ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبْحَان

کا

پارہ نمبر ۲۱

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ

فاضل اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

پوسٹ بکس ۱۲۰۶ سوئیوالان ۱۵۶۵

نئی دہلی ۲

نے شائع کی !!

(جزو اول) ۲۱

اکیسواں پارہ

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ

(اے محمد) جو کتاب وحی کے ذریعے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے اُس کو پڑھو اور نماز ٹھیک طرح سے پڑھو کیونکہ نماز بے حیائی اور بُرے کام سے روکتی ہے

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ

یہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے اور اہل کتاب سے مباحثہ اسی طریقہ سے کرو جو نہایت اچھا

اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا

ہو ہاں ان میں سے جو لوگ ظلم کریں (اُن سے سختی کرنے میں حرج نہیں) اور تم کہہ دو کہ ہم تو اس کو مانتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور جو تم پر اتارا گیا اور ہمارا تمہارا

وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ

معبود ایک ہی ہے ہم اسی کے فرماں بردار ہیں (اے محمد) اسی طرح ہم نے تمہاری طرف کتاب اُتاری پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب

الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَ

دی ہے وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان (اہل مکہ) میں سے بھی بعض اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہماری آیتوں کا وہی انکار کرتے ہیں جو کافر ہیں تم

مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ

اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے ورنہ ایسی حالت میں یہ اہل باطل ضرور شبہ کرتے بلکہ

هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

یہ قرآن اُن لوگوں کے سینوں میں روشن آیات ہیں جن کو علم دیا گیا ہے اور ہماری آیتوں کا وہی انکار کرتے ہیں جو ظالم ہیں

تفسیر جب رب الخلق اور خلاق حکیم نے اس دنیا کو بنایا اور بسایا تو کائنات کا سلسلہ اس طرح قائم کیا کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ ہر مخلوق کا ایک فطری ذریعہ مقرر کر دیا۔ ضابطہ کی زنجیروں میں اس کو ایسا جکڑ دیا کہ کسی کو خلاف ورزی کی مجال نہیں۔ آسمان، چاند، سورج، تمام ستارے، سیارے، ہوائیں، کائنات، مٹی، پہاڑ، درخت، حیوان سب ہی اپنا قومی اور شخصی فرض ادا کرنے میں ہمہ تن [illegible] تاثیر و تاثر، فعل و انفعال، سبب اور نتیجہ کی ایسی حلقہ در حلقہ زنجیر ہے جس کے مبدا اور منتہا میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ایسا ممکن نہیں کہ سورج کبھی مغرب سے نکلے یا مشرق میں غروب ہو یا کسی وقت ساکن ہو جائے یا مقررہ مسافت سے کم و بیش طے کرے یا روشنی اور حرارت نہ پیدا کرے۔ ستارے سیارے بن جائیں یا سیارے ستاروں کی جگہ لے لیں۔ ہوا میں مٹی کا وزن اور کثافت پیدا ہو جائے یا پانی آگ کی شکل اختیار کرلے۔ کوئی کسی کے فرض میں دخل نہیں دے سکتا اور اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل نہیں ہو سکتا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ پانی برسے اور زمین تر نہ ہو یا بغیر پانی کے زمین تر ہو جائے۔ کون دعوے کر سکتا ہے کہ اگر حرارت نہ ہو تو کوئی چیز جل جائے یا ..... حرارت رہتے ہوئے اپنا عمل ترک کردے یا نور اپنی حقیقت چھوڑ کر ظلمت اختیار کرلے یا ظلمت نورانی

حقیقت کی حامل ہو جائے۔ درخت انار میں سیب نہیں آسکتے اور سیب کا درخت اناروں سے بار ور نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک بجائے خود اپنے فرض کو ادا کرنے میں مشغول ہے اور سب مل کر اس فطری فرض کو ادا کر رہے ہیں جو نظامِ کائنات کو چلانے کے لئے قدرت کی طرف سے اُن پر عائد کیا گیا ہے لیکن انسان کہ ظلوم و جہول انسان فطری تقاضے کی آواز کو نہیں سُنتا بہرا بنا ہوا ہے۔ قدرت کے طلبگار ہاتھ کو نہیں دیکھتا اندھا بنا ہوا ہے۔ اقتضائے نیچر کو نہیں سمجھتا بیوقوف اور بھولا بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کے لئے کمربستہ ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ زنجیرِ فطرت کی کڑیوں کو توڑنے اور اُن سے گلو خلاصی کرنے کے درپے ہے۔ قدرت اُس کو پکار پکار کر خوابِ غفلت سے بیدار کر رہی ہے اور قدرتی نشانیاں چمک چمک کر اس کی آنکھوں کے سامنے حقائق عالم کو واشگاف کر رہی ہیں مگر وائے رے غفلت اور ہائے رے جمود و بے حسی کہ اس کی گراں گوشی دور نہیں ہوتی اور آنکھوں میں روشنی نہیں آتی بس اسی بنا پر وہ صاحبِ فطرت کے وجود کا بھی انکار کرنے لگتا ہے۔ اس کی الوہیتِ عامہ اور ربوبیتِ تامہ کو بھی نہیں مانتا اور اس کی بے ہمتائی و یگانگت کو بھی بلائے استعجاب سے ٹھکراتا ہے پھر اس پر بس نہیں کرتا بلکہ اپنے نوعی برادران کے حقوق پر دست درازیاں کرتا ہے اور فطری قوانین کی یہاں تک مخالفت کرتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں کی معصوم آبرو، محفوظ مال اور بے قصور جانوں کو تکبر و غرور کے قدموں سے روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور انتہائی رعونت کے ساتھ آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہتا ہے میرے سوا کون شوکت و جبروت اور طاقت و اقتدار والا ہے۔ لیکن ارحم الراحمین کی رحمتِ عامہ صرف اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتی کہ اس نے بتا اپنی قدرت اور آیاتِ فطرت نمودار کر دیں اور بس۔ بلکہ ربانی عطوفت روٹھے ہوئے انسان کو مناتی اور انتہائی شفقت کے ساتھ دعوتِ توجہ دے کر کہتی ہے۔ بھولے بھالے انسان کہ اول میری قدرتی نشانیوں کی طرف دیکھ۔ اگر تجھ میں یہ قوت نہیں اور اتنا ہی کوتاہ نظر ہے تو میں تیرے ہی بھائی بندوں میں سے ایک انسان کو پیامبر بنا کر بھیجتی ہوں جو لکھا پڑھا نہیں ہر وقت تیرے ساتھ رہنے والا ہے۔ وہ تجھے اللہ کا پیام سُنائے گا، بھولا ہوا سبق یاد دلائے گا۔ فطری اقتضاء کو تیرے سامنے بیان کرے گا۔ قانونِ عدل پڑھائے گا اور ایسا درس دے گا جس سے تو خدا کو بھی پہچان جائے اس کے قدرتی نظام کو بھی سمجھ جائے۔ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنی چھوڑ کر خود بھی امن چین صلاح اور عدل کی زندگی بسر کرے اور دوسروں کو بھی عافیتِ زندگی میسر آنے کا موقع دے۔ میرا پیام کیا ہے اس کا نام قرآن ہے۔ میں نے اپنے پیامبر کو حکم دے دیا ہے کہ وہ قرآن پڑھ کر تجھے سُنائے۔ اس کا مطلب سمجھائے اور قوانینِ الٰہیہ سے تجھے واقف کرے اور پھر اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پیغمبر کو یہ بھی ہدایت کر دی ہے کہ وہ عملی نمونہ بھی بن جائے۔ قانونِ اعتدال اور ادائے حقوق اور اخوتِ عامہ کا مجسمہ بن کر بھی تجھے دکھائے جس کا اوّلین مظاہرہ یہ ہو کہ وہ نماز مع شرائط ادا کرے تاکہ تیرے اخلاق بھی درست ہوں، اعمال بھی صحیح ہوں، سماجی زندگی کی بھی اصلاح ہو۔ تمدن اور سیاست کا بھولا ہوا سبق بھی تجھے یاد ہو جائے۔ تنظیمِ باہمی، مساواتِ عمومی، اطاعتِ امیر، نظافتِ ظاہری اور طہارتِ روحانی کا مجسمہ تیری نظروں کے سامنے آجائے۔ فحشاء اور منکر سے بھی تو بچ جائے۔ تیرے ظاہری اور باطنی تمام عیوب دور ہو جائیں اور تجھے وہ رشتہ پھر معلوم ہو جائے جو خدا کے اور تیرے درمیان ہے۔ اس رشتہ کو یاد کرنے سے کھلا ہوا فائدہ یہ نکلے گا کہ تیرا سرِ نیاز اپنے معبود کے سامنے جھک جائے گا۔ اس کے احکام کو بے چون و چرا تسلیم کر کے اس پر تو عمل پیرا ہو جائے گا تو اس مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔ تو ابنائے نوع سے تیری ذاتی رنجشیں دور ہو جائیں گی۔ بغض و عناد کا جذبہ تیرے دل میں باقی نہ رہے گا۔ اور پھر نہایت شفقت کے ساتھ تو سب کو دعوتِ امن دے گا، صلاح و عافیت کی آواز سے پکارے گا، آشتی و نرمی سے خطاب کرے گا اور انتہائی پاک باطنی اور رواداری سے کہہ دے گا کہ اے وہ لوگو جو قوانینِ الٰہیہ پر کاربند ہونے کے مدعی ہو! اے وہ گروہ جو اپنے آپ کو کتابِ الٰہی کا علمبردار اور مرضیٔ مولیٰ کا طلبگار کہتے ہو آؤ ادھر آؤ ہماری تمہاری کوئی لڑائی نہیں۔ ہم تم سے کوئی جنگ کوئی جھگڑا کوئی جدال کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے تمہارے درمیان کوئی کدورت نہیں۔ صرف ایک بات پر ہمارا تمہارا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہوا و ہوس کو چھوڑ دو، قوانینِ فطرت کو توڑنے والے تمام ہتھیاروں کو توڑ دو، فتنہ و فساد سے منہ موڑ لو اور صرف اللہ سے رشتہ جوڑ لو۔ وہی ہمارا واحد و یگانہ مولا، وہی ہمارا کارساز بے نیاز آقا، وہی ہمارا خالق، وہی ہمارا رازق اور وہی ہمارا معبود و مسجود ہے۔ ہم اس کے ہر حکم کو بے چون و چرا مانتے ہیں، تم کو بھی اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ رہبانیت، مشائخیت اور امارت کے نشہ کو سر سے اُتار دو اور عجز و نیاز کے بادۂ کہن سے سرشار ہو کر اسی اللہ کے سامنے جھک جاؤ۔ ہمارا تمہارا خدا الگ الگ نہیں، ایک ہی ہے۔ تمہارے پاس جو اس کے پیام آچکے ہیں ہم ان سب کو مانتے ہیں اور ہمارے پاس جو اس کا پیام آیا ہے ہمارا اس پر بھی ایمان ہے۔ لہٰذا تم کو بھی سب پیاموں کو ماننا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے پاس خدا کا کوئی نیا پیام نہیں آیا بلکہ اس سے پہلے تمہارے پاس مختلف پیام آچکے ہیں۔ پھر ہمارے پاس جو پیام آیا ہے اس کا مضمون بھی کوئی جدید نہیں بلکہ پروردگارِ عالم

کی توحید، قیامت کی حقانیت، جزا سزا کے وجوب اور پیغمبر کی صداقت کی مکمل نشانیاں ہیں۔ اصلاحِ خلق، الٰہی رواداری، قیامِ امن اور اشاعتِ عدل کے واضح قوانین ہیں۔ پس اسے اہلِ کتاب سوچو سمجھو اور رغبت پیدا کرو۔ اگر انکار کرو گے تو ہمارا یا خدا کا کچھ نقصان نہ کرو گے اپنا ہی نقصان کرو گے۔

تحلیلِ اجزاء

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اس آیت میں تلاوتِ قرآن کا حکم دیا گیا ہے۔ خطاب اگرچہ حضور اقدس ﷺ کو ہے لیکن روئے سخن تمام افرادِ اُمت کی طرف ہے۔ تلاوت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ تلاوت جو بطور ارشاد و ہدایت کے ہو، دوسری وہ جو بطور عبادت کے ہو۔ اس جگہ موخرالذکر تلاوت مراد ہے کیونکہ اگر اول صورت مراد ہوتی تو اُتْلُ عَلَیْهِمْ کہا جاتا۔ تلاوتِ قرآن نماز میں بھی ہوتی ہے اور نماز سے خارج بھی۔ آیت میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں بیرونِ نماز تلاوت مراد لینے کا قرینہ موجود ہے کیونکہ حکمِ تلاوت کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اگر تلاوت سے تلاوت فی الصلوٰۃ مراد ہوتی تو اس کے لئے اقامت الصلوٰۃ کا حکم کافی تھا۔ مزید حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ممکن ہے کہ تلاوتِ قرآن کا حکم دینے سے مراد یہ ہو کہ ہدایت و ارشاد حاصل کرنے اور احکامِ الٰہی معلوم کرنے کے لئے تلاوتِ قرآن لازم ہے اور اسی کا مطالعہ راہِ مستقیم دکھانے کے لئے کافی ہے۔ کسی دوسری مذہبی کتاب کے تصفح، تلاش اور تحقیق و تنقیح کی ضرورت نہیں۔ ایک حدیث بیہقی نے بروایت جابر بن عبداللہ نقل کی ہے جو صحاح کی بعض کتابوں میں بھی موجود ہے کہ ایک مرتبہ کسی صحابی کے ہاتھ میں توریت کے چند اوراق ملاحظہ فرما کر حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غصہ کے آثار نمودار ہوگئے اور فرمایا اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری پیروی کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اس حدیث میں مقصود یہ ہوگا کہ قرآن پر غور و خوض اور مطالعہ و فکر کرنا ہدایت و رشد اور ثواب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا الفاظِ قرآنی پڑھا کرو اور ان کے مضامین کو سمجھا کرو۔ انبیاء سابقین کی کتابیں قرآن کی موجودگی میں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ تلاوت کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا۔ اقامت کا لفظ تعدیلِ ارکان کو بھی شامل ہے اور نماز کے اجزائے خمسہ کو بھی اور اخلاصِ قلبی کو بھی اور حسنِ نیت کو بھی اور تمام اندرونی و بیرونی شرائط کو بھی گویا عمومی تلاوت سے لذت صرف دل یا زبان یا نظر کو حاصل ہوتی ہے دوسرے اعضاء شریک نہیں ہوتے لیکن نماز میں تمام اعضاء کیف اندوز ہوتے ہیں۔ تلاوت بغرضِ عبادت بھی ہوتی ہے اور بغرضِ ہدایت بھی مگر نماز کی اصل غایت عبادت ہی ہے۔ تلاوت سے مقصود اپنے نفس کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور دوسروں کی اصلاح بھی البتہ نماز سے اصل مقصود صرف اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ ان تمام مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اصلاحِ نفس دوسروں کی اصلاح سے مقدم ہے پہلے اپنے اعمال کی درستگی کر کے عبدیتِ کاملہ کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ پھر دوسروں کو عبدیت و عبودیت اختیار کرنے کی تلقین کرنی مناسب ہے۔
حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ کلامِ پاک کی عمومی تلاوت بھی کرو اور خصوصاً نماز کو اس کے ارکان و شرائط کے ساتھ ادا بھی کرو کیونکہ اس لئے کہ:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى الخ۔ نماز میں دو عظیم الشان فائدے ہیں۔ یہ وہ گنجِ جواہر ہے جس کے دو جوہر شاہی اور بہت آبدار ہیں۔ اول یہ کہ نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے۔ دوم یہ کہ اس میں یادِ الٰہی سب سے بڑی چیز ہے۔ ہم ان دونوں حصوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) عمران بن حصین کی حدیث میں ہے کہ جس شخص کو اس کی نماز نے منکر اور فحش سے نہ روکا تو اس کی نماز نہیں (رواہ ابن ابی حاتم و ابن مردویہ) اور ایسی نماز سے سوائے اس کے کچھ نہیں ملتا کہ اللہ سے مزید دوری حاصل ہو (رواہ الطبرانی وغیرہ عن ابن عباس) ایک شخص نے خدمتِ گرامی میں عرض کیا حضور فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے اور دن کو چوری کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا عنقریب نماز اس کو روک دے گی (رواہ البزار و احمد) حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک انصاری نوجوان حضور ﷺ کے ساتھ پانچوں نمازیں پڑھتا لیکن اگر کوئی برا کام سامنے آجاتا تو اس کے کرنے سے بھی چوکتا نہ تھا خدمتِ مبارک میں اس تذکرہ کیا گیا ارشاد فرمایا عنقریب اس کی نماز ایک دن اس کو روک دے گی چنانچہ چند دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس نے توبہ کرلی اور اس کی حالت اچھی ہوگئی۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے بشرطِ التزام آدمی گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ اول تو ہر نماز خواہ کیسے ہی گناہوں سے روکتی ہے اتنی دیر ارتکابِ جرائم سے بچا رہتا ہے پھر کبھی کبھی آدمی کے دل میں خیال پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ میں نمازیں پانچوں وقت اپنے پروردگار کے سامنے جا کر گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا عہد کرتا ہوں لیکن پھر اس عہد کو توڑ ڈالتا ہوں۔ آخر کب تک نقضِ عہد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا پروردگار سے شرم کرنی ضرورت ہے۔ پھر لوگوں کی نظر میں نمازی ہوتے ہوئے بدکاری سے میری بدنامی اور رسوائی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے خیالات بالآخر

اس کو گناہ سے روک دیتے ہیں اور اس وقت قرآن کی صراحت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بقول ابو العالیہ نماز میں تین امور ہوتے ہیں جس نماز میں ان امکانِ سہ گانہ میں سے کوئی نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔ اخلاص، خوفِ الٰہی، ذکرِ الٰہی۔ اخلاص نیک کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔ خوفِ الٰہی بُرے کاموں سے روکتا ہے اور ذکرِ الٰہی یعنی قرآن امر و نہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر کسی نماز میں ارکانِ مذکورہ میں سے کسی ایک رکن کی کمی ہوگی تو اتنا ہی نماز میں نقصان ہوگا۔ ناقص نماز بھی اگرچہ گناہوں سے روکتی ہے لیکن آیت میں مراد کامل نماز ہے کیونکہ اقامت الصلوٰۃ کا حکم دینے کے بعد فرمایا ہے کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز سے وہی نماز مراد ہے جس کا حکم اقم الصلوٰۃ میں دیا گیا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ اقامت الصلوٰۃ تمام اندرونی و بیرونی اجزاء مع شرائط کو حاوی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کامل نماز فحش و منکر سے روکتی ہے یعنی ناقص نماز ترقی کرتے کرتے جب حدِ کمال کو پہنچتی ہے تو پھر گناہ کرنے کی جرأت ہی نہیں رہتی۔

فحشاء کیا چیز ہے اور منکر کی کیا حقیقت ہے۔ اس کو جاننے کے لئے سب سے پہلے انسانی زندگی پر ایک اچٹتی نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حدِ اعتدال پر قائم رہنا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اسی کی تعلیم کے لئے اسلام آیا اور قواعدِ اسلامی کی بنا اسی پر ہے۔ اب اعتدال کے اقسام ان گنت ہیں، کیونکہ زندگی کے اعمال، اقوال، معاملات اور تعلقات غیر محدود ہیں تاہم چند لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اعتدالِ کامل نام ہے اخلاقی، معاشرتی، سماجی اور روحانی اور مادی اعتدال کا۔ جب اخلاقی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے تو انسان کے وہ اعمال برباد ہو جاتے ہیں جن کا اثر اس کی ذات پر براہِ راست پڑتا ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگ بھی اس کے اثرات سے نہیں بچ سکتے مگر دوسروں پر تاثیر ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً کوئی جھوٹ بولتا ہے، شراب پیتا ہے، مالِ حرام کھاتا ہے، بھیک مانگتا ہے۔ ان تمام افعال کا اثر براہِ راست اس کی ذات پر پڑتا ہے لیکن آخرکار پوری قوم بھی اثر پذیری سے خالی نہیں رہتی۔ لیکن جن عیوب کا اثر براہِ راست دوسروں پر پڑتا ہے مثلاً سرقہ، ڈاکہ، قتل، آبرو ریزی وغیرہ تو ایسے عیوب معاشرتی سماجی کہلاتے ہیں۔ معاشرتی اور سماجی عیوب کا اثر اگرچہ صاحبِ عیب پر بھی پڑتا ہے مگر سماج کا تاثر اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اس تقریر کی تحلیل بسیط مقالہ چاہتی ہے اور تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال:-

اخلاقی جرائم کی طرف لفظ فحشاء سے اشارہ ہے اور معاشرتی و سماجی عیوب کی طرف لفظ منکر سے اشارہ ہے۔

جب انسان اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول ہو جاتا ہے جس کا اعلیٰ ترین مظاہرہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالق کی طرف رُخ کرے اور اخلاص کے ساتھ اپنی عبدیت اور اس کی معبودیت کا اقرار کرے، تو پھر رفتہ رفتہ اس کا نفس خود اصلاح پر آ جاتا ہے اور چونکہ نماز تنظیم باہمی کی، مساوات کی، تفوق و استبداد کے خیال کے ازالہ کی، طہارتِ روحانی و جسمانی کی اور طمانیت و سکون کی بھی تعلیم دیتی ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ پُرخلوص نمازی کی وجہ سے وہ تمام اعمال متروک ہو جاتے ہیں جو دنیا میں بے چینی پیدا کریں، امنِ عالم کو تباہ کریں اور سکونِ جہاں کو اضطراب سے بدل دیں۔ ماحصلِ بیان یہ ہے کہ نماز فحش سے روک کر اپنے نفس کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے اور منکر سے روک کر تعمیرِ عالم کے قواعد پر بھی کاربند بنا دیتی ہے۔ یہی سرچشمہ ہے اسرارِ قدس کے حاصل ہونے کا، فیضِ روحانی کی بارش کا، اہلِ ایمان کی معراج کا، چشمِ مدام کی خنکی کے حصول کا اور یہی مخزن ہے امنِ عام، مساوات، طہارت اور تنظیمِ انسانی کا۔ والتفصیل فی قلوب اہل المعارف۔

(۲) نماز میں یادِ الٰہی ہوتی ہے اور یادِ الٰہی سب سے بڑی چیز ہے۔ آیت ولذکر اللہ اکبر کی تفسیر دو طرح سے مروی ہے۔ ابن عون انصاری نے فرمایا کہ نماز میں جو ذکرِ الٰہی بندہ کرتا ہے وہ سب سے برتر چیز ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابو درداءؓ، سلمان فارسیؓ، مجاہد، ابن جریر وغیرہم نے فرمایا کہ جب بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو پروردگار اپنے بندہ کا تذکرہ فرماتا ہے اور اللہ کا اپنے بندہ کو یاد فرمانا بہت بڑی چیز ہے۔ اس مطلب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کے راوی ابو ہریرہؓ اور ابو سعید خدریؓ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس قوم نے اللہ کی یاد کی تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ہر طرف سے ملائکہ اسے گھیر لیتے ہیں۔ رحمت چھا جاتی ہے۔ اس پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ اپنے مقربین میں اس کا ذکر فرماتا ہے (البخاری)۔ بہرحال بندہ اپنے رب کو یاد کرے یا پروردگار اپنے بندہ کا تذکرہ فرمائے دونوں بہتر ہیں تاہم خصوصیت یہ ہے کہ اقامت الصلوٰۃ کے بعد ولذکر اللہ اکبر فرمانا ایک خاص نکتہ کا حامل ہے جو اہلِ نظر کو دعوتِ غور دے رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کے مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ ادنیٰ مرتبہ صرف زبان سے یاد کرنے کا ہے اور اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جس میں پہنچ کر عارف کے تصور سے ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ الٰہی دور نہیں ہوتی۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اس کے دماغ پر یادِ الٰہی کا ایک خاص جذبہ مسلط رہتا ہے۔ دنیا کے کسی کام میں بھی مشغول رہ کر اس کے دماغی تخیلات، جسمانی حرکات اور زبانی اقوال کا اصل مرکز ذکرِ الٰہی رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا موضوع ہی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ اس کی نماز، اس کا روزہ، اس کا دنیوی انہماک، اس کا جینا، اس کا مرنا سب ہر وقت اللہ ہی کے واسطے ہوتا ہے، یہی کمالِ ایمان کا مرتبہ علیا ہے۔ یہی مومن کا منتہائے نظر ہے۔ اب کل آیات کو ملا کر پڑھئے تو مطلب صاف مسلسل اس طرح نکلتا ہے کہ سب سے پہلے یادِ الٰہی کی طرف رغبت پیدا کرنے والی چیز کی تحصیل ضروری یعنی قرآن مجید کی تلاوت لازم ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے بندہ کو اپنے روابط و تعلقات کا علم ہو جائے جو اس کے اور

خدا کے درمیان ہیں۔ جب یہ رابطہ معلوم ہو جائیں تو لازم ہے کہ چند مقررہ اوقات میں اس کی یاد بھی کی جائے۔ اس کے سامنے سرِ نیاز بھی جھکایا جائے۔ عبدیت کا اقرار بھی کیا جائے۔ بندگی کا اظہار بھی ہو تاکہ حاضر رہا ہے۔ اگر نفس کی پرورش اولاد کے مشاغل اور دنیوی جاہ و مال کے حصول میں آدمی غرق رہتا ہے تو روز بے لیکن شبانہ روز میں اوقاتِ مقررہ پر تمام مخلوق سے رشتہ توڑ کر اللہ سے تعلق جوڑنا بھی فرضِ قطعی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ چند لمحات کا تعلق جوڑنا اس دوامی واقعی تعلق کے اظہار کا ایک نمونہ ہے جو مخلوق کو خالق سے اور عابد کو معبود سے ہے۔ چونکہ وہ تعلق کسی طرح توڑنے سے ٹوٹ نہیں سکتا خدا کو بھول جانے سے رشتہ خالق و مخلوق قطع نہیں ہو سکتا ہے اس لئے صرف نماز کے چند مخصوص اوقات ہی میں اس لازوال تعلق کی یاد کر لینی کافی نہیں بلکہ مومن پر لازم ہے کہ اپنی پوری زندگی کو ایک ہی سانچے میں ڈھال لے۔ رضائے مولیٰ کی جستجو ہر وقت پیشِ نظر رکھے قوانینِ الٰہیہ کی زنجیر میں زندگی کے تمام لمحات کو جکڑ دے۔ کسی وقت اللہ کی یاد کو دماغ سے دور نہ ہونے دے۔ یعنی دنیا میں کچھ کرے سب سے بے نیاز ہو کر کرے صرف رضائے مولا کے حصول کے لئے کرے باہمہ دکھائی دے مگر واقع میں بے ہمہ ہو۔ یہی یادِ الٰہی ہے اور اس کے بعد ہوش و حواس کی دنیا میں رہتے ہوئے عارف کے لئے آگے بڑھنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ اس استغراقِ یاد کی عظمت اتنی بڑی ہے کہ پھر ایسے بندے کو پروردگار یاد کرنے لگتا ہے۔ محب محبوبیت کا درجہ پا لیتا ہے۔ پہلے ایسے بندے سے خدا راضی ہوتا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ پس تلاوتِ کلامِ مجید سے آغازِ ایمان ہوا اور استغراق فی الذکر یعنی قوانینِ الٰہیہ کے سانچے میں پوری زندگی کا اختتام ہوا۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۔

تتمہ ذکرِ الٰہی دو طرح کا ہوتا ہے۔ جہری اور سری یعنی چلّا کر ایسی آواز سے تذکرۂ الٰہی کرنا کہ کم از کم دوسرا آدمی سن لے اور یا چپکے چپکے زبان سے ذکر کرنا کہ دوسرا کوئی سُن نہ سکے۔ میرے نزدیک اگر جہری اور سری سے مراد اس طرح لی جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ جس ذکر میں ظاہری اعضا کی حرکات کو دخل ہو وہ جہری ہے خواہ زبان سے ہو یا دوسرے اعضا سے اور ذکرِ سری ہے دل میں خدا کو یاد کرنا اور کسی وقت دماغی تصور کو یادِ خداوندی سے خالی نہ رکھنا۔ آیت میں لفظِ ذکر دونوں قسموں کو شامل ہے یہ مطلب تو اس صورت کی تفسیر پر ہوگا جس میں ذاکر بندہ ہوگا اور مومن ذکر تفسیر پر جس میں ذاکر پروردگار قرار دیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پروردگار نہ ذکرِ جہری کرتا ہے نہ سری وہاں لفظِ ذکر کا اطلاق مجازی ہے۔ اللہ کا اپنے بندہ کو یاد کرنا اور بڑائی کے ساتھ اس سے تذکرہ فرمانا ہر قسم کی صوتی کیفیت اور اعضا کی حرکت سے خالی ہے نہ وہاں تصور و تخیل ہے نہ الفاظ تلبی نہ قوتِ دماغی۔ اس یاد کی حقیقت تو سوائے یاد کرنے والے کے کوئی بھی نہیں جانتا۔ واللہ اعلم

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۔ یعنی اللہ کو یاد کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان سے تو رٹ لگائی جائے اور دل اور کسی طرف ہو خوب سمجھ لو کہ تمہاری حرکات سے خدا خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو اُس کو وہ جانتا ہے منافقوں کی طرح بادلِ ناخواستہ نماز میں شریک ہونا ذکرِ الٰہی نہیں بلکہ حُسنِ نیت خشوع و خضوع اطمینان و ایمان کے ساتھ تمام اعضاء کو اللہ کی طرف مائل کرنا اور دل زبان اور دوسرے اعضاء سے یادِ الٰہی کرنی ذکرِ الٰہی ہے گویا ذکرِ الٰہی نام ہے تمام حرکاتِ زندگی کو شریعتِ الٰہیہ کے سانچے میں ڈھال لینے اور قوانینِ خداوندی کی ہر وقت ظاہری اور باطنی پابندی کرنے کا۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ الخ۔ دو شخص اگر تحقیق و تنقیحِ حق کے لئے باہم مباحثہ کرتے ہیں تو ایسے مباحثہ کو مناظرہ کہا جاتا ہے لیکن تحقیقِ حق اگر مقصود نہ ہو صرف دوسرے کو لاجواب کر دینا اور اس پر غالب آجانا مقصود ہو تو ایسے مباحثہ کو مکابرہ کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر اگر لاجواب کر دینا بھی غرض نہ ہو صرف نوک جھونک اور جھگڑا ہی مقصود ہو تو اس کو جدال کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحی فرق ہے۔ لغت میں جدال کا لفظ مناظرہ اور مکابرہ کو بھی شامل ہے۔ دو پہلوانوں کا باہم کشتی لڑنا تاکہ ایک دوسرے کو پچھاڑ دے جدال کہلاتا ہے۔

جدال شرعاً مذموم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس قوم کو اللہ نے ہدایت فرمائی پھر لمانہ دراز گزرنے کے بعد انھوں نے ناشکری کر کے راہِ ہدایت بدل ڈالی تو ان کو جدال دیا جاتا ہے (الترمذی) یعنی عقل و معرفت کا نورِ قرآن سے چھین لیا جاتا ہے شیطانی اوہام اور زبانی جھگڑے ان کے پاس باقی رہ جاتے ہیں اور وہم کو فہم اور مغالطہ کو فلسفہ سمجھنے لگتے ہیں اور اصل کتاب کے مقابلے میں طمع کرواتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ کتاب کی بھی یہی کیفیت ہو گئی تھی۔ اللہ کی کتابوں کو انھوں نے مسخ کر ڈالا تھا تعلیمِ الٰہی کے خلاف عقائد بنا لئے تھے۔ قوانینِ ربانی کو خواہشاتِ نفس کے تحت بگاڑ دیا تھا غرض عمل کی قوت تو ان کی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ جنت کے ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ انسانوں کو خدا یا اُلوہیت ماننے لگے تھے۔ جدال الٰہی کے شیرازہ کو پارہ پارہ کر دیا تھا عرب کے اہلِ کتاب حاملانِ اسرارِ الٰہی بنے بیٹھے تھے۔ عموماً عربی اقوام کو بہکاتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام کی خبر مشہور ہوئی اور مکہ کے کافروں نے مخالفت کی تو بعض لوگ اہلِ کتاب سے بھی دریافت کرنے لگے۔ انھوں نے اسلامی جماعت سے لڑنے اور مقابلہ کرنے پر برانگیختہ کیا مسلمانوں میں اس وقت ظاہری اسباب کا لحاظ کرتے ہوئے قتال و جدال کی قوت نہ تھی لیکن حمایتِ حق سے گریز بھی تعلیمِ الٰہی کے موافق نہ تھا اس لئے اب حکم نازل فرمایا

جس میں قتال و جہاد کی صریح تعلیم بھی نہیں ہے نہ ممانعت ہے بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کی طرف مائل کرنے کی ہدایت ہے اور جو لوگ اپنی کج نفسانی اور بدباطنی کی وجہ سے نہ مانیں ان کے لئے ہر موعظت و نصیحت اور فہمائش خواہ کسی طریقہ سے ہو بیکار ہوتی ہے اس لئے ایسے خبیث باطن گروہ کو مستثنیٰ کر دیا اور چونکہ مسلمانوں کو اس وقت تک مصلحت جہاد کا حکم نہ ملا تھا اس لئے ایسے اشخاص یا جماعتوں کے متعلق کوئی تفصیلی حکم اس جگہ نازل نہیں فرمایا۔ اسی بنا پر ہمارے بعض علمائے تفسیر کا قول ہے کہ یہ آیت آیت سیف سے منسوخ ہے۔ اب اسلام یا جزیہ یا قتال کے علاوہ اور کوئی حکم باقی نہیں رہا۔ قتادہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ کما صرح بہ ابن کثیر لیکن عموماً علماء آیت مذکورہ کو غیر منسوخ کہتے ہیں۔ مجاہد، سعید بن جبیر وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ ابن جریر اور ابن عربی نے بھی اس کو ترجیح دی ہے اور حق بھی یہی ہے کیونکہ آیت مذکورہ میں موعظت حسنہ کا حکم دیا گیا ہے اور جو گروہ کسی نصیحت کو کسی اسلوب سے نہ مانیں ان کو مستثنیٰ کر لیا ہے۔ ان کے متعلق کوئی تفصیلی حکم اس جگہ نہیں دیا آیت جہاد میں ان کے متعلق تفصیلی حکم قتال کا نازل فرما دیا پس ایسی صورت میں نسخ کہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔

ہر آسمانی مذہب کی بنا باری تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام کی اطاعت پر ہے۔ احکام الٰہی کی تفصیل مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء کرام کے ذریعہ بتائی گئی تمام انبیاء خدا کے فرستادہ اور اس کے احکام کو لانے والے اور گمراہوں کو راہ راست دکھانے والے تھے۔ فرق صرف سابق مسبوق اور مقدم مؤخر کا تھا۔ اس لئے اس آیت میں بتایا گیا کہ جب گمراہوں کو ہدایت کرنے اور بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر لانے کے لئے انبیاء کا آنا اور خدا کے بھیجے ہوئے احکام کا خلق میں پھیلانا ضروری ہے اور ایسا ہوتا چلا آیا ہے تو پھر قرآن کی صداقت میں تامل کرنے کی کیا وجہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اس سے پہلے کتابیں بھیجیں اسی طرح قرآن بھی نازل فرمایا۔ ایسی صورت میں جن لوگوں کے دلوں میں جذبات حق پرستی ہیں وہ تو انکار نہیں کر سکتے ہاں جو انتہائی بدباطن اور کفر شعار بن گئے ہیں وہ ضرور نہیں مانیں گے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ رسول خدا پڑھے لکھے نہ تھے کوئی کتاب اس سے پہلے آپ نے پڑھی نہ تھی اگر کوئی آسمانی کتاب پڑھی ہوتی تو شاید یہ شبہ کیا جا سکتا کہ اسی کی نقل کر رہے ہیں۔ عبارت خود بنائی ہے۔ مضامین کا اقتباس ان کتابوں سے کر لیا ہے لیکن جب نہ کچھ پڑھا نہ لکھا اور آسمانی کتابوں کے موافق اصولی تعلیم دی اور ایسی کتاب پیش کی جو عقائد اور اصول اعمال میں گزشتہ کتابوں سے سر مو تفاوت نہیں رکھتی ہے تو پھر انکار کی بنا محض ناحق کوشی پر نہیں تو اور کیا ہے۔

اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ اہل کتاب سے جدال یعنی مباحثہ کرنے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے مگر خوش اسلوب یا احسن مدعا کو پیش نظر رکھ کر مناظرہ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ خوش اسلوب یا احسن مدعا کیا ہے اس کی تفصیل خود آئندہ آیت میں فرما دی۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ۔ اہل کتاب کے دو فریق قرار دیئے ایک وہ جو ظالم نہ تھے یعنی حق کے طالب اور مذہب کی پرستاری اور اطاعت کے جذبہ سے سرشار تھے وہ اہل حق سے عناد نہیں رکھتے تھے۔ ان کی مخالفت بھی جذبہ حق کے تحت تھی۔ دوسرا گروہ جو ظالم یعنی ناحق کوش تھا۔ اس کا مذہبی اختلاف جستجوئے حق اور اتباع صداقت کے لئے نہ تھا بلکہ صرف فرقہ بندی، آبائی تقلید اور نفسانی جذبات کے زیر اثر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم کسی دوسرے مذہب کے پیرو بن کر اپنی عزت کو کم کر دیں چونکہ اس گروہ سے کسی طرح پر نصیحت پذیری کی امید نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اس سے مناظرہ کرنے کی قطعی ممانعت فرما دی اول الذکر گروہ میں قبول حق کی صلاحیت تھی پس اس سے مناظرہ بحسن اسلوب کرنا مفید ہو سکتا تھا اس لئے اجازت دے دی۔ ابن عباس نے فرمایا جس طریقہ سے مناظرہ کرنے کا حکم دیا وہ طریقہ صرف دعوت لا الٰہ الا اللہ ہے۔

عدی بن حاتم جب بھاگ کر ملک شام کو چلے گئے اور حضور ﷺ نے عدی کی پھوپھی کو کرم ذاتی کے زیر اثر نہایت عزت سے آزاد فرما دیا اور پھوپھی واپس چلی گئی تو اس نے جا کر اپنے بھتیجے عدی سے کہا کم بخت کیوں بھاگا پھرتا ہے میں نے ایسا کریم اخلاق انسان نہیں دیکھا۔ جا چلا جا حاضر ہو کر عفو کا خواستگار ہو۔ عدی فوراً پھوپھی کے مشورہ سے متاثر ہو کر حاضر دربار رسالت ہوئے حضور ﷺ نے نہایت سکون سے سمجھا کر فرمایا۔ عدی تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کیوں گریز کرتا ہے۔ کیا تو اللہ کے سوا کوئی اور معبود والا پاتا ہے۔ عدی فوراً مسلمان ہو گئے۔ یہ تھا حضور ﷺ کا طریقہ احسن جس کے مطابق آپ تبلیغ فرماتے تھے۔ اسی طرح اور بھی بکثرت واقعات احادیث میں مذکور ہیں کہ جگہ خدا تعالیٰ نے خود ہی طریقہ احسن کی تصریح فرما دی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ الخ مسلمانو کہہ دو کہ ہمارا تمہارا سب کا معبود تو بہر حال ایک ہی ہے۔ اسی نے احکام بھیجے۔ کتابیں اور صحیفے مختلف انبیاء پر اتارے اب اگر تم تمہاری نازل شدہ کتابوں کو (اور تمہارے انبیاء کو) سچا جانتے اور سب کو مانتے ہیں اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری ہدایت کے لئے بھیجی گئی (تم کیوں ہماری کتاب اور ہمارے رسول کو نہیں مانتے) اس کے علاوہ ہم اللہ کے فرمانبردار بھی ہیں یعنی مذہب کی بنا جذبہ حق پرستی اللہ کی فرمان پذیری ہے اور ہم مرکز توحید محض اطاعت

گزاری ہی کو جانتے ہیں نفس و نفسانیت کو دخیل نہیں بناتے لہٰذا تم کو بھی خواہش نفس کی پیروی چھوڑ کر اللہ کا فرمان پذیر بن جانا چاہیے

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ الخ اب رہی یہ بات کہ سابقہ کتابوں کے بعد کوئی کتاب آ ہی نہیں سکتی اور نزولِ کتب کا دروازہ بند ہو گیا تو یہ دعویٰ بلا ثبوت ہے کیونکہ جس طرح ہم پہلے کتابیں ہدایتِ خلق کے لئے نازل کی تھیں اسی طرح اس قرآن کو ہم نے اتارا ضرورت کے موقع پر جیسے پہلے نزول ہوا تھا اب بھی اسی ضرورت کے سبب نزول ہوا پس جس طرح موسیٰ کے زمانہ میں ان کی امت پر موسیٰ کے حکم کی تعمیل اور ان پر ایمان لانا ضروری تھا اور جس طرح داؤد اور عیسیٰ کے زمانوں میں ان کی امتوں پر اپنے پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلنا اور اپنے وقت کی نازل شدہ کتابوں کو ماننا لازم تھا اسی طرح محمد رسول اللہ کے زمانہ میں قرآن کو ماننا اور رسول کے حکم پر چلنا ضروری ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ الخ۔ اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ تمام اہلِ کتاب چونکہ اپنی مذہبی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے محمد رسول اللہ اور قرآن پاک کی حقانیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں خواہ زبان سے عناداً نہ مانیں مگر ایک نبی کا پیدا ہونا اور قرآن کا اس پر نازل ہونا ان کی تمام مذہبی کتابوں میں موجود ہے جس کا انکار وہ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ توریت و انجیل وغیرہ کتابیں جن لوگوں کو ہم نے دی تھیں اور سچے دل سے وہ ان کتابوں کو مانتے تھے تو یقیناً قرآن اور رسول اللہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں مثلاً عبد اللہ بن سلام وغیرہ البتہ جن لوگوں کا اپنی مذہبی کتابوں پر سچا ایمان نہیں وہ قرآن اور رسول اللہ کو بھی نہیں مانتے۔ میرے نزدیک موخر الذکر مطلب صحیح نہیں۔ کیونکہ مکی زندگی میں عبد اللہ بن سلام یا کوئی دوسرا یہودی عیسائی مسلمان نہ ہوا تھا اور آیت مکی ہے ہاں اگر مکہ کے اندر یا حوالی مکہ یا کسی اور مقام کے رہنے والے کسی اہلِ کتاب کا مسلمان ہونا مکی زندگی کے دوران میں ثابت ہو جائے تو آخری مطلب بھی صحیح مان لیا جائے گا۔

وَمِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ۔ اس فقرہ کا مطلب بھی دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ مشرکینِ مکہ میں سے بھی بعض لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے علمائے اہلِ کتاب سے رسول اللہ کی بعثت اور قرآن کے نزول کی بشارت پہلے سے سن لی تھی تو چونکہ وہ اہلِ کتاب کی تصریحات پر ایمان رکھتے تھے اور رکھتے ہیں اس لئے رسول کی رسالت اور قرآن کی صداقت کو بھی مانتے ہیں اگرچہ عناداً نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کافروں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ البتہ جن کا شعار ہی کفر ہے جن کے پیشِ نظر ایمان ہی نہیں ہے وہ بدستور سابق منکر ہیں۔ ایک بالکل سادہ مطلب دونوں فقروں کا ملا کر اس طرح ہو سکتا ہے کہ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمْ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ سے مسلمان مراد ہوں اور هٰۤؤُلَاۤءِ سے دوسرے فرقہائے کتابی۔ اس صورت میں حاصلِ مدعا یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کے لئے تو ہم نے قرآن نازل کیا ہے وہ تو ایمان رکھتے ہی ہیں باقی دوسرے اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ بھی اس کو سچا جانتے ہیں تکذیب کرنے والے وہی کافر ہیں جنہوں نے ہٹ دھرمی پر کمر باندھی ہے۔ واللہ اعلم

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ۔ جحود کے معنی ہیں ہٹ دھرمی سے انکار کرنا اور آیات سے مراد ہے رسول کی رسالت اور قرآن کی صداقت۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی وحدانیت اور قیامت کی حقانیت کے منکر ہیں وہی ہٹ دھرمی سے رسول کی رسالت اور قرآن کی صداقت کو نہیں مانتے ورنہ جو لوگ خدا اور روزِ جزا کا یقین رکھتے ہیں ان کے لئے تو رسول اللہ کی رسالت کو ماننا اور قرآن کو سچا جاننا بالکل واضح بات ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا الخ۔ یہ ایک شبہ کا جواب اور رسولِ پاک کی صداقت کا ثبوت ہے۔ ممکن تھا کوئی شبہ کرے کہ خدا کو واحد جاننے اور قیامت کو ماننے سے لازم نہیں آتا کہ قرآن کو سچا اور رسول اللہ کو برحق مانا جائے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ نے دوسری کتابوں کے مضامین اخذ کر کے خود عربی عبارت میں ادا کر دیئے ہوں اس کو کتابِ الٰہی کہہ کر پیش کیا ہو۔ کا جواب آیاتِ مذکورہ میں دیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ رسول اللہ لکھے پڑھے نہیں اگر لکھے پڑھے ہوتے تو کتبِ سماویہ سے اقتباس کرنے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اگرچہ وہ شبہ بھی بے بنیاد ہوتا۔ رسول اللہ کے پڑھا لکھا ہونے سے اقتباس کو ضروری قرار دینا لازم نہیں آتا تاہم اہلِ باطل کو کمزور ترین شبہ کا موقع بھی مل سکتا لیکن اب تو بے بنیاد شبہ کی بھی گنجائش نہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ الخ۔ بعض کتبِ سابقہ میں امتِ اسلامیہ کی تعریف میں یہ صراحت موجود تھی کہ ان کی آسمانی انجیل ان کے سینوں میں ہوگی یعنی ان کو اپنی مذہبی کتاب حفظ ہوگی۔ اس صراحت کو اہلِ کتاب بھی مانتے تھے اس لئے علاوہ رسول اللہ کے امی ہونے کے دوسری دلیل نہایت لطیف عبارت میں بیان فرمائی کہ قرآن اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہے اور آسمانی کتاب کا اس کے ماننے والوں کے سینوں میں موجود ہونا پہلے بیان کر دیا گیا تھا لہٰذا وہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اس کی مصداق صرف امتِ اسلامیہ ہے جس سے قرآن کی صداقت اور رسول اللہ کی رسالت کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔

مقصودِ بیان قرآن مجید پڑھنے کا حکم، نماز کا امر و جوبی اور کل ارکان و شرائط کے ساتھ ادا کرنے کی صراحت۔ کامل صلوٰۃ تمام اخلاقی معاشرتی اور سماجی خرابیوں کو دور کرنے کا علاج ہے۔ اللہ کی یاد کی فضیلت اور یادِ الٰہی کی ترغیب اور بقول حضرت ابن مسعود و حضرت ابو درداء و حضرت سلمان فارسی اس بات کی صراحت ہے کہ جو خدا کو یاد کرتا ہے خدا اس کو یاد فرماتا ہے۔ اہلِ کتاب سے فضول بحث و مباحثہ کی ممانعت اور حسن اسلوب کے ساتھ مناظرہ کرنے کی ہدایت بشرطیکہ فریقِ مخالف پر نصیحت پذیری۔

صلاحیت واستعداد معلوم ہوتی ہو اور اگر ان کے قلوب کسی طرح اصلاح پذیر ہی نہ ہوں تو مناظرہ کے بجائے جیرہ دستی اور مغالبہ کی کوشش کی طرف ایما ۔ حسن اسلوب کے ساتھ مناظرہ کرنے کی تفصیل و تشریح ، اسلام کی حقانیت کی ناقابل تردید دلیل اور اس امر کی صراحت کہ مسلمان تمام سابقہ سماوی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھتا ہے گویا کسی سچے مذہب کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ اسلام کا مدار ہی اس امر پر ہے کہ کسی سچے مذہب کی تکذیب نہ کرے ۔ ونحن لہ مسلمون کے الفاظ سے اس طرف ایما کہ مسلمان کے پیش نظر اطاعت اور انقیاد الٰہی ہونا چاہیئے ۔ اس کے مذہب کا خلاصہ محض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے اوامر و نواہی کے سامنے بغیر چون و چرا کئے سر رکھدے ۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا الخ سے قانون الٰہی کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ اور صداقت قرآنی کی پختہ دلیل وہ یہ کہ جب گزشتہ انبیاء کا آنا اور آسمانی احکام لانا اور مخلوق تک پہنچانا صحیح اور ضروری ہے اور ایسا ہوتا چلا آیا ہے تو پھر رسول اللہ کی رسالت اور قرآن کی حقانیت کا انکار بیجا ہے ۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا الخ سے رسول پاک کے امی ہونے کی صراحت اور امی ہونے سے قرآن کی حقانیت پر استدلال یہاں سے استیصال ہو جاتا ہے اس ملحد بے دین گروہ کے خیال کا جو کہتا ہے کہ رسول اللہ قرآن کی عبارت و مضامین خود بنایا کرتے تھے البتہ ان کا نفس مقدس تھا اور روحانی طاقت قوی تھی بیراہ راست عالم بالا سے ان کا تعلق تھا عالم قدس سے روحانی فیضان ہوتا تھا لیکن مادی عالم میں وکر آپ جو کچھ پیش کرتے تھے وہ آپ کا ساختہ پرداختہ ہوتا تھا ۔ آیت بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ میں صحابہ کرام خصوصاً ان صحابہ کی مدح جو حافظ قرآن تھے اور لفظ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے اس امر کی تشریح کہ علم در حقیقت کسی مصرانی یونانی فلسفہ کا نام نہیں ارسطو اور فیثا غورث کی منطق کا نہیں ، کلدانیوں اور بابلیوں کی تاریخ جاننے کا نہیں بلکہ وہ علم وہ ہے جو خدا تک پہنچا دے اور وہ قرآن اور صرف قرآن ہے ۔ وغیرہ

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَ

اور کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل کی گئیں تم کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا

لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ ع

ان کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے اس میں ایمان رکھنے والی قوم کے لئے رحمت و نصیحت ہے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ

تم کہہ دو کہ میرے تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لئے کافی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس سے واقف ہے اور جو لوگ باطل کو مانتے ہیں

وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى

اور اللہ کا انکار کرتے ہیں وہی نقصان پانے والے ہیں یہ لوگ تم سے عذاب کی جلدی مچاتے ہیں اگر وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر

لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ

عذاب آجاتا اور دفعتہً ان کی بےخبری کی حالت میں وہ آئے گا مزید تم سے عذاب کی جلدی مچاتے ہیں

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ○ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

اور جہنم اس روز کافروں کو مزید گھیرے ہوئے ہوگی جب ان پر اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے عذاب چھایا ہوا

اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ہوگا اور اللہ فرمائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو

تفسیر نبوت کیا ہے رسالت کی کیا حقیقت ہے۔ نبوت کی اصل غرض کیا ہے۔ معجزات کی ضرورت [illegible] یا نہیں۔ اگر ضرورت ہے تو کس قدر اور کس قسم کے معجزات کی سب سے بڑا معجزہ کونسا ہو سکتا ہے یہ ایسے سوالات ہیں جن کے مفصل جواب ہم نے مختلف مقامات پر اسی تفسیر میں دیئے ہیں اور سیر حاصل تنقیح کی ہے اس جگہ مختصر طور پر اتنا جان لینا کافی ہے اور اتنا ہی جان لینے سے آیاتِ مذکورہ کے مطالب پر ضروری روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ اسرارِ الٰہیہ جن کا کچھ حصہ اصلاح عالم کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ جان لینا اصل مفہوم نبوت ہے یعنی عالم الغیب والشہادۃ اپنی ذات صفات غیبی کائنات اور مفید ترین اصلاحی ضوابط و قوانین کا علم اگر کسی کو وحی کے ذریعہ سے عطا فرما دے تو اس علم کو نبوت کہا جاتا ہے جہاں تک صفات و ذات کے علم کا تعلق ہے اس کی نہ حد بندی کی جا سکتی ہے۔ نہ اصلاح بشری کا نبوت کے اس درجہ سے کوئی تعلق ہے البتہ جہاں اصلاحی ضوابط کا علم پیدا ہوتا ہے وہاں بشری کائنات کو مفید ترین سرمایۂ ہدایت ہاتھ آتا ہے۔ نبوت کے تبلیغی اصلاحی حصہ کا نام رسالت ہے۔ گویا نبوت کا لقب الٰہی تعلق اور علومِ الٰہیہ کے حصول کے اعتبار سے ملتا ہے اور پیغمبر و رسول ہونے کا اطلاق اصلاح بشری اور ہدایت و ارشاد کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ رسالت و نبوت کی اصل غرض تو وہی ہے جس سے اس نبی کی ذات مقدس فائدہ اٹھاتی ہے یعنی اسرار علوم سے واقف ہونا اور غیبی معارف کی پردہ کشائی سے لذت اندوز بننا دوسرا مقصد اصلاحِ خلق ہے۔ ہر نبی ہر رسول، ہر مامور من اللہ اللہ کے پاس سے کچھ اصلاحی تعلیم لے کر آتا ہے جس کی تبلیغ انسانوں میں کرتا ہے تاکہ ہر شخص سعادت سے [illegible] ہو جائے۔ لیکن عام طور پر انسانی طبیعت و عادت دوسروں کی ہدایت پر عمل کرنے سے انکار کرتی ہے لوگ نہیں چاہتے کہ اپنے اور اپنے اسلاف کے رسم و ملت کو ترک کر کے اپنے دماغی اور علمی انتخاب کو چھوڑ کے دوسروں کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے دیں اور بلا وجہ اپنی خواہشات کو دوسروں کے تابع بنا دیں تاوقتیکہ نصیحت کرنے والے کے اندر کوئی غیر معمولی انسانوں سے برتر مادی کی شخصیت نہ معلوم ہو جائے اگر اُس کے اندر ان کو کوئی غیبی قوتِ قاہرہ دکھ جائے تو پھر پیام ہدایت کی صدا[illegible] ماننے پر وہ مجبور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ باستثناء بعض عام لوگ ہر مدعیِ نبوت سے غیر معمولی کرشمہ سازی اور معجزہ نمائی کے خواستگار ہوتے ہیں اور انبیاء پر لازم ہو جاتا ہے کہ کوئی معجزہ ضرور دکھائیں حالانکہ اصل مقصد نبوت کو معجزہ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا لیکن عوام اور معمولی ذہنیت رکھنے والوں سے اپنی ہدایت کو منوانے کے لئے بیچارے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے غیر معمولی انسان ہونے کا کوئی ثبوت پیش کریں ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ معجزہ اور غیبی کارفرمائی کی ضرورت صرف عوام کے لئے ہوتی ہے صاف دماغ رکھنے والے اس قسم کی ضرورت سے بے نیاز ہوتے ہیں وہ تو صرف تعلیم کی اچھائی برائی اور قول کے نفع و ضرر کو دیکھتے ہیں اچھا اور سودمند پیام کو مان لیتے ہیں اور قبیح و مضر اغواء سے کنارہ کش رہتے ہیں۔

لیکن سارے عوام کا بھی ایک مرتبہ نہیں، ایک ذہنیت نہیں، ایک استعداد نہیں، سب کا دماغی وزن برابر نہیں۔ سمجھ بوجھ میں تفاوت ہے فکر و نظر میں اختلاف ہے اس لئے ہر شخص کے لئے کسی خاص نوعیت کے معجزہ کی کارفرمائی تسلی بخش نہیں ہو سکتی۔ عموماً لوگ جامد دماغ رکھتے ہیں محسوسات سے بالا ان کی نظر نہیں جاتی [illegible] معجزات میں کارفرمائی کے وہ خواستگار رہتے ہیں۔ لاٹھی کا سانپ بن جانا، مردے کو زندہ کر دینا، لاعلاج بیمار کو اچھا کر دینا، رات کی کھائی ہوئی چیز بتا دینا، پہاڑ سے اونٹ پیدا کر دینا، آگ کو گلزار بنا دینا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ پھوٹنا، پتھروں کا تسبیح پڑھنا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے معجزات سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے موجب طمانیت ہو[illegible] [illegible] [illegible] رکھتے ہیں وہ نیم محسوس یا غیر محسوس تصرفات کے خواستگار ہوتے ہیں لیکن یاد رکھو [illegible] طرح کے معجزات سے نبوت پر واقعی استدلال نہیں کیا جا سکتا [illegible] [illegible] شخصیت کا ثبوت اس سے ملتا ہے اور بس۔ ہاں سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ وہی ہو سکتا ہے جو صاحب معجزہ کی غیر معمولی بے نظیر علمی قوت کا جہاں اظہار کرتا ہو [illegible] پیام نبوت کی صداقت کو بھی ثابت کرتا ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ نبی صاحب تصرف بھی ہے اور اس کا قول اس قابل بھی ہے جس کو تعلیم الٰہی کہہ سکیں۔ اگر کسی معجزہ میں ان دونوں مقاصد کا اجتماع ہو جائے اور کوئی معجزہ ان کا مظہر بن جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا معجزہ ہو نہیں سکتا کیونکہ اس میں عوام و خواص دونوں گروہوں کے اطمینان کا سرمایہ موجود ہوتا ہے۔ غیبی قدرت کی کرشمہ سازی بھی اس سے معلوم ہوتی ہے اور پیام ہدایت کی حقانیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ گویا معجزہ خود ہی معجزہ ہوتا ہے اور خود ہی تعلیم نبوت کا اصل مقصد۔ خود ہی دلیل اور خود ہی مدعا۔ اس میں وہ بے ربطی نہیں ہوتی جو عموماً معجزات کے ظہور اور مقصدِ نبوت میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کوئی شخص ماہر انجینئر تعمیرات یا حاذق ڈاکٹر ہونے کا دعویٰ کرے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ کہے کہ میں پانی میں تیر تا ہوں اور میرے کپڑے تر نہیں ہوتے یا ہوا میں اڑتا ہوں تو ظاہر ہے کہ دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت نہیں۔ پانی میں تیرنے اور ہوا میں اڑنے کو تعمیری مہارت اور طبی حذاقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اگر تعمیر کا انجینئر کوئی عالیشان بے نظیر عمارت بنا دے اور ڈاکٹر کسی علاج سے بیمار کو تندرست کر دے یا دونوں شخص اپنے اپنے فن کے متعلق کوئی کتاب کامل تنقیح و تحقیق کے ساتھ لکھ دیں تو ان کی سچائی کے لئے دلیل ہو سکتی ہے۔ البتہ بے ربط کمال دکھانے سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ عام لوگ ایسے انجینئر اور ڈاکٹر کی شخصیت کو غیر معمولی سمجھنے لگیں گے لیکن اہلِ بصیرت کو دعویٰ تسلیم کرنے میں تسلی نہ ہوگی بعینہٖ یہی حال معجزات کا بھی ہے۔ بے ربط معجزہ عوام کی تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے مگر خواص کے لئے غیر مفید ہوتا ہے اور جو معجزہ دونوں کمالوں کا مظہر ہو وہ ہر گروہ کے لئے تسلی بخش ہوتا ہے۔

... مختلف نبیوں سے مختلف معجزات ظہور پذیر ہوئے جن میں بیشتر محسوس کے دائرے سے باہر نہ تھے۔ کچھ نیم محسوس تھے اور بہت کم غیر محسوس لیکن کوئی معجزہ سوائے قرآن کے ایسا نہیں ہوا جو دونوں کمالوں کا مظہر ہو یعنی قوت قاہرہ کو ظاہر کر رہا ہو اور ارواح عاقلان کی مکمل شستگی و شائستگی کا پورا پورا سرمایہ بھی اس میں موجود ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ خدا میں ہر طرح کی طاقت ہے اور اس کی ہمہ گیر قدرت ہر معجزہ کو بروئے ظہور لا سکتی ہے لیکن ہر جاہل معاند بے وقوف اور بد اندیش کی فرمائش کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اول تو ہر شخص کی خواہش کے مطابق معجزہ کا ظاہر ہونا محال ہے۔ زید کہتا ہے اس وقت پانی برسنا چاہیئے۔ عمر کی خواہش ہے نہ برسنا چاہیئے۔ دونوں کی درخواست پوری نہیں کی جا سکتی پتھروں کا سونا بن جانا فلاں کے لئے موجب سکون ہے لیکن بکر چاہتا ہے کہ درخت زمرد کے بن جائیں۔ بہر حال مختلف طبقات و اشخاص ہیں اور ان کی مختلف لامحدود خواہشیں سب کو پورا کرنا لغو ہے۔ پھر اگر تکمیل فرائض میں نبی پھنس جائے تو ہمیشہ معجزہ نمائی اور کرشمہ سازی میں ہی مشغول رہے گا اپنی قوت جلال اور تصرف کے اظہار سے ہی نہ چھوٹنے پائے گا کہ رہنمائی اور ہدایت کی طرف توجہ کرے اور نہ مخلوق کو ایسے نبی سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے بلکہ نبی کے ہمہ گیر تصرف کا ظہور ہر وقت ہوتا رہے گا جس سے مقصد نبوت کو تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر فرمائشی معجزہ کی تکمیل نہیں کی جاتی۔ نہ کی جانے سے نہ کی جا سکنے پر استدلال کرنا حماقت ہے۔ اس تمہید کا خلاصہ یہ نکلا کہ عوام کے لئے معجزات کی ضرورت ہے اگرچہ مقصد نبوت کا مدار معجزہ پر نہیں اور سب کی فرمائشوں کو پورا کرنا مصلحت اور مقصد نبوت کے منافی ہے اور سب سے بڑا معجزہ وہی ہو سکتا ہے جس سے سبب معجزہ نفس بے نظیر کمالی بھی ظاہر ہوتا ہو اور وہ مقصد نبوت کی تبلیغ کا بھی حامل ہو۔ قرآن میں چونکہ دونوں اوصاف ہیں یہ فصاحت، حلاوت، سلاست، بلاغت، اسلوب بیان طرز ادا اور طریق تعبیر میں بے نظیر بھی ہے اور اس کی تعلیم مردہ دلوں میں روح حیات پھونکنے والی، جامد دماغوں میں ترقی کی تڑپ پیدا کرنے والی۔ اخلاق، اعمال اور معاشرت کو شستہ بنانے والی اور روحوں کو پاکیزگی عطا کرنے والی ہے۔ یہ سرچشمۂ طہارت ہے، خزانۂ نظافت ہے، ذخیرۂ سعادت ہے، معدن نجات ہے، بحر محیط ہے، جس کے اندر ان گنت آبدار شاہوار موتی موجود ہیں۔ ایسا چمن جس میں عمران بشری اور سکون انسانی کے ہزاروں گل ہائے رنگا رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ پس اس سے بڑھ کر اور کونسا معجزہ ہو سکتا ہے جو معجزہ بھی ہے اور سعادت زندگی کا دستور العمل بھی۔ جو انسانی دنیا کو قیامت تک متحیر اور عاجز بنانے والا بھی ہے اور گم کردہ راہوں کے لئے شمع ہدایت بھی۔ ہر معجزہ کی کارفرمائی اسی زمانہ میں ہوتی ہے جس زمانہ میں صاحب معجزہ موجود ہو۔ حضرت سلیمان کا تخت مشہور معجزہ تھا لیکن انہی کے زمانے کے لئے۔ یہ ضرور نہیں کہ آئندہ کوئی ایسا ہوائی تخت نہ بنا سکے۔ حضرت موسیٰ نے لاٹھی کو سانپ بنایا لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد کو اور کوئی شخص بھی لاٹھی کا سانپ بنا دے۔ ہاں قرآن ہی وہ معجزہ ہے جس کی کارفرمائی عدیم النظیر صداقت بے مثال تعلیم اور مفقود المثل اعجاز نہ حضور والا کے زمانہ میں ممکن تھا نہ قیامت تک ممکن ہے۔

کفار مکہ محسوس پرست تھے، تاریک دماغ رکھتے تھے۔ اپنے فرمائشی معجزات کی تکمیل کے طلبگار رہتے تھے۔ مرئیات سے دور ان کی نظر نہ پہنچتی تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ مکہ کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دو تاکہ میدان نکل آئے۔ کوئی خواہشمند تھا یہاں شیریں پانی کے بکثرت چشمے بہا دو۔ کسی کا قول تھا کہ تمہارے پاس سونے چاندی کے انبار ہونے ضروری ہیں وغیرہ وغیرہ۔ فرشتوں کو تصدیق کے لئے طلب کرتے تھے اور کہتے تھے تمہارے آگے آگے فرشتہ پکارتا جائے کہ یہ نبی برحق ہے اس کی پیروی کرو۔ سب سے بڑا گستاخ کہتا تھا کہ اگر خدا خود آکر ہم سے تمہاری تصدیق کرے تو ہم مانیں گے۔ خدا سے تو کوئی چیز بھی بعید نہیں وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کر سکتا ہے لیکن اس قسم کی تمام فرمائشوں کی تکمیل نہ فقط غیر مفید تھی بلکہ مقصد نبوت کو نقصان پہنچانے والی بھی تھی، اس لئے صاف جواب دے دیا گیا کہ اگرچہ تمام فرمائشیں خدا پوری کر سکتا ہے لیکن رسول کی رسالت کا مقصد تو ہدایت و انذار ہے اس مقصد کے لئے ایسے معروضات کی تکمیل نقصان رساں ہے۔ اگر معجزہ کی کارفرمائی ہی دیکھنی ہے تو قرآن کافی ہے جو عدیم النظیر بھی ہے اور حامل ہدایت بھی جب قرآن کافی نہیں تو کوئی دوسرا معجزہ جس کا مرتبہ قرآن کی برابر ہو بھی نہیں سکتا کس طرح سود مند اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ پس آخری فیصلہ شہادت الٰہیہ پر موقوف ہے اور شہادت الٰہیہ قرآن کی صداقت کو ظاہر کر رہی ہے الخ۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ الخ جو شخص ازلی بدبخت ہے اس کو کوئی معجزہ اور کوئی تصدیقی نشانی سود مند نہیں ہوتی کیونکہ نبوت و رسالت کی غرض سے ہی آشنا نہیں ہوتا معجزات کتنے ہی اکمل و اعلیٰ ہوں لیکن دماغی نابینا کی چشم بصیرت کھولنے کے لئے ناکافی ہوتے ہیں۔ ابوجہل اور اس کے ساتھی دوسرے کافر بھی انہی کور بصران ازلی میں سے تھے۔ وہ معجزہ کو سحر سمجھے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح جادو کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی کارفرمائی عند الطلب ہوتی ہے اسی طرح معجزہ کا ظہور بھی ہمیشہ اور طلب کے موافق ہوا کرے۔ گویا معجزہ اور جادو میں انہوں نے فرق نہ سمجھا تھا۔ جادوگر کی طرح نبی کی بعثت کو بھی وہ عامل سمجھے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جادوگر کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جادو کا اظہار کر کے لوگوں کو معترف بنالے اور اس کے ذریعہ سے حقیر مال دنیا حاصل کرے لیکن بعثت نبی کی غرض اظہار کمال اور تحصیل مال نہیں بلکہ ارشاد و ہدایت ہے۔ ارشاد و ہدایت کے لئے کسی معجزہ کی ضرورت ہی نہیں صرف تسلیم کا رشد آفریں و ہدایت آگیں ہونا کافی ہے لیکن کمزور دماغ والے چونکہ اپنے دماغوں میں غور کرنے کی طاقت نہیں پاتے

اور یہ قوت جاہل تعلیم کے حسن و قبح سے واقف نہیں ہوتے اس لئے ان کی نظر معلم کی غیر معمولی شخصیت اور حیرت انگیز قوت کی طرف ہوتی ہے ہمہ گیر اور محیط کل طاقت رکھنے والے کے قول کو ہی وہ قابلِ پذیرائی جانتے اور واجب العمل سمجھتے ہیں اور معمولی انسان کی مفید ترین بات کی طرف کان بھی نہیں دھرتے۔ اس بنا پر نبی کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت دینے اور بلند و برتر دکھانے کے لئے اللہ مختلف معجزات اس کے ہاتھ سے ظاہر کراتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر شخص کی خواہش کے مطابق معجزات کا ظہور ہو ورنہ معجزات کا تسلسل غیر محدود ہو جائے گا اور اسی تسلسل میں پھنس کر نبوت کی اصل غرض فوت ہو جائے گی۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی نبی کو خود کوئی معجزہ رونما کرنے اور بروئے ظہور لانے کی بالذات کوئی طاقت ہوتی ہے بلکہ وہ حکمِ الٰہی کا تابع ہوتا ہے باذنِ الٰہی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ نہ مدعا ہے کہ ہر نبی کے معجزات ایک ہی طرز اور ایک ہی نوعیت کے ہوں وہ نہ اقتیاز یا خاص تفرقۂ اقوام و اختلافِ زمانہ کی کوئی رعایت نہ ہوگی۔

حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور بعض دوسرے پیغمبروں کے کچھ مادی معجزات کفارِ مکہ نے سنے تو حضور ﷺ والا سے بھی اس قسم کے معجزات کی درخواست کی عموماً درخواست قبول کی گئی۔ کیونکہ ان کافروں کی محسوس پرستی اور کوتاہ فہمی سے حضور اقدس واقف تھے لیکن ان کا مدعا یہ تھا کہ ہمیشہ ہر فرمائش اُن کی پوری کی جائے۔ خواہ وہ معجزہ دیکھنے کے بعد راہِ ہدایت پہ آئیں یا نہ آئیں تکمیلِ درخواست ضرور کر دی جائے چونکہ اس قسم کی تکمیل لاحاصل اور ناممکن تھی اس لئے درخواست کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ کفارِ مکہ کہتے ہیں اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے بکثرت معجزات (یعنی ہمیشہ ہماری ہر خواہش کے مطابق معجزہ کا ظہور) کیوں نہیں ہوتا۔ اس قول کی بنا دو باتوں پر تھی اول یہ کہ کفار کے نزدیک نبی کو اظہارِ معجزات کا اختیارِ کامل ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے نزدیک بعثتِ نبی کی غرض محض معجزات کو ظاہر کرنا قرار پایا تھا۔ کفار کے کلام سے انہی دونوں باتوں کا ترشح ہوتا تھا۔ اس لئے دونوں کے جواب کے متعلق صاف طور پر حکم دے دیا کہ:۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ معجزات کا کامل اختیار تو خدا کے دستِ قدرت میں ہے یعنی وہی جب چاہے ظاہر فرمائے نہ چاہے نہ ظاہر فرمائے۔ میرا کام تو صرف ڈرانا ہے۔ ابدی ہلاکت اور دوامی عذاب سے ڈرانے کے لئے میں آیا ہوں۔ ہر وقت ہر فرمائش پر معجزہ کو ظاہر کرنے اور اپنے غیر معمولی کمال کا معترف بنانے کے لئے میری بعثت نہیں ہوئی بلکہ ارشاد و ہدایت کے لئے ہوئی ہے۔ نبوت کی اصل غرض اصلاح ہے اور اصلاح کے لئے تمام فرمائشی معجزات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ نبوت کا سب سے بڑا معجزہ ارشاد و تذکیہ ہے۔ اگر نبوت کی اصل غرض پیشِ نظر ہو تو اس قول کی صداقت میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ پس جب سب سے بڑا معجزہ وہی ہے جو ہدایت آفریں بھی ہو تو پھر قرآن پاک سے بڑھ کر اور کون سا معجزہ ہو سکتا ہے۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا الخ۔ کیا تصدیق اور ایمان کے لئے نزولِ قرآن کافی نہیں ہے۔ کیا کلامِ پاک واضح ترین معجزہ نہیں ہے، کیا اس کے ہدایت آفریں مضامین گزشتہ واقعات کا اظہار پیش آنے والے سوانح کا بیان طرزِ ادا ربطِ تعبیر اور حلاوت اور بلاغت ناقابلِ نظیر نہیں ہے۔ اگر ہے اور ضرور ہے تو پھر یہ عظیم ترین معجزہ ہے کیونکہ معمولی معجزات صرف مغلوب کن ہوتے ہیں اور یہ قوتِ مقابلہ کو شکست کرنے کے ساتھ ہدایت آفریں بھی ہے اور ایسا ہے جس کی نظیر ناممکن ہے۔ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی۔ قرآن کیا چیز ہے۔ خیر و شر اچھے برے اور سفید و سفر میں تفرقہ کرنے والا اور برائی سے بچا کر بھلائی کی طرف لانے کے لئے ایک ہدایت نامہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی کمزوری کی رعایت اور قوتِ بشری کا ضعف بھی اس کے پیشِ نظر ہے اس لئے ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناقابلِ برداشت ہو۔ خلاصہ یہ کہ انسانوں کے لئے رحمت ہے اس کے ضوابط و قوانین سہل ہیں، اصلاح آفریں ہیں۔ امن و عافیت کے حامل ہیں۔ سعادتِ انسانی کے علمبردار ہیں، عدل و انصاف سے بھرے ہوئے ہیں، دماغوں کو روشن، روحوں کو پاک، دلوں کو نورانی، اخلاق کو شستہ، اعمال کو پاکیزہ اور زندگیوں کو سدھارنے والے ہیں۔ رحمتِ مجسم ہیں لیکن ان میں اتنی بھی آزادی نہیں جو انسان کو شتر بے مہار کر دیں، حرام و حلال کی تمیز اڑا دیں، اچھے برے اور سفید و سفر میں فرق نہ کریں۔ بلکہ یادداشت موعظت نامہ اور پیامِ تذکیر بھی ہے لیکن کس کے لئے کیا ہر شخص کے لئے خواہ اس میں نصیحت پذیری کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ نہیں ہر شخص کا ہدایت پذیر ہونا تو ناممکن ہے۔ دماغ کے اندر روشنی نہ ہو تو بیرونی نور کیا کام دے سکتا ہے۔ قرآن رحمت و نصیحت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ الخ۔ ایمان رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جن کا قلب مومن اور ضمیر مومن ہو جن میں بالقوۃ ایمان کی قابلیت ہو۔ جو لوگ ایمان ہی نہ لائیں قرآن کو سچا ہی نہ جانیں ان کو اس سے کچھ فائدہ ہی نہیں پہنچ سکتا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا۔ بعض کور باطن خبر کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو تو قرآن کی ضرورت ہی نہیں۔ اُن کے لئے رحمت و موعظت ہونے کے معنی ہی کیا۔ ضرورت تو کافروں کو ہے جو خود راہِ راست پر نہ ہو اس کو رہنمائی کی ضرورت ہے سیدھے راستے پر چلنے والے کو رہنما کی کیا حاجت۔ درحقیقت ایسے بے وقوف لوگوں نے آیت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ دنیا میں دو ہی قسم کے انسان ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو پیامِ حق پر ایمان نہیں لاتا، کسی موعظت نامہ کو نہیں مانتا۔ اپنے حالات کو محتاجِ ہدایت نہیں جانتا۔ دوسرا

گروہ وہ ہے جو ہدایت نازل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایمان ہے بشرطیکہ پیام میں لوازمِ ہدایت موجود ہوں۔ اول گروہ کو کوئی چیز راہِ مستقیم پر نہیں لا سکتی۔ کوئی مشعل اس کی آنکھوں کو روشن نہیں کر سکتی۔ جس چیز کو وہ روشنی سمجھے ہوئے ہے وہ اندھیرا ہے اور جس کو وہ اندھیرا جانتا ہے وہ نور ہے اور جب اس میں نور و ظلمت کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تو پھر کون رہنما اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ ہاں مؤخر الذکر گروہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ نور آفرین آفتاب کے طلوع کا منتظر ہوتا ہے۔ جس پیام میں روشنی ہوگی وہ اس کو دیکھ جائے گی۔ قرآن پاک کی رحمت بیزی اور نصیحت انگیزی سے اسی گروہ کو فائدہ پہنچتا ہے۔

تکملہ: اس سورۂ بشریٰ میں دو طرح کے آدمی ہیں۔ ایک گروہ ان اہلِ ایمان کا ہے جو اللہ کو وحدہٗ لاشریک جانتے ہیں صفاتِ ربوبیت والوہیت میں اس کو یگانہ و بے ہمتا مانتے ہیں، تمام اوصافِ کمالیہ کا سرچشمہ اسی کو سمجھتے ہیں۔ یہ گروہ مخلص اہلِ توحید کا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو خدا کی ہستی کے قائل ہی نہیں۔ ان کے نزدیک خدا کا ہونا محال یا غیر ضروری ہے یا اگر خدا ہے تو ناقص دم بریدہ محتاج ذات میں نہ ہوا صفات میں تو اس کے بہت شریک ہیں۔ یہ گروہ مخلوق کو بھی الوہیت کے درجہ تک پہنچاتا ہے اور قابلِ پرستش جانتا ہے، بہتوں کو رب مانتا ہے۔ ہزاروں کے در پر جبہ سائی کرتا ہے۔ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا کارساز قاضی الحاجات دافع البلاء مجیب الدعا اور رازق سمجھتا ہے اس کا ایمان باطل پر ہے۔ یہ اللہ کا یا تو بالکل ہی منکر ہے یا ربوبیت والوہیت میں اس کی یکتائی کا منکر ہے۔ بہرحال اللہ کا منکر ہے۔ آیتِ مذکورہ ہر طرح کے منکرین کو شامل ہے۔ خواہ وہ ذاتِ خداوندی کے منکر ہوں یا صفاتِ ربوبیت والوہیت کے یا وحدتِ صفاتی کے بہرحال ایمان بالباطل سے انکارِ الوہیت لازم آتا ہے۔ دوسروں کو ماننے سے اللہ کی یکتائی کا عقیدہ قائم نہیں رہتا۔ کفر باللہ کے یہی معنی ہیں۔ گویا کفر باللہ کے تحت تمام وہ لوگ داخل ہیں جو منکرِ ذات ہوں یا مشرک فی الصفات ہوں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ الخ۔ جب آدمی کا باطنی شعور افسردہ اور عقلِ روحانی مردہ ہو جاتی ہے تو وہ باطل کو حق اور حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور اپنے عقیدہ پر اس قدر جم جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی جسمانی و روحانی طاقت اس کے خیال کو زائل نہیں کر سکتی اور جب اس عقیدہ کے نتیجۂ بد سے اس کو آگاہ کیا جاتا ہے اور آئندہ زیان سے ڈرایا جاتا ہے تو چونکہ اس کی عقل مسخ ہو چکی ہوتی ہے اس لئے وہ مآل کی بجائے نتیجہ کا فی الفور طالب ہو جاتا ہے۔ عمل اور نتیجہ کے اوقات میں تفرقہ نہیں کرتا وہ نہیں سمجھتا کہ تخم اور ثمر کا ایک وقت نہیں ہوتا۔ اسباب سے نتائج بیک وقت پیدا نہیں ہوتے عمل اور حاصلِ عمل کا تلازم یک نہیں ہو سکتا۔ جب اسباب کا سلسلہ اپنی آخری کڑی پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے اس وقت نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جب تخم اپنی تخمی حالت کو چھوڑ کر ترقی کرتے کرتے پودا بنتا اور پھر آگے بڑھ کر پھول لاتا ہے تو اس کے بعد پھل آتا ہے۔ جب عملی زندگی کا دور انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو حاصلِ زندگی سامنے آنے کا وقت آتا ہے۔ زہر کھانے کے بعد جب تک بدن میں اس کا ہضم نہ ہو جائے اور رگ رگ میں اس کا اثر نہ پہنچ جائے اور روحِ حیات اس سے اثر پذیر نہ ہو جائے اس وقت تک آدمی نہیں مرتا۔ اگرچہ غفلت سرشاری مدہوشی اور دوسرے آثار پہلے سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لیکن موت اسی وقت طاری ہوتی ہے جب کامل تاثیر ہو جائے۔ یہی حال اللہ کے اُخروی عذاب کا ہے۔ آخرت کا عذاب دنیا میں نہیں آتا کیونکہ یہ عمل کا زمانہ ہے نتیجہ کا دَور نہیں۔ کفر سے موت قبل از وقت نہیں آتی۔ کیونکہ تخم ریزی کے ساتھ ہی کھیتی بار آور نہیں ہوتی۔ آثار و اسباب کی پہلے تکمیل ہونی ضروری ہے۔ جب تکمیل ہو جاتی تو نتیجہ کا ظہور لازم ہے۔ موت کا ایک دن اور ایک وقت مقرر ہے اور قانونِ قدرت نے دیگر اسباب و نتائج کے سلسلہ کی وابستگی کی طرح اس کو بھی معین کر رکھا ہے۔ اگر موجودہ قانونِ قدرت عالم میں جاری اور ساری نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ نتائجِ اعمال کے ساتھ ساتھ برآمد ہو جاتے لیکن نظامِ کائنات ایسا نہیں ہے البتہ آثارِ نتیجہ پہلے سے ظاہر ہو جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ کفر اور عناد از حق کے ثمرۂ بد کے آثار پہلے سے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ مختلف ناکامیاں قحط، وبا، عمومی تباہی طرح طرح کی ذلت جان و مال کا نقصان غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے آثار مختلف اوقات میں اسی عملی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔ آخرکار وقتِ مقررہ پر انتہائی ہولناکی کے ساتھ موت کا یاس سوز چہرہ سامنے آتا ہے اور مرنے کے بعد دوامی عذاب جو عملِ دنیوی کا اصل نتیجہ ہے پیش آتا ہے۔ اس وقت آدمی کیسا ہی تڑپے پھڑکے مضطرب و بے چین ہو مگر عذاب اوپر نیچے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے اور الم عذاب سے کسی طرح رہائی نہیں ملتی۔ دنیا کے دوسرے بیوقوفوں کی طرح مکہ میں بھی ابوجہل اور نضر بن حارث ایسے کچھ مخبوط العقل اور مسلوب الدماغ لوگ رہتے تھے۔ حضور والا کی نصیحت سے جب انہوں نے سرتابی کی تو اللہ کے برحق پیغمبر نے ان کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ وہ سمجھے کہ شاید اسی دنیا میں ہم پر عذاب نازل ہونے کی دھمکی دے رہے ہیں یا اُخروی عذاب عمل کی دنیا میں ہی آسکتا ہے اس لئے فوری عذاب کے خواستگار ہوئے اور انتہائی ڈھٹائی سے کہنے لگے۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ پروردگار اگر واقعی تیری طرف سے یہ پیام ہدایت اور وعید و تہدید ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی دردناک عذاب ہم پر مسلط کر۔ قرآن پاک ان بیوقوفوں کے جواب میں فرماتا ہے۔

وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ کہ اگر قانونِ قدرت کی مقرر کردہ میعاد نہ ہوتی اور خدا کی طرف سے موت اور عذاب کا وقت معین نہ ہوتا یعنی اگر عمل اور نتائج

کے وقت کی تفریق اس ضابطہ کے تحت نہ کردی گئی ہوتی جو عالم میں جاری ہے تو اب تک عذاب ضرور آچکا ہوتا۔ دوامی عذاب موجود ہیں اسباب فراہم ہیں۔ ایسی صورت میں عذاب کا ظہور ضروری تھا۔ فوری عذاب آتا۔ اس طرح سے آتا کہ تم کو پتہ بھی نہ چلتا۔ ورود عذاب کی پیشگی معلوم بھی نہ ہوتی۔ یہ تو دنیا میں ہوتا آخرت میں جو کچھ ہوتا اس کے متعلق فرماتا ہے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ۔ جہنم لامحالہ کافروں کا احاطہ کرے گا اور نیچے اوپر سے عذاب چھایا ہوا ہوگا۔ کافروں کا کفر اس عذاب کا ان کو مستحق بنا رہا ہے۔

عکرمہ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا جہنم یہی بحر شور ہے جس میں ستارے ٹوٹ کر گریں گے اور یہی سمندر جہنم کی آگ بن جائے گا (رواہ ابن ابی حاتم) یعلی بن امیہ کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا سمندر یہی جہنم ہے۔ لوگوں نے یعلی سے پوچھا کیا یہی پانی جہنم ہے۔ یعلی نے جواب دیا کیا تم نے اللہ کا فرمان نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا نہیں سُنا۔ اس کے بعد یعلی نے کہا واللہ اس کا ایک قطرہ بھی میرے بدن کو نہ چھوئے گا یہاں تک کہ میں اللہ کے حضور میں پہنچوں (رواہ احمد) شیخ ابن کثیر نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور یہ تعبیر بھی غیر مشہور ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بحر شور کے موجود پانی کو جہنم کی آگ بتانا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ حضور اقدسؐ نے تو سمندر کے پانی کو پاک اور اس کی مچھلیوں کو حلال فرمایا اور یہ مفسر سمندر کے پانی کو آتشِ جہنم قرار دیتے ہیں یاللعجب درحقیقت اگر ابن عباسؓ کا قول اور حضورؐ کا فرمان روایتاً صحیح ثابت ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سمندر کے پانی کی لہریں جس طرح ڈوبنے والے کا احاطہ کرلیتے ہیں یا جس طرح سمندر میں پھنسے ہوئے جہاز کو چاروں طرف سے اُٹھ اُٹھ کر موجیں گھیر لیتی ہیں اسی طرح جہنم کی آگ کے پردے دوزخیوں کو گھیر لیں گے یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن سمندروں کا پانی جہنم کی آگ بن جائے گا اور خدا تعالیٰ اس کی ماہیت الٹ دے گا۔ نہ یہ کہ اس وقت جو پانی موجود ہے وہ جہنم کی آگ ہے یہاں تک کہ اس میں داخل ہونا، اس سے غسل کرنا اور اس میں سفر کرنا ممنوع ہے۔

ایک یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ چونکہ کافروں کے عقائد کی خرابی اور بداعمالی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ان کا سماج تمدن معاشرت اخلاق سیاسیات اقتصادیات اور ذہنیات اس قدر حقیقت سے دور ہوچکے ہیں کہ کوئی لمحہ کوئی دقیقہ بدکاری سے خالی نہیں۔ ان کی نشست و برخاست، رفتار گفتار خواب بیداری سب ہی زیاں کاری اور بدکاری کا مجسمہ ہے بداعمالی ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ تو گویا جہنم کی آگ ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے کیونکہ عالم مثال اور جہانِ قیامت میں یہی اعمال تمثیلی عذاب کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اعمالِ بد کا احاطہ درحقیقت نارِ جہنم کا احاطہ ہے۔

وَیَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے ہوسکتا ہے۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے عذاب کے فرشتوں سے کہلوائے گا کہ دنیا میں تم جو کچھ کرتے تھے اس کی پوری پوری سزا بغیر کمی بیشی کے آج چکھو۔ اس تفسیر پر عمل کو چکھنے سے مراد ہوگا عمل کی سزا کو چکھنا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے فرشتے کافروں سے کہیں گے کہ آج تم اپنے بداعمال کا مزہ چکھو۔ دیکھو دنیا میں تم نے جو کچھ کیا تھا آج اس کی کیسی بُری کیفیت تکلیف دہ حالت اور ہیبت ناک صورت ہوگئی ہے۔ یہ موجودہ فی الحقیقت کوئی نئی چیز نہیں بلکہ وہی تمہارے اعمال سیئہ اور عقائد غیر صحیحہ ہیں جن کی شکل بدل گئی ہے۔

مقصودِ بیان کافروں کی نظر میں رسول پاک کے معجزات اہم نہ تھے اور قرآن کو وہ ہدایت و ایمان کے لئے کافی نہ سمجھتے تھے اس لئے محسوس عظیم الشان معجزات کی طلب کرتے تھے۔ نبی کو خود معجزات کے اظہار کی طاقت نہیں ہوتی بلکہ باذنِ الٰہی وقتی طور پر اس کو غیر معمولی تصرف کی طاقت عطا کردی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہر طرح کے معجزات کو ظاہر کرنے پر قادر ہے لیکن تمام فرمائشی معجزات کا اظہار مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اس لئے بہت سی فرمائشوں کی تکمیل نہیں کی جاتی۔ قرآن عظیم الشان اور سب سے بڑا معجزہ ہے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا معجزہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن رحمت بھی ہے اور نصیحت نامہ بھی یعنی اس کے احکام ناقابلِ برداشت اور ہدایات خارج از عقل نہیں۔ نہ انسان کو تکلیف دینے والے ہیں۔ دنیا اور دین کی ہر بھلائی کا خزانہ اس کے اندر موجود ہے لیکن ایسے آزاد چھوڑنے والے بھی نہیں کہ انسان مطلق العنان ہوجائے اور حرام حلال کا فرق اٹھا دے۔ قرآن سے فائدہ اسی قوم کو پہنچ سکتا ہے جو اس کے قواعد و ضوابط کی صحت کو مانتی اور اس پر عمل کرتی ہو۔ ہر قوم کے لئے اس سے بہرہ اندوز ہونا ممکن نہیں۔ یعنی بغیر ایمان و عمل کے قرآن کو طاقچہ اور صندوق میں رکھنے سے رحمت و موعظت حاصل نہیں ہوسکتی۔ باطل پرستی بُری بلا ہے۔ حق پرستی کی آنکھوں کو اندھا کردیتی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو ماننے والا ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ عذاب کی فوری طلب سے عذاب نہیں آجاتا۔ نہ قبل از وقت موت کی درخواست سے موت آتی ہے۔ نہ عذابِ آخرت دنیا میں آسکتا ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ قانونِ قدرت ہے کہ وقت سے پہلے کسی عمل کا نتیجہ نہیں برآمد ہوتا ہے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ کفر و بدکاری سے لازم نہیں آتا کہ آدمی خواہ مخواہ فی الفور مرجائے بلکہ موت اپنے وقت پر آئے گی۔ کافروں کی بداعمالیاں جہنم میں لے جانے کا موجب ہیں مطلب یہ کہ خدا ظالم نہیں کہ بلاوجہ کسی کو جہنم میں لے جائے۔ اسبابِ جہنم انسان خود فراہم کرتا ہے۔ پھر کرتوت سے زیادہ پاداش بھی نہیں ملے گی اعمال کے مطابق سزا ہوگی۔ وغیرہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ○ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ

اے میرے مومن بندو! میری زمین وسیع ہے تم میری ہی عبادت کرو ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے پھر

اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ

ہمارے ہی پاس تم کو لوٹ کر آنا ہے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ہم اس جنت کے بالا خانوں میں ان کو ضرور جگہ دیں گے جس کے اندر

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○

نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (آہ) عمل کرنے والوں کا کیسا اچھا اجر ہوگا جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَ

بہتیرے جانور اپنا رزق خود لادے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو اور تم کو رزق دیتا ہے وہی سننے والا جاننے والا ہے اگر

لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ

تم ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کس نے بنائے اور سورج چاند کو کس نے کام میں لگایا تو ضرور کہیں گے اللہ نے

فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

پھر کدھر الٹے جا رہے ہیں اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے اللہ یقیناً سب کچھ

عَلِيْمٌ ○ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا

جانتا ہے اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے پانی برسا کر اس سے زمین کو کس نے خشک ہو جانے کے بعد تر و تازہ کیا تو ضرور

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ ع

کہیں گے اللہ نے تم کہہ دو الحمد للہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے ناسمجھ ہیں

رکوع ۶

تفسیر دکھ سکھ اور رنج و راحت کا کیا مفہوم ہے۔ کیا یہ دنیا اور اس کی پُرفریب نعمتیں اس قابل ہیں کہ ان کو اصل مطمح نظر بنایا جائے۔ ان کی نگہداشت اور تحصیل کی ہر وقت اور ہر حالت میں فکر رکھی جائے خواہ روح کی دنیا آباد ہو یا برباد کفر و معصیت اختیار کرنا پڑے یا تقویٰ و توحید۔ ایمان فروشی کرنی ہو یا استقامت ایمانی برقرار رہے بہر حال یہاں کی آرائش و زیبائش، عیش و تنعم، جاہ و حشم، خیل اور خدم پر ہر خیال ہر عمل ہر علم اور ہر جذبہ کو قربان کر دیا جائے۔ ان ہی کو قرارگاہ سکون مخزن سعادت اور معدن عافیت سمجھا جائے اور انہی کو عیش جاودانی کا چمنستان قرار دیا جائے یا دکھ سکھ کا معیار کچھ اور ہے اور انسانی مطمح نظر کسی دوسری چیز کو ہونا چاہیے۔ درحقیقت دنیا اور دنیا کی دلچسپیاں بے انتہا دلفریب ہیں اس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ایسی ہیں جو انسان کو از خود رفتہ اور وارفتہ کر دیتی ہیں کہ آدمی خود کو بھی بھول جاتا ہے اور خدا کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ دنیا کتنی ہی دلکش، دلفریب، دلربا، دل نشین ہو، اس کی راحت کیسی ہی سکون بخش، آرام دہ، سکھ آفریں، لذت آگیں، مسرت افزا اور بشاشت زا ہو لیکن پھر بھی فریب نظر ہے متاع غرور ہے، سراب ہے آب نہیں، شیشہ کے ٹکڑے ہیں ہیرے نہیں، یہ انگارے ہیں لعل رمانی اور یاقوت

نہیں ہے اسی طرح اس دارالمحن مرکز آلام سیدار افکار منشاء ہموم اور مرجع تکالیف کا دکھ کیسا ہی دلفگار دلدوز اور دلخراش ہو، یہاں کی مصیبت کتنی ہی حوصلہ فرسا، صبر شکن اور جاں گسل ہو لیکن ناقابل برداشت ہے، ناپذیر ہے محض اعتباری اور بے حقیقت ہے، بے بنیاد ہے، یہاں کبھی دشمنوں کی طرف سے آزار کے تیر برسیں گے، کبھی صورت دشمنان کا غلبہ ہوگا کبھیتیاں سوکھ جائیں گی باغ جل جائیں گے، بجلیاں آئیں گی مصیبتیں پڑیں گی، جگر پاروں کی موتیں بھی ہوں گی، مگر یہ تمام نقصانات سارے خسارے، کل جائیدادیں اب سب کچھ فانی ہیں ناپائیدار ہیں۔ بالغرض نہ یہاں کے دکھ کا اعتبار، نہ سکھ کا اور راحت وچین میں مسلم کے لئے کوئی دلکشی ہونی چاہئے، نہ غم واندوہ میں کچھ حوصلہ فرسائی اور صبر شکنی اس کو نہ فوت ہونے کا کچھ غم نہ ملنے کی کوئی خوشی، اس کا مرکز توجہ آخرت اور صرف آخرت ہونا چاہیئے۔ اگر راہ خدا میں گھر چھوٹے، وطن سے رشتہ ٹوٹے، اسباب دولت و راحت تباہ ہوں، روزی کے ذرائع برباد ہوں، بلکہ آخر میں گھر بار لٹا جاتے، بیوی اور بچوں سے کنارہ کش ہونا پڑے یہاں تک کہ جان عزیز پر بھی بن جائے تب بھی ہر شئی ہوا کے حصول کا شائبہ دکھ کو بنا دے مسلمان سو کا بندہ نہ ہوا ایک کا ہو۔ در در سے اس کو طمع نہ ہو ایک در سے ہو۔ ہر پتے کی آواز اور ہر جھونکے کی سنسناہٹ اس کو خوف زدہ کر دے۔ ہر بالا اعلیٰ کی طاقت دل اس کو دل شکستہ نہ بنا دے بلکہ خوف ہو تو صرف خدا کا اور غم ہو تو عاقبت کا۔ پس اے وہ لوگو! جن کو خدا اپنا بندہ فرماتا ہے اور جو اس کے وعدوں پر سچا ایمان رکھتے ہیں اگر کفار چاروں طرف سے تم کو گھیر لیں۔ اگر اٹھتے بیٹھتے تم کو دکھ پہنچائیں، اگر چلتے پھرتے تم کو ستائیں تو اللہ پر بھروسہ رکھو، اس کی مدد طلب کرو، کافروں کے آزار وایذا پر صبر رکھو یاد کے ذکر سے غافل نہ ہو، تم اپنا کام کئے جاؤ۔ یہ دنیا دارالعمل ہے، کوشش کا میدان ہے، لیکن اگر ضوابط اسلامیہ پر پابند ہونا کسی طرح ممکن نہ ہو، اگر کفار کی جبر و دستیاں تم کو معبود مسجود کے سامنے سر نیاز جھکانے سے بھی روک دیں۔ اگر شریعت پر عمل کرنا کسی کفرستان میں محال بن جائے تو پھر یاد رکھو خدا کا ملک تنگ نہیں ہے جہاں آزادی دیکھو چلے جاؤ۔ گھر بار چھٹنے کی، عزیزوں دوستوں سے رشتہ ٹوٹنے کی، اہل وعیال کی جدائی کی، مال ومنال اور دولت وجائیداد سے محروم ہونے کی پرواہ نہ کرو۔ پرندوں چرندوں اور درندوں کو دیکھو کیا وہ اپنی روزی ساتھ ہر وقت لئے پھرتے ہیں۔ کیا ہر جگہ وہ اپنی خوراک اپنی پشت پر لادے رہتے ہیں ایسا نہیں ہوتا اور یقیناً نہیں ہوتا۔ پس تم کو بھی روزی کی طرف سے مطمئن رہنا چاہیئے۔ دین کو بچانا اور ایسی جگہ جانا جہاں مذہبی فرائض کی ادائیگی کی آزادی ہو فرض قطعی ہے رزق کا کفیل تو پروردگار ہے۔ آسمان اور زمین کو اسی نے بنایا چاند اور سورج کو اسی نے چمکایا ابر سے پانی اسی نے برسایا مردہ زمین کو اسی نے جلایا اور خشک میدانوں کو سیراب کر کے اسی نے سبزہ لہلہایا اور پھولوں کو کھلایا پس وہی انسانوں کے رزق میں تنگی اور فراخی کرنے والا اور روزی کے دروازے بند کرنے یا کھولنے والا ہے۔ کون ہے جس نے کائنات کو بنایا۔ مینہ برسایا اور سبزہ کو لہلہایا۔ لہٰذا بغیر تردد اللہ اور پیغمبر کے دین کو بچاؤ اگر تحفظ دین کے راستہ میں تمہاری جانوں پر بن جائے اور کفار کی چیرہ دستیاں اور ستمگاریاں تمہاری جان لیوا بھی ہو جائیں تب بھی کچھ پرواہ نہ کرو۔ کیونکہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور بہرحال لوٹ کر خدا کے پاس جانا ہے۔ تمہارے پیش نظر تو صرف اپنا اصلی مرکز ہونا چاہیئے۔ اس عارضی تکلیف کے بعد ارحم الراحمین تم کو جنت نعیم عطا فرمائے گا۔

تحلیلِ اجزاء يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ الخ ابتدائے اسلام میں بیچارے مسلمان اپنی کمزوری اور قلت کے سبب کفار مکہ کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہر طرف سے غریبوں پر مار دھاڑ تھی۔ خدائے واحد کی عبادت کرنے سے باطل پرست ہر وقت مانع آتے تھے۔ مجبوراً حضور اقدس نے ہجرت کی اجازت دی اور مسلمان ترک وطن پر آمادہ ہوئے چنانچہ اسی تراسی آدمی حبش کی طرف ہجرت کر گئے پھر جب بقیہ مسلمانوں کو بھی عافیت نصیب ہونی ناممکن ہو گئی تو حضور مع دیگر اصحاب کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ لیکن بعض مسلمان اپنے جائدادی تعلقات یا معاشی موانع یا قلت زاد یا ضعف اور کمی استعداد کے سبب مکہ میں ٹھہرے رہے اور بالآخر اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام ممالک اللہ کے ہیں اور سب لوگ اللہ ہی کے بندے ہیں پس جس زمین میں تم کو بہتری حاصل ہو وہیں قیام کرو (رواہ احمد) آیت مذکورہ کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانو تمہارے پیش نظر صرف عبادت الٰہیہ اور دینی تحفظ ہونا چاہیئے۔ اگر وطن مالوف میں اللہ کی عبادت ناممکن ہو تو ترک وطن کرو، ملک خدا تنگ نہیں ہے کیونکہ تم سب خدا کے بندے ہو لیکن مال اولاد، جائداد، اعزہ اقارب اور دیگر دنیوی تعلقات کے پرستار نہیں ہو۔ محبت الٰہی کے مقابلہ میں تم کو کسی سے محبت نہ ہونی چاہیئے۔ غلام کا جو تعلق آقا سے ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ہوتا۔ تمہارا جو تعلق خدا سے ہے وہ کسی سے نہیں ہے پھر تم تو احکام الٰہیہ کو مان چکے ہو۔ تمہارا بندہ ہونا اور آقا کے احکام کو تہ دل سے سچا جاننا اسی کا مقتضی ہے کہ جہاں اللہ کی عبادت بغیر شرک کے بسہولت ممکن ہو وہیں سکونت اختیار کر لو۔ آیت میں عبادت سے کیا مراد ہے اور واقع میں عبادت الٰہیہ کیا چیز ہے۔ اس کے متعلق عام علمائے تفسیر نے تو صرف نماز کا ذکر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں نماز اور تلاوت کلام پاک بسہولت میسر ہو وہیں جا رہو لیکن میرے نزدیک یہ مطلب کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے۔ درحقیقت عبادت صرف نماز اور تلاوت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اسلامی قوانین، ضوابط دیوانی وفوجداری

قواعد اور کل قرآنی نظریات کا نام عبادت ہے۔ عبادت دراصل عبدیت کے مظاہرہ کا نام ہے۔ مولا کے ہر حکم کی تعمیل بغیر چون و چرا کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ قرآن کے تمام احکام الہٰی کی پابندی عبادت ہے۔ خواہ اُن کا تعلق معاشیات سے ہو یا اخلاقیات سے معاشرت سے یا سماج اور تمدن سے سب کے سب عبدیت کے مظاہرات اور عبادت کی شاخیں ہیں مسلمان کی سلامی زندگی اور زندگی کے تمام اوقات عبادات میں صرف ہونے لازم ہیں۔ اگر قوانین اسلامی پر عمل کرنے سے کسی ملک میں کوئی چیز مانع ہو خواہ ابنائے وطن روکتے ہوں یا حکومت بازداشت کرتی ہو اور مدافعت کی طاقت نہ ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے کیونکہ ایسی حالت میں اگر حکومت وقت کے حکم کو یا ابنائے وطن کی روک تھام کو مانا جائے گا تو چونکہ اس بات سے اللہ کے مقرر کردہ احکام کی خلاف ورزی ہوگی اس لئے شرک فی العبادت ہو جائیگا اور عمل بالتوحید میں خرابی آئے گی اس لئے صحیح حاصل مطلب یہ ہے کہ مسلمانو تمہاری اندرونی خصوصیات ہیں۔ اول تو تم خدا کے خاص بندے ہو۔ اس کی بندگی کے علاوہ تمہارا اور کوئی مقصد نہیں ہے اور بندہ کا کام یہی ہے کہ آقا کے ہر حکم کی تعمیل کرے اور تمام موانع کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ تم اہلِ ایمان ہو اللہ کی الوہیت کاملہ پر تمہارا ایمان ہے اس لئے کسی دوسری چیز کو تم الٰہ نہ بناؤ خواہ مال و جائداد اور معاش تجارت قربان کرنی پڑے یا تعلقات اور رشتہ داریاں منقطع کرنی ہوں یا رنج اور تکلیف اٹھانی پڑے۔ بہرحال اپنی عبدیت و عبادت کے تحفظ کے لئے تم کو ترکِ وطن کرنا چاہیئے۔

اب اگر یہ اندیشہ ہو کہ اگر کافروں کو خبر ہو گئی تو وہ ہم کو پکڑ کر زدوکوب کریں گے یا مار ڈالیں گے یا کچھ اور جسمانی دکھ پہنچائیں گے تو پرواہ نہ کرو کیونکہ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ہر آدمی کو موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے۔ ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے۔ موت ٹلنے کی چیز نہیں ہے۔ آنے والی ضرور آکر رہے گی۔ پھر اندیشہ موت کو اپنے اصل مقصد کے حصول میں کیوں آڑ بناتے ہو۔ یہاں پڑے پڑے مرے تب کیا! اور راہِ خدا میں نکل کر کفار کے مصائب کا شکار ہوئے تب کیا۔

ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ۝ بالآخر مر کر خدا کے پاس پہنچنا ضرور ہے۔ اُخروی زندگی کی عافیت پیشِ نظر رکھنی لازم ہے یہاں کا دکھ سکھ ہیچ ہے۔ اصل چین وہی ہے جو مرنے کے بعد حاصل ہوگا۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ الخ۔ مرنے کے بعد نیکوکار اطاعت شعار ایمانداروں کو بہشت بریں کی کوٹھیاں ہمیشہ کے لئے سکونت کے واسطے ملیں گی وہی ان کی قرارگاہ بنیں گی۔ گویا یہ دنیوی زندگانی تو ایک مرحلہ ہے جس کو کاٹنا ضرور ہے۔ درمیانی منازل کا دکھ سکھ ناپائدار اور بے اعتبار ہے مرکز تو وہ اصل منزل ہے لیکن خوب یاد رکھو۔

نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا اور مختلف حیلے بہانے کرنا اور راہِ خدا میں نکلنے سے جی چرانا کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے عمل کی ضرورت ہے۔ اجر تو انہی لوگوں کو ملتا ہے جو کچھ کرتے ہیں۔ راہِ خدا میں اپنے تن من دھن پیش کرتے ہیں۔ اگر سبیل عمل میں اگر مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو بخوشی خاطر انتہائی جرأت کے ساتھ ان کو برداشت کرتے ہیں اور الَّذِينَ صَبَرُوا الخ۔ ہر دکھ الم، رنج اور تکلیف پر صبر رکھتے ہیں لیکن یہ بھی خوب سمجھ لو کہ تمہاری کوشش مصائب پر صبر اور رنج والم کی برداشت صرف ایک جذبہ کے تحت ہونی چاہیئے اور وہ جذبہ توکل ہے۔ موجودہ تکالیف اور پیش آنے والی مصائب پر صبر اور ان کو دور کرنے کی کوشش اور پھر اسی کے ساتھ اللہ کی ذات پر اس امر کا اعتماد کر وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ ہمارے دُکھ کو دور کرکے آئندہ راحت و چین عطا فرمائے گا یہی چیزیں ہیں کہ بہترین اجر کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ مفسر خازن نے لکھا ہے کہ پہلی آیت میں جو ہجرت کی ترغیب دی ہے اس کو سن کر مسلمانوں نے ہجرت کا پختہ ارادہ کر لیا لیکن طبیعتوں میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ مدینہ میں پہنچ کر اسبابِ معاش مہیا نہ ہوئے تو کیا ہوگا۔ اس وقت توکل کی ترغیب اور صابرین متوکلین کا اجر بیان کرنے کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر یہ سببِ نزول روایۃً صحیح ہو (جس کا خازن نے کوئی حوالہ نہیں دیا) تب تو چون و چرا کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے ورنہ میرے نزدیک سیاق و سباق اس مفہوم کا انکار کرتا ہے۔ ان مسلمانوں کو جو مکہ میں رہ گئے تھے اور اپنی تعلقات یا اندرونی ذہن کے سبب ہجرت نہ کر سکے تھے۔ اگر شبہات ہو سکتے تھے اور ارادہ ہجرت سے روکنے والا کوئی خطرہ ہو سکتا تھا تو اس کی صرف دو صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ اگر ہم نے یہاں سے ہجرت کی تو چونکہ ہم بے بضاعت کمزور اور مغلوب ہیں اس لئے ممکن ہے کفار خبر پاکر ہم کو راستہ ہی میں جا پکڑیں اور پھر ہم پر مزید ظلم توڑیں یا ہمارے پیچھے ہمارے بھائی کو ستائیں گھر بار کو لوٹ لیں مال و جائداد کو برباد کر دیں۔ دوسرے یہ کہ مدینہ میں پہنچ کر ہم کیا کریں گے۔ جب تمام اسبابِ معاش مکہ میں رہ گئے احباب اعزا اور گھر بار دیں چھوٹے گئے تو پردیس میں پہنچ کر ہم کو بھوکے مرنے کے سوا اور کیا چارہ ہوگا۔ اِدھر خانہ بربادی ہوگی اُدھر بیکاری اور افلاس کا شکار ہوں گے یہی دو شبہات مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلے شبہ کو دور کرنے کے لئے آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور عمل و صبر کے ساتھ اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی گئی اور بلیغ ترین عبارت میں مصائب و الم کی برداشت پر آمادہ کیا گیا اور دوسرے شبہ کے ازالہ کے لئے آیت ذیل وَكَأَيِّنْ مِنْ دَابَّةٍ الخ اتاری گئی۔ اس آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ بہتیرے زمین پر چلنے والے چرند پرند ایسے ہیں جو اپنی روزی ساتھ ساتھ اٹھائے نہیں پھرتے۔ بھوکے بغیر کسی زادِ راہ کے جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں۔ پس وہی تم کو بھی دے گا۔ وہ ہر ایک کی دعا کو خوب سنتا اور ہر ایک کی حالت کو خوب جانتا ہے۔

حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میں چاہوں اور اپنے پروردگار سے دعا کروں تو میرا رب قیصر و کسریٰ کی سلطنت مجھے عطا

نہ پا رہے گا۔ پھر فرمایا اے ابن عمر تیری کیا حالت ہوگی جب کہ تو ایسی قوم میں رہ جائے گا جو برسوں کے رزق اکٹھا کریں گے اور اُن کا یقین کمزور ہو جائے گا ابھی ہم نے فرمایا کہ ابھی ہم مجلس سے نہیں ہٹے تھے کہ آیت وَكَأَيِّنْ مِّن دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا الخ نازل ہوئی (رواہ عبد بن حمید وابن مردویہ والبیہقی ولکن ضعفہ الشیخ ابن کثیر والسیوطی)

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

بعض بے وقوف ذہنیت رکھنے والے شاید شبہ کرنے لگیں کہ آیت مذکورہ کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ انسان کو رزق و معاش کی کوئی فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ جس طرح بکثرت حیوانات آئندہ روزی کے اہتمام سے بے نیاز ہیں اسی طرح ہر مسلمان پر لازم ہے کہ کل کے لئے کھانے کی فکر نہ کرے۔ خدا رازق ہے۔ اس کے علاوہ سفر میں نہ زاد سفر کی ضرورت نہ توشہ ودلیل ہونا جائز نہ معاشی انتظام سے کوئی سروکار ہاتھ پاؤں توڑ کر دنیا سے منہ موڑ کر جملہ سے رشتہ جوڑنا اور محض عبادت کو مرکز توجہ بنانا لازم ہے۔

ایسی گندہ ذہنیت رکھنے والوں کو مختصر جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ آپ کا بیان کردہ مطلب صریح آیت کے خلاف ہے۔ در حقیقت آیت کا نزول تو دینی تحفظ کی ترغیب اور ہجرت و ترک وطن پر آمادہ کرنے کے لئے ہوا تھا اور ان حیلوں بہانوں کو ساقط کرنا مقصود تھا جو حکم الٰہی کی تعمیل میں لوگ پیش کر سکتے تھے نہ کہ اس سے توکل کی تعلیم مقصود تھی۔ اس کے علاوہ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا کسی جانور کو بغیر چلے پھرے یا بلا کام کئے روزی مل جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پشت پر روزی کا انبار وہ لادے نہیں پھرتا مگر کام تو ضرور کرتا ہے۔ پس انسان پر لازم ہے کہ وہ ضرور محنت اور کوشش کرے اور تمام پیش آنے والی تکلیفوں کو جو وہ جفاکشی اور استقامت کے ساتھ برداشت کرے اس پیش نظر زات الٰہی کو رکھے اور اسی پر اعتماد و بھروسہ رکھے۔ العاملین کا لفظ تو صاف بتا رہا ہے کہ عمل لازم ہے اور صبروا کا لفظ مصائب کی تلقین کر رہا ہے۔ پھر آخر میں یتوکلون اعتمادی الخیال اور توکل فی العقیدہ کی تعلیم دے رہا ہے نہ کہ توکل فی العمل اور ترک کی سعی کی۔

ایک نکتہ

عالم الغیب والشہادۃ نے آیت مذکورہ میں یہ نہیں فرمایا کہ زمین پر چلنے والے سب جانور روزی جمع کر کے نہیں رکھتے بلکہ یہ صراحت اکثر جانوروں کے متعلق فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض جانور اپنا رزق جمع کر کے بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً چوہا چیونٹی وغیرہ اس لئے حکم کلی نہیں لگایا جاسکتا۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ۔ کفار عرب کا مذہب تھے۔ بعض یہودی تھے بعض عیسائی، بعض مجوسی بعض بت پرست۔ یہودی یا عیسائی تو یقیناً اللہ کی ہستی کو مانتے تھے۔ رہے مجوسی اور بت پرست وہ بھی خدا کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ الفاظ کا تغیر تبدل تھا مگر ہستی کا سب کو اقرار تھا۔ البتہ یہ سب شرک میں مبتلا تھے۔ الوہیت و ربوبیت میں کسی واحد و یگانہ نہیں مانا جاتا تھا۔ مظہر الوہیت یا صفات خداوندی سے متصف دوسروں کو قرار دے رکھا تھا اور میرے خیال میں تو سارے جہاں میں کوئی بھی خدا کا منکر نہیں ہے۔ کہنے کو منہ سے کہہ دے کہ یہ کائنات خود بخود بن گئی ہے لیکن نیچر، قدرت، فطرت، ہمہ گیر قوت، محیط کل طاقت، ضابطہ کائنات یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ جن کی حقیقت تقریباً ایک ہی ہے ہر شخص ضرور استعمال کرتا ہے۔ لفظ اللہ یا خدا سے چڑ ہو تو ہو ہمہ گیر قوت قاہرہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا خواہ اس کو زمانہ کہا جائے یا نیچر یا کچھ اور۔

بہر حال کفار عرب بھی خدا کی ہستی اور اس کے بعض مخصوص اوصاف کے منکر نہ تھے۔ وہ خدا کو خالق کائنات جانتے تھے۔ مینہ برسانے والا اور اس سے سبزہ اگانے والا مانتے تھے لیکن اپنے دوسرے معبودوں اور دیوتاؤں کو بھی خدا تک پہنچنے اور اس سے کار برآری کرانے کی درمیانی کڑیاں سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان فرضی خداؤں کو خوش رکھنا بزعم خود ضروری قرار دیتے تھے۔ گزشتہ آیات میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب دی تھی پیش آنے والے مصائب کو برداشت کرنے کی تلقین کی تھی اور سلسلۂ رزق کی بندش کا جو شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس کا ازالہ فرمایا تھا اب یہاں ایک عام استدلالی رنگ میں اپنے رزاق مطلق ہونے کو بیان فرمایا ہے اور اس بلیغ اسلوب ادا سے ظاہر فرمایا ہے کہ مسلمان تو مسلمان کسی کافر کے دل میں بھی کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ خلاصہ استدلال یہ ہے کہ اگر ان منکرین اسلام سے بھی دریافت کیا جائے کہ یہ آسمان و زمین کس نے بنائے اور چاند سورج کس نے بنائے تو بلا شبہ بے ساختہ وہ اللہ ہی کا نام لیں گے۔ اسی طرح جب ان سے پوچھا جائے کہ ابر سے پانی کون اتارتا ہے اور کون اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے تو وہ لا محالہ اس کا فاعل خدا ہی کو قرار دیں گے تو اب ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ انسان حیوان چرند پرند اور درند جس چیز کو کھاتے پیتے استعمال کرتے اور جو بقائے حیات کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ جن چیزوں پر زندہ کائنات کی زندگی موقوف ہے ان چیزوں کی پیداوار کس طرح ہوتی ہے اور پیدائش کے اسباب کیا ہیں۔ زمین گویا اثر پذیری کی قوت ہے اور آسمان خواہ آسمان کا مفہوم کچھ بھی لیا جائے اپنے ہر گوری مدار سے زمین پر مختلف کیفیات اور حالات منعکس کرتا ہے۔ چاند سورج کی روشنی اور حرارت کو ان اجناس میں تغیرات پیدا کرنے کی کیا کچھ مداخلت ہے۔ کیا سورج کی روشنی کے بغیر بھی کبھی دن نکلا ہے یا نکلتا ہے یا اس کی گرمی کے بغیر کوئی پھل پیدا ہوتا اور پکتا ہے۔ کیا چاند کی روشنی رات کو اجیالا کرنے والی نہیں ہے۔ پھل پھولوں کی پیداوار میں اس کو دخل نہیں ہے پھر یہ بھی غور کرو کہ بارش کے بغیر صرف مٹی، ہوا، سورج کی

گرمی، چاند کی خنکی اور تخم کی موجودگی سے تو کوئی سبزہ نہیں پھوٹ سکتا۔ اگر نمی نہ ہو تو بیج میں اولیں سوئی کیسے پھوٹے۔ زمین میں تری نہ ہو تو بیج کو کیسے اور پھر کس طرح نمو ہو اور اس زندہ کائنات کو بغیر سبزہ اور پھل پھول کے روزی کہاں سے ملے۔

جب خالق ارض و سما خدا ہے چاند سورج اسی نے بنائے بارش اسی نے اتاری سبزہ اسی نے اگایا، پھل پھول اسی نے پیدا کئے اور ہر زندہ کی زندگی پیدا کرنے کے تمام اسباب اسی کے دست قدرت میں ہیں تو پھر کس قدر ظلم ہے کہ اس کو رزاق مطلق اور قسام کل نہ قرار دیا جائے۔ نہ یہ کسی طرح جائز ہے کہ اس کا دروازہ چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر دستک دی جائے اور در در کاسہ لیسی کی جائے اور بے کس بے بس مخلوق کے سامنے سر نیاز جھکا کر دست سوال دراز کیا جائے۔ نہ یہ اندیشہ کرنا اور دل میں خطرہ لانا مناسب ہے کہ اگر موجودہ دروازے بند ہو گئے، اگر کاروبار بگڑ گیا۔ اگر موجودہ تجارت گر گئی تو آئندہ پھر کیا ہوگا۔ اگر ہم اپنا کاروبار اور معاشی وسائل کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے چل دیئے تو ناداری کی حالت میں کہاں سے کھائیں گے۔ یقین رکھنا چاہیئے کہ روزی کا دروازہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جس کے لئے چاہتا ہے اس کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔

مقصود بیان لفظ یا عبادی سے پرلطف اشارہ ہے اس طرف کہ یوں تو سب اللہ ہی کے بندے ہیں لیکن اہل ایمان کو خصوصیت حاصل ہے اس لئے ان کو اللہ ہی کا بندہ رہنا اور ہر وقت ہر حالت میں اللہ کی بندگی کے جذبہ کو مطمح نظر رکھنا لازم ہے۔ ان کا دل اللہ کے سوا دوسروں سے نہ بندھنا چاہیئے۔ ان کا بندھن بس ایک سے ہو چکا۔ پھر دوسروں سے وابستگی اور مال و عیال کا خیال کیسا۔ شیخ سہل نے فرمایا کہ ارضی واسعۃ کا لفظ تعلیم دے رہا ہے کہ جس ملک میں بدعت و معصیت پھیلے اس کو چھوڑ کر اہل طاعت کے ملک میں چلے جاؤ۔ مراد یہ ہے کہ اگر کفرستان اور مقام بدعت میں رہ کر کفر و بدعت دور کرنے کی طاقت نہ ہو تو ایسی صورت میں ترک وطن لازم ہے۔

اِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ میں ایماء ہے اس جانب کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز کی عبادت حرام ہے۔ یعنی اللہ کے اوامر و نواہی سے جو چیز بھی روکے اس کو ترک کرنا لازم ہے خواہ وہ اہل وطن ہوں یا اعزا احباب یا اہل و عیال یا مال و منال یا کچھ اور۔ بہر حال مسلمان کو صرف اللہ کا پرستار ہونا چاہیئے۔ راہ خدا میں کسی چیز کی یہاں تک کہ جان قربان کر دینے کی بھی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ مسلمان کے پیش نظر صرف اخروی زندگی ہونی مناسب ہے اور ہر وقت یہی خیال رکھنا چاہیئے کہ لوٹ کر پروردگار کے پاس جانا ہے۔ وہاں کا ذوق شوق حقیقی ہے۔ دنیوی رنج و راحت ناپائیدار ہے۔ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ کہنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سعی اور عمل لازم ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا تعلیم الٰہی کے خلاف ہے۔ صبر والے کہنے سے یہ مراد ہے کہ راہ مولا اور حفاظت دین میں جو مصائب و آلام برداشت کرنے پڑیں ان کو برداشت کرنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنی اس کوشش اور تحمل مصائب کو کامرانی کا موجب نہ خیال کر لینا چاہیئے بلکہ بھروسہ ذات الٰہی پر رکھنا چاہیئے۔ عمل کے ساتھ توکل ضروری چیز ہے۔ نہ توکل بغیر عمل کے کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ نہ عمل بغیر توکل کے سودمند ہے۔

رزق حیوانات کا ذکر کر کے مسلمانوں کو تسلی دینی مقصود ہے کہ آئندہ زندگی کے رزق کی فکر نہ کریں بغیر تردد کے وطن کو چھوڑ کر چل دیں اور جہاں دینی تحفظ ممکن ہو وہاں قیام کریں۔ رزاق خدا ہے وہ خود رزق کا دروازہ کھول دے گا۔ دیکھو تمام اسباب رزق خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ آسمان، زمین، چاند، سورج، بارش، سبزہ، پھل، پھول، غذا اسی نے پیدا کیا۔ آغاز سے لے کر انجام تک سبب سے لے کر نتیجہ تک اور واقعی اسباب کی ترتیب سے لے کر بیرونی آثار کے ظہور تک سب کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے۔ وغیرہ

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

یہ دنیوی زندگانی تو صرف کھیل کود ہے اور دار آخرت درحقیقت زندگی ہے کاش ان کو معلوم ہوتا

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾

جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں لیکن جب اللہ ان کو بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۟ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ

ہیں تاکہ ہمارے دیئے ہوئے کی ناشکری کریں اور مزے اڑالیں ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو باامن بنایا ہے اور

يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ○ وَمَنْ أَظْلَمُ

ان کے ارد گرد آدمیوں کو پکڑ لیا جاتا ہے کیا باطل کو یہ مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اس سے بڑھ کر ظالم

مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ○

کون ہے جو اللہ پر دروغ بندی کرے یا جب حق اس کے پاس آ جائے تو اس کی تکذیب کرے کیا جہنم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں ہے

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ○ ع

اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھاتے ہیں اور اللہ بلاشبہ مخلصوں کے ساتھ ہیں

تفسیر یہ بھری پُری اور پُر رونق دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ بے ثبات ہے فانی ہے۔ یہاں کی سکونت مستقل نہیں۔ یہ امتحان گاہ ہے اور معین وقت تک کے لئے قرارگاہ۔ یہاں کبھی دھوپ ہے کبھی سایہ، کبھی روشنی کبھی تاریکی، کبھی دن کبھی رات، کبھی سردی کبھی گرمی، کبھی سختی کبھی نرمی۔ یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ نہ دکھ دائمی ہے نہ عیش جاودانی ہے۔ سورج نکلتا ہے سرخ ہوتا ہے۔ چڑھتا ہے، بڑھتا ہے، سفید ہوتا ہے، نور پھیلاتا ہے، گرمی بڑھاتا ہے۔ حد معین پر پہنچ کر گرتا ہے گھٹتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماند پڑ جاتا ہے۔ چھپ جاتا ہے، اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ نہ وہ روشنی باقی رہنے والی تھی، نہ یہ تاریکی لازوال ہے۔ وہ بھی فنا پذیر، یہ بھی قریب زوال، ہر آن ہر پل، ہر لمحہ ہر منٹ اور ہر ساعت نیا ہے۔ نیا رنگ ہے نیا ڈھنگ ہے۔ مادی دنیا تغیرات کی کروٹیں لے رہی ہے جیسے بحر مادہ عالم میں پانی کی طرح لہریں اٹھتی رہتی ہیں، گھٹتی رہتی ہیں۔

جہاں پیدا ہوئے چلانا شروع کر دیا۔ نہ بھوک کا شعور نہ پیاس کا پتہ۔ غوں غوں کرتا آیا ایڑیاں رگڑنے لگے۔ ماں نے دودھ پلایا چھاتی سے لگایا نہلایا میں ظالیچہ میں بول و براز سے فراغت حاصل کرتے رہے۔ ماں دھوتی رہی۔ آگے بڑھے بیٹھنے لگے اور بڑھے گھٹنوں کے بل سرکنے لگے۔ ماں باپ نے انگلی پکڑ کر کھڑا کیا ایک دو قدم کھینچ کر چلایا پھر کیا تھا چند روز میں دوڑنا شروع کر دیا۔ گھر کے بچوں کو مارا، بہنوں کو ستایا، مکان کی چیزوں کا ستیاناس کر دیا پھر بغل میں بستہ دبایا۔ مدرسہ کا راستہ لیا استاد کی مار کھائی۔ سن شعور کو پہنچے، اچھے برے کی تمیز ہوئی۔ جوان ہوئے ہاتھ پاؤں میں جان، چہرے مہرے میں نشان اور چال ڈھال میں آن بان پیدا ہو گئی۔ دکھ سہا سکھ اٹھایا نرمی سختی جھیلی اور سردی گرمی برداشت کی۔ چالیس خزاں اور چالیس بہاریں دیکھیں۔ بالوں میں سفیدی آنے لگی۔ رو سیاہی جاتی رہی پیام اجل آنے لگا۔ اعضاء میں کمزوری، اعصاب میں ڈھیلا پن، رگوں میں سختی خون میں کمی، بدن میں خشکی اور عام نقاہت پیدا ہو گئی۔ کمر جھکنے لگی، گردن کے مہرے ڈھیلے پڑ گئے۔ زمین نے سر کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا کوزہ پشت ہو گئے۔ بالآخر مٹی نے کھینچ لیا۔ وہ آغاز تھا۔ یہ انجام ہوا۔ وہ طلوع تھا یہ غروب ہوا پس کیا یہ دنیا فریب نظر نہیں ہے۔ کیا زندگی سراب اور نقش بر آب نہیں ہے کیا دکھ سکھ کا انقلاب دھوپ چھاؤں کا تغیر نہیں ہے۔

دنیا میں ہر امیر اور غریب، شاہ اور گدا، زن اور مرد تا دم مرگ جس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کی خواہش ہر دل میں موجزن ہے جس کے لئے انسان بڑی سے بڑی اور پیہم تکالیف اٹھانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ خوشی ہے لیکن جس طرح بہار کے بعد خزاں اور نور کے پیچھے تاریکی کا آنا لازم ہے۔ اسی طرح خوشی اور غم بھی توام ہیں نوش و نیش اور شب و روز کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ جہاں سامان عیش فراہم ہوئے کدورت کی صورت بھی سامنے آ گئی۔ دنیا میں کسی کو اصلی خوشی میسر نہیں ہے۔ پھر ایک دنیا ہے کہ اس کے حصول کی سعی میں مجنونانہ دوڑ رہی ہے۔ اسی دوڑ میں عمر گزر جاتی ہے۔ موت آ جاتی ہے اور خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

ایک طالب علم شبانہ روز محنتیں کرتا اور ماہ و سال گزارتا چلا جاتا ہے اور اس آرزو میں کہ ایک روز اسے فائنل ڈگری ملنے کی خوشی حاصل ہو جائے یہ وقت آ کر خوشی حاصل ہوتی ہے تو چند روز بعد ہی روزگار کی فکر گھیر لیتی ہیں۔ تگ و دو میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ بھی حاصل ہو کر خوشی ہوئی تو شادی کا فکر لاحق ہوا۔ پھر اولاد کی آرزو پھر اس کے لائق ہونے کی تمنا، پھر ان کی شادیوں کا سوچ۔ غرض خوشیاں حاصل ہوتی ہیں اور آن کی آن میں دوسرے رنج و افکار یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر ان کے نقوش مٹاتے جاتے ہیں اور موت آ کر سب کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کے رخ پر سہرے کی بہار دیکھنے کی تمنا میں اپنی راحتیں قربان کر دیتی ہے۔ ایک موجد کوئی چیز ایجاد کرنے

دھن میں مدتیں گزار دیتا ہے۔ ایک لشکر کش بادشاہ وسعتِ اقتدار کی ہوس میں بادیہ پیمائی اور طے منازل کرتا جاتا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کا بے دریغ خون بہاتا ہے۔ ایک عاشق شیفتگی محبت کے جنون میں حصولِ مسرتِ وصل کے لئے تمام عیش تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن ہر آرزو کی تکمیل کے بعد اور ہر ارمان نکلنے کے پیچھے ان کی جگہ نئی آرزوئیں اور نئے ارمان پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک خوشی کے حصول کے بعد دوسری خوشی کا جذبہ کارفرما ہوتا چلا جاتا ہے۔ آرزو کیا ہے خوشی کے حصول کی تمنا۔

آرزو ایک پھانس ہے، ایک الم ہے، ایک چنگاری ہے جو دل میں چبھی اور دماغ سے چپکی ہوئی ہے۔ آرزو پوری ہو گئی گویا پھانس نکل گئی، تکلیف رفع ہو گئی، بے چینی جاتی رہی مجنوں کو خشکی لڑی جنگ وردہ اور بڑی آرزو تھی کہ مقدمہ جیت جائیں، پاس ہو جائیں، نوکری مل جائے، بیٹا ہو جائے۔ دعائیں مانگ رہے ہیں، خیرات کر رہے ہیں، وظیفے پڑھ رہے ہیں بڑی بے چینی ہے، بڑا اضطراب ہے۔ جیت گئے، پاس ہو گئے، عہدہ مل گیا، بیٹا ہو گیا تو کچھ نہیں ایک تکلیف رفع ہو گئی۔ ایک بے چینی تھی جاتی رہی، ایک پھانس چبھی ہوئی تھی نکل گئی۔ عارضی سکون ہو گیا اور بس لیکن نت نئی آرزوؤں کا سلسلہ پیہم چل رہا ہے نئے نئے ارمان پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پھانسیں لگتی اور نکلتی چلی جا رہی ہیں اور اسی جال میں انسان گرفتار ہے۔ خوشی اور حقیقی خوشی کسی کو حاصل نہیں۔ مفلس سمجھتا ہے کہ دولتمند مسرور ہے اور دولتمند مفلس کو خوش کہتا ہے۔ حقیقت میں کوئی بھی مسرور نہیں۔ ایک کو بے زری کا غم، دوسرے کو انتظامِ زر کی فکر، ایک کا پیٹ خالی، دوسرے کو شکم سیری کے سبب بدہضمی کی شکایت، کوئی بے اولاد ہونے کے غم میں مبتلا اور کوئی نادانی میں گرفتارِ اولاد کملاشا کی۔ ایک سائم المرض کروڑپتی ایک طاقتور مزدور کی صحت کو بنظرِ رشک دیکھتا ہے۔ ایک نادار مزدور دولتمند کے انبارِ زر پر للچائی نظر ڈالتا ہے۔ دونوں پریشان ہیں۔ [illegible] محلوں میں سکونت، ہر طرف بول بالا، ہر وقت عیش و طرب کے گانے اور مسرت کے ترانے، جھروکے میں بیٹھی دور سے دیکھ رہی ہے، گھسیارنیں اپنے شوہروں کے ساتھ گھاس کا گٹھا سروں پہ لادے خوش خوش ہنستی اور چہلیں کرتی چلی جاتی ہیں۔ رشک آتا ہے، دل میں ہوک اٹھتی ہے، اپنی قید کا اس کی آزادی سے مقابلہ کرتی ہے تو دل میں دکھ پیدا ہوتا ہے، اُدھر گھسیارنیں مہارانی کے عیش و نعمت پر مرٹی جاتی ہیں۔ دو نوجوان عورتیں ہیں ایک جوان مفلس کے گھر میں ہے دوسری دولتمند بڈھے کے گھر میں۔ دونوں شاکی ہیں، ایک دوسرے پہ رشک کر رہی ہے پس حقیقت یہ ہے کہ:۔

نہ کوئی خوش ہے اور نہ کوئی ناخوش۔ ایک ناخوش ہے تو دوسرا ناخوش۔ یہ دنیا ایک گل بے بو ہے۔ ایک تجربہ بے کیف ہے۔ دھوکے کی ٹٹی ہے، خوش پوش فاسد گھن کا سہرہ ہے، تازہ پاش بڑھیا ہے۔ لطیف ڈھکن رکھنے والی زہر اور گداز سانپ ہے، ہر یم سرا کی چاندنی اور فریب کی جوانی ہے۔ جو رنا مغل بیابانی ہے۔ یہ ٹپ ٹپ رونق دکھائی دیتی ہے مگر پُرفریب ہے۔ عیش و نشاط کو نظر آتی ہے مگر دار المحن اور الم خانہ ہے۔ یہاں کی کسی چیز کو بقا نہیں ہے۔ بقا ہے تو آخرت اور اصل گھر کے لئے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ انسان سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان یہاں کے ہر عمل کو دائمی عیش اور ہر راحت کو حقیقی راحت سمجھے ہوئے ہے۔ شعبدہ کی واقعیت، تیتر کے سینے کو اصلیت، ٹھیکرے کو ہیرا، انگارے کو یاقوت اور شبنم کے قطروں کو در صدف سمجھتا ہے۔ وہ غازہ پوش بڑھیا کو مستِ شباب دوشیزہ اور جھوٹے بالوں کو جوانی کا رنگ مانے ہوئے ہے۔ اس کو بحقیقت غبار پوش دانہ دکھتا ہے گرفتار بلا کرنے والا جال نہیں سجھائی دیتا فانی عیش میں مست ہے اور سرمدی طرب پر مرمٹنے والا ہے تار سے نکلنے والے سریلے اور ساحرانہ نغمہ پر شیدا ہے اور نہیں جانتا کہ ڈھول کی پول کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جاہ و حشم، خیل و خدم، وقار و اقتدار، جوانی اور سرمستی، صحت اور شاہد پرستی کا جال اس کو چاروں طرف سے جکڑے ہوئے ہے، اس کے بند بند اور جوڑ جوڑ کو باندھے ہوئے ہے۔ گرفتہ خوابِ غفلت میں سرمست اور بادۂ بے ہوشی سے سرشار، نہ اپنی خبر نہ دوسروں کا ہوش، خودی میں بدمست اور رضا فراموش بنا ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ میرا ہے اور ہمیشہ میرا رہے گا، ہوا و ہوس کے فرضی دیوتا اس نے بنا لئے ہیں۔ خواہشات اور پندارِ نفس کے جھوٹے معبود تراش لئے ہیں۔ اگر کبھی جھکتا ہے تو انہی کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے لیکن عیش و طرب کب تک اور راحت و فراغت تا چند۔ اگر کبھی پنجۂ حوادث میں گرفتار ہو گیا، انقلاب کے جال میں پھنس گیا، مصائب میں گھر گیا، خطرات اور ہولناکیوں نے محاصرہ کر لیا، بیچ سمندر میں جہاز بھنور میں آ گیا، طوفانی لہریں اٹھنے لگیں، تیز آندھی کے جھونکے جہاز کو ڈگمگانے لگے تو اس وقت عیش کو بھول گیا۔ دولت و راحت کے فرضی دیوتا دماغ سے دور ہو گئے، غفلت اور خود بینی اور باطل پرستی کا نشہ کافور ہو گیا، بادۂ پندار کی سرمستی ہرن ہو گئی، نہ کوئی دیوی یاد رہی نہ دیوتا، نہ مورت نہ صورت، نہ لات و منات، نہ پیر نہ فقیر، نہ غوث نہ قطب، نہ مٹی کے ڈھیر، نہ گیسو دراز مرشد، لگا خدا کے سامنے گڑگڑانے، نالہ و زاری کرنے، شور و واویلا مچانے، پکارا اور دل کی صداقت سے پکارا کہ اگر اب کی مرتبہ چھوٹ گیا، اگر اس دفعہ جہاز کنارے لگ گیا اور گردابِ بلا سے چھوٹ کر ساحلِ مراد پر پہنچ گیا تو پھر کسی کے دروازے کو نہ کھٹکھٹاؤں گا۔ قاضی الحاجات حامی و ناصر کا دروازہ نہ چھوڑوں گا۔ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ رحمت کا دریا غضب کے نارستان کو سرد کر دیتا ہے۔ بھاگا ہوا غلام جب پھر لوٹ کر آیا اور زاری کرنے لگا تو رحم آ گیا۔ بے پرواہ خدا از راہِ اشفاق بندہ نوازی جب پھر اس کو پکارا تو پھر اس نے لبیک کہی۔ آفت سے نجات دے دی۔ جہاز بھنور سے نکل گیا۔ ساحلِ مراد پر لگ گیا۔ اللہ کے سامنے گڑگڑانے والا بندہ ہنسی خوشی اتر گیا اور

کاروبار میں مشغول ہو گیا۔ پھر وہی بیوپار ہے، وہی نفع نقصان، وہی غرور وہی پندار وہی بدمستی اور سرشاری غفلت کے نشہ سے سرشاری، خدا کو بھول گیا خودی میں چور ہو گیا۔ سمجھنے لگا کہ اب میرا کیا ہو سکتا ہے۔ ہلاکت کے مقام سے تو نکل ہی آیا۔ خدا کے پنجہ سے چھوٹ ہی گیا۔ اب میرا رشتہ اس سے کٹ ہی گیا۔ یہ آباد شہر یہ پُر رونق بستیاں یہ خار اسیاہ رنگ یہ چین زار اور یہ مرغزار یہ ملک ہے جو مجھے برباد کر سکتا ہے۔ اس وقت تو ضرورت پڑی تھی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا تھا مجبوراً خدا کی طرف دوڑا تھا۔ اب کیوں عزیزوں کی دشمنی دوستوں کی عداوت اور طاقت وروں کا غضب مول لوں ناحق کیوں کسی سے بگاڑوں، تمام برادری اور عزیز داری کے خلاف اگر خدا کا نام لوں گا تو سب لوگ میرے دشمن ہو جائیں گے مال جائیداد کو لوٹ لیں گے۔ جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ میں کس کے سامنے روتا پھروں گا۔ اس کم بخت کو نہیں معلوم کہ جان و مال کی حفاظت تو خدا کرتا ہے۔ ایک ہی ملک اور ایک ہی دیس ہوتا ہے ایک ہی شہر اور ایک ہی آبادی ہوتی ہے۔ لیکن آبادی کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے کوئی غارتگر کوئی لٹیرا کوئی سفاک ظالم اس کی طرف نظر بد سے دیکھ بھی نہیں سکتا اور اسی کے برابر رہنے والے لوٹے جاتے ہیں ان کا تختہ تاراج کیا جاتا ہے بلکہ بعض آبادیاں تو ایسی ہیں کہ ان میں ہمیشہ سے عافیت اور امن معدوم رہی ہے مگر انہی کا کچھ حصہ بغیر کسی مادی قوت اور حفاظتی طاقت کے ہمیشہ امن محفوظ و معصوم بلکہ امن گاہ اور عافیت پناہ رہا ہے۔ دوسری آبادیوں کے رہنے والے بھی اگر بھاگ کر وہاں پہنچ گئے تو ہر خطرہ سے بچ گئے باوجودیکہ وہاں نہ کوئی برج کھڑا ہے، نہ محافظ، نہ شاہی اقتدار ہے نہ کوئی قلعہ نہ پولیس نہ فوج۔ اگر اس سرکش بے وقوف انسان میں عقل و دانش اور فہم و فراست کا کچھ حصہ بھی ہوتا اور آنکھوں میں بصارت کا کچھ نور بھی ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ سارا ملک عرب قدیم زمانہ میں قتل و خونریزی اور سفاکی اور غارتگری کا گہوارہ رہا ہے۔ کسی کی جان اور کسی کا مال، کسی کی آبرو اور کسی کی عیال وہاں محفوظ اور بے خطر نہیں رہی، لیکن اسی دیس میں ایک بستی ایسی بھی ہے جس کو حرم کہا جاتا ہے۔ وہاں نہ کسی بادشاہ کی محافظ فوج تھی، نہ پولیس نہ پہرہ دینے والے سپاہی، نہ اقتدار نہ وقار لیکن اس کے باوجود کسی لٹیرے ظالم اور سفاک غارتگر کی ہمت نہ تھی کہ حرم میں داخل ہو جاتا یا وہاں رہنے والے انسان کو آزار پہنچا سکتا۔ یا وہاں کے جانوروں کو ستا سکتا یا شکار کر سکتا۔ آخر یہ غیبی حفاظت کرنے والا کون ہے، حرم کو امن گاہ اور عافیت پناہ بنانا کس کا کام ہے۔ اگر اس میں بصیرت کا کوئی ذرہ ہوتا تو سمجھ لیتا کہ کوئی دشمن کسی کو ستا نہیں سکتا، کوئی غالب اور قوی کسی مغلوب اور کمزور کو اپنی چیرہ دستی کا شکار نہیں بنا سکتا تا وقتیکہ خدا نہ چاہے جس کی حفاظت خدا کرتا ہے اس کا بگاڑ کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ خشکی میں نہ تری میں نہ آبادیوں میں نہ ویرانوں میں نہ میدانوں میں نہ دریاؤں میں، لیکن کج فہم بدانديش ان بدیہی حقائق کے باوجود نہیں سمجھتے۔ اضطرار کی حالت میں تو خدا کو پکارتے ہیں مگر جب ہوش حواس ٹھکانے سے ہوتے ہیں۔ پیٹ میں روٹی اور بدن پر بوٹی ہوتی ہے تو کہنے لگتے ہیں۔ ابی حضرت خدا کو کہاں ڈھونڈیں تمام دوست احباب اقارب اعزا تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے تغلب اور چیرہ دستی کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی ساری طاقت اور قوت ہماری نظروں کے سامنے ہے خدا کو کہاں تلاش کریں۔ غیر مرئی اور غیر محسوس کو کیسے دیکھیں۔ بن دیکھے ان سُنے اور خارج از فہم خدا تک رسائی کس طرح ہو۔ حقیقتہً یہ ان بدکیش جاہل پرستاروں کی حیلہ تراشی اور بہانہ سازی ہوتی ہے۔ خواہشات کو چھوڑنا اور مرغوبات نفس سے منہ موڑنا نہیں چاہتے اور خدا کی تلاش ان کو مقصود ہی نہیں ہوتی اگر ان کو خدا کی جستجو ہوتی اور بارگاہ و الوہیت تک پہنچنا فرض ہوتا تو سب سے پہلے تدریجی طور پر اپنے اعمال اور افعال کو درست کرتے، سرتابی چھوڑ کر عبدیت کی طرف آتے نوامیس نفسانیت اور وظائفِ عبدیت کو ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ رفتہ رفتہ خدا ان کو اپنے راستے بتا دیتا یہ منزل بمنزل ترقی کرتے چلے جاتے بالآخر مرتبہ احسان میں پہنچ جاتے اور پھر آگے بڑھتے رضا تسلیم میں پہنچ کر فنا فی الارادہ اور پھر فنا فی الذات تک رسائی ہو جاتی علم الیقین سے عین الیقین پر پہنچتے اور عین الیقین سے حق الیقین کی چاشنی چکھ لیتے۔ کیونکہ نیکوکاروں کو خدا کے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی خدا تو خود ان کے ساتھ رہتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ۔ اس آیت کا تعلق گزشتہ آیات سے ہے۔ گزشتہ آیات میں مرضی مولیٰ کے حصول کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کا حکم دیا تھا لیکن خدا سے پھیر لے والی اور راہ مولیٰ سے موڑنے والی اگر کوئی چیز ہے تو یہی پر فریب دنیا، اسی کا عیش و نشاط اسی کا جاہ و جلال اگر اعترافِ حق اور عملِ صداقت سے کوئی شے روکنے والی ہے تو اسی ذلیل حقیر دنیا کے زوال کا اندیشہ۔ پس اس آیت میں رب کریم نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی فرمائی ہے اور آخرت کی لازوال نعمت کی طرف رغبت دلائی ہے۔

آیت مذکورہ میں چند لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ حیاۃ دنیا لہو لعب ہم ذیل میں اس کی قدر تنقیح کرتے ہیں۔

حیوٰۃ درحقیقت وہ قوت ہے جس کی وجہ سے صاحبِ حیات مختلف اعمال و افعال پر قدرت رکھتا ہے اور اس سے ارادی یا غیر ارادی حرکات سرزد ہوتی ہیں یوں تو حیات اہلِ تحقیق کے نزدیک ہر چیز میں ہے۔ عالم کا ذرہ ذرہ صاحبِ حیات ہے۔ لیکن انسانی حیات اپنے اندر گونا گوں اچھوتی غیر مشترک کیفیات رکھتی ہے عناصر اربعہ کے کسر انکسار اور امتزاج سے ایک خاص کیفیت یا قوت پیدا ہوتی ہے جو پتھروں میں سبزہ میں اور دوسرے حیوانوں میں نہیں ہوتی۔ ادہ مشترک ضرور... ہے صورت

جسمانیہ بھی ایک ہے لیکن نوعی صورتیں جدا جدا ہیں۔ جمادات کی علیحدہ، نباتات کی علیحدہ، ہر نوع کے حیوان کی علیحدہ اور انسان کی علیحدہ۔ حیات درحقیقت ایک انفعالی اضطراری کیفیت ہے جو فاعلہ قوتوں کے فعل و تاثیر اور منفعلہ قوتوں کے تاثر کا نتیجہ ہے یا یوں کہو کہ قوتوں کے باہمی کسر و انکسار کے بعد ایک اور قوت فائض ہوتی ہے اس کو حیات کہتے ہیں۔ بہرحال اس لفظ سے خود زوال فنا اور تغیر کا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ گویا جب انسان حیوان نبات یا کسی اور چیز پر حیات کا اطلاق ہوتا ہے تو خود واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لازوال اور باقی رہنے والی ہستی نہیں زوال پذیر اور فانی ہے۔ تغیر کے دور سے گزر رہی ہے۔ تبدل اور بگاڑ وغیرہ ہر وقت اس پر آتا رہتا ہے یا آئے گا لیکن تغیر اور فنا کا بھی ایک درجہ اور ایک مرتبہ نہیں۔ ملائکہ آسمان عرش کرسی اور دیگر علوی کائنات بھی فانی ہے مگر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ملائکہ میں نہ نمو ہوتا ہے، نہ ذبول، نہ بڑھاؤ نہ گھٹاؤ ان کی اب تک ایک صورت ہے اور آغاز آفرینش سے تا قیامت ایک صورت پر رہیں گے۔ اسی طرح عرش کرسی، لوح و قلم، آسمان اور ستارے سب ہی فنا پذیر ہیں لیکن ابھی تک بدستور حالت سابقہ پر باقی ہیں۔ حرکت و سیر سے ان میں گھٹاؤ بڑھاؤ یا لاغری اور فربہی نہیں پیدا ہوتی، وہ غذا کے محتاج نہیں۔ ان کے اصلی اجزاء تحلیل نہیں ہوتے۔ ان کی صورتوں میں روزانہ ایسا فرق نہیں ہوتا جیسا عنصری عالم میں ہوتا رہتا ہے تاہم ایک دن فنا ان کے لئے بھی ہے ان کو بھی ایک حالت پر قرار نہیں ہے حرکت سے وہ بھی خالی نہیں۔ ایک مقررہ وقت پر وہ بھی سب کے سب معدوم ہو جائیں گے لیکن ان کے فنا کا وقت اتنا قریب نہیں جتنا عنصری کائنات کے فنا کا وقت قریب ہے۔ یہ تو ہر ساعت بلکہ ہر پل فنا اور پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس کے تمام لوازم اور خصوصیات ہر آن موت کے آغوش میں ہیں۔ یہی سفلی اور علوی حیاتوں کے تغیر کا فرق ہے اگرچہ حیات کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔

لفظ دنیا کا لغوی ترجمہ نزدیک یا قریب ہے یعنی فنا کے قریب اور زوال کے نزدیک پس حیات دنیا کا ترجمہ ہوا ایسی زندگانی جو قریب زوال اور مورد فنا اور آغوش موت ہو یہ قریب الزوال زندگی کس کی ہے۔ اسی زیریں عالم کی جس میں جمادی نباتی حیوانی اور انسانی دوائر داخل ہیں ہر دائرہ اپنے محور پر بجائے خود حرکت کر رہا ہے لیکن چاروں کے چاروں اس سفلی احاطہ کے اندر داخل ہیں جو ہر وقت فنا سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ پس حیوۃ دنیا سے مراد ہوئی عالم سفلی کی زندگی حیات کے بعد لفظ دنیا لانا خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد ایسی زندگانی ہے جس میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور ہر آن ان پر موت طاری ہوتی رہتی ہے۔

لہو کے معنی ہیں دل کا بہلاوا حق کی طرف سے غافل کرنے والا اور اپنی طرف مائل کرنے والا۔ اور لعب کے معنی ہیں دل لگی کھیل اور ایسا فعل جس کا نتیجہ باطل ہو حاصل مطلب یہ ہے کہ عالم سفلی کی ہر چیز خواہ جمادی ہو یا نباتی ہو یا حیوانی یا انسانی ہیرے پکھراج نیلم یاقوت سونا چاندی طرح طرح کی معدنی چیزیں فلک بوس کوٹھیاں، اونچے اونچے تکیے سنگی اور آہنی محل بلند بالا درخت حسین صورت اور دلکش خوشبو رکھنے والے پھول لذت آفریں کیف آگیں پھل زندگی پیدا کرنے والی جڑی بوٹیاں، قسم قسم کے خوبصورت اور منافع رساں پرندے کام میں آنے والے چرندے اور شکاری درندے، غرض زمین کی پیداوار اور اس کی تمام رونق کائنات عنصری اور اس کی تمام زینت نرم گرم یا سفید سیاہ بھڑکیلے لباس محل جاہ و جلال، مال و منال، دولت و اقبال، شہرت و شان، آن بان جو کچھ ہے سب دل کو بہلانے والا، کام سے غافل بنانے والا اور انسانی طبیعت کو اپنی طرف مائل کرنے والا ہے لیکن بے حقیقت ہے، بے مقصد ہے، ہر وقت مورد فنا اور شکار موت ہے، ہر آن تغیر پذیر ہے۔ اس کی وقعت کھیل کود کی چیزوں سے زیادہ نہیں جس طرح بچے کھیلنے کود کر دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور کھیل میں مشغول ہو کر سارے عالم کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اسی طرح طالبان دنیا اس دنیا میں غرق ہو کر انجام و عاقبت کی طرف سے غافل بن جاتے ہیں اور جس طرح بچوں کا کھلونا اور کھیل بے مقدار چیز ہے۔ اسی طرح دنیا اور آرائش دنیا کے اسباب ہیچ ہیں۔ اگر وقتی تفریح کے لئے ان کو کھلونوں کی طرح استعمال کیا جائے تو خیر ورنہ ان میں غرق ہو جانا تباہی انگیز ہے۔ پس دنیوی زندگی پر جو شخص مطمئن ہو کر بیٹھ رہا اور اس کی لذتوں میں منہمک ہو کر غافل پڑا رہا اس نے بے فائدہ افعال و اعمال میں اپنی عمر عزیز برباد کی کیونکہ بدن کو پالا، روح کو تباہ کیا۔ روح باقی رہنے والی چیز تھی۔ بدن سڑ گل کر سیاہ خاک ہو جائے گا اور اس کو آسائش پہنچانے میں جو کچھ مشقت اٹھائی تھی وہ خاک میں مل جائے گی۔ درحقیقت ضرورت تو ایسی تربیت جسمانی اور آسائش بدنی کی تھی جو روح کو زندگانی کا پرخار دشوار گزار سفر آسانی سے طے کرا دے۔ اگر جب اصل مقصد کو چھوڑ کر سفر کی درمیانی منازل میں ہی مستقل قیام کر لیا اور ہر خونخوار درندہ کا لقمہ بنانے کے لئے اپنے کو تیار کر لیا تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ درمیانی منازل میں نزول تو صرف تعب دور کرنے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ ہمیشہ کی سکونت کے ارادے سے وہ مستقل مسکن نہیں ہوتے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ مستقل مسکن اصلی قیام گاہ تو دار آخرت ہے جو غیر فانی اور ناقابل زوال ہے۔

لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا۔ کیا معلوم ہوتا اس کی کوئی صراحت نہیں فرمائی۔ سیاق مقتضی ہے کہ دنیا اور آخرت کے فرق کو ہی نامعلوم قرار دیا جائے یعنی ان لوگوں کو دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کا دوام معلوم نہیں۔ دنیا کے تغیرات دیکھتے ہیں مگر یقین نہیں آتا۔ دوسروں کو مرتے دیکھتے ہیں مگر اپنے مرنے کی طرف سے غافل رہیں اور آخرت

کی طرف سے تو ان کی آنکھوں پر بالکل ہی پردہ پڑا ہوا ہے۔ کہنے کو بعض لوگ آخرت کے قائل ہیں، اگر معاملات اور اعمال زندگی میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا ان کو آخرت پر یقین ہی نہیں ہے اور دنیا کی زندگی کو فانی جانتے اور زوال پذیر مانتے ہیں مگر عملاً اس کے اندر ایسے منہمک ہیں اور اس سے ایسی محبت رکھتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد یہی ہے۔ اُن کو دنیا اور آخرت کے زوال و بقا کا جو فرق ہے معلوم ہی نہیں۔ نہ دنیا کے زوال پر یقین ہے، نہ آخرت کے کمال پر۔ کاش اُن کو یہ فرق معلوم ہوتا۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ الخ۔ ان آیات میں انسان کی جہالت اور بے بصیرتی اور کفرانِ نعمت کی تصویر حق تعالیٰ نے کھینچی ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ بعض لوگ دریائی سفر میں جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں اور جہاز تباہی کے بھنور میں پھنس جاتا ہے اور نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس وقت تمام فرضی دیوتاؤں اور موہومی خداؤں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ کی طرف بخلوصِ قلب متوجہ ہو کر پکارتے ہیں کہ الٰہی ہم کو اس گرداب بلا سے رہائی عطا فرما۔ لیکن جب یہ معبودِ عالم جہاز کو کنارے لگا دیتا ہے اور نجات مل جاتی ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں یعنی درمیانی وسائل اور فرضی دیوتاؤں کی کڑیاں پھر جوڑنے لگ جاتے ہیں۔ اگرچہ عقیدۂ خدا کو ایسی حالت میں بھی مانتے ہیں۔ لیکن دروغ بیانی کرنے اور مغالطۂ وسائل کو ڈھونڈنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کا انکار کریں اور مزے اڑاتے رہیں۔ غرض یہ کہ چاروں طرف سے مایوسی کے وقت تو بے اختیار خدا کو پکارتے ہیں اور جب صحیح ہوش و اختیار کے حدود کے اندر پہنچتے ہیں تو اللہ کو بھول جاتے ہیں اور دوسروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، یا اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی ملا دیتے ہیں جس کا اصلی نتیجہ کفرانِ نعمت اور تمتع پذیری ہوتی ہے۔ گویا عملاً خدا کی کارسازی اور قاضی الحاجات ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ پس ان کو عنقریب مرنے کے بعد اس ناشکری اور کفرانِ نعمت کا انجام بد معلوم ہو جائے گا اور ظاہر ہو جائے گا کہ جس کو اللہ کا ساجھی قرار دیتے تھے وہ کچھ بھی طاقت نہیں رکھتا۔ محمد بن اسحاق نے مغازی میں حضرت عکرمہ بن ابوجہل کی روایت نقل کی ہے۔ عکرمہ نے بیان کیا کہ جب حضور اقدس نے مکہ فتح کیا تو میں بھاگ کر جہاز میں سوار ہو کر ملک حبش کی طرف چل دیا۔ جہاز کچھ دور ہی چلا تھا کہ سمندر میں تلاطم برپا ہو گیا۔ کپتان نے پکار کر کہا۔ لوگو! جہاز ڈوبتا نظر آتا ہے پس سب لوگ خلوص کے ساتھ محض اللہ سے دعا کریں کہ یہاں سے وہی نجات دلانے والا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر سمندر میں اللہ کے سوا کوئی نجات دینے والا نہیں ہے تو والله خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہو سکتا۔ الٰہی میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر میں اس تلاطم سے پار ہو گیا تو ضرور جا کر (تیرے رسول) محمدؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا (ان کی بیعت کر لوں گا) آخر یہی ہوا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا الخ۔ بعض کافروں نے حضور والا کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہم کو مسلمان ہونے سے اور کوئی مانع نہیں صرف یہ اندیشہ ہے کہ ہمارے بھائی بند کفارِ عرب کثیر ہیں اور مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہم کو اچک لیا جائے گا۔ اس قول کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت کعبہ کی عمارت بنائی اسی وقت سے سرزمینِ حرم کو باعزت قرار دیا تھا۔ وہاں کی گری پڑی کانٹے صاف کرنے، سبزہ اور گھاس تراشنا ممنوع تھا۔ کسی جانور کو شکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حدودِ حرم کے اندر ہر قسم کے فجور اور قتل و غارت کی ممانعت تھی، اگر کوئی شخص اس قیمتی قانون کی مخالفت کرتا تو فوراً اسی زندگی میں عبرتناک سزا پاتا تھا۔ اصحابِ فیل کا واقعہ تو دنیا کی تاریخ میں مشہور ہی ہے۔ ابرہہ اور اس کے ساتھیوں کی بربادی سے اہلِ روایت واقف ہیں۔ سارا ملکِ عرب جہاں قتل و سفاکی قابلِ فخر اور غارتگری معزز ترین پیشہ تھی، جہاں قبائل کی باہم یورشیں اور ادنیٰ بات پر نصف صدی تک خون کا سلسلہ پیہم جاری رکھنا معتاد شجاعت سمجھی جاتی تھی۔ جہاں کا کوئی راستہ اور کوئی قافلہ اور کوئی مسافر محفوظ نہ تھا۔ جہاں دوسروں کا مال آبرو اور جانیں مباح شیر مادر سمجھ کر تلف کی جاتی تھیں۔ اسی جزیرہ میں ایک بستی ایسی امن گاہ اور عافیت پناہ بھی تھی جہاں کسی کی ہمت نہ تھی کہ ناجائز قتل و غارتگری تو درکنار اپنے باپ کے واقعی قاتل سے حدود کے اندر قصاص لے لے یا اس کو گرفتار ہی کر سکے۔ یہ بلدہ حرام اور مقامِ امن مکہ مکرمہ تھا۔ قریش اسی حرم محترم کے باشندے تھے۔ اسی لئے ہر امن سوز حرکت اور صلح و عافیت کو تباہ کرنے والی یورشوں سے محفوظ تھے۔ کس قدر عجیب اور حیرت آفریں ہے یہ بات کہ بغیر کسی فوج پولیس اور محافظ دستہ کے بغیر کسی امیر اور بادشاہ کے اقتدار و وقار کے اور بغیر کسی مادی قوت کی حفاظت کے حرم پاک کی سرزمین کے اندر کسی کو مجرمانہ حرکت کرنے کی مجال نہیں تھی۔ باوجودیکہ آس پاس کی بستیاں اور ویران صحرا اور آبادیاں، راستے اور بازار سب ہی خطرناک تھے اور کیسے میدانِ سفاکی بنے رہتے تھے۔ کفارِ مکہ کو خصوصاً اور کفارِ عالم کو عموماً تنبیہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ دیکھو حرم کیسا امن گاہ ہے باوجودیکہ کوئی محافظ نہیں ہے مگر ہم نے اس کو مقامِ امن قرار دیا ہے باوجودیکہ پرندوں کی طرح آس پاس کے مقاموں سے لوگ اچک لئے جاتے ہیں۔ اور عموماً قتل و غارت کی گرم بازاری ہے پس کیا اتنا عظیم الشان کھلا ہوا احسانِ خداوندی نہیں مانتے اور اسی محسوس پرستی پر شیدا اور مادی قوتوں پر فریفتہ رہ گئے جو سراسر بے حقیقت اور باطل ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا الخ۔ اللہ کا شریک قرار دینا خواہ ذات میں ہو یا صفات میں بدترین ناشائستہ عمل اور بیہودہ حرکت ہے جب رسول اللہ برحق اور آپ کی لائی ہوئی کتاب برحق اور ان کی ہر ہدایت برحق ہے۔ خصوصاً پیامِ توحید اور اللہ کی الوہیت و ربوبیت کی وحدت کا اعلان سراسر حق ہے تو ایسی صورت میں پیامِ

مرہم خوشامد کے جال میں پھنس کر ان تمام صداقتوں حقانیتوں کو نہ ماننا اور باطل کی طرف جھکنا کتنی عظیم الشان نازیبا حرکت ہے۔ انسان کسی فرضی خطرہ کی وجہ سے اپنی ذات کو ہمیشہ کے لئے برباد کرنے کتنا بڑا ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کا مرکز ماویٰ اور قیام گاہ جہنم ہے

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا۔ اس آیت میں جہاد فی اللہ سے کونسا جہاد مراد ہے اور ہدایت سبیل سے کیا۔ اس کی تفصیل بہت ہی طویل ہے۔ ہم ذیل میں چند اقوال نقل کرتے ہیں جن کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ احمد بن ابوالحواری نے ابو احمد عباس ہمدانی کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاد سے مراد ہے علم سنت کے موافق عمل کرنا اور اللہ کے راستوں سے مراد ہیں معارف کی راہیں مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اتباع سنت کرتے ہیں اور شریعت پر چلتے ہیں۔ اللہ ان کو اپنی راہیں خود دکھا دیتا ہے یعنی ان کی روحانی بصیرت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور وہ معرفت حاصل ہوتی ہے جس کا علم ان کو پہلے سے نہیں ہوتا۔ ابوسلیمان دارانی نے اسی مطلب کی تائید میں فرمایا کہ اگر کسی کو کسی کار خیر کا الہام ہو اور کوئی اچھی بات دل میں آئے۔ احادیث و آثار میں کہیں اور اس بات کا جواز مل جائے تو اس پر عمل کرے اور اپنے قلب کی موافقت پر اللہ کی حمد و ثنا کرے (رواہ ابن ابی حاتم ونقلہ ابن کثیر)

حسن بصری نے فرمایا جہاد سے مراد ہے خواہش نفس کی مخالفت یعنی اس خواہش کی مخالفت جو خلاف شرع ہو فضیل ابن عیاض نے فرمایا جنہوں نے علم حاصل کرنے میں جہاد کیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ عمل کی راہ خود دکھاتا ہے۔ سہل ابن عبداللہ تستری نے فرمایا جنہوں نے سنت قائم کرنے میں کوشش کی اللہ اس کو جنت کی ہدایت فرماتا ہے۔ اس قول میں جہاد سے مراد ہوئی اقامت سنت کی کوشش اور سبیل اللہ سے مراد ہوئی راہ جنت۔ ابن عباس کا ایک قول منقول ہے کہ جنہوں نے طاعت الٰہی میں کوشش کی ان کو اللہ ثواب کا راستہ دکھاتا ہے۔ شیخ جنید نے فرمایا جنہوں نے صدق نیت کے ساتھ طاعت میں کوشش کی اللہ ان کو راہ اخلاص دکھاتا ہے۔ شیخ ابن عطا نے فرمایا۔ مجاہدہ یہ ہے کہ پوری رغبت کے ساتھ ہر چیز سے منقطع ہو کر اللہ کا ہو رہے اور اسی کا محتاج بن جائے۔ ایک بزرگ نے مجھ سے کیسا اچھا مطلب بیان کیا کہ جہاد کا فرد دشمن سے لڑائی لڑنے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی بندگی میں نفس سے جہاد کرنا بھی جہاد ہے۔ دین کی نصرت کے لئے کوشش کرنا بھی جہاد ہے۔ اہل ظلم و ستم کے رد کرنے کا نام بھی جہاد ہے۔ نیک کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے باز داشت کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ میرے نزدیک بہترین مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اعلاء شریعت تبلیغ احکام الٰہی اقامت سنت ہدایت اوامر و مخالفت از مناہی کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کے واسطے ہر عمل کرنے کے لئے اپنے تن من دھن کی قربانی کرتے ہیں اور ان تمام کاموں کی تکمیل میں ان کی نفسانی خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا تو ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ اپنے پاس آنے اور معرفت پانے کے راستے بتا دیتا ہے۔ صدق نیت اور اخلاص عمل شرط ہے۔ مراتب کی ترقی اور مدارج پر چڑھانا خدا کا کام ہے۔ اہل عرفان نے معرفت کے مختلف مراتب قائم کئے ہیں جن کے اصطلاحی نام بھی رکھے ہیں اور ان کے حصول کے لئے جن علوم و اعمال کی ضرورت پڑتی ہے ان کی تفصیل بھی کی ہے۔ حال کو قال میں لانا اور وجدانی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے لیکن منازل کی علامت کا کسی قدر پتہ چل جاتا ہے۔ اہل معرفت اور حاملان شریعت کی ہدایت ہے کہ سب سے پہلے آدمی کو شرک فی الذات اور شرک فی الصفات سے پرہیز کرنا چاہئے یعنی ذات میں تعدد نہ مانا جائے۔ نہ اس کے اجزاء مانے جائیں۔ نہ اس کا حلول کسی مخلوق میں تسلیم کیا جائے اور اس امر کا عقیدہ رکھا جائے کہ کوئی مخلوق مظہر الوہیت نہیں ہو سکتی نہ اللہ کے سوا کوئی رب ہے، نہ خالق، نہ رازق نہ قاضی الحاجات نہ مجیب الدعاء نہ دافع البلاء، جو کچھ ہے اس کا ہے وہی سب کچھ کرتا ہے۔ اسی کا حکم نافذ ہے اسی کی قدرت عالم میں جاری ساری ہے۔ اس کے علمی احاطہ سے کوئی چیز خارج نہیں۔ وہ بے نیاز ہے کارساز ہے الخ۔

اس کے بعد ان کاموں سے اجتناب کرے جن سے بچنے کی خدا نے ہدایت فرمائی ہے اور جن کے پاس جانا بھی حرام قرار دیا ہے۔ پھر فرائض کی ادائیگی کا التزام کرے اور وظائف کی پابندی کے بعد مشتبہات اور مشکوکات سے بھی پرہیز اختیار کرے کیونکہ ارتکاب شبہات سے حرام میں پڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے بعد خواہش نفس سے بالکل منہ موڑ لے یہاں تک کہ پھر ذاتی محبت کسی سے نہ کرے بیمہ بن جائے۔ اپنے ارادہ کو ارادۂ الٰہیہ میں فنا کر دے۔ اس کی نشست و برخاست، گفتار و رفتار اور کردار، خواب اور بیداری یہاں تک کہ موت اور زندگی محض خدا کے لئے ہو۔ ایسے درجے پر پہنچ کر انسان گویا مرنے سے پہلے مر جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی اپنی خواہش نہیں رہتی۔ اگر کھاتا ہے تو خدا کے لئے، پیتا ہے تو خدا کے لئے، قربت عشقی کرتا ہے تو خدا کے لئے، ہر لذت سے الگ ہوتا ہے خدا کے لئے، رنج اٹھاتا ہے خدا کے لئے، دوستی کرتا ہے اور دشمنی کرتا ہے تو خدا کے لئے۔ نہ اللہ کے سوا اس کی کسی سے ذاتی دوستی ہوتی ہے نہ دشمنی، نہ کوئی جذبہ نہ مطالبۂ نفس، نہ ملامت ہوتی، اس وقت اس کے ہاتھ کی حرکت اللہ کے ہاتھ کی حرکت اور اس کا عمل اللہ کا عمل ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی زبان بن جاتا ہے، اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ فناء بشریت کا آخری درجہ یہی ہوتا ہے۔ یہی تمام درجات جہاد کے درجات ہیں۔ یہی سارے کے سارے اللہ کے راستے ہیں۔ مگر ایک درجہ پر انسان قدم رکھتا ہے تو دوسرا درجہ خود اس کے سامنے آ جاتا ہے اور جب دوسرے پر چڑھتا ہے تو تیسرا درجہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ بالآخر تمام منازل ترقی اور مدارج صعود طے کر کے معرفت کی آخری سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ تو عملی ترقی ہوتی ہے علمی ترقی اس کے علاوہ ہوتی ہے۔ براہین فطرت کا مطالعہ کرنے کی

ہادی برحق کا ہدایت پر کلام سننے سے اللہ کی الوہیت اور دیگر صفات کا علم ہوتا ہے یا شریعت غرا کے اصول و ضوابط اور قوانین مدلل معلوم ہوتے ہیں تو یہ علم چونکہ صرف علمی حد تک رہتا ہے اس لئے ایسے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے لیکن علم الیقین کے بعد کشف اور معائنہ کا نمبر آتا ہے۔ جب علم الیقین میں پختگی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر احکام الٰہیہ کی حقانیت اور اللہ کی ذاتی اور صفاتی وحدت اس کو چشم سر سے دیکھنے لگتی ہے اس کو پتہ پتہ اور ذرہ ذرہ میں اسی کی کارفرمائی اور بے ہمتائی نظر آتی ہے ہر آواز میں خدائی آواز سنائی دیتی ہے ہر صورت میں خدائی جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اس حالت میں پہنچ کر اس کو تاریکی میں بھی نور دکھائی دیتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کو حسین ہی معلوم ہوتا ہے حسن فطرت اس کی نگاہوں میں چھلکنے لگتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت چیز اس کو حسین محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کو اس کے اندر فطرت الٰہیہ نظر آتی ہے جو ہر قبح اور بدصورتی سے پاک ہے۔ یہ درجہ عین الیقین کا ہوتا ہے لیکن یہاں پہنچ کر اس کو ایک اور اونچا زینہ دکھنے لگتا ہے۔ وہ صرف روحانی وجدان ہوتا ہے، لذت و ذوق ہوتا ہے یعنی جلوے اس کی روح کے ذرہ ذرہ کو جگمگا دیتے ہیں اور اس کو اپنے ہر چہار سو سے نور برستا نظر آنے لگتا ہے اس درجہ میں پہنچ کر بعض وقت تو وہ ایسا بے خود اور بے ہوش ہو جاتا ہے کہ خودی اور خدائی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ عبدیت و معبودیت باوجود جدا جدا ہونے کے اس قدر جذب ہو جاتی ہے کہ اس کو عبدیت کی ہستی معبودیت میں فنا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ بس یہ آخری درجہ ہے جہاں تک انسانی طاقت کی پرواز ہو سکتی ہے اور اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے کسی ثقہ معتبر آدمی نے اگر کہیں چشمہ ہونے کی اطلاع دی اور یقین آگیا تو یہ علم الیقین ہوا۔ اگر خود وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو عین الیقین ہوا پھر خود چشمہ پر داخل ہو کر پیٹ بھر کر پانی پی لیا تو حق الیقین ہوا لیکن یہ تمام الفاظ اور سلسلہ تعبیر محض اعتباری اور اصطلاحی ہیں ورنہ وجدانی کیفیت کو کن لفظوں میں بیان کر سکتا ہے اور کون ان گنت نامحدود درجات کی حد بندی کر کے چند لفظوں میں ان کا احاطہ کر سکتا ہے۔

پس حاصل و خلاصہ یہ نکلا کہ جو لوگ راہ مولا پر چلتے اور اس کی بارگاہ تک پہنچنے کے لئے عملی اقدام کرتے ہیں اللہ ان کو خود اپنے راستے بتا دیتا ہے اور ایک راہ ختم ہونے کے بعد دوسری راہ دکھاتا ہے پس اے وہ لوگو جو اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہوئے ڈرتے ہو اور کافروں کی چیرہ دستیوں کا اندیشہ رکھتے ہو تم راہ مولا میں آجاؤ، دائرہ اسلام میں داخل تو ہو جاؤ پھر مولا خود تمہاری مدد کرے گا، خود اپنی طرف کھینچتا چلا جائے گا۔

مقصود بیان حیاتِ انسانی اور اس کی پرفریب آرائشوں کی تصویر کشی اور اس امر کی طرف ایماء کہ دنیا ایک کھلونا ہے جو اس کو کھلونا سمجھ کر وقتی تفریح کا سامان سمجھتا ہے وہ راز دار فطرت ہوتا ہے اور جو اس کو مستقل قیام گاہ اور پائیدار مقصود زندگی قرار دیتا ہے وہ دھوکا پاتا ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ سے دنیا کی حقیقت حاصل کرنے اور چشم بصیرت کھولنے کی ترغیب۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ سے انسان کی محسن کشی اور فراموشی کا اظہار مقصود ہے کہ حامی و ناصر اور قاضی الحاجات تو خدا ہے مگر انسان جب مصیبت کے پنجے سے چھوٹ جاتا ہے تو اس کو بھول جاتا ہے اور دوسروں کے سامنے دست طلب پھیلاتا ہے۔ لِيَكْفُرُوْا اور لِيَتَمَتَّعُوْا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اگرچہ بالارادہ وہ شرک نہیں کرتے مگر ان کے افعال سے شرک پیدا ہوتا اور کفرانِ نعمت کا اظہار ہوتا ہے اور دنیوی تمتع اور ذوق کے مقصود ذاتی ہونے کا پتہ چلتا ہے پس عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کمزور خیال رکھنے والے جاہلوں اور ان تبلیغ بدعت کرنے والے عالموں کو جو اللہ کو چھوڑ کر مٹی کے ڈھیروں، جھوٹے پیروں اور مداریوں کو اپنا قاضی الحاجات جانتے اور ان کے سامنے سجدہ ریزیاں کرتے ہیں یا کم از کم ایسے افعال کا ارتکاب کرتے ہیں جن سے ان کی شرک آفرینی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور شرک کی مشابہت پیدا ہوتی ہے خواہ ان کا ارادہ شرک کا نہ ہو۔ ایک امر یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جس قدر حیات دنیا اور اس کے عیش کی طرف رغبت ہوتی ہے اسی قدر عقل مفقود اور جہالت کا غلبہ ہوتا ہے اور جس قدر دنیا سے دل برداشتگی اور خیال موت سے قرب ہوتا ہے اسی قدر نور عقل ظاہر ہوتا ہے۔ غور کرو کہ کشتی میں سوار ہونے والے کو جب غرق ہونے کا اندیشہ اور موت کا خوف ہوتا ہے تو تمام باطل خیالات زائل ہو کر اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور جب کنارے پہنچ کر پھر فراغت حال اور راحت حاصل ہوتی ہے اور حیات دنیوی کا اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر وہی باطل پرستی اور کفر پردازی لوٹ آتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا سے کافروں کو ہدایت طلب کرنے پر اور مسلمانوں کو شریعت کے احکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے اور اہل صلاح کو بشارت ہے کہ نیکی کی کوشش کرنے میں اللہ ان کے ساتھ ہے اور جس بندے کے ساتھ خدا ہو اس کے سب کام آسان ہیں اسی لئے احادیث میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے اور ایک حدیث میں دعائے مقدس اس طرح شروع ہے۔ حضور نے فرمایا تھا الٰہی ہم کو ہمارے نفس کے بھروسہ پر نہ چھوڑ کیونکہ اگر تو ہم کو ہمارے نفس کے اعتبار پر چھوڑ دیگا تو ہمارا نفس ہم کو بدکاری سے قریب اور نیکی سے دور کردے گا الخ۔

سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی اس میں ساٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

ابن عباس اور ابن زبیر کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے۔ قرطبی کی صراحت کے مطابق اس کا مکی ہونا اجماعی ہے بیضاوی نے آیات فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ الخ کو مدنی قرار دیا ہے۔ ممکن ہے قاضی بیضاوی نے مضمون کی مناسبت سے ان آیات کو مدنی کہا ہو لیکن اہل تفسیر کے نزدیک کی مدنی ہونے کا یہ معیار نہیں اگر نقل صحیح وارد نہ ہو تو صرف مضامین کے لحاظ سے مدنی کی کی تخصیص غلط ہے۔ اس سورۃ میں ۵۹ یا ۶۰ آیات ہیں بقول خطیب ۸۱۹ کلمات اور ۳۵۳۴ حروف ہیں۔
صبح کی نماز میں حضورؐ نے سورۂ روم پڑھی تھی (رواہ احمد و عبدالرزاق وحسنہ السیوطی ورواہ البزار)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ

الٓمّٓ نزدیک کی زمین میں رومی مغلوب ہو گئے اور وہ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں عنقریب غالب

سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ

آجائیں گے اللہ ہی کی حکومت ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور اس روز مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کو چاہتا

مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

ہے مدد دیتا ہے وہی غالب و مہربان ہے یہ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے اور اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا مگر اکثر آدمی

لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚۖ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

نہیں جانتے وہ دنیوی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت سے خاص کر بے خبر ہیں

تفسیر کاشتکار زمین پر بیج بوتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد اس میں سے سوتا نکلتا زمین میں جمتا اور موٹا پڑ کر جڑ کہلاتا ہے۔ بالائی سطح پھول کر بیج کی مینگ اپنی صورت بدل کر کونپل کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر بڑھ کر تنے ڈنڈی، شاخ ٹہنی پھول اور پھل کی ہیئت اختیار کرتی ہے اس وقت اس بیج کو درخت کہتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تخم درخت سے جدا چیز ہے۔ پھر یہ درخت کہاں سے آیا۔ جب تخم میں درخت بننے والے اجزا نہیں تو درخت کیسے نمودار ہوا اور اگر تخم کا ہر حصہ درخت کے ہر حصے کوئی مناسبت رکھتا ہے اور تخم درحقیقت نام ہے درخت کے سارے اجزا کا تو پھر اتنا بڑا درخت اتنے ننھے بیج میں کیسے سمایا اور ہزاروں پھول پھل سینکڑوں شاخیں بے شمار پتیاں اور اتنا موٹا تنا ذرا سے بیج میں کس طرح در آیا۔ اہل بصیرت جواب دیتے ہیں کہ نمود اور زائیدگی سے پہلے بیج کے اندر پورا درخت موجود تھا لیکن چھپا ہوا تھا۔ بالقوۃ تھا۔ عظیم الشان درخت وہی تخم ساتھ ہے کوئی جدا چیز نہیں لیکن فرق ہے ظہور و خفا کا، نمود اری اور بطون کا، اجمال و تفصیل کا۔ جو چیز تخم میں پوشیدہ مجمل اور غیر نمایاں تھی وہی چیز درخت میں ظاہر نمودار اور مفصل ہو کر سامنے آگئی۔ حالت اول سے سر مو فرق نہیں ہے۔ پس جو حالت تخم اور درخت کی ہے وہی حالت عالم باطن و ظاہر کی سمجھو۔ اس ظاہر دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے تفصیلی عکس ہے اس عالم غیب کا جس میں ذرہ ذرہ کی تصویر اور پتہ پتہ کا علمی خزانہ موجود ہے۔ دنیا کے ہر گزشتہ موجودہ اور آئندہ واقعہ کا اندراج بے کم و کاست وہاں ہے اندراج کے ساتھ بعینہٖ یہی واقعات موجود ہیں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ اس عالم اور اس عالم میں فرق صرف ظہور بطون اجمالی تفصیلی اور رونمائی و خفا کا ہے۔ وہ عالم غیب کیا چیز ہے۔ کوئی اس کو اللہ کا علم اجمالی کہتا ہے کوئی لوح محفوظ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی مثل (تصاویر) افلاطونیہ کہتا ہے۔ کوئی سید ریاض یعنی دسویں عقل کا خزانہ علمی جانتا ہے۔ کوئی مقدس ملائکہ کے معلومات ظاہر کرتا ہے۔ کچھ بھی کہو الفاظ بہت ہیں مطلب ایک ہے۔ اس عالم کی تخمی حالت کا نام عالم غیب ہے بلکہ تخمی حالت میں تفصیل بالکل نہیں ہوتی

اور وہاں تھوڑے تفصیل ہے لیکن اتنی نہیں جتنی کہ اس عالم ظاہر میں ہے۔ بلکہ سمجھ آپ اس کو عالم قدر کہیں مگر یہ لفظ بھی عالم غیب کی صحیح تصور کشی سے قاصر ہے۔ یوں تو ہر نفس ناطقہ اور ہر روح کا تعلق عالم بالا سے ہے اور کچھ نہ کچھ آئندہ واقعات اور گزشتہ حوادث کی غیبی صورتیں ہر نفس کے آئینہ میں ضرور چھپ جاتی ہیں لیکن وہ کبھی مادی اور جسمانی کثافتوں میں آلودہ ہو جانے کے سبب کدر بھی ہو جاتی ہیں اور خواب میں دیکھی ہوئی یا بتوجہ نفس کے وقت سوچی ہوئی باتیں صحیح یاد نہیں رہتیں لیکن اس انسانی دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا آئینۂ روح بالکل صاف ہوتا ہے جن کا تعلق عالم بالا سے خصوصیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جن کے پاس وہاں سے کبھی براہ راست پیام آتے ہیں، کبھی ان کو خود اس عالم کے سیر کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گروہ مقدس اولیاء اور پاک انبیاء کا ہے جن کو مراقبہ کے وقت کبھی ان غیبی حوادث کی صورتیں دکھائی جاتی ہیں اور ان واقعات کی سیر کرائی جاتی ہے جو اس مقدس دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔ خواہ اُن کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے یا استقبال سے، کبھی اُن کے پاس غیبی دنیا سے پیام آتے ہیں جن کو الہامِ رحمانی اور وحیِ ربانی کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ آئندہ واقعات کے متعلق اپنے کشف الہام اور وحی کے مطابق لوگوں کو قبل از وقت کچھ مناسب اطلاعیں دیتے ہیں جن کو پیشین گوئیاں کہا جاتا ہے۔ آئے ہوئے پیام کے مضامین کو کبھی یہ لوگ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور کبھی انہی الفاظ میں جن میں پیامبر پیام لے کر آیا تھا۔ وحی خفی اور وحی جلی کا یہی فرق ہے۔ احادیثِ پاک میں جو پیشین گوئیاں ہیں ان کو وحی خفی سے تعلق ہے اور قرآن پاک میں جو قبل از وقوع واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ وحی متلو اور پیام جلی کے دائرے کے اندر ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو پیامبر نے بھیجنے والے کی طرف سے آکر سنائے تھے۔ مضامین بھی وحی ہیں اور تعبیر بھی وحی ہے۔ وحی خفی اور جلی میں بیان کی ہوئی پیشین گوئیوں کو سننے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ ہوتا ہے جس کا آئینۂ قلب صاف ہوتا ہے۔ ایمان کی اس پر جلا ہوتی ہے۔ وہ تو سن کر فوراً ہی یقین کر لیتا ہے اور سر مو اس کو شک نہیں ہوتا۔ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو کثیف مادی حواس کی تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے دماغ میں چونکہ بینائی نہیں ہوتی اس لئے سب جگہ اس کو اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ اللہ کے پیامبر ہر چند اعلان کریں اس کی بھیجی ہوئی کتابوں میں آئندہ کے متعلق کچھ بھی صراحت ہو جب تک اس کے مطابق اس عالم ظاہر میں وقوع نہ ہو جائے اس گروہ کو یقین نہیں آتا۔ اول گروہ کے سرتاج امام الاصفیاء سید الصدیقین راس الاتقیاء برہان العلماء حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آیاتِ مندرجہ بالا میں جب اہلِ روم کے آئندہ چند سال میں غالب ہو جانے کی صراحت انہوں نے سنی تو فوراً یقین کر لیا اور دوسرے گروہ کا سردار سید الجہال امام اہل ظلمت ابی ابن خلف تھا جس کو قرآن کی صراحت کا کسی طرح یقین نہ آیا۔ صدیق اکبر گویا اپنی آنکھوں سے قرآن کی صداقت کو دیکھ رہے تھے۔ ابی بن خلف سب کو دماغوں سے زیادہ اپنے دماغ میں تاریکی رکھتا تھا جتنا ان کے دماغ میں نور تھا اتنی ہی اس کے دل میں تاریکی تھی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نظر قرآنی ربہارک پر تھی اور ابی ابن خلف کی نگاہ اہل فارس کی طاقت عظمت فوج کی کثرت شجاعت اور کمال جلادت پر صدیق اکبر مستقبل کے انقلاب کو دیکھ رہے تھے اور ابی بن خلف حال کو دونوں نے آئندہ کے متعلق اپنے اپنے دعوے کی صداقت پر شرط باندھی مالک کے لئے شاہد نور روح تھا۔ دوسرے کا استدلال واقعاتِ حاضرہ سے تھا بالآخر قرآن کی صراحت سچی ہوئی اور چند ہی سال میں روم کو ایران پر فتح حاصل ہوئی۔

تحلیلِ اجزاء

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ الخ۔ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں روم کی سلطنت نصاریٰ کے قبضہ میں تھی جس کا بادشاہ ہرکلیس یعنی ہرقل تھا اور ملک فارس کے حکمران آتش پرست یعنی مجوسی تھے جن کا سردار خسرو پرویز تھا۔ روم دراصل اٹالیہ کو شہر روما کے سبب کہتے ہیں مگر ایشیائے کوچک سے لے کر قسطنطنیہ تک بلکہ اس کے آگے تک بہت سے ملکوں کو عرب روم ہی کہتے تھے اور جو ان ملکوں میں رہتا تھا اس کو بھی روم یا رومی کہتے تھے شاہ فارس نے اپنے دو بہادر سرداروں شہر یار اور فرخان کی زیر قیادت ایک جرار لشکر روانہ کر کے روم پر حملہ کیا۔ یہ لشکر بصرہ کی طرف سے بڑھتا بڑھتا رومیوں کو دباتا شام تک پہنچا اور شام بیت المقدس کو بھی فتح کر لیا یہاں تک کہ ایشیائے کوچک کے تمام علاقے دبا لئے آخر قسطنطنیہ کے محاصرہ تک نوبت پہنچی ہزاراہل روم اس جنگ میں مارے گئے۔ بڑی شکست فاش ہوئی۔ اہل روم سے مسلمانوں کو قدرتی محبت تھی وہ بھی اہل کتاب ہونے کے مدعی تھے اور یہ بھی حامل قرآن تھے۔ ان کا مذہب بھی اصلاً آسمانی تھا اور ان کا بھی آسمانی تھا۔ وہ بھی ایک واقعی پیغمبر کے پیرو تھے اور یہ بھی رسول پاک کے شیدائی۔ انہی مناسبات اور روابط کے سبب مسلمانوں کو عیسائیوں سے قلبی تعلق تھا اور چونکہ اہلِ فارس آتش پرست بلکہ عناصر پرست تھے اور کفارِ مکہ بھی بت پرست اور عجائب پرست اس لئے ان سے ان کو دلی لگاؤ تھا اہلِ روم کی اس شکست پر کافروں کو مسلمانوں پر آوازے کسنے اور طعنہ زنی کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمانوں کو رومیوں کی ہزیمت کا رنج ہوا۔ کفار نے مسلمانوں سے کہا کہ اہلِ فارس کا اہلِ روم پر یہ غلبہ ہمارے لئے فالِ نیک اور تمہارے لئے شگونِ بد ہے جس طرح یہ آتش پرست نصاریٰ اہلِ کتاب پر غالب ہوئے اسی طرح چند دنوں میں ہم بھی تم پر فتح و غلبہ حاصل کریں گے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں کہ اگرچہ اس وقت اہلِ روم کو شکست ہو گئی ہے مگر وہ چند سال میں اہلِ فارس پر غالب ہو جائیں گے اور اس وقت مسلمانوں کو خوشی ہو گی چنانچہ فتح اہلِ فارس کے ساتویں سال دوبارہ جنگ ہوئی اور قیصر روم کو مدائن پر فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت عجیب اتفاق یہ تھا کہ مسلمان جنگ بدر میں فتح پانے کی خوشیاں منا رہے تھے بعض اہلِ روایت نے غلبۂ فارس سے نویں سال روم کی فتح لکھی ہے۔ یہ واقعہ بھی ایک مستقل معجزہ اور سچی پیشین گوئی تھی۔ کیونکہ دو زبردست سلطنتوں کے بارے میں برسوں پہلے بڑے وثوق

کے ساتھ ایک قطعی فیصلہ دے دینا۔ باوجودیکہ اہل روم کے فتحیاب ہونے کے ظاہر آثار کچھ بھی نہ تھے۔ بغیر وحی کے ممکن نہ تھا پھر یہ اطلاع بھی دی تھی کہ اس دن مسلمان مسرور ہو جائیں گے
پیشین گوئی ذاتی فتح پر مشتمل ہے اور بدر کے غلبہ سے پوری ہوئی۔ مذکورہ بالا سبب نزول عکرمہ شعبی مجاہد قتادہ زہری سدی اور ایک جماعت تابعین سے منقول ہے۔ عکرمہ نے از غ
انفرادی روایت اور بھی بیان کی ہے۔ رسالہ مختصر میں شکست فارس کے اسباب ذیل میں کہا ہے کہ جب فارس کو روم پر غلبہ حاصل ہو گیا تو ایک روز فرخان نے (جو جنرل اعظم کے
کمانڈر تھا) شراب کی مجلس میں اپنے اشراف سے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں کسریٰ کے تخت پر بیٹھا ہوں۔ جب یہ اطلاع کسریٰ کو پہنچی تو اس نے فرخان کے بھائی شہریار
روم میں فرخان کا مددگار بھی تھا لکھا کہ جونہی میرا یہ حکم تیرے پاس پہنچے فرخان کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دے۔ شہریار نے جواب میں لکھا اعلیٰ حضرت ایران کو فرخان کی
نہیں ملے گا۔ دشمن اس کا نام سن کر بھاگتے ہیں۔ شاہ ایران نے لکھا ایران میں اس کی طرح بہت آدمی ہیں۔ بغیر تردد کے حکم کی تعمیل کر۔ شہریار بھی ٹالتا رہا اور شاہی تاکید کا سلسلہ
رہا بالآخر فرخان کے پاس حکم آیا کہ شہریار کو قتل کر دو۔ فرخان نے بھائی کو گرفتار کر کے جلاد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ شہریار نے وصیت کرنے کی مہلت چاہی اور مہلت ملنے پر وہ تمام خطوط
جو بادشاہ نے اس کو لکھے تھے۔ یہ دیکھ کر فرخان کو بھی غصہ آگیا اور دونوں متفق الرائے ہو کر خفیہ طور پر ہرقل سے مل گئے اور ہرقل نے ایران کا تختہ تاراج کیا۔ یہاں تک کہ تخت گاہ
برباد کر کے وہاں ایک شہر رومیہ کے نام سے بسایا۔ اس قصہ کا سلسلہ روایت انفرادی ہے اسی لئے شیخ ابن کثیر نے اس کو غریب لکھا ہے تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت فر
تسلط روم پر ہوا تھا اس وقت جنگ کا پانسہ پلٹنے کے ظاہری اسباب کچھ بھی نہ تھے۔ لیکن عالم الغیب والشہادۃ تمام حال و استقبال سے واقف اور واقعات حاضرہ و آئندہ سے
نے قرآن پاک میں صراحت فرما دی کہ اب اگرچہ رومی مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند ہی سال میں ان کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ رومیوں کے غلبہ کے اسباب فرخان کی بغاوت اور
ساتھ مل جانے کی صورت میں نمودار ہوئے اور دولت ایران برباد ہو گئی۔

فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ۔ بضع کا اطلاق عربی میں تین سے لے کر نو تک ہر عدد پر ہوتا ہے۔ آیت میں اس کا کوئی تعین نہیں ہے۔ ابن مسعود سے مروی ہے کہ جب آیت نازل
ہوا تو مشرکوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا۔ تمہارا دوست کہتا ہے کہ چند سال میں روم کو فارس پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ صدیق اکبر نے فرمایا انہوں نے سچ فرمایا۔ مشرکوں نے کہا۔ کیا شرط
ہو۔ صدیق اکبرؓ راضی ہو گئے اور طے پایا کہ اگر چھ سال میں رومی فارس پر غالب آ گئے تو صدیق اکبر چار اونٹنیاں لے لیں گے ورنہ اتنا ہی مال ان کو دینا ہوگا۔ ابن عباسؓ کی روایت
شرط پانچ سال اور مالی شرط دس اونٹنیاں مذکور ہیں۔ سعید بن مکرم کی روایت میں شرط باندھنے والا ابی ابن خلف تھا (شاید مشرکوں کی طرف سے یہ نمائندہ ہوا) غرض چھ برس
اور رومی غالب نہ ہوئے تو صدیق اکبرؓ کو مالی شرط دینی پڑی۔ حضور والا کو اطلاع ملی تو گراں گزرا اور مسلمانوں نے مدتِ شرط کے کم مقرر کرنے کے متعلق صدیق اکبر پر نکتہ چینی
روایت میں یہ بھی آیا ہے۔ حضور اقدس نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ دوبارہ ان لوگوں سے دو برس میعاد بڑھا کر زیادہ مال پر شرط لگا دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے مشرکوں سے فرمایا
دو برس کے لئے سو اونٹنیوں کی شرط کرتے ہو۔ مشرکین راضی ہو گئے اور ساتویں سال اہل روم غالب آ گئے اور صدیق اکبر نے مال مشروط لے لیا۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں
حضور والا نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا۔ اس کو خیرات کر دو

ترمذی نے باسناد حسن ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ حضور والا نے صدیق اکبر سے فرمایا۔ ابوبکرؓ تم نے کیوں کمی کی بضع تو تین اور نو کے درمیان ہوتا ہے
میں دوبارہ شرط باندھنے کا حکم دینا منقول نہیں ہے۔

بہر حال سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا طرفین سے شرط باندھنا اور مال مشروط جیت کر لے لینا جائز ہے یا نہیں۔ اگر جائز نہیں تو صدیق اکبر نے ایسا کیوں کیا اور حضور
کرنے کا حکم کیوں دیا (جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے) اس کا جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ حرمتِ قمار سے پہلے کا یہ واقعہ تھا تو پھر حضور نے مال مشروط کو خیرات
کیوں حکم دیا۔ جیسا کہ ابن ابی حاتم کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور نیشاپوری نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد نے فرمایا کہ دار الحرب میں کفار کے ساتھ
عقد کرنا جائز ہیں لیکن اعتراض ہوتا ہے کہ پھر خیرات کر دینے کے کیا معنی تو ابن کثیر نے جواب لکھا ہے کہ عقد بجائے خود جائز ہے۔ اس میں کوئی گناہ نہیں۔ ہاں خرچ سے حاصل کیا
تصرف میں لانا جائز نہیں جیسا کہ روایت مذکورہ سے ثابت ہے۔

ایک غیر مشہور روایت

بعض روایات میں غَلَبَتْ بصیغہ معروف اور سَيُغْلَبُوْنَ بصیغہ مجہول آیا ہے۔ یعنی رومی غالب ہو گئے ایرانیوں کے
ان کو فتح حاصل ہو گئی لیکن چند سال بعد پھر مغلوب ہوں گے اس روایت کے بموجب آیت مکہ میں در پیشین گوئیاں
قبل از وقت رومیوں کے غالب آنے کی صراحت۔ ہجرت سے چھ برس پہلے اس آیت کا نزول ہوا کہ جنگ بدر کے بعد ہی رومیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ سات
ظاہری علامات ملے کسی واقعہ کے متعلق قطعی فیصلہ کر دینا وحی کا کام ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کے خوش ہونے سے مراد ہوگا۔ فتح بدر پر مسلمانوں کا خوشیاں منانا اور غلبہ روم

کے مقابلہ میں قرآنی صراحت کا پورا ہونا اور مسلمانوں کا مسرور ہونا۔ دوسری پیشین گوئی رومیوں کے مغلوب ہونے کی ہے۔ اس تقدیر پر فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ کا تعلق سَیُغْلَبُوْنَ سے ہوگا نہ کہ غَلَبِہِمْ سے ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ چند سال میں رومیوں کا غلبہ اتنا یقینی ہے گویا ہو چکا۔ اس کے بعد عنقریب ان کی شکست بھی مقدر ہوگی مگر ان کی شکست دیکھا اس کی کوئی صراحت نہیں اس کے بعد یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ فرما نا بتا رہا ہے کہ یہ تسلط اور غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہوگا اور رومیوں کی بربادی مسلمانوں کے ہاتھ ہوگی اس وقت مسلمان خوش ہوں گے چنانچہ ظہور میں آئی بھی حضرت عمرؓ کی خلافت میں سولہویں سال یہ بات پوری ہوئی اور مسلمان سلطنت روم کو اپنے تصرف میں لائے۔

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یعنی فتح و شکست کا اختیار اس سے پہلے بھی خدا ہی کو تھا اور اس کے بعد بھی خدا ہی کو ہوگا۔ اس میں تہدید ہے ہر آن باطل پرست بدکیش کے خیالات کی جو فتح و نصرت کو مادی طاقت کا ممنون کرم سمجھتے ہیں اور ظاہری قوت کے بڑھاؤ گھٹاؤ کو موجب فتح و شکست جانتے ہیں اور فی الحال کافروں کو وعید اور مسلمانوں کو بشارت بھی ہے کہ فتح و شکست جس طرح اس سے پہلے خدا کے ہاتھ میں تھی اسی طرح اس کے بعد بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہوگی مسلمانوں کی بے بضاعتی اور کمزوری اور کافروں کی قوت و دولت کو اس میں دخل نہیں ہے لیں کافروں کو اپنی طاقت کا گھمنڈ نہ کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے ضعف کو دیکھ کر شکستہ خاطر نہ ہونا چاہیے۔ اللہ کافروں کو شکست اور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا خود یہ سب کچھ بِنَصْرِ اللّٰہِ اللہ ہی کی مدد سے ہوگا۔ نہ کہ مسلمانوں کی قوت، اعداد، ساز و سامان کی فراوانی اور لشکر کی کثرت کے سبب کیونکہ فتح و نصرت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ الخ۔ وہ جس کو چاہتا ہے فتح یاب کرتا ہے جس کی ہمہ گیر قوت اور کامل اندیشِ مصلحت میں کسی کو دخل نہیں۔

وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ اس آیت میں صاف صراحت ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ہے (نہ دنیا میں نہ آخرت میں)۔ لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر گنہگار مسلمانوں کا دوزخ میں جانا یقینی ہے کیونکہ گناہ کی سزا دوزخ ہے صراحتاً۔ نیز قرآنی آیات کہہ رہی ہیں کہ معصیت کی سزا ضروری ہے پھر باب مغفرت بالکل بند ہو جاتا ہے۔ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ عفو کے دروازے پر قفل لگا رہا ہے اس کا جواب بالکل ظاہر ہے کہ جس طرح گنہگار مسلمانوں کو سزا کی وعید دی گئی ہے وہاں عفو کا امیدوار بھی بنایا گیا۔ ظاہر ہے تو اس کی صفت رحمان بھی ہے۔ دوزخ میں ڈالنے کی صراحت کے ساتھ معاف کر دینے کا وعدہ بھی ہے۔ خدا نے اپنی مشیت کو تابع نہیں بنایا ہے نہ اپنے کو کہیں مجبور ظاہر کیا ہے گویا سزا اور عفو کے جدا جدا وعدے ہیں جن کی تطبیق اس طرح کی جا سکتی ہے کہ سزا کا وعدہ بشرط عدم عفو ہے یا اگر خدا تعالیٰ معاف فرما دے تو پھر سزا کا وعدہ نہیں۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاہِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا الخ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے اول یہ کہ اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں ظاہر دنیا میں جس کا غلبہ دیکھتے ہیں اسی کی طرفداری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق سبحانہٗ اسی سے خوش ہے آخرت کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ جس نے اپنی آخرت سنبھال خدا اس سے خوش ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ظاہری مال و متاع اور شوکت و طاقت پر اعتماد کر رہے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں اس کے سنبھالنے کا خیال نہیں کرتے اور دنیا کے بھی صرف ظاہر پر فریفتہ ہیں۔ اس کے باطن سے آگاہ ہوں کہ آخر فنا ہونے والی اور حرص و ہوا کے جال میں پھنسا کر برباد کرنے والی ہے تب ہی سنبھل جائیں (خازن)۔ اَلْاٰخِرَۃِ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آئندہ خواہ دنیا کے آئندہ واقعات ہوں یا پوشیدہ انجام ہو یا قیامت کی سزا و جزا، حشر نشر اور جنت و دوزخ ہو یا موت اور احوالِ موت ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہو انسان بہت کم آل اندیش واقع ہوا ہے۔ ایک تیسرا مطلب اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اکثر لوگ کوتاہ بین واقع ہوئے ہیں۔ جس چیز کے ظاہر اسباب نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اسی کو مانتے ہیں اور جن کے اسباب نظر نہیں آتے اس کو نہیں مانتے۔ ایرانیوں کی فتح آنکھوں سے دیکھ لی یقین کر لیا اور اہل روم یا مسلمانوں کی نصرت کے ظاہر اسباب نظروں کے سامنے نہ تھے اس لئے اس کا یقین نہ کیا۔

مقصودِ بیان رومیوں کے غالب آنے کی قبل از وقت صراحت۔ یہ صراحت قرآن پاک کی صداقت اور نبوت رسول اقدسؐ کو برہانی طریقہ سے ثابت کر رہی ہے۔ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شکست و فتح اور دنیا کے تمام انقلاب اللہ کے دستِ قدرت میں ہیں، اس سے کافروں کو تنبیہ اور مسلمانوں کو بشارت دینی بھی مقصود ہے کہ آخر میں کافر خوار اور مسلمان فتح یاب ہوں گے۔ اس ظاہر پرست فرقہ کے خیال کا ازالہ بھی اس سے مقصود ہے جو ظاہر اسباب کا پرستار ہے اور آنے والے نتائج کو انہی اسباب کی زنجیروں سے وابستہ سمجھتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہ اسباب حقیقی ناقابل زوال نہیں ہیں مسبب کو پلٹ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اس لیے ہر عہد دنیا پرست صوفی اور عالم طبقہ کو جو اسلامی جہاد کی فرضیت کے منکر بن گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک طاقت نہ ہو مقابلہ کرنا خودکشی کے برابر ہے۔ یہ بیوقوف گروہ نہیں جانتا کہ جہاد کی تیاری کرنا بھی جہاد ہے اور جہاد مادی اسباب کے حصول میں مرہون نہیں ہے۔ نہ فتح و شکست مادی طاقت پر موقوف ہے۔ یہ اختیار تو صرف اللہ ہی کو ہے جس کو چاہے فتحیاب کرے ہمارا کام صرف موجودہ امکانی طاقت کو فراہم کرنا، حسن نیت اور اخلاص کے

ساتھ عمل کرنا اور اللہ کا کام مدد دینا اور فتحیاب بنانا ہے۔ خوب کان کھول کر سُن لیں علمائے کرام اور واعظان ذوی الاحترام اور پیران عظام کروہ خدا کے ہاں سخت ماخوذ ہوں گے
یہ پست حوصلگی اور اسباب پرستی کب تک اور طاقتوں کی زنجیروں سے وابستہ ہونا ملتے۔ اسباب پرستی کا عقیدہ رکھنا تو کفر ہے کیا خدا کی طاقت اور بہ جبر قدرت کا کوئی مسلمان انکار کر سکتا
ہے۔ ہاں اپنی موجودہ طاقت کو کم دینا اور آئندہ طاقت کو فراہم کرنے کی طرف سے غافل بن جانا بھی نص قرآن کے خلاف ہے اور عقل بھی ایسے فعل کو مجنونانہ فعل کہتی ہے لیکن قرآن کہیں بھی
نہیں کہتا کہ کافروں کی برابر طاقت ہو جائے تو مقابلہ کرو۔ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا اور نہ آئندہ کبھی اس کی اُمید کی جاسکتی ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔
یَنْصُرُ کا لفظ بھی اسباب پرستی کی بیخ کنی کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں فتحیاب بنانا ہے۔ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود
ہے کہ اکثر لوگوں کی نظر ظاہر کی طرف ہوتی ہے حقیقت سے وہ واقف نہیں ہوتے۔ عموماً لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ نہ مرنے کا خیال نہ مرنے کے بعد پیش آنے والی جزا سزا کا فکر دنیوی
مال کا ذہن لیکن بعض عقلمند پاک باطن اس کلیہ سے مستثنیٰ بھی ہیں۔ وہ اللہ کے دستِ قدرت کی حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہر وقت اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے نہ کہ ظاہری اسباب پر وغیرہ۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ
کیا انھوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمینوں کو اور اُن کی درمیانی کائنات کو تدبیر ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ایک وقت
مُسَمًّى ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ۝ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا
مقرر کیلئے بنایا ہے۔ اور بہتیرے لوگ اپنے پروردگار کے ملنے کے منکر ہیں کیا انھوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ
کہ ان سے پہلوں کا انجام کیسا ہوا وہ قوت میں بھی اُن سے بڑھے ہوئے تھے اور زمین کو بھی انھوں نے خوب جوتا تھا اور جس قدر انھوں نے
مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝
آباد کیا ہے اس سے زیادہ انھوں نے زمین کو آباد بھی کیا تھا اور اُن کے پاس اُن کے پیغمبر معجزات لیکر پہنچے تھے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے
ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ۝ ع
پھر بدکاروں کا انجام برا ہی ہوا اس لئے کہ انھوں نے اللہ کے احکام کو جھٹلایا تھا اور اُن کی ہنسی کرتے تھے

تفسیر ہر وہ کام جو ارادہ اور قصد سے کیا جاتا ہے اور کوئی حیوان یا انسان اس کو اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ اس کے صدور و حدوث اور تکمیل کے لئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے
اگر چار چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہ ہوگی تو اس کام کا مکمل ہونا تو درکنار پیدا ہونا ہی ناممکن ہوگا (۱) ہر فعل کے حدوث کے لئے سب سے پہلے فاعل کا ہونا ضروری ہے۔ اگر فاعل
نہ ہو تو فعل کے صدور کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے (۲) دوسرے نمبر پر کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کی غرض غایت فائدہ اور نتیجہ کا تصور کرنا بھی ضروری ہے۔ فعل ارادی کے معنی ہی یہ ہیں
کہ کسی مقصد کی تکمیل فاعل کے پیش نظر ہے خواہ وہ مقصد حاصل ہو نہ ہو لیکن تخیل و تصور میں اس کا پہلے سے موجود ہونا لازم ہے (۳) تیسرے درجہ میں اس مادہ اور قوام کا ہونا لازم
ہے جس میں فاعل کسی قسم کا تصرف اور عمل کرنا چاہتا ہے اور اس کو خاص صورت پہنا کر اپنے ارادہ کی تکمیل اس کے پیش نظر ہوتی ہے کیونکہ اگر مادہ نہ ہو تو کام کرنے والا اپنے مقصد کو حاصل کرنے
کے لئے کس چیز میں تصرف کرے گا اور صورت تکمیل کو کونسی چیز قبول کرے گی۔ آخر میں مادہ کے اندر کسی صورت کو پیدا کرنا اور کسی خاص شکل ہیئت کا اس کو جامہ پہنانا ضروری ہے۔ جب مادہ
صورت کا جامہ پہن لیتا ہے تو وہ چیز بن جاتی ہے جس کو بنانے والا بنانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کرسی بنانی مقصود ہے تو اول بنانے والے کاریگر کی ضرورت ہے۔ اگر
بنانے والا نہ ہو تو بنائے کون پھر کاریگر پر لازم ہے کہ وہ کرسی کی غرض کا بھی تصور کرے اور پہلے سے یہ خیال کرے کہ کرسی کی ایسی صورت ہوتی ہے اس کام میں آتی ہے۔ لوگ اس پر بیٹھتے

وہ۔ مجہول چیز کو وہ بنا ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد لکڑی کے تختے ٹکڑے کیلیں، بید کے چھلکے اور ان تمام لوازم کا فراہم ہونا ضروری ہے جس کی ضرورت کرسی بنانے کے لئے پڑتی ہے۔ اگر وہ مادہ اور قوام نہ ہوگا تو پھر کرسی کس چیز کی بنے گی۔ آخر میں تختوں اور لکڑیوں کو جوڑنا اور کرسی کی خاص شکل بنانا ضروری ہے۔ جب لکڑیاں جوڑ کر خاص طریقہ سے ملا کر کرسی کی شکل پیدا کر دی جائیگی تو کرسی تیار ہو جائیگی۔ اگر ان چار چیزوں میں سے ایک چیز بھی معدوم ہوگی تو کرسی نہیں بن سکتی پھر یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اگر کام کرنے والے کی غرض پوری ہو جائے مثلاً ایک بادشاہ کے لئے کسی بڑھئی نے سنار یا سادہ کار نے کوئی خاص کرسی بنائی اور بادشاہ اس پر بیٹھ گیا اور ایک مدت کے بعد کرسی کو خارج کر دیا یا کرسی بھی فرسودگی اور بوسیدگی کی وجہ سے بیٹھنے کی قابلیت ہی نہ رہے تو بالآخر کاریگر پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کرسی کو توڑ دے اور اس کے مادے سے کوئی اور چیز تیار کرے بشرطیکہ اس کے مادے میں اتنی صلاحیت ہو کہ اس سے کوئی چیز بنائی جا سکتی ہو اور اگر کرسی کی لکڑی وغیرہ بالکل ناکارہ ہو گئی ہو تو پھر اس کو جلانے کے سوا کسی کام میں نہیں لایا جا سکتا۔

بعینہ یہی صورت اور طریقہ اس عالم کو بنانے کا بھی ہے مگر گہری نظر اور غور و فکر کرنے والے دماغ کی ضرورت ہے۔ اگر اس عالم کو بنانے والا نہ ہوتا تو یہ کائنات کیسے بنتی۔ یہ اونچے نیلے گول آسمان اور اس کی موجودات یہ چوڑی ہموار نرم اور قابل سکونت زمین کون بناتا اور کیسے تیار ہوتی نظر کو اس سے کسی قدر بلند کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کو بنانے کی غرض بھی کچھ ہونی ضرور ہے۔ بیکار تو خدا نے اس دنیا کو نہیں پیدا کیا۔ فطرت کا کچھ تو مقصود ہے۔ اسباب و نتائج کی یہ گوناگوں وابستگی اور کائناتی زنجیروں کے ہر حلقہ کا دوسرے سے بندھا کوئی معنی تو اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیا یہ معرفت الٰہیہ کا ذریعہ نہیں ہے۔ کیا یہ صناع مطلق کی ہمہ گیر حکمت اور محیط کل قدرت کو ظاہر نہیں کر رہا ہے کیا یہ مخلوق کے لئے خالق تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ کیا یہ اللہ کی ربوبیت تامہ اور الوہیت عامہ پر دلالت نہیں کر رہا ہے کیا اس پر حکمت صنعت اور مصالح سے بھری ہوئی تربیت سے ہم کو یہ سبق نہیں ملتا کہ اللہ کا قانون عالم میں جاری اور ساری ہے۔ کائنات کی کوئی نوع اور نوع کا کوئی فرد اس کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے۔ مقصود فطرت کی تکمیل میں عالم کا ذرہ ذرہ منہمک ہے۔ پھر کیا انسان کے لئے اللہ کے قانون عمل سے سرتابی کرنی اور اس کے حکم سے عدول کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ کیا فطرت کا قانون تعامل انسان کے عمل کے لئے نہیں ہے۔ کیا انسان کی ایسی سرکش اور پر جرأت ہستی ہے کہ تمام کائنات سے علیحدہ ہو کر تن تنہا ضابطۂ قدرت کی خلاف ورزی کرنی اس کے لئے جائز ہو جائے ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ غرض فطرت کی تکمیل انسان پر بھی فرض ہے۔ اس سے ذرا اور پر نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے اور غور کیا جائے تو مادہ عالم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آسمان، زمین، ہوا، پانی، آگ ستارے سیارے اور دوسرے ظاہر یا باطن مخلوق کس چیز سے بنی ان کا اصلی قوام کس شے سے ہوا گیس تھا، کہربائی ذرات تھے۔ اجزاء دیمقراطیسی تھے جواہر فردہ تھے یا کیا تھا۔ اس کے بعد کائنات اور اس کی گوناگوں انواع و افراد کا تلون نیرنگی اور قسم قسم کی صورتیں شکلیں بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ گہری نگاہ سے مطالعہ کرنا لازم ہے کہ ان گنت انواع کے لامحدود افراد کی کتنی بے پایاں شکلیں اور غیر محدود صورتیں ہیں۔ کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔ کوئی رنگ دوسرے سے یگانگت نہیں رکھتا۔ ہر انگلی کا نقش دوسری انگلی کے نقش سے جدا ہے۔ ہر پتی کی ہیئت دوسری پتی کی ہیئت سے علیحدہ ہے۔ ہر ذرہ اپنی صورت، مساحت، رنگ اور وزن کے اعتبار سے وہ امتیاز رکھتا ہے جو ناقابل شرکت ہے۔ یہ تو عالم کی تخلیق کے لئے چار اسباب ہیں لیکن یہاں ایک پانچویں بات بھی قابل غور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ نے عالم کو بنایا اپنی الوہیت عامہ کے اظہار اور ربوبیت تامہ کے اعلان کے لئے بنایا۔ عالم کا کچھ نہ کچھ مادہ بھی ضرور ہے۔ اس مادہ کو لاکھوں صورتوں کا جامہ بھی اسی نے پہنایا۔ یہ سب کچھ واجب التسلیم ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ عالم کا مادہ کہاں سے آیا۔ کیا یہ یونہی ہمیشہ سے ہے پھر اس میں یہ رنگا رنگی اور تلون کیوں ہے یا یہ حادث ہے۔ اگر حادث ہے تو اس کو عدم سے وجود میں لانے والا کون ہے۔ کرسی لکڑی سے بنی، لکڑی درخت سے کٹ کر آئی۔ درخت ہوا زمین کھاد اور تخم سے پیدا ہوا اور یہ چیزیں بسیط اجزاء سے تیار ہوئیں اور بسیط اجزاء گیس یا کہربائی ذرات سے بنے۔ مگر یہ گیس اور ذرات کہاں سے آئے اور کس نے بنائے اور کس چیز سے بنائے یہ سوال زبانوں کو گونگا عقلوں کو حیران اور دماغوں کو پریشان کر دیتا ہے۔ سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ بے اختیار ہو کر صاف طور پر اعلان کر دیا جائے کہ اصل مادہ عدم سے وجود میں لانے والا خدا ہے۔ اس نے اس مادہ کو بغیر مادہ کے پیدا کیا۔ اصل میں کوئی چیز نہ تھی اسی نے اس مادہ کو بغیر مادہ کے پیدا کیا۔ اسی نے سب کو نیست سے ہست کیا اور نابود سے بود بنایا۔ اب یہ امر تنقیح طلب ہے کہ کیا یہ کائنات یونہی ہمیشہ چلتی رہے گی۔ زمین و آسمان کا یہ دور و سکون اور زنجیر کائنات کی یہ حلقہ در حلقہ گردنائی اسی طرح جاری رہے گی اور ارادہ و اختیار والی ہستیاں نتیجہ اور جزا و سزا سے یونہی بے نیاز رہیں گی جیسے اب ہیں یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوگا۔ اس حرکت کو کبھی سکون بھی ہوگا۔ جزا سزا بھی کبھی ہوگی اور اس عالم کو توڑ پھوڑ اور از سر نو ساخت کا کبھی وقت آئے گا۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ کاریگر پر لازم ہو جاتا ہے جبکہ کرسی بوسیدہ ہو کر بیکار ہو جائے یا کرسی کی اصل غرض پوری ہو جائے کہ اس کو توڑ کر تختوں کی کوئی اور چیز بنا دے اور اگر لکڑیاں بالکل ہی ناکارہ ہو جائیں تو ان کو نذر آتش کر دے۔ پس جبکہ تخلیق عالم کی بھی کوئی خاص غرض ہے اور جب پروردگار کی ملکیت عامہ کا اعلان ہو چکا اور پیدائش کائنات کی اصل غرض پوری ہو گئی تو لازم ہے کہ اس بہار کو خزاں آئے، تعمیر کی تخریب ہو، کائنات میں شکست و ریخت کا عمل ہو اور ایک دن ایسا آئے کہ عالم کی موجودہ صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے اور پھر انسان کو از سر نو پیدا کیا جائے۔ نئی زندگی عطا کی جائے اور جس طرح تخلیق کی ابتدائی اور درمیانی حالت نتیجہ کی ذمہ دار ہوتی

ہوتی ہے۔ جیسا تخم ہوتا ہے جس طرح اس کی پرورش ہے ویسا ہی حاصل زراعت ہوتا ہے۔ پس کھیتی ہی کی طرح انسانی اعمال کا اچھا برا نتیجہ برآمد ہونا اور اعمال گزشتہ کی انہی کے مناسب شکلیں پیدا ہونا ضروری ہیں۔ لیکن وائے بر حال انسان کہ پروردگار کی ربوبیت اور اللہ کی الوہیت اور بقائے آخرت اور حشر قیامت اور معاوضۂ حیات کو ماننے سے اس کی سرکشی روکتی ہے۔ دولت کی فراوانی جسمانی طاقت کی ارزانی جتھے کی بہتات اور دماغی کاوشوں کی نکتہ رسی اس کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ اللہ کی بے ہمتائی کو مانے اس کی صفات کو جانے اور حشر نشر کا اقرار کرے۔ کاش اس نے غور سے دیکھا ہوتا کہ ایسا پر شوکت آسمان ایسی مفید زمین کس لئے بنائی کیوں بنائی اور کس وقت تک کے لئے بنائی حرکات و طاقت پر نازکرنے والا مغرور انسان کاش گزشتہ اقوام کے احوال کو دیکھ کر سمجھتا کہ پہلے انسانوں کی طاقت کیسی عظیم الشان تھی۔ انھوں نے کیسی کیسی مدنی زندگیاں گزاری تھیں کیسے کیسے تمدن قائم کئے تھے۔ عمران بشری میں ان کا کتنا وافر حصہ تھا اس زمین کے تختے کو وہ کس قدر الٹے تھے لیکن ان کی بداعمالیاں بالآخر رنگ لائیں اور نتیجہ بد سامنے آیا۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ پس اے کاش سادہ لوح بے وقوف انسان اقوام گزشتہ کے اعمال کے نتائج اور نتائج کے اسباب پر غور کرتا اور راہ ہدایت پر گامزن ہوتا۔

تحلیلِ اجزاء

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِہِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الخ۔ ان آیات میں پروردگار نے مشرکوں کو آیاتِ قدرت ظاہرہ اور براہینِ فطرت کو غور و خوض کی نظر سے دیکھنے اور سوچ بچار کرنے کی ہدایت فرمائی اور سرکشی چھوڑ کر راہ راست پانے کا ارشاد فرمایا اور خوف دلایا کہ اگر یہ غفلت میں یونہی منہمک رہیں گے اور آیاتِ ربانیہ کا یونہی مذاق اڑاتے رہیں گے تو برا انجام ان کی منتظر ہے جو آج ان کا راستہ دیکھ رہی ہے بربادی آخرت سے اُن کو ہمکنار ہونا پڑے گا۔

آیت مذکورہ میں دو لفظ خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں۔ (۱) بالحق (۲) واجلِ مسمّی۔ اول لفظ بے پایاں مضامین کو حاوی ہے۔ اللہ نے آسمانوں کو زمین کو اور دیگر کائنات کو برحق پیدا کیا بیکار نہیں بنایا ان کی تخلیق حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ نظامِ کائنات کا ایک خاص ضابطہ کے تحت چلنا اور کسی کا اس ضابطہ سے سرتابی نہ کرنا اور سب کا مل کر فطرت کی غرض کو پورا کرنا اور سلسلۂ موجودات کے ہر حلقہ کا دوسرے حلقہ سے وابستہ ہونا اور کسی کڑی کا درمیان سے نہ ٹوٹنا بے فائدہ نہیں پھر ان تمام کڑیوں کا باہم تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کا باہم دگر ایک خاص تناسب کے ساتھ جاری ہونا اسباب و نتائج کا باہم آمیختہ اور وابستہ ہونا اور ان سب کا قدرتی کنٹرول کے تحت چلنا صانع مطلق کی کاریگری وحدت قدرت اور علمی حافظہ کو ثابت کر رہا ہے۔ دوسرا لفظ بتا رہا ہے کہ ہر موضوع ہر معمول اور ہر مخلوق کی انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک مدت حیات ہوتی ہے۔ ہر پودا ہر سبزہ ایک خاص میعادِ زندگی رکھتا ہے۔ ہر پھول اور ہر پھل ایک معزرہ عمر رکھتا ہے ہر حیوان اور ہر انسان ایک وقت معین کے دائرہ میں محدود ہے۔ ممکن نہیں کہ کائنات عالم میں سے کوئی چیز اپنی مخصوص مقدارِ حیات سے آگے بڑھ سکے۔ پھر اجتماعی نظام کی بھی یہی حالت ہے۔ ہوا کے لاکھوں کروڑوں اجزاء جمع ہو کر بادل کی شکل میں نمودار ہو کر رہتے ہیں برسنے کے بعد سب کی قومی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی جگہ دوسرے اجزاء نئے ہوائیہ لیتے ہیں اور نیا ابر آتا ہے اور اس کی زندگی بھی ایک مقررہ وقت تک رہتی ہے۔ ہر قسم کے درختوں کا نشو و نما ہونا اور پھلنا ایک مقررہ زمانے میں ہوتا ہے۔ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے تو خزاں آکر ان کی قومی اور تمامی زندگی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اقوام حیوانی کے عروج و زوال ترقی تنزل اور حیات و موت کا بھی یہی حال ہے۔ پس جب ہر ذرہ ہر پودا ہر پھول ہر پھل ہر جاندار اور ہر بے جان موت کی آغوش میں ہے اور ہر موجود کی زندگی کو عدم کا زبردست ہاتھ اپنی طرف کھینچ رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جب مجموعہ عالم کی اصلی غرض پوری ہو جائے کل دنیا اپنی غایت کو پہنچ جائے اور زندگی کی مسافت طے ہو جائے تو ایسی صورت میں بھی عالم پر فنا طاری نہ ہو کیوں آغوشِ موت میں ہر چیز نہ سو جائے جبکہ اس کی تخلیق کا فائدہ حاصل ہو چکا ہو اور کس وجہ سے نظامِ کائنات درہم برہم نہ ہو جائے جبکہ نظام کا اصل مدعا پورا ہو گیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ دوبارہ سب کی تخلیق نہ ہو اور اعادۂ حیات نہ کیا جائے جبکہ قانونِ قدرت اجازت دے رہا ہے بلکہ براہینِ تعلیمیہ ثابت کر رہا ہے کہ عدم کے بعد وجود اور نیستی کے بعد ہستی ضروری چیز ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اصل زندگی زرعی حیثیت رکھتی ہو اور ثانوی حیات مثل حاصلِ زراعت کے ہو جب پہلا دور سببی ہو اور دوسرا دور نتیجہ کا۔ پس جبکہ ہر سبب کا نتیجہ اور ہر عمل کا پھل ملنا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ سزا و جزا کے لئے قیامت نہ آئے اور ایک میدان میں سب کو حشر کر کے پہلی زندگی کا عوض نہ دیا جائے۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ الخ۔ لیکن باستثناء اہل ایمان تمام لوگ لوٹ کر اللہ کے سامنے جانے اور قیامت بپا ہو کر جزا سزا ہونے سے منکر ہیں وہ مرنے کے بعد حیات ثانوی کے قائل نہیں اور اصل مرکز کی طرف رجوع کرنے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ آیت مذکورہ میں کثیر کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ دنیا کے سب لوگ قیامت کے منکر نہیں ہیں اہل ایمان اقرار کرتے ہیں ان کو حیات آخرت پر ایمان ہے۔ چونکہ اہل ایمان کی تعداد کافروں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم رہی ہے اس لئے منکروں کا گروہ ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ اس انکار کی اصل وجہ یہ نہیں کہ ان کے پاس کوئی عقلی برہان یا نقلی دلیل اپنے قول کے ثبوت کے لئے موجود ہے بلکہ غرورِ نفس اور بے پناہ طاقت تمدن کی عظمت اور سامانِ دنیا کی شوکت جانی اور صحت۔ ان تمام امور نے ان کی چشم بصیرت پر حماقت کا پردہ ڈال دیا ہے اور اسی بنا پر وہ اللہ کے بھیجے ہوئے پیام اور پیغمبروں کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کے اس زعم باطل کے ازالہ کے لئے فرمایا

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا الخ۔ کیا ان لوگوں نے ملک یمن سرزمین شام وادی حجر اور دوسری بستیوں میں چل پھر کر نہیں غور کیا۔ گزشتہ اقوام کے احوال کا ان کے فرمودہ

آثار سے جائزہ نہیں لیا، فلک بوس محلات کے ویران کھنڈروں اور سرسبز و شاداب باغوں کے اجاڑ نشانات کو نہیں دیکھا کہ ان کی جسمانی طاقت ان سے کس قدر زیادہ تھی۔ کیسے لمبے چوڑے اور موٹے تر وہ الجثہ اور پر جبروت بدن والے تھے کھیتی باڑی اور زمین سے حاصل پیدا کرنے پر کس قدر قادر تھے۔ کیسے کیسے کنویں چشمے اور تالاب انھوں نے کھودے، کیسے باغ گلزار اور چمن لگا کر دنیا میں انھوں نے کتنا وافر حصہ لیا اور کیسی کیسی بستیاں بسائیں اور مکان بنائے لیکن جب انھوں نے قانون عدل اور ضابطہ قدرت سے سرکشی کی تو اللہ کے ناصحوں کے پاس آیات بینات اور احکام واضحہ کر پہنچے، ہر طرح سے ہدایت کی مگر انھوں نے خیر خواہوں کی ایک نصیحت نہ مانی اور اللہ کے پیغمبروں کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا یہی کہ جنھوں نے بدکاریاں کی تھیں ان کو برا ثمرہ ملا (دنیا میں بربادی اور تباہی سے دوچار ہونا پڑا اور آخرت بھی برباد ہوئی)

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ الخ۔ اس آیت کا ترجمہ اہل تفسیر نے دو طرح سے بیان کیا ہے۔ اول اس طرح کہ جنھوں نے بدکاریاں کی تھیں چونکہ انھوں نے احکام الٰہیہ کا انکار کیا تھا اور پیغمبروں کا مذاق اڑایا تھا اس لئے ان کا نتیجہ بھی برا ہوا۔ یہ ترجمہ عام اہل تفسیر نے لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ دوسرا ترجمہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس اور قتادہ کے قول کے مطابق اس طرح بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے بدکاریاں کی تھیں ان کا انجام یہ ہوا کہ انھوں نے اللہ کے احکام کو نہ مانا اور پیغمبروں کی ہنسی اڑانے لگے۔ یہ ترجمہ کسی قدر ضعیف ہے۔ کیونکہ آیات الٰہیہ کے انکار اور پیغمبروں سے استہزاء کو اس صورت میں نتیجہ بدی قرار دینا پڑتا ہے اور بدی کسی دوسری حرکت کو ماننا پڑتا ہے۔ حالانکہ دونوں حرکتیں ہر برائی سے زیادہ قبیح ہیں۔ ان برائیوں کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا بیان آیت میں کچھ نہ ہوا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

مقصود بیان

کائنات و فناء کائنات، انقلاب کائنات اور تغیر کائنات کو نظر بصیرت اور چشم غور سے دیکھنے کی دعوت اور اس بات کی طرف صراحت اشارہ کہ عالم کا ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ پر حکمت تغیر ہستی اور نیستی کے تبادل اور موت و حیات کی ہم آغوشی پر دلالت کر رہا ہے۔ صانع کے وجود اور اس کی ہمہ گیر طاقت اور محیط کل علم کو پکار پکار کر ظاہر کر رہا ہے اور ہر چیز کی زندگی ایک خاص مدت اور مقرر میعاد بقا کے ہاتھ میں مرہون ہے جس سے تجاوز کرنا ناممکن ہے۔ أَجَلٍ مُّسَمًّى کے لفظ سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ہر چیز کی زندگی اور موت کا وقت مقرر ہے۔ پس مرنا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا خلاف عقل نہیں۔ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دنیا میں کافروں کی کثرت رہی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہوگا جبکہ کثرت سے کثرت اضافی مراد لی جائے اور اہل ایمان کے مقابلہ میں کثرت سمجھی جائے۔ لیکن اگر کثرت سے واقعی کثرت مراد لی جائے تو مذکورہ بالا مفہوم پر دلالت نہیں ہوتی۔ أَوَلَمْ يَسِيرُوا الخ سے دنیا میں چلنے پھرنے کی طرف ترغیب ہے لیکن بدمعاشیاں اور بدچلنیاں، بے ایمانیاں اور سیہ کاریاں کرنے کے لئے نہیں بلکہ اقوام پارینہ کے احوال کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے اور نصیحت قبول کرنے کے لئے۔ آیت وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ الخ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا ظالم نہیں بلکہ اپنی بربادی کا سامان انسان خود اپنے ہاتھوں سے فراہم کر کے برباد ہوتا ہے۔ آخر آیت میں صراحت ہے کہ بدکاری و انکار صداقت اور تکذیب پیغمبر کا نتیجہ بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوا وغیرہ۔

اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝

اللہ ہی مخلوق کو ابتداءً پیدا کرتا ہے پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا پھر اسی کے پاس تم سب کو لوٹ کر جانا ہوگا جس روز قیامت بپا ہوگی تو مجرم نا امید ہو جائیں گے

وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ

اور ان کے شرکا ان کے سفارشی نہ ہوں گے اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے جس روز قیامت بپا ہوگی

يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ۝

اس روز وہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ مومن و نیکوکار ہوں گے وہ تو بہشت میں خوش کردیئے جائیں گے

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۝

اور جنھوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھوٹ سمجھا تھا وہی عذاب میں حاضر کئے جائیں گے

تفسیر ہم ایک سے زیادہ مرتبہ اوپر لکھ آئے ہیں کہ ہر ساخت کی ایک غرض اور ہر صنعت کی ایک غایت مقرر ہوتی ہے۔ ہر بناوٹ سے بنانے والے کے منشاء پر استدلال کیا جاتا ہے لیکن جب وہ غرض وغایت پوری ہو جائے وہ مفاد ختم ہو جائے اور اس منشاء کی تکمیل ہو جائے جس کے لئے اس مصنوع کی ہستی عالم ترکیب تکوین میں آئی ہے تو لا محالہ اس مصنوع کے اجزاء منتشر اور ساخت میں تحلیل ضرور ہے۔ ترکیب کی تحلیل اور مصنوع کے اختتام کے بعد اس کے اجزاء کہاں جاتے ہیں، تمام اجزاء کس کام آتا ہے۔ یہ بنانے والا ہی جانے۔ جہاں سے اجزاء کو فراہم کر کے وہ لاتا ہے کبھی وہیں پہنچاتا ہے یا کبھی اور کام میں لاتا ہے۔ دونوں صورتیں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہی کرسی کی حالت پیش نظر رکھو کہ کرسی کی ساخت کا مفاد ختم ہونے کے بعد کاریگر اس کے اجزاء کو منتشر کر کے جلانے کے کام میں لائے یا اس سے کوئی دوسری چیز بنالے یہ اس کا کام ہے۔ بہرحال لوٹ کر لکڑی کا کاریگر کے ہاتھ میں پہنچنا ضروری امر ہے۔ اب دوبارہ وہ اس لکڑی کو کس شکل میں نمودار کرے گا یہ وہی جانے مگر یہ بدیہی امر ہے کہ اگر اس لکڑی میں کچھ قابلیت ہوئی تو اس کے اجزائے پریشان کا اجتماع اور نئی چیز کی بناوٹ ہونی ضرور ہے۔ پس یہی حال اس عالم کون وفساد کا سمجھو۔ اس کے اجزاء کہاں کہاں سے اکٹھے کئے گئے، کس ترکیب سے جوڑے گئے، کہاں سے ان کی تخلیق ہوئی۔ ان تمام امور سے صناع اور خلاق حقیقی ہی واقف ہے لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ جب تخلیقی مفاد ختم ہو جاتا ہے یا ہو جائے گا تو اس عالم کے جمع شدہ اجزاء کا انتشار اور ترکیبی ہیئت کی پراگندگی ہے ضروری امر پھر اس انتشار وتحلیل کے بعد یہ اجزاء کہاں جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل معدوم نہیں ہو جائیں گے۔ اس لئے پھر خلاق کے دست قدرت میں پہنچیں گے، اسی کی طرف لوٹیں گے اور وہی جب مناسب سمجھے گا پھر ان تحلیل شدہ اجزاء کو جوڑے گا اور نئے روپ اور نئی شان اور نئے رنگ ڈھنگ میں نمودار کرے گا۔ بہرحال ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ تمام عالم کے اجزاء کو پراگندہ کیا جائے گا، الگ الگ کر دیا جائے اور پھر سب کو دوبارہ جوڑ کر وقت مقررہ پر سامنے لایا جائے۔ یہی تخلیق ثانوی اعادۂ حیات اور حشر نشر کا وقت ہوگا رجوع الی اللہ کے یہی معنی ہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ کرسی دیمک خوردہ بوسیدہ فرسودہ زنگ آلودہ ناکارہ اجزاء سے تخت شاہی میز الماری شاہی محل کی چوکھٹ کیواڑ اور امراء کے استعمال کے قابل مختلف اقسام کا فرنیچر نہیں تیار کیا جا سکتا۔ نہ اور مفید ترین لوازم حیات میں صرف کیا جا سکتا ہے بلکہ روشن چولہوں، دہکتی ہوئی بھٹیوں اور بھڑکتے تنوروں کی شکم سیری ان سے کی جاتی ہے۔ کاریگر کے ہاتھ میں جب استعمال شدہ پرانی میز پہنچتی ہے تو وہ اس کو توڑ کر اس کے اجزاء کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک قسم کے اجزاء تو وہ ہوتے ہیں کہ آئندہ ان سے کوئی فرنیچر تیار کر کے اونچی اونچی کوٹھیوں شاندار شاہی عمارتوں اور امیروں کے درباروں میں لگانے چننے سجانے اور ضروریات زینت فراہم کرنے میں استعمال کیا جا سکتا ہو۔ خواہ اس کو ویسے ہی درست کر کے یا رندے سے چھیل کر تراش کر بوسیدہ اجزاء صاف کر کے بہرحال ان کے اجزاء کو ضروریات حیات اور لوازم عیش کی فراہمی میں صرف کیا جا سکتا ہو ایسے اجزاء کو کاریگر الگ چھانٹ لیتا ہے اور ایک صف میں رکھ لیتا ہے۔ دوسری قسم کے اجزاء وہ ہوتے ہیں جو کسی طرح زندگی کے کام کی کوئی چیز تیار نہیں کر سکتے سوائے آگ میں ڈالنے اور جلانے کے کسی اور غرض کے لئے استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ ایسے اجزاء کو کاریگر بالکل علیحدہ رکھتا ہے۔ اول الذکر اجزاء کی مختلف چیزیں تیار کرتا ہے جن کو انسانوں کے مختلف طبقات حسب مرتبہ اپنے کام میں لاتے ہیں، بہرنگ ترین شہنشاہ امیر والا جاہ باختیار وزراء اور عیش پسند تاجروں کی کوٹھیوں محلوں اور مکانوں کی زینت انہی سے ہوتی ہے۔ ان کو ہر وقت صاف شستہ اور محفوظ رکھا جاتا ہے، غلاف چڑھائے جاتے ہیں۔ پالش اور وارنش لگایا جاتا ہے اور ہر طرح سے ان کو چمکایا جاتا ہے۔ دوسرے قسم کے اجزاء کی جگہ وہی آتشکدہ وہی تنور وہی بھٹی اور وہی چولہا ہے بس۔

یہی حال اس عالم کے اجزائے پریشان کا سمجھو جب صناع کے ہاتھوں میں تحلیل شدہ اجزاء پہنچتے ہیں تو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو کفر وشرک کے زنگ نے معایا ہوتا ہے، سرکشی سرتابی اور معصیت کی دیمک اس کو اپنی خوراک بنا چکی ہوتی ہے۔ ایسے اجزاء کو چھانٹ کر الگ ایک صف میں صناع رکھے گا اور ان ناکارہ اجزاء کی جگہ سوائے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کے اور کوئی نہیں۔ ان میں قابلیت ہی نہیں ہوگی کہ چھیل کر صاف کر کے کسی طرح ان سے کام لیا جا سکے۔ دوسری قسم کے اجزاء وہ ہوں گے جو یا تو بالکل صاف ستھرے اور مضبوط ہوں گے یا ان کے بیرونی حصہ پر گناہوں اور نافرمانیوں کا میل کچیل اور معاصی کے کیڑوں کے ڈنک لگے ہوں گے تاہم ان کا جوہر توحید محفوظ ہوگا اور کسی قسم کے گناہ کا کوئی کیڑا ان کے جوہر اصلی تک نہ پہنچا ہوگا اور تیز رندے دھار دار بسولے اور دندانہ دار آرے سے چھیل کر تراش کر کاٹ کر ان کو کام میں لانے کی اور شاہی محلات میں سجانے کے قابل کوئی چیز بنانے کی قابلیت ہوگی۔ اس طرح کے اجزاء کو عالم کا کاریگر الگ چھانٹ لے گا اور ان کی جگہ جنت کی کوٹھیاں اور بہشت بریں کے کوشک ہوں گے۔

اب اگر کسی لکڑی کے بالکل ناکارہ قابل سوختنی اجزاء یہ خیال کر لیں کہ ہم کو چولہوں اور بھٹیوں کی دہکتی آگ میں جلنا نہ ہوگا کیونکہ ہمارے پیش نظر کچھ کاریگر ایسے ہیں جو سفارش کر کے بڑے کاریگر سے ہم کو شاہی محل میں پہنچنے کے قابل بنوا دیں گے تو اس قسم کا خیال کرنا ان بے وقوف اجزاء کی غلطی ہے کیونکہ جب وہ بالکل ہی گھن خوردہ اور دیمک رسیدہ ہو گئے جب ان کا اصل جوہر ہی کیڑوں کی خوراک بن چکا اور جب ان میں کسی قسم کی کوئی چیز بننے کی قابلیت ہی نہیں رہی تو کیا ایسے اجزاء کو شاہی محل میں سجانا اور چاند محل کو بجلس اور غیر موزوں کرنا نہیں ہوگا کیا کوئی عقلمند کاریگر اس پر تیار ہو سکتا ہے۔ پھر خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ فرنگ بھی کہ سفارش میں پیش کیا گیا ہو کاریگری اور صناعی سے ذرا کا تعلق بھی نہ رکھتے ہوں اور کوئی چیز بنانی نہ آتی ہو

اور نجاری سے بالکل نابلد ہوں ان کی طفل تسلیاں کیا کام دے سکتی ہیں! اور مزید طرفہ یہ کہ ان سفارش کرنے والوں کا اصل کاریگری کی منشا میں کوئی دخل بھی نہ ہو وہاں تک رسائی بھی نہ ہو ان کے قول کی وہاں شنوائی بھی نہ ہو اور مزید یہ کہ جن سے سفارش کی امید باندھی گئی ہو ان میں سفارش کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو انہوں نے وعدہ سفارش کیا ہو ایسی حالت میں ان بیچارے بوسیدہ اجزاء کا امید باندھنا اور شاہی محلات کی زینت بننے کی آرزو کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے بس

قیامت کے دن یہی حال اس عالم انسانی کا ہوگا جب اس کے پراگندہ اجزاء کو صانع مطلق اکٹھا کرے گا اور دوبارہ تخلیق فرمائے گا تو ان کو دو فریقوں میں تقسیم کر دیگا۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جن کے دلوں میں جوہر توحید موجود ہوگا اور افعالِ حیات میں شستگی پختگی اور صلاحیت ہوگی اور وہ اس قابل ہوں گے کہ بہشت بریں کی زینت بن سکیں۔ اس گروہ کو الگ کر دیا جائے گا۔ دوسرا گروہ اور کثیف فرسودہ بوسیدہ افراد کا ہوگا جن کے اقوال کو ناپاکی کے گھن نے اعمال کو نجاست اور تعدی کے کیڑے نے اور پوری رفتار حیات کو معصیت کوشی کی دیمک نے کھا لیا ہوگا یہاں تک کہ ان کے دلوں کے اندر جوہر توحید بھی خاکستر ہو چکا ہوگا۔ اس گروہ کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا اور جہنم کی آگ کے سوا کوئی دوسرا سکن ان کو نصیب نہ ہوگا۔ دنیا میں جن دیوتاؤں اور فرضی خداؤں کی یہ پرستش کرتے تھے قیامت کے دن کسی کو سفارش نصیب نہ ہوگی۔ یا تو ان کے سفارشی خود مجبور ہوں گے۔ پھر درماندہ سفارش کس کی کرے یا ان میں قوت ہی نہ ہوگی کہ سفارش کر سکیں۔ بہر حال کسی کی شفاعت اس خبیث گروہ کو میسر نہ ہوگی۔ انجام کار جب ہر طرح نجات سے مایوس ہو جائیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب جہنم کی آگ میں جلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور جو کچھ دنیا میں ہم نے اُمیدیں باندھیں تھیں وہ غلط تھیں تو اس وقت اپنے فرضی معبودوں اور موہومی سفارش کرنے والوں سے اظہارِ بیزاری کریں گے۔ لیکن اس وقت ندامت توبہ اور بیزاری بے سود ہوگی۔ عذابِ الٰہی سامنے ہوگا اور وہ عذاب کے سامنے۔

تحلیل اجزاء اَللّٰہُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ثُمَّ اِلَیْہِ الخ۔ کفار اپنے عقائد کے لحاظ سے چند طبقات و اقسام رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو موجودہ زندگی کو بغیر کسی صانع کے جانتا ہے۔ اس کے نزدیک اس عالم کون کا کوئی خالق نہیں۔ مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ باقی وہ صورتیں جو پے درپے مادہ پر آتی رہتی ہیں اور مادہ ان کا لباس پہنتا رہتا ہے وہ صرف زمانہ کے تغیرات اور خود بخود طبیعت کی رنگینیاں ہیں۔ نہ کوئی باری ہے نہ خالق۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس دورِ حیات اور سلسلۂ ہستی کو ایک خالق مختار کے دستِ تصرف میں جانتا اور مانتا ہے۔ وہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے۔ اسی نے کل عالم کو بنایا اور نیست سے ہست کیا ہے لیکن جب کوئی موجودہ دائرۂ عدم میں داخل ہو جاتا ہے تو بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی تخلیق اور اعادہ ناممکن ہے۔ ریزہ ریزہ اور چورہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پراگندہ اجزاء کو اکٹھا کر کے ہستی کا جامہ پہنانا محال ہے۔ جو گیا وہ گیا پھر لوٹ کر نہیں آسکتا۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو تخلیقِ ثانوی اور اعادۂ حیات کا قائل ہے۔ جزا و سزا کو بھی مانتا ہے۔ مگر دوبارہ سہ بارہ، چوبارہ اور اس سے زیادہ مرتبہ تخلیق کا محور اسی عالم کو قرار دیتا ہے۔ اسی دنیا کو کرم کے چکر کا مرکز بتاتا ہے جنم ضرور بدلتا ہے۔ ترقی اور تنزل بھی ہوتا ہے۔ کرم کا پھل بھی ملتا ہے۔ مگر اس عالم میں۔ زید مر گیا اس کی روح عمر میں داخل ہو کر ظاہر ہوگی یا بکر کا جسم لے گی۔ اس گروہ میں سے کچھ لوگ تو الٹا پلٹی منزل کے دائرہ کو اس قدر وسیع جانتے ہیں کہ انسانی ارواح کو زیریں حیوانات کی شکلوں میں رونما سمجھتے ہیں بلکہ اس سے بھی نیچے نباتاتی اجسام میں حلول کر جانے کے بھی قائل ہیں۔ نسخ فسخ مسخ اور رسخ مختلف نام اسی الٹا پلٹی چکر کے انھوں نے رکھے ہیں۔ بہرحال ان کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ سزا جزا ضرور ہوتی ہے اور انسانی روح اپنے اعمال کے موافق مختلف انسانی یا حیوانی یا نباتی اجسام میں پے درپے اور نوبت بہ نوبت رونما ہوتی رہتی ہے اور آخر کار جب بالکل پاک صاف ہو جائیگی تو قربِ الٰہی میں پہنچ جائے گی اور بیکنٹھ میں داخل ہوگی۔ کفار کے یہ تینوں گروہ حضور اقدس کے زمانہ میں مختلف ممالک میں موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں اور شاید قیامت تک رہیں گے۔ تینوں گروہوں کے عقیدہ کو زائل و باطل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

سب سے پہلے فرمایا اللہ ہی ابتدائی تخلیق فرماتا یعنی یہ عالم خود بخود نہیں بنا کسی بنانے والے نے بنایا ہے۔ خلق کے معنی ہیں اندازہ کرنا۔ ایک خاص اندازہ کے موافق بنانا۔ اس لفظ سے اللہ کے خلاق ہونے کی دلیل کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ جب کائنات کا ایک خاص نظام نوعی اور ضابطۂ فطرت کے زیر حکم چلنا مسلم ہے اور کسی کو اس سے انکار کی مجال نہیں تو پھر کس قدر غلطی ہے کہ تمام عالم کے کروڑ در کروڑ موجودات ایک ہی اندازہ اور نظام کے تحت اتفاقاً اپنی رفتار زندگی کو پورا کرے اور کوئی حلقہ دوسرے حلقہ کے معمول میں دخل انداز نہ ہو اور نہ اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے جو ساری کائنات میں جاری ساری اور کل موجودات کو گھیرے ہوئے ہے۔ عالم ہستی کے ہر فرد اور ہر نوع کا ایک اندازہ کے مطابق چلنا صانع حکیم اور خالق برحق کی ہستی پر دلالت کر رہا ہے۔ بس وہ اللہ ہی ہے جس نے ابتدائی تخلیق فرمائی۔ دوسرے گروہ کے خیال کے استیصال کے لئے فرمایا۔

پھر وہی اللہ اس تخلیق کا اعادہ بھی فرمائے گا۔ یعنی جب کائنات کا وجود اوّل اتفاق اور بے سوچے سمجھے نہیں بلکہ اندازۂ الٰہیہ کے موافق ہے اور اس نے اپنی منشاء کے مطابق اس کو بنایا ہے تو وہ دوبارہ بھی اسی اندازہ کے موافق اس کو بنا سکتا ہے اور بنائے گا۔ کاریگر جب پہلی ہی مرتبہ اندازہ کے موافق برتن بناتا ہے تو دوبارہ بھی اسی مٹی سے اپنے اندازہ کے مطابق بنا سکتا ہے اور بناتا ہے۔ اس میں استحالہ کی کوئی وجہ نہیں رہی۔ اعادۂ حیات کی ضرورت اور تخلیق ثانوی کی وجہ تو تیسرے گروہ کے عقیدہ کو باطل کرنے کے ذیل میں

فرماتا ہے تم سب کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا یعنی تناسخ اور آواگون کا چکر، مسخ فسخ کچھ بھی نہیں۔ جزا سزا برداشت کرنے کے لئے تم سب کو خدا کے پاس جانا ہوگا۔ یہ دنیا دار جزا نہیں
بیت العمل ہے۔ یہاں کی زندگانی زراعت ہے حاصل زراعت دوسری زندگی میں ملے گا۔ اب رہے وہ لوگ جو قیامت کا واقعی اقرار کرتے تھے لیکن محال معتقد تھے اگر وہ ان لئے تمہارا
باطل پرستی کو ضروری قرار دینے کے لئے کہتے تھے کہ قیامت اگر ہوئی تو یہ ہمارے معبود اور دیوتا ہم کو خدا سے سفارش کرکے عذاب سے بچالیں گے قرآن کے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے
لئے فرماتا ہے کہ:۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ۔ جس روز قیامت ہوگی اس روز مجرم اپنی رہائی سے ناامید ہو جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے عقیدہ کی صحت
عمل کی صلاحیت کی جڑ کو کاٹ دیا ہے اُن کے فرضی سفارشی کچھ کام نہ آئیں گے۔ ذخیرہ نجات تو ان کے پاس پہلے ہی سے نہ ہوگا۔ نہ عقیدہ صحیح نہ عمل درست اور سفارشیوں کی سفارش
کا بھروسہ ہوگا سو سفارش کرنے والے یا تو سفارش سے انکار کردیں گے اور (طلبہ بیزاری کریں گے) یا ان میں سفارش کرنے کی قدرت ہی نہ ہوگی۔ بہرحال وہ قیامت کے دن مجرموں کے کام نہ
آئیں گے۔ وہاں بدکیشوں کو مایوس ہونا پڑے گا اور نہ فقط مایوس ہونا پڑے گا بلکہ:۔

وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ۔ اس روز مجرم ان معبودوں کا انکار کردیں گے جن کو اللہ کی الوہیت و ربوبیت میں شریک قرار دیتے تھے کیونکہ اس وقت ان
خیال کی غلطی اور اپنے معبودوں کی مجبوری اور بیکسی ظاہر ہوگی۔ پس:۔

يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ۔ اس روز انسانوں کے دو گروہ ہوں گے۔ مومن نیکوکار اور کافر بدکار۔ جو لوگ اہل ایمان اور نیکوکار ہوں گے وہ تو جنت میں
مسرور ہوں گے اور جو لوگ اللہ کو اللہ کی وحدانیت کو اللہ کے احکام اور پیغمبروں کو اور روز قیامت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں ہی پڑے رہیں گے۔ بِآيَاتِنَا کا لفظ آسمانی کتب
احکام انبیاء ملائکہ وغیرہ سب کو شامل ہے ان میں سے کسی ایک کا منکر کافر ہے۔

قتادہ نے فرمایا ان دونوں فریق میں یہ ایسی جدائی ہوگی کہ اس کے بعد کبھی یکجا نہ ہوں گے کیونکہ کافر تو اسفل السافلین کے عذاب میں رہیں گے اور مومنوں کو خدا
اعلیٰ علیین میں دائمی عیش کے ساتھ رکھے گا شیخ ابوبکر بن طاہر نے فرمایا دنیا میں ہر شخص اپنی سعادت و شقاوت کے درجہ میں جدا جدا ہے مومن سعید ہے اور کافر شقی ہے۔ دونوں کا
جدا جدا ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو اہل سعادت اپنی منزل سعادت یعنی جنت میں چلے جائیں گے اور اہل شقاوت اپنے درجہ شقاوت یعنی جہنم میں ڈالے جائیں گے اہل سعادت
دنیا میں اللہ کے ساتھ تھے۔ آخرت میں بھی اسی کے ساتھ رہیں گے اور اہل کفر کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بناتے تھے اس لئے آخرت میں وہ عطیۂ الٰہی سے الگ ہوں گے۔

مقصود بیان

اول آیت سے تخلیق عالم کی ضرورت اعادۂ حیات پر قدرت اور قیامت کی اصل غرض کی طرف صراحت سے اشارہ کرنا مقصود ہے۔ گویا
قیامت کو برہانی طریقہ سے دوبارہ بیان فرمایا ہے۔ بروز قیامت مجرموں یعنی کافروں کے مایوس ہونے کی صراحت ہے اس سے شفاعت انبیاء
و ملائکہ کے انکار پر استدلال کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ یہ آیت کافروں کے متعلق ہے اور شفعاء سے مراد یہ فرضی معبود ہیں جن کی کفار با امید شفاعت پرستش کیا کرتے تھے۔ ہاں ان کے
کا مفہوم ان مسلم نما کافروں کو ضرور شامل ہے جو جھوٹے پیروں شیطان فقیروں اور فرضی شیطانوں کی پرستش مختلف طور پر کرتے ہیں اور ان سے امید شفاعت رکھتے ہیں
شیخ سدو کے کونڈے کرتا ہے کوئی کسی ولی کے نام کی چوٹی چھوڑتا ہے۔ کوئی کسی کے نام پر بکرا ذبح کرتا ہے۔ یہ سب کے سب فرضی خدا ایسے کافروں سے اظہار بیزاری کریں گے
اور ان کافروں کو اس وقت اپنی غلطی معلوم ہوگی تو انکار کریں گے۔

آیت وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا میں مفعول کا نہ کرنا دلالت کرتا ہے کہ کفر سے کوئی خاص کفر مراد نہیں ہے بلکہ ہر کفر خواہ اللہ کی ہستی کا منکر ہو یا الوہیت کا یا ربوبیت
کا یا وحدانیت کا یا کسی اور صفت کا بہرحال دوامی عذاب میں رہیگا جس طرح کہ اللہ کے ملائکہ انبیاء اور کتابوں کا انکار کرنے والے اور روز قیامت کو نہ ماننے والے دائمی جہنمی ہیں

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

پس　شام و صبح　کے اوقات میں　اور تیسرے پہر　اور ظہر کے وقت　اللہ کی پاکی　بیان کیا کرو　آسمانوں　اور　زمین میں

وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ○ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْ

اسی کو　حمد　زیبا　ہے　وہ جاندار کو　بے جان سے　اور بے جان کو　جاندار سے نکالتا ہے　اور　زمین

الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم

مُردہ ہونے کے بعد اسکو زندہ کرتا ہے اسی طرح تم بھی (قبروں) سے نکالے جاؤگے اُسی کے نشانات قدرت میں سے یہ بات ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر اب

بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا

آدمی ہو کر پھیلے پڑتے ہو اسی کے نشانہائے قدرت سے یہ بات ہے کہ اس نے تمہاری ہی نوع سے تمہاری بیبیوں کو تمہارے سکونِ خاطر کے لئے

إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ

پیدا کیا اور تمہارے آپس میں محبت و ہمدردی پیدا کر دی اس میں غور کرنے والی قوم کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں اُسی کے نشانہائے

خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

قدرت میں آسمانوں کو اور زمین کو بنانا ہے اور تمہاری زبانوں کا اور رنگتوں کا باہمی اختلاف بھی ہے اس میں دانشمندوں کے لئے بڑی

لِّلْعَالِمِينَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُم مِّن فَضْلِهِ ۚ إِنَّ فِي

نشانیاں ہیں اُسی کے نشانہائے قدرت میں سے رات و دن میں تمہارا سونا اور فضلِ خدا (روزی) کو تلاش کرنا ہے اس میں بھی

ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ

سننے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں اسی کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ خوف و امید کے لئے تم کو بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے پانی

السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○ وَمِنْ

اُتار کر اس سے مُردہ ہونے کے بعد زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس میں بھی سمجھدار قوم کے لئے نشانیاں ہیں اُسی کی

آيَاتِهِ أَن تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ۚ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنتُمْ تَخْرُجُونَ ○

نشانیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ آسمان و زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جس وقت وہ تم کو ایک بار بلائے گا تم فوراً زمین سے نکل پڑو گے

تفسیر

تسبیح سے کیا مراد ہے؟ کیا پنجگانہ نماز خصوصیت کے ساتھ مراد ہے یا فقط حمد و ثناء اور تہلیل و تمجید۔ یہ تنقیح تحلیلِ اجزاء کے ذیل میں کی جائیگی۔ ہمارا تفسیری منشاء اس تعیین و تنقیح کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں تسبیح سے صرف اللہ کی پاکی بیان کرنا دل سے اس کی نزہت و تقدس کو ماننا زبان سے اس کے بدائع کمالات اور بری از عیب ہونے کا اقرار کرنا اور اعضاء و جوارح سے اس عقیدہ اور اقرار کا مظاہرہ کرنا بھی مراد ہے اور اسی تسبیح کے لئے اوقاتِ خمسہ کی تعیین آیت متذکرہ میں کی گئی ہے۔ آیات کا مغز اور تعیین اوقات کا اصل گر ذیل کا تفسیری مقالہ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔

یوں تو ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ انقلاب و موت کی تعبیر ہے۔ ہر پھل کی ہر رگ اور ہر کانٹے کی ہر نوک بلند آواز سے تغیر و فنا کی دعوت دے رہی ہے جس کا کچھ مختصر تذکرہ آئندہ آیات میں بھی آتا ہے لیکن مندرجۂ بالا آیات میں رب العالمین نے سب سے پہلے (۱) تغیرِ اوقات اور انقلابِ ساعات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے مقررہ اوقات میں نماز یا مطلق تسبیح کا حکم دیا ہے اور یہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ ان اوقات میں زمین و آسمان میں اللہ کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں پھر (۲) بے جان سے جاندار کی پیدائش اور جاندار

سے بے جان کی آفرینش کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد زمین کو سرسبز فرماکر حیات تازہ بخشنے کی مراحت کی ہے۔ غرض تغیر اوقات تبادل احیاء و اموات اور احیاء ارض سے آخر میں انسان کے اعادۂ حیات اور قیامت پر استدلال فرمایا ہے۔ ہم ترتیب وار ہر ایک ٹکڑے کی تشریح ذرا بسط سے کرنی چاہتے ہیں۔

(۱) تغیر اوقات اور تبدیل حالات سے جسمانی تبدیلیاں ناقابل انکار ہیں۔ اسی طرح تغیر اوقات کے ساتھ انسان پر روحانی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ تغیر وقتی کا اثر انسان کے جسم پر بھی پڑتا ہے اور اس کی روحانیت بھی مخصوص طور پر اثر پذیری سے محفوظ نہیں رہ سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ ہر لمحہ انسان تغیری دور سے گزر رہا ہے۔ اس کی جسمانی اور روحانی حالت ہر آن نئی ہے۔ لیکن عظیم الشان نمایاں تغیرات صرف پانچ اوقات میں نمودار ہوتے ہیں جن کو تمثیل دے کر ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

وقتِ ظہر کی تعین

جس وقت تم کو اطلاع ملتی ہے کہ تم پر کوئی مصیبت یا بلا آنے والی ہے۔ مثلاً عدالت سے وارنٹ جاری ہونے والا ہے، کوئی مالی خسارہ یا نقصان ہونے والا ہے تو تم فوراً پریشان ہو جاتے ہو اور چاہتے ہو کہ کسی نہ کسی طرح یہ بلا سر سے ٹل جائے۔ انسان کی یہ حالت ابتداءِ زوال کے مشابہ ہے اس سے خوشی کے زوال پر استدلال کیا جاتا ہے۔ آفتاب انتہائے ترقی پر پہنچ کر آہستہ آہستہ انحطاط کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ دن کی ترقی ختم ہو کر گرم روی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی زوال کے آغاز کا وقت بھی ہوتا ہے اور اضطراب کا بھی۔ رگوں میں خون کا چکر تیز ہو کر دماغ میں گردش اور حرارت میں ابھار ہونے لگتا ہے اور دل میں سکون کی جگہ قلق اور راحت کی جگہ بے چینی اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تکلیف کو زائل کرنے کے لئے ظہر کے وقت تسبیح کرنی ضروری قرار پائی تاکہ جس کے قبضہ میں آفتاب کا زوال جسم کا انحلال اور روح کا ملال ہے اس کی قدرت کو یاد کر کے اسی کی طرف توجہ کی جائے۔ اس وقت آسمانوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں عالم مادی کے عناصر ترکیبی انتہائی تحلیل پر ہوتے ہیں۔ رونگٹے رونگٹے کی جڑ اور مسام مسام کا دروازہ وا ہوتا ہے۔ ہر رگ گل ہر نوک خار ہر بن مو ہر ذرۂ ریگ ہر قطرۂ سمندر اور شعاع آفتاب تغیر فطرت کی زبان ہو کر اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور جہاں پیا الوہیت کے گیت گاتی ہے۔ پس انسان کا بھی فرض ہے کہ عالم کے تغیرات کو دیکھ کر فطرتِ جہاں کے اقتضا کو پورا کرے اور ہر نقص و عیب سے اللہ پاک کا اقرار کرتے ہوئے اس حالت اضطرار کے ختم ہو جانے کی دعا کرے۔

وقتِ عصر کی تعین

یہ حالت اور اضطرابی تغیر تو اس وقت ہوتا ہے جب وارنٹ جاری ہونے کی تم کو اطلاع ملتی ہے گویا وہ زوالِ آفتاب کا وقت ہوتا ہے جب مصیبت قریب الوقوع ہوتی ہے اور تم گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے دست و پا بستہ اور دل گرفتہ پہنچا دیے جاتے ہو۔ اس وقت خوف کی وجہ سے تمہارا خون خشک اور تسکین و اطمینان کا نور تمہاری صورت سے رخصت ہونے لگتا ہے۔ اس حالت کو سورج کی اس حالت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جبکہ آفتاب کا نور کم ہونے لگتا ہے اس پر نظر جم سکتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ آفتاب اب قریب غروب ہے۔ یہ وقت بھی عالم میں عظیم الشان تغیر پیدا ہونے کا ہوتا ہے۔ ایک طرف کو روشنی بھاگتی ہے اور دوسری جانب سے تاریکی بڑھتی آتی ہے۔ کچھ دنیا سیاہ اور کچھ سفید نظر آتی ہے۔ روئے زمین پر کسی قدر تاریکی اور فضا میں کچھ روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہی حالت اور ایسے وقت میں کائنات مادیہ کا وہ گروہ جو حرارتِ آفتاب کے سبب پژمردہ افسردہ خوابیدہ اور مردہ تھا پھر چیتی بیداری اور زندگی کی کروٹ لیتا ہے۔ ستارے مہتاب اور دریائی موجودات سمٹ کر ترجیح پا کر تیر و کرن سے سر نکال کر اپنی گل گشت کرنے اور جلوہ ریز ہونے کا میدان تلاش کرنے لگتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی نیم مردہ پتیاں نازک انگڑائیاں لے کر زندگی کی انگڑائی لیتی ہیں۔ غرض آفتابی دنیا کی موت اور سیال دنیا کی بے حسی و جمود کا وقت قریب آتا جاتا ہے اور کائنات باہم آویزش اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے اور ظلمت و نور کی جنگ کا ایک تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اس سے انسان کو اپنے کمال کے زوال اور ہستی پر نیستی طاری ہونے اور وجود کی بساط پر شاہِ عدم کی لشکر کشی کرنے کا یقین کرنا چاہیے اور اس جسمانی بے چینی اور روحانی اضطراب کو دور کرنے کے لئے اس رب کائنات کی عظمت تقدس الوہیت اور قدرت کا علمی زبانی اور عملی اقرار کرنا چاہیے جو ہر تغیر سے پاک اور ہر تبدل سے مبرا ہے اسی مالک رحمٰن کی طرف خلوص کے ساتھ توجہ کی جائے جس کی رحمت کا ایک چھینٹا زوال و وبال کی اس کثافت کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

وقتِ مغرب کی تعین

تمہاری حالت میں تیسرا تغیر اس وقت ہوتا ہے جب مصیبت سے رہائی پانے کی امید بالکل منقطع ہو جاتی ہے۔ فرد قرار داد جرم لگ جاتی ہے۔ ثبوت کے گواہ تمہاری سزا کے لئے سنا دیے جاتے ہیں اور جرم ثابت ہو جاتا ہے اس وقت تمہاری حالت بہت ابتر انتہا کی ہوتی ہے۔ اوسان خطا ہو جاتے ہیں رگ رگ کے خون میں پریشانی چکر لگانے لگتی ہے آنکھوں سے اشک خونیں اور بدن سے عرق انفعال بہنے لگتا ہے۔ یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ دن کی روشنی کی تمام ہو سکنے والی امیدیں ختم ہو جاتی ہیں اور سرا کی تاریکی چھا جانے کا یقین ہو جاتا ہے۔ عالم میں بھی اس وقت عجیب انقلاب ہوتا ہے۔ بیدار مخلوق آشیانۂ خواب کی طرف دوڑتی ہے۔ ملکۂ شب اپنے پورے جاہ و جلال اور موکب کواکب کو ساتھ لے کر دن کی نورانی چھاؤنی پر شب خون مارتی ہے۔ ادھر آفتاب کے غروب ہوتے ہی مردہ ستارے اور سیارے روحِ حیات کی پھریری لے کر بر سر بام آ جاتے ہیں۔ پھدکتے کیڑے، چہچہاتی چڑیاں اور شور و غل مچانے والی کائنات اپنے

راحت کدوں میں رو پوش ہو جاتی اور دکھوں کی نیند سونے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ غرض ایسا عظیم الشان انقلاب بپا ہوتا ہے جس سے موجودات کا کوئی فرد واحد کوئی شخص اور کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی۔ اس اندوہناک حالت کی اندوہناکی اور اس الم انگیز انقلاب کی غم انگیزی دور کرنے کے لئے مالکِ انقلاب اور قادرِ کائنات کی طرف انتہائی سچائی اور پاکیزگیٔ باطنی کے ساتھ رجوع کرنا لازم ہے اور ہر زوال و فنا کے داغ دھبے سے اس کے پاک اور امن ہونے کا یقین کرنا ضروری ہے۔

وقتِ عشاء کی تعیین

جو تغیر تم پر اس وقت آتا ہے جبکہ مصیبت تم پر طاری ہو جاتی ہے اور بلا کی تاریکی تمہارا احاطہ کر لیتی ہے فردِ قرار داد جرم اور ثبوتِ شہادتوں کے بموجب تم کو سزا کا حکم سنا دیا جاتا ہے اور قید کے لئے تم کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور جیل بھیجنے کے لئے تم روانہ کر دیئے جاتے ہو۔ اس وقت مایوسی کی گھٹا ٹوپ اندھیری تم کو گھیر لیتی ہے۔ ناامیدی کے کالے بادل اُمنڈ کر تم پر چھا جاتے ہیں اور تم کو اپنی آغوشِ آہنی میں پکڑ لیتے ہیں۔ انسان کی یہ حالت اس وقت کے مشابہ ہوتی ہے جبکہ سورج کے طلوع ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی اور تاریکی دور ہونے کا کوئی آسرا نہیں رہتا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا رہتا ہے حرکت اور تندی کی ہر لہر سکون و ظلمت کی آغوش میں سو جاتی اور عدم کے ساحل سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہے۔ ہر آواز اور ہر لے فضا کی خاموش تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ ہر جاندار و ہر نامی خوابیدہ افسردہ اور نیم مردہ ہو جاتا ہے۔ اس روحانی تکلیف اور جسمانی الم کو دور کرنے کی دعا مجیب الدعا سے کرنی اور بلیات و مصائب کی زنجیروں کو توڑنے کی اس سے درخواست کرنی بہت ضروری ہے تاکہ اس تاریکی کی قید اور زوال کی جیل سے رہائی کی اُمید ہو سکے۔

وقتِ فجر کی تعیین

پانچواں تغیر تم پر اُس وقت آتا ہے جب تم ایک رات تک مقید رہنے کے بعد نیک چلنی کی رہائی مجرا کر کے جیل سے خلاص ہوتے ہو اور پھر اطمینان کے ساتھ خوشی اور مسرت سے ہمکنار ہوتے ہو اور دوبارہ اپنے دوستوں عزیزوں اور بہی خواہوں سے ملتے ہو۔ اس حالت کو اس وقت سے مشابہ کہا جاسکتا ہے جبکہ سویا ہوا عالم پھر جاگ اُٹھتا ہے آفتاب عالمتاب اپنی تمام رعنائیوں اور دل آویزیوں کے ساتھ افق سے نمودار ہونے لگتا ہے چرندے پرندے اور درندے اپنے مرقد اور مدفن سے باہر نکلتے ہیں اور پھر کائنات میں زندگی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کو بھی تاریکی کی جیل سے نجات ملتی ہے اور صبح کھل آتی ہے اور پھر گزشتہ دن کی طرح روشنی اپنی اصلی چمک کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کو دوبارہ زندگی عطا ہوتی ہے۔ اس حیاتِ ثانوی کا شکریہ ادا کرنا اور حیات بخشنے والے قادرِ مطلق کی پاکی بیان کرنا انسان کا فرض ہے۔

اگر تسبیح سے مراد صرف تحمید تہلیل اور تقدیس ہو تو اس کے اوقاتِ خمسہ کی تعیین اور فلسفۂ تعیین ظاہر کرنے کے لئے مذکورۂ بالا تقریر کافی ہے لیکن اگر خصوصیت کے ساتھ نماز ہی مراد ہو تو چونکہ نماز کے ظاہری اجزائے ترکیبی چار ہیں۔ قیام، قعود، رکوع اور سجود کے فوائد بیان کرنے بھی مناسب ہیں تاکہ اوقاتِ خمسہ میں خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے کی حقیقت پر روشنی پڑ سکے۔

قیام کیا ہے

جب انسان فروتنی اور عاجزی کے ساتھ خاص خدا کے لئے نماز کو کھڑا ہوتا ہے تو اس سے پوری نیاز اور کامل احتیاج کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ حضور و شہود کے غلبے میں محو ہو کر اپنے ظاہری اور باطنی قیام کو اس کی طرف سے ہی خیال کرتا ہے۔ اپنے خیالات خواہشات بلکہ اپنی ہستی کے تصور سے خالی ہو کر اللہ کی توحید میں ڈوب جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ مرتبہ قرب اور حالتِ مشاہدہ حاصل نہیں ہوتی تو پھر جہادِ نفسانی کرتا ہے نفسانی نیتوں اور حیوانی جذبات کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا کی حمد و ثنا میں دست بستہ ہو جاتا ہے۔ جب عروج کا یہ مرتبہ میسر آجاتا ہے تو خدا کی رحمت چاروں طرف سے محیط نظر آتی ہے اور روحانی ترقیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس خاکی کالبد کو بھی نظر کشفی سے اونچے اونچے مراتب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ فوراً ازل کی جلوہ پاشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ چہرہ روح اور صورت خاکی دونوں جگمگا جاتے ہیں۔ بالآخر گناہوں کی کثافت اور نافرمانیوں کی تاریکیوں سے قلبی نفرت ہو جاتی ہے۔

قعدہ کیا ہے

قعدہ میں نمازی کے دل میں سکون اور تمکین پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کے حضور و شہود سے دل کو راحت و تسکین ملتی ہے۔ نہایت مؤدب بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کرنے سے نفس میں وقار اور کامل بردباری پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام احوال کے تغیرات سے نکل کر صرف تنزیہ باری تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے لگتا ہے۔ تمام دنیا کی ہوسناکیوں اور ہوا پرستیوں سے دل بیٹھ جاتا ہے۔ مالِ حرام اور ایذا رسانی سے ہاتھ رک جاتا ہے۔ گناہ کی چال اور نافرمانیوں کے قیام سے پاؤں سمٹ کر بند ہو جاتے ہیں نامحرم پر نظر بد پڑنے سے آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ فضول لکواس غیبت اور جھوٹ سے زبان بند ہو کر خدائے قدوس کے شکر و ثنا میں جاری ہو جاتی ہے۔

رکوع کیا ہے

جب انسان نماز کے اندر حکمِ الٰہی کی تعمیل میں بیٹھ کر جھکاتا ہے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سامنے پست کرتا ہے تو تمام مخلوقات کی عظمت اس کے دل سے دور ہو جاتی ہے۔ تمام فرشتوں اور آسمانوں کو عبادتِ الٰہی میں جھکا ہوا سمجھ کر جب وہ اپنے آپ کو بھی ان کے ساتھ شریک کر دیتا ہے تو دنیا کے

باجبروت سرکش بادشاہوں، نخوت پرست مغرور حسینوں اور جاہ وجلال والے امیروں کو عظمتِ الٰہی کے سامنے ہیچ سمجھتا ہے۔ اس کا نفس سرکش کتنا ہی غرور اور سرتابی کرنا چاہے اور دنیا کی رنگینیاں اور دلفریبیاں کتنی ہی اس کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہیں مگر وہ خدا کے سامنے اپنی پشت دوکر کر جھکاتا ہے (جس کو رکوع کہا جاتا ہے) اور اس کی اس عملی زبان کے ہر بنِ مو سے صدا نکلتی ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ ؕ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ صرف یہ کہ جاہ دولت کا حسن زوال پذیر حکومت اور مغرور امارت سے اس کا دل بیزار ہو جاتا ہے پرکاہ کی برابر دنیا کی وقعت اس کے دل میں باقی نہیں رہتی اور بالآخر وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا۔

سجدہ کیا ہے

جب نمازی سجدہ کرتا ہے تو گویا معشوقِ ازلی کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ اپنی پر نخوت بھری پیشانی اور تکبر آلود ناک رگڑتا ہے اور دیر تک رگڑتا رہتا ہے۔

عظمتِ الٰہی میں فنا ہو جاتا ہے۔ خدائی جبروت کے سامنے اپنے تن اور من کو عاجزی کی زمین پر دے پٹکتا ہے اور خوب سمجھ لیتا ہے کہ یہ شاندار فلک بوس عمارتیں یہ ریشمی نرم اور نازک پوشاک یہ رستمانہ جسمانی طاقت یہ چمکدار نظر فریب حسنِ یوسفی یہ سکندری تخت وتاج اور یہ جمشیدی جاہ وجلال اس خاک میں ملنے والا ہے۔ پس وہ غرور کو سر سے اتار کر زمین پر ذلت وحقارت کے ساتھ ڈال دیتا ہے اور کبریائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے روح کی زبان سے کہنے لگتا ہے۔ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى۔

ایسی نماز کی پابندی جب مذکورہ بالا اوقات میں کی جاتی ہے تو نمازی کا دل دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ کی عظمت محبت الوہیت اور وحدانیت کی روشنی اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور تجلیاتِ الٰہیہ کا ظہور اس روح پر ہونے لگتا ہے۔

اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ اوقات کا تغیر کس طرح بعثِ ثانیہ اور حیات بعد الممات پر دلالت کرتا ہے تو اہلِ بصیرت کے لئے اس کا سمجھنا بالکل آسان ہے۔ تغیر کے معنی ہیں ایک حالت پر برقرار نہ ہونا ایک کیفیت کا قائم نہ رہنا اور صورت ہیئت مقدار مساحت غرض اعراض وجواہر کا بدلا رہنا اوقات کا تغیر اور زمانہ کا تبدل ہر چیز کی عرضی اور جوہری حالت پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ زمانہ مقدارِ حرکت ہے۔ زمانہ کی رنگینی حرکت میں تغیر پیدا کرتی ہے اور چونکہ کائنات میں کوئی چیز حرکت (کمی ہو یا کیفی یا اینی یا وضعی) سے خالی نہیں اس لئے وقت کا تغیر ہر چیز کی حالت کو ضرور بدلتا ہے۔ تغیر میں دو حالتیں ہیں۔ ایک کا زوال دوسری حالت کا حدوث ایک کا فنا دوسری کا ظہور گویا تغیرِ اوقات کے سبب ہر چیز فنا وحدوث اور موت وحیات کی کشاکش میں ہے۔ ہر حالت کا بدلنا گویا موت ہے اور نئی حالت کا پیدا ہونا گویا حیات ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب عالم کا ذرہ ذرہ موت حیات کی کشاکش میں مشغول ہے اور لاتعداد موتیں اور ان گنت زندگیاں دوش بدوش چلی جا رہی ہیں تو کیا وجہ کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ نہ ہو۔ آخر انسان کی موت بھی ایک فطری تغیر ہی ہے اور جب تمام کائنات فطری تغیر کے چکر سے خارج نہیں تو انسان کس طرح اس قانون سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے اور جب ہر زوال فنا اور موت کے بعد بھی اعادۂ حیات ضروری ہے تو انسانی موت کے بعد بھی اعادۂ حیات سے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ پس جس طرح ہر وقت ہر ساعت ہر لمحہ اور ہر ثانیہ کے بعد دوسرے وقت دوسری ساعت دوسرے لمحہ اور دوسرے ثانیہ کا آنا ضروری ہے اسی طرح انسان کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی لازم ہے۔ جب اللہ کو تبدیلِ اوقات اور زمانی موت وحیات کے تسلسل سے کوئی چیز نہیں روک سکتی تو انسان کے اعادۂ حیات اور بعثِ ثانیہ سے کس طرح روک سکتی ہے۔

(۲) بے جان کا جاندار سے اور جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا پہلے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ نطفہ کیا چیز ہے اور نطفہ سے کوئی انسان یا حیوان کیسے پیدا ہوتا ہے بلکہ اگر حیات کے معنی کی توسیع کر لی جائے اور نباتات کو بھی زندہ اجسام کی فہرست میں داخل کر لیا جائے تو پھر تخم سے سبزہ کے پیدا ہونے اور سبزہ سے تخم کے ظاہر ہونے پر بھی نظر غائر ڈالنی پڑے گی۔ یہ پروردگارِ عالم اور خلاقِ کائنات کا عجیب صنعت خانہ ہے جس کی ماہیت دریافت کرنے میں بڑے بڑے اہلِ بصیرت کی حیران عقلیں بیکار ہیں۔ یہ وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس کا اور چھور کہیں نہیں ملتا جس قدر غور کیا جائے اتنا ہی رازہائے سربستہ پردہ کا انکشاف ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر بھی کہ جو موجب نظر ہے اور قابلِ فکر ہے یہ امر کہ ہر حصہ جسم کا جو تعلق عام بدن سے ہے وہی تعلق نوع کا باقی سلسلۂ انواع سے ہے۔ کوئی انسان یا حیوان کیسے زندہ رہتا ہے باوجودیکہ ہر وقت اس کے بدنی اجزاء میں تحلیل ہوتی رہتی ہے پھر کیوں یہ بہت جلد فنا نہیں ہو جاتا اور کس طرح اس کے نطفہ سے دوسرا بدن بنتا ہے اور دوسرا بدن پہلے بدن کے کیسے مشابہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص زندہ رہنے کا خواستگار ہوتا ہے یا یوں کہو کہ فطرت کی طرف سے زندہ رہنے پر مجبور ہوتا ہے تو نباتی لحمی شحمی معدنی اور دوسری قسم کی غذا کو حاصل کر کے اپنے بدن میں داخل کرتا ہے۔ صناعِ مطلق نے ہر شخص کی مری اور معدہ میں ایک قوتِ جاذبہ پیدا کی ہے۔ اسی طرح حلق معدہ اور اندرونی احشاء میں قوتِ دافعہ بھی موجود ہے۔ جب کوئی غذائی لقمہ منہ میں جاتا ہے تو منہ کی قوتِ دافعہ اس کو اندر کی طرف دفع کرتی ہے اور کھینچنے والی طاقت اندر سے کھینچتی ہے اس طرح لقمہ معدہ میں پہنچ جاتا ہے۔ معدہ میں پہنچ کر غذا کچھ دیر رکتی ہے۔ کیونکہ وہاں روکنے والی

قوت (ماسکہ) موجود ہے پھر معدہ کی پکانے والی قوت (ہاضمہ) اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور ایک قوامی مادہ تیار کرتی ہے جس کا رنگ عموماً وہی ہوتا ہے جو اصل غذا کا ہوتا ہے۔ البتہ بو اور قوام میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد معدے کی قوت دافعہ فضلات کو آنتوں کی طرف اور عمدہ حصہ کو جگر کی طرف پھینک دیتی ہے۔ پھر آنتیں بھی فضلات میں سے کچھ قابل تغذیہ اجزاء کو چھانٹ کر جگر کی طرف روانہ کر دیتی ہیں۔ جگر میں بھی وہ تمام قوتیں موجود ہیں۔ یہاں پہنچ کر اس غذائی قوام میں پھر ہضم ہوتا ہے اور چار اخلاط یعنی چار قسم کا مادہ بنتا ہے۔ ہر حصہ کا رنگ بو مزہ قوام اور خاصہ جدا جدا ہوتا ہے۔ پت، خون، بلغم اور سودا یہ چاروں اخلاط جگر ہی میں بنتے ہیں۔ یہاں سے ہر خلط کو اس کے مخزن (اسٹور) یا گودام کر بھیج دیا جاتا ہے تاکہ بقدر ضرورت مختلف اجزاء جسم کو تقسیم کیا جا سکے یا ان اجزاء میں سے قدرے قدرے حصہ ہر حصۂ بدن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ جتنے اجزائے بدن تحلیل ہو جاتے ہیں اتنے یا ان سے کم و بیش اجزاء بھی چاروں بدن کے لئے مہیا کر دیتے ہیں۔ جب یہ چاروں آتے مختلف اجزائے بدن میں پہنچتے ہیں تو وہاں پہنچ کر پھر ان میں ہضم اور شکست و ریخت ہوتی ہے۔ رنگ قوام اور مزہ بو اور شکل میں تبدیلی ہوتی ہے۔ رقت دور ہو کر غلظت پیدا ہوتی ہے انگلی میں پہنچ کر انگلی کی شکل، دانت میں پہنچ کر دانت کی شکل، غرض یہ کہ ہر حصہ میں پہنچ کر اسی کی شکل کو یہ مادہ اختیار کر لیتا ہے ہڈی گوشت پٹھا شریانیں ورید کھال بال اور ہر جز اسی طرح تیار ہوتا ہے اور سابق فرق بھی قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد ہر ناخن کی نوک، ہر بال کی جڑ، ہر کھال کے جال بلکہ سر کی چوٹی سے لے کر انگشت پا کے آخری سرے تک ہر جزء سے ایک لطیف جوہر، ایک عمدہ رطوبت، ایک اعلیٰ خلاصہ کھنچ کر آتا ہے۔ اس جوہر میں انسانی بدن کے ہر حصہ کا ایک جزء ضرور شامل ہوتا ہے۔ یہی جوہر منوی ہے جس بدن میں یہ جوہر پیدا ہوتا ہے اس بدن کی تربیت تو اس جوہر سے ہوتی ہی ہے اس تربیت کے علاوہ اس میں ایسی قابلیت بھی ہوتی ہے کہ جس بدن سے کھنچ کر آیا ہے اسی بدن کی طرح دوسرا بدن بنا سکے اور چونکہ بدن کے ہر حصہ سے کھنچ کر یہ جوہر آتا ہے اس لئے اس میں تمام اس بدن کے خواص تمام کیفیات تمام حالات اور تمام عوارض موجود ہوتے ہیں گویا یہ جوہر درحقیقت وہی بدن ہوتا ہے لیکن مجمل اور بالقوہ۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جس بدن سے کھنچ کر آتا ہے وہ بدن جاندار ہوتا ہے اور یہ جوہر بے جان ہوتا ہے اسی جوہر بے جان کو نطفہ کہا جاتا ہے۔ جب نطفہ رحم مادر میں پہنچتا ہے تو رحم کی قوت مصورہ اس میں بالفعل شکل پیدا کر دیتی ہے اور جو چیز پہلے بالقوہ تھی اب بالفعل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ زید کا نطفہ اس کے بدن کے ہر حصے سے کھنچ کر بنتا ہے جس طرح کسی چیز کا عطر ہوتا ہے اور اس چیز کی پوری خاصیت اور ساری کیفیت عطر میں ہوتی ہے اسی طرح زید کے نطفہ میں زید کی تمام جسمانی اور اس کی کیفیات موجود ہوتی ہیں۔ اس نطفہ سے جو انسان بنتا ہے اس میں زید کی جسمانی ساخت رنگ شکل مزاجی افتاد اور خواص موجود ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ پس ایک جاندار سے بے جان نطفہ کی ایسی تخلیق کہ اس جاندار کی تمام کیفیات کمیات عرضیات اور ذاتیات اس میں موجود ہوں کس قدر تعجب خیز ہے۔ پھر یہی نطفہ جب رحم مادر میں پہنچ کر پرورش پاتا ہے اور قدرت کی طرف سے اس پر فیضان ہوتا ہے تو نطفہ کا جو جز زید کے بدن کے جس جز سے کھنچ کر آیا ہے اس سے وہی عضو بنتا ہے۔ مثلاً ناخن سے کھنچ کر جو جز آیا تھا اس سے ناخن بنتا ہے ٹانگ کے پورے سے جو جز کھنچ کر آیا تھا اس سے پورا بنتا ہے۔ کلائی، کہنی، مونڈھا، شانہ، بازو، بانہہ، سینہ کی پسلی، پشت کی پسلی ہر جگہ کے مختلف عضلات، اعصاب، عروق، دل، جگر، معدہ، آنتیں دماغ، پھیپھڑہ غرض جس عضو اور عضو کے جس مقام سے جو جز کھنچ کر آیا تھا اس سے اسی عضو اور اسی چیز کی تخلیق ہوتی ہے اور جب تمام جسمانی نظام اور اعضاء کی ساخت درست ہو جاتی ہے تو روح عالم اس پر پرتو ڈالتی ہے اور جیتا جاگتا ہوا انسان یا حرکت اور حس رکھنے والا حیوان تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نطفہ کی کارگزاری اور تاثیر یونہی ختم نہیں ہو جاتی اور اسی حد پر اس کی انتہا نہیں ہوتی بلکہ جو انسان یا حیوان پیدا ہوتا ہے اس میں نطفہ کی بھی پوری صلاحیت ہوتی ہے اور جس طرح باپ کے بدن سے اس کی تخلیق ہوئی تھی اسی طرح اس میں دوسرے بدن کو بنانے کی ساری قابلیتیں موجود ہوتی ہیں۔ پہلے جاندار ہی کر اسی قسم کے بے جان کی پیداوار ہوتی ہے اور اس طرح نوعی سلسلہ باقی رہتا ہے۔ سچ ہے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۔ یہ تو حیوانی اور انسانی نطفہ کے احوال کا بیان تھا۔ نباتات اور تخم نباتات کی بھی بعینہٖ یہی کیفیت اور حالت ہوتی ہے۔ مٹی پانی اور ہوا سے اجزائے غذائی کو جذب کرنا ایک وقت خاص تک روکنا ہضم کرنا فضلات کو دفع کرنا باہر پھینک دینا، اور عمدہ حصہ کو باقی رکھنا، اس کا رنگ شکل اور قوام بدلنا پھر اس سے ہر رگ و ریشہ ہر نوک خار، ہر جڑ، ہر سونتا، ہر ٹہنی، ہر شاخ، ہر تنہ، ہر پھل اور ہر پھول کا تیار کرنا اور پھر اس میں وہی تخم پیدا ہونا جس تخم سے یہ درخت تیار ہوا تھا اور اس تخم کے تمام خواص و کیفیات کا ظاہر ہونا یہ سب کچھ تخم بے جان سے ہوتا ہے اور جاندار درخت ہو جاتا ہے تو اس سے ہزاروں بے جان تخموں کی پیدائش بھی اسی ضابطہ کے تحت ہوتی ہے۔

ہم نے یہ بہت ہی مجمل اور مختصر تذکرہ کیا ہے۔ تفصیل کے لئے بسیط ترین مجلدات کی ضرورت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب ہر لمحہ اور ہر سکنڈ میں لاتعداد بے جانوں سے ان گنت اور غیر محدود جاندار پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح غیر محصور جانداروں سے

ناقابلِ شمار بے جان بن رہے ہیں اور تغیر انقلاب تخلیق اور اعادۂ حیات کا یہ لا محدود سلسلہ بغیر انقطاع کے جاری ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان کو دوبارہ نہ پیدا کیا جاسکے اور کیوں بعثتِ ثانیہ نہ ہو جبکہ عالمِ مادی کا ذرہ ذرہ بلند آواز سے عدم از وجود اور وجود از عدم کی شہادت دے رہا ہے۔

(۳) زمین کے مر جانے کے بعد اللہ اس کو پھر زندہ کرتا ہے۔ زندگی اور موت کیا چیز ہے کیا زمین بھی مرتی اور زندہ ہوتی ہے۔ کیا موت اور زندگی صرف جانداروں کے لئے مخصوص نہیں ہے بے جان عناصر میں بھی یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اگر زمین مرتی اور زندہ ہوتی ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان سوالات کا حل بہت ہی تفصیل طلب ہے۔ بڑے بڑے فلاسفروں، حکیموں اور بصیرت رکھنے والے دانشمندوں نے اس کے متعلق طویل ترین تنقیحات اور معرکۃ الآرا مباحث لکھے ہیں اور بہت کچھ کاوش کی ہے لیکن اجماعی طور پر کسی بحث کو طے نہ کر سکے اور نہ یہ چیزیں انسانی دماغوں سے طے کی جانے کے قابل ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور عموماً علمائے اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ زمین کی زندگی اس کی روئیدگی سبزہ پوشی اور بالیدگی ہے اور اس کی موت سبزہ کا مرجھانا، سوکھ جانا اور چٹیل میدان بن جانا ہے لیکن کیا یہ حیات و موت واقعی ہوتی ہے یا صرف تعبیری۔ کیا زمین پر حیات و موت کا اطلاق حقیقی ہے یا مجازی۔ اس کے متعلق بڑے بڑے علماء کا خیال صرف یہ رہا ہے کہ زمین اور زمین ایسی کل بے جان مخلوق پر موت و حیات کا اطلاق مجازی ہے۔ لیکن آیت مذکورہ اس قول سے انکار کر رہی ہے کیونکہ آیت میں زمین کی موت و حیات سے انسان کی بعثتِ ثانیہ پر استدلال کیا ہے اور بعثتِ ثانیہ واقعی حقیقی ہوگی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان صفات کا اطلاق زمین پر مجازاً ہو۔ زمین کی مجازی اور تعبیری موت و حیات سے حقیقی حیات پر استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جب زمین واقع میں نہ مرتی ہے نہ جیتی ہے صرف سبزہ پوش اور خشک ہو جاتی ہے اور سبزی اور خشکی کو بلیغانہ طرزِ ادا کے ساتھ جب ظاہر کیا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ زمین مرتی اور جیتی ہے واقع میں زمین پر موت آتی ہے نہ حیات تو ایسی صورت میں اس زندگی پر استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے جو حقیقی ہے واقعی ہے تاہم لوازمِ حیات اور خواص زندگی اس میں کامل ترین صورت کے ساتھ موجود ہیں۔ کیا یہ کمزور سے قوی اور بے جان سے جاندار پر استدلال نہیں ہوا۔ اگر خدا تعالیٰ زمین کو مجازی طور پر زندہ کر دیتا ہے تو گویا سچ مچ زندہ نہیں کرتا۔ صرف سمجھانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے زمین کو زندہ کر دیا۔ اگرچہ زمین میں لوازمِ حیات پیدا نہیں ہوتے اور زندگی کے واقعی خواص سے زمین خالی رہتی ہے تو کیا ضروری ہے کہ انسان کو واقعی زندگی عطا کر دے جس میں زندگی کے تمام خصوصیات موجود ہوں۔ کیا اگر بچے کسی بادشاہ کے دربار کی نقل کر لیں تو واقعی طور پر شوکت دربار والا بادشاہ بن جاتا اُن کے قبضہ میں ہو جاتا ہے۔ کیا اگر مجازی شیر یعنی بہادر انسان کو کوئی زیر کرلے تو ضروری قرار پاتا ہے کہ وہ واقعی شیر پر بھی غالب آجائے۔ یہ صرف دھوکہ اور طفل تسلی ہے۔ علماء کو یہ دھوکا کیونکر ہوا اور وہ کیوں اس فریب نفس کا شکار ہوئے صرف اس وجہ سے کہ غیر مسلم فلاسفروں نے موت و حیات کی جو تعریفیں کی تھیں اور جو اصطلاحات قائم کر دی تھیں ان کو حرف بحرف ان علماء نے مان لیا اور صحیح تسلیم کر لیا اور جب ان مسلمات کا اسلامی تصریحات سے تعارض ہوا تو بجائے اس کے کہ اپنے مسلمات کو غلط قرار دیں اسلامی تصریحات میں خود بُرد اور تاویلیں کرنے لگے۔ اکثر علماء نے حیات کے لئے ارادہ ادراک اور شعور کو لازم قرار دیا تھا۔ بعض حالیہ تحقیقات نے نامی اجسام کو با وجود شعور و ارادہ سے بے بہرہ ہونے کے یا ہر نامی جسم میں شعور ثابت کرنے کے بعد صاحبِ حیات قرار دیا اور علمائے اسلام نے اس تنقیح کو بغیر چون و چرا صحیح تسلیم کر لیا اور جب قرآن نے صراحت کی کہ زمین پہاڑ اور پتھر سب ہی زندہ ہیں تو لگے تاویلیں کرنے اور ان میں مجازی حیات ثابت کرنے۔ درحقیقت یہ غلطی اصول ہے۔ حیات کا حقیقی مفہوم غلط سمجھا گیا کوئی جامع مانع تعریف نہیں کی گئی۔ اس لئے مجبوراً کسی کو صاحبِ حیات اور کسی کو غیر ذی حیات کہہ دیا گیا۔

آیاتِ قرآنیہ کی تصریحات اشارات اور اسرار کنایات کی روشنی میں اگر غور کیا جائے گا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ موت و حیات کا توارد کائنات کی ہر چیز پر ہوتا ہر چیز زندہ بھی ہوتی ہے اور مرتی بھی ہے اور ہر چیز پر موت و حیات کا یہ پیہم توارد حقیقی ہے۔ واقعی ہے صرف تزئینِ عبارت اور رنگینیٔ بیان ہی نہیں ہے۔ ہوا، پانی، مٹی، آگ، پتھر، سونا، چاندی تمام معدنیات کل نباتات سارے حیوانات اور سب انسان زندہ بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔

موت و حیات کے مفہوم کا لب لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کی طرف سے جس سے جو فوائد وابستہ کئے گئے ہیں اس کے متعلق جن وظائف و فرائض کی ادائگی کی گئی ہے اگر وہ چیز مفوضہ فرائض کو ادا کر رہی ہے اور فطری اغراض و فوائد اس سے حاصل ہو رہے ہیں تو یہ اس کی زندگی ہے۔ اور اگر مفوضہ فرائض کی انجام دہی سے وہ کسی وجہ قاصر ہوگئی یا فوائد مقررہ اس سے حاصل نہ کئے جاسکے تو یہ اس کی موت ہے۔ اگر ہوا پانی اور آگ کے اندر وہ تمام خواص موجود ہیں جو فطرت کی طرف سے ان کو ملے ہیں اور سارے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں جو حاصل ہونا چاہئیں تو ایسی ہوا ایسا پانی اور ایسی آگ زندہ ہے ورنہ مردہ ہو اس نے اپنے خصوصیات چھوڑ دیئے اور بستہ ہوگئی فطری فوائد اس کے حاصل نہ ہوسکے تو وہ ہوا مر گئی اور مر کر پانی بن گئی۔ اگر پانی نے خواص جاتے رہے اور فوائد معدوم ہوگئے تو وہ پانی زندہ نہ رہا مر گیا۔ برف یا ہوا یا اور بن گیا۔ اگر آگ میں گرمی اور دیگر خصوصیات باقی نہ رہیں تو وہ مردہ ہوگئی خاک یا کوئی اور چیز بن گئی اور اگر پھر دوبارہ ان چیزوں میں اصلی خواص اور صفتیں اور فوائد آ

تو پھر زندہ ہو گئیں سونا چاندی اور دوسری معدنی چیزیں مرگئیں کشتہ ہو گئیں یعنی وہ خواص نہ رہے جو پہلے تھے پھر سابق صورت اور خاصیت پیدا ہو گئی ان کو پھر زندگی مل گئی۔ سبز یا درخت سوکھ گیا اس میں سایہ سبزی پھل پھول اور دوسرے فوائد نہ رہے وہ حقیقۃً مرگیا۔ پھر دوبارہ فوائد پیدا ہو گئے وہ پھر واقعی زندہ ہو گیا۔ اسد میں اسدیت فرس میں فرسیت اور دوسرے حیوانوں میں ان کی خاص خصوصیات نہ رہیں وہ مرگئے۔ اگر حیوان میں شعور نہ ہو، حس نہ ہو، حرکت نہ کر سکے، نمو مفقود ہو جائے، تغذیہ اور تحلیل معدوم ہو جائے تو یہی اس کی موت ہے۔ اگر یہ چیزیں اس میں موجود ہیں تو یہی اس کی حیات ہے۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ اگر کسی کا نمو بند ہو جائے تو موت آ جاتی ہے اس کی حس اور شعور کی طاقتیں زائل ہو جائیں تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ اگر حرکت نہ کر سکے بے حرکت اور بے حس ہو جائے تب وہ مر جاتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہو مگر انسانیت جاتی رہے، نطق اور روحانیت زائل ہو جائے تب بھی وہ حقیقۃً مردہ ہو جاتا ہے کیونکہ انسانیت کے فطری فوائد اس میں موجود نہیں ہوتے۔ اسی لئے کافروں کو مردہ اور اہل ایمان و معرفت کو زندہ کہا گیا ہے۔ علماء نے اس موت و حیات کو مجازی قرار دیا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے۔ نمو، حس، شعور اور حرکت نہ ہونے کی وجہ سے تو حقیقی موت آ جائے اور نطق و ادراک مفقود ہونے کی صورت میں مجازی موت کہا جائے، یا للعجب۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ زمین پر بھی موت و حیات کا واقعی اور حقیقی قرار ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زمین کی حیات و موت کیا ہے۔ اور زمین کے کیا فوائد ہیں جن کے نہ ہونے کو موت کہا جاتا ہے تو قرآنی تنقیح کرنے اور تجربہ و مشاہدہ سے مدد لینے کے بعد زمین کے فوائد تخلیقی انسانوں اور حیوانوں اور دوسری نامی چیزوں کے لئے مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) قابلِ سکونت مقام کا قابلِ سکونت رہنا۔ مثلاً وہ زمین جس میں عمارتیں بنتی ہیں جب تک وہ قابلِ سکونت ہے اس کو مردہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ اس میں کوئی سبزہ اور درخت نہ ہو۔ شاہی محلوں کی زمین کو کوئی مردہ کہہ سکتا ہے۔ کعبہ اور مقدس مساجد کی زمینیں کس طرح مردہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ غرض انسان یا حیوان کی خارجی ضرورت کے لئے جو زمین استعمال کی جاتی ہو وہ مردہ نہیں۔ لیکن اگر سربفلک مکانات گر جائیں، ویران ہو جائیں، آبادیاں مٹ جائیں کھنڈر بن جائیں تو وہی خطۂ زمین مردہ ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ اس میں نہ پہلے کوئی درخت تھا نہ اب ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نام زمین کی حیات کو صرف سبزہ پوش ہونے پر مقصود سمجھنا غلطی ہے۔

(۲) وہاں جو زمینیں قابلِ زراعت اور لائقِ روئیدگی ہیں، جن میں نشوونما اور بالیدگی ہوتی ہے ان کی موت سبزہ کا نہ ہونا، خشک اور چٹیل میدان بن جانا اور شاداب ہونے کی بجائے بنجر ہو جانا ہے اور ان کی زندگی روئیدگی و سبزہ پوشی کا نام ہے کیونکہ ایسی زمینوں سے مقصود قابلِ سکونت اور معمور ہونا نہیں ہوتا بلکہ سایہ سبزہ حیوان اور انسان کی غذا کی فراہمی پھول اور پھل اور دیگر فوائد کا حصول مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔ ریگستان بیابان سنگلاخ زمینیں اسی سے مردہ کہلاتی ہیں۔

(۳) مذکورہ بالا زندگی اور موت تو زمین کے ٹکڑوں کے لحاظ سے ہے۔ عام زمین کی زندگی اور موت کیا ہے تو اس مفہوم کی تعیین بہت تحقیق طلب ہے۔ خصوصیاتِ ارضی مثلاً ثقل مطلق مرکزیت اور ہر جاندار کا مسکن بننا اور ان کے علاوہ دیگر لوازم کا حصول زمین کی زندگی کہلایا جا سکتا ہے لیکن قرآنی تصریحات اور عام محاورات میں اس مفہوم پر زندگی کا اطلاق وارد نہیں ہوا۔ نہ آیتِ مذکورہ میں اس طرف کوئی اشارہ ہے۔ اس لئے اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

مذکورہ تنقیح سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کسی چیز کے خصوصیات و فوائد کی تکمیل اس کی حیات اور فرائض مفوضہ کا فقدان اس کی موت ہے۔ انسان کی حیات اس کی ادراکی طاقت کی بحالی اور نطق و معرفت کی تحصیل ہے یا جسمانیت حرکتِ ارادی نمو شعور حس اور نطق کے مجموعہ کو حیاتِ انسانی کہا جائے تب بھی بیجا نہیں ہے۔ تو جو خدا زمین کے مختلف مقامات کے خصوصیات و فوائد سلب کرنے کے بعد کچھ مدت کے لئے اس کو مردہ کر دیتا ہے اور پھر دوبارہ فطری خصوصیات عطا فرما کر اس کو زندہ بنا دیتا ہے کیا وہ انسان کی جسمانیت ارادی حرکت نمو شعور حس اور نطق کو سلب کرنے اور موت طاری کرنے کے بعد پھر اس کو یہی خصوصیات دے کر از سر نو زندہ نہیں کر سکتا؟ یقیناً کر سکتا ہے۔ حاضر سے مستقبل پر ایک جزئی سے دوسری جزئی پر قیاس کرنا صحیح سمجھا جاتا ہے پس زمین کی حیات پر انسانی بعثت کو قیاس کرنے سے بھی کوئی وجہ مانع نہیں رہا۔ حیاتِ ثانوی کا طریقہ تو وہ ضرور پہلے طریقہ سے جدا ہوگا۔ دوبارہ آئینِ پیدائش یہ نہ ہوگا جواب ہے لیکن اس سے ثانوی حیات کا عدمِ امکان مترشح بھی نہیں ہو سکتا۔ حاصلِ کلام یہ نکلا کہ اوقات کا تغیر، بے جان کا جاندار سے اور جاندار کا بے جان سے پیدا ہونا اور مردہ ہونے کے بعد زمین کا زندہ ہونا انسان کے اعادۂ حیات کو ثابت کر رہا ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

تحلیلِ اجزاء فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۔ یہ جملہ جزء ہے۔ کلام سابق سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی الوہیت ربوبیت اور تمام صفات پر ایمان رکھنا اور نیک کام کرنا ضروری ہیں اور شرک و بد عملی وبالِ آخرت کی موجب ہے۔ اس کلام سے شبہ

کیا جاسکتا تھا کہ کیا خدا تعالیٰ نے ہماری اطاعت کا محتاج ہے کیا وہ کوئی دنیوی بادشاہ ہے جس کو رعیت کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمتگاری و جانسپاری کی ضرو
ہے۔ اس خبہ کا ازالہ اس آیت سے ہوجاتا ہے کہ خدا کو تمہاری اطاعت و عبادت کی ضرورت نہیں وہ ہر نقص و عیب اور ہر ضرورت و احتیاج سے پاک ہے۔ بلکہ ہم
اطاعت کا حکم صرف اس وجہ سے ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی مخلوق اللہ کی اطاعت سے سرتابی نہیں کرتی اور نہیں کر سکتی۔ کل کائنات میں اس کے کمال کا اعتراف
بے پایاں انعامات پر حمد ہوتی ہے۔ جب تمام کائنات کا یہی دستور العمل اور یہی عمل ہے تو انسان کی اطاعت بھی لازمی ہے۔

جمہور کا قول ہے کہ مذکورہ عبارت اگرچہ جملہ خبریہ ہے مگر انشاء اور امر کا فائدہ دے رہی ہے۔ جب مخاطب سے کسی کام کا کرانا بہت ہی ضروری ہوتا
تو طرز کلام ایسا اختیار کیا جاتا ہے جو ناقابلِ انکار ہو اور گویا مخاطب کے مسلمات میں سے ہو۔ اس صورت میں مطلب کا خلاصہ یہ ہوگا کہ صبح و شام اور دوپہر سہ پہر کو تم
پاکی بیان ہی کرتے ہو اور اس لئے بیان کرتے ہو کہ آسمان و زمین کی تمام کائنات ان اوقات میں اللہ کی حمد میں مشغول ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اوقاتِ مذکورہ میں عبادت
کی وقت وہی ہے جس کو تم بھی جانتے ہو کہ تمام دنیا ان اوقات میں عبادت کرتی ہے لہٰذا تم بھی دنیا کے دستور العمل کو ترک نہ کرو اور اللہ کی پاکی بیان کرو۔ پاکی بیان کر
سے کیا مراد ہے۔ اس میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔

علمائے اسلام کی ایک جماعت کہتی ہے کہ چونکہ آیات مذکورہ کا نزول مکہ میں ہوا اور اس وقت تک پنجگانہ نماز فرض نہ ہوئی تھی اوقاتِ مذکورہ میں تسبیح و تحمید کرنا
کافی تھا اور کوئی تعداد بھی مقرر نہ تھی۔ اس لئے اِن آیات میں پنجگانہ نماز کا حکم نہیں ہے بلکہ صرف تسبیح و تحمید کا ہے۔ لیکن یہ قول کئی وجوہ سے مخدوش ہے۔ اول یہ کہ ابتدا
دَورِ اسلام میں حضورِ اقدس کا نماز پڑھنا مختلف احادیث سے ثابت ہے۔ پھر کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مکی زندگی میں نماز کی فرضیت نہ ہوئی تھی اور تسبیح و تحمید
تھی۔ اس دعوے کے لئے کسی نقلی ثبوت کی ضرورت ہے اور ایسی کوئی صحیح روایت موجود نہیں جس سے مذکورہ دعویٰ ثابت ہوتا ہو۔ دوسرے ابن عباسؓ نے صراحت
کردی ہے کہ اس سے مراد پنجگانہ نماز ہے۔ حِیْنَ تُمْسُوْنَ سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ سے فجر کی نماز عَشِیًّا سے عصر کی نماز اور تُظْهِرُوْنَ
سے ظہر کی نماز مراد ہے اور وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جملہ معترضہ ہے۔ قرآن کی عادت ہے کہ وہ نماز کی اس کے اجزاء کا تذکرہ کرکے بیان فرماتا ہے۔ نماز
میں تسبیح بھی ہے تحمید بھی ہے۔ رکوع بھی ہے سجدہ بھی ہے قیام بھی ہے قعود بھی ہے۔ قرآن نے کبھی لفظ رکوع بول کر نماز مراد لی ہے کبھی لفظ سجدہ بول کر کبھی تسبیح و تحمید
کے لفظوں سے نماز کی تعبیر کی ہے اور کبھی لفظ قیام سے۔ تیسرے یہ کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ مکہ میں ہر وقت کے لئے دو دو ہی رکعت مقرر ہوئی تھیں
پھر مدینہ میں آکر رکعتوں کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ بخاری اور مسلم نے صراحت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ نماز کی دو دو رکعتیں فرض ہوئی تھیں۔ پھر جب حضورؐ نے ہجرت
کی تو چار رکعتوں کی فرضیت ہوئی۔ لیکن سفر کی نماز فرضیت اولیٰ پر باقی رکھی گئی۔ اس صراحت کے ہوتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ مکی زندگی میں فرضیتِ صلوٰۃ کا انکار کیا جائے
ہاں تعدادِ اوقات کی تعیین معراج کے بعد ہوئی۔ حدیثِ معراج سے یہی ثابت ہے لیکن معراج چونکہ مکہ میں ہوئی اس لئے ہوسکتا ہے کہ غالب ظن یہی ہے کہ آیاتِ مذکورہ کا نزول معراج
کے بعد ہوا ہو۔

رہی اوقاتِ مذکورہ میں تسبیح و تحمید کی اہمیت تو وہ بہرحال کم نہیں ہوئی پنجگانہ نماز کے بعد بھی بدستور سابق باقی رہتی ہے۔ حضورِ اقدس نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی
ہر صبح و شام سو بار سبحان اللہ وبحمدہ پڑھے گا اس روز اس کی برابر کسی کی نیکیاں نہ ہوں گی مگر اس کی جو اسی تعداد یا اس سے زائد پڑھے (متفق علیہ) معاذ بن انس الجہنی کی روایت
ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ اللہ نے ابراہیم کو خلیل وفادار کس لئے فرمایا۔ اس لئے فرمایا کہ وہ ہر صبح و شام پڑھا کرتے تھے سُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ
وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (رواہ احمد) ابو داؤد اور طبرانی نے محمد بن عبدالرحمٰن بن البیلمانی کے طریق سے بروایت ابن عباس حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ جس شخص نے سبحان اللہ
حین تمسون وحین تصبحون تینوں آیات پڑھیں تو دن کا حق اس نے پورا کردیا اور جس نے شام کو یہ آیات پڑھیں تو رات کا حق ادا کردیا (یعنی فرض نماز کے علاوہ ا
نے سلسلۂ اسناد کو صحیح مانا ہے لیکن سیوطی نے محمد بن عبدالرحمٰن بن بیلمانی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام اعظم کی مسندات میں اس راوی کا سلسلہ موجود ہے اس لئے یہ
اور معتبر ہے۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا الخ۔ یہ جملہ معترضہ اور کلام سابق کی علت ہے۔ مراد یہ ہے کہ تم کو صبح و شام اللہ کی بندگی اور عبادت
چاہئے کیونکہ ان اوقات میں آسمان و زمین کی مخلوق اس کی ستائش میں مشغول ہوتی ہے۔ فرشتے چرند پرند اور تمام نامی وغیر نامی مخلوق اس کی حمد کرتی ہے۔ کیسے کرتی ہے۔ اس
ہم تفسیری مقالہ میں لکھ آئے ہیں۔ مزید تفصیل موجب تطویل ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ الخ - مردہ یعنی بے جان سے مراد نطفہ اور تخم ہے اور زندہ سے مراد جاندار یا صاحبِ حیات ہے۔ حیات و موت کی تشریح ہم اوپر کرچکے ہیں۔ بعض مفسرین نے میت سے نطفہ اور حی سے زندہ آدمی مراد ہونے کی تعیین کی ہے۔ بعض اہلِ ارشادات نے اس آیت سے استنباط کیا ہے کہ جس مومن نے اپنے اندر سامانِ موت پیدا کیا یعنی ناجائز نفسانی خواہشات کو مار ڈالا تو اس مردہ سے زندہ پیدا ہوتا ہے وہ اسی زندگی حاصل ہوجاتی ہے اور جس کافر نے اپنے کو زندہ سمجھا اور فانی بقا کے دوامی اسباب کو فراہم کیا تو اس سے مردہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کو دوامی موت نصیب ہوتی ہے۔

مقصودِ بیان پنجگانہ نماز کی فرضیت کا اظہار لفظ سبحان سے اس طرف اشارہ کہ نماز کا مغز اللہ کی تسبیح و تقدیس ہے۔ جس نماز میں اللہ کی تنزیہ اور شرک کا استعمال نہیں وہ نماز نہیں، گویا عیسائیوں اور یہودیوں کی نماز ناقابلِ اعتبار ہے اور دوسرے مذاہب کا طریقہ عبادت بھی غلط ہے کیونکہ وہ شرک آمیز ہے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ الخ سے اللہ کی قدرتِ کاملہ اور تسخیرِ مطلقہ کی صراحت اور قیامت کے وجود کا ثبوت يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا سے بھی وقوعِ قیامت پر استدلال۔ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ سے اس بات کی طرف اشارہ کہ نطفہ سے انسان اور انسان سے نطفہ پیدا کرنے اور زمین کو سبزی پوش بنانے سے زیادہ اہمیت خدا کے نزدیک انسان کی تخلیقِ ثانوی کی نہیں ہے۔ مرئی اور محسوس پر غیر محسوس اور غیر مرئی کو قیاس کرنا بالکل ظاہر ہے۔ الخ

لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ

اور جو کوئی آسمانوں میں اور زمین میں ہے اُسی کا ہے سب اُسی کے تابعدار ہیں وہی ابتدائً مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا اور

هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ع

(دوبارہ پیدا کرنا) اُس کے لیے بہت آسان ہے اور آسمانوں میں اور زمین میں اُسی کی شان اعلیٰ ہے وہی غالب وباحکمت ہے

تفسیر مندرجہ آیات میں اللہ نے اپنی الوہیت اور وحدانیت کو اپنی ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل طاقت کے مختلف آثار دکھا کر ثابت کیا اور تخلیق تربیت احاطہ علمی اور اقتدارِ کامل کے چند مظاہرات بیان فرما کر امکانِ قیامت کو ان پر متفرع فرمایا ہے۔ دلیل اگرچہ مجموعی طور پر ایک ہی ہے لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو تیرہ دلائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

(۱) اللہ نے انسان کو مٹی سے بنایا کیونکہ حضرت آدمؑ کے خمیر میں زیادہ حصہ مٹی کا شامل تھا، پانی اور آگ بھی تخلیقِ انسانی کے عناصر ہیں لیکن مقدار کیفیت، خاصیت اور وزن کے لحاظ سے مٹی کا پلہ بھاری ہے یا یوں کہا جائے کہ عموماً ہر انسان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے اور نطفہ اس غذا کا لطیف جوہر ہوتا ہے جو انسان کھاتا پیتا ہے اور غذائی اجزاء میں یا اجزائے حیوانی شامل ہوتے ہیں یا اجزائے نباتی یا اجزائے معدنی۔ بہرحال حیوانی اجزاء ہوں یا نباتی یا معدنی ہر ایک کی پیدائش کا قوی ترین عنصر مٹی ہی ہے اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ تخلیقِ انسانی مٹی سے ہوئی ہے۔ مٹی ایک عنصر ہے، ایک خاصیت اور ایک طبیعت رکھتی ہے اس کو بے جان بھی کہا جاتا ہے لیکن اسی بسیط بے جان عنصر سے حسین جمیل شگفتہ رو انسان پیدا ہوتا ہے اور جیتا جاگتا ہنستا بولتا بن کر ملک میں پھیلا پھرتا ہے۔ یہ خدا کی کیسی قدرت ہے اور وہ کیسا خلاقِ مطلق ہے کہ بے جان مٹی سے جاندار انسان بناتا ہے اور بغیر اصل کے نسل پیدا کرتا ہے۔

(۲) دعوتِ نظر ہے اہلِ تفکر کے لئے کہ ایک ہی مادہ اور ایک ہی قوام سے دو شکلوں دو مزاجوں دو طبیعتوں اور دو خاصیتوں کے دو آدمی خدا نے بنائے ایک کا نام مرد اور دوسرے کا نام عورت قرار پایا اور دونوں میں علاوہ شرکتِ آدمیت کے رشتۂ زوجیت کو مضبوط کرنے کے لئے علاقہ محبت و ہمدردی پیدا کر دیا تاکہ ہر ایک کو دوسرے سے سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب میسر آئے اور روحانی نشاط نصیب ہو۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ایک مادہ میں دو خاصیتیں اور دو قسم کی طبیعتیں کس نے بنائیں اگر انسان کا جوڑا کسی غیر انسان سے ہوتا تو باہمی اُنس نہ ہوتا اور ایک دوسرے سے منافرت قائم رہتی۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ جوڑے میں علاقہ محبت پیدا نہ کرتا تو نشاطِ زندگانی کیسے حاصل ہوتا اور یہ مسرتناک پاک زندگی کس طرح میسر آتی۔ یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ دو متضاد صنفوں کو اس نے پرحکمت صنعت سے مربوط کیا اور لطفِ حیات عطا فرمائی۔

(۳) انھوں نے آسمانوں اور زمین کو بنایا۔ کہنے کو تو آسمان و زمین کی پیدائش معمولی الفاظ میں بیان کی جاتی ہے لیکن مفصل تذکرہ بڑے بڑے اسفار و مجلدات کا محتاج ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کس مادہ سے ہوئی کیسے ہوئی کب ہوئی کیوں ہوئی زمینیں کتنی ہیں کہاں ہیں کن خصوصیات کی حامل ہیں آسمان کہاں ہیں کس شکل اور کس طبیعت کے ہیں، ان کے کیا کیا فوائد ہیں وہ کتنے بڑے ہیں ساکن ہیں یا متحرک، تہ بتہ ہیں یا ہر آسمان علیحدہ کرہ ہے۔ اگر متحرک ہیں تو ان کی حرکت کا رُخ کدھر کو ہے اور مسافت کتنی ہے اور اس حرکت سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، ہر آسمان کی تاثیر کیا ہے۔ موجودات کیا کیا ہیں۔ یہ امور ایسے ہیں جو تمام دنیا کو درس بصیرت اور دعوت فکر دے رہے ہیں۔ اور جس قدر تنقیح کاوش اور تحقیق کئے جاؤ اسرار قدرت کی پردہ کشائی اتنی ہی زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اور صناع مطلق قادر علی الاطلاق کی بے چونی و بے ہمتائی کا انکشاف ہوتی جاتی ہے۔

(۴) سب سے پہلا انسان جب بنا تھا تو اس کی زبان اور طرز تعبیر کیا تھی اور اس زبان کا واضع کون تھا پھر ایک انسان کی نسل کی ہزاروں مختلف زبانیں کیسے ہو گئیں، یہ زبانیں کس نے بنائیں، الفاظ کس نے وضع کئے، ماحول اور گرد و پیش کی ضروریات سے مجبور ہو کر انسان وضع کرتا گیا اور مختلف زبانیں بناتا گیا یا تمام زبانوں کا تعلق الہام سے ہے اور سب کا وضع کرنے والا خدا ہے باپ نے بیٹے کو وہی زبان سکھائی ہوگی جو اس کو خود آتی تھی۔ بیٹے نے باپ سے وہی زبان سیکھی جس کا علم اُس کے باپ کو تھا اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ ان گنت زبانیں کیسے بن گئیں۔ کیا اول ترین انسان کو یہ سب زبانیں آتی تھیں اور اس نے اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو جُدا جُدا زبان بتائی اس طرح مختلف زبانیں دنیا میں پھیل گئیں، یا اول ترین انسان کو صرف ایک زبان آتی تھی اس کی نسل نے انفراداً اور اجتماعاً مختلف الفاظ خود وضع کر کے زبانوں کی ترتیب و ترکیب کر لی۔ یہ تمام امور غور طلب ہیں اور اللہ کی حکمتِ بے پایاں کا پتہ دے رہے ہیں۔

(۵) سب آدمی مٹی سے بنتے ہیں اور مٹی کا رنگ ایک تھا جس کو خاکی رنگ کہہ سکتے ہیں۔ پھر انسانوں کے یہ مختلف رنگ کیسے بنے اور کس نے بنائے۔ ہر خطۂ ارض کے باشندوں کا رنگ جدا جدا کیسے ہوا بلکہ ہر آدمی کا رنگ دوسرے آدمی کے رنگ سے کیوں بیگانہ ہے۔ ایک خاک کے سب پتلے، سب کا ایک خمیر، پھر کونسے عوارض و احوال تھے جنھوں نے کسی کو گورا کسی کو کالا کسی کو پیلا اور کسی کو خاکیلا کر دیا۔ اس میں بھی اہلِ نظر کے لئے قدرتِ الٰہی کی نشانیاں اور اس کی الوہیت و تسخیر کی آیات بینات موجود ہیں۔

(۶) انسان دن یا رات میں سوتا ہے، کیوں سوتا ہے، کیسے سوتا ہے کیا نیند حواسِ ظاہری کے تعطل کا نام ہے یا مفقود و معدوم ہو جانے کا۔ یہ آنکھوں اور کانوں پر کیسے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اچھا خاصا طاقتور تندرست آدمی بے حس اور بے بس کیوں ہو جاتا ہے اور کس طرح ہو جاتا ہے۔ کیا اس سے بدن کے لئے غذائی ذخیرہ میں افزونی ہوتی ہے یا تحلیل اجزاء میں بیشی کیا نیند سے بدن کی تکان دور ہوتی ہے یا کسل اور سستی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ نیند کی کیا حقیقت ہے۔ فلاسفروں سے پوچھو اس کے کیا فوائد ہیں، طبیبوں سے دریافت کرو بقائے حیات میں اس کو کیا دخل ہے۔ ماہرین فن سے سوال کرو، ہم تو مجمل طور پر اتنا کہتے ہیں کہ نیند سے آدمی کی آدمی زندگی تھکم سے گزر جاتی ہے حرکت کے بعد آرام ضروری ہے، کام کے بعد آرام لازم ہے اس لئے بہتوں کی نیند بدن کو بڑھتے ہوئے ذبول اور فنا کن تحلیل سے بچا لیتی ہے۔ بہتوں کی نیند اللہ تعالیٰ کی طاعت کی خلاف ورزی سے روک دیتی ہے۔ نیند کا فائدہ اس خشک دماغ رکھنے والے بیمار سے پوچھو جس کو نیند نہ آتی ہو، اس دیوانہ سے دریافت کرو جو یبوستِ دماغی کا شکار ہو۔ ایک دو دن نہ سونا اعصاب کو نیم مردہ، چہرہ کو پژمردہ اور ہمت کو افسردہ کر دیتا ہے۔ رنگ زرد، سر اور بدن میں درد ہو جاتا ہے۔ پس کیا نیند اللہ کی کارفرمائی کا اظہار، پر حکمت قدرت اور مصلحت آگیں خلاق کی چھوٹی نشانی ہے۔ کیا اب بھی اس کے سوا کوئی معبود ہو سکتا ہے۔

(۷) زیادہ سکون سے جمود پیدا ہو جاتا ہے اور جمود موت کا دوسرا نام ہے۔ زیادہ آرام سست و ناکارہ اور ناکام بنا دیتا ہے اور ناکامی زندگی کے فنا ہو جانے کے مرادف ہے۔ سونے کے بعد جاگنا اور جسمانی رطوبتوں کا سیلان رکھنے کے بعد حرکت کے ذریعہ سے بہنا ضروری ہے۔ بقائے زندگی کے لئے غذا کی تحصیل بھی لازم ہے اور غذا کی تحصیل تگ و دو اور کد و کاوش کے بغیر ناممکن ہے۔ بدن میں تگ و دو کی طاقت تحصیلِ معاش کی قدرت اور اعصاب و عضلات میں جولانی اور حرکت کون پیدا کرتا ہے اللہ، پھر کسبِ معاش کے لئے حرکت ارادہ اور ارادہ کے تحت جسمانی حرکت اور نقلِ مکانی کی قدرت خداداد ہے پھر فضلِ الٰہی کہاں سے آتا ہے۔ کیا انسانی تدبیر اس کو حاصل کرتی ہے اگر ایسا ہے تو دانشمند کیوں بھوکا مرتا ہے اور احمق کیوں مالدار ہوتا ہے، اسپ تازی زیر پالان کیوں مجروح ہوتا ہے اور گدھے کی گردن میں طوق زریں کیوں پڑا ہوتا ہے۔ درحقیقت روزی ایک عطیہ الٰہی ہے۔ ایک فضلِ رحمانی ہے ایک فیضِ ربانی ہے۔ وہی روزی دیتا ہے۔ وہی تحصیلِ رزق کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ پس کیا تحصیلِ مال کی قدرت عطا کرنا اور حصولِ رزق کے اسباب فراہم کرنا اس کی ربوبیت تامہ اور الوہیت عامہ کی نشانی نہیں ہے۔

(۸) اہلِ فلسفہ کے مسلمات میں سے ہے اور شاید واقعی حقیقت بھی ہے کہ اجزائے بخاری یا دخانیات کے باہمی تصادم و رگڑ سے چمک پیدا ہوتی ہے جس کو بجلی کہا جاتا ہے۔ اجزائے بخاری میں ہوا اور پانی کے مواد شامل ہوتے ہیں اور دخان نام ہے ارضی اور ناری اجزاء کے مرکب کا جب شدید تصادم سے حرارت پیدا ہوتی ہے تو شدتِ حرارت کے سبب کبھی دخانی اجزاء سوختہ ہو کر نیچے گرتے ہیں اور جس چیز پر گرتے ہیں اس کو جلا دیتے ہیں۔ چمک اور کڑک کی یہی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔ بہر حال جب بادل امنڈ کر آتے ہیں اور بخاری دخانی اجزاء مخلوط ہو کر باہم بند ہو جاتے ہیں اور پھاڑ کر نکلنا چاہتے ہیں تو سخت کڑک اور ہیبت ناک آواز ہوتی ہے ادھر ابر کو محیط دیکھ کر قحط زدہ مرجھائی ہوئی امیدوں والی مخلوق آس کی نظر سے بارش کی منتظر ہوتی ہے لیکن بجلی کی کڑک اور چمک سے جان و مال کی ہلاکت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے یہ امید و بیم کی کشاکش ہر کاشتکار ہر باغبان بلکہ ہر پیاسی مخلوق کے دل میں ہوتی ہے۔ کس قدر تعجب انگیز ہے یہ حقیقت کہ ایک ابر جس کی حقیقت ماہیت اور خاصیت میں کوئی تفاوت نہیں شادابی سرسبزی بارآوری ثمر وری ازالۂ تشنگی اور بقائے حیات کا بھی موجب ہوتا ہے اور بربادی تباہی اور ہلاکت پیدا کرنے کا سبب بھی ہوتا ہے۔ ایک شے سے ایک وقت میں دو مختلف متضاد نتائج کی پیدائش حیرت آفرین ہے اور پُر حکمت قدرت کے سربستہ راز کا افشا کر رہی ہے۔

(۹) غور کا مقام ہے کہ ہوا کا فطری مزاج گرم ہے اور پانی کا مزاج سرد پروردگارِ عالم جب مردہ زمین کو زندہ کرنا اور خشک چٹیل میدان کو سرسبز بنانا چاہتا ہے تو پانی کی حقیقت کو الٹ دیتا ہے پانی کی فطری سردی دور ہو جاتی ہے اور گرمی پیدا ہو کر ہوائی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس ہوا سے ابر بنتا ہے یا یوں کہو کہ ہوائے غلیظ کا نام ہی ابر ہے پھر ہوا میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور حرارت کے سبب اس کے اجزاء پگھلتے ہیں اور اجزائے ہوائیہ پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ٹپکنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس سے مُردہ زمین میں از سر نو زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دانش مندوں کے دماغ محوِ حیرت ہیں کہ پانی سے ہوا بنانا اور پھر ہوا کو پانی کی شکل دے کر بہانا اور ایک ضد کا دوسری ضد کی ماہیت و خاصیت کو قبول کرنا کیسی ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل حکمت کا مظاہرہ ہے۔

(۱۰) اتنا بڑا آسمان جس کی پہنائی اور وسعت کا صحیح اندازہ دماغی تصور سے بھی نہیں کیا جا سکتا جس کے انتہائی نقطہ تک رسائی تخیل کی بھی نہیں ہو سکتی جس کا ٹھوس حجم محل وقوع رنگ ساخت کیت ماہیت اور خاصیت کا ادراک صحیح طور پر کوئی ماہرِ فلکیات آج تک نہ کر سکا کس نے قائم کیا کیسے قائم کیا۔ نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی سہارا پھر یہ کس طرح اور کس چیز پر ٹھہرا ہوا ہے کیوں نیچے کو نہیں گرتا۔ اگر علاقہ جذب اس کو روکے ہوئے ہے تو وہ کیا چیز ہے وہ کونسی کشش ہے جو اجزاء کرہ کو باہم باندھے ہوئے ہے اور وہ کونسی قوتِ جاذبہ ہے جس نے آسمان کو معلق کر چھوڑا ہے۔ پھر زمین کی حالت غور طلب ہے اتنا وزنی جسم کس چیز پر لٹکا ہوا ہے کیوں اپنی جگہ نہیں چھوڑتا یہ وسط میں کیوں اور کس وجہ سے معلق ہے۔ کیا دوسرے کروں کی کشش اس کو روکے ہوئے ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس جذب کی حقیقت انکشاف کی طلبگار ہے معلوم نہیں وہ قوتِ جاذبہ مادی ہے یا غیر مادی تمام کروں کا تدافع تصادم اور ٹکراؤ لازمی ہے۔ ہر کرہ دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور دوسرے کے جذب کو دفع کر رہا ہے جذب میں یہ کیسی مساوات ہے کہ چھوٹا کرہ ہو یا بڑا قوتِ جاذبہ سب کی برابر ہے۔ ایک کرہ باوجود چھوٹا ہونے کے دوسرے کی طرف کھینچ کر نہیں چلا جاتا اور ٹکراؤ نہیں ہونے پاتا۔ نظریۂ جذب کے ماہرین سے دریافت کرو کہ اختلافِ حجم تفاوتِ وزن فرقِ حرکت اور بُعدِ مکانی کے عدم مساوات کے باوجود کھنچاؤ اور کشش کی طاقت سب میں برابر کیوں ہے۔ وہ کس کی قدرتِ قاہرہ ہے جو زمین اور آسمان کو اس کی جگہ باندھے ہوئے ہے۔ کیا اس سے حکمتِ الٰہیہ کی بے پایانی اور صنعتِ ربانیہ کی لا انتہائی ثابت نہیں ہوتی۔ کیا ایسے قادرِ مطلق کے ہوتے ہوئے کسی عاجز بے بس مخلوق کو معبود بنانا جائز ہو سکتا ہے اور کیا ایسے با اقتدار خود مختار قہار خلاق کی قدرت سے کچھ بعید ہے کہ مردہ انسانوں کو زمین کے اندر سے صرف ایک صدائے قدرت دے کر زندہ کر کے اٹھا لے اور محض ایک آوازِ بے کیف کو سن کر تمام آدمی قبروں سے نکل پڑیں۔

(۱۱) عالمِ مادی کے تخلیقی عناصر، عناصر کے تحلیلی اجزاء اور ترکیبی کائنات خواہ ثنائی ہو جیسے بخار اور دخان یا دو سے زیادہ اجزاء کو ملا کر بنائی گئی ہو جیسے معدنیات پتھر اور تمام حجری موجودات خواہ اس میں صرف نفسِ نامیہ ہو جیسے نباتات یا حس اور حرکتِ ارادی کی طاقت بھی ہو جیسے تمام کیڑے مکوڑے بھنگے پتنگے پرندے چرندے اور درندے یا اس میں عقل و ادراک کی قوتیں بھی موجود ہوں جیسے انسانی دنیا، سب اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اسی طرح عالمِ علوی کی بے پایاں کائنات ارواح ملائکہ اور غیبی نامعلوم مخلوق سب کی سب اللہ کی تابعدار اور مطیعِ حکم ہے۔ غرض آسمان اور زمین اور ان کے وسط میں جو کچھ ہے ایک نظام ایک قانون ایک طاقت ایک قدرت اور ہمہ گیر سطوت کے زیرِ اثر چل رہی ہے کسی کی مجال نہیں کہ اپنے حدود سے آگے بڑھ سکے یا ضابطۂ فطرت سے سرتابی کر سکے۔ اس فطرت کا فاطر اس قانون کا مقنن اس ضابطہ کا ضابط اس قدرت کا قادر اور اس نظام کا ناظم کون ہے۔ اللہ اس کی الوہیت کا اعتراف مادی اور غیر مادی کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہزاروں پردوں کو چیر کر عقلمندوں کے کانوں میں آ رہا ہے۔

(۱۲) آغاز آفرینش کس کا ممنونِ کرم ہے، ابتدائی تخلیق کس نے کی، عدم سے دائرہ وجود میں سب سے پہلے کون آتا ہے۔ اجناس انواع اور افراد کی رسی کا ابتدائی کنارہ کس کے ہاتھ میں ہے مادہ کو مادہ اور صورت کو صورت اور طبیعت کو طبیعت سب سے پہلے کس نے بنایا۔ مادہ اور صورت کو ملا کر جسم و جسمانیت کا یہ ظہور کس کا اثر صنعت اور مظاہرہٗ قدرت ہے۔ غور کرو سوچو اور سمجھو کہ یہ عالم کہاں سے آیا۔ درخت مٹی ہوا اور پانی سے بنا یہ تینوں عناصر اجزائے بسیط سے بنے اور اجزائے بسیط کا ظہور مادہ اور صورت کی ترکیب سے ہوا جس کا نام لوگوں نے گیس یا غاز رکھ لیا۔ بہر حال گیس یا غاز کو کس نے پیدا کیا اور کس چیز سے پیدا کیا غاز کا تخلیقی مادہ کیا تھا اور کیسے تھا۔ اور کس کا منت کش تخلیق تھا۔ ملائکہ اور روحانی مخلوق کو نور سے بنایا نور کس چیز سے بنا اور کب بنا اور کس نے بنایا اس کا فاعل اللہ ہے تو جب اس نے سب کو نیست سے ہست اور عدم محض کا پردہ پھاڑ کر موجود کیا تو کیا تخلیق ثانوی اس کے لئے کچھ دشوار ہے نقشِ ثانی تو نقشِ اول ہے آسان ہے، ابتدائی تخلیق ہے تو مادۂ اولیٰ اور صورت دونوں کا ظہور ہوا تھا اور دونوں نیست سے ہست ہوئے تھے۔ ثانوی تخلیق تو صرف جدید صورت کو پیدا کرنے سے ہی ہو جاتی ہے مادہ کو از سرِ نو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ موت کا ورود صورت پر ہوتا ہے مادہ باقی رہتا ہے۔ پس قیامت کے دن انہی مادی اجزاء کو جا بجا سے اکٹھا کر کے نئی صورت کا جامہ پہنا دیا جائے گا تو اس میں کیا دشواری ہوگی۔ ایسے قادرِ مطلق کے لئے مادہ کو لباسِ صورت عطا کرنا بہت آسان ہے۔

(۱۳) آسمان زمین اور ساری کائنات کا ذرہ ذرہ حرکت تغیر انقلاب اور موت و حیات کی باہمی کشاکش کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ آنے والا لمحہ پچھلے کی جگہ لے رہا ہے موجودہ حالت گزشتہ حالت کے قائم مقام ہے اور آئندہ حالت موجودہ حالت کی نیابت کر رہی ہے پتہ پتہ، قطرہ قطرہ، ثانیہ ثانیہ اور لحظہ لحظہ عروج و زوال صعود و ہبوط بلندی و پستی ترقی و تنزل اور فنا و فساد کی دعوت بلند آواز سے دے رہا ہے۔ سورج طلوع کرتا اور غروب ہوتا ہے ایک منٹ کو کبھی قرار نہیں پکڑ پاتا اور ستارے نکلتے اور چھپتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کسی جگہ نہیں ٹھہرتے۔ عالم کا نظام محوری دوری حرکت میں سرگرداں ہے کبھی ساکن نہیں ہوتا۔ اگر کہیں سکون محسوس ہوتا ہے تو وہ بھی حقیقی سکون نہیں ہوتا سکون نما حرکت ہوتی ہے۔

زمین کے پردے میں مٹی کے اندر بیج چھپ کر رطوبت کو کھینچتا، پھولتا اپنی حالت کو اور کیفیت کو بدلتا ہے شکل اور رنگ میں تغیر پیدا کرتا ہے اور زمین سے سوئی کی نوک نکلتی ہے۔ ہر منٹ اُبھرتی قوت پکڑتی اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے گویا زندگی کی مسافت طے کرتی ہے۔ زمین کی سطح پر کونپل نمودار ہوتی ہے، پتیاں پھوٹتی ہیں اور آناً فاناً بڑھاؤ ہوتا ہے شاخیں پھیلتی اور ٹہنیاں گردن اُٹھا اُٹھا کر اپنی ترقی کا گیت گاتی ہیں خوب سایہ ہوتا ہے۔ پھول آتے ہیں۔ بعض پھولوں سے پھل بنتے ہیں، ان میں گوناگوں کیفیات اور لاتعداد رنگینیاں تبدیلیاں اور رعنائیاں ہوتی ہیں بالآخر نمو صعود ترقی اور بلندی کا دور ختم ہوتا ہے، خزاں آتی ہے جس طرح اور جس طریقہ سے عروج ہوا تھا اُسی طرز سے زوال ہونے لگتا ہے اور چند روز میں خاک اُڑنے لگتی ہے۔

حیوان اور انسان کی بھی یہی حالت ہے بمفصل تصویر کشی موجبِ تکرار ہے۔ لیکن عدم و وجود، پستی و بلندی، زوال و عروج، تنزل و ترقی، ہبوط و صعود اور ہر حرکت و تغیر سے بالاتر بھی کوئی چیز ہے جو سب کو بناتی بگاڑتی، ہلاتی اور ساکن بناتی ہے ہر چیز میں اس کا اثر ہے۔ سات سمندروں کے اندر کسی دقیق ترین کیڑے کی بہت ہی باریک رگ اس کے اقتدار و علم سے خارج نہیں لیکن نہ باوجود اس احاطۂ قدرت، ہمہ گیری علم اور وسعت حکمت کے سب سے بالا سب سے اعلیٰ اور سب سے نرالا ہے۔ اس کی آن بان سب سے الگ اور اس کی شان سب سے جدا ہے اس کی ذات والا سب سے بے نیاز اور برتر تاثر و انفعال سے پاک ہے وہ موثر ہے متاثر نہیں، فاعل ہے منفعل نہیں قادر ہے، مقدور نہیں حاکم ہے محکوم نہیں، معبود ہے عابد نہیں، مسجود ہے ساجد نہیں، عاجز کن ہے عاجز نہیں، معدوم کرنے والا ہے معدوم نہیں۔ وہ کون ہے کون بتا سکتا ہے۔ وہ کیا ہے کیا کہا جا سکتا ہے اس کی شان ہر رنگ میں ہے مگر بے رنگ ہر جگہ ہے، مگر عدیم المکان ہر صورت کیفیت میں ہے مگر بے صورت و بے کیف، نہ جوہر و عرض نہیں کیونکہ یہ ممکن کے اقسام ہیں اور وہ ممکن نہیں اس میں حقیقتہً نہ وحدت ہے نہ کثرت، کیونکہ وحدت و کثرت عرض کے مختلف مظاہر ہیں واقع میں وہی سب کچھ ہے اور عالم کچھ بھی نہیں اگرچہ مادی آنکھوں سے عالم سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور وہ کچھ بھی نظر نہیں آتا میں اس کو پھول کی خوشبو کہوں، پھول سے خوشبو نکالی جا سکتی ہے مگر اس کو کائنات سے الگ نہیں کیا جا سکتا میں اس کو کائنات کی روح کہوں روح کا تعلق بدن کے بعض اجزاء سے نہیں رہتا اور بعض اعضاء مفلوج ہو جاتے ہیں لیکن کائنات کا تعلق اس سے نہیں ٹوٹ سکتا میں اس کو ستاروں اور ماہتاب و آفتاب کی روشنی سے تشبیہ دوں مگر کس طرح تشبیہ دوں جبکہ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ روشنی میں کمی بیشی تغیر حدوث سب کچھ ہوتا رہتا ہے، جبکہ میں جانتا ہوں کہ روشنی کسی ستارہ کی اختیاری چیز نہیں جب میں سمجھتا ہوں کہ باوجود بے رنگ مشہور ہونے کے پھر بھی کوئی روشنی رنگ سے خالی نہیں ہوتی غرض میں اس کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی تمثیل و تشبیہ نہیں دے سکتا۔ اس کی تمثیل بھی سب سے اعلیٰ بالا ہے۔ نہ وہ ایسا ہے جیسا

دودھ میں مکھن ہوتا ہے نہ ایسا ہے جیسے علمی طاقت دماغ میں اور عملی طاقت اعضاء میں ہوتی ہے نہ وہ تخم ہے کہ تمام عالم اس سے پھوٹ کر نکلا ہو نہ وہ ایسا سمندر ہے کہ کائنات کے حباب اس سے ابھرے ہوں۔ وہ ایسا بلند ہے جیسے پہاڑ بلند ہوتے ہیں۔ نہ ایسا وسیع ہے جیسے آسمان وسیع ہیں بلکہ ان سب سے بلند اور سب سے وسیع، بجلی، جذب، طاقت، روشنی، خوشبو، روح کوئی چیز بھی اس کی اصلی تصویر کشی نہیں کر سکتی۔

وہ مادہ کا مادہ، صورت کی صورت، کیفیت کی کیفیت، روح کی روح، طاقت کی طاقت، جذب کا جذب، خوشبو کی خوشبو، بجلی کی بجلی اور نور کا نور ہے، لیکن یہ بھی الفاظ ہیں۔ اس کی ہر حقیقت ہر تصویر و تعبیر سے بہت دور ہے، اس کے پیارے مکھڑے پر نور کے ستر حجاب پڑے ہیں۔ پھر میں اس کو کیسے دیکھوں اور کیا بتاؤں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

تحلیلِ اجزاء

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اس جگہ خدا تعالیٰ نے كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ تک تیرہ آیات قدرت کو بیان فرمایا ہے یعنی انسان کی آغازِ آفرینش سے لے کر حشر تک جو قدرت کی نشانیاں بروئے ظہور ہوتی ہیں اُن کو ظاہر فرمایا پھر آخرت کا تذکرہ کیا اور اس ذیل میں آفاقی نشانیاں بھی ظاہر فرما دیں۔

(۱) انسان کی تخلیق و ترقی اور درجۂ کمال تک پہنچنا (۲) سکونِ خاطر حاصل کرنے کے لئے سلسلۂ زوجیت قائم کرنا (۳) زبانوں کا اختلاف (۴) رنگ کا تفاوت (۵) خواب (۶) تلاشِ رزق۔ یہ چھ نشانیاں تو انسان کی ذات سے تعلق رکھنے والی ہیں باقی سات آفاقی ہیں (۱) تخلیقِ آسمان (۲) تخلیقِ زمین (۳) بقائے آسمان (۴) بقائے زمین (۵) بجلی (۶) بادل (۷) تمام کائنات کا ضابطۂ قدرت کے تحت چلنا اور کسی کا سرکشی نہ کرنا۔ یہ سب نشانیاں وہ ہیں جو ذاتِ انسان سے باہر ہیں۔ پھر ذیلی طور پر بجلی اور بادل کے فوائد بھی ذکر کر دیئے۔ اگر ان کو مستقل نشانیاں قرار دیا جائے تو آفاقی نشانیاں نو ہو جاتی ہیں۔ غرض ان تمام آیاتِ قدرت کا تذکرہ فرما کر حشرِ انسانی اور وقوعِ قیامت پر برہانی استدلال فرمایا ہے اور آخر میں اپنی ذات کو ہر تغیر و حدوث اور تبدل و زوال سے بالاتر ثابت کر کے تصرف فی الکل اور اقتدارِ کامل کی مہر لگا دی ہے۔

آیت مذکورہ بالا میں تراب یعنی خاک سے انسانوں کی پیدائش کا تذکرہ کیا ہے۔ اہلِ تفسیر نے صراحت کی ہے کہ چونکہ حضرت آدم خاک سے بنائے گئے تھے۔ لہٰذا اولادِ آدم کا تخلیقی مادہ بھی خاک ہی ہوئی۔ آیت کا یہی مطلب ہے۔ مراد یہ ہے کہ آدم کے پتلے کی پیدائش کا بیشتر مادہ چونکہ خاک ہی تھی اس لئے خاک ہی سے ان کی تخلیق قرار دی گئی۔ اگرچہ پانی ہوا اور آگ بھی تخلیقِ آدم کے اجزاء تھے لیکن وزن قوتِ جذب اور خصوصیات کے لحاظ سے ان کا پلڑہ خاک سے ہلکا تھا اس لئے ان تینوں کا ذکر نہیں فرمایا۔ (تخلیق از خاک کا دوسرا مطلب ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ یعنی تراب سے اگر نطفہ مراد لیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے) تقریر مذکورہ سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں لیسدار چپکتی ہوئی کیچڑ اور کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو تخلیقِ آدم کی صراحت آئی ہے۔ ان آیات سے اس آیت کا تعارض نہیں ہوتا کیونکہ اصل قوام تو خشک مٹی سے ہوا بعد کو پانی ملایا گیا اور مجسمہ بنایا گیا پھر جزء ناری شامل کر کے خشک کیا گیا اور جزء ہوائی ملا کر زندہ بنایا گیا۔ حالات کا یہ تغیر تو اضافۂ اجزاء کے تحت ہوا لیکن قوامی مادہ بہر حال خاک ہی تھا اسی پر مختلف احوال کا توارد ہوا۔

ضمیمہ انسان کا ابتدائی پتلا تو بہر حال مٹی سے بنایا گیا لیکن انسان کی تخلیق صرف ایک ہی مرتبہ نہیں ہو گئی بلکہ جزوی طور پر ہر منٹ نئی تخلیق ہوتی ہے۔ پرانے اجزاء تحلیل ہوتے ہیں پچھلی ساخت بگڑتی اور فنا ہوتی ہے نئے اجزاء کا اضافہ ہوتا ہے اور نئی طرز سے بناوٹ ہوتی اور نئی ساخت تیار ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی اس بدنی ساخت کو باقی رکھنے یا یوں کہو کہ تحلیل شدہ اجزاءِ جسم کا بدل پہنچانے کے لئے اللہ نے معدنی نباتی اور حیوانی چیزیں پیدا کیں اور سب کا قوامی مادہ مٹی کو قرار دیا۔ ہر حیوان ہر نبات اور معدنی چیز اصل پر پہنچ کر مٹی ہی نظر آتی ہے۔ حیوان گھاس دانہ کھاتا ہے گھاس دانہ مٹی سے بنتا ہے یا اگر کوئی حیوان گوشت کھاتا ہے تو جس گوشت کو کھاتا ہے اس کی پیداوار نباتی اجزاء سے ہوتی ہے اور نباتی اجزاء مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ بہر حال انسان کے بدن اور جسم کے اندر اگر کچھ ضروری اجزاء کم ہو جاتے ہیں تو اسی قسم کے اجزاء مناسب مقدار کے ساتھ اگر بدن میں دوبارہ پہنچ جاتے ہیں تو بدن کمزور نہیں ہوتا اور اقرار ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر بدن میں کسی قسم کے نباتی یا فولادی یا سونے یا چاندی وغیرہ کے اجزاء کم ہو گئے اور آدمی بیمار ہو گیا تو جب تحلیل شدہ اجزاء کی نوعیت کے مطابق غذا یا دوا بدن میں پہنچے گی تو تندرستی ہو جائے گی ورنہ بیماری بڑھتی رہے گی غرض بدن انسان کے اندر ہر منٹ چونکہ زوال ہوتا رہتا ہے اس لئے ہر منٹ تخلیقِ جدید بھی ہوتی رہتی ہے۔ پس اس طرح سے انسان شگفتہ رو ہشاش بشاش چاق اور چوبند ہو کر دنیا میں پھرتا ہے۔ قیامت کے وقوع پر یہ عظیم الشان برہان ہے۔

آیت مذکورہ میں اللہ نے صرف تخلیق جسمانی کا ذکر فرمایا۔ روحانی تغیرات اور مادی و علمی نشانات کو ظاہر نہیں فرمایا کیونکہ قیامت کا انکار کرنے والے عموماً مشرک تھے اور مشرک تخلیق جسمانی کی نیرنگیوں سے بھی کامل طور پر واقف نہ تھے پھر علمی تطورات کیسے سمجھتے ان کی جہالت عجائب روحانیت کو دریافت کرنے کی اجازت دیتی تھی اس قسم کی معرفت تو ایمان کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا الخ۔ آیت مذکورہ سابق میں تو انسان کی تخلیق جسمانی اور بقائے شخصی کو آیت قدرت قرار دیا تھا اس آیت میں بقائے نسل کا حیران کن طریقہ بتلایا کہ باہمی ازدواج و امتزاج سے اسی خاصیت و طبیعت اور خُو بُو کا آدمی پیدا کیا جاتا ہے۔ انسان کا جوڑا انسانی نوع کی دوسری صنف کو بنایا اور صرف اس لئے بنایا کہ ایک کو دوسرے سے سکون خاطر حاصل ہو۔ اکثر اوقات زوجین میں قربت نسب اتحاد وطن توافق رنگ و صورت اور مطابقت زبان نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کامل مغائرت اور کمل تباین صرف رشتۂ زوجیت کے سبب آپس میں محبت علوفت اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے یہ محض قدرت الٰہیہ اور آیت ربانیہ ہے کہ تسلسل نسل اور بقائے نوع کے لئے اس نے ایسے ضمنی اسباب فراہم کئے ورنہ نسل انسانی ضائع ہو جاتی اور یہ زمین عمران بشری سے محروم رہتی۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ قدرت کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کی تخلیق بھی ہے۔ یعنی آسمانوں کو اتنا بلند اتنا وسیع بغیر کسی ستون اور ٹیک کے پیدا کیا اس کو ستاروں اور سیاروں سے آراستہ کیا۔ کس نے بنایا، کیسے بنایا، اس میں کیا کیا تاثیریں پیدا کیں اور کیا خصوصیات عطا فرمائیں۔ پھر ہر آسمان کا محل وقوع کہاں ہے۔ حجم کتنا ہے وزن کتنا ہے۔ ایک آسمان کا دوسرے سے کتنا فصل ہے۔ کیوں ہے، کیسے ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اللہ کی قدرت قاہرہ کا کمل ثبوت ہے اسی طرح زمین کی پیدائش محل وقوع قوامی مادہ تاثرات اور خصوصیات قابل غور ہیں۔

تکملہ سموات کے لفظ کو جمع اور ارض کو مفرد ذکر کرنے سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے کہ زمین کے طبقات اگرچہ مختلف ہیں اور خواص بھی جدا جدا ہیں لیکن ثقل وزن طبیعت اور قوامی مادہ وغیرہ میں اشتراک ہے۔ البتہ آسمانوں میں باہم ان چیزوں کا بھی اشتراک نہیں۔ ایک آسمان دوسرے سے علیحدہ ہے۔ ہر ایک کا مادہ دوسرے کے مادہ سے مغایر ہے۔ خصوصیات تو ہر حال جدا ہی ہیں گویا ہر آسمان دوسرے آسمان سے سوائے لفظی اشتراک کے اور کسی قسم کا اتحاد نہیں رکھتا۔ نہ محل وقوع میں یکانگت ہے نہ صورت و طبیعت میں نہ نوعیت و مادہ میں نہ مزاج و خواص میں۔

ایک خاص نکتہ انسانی ساخت میں بدن کو زمین اور روح و عقل کو آسمان قرار دیا جاسکتا ہے اور عالم سماوی کا تعلق عالم ارضی سے صاف ظاہر ہے ایک مؤثر ہے دوسرا متاثر، ایک فاعل ہے دوسرا منفعل، آسمانی قوتوں کا زمین پر فیضان اور زمین کی قوتوں کا ان سے متاثر ہونا ایسا ہی ہے جیسا روحانی قوتوں کا جسمانی قوتوں پر فیضان اور بدنی قوتوں کا ادراکی قوتوں سے تاثر۔ لیکن جس طرح زمین کی نا اہلیت اور قطعاً ناکارہ ہونا آسمانی فیضان کو کامل طور پر قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اسی طرح جسمانی حواس کی خباثت اور بدنی ساخت کی نا اہلیت عقلی فیوض کو قبول کرنے سے سرتابی کرتی ہے تاہم جس طرح آسمانی تاثیر (حرارت، روشنی اور سردی گرمی وغیرہ) زمین پر لامحالہ پڑتی ہے اور زمین بہر صورت متاثر ہوتی ہے اسی طرح روح اور عقل کی تاثیر سے جسم اور جسمانی حواس محفوظ نہیں رہ سکتے اگرچہ کتنی ہی سرکشی کریں مگر حس، ارادی حرکات، شعور اور ادراک بغیر عقلی حکمرانی کے ناممکن ہے اس لئے جس طرح عالم کبیر ایک زنجیر میں بندھا ہوا ہے اسی طرح یہ عالم صغیر بھی اپنے اندر عالم کبیر کی تمام نظائر رکھتا ہے۔

تنبیہ بعض مفسرین نے آیت مذکورہ سے آسمانوں کے تہ بتہ ہونے متحرک ہونے اور محیط ہونے پر استدلال کیا ہے اور زمین کو ساکن گول اور مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔ واقع میں یہ صحیح ہو یا غلط اور تنقیح و تحقیق کے بعد ثابت ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن آیت مذکور کے کسی لفظ سے ان مطالب کا ترشح نہیں ہوتا یہ خود ساختہ دعویٰ ہے جس کی اس جگہ کوئی دلیل نہیں۔

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ۔ زبانوں کا اختلاف بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ قدرت الٰہیہ اور حکمت ربانیہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک زبردست نشانی ہے۔ مقام غور ہے کہ تمام انسانوں کے باپ ایک ہی تھے۔ ان کی ایک ہی زبان ہوگی۔ پھر زبانوں کی یہ ہزار رنگی کیسے پیدا ہوئی۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو سب زبانوں کا واضع پروردگار ہے۔ اس نے ابو البشر کو سب زبانیں سکھا دیں اور انہوں نے اپنی اولاد کو چند در چند زبانوں کی تعلیم دی۔ پھر ان کی اولاد نے باپ سے سیکھی ہوئی تمام زبانیں سکھائیں اور اس طرح گوناگوں اور رنگا رنگ زبانیں دنیا میں پھیل گئیں۔ اس سے بھی قدرت کی ہمہ گیری اور علم الٰہی کی بے پایانی ثابت ہوتی ہے تمام اقوام اور ساری ملتوں کو ہر زمانہ اور ہر خطۂ زمین کی ضرورت کے مطابق ابو البشر کی وساطت سے الفاظ سکھائے جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا قیامت تک جتنی مفردات

آتی رہیں گی سب کی ضرورتوں کا اندازہ اور سب کے احوال سے واقفیت علام الغیوب کا ہی کام ہے۔ پھر قیامت تک آنے والی تمام ضروریات کی کفالت کرنے والے الفاظ کی تعلیم ایک انسان (ابوالبشر) کو دینی اور ان سے ان الفاظ کو اس طرح تقسیم کرانا کہ ہر قوم اور ہر خطۂ زمین کے رہنے والے اپنے ملکی احوال اور اپنے زمانہ کے کوائف کے مطابق بول سکیں اور کوئی بھی تعبیر مقصود سے قاصر نہ رہے ایک حیرت ناک تعلیم ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت آدم کو ایک ہی زبان سکھلائی گئی لیکن ان کی اولاد اور آنے والی نسل نے اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ اختراع کر لئے اور زبانیں بنالیں اور قیامت تک کے لئے یہ سلسلہ یونہی جاری ہو گیا۔ اگر یہ صورت ہوئی ہے تب حیرت انگیزی کچھ کم نہیں ہو جاتی۔ ہر قوم کو علیحدہ الفاظ بنانے ان کی بندش اور ترکیب کی تعلیم دینی اس کے حلق اوتار الصوت اور مخارج حروف کو اس کے زمانہ اور ملکی خطہ کے مطابق بنانا کس قدر تعجب انگیز ہے۔ عرب ٹ ڈ ڑ نہیں بول سکتا کتنی ہی کوشش کرے ان حروف کا تلفظ اس کے لئے صحیح طور پر ناممکن ہے۔ اس گروہ کو مخرج ہی نہیں عطا کیا گیا کہ وہ بول سکے۔ عربی زبان میں اور عربی بولنے والے کے مخارج میں دو ساکن حرفوں کا اجتماع ناممکن ہے لیکن انگریزی زبان میں یہ سب کچھ جائز بلکہ ضروری ہے اردو میں تین بلکہ چار ساکن حرف بھی جمع ہو سکتے ہیں بیٹھ پینٹھ وغیرہ الفاظ بکثرت مستعمل ہیں۔ بنگالی، جاپانی، برمی اور چینی زبانیں اپنی خصوصیات کی حامل ہیں جو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کو میسر نہیں۔ غرض ہر خطۂ زمین کے رہنے والے اور ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے اپنی صوتی کیفیت لب و لہجہ، الفاظ کی تراش خراش اور بندش و ترکیب کے لحاظ سے وہ خصوصیات رکھتے ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ یہ سب کچھ قدرت کی کارسازی اور رحمٰن کی عطوفت عامہ ہے۔ اگر سب کا لہجہ ایک ہوتا، مخارج میں یگانگت ہوتی، الفاظ میں اتحاد ہوتا اور صوتی کیفیت ایک طرح کی ہوتی تو کسی طرح پیش آنے والی مختلف ضرورتوں کی تعبیر ہو سکتی اور کیونکر ایک انسان دوسرے کو اپنا پورا مقصود باسانی سمجھا جا سکتا۔

وَاَلْوَانِكُمْ ہر ملک کے رہنے والوں کا رنگ مختلف ہے بلکہ ہر شخص کا رنگ دوسرے شخص کے رنگ سے جدا ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے ایک ہی آدمی پیدا ہوا تھا اور اس کا ایک ہی رنگ تھا اور اسی کے تخم سے اس کی ساری نسل پھیلی۔ اگر رنگ اور شکل تخمی اثر کا نتیجہ ہے تو پھر یہ رنگا رنگی اور تلون کیوں ہے؟ اگر ملکی خصوصیات آب و ہوا اور زمین کی تاثیر اختلاف رنگ کی علت تامہ ہے تو پھر ایک ملک بلکہ ایک شہر بلکہ ایک گاؤں بلکہ ایک گھر کے رہنے والوں میں رنگ کا رنگ کا اختلاف کیوں ہے۔ ملک آباد ہوا پانی ہوا ملکی احوال افلاس و مالداری غرض اختلاف رنگوں کے تمام مسلمہ اسباب متحد ہوتے ہیں پھر بھی کسی ایک شخص کا رنگ بھی پوری کیفیت کا لحاظ کرتے ہوئے دوسرے شخص کے رنگ سے متحد نہیں ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ درحقیقت اختلاف زبان، اختلافِ لب و لہجہ، اختلاف اوتار الصوت، اختلاف مخارج اور اختلافِ رنگ تمام انسانوں کو (خواہ کافر ہوں یا مومن عالم ہوں یا جاہل، امیر ہوں یا غریب، حکیم ہوں یا فلاسفر ہوں یا عامی) دعوتِ غور دے رہا ہے۔ صدائے بے نیاز طلب سے پکار رہا ہے اور قدرت الہیہ کو اپنی بے زبانی زبان سے ثابت کر رہا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ۔ عموماً آدمی رات کو سوتے ہیں کچھ آدمی دن کو بھی سو جاتے ہیں سونے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھے خاصے بیدار حواس پر کون خواب کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ظاہری بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ کانوں میں شنوائی کی طاقت نہیں رہتی یا کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس سے بدن کو کیا سکھ ملتا ہے۔ روح اور دماغ میں کیا طراوت پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے اور کس طرح پر نیند آتی ہے باوجودیکہ اندرونی طاقت اور بدن کی فطری طبیعت بدستور اپنا کام کرتی رہتی ہے اور اس میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ بیرونی طاقت کیوں کمزور پڑ جاتی اور آرام کی خواستگار ہوتی ہے۔ اگر تعب اور تکان موجب آرام طلبی ہے تو پھر اندرونی طاقت کیوں نہیں تھکتی اور کیوں آرام کی خواستگار نہیں ہوتی۔ اندرونی اور بیرونی طاقتوں کی قوت و کمزوری میں کیا تفاوت ہے اور یہ تفاوت کس نے قائم کیا۔ اندرونی طاقت کو آرام طلبی سے غنی اور بیرونی طاقت کو محتاجِ آسائش بنایا اور پھر آسائش کا طریقہ بتایا اور حصولِ آرام کے بعد تازہ دم بنایا۔ واقع میں یہ دونوں طاقتیں ایک ہی ہیں یا جدا جدا ہیں۔ اس ساری تخلیق سازی اور اہتمام خوابی میں خلاق حکیم کی حکمت اور قادر مطلق کی قدرت کا مظاہرہ ہے۔

وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ بقائے زندگی کے لئے حصول غذا لازم ہے اور غذا کا حصول تلاش و سعی کا محتاج ہے لیکن تلاش و کوشش سے معاش کی تحصیل ضروری نہیں ہے۔ کوشش دماغی اسکیم کے مطابق ہوتی ہے اور دماغی رسائی یقینی طور پر غیبی امور تک نہیں ہو سکتی۔ اسباب معاش عموماً پس پردہ ہوتے ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ کن اسباب کی وجہ سے یقینی طور پر مال حاصل ہوگا۔ اگر اسبابِ معاش کا یقینی علم لوگوں کو ہوتا تو پھر کوئی مفلس کیوں رہتا معلوم ہوا کہ حصولِ مال صرف تقدیری چیز ہے اور مال محض اللہ کے فضل اور خداداد انعام ہے لیکن طلب و کوشش پھر ضروری ہے۔ پس اگر خدا دماغ میں علم ارادہ احساس نہ پیدا کرتا۔ اگر اندرونی طاقتیں بر سرِ کار نہ آتیں اور اگر اعصاب و اعضاء کام نہ کرتے تو پھر کس طرح غذا حاصل ہوتی اور کس طرح بقائے حیات ممکن ہوتی۔

اکثر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ فضل سے مراد مال ہے۔ لیکن اگر فضل کے دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا جائے اور علم ارادہ اور اعصابی تحریک اور عضلاتی تاثیر غرض حصولِ معاش کے تمام ظاہری اسباب کو لفظ فضل کے تحت داخل کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ ہر انسان کو ان تمام چیزوں کی طلب ہوتی ہے۔ صحت، دولت، حکومت اور علم ہر ایک خدا کا فضل ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○ چونکہ خواب کے فلسفہ پر غور کرنا اور طلبِ معاش کے لئے جس نظامِ جسمانی کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکوینی حقیقت سے سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے واقف ہو سکتے ہیں جو ذہنی حرکات اعصابی تموج اور عضلاتی مدد و تشنج سے واقف ہیں۔ ہاں سُن کر بہت سے لوگ سمجھ سکتے ہیں اس لئے اس جگہ لفظ یَسْمَعُوْنَ فرمایا۔ اہلِ طب خواب کو اعصابی سکون عضلاتی آرام اور دماغ کا سکون قرار دیتے ہیں جس کی وجہ سے اعضاء جوارح نو حرکت کرنے کا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر قوت تازہ اور ہر طاقت نئے سر سے مطابقِ اندازہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کسی چیز کی طلب کے لئے اول علم پھر ارادہ پھر تحریکِ اعصاب پھر پٹھوں یا عضلات کے تناؤ یا کھنچاؤ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کسی چیز کو پکڑنا حاصل کرنا یا دفع کرنا مقصود ہوتا ہے تو اول دماغ کی علمی قوت اس کو کہتی ہے پھر قوتِ ارادہ اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد قوتِ ارادہ قوتِ فاعلہ کو حرکت دیتی ہے۔ قوتِ فاعلہ پٹھوں کے مرکز میں گرگری پیدا کرتی ہے۔ مرکزِ اعصاب ہاتھ یا پاؤں والی شاخ کے پٹھوں کو ابھارتا ہے۔ اس وقت پٹھوں میں تناؤ اور کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جس چیز کی طلب ہوتی ہے وہ ہاتھ آ جاتی ہے یا جس چیز سے بچاؤ مقصود ہوتا ہے ہاتھ پاؤں کے عضلات اس کو روک دیتے ہیں۔ ایسا تناؤ اور کھنچاؤ بلکہ تمام نظامِ علمی اور ارادی اور فاعلی میں بیداری اور عمل ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے حصول یا کمزور سے کمزور ضرر کو دفع کرنے کے لئے بغیر کسی خاص شعور کے انسان کے جسم کے اندر ہوتا رہتا ہے۔ ایک قلم اٹھاتا ہو، ایک لقمہ پکڑتا ہو، کپڑا ناپتا ہو، غلہ تولتا ہو یا کچھ اور کام کرتا ہو، ہر حرکت کے وقت پورا نظام بر سرِ عمل آ جاتا ہے۔ معدہ کے حملہ کو روکنا، دشمن کے ہتھیار سے بچنا، موذی کیڑوں کو دفع کرنا سب کچھ اسی نظامِ فطرت کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ بہت کم آدمی غور کرتے ہیں کہ جب سامنے سے کوئی دشمن تلوار یا لاٹھی سے حملہ کر دے اور تلوار یا لاٹھی اس جانب کو جس شخص پر حملہ کیا گیا ہو بے ساختہ اس کا ہاتھ حملہ کو روکنے کے لئے چہرے کے سامنے آ جاتا ہے اور دشمن کے وار کو اپنے اوپر لے لیتا ہے اور چہرے یا سینے کو بچا لیتا ہے۔ اس کی حقیقت یہی ہے علمی ارادی فاعلی اعصابی عضلاتی تمام قوتیں ترتیب وار بر سرِ عمل آ کر ہاتھ کے پٹھوں کو ڈھیلا کر کے پھر سامنے لا کر اوپر کو اٹھا کر تناؤ پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن کون سمجھے اور کون سوچے اور کون فلسفۂ جذب و دفع کو جاننے کے لئے سر مغزی کرے۔ عوام کے بس سے تو اس کا سمجھنا خارج ہے۔ ہاں دوسروں سے سُن کر سمجھ سکتے ہیں لیکن سننے والوں میں سے وہی سمجھیں گے جو دل کے کانوں سے سُنیں اور دماغ کی بصیرت کو کام میں لائیں۔ محض سُن لینا اور ایک کان کے راستے سے داخل کر کے دوسرے کان کے سوراخ سے نکال دینا اور سنی کو ان سنی کر دینا بیکار ہے۔ اسی لئے مفسرین نے سننے سے مراد لیا ہے دل کے کانوں سے سننا اور گوشِ صداقت نیوش سے توجہ کرنا۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ یہ بھی غور طلب حقیقت ہے کہ وہ اجزائے مائیہ جو پانی کا چشمہ ہیں اور جن کو عرفِ عام میں بادل کہا جاتا ہے پروردگار ان میں چمک پیدا کر دیتا ہے۔ لوگوں کو بادل دیکھ کر بارش ہونے اور کھیتیاں سیراب ہونے کی اُمیدیں لگی ہوتی ہیں لیکن جونہی بادل میں چمک پیدا ہوتی فوراً ڈر گئے۔ باغ زراعت پھل پھول مکان دوکان اور جان مال پر بجلی گرنے کا خوف ہو گیا اول تو مائی اجزاء میں آگ سے زیادہ روشنی اور اس سے زیادہ جلانے والی چمک پیدا کر دینا حیرت انگیز ہے۔ پھر اس مخزنِ آتشی سے لوگوں کے دلوں میں حیات آفرینی کی امیدیں پیدا ہونی مزید حیرت انگیز ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ہی مادہ سے ایک ہی صورت سے ایک ہی چیز سے ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص کے دل میں دو متضاد خیال کی پیدائش محیر العقول ہے۔ چمک کے بعد ابرِ رحمت مینہ برساتا ہے۔ کون برساتا ہے بجلی سے پانی کون بناتا ہے وہی بناتا ہے جس نے پانی سے بجلی بنائی تھی۔ لیکن پانی میں سبزہ کو پیدا کرنے، باغوں اور کھیتوں کو سرسبز بنانے اور زمین کو پُر رونق کرنے کی طاقت کہاں سے آئی۔ بعض جگہ مزید تباہی پیدا ہوتی ہے۔ کثرتِ بارش ہلاکت انگیز ثابت ہوتی ہے۔ سیلاب اور پانی کا طوفان ہر درخت اور سبزہ کو غارت کر دیتا ہے اور بعض زمینیں بارش کے بعد بھی بنجر اور خشک رہتی ہیں۔ درحقیقت یہ قدرت کی کرشمہ سازی ہے کہ اس نے پانی میں حیات کار...

کی طاقت پیدا کی اور مردہ زمین کو زندہ بنایا ورنہ پانی تو طوفان اور سیلاب کا بھی ہوتا ہے۔ اگر اس میں حیات بخشی کی ذاتی خاصیت ہوتی تو کبھی تباہی نہ پیدا کرتا معلوم ہوا کہ پانی سے مردہ زمین کا زندہ ہونا قدرت کے تابع ہے اور حکمتِ ربانیہ ان تمام کرشمہ سازیوں کا سرچشمہ ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ پانی، آگ اور مٹی کی حقیقت خاصیت اور فطری کیفیت کو دریافت کرنا اور ان سے جو بخارات اور دخانات بنتے ہیں ان کی ماہیت کو سمجھنا پھر بخار اور دخان سے جو بادل برق اور صاعقہ وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اس کی واقعی حالت کو جاننا اور ان کے اجزائے ترکیبی کو دریافت کرنا اور اجزاء کا باہمی توازن و تناسب معلوم کرنا اور ان کے اسبابِ مولدہ سے واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چاروں عناصر اور ان کے مرکبات کو ان کے حدود کے اندر رکھنا اور باوجود ان کی بے پایاں قوت کے سب کو غیبی قدرت کا مطیع سمجھنا انہی لوگوں کا کام ہے جن کے پاس عام ماہیات و کلیات کو جانچنے اور سمجھنے کی عقل کلی ہو اشیاء عالم کے عام حقائق پر تبصرہ نہ حسی حواس اور مادی قوتوں کا کام نہیں ہے۔ بلکہ فکری اور غور عقلی کی ضرورت ہے۔ احساس تخیل اور توہم کے درجات سب نیچے رہ جاتے ہیں، حقیقتِ کائنات کو دریافت کرنے اور غیر محسوس غیبی طاقت کو جاننے کے لئے تعقل کی ضرورت اور سادہ فکر کی حاجت ہوتی ہے۔ اسی لئے اس آیت میں بجائے یَسْمَعُوْنَ کے یَعْقِلُوْنَ فرمایا۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ۔ آسمان کا وزن حجم جذب غرض ہر چیز زمین سے زائد ہے پھر کس طرح بغیر ٹیک اور سہارے کے اپنی جگہ قائم ہے۔ زمین کیوں اوپر نیچے نہیں ہوتی۔ کیوں اپنی جگہ ساکن ہے یا اپنے محور پر حرکت کر رہی ہے یا یوں کہو کہ اگر کسی کرہ کے آس پاس زمین گھومتی ہے تب بھی اپنا محیط دائرہ نہیں چھوڑتی اور باوجود انتہائی تیز حرکت کرنے کے سطح پر رہنے والوں کو محسوس نہیں ہوتی اور نہ فقط یہ کہ اس کی حرکت محسوس نہیں ہوتی بلکہ جو کائنات سطح پر موجود ہے وہ بھی زمین کے ساتھ حرکت بالعرض اسی سرعت کے ساتھ کر رہی ہے لیکن کسی کو اپنی حرکت بھی محسوس نہیں ہوتی اور باوجود بندش نہ ہونے کے کسی کو ادھر ادھر بے ضابطہ ہلنا نہیں پڑتا۔ یہ کیسی حرکت ہے اور کیسا سکون ہے، کیسا قیام اور کیسا اعتماد ہے۔ کوئی مادی سہارا نہیں جسمانی ٹیک نہیں، کوئی ستون نہیں کوئی بندھن نہیں پھر اصلی مقام اصلی حالت اصلی کیفیت اور اصلی صورت پر بقاء عجیب حیرت آفریں ہے فلسفۂ جذب کے قائل بہت سے خندقوں میں گرے ہیں۔ بہت پتھروں سے ٹھوکریں کھائیں قوتِ جاذبہ ہر کرے میں موجود ہے۔ یہ صحیح لیکن اس کو مان کر بھی غیبی ہمہ گیر علم ارادہ اور مختار کل قدرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ٥ جب آسمان اور زمین کی مجال نہیں کہ اپنے رب کے حکم سے سرتابی کر سکیں اسی کے حکم سے ان کی تخلیق اور ان کی بقا ہے۔ تمام مادی اسباب امر الٰہی کے تابع ہیں تو پھر یہ یقینی بات ہے کہ جب پروردگار مردہ انسانوں کو طلب فرمائے گا تو وہ فوراً بغیر تامل کے قبروں سے نکل کر باہر آجائیں گے اور قیامت ہو جائے گی۔

تبصرہ ارض کے ساتھ سماء کو ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ جس طرح زمین ایک واقعی کرہ ہے اسی طرح آسمان بھی ایک واقعی چیز ہے اور جو کچھ ہم کو دکھائی دے رہا ہے یہ فریب نظر نہیں ہے۔ نہ آفتاب اور سیاروں کی شعاعوں میں سے چھنی ہوئی نیلی چمک ہے جس کا عکس آنکھ کے طبقہ پر پڑ رہا ہو۔ اور ساکن نیلی شعاعوں کو دیکھ کر ان کو آسمان سمجھ رہی ہو کیونکہ آسمان کا عکس پانی میں آئینہ میں اور دوسری شفاف چیزوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ واقعی آسمان نہیں تو پھر شفاف چیز کے اندر کیا دکھائی دیتا ہے۔ عکس کا عکس نہیں ہوتا اصلی شئے کا عکس ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہ واقعی کوئی چیز ہے جس کو عرفِ عام میں آسمان کہا جاتا ہے۔

ایک یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ تقوم کے لفظ سے سکون مراد لینا اور اس سے زمین کے ساکن ہونے پر استدلال کرنا غلطی ہے قیام سے مراد ہے بقا اور اپنی خاص کیفیت وضع اور حالت پر برقرار رہنا کیونکہ اگر قیام سے سکون مراد لیا جائے گا تو آسمان کو بھی ساکن ماننا پڑے گا حالانکہ کوئی عقلمند اس کا قائل نہیں۔ متقدمین آسمان کو محیطِ کل بتاتے ہیں۔ وہ ہر آسمان کی حرکت دوری کے قائل ہیں اور متاخرین فلاسفہ جو ہر کرہ کو جدا جدا مانتے ہیں وہ بھی محوری یا دوری حرکت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ آیت مذکورہ میں زمین و آسمان کی حرکت کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے نہ اس سے بحث کرنا قرآن کا منشاء ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں ہزاروں قسم کی پوشیدہ اور ظاہر مخلوق رہتی ہے۔ ہر نوع ہر جنس اپنے مکان اور اپنے حیز میں موجود ہے زمین پر گوناگوں جمادات نباتات حیوانات اور کائناتی عناصر موجود ہیں۔ آسمان پر ستارے سیارے تمام ملائکہ اور خدا جانے کون مخلوق ہے۔ یہ سب خدا کے بنائے ہوئے اور نیست سے ہست کئے ہوئے ہیں سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں۔ ہر چیز کی حقیقی ملک خدا ہی کو حاصل ہے۔ نہ زید مالک ہے نہ عمر نہ فرشتے نہ جنات نہ کوئی اور۔ ضابطۂ فطر

کے تحت رہتے ہوئے اگرچہ ظاہری طور پر زید کا مال زید کا اور عمر کا مال عمر کا ہے۔ اسباب اولادسے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ علت سے معلول کا وجود ہوتا ہے۔ زید عمر کا باپ کہلاتا ہے بکر کو خالد کا غلام کہا جاتا ہے۔ ستاروں اور سیاروں کی روشنی حرارت اور حرکت سے زمین پر تغیرات دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقی ملک کسی کی بھی نہیں صرف ظاہری تبرز اور تصرف ہے۔

كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ۔ نہ فقط ملک خدا کی ہے بلکہ ملک بھی خدا کا ہے۔ وہ ملک ہے تو ملک بھی ہے وہ خالق ہے تو حکمراں بھی ہے۔ اس نے نیست سے ہست کیا ہے تو حکومت بھی اسی کی ہے سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ جو قانون جس نوع کے لئے اس نے بنا دیا ہے اس سے سرکشی کوئی بھی نہیں کر سکتا جس شخص کو جس دائرہ کے اندر بند کر دیا وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ مقصود فطرت کی تکمیل میں تمام اجناس انواع اشخاص اور افراد سرگرم ہیں۔ قہری تسلط کے سامنے ہر ذرہ کا سر خم ہے۔

ایک وہم اگر شبہ کیا جائے کہ کروڑوں کفار مشرکین اور نافرمان انسان دنیا میں ہیں جو اللہ کے حکم کو نہیں مانتے اور اس کے قانون کو توڑتے ہیں۔ پھر ہر چیز کو فرمانبردار بتانا کس طرح صحیح ہے۔ اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں اطاعت سے اطاعت اختیاری مراد نہیں بلکہ انقیاد اور اطاعت اضطراری مراد ہے اضطراری اطاعت پر ہر کافر اور سرکش متمرد انسان بھی مجبور ہے۔ کون ہے جس کے قبضہ میں اپنی موت حیات مرض صحت افلاس تونگری ہو اور کون شخص ایسا ہے جو اپنی اندرونی اور بیرونی قوتوں کو پیدا کر سکتا ہے یا سلسلۂ نوعی کو توڑ کر اپنی ذات کو نوع انسان سے خارج کر سکتا ہے۔ یا لوازم انسانیت کو دور کر سکتا ہے یا غیبی اسباب کا علم اور ان پر تصرف رکھ سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ۔ اہل تفسیر نے باتفاق آراء لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں ابتداء تخلیق سے مراد ہے اس دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ پیدا کرنا اور اعادہ سے مراد ہے قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ تخلیق ثانوی تخلیق اول سے آسان ہے۔ صرف نئی صورت کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مادہ پہلے سے موجود ہی ہوگا یا ابتدائی تخلیق دشوار تھی جس کے لئے صورت کو پیدا کرنے کے ساتھ مادہ کو بھی عدم سے وجود میں لانا تھا جب خدا نے اول مرتبہ پیدا کر دیا اور نیست سے ہست کر دیا تو پھر دوبارہ پیدا کرنا اور موجودہ مادہ کو نئی صورت میں جلوہ گر کرنا دشوار نہیں۔ مفسرین کا بیان کیا ہوا مطلب بالکل صحیح ہے لیکن اگر اس کو کچھ اور وسعت دیدی جائے تو بہت لطیف مغز نکلتا ہے۔ يَبْدَؤُا اور يُعِيدُهُ دونوں مضارع کے صیغے ہیں۔ اول سے مراد ہے حال اور ثانی سے مراد ہے استقبال یعنی اللہ مخلوق کو اس دنیا میں ابتداءً پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہر منٹ بلکہ ہر سیکنڈ بلکہ ہر پل تمام کائنات میں تغیر تبدل کرتا رہتا ہے۔ ہر آن ہر چیز کو نئی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے اور اس تطور و نیرنگی کا سلسلہ جاری ہے پس ایسے خدا کے لئے بالکل آسان ہے کہ قیامت کے دن وہ دوبارہ پیدا کر دے کیونکہ وہاں تو صرف ایک مرتبہ پیدا کرنا ہوگا ہر آن اور ہر پل جسمانی ساخت میں تغیر پیدا کرنا نہ پڑے گا اور نہ ہر سکنڈ نئی صورت سے جلوہ گر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ دنیا میں تو وہ لاکھوں کروڑوں بلکہ لامحدود مرتبہ ہر شخص کے جسمانی اجزاء کی تخلیق و تبدیلی کرتا ہے۔ کیا آخرت میں اس کے جسمانی اجزاء کو اکٹھا کر کے صرف ایک صورت کا لباس بھی نہ پہنا سکے گا۔

ایک وہم کا ازالہ کمال الٰہی کا حال یکساں ہے نہ اس کے لئے کوئی چیز دشوار ہے نہ آسان نہ کسی چیز کا پیدا کرنا دوسری چیز کے پیدا کرنے سے اس کے لئے سہل ہے۔ درحقیقت کافروں کے لئے اعادۂ تخلیق کو ابتدائے تخلیق سے زیادہ آسان قرار دیا ہے۔ ابتدائے تخلیق کے تو کفار بھی قائل تھے مگر وجود ثانی کے منکر تھے اور اعادۂ حیات کو محال کہتے تھے اور محال کی ضد ہے سہل ترین امکان اس لئے خدا تعالیٰ نے پیرایہ تنقیل میں اعادۂ حیات کو سہل ترین قرار دیا گویا ان کو سمجھایا کہ جب خدا کے لئے پہلی مرتبہ پیدا کرنا دشوار نہیں جانتے تو تخلیق ثانوی کو تو مزید سہل سمجھو۔ احوال چگونگی تو اعادہ کے سہل ترین ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ اسی لئے حدیث قدسی میں آیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ آدمی نے میری تکذیب کی۔ حالانکہ یہ فعل اس کے سزاوار نہ تھا آدمی نے کہا کہ خدا نے جس طرح مجھ کو پیدا کیا اس طرح میرا اعادہ نہیں کرے گا باوجودیکہ (یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ ابتدائی تخلیق دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ مجھ پر آسان نہ تھی) مطلب یہ کہ خدا کے فعل میں سہولت و دشواری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا نہ اس کے لئے کوئی فعل دوسرے فعل سے آسان ہے نہ دشوار (بخاری)

وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ الخ۔ محمد بن منکدر کا قول ہے کہ مثل اعلیٰ سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ (رواہ مالک) ابن عباس اور قتادہ نے فرمایا مثل اعلیٰ سے مراد ہے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ دونوں قولوں کا حاصل ایک ہی ہے یعنی جس صفت اور جس شان میں نقص ہو وہ اللہ کے شایان نہیں۔ ہر صفت کمال میں کمال اعلیٰ واسطے ہے۔ پس اس کے سوا کسی میں وصف الوہیت کا تحقق ممکن نہیں۔ وہی الٰہ مطلق اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ ایک لطیف مطلب یہ اور بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی شان الوہیت و ربوبیت کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ ہر تمثیل ناقص اور ہر تشبیہ غیر ممکن ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں کہ اللہ کی ذات کو سمجھانے کے لئے اس سے تشبیہ دی

جاسکے۔ نہ کسی کے احوال و صفات ایسے ہیں کہ صفاتِ باری تعالٰے کو مجازی طور پر ہی واقعی تمثیل ان سے دی جائے۔ کیونکہ تمثیل و تشبیہ بغیر وجہ مشابہت اور صفتِ مماثلت کے ناممکن ہے۔ دو چیزوں میں اگرچہ کوئی وصف مشترک ہوتا ہے لیکن ایک میں کم اور دوسری میں زیادہ تو کم وصف رکھنے والی چیز کو زیادہ وصف رکھنے والی چیز سے مشابہت دی جاتی ہے۔ مثلاً زید بھی بہادر ہے۔ مگر زید کی شجاعت شیر کی شجاعت سے کم ہے تو زید کی بہادری کو شیر کی بہادری سے ادعاءً تشبیہ دینی ممکن ہے یہاں تک کہ زید کی انتہائی شجاعت کا لحاظ کرتے ہوئے بطور مبالغہ زید کو بعینہٖ شیر قرار دیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر زید میں شجاعت بالکل نہ ہو وہ انتہائی بزدل نامرد ہو تو ایسی صورت میں اس کو شیر سے مشابہ قرار دینا یا شیر کہنا محض استہزاء اور مذاق کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ چونکہ باری تعالٰے اپنی ذات و صفات میں تمام مخلوق سے علیحدہ ہے اور کسی مخلوق کو صفاتِ الٰہیہ کا ایک ناقص حصہ بھی نہیں ملا (کیونکہ اگر مخلوق کو وصفِ الٰہی کا ناقص طور پر حامل قرار دیا جائے گا تو اس کو ناقص اگر کہا جانا پڑے گا۔ اللہ کامل اللہ ہو گا۔ کیونکہ اس کو اپنی صفات میں کمال ہے اور مخلوق ناقص الٰہ ہو گی کیونکہ اس کے اندر ناقص صفاتِ الٰہی موجود ہیں۔ کسی مخلوق کو ناقص الٰہ کہنا بھی شرک ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کو ناقص طور پر صفاتِ الٰہیہ کا حامل نہیں قرار دیا جا سکتا) مخلوق کے اوصاف جدا ہیں اور خالق کے اوصاف جدا۔ پس اگر اللہ کی ذات یا صفات کی تصویر کشی کرنے کے لئے کسی مخلوق کو تمثیل ہی کے طور پر پیش کیا جائے گا تو یہ کذب و استہزاء کے علاوہ اور کیا ہو گا۔ تباین ذات و صفات کے باوجود تماثل و تشابہ کس طرح ممکن ہے۔ پس اللہ کی ذات صفات کی تصویر کشی ناممکن ہے۔ اس کی تصویر کشی تمام مخلوق کی سطح سے بالاتر ہے اصل تصویر کی حامل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ البتہ اہلِ معرفت کے قلوب پر تصویر کا عکس کسی قدر پڑ سکتا ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

إِذَا سَكَنَ الْغَدِيرُ عَلَى صَفَاءٍ ‏ ‏ ‏ وَجُنِّبَ أَنْ يُحَرِّكَهُ النَّسِيمُ

يُرَى فِيهِ السَّمَاءُ بِلَا امْتِرَاءٍ ‏ ‏ ‏ كَذَاكَ الشَّمْسُ تَبْدُو وَالنُّجُومُ

كَذَاكَ قُلُوبُ أَرْبَابِ التَّجَلِّي ‏ ‏ ‏ يُرَى فِي صَفْوِهَا اللّٰهُ الْعَظِيمُ

یعنی جب کسی تالاب کا یا حوض کا پانی صاف اور ساکن ہو اور ہوا کے جھونکے اس کو حرکت نہ دے رہے ہوں تو سورج اور ستاروں کا عکس اس میں دکھتا ہے یہی حالت اہلِ معرفت کے دلوں کی ہوتی ہے جب وہ صاف ہوتے ہیں تو ان کے اندر تصویرِ الٰہی کی جلوہ پاشیاں دکھائی دیتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان انسان کے جسمانی تغیرات پر بصیرت کی نظر ڈالنے کی دعوت اور آدمیوں کے مٹی سے پیدا کرنے کی صراحت اور بے جان مٹی میں جان پیدا کرنے کا تذکرہ اور اس سے قدرتِ قاہرہ کی ہمہ گیری اور وقوعِ قیامت کی صداقت پر ضمنی استدلال لِتَسْكُنُوٓا اِلَيْهَا سے زوجیت کی غرض کا بیان اور زوجین میں مودت و الفت پیدا کرنے کا تذکرہ فرما کر اس امر کی طرف ایماء کہ رشتہ زوجیت اور تقاربِ صنفی کو قائم رکھنے کے لئے خدا تعالٰے نے کیسا عظیم الشان احسان کیا کہ باوجود غیریتِ نسب، اختلافِ وطن، تفاوتِ شکل اور بیگانگی زبان صرف زوجیت کے تاگے ہی ایک کا دل دوسرے کی طرف کھنچ جاتا ہے اور ہر شخص کو اپنے جوڑے سے محبت ہو جاتی ہے۔ آیت وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ میں الوان کے ساتھ السنہ کا تذکرہ کرنا دقیق ترین اشارہ سے بتا رہا ہے کہ جس طرح جسمانی رنگ اور شکل کا خالق کوئی انسان نہیں۔ گوشت پوست کا رنگ قطعی طور پر بدل ڈالنا اور نیا رنگ پیدا کرنا انسانی قدرت سے خارج ہے۔ اسی طرح اختلافِ زبان کا خالق بھی کوئی انسان نہیں زبانیں اور زبانوں کے تمام الفاظ خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں جن کو آدمی اپنے مخارجِ صوتی کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں رات اور دن دونوں کا تذکرہ کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ سونا دن میں ہو یا رات میں بہر حال قدرتِ الٰہیہ کی ایک نشانی ہے اور بشرطِ ضرورت سونا کسی وقت ناجائز نہیں دن ہو یا رات۔ اس سے تردید ہوتی ہے ان لوگوں کے قول کی جو جَعَلْنَا الَّيْلَ سُبَاتًا اور جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے الفاظ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ دن میں سونا جائز ہی نہیں ہے۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے الفاظ مذکورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ رات اور دن کی پیدائش کے عمومی فوائد یہی ہیں کہ لوگ رات کو سوتے اور دن کو کماتے ہیں، لیکن اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو عدمِ جواز کا استنباط کسی طرح صحیح نہیں۔ احوال کے اقتضاء سے رات کو کمائی کرنی اور دن کو سونا ممنوع نہیں۔ بیماری ہو یا کوئی دوسرا خاص سبب اور اس کی وجہ سے معمولِ عمومی میں تغیر ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے ملکیتِ عامہ اور كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ سے حکومتِ تامہ کا اظہار مقصود ہے۔ وغیرہ

ضَرَبَ لَكُم مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ ۖ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا

اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہی ذات سے ایک مثال بیان کی کہ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی اس چیز میں جو ہم نے تمہیں دی ہے تمہارا شریک ہے

رَزَقْنَاكُمْ فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ

پھر تم اور وہ اس میں برابر ہو اور اُن سے ایسا خوف کرتے ہو جیسا انہیں اپنے (لوگوں) کا ہوتا ہے اللہ سمجھدار قوم کے لئے اپنی مدد کی نشانیاں

يَعْقِلُونَ ۝ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ فَمَن يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ

بیان فرماتا ہے بات یہ ہے کہ ظالم بغیر جانے بوجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے پس جسے خدا گمراہ چھوڑ دے اُسے کون ہدایت کرسکتا

اللَّهُ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝

ہے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔

تفسیر شیطان اے دہریت آدمیوں کی عادت ہے کہ جس بات تک ان کے تصور و ادراک کی رسائی نہیں ہوتی اور جو چیز اُن کے حدِ تخیل سے باہر ہوتی ہے اس کو سمجھنے جاننے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور جب وہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی اور دماغ کی پہنچ وہاں تک نہیں ہو سکتی تو پھر تخمین ظن اور وہم سے کام لیتے ہیں۔ ناقابل الفہم اور خارج از ادراک چیز کو اپنی ذات پر قیاس کرتے ہیں۔ ان کے سانچے میں اس مستحیل الادراک چیز کو ڈھال لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ زید کسی گاؤں میں رہتا ہے کبھی متمدن شہروں میں جانے کا اتفاق اس کو نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں قصر بکھنگم کی حقیقت اور کیفیت سمجھنا اس کے حد ادراک سے خارج ہے۔ وہ بیچارا اِدھر اُدھر لوگوں سے بکھنگم کے حالات دریافت کرتا ہے۔ اتفاق سے اس کو کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا جس نے قصر مذکور اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔ لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں اس کو بتاتے ہیں۔ غرض قصر مذکور کی واقعی کیفیت جب اس کے دماغ میں کسی طرح نہیں آتی یا نہیں آسکتی تو اپنے گاؤں کے زمیندار کے مکان پر قصر مذکور کو قیاس کرتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے کہ جس طرح زمیندار صاحب کا مکان اینٹ چونے لکڑی اور لوہے کا بنا ہوا ہے اور بڑا دروازہ لکڑی کے کواڑوں کا لگا ہوا ہے اور مکان کے سامنے ایک باغیچہ ہے جس میں مختلف قسم کے درخت لگے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی قصر بکھنگم ہوگا اور چونکہ اس کا مالک زمیندار سے بڑا ہے اس لئے اس کے مکان کی آراستگی اور شان اس سے زیادہ ہوگی۔ بس یہیں تک اس کے تصور کی رسائی ہوتی ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں سمجھتا۔ کتنا ہی اس کو سمجھایا جائے مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دوسری مثال (جو کسی قدر دقتِ نظر کی محتاج ہے) اس طرح سمجھو کہ فرشتوں کی حقیقت آج تک کسی کے دماغ میں نہیں آئی اور کسی نے فرشتوں کو نہیں دیکھا (الا ماشاء اللہ) اب عام طور پر لوگوں نے فرشتہ کی جو تخیلی صورت قائم کر رکھی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ شریعت کی زبان سے اتنا سن لیا تھا کہ فرشتے نور سے بنتے ہیں اور جنات نار سے اور انسان مٹی سے کسی چیز کا نورانی جسم آج تک نہیں دیکھا تھا اور نہ اس حد تک تصور کی رسائی تھی اس لئے خیالی گھوڑے دوڑائے اور ایک فرضی نورانی جسم جس میں طول عرض عمق اسی مادی جسم کی طرح جو طبع پر قائم کر لیا اور پھر اکثر لوازم جسمیت اس نورانی جسم میں ثابت کر دیئے۔ حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر مصر کی عورتوں نے جو اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ کہا تھا وہ اسی کلیہ کے ماتحت تھا۔ اُن کے خیال میں فرشتہ نام تھا ایک چمکدار حسین جسم کا حضرت یوسفؑ کے چہرے کی چمک دمک انہوں نے معمولی انسانوں سے بہت زیادہ دیکھی بس فوراً انسانی دائرہ سے ان کو خارج کر کے فرشتوں کی صف میں داخل کر دیا۔

تیسری مثال (جو بہت زیادہ غور طلب ہے) اس طرح سمجھو کہ جنت دوزخ کی واقعی حقیقت کو انسان اس زندگی میں رہتے ہوئے نہیں سمجھ سکتا عالم راحت والم کی چیزیں کسی نے نہ آنکھوں سے دیکھیں نہ کانوں سے سُنیں نہ دماغی تصور وہاں تک پہنچ سکا۔ لیکن شریعت کی زبان نے چند تمثیلات دے کر غیر محسوس کو محسوس کر کے بتایا اور مستحیل الفہم چیزوں کی طرف راغب بنانے یا اُن سے ڈرانے کے لئے حور قصور پھل پھول شراب دودھ شہد چاندی سونے موتی اور لعل وغیرہ

نعمتوں کا تذکرہ کیا اس طرح آگ سانپ بچھو تنگ قید خانہ آنکڑہ پیپ لہو اور ایسی ہی دوسری خبیث چیزوں کو بیان کیا چونکہ انسانوں نے یہ چیزیں دیکھی نہیں اور سمجھ میں آسکتی نہیں اس لئے قرآن نے غیر محسوس کو محسوس کا جامہ پہنا دیا۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ دوزخ و جنت کی کیفیت ماہیت اور خاصیت اسی قسم کی ہوگی جیسی ان چیزوں کی ہے۔ اصل مقصد تو صرف ترہیب و ترغیب اور واقعی مجہول الحقیقت مستحیل الفہم چیزوں کی تصویر کشی تھی مگر بے وقوف لوگوں نے اس سے دوزخ میں واقعتہ سانپ بچھو اور جنت میں لڑکیاں اور لڑکے سمجھ لئے۔ صرف اتنا تفاوت قائم رکھا کہ جنت و دوزخ کی چیزوں کی دنیا کی چیزوں کی کیفیت سے اعلےٰ تصور کر لیا حقیقت وہی باقی رکھی ہاں جو سمجھدار گروہ تھا اس نے جنت و دوزخ کے واقعی ہونے کا تو یقین کر لیا باقی مزید تفصیلات کو راحت و الم کی تصویر کشی کے لئے استعارہ اور کنایہ سمجھا اور صاف کہہ دیا کہ واقعی حقیقت اور کیفیت اور خصوصیات و لوازم ہماری حد ادراک سے خارج ہیں۔ خدا ہی جانے وہ کیا ہیں ہم ہمارا سب پر ایمان ہے۔

کوتاہ نظر انسانوں کی کوتاہ بینی اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس توہم و فرض کا تیر بہت ہی اونچی سطح پر پھینکا جاتا ہے اور ہر زمانہ میں ایسے غائبانہ تیر پھینکے گئے ہیں۔ جب قرآن ناطق نے بلند آہنگی سے اعلان کیا کہ اللہ وہ ہے جس نے تمام عالم کو پیدا کیا جو سب پر حکومت کرتا ہے جس کے قبضہ میں سارا جہان ہے۔ جس کی قدرت ساری کائنات میں جاری اور ساری ہے جو دنیا میں بھی سزا جزا دیتا ہے اور آخرت میں بھی ثواب عذاب دے گا۔ جو ہر جگہ ہے مگر آنکھوں سے نہیں دکھ سکتا جو سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے، جو سب سے اعلیٰ بالا اور ذالا ہے جس کے اقتدار کے سامنے آسمانوں کی بلندی، پہاڑوں کا استقلال، دریاؤں کی روانی اور سمندروں کی پہنائی ہیچ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سُن کر کافروں نے فکر کے گھوڑے خوب دوڑائے سمجھنے کی کوشش کی، خوب غور و خوض کیا مگر خدا کا یہ مفہوم نہ انھوں نے کبھی سنا تھا نہ ایسا خدا کبھی دیکھا تھا اس لئے ان کا دماغ حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن ان کے نزدیک بے دیکھے اور بے سمجھے خدا کو ماننا بھی حماقت کی علامت تھی۔ اس لئے انھوں نے خدائی کا تصور اپنی قوتِ واہمہ کے زور اور فرضِ تخیل کی قوت سے قائم کر لیا۔ انھوں نے سمجھا کہ خدا یقیناً ایک عظیم الشان شہنشاہ ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کا اقتدار زمین پر ہوتا ہے اور ان کے پاس راحت کدہ اور جیل خانے ہوتے ہیں۔ خدا چونکہ سب سے بڑا بادشاہ ہے۔ اس کا اقتدار پوری کائنات پر ہے۔ بادشاہ بھی پردے میں رہتے ہیں۔ اس لئے خدا بھی روپوش ہے۔ شاہی حکم ہر جگہ جاری ہوتا ہے۔ خدا کا حکم بھی ہر جگہ جاری ہے۔ بادشاہوں کو رعایا کی پوری ظاہری حالت معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو بھی ساری کائنات کا ظاہری علم ہے اس کا بھی ایک عیش خانہ (بہشت) اور ایک جیل خانہ (دوزخ) ہے۔ غرض ان بیوقوفوں نے اصل حقیقت کو نہ سمجھنے اور بغیر سمجھے ایمان نہ لانے کی وجہ سے خدا کو ایک بہت ہی بڑا بادشاہ فرض کر لیا اور پھر لوازم شہنشاہی کا خیر حصہ خدا میں موجود سمجھ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بادشاہ تن تنہا پوری حکومت کے سارے کام نہیں کر سکتا اسی لئے اس کو مشیرانِ حکومت وزراء عمال محصلان فوج اور دیگر خدام کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان معاونوں کے بغیر حکومت کا کام سرانجام نہیں پا سکتا اور یہ بھی ان کے پیشِ نظر تھا کہ ہر شخص کی براہِ راست بادشاہ تک رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ زیادہ کام وزیروں مصاحبوں اور کارندوں سے ہی نکلتے ہیں۔ اگر بادشاہ سے کوئی کام کرانا ہوتا ہے تو وزیروں اور پیشکاروں ہی کے ذریعہ سے درخواست کی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے یقین کر لیا کہ زمین و آسمان کے شہنشاہ کے لئے بھی مشیرانِ حکومت اور معاونین کی ضرورت ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ اس کی حکومت میں بہت سے اشخاص شریک نہیں ہیں تب بھی ایک کارندے کی تو بہر حال ضرورت ہے۔ لیکن کارندہ وہی ہوگا جس کو خدا نے خود یہ خدمت سپرد کی ہوگی وہ خدا کے زیر اقتدار ہوگا اس کا خدا پر اقتدار نہ ہوگا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے توہمات اور فرضیات کو ان بے دینوں نے خدا کی پاک ذات میں دخیل بنایا۔ اس حماقت کا سرچشمہ صرف یہ خیال تھا کہ کارندے اور عمال فرض کئے اور پھر خادموں کو شریک فی الحکومت سمجھ لیا۔ اول تو خدا کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرنا ہی غلط تھا پھر تمام لوازم شہنشاہ اس کے لئے ثابت کرنا خیال محال تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر غلطی یہ تھی کہ زبردست مجبور اور عاجز بیکس کو زبردست مختار اور مطلق کا سہیم و شریک بنا لیا۔ توہمات و فرضیات کی رو میں بہہ گئے اور یہ نہ سمجھا کہ خادم خادم ہی ہوتا ہے اور شریک شریک ہوتا ہے۔ خادم نوکر زیر دست اور عاجز ہوتا ہے اور شریک ساوی مرتبہ رکھتا ہے۔ کم بختوں نے خدا کو اپنی ذات سے بھی زیادہ کمزور سمجھ لیا۔ اگر اپنی حالت پر ہی خدا کی حالت کو قیاس کیا ہوتا تو عقیدہ میں یہ فساد نہ پیدا ہوتا۔

کون آدمی ایسا ہے جو اپنے غلام یا باندی کو وہ حقوق عطا کر دے جو برابر کے حصہ دار اور تجارتی شریک کو حاصل ہوتے ہیں۔ کیا شریک تجارت کی طرح غلاموں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ یا غلاموں سے مالی کاروبار اور تجارتی تصرفات میں ایسا اندیشہ اور خوف کیا جاتا ہے جو شریک تجارت سے کیا جاتا ہے۔

تجارت میں برابر کی شرکت اگر کسی شخص سے ہو جائے تو پھر آدمی تجارتی مال کا پورا حساب درست رکھتا ہے اور اس کو اندیشہ رہتا ہے کہ اگر شریک نے حساب فہمی کا مطالبہ کیا تو غلطی نہ ہو جائے لیکن اپنے غلام سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کو کتنا مختار کر دیا جائے۔ پھر بھی اس کی طرف سے گرفت کا خوف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کو تجارتی حکومت حاصل نہیں ہوتی اور وہ ہر وقت آقا کی نظر کا محتاج ہوتا ہے۔ غلام اور شریک کا یہ فرق ہر شخص کے پیش نظر ہے۔ باوجودیکہ غلام اور باندی کا خالق کوئی آقا نہیں ہوتا صرف مجازی مالک ہوتا ہے نہ وہ دولت و مال جو تجارت میں لگایا جاتا ہے اس کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے بلکہ خدا داد ہوتا ہے۔ لیکن خدا تو ساری کائنات کا خالق ہے۔ یہ پورا سرمایۂ وجود اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر کسی کو اس کا معاون اور نائب فرض کر لیا جائے تب بھی حصہ دار نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسے نائب کا درجہ غلام سے کمتر ہوگا وہ خود خدا کا پیدا کردہ ہوگا اور غلام اپنے آقا کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔

پس کس قدر حماقت ہے کہ بے دقوف کا فر خدا کا شریک اور سہیم قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق، حاکم حاکم ہے اور محکوم محکوم، مالک مالک ہے اور مملوک مملوک، مختار مختار ہے اور مجبور مجبور، لیکن والے بدنصیبی۔

جس کو خدا ہدایت نہ کرے اسے کون ہدایت کر سکتا ہے جس کو اللہ نے بے راہ چھوڑ دیا ہو اس کو کوئی درس بصیرت کوئی تمثیل اور کوئی تشبیہ کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔ بڑا حسرتناک ہوگا وہ وقت جبکہ فرضی معبود اور موجودہ شریک الوہیت کچھ کام نہ آئیں گے اور مشرک بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ فَعِيَاذًا بِاللهِ ثُمَّ عِيَاذًا بِاللهِ۔

تحلیلِ اجزاء ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ۔ جتنی جس کی نظر ہوتی ہے اتنا ہی اس کا علم ہوتا ہے۔ عام لوگ کوتاہ بین اور قاصر الفہم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا اور ہر مافوق الادراک چیز کو اپنے ہی دائرے میں ڈھونڈتا اور عقل سے بالاتر ہستی کے احوال کو اپنے احوال پر قیاس کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لئے بھی کوئی خاص طرز کلام اور طریق تعبیر ہونا ضروری ہے۔ قرآن ناطق فقط علماء حکماء اور دانشمندوں کی ہی ہدایت کے لئے نہیں نازل ہوا بلکہ عوام کی ہدایت اس کا اولین مقصد ہے۔ اس لئے بعض مقامات پر طرز بیان بھی وہی اختیار کیا گیا جو عوام کے دماغ کے مناسب ہے اور خواص کو اس میں چوں و چرا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مقصد کے پیش نظر شرک کی بیخ کنی اور غیر اللہ کی الوہیت کی نفی کرنے کے لئے تمہاری ذات اور احوال ذات کو پیش کر کے خدا تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے۔ تمثیل کے کیا فوائد ہیں۔ ہم متعدد مرتبہ اس کو بسط سے بیان کر چکے ہیں معقولات اور مافوق الادراک چیزوں کو من وجہ قابل فہم اور سہل العلم بنانے کے لئے محسوسات مبصرات اور عادیات کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے تاکہ کوتاہ نظر رکھنے والے بھی اپنے دماغوں سے بالاتر چیزوں کو کسی نہ کسی صورت سے کسی قدر سمجھ جائیں اور غیر مرئی حقیقت نظروں کے سامنے آجائے۔

آغاز آیت سے لے کر آخر تک پورا بیان اگرچہ ہر قسم کے شرک کا ابطال اور توحید کے اثبات پر دلالت کر رہا ہے لیکن تسلیم مطلب کے باوجود اہل تفسیر نے اس کا سبب نزول ایک خاص لکھا ہے۔ عموماً مشرکین عرب اسلام سے پہلے بھی حج کرتے تھے مگر ان کا حج شرک آمیز ہوتا تھا۔ محض لوجہ اللہ نہ ہوتا تھا چنانچہ تلبیہ پڑھنے کے وقت یہ الفاظ کہتے تھے۔ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ یعنی اے خدا ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہاں ایک شریک ضرور ہے کہ وہ تیرا ہی ہے اور تو ہی اس کا مالک ہے وہ (کسی چیز کا خود) مالک نہیں گویا اہل شرک خدا کا ایک ساجھی اور شریک بھی قرار دیتے تھے اور اس کو خدا کا مملوک اور زیردست بھی جانتے تھے۔ شریک اور خادم میں ان کے نزدیک کوئی تفرقہ نہ تھا (ایسا کیوں کرتے تھے صرف وساطت اور وسیلہ ثابت کرنے کے لئے اور اپنی بداعمالیوں کو سفارشی کی سفارش سے بارگاہ خداوندی سے معاف کرانے کے لئے اگر کسی سفارشی کا عقیدہ اور وساطت و وسیلہ کا خیال ترک کر دیتے تو پھر بدکاریوں کے میدان میں مطلق العنان ہو کر دوڑنا ان کو کیسے میسر آتا) مذکورہ عقیدہ اور قول کی تردید میں ان آیات کا نزول ہوا اور شریک و مملوک کا فرق دکھا کر بتا دیا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر چیز اس کی مخلوق و مملوک ہے پھر کسی کو حقوق شریکانہ کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ الخ خلاصہ مثال یہ ہے کہ تم اور تمہارے مملوک باندی غلام سب اللہ کی دی ہوئی روزی کھاتے ہو۔ پھر بھی ملک کے تعلق کا اتنا اثر ضرور ہے کہ تم ان کو حق تصرف میں نہ اپنے برابر کر کے ان کو مشورے وغیرہ میں شریک رکھتے ہو۔ نہ ان کی رضاجوئی کا خیال ہر وقت تمہارے پیش نظر رہتا ہے نہ کاروباری شرکت کے مطالبہ کا ان سے تم کو ایسا اندیشہ رہتا ہے جیسے اپنے شریکوں سے رہتا ہے۔ پھر بھلا مالک حقیقی یعنی اللہ کیونکر کسی کو اپنا شریک بنانا اور معبود کہلوانا پسند کر سکتا ہے۔ باوجودیکہ سب اس کے پیدا کئے ہوئے اور حقیقتاً مملوک ہیں اور باندی غلاموں سے کہیں کم تر درجہ رکھتے ہیں اور کسی ذاتی یا وصفی

کمال میں اس کے مثل نہیں۔

فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ فقرۂ مذکورہ میں باندی غلاموں کو شریک فی الاموال بنانے کے متعلق استفسار کیا تھا۔ اس جملہ کو اسی پر متفرع کیا۔ یعنی اول تو تم باندی غلاموں کو اپنے مال میں شریک ہی نہیں بنا سکتے۔ باوجودیکہ مال کے حقیقی مالک تم بھی نہیں ہو بلکہ سب مال خداداد ہے۔ نہ باندی غلاموں کے تم حقیقی مالک ہو پھر خصوصیت کے ساتھ ایسا شریک تو ان کو ہرگز بنانا پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اور ان کے حقوق ملکیت و تصرف اس مال میں برابر ہو جائیں۔

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ۔ پھر شرکت اور مساوات حقوق بھی ایسی ہو کہ جس طرح اپنے لوگوں سے (مالی معاملات میں) ڈرتے ہو ایسے ہی ان سے بھی ڈرو۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مملوک کو مالی معاملات میں کوئی حق آقا کی گرفت کا تم نہیں دیتے اور اگر مختارِ تجارت بنا کر ایسا کر بھی دو تب بھی مساویانہ شرکت اُن کی گوارا نہیں کرتے اور اگر یہ بھی ہو جائے اور کوئی مندمیں آکر ایسا کر بھی لے تب بھی غلام باندی کی طرف سے اس کو حسابی غلطی اور کاروباری نقص پر گرفت کرنے کا ایسا اندیشہ اور خوف نہیں ہوتا جیسا آزاد مختار شریک کار سے ہوتا ہے۔ ابومجلز نے فقرۂ مذکورہ کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ تم کو اپنے مملوک سے یہ خوف نہیں ہوتا کہ اہلِ قرابت کی طرح وہ تمہارے مال کی تقسیم کرائے گا اور اپنا حصہ اپنے قبضہ اور تصرف میں لے لیگا۔ فائنًا ابومجلز کے نزدیک انفسکم سے مراد قرابتدار ہیں اور اول مطلب کی صورت میں آزاد شریک کار مراد ہوں گے۔ اور ممکن ہے مَا رَزَقْنٰهُمْ سے مال وراثت مُراد ہو اور اَنْفُسَكُمْ سے وہ لوگ مراد ہوں جو شرعی قانونی حقوقِ وراثت رکھتے ہیں۔ باندی غلاموں کو رواجًا اور شرعًا آقا کی میراث میں سے کوئی حصہ نہیں پہنچتا اور کوئی بیٹا اپنے باپ کے مرنے کے بعد مالِ وراثت میں اس کے باندی غلاموں کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتا بلکہ باندی غلام خود بھی اس کی ملکیت میں آجاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جس چیز کو کوئی انسان اپنے لئے پسند نہیں کرتا بلکہ باندی غلام خود بھی اس کی ملکیت میں آجاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جس چیز کو کوئی انسان اپنے لئے پسند نہیں کرتا خدا کے لئے اس کو ثابت کرے۔

مقصودِ بیان شرک کی عقلی اور برہانی مذمت اور اس بات کی طرف اشارہ کہ جس چیز کو انسان اپنے لئے پسند نہ کرے لازم ہے کہ اس کو خدا کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ اگر باری تعالیٰ کی کمل تنزیہ و تقدیس تجرد ذہنی اور روشنی عقل کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی تو کم از کم اتنی بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا پر ان اوصاف کی بندش جن کو خود انسان اپنے لئے پسند نہیں کرتا مذموم ترین فعل ہے۔

اَهْوَآءَهُمْ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقتًا ان ظالموں کا عقل اور روحانیت سے کچھ تعلق نہیں یہ نفس پرست اور بندگانِ خواہش ہیں۔ واقع میں ان کو کوئی واقفیت نہیں نہ عقلی علم نہ نقلی۔

مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ گمراہ چھوڑنے والا یا بے راہ کرنے والا یعنی ایسے اسباب فراہم کرنے والا جس سے آدمی بے راہ ہو جائے خدا ہی کا کام ہے اور جس کو خدا بے راہ چھوڑ دے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ

تم یکسو ہو کر اپنا رُخ دین کی طرف سیدھا رکھو یہ دین وہی فطرتِ خدا ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے میں

اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ڎ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ

تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ بے علم ہیں (فطرت کا اتباع کرو) خدا کی طرف متوجہ ہو کر اور اُس سے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڎ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ

ڈرو اور نماز ٹھیک پڑھتے رہو اور مشرکوں سے نہ ہو جنھوں نے اپنے دین کو پراگندہ کر رکھا ہے اور

كَانُوا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝

فرقے فرقے بن گئے ہیں ہر گروہ اسی پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے

تفسیر

آیاتِ مذکورہ میں دینِ توحید کو دینِ فطرت کہا گیا ہے اور دینِ فطرت پر قائم رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور نماز کی پابندی کا خصوصی حکم دیا گیا ہے اور ان مشرکوں کے ساتھ شامل ہونے کی ممانعت کی گئی ہے جنھوں نے دینِ فطرت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ شیرازۂ توحید کو بکھیر دیا اور مذہب حق کو پارہ پارہ کر کے چند در چند فرقے بن گئے۔ دینِ فطرت کونسا ہے اور کن لوگوں نے اس کے شیرازہ کو بکھیرا اور مشرک ہو گئے اور نماز سے کونسی نماز مراد ہے اس کی تشریح کے لئے بسیط مقالہ کی ضرورت ہے اور زیادہ تطویل کے لئے نہ ہمارے پاس وقت ہے نہ یہ مختصر تفسیر اس کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لئے مختصر طور پر تنقیح کافی سمجھتے ہوئے چند الفاظ لکھ دینے ہی مناسب ہیں۔

شرک کیا چیز ہے طویل طریقوں کو چھوڑ کر اور تمام اقسام سے قطع نظر کر کے اتنا جان لینا کافی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو کارخانۂ قدرت کا مختارِ مطلق سمجھنا یا کسی اور کو خدا کا مددگار جاننا یا حکومتِ جہان میں کسی کو خدا کا ساجھی خیال کرنا خواہ بطور معاونت ہی ہو یا ذاتِ اقدس کے علاوہ کسی کو قابلِ پرستش یقین کرنا سب ہی شرک کے اقسام ہیں۔ توحید کا دعویٰ تو دنیا کی تمام اقوام اور سارے مذاہب میں موجود ہے۔ خدا کے تعدد کا کوئی بھی قائل نہیں لیکن باوجود ادعائے توحید کوئی ملت بھی شرک سے خالی نہیں رہی۔ کارخانۂ قدرت کا مختار یا حکومتِ الٰہیہ کا مددگار تمام ملتوں نے کسی نہ کسی کو بنا لیا اور عملاً غیر اللہ کی پرستش سب ہی اقوام میں جاری ہو گئی۔

صابی مذہب کا شرک

دنیا کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے شرک کا آغاز کواکب سے ہوا مصر، کلدانیا، ایران اور ہند میں ستارہ پرستی کا سب سے مقدم ہونا پایا جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری تاثیرات گرمی سردی، نباتات کا نشو و نما، معدنیات کی رنگ آمیزی، نباتات کی نیرنگی اور حیوانات کی تلون مزاجی اور نیرنگی حال کو دیکھ کر نظامِ علوی (آسمانی) اور نظامِ سفلی (زمینی) کا باہم میل ملاپ اور تاثیر و تاثر انسانی عقل میں آیا اور انہیں دونوں نظاموں کے طبعی اثرات دیکھنے کے بعد ان کے باہمی تعلقات سمجھ میں آئے جن کے سبب ایک طرف علم نجوم گردشِ کواکب کی وجہ سے قائم ہوا اور دوسری طرف ستاروں کی تاثیر روکنے یا رفع کرنے کے لئے ان کی پرستش شروع کر دی گئی اور پرستش کا نام تسخیر رکھا۔ ستارہ پرستی کے متعلق یہ خیال قائم ہوا کہ ستارے جاندار اور ذوی عقل ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ان میں دیوتاؤں کا مسکن ہے اور یہ خیال تمام مشرقی اقوام میں اب بھی پھیلا ہوا ہے۔ تاثیرات اور گردش فلکی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ستاروں کا اثر دنیا پر ہے اور اسی سبب سے ان کی تعظیم اور عبادت ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ یہی ستارے قدیم زمانے میں شخصی نام سے موسوم ہو گئے مثلاً زحل، مریخ، عطارد، زہرہ، مشتری وغیرہ۔ چونکہ یہ ستارے نظر سے غائب ہو جاتے تھے۔ اس لئے ان کی جگہ ان کی ہیکلیں قائم کی گئیں۔ اور ان ہیاکل کی ویسی ہی عبادت ہونے لگی جیسی اصلی ستاروں کی ہوتی تھی۔ مسٹر بردوڈ کا خیال ہے کہ صابی مذہب کی پرستش اصنام کا یہی آغاز ہے اور تمام قدیم اقوام اس میں آلودہ تھیں۔ بعض جانوروں کو بعض ستاروں کا خصوصی مظہر خیال کیا جاتا تھا۔ مثلاً سانپ کو سورج کا مظہر کہا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ تمام خلا روحانیات سے بھرا ہوا ہے۔ کلدانیہ سے صابی مذہب جاری ہو کر مصر اور ہندوستان پہنچا اور پھر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ ہند کے معبد اور مندر بھی صابی مذہب کی طرح ہوئے۔ اس تقریر سے یہ امر واضح ہو گیا کہ ستارہ پرستی کا فلسفہ یہ ہے کہ ستارے ذوی روح اور ذی عقل ہیں۔ ان میں نیک و بد کی تاثیرات کی قوت ہے اور گردشِ فلکی پر ان تاثیرات کا انحصار ہے۔ ستاروں کا سعد و نحس انسان کے جسم اور دنیا کے تمام امور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بارش کی کشش بھی ان ہی ستاروں کی تاثیر پر منحصر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام روئے زمین اور خلا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی تاثیر سے ہوتا ہے۔ خدا اگرچہ ہے اور ایک ہے لیکن عالم میں تصرف اور حکومت ستاروں کی ہے۔ پس عبادت کے ذریعہ ان کی خوشنودی حاصل کرنی لازم ہے۔ یہ صابی مذہب کی توحید تھی جو سراسر شرک سے بھری ہوئی تھی۔

زردشتی مذہب کا شرک

دساتیر، ژند اور اوستا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشتی مذہب میں بھی ستاروں کی تعظیم کا حکم ہے اور عبادت کے وقت ان کی ہیکلوں کو پیشِ نظر رکھنے کی خصوصی ہدایت ہے۔ نامہ آباد (جو اگرچہ اسلامی دور کی تالیف ہے اور کسی طرح تحریف سے خالی نہیں تاہم اہلِ مذہب کے نزدیک اس کی صداقت و صحت مسلّم ہے) میں زردشت کی یہ عبارت یعنی اصل عبارت کا ترجمہ درج ہے:

مد و بسوئے ایشیں نماز ادا کنید یعنی تماثیل و اشکال سبعہ سیارگان ہنگام نماز کردن پیش روداریدو بداں سو نماز گزارید۔"

اس سے ثابت ہوا کہ اہل ایران کواکب کو قبلہ نماز بناتے تھے اور ان کی انتہائی عظمت کرتے تھے اور عالم سفلی کے تمام حوادث پر ستاروں کی اثر اندازی کے قائل تھے ستارہ پرستی کے علاوہ زردشتی مذہب میں عالم سفلی کی بھی پرستش کی تعلیم تھی۔ عالم سفلی آگ، پانی، ہوا اور خاک سے مرکب ہے، انہی عناصر سے جمادات نباتات اور حیوانات کا وجود ہوا۔ یہ ساتوں مل کر عالم سفلی کے سبعہ سیارہ ہیں۔ ان ساتوں میں روح مسلم ہے اور جسم طبعی تو ان کا ظاہری ہے۔ اس طبعی جسم اور روح کا نظام فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے اور ہر ایک قسم کا ایک خاص فرشتہ اس کا رب النوع ہے اور چونکہ یہ مظاہر قدرت رب النوع کی وجہ سے دنیا میں جلوہ نما ہوئے ہیں اس لئے رب النوع کی عبادت ضروری ہے۔ زردشتی مذہب میں رب النوع کی پرستش سے ہی انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے اور اسی کے واسطے سے خدا تک رسائی ممکن ہے اس فلسفہ کے موجد قدیم ایرانی ہیں۔ ان کے مذہبی اقوال میں یہ بات صاف طور پر عیاں ہے اور دیگر اقوام مصر و کلدانیہ اور ہندی آریہ میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

زردشت کی سوانح عمری میں الہام دوئم کا یہ مضمون ہے کہ خاک، پانی، آگ، ہوا، جمادات، نباتات اور حیوانات کے ارباب الانواع سے زردشت کی جدا جدا ملاقات ہوئی اور انھوں نے زردشت کو اپنی اپنی جنس کی حفاظت کی ہدایت کی۔ زردشت چونکہ اشیاء کا محافظ تھا اور ساتوں میں آگ سب سے زیادہ روشن اور مظہر نور نوع تھی۔ اس لئے اس نے ان میں سے آگ کو قبلہ نماز قرار دیا اور اس کی حفاظت کے لئے آتش کدے بنوائے۔ عبادت کے وقت آگ کو پیش نظر رکھنے سے یہ مقصود تھا کہ وہ آگ کے رب النوع سے مخاطب ہے۔ اسی لئے وہ نماز کے وقت یہ الفاظ ادا کرتا تھا:۔

"اے پروردگار نماز مرا بہ یزداں برساں"

گویا زردشتی مذہب میں موسس مذہب کے قول کے مطابق ستاروں کی ہیکلوں کو یا آگ کو عبادت کے وقت پیش نظر رکھا جاتا تھا ستارے بھی نورانی ہیں اور عالم سفلی میں آگ سب سے زیادہ روشن ہے اور نور ہی کی پرستش زردشتی مذہب کا سنگ بنیاد ہے لہٰذا سبعہ سیارہ اور آگ کی پرستش عبادت کا اصل مظہر قرار پایا۔

لیکن زردشت کا یہ بھی خیال تھا کہ برزمین ہرچہ ہست پیکر و سایۂ چیز یست کہ در سپہر است۔ اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زردشتی عبادت سایہ کی نہ تھی بلکہ جس کا سایہ تھا اُس کی تھی۔

اس لمبی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آتش کدے قدیم سے ہیں اور زردشتی مذہب میں آگ اور ستارے قبلہ نما قرار پائے تھے۔ آسمانی اجسام اور آگ کا رب النوع معبود یا کم از کم عبادت کا وسیلہ اور واسطہ ضرور تھے۔ لیکن واسطہ اور وسیلہ کی (حتیٰ عظمت بڑھادی) گئی تھی کہ آخر میں وہ بجائے خود معبود بن کر رہ گیا تھا۔ اور اس طرح توحید میں تکثیر پیدا ہوگئی اور معبود واحد کی جگہ متعدد معبودوں نے لے لی اور دین فطرت کا شیرازہ بکھر گیا اور خالص توحید شرک آلود ہو۔

ہندو مذہب کا شرک

یہ حالت تو صابی اور مجوسی مذہب کی تھی۔ اب ذرا ہندو ازم کی حالت بھی سنئے۔ یورپین مورخ وید کے زمانے میں ہندوؤں کے مذہب کی حالت محض قدرتی مظاہر پرستی بتاتے ہیں جس میں نظام علوی یعنی کواکب پرستی اور نظام سفلی یعنی عناصر جمادات، نباتات اور حیوانات کی پوجا داخل ہے۔ رگ وید میں جن قابل پرستش دیوتاؤں کا ذکر ہے ان کی ترتیب یہ ہے:۔

(۱) اندر (بارش کا دیوتا) (۲) ورنا (آسمان یا انصاف کا دیوتا) (۳) ولیشن، وشنو (سورج کا دیوتا) (۴) اگنی (آگ کا دیوتا) (۵) وایو (ہوا کا دیوتا) (۶) یاما، یامی (صبح اور شام کا دیوتا) (۷) سرسوتی (دریا کا دیوتا)۔ یہ وہ دیوتا ہیں جو معبود یا قابل پرستش خیال کئے جاتے تھے اور انہی کی عبادت کی جاتی تھی اور کائنات کا نظام انہی کے ہاتھوں میں خیال کیا جاتا تھا۔ خود سری کرشن رہنمائے مذہب ہنود نے ان کی پرستش کی تلقین کی اور صراحت کردی کہ عوام نا معلوم خدا کا تصور نہیں کر سکتے اور نہ حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے موجودہ کائنات کو خدا ہی سمجھیں۔ اسی لئے سری کرشن نے سب سے پہلے اپنے آپ کو خدا کہا اور صاف اعلان کردیا کہ تم ثابت قدمی سے میری جانب اپنے خیالات لوٹانے کی قابلیت نہیں رکھتے تو سخت عشق و عبادت سے میری قربت حاصل کرو۔ عشق میں ثابت قدم نہ رہ سکو تو ادائے فرائض میں سرگرم رہو سخت عشق سے علم بہتر ہے اور علم پر مراقبہ یعنی تصور کو ترجیح ہے اور تصور پر ترک خواہشات کو، لیکن بے دیکھے خدا کی پرستش کرنی انسان فانی کے لئے سخت دشوار ہے۔ لہٰذا بشکل نمایاں پرستش کرنی چاہیئے اور وہ نمایاں شکل مخلوقات ہے۔ انسان مخلوق کی پرستش کیونکر کر سکتا ہے بھگتی یا عشق کے ذریعہ سے۔ سری کرشن کا قول ہے ہم کو خدا پر پورا بھروسہ کرنا چاہیئے مگر خدا کی پرستش شکل نمایاں میں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دنیا کے مغالطہ کی وجہ سے انسان بے دیکھے خدا کو نہیں جان سکتا جس طرح سویا ہوا آدمی اپنی خواب گاہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس انسان کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو اس کے اختیار میں ہو اور جس کے ذریعہ سے

وہ نزقی کر سکے۔ عالم مخلوقات، ویسا نہیں ہے جیسا انسان اس کو سمجھتا ہے، تاہم وہ جھوٹا اور غیر حقیقی بھی نہیں ہے۔ عالم مثال گو مغالطہ کی وجہ سے انسان کا پیدا کیا ہوا ہو، مگر وہ خدا کی شکل میں نمایاں ضرور ہے۔ خدائے حقیقی کو جاننا مغالطہ میں پڑے ہوئے انسان ضعیف البنیان کے لئے ناممکن ہے۔ لہٰذا قدرت کاملہ یعنی عالم موجودات کو اپنا خدا ماننا چاہیئے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح سے تیرہ سو برس پہلے صورت پرستی عام طور پر پھیل گئی اور مظاہر پرستی پہلے ہی سے تھی۔ لہٰذا بت پرستی اور آثار پرستی عام ہو گئی۔

اس کے بعد نویں صدی عیسوی میں شنکر اچاریہ ہندو ریفارمر نے بُت پرستی میں معمولی ترمیم کر کے اس کو برقرار رکھا۔ بعض مندروں میں مورتی اور بعض کی مورتیں رکھیں۔ پھر گیارھویں صدی میں رامانج نے شیو (کارکنان قدرت) کی پوجا عوام میں جاری کی۔ پھر راما نند نے رام (اجودھیا کے ایک بزرگ آدمی) کو الوہیت کا درجہ دے کر شمالی ہند میں ان کی پرستش کو رواج دیا۔ گویا ان چار بزرگوں کے نام سے قدرت کی مظاہر پرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ سری کرشن نے عام طور سے موجودات کی پرستش کو جائز قرار دیا۔ شنکر اچاریہ نے وشنو اور رامانج نے شیو کی پوجا کرائی اور راما نند نے ہیرو پرستی یعنی رامچندر کی پرستش کو رواج دیا۔ گویا ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی مندروں میں اب تک پرستش ہوتی ہے انہی چار اشخاص کے ایجاد کردہ ہیں۔ یہ ہے ہندو دھرم کی کیفیت اور یہ ہے توحید مشرکانہ جس میں خالص خدا کے سامنے سر جھکانے کی کہیں بھی تعلیم نہیں۔ اگر ہے تو شرک آمیز یا خالص شرک۔

بدھ مت کا شرک

ساکیامنی یعنی گوتم بدھ (جس کے پیرو کروڑوں انسان ہوئے) نے سب سے بڑا اصول دہریاپن کا نکالا۔ انسان کو خدائی کا درجہ دیا۔ اپنی ذات کو عقل کل بتایا۔ دنیا میں اپنی الوہیت کا بلند آواز سے اعلان کیا اور خدا کے معمولی تصور کو بھی مٹا دیا یہاں تک کہ گوتم نے مورت پرستی اور ضابطہ کو دونوں سے الگ رہ کر انسان پرستی کی بنیا ڈالی لیکن گوتم نے پیروؤں نے برہما، وشنو اور شیو کی پوجا کو رواج دیا۔ مختلف معابد اور شیالے بنائے مورتیں قائم کیں، تیرتھ یاترا اور میلے جاری کئے اور انسان پرستی کو بُت پرستی میں غرق کر دیا۔ جڑ ہی خراب تھی شاخیں اور زیادہ خراب ہو گئیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے سابی مذہب میں ستارہ پرستی یعنی نظام علوی کی عبادت کی جاتی تھی۔ ایرین یا زردشتی دین میں کواکب پرستی کے ساتھ ساتھ آتش پرستی بھی عبادت کا جزو لازم قرار پایا۔ ہندو دھرم میں مخلوق پرستی، دیوتا پرستی، ہیرو پرستی اور بُت پرستی رواج پذیر تھی۔ بدھ مت میں انسان پرستی اور صنم پرستی نمودار ہوئی۔ غرض خالص توحید کا کسی جگہ نام و نشان نہ تھا۔ اگرچہ ہر مذہب خدا کے واحد ہونے کا مدعی تھا مگر اس کے سامنے سر جھکانا محال سمجھا جاتا تھا اور جہان کی حکومت و تصرف سے اس کو سبکدوش خیال کیا جاتا تھا۔

اب ذرا اُن مذاہب پر بھی اجمالی نظر ڈال لیجئے

جو خدا پرستی کے مدعی ہیں کہ کہاں تک ان میں پرستش کرد گار ہے۔ کیا واقعی ان کی عبادت ریاضت اس قابل ہے کہ اُن کو پرستش الٰہی کہہ سکیں یا محض زبانی جمع خرچ ہے۔ خدا پرستی کا دعویٰ کرنے والے دو مذہب خیال کئے جاتے تھے۔ یہودیت اور عیسائیت۔ ہم ذیل میں ہر ایک کی حالت علیحدہ بیان کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد بانیان مذہب کی ذات تعلیم اور اقوال پر کسی قسم کا کوئی حملہ کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے عقیدہ میں یہ ہستیاں صادق، معصوم اور خالص توحید کی علمبردار تھیں۔ وہ سب خدا کے فرستادے اور سچے نائندے تھے۔ ہم صرف ان کے بگڑے ہوئے طریق مذہب سے بحث کرنی چاہتے ہیں اور دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا پرستی ان دونوں میں سے کس میں بحالہ باقی رہی اور کس کا طریق عبادت بُت پرستی اور شرک کی آلائشوں سے ناپاک ہو گیا۔ خدا پرستی یا نظام خدا پرستی کے پانچ ارکان ہیں۔ توحید، رسالت، امام و نواہی، اجزا، توحید تمام مبدا و معاد کا مرکز ہے اور مبدا و معاد مخلوق کے آغاز و انجام کا نام ہے۔ رسالت ایک قدرتی مشعل ہے جو مبدا و معاد کی تاریکی دور کرتی ہے اور اس کا نورانی جلوہ دکھاتی ہے۔ یہی نور و ظلمت اوامر و نواہی ہیں جن سے مبدا و معاد کا سلسلہ وابستہ ہے۔

یہودیت کا شرک

یہودیت اپنے اندر پانچوں ارکان موجود ہونے کی مدعی ہے۔ وہ خالص توحید کے دعوے کے ساتھ حضرت موسٰی (۱۵۰۰ق م) کی رسالت کا اقرار کرتی ہے۔ اوامر و نواہی اور سزا جزا کا مرکزی نقطہ حضرت موسٰی کی ذات ہی کو قرار دیتی ہے اور توریت کے سختی سے مطابق عمل کرنے کا بھی اعلان کرتی ہے۔ لیکن کیا واقعی یہودی خالص توحید کے قائل ہیں؟ کیا ان کی عبادت موحدانہ ہے؟ اگر اس کی تنقیح کی جائے گی تو جواب نفی میں ملے گا۔ حضرت موسٰی نے واقعی خدائے واحد کی پرستش کا اعلان کیا، بُت پرستی کے خلاف جہاد کیا، نماز کو ذریعہ عبادت قرار دیا۔ صحیح اعمال و عقائد کی تعلیم دی، لیکن یہودیوں نے حضرت عزیر (۴۹۵ق م) کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ ان میں سے کچھ لوگ علم اور اللہ کی کتاب کے خاص طور پر حامل بن گئے۔ عام لوگوں کو کتاب الٰہی کی تعلیم سے محروم کر دیا اور خود

اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حرام و حلال کے احکام دینے شروع کر دیئے۔ اس طرح ان کی زبان شریعت بن گئی اور انھوں نے انسانوں کو خدا کی بجائے اپنے احکام کا مطیع بنالیا۔ کتاب عذرا باب ۹ آیت ۱۳ میں ان کو نماز میں سجدہ اور رکوع کرنے کا صاف تاکیدی حکم دیا گیا تھا مگر ان مدعیانِ علم نے نماز سے رکوع کو خارج کر دیا اور قوم والوں نے ان کے ہر جائز و ناجائز حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ گویا ان کو اپنا رب مان لیا۔ [اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ]۔ اس طرح موسوی توحید شرک آمیز ہوگئی۔ خدا پرستی میں پیر پرستی شامل ہوگئی۔ توحید کی جگہ تثنیہ بلکہ تکثیر نے لی اور نماز بھی موحدانہ نہ رہی مشرکانہ بن گئی۔

عیسائیت کا شرک

باقی رہی عیسائیت تو وہ بھی اگرچہ خدا پرستی کی مدعی تھی اور نظامِ خدا پرستی کے پانچوں ارکان اس میں موجود تھے لیکن کچھ ہی مدت کے بعد عیسائیوں نے اپنی مذہبی کتاب اور مذہبی تعلیم فنا کر دی۔ بقول فرلانگ ۱۷۵ء کی بنی ہوئی انجیل پر عمل کرنے لگے۔ توحید کی تجزی کر دی۔ خدا کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ خالق و مخلوق کے تعلقات کو ایک دوسرے میں غائب کر دیا۔ خدا کو مادی سمجھنے لگے۔ یا کم از کم مادی جسم کے اندر حلول کیا ہوا جاننے لگے۔ پھر علماء و رہبان کو بھی انھوں نے وہی مرتبہ دیا جو ان سے پہلے یہودیوں نے دیا تھا۔ غرض نظامِ خدا پرستی، نظامِ خود پرستی بن گیا۔ قدرتی مشعل کی روشنی بجھ گئی، توحید کی جگہ تثلیث بلکہ تکثیر نے اور رسالت کی جگہ ابوت و بنوت نے لے لی۔ پس ان کی نماز میں بھی نہ اخلاص رہا نہ سچائی، نہ توحید نہ صفائی قلب، نہ روح کی روشنی، نہ روح کی یکسوئی نہ نور باطن۔ اگر عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ کس کی عبادت کرتے ہو تو وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی نما خدا کی پرستش ہماری اصلی غرض ہے۔ الغرض ان کی خدا پرستی بھی انسان پرستی بلکہ بت پرستی میں غرق ہوگئی۔

ملتِ قرآنیہ کی توحید

لیکن ان مدعیانِ خدا پرستی کے علاوہ ایک ملتِ حنیفیہ اور بھی ہے۔ ایک اور دین بھی توحید کا علمبردار ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ خالص توحیدی رنگ میں خدا کی پرستش کرو۔ دنیا سے رشتہ توڑ کر اپنے پرائے سے منہ موڑ کر اور سب مخلوق کو چھوڑ کر ایک خدا سے سلسلہ جوڑ لو، اسی کی عبادت میں محو ہو جاؤ، اسی کے سامنے دست بستہ کھڑے بھی ہو اور جھک بھی جاؤ، اسی کی بارگاہ میں پیشانی اور ناک بھی رگڑو اور ادب و تہذیب کے ساتھ بیٹھ بھی جاؤ۔ خوب سمجھ لو کہ خدا ایک ہے مگر تعداد سے خارج، قادر ہے مگر روح و جان کی مدد سے نہیں۔ گویا ہے بغیر زبان کے، سنتا ہے بغیر کان کے، دیکھتا ہے بغیر آنکھ کے، عالم ہے بعلم حضوری، اس کو استدلال کی ضرورت نہیں، وہی رازق ہے بغیر غرض کے، کارساز ہے بغیر نیاز کے، افعال کی ایجاد میں با اختیار ہے مجبور نہیں، اپنی صنعت میں حکیم ہے، ازلی ہے، اس کی ابتدا نہیں، لا شریک لہٗ ولا ملک الا اللہ۔ تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے، تمام جہان ناقص ہے۔ وہی کامل ہے، سب دنیا عیب دار ہے، وہی عیب سے پاک ہے۔ وہ جوہر نہیں، عرض نہیں، کل نہیں، جزو نہیں، صورت نہیں، حیثیت نہیں، کیفیت نہیں، کوئی ہیئت نہیں، اصل نہیں، فرع نہیں، بیٹا نہیں، باپ نہیں، لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ہر جگہ اس کا پر تو اور ہر مقام پر اس کا ظہور ہے۔ نور میں، ظلمت میں، سورج میں، چاند میں، آسمان میں، زمین میں، بہار میں، خزاں میں، گرمی میں، جاڑے میں سب میں اس کی ضیا پاشیاں ہیں مگر کسی چیز میں اس کا حلول نہیں۔ وہی بیشک مسجود ہے، انسانی ادراک سے اس کی حقیقت خارج ہے، کل کائنات اسی غائب خدا کی بلا واسطہ پرستش کرتی ہے، اسی کی پرستش دینِ فطرت ہے۔ پس انسان کو بھی اسی کی پرستش بلا واسطہ کرنی چاہیئے کیونکہ (كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ) تمام دنیا سے انسان افضل ہے۔ ہر مخلوق انسان سے کم درجہ پر ہے۔ پھر کیوں غیر اللہ کی پرستش کی جائے اور کیوں کسی کو ذریعۂ عبادت قرار دیا جائے۔ یہ ملتِ حنیفیہ دینِ اسلام ہے۔ مذہب توحید ہے، تعلیم محمدی ہے، کلامِ قرآنی ہے۔ پس توحید در حقیقت مسلمانوں کی توحید ہے جس میں شرک کی کسی طرح آمیزش نہیں اور نماز مسلمانوں کی نماز ہے جو ہر طرح غیر خدا کی پرستش سے پاک ہے۔ اسلامی نماز کے علاوہ عبادت کے تمام طریقے ہیچ ہیں پس اے مدعیانِ اسلام اور اے علمبردارانِ توحید اسی دینِ فطرت پر چلو۔ محض خدا کی طرف رجوع کرو، نماز ہی پڑھو اور عقیدۃً یا عملاً ان مشرکوں میں سے نہ بن جاؤ جنھوں نے ملتِ فطرت کے شیرازہ کو بکھیر دیا، جنھوں نے توحید کا تجزیہ کر دیا، جنھوں نے خدا کے سامنے سجدہ کرنے کو محال قرار دے لیا اور جنھوں نے کتابِ الٰہی کے ایک ایک ورق کو پراگندہ کر کے خواہشِ نفس کی آگ میں جلا دیا۔

تحلیلِ اجزاء

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب حضور ﷺ کو ہے لیکن بالاجماع تمام امتِ اسلامیہ کو تابع ہونے کی حیثیت سے حکم شامل ہے۔ اقامتِ دینی بہت مشکل کام ہے۔ بغیر کسی کجی کے صحیح طور سے ملتِ انبیاء پر قائم رہنا بہت دشوار ہے اس لئے حضور ﷺ کو براہِ راست خطاب فرمایا اور امت کو تابع بنایا۔ اسی وجہ سے علمائے اہلِ سنت کا اجماعی قول ہے کہ سوا انبیاء کے کوئی شخص معصوم نہیں خواہ وہ سید الصدیقین ہو یا راس العارفین۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا منہ ہر طرف اور ہر غرض سے موڑ کر اطاعتِ الٰہیہ کی طرف ٹھیک ٹھیک کر لو۔ یعنی ہر دین، ہر

مذہب اور ہر کتاب سے دل کی توجہ کو موڑ کر دینِ توحید کی جانب جھک جاؤ۔ اپنی حاجت کو پورا کرنے والا بھی سوائے خدا کے کسی کو نہ سمجھو، عقیدۂ توحید میں کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہ کرو، نہ اعمال ایسے کرو جن کی اصل غرض مرضیٔ مولا کے حصول کے علاوہ کچھ اور ہو، نہ ایسا کرو جس کا اچھا نتیجہ آخرت میں نہ ملے۔ حدیث میں آیا ہے آدمی کے اسلام کی یہ خوبی ہے کہ غیر مفید کام کو چھوڑ دے (رواہ مسلم) اور اگر نیک کاموں کو ثواب کی نیت سے شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کے موافق نہ کیا جائے تو ایسے نیک کاموں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ پس مطلب کا خلاصہ یہ نکلا کہ اعتقاد اور عمل میں کامل طور پر شریعتِ اسلامیہ کی پابندی کرو۔ ممنوعات سے اجتناب رکھو اور واجبات کو ادا کرو اور ہر کام میں نیت کو خالص رکھو اور مرضیٔ مولا کے طلبگار رہو۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ بعض علماء کے نزدیک فطرت سے مراد قابلیت اور استعداد ہے یعنی قابلیت و استعداد کے موافق لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ قول کمزور ہے۔ صراحت حدیث اور اجماع مفسرین کے خلاف ہے۔ واحدی نے اجماعِ مفسرین کی صراحت کی ہے اس امر پر کہ فطرت سے مراد توحید و اسلام ہے۔ ازل میں سب ہی لوگوں سے اللہ نے اپنی توحید کا اقرار لے لیا تھا۔ چنانچہ ہر شخص دینِ توحید پر پیدا ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے حضورؐ والا نے ارشاد فرمایا۔ ما من مولودٍ الّا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء ھل تحسون فیھا من جدعاء ثم قرء فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ ذٰلک الدین القیّم (رواہ البخاری و مسلم) یعنی ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر بعد میں اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جس طرح حیوانات میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے صحیح سالم بے عیب پیدا ہوتا ہے کسی کا کان کٹا ہوا نہیں ہوتا۔ بعد میں لوگ اس کے کان کاٹ ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد حضورؐ والا نے یہ آیت پڑھی۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح چوپایوں کے بچے اصلی حالت و صورت پر پیدا ہوتے ہیں سب کے کان سالم ہوتے ہیں۔ بعد میں انسان اس کے کان کاٹ ڈالتے اور فطرت بگاڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح ہر انسان بھی عقیدۂ توحید و اسلام پر پیدا ہوتا اور عادات و خیالات پاکیزہ لے کر آتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں آکر بیرونی اثرات اس کے افکار و عقائد اور اعمال و اقوال کو خراب کر دیتے اور راہِ فطرت سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس کی فطری توحید شرک میں آلودہ ہو جاتی ہے اور پیدائشی پاکبازی ماحول کی نجاستوں سے مل کر ناپاکی سے بدل جاتی ہے۔ اگر صحبت اور ماحول کا اثر اس پر نہ پڑے اور وہ ہر بیرونی تاثر سے محفوظ رہے تو پھر وہ جوان ہو کر بھی پکا مومن کامل موحد اور پاکباز نیکوکار باقی رہے۔ بیرونی تاثیرات کی جڑ چونکہ ماں باپ کی صحبت تربیت اور تعلیم ہے۔ تمام غیر لوگوں کا مرتبہ ماں باپ کے بعد ہے۔ بچہ سب سے پہلے ماں باپ ہی کو پہچانتا، انہی سے محبت اور انہی کے گفتار و کردار سے اثر قبول کرتا ہے اس لئے ماں باپ کو ہی یہودیت عیسائیت اور مجوسیت کا سرچشمہ قرار دیا ورنہ ہر بیرونی غلط مؤثر سے یہ ہی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کا تذکرہ بھی بطورِ تمثیل ہے، اس سے مراد ہر باطل مذہب ہے۔ تینوں میں حصر کرنا ہی مقصود نہیں ہے۔ ایک روایت میں لفظ فطرت کی جگہ ملت توحید آیا ہے یعنی ہر بچہ ملت توحید پر پیدا ہوتا ہے الخ (رواہ البخاری واحمد والنسائی) اسود بن سریع کی روایت ہے کہ حضورؐ والا نے مجاہدین کا ایک دستہ خیبر کی طرف بھیجا وہاں پہنچ کر انھوں نے جہاد و قتال کیا یہاں تک کہ بچوں کو بھی مار ڈالا۔ جب واپس آئے تو حضورِ اقدس نے قتل اطفال کا سبب دریافت فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ بھی مشرکوں کی ہی نسل تو تھی۔ ارشاد فرمایا تم میں سے جو لوگ بہترین صحابی ہیں وہ بھی مشرکوں کی ہی اولاد ہیں۔ اس کے بعد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو بچہ پیدا ہوتا ہے فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان پھوٹے (رواہ احمد والنسائی) ایک قدسی حدیث میں ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف (موحد حق پرست) پیدا کیا پھر شیطانوں نے اُن کے پاس پہنچ کر اُن کو دین سے بہکایا اور جو چیزیں اُن کے لئے حلال کی تھیں اُن کو حرام قرار دے دیا (رواہ احمد) غرض یہ کہ بااختیار اور صاحبِ شعور و ارادہ ہونے سے پہلے انسان ملت توحید پر ہوتا ہے اور اسلام ہی اس کا دینِ فطرت ہوتا ہے۔ لیکن بیرونی اثرات سے متاثر ہو کر غلط رُو اور کج رفتار بن جاتا ہے۔

ایک شبہ مذہب آں عملی فکری اور عملی اصول و قواعد کا نام ہے جن کو انسانوں کی جماعت بناتی ہے یا آسمانی کتابوں سے اُن کی تعلیم کا اعلان ہوتا ہے یا کوئی دانشمند آدمی خود ان کی ایجاد و اشاعت کرتا ہے اور لوگ ان پر عمل کرتے یا عمل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور چونکہ صاحبِ ہوش و خرد اور مالکِ شعور و ارادہ ہونے سے پہلے کوئی بچہ عقلاً نقلاً مکلف نہیں اس لئے اس کا مذہب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ نہ توحید نہ شرک جس طرح دیوانہ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اسی طرح بے عقل اور بے شعور بچہ کا بھی کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں دینِ فطرت کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔

ازالہ مذہب دو قسم کا ہوتا ہے، اختیاری اور اضطراری۔ اختیار پر تکلیف کا دار و مدار ہے۔ اسی لئے کوئی بے شعور بچہ اور کوئی دیوانہ مکلف نہیں لیکن غیر اختیاری مذہب بیرونی اثر پذیری کا نتیجہ نہیں ہے۔ دماغی تاثر اور ذاتی تفکر دونوں احوال سے تصوری نقش قبول کرتے ہیں۔ لیکن اختیار و شعور کے سن کو پہنچنے سے پہلے بھی بچہ کی زندگی کی کوئی رفتار ہوتی ہے اور پیدائشی طور پر بھی اس کی روح اور قلب پر مختلف احوال کا توارد ہوتا ہے اور شکم مادر سے خارج ہوتے ہی بلکہ ماں کے پیٹ کے اندر جاندار ہونے کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا کوئی راستہ ہوتا ہے یہی اضطراری مذہب ہوتا ہے۔ اسی کو دین فطرت، ملت توحید اور اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے قبل از اختیار بچہ کی زندگی جس راستہ پر گامزن ہوتی ہے اگرچہ بچہ کو اس کا شعور نہیں ہوتا۔ وہی راستہ دین فطرت کا ہے گویا ہر ماحولی زنگ آمیزی سے بے رنگ رہنے کا نام فطرت ہے اور بے رنگی کا دوسرا نام توحید کا دور ہے۔ اب بالاختیار ہو کر ماحول کا اثر قبول کرنے کے بعد اگر وہی بے رنگی قائم رہتی ہے اور آئینہ فطرت پر کوئی میل کچیل نہیں پیدا ہوتا تو آدمی دین فطرت پر قائم رہتا ہے، ورنہ آئینہ روح زنگ خوردہ اور میل آلودہ ہو کر خراب ہو جاتا اور فطری مذہب اختیاری مذہب سے تباہ ہو جاتا ہے لیکن یہ امر جان لینا ضروری ہے کہ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہم نے اگرچہ فطری مذہب کا موجود ہونا ظاہر کیا ہے لیکن وہ مذہب ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ قابل اعتبار مذہب وہی ہے جو اختیاری ہو اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد قبول کیا گیا ہو۔ پیدائش تو غیر اختیاری ہے۔ اس میں کسی شخص کے عمل اور کسب کو دخل نہیں کہ ثواب مرتب ہو سکے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ - ابن عباس نخعی، سعید بن جبیر مجاہد عکرمہ قتادہ ضحاک اور اکثر معتبر اہل تفسیر نے اس فقرہ کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ فطرت اسلامی میں سب مخلوق یکساں ہے۔ تمام انبیاء کا یہی مسلک ہے۔ کافر کا بچہ ہو یا مومن کا سب ہی کی تخلیق دین فطرت پر ہوتی ہے کوئی تفاوت یا فرق نہیں ہوتا۔ اسی تقدیر پر جملہ مذکورہ خبریہ ہوگا۔ بخاری نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فقرۂ مذکورہ انشائیہ بصورت خبریہ ہے۔ یعنی تم لوگ فطرت الٰہیہ کو نہ بدلو اور دین فطرت کے علاوہ کوئی اور دین اختیار نہ کرو اور توحید کو شرک کی کیچڑ سے آلودہ نہ کرو۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے۔ یہ معنی بھی صحیح ہیں۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے یہ معنی ہوں کہ فطرت الٰہیہ کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اللہ کی بناوٹ کو بگاڑنا ناممکن ہے چونکہ فطرت کو کروڑوں انسانوں نے بدل ڈالا ہے۔ غلط طریقوں پر چل رہے ہیں۔ توحید کی جگہ شرک، عدل کی جگہ ظلم، صدق کی جگہ کذب اور سادگی کی جگہ رنگ آمیزی نے لے لی ہے اور اس سے آیت کے مطلب کی غلطی کا شبہ ہوتا ہے اس لئے توضیح کرنی ضروری ہے۔

تبدیل و تغییر میں فرق ہے۔ تبدیل کے معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو اس طور پر دے دینا کہ اول چیز کے تمام لوازم و خصوصیات دوسری چیز میں پیدا ہو جائیں۔ مثلاً حکومت تبدیل ہوتی ہے یعنی ایک حکومت زائل ہو جاتی ہے دوسری اس کی جگہ آتی ہے اور جو لوازم پہلی حکومت کے تھے وہ دوسری حکومت کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ پہلی حکومت کے پاس لوگوں کے باہمی فیصلہ کرنے کے لئے عدالتیں تھیں اور لوگ ان سے اپنی چارہ جوئی کرتے تھے تو دوسری حکومت کو بھی یہ بات میسر آجاتی ہے اس کا بھی تسلط ہو جاتا ہے۔ اس کی عدالتوں میں بھی آکر لوگ استغاثہ کرتے اور فیصلہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اگر پہلی حکومت کے پاس حسابی مالی اور انتظامی شعبے تھے تو دوسری حکومت میں بھی یہ چیزیں ہو جاتی ہیں۔ اگر پہلی حکومت کے پاس وزراء مشیران قانونی اور حکمران جماعت تھی تو دوسری حکومت بھی اس سے خالی نہیں ہوتی۔ غرض تبدیل نام ہے تحویل انقلاب اور مکمل جانشینی کا۔ لیکن تغییر کا مفہوم اس سے عام ہے۔ مکمل جانشینی ہو جب بھی تغییر کہا جائے گا اور کسی قدر احوال بدل جائیں حکام و وزراء اور مشیران حکومت کا رد و بدل ہو جائے تب بھی تغییر کا اطلاق ہوگا۔ وزیر اعظم بدل گیا۔ حکومت میں تغیر ہو گیا، ارکان وزارت میں الٹ پھیر ہو گیا، حکومت کی تغییر ہو گئی، حکومت کا طریقہ بدل گیا تب حکومت کا تغیر ہو گیا۔ اس فرق کو سمجھنے کے بعد اب آیت کے الفاظ اور مضمون پر غور کرنا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی بظاہر حق پر باطل غالب آجاتا ہے، سچ کی جگہ جھوٹ لے لیتا ہے۔ انصاف معدوم ہو کر ظلم کی حکمرانی ہو جاتی ہے ادائے فرائض کی بجائے لوگ حق تلفیاں اور ناحق کوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ توحید کو چھوڑ کر لوگوں نے مشرکانہ طریقے اختیار کر لئے۔ اللہ واحد کی پرستش سے منہ موڑ کر ہزاروں کے سامنے سجدہ ریزیاں کرنے لگے۔ جو قوم توحید کی علمبردار تھی، اس کی توحید میں بھی بکثرت شرک کی رنگ آمیزی ہو گئی۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ کیا اس سے فطرت میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے یا صرف احوال کا تغیر ہو گیا ہے۔ کیا ظلم کو قانونی شکل دے کر انصاف کا جامہ پہنا کر پیش کر لینے سے اس میں واقعی عدالت پیدا ہو گئی ہے اور وہ تخریب و حق تلفی کی تمام کثافتوں سے پاک ہو گیا ہے یا صرف فریب نظر اور ذہنی دھوکہ ہے۔ کیا کائنات عالم میں سے کسی کے سامنے سجدہ ریزی کرنے اور اس کو معبود ماننے سے واقع میں اس کے اندر اوصاف معبودیت اور صلاحیت الوہیت پیدا ہو گئی ہے یا یہ صرف واہمہ کی کار فرمائی ہے۔ حقیقت کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ تمام تغیرات اپنے اندر واقعیت رکھتے ہیں اور توحید کی جگہ شرک نے عدل کی جگہ ظلم نے اور صدق کی جگہ کذب نے واقعی لے لی ہے اور توحید عدل اور صدق کے تمام لوازم شرک ظلم اور

کذب میں پیدا ہو گئے ہیں اور باطل طریق پر حق ہو گیا ہے تب تو آیت کے مفہوم پر اعتراض کرنا صحیح ہو سکتا ہے، ورنہ نمائشِ نظر فریب حواس اور تغیرِ احوال کا نام تو تبدیلی نہیں ہے۔ اگر کسی جانور کے کان کاٹ ڈالے تو کیا اس سے آئندہ تمام جانور کن کٹے پیدا ہونے لگیں گے یا کنکٹے جذوری کو تندرست گوش کہنا صحیح ہو جائے گا۔ ہاں اس جانور کے کانوں کی حالت اور صورت ضرور بدل جائے گی، لیکن فطرت کی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ تبدیلِ فطرت کی کوشش سے تبدیلی لازم نہیں آتی۔ اسی لئے بالوں میں بال جوڑنے، بدن کو گدوانے اور جانوروں کے کان کاٹنے کی ممانعت احادیث سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ تبدیلِ فطرت کی کوشش ہے اور خلافِ فطرت کوشش کرنی حرام ہے لیکن ناخن تراشنا، جسم کے حصوں کو چھوڑ کر دوسرے حصوں کے بال مونڈنا، شرعی لباس پہننا (عورتوں کا) مناسب زیور سے آراستہ ہونا، نہ فقط غیر ممنوع بلکہ سنت ہے۔ تغیرِ حالت اس میں بھی ہوتی ہے اور اول الذکر صورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ثانی الذکر سے تبدیل کی کوشش کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور مقدم الذکر سے سعیِ تبدیل کا اظہار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ یعنی دینِ فطرت ہی سیدھا دین ہے۔ اس سے اصلاحِ عالم وابستہ ہے۔ اسی سے امن و عافیت اور سعادت و نجات کا قوام ہوتا ہے۔ اسی میں استقامت ہے۔ زندگی کا قریب ترین راستہ یہی ہے اور روح کی فلاح، دل کا سکون، جان کا چین اور دماغ کا سکھ اسی سے ملتا ہے۔ فطرت کی آواز پر لبیک کہنا، ہر مخالفِ فطرت تعلیم و رواج کو ترک کرنا اور اُن اصول و ضوابط پر کاربند ہونا جو اقتضائے فطرت کے موافق ہیں سیدھا درست صحیح اور مستحکم دین ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ لیکن اکثر آدمی ناواقف ہیں یعنی وہ فطرت کی آواز کو نہیں سنتے ہیں۔ فطرت کی تصویر کو نہیں دیکھتے۔ اقتضائے فطرت کو نہیں سمجھتے اور تعلیمِ فطرت کو نہیں جانتے۔ انھوں نے ایک رب ایک الٰہ اور ایک مقتنن کو چھوڑ کر مظاہر پرستی، صورت پرستی، شخصیت پرستی اور نفس پرستی اختیار کر لی ہے۔ دنیا ہے پیدا کیا ہے خدا نے نذر چڑھاتے ہیں غیروں کی، مرادیں مانگتے ہیں محتاجوں سے، پرستش کرتے ہیں پرستاروں کی اور سر جھکاتے ہیں ذلیلوں کے سامنے۔ غرض انھوں نے دینِ فطرت کو اپنے اختیار کردہ مذہب سے تباہ کر ڈالا اور نہیں سمجھتے کہ ہم ترکستان کے راستہ سے کعبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ پس اے عقل و دانش رکھنے والو تم فطرت پر چلو اور

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ۔ ہر دنیوی اور دینی امر میں اللہ کی طرف خلوصِ نیت کے ساتھ توجہ کرو۔ ارادہ کا خلوص لازم ہے۔ مرکزِ توجہ رضائے مولا کو قرار دینا ضروری ہے۔ آغازِ آیات میں اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فرما کر براہِ راست خطاب رسولِ پاک کو کیا تھا اور امت کا شمول ذیلی طور پر تھا۔ یہاں سے انابت، اتقاء، اقامتِ صلوٰۃ اور عدمِ شرک کا حکم عام اہلِ ایمان کے لئے براہِ راست ہے۔ کیونکہ ہر ماسوا سے توجہ ہٹا کر، ہر چیز سے منہ موڑ کر ٹھیک ٹھیک ایک خدا کا ہو جانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ ایسا فرض ہے جس کی کامل طور پر ادائیگی سوائے رسولِ معصوم کے اور کسی سے ممکن نہیں۔ ہاں خلوصِ نیت تقویٰ حسبِ مراتب نماز کی پابندی اور تعدیل اور شرک نہ کرنا اتنا دشوار نہیں کہ کوشش کرنے کے بعد ان کی تکمیل آدمی نہ کر سکے۔

وَاتَّقُوْهُ۔ اللہ سے خوف و تقویٰ رکھنے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔ تقویٰ کے لاتعداد مراتب ہیں۔ انسانی حالت جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے، جتنا مرتبہ اونچا ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی اتقاء میں اور سختی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ سب سے پہلے شرکِ جلی سے بچنا تقویٰ کا ابتدائی زینہ ہے۔ پھر شرکِ خفی سے بچنا دوسرا درجہ ہے۔ اس کے بعد تمام ممنوعات سے اجتناب تیسرا منبر ہے۔ پھر مکروہات اور مشتبہات سے کنارہ کشی چوتھا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد اپنے ارادہ اور خواہشِ نفس سے نکل جانا پانچویں منزلت ہے۔ آخر میں ارادۂ الٰہیہ میں اپنے ارادہ اور ہستی کو ختم کر دینا تقویٰ کی آخری سطح ہے۔ ہر تحتانی درجہ فوقانی درجہ والے کے لئے گناہ ہے۔ اگرچہ تحتانی درجہ والے کے لئے گناہ نہیں ہے۔ سچ ہے حسنات الابرار سیئات المقربین نیکوں کی نیکیاں بھی اہلِ قرب کے لئے گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ اوپر کی آیت میں تقویٰ کا حکم دیا گیا تھا اور تقویٰ کا درجہ منفی درجہ ہے اور حصولِ سعادت کے لئے صرف نفیِ شقاوت کافی نہیں بلکہ اُن اسباب کا موجود ہونا بھی ضروری ہے جو موجبِ سعادت ہیں۔ آئینہ میں منہ دیکھنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کی کثافت اور زنگ دور کر دیا جائے بلکہ صفائی کے ساتھ جلا کرنے اور چمک پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے اس آیت میں اقامتِ الصلوٰۃ کا حکم دیا۔ نماز تمام ارکانِ دینی سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ رکنِ اعظم ہے۔ اس کا قصداً تارک عملی کافر ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ کافر و مومن کے درمیان فرق کرنے والی نماز ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جس نے قصداً نماز کو ترک کیا وہ (عملاً) کافر ہو گیا۔ نماز تمام دینی اور دنیوی اصلاحات کا سرچشمہ ہے جس کی تحقیق اسی پارہ کے ابتدائی مقالہ میں ہم کر چکے ہیں۔ اسی لئے اس جگہ صرف نماز کا ذکر کافی سمجھا گیا۔ اور دوسرے اسلامی ارکان کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ نماز کی اہمیت کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ دوسرے اسلامی ارکان سب لوگوں پر فرض نہیں ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ صرف دولتمندوں پر فرض ہے۔ مفلس اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ نادار کیا دے سکتا ہے۔ حج صرف اُن لوگوں پر فرض ہے جن میں مالی استطاعت ہو۔ بیماری اور کمزوری بھی ایسی نہ ہو

کرراستہ میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، راستہ بھی مامون ہو اور دوسرے شرعی موانع بھی نہ ہوں۔ تمام عوام سے اس فرض کا بھی تعلق نہیں ہے۔ شرائط حج کا تحقق بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ روزہ کی فرضیت کے لئے بھی جسمانی قوت ضروری ہے۔ لازم الفراش بیمار، بہت زیادہ ضعیف العمر اور ضعیف القویٰ آدمی مجبور ہیں کہ روزہ رکھیں بلکہ فدیہ دے سکتے ہیں اور فدیہ بھی میسر نہ ہو تو اس فرضیت سے آزاد ہیں۔ ہاں نماز ایسا فرض ہے کہ جب تک ہوش و حواس برقرار ہوں بے ہوشی اور دیوانگی نہ ہو خواہ اتنی کمزوری ہو کر اٹھ بھی نہ سکتا ہو۔ ایسی عمر کو پہنچ گیا ہو کہ منہ میں دانت پیٹ میں آنت نہ رہی ہو تب بھی کھڑے ہو کر بیٹھ کر لیٹ کر جس طرح ممکن ہو نماز پڑھنی لازم ہے اور کسی طرح فدیہ دے کر نماز کی معافی نہیں ہو سکتی۔ گونگا ہو تو خالی صورت نماز بنانی ہی کافی ہے۔ بہر حال ارکانِ صلوٰۃ بدرجۂ مجبوری ساقط ہو سکتے ہیں لیکن نماز کسی طرح قابلِ عفو نہیں اور کوئی شخص اس فرض سے مستثنیٰ نہیں۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ الخ آیاتِ مذکورہ میں انابت الی اللہ اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔ انابت سے مراد ہے خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا۔ انابت کے بعد شرک کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ بظاہر اس جملہ کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اور عدم شرک کا حکم بیکار نظر آتا ہے۔ اس لئے آیت کے مطلب کو واضح کرنے کی ضرورت ہے اور لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ کی بجائے لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ فرمانے کی وجہ بیان کرنی بھی لازم ہے۔

بات یہ ہے کہ توحیدِ ذاتی کا انکار کرنے والا تو کوئی گروہ اور کوئی مذہب بھی دنیا میں نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی ہستی کے منکر ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں ہے باقی جو خدا کو موجود مانتے ہیں وہ ضرور اس کو واحد بھی مانتے ہیں لیکن کس گروہ کی توحید قابلِ اعتبار ہے اور کون فرقہ شرک کی کیچڑ میں آلودہ ہو گیا ہے اس پر مفصل تبصرہ ہم تفسیری مقالہ میں کر آئے ہیں۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ جو شخص خدائی صفات کو خدا کے سوا کسی دوسرے میں مانتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے یا اگر کوئی شخص خدا کے اندر وہ اوصاف مانتا ہے جو مخلوق کے ساتھ مخصوص ہیں تو وہ مخلوق کے ساتھ خدا کو شریک بناتا ہے اور دونوں طرح کا شرک جرم ہے دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ مثلاً اگر کوئی کسی مخلوق کو قاضی الحاجات، کارساز، رازق، اولاد بخش یا شافی خیال کرتا ہے تو وہ خدائی صفات میں مخلوق کو شریک کرتا ہے یا کسی کو عالم الغیب، معبود، مسجود، خالق وغیرہ سمجھتا ہے تو وہ بھی خدا کا شریک بنانے والا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی خدا کو صاحبِ اولاد کہتا ہے۔ اس کی بیوی ثابت کرتا ہے، اس کا جسم مانتا ہے، اس کو دنیوی بادشاہوں کی طرح سمجھتا ہے، کارکنوں اور خدمتگاروں کا محتاج جانتا ہے تو گویا اس کو مخلوق کے ساتھ شریک بناتا ہے۔ یہ تمام صفات مخلوق کے ہیں۔ خدا ان سب سے بے نیاز ہے۔

تقسیمِ شرک کو سمجھنے کے بعد اب یہ جاننا چاہیے کہ آسمانی مذہب کا سنگِ بنیاد عقیدۂ توحید ہے۔ ہر نبی اور ہر مصلح نے خدا کو ذات و صفات میں واحد بے ہمتا بتایا ہے اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرنے کی تعلیم دی ہے۔ خالق، رازق، رب، عالم الغیب، غنی، معبود، مسجود اسی کو قرار دیا ہے۔ ہر مذہب کا بانی یہی کہتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے ماننے والوں کا ابتدائی گروہ اپنے پیشوا کی صحیح تعلیم پر چلتا رہا اور کسی نبی کی زندگی میں اس کے مخصوص حلقہ کو شرک کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن نبوت کا دور جس قدر دور ہوتا گیا اسی قدر مذہبی تعلیم فراموشی کے پردے میں چھپنے لگی۔ صحیح تعلیم پھیلانے والے اور مذہبی اصول و احکام کی اشاعت کرنے والے نفس کے پرستار اور خواہشات کے بندے ہو گئے اور عوام انجام کار اُن کی ہوس پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ ان گمراہ کن گمراہیوں کی گمراہی دو طرح کی ہوئی۔ زیادہ چالاک طرار گروہ بر قادر الکلام شیریں زبان خوش بیان تیز فہم بیدار مغز گروہ نے تو خدا کے اندر ان اوصاف کو ثابت کیا جو مخلوق کے ساتھ مخصوص تھے۔ کسی نے عزیر اور مسیح کو خدا کے بیٹے کہا، کسی نے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، کسی نے مریم کو خدا کی جورو قرار دیا، کسی نے خدا کو مجسم مانا اور کسی نے اقانیم ثلاثہ کو خدا کا مجموعہ ثابت کیا۔ کسی نے خدا کو صاحبِ احتیاج بادشاہ ظاہر کیا۔ غرض اللہ کے بھولے بھالے سیدھے سادہ لوح بندوں کو خوب لوٹا اور خود بانیٔ مذہب کا مرتبہ حاصل کر لیا اور ان کا گروہ مستقل گروہ بن گیا۔

جو لوگ ایسے زبردست ڈاکو بننے سے قاصر تھے انھوں نے مخلوق کو لوٹنے کی دوسری شکل اختیار کی اور چونکہ یہ شکل پہلی صورت سے زیادہ سہل القبول اور جلد دلنشین ہونے والی تھی اس لئے دینِ نبوی کا نام لینے والوں اور تعلیمِ نبوت پر چلنے کا دعویٰ کرنے والوں میں سے بیشتر افراد نے اس کو قبول کر لیا اور زیادہ دنیا شکار ہو گئی۔ ان لوگوں نے اپنے اسلاف اور پیشواؤں کو خدا کا ہم پلہ قرار دیا یا کم از کم کارخانۂ قدرت کا مختار بنا دیا۔ اُن کی ذات کو صفاتِ خداوندی کا مظہر کہا بلکہ بعض نے تو ذات یا صفاتِ الٰہی کے حلول کا بھی قول کیا اور صاف کہہ دیا کہ خدا کی ذات یا کم از کم صفات فلاں پیشوا اور فلاں بزرگ میں حلول کر گئی تھیں۔ بہتوں نے انبیاء اور اولیاء کو قادرِ مطلق قاضی الحاجات کارساز متصرف فی الکل حاضر و ناظر اور ہر جگہ موجود قرار دیا۔ ان سے مرادیں مانگنے اور ان کی منتیں ماننے کی تعلیم دی۔ کسی

ولی کی کرامت یا نبی کے معجزہ کے اظہار میں اتنا مبالغہ سے کام لیا کہ خدا کو بھی گوشہ میں بٹھا دیا۔ سجدۂ تعظیمی کو سجدۂ عبادت سے الگ بتا کر تعظیماً کسی کے سامنے پیشانی اور ناک رگڑنے کو نہ صرف جائز بلکہ مستحب فعل ظاہر کیا۔ ان میں جو کسی قدر روشن خیال گروہ تھا اُس نے اپنے بزرگوں کو عقیدۂ مختارِ مطلق اور کارسازِ حقیقی تو نہ مانا مگر تمام دنیوی اور دینی امور کا سفارشی ضرور بتایا اور اعلان کر دیا کہ فلاں بزرگ جو کام چاہیں کرا سکتے ہیں اور ایسے مقدس اور مقرب الٰہی ہیں کہ تقدیر کا لکھا اُن کی دعا نہیں ٹل سکتی۔ اس گروہ نے لفظوں کا ہیر پھیر کر دیا مگر مغز اور مفہوم اس کے قول کا بھی وہی ہے جو اپنے پیشواؤں کو کارساز مطلق اور مختار حقیقی جاننے والوں کے قول کا ہے۔ اس گروہ نے خدا کو بالکل دنیوی بادشاہ سمجھ کر وزیروں مشیروں اور کارندوں کا عملاً محتاج قرار دیا۔ گو عقیدۃً اس کی تلقین نہیں کی۔ اسی لئے نذر و نیاز اور مُردوں پر بھینٹ چڑھانے کی انھوں نے بھی پر زور تبلیغ کی۔ غرض شیرازۂ توحید کا ایک ایک ورق بکھیر دیا اور سب کی توحید مشرکانہ توحید بن کر رہ گئی۔ اس کے اندر سوائے زبانی توحید کے مغزِ توحید بالکل نہ رہا۔

اور چونکہ ان کی مذہبی کتابیں اور بانیانِ مذہب کا مذہبی لٹریچر اس بیہودہ عقیدہ کی تبلیغ اور شرک آمیز اعمال کی تعلیم سے بالکل پاک تھا اس لئے بعض جگہ سے جا بجا کتاب کو بدل ڈالا اور آسمانی تعلیم کو مسخ کر کے دماغ زائیدہ تعلیم بھر دی اور آسمانی علوم و اسرار کا حامل اپنی ذاتوں کو قرار دیا تاکہ ان کا مرتبہ بھی دوسرے انسانوں سے ممتاز ہو جائے اور حرام و حلال کے فیصلہ کرنے کا بھی ان کو کامل اختیار حاصل ہو جائے۔ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا۔

یہ حال تو ان لوگوں کا تھا جو دنیا میں خدائی قوانین کے نافذ ہونے کے معترف تھے۔ صحیح عقائد اور نیک اعمال کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنے کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور عظیم الشان بڑے بڑے دانشمندوں کا گروہ بھی ہوا جو انسانیت کے جامہ کے اندر رہ کر خدا تک پہنچنے کے امکان کا ہی قائل نہیں ہے۔ اس گروہ نے اپنا تعلق خدا سے بالکل توڑ لیا اور اس کائنات سے رشتہ جوڑ لیا جس میں اس کو عظمت قدرت تاثیر فاعلیت اور نورانیت نظر آئی تھی۔ اس کے پیش نظر یا تو خدا کی ذات و صفات کا تصور ہی نہیں رہا اور صفات و ذات کو جاننا اس کو محال معلوم ہوا یا تصور پیش نگاہ رہا بھی تو بہت مدھم اور دھندلا۔ گویا نام کے لحاظ سے تو اس سارے گروہ نے خدا کی ہستی کا انکار کیا مگر کام کے لحاظ سے خدا کو معطل و بیکار قرار دیا اور ساری کائنات کو اس سے بے نیاز کہا۔ بلکہ خدا کی جگہ اس گروہ نے ان عناصر مرکبات سیارات کواکب اور اشخاص کو دے دی جو اس کے عقیدہ میں مختارِ مطلق حاجت روا اور گردش زمانہ کے اصل علل و اسباب تھے۔ یہ گروہ بھی گمراہ ہو گیا اور کروڑوں کو گمراہ کر گیا۔ خود بھی شرک میں آلودہ ہوا اور دوسروں کو بھی پاک صاف نہ چھوڑا۔ یہ تمام گروہ علمبردارانِ توحید کے تھے لیکن مشرک ہو گئے۔ سب کا ایک گروہ تھا سب دینِ فطرت پر تھے مگر فرقہ فرقہ ہو کر برباد ہو گئے اور لطف یہ کہ کسی کو دینِ فطرت کی بربادی کا احساس بھی نہ رہا۔ ہر گروہ اور ہر شخص اپنے کمال میں مست ہو گیا۔ نصاریٰ نے کہا یہودی ناحق پر ہیں۔ یہودیوں نے کہا نصاریٰ باطل پرست ہیں۔ مجوسیوں نے سب کو غلط راستہ پر بتایا۔ بدھ مت کے فدائیوں نے سب ہی کی تکذیب کی اور ہندوؤں نے اپنا فرقہ سب سے الگ بنا لیا۔ ہر ہر فرقہ کے اندر لاتعداد فرقے بن گئے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ دیکھو خلوص قلب کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو دینِ فطرت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ توحید میں شرک کی آمیزش نہ کرو۔ خالص توحید پر قائم رہو۔ شرک کرنا اور مشرک بننا تو درکنار مشرکوں کے ساتھ بھی شامل نہ ہو۔ جنھوں نے شیرازۂ توحید کو بکھیر دیا اور آئینۂ تنزیہ کو شرکت کی کثافت سے میل آلود کر کے ذاتی عناد اور خواہشِ نفس کے پتھر سے ریزہ ریزہ کر دیا اور ہر جماعت نے ایک ورق اور ایک ٹکڑا لے کر اپنا گروہ الگ بنا لیا اور جو کچھ اپنے پاس تھا اُسی پر اترانے اور اکڑنے لگا۔

مگر آہ! ثم آہ!

مسلمانوں کی کوششیں اس مشفقانہ نصیحت کے خلاف سرگرم ہیں۔ جاں نثارانِ اسلام کی نسلوں نے پیامِ ربّانی کی مخالفت کا کوئی شمہ اٹھا کر نہ رکھا جان و مال اولاد اور عیال سب ہی کو دینِ فطرت کے برباد کرنے کے لئے قربان کر دیا اور حضورؐ اقدس کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضورؐ والا نے پہلے سے متنبہ کرنے کے لئے فرما دیا تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے بٹ کر بہتر فرقے ہو گئے مگر میری امت کے تہتر ٹکڑے ہو جائیں گے۔ حاکم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ کسی نے حضورؐ سے دریافت کیا پھر اُن فرقوں میں حق پر کون ہو گا۔ ارشاد فرمایا میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر رہنے والا۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آخر میں یہ لوگ بھی یہود و نصاریٰ کے قدم بہ قدم چلیں گے۔ صحابہ کا دَور کیسا اچھا دَور تھا۔ اللہ نے اُن کے دلوں میں دینی اُلفت و محبت پیدا کر دی تھی اور وہ سب باہم جُڑ گئے تھے۔ دنیوی معاملات میں جھگڑے اور اجتہادی مسائل میں اختلافات اُن میں بھی ہوتے تھے لیکن الفت ایمانی اور محبت اعتقادی میں سب متحد تھے کوئی دوسرے کو گمراہ نہ بتاتا تھا لیکن پھر شیطان نے ان میں پھوٹ ڈال دی اور سب سے پہلے خارجیوں کا فرقہ پھوٹ کر نکلا پھر رافضی نمودار ہوئے پھر اسی طرح معتزلہ جہمیہ حشویہ کرامیہ

وغیرہ فرقے پیدا ہو گئے اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں نکل پڑیں۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا اختلاف کچھ برا نہ تھا اگر ایک کی دوسرا تضلیل نہ کرتا۔ عامل بالحدیث اور مقلد کا جھگڑا گناہ نہ تھا، اگر دونوں کو حق کی تلاش ہوتی۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ اختلاف نے مخالفت کی صورت اختیار کرلی۔ تلاشِ حق کا ولولہ عناد ذاتی کے جذبہ سے بدل گیا اور اس طرح دینِ فطرت کے علمبرداروں کی ٹکڑیاں بن گئیں۔ آیاتِ قرآنیہ نے اور نصوصِ نبویہ نے پکار پکار کر کہا تھا کہ شرک کی بو سے بھی بچنا۔ مگر آہ مسلمان ہر در پہ سجدہ ریزی کرنے لگے۔ شیخ سدو کا بکرا، امام جعفر صادقؓ کے کونڈے، سید الاولیاء شیخ الامۃ عبدالقادر جیلانی کی گیارھویں اور خدا جانے کیا کیا رسمیں ان میں پیدا ہو گئیں۔ کسی کے نام کی چوٹی چھوڑنے لگے، کسی کی قبر پہ چادریں چڑھانے لگے۔ اولیائے اُمت کو کارخانۂ قدرت کا مختارِ مطلق جاننے لگے۔ غرض وہ تمام بداعتقادیاں وہ ساری بداعمالیاں وہ کل خرابیاں جو گزشتہ اقوام میں تھیں ان میں بھی پیدا ہو گئیں۔

مقصودِ بیان

دنیا طلبی حرام ہے۔ ہر وقت اور ہر کام میں دین کی طرف توجہ رکھنی لازم ہے۔ دنیا کا ہر کاروبار، ہر معاملہ اور ہر قضیہ دینی جذبہ کے تحت ہونا ضروری ہے۔ مذہب اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر صحت خراب نہ ہو، اگر کوئی بہکانے والا نہ ہو، اگر شیطان کی کشش اپنی طرف نہ کھینچے، اگر دنیا میں کسی مذہب و ملت، کسی ضابطہ اور قاعدہ کی اطلاع نہ ہو تو ایسے وقت میں انسان کا سادہ دماغ جس طریقہ سے زندگی کے مراحل طے کرے گا اور بیرنگ دماغ میں سب سے پہلے خود بخود جو رنگ پیدا ہوگا وہ اسلام ہی ہوگا۔ توحید ہی کے اقرار کی طرف انسانی طبیعت کا رجحان ہوگا۔ تخلیق انسانی اسلام پر ہی ہوتی ہے۔ دنیا میں معتدل مذہب اسلام کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آیات میں تمام مسلمانوں کو تین باتوں کا حکم دیا ہے۔ خلوصِ نیت کے ساتھ خاص اللہ کی طرف توجہ۔ تقویٰ اور نماز کی پابندی۔ تینوں کو ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح بغیر خلوصِ نیت اور ابتدائی اتقاء کے کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا اسی طرح بغیر نماز کے کسی کو (عملاً) مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

آخر میں شرک اور شائبہ شرک سے بچنے کی نہایت تاکید کے ساتھ ہدایت کی ہے اور فرقہ بندی کی سخت مذمت کر کے پرزور باز داشت فرمائی ہے۔ وغیرہ

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ

جب لوگوں پر کوئی تکلیف آ پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر اس کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب وہ اپنی طرف سے رحمت کا کچھ مزہ اُن کو چکھا دیتا ہے تو فوراً اُن

مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمْ

میں سے ایک فریق اپنے پروردگار کا شریک بنانے لگتے ہیں تاکہ ہماری دی ہوئی چیز کی ناشکری کریں تو اچھا مزہ اڑا لو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کیا

اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ۝ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً

ہم نے اُن پر کوئی سند اُتاری ہے اور اُس کے حق ہونے کو کہہ رہی ہے جس کو وہ خدا کا شریک کرتے ہیں جب ہم لوگوں کو کسی قدر رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں

فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا

تو اس پر اترا جاتے ہیں اور جب ان پر کوئی مصیبت اُن کے سابقہ کرتوت کی وجہ سے آجاتی ہے تو وہ فوراً نا اُمید ہو جاتے ہیں کیا انھوں نے

اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

نہیں دیکھا کہ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے اس میں ایماندار قوم کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

تفسیر انسان کے انحطاط و تنزل کے فطرت کی طرف سے دو طریقے مقرر ہیں۔ ان دو طریقوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ تنزل کا نہیں ہے۔ یا تو یکدم انقلاب ہو جاتا ہے اور

انسان ہلاکت کے غار میں گر جاتا ہے۔ مثلاً سرسبز و شاداب لہلہاتی کھیتی باد سموم کے ایک جھونکے سے جل جاتی ہے۔ دفعۃً ژالہ باری اور برق کی انگلی کی نذر ہو جاتی ہے۔ ہرے بھرے بلدار درخت آن کی آن میں طوفانی باد و باراں اور برقی تجلیاں کی ہلاکت آفرینیوں پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ایک غیبی زلزلہ فلک بوس کوٹھیوں اور کوہ نما کارخانوں کو زمین پر دے پٹکتا ہے۔ چند منٹ پہلے جہاں قصر سلیمانی اور محل جمشیدی تھے وہاں خاک کے ڈھیر اور پگھلے ہوئے لوہے کے انبار نظر آتے ہیں۔ اچھا خاصا طاقتور حسین اور رعنا جوان ہوتا ہے۔ اس کی رگ رگ اور بال بال میں روغن جوانی بھرا ہوتا ہے۔ چہرے کی تابانی اور پیشانی کی درخشانی، بازوؤں میں رستمانہ طاقت اور سینہ میں شیرانہ ہمت و شجاعت اس کے حسن یوسفی اور شاہانہ جلال و جبروت کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن تیز آندھی کا ایک جھونکا اس کی زندگی کے چراغ کو یکدم بجھا دیتا ہے۔ ایک گھنٹہ کا طاعونی بخار اور فوری ہونے والی کالرا کے جراثیم اس کے شجر حیات کو جڑ سے ڈھا دیتے ہیں۔ مجلس برات میں نوجوان دولہا مسند عروسی پر متمکن ہوتا ہے کہ حرکت قلب بند ہو جاتی ہے، روح پرواز کر جاتی ہے اور اجل کا بے رحم ہاتھ سارے ارمانوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے ان گنت واقعات فوری انقلاب اور ناگہانی تنزل کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

یا تنزل کی رفتار تدریجی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ جسمانی اور مالی حالت نیچے کو اترتی ہے۔ ابتداءً معمولی زکام ہوتا ہے پھر نزلہ پھر کھانسی پھر بخار پھر نقاہت علیہ پھر ڈھول و دل اور آخر موت آ جاتی ہے یا چہل سالہ تندرست آدمی کے اعصاب و عضلات میں اضمحلال شروع ہوتا ہے۔ بدن میں لاغری اور عام قوت میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ تمام آلات ہضم اپنے فرائض کے انجام دینے میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ اور اجزائے شریفہ رو بہ انحطاط ہو جاتے ہیں۔ بالآخر کڑیل نوجوان پیر فرتوت بن جاتا ہے۔ لاٹھی کی ٹیک یا کسی کے ہاتھ کے سہارے سے بمشکل اپنی جگہ سے سرک سکتا ہے۔ اور پھر اس حالت پر بھی قرار نہیں رہتا۔ یہ کیفیت بھی پائیدار نہیں ہوتی۔ انجام کار ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جاتا ہے۔ مالی تنزل کی بھی یہی حالت ہے۔ تجارت، زراعت اور دوسرے کاروبار میں تھوڑا تھوڑا نقصان ہوتا رہتا ہے جس کا کچھ زیادہ احساس نہیں ہونے پاتا لیکن دوسری اور تیسری اور چوتھی غرض ہر بار یونہی کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ انجام میں کل سرمایہ برباد ہو جاتا ہے اور بیکس انسان جیسا خالی ہاتھ دنیا میں آیا تھا ویسا ہی نہتا رہ جاتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل مایوس و نامراد ہو جاتا ہے۔ یہ حالت و انحطاط و تنزل کی ہوتی ہے۔ ترقی اور کامیابی کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مفلس نادار نان شبینہ کو محتاج انسان ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ میں امیر کبیر اور رئیس اعظم بن جاتا ہے۔ ادنیٰ لشکری اور سپاہی ایک ساعت میں شاہ زماں ہو جاتا ہے۔ تیمور لنگ، نادر شاہ درانی، رضا شاہ پہلوی، ہیر منی کا ہرفان ہٹلر، اطالیہ کا موسیولینی اور ان کے علاوہ ہزاروں مثالیں فوری انقلاب کی ملیں گی۔ چند ساعات یا چند ایام یا چند ماہ یا چند سالوں میں پستی میں پڑا ہوا انسان عروج کی انتہائی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی رامپور کا اب سے دس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ دو آدمی نہایت پست ترین حالت میں تھے۔ بادہ نان کو محتاج تھے۔ نامہ سے زائد ہر ایک کی چھ سات روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ ایک بلا زمین دو روپیہ کی سبزی ترکاری خرید کر فروخت کیا کرتا تھا۔ دوسرا گھاس کھودتا تھا۔ ہز ہائینس آف رام پور کی دو علاتی بہنیں جوان قابل نکاح تھیں۔ ایک روز شاہی محل میں مشورہ ہونے کے بعد طے پایا کہ ان دونوں کا نکاح بہت جلد کر دیا جائے۔ کس کے ساتھ کر دیا جائے؟ فوری طور پر کوئی آدمی سمجھ میں نہ آیا۔ والدہ نے اپنے دونوں رشتہ داروں کا تذکرہ کیا۔ نواب صاحب واقف نہ تھے۔ والدہ کے کہنے سے راضی ہو گئے۔ سعادت مندی اور اطاعت پسری کے جذبہ نے انکار نہ کرنے دیا۔ فوراً چوبدار نقیب ہرکارے بھیجے گئے۔ ایک صاحب بازار میں گئے ترکاری فروخت کر رہے تھے۔ دوسرے کسی باغ میں گھاس کھود رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا۔ دونوں کو ملاحظۂ شاہی میں پیش کیا گیا۔ حسب الحکم حمام میں بھجوا کر انسانی جامہ زیب تن کرایا گیا۔ بعد مغرب کے شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ صبح کو تمام امراء و عہدہ دار عمائد اور وجاہت والوں میں نکلے۔ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ جلوس کا مظاہرہ بازاروں میں کیا گیا۔ کثیر مال و منال لاکھوں کے جواہر، شاہی محلات، کئی کئی ہزار کی تنخواہ، بڑے بڑے زرخیز گاؤں۔ غرض وہ سب کچھ مل گیا جو شان امارت کے لئے مناسب تھا اور نواب زادیاں گھسیاروں کی بیویاں بن گئیں۔ تلاش کی نظر سے دیکھا جائے تو دنیا میں ہر جگہ بکثرت اس قسم کے واقعات ملیں گے۔ رہی تدریجی ترقی تو اس کی تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہر شخص اس دور سے گزر ہی رہا ہے اور جاہل ترین آدمی بھی اس سے ناواقف نہیں ہے۔

ترقی اور تنزل کے اس دور سے دنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے۔ دکھ سکھ، رنج اور راحت انسانی لوازم میں سے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دکھ میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اور سکھ میں کیا کیفیت رہتی ہے۔

روشن روح، بیدار دماغ، چشم بصیرت اور پاک ایمان رکھنے والے تو کسی دکھ سکھ کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ ہر حالت کو ناپائیدار اور زوال پذیر جانتے ہیں ان

کی نظر ہر وقت خدا پر ہوتی ہے۔ وہ کسی حالت میں اللہ کو نہیں بھولتے۔ تکلیف ہو یا چین، مصیبت ہو یا راحت، ترقی ہو یا تنزل، خوشحالی ہو یا بدحالی ہر چیز کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں۔ اگر مصیبت اور دکھ کے وقت خدا سے دعا کرتے ہیں اور صبر و استقامت کے ساتھ مجیب الدعاء کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو راحت و سکھ کے وقت بھی اسی کا شکر کرتے ہیں اور حمد و ثناء میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ نہ مصیبت اور بربادی کا چکر اُن کو مایوس بناتا ہے۔ نہ راحت و کامرانی اُن کو مغرور بنا کر خدا فراموش کر سکتی ہے۔ لیکن ایسے آدمی بہت کم ہیں اس لئے ان کا تذکرہ کچھ زیادہ ضروری نہیں۔

زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کی روحیں تاریک، دماغ زنگ خوردہ، بصیرت مُردہ، دانش افسردہ اور ایمان پژمردہ ہیں۔ یہ لوگ اگر کسی ناگہانی مصیبت میں گھر جاتے ہیں۔ اگر طوفانی لہریں اور ہلاکت آفریں ہوائیں اُن کے سفینۂ حیات کو احاطہ کر لیتی ہیں کسی تدبیر سے کسی طرح نجات بظاہر ممکن نہیں ہوتی۔ انسانی دانش و فکر کی بے بسی اور ہر تدبیر کی واماندگی سامنے آجاتی ہے۔ تمام مادی اسباب کی زنجیر کٹ جاتی ہے۔ ہر وکیل کی وکالت، ہر کفیل کی کفالت، ہر ڈاکٹر کی حذاقت اور ہر طاقتور کی طاقت کی مجبوری نمایاں ہو جاتی ہے تو اس کوتاہ نظر گروہ کو ایسے وقت میں خدا یاد آتا ہے۔ ایسی اضطراری حالت میں پروردگار کی طرف دوڑتا ہے۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر محض اللہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ بندوں کی بیکسی دیکھ کر رحمٰن کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔ فوراً مصیبت سے رہائی عطا فرما دی جاتی ہے۔ دکھ دور کر کے سکھ عنایت کر دیا جاتا ہے اور بگڑا کام بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن احسان فراموش انسان جب مصیبت سے چھوٹ کر راحت سے ہمکنار ہوتا ہے تو پھر بُرا وقت اُس کو یاد نہیں رہتا۔ اللہ کو بھول جاتا ہے، اُس کی کارسازی کو فراموش کر دیتا ہے اور پھر در در جبہ سائی کرنے لگتا ہے۔ اعمال و عقائد میں پھر شرک آمیزی کرنی شروع کر دیتا ہے۔ کسی کو خدا تک پہنچنے کا زینہ کسی کو دنیوی کارسازی کا ذریعہ کسی کو وسیلہ اور کسی کو حاجت روائی کا گنجینہ کہنے اور سمجھنے لگتا ہے۔ اُس کے کردار و اطوار سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس کو خدا کی ہستی کا انکار ہے اور احسانِ الٰہی کو یہ تسلیم نہیں کرتا۔ کاش اس بے خبر آدمی کو معلوم ہوتا کہ موجودہ سکھ اور راحت بھی دوامی نہیں چند روزہ ہے، زوال پذیر ہے۔ یہ تمتع اندوزی اور عیش پرستی باقی رہنے والی نہیں۔ اس کی بربادی بہت ہی قریب ہے۔ اگر زندگی میں زوال نہ ہوا تو موت کا زبردست پنجہ بہر حال تمام راحتوں کو ضرور چھین لے گا اور پھر سارا کفرانِ نعمت اور تمام غرور سامنے آئے گا۔

اس کفر طراز بے دین طبقہ میں سے جن کی دانش و بصیرت بالکل مُردہ ہوتی ہے اور جن کے حصہ میں ایمان و ایقان کا کوئی ذرہ نہیں ہوتا ان کی حالت اور زیادہ خراب اور قابلِ افسوس ہوتی ہے جن پر (ناگہانی مصیبت تو در کنار) اگر کوئی معمولی مصیبت، تدریجی نقصان یا عادی دکھ آپڑتا ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ قنوطیت کی گھنگھور گھٹا ان کے دماغوں اور دلوں پر چھا جاتی ہے۔ اللہ کی طرف کو دوڑنے کی بجائے اس کی رحمت سے ناامید ہو جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب کبھی یہ مصیبت رفع نہ ہوگی۔ بیماری تو تمام عمر یونہی تکلیفوں میں کٹ گئی۔ لیکن اللہ بہر صورت اللہ ہے۔ رحمٰن کی رحمت کو کوئی مانے یا نہ مانے، اس کی ربوبیت و عطوفت کو کوئی جانے یا نہ جانے، اُس کی طرف کو کوئی دوڑے یا نہ دوڑے۔ بہر حال وہ دستگیری فرماتا اور کارسازی کرتا ہے۔ چنانچہ اس نامراد مایوس طبقہ کی مصیبت کو بھی دور کرتا ہے نا داری کی جگہ مالداری، بیماری کی جگہ صحت، مقاصد میں ناکامی کی جگہ کامیابی اور نقصان کی جگہ نفع عنایت فرماتا ہے۔ جب اس خدا فراموش مایوس از رحمت گروہ کی حالت پلٹ جاتی ہے امید کا آفتاب چمکنے لگتا ہے، سموم سے نسیم کا اور رات سے دن کا تبادل ہو جاتا ہے تو کم بخت کم ظرف اکڑ جاتا ہے اترانے لگتا ہے مغرور بن جاتا ہے بادۂ نخوت سے چُور ہو جاتا ہے۔ دُکھ میں خدا فراموش تھا سکھ میں خود فراموش بھی ہو جاتا ہے۔ کاش اس بے بصیرت کور دانش بد باطن جماعت کو علم ہوتا کہ لیل و نہار کا تبادل، سردی و گرمی کا اختلاف، صحت و بیماری کا ادل بدل، سکھ و دُکھ، افلاس و دولت، قوت و ضعف اور نقصان و نفع کا نوبت بہ نوبت آنا اور فطری مصالح کے تحت ہوتا ہے۔ رزق کی تنگی اور فراخی تو خدا کرتا ہے اور اپنی مشیت کے موافق کرتا ہے جس کو چاہتا ہے فارغ البال اور خوشحال بناتا ہے اور جس کو چاہتا ہے شکستہ حال و ابتر حال کر دیتا ہے۔ ایک حالت کسی کی بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔ یہ انقلاب یہ تبادل یہ اختلاف یہ رنگینیاں اور یہ تغیراتِ زندگی دعوتِ غور دے رہے ہیں۔ اہلِ ایمان کو آہنگ تبصرہ دے رہے ہیں۔ ارباب معرفت کو اور پکار پکار کر بلا رہے ہیں۔ روشن روح رکھنے والے حاملانِ یقین کو ایسے ہی تغیر و تبدل اور دَوروں میں اُن کے لئے موعظت و عبرت ہے۔ نصیحت اور نشانِ قدرت ہے۔

تحلیل اجزاء وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ الخ۔ ان آیات میں رب العالمین نے کمزور انسان کی عادی کمزوری کو ظاہر فرما کر در پردہ اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ کمزوری اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک ہر دکھ سکھ کو زوال پذیر نہ سمجھا جائے۔ مصیبت میں صبر و استقلال اور راحت میں شکر جاری نہ رکھا جائے اور رنج و آرام کو اللہ کے حکم کا تابع سمجھ کر محض تبدیلِ احوال اور تغیر کیفیات نہ جانا جائے اور ہر وقت اپنا مطمح نظر ان تمام انقلابات سارے

تغیرات اور کل تصرفات سے بالاتر نہ مقرر کیا جائے۔ گویا جب تک ہر گردشِ لیل و نہار اور تبدیل کوائف میں اللہ کے ہمہ گیر دستِ قدرت کا تصرف نظر نہ آئے اور ہر شے میں غیبی حکم کو کار فرما نہ دیکھا جائے اُس وقت تک ایمان پختہ نہیں ہو سکتا اور جب تک ایمان پختہ نہ ہو روح کا سکون اور دل کا چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا:۔

اگر سکون و چین، اطمینان اور سکھ کی ضرورت ہے تو بجائے اس کے کہ مال کی فراوانی، عیال کی کثرت، مویشیوں کی بہتات اور حکومت و جاہ کی طلب کی جائے اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا اقرار کیا جائے اور ہر صنعت کو صانع کی بے چون صنعت کا مظاہرہ سمجھ لیا جائے۔ یہ ہے لب لباب ان تمام آیاتِ مقدسہ کا۔

اس مجموعۂ ہدایت میں دو جگہ لفظ رحمت مذکور ہے پہلی جگہ لفظ رحمت کے مقابلہ میں لفظ ضُرٌّ آیا ہے اور دوسری جگہ سَیِّئَۃٌ ذکر کیا گیا ہے۔ شاید لفظ ضُرٌّ سے ناگہانی مصیبت اور اضطراب انگیز دکھ مراد ہے اور اس کے مقابل لفظ رحمت سے ناگہانی بلا کا ازالہ۔

اور مؤخر الذکر آیت میں لفظ سَیِّئَۃٌ سے تدریجی مصیبت مراد ہے اور لفظ رحمۃ سے اس کا ازالہ۔

اہلِ تفسیر نے آیتِ مذکورہ کے سبب نزول میں ایک قصہ نقل کیا ہے۔ جب مشرکوں کو جنگِ احد میں کسی قدر غلبہ حاصل ہوا تو ابوسفیان نے پکارا اُعْلُ هُبَل اُعْلُ هُبَل یعنی ہبل (ایک مورتی کا نام) بلند ہبل بلند کہا۔ مطلب یہ کہ فتح ہبل کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ حضورِ اقدس نے حکم دیا کہ بلند آواز سے تم پکارو۔ اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ۔ بہرحال شانِ نزول میں اس واقعہ کا تذکرہ صحیح ہو یا نہ ہو حکم ضرور عام ہے۔ لفظ ضر کے ساتھ مَسّ (چھونا) اور لفظ رحمۃ کے ساتھ لفظ ذوق کا لانا دو خاص تفسیری نکتے بتا رہا ہے۔ ساول یہ کہ بے دین ظاہر پرست انسان بہت ہی بزدل پست حوصلہ اور کم ظرف واقع ہوا ہے۔ ناگہانی مصیبت میں گھر جانا تو درکنار اگر کوئی مصیبت اس کو چھو بھی جائے تو چیخ اُٹھتا ہے۔ اسی طرح اگر سکھ اور راحت کا مزہ بھی چکھنے کو مل جائے تو اِترا جاتا ہے اور ساری مصیبت کو بھول جاتا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دنیوی تکلیف کتنی ہی عظیم الشان ہو اور آدمی کو چاہے چاروں طرف سے گھیر لے لیکن آخرت کے دکھ کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ عذاب دراصل آخرت کا عذاب ہے۔ دنیوی سخت ترین مصیبت کا احاطہ آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں گویا ایسا ہے جیسے کسی تکلیف کا بدن کو چھو جانا۔ اسی کی تائید حدیث سے ہوتی ہے۔ حضورِ والا نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس مومن بندہ کو دنیا میں سراسر تکالیف ہی پہنچی ہوں گی، جب وہ آخرت کی نعمت میں غوطہ مارے گا۔ اور پھر اُس سے دنیوی مصائب کو دریافت کیا جائے گا تو اس کو کچھ یاد نہ آئے گا۔

اسی طرح آخرت کے چین کے مقابلہ میں دنیوی عیش و راحت کی حالت ہے یہ کتنی ہی بہتر اور کثیر ہو اور کتنا ہی سیر ہو کر انسان اس سے تمتع اندوز ہو لیکن یہ ساری تمتع اندوزی چکھنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

حاصلِ مطلب یہ ہے کہ جب کافروں کو کوئی ادنیٰ تکلیف (مثلاً افلاس بیماری یا جان و مال کا خطرہ یا کوئی اور مصیبت) چھو بھی جاتی ہے (اور تمام تدبیریں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اسباب کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں، علائق منقطع ہو جاتے ہیں۔ کوئی فریادرس نظر نہیں آتا حواس پراگندہ ہو جاتے ہیں کوئی یار و مددگار نہیں ملتا) تو ایسی اضطراری حالت میں اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ خلوصِ قلب کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور تمام وسائل و ذرائع کے تصور ہی کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب اللہ کی رحمت کا صرف ایک جھونکا چل جاتا اور سکھ کا مزہ چکھنے کو مل جاتا ہے تو اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں میں سے کچھ لوگ بدستور پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں (اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ کوئی کسی کو مظہرِ قدرت بنا کر پوجتا ہے۔ کوئی ارباب انواع سمجھ کر ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ کوئی خدا کے تصور کو ناممکن بتاتے ہوئے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کو تصفیۂ قلب اور تزکیۂ روح کا موجب جانتا ہے۔ کوئی خدا کو دنیوی بادشاہ خیال کر کے درمیانی وسائل و ذرائع کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کوئی پیروں فقیروں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے سجدہ ریز ہوا کرتا ہے اور ان کو کارخانۂ قدرت کا مختار سمجھتا ہے۔ کوئی اس سے بھی خفی شرک کرتا ہے تو اولیاء انبیاء اور اپنے اپنے پیشوا کی تعریف میں اتنا مبالغہ کرتا ہے کہ خدائی اوصاف کی ایک جھلک اُن میں نمایاں بتاتا ہے۔ غرض ناگہانی مصیبت سے چھوٹنے کے بعد اللہ کے احسان کو بھول جاتا ہے اور اگر نہیں بھولتا تو کم از کم اس کی شرک آفرینیوں سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ اللہ کے احسان کا انکار کرنا چاہتا ہے اور نعمتِ الٰہیہ کو بھول گیا ہے۔ مراد یہ کہ اس کے افعال معصیت آگیں اور کفر آگیں ہو جاتے ہیں لیکن اس کو ظاہراً احسان فراموش سے کچھ روکتا۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ اب تو مزے اُڑائے جاؤ کچھ ہی زمانہ کے بعد تم کو اپنے کیے کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔ یعنی اجل مقدر تک تو جس

باطل خیال پر جا مور ہو اور جس طرح دل چاہے زندگی بسر کرو۔ مرنے کے بعد اس بے اعتقادی اور بد اعمالی کا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا اور کرتوت کا مزہ چکھنا ہوگا۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا الخ یعنی ان کافروں کے پاس اپنی کفر آفرینیوں کے ثبوت کے لئے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں کوئی برہان اور حجت شرک کا سبق نہیں دے سکتی۔ نہ اللہ نے فطرتِ سلیمہ کو داعی کفر بنایا، نہ کسی کتاب اور صحیفہ کو پیام شرک پہنچانے کے لئے بھیجا۔ پس ان کی تمام کفر شعاریاں خود تراشیدہ اور اختراعی ہیں۔

تنبیہ عموماً کافروں کی یہی حالت ہے کہ لازوال مصیبت پڑنے پر تمام دیوتاؤں مورتیوں سے مُنہ موڑ کر خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن کچھ خبیث جربطن ایسے بھی ہیں کہ سخت ترین مصیبت کے وقت بھی خدا کو یاد نہیں کرتے اس لئے النَّاس سے مراد تمام کفار نہیں بلکہ افراد کا معمول و دستور ظاہر کرنا مقصود ہے۔

پھر عیشی اور سکھ میں پہنچ کر ہمیشہ کفر کرنا بھی ہر کافر کا کام نہیں ہے۔ نہ ہر کافر خواہ مخواہ ایسی حرکت کرتا ہے۔ ہاں ایک گروہ ضرور ایسا کرتا ہے اس لئے لفظ فریق فرمایا۔ اس مطلب کے موافق النَّاس سے مراد کفار ہوں گے اہلِ ایمان کا تذکرہ نہ ہوگا۔ اہلِ ایمان بھی مصیبت پڑنے کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ہر مصیبت کو اللہ کی طرف سے جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت ہی چھوٹی تکلیف کے وقت بھی اللہ ہی کے دروازہ کی طرف دوڑتے ہیں۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ چراغ بجھ گیا تو حضورؐ اقدس نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ نے عرض کیا کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ ارشاد فرمایا کانٹا لگ جائے تو وہ بھی مومن کے واسطے مصیبت ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جوتی کا تسمہ اور نمک کی کنکری بھی اللہ ہی سے مانگے۔ لیکن اہلِ ایمان کا اللہ کی طرف رجوع کرنا معیوب نہیں بلکہ مستحسن فعل ہے بلکہ واجب ہے۔ کیونکہ اُن کے دلوں سے تو خدا کی یاد کبھی زائل ہی نہیں ہوتی۔

یہ تفسیری مطلب وہ ہے جو عام مفسروں نے بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک اگر النَّاس سے عموماً وہ انسان مراد لئے جائیں جو دُکھ کے وقت خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں خواہ مومن ہوں یا کافر اور فریق سے مراد صرف کافروں کی جماعت ہو تو مطلب زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہوگا کہ دُکھ کے وقت تو مومن کافر سب ہی خدا سے التجا کرتے ہیں لیکن دُکھ دور ہونے پر مومن تو توحید و ایمان پر بدستور قائم رہتے ہیں اور کافروں کا گروہ معمول قدیم کے موافق شرک آفرینیوں میں منہمک ہو جاتا ہے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا۔ غالباً اس آیت میں رحمت سے مراد ہے تمدنی نعمت آہستہ آہستہ فراخدستی رفتہ رفتہ مال کی فراوانی اولاد کی کثرت صحت کی افزونی جتھے کی بہتات اور عزت و جاہ کی بیشی یعنی جب اللہ کم ظرف تنگ حوصلہ لوگوں کو اپنی رحمت کا تھوڑا سا مزہ چکھا دیتا ہے۔ مال و جاہ میں کچھ ترقی ہو جاتی ہے یا اولاد اور جماعت بڑھ جاتی ہے تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے اترا جاتے ہیں اور مغرور ہو جاتے ہیں۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ۔ لیکن اگر اتفاق سے کبھی کوئی بُرائی آگئی دُکھ پہنچ گیا، تنگدستی، افلاس، مرض، زوالِ عہدہ، مقدمہ میں ناکامی یا کوئی اور مصیبت آپڑی تو باوجودیکہ مصیبت کی یہ اُفتاد اُنہی کے کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ باوجودیکہ یہ دُکھ اُنہی کا خود آوردہ ہوتا ہے باوجودیکہ یہ تکلیف اُنہی کے اعمال کا خمیازہ ہوتی ہے لیکن وہ یکدم مایوس ہو جاتے ہیں اور نہیں خیال کرتے کہ دُکھ سُکھ تو لوازم انسانیت میں سے ہے۔ اس کو مقصودِ اصلی بنا کر مغرور یا نااُمید ہو جانا عقل و ایمان کے اقتضا کے خلاف ہے۔ یہ حقیقت تو اتنی ظاہر ہے جیسے محسوس۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الخ۔ اور یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ رزق کی تنگی اور فراخی تو خدا کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے فراخدست کرتا ہے۔ فقر و افلاس کو دوام ہے نہ وسعتِ دولت لازوال ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ لیکن ایمان و ایقان کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اہلِ یقین کے لئے ناداری اور مالداری کے تواتر فقیری اور امیری کے تبادلہ اور سُکھ دُکھ کے انقلاب و تغیر میں اللہ کی حکمت مصلحت اور قسمت کو سمجھنے کے لئے درسِ بصیرت اور دعوتِ موعظت موجود ہے (مثلاً کافر کے حق میں اس کی دولت مزید سرکشی اور طغیان کا باعث ہے اور فقر و افلاس مومن کے لئے اجر جزیل بڑھانے کا موجب اور صبر و استقامت کا باعث ہے کافر کے لئے اس کا افلاس رحمتِ الٰہی سے نااُمید ہونے اور سایۂ عطوفت سے دور ہونے کا ذریعہ ہے اور مومن کے لئے تونگری مزید شکر ادا کرنے اور اللہ کو یاد کرنے کا سبب ہے۔

مقصودِ بیان پست حوصلہ آدمی کی کم ظرفی کی تصویر کشی اور عموماً انسانی طبائع کا عمومی اظہار۔ اس امر کا بیان کہ اکثر آدمی خواہ کافر ہوں یا مومن سخت مصیبت کے وقت خدا کی طرف دوڑتے ہیں اور مصیبت دور ہونے پر بعض سرکش انسان اللہ کی طرف سے مُنہ موڑ کر دوسروں سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ دراصل وہ ہر قسم کے شرک کی پُر زور مذمت۔ لِیَكْفُرُوْا کا لفظ بتا رہا ہے کہ مشرکانہ اعمال بھی (خواہ عقیدۂ شرک نہ ہو) کفر کی شاخیں ہیں۔ بِمَا قَدَّمَتْ

آیتیں ان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ہر طرح کا دکھ دنیوی سزا کے طور پر ہوتا ہے۔ انسانی اعمال اس کے بموجب ہوتے ہیں۔ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ سے ناامید ہو جانے کی مذمت مترشح ہو رہی ہے۔ آخری آیت میں صراحت ہے کہ امیری فقیری اللہ کے دستِ قدرت میں ہے اور اس کی مشیت و مصلحت کے تابع ہے۔ اہلِ ایمان کو اس پر غور کرکے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ

پس تم رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق) دیا کرو یہ اُن لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی خوشنودی کے خواہاں

وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ

ہیں یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اور یہ جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو

فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ؀

تو اللہ کے ہاں وہ نہیں بڑھتا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو زکوٰۃ تم دیتے ہو تو ضرور (زکوٰۃ دینے والے لوگ مال کو) دوگنا کرنے والے ہیں

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ

اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو مُردہ کرے گا پھر تم کو زندہ کرے گا بھلا تمہارے شریکوں میں سے بھی کوئی ایسا ہے

يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؀ع

رکوع ۱۳ ع

جو ان کاموں میں سے کچھ کر سکے وہ پاک ہے اور ان کی شرک انگیزیوں سے برتر ہے

تفسیر کوتاہ نظر کور باطن کم فہم اور نارسا دانش رکھنے والے بے دین عقیدۃً یا عملاً اس زندگی کے علاوہ دوسری زندگی نہیں جانتے کسی سزا و جزا کا اُن کو یقین نہیں ہوتا اسی لئے ان کا مرکزِ توجہ صرف اسی زندگی کی آسائش اور راحت ہوتی ہے اور چونکہ ان کی مطلوبہ راحت بغیر مال کے حاصل نہیں ہوتی نور معرفتِ الٰہیہ، باطنی سکونِ قلب اور روحانی راحت سے وہ واقف ہی نہیں ہوتے۔ صرف سکونِ دماغی اور آسائشِ جسمانی کو جانتے ہیں اور ان چیزوں کا میسر آنا دولت کی کثرت پر موقوف ہے۔ پس اسی بنا پر وہ پیسہ کو پیسے سے اور روپیہ کو روپیہ سے جوڑ کر زمین میں دفن کرتے ہیں ظلم سے انصاف سے جائز اور ناجائز طریقے سے حرام اور حلال راستے سے لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ مار کر مال جمع کرتے ہیں۔ یوں تو حصولِ مال کے لاکھوں جائز اور ناجائز ذرائع ان کے سامنے ہوتے ہیں، اور ہر شخص کے مکان کے اندر اُن کے شیطانی دماغ نقب لگاتے رہتے ہیں لیکن ایک بلا جس میں دنیا کے بیشتر افراد مبتلا ہیں خصوصیت کے ساتھ بہت ہی زہریلا اور تباہ کن ہوتی ہے انسانی ضمیر بھی اس پر ملامت کرتا ہے۔ فطرتِ انسانی کی بھی اس سے کھلی مخالفت ہوتی ہے۔ روح میں تاریکی اور دل میں کثافت و شقاوت بھی اس سے پیدا ہوتی ہے۔ بیرحمی کے شیطانی جذبہ کا بھی اس سے انتہائی مظاہرہ ہوتا ہے۔ بزدلی اور خوف کی تیز ہوائیں بھی اس کی وجہ سے چاروں طرف سے انسان کے دماغ کو گھیر لیتی ہیں۔ سستی اور کاہلی پیدا کرنے کا بھی وہ سرچشمہ ہے اور پھر لطف یہ کہ دنیا کے بنائے ہوئے قانون کی شکست بھی اس سے نہیں ہوتی۔ اعلیٰ دماغ رکھنے والا طبقہ بھی اُس کو بُرا نہیں کہتا بلکہ ہر ممکن طور سے اس کی تائید کرتا ہے اور اس کو جائز نفع قرار دیتا ہے۔ اس کو نہ بے ایمانی سمجھا جاتا ہے نہ چوری نہ غبن نہ خیانت نہ ڈاکہ نہ حق تلفی۔ مزید طرہ یہ کہ اس سے مال میں روز افزوں ترقی ہوتی ہے۔ بڑی سے بڑی سلطنت کا مالیہ اُس سے مقابلہ نہیں کر سکتا کوئی تجارت اس کے ہم پلہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ تحصیلِ مال کا ایسا ہمہ گیر جال دنیا نے آج تک کوئی اور نہیں بنایا اور انسانی پرندوں کا شکار آج تک کبھی کسی اور طریقہ سے ایسا نہیں

ہوا۔ اس سے ہزاروں آدمیوں کا مال ایک شخص کی جیب میں آجاتا ہے۔ لاکھوں غریب مزدوروں اور بھولے بھالے کاشتکاروں کے خون کا آخری قطرہ بھی ایک حریص اور لالچی انسان کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ ان گنت گھروں کی مٹی سے پختہ اینٹیں بنا کر ایک ظالم کی کوٹھی تعمیر کی جاتی ہے۔ لاتعداد یتیموں اور بیواؤں کی ننگی بھوکی لاشوں کی تڑپ ایک سنگدل کی تفریح کا ذریعہ بنتی ہے اور سینکڑوں آبادیوں کی بربادی ایک شقی القلب آدمی کے گھر کے آباد ہونے کا وسیلہ ہوتی ہے۔ ہزاروں پاکباز نوگابیوں کے نونہال کاٹ کر ایک بے برگ و بار تناور درخت کی باڑ بنائی جاتی ہے اور بے شمار پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے حسین درختوں کا رس اور ساری رطوبت کھینچ کر ایک بے سایہ بے فائدہ زہریلے درخت زقوم کی آبیاری کی جاتی ہے۔ خارج از حساب نازنینوں اور حسینوں کو برہنہ بدن آتشناک خاکستر اور تپتی ہوئی ریت میں لیٹنا کروٹیں لینا اور بالآخر شدتِ گرمی سے جھلس جھلس کر بے ہوش ہو جانا پڑتا ہے صرف اس لئے کہ ایک قوی ہیکل مکروہ منظر دیو کو حریری قالینوں اور دیبائی صوفوں پر نلک بوس کوٹھیوں کے اندر خس کی ٹٹیوں میں بجلی کے پنکھوں کے نیچے ایک گھنٹہ کے لئے چین و سکون کی تھپکیاں دے کر سلا دیا جائے اور بہت سے نازک بدن گلگوں معصوموں کو برفپوش میدانوں اور زمہریری ہواؤں میں چشم گریاں دل بریاں اور بدن عریاں حالت میں تڑپ تڑپ کر عزیز اور معصوم جانیں دینی پڑتی ہیں۔ محض اس لئے کہ ایک خبیث عفریت کو اونی گدوں اور ریشمی لحافوں کے اندر ہیٹر کی خوشگوار گرمی میں ایک ساعت کے لئے جسمانی آسائش کے ساتھ نیند آجائے۔ تحصیل مال کا یہ ذریعہ ایسا سفاک ظلم ہے جس کو قانون کا جامہ دنیا والوں نے پہنا دیا ہے۔ یہ ایسا خونریز ڈاکو ہے جس نے شاہ معدلت پناہ کے تخت پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ ساری ہلاکت آفرینیاں تباہی خیزیاں خونریزیاں اور بیرحمیاں کس کی ہیں؟ صرف دستور سود کی اور تعامل ربا کی۔

سود خوار کو دکھائی دیتا ہے کہ میرا گھر بھر گیا لیکن پوری بستی تباہ ہو گئی۔ وہ جانتا ہے کہ میرے صندوق زر و جواہر سے پُر ہو گئے۔ لیکن لاکھوں مستحق انسانوں کو نادار بنا کے وہ ساری آبادی کی دولت کو سمیٹ کر زمین کے اندر دفن کر دیتا ہے اور دولت سے دولت کے لغوی مفہوم (انتقال۔ ادل بدل) کو سلب کر لیتا ہے۔ لوگ مال کے فائدے سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس کو بھی تمتع اندوزی نصیب نہیں ہوتی۔ گویا زمین سے دولت نکالتے اور اہل علم کے مال میں اضافہ کرنے کی بجائے وہ مٹی کے اندر دولت کو دفن کرتا اور دنیا والوں کے مال میں کمی کرتا ہے۔ پس وہ دولت کو دولت نہیں رکھنا چاہتا بلکہ پتھروں اور کنکریوں کی طرح ایک جگہ ڈال رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا اضافۂ دولت درحقیقت اضافہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ نہ ایسی بیشی واقع میں بیشی ہے۔ یہ تو دنیا والوں کے مال کی کمی ہے۔ ایسے بدباطن بے رحم انسان سے اگر کہا جائے کہ کچھ مال مسکینوں مسافروں اور محتاج قرابتداروں کو دیدے تاکہ ان کی زندگیاں کسی قدر خطرات ہلاکت سے محفوظ ہو جائیں تو چونکہ اس کو اس طرح مال دینے سے اپنے اسٹاک میں کمی محسوس ہوتی ہے اس لئے ترش روئی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے اور تیوری پر بل ڈال کر ایک غلط انداز تحقیری نظر سے غریبوں کو دیکھ کر اپنی بے رحمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نادان نہیں جانتا کہ مال کو پاک کرنے والی، دولت میں اضافہ کرنے والی اور غنا کو بڑھانے والی تو یہی چیز ہے۔ رشتہ داروں کی رشتہ داری اسی لئے ہے کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی جانی اور مالی مدد کرے۔ مسکینوں کی مسکنت کا مانگ یہی ہے کہ اہل مال ان کی مدد کریں۔ اگر غریب طبقہ نہ ہوگا تو سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ ان کی مدد تو سرمایہ میں اضافہ کرنے والی ہے۔ کمی کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ مسافر جو دور دراز ملکوں کے رہنے والے ہیں، جو بے یار و بے وطن پڑے ہیں اگر ان کی مدد نہ کی جائے گی تو وہ اپنی بستیوں میں کسی مسافر کی مدد نہ کریں گے۔ اور اس طرح عالم کا ربط ضبط میل ملاپ تناصر و تعاون اور مساعدت ختم ہو جائے گی۔ انسانی معیشت اور مدنیت برباد ہو جائے گی۔ پس حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ اور امداد اہل ضرورت مال کو بڑھاتا ہے اور سود دولت کو برباد اور سرمایہ کی جڑوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔

لیکن زکوٰۃ اور امداد کی بھی گوناگوں صورتیں ہیں۔ مال کے دینے کے بھی مختلف احوال ہیں۔ تجارت بھی لین دین کا نام ہے۔ نام و نمود کے لئے دینا بھی دینا ہی ہے۔ عزت و جاہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرنا بھی صرف ہی کہلاتا ہے۔ غرض تمام اغراض کو پورا کرنے کے لئے خرچ کرنے کو خرچ کرنا ہی کہتے ہیں۔ ایسا دینا اور ایسا خرچ کرنا لاحاصل ہے۔ بے فائدہ ہے۔ اس سے عالم کی آبادی میں بیشی نہیں ہوتی۔ مدنیت اور عمرانیت کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ یہ تو تعمیر نہیں تخریب ہے۔ اگر تعمیر ہے تو ایک شخص کی اور تخریب ہے تو ایک عالم کی اور چونکہ اپنے ذاتی مقصد کی تعمیر دوسروں کی تخریب کرکے چاہنے والا بھی نوع انسانی کا ایک فرد اور قوم کا ایک جزو ہے اس لئے درحقیقت اس طریقے سے اس کی بھی تعمیر نہیں ہوتی۔ مکان کے تمام کمروں کو گرا کر صرف ایک کمرے کو بنایا جائے تو بالآخر اس کمرے کو بھی بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا اور جب تمام کمروں کی اینٹیں رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گی تو پھر اس کی مرمت کس طرح ہو سکے گی اس لئے دانشمندانہ فعل یہ ہے کہ اگر ترمیم یا تعمیر کی ضرورت ہو تو دوسرے کمروں کو ڈھانے کی بجائے نئی اینٹیں تیار کرائی جائیں تاکہ اس کمرے کی تعمیر بھی ہو جائے اور دوسرے

کرے بھی درست حالت میں رہیں۔

واقع میں زکوٰۃ اور امداد، عطاء و سخاوت ہے جو نفسانی لالچ سے پاک ہو۔ ذاتی اغراض سے بالاتر ہو۔ اپنے کسی مفاد کا حصول اس سے وابستہ نہ ہو۔ محض قوم کا قوام درست رکھنے اور حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے مال خرچ کیا جائے اس سے عمرانِ عالم میں اضافہ مدنیت و عافیت میں بیشی اور نسلِ انسانی میں تسلسل کی فراوانی ہوگی۔ یہی صدقات یہی خیرات اور یہی زکوٰۃ اس قابل ہے کہ اس کو لوجہ اللہ کہا جائے اور یہی وہ مَصرف ہے جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور ایسے ہی خرچ کرنے والے دونوں جہان میں کامیابی سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔

پس اے عزیزانِ ذی ہوش نفع کو نقصان سے تعمیر کو تخریب سے اور خیر کو شر سے ممتاز کرو۔ مستحق قرابتداروں کے حقوق ادا کرو۔ تمہارے مال میں اُن کا واجبی حق ہے (تمہارے مرنے کے بعد حسبِ مرتبہ ہر ایک اپنا حصہ لے لیگا۔ پھر ضرورت کے وقت ان کو دینا کیا لازم نہیں ہے) مسکینوں کی پرورش کرو۔ سکونِ عالم اُن کے دم سے ہے۔ اُن کی مسکنت کو سکنت نہ جانو بلکہ سکون سمجھو۔ نوعِ انسانی کا اضطراب اُنہی کی سکون انگیزیوں سے دور ہوتا ہے) بے وطن مسافروں کی بھی کفالت کرو (اُن کو مسافر اور بے وطن نہ جانو وہ سبیلِ انسانیت کے گہوارے میں پرورش پانے والے نونہال ہیں۔ اُنہی کے قدموں سے آئندہ نسلوں کی بہبودی وابستہ ہے) ایسا کرنے سے تم کو دونوں جہان میں سُرخروئی حاصل ہوگی اور کس طرح حاصل نہ ہوگی جبکہ تم قوم کا قوام درست کرنے کے لئے محض اللہ واسطے اہلِ استحقاق کو دوگے اور اُن کی امداد کروگے۔ اگر تم کو خیال ہو، اگر تمہارا نفس تم کو دھوکہ دے، اگر خطرات تمہارے دماغوں میں چٹکیاں لگائیں کہ خیرات کرنے صدقہ دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے مال میں کمی اور دولت میں نقصان ہوگا تو ایسے خیال کو دماغ میں نہ آنے دو۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور عمرانیت و فوقیت کو پختہ کرنے کے لئے زکوٰۃ دینے سے کمی نہیں ہوتی بلکہ دولت کی برکت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قومی مفاد کے ساتھ تمہارے ذاتی مفاد کا حصول بھی روز افزوں ترقی پر ہوگا اور خسارہ کی بجائے فلاح حاصل ہوگی۔

لوگ سود کو دولت کی فراوانی کا ذریعہ کہتے ہیں لیکن درحقیقت لوجہ اللہ زکوٰۃ دینی افزونی دولت کا قوی ترین سبب ہے اور سود بربادی کا سرچشمہ ہے۔ سود سے مال میں جو افزونی ہوتی ہے وہ خدا کے نزدیک ہیچ ہے (قوم کی تباہی جس چیز سے پیدا ہوتی ہے وہ تخریب کرنے والی اور مال میں کمی کرنے والی ہے) خدا کے نزدیک (یعنی واقع میں) اس سے مال میں اضافہ نہیں ہوسکتا نہ دنیا میں وہ عمرانیت پیدا کرنے والی ہے، نہ آخرت میں حصولِ ثواب کا سبب ہے۔ ہاں اس کے بالکل برعکس زکوٰۃ سے دولت میں برکت اور آخرت میں اجر حاصل ہوگا۔ ذرا غور تو کرو زکوٰۃ وخیرات سے بربادی کا خیال کرنا درحقیقت خدا پر بدگمانی کرنا اور مال پر کامل بھروسہ کرنا ہے اور مال کسی طرح قابلِ اعتماد چیز نہیں۔ نہ خدا کے سوا کوئی اور مال عطا کرنے والا ہے۔ کیا تمہاری پیدائش اللہ کے سوا کسی کی ممنونِ کرم ہے۔ کیا تمہاری موت اللہ کے علاوہ کسی کے دستِ تصرف کا نتیجہ ہے۔ کیا تمہاری ثانوی زندگی پر خدا کو چھوڑ کر کوئی اور قادر ہے۔ جب ان تینوں دوروں میں خدا کے علاوہ کسی کی کارفرمائی کو دخل نہیں تو پھر مال عطا کرنے والا اور غنی بنانے والا بھی اُس کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مال منال کو شش تدبیر اور ان کے علاوہ کسی اور کو اپنا کارساز جاننا اور زکوٰۃ کو مالی تباہی کا سبب سمجھنا کس قدر بڑی غلطی ہے۔

تحلیلِ اجزاء فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ مذکورہ بالا آیات میں ظاہر فرمایا تھا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا مومن کی شان نہیں۔ رزق دینا، دینا فراخ دست اور تنگ حال بنانا اللہ کا کام ہے۔ اُس کی جیسی مشیت ہوتی ہے ویسا ہی وہ کرتا ہے اب اس آیت میں خدا داد رزق میں جائز تصرف کرنے اور بندگانِ خدا کی امداد کرنے کا حکم دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ ہی رزق دیتا ہے کوئی خود مالک حقیقی نہیں تو پھر اپنے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ دوسرے ضرورتمندوں کو دلانا اور دینے کا حکم دینا بھی اسی کا کام ہے اور کچھ بے جا نہیں اگر پروردگار کسی کو کسی تک پہنچانے کے لئے صرف آلۂ کار بنالے اور خود رحمت فرما کر ایک کو دوسرے کے ذریعے پہنچائے۔

اِس آیت میں خطاب اگرچہ رسول پاک کو ہے لیکن تمام امت کو شامل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ براہِ راست ہر مالدار باقتدار مومن ہی کو خطاب ہو کیونکہ رزق وسیع کو صالحات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے۔ نعم المال الصالح للرجل الصالح پاکیزہ حلال مال نیک آدمی کے لئے اچھی چیز ہے (مسلم)

آیت مذکورہ میں اقرباء کو (حسب درجہ) ان کا حق دینے کا حکم دیا ہے۔ یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ مزید تنگدست اقرباء (والدین اور اولاد) کی کفالت کرنی اور حسبِ توفیق اُن کے مصارف اُٹھانے فرض ہیں۔ ائمہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے بھی صراحت کی ہے کہ دولتمند کے مال میں اُس کے قرابتدار فقیر کا حق واجب ہے۔ بلکہ مجاہد کا تو یہ قول ہے کہ اگر قرابتدار محتاج موجود ہو تو تونگر کا وہ صدقہ قبول نہ ہوگا جو کسی دوسرے کو دیا جائے۔ آثار و احادیث سے بھی ثابت ہے کہ

جس خاندان کے گھیرے کے اندر کوئی معذور بھوکا محتاج رات گزارے تو اس احاطہ کے رہنے والے دولتمندوں کی خیرات (اگر کسی غیر کو دی جائے تو) قبول نہ ہوگی۔ ائمۂ حنفیہ نے فقہ کے باب نفقۂ اقارب میں وجوب کے شرائط مفصل ذکر کئے ہیں۔ یہاں ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

یہ حدیث سے ثابت ہے کہ محتاج قرابتداروں کو دینے سے دوہرا ثواب ملتا ہے۔ ایک کنبہ پروری کا ثواب دوسرا خیرات کا ثواب۔ اگر قرابتدار کی حالت ایسی نہ ہو کہ اس کو دینا واجب ہو بلکہ نفلی صدقہ ہو تب بھی افضل ہے۔ اس میں بھی دوہرا اجر ملتا ہے۔ بات یہ ہے کہ خیرات و زکوٰۃ سے اصل غرض قوم کا قیام اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہے بمساوات عامہ اور اخوتِ تامہ کی تاسیس و پختگی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان خود محتاج ہو اور اپنی سخت ترین ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل نہ ہو اس وقت تک اس پر کوئی زکوٰۃ یا صدقہ فرض نہیں ہے (ہاں ایثار کرے تو دوسری بات ہے) کیونکہ یہ خود بھی قوم کا ایک فرد ہے۔ اس کی درستگی اور بقا سے بھی قوم کی تقویم ہوتی ہے۔ اپنی ذات کے بعد حسب درجہ اقارب کی پرورش لازم ہے۔ قوم کے اجزا وہ بھی ہیں مگر اس شخص کے لئے ان کی امداد زیادہ وقیع ہے۔ عام قوم سے اپنے کنبہ کا حق بہرحال نافذ ہے۔ اس کے بعد عام فقراء مساکین یتامیٰ کی کفالت ضروری ہے۔ لیکن اہلِ وطن کا حق سب سے مقدم ہے کیونکہ ان سے شرکتِ دینی اور قومی کے علاوہ شرکتِ وطنی بھی ہے۔ ایک ہی خطۂ زمین سب کو اپنی گود میں پرورش کرتا ہے پھر اجانب کا حق ہے۔ لیکن غیر وطنی حضرات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو اپنے شہر اپنے دیس اپنے اقربا و احباب میں موجود ہے۔ دوسرا گروہ آئی خانہ بدوشوں کا ہے جن کا کوئی عزیز قریب کوئی دوست اور یار و مددگار موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ مؤخر الذکر گروہ زیادہ پہلے کا مستحق ہے اور اول الذکر فقراء کا حق سب کے بعد ہے۔ اس ترتیب سے تمام قوم کا قوام درست ہو جائے گا اور سب مسلمان منظم ہو جائیں گے اور کوئی کسی دوسری قوم کا دستِ نگر نہ رہے گا اور اسلام کا شیرازہ پراگندہ ہونے سے محفوظ رہے گا۔ اس جگہ ترتیب درجات کی کوئی تفصیل بیان نہیں فرمائی صرف اہلِ استحقاق کے تین گروہ بتا دیئے۔ ترتیب اہلِ استحقاق مفصل طور پر احادیث آثار اور فقہ میں مذکور ہے۔

وَالْمَسٰكِيْنَ۔ لفظ مسکین سکن سے ماخوذ ہے یعنی ایسا شخص جس کی حالت انتہائی پستی پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہو اور اس سے نیچے افلاس کا کوئی درجہ نہ ہو۔ اسی بنا پر بعض علماء نے مسکین کو فقیر سے بدتر کہا ہے امام اعظمؒ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ بعض کا قول اس کے برعکس ہے۔ ابن کثیر نے دونوں قولوں کو جمع کر کے لکھا ہے کہ مسکین وہ شخص بھی ہے جس کے پاس اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ ہو اور وہ شخص بھی ہے جس کے پاس کچھ صرف تو ہو مگر نفقۂ ضروریہ کے لئے کافی نہ ہو۔ غالباً آیت میں عام مفہوم ہی مراد ہے۔ کیونکہ دونوں گروہوں کو دینے کا حکم ہے۔ دونوں کی امداد قوم کی تقویم کے لئے ضروری ہے۔ البتہ فرق مرتبہ قائم رکھنا حسب امکان لازم ہے۔

وَابْنَ السَّبِيْلِ یعنی اس مسافر کی امداد بھی ضروری ہے جو سفر میں محتاج ہو گیا ہو اگرچہ اپنے وطن میں مالدار ہو۔ احتیاج کے مدارج مختلف ہیں کسی مسافر کو روٹی کی کسی کو کپڑے کی کسی کو زادِ راہ کی اور کسی کو سواری کی حاجت ہوتی ہے۔ اس لئے ہر طرح کے حاجت مند مسافر کی حاجت روائی ضروری ہے۔ حدیث میں آیا ہے سائل کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ (رواہ ابن ماجہ) کیونکہ احتمال ہے کہ وہ مسافر ہو اور گھوڑا اس کے لوازم سفر سے ہو۔ ہاں اگر مسافر ایسے ہوں جن کی حالت کا بخوبی علم ہو اور یہ معلوم ہو کہ ان کو واقع میں کوئی حاجت نہیں تو ایسے لوگوں کو دینا مشائخ فقہاء نے ممنوع لکھا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ان کی حرام خوری کی اعانت ہوگی جو کسی طرح جائز نہیں۔

ایسے مسافروں کو دینا جائز نہیں ہے جن کا پیشہ ہی بھیک مانگنے کا ہو اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں وہ بھیک مانگنے کے لئے ہی سفر کرتے پھرتے ہوں۔

رہی یہ بات کہ مسافر کا سفر کسی واجب یا جائز ضرورت کے لئے ہو مثلاً طلبِ علم کے لئے تجارت کے لئے یا کسی ممنوع کام کے لئے ہو مثلاً ناچ دیکھنے یا قماربازی کرنے کے لئے اور ان دونوں مسافروں میں سے کوئی شخص سفر میں محتاج ہو جائے تو کس کی مدد کی جائے اور کس کی نہ کی جائے تو اس کی کوئی تفصیل آیت میں نہیں ہے۔ بظاہر ہر گروہ کی اعانت ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ وقتی اعانت سے معصیت کوش مسافر کے عصیان کی امداد نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اول مطلب یہ ہے کہ خیرات و صدقات کا اجرا ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو دیدارِ الٰہی کے طلبگار ہیں یعنی حشر نشر پر ان کا یقین اور خدا کے دیدار پر ان کا ایمان ہے گویا اقرباء نوازی مسکین پروری اور مسافروں کی امداد دیدارِ الٰہی کے حصول کا سبب ہے۔ دوسرا مطلب عام اہلِ تفسیر نے اس طرح لکھا ہے کہ امدادِ اقارب اعانت فقراء اور پرورش مسافر بہت بہتر کام ہیں مگر اس شخص کے لئے جو محض لوجہ اللہ کرے اور اس کے پیشِ نظر مرضیٔ مولا کے حصول اور امرِ الٰہی کی تعمیل کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ نام و نمود شہرت اور عزت و جاہ کی تحصیل نہ ہو۔ اول مطلب کو ابن کثیر نے پسند کیا ہے۔ اس سے معتزلہ کی تردید بھی مستفاد ہوتی ہے۔ کیونکہ معتزلہ دیدارِ الٰہی کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک قیامت کے دن بھی دیدارِ الٰہی ہر شخص کے لئے محال

ہے۔ لیکن چونکہ ارادۂ دیدارِ الٰہی کو آیتِ مذکور میں بصورت مدح ذکر کیا ہے اس لئے نہ فقط امکان کا بلکہ وقوعِ رویت کا ثبوت بھی آیت سے نکلتا ہے۔ دوسرا مطلب جمہور نے لکھا ہے میرے نزدیک یہی زیادہ صحیح بھی ہے کیونکہ تمام علمائے اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو نیک کام بغیر خلوصِ نیت کے کیا جائے وہ قبول نہیں کیا جاتا إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ مشہور (اور بعض کے نزدیک متواتر) حدیث ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اگر وجہ اللہ سے مراد دیدار لیا جائے گا تو آیت متشابہات میں سے ہو جائے گی محکمات میں سے نہ رہے گی۔ کیونکہ خدا ہر قسم کی جسمانیت سے پاک ہے اس لئے لفظ وجہ (چہرہ) کا مطلب تاویلی طور پر بیان کرنا ہوگا اور بلا وجہ مجاز کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ یعنی جو لوگ اقربا، مساکین اور مسافروں کی مالی مدد کرتے ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگ جو مالِ مذکور کا انکار کرتے ہیں مطلقاً فلاح یاب نہ ہوں گے کیونکہ فرض کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کافر بالکل فلاح یاب نہ ہوں گے یا کامل طور پر فلاحِ آخرت سے محروم رہیں گے۔ (کیونکہ بغیر انکارِ فرضیت کے فرض کو ترک کرنے سے کفر لازم نہیں آتا اہلِ سنت کا مسلک یہی ہے اور بغیر کفر کے مطلقاً فلاح یابی کی نفی نہیں ہو سکتی ہاں کمالِ فلاح کی نفی ہو جائے گی۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ الخ۔ اس آیت میں ربوا سے مراد عطیہ اور ہدیہ ہے۔ ابن عباس، مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، محمد بن کعب اور شعبی کا یہی قول ہے۔ واحدی نے جماعتِ مفسرین کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کسی نے کسی کو اس نیت سے ہدیہ دیا کہ وہ اس ہدیہ سے زیادہ عوض دے تو ایسے ہدیہ کا خدا کے ہاں کچھ ثواب نہ ہوگا۔ ضحاک کا قول ہے کہ حضور اقدس کے واسطے تو قطعاً جائز نہ تھا کہ عوض کے لالچ میں کسی کو کچھ عنایت فرمائیں۔ آیت وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ میں اس کی صاف ممانعت فرما دی گئی ہے۔ یعنی ایسا ہدیہ نہ دو جس سے تمہاری نیت زیادہ عوض ملنے کی ہو لیکن دوسرے لوگوں کے لئے یہ فعل جائز ہے۔ پھر بھی ایسے ہدیہ کا ثواب کچھ نہ ہوگا۔ مہلب نے کہا کہ امام مالک نے فرمایا اگر واہب موہوب لہٗ سے عوض کی خواہش رکھتا ہو تو ہبہ کے برابر عوض کا اس کو استحقاق ہے جیسے کوئی غریب کسی مالدار کو خادم مخدوم کو اور رعایا بادشاہ کو کوئی چیز ہدیہ میں دے۔ شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر واہب نے دیتے وقت عوض کی شرط نہ کی ہو تو عوض کا اس کو استحقاق نہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول منقول ہے کہ ہبہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ ہبہ جو لوجہ اللہ ہو۔ دوسرا وہ ہبہ جس سے مقصود اپنی تعریف ہو۔ تیسرا وہ ہبہ جس سے مقصود عوض ہو۔ اس تیسری صورت میں اگر عوض نہ ملا تو ہبہ سے رجوع کر لینے کا اختیار ہے لیکن مقدم الذکر دونوں صورتوں میں رجوع کرنے کا اختیار نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ربوا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قسم حرام ہے یعنی بیع میں ربوا۔ دوسری قسم جائز ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کسی نے حصولِ عوض کی نیت سے کسی کو کوئی چیز ہدیہ میں دی۔ اس کے بعد ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ پڑھی اور فرمایا خدا کے نزدیک ثواب ایسے عطیہ کا ہے جو لوجہ اللہ ہو۔

بہر حال ان ائمہ کے اقوال سے اتنا معلوم ہوا کہ ہبہ بہ نیت عوض جائز ہے مگر اس کا ثواب خدا کے ہاں نہ ملے گا۔ آیت کا بھی یہی مطلب ہے۔ لیکن اگر ربوا سے سود مراد لیا جائے تو ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی مکمل تشریح ہم تفسیری مقالہ میں کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک ربوا سے سود مراد لینا اولیٰ ہے۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ الخ۔ یعنی جو چیز تم از قسم زکوٰۃ لوجہ اللہ دو گے اس کا ثواب تم کو کئی گنا ملے گا۔ مشہور تفسیر کے موافق زکوٰۃ سے پاک عطیہ اور بغیر نیت عوض کے ہدیہ مراد ہوگا۔ اور ہم نے جو تفسیری مقالہ میں تفصیل کی ہے اس کے مطابق زکوٰۃ سے خیرات و صدقات مراد ہوں گے۔ حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ جب کوئی بندہ ایک چھوارہ کے برابر اپنی حلال کمائی میں سے صدقہ دیتا ہے تو ارحم الراحمین اس کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر صدقہ دینے والے کے لئے بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ چھوارہ اس کوہِ احد سے بڑا ہو جاتا ہے جس طرح تم میں سے بعض اپنے گھوڑے یا اونٹ کے بچہ کو پرورش کرتے ہیں (اسی طرح خدا تعالیٰ اس کے صدقہ کو پرورش کرتا اور بڑھاتا ہے) رواہ البخاری۔

اب قابلِ سوال یہ امر ہے کہ یہ سورت تو مکی ہے اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں پہنچ کر ۲ھ میں ہوئی پھر زکوٰۃ سے فرضی زکوٰۃ مراد لینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب ہماری تفصیل سے ظاہر ہے۔ بات یہ ہے کہ زکوٰۃ سے وہ زکوٰۃ مراد نہیں ہے جو مدینہ میں پہنچ کر فرض ہوئی یعنی مال کا چالیسواں حصہ ادا کرنا بلکہ عام خیرات اور صدقات مراد ہیں لیکن مکہ میں چونکہ مسلمانوں کو آپس کی تنظیم اور اسلام کی تبلیغ کے لئے روپے کی زیادہ ضرورت تھی اور روپیہ کا حصول ناممکن تھا اس لئے سوائے ضروری حوائج میں صرف کرنے کے باقی کل مال بوقتِ ضرورت مسلمانوں کے کام میں لانا واجب تھا نفل نہ تھا۔ مدینہ میں پہنچ کر ۲ھ میں اس کی مقدار مقرر کر دی گئی۔ یہی زکوٰۃ کا مصرف کیا تھا۔

اس کی کسی قدر تفصیل ان آیات مقدسہ کے آغاز میں کی گئی ہے اور اقارب مساکین اور مسافروں کو دینا لازم قرار دیا گیا ہے اب بھی اگرچہ لازم ہے لیکن اس قسم کا لزوم نہیں جیسا کہ مکہ میں تھا کیونکہ اب مقدار زکوٰۃ کی تعیین ہو چکی ہے اب زکوٰۃ مقررہ کے علاوہ ہر قسم کی خیرات (بعض خاص ضروری ترین صورتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) نفل ہے فرض نہیں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ الخ لوجہ اللہ بغیر لالچ کے کسی کو کچھ دینا بہت مشکل کام ہے۔ بہت آدمی ہیں جن کی سخاوت اور جود لوجہ اللہ معلوم ہوتی ہے مگر واقع میں وہ لوجہ اللہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے مقصود عزت شہرت اور ناموری کا حصول ہوتا ہے۔ بہت آدمی ہیں جو اپنے بھائی بہن ماں باپ اور دوسرے اقرباء کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی نیت خالص معلوم ہوتی ہے مگر واقع میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی پرورش کر رہے ہیں ان پر اثر قائم رہے اور وہ کبھی سرتابی نہ کریں اور کسی کام میں مخالفت نہ کرسکیں۔ گویا تسلط قائم رکھنے کے لئے ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ بہت امیر اور بادشاہ رعایا کو قابلِ رحم اور مستحقِ امداد سمجھ کر نہیں دیتے بلکہ اس لئے دیتے ہیں کہ ان کی عزت رعایا کے دل میں بڑھ جائے۔ کوئی ان کی حکومت کی مخالفت اور ہر جائز و ناجائز حرکت پر نکتہ چینی نہ کرسکے اور ان کا ہر فعل محاسبہ کے خطرے سے پاک ہو جائے۔ بہت لوگ ایسے ہیں جو اپنی برادری کی شادی یا غم میں بطور نیوتہ کچھ رقم دیتے ہیں اور یہ نیت رکھتے ہیں کہ کل کو ہمارے ہاں اگر کوئی خوشی یا غم کا واقعہ ہوا تو ہمارا یہ قرض واپس آجائے گا۔ غرض لوجہ اللہ دینا بہت ہی دشوار ہے۔ محض قوم کی تقویم اسلام کی حفاظت اور دوسری قوموں کی دست نگری سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے بغیر کسی ذاتی لالچ اور شخصی مفاد کو پیش رکھنے کے دینا اور مرضیِ مولا کا طلبگار رہنا لوجہ اللہ خیرات ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی نظروں میں محبوب بننے اور اپنی عزت کو قائم رکھنے کے خیال سے دینا بھی کوئی برا فعل نہیں مستحسن ہے گو لوجہ اللہ نہیں ہے۔ جائز مفاد کو حاصل کرنے کے لئے روپیہ صرف کرنا (جبکہ ناجائز طریقہ سے نہ ہو) ممنوع نہیں۔ مگر اسے ہر دنیوی مقصد سے بالاتر رہ کر دینا ہی راہِ مولا میں دینا کہا جاسکتا ہے اور یہ سخت دشوار ترین کام ہے۔ اپنا جمع شدہ روپیہ کسی کو مفت دے دینا کم ظرف کوتاہ نظر انسان کا کام نہیں۔ روپیہ دے دینے کے بعد مفلس بن جانے کا خطرہ ہر کم فہم آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ بے وقوف آدمی مختلف دنیوی مقاصد کو سرمایۂ حیات جانتا ہے خصوصاً روپے پر تو اس کو کامل بھروسہ اور پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اپنی دنیوی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ در در جبہ سائی کرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ نہ روپیہ بقائے زندگی کا اصلی سبب ہے نہ جابجا سجدہ ریزیاں کرنی اور ہزاروں معبودوں پر سر جھکانا مفید مقصد ہو سکتا ہے نہ کسی کے قبضہ میں کوئی چیز ہے۔

خدا کے متعلق اس بے اعتمادی اور بدگمانی کو دور کرنے اور فرضی معبودوں (روپیہ، حاکم، جسمانی طاقت، قدرت کے مختلف مظاہر، قبور انبیاء و اولیاء وغیرہ) پر اعتماد کرکے شرک آفرینی کرنے سے روکنے کے لئے مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ تمہارا خالق بھی خدا ہے رازق بھی خدا ہے موت بھیجنے والا بھی خدا ہے اور دوبارہ زندہ کرنے والا بھی خدا ہے۔ تخلیق، عطائے رزق، تقدیرِ موت اور احیائے ثانی میں کسی فرضی شریک اور موہومی دیوتا کو دخل نہیں۔ پس اللہ ہی کی ذات واجب الاعتماد ہے وہ ہر عیب سے بالا اور ہر نقصان سے پاک ہے۔

مقامِ غور ہے کہ ہر انسان ننگا بھوکا کمزور اور بے بس پیدا ہوتا ہے۔ اللہ اس بے کسی اور بے بسی میں اس کو رزق دیتا اور پرورش کرتا ہے قوت عطا فرماتا ہے اور اس کے اعضاء کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کوشش کرکے مال و متاع اور لباس و غذا حاصل کرے۔ یہی اس کے حواس اور جسمانی اعضاء کی عبودیت ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے اس کا مقدر رزق اس کو پہنچتا ہے پھر اجل مقررہ آجاتی ہے۔ پس کیا ایسے کارساز بے نیاز بے غرض پروردگار کو چھوڑ کر مال، قوت اور دنیا کی دوسری طاقتور چیزوں پر اعتماد کرنا اور انہی کو سرمایۂ حیات سمجھنا صحیح ہے۔ کیا کسی طاقت نے مال نے فرضی دیوتاؤں نے بے بسی اور بے شعوری کی حالت میں انسان کی پرورش کی تھی۔ کیا کسی میں یہ طاقت تھی کہ بچہ کو پیدا کرتا اس کو رزق دیتا اور اعضاء میں طاقت پیدا کرکے کمائی کے قابل بناتا۔

امام احمد کی روایت کردہ ایک حدیث ہے۔ خالد کے دونوں بیٹوں حبہ اور سواء کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت سرکار کسی کام کی درستی میں مشغول تھے۔ ہم نے بھی کچھ اعانت کی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا جب تک تمہارے سر حرکت کرتے ہوں (یعنی جب تک تم زندہ ہو) رزق سے مایوس نہ ہونا۔ کیونکہ انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو سرخ گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے جس پر چھلکا بھی نہیں ہوتی۔ پھر اللہ اس کو رزق پہنچاتا ہے۔

مقصود بیان اقرباء مساکین اور مسافروں کو دینے کا حکم لفظ حَقَّهٗ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ غریب قرابتداروں کا دولتمندوں پر ضروری حق ہے۔ کنبہ پروری، غریب نوازی اور امدادِ مسافر کی خوبی اور بھلائی خلوصِ نیت پر موقوف ہے بے غرض ہو کر محض لوجہ اللہ دینا

موجبِ ثواب ہے۔ پس عبرت حاصل کریں نام آوری اور شہرت کے طلبگار، عزت و جاہ کے شیدائی تسلط و سطوت کے خواستگار دینے کا احسان رکھنے والے اور لینے والوں سے مت کشی کی اُمیدیں قائم کرنے والے ان لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا دینا آخرت میں سود مند نہیں۔ اَلْمُفْلِحُوْنَ سے اگر کامل فلاح پانے والے مراد ہوں تو اختارۃً یہ بات مستفاد ہوگی کہ جائز دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے جائز طریقہ سے دینا بھی اگرچہ موجبِ فلاح ہے لیکن اس سے کامل فلاح یعنی ثوابِ آخرت حاصل نہیں ہوگا۔ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بہ نیتِ عوض دینے سے ثواب حاصل نہیں ہوتا اگرچہ ہبہ بقصدِ بدل کی ممانعت بھی نہیں ہے اور اگر ربوا سے سود مراد لیا جائے تو صراحت ہو جائے گی اس امر کی کہ سود سے جو کچھ اضافہ مال میں ہوتا ہے وہ خدا کے نزدیک ہیچ ہے۔ اللہ اُس کو مالی ترقی نہیں قرار دیتا یعنی واقع میں وہ بیشی نہیں ہوتی۔ ہاں زکوٰۃ ادا کرنی مال کو چند گنا کر دیتی ہے۔ دنیا میں بھی مال کے اندر برکت پیدا ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ثوابِ عظیم ملے گا۔ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ کے الفاظ تعلیم کر رہے ہیں کہ زکوٰۃ وصدقات اور خیرات دینے کی غرض محض مرضیٔ مولا کا حصول ہونا چاہیئے۔ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ذاتی مفاد وابستہ ہوگا تو پھر مال کو چند گنا بنا دینے کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ پس درسِ حکمت حاصل کرنا چاہیئے اُس کور دانش بے بصیرت سود خوار گروہ کو جو سود در سود سے حاصل کئے ہوئے روپے کو اضافۂ دولت کا موجب جانتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا کہ سودی روپے سے دنیا کی دولت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ کمی ہوتی ہے تمام دنیا سے سونے اور چاندی کو سمیٹ کر صندوقوں میں بھر لینے اور زمین میں دفن کر لینے سے بہت سے لوگ مالی لین دین اور تبادلۂ دولت سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ دنیا کے ہاتھوں میں دولت ہی کم ہو جاتی ہے۔ پھر لین دین کس چیز کا ہو سکتا ہے۔ ہاں مال دینے اور ضرورت مندوں کے صرف میں لانے سے دنیا کی دولت بڑھتی ہے۔ دنیا میں سونے چاندی کا لین دین ترقی پر ہوتا ہے اور اضافہ کے یہی معنی ہیں جس دولت سے کام حاصل نہ ہو وہ دولت نہیں پتھر ہے اور جس پتھر سے کام حاصل ہو وہ پتھر نہیں دولت ہے۔ پس اندوختہ کیا ہوا دولت نہیں اور زکوٰۃ میں نکالا ہوا روپیہ دولت ہے دولت کو تباہ کرنے والا نہیں۔

ذرا نظرِ غور سے دیکھنا چاہیئے اُن غیر مسلموں کو جو اسلام کے اقتصادی قانون کو تباہی انگیز اور فقر آفریں کہتے ہیں۔ کیا واقع میں سود کی ممانعت اور ادائے زکوٰۃ وخیرات کے حکم سے بہتر اور مفید تر کوئی دوسرا اقتصادی قانون ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے بے رحمی سنگدلی رنج دماغی اور عالم کی بربادی کا ازالہ نہیں ہوتا۔ کیا اسلام نے یہ دونوں قانون جاری کر کے تنظیم، مساوات، ہمدردی رحم اور امدادِ اہلِ ضرورت کی تعلیم کو انسانیت کے فرائضِ اولیں میں داخل نہیں کر دیا اور کیا سرمایہ دار طبقہ اور مزدوروں کی طبقاتی جنگ ختم کرنے کی اس سے اعلیٰ اور سہل ترین تدبیر کوئی اور ہو سکتی ہے۔ بندشِ سود اور ادائے زکوٰۃ کی تعلیم سے نہ سرمایہ دار تباہ ہوتا ہے نہ مزدور نانِ شبینہ کو محتاج رہتا ہے۔ نہ افلاس کے مہیب کالے بادل محنتی طبقہ کے سروں پر منڈلاتے ہیں، نہ مایا کا سانپ کسی کو ڈستا ہے۔ فتفکروا یا اولی الابصار و تدبروا یا اولی الالباب

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا

لوگوں کے کرتوت کی وجہ سے خشکی و تری میں فساد پھیل گیا ہے تاکہ اللہ اُن کے بعض اعمال کا ان کو مزہ چکھائے شاید یہ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن

باز آجائیں (اے محمد) کہہ دو کہ ملک میں چل پھر کر دیکھو کہ پہلے لوگوں کا انجام کیسا ہوا

قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ○ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ

اُن میں سے اکثر مشرک تھے تم اپنا رُخ دینِ راست کی طرف سیدھا رکھو اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے

لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ○ مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

وہ دن آموجود ہو جس کو ٹلنا نہیں ہے اُس روز لوگ جُدا جُدا ہو جائیں گے جو شخص کافر ہوا تو اُس پر اس کے کفر کا وبال ہوگا اور جنہوں نے نیک کام کیے وہ

فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اپنے ہی لئے آرام گاہ سدھارتے ہیں۔ تاکہ اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اپنے فضل سے ثواب عنایت کرے بلاشبہ وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا

تفسیر قدرت کو منظور ہے کہ یہ معمورۂ انسانی برباد نہ ہو۔ کھیتیاں سرسبز باغ شاداب پودے ہرے بھرے اور درخت بار آور رہیں۔ سبزہ لہلہاتا پھول کھلتے اور غنچے چٹکتے رہیں۔ ہستی کے گہوارہ میں ابو البشر کی معصوم اولاد کھیلتی جھولتی اور اُبھرتی رہے۔ پستانِ فطرت سے انسانی نونہال نمو اور فربہی کا دودھ پی کر خنچل دماغ خوش عیش قلب اور پرسکون رُوح کے حامل بن جائیں۔ امن اور عافیت کا دَور دورہ ہو ظلم و ستم مفقود اور حقوق باہمی کی لوٹ قطعاً معدوم ہو جائے۔ کوئی کسی کا معبود اور کوئی کسی کا مسجود نہ ہو۔ پرستشِ کائنات کا ہر جرثومہ اور ہر سوتا کٹ جائے اور سب مل کر ایک رب ایک خالق اور ایک معبود کی پرستش کریں۔

لیکن انسان کی شیطانی طبیعت کی چیرہ دستیاں طاغوتی دماغ کی سرتابیاں اور سرکش نفس کی دعوت آفرینیاں کب گوارا کرتی ہیں کہ زندگی کا چمنستان ہرا بھرا رہے شجرۂ عافیت پر نمو رہے۔ خوش عیش زندگانی کی کارفرمائیاں ظہور پذیر رہیں۔ حقوقِ انسانی کی فطری حد بندیاں قائم رہیں۔ روحوں میں اضطراب اور دلوں میں بے چینی نہ ہو۔ کوئی کسی کا خدا اور کوئی کسی کا بندہ نہ ہو۔ شیطان اپنی پرستش سے مایوس ہو جائے اور عالم میں صرف ایک خدا کی پوجا کی جائے۔

انسان کا نفس طاغوتی فطرت شکن اور عافیت کا برباد کرنے والا واقع ہوا ہے۔ اس کو کس طرح دنیا میں امن، آبادی، عمرانیت، سکون اور رُوح نواز آسائش دیکھنی گوارا ہو سکتی ہے۔ پس اُس نے اول کتابِ کائنات کی ورق گردانی خوب کی۔ ہر صفحہ کو اول سے آخر تک پڑھا۔ ہر سطر کا بغور مطالعہ کیا اور ہر لفظ کا مطلب اچھی طرح سمجھا اور سمجھے ہوئے مطلب کو اپنے آز آلود اور حریص اقتادِ ذہن کے خلاف پا کر ایک دم فطرت کے شیرازہ کو توڑ دیا۔ کتابِ کائنات کا ایک ایک ورق بکھیر دیا۔ ہر روشن سطر کو دماغی کثافتوں کے میل سے گندہ کر دیا۔ قدرت کے جلی اور اُبھرے ہوئے حروف کو اپنی تر دامنی کے پانی سے نمی دے کر مادی طاقتوں کے دستِ کثیف سے محو کر دیا اور ساری کتاب کو درہم برہم اور دریدہ بریدہ کر کے رکھ دیا۔ پس ہر شخص نے دوسرے شخص کے حقوق پر ڈاکہ مارا۔ ہر نفس نے کوشش کی کہ اپنے کو خدا اور دوسرے کو بندہ بنا لے۔ ہر کس و ناکس نے نفسانیت کی تیز چھری سے معصوم روحانیت کے نوخیز شباب کو ذبح کر دیا۔ ایک خدا کو چھوڑ کر لاکھوں خداؤں کی پرستش ہونے لگی۔ نفسِ مطمئنہ کا اطمینان جاتا رہا اور نفسِ امارہ کی کارفرمائی کا دور آ گیا۔ پتھر معبود، آگ مسجود، ستارے الٰہ اور اربابِ انواع خدا کے ہم پلہ بنا دیئے گئے۔ انسانیت کبریٰ کو تذلیل کے آخری نقطہ پر پہنچا دیا گیا۔ آزاد فطرتِ بشری کو ہمہ پرستی کی زنجیروں سے باندھ دیا گیا اور قدرت کا شیر خوار معصوم بچہ اس خبیث عفریت کے طاغوتی پنجہ میں پھنس کر تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگا۔ مگر اس سنگدل بے رحم کو رحم نہ آیا۔ الغرض دنیا میں شرک غارت گری جدال قتال فتنہ فساد اور باہمی حق تلفیوں کا عموم ہو گیا۔ اس عموم فساد اور شیوع کفر کی کیا صورت ہوئی اور کس طرح بے دینی اور ظلم کا رواج ہوا اس کی وضاحت مندرجہ ذیل سطور میں ہوتی ہے:-

جب اول ترین انسان کی ابتدائی نسل پیدا ہوئی تو اُس میں بعض آدمی خلقتاً کمزور تھے اور بیشتر اشخاص طاقتور تھے۔ جو لوگ طاقتور تھے وہ جانفشانی اور محنتِ شاقہ کر کے اپنی روزی خود پیدا کرتے اور سُکھ سے زندگی کے دن گزارتے تھے۔ اُن کی زندگی ایک نظم سے گزرتی تھی۔ کوئی کسی سے زیر اور کوئی کسی سے زبر نہ تھا۔ ہر شخص اپنے حق پر قانع تھا۔ دوسرے کا دستِ نگر نہ تھا۔ اس کی نظرِ حرص دوسرے کی کمائی کی طرف اُٹھتی تھی، نہ چوری کا خوف نہ چیرہ دستی کا اندیشہ، سب لوگ ایک خدا کے بندے ایک خالق کے پرستار اور ایک رازق کے عبادت گزار تھے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی چیز حائل نہ تھی۔ فرش کا عرش سے براہِ راست تعلق تھا۔ بندہ عابد تھا اور خدا معبود بندہ ساجد تھا اور خدا مسجود، خدائی بھی تھی اور خودی بھی لیکن خود پرستی اور خود غرضی نہ تھی۔ کوئی خدا فراموش نہ تھا، معصیت کوش بھی نہ تھا۔ انسانی آفرینش کی غرض سے ہر شخص واقف تھا۔ انسانیت کی عظمت کو ہر آدمی جانتا تھا۔ سب کی عقلیں سادہ اور دماغ معصوم تھے لیکن جو لوگ خلقی کمزور تھے اُن کی حالت طاقتور طبقہ سے جُدا تھی۔ جسمانی کمزوری پستی حوصلہ کی ماں ہے۔ ضعفِ بدن طبیعت کی سستی کا میدا ہے۔ اس لئے کمزور آدمی پست حوصلہ اور سست تھے اور تحصیلِ معاش بلندی حوصلہ محنت جانفشانی اور چستی کے خواستگار ہیں۔ اسی وجہ سے یہ گروہ تحصیلِ رزق سے قاصر تھا۔ اس کی زندگی غیر منتظم، گزر اوقات دشوار اور راحت و چین مفقود تھی۔ ہر شخص کی نظر میں ذلت دردر کی ٹھوکریں اور گھر گھر کی کاسہ لیسی اس کا وطیرہ تھا۔

قانونِ قدرت ظالم نہیں ہے، تقسیمِ فطرت غیر منصفانہ نہیں ہے، اللہ کی تمام نعمتیں کسی ایک ہی شخص کو نہیں دیدی گئی ہیں۔ نہ کسی ایک کو ہر طرح کی نعمت سے محروم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے پٹھے سخت عضلات مضبوط اور بدن طاقتور ہیں اُن میں کے بیشتر افراد دماغی جولانی طبیعت کی روانی اور ذہانت کی روشنی سے

محروم ہیں اور جن لوگوں کو تیز کی واقفی دماغی وسعت اور ذہنی سرعت عطا کی گئی ہے اُن میں سے اکثر اشخاص اعصابی اور عضلاتی طاقت سے خالی ہیں۔ اسی وجہ سے کمزور گروہ کے بعض افراد اگرچہ سادہ لوح اور بھولے بھالے تھے لیکن زیادہ تعداد چالاک ہوشیار وسیع الفہم سریع الذہن اور تیکھی طبیعت کے آدمیوں کی تھی۔ اُن کے دماغوں میں وہ روشنی اور جولانی تھی جس سے اکثر اہل قوت محروم تھے۔ اُن کو چالاکی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے وہ حصّہ وافر ملا تھا جو پیل تن کو شکن عضلات رکھنے والوں کے نصیب میں نہ آیا تھا۔ پس اس گروہ میں سے جو قلیل افراد باوجود جسمانی کمزوری کے سادہ لوح بھی تھے اُن کی بقائے زندگی کا تو سوائے بھیک کے ٹکڑے کھانے اور ٹھوکریں مارتے پھرنے کے اور کوئی ذریعہ ہی نہ تھا اور جو بیشتر اشخاص ہوشیار او رذکی تھے ان کو گداگری اور ذلت پسند نہ آئی۔ انھوں نے دماغ کی جولانی اور ذہن کی روانی سے کام لیا۔ ایسی ایسی تدبیریں سوچیں جس سے طاقتور گروہ پر غالب آجائیں۔ وہ اسکیمیں بنائیں اور منصوبے قائم کئے جن سے اُن کی زندگیاں بغیر محنت و جفاکشی کے آسائش سے گزر جائیں اور بغیر کمائی کے مفت کا مال ہاتھ آجائے۔ اس طبقہ کے تین حصّے ہو گئے، کیونکہ ذہانت اور ذکاوت کے تفاوت نے ان کو تین حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصہ جو زیادہ چالاک تھا اُس نے ابتدا میں بھیک یا چوری یا کسی اور وجہ سے کچھ مال حاصل کر لیا اور خود تکلیف اُٹھا کر اس کو خرچ ہونے سے بچائے رکھا پھر سادہ لوح غریب طبقہ کو اعانت و امداد کے بہانہ سے قرض دے دیا لیکن واپسی کے وقت کسی قدر بیشی کی شرط کر دی اور اس طرح سود در سود کے جال میں نادار مفلسوں کی گردنوں کو پھنسا لیا۔ ان سے زیادہ عیار طائفہ نے یہ لائن بھی اختیار نہ کی کیونکہ اس راہ پر چلنے سے اگرچہ مالی منافع بے شمار بغیر کسی محنت کے حاصل ہوتے تھے لیکن فوقیت پسند طبائع کب اس درجہ پر قناعت کرنے والی تھیں۔ ان کو اپنی برتری دکھلانے اور لوگوں سے اپنی تعظیم کرانے کی بھی خواہش تھی اس لئے اس مکار فرقے نے زیادہ دقیق اور غیر محسوس جال بچھایا۔ اپنے تقدس اور صفائے نفس کا دعویٰ کیا۔ غیبی مخلوق سے اپنے تعلقات ہونے کا جھوٹا اظہار کیا شعبدہ بازی کہانت اور دوسرے طریقوں سے اپنی ذاتوں کو دوسرے انسانوں سے زیادہ غیبی روحانی طاقتوں کا مظہر قرار دیا۔ سیدھے سادے لوگ اُن کے جال میں پھنس گئے۔ بہتوں نے اُن کے تقدس کا اعتراف کر لیا، بکثرت اشخاص اُن کے غلام بن گئے۔ ایک بڑی تعداد نے انسانیت سے بالا انسان کا درجہ قائم کیا اور اس طرح انسان پرستی پھیلنی شروع ہو گئی اور چونکہ غیبی طاقتوں سے اپنے تعلقات استوار ہونے اور قریب ترین رشتہ داری ہونے کا اس گروہ کو دعویٰ تھا اور انھوں نے ارواح کائنات کا مظہر یا مظہر اپنے نفوس کو قرار دیا تھا اس لئے لازم تھا کہ جہاں سے ان کو براہ راست فیض ہو رہا تھا وہاں تک اپنے حلقہ بگوشوں کو بھی پہنچا دیتے تاکہ ان کو بھی وہ فرضی برکات اور موہومی فیوض حاصل ہو جاتے جو اس شیطانی گروہ کو حاصل ہو گئے تھے۔ اور مریدوں کو غیبی طاقتوں کی دنیا تک پہنچانے کا کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ ان طاقتوں کے دروازے پر سادہ لوح مریدوں کی گردنیں خم کرا دی جائیں اور ان کی پرستش کرائی جائے پس ایسا ہی کیا گیا۔ مظاہر پرستی کی تعلیم دی گئی۔ عناصر و کواکب اور ارواح غائبہ کی پرستش کو پھیلایا گیا۔ اس طرح ہزاروں معبود و مسجود ہو گئے۔ سورج، چاند، آگ، پانی، ہوا، مٹی اور دوسرے عناصر انواع کو الوہیت صغریٰ کا درجہ دیا گیا۔ انہی کے ناموں پر چڑھاوے چڑھوائے گئے، قربانیاں کرائی گئیں اور اس طرح بے وقوف مخلوق کو خوب لوٹا گیا۔ پھر جب یہ مکار آدمی مر گئے تو ان کے مریدوں نے اپنی انتہائی وابستگی کے سبب ان کی صورتیں اور مورتیں بنا کر گھروں میں اور عام رہگزاروں میں لگا دیں۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی پرستش کی جانے لگی اور اس طور پر اصنام پرستی کا رواج ہوا اور چونکہ ان مدعیانِ تقدس کی روحانی نظافت اور اخلاقی طہارت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی فعل کو لوگ شک کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور ہماری ساری زندگی نکتہ چینی اور خوردہ گیری کے اندیشے سے پاک ہو چکی ہے اس لئے انھوں نے تقدس اور طہارت کی آڑ میں ایسی ایسی حیا سوز عصمت شکن حرکتیں کیں جس کی وجہ سے انسانیت کبریٰ کی گردن شرم کے مارے ہمیشہ کے لئے خود اپنے سامنے بھی خم ہو گئی اور عرقِ انفعال کے پیہم قطرے معصوم بشریت کی پیشانی سے بہنے لگے۔ اول تو ان کی تمام عصمت سوزیاں اور عفت شکنیاں چھپی رہیں اور لوگوں کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے رہے لیکن اگر کبھی اتفاق سے کسی حرکتِ شنیعہ کا اظہار ہو بھی گیا تھا تو اس مکار طبقہ نے تلبیس تدلیس اور ملمع کاری سے کام لے کر وہ نظر فریب دلفریب رونق اس پر چڑھایا کہ کراہت منظر کی جگہ حسن باصرہ نواز دکھائی دینے لگا اور جو لوگ پہلے اس کو قبیح اور قابل نفرت سمجھتے تھے وہی آدمی ملمع کاری کے بعد اس کو مستحسن اور چہرۂ انسانیت کا غازہ سمجھنے لگے اور اس طرح زمائم الاگناہوں کی اشاعت ہو گئی۔

تیسرا گروہ اُن آدمیوں کا تھا جو کسی قدر کم عیار تھے مگر مکاری تھی ان میں ضرور۔ انھوں نے چوری، پرائے مال پر دراز دستی، خیانت، غبن اور غصب حقوق کا کھلا راستہ اختیار کیا کوئی پردہ اور چھپاؤ نہ رکھا۔ اس کی وجہ سے ساری سوسائٹی ان سے نفرت کرنے لگی۔ ہر ایک کی نظر میں وہ مکروہ و مطرود ہو گئے لیکن یہ طبقہ سادہ لوح نہ تھا ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا کہ اس ذلت و اہانت پر صبر کر کے بیٹھ رہتا اور سوسائٹی کی لعنت کا طوق اپنی گردن میں ڈالے رکھتا پس اس گروہ میں سے

جن لوگوں نے لوٹ کھسوٹ اور چوری سے حاصل شدہ مال کی زیادہ مقدار جمع کر لی تھی اور پرائے مال کو سمیٹ کر بہت زیادہ دولتمند ہو گئے تھے انھوں نے اپنے ہی گروہ کے بعض نادار آدمیوں کو نوکر رکھا ان کی تنخواہیں مقرر کیں اور سوائے اس کے کوئی خدمت اُن کے سپرد نہ کی کہ وہ اپنے آقاؤں کے ہمرکاب ہو کر چوری اور غارتگری کا بازار گرم کر دیں اور محنتی گروہ کے اس مال کو لوٹ لیں جو اُس نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا ہے۔ اس طرح چند دولتمند لیڈروں نے غارتگروں کی ایک فوج بنالی، لوٹ اور غنیمت کے مال میں سے اپنے نوکروں کا حصہ مقرر کیا اور منظم طور پر ڈاکہ زنی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ ان کا رعب اور سطوت لوگوں کے دلوں میں بڑھتا گیا اور ڈر کر بعض بستیوں نے اپنی جانوں اور مالوں کا اختیار دیدیا اس وقت غارتگری نے بادشاہت کا پُر فریب لباس پہن لیا۔ قوانین غارتگری کا نام بدل کر اصول حکمرانی رکھا گیا۔ ضوابط ظلم آئین جہانبانی قرار پائے اور ظلم نے قانونی نفاذ کی شکل اختیار کر لی۔ کھلی ہوئی ڈاکہ زنیاں وصولی محاصل و ٹیکس کی آڑ میں چھپ گئیں اور گرگ دہن آلودہ چرواہے بن گئے۔ رعایا کا کمایا ہوا مال ہی ان غارتگروں کے خزانے بھرنے کے کام نہ آیا بلکہ ان سیدھے سادے مزدوروں کی بیٹیاں اور بیبیاں بھی شاہی حرم سرا کی زینت بن گئیں فسق و فجور اور قانونی بدمعاشیوں کی ایسی کثرت ہوئی کہ کل روئے زمین کی ہوا ناپاک اور عفونت آلود ہو گئی۔ جبر و دست حکام یا مہذب لیڈروں کے مظالم سے معصوم انسانیت چیخ اُٹھی اور گناہوں کی کثرت نے اعلیٰ جوہر کی مخلوق کو پست ترین تاریک غار کی انتہائی تہہ میں دھکیل دیا۔ لیکن ابھی اس حکمران طبقہ کو ایک اندیشہ لگا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک خلش باقی تھی اور ایک کانٹا کھٹک رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ رعایا کے دلوں میں ابھی تک انفرادی شکوہ موجود تھا۔ روحانی طمانیت ان کو حاصل تھی۔ ہاتھ پاؤں ان کے بستہ ہو چکے تھے روحیں اور دل آزاد تھے اور روحوں کی آزادی ظالم حکمرانوں کو اپنے ہمہ گیر تسلط کی راہ میں روڑا نظر آتی تھی اس لئے ابلیس کے پیرو بھی انھوں نے ٹھاٹھ مارا۔ شاہی سے الوہیت کے زینہ پر قدم رکھا اور رعایا کو مجبور کیا کہ ان کی الوہیت کا عملی اقرار کریں اور خدائے برتر کو چھوڑ کر ان کو اپنا رازق سمجھیں، اُن کی بارگاہ خسروانی پر جبہ سائی کریں اور سجدہ ریز ہوں اور ان کو غریب پرور اور ان داتا کہہ کر پکاریں۔ یہ انسان کی انتہائی رعونت اور سرکشی تھی اور یہی وہ آخری درجہ تھا جہاں تک انسانی تخیل کی رسائی ہو سکتی تھی۔ پس اس طرح دنیا میں شیطان کی پرستش ہونے لگی، کفر و الحاد پھیل گیا، فسق و فجور اور ظلم و ستم کی اشاعت ہو گئی۔ قتل، غارتگری اور خیانت و بدکاری کا عموم ہو گیا اور سارا بر و بحر فتنہ و فساد سے بھر گیا۔

بیان مذکور سے دنیا میں پھیلے ہوئے فساد کا ایک دھندلا سا خاکہ نگاہ کے سامنے آجاتا ہے جس سے اصل حقیقت کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور چل جاتا ہے لیکن قابل حل یہ بات رہ جاتی ہے کہ اگر قصور تھا تو چالاک اور عیار طبقہ کا۔ اگر فطری حد بندیوں کو توڑا تھا تو مکار گروہ نے، اگر قانون عادل کی خلاف ورزی کی تھی تو غارتگروں اور لیڈروں نے پس تباہ ہونا چاہیئے تھا تو اسی گروہ کو اور خسران مالی نصیب ہونی چاہیئے تھی تو اسی بدکار فرقہ کو۔ جفاکش مزدوروں محنت شعار صناعوں صداقت پسند سوداگروں اور بے قصور غریبوں کی کیا خطا تھی کیوں تو ان کو زمانہ عضا پر گر آیا اور کیوں ان کے شکم کو دکھ سے، عافیت کو بے چینی سے اور راحت کو رنج سے بدلا گیا۔ آخر ان کی وہ کونسی غلطی تھی جس کا خمیازہ ان کو اس صبر شکن مصیبت میں پھنس کر بھگتنا پڑا؟ اس کا جواب تقریر مذکور سے ظاہر ہے۔ مزدوروں کے طبقہ نے ہی ظالموں کی مدد کی ستمرانوں کی ہاں میں ہاں ملائی اور اطاعت کی ساحروں کاہنوں اور شعبدہ بازوں سے عقیدت اور ارادت انھوں نے ہی رکھی۔ ظلم کے ہاتھوں کو انھوں نے ہی مضبوط کیا۔ شرک و کفر سے انھوں نے اپنے دلوں اور روحوں کو آلودہ کیا۔ چند سکوں کے لالچ یا گرفت کے خوف سے بادشاہوں اور حکمرانوں کو انھوں نے ہی معبود و مسجود سمجھا۔ دنیا میں ان کی کثرت تھی ان کے اندر طاقت بھی تھی۔ اُن کے اعضاء میں محنت کو برداشت کرنے کی قوت بھی تھی پس کیوں یہ عیاروں کے پھندے میں پھنس گئے، کیوں ان کا شکار بن گئے اور کس نے انھوں نے ایک خدا کی جگہ ہزاروں خدا بنا لئے، کیا سبب تھا کہ انھوں نے معبود برحق سے رشتہ توڑ لیا اور کیا فائدہ دیکھا کہ غیروں سے تعلق جوڑ لیا۔ فرش و عرش اور عبد و معبود کے درمیان کیوں انھوں نے بے پایاں فرضی وسائل کی حکمرانی تسلیم کر لی اور کس وجہ سے حقیقت کو نگاہ سے اوجھل کر دیا۔ کمزور مجبور ہو سکتا ہے لیکن طاقتور تو معذور نہیں پس کس بنا پر انھوں نے وہ فعل اختیار کیا جس کی بنا کمزور طبقہ نے ڈالی تھی اور کیوں نتیجہ کی اچھائی برائی نہ سوچی۔ پس اس قصور نے اُن کو پاداش کا مستحق بنایا اور دنیا فتنہ و فساد کی تاریکیوں سے بھر گئی۔ فطرت کی طرف سے نوبہ نو سزائیں ظاہر ہونے لگیں۔ قحط، زلزلہ، وبا، عمومی قتال، اجبر کا تسلط، ظلم، جبر و دستی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام سزائیں قدرتی طور پر ان کو ملنے لگیں۔ ان کو اب بھی قدرت نے موقع دیا ہے کہ ظالم اور مکار طبقہ کے پنجہ سے اپنی گردنوں کو آزاد کرالیں۔ ماسوا سے رشتہ توڑ کر خدا سے جوڑ لیں اور توبہ کر لیں کہ آئندہ کبھی قوانین فطرت سے سرتابی نہ کریں گے اور عہد کر لیں کہ بے دینوں اور ظالموں کی حمایت کبھی عملی اور زبانی اور قلبی ہم سے نہ ہوگی۔ اب بھی وقت ہے کہ دین قیم کی طرف رُخ کر لیں اور باطل پرستی کی طرف سے پشت پھیر لیں کیونکہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے کہ جھوٹے آقاؤں اور گمراہ کن رہبروں کی جماعت ان سے بچھڑ جائے گی اور تباہی کی آگ سے جلتا ہوا ان کو چھوڑ جائے گی۔ اس وقت کوئی ندامت سود مند نہ ہوگی۔

تحلیل اجزاء: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ الخ ابن عباس، عکرمہ، ضحاک اور سدی وغیرہم کے اقوال کے مطابق

بر سے جنگل اور میدان مراد ہیں اور بحر سے شہر اور دیہات۔ ابن عباس اور عکرمہ کا قول دوسری روایت کے بموجب یہ ہے کہ بحر سے ساحلی بستیاں مراد ہیں۔ عطا خراسانی کا قول ہے کہ بر سے شہر و دیہات مراد ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بر سے یہی خشکی اور بحر سے سمندر اور دریا مراد ہیں۔ ابن کثیر نے ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ اہل عرب ساحلی بستیوں کو بحر کہہ لیتے ہیں۔ زید بن رفیع نے آخری قول کو پسند کیا ہے۔ بہر حال بر و بحر سے کچھ بھی مراد ہو تمام عالم میں فساد کی اشاعت کا بیان مطلوب ہے۔ مجاہد نے فسادِ عالم کی چند صورتیں بطور تمثیل بیان کی ہیں جس کو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ لیکن چونکہ ہر زمانے میں فساد کی ایک نوعیت نہیں نہ ایک صورت میں حصر ہے اس لئے اس کے متعلق سلف کے اقوال نقل کرنے بیکار ہیں۔ بیماریوں کی کثرت، قحط کی ہمہ گیری، اشیاء کی گرانی، جنگ و جدال کی ہیبت، موت کا عموم، حکومت کا جبر، ظالموں کا ظلم، عصمت دری اور آبرو ریزی کی فراوانی، بےحیائی کا شیوع، لہو و لعب کی افزونی، اہلِ عالم کے لئے یہ سب ہی آفات ہیں۔ فتنہ و فساد کی گوناگوں صورتیں ہیں۔ ظالم حکومت بداعمال رعیت پر مسلط ہوتی ہے۔ جبر و استبداد کے دیوتا پراگندہ اقوام پر غالب آتے اور اپنا تسلط جما لیتے ہیں۔ زنا کی کثرت سے آتشیں امراض پیدا ہوتے اور لوگوں کو اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔ غرض ہزاروں آبادیاں برباد ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئے طریقہ سے چمن بندیاں کی جاتی ہیں۔ ہزاروں ثمر ور سایہ دار درخت کاٹ دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ جدید پودے نصب کئے جاتے ہیں۔ لاکھوں دلفریب صورتیں خاک میں روپوش ہو جاتی ہیں اور ان کے مکانوں میں گریہ منظر عفریت قیام پذیر ہوتے ہیں۔ ان گنت لاشیں میدانِ کارزار میں تڑپتی ہیں اور ان کو خونخوار شیاطین روندتے چلے جاتے ہیں۔ لاتعداد انسان اور حیوان زمین کے ایک مضطربانہ زلزلے سے تہ خاک پہنچ جاتے ہیں اور دوبارہ اُن کے سروں پر شاندار محل تعمیر ہوتے اور دوسرے انسانوں سے آباد ہوتے ہیں۔ ناقابلِ شمار توپیں ہیں جو پرورش کرکے بہت جماعتوں کو فنا کے گھاٹ اتارتی چلی جاتی ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟ انسان کی بداعمالی کی وجہ سے ساری بربادیاں تمام تباہیاں اور کل ہلاکت آفرینیاں انسانی بدکرداری کے نتائج مذمومہ ہیں۔ خالق اور مظہر سب کا خدا ہے مگر فطرتِ الٰہیہ سے سرتابیاں اُن کی موجب ہیں۔ انسان کی گناہگاریاں قحط اور وبا کو لاتی ہیں۔ معصیت کوشیاں آتشک اور امراضِ خبیثہ پیدا کرتی ہیں۔ ستم رانیاں اور بےایمانیاں جابر حاکموں کے تسلط کو ہمہ گیر کرتی ہیں۔ آپس کی برائیاں اور جعل خوریاں بربادی کو دعوت دیتی ہیں۔ نفاق انگیزیاں اور شقاق ریزیاں غیر قوموں کے آہنی زنجیروں میں ملک کی گردنوں کو مضبوطی کے ساتھ جکڑ دیتی ہیں۔ آپس کی بداعتمادی اور بدگمانی کمزوری اور اضمحلال کو بناتی ہے۔ شراب خواری کی کثرت صحت کو برباد کر دیتی ہے۔ فسق آفرینیاں مجور آگینیاں اور بدمعاشیاں نسلوں کو تباہ، اخلاق کو برباد اور دستورِ معاشرت کو گندہ کر دیتی ہیں۔ غرض اس معمورۂ انسانی میں بھی انسان کا کوئی قول بےنتیجہ کوئی عمل بےثمر اور کوئی حرکت و سکون بےحاصل نہیں ہوتا۔ پس انسان ہی کے ہاتھوں سے خشک و تر کی بربادی ہو رہی ہے۔ سرسبز لہلہاتی کھیتیاں مرجھا رہی ہیں۔ شاداب اور تر و تازہ باغ اُجاڑ ہو رہے ہیں۔ آباد اور پُر رونق بازار برباد اور بےرونق ہو رہے ہیں۔ چنگیز اور ہلاکو سے کون واقف نہیں اور ان کے کردار سے کون غافل ہے۔ روس کی ستمگاریاں، برطانیہ کی ظلم کوشیاں اور فرانس کی معدلت سوزیاں کس سے چھپی ہوئی ہیں۔ اس دور میں ہٹلر کی بمباریاں اور موسولینی کی آتش ریزیاں کس سے پردہ میں ہیں۔ سرمایہ داروں کی خونخواریاں اور بےحیائیاں کب کسی سے مخفی ہیں۔ مزدور طبقہ کی بیباکیاں کون نہیں جانتا۔ مہذب کلب کیا ہیں۔ قماربازی اور شراب خواری کے اڈے آباد ہوٹل کیا ہیں معصوم عزتوں کو لوٹنے کے مرکز۔ پُر رونق شہروں کے رہنے والوں کا کیا مشغلہ ہوتا ہے۔ ہر سانس گناہ میں آلودہ ہو کر نکلتا اور ہر تنفس فطرت دری کا زہریلا اثر لے کر سینہ میں جاتا ہے۔ غرض ایک عالم کے سروں پر گناہوں اور خطاؤں کے کالے بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں۔ سارے انسانوں کی آبادیوں پر معاصی کی گھٹا ٹوپ اندھیری چھا رہی ہیں۔ کل جہان میں تاریکی کا دَور دَورہ ہے اور زمانہ کا ہر نور کثافت اور میل کچیل کی عفونت انگیز آغوش میں دبا ہوا ہے اور بر و بحر فتنہ و فساد کی آگ سے جلا جا رہا ہے۔

یہ ہے مغزِ آیت مذکورہ کا اور مقصود عبارتِ مقدسہ کا۔ تفصیل کے لئے دفاتر اور مجلدات کی ضرورت ہے۔ بقول ابو العالیہ خلاصہ سب کا یہ نکلا کہ شرک اور معصیت آسمان و زمین کی صلاح کو برباد کرنے والی اور فساد کو پھیلانے والی چیز ہے۔

لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ لوگوں کے شرک و معاصی سے قدرتی تباہیاں اس لئے آتی ہیں کہ بداعمالیوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی اُن کو مل جائے اور اس نتیجۂ بد سے متاثر ہو کر وہ نافرمانیوں سے توبہ کر لیں۔ یعنی شرک، بدکرداری اور ظلم و ستم کی پوری سزا تو آخرت میں ملے گی لیکن دنیا میں بھی کچھ نتیجہ اٹھانا پڑتا ہے۔ طرح طرح کی وباؤں سے جانیں تلف ہوتی ہیں۔ قتال و جدال کی کثرت سے بہت آدمی مرتے ہیں۔ خشک سالی اور قحط سے کھیتی اور پھلوں کی برکت جاتی

رہتی ہے اور ان سارے نقصانات کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح شرک اور معاصی سے توبہ کرلیں۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمیوں پر دونوں حالتوں کا توارد ہوتا رہتا ہے۔ آسودگی، فراخدلی، خوشحالی اور دولت ملتی ہے۔ سر سے پاؤں تک ایک انسان مال میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مٹی اٹھاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ ایمان شکر عدل اور نیک اعمال کی جگہ دینِ الٰہی کا مضحکہ اڑانے لگتا ہے اور ظلم و بدکرداری پر کمر باندھ لیتا ہے تو پھر آخر میں مختلف بلائیں وبائیں اور مصیبتیں اس پر مسلط کردی جاتی ہیں تاکہ تکلیف پاکر شرک آفرینیوں اور بدکرداریوں سے رجوع کرے اور بارگاہِ الٰہی کی طرف دوڑے۔ بہرحال دونوں طریقوں سے امتحان ہوتا رہتا ہے۔ سکھ سے بھی دکھ سے بھی عیش و راحت عطا کرکے بھی اور خستہ حال کنگال بناکے بھی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ دونوں طریقوں سے امتحان کا یہ سلسلہ امتِ اسلامیہ کے لئے قیامت تک جاری رہے گا کیونکہ یہ امت عذاب استیصال سے محفوظ ہے۔ ارحم الراحمین نے اپنی رحمت سے قیامت تک اس کو باقی رکھنے کا وعدہ فرمالیا ہے اس لئے اس کی بیخ کنی مکمل بربادی اور کلی طور پر تباہی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اقوامِ سابقہ کے متعلق اللہ کا قانون جاری تھا کہ جب دونوں طریقوں سے ان کی آزمائش کرلی جاتی تھی اور وہ کسی طرح راہِ راست پر نہ آتے تھے تو پھر مال و منال کی کثرت عیش و راحت کی افزونی، عیال و اطفال کی فراوانی اور صحت و قوت کی بہتات ان کو عنایت کی جاتی تھی کہ دن دونی اور رات چوگنی ان کی ترقی ہوتی تھی۔ جب وہ خوب جی بھر کر سرکشیاں کرتے اور گناہوں میں غرق ہو جاتے تو پھر یکدم عذابِ الٰہی آتا اور سب کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتا تھا۔

میرے نزدیک علماء کی یہ تشریح کچھ زیادہ با وقعت اور صحیح نہیں ہے کیونکہ عذاب استیصال کے اگر یہ معنی ہیں کہ پوری قوم کا صفحۂ ہستی سے نام مٹا دیا اور اس کی نسل بالکل منقطع کردی جائے تو اقوامِ سابقہ کے متعلق عموم استیصال کا قول غلط ہے اور کلیہ قابلِ تسلیم نہیں۔ ثمود جدیس عاد ثمود قوم لوط اور قوم ابراہیم علیہم اگرچہ اب باقی نہیں ہیں اور ان کے احوال بھی صفحاتِ تاریخ سے مٹ چکے ہیں لیکن ہندو بدھ مجوس یہودی اور عیسائی بکثرت موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی استیصال نہیں ہوا۔ کیا انھوں نے پیغمبروں کی نافرمانیاں کچھ کم کی تھیں۔ کیا ان کی شرک انگیزیاں اور بدکرداریاں اس قابل نہ تھیں کہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا اور اگر استیصال کے یہ معنی ہیں کہ بدکردار شرک آفریں طبقہ کو فنا کردیا جاتا ہے اور جب ساری قوم میں بدکرداری کی کثرت ہو جاتی ہے۔ قومی نکبت پستی اور ذلت کا دور آجاتا ہے تو ایسے استیصال سے مسلمان بھی محفوظ نہیں ہیں بلکہ دوسری قوموں سے زیادہ نکبت و ذلت میں مبتلا ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ امتِ اسلامیہ اور دوسری ملتوں میں فرق قائم کیا جائے۔ ہاں بعض احادیث میں عذاب استیصال (مسخ وغیرہ) سے ملتِ اسلامیہ کا استثناء وارد ہوا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ دوسری تمام قوموں پر ایسا عذاب ضروری نازل ہوچکا ہے اور امتِ اسلامیہ پر نہ ہوگا بلکہ مراد یہ ہے کہ پہلے بعض سرکش قومیں پیغمبروں کی مخالفت کا نتیجہ ظاہر طور پر محسوس کرلیتی تھیں اور ان کی بدکرداریوں کا ثمرہ فوراً ان کے سامنے مرئی شکل میں آجاتا تھا (اگرچہ ایسا کلیہ نہ تھا) اور امتِ اسلامیہ کو اللہ نے ایسے عذاب سے من حیث القوم محفوظ رکھا ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ۔ ان آیات میں بعض گزشتہ اقوام کے نتائجِ بد اور خبیث اعمال کے نتائج بد اور آثار مشہودہ کو مشاہدہ کرنے کا حکم دیا ہے اور صراحت فرمائی ہے کہ اقوام ہالکہ میں سے اکثر مشرک تھے۔

یہاں دو امر قابلِ تنقیح ہیں (۱) ملک میں چل پھر کے دیکھنے کا حکم (۲) اکثر کا مشرک ہونا۔ اول کے متعلق یہ بات جاننے کے قابل ہے کہ کسی ایک بستی میں تو تمام تباہ کاریاں جمع نہیں کی جاسکتیں۔ کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے تمام عالم کی بدکاریاں کر نہیں سکتے اور دوسری بستیوں کی بداعمالی پر گرفت کرنی قانونِ عدل کے خلاف ہے لہٰذا چل پھر کر دوسرے شہروں اور بستیوں کے آثارِ فانیہ کو دیکھنا ضروری ہے اور اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس بستی اور اس قوم کی بربادی کی کیا وجہ ہوئی؟ بربادی اور موت تو ہر ایک کی آتی ہے۔ نیک بھی مرتے ہیں اور بد بھی، مومن بھی کافر بھی لیکن مرنے کی نوعیت جدا جدا ہوتی ہے اور اسبابِ ہلاکت مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کی موت پھانسی کے تختہ پر آتی ہے اور کوئی تیمارداروں کی گود میں مرتا ہے، کوئی طوفانِ باد و باراں اور غیبی زلزلوں سے تباہ ہوتا ہے اور کوئی معمولی موت کے پنجہ کا شکار بنتا ہے۔ عبرت آفریں موت کس کو ہوتی ہے؟ پھانسی کے تختہ پر لٹکنے والے کی اور غیبی آفاتِ ارضیہ و سماویہ سے ہلاک ہونے والوں کی یا سکون و چین سے معمول کے مطابق مرنے والوں کی۔ ظاہر ہے کہ قانونِ موت کی ہمہ گیری سے کوئی بھی خارج نہیں۔ پس موت اگر کوئی قابلِ عبرت چیز ہے تو انہی لوگوں کی جو غیبی انقلاب کے شکار ہوئے ہوں اور غیر معمولی اسباب سے عبرت آفریں طور پر ان کی ہلاکت ہوئی ہو۔ عبرت آفریں طور پر کونسی اقوام یا کونسے اشخاص مرے اور ہلاک ہوئے۔ پس یہی لوگ جن کا بیشتر حصہ مشرک تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیبی اسبابِ ہلاکت کو کھینچ کر لانے والا اور مہلک آفاتِ ارضیہ و سماویہ کو دعوت دینے والا شرک ہی ہے

اگر مومن اقوام یا اشخاص غیر معمولی اسبابِ موت سے مرتے اور مشرکوں کی تعداد غیر معمولی مرنے والوں میں کم ہوتی تو اُس وقت ایمان کو یقینی اسبابِ ہلاکت کا حامی سمجھا جاتا۔ لیکن واقعہ تو اس کے برعکس ہے۔ پس شرک کو بھی موجبِ بربادی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ کوئی وجہ فرق نہیں (۲) اکثر کے مشرک ہونے کے دو تفسیری معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ آفاتِ ارضیہ و سماویہ سے غیر معمولی طور پر ہلاک ہونے والی قومیں اکثر مشرک تھیں، ہو سکتا ہے کہ تلاش کرنے اور صفحاتِ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے کوئی مومن قوم بھی ہالکین میں سے نکل آئے (مثلاً کوئٹہ کے مسلمان) لیکن بیشتر اقوام ہالکہ مشرک ہی تھیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو قوم ہلاک ہوئی اس کے بیشتر افراد مشرک تھے۔ اگرچہ ہلاک ہونے والی بستی میں کوئی مسلمان بھی تھا لیکن بہت زیادہ آبادی اہل شرک ہی کی تھی۔ جب مشرکوں کو برباد کیا گیا تو چند اہلِ اسلام بھی اسبابِ ہلاکت کی نذر ہو گئے یا ان کو بچا لیا گیا۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ الخ۔ شرک کے عبرت آفریں نتیجۂ بد کو مشاہدہ کرنے کا حکم دینے کے بعد اس آیت میں خالص توحید کا حکم دیا۔ دینِ قیم کی طرف رخ کرنے کے معنی ہیں خالص توحید پر جم جانا۔ شرک اور آمیزشِ شرک سے بیزار ہو جانا اور ہر اس مذہب کو ترک کر دینا جس کی تعلیم میں شرک کی بو بھی ہو۔

ہم ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ آئے ہیں کہ شرک فی الذات کا تو کوئی مذہب قائل نہیں۔ البتہ صفاتی شرک اسلام کے علاوہ تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ قَیِّم کے معنی ہیں سیدھا اور مستقیم۔ پس اسلام کے علاوہ کوئی ایسا مذہب نہیں جس کا رخ براہِ راست توحید کی طرف ہو اور اس کا بتایا ہوا راستہ توحید تک پہنچانے کے لئے سب سے چھوٹا راستہ ہو۔ مظاہر پرستی عناصر پرستی مورت پرستی صورت پرستی شخصیت پرستی غرض ہزاروں اقسام پرستش کے بعد توحید کے مرکزی نقطہ پر پہنچنا بہت ہی ٹیڑھا راستہ ہے۔ صفات میں شرکت کا عقیدہ رکھنے کے بعد ذات کی وحدت کو ڈھونڈنا بہت ہی دشوار ہے۔ ہزاروں پیچ در پیچ کوچوں میں گھوم پھر کر منزل پر پہنچنا بہت ہی حوصلہ فرسا ہے۔ جب قریب ترین سیدھی شاہراہ موجود ہے اور سامنے منزلِ مقصود دکھائی دے رہی ہے تو پھر کج مج گلیوں اور کھیت در کھیت پگڈنڈیوں میں سرگرداں پریشان پھرنا حماقت ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ رفتار کی طاقت اور فرصت بھی کم ہو اور راستہ کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں بھی ہوں جن کے اندر قسم قسم کے درندے چھپے بیٹھے ہوں اور حملہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیٹرے اور راہزن بھی موجود ہوں جو لوٹنے کے درپے ہوں راستہ میں گہرے غار اور خس پوش خندق بھی ہوں جن میں گرنے کا قدم قدم پر اندیشہ ہو۔ ہر راہ جا بجا نوکیلے پتھر بھی ہوں جو پیروں کو زخمی کر رہے ہوں۔ ایسے راستوں کی بجائے اگر سیدھا سہل راہی اور محفوظ راستہ موجود ہو تو اس پر نہ چلنا اور داخل الذکر پگڈنڈیوں پر قدم فرسائی کرنا انتہائی غلطی ہے۔ پس اگر منزلِ توحید پر پہنچنا ہے تو اس کا مستقیم ترین راستہ اسلام ہی ہے دوسرے تمام مذاہب کج مج راستوں پر چلنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اسلام نہ صفاتی شرکت کا عقیدہ رکھنے کی اجازت دیتا ہے نہ ذاتی شرکت کو جائز بتاتا ہے۔ اس میں نہ مظہر پرستی ہے نہ صنم پرستی نہ شخصیت پرستی۔ پس یہی دینِ قیم ہے۔ اسی کی طرف اپنے نفس اور نفس کی تمام قوتوں کی توجہ لازم ہے۔ مرکزِ توجہ اسی کو بنانا ضروری ہے۔

قیم کے معنی مقوّم بھی ہو سکتے ہیں یعنی مصلح۔ حالات کو درست کرنے والا سرپرست اور تمام ضروریات کا ذمہ دار۔ قَیِّمُ الدَّار عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو سارے گھر کا ذمہ دار منتظم مصلح اور سرپرست ہو۔ اسلام بھی دینِ قیم ہے تمام ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہے۔ معاشی اور معادی ساری اصلاحیں اس میں موجود ہیں ہر مسلمان کے حالات درست کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مذہب ایسا نہیں جو تمام ضروریاتِ زندگی کا مصلح اور کفیل ہو اور عقائد و اعمال کو درست کرنے کی مکمل تعلیم اس میں موجود ہو۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ۔ یعنی دینِ توحید و اصلاح کی طرف رجوع کرو۔ قیامت کے دن یا مرنے کے دن سے پہلے کیونکہ روزِ قیامت اور روزِ موت اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ آنے والے دن کو پلٹ سکے۔ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ سے یا تو قیامت کا دن مراد ہے یا موت کا دن کیونکہ ہر شخص کی موت اُس کی قیامت کا آغاز ہے۔ اگرچہ تمام انسانوں کے لئے مجموعی طور پر بھی قیامت ضرور آئے گی مطلب یہ ہے کہ جب تک اختیار اور عمل کی دنیا میں ہو اُس وقت تک اپنے عقیدہ اور عمل کی اصلاح کر سکتے ہو۔ اختیاری زندگی ختم ہو جانے کے بعد کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں لہٰذا اس دورِ حیات میں اسلام کو اپنا مذہب بنا لو اور اسی شاہراہ پر چلو۔ یہ بالکل سیدھا راستہ ہے تعلیمی اور عملی اصلاحات کا واحد کفیل ہے۔ اسی سے نظمِ حیات درست ہوتا ہے اس کی تعلیم ہر طرح کی مشرکانہ کثافتوں اور عملی خرابیوں سے پاک ہے لیکن جب کثیر دنیا ایک راستہ پر گامزن ہو۔ ماں باپ بھائی بہن اولاد اقارب اور دوست احباب کسی راہ پر چل رہے ہوں تو اُن کو چھوڑ کر نئے راستہ پر چلنا اُن سے بچھڑنا سب سے تعلق کاٹنا اہل و عیال اور مال و منال سے ہاتھ اٹھا لینا اور رفاقت سے منہ

موڑ کر سب سے الگ، چلنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ زنجیریں ایسی ہیں جو کاٹے سے نہیں کٹتیں اس لئے فرماتا ہے :۔

یَوْمَىٕذٍ یَّصَّدَّعُوْنَ۔ یعنی یہ تمام علائق سارے روابط اور کل وابستگیاں زندگی کی ہیں مرنے کے بعد تمام تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اس وقت حق و باطل الگ الگ ہو جائے گا کوئی کسی کا ساتھ نہ دے گا۔ سب بچھڑ جائیں گے دو گروہ بن جائیں گے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ الخ۔ جس نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہوگا (خواہ وہ ماں باپ ہوں اولاد ہو، عزیز قریب ہو دوست اور حبیب ہو) اس کے کفر کا وبال اس پر ہوگا۔ خود اپنے کرتوت کی سزا بھگتے گا اور جو نیکوکار ہوگا وہ اپنی منزل سنوارے گا۔ لہٰذا لازم ہے کہ اسی زندگانی میں اپنا راستہ الگ اختیار کرو، تعلقات کے فریب میں نہ آؤ، روابط و علائق کی پاسداری کر کے راہِ حق سے منہ نہ موڑو، عزیزوں اور جگر پاروں کو (اگر وہ تمہارے راستہ پر کسی طرح نہ چلیں) اُن کی راہ پر چھوڑ دو۔ خوب سمجھ لو کہ :۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ۔ نیکوکار اہلِ ایمان پر اللہ کی مہربانی ہوگی۔ اُن کی نیکی کی جزا ہوگی اور کافروں پر اللہ کی مہربانی نہ ہوگی۔ یعنی نیکوکار اہلِ ایمان کو اللہ ثواب ضرور دے گا مگر ثواب دینا اس پر لازم نہیں۔ اعمال ثواب کے موجب نہیں بلکہ اپنے فضل سے وہ ثواب دے گا۔ اعمال کی جزا دینی اس کی مہربانی پر موقوف ہے۔

مقصودِ بیان

ملک میں فتنہ و فساد تباہیاں اور بربادیاں لوگوں کی بداعمالیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ بلاوجہ کسی کو برباد نہیں کرتا۔ پروردگار کا مقصود اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کئے کی کچھ سزا پائیں اور بدکرداری کی محسوس سزا پاکر شرک و معاصی سے توبہ کریں۔

پس درسِ عبرت ہے اس آیت میں مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور تمام عالم کے لئے عموماً دانش کی آنکھیں کھول کر مسلمانوں کو اپنی خستہ حالی نکبت اور ذلت کو دیکھنا اور بربادیوں کے اسباب پر غور کرنا چاہئے اور یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ ساری تباہی خود آوردہ ہے انھوں نے خود اپنی حالت تباہ کر لی۔ خدا نے ان کو بھی برباد کر دیا۔ اب موقع ہے کہ سچے دل سے توبہ کریں۔ سود در جیہ سائی چھوڑ کر ایک اللہ کے دروازے کی طرف دوڑیں۔ اصولِ قرآنی پر کاربند ہو کر اپنی زندگیوں کو شریعت کے سانچے میں ڈھال لیں پھر دیکھیں وہی کامیابی اور کامرانی ہوگی۔ وہ نجاح اور فلاح ہوگی اور وہی نور و سعادت ہوگی جو پہلے تھی۔

کسی کے کفر و اسلام سے اللہ کا کچھ بگڑتا نہیں اپنے ہی نتیجہ کا بگاڑ اور سنوار ہوتا ہے۔ مِنْ فَضْلِهٖ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اعمال کا ثواب دینا خدا پر واجب نہیں ہے بلکہ اس کی مہربانی پر موقوف ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ کا یہ مقصود ہے کہ خدا کی مہربانی آخرت میں کافروں پر نہ ہوگی۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ

اس کے نشانہائے قدرت میں سے یہ بات ہے کہ وہ خوشخبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ تم کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا دے اور کشتیاں اس کے حکم سے چلیں

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ

اور تم اس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو (اے محمد) تم سے پہلے بھی ہم بہت سے پیغمبروں کو اُن کی قوم کی طرف بھیج چکے ہیں

فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور وہ اُن کے پاس معجزات لے کر پہنچے تھے پھر ہم نے جرم کرنے والوں سے انتقام لیا اور مسلمانوں کو مدد دینی ہم پر لازم تھی ۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا

اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر اُس بادل کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا تا رہتا ہے اور اُس کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ

پھر اس کے اندر سے تم کو بارش نکلتی ہوئی نظر آتی ہے پھر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وہ بارش کو پہنچا دیتا ہے تو وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۝ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ

اگرچہ وہ نزولِ بارش سے قبل نا امید تھے پس اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو

اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

وہ کس طرح خشک ہو جانے کے بعد زمین کو تر و تازہ کرتا ہے بیشک وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے

وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ۝

اگر ہم ہوا بھیج دیں پھر وہ اُس (کھیتی) کو زرد پڑا ہوا دیکھ لیں تو ضرور اُس کی ناشکری کرنے لگتے ہیں

تفسیر مندرجہ آیات کے متعلق تفسیری مقالات تو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم تحلیلِ اجزاء کے ذیل میں بیان کریں گے یہاں بہت ہی مختصر طور پر اتنا جان لینا چاہیئے کہ جس طرح آسمان پر بہت گہری گھنگھور گھٹا چھا جاتی ہے۔ کالی کالی بدلیاں آ جاتی ہیں۔ دنیا اندھیری ہو جاتی ہے اُس وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ مُردہ بدنوں میں رُوح پھونکنے والے مینہ کا پیام لاتی ہیں۔ پھر مری ہوئی قوتیں جی جاتی ہیں۔ نا اُمید باغبانوں اور مایوس کاشتکاروں کی یاس آس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ زمین شاداب ہو جاتی ہے، درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ ہر چیز پر رونق آ جاتی ہے۔ لیکن کچھ زمانہ کے بعد مینہ برسانے والی ٹھنڈی ہوا اپنا رُخ موڑ لیتی ہیں۔ برف سے بھری ہوئی بادِ خزاں اور کل مادی دنیا کو سوختہ بنا دینے والی سموم چلنے لگتی ہے اور پہلے ہی جھونکے پر تمام سرسبزیوں اور شادابیوں کو اپنی لپیٹ میں لپیٹ لیتی ہے۔ اس وقت ظاہر پرست انسان کے دماغ پر پھر مایوسی چھا جاتی ہے۔ موت آفریں سموم کو دیکھ کر حیات بخش نسیم کو بھول جاتا ہے اور مصیبت کے وقت راحت پردۂ فراموشی میں چھپ جاتی ہے۔

اسی طرح انسانی دلوں کی دنیا جب خشک اور ویران ہو جاتی ہے رُوحیں افسردہ اخلاق مُردہ اور آپس کے تعلقات پژمردہ ہو جاتے ہیں اور دنیا روحانی تشنگی سے چیخ اٹھتی ہے اس وقت نبوت کی گھٹائیں دلوں کی دنیا پر چھا جاتی ہیں۔ کالی بدلیاں بظاہر دیو ہیکل ہوتی ہیں۔ رسم و رواج اور عقائدِ اسلاف کی تیز روشنی اُن سے چھپ جاتی ہے۔ ہے لیکن جھلستی ہوئی دھوپ کی جگہ ٹھنڈا سایہ دنیا کو نصیب ہو جاتا ہے۔ وہی کالی کالی بدلیاں رحمت کا پانی بن کر نیچے کو برستی ہیں۔ خشک زمین کو ہرا بھرا کر دیتی ہیں اور رحمتِ الٰہی کی ہواؤں کی گود میں جھولتی ہوئی آ کر مُردہ دلوں کو زندہ کر دیتی ہیں۔ لوگ مادی اور روحانی طور پر مالا مال ہو جاتے ہیں۔ ویرانیاں عمرانیوں سے اور بربادیاں آبادیوں سے بدل جاتی ہیں لیکن اگر (نبی کی نافرمانی اور دستورِ قدرت کی کارفرمائی کے سبب) سرد اور نسیم کے بجائے بادِ صرصر یا سموم کا کوئی جھونکا آ جاتا ہے اور (امتحان کے طور پر) دنیوی کامرانی کی سبز کھیتیاں خشک اور زرد پڑ جاتی ہیں اور عیش و نشاط کے درختوں کی بار آوری اور سایہ افگنی ختم ہو جاتی ہے تو کوتاہ نظر مادی فوائد کے طلبگار ناشکری کرنے لگتے ہیں۔ نہیں سوچتے کہ دستورِ قدرت یونہی جاری ہے کہ گرم ہواؤں کے بعد سرد ہوائیں اور نسیم کے بعد سموم چلتی رہتی ہے۔ رنج و راحت اور مضرت و منفعت قدرت کے دو امتحانی سوال ہیں جن کا حل صبر و شکر کے سوا اور کچھ نہیں۔

تحلیلِ اجزاء وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے توحید نبوت اور معادِ جسمانی کو ضوابطِ قدرت اور براہینِ فطرت بیان فرما کر ثابت کیا ہے۔ اوپر کی آیات میں انسان کی بداعمالیوں سے بر و بحر میں فساد بپا ہونے کو ظاہر کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ضبطِ قدرت اور مقصودِ فطرت کو ان آیات میں بیان فرما کر یہ دکھایا ہے کہ اللہ کس قدر رحیم و مہربان ہے کہ باوجود انسان کی فتنہ انگیزیوں اور فساد آفرینیوں کے اس کی زندگی کو باقی رکھنے آرام پہنچانے اور انتظامِ عالم کو چلانے کے لئے غیبی کارسازیاں فرماتا رہتا ہے۔ اگر اللہ کی ان عنایتوں میں سے ایک عنایت بند ہو جائے

تو نہ فقط آدمی بلکہ ساری حیوانی دنیا بھوکی پیاسی مرجائے۔ سب کے دم گھٹ کر رہ جائیں اور رحمتِ ربانی کی نوازنگاہ بدلتے ہی کل زندہ دنیا تباہ ہو جائے۔ غرض ان آیات میں دعوتِ غور ہے سرکش انسانوں کے لئے کہ وہ باوجود اس قدر فیض کرم فرمائی کے قوانینِ قدرت سے سرتابی کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اگر قدرت نے ایک دم کے لئے اپنی آنکھ پھیر لی تو خوش عیش زندگانیوں کی شیرینی تلخی سے بدل جائے گی اور کارخانۂ حیات کی ساری مشینری بند ہو جائے گی۔

آیت مندرجہ بالا میں لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ہوائیں چلانے کے پانچ مقاصد بیان فرمائے ہیں۔ دو بری ایک بحری۔ ایک مشترک اور پانچواں ان چاروں کا نتیجہ یا یوں کہو کہ چار مظاہر فطرت ہیں اور پانچواں اصلی مقصد۔

آیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ اللہ ہواؤں کو بھیجتا رہتا ہے (کہاں سے بھیجتا ہے کس طرف بھیجتا ہے) یہ کون بتائے کس قسم کی ہوائیں بھیجتا ہے اُن کی ساخت کس طرح کی ہوتی ہے۔ اجزاء میں کیا تغیر تبدل کیا جاتا ہے اس کو کون جانے۔ بہر حال خدا ہوائیں بھیجتا رہتا ہے۔ ساری دنیا میں روزانہ کا یہی دستور ہے۔ ایک دو دن ہفتہ دو ہفتہ ماہ دو ماہ یا سال دو سال کا یہ کام نہیں ہے بلکہ جب سے نظمِ حیات قائم ہے جب سے قدرت کا یہ حیاتی کارخانہ چل رہا ہے۔ رب العالمین اسی وقت سے برابر پیہم مسلسل بغیر کسی انقطاع کے ہوائیں بھیجتا رہتا ہے۔ ہواؤں کے بھیجنے کے اسباب فاعلہ کیا ہوتے ہیں اس مشین کو چلانے کے لئے کن کن پرزوں کو حرکت دی جاتی ہے اور حرکت دینے کی کیا صورت ہوتی ہے۔ اس کا بیان بہت دقیق ہے۔ عام ذہنیت رکھنے والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں نہ وہ (اس) کو سمجھ سکتے ہیں نہ ان کو اس کے سمجھنے سے کوئی خاص فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان آیات میں اس کی کوئی تشریح نہیں فرمائی نہ قوامی مادہ کا تذکرہ کیا کہ حیات بخش ہوائیں کس چیز سے بنتی ہیں نہ ان درمیانی اسباب (زمین اور سمندر کی تبخیری قوت) کی تفصیل فرمائی جن کی حرکت ارسالِ ہوائی کا ذریعہ ہو سکتی ہے صرف دو باتیں ذکر فرمائیں سب سے پہلے اُس علتِ تامہ کا تذکرہ فرمایا جو صنعت خانۂ قدرت کی صانع موجد خالق اور اصلی محرک ہے جس کے اشارۂ ابرو سے ساری کائنات کی مشینری حرکت میں ہے یعنی اللہ۔ اس کے بعد اُس غرض غایت اور مقصد کو ظاہر فرمایا جو تحریکِ ہوائی کے اصل باعث ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے ہوا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے۔ گویا باعث فاعلیہ اور علتِ غائیہ کو تو بیان فرما دیا اور علت مادیہ و صوریہ کے بیان کو اس جگہ غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا ہواؤں کو حرکت میں لانے کے جو اسباب اہلِ فلسفہ بیان کرتے ہیں وہ درحقیقت وسائل اور درمیانی آلات ہیں جن کو کوتاہ نظری کے سبب عقلی دنیا کے ٹھیکہ داروں نے فاعل قرار دے رکھا ہے اصل فاعل احکم الحاکمین کا حکم ہے۔ اُسی کی مشیت کے موافق درمیانی وسائل حرکت کرتے ہیں پس خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے اصل فاعل و محرک کا ذکر کیا اور فرمایا۔ اللہ ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ کیوں بھیجتا ہے۔ اس کی تشریح بہت ہی تفصیل طلب ہے۔ اس جگہ ارسالِ ہوائی کے مندرجہ ذیل مقاصد بیان کئے ہیں۔ (۱) ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ کر خوشخبریاں دیتی ہیں۔ جب سمندر یا دامنِ کوہ سے اٹھتی ہیں یا کسی اور نشیبی بالائی مقام سے چل کر دوسری جگہ پہنچتی ہیں تو مژدہ لاتی ہیں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں تو بارش کا پیام آتا ہے۔ باغوں کی شادابی درختوں کی ثمر وری چمن کی بہار آفرینی اور کھیتوں کی سرسبزی کی خوشخبریاں سرد جھونکوں کی ترنم ریز صداؤں سے سنائی دیتی ہیں اور مری ہوئی نامی دنیا کے کانوں میں دعوتِ حیات پہنچ جاتی ہے۔

وَلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۲) ہواؤں کے چلنے کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ انسان رحمتِ الٰہی کا مزہ چکھے۔ درختوں میں نمو ہو، کونپلیں پھوٹ کر نکلیں، کلیاں چٹکیں، پھولوں کی پژمردگی دور ہو، کھیتیاں سرسبز ہوں، حیوانوں اور انسانوں کی تشنگی زائل ہو، ترو تازہ رہنے کا ذریعہ پیدا ہو جائے۔ بدن پر اجزاءِ نسیم لگ کر طبیعت میں فرحت اور دماغ میں بشاشت پیدا کریں، چہروں پر تازگی اور دلوں میں ولولے پیدا ہو جائیں۔ انسان اور حیوان کے جسم کے اندر جو ہوا چلی گئی ہے وہ باہر نکل کر صاف ہو جائے اور صاف ہو کر پھر بدن میں داخل ہو کر امدادِ حیات کا ذریعہ بن جائے۔ روئے زمین کی ساری کثافتیں دھل جائیں، زہریلے جراثیم بہ جائیں کوڑا کرکٹ صاف ہو جائے۔ غرض یہ اور اس قسم کے سارے فوائد اللہ کی رحمت کے مظاہر ہیں جو قدرتِ خداوندی نے سرد ہواؤں کی حرکت سے وابستہ کر دیئے ہیں۔ یہ فوائد تو وہ ہیں جو خشکی سے تعلق رکھتے ہیں اور میدانی ہیں جن سے خشکی پر رہنے والوں کی زندگیاں وابستہ ہیں اور قدرت کی طرف سے امن و عافیت صحت اور دولت پیدا ہونے کے لئے اُن کا وجود ضروری قرار دیا گیا ہے۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ (۳) ہواؤں کے چلنے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ بادبانی کشتیاں اور جہاز بحکم خداوندی چل سکیں آج کل اگرچہ دخانی جہاز چلتے ہیں اور بادبانی جہازوں کا رواج جاتا رہا ہے لیکن یہ بھی بغیر ہوائی حرکت کے نہیں چل سکتے۔ اگر ہوا میں بالکل سکون ہو جائے گویا ہوا جامد بن جائے تو کون طاقت ہے جو سمندروں میں جہازوں کو لے جائے۔ وہ کونسا انجن ہے جو جہاز کو کھینچ سکے اگر ہوا میں حرکت نہ ہو گی تو پانی بھی حرکت نہ کرے گا نہ امواج کی رستخیز ہو گی پھر جہازوں کو کون حرکت دے گا

حقیقت یہ ہے کہ جہاز کو چلانے والی ہوا کی حرکت ہی ہے دخانی طاقت اس کی مددگار بن جاتی ہے اور بادِ مخالف کو موافق بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ جہاز کی حرکت کے لئے ہوا کا سینہ چیرنا ضروری ہے اور اس کی سینہ شگافی کا نتیجہ حرکت ہے۔ بہرحال ہوائیں کشتیاں چلاتی ہیں اور پانی کی سطح پر اتنے عظیم الشان بار کو لے کر چلتی ہیں ہوا کی حرکت ہی ہر جز پانی پر دباؤ ڈالتی ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے پانی جہاز کو اپنی پشت پر اٹھائے رہتا ہے۔ ادھر ہوا بھی جہاز کو چاروں طرف سے گھیر کر دبا کر اوپر اٹھائے رکھتی ہے اور اس طرح جہاز پانی کی سطح پر چلتا ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا سخت غلطی ہے کہ ہوا جہاز کو ذاتی طور پر چلاتی ہے اور رفتار جہاز کی علت فاعلی حرکت ہوا ہے درحقیقت جہاز کی حرکت اس خدائے کارساز کے دستِ تصرف کا ایک نتیجہ ہے جو ہوا میں حرکت پیدا کرتا ہے اور ہوا میں متحرک بنانے والے اسباب کو بروئے کار لاتا ہے اور حکمِ خداوندی کے بغیر نہ ہوا جہاز کو چلا سکتی ہے نہ کوئی دوسرا سبب اثر پیدا کر سکتا ہے۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ۔ یہ تحریک ہوا کا یہ چوتھا مقصد ہے جو بر و بحر دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ فضلِ الٰہی غیر متناہی ہے انعامات جسمانی دنیوی، اُخروی ہر قسم کی مہربانیاں خدا کی ہی ہیں۔ مگر اہلِ تفسیر نے فضل کی تفسیر اس جگہ مال اور رزق سے کی ہے۔ حرکت ہوا کی وجہ سے پھل پھول غلہ سبزی ترکاری غرض جسمانی زندگی کو باقی رکھنے والی ہر چیز پیدا ہوتی ہے اور انسان اس کی تلاش کرتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس جگہ فضل کی تفسیر ان تجارتی منافع سے کی ہے جو بحری سفر میں آدمی کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس تقدیر پر تحریک ہوا کا یہ فائدہ بحر و بر دونوں میں مشترک نہ ہوگا بلکہ صرف بحر سے اس کا تعلق ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہوا چلانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم بحری سفر کر کے تجارتی منافع حاصل کرو اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں بحری راستہ سے بغرضِ تجارت جا سکو۔ دریائی شکار کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ ثمرہ ہے گزشتہ چاروں اغراض کا اور اصلی غایت ہے ہوا کے تمام فوائد کی۔ مذکورہ بالا بیان سے اللہ کی ربوبیتِ عامہ کا ثبوت ملتا ہے اور چونکہ اللہ ہی کے یہ عام انعامات ہیں کسی دوسرے کے عطا کردہ نہیں ہیں لہٰذا اس سے اُس کی وحدانیت بھی کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مسئلہ نبوت اور معاد کا ثبوت تو وہ آیات کے تحت میں آتا ہے۔ آیات مذکورہ بالا کی صحیح تفسیر تو وہی ہے جس کو ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اہلِ بصیرت کی ضیافتِ فکر کا کچھ پُرلطف سامان فراہم کر دیا جائے اور اہلِ علم کی ذہن نوازی کے لئے تاویلی تشریح کر دی جائے تو غالباً نکتہ رس دماغ رکھنے والوں کو ناگوار نہ ہوگا اور کیف علمی محسوس ہوگا لیکن خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ تفسیر نہیں صرف دعوتِ فکر ہے کلام الٰہی کے اندر علم کے لاتعداد خزانے پوشیدہ ہیں۔

ہواؤں سے اشارہ ہے فیضِ ربانی کی مخفی غیبی ہواؤں کی طرف جو عالمِ قدس سے چلتی ہیں جن سے عالم کا ذرہ ذرہ متاثر ہوتا ہے اور فرش سے لے کر عرش تک کائنات کی کوئی شے کوئی خلا کوئی قطرہ کوئی پتہ کوئی کارساز اور کوئی پھول ان کی اثرانگیزی سے خالی نہیں رہتا۔ فیضِ قدسی کی یہی ہوائیں کائناتِ ہستی کو برقرار رکھنے والی ہیں۔ یوں تو ہر چیز فیضِ الٰہی کی ہوا کی ممنون ہے اور ہر شے میں جو روحِ حیات کارفرما ہے وہ ہوائے رحمانی کی ایک لپٹ ہے جسمانیت کو برقرار رکھنے والا جوہر نمو اور حرکت اور شعور پیدا کرنے والی طاقت اور علم و ادراک حاصل کرنے والی قوت سب ہی غیبی روح یا مخفی روح کے مظاہرات ہیں۔ آسمان اور اس کی بلندی، سورج اور اس کی تیز چمکیلی شعاعیں، زمین اور اس کے وزنی پہاڑ، دریا اور اُن کی تلاطم خیز موجیں، فضا اور اُس کی پہنائی، تمام فصلیں کل زمانہ ماضی اور مستقبل ہر متحرک اور ساکن چیز، ہر پوشیدہ اور ظاہر شے، ہر قریب اور بعید شخص، سارا تر و خشک کھڑا بیٹھا جاگتا سوتا آنکھوں سے اوجھل ہونے والا اور سامنے حاضر رہنے والا غرض کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے گوشِ فطرت سے نسیمِ رحمانی کے ترنم ریز جھونکوں کی کیفیت آفریں اور مسحور کن صدائیں سن رہا ہے اور ہستی کی بشارتیں ہر شے کے گوش نواز اس طرح ہو رہی ہیں کہ ہر چیز فنا فی الوجود نظر آتی ہے۔ اس بادۂ ازل سے تمام مخلوق سرشار ہے اور اسی نغمۂ سرمدی سے کل موجودات سرمست، خلاصہ یہ کہ قدسی ہوا کیا ہے روحِ کائنات اور اس کی بشارت کیا ہے ہر چیز کو ہستی اور زندگی کی بشارت۔ لیکن اس بشارتِ حیات کے علاوہ روحِ کائنات کا ایک خصوصی تعلق انسان سے اور بھی ہے نسیمِ حیات بخش انسان کے دل اور اس کی روح کو ایک اور طریقے سے بھی نوازتی ہے۔ آدمی کے باطن پر اس سروِ ازلی کا ایک اور اثر بھی پڑتا ہے جو دوسری کائنات پر نہیں پڑتا اور جس کا فقدان انسان کے دل و روح کو مردہ بنا دیتا ہے۔ وہ خصوصی اثر ہے معرفت کی چاشنی۔ روحِ کائنات کے ایک جھونکے نے سارے جہان کو زندگی کی بشارت دی اور انسان کو بشارتِ حیات کے ساتھ معرفت کا بھی مزہ چکھایا۔ اسی معرفت کو آیتِ مذکورہ میں رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور معرفتِ الٰہیہ کی تکمیل اور اس کا احاطہ کم ظرف انسان کے بس کی چیز نہیں اس لئے کچھ رحمت کا مزہ چکھانے کی صراحت فرمائی ہے۔

یہ تو ہوائے قدس کا وہ فیض تھا جو بلاواسطہ براہِ راست انسان کو حاصل ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے بے جان عناصر سے بنے ہوئے انسان کو زندہ دل

اور زندہ روح کہا جاتا ہے لیکن اس روحانی نوازش کے علاوہ ایک جسمانی پرورش بھی ہے نسیمِ ازلی کی ایک ایسی عنایت بھی ہے جس سے آدمی اس مادی سمندر کو بآسانی طے کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہستی کے سمندر میں ہر صامت اور ناطق، ہر جاندار اور بے جان، ہر نامی اور جامد، ہر متحرک اور ساکن، ہر ذی شعور اور بے حس، ہر بلند اور پست، ہر روشن اور تاریک اور ہر حاضر و غائب کی کشتیٔ حیات چل رہی ہے۔ ہستی کے سمندر کو ہر مخلوق کی کشتی جدا جدا عبور کر رہی ہے۔ اس بحرِ ناپیدا کنار کا اور چھور اگرچہ کہیں دکھائی نہیں دیتا لیکن پھر بھی ساحلِ مراد کا فرضی منصوبہ قائم کر کے کائنات کی تمام کشتیاں رواں دواں ہیں اور ان تمام کشتیوں پر انسان سوار ہے۔ کشتیوں کی روانی بجائے خود کوئی وقعت اور غرض نہیں رکھتی۔ سوار ہونے والے مسافر کا منزلِ مقصود پر پہنچنا اس روانی اور دوانی کی اصل غایت ہوتی ہے۔ پس کائنات کی یہ کشتیاں بھی اپنی رفتار کی کوئی ذاتی غرض نہیں رکھتیں بلکہ انسان کو اس مادی سمندر کو عبور کرا کے ساحلِ مطلوب تک پہنچانا ان کا اصل مقصد ہے۔ سورج چمکتا ہے لیکن کیا چمکنے اور روشن ہونے میں اس کی کوئی ذاتی غرض ہے بالکل نہیں۔ انسان کے لئے گرمی اور روشنی پیدا کرنا، اس کی غذا کے لئے کھیتیوں اور پھلوں کو پکانا، ان کی حفاظت کے لئے زہریلے کیڑوں کو مارنا اور ہر طرح سے ان کو تکمیل پہنچانا آفتاب کے طلوع کا مقصد ہے۔ غروب ہوتا ہے صرف اس لئے کہ بے چین انسان کی مضطرب روح پراگندہ حواس اور پریشان قوتوں کو رات کی پرسکون خوشگوار اور راحت بخش تاریکی میں آرام مل جائے اور اس کی طاقتیں آسودہ ہو کر از سرِ نو زندہ بن جائیں۔ چاند نکلتا ہے صرف اس لئے کہ اپنی خنکی بخش روشنی سے انسان کے بدن اور دماغ کو تازگی عطا کرے اور انسان کی روزی کا سامان فراہم کرے۔ غرض آسمان و زمین بلکہ ہر کرۂ ہوا پانی آگ اور مٹی بادل بجلی شبنم برف اور اولے سارے معدنیات اور فلزات کل نباتات تمام پرندے چرندے اور درندے اپنی کشتیٔ حیات پر انسان کو سوار کر کے منزلِ اصلی پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ سب آدمی کے خادم ہیں اور آدمی سب کا مخدوم۔ کل کی ہستی انسان کے لئے ہے اور انسان کی ہستی رحمتِ پروردگار کا مزہ چکھنے اور اس سے کیف اندوز ہونے کے لئے اور پھر اس رحمت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے غفلت میں پڑا پڑا کھانا اور سرچشمۂ رحمت کی فیض رسانی کو بھول جانا منشائے فطرت کے خلاف ہے۔ پس جبکہ ساری کائنات انسان کے لئے رحمتِ پروردگار ہے اور تمام مخلوق کی سفینۂ حیات اسی کے لئے رواں دواں ہے اور ہر چیز آدمی کے لئے بنی ہے تو لامحالہ تخلیقِ انسانی کا کوئی دوسرا مقصد ہے۔ کل کی پیدائش اس کے لئے اور اس کی پیدائش کسی اور کے لئے ہے۔ نعمتوں کو کھا کر احسان فراموشی کرنا احسان کوشی ہے۔ سب کو اپنے سامنے سرِ نیاز جھکاتے دیکھ کر اللہ پر ناز کرنا اور اس کے در سے پُر نخوت گردن کو موڑنا بے سپاسی اور ناشکری ہے۔ پس انسان کا بھی اولین اور آخرین فرض ہے کہ جس نے کل کو اس کا بنا دیا اپنے کو اس کا بنا دے اور کفرانِ نعمت کرنے کے بجائے شکر گزار بندہ بن جائے۔ واللہ اعلم۔

آؤ میرے عزیزو! جب دعوتِ فکر کا ہی موقع ہے تو ایک لمحۂ فکریہ اور بھی۔ ایک صحیح الدماغ مجنون کی بڑ سننے کے لئے صرف کر دو۔ گوشِ ہوش سے خوب سنو کہ جب تمام عالم میں کفر و شرک کا حبس ہو جاتا ہے۔ جب معاصی اور بداعمالیوں سے دنیا کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ جب انسان کی گرمی سے انسان کی ساری قوتیں بے ہوشی کے قریب پہنچ جاتی ہیں، جب ساری زمین پر روحانی غذا کا کال پڑ جاتا ہے، جب حقانی علوم و معارف کے تمام چشمے خشک ہو جاتے ہیں، جب امن و عافیت اور انصاف و صداقت کے سب درخت سوکھ جاتے ہیں، جب ظلم و ستم کا تیز سورج طلب و انصاف کے کمزور سبزہ کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے، جب غلامت گری اور بے ایمانی مکاری خیانت اور حق تلفیوں کا غبار سارے روئے زمین پر اڑنے لگتا ہے اس وقت نبوت کی خوشگوار فرحت افشاں ہواؤں کے جھونکے چلتے ہیں اور ساری کائنات کو زندگی کی خوشخبریاں سناتے ہیں۔ خشک زمینوں اور سوکھے ہوئے درختوں کو پیام ملتا ہے کہ اب تمہاری شادابی اور سرسبزی کا دور آ گیا ظلم کی خزاں ختم ہوئی اور انصاف کی بہار آفریں بدلیاں عالم پر چھا جانے والی ہیں، حیوانوں کو ندا دی جاتی ہے کہ اب تمہاری احشا سوز پیاس آبِ رحمت سے بجھا دی جائے گی۔ اب تمہارے پروردگار کی رحمت کا چھینٹا تم کو تشنہ نہ چھوڑے گا۔ ویرانیوں کو بشارت ہوتی ہے کہ اب تمہاری فرسودگی اور بوسیدگی عمرانیت سے بدل جائے گی۔ غرض نبوت کی ہوائیں سارے عالم کو حیات بخشی کا مژدہ سناتی ہیں۔ لیکن انسان کو عمومی مژدہ کے علاوہ ایک خصوصی حیات آفریں خبر بھی دی جاتی ہے۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ مردہ دل انسانو آؤ، بوسیدہ گندہ روحیں رکھنے والو ادھر متوجہ ہو، فرسودہ پژمردہ دماغ رکھنے والو دوڑو کہ تمہاری زندگی تازگی شادابی اور بہار آفرینی کا زمانہ آ پہنچا۔ رحمتِ رحمٰن جوش پر ہے۔ تمہاری بدحالی اور خستہ حالی پر اس کو رحم آ گیا۔ نبی کی کیف آفریں ہدایت کی ہواؤں سے روحوں کو زندہ دلوں کو تازہ دماغوں کو پرسکون اور اقوال و اعمال کو درست بنا لو۔ اپنی سفینۂ زندگانی کو نبوت کی ہوا کے فضا پرور جھونکوں کے زیرِ عاطفت رکھ کر منزلِ مراد پر پہنچا لو۔ راستہ کی تلاطم خیزیاں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ مادیت کے سمندر کی بے پایانی اور شیطانی پہاڑوں کا اس سمندر کے وسط میں ابھار تم کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ شکر کرو کہ نجات بخش ہواؤں کے جھونکے چلنے کا وقت آ گیا تاکہ تمہاری زندگانیوں کی کشتیاں پرسکون رفتار کے ساتھ چل کر ساحلِ آخرت تک پہنچ جائیں۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر کسی نے ناشکری کی اور اس کیف پرور ہوا سے

بھاگ کر بادِ سموم کی طرف دوڑا اور پرسکون ہوا کے جھونکوں سے کترا کر تلاطم خیز لہروں میں پھنس گیا تو کسی کا کچھ نہ بگڑے گا بشکر گزار اہلِ ایمان تو امن وعافیت کے ساتھ ساحل پر پہنچ جائیں گے۔ خدا کی مدد اُن کے ساتھ ہوگی۔ نقصان انہی کو اُٹھانا پڑے گا جن کی سفینۂ حیات پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جانے والی موجوں میں پھنس جائے گی۔ اُس کو راستہ میں شیطانی پہاڑوں سے ٹکر بھی کھانی ہوگی، کہیں ٹیلے پر پہنچ کر حیران پریشان بھی ہونا پڑے گا اور انجام کار ساحلِ مراد پر لگنے کی بجائے وسطِ سمندر میں بلا خیز لہروں کی نذر ہو کر ڈوب جائے گی اور ہوائے نبوت سے سرتابی کرنے اور منہ موڑنے کا یہ انتقام الٰہی ہوگا۔ ہماری اس تاویلی تشریح کے مناسب ذیل کی یہ آیت ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا الخ۔ اس آیت میں رسولِ پاک کو اور تمام اہلِ ایمان کو خدا تعالیٰ نے تسلی دی ہے اور دستورِ قدرت کی صراحت فرماتے ہوئے انجام کار کامیابی کا ناقابلِ شکست وعدہ فرمایا ہے اور کافروں کی بربادی وتباہی کی طرف بھی ایما کیا ہے۔ فوائد ہوا کے بعد اور کیفیتِ سحاب بیان کرنے سے پہلے وسط میں اس آیت کو ذکر کرنا اسی نیت کو ظاہر کر رہا ہے جس کی تشریح ابھی متذکرۃ الذکر سطور میں ہم نے کر دی ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ آپ سے پہلے بھی ہم نے بہت (بشارت دینے والے حیات آفرین اجزائے نسیم یعنی) پیغمبر بھیجے۔ انھوں نے اپنی قوموں کے پاس جا کر پیامِ الٰہی سنایا (وہ حیات بخشی کی) صداقت کے ثبوت میں کھلے کھلے نشانات بھی پیش کئے لیکن کچھ لوگوں نے اُن کے قول کو مانا کچھ نے نہ مانا جنھوں نے نہ مانا ان سے انتقام لیا۔ اُن کو دنیا میں ذلیل خستہ خراب حال اور برباد کیا اور آخرت میں عذابِ دوام ان کے لئے تیار کر لیا اور جن لوگوں نے سچے دل سے مان لیا اور احکامِ نبوت کی تعمیل کی ان کی امداد اللہ نے کی۔ کیونکہ اللہ پر اس کے وعدہ کے مطابق اہلِ ایمان کو کامیاب بنانا لازم ہے۔

اِلٰى قَوْمِهِمْ۔ قومہم کی ضمیر مقرر ہے اور رسل صیغۂ جمع ہے اور مفرد ضمیر رسل کی طرف راجع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے رسل سے مراد ہوگا کل واحدٍ من الرسل یعنی ہم نے ہر ایک پیغمبر کو اس کی قوم کی طرف بھیجا پس محمد کی بعثت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ دستورِ الٰہی یوں ہی جاری ہے کہ اللہ کے فرستادے آتے رہتے ہیں۔

فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ۔ بیّنات سے مراد یا تو معجزات واضح ہیں یا وہ ہدایاتِ الٰہیہ ہیں جن کی حقانیت وصداقت کھلی ہوئی تھی۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا۔ انتقام کی بنا جذبۂ نفسانیت پر ہے اور خدا نفسانیت سے پاک ہے اس لئے انتقام کا لازم معنی یعنی دکھ اور سزا مراد ہوگا۔ مطلب یہ کہ ہم نے مجرموں کو سزا دی۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ جملہ محذوف کلام کی علت ہے یعنی ہم نے مومنوں کو کامیاب بنایا۔ کیونکہ مومنوں کی مدد کرنا لازم ہی ہے پہلا کلام سے ظاہر ہو گیا کہ کافروں کو برباد اور مسلمانوں کو فتحیاب کیا جائے گا۔ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کبھی مومنوں کا گروہ بلکہ بعض پیغمبر فتح یاب نہیں ہوئے۔ کافروں کو غلبہ حاصل ہوا اور پیغمبروں کی شہادت تک نوبت پہنچی۔ ذکریا، یحییٰ وغیرہم بہت پیغمبر ستائے گئے اور اُن کو قتل کیا گیا۔ پھر نصرتِ اہلِ ایمان کا کلیہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ نصرت کبھی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور کبھی صرف آخرت میں۔ آخرت کی سرخروئی اور نصرت سے تو کوئی مومن محروم نہیں ہو سکتا۔ اور دنیا میں بہت کم مثالیں مغلوبیت اہلِ ایمان کی ملیں گی تاہم اہلِ حق کو کبھی عارضی مغلوبیت ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جس کسی مسلمان نے اپنے بھائی (مسلمان) کی آبرو بچائی تو اللہ پر حق ہے کہ قیامت کے روز اس سے جہنم کی آگ دور فرمائے۔ اس کے بعد حضور نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی (رواہ ابن ابی حاتم والترمذی والطبرانی) اس کے علاوہ نصرت کی دو قسمیں ہیں۔ جمہوری اور شخصی۔ اگر اہلِ ایمان کے گروہ میں سے بعض علمبردارانِ حق شہید ہو گئے اور ایسا ہوتا ہی رہتا ہے تو اس سے جمہوری شکست لازم نہیں آتی اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مشنِ الٰہی دنیا میں ناکام ہوا ہو۔ یہی نصرتِ الٰہیہ اور جمہور اہلِ حق کی فتح ہے۔

ہاں ایک شبہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اشاعرہ کے مسلک پر تو کوئی چیز اللہ پر لازم نہیں ہے۔ دنیوی کامرانی ہو یا اخروی ثواب سب اللہ کی مہربانی پر موقوف ہے۔ پھر اللہ پر نصرتِ اہلِ ایمان کے لازم ہونے کے کیا معنی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لزوم ذاتی ہوتا ہے اور ایک لزوم اضافی۔ مثلاً زید نے عمرو سے دس روپے اُدھار لئے تو اس صورت میں عمرو کے زید پر دس روپے واجب الادا ہیں خواہ زید ادائیگی کا وعدہ کرے یا نہ کرے اور اگر زید نے عمرو سے کچھ قرض نہیں لیا بلکہ خود کہہ دیا کہ ہم تم کو دس روپے دیں گے تمہارے دس روپے لازم ہیں تو لزوم اضافی ہوگا۔ اللہ پر کسی کے حق کا لزوم ذاتی نہیں کیونکہ کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے ہر نیکی اس کے دنیوی احسانات کو بھی نہیں اُتار سکتی آخرت کا استحقاق پیدا کرنا تو درکنار۔ ہاں چونکہ اللہ نے خود اپنے اوپر نیکیوں کا حق لازم کر لیا ہے اور فرما دیا ہے کتب علی نفسہ الرحمۃ اور وعدۂ الٰہیہ کی خلاف ورزی محال ہے۔ اس لئے امدادِ اہلِ ایمان اللہ پر لازم قرار پائی دنیا میں ہو اور دین میں بھی لیکن ایمان اس امداد کا موجب نہیں بلکہ وعدۂ الٰہیہ موجب ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ۔ آغاز آیات سے بھی ارسالِ ہوا اور اس کے فوائد کا بیان تھا اور اس جگہ بھی بعثتِ ریاح کا ذکر ہے۔ لیکن بیان کی نوعیت کیفیت مقصد اور ماحصل جدا جدا ہے۔ اول الذکر آیات میں ہوا چلنے کے فوائد اور فوائد کی اصلی غرض کا بیان تھا اور اس سے اللہ کی ربوبیتِ عامہ پر استدلال کر کے وحدانیتِ الوہیت کو ثابت کیا گیا تھا اور اس کے بعد ضرورتِ نبوت کی طرف بھی ایما فرمایا تھا۔ اس جگہ ہواؤں سے بادلوں کا اٹھنا، اُن سے مینہ برسنا، زمین کا سرسبز ہونا اور اللہ کے حکم سے کھیتیوں کا زرد پڑجانا اور اس وقت کافروں کا کفرانِ نعمت کرنا بیان فرما کر معادِ جسمانی کی توضیح ضمنی طور پر فرمائی ہے۔ گویا مقدم آیات سے توحید نبوت کا ثبوت ہوتا ہے اور ان آیات سے معاد کے مسائل کی توضیح و تنقیح۔ اس کے علاوہ رفتارِ کلام چند دیگر فوائد پر بھی روشنی ڈال رہی ہے جن کی وضاحت ہم ہر ٹکڑے کی تفسیر کے ذیل میں کریں گے۔ فقرۂ مذکورہ میں ریاح سے رحمت کی ہوائیں مراد ہیں وہ بادِ سموم مراد نہیں ہے جو درختوں کو خشک کر دیتی اور کھیتیوں کو جھلسا دیتی ہے۔

فَتُثِيْرُ سَحَابًا۔ اللہ رحمت کی ہوائیں بھیجتا ہے اور وہ بادلوں کو اٹھا کر لاتی ہیں۔ بادل کا قوامی مادہ بخار اور بخار نام ہے اس مرکب کا جس کے کچھ اجزا ہوائی ہوتے ہیں اور کچھ مائی۔ بقدرتِ الٰہی ہوائی اجزاء آبی اجزاء سے مل کر ان کو اپنا ہم شکل بنا کر خفت کے سبب اوپر کو اٹھتے ہیں۔ پھر خالص ہوا ان کو اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ جب فضائی طبقہ ہوا کی خنکی بخارات کو لگتی ہے تو وہ بستہ ہو کر سحابی شکل میں نظر کے سامنے آجاتے ہیں اور آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ آسمان پر ابر کا پھیلاؤ دو طرح سے ہوتا ہے۔ کبھی گھٹا گھر آتی ہے اور ابرِ محیط یکساں حالت میں دکھائی دیتا ہے اور کبھی ٹکڑے ٹکڑے اِدھر سے اُدھر کو اور اُدھر سے اِدھر کو چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہر حال ہوا ابر کو اٹھا کر لاتی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ ہوا کی بذاتِ خود یہ طاقت ہرگز نہیں کہ وہ کسی طرف بھی رُخ کر سکے۔ وہ صرف امرِ الٰہی کے تابع ہے اللہ ہی اس کو بھیجتا ہے۔ طبیعات کے ماہر اتنا تو کہتے ہیں کہ ہوائیں ابر کو اٹھا کر لاتی ہیں۔ سمندروں سے مانسون اٹھتے ہیں اور مختلف سمت کی ہواؤں کے سبب ان کا رخ کسی خاص طرف کو ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی کوتاہیِ نظر کی وجہ سے یہ نہ دیکھ سکے کہ ہواؤں کو کون بھیجتا ہے، ان کا رُخ کون بدلتا ہے۔ جسمِ خفیف جسمِ ثقیل کو کیسے اٹھاتا ہے وغیرہ۔ اس کی تنقیح وہی کر سکتا ہے جس کا علم استدلالی نہ ہو حضوری ہو جس کے آئینۂ علم کے سامنے ہر چیز اصلی خد و خال کے ساتھ ہر وقت موجود ہو۔ پس اللہ نے اپنی خلاقی کے اظہار کے لئے ان وسائط کا ذکر فرمایا جو چھوٹی نظر رکھنے والوں کو اصلی فاعل دکھائی دیتی ہیں اور فرمایا ہوائیں ابر کو اٹھاتی ہیں مگر ان کو بھیجتا خدا ہے۔ گویا وہ خود ابر کو نہیں اٹھاتیں جب تک خدا کی بخشی ہوئی طاقت اور اللہ کا حکم ان کو نہ مل جائے۔ وہ علمائے طبیعت جو خلاقِ اعظم اور علتِ تامہ کے وجود کے بھی قائل ہیں کہتے ہیں کہ خالق سب کا خدا ہی ہے۔ یعنی اس نے مادہ کو خاص صورت کا لباس پہنا کر مخصوص مزاج اور طبیعتِ نوعیہ عنایت کی ہے رہے جزئی تغیرات اور وقتی افعال وہ طبیعتِ نوعیہ خود کرتی ہے یا اس کا مزاجی اقتضا یوں ہی ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ نے مادہ کو ہوائی صورت ہوائی طبیعت اور ہوائی مزاج عنایت کر دیا۔ اب جزئی افعال کی تکمیل طبیعت ہوائیہ خود کر لیتی ہے۔ خود اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتی جاتی ہے۔ خود اوپر کو اٹھتی اور نیچے کو اترتی ہے خود گھومتی پھرتی ہے اور بعض دوسری چیزوں کو بھی لئے چلتی ہے۔ ابر کو اٹھا کر لانا اس کا طبعی اقتضا ہے لیکن اس تراشیدہ بیان کے مقابلہ میں بلند آہنگی سے قرآن کہتا ہے کہ اللہ ہی ہوا کو بھیجتا ہے اور ہوا ابر کو اٹھا کر لاتی ہے یعنی ہوا کا طبعی اقتضاء ضرور ہے کہ ابر کو اٹھائے لیکن اس اقتضاء کی تکمیل بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں ہوتی ہوا کو طبیعت نوعیہ اور مزاجِ خاص عطا کرنے کے بعد خدا معطل نہیں ہو گیا بلکہ ہر وقت اقتضائے ہوا کی تکمیل اسی کے حکم سے ہوتی ہے اور ہمیشہ طبعی مقتضا کو پورا کرنا اسی کا کام ہے لیکن اس لئے کہ:۔

فَيَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ۔ کہ وہی بادلوں کو آسمان پر اپنی مشیت کے مطابق پھیلاتا ہے۔ یعنی اگر مشیتِ الٰہی کو دخل نہ ہوتا اور ہوا کا طبعی اقتضا کافی ہوتا اور یہ تمام مظاہرات مزاجِ ہوا کے ہوتے تو ابر کے پھیلاؤ میں اختلاف کیوں ہوتا کیونکہ کسی جگہ کم کسی جگہ زیادہ، کہیں موٹا اور کہیں پتلا ہوتا۔ نوعی اقتضا ہر جگہ ایک طرح کا ہونا چاہئے۔ زمان و مکان کے اختلاف سے نوعی اور مزاجی اقتضا میں کیوں اختلاف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کی طبیعت اپنے اقتضائیات میں خود مختار نہیں بلکہ مشیتِ خداوندی کے تابع ہے جس طرح طبیعتِ کلیہ کا عمومی اقتضا بغیر تخلیقِ الٰہی کے نہیں ہوتا اسی طرح وقتی اور مقامی اقتضا کی تکمیل بھی بغیر مشیتِ الٰہی کے نہیں ہوتی۔ پس اللہ ہی آسمان پر ابر کو جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔

وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا۔ اور اُس کو پارہ پارہ کرتا ہے۔ مجاہد ابو عمرو اور قتادہ سے یہی ترجمہ منقول ہے۔ ضحاک وغیرہ نے کہا پارہ پارہ کرنے سے مراد ہے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تہ بہ تہ بنانا۔ اول الذکر ترجمہ پر یہ مطلب ہو گا کہ اللہ ابر کو پارہ پارہ اور الگ الگ کر کے متفرق کر دیتا ہے (کچھ ٹکڑے ادھر دوڑے جاتے ہیں کچھ ادھر گھومتے پھرتے ہیں) ضحاک کے ترجمہ پر مطلب اس طرح ہو گا کہ اللہ ابر کو پھیلا کر تہ بر تہ اور غلیظ بناتا ہے۔ گویا گھٹا چھا جاتی ہے۔

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ اب ہر شخص کو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے ابر کے سوراخوں سے پانی نکل رہا ہے۔ مقام غور ہے کہ ہوا سے کس طرح اور کیونکر آبی اجزاء اپنی طبیعت کے خلاف اوپر کو اٹھے پھر کس طرح اجزائے ہوائی پر غالب آ کر نیچے کو اتر پڑے۔ پہلے پانی نے ہوا کی شکل کیوں اختیار کی اور پھر ہوا نے پانی کی شکل کیوں قبول کی تحقیقِ حقائق کے علمبردار کہیں گے کہ تبخیر بغیر حرارت کے نہیں ہوتی اور حرارت سے اجزاء میں تخلخل ہو جاتا ہے اور تخلخل والی چیز اوپر کو اٹھتی ہے کیونکہ وہ ہلکی ہو جاتی ہے پھر اوپر پہنچ کر دوبارہ ان اجزاء کو سردی لگتی ہے اور تکاثف پیدا ہو کر ابر کی شکل نمودار ہو جاتی ہے۔ پھر یہ اجزائے متکاثفہ بوجھل ہونے کی وجہ سے نیچے کو گرتے ہیں اور حرکت سے حرارت پیدا ہو کر ان کو پگھلا دیتی ہے اور پگھل کر پانی کی شکل میں پھر ان کا ترشح ہونے لگتا ہے۔ اہل فلسفہ کی تحلیل کو اگر کامل طور پر صحیح مان لیا جائے تب بھی خدا کی کیسی ہمہ گیر قدرت ثابت ہوتی ہے، کیسی بے پایاں حکمت اور انتہاء مصلحت پر روشنی پڑتی ہے۔ سمندروں سے خشک صحراؤں، تپتے ہوئے ریگستانوں اور جھلستے ہوئے میدانوں میں پانی پہنچانے کے لئے خدا تعالیٰ کیسے کیسے تغیرات اور انقلابات کرتا ہے اور سمندر کے پانی کو کہاں سے کہاں پہنچا کر کہاں برساتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی پر مصلحت مشیت اور خود مختار ارادہ کے تحت ہوتا ہے۔ ورنہ کہاں سمندر کا پانی اور کہاں خشک چٹیل میدان میں زید کی کھیتی، کہاں کے بخارات اور کہاں عمرو کا مرجھایا ہوا باغ، کہاں کے پیاسے چرندے پرندے اور کہاں سے پانی کی روانی۔ کہاں سے اٹھان اور کدھر کو روانی۔

فَاِذَآ اَصَابَ الخ۔ جب خشکی اور حرارت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ لوگ اپنی کھیتیوں اور باغوں کی سرسبزی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور بارش کی کوئی شکل نہیں دکھائی دیتی اور مینہ کے ظاہری اسباب بالکل مفقود ہوتے ہیں تو عین ایسے وقت میں خدا تعالیٰ ابر کو ہوا کے دوش پر بھیج کر ضرورت کے مقام پر بارش کرتا ہے۔ اور وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے ناامید تھے یکایک خوش ہو کر کھل کھلا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں خشکی پڑے وہاں ضروری بارش ہو بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے نظامِ کائنات کا جیسا تقاضہ ہوتا ہے اور خدا کی جیسی مشیت ہوتی ہے اور انتظامِ عالم کے لئے جہاں بارش کرنی اللہ کے نزدیک مناسب ہوتی ہے وہاں بارش کی جاتی ہے خواہ وہاں کافروں کی بستی ہو یا اہلِ ایمان کی آبادی، بدکاروں کی کھیتی ہو یا نیکوں کے باغ، بہرحال ہوا یا ابر کا یہ فعل نہیں، نہ اضطراری طور پر ان کی طبیعتوں سے اس فعل کا صدور ہوتا ہے بلکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کے تابع ہے۔ نہ بچھتر کو اس میں دخل ہے نہ پالھ کو۔ ستاروں کا طلوع اور غروب اور تمود و خفا رتو اثباتِ قدرت میں موثر نہیں۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى۔ بیانِ آیات کا یہ اصل مرحلہ ہے۔ اگرچہ ربوبیتِ کاملہ کا اظہار بھی بیانِ مذکور سے ہوتا ہے لیکن غرضِ بیان قدرتِ تامہ کا اظہار ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جس کی قدرتِ عظیمہ کے یہ آثار ظاہر ہیں جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور جو دن رات ہوتے رہتے ہیں۔ پانی سے ہوا بننا، ہوا سے پانی ہو جانا اور مردہ زمین کو زندہ کر دینا ہر چیز عدم سے اخراجِ وجود پر دلالت کر رہی ہے۔ پس ایسا عظیم القدرت خلاقِ مطلق ضرور مُردوں کو بھی زندہ کرے گا اور جسمانی معاد اس کی قدرتِ قاہرہ سے بعید نہیں۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا الخ۔ یہاں ریح سے خزاں کی ہوا یا خشکی پیدا کرنے والی ہوا مراد ہے۔ کافروں کا دستور ہے کہ اگر خوشگوار ابر آ گیا، بارش خیز ہوا چلتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور جہاں سموم چلی اور سبزہ زرد پڑا بس سارے احسانات بھول گئے اور لگے ناشکری کرنے۔ نہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، نہ کانوں سے سنتے ہیں کہ حکمتِ ربانیہ کے یہ مظاہر ہیں، نہ دلوں سے سوچتے ہیں کہ ان تغیرات و انقلابات میں انتظامِ عالم کا راز مضمر ہے۔ پس گویا وہ مردے ہیں (مردہ دل ہیں) اندھے ہیں (بصیرت کی آنکھیں پھٹ ہیں) بہرے ہیں (گوشِ ہوش گراں ہیں)۔

تنبیہ مفسرین نے جو کچھ تفسیری مطلب لکھا تھا وہ تو ہم نے تشریح بالا میں ظاہر کر دیا لیکن اہلِ معارف کی ابھی کافی سیری نہیں ہوئی۔ معادِ جسمانی کا ثبوت اگرچہ مکمل ہو گیا اور اسی ثبوت کے لئے قدرت کے اس عظیم الشان تصرف کو بیان فرمایا تھا لیکن اربابِ ذوق کی ابھی تشنگی نہیں بجھی۔ ابھی تاویلی اشارات کی ضرورت ہے قرآن کا دستور ہے کہ کسی مقصد کے لئے کچھ آیات بیان کرتا ہے۔ عقل اور مشاہدہ کو دعوت دیتا ہے اور برہان حجت یا استقراء و تمثیل سے پیش ارادہ مدعا کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن ہزاروں آبدار موتی راستہ میں بھی بکھیرتا چلا جاتا ہے اور طلبگارانِ حقیقت اس رہ نوردی کے درمیان بکثرت ان جواہر کو لوٹ لیتے ہیں جو دامنِ بیان سے جھڑتے چھلکتے ہیں۔ بیانِ آیات کی آخری منزل مقصود جو کچھ ہوتی ہے وہاں تک تو سلسلۂ کلام پہنچتا ہی ہے لیکن بلا ارادہ ان ہزاروں سائلوں کو بھی وہ تمام مطلوبہ بھیک دیتا چلا جاتا ہے جس کے لئے دستِ تمنا پھیلائے گروہ در گروہ یہ لوگ سرِ راہ کھڑے ہوتے ہیں۔ اہلِ علم اس بلا ارادہ سخاوت کو تفسیر نہیں کہتے کیونکہ براہِ راست ان کو بیان کرنا مقصودِ اصلی نہیں ہوتا۔ ہاں وہ تاویل ضرور ہوتی ہے جس کو ظاہر کرنے والی معرفت کی ذہنی کاوش ہوتی ہے جس کا میدانِ عمل آیات کے اندر دفن کئے ہوئے خزانے

ہوتے ہیں۔ آؤ ہم بھی دماغی کاوش سے کچھ دبے ہوئے جواہر برآمد کریں تاکہ ارباب طلب کی روحانی آسائش کا کچھ سامان فراہم ہو جائے۔

ایک لمحہ نظر صرف کرو اور سوچو کہ سمندر اور کوہستان کیا چیز ہے۔ ان سے اُٹھنے والے بخارات کیا ہیں۔ ہواؤں سے کس طرف ابھار ہے۔ بادل سے کیا ترشح ہوتا ہے کس کو سیرابی ہوتی ہے اور کس کو نہیں ہوتی۔ کہاں سبزہ اُگتا ہے اور کہاں نہیں اُگتا۔ شکرگزار کون ہوتا ہے اور ناشکری کون کرتا ہے۔ یہی مٹی ہے یہی پانی ہے یہی ہے یہی بخار ہے۔ اسی سے تمام آدمیوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ کافر مومن شیاطین الانس اور انبیاء سب اسی سے بنے ہیں۔ جب روحوں کی زمین مردہ ہو جاتی ہے جب دلوں کی بستیاں اُجاڑ ہو جاتی ہیں، جب اخلاق کے باغ سوکھ جاتے ہیں۔ جب انصاف و حق کوشی کی لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو کر خاکستر بن جاتی ہیں تو اس وقت اللہ انسان کے اسی تخلیقی مادہ سے ایک مرکب (بخار) ایسا تیار کرتا ہے جس کی پیدائش اگرچہ اسی زمین اور پانی سے ہوتی ہے لیکن اس کے اندر ایک جز ایسا بھی ہوتا ہے جو اس کو پستی سے نکال کر بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا قوامی مادہ اس کو روکتا ہے مگر وہ اس کو بھی کھینچ کر اوپر کو چڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ چڑھانے والا جز ہوائی حصہ ہوتا ہے جو بخار میں شامل ہوتا ہے۔ اگر اس جز کو نکال لیا جائے تو خالص پانی رہ جاتا ہے یا کچھ حصہ کثافت ارضی کا اور پانی ہو یا مٹی دونوں کی طبیعت اوپر کو چڑھنے سے انکار کرتی ہے لیکن ہوائی جز کی طاقت اس کو اوپر کی طرف کھینچتی ہے۔ پھر مزید امداد اس طرح ملتی ہے کہ اِدھر اُدھر سے خوشگوار ہوا کے سرد جھونکے اس کو اوپر اٹھاتے ہیں اور بالآخر اس بخار کا ہوا کے جھونکوں کی امداد سے ابر بن جاتا ہے جو عالم پر چھا جاتا ہے اور اس سے جا بجا پانی کی ریزش ہوتی ہے بس یہی حالت نبوت کی بھی ہوتی ہے جس مادہ سے اور لوگ بنتے ہیں اسی سے نبی کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن روحانیت اور دانش کا وہ جوہر لطیف اس میں زائد ہوتا ہے جو اس کو انسانی مادہ کی پستی سے اٹھا کر عرش بریں کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور جب وہ انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے تو پھر لوگ اس کی تخلیق کو معمولی انسان کی تخلیق سے جدا چیز سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس تخلیقی مادہ نبی کا بھی وہی ہوتا ہے جو دوسرے آدمیوں کا ہوتا ہے۔ مابہ الفرق صرف روحانیت اور عقل ہوتی ہے جو خدا تک پہنچا دیتی ہے۔ بخاراتِ نبوت پانی یا زمین سے نکل کر جب روحانیت کے سبب اوپر کو چڑھتے ہیں تو چڑھنے کے وقت عنایاتِ ربانیہ اور الطافِ رحمانیہ کے سرد جھونکے اس کو لگتے ہیں اور بخاراتِ نبوت کو ابرِ رحمت بنا کر اہلِ جہاں کے سروں پر سایہ فگن کر دیتے ہیں۔ جونہی دیکھنے والوں کو ابرِ رحمت نظر آتا ہے دلوں میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں، چہرے شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اب میری مردہ روح زندہ ہو جائے گی، کوئی کہتا ہے میرا پژمردہ دل کھل کھلا جائے گا، کوئی خیال کرتا ہے کہ میرے اخلاق کے باغ میں اب خوب پھل اور پھول آئیں گے۔ لیکن کسی کو مال کی فراوانی مویشیوں کی بہتات معمولی درختوں کی سرسبزی اور بارآوری اور ان رواجی کھیتیوں کے لہلہا جانے کی خوشی ہوتی ہے کیونکہ ابر نبوت سے جو باران رحمت برستا ہے اس سے روحانی اور مادی دونوں طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں کی زمین شور اور ریگستانی ہوتی ہے، جن کی روحوں کے میدانوں میں بداعمالی اور شوریدہ حالی کا کوڑا کرکٹ اس قدر جمع ہو چکا ہوتا ہے کہ عظیم الشان سیلاب سے بھی اس کی صفائی ناممکن ہوتی ہے۔ بہرحال تمنا ان کو بھی ہوتی ہے (لیکن اس گروہ کو ابرِ نبوت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا نہ اس جگہ اس کا ذکر ہے۔)

غرض ابرِ نبوت برستا ہے علمی اور فکری اصلاحات اور دینی و دنیوی سعادتوں کا مینہ پڑنے لگتا ہے۔ نبی کی ہدایات کا فیضان ساری قوم کو گھیر لیتا ہے۔ بہت سے مردہ دلوں میں روحِ حیات پیدا ہو جاتی ہے، بہت سی پژمردہ روح والی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، بہت سے آدمیوں کے اخلاق کے درخت سرسبز اور شاداب ہو جاتے ہیں۔ بہتوں کو سعادتِ دارین کی شگفتگی حاصل ہو جاتی ہے۔ دل پاک، روحیں روشن، دماغ منصف اور اعضاء تمام عالم پر حکمراں بن جاتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے اگر زمانہ نبوت ختم ہونے کے بعد لوگوں کی بدکرداریوں اور لیڈروں کی بادِ سموم چلنے لگتی ہے اور پرستارانِ حق باوجود دل کی پاکی روح کی روشنی اور اخلاق کی شستگی کے دنیوی فوائد سے عارضی طور پر محروم ہو جاتے ہیں تو عام پرست جن کا اصل مقصد اسلام سے دنیوی مفاد کا حصول تھا اپنے منافع کو جاتا دیکھ کر حق سے مڑ جاتے ہیں، فیضِ نبوت کا انکار کرنے لگتے ہیں ہدایتِ رسالت کو ضرر انگیز بتاتے ہیں اور ناشکرے بن جاتے ہیں۔

مقصود بیان ہواؤں کے مختصر فوائد کا اظہار، رسل اور ربقی کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اس سے اس بات کی تصریح کرنی مقصود ہے کہ ہواؤں کے فوائد نہ تو اضطراری اور طبعی ہیں جن کے ظہور میں کسی اور کے فعل کو کچھ دخل ہی نہ ہو نہ یہ ہے کہ خود ہوا اپنے افعال میں کرتا ہے ان کی فاعلِ حقیقی ہے بلکہ رب العالمین کے زیرِ تربیت اور احکم الحاکمین کے زیرِ حکم یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ میں در پردہ امر ہے حصولِ معاش اور کسبِ مالِ حلال کے لئے ہر طرح کی جائز کوشش کرنے کا یہاں تک کہ اگر دریائی سفر کرنے کی بھی ضرورت پڑے تو اس پر بھی مسلمان کو کمر ہمت چست باندھ لینا چاہئے۔ یہ پیام عبرت ہے گوشہ نشین

پیروں کو خانقاہ کو آرام گاہ بنانے والے تارک الدنیا درویشوں کو ۔ قوم کی گردن پر اپنی معاش کا بار ڈالنے والے واعظوں اور عالموں کو اور تندرست ہاتھ پاؤں کو توڑ کر بستے ہوئے منہ موڑ کر خانۂ عافیت میں بیٹھ جانے والے صوفیوں کو ، ان تمام جماعتوں کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ فضلِ الٰہی کی طلب واجب ہے ، کوشش اور محنت لازم ہے خصوصاً بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کرنے والے فقیروں کو اس حکم سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے جنھوں نے کمائی اور مزدوری کو چھوڑ کر گداگری پیشہ بنا لیا ہے ۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ اس طرف ایما ہے کہ وہ عناصر جن کے انفرادی اور اجتماعی فوائد ناقابلِ التفات سمجھے جاتے ہیں اللہ کے بیش بہا انعامات ہیں جن کی شکرگزاری واجب ہے ۔ غافل انسان ہوا (اور پانی وغیرہ) کو معمولی چیز سمجھتا اور اس کی عظمت وضرورت کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا ۔ حالانکہ ایسے انعامات کی تخلیق اور عمومی عطا وجوبِ شکرگزاری کی مقتضی ہے فَانْتَقَمْنَا کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ پیغمبروں کی مخالفت کرنے سے غضبِ الٰہی جوش میں آجاتا ہے اور مقابلہ کرنے والوں کا تختہ تاراج کر دیا جاتا ہے ۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حق کی امداد کا حق خدا تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے ۔ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی جگہ بغیر مشیتِ الٰہی کے بارش نہیں ہوتی اور مینہ برسانے والا حقیقتاً امرِ الٰہی ہے نہ کہ ابر کا گھراؤ ۔ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) زمین کی سرسبزی اور شادابی رحمتِ الٰہی کا اثر ہے (۲) اہلِ نظر پر لازم ہے کہ اثر سے مؤثر پر اور صنعت سے صانع پر استدلال کریں اور صنعت واثر کی تہ کے اندر جو راز پوشیدہ ہے اس کو سمجھیں اور سوچیں کہ انسان کی ثانوی زندگی بھی زمین کی سرسبزی کی طرح ہے ۔ لَظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ الخ میں تعریض ہے اُن لوگوں پر جو تکلیف اور سختی پا کر ناشکری کرنے لگتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ہر بہار کے بعد خزاں اور ہر راحت کے بعد رنج لازم ہے ۔ مصیبت کے وقت نعمت کو بھول جانا نادانی ہے وغیرہ ۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ

(اے محمد) تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو آواز سُنا سکتے ہو جبکہ وہ پشت پھیر کر چل دیں اور نہ اندھوں کی گمراہی

الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ۧ اَللّٰهُ الَّذِيْ

ع ۱۳ / ۸

دور کر کے تم ہدایت کر سکتے ہو بس تم تو انہی کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں کو مانتے ہیں اور وہ فرماں بردار ہوں اللہ ہی نے تم کو

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا

کمزور حالت سے پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد توانائی دی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا

وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝

دیا جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے وہی جاننے والا صاحبِ قدرت ہے

تفسیر لوگ کہتے ہیں ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

لیکن یہ کوتاہ نظر رکھنے والوں کی نظر میں موت وحیات کا مفہوم ہے ۔ حقیقت میں انسانی بلکہ حیوانی زندگی کا بھی یہ مفہوم نہیں ۔ شاید نباتی موت وزیست کہنا اس کو صحیح ہو ۔ موت نام ہے ان خصوصیات کے فنا ہو جانے کا جو باری تعالیٰ نے ہر نوع کے افراد کو عطا فرمائی ہیں اور زندگی عبارت ہے نوعی خصوصیات کے بقا کا گھوڑے کی موت ہے خصوصیاتِ فرسیت کا فنا ہو جانا ، گدھے کی موت نام ہے حماری خصوصیات زائل ہو جانے کا پس اسی طرح انسانی موت نام ہے خصوصیاتِ انسانیت کے مرجانے کا ۔ آدمی مرتا ہے یعنی اس کی آدمیت مرجاتی ہے اگرچہ حیوانیت باقی ہو ۔ اگر اس کی حیوانیت بھی مرجائے تب وہ لاشۂ بے جان رہ جاتا ہے ۔ انسانیت اور حیوانیت دونوں مرجاتی ہیں ۔ اگر نعش سڑ گل کر خاک بن جائے اور اجزائے جسم پراگندہ ہو جائیں اس وقت اس پر نباتی موت بھی آجاتی ہے گویا تین موتیں آجاتی ہیں ۔ انسانی حیوانی اور نباتی ۔ حیوان سنتا ہے دیکھتا ہے سونگھتا ہے چھوتا ہے بولتا ہے اور انسان سے بھی ان افعال کی تکمیل ہوتی ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ حیوان کا سننا دیکھنا سونگھنا چھونا

جانا موقوف ہے۔ دماغ اور اعصاب کی مادی قوتوں کے برسر عمل آنے پر اور انسان کا سننا، دیکھنا، بولنا وغیرہ نام ہے ہوش کے گوش سے سماعت کرنے بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنے اور روحانیت کی زبان سے بولنے کا۔ جو انسان سنتا ہے مگر گوشِ روحانیت سے نہیں سنتا وہ گراں گوش ہے۔ جو شخص دیکھتا ہے مگر اس کی چشمِ بصیرت وا نہیں وہ اندھا اور مردہ بصر ہے اور جو آدمی بولتا ہے مگر اس کا نطق صداقت لال ہے وہ گونگا ہے۔ حیوانی سماعت حیوانی بصارت اور حیوانی عبارت کا نام انسانی سمع انسانی بصر اور انسانی نطق نہیں ہے۔ مادیت کی طرح روحانیت کی بھی یہ سب قوتیں ہوتی ہیں لیکن جس طرح حیوانیت اور مادیت کے مرنے سے انسانیت اور روحانیت مُردہ نہیں ہوتی۔ مادی قوتوں کی موت سے روحانی قوتوں کی موت لازم نہیں۔ اہلِ معرفت اور انسانِ کامل مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتے ہیں سنتے دیکھتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ مگر حیوانی قوتوں سے نہیں بلکہ انسانی قوتوں سے۔ ان کی حیوانی زندگی فنا ہو جاتی ہے۔ نباتی حیات مر جاتی ہے مگر انسانی زندگی باقی رہتی ہے۔ پس اسی طرح انسانی زندگانی مرنے سے حیوانی اور نباتی زندگانی کا مردہ ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ انسانیت اور روحانیت کے مرنے کے بعد بھی حیوانیت اور مادیت باقی رہتی ہے انسانی قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔

مگر حیوانی اور نباتی قوتیں برسرِ عمل رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مردہ روح (کافر) اگرچہ دیکھتا سنتا اور بولتا ہے۔ کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے، شعور رکھتا اور جانتا اور سمجھتا ہے لیکن اس کو مردہ، بہرہ، گونگا اور اندھا کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اس کی انسانیت مر جاتی ہے۔ وہ زندہ حیوان ہوتا ہے مگر مردہ دل اور مردہ روح فرزند ہوتا ہے۔ اس مختصر تمہید سے واضح ہو گیا اور یہ حقیقت بالکل عریاں ہو گئی کہ راہِ صداقت وہی دیکھ سکتا ہے جس کی روحانی آنکھیں بند نہ ہوں، جس کی روحانی بصیرت کور ہو اس کو کسی کی رہنمائی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ آوازِ حق اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس کے ہوش کے کان کھلے ہوں۔ حقانیت کی پکار کو وہ شخص ہرگز نہیں سن سکتا جس کے کانوں میں نغماتِ حق سننے کی طاقت نہ ہو۔ جو گراں گوشِ انسانیت ہو، جس کی انسانیت مر چکی ہو پس وہ کافر جو روحانی زندگی کے مالک نہیں اور جو لوازمِ انسانیت سے خالی ہیں وہ اندھے ہیں راہِ حق اُن کو سجھائی نہیں دے سکتی۔ وہ بہرے ہیں صداقت کی پکار نہیں سن سکتے۔ وہ مردہ ہیں اور ایسے مُردہ ہیں کہ ان کو کوئی افسوں کوئی معجزہ تبلیغ کی کوئی پکار نبوت کا کوئی صور زندہ نہیں بنا سکتا یہاں تک کہ شہنشاہِ رسالت کی وہ آواز جو آفاقِ ارض میں گونج رہی ہے، جو حجر و شجر کو بھی سنائی دے رہی ہے۔ ان مردوں کے کانوں میں نہیں پہنچ سکتی۔

بیرونی آواز اور خارجی دعوت کے علاوہ انسان کے اندر سے صداقت کی پکار ہر وقت آرہی ہے۔ ضعف و قوت کا تبادل، طاقت و کمزوری کا توارد، بچپن جوانی اور پیری کے تغیرات ہر آن اور ہر لحظہ کی مدتِ حیات کا بلند بانگ نعرہ، پکار پکار کر ربوبیتِ ربانیہ اور الوہیتِ الٰہیہ اور قیامتِ کبریٰ کا اعلان کر رہا ہے اور ہر ساکن و متحرک ہر ناطق و صامت اور ہر عاقل و احمق اس آواز کو سن رہا ہے لیکن ہر دو گانِ ازلی اور گرانِ گوشانِ سرمدی اس نغمۂ دل آہنگ کو نہیں سنتے۔

پس جو ہر آن اپنی طفولیت کی آواز کو (یعنی جوانی کی ندا کو اپنی) پیری کے بانگِ بلند آہنگ کو نہ سن سکتا ہو اور اپنے اندرونی تغیرات کے ہمہ گیر صورتِ حق کو سماعت نہ کر سکتا ہو وہ باہر کی آواز کو کس طرح سن سکتا ہے۔ مردہ سنتے ہیں زمین و آسمان اور عرش و فرش کی پکار بیکار ہے۔

تحلیلِ اعتراض — فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ۔ اس آیت میں مردوں بہروں اور اندھوں سے مراد وہ محرومانِ ازلی ہیں جن کی قسمت میں ایمان و ایقان کا ذرہ نہیں اور صداقت کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ آنکھوں سے تعمیر پر حکمت دیکھتی ہے، نہ کانوں سے ندائے صداقت سنائی دیتی ہے۔ پس وہ مردہ بصیرت ہیں اور مردہ فکر ہیں، مردہ نظر ہیں اور جس چیز کو حقیقتاً حیاتِ انسانی کہا جاتا ہے اس سے محروم ہیں۔ ان کی حیوانی زندگی اگرچہ موجود ہے آنکھوں سے ایسا ہی دیکھتا ہے جیسا دوسرے حیوانوں کو دکھائی دیتا ہے۔ کانوں سے ایسا ہی سنائی دیتا ہے جیسا دوسرے جانوروں کو سنائی دیتا ہے۔ ان کی مادی زندگی ایسی ہی ہے جیسی دوسرے بہائم کی ہے۔ مگر روحانی زندگی کا کوئی حصہ ان کو نہیں ملا۔ نہ دانشِ سلیم نہ چشمِ بصیرت نہ گوشِ ہوش گویا انسانی زندگی سے وہ یکسر محروم ہیں پس ایسے لوگوں کو وہ پیام سنانا وہ نصیحت کرنی وہ تصویر دکھانی اور وہ بات سمجھانی جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے بالکل بیکار ہے۔ بھینس کے سامنے بین بجانے سے کیا فائدہ ہے۔ ہاں جن لوگوں کو انسانیت اور نفسانی خواص کا کچھ حصہ ملا ہے، جن دماغوں میں سمجھنے کی انسانی طاقت ہے، جن کی آنکھوں میں انسانی بینائی کی روشنی ہے اور جن کے کانوں میں انسانی شنوائی ہے گویا جن کو انسانی زندگی سے کوئی بہرہ حاصل ہے اُن کو سُنانا درحقیقت سنانا ہے، کیونکہ ایسا سنانا مفید ہو سکتا ہے۔

آیتِ مذکورہ پر کم فہم غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ کافروں کو مُردہ اندھا اور بہرہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اُن کے پاس دانش و فہم اور چشم و گوش موجود تھے اگر سمجھنے دیکھنے اور سننے سے مراد ایمان لانا ہے اور کفار ایمان نہیں لاتے تھے اس لئے ان کو مردہ کہا گیا تو پھر اس کے کیا معنی کہ تم اہلِ ایمان کو سنا سکتے یا سناتے ہو اہلِ ایمان تو حسبِ ادعائے قرآن، پہلے ہی سنتے ہیں جو سُن رہا ہو اس کو سنانے کے کیا معنی۔ اس اعتراض کے جواب میں ہمارے مفسرین نے وہ دور از عقل تاویلیں کی ہیں جو تاویل ؟

کہلانے کی مستحق ہیں صاف بات وہی ہے جو ہم نے کہہ دی کہ قرآن نے کافروں سے لوازم انسانیت کو سلب کیا ہے نہ کہ خصوصیات حیوانیت کو لوازم روحانیت کی نفی کی ہے نہ کہ لوازم مادیت کی انسانی زندگی سے محروم بتایا ہے نہ کہ حیوانی زندگی سے (حیات کے مفہوم کی تحقیق ہم نے اوپر اسی پارہ کے کسی مقام پر کر دی ہے جس میں ہر جاندار کو زندہ ثابت کیا ہے لیکن ہر نوع کی زندگی کا مفہوم جدا جدا قرار دیا ہے مگر تشریح موجب طوالت ہے) پس کافروں کو اگر مادی آنکھیں مادی کان اور مادی فہم حاصل ہے تو اس سے ان کی انسانی زندگی ثابت نہیں ہو سکتی یہ کام تو حیوان بھی کرتے ہیں۔ وہ بھی دیکھتے سنتے اور کچھ نہ کچھ جانتے ہیں کیا جسم کے علاوہ روح کی آنکھیں روح کے کان اور روح کی سمجھ نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت آنکھیں تو روح کی ہی آنکھیں ہیں کان روح ہی کے کان ہیں اور فہم روح ہی کا فہم ہے۔ یہی انسانی خصوصیات ہیں انہی کی نفی آیت میں کی گئی ہے اور چونکہ کافران سے محروم ہیں اس لئے ان کو مردہ انسان (نہ کہ مردہ حیوان) قرار دیا ہے ہاں جن لوگوں میں لوازم انسانیت موجود ہیں انہی کو انسان کہا جاتا ہے اور انہی کو وہ پیام سنایا جا سکتا ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ کفار وہ کفار جو کسی طرح ایمان لانے والے نہیں درحقیقت مردہ انسان ہیں۔ اگرچہ ان میں حیوانی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور مومن وہ مومن جو اس وقت اگرچہ کافر ہوں لیکن ایمان لانے والے ہوں درحقیقت زندہ ہیں اگرچہ ان کی حیوانی زندگی کمزور ہو آنکھوں میں روشنی بھی کم ہو کان بھی بہرے ہوں دنیوی معاملات میں ہوشیاری بھی نہ ہو، بھولے بھالے اور سادہ لوح ہوں۔

بحث سماعِ موتٰے

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے مُردوں کے سننے نہ سننے کی تحقیق کی ہے۔ چونکہ یہ آیت پہلے بھی گزر چکی ہے اور وہاں ہم نے کمل تشریح کر دی ہے اس لئے اس جگہ پوری تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہاں کچھ تنقیح ضروری ہے۔

امام شافعی اور اہل علم کی ایک جماعت کا مسلک ہے کہ مُردہ سنتا ہے۔ عقلی توضیح تو ایسے بحث کی ممکن نہیں جس کی ابتدائی سرحد تک بھی انسانی دماغ کی رسائی نہیں۔ مابعد موت کے احوال کو عقل سے دریافت کرنا ناممکن ہے اور تاریکی میں تیر چلانا کوئی یقینی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ ہاں اگر وجود یا عدم کے ثبوت میں کسی چیز کو پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ اس معصوم محقق کائنات کا قول ہے جس کے پاس علوم قدسیہ اور معارف غیبیہ لے کر ایک فرشتہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا تھا۔ مابعد موت کے احوال خواہ سننے نہ سننے سے تعلق رکھتے ہوں یا سزا و جزا کی چلوگی سے مربوط ہوں یا کچھ اور ہوں اقوال نبویہ سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں، اس لئے علمائے اسلام نے عقلی گھوڑے دوڑانے کی بجائے اپنے اپنے دعوے کا نقلی ثبوت پیش کیا ہے۔

سماعِ موتیٰ کے قائلین اپنے قول کے ثبوت میں تین نقلی شہادتیں پیش کرتے ہیں (۱) وہ احادیث جو زیارت قبور کے متعلق وارد ہیں۔ ان سے ثابت ہے کہ حضور والا نے مردوں سے خطاب کیا۔ ترمذی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ حضور والا مدینہ کے قبرستان کی طرف سے گزرے اور فرمایا السلام علیکم یا اہل القبور مسلم نے بروایت ام المومنین عائشہ صدیقہ نقل کیا ہے کہ حضور اقدس نے بقیع میں جا کر فرمایا السلام علیکم دار قوم مومنین الخ اگر مردوں میں سننے کی طاقت نہ ہوتی اور وہ سن نہ سکتے تو حضور گرامی ان کو خطاب اور سلام کیوں کرتے (۲) حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا جب میت کو قبر میں رکھ کر اس کے آدمی پھرتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آہٹ اور کھٹ کھٹ سنتا ہے الخ اس حدیث سے سماعت میت ثابت ہوتی ہے (۳) بدر کی لڑائی ختم ہونے اور فتح یاب ہونے کے بعد حضور والا نے کفار قریش کی لاشوں کو (جو ایک گڑھے میں ڈال دی گئی تھیں) خطاب کرتے ہوئے فرمایا جو کچھ ہمارے رب نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا وہ تو ہم نے پا لیا کیا جو کچھ تم کو تمہارے رب نے وعید (عذاب) دی تھی اس کو تم نے بھی واقعی پا لیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ حضورؐ کیا یہ سنتے ہیں۔ ارشاد فرمایا تم ان سے زیادہ نہیں سنتے لیکن یہ جواب نہیں دیتے (متفق علیہا) ان تینوں احادیث سے سماعِ موتیٰ ثابت ہے۔

امام ابو حنیفہ آپ کے دونوں بابرکت شاگرد اور بکثرت علماء میت کو ناقابل سماعت قرار دیتے ہیں اور حضرت عائشہؓ کے استدلال کو اپنے قول کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں حضرت عائشہؓ بھی سماعِ موتیٰ کی قائل نہ تھیں اور آپ نے اپنے قول کے ثبوت میں آیت مذکورہ کو پیش فرمایا تھا اور واقعہ بدر میں جو حضورؐ نے کفار کی لاشوں کو خطاب فرمایا تھا اس کی تاویل اس طرح کی تھی کہ حضور والا کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ کفار سنتے ہیں بلکہ مقصود اصلی اس امر کا اظہار تھا کہ جو بات میں ان سے کہتا تھا اس کا حق ہونا ان لوگوں نے اب خوب جان لیا۔ قتادہ نے فرمایا کہ اللہ نے ان مقتولوں کو اخروی زندگی اتنی عطا فرما دی تھی کہ انہوں نے حضورؐ کا زجر آمیز کلام سن لیا۔

امام اعظمؒ اور دیگر احناف نے احادیث مذکورہ کا جواب اس طرح دیا ہے کہ بعض مواقع پر مُردوں سے خطاب کرنا اور ان کو کلام سنانا حضور والا کے خصوصیات میں سے تھا اللہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے رسول کا کلام سننے کے لئے مردوں کو سننے کی طاقت وقتی طور پر عطا فرما دے لیکن احناف کی اس تاویل سے قرع نعال والی حدیث کا جواب نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر میت کے متعلق ہے اور ہر مردہ کا دفن ہونے کے فوراً بعد اپنے عزیزوں اور دفن میں شریک ہونے والوں کی جوتیوں کی آہٹ کا سننا اس سے ثابت

ہے۔ اس کے علاوہ قبرستان میں پہنچ کر مردوں کو خطاب کر کے سلام علیک کرنے کا حکم عموماً ثابت ہے۔ ابن عباسؓ کی حدیث مذکور کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ حضورؐ نے اس کی تعلیم بھی دی
پھر چونکہ خصوصیاتِ رسالت میں سے یہ فعل ہو سکتا ہے۔ ہاں اصحابِ قلیب کو بدر کے روز خطاب کرنا ممکن ہے خصوصیاتِ رسالت میں سے یہ فعل ہو۔ لہٰذا احناف اگر اپنے قول کے
ثبوت اور مقابل کے استدلال کی نفی میں یہ کہیں تو میرے نزدیک بہتر معلوم ہوتا ہے۔ گو احادیث مذکورہ سے سماعِ موتیٰ کا عموم ثابت نہیں ہوتا یہ ہو سکتا ہے کہ جس چیز یا جس کلام کا
احادیث سے ثابت ہے بس مُردے اتنا ہی سنتے ہوں سلام کا خطاب اور جوتیوں کی آواز سے زیادہ سننے کی طاقت ان میں نہ ہو۔ یہ تاویل فقط امکانی نہیں بلکہ واقعی ہے کیونکہ
اگر کسی جگہ کسی مسئلہ میں نصِ قرآنی کا تعارض صحیح حدیث سے ہو جائے اور کوئی صورت توافق کی ممکن نہ ہو تو لامحالہ یا حدیث کو ترک کیا جائے گا یا صرف اسی کے مورد پر اس کو
محصور کیا جائے گا حکم کو عام نہیں قرار دیا جائے گا اور یہ تو ظاہر ہے کہ حدیث کی صحت ثابت ہونے کے بعد اس کا تعارض قرآن سے ممکن ہی نہیں قرآن کا عالم رسولؐ پاک سے بڑھ کر
اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ حضورؐ نے دیدہ دانستہ قرآنی صراحت کے خلاف کوئی حکم دیا ہو (جہالتِ رسول اللہ کا عقیدہ رکھنا تو کفر ہے) پس معلوم ہوا کہ حضورؐ
کا کلام اپنی جگہ پر ضرور صحیح ہے اور قرآنی صراحت بھی غلط نہیں ہے گویا قرآنی صراحت کا عموم رسولِ پاک کے فرمان کے علاوہ دوسرے مقامات پر ہونا لازم ہے۔ پس جب آیت
قرآنی سے ثابت ہے کہ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور حضورؐ نے فرمایا کہ مُردے سنتے ہیں تو لامحالہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ جس چیز کو سننا حضورؐ کے کلام سے ثابت ہے اس چیز کو مُردے
سنتے ہیں یعنی جوتیوں کی آہٹ اور سلام علیک وغیرہ یا اور جو کچھ احادیث میں آ جائے۔ اس کے علاوہ اور کچھ مُردے نہیں سنتے۔

رہی یہ بات کہ قرآنی آیت سماعِ موتیٰ کی نفی پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ مردوں سے مراد کفار ہیں نہ کہ واقعی مردے تو شوافع یا طرفدارانِ شوافع کی یہ تاویل قطعاً غلط ہے
اس کی تین وجوہ ہیں (۱) حضورؐ نے بدر کے دن کفارِ قریش کی مُردہ لاشوں سے خطاب فرمایا تھا جب از روئے آیت زندہ کفار نہیں سنتے تو مردہ کفار کیا سن سکتے ہیں لامحالہ کہنا
پڑے گا کہ بدر کے دن مردہ کفار کو خطاب کرنے سے مقصود ان کو سنانا نہ تھا بلکہ استقرار و عبرت کا اظہار مقصود تھا (۲) حضرت عائشہؓ نے تو آیتِ مذکورہ سے عدمِ سماعِ موتیٰ پر
استدلال کیا تھا اور کسی ذی علم صحابی نے اس استنباط کو غلط بھی نہیں قرار دیا گویا سکوتی اجماع ہو گیا کہ آیت کا مفہوم ضرور یہی ہے کہ مُردے نہیں سنتے۔ اس کے بعد کس کی مجال
ہے کہ اس مفہوم کو غلط قرار دے (۳) آیت مذکورہ میں موتیٰ سے مراد ضرور کفار ہیں اور سننے سے مراد ہے گوشِ ہوش سے سننا گویا موتیٰ سے مراد بھی حقیقی معنی نہیں ہیں اور سننے
کا بھی حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے دونوں جگہ مجازی معنی (خواہ بطورِ مجاز یا بطورِ استعارہ) مراد ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسا وصفِ مشترک ہے جو زندہ اور مُردوں کے درمیان
میں بطورِ اشتراک پایا جاتا ہے کیونکہ مجاز اور حقیقت میں کسی علاقہ کا تحقق اور مشبہ و مشبہ بہ میں کسی وجہ جامع کا پایا جانا ضروری ہے۔ شیر بول کر زید مراد لیا جاتا ہے کیونکہ شجاعت
جس طرح شیر میں پائی جاتی ہے اسی طرح زید میں پائی جاتی ہے۔ گدھا بول کر احمق مراد لیا جاتا ہے کیونکہ حماقت جس طور پر گدھے میں پائی جاتی ہے ویسی ہی بکر میں پائی جاتی ہے
بہرحال وصفِ مشترک اور علاقہ جامع کا تحقق ضروری ہے وہ وصفِ مشترک کیا ہے بے حس اور لاعلم ہونا۔ نہ بول سکنا نہ سننا نہ جواب دینا نہ دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ پس اگر مردے بے حس
اور لاعلم نہیں ہوتے اگر سنتے دیکھتے بولتے اور جواب دے سکتے ہیں تو پھر کافروں کی ان سے تشبیہ کیونکر ہو سکتی ہے۔ وجہ جامع تو مشترک ہی نہیں اور اگر اوصافِ مذکورہ کے علاوہ وجہ
جامع کچھ اور ہے تو وہ صراحتِ قرآنی کے خلاف ہے۔ آیت میں تو بے بصیرت، بے بصر اور مفقود السماع ہونے کو وجہ جامع قرار دیا ہے اور فرمایا ہے تم مردوں کو نہیں سنا سکتے تم
بہروں کے کانوں میں اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے۔ تم اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتے۔ گویا کافر مردہ بھی ہیں، بہرے بھی ہیں اور اندھے بھی ہیں۔ پس جس طرح بہرے نہیں سنتے اور اندھے
نہیں دیکھتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جس طرح مردے ان تمام اوصاف سے محروم ہوتے ہیں اسی طرح کفار کی بھی حالت ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جب ایک ہی آیت میں
کافروں کو مردہ، بہرہ اور اندھا کہا گیا ہے تو اس سے سماعِ موتیٰ کی نفی تو غیر ماخوذ قرار دی جائے اور اندھوں کا نہ دیکھ سکنا اور بہروں کا نہ سن سکنا ثابت سمجھا جائے۔ اگر مردے
سنتے ہیں اور آیت میں ان کے نہ سننے کی کوئی صراحت نہیں تو پھر کہنا پڑے گا کہ بہرے بھی گوش پر نیوش رکھتے ہیں اور اندھے بھی دیکھتے ہیں۔ ایک جگہ استنباطِ نفی کو غلط قرار دینا
اور دوسری جگہ استخراجِ نفی کو صحیح کہنا زبردستی نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے بے انتہا تعجب ہے موجودہ زمانے کے ان حنفی علماء پر جو بزرگوں کے مزاروں پر السلام علیک اور الفاظ
ماثورہ کہنے کی حد سے بڑھ کر داستانیں سناتے ہیں اور تمام ائمہ حنفیہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا ان کو نہیں معلوم کہ تمام علمائے احناف عدمِ سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں۔ کیا قبر پرستی
کے لئے شافعی مسلک کو اختیار کرنا اور دوسرے مسائل میں حنفی ہونے کا ڈھونگ کرنا تدین اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے۔ کیا یہ دورخی پالیسی اختیار کرنی ہوا پرستی نہیں ہے۔

وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۔ بہرے اگر سننے کی طرف توجہ کریں اور درمیانی آلات (تار برقی وغیرہ) بھی استعمال کریں اور سنانے والے بھی
اُن کو سنانا چاہیں تو ممکن ہے وہ کچھ سن لیں لیکن جس شخص کے کان پٹ بہرے ہوں اور وہ سننا بھی نہ چاہے بولنے والے کے لب ہلتے دیکھتے ہی پشت پھیر کر بھاگے تو ایسی صورت میں
کوئی بلانے والا اُس کو سنائی نہیں دے سکتی خواہ سنانے والا اس کو کتنا ہی سنانا چاہے۔ آیت مذکورہ میں بھی حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا ہے کہ کفار کی حالت پٹ بہروں کی طرح

ہے جو سننا بھی نہیں چاہتے اور پیٹھ پھیر کر گردن موڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے بہروں کو تم پکار نہیں سنا سکتے۔ کافر یہی کیفیت رکھتے ہیں۔ اہل قرآن کے گوش خوش ویسے ہی بہرے ہیں حقانیت کی آواز ان کے کانوں میں نہیں جاتی۔ پھر بے رخی بھی کرتے ہیں، تمہارے پیام اور کلام کی طرف ذہنی توجہ اور قلبی میلان نہیں رکھتے۔ ایسی حالت میں آوازۂ صداقت کا سننا ان کے لئے اور سنانا تمہارے لئے ناممکن ہے۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ۔ پہلے فقرے میں کافروں کی پیدائشی اور دوسرے فقرے میں گراں گوشی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس فقرہ میں مفقود البصر ہونا بیان فرمایا جس طرح گمراہ اندھوں کو صرف رہنمائی کر کے کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا بلکہ رہنمائی نہیں کر سکتا (جب تک ہاتھ پکڑ کر زبردستی نہ کھینچ لے صرف رہنمائی اندھے کے لئے مفید نہیں ہو سکتی) اسی طرح کفار کو صرف بتانے سے راہِ حق نہیں سوجھ سکتی (جب تک ان کو زبردستی کھینچ کر بے راہی سے نہ روکا جائے اور مجبور کر کے منزل مقصود پر نہ پہنچا دیا جائے صرف راستہ دکھانا کافی نہیں ہے اور چونکہ زبردستی کرنے اور کافروں کے اندر دیدِ حق کی طاقت پیدا کرنے کا اختیار رسول ﷺ کو نہیں دیا گیا تھا اس لئے محرومانِ ازلی کا لامحالہ حضور ﷺ کی ہدایت سے محروم رہنا ضروری تھا۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الخ۔ ہاں جو لوگ اللہ پر اور احکامِ الٰہیہ پر ایمان رکھنے والے ہیں (علم الٰہی میں آئندہ ایمان لانا ان کا موجود ہے ان میں ایمان لانے کی صلاحیت موجود ہے اگرچہ اس وقت وہ مومن نہ ہوں) ان کو کلامِ حق کا پیام سنانا مفید ہو سکتا ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ نکلا کہ آفاقی آثارِ قدرت کو جو نہیں سمجھتا جو نہیں دیکھتا نہیں سنتا جو ان تینوں لوازمِ انسانیت سے محروم ہے، جس میں ایمان کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس کو پیامِ حق سنانا سود مند نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ اگر آپ کی بات نہ مانیں اور ایمان نہ لائیں تو کبیدہ خاطر اور غمگین نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ازلی محروم ہیں اور محرومانِ ازلی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اب شبہ ہوتا ہے کہ پھر آپ کو نصیحت کرنے کا کیوں حکم دیا اور رسول کو کیوں مامور کیا گیا کہ پیامِ خداوندی کو کافروں تک پہنچا دیں تو اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ جو ایمان لانے والے ہیں ان کو پیام سننے سے ضرور فائدہ ہوگا۔ یعنی یہ تو معلوم نہیں کہ کون ازلی محروم ہے اور کس میں ایمان لانے کی صلاحیت موجود ہے۔ قابلِ ایمان لوگ بھی انہی کافروں میں ملے جلے ہیں اس لئے تبلیغِ احکام سب کو ضروری ہے لیکن کسی کے ایمان نہ لانے کا غم بے سود ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ الخ۔ قیامت اور حشرِ جسمانی کی ایک دلیل تو گزشتہ آیات میں بیان کی تھی جس کا تعلق خارجی موجودات سے تھا اور تغیراتِ کونیہ دکھا کر احاطۂ علم و قدرت ثابت کر کے وقوعِ قیامت پر استدلال کیا تھا۔ اس آیت میں انسان کے بدنی اور تخلیقی احوال کو بیان کر کے علم و قدرت کی ہمہ گیری ظاہر فرما کر یومِ بعثت کو ثابت کیا ہے غرض پہلی دلیل دلیلِ آفاقی تھی جو کسی قدر خفی تھی جس کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تاملِ ذہنی کی ضرورت پڑتی تھی اور یہ دلیل نفسی ہے جو پہلی دلیل سے زیادہ ظاہر ہے۔ احمق ترین آدمی بھی بغیر کسی خاص ذہنی توجہ کے اس کو سمجھ سکتا اور سمجھتا ہے۔ مفسرین کے نزدیک تمام مذکورہ میں ضعف سے مراد نطفہ ہے کیونکہ نطفہ سے آدمی کی تخلیق ہوتی ہے اور نطفہ بے جان چیز ہے اور بے جان سے زیادہ کمزور اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ضعف سے مراد ابتدائی تخلیقی ضعف ہو جو نطفہ کو بھی شامل ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں۔ جب تک آدمی کامل جوان نہ ہو جائے کمزوری اپنے درجات طے کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ قوت بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ آدمی پورا جوان ہو کر اپنی مزاجی اور فطری قوت کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ بے جان مٹی پانی آگ ہوا انفرادی حالت میں سب کمزوری کے پست ترین درجات ہیں۔ پھر انہی کی ترکیب اور تغیر سے غذا بنتی ہے اور پہلے سے زیادہ قوت کے درجہ تک رسائی ہوتی ہے۔ پھر آخری ہضم غذائی کے بعد جوہر معدی بنتا ہے جس میں پچھلے درجات سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔ پھر اس میں مردم آفرین باریک باریک کیڑے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں تخلیقِ انسانی کی پوری طاقت ہوتی ہے پھر نطفہ سے علقہ پھر مضغہ پھر ہڈیاں، عروق اور اعصاب و عضلات بنتے ہیں۔ پھر روح پڑتی ہے جان پڑنے کے بعد تمام گزشتہ درجات سے زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جو لحہ گزرتا ہے بدنی قوت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر تدریجی نمو کے ساتھ قوت بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر بلوغ کا زمانہ آجاتا ہے اور دیوانی جوانی آتی ہے۔ پھر جوانی رفتہ رفتہ ترقی کی آخری چوٹی پر پہنچ جاتی ہے۔ حاصلِ مطلب یہ کہ اللہ نے آدمی کو ضعف سے پیدا کر کے آگے کو ترقی دی یا نطفہ سے بنایا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً۔ پھر قوت کی تکمیل فرمائی ضعف کے درجات ختم کئے اور طبعی قوت کی آخری چوٹی پر پہنچا دیا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً۔ پھر قوت (جوانی) کے بعد ضعف اور پیری کو بھیج دیا۔ انتہائی جوانی کے بعد دورِ پیری آگیا۔ ادھیڑ ہوا، بڑھاپا آیا پھر بڑا بوڑھا آیا، بہت کمزور، بدن سست، عضلات ضعیف اور تمام اندرونی اور بیرونی قوتیں مضمحل ہو گئیں۔ یہ تو بدنی قوت و ضعف کی حالت ہوتی ہے دماغی اور علمی ترقی و تنزل کو بھی اسی پر خیال کرنا چاہئے۔ آخری جوانی تک دماغی قوتیں کمل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد ضعفِ دماغی شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جب آدمی

بدحواس ہو جاتا ہے تو دماغی قوتوں کا سارا نظام مختل ہو جاتا ہے۔ کوئی بات یاد نہیں رہتی نسیان کا غلبہ ہو جاتا ہے اور جاننے کے بعد آدمی انجان ہو جاتا ہے۔ غرض یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ الخ جو چاہتا ہے بناتا ہے جو اس کی مشیت ہوتی ہے پیدا کرتا ہے۔ اس کا علم اور اس کی قدرت ہمہ گیر ہے اور علم و قدرت ہی تخلیق کے اہم شرائط ہیں پس جب وہ اپنے ہمہ گیر علم اور محیط کل قدرت کے سبب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر سکے اور معادِ جسمانی محال ہو۔

مقصود بیان درحقیقت کفار اندھے ہیں بہرے ہیں مردہ ہیں واقع میں آنکھیں مومن کی آنکھیں کان مومن کے کان اور زندگی مومن کی زندگی ہے۔ ایمان سماعت ہے ایمان بصارت ہے، ایمان بصیرت ہے اور ایمان ہی حیات ہے۔ محرومانِ ازلی کو نصیحت بیکار ہے۔ لیکن چونکہ معلوم نہیں کہ کون ازلی بدقسمت ہے، اس لئے تبلیغ احکام بہرحال ضروری ہے۔ تغیراتِ عمر اور زوالِ قوت و ضعف دکھا کر معادِ جسمانی کا اثبات فرمایا ہے اور یہ بات بتائی ہے کہ واقع میں مادۂ انسانی کی تخلیق سے لے کر مرتے دم تک ہر آن قیامت بپا ہوتی رہتی ہے لیکن سوچنے والے فہم اور سمجھنے والے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ کہنے سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ خود مختار خالق ہے۔ ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانا اسی کا کام ہے۔ اس کی مشیت اسباب و شرائط کی بھی پابند نہیں ہے۔ العلیم القدیر کے الفاظ سے ضروری اسبابِ تخلیق کی موجودگی کی طرف ایما ہے اور یہ بات دکھائی ہے کہ تخلیق علمِ خالق کی وسعت اور اس کی قدرت کی ہمہ گیری کو چاہتی ہے اور خدا علیم قدیر ہے لہٰذا کوئی امر انسان کی تخلیقِ ثانوی سے مانع نہیں وغیرہ۔

وَيَوۡمَ تَقُومُ ٱلسَّاعَةُ يُقۡسِمُ ٱلۡمُجۡرِمُونَ مَا لَبِثُواْ غَيۡرَ سَاعَةٖۚ كَذَٰلِكَ كَانُواْ يُؤۡفَكُونَ ○

جس روز قیامت برپا ہوگی اس روز مجرم قسمیں کھائیں گے کہ ہم (دنیا میں) ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے اسی طرح یہ پھرے جاتے تھے

وَقَالَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡعِلۡمَ وَٱلۡإِيمَٰنَ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِي كِتَٰبِ ٱللَّهِ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡبَعۡثِۖ فَهَٰذَا

اور جن لوگوں کو علم و ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم تو اللہ کی تحریر کے موافق قیامت کے دن تک رہے ہو سو یہ قیامت کا

يَوۡمُ ٱلۡبَعۡثِ وَلَٰكِنَّكُمۡ كُنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ○ فَيَوۡمَئِذٖ لَّا يَنفَعُ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مَعۡذِرَتُهُمۡ

دن ہے لیکن تم نہیں جانتے تھے اس روز ان ظالموں کو ان کا عذر فائدہ نہ دے گا

وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُونَ ○

اور نہ ان سے توبہ طلب کی جائے گی

تفسیر اس زمین پر رہنے والے جزا سزا پر عقیدہ رکھنے کے اعتبار سے چار گروہ بنے ہوئے ہیں۔ (۱) ایک گروہ جس میں اس زمانہ کے علماء طبیعت اور دہریہ کو امامت حاصل ہے اور عرب کے عموماً کفار بھی شامل تھے وہ ہے جو اسی موجودہ زندگانی کو جانتا ہے۔ یہی شکوہ دکھ اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد دوسری زندگی یا اس زندگی کے اعمال کا نتیجہ اس کی نظر میں ہیچ ہے سزا جزا افسانہ ہے جنت دوزخ کا تصور خواب یا جنون ہے اور انسانی حیات کی غرض بس یہی عیش و آرام ہے (۲) دوسرا گروہ اہلِ فلسفہ کا ہے جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا قائل ہے۔ دنیا کو دار العمل جانتا ہے اور مرنے کے بعد جزا سزا ہونے کا قائل ہے۔ لیکن دوسری زندگی کو مادی نہیں جانتا۔ فلاسفر کہتے ہیں کہ تخلیقِ انسانی کی اصل غرض علوم و معارف کا حصول ہے۔ انسان کا نفسِ ناطقہ تمام عمر اسی کی کوشش کرتا ہے۔ مرنے کے بعد اگر تمام مادی آلائشوں سے پاک صاف ہوتا ہے تو قربِ الٰہی میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی اس کی جزا ہے اور اگر اس زندگی میں مادی کدورتوں سے اس حد تک آلودہ ہوتا ہے کہ علوم و معارف کا مزہ چکھنا اس کو کبھی نصیب نہیں ہوتا تو مرنے کے بعد لامحالہ وہ لذتِ قرب سے محروم رہتا ہے۔ لیکن چونکہ معارف کی چاشنی سے وہ پہلے سے ہی ناواقف تھا اس لئے قربِ خداوندی سے محرومی اس کے لئے مزید المِ دوری کا باعث نہیں ہوتا اور لطافت کاملہ کے حصول تک اس کو نہ کوئی دکھ ہو

ہے نہ شکوہ۔ ہاں اگر اس کی حالت متوسط ہو۔ یعنی علوم و معارف کا کچھ حصہ اس کو حاصل ہو گیا اور باقی اوقاتِ عمر مادی قوتوں کے زیرِ حکم بسر ہوئے ہوں تو مرنے کے بعد اس کو سخت دکھ ہوتا ہے۔ مادی آلائشوں کے سبب اس کا نفس پاک صاف نہیں ہوتا اور معرفت کا مزہ اس کو کچھ پہلے حاصل ہو چکا ہے اس لئے قربِ الٰہی سے محرومی اس کی تکلیف کا باعث ہو جاتی ہے۔ یہی اس کا عذاب ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ عذاب ثواب محض روحانی ہوتا ہے اور عذاب کی ایک مدت معین ہے۔ بالآخر سب کو قربِ الٰہی میسر آ پہنچتا ہے۔ (۳) تیسرا گروہ اہلِ تناسخ کا ہے۔ حکمائے اشراقیہ کا امام افلاطون اور سارے ہندو خصوصاً آریہ قائل ہیں کہ اس زندگی کے بعد دوسری تیسری چوتھی بلکہ ہزاروں زندگیاں اور بھی ہیں۔ سابقہ اعمال کا نتیجہ آئندہ زندگی میں بھگتنا لازم ہے۔ جو لوگ روشن ضمیر پاک باطن نفس کش اعمالِ ریاضت ہیں وہ تو اس خاکی پنجرے سے چھوٹنے کے بعد براہِ راست قربِ الوہیت میں پہنچ جاتے ہیں اور جو لوگ کثیف باطن بد اعمال سیاہ دروں اور خواہش کے پرستار ہیں ان کو مرنے کے بعد دوسری تحتانی زندگی اعمال کے موافق عطا کی جاتی ہے۔ مثلاً بداعمال دولت مند مرنے کے بعد جاہل کسان یا ذلیل شودر کا جنم لیتا ہے۔ بدمعاش بے ایمان ودیانت آئندہ زندگی میں مفلس اچھوت بن جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس زندگی میں جیسے کرتوت ہوتے ہیں آئندہ جنم چکر میں ویسا ہی انسانی جامہ اس کو ملتا ہے بلکہ انسان سے نیچے دوسرے حیوانات کے جسموں میں بھی انسانی روح تنزل کر کے پہنچتی ہے۔ اور اس سے بھی نیچے درختوں اور پتھروں تک میں بھی بطورِ سزا گرتا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب آخر میں پاک صاف بن جاتی ہے تو یہ عذاب کا چکر یا آواگون ختم ہوتا ہے اور بدلگا وایزدی تک روح کی رسائی ہوتی ہے۔ (۴) اسلام کہتا ہے کہ جزا و سزا جسمانی ہو گی۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی ملے گی اور سب کو ملے گی۔ جسدی ہوگا حشر کا ایک دن مقرر ہے اچھے برے کا فیصلہ بھی اسی دن ہو گا۔ اہلِ شقاوت کو کبھی عذاب سے رہائی ملنی ناممکن ہے۔ آواگون اور جنم چکر نہیں ہوتا۔ نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ جب سب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو بدبخت بد اعتقادوں پر سخت مصیبت پڑے گی اور وہ حشر کو قبل از وقت سمجھنے لگیں گے۔ کیونکہ عذاب کا برمحل اور بر وقت وقوع بھی گرفتارانِ بلا کو قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اہلِ ایمان چونکہ دنیا میں بھی صحیح علم اور درست اعتقاد رکھتے تھے اس لئے ان کو وقوعِ حشر قبل از وقت نہیں معلوم ہو گا وہ یقینی طور پر سمجھ اور جان جائیں گے کہ علمِ ازلی میں اللہ نے حشر کا جو دن مقرر کر رکھا تھا اس سے تعجیل ناممکن ہے۔ بعثتِ ثانیہ اپنے وقت پر ہوئی ہے۔ عذاب کو معجل سمجھنا اور وقوعِ حشر کو قبل از وقت جاننا علم کا نقصان اور فہم کی غلطی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَٰلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ۔ اوپر کی آیات میں بتایا تھا کہ چونکہ اللہ وسیع ترین علم اور کامل ترین قدرت رکھتا ہے اس لئے جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ قیامت بپا کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے سے کوئی امر مانع نہیں۔ پس دلیلِ عقلی سے ثابت ہو گیا کہ قیامت ضرور ہو گی لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کو ماننے سے کیا نتیجہ؟ اگر ہو گی ہو جائے گی۔ ابھی سے قیامت کا خیال ہر وقت قائم کر کے دل کو گھن لگانا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر قیامت کا انکار ہی کیا جائے گا تو کیا بگڑ جائے گا۔ اس کا جواب مذکورۂ بالا آیت سے نکلتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جس شخص کو قیامت پر یقین نہ ہو اس کو آخروی سزا جزا کا کوئی خیال نہ ہو گا اور مرتے وقت اس کو بے غمی چین اور اطمینان ہو گا۔ نہ قیامت کا فکر نہ عذاب ثواب کا خطرہ نہ دوبارہ زندہ ہونے کا احتمال لیکن جب قیامت کا دن ہو گا اور سارے آدمی دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اس وقت منکرینِ قیامت کو اچنبھا ہو گا حواس بجا نہ ہوں گے۔ ہیبت ناک سماں اور ہول انگیز منظر دیکھ کر دنیا یا عالمِ برزخ کا قیام ایک ساعت سے زیادہ معلوم نہ ہو گا جیتے جی تو دنیا کی حیاتِ چند روزہ پر ایسے مغرور تھے کہ دنیا میں رہنے کو دوامی سمجھے ہوئے تھے یا کم از کم روزِ آخرت کا ان کو احتمال ہی نہ تھا۔ اچانک قیامت کا وقوع دنیا کی زندگی کو ان کی نظروں میں ایسا حقیر و قلیل کر دے گا کہ سارا زمانۂ حیات یا قیامِ قبر ایک ساعت سے زیادہ محسوس نہ ہو گا۔ اس وقت اہلِ ایمان ان کو مطلع کریں گے کہ ایک ساعت رہنے کا دعویٰ تمہارا غلط ہے نوشتۂ خداوندی کے موافق قیامت اپنے وقت پر آئی ہے مگر چونکہ تم کو دنیا میں یقین نہ تھا اور وقوعِ قیامت کا انکار کرتے تھے اس لئے آج تم کو پریشانی کا سامنا ہوا اور گھبراہٹ کے سبب اس خیال کی نوبت آئی کہ قیامت قبل از وقت آ گئی۔ خلاصۂ جواب یہ نکلا کہ انکارِ قیامت کرنے والوں کو چونکہ غیر متوقع طور پر قیامت کا سامنا کرنا ہو گا اس لئے انتہائی ہولناکی ان کے حواس پر چھا جائے گی اور چونکہ دنیوی زندگی میں آخرت کی سزا جزا کے قائل نہ تھے اور اسی لئے ان کو آئندہ زندگی کی کچھ پرواہ نہ تھی قیامت کے دن اچانک عذاب کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش بجا نہ رہیں گے۔ اگر دنیوی زندگی میں قیامت کا یقین ہوتا تو یہ اچانک عذاب اور ناگہاں سزا کا اندیشہ ان کو بدحواس نہ کرتا۔ آیتِ مذکورہ میں قسم کھانے سے مراد ہے پختہ یقین کے ساتھ کہنا اور عدمِ قیام سے مراد ہے دنیوی زندگی کا عدمِ قیام یا عالمِ برزخ کا عدمِ قیام اور كَذَٰلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آخرت میں منکرینِ قیامت نے غلطی کھائی اسی طرح دنیا میں غلطی کھا کر بہکے رہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ۔ چونکہ علما و اہلِ ایمان کا یہ جواب یقینی طور پر ہو گا اور مومن عالم کا فیصلہ ہو گا کہ قیامت کے دن ضرور ایسا کہیں گے اس لئے صیغہ

ماضی تعبیر کیا یعنی مستقبل کو صیغہ ماضی سے تعبیر کرنا اس کے قطعی الوقوع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ۔ یعنی مومن علماء کافروں سے کہیں گے کہ تم فیصلہ الٰہیہ کے مطابق روز حشر تک زمین میں قیام پذیر ہے اللہ نے تمہارے قیام کی جتنی مدت مقرر کردی تھی وہ پوری ہوگئی اور:۔

فَهَٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ۔ اب روز حشر آگیا۔ لیکن تم کو یقین نہ تھا کہ قیامت بھی آئے گی۔ تم تو بعث کے قائل ہی نہ تھے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ۔ پس قیامت کے دن ظالموں کی کوئی معذرت مفید نہ ہوگی۔ نہ اُن کو توبہ کا موقع دیا جائے گا۔ توبہ کا موقع نہ دیئے جانے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں لوٹ کر جانے کا موقع ان کو نہ دیا جائے گا کہ وہاں دوبارہ جا کر توبہ کرلیں۔ دوسرے یہ کہ قیامت کے دن توبہ کرنے کا موقع اُن کو نہ ملے گا۔ استعتاب کے لغوی معنی ہیں کسی کو ایسا موقع دینا کہ وہ راضی کرلے اور قیامت کے دن ایسا موقع دینے کا یہی معنی ہیں کہ اُن کو توبہ کرنے کی فرصت دے دی جائے۔

مقصود بیان انکار قیامت کے ہولناک نتیجہ کا اظہار اور حقانیت قیامت کا عقیدہ رکھنے کی درپردہ ترغیب۔ کافروں کی بدحواسی کی صراحت۔ اس امر کی توضیح کہ کافروں کا خیال دین دنیا دونوں میں غلط ہوتا ہے۔ کنایۃً اس امر کا اظہار کہ کافر ظالم ہیں۔ کافروں کو قیامت کے دن توبہ کا موقع نہ ملنے کی صراحت اور ہر عذر کے مردود ہونے کی نص۔ درپردہ اس بات کی تعلیم کہ جو کچھ توبہ استغفار کرنا ہے دنیا میں اسی زندگی میں کرلیا جائے آخرت میں اس کا موقع نہ ملے گا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کردی ہے (اے محمد) اگر تم ان کے پاس کوئی نشانی لے کر آؤ تب بھی

الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ۝ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا

کافر کہیں گے کہ بس تم سب جھوٹے ہی ہو اسی طرح اللہ بے سمجھ لوگوں کے دلوں پر مہر لگا

يَعْلَمُونَ ۝ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ۝ ع

دیتا ہے (اے محمد) تم صبر کرو یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ یہ بے ایمان تم کو (تبلیغ احکام میں) کمزور نہ بنا دیں

تفسیر کبھی کسی موقع پر ایسا کلام یا جملہ بول دیا جاتا ہے جو پر مغز ندرت اور سہل الفہم ہونے کے سبب دل نشین ہو جاتا ہے اور سننے والوں کو بلا ارادہ یاد ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ مدت کے بعد اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو پہلے موقع سے ملتا جلتا ہے اور دونوں میں کچھ وجہ مشترک موجود ہے اور ثانی اول سے مشابہت رکھتا ہے تو لوگ وہی جملہ بول دیتے ہیں جو پہلے موقع پر بولا گیا تھا ایسے جملہ یا ایسے کلام کو مثل کہا جاتا ہے۔ مثل یا کہاوت سے بالاختصار بہت آسان طریقہ سے پورے واقعہ کی تصویر کشی ہو جاتی ہے اور طویل القول بیان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ تو مثل کی لغوی تحقیق ہے لیکن اس کے بعد اس لفظ کے استعمال میں اصل لغوی معنی سے بڑھ کر توسیع کی گئی یعنی مثل ہر اس قصہ کو کہنے لگے جس میں ندرت اور تعجب انگیزی ہو جس کو سننے والا متعجب ہو جائے اور اس کو خاص لذت آئے خواہ قصہ کے اندر کوئی جملہ بطور مثل نہ ہو اور خواہ بیانیہ قصہ سے پہلے کوئی واقعہ ایسا یا اس سے ملتا جلتا پیش نہ آیا ہو۔ بہر حال نادر اور تعجب آفرین قصہ کو توسیع محاورہ میں لا کر مثل کہا جانے لگا اس کے بعد اس لفظ کے اطلاق اور استعمال میں مزید توسیع کی گئی یعنی مثل کا اطلاق ہر اس کلام پر کیا جانے لگا جو پُر مغز اصلاح آفرین عبرت انگیز نصیحت آمیز مطابق حقیقت، سہل الاداء اور سہل القبول ہو نہ اتنا مختصر ہو کہ اصل مطلب فوت ہو جائے نہ اتنا طویل کہ سننے والا اکتا جائے۔ مشہور ہو اتنا کہ ادنیٰ اعلیٰ ہر ایک سن کر اس کو زبان زد کرلے اور دل نشین ہو ایسا کہ ہر شخص اس کو پسند کرے اور ہر آدمی کی دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے خواہ اس میں کوئی بھی جملہ مثلیہ یا تعجب انگیزی یا داستان گوئی نہ ہو قرآن پاک میں لوگوں کو ہدایت کے لئے بکثرت امثال موجود ہیں لیکن قرآنی مثل نمبر اول کے مفہوم سے خالی ہے کیونکہ اس کے اندر کوئی ایسا جملہ نہیں جو عربی زبان میں پہلے

سے مشہور ہوا اور قرآن نے اس کو استعمال کیا ہو۔ قرآن کی زبان اور طرزِ ادا الہامی اور ربّانی ہے۔ انسانوں کی بیان کردہ مثل اور طرزِ تعبیر سے یہ بالکل خالی ہے۔ ہاں عجوبۂ ہنر سویم کی مثلیت قرآن میں موجود ہے۔ اس میں بعض قصص کا اظہار بھی ہے۔ ندرتِ مضامین بھی ہے۔ اصلاح آفرینی بھی ہے۔ سہولتِ فہم سہولتِ ادا سہولتِ قبول اور دلنشینی بھی ہے۔ ایجاز غیر مخل اور اطناب غیر مملّ بھی ہے۔ حقائقِ کائنات کی تصویر کشی بھی ہے مگر رنگ آمیزیوں سے خالی اور علمی خزائن کا اظہار بھی ہے مگر سادہ طرز میں لیکن یہ ظاہر ہے کہ تمام عالم کے عجیب واقعات اور پر تکلف داستانیں قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ نہ قرآن داستانوں کی کتاب ہے اس لئے آیت مذکورہ میں۔

مثل سے مراد تعبیرِ بے نظیر کے معنی ہی ہیں۔ کیونکہ قرآن نے اصلاحِ علم وعمل اور نصیحت و وعظ کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر کافی روشنی نہ ڈالی ہو۔ سمجھانے کے لئے ٹھوس حقائق کو بھی بیان کیا۔ عامی دماغ رکھنے والوں کے لئے ترغیب و ترہیب سے بھی کام لیا طرزِ ادا بھی اچھوتا اختیار کیا۔ اصول و قوانین بھی کامل المنفعت بیان کئے۔ الغرض اس سے زیادہ بلیغ نافع پُر مغز سہل القبول اور سہل الفہم کلام ہونا ممکن تھا اور نہ ممکن ہے۔ اس لئے صحیح طور پر دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر قسم کی مثل اور تمام اصلاحی مادہ موجود ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ۔ مبحثِ معاد کے بعد مسئلہ رسالت کی تکمیل نہایت سادہ اور یقینی دلائل کے ساتھ ان آیات میں کی ہے۔ رسالت کی سچائی دو باتوں سے سمجھ میں آتی ہے۔ اوّل سب سے بڑھ کر اس پیام اور ہدایت نامہ کی خوبی پر نظر کی جاتی ہے۔ جس کو رسالت کا علمبردار لوگوں کے سامنے لاتا ہے اور زندگی کا دستور العمل بتاتے ہوئے کل جہان یا صرف اپنی قوم کو اس پر چلنے اور کاربند رہنے کا حکم دیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ اگر پیش کردہ ہدایت نامہ تمام آدمیوں کی حاجات کے لئے کافی نہ ہو اور انسانی جذبات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کامل رہنمائی نہ کرے۔ آدمی کے طبعی مدوجزر کے تمام احوال اور اخلاقی معاشرتی تمدنی ضروریات کی حد تمام کفالت نہ کرے تو وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کا مجموعہ اور آسمانی الہامی دستورِ زندگی نہیں ہوسکتا۔ پھر الفاظ اور عبارت کی رفتار، بندش اور ساخت کی لطافت خاص بھی قابلِ غور ہوتی ہے۔ ہر کلام سے متکلم کا پتہ چل جاتا ہے۔ شاہی کلام سے رعب داب بلند ظرفی اور عالی حوصلگی ٹپکتی ہے۔ ذلیل غلاموں اور پست معاشرت رکھنے والے چرواہوں کی بات چیت میں دنائت کم ظرفی اور ماحول کی پستی نمایاں ہوتی ہے۔ دانشمند کا کلام حکمت سے پُر ہوتا ہے اور بے وقوف کی باتوں سے حماقت مترشح ہوتی ہے۔ شہوت پرست آدمی کا کلام شہوانی خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور عفت مآب اشخاص کی گفتگو عصمت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ متین مزاج رکھنے والوں کے الفاظ میں سنجیدگی اور دلدادگانِ ہزل کی ہر تعبیر میں بیہودگی ہویدا ہوتی ہے غرض ہر ظرف سے وہی چھلکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ جب اصنافِ ناس کا کلام اپنے متکلم کا چاغماز ہوتا ہے تو اللہ کا کلام کیوں ذاتِ اعلیٰ کی نمائندگی سے خالی ہوسکتا ہے۔ الفاظ کا سہل ممتنع ہونا اختصار، حکمت آفرینی، ایسے مضامین کا اظہار جو کل عالم کے لئے ہر زمانہ میں رہبری کرسکیں متکلم اور مخاطب دونوں کی شان وحال کے مناسب ترتیب و ترغیب مباحث، برہانیہ کو تمثیلی رنگ میں ادا کرنا تاکہ ادنیٰ اعلیٰ سب ہی سمجھ جائیں۔ التزام کا وجود دکھا کر ہدایت کا اثر کو مخاطب کے دل نشین بنا مشکل ترین مباحث کو سادہ الفاظ میں ادا کرنا غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے خواص کلامِ الٰہی کے ہونے چاہئیں۔

دوسری بات جس سے صداقتِ نبوت کا اظہار ہوتا ہے معجزات ہیں۔ یہی وہ بینات ہیں جن سے حق واضح ہوجاتا ہے۔ اول الذکر بات کو آیت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ندرتِ مضامین، شہرت، سہولتِ فہم، دل نشینی، اظہارِ واقعات اور بعض دوسری خصوصیات کے سبب قرآن کو مثل قرار دیا ہے۔ غرض یہ کہ قرآن تمام ضروریاتِ بشریہ اور اصلاحاتِ عمرانیہ کو بیان کرتا ہے لیکن پُر پیچ اور الجھی ہوئی فلسفیانہ طرزِ عبارت میں نہیں بلکہ صاف ستھری سہل عبارت میں جیسے کہاوتیں ہوتی ہیں تاکہ عام فہم دماغ بھی اس کو بآسانی سمجھ کر قبول کرسکیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کا مفید اصلاحی پُر حکمت کلام سہل سادہ تمثیلی رنگ میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بیان کیا ہے۔

ذٰلِكَ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ۔ اس آیت میں صداقتِ رسالت کے دوسرے ثبوت کو بیان کیا ہے۔ ہم پہلے کسی مقام میں کہہ آئے ہیں کہ عام طبقہ والے ادب کے کلام کی ہدایت آفرینی حکمت آگینی اور اصلاح زائی کو بہت ہی کم دیکھتے ہیں، کیونکہ ان کے دماغ میں ان چیزوں کو سمجھنے کا سلیقہ ہی بہت کم ہوتا ہے۔ وہ اکثر اپنے عقائد رسوم اور معمولات کسی ہادی کے ہاتھ فروخت کرسکتے ہیں تو اسی وقت جبکہ علمبردار اصلاح کے اندر ان کو ایسی غیر معمولی طاقت نظر آجائے جس سے دوسرے تمام آدمی خالی ہوں، اسی لئے رب علیم نے ہر نبی کو کسی نہ کسی معجزہ کی طاقت مرحمت فرمائی تاکہ عوام کی تشفی ہو کہ غیر معمولی انسان ہونا ظاہر ہوجائے اور اس کی عظمت و صداقت کا اقرار کرسکیں لیکن یاد رکھو کہ نبوت اور سحر کی طاقت اور ان دونوں کے مظاہرات میں فرق کرلینا اور نبی کو ساحر سے ممتاز سمجھنا پست ترین ذہنیت رکھنے والے عوام کا کام نہیں ہے۔ عقلاء اور

اہلِ علم تو دونوں کے فرقِ عظیم سے واقف ہی ہیں۔ عوام میں سے وہ طبقہ اس امتیاز سے شناسا ہو سکتا ہے جس میں حق کو قبول کرنے کی کسی قدر صلاحیت ہے اور جو اخلاقی طہارت و نجاست اور روحانی لطافت و کدورت کے فرق کو سمجھ سکتا ہے۔ بالکل گندہ دماغ رکھنے والے انسان تا حیوان اس امتیاز سے واقف نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی نبی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو دانشمند طبقہ صرف پیامِ نصیحت کی حکمت آفرینی کو سمجھ کر ایمان لے آیا اور عوام نے غیر معمولی طاقت کے حامل ہونے کا ثبوت طلب کیا۔ نبی نے معجزات ظاہر کر کے اپنے کو غیر معمولی انسان دکھایا۔ پس ان عوام میں سے جن لوگوں کو زیرکی اور دانش وری کا کچھ بھی حصہ ملا تھا اور جو نبوت کی صداقت اور سحر کی کذب آفرینی کو سمجھ سکتے تھے وہ مومن ہو گئے۔ نبی کو انھوں نے سچا جان لیا اور اس کو مرسل من اللہ مان لیا لیکن بدترین نجس دماغ اور گندہ دہن رکھنے والے پھر بھی ایمان نہ لائے اور کہنے لگے تمہارے اندر غیر معمولی طاقت تسلیم۔ لیکن تم ساحر ہو۔ ایسے کام ساحر ہی کر سکتے ہیں۔ ان بے وقوفوں نے نبی کو جادوگر کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جو نبی کی صداقت کو مان چکے تھے ان کو جادو زدہ مسحور اور باطل پرست کہا اور سب کو غلط راستہ پر بتایا۔ رسولِ پاک نے بھی جب رسالت کا دعویٰ کیا اور قرآن کو پیغمبری کے ثبوت میں پیش کیا تو اہلِ دانش نے تو صرف قرآن کے مضامین کو سمجھ کر حلقہ بگوشی اختیار کر لی اور فوراً ایمان لے آئے۔ بے دانش گروہ نے معجزات طلب کئے اور اس گروہ میں سے جو کسی قدر اہلِ بصیرت تھے وہ معجزات دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ باقی رہے وہ اشخاص جو ازل سے محروم از بصیرت تھے اور جو انتہائی پلید فطرت اور معاند و سرکش دماغ رکھتے تھے انھوں نے معجزات واضحہ کو دیکھ کر کہنا شروع کر دیا یہ تو جادو ہے اور اس کو ماننے والے جادو زدہ باطل پرست ہیں۔ ایسے ہی کافروں کے حق میں خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں صراحت فرمائی ہے اور ان کی معاندانہ بے دانشی کی وجہ بھی ظاہر فرما دی ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ:۔

اگر اے نبی آپ ان کافروں کے سامنے کھلا ہوا نشان (نبوت کا) لے آئیں یعنی معجزہ پیش کریں تب بھی یہ مسلمانوں کو باطل پرست ہی کہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جاہلوں کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے (اسی لئے یہ معجزات کی بھی حقانیت نہیں سمجھتے اور نشانِ نبوت کو سحر کہتے ہیں) اب یہاں بحث طلب دو امر ہیں۔ آیت سے مراد کس قسم کا معجزہ ہے اور مہر لگا دینے کے کیا معنی ہیں۔ پہلے مطلب کی توضیح کے لئے سمجھنا چاہئے کہ حضور والا کے معجزات دو طرح کے تھے۔ ایک وہ جس کی معجز نگاری قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔ شاہدِ نبوت میں اول ترین مرتبہ جن کفار کی ہدایت کے لئے معجزہ کو پیش کیا گیا جس کا مقابلہ کرنے سے وہ عاجز رہے اور انتہائی شخصی اور اجتماعی طاقت صرف کرنے کے بعد ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہی کفار کے مقابلہ پر اس معجزہ کی معجز نمائی ختم نہیں ہو گئی بلکہ ظہورِ معجزہ سے قیامت تک جتنے انسان آنے والے ہیں اور جتنی علمی، مالی اور عملی طاقتیں ان کی ہونے والی ہیں سب کی سب اس معجزہ کے مقابلہ سے مع تمام قوت کے عاجز رہیں گے۔ گویا یہ معجزہ وہ ہے جس کی عجز انگیزی کا دوام ہے۔ اس معجزہ کا نام قرآن ہے۔ دوسری قسم میں وہ معجزات داخل ہیں جن کی معجز نمائی ایک وقتِ مخصوص تک باقی رہی۔ ظہورِ معجزات کے زمانہ میں روئے زمین پر اس قسم کی معجزہ نمائی سے قاصر رہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ آئندہ کبھی کوئی شخص اس طرح کا کام نہ کر سکے۔ مثلاً انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو جانا۔ جانوروں کا کلام کرنا۔ آئندہ واقعات کی قبل از وقوع اطلاع دے دینا وغیرہ۔ اس طرح کے معجزات ایک وقتِ خاص تک دعوت تصدیق دے رہے تھے لیکن بعد کو اولیائے امت سے بھی بڑی بڑی حیرت انگیز کارروائیاں ظہور پذیر ہوئیں لیکن اُن کو رسالت کا دعویٰ نہ تھا بلکہ وہ جبینِ رسالت کے ہی خوشہ چین تھے اس لئے ان کی محیر العقول کارفرمائیوں کو معجزہ نہیں کرامت کہا جاتا ہے۔ اول قسم کا معجزہ کفار سمجھ نہ سکتے تھے۔ باوجود عاجز ہو جانے کے پھر بھی نہ مانتے تھے اور دوسری قسم کے محسوس معجزات کے طالب ہوتے تھے اور جب اُن کی سمجھ کے مطابق ثانی الذکر معجزات بھی ظاہر کر دیئے جاتے تھے تب بھی راہِ راست پر نہ آتے تھے اور اپنی بدبختی قلب کے سبب ان کو بھی جادو کہتے تھے اور ان کے ماننے والوں کو باطل پرست بتاتے تھے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ میں فرما دیا کہ اگر ان کافروں کے سامنے نبوت کا نشان (یعنی دوسری قسم کے معجزات) آپ ان کی خواہش کے مطابق بھی ظاہر کر دیں تب بھی یہ لوگ اہلِ ایمان کو باطل پرست اور معجزہ کو جادو ہی کہیں گے)۔

(۲) دلوں پر مہر لگا دینے کے یہ معنی ہیں کہ تقدیرِ ازلی نے ان کو اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ حق کی بات جانیں اور مانیں۔ غیر مسلم مناظر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن خدا تعالیٰ کی ذات کو عیب دار کرتا ہے اور ایسی باتیں اس کی ذات میں مانتا ہے جن سے اس کی ذات ناقص اور عیب دار ہو جاتی ہے۔ مثلاً دلوں پر مہر کر دینا گمراہ کر دینا۔ اس اعتراض کے جواب میں معتزلہ سرگرداں بر بغیان وادیٔ حیرت میں گھومنے لگے اور بالآخر اس قسم کی صفات کا تحقق انھوں نے خدا سے سلب کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ خدا نہ گمراہ کرتا نہ دلوں پر مہر لگاتا ہے۔ رہا ان آیات کا حل جن سے خدا کا گمراہ کن اور مہر افگن ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس کے لئے انھوں نے دور از عقل تاویلیں کیں اور خوب ذہنی گھوڑے دوڑائے لیکن اہلِ حق نے نہایت معقول اور شستہ جواب دے کر اعتراض کی جڑ کاٹ دی۔ انھوں نے کہا کہ ہر ملک اور ہر زبان میں ہر متکلم کے محاورات مخصوص ہوتے ہیں جب تک ان کو نہیں معلوم کیا جاتا ایک سرسری نظر کا آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ دلوں پر مہر کر دینا درحقیقت آگے پیچھے گمراہی کی دیوار کھینچ دینا اعمال کے افعالِ ارادیہ سے اسباب کا گہرا پیدا

کرلینا مراد ہے جس کو بطور سرزنش کے بیان فرمایا جاتا ہے۔

حاصلِ مطلب یہ نکلا کہ معجزات واضحات دیکھ کر بھی روگردانی کرنے والوں کے متعلق خدا تعالیٰ کا دستور یہی جاری ہے کہ وہ اگرچہ اپنے مطلوبہ معجزہ کی کتنی ہی خواہش کریں معجزہ نہیں دکھایا جاسکتا کیونکہ تقدیر الٰہی نے اُن کو اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ (معجزہ دیکھنے کے بعد بھی) حق کی بات سمجھ سکیں۔

عیسائی عالم کہتا ہے کہ مسلمانوں کا قرآن خود پکار پکار کر مسلمانوں کے رسول کی کمزوری کو ظاہر کر رہا ہے اور اظہار معجزات کی قدرت کی نفی کر رہا ہے۔ جب قرآن خود صدورِ معجزہ کا منکر ہے تو پھر حاملِ قرآن کی رسالت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اس متعصب طبقہ نے خود اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر نہیں دیکھا۔ اس کو اپنے مذہبی اناجیل کا پہلے مطالعہ کرنا چاہئیے تھا۔ کیا اس کو نہیں معلوم کہ خود مسیح نے ایسے مواقع پر معجزات دکھانے سے انکار کیا ہے۔ دیکھیے انجیل متی کے باب ۱۲ کے شروع میں ہے (فریسیوں اور صدوقیوں نے آکے آزمائش کے لئے اس سے چاہا کہ ایک آسمانی نشان ہمیں دکھا اس نے جواب میں ان سے کہا الخ اس زمانے کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پھر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان ان کو دکھایا نہ جائے گا) قرآن پاک نے بھی جہاں اظہار معجزات سے انکار کیا ہے وہ اسی قسم کا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ الخ۔ جب جاہل آدمی مقابلہ میں شکست کھا جاتا ہے اور اس کی بات کو قابلِ توجہ نہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے تو اس وقت وہ ہر طرح کی بدکلامی دشنام طرازی ملامت ایذارسانی اور تکلیف دہی پر اتر آتا ہے اور خصوصیات جہالت کو ظاہر کرنے سے کسی طرح دریغ نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں اس کے مقابل کو انتہائی استقلال صبر استقامت اور سنجیدگی سے تمام پیش آمدہ مصائب کو برداشت کرنا اور تحمل سے کام لینا اور اللہ کی امداد پر بھروسہ رکھنا لازم ہے۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں رسول پاک کو بالواسطہ اور عام اہلِ ایمان کو بواسطہ رسول صبر و استقامت کا حکم دیا اور تسلی دیتے ہوئے صراحت فرما دی کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے یعنی دونوں جہان میں خدا تعالیٰ تم کو کامران و سرخرو رکھے گا۔ یقین رکھو وعدۂ خداوندی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ۔ یعنی اللہ نے آپ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کی تصدیق کرنے والے مسلمانوں کو کافروں کے مقابلہ میں اعلیٰ بنائے گا اور چونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اس لئے قطعی طور پر آپ ان سے بالا و برتر ہیں پس ایسی حالت میں (اگر موجودہ کمزور حالت کو دیکھ کر آپ سے تمسخر کریں اور ہنسی اڑائیں تو) آپ اپنے کو خفیف نہ سمجھیں۔ ان کے تمسخر کرنے سے آپ کے اندر ہلکاپن نہیں پیدا ہوسکتا یا یہ مطلب ہے کہ کفار کی ایذارسانی پر آپ صبر رکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کفار کی تکلیف دہی کے رنج و افسوس میں آپ کی قوتِ برداشت کمزور پڑ جائے اور آپ قبل از وقت کسی کام کے جلد ہو جانے کی تمنا کرنے لگیں۔

مقصودِ بیان قرآن پاک میں ہر قسم کے ہدایت آفرین اصلاح آمیز حکمت انگیز فلاح خیز مضامین کا بیان ہے۔ لیکن سہل اور دل نشین طرز ادا کے ساتھ بلاغت یہ ہے کہ قرآن تمام لوگوں کے لئے ہدایت نامہ ہے۔ اگر سہل الحصول پیرایۂ بیان نہ اختیار کیا جاتا تو اکثر لوگ مطلب قرآن کو نہ سمجھ سکتے اور اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ اس سے دو پہلو یہ مضمون مترشح ہوا کہ واعظ کے لئے آسان ترین طریقۂ ادا اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اہلِ دانش کو تو وعظ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ عقلی نصیحت عامی طبقہ پر ہوتا ہے اور فلسفیانہ اینچ پیچ کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ فرمائشی معجزات کا اظہار چونکہ بعض مواقع پر سودمند نہیں ہوتا اس لئے ہمیشہ اس قسم کی فرمائشوں کی تکمیل نہیں کی جاتی۔ کفار یعنی بے دانش کفار (چونکہ معجزہ اور سحر میں فرق نہیں جانتے اس لئے) معجزات واضحات دیکھنے کے بعد بھی راہِ راست پر نہیں آتے معجزہ کو سحر اور معجزات کو ملمع و تلبیس کو باطل پرست کہتے ہیں۔ تقدیر ازلی نے جن لوگوں کو ناقابلِ ہدایت پذیری بنا دیا ہے وہ کبھی راہِ ہدایت پر نہیں آسکتے۔ استقرار و حق پر جو مصائب نازل ہوں ان پر صبر رکھا جائے۔ اہلِ حق دونوں جہان میں کامران ہوتے ہیں۔ اللہ کا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا۔ اہلِ حق اگرچہ کمزور ہوں لیکن وہ اپنے کو ہلکا نہ سمجھیں اور کفر کے مذاق سے خفیف نہ ہوں۔ وغیرہ۔

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ لقمان　مکہ میں　نازل ہوئی　اس میں چونتیس آیات　اور چار　رکوع　ہیں

اس سورت میں ۵۴۸ یا ۵۴۹ کلمات اور ۲۱۱۰ حروف ہیں۔ قتادہ نے ساری سورۃ کو مکی کہا ہے۔ البتہ دو آیات مستثنیٰ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول ہے کہ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ سے عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ تک تین آیات مکی نہیں ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اکرمؐ کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے تو سورۂ لقمان و ذاریات میں سے کوئی کوئی آیت سنائی پڑ جاتی تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

الٓمّٓ یہ پر از حکمت کتاب کی آیات ہیں اُن نیکوکاروں کے لئے ہدایت و رحمت ہے جو جو ٹھیک ٹھیک نماز

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ

پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر خاص کر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ

اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں بعض لوگ بیہودہ قصوں کو خریدتے ہیں تاکہ خدا کی راہ سے بغیر سمجھے بوجھے

اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا

لوگوں کو بہکائیں اور اس کی ہنسی اڑائیں ان لوگوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ ذلت کا عذاب ہے جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی

وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

جاتی ہیں تو غرور کے ساتھ منہ پھیر لیتے ہیں گویا انہوں نے ان کو سنا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کانوں میں گرانی ہے تو ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے آرام کی جنتیں ہیں جن کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ نے

اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

سچا وعدہ کیا ہے وہی غالب اور حکمت والا ہے

تفسیر وہ ضوابطِ حیات جن کو بشری زندگی کے لئے لائحۂ کار اور دستور العمل قرار دیا جا سکتا ہے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انسانی اور آسمانی۔ دونوں قسموں کے ضوابط اپنے مخصوص انداز میں کائنات کی توجیہ کرتے ہیں۔ اشیاء کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ کسی کو خیر اور کسی کو شر قرار دیتے ہیں۔ اجتماع اور افراد کے تعلقات و اعمال کی ترتیبیں مقرر کرتے ہیں۔ اپنے کمال صحت، صلاح اور جامعیت کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہاں تک دونوں ضابطوں کے دعاوی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں کے ما بین کوئی مابہ الامتیاز طریقہ بھی ہونا چاہیے۔ انسانی اور آسمانی ہونے کا امتیاز کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ضابطہ سازوں نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے وہ پہلے تجرباتِ خیالات اور عقل کے اصولِ اولیہ کے خلاف تو نہیں ہے۔ اور ان ضوابط نے اشیائے اعمال اور اعمال کی جو قیمتیں اور اندازے مقرر کئے ہیں ان پر خیر و شر کے جو

احکام ملاحظہ ہیں اگر قرآن کے مطابق انسانی حیات کے رُخ کو پھیر دیا جائے تو زندگی میں کس قدر داخلی توافق پیدا ہو جاتا ہے اور ان ضوابط کو خود اپنے تعمیر کردہ مذہب کی تعمیر میں کس قدر دخل ہے۔ ظاہر ہے اور ہم ایک سے زیادہ مرتبہ پہلے لکھ بھی آئے ہیں کہ انسانی علم ہمہ گیر نہیں اس لئے انسانی ضوابط کائنات کی جو توجیہ کرتے ہیں وہ ہمارے تجرباتِ حیات و عقل کے اصولِ ابتدائیہ کے بالکل موافق نہیں ہو سکتی۔ نہ یہ ممکن ہے کہ انسانی ذہن نے اجتماعیت اور انفرادیت کو سُدھارنے کے لئے خیر و شر کے جو ضوابط مقرر کئے ہیں اگر انسانی حیات کے رُخ کو ان کے مطابق پھیر دیا جائے تو زندگی کے اعمال و افعال میں اندرونی توافق پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ زندگی کے اعمال و خواص میں داخلی توافق پیدا کرنا اجتماعیت و انفرادیت کو سُدھارنے کے لئے خیر و شر کے احکام لگانا اور تجربہ و عقل کے اصولِ اولیہ کے مطابق توجیہِ کائنات کرنا آسمانی ضوابط کا کام ہے۔

اس کے علاوہ انسانی اور آسمانی ضوابط میں یہ فرق بھی ہے کہ آسمانی ضوابط جا شیاء کی قدر و قیمت معین کرتے ہیں۔ اس کا دائرہ ساری کائنات کی ہستی پر حاوی ہوتا ہے اور ہم ضوابطِ آسمانی کا مطالعہ کرنے کے لئے مطلق ہستی اس کی نیت اور اس کے نصب العین کی طرف پہنچ جاتے ہیں اور انسانی ضوابط کا تعلق محض انسان کی اجتماعی اور انفرادی احوال سے ہوتا ہے۔ مطلق ہستی اور اس کے نصب العین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اس تمہیدی تقریر سے واضح ہو گیا کہ انسانی ذہن کے اختراع کردہ ضوابط ناقابلِ عمل ہوتے ہیں اور آسمانی ضوابط واجب العمل۔ واجب العمل ضوابط اور اٹل قوانین کا نام ہی کتابِ حکیم ہے۔ اس لئے کتاب کے معنی ہی مفروض واجب اور قطعی ہیں اور ان پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ پس کتابِ حکیم آسمانی ضوابط اور الٰہی قوانین کے اس مجموعہ کا نام ہے جس کے ہر حصہ پر عمل کرنا واجب ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کتابِ حکیم قرآن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آیاتِ مذکورہ یا زیادہ سے زیادہ عرفِ شریعت میں کتابِ حکیم سے مراد قرآن ہوتا ہے ورنہ کتابِ حکیم عام لفظ ہے۔ نہ فقط قرآن کا۔ قرآن اور فرقان کا فرق ظاہر ہے۔ قرآن یہی منطوق عربی کتاب ہے۔ جو رسول اللہ کی طرف اللہ کی طرف سے جبرئیلؑ کی وساطت سے نازل ہوئی اور بطور تواتر آج تک نقل در نقل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اور فرقان وہ قوانینِ نظریہ براہینِ کونیہ دلائلِ علمیہ شہاداتِ عقلیہ اور تجرباتِ حیاتیہ ہیں جو تخلیقی جبلی سرشت اور نیچرل طور پر خیر و شر کے معیار کو مقرر کرتے ہیں۔ انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو سُدھارنے کے قواعد بتاتے اور مقیدِ کائنات کا مطلق ہستی سے ربط ظاہر کرتے ہیں اور جن کی ساخت بناوٹ اور اختراع میں انسانی ذہن اور اس کی کاوشوں کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس فرقان کی تعبیری صورت کا نام قرآن ہے اور قرآن کے مغز کا نام فرقان۔ معنویت کے لحاظ سے قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے اور تعبیری اعتبار سے فرقان کو قرآن۔

یوں تو قرآن نے عام براہینِ کونیہ کی تعبیر اور ضوابطِ فطریہ کی ترجمانی کی ہے مگر مخصوص طور پر اس کے پیشِ نظر دو چیزیں ہیں۔ کائنات کے مطلق ہستی (خدا) سے ربط کو ظاہر کرنا اور انسانی حیات کو سُدھارنے کے لئے خیر و شر کے قوانین مقرر کرنا۔ جو لوگ قرآن کے مقرر کردہ احکامِ خیر و شر پر چل کر اپنی زندگیوں کو سُدھارتے اور کائنات کو خدا سے مربوط مان کر علم و یقین کے سانچے میں اپنے تمام احوال و افعال کو ڈھالتے ہیں وہ اہلِ احسان کہلاتے ہیں۔ یعنی حُسنِ فطرت کے پرستار محاسنِ تخلیقی کے حامل اور نیچرل خوبیوں کے مالک اور جو لوگ آسمانی اور قرآنی قواعد کی جگہ انسانی ضوابط کو دیتے ہیں۔ ذہنی اختراع ان کے نزدیک فرقانی صداقت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کتابِ منطوق و صامت کے خواہ دلائل اور اصول کو ان کی انانیت تسلیم نہیں کرتی۔ عقلی آزادی کے پاؤں میں رسم و رواج اور تقلیدِ اسلاف کی زنجیریں باندھ کر توہمات کے گھروں کو مطلق العنان کر دیتے ہیں اور یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ ان کا پُر نخوت دماغ براہینِ فطرت پر غور کرنا درکنار دعوتِ فطرت کو سننا اور آسمانی فطرت کی طرف کان رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسے آدمی اصحاب ہونے فریبِ نفس کے شیدائی اور حرماں نصیب لہو الحدیث کہلاتے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں گروہ میلانِ طبع یکرنگی احوال اور تکوین کے اعتبار سے غیر محدود آثار کے حامل ہوتے ہیں لیکن پھر بھی نمایاں اور واضح علامات ہر گروہ کی مندرجہ ذیل ہوتی ہیں۔ اہلِ احسان کے ذیلی اعمال سے قرآنی احکامِ خیر و شر کی پابندی اور عبادات میں خدا کی کار فرمائی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اصحابِ لہو کے افعال سے لہو پرستی توہم فریبی اور نیچرل قوانین سے سرتابی کا پتہ چلتا ہے۔ محسن گروہ اپنی زندگیوں کی تمام شاخوں میں تین نمایاں خصوصیات رکھتا ہے۔

(۱) دل اور روح کی نظافت کے ساتھ بدن کی شستگی کا بھی التزام کرتا ہے۔ حواس اور مشام کی طہارت کے ساتھ بدنی کپڑوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ وہ اپنے پُر نخوت سر کو غرور کے عرش سے انکسار کے فرش پر گرا دیتا ہے۔ معبودیت کے وہمی آسمان سے اُتر کر عبدیت کی زمین پر ناک رگڑتا ہے۔ عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرنے کے لئے معبود کے سامنے جھکا مہذب کھڑا ہوتا اور مؤدب بیٹھتا ہے۔ تمام عالم سے اُٹھا کر خالقِ عالم کی کبریائی کا عملی اقرار کرتا ہے۔ اس کی سجدہ گاہ پاک ہوتی ہے۔ ظاہری نجاست سے اس کا پیراہن پاک ہوتا ہے۔ باطنی کثافت سے ہر وقت کم از کم چند مقررہ اوقات میں وہ براہینِ فطرت کا مطالعہ کرتا۔ اللہ کی ہمہ گیر کار فرمائی کو سمجھتا سوچتا اور

ساری کائنات کی زنجیر کے دونوں کنارے (آغاز و انجام) اللہ ہی کے ہاتھ میں دیکھتا ہے۔ مطالعۂ فطرت سے توجہ ہٹانے کے وقت وہ علی الاعلان کہتا ہے سلامتی ہو تم پر اے
اے اہل کون (اس لئے کہ میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں کہ تمہارا رب ہر وقت تمہارا نگران او رکارفرما ہے) ہر دکھ اور ہر رنج سے بچاؤ ہو تمہارے لئے اے اہل مجلس (کیونکہ) معبود
کی قدرت ہر ذرہ میں جاری اور ساری ہے) یہ گروہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہوتا ہے اتنا کہ بڑے سے بڑے پر جبروت شہنشاہ کو بھی انسانیت کے
درجات و لوازم میں اپنے سے زیادہ نہیں جانتا اور منکسر المزاج ہوتا ہے اس قدر کہ ذلیل ترین نادار غلام کو اپنا ہم پلہ مانتا ہے۔ وہ ہر بڑے اور چھوٹے انسان کے دوش بدوش
اور شانہ بشانہ کھڑے ہو کر زندگی کی دوڑ میں مساوات کا اظہار کرتا ہے اس کے نزدیک کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی وجہ برتری حاصل نہیں۔ حکومت، وجاہت،
شہرت، عزت، دولت، صحت، طاقت، حسن اور ہمہ گیر سطوت سب اس کی نظر میں ہیچ ہوتے ہیں۔ اگر ذریعہ فوقیت کسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ تعلیم قرآنی کی زیادہ
سے زیادہ پابندی اور تقویٰ ہے اس لئے وہ سب سے زیادہ پابند قرآن کو اپنا لیڈر، رہبر، پیشوا اور مقتدا مانتا ہے۔ نہ فقط مانتا ہے بلکہ عملی طور پر اس کے ہر سکون و حرکت کی
نقل اور ہر فعل کی پیروی کرتا ہے۔ وہ اپنے لیڈر کی پیروی کرتا ہے اور اپنے لیڈر کی اطاعت کرتا ہے۔ سر سے ہاتھ سے پاؤں سے کھال سے بال سے دل سے جان سے اور
ضمیر و ایمان سے۔ خلاصہ یہ کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

(۲) یہ گروہ اپنے ہم عقیدہ بھائیوں کی امداد بھی کرتا ہے۔ چال ڈھال سے رفتار گفتار سے تمام جسمانی اعضاء سے وقتِ ضرورت بھائی کی مدد سے دریغ نہیں کرتا جب
ضرورت تمام مال اور کم از کم مال کا مقررہ حصہ اعانتِ فقراء میں صرف کرتا ہے۔ اپنے دماغی علمی خزانے اور صداقت و رشد کے جواہر پارے بھی ملتِ اسلامیہ سے بچا کر نہیں رکھتا
غرض دامے درمے قدمے سخنے جس طور پر بھی ممکن ہوتا ہے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اہلِ احتیاج کے کام میں لاتا ہے اور اس طرح طبقاتی خراشوں اور اجتماعی
ٹکراؤ کو ایک حد تک دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عالم جاہلوں کو اپنے علم میں حصہ دار بناتا ہے۔ مالدار گروہ ناداروں کی ناداری دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ طاقتور اعضاء رکھنے والے
کمزوروں کی خدمت اور اصحابِ صحت بیماروں کی تیمارداری اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ اس انسانی تصادم کو دور کرنے کی کوشش سے زمین کی پشت فساد سے پاک ہو جاتی ہے
دل کینہ و حسد سے صاف ہو جاتے ہیں۔ عالم کا امن تباہی سے بچ جاتا ہے۔ مال کنجوسی اور اسراف کے میل سے اور روح ہر بد اخلاقی کی کثافت سے پاک ہو جاتی ہے۔ غرض یہ
کہ یہ گروہ زکوٰۃ دیتا ہے۔

(۳) قرآن نے اشیاء کے جو خواص اور قیمتیں مقرر کی ہیں اور خیر و شر کے جو احکام لگائے ہیں یہ گروہ نہ فقط اُن کو جانتا مانتا اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے
بلکہ اس عالمِ تکوین کا جو بعدِ مطلق ہستی سے ہے اس کو سمجھتا سوچتا اور یقین کرتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ یہ احکام خیر و شر بیکار نہیں بلکہ ان
کی سزا جزا یقینی ہے۔ جس طرح ہر تکوین کا انجام یقینی ہے اسی طرح تکوینِ انسانی کا انجام بھی ایک روز ضرور ہونا ہے اور جس طرح کائنات کے آغاز کا کنارہ اللہ کے
کے ہاتھ میں ہے اسی طرح انجام کا کنارہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آغاز کا سرا چھوڑ دینے سے یہ عالمِ کون و فساد ظاہر ہوا ہے تو انجام کا کنارہ کھینچ لینے سے ہر چیز لوٹ کر وہیں
پہنچ جائے گی جہاں سے چلی تھی۔ غرض روزِ مکافات اور سزا جزا پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔

یہ تینوں خصوصی نشانات تو اہلِ احسان کے ہوتے ہیں۔ ان کے مقابل میں اصحابِ لہو الحدیث کی بھی تین ممتاز خصوصیتیں ہیں:-

(۱) اس گروہ کو احکامِ خیر و شر کا کوئی آسمانی علم نہیں۔ اچھائی برائی کا اندازہ نہیں صرف ذہنی اختراع اور من گھڑت کی پرستش اس کا شیوہ ہے۔ انسانی ساختہ
پرداختہ اقسانے غیر ممالک سے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ لوگوں کو انسانی افسانوں میں مشغول کر کے قوانینِ آسمانی سے روکتا ہے۔

(۲) آسمانی قوانین اس کی نظر میں ہیچ ہوتے ہیں۔ اصلاحی ضوابط اور اجتماعی بھلائی کو ممتاز کرنے والے الٰہی قوانین کا مذاق اڑاتا ہے۔ ان کو ہلکا سمجھتا ہے۔ انسانی
من گھڑت کو وزنی اور آسمانی حقائق کو خفیف سمجھنا اس کا کارنامہ ہوتا ہے۔

(۳) آسمانی قوانین اس کے نزدیک ایسے لچر اور مہمل ہوتے ہیں کہ ان کو کان لگا کر سننا بھی یہ گوارا نہیں کرتا۔ گویا جہلِ مرکب کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے۔ حق کو
باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔ انانیت اور غرور اس کو اجازت نہیں دیتا کہ انسانی مہملات سے آسمانی اصلاحیات کو وزنی سمجھے یا کم از کم ان کے ہم پلہ جانے بلکہ ہر وقت
اپنی انانیت میں مست رہتا ہے۔

یہ تینوں خصوصیات اصحاب لہو الحدیث کی ہیں۔ اول الذکر گروہ کی جزا دوامی جنات النعیم اور آخری گروہ کی سزا عذاب مہین ہے۔

(باقی دوسرے جزو میں دیکھئے)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۲۱

جزو ثانی

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں [illegible] سے باقساط ہر مہینہ شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے اصرار پر

بصورت پارہ

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک و مدیر ماہنامہ مولوی دہلی

نے برائے اشاعت معارف القرآن

وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی) سے شائع کیا

دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کیلئے عظیم الشان پروگرام

اللہ جل شانہٗ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ ہمارے ادارہ نے تفسیر بیان السبحان کی قسطوار اشاعت سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جس عظیم تبلیغی خدمت کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تفسیر بیان السبحان اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے ایک بے مثال تفسیر ہے۔ عام مسلمانوں اور علمی حلقوں میں کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اب تک اس کے چھبیس پارے قسطوار شائع ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ مستقبل قریب ہی میں پروگرام کے مطابق مکمل ہو جائے گی۔

تفسیر بیان السبحان کی قسطوار اشاعت میں ممبر حضرات اور عام خریداران نے اپنے دینی ذوق و شوق کے زیر اثر اس تفسیر کی پذیرائی میں جو حصہ لیا وہ بلاشبہ یقیناً حوصلہ افزا ہے اور اس ہمت افزائی اور مومنانہ تعاون کے لئے ہم ان کے بصمیم قلب شکر گزار ہیں۔

تفسیر بیان کی اشاعت کے دوران میں بہت سے محبین و مخلصین نے تحریر کیا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح و فلاح کے لئے اسلامی قوانین کی ایک جامع اور مستند انسائیکلوپیڈیا بھی شائع کی جائے تو بہت بہتر ہے تاکہ عام مسلمان اسلامی زندگی کے تمام مسائل سے واقف ہو جائیں اور ان کے مطابق عمل کر کے خود کو شرافت و انسانیت کا نمونہ بنا سکیں، ضرورت اور افادیت کے پیش نظر یہ مشورہ ادارہ کے لئے یقیناً قابل قبول ہے اور تبلیغ و اشاعتِ دین کا وہی جذبہ جو تفسیر بیان السبحان کی اشاعت کا محرک ہوا اس کارِ خیر کے لئے بھی محرک بن گیا، چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے فقہ اسلامی کی بہترین اور مستند کتاب فتاویٰ عالمگیری کے اصل عربی متن کو سلیس عام فہم اردو ترجمہ اور شرح کے ساتھ اجزاء کی صورت میں قسطوار شائع کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری

بلاشبہ عہدِ عالمگیری کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہے جسے اُس زمانہ کے سینکڑوں علمائے اُمت و مفتیانِ دین نے پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک عرصہ کی شدید کاوش و محنت کے بعد مرتب کیا تھا۔ درحقیقت یہ کتاب اسلامی دینی احکام و مسائل کی ایک عظیم الشان "انسائیکلوپیڈیا" ہے اور آج تک مسائلِ دینیہ میں مسلمانوں کے لئے دلیل و حجت اور مشعلِ ہدایت ہے۔ فقہ حنفی اس کتاب پر بجا طور پر فخر و ناز کرتی ہے۔

ضروری گزارش اور اپیل

تمام برادرانِ اسلام سے بالعموم اور اپنے مخلصین و محبین سے بالخصوص ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ اس اہم ترین دینی اور تبلیغی کام میں اپنے گرانقدر تعاون سے ہماری ہمت افزائی فرمائیں تاکہ یہ اہم بالتحقیق کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔

فتاویٰ عالمگیری مروجہ طریقِ کار کے مطابق بصورتِ اجزاء قسطوار شائع کی جا رہی ہے۔ ہر جزو دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ کاغذ سفید، رنگین دیدہ زیب ٹائیٹل سائز بیان السبحان کی طرح ۲۰×۳۰ کتابت و طباعت اعلیٰ اور معیاری ہوگی۔ ان خصوصیات اور خوبیوں کے باوجود ہر جزء کتاب کی قیمت دو روپے معمولی رکھی گئی ہے تاکہ ہر مسلمان اس نادر کتاب کو بآسانی خرید سکے محصول ڈاک قیمت کتاب کے علاوہ ہوگا۔ جو حضرات تفسیر بیان السبحان اور فتاویٰ عالمگیری کو ایک ساتھ منگانا چاہیں ان کو وی۔پی تین روپے پچاس پیسے میں روانہ کیا جائے گا۔ محصول ڈاک اس میں شامل ہے۔ الحمد اللہ فتاویٰ عالمگیری کے تین جزء شائع ہو چکے ہیں ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔

رعایتی تبلیغی اعلان

جو حضرات فتاویٰ عالمگیری کے مستقل خریدار بن کر اپنا نام ایک روپیہ فیس ممبری داخل کر کے بحیثیت ممبر درج رجسٹر کرا لیں گے ان کے ساتھ خاص رعایت کی جائے گی۔ یہ رعایت اس طرح ہوگی کہ ممبران کو کتاب کا ہر جزء مع محصول ڈاک صرف دو روپے میں بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا اس صورت میں خریداروں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ہر جزء کا محصول ڈاک جو تقریباً ایک روپیہ ہوتا ہے ادا نہ کریں گے بلکہ یہ محصول ادارہ خود ادا کرے گا۔ ہر ممبر کو فیس ممبری صرف ایک مرتبہ ادا کرنی ہوگی۔ ہم اپنے تمام محبین سے مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک روپیہ فیس ممبری روانہ کر کے اپنا نام رجسٹر ممبران میں درج کرا لیں اور اس رعایتی اعلان سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ کوپن منی آرڈر میں لفظ فیس ممبری فتاویٰ عالمگیری ضرور تحریر فرمائیں۔

وسیم بکڈپو، وسیم فائن آرٹ پریس، دیوبند (یو۔پی)

اکیسواں ۲۱ پارہ جزو ثانی

تحلیلِ اجزاء تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ کتاب حکیم سے مراد قرآن عظیم ہے۔ تلک سے اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو رسول پاک پر نازل کی گئی ہیں یا جن کو حضور اکرم لوگوں کے سامنے تلاوت فرماتے تھے۔ حکیم کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) حکیم بمعنی محکم کے یعنی جن آیات کو رسول اللہ تلاوت فرماتے ہیں وہ کتاب محکم کی آیات ہیں۔ شیطانی الہام اور انسانی وضع و اختراع کو ان میں دخل نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جو اصول نظریات اور قواعد ضوابط انسان کی انفرادی یا اجتماعی کاوشوں کے نتائج ہوتے ہیں وہ یا تو بالکل بے بنیاد اور حقیقت سے میلوں دُور ہوتے ہیں۔ ان کی بنا محض تخیل، توہم اور دماغی جولانی پر ہوتی ہے، لیکن کوتاہ نظر انسان ان کو حقیقی اور واقعی سمجھنے لگتا ہے اور اپنے زورِ بیان سے ان کو صادق اور حقیقت آفریں ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے یا ان میں کسی قدر واقعیت ہوتی ہے۔ اخلاق، مدنیت اور معاشرت کی اصلاح کے کچھ ذاتی سیچے قواعد ہوتے ہیں جن کو آدمی خود بناتا ہے، لیکن یاد رکھو کہ آدمی تمام دنیا کے احوال اور ہمہ گیریوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ عادات، رسم و رواج اور طبائع کا اختلاف جغرافیہ کا تفاوت، آب و ہوا کا تغیر اور اسی قسم کی متعدد چیزوں کا عدم اتحاد اس کے علم میں ہمہ گیری پیدا نہیں ہونے دیتا اور بغیر علم کی ہمہ گیری کے سب کے لئے تمام دنیا کے لئے مفید قواعد کی وضع ناممکن ہے۔ پھر کسی انسان کی نظر موجودہ حالات سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آئندہ کا کسی کو صحیح یقینی علم نہیں پس ایسی حالت میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی جسمانی اور ذہنی طاقتوں سے کام لے کر جن قواعد کو بناتا ہے ان کے منافع اگرچہ بالفعل نظر آتے ہیں، لیکن مآل کے لحاظ سے وہ مضرت انگیز ہوتے ہیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نجاتِ آخرت اور الٰہیات کا علم تو انسان کو کما حقہ اختراعی طور پر ممکن ہی نہیں۔ تاریکی میں تیر چلانا نتائج نہیں پیدا کر سکتا، اس لئے معاش و معاد کے متعلق واقعی یقینی مفید کار آمد اور ناقابل النسخ قوانین کی ساخت سوا خدا کے کوئی نہیں کر سکتا اور ایسے ہی قوانین کے مجموعہ کا نام کتاب محکم ہے۔ (۲) حکیم بمعنی پر حکمت کے یعنی وہ کتاب جو اسلامی ضوابط، صحیح اعمال اور سچے عقائد و نظریات کی حقیقی تصویر کشی کرنے والی ہے۔ اہل دانش کے نزدیک علم دو طرح کا ہوتا ہے جو ایک واقعیت سے خالی یا صحیح و غلط کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دوسرا جو صحیح طور پر حقائق اشیاء کا انکشاف کرتا اور کائنات کی واقعی تصویر دکھاتا ہے۔ مؤخر الذکر علم کو حکمت کہا جاتا ہے۔ قرآن پُر حکمت ہے یعنی اس میں مبدء و معاد اور کائنات سماوی و ارضی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ واقعی ہے اس میں غلطی کا احتمال بھی نہیں ہے۔ علوم عقلیہ اور فلسفہ کائنات کے علمبردار اگر قرآن کی سادہ اور طرزِ تعلیم کی شستگی و سہولت کو استخفاف کی نظر سے دیکھیں اور اپنی عقلی تحقیقات کے مقابلے میں تصریحات قرآنی کو غلط سمجھیں تو یہ ان کی کوتاہی نظر اور غلطی فہم ہے، قرآن نے اعیان خارجیہ اور موجودات ذہنیہ کا جو کچھ بیان کیا ہے وہ مبنی بر حقائق اور واقعی ہے۔ طبیعیات کے متعلق ہو یا ماقبل الطبیعیات کے نفسیات کی بابت ہو یا الٰہیات کے بہرحال قرآنی اظہار واقعیت سے خالی نہیں، مدعیانِ تحقیق کی نظریں وہاں تک پہنچیں یا نہ پہنچیں۔

خارجی واقعات اور حقائق کی تصویر کشی دو طرح ہوتی ہے جو ہو سکتی ہے۔ نمبر۱ اس کائنات کی واقعی تحقیق جو انسان کی مدنی، معاشرتی، اخلاقی اجتماعی زندگی میں مشعلِ راہ کا کام دے۔ تزکیۂ نفس، تنظیف روح، اصلاح، اعمال اور سعادت حیات اس سے وابستہ ہو اور بالآخر نجاتِ آخرت کا مدار اس پر ہو۔ نمبر۲ ارضی و سماوی اور فضائی موجودات کی ایسی توضیح جو ہو تو واقعی اور سچی مگر حیاتِ بشری کا مرکزی نقطہ بننے کی اس میں صلاحیت نہ ہو سوا دعوتِ نظر اور دماغی عیاشی کے اس کا کوئی حاصل نہ ہو۔ زندگی کے اصول اور دینیات کے ضوابط پر اس سے کچھ بھی روشنی نہ پڑتی ہو۔ مذکورہ بالا دونوں قسمیں حکمت کی شاخیں ہیں، لیکن ایک اُڑانِ بشری کے لئے سود مند اور دوسری بے نتیجہ۔ قرآن پاک پُر حکمت کتاب ہے، لیکن مؤخر الذکر شاخ سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے واقعات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، حقائق کا سچا انکشاف کرتا ہے، لیکن غیر مفید معارف سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حیاتِ بشری کو جن معارف نظری علوم سے اس کی کوئی وابستگی نہیں، مساحت ارض کی تفصیل، خلاءات، معدنیات اور نباتات کی کیمیکل تحقیقات، جغرافیائی حد بندیاں، اقالیم حارہ و باردہ کا امتیاز، ہر کرہ کی طبعی اور قسری حرکات کا اظہار۔ ہر کرہ کا دوسرے کرہ سے بعد اور اس کی تعیین فلسفۂ جذب و ثقل اجرام علویہ اور اجسام سفلیہ کے اجزاء تحلیلیہ و ترکیبیہ کی توضیح غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے مباحث سے موضوع قرآن کا براہ راست کوئی ایجابی یا سلبی تعلق نہیں، قرآن نے ان حقائق کونیہ کی تحقیق سے کہیں باز داشت نہیں کی جو ورزش فکر اور ضیافت نظر کے لئے کہیں کہیں مقصود ذاتی قرار دیتے ہوئے اہل عقل کو دعوت بھی دی ہے، مگر قرآن

کا اصل مقصد عقائد و اعمال کی اصلاح ہے۔ مبدء و معاد و الٰہی کائنات کے متعلق صحیح تعلیم اور عمرانِ بشری کے ضوابط کا اظہار اس کا مطمحِ نظر ہے۔ انسان کی انفرادی
اور اجتماعی زندگی کو سدھارنا، سماج و معاشرت کو فائدہ پہنچانے والی تعلیم کا پھیلانا، عالم کی بربادی اور تباہی پیدا کرنے والے طریقوں پر چلنے سے روکنا، ظلم اور
دست درازیوں کی بندش کر کے انصاف اور امنِ عام قائم کرنا اس کا مقصد ذاتی ہے۔ گویا یہ ہدایت نامہ ہے اور حیاتِ بشری کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ گم
گشتہ انسان کی رہنمائی کے لئے اسی لئے آیات الکتاب الحکیم کہنے کے بعد لفظ ھدًی کی صراحت فرمائی ہے۔

وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ۔ لیکن یاد رکھو کہ مشعلِ راہ سے ہر شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اندھے کے لئے تو سورج کی روشنی بھی بے سود ہے۔ جس میں دیکھنے
کی قابلیت ہی نہ ہو وہ کسی نور سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ قرآن ضرور ہدایت نامہ ہے۔ عمومی چراغ سرِ راہ ہے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ضوابطِ تعمیری کی وضاحت
کرنے والا ہے نیک اور بد دونوں گروہ نفع کر لیں، لیکن اس سے فائدہ وہی نیکوکار اطاعت شعار، عبادت گذار اٹھا سکتے ہیں جن کے ضمیر میں نیکی ہو جن کے اعمال
و اقوال میں حسن ہو، جن کے افکار و خیالات میں صحت ہو جن کے پیشِ نظر امورِ عملی حیات کا یقینی نتیجہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ اہلِ احسان ہوں۔ ذاتی اور صفاتی
خوبیاں ان کے اندر ہوں۔ ان کی ساری زندگی اور زندگی کے تمام ساعات و لمحات اللہ کی فرماں پذیری میں احسان (؟) اور جانکشی کے ساتھ گذر رہے ہوں
گویا خدا ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یا کم از کم ان کا یہ یقین اس حد پر پہنچا ہوا ہو کہ وہ ہر وقت خدا کے سامنے ہیں۔ یہی گروہ اربابِ احسان کہلاتے ہیں
یہی ہر خیر و خوبی کے حامل ہیں۔ پس ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن رحمتِ مجسم پیامِ نجات اور کفیلِ سعادت ہے۔ ھدًی کہنے کے بعد رحمةً الخ کہنے کا یہی مقصد ہے

اَلَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ یہ اربابِ احسان کی اجمالی تشریح ہے۔ اصحابِ خیر و صلاح کون لوگ ہیں، حاملانِ حسن میں کن صفات کا تحقق ضروری
ہے۔ وہ کیا محاسن ہیں جن کی موجودگی نیکوکار بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے جسمانی حرکات میں استقامت، مساوات، حریت، اخوت اور تنظیم کا مظاہرہ
ضروری ہے۔ نخوت، کبر، شقاقی، بے حقیقت تفوق اور استبداد و خودپرستی کی شکست لازم ہے۔ طہارتِ بدن، صفائیِ قلب، نظافتِ روح، شستگیِ افکار
اور کسوئیِ تخیل لابدی ہے۔ توجہ الی اللہ، مشاہدہ الٰہیہ (خشوع) کمالاتِ فطرت کے لئے کل سے رشتہ توڑ کر ایک سے تعلق جوڑنا غیر معمولی حقیقت رکھتا ہے
خلاصہ یہ کہ جسمانی تصفیہ اور روحانی اور ذہنی حرکات ترکیہ کینہ کا تابع ہونا اور عجز و فروتنی کے اقرار کے ساتھ انسانیتِ کبریٰ کے مرتبہ کو سب سے بالا ثابت کرنا ضروری
ہے۔ اس کی اصلاح و فلاح کا مظاہرہ نماز سے ہوتا ہے۔ یعنی نماز درسِ مساوات و اخوت ہے پیامِ حریت و استقامت ہے، نظافتِ روح و ابتہالات
جسم کا مظہر ہوتا ہے، اس لئے اہلِ احسان کے لئے سب سے پہلے نماز کی پابندی لازم ہے تاکہ روح و جسم کی پاکیزگی اور اصلاحِ قالب کے جذبہ کا اعلیٰ ترین عمل ظاہر ہو جائے

وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ۔ لیکن صرف شکلی خیر تری کے زیادہ مفید نہیں۔ جاہ کے ساتھ دام اور جسمی لطیفہ کی معیت میں مالی ہمدردیاں بھی لازم ہیں۔ فقط
جسمانی حرکات سے اخوت و تنظیم کا مظاہرہ اور مساوات کا عملی سبق پڑھنا بے مغز پوست سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تنظیم افراد و اقوام کے لئے مالی اعانت بھی
کم اہمیت نہیں رکھتی بلکہ شاید یہ بات حقائق مسلمہ میں سے ہے کہ فقراء، مساکین اور اہلِ احتیاج کی تنظیم کے بغیر تنظیمِ انسانیت ناممکن ہے۔ دنیا میں اہلِ فقر کی
تعداد میں ثلث سے بھی زیادہ ہے بھوکے اور ننگے ہی انسانی عمارت کے ستون ہیں۔ پس ان کے دلوں کو ہاتھ میں لینا، وقتِ ضرورت ان کی مدد کرنا اور ان کے
دلدر کو دور کرنے کے لئے مال صرف کرنا مال کی اس نجاست کو صاف کر دیتا ہے جو سفلہ و قوموں کے اندر ذلت کر کے ڈال رکھنے سے ہو جاتی ہے، اس لئے جو لوگ عالم میں حسن
پیدا کرنے کے خواہاں اربابِ حسن بننا چاہتے ہیں ان کے لئے اصحابِ ضرورت کی ہر طرح مالی امداد کرنا ضروری ہے اور اتنی ضروری ہے جس سے ان کا مال کنجوسی اور فضول خرچی کی
آلائش سے پاک ہو جائے۔ جس کا ادنیٰ ترین مظاہرہ زکوٰۃ شرعی (؟) کی شکل میں ہوتا ہے۔ یوں تو بغیر کسی حد بندی اور تعیین کے امدادِ فقراء لازم ہے، لیکن اگر
مکمل ترین اعانت نہ ہو سکے تو کم از کم فقراء کا ایک خاص حصہ تو مال میں سے نکالنا لازم ہے، اگرچہ یاد رکھو کہ :-

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ کسی کارِ خیر کا ظہور کسی نیکی کی رغبت اور کسی اصلاح و افادات کا تحقق بغیر اندرونی جذبہ کے نہیں ہو سکتا۔ جب تک داخلی عاطفہ
برسرِ عمل نہ ہو اس وقت تک کسی اچھے کام پر طبیعت میں ابھار نہیں پیدا ہوتا لیکن جذبہ میں ابھار کس طرح ہوتا ہے داخلی عاطفہ کے برسرِ عمل آنے کی کیا علت ہے؟ اس کی
دو وجوہ ہیں۔ ۱۔ انسان کے اندر فطرۃً رحم اور مہربانی کی قوت ودیعت رکھی گئی ہے۔ جب بیرونی محرکات اس میں تحریک کرتے ہیں تو وہ عملی مظاہرہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی
ہے۔ فقیروں کا فقر، محتاجوں کی احتیاج، یتیموں اور رانڈوں کی شکستہ حالی، بیماروں کی بے قراری، سماج کی بد انتظامی، سوسائٹی کی خرابی، اخلاق کی تباہی اور
انسانیت کی بربادی صاحبِ رحم آدمی سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہ تمام بیرونی محرکات اس کی قوتِ رحم کو ظہور پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر انسان کے اندر حصولِ منافع کی فطری خواہش

پنہاں رہے، اس لئے وہ لالچ کا بندہ بھی ہے۔ غرض کی آمیزش سے پاک ہو کر کبھی بھی اس کے اندرونی جذبات برسر ظہور نہیں آتے۔ بیرونی محرکات اگرچہ اپنا اثر ضرور ڈالتے ہیں پھر بھی وہ قوت کے فعل کے درجہ تک کامل طور پر پہنچا دینے سے قاصر ہیں۔ ہر صاحب خیر الذکر کا ہمہ کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ذاتی لالچ ضرور ہوتا ہے جو اس کو نیکی کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ بے لوث نیکی کا وجود عالم میں نہیں۔ شہرت، عزت و جلالت، دولت وغیرہ کا حصول یا جذبۂ محبت کے اقتضاء کو پورا کرنا یا رقتِ جنسیت کی خواہش کی تکمیل یا کم از کم مرنے کے بعد اچھے معاوضے کی تمنا، یہ وہ خیالات ہیں جو آدمی سے نیکی کا ظہور کراتے ہیں۔ انبیاء اور رسولوں میں بھی اس جذبہ اور اس تمنا سے پاک نہیں نظر آتے۔ نیکی کو صرف نیکی سمجھ کر بغیر کسی معاوضہ کی خواہش کے ادا کرنا دنیا میں مفقود ہے۔ اب حل طلب صرف یہ امر رہ گیا ہے کہ نیکی کے کس معاوضہ کی طلب اچھی ہے اور کس معاوضہ کی بری۔ شہرت، عزت، حکومت، دولت، راحت وغیرہ کے حصول یا اقتضاء محبت اور رقت جنسیت کی تکمیل کے لئے کوئی نیکی کرنی اچھی اور قابل مدح چیز ہے یا اجر آخرت کے لالچ میں نیکوکاری مستحسن فعل ہے۔ اہل دانش کا اجماع ہے کہ جس نیکی کا بدلہ لے لیا جائے وہ قابل قدر چیز نہیں رہتی۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ بغیر خواہش معاوضہ کے نیکی کا ظہور ہو نہیں سکتا۔ پس ہم کو گہری نظر سے دیکھنا ہوگا کہ آخر اہل دانش کے اس اجماعی قول کا کیا مطلب ہے۔ جب سمجھو کہ اجر کی طلب بری چیز نہیں اور بری چیز بھی ہے اس قدر کہ اس سے زیادہ بری چیز کا تصور بھی ناممکن ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ نیکی کرنی مخلوق سے معاوضہ حاصل کرنے کی خواہش لے کر انتہائی مذموم ہے۔ یہ بہیمیت، طمع نفس اور لالچ ہے جو ریا اور شہرت ہے۔ ہاں مخلوق کے ساتھ نیکی کرنے کا معاوضہ خالق سے طلب کرنا وجوبی امر ہے، پاکیزگی ہے، نظافتِ روح ہے اور طہارتِ نفس ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے اور طلب معاوضہ دونوں جگہ ہے۔ فرق خالق و مخلوق کا ہے۔ اسلام نے اجر آخرت کے جذبہ کے تحت ہر نیکی کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی لئے آخرت پر یقین رکھنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ اخروی حساب و کتاب اور اجر و عذاب پر ایمان رکھنا جزو ایمان بنایا ہے کیونکہ سخت ترین عذاب کا اندیشہ اور اعلیٰ ترین جزا کی تمنا ہی شر سے باز داشت اور خیر کے ارتکاب پر آمادہ کر سکتی ہے اور عذاب و ثواب کا اعلیٰ ترین مظاہرہ آخرت میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس زندگی کا عذاب و ثواب بھی بے حقیقت نہیں ہے، مگر اخروی جزا و سزا کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں، وہ دوامی ہے، یہ فانی وہ کامل ہے یہ ناقص۔ پس آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہوا کہ اہل احسان وہ لوگ ہیں جن کا ایمان آخرت پر ہوتا ہے۔ یعنی جو ہر دنیوی معاوضہ کی خواہش سے آزاد ہو کر نیکی کرتے ہیں۔ جو اپنی نیکوکاری کی جزا کسی مخلوق سے نہیں چاہتے۔ ان کے پیش نظر معاوضہ آخرت پر ہوتا ہے۔ اور خالق کا دستِ کرم، نیکی درحقیقت انہی کی نیکی ہے اور ایمان انہی کا ایمان ہے۔ رہے وہ لوگ جو صرف دنیوی لالچ کے پیش نظر نیکی کرتے ہیں اور جس کے ساتھ نیکی کرتے ہیں اس کے ساتھ معاوضہ کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ وہ درحقیقت نیکوکار نہیں لالچی ہیں، خود غرض ہیں۔ ہاں ایک گروہ وہ بھی ہے جو ادھر دنیا میں مخلوق سے بھی معاوضہ کا خواستگار ہوتا ہے ادھر آخرت میں خالق سے بھی اجر مانگتا ہے۔ اس گروہ کی نیکی بدی سے مخلوط ہوتی ہے۔ اگر دارین کی خوبیاں مالک سے ہی مانگی جاتیں تو کوئی حرج نہ تھا، مگر مخلوق سے معاوضہ کی تمنا تو کرمانہ حرکت ہے۔ پس قابلِ استحقاق وہ لوگ ہیں جو آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ مخلوق سے خواہش مند نہیں ہوتے صرف خالق سے نیکی کی جزا چاہتے اور ان کے پیش نظر صرف آخرت ہوتی ہے۔ دنیا میں خدا کچھ دے یا نہ دے اور دے تو ان کا نقطۂ نظر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ لفظ بِالْآخِرَةِ (جار و مجرور) کو يُوقِنُونَ (فعل) سے پہلے ذکر کرنے میں یہی نکتہ ہے۔ پھر لفظ هُمْ کا مکرر ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ جو لوگ مخلوق اور خالق دونوں سے اجر کے طالب ہوتے ہیں ان کے پیش نظر آخرت نہیں ہوتی یا آخرت کی اہمیت نہیں ہوتی، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن کا ایمان صرف آخرت پر ہے جو آخرت کی ہی تمنا میں ہر نیکی کرتے ہیں، درحقیقت وہی کامل طور پر آخرت کے [illegible] ہیں۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ۔ یعنی انفرادی اور اجتماعی، علمی اور اداری خوبیوں کے حامل (جن کی ادنیٰ ترین علامت ادائے صلوٰۃ و زکوٰۃ اور ایمانِ آخرت ہے) ہی شاہراہ صداقت و حقانیت پر گامزن ہیں۔ اس حیات میں انہی کو منتظم العالم کی طرف سے وہ قانون صلاح حاصل ہے جو ہر خیر اور ہر نیکی کا راستہ دکھانے والا اور سعادت انسانی کی منزل تک پہنچانے والا ہے۔ یہ ان کی ساری زندگی اور زندگی کے تمام ساعات و لمحات کے لئے لائحۂ عمل خداداد موجود ہے اور چونکہ خدا انسانی زندگی کے عملی اور علمی دونوں پہلوؤں کو معراج ترقی پر رفتہ رفتہ پہنچانے کا کفیل ہے یعنی رب ہے، اس لئے اہل احسان کی زندگیوں کا دستور العمل ان کو فائز المرام بنانے کیلئے ہے۔ پس درحقیقت ہدایت الٰہیہ پر یہی گروہ چل رہا ہے اور اس کی شاہراہ کے علاوہ ہر راستہ کج ہے۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ فلاح خیر و صلاح پر کاربند ہونے اور خداداد مشعلِ راہ کی روشنی میں چلنے والوں کی فائز المرامیاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہیں کہ دنیا اور آخرت کی فلاح کے دروازے انہی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دنیوی سعادت و کامرانی سے بھی بغلگیر ہیں اور اخروی کامیابی بھی ان کی آغوش میں ہے۔ سعادت درحقیقت انہی کی سعادت ہے کیونکہ سعادتِ عملی ان کو حاصل ہے اور فلاحِ دائمی کے حامل و اتبع یہی ہیں۔ کیونکہ ان سے بڑھ کر یا ان کے برابر کسی کو فلاح حاصل نہیں۔

ایک شبہ آیت ھم المفلحون حصر پر دلالت کر رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے والے اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہی فلاح پائیں گے ان کے علاوہ کسی کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔ حالانکہ ایسا واقع میں نہیں ہے کیونکہ فلاح دنیوی دوسروں کو بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ ارکان اسلامی حقیقت ایمان سے خارج ہیں اور نجات کے لئے صرف ایمان اقرار شہادتین کافی ہے پھر نماز نہ پڑھنے والے اور زکوٰۃ نہ دینے والے کس طرح فلاح اخروی سے محروم ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہوں۔

ازالہ ۔ فلاح سے مراد دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح ہے صرف دنیا کی فلاح مراد نہیں ہے۔ دنیا کی فلاح اگرچہ دوسروں کو بھی حاصل ہوتی ہے، مگر فلاح دارین کے مجموعہ سے مذکورہ گروہ کے علاوہ دوسرے لوگ محروم ہیں۔ ۲ آیت میں اہلِ فلاح کے تین اوصاف بیان کئے ہیں اور زکوٰۃ اقامت صلوٰۃ ایمان آخرت ان تینوں صفت کے مجموعہ کو فلاح یابی کی علت قرار دیا ہے۔ اور مجموعہ کے حاملین میں ہی فلاح کا حصر کیا ہے، لیکن اس سہ گانہ صفات میں اول الذکر دونوں اوصاف شرط کا درجہ رکھتے ہیں اور مؤخر الذکر صفت پر نجات کا مدار ہے بغیر یقین آخرت رکھتے ہوئے ہر عمل بےکار ہے۔ پس اس صورت میں نماز پڑھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے نجات سے محروم نہ ہوں گے بلکہ وہ بے نمازی اور بخیل محروم ہوں گے جن کا ایمان آخرت پر نہ ہوگا۔ ۳ فلاح سے مراد فلاح کامل ہے اور کامل فلاح انہی لوگوں کو حاصل ہے جو مذکورہ سہ گانہ صفات کے حامل ہوں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ مقابل مع اہلِ احسان کے خصوصی احوال اور ان کے ثمرات طیبہ کا بیان اوپر کی آیت میں کر دیا گیا۔ اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کے لئے آیاتِ قرآنیہ رحمت نہیں ہیں، جو اپنی نابینائی کی وجہ سے نورِ ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یوں تو اس گروہ گمراہ کے گوناگوں افعال اور چیدہ چیدہ قبائح ہیں جن کا حصر کسی خاص بیان میں نہیں کیا جا سکتا، لیکن مختصر طور پر اس طرح کہا جاتا ہے کہ ان احمقوں کی کم سے کم دو علامتیں ہیں۔ ۱ کھیل کی باتوں کو پسند کرتے ہیں وہ باتیں ان کو دل سے مرغوب ہیں جو حقانیت و صداقت کی طرف سے غافل بنانے والی اور انجام کی جانب سے مدہوش کر دینے والی ہیں۔ ۲ آیاتِ الٰہیہ اور احکام قرآنیہ کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ سنتے ہیں منہ پھیر کر چل دیتے ہیں، سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں۔ آیات تشریحی مطلب اور اس پر نظری تبصرہ تو ہم آگے کریں گے سب سے پہلے شانِ نزول بیان کر دینا ضروری ہے کیونکہ سبب نزول جان لینے سے آیت کے مفہوم پر خاص روشنی پڑتی ہے لیکن اس سے حکم کی خصوصیت نہ سمجھ لینی چاہیئے۔ شانِ نزول کی تخصیص سے حکم کے عموم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نضر بن حارث قریشی بغرض تجارت حیرہ (تخت گاہ عراق) کو جاتا تھا اور وہاں سے اہلِ فارس کو جھوٹے قصوں اور من گھڑت افسانوں کی بیہودہ کتابیں خرید کر لاتا تھا اور پھر مکہ میں اپنی نشست گاہ میں بیٹھ کر سب لوگوں کو جمع کر کے کہتا تھا کہ محمد تم کو عاد و ثمود کے پارینہ قصے سناتے ہیں۔ میں تم کو رستم و اسفندیار اور شاہانِ فارس کی حکایتیں سناتا ہوں۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ نضر بن حارث کچھ گانے والی چھوکریاں بھی خرید کر لاتا تھا اور شاہانِ فارس کے لغو منظوم قصے ان کو یاد کرا دیتا تھا پھر جب کسی کا اسلام کی طرف رغبت دیکھتا تھا تو اس کو اپنے گھر لے جاتا، مہمانی کرتا اور گانے والی چھوکریوں کو تلقین کرتا کہ اس کو شراب پلا کر گانا سنا دو اور بطور مشورہ کہو کہ کیا یہ عیش و عشرت تیرے لئے بہتر ہے یا وہ نماز روزہ اور جہاد جس کی تعلیم محمد دیتے ہیں۔ غرض اس تدبیر سے طالبانِ حق کے جذبہ حق پرستی کو دبانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی شخص کے حق میں آیاتِ مذکورہ کا نزول ہوا۔

آیاتِ مذکورہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ کھیل کی باتوں کو خرید کر لاتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بیہودہ باتوں میں مشغول کر کے راہِ حق سے روک دیں۔ باوجودیکہ ایسا کرنے والے ان بیہودہ افسانوں کی صداقت اور لغو باتوں کی حقانیت سے خود بھی واقف نہیں ہوتے اور انجام کار سے غافل بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی محض عناد و عداوت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ پھر ان کا جذبہ مخالفت اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بیہودہ افسانوں اور واہیات لغو باتوں کو آیاتِ قرآنیہ کے مقابلے میں پیش کر کے آیات کا مذاق اڑانا بھی چاہتے ہیں اس طرح ان کا جرم دوگونہ ہو جاتا ہے۔ ایک بلا وجہ گمراہ کرنے کا دوسرا آیاتِ حق کی توہین کا۔ مذکورہ حرکت سے تو ان کے جذبۂ عناد و عداوت اور مخالفتِ حق کا اظہار ہوتا ہے۔ رہی ان کی ذاتی نفرت اور حق و صداقت سے طبعی کراہت تو اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جب آیاتِ الٰہیہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں اور پیامِ الٰہی ان کو پہنچایا جاتا ہے تو ماننا اور عمل کرنا تو بجائے خود وہ اس کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ تکبر و اہی اور غرور نفس کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گراں گوش ہیں، انہوں نے سنا ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے

عذاب جہنم مضمون ہے۔

آیت مذکورہ میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے۔ یہ بحث تفصیل طلب ہے۔ ہم کسی قدر وضاحت سے بیان کرتے ہیں

نیشاپوری نے لکھا ہے کہ جو باتیں لغو اور بری ہیں وہ لہو الحدیث ہیں۔ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ (دین اور آخرت) کی طرف سے غافل کرنے والی چیزیں، بے فائدہ کلام، بے اصل باتیں، فضول قصے، ہنسانے والی حرکتیں اور لایعنی خرافات سب لہو الحدیث ہے۔ قرطبی نے کہا کہ لہو الحدیث یہی گانا ہے صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا گانا اور اس کی مانند چیزیں لہو الحدیث ہیں (رواہ البخاری فی الادب المفرد) ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر فرمایا گانا لہو الحدیث ہے (ابن جریر) ابن عمر کی حدیث میں آیا ہے کہ جو چیز بے فائدہ اور باطل خریدی جائے وہ لہو الحدیث میں شامل ہے (ابن مردویہ) حسن بصری، عکرمہ، سعید بن جبیر وغیرہم سے اسی مضمون کی روایات مروی ہیں۔ حدیث ابو امامہ میں وارد ہے کہ حضور گرامی نے فرمایا گانے والی چھوکریوں کی خرید و فروخت مت کرو ان کی تجارت میں بھلائی نہیں ہے۔ ان کی قیمت حرام ہے۔ ایسے ہی معاملہ میں آیت ومن الناس من یشتری لہو الحدیث الخ نازل ہوئی ہے (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والطبرانی والبیہقی وغیرہم) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور والا نے فرمایا اللہ نے گانے والی چھوکریاں، ان کا بیچنا، ان کی قیمت، ان کو (گانے کی) تعلیم دینی اور ان کے گانے کو کان لگا کر سننا سب حرام فرمایا ہے۔ پھر حضور نے آیت ومن الناس من یشتری لہو الحدیث تلاوت فرمائی (ابن ابی الدنیا و ابن مردویہ) ابن مسعود سے مروی ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا جس طرح پانی سبزی اگاتا ہے، گانا اسی طرح دلوں میں نفاق جماتا ہے (البیہقی، ابن ابی الدنیا، ابن مردویہ) حدیث ابی امامہ میں آیا ہے کہ حضور والا نے فرمایا کہ جو شخص گانے کی آواز اٹھاتا ہے اللہ اس پر دو شیطان مسلط کرتا ہے۔ وہ اس کے دونوں کاندھوں پر بیٹھ کر اور سینے پر دونوں ایڑیوں سے ٹھوکر لگاتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو (ابن ابی الدنیا و ابن مردویہ) اس روایت کی تائید میں ترمذی نے مرفوع حدیث بیان کی ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی مرفوع روایت ہے کہ حضور گرامی نے ارشاد فرمایا کہ مجھے صرف دو احمق فاجر آوازوں سے منع کیا گیا ہے۔ ایک آواز بوقت نغمہ لہو اور مزمار شیطان کی ہے۔ دوسری آواز بوقت مصیبت شیطان کی راگنی کی منہ نوچنے اور پیٹنے کی ہے (العین المستق) ابن جریر نے گانے کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے۔ مذکورہ اقوال تو ان لوگوں کے تھے جو تحریم غنا کے قائل ہیں۔ ذیل میں مجوزین غنا کے دلائل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے تاکہ اصل بحث پر کافی روشنی پڑ سکے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ انصار کی کچھ لڑکیاں اشعار پڑھ رہی تھیں۔ جب انہوں نے یہ شعر پڑھا کہ ہم میں اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ جو کل کو ہونے والی بات جانتے ہیں، تو حضور نے ان الفاظ سے منع فرمایا اور باقی کی اجازت دی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ لڑکیاں جنگ بعاث کے رجزیہ اشعار پڑھ رہی تھیں اور عید کا دن تھا تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ دف بجاتی اور اشعار پڑھتی تھیں۔ ایک حدیث میں کسی انصاری دلہن کے رخصت کے متعلق حضور والا نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا تم نے ساتھ میں غنا کیوں نہ کر دیا، انصار کو تو گانا پسند ہے۔ مذکورہ احادیث سے غنا کا جواز ثابت ہوتا ہے بلکہ ایک باندی نے تو منت مانی تھی کہ اگر جہاد سے حضور خیر و عافیت کے ساتھ واپس تشریف لائے تو میں دف بجا کر گاؤں گی جب اس باندی نے حضور والا سے اپنی نذر کا اظہار کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو نے نذر مانی ہے تو پوری کر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر گانا حرام ہوتا تو اس کی نذر ماننی اور اس کو پورا کرنا جائز نہ ہوتا کیونکہ اگر نذر گناہ ہو تو اس کو پورا کرنا جائز نہیں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں غنا کے متعلق مستقل ایک باب لکھا ہے جس میں حلت غنا کو بعض شرائط کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے اپنی مملوکہ باندی کا گانا سننا جائز قرار دیا ہے۔

فیصلہ فتاوی ظہیریہ، فتاوی سراجیہ اور فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے کہ بعض لوگ جو صوفی ہونے کے مدعی ہیں اور اپنی کمائی کو چھوڑ کر لوگوں کے مال کھاتے ہیں اور راگ گانا سنتے ہیں اور بعض اس پر رقص کرتے ہیں۔ یہ سب حرکات ممنوع اور حرام ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ مشائخ سلف سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔

نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ ایک کثیر جماعت کے نزدیک گانا حرام ہے اور بعض اس کو جائز کہتے ہیں۔ اور شرعی اصول میں یہ بات مصرح ہے کہ جس چیز کی حرمت و حلت میں اختلاف ہو اس کا ترک واجب ہے کیونکہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جو شبہات سے پرہیز کرتا ہے وہ اپنے دین اور آبرو کو

بچا لیتا ہے اور جو کوئی چراگاہ کے گرد گھومتا ہے اس کا اندر گھس پڑنا قریب الوقوع ہوتا ہے اور چراگاہ سے مراد محرمات الٰہیہ ہیں۔ لہٰذا اسماع غنا ترک کرنا واجب ہے۔

شیخ گنج بخش ہجویری چشتی نے کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ اگرچہ بعض مشائخ چشت کے نزدیک گانا سننا جائز ہے، لیکن جماعت کثیر چونکہ اس کو حرام جانتی ہے، اس لئے ہمارے نزدیک بھی ترک اولیٰ ہے۔ یہ اختلاف صرف اس غنا کے متعلق تھا جو بغیر معازف اور مزامیر کے ہو رہا وہ گانا جو مزامیر کے ساتھ ہو تو اس کو جائز کہنے والا امت اسلامیہ میں سے کوئی شخص بھی نہیں۔ تاشہ، باجہ، سہ تارا، دوتارا، ایک تارا، ستار، رنگین بانسری، بین، ڈھولک، طبلہ وغیرہ تمام آلات لہو ہیں۔ جن کی حلت علماء سلف میں سے کسی سے منقول نہیں (تفسیر احمدی) دف کا جواز بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے، مگر وہ بھی شادی یا عید یا جہاد یا کسی اور خوشی کے موقع پر۔ مزامیر کا جواز تو کہیں سے بھی ثابت نہیں بلکہ عمرو بن قرہ کی حدیث میں تو گانے کی کمائی کی ممانعت صراحۃً وارد ہے۔ حضور ؐ سے جب عمرو بن قرہ نے اجرت غنا کے متعلق دریافت کیا تو حضور ؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو حلال روزی دی تھی مگر تم نے حرام روزی کو پسند کیا اور حلال کو چھوڑ دیا (مشکوٰۃ) اب رہا اس حدیث کا جواب جس میں کسی باندی کا نذر ماننا اور حضور ؐ کا گانے کی اجازت دینا مذکور ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے مورد پر مقصور ہے اور خصوصی شان رکھتا ہے۔ اگر روایۃً اس کا ثبوت بہم ہو جائے تب بھی علت جامعہ نکال کر اس پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ نامحرم کا گانا سننا مجوزین غنا کے نزدیک بھی حرام ہے اور باندی یقیناً اجنبی تھی۔ اگر اس حدیث سے جواز غنا پر استدلال کیا جائے گا تو لازم ہو جائے گا کہ نامحرم عورت کا گانا جائز ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ الخ۔ اوپر کی آیات میں فدایان لہو اور پرستاران باطل کے اعمال خبیثہ اور ان کے انجام بد کا بیان ہے، اور نیکی کی طرف راغب بنانے کے لئے صرف بدکاری کا برا نتیجہ ظاہر کرنا ہی کافی نہیں۔ بلکہ نیکی کے ثمرات طیبہ کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے، اس لئے اصحاب باطل کے مقابلے میں ارباب خیر کے نتائج حسنہ کو بیان کرنا بھی لازم ہے۔ آیات مندرجہ میں اسی مناسبت سے نیکوکار اہل ایمان کے عیش دوامی کا ذکر کیا گیا ہے اور صراحت فرمائی ہے کہ جنات النعیم دوامی طور پر نیکوکار مومنوں کے لئے مخصوص ہیں، لیکن بعض کوردنفس کہہ سکتے تھے اور کہتے بھی ہیں کہ نو نقد نہ تیرہ ادھار، نقد کو چھوڑ کر ادھار کا سودا کرنا عقل کے خلاف ہے۔ جنت کس نے دیکھی ہے۔ پیش نظر عیش کو چھوڑ کر موہومی امید پر جینا اور راحت سے منہ موڑ کر صرف بہشت کے بھروسہ پر تکلیف اٹھانا اقدام نعل ہے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ نیکوکار مومنوں سے دوامی جنت کا وعدہ خدائی وعدہ ہے اور خدا کا وعدہ حق ہے یعنی امید موہوم نہیں ادعاء نفس نہیں۔ وعدۂ الٰہیہ کی صداقت ناقابل فسخ ہے، اس لئے عیش سرمدی سے منہ موڑنا اور عیش دوفانی کی طرف دوڑنا خلاف دانش ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ لیکن اتنی بڑی اور عظیم الشان نعمتیں جو احاطۂ حسیہ، دائرۂ سماع اور حدود تصور سے خارج ہیں۔ کس طرح ممکن ہیں، کہاں ہیں، کب ہیں، کس نے بنائے، کیسے بنائے۔ جو چیز عقل میں نہ آئے اس کو کیسے مانا جائے تو اس قسم کے شبہات، توہمات اور خرافات ہیں۔ اللہ سب پر غالب ہے۔ اس کا دائرۂ تصرف اور احاطۂ قدرت بہت وسیع ہے۔ تصور کی نارسائی سے احاطۂ قدرت سے خروج پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ رہی یہ بات کہ اہل ایمان کی کوششوں کا نتیجہ متقی اور کافروں کا عیش نظروں کے سامنے یہ فرق مراتب کیوں ہے اور اس میں کیا فائدہ ہے تو اس کے جواب کیلئے فقط یہ عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ اللہ حکیم ہے اس کا ہر عمل پر حکمت ہے۔ فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہر حال عمل الٰہی بے پایاں فوائد سے خالی نہیں ہوتا۔

مقصود بیان

لفظ کتاب سے اس طرف اشارہ ہے کہ قرآنی احکام ناقابل ترمیم ہیں۔ اس میں جو کچھ ہے قطعی اور یقینی ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا تعالیٰ اندھا دھند احکام قرآنی پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے، نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ قرآن محکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ اس کی تعلیم پر حکمت اور مبنی بر حقائق ہے اور وہ فقط حقیقت نمائی نہیں بلکہ راہ راست دکھانے والی اور طریقۂ سعادت بتانے والی، گویا تمام عالم کے لئے ہدایت نامہ ہے، لیکن اس کا فائدہ انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو عاملین محسن اور اخلاق حمیدہ کے مالک ہیں۔ پس قرآن اہل احسان کے لئے رحمت مجسم ہے۔ آیات میں اہل احسان کے تین اوصاف بیان کئے ہیں جن سے ان کی غیر معمولی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

جو چیز راہ خدا سے روکنے والی اور توجہ الی اللہ سے غافل بنانے والی ہے وہ حرام ہے، لہو الحدیث میں داخل ہے۔ آیات قرآنیہ کا مذاق اڑانا خواہ دل سے ہو یا دل لگی کے لئے، بہر حال کفر ہے۔ احکام قرآنیہ کے مقابلے میں سرتابی کرنا اور بطور استغنا منہ موڑنا بھی کفر ہے۔ اللہ کا وعدہ حق ہے، اس کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَبَثَّ

انہوں نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بنایا جن کو تم دیکھ رہے ہو اور زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ زمین جھک نہ پڑے اور اس

فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ۝

میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیئے ہم نے آسمان سے پانی برسا کر زمین میں ہر جنس کا نفیس سبزہ اگایا

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

یہ تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اب تم مجھے دکھاؤ کہ اس کے سوا اوروں نے کیا پیدا کیا بات یہ ہے کہ ظالم صریح گمراہی میں ہیں

تفسیر پروفیسر وہائٹ ہیڈ نے کائنات کی توجیہ مظاہر ازلیہ سے کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ مظاہر ازلیہ مجردہ امکانات ہیں جو غیر محدود ہیں۔ انہیں امکانات کی محسوس شکل کائنات ہے۔ ان غیر محدود مظاہر ازلیہ کی واقعیت اسی حد تک ہے جس حد تک یہ محدود ہو کر محسوس شکل اختیار کر لیں اور رونما ہو جائیں۔ ان کی رونمائی ہی ان کی واقعیت ہے۔ ان کی واقعیت کا مدار زمانی اور مکانی خصوصیات کی حامل ہونے پر ہے، لیکن ان غیر محدود امکانات میں سے کون رونما ہوتا اور واقعیت کا جامہ پہنتا ہے اور کون پردۂ خفا میں رہتا ہے۔ اس تحدید تعیین اور ترجیح کے لئے ایک محدد معین اور مرجح اصل کی ضرورت ہے۔ اور یہی اصل خدا ہے۔ خدا غیر محدود ممکن عالموں میں سے کسی ایک عالم کو ترجیح دے کر ان کو واقعی اور حقیقی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غیر محدود ممکن تعلقات میں سے مخصوص تعلقات کو ترجیح دے کر واقعی اور حقیقی بنا دیتا ہے، لیکن ایسا کیوں کرتا ہے۔ ترجیح کی کیا وجہ ہے، یہ اس سے کون پوچھے، کون سمجھے اور کون بتائے جس طرح اصل خدا دائرۂ تعقل سے خارج ہے۔ اسی طرح بے انتہا امکانات میں سے کسی ایک ممکن کو ترجیح دے کر رونما کرنے کی وجہ بھی غیر عقلی اور رسائی فہم سے بالا ہے۔

متکلمین اسلام کا قول بھی یہی ہے کہ مقدوراتِ الٰہیہ غیر متناہی ہیں۔ ممکنات کی کوئی حد نہیں۔ ان بے انتہا ممکنات میں سے جتنے ممکنات دائرۂ امکان سے آگے بڑھ کر فعلیت کی حد میں قدم رکھتے ہیں اور بالفعل موجود ہو جاتے ہیں۔ وہ سب محدود اور متناہی ہیں۔ متکلمین کے نزدیک غیر متناہی ممکنات پہلے دائرۂ واقعیت سے خارج نہ تھے، مگر صرف امکانی حالت میں تھے۔ وجود بالفعل کے بعد واقعیت بدستور قائم رہی، صرف امکان فعلیت سے بدل گیا۔ لیکن اصل سوال پھر بھی باقی رہا کہ بعض ممکنات کا وجود بالفعل ہو جاتا اور باقی کا پردۂ خفا یا دائرۂ عدم میں رہنا کیوں ہے، ترجیح کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب ان کے نزدیک بھی وہی ہے کہ جس طرح اصل خدا دائرۂ تعقل سے خارج ہے اسی طرح بعض ممکنات کے ظہور بالفعل کی وجہ ترجیح بھی فہم کی رسائی سے بالا ہے۔ تاہم اس گروہ نے اتنا جواب ضرور دیا ہے کہ چونکہ خدا صاحبِ ارادہ، مالک اختیار اور بے قید مشیت کا حامل ہے، اس لئے اس کا اختیار و ارادہ اور اس کی مشیت ہی وجہ ترجیح ہے۔ اس نے جو چاہا کیا اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مخفی رہنے دیتا ہے۔ کوئی اس سے بازپرس کرنے والا نہیں، لیکن اتنا جان لینا اور مان لینا ضروری ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کا استعمال بلا وجہ نہیں کرتا کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے کہ وہ غیر محدود ان گنت ممکنات میں سے بعض کو رونما کرتا اور بعض کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ ظہور کائنات کے کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں۔ اس کی حکمت مصالح سے خالی نہیں۔ خواہ عقل و فہم کو تخلیق ممکنات کے فوائد کلی طور پر معلوم ہوں یا نہ ہوں، مگر کسی چیز کا نیستی سے ہستی میں آنا بغیر فوائد کے نہیں پس :- جس نے آسمانوں کی عمارت بنائی۔ کب بنائی، کیسے بنائی، یہ بازپرس بیکار ہے۔ بظاہر تو کوئی ستون اور ٹیک نظر نہیں آتی جس پر یہ عمارت قائم ہو۔ اندرونی طور پر قوت جاذبہ ان کو قائم کئے ہوئے ہو تو ہو، لیکن قوت جاذبہ آنکھوں سے دکھائی دینے کی چیز نہیں۔ بہرحال کوئی وجہ اور سبب ضرور ہے۔ جو آسمانوں کی تخلیق کی علت اور بقا کا ذریعہ ہے۔ ہمارے لئے اس کی جستجو نہ فقط بے کار بلکہ ناممکن الحصول ہے۔ رہے فوائد تو ان کی تفصیل مندرجۂ بالا آیات میں اگرچہ نہیں ہے مگر دوسری آیاتِ قرآنیہ میں مذکور ہے۔

اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں قائم کیں ۔ کیسے ، کب ، کیوں اور کس مادہ سے ۔ یہ ناقابلِ حل سوالات ہیں ۔ البتہ ان کا نمایاں فائدہ یہ ہے کہ اگر یہ میخیں قائم نہ کی جاتیں تو زمین میں اضطرابی حرکات اور زلزلہ تھا جنبشیں ہوتیں ۔ انسانی آبادی کو قرار نہ ہوتا ، تمام جان دار مر جاتے ۔ راحت و سکون میسر نہ آتا ۔ یہ مصالح فطریہ ہیں جو پہاڑوں کی میخیں قائم کرنے کے لئے برہانِ الٰہی بلکہ دلیلِ انّی ہے ۔

اسی طرح زمین پر ہر طرح کے چلتے پھرتے جانداروں کو پھیلانا اور اوپر سے پانی برسا کر ہر قسم کی عمدہ سبزی پیدا کرنا حکمت بالغہ کے شواہد اور ربوبیت کاملہ کے واضح آثار ہیں ۔ صاحبِ ارادہ خدا کی قدرت اور اس کی الوہیت پر دلالت کر رہے ہیں ۔

بہر حال کائنات کو مظاہر ازلیہ سے تعبیر کیا جائے یا معدوداتِ غیر متناہیہ کا ایک حصہ قرار دیا جائے ۔ سب کی اصل مرجع منبع ظہور اور سرچشمۂ ایجاد ایک ہی ذاتِ والا صفات ، ایک ہی قادر اور ایک ہی بے قید مشیت کا حامل ہے ۔ اسی نے سب کو بنایا ، پیدا کیا ۔ جب یہ کائنات باجماع اہلِ دانش ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں تو وہی الٰہ مطلق ہے ، اسی سے ساری کائنات کا رشتۂ عبدیت تعلق عبودیت قائم ہے ۔ انصاف تو اس کے خلاف کسی قول کی اجازت نہیں دیتا ۔ اگر کوئی نا انصافی پر اُتر آئے تو یہ اس کی کھلی ہوئی گمراہی ہے ۔ مُظہِر کو چھوڑ کر مَظہَر کی طرف دوڑنا اور قادر کے ساتھ متعدد کو پکارنا واضح اور بدیہی ضلالت ہے ۔

تخلیقِ اجرامِ سماویہ

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔ اس سے اوپر کی آیت میں صراحت فرمائی تھی کہ اللہ غالب اور صاحبِ حکمت ہے ۔ یہاں اس کے غلبہ اور حکمت کی تفصیل پُر لطف طریقہ پر کرکے صنعت و ربوبیت سے صانع اور رب کی وحدت پر استدلال نہایت ہی بلیغ انداز بیان سے کیا گیا ہے ۔

آیت کا ترجمہ دو طور سے ممکن ہے ۔ اوّل اس طرح کہ غیر مرئی ستونوں کے اللہ نے آسمانوں کو بنایا ۔ اوّل صورت میں لفظ ترونہا عمد کی صفت ہوگا اور ضمیر منفصل ستونوں (عمد) کی طرف راجع ہوگی اور دوسری صورت میں لفظ ترونہا کا تعلق عمد سے نہیں بلکہ سموات سے ہوگا ۔ اوّل صورت پر آسمانوں کے ستونوں کی مطلق نفی نہیں ہوگی بلکہ ان ستونوں کی ہوگی جو آدمیوں کو دکھتے ہوں یعنی آسمان کے ایسے ستون نہیں جو آدمیوں کو دکھائی دیں ۔ ہو سکتا ہے کہ آسمانوں کو برقرار رکھنے والی ہمنی شکیں ہو جس کو قوت جاذبہ مقناطیسی کشش اجسام جو کچھ کہہ لو ۔ دوسری صورت میں مطلق ستونوں کی نفی آیت سے ثابت ہوگی یعنی تم دیکھتے ہو کہ آسمان کے لئے کسی قسم کا کوئی ستون نہیں یعنی مادی ستون نہیں لگی تو نبی آنکھ سے نظری ۔ قتادہ اور اکثر علماء تفسیر نے مؤخر الذکر ترجمہ کو پسند کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ آسمان کے لئے کسی قسم کا کوئی ستون نہیں یعنی مادی ستون نہیں لگی تو نبی آسمان کو اٹھائے اور برقرار کئے ہوئے ہیں ۔ اوّل الذکر ترجمہ ان علماء کو پسند ہے جو فلسفۂ کشش کے قائل ہیں اور ہر کرہ کی انطباقی وابستگی کی علت قوت جذب کو قرار دیتے ہیں ۔ بہر حال دونوں ترجموں سے اتنا تو ضرور ہے کہ آسمان کی شکل گول ہے ۔ کیونکہ کروی شکل ہی مادی ستونوں کی محتاج نہیں ہوتی ۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ۔ رواسی سے مراد عام اہلِ تفسیر کے نزدیک وہ پہاڑ ہیں جن کو میخوں کی طرح اللہ نے زمین میں گاڑ دیا ہے تاکہ زمین کو اضطراب نہ ہو ۔ اس سے زمین کی دوسری حرکت کی نفی نہیں ہوتی ۔ ہو سکتا ہے کہ زمین کروی حرکت کر رہی ہو یا ساکت ہو ۔ نہ کسی کا ثبوت نہ کسی کی نفی ۔ ہاں کائناتِ ارضی کو زلزلہ نما بے قراری اور اضطرابی حرکات سے محفوظ رکھنے کیلئے پہاڑوں کی میخیں قائم کی گئی ہیں ۔ اگر زمین جگہ جگہ ان میخوں سے جکڑی ہوئی نہ ہوتی تو یہ بات یقینی تھی کہ خود زمین کے اندر کے طرح طرح کے مادے گیس نما تبخیری کیفیت کے سبب ہر وقت زمین کو مضطرب رکھتے ۔ چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں پہاڑ کم ہیں اور ساحلی علاقہ ہے اور جزائر ہیں وہاں روک نہ ہونے کی وجہ سے بکثرت زلزلے آتے ہیں ۔ اگرچہ نادر طور پر پہاڑی علاقوں میں بھی آتشی مادوں کی کثرت کے وقت زلزلہ آتا ہے ، مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا بلکہ صرف اس وقت ہوتا ہے جبکہ زلزلہ انگیز تبخیری مادے کی مضطرب کن طاقت پہاڑوں کی قوتِ بندش پر غالب آجائے ۔ البتہ ساحلی اور جزائری علاقے میں زلزلہ پیدا ہونے کے لئے ادنیٰ محرک کافی ہوتا ہے ۔

عام اہلِ تفسیر نے اس آیت کا مطلب سمجھنے میں میری رائے میں غلطی کی ہے ۔ انہوں نے آیت کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ زمین کے اندر پہاڑوں کی میخیں قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین اپنی موجودات کو لے کر ایک طرف کو جھک نہ پڑے ۔ گویا زمین کو ہر قسم کی حرکت سے روکنے کیلئے پہاڑوں کی میخیں قائم کی گئیں چونکہ زمین کا احاطہ پانی نے کیا ہے اور پانی کی لہریں زمین سے ٹکراتی رہتی ہیں ۔ جن سے زمین کا ہلنا یقینی تھا ، اس لئے پہاڑوں کو پیدا کر دیا تاکہ زمین پر سمندر کی لہریں اثر نہ کر سکیں ۔ یہ مفسرین کی خوش فہمی ہے ورنہ اصل مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا کہ زلزلہ انگیز مضطرب کن حرکات سے محفوظ رکھنے کیلئے

پہاڑوں کی میخیں قائم کی گئیں۔

وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ آسمان دور ہے، زمین بھی بہت بڑی جسامت رکھتی ہے۔ پہاڑوں کا طول اور ارتفاع بھی احاطۂ نظر سے خارج ہے، اس لئے ان چیزوں کا مطالعہ وسیع النظر ہونے کا محتاج ہے، لیکن زمین پر چلنے پھرنے، رینگنے، اُڑنے والے جانور تو ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ بچہ، بڑا، جوان، بوڑھا، عورت، مرد، دیوانہ اور ہوشیار ہر ایک واقف ہے کہ پیٹ کے بل سر کنے والے جانور دو پاؤں چار پاؤں، ہزار پا اور ان گنت پاؤں سے چلنے والے جانور غرض ہر قسم، ہر نوع اور ہر صنف کے جانور کس قدر گوناگوں اور لاتعداد شکلیں، خواص، طبائع، فوائد اور تخلیقی کوائف کے حامل ہیں۔ ایک کی صورت دوسرے سے متحد نہیں، مزاج ایک نہیں، خصوصیت اور اقتضاء میں یگانگت نہیں۔ اللہ نے ان سب جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو زمین پر پھیلا یا تخلیقی لمز کا اتحاد اور انواع۔ صور اور خصوصیات کا باہم اختلاف ہے۔ اپنے اندر دعوتِ فکر کے بے انتہا خزانے رکھتا ہے۔

وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً کائنات علویہ اور قوتِ سفلیہ اور نفوس حیوانیہ اور ان سب کے خصوصیات تو دعوتِ نظر دے رہے ہیں۔ ذرا نفوسِ حیوانیہ سے نیچے نظر دوڑاؤ۔ دیکھو اور غور کرو کہ اللہ اوپر سے پانی برساتا ہے۔ پانی کا اصل مرکز نیچے ہے اوپر کہاں سے آیا۔ ابر سے یا اسبابِ سماویہ سے۔ اس کی پیداوار علیحدگی کیوں کر ہوئی، اس کے اصل اسباب کیا ہیں۔ یہ غور طلب مباحث ہیں۔ پانی کا اوپر سے نیچے اتارنا طالبِ حکمت اور خواستگار نظر ہے۔

فَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ۔ پانی کا اوپر موجود ہونا اور پھر اوپر سے نیچے اترنا بجائے خود خزانۂ حکمت تھا، لیکن ذرا پانی کے نزول کی غایت اور فائدہ انگیزی پر غور کرو۔ کیسی کیسی عمدہ چیزیں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ زمین میں انسان بھی ہیں دوسرے جانور بھی ہیں۔ سبزہ بھی ہے، ہر طرح کے گل بوٹے بھی ہیں اور سب کی پیداوار اور روئیدگی اور بالیدگی پانی سے ہے۔ پانی کی نوعیت، خاصیت اور لوازم کا تبدل اور عنصریت سے ترکیب مزاجی کی طرف انتقال اپنے اندر اعجوبہ کاری کے کس قدر اسرار مخفی رکھتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پانی سے سبزہ ہوتا اور بڑھتا ہے۔ ہر جانور زندہ ہوتا اور رہتا ہے۔ قانونِ فطرت ہی یہی ہے کہ پانی پر انواع نبات و حیوان کا نشوونما موقوف ہے، لیکن اس امر پر غور کرنے والے بہت کم ہیں کہ یہ قانونِ فطرت کیوں اور کیسے ہے اور اس قانون کو بنانے والا کون ہے۔ تمام کائنات قانون پر چل رہی ہے اور اس کو استعمال کر رہی ہے، لیکن اس بات کو بہت کم لوگ سوچتے ہیں کہ قانونِ فطرت کا استعمال سمجھنا اور اس کی رنگینیوں کو دیکھنا تو سب دانشمندوں کا کام ہے۔ قانون بنانا کس کا کام ہے۔ پانی میں ایسی طاقت کس نے بنائی اور ایسے خواص کس نے پیدا کئے کہ اس سے ہر نامی چیز کی روئیدگی اور بالیدگی ہوتی ہے۔ اس کا جواب بے وقوفوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے، لیکن عقلمند بانگِ دہل کہہ دیتا ہے کہ:۔

هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ یہ اللہ کا انداز اور اس کی تخلیق کردہ فطرت ہے اسی نے تمام کائنات کے لئے فطری قوانین بنائے۔ قوانین تمام اہلِ عقل سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن قوانین کا واضع بس اللہ ہی ہے۔ پس جس خدا کی ربوبیت و ایجاد کے اتنے بے پایاں مظاہر ہیں وہی الوہیت کا بھی صحیح طور پر مستحق ہے۔ اس کے سوا کوئی اللہ ہو نہیں سکتا۔

فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ جب تمام کائنات کو بنانے والا اور قوانین کائنات اور عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے تو پھر کس بوتے پر دوسروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ آخر انہوں نے کیا بنایا ہے، کیا پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کو الوہیت کا استحقاق ہو گیا۔ کیا خلاقِ کائنات خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو پوجنا یا اس کی معبودیت میں دوسرے محتاجوں کو شریک بنانا حق کوشی اور احسان فراموشی نہیں ہے؟

بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ہ پس ان ناحق کوش کافروں کے پاس اپنی انسانیت فروشی اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازوں اور آستانوں پر جبہ سائی کرنے کی کوئی برہانی توجیہ نہیں بلکہ واضح گمراہی میں یہ ظالم سرگرداں پھر رہے ہیں۔

مقصودِ بیان:۔ آسمان کی شکل گنبد نما گول ہے اور اس کے ستون نہ ہونا اس کی کرویت بتا رہا ہے۔ اس سے کشش کی قوت کے انکار پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ زمین کو مضطربانہ حرکت سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ نے پہاڑوں کی میخیں قائم کی ہیں۔ پہاڑوں کے دوسرے فوائد سے قطع نظر کرکے یہ تخلیقی فائدہ کتنا عظیم الشان ہے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو جانداروں کی سکونت زمین پر ناممکن ہو جاتی۔ مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ نباتات میں بھی روئیدگی بغیر نر و مادہ کے اختلاط کے نہیں ہوتی۔ یہ اشارہ یا تر شح اس وقت ہوگا جب زوج کا معنی جوڑا لیا جائے اور اگر اس لفظ کا ترجمہ قسم کیا جائے گا تو نر و مادہ کے اختلاط کی طرف اشارہ

نہیں ہوگا، مذکورہ بالا تمام آیات میں طبیعیات، فلکیات اور عضویات کی حقیقت اور آثار اور علل و نتائج پر غور کرنے کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت، ربوبیت و الوہیت کو سمجھنے کیلئے عقل کافی ہے۔ مطالعہ فطرت کے بعض طرح کی ہستی اور یگانگت پر استدلال کیا جاسکتا ہے (ق)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی اور (حکم دیا کہ) اللہ کا شکر کرو جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے شکر کرتا ہے اور

مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ

جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز سزاوار حمد ہے جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا بیٹا اللہ کا شریک

بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي

نہ کرنا بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے ہم نے انسان کو ماں باپ کے حق میں تاکید کر دی ہے اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر

وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ

پیٹ میں رکھا اور دو برس میں دودھ بڑھایا (بھی اسی کا کام ہے) (اور ہم نے حکم دیا) کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر میری طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر ماں باپ

تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ

میرے ساتھ اس چیز کو شریک کرنے پر مجبور کریں جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہنا مان ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی معاشرت رکھ اور ان لوگوں کے راستہ پر چل

مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ

جنہوں نے میری طرف رجوع کیا ہے پھر میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے جو کچھ تم کرتے تھے میں تم کو بتادوں گا (لقمان نے کہا) اے میرے بیٹے اگر رائی

مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ

کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو زمین میں ہو اس کو اللہ لا کر حاضر

بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

کردے گا بلاشبہ اللہ لطیف و باخبر ہے اے بیٹے نماز ٹھیک ٹھیک پڑھ اور نیک کام کا حکم دے اور بری باتوں سے منع کر

وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ

اور جو مصیبت تجھے پہنچے اس پر صبر کر بیشک یہ بڑے کاموں میں سے ہے اور اپنے رخسارے لوگوں کے سامنے نہ پھلا اور زمین میں پھر

فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ

اکڑ کر نہ چل اللہ شیخی خورے، اترانے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی چال میانہ رکھو اور اپنی آواز

مِنْ صَوْتِکَ ؕ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝

نیچی رکھو بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے

تفسیر حکمت بلند آواز سے علماء کو پکار رہی ہے اور از روئے عقل ان سے اپنا حق طلب کر رہی ہے۔ حکمت کیا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے۔ حکمت کا مقصد یہ ہے کہ حیوانی مدرکات کی تنگنائی سے نکل کر انسانی مشاعر کی لمبی چوڑی فضا کی جانب پرواز کی جائے تاکہ اوہام بہیمیہ کی تاریکیوں کا ازالہ فطری اور طبعی انوار سے ہو جائے۔ دل اور آنکھوں کی کوری بصیرت اور بینائی سے بدل جائے۔ جہل، نادانی اور بربریت اور وحشت کے دشت سے نکل کر دانش اور کامرانی کی مدینت فاضلہ میں داخل ہو۔ غرض کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنایا جائے اور اس کی زندگی کو ایک مقدس عقلی زندگی کا جامہ پہنایا جائے۔ فلسفہ کا مقصد انسان کو عقل، نفس اور معیشت میں درجہ کمال تک پہنچانا ہے اور اس کے اطوار معیشت اور رفاہیت میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جو زندگی کے کمال عقلی و نفسی کیلئے شرط اعظم ہے۔ فلسفہ انسان کی حرکات عقلیہ اور ان کو دائرۂ حیوانی سے خارج کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ قبیلوں اور قوموں کو وحشیانہ حالت سے متمدن اور شہری بنانے کا واحد ذریعہ ہے خصوصاً حکمت معیشت انسانیہ معارف ایجاد علوم اور اختراع صنائع و بدائع کی علت اولین ہے۔ کیونکہ انسان اپنی کمال معیشت میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ زراعت باغبانی پھلوں کی حفاظت اور مویشی مہیا کرنے، نہروں کی دیکھ بھال، پلوں کے بنانے، چشموں کے نکالنے اور کپڑوں کے بننے میں کوئی شایان شان اور دل پذیر طریقہ اختیار کرے۔ عمارتوں کی تعمیر میں جدت پسندیاں دکھائے اور اپنی صحت کی حفاظت اور امراض جسمانی کا علاج بطریق احسن کرے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی خواہش اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک وہ فصلوں، زمانوں اور فلکی حوادث کی معلومات حاصل نہ کرے۔ اشیاء طبیعیہ کو نہ پہچانے۔ ملکوں کے خواص اور ہوا کی تاثیرات کو نہ جانے۔ بسائط کے کسر و انکسار مرکبات کے مزاج اور اشیاء کی ترکیب و تحلیل سے واقف نہ ہو اور مادی اشیاء کی شکست اور ریخت اور اس سے بنی ہوئی اشیاء کے تراشنے خراشنے اور ان کے محل استعمال اور تبدیل و موازنہ کی قابلیت نہ رکھے۔ اگرچہ کسی انسان کے لئے ان لاتعداد امور کی واقفیت ایک دشوار امر ہے، لیکن ان کے ساتھ تعاون اور تبادل جسے معاملہ داری کہتے ہیں۔ اس کے لئے ناگزیر ہے۔

جس سے یہ ثابت ہوا کہ معیشت میں کمال انسانی ان لاتعداد جزئیات کا محتاج ہے، اس لئے انسان پر واجب ہے کہ وہ ان جزئیات کو کسی قاعدۂ کلیہ اور قانون مسلمہ کے تحت لائے اور چونکہ انسان کے نزدیک قاعدۂ کلیہ بہت سے ہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے وہ ان جزئیات اور قواعد کلیہ کے باہمی توافق و تناسب کے پیش نظر ایسے کلیہ کا انتخاب کرے جس پر جملہ علوم و فنون کی بنیاد رکھی جا سکے اور ان کو یکجا کیا جا سکے۔ جیسے کہ فن فلاحت باغبانی علم حیوانات و معالجۂ دواب علم ہندسہ و مثلثات و مساحت علم حساب و جبر و مقابلہ علم طب و جراحت تشریح الابدان فزیالوجی خواص ادویہ اور ان کی کیفیت ترکیب۔ علوم فلکیہ جغرافیہ اسطرلاب بحری معادن طبقات الارض علم طبیعیات اور جر ثقیل علم کیمسٹری علم تدبیر منزل فن قوانین مدنیہ نظامات بلدیہ اور سیاست سلطنت غرضیکہ ان سب فنون کا مقصد ایک عملی شغل تھا، اس لئے علم و عمل کے درمیان مطابقت اور موافقت پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی گئی اور انسانوں کی جتنی تعداد بڑھتی گئی معیشت کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

یہ تقاضا مطلب اس قول سے کہ کمال معیشت تمام علوم و معارف اور صنائع کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا اولین سبب ہے۔

لیکن انسان کو چاہئے کہ ضروریات معیشت پوری ہونے کے بعد اپنے نفس کی جانب رجوع کرے اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کمال معیشت جس سے تمام راحت بدنی تو حاصل ہوں، لیکن اخلاق اور ملکات باطنی میں نقص اور فساد ہے عین نقصان ہے چونکہ بزدل خطرات شدیدہ سے

گھیرا جاتا ہے۔ حریص اور طامع کا تنور شکم کبھی نہیں بھرتا۔ حاسد دوسروں کو فارغ البال دیکھ کر جل بھن جاتا ہے۔ مغلوب الغضب معمولی سی تحریک سے آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ اور بخیل اپنے بخل کے سبب محروم لذت رہتا ہے، اس لئے اگر ایسے لوگوں کو جملہ اسباب معیشت مہیا بھی ہوں تو وہ ان سے حقیقی راحت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اخلاق فاضلہ اور ملکات رذیلہ کو ایک دوسرے سے متمیز کیا جائے اور اس کے بعد ملکات رذیلہ کو ترک کر کے ان کی جگہ اخلاق فاضلہ کو اختیار کیا جائے۔ اس طرح کمال نفسانی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے فن تہذیب الاخلاق کی اختراع کی گئی اور جب عقل بدن اور معیشت کی اصلاح اور اخلاق نفس کی تعدیل سے فراغت ملی تو انسان اپنی عنان فکر کو اپنی جانب منعطف کر کے ایسے متوقع کمال کا جویاں ہوا جس میں حیات حقیقی اور سعادت ابدی حاصل ہو۔ اپنی پیدائش اور اس کی حقیقت کے متعلق بحث کر کے شعور کے اسباب اور مدرکات کی طلبوں اور بدنی حواس کے ساتھ ان کے ارتباط کو معلوم کرنے کا خواستگار ہوا اور معلومات میں سے ہر ایک معلول کے نتائج کا طالب گار رہا۔ نیز اس کا بھی پتہ لگایا کہ معاملات میں سے ہر ایک کے صلاح و فساد کے مقتضیات کیا ہیں۔ عقل ہوا اور جوارح سے ایمان کا کیا تعلق ہے، اخلاق کے اختلاف کی کیا وجہ ہے، ہر خلق کے جدا گانہ حصوں کے کیا اسباب ہیں۔ قوموں کے تمدن اور علوم و فنون کے عروج و زوال کے کیا اسباب ہیں۔ شرائع اور تشریع کی کیا علت ہے۔

اس سے فارغ ہو کر جب انسان نے دنیا پر نظر ڈالی اور اپنی قوت فکر کو کام میں لایا تو کائنات کی اصل مادہ عوارض حوادث علل اور معلومات میں عام و خاص طریقہ سے غور کیا۔ اجزائے عالم کے تجاذب و تدافع اور فعل و انفعال کی تحقیق کی حرکت اور اس کے اسباب کا انکشاف کیا۔ نباتات و حیوانات کی پیدائش کے وجوہ اور ان کی ہیئت منتظمہ اور اشکال متغیرہ میں تبدیل ہونے کے اسباب اور ان کے وجود کی غرض و غایت کو سمجھا اور اپنی سعادت و بقا میں گہری سوچ بچار سے کام لیا اور اس سب کے قوانین کلیہ بنائے۔ غرض اس طرح فلسفۂ عقلیہ فلسفۂ اخلاق فلسفۂ شرائع و قوانین فلسفۂ مبدء و معاد اور حکمت الٰہیہ کے قوانین کی وضع اور ان کا علم ہوا۔

جب فلسفہ و حکمت کی غرض و غایت معلوم ہو گئی تو اب یہ بات مخفی نہیں رہی کہ عالم انسانی میں اس کے وجود کا حقیقی سبب کیا ہے۔ پہلا سبب انسان کی معیشت کی دشواریاں اور حاجتیں اور دوسرا سبب انسان کی عقل فطری اور خلقی ہے۔ جس کی زندگی کا انحصار انسان کی ان لذات اور مسرتوں کے علل اور اسباب کے ادراک پر ہے جو علم ہستی کی مخفی حقیقتوں کو جاننے اور مجہولات کے انکشاف میں حاصل ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ لذت جو علۃ العلل مسبب الاسباب اور حقیقت کل کے دریافت سے پیدا ہوتی ہے۔

تقریر مذکور سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ۱۔ فلسفہ کی تمام کڑیاں باہم مربوط و وابستہ ہیں۔ فلسفۂ معیشت بغیر تہذیب اخلاق جہاں انفرادی اصلاح کا مقتضی ہے، وہاں اجتماعی اصلاح اور سماجی درستگی کے بغیر اس کو کوئی چارہ نہیں کیونکہ انفرادی فساد سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور سماجی انتظام سے انفرادی تہذیب لابدی ہے۔ فرد سوسائٹی سے غیر نہیں اور نہ سوسائٹی افراد سے جدا کوئی شخصیت رکھتی ہے۔ پھر اخلاقی تعدیل اور فلسفۂ کونی کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فلسفۂ مبدء و معاد کے صحیح حصول کے بغیر نہ یہ کہ حیات حقیقی اور سعادت ابدی کا حصول ناممکن ہے۔ بلکہ تہذیب اخلاق اور ملکات رذیلہ سے خصائل حمیدہ کا اختیار بھی سخت دشوار ہے۔ پس تہذیب خلقی کیلئے کائنات کی ہیئت منتظمہ اور اشکال متغیرہ پر غور کرنا، اس کی نہ سنائی دینے والی آواز کو سننا اور اپنی سعادت و عافیت اور بقا و فلاح میں سوچ بچار کرنا ضروری امر ہے۔ گویا فلسفۂ معیشت سے لے کر حکمت علیا کی انتہائی چوٹی تک ایک مسلسل زنجیر ہے۔ جس کا ہر حلقہ دوسرے سے وابستہ ہے کہ کسی کو مبدء یا منتہا کہنا اور نقطۂ آغاز یا کنارہ انجام قرار دینا سخت دشوار ہے۔ ۲۔ حکمت الٰہیہ کا آخری درجہ یہ ہے کہ نیچے کے تمام مدارج حسب ضرورت طے کر لئے گئے ہوں۔ داخلی اور خارجی کائنات پر غور کر کے علت و نتائج کو دریافت کر کے زنجیر عالم کے ابتدائی اور انتہائی دونوں کناروں سے علۃ العلل مسبب الاسباب اور صانع کائنات کے دامن تمسک میں جان لئے گئے ہوں۔ معاشی خلقی اور عقلی فلسفہ کی اصل غرض حاصل کر لی گئی ہو۔ یعنی اخلاق کی وحدت و یکتائی سمجھ لی گئی ہو۔ جسمانی اعضاء دل اور دماغ و عقل کا مرکز توجہ صرف علۃ العلل کو قرار دے کر اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اعضاء جسم کے حرکات زبانی نطق اور قلبی تصورات کو وقف کر دیا گیا ہو۔ الغرض شرک کو شکر سے بدل دینا ہی اصل حکمت ہے جس طرح شرک کا دائرہ وسیع ہے۔ معیشت میں شرک، اخلاق میں شرک، فلسفۂ کائنات اور حکمت عقلیہ میں شرک وغیرہ۔ اسی طرح شکر کا حلقہ بھی بہت بڑا ہے۔ شرک کی ضد کا نام شکر ہے۔ شرک کا جو مخالف پہلو پیدا ہوتا ہے اس کو شکر کہتے ہیں۔ پس شکر ہاتھ پاؤں کے حرکات، سکنات اور زبان کی جنبش و جولانی سے بھی ہوتا

ہے۔ اور اخلاقِ نفس کی تعدیل و اصلاح سے بھی اور حکمتِ علیا کے ہر زینہ کو طے کرنے سے بھی لقمان حکیم کو خدا تعالیٰ نے حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی۔ یعنی حسنِ معاش، تہذیب الاخلاق، اصلاحِ معاشرت، انتظام، سلوک، تعدیل اور نفس داخلی و خارجی کائنات پر غور کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے اور علل و معلومات کے باہم وابستگی دیکھ کر آغاز و انجام کے دونوں کنارے علۃ العلل کے ہاتھوں میں دیکھنے کی طاقت عطا فرمائی تھی۔ ان کو قوتِ فکریہ ایسی مرحمت ہوئی تھی جو رموزِ کائنات اور اسرارِ فطرت کو صحیح طور پر دریافت کرتی تھی اور قوتِ نطق ایسی ملی تھی جو علمِ فطرت کی ترجمان تھی اور اعمال و افعال ایسے عنایت کئے گئے تھے جو قوتِ فکر اور نطق کے موافق تھے۔ خلاصہ یہ کہ لقمان حکیم کو عقلی، فطری، نطقی اور عملی شکر کی توفیق دی گئی تھی۔ یہ ہی وہ حکمت فاضلہ تھی جس نے لقمان کو لقمان حکیم بنا دیا اور یہی وہ نعمت کاملہ تھی جس کو حاصل کرنے کے بعد اس کا حق ادا کرنا لقمان پر واجب تھا اور انہوں نے اس کو ادا کیا۔ یعنی حکمت کے زیور سے اپنے کردار، اطوار اور گفتار کو آراستہ کیا اور دانائی کے نور سے دل و دماغ کو روشن کیا اور تخیلات و تصورات سے لے کر جسمانی اعضاء کے مادی حرکت و سکون تک ساری زندگی اور زندگی کے تمام اوقات کا مرکزی نقطہ شرک کو نہیں بلکہ شکر کو قرار دے لیا۔

تحلیلِ اجزاء وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ الخ - آیت کی تفسیر کرنے سے پہلے تین امور کی تشریح کی ضرورت ہے۔ ۱۔ لقمان کا نسب اور وطن۔ ۲۔ لقمان نبی تھے یا نہ تھے ۳۔ وجہِ حکمت۔ ۱۔ وہب بن منبہ کا قول ہے کہ لقمان حضرت ایوب کی بہن کا بیٹا تھا۔ مقاتل نے کہا خالہ کا بیٹا تھا۔ ایک ہزار برس کی عمر پائی۔ حضرت ایوب سے علم سیکھا۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد کا زمانہ پایا۔ بعثتِ داؤد سے پہلے بنی اسرائیل کا مفتی تھا، لیکن داؤد پیغمبر ہوئے تو فتویٰ دینا موقوف کر دیا۔ (لوگوں) نے وجہ دریافت کی تو جواب دیا پیغمبر کی موجودگی میں کسی دوسرے کو فتویٰ دینا جائز نہیں۔ واقدی نے کہا لقمان بنی اسرائیل کا قاضی تھا۔ سہیلی نے کہا لقمان عنقا کا بیٹا اور عنقا مردون کا بیٹا تھا۔ ابن کثیر نے مردون کی جگہ سدون لکھا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ لقمان بن باعوراء بن ناحور بن تارخ تھا اور یہ وہی ہے جس کا لقب آذر تھا۔ بعض اہلِ تاریخ کا قول ہے کہ لقمان سیاح تھا۔ عرب، شام اور یونان میں مدت دراز تک سیاحت کی۔ اسی لئے بعض مورخوں نے اس کو یونانی حکیم اور ابندقلیس کا استاد قرار دیا ہے اور تاریخ یونان میں اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جس لقمان کا ذکر قرآن میں ہے وہ عاد کا بیٹا تھا۔ شداد کے بعد یمن کا بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی ذوسدد بادشاہ ہوا اور ذوسدد کے بعد اس کا بیٹا ذوسدد الرائش تخت نشین ہوا۔ یہی تبع اول ہے۔ تبع کے بعد اس کا بیٹا صعب (ابوکرب) بادشاہ ہوا۔ اس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ گویا ذوالقرنین لقمان کے بھتیجے کا بیٹا تھا۔ شداد نہایت ظالم، سرکش اور مغرور بادشاہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک باخدا منصف اور رحیم شخص اس کا جانشین ہوا۔ ذوالقرنین تک اس کی برکات کا سلسلہ قائم رہا۔ صحیح یہ ہے کہ لقمان کا صحیح نسب تحقیقی طور پر معلوم نہیں۔ ۲۔ لقمان نبی نہ تھا۔ اکثر علماء بلکہ جمہور کا یہی قول ہے۔ ابن کثیر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھا جو نجاری کا کام کرتا تھا (اسنادہ صحیح)۔

عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں میں نے جابر بن عبداللہ سے لقمان کے متعلق دریافت کیا۔ جابر نے جواب دیا وہ نوبہ کا رہنے والا کوتاہ قد چپٹی ناک والا تھا (رواہ قتادہ)۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان مصر کے حبشیوں میں سے تھا جس کو اللہ نے حکمت عطا فرمائی تھی۔ نبوت نہیں دی تھی۔ اوزاعی نے بروایت عبدالرحمن بن حرملہ ذکر کیا ہے کہ سعید بن مسیب کے پاس ایک حبشی کچھ پوچھنے آیا، مگر اپنے کو حقیر سمجھ کر کچھ جھجکنے لگا۔ سعید نے فرمایا تم اپنے رنگ کے سیاہ ہونے پر افسردہ خاطر نہ ہو کیونکہ اہلِ حبش میں سے تین آدمی ایسے گزرے ہیں جو لوگوں کے سردار تھے۔ بلال ہجیع (حضرت عمر کے آزاد کردہ) اور لقمان حکیم نوبہ کے حبشیوں میں سے تھا۔ ابن جریر نے اپنی اسناد سے خالد ربعی کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھا۔ ابن جریر نے عمرو بن قیس کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھا۔ ایک روز وعظ کہہ رہا تھا ایک شخص نے کہا تم وہی ہو کہ فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چراتے تھے۔ لقمان نے اثبات میں جواب دیا۔ اس شخص نے دریافت کیا پھر اس مرتبہ کو کہاں سے پہنچے۔ لقمان نے کہا سچ بولنے اور بے کار بات نہ کہنے سے۔ ابن ابی حاتم نے باسنادِ صحیح عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے روایت کی ہے کہ لقمان کو خدا تعالیٰ نے مراتبِ حکمت عطا فرمائے۔ ایک ناواقف شخص نے آکر کہا تم تو فلاں قوم کے غلام ہو جو کل بکریاں چراتے تھے۔ لقمان نے جواب دیا ہاں۔ اس شخص نے کہا پھر اس مرتبہ کو کیسے پہنچے۔ لقمان نے جواب دیا میں نے اللہ کی عظمت کا لحاظ رکھا۔ امانت ادا کی، سچ بولنا اختیار کیا، بیکار باتوں کو ترک کیا۔

ابن کثیر نے لکھا ہے ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے۔ کیونکہ ہر پیغمبر کا شریف النسب اور اپنی قوم میں باوجاہت ہونا ضروری تسلیم

کیا گیا ہے ۔ بعض احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ اور چونکہ لقمان غلام رہ چکے تھے ، اس لیے نبی ہونا غلط ہے اسی لئے جمہور سلف کا لقمان کے پیغمبر نہ ہونے پر اتفاق ہے ۔ البتہ عکرمہ کا اختلافی قول بعض اہلِ علم نے نقل کیا ہے ، لیکن ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ تک جو اس قول کی روایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس میں جابر بن یزید جعفی ضعیف (اور غیر ثقہ راوی) ہیں ۔ اس لیے نبوت لقمان کے متعلق صحیح طور پر عکرمہ کا قول بھی محقق نہیں ۔ اسی طرح واحدی نے بھی بغیر سند کے سدی اور شعبی کی جانب نبوت لقمان کا قول منسوب کر دیا ، مگر از روئے روایت ثابت نہیں ۔

ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جبرئیل نے اس میں حکمت بھر دی ، لیکن ابن کثیر نے اس میں تضعیف کی ہے کیونکہ اس میں ایک راوی سعید بن بشیر ہے جو ضعیف ہے ۔ اور اگر روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو خواب میں دیکھنے سے نبوت ثابت نہیں ہو سکتی ۔ ۲ ۔ لقمان کی حکمت کا ثبوت کچھ تو قرآن پاک کی آیات میں موجود ہے جو بالکل قطعی ہے ، لیکن اس کے علاوہ کچھ نصائح اور کلمات حکمت کی طرف اور بھی منسوب کئے جاتے ہیں جو شہرت کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں ۔ ان میں سے بعض نصائح ہم اسی جگہ نقل کرتے ہیں ۔ جن کا ثبوت روایت کچھ زیادہ ضعیف نہیں ہے ۔

ابن عمر کی حدیث ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا کہ لقمان کہا کرتا تھا جو چیز اللہ کے پاس ودیعت رکھی جائے اللہ اس کی حفاظت فرماتا ہے ۔ (رواہ احمد) یہ روایت قوی ہے ، لیکن منقطع ہے نہشل بن مجمع راوی کی ملاقات ابن عمر سے کبھی نہیں ہوئی ۔

قاسم بن مخیمرہ کی روایت ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی بیٹا گھونگھٹ نکال کر چادر اوڑھنا کیونکہ رات میں یہ سبب خوف اور دن میں باعث مذمت ہے ۔ (رواہ ابن ابی حاتم وقال اسنادہ صحیح مرسل) ابن ابی حاتم نے بروایت ابن یحییٰ نقل کیا ہے کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا حکمت فقیروں کو بادشاہوں کے تخت پر بٹھا دیتی ہے ۔ خطیب نے بغیر اسناد کے لقمان کی چند نصیحتیں ذکر کی ہیں جن کو ہم نقل کرتے ہیں ۔

بیٹا جنازہ کے ساتھ شریک ہو اور شادی کی محفل میں مت جا ۔ کیونکہ جنازہ کی معیت تجھ کو آخرت کی یاد دلائے گی اور شادی کی محفل دنیا کی طرف راغب کرے گی ۔ شکم پُری کے بعد مزید کھانا نہ کھا ۔ ایسے کھانے سے کُتّے کو ڈال دینا بہتر ہے ۔

مرغ کو دیکھ کہ سحر کو بانگ دیتا ہے تو مرغ سے کمزور نہ بن کہ بستر پر پڑا سوتا رہے ۔ توبہ میں تاخیر نہ کر موت اچانک آجاتی ہے ۔ جاہل سے محبت نہ کر ۔ خاموشی پر تجھے کبھی ندامت نہ ہوگی ۔ اگر تیرا کلام سراسر چاندی ہو تب بھی خاموش رہنا سونا ہے ۔ شدتِ غضب سے پرہیز کر ۔ غصّہ کی تیزی سے حکیم کے دل کا نور مٹ جاتا ہے ۔ عالموں کی مجلس میں حاضر ہو اور فقہائے ربانی کا کلام سُن ۔ کیونکہ نورِ حکمت سے مُردہ دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے جس طرح بارش کے پانی سے زمین ہری ہو جاتی ہے ۔ جھوٹ بولنے والے کے چہرے کی رونق جاتی رہتی ہے ۔ بداخلاق پر افکار کا ہجوم ہوتا ہے ۔ پہاڑ سے پتھر ڈھونا آسان ہے اور ناسمجھ کو سمجھانا دشوار ۔ اگر دانشمندی اچھی میسر نہ ہو تو جاہل کو ایلچی بنا کر مت بھیج ۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ علم اور علم والے کی آنکھ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوگی ۔ کھانا کھلانے کے لئے پرہیز گاروں کا انتخاب کر اور مشورہ عالموں سے لیا کر ۔ ایمان بہت عمیق قعر ہے جس میں کمزور دل ڈوب گئے ۔ اگر تجھے نجات منظور ہے تو تقویٰ اور توکل کی کشتی پر سوار ہو کر پار ہو جا ۔ سب سے زیادہ تکلیف ہمسایہ کی برائی ہے اور تلخ ترین چیز افلاس ہے ۔ لوگوں کی طرف سے اپنی تعریف کا خواستگار نہ ہو ۔ جب تک پڑھے ہوئے علم پر عمل نہ کرے گا پڑھا ہوا علم تجھ کو حاصل نہ ہوگا ۔ اگر کسی سے دوستی کرنی مقصود ہو تو پہلے اسے غضبناک کر کے دیکھو ۔ اگر غصّہ کی حالت میں وہ تیرے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرے تو دوستی کے لائق ہے ورنہ قابل اجتناب ۔ قرض لینے سے پرہیز رکھ ۔ قرضہ دن میں باعثِ ذلت اور رات میں باعثِ فکر ہے ۔ امام احمد نے بروایت کاملہ عروہ بن زبیر کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان کے اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ نرم گفتگو اور کشادہ پیشانی آدمی کو والدین سے بھی زیادہ محبوب بنا دیتی ہے ۔ کسی بات پر بحث نہ کرو ۔ بے قاعدہ بات نہ کرو ۔ بغیر تعجب کے نہ ہنسو ۔ بغیر ضرورت کے ادھر ادھر مارے مارے نہ پھرو ۔ دوست کو دولت کے وقت پہچانو ۔ صاحب علم غصّہ کے وقت پہچانا جاتا ہے ، جیسے بہادر لڑائی کے وقت ۔ لقمان سے دریافت کیا گیا کون شخص سب سے زیادہ شریر ہے ؟ فرمایا جس کو یہ خیال ہو کہ لوگ اس کو بدکاری کی حالت میں دیکھیں گے ۔

اسی قسم کے دوسرے پُرحکمت اقوال بھی لقمان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں لیکن ان کے ثبوت میں بہت زیادہ ضعف ہے ، اس لئے ان کا ترک ہی اولیٰ ہے ۔ لقمان کے نسب ، نبوت اور نصیحت خیز اقوال کے ذکر کے بعد اب ہم آیت کی تفسیر کرتے ہیں ۔

چونکہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ لقمان حکیم کی چند مواعظ حسنہ نقل فرمائی ہیں ۔ اور کتاب الٰہی میں کسی حکیم کے اقوال کو بعینہٖ نقل کر دینا کتاب الٰہی ہونے پر دھبہ

لگتا ہے۔ دوسروں کے اقوال کو پیش کر کے ان کی تقلید کا حکم دینا شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید خدا تعالیٰ نے دانشمندوں سے ان کی نصیحتیں سیکھ کر بیان فرمائی ہیں۔ حالانکہ قرآنی تعلیم بجائے خود کامل مکمل ہے۔ اسلام اپنے نظریات اور قوانین و ضوابط کا خود بہترین مجموعہ، منظم اور مکمل ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں لقمان کے تذکرہ کو اس انداز سے بیان فرمایا کہ جس سے مذکورہ بالا شبہ پیدا ہی نہ ہو سکے بلکہ قرآنی مضامین کے پُرحکمت ہونے کی مزید تائید ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ خدا تعالیٰ نے فقط قرآن پاک ہی میں اصول خیر اور ضوابط سعادت کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ وہ لقمان حکیم جس کی دانشمندی اور دانشمندانہ اقوال عرب خصوصاً یہودیوں میں ضرب المثل بنے ہوئے تھے وہ بھی عطیۂ الٰہی کا مرہون تھا۔ جو کچھ حکمت اور سعادت اور راہ اصول ہدایت اس کو حاصل ہوئے تھے وہ بھی خدا داد اور الہامی تھے۔

اب رہی یہ بات کہ حکمت کس کو کہتے ہیں اور یہاں اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ عرف حکماء میں حکمت نام ہے علوم نظریہ کو انسانی طاقت کے موافق حاصل کرنے کے بعد افعال حسنہ کا ملکہ تامہ حاصل کرنا تاکہ نفس انسانی کی تکمیل ہو جائے۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ قول اور عمل میں درستی کا نام حکمت ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ حکمت سے مراد ہے دین کی سمجھ بوجھ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ علم اور دانش مراد ہے۔ میرے نزدیک جو کچھ صحیح تھا وہ تفسیری نقلے میں میں نے لکھ دیا ہے۔ قرآن پاک نے اسی جگہ حکمت کی تشریح خود جس لفظ سے کی ہے وہی واجب القبول ہے۔ ادائے شکر کو اس جگہ حکمت قرار دیا ہے۔ اور اس سے بہتر حکمت کی تشریح ممکن بھی نہیں ہے۔ شکر نام فقط زبان سے ثنا کرنے کا نہیں ہے نہ صرف اعضائے جسم سے اطاعت کرنا مصداق شکر ہے، اس لئے صاحب مدارک کا قول صحیح نہیں۔ نہ صرف علوم نظریہ اور عملیہ صحیح طور پر حاصل کرنا شکر کہلاتا ہے، اس لئے حکماء نے جو تعریف حکمت کی بیان کی ہے وہ یہاں مراد نہیں۔ نہ فقط بلا عمل دانش کے حصول کو شکر کہا جاتا ہے، اس لئے قتادہ اور ابن کثیر کی صراحت بھی قابل قبول نہیں۔ بلکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ منعم حقیقی کے احسان و اکرام کا حق ادا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی جائے۔ بقدر نعمت عوض دینے کی کوشش کی جائے۔ اگر منعم کی نعمت لامحدود اور ہمہ گیر ہو، کوئی آن اور کوئی حالت اس کی فیض رسانی سے خالی نہ ہو تو پھر ہر دم قال سے حال، اطوار و رفتار سے کردار اور گفتار سے اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ ہر وقت دل میں موجود رہے۔ ظاہری اور باطنی قویٰ کی کوئی حرکت و سکون رضائے منعم کے حصول کے مقصد سے خالی نہ ہو۔ غرض افکار دماغیہ، خطرات قلبیہ، اقوال لسانیہ، اعمال جسمانیہ اور ہر حال و مآل کو رضائے مولیٰ کے حصول کے لئے وقف کر دینے کا نام شکر ہے اور یہی تفصیل حکمت کا اجمال اور اجمال حکمت کی تفصیل ہے۔ گویا حکمت کا دوسرا نام شکر ہے۔

ایک شبہ: جب لقمان حکیم نبی نہ تھا تو پھر باری تعالیٰ کی طرف سے اس کو شکر کرنے کا حکم کس طرح ملا۔ وحی تو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔

ازالہ: پیغمبر وقت کی وساطت سے لقمان کو ادائے شکر کا حکم ملنا ناممکن نہیں ہے۔ تمام افراد امت کو انبیاء کی وساطت سے خصوصی اور عمومی احکام ملا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لقمان حکیم کو بھی پیغمبر وقت کے ذریعہ سے حکم مذکور ملا ہو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور الہام اور بصورت القائے عقلی بغیر کسی شرعی وحی کے لقمان کو حکم مذکور ملا ہو۔ یعنی خدا تعالیٰ نے لقمان کو ایسی دانش عطا فرمائی ہو اور فطری طور پر ایسی سمجھ عنایت کر دی ہو جو اللہ کا کامل شکریہ ادا کرنے کا موجب ہو کیونکہ شریعت نقل کے علاوہ شریعت عقل میں بھی منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ اور کلام سابق سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شکریہ کا حکم دینے سے شاید خدا کی کوئی ذاتی غرض وابستہ ہے۔ حالانکہ اللہ کا کوئی فعل معلل بالغرض نہیں۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اللہ کو کسی کی ناشکری یا ادائے شکر کی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال تمام عالم میں محمود اور مستحق حمد ہے، کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے اس کی ذاتی محمودیت میں نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی۔ ہاں جو کوئی شکریہ ادا کرے گا وہ اپنی بھلائی کے لئے کریگا۔ ایک تو فرض الٰہی کا بوجھ اس سے ہلکا ہو گا۔ دوسرے مزید نعمت کے حصول کا بھی موقعہ ملے گا۔ کیونکہ ایک اور آیت میں آیا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم تم کو اور زیادہ دیں گے۔ اور جو ناشکری کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اپنا ہی نقصان کرے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تمام مخلوقات آسمان و زمین میں سب سے بدتر قلب پر ہو جائے یعنی شیطان ہو جائے تب بھی اللہ کی سلطنت میں ایک ذرہ کی کمی نہ ہو گی۔ (مسلم)

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ۔ بعض مخصوص بیش قیمت جواہر ایسے ہوتے ہیں جن کو انسان غیروں سے بچا کر رکھتا ہے، مگر اپنے جگر پاروں سے ان کو نہیں بچاتا۔ دوسروں کی ہلاکت اور بربادی برداشت کی جا سکتی ہے، مگر اپنے دل کے ٹکڑوں کا تباہ ہونا گوارا نہیں ہوتا۔ کتنا ہی بڑا انسان ہو، کیسا ہی دانشمند اور فلاسفر ہو، مگر جو رشتۂ محبت اس کا اپنی اولاد سے وابستہ ہوتا ہے وہ دوسروں سے نہیں ہوتا۔ لقمان بہر حال نبی نہ تھا کہ اس کی نظر میں اولاد اور

امت کے تمام افراد کی حالت غیر متفاوت ہوئی ۔ عموم دعوت اور وحدت نظر تو کام انبیاء کا ہے ۔ لقمان حکیم تھا اور اکتسابی دانش کا آسمان معبت کے آسمان سے بلند نہیں ہے ، اس لئے لقمان نے مخصوص طور پر اپنے بیٹے کو نصیحت کی ۔

یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۔ قشیری نے لکھا ہے کہ لقمان کا بیوی اور بیٹا دونوں کافر تھے ۔ موعظت لقمان کے بعد مسلمان ہو گئے ۔ خطیب اور خازن نے بھی لکھا ہے کہ لقمان کی نصیحت مان کر بیٹا مسلمان ہو گیا تھا ۔ بظاہر ان دونوں قولوں کی بنا اسرائیلی روایات پر ہے ورنہ لقمان تک کسی قول کی صحیح اسناد نہیں ۔ نہ اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث ہے ۔ نہ اس سے لقمان کے بیٹے کا کافر ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ شرک کی ممانعت سے بیٹے کے مشرک ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ ان نصائح سے مقصود تو حکمت الایمان ہے اور حکمت البرہان کا اظہار ہے ۔ نہ یہ کہ بیٹے میں یہ تمام عقائد اور خصائل ناپسندیدہ موجود تھے اور لقمان نے ان کا ازالہ کرنا چاہا تھا ۔

شیخ ابن کثیر نے بحوالہ سہیلی لقمان کے بیٹے کا نام ثاران لکھا ہے ۔ ابتدائی آیت میں ادائے شکر الٰہی کو مصداق حکمت قرار دیا تھا ۔ وہ اجمالی تشریح تھی جس کو ہم نے اوپر بیان کر دیا ۔ یہاں سے تفصیلی توضیح شروع کی گئی ہے ۔ بات یہ ہے کہ بقول شاہ کرمانی دانش و حکمت کی تین علامتیں ہیں ۔ ۱ اپنے نفس کو اس کے صحیح مرتبہ پر رکھنا ۔ ۲ دوسروں کے مراتب کی صحیح مقدار سمجھنا ۔ ۳ لوگوں کی سمجھ کے مطابق کلام کرنا ۔ لقمان چونکہ حکیم کامل تھے اس لئے انہوں نے بیٹے کی سمجھ کا لحاظ رکھا ۔ اول اجمالاً وہ چیز ظاہر کی جو تمام علوم صحیحہ اور اعمال حسنہ کے لئے اصل الاصول ہے ۔ پھر اسی جڑ کی مختلف شاخیں بیان فرمائیں ۔

ادائے شکر کی جب تحلیل کی جاتی ہے تو اس کے دو حصے نکلتے ہیں ۔ ۱ صحیح افکار و خیالات ۲ اچھے الرادے اخلاق ، سوسائٹی کو تکلیف نہ دینے والا طریق زندگی اور سماج کو فائدہ پہنچانے والے اعمال ۔

۱ حقائق کائنات کے متعلق صحیح معارف و افکار رکھنے کا سنگ بنیاد علۃ العلل اور مبدء کائنات کا علم ہے ۔ تمام ممکنات کے تخلیقی سلسلہ کو ایک واجب الوجود مختار مطلق ہستی تک پہنچانا اور ذات و صفات میں اس کو یگانہ سمجھنا ۔ تمام کائنات کے تخلیقی نظم اور مربوط سلسلے کو دماغ کے سامنے لے آتا ہے اور اشخاص سے لے کر اجناس تک ہر چیز کی صحیح تصویر کشی ہو جاتی ہے ۔ انقلاب دہر اور اس کی چلگونگی بہار و خزاں کا تبادل ، سردی گرمی کا تغایر ، سورج کا چڑھنا اور پھر ڈوب جانا ، چاند کا بڑھنا پھر گھٹنا ، روشنی اور تاریکی کا مقابلہ ، بلندی اور پستی کا ٹکراؤ ، ہبوط اور صعود کا تصادم ، ہستی اور نیستی کی کشاکش اور موت و زندگی کا اختلاف ۔ سب کچھ صحیح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے اور معقولیات پر کبھی اوہام کا پردہ نہیں پڑتا ۔ غرض یہ کہ عدم شرک ادائے شکر کا پہلا حصہ ہے ۔

۲ سماج کی اصلاح ، معاشرت کی درستی اور اخلاق کی بہتری کا مدار ایک خاص نظریہ پر ہے ۔ اگر معاد اور ہر فعل کے نتیجہ کا اندیشہ نہ ہو تو بہت کم ایسے شخص ہیں جو خود بخود اپنی افتاد طبع کے زیر اثر خیر اور نیکی کی طرف مائل ہوں ۔ عموماً حشر اور سزا جزا کا یقینی خیال ہی ہے جو بدی سے روکتا اور نیکی پر آمادہ کرتا ہے ۔ سماج کی درستگی معاشرت کی اچھائی پر موقوف ہے اور معاشرت کی خوبی اخلاق اور انفرادی زندگی کی بہتری پر مبنی ہے ۔ سوسائٹی افراد سے بنتی ہے اور عمومی سماج تمام چند جماعتوں کے مجموعہ کا ہے ۔ الغرض سماج معاشرت اور اخلاق کے سلسلے کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان تمام حلقوں کی انفرادی اور اجتماعی طور پر مضبوطی نتائج اعمال کے دماغی عقیدہ پر مبنی ہے ، لیکن لاکھوں کروڑوں بلکہ ان گنت اعمال ، اقوال اور لامحدود حرکات و سکنات کی سزا جزا جب ہی ممکن ہے جب تمام کوائف زندگی اور حالات حیات اور تغیرات دہر کی تصویریں اجتماعی شکل میں پیش نظر ہوں ، جزا سزا دینے والا ہمہ گیر علم رکھتا ہو ، اس کی واقفیت وامنہ سے عالم ۔ کہ کسی ذرہ کی حرکت غائب نہ ہو ۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کے ہمہ گیر علم کے عقیدہ پر معاد اور نتائج اعمال کے عقیدہ پر اجتماعی اور انفرادی اعمال اور اعمال کی خوبیاں مبنی ہیں ، اس لئے لازم ہے کہ اللہ کے علم کو محیط سمجھا جائے اور یہ یقین کر لیا جائے کہ زمین میں آسمان میں یہاں تک کہ پتھر کے جگر میں کوئی ذرہ اور رائی کے دانہ کے برابر کوئی چیز ایسی نہیں جس کا علم خدا کو نہ ہو جو سزا جزا دینے کے لئے خدا اس کو سامنے نہ لا سکے ۔ یہ عقیدہ اور پختہ خیال آدمی کو ہر برائی سے روکنے اور نیکی کی طرف ملتفت بنانے کے لئے تمام دواعی اور موانع سے زیادہ محکم ہے ۔ اس لئے لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو ادائے شکر کے دونوں حصوں کی تعلیم دی ۔ پہلے حصہ کی طرف اشارۃً آیت مذکورہ کی

عبارت میں موجود ہے ۔ عدم شرک کی تلقین اور شرک کو سب سے بڑی بے جا حرکت قرار دینا بتا رہا ہے کہ حقائق و معارف معاد کی صحیح تصویر کشی کی بنا اللہ کی وحدانیت پر ہے ۔ تمام افکار اور نظریات میں غلطی بجائے خود بے جا حرکت ہے لیکن سب سے بڑی بے جا حرکت شرک ہے ۔ کیونکہ عقیدۂ توحید ہی تمام عقائد اور نظریات صحیحہ کی جڑ ہے ، علۃ العلل پر صحیح عقیدہ رکھنے کے بعد ہی معلولات اور ان کی حقائق کا صحیح علم ہو سکتا ہے ۔

ادائے شکر کے دوسرے حصہ کو آیت انہا ان تک مثقال حبۃ میں بیان فرمایا اور پھر اس کے بعد عملی زندگی کو درست کرنے کی تعلیم دی ۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ یہاں سے لے کر بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ تک خدا کا پیام ہے ۔ موعظت لقمان کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے اللہ نے یہ چند نصیحت آمیز فقرے بیان فرمائے ہیں ۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو عدم شرک کی تعلیم دی تھی ، لیکن والدین کی فرماں پذیری اور ماں کی شرائط کی تفصیل اس لئے ظاہر نہیں کی تھی کہ ذاتی غرض کا شائبہ نہ معلوم ہو اور چونکہ فطری اور سرشتی طور پر انسان کا مادی اور روحانی وجود والدین کا مرہون ہے نظام عالم ہی اس طور پر ہے کہ والدین کے بغیر (باستثناء بعض) کوئی شخص اس جلوہ گاہِ ہستی میں رونما نہیں ہو سکتا ، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا خالق ہے تو ذرائع تخلیق میں نمبر اول والدین کا ہے ۔ پس ان کی فرماں برداری اور ان کے ساتھ امکانی حسن سلوک فریضۂ خلقی ہے جو فطرت کی طرف سے ہر انسان پر عائد کیا گیا ہے اور فریضۂ فطرت کا انجام دینا ضروری ہے ۔ اس مضمون کی طرف فقرۂ مذکورہ میں اشارہ ہے ۔

جملۂ مذکورہ میں وصیت سے مراد موعظت بھی ہو سکتی ہے اور ان مذہبی کتابوں کا حکم بھی جو اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہیں ۔ تقاضائے فطرت بھی ہے کہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل کی جائے اور تمام آسمانی کتابوں کی بھی یہی تعلیم ہے ۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ اس آیت میں حقوق تولیت کی علت اور فرماں پذیری کی اصل وجہ بیان فرمائی ہے ۔ مرد عورت سے تخلیقاً قوی اور اپنی روزی کمانے اور ضروریات معاش کو فراہم کرنے پر زیادہ قادر ہوتا ہے اس لئے والد زیادہ واجب الخدمت ہے اور مستوجب شفقت ہے ۔ پھر ماں حالتِ حمل اور دوران پرورش میں تکلیفیں اٹھاتی ہے جو دکھ سہتی ہے وہ باپ کی محبت اور سرپرستی سے زیادہ نمایاں ہے ، اس لئے آیت مذکورہ میں والدہ کی تکالیف کی تصویر کشی فرمائی ہے ۔ اگرچہ فرماں پذیری اور حسنِ سلوک کا حکم ماں باپ دونوں کے حق میں عام ہے ۔

وہن کا معنی یا کمزوری ہے یا مشقت اور تکلیف ثانی قول قتادہ اور مجاہد کا ہے اور اول قول عطائے خراسانی کا ۔ قول دوم کے موافق مطلب یہ ہوگا کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو ماں تکلیف پر تکلیف اٹھاتی اور مشقت پر مشقت سہتی ہے ۔ اول قول پر یہ مطلب ہوگا کہ ماں بچہ کو پیٹ میں لئے ضعف پر ضعف اٹھاتی چلی جاتی ہے ۔ کیونکہ بچہ جس قدر بڑھتا ہے ماں کی کمزوری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اگر بچہ ضائع ہو ناگوار نہیں کرتی یا یہ مطلب ہے کہ بچہ حالتِ حمل میں کمزور ہوتا ہے اور ماں اس کی مسلسل کمزور حالت کو اٹھاتی ہے ۔ یہاں تک کہ دو برس تک دودھ پلاتی اور اٹھتے بیٹھتے ، سوتے جاگتے اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتی ہے ۔

فصال سے مراد ۔ یا انفصال حمل ہے یعنی حمل کی انتہائی مدت دو سال ہوتی ہے ، مگر یہ قول ضعیف ہے ۔ قوی اور اکثری قول یہ ہے کہ پیدائش کے بعد دو برس تک ماں بچہ کو دودھ پلاتی ہے ۔ دو برس کے بعد دودھ چھڑا دیتا ہے ۔

بیضاوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ دودھ پلانے کی پوری مدت دو برس ہے ۔ اس جگہ یہ مسئلہ استنباط سے معلوم ہوتا ہے لیکن دوسری آیت میں اس کی صراحت ہے ۔ فرمایا ہے ۔ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں ۔ بشرطیکہ رضاعت پوری کرنی منظور ہو ۔ امام ابو یوسفؒ ، امام محمدؒ اور امام ابو شافعیؒ کا یہی قول ہے ۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دودھ پلانے کی انتہائی مدت دو سال چھ مہینے ہے ۔ کیونکہ دوسری آیت میں وارد ہوا ہے ۔ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا یعنی بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہے ۔

ابن عباس اور دیگر علماء نے فرمایا ہے کہ جب دوسری آیت میں مدت رضاعت دو سال مقرر کر دی گئی ہے اور اس آیت میں حمل و فصال کی مجموعی مدت ڈھائی سال قرار دی ہے تو لامحالہ دو سال کی مدت دودھ پلانے کیلئے اور چھ ماہ حمل کی کمترین مدت قرار پائی ہے (کذا نقلہ ابن کثیر عن ابن کثیرؒ) بہر حال خلاصہ وصیت یہ ہے کہ :-

اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ اللہ کا اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔ اللہ خالق ہے اور ماں باپ ذریعۂ تخلیق۔ اللہ مربی ہے اور ماں باپ وسائطِ تربیت۔ اللہ محسنِ حقیقی ہے اور ماں باپ محسنِ مجازی، اس لئے ماں باپ کا شکر ادا کرنا بھی واجب ہے۔

اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ اگر کسی محسن کا احسان اور منعم کا انعام ایسا ہو کہ اس کو حاصل کرنے کے بعد اصلی محسن سے کوئی تعلق نہ رہے۔ تب بھی اہلِ دانش کے نزدیک حق کوشی اور ادائے شکر واجب ہے۔ احسان فراموشی کسی طرح جائز نہیں، لیکن اگر منعم ایسا ہو کہ احسان سے سرفراز کرنے کے بعد تعلق منقطع نہ کرے ہر وقت فیضان جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اپنے انعام کے حق ادا کرنے نہ کرنے کی بازپرس بھی کرے اور نعمتوں سے سرفراز ہونے والا کبھی بھی منعم کی بازپرس سے نہ بچ سکے تو ایسے منعم کے انعام کا شکریہ ادا کرنے والا معمولی سمجھ رکھنے والوں کے نزدیک واجب ہوتا ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ ایسا منعم ہے کہ اس کی زندگی اور زندگی کے تمام مدارج و احوال اسی کے انعام کے مظاہرات ہیں اور اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد بھی مآل کار اسی سے واسطہ پڑنے والا ہے اور دوسری زندگی میں اپنے انعامات کے متعلق وہی بازپرس کرنے والا بھی ہے، اس لئے اسی کے احسان بھولنا اور نعمتوں کا عملی، قولی اور فکری شکر ادا کرنا نہ کرنا نہ فقط حماقت بلکہ موجب بربادی ہے۔

ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکارِ عالیؐ سے پوچھا: خدمت اور حسنِ سلوک کا زیادہ مستحق کون ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا ماں کے بعد کون۔ فرمایا تیرا باپ (مسلم و بخاری) حضور گرامیؐ نے ارشاد فرمایا ماں باپ کی خوشنودی میں خدا کی خوشنودی ہے اور ان کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی (ترمذی) حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اقدسؐ نے ارشاد فرمایا بڑا بدبخت وہ شخص ہے جس نے ماں باپ دونوں کو یا دونوں میں سے ایک کو زندہ پایا پھر (انہوں) نے اس کو جنت میں داخل نہ کیا یعنی ان کی خدمت نہ کی اور جنت سے محروم رہا۔ ایک شخص بغرض شرکتِ جہاد حاضر ہوا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کیا تیرے والدین زندہ ہیں۔ اس نے جواب دیا جی ہاں۔ فرمایا انہی کی خدمت گزاری میں جہاد کر۔ یعنی ان کی خدمت کرنی ہی تیرے لئے جہاد ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔

سفیان بن عیینہ نے فرمایا جس نے پانچوں نمازیں پڑھیں اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جس نے پانچوں نمازوں کے بعد اپنے والدین کے لئے دعا مانگی اس نے والدین کا شکر ادا کیا اور اگر کسی کے ماں باپ دونوں یا دونوں میں سے ایک زندہ ہوں تو ان کا حکم ماننا اور ان کو ہر طرح آرام پہنچانا اور کبھی کسی معاملے میں ادنیٰ ترین نازیبا کلمہ نہ کہنا لازم ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے ہر عاقل انسان کو فطری یا مذہبی طور پر نصیحت فرما دی ہے کہ اللہ اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو اور ان کے حقوق پورے کرو اور یہ سمجھ لو کہ مآلِ کار مرنے کے بعد اللہ ہی کے پاس جانا ہے یعنی وہاں نعمتوں کی بازپرس ہوگی۔ منعمِ حقیقی اور محسنِ مجازی کی حق تلفی پر عذاب اور ادائے حقوق پر ثواب ملے گا۔

وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ الخ۔ اوپر کے کلام میں اطاعتِ والدین کا حکم دیا تھا، لیکن تفصیل کچھ نہ کی تھی، شرطیں کچھ نہ بیان کی تھیں۔ کس امر میں اطاعت کرنی چاہیئے۔ کیا اگر والدین ارتکابِ شر اور ترکِ خیر کا حکم دیں تب بھی حکم ماننا چاہیئے۔ پھر شر اور خیر کے بھی مدارج ہیں۔ خیر کا کوئی درجہ مستحب ہے کوئی واجب، کوئی فرض کوئی فرضِ اولین۔ کس خیر کو والدین کے حکم سے ترک کیا جا سکتا ہے اور کس حد تک سرکشی کرنی جائز ہے۔ یہ تمام مباحث تشریح طلب ہیں، اس لئے بعض شرائط کو بیان کرنا ضروری ہے۔ منجملہ دیگر شرائط کے اہم ترین شرطِ اطاعتِ والدین کی یہ ہے کہ اولین فرض یعنی توحیدِ ربوبیت والوہیت کے خلاف والدین کا حکم نہ ہو۔ کیونکہ اللہ کا کوئی شریک کسی کو عقلی و نقلی طور پر معلوم نہیں۔ نہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اللہ کے شریک کی حقیقت بلکہ عوارض اور وجود بھی آج تک کسی کے ذہن میں نہ آئے۔ اگر وجود اور عوارض کا بھی علم ہو جاتا تو کم از کم شریکِ خدا کا علم بالوجہ تو ہو جاتا۔ پس جب شریکِ خدا کا وجود ذہنی بھی نہیں ہے تو لامحالہ وہ معدوم بلکہ مستحیل الوجود ہے اور مستحیل الوجود کا وجود فرض کرنا اور پھر اس کو افعالِ حقیقہ کا مصدر اور فاعل قرار دینا سخت ترین حماقت اور سب سے بڑی بے جا حرکت ہے، اس لئے اگر ماں باپ مجہول الحقیقت غیر معلوم العوارض چیز کو خدا کا شریک بنانے پر مجبور کریں اور انتہائی زور ڈالیں تب بھی ان کا کہنا ماننا اور اس کے بیہودہ غلط اور محال عقیدہ کو ماننا ہو، مگر دنیا اللہ کاذب ترین قول کا زبان سے اقرار کرنا ناجائز ہے۔

آیت مذکورہ میں چونکہ صراحت کر دی گئی ہے کہ جس چیز کا تم کو علم نہ ہو اس کو ماں باپ کے کہنے سے اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ

(اگر علم ہو (خواہ صحیح یا غلط) تو شرک کرنا جائز ہے۔

یہ شبہ درحقیقت آیت کا مطلب غلط سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آیت میں خدا تعالیٰ نے استحالۂ شرک کی قطعی دلیل بھی بیان فرما دی ہے۔ شرک کی ممانعت مع دلیل کے کرنی مقصود ہے اور یہ ظاہر کرنا فرض ہے کہ جب اللہ کا شریک موجود ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کا وجود ذہنی بھی نہیں ہے اور آج تک کسی کے دماغ میں اس کا وجود نہ آسکا تو لامحالہ اس کا واقعی وجود نہیں ہے کیونکہ وجود کی دو قسمیں ہیں خارجی اور ذہنی۔ ذہنی وجود کا درجہ خارجی وجود سے بہت گرا ہوا ہے۔ وجود ذہنی مثل عکس اور سایہ کے ہوتا ہے۔ اور وجود خارجی اصل ہوتا ہے تو ایسی چیز کا اصل وجود تو کجا ئے خود رہا عکس اور ظلی وجود بھی نہیں۔ اس کو شریک خدا بنانا فرض محال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور ظاہر ہے کہ کسی کے کہنے سے (خواہ کہنے والے ماں باپ ہی ہوں) محال کو واقعی چیز مان لینا کسی طرح جائز نہیں۔ پس حکم شرک میں والدین کی اطاعت بھی جائز نہیں۔ صحیح حدیث میں آیا ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ یعنی کسی مخلوق کے کہنے سے خالق کی نافرمانی نہ کرنی چاہیے۔

علمائے مفسرین نے آیت مذکورہ کا سبب نزول حضرت سعد بن ابی وقاص کے واقعہ کو قرار دیا ہے۔ خود سعد کا بیان ہے کہ میں اپنی والدہ کی بہت خدمت کرتا تھا اور وہ اپنی تمام اولاد سے زیادہ مجھے چاہتی تھی۔ لیکن جب میں مسلمان ہو گیا تو اس نے کہا میرے خیال میں تو نے یہ نیا دین اختیار کر رکھا ہے تو اس کو چھوڑ دے ورنہ میں نہ ان برت رکھوں گی اور تجھے عمر بھر طعنہ دیا جائے گا اور ماں کا قاتل کہا جائے گا۔ میں نے کہا اماں ایسا مت کر۔ کیونکہ میں کسی طرح اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا مگر اس نے نہ مانا اور ایک رات دن بغیر کھائے پیئے پڑی رہی۔ صبح کو اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ لیکن دوسرا دن رات بھی اس نے یونہی گزار دیا۔ تیسری صبح کو اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ مگر وہ دن رات بھی اس نے اسی طرح گزار دیا۔ یہاں تک کہ چوتھی صبح کو وہ تقریباً بے ہوش ہو گئی۔ میں نے یہ حالت دیکھ کر کہا اماں تو خوب سمجھ لے کہ اگر تیری سو جانیں ہوں اور ایک ایک کرکے میرے سامنے نکل جائیں تب بھی خدا کی قسم میں اپنے اس مذہب کو کسی طرح نہیں چھوڑوں گا۔ اب تیرا جی چاہے کھا تیرا جی نہ چاہے نہ کھا۔ یہ سن کر وہ کھانے لگی (رواہ الطبرانی واہل السنن والصحیح) سنن کی میں اتنا زائد آیا ہے کہ سعد کی ماں نے سعد سے کہا تیرے رب نے تجھے والدین کی فرماں برداری کا حکم دیا ہے۔ سعد نے کہا بے شک حکم دیا ہے۔ ماں نے تو جب تک اس مذہب سے برگشتہ نہ ہوگا میں راضی نہ ہوں گی۔ یہ سن کر سعد حضور والا کی خدمت میں عرض حال کے لیے حاضر ہوئے۔ اس وقت آیت وَاِنْ جَاهَدٰكَ نازل ہوئی اور حضور والا نے پڑھ کر سنائی۔ اسی آیت سے معلوم ہو گیا کہ تعلیم شرک میں والدین کے حکم کو نہ ماننا ضروری ہے۔ لیکن دیگر واجبات و فرائض اور مستحبات کا حکم نہ معلوم ہو سکا۔ علماء نے احادیث سے استنباط کرکے لکھا ہے کہ اگر والدین ترک فرائض و واجبات کا حکم دیں تو اطاعت نہ کرنی لازم ہے۔ اس میں نماز روزہ اور دیگر تمام فرائض آ گئے۔ ہاں اگر نوافل اور مستحبات کو ترک کرنے کا حکم دیں تو اطاعت ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ اسلام تنگ نظر مذہب نہیں ہے۔ رواداری اور حسن معاشرت اس کا ضروری جزو ہے۔ اوپر کی آیت میں والدین کی مشرکانہ تعلیم نہ ماننے کا حکم دیا تھا۔ اس سے بعض کج فہموں کو نکتہ چینی کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ اسلام کی تعلیم رشتۂ انسانیت، رشتۂ وطنیت، رشتۂ اخوت، مودت یہاں تک کہ رشتۂ ولدیت کو بھی قطع کراتی ہے۔ اسلام کی تعلیم کا مقصود یہی ہے کہ دنیا میں تباہی پھیلے اور تمام روابط محبت اور علائق عمرانیت ٹوٹ جائیں۔ چونکہ یہ نکتہ چینی بے بنیاد اور سراسر غلط تھی، اس لئے فرمایا کہ:۔

کافر ماں باپ کے ساتھ بھی حسن سلوک سے برتاؤ کرو یعنی ادب اور تہذیب سے پیش آنا، کھانے پینے کی تکلیف نہ دینی، ضروریات زندگی کی کفالت کرنی اور اسی طرح کے دوسرے سعادتمندانہ افعال لازم ہیں۔ شاہراہ زندگی کے جدا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ فطری علائق کو بھی منقطع کر لیا جائے۔ کفر و اسلام کا تفرقہ پیدائشی روابط کو نہیں توڑتا ہاں:۔

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔ زندگی کی شاہراہ انہی لوگوں کی اختیار کرو انہی کے راستہ پر چلو جو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ عمل اسی دستور حیات پر کرو جو خدا پرستوں کا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ روابط انسانیت اور علائق قرابت و زوجیت اور عواطف مالیت و حکومت تم کو اللہ ہی کی طرف دوڑنے والوں کے رستہ سے روک دیں۔ قرابت اور رشتہ داری، محبت اور مودت صرف ایک دھوکہ ہے اس کا پاس لحاظ اس وقت تک کیا جا سکتا ہے جب تک دنیوی عمرانیت کے لئے ضروری ہے۔ دینی مدد و نصرت میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ آخر میں۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ الخ ۔ سب کو لوٹ کر خدا کے پاس جانا ہے ۔ اچھے بُرے اعمال اور صحیح غلط دستورِ زندگی کی اطلاع اور اس کی پاداش خود خدا دے گا ۔ خدا کا کام ہے تمہارا کام اپنے راستہ پر چلنا اور رواداری سے دنیوی زندگی کو گزار دینا ہے ۔

صدیق اکبر کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء جو حضرت زبیر بن عوام کی بیوی تھیں ۔ فرماتی ہیں کہ قریش مکہ کے معاہدہ کے زمانے میں میری ماں میرے پاس آئیں وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئی تھیں ۔ میں نے رسول اللہ سے دریافت کیا کہ میری ماں آئی ہے اور اسلام سے نفرت رکھتی ہے کیا میں اس سے کچھ سلوک کروں ۔ حضور نے فرمایا اس سے سلوک کرو (مسلم و بخاری)

یٰبُنَیَّ اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ یہاں تک تو ادائے حقوق والدین کا حکم جملۂ معترضہ کی صورت میں تھا ۔ بات میں بات آن پڑی تھی ۔ لقمان حکیم نے شکرِ والدین کی نصیحت نہ کی تھی ، اس لئے خدا تعالیٰ نے ماں باپ کا شکریہ ادا کرنے کا حکم مفصل طور پر بیان فرما دیا ۔ اس جگہ پھر مواعظ لقمان کی حکایت شروع فرمائی ۔ لقمان حکیم نے ادائے شکر کا پہلا حصہ کلام سابق میں بیان کیا تھا جس پر نظری عقائد اور فکری معارف کی صحت موقوف تھی ، لیکن یہ دنیا دار العمل ہے ، میدانِ تگ و پو ہے ۔ صرف نظری افکار کی صحت اور عقائد کی درستی زندگی سدھارنے کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے اصلاحِ اعمال کی تعلیم بھی لازم تھی ۔ اخلاق معاشرت اور سماج کو درست کرنے والے قوانین بھی بنائے جانے ضروری تھے ، لیکن اصلاحی عملی قوانین کا اجراء اور ان پر عمل جب ہی ممکن ہے کہ جزا سزا کا یقین ہو اور نتائج کا یقین اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ سمجھ لیا جائے کہ خلاق کائنات کے سامنے جانا ہے ، اس کو ہر حرکت و سکون کا جواب دینا ہے اس میں جزا سزا دینے کی قدرت بھی ہے اور اس کا علم ہمہ گیر بھی ہے ۔ ہماری کوئی حرکت جسمانی اور خطورِ قلبی اس سے پوشیدہ نہیں ۔ اسی لئے لقمان حکیم نے اصلاح اعمال کی تعلیم دینے سے پہلے ادائے شکر کے دوسرے حصہ کو آیت مذکورہ میں بیان کیا اور فرمایا :-

بیٹا خوب سمجھ لے کہ اللہ کے علم سے کوئی دقیق سے دقیق چیز بھی غائب نہیں ۔ اگر کوئی چیز رائی کے دانے کی برابر کسی پتھر کے جگر کے اندر یا آسمان میں یا زمین میں غرق کہیں ہو اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ۔ اللہ اس کو بھی جانتا ہے اور نہ فقط جانتا ہے بلکہ اس میں یہ قدرت بھی ہے کہ وہ اس کو سامنے لا کر کھڑا کر دے گا ۔ خلاصۂ قول یہ نکلا کہ اس زندگی کے حرکات و سکنات کو معدوم سمجھنا غلطی ہے اور کسی چیز کو علم الٰہی سے غائب سمجھنا بھی صحیح نہیں ۔ تہ خانے کے اندر پردہ میں چھپ کر اگر کوئی اچھا برا کام کیا جائے گا تو خدا کو اس کا علم ہونا یقینی ہے اور ہر اچھے بُرے کام کی پاداش بھی ضروری ہے ۔ کیونکہ سزا جزا کا وجود اس وقت ناممکن ہے جب خدا تعالیٰ کو ہمارے اعمال کا علم نہ ہوتا یا علم ہوتا بھی تو وہ ہمارے کئے ہوئے افعال کو دوبارہ بروئے کار نہ لاتا اور مرنے کے بعد ہمارے پراگندہ اجزا کو وہ اپنی ناواقفیت یا کمزوری کی وجہ سے جمع نہیں کر سکتا لا ، چونکہ ایسا نہیں ہے ، اس لئے سزا جزا یقینی ہے اور جب ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا لازم ہے تو کردار اطوار اور گفتار کی درستی بھی ضروری ہے ۔ حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص ایسے پتھر کے اندر جس سوراخ یا شگاف بھی نہ ہو کوئی عمل کرے تو بھی اس کا علم (قیامت کے دن) لوگوں کے سامنے آ جائے گا ۔ چاہے جس قسم کا ہو (رواہ احمد)

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ یوں تو تخیل کی یکسوئی اور نفرت و رغبت کے جذبات کا رُخ ہر طرف سے موڑ کر اللہ کی طرف کر دینا ہر خدا پرست پر فرض ہے اور تمام مہماتِ زندگی میں اطاعتِ الٰہیہ کے جذبہ کے زیر اثر سارے اعمال سر انجام دینا لازم ہے ۔ معاملات ہوں یا اخلاقیات سب ہی عبادت ہیں کیونکہ زندگی کے سارے حرکات و سکنات اطاعت کے اثر سے خالی نہ ہونا چاہئیں اور اطاعتِ کاملہ کا نام ہی عبادت ہے ، لیکن تخیل کی یکسوئی اور انقطاع الی اللہ کے بعض اوقات خصوصی تمام آسمانی مذاہب میں مقرر کئے گئے ہیں ۔ تاکہ اگر نفس انسانی میں زندگی کے تمام اوقات کے اندر جذبۂ اطاعت کو ہمہ گیر بنانے کی طاقت نہ ہو تو کم سے کم مخصوص اوقات میں تو کل علائق و روابط سے تعلق توڑ کر اللہ سے براہِ راست رشتہ جوڑ لیں اسی توڑ جوڑ کا نام نماز ہے ۔ نماز خالق کے سامنے مخصوص طور پر عجز و نیاز کرنے کا نام ہے ۔ ہر نبی اور ہر زمانے کے موافق اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں ۔ کہیں صرف دعا اور گریہ و زاری تھی کہیں سجود و قیام تھا کہیں اللہ کی تسبیح و تقدیس اور اس سے عفو قصور کی درخواست تھی ۔ معلوم نہیں لقمان حکیم کے عہد میں نماز کی کیا صورت تھی ۔ بہرحال اللہ کی طرف توجہ کرنے اور تخیل کو یکسو بنانے اور نورِ معرفت حاصل کرنے کے لئے چونکہ نماز ضروری چیز تھی ، اس لئے اعمال میں سب سے پہلے لقمان نے نماز کو بغیر سستی کے پورے شرائط و لوازم کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ فطرتِ انسانیہ کا اقتضاء ہے کہ اگر پیش آنے والی مصیبت سے اپنی جان بچ جائے تو اس کے بعد دوسرے کو بغیر رشتۂ قرابت و مودت کے اس مصیبت سے بچانے کی کوشش کی جائے ۔ شیر سامنے آتا ہے تو پہلے آدمی خود اپنے کو بچاتا ہے ۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوتا ہے تو اپنے

دوسرے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ سرِ راہ کنوئیں سے آدمی اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے پھر دوسرے لوگوں کو ہٹاتا ہے۔ یہ اقتضائے فطرت ایسا کام ہے کہ ہر انسان کی سرشت اس سے واقف ہے اس کے خلاف دو صورتیں ہیں۔ نمبر اوّل یہ ہے کہ انسان ہلاکت سے اپنے آپ کو بچانے کی کوئی دائمی تدبیر نہ کرے، تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے جو کام کرنے چاہئیں وہ نہ کرے اور جو کام موجبِ ہلاکت ہوں ان کو کرے۔ یہ عمل اقتضائے حیوانیت سے بھی نیچے گرا ہوا ہے۔ یہ ایسی حرکت ہے جس سے فطرتِ انسانیہ تو درکنار حیوانی سرشت بھی انکار کرتی ہے۔ نمبر دوئم یہ کہ انسان خود اپنے کو بچانے کی کوشش تو کرے، لیکن اپنی ذات کو محفوظ کرنے کے بعد باوجود طاقت اور وقت کے دوسروں کو بچانے کی کوئی سعی نہ کرے۔ یہ عمل اگرچہ اقتضائے حیوانیت کے موافق ہے، مگر انسانی فطرت اس سے ناواقف ہے۔

مقدم الذکر عمل کو عرفِ شریعت میں معروف کہتے ہیں۔ یعنی ایسا کام جس سے ہر انسان کی سرشت واقف ہے۔ اسی کو خیرِ حقیقی اور نیکی اور حسنِ عمل اور صالح بھی کہا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر دونوں صورتوں کو سرشت منکر کہتی ہے۔ یعنی ایسا فعل جس سے کسی انسان کی فطرت واقف نہیں (منکر بمعنی نامعلوم) انسان کی طبیعت بحیثیت انسانیت اس کو نہیں چاہتی نہ جانتی ہے۔ ہاں حیوانی اقتضاء ہو تو ہو۔ اسی عمل کو سیئہ، خطا، گناہ اور شر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسا کام انسانیت کا گناہ اور اقتضائے انسانیت کے لئے مُضر ہے۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے ایسی چیز کی تعلیم دی جو ہر سعادت کے لئے سنگِ بنیاد اور ہر خیر کے لئے اصل الاصول ہے۔ پھر اقتضائے انسانیت کو پورا کرنے کی عمومی تلقین کی اور حکم دیا کہ اپنی اصلاح کے بعد (خود غرضی کو چھوڑ کر) دوسرے لوگوں کو بھلائی اور حسنِ عمل پر آمادہ کرو اور بُرے کاموں سے روکو۔

بات یہ ہے کہ جو شخص قانونِ صلاح اور ضابطۂ اصلاح کا پابند ہو اس کا فرضِ قطعی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو بھی قانون کا پابند بنائے اور قانون کی خلاف ورزی سے روکے۔ اگر باوجود طاقت اور امکان کے قانون کی خلاف ورزی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے برداشت کی جائے گی تو فی الحقیقت یہ قانون شکنی پر رضامند ہونے کا سکوتی اظہار ہوگا، اسی لئے حق بات سے خاموش رہنے والے کو گونگا شیطان کہا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے حضور گرامی نے ارشاد فرمایا واللہ تم لوگ نیک کام کرنے کا حکم دوگے اور بُرے کاموں سے منع کروگے ورنہ اللہ تمہارے دلوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مدح اور اس کے خلاف کرنے والوں کی مذمت آئی ہے۔

رہی یہ بات کہ نیکی کا حکم اور بدی سے باز داشت کس حد تک اور کس موقع پر کی جائے تو یہ اپنی استطاعت کے مطابق ہے۔ ہاتھ سے روکنے اور مُنہ سے منع کرنے کا حکم حدیث میں وارد ہے اور مجبوری درجہ پر صرف دل سے امرِ منکر کو بُرا جاننا ایمان کا ضعیف ترین درجہ قرار دیا گیا ہے، لیکن فقہا نے اس کی تفصیل کی ہے اور لکھا ہے کہ ہاتھ اور ہتھیاروں سے روکنا تو حاکموں کا کام ہے اور زبان سے منع کرنا عالموں کا کام ہے اور دل سے بُرا جاننا عام اہلِ ایمان کا فرض ہے۔ فقہا نے یہ تفصیل شاید اس لئے کی ہے کہ اہلِ حکومت کے پاس تو مادی طاقت ہوتی ہے اور علماء کے پاس معارف پر ور دماغ اور ناطق زبان ہوتی ہے اور عام لوگ ان دونوں چیزوں سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ ان کے پاس صرف قلبی ایمان ہوتا ہے، اس لئے ہر گروہ اسی قدر حکم شرع کی تعمیل پر مامور ہے جتنی اس میں طاقت ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ جب آدمی تبلیغِ حق کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اہلِ باطل اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور طرح طرح سے اس کو ستاتے ہیں۔ مالی نقصان، آبرو کی شکست اور جان کا ضرر جب کچھ اہلِ باطل کی طرف سے کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اچھے اچھے دیندار کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ اسی لئے لقمان نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دینے کے بعد بیٹے سے کہا (اعلانِ حق اور اشاعتِ صداقت کے راستہ میں) جو مصائب تم پر آئیں ان پر صبر کرو۔ تکالیف پر صبر کرنا بلندیٔ حوصلہ اور پختگی ارادہ کی علامت ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ الخ۔ جب مصائب اور شدائد برداشت کرنے کے بعد اعلانِ صداقت کرنے والا فائز المرام اور کامیاب ہو جاتا ہے اور اہلِ باطل کو شکست ہو جاتی ہے اور ناصح لیڈر کی پیروی کرنے والوں کی ایک جماعت بن جاتی ہے اور کثرتِ انسان مرشدِ اعظم کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں تو بعض اہلِ ارشاد بلکہ اکثر رہنما غرور و پندار کے نشہ سے سرمست ہو جاتے ہیں۔ مخلوقِ الٰہی کا رجوع اور تسخیرِ عوام ایک ایسی مئی دو آتشہ ہے، جس کا نشہ پیشواؤں، عالموں اور ناصحوں کے دماغ کو معطل کر دیتا ہے، دست بوسی دل میں رعونت پیدا کر دیتی ہے اور دست بستہ لوگوں کا حلقہ نفس میں خود فریبی اور دماغ میں اکڑ نمودار کر دیتا ہے۔ کامیاب فقیر اپنے کو دوسرے انسانوں سے برتر ہستی سمجھنے لگتا ہے۔ راستہ میں چلتا ہے تو سب سے آگے اور اکڑ کر

بات کرتا ہے تو لاپرواہی سے منہ بسورکر۔ آواز دیتا ہے تو ڈانٹ کر چلا کر۔ غرض اس کی چال میں رعنائی، آواز میں تمکنت اور گفتار میں فخر و پندار نمایاں ہو جاتا ہے پس جس طرح مصائب سے تنگ آکر اعلانِ صداقت سے کنارہ کشی، بزدلی اور پستی حوصلہ کی دلیل ہوتی ہے اور آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اعلانِ حقانیت میں کامیاب ہو جانے کے بعد پندار کے علامات کا ظہور بھی برباد کر دیتا ہے۔ اسی لئے لقمان نے اپنے بیٹے کو جس طرح استقلال، حوصلہ اور عزم راسخ کی تعلیم دی اسی طرح تواضع اور انکسار کا حکم دیا اور رفتار و گفتار میں رعونت اختیار کرنے سے منع کیا۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ کا مطلب یہ ہے کہ (تکبر سے) لوگوں کے سامنے گال نہ پھلا۔ ابوایوب کی روایت کردہ حدیث میں یہی مطلب آیا ہے (رواہ الطبرانی و ابن عدی وابن مردویہ) ابن عباس نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ جب لوگ تجھ سے باتیں کریں تو تکبر سے ان کو حقیر سمجھ کر گردن نہ ٹیڑھا اور منہ نہ موڑ۔ امام مالک نے زید بن اسلم سے یہی تفسیر روایت کی ہے۔ عوفی، عکرمہ، مجاہد، یزید بن اصم، ابوالجوزاء، سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ ابن کثیر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ اگر روایت حدیث درجہ تک پہنچ جائے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ اگرچہ لفظی ترجمہ میں کچھ تغیر ہے۔ یہ کردار و معاملات میں تکبر نہ کرنے کی تعلیم تھی۔ اس نے آگے رفتار میں غرور آمیزی کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ زمین پر اکڑ کر اور اترا کر نہ چلو کیونکہ اترانے والا مغرور خدا کو ناپسند ہے بلکہ چال میں اعتدال رکھو یعنی نہ کودتے زمین پر پیر مارتے ہوئے پہلوانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چلو نہ مٹکتے اور ناز سے قدم اٹھاتے چلو۔ ابن مسعود کا بیان ہے کہ پہلے زمانے میں عیسائی پادری جبہ پہنے لاٹھی یا چھڑی ٹیکتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ نازک خرامی کرتے تھے اور یہودی بہت زیادہ تیزی سے چلتے تھے۔ ان دونوں چالوں کی ممانعت اس آیت سے مستفاد ہوتی ہے۔ آجکل بعض علماء اور مشائخ نے بھی شاگردوں اور مریدوں کے جھمگٹ کو ساتھ لے کر نازک خرامی اختیار کر رکھی ہے اور ان کے خلاف جنگجو اوباش لوفر طبقہ نے مستانہ چال پسند کر لی ہے اور یہ دونوں رفتاریں مذموم ہیں۔ حضور اقدس کی چال نہ متکبرانہ تھی نہ معشوقانہ بلکہ درمیانی رفتار سے حضور چلتے تھے، مگر کسی قدر سرعت کے ساتھ تاکہ سستی کا مظاہرہ ہو۔ اس سے آگے آواز و گفتار میں تمکنت پیدا کرنے سے باز داشت کی ہے اور گدھوں کی طرح چلانے سے روک کر دبی ہوئی نرم آواز نکالنے کی ہدایت کی ہے۔

مقصودِ بیان لقمان کی نصیحت صرف اپنے بیٹے کو دلالت کر رہی ہے کہ لقمان نبی نہ تھے۔ نبی کی عمومی نصیحت خصوصی مورد کے منافی ہے، شرک سب سے بڑی بے جا حرکت ہے۔ اس سے بڑھ کر نامکن چیز کوئی نہیں۔ ماں باپ کی اطاعت اور فرماں پذیری واجب ہے۔ شکر الٰہی کے بعد ماں باپ کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ اگر ماں باپ اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی نافرمانی ضروری ہے۔ مدت رضاعت دو سال ہے۔ اللہ کا کوئی شریک کسی کو معلوم نہیں یعنی شریک خدا اتنا محال ہے کہ اس کا وجود کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا۔ خارجی اور اصلی وجود کا تو ذکر ہی کیا ہے کافر ماں باپ کے ساتھ رہنا سہنا جائز ہے۔ لفظ صاحبہما اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کافر ماں باپ سے حسن سلوک کرنا ان کی ضروریات معاش کی کفالت کرنی اور تہذیب و ادب سے پیش آنا واجب ہے، لیکن مذہبی پیروی صرف خدا پرستوں کی کرنی چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ شریعت قرآنیہ میں رشتۂ اسلام اور رشتۂ صلاح رشتۂ قرابت سے یہاں تک کہ رشتۂ والدیت سے بھی مقدم ہے۔ رشتہ ولایت رشتۂ زوجیت اور رشتۂ اخوت و مودت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اللہ کا علم ہمہ گیر ہے اور اس کی قدرت بھی محیط کل ہے۔ گویا اسلام جس اللہ کی طرف جھکنے کی تعلیم دیتا ہے وہ فلاسفہ کے واجب الوجود سے جدا چیز ہے نہ وہ آریہ کا مفروض خدا ہے نہ عیسائیوں کا مرکب خدا۔ فلاسفہ کے نزدیک خدا عالم کلیات ہے اور جزئیات مادیہ سے بھی من حیثیت الجزئیت ناواقف ہے۔ آریہ کا خدا صرف روح اور مادہ کو ملانے والا ہے، عدم سے وجود میں لانے کی اس میں قدرت نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک روح و مادہ بجائے خود قدیم ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا نام ہے اقانیم ثلثہ سے مرکب کا یا صرف باپ کا اور چونکہ باپ ہونا یا مرکب ہونا علامت احتیاج ہے، اس لئے ان کا خدا قادر کل نہیں بلکہ محتاج ہے۔

قیامت کے دن اسی زندگی کا ہر ذرہ سامنے آجائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے کئے ہوئے اعمال فنا نہیں ہو جاتے صرف نظر سے غائب ہو کر حال سے ماضی بن جاتے ہیں۔ اصل اعمال یا ان کے نقوش خزانۂ الٰہیہ (اعمال نامے یا کرامًا کاتبین کے رجسٹر یا کہیں دوسری جگہ) میں محفوظ رہتے ہیں۔ صرف ظہور و خفا کا فرق رہتا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ کائنات کے اندر جو پوشیدہ حقائق ہیں وہ بر روئے ظہور آجائیں گے اور اعمال انفسیہ بھی مرتب شکل میں رونما ہو جائیں گے۔

لقمان حکیم کے زمانے میں بھی نماز پڑھنی واجب تھی، لیکن نماز کی کیا صورت تھی یہ معلوم نہیں۔ اصولِ خیر تمام آسمانی مذاہب میں مشترک ہیں۔ کیونکہ جو چیز

فطرت انسانیہ کو معلوم ہے معروف اور خیر ہے جس سے انسانی فطرت ناواقف ہے وہ منکر نامعلوم اور شر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر آسمانی مذہب فطرت انسانیہ کے اقتضاء کو پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی خلاف ورزی سے روکتا ہے۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اس ایمان فروش غلط فہم علماء کو جو مصالح وقت کا بہانہ تراش کر اظہار حق سے خاموش رہتے ہیں اور امر بالمعروف کو ترک کر دیتے ہیں۔ نیز سبق لینا چاہیے اس حیلہ ساز طبقہ کو جو اپنے کو مجبور محض سمجھ کر یا ضعیف مطلق ظاہر کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غافل رہتا ہے اس کو جان لینا چاہیے کہ بقدر امکان امر و نہی کا حکم عام ہے کسی کی حیلہ تراشی اس تعلیم کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتی۔ گفتار رفتار اور کردار میں رعونت کرنی حرام ہے۔ یہاں تک کہ غرور کی علامات سے پرہیز رکھنا لازم ہے۔ گفتگو کے وقت منہ پھلانا، گردن نیوڑانا، نفرت سے منہ پھیر لینا، اکڑ کر چلنا، مستانہ خرامی کرنی، معشوقانہ رفتار اختیار کرنی، ڈانٹ کر متکبرانہ آواز نکالنی۔ غرض زندگی کے تمام اقوال و اعمال میں تکبر کی آمیزش کرنی ممنوع ہے۔ پس اس سے سبق لیں وہ مغرور مشائخ اور متکبر علماء جو خودداری اور عزت نفس کا بہانہ کر کے عوام بلکہ شاگردوں اور مریدوں سے غرور کرتے ہیں اور چال ڈھال میں رعونت کی نمائش کرتے ہیں۔ اگر ان کے حلقہ بگوش ان سے پہلے بیٹھ جائیں یا ان کے آنے پر سرو قد تعظیم نہ دیں یا راستہ میں ان سے آگے بڑھ جائیں یا بجائے پیچھے چلنے کے ان کے برابر آجائیں تو وہ غصہ کے مارے کپّے کی طرح پھول جاتے ہیں اور ان کے چہرے سرخ ہو کر تمتمانے لگتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات شرعاً حرام ہیں۔ پھر درس حاصل کرنا چاہیے ان مغرور مسلم حکام کو حکومت کے رکھ رکھاؤ کے بہانہ سے اپنے ملازموں، زیردستوں اور اہل معاملہ سے گفتگو کرنے کے وقت لہجہ کو سخت بنا لیتے ہیں اور شاید ادر گرجیلی آواز سے گفتگو کرتے ہیں اور اس کو حاکمانہ شان سمجھتے ہیں۔ نیز تعلیم حاصل کرنی چاہیے اس لوفر اوباش طبقہ کو گدھوں کی طرح اپنے محلوں میں اور بازاروں میں چیختے پکارتے پھرتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں کرتے کہ اسلامی تہذیب ان کے اس رنگ ڈھنگ کو استحسان کی نظر سے نہیں دیکھتی وغیرہ۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ

کیا تم لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ نے تمہارے کام پر لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی نعمتیں ظاہر و پوشیدہ طور

ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۗ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا

پر نازل فرمائیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے اللہ کے بارے میں

كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

جھگڑا کرتے ہیں اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ (اُس) کتاب پر چلو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر ہم نے

اٰبَآءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ إِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○ وَمَنْ يُّسْلِمْ

اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا اگر ان کے باپ دادا کو شیطان دوزخ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو (تب بھی) یہ انہی کی پیروی کریں گے جو شخص اپنا رُخ

وَجْهَهٗ إِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ وَإِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ

اللہ کی طرف کر دے اور نیک کام کرنے والا ہو تو بے شک اُس نے مضبوط رسی کو پکڑ لیا اور اللہ ہی کی طرف کل

الْأُمُورِ ۝ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهُ ۚ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا

کاموں کا انجام ہے ۝ اور جو کوئی کفر کرے تو اس کا کفر تم کو رنجیدہ نہ کرے ہمارے ہی پاس ان سب کو لوٹ کر آنا ہے جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ہم ان کو

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ

بتا دیں گے بلاشبہ اللہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے ۝ ہم تھوڑے دنوں ان کو بہرہ مند کریں گے پھر سخت عذاب کی طرف ان کو کھینچ لیں گے۔

تفسیر یہ کائنات ایک ایسی مضبوط زنجیر ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے۔ فوق المادہ کائنات سے لے کر ادنیٰ ترین مادی مخلوق تک ہر چیز اپنے ماتحت اور مافوق سے ایک خاص ربط رکھتی ہے۔ اگر ایک انچ نیچا اترے تو اپنی نوع سے خارج ہو کر پست درجہ والی نوع میں داخل ہو جائے اور اگر قدرے اوپر کو اٹھ جائے تو بالائی نوع کے اندر اس کا اندراج ہو جائے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنی فطری حد سے نیچے اوپر ہو سکے یا فرائض فطرت کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ آغاز کائنات گیس سے ہوا جو اتنا خفیف تھا کہ گویا اس میں وزن نہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں وزن بڑھتا گیا اور گیس نے مختلف عناصر کی شکل اختیار کی۔ ہر بسیط عنصر گیس کے ایک خاص حصہ سے بنا۔ اسی کے بعض اجزا سے آسمان اور اس کی موجودات کی تخلیق ہوئی۔ اسی کے بعض حصوں سے ارضیات کو بنایا گیا۔ پھر بعض عناصر سے بعض کو ربط دے کر مختلف المقدار اور متفاوت القوت اجزا عنصری کو ملا کر مختلف قسم کی مرکب چیزیں بنائی گئیں۔ معدنیات اور جمادات میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو حد عنصریت کے قریب ہیں اور تحلیل کیمیاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی ان کی عنصری بساطت ختم ہو کر ترکیبی مزاج اور صورت پیدا ہوئی ہے۔ پھر اعلیٰ مرکبات سے اوپر درجہ کچھ قوی معدنیات کا ہے اور ان سے بھی اوپر مزید قوت رکھنے والے ذرات ہیں اور اسی طرح تدریجی ترقی ہوتے ہوئے کائنات نباتی کا آغاز ہو جاتا ہے اور کائنات نباتی کے ابتدائی درجہ سے ترقی ہو کر آخری چوٹی آتی ہے۔ یہاں سے عالم حیوانیت کا آغاز ہو جاتا ہے اور حیوانات میں بھی یہی منظم سلسلہ چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے بالا درجہ رکھنے والا حیوان یعنی انسان اپنی تمام رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا کائنات انسانیت کے لئے مادی کائنات کے تمام مراتب طے کرنے پڑتے ہیں۔ غازی حالت سے لے کر حیوانیت کی آخری چوٹی تک تمام کائنات جب تک ایک ایک خاص نظم اور ربط کے ساتھ اپنی فطری نوعی خدمات کو سرانجام نہ دے۔ اس وقت تک انسانیت کی دنیا نمودار نہیں ہو سکتی۔ اگر گیس کے جن اجزا سے پانی بننے والا تھا، ان سے آگ بنائی جائے اور جن اجزا میں آگ کی شکل قبول کرنے کی صلاحیت تھی ان سے پانی بنایا جائے تو نہ پانی رہے گا نہ آگ اور مائی ناری نوع میں اختلال پڑ جائے گا۔ پھر وہ کائنات جس کی تخلیق کے لئے مائی و ناری اجزا کی ضرورت ہے کہاں سے پیدا ہو سکے گی۔ غرض اور نار کا فرض کے ادنیٰ تغیر سے تمام کائنات میں فساد اور تباہی بپا ہو جائے گی اسی طرح جمادی نباتی اور حیوانی انواع یا افراد کو سمجھو۔ اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے فرض کو ادا کرنے سے غافل ہو جائے یا نظم فطرت کی خلاف ورزی کرے تو انسانی ہستی بروئے ظہور نہ آ سکے۔ سورج اور دوسرے سیارے گرمی اور روشنی نہ پیدا کریں یا اپنی معمولی مقدار میں کمی بیشی یا تغیر کر دیں تو عالم تہ و بالا ہو جائے۔ اگر آپس میں ایک کرہ دوسرے کرہ سے اور ایک ستارہ دوسرے ستارے سے ٹکرا جائے تو کائنات کا گل سرسبد یعنی انسان کس طرح باقی رہے گا۔ اگر ایک کرہ اپنی طبعی اور فطری کشش میں کمی یا زیادتی کرنے لگے تو کس طرح اور کیونکر سلامتی ممکن ہے۔ غرض مادہ اور تمام مادیات ایک فرض فطرت ادا کرنے میں ایک خاص نظم کے ساتھ مشغول ہیں۔ اور ان سب کی آخری چوٹی انسانیت ہے۔ سماوی اور ارضی مخلوق کی تسخیر اور اطاعت و فرماں پذیری یہی ہے اور واضح طور پر تمام ارضی سماوی کائنات کو تدریجاً انسانی ایجاد اور اس کو باقی رکھنے کے لیے اپنا اپنا فرائض پورے کرنے پڑ رہے ہیں۔ انسان جس قدر غور کرتا جائے گا تمام مخلوق کو اپنا خادم پاتا جائے گا اور مادی ترقی کے تمام مراتب اس کو اپنے سے نیچے نظر آئیں گے۔ یہ تمام احسانات اور انعامات وہ ہیں جن سے کھلم کھلا ظاہری طور پر انسانی جسمانی تخلیق وابستہ ہے لیکن انسان فقط مادہ اور مادہ کی جگر گوشگی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر ایک ایسی طاقت اور قوت بھی ہے جو کائنات کے کسی مادہ میں نہیں ہے۔ اوّل تو طاقت کو مادی کہنا ہی غلط بات

ہے کیونکہ طاقت اور قوت مادہ سے جدا چیز ہے، لیکن چونکہ بعض قوتیں مادہ سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً تغیر قبول کرنے والی مختلف اشکال کو قبول کرنے والی قوت جذب غذا اور نمو کرنے والی طاقت، حرکت اور انتقال مکانی کرنے والی طاقت ۔ ان تمام طاقتوں کا تعلق چونکہ مادہ اور مادیات سے ہے اور ان طاقتوں کے آثار مادیات میں ہی ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ کا میدان ہی ان کی جولان گاہ ہے، اس لئے ان طاقتوں کو مادی کہہ لیا جاتا ہے پھر بھی انسان جن باتوں کا حامل ہے وہ تمام مادی طاقتوں سے بالاتر ہے ۔ البتہ او رمادیات کی تمام طاقتیں (جن میں بعض کا نام ہم نے ابھی لیا تھا) انسان کے اندر بھی ۔ تغیر کو قبول کرنے والی، ترکیب اجزا کی حفاظت کرنے والی، شکل اور رنگ بنانے والی، غذا کو کھینچ کر بدنی ساخت میں تبدیل کر کے نمو پیدا کرنے والی اور حرکت دینے والی تمام قوتیں انسان میں موجود ہیں ۔ ان سب سے بلند ایک اور طاقت بھی ہے جو انسان کے سوا کسی اور مادی مخلوق میں نظر نہیں آتی اور جس طرح تمام مادی کائنات نے متغیرات کے اعتبار سے انسان کی تربیت اور خدمت کی تھی اور ابتدائی غاذی حالت سے ترقی کر کے انسانیت کی چوٹی تک مادی مخلوق کی رسائی ہوئی تھی ۔ اسی طرح اندرونی طور پر تمام کائنات کی طاقتیں باہمی منظم ربط رکھتی ہیں اور ایک طاقت کے بعد دوسری طاقت کا ظہور ہوتا ہے اور دوسری کے بعد تیسری طاقت رونما ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ سب سے بلند چوٹی یعنی انسانی طاقت کی حدود شروع ہو جاتی ہیں ۔ ان طاقتوں کی تنظیم اسی طرح ہے جس طرح ظاہری طور پر تمام مادیات کی ہے ۔ کائنات کی طاقتوں کی تفصیلی بحث چونکہ طویل ہے، اس لئے اس کو چھوڑتے ہوئے ہم انسانی طاقت پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالنی چاہتے ہیں ۔

انسان کے اندر غذا کو کھینچنے والی پھر اس کو روکنے والی پھر اس کو توڑ مروڑ کر پکانے والی پھر فضلہ اور عمدہ حصہ کو مختلف راستوں سے ان کے ٹھکانوں تک پہنچانے والی طاقت موجود ہے ۔ آدمی منہ میں لقمہ لیتا ہے تو حلق کی طاقت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے پھر معدہ کی قوت جاذبہ عمل جذب کرتی ہے جب غذا معدہ میں پہنچ جاتی ہے تو ایک طاقت اس کو معدہ کے اندر کچھ دیر کیلئے روکتی ہے اور فوراً آنتوں کی طرف نہیں گرنے دیتی پھر معدہ کے اندر پکانے والی طاقت اپنا کام شروع کر دیتی ہے اور غذا کو توڑ مروڑ کر پختہ کر دیتی ہے ۔ معدہ جوہر غذائی الگ چھانٹ لیتی ہے اور فضلہ حصہ کو جدا کر دیتی ہے ۔ اس کے بعد عمدہ حصہ کو جگر تک اور ناکارہ حصہ کو آنتوں تک دفع کرنے والی طاقت بر سر عمل آتی ہے پھر جوہر غذائی جب جگر میں پہنچ جاتا ہے تو اس میں پھر وہی عمل ہوتا ہے جو معدہ میں ہوا تھا اور جگر میں بھی اتنی ہی طاقتیں کام کرتی ہیں جتنی معدہ میں کرتی ہیں پھر جس حصہ تک شریانیں اور وریدیں پہنچ اور اخلاط اربعہ کو پہنچاتی ہیں وہاں بھی تحلیل و تبدیل کرنے کے لئے وہی قوتیں موجود ہیں جو جگر میں موجود ہیں ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ بعض طاقتیں ہر حصہ بدن میں ایسی بھی ہیں جو اخلاط کے قوام اور شکل کو بدل کر گوشت پوست ہڈی گودی اور رگ پٹھے کی شکل میں تبدیل کرتی ہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک قوت ایسی ہے جو سلسلۂ نوعی کو قائم رکھنے کے لئے بدن کے ذرہ ذرہ سے خلاصہ جوہر نکال کر آلات مقررہ کے ذریعہ سے صنف دوم تک پہنچاتی ہے ۔ یہ فہرست تو ان طاقتوں کی ہے جن کو اہل علم نے تاڑ کر دیا ہے اور اصطلاحی طور پر ان کے نام رکھ دیئے ہیں ورنہ واقع میں ان کے ذیل میں ان گنت اور لا محدود طاقتیں ہیں جو ہر لمحہ اور ہر پل اپنا کام کرتی ہیں اور ہر لمحہ کی طاقت اول کی طاقت سے مغایر ہے ۔

مذکورۂ بالا طاقتیں وہ ہیں جن کو طبعی کہا جاتا ہے اور جن کا کام بدنی ساخت کی تکمیل یا سلسلۂ نوعی کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی ہے ۔ یہ تمام طاقتیں بغیر شعور اور احساس کے اپنے اپنے فرائض کی سر انجام دہی کرتی رہتی ہیں نہ تغذیہ، تنمیہ اور تولید کی خدمت انجام دینے کے لئے دماغ کو کچھ کام کرنا پڑتا ہے نہ کچھ سوچنا پڑتا ہے ۔

ان کے علاوہ انسان کے اندر کچھ امتیاز و تفریق کرنے والی اور طاقتیں بھی ہیں ۔ بدبو اور خوشبو میں امتیاز کرنے والی طاقت آواز کو سننے والی اور اس کو اسکی کو شناخت کرنے والی طاقت، خوبصورت، بدصورت، سیاہ، سفید، سرخ اور سبز رنگ ۔ لمبی چوڑی مستقیم منحنی گول اور چپٹی شکل کی شناخت کرنے والی طاقت شیریں، تلخ، بدمزہ اور خوش مزہ میں تفریق کرنے والی طاقت سرد گرم سخت نرم چکنا اور کھردرا ہموار اور ناہموار میں تمیز کرنے والی طاقت یہ تمام قوتیں بھی انسان کے اندر موجود ہیں ۔ جو بلا فکر غیر ارادی طور پر اپنا کام کرتی رہتی ہیں ۔ سوچنے اور خواہش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ انسانی طبیعت چاہے یا نہ چاہے بہر حال یہ طاقتیں اپنے فرض کی سر انجام دہی سے غافل نہیں ہوتیں ۔ آدمی نہیں جانتا کہ اتنیازات کیسے ہو رہے ہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ ہو رہے ہیں ۔ ناک سونگھتی ہے کان سنتے ہیں، آنکھیں دیکھتی ہیں، زبان چکھتی ہے ۔ بلکہ بدن کی تمام کھال

بلکہ ہر حصہ کی بیرونی سطح چھوتی ہے، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، کس طریقہ اور کس کیفیت سے ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں۔ ان کے علاوہ انسان کے اندر کچھ شعور کی احساسی اور فہمی طاقتیں بھی ہیں جن کے سبب سے بیرونی اشیاء کا انکشاف اور انجلاء ہوتا ہے۔

۱۔ بیرونی چیزوں کو دیکھ کر اور سن کر اور چکھ کر اور سونگھ کر اور چھو کر خاص اثر حاصل کرنا اور بیرونی موجودات کو جسمانی طور پر باہم ربط دے کر ایک سلسلہ قائم کرنا ایک خاص دماغی قوت کا کام ہے۔ آدمی اپنی آنکھوں سے اوپر سے قطرہ اترتا دیکھتا ہے یا اس کے سامنے کوئی کھلاڑی آگ کی بنی گھماتا ہے تو آنکھ کی طاقت کا کام صرف اتنا ہے کہ قطرۂ نامیہ اور شعلۂ متنقلہ کو دیکھ لے، لیکن نازل شدہ قطرہ سے ایک مسلسل خط بنا لینا یا بنی کی دوسری حرکت سے شعلۂ جوالہ کا چکر قائم کر لینا آنکھ کا کام نہیں بلکہ آنکھ کے اوپر دماغ کے اندر ایک اور طاقت کا کام ہے۔

۲۔ آدمی مختلف آدمیوں، جانوروں اور چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اُن کی صورتوں کو شناخت کرتا ہے، لیکن جب نظر سے وہ چیزیں غائب ہو جاتی ہیں تو ان کی صورتیں دماغ میں رہ جاتی ہیں پھر دوسرے روز جب وہی آدمی یا جانور یا چیزیں نظر کے سامنے آتی ہیں تو آدمی یاد کر لیتا ہے کہ یہ وہی شخص یا چیز ہے جو میں نے کل دیکھی تھی۔ بات یہ ہے کہ گزشتہ دن کے نقوش دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ جب دوسرے روز پھر وہی صورتیں سامنے آتی ہیں تو دماغ اپنے اندر کے نقوش کا جدید صورتوں سے مقابلہ کرتا ہے، اگر جدید اور قدیم نقوش ایک طرح کے معلوم ہوتے ہیں تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ وہی شخص یا وہی چیز ہے جو میں نے کل دیکھی تھی اور اگر جدید و قدیم نقش میں مطابقت نہ ہوئی تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ جدید نقوش ہیں اور کل جو نقوش حاصل کئے تھے ان سے یہ غیر ہیں۔ بہر حال صورتوں کی غیریت یا عینیت دریافت کرنے کے لئے ایک قوت اور ہے جس کا کام نقوش کو محفوظ رکھنا ہے۔

۳۔ زید کا بھائی سامنے آتا ہے تو سمجھ لیتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ میرا دوست ہے اس سے مجھے ضرر نہیں پہنچے گا بلکہ فائدہ حاصل ہوگا اور شیر سامنے آتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ میرا دشمن ہے اس سے ہلاکت کا اندیشہ ہے، اس کا کام پھاڑ ڈالنا ہے۔ بہر حال بھائی کی دوستی اور شیر کی دشمنی پہچاننے کیلئے دماغ کے اندر ایک خاص طاقت ہے۔ کیونکہ اس سے پہلی طاقت نے تو صرف صورتوں کو شناخت کیا تھا دوستی اور دشمنی کے مفہوم کو سمجھ لینا اور کسی کو دوست یا دشمن جاننا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ کام ایک مزید طاقت کا ہے۔

بیس سال ہوئے زید کو دیکھا تھا اور اس نے شفقت کا سلوک کیا تھا، اس لئے اس کو دوست سمجھ لیا تھا۔ امتداد زمانہ کے سبب زید کی صورت فراموش ہو گئی۔ اس کی دوستی بھی یاد نہ رہی۔ اب بیس سال کے بعد پھر زید سامنے آیا تو غور کرنے کے بعد اس کو پہچان لیا اور اس کی دوستی بھی یاد آ گئی۔ بیس سال پہلے احساس کی دو قوتوں نے کام کیا تھا۔ شعوری قوت نمبر اول اور شعوری قوت نمبر سوئم۔ انیس سال کے بعد زید کو پہچاننے اور اس کی دوستی کو یاد کرنے کا کام دو قوتوں نے کیا۔ زید کی صورت تو شعوری قوت نمبر دوئم نے پہچانی اور زید کی دوستی کو دوبارہ یاد کر لینا یہ تینوں قوتوں میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی یہ کام ایک مزید قوت کا ہے گویا بھولے ہوئے معنی کو دوبارہ یاد کر لینا اس قوت کا کام ہے یا یوں سمجھو کہ زید نے دس سال پہلے ایک سبق پڑھا۔ حروف کے نقوش تو شعوری قوت نمبر اول نے سمجھے تھے اور معنی شعوری قوت نمبر سوئم نے جانا تھا۔ پھر دس سال کی مدت گزر گئی اور حروف کے نقوش مع مطلب کے فراموش ہو گئے۔ اب دوبارہ پھر وہی سبق انہی نقوش کے ساتھ دس سال کے بعد سامنے آیا تو گزشتہ نقوش یاد ہو گئے اور حروف کا توڑ جوڑ اور تمام شکلیں پھر دماغ نے جان لیں اور ان کے معنی بھی سمجھ لئے۔ تو یہ کام دو قوتوں کا ہوا۔ حروف کو دوبارہ پہچان لینا قوت دوئم کا کام ہوا اور معانی کو دوبارہ یاد کر لینا قوت چہارم کا کام ہوا۔ ۵۔ ہاتھی گھوڑا اور آدمی سب ہی صورتیں دماغ میں موجود ہوتی ہیں اور سب کے معانی بھی ہوتے ہیں، لیکن خواب میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے دھڑ میں ہاتھی کا سر یا ہاتھی کے بدن میں آدمی کا سر جوڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گویا نقوش دماغیہ میں بے ربط اتصال محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ان معانی میں کبھی کبھی بے ربط اور بلا تناسب ملاپ نظر آتا ہے جو دماغ میں موجود رہتے ہیں یہ کام ایک پانچویں قوت کا ہے۔

۶ و ۷۔ شیر سامنے آیا اس کی صورت دیکھ کر اس کے پھاڑ ڈالنے اور دشمن ہونے کا تصور ہوا۔ یہ تصور پیدا ہوتے ہی بچنے کے لئے بھاگ جانے یا چھپ جانے کا ارادہ دل میں پیدا ہوا۔ یا کسی عادل فیاض بادشاہ کی صورت دیکھ کر اس کی فیض رسانی کا تصور بندھا پھر اس طرف بڑھنے اور عرض مدعا کرنے کی ہمت ہوئی۔ دونوں صورتوں میں ارادہ اور ہمت پیدا ہونے سے پہلے کا کام یعنی شیر کو دیکھ کر اس کو دشمن سمجھنا اور فیاض بادشاہ کو دیکھ کر اس کی فیض رسانی کا تصور کرنا مذکورۃ الصدر قوتوں میں سے نمبر اول اور سوئم کا کام تھا، لیکن ارادہ اور ہمت پیدا کرنا پانچوں قوتوں میں سے کسی کا کام

نہیں۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے مزید دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک کا کام فائدہ رساں چیز کو دیکھ کر اس کی رغبت کرنا اور دوسری کا کام ضرر رساں چیز کو دیکھ کر نفرت کرنا ہے۔

۸ د ۹ لیکن رغبت، اور نفرت کے بعد حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے عملی حرکت اور جسمانی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ صرف دماغی رغبت ونفرت پر منفعت یا مضرت مرتب نہیں ہوسکتی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب قوت نمبر ہفتم یا قوت نمبر ششم کا کام ختم ہوگیا تو دماغ کی کسی قوت نے فوراً مرکزِ اعصاب (پٹھوں کی جڑ) کو گدگدایا۔ اس نے اعضائے جسم کے مختلف پٹھوں کو متنبہ کیا۔ ہاتھ پاؤں اور مختلف اجزاء جسم کے پٹھے فوراً تیار ہوگئے۔ کوئی پھٹا ڈھیلا ہوا کسی میں کھچاؤ پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہاتھ پھیلایا سمٹا دونوں حرکتیں پیدا ہوئیں۔ اسی طرح پاؤں کا پٹھا کھچا۔ یہ تمام کام ایک اور قوت کے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک شخص سامنے کھڑا تھا اس نے مارنے کے لئے لاٹھی اوپر کو اٹھائی۔ دماغ نے اس کی موجودگی دیکھی، اس کو ضرر رساں سمجھا دل میں نفرت پیدا ہوئی اور اس کو دفع کرنے کا ارادہ ہوا۔ یہ تمام کام آن کی آن میں ہوگئے۔ غرض دفع کرنے کا ارادہ ہوتے ہی پٹھوں کی جڑ کو دماغ کی عملی قوت نے گدگدایا۔ مرکزِ اعصاب نے ہاتھ پاؤں اجزائے جسم کے پٹھوں کو مطلع کر کے آمادہ کیا کہ فوراً اس کو دفع کرو۔ اطرافِ جسم کے پٹھے ایک سیکنڈ کے ساٹھویں حصہ سے بھی کم میں آمادہ ہوگئے۔ پاؤں اور ہاتھ کے پٹھوں کو اندرونی اور بیرونی سمتوں میں حرکت ہوئی۔ کبھی کھچاؤ ہوا کبھی تناؤ اور طرفۃ العین میں لاٹھی کی ضرب کھانے سے پہلے اس آدمی نے مارنے والے کا گلا دبا لیا، ہاتھ پکڑ لیا اس کو گرا دیا۔ کم از کم اپنا ہاتھ ہی اپنے چہرے کے اوپر روک لیا تاکہ اگر ضرب لگے تو ہاتھ پر، سینہ اور چہرہ اور دماغ وغیرہ محفوظ رہے تو یہ دفعِ مضرت کی عملی کوشش کی مثال تھی۔ حصولِ منفعت کو بھی اسی پر قیاس کرو کوئی شخص سامنے کھڑا ہے روپیہ دے رہا ہے اس کی صورت دیکھنا، فیاض سمجھنا اور لینے کی رغبت پیدا ہونا مذکورہ بالا قوتوں میں سے بعض قوتوں کے فرائض تھے۔ لیکن لینے کے لئے مرکزِ اعصاب کو گدگدانا پھر اطراف کے پٹھوں کو آمادہ کر کے متحرک بنانا اور روپیہ حاصل کرنے کے لئے ہاتھ کے پٹھے کو ڈھیلا کر کے بڑھانا یہ سب کام ایک مزید قوت ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جذبۂ نفرت ورغبت کے بعد حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے عملی کوشش کرنی اس قوت کا فریضہ ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ درحقیقت یہ طاقت دو طاقتوں کا مجموعہ ہے۔ محرک اور متحرک۔ یا یوں کہو کہ ایک کا کام آمادہ کرنا ہے اور دوسری کا کام آمادہ ہو کر حکم کے مطابق عمل کرنا۔

یہاں تک تو ان قوتوں کی قدرے تفصیل تھی جو انسان کے اندر تو بہر حال موجود ہیں، لیکن انسان کے علاوہ دوسرے جانوروں اور درخت وسبزہ بھی ان میں بعض قوتوں سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ مثلاً غذا یا بیدگی اور تولید کی جو قوتیں انسان میں ہیں وہ تمام نباتات اور حیوانات میں ہیں۔ احساس وشعور کی جو طاقتیں انسان میں ہیں دوسرے حیوانات میں یقیناً ہیں اور ممکن بلکہ اغلب ہے کہ نباتات میں ان سے زیادہ تعداد موجود ہو۔ اسی طرح رغبت، نفرت اور تحریک کی طاقتیں بھی مشترک ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا طاقتیں تمام حیوانی ہیں اور ان میں سے بیشتر حصہ نباتی بھی ہیں۔

ان تمام طاقتوں سے بلند سب سے اعلیٰ امتیازی طاقت اور بھی ہے جو صرف انسان میں ہے دوسری مادی مخلوق اس سے خالی ہے نہ آسمان اور زمین اس کے حامل ہیں نہ کائناتِ سماوی اور موجوداتِ ارضی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہی بار امانت ہے جس کو اٹھانے سے آسمان اور زمین نے انکار کر دیا۔ یعنی فطرۃً ارض وسما میں اس کو اٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں، لیکن انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ وہ طاقت صرف تعقل کی ہے، سمجھ بوجھ، غور وفکر اور دانش وفہم کی ہر۔ جب انسان مادیات سے ہٹ کر اوپر نظر اٹھاتا ہے تو یہ طاقت کام کرتی ہے یا مادیات کو ترتیب دے کر جب نتیجہ کلیہ نکالتا ہے تب بھی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ تمام عالم کے دقیق ترین اختراعات، ہندسہ، حساب، موسیقی، علم العلاج، منطق، فلسفہ کی تمام شاخیں اسی کے مظہر ہیں۔ اچھے بُرے عمل میں فرق کرنا، صحیح اور غلط عقیدہ کو سمجھنا، مبدء ومعاد وغرضِ تخلیق کی تنقیح کرنی مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا اور کل کائنات کو مسخر کر لینا اسی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہی دُرِ نایاب اور لعلِ شب چراغ ہے جس سے سب سنسار محروم ہے۔ تہذیب الاخلاق، حسنِ معاشرت، سیاستِ ملکی اور لسارِ انتظم ونسق اسی کا واضح اثر ہے۔

مذکورۂ بالا طاقتوں کے علاوہ انسان کے اندر ایک اور طاقت ہے جس کو روحانی طاقت کہا جاتا ہے۔ اس کی ان گنت شاخیں ہیں۔ روح کی ہر حالت کا مبدء جدا ہے۔ یہ طاقت بہت ہی خفی ہے۔ اسی لئے مادہ پرست دنیا اس کا اقرار نہیں کرتی، لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ تعقل کا ابتدائی مرتبہ تعقل سادہ ہے۔ پھر تعقل بدیہیات کا درجہ آتا ہے۔ پھر تعقل نظریات کا مرتبہ ہے اور آخر میں استحضار نظریات نہیں بلکہ حضورِ نظریات کا درجہ ہے۔ تعقل کے ان چاروں مراتب

کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا (اس جگہ سب کی تفصیل طوالت طلب ہے) اس لئے ممکن ہے کہ تعقل کے دوسرے درجے کے کمال کو یا چوتھے درجہ کو ہی الہام و وحی کہہ دیا جائے۔ اسی صورت میں کسی کو انکار کی مجال نہ رہے۔ بہر حال روحانیت کو مانا جائے یا نہ مانا جائے تعقل کے چاروں اقسام اور ہر قسم کے لئے عقل کا ایک خاص درجہ ہونا تو قابلِ انکار حقیقت ہے۔

اس تمہید کے پڑھنے کے بعد یہ بات بآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ تسخیر ما فی السموٰت والارض سے کیا مراد ہے اور انسان کو جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ حاصل تمہید یہ ہے کہ تمام مادی کائنات بحیثیت جسمانیت یہاں تک کہ انسان کا سارا بدن باعتبار جسمیت کے ظاہری نعمتیں ہیں اور کل جہان مادیت کی طاقتیں یہاں تک کہ خود انسان کی تمام اندرونی، بیرونی، شعوری، علمی اور عملی قوتیں باطنی نعمتیں ہیں۔

لیکن افسوس کہ بے وقوف جاہل انسان اس کو نہیں سمجھتا۔ نادانی کے پردے اس کے دماغ پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی عقل و بصیرت کی ساری فضا تاریک ہے۔ ظلمت بصیرت اور تیرگی عقل کے وجوہ چند در چند ہوتے ہیں۔ ۱۔ جرم نفس کا نقصان یعنی نفس کا ایسے سقیم درجہ پر پہنچنا کہ صحیح علم و عمل پر پہنچنے کی اس میں صلاحیت ہی نہ ہو جیسے بے شعور بچے اور مخبوط الحواس دیوانے ہوتے ہیں۔ ۲۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل میں اتنا غرق ہو جانا کہ حق و صداقت کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ جہت مطلوبہ اور غایہ مقصودہ کی طرف نفس انسانی کا رخ صحیح نہ ہونا اور کعبہ کو جانے کے لئے ترکستان کی طرف رخ کرنا یعنی اصل مقصد کو حاصل کرنا تو ضرور پیش نظر ہو، انکشاف حقیقت اور حصول سعادت و نجات کا جذبہ ضرور برسر عمل ہو، لیکن راستہ غلط اختیار کیا گیا ہو۔ حصول مقصد کے لئے جن عقائد صحیحہ، فکر مبارک اور عمل خالص کی ضرورت ہو۔ ان سے دور رہ کر عقائد فاسدہ، فکر غیر صحیح اور غلط اعمال کو حصول کامرانی کا ذریعہ بنایا جائے۔ ۴۔ اصل مقصد کی جہت بھی صحیح ہو اور صحیح رخ پر قدم فرسائی بھی کی جائے، اور حصول مقصود کے ذرائع اور وسائط بھی صحیح طور پر اختیار کئے جائیں۔ لیکن وسائط و وسائل میں اتنا الجھاؤ اور پھنساؤ ہو جائے کہ اصل منزل مقصود تک پہنچنا دشوار ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص حقائق کائنات کا کشف چاہتا ہے اور معرفت الہیہ کا طلب گار ہے تو اس کے لازم ہے کہ بدنی اور روحانی ریاضت کرے، لیکن وہ بدنی اعمال اور نوافل و مستحبات کی ادائیگی میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ حقائق علم پر غور و خوض، فکر صحیح، مراقبہ تخیل کی یکسوئی کا اس کو موقع ہی نہیں ملتا تو ظاہر ہے کہ ایسا آدمی صاحب معرفت ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اوراد و وظائف اداء نوافل و مستحبات میں اس نے اتنا انہماک کر لیا ہے کہ شاہد مقصود اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اگر بقدر ضرورت جسمانی عبادت کر کے غور و فکر اور مراقبہ میں غرق ہو جاتا تو اصل مدعا حاصل ہو جاتا تھا لیکن اس نے تحصیل وسائط میں اتنی زیادتی کی کہ گویا انہی کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا۔ ۵۔ مذکورہ بالا چاروں بیماریاں نفس بشری کو منزل مقصود تک پہنچنے سے روکتی ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر کور بصیرت بنانے والی ایک پانچویں بیماری کورانہ تقلید کی ہے۔ جب کسی آدمی کو پیر، گورو یا باپ دادا وغیرہ سے اتنا حسن ظن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے ہر فعل کو، ہر عقیدہ کو اور ہر رفتار حیات کو حقیقت و صداقت کا حامل سمجھنے لگتا ہے تو اس کی عقلی بصیرت اندھی ہو جاتی ہے کیونکہ محبت کی چمک بصیرت کی سطح سے اونچی ہے۔ وہ باپ دادا کے ہر قول کو صحیفہ آسمانی سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے دماغ پر نادانی کے ایسے موٹے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وحی اور بصیرت کا سورج اپنی روشنی نہیں پہنچا سکتا۔ کورانہ تقلید درحقیقت مخبوط الحواس بھی بنا دیتی ہے۔ انہماک فی الہوی بھی اس کا میدان ظہور ہوتا ہے اور جہت مطلوبہ کے رخ کو بھی غلط دکھاتی ہے۔ گویا یہ امراض جہالت کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لئے کورانہ تقلید کرنے والے راہ راست پر آجانا ناممکن ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ اندھا دھند حسن ظن رکھنے کے مرض سے اچھا ہو جائے۔ یہی وہ شیطان ہے جو نجات و سعادت کی طرف نہیں بلکہ ابدی ہلاکت کی طرف بلاتا ہے، مگر اندھا مقلد کچھ نہیں سمجھتا۔ لیکن اس بصیرت سوز روش کے خلاف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دانش و بینش کی قربانی نہیں کرتے۔ کائنات مادی اور اس کی طاقتوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ سوچ بچار سے کام لیتے ہیں۔ اپنی اندرونی اور بیرونی قوتوں کو دیکھتے ہیں اور گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو ہر ذرہ ہر قطرہ اور مادہ کی حرکت میں ایک ایسی ہستی کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور تخلیقی کرنٹ کا مرکز ہے۔ ان کو استمراری قدرت پورے سنسار میں جاری اور ساری دکھائی دیتی ہے جس کے احاطہ سے کوئی چیز خارج نہیں۔ یہ دیکھ کر اپنی باطنی توجہ کا رخ اسی ہستی کی طرف پھیر دیتے ہیں اور تمام درمیانی وسائط و وسائل سے اپنے نفس کے میلان کو ہٹا کر اصل الاصول علۃ العلل اور خلاق علی الاطلاق کو مرکز میلان قرار دیتے ہیں۔ اس درجہ پر پہنچ جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس کائنات کی فطری جکڑ بند اور تخلیقی قیود سے اپنے کو آزاد کر کے قوانین فطرت سے سرتابی کرتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں کرتے بلکہ ان کے ہر کردار، گفتار اور رفتار سے قانون فطرت کی پابندی اور موافقت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ آن کائنات میں سے کسی چیز کا بے محل استعمال نہیں کرتے اور نہ کسی کی حق تلفی کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ ذات بے ہمتا کو مرکز توجہ قرار دینے کے ساتھ قول اور عمل میں

حسن بھی رکھتے ہیں ۔ ایسے لوگ دنیا میں سعید اور آخرت میں نجات یافتہ ہوں گے ۔

تحلیلِ اجزاء

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الخ قرآن پاک میں سلف صالحین اور متقدمین کے جو قصے جہاں بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے نہیں بیان کئے گئے ۔ کیونکہ قرآن نہ کوئی پارینہ داستان ہے نہ تاریخی قصص کی کتاب بلکہ ماضی کو سامنے لاکر حال و استقبال کو سدھارنے اور عبرت انگیز اثر رکھنے والے کو درس بصیرت دینے کے لئے ایسا کیا گیا ہے اور درحقیقت تاریخ کا یہی فائدہ بھی ہے ۔ ورنہ تفنن طبع اور تفریح خاطر کے لئے تو جھوٹے داستان تاریخ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ قرآن کا مقصود چونکہ تاریخی مباحث کی تنقیح نہیں اس لئے تدوین تاریخ کے لوازم و شرائط کا بھی اس نے لحاظ نہیں رکھا۔ البتہ واقعات بینہ کی صداقت اور تاریخ کے مغز یعنی درس عبرت کو اس نے نہیں فوت ہونے دیا ۔ حکیم لقمان پیغمبر نہیں تھے ان کو معارف صحیحہ کا حصول اور حقائق کونیہ کا کشف وحی کے ذریعہ سے نہیں ہوا ۔ بلکہ ان کے تمام علوم اکتسابی تھے جو دماغی کاوش اور ذہنی سلامت روی کے نتائج تھے انہوں نے اپنی اور عام انسانی بلکہ کائناتی حالت پر نظر بصیرت ڈالی کر صداقت کو حاصل کیا تھا اور عقل سلیم نے ان کی رہنمائی کی تھی ۔ اس لئے ناممکن نہیں کہ دوسرے لوگ بھی غور و فکر اور صحیح نظر سے کام لے کر اسی نتیجہ پر پہنچ جائیں جس پر لقمان پہنچے تھے ۔ آسمان و زمین کی تخلیق، سماوی اور ارضی کائنات کا ایک خاص نظم پھر تمام مخلوق کا انسانی وجود و بقا کے لئے سرگرم عمل ہونا اور انسانی ہستی پر ساری ظاہری اور باطنی نعمتوں کا فیضان دعوتِ غور دے رہا ہے اور حق کا منادی پکار رہا ہے کہ ہر چیز کو اللہ نے تمہارے لئے بنایا اور تم کو اپنے لئے ۔ سارے سنسار کا فرض ہے کہ تمہاری خدمت کرے اور تمہارا فرض ہے کہ اطاعتِ قدرت میں غرق ہو جاؤ اور حکم اللہ کے خلاف سرمو جنبش نہ کرو ۔ انسان کی جامعیت بلند آواز سے کہہ رہی ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی ذریعہ اور واسطہ نہیں آسمان و زمین اس کے خادم ہیں ۔ چاند اور سورج اس کے ادنیٰ سیوک ہیں اور کائنات فضائی اس کی غلام ہے ۔ بس جس طرح کائنات کل انسانی مقصد کے خلاف جنبش نہیں کر سکتی ۔ اسی طرح انسان کو بھی ہر قسم کے شرک سے پاک کر اللہ کا فرماں پذیر غلام (عبد) بن جانا چاہیئے ۔

آیت مذکورہ میں ظاہری اور باطنی نعمتوں سے کیا مراد ہے ۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں ۔

۱۔ بدنی صحت جسمانی ساخت کی تکمیل اور تمام ظاہری حواس نعمت ظاہرہ ہے اور علم فہم قلب عقل اور باطنی حواس باطنی نعمت ہے ۔

۲۔ نعمت ظاہرہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر آئے مثلاً مال و جاہ حکومت و سلطنت حسن و جمال اور اعمال اطاعت اور نعمت باطنہ وہ ہے جس کا وجود صرف قلب میں ہوتا ہے ۔ مثلاً معرفت الٰہیہ حسن یقین اور کرائف قلبیہ وغیرہ ۔ ۳۔ نعمتِ ظاہرہ نعمتِ دنیا ہے اور نعمت باطنہ نعمتِ آخرت ۔ ۴۔ ظاہری نعمت خوبصورتی اسلام اور دین داری ہے اور باطنی نعمت وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو بطور پردہ پوشی اللہ نے بندوں کی نظر سے چھپا لیا ہے ۔ ۵۔ ظاہری نعمت آسمانی شریعت ہے اور باطنی نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ۔ ۶۔ ظاہری نعمت غلبۂ اسلام ہے اور باطنی نعمت ملائکہ کی امداد بوقت جنگ ۔ ۷۔ ظاہری نعمت اتباع رسول ہے اور باطنی نعمت محبت رسول ۔ ۸۔ ابن عباس رضؓ سے ایک روایت ہے کہ ظاہری نعمت اعضائے جسم کا درستی اور باطنی نعمت ستر عورت ہے (رواہ البیہقی) دوسری روایت میں آیا ہے کہ عیوب و برائیوں پر پردہ ڈال دینا باطنی نعمت ہے (رواہ ابن النجار) تیسری روایت میں ہے کہ ظاہری نعمت اسلام ہے اور باطنی نعمت عیوب کی پردہ پوشی ۔ (رواہ ابن مردویہ)

شیخ جنید کا قول ہے کہ نعمتِ ظاہرہ اخلاق ہیں اور نعمتِ باطنہ معرفت ۔ شیخ ابوبکر وراق نے کہا صورت کی درستی ظاہری نعمت ہے اور سیرت کی خوبی باطنی نعمت ہے ۔ بعض علمائے تصوف کا قول ہے کہ ظاہری شریعت کا اتباع ظاہری نعمت ہے اور اس اتباع کی حقیقت کی تلاش باطنی نعمت ہے ۔ غرض ہر عالم نے اپنے ذوق کے مطابق ظاہرہ اور باطنہ نعمتوں کی تشریح کی ہے ۔ جامع قول اس طرح ہو سکتا ہے کہ حسن صورت جمال سیرت، خد و خال کی دلکشی، ادب، ظرافت صحت و عافیت، قوت و سلامت اتباع، شریعت ترک معصیت اور پابندیٔ ہدایت وغیرہ کا شمار ظاہری نعمت میں کیا جا سکتا ہے اور فطرتِ سلیمہ، عقل کامل قبول فیض کی استعداد فطانت و ذکاوت فہم و حکمت، روح کی صفائی، نفس کی طمانیت، اخلاص، توحید، عرفان، ایقان، ایمان، اندرونی حالت کی پاکیزگی انس، حیا، محبت اور شوق وغیرہ کا شمار باطنی نعمتوں میں ہے ۔ ہمارے نزدیک ظاہری اور باطنی نعمتوں کی جو جامع تشریح تھی وہ تفسیری مقالہ میں ہم نے لکھ دی ہے جس کا خلاصہ دو لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ تمام عالم مادیت اور اس کا خاص نظم پر چلنا اور انسان کے وجود و بقا کے لئے سب کا سرگرم عمل ہونا ظاہری نعمت ہے اور عالم مادیت کے اندر ایک نظم خاص پر طاقتوں کی کارفرمائی اور طاقت نمائی اور سب طاقتوں کا انسانی طاقت کے زیر حکم ہونا باطنی نعمت ہے واللہ اعلم

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۔ غیب کا منادی اگرچہ انسان کو اللہ کی عبدیت میں داخل ہونے کی دعوت دے رہا ہے اور پکار کر کہہ رہا ہے کہ تمام کائنات اس قابل نہیں کہ انسان اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ اس کا مطمع نظر صرف ایک ہی ذات ہونا چاہیے جس کا تعلق ان سے براہ راست ہے اور اتنا قریبی ہے کہ سارے سنسار میں کسی کا اتنا قریبی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ہر شخص لقمان کی طرح بصیرت نہیں رکھتا کہ غیبی آواز کو سنے اور کارگاہِ حیات کے تمام کل پرزوں پر غور کر کے وہی نتیجہ نکالے جو لقمان نے نکالا تھا بلکہ بہت سے آدمی ایسے ہیں جو اپنی دانش کو کھو اور دماغ کو نابینا بنا لیتے ہیں نہ تو ان کی شخصی ذہنیت ایسی رسا ہوتی ہے کہ وہ صحیح علم خود حاصل کر سکیں نہ کسی ناصح اور ہادی کی ہدایت کو وہ سمجھتے اور مانتے ہیں نہ کسی آسمانی کتاب اور الہامی ملفوظات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حصول صداقت وصحت کے تمام ذرائع سے بے بہرہ ہیں۔ لیکن باوجود اس بے بہرگی اور ناداری کے وہ اللہ کی ذات صفات الوہیت ربوبیت اور دوسری حقیقتوں کے متعلق خواہ مخواہ جاہلانہ گفتگو اور جدال کرتے ہیں۔ علم ذاتی، ہدایت ہادی اور کتاب آسمانی یہی ایسے تین ذرائع تھے جن سے حقیقت کا کچھ کشف ہو سکتا تھا، لیکن ان کے پاس کوئی ذریعہ معرفت نہیں پھر بھی وہ جھگڑا کرتے ہیں (کوئی کہتا ہے اللہ ایک بادشاہ ہے اور ہر بادشاہ کے وزیر ہوتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء اللہ کے وزیر ہیں۔ کوئی کہتا ہے اللہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے اس کے دربار تک ہم جیسے لوگوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اس لئے زینہ بزینہ اور درجہ بدرجہ درخواست پیش کرنی چاہیئے۔ کوئی قائل ہے کہ اللہ کی معرفت ہم کو بالکل حاصل نہیں ہو سکتی نہ اس کا تصور ہم کر سکتے ہیں۔ پھر کس طرح ہم اس کی پرستش کریں۔ لہٰذا ایسی مخلوق کی پرستش کرنی چاہیئے جو جلوہ گاہ الوہیت ہے۔ مثلاً ملائکہ، بعض انبیاء، آگ، سورج، چاند اور مختلف ستارے۔ کسی کا خیال دوڑتا ہے کہ ارباب الانواع (دیوتا یا موکل فرشتے وغیرہ) قدرت کے کارندے ہیں۔ ہماری معاش، صحت، سلامتی و فلاح و بہبود انہی سے وابستہ ہے۔ لہٰذا انہی کے ناموں پر قربانی کرنی، بھینٹ چڑھانی اور ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرنی ہمارا فرض ہے۔ کوئی خدا کو باپ اور بعض مخلوق کو زادہ اولاد قرار دیتا ہے۔ غرض جہالت کی جو نوعیت ہے ویسے ہی اس کے مظاہر ہیں)۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ الخ۔ ایسے جہالت کیشوں اور بداندیشوں کو جب صداقت وحقانیت کی دعوت دی جاتی ہے اور ان کو ان احکام و دساتیر زندگی کو ماننے اور عمل کرنے کو کہا جاتا ہے جن کی برہانیت اور قطعی صداقت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ احکم الحاکمین کے نازل کردہ ہیں تو وہ سرتابی کرتے ہیں اور نہ فقط سرتابی کرتے ہیں بلکہ قومی رسم و رواج بلکہ سوسائٹی کے تامل اور اپنے اسلاف کے معمولات کو خدا کی پیش کردہ صداقت کے مقابلے میں لاتے ہیں اور آباؤ اجداد کی راہ تقلید کو منصوص یقینی حقانیت پر ترجیح دیتے ہیں گویا ان کے نزدیک آباؤ اجداد کا تقدم زمانی دلیل ہوتا ہے اس بات کی کہ وہ عقل و بصیرت میں بھی مقدم تھے اور ان کا کوئی قول و عمل اور کوئی عقیدہ صداقت سے خالی نہ تھا۔ حالانکہ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ زمانے کے تقدم تاخر اور پیدائش کے اگلے آخر ہونے سے دستورِ زندگی کی حقانیت یا بطلان ثابت نہیں ہو سکتا جس طرح باپ دادا جسمانی اور دماغی قوتوں کے حامل تھے ویسے ہی ان کی نسل بھی [illegible] تناسب اعضاء، توازن ساخت اور فکری قوتوں کی مالک ہوتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو اسلاف باطل پرست اور بد اندیش اور ضعیف العمل ہوتے ہیں۔ ایسے اسلاف کی پیروی تو بجائے فائدہ کے تباہ کر دینے والی اور انسانیت کو سوختہ کر دینے والی آگ میں داخل کر دینے والی ہوتی ہے۔ لیکن برا ہو [illegible] کی پستی اور اسلاف پرستی کے شیطانی جذبہ کا جو انسان کو باطل پرستی کی دہکتی آگ میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور بوسیدہ دماغ رکھنے والے انسان اس کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے آگ میں کود پڑتے ہیں اور عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ آیت ومن الناس سے عذاب الیم تک نضر بن حارث ابی بن خلف اور امیہ بن خلف وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہے جو شانِ توحید میں حضور والا سے ناحق جھگڑا کرتے تھے حالانکہ وہ اللہ کی ذات و صفات سے قطعی ناواقف تھے۔

خطیب نے سراج المنیر میں لکھا ہے کہ حضور گرامی ان لوگوں کو غور و بصیرت اور مطالعۂ قرآن کی دعوت دیتے تھے اور وہ اپنے باپ دادوں کے پارینہ اقوال اور بوسیدہ دستور العمل کے دلدادہ تھے۔ حالانکہ ان کے باپ دادوں پر شیطان مستولی ہو کر ان کو کافر بنا چکا تھا بس حقیقت میں وہ اسلاف کے پیرو نہ تھے بلکہ شیطان کے مقلد تھے، اس لئے اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ فرمایا۔

مبحث تقلید کی تنقیح مختصر طور پر

شیخ ابن القیم نے لکھا ہے کہ علماء نے ایسی ہی آیتوں سے تقلید کے بطلان پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس جگہ بغیر علم و ہدایت اور بدون صراحت کتاب کے آباؤ اجداد کی تقلید کرنے کی مذمت کی ہے لہٰذا جو شخص بغیر ہدایت

تبی اور بدون صراحتِ قرآنی کے کسی مسئلہ میں کسی عالم کی تقلید کرے گا وہ انہی مقلدوں کے مشابہ ہوگا جن کے متعلق آیت کا نزول ہوا ہے - ابن کثیر کے قول سے عمومی تقلید کی حرمت معلوم ہوتی ہے ۔ حالانکہ کورانہ تقلید حرام ہے اور مبصرانہ تقلید واجب اس لئے لازم ہے کہ ہم کسی قدر اطمینان بخش طریقہ سے مسئلہ کی تنقیح کر دیں - جن لوگوں کو قرآن اور حدیث کا علم نہیں ہے خواہ کلام عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے یا تلاش اور تحقیق کی قوت نہ ہونے کے سبب سے ان پر لازم ہے کہ وہ کسی عالم دین سے پوچھیں -

اب جو مباحث دریافت کرنے کے قابل ہیں وہ دو طرح کے ہیں اعتقادی اور عملی - اگر کسی عالم سے اعتقادی مسائل دریافت کئے جائیں تو اس دریافت کرنے کا یہ مطلب ہونا چاہیئے کہ قرآن اور حدیث میں ان مسائل کے متعلق کیا تعلیم دی گئی ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے ان کے متعلق کیا فرمایا ہے جیسے کوئی نابینا کسی آنکھوں والے سے راستے کے نشانات پوچھتا ہے اور یہ یقین بھی رکھتا ہے کہ آنکھوں والے نے راستے میں یہ نشانات خود قائم نہیں کئے بلکہ راستہ سے وہ واقف ہے، اس لئے تمام نشانات بھی اُسے معلوم ہیں بالکل اسی طرح جاہل کو عالم سے اعتقادی مسائل پوچھنے چاہئیں اور اس کے قول کے موافق عقیدہ قائم کرنا چاہیئے - مثلاً اگر کوئی ناواقف کسی عالم سے اللہ کے صفات دریافت کرے اور عالم اس کو بتلائے کہ خدا خالق ہے، رازق ہے، صاحب علم و ارادہ ہے تو سائل کو دریافت کرنے کے بعد یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ شخص چونکہ عالم ہے اور جھوٹا بھی نہیں ہے، اس لئے قرآن کا ضروری حکم ہے اور خدا ضرور ان صفات کا حامل ہے - یہ اعتقاد نہ رکھنا چاہیئے کہ چونکہ یہ عالم متبحر ہے میں اس کے قول کو ضرور مانوں گا - خواہ قرآن میں ہو نہ ہو - اول قسم کی تقلید واجب ہے کیونکہ وہ درحقیقت ایک زبان کی دوسری زبان میں تعبیر ہے یوں کہو کہ قرآنی تعلیم کا اظہار ہے اور موخر الذکر تقلید حرام ہے - اس کی بنا محض حسن ظن پر ہے - خلاصہ یہ کہ اگر کسی حیثیت سے اپنا رشتہ تقلید اس لئے جوڑا جائے کہ وہ قرآن کا عالم ہے تو یہ تقلید حقیقت میں قرآن کی تقلید ہوگی جو واجب ہے اور اگر کسی کی تقلید صرف اس لئے کی کہ وہ زبردست عالم ہے کبھی غلطی نہیں کر سکتا اور غلطی بھی کرے تو کرے وہ ہم سے بدرجہا زیادہ دانشمند اور عالم ہے - ہم اس کی ضرور تقلید کریں گے - خواہ قرآن کی آیات واضح طور پر اس کے قول کے خلاف تعلیم دے رہی ہوں تو یہ تقلید کورانہ تقلید ہے جو حرام ہے - یہ تو اعتقادی تقلید کی تفصیل تھی رہی عملی مسائل کی تقلید اور ان کے متعلق سوال تو ظاہر ہے کہ ناواقف آدمی کا عالم سے مختلف اعمال زندگی کے متعلق شرعی فیصلہ دریافت کرنے پر مجبور ہے کیونکہ اس کو خود کچھ معلوم نہیں ہے - اس تقلید کی تفصیل بھی وہی ہے جو اعتقادی تقلید کی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ عقائد میں اہل اجتہاد کا اختلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ ان میں نسخ اور تبدیل ممکن نہیں - اور عملی مسائل میں نسخ تبدیل اور تغیر ممکن ہے، اس لئے مسائل عملیہ میں اختلاف ہو سکتا ہے - مقلد کو حق پہنچتا ہے جس مجتہد کے قول کے قیاس کے موافق عمل کرے - مگر یہ خیال ضرور پیش نظر رہے کہ میں اس امام کی رائے پر عمل کر رہا ہوں ۔ امام تو صرف اور مترجم ہے جو مجھے قرآن کی عبارت کا ترجمہ بتا رہا ہے - لیکن اگر اتفاق سے اس شخص نے قرآن کی کسی ظاہر آیت یا ظاہر حدیث کو پڑھ کر مجتہد کے قول کے خلاف عمل کیا تو چاہے اس کا یہ عمل غلط فہمی پر مبنی ہو اور کم علمی کی وجہ سے وہ صحیح حکم نہ سمجھ سکا ہو اور تعارض و نسخ کو نہ جاننے کے سبب صحیح استنباط نہ کر سکا ہو، مگر چونکہ اس کا جذبہ صحیح ہے - اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اس کا اصلی مطمح نظر ہے، اس لئے شرعاً وہ ماخوذ نہیں - مثلاً کسی امام کے کہنے سے اس کو معلوم ہوا کہ روزے میں پچھنے لگوانے یا فصد کھلوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا - اس حکم کے موافق اس نے رمضان میں فصد کھلوائی، لیکن اتفاق سے اس کو حضور کا فرمان (افطر الحاجم والمحجوم) پہنچا یعنی روزے کی حالت میں جو پچھنے لگائے اور جو لگوائے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے - اس حدیث کو سن کر اس شخص نے سمجھا کہ اب تو میرا روزہ ٹوٹ گیا اس نے یہ خیال کر کے کچھ کھا لیا تو ایسا شخص جو کفارہ کا مستحق نہیں کیونکہ اس کے دل میں اتباع شریعت کا جذبہ صادق ہے - یہاں تک کہ ایک حدیث کو سن کر اس نے امام کے قول کو ترک کر دیا - صرف حدیث کا مطلب اس کا مورد نسخ و تبدیل کی تفصیل اس کو صحیح طور پر معلوم نہ ہوئی اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے اس نے ظاہر الفاظ کو دیکھ کر روزہ کا ٹوٹ جانا سمجھ لیا تو یہ فی الحقیقت فہم کی غلطی ہے نہ کہ جذبہ کی - پس اس قسم کی تقلید حرام نہیں - مگر کورانہ تقلید ہے - بُت پرست، مشرکوں یا یہودیوں یا عیسائیوں کی کورانہ اور احمقانہ تقلید پر اس کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے بت پرست مشرک تو حکم نبوی اور صراحتِ قرآنی کے مقابلے میں اپنے اسلاف کے قول کے دلدادہ تھے اور انہی کے راستے پر چلتے تھے اور یہود و نصاریٰ نے اتباع کتاب اللہ نہیں بلکہ اتباع قول عالم اپنے اوپر واجب کر لیا تھا - چنانچہ آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں حضور اقدس نے یہی معنی بیان فرمائے کہ یہودیوں نے اپنے علماء کو اور عیسائیوں نے اپنے درویشوں کو اس طرح رب بنا لیا تھا کہ ان کے ہر قول کی (خواہ صحیح ہو یا غلط) تقلید کرتے تھے (ترمذی) مگر مسلمان مقلد ایسا نہیں کرتا - قرآن و حدیث کی صراحت کے مقابلے میں امام کے قول کو نہیں مانتا بلکہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے نہ اس کا امام سے رشتہ یگانگت اور علاقہ تقلید اس لئے قائم ہے کہ امام اس کو قرآن و حدیث سے حکم نکال کر بتانے والا ہے اور اس کا قول قرآن و سنت کا ترجمان ہے نہ یہ کہ وہ خود کوئی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور قرآن و سنت کے مقابلے میں کچھ بھی قابل وقعت ہے - اگر ائمہ کے اقوال کو بغیر قرآن و حدیث کے کوئی شخص اپنے اوپر لازم کرے تو وہ بزرگان سلف اور اہل ایمان کے راستہ سے نکل جائے گا -

خطیب نے سراج المنیر میں لکھا ہے کہ مشائخ و مجتہدین کے کلام کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے گا۔ اگر مطابق ہوگا اور اس کا اتباع کیا جائے گا تو یہ اتباعِ شریعت ہوگا اور اگر مخالف ہوگا تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں خود ائمہ مجتہدین نے بھی اس کی سخت ترین تاکید فرمائی ہے۔ ابو حنیفہ، شافعی اور مالک وغیرہ سے اس طرح کے تاکید آمیز الفاظ بکثرت مروی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ نکلا کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی تقلید پر اہلِ اسلام کی تقلید کو قیاس کرنا فاحش غلطی ہے اور ان گروہوں کی تقلید کی حرمت کے متعلق جن آیات کا نزول ہوا ہے ان سے مسلمانوں کی تقلید کی حرمت پر استدلال کرنا ایسے شخص کا غیر صحیح ہے۔ مسلمانوں کی تقلید کورانہ نہیں بلکہ بصیرانہ ہوتی ہے اور غیر مسلم کی تقلید بصیرانہ نہیں بلکہ کورانہ ہوتی ہے اور دونوں کا فرق بالکل واضح ہے۔ مسلمان کی تقلید اتباع ما انزل اللہ ہے اور غیر مسلم کی تقلید اتباع ما وجدنا علیہ آباءنا۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى اوپر کی آیت میں اس مشرک جاہل پرست اہلِ جہالت طبقہ کا ذکر تھا۔ جو عقل و بصیرت کی روشنی کو چھوڑ کر تقلید کی تاریک وادیوں میں سرگرداں ہے۔ اس کی ہستی ایسی ناپاک ہے کہ اس کی زندگی کے دونوں پہلو گمراہی کے پہلوؤں سے متعفن ہو رہے ہیں۔ وہ علمی روشنی سے بے بہرہ ہیں اور عملی راستی سے بھی بہت دور ہیں۔ نہ ان کے پاس ذاتی علم ہے نہ ہدایت رہنما نہ کتاب آسمانی نہ اس کی عملی زندگی کسی روشن دستور العمل کے تحت ہے۔ اس گمراہ اور کجراہ طبقہ کے مقابلے میں ایک اور گروہ بھی ہے جس کی زندگی کے دونوں رخ روشن ہیں۔ اس کو علمی نورانیت حاصل ہے اور عملی راستی بھی۔ اس گروہ کی حالت آیت مذکورہ میں بیان فرمائی ہے۔

منہ کو اللہ کی طرف پھیرنے سے مراد ہے اللہ کو مرکزِ توجہ بنانا حقائق نظریہ کا نظری نقطہ محض ذاتِ الٰہی کو قرار دینا۔ تخیل و تفکر اور عزم و تعقل کا رشتہ براہِ راست اللہ سے جوڑنا تمام وسطی ذرائع کو چھوڑ کر اور درمیانی علائق و عوائق کو توڑ کر علۃ العلل پر نظر رکھنا اس کو اور محض اسی کو کارفرما سمجھنا اور اسی کے حکم کو تمام سنسار میں جاری اور ساری جاننا اور کل کائنات کو اس کے فرمان کا مسخر یقین کرنا۔ یہ تھی علمی رخ کی روشنی۔ دوسری چمک عملی زندگی کی ہے جس کا نام عرفِ شریعت میں احسان ہے۔ احسان کو اطاعتِ مخلصانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

الغرض جس کا علم و عمل قرآنی فیصلہ کے مطابق صحیح ہے۔ اس نے گویا ایک ایسی مضبوط رسی پکڑ لی ہے جو اس کو نجات و سعادت کے سقفِ بریں تک پہنچا دے گی جس کے ٹوٹنے کا بالکل خطرہ نہیں ہے۔ کبھی یہ اندیشہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور ہم ہلاکت و تباہی کے غار میں گر پڑیں گے۔

نجات و سعادت تک پہنچانے والے مضبوط ترین ذرائع کو مجازاً عروۃ الوثقیٰ فرمایا۔

بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ عروۃ الوثقیٰ سے مراد عہدِ الٰہی ہے۔ کیونکہ اللہ نے مسلم محسن سے نجات کا جو محکم وعدہ فرما لیا ہے وہ ناقابلِ شکست ہے۔ شیخ سہل نے فرمایا عروۃ الوثقیٰ یہی سنتِ رسول اللہ ہے۔ شیخ ابو عثمان کا قول ایک روایت میں اس طرح ہے کہ عروۃ الوثقیٰ ذاتِ محمدی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ مراد ہے۔ صحیح عام مقصود وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔ تعیین بلا دلیل ہے۔ کتاب اللہ بھی عروۃ الوثقیٰ ہے۔ عقل بصیرت بھی عروۃ الوثقیٰ ہے، لیکن معین طور پر کسی ایک کو مراد لینا مناسب نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ اللہ تک پہنچنا اور اس زندگی کے راستے کو طے کر کے منزلِ اعلیٰ میں فروکش ہونا سب کا مقصود ہے، اس لئے تمام امور کی انتہا ذاتِ الٰہی پر ہے، لیکن سیدھے راستہ پر چل کر کون منزلِ مراد تک پہنچتا ہے اور کون کج مج پگڈنڈیوں پر چل کر اپنی زندگی کو تباہ کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ سب کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ مضبوط رسی کون سی ہے جو مقصود کے عرشِ اعظم تک پہنچاتی ہے اور کون سی رسی کمزور ہے جس کو پکڑ کر اگر اوپر کو چڑھنے کی کوشش کی جائے تو راستہ میں ٹوٹ جائے گی اور چڑھنے والا تباہی کے غار میں گر پڑے گا۔ اس کی وضاحت اللہ ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ مضبوط رسی کا آخری کنارہ اس کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہی واقف ہے کہ کون سی مضبوط رسی کا کنارہ اس کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اللہ کو مرکزِ توجہ بنانے اور قانونِ الٰہی پر کاربند ہونے سے منع کرنے والی خواہشِ نفس ہے اور خواہشاتِ نفس کے مختلف مرکزی نقطے ہیں، لیکن سب سے بڑی اہمیت مال کی کثرت، اولاد کی فراوانی، حکومت کی سطوت، جاہ و حشم کی افزونی، طاقت و حسن کی نمائش کو حاصل ہے۔ منجملہ دیگر موانع کے سب سے بڑا مانع انہی چیزوں میں سے کوئی چیز ہوتی ہے۔ دولتمند انسان دوسرے کے سامنے گردن جھکانے سے انکار کرتا ہے۔ جاہ و حشم والا حاکم اپنے نشۂ پندار سے سرمست ہوتا ہے، اور کسی کی اطاعت کرنے کے بجائے دوسروں کو اپنے سامنے دست بستہ اور سر افگندہ دیکھنا

فالتو یلقن الا یکر حسن خود بجائے خود مغرور ہوتا ہے۔ یہ ہی چیزیں انسان کو گمراہ اور باطل پرست بنا دیتی ہیں۔ فکر کی بجائے کفر اور شکر کی بجائے شرک پر آمادہ
چاہتا ہے۔ ان ہاتھوں سے اہل حق کو بہت سے دکھ سہنے اور بہت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں کیونکہ ان کے پاس مادی وسائل غیر معمولی ہوتے ہیں اور مادیت کے
کر دیتی ہیں۔ سیاسی طبقہ کے ان کے حلقہ بگوش ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ایسے ہی خبیثوں کے ہاتھوں سے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی
پرستار کثرت ان کے حلقہ بگوش ہوتے ہیں۔ حضور کی ذات بجائے خود تو ایسی بلند حوصلہ اور راسخ ہمت رکھنے والی تھی کہ اس کو غلک رفعت اور کوہ استقلال کہنا بھی اس کی توہین تھی، لیکن دوسرے اہل ایمان
نہیں۔ حضور کو اہل ایمان کے دکھ بلکہ سخت تکلیف اور قلبی کوفت ہوتی تھی، اس لئے رب العالمین نے بطور تسلی آیت مذکورہ
بعض وقت مصائب سے گھبرا جاتے تھے۔ حضور کی آپ غم نہ کھائیں۔ چند روز کی بات ہے۔ دنیوی زندگی کتنی ہی طویل ہو بہرحال کم ہے۔ آخر لوٹ کر تمام سب کو
نازل فرمائی۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ کسی کے کفر سے آپ غم نہ کھائیں۔ ظاہری اعمال کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ چند دن یہ مزے اڑا لیں۔ آخر ان کو مجبوراً سخت دکھ کی مار
اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔ وہ ان کے خطرات قلبی سے بخوبی واقف ہے۔
ان پر پڑے گی۔

موجودات سماوی اور ارضی کی تسخیر اور عطا نعمت کاملہ کو پیش کر کے ربوبیت و الوہیت کا اثبات لفظ اَلَمْ تَرَوْا سے سارے عالم کو نظر بصیرت

مقصود بیان سے دیکھنے کی دعوت اور فلسفہ کائنات پر غور کرنے کی پُرلطف ضمنی تلقین لفظ عِلْم اور ہدًی اور کِتَاب مُّنِیْر کا ذکر کرنے سے یہ بات تشریح
ہوتی ہے کہ مبدء و معاد اور اللہ کی ذات و صفات کا علم تین ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو اپنے دماغ میں کشف حقائق اور استنباط حقائق کی صلاحیت ہو یا کسی
صاحب وحی و الہام ہادی کی رہنمائی سے وقوف حاصل ہو یا کوئی آسمانی کتاب تعلیم دے۔ ان تینوں ذرائع کے علاوہ محض وہم یا قیاس مع الفارق یا سفسطہ یا کورانہ
تقلید موجب علم نہیں ہو سکتی اور بغیر کسی قطعی علم کے اللہ کی شان میں جھگڑا کرنا جہالت و ضلالت ہے۔ اس سے تنبیہ حاصل کرنی چاہئے ان توہم پرست دماغ زدہ
فلاسفروں کو جو توہم کو تعقل اور اصطلاح کو حقیقت سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں اور اپنی حقیقت کو نہ جاننے کے باوجود محض اٹکل اور تخمین سے اللہ کی شان میں گفتگو کرتے ہیں
اور ان کو بھی اس سے عبرت پکڑنی چاہئے جو اللہ کے علم، ارادہ، مشیت، تقدیر، سمع، بصر، قدرت اور بعض دوسری صفات کو اپنے عقلی اور وہمی گھوڑوں کی جولانگاہ
بنائے ہوئے ہیں اور صراحت شرع کے خلاف صفات کی عینیت، غیریت اور کلام اللہ کے حدوث و قدم کے متعلق جھگڑے کرتے ہیں۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ سے کورانہ
تقلید کی مذمت ظاہر ہو رہی ہے، لیکن اس سے مطلق تقلید کی ممانعت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ واجب التسلیم اور
قابل اتباع محض قوانین الٰہیہ ہیں۔ یعنی اسلاف کا تعامل، سوسائٹی کا رسم و رواج، حکومت کا آئین اور دماغی اختراع اگر حکم خداوندی کے خلاف ہو تو واجب
الترک ہے۔ وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ سے ندرت یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ اس کارگاہ حیات میں اصلی مقصد اللہ کی ذات کو مرکز توجہ بنانا ہے۔ زندگی اور اس کے تمام
لوازم اگر توجہ الی اللہ میں خلل انداز نہ ہوں تو قابل استحسان ہیں اور اگر توجہ الی اللہ سے روکتے ہوں تو قابل نفرت ہیں۔ وَهُوَ مُحْسِنٌ کا لفظ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ
محض حسن عقیدہ تکمیل انسانیت اور حصول سعادت کیلئے یقینی طور پر کافی نہیں تاوقتیکہ حسن عمل اور حسن قول اس کے ساتھ نہ ہوں وغیرہ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ

(اے نبی) اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے تم کہو الحمد للہ بات یہ

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ وَلَوْ اَنَّ مَا

ہے کہ اکثر لوگ بے علم ہیں جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے بلاشبہ اللہ بے نیاز سزاوار حمد ہے

فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ

زمین میں جس قدر درخت ہیں اگر سب قلم ہو جائیں اور سمندر اس کی سیاہی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر اور (ملا دیئے جائیں) تب بھی اللہ کی باتیں ختم

اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ مَا خَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ ۝

نہ ہوں بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے تم سب کا پیدا کرنا اور تمہارا (دوبارہ) زندہ کر دینا ایک شخص کے پیدا کرنے کی طرح ہے بلاشبہ اللہ سننے والا دیکھنے والا

تفسیر تکمیلِ الوہیت کے لئے خدا کے اندر مندرجہ ذیل صفات کا تحقق ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی صفت معدوم ہوگی تو الوہیت کا کامل استحقاق نہ ہوگا۔ ۱۔ خلاقِ کل ہونا۔ ۲۔ اوصافِ حمیدہ کا جامع ہونا۔ ۳۔ ملکیت عامہ۔ ۴۔ قدرت تامہ اور غلبۂ مطلقہ۔ ۵۔ بے احتیاج ہونا۔ ۶۔ حکمت کاملہ اتنی کہ نہ اندر وہ جہاں اور اس کے اسرار بے پایاں ہوں۔ ۷۔ احاطۂ علمی اتنا کہ چھوٹی سے چھوٹی کوئی چیز خارج نہ ہو۔ یہاں تک کہ سانس کی آواز اور حرکتِ قلب کی آہٹ کو بھی سنتا ہو اور باریک سے باریک کیڑے کی اس خفی حرکت کو بھی دیکھتا ہو جو قعرِ سمندر یا جوفِ زمین کے اندر پتھر کے جگر میں رینگنے سے پیدا ہوتی ہو۔ اگر الوہیت کے ان ارکانِ سبعہ میں سے کوئی ستون گر جائے گا تو قصرِ الوہیت بھی گر جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے کس خدا کی الوہیت کو ماننے کی دعوت دی ہے۔ کیا وہ خدا وہی ہے جو یونانی فلاسفہ کا تھا جس میں استغنا کامل نہ تھا بلکہ اس کی معلولات کی بقا پر موقوف بھی جو علۃ العلل ہونے کے باوجود خلاقِ مطلق یعنی عدم سے وجود میں لانے والا نہ تھا جس کو اپنے مصنوعات پر تقدمِ زمانی حاصل نہ تھا جس کو جزئیات اور کا علم تفصیلی طور پر نہ تھا جو غالب اور قادر ضرور تھا، مگر اس کو غلبۂ مطلقہ اور قدرتِ تامہ حاصل نہ تھی۔ اعادۂ معدوم پر قادر نہ تھا اور وہ مادہ کو معدوم کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

یا ان عیسائیوں کا خدا ہے جو رشتہ اور بیٹے کا محتاج ہے جس کو اس دنیا والوں کی اصلاح کے لئے انسانیت کا جامہ پہن کر سامنے آنا پڑا جو ایک ہے مگر تین سے بنا ہوا جو کہنے کو مستغنی ہے، مگر اس کی حقیقت ترکیب اجزا کی محتاج۔

یا پھر وہ جین مت کا خدا ہے جس نے اپنی پرستش بلکہ صفاتی تصور کو بھی ناممکن بنا دیا ہے جو انسانوں میں حلول کر کے سامنے آیا تھا، جس نے دس عارفوں کا لباس پہنا تھا اور جس نے مخلوق کا کھانا پینا عیش و آرام سب کچھ حرام کر دیا تھا اور جس نے دس عارفوں کے علاوہ اپنی معرفت کسی اور انسان کے لئے جائز قرار نہ دی۔

نہیں وہ خدا ان خداؤں میں سے نہیں ہے بلکہ وہ اپنی ہستی ان سب سے جدا رکھتا ہے۔ وہ خلاقِ کل ہے کہ دنیا میں کوئی بھی اس کی خلاقی کا انکار نہیں کر سکتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کو خلاق مانتا ہے۔ سورج بچارے کام نہ لینے والے بھی اس کو خالق جانتے ہیں۔ اگرچہ عملاً اپنے اقرار کے خلاف کرتے ہیں اور اپنی بیوقوفی کے سبب نہیں جانتے کہ عمل اور اقرار میں موافقت ہونی چاہیئے اور وہ لوگ بھی اس کی خلاقیت کو لاجواب جانتے ہیں جو ترکیبِ کائنات کو اتفاقی اور طبعی کہتے ہیں (جیسے حکیم ذیمقراطیس اور اس کا گروہ) کیونکہ کائنات کی ترکیب کو وہ ضرور اتفاقی کہتے ہیں اور مشیت و قدرت اور ارادہ و علم کو اس ترکیب میں دخیل نہیں جانتے لیکن اس کائنات کے اجزائے اولیہ یعنی ذراتِ متحدۃ الطبع مختلفۃ الاشکال کا وجود کیسے ہوا کہاں سے ہوا کس نے کیا کیوں کیا اور کیسے یا کہاں بالفاظِ دیگر ان نے عدم کو چھوڑ کر ہستی کا لباس کیسے پہنا۔ اس درجہ پر پہنچ کر وہ خلاقِ مطلق کی تخلیق کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس تخلیق کو تخلیق اضطراری غیر اختیاری کہتے ہیں۔

۲۔ اسلام کا خدا تمام اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ ستودہ کا بھی حامل ہے اول تو سب ہی اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی نہ بھی کرے تب بھی آسمان و زمین اور فضا میں اس کے آثارِ کمال اتنے اور ایسے ہیں جو واقعی طور پر اس کے محمود ہونے کی شہادت دے رہے ہیں۔

۳۔ وہ مالکِ کل ہے اس کی ملکیت سے کوئی چیز خارج نہیں۔ جو کوئی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے جس طرح کوئی غلام اپنے لئے حقیقی ملکیت ثابت نہیں کر سکتا بلکہ وہ اور ان کا مال آقا کی ملک ہوتا ہے۔ اگرچہ آقا کی اجازت سے وہ ہر چیز میں جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے، لیکن پھر بھی وہ مالک نہیں ہوتا اسی طرح باذنِ الٰہی املاکِ ذاتیہ و جمہوریہ کی تفصیل مختلف کتابوں اور مذہبوں میں دکھائی دیتی ہے، مگر یہ حقیقی ملکیت نہیں بلکہ باذنِ مالک ہے۔ مالکِ حقیقی اور اصل آقا ایک ہی ہے۔ پس اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

۴۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے عزیز ہے صاحبِ عزت و شوکت ہے قاہر ہے۔ کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ عرش سے کر فرش تک ہر چیز اسی کے زیرِ حکم ہے۔

۵۔ باوجود اس تخلیقِ کل کے وہ بے احتیاج ہے۔ نہ اس کو جورو کی ضرورت ہے اور نہ نرینہ اور مادینہ اولاد کی۔ سب کا انتظام کرتا ہے لیکن

اس کی ذاتی غرض کوئی بھی نہیں۔ کوئی اس کی پرستش کرے یا نہ کرے، حمد و ثنا کرے یا گالیاں دے، شکر کرے، یا کفرانِ نعمت سب کو پالتا ہے۔ سب کی پرواہ رکھتا ہے لیکن ذاتی اغراض کے لحاظ سے وہ لاپرواہ ہے، کسی سے اس کو لالچ یا خوف نہیں وہ علۃ العلل ہے، معلولات کا محتاج نہیں، وہ واحد بیرنگ ہے نہ اس کو اجزائے ترکیبیہ کی حاجت نہ رنگ کی نہ شکل کی نہ ہیئت اور صورت کی۔ غرض یہ کہ وہ غنی ہے۔

۲۔ وہ حکیم مطلق ہے۔ تمام مادی اور غیر مادی دنیا اس کی بے پایاں حکمت کے مظاہر ہیں۔ یہاں تک کہ دماغی تصورات و تخیلات کی لامحدود پوشیدہ حرکات شعاع نظر کی خروجی اور رجوعی رفتار اس کے ایسے اسرارِ حکمت ہیں جن کی حقیقت آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ کروڑوں کتابیں لکھی گئیں، غیر محدود باتیں کی گئیں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں مرتبہ ان کو سمجھنے کی کوشش کی گئی، مگر پوری حقیقت ابھی تک سربستہ رہی۔ لوگ کہتے ہیں تصور عرش بریں تک پہنچ جاتا ہے اور توہم کا میدان غیر محدود ہے، لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ تصور و توہم کی یہ رسائی کیسے ہوتی ہے۔ ان کی جولانی کی یہ وسعت کس حقیقت کی حامل ہے۔ اہل علم کہتے ہیں کہ مادی کائنات کا آغاز چھوٹے چھوٹے ٹھوس ذرات سے ہوا۔ کیوں ہوا، کیسے ہوا، ذرات میں دوری یا موجی حرکت کیسے پیدا ہوئی، کیوں پیدا ہوئی، کب پیدا ہوئی۔

بتایا جاتا ہے کہ درخت میں نمو کی طاقت ہے۔ جذب غذا کی طاقت ہے، لیکن کیوں ہے، کیسے ہے، کس طرح اور کیوں ایک تخم ہوا پانی اور مٹی کو کھینچ کر تحلیل کر کے، بدل کر، رنگ بو اور کیفیت بدل کر سر اوپر نکالتا اور ثمردار ہوتا ہے۔ اس کی جڑ، سوتے، تنے، شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل کیسے بنتے ہیں۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ پھر بیج میں اللہ نے نشوو نما کی قوت کیوں رکھی ہے۔ نامی اور غیر نامی کا فرق کیوں ہے۔ آگ کیوں جلاتی ہے، پانی کیوں غرق کرتا ہے۔ ہوا میں خفت اور مٹی میں ثقل کیوں ہے۔ کیوں ایک میں حرارت اور دوسرے میں برودت ہے۔ کیوں ایک یبوست اور دوسرا رطوبت کا حامل ہے۔ سمندر کی موجیں، قطرات کی بارش، شمس کی درخشانی اور خواص عالم کی اس بے پایانی کی غایت کیا ہے، کوئی نہیں بتا سکتا۔

غرض یہ کہ تصوری حرکت سے لے کر ادنیٰ ترین ذرہ کی تبدیلی ظاہر کر رہی ہے کہ حکمت الٰہیہ کے اسرار ناقابلِ احاطہ ہیں۔ اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور دریا بھی بن جاتے ہیں اتنی ہوں اور وہ سب روشنائی ہو جائیں اور تمام زمین کے درختوں کے قلم بنا لئے جائیں اور پھر مقدرات الٰہیہ، اسرار حکمت اور دلائل قدرت لکھا جائے تو روشنائی ختم ہو جائے، قلم گھس کر فنا ہو جائیں، مگر بے پایاں اسرار ختم نہ ہوں۔

۳۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔ اس کے کان اور آنکھ نہیں، لیکن وہ پوشیدہ آواز جو کانوں سے کبھی نہ سنائی دے وہ سنتا ہے اور وہ باریک مخفی بے رنگ چیز جس کو آنکھیں آلات کے ذریعہ سے بھی نہ دیکھ سکیں اس کو وہ دیکھتا ہے۔ کلیات اور جزئیات مجردات اور مادیات ماضی اور استقبال بلکہ موجود اور معدوم سب اُس کے سامنے حاضر ہیں اور ایسے حاضر ہیں کہ ان کی کوئی کیفیت اس سے چھپی نہیں۔ انسان کے گذشتہ اور آئندہ اعمال سے بھی وہ واقف ہے۔ اس کی قلبی حرکات اور سانس کی رفتار کو بھی وہ جانتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کے جسم کے اجزا پریشان کہاں جاتے ہیں۔ کیا شکل اور کیا رنگ اختیار کرتے ہیں اور کس طرح پھر ان کو دوبارہ جمع کیا جا سکتا ہے ان تمام باتوں سے وہ واقف ہے۔

یہ ہے اسلام کا خدا جس نے تمام عالم کو پیدا کرنے کے ساتھ انسان کو سب کا جامع بنایا اور پھر سب کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ ایک آدمی کی ابتدائی اور ثانوی تخلیق ایسی ہی ہے جیسے سب کی اُس کے لئے نہ اوّل دشوار ہے نہ ثانی ناممکن۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ اُردو کی نقل ہے کہ موت وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اور صداقت وہ جس کا انکار دشمن کو بھی نہ بن پڑے۔ اسلام برہانی مذہب ہے۔ اس کے تعلیم کردہ عقائد و حقائق ثابتہ ہیں۔ بلا دلیل مفروضات نہیں۔ اپنی تعلیم کو یہ عقل و بصیرت کی روشنی میں منواتا ہے۔ بلا وجہ ان لینے کو نہیں کہتا۔ آسمان و زمین اور ان کا سارا جہان اللہ نے بنایا۔ یہ اسلام کا نظریہ ہے۔ اگر اس کے متعلق معاند کافر اور مادہ پرست دہری سے بھی دریافت کیا جائے گا تو اس کو اقرار کرنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ کوئی کس طرح انکار کر سکتا ہے۔ جبکہ سلیم اور گہری نظر عامی دماغ اور حکیمانہ غور و فکر سب ہی اس قول کے صادق ہونے کی شہادت دے رہے ہیں اور ہزار دلائل عقلی ثبوت اس کے موجود ہیں۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ۔ پس اے نبی آپ اللہ کا شکر ادا کریں، اس کی ستائش کریں کہ اس نے ناقابلِ انکار حقیقت کی آپ کو تعلیم دی اور دشمن کی زبان سے بھی آپ کے قول کی صداقت کا اقرار کرا دیا۔ اب رہی یہ بات کہ یہ موقوف کہ ما سوا وجود اقرار مذکور کے پھر بھی شرک کرتے ہیں یا اقرار خدائی کے باوجود توحید الوہیت کے قائل نہیں اور دونوں کو جدا جدا نظریات جانتے ہیں تو اس کی :-

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وجہ اور کچھ نہیں۔ یہ محض ان کی نادانی ہے۔ ان میں اکثر نادان ہیں۔ دونوں تیدوں کے اتحاد کو نہیں جانتے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ جو خلاق ہوگا وہی الٰہ بھی ہوگا۔ جب سب کو اسی نے بنایا تو اس کو کیسے گوارا ہوگا کہ اسی کی مخلوق دوسروں کی پرستش کرے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اوپر کی آیت میں اللہ کی خلاقی کو ظاہر فرمایا تھا۔ اس فقرہ میں ملکیت عامہ اور تصرف تام کا بیان فرمایا۔ شبہ ہوسکتا تھا کہ صرف خلاقی الوہیت کا استحقاق پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ پیدائش کے بعد انتظام تربیت، حکومت اور تصرف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے بتا دیا کہ خدا فقط خالق ہی نہیں کہ پیدائش کے بعد اس کی ضرورت نہ رہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں یعنی سارے جہان میں ہے اسی کا مملوک، مصنوع، محکوم، مربوب اور زیر تصرف ہے وہی منتظم اور آمر ہے اسی کے دستِ قدرت میں سب کی مالکیت اور ملکیت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ اس فقرہ میں دو اوصاف کا بیان ہے جو تکمیل قصرِ الوہیت کے ضروری اجزا ہیں۔ جب اللہ سب کا خالق اور مالک ہے تو کیا اس تخلیق سے کوئی غرض وابستہ ہے اور ملکیت سے اس کو کوئی خاص لالچ ہے۔ کیا اس مخلوق اور مملوک سے اس کی بڑائی میں اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محتاج نہیں۔ کسی سے اس کی غرض وابستہ نہیں۔ یہ مخلوق اور مملوک اس میں کوئی بڑائی پیدا نہیں کرتے۔ وہ مخلوق کا خالق اور مملوک کا مالک ضرور ہے، مگر بلاشبہ غنی ہے، لاپرواہ ہے۔ یعنی کسی کی اس کو حاجت نہیں۔ ۲۔ مخلوق کا فرض یہ ہے کہ اس کی پرستش کریں، حمد و ثنا کریں، شکر کریں، اس کی ربوبیت، الوہیت اور وحدت کا اقرار کریں، لیکن ایسا کیوں کریں۔ اس نے اس کا حکم کیوں دیا۔ کیا مخلوق کی ستائش اس کو محمود بنا دیتی ہے۔ اگر مخلوق اس کی تعریف نہ کرے تو وہ ناقابل حمد قرار پائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کسی کی حمد کا بھی محتاج نہیں۔ اُس کے صفات، اُس کے احسانات، اس کی فیاضیاں، اس کی پروردگاریاں اس کے محمود اور واقعی قابلِ حمد ہونے کے لئے کافی ہیں۔ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ۔ الخ۔ خطیب نے لکھا ہے کہ علمائے یہود نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کا علم قلیل ہے۔ حالانکہ ہم کو توریت عطا ہوئی ہے۔ اسی وقت ان آیات کا نزول ہوا۔

محمد بن اسحاق نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا کہ جب حضور اقدسؐ مدینہ میں تشریف لائے تو علمائے یہود نے جمع ہو کر عرض کیا آپ فرماتے ہیں کہ اللہ نے وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا آیت نازل فرمائی ہے۔ کیا اس سے آپ کی مراد صرف اپنی قوم ہے یا ہم لوگ مراد ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا میری قوم اور تم سب ہی مراد ہو۔ یہودیوں نے عرض کیا آخر آپ پر یہ آیت بھی تو نازل ہوئی ہے کہ ہم لوگوں کو توریت عطا کی گئی ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ آپ نے فرمایا وہ علم الٰہی کی نسبت سے بہت قلیل ہے۔ اس میں صرف تمہاری ضرورتوں کی کفالت ہے۔ (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم) اس پر اللہ نے آیاتِ مذکورہ نازل فرمائیں۔ عکرمہ اور عطاء بن یسار سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ مدنی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ روایات مذکورہ اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ان کی تائید اس کی ہوتی ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے بقول ابن عباس اس کو مدنی قرار دیا ہے۔ اگرچہ مشہور یہ ہے کہ ان آیات کا نزول مکہ میں ہوا اور قریش کو تنبیہ کرنے کے لئے ہوا۔

مذکورہ روایات اور قول مشہور میں تطابق اس طرح ہو سکتا ہے کہ آیات کا نزول تو مکہ میں ہی ہوا لیکن مدینہ میں پہنچنے کے بعد جب علمائے یہود سے مذکورہ بالا گفتگو ہوئی تو اس وقت حضور والاؐ نے آیاتِ مذکورہ کی تلاوت فرمائی۔ حضورؐ کے تلاوت فرمانے سے راوی نے یا راوی کے قول کا مطلب سمجھنے والے نے یہ سمجھا کہ نزول ہی مدینہ میں ہوا۔ واللہ اعلم۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سات سمندروں کا تذکرہ بطور حصر نہیں ہے نہ یہ مقصود ہے کہ سات سمندر اس زمین کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی تمام روایات اسرائیلی ہیں۔ مقصد صرف کثرت کا اظہار ہے کہ جس قدر سمندروں کی روشنائی فرض کر لو وہ تب بھی کلمات الٰہیہ لکھنے سے کم ہوں گی۔

میں کہتا ہوں کہ سمندروں کی شمار واقعی شمار نہیں۔ کیونکہ سمندر سارا ایک ہی ہے۔ وہ تمام پانی جو روان نہیں اور اس خشکی کو گھیرے ہوئے ہے سمندر کہلاتا ہے۔ البتہ محل وقوع اور کیفیات کے اختلاف سے اہل جغرافیہ نے اس کے مختلف نام رکھ دیے ہیں۔ جن کی تعداد سات مقرر کی گئی ہے۔ بحرِ احمر، بحرِ اخضر، بحرِ اطلس، بحرِ اسود، بحرِ ابیض، بحرِ ازرق وغیرہ۔ اسی طرح زمین کو بھی محل وقوع کے لحاظ سے اور خواص کے اختلاف کی وجہ سے سات حصوں پر پہلے زمانہ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جن کو سات اقلیم کہا جاتا تھا اور اس زمانہ میں بجائے سات کے پانچ براعظم مقرر کئے گئے ہیں۔ ایشیا، آسٹریلیا، افریقہ، امریکہ اور یورپ۔ پس آیاتِ مذکورہ میں جو سمندروں کی تعداد اور گنتی بیان کی گئی وہ عام شہرت اور محاورہ کی بنا پر ہے حقیقی حد مقصود نہیں۔

کلماتُ اللہ سے مراد کیا ہے ؟ اس کی تعیین نہیں کی جاسکتی ۔ اللہ ہی علیم ہے کیا مُراد ہے ۔ بعض کے نزدیک کلمات سے مقدرات الٰہیہ یا صفات قدسیہ اسرار قدرت اور رموزِ حکمت وغیرہ مراد ہیں ، لیکن اس قسم کا کوئی معنیٰ مراد لینا عربی کے خلاف ہے ۔ کلمات کا صحیح ترجمہ اور معنی اردو بولیاں یا باتیں کہا جا سکتا ہے ۔ خلاصہ مطلب یہ کہ اگر زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندروں کے پانی کو روشنائی بنا لیا جائے بلکہ ان سمندروں کو مزید روشنائی مل جائے اور کلماتِ الٰہیہ کو لکھا جائے تب بھی ان کا احاطہ ناممکن ہے ۔ قلم اور روشنائی ختم ہو جائے گی اگر کلماتِ الٰہیہ کی انتہا نہ ہوگی ۔

ربیع بن انس نے کہا کہ اگر تمام مخلوقات اولین و آخرین کا علم جمع کیا جائے تو علمِ الٰہی کے مقابلے میں اتنا ہوگا جتنا سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ ۔

صحاح میں ایک حدیث بھی آئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کل کائنات کا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے سمندروں کے مقابلے میں سوئی کے ناکے کی وہ تری ہے جو دریا میں ڈبو کر نکالنے کے بعد رہ جاتی ہے ۔

اللہ کی بولیاں اتنی ان گنت ہیں کہ کوئی ان کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ ذرہ ذرہ ، قطرہ قطرہ ، پتہ پتہ ، دریاؤں کی روانی ، سمندروں کی طغیانی ، ستاروں کی شعاعیں اور سیاروں کی کرنیں ، عالمِ مادیت کا وسیع الاطراف بیابان اور عالمِ قدرت کا لامحدود میدان غرض عرش سے لیکر فرش تک اور لامکان کی بلندی سے لے کر مکان کی انتہائی پستی تک اللہ کی آواز گونج رہی ہے ، اسی کی بولیاں سنائی دے رہی ہیں ، مگر سننے کے لئے کانوں کی ضرورت ہے اور کانوں میں قوت شنوائی کی حاجت ہے اور قوت سماعت میں اثر پذیری کا ہونا لابدی ہے ۔ پہلے ان ظاہری گوشت پوست کے کانوں کی بندش لازم ہے پھر باطنی کانوں کے داخلی سوراخوں کو کھولنا ضروری ہے ۔ اس وقت غیب کی آوازیں سنائی دیں گی جن کے لئے نہ کوئی سمت ہوگی نہ رُخ نہ کیفیت صوتی نہ ہوا کی لہروں کا دباؤ ۔

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

ہر گیاہے کہ از زمیں گوید کلمۂ لا الٰہ ..... می گوید

جو لوگ کلمات اللہ سے مراد معلومات یا مقدورات یا صفات یا اسرارِ قدرت اور رموزِ حکمت لیتے ہیں ان کا قول بھی غلط نہیں ہے ۔ کیونکہ اللہ کے معلومات اور مقدورات اور صفاتِ قدسیہ غیر متناہیہ ہیں ۔ اس کی قدرت کے اسرار اور حکمت کے رموز بے پایاں ہیں ، لیکن ان تمام چیزوں کی تعبیر کلمات سے ہوتی ہے ۔ گویا معلومات اور صفات وغیرہ کا درجہ مکی عنہ اور معنی کا ہے اور کلمات کا درجہ عبارت و ظہور کا ایک کو بول کر دوسرے کو مراد لیا جا سکتا ہے ، اس لئے کلمات سے مذکورۂ بالا ہر معنی مراد ہو سکتا ہے ، لیکن تعیین کرنی اور صرف معلومات یا مقدورات یا اسرار و رموز مراد لینے مناسب نہیں ، اس لئے بہتر یہی ہے کہ کلمات سے بولیاں ہی مراد لی جائیں اور چونکہ اللہ کے معلومات و مقدورات وغیرہ لامتناہی ہیں ، اس لئے ان کو ظاہر کرنے والی بولیاں بھی بے پایاں ہیں ۔ عارفِ کامل ، ہر پھول کے منہ سے ، ہر کانٹے کی زبان سے ، دریاؤں کے ترنم سے اور آبشاروں کے نغمہ سے ، ہواؤں کی سنسناہٹ سے اور ابر کی گڑگڑاہٹ سے اللہ کی بولیاں سنتا ہے اور بے خود ہو کر جھومتا ہے اور اس کی روح بدمستی کی حالت میں رقص کرتی ہے اور چونکہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا ، اس لئے محوِ حیرت ہوتے ہوتے اپنی انانیت کو کھو بیٹھتا ہے ۔

الغرض اللہ کی حکمت کا علم غیر محدود ہے ۔ ذرہ ذرہ کی تربیت اور مصلحت کے مطابق اس کی ترقی تنزل وغیرہ ایک ایسی لامحدود حکمت کے زیرِ عمل ہے جس کا احاطہ ناممکن ہے ۔ پھر اس سے اس کی حکمت کا غیر محدود ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا ۔ بلکہ قدرت کی ہمہ گیری اور قبضہ کا کمال بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ اگر قدرت و غلبہ لامحدود نہ ہوتا تو یہ تصرفات بے پایاں جو بطون سے ظہور اور عدم سے وجود میں آتے چلے جاتے ہیں ، کہیں تو جا کر ٹھہرتے اور کہیں تو ان کی حد ہوتی ۔ اسی لئے ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اس سے آگے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ غالب اور حکیم مطلق ہے ۔ گویا حاکم بھی وہی ہے اور حکیم بھی وہی ہے ۔ حکم اور حکومت بھی اسی کو سزاوار ہے اور حکمت بھی اسی کی لامتناہی ہے ۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ جب اللہ کی حکمت بے پایاں اور قدرت ہمہ گیر ہے تو اس کے نزدیک انسانوں کی ابتدائی تخلیق اور ثانوی حیات دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ جب پہلی مرتبہ پیدا کیا تو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور کروڑوں انسانوں کو عدم سے وجود میں لانا یا ایک آدمی کو پیدا کرنا دونوں باتیں اس کیلئے ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں ۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ یعنی ہمارا حکم بس پلک مارتے میں پورا ہو جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ پراگندہ اجزاء کو جمع کرنا پھر ان کو مناسب طور پر ملانا اور ان کو زندہ بنانا اس وقت ناممکن ہوتا جب اس فعل کے فاعل کو ذراتِ پریشان کا مقام نہ معلوم ہوتا ۔ وہ واقف نہ ہوتا کہ انسانی جسم جب سڑ گل کر خاک ہو جاتا ہے تو اس کے ذرات کہاں کہاں چلے جاتے ہیں ۔ یا وہ یہ نہ جانتا کہ اس کی کیفیت اور حالت کیا ہے یا وہ اس علم سے بے بہرہ ہوتا کہ

کون سا سبزہ سر کا ہے اور کون سا پانی (کا) یا اس کو ان سب کو اکٹھا کرنے کی قدرت نہ ہوتی یا وہ اعادۂ حیات کرنے سے عاجز ہوتا۔ جب ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے
اس کی حکمت محیط قدرت ہمہ گیر اور
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ہر جلی خفی سے واقفیت کامل طور پر ہے۔ وہ خوب سنتا ہے (بغیر مادی کانوں کے) وہ خوب دیکھتا ہے (بغیر جسمانی اور مقداری آنکھوں
کے) تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے۔

مقصودِ بیان

آغاز آیت دلالت کر رہا ہے کہ اہلِ شرک بھی ذاتِ الٰہی میں شرک نہیں کرتے بلکہ زمین و زمان کا خلاق بھی دوسرے کو نہیں قرار دیتے۔
لیکن پھر بھی آیتِ مذکورہ ان کو نادان، جاہل اور لاعلم کہہ رہی ہے۔ کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ عملی شرک میں مبتلا تھے۔ وہ نہیں
جانتے تھے کہ ہمارا فعل قول کے خلاف ہے۔ قول کے ثبوت سے فعل کی بیخ کنی اور فعل کی حقانیت سے قول کا استیصال لازم آتا ہے۔ یہی اُن کی نادانی تھی۔ پس ان
سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان موحد اہلِ اسلام کو جو زبان اور قول سے تو اللہ کی الوہیت خلاقیت اور ربوبیت کی وحدت کا اعلان کر رہے ہیں، لیکن ان کے
اعمال مشرکانہ ہیں۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے حقیقی مدد طلب کرنی، در در سجدہ ریز ہونا، کسی غائب کو حاضر ناظر سمجھنا، قبروں اور استھانوں پر نظریں چڑھانی
وغیرہ وغیرہ۔ تمام مشرکانہ حرکات ہیں۔ صوفی کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ شرک کی ازخود ہی جائز نہیں، لیکن یہ بات کشفی اور حالی ہے۔
مقالی اور برہانی نہیں۔ بیان میں تو اتنا آسکتا ہے کہ اللہ کے خصوصی صفات میں اس کا شریک کوئی نہیں۔
آیت لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بتا رہی ہے کہ ملکیت اور حکومت اللہ کی ہی ہے۔ اس سے سبق سیکھنا چاہیئے ان لوگوں کو جو شخصی اور جمہوری
حق کے مباحث کو لغزش گاہ عقول بنائے ہوئے ہیں اور اسلام میں حکومت کو آمریت یا جمہوریت وغیرہ ایسے کمزور بے حقیقت الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔
ان کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ حقیقی طور پر سب ملک خدا کا ہے اور حکومت خدا کے بھیجے ہوئے قانون کی ہے۔ نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم نہ آمر نہ مامور۔ البتہ
بعض لوگوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ خود قانون کی پابندی کرنے کے بعد دوسروں کو بھی پابند بنائیں اور قانون کی اشاعت کریں بلکہ ہر شخص کو اس کا مکلف کیا گیا
ہے کہ بقدر طاقت قانون کی اشاعت کرے۔ اسی طرح ہر شخص کو بعض چیزوں میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے اور بعض چیزوں کو استعمال کرنے
کی اجازت دے دی گئی ہے ورنہ واقع میں کسی کی کوئی ملک نہیں۔ نہ انفرادی نہ جمہوری۔ عقیدۂ ملکیت و حکومت اگرچہ نظری ہے، مگر بڑے بڑے اختلافی
مباحث کا فیصلہ کر دینے والا ہے اور دنیا میں امن عام پیدا کر دینے والا ہے۔ احکم الحاکمین نے مذکورۂ بالا لفظوں میں اس کا فیصلہ کر دیا۔
سات صفات کا مذکورۂ فوق آیات کے مجموعہ میں ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ یہ سب کے سب الوہیت کے ارکان ہیں۔ ان میں سے ایک رکن کے گر جانے
سے قصرِ الوہیت گر پڑے گا۔ گویا یہ اعلان ہو گیا اس امر کا کہ اسلام کے علاوہ اور فرقے یا عقلی گھوڑے دوڑانے والے اشخاص جس خدا کی خدائی کے قائل
ہیں چونکہ اس کی الوہیت ناقص ہے، اس لئے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اسلام اُس خدا کی ہستی کا اعلان کر رہا ہے جو ہر طرح کامل ہے۔ پس اگر کوئی مذہب ازل
اللہ کی طرف سے اور بصیرت کے موافق ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام کا عقیدۂ وحدانیت والوہیت وغیرہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کی خوبیوں کا ان گنت ہونا
دعوت دے رہا ہے کہ انتہائی کد و کاوش اور دماغ فرسائی کے بعد بھی حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا وغیرہ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ
کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور آفتاب و ماہتاب کو اُسی نے کام میں لگا رکھا ہے
يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ
سب ایک معین میعاد تک چلیں گے جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور

أَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ

اور اس کے سوا جس چیز کو تم پکارتے ہو وہ بے اصل ہے اور اللہ یقیناً برتر و بزرگ ہے کیا تم کو معلوم نہیں کہ کشتیاں

تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ

اللہ کے فضل سے سمندر میں چلتی ہیں تاکہ اللہ تم کو بعض نشانیاں دکھائیں اس میں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لئے بڑی نشانیاں

شَكُورٍ ۝ وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا

ہیں جب ان پر سائبانوں کی طرح لہر چھا جاتی ہے تو وہ اللہ کی خالص عبادت کرتے ہوئے اس کو پکارتے ہیں لیکن جب اُن کو

نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ۝

بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو بعض اُن میں سے (کفر و ایمان کے) درمیان ہو جاتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار ہر عہد شکن اور ناشکری کرتا ہے

تفسیر: آدمی کے اندر اور باہر ظاہری اور باطنی آفاقی اور نفسی جسمانی اور روحانی طرح طرح کے انعام اور احسان ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا رہتا ہے اور زندگی کے دکھ درد کو سکھ سے گزارتا ہے، لیکن کوتاہ نظر دکھنے والے کہتے ہیں کہ اس میں خدا کا کون سا احسان ہے یہ تو زمانہ کا انقلاب ہے۔ شبانہ روز کی گردش ہے فصلوں اور موسموں کا تغیر تبدل ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تصرفات دہریہ کا اقتضاء ہے، سردی گرمی کا اثر ہے۔ اس بے وقوف کو نہیں معلوم کہ زمانہ بجائے خود کوئی چیز نہیں لمحات سے ساعات اور ساعات سے رات دن سے ہفتے مہینے اور برس بنتے ہیں اور شبانہ روز کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کا وجود و عدم چاند سورج کے طلوع و غروب کا تابع ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ کہیں رات زیادہ اور دن کم ہوتا ہے اور کہیں دن زیادہ اور رات کم۔ آفتاب و ماہتاب کا ظہور دن کو بناتا اور بگاڑتا ہے، لیکن آفتاب و ماہتاب کی حرکت کس کے زیر اثر ہے۔ گیارہ گھنٹے کی رات اور تیرہ گھنٹے کا دن کیوں ہوتا ہے۔ آفتاب کے طلوع اور چاند کے غروب کا یہ تقدم و تاخیر کیوں ہوتی ہے۔ ایک ہی ملک والے باوجود یکساں حالت رکھنے کے کیوں اس تغیر کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ فصلوں کا تغیر کس کے ہاتھ میں ہے اور کون اس کی مصلحت سے واقف ہے۔ کون انسان کی ضروریات زندگی کو جانتا ہے اور جان کر اُن کے مناسب تغیر کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ شبانہ روز کا گھٹنا بڑھنا خود نہیں ہوتا بلکہ چاند سورج کے طلوع و غروب سے ہوتا ہے۔ پھر چاند سورج کے طلوع و غروب کے اوقات میں اختلاف کیا خود ہو جاتا ہے۔ کیا ان میں قوتِ ارادہ ہے، کیا یہ صاحب شعور ہیں۔ کیا یہ بجائے خود ناقص اور زوال پذیر نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو پھر خود مختار کس طرح ہو سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیر اور حرکت کسی دوسرے کی مرضی کے تابع ہے جو ارادہ بجائے خود واجب الوجود ہے۔ ہر تغیر سے پاک، ہر زوال سے بالا اور ہر حدوث سے بلند ہے۔ اسی کو حق اور علیّ کبیر کہتے ہیں۔ پس جب تمام احسانات کا اصل مبدا یہی ہے تو کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ وہی مختار مطلق اور محسن حقیقی اور علیم و خبیر ہے۔

آسمانی سیاروں اور ستاروں کی گردش اور اس سے شبانہ روز کی پیدائش اور اس گردش کی چگونگی اور کیفیت۔ یہ تو بہت اونچی باتیں ہیں۔ ایک کھلی ہوئی حقیقت اس سے بھی زیادہ واضح ہے جس سے اسباب و مسببات کی باہم وابستگی صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔ دیکھو کشتیاں اور جہاز سمندر میں چلتے ہیں، پانی کی سطح کو چیرتے ہیں، مال و اسباب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں۔ کیا یہ بھی خود کو چلاتے ہیں۔ کیا ان میں بھی ارادہ اور شعور ہے۔ آخر ان کو باوجود بھاری اور وزنی ہونے کے ہلکے پھلکے اور تیرنے والا اور غرق ہونے سے بچانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو ہوا کو حکم دیتا ہے کہ جہازوں کو چلائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیات قدرت سے فائدہ اٹھانا ہر شخص کا کام نہیں۔ دنیا میں تین طرح کے آدمی رہتے ہیں۔ ایک گروہ تو ان مومنین کاملین کا ہے جو ہر دکھ سکھ کو اللہ کی طرف سے جانتے ہیں۔ ہر تغیر، ہر تبدیل اور ہر انقلاب میں اسی کے ہاتھ کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ وہ ہر طرح مطمئن رہتے ہیں۔ دکھ آتا ہے تو صبر کرتے ہیں، دکھ میں بھی ان کو لذتِ عرفان حاصل ہوتی ہے اور سکھ

اسکے ہے تو شکر کرتے ہیں اسکو ہیں بھی ان کو ایمان کی حلاوت ملتی ہے، لیکن دوسرا گروہ وہ ہے جو عافیت اور آسائش کے زمانے میں تصرفات زمانیہ کو انقلاب دہر تغیرات طبیعیہ، آثار سماویہ، تبادلات فصلیہ اور خدا جانے کیا کیا کہتا ہے اور خدا کو بھول جاتا ہے، لیکن جب اُس پر کوئی غیبی مصیبت پڑتی ہے ہلاکت کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے، نجات کے سب راستے بند دکھتے ہیں اُس وقت وہ تمام توہمات اور خرافات سابقہ کو چھوڑ کر خلوص قلب کے ساتھ اللہ کی طرف منہ موڑ لیتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے۔ قدرت اُس کو مجبور کر کے قادر کے وجود کا قائل بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ زبردست سے زبردست بڑے سے بڑا مادہ پرست اہل مصیبت کے وقت سب مادہ پرستیاں اور خود پندار یاں بھول جاتا ہے اور روسی سوشلسٹ بھی خدا کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہے اور جب خدا اس کو مصیبت سے بچا دیتا ہے تو اس گروہ میں سے کسی قدر عقلمند طبقہ تو خدا کی ہستی اور قدرت کا قائل رہتا ہے۔ اگرچہ اس کا وہ پہلا خلوص اور پختہ ایمان تو نہیں رہتا، مگر کبھی بھی اس کو فیبی کارفرمائی کا اقرار ہوتا ہے، لیکن تیسرا ابلیت مجہول العلم گروہ مصیبت سے نجات پانے کے بعد خدا کو بالکل بھول جاتا ہے۔ بلکہ اپنی رہائی کو اپنی خوش تدبیریوں اور وقت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ کہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ فلاں شخص یا فلاں قوم کی مدد سے مجھے نجات ملی کبھی کہتا ہے موافق ہوا چلنے سے میرا جہاز ساحل مراد پر پہنچ گیا اور کوہ نما لہروں سے بچ گیا۔ غرض یہ خبیث گروہ نجات کے بعد بد عہدی اور ناشکری کرتا ہے۔ تباہی میں پھنس جانے کے بعد تو اشخاص یا اقوام کی مدد، ہوا کی موافقت اور تمام دماغی خوش تدبیریاں کو بھول گیا تھا اور صرف ایک ہستی اس کو یاد رہی تھی جس کی ہمہ گیر قدرت کا وہ قائل ہو گیا تھا، لیکن نتیجہ ختم کے بعد اپنے سابق قول سے پھر جاتا ہے۔

تحلیل اجزاء

اَلَمْ تَرَ اکثر علماء کے نزدیک یہ خطاب رسول پاک کو ہے اور عام مسلمان ذیلی طور پر مامور ہیں۔ کیونکہ کفار مکہ کو خطاب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ لفظاً اگرچہ خطابی ہے، لیکن مخاطب مخصوص نہیں۔ اس طرح کے الفاظ ہر زبان کے محاورات میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم لیگی مقرر ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے کرتے کہتا ہے اور کہتا ہے اے بے وقوف کانگریسی تو ہندوستان میں جو وحدت سلطنت کا خواب دیکھ رہا ہے وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اس جملہ میں کوئی خاص کانگریسی مراد نہیں۔ اگرچہ حرف ندا استعمال کیا گیا ہے۔

اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ نے تمام سماوی اور ارضی چیزوں کو مطیع حکم بنا رکھا ہے۔ ان آیات میں سماوی اور ارضی چیزوں کی تفصیل لطور تمثیل فرمادی۔ آسمانی چیزوں میں سے رات دن اور چاند سورج کا ذکر فرمایا اور ارضی چیزوں میں سے جہازوں کے چلنے کا تذکرہ کیا۔ یا اس طرح کہہ لیجئے کہ گزشتہ آیت میں حشر جسمانی کا ذکر فرمایا تھا، لیکن بعض بے وقوف چونکہ موت وحیات بلکہ تمام تغیرات کو ایام ولیالی کے ہاتھوں میں مرہون سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تغیر اور حرکت دہر کی کرشمہ نمائی ہے تو اس خیال کو زائل کرنے کے لئے فرمادیا کہ یہ تمام کرشمہ سازیاں اللہ کے دست قدرت میں ہیں۔ لیالی اور ایام ان کے حقیقی اسباب نہیں ہیں۔ اوقات اور مزمن ستارے اور سیارے قسمت خداوندی کے فرماں بردار ہیں۔

رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اوقات نہار کا کچھ حصہ کبھی رات میں شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً دن گیارہ گھنٹے کا اور رات تیرہ گھنٹے کی ہو جاتی ہے اسی طرح اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔

نکتہ۔ آیت مذکورہ میں نیز بعض دوسری آیتوں میں رات کا ذکر دن کے ذکر سے پہلے فرمایا ہے۔ ایک آیت میں آیا ہے وَجَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّھَارَ اٰیَتَیْنِ۔ دوسری جگہ وارد ہے وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ تیسری جگہ ہے وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ۔ اسی طرح بعض آیات میں حیات سے پہلے موت کا تذکرہ فرمایا ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ الخ اس تقدیم میں ایک خاص نکتہ ہے بات یہ ہے کہ عام طور پر ظلمت عدم نور کو لیل عدم نہار کو اور موت عدم حیات کو کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ ازل میں نہ نور تھا نہ دن نہ حیات نہ وہاں ظلمت تھی نہ رات نہ موت۔ درحقیقت مؤخر الذکر تینوں چیزوں کا مفہوم محض عدمی نہیں ہے بلکہ یہ ایسے اعدام ہیں جن میں صلاحیت وجود ہے۔ مثلاً اندھا کسی دیوار کو نہیں کہتے باوجودیکہ دیوار کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ وجہ یہ ہے کہ دیوار میں آنکھیں ہونے کی قابلیت ہی نہیں ہے اس لئے باوجود آنکھیں نہ ہونے کے دیوار کو اندھا نہیں کہا جاتا۔ یہی حال رات کا ہے، ظلمت کا ہے اور موت کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ تاریکی اور رات اور موت کے مفہوم میں بھی کسی قدر ثبوتی معنی پائے جاتے ہیں، لیکن یہ ایسا ثبوت ہے جو مخلوق کے لئے سبب سوال بن سکتا ہے دن حیات اور روشنی تو ایسی چیزیں تھیں جن کے اسباب دریافت کرنے کے قابل نہ تھے۔ ہر شخص واقف ہے کہ سورج نکلنے سے دن اور روشنی کا ظہور ہو جاتا ہے اور سانس آنے سے حیات ہو جاتی ہے۔ معمولی چیز کا سبب دریافت نہیں کیا جاتا۔ بازار میں آدمی بازار میں گھوڑے پر سے لڑکوں چلتے پھرنے کی وجہ نہیں پوچھتا۔ غیر معمولی چیز کا سبب دریافت کیا جاتا ہے۔ بادشاہ بازار میں گشت کر رہا ہو تو ہر شخص وجہ دریافت کرتا ہے۔ پس ظلمت اور رات اور موت بھی ایسی

چیزیں ہیں جن کے اسباب پوشیدہ اور غیر معمولی ہیں جس طرح کسی کے بینا ہونے کا سبب نہیں دریافت کیا جاتا ہے بلکہ نابینا ہونے کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ اسی طرح دن، روشنی اور حیات ناقابلِ سوال چیزیں ہیں۔ قابلِ سوال صرف ظلمت، لیل اور موت ہے۔ ان کے اسباب بیان کرنے اور دلالت کو ظاہر کرنے کی سب سے پہلے ضرورت تھی، اس لئے فرمایا کہ دیکھو اللہ ہی رات کو گھٹاتا اور دن کو بڑھاتا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى۔ تسخیر کائنات کی توضیح ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ کردی ہے۔ لیکن اس جگہ عمومی تسخیر مراد نہیں ہے۔ بلکہ ان بے وقوفوں کے خیال کو زائل کرنا مقصود ہے جو شمس و قمر کی رفتار کو مستقل سمجھتے اور از خود جانتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ چاند ہو یا سورج ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خلافِ فطرت چاند سورج کی رفتار میں کمی بیشی ہو جائے۔ سردی میں دن بڑا رات چھوٹی اور گرمی میں رات بڑی دن چھوٹا ہو جائے۔ یعنی اگر ان کی رفتار از خود ہوتی اور مطیعِ حکم نہ ہوتے تو ہر وقت کمی بیشی کا ان کو اختیار ہوتا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل علم ان کی حرکت کا حکمراں ہے۔ وہی خلق کی مصالح سے واقف ہے بس۔

وَأَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ جو خدا تمام کائنات کے ادنیٰ ترین مصلحتوں اور ضرورتوں سے واقف ہے۔ وہ انسان کے اعمال سے بھی بخوبی باخبر ہے۔ اور جس کی قدرت ایام و لیالی اور شمس و قمر کو مسخر کئے ہوئے ہے۔ وہی انسان کو مرنے کے بعد زندہ کرسکتا ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا، چاند کے بعد سورج اور سورج کے بعد چاند کا رونما ہونا اگر قابلِ شک ہو اور موت کے بعد حیات میں شبہ کیا جائے یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ باطل کے معنی ہیں زوال پذیر اور فانی اور حق کے معنی ہیں ثابت موجود۔ گزشتہ آیات میں صفاتِ سلبیہ اور ثبوتیہ کا ذکر کردیا گیا تھا۔ غنی ہونا سلبی وصف تھا اور حمید، عزیز، حکیم، سمیع، بصیر وغیرہ ثبوتی اوصاف تھے۔ اور تمام صفات کی علت اس آیت میں بیان فرمائی اور طنز آمیز آہنگی سے اعلان کردیا کہ چونکہ اللہ ہی واجب الوجود، موجود، ثابت اور ثابت ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز فانی اور زوال پذیر ہے، اس لئے اللہ ہی مذکورہ اوصافِ کمال کا حامل ہے اور دوسری چیزیں صفاتِ کمال سے خالی ہیں۔ انسان اگر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو اور مختلف حرکات کرے تو آئینہ کی تصویر میں بھی مختلف حرکات کا عکس نظر آتا ہے۔ مگر اصل اور عکس میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک مختار قادر دوسرا مجبور عاجز، ایک حرکات کا سرچشمہ دوسرا تابع، ایک زندہ حساس باشعور دوسرا بے جان بے حس، بے شعور۔ ایک کے حرکات اس کے صفاتِ کمال کے آئینہ دار اور دوسرے کے حرکات بے بسی کے مظہر اور نقصان کے مظہر۔ پس یہی فرق کائنات اور خدا میں سمجھو۔ اللہ ہی کی ہستی صفاتِ کمال کی سرچشمہ ہے اور مخلوق کی ہستی کمزوری اور نقصان کی پیکر۔ وہ اصل ہے یہ سایہ، وہ حق ہے یہ ناحق، وہ واجب اور قدیم، یہ ممکن اور حادث۔

لمحۂ علمیہ عالم کی تمام چیزوں کو چار قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ناقص، مکتفی، تام یعنی کامل، فوق التام یعنی اکمل۔ ناقص وہ چیز ہے جو اپنی ہستی کی ضروریات سے بھی محروم ہو۔ مثلاً بچہ، بیمار، اندھا وغیرہ۔ مکتفی وہ چیز ہے جس کے پاس تمام ضروریات موجود ہوں، لیکن اس کی حالت زوال پذیر اور ہر دم متغیر ہو۔ مثلاً تمام جاندار اور سبزہ وغیرہ۔ تام اور کامل وہ چیز ہے جس کو ضروریات بھی میسر ہوں اور اس کے حالات میں نقصان بھی نہ آتا ہو۔ مثلاً فرشتے اور آسمان وغیرہ۔ فرشتوں کے جو مراتب مقرر ہیں ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی اور آسمانوں کی جو جسامت، شکل اور کیفیت ہے وہ نہیں بدلتی۔ چاند سورج اور تمام ستارے اسی قسم میں داخل ہیں۔ فوق التام یعنی اکمل وہ چیز ہے جس کو اپنے تمام ضروریات اور کمالات حاصل ہوں اور دوسروں کو بھی ضروری حوائج اسی نے عطا کئے ہوں یعنی دوسروں کو درجۂ تمام تک پہنچانا بھی اس کا کام ہو۔ اس کی مثال میں صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ باری تعالیٰ بجائے خود کامل اور تام بھی ہے، تمام کمالات اور ضروریات اس کو بالفعل حاصل ہیں اور دوسروں کو حوائج و کمالات بھی وہی عطا فرماتا ہے۔ آیتِ مذکورہ میں تمام اور فوق التمام دونوں معنوں کو ضمناً بیان فرمایا ہے۔ تمام کی طرف لفظ هُوَ الْحَقُّ سے اشارہ فرمایا۔ یعنی موجود کامل ناقابلِ زوال واجب الوجود قدیم لم یزل ولا یزال اللہ ہی ہے اور اکمل ہونے کی طرف هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ سے اشارہ فرمایا۔ یعنی وہ سب سے بلند اور برتر ہے۔ دوسروں کو علو اور کمال اسی نے عطا فرمایا۔ وہ صفات کے لحاظ سے علی اور ذات کے اعتبار سے کبیر ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ۔ اوپر کی آیت میں آسمانی نشانی کا ذکر کیا تھا اور سبب و مسبب کی والبستگی کی طرف بھی اشارہ کردیا تھا۔ اس آیت میں ارضی نشانِ قدرت کا ذکر فرمایا ہے اور مسبب کے ساتھ اس کا سبب بھی ظاہر کردیا ہے۔ جس طرح شب و روز کی پیدائش، آفتاب

و ماہتاب کے طلوع اور غروب سے ہوتی ہے ۔ اسی طرح سمندر اور دریا میں جہاز اور کشتیاں ہوا سے چلتی ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شب و روز کے تواتر اور چاند سورج کے طلوع و غروب میں انسانی صنعت کو کوئی دخل نہیں ہے اور جہازوں کی رفتار میں انسانی اختیار کو دخیل سمجھا جاتا ہے ۔

اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ نِعْمَتِ اللّٰہِ سے مراد اس جگہ ہوا ہے ، لیکن جس طرح آفتاب اور ماہتاب کے تابع ہیں اسی طرح ہوا بھی فرمانبردار ہے ۔ وہ بھی قدرت کی نشانی ہے ۔ یہ بھی قدرت کی نشانی ہے اسی لئے فرمایا ۔

لِیُرِیَکُمْ مِّنْ اٰیٰتِہٖ کہ کشتیوں کو دریا میں چلا کر اللہ تم کو اپنی بعض نشانیاں دکھانا چاہتا ہے ۔ اللہ کی قدرت کی نشانیاں تو ان گنت ہیں ۔ تمام نشانیاں انسان کو دکھانا ناممکن ہے ۔ محدود علم رکھنے والا انسان احاطۂ آیات کی طاقت رکھتا ہے ۔ اسرارِ ملکوت اور رموزِ ناسوت کا ذہنی احاطہ کرنا وسعتِ دماغ سے خارج ہے ایسی صورت میں وہی نشانیاں دکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے جو بالکل واضح ہوں اور ان کو دیکھ کر آدمی راہِ یقین پر چل سکے ، اسی لئے آیت مذکورہ میں اپنی نشانیاں دکھانے کی صراحت فرمائی ، لیکن ہر شخص کا تو کام نہیں کہ قدرت کی کرشمہ نمائیاں دیکھ سکے اور ان سے قادر کی ہستی کو سمجھ سکے ۔ بہت لوگ ہیں جو لالچ کے بندے ہیں اور بہت ایسے ہیں جو پست حوصلہ و دنی الہمت اور صغیر النفس واقع ہوئے ہیں ۔ نعمت و مال اور عزت و حکومت کو پاکر اترانا یا مصیبت پڑنے پر بے صبر ہو جانا کوتاہ نظر لوگوں کا کام ہے ۔ جن لوگوں کی نگاہ صرف دنیوی دکھ سکھ پر ہوتی ہے اور جن کا بھروسہ اسی متاعِ فانی پر ہوتا ہے ۔ اگر ان کو افلاس ، مرض یا کسی قسم کی ظاہری ناکامی کی مصیبت سے دوچار ہو جانا پڑ جائے تو وہ بے صبر ہو جاتے ہیں اور دنیوی راحت ملنے پر اترانے لگتے ہیں ۔ لیکن جن کی نظر بلند ہوتی ہے جو سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی سے بھی پار اپنی نگاہ کو دوڑا سکتے ہیں ان کو دکھ جاتا ہے کہ آغاز اور انجام دونوں کنارے غیبی قدرت کے ہاتھ میں ہیں ۔ نہ یہ دکھ باقی رہنے والا ہے نہ سکھ دوامی ہے ۔ پانی کے بلبلے ہیں جو اٹھتے رہتے ہیں ۔ کٹھ پتلیاں ہیں جو پس پردہ تاگا ہلانے والی حرکت دست سے ناچتی رہتی ہیں ۔ یہ دیکھ کر اس کے ایمان میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی مصیبت اُن کو بے صبر نہیں بنا سکتی نہ کوئی راحت ان کی شکرگزاری میں خلل ڈال سکتی ہے اسی لئے فرمایا کہ ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ؁ انقلابِ لیل و نہار ، تسخیرِ شمس و قمر اور کشتیوں کی رفتار کے اندر عروج و زوال اور کمال و نقصان کو دیکھ کر قدرت کی نشانیاں اُنہی لوگوں کو نظر آتی ہیں جو بہت زیادہ صبر کرنے والے اور شکرگزار ہیں یعنی کامل الایمان ہیں ۔ حدیث میں آیا ہے ایمان کے دو حصے ہیں نصف حصہ صبر ہے اور نصف حصہ شکر ہے ۔ دوسری جگہ آیا ہے کہ ایمان خوف و اُمید کے درمیان ہے سب یہ وہ لوگ ہیں

وَاِذَا غَشِیَھُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کوتاہ نظر جن کے دماغ عافیت اور راحت کے وقت قدرت کی نشانیاں نہیں سمجھ سکتے اور اللہ کی ہمہ گیر طاقت کا احاطہ ان کو نظر نہیں آتا وہ مصیبت پڑنے پر خدا کی طرف دوڑتے ہیں ۔ اگر ان کی کشتی منجدھار میں پہنچ جائے اور سائبانوں (یا پہاڑوں یا اُٹھتے ہوئے بادلوں) کی طرح ۔

دریا کی کوئی معمولی لہر ان پر چھا جائے اور نجات کے تمام ظاہری راستے بند ہو جائیں اور غرق ہو جانے کا اُنکو یقین ہو جائے تو وہ تمام متروک پرستیاں بھول جاتے ہیں اور سچے دل اور خالص اطاعت کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں ۔ گویا قدرت ان کو مجبور کرکے اپنی ہمہ گیری اور کارسازی کا اقرار کراتی ہے ۔ اگرچہ اس طبقہ کا رجوع آخر میں خدا کی طرف ہوتا ہے ، مگر چونکہ نظر میں وہ بلندی نہیں ہوتی جو صابر شاکر مومن کی نظر میں ہوتی ہے ۔ مومن کا ایمان سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے بعد ہوتا ہے جو کسی دکھ سکھ میں زائل نہیں ہوتا اور اس گروہ کا ایمان اضطراری ہوتا ہے ، اسی لئے اضطراری حالت دور ہونے کے بعد پہلے کی طرح خلوص اور جذبۂ اطاعت باقی نہیں رہتا ۔

فَلَمَّا نَجّٰھُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ ط وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ ؁ بلکہ تباہی سے نکلنے اور نجات پاجانے کے بعد اس طبقہ کے دو حصے ہو جاتے ہیں ۔ ٹھوکر کھا کر دانش حاصل کرنے اور سبق لینے والے تو اللہ کی توحید پر قائم رہتے ہیں اور بدعہد ناشکرے آیاتِ قدرت کا انکار کرنے لگتے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے موجوں کی چڑھائی اور اتار معمولی چیزیں ہیں جن کا مدار سمندر کے مد و جزر پر ہے ۔ جہاز کا لہروں میں پھنس جانا اور پھر نکل آنا اتفاقی حادثہ ہے ۔ کوئی کہتا ہے بادِ مخالف کے مخالف کے چلنے سے ہمارا جہاز موجوں میں پھنس گیا تھا جب ہوا موافق چلی تو جہاز نکل آیا ۔ کوئی کہتا ہے جہاز کا کپتان بڑا ماہر تھا ۔ جہاز کو کیسا صاف بچا لیا ۔ غرض ساحلِ مراد پر پہنچ جانے کے بعد یہ بداندیش گروہ اپنی سابقہ حالت کو بھول جاتا ہے ، اور موجوں میں پھنس جانے کے وقت جو عہد و پیمان اللہ سے کئے تھے ان کو توڑ دیتا ہے ۔ سابق عہد کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے اور نعمتِ نجات کی ناشکری بھی ۔

مجاہد ، حسن اور قتادہ نے خَتَّار کے معنی غدار اور زید بن اسلم نے سخت عہد شکن لکھے ہیں ۔ (ابن کثیر)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ابوجہل کے بیٹے حضرت عکرمہؓ کے حق میں ہوا۔ جب حضور اقدس ﷺ نے مکہ فتح کیا تو عکرمہ بھاگ کر سمندر کے کنارے پہنچے تاکہ کسی جہاز میں سوار ہو کر کہیں سمندر کے پار چلے جائیں۔ جب جہاز میں سوار ہو کر چلے تو ہوا کا طوفان آیا۔ موجوں کا تلاطم برپا ہو گیا۔ جہاز تباہی میں پھنس گیا۔ لوگوں نے گھبرا کر اپنے اپنے معبودوں کو پکارنا شروع کیا۔ ناخدا نے کہا اس وقت ہمارے جہاز کو نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ خالص دل سے اللہ ہی کو پکارا جائے۔ اس قول کو سن کر عکرمہ کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور ایمان چمکنے لگا۔ دل میں کہنے لگے اگر سمندر میں خدا وحدہٗ لاشریک ہے تو خشکی میں بھی وہ یکتا و بے ہمتا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب اگر اللہ نے مجھے نجات دی تو فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مہربانی اور رحم فرمائیں گے۔ کچھ دیر کے بعد طوفان اتر گیا۔ جہاز کنارے لگا۔ عکرمہ اتر پڑے اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ اہل سعادت کی یہی شان ہے۔

مقصودِ بیان سماوی اور ارضی، اختیاری اور غیر اختیاری نشانہائے قدرت کو پیش کر کے توحید الوہیت کو ماننے کی دعوت۔ آیاتِ وصفی (عزت حکمت علم ارادہ قدرت وغیرہ) کے بعد آیاتِ فعلی (رات دن چاند سورج کشتی ہوا وغیرہ) کا بیان اور اس امر کی طرف اشارہ کہ آیاتِ فعلیہ سے آیاتِ وصفیہ پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ضمنی طور پر اس امر کی صراحت کہ گردشِ زمانہ اور ستاروں کی تاثیر کا ایک بے حقیقت چیز ہے۔ جب تک حکم الٰہی نہ ہو کوئی اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس بات کی وضاحت کہ آیاتِ قدرت کی حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے اندر روحانیت کارفرما ہو جن کے دلوں میں پختہ ایمان ہو یعنی جو دکھ کی بے حقیقت سمجھ کر اس پر صبر کرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کی حقیقت سمجھ کر شکر ادا کرنے والے ہوں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ صراحت ہے اس امر کی کہ پختہ ایمان صبر و شکر کا نام ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو راحت و تکلیف سے اپنی نظر اٹھا کر اللہ کی ذاتِ واحد کی کارفرمائیاں ہر چیز میں نہ دیکھے وہ کامل مومن نہیں ہو سکتا۔

اس بات کی صراحت کہ اچانک اٹل مصیبت پڑنے پر ہر انسان خواہ کسی عقیدہ اور کسی مل کا ہو یہاں تک کہ خدا کا منکر بھی خدا ہی کو پکارتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت فطری چیز ہے۔ اس کے خلاف تمام مشرک پردازیاں اور کفر طرازیاں سوسائٹی، ماحول، وراثت، تقلید اور رسمِ دنیا کے نتائج ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ

لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام نہیں آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ

عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ

کے کام آئے گا بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے تمہیں یہ دنیوی زندگانی دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے بارے میں تم کو

الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا

شیطان دھوکہ دے بلاشک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے وہی پانی برساتا ہے اور رحموں کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اس کو جانتا ہے اور کسی

تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ع ۴ / ۱۲

شخص کو نہیں معلوم کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کسی شخص کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا یقیناً اللہ دانا باخبر ہے۔

تفسیر (۱) تغیراتِ کبریٰ مجموعہ کائنات میں سے ہر جز اور ہر ذرہ کے مسلسل تغیر کا نام ہے۔ علم الحساب کا قاعدہ ہے کہ اکائی سے ان گنت اعداد بنتے ہیں۔ اقلیدس کا نظریہ ہے کہ چھوٹے زاویوں سے بڑے بڑے زاویے بنتے ہیں پہلے زاویہ حادہ ہوتا ہے پھر قائمہ پھر منفرجہ پھر انفراج کی کوئی حد نہیں رہتی ۔ اطباء خوب جانتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے متعدد عوارض بڑی بیماری کا پیش خیمہ ہوتے ہیں قطرہ قطرہ کے جمع ہونے سے سمندر اور ذرہ ذرہ کے اکٹھا ہونے سے ناپید اکنار ریگستان

نمودار ہوجاتے ہیں۔ نباتات کے ماہر واقف ہیں کہ ایک ایک ریشہ کو ملانے سے تناور درخت اور ایک ایک پتی کو جمع کرنے سے نظر فریب بہاریں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

(۲) یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تخم کے اندر وہ تمام پتیاں سارے ڈنٹھل کل ریشے اور پورے پھل پھول اجمالی صورت میں موجود ہوتے ہیں جو خاص مدت اور ضروری شرائط فراہم ہونے کے بعد تفصیل وار نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

(۳) فعل و انفعال، کسر و انکسار اور تاثیر و تاثر کی یہ ساری دنیا گہوارۂ تغیر ہے، ہر چیز متبدل ہے اور جزئی انقلاب ہے۔ اس کا ہر ذرہ ہر قطرہ ہر پتہ اور ہر ریشہ بربادی، تباہی اور بیگانگی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ جامد ہو یا نابت، بے حس ہو یا ذی شعور، خاموش ہو یا ناطق ہر چیز فساد اور خرابی کی دعوت دے رہی ہے۔ گویا ہمہ وقت ہر ہر نوع، ہر صنف، ہر طبقہ اور ہر شخص کے اندر قیامت صغریٰ بپا ہے۔ ہر ہوش مند اس سے واقف ہے۔ کوئی دانا اس سے انکار نہیں کرسکتا لیکن اس کے باوجود کوئی بھی ہر آن بپا ہونے والی قیامت صغریٰ کا خاص وقت مقرر مدت اور متعین آن نہیں بتا سکتا اور کس طرح بتا سکتا ہے جب کہ جانتا ہی نہیں ہے۔

انسانی دنیا دو قسم کے خمیر سے بنی ہے۔ اختیاری اور اضطراری، غیر ارادی۔ یعنی یوں کہو کہ کائنات انسانی میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو سطحی نظر رکھنے والا اپنے اختیار میں سمجھتا ہے اور بعض چیزوں کو اپنے اختیار کے حدود سے خارج جانتا ہے۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، لیٹنا، علوم و فنون کو حاصل کرنا، کمائی کرنا اور ہر قسم کے معاشی فرائض کو انجام دینا ان چیزوں کو کوتاہ نظر انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے، لیکن کیفیت تولید، شکم مادر کے اندر بچہ کا نر و مادہ ہونا پھر پیدائش کے بعد نیک بد، خوبصورت بدصورت، کالا گورا، فقیر امیر اور اسی طرح کے دوسرے احوال سے موصوف ہونا یہ تمام باتیں انسان کے اختیار سے خارج سمجھی جاتی ہیں۔

پھر پیدائش کے بعد بقائے حیات کے اسباب خصوصاً تمام اسباب کا اصل سبب یعنی پانی کس طرح بنتا ہے کیسے بنتا ہے، کہاں کہاں بنتا ہے اور پہنچتا ہے۔ گونا گوں نباتی اور حیوانی غذا کس طرح اور کہاں پیدا ہوتی ہے۔ یہ چیز بھی انسان کے دسترس سے باہر ہے۔

پھر مدت زندگی پوری کرنے کے بعد موت ضرور آتی ہے۔ موت کیا چیز ہے؟ کیسے آتی ہے کب آتی ہے اور کہاں آتی ہے؟ یہ بات آدمی کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ انسان کے اندر دو قسم کا خمیر ہے اختیاری اور غیر اختیاری۔ ان دونوں قسموں میں تاثیر تاثر اور کون و فساد کا لامتناہی سلسلہ قائم ہے۔ ہر آن تکمیل ہستی ہے تو شکستگی اس سے پہلے ہے۔ اگر کسی چیز کی تعمیر ہے تو تخریب اس سے سابق ہے۔ نیا رنگ نیا ڈھنگ پرانے رنگ پرانے ڈھنگ کے زائل ہونے کے بعد آتا ہے۔ پیدائش سے قبل شکم مادر کے اندر استقرار نطفہ اور گوناگوں تغیرات ہوتے ہیں۔ غذا کو جزو بدن بنانے میں ہزاروں انقلابات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آج کا دن اس وقت آتا ہے جب کل کا دن گزر گیا ہو۔ جمعہ گزر جائے تو سنیچر آئے گا۔ زندگی کا دور ختم ہوجائے تو موت آئے گی۔ غرض چھوٹی چھوٹی قیامتوں کا ایک طوفان بپا ہے اور انسانی دنیا ان سب کے لئے میدانِ ظہور۔ پس انسانی خمیر دعوت دے رہا ہے ایک عظیم الشان انقلاب کی جو تمام قیامتوں سے بڑا اور ہولناک ہوگا اور کائنات جسم کا جزوی تغیر پیش خیمہ ہے کل ساخت کے تغیر کا جس کا نام قیامت کبریٰ ہے۔

اور جس طرح تمام چھوٹی چھوٹی قیامتوں کے تین خصوصی احوال ہیں:۔ (۱) اختیار انسانی سے خارج ہونا۔ (۲) وقت کا غیر معلوم ہونا۔ (۳) اپنی جسمانی ساخت پر داخت میں مشغول ہوکر طبیعت انسانی کا ہر باہر کی چیز سے غافل ہوجانا۔ اسی طرح وہ قیامت کبریٰ جس کی حامل یہ صغریٰ قیامتیں ہیں تین خصوصی اوصاف رکھتی ہے۔ وہ انسان کے اختیار سے خارج ہے۔ اس کا مقررہ وقت معلوم نہیں۔ اس کے بپا ہونے کے وقت ہر انسان اپنی ساخت کی فکر میں اتنا غرق ہوگا کہ قریب ترین عزیزوں اور جگر پاروں کی بھی اس کو پرواہ نہ ہوگی۔

تحلیل اجزاء يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا ۚ آغاز سورت سے گزشتہ آیات تک مختلف طریقوں سے وحدانیت کو ثابت کرنے کے بعد اس آیت میں تقویٰ کا حکم دیا گیا۔

بات یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں متعدد کارفرما اور مالک ہوں تو تعین کے ساتھ کسی ایک کی ناراضگی کا اندیشہ اتنا قوی اور انتہا درجہ نہیں ہوتا جتنا اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ معاملہ ایک ہی کے ہاتھ میں ہو اور ایک ہی مالک متصرف اور فیصلہ کن ہو۔ پس جب خدا کی یکتائی ثابت ہوگئی اور یقین ہوگیا کہ خدا ایک ہی ہے تو اس کی ناراضگی سے ڈرنا عاقل کا فرض ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہی محسن اور مربی ہو۔

لیکن ناراضگی اور انتقام کا خوف بھی مختلف مدارج رکھتا ہے۔ اگر بادشاہ ایک ہی ہو اور یہ معلوم ہو کہ بادشاہ ہماری حرکات سے ناواقف ہے یا واقف ہے لیکن کبھی بازپرس نہ کرے گا اور حساب دہی کا کوئی وقت نہ آئے گا تو اس صورت میں اتنا خوف نہیں ہوتا جتنا بادشاہ کی حساب فہمی اور یوم المواخذہ کے یقین کی صورت

میں ہوتا ہے۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ ایک دن تمام مقررہ فرائض کی تکمیل انجام دہی اور قصور وار کا احتساب دینا ہوگا اور ثبوت قصور پر سزا بھگتنی پڑے گی تو ایسی حالت میں بادشاہ کا خوف بہت زیادہ قوی ہوتا ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں روزِ آخرت سے ڈرایا۔

لیکن باقتضائے بشریت خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کے سامنے بروزِ حساب کوئی شخص طاقت یا سفارش یا تدبیر وغیرہ سے کچھ مدد کر دے گا تو طبیعت میں اتنا اندیشہ نہیں رہتا جتنا اندیشہ اُس وقت ہوتا ہے جبکہ مددگار نہ ہونے کا یقین ہو پھر امداد و اعانت کے لئے دو آدمیوں سے زیادہ قابلِ وثوق کسی اور ہستی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ انسانی افراد کے اندر روابط مختلف ہیں۔ وطنیت کی ہمدردی، دوستی کی ہمدردی، برادری کی ہمدردی، زوجیت کی ہمدردی، ہم مذہب ہونے کی ہمدردی، کاروبار میں شرکت ہونے کی ہمدردی، ہم پیشہ ہونے کی ہمدردی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جو ہمدردی والد کو اولاد سے اور اولاد کو والدین سے ہوتی ہے وہ دوسرے طریقے سے معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کوئی مثال اس کے خلاف مل جائے، لیکن عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ پس جب یقین ہو جائے کہ بروزِ حساب و مواخذہ کے وقت والدین اپنی اولاد کے اور اولاد اپنے ماں باپ کے کام نہیں آ سکتی اور کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تو ایسی حالت میں انتقام کا خوف قوی تر ہو جانا بدیہی امر ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں فرمایا کہ لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور روزِ مواخذہ کا خوف کرو۔ جبکہ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ یہاں تک والدین اولاد کی اور اولاد والدین کی بھی کچھ مدد نہ کر سکیں گی۔ ماں کو اولاد سے اگرچہ محبت زیادہ ہوتی ہے، لیکن وہ اپنی خلقی کمزوری کے سبب اتنی مدد نہیں کر سکتی جتنی مدد باپ اپنے اعضاء کی قوت کے سبب کر سکتا ہے۔ اسی لئے آیت میں صرف والد کا تذکرہ فرمایا اور ممکن ہے والد سے مراد باپ اور ماں دونوں ہوں۔

ایک نکتہ بعض باتیں ایسی ہیں کہ باپ بیٹے کی طرف سے برداشت کر لیتا ہے اور بیٹا اپنے باپ کی طرف سے برداشت نہیں کرتا۔ مثلاً بیٹے کو مال کی ضرورت ہو اور وہ قرض دار ہو تو باپ اس کی امداد کرتا ہے بیٹا بیمار ہو تو باپ کی طبیعت پر جو کیفیت ہوتی ہے وہ بیٹے کے دل پر باپ کی بیماری کی صورت میں نہیں ہوتی۔ باپ بیٹے کا قرض اپنی ذات پر لینا گویا اپنے ذمہ سمجھتا ہے، لیکن بیٹا ایسا نہیں کر سکتا، مگر اس کے ساتھ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں کہ بیٹا اپنے باپ کی طرف سے برداشت کر سکتا ہے، مگر باپ اپنے بیٹے کی طرف سے نہیں اٹھا سکتا۔ مثلاً ماں باپ کی سخت کلامی اور توہین آمیز الفاظ بیٹا اٹھا سکتا ہے، مگر باپ ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی باپ کی قلت ہو رہی ہو تو بیٹا اس ذلت کو اٹھانے کو تیار ہو جاتا ہے، مگر باپ بیٹے کی ذلت اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ اگر کسی باپ کو کھینچ کر پولیس یا عدالت میں کوئی لے جائے تو بیٹا چاہتا ہے کہ اُس کا باپ اس ذلت سے چھوٹ جائے اور وہ خود باپ کی جگہ چلا جائے، لیکن اس کے خلاف بیٹے کی بجائے باپ اپنی ذات کو پیش نہیں کر سکتا۔

پس آیتِ مذکورہ میں دونوں طرح کی مدد کی نفی فرما دی۔ نہ قیامت کے دن اُس طرح کی مدد ممکن ہو گی جس طرح باپ اپنے بیٹے کی کرتا ہے نہ وہ اعانت میسر ہو گی جو بیٹا اپنے باپ کی کرتا ہے۔ (کبیر)

ایک مزید نکتہ اسم صفت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جبکہ کوئی شخص کسی فعل کا عادی ہو یا پیشہ رکھتا ہو۔ مثلاً زید خیاط ہے۔ یہ جملہ اس وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ زید سینے کا عادی ہو یا خیاطت اُس کا پیشہ ہو اور فعل کا استعمال اس وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ غیر عادی طور پر کوئی فعل کسی سے سرزد ہو جائے۔ مثلاً بادشاہ نے کسی کا کپڑا سیا۔ یہ جملے اُس وقت بولے جاتے ہیں جبکہ بادشاہ سینے کا عادی نہ ہو اور اتفاقاً کپڑا سی لے۔

آیتِ مذکورہ میں بیٹے کے ساتھ اسم صفت (جَازٍ) اور باپ کے ساتھ فعل (لَا یَجْزِیْ) کا استعمال اسی نکتہ کے تحت کیا گیا ہے۔ باپ تو بیٹے کی امداد کا عادی ہوتا ہی ہے بیٹے کی مدد کرنی اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ البتہ بیٹا باپ کی مدد کرنے کا عادی نہیں ہوتا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے دن ہر قسم کی مدد طلبی ناممکن ہو گی۔ نہ تو عادی مدد کرنے والا مدد کر سکے گا نہ غیر عادی طور پر کوئی کسی کا معاون ہو گا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔ وعدۂ الٰہی سے مراد یا تو وقوعِ قیامت ہے یا قیامت کے دن کسی کا بار اپنے اوپر نہ اٹھا سکنا مراد ہے۔ کیونکہ دوسری آیت میں صراحت کر دی گئی ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ یا دونوں مراد ہیں۔ یعنی ایسے دن کا آنا حق ہے جس میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور کوئی کسی کا بار اپنے اوپر نہ اٹھا سکے گا۔ بخاری اور مسلم میں آیا ہے کہ ایک روز حضور گرامی نے فرمایا اے قریشی اپنی نجات کی تلاش کرو۔ میں تمہارے کچھ کام نہ آؤں گا۔ اے اولادِ عبد مناف میں تمہارے کچھ کام نہ آؤں گا۔ اے صفیہ محمدؐ کی پھپھی میں تیرے کام بھی نہ آؤں گا۔ اے فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی مجھ سے جو مال چاہے لے لے اللہ کے معاملے میں تیرے کچھ کام نہ آؤں گا۔ یعنی اعمال و ایمان کو چھوڑ کر یہ بھروسہ نہ کر بیٹھو کہ ہم پیغمبر کے اقارب ہیں جیسا کہ عیسائیوں نے مسیح کے کفارہ ہونے پر بھروسہ کر کے اعمالِ صالحہ کو لغو قرار دے دیا۔ گویا ہر قسم کی بدکاری کا دروازہ کھول دیا۔

ایک شبہ کا ازالہ

آیتِ مذکورہ سے بعض لوگوں کو انکارِ شفاعت کرنے کا موقع ملتا ہے اور حدیثِ مذکورہ کی تائید تو مزید سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے لیکن یہ اُن کے فہم کی غلطی ہے۔ آیت اور حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کوئی کسی کی سفارش نہ کر سکے گا۔ اولیاء، انبیاء، ملائکہ اور علماء کی سفارش تو بشرطِ اجازت حق ہے۔ آیت میں وارد ہے لَا یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ بعض دوسری آیات میں بھی شفاعت کی صراحت کی گئی ہے۔ اگرچہ مشروط باجازت ہے اور صحاح میں جو حدیثِ شفاعت آئی ہے وہ تو محدثین کے نزدیک ناقابلِ انکار ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت اور حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ کوئی کسی کا بار اپنے اوپر نہ لے سکے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ زید کسی کے گناہ کا وبال اپنے اوپر اس طرح لے لے کہ اس کو آزاد کرا دے۔ اہلِ علم نے مختلف طور پر تاویلیں کی ہیں، لیکن سب سے مختصر قابلِ قبول اور واضح جواب یہی ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کا بھی یہی مطلب اہلِ تفسیر نے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَا یَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ۔ جب آیتِ مذکورہ میں صراحت کر دی گئی کہ قیامت کے دن کچھ اور کسی کے کوئی کام نہ آئے گا تو اس صورت میں آخرت سے غافل ہو جانا اور عاقبت کو برباد کر کے دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کرنی حماقت ہے۔ دنیا میں دو طرح کے آدمی ہیں ایک وہ جن کے پیشِ نظر آخرت کا خیال ہی نہیں ہے اُن کا مطمحِ نظر صرف دنیا ہے، یہاں کا عیش و آرام اور بس۔ یہ گروہ بھی فریب خوردہ ہے اس کو فریب دینے والی اس کی دنیوی حیات ہے۔ آخرت کا تو یہ قائل ہی نہیں یا قائل ہے، مگر اتنا غافل ہے کہ کبھی آخرت کا خیال ہی نہیں کرتا۔ اس حیاتِ فانی پر ریجھا ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو حیاتِ آخرت کا قائل ہے اور اس کو سدھارنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے، مگر اس کا نفسِ امارہ یا کوئی شیطان اس کو بہکاتا ہے اور کہتا ہے، ابھی مرنے کے لئے بہت زمانہ پڑا ہے۔ تندرستی ہے، جوانی ہے، اعضاء میں قوت ہے۔ مرنے سے کچھ مدت پہلے توبہ کر لینا۔ اس طرح آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے گی اور دنیا میں بھی دادِ عیش دینے کا موقع ملے گا۔ یا کوئی گمراہ کرنے والا اس کو اس طرح گمراہ کرتا ہے کہ دنیوی عیش و راحت حرام نہیں۔ دینِ اسلام زندگی کو تنگ بنانے کے لئے نہیں آیا۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ دولت میری جلتی ہے میں جو چاہے کروں۔ دوسرا کون بولنے والا، کیوں دخل دے، خود کیوں نہ اٹھاؤں۔ بعض لوگوں کے سامنے شر کو خیر کا اور باطل کو حق کا جامہ پہنا کر شیطان لا کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ گروہ بھی فریب خوردہ ہے۔ آیتِ مذکورہ میں دونوں طرح کے فریب خوردہ ہونے سے باز داشت فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ حیاتِ دنیا بھی تم کو فریب خوردہ نہ بنائے نہ کوئی اور دھوکہ دینے والا اللہ کے معاملہ میں تم کو دھوکہ دے کیونکہ وعدۂ الٰہیہ حق ہے۔ اللہ کے معاملے میں فریب خوردہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں اپنی سرداری اور دولتمندی اور اولاد کی فراوانی دیکھ کر یہ خیال کرنا چاہئے کہ آخرت میں بھی خدا یہ سب کچھ تم کو ضرور دے گا۔ خواہ تمہارے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں یا جس طرح تمہارے اعزاء، اقارب سفارش کر کے یہاں چھڑا لیتے ہیں وہاں بھی چھڑا لیں گے۔ یا بزرگوں کی قربانیوں سے تمہارے گناہ ساقط ہو جائیں گے یا تمہارے معبود اللہ کے گھر کے مختار ہیں تم کو آخرت میں بچا لیں گے۔

ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ضحاک کے نزدیک غرور سے مراد شیطان ہے۔ لیکن اس روایت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ شیطان جن مراد ہے یا شیطانِ انس۔ کیونکہ بہکانے والے دونوں ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ شیطان اور نفسِ امارہ دونوں کو لفظِ غرور کے تحت میں داخل کر لیا جائے۔

ابن ابی حاتم نے بروایت وہب بن منبہ باسنادِ حسن حضرت عزیز کا قول نقل کیا ہے۔ جس کی تائید توریت سے بھی ہوتی ہے کہ جب فرشتے سے عزیز نے دریافت کیا کہ کیا صالحین کی روحیں یا ماں باپ کی روحیں اپنی اولاد کے واسطے سفارش کر سکیں گی؟ تو فرشتہ نے جواب دیا قیامت کے دن سلطانِ حق کا ظہور ہوگا۔ فیصلہ حق ہوگا بغیر اجازت کوئی نہ بول سکے گا۔ نہ اولاد کی طرف سے نہ باپ کو بطور عوض لیا جائے گا نہ باپ کی طرف سے اولاد کو نہ بھائی کی طرف سے بھائی کو نہ آقا کی طرف سے غلام کو نہ کوئی کسی سے رنج کر سکے گا نہ کوئی کسی پر شفقت کر سکے گا بلکہ ہر شخص کو اپنا ہی ڈر ہوگا اور ہر شخص اپنے ہی گناہ کا بار اٹھائے گا۔ کسی دوسرے کے گناہوں کا بار نہ اٹھائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الخ۔ اوپر کی آیت میں وقوعِ قیامت کی صراحت کی گئی تھی اور صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔ اس صراحت پر خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ آخر قیامت کب ہوگی۔ بات یہ ہے کہ جو چیز گزشتہ زمانہ میں نہ ہوئی ہو اور اس کا تصور بھی صحیح طور پر دماغ میں نہ آ سکے اور اس کی آمد یہ زالی حیرت آفرین ہو تو کسی طرح یقین نہیں آ سکتا کہ یہ چیز کبھی عالمِ ظہور میں آئے گی۔ مثلاً ریل، ہوائی جہاز، لاسلکی ریڈیو وغیرہ کے ظاہر ہونے سے پہلے کسی کو ان کے موجود ہو جانے کا یقین بھی نہ تھا۔ یا اب اگر کوئی کہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ پورا کوہ ہمالیہ یکدم اٹھا کر ایک ہوائی تخت پر رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے گا، تو کون اس بات کی تصدیق کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ یہ ہی سبب تھا کہ باوجود مختلف صراحتوں اور دلائل کے کفار کو وقوعِ قیامت کا یقین نہ ہوتا تھا اور یقین نہ ہونے کے دو سبب تھے۔ اوّل تو قیامت کی طرح اس وقت تک کوئی دن نہ آیا تھا۔ انہوں میں قیامت کی کوئی نظیر نہ ملتی۔ دوسرے قیامت کا حیرت آفریں کیفیات

کو حاصل ہونا اور ایسے نادر احوال کے رونما ہونے کا دعویٰ کرنا جن کو سمجھنا انسان کے ذہنی احاطہ سے خارج ہے بجائے خود موجب انکار تھا۔ پھر آئندہ اس کا وقت بھی مقرر نہ تھا تو پھر ایسی مجہول المیعاد غیر المعقول بعید از فہم چیز کو مان لینا کفار کے لئے کس طرح جائز ہو سکتا تھا۔

اسی خیال کو دور کرنے کے لئے آخر سورت تک اس آیت کا نزول ہوا اور انکار کی بنا جن دو اسباب پر تھی انھیں کی بیخ کنی فرمادی اور مدلل طریقہ سے فرمادی۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا علم، صحیح تعین اور صحیح مفصل کیفیت کے ساتھ تو اللہ ہی کو ہے۔ اس کے سوا حقیقت، قیامت اور اس کے مقررہ وقت وقوع سے کوئی واقف نہیں، لیکن اس سے اُس کے ناممکن الوقوع ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے۔ عقلمند کا قاعدہ ہے کہ نظیر سے نظیر پر اور ایک مثل سے دوسری مثل پر (بشرطیکہ وجہ جامع موجود ہو) قیاس کرتا ہے۔ پس قیامت اگرچہ ابھی تک نہیں آئی، لیکن قیامت کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ چیزیں روزمرہ رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کی حیرت آفرینی اور اعجوبہ زائی کسی طرح قیامت سے کم نہیں۔ چونکہ وہ بدیہی طور پہ ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں، اس لئے ان کے وجود میں کوئی شک نہیں کرتا پھر قیامت کے وقوع میں شک کرنے کے کیا معنی۔ کیوں قیامت کے وقوع کو اُن چیزوں کے ظہور پر کیوں قیاس نہیں کر لیا جاتا۔ وجہ جامع تو موجود ہے۔ حیرت آفرینی میں اشتراک ہے۔ قدرتِ نادرہ کی دونوں جگہ ضرورت ہے۔ ان چیزوں کو پیدا کرنے والے کا محیط العلم ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح حشر بپا کرنے والے کا واقف العلم ہونا لازم ہے۔ ان چیزوں کے وقوع اور ظہور کا بھی وقت معلوم نہیں۔ باوجودیکہ روزانہ ان کا وقوع ہوتا رہتا ہے، لیکن وقوع سے پہلے سوا علامات کے کوئی بھی صحیح مقررہ وقت وقوع اور کیفیتِ وقوع سے واقف نہیں۔ پھر قیامت کی اعجوبہ نمائی اور وقت کی عدم تعیین کیوں یقین سے مانع ہوتی ہے۔

مثلاً: وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ۔ اللہ باران رحمت نازل فرماتا ہے (جس سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے)۔ سمندروں سے بخارات کا اٹھانا اور پھر ان کا ابر بنانا پھر ابر کو تحلیل کر کے پانی کے قطروں کی شکل میں برسانا پھر اس سے زمین کو سرسبز کر دینا کیسے عظیم الشان آثار قدرت ہیں اور یہ تغیرات، انقلابات اور رنگا رنگی کیفیات حیرت آفرینی اور اعجوبہ زائی میں وقوعِ قیامت سے کم نہیں۔ کروڑوں من پانی برسات کے موسم میں سمندر سے اٹھتا اور خشکی میں برستا ہے اور اسپ دراب قطروں کی شکل میں نیچے اترتا ہے، لیکن کوئی سائنس داں اور طبیعیات کا ماہر اور ستاروں کی رفتار کا واقف اور سمندر کے احوال کا عالم یقینی طور پر نہیں جانتا کہ سمندر سے مانسون کب اٹھیں گے اور اٹھیں گے تو ان کی رفتار کا رُخ کدھر کو ہوگا اور ان سے پانی برسے گا یا نہیں اور برسے گا تو کتنا برسے گا اُس کی کیا مقدار ہوگی اور کیا وزن ہوگا اور کس بستی، کس گاؤں، کس زمین، کس مکان، کس جمعیت اور کتنے حصۂ زمین پر برسے گا۔ اگرچہ بعض لوگوں کو تجربہ، قیافہ اور الہام وغیرہ کی علامت سے محل وقوع اور جائے نزول کا علم ہو جاتا ہے۔ مانسون کا رُخ دیکھ کر سمت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے سے بارش کی آمد کی خوشخبری بھی مل جاتی ہے، لیکن پھر بھی صحیح علم حاصل نہیں ہوتا۔ پانی کی مقدار اور سیکنڈ منٹ سے وقت کی تعیین اور حصۂ زمین سے رقبت کی حد بندی اس سے کوئی اللہ کے سوا واقف نہیں۔ لاعلمی کے باوجود بارش ہونے پر نہ کسی کو تعجب ہوتا ہے نہ کسی کو انکار کی مجال۔ مثلاً:۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ۔ عورت اور مادہ جانور کے رحم کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اس کو سوا اللہ کے اور کوئی یقینی طور پر نہیں جانتا۔ کبھی طبیب اور ڈاکٹر اپنے تجربہ، علم اور قیاس سے کام لے کر حمل کو حامل کہتے ہیں، لیکن حمل نہیں ہوتا اور حمل بھی ہوتا ہے تو نر و مادہ کی شناخت نہیں ہوتی اور آلۂ عکس ریز سے اگر کبھی نر و مادہ کی شناخت بھی ہو جاتی ہے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گورا ہے یا کالا، خوبصورت ہے یا بدصورت، قوی ہے یا کمزور اور اگر کبھی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظاہری اور باطنی حواس درست ہیں یا ماؤف، عالم ہوگا یا جاہل، نیک ہوگا یا بد وغیرہ۔ بہرحال ولادت سے پہلے اول تو کچھ علم ہی نہیں ہوتا اور اگر کچھ معلوم بھی ہو جائے تو وہ علم تخمینی اور قیاسی ہوتا ہے۔ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا بلکہ بعض احوال تو قطعاً پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ سعادت و شقاوت، مدت وحیات اور مقدار رزق وغیرہ قطعاً ناممکن العلم امور ہیں۔ سیکنڈ اور منٹ کی تعیین کر کے وقتِ ولادت بھی کوئی نہیں بتا سکتا۔ پس حمل کا استقرار، اس کی ترقی اور تربیت پھر جاندار اور ہوشمند بنا کر وقتِ خاص پر اس کی پیدائش کرنی یہ بھی ایسے غیر المعقول افعال ہیں، جو حیرت آفرینی میں وقوع قیامت سے کم نہیں اور خلاق کی قدرت کاملہ کا اسی طرح اظہار کر رہے ہیں جس طرح انسان کی بعثت ثانیہ۔ یا مثلاً:۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا۔ کسی کو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ کل کو وہ کیا کرے گا، اس کی کیا حالت ہوگی، بیمار ہوگا یا تندرست۔ مستقبل بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، خوشی اور غم، دکھ اور سکھ، طاعت اور معصیت، فارغ البالی اور تنگ حالی غرض تمام حالات، حرکات سکنات یہاں تک کہ زندگی اور موت بھی پوشیدہ ہے۔ سوا تخمین اور قیاس کے صحیح طور پر کسی کو علم نہیں اور تخمین بھی جزئی کیفیات کو نہیں بتاتا، لیکن اس کے باوجود منکر

احوال سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ مختلف احوال کن اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اسباب کیسے پیدا ہوتے ہیں ، ان کا اصل مبدا اور منشا کیا ہوتا ہے ۔ پھر ظہور اسباب و احوال کا مقرر وقت کون سا ہوتا ہے ۔ ان باتوں میں سے کوئی بھی بات قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں ۔ مقام غور ہے کہ معاش اور کوائف زندگی کی نیرنگیاں قطعی ہیں ، لیکن انسان ان سے ناواقف ہے تو جب معاش کا قطعی علم نہیں اور اس زندگی کے آنے والے احوال مجہول ہیں ، لیکن اس کے باوجود کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ تو پھر اخروی زندگی اور ۔ و جزا کا انکار کیا معنی رکھتا ہے ۔ یا مثلاً :

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ کسی آدمی کو معلوم نہیں کہ کس ملک کس دیس کس شہر کس بستی اور کس خطۂ زمین میں وہ مرے گا ۔ موت اسباب موت محل موت اور کوائف موت سب کچھ پوشیدہ ہیں ، لیکن موت کا وقوع یقینی ہے ۔ موت کے مختلف کوائف مقام اور اسباب کا تحقق بھی لازم ہے اور اس سے قدرت کی ہمہ گیری بھی ثابت ہوتی ہے ۔ پس کیا ان چیزوں کے اوقات کا نہ معلوم ہونا ان کے وقوع کو غیر یقینی یا قابل انکار بنا سکتا ہے ۔ ایسا کوئی ہوشمند نہیں کر سکتا ۔ پیدائش زندگی ، اسباب زندگی اور موت یہ تمام امور پوشیدہ ہیں ، لیکن ہوتے ضرور ہیں بالکل اسی طرح قیامت کا وقوع بھی یقینی ہے ۔ اگرچہ اس کا مقرر وقت معلوم نہیں ۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ بلا شبہ اللہ کو ان تمام باتوں کا صحیح علم ہے ۔ وہ ہر شی اور اس کی چگونگی سے باخبر ہے ۔ علیم سے مراد ہے عالم مطلق ہونا اور خبیر سے مراد ہے ہر چیز کے باطن سے واقف ہونا یعنی اللہ کے علم سے کوئی چیز خارج نہیں ۔ وہ اشیا کے اندرونی احوال سے بھی باخبر ہے ۔

ایک ضروری نکتہ

آیت مذکورہ میں جن پانچ چیزوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بالکل واضح ہیں ۔ چار امور کو پیش کر کے پانچویں امر کو ثابت کرنا مقصود ہے ۔ پیدائش بقائے حیات کا سبب (یعنی بارش) اور موت یہ چاروں امور بالکل بدیہی ہیں ، لیکن انسان ان سب سے ناواقف ہے ، مگر اس کی ناواقفیت انکار کو جائز قرار نہیں دے سکتی ۔ ان چاروں باتوں سے قادر کی قدرت کاملہ ، علم محیط ، ارادہ مطلقہ اور حکمت عامہ کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ پس اسی طرح قیامت کا وقوع بھی قدرت کاملہ ، ارادہ مطلقہ اور علم محیط کے زیر اثر اور حکمت تامہ کے تحت ہوگا ۔ کسی کو اگر قیامت کا مقرر وقت یا حقیقی کیفیت معلوم نہیں تو اس سے اللہ کی قدرت ، حکمت ، ارادہ ، علم میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی نہ قیامت بپا ہونے کا انکار کیا جا سکتا ہے ۔

یوں تو اللہ کا علم بے پایاں ہے اور تمام مخلوق کا علم اس کے مقابلے میں ہیچ ہے اور ان گنت اسرار قدرت ایسے ہیں جن کا علم کائنات میں سے کسی کو بھی نہیں ۔ طوفان نوح کے وقت جو ذرہ تحت الثریٰ میں موجود تھا ۔ اس سے آئندہ کیا کچھ اور کس طرح بننے والا تھا ۔ اس کو سوا اللہ کے کون جانے ۔ آسمانوں کے ستاروں کی تعداد ہر ستارہ کی شعاعوں کا حساب ، جانوروں اور انسانوں کے بالوں کا شمار ، درختوں کے پتوں ، پھولوں ، کانٹوں اور بیجوں کا احاطہ پھر ہر کلی کے اندر تخم کی تفصیل اور ہر تخم سے کتنے درخت کس کیفیت ، کس خاصیت اور کس چگونگی کے پیدا ہوتے رہیں گے اور کب تک اور کس زمین میں اور کتنے بڑے ہوتے رہیں گے ۔ یہ تمام امور اسرار حکمت ہیں ، رموز قدرت ہیں ، خزائن غیب ہیں ، ذخائر علم ہیں کسی کو ان کا قطعی یقینی محکم نا قابل شک علم نہیں ۔ اللہ ہی ان سب باتوں سے واقف ہے ۔ انبیاء ، اولیاء ، اور دانشمند حکماء کو خدا تعالیٰ نے وحی ، الہام اور عقل کے ذریعہ سے جو کچھ عطا فرمایا ہے وہ اگرچہ یقینی ہے ، مگر ناقص ہے کسی چیز کا کامل علم تو سوا رب العالمین کے کسی کو بھی نہیں ۔ اس تقریر سے دو شبہات حل ہو گئے ۔ پہلا شبہ اس طرح کیا جا سکتا تھا کہ آیت میں جن امور کا تذکرہ ہے کیا انہیں سے مخلوق ناواقف ہے اور تمام امور سے واقف ہے اور کیا خدا کے پاس خزائن غیب یہی پانچ امور ہیں باقی اسرار قدرت ظاہر کر دیئے گئے ہیں ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان پانچ کو خاص طور پر کیوں ذکر کیا گیا ۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ چونکہ انسان کے تصرفات اور احوال سے انہیں چیزوں کا تعلق ہے ۔ پیدائش ، موت ، افعال زندگی ، بقائے زندگی کا سبب یہ ہی امور انسان کے سامنے ہیں ، اس لئے انہیں کو بیان کر دیا اور بتا دیا کہ جب سامنے کی چیزوں کا صحیح علم بھی سوا خدا کے کسی کو نہیں ۔ باوجودیکہ ان چیزوں کا تحقق نا قابل انکار ہے تو پھر قیامت نا قابل انکار ہے تو پھر قیامت کے خاص وقت کی جستجو اور اس کا انکار محض بے بنیاد ہے ۔

دوسرا شبہ اس طرح کیا جا سکتا تھا کہ بعض انبیاء اور اولیا کو اپنی موت کا وقت اور دفن کا مقام بلکہ دوسروں کے مرنے کے مقامات اور ان کے مرنے کے اوقات معلوم ہو جاتے ہیں ۔ حضور اقدس ﷺ نے جنگ بدر میں ایک دن پہلے مرنے والے کافروں کے نام اور ان کے مقام قتل کی تصریح فرما دی تھی (کما فی الصحیح) علامات قیامت کو بھی کھول کر بیان فرمایا تھا ۔ بعض آنے والے واقعات کی صحیح خبر دی تھی ، انتقال نجاشی اور قتل پرویز کی خبر بھی اسی صنف میں سے تھی ۔ شیخ ابوالغریب اصفہانی شیراز میں بیمار ہو گئے ۔ لوگوں نے کفن کا انتظام کیا ۔ شیخ نے کہا اگر میں یہاں مر جاؤں تو مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرنا ۔ کیونکہ میں نے اپنے رب سے درخواست کی تھی کہ طرطوس میں مروں ۔ چنانچہ شیراز میں شیخ کا انتقال نہ ہوا بلکہ طرطوس میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے (عرائس) شعرانی نے لواقح الانوار میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے ۔ گویا

شیخ کو اپنے مرنے کا مقام پہلے سے معلوم ہوگیا اور لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے انہوں نے مذکورہ بالا صحت الفاظ کہے تھے۔ شیخ یوسف بن الحسین نے کہا تھا مجھے معلوم ہے کہ میں کب مروں گا اور کس خاندان کی عورت سے نکاح کریں گے پھر بارش ہونے کا علم تو کسی کشف پر موقوف ہی نہیں ہے۔ بہت سے ماہرین سائنس کو مانسون کی رفتار اور فضا کی کیفیت سے اس کا علم ہو جاتا ہے بلکہ بعض دیہاتی جاہل تو ہوا کی خنکی محسوس کر کے اس کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذکورہ امور کو خزانۂ غیب کہنا کس طرح صحیح ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ (۱) جو الہام اور کشف سے، فنی مہارت سے ہو یا تجربہ اور مشاہدہ سے پوری کیفیت کسی چیز کی کسی کو معلوم نہیں۔ ہر چیز کے احوال اور کیفیات لامحدود ہیں۔ اور تمام احوال کا احاطہ ناممکن ہے مثلاً قیامت کے احوال حضورؐ کو معلوم تھے، علامات معلوم تھے، لیکن وقت کی تعیین مجہول تھی۔ آئندہ واقعات کی خبر علم پر ضرور دلالت کر رہی ہے، لیکن علم محیط اور کمال واقفیت پر دلالت نہیں کرتی۔ بارش کا قبل از وقت علم الہامی یا ظنی ہو سکتا ہے، لیکن قطرات کی تعداد وقت نزول کی تعیین، محل نزول اور کیفیت نزول کا علم محیط نہ کسی نبی کو ہوتا ہے نہ ولی کو نہ سائنس کے ماہر کو۔ کہاں سے بخارات اٹھے، ان کے اندر مائی اجزا کتنے ہیں اور ہوائی کتنے ہیں۔ کس بستی، کس کھیت اور کس خطۂ زمین پر پانی کا نزول ہوگا۔ کون سا درخت اور جانور اس سے سیراب ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور مجہول ناقابل علم ہیں ان کو اللہ ہی جانتا ہے اور بس باقی ہوس۔

تنقیح مبحث

حضرت بریدہ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا پانچ باتوں کو اللہ کے کوئی نہیں جانتا پھر حضورؐ نے آیت اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الخ تلاوت فرمائی۔ (رواہ احمد باسناد صحیح)

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں حضور کا فرمان ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جن سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں پھر یہی آیت حضور نے پڑھی (رواہ البخاری باسنادہ واحمد باسانید) حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے ایک روز حضور بالکل سامنے تشریف فرما تھے۔ ایک شخص جلسہ میں حاضر ہوا (جو بہت اچھا، سفید خوبصورت کپڑے پہنے تھا اس کے بال سفید تھے، سفر کا کوئی نشان بھی غبار وغیرہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ (کما فی حدیث ابن عمر) اور عرض کیا یا رسول اللہ اسلام کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ مُحَمَّدٌ عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ کی شہادت دینی۔ نماز ٹھیک ادا کرنی۔ فرض زکوٰۃ دینی۔ رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا سائل نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔ پھر بولا یا رسول اللہ ایمان کیا ہے؟ فرمایا اس کے ملائکہ کو، اس کی کتابوں کو اس کے پیغمبروں کو اور قیامت بپا ہونے کو دل سے ماننا۔ (بعث حشر جنت دوزخ حساب میزان اور تقدیر کو بھی ماننا) (رواہ احمد عن ابن عباس) اس نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں (مسلم صحیح) پھر بولا یا رسول اللہ! احسان کیا ہے؟ فرمایا اللہ کی عبادت اس طرح کرنی کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو یا (کم از کم اس طرح عبادت کرنی کہ) وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ سائل نے پوچھا یا رسول اللہؐ! قیامت کب ہوگی؟ فرمایا جس سے سوال کیا جا رہا ہے (وہ اس بات کو) سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں تم سے اس کی علامتیں بیان کرتا ہوں۔ لونڈی جب اپنی مالکہ کی ماں ہو تو یہ قیامت کی علامت ہے۔ جب تم دیکھو کہ برہنہ پا برہنہ بدن آدمی لوگوں کے سردار بنے بیٹھے ہیں تو یہ بھی اس کی علامت ہے۔ قیامت منجملہ اُن پانچ امور کے ہے۔ جن کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تم کو تمہارے دین کی تعلیم دینے آئے تھے (بخاری و مسلم) بعض روایات میں ہے کچھ بیشی ہے یا الفاظ کا تغیر ہے، مگر قیامت اور پانچ غیبی امور میں جن سے سوا خدا کے کوئی واقف نہیں۔ داخل کرنے کا تذکرہ سب میں ہے بلکہ بعض روایات میں) تو یہ بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے آیت عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ بھی تلاوت فرمائی۔

ان روایات میں سے کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مخلوق مذکورۂ بالا پانچ امور سے بالکل جاہل ہے کیونکہ یہ بات بداہت کے خلاف ہے بلکہ مطلب سب روایتوں کا یہی ہے کہ صحیح کامل علم ان چیزوں کا سوا خدا کے کسی کو نہیں۔ علامات جاننا، قرائن سے کچھ معلوم کرنا علم یقینی نہیں کہا جاتا نہ یہ کمال علمی ہے۔ پس اس جواب سے واضح ہو گیا کہ اگرچہ تمام کائنات کے داخلی اسرار اور باطنی رموز سے سوا خدا کے کوئی بھی واقف نہیں، لیکن انسان کا واسطہ مذکورۂ بالا چار چیزوں سے ہی پڑتا ہے۔ دوسری علمی حقائق کا انکشاف تو خاص خاص آدمیوں کا کام ہے جو زیادہ مفید بھی نہیں ہے۔ زندگی میں کام آنے والے علوم یہی چار ہیں۔ بیوی کو حمل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو انسان یہ جان لینے کے لئے بیتاب ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ خوبصورت ہے یا بدصورت۔ طاقتور ہے یا کمزور۔ نیک ہوگا یا بد۔ آئندہ زندگی میں یہ مالدار اور صاحب عزت ہوگا یا مفلس ذلیل۔ حاکم وقت ہوگا یا غلام وغیرہ۔

بقائے حیات کے اسباب کی جستجو بھی انسان کو لگی رہتی ہے۔ ابر آئے گا یا نہ آئے گا۔ آ گیا تو بارش ہوگی یا نہ ہوگی۔ ہوگی تو کہاں ہوگی کتنی ہوگی، فائدہ بخش ہوگی یا ضرر رساں۔ کھیتیاں اور درخت اس سے کتنا فائدہ حاصل کریں گے۔ میرے جانوروں کو چارہ گھاس میسر ہوگا یا نہ ہوگا۔ مجھے کھانے کو غلہ، سبزی، میوہ

گوشت، دودھ، دہی، مکھن، پنیر، گھی وغیرہ ملے گا یا نہ ملے گا۔
تیسرے نمبر پر انسان کو آئندہ کمائی کی تلاش ہوتی ہے۔ اپنے افعال و اعمال کا خیال ہوتا ہے۔ صحت و مرض کی فکر ہوتی ہے۔ کل کو پرسوں کو اس ماہ میں اگلے ماہ، اس سال آئندہ سال میری آمدنی کتنی ہوگی، کس طرح ہوگی، خرچ کیا ہوگا، کیسے ہوگا کہیں بیمار تو نہ ہو جاؤں گا، صحت تو قائم رہے گی۔ عیش و آرام ملے گا یا تکلیفیں تو نہ اٹھانی پڑیں گی وغیرہ۔
چوتھے درجہ میں موت کا خیال آتا ہے۔ میں کب مروں گا۔ کتنی مدت باقی ہے۔ کہاں مروں گا۔ کہیں ناگہانی یا زہریلے مرض سے تو بری موت واقع نہ ہو جائے گی۔ یا دوستوں اور عزیزوں سے دور غریب الوطنی کی حالت میں تو نہ مر جاؤں گا۔ کفن دفن کا انتظام ٹھیک ہوگا یا لاش کو کتے کھا ئیں گے وغیرہ۔
پس جب ان چار چیزوں کا علم کامل سوائے خدا کے کسی کو نہیں باوجودیکہ ان کو جاننے کا ہر شخص مشتاق ہے بلکہ کسی قدر جانتا بھی ہے تو پھر ان گنت اسرار قدرت کس کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ گویا علم کامل سوا خدا کے کسی کو حاصل نہیں۔ مخلوق کو جو معاش معاد اور لوازمات زندگی کے اسباب کا علم ہے وہ ناقص ہے۔ پس اسی کے ہاتھ میں خزائن غیب اور مفاتح غیب ہیں۔ اسی تنقیح کی طرف آخری فقرہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ علیم کے بعد خبیر کو لانا یہ بھی بتا رہا ہے۔

مقصودِ بیان

قیامت کے دن کوئی کسی کی مدد کسی طرح نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ تولید و تولد کا رشتہ بھی وہاں کام نہ آئے گا۔ یعنی باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا تصور اپنی ذات پر برداشت کرنا نہ چاہے گا اور بالفرض اگر ایسا کرنا چاہے گا بھی تو نہ کر سکے گا۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان لوگوں کو جو ماں باپ اولاد بیوی وغیرہ کے لئے حرام اور حلال مال جمع کر کے وبال اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ ان کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ وہاں ہمدردی کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ سے صدور کذب کا امکان نہیں۔ اللہ کے وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا کو مطمح نظر نہ بنا لینا چاہیئے اور صرف اسی زندگی کے عیش و آرام کی جستجو میں سرگرم نہ رہنا چاہیئے وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ دنیوی سرداری، دولت حکومت، عزت اور صحت و قوت کے بھروسہ پر آخرت میں بھی ان چیزوں کے حصول کا یقین کر لینا اور غیر صحیح عقائد و اعمال رکھتے ہوئے اپنے کو آخرت کا سردار سمجھنا نہ چاہیئے یا کسی کی شفاعت کی امید پر زندگی گزارنا یا بزرگوں کی قربانیوں کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھنا فریب نفس ہے، اغوائے شیطانی ہے۔ اس سے شفاعت کا انکار نہیں نکلتا بلکہ شفاعت وغیرہ کے بھروسہ پر اپنی زندگی کو برباد کر لینے کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الخ۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کا خیال انسان کو فطرۃً ترتیبی طور پر ہوتا ہے، لیکن کسی کو بھی ان کا علم کامل نہیں۔ قیامت پر ہی انحصار نہیں۔ ولادت اور موت، سبب حیات اور اعمال زندگی بھی پورے طور پر معلوم نہیں نہ ان کے اوقات متعین نہ صورت اور تکمیل شان کے ساتھ معلوم ہیں، لیکن ان کا ہونا بالکل ظاہر ہے۔ پس اسی پر قیامت کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ اس کی تعیین بھی پردۂ خفا میں ہے اور جس طرح ان چیزوں کی ایجاد خاص قادر کی قدرت و حکمت سے خارج نہیں۔ اسی طرح ایقاع قیامت پر بھی وہ قادر ہے اور اخفا کے مصالح سے وہ ہی واقف ہے۔ عدم تعیینِ وقت اور جہالت کو انکار از وقوع کی علت نہ قرار دینا چاہیئے۔ لفظ خبیر سے اللہ کے کمال علمی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ فقط ظاہر ہی کا عالم نہیں ہے بلکہ سربستہ حقائق اور بواطن اشیاء سے بھی واقف ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اس میں تیس آیتیں اور تین رکوع ہیں

اس سورت کا نام سورۂ مضاجع بھی ہے (کبیر) کیونکہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ ہمیشہ حضور اقدس صلعم سونے سے پہلے الم تنزیل السجدہ اور تبارک الذی بیدہ الملک پڑھا کرتے تھے (احمد، ترمذی، حاکم، نسائی، دارمی) اس سورت میں ۳۰ یا ۲۹ آیات ہیں۔ کیونکہ بعض لوگوں کے نزدیک اَءِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ پر آیت ہے تو کل آیات ۳۰ ہو جائیں گی اور بعض کے نزدیک کٰفِرُوْنَ پر آیت ہے۔ اس صورت میں ۲۹ آیات ہوں گی۔

اس سورت میں ۶۸۰ کلمات اور ۱۸ ا ۸ حروف اور ۳۰ رکوع ہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ پوری سورت مکی ہے۔ ابن عباس اور ابن زبیر کا بھی یہی قول ہے، لیکن بخاری نے ابن عباس کا جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا سے تین آیات مدنی ہیں۔ باقی ۲۷ مکی ہیں۔ کلبی اور مقاتل کا بھی قول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ سے كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ تک پانچ آیات مدنی ہیں باقی ۲۵ مکی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز فجر کی نماز میں الم تنزیل السجدۃ اور ھل اتی علی الانسان پڑھا کرتے تھے (رواہ البخاری ومسلم واہل السنن واحمد وغیرہم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ

الٓمّٓ　اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا نازل کرنا رب العلمین کی طرف سے ہے　کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد نے اس کو خود بنا لیا ہے، نہیں بلکہ

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ

وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تاکہ تم اُن لوگوں کو ڈراؤ　جن کے پاس تم سے پہلے　کوئی ڈرانے والا　نہیں آیا　شاید وہ راہ پر

يَهْتَدُوْنَ ۞ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

آ جائیں　اللہ ہی نے　آسمانوں کو　اور زمین کو اور ان دونوں کی درمیانی کائنات کو چھ دن کے دور میں پیدا کیا پھر عرش پر

عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۞ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

جلوہ فرما ہوا　اُس کے سوا نہ تمہارا　کوئی حمایتی ہے　نہ کوئی سفارشی　کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے　وہ آسمان سے زمین تک

مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا

ہر کام کا　انتظام کرتا ہے　پھر وہ کام اُس کی طرف　ایک دن میں چڑھ جائے گا　جس کی مقدار تمہاری حسابی گنتی سے　ہزار برس کی

تَعُدُّوْنَ ۞ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۞ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ

ہوگی　وہی غائب و حاضر کا جاننے والا　غالب و مہربان ہے　جس نے　جو چیز بھی بنائی خوب

شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۞ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ

بنائی　اور انسان کی　ابتدائی بناوٹ　مٹی سے کی　پھر اس کی نسل کو خلاصہ (اخلاط) یعنی ذلیل پانی سے پیدا

مَّهِينٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ

کیا پھر اُسے درست کیا اور اُس کے اندر اپنی روح پھونکی اور تمہارے کان آنکھیں اور دل بنائے (مگر تم)

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ بَلْ هُم

تم بہت کم شکر کرتے ہو (کافر) کہتے ہیں کہ جب ہم زمین کے اندر گم ہوگئے پھر بھی ہم کیا نئی پیدائش میں آئیں گے بات یہ ہے کہ

بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ۝ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ

یہ لوگ اپنے رب سے ملنے کے منکر ہیں (اے محمد) کہہ دو کہ تمہاری جان وہی فرشتہ موت قبض کریگا جو تم پر تعینات ہے پھر تم سب کو اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا۔

تفسیر آیاتِ مندرجہ کا ہر ٹکڑا اپنے اندر گوناگوں معنویت کے خزائن رکھتا ہے اور ہر فقرہ ایک زبردست فلسفی یا منطقی سوال کا حل پیش کر رہا ہے۔ تمام کے ساتھ بیان کرنا موجبِ طوالت ہے، اس لئے مختصر طور پر تفسیر کر دینی مناسب ہے۔ اس مطالبہ میں سائل کی تعیین نہیں کی گئی۔ کیونکہ اصل مقصد سوال کا حل ہے نہ کہ سائل کی تعیین۔

سوال:۔ قرآن کا مصنف کون ہے؟

جواب:۔ قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔

سوال:۔ کیا قرآن جھوٹے سچے افسانوں کا مجموعہ ہے اور دماغی اجتہاد یا سوچ بچار کا ایک بے حقیقت نتیجہ ہے جس کے اندر کچھ باتیں شک کی اور کچھ بیہودہ ہیں اور کسی طرح اس قابل نہیں ہے کہ اس کو زندگی کا دستور العمل بنایا جائے۔

جواب:۔ قرآن حاملِ حقیقت ہے، سرچشمۂ صداقت ہے۔ اس کا کوئی قانون توہم پر مبنی نہیں ہے۔ نہ فکر و دانش کو اس کے ہدایت آفریں ہونے میں شک کرنے کی گنجائش ہے۔ یہ انسانی زندگی کے لئے وجوبی دستور العمل (کتاب) ہے (لاریب فیہ)

سوال:۔ اللہ کی ذات بہت برتر اور بالا ہے۔ واجب ہے، قدیم ہے، لم یزل ولایزال ہے۔ اس کا کلام اور اس کا تجویز کردہ دستورِ حیات کس طرح انسانوں تک پہنچ سکتا ہے جو بجائے خود واجب اور ہر تغیر و حدوث سے پاک ہے۔

جواب:۔ اللہ نے اپنے ازلی ابدی قدیم کلام کو حادث کا جامہ پہنا کر بھیجا ہے اور اونچے درجہ سے نیچے درجہ کی طرف اتارا ہے (لفظاً) اس مضمون کا حال ہے۔ اس کلام کا مغز اور حقیقت اگرچہ بہت بلند اور برتر ہے، لیکن الفاظ اور پیرایۂ بیان اور صورتِ ہدایت وہ اختیار کی ہے جو انسانوں کے لئے مناسب تھی۔

سوال:۔ اللہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہماری زندگی رفتار میں دخل دے اور ہمارے افعالِ حیات کو جکڑ بند کر دے۔ ہمارا اس سے تعلق ہی کیا ہے ہم مخلوق وہ خالق، ہم ممکن وہ ذاتِ واجب۔

جواب:۔ تمام کائنات کا جو تعلق خدا سے ہے وہ ایسا ہے کہ ایسا کسی کا کسی سے نہیں ہے۔ وہ رب العالمین ہے، پروردگار ہے۔ جسمانی اور روحانی تربیت اُسی سے متعلق ہے جس طرح انسان کے جسم کو پیدا کر کے اُس کی بتدریجی ترقی کا سامان اُس نے فراہم کیا۔ اسی طرح روح کا جسم سے تعلق قائم کرنے کے بعد روحانی تربیت، شستگی، دوشیزگی اور بڑھوتری کے اسباب اور اصول مہیا کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اصولِ ہدایت کو قرآن کی شکل میں بھیجا اور انسانوں کے لئے زندگی کا دستور العمل بنایا (من رب العالمین)

سوال:۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ نے خود یہ کتاب بنائی ہے۔ مضامین کا الہامی اور اتفاقی ہونا اس کتاب کو آپکی کتاب ثابت نہیں کر سکتا۔ معانی اور مضامین ہمیشہ اتفاقی ہی ہوا کرتے ہیں۔ جن کو الفاظ کا جامہ پہنا کر لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ شاعر اور دوسرے فنی ماہر اور بڑے بڑے فلاسفر ایسا ہی کرتے

ہیں۔ پس اوّل تو مضامین کا الہامی ہونا محلِ نظر ہے ۔ دوسرے مضامین کا الہامی ہونا تو ثابت نہیں ہوتا ۔ عبارت اور طریقِ تعبیر انسان کا خود ساختہ ہے ۔ غلط طور پر خدا کی طرف نسبت کردی گئی ہے ۔

جواب : ۔ قرآن نام صرف معانی اور مضامین ہی کا نہیں ہے بلکہ عبارت اور طریقِ تعبیر اس کا ضروری جزء ہے ۔ درحقیقت قرآن کے اندر تین چیزیں ہیں ۔ معانی ، تعبیر اور تلفظ ۔ تلفظ تو یقیناً قرآن نہیں ہے ۔ ہر شخص کی زبان جُدا ہے تلفظ جُدا ہے البتہ معانی اور عبارت کے مجموعہ کا نام قرآن ہے اور یہ قرآن تمام من اولہ الی آخرہ مع معانی اور عبارت کے الہامی ہے ۔ کیونکہ معانی کا قلب اور دماغ میں القاء بغیر کسی خاص عبارت کے ناممکن ہے ۔ آدمی جو کچھ سوچتا ہے عبارت سے ہٹ کر نہیں سوچتا ۔ کوئی نہ کوئی زبان اور اس کے الفاظ اوّل دماغ میں منزور آتے ہیں اور ان کی تہ کے اندر معانی کا ظہور ہوتا ہے پس جس طرح قرآنی معانی اللہ کی طرف سے الہام کردہ ہیں اسی طرح قرآنی عبارت بھی الہامی ہے ۔ رہے شاعر اور فلاسفر تو ان کے دماغوں میں بھی معانی کا نزول بغیر الفاظ کے جامہ کے نہیں ہوسکتا ، لیکن الہام قرآنی سے اس کی کوئی نسبت نہیں اوّل تو فلاسفر وں اور شاعروں کے دماغ میں جو معنی پیدا ہوتے ہیں وہ سادہ نہیں ہوتے ۔ تعمل دماغی اور کاوشِ فکر کا ان میں دخل ہوتا ہے ۔ دوسرے ان میں سے کچھ نتیجے اور معنی برحق ہوتے ہیں تو بیشتر حصہ غلط اور مبنی بر توہم ہوتا ہے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شاعر کا ہر شعر اور فلاسفر کا ہر نظریہ سچا ہی ہو اور اس کے اندر کوئی جزو غلط شامل نہ ہو ، اسی لئے شعر فلسفہ اور دوسرے دماغی اختراعات کو الہام رحمانی کے بجائے القائے شیطانی کہنا زیادہ مناسب ہے ۔ اس کے علاوہ شاعر اور فلاسفر کے دماغ میں معانی کا اوّل ترین نزول جن سادہ الفاظ میں ہوتا ہے وہ تعبیر کے وقت ان الفاظ کو بدل دیتا ہے ۔ قطع برید اور تراش خراش اس کا شیوہ ہے ۔ مگر قرآن اس ساری خرافات سے پاک ہے اس کا ہر کلیہ سچا اور ہر قاعدہ برحق بلکہ عین حق ہے اور اس کے تمام الفاظ وہی ہیں جن کو نزول معانی کا اوّل ترین جامہ قرار دیا گیا تھا جس طرح اس کے معانی میں دماغی غور و پرداخت کو دخل نہیں ہے ۔ اسی طرح اس کی عبارت ، ذہنی کاوش اور ساخت کی مرہون نہیں (ھوالحق)

سوال : ۔ اچھا یہ مان لیا کہ قرآن خدا کا کلام ہے ، لیکن خدا تو ہر نقص سے پاک ہے پھر اس کو اپنا کلام نازل کرنے اور رسول کو بھیجنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی ؟

جواب : ۔ بات یہ ہے کہ انجام اور نتیجہ سے یقینی طور پر کوئی واقف نہیں ۔ انسانی عقل آخرت کی زندگی کے متعلق کوئی ریمارک نہیں کرسکتی ۔ معلوم نہیں سیدھا راستہ کون سا ہے اور کج گیڈنڈیاں کون سی ہیں ۔ تباہی کے غار میں گرا دینے والی کون سی سبیل ہے اور منزلِ سعادت پر پہنچانے والا کون سا طریق ہے ۔ انسان کی گمراہی اور حیرانی پر رحم فرماکر پروردگارِ عالم نے اپنا رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل کی اور رسولِ خدا کلام الٰہی کی روشنی میں حیران انسانوں کو راہِ سعادت دکھادے اور ہلاکت آفریں ٹیڑھے راستوں سے بچنے کی ہدایت کردے ۔ ممکن ہے رسول کی تنبیہ سے متنبہ ہوکر لوگ غلط راستوں سے کنارہ کش ہوکر راہِ نجات پر گامزن ہوجائیں ۔ (لعلہم یہتدون)

سوال : ۔ ضرورت رسالت و نبوت تسلیم لیکن پیغمبر تو پہلے بھی آچکے اور کتابیں بھی نازل ہوچکیں پھر جدید پیغمبر اور مزید کتاب کی کیا حاجت تھی ؟

جواب : ۔ ہر پیغمبر کی ہدایت کا اثر ایک خاص وقت تک رہتا ہے ۔ مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں ۔ انبیائے سابقین کے ترتیبی دور بھی اسی قاعدے کے تحت گزرے ۔ جب ایک پیغمبر کی ہدایت کو فراموش کردیا گیا تو خدا تعالیٰ نے دوسرے پیغمبر کو بھیجا ۔ اسی طرح ہر کتاب کی حالت ہوتی ہے ۔ جب تک کتاب الٰہی تبدیل اور تحریف سے پاک رہتی ہے کسی مزید کتاب کی ضرورت نہیں رہتی ۔ لیکن جب لوگ آسمانی کتابیں از خود تراش خراش اور قطع برید کرکے کچھ سے کچھ بنالیتے ہیں اور کتاب الٰہی کو نا قابلِ مسخ کردیتے ہیں کہ پھر اس کی اصلاح کی تجدید کتاب کے علاوہ اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو جدید کتاب بھیجی جاتی ہے ۔ کتبِ سابقہ کا نزول اسی ضابطہ کے تحت ہوا ۔ محمد رسول اللہ کی بعثت سے پہلے عام عرب نیز دوسری اقوام کی حالت بہت پست ہوچکی تھی ۔ لوگوں نے گزشتہ کتابوں کی صراحت اور سابق نبی کی ہدایت کو فراموش کردیا تھا اور گمراہی کے غار میں گر چکے تھے اور مدت دراز سے کوئی ہادی ان کے پاس نہ آیا تھا ۔ اس لئے لازم تھا کہ جدید کتاب نازل کردی جائے اور نئے پیغمبر کو بھیجا جائے (لتنذر قوماً ما اتاہم من نذیر)

سوال : ۔ تو کیا محمد رسول اللہ صرف عرب کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے ۔ آیت لتنذر قوماً سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ۔

جواب : ۔ جس قوم اور ملک میں نبی کی پیدائش ہو اس کو پیغمبر کی ہدایت سے فائدہ اندوزی کا سب سے پہلے موقع ملتا ہے اسی لئے سب سے پہلے اعزا اور قریب ترین اقربا کو ہدایت کرنے کا حکم قرآن میں آیا ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسرے لوگ تمتع پذیری اور خوشہ چینی پر مکلف نہیں ہوتے ۔ محمد رسول اللہ کو سب سے پہلے قریش کو ہدایت کرنے کا حکم ہوا ۔ کیونکہ وہ آپ کا خاندان تھا بلکہ قریش میں بھی سب سے پہلے اقربا کو نصیحت کرنے کا امر ہوا ۔ قریش کے بعد

دوسرے عرب عجم دور کے رہنے والے احباب ۔ اسی طرح تمام عالم کے لئے حضور کی بعثت عام ہو گئی ۔ کیونکہ اگر حکم میں خصوصیت نہ ہو تو کسی خاص قوم کا تذکرہ کرنے سے دوسری اقوام کی نفی نہیں ۔ عام مجلس اقوام میں اگر یہ کہا جائے کہ زید کو کھانا کھلا دو تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ دوسروں کو کھانا نہ کھلاؤ ۔ ہاں اگر دعوت خاص ہو تو خصوصیت ضرور پیش نظر ہوتی ہے ، لیکن ہدایت قرآنی میں تو اشخاص یا اقوام کی تخصیص نہیں ہے ۔ صرف آیت مذکورہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قریش یا عرب کو نصیحت کرو ۔ اس سے یہ کس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرو ۔

سوال ۱ : ۔ قرآن نے لوگوں کی اصلاح کی اور وہ کیا اصول ہیں جن کو رسولِ خدا انسانوں سے تسلیم کرانا چاہتے تھے ؟ کیا وہ قوانین عمل ہیں یا نظریات فکر یا کیا ؟

جواب ۱ : ۔ (عمل چونکہ شاخ ہے صحت فکر کی ، اس لئے اس جگہ قوانین عمل کا تذکرہ نہیں کیا گیا ۔ صرف عقیدہ کی صحت کی تفصیل فرمائی ہے) فرمایا ۔

قرآن چند نظریات کو پیش کرتا ہے اور ان کی صحت پر زور دیتا ہے اور تمام انسانوں کو ان کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔

سب سے پہلے اس بات کا عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ اللہ تمام کائنات کا خالق ہے ۔ آسمان اور زمین اور درمیانی چیزیں اسی نے بنائی ہیں ۔ (آسمان ، زمین اور فضائی کائنات میں سے ہر ایک کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ذاتی اور صفاتی یا مادی اور روحی یا ظاہری اور باطنی اس لئے کل عالم کی چھ حیثیتیں ہیں اور ہر چیز کو ایک حیثیت سے تخلیق کرنے کے لئے ایک وقت کی ضرورت ہے پس) ساری کائنات کو چھ اوقات یعنی امتیازی اوصاف اور متفرق اوقات میں اسی نے پیدا کیا اور سب کا مرکز عرشِ اعظم کو قرار دیا (خلق السموات والارض وما بینہما ستۃ ایام ثم استوی علی العرش)

دوسرا عقیدہ : ۔ اللہ کی بے مثال قدرت اور بے نظیر طاقت کا رکھنا بھی لازم ہے ۔ اس بات کا پختہ یقین کرنا چاہیئے کہ اللہ کی سطوت اور جبروت کے سامنے تمام عالم ہیچ ہے ۔ جن پر خدا کا غضب نازل ہو ان کی کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا نہ زور اور طاقت کے بل بوتے پر کوئی بچ سکتا ہے نہ سفارش اور شفاعت کی کسی میں جرات ہو سکتی ہے ۔ ہیبتِ الٰہیہ سب پر مسلط ہے اور رہے گی ۔ اللہ کی مرضی کے خلاف کسی کو جنبش کرنے کی طاقت نہ ہوگی ۔ (مالکم من دونہ من ولی ولا شفیع)

تیسرا عقیدہ : ۔ اللہ کے ہمہ گیر نظم اور تسخیر کل کے متعلق رکھنا بھی ضروری ہے ۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کر کے یوں ہی انہیں چھوڑ دیا ہے نہ خود تخلیق سے فارغ ہو کر معطل بیٹھا ہے بلکہ ہر آن مخلوق سے اس کا تعلق ہے ۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز کا انتظام وہی کرتا ہے ۔ سارے عالم کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے ۔ گویا عالم اور اس دونوں کی لگام اس نے اپنے ہی دستِ قدرت میں رکھی ہے (یدبر الامر الخ)

چوتھا عقیدہ : ۔ اس کے علمی احاطہ کے متعلق ہونا چاہیئے وہ چیزیں جو مخلوق کی نظر اور تصور سے غائب ہیں اور وہ چیزیں جو مخلوق کے دماغ اور فکر کے سامنے ہیں سب کا علم خدا کو ہے ۔ کھلی اور چھپی کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں (عالم الغیب والشہادۃ)

پانچواں عقیدہ : ۔ غلبہ اور رحمت کے متعلق رکھنا ضروری ہے ۔ اللہ کو محیط کل غلبہ حاصل ہے ۔ وہ عزیز ہے اگر چاہے تو دم بھر میں سارے سنسار کو فنا کر دے مگر اس کے ساتھ وہ رحیم بھی ہے (کہ مخلوق کتنی ہی سرکشی کرے ، معصیت کوشی کرے ، احسان فراموشی کرے ، مگر اس کی رحمت نہیں چاہتی کہ کسی کی روزی بند کر دے اور اپنے دروازے سے ٹھکرا دے (العزیز الرحیم)

چھٹا عقیدہ : ۔ حسنِ تخلیق اور خوبی فطرت کے متعلق ہونا چاہیئے ۔ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی تخلیق میں کوئی قصور نہیں ۔ عالم میں شر کی تخلیق ہی نہیں واقعی قبح موجود نہیں (اگر شر قبح اور بدی موجود ہے تو استعمال سے ہے یا اضافی ۔ بعض چیزیں بعض آدمیوں کے لئے بری اور مضرت رساں ہیں اگر وہ آدمی اُن چیزوں کو استعمال کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے ورنہ واقع میں ان چیزوں کی پیدائش میں کوئی خرابی نہیں ۔ خنزیر اور زہر بجائے خود کامل چیزیں ہیں لیکن ان کی تخلیق میں کوئی خرابی نہیں حسنِ فطرت کی آئینہ دار ہیں ۔ خلاق کی کاریگری ان سے نمایاں ہے ۔ جلوۂ فطرت ہویدا ہے ، لیکن انسانوں کے لئے اس کا بے محل استعمال مضرت رساں ہے ، اس لئے اضافی برائی پیدا ہو گئی ہے (الذی احسن کل شئی خلقہ)

ساتواں عقیدہ : ۔ یہ ہونا چاہیئے کہ دنیا کی ہر چیز گزرنے کے بعد اپنے مرکز پر پہنچ جاتی ہے اس طرح معدوم نہیں ہو جاتی کہ پھر کبھی سامنے آ ہی نہ سکے جب زمانہ اور زمانے کا سارا دور ختم ہو جائے گا تو قیامت برپا ہوگی اور ایک وقت (جس کو وقت کہنا بھی مجاز اً ہے کیونکر وہ) ایسا ہوگا جس کے طول کا اندازہ کرنا بھی بہت دشوار ہوگا ۔ مثال کے طور پر ہم اپنی گنتی میں اس کو ہزار برس کا دن کہہ سکتے ہیں ۔ اس روز ہر چیز کا رجوع براہِ راست اللہ کی طرف ہوگا ۔ اس زندگی میں تو بظاہر بکثرت اہل ملک اللہ اہل ملک نظر آتے ہیں ، لیکن قیامت کے دن نہ کوئی مالک ہوگا نہ ملک ۔ ہر چیز اور ہر کام کا مرجع اللہ کے پاس ہوگا ۔ وہ عدالتِ الٰہی ہوگی ۔ جہاں اعمال کا ۔۔۔

سب مثلیں پیش ہوں گی (ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہٗ الف سنۃ مما تعدون)
یہ سات عقائد تو وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کی ذات صفات اور کائنات کے آغاز و انجام سے عموماً ہے، لیکن ان سات کے علاوہ آٹھواں عقیدہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اللہ نے اول ترین انسان کو مٹی سے بنایا پھر بقائے نوع کے لئے نطفہ سے تخلیق کا قاعدہ بنایا اور انسانی قالب کو درست کرنے کے بعد حیاتِ انسانی پیدا کرنے کے لئے اپنی خاص روح کا ایک پرتو ڈال کر انسان کے ریشہ ریشہ اور رونگٹے رونگٹے کو جگمگا دیا ۔ گویا آدمی کے اندر روح پھونک دی پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ علم و ادراک کے ذرائع بھی عطا فرمائے ۔ بجائے خود سوچ بچار کرنے کے بعد حقیقت تک پہنچنے کے دل اور خارجی چیزوں کو دیکھ کر دماغ سے کام لے کر حقیقت تک پہنچنے کے لئے آنکھیں اور دوسرے سچے عالموں کا کلام سن کر منزلِ حقیقت پر پہنچنے کے لئے کان عطا فرمائے (وبدأ خلق الانسان الخ) لیکن انسان ناشکرا ہے بہت کم لوگ ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں (قلیلا ما تشکرون)

یہ آٹھ عقائد ہیں جن کا تذکرہ اس جگہ فرمایا ہے ۔ ان کے علاوہ دوسرے نظریات انہی کی شاخیں ہیں جن کا ذکر دوسری آیتوں میں آیا ہے ۔ اہلِ فکر کی اصلاح اور ہدایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے ۔

(اول) اللہ کی ذات اور صفات کو ہم مانتے ہیں اور کائنات کے آغاز کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور انسان کی تخلیقی صورت سے بھی انکار نہیں کرتے، لیکن وجودِ قیامت محتاجِ ثبوت ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آدمی مر کر ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں مل گیا تو پھر ان پریشان ذرات کا اجتماع اور از سرِ نو تخلیق کس طرح ممکن ہے ۔

اس شبہ کی حقیقت سوا اس کے کچھ نہیں کہ اللہ کی قدرت، علم اور بعض دوسری صفات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے جزا سزا کے لئے پیش ہونے سے انکار کیا جا رہا ہے ۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ خدا کے سامنے جانے کو ناممکن سمجھا جا رہا ہے اور بہانے کے طور پر توہم کو تعقل کہا جا رہا ہے ۔ مقامِ غور ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں کہ موت کے فرشتہ کے پنجہ سے بچ سکے (یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم)

(الموت کا فرشتہ کیا ہے؟ اللہ کی طرف سے مقرر کی ہوئی غیبی قوت مدبرہ جس کے عمل کا پروگرام تعمیری نہیں تخریبی ہے ۔ اب ذرا دماغ سے کام لے کر سوچنا چاہیئے کہ کروڑ ہا کروڑ انسانوں کی موت کے لئے اللہ نے غیبی قوتوں کو مسخر کر دیا ہے اور ہر ایک شخص بلکہ ہر شخص کے ہر حصۂ جسم کی تخریب کے لئے ان گنت قوتوں کو جدا جدا مامور کر دیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تمام آدمی اللہ کے پاس دوبارہ لوٹ کر نہ بلائے جائیں (ثم الیہ ترجعون) (عمومی موت سے اللہ کے عموم قدرت اور محیطِ کل علم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جب اللہ کی قدرت تمام عالم میں جاری ساری ہے اور اس کے علمی احاطہ سے کوئی چیز خارج نہیں تو پھر زمین میں کھوئے ہوئے اور خاک میں ملے ہوئے ذرات کو اکٹھا کر کے دوبارہ جمع کرنا اور ان سے انسانی جسم کو از سرِ نو بنانا کون سا دشوار کام ہے پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جب ہر چیز کا آغاز اللہ کے پاس سے ہوا تو اس زندگی کا آخری کنٹرول بھی اسی کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو نقطۂ آغاز ہے وہی نقطۂ انجام ہے ۔ دوری حرکت کا مبدا اور منتہا ایک ہوتا ہے ۔

تحلیلِ اجزاء الٓمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ حضور اقدس ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور آیاتِ قرآنی کو ثبوت میں پیش کیا تو قریش اور دوسرے خاندانوں کے کافر ہر طرح سے نورِ حق کو بجھانے کے درپے ہو گئے ۔ یہاں تک کہ اطرافِ ملک سے جو دیہاتی تعصباتی تحقیق حق کے لئے مکہ آتے اور پوچھ گچھ کرتے اور اصل معاملات دریافت کرتے تھے تو عناد و حسد کے سبب کفار جواب دیتے تھے ابھی کچھ بھی نہیں ہے بس ایک کتاب ہے جسے انہوں نے خود بنا لیا ہے، لیکن کلامِ الٰہی اور وحی آسمانی کہہ کر لوگوں کو سناتے اور بہکاتے ہیں ۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا اور صاف صراحت فرما دی کہ یہ اللہ رب العالمین ہے بلاشبہ یہ کتاب اسی کی طرف سے نازل کردہ ہے یعنی جس طرح جسمانی پرورش خدا کے دستِ قدرت میں ہے اسی طرح روحانی پرورش کیلئے اخلاقی معاشرتی انفرادی اور اجتماعی اصول ہدایت مقرر کرنا اور قوانینِ اصلاح بھیجنا بھی اسی کا کام ہے چنانچہ یہ کتاب خلق کی اصلاح کے لئے اسی نے بھیجی ۔

الٓمٓ ۔ تنزیل ۔ کتاب ۔ لاریب اور رب العالمین کے الفاظ کی تشریح ایک سے زیادہ مرتبہ اوپر گزر چکی ہے ، مزید تکرار موجبِ طوالت ہے ۔ بہرحال لفظ کتاب سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے اصولِ ہدایت اور ضوابطِ اصلاح قطعی واجب العمل ہیں ۔ کیونکہ اللہ نے انسانی سعادت اور فلاح کے تمام قوانین سے چھانٹ کر مفید ترین مواد کو ایک جگہ جمع کر کے بھیجا ہے (لغت میں کتب کے معنی ہیں جمع کرنا اسی لحاظ سے کتیبہ لشکر کو کہتے ہیں ۔ کتاب کے معنی ہوئے مجموعہ یعنی قوانینِ اصلاح کا مجموعہ) لاریب فیہ کے بعد من رب العالمین کے لفظ سے عدم شک کی دلیل بیان کرنی مقصود ہے ۔ کیونکہ انفرادی یا اجتماعی مرتب کردہ قوانین اور پیش کردہ دستور العمل میں بطلان اور نقصان کا شبہ ہو سکتا ہے بلکہ شبہ کیا یقین ہو سکتا ہے اور یقین بھی واقعیت پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے کہ

انسانی تدبر اور بصیرت درجۂ کمال تک پہنچ سکنے سے قاصر ہے۔ وضع قوانین کی ضروری شرطوں کا تحقق کسی ایک فرد یا گروہ میں ہونا ناممکن ہے۔ ہاں اگر قوانین کا واضع اور نافذ کرنے والا پروردگار ہو تو چونکہ وہ خود کامل ہے، اس کا علم کامل ہے، اس لئے اس کے بھیجے ہوئے اصول بھی کامل خیر و سعادت کے حامل ہوں گے اور ان میں نقصان ضرر اور بطلان کا شک بھی نہیں ہو سکتا۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ۚ بَلۡ هُوَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ۔ جن لوگوں کی نظر کوتاہ اور بصیرت کمزور ہوتی ہے وہ ہر چیز کی قدر کا اندازہ اپنے قیاس سے کرتے ہیں۔ جس کی نگاہ کج ہوتی ہے اس کو وحدت بصورت کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مکے کے کافر حضور گرامی کی باطنی قوت کو اپنی طاقتوں سے بالاتر دیکھتے ہیں، لیکن اسی برتری کی وجہ اور اپنی عاجزی کا سبب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، اس لئے باتفاق آرا کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ کوئی ساحر کہتا تھا تو کوئی کاہن، کوئی جن رسیدہ کوئی دیوانہ۔ یہ افکار اور اقوال اگرچہ مختلف تھے، لیکن ان سب میں ایک جہت مشترک تھی یعنی افترا اور غلط انتساب پر تمام کا اجماع تھا۔ سحر یا کہانت یا القاء جن کہنا دلیل تھی اس بات کی قرآن خدا کا کلام نہیں۔ نہ اللہ نے یہ اصولِ حیات انسانی کی سعادت کے لئے بھیجے ہیں بلکہ رسول پاکؐ نے (نعوذ باللہ) خود بنا لئے ہیں اور غلط طور پر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اس اجمالی خیال کی تردید فقرۂ مذکورہ میں فرما دی۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ کافروں کو قرآن کی حقانیت کا اقرار ہے یا انکار؟ اگر انکار ہے تو انکار کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کو افترا کہیں حالانکہ یہ افترا نہیں نہ اللہ کی طرف غلط انتساب ہے بلکہ واقعی اللہ کی کتاب ہے۔ اس کی حقانیت ناقابلِ شک ہے۔ نہ اس کی افادی حیثیت قابلِ انکار ہے۔ کیونکہ اللہ جب رب ہے تو ضروری ہے کہ اس کے مرسلہ قوانین حق صادق اور مفید ترین ہوں، لیکن خیال ہو سکتا تھا کہ قرآن کو نازل کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اللہ کو ہمارے لئے قوانینِ حیات بھیجنے کی کیا ضرورت پیش آئی، اس لئے فرماتا ہے:-

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰٮهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ۔ اللہ نے کتاب تمہارے ہی فائدہ کے لئے بھیجی ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے لق و دق صحرا میں تم بھٹکتے نہ پھرو اور راہِ سعادت تم کو مل جائے۔ رسول ایک راہ شناس راہنما ہے جو تم کو بتا رہا ہے کہ پراگندہ پگڈنڈیوں پر چلنے سے تباہی کے غار میں گرنا لازم ہے۔ شاہراہِ نجات صرف ایک ہی ہے اور وہ راستہ وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ دورِ ہدایت ختم ہونے کے بعد اگرچہ مدت دراز سے کوئی پیغمبر تمہاری رہنمائی کے لئے نہیں آیا اور نہ کسی نے یہ بتایا کہ کج مج راہوں پر چلنا موجبِ ہلاکت ہے۔ مگر اب خدا نے اپنی کتاب اپنے رسول کی معرفت صرف اس لئے بھیجی کہ تم کو ہلاکت انگیز راستوں سے بچانے کی کوشش کرے اور یہ امید قائم کرتے ہوئے کوشش کرے کہ تم راہِ راست پر آ جاؤ گے۔

ایک شبہ آیت مذکورہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ عام عرب خصوصاً اولادِ اسماعیل کی ہدایت کے لئے پیدائشِ آدم سے عہدِ محمدیؐ تک کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ اگر ہدایت کے لئے خدا نے کسی ہادی کو مبعوث نہیں فرمایا، لیکن اس کے باوجود ان کو عذاب کی دھمکی بھی دی۔ حالانکہ خود ہی فرمایا ہے کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ۔ اس کے علاوہ ہر قوم کے لئے ہادی اور نذیر مقرر ہونے کی بھی خود ہی صراحت فرمائی ہے وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ۔ پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عرب کی ہدایت کے لئے کسی پیغمبر کو نہ بھیجا گیا ہو۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اسرائیلیوں میں ہزاروں انبیا گزرنے اور اولادِ اسماعیل سے بنی اسرائیل کا رشتہ کچھ دور کا نہ تھا۔ انبیائے بنی اسرائیل کی ہدایتوں سے اولادِ اسماعیل بھی بہرہ اندوز ہو سکتی تھی۔ مزید برآں یہ بات بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے عاد، ثمود اور مختلف اقوامِ عرب کے لئے ہود و صالح اور بعض دوسرے پیغمبروں کو بھیجا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں عہدِ محمدی سے پہلے ہر ہادی کے مبعوث ہونے کی نفی کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر خاص قریش یا کوئی دوسرا خاندان مخاطب قرار دیا جائے اور نزولِ قرآن سے پہلے بعثتِ عیسوی سے بعد کا زمانہ مراد ہو اور یہ مطلب ہو کہ عیسیٰ کے بعد کوئی نبی تمہاری ہدایت کے لئے نہیں آیا تو پھر یہ وصف قریش یا تمام اہلِ شرک کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا۔ اس دور میں اہلِ کتاب کی ہدایت کے لئے کوئی نبی نہ آیا تھا۔ ان کے اسلاف کے دور میں آیا تھا جس کو گزرے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔

ازالہ ہم نے تفسیری مطلب میں اس شبہ کے ازالہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ آیت میں خدا تعالیٰ عام کافروں پر احسان رکھتے ہوئے فرمانا چاہتا ہے کہ دیکھو تم پر اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ تمہاری ہدایت کا دور ختم ہونے اور تمہارے گمراہ ہونے کے بعد سے لے کر عہدِ محمدی تک کوئی ہادی تمہارے پاس نہ آیا تھا کسی نے آکر تم کو سیدھا راستہ نہ بتایا تھا۔ اب خدا نے اپنا رسول بھیجا اور تم کو گمراہی سے نکالنے کا حکم دیا۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضور اقدسؐ سے پہلے عرب کی ہدایت کے لئے کوئی نبی آیا ہی نہ تھا۔

ایک اور سوال:- آیت لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰٮهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ پاکؐ اور نبوت اسی قوم یا اقوام کے ساتھ مخصوص تھی جن کی ہدایت

کے لئے آپ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا گیا اور چونکہ اہلِ کتاب کی ہدایت کے لئے مختلف انبیاء کو بھیجا گیا تھا، اس لئے اہلِ کتاب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنا ضروری نہیں۔

اس شبہ کا ازالہ ہم تفسیری مکالمہ میں مختصر طور پر لکھ چکے ہیں۔ اس جگہ قدرے تفصیل کرنا چاہتے ہیں:۔

حل ۱۔ اگر نفی ماسوا کے علاوہ تخصیص کا کوئی سبب موجود ہو تو کسی شخص یا قوم کا خاص طور پر تذکرہ کرنے سے دوسرے اشخاص یا اقوام کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ ضابطہ عام ہے۔ اصطلاحِ شرع اور عرفِ عام اور زبان کے محاورات اس کے شاہد ہیں اور چونکہ تخصیص عرب کی خاص وجہ اس جگہ موجود ہے، اس لئے اہلِ کتاب حکم سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ بات یہ ہے کہ عام مشرکوں کو انذار کرنا اہلِ کتاب کو نصیحت کرنے سے اولیٰ تھا کیونکہ اہلِ کتاب تو صرف رسالت کے منکر تھے اور عام مشرک نہ توحید کے قائل تھے نہ حشر نشر کے نہ نبوت کے، اس لئے عام مشرکوں کی اصلاح نبوت کا اوّل ترین فرض تھا اور دوسرے لوگوں کو نصیحت کرنی بعد کا کام تھا۔ اگر کوئی بیمار مہلک ترین مرض میں مبتلا ہو اور قریب ترین وقت میں اس کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو تو معالج کا اولین فرض یہ ہے کہ دوسرے بیماروں کو چھوڑ کر اس کی طرف پہلے توجہ کرے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قریب الہلاکت بیمار کا علاج کرنے کے بعد دوسرے بیماروں کا علاج نہ کرے یا باقی بیماروں کو تندرست سمجھ کر علاج کرانے سے پہلوتہی کریں۔ پس یہی حالت اہلِ شرک اور اہلِ کتاب کی تھی۔ سب سے پہلے اہلِ شرک کی اصلاح ضروری تھی۔ بعد کو اہلِ کتاب کو نصیحت کرنی لازم تھی۔ اسی بنا پر مشرکوں میں سے خاص اقارب کو نصیحت کرنے کا حکم سب سے پہلے رسول اللہ کو ملا تھا، کیونکہ ماحول کے اعتبار سے وہ ہی زیادہ قریب تھے۔

۲۔ آیت مذکورہ میں قَوْمًا سے مراد خاص مشرک اور بُت پرست ہی نہیں بلکہ اہلِ کتاب بھی اُن کے ساتھ شامل ہیں۔ کیونکہ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جس قوم کی ہدایت کے لئے رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت آدمؑ کے اولین دور تک کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اس قوم کی ہدایت کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا (ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی گزری نہیں جو آغازِ آفرینش سے گمراہ اور وجودِ پیغمبر سے خالی رہی ہو۔ عرب کی ہدایت کے لئے بھی صالحؑ، ہودؑ اور بعض دوسرے پیغمبروں کو بھیجا جا چکا تھا) بلکہ مطلب یہ ہے کہ سابق نبی کا زریں دور ختم ہونے کے بعد جب عام لوگ گمراہی میں مبتلا ہو گئے تو دورِ گمراہی کے بعد ان کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو نہیں بھیجا گیا تھا اور سب لوگ حیرانی اور گمراہی کے لق ودق صحراؤں میں گھوم رہے تھے۔ ایسی حالت میں اللہ نے احسان فرمایا کہ رؤف رحیم نبی کو ان کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا۔ گویا قوم سے مراد وہ قوم ہے جو ہدایت یافتہ ہونے کے بعد گمراہ ہو گئی تھی اور پھر دوبارہ ان کی ہدایت کے لئے کوئی جدید پیغمبر نہیں آیا تھا اور چونکہ یہ حالت اہلِ کتاب اور اہلِ شرک دونوں کی تھی، اس لئے اہلِ کتاب کو بھی اہلِ شرک کے ساتھ شامل قرار دیا جائے گا۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔ تذکرۂ رسالت کے بعد فریضۂ رسالت کو بیان فرماتا ہے۔ اصلاح، اعمال اور قوانینِ ہدی کے اظہار سے پہلے فکری اصلاح کرنی رسالت کا اوّل ترین فرض ہے اور فکری اصلاح میں بھی عقیدۂ توحید کی تبلیغ تمام عقائد و نظریات کے لئے سنگِ بنیاد ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس نے زمین آسمان اور درمیانی کائنات کو ان کے متفرق اوقات میں پیدا کیا وہ ہی اللہ ہے یعنی مستحقِ الوہیت وہ ہی ہو سکتا ہے جو خالقِ کائنات ہو اور چونکہ خالقِ کائنات ایک ہی ہے، اس لئے وہی مستحقِ الوہیت ہے۔

یہاں یہ امر تشریح طلب ہے کہ کائنات کو چند روز میں پیدا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اللہ کا کوئی فعل مقید بزمانہ نہیں پھر یہ تدریجی تخلیق کیسی؟ اس سوال کا اجمالی ترجمہ ہم نے سورۂ بقرہ میں کر دیا ہے۔ یہاں دوسرے طور پر جواب دینا مناسب ہے۔ بات یہ ہے کہ آیت میں تمام مادی کائنات کو تین صنفوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ علوی، سفلی اور درمیانی اور ہر ایک صنف کی تخلیق جدا حیثیت، جدا نوعیت، جدا صورت اور جدا حالت رکھتی ہے، اس لئے ہر ایک کی تخلیق کا زمانہ بھی جدا ہونا چاہیے۔ پس تین صنفوں کی تخلیق کے لئے تین اوقات ہونے چاہئیں۔ خواہ وہ اوقات آنی ہوں یا زمانی اور چونکہ علوی، سفلی اور درمیانی کائنات میں سے ہر صنف کی دو خصوصیتیں ہیں ذات یا صفت یا ظاہر و باطن یا اقوام اور حالت یا جوہریت اور عرضیت، مثلاً آسمان کی ایک ذات ہے جو جوہریت ہے ظاہری جسمانیت ہے قوامِ مادیت ہے اور دوسری خصوصیت جسمانیت کا طول عرض اور عمق ہے۔ خوب صورت یا بدصورت ہونا ہے، حرکت یا سکون ہے، مادہ یا کوکب ہونا ہے، حجم یا وزن ہے، شکل اور رنگ ہے وغیرہ۔ اسی طرح زمین کی بھی ایک ذات ہے اور دوسری چیز ذات کے علاوہ اس کے تمام احوال ہیں۔ علیٰ ہذا فضائی کائنات کا حال ہے۔ پس ہر صنف کی کل تخلیق درحقیقت دو دوسری چیزوں کی تخلیق ہوئی اور دونوں تخلیقوں میں نمایاں تفاوت اور دو رنگی ہے، اس لئے تین

صنعتوں کی تخلیق کے لئے تین اوقات کے بجائے چھ اوقات ہونے لازم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے علوی، سفلی اور درمیانی کائنات کو چھ اوقات میں بنایا۔ رہا یہ سوال کہ خدا کا ہر فعل زمانیت سے پاک ہے۔ یہ اُس وقت کہا جاسکتا ہے جب ایام سے مراد دن ہو اور یوں ترجمہ کیا جائے کہ اللہ نے چھ دن میں ان اشیا کو بنایا۔ اس جگہ ایام سے مراد اوقات ہیں اور یہ ہر زبان کا عام عرف ہے کہ وقت کو لیل یا نہار سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ زید جمعہ کے دن پیدا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رات کو پیدا ہوا ہو۔ پھر اس سے یہ مراد بھی نہیں ہوتی کہ زید گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ تک پیدا ہوتا رہا ہو بلکہ مراد ایک فعل کا ظہور ہوتا ہے خواہ ظہور ایک پل میں ہو۔ مثلاً جمعرات کے دن دوپہر کے وقت ریل آکر ٹھہری۔ ظاہر ہے کہ ریل کی حرکت کا اختتام یا حرکت کا آغاز دونوں آن سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں زمانی نہیں۔ پس اسی طرح آیت کا مطلب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے چھ آنات میں کائنات کو بنایا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (استواء علی العرش کی تحقیق) چونکہ اللہ کے لئے کسی خاص مکان میں جسمانی طور پر ٹھہرنا، کھڑا ہونا، بیٹھنا، لیٹنا اور قرار پکڑنا حقیقی معنی کے لحاظ سے ناممکن ہے کیونکہ خدا نہ جسم ہے نہ جسمانی وہ ہر کثافت سے پاک ہے اور ہر آلائش سے منزہ۔ اور آیت کے ظاہری الفاظ استقرار جسمانی کو ظاہر کر رہے ہیں، اس لئے تشریح کی ضرورت ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم نے اس کی کسی قدر تفصیل کر دی ہے، لیکن وہ تشنہ کاموں کی تشنگی دور کرنے کے لئے کافی نہیں اس لئے اس جگہ مکمل تشریح کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ استواء کا کیا مفہوم ہے اور عرش سے کیا مراد ہے اور استواء علی العرش کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) اوّل یہ ہے کہ کوئی جواب ہی نہ دیا جائے اور صاف طور پر کہہ دیا جائے کہ ہم نہیں جانتے کہ استواء علی العرش سے کیا مراد ہے اور کیا کیفیت ہے۔ جب ہم اللہ کی ذات اور اس کی دیگر صفات کی تفصیل سے لاعلم ہیں تو پھر استواء علی العرش کی مفصل حقیقت جاننے اور بیان کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اللہ کی یہ صفت بھی اُن صفات میں سے ہے جن کی تفصیل سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ہاں ہم تحقیق کے ساتھ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آیت میں استقرار مکانی مراد نہیں۔ خدا تمام صفات نقص سے پاک ہے۔ یا یوں کہہ دیا جائے کہ ہم کو مراد الٰہی معلوم نہیں نہ ہمارے لئے اس کا جاننا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن کے بعض حقائق کا علم سوا حضور اقدس ﷺ کے کسی کو نہ ہو۔ اس کا جواب ہی عدم العلم ہے۔ یہ راستہ بہت سالم ہے۔ کیونکہ تین اصول کو تفصیل وار نہ جاننے کا آخر میں اقرار ہی کرنا پڑتا ہے۔ توحید، حشر، رسالت، یہ تینوں اصول ایسے ہیں جن کی تفصیل سے کوئی واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اللہ کی توحید ذاتی و صفاتی کا مکمل علم کیفیت حشر کی کماحقہ تفصیل اور انبیاء کی پوری تعداد کون بتا سکتا ہے۔ صرف اجمالی طور پر ان چیزوں کا ماننا ضروری ہے۔ تفصیل میں جانے سے جہل مرکب اور کذب کے غار میں گر پڑنا لازم ہے اور ظاہر ہے کہ عدم علم اور سکوت جہل مرکب اور کذب سے افضل ہے۔ (۲) دوسری شق جوابی تشریح کی ہے۔ ہم اس کی کچھ تنقیح کرتے ہیں، لیکن دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آیت میں یہی مراد ہے۔ انکشاف حق کی کوشش کرنی ہمارا فرض ہے اور خطا روی کو معاف کرنا اللہ کا وعدہ ہے۔ ہماری خواہش صادق ہے۔ اس شق کا حاصل یہ ہے کہ آیت کے الفاظ کے حقیقی معانی مراد نہیں بلکہ مجازی مفہوم مراد ہے، لیکن مجازی معانی کون سے مراد ہیں اس کی تشریح حسب ذیل ہے :-

(۱) عرش سے مراد عظمت اور حکومت ہے۔ بات یہ ہے کہ معمولی حکمراں کے لئے نہ تخت ہوتا ہے نہ تاج۔ بڑے بڑے بادشاہ اور خود مختار سلاطین عموماً صاحبِ تخت و تاج ہوتے ہیں۔ عرف میں کسی بادشاہ کی عظمت اور خود مختاری ظاہر کرنے کے لئے تخت نشین ہونے کے الفاظ کہے جاتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ بادشاہ واقع میں تخت پر بیٹھ گیا بلکہ حکومت خود اختیاری اور عظمتِ سلطنت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح شکست خوردہ مغلوب بادشاہ جب مغلوب بادشاہ ملک چھوڑ کر بھاگتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ پر زمین تنگ ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ زمین کسی پر تنگ نہیں ہوتی۔ مکان کی ضرورت ہر شخص کو رہتی ہے۔ کوئی شخص بغیر مکان کے نہیں رہ سکتا۔ مذکورہ الفاظ سے پریشان حال مفرور کی حالت کی تصویر کشی اور عدم استقرار کا اظہار مقصود ہوتا ہے پس جس طرح واجب المکان جسم کے لئے بے مکان ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں واجب التنزہ خدا کے لئے عرش کو مکان قرار دیا گیا ہے اول شق میں مکان ہونے کی نفی ہوتی ہے نہ دوسری صورت میں مکان کا ثبوت۔ پہلی شق میں اختیارات کا چھن جانا اور مفرور ہونا مقصود ہوتا ہے دوسری صورت میں خود مختار، قادر اور عظیم القدر ہونے کا اظہار اصل غرض ہے۔

اس تشریح پر ایک شبہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ لفظ ثُمَّ عربی زبان میں تاخیر فعل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر لفظ ثُمَّ سے پہلے کوئی فعل مذکور ہو اور

ثُمَّ کے بعد کوئی دوسرا فعل ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ اوّل فعل دوسرے فعل سے بہت پہلے ہوا ہے ۔ مثلاً جاء زید ثم عمر کا مطلب یہ ہے کہ زید عمر سے بہت پہلے آیا ۔ لیکن اگر آیت میں یہی مراد ہو تو مطلب غلط نکلتا ہے ۔ کیا اللہ نے آسمان زمین اور کائنات کو پیدا کرنے کے بہت بعد حکومت خود اختیاری پر قبضہ کیا ؟ کیا تخلیق سے پہلے اور تخلیق کے دوران میں اس کو اختیارات حاصل نہ تھے ؟

اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ لفظ ثُمَّ کا استعمال عربی میں صرف تاخیر فعل کے لئے ہی نہیں ہوتا بلکہ بیان قصہ کی تاخیر کے لئے بھی ہوتا ہے اگر کسی واقعہ کو بعد کو ظاہر کیا جائے تو لفظ ثُمَّ کا استعمال کیا جاتا ہے ۔ خواہ وہ واقعہ پہلے کا ہو یا بعد کا ۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ نے تمام جہان کو بنایا ، لیکن بنا کر یہ کارخانہ چھوڑ دیا تھا بلکہ سارے سنسار کی حکومت بھی اپنے دستِ تصرف میں رکھی ۔ اس نے سب کو پیدا تو کیا پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ ملکیت و ملوکیت بھی اُسی کے قبضہ میں ہے گویا آیت میں لفظ ثُمَّ تاخیر حکایت کے لئے ہے ۔ تاخیر محکی مقصود نہیں ۔

۲ بیضاوی اور رازی وغیرہ نے لکھا ہے کہ عربی میں لفظ استوار کا معنی استیلا اور غلبہ بھی ہے ۔ ایک شاعر کا شعر ہے : ۔

قد استوی بشر علی العراق　　　من غیر سیف ودم مهراق

یعنی بغیر شمشیر زنی اور خون ریزی کے عراق پر بشر کا تسلط اور غلبہ ہو گیا ۔ آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے ۔ مطلب یہ ہوا کہ آسمان اور زمین اور درمیانی کائنات کو اللہ نے پیدا کیا ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عرش اس کے تصرف اور استیلاء سے خارج ہے ۔ ایسا ہرگز نہیں عرش پر بھی اللہ کا تسلط ہے ۔ اس صورت میں لفظ ثُمَّ تاخیر حکایت اور محض ترتیب بیان کے لئے ہوگا ۔ تاخیر واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ۔

۳ استوار کا ترجمہ استقرار بھی ہے اور آیت میں یہی مراد ہے ، لیکن عربی زبان میں بلکہ ہر زبان میں قرار پکڑنا ، ٹھہرنا اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ دو معنی رکھتے ہیں ۔ جسمانی قرار اور آخری فیصلہ ۔ مثلاً زید نے تخت پر قرار پکڑا ۔ عمر چارپائی پر ٹھہر گیا ۔ ان مثالوں میں جسمانی قرار مراد ہے ، لیکن اگر اس طرح کہا جائے کہ اختلاف کے بعد جمہوری کی رائے یہ ٹھہری کہ زید کو رہا کر دیا جائے تو اس مثال میں رائے کے ٹھہرنے سے مراد ہوتا ہے ۔ اتفاق آراء اور آخری فیصلہ یا قطعی ارادہ یا اسی کے مشابہ کوئی دوسرا مفہوم مراد ہوتا ہے ۔ مؤخر الذکر مثال میں چونکہ قرار جسمانی ممکن نہیں ، اس لئے قرار کا اوّل معنی مراد نہیں ہو سکتا ۔ پس آیت میں بھی چونکہ استقرار اور استواء سے جسمانی استقرار و استواء مراد لینا ممکن نہیں ۔ اللہ ہر جسمانیت سے پاک ہے اور تمام حدود مکانی سے منزہ ، اس لئے مؤخر الذکر معنی ہی مراد ہیں ۔ مطلب یہ ہوا کہ آسمان و زمین کو تو خدا نے پیدا کیا ، لیکن اس کی صلاحیت اُنہی کی تخلیق پر مخصوص نہیں ہے بلکہ عرش کی تخلیق بھی اُسی کی مشیت اور قطعی ارادہ سے ہوئی ہے ۔ اُسی کا فیصلہ عرش پر بھی حاوی ہے ۔ اس طرح کی دوسری تشریحیں بھی اہل تفسیر نے لکھی ہیں جن کا نقل کرنا موجب طوالت ہے ۔ غیر مذاہب کے شبہات کو دور کرنے کے لئے یہ تشریحات تو کافی ہیں ، لیکن سب سے اعلیٰ اپنی لاعلمی کا اظہار ہے ۔ کما ذکرناہ اولاً ۔

مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۔ اوپر کی آیات میں اللہ کا خالق کائنات ہونا ثابت کیا گیا تھا جس سے مقصود توحید الوہیت کا ثبوت تھا ، لیکن کچھ سادہ لوح آدمی ایسے بھی ہیں جو توحید کے اصل گُر سے ناواقف ہیں یا ایسے عیار ہیں جو دانستہ توحید کو شرک سے آلودہ کر کے اصل مقصد کی طرف سے غافل بنتا چاہتے ہیں ۔ اللہ کو واحد یکتا اور لاشریک ماننے کا اصل مدعا یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور تعمیرِ کائنات کو تخریب سے نہ بدلے اور قوانینِ کائنات پر کاربند ہو کر نظامِ فطرت کو مضبوط کرنے میں مدد کرے اور اس ضابطہ کے موافق اپنی زندگی کو سنوارے جو ایک اللہ کی طرف سے سارے سنسار میں جاری و ساری ہے ، لیکن بعض کور دماغ یا کج ذہنیت رکھنے والے ایسا نہیں کرتے ۔ کہنے کو تو اللہ کو واحد اور خالق کائنات کہتے ہیں ، لیکن پھر بھی قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عملی یا اعتقادی طور پر دوسروں کے سامنے دستِ اُمید پھیلاتے ہیں اور اپنی بدکرداری کے لئے طرح طرح کے حیلے بناتے ہیں ۔ ایسے کج یا کور دماغ رکھنے والوں کو دو معنوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا طبقہ وہ ہے جو اللہ کی وحدت ، الوہیت اور خلاقیت کا اقرار کرنے کے باوجود مخلوق میں سے بعض چیزوں کو کارساز تو نہیں لیکن اور مددگار جانتے ہیں ۔ مثلاً ستاروں کی رفتار اور طلوع و غروب سے جب اُن کو سنسار کا نظام وابستہ دکھتا ہے تو کہتے ہیں ستارے ہمارے مددگار ہیں ۔ ہمارا رزق ، ہماری صحت اور ہماری زندگی ان سے وابستہ ہے ۔ یہ ہمارے کارساز ہیں ، مددگار ہیں ۔ پس ان کو خوش رکھنا اور ان کی پرستش کرنی ہمارا فرض ہے حالانکہ خدا ہے ۔ اگر یہ ناصر ، حامی اور بگڑی کو بنانے والے ہیں ۔ تاریکی اور روشنی ، غلہ کی پختگی اور پیداوار ، ہواؤں کا تغیر ، موسم کا انقلاب اور وہ تمام دوسرے آثار فطرت کی طرف سے ان ستاروں کی اضطراری غیر اختیاری رفتار کے نتائج مقرر کئے گئے ہیں اُن کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ فریب و وہم میں مبتلا ہو کر اسباب و نتائج کی ہوا بکی

کو علت و معلول اور مؤثر و متاثر کا باہمی نظام سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ ستارے ان کی نظر میں مایۂ صد تعظیم ہوتے ہیں اور ستاروں کی اصلی شکل سے ہر شخص واقف نہیں ہوتا، اس لئے اس طبقے کے علماء ستاروں کی شکلیں بنا کر لوگوں کے سامنے لاتے ہیں۔ خود بھی اُن کی عظمت کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی عظمت کراتے ہیں۔ کلدانی، یونانی، ایرانی اور ہندی دانش مندوں کو اسی فریب نفس نے تباہ کیا۔ اسی وہم پرستی کا انتہائی نتیجہ یہ ہوا کہ خوشی، غم، عشق اور دوسرے وجدانیات کو ستاروں کے زیر اقتدار سمجھا جانے لگا اور وجدانیات کے ناموں پر ستاروں کے نام تجویز کئے گئے اور ہر وجدانی کیفیت کا کارساز خاص ستارہ کو سمجھ کر اصلی کیفیت کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کی جانے لگی۔ جزیرۂ عرب میں بھی نزولِ قرآن کے وقت اس عقیدہ اور مسلک کے کچھ آدمی رہتے تھے جن کو ہمسایہ ممالک سے ربط ضبط کرنے یا بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ آیت مذکورہ کا پہلا فقرہ ان تمام بے ہودہ خیالات کی تردید کر رہا ہے۔ صاف صراحت فرما دی ہے کہ اللہ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہی خالق کائنات ہے اور کائنات میں سے کوئی کسی کا کارساز نہیں۔ ظاہری کارسازی اور مددگاری سے دھوکہ کھانا دماغ کی غلطی ہے۔ اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا نہ اُس کے علاوہ کوئی حقیقی کارساز اور مددگار ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو صنم پرست نہیں، ستارہ پرست نہیں، عناصر پرست نہیں۔ توحید الوہیت اور خالقیت کو بھی مانتا ہے۔ خدا کو کارساز بھی جانتا ہے، لیکن انبیاء و اولیاء کو اپنا سفارشی کہتا ہے اور شفاعت کے بھروسے پر اعمال خیر اور اقوال اصلاح کو ترک کر بیٹھا ہے گویا اُن کی ہوا پرستی اور بداعمالی کے جواز کے لئے اہل شفاعت کی آڑ ہاتھ آ گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم جانتے ہوئے گرفتاری اور سزا یابی سے بلند سمجھے ہوئے ہے اور صرف اس وجہ سے سمجھے ہوئے ہے کہ جس کے جھنڈے کے نیچے وہ اپنے کو داخل سمجھے ہوئے ہے اور صرف اسی وجہ سے سمجھے ہوئے ہے کہ جس کے جھنڈے کے نیچے وہ اپنے کو داخل سمجھے ہوئے ہے وہ اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ ہے۔ یہ بھی درحقیقت فریب نفس ہے، اغوائے شیطانی ہے۔ اوّل تو اس طور پر شفاعت کا عقیدہ غلط ہے۔ دوسرے مورت پرستی اور صورت پرستی کا جواز اس سے کسی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، گوتم بدھ، سری کرشن جی اور رام چندر جی کی مورتیاں اور تصویریں کی تعظیم و تکریم خوش گمانی تک بھی نہیں پیدا کر سکتی۔ آیت کے آخری ٹکڑے میں صراحت فرما دی ہے کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔ کسی کو مجال نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف لب کشائی کر سکے۔

بحثِ شفاعت کی تنقیح

قرآن پاک کی بعض آیات سے شفاعت کا سلب اور اثبات دونوں مستفاد ہوتے ہیں۔ مثلاً آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ میں شفاعت کی نفی کر کے استثناء کو اذنِ الٰہی سے مشروط کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اذن حاصل ہونے کے بعد بعض حضرات بعض لوگوں کی سفارش کریں گے، لیکن اس جگہ جو آیت مذکور ہے اُس میں شفیع کی نفی کی گئی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مبحث کی تنقیح کر دی جائے اور یہ بیان کر دیا جائے کہ کس قسم کی شفاعت ناممکن ہے اور کس قسم کی سفارش ممکن۔

دنیا میں حاکموں سے سفارش کئی طرح پر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص بادشاہ کے حضور میں مجرم ثابت ہوا اور کوئی امیر وزیر اپنی سفارش سے اس کو بچانے کے درپے ہو جائے اور حالت یہ پیش آئے کہ بادشاہ کا جی تو اس مجرم کو چھوڑنے کو نہ چاہتا ہو مگر امیر سے دب کر یا حکومت کی کسی مصلحت کے زیر اثر چار ناچار اس کی تقصیر معاف کر دے اس قسم کی سفارش بارگاہِ الٰہی میں ناممکن ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بادشاہ اپنے کسی مقرب کی محبت سے مجبور ہو کر مجرم کی تقصیر معاف کر دے اور اپنا غصہ پی جائے۔ بارگاہ خداوندی میں اس طور پر بھی سفارش ناممکن ہے اللہ کسی کی محبت سے مجبور نہیں ہو سکتا۔ نہ قہرِ الٰہی کو کسی کی محبت دور کر سکتی ہے۔ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ بھی شرک اور جہالت ہے۔ مشرکوں اور کافروں کا عقیدہ اسی طرح کا تھا اور ہوتا ہے۔ انبیاء، اولیاء، اور بزرگانِ ملت کو وہ اسی طرح کا شفیع جانتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں انہی دونوں طرح کی شفاعت کی نفی کی گئی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جرم ثابت ہو گیا، مگر وہ مجرم ہمیشہ کا مجرم نہیں نہ جرم اس کا پیشہ ہے نہ وہ جرم کرنے پر دلیر ہے، مگر نفس کی شامت یا بھول سے کوئی قصور ہو گیا۔ اس پر وہ شرمندہ اور نادم ہے۔ دن رات ڈرتا ہے، پچھتاتا ہے، بادشاہ کے آئین کو سر اور آنکھوں پر رکھتا ہے۔ اپنے کو قصوروار اور گنہگار سمجھتا ہے اور سزا کے لائق جانتا ہے اور کسی وزیر امیر یا مقرب کی حمایت یا سفارش نہیں ڈھونڈتا نہ بادشاہ پر کوئی بیرونی دباؤ ڈالتا ہے۔ اپنے آپ کو بادشاہ کے حکم کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ ذلت و مسکنت، عاجزی اور شرمندگی دیکھ کر بادشاہ کو اس پر ترس آتا ہے مگر آئین حکومت بے سبب درگزر کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے کسی امیر کو سفارش کرنے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ امیر وزیر بادشاہ کی مرضی پا کر عفو و درگزر کی سفارش کر دیتا ہے اور بادشاہ اس کی عزت بڑھانے کو سفارش کے نام پر مجرم کی تقصیر معاف کر دیتا ہے۔ اس امیر نے مجرم کی سفارش اس لئے نہیں کی کہ وہ بادشاہ کا قرابت دار، دوست، آشنا، عزیز اور محبوب ہے یا مجرم کا حمایتی بنا ہے

نہ بادشاہ نے اس کو یہ منصب دیا کہ وہ مجرموں کی سفارش کرکے چھڑوں، تاکہ مجرموں اور نافرمانوں کو آئین کی خلاف ورزی پر دلیر کرتا رہے بلکہ محض بادشاہ کا ایماء پاکر اس نے سفارش کردی۔ سفارش خود بادشاہ کی مرضی اور ایما سے ہوتی۔

اس جگہ فقرۂ مذکورہ میں اوّل الذکر دونوں قسم کی شفاعتوں کی نفی کی گئی ہے اور جہاں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے وہاں شفاعت بالاذن یعنی شفاعت کی تیسری قسم مراد ہے۔ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ۔ بعض اہلِ توحید خدا کو واحد معبود خلاق رب اور قادر مطلق جانتے ہیں۔ اس کے سوا کسی کو کارساز اور حامی بھی نہیں سمجھتے نہ غلط طور پر شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن یہ خیال اُن کا مزور ہوسکتا ہے کہ چونکہ دنیا دار الاسباب ہے۔ یہاں کی ہر چیز دوسری چیز سے وابستہ ہے۔ جس طرح ظاہری مادی دنیا میں سے بعض چیزیں بعض چیزوں کی پیدائش اور ظہور کے اسباب ہیں۔ سمندروں سے بخارات کا اٹھنا، بخارات کا ابر بننا، ابر کا گرمی کے سبب ٹپکنا، برسے ہوئے پانی سے سبزہ کا اُگنا، سبزہ میں پھول پھل آنا، پھول پھل کا حیوان اور انسان کی غذا بننا غرض یہ اسباب و مسببات کی زنجیر ازل سے ابد تک اور آغاز سے انجام تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس کائنات کا اندرونی انتظام بھی غیبی ملائکہ اور ارواح اولیاء کے متعلق کر دیا گیا ہے۔ موکل، فرشتے اللہ [illegible] یہاں کارفرما ہیں، مدبر عالم ہیں، اُن کو تصرف کامل کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ دنیوی معاملات میں انبیاء، اولیاء کی مقدس ارواح اور ملائکہ سے مدد طلب کرنا اسی خیال پر مبنی ہے، مگر یہ عقیدہ بھی جاہلانہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کام پر ایک ایک فرشتہ مقرر ہے۔ یہاں تک کہ بارش کے ہر قطرہ کو نیچے لانا بھی فرشتہ ہی کا کام ہے، لیکن کسی روح یا فرشتہ کو تصرف کامل کا کوئی اختیار نہیں وہ از خود کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اپنے اختیارات کسی کے سپرد نہیں کئے۔ نہ کسی کو مختار بنا کر خود معطل اور غافل ہو کر بیٹھ گیا بلکہ آسمان سے لے کر زمین تک سارے عالم امر یعنی ارواح مجردات اور ملائکہ کا انتظام بھی اُسی کے دستِ قدرت میں ہے وہ غافل نہیں، معطل نہیں، عاجز نہیں۔ اس کو وزیروں اور کارندوں کی ضرورت نہیں۔ خود ہی تدبیر عالم کرتا ہے اور ہر قسم کی ہر چھوٹے سے چھوٹے کام پر غیبی طاقتوں کو خود ہی مامور فرماتا ہے۔ آیت مذکورہ کا یہی مطلب ہے۔

ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت کا تفسیری مطلب اس طرح لکھا ہے کہ امر الٰہی آسمان سے اُتر کر زمین تک آتا ہے اور پھر امر کے مطابق انتظام عالم ہوتا ہے۔ اس کے بعد امر کے مطابق عمل (یعنی تعمیلی رپورٹ) اللہ کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ گو یَعْرُجُ کی ضمیر اُس عمل کی طرف راجع ہے جو معنیً مذکور ہے۔ میرے نزدیک یہ مطلب رکیک تاویل کا محتاج ہے اور سیاقِ آیت کے بھی خلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ يَعْرُجُ کی ضمیر امر کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آسمان سے لے کر زمین تک اللہ ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ پھر ہر کام اُسی کی جانب لوٹ کر جائے گا۔ یعنی فنا کے بعد ہر ایک چیز اُسی کی طرف لوٹے گی۔

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔ ہمارے بیان کردہ مطلب کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس تقدیر پر اس آیت میں جس یوم کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس کی مقدار دنیوی حساب کے اعتبار سے ایک ہزار سال بتائی گئی ہے۔ اس سے مراد روزِ قیامت ہے یعنی قیامت کے دن ہر چیز اور ہر بات کا رجوع اللہ کی طرف ہوگا۔

روزِ قیامت کی مقدار اس جگہ ایک ہزار برس اور آیت فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ مما تعدون میں پچاس ہزار برس بتائی گئی ہے، لیکن دونوں جگہ تعیینِ زمانہ مقصود نہیں صرف طوالتِ مدت ظاہر کرنی غرض ہے۔ واقع میں قیامت کا دن نہ ہزار برس کا ہوگا نہ پچاس ہزار برس کا بلکہ بہت لمبا دن ہوگا جس کو ہزاروں برس کا دن کہا جا سکتا ہے، لیکن اگر امام رازی کے بیان کردہ مطلب کو صحیح مان لیا جائے تو آیت تاویل طلب ہوگی۔ اس صورت میں یوم سے مراد روزِ قیامت نہ ہوگا بلکہ نزولِ امر اور عروجِ عمل کا دن مراد ہوگا اور دو طور پر تفسیری مطلب بیان کیا جائے گا۔

۱۔ چونکہ آسمان سے زمین تک بظاہر احادیث کے اعتبار سے پانچ سو برس کی راہ ہے، اس لئے جب آسمان اور زمین پر امر الٰہی نازل ہوتا ہے تو پانچ سو برس کی مدت کی ضرورت ہے اور جب امر کے مطابق عمل کا صعود ہوتا ہے تو اس کے لئے بھی پانچ سو برس لازم ہیں۔ دونوں کا مجموعہ ایک ہزار برس ہوا۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ امر الٰہی کا نزول اور عمل کا رجوع روز مرہ ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کام کے لئے دنیوی حساب سے ایک ہزار برس کی مدت ضروری ہے۔

۲۔ یوم سے مراد ایک دن نہیں بلکہ وقت اور زمانہ مراد ہے۔ اگر کسی کا حکم ایک دو روز جاری رہے اور پھر منقطع ہو جائے تو ہمہ گیری اور حکومت کا اتنا اظہار نہیں ہوتا جتنا مدت دراز تک حکم کے جاری رہنے سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا حکم اتنے طویل زمانے تک اور طویل مدت سے جاری ہے کہ جس کا ایک دن ہزار برس کی برابر ہے۔ اب اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک دن کی مقدار اتنی طویل ہے تو ایک ہفتہ ایک مہینہ ایک برس اور صدہا

بریں کی مقدار کتنی لمبی ہوگی۔ غرض یہ کہ اللہ کا حکم ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

ایک نکتہ امام رازی نے جو مطلب بیان کیا ہے اس میں ایک خاص لطیفہ مضمر ہے۔ پہلی آیت میں تخلیق عالم اجسام کا ذکر کیا تھا اور استقرار مکان کا تذکرہ کر کے عظمت، حکومت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ اس جگہ تدبیر عالم ارواح کا ذکر فرمایا اور طویل زمانہ کا تذکرہ کر کے اجراء امر کے دوام کی طرف اشارہ کیا۔ گویا دونوں آیتوں کے مجموعہ سے اللہ کی حکومت کی عظمت اور حکم کا نفاذ کامل ظاہر ہوگیا۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ غیب سے مراد عالم ارواح اور شہادۃ سے مراد عالم اجسام ہے۔ یا غیب سے اشارہ اُس کائنات کی طرف ہے جو ابھی تک نمودار نہیں ہوئی آئندہ ہونے والی ہے اور شہادت سے اس مخلوق کی جانب اشارہ ہے جو پیدا ہو چکی ہے جہاں دونوں لفظوں سے باطن اور ظاہر مراد ہے بہرحال اللہ کے علم کی ہمہ گیری بیان کرنی مقصود ہے اور علم کی ہمہ گیری سے تدبیر کامل کا ثبوت ہوتا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ انتظام عالم کے لئے علم کامل کی ضرورت ہے اور اللہ کا علم محیط کل ہے۔

الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ یعنی اللہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ کافروں سے انتقام لینے پر قادر ہے اور وسیع الرحمۃ ہے۔ فرماں برداروں پر رحم فرمانے والا۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ۔ الرحمٰن اور حاکم مطلق ہونے کے لئے چند امور کا موجود ہونا ضروری ہے۔ (۱) خلاقِ کل ہو (۲) مدبر کامل ہو، مکمل نظم و تربیت کا تعلق اُسی سے ہو (۳) اس کا علم محیط کل ہو۔ (۴) قادر مطلق ہو، فرماں برداروں کو جزا اور نافرمانوں کو سزا دینے کی طاقت رکھتا ہو (۵) صاحب ارادہ ہو جو کام کرے ارادہ اور مشیت سے کرے اور اس کی مشیت آزاد ہو۔ اوّل الذکر چاروں امور کا بیان آیات مذکورہ بالا میں کر دیا گیا۔ پانچویں نمبر کا ذکر بھی فی الجملہ آ گیا تھا کیونکہ تخلیق عالم اور تدبیر بغیر آزاد ارادہ اور غیر مقید مشیت کے ناممکن ہے، لیکن یہ دونوں فعل جس زور اور شان کے ساتھ کمال قدرت پر دلالت کرتے ہیں اتنی صراحت کے ساتھ ارادہ اور مشیت پر دلالت نہیں کرتے۔ شاید یہ ممکن ہو سکے کہ تخلیق عالم اور تدبیر اضطراری اور بغیر ارادہ کے ہو یا یہ افعال ارادی ہوں، مگر ارادہ بجائے خود اتفاقی ہو، اس لئے اس آیت میں ایک ایسے فعل کی صراحت فرمائی جس سے کمال ارادہ اور بے قید مشیت کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان کی آفرینش گوناگوں تغیرات کی حامل ہے۔ پانی اور مٹی کا ایک مخلوط قوام خاص تناسب کے ساتھ تیار کرنا پھر اُس سے انسانی پتلا بنانا پھر اس کے اعضائے داخلی و خارجی ہموار کرنا اور روح پھونکنا پھر اس کے نوعی سلسلہ کو باقی رکھنے کے لئے غذائی اجزاء میں ہزاروں تغیرات اور ان گنت انقلابات کر کے جوہر منوی تیار کر کے جیتا جاگتا انسان بنانا اور پھر اس خاکی پیداوار کو صاحبِ حیات بنا کر عقل شعور اور حصول علم کے بیرونی ذرائع پیدا کرنا کمال ارادہ کی خاص نشانی ہے۔

ایک خاص نکتہ أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ فرمانے کے بعد خصوصیت کے ساتھ تخلیق انسانی کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ كُلَّ شَيْءٍ میں انسان بھی داخل تھا، لیکن انسانی تغیرات کو غور کے ساتھ دیکھنے کی دعوت دینے کے لئے تخلیق انسانی کی تفصیلی کیفیت مستقل طور پر بیان فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان خلاصۂ کائنات ہے، مادی اور مجرد مخلوق کا مجموعہ ہے، روحانیت اور جسمانیت کی معجون ہے اور ساری کائنات پر فضیلت رکھتا ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ۔ یعنی سب سے پہلے انسان (آدم) کو اللہ نے پانی اور مٹی کے مخلوط قوام سے بنایا، لیکن ہر انسان کا پتلا تیار کرنے کا یہ قاعدہ نہیں مقرر کیا بلکہ عام انسانی تخلیق کے لئے یہ قاعدہ بنا دیا کہ والدین کے تمام اجزائے بدن سے اصل جوہر جو حقیقت میں نا قابل التفات حقیر ترین رطوبت ہے کھینچ کر ہونے والے نوعی کا سلسلہ جاری کیا۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ یعنی انسان کا قوامی مادہ تیار کرنے کے بعد اس کی اندرونی اور بیرونی جسمانی ساخت کو ہموار کیا۔ رگ پٹھا، ہڈی آنت، معدہ، جگر، دل، طحال، گردے، دماغ، آنکھ، ناک، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں غرض تمام اجزا اور اعضا کو خاص توازن اور ضروری تناسب کے ساتھ بنایا۔ ہر جزو کو اس کی مناسب جگہ پر رکھا۔ اس کے بعد اپنی خاص روح اُس کے اندر پھونکی اور بے حس بے جان لاشہ کو جاندار اور متحرک انسان بنا دیا۔

ایک ضروری تنقیح روح کیا چیز ہے؟ کیا کوئی گیس یا ہوا ہے جس کو بدن کے اندر پھونک دیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا اعضائے بدن کے کٹنے، گلنے، سڑنے اور تغیر پذیر ہونے سے روح بھی کٹتی گلتی سڑتی اور تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے یا روشنی کی طرح کٹتی پھٹتی اور سڑتی گلتی نہیں ہے یا پھول کی خوشبو کی طرح ہر جزو میں سرایت کئے ہوئے ہے یا عقل اور قوت علمیہ کی طرح کسی محل اور مکان کی محتاج نہیں ہے۔ مباحث اسلامیہ کی تنقیح کرنے والوں نے

اس کے متعلق بہت کچھ کھینچ تان کی ہے اور دماغ کھپائے ہیں ۔ یہ جگہ زیادہ تفصیل کی نہیں ہم مجمل تبصرہ کرنا چاہتے ہیں ۔

اللہ نے دو عالم پیدا کئے ہیں ۔ عالم خلق اور عالم امر یا عالم مادی اور عالم مجرد یا جسمانی اور غیر جسمانی یا محسوس اور غیر محسوس ۔ بہر حال الفاظ مختلف ہیں ۔ مطلب سب کا ایک ہے ۔ پھر دونوں عالموں میں حکیم کامل نے ایک خاص ربط اور تعلق بھی رکھا ہے ۔ عالم امر حاکم ہے اور عالم خلق محکوم ۔ عالم خلق کا ذرہ ذرہ لاشعور بیجان تھا ، بے حس اور بے حرکت تھا ۔ نہ اس میں نمو تھا نہ شعور بلکہ اس کے تمام اجزاء پراگندہ تھے غیر مجتمع تھے ۔ باہم کچھ ربط نہ تھا ۔ اللہ نے ان میں ربط کی قوت پیدا کی جو بالکل غیر مادی اور غیر جسمانی تھی ۔ اس غیر مادی قوت رابطہ نے پراگندہ مادی اجزاء کے ہر ذرہ پر اپنا اثر ڈالا اور ان میں ربط پیدا ہو جانے کا حکم دیا ۔ وہ خود الگ رہی ، مگر اس کے اثر سے پراگندہ اجزاء کا کوئی ذرہ نہ بچ سکا ۔ عالم مادی کے کسی جز کی مجال نہ تھی کہ اس غیر مادی قوت رابطہ کے حکم سے سرتابی کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ مادی دنیا کے غیر مجتمع اجزا مجتمع شکل میں نمودار ہو گئے ۔ اس کے بعد اللہ نے نمو ، حس حرکت ، ارادہ ، مشیت ، خواہش اور شعور پیدا کرنے والی قوتوں کو اس مادی کائنات پر مسلط فرما دیا جو بجائے خود تو غیر مادی تھیں ۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا دائرۂ عمل اور احاطۂ حکمرانی یہی عالم مادی تھا ۔ ہر قوت نے اپنا اثر ڈالا ، حکم نافذ کیا اور مختلف مادی مرکبات نے مختلف طور پر ان قوتوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی مادی مرکب نامی بن گیا کوئی متحرک اور حساس اور صاحب ارادہ اور مالک شعور وغیرہ ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ تمام حکمران قوتیں نہ جسمانی تھیں نہ مادی نہ محسوس نہ عالم خلق کے اجزاء نہ کسی جسم میں داخل تھیں نہ کسی سے خارج نہ ان کا کوئی خاص مکان تھا نہ مقام ۔ بات یہ ہے کہ کسی چیز میں داخل ہونا یا کسی چیز سے خارج ہونا مادی چیزوں کی خصوصیت ہے اور چونکہ مذکورۂ بالا قوتیں مادی نہیں ، اس لئے ماديات میں داخل یا خارج ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ، لیکن اس کے باوجود حکمرانی امر نافذ ، تدبیر اور تصرف کا تعلق ماديات سے ان کا ضرور ہے ۔ محسوس اور غیر محسوس میں ایک خاص کشش ہے ، ایک غیر محسوس ربط ہے ، ایک ضروری نظمی شاقہ ہے جس کی وجہ سے بے حس مادہ میں حس و حرکت اور جلد جسم میں نمو اور بے شعور مخلوق میں شعوری کیفیت کے آثار محسوس ہوتے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ عالم امر کی تمام قوتیں غیر مادی ہیں ، بلکہ مادہ کے اندر نہ داخل ہیں نہ کسی سے خارج نہ مکانیت اور عدم مکانیت کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے ۔ صرف حاکم ، آمر ، مدبر ، متصرف اور مسلط ہیں پھر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ مذکورۂ بالا تمام قوتیں ایک درجہ اور ایک حیثیت نہیں رکھتیں ۔ ان کے مدارج اور مراتب ترتیبی ہیں ۔ ان کے آپس میں بھی حاکمیت اور محکومیت یا بلندی اور پستی یا فضیلت اور مفضولیت کا فرق ہے ۔ بالائی قوت اپنے فرائض کی سرانجام دہی اسی وقت کر سکتی ہے جب زیریں قوت اپنی خدمات پوری کر چکے ۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھو کہ مادہ کے پراگندہ اجزاء میں ربط اور اجتماع پیدا کرنے والی قوت سب سے پہلے بروئے کار آتی ہے ۔ پھر اس اجتماع اور ربط کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے والی قوت اپنا کام کرتی ہے ۔ پھر بڑھاؤ اور نمو پیدا کرنے والی قوت خدمت مفوضہ کو ادا کرتی ہے ۔ پھر ارادہ ، حس اور شعور پیدا کرنے والی قوتیں علی الترتیب اپنے اپنے واجبات کو پورا کرتی ہیں ۔ اوپر والی قوت اسی وقت اپنا کام کرتی ہے جب نیچے والی قوت اپنی خدمت پوری کر چکے ۔ گویا یہ تمام قوتیں آمر اور حاکم تو ہیں ، مگر حکمرانی میں ایک مرتبہ نہیں رکھتیں ۔ کوئی بڑی حکمران ہے کوئی چھوٹی کوئی اس سے چھوٹی ۔ چھوٹی قوت کا کام جب ہو چکتا ہے تو بڑی حکمران اپنا کام کرتی ہے ۔ نیچے والی قوتیں خادم ہیں اور اوپر والی مخدوم یا یوں کہو کہ اوپر والی قوت زیریں قوت کو تکمیل خدمت کا حکم دیتی ہے اور زیریں قوت اس کے حکم کو قبول کرتی ہے ، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور قوت ہے جو آمر مطلق ہے ، مستقل حاکم ہے جس کا کام سوچنا سمجھنا ، علم حاصل کرنا اور نتائج اخذ کرنا ہے جس کی وسعت رس نہ فقط خاص مادی چیزوں تک ہے بلکہ غیر مادی ثمرات کی تحصیل بھی اس کا شیوہ ہے ۔ تصورات ، تخیلات ، توہمات اور تعقلات اسی کی کارفرمائی کے مظاہر ہیں ۔ تمام مادی اجسام اور مادیات سے تعلق رکھنے والی قوتوں پر حکومت کرنا اس کا کام ہے ۔ اس کا تعلق براہ راست ذات باری تعالیٰ سے ہے ۔ عالم امر کی کسی اور قوت سے وہ استفادہ نہیں کرتی نہ کوئی اور قوت اس کی حکمران ہے ۔ وہ سب پر حاکم ہے اور سب اس کی محکوم ہیں اور سب مامور ۔ جب اس کا تعلق اس مادی دنیا سے ہو جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مادیات کے ذرے ذرے میں کوئی گیس پھونک دی گئی ہے ۔ واقع میں نہ وہ گیس ہے نہ پھونکے جانے کی چیز ہے نہ مادہ کے اندر داخل یا خارج ہونے کی اس میں صلاحیت ہے ۔ ہاں اس کا اثر تو نورپاشی جلوہ ریزی لمعہ افگنی آمریت اور حاکمیت کا تعلق ضرور قائم ہے نہ اس کو خوشبو کہہ سکتے ہیں کیونکہ خوشبو ایک مادی کیفیت کا نام ہے نہ ایسی ہے جیسے دودھ میں گھی ۔ ہاں اگر اس کی کچھ ناقص تشبیہ ہو سکتی ہے تو اس عکسی تصویر سے جو آئینہ کے اندر ثبت ہو جاتی ہے یا آفتاب کی اس عکسی تصویر سے جو آئینہ کے اندر ثبت ہو جاتی ہے یا آفتاب کی اس روشنی سے جو ذرہ ذرہ کو روشن کر دیتی ہے ، لیکن یہ تمام تشبیہات مکمل نہیں ناقص ہیں ۔ یہ سب چیزیں محل اور مکان کی محتاج ہیں ۔ بے سمجھ اور بے عقل ہیں صاحب ارادہ نہیں ، مالک اختیار نہیں ، لیکن وہ قوت ہر مکان سے مستغنی ہے ۔ غیر حاضر کو حاضر کرنے والی سیکنڈ کے لاکھوں حصہ میں غیر متناہی مسافت

قطع کرنے والی ہے، غیر موجود کو موجود بنانے والی صاحب ارادہ اور عامل اختیار ہے اور چونکہ براہ راست اس کا تعلق اللہ کی ذات پاک سے ہے، اس لئے اس کو روح اللہ یعنی بلا واسطہ اللہ کی طرف سے عطا کی ہوئی رُوح کہا جاتا ہے۔ یہی روح ہے جو عالم امر کا سب سے بڑا رکن ہے۔ مجردات کے سروں کا تاج ہے، سب سے اعلیٰ اور سب سے بالا ہے۔ مرئیات مسموعات اور معقولات کا علم اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ روح سوا انسان کے کسی مادی مخلوق کو عطا نہیں کی گئی۔ تمام مادی کائنات کی غیر مادی قوتیں اس کے زیر نگیں ہیں۔ یہی انسان کو انسان بنانے والی اور لاشۂ بے جان کو دانا، بینا اور شنوا کر دینے والی ہے۔ گویا اللہ نے براہ راست اس کو انسان کے خاکی پتلے میں پھونکا ہے۔ اس تقریر سے آیت کا مطلب کسی قدر واضح ہو گیا۔ مزید تفصیل بے محل ہے۔ اللہ

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ جب اللہ نے روح کا تعلق جسم انسانی سے قائم کر دیا۔ ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنا دیا تو پھر اس کے ثمرات کا تذکرہ فرمایا۔ سب سے اس عالم شہود میں آنے کے بعد انسان کانوں سے کام لیتا ہے، اس کے کانوں میں مختلف آوازیں پڑتی ہیں۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش دیکھتا اور تدریجی علم حاصل کرتا ہے پھر سوچنے سمجھنے کی طاقتوں سے کام لیتا ہے اور ظاہری چشم و گوش کے تغیری علمی ثمرات توڑتا ہے۔ یہ ہیں روح الٰہی کے تعلق کے خصوصی نتائج۔ یعنی مادی اور غیر مادی، محسوس، نیم محسوس اور غیر محسوس اشیا سے علمی نتائج کا اخذ کرنا روح کا خاص فریضہ ہے۔ باقی حس حرکت شعور نمو وغیرہ دوسرے فرائض قویہ ماتحت قوتوں سے وابستہ ہیں جو تمام مادیات پر حکومت کر رہی ہیں۔ جب اعلیٰ اور برتر چیز انسانوں کو روح اور جسم کے تعلق کے سبب حاصل ہو گئی تو دوسرے تمام انی اوصاف کا حصول تو بدرجۂ یقین ہونا ہی چاہیے، لیکن انسان اپنے ظاہری حواس اور باطنی مدرکات سے بہت ہی کم صحیح طور پر کام لیتا ہے۔ شکر کی بجائے کفر کرتا ہے۔ دہری اور طبیعی دماغ والے تو اللہ کی ہستی کے ہی منکر ہیں۔ رہے شیفتگان شرک تو وہ اگرچہ کہنے کو خدا کو ایک کہتے ہیں، مگر ان کی توحید شرک آمیز ہے۔ صفات الٰہیہ میں دوسروں کو ساجھی جانتے ہیں۔ غرض کان آنکھ اور قلب کا صحیح مصرف کسی کو معلوم نہیں اور معلوم بھی ہے تو صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے۔ یہ کفران نعمت ہے اور ناشکری ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ اصولی طور پر کفار کو تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو اللہ کی ہستی یا وحدانیت کا منکر ہے دوسرا گروہ وہ ہے جو رسالت کا اقرار نہیں کرتا۔ تیسرا فرقہ وہ ہے جو حشر کو نہیں مانتا۔ اسی لئے رب العالمین کی عادت ہے کہ دو اصل (توحید و رسالت) کے ساتھ تیسرے عقیدے کو ضرور بیان فرماتا ہے۔ اس جگہ بھی حسب عادت رسالت کا بیان مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ تک فرمایا اور پھر توحید کی صراحت اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سے قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ تک فرمائی۔ اب اس آیت سے حشر کے وقوع کو ظاہر کیا۔ حشر و نشر کے متعلق سطحی دماغ رکھنے والوں کو سب سے بڑا شبہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد جب اجزائے بدنی پراگندہ ہو گئے اور ذرہ ذرہ الگ ہو کر خاک میں مل گیا تو پھر ان کی تخلیق ثانوی کس طرح ہو گی۔ اعادۂ معدوم محال ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۔ اس آیت کا مطلب بقول رازی دو طرح سے کہا جا سکتا ہے (۱) کافر فقط تخلیق ثانوی اور حشر جسمانی کے ہی منکر نہیں بلکہ سارے احوال آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ بالفرض اگر وہ حشر جسمانی کو مان بھی لیں تب بھی عذاب ثواب کو نہیں مانتے۔ (۲) کافروں کی طرف سے حشر کا انکار کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کو اللہ کے پاس جانے یعنی اخروی زندگی میں حساب کتاب اور عذاب و ثواب میں ماخوذ ہونے سے انکار ہے۔ پراگندہ اجزاء کے اجتماع کو محال کہنا تو ایک بہانہ ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اپنی موجودہ زندگی کے ہر کرتوت کو سزا اور پاداش کے تخیل سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ۔ اس آیت میں تخلیق ثانوی کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ وقوع موت سے انکار کرنے کی کسی کو مجال نہیں۔ موت کا مقررہ کارندہ جسے موت کا فرشتہ کہا جاتا ہے اپنے وقت پر آتا ہے اور زندہ کو مردہ کر دیتا ہے، لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ کیا مرنے کے بعد انسان بالکل معدوم ہو جاتا ہے یا انسان باقی رہتا ہے صرف لباس اُتار دیا جاتا ہے روح پر موت طاری ہونے کا دعویٰ کوئی دانشمند نہیں کر سکتا۔ جسم کا بے حس و حرکت ہونا اور اجزائے جسم کا پراگندہ ہو جانا بالکل ظاہر بات ہے لیکن جسم پر حکومت کرنے والی غیبی طاقت کا فنا ہو جانا کیسے اور کس طرح ممکن ہو جبکہ روح نہ جسم کے اندر ہے نہ باہر۔ تصرفات اور تعلقات کا منقطع ہو جانا دوسری بات ہے اور صاحب تصرف کا معدوم ہو جانا حقیقت رکھتا ہے۔ موت کا فرشتہ آتا ہے تو روح کو قبض کر لیتا ہے یعنی اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اور مرکز ارواح میں جمع کر دیتا ہے۔ اس کا نام عدم محض اور فنائے مطلق نہیں۔ پھر جب وقت آئے گا تو مقبوضہ روح کو پارینہ لباس درست کر کے پہنا دیا جائے گا۔ نہ اس سے اعادۂ معدوم لازم آتا ہے نہ اخراج از عدم

وفات پانے کے معنی معدوم ہو جانے کے نہیں بلکہ وصول، اخذ، قبض وغیرہ کے ہیں۔ پس موت کا فرشتہ روح کو لے لیتا ہے نہ یہ کہ فنا اور معدوم کر دیتا ہے۔

شیخ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے ملک الموت کا ایک شخص معین ہونا ظاہر ہو رہا ہے اور احادیث میں عازب کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ بعض آثار میں اُس کا نام عزرائیلؑ آیا ہے۔ قتادہ اور اکثر تابعین کا یہی قول ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عزرائیلؑ کے ماتحت اور زیر دست کام کرنے والے دوسرے فرشتے نہیں ہیں۔ بعض احادیث سے ملک الموت کے اعوان کا ہونا ثابت ہے۔ ابن عباس کا قول زہیر بن محمد کی مرسل حدیث اور امام محمد باقر کی روایت اور بعض دوسرے آثار اس کے شاہد ہیں۔ بات یہ ہے کہ ماتحتوں کے کام کو ذمہ دار سردار کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے موت کا بھی ایک خاص انتظام ہے اور اس کو سرانجام دینے والی ایک غیبی مخلوق ہے اور اس کا ایک سردار ہے جس کا نام عزرائیل کہا جاتا ہے۔ پس ملائکہ کتنے ہی ہوں، لیکن سب عزرائیل کی زیر سیادت ہیں۔ جب سردار باذن الٰہی حکم دیتا ہے تو کارندے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

مقصود بیان لفظ کتاب سے اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن اصول ہدایت کا مجموعہ ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ سے اس جانب ایماء ہے کہ غلطی، وہم، شک اور جھوٹ سے قرآن پاک ہے۔ اس کا کتاب اللہ ہونا اور انسانوں کے لئے مفید ہونا یقینی ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر قسم کی تربیت کرنا اللہ کا کام ہے، اس لئے روحانی تربیت کے لئے اصول زندگی کو قائم کرنا اور بتانا بھی اسی کو زیبا ہے کسی انسان یا فرشتہ کو قانون حیات وضع کرنے کا حق نہیں ہے ھُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ پس وہ فلسفی دماغ رکھنے والے غلطی پر ہیں جو قرآن کے معانی کو تو الہامی اور القائی قرار دیتے ہیں اور تعبیر کو رسول اللہ کی ساختہ پرداختہ کہتے ہیں کیونکہ کتاب نام مجموعہ کلام ہے صرف معانی کا نہیں ہے۔ لَعَلَّھُمْ یَھْتَدُوْنَ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ رسالت کی ضرورت اور انبیاء کی بعثت صرف اصلاح خلق کے لئے ہے پیغمبر کو بھیجنا اور کتابیں نازل کرنے سے خدا کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے۔ مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ سے یہ امر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کارسازی صرف اللہ کا کام ہے۔ نفع نقصان پہنچانا اُسی کا فعل ہے۔ اُس کے بھیجے ہوئے ضرر کو کوئی دفع نہیں کر سکتا۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اُن لوگوں کو جو اولیاء، انبیاء اور صلحاء کو اپنا کارساز جانتے ہیں اور ارواحِ صالحین کو پکارتے اور ان سے مدد کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ وَلَا شَفِیْعٍ کا لفظ بظاہر مطلق شفاعت کی نفی کر رہا ہے لیکن معنی خاص قسم کی شفاعت کی نفی ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ سے اللہ کے مختار مطلق اور غیر محتاج ہونے کا بیان کرنا مقصود ہے اور غیر اللہ کے تصرفات کی نفی کرنی غرض ہے۔ گویا توحید صفاتی کا ثبوت پیش کرنا اصل مدعا ہے۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ سے اللہ کے علم کا ہمہ گیر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ پس غلطی پر ہیں جو اللہ کو جزئیات ادبیہ کا تفصیلی طور پر عالم نہیں کہتے یا اس کے علم سے کسی چیز کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں وغیرہ۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا

(اے نبی) اگر تم وہ سماں دیکھو جبکہ مجرم اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے (اور کہتے ہونگے کہ) ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا

نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ

اب ہم کو لوٹا دے تاکہ ہم نیک عمل کریں بیشک ہم کو یقین آگیا (تو اس وقت تم کو افسوس ہوگا) اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت عطا کر دیتے مگر میری طرف سے یہ بات

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ

ہو چکی ہے کہ جہنم کو جن و انس دونوں سے بھر دوں گا پس اب تم مزہ چکھو کہ تم نے اس دن میں اپنے رب سے ملنے کو

هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا

فراموش کر دیا تھا بلاشک ہم نے تم کو بھلا دیا اور اپنے کرتوت کی پاداش میں دائمی عذاب کا مزہ چکھو ہماری آیتوں پر وہی لوگ

الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩

ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور حمد کے ساتھ اپنے رب کی پاکی بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

اُن کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں بیم و امید سے اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے کچھ (راہِ خدا میں)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ أَفَمَن كَانَ

خرچ کرتے ہیں کوئی شخص واقف نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے انکے گذشتہ اعمال کے صلہ میں کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے بھلا جو شخص مومن ہو

مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا ۚ لَّا يَسْتَوُونَ ۝ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ

وہ اُس جیسا ہو سکتا ہے جو فاسق ہو یہ سب برابر نہیں ہو سکتے جو لوگ مومن اور نیکوکار ہیں اُن کے گزشتہ اعمال کے صلہ

جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا

میں اُن کے لئے رہنے کے باغ ہیں اور جو لوگ نافرمان ہیں اُن کا ٹھکانا آگ ہے جب بھی وہ

أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنتُم بِهِ

وہاں سے نکلنا چاہیں گے تو اُسی میں لوٹا دیئے جائیں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ آگ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کی تم تکذیب

تُكَذِّبُونَ ۝ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

کیا کرتے تھے ہم عذابِ اکبر کے علاوہ دنیا میں عذاب کا مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ۝ ع ۱۹

اور اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جسکو اس کے پروردگار کی آیتوں کی گئی پھر بھی اُن سے منہ موڑ گیا ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں

تفسیر رشتۂ ہدایت اور حبل المتین دانش کو کاٹنے والوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے کسی چیز کا یقین نہیں کرتے۔ ارباب وحی اور اصحاب دانش اُن کو کتنا ہی سمجھائیں، آنے والے واقعات سے ڈرائیں اور پیش بندی کا حکم دیں، مگر کج فہم بے دانش انسان کب کسی کی مانتا ہے۔ اس غفلت اور اندھے پن کی سزا یہ ہوتی ہے کہ مصائب مقررہ کا وقوع جب اپنے وقت پر ہو جاتا ہے تو اسی بے وقوف آدمی کے پاس ان سے بچاؤ کی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ اُس وقت وہ حیرانی سرگردانی کے عالم میں تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ حوادث کی رَو میں اپنے کو بہتا ہوا دیکھ کر مجبور ہوتا ہے کہ موہوم مددگار سے بھی استعانت کرے، مگر بُرے وقت میں کون کسی کا شریک ہوتا ہے۔ مایوس ہو کر پھر اُس کو آرزو ہوتی ہے کہ کاش گزشتہ ایام فراغت دوبارہ میسر ہو جائیں۔ آزادی طاقت اور وقت عمل از سر نو حاصل ہو جائے۔ مگر اس بے وقوف کو نہیں معلوم کہ قانونِ قدرت کو بدلا نہیں جا سکتا۔ فطرت نے جو ضابطہ بنا رکھا ہے اس کی شکست ممکن نہیں۔ عمل اور نتیجہ

دو جدا جدا چیزیں ہیں اور دونوں کے اوقات بھی الگ الگ ہیں جس طرح وقتِ عمل میں نتیجہ کو ڈھونڈنا طلبِ محال ہے۔ اسی طرح ظہورِ نتیجہ کے وقت امکانِ عمل کی آرزو مجنونانہ آرزو ہے۔ غرض غافل احمق کو اپنی غفلت اور بدکرداری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ظہورِ نتیجہ کے وقت نتیجہ کا مشاہدہ اور یقین سُود مند نہیں ہوتا۔ ہاں دانشمند انسان وہ ہیں جو اہلِ بصیرت کے سمجھانے یا اپنی ذہنی کاوشوں کے سبب ظہورِ نتیجہ کے وقت سے پہلے ضروری تیاریاں کر لیتے ہیں۔ اُن کو آندھی کے آنے سے پہلے موسم کی رفتار اور ماہرینِ فن کی پیش گوئیوں سے یقین ہو جاتا ہے کہ تباہی انگیز آتشیں جھکڑ ضرور چلیں گے، اس لئے وہ پہلے سے اُن کی مدافعت اور اپنے بچاؤ کی تدبیریں کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب مصیبت سر پر آپہنچتی ہے تو ان کو کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ ان کی پناہ گاہیں مضبوط اور لوازمۂ حیات کے اسباب غیر معمولی مقدار اور کافی راحت رسانی کے حامل ہوتے ہیں۔ بالکل یہی حالت اہلِ کفر اور اربابِ ایمان کی ہوتی ہے۔ منکرینِ خدا (قیامت) کو کتنی ہی بار نصیحت کی جائے۔ آنے والے دکھ سے ڈرایا جائے، آئندہ عذاب سے وعید کی جائے، وقوعِ مصیبت کے دلائل بیان کئے جائیں اور بچاؤ کی فہمائش کی جائے، مگر ان کو یقین نہیں آتا۔ اُن کی نظر فعلیت سے آگے نہیں بڑھتی۔ بصیرت کی کوتاہی ظہور سے پہلے نتیجہ کا یقین نہیں پیدا ہونے دیتی اسی وجہ سے وہ کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کرتے، بچاؤ کا سامان نہیں فراہم کرتے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ظاہر ہے جب عذاب نظروں کے سامنے آجائے گا، جب ہلاکت انگیزیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی تو اس وقت شرمندگی، مایوسی اور حیرانی کے زیرِ اثر سر جھکا لیں گے۔ اُس وقت آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سُن کر عذاب کا یقین ہوگا۔ آرزو کریں گے کہ کاش دوبارہ ایامِ فراغت اور وقتِ عمل ہم کو میسر ہو جائے اور ہم نیکو کردار بن جائیں، مگر ضابطۂ فطرت ٹوٹ نہیں سکتا۔ خدا کو کسی سے ذاتی دشمنی نہیں۔ ظہورِ نتیجہ کے وقت عمل کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اصل مقصود یقین دلانا نہیں کیونکہ اگر یہی مقصود ہوتا تو کوئی بھی گمراہ نہ بچتا بلکہ اظہارِ نتائج سے پہلے میدانِ عمل میں اطاعت و انقیاد کی جانچ کرنی غایتِ تخلیق ہے اور امتحان میں فیل ہونے والوں سے دوزخ کو بھر دینے کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اس لئے دوزخ کی بھرتی بھی ضروری ہوگی اور علمی و عملی امتحان میں فیل ہونے والوں کو ہمیشہ دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ وہاں وہ کتنی ہی درخواستِ رحم کریں، مگر شنوائی نہ ہوگی۔ جس طرح انہوں نے ندائے حق سُنی اَن سُنی کر دی تھی۔ گویا احکم الحاکمین کی پیشی کو بھول گئے تھے اسی طرح قیامت کے دن اُن کی درخواستِ ترحم اور چیخ پکار نا قابلِ توجہ قرار دی جائے گی۔ گویا اُن کو فراموش کر دیا جائے گا۔

ہاں جو لوگ دنیوی امتحان گاہ میں پاس ہو چکے ہیں جو اللہ کو تمام صفاتِ نقصان سے پاک اور اوصافِ حمیدہ کا حامل سمجھتے ہیں۔ اللہ کے سامنے سرِ نیاز جھکاتے اور پیامِ حق سے سرتابی نہیں کرتے ہیں۔ جنہوں نے سارے مفاسد سے منہ موڑ کر اللہ ہی کو خوف و طمع کا مرکز بنا رکھا ہے۔ ان کو امیدِ نجات و عافیت ہے تو خدا سے اور خوفِ عذاب ہے تو خدا سے۔ اسی بیم و رجا کی کشاکش کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف وہ راتوں کو اٹھ کر شیریں خوابِ راحت کو چھوڑ کر خوابگاہوں سے منہ موڑ کر اپنے رب سے لو لگاتے ہیں۔ دوسری طرف اپنی تمام مالی اور بدنی قوتوں کو بندگانِ خدا کی آسائش کے لئے کچھ نہ کچھ بقدرِ ضرورت صرف کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے عمل کا نتیجہ جو کچھ برآمد ہوگا اور جو سعادت ان کو حاصل ہوگی اس کا اس دنیا میں مشاہدہ تو درکنار کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کسی کے دماغ کی جولانی بھی ان راحتوں کی سرحد تک نہیں پہنچ سکتی جو اللہ نے ان کے لئے فراہم کر رکھی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر چیز کا دینے والا اللہ ہی ہے۔ اسی کی عنایت سے سب کچھ ملے گا، لیکن بدکار اور نیکوکار برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا ظالم نہیں عادل ہے اس کی عدالت کا اقتضا یہی ہے کہ نیک اعمال کی جزا اپنی رحمت سے عطا فرمائے اور بدکاروں کو آتشِ جہنم میں جلائے بلکہ عذابِ آخرت سے پہلے دنیا میں بھی بدکرداری کی سزا کو سامنے لے آئے تاکہ اہلِ فسق متنبہ ہو کر اپنی بد اطواری کو چھوڑ دیں۔ اب اس پر بھی اگر کوئی کج اندیش مجرم ناحق کوش بصیرت سے کام نہ لے اور آیاتِ قدرت دیکھنے کے بعد بھی بیدار نہ ہو اور ان کی طرف سے منہ پھیر لے تو ایسے مجرموں کو قدرت ضرور ان کے کرتوت کی پاداش دے گی۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ الخ۔ اس خطاب حضورؐ کو ہے جس سے مقصود تسلی دینی اور کفار کی اذیت رسانی پر صبر دلانا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ خطاب عمومی ہو۔ روزمرہ کے محاورات میں تخاطب کے صیغے بغیر تعیینِ مخاطب کے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً زید ایسا شریف آدمی ہے کہ اگر تم اس کے ساتھ ایک مرتبہ سلوک کرو تو وہ تمام عمر تمہارا احسان کش رہے گا۔ اس مثال میں خطاب کے صیغے موجود ہیں، مگر خاص مخاطب مراد نہیں۔ سرنگوں ہونے سے مراد ہے انتہائی شرمندگی۔ شرط کی جزا محذوف ہے۔ دیکھنے اور سننے سے مراد ہے حشر کو دیکھنا اور قولِ رسول کو سننا (کبیر) یا قولِ پیغمبر کی صداقت کو سننا۔ بہر حال کوتاہ دماغ والے چونکہ روشن اور سلیم دانش سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اُن کی قوتِ

فکر ناکارہ ہوتی ہے، اس لئے جب تک واقعی حقیقت اور یقینی صداقت ان کی نظروں کے سامنے نہ آجائے اور بُرہانی چیز عیانی نہ ہو جائے اور اپنی آنکھوں سے وہ نہ دیکھ لیں اُس وقت تک اُن کو یقین نہیں آتا۔ اسلامی تعلیم کا سنگِ بنیاد عقیدۂ قیامت ہے۔ حشرِ جسمانی اور بعثتِ ثانیہ کا یقین ہر عمل اور عقیدہ کی جڑ ہے، لیکن اس کا یقین قبل از وقت وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا دماغ بُرہانی ہو۔ جو عقل کی کسوٹی پر نظریاتِ مذہبی کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں عوام کالانعام کی قوتِ فکریہ ناکارہ اور جودتِ دماغی مُردہ ہوتی ہے۔ اُن کے ذہنوں میں حقائق کو سمجھنے سوچنے اور غور کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی، اس لئے غیر مبصر، غیر محسوس اور غیر مادی حقیقت کو سمجھنے، یقین کرنے اور اقرار کرنے کی اُن کے واسطے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو دنیا میں ہی قیامت اپنے تمام کوائف اور خواص کے ساتھ رونما ہو جائے یا فنائے عالم کے بعد دوبارہ حشر ہو اور حقائق موجودہ سامنے آجائیں۔ اوّل الذکر صورت ناممکن ہے۔ یہ دنیا دار العمل ہے عمل کی دنیا اور عمل کے زمانے میں کامل جزا سزا کی رونمائی نہیں ہو سکتی۔ ہاں مؤخر الذکر صورت ہی منکر طبقہ کے لئے ظہور پذیر ہو گی۔ جب قیامت آجائے گی نظروں کے سامنے جزا سزا اور دوزخ جنت نمودار ہو جائیں گی وہ اپنی آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھ لیں گے اور اپنے کانوں سے ہر آہنگ صداقت کو سُن لیں گے اُس وقت اُن کو کامل یقین ہو جائے گا اور یقین کے بعد عمل کی ہر خواہش بے سُود ہو گی۔ ظہورِ نتیجہ کے وقت نتیجہ انگیز کوشش ناممکن ہو گی، اس لئے اِن کو سوا حسرت و یاس کوئی عمل نہ ہو گا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا مقصودِ فطرت کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ طبعی خواہشات اور مادی جذبات سے آزاد ہو کر جو لوگ سمجھنا چاہیں انہیں کی سمجھ میں کچھ آسکتا ہے۔ عام طور پر تو یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری اصلاح، ہدایت، عافیت کوشی اور راست روی سے فطرت کی ذاتی غرض وابستہ ہے۔ اللہ کا مقصد اور اس کے مقصد سے حاصل ہونے والا ذاتی نفع یہی ہے کہ ہم اس کی پرستش کریں اور اپنے عقائد و اعمال کی درستگی کریں۔ یہ درحقیقت علم کی الوہیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ خدا کی کوئی ذاتی غرض ہماری نیکیوں اور عملوں سے وابستہ نہیں نہ ہمارے حسنِ عمل اور صحتِ عقیدہ سے اُن کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ سرتابی اور نافرمانی سے اس کا کچھ نقصان ہوتا ہے۔ نہ اُس کا یہ منشاء ہے کہ تمام عالم ہدایت یاب ہو جائے اور کوئی گمراہ نہ بچے بلکہ ایسا ہونا تو منشائے تخلیق کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پُر حکمت ہونا تو کسی ہوش مند کے نزدیک قابلِ انکار نہیں ہے۔ اللہ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ جو کچھ اس نے کیا ہے پہلے سے سوچ کر کیا ہے، لیکن اس کی حکمت و مصلحت کو تفصیل سے سمجھ لینا ناممکن ہے۔ ہاں اجمالی طور سے اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی اجمالی نظر کا جو نتیجہ فکر ہے وہ اتنا ہے کہ اللہ نے کوئی مخلوق ایسی نہیں پیدا کی جو سراسر شر اور بدی ہی ہو اور جس کے پیدا کرنے سے سوا شر کے کوئی حاصل نہ ہو۔ البتہ تین طرح کی مخلوق اللہ نے بنائی ہے۔ ایک وہ جس کی تخلیق شر کا شائبہ بھی نہیں یعنی عالم ملائکہ۔ دوسری مخلوق وہ ہے جس کی تخلیق خیر اور شر دونوں کی حامل ہے، ایسی مخلوق بھی تین گروہوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک گروہ وہ جس کی تخلیق میں خیر غالب اور قلیل ہو۔ دوسرا وہ جس کی تخلیق میں شر کثیر اور خیر قلیل ہو۔ تیسرا گروہ وہ جو مساویانہ طور پر شر اور خیر کا حامل ہو۔ مؤخر الذکر دونوں صورتیں حکمت کے خلاف ہیں)۔ شر اور خیر کو مساویانہ طور پر پیدا کرنا یا خیر قلیل کے ساتھ شر کثیر کو آمیختہ کر کے نمودار کرنا کسی عاقل کی عقل میں نہیں آسکتا۔ ہاں تیسری صورت یعنی خیر کثیر کے ساتھ شر قلیل کو پیدا کرنا خلافِ مصلحت نہیں کہا جا سکتا۔ پس تخلیق کی دو ہی صورتیں پُر حکمت ہو سکتی ہیں۔ خیر محض کو پیدا کرنا اور ایسی مخلوق کو بنانا جس میں خیر کا کثیر حصہ اور شر کا قلیل حصہ شامل ہو۔ اوّل الذکر ظلم ملائکہ کا عالم ہے اور مؤخر الذکر تخلیقِ انسان کی تخلیق ہے۔ اب یہ ممکن تھا کہ اللہ خیر محض کو ہی پیدا کرتا اور ساری دنیا نہ بناتا، لیکن شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کو چھوڑ نا بھی خلافِ حکمت تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ہم کو سراسر بنا ہدایت یافتہ کر دیتا، لیکن اُس وقت فرشتوں کی تخلیق اور انسان کی فطرت میں کوئی فرق نہ ہوتا جس طرح فرشتوں کا عالم خیر ہی کا عالم ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا بھی محض خیر کی دنیا ہوتی ہے اور وہ شق بالکل چھوٹ جاتی جس میں خیر کی کثرت اور شر کی قلت ہو سکتی تھی اور اس سے حکیم کی حکمت کا قصور لازم آتا۔ اسی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر اللہ نے خیر کو شر کے ساتھ مخلوط پیدا کیا، لیکن خیر کو غالب اور شر کو مغلوب رکھا۔ پس اُس نے نہ چاہا کہ تمام انسان ہدایت یافتہ ہو جائیں اور ملکی صفت میں داخل ہو جائیں بلکہ ہدایت کے ساتھ ضلالت کو اور روشنی کے ساتھ تاریکی کو بھی بنایا۔ تاکہ روشنی قبول کرنے والے تو نجات پائیں اور گمراہی کی طرف میلان کرنے والے جہنم کا ایندھن بنیں۔ اور وہ :۔

وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ قول پورا ہو جائے جو ابلیس نے انسانی آبادی کے پہلے فرمایا تھا کہ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ میں فطری خیر کو شر پر ترجیح دینے والوں اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے والوں سے دوزخ کو بھر دوں گا۔

یاد رکھو کہ انسان اور جنوں کو دوزخ میں بھرنے سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ نہ اس کا کوئی ایسا جذبۂ انتقام ہے کہ اس طرح اس کو سرد کیا جائے۔

حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی کہ اس طرح حکمت کی شقِ ثانی کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کے بغیر نقصانِ حکمت لازم آتا ہے۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا الخ بعض بدکار بظاہر زبان سے قیامت کا اقرار کرتے ہیں، لیکن ان کے اعمال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قیامت کا انکار ہے یا کم سے کم وہ قیامت کے قیام اور اخروی جزا سزا کو بھولے ہوئے ہیں اور بعض بدعقیدہ تو سرا سر قیامت کے قائل ہی نہیں۔ گویا انہوں نے ذکرِ قیامت کو ناقابلِ التفات سمجھ کر فراموش کر دینا ہی مناسب خیال کر لیا ہے۔ اوّل الذکر گروہ اگرچہ مستحق سزا ہے اور اس کو اپنے کرتوت کی سزا ملے گی، لیکن اقرارِ قیامت چونکہ اُس کو ہو چکا ہے، اس لئے دوامی عذاب میں ماخوذ نہ ہوگا۔ البتہ مؤخر الذکر گروہ سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ چونکہ تم نے قیامت کو فراموش کر دیا تھا، اور اس کا تم کو انکار تھا، اس لئے آج اپنے انکار اور کردار کی سزا کا مزہ چکھو۔ آج تم کو عذاب میں ماخوذ ہونا پڑے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا ہو گے۔ جیسے ہم تم کو دوزخ میں ڈال کر بھول گئے۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ الخ۔ اوپر کی آیات میں کفار اشرار کے نتائج قبیحہ ان کی حسرت و یاس اور دوامی عذاب میں ماخوذ ہونے کی صراحت فرمائی تھی تاکہ وعید شدید سُن کر سعادت مندوں کو تنبیہ ہو۔ ان آیات میں ان روشن دل رکھنے والوں کی جزا کا بیان فرمایا جن کے پیشِ نظر سوا آخرت کے اور کچھ نہیں ہے اور جن کا مرکزِ توجہ صرف حسنِ انجام ہے اور جن کے خوف و رغبت کا محوری نقطہ محض ذاتِ الٰہیہ ہے۔ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان والے درحقیقت وہ ہی آدمی ہیں اور اللہ کے احکام پر یقین انہی لوگوں کا ہے کہ جب آیاتِ الٰہیہ ان کو سُنائی جاتی ہیں اور قرآن اُن کو نصیحت کرتا ہے تو وہ بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی ستایش کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ صفاتِ نقص و عیوب سے اس کو پاک جانتے اور پاک کہتے ہیں اُس کے ساتھ عملی طور پر بھی اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ حکمِ الٰہی کو حقیر سمجھ کر اس سے سرتابی کریں۔ راتوں کو راحت بخش خوابگاہیں اور سکون آفرین شبستان چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور فقط اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ وہ قلبی تعلق کو تمام عالم سے توڑ لیتے ہیں۔ اُن کو کسی کے قبضہ میں کوئی چیز نہیں نظر آتی۔ کسی کو نقصان نفع اور راحت و ضرر کا مالک نہیں جانتے۔ ماسوا سے رشتہ توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ اسی کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور اسی کے انعام کی خواہش کرتے ہیں پھر یہی ان کی خصوصیت ہوتی ہے کہ رقتِ قلب، استغراق فی العبادت، تصفیۂ باطن، تزکیۂ قلب اور توجہ الی اللہ کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنے سے بھی غافل نہیں رہتے جو انعام اللہ نے ان پر کیا ہے اور جن کو نعمتوں سے سرفراز کیا ہے اس کا کچھ حصہ وہ مولیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو بھی دیتے ہیں۔

ان آیات میں تحقیق طلب چند امور ہیں:۔

(۱) شیخ جمل نے لکھا ہے کہ کلام مذکور میں جن آیات، وعظ کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سے مراد کون آیات ہیں؟ یہ بات محلِ غور ہے کیونکہ اگر کل قرآن کی آیات مراد ہوں تو یہ صراحتہً غلط ہے، اس لئے کہ آیاتِ سجدہ کے علاوہ دوسری آیات کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنا واجب کیا مشروع بھی نہیں ہے اور اگر آیاتِ سجدہ ہی مراد ہوں تو بے شک ان کی تلاوت سے سجدہ کا وجوب (بر قول احناف) ہو جاتا ہے، لیکن ان میں وعظ و نصیحت کے معنی نہیں ہیں۔ اس کے بعد شیخ جمل نے لکھا ہے کہ اس سوال کا جواب کسی مفسر نے نہیں دیا۔ شاید شیخ نے غور نہیں کیا ورنہ اس کا جواب تو شیخ ابن کثیر کی تفسیر اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تشریح سے صاف واضح ہو رہا ہے۔ ابن کثیر نے آیتِ مذکورہ میں سجدہ کے معنی سر جھکانے کے لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان آیاتِ الٰہیہ کو کان لگا کر سُنتے اور قول و عمل سے ان کی اطاعت کرتے ہیں اور غرور یعنی نافرمانی نہیں کرتے۔ گویا شیخ کے قول کے مطابق آیات سے مراد ہیں عام آیاتِ موعظت اور سجدہ سے مراد ہے سر جھکانا۔ اب یہ اعتراض ہی نہیں پیدا ہوتا کہ عام آیات کی تلاوت کے وقت سجدہ واجب نہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت کا نزول پنجگانہ نماز کے متعلق ہوا ہے۔ گویا ابن عباسؓ کے نزدیک تسبیح سے مراد ہے نماز پڑھنی۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان حکمِ قرآن کے مطابق آیات کی تلاوت کرتے اور سجدہ میں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ یا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَبِحَمْدِهٖ پڑھتے ہیں۔ اس تشریح کے مطابق بھی آیات کے لفظ سے عام آیات مراد ہیں اور سجدہ کرنے سے مراد ہے نماز میں سجدہ کرنا۔

(۲) خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اس مقام کا سجدہ عظیم الشان سجدوں میں سے ہے۔ قاری اور سامع دونوں پر لازم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اس مقام پر سجدہ کرنا سنت طور پر واجب ہے اور شوافع کے نزدیک سجدۂ تلاوت چونکہ مسنون ہے، اس لئے ان کے نزدیک مسنون ہونے میں تاکید ہے۔ حدیث مشہور ہے کہ جس وقت حضور اقدس ﷺ ایسی صورت پڑھتے جس میں سجدہ ہوتا اور نماز میں نہ ہوتے تو خود بھی سجدہ کرتے اور ہم لوگ بھی سجدہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو سجدہ کرنے کے لئے جگہ نہ ملتی تھی (مسلم)

(۳) آیت تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ سے کیا مراد ہے اور اس کا نزول کن حضرات کے متعلق ہوا؟ اس کی بابت تین اقوال ہیں: ۔ ۱ عشاء کی نماز مراد ہے ۲ تہجد کی نماز مراد ہے۔ ۳ صلوٰۃ عشاء اوّابین یعنی مغرب وعشاء کے درمیان کی چار رکعتیں۔ ہم ذیل میں ہر قول کی تائیدی روایات ترتیب وار نقل کرتے ہیں۔ ۱ حضرت انس سے مروی ہے کہ اس سے مراد نماز عشاء کا انتظار کرنا ہے (رواہ ابن جریر باسناد جید) خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا یہ آیت ہمارے گروہ انصار کے حق میں نازل ہوئی کہ ہم لوگ مغرب پڑھ کر گھروں کو نہ جاتے تھے بلکہ منتظر رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضور اقدس کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھ کر گھروں کو واپس ہوتے تھے۔ حضرت انسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ ہم لوگ عشاء کی نماز پڑھنے سے پہلے بستروں سے پرہیز کرتے تھے۔ میں نے حضور والا کو عشاء کی نماز پڑھنے سے پہلے کبھی بستر خواب پر نہیں دیکھا اور نہ عشاء کے بعد باتیں کرتے دیکھا اور یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور والا سے دریافت کیا گیا کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی صفت اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو عشاء سے پہلے نہیں سوتے۔

ابن کثیر نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو عشاء کی نماز جماعت سے پڑھتے ہیں۔

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر کو واپس آنے سے پہلے عشاء کی نماز پڑھنے کا انتظار کرنے والوں کے حق میں آیت مذکورہ کا نزول ہوا ہے۔ ۲ حسن بصری اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک نماز تہجد پڑھنے والے مراد ہیں۔ شیخ ابن کثیر نے ابن مسعود کی روایت لکھی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہمارا رب دو شخصوں سے خوش ہوتا ہے۔ ایک وہ جو اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر بستر اور لحاف سے نکل کر بامید ثواب اور بخوف عقاب نماز کو کھڑا ہوتا ہے الخ۔ (رواہ احمد وابو داؤد) امام احمد نے بروایت معاذ بن جبل بیان کیا کہ ایک مرتبہ معاذ ایک سفر میں حضور والا کے ہم رکاب تھے۔ قریب صبح کے اثنائے راہ میں معاذ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتا دیجئے جو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا تُو نے بڑی بات پوچھی، مگر جس کے لئے اللہ آسان کر دے تو آسان ہے۔ تُو اللہ کی عبادت کر کسی کو اس کا شریک نہ بنا۔ نماز پڑھا کر زکوٰۃ دیا کر۔ رمضان کے روزے رکھا کر۔ بیت اللہ کعبہ کا حج کر۔ میں تجھے خیر کے دروازے بتاتا ہوں۔ روزہ ڈھال ہے۔ صدقہ گناہوں کی آگ کو بجھاتا ہے اور وسط شب کی نماز بھی (خیر کا دروازہ) ہے۔ اس کے بعد حضور نے آیت تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ ... يَعْمَلُوْنَ تک تلاوت فرمائی۔ الخ۔ (رواہ النسائی وابن ماجہ والترمذی فقال حسن صحیح وکذا رواہ ابن جریر) ابن ابی حاتم نے اسی روایت میں اتنے الفاظ اور زیادہ نقل کئے ہیں کہ وسط شب کی نماز کے لئے حضورؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ میں نماز تہجد مراد ہے۔

۳ عکرمہ، محمد بن المنکدر، ابو حازم اور قتادہ وغیرہم کے نزدیک صلوٰۃ اوّابین مراد ہے۔ حضرت انس کی ایک روایت ہے کہ یہ آیت اُن صحابہ کے متعلق نازل ہوئی جو مغرب سے عشاء تک نماز پڑھتے تھے۔ مالک بن دینار بحوالہ حضرت انسؓ بیان کیا کہ مہاجرین اوّلین میں سے کچھ لوگ نماز مغرب پڑھ کر عشاء تک نماز پڑھتے تھے۔ اُن ہی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ قیس بن ابی حازم نے کہا مغرب اور عشاء کے درمیان صلوٰۃ اوّابین ہے۔ حضرت بلالؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ صحابی مغرب کے بعد عشاء تک نماز پڑھا کرتے تھے۔ پس آیت تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ ... يُنْفِقُوْنَ تک نازل ہوئی۔ (رواہ البزار) میرے نزدیک تینوں اقوال کا مجموعہ مراد لینا غیر مناسب نہیں۔ عشاء کا انتظار مسجد میں بیٹھ کر اور صلوٰۃ اوّابین اور تہجد تینوں کمال ایمان کی نشانیاں ہیں۔ تینوں کے لئے بستر راحت کو چھوڑنا پڑتا ہے اور تینوں کی پابندی نفس پر شاق ہے اور تینوں کی فضیلت مختلف احادیث میں وارد ہے۔ پس تینوں کو مراد لینا ہی اولیٰ ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۔ قرۃ العین کے دو معنی ہیں۔ آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی دل کی فرحت وراحت۔ آنکھوں کا قرار اور سکون۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی چیز نظر کش اور بامزہ لذیذ ہوتی ہے تو نگاہ اس پر ٹھہر جاتی ہے اور دوسری طرف انسان کی توجہ نہیں ہوتی۔ بامزہ نواز حسن کی نظر کشی اس کی شاہد ہے اور اگر کوئی چیز نفرت انگیز کراہت آفریں سامنے آجاتی ہے تو ابتدائی نظر کے بعد آدمی اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتا ہے اور دوبارہ اس کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اہل ایمان کے لئے جو راحت بخش فرحت آفریں قرار آگیں سکون انگیز منظر کش بامزہ نواز جاذب قلب چیزیں چھپا کر رکھی گئی ہیں اور جو عجیب الکیفیت نادر الماہیت نعمتیں آخرت میں ان کو ملیں گی دنیا میں ان کی تعداد اور کیفیت سے صحیح طور پر کوئی شخص واقف نہیں۔ دوسری آیت میں اسی مفہوم کی تائیدی صراحت آئی ہے۔ جنت کی نعمتوں کے متعلق ارشاد فرمایا لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

یعنی جنت کی نعمتوں کو دنیا میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا نہ انسانی تصور کی وہاں تک رسائی ہوئی ۔

تحقیق مبحث

لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک اور مختلف احادیث میں جنت کی نعمتوں کی تصویر کشی مختلف الفاظ میں کی گئی ۔ حور و غلمان کوثر و تسنیم ، انار ، سیب ، انگور اور مختلف فواکہ شاندار محلات ، راحت بخش فضا اور عیش آفریں ماحول ان سب چیزوں کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ کیا یہ سب چیزیں بے حقیقت ہیں کوئی چیز واقعیت پر مبنی نہیں ۔ اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے اہل تفسیر نے بہت کوشش کی ہے اور یہ بحث اپنی خاصی طویل ہوگئی ہے ۔ ایک گروہ نے تو جنت کی تمام نعمتوں کا انکار ہی کر دیا اور صاف کہدیا کہ قرآنی بیان اور حدیث کی صراحت محض ترغیبی ہے ورنہ آخرت کی نعمتیں بالکل غیر مادی ہیں ۔ دوسرے گروہ نے اتنی ظاہر پرستی اختیار کی کہ آخرت کی نعمتوں کو بالکل دنیوی نعمتوں کی طرح قرار دے لیا ۔ یہاں تک کہ وہ آخرت کے انگوروں کو دنیا کے انگوروں کی طرح سمجھنے لگے ۔ صرف کمیت اور کیفیت میں کچھ امتیاز قائم رکھا ۔ میرے نزدیک یہ افراط اور تفریط درست نہیں ۔

حقیقت سمجھنے کے بعد قرآنی بیان میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا ۔ بات یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں کو صحیح طور پر کما حقہٗ کسی انسان کو اس دنیا میں سمجھانا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ ان نعمتوں کے لئے کسی زبان میں کسی قسم کے الفاظ کی وضع ہی نہیں ہوئی اور افہام بشری کے لئے الفاظ کی ضرورت ہے ۔ انسان اُسی چیز کو سمجھ سکتا ہے جو اس دنیا میں موجود ہو یا اُس کا دماغ وہاں تک رسائی کر سکے ۔ جنت کی نعمتیں اس دنیا میں موجود نہیں نہ وہاں تک دماغوں کی رسائی ہے ۔ پس آخرت کی تمام کیفیات ، واقعات اور سزا جزا کے اصلی خد و خال کو سمجھنا ناممکن ہے ۔ جس طرح غیبی مخلوق کی حقیقت پردۂ خفا میں ہے ۔ ملائکہ عرش کرسی یہاں تک کہ خود ذات الٰہیہ ناقابل فہم چیزیں ہیں ۔ اسی طرح قیامت ، احوال قیامت ، دوزخ کے شدائد اور جنت کے لذائذ بھی احاطۂ دماغی سے خارج ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسانوں کے دماغ ان چیزوں کے سمجھنے میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتے اور ان کا علم مجمل طور پر بھی ممکن نہیں ۔ قیامت کے احوال اور دوزخ جنت کی کیفیات کی جو تصویر کشی شریعت نے کی ہے وہ اس طرح کی ہے کہ انسانوں کے دماغ اس کو سمجھ لیں ۔ مثلاً انسان کی خواہش گونا گوں حیثیت اور چند در چند نوعیت رکھتی ہے ۔ ہر شخص کی طبیعت جُدا ہے ، اس لئے طبیعت کا اقتضا بھی جُدا ہے ، لیکن اس کے باوجود تمام خواہشات کا ایک اتحادی مرکز بھی ہے ۔ یعنی اچھا لباس ، اعلیٰ غذا ، عزت اور حکومت کی ہمہ گیری ، شاندار مسکن اور فرحت آفریں صنفی تعلقات یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو تمام انسانوں کے لئے نقطۂ اشتراک قرار دیا جاسکتا ہے ۔ اسی طرح کھانے پینے پہننے اور رہنے کی تکلیفوں سے ہر شخص کو کراہت ہوتی ہے اور ان چیزوں کے بدترین الم انگیز تصور سے دماغی تکلیف ہوتی ہے پس انسانی طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن نے جنت اور دوزخ کی تصویر کشی کی اور صحیح طور پر کی ۔ جہاں تک انسانی سمجھ میں آسکتا تھا حقائق کو سمجھایا ۔ سونے چاندی اور موتی کے مکان ، بہترین فواکہ اور اعلیٰ شربت ، فرحت بخش صنفی تعلقات ، ہمہ گیر حکومت ، حسین اور فرماں بردار خدام ۔ غرض انسانی تصور جس خواہش تک پہنچ سکتا تھا اس کو بیان کیا ، لیکن اختلاف خواہشات کے سبب تمام انسانوں کی تشفی اس بیان سے نہیں ہو سکتی تھی ۔ سرد ملک کے رہنے والوں کے لئے سردائی کوئی اچھی چیز نہیں ۔ انار اور سیب اہل کشمیر کے لئے کوئی عجیب اور نادر چیزیں نہیں ، اس لئے آخر میں یہ بھی فرمادیا کہ ان کے علاوہ انسان جس چیز کی خواہش کرے گا اُس کو ملے گی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے لذائذ انسان کی تصویر کشی حقیقی رنگ میں ضرور کی ہے ، لیکن جب ہر زبان کے الفاظ قاصر ہیں اور آخرت کی نعمتوں کو بیان کرنے کے لئے لسانی وضعیات ناکافی ہیں تو قرآن نے بھی اصلی حقائق کو بیان کرنے کے لئے اُنہی الفاظ کو استعمال کیا جو انسان کی سمجھ میں آسکتے تھے کسی خاص لذت کو انگور کہا ، کسی کو انار ، اور کسی کو موتی اور کسی کو سونا چاندی اور کسی کو شراب طہور ، اور کسی کو حور و قصور ورنہ کما حقہٗ اظہار تو الفاظ کے فقدان کے سبب ناممکن تھا ۔ اگر صحیح الفاظ وضع کئے جاتے تو اُن کے معانی سمجھ میں نہ آتے ۔ پس اس صورت میں آیات اور صراحات کا مطلب کچھ پیچیدہ نہیں رہا ۔ واقعی کیفیت اور حقیقت اور تعداد اور کما حقہٗ صفات و احوال کا بیان تو ناقابل فہم ہے ۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کتنی اور کیسی راحت بخش نعمتیں پردۂ آخرت میں اہل ایمان کے لئے پوشیدہ ہیں نہ ان کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا نہ انسانی تخیل کی وہاں تک رسائی ہوئی ۔ ہاں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے حقائق مجہولہ کو الفاظ معلومہ کا جامہ پہنا کر دکھا دیا گیا ہے ۔ اس تقریر سے اصل مسئلہ کی وضاحت ہوگئی کہ حقائق مجہول ہیں ، لیکن ان کی رونمائی واقعی ہے ۔ کیفیات اور کمیات کا علم نہیں نہ تعداد معلوم ہے نہ صفات ، لیکن مجمل طور جتنا بیان کیا گیا ہے اور جتنا سمجھایا گیا ہے وہ بجائے خود صحیح ہے ۔ والعلم عند اللہ ۔

ایک نقطہ اور بھی اس جگہ قابل بیان ہے ۔ یہ ظاہر بات ہے کہ آدمی کا سارا بدن مادی ہے اور دماغی حواس بھی مادی قوتوں کے مختلف نام ہیں ۔ صرف علمی اور عملی حیثیت کا فرق ہے ۔ اجزائے بدن کے ترکیبی نظام کا جہاں تک تعلق ہے اس کو کلی قوتوں کے دست کرم کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے ، لیکن علم جسمانی کی فکر اور خارج

و داخل کے متعلق جتنی طور پر سوچ بچار علمی تو (قوت) کا فریضہ ہے ۔ پس انسان کے دماغی حواس کی رسائی بھی انہی چیزوں تک ہو سکتی ہے جو مادی ہوں یا مادہ سے تعلق رکھنے والی ہوں ۔ لیکن بہت سی علمی چیزیں منتہائے حس سے خارج بھی ہیں ۔ جنت کی چیزیں دو نوعیتیں رکھتی ہیں ۔ قرآن و احادیث میں جن نعمتوں کی تفصیل آئی ہے وہ انسانی ترغیب کیلئے ہے اور ان سب کا تعلق مادہ سے ہے ۔ کھانا ، پینا ، رہنا ، سہنا ، پہننا اور جنسی تمتع اسی قسم سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں ۔ لیکن ان سے بالاتر کچھ اور نعمتیں بھی ہیں جن کی اطلاع کسی آدمی کو نہ دنیا میں دی گئی نہ اُن کا علم کسی کو ہو سکتا ہے ۔ انہی مو خر الذکر نعمتوں کی طرف اشارہ آیت مذکورہ میں کیا گیا ہے ۔ اب قرآنی صراحات میں کوئی تعارض نہ رہا ۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ اللہ نے اپنے بندوں پر گوناگوں احسان فرمائے ۔ تمام ظاہری اور باطنی قوتیں عطا فرما کر عالم وجود میں لانا اور پیدا کرنے کے بعد ساری علمی اور عملی قوتوں کو برسرِ کار رکھنا اور رفتہ رفتہ ترقی دے کر ایک حدِ خاص پر پہنچانا اور بقائے حیات کے اسباب پیدا کرنا اور ان اسباب کو اپنے فوائد کے لئے مشغول رکھنا اور آدمی کو ان کے استعمال کی طاقت عنایت کرنا یہ تمام وہ احسان ہیں جو اللہ نے انسان کو مکلف کرنے سے پہلے کئے ہیں ۔ دوسری قسم وہ احسانات ہیں جو آخرت میں ہوں گے ۔ اب آدمی جو نیکیاں اور اعمالِ صالحہ کرتا ہے اور اللہ کا شکر زبانی اور عملی طور پر ادا کرتا ہے تو اس کا احسان اللہ پر کچھ نہیں ہوتا ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرما سکتا ہے کہ میں نے بندوں پر احسان پہلے کر دیے ہیں اور اتنے کئے ہیں جن کی گنتی نہیں ہو سکتی ۔ اگر بندے میرے حکموں کی پابندی اور میرا شکر ادا کرتے ہیں تو وہ کسی جزا کے مستحق نہیں ۔ میں تو کام سے پہلے مزدوری دے چکا ۔ اب میں جو کچھ آخرت میں دوں گا وہ میری مہربانی اور عنایت ہوگی اعمال کا صلہ نہ ہوگا ۔ دوسرا جواب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بندوں نے جو اچھے کام کئے وہ اس قابل ہیں کہ میں ان کی جزا آخرت میں ان کو عطا کروں ۔ پہلی میرے گزشتہ احسانات محض مہربانی پر مبنی تھے ۔ چونکہ انسان کمزور ، کم حوصلہ ، ضعیف البنیان ہے ، اس لئے اگر انسانی نیکیوں کو خدا تعالیٰ گزشتہ احسانات کا معاوضہ قرار دے دیتا کہ میں نے کام سے پہلے مزدوری دے دی تو آدمی کی دل شکنی ہوتی ۔ اعمالِ صالحہ کی رغبت پیدا نہ ہوتی جو کچھ کرتا وہ بددلی کے ساتھ کرتا اور ایسا ہی ہوتا جیسا کوئی مزدور پیشگی مزدوری دے کر رکھا جاتا ہے اور پھر کام کی تکمیل بددلی سے کرتا ہے ، اس لئے خدا تعالیٰ نے مناسب نہیں سمجھا کہ بندوں کے دل توڑ دے اور آئندہ ثواب کا ان کو مستحق نہ قرار دے اور اپنے گزشتہ احسانات کے معاوضہ میں انسانی زندگی کی ساری نیکیاں محسوب کر لے ۔ پس اُس نے اوّل جواب کی جگہ دوسرے جواب کی صراحت فرمائی ۔ اگرچہ اوّل جواب واقع کے مطابق تھا ۔ انسانی نیکیوں سے گزشتہ انعامات کا حق بھی ادا نہیں ہوتا آئندہ استحقاق پیدا کرنا تو کیا معنی رکھتا ہے ، مگر اللہ مہربان ہے ۔ اس نے پچھلے احسانوں کو مہربانی اور عنایت پر مبنی قرار دیا اور اُن کے معاوضہ کا طالب بھی نہ ہوا اور انسانی اعمال کی جزا دینے کا وعدہ فرما لیا اور صراحت فرما دی کہ نیکوکار اہلِ ایمان کے لئے جو انعامات آخرت کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں وہ ان کے اعمال کی جزا ہوں گے ۔ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ۔ خطیب نے بروایت ابن عباس لکھا ہے کہ اس آیت کا سببِ نزول ولید بن عقبہ بن ابی معیط اور حضرت علیؓ کا باہمی مخاصمہ ہے ۔ ایک بار ولید نے حضرت علی سے کہا تو بچہ ہے اور میں بہادر بوڑھا ۔ میری زبان تیری زبان سے زیادہ رواں ہے ۔ میرا نیزہ بھی تیرے نیزے سے زیادہ تیز ہے ۔ میرا دل تیرے دل سے زیادہ بہادر ہے ۔ میں جس لشکر کے وسط میں ہوں وہ لشکر بھاری ہو جاتا ہے ۔ حضرت علیؓ نے فرمایا چپ رہ تو فاسق ہے ۔ شیخ ابن کثیر نے بروایت سدی و عطاء بن یسار سببِ نزول اسی واقعہ کو قرار دیا ہے ، لیکن ولید کی جگہ اُس کے باپ عقبہ کا نام ذکر کیا ہے ۔ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا ۔ اوپر والے فقرہ میں مومن اور کافر کا عدمِ استواء ظاہر کیا تھا ۔ اس آیت میں عدمِ استواء کی تفصیل فرماتا ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کے پاس بطور مہمان یا امیدوار بن کر جائے اور بادشاہ اس کی تنخواہ مقرر کرنے سے پہلے کچھ طعامِ مہمانی جاری کرنے کا حکم دے دے اور بطور مہمان اس کو ٹھہرائے تو ایسے کھانے کو عربی زبان میں نزول کہتے ہیں ۔ نیکوکار اہلِ ایمان کے لئے جنت الماویٰ بھی بطور نزل ملے گی ۔ اس کے بعد جو نعمتیں ملیں گی وہ ناقابلِ بیان ہیں ۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا ۔ اس جگہ فسق سے مراد کفر ہے ۔ پہلی آیت میں اٰمَنُوْا کے ساتھ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی فرمایا تھا ۔ کیونکہ بغیر عمل صالح کے صرف ایمان کچھ زیادہ سود مند نہیں ۔ اس جگہ فَسَقُوْا کے بعد عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ نہیں فرمایا ۔ کیونکہ کفر خود موجبِ عذاب ہے ۔ خواہ اس کے بعد اعمال بُرے ہوں یا نہ ہوں ۔ کافر کے نیک اعمال بھی قابلِ قبول نہیں ۔

كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۔ ایک شاعر کا قول ہے ۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

طبیب کہتے ہیں اور واقعہ بھی ہے کہ دق کے بخار کی اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی ملیریا کی ہوتی ہے۔ مدقوق کو امتداد زمانہ اور خوگر ہونے کے سبب بخار کی حرارت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور ملیریا بخار چونکہ وقتی ہوتا ہے اور مریض کی طبیعت اس کی عادی نہیں ہوتی، اس لئے اس کو زیادہ حرارت اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اگر سرد پانی میں ہاتھ ڈالا جائے تو شروع میں ہاتھ کو ٹھنڈک زیادہ محسوس ہوتی ہے، لیکن جب دیر تک برفاب میں ہاتھ کو رکھا جائے تو ہاتھ بھی برف ہو جاتا ہے اور خنکی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ غرض تکلیف دہ چیز اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ دوزخ کا عذاب تو اتنی شدت کا ہوگا جس کی کوئی حد بیان نہیں کی جاسکتی، اس لئے خیال کیا جاسکتا تھا کہ شاید ابتدائی صدمۂ الم کے بعد اہل نار کو تکلیف کا احساس کم ہو جائے گا۔ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے فرمایا کہ جب وہ شدتِ تکلیف سے گھبرا کر باہر نکلنا چاہیں گے تو نکل نہ سکیں گے بلکہ ہر بار ان کو اندر ہی کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور کسی طرح شدتِ الم کم نہ ہوگی۔ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۞ اس آیت میں کافروں کو عذاب قیامت کے علاوہ دوسرے خفیف عذاب کی وعید کی گئی ہے، لیکن وہ عذابِ ادنیٰ کیا تھا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ عذابِ ادنیٰ یہی دنیوی مصائب، بیماریاں اور آفات و بلیات ہیں جن کی سختی سے مجبور ہو کر بندے اپنے رب سے توبہ کرتے ہیں۔ ابی بن کعب، ابو العالیہ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعی، ضحاک، علقمہ، عطیہ، مجاہد اور قتادہ وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے سزائے حدود کو بھی اسی میں شامل قرار دیا تھا۔ عکرمہ نے اتنا مزید بیان کیا کہ حضور گرامیؐ کی بددعا سے جو قحط قریش پر پڑا تھا جس میں بھوک کی شدت سے کھال اور بال تک کھا گئے تھے۔ وہ بھی عذابِ ادنیٰ کی ایک شاخ تھی (سراج) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خاص طور پر فرمایا عذابِ ادنیٰ وہ قتل و قید ہے جس میں بدر کے دن کفارِ قریش مبتلا ہوئے تھے۔ مالک نے بروایت زید بن اسلم یہی تفسیر نقل کی ہے۔ سدی نے اتنا اور بیان کیا کہ مکہ میں کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہا تھا جس میں غم و درد نہ سمایا ہو۔ خواہ ان کے کسی آدمی کے قتل ہونے کے سبب یا قید ہونے یا مجروح ہونے یا شکست کھا کر بھاگنے کی وجہ سے۔

حضرت ابی بن کعب سے ایک اور روایت آئی ہے جس میں آپ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا قمر اور دخان تو گزر چکے اور بطش و لزام باقی ہیں۔ (مسلم) براء بن عازب اور ابو عبیدہ نے فرمایا عذابِ ادنیٰ سے مراد عذابِ قبر ہے۔ اس روایت کے مطابق آیت کا ظاہری مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ عذابِ قبر کے بعد توبہ کا کون موقع رہ جاتا ہے۔ ہاں اگر اس طرح مطلب بیان کیا جائے کہ ہم ان کو عذابِ قیامت سے پہلے عذابِ قبر کا مزہ چکھائیں گے تاکہ اس وعید کو سن کر اور اس عذاب سے خوف کھا کر وہ لوگ ابھی توبہ کر لیں۔

میرے نزدیک وہی قول زیادہ چسپاں ہے جس میں دنیوی مصائب و آلام کو عذابِ ادنیٰ کہا گیا ہے اور جس کے اندر وہ قحط بھی داخل قرار دیا گیا جو حضورؐ کی بددعا سے پڑا تھا۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ الخ۔ گزشتہ آیات میں بتایا تھا کہ اہل ایمان درحقیقت وہی لوگ ہیں کہ جب اُن کو نصیحت کرنے کیلئے قرآنی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ سرِ نیاز جھکا دیتے ہیں۔ یعنی لسانی اور عملی طور پر اطاعت کرتے ہیں، لیکن اس گروہ کے خلاف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اُن کو نصیحت کرنے کے لئے جب اللہ کا کلام ان کو سنایا جاتا ہے تو بجائے اطاعت کے وہ سرکشی کرتے ہیں بلکہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ منہ پھیر لیتے ہیں۔ عمل کرنا اور ماننا تو درکنار۔ گویا وہ آیاتِ الٰہیہ کو ماننے کے قابل نہیں جانتے۔ ایسے آدمی انتہائی ناحق کوش اور ظالم ہیں۔ یہ گروہ ہدایت یاب ہونے اور اعمال عقائد کو درست کرنے کی جڑیں کاٹ دینے والا ہے۔

إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ۔ پس ایسے ظالموں کو خدا تعالیٰ ضرور سزا دے گا اور ان کو سخت عذاب دیا جائے گا۔

اس جگہ ایک اعتراض پیدا ہو سکتا ہے۔ کوئی کوتاہ فہم کہہ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو تمام انسانی جذبات سے پاک ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی سے انتقام لے۔ کیا خدا کو کسی سے بغض اور کینہ ہوتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے بیہودہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں جو فلاسفہ کے کفش بردار ہیں اور قرآن کی روشنی کو فلسفہ کی تاریکی میں گم کر دینے کے خواستگار۔ یہ صحیح ہے کہ خدا تمام جذباتِ نفسانیہ سے پاک ہے۔ نہ وہاں نفس ہے نہ نفسانیت لیکن مجرم کی سزا دینے میں کیا جذباتِ نفسانیہ کو دخل ہوتا ہے۔ کیا قانونِ عدل بے کار چیز ہے۔ کیا ظلم کی سزا نفسانیت پر مبنی ہوتی ہے۔ انتقام کے لفظ سے

دھوکہ کھانا اور دوسروں کو دھوکہ دینا قرینِ دانش نہیں۔ جس طرح انتقام ذاتی ہوتا ہے اسی طرح حق سے روگردانی کی سزا کو بھی انتقام کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ انتقام تو سب سے بڑا انتقام ہوتا ہے۔ نظامِ عالم کو درہم برہم کرنے اور قانونِ فطرت کو توڑنے کی کوشش کرنے کی سزا دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔ ایسا ہی انتقام آیت میں مراد ہے۔ ورنہ کسی کے کفر، شرک اور معصیت سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کو کچھ دکھ پہنچتا ہے۔

مقصودِ بیان

کافروں کی اُخروی حسرت و یاس کا اظہار اور اس بات کی صراحت کہ کفار قیامت کے دن عذاب کو دیکھ کر دنیا میں واپس جانے اور عمل صالح کرنے کی تمنا کریں گے، مگر ان کی یہ تمنا بے سود ہوگی۔ گویا درپردہ اس بات کی تبلیغ کرنی مقصود ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا موقع تو اسی زندگی میں ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد کفر و معصیت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ معلوم نہیں کب اور کس وقت اس عمل کی زندگی کا رشتہ منقطع ہو جائے۔ اس وقت حسرت و یاس کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آیت وَلَوْ شِئْنَا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ہدایت یاب کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ گو چھوڑ دینے میں اس کی مصلحت ہے۔ ثواب و عذاب کا حکم ازلی ہے۔ جو لوگ دارِ آخرت کو بھول کر دنیا پر بھروسہ کر بیٹھتے ہیں اور اصلی گھر کو یاد نہیں کرتے تو اب جزا کی تقسیم کے وقت ان کو بھی فراموش یعنی ترک کر دیا جائے۔ آیت اِنَّمَا يُؤْمِنُ الخ بتا رہی ہے کہ مومن احکامِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ عملی طور پر اطاعت و انقیاد کا اظہار کرتا ہے۔ مرکزِ توجہ اپنے رب کو ہی قرار دیتا ہے۔ خوف و طمع اسی سے رکھتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اہلِ ضرورت کی مالی جسمانی اور علمی ہمدردی کرتا ہے۔ گویا اس صراحت سے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ جو لوگ ان اوصاف کے حامل نہیں وہ قطعاً مومن نہیں۔ جو لوگ آیاتِ قرآنیہ کی توہین کرتے ہیں، انسانی ساختہ قوانین کو خدا کے نازل کئے ہوئے ضوابط پر ترجیح دیتے ہیں وہ مومن نہیں۔ جن کو اللہ کے علاوہ کسی سے طمع یا خوف ہو یعنی کو ذاتی نفع نقصان پہنچانے والا خیال کریں اور اللہ کے علاوہ ان کا مرکزِ توجہ کوئی اور ہو جائے تو وہ بھی مومن نہیں۔ آیت فَلَا تَعْلَمُ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی جس قدر نعمتوں اور خوبیوں کا اظہار قرآن اور احادیث میں کیا گیا ان کی واقعی کیفیت اور تعداد کوئی بھی نہیں جانتا اور ان بیان کردہ نعمتوں کے علاوہ کچھ انعامات ایسے بھی ہیں جن کا نام نشان بھی کسی کو معلوم نہیں۔ آیت جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ سے مترشح ہو رہا ہے کہ (اعمال اگرچہ موجبِ جزا نہیں مگر) اللہ نے جزا کو اعمال سے وابستہ کر دیا ہے اور اُخروی ثواب کو اعمال کا صلہ قرار دیا ہے۔ آیت اَفَمَنْ كَانَ بتا رہی ہے کہ مومن اور کافر برابر نہیں یعنی اللہ کے نزدیک مال، جمال، حکومت اور وجاہت کا اعتبار نہیں بلکہ ایمان و کفر معیارِ امتیاز ہے۔ اٰمَنُوْا کے بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کو ذکر کرنے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اعمال ایمان کے اجزا نہیں مگر صرف ایمان بغیر عمل صالح کے نرا سود مند نہیں۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ سے کافروں کے الم کا استمرار اور احساسِ تکلیف کا دوام ظاہر کرنا مقصود ہے۔ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے دنیوی مصائب کا نزول اس لئے ہوا ہے کہ بندے گناہوں سے توبہ کریں۔ الخ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ

ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی لہٰذا (اے محمد) تم قرآن ملنے میں کوئی شک نہ کرو اور ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لئے

اِسْرَآءِيْلَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا

ہدایت بنایا تھا اور ان ہی میں سے کچھ پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے جبکہ انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیتوں پر یقین

يُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

رکھتے تھے بیشک تمہارا پروردگار ہی قیامت کے دن اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ

کیا ان کو اس سے ہدایت نہ ہوئی کہ ان سے پہلے ہم کس قدر قوموں کو ہلاک کر چکے یہ لوگ ان کے گھروں میں پھرتے ہیں اس میں بلاشک

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَاۗءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ

بہتری نشانیاں ہیں کیا یہ نہیں سنتے کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمین کی طرف بہاتے ہیں پھر اس سے کھیتی پیدا کرتے

بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ○ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا

ہیں جس میں سے اُن کے چوپائے اور وہ خود کھاتے ہیں کیا وہ دیکھتے نہیں کہتے ہیں کہ اگر سچے ہو تو بتاؤ

الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا

کہ فتح کب ہوگی (اے محمد) کہہ دو فتح کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا کچھ کام نہ دے گا اور نہ

هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ○ ع

ان کو مہلت دی جائے گی لہٰذا تم ان سے اعراض کرو اور منتظر رہو وہ بھی منتظر ہیں

تفسیر قانونِ قدرت اور ضابطۂ فطرت یہی ہے کہ جب عقائد اور اعمال کی زمین بنجر ہو جاتی ہے اور انسانی گروہ سرکشی اور عصیان کوشی کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے تو ارحم الراحمین کسی نبی برحق کو مبعوث فرماتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے بنجر زمین کی آبیاری ہو جائے اور مُردہ اخلاق اور مُردہ اعمال مردہ دل انسانوں کو دوبارہ زندگی عطا فرما دی جائے ۔ اس ضابطہ کے تحت آسمانی کتابیں آتی ہیں، ہادیٔ مطلق کی طرف سے احکام نازل ہوتے ہیں پیغمبر وقت ان احکام کو عام لوگوں تک پہنچاتا ہے ۔ جن کو احکام پہنچائے جاتے ہیں وہ پھوٹ کر دو گروہ بن جاتے ہیں ۔ ایک گروہ تو مخالفوں کا ہوتا ہے جو اللہ کے احکام اور پیغمبر کی ہدایت کو پائے تکبر سے ٹھکرا دیتا ہے ۔ آسمانی کتاب کو ناقابلِ عمل اور رسولِ نبی کو ناقابلِ توجہ قرار دیتے ہوئے اپنی سابقہ بدکاریوں میں منہمک رہتا ہے ۔ ظلم کوشی اور عدل فراموشی کا لازمی نتیجہ بربادی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ۔ سرکش افراد اور باغی قوم کا تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے ۔ اُن کی سربلک کوٹھیاں سرسبز باغات اور عیش و طرب کے سامان تباہ کر دیے جاتے ہیں ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو پیغمبر کی ہدایت کو ماننے اور لائے ہوئے احکام پر یقین کرتے اور اُن کے مطابق عمل کرتے ہیں ۔ اس گروہ کی خشک اور بے آب و گیاہ اخلاقی کائنات از سرِ نو ہری ہو جاتی ہے ۔ احکامِ الٰہیہ کا پانی اس کو سرسبز بنا دیتا ہے ۔ ان کی مادی زندگانی میں ہی نمو ہوتا ہے ، پھول اور پھل آتے ہیں ۔ خود بھی ان کو عزت اور عروج حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ان سے تمتع اندوزی کا موقع ملتا ہے ، لیکن یہ عافیت اور عیش و عزت آسانی سے حاصل نہیں ہو جاتی ۔ نئے مذہب ، نئے احکام اور نئے قوانین کو ماننے اور کاربند ہونے سے سخت ترین شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ساری قوم ، پورا ماحول اور کل شیطانی طاقتیں اُن کے مقابلے میں آ جاتی ہیں ۔ اور سب طاغوتی قوتیں اُن کی زندگی کو خارزار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں ۔ راہِ عمل کے قدم قدم پر نوکیلے پتھر ان کے پاؤں کو زخمی کرتے ہیں ۔ شیطانی بھیڑیے ان کو راستے کے دونوں طرف سے گھیر کر حملے کرتے ہیں ۔ وسطِ راہ میں بڑے بڑے مصائب کے خندق کھودے جاتے ہیں ۔ ان گنت لٹیرے ، ان کو لوٹنے کے درپے ہو جاتے ہیں ، غرض ان کے لئے پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر قدم فرسائی کرنی اور راہِ زندگی کو طے کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے ۔ رہ نوردی کے آغاز میں منزلِ مقصود بھی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے ۔ رہنما ہوتا ہے رہنمائی کرتا ہے ، مگر اصل منزل بہت دُور ہوتی ہے اور مسلسل رہ نوردی کے سبب انسانی قوتیں تھک جاتی ہیں ، مگر استقلال ثبات اور بلندیٔ حوصلہ ان کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹنے دیتی ۔ جو قدم اٹھتا ہے آگے کو اٹھتا ہے اور جذبۂ ایمان کی کارفرمائی بڑھتی جاتی ہے ۔ نتیجہ آخر میں بصورت کامرانی نظر آتا ہے ، مغلوب غالب ، کمزور قوی ، ذلیل باعزت اور محکوم حاکم ہو جاتا ہے ۔ پھر پیغمبر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُس کی مسندِ ہدایت پر وہ لوگ ہی بیٹھتے ہیں جن کو ابتدائی دور میں ذلیل ، بے عزت اور کمزور سمجھا جاتا تھا ۔ رہ نوردی کے صلہ میں اُن کو رہنمائی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے ۔ پیچھے چلنے والے پیشوا بن جاتے

ہیں۔ ساری قوم ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگتی ہے اور ان کو اپنا مقتدا، رہبر، لیڈر مانتی ہے۔ ان رہنماؤں کی تعداد اگرچہ چند در چند ہوتی ہے لیکن تعلیم سب کی ایک ہوتی ہے۔ طریقۂ ہدایت میں کچھ ظاہری تبدیلی نظر آتی ہے لیکن اصولِ ہدایت مشترک ہوتے ہیں۔ کیونکہ سب ایک ہی شجر کے کلمیں اور ایک ہی درخت کے بار اندوز ہوتے ہیں، لیکن جب ان ہادیوں کا پہلا طبقہ اس دنیا سے روپوش ہو جاتا ہے تو وہ اپنے جدا جدا جانشین چھوڑ جاتا ہے۔ مختلف لوگ مختلف ہادیوں کے فیض یافتہ ہوتے ہیں، پھر خواہشاتِ نفس پر ان کو وہ تسلط بھی حاصل نہیں ہوتا جو اوّل طبقہ کو حاصل تھا۔ نہ ان کو ان مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے ان کے رہنما ہمکنار ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شرعی اور دینی امور میں باہم اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کے سامنے اس کے پیشوا کا قول ہوتا ہے اور کوتاہ فہمی کی بنا پر پیشواؤں کے اقوال میں تضاد نظر آتا ہے۔ پس ایک گروہ چند ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یعنی زمانہ گزرتا جاتا ہے باہمی پراگندگی بڑھتی ہی اختلاف مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور مخالفت بصورت عناد رونما ہو جاتی ہے اور پھر عناد جدال اور جدال قتال بن جاتا ہے۔ غرض معمولی اختلاف کا آغاز اس پراگندگی کے لئے سنگِ بنیاد ہو جاتا ہے جس کو دور کرنے والا قیامت تک کوئی نہیں ہو سکتا۔ پس خدا ہی قیامت کے دن اس کی باہمی صداقت و کذب اور حقانیت و بطلان کا فیصلہ کرے گا، لیکن جب قیامت کے دن حق و باطل کا فیصلہ ہو گا تو اس وقت راست روی اور ہدایت یابی کا کوئی موقعہ نہ ہو گا نہ اُس وقت حقانیت کا یقین فائدہ پہنچا سکے گا نہ صداقت کا اقرار۔

تحلیلِ اجزاء وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ۔ اس سورت کے آغاز میں تین اصولوں کی تعلیم دی تھی۔ رسالت، توحید، حشر۔ سورت کے اختتام میں بھی انہی اصولِ ثلاثہ کو بیان فرمایا ہے۔ سورت کے شروع میں رسالت کا اظہار لِتُنْذِرَ قَوْمًا الخ سے اور توحید کا اثبات آیات اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ الخ سے اور حشر کا تذکرہ آیت وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ میں کیا تھا۔ یہاں پر رسالت کا بیان وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ کے الفاظ میں کیا اور توحید کا اثبات اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ اور اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ سے کیا اور پھر حشر کا تذکرہ آخر میں آیت وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ میں فرمایا۔ اس طریقہ سے سورت کے آغاز اور اختتام میں یگانگت اور ہمواری پیدا ہو گئی۔

آیت مذکورہ میں موسیٰ کی نبوت اور ان کی کتاب کا تذکرہ حضورِ اقدس کی نبوت کو پختہ کرنے کے لئے فرمایا ہے۔ گویا یہ دکھانا مقصود ہے کہ آپ نئے نبی نہیں ہیں۔ آپ سے پہلے اور انبیاء بھی گزرے ہیں۔ نہ یہ قرآن کوئی نئی کتاب ہے۔ اس سے پہلے اور کتابیں بھی آسمان سے اتر چکی ہیں۔ خصوصاً موسیٰ کی نبوت اور ان کی کتاب تو مسلم الثبوت ہی ہے۔ یہودیوں کے علاوہ عیسائی بھی اس کو مانتے ہیں پھر آپ کی نبوت کو نہ ماننا اور قرآن کا انکار کرنا کسی دلیل پر مبنی نہیں۔

فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ۔ اس آیت کا مطلب تین طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ اس میں رسول اللہ کو تسلی دینی مقصود ہے۔ جب حضور نے نبوت کا دعویٰ کیا، معجزات کو ظاہر کیا، قرآن کو پیش کیا تو کافروں نے سرتابی کی اور طرح طرح سے ایذائیں دینی شروع کیں۔ حضور کو رنج ہوا اور ملال نے گھیر لیا۔ تو بطور تسلی ارشاد ہوا کہ آپ کو غم نہ کرنا چاہیئے۔ آپ سے پہلے موسیٰ کو بھی ان مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ جلیل القدر نبی ہونے کے باوجود اذیت یابی سے نہ بچ سکے (بلکہ اُن کو نہ فقط دشمنوں نے تکلیف پہنچائی بلکہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے بھی گوناگوں اذیتیں اٹھانی پڑیں) پس آپ کو اُن تکلیفوں کے اٹھانے اور آخر میں کامیاب ہونے میں شک نہ کرنا چاہیئے جو موسیٰ نے پائی تھیں۔ جو کچھ انھوں نے دُکھ اٹھائے آپ کو بھی اٹھانے ہوں گے۔ اور آخر میں جس طرح ان کو کامیابی ہوئی آپ کو بھی ہو گی۔ اس مطلب کے موافق مِنْ لِّقَآئِهٖ کی ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہو گی۔

دوسرا مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ کو ہم نے کتاب دی تھی اور آپ کی اُن سے ملاقات بھی کرائیں گے۔ آپ کو اُن کی ملاقات میں شک نہ کرنا چاہیئے۔ گویا یہ آیت بطور جملۂ معترضہ بیان کی گئی ہے اور مِنْ لِّقَآئِهٖ کی ضمیر موسیٰ ہی کی طرف راجع ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ وعدہ کب پورا ہوا تو بقول قتادہ اس وعدہ کو پورا کرنے کا وقت معراج کا زمانہ ہوا۔ معراج کی رات میں موسیٰ سے ملاقات کرائی گئی۔ ابو العالیہ نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا کہ حضور نے فرمایا شبِ معراج میں میں نے موسیٰ بن عمران کو دیکھا۔ اُن کا رنگ گندمی، قد دراز اور بال گھونگریالے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قوم شنوءہ کے آدمی ہیں (رواہ الطبری) صحاح میں بھی یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے۔ میرے نزدیک یہ مطلب کمزور ہے کیونکہ اول تو موسیٰ کی ملاقات سے سیاق و سباق کا کوئی تعلق نہیں۔ موسیٰ کی نبوت، توریت کا عطا ہونا اور امتِ موسیٰ میں سے بعض افراد کا ایمان لانا، مصائب پر صبر کرنا، پھر ان کو رہنما بنانا۔ ان مضامین کو اول اور آخر میں بیان فرمایا ہے۔ موسیٰ سے ملاقات کرنے کا تذکرہ بطور اشارہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ پھر موسیٰ کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ شبِ معراج میں تو ابراہیمؑ عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

معراج میں سب کا تذکرہ موجود ہے۔ خصوصاً روایت مذکورہ میں تو موسیٰ کے ذکر کے بعد عیسیٰ سے ملنے کا ذکر موجود ہی ہے۔ حدیث معراج میں سب کا ذکر موجود
ہے۔ خصوصاً روایت مذکورہ میں تو موسیٰ کے ذکر کے بعد عیسیٰ سے ملنے کا ذکر موجود ہی ہے۔ حدیث مذکور کے آخر میں حضورؐ نے فرمایا تھا: میں نے عیسیٰ بن مریم
کو دیکھا میانہ قد بھاری، رنگ سفیدی مائل اور بال لٹکے ہوئے تھے۔ (رواہ الطبرانی)

تیسرا مطلب جو زیادہ سہل اور صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی (آپ کو بھی مکمل کتاب دیں گے ان کو یکدم دی تھی آپ کو
دفعۃً بتدریج دیں گے) پس آپ کو کتاب کے ملنے میں شک نہ کرنا چاہیے۔ (آپ کو پوری کتاب ضرور ملے گی)۔

وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ کو کتاب دی تھی اور کتاب دینے کی اصل غرض صرف بنی اسرائیل کی ہدایت تھی،
یعنی تمام بنی اسرائیل کو توریت پر چلنے کا حکم تھا۔ باقی موسیٰ کی نبوت کا اقرار اور توریت کے منزل من اللہ ہونے کا اعتراف تو اس پر مامور صرف بنی اسرائیل ہی
نہ تھے بلکہ سب انسانوں پر یہ بات لازم تھی۔ کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب کا انکار موجب کفر ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ توریت پر عمل کرنا تمام اہل
عالم پر فرض تھا اور شریعت موسوی ہمہ گیر تھی۔ پس یہودیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ موسیٰ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور نہ شریعت موسیٰ کے بعد کسی شریعت
کی ضرورت ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے علاوہ دوسرے آدمی بھی تو اللہ کے فیض اور آسمانی ہدایات کے مستحق ہیں۔ جب موسیٰ کی شریعت اور کتاب ہمہ گیر نہ تھی تو
کیا وجہ کہ دوسری قومیں آسمانی ہدایات سے محروم رہیں۔ گویا اس سے در پردہ رسالتِ محمدی کو ثابت کرنا مقصود ہے اور یہ بات ظاہر کرنی ہے کہ بنی اسرائیل
تو خدا کے ایسے پیارے بن جائیں کہ ان کو کتاب بھی ملے اور انبیاء بھی انھیں میں مبعوث ہوں اور بنی اسماعیل ایسے مبغوض ہوں کہ نہ ان میں کوئی نبی ہو نہ کتاب
یہ بات خلاف عدل ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا۔ جب بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے توریت نازل کی گئی تو ان میں سے بعض لوگ نہ فقط خود راہ ہدایت
پر گامزن ہوئے بلکہ توریت کے موافق دوسروں کو چلنے کی بھی انھوں نے ہدایت کی۔ ائمہ کا لفظ ان تمام مصلحین اور رہنمایانِ دین کو شامل ہے جنھوں نے حکم الٰہی
کے مطابق لوگوں کو چلنے کی ہدایت کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف انبیاء بنی اسرائیل مراد ہوں بلکہ قرینہ اسی کا مقتضی ہے اور منشاء آیت بھی اسی کا خواستگار ہے
کیونکہ اس جگہ اصل مقصود انبیاء کی بعثت کا اظہار ہے۔ موسیٰ سے لے کر بعد کو آنے والے تمام اسرائیلی انبیاء کا سلسلہ ظاہر کرنا مقصود ہے اور اس بات کی صراحت
کرنی غرض ہے کہ انبیاء کی بعثت کوئی تعجب انگیز چیز یا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ بنی اسرائیل میں بکثرت متواتر کے ساتھ انبیاء آتے رہے ہیں۔ پس بنی اسماعیل میں اگر
ایک نبی مبعوث ہو گیا تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ۔ اوپر کی آیت میں ظاہر فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے منتخب افراد کو ہم نے پیشوائی اور رہنمائی کا مرتبہ عنایت کیا
تھا اور ان کو تبلیغ احکام اور ہدایتِ قوم کی عزت عطا کی تھی۔ اس آیت میں اس عزت بخشی اور قدر افزائی کی وجہ بیان فرمائی ہے بات یہ ہے کہ لیڈر اور رہنما بننے کا حق
اسی شخص کو پہنچتا ہے جو مقررہ نظریات پر خود یقین رکھتا اور ان کو صحیح جانتا ہو اور ان کو پھیلانے میں جو تکلیفیں اٹھانی اور دکھ سہنا پڑیں ان کو خوشی کے ساتھ برداشت
کرتا ہو کوئی مصیبت اس کے پاؤں کو لغزش نہ دے سکے۔ اگر کسی میں مصائب برداشت کرنے کی طاقت نہ ہو اس کا حوصلہ پست اور قوت استقلال کمزور ہو۔ قید بند،
افلاس، ذلت اور دوسری تکلیفیں اس کی ہمت کو توڑ دیں اور مصائب اس کو اصل مقصد سے روک دیں یا اس کو خود اُن قواعد و اصول پر یقین نہ ہو جن کو وہ
دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے تو ایسے شخص کو امامت و ہدایت کا منصب کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ پیشوائی کا اس کو استحقاق ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیشوائی اور
رہنمائی کا منصب نتیجہ ہے یقین کامل اور استقلال عمل کا۔ پس جن اسرائیلیوں کے اندر یہ دونوں باتیں موجود تھیں احکام الٰہیہ پر اُن کو کامل یقین بھی تھا اور شدائد پر
انھوں نے صبر بھی کیا تھا۔ اللہ نے ان کو ہدایت کا مرتبہ عنایت فرمایا۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الخ۔ لیکن ان ہادیانِ برحق کے بعد آنے والی نسلیں تو متحد نہ رہ سکتی تھیں۔ ہر گروہ کا پیشوا جدا تھا۔ پیشواؤں کے
اقوال کا ظاہری اختلاف تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ سب کا مقصد ایک تھا۔ طریق کار ایک تھا۔ رہبری ایک تھی۔ اصولِ ہدایت اور قوانینِ رہنمائی ایک تھے۔
مکانی اور ماحولی اختلاف کے سبب اُن کے اقوال میں ظاہری اختلاف نظر آتا مگر کوئی کسی کو گمراہ یا کج راہ نہیں قرار دیتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کی صداقت اور حقانیت کا اقرار
کرتا تھا۔ غرض ہر گروہ سب باہم متحد تھے۔ البتہ ان کی ذریت ناخلف اور بیرو ناقص العلم اور غبی الفہم تھے۔ انھوں نے ائمہ کے ظاہری اختلاف کو رنگ دے کر مخالفت کی

شکل ہی نمودار کر دیا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ پھر اس پر عناد و خصومت کے محل چننا شروع کر دیئے اور رائی کے دانہ کے برابر اختلاف کوہ ہمالیہ کے برابر ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیدا ہوئی کہ موسیٰ کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے ان کی تصدیق کسی نے کی اور کسی نے نہیں کی۔ موسیٰ اور موسیٰ کی کتاب کو ماننے والے تو سب ہی تھے مگر بعد کو آنے والے پیغمبروں کی نبوت پر سب کا اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گروہ بٹ کر چند در چند گروہ بن گیا اور دینی تفرقہ پیدا ہو گیا اور ایسا پیدا ہو گیا کہ قیامت تک اس کو دور کرنے والا کوئی نہیں۔ بس قیامت کے دن خدا ہی اس اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ اہلِ حق کو ثواب اور اہلِ باطل کو عذاب دے گا۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ الخ۔ اللہ میں دو صفتیں ہیں دو طاقتیں ہیں (۱) مانا برباد کرنا غارت کر دینا۔ ہستی کے نشانات مٹا دینا (۲) زندہ کرنا پیدا کرنا آباد کرنا ترقی دینا۔ پھر ان دونوں فعلوں کے اسباب بھی وہی پیدا فرماتا ہے۔ بربادی اور آبادی، فساد اور صلاح موت اور زندگی افراد کی ہو یا اقوام کی، اُسی کی خلاقیت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس عبرت انگیز دماغ اور نتیجہ پذیر ذہنیت ہے وہ گزشتہ افراد و اقوام کی بربادی کے واقعات اور اس کے اسباب گوشِ ہوش سے سنتے ہیں اور پستی کی بلندی، ذلت کی عزت، غلامی کی حکومت افلاس کی دولت اور موت کی زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ چشمِ بینا سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ پانی کہاں سے آتا ہے، کیوں آتا ہے، چٹیل بے آب و گیاہ خشک زمین میں کیسے پہنچتا ہے، اس کے پہنچنے سے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کس طرح نکلتا ہے اور یہ تمام کارسازی کس کی ہوتی ہے۔ پس افراد و اقوام بلکہ کائنات کی بربادی اور آبادی خشکی اور شادابی، موت اور زندگی کا مطالعہ ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ یگانہ و بے ہمتا خدا کی الوہیت و ربوبیت کا اقرار کریں لیکن جن کے گوشِ ہوش بند ہیں اور چشمِ بصیرت میں روشنی نہیں آنکھ کو آثارِ قدرت اور نتائجِ افعال راہِ راست پر نہیں لا سکتے۔ پس آیتِ مذکورہ میں اللہ نے گزشتہ افراد و اقوام کی بربادی کے واقعات اور تباہی کے اسباب سننے کی طرف توجہ دلائی ہے چونکہ گزشتہ واقعات نظروں کے سامنے نہیں ہوتے صرف سنے جا سکتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ کیا گزشتہ اقوام کی بربادی اور اس کے وجوہ ان لوگوں کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں۔ یہ قرآن کے فرسودہ تباہ شدہ کھنڈروں میں آتے جاتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ کیا انھوں نے اُن کے واقعات نہیں سنے، اللہ کے حکم اور پیغمبر کے فرمان سے سرتابی کرنے کا جو نتیجہ ان کو ملا وہ تو خود طلب اور نتیجہ خیز نشانِ قدرت ہے پھر کیوں نہیں سوچتے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ الخ۔ جس طرح نافرمان اقوام کی بربادی اور ہلاکت نشانِ قدرت ہے اسی طرح مُردہ چٹیل خشک زمینوں میں پانی کے سبب سرسبزی اور شادابی بھی عمومی حکمت ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل ربوبیت کی ایک واضح علامت ہے لیکن وہاں گزشتہ اقوام کے واقعات کا تعلق سُننے سے تھا یہاں زمین کی سبزی اور سبزہ سے جانوروں کی پرورش کا تعلق دیکھنے سے ہے اس لئے جیسے فرسودہ پارینہ کھنڈروں کی حالت پر غور کرنے کی گزشتہ آیت میں دعوت دی تو آخر میں اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ فرمایا اور جب پانی سے کھیتی کے پیدا ہونے اور اس سے جانوروں اور آدمیوں کی پرورش پانے کا تذکرہ فرمایا تو آخر میں اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ پر اختتام کیا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الخ۔ رسالت اور توحید کے ذکر کے بعد ان آیات میں حشر کا تذکرہ فرمایا ہے۔ الفتح سے فراء اور قتیبی کے نزدیک فتحِ مکہ کا دن، سدی کے نزدیک بدر کا دن اور مجاہد وغیرہ کے نزدیک قیامت کا دن مراد ہے۔ اوّل الذکر دونوں قول غلط ہیں کیونکہ فتحِ مکہ اور بدر کے دن کفار کا ایمان ناقابلِ اعتبار اور غیر مقبول نہ تھا۔ فتحِ مکہ کے روز جو لوگ ایمان لائے تھے اُن کو رد نہیں کیا گیا۔ اصل مقصد تیسرے رکن یعنی حشر کا تذکرہ اور اُس کو ماننے کی ترغیب دینی ہے۔

بعض اہلِ تفسیر نے یہ تاویل کی ہے کہ بدر یا فتحِ مکہ کے دن ایمان کے غیر مفید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس روز کافروں کو ایمان کی توفیق ہی نہ ہو گی۔ اس مطلب کے ثبوت میں ایک قصہ بطور شانِ نزول خازن میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کافروں سے کہا کہ فتح کا دن آنے والا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ ہم تم پر غالب ہوں گے۔ اس پر کافروں نے دریافت کیا کہ وہ روز کب آئے گا۔ یہ قصہ روایتاً صحیح نہیں معلوم ہوتا اور بالفرض اگر اس کا ثبوت ہو بھی جائے تب بھی آیات کا سببِ نزول نہیں بن سکتا کیونکہ کافروں کو ایمان کی توفیق نہ ہونا اور ایمان کا غیر مفید ہونا یہ دونوں معنی جدا جدا ہیں۔ اس کے علاوہ واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ فتحِ مکہ کے دن بہتیرے کافر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ پھر ایمان کی توفیق نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں اس لئے صحیح یہ ہے کہ یوم الفتح سے حشر کا دن ہی مراد ہے۔ کیونکہ اس روز حقیقتِ حال کھل جائے گی۔ حقانیت اور بطلان کی وضاحت ہو جائے گی۔ عقائد اور اعمال کی صحت اور غلطی کا پردہ اُٹھ جائے گا اور کل نتائج سامنے آ جائیں گے۔

مقصودِ بیان

موسیٰ کو کتاب عطا کرنے کے تذکرے سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ انبیاء کی بعثت اور کتاب الٰہی کا نزول کوئی غیر معمولی اور تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ سے مکمل کتاب عطا فرمانے کا رسول اللہ سے وعدہ کیا گیا ہے اور تسلی دی گئی ہے کہ موسیٰ کو بھی ہم نے کتاب دی تھی۔ آپ کو بھی مکمل کتاب دیں گے۔ آہستہ آہستہ نزولِ آیات سے اس بات کا شبہ نہ کرنا چاہیے کہ موسیٰ کو تو پوری کتاب یکدم دی گئی تھی اور قرآن خدا جانے پورا دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ توریت صرف بنی اسرائیل کے لئے دستور العمل تھی دوسری قومیں اُس کے احکام پر چلنے کی مکلف نہیں تھیں۔ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا سے واضح ہو رہا ہے کہ امامت اور پیشوائی کا استحقاق اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو جذباتِ نفس سے پاک اور ذاتی خواہشات سے صاف ہو کر امرِ الٰہی کے مطابق ہدایت کرے۔ نفسانی خواہش اور ذاتی جذبہ کے زیر اثر کام کرنے والا امام نہیں ہو سکتا۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اُن واعظوں، مولویوں، عالموں اور مذہبی لیڈروں کو جو وجاہت عزت شہرت اور دولت حاصل کرنے کے لئے تبلیغ اسلام کی آڑ تلاش کرتے ہیں اور مسائلِ دینیہ کو ذاتی اغراض کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ روپیہ ٹھہرا کر فتویٰ نویسی، مسند حق اور کفایتِ حیات سے زائد تنخواہ لے کر مدارس میں نوکری اور قرآن و حدیث کا درس دے کر ضروریاتِ زندگی سے زیادہ اُجرت لینی سب چیزیں حرام ہیں۔ کیونکہ یہ امرِ الٰہی کے مطابق ہدایت نہیں بلکہ ذاتی اغراض کے حصول کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ آیت۔ لَمَّا صَبَرُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ ہادی اور امام کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی دوسروں کو ہدایت کرتا ہے پہلے خود اُس کو اس پر یقین ہو اور تبلیغ کے راستہ میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آئیں اُن سے تنگدل نہ ہو خوشی کے ساتھ ان کو برداشت کرے۔ اس سے اشارہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو بھی ہے کہ تم کو بھی سب سے پہلے آیاتِ الٰہیہ پر ایمان رکھنا اور مصائب کی برداشت پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔ آیت اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا سے دعوت دینی غرض ہے اُن لوگوں کی حالت کے مطالعہ کی جن کو قانونِ قدرت سے سرکشی کرنے کی بنا پر برباد کر دیا گیا اور اب سوائے فرسودہ بوسیدہ نشانات کے اُن کے آثار میں سے کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر دعوتِ مطالعہ دے کر عبرت دلانی مقصود ہے ان لوگوں کو جو زمانہ کی نیرنگیوں میں مبتلا ہو کر اور دنیا کی سطوت سے سرشار ہو کر پندارِ خام میں مبتلا ہیں اور اپنے انجامِ بد کی طرف سے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں۔ پس اس زمانہ کے عام اہلِ اسلام کو حوادثِ زمانہ اور فنائے اقوام سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور معصیت کوشی کو چھوڑ کر قوانینِ فطرت یعنی اصولِ قرآنی پر مضبوطی کے ساتھ عمل شروع کر دینا چاہیے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ الخ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ درسِ عبرت اور سبقِ موعظت صرف حوادثِ دہر اور بربادیِ اقوام ہی نہیں بلکہ نتیجہ آفرین دماغوں کے لئے کائنات کا ذرۂ حیات بھی حکمت آگیں ہے۔ خشک چٹیل میدانوں کو آبیاری کے ذریعہ سے سرسبز و شاداب بنانا قدرت کا موعظت خیز نشان ہے جس سے عطوفتِ عامہ، ربوبیتِ تامہ، رحمتِ کاملہ اور غیبی طاقت کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے پھر جب باقی اور عنصری کائنات قوانینِ فطرت سے سرتابی نہیں کر سکتی تو خود مختار صاحبِ ارادہ مالکِ ذی شعور و اقتدار مخلوق کا سرکشی کرنا انتہائی تعجب انگیز ہے۔ لیکن سے دیدہ اس طرف بھی ایما ہو سکتا ہے کہ مشیتِ الٰہیہ خود مختار ہے جہاں جس بات کی صلاحیت دیکھتی ہے وہاں اُسی بات کو پیدا کرتی ہے جس خشک چٹیل زمین میں قابلیت پاتی ہے وہاں غیر معلوم غیبی اسباب پوشیدہ طریقہ سے پہنچا کر زندگی عطا فرما دیتی ہے اور پھر اُس سبزہ سے دوسرے فرد تمتعوں کی پرورش کرتی ہے اسی طرح جس انسان کے دل میں اس کو صلاحیت نظر آتی ہے وہاں نورِ نبوت پیدا کرتی ہے۔ وحی اور الہام کے پانی سے دل کی خشک زمین کی آبیاری کر کے اول اُس کو زندہ کرتی ہے جب وہ سرسبز ہو جاتا ہے تو پھر اس سے دوسرے اہلِ استعداد کی روحانی پرورش کرتی ہے اور اس طرح مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں اور انسان کی مردہ زندگی میں جان آجاتی ہے۔ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ سے یہ بات بتانی غرض ہے کہ قابلِ سوال تعینِ قیامت نہیں بلکہ کیفیتِ قیامت ہے کیونکہ وقوعِ قیامت کے بعد تو عمل کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے گا۔ نتیجہ سامنے آنے کے بعد عمل کا وقت ختم ہو جائے گا۔ پس ظہورِ نتیجہ سے پہلے عملی زندگانی کو غنیمت سمجھ لینا چاہیے اور یہ دریافت ہی نہ کرنا چاہیے کہ ظہورِ نتیجہ کب ہوگا۔ آیت فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ محض جھگڑا کرنے والے اہلِ عناد سے مباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ طلبگارانِ حق سے مکالمہ سود مند ہو سکتا ہے مگر اہلِ عناد سے مناظرہ بیکار ہے اس لئے ان کی طرف توجہ ہی نہ کرنی چاہیے وغیرہ۔

سورۃ احزاب مدینہ میں نازل ہوئی ہے اس میں — سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ — تہتر آیات اور نو رکوع ہیں۔

اس سورت میں ۷۳ آیات ۱۲۸۰ کلمات اور ۵۹۹۰ حروف ہیں۔ زر بن حبیش کہتے ہیں مجھ سے ابی بن کعب نے فرمایا تو سورۂ احزاب کی کتنی آیتیں پڑھتا ہے؟ میں نے کہا ۷۳ آیات۔ فرمایا بس۔ میں نے تو اس کو اس حالت میں پڑھا تھا جب وہ سورۂ بقرہ کے قریب تھی اور ہم میں اس نے یہ آیت بھی پڑھی تھی اذا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم ۰ پھر جو کچھ اللہ نے چاہا اُٹھا لیا (احمد والنسائی) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کی آیات بہت تھیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی اور صرف تہتر آیات رہ گئیں۔

ابن عباس رضی کی ایک روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق نے منبر پر حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا لوگو! اللہ نے محمد کو نبی برحق بنا کر بھیجا اُن پر کتاب بھیج نازل فرمائی۔ اس کتاب میں آیت رجم بھی ہے جس کو ہم نے پڑھا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی نے آیت مذکورہ کی تلاوت کی پھر فرمایا حضور نے اپنے عہد مبارک میں (زنا کی سزا میں) سنگسار کرایا۔ پھر حضور کے بعد ہم لوگوں نے بھی سنگسار کرایا لیکن اب مجھے اندیشہ ہے کہ زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم کو کتاب الٰہی میں آیت رجم نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کا ایک فرض چھوڑنے سے گمراہ ہو جائیں گے (بخاری و مسلم) ایک روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت عمر رضی نے آخر فرمایا کہ اگر مجھے لوگوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب الٰہی میں اضافہ کر دیا تو میں آیت رجم کو مصحف میں لکھوا دیتا۔

حضرت عائشہ رضی سے مروی ہے کہ حضور کے زمانے میں سورۂ احزاب کو دو سو آیات کے پڑھا جاتا تھا لیکن جب حضرت عثمان رضی نے مصاحف لکھوائے تو ہم لوگ اس مقدار کے جو اب موجود ہے اور کچھ مقدور نہ ہوا۔ حضرت عائشہ رضی کے اس قول سے بعض روافض کہنے لگے کہ قرآن کا کچھ حصہ چھوٹ گیا ہے اور موجودہ مصحف میں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ شیعہ کا یہ استدلال غلط ہے۔ ام المومنین کا مقصود تو صرف یہ تھا کہ اللہ نے جس آیت کی تلاوت یا حکم کو منسوخ کر دیا اس کو حافظوں کے دلوں سے بھی محو کر دیا۔ کسی کو قدرت نہ ہوئی کہ اس کو تلاوت کر کے مصحف میں درج کرتا۔ اس مطلب کی تائید حضرت عمر رضی کے آخری فقرہ سے ہوتی ہے کہ اگر مجھے لوگوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے مصحف میں اضافہ کر دیا تو میں آیت رجم کو لکھوا دیتا اس سے معلوم ہوا کہ جو آیت منسوخ ہو گئی وہ قرآن کا جزو ہی نہیں رہی۔ یہاں تک کہ اگر اس کو لکھوا دیا جائے تو وہ اپنی طرف سے زیادتی ہو گی۔ پھر یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ مصحف کی تدوین تو صدیق اکبر رضی کے عہد میں ہو چکی تھی۔ حضرت عثمان رضی نے تو اس کی نقلیں کرا کے اطراف ملک میں بھیجی تھیں۔ بہرحال بعض آیات کے منسوخ التلاوت ہونے سے قرآن مجید پر تحریف کا الزام لگانا درست نہیں۔ اس کے علاوہ ابو مسلم وغیرہ محققین تو اس کے قائل ہی نہیں وہ منسوخ التلاوت آیات کو قرآنی آیات ہی نہیں کہتے بلکہ ایسی آیات کو حدیث قرار دیتے ہیں جو حضور گرامی نے زبانِ مبارک سے بطور تفسیر ارشاد فرمائی تھی اور چونکہ تلاوت آیات قرآنیہ اور ارشاد تفسیر میں کوئی فصل نہ تھا اس لئے سننے والوں نے اس تفسیری حدیث کو بھی آیت قرآنی سمجھ کر اپنے مصاحف میں لکھ لیا اور مختلف اوقات میں بطور آیت اس کو پڑھتے رہے۔ لیکن قرآن اصلی حالت پر لکھوایا گیا اور اس کام کے لئے قاری مامور کئے گئے اور جتنا جتنا حصہ لوگوں کے سینوں یا کاپیوں میں تھا اس کو تلاش کرا کے ایک جگہ جمع کیا گیا تو وہ ارشادِ تفسیری جس کو آیت سمجھا جاتا ہے درج نہیں کیا گیا۔ میرے نزدیک ابو مسلم کی یہ توجیہ ضرور قابل غور مگر صراحتِ قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ نسخ کا ثبوت تو خود قرآن میں موجود ہے۔ آیت مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا اور بعض دوسری آیات صاف بتا رہی ہیں کہ بعض آیات منسوخ کر دی گئی ہیں اور اُن کی جگہ دوسری آیات نازل کی گئی ہیں اور یہ نسخ صرف نسخ حکم نہیں بلکہ نسخ تلاوت ہے۔ واللہ اعلم۔

بقول ابن عباس و ابن زبیر وغیرہ یہ پوری سورت مدنی ہے اور اس میں جنگِ خندق کا بیان ہے۔ جنگ احد ۳ھ میں ہوئی تھی کفار کو کچھ غلبہ حاصل ہوا تھا اس سے اُن کی ہمتیں پختہ ہوتی تھیں اس لئے ماہِ شوال ۵ھ میں تمام قبائل میں پروپیگنڈہ کرنے کے بعد مختلف جماعتوں کو یکجا کر کے ابو سفیان وغیرہ سرداران قریش مدینہ پر چڑھ آئے۔ حضور والا نے سلمان فارسی رضی کے مشورہ سے شہر کے گرداگرد خندقیں کھدوائیں مزید تفصیل آئندہ آتی ہے چونکہ احزاب مختلف جماعتوں کی یورش کرنے کا بیان اس سورت میں ہے اس لئے اس کا نام سورۂ احزاب ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانو بیشک اللہ دانا مصلحت بین ہے

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ وَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

اور اسی پر چلو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی بھیجی جاتی ہے یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ کافی کارساز ہے

تفسیر ہم اوپر مختلف مقامات میں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ انسانی حیات کو شعلہ عدل و انصاف کے ساتھ باہمی مصالحت، اجتماعیت اور اختلاط کو نباہنے کے لئے قانونِ الٰہی کی ضرورت ہے۔ اس کے دو سبب ہیں (۱) اگر انسان اپنے محدود علم اور عقل سے قوانینِ حیات اور دستورِ عمل کی وضع کرے گا تو ایسے ضوابط یقیناً ناکافی اور ناقص ہوں گے کیونکہ قانون وضع کرنے والے بھی نفسانی جذبات کی آلائش اور طبعی نیچرل میلانات سے پاک نہیں ہو سکیں گے۔ صاف عقل کی روشنی کسی انسان کو میسر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے انسانی ضروریات و لوازم کا پابند ہے۔ مادی کثافت ہر انسان کی عقل کے ساتھ ہے اسی لئے اس کی ہر رائے اور ہر بصیرت صحیح نہیں ہو سکتی۔ قومی رجحانات، خاندانی عواطف و دواعی اور ذاتی مرغوبات و مبغوضات عقل کی روشنی کو کمزور بلکہ بعض اوقات تاریک کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے فلسفر ڈاکٹر اور ہوشمند انسان، انسانی خواہشات اور لوازم کے سیلاب میں بہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ممکن ہی نہیں کہ کوئی آدمی تمام جذباتِ نفس سے پاک ہو کر کوئی قانون وضع کر سکے اور جس قانون کی وضع میں ملکی تعصب، قومی میلان، خاندانی خصوصیت اور ذاتی رغبت و نفرت کو دخل ہو وہ قانون عدل کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ نہ عام انسانوں کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ قانون بنانے والے یا دستورِ العمل میں ترمیم کی خواہش کرنے والے دروغ اور حق سے انکار کرنے والے ہوں تو ناممکن ہے کہ ایسے گروہ کی کوئی رائے صحیح اور کوئی مشورہ جذباتِ نفسانیہ سے پاک ہو۔ ہاں عدالت، حکمت اور مصلحتِ الٰہی قانون میں ہی ہو سکتی ہے کیونکہ خلاقِ کائنات کا تعلق تمام انسانوں سے بغیر خاص رعایت کے مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سب کا وہی مالک اور رب ہے۔ تخلیقی اعتبار سے اس کا کسی خاص شخص یا قوم یا خاندان یا ملک سے مخصوص تعلق نہیں پس اس کا بنایا ہوا قانون ہر کدورت سے پاک، ہر کثافت سے مبرا اور ہر ظلم سے منزہ ہوگا۔

(۲) انسان کا علمی دائرہ بہت تنگ ہے اس کو نہیں معلوم کہ گزشتہ زمانوں میں انسان کہاں کہاں آباد تھے اور آئندہ کہاں کہاں آباد ہوں گے، کتنے تھے اور کتنے ہوں گے۔ مختلف قوموں اور خاندانوں کے ضروریات، مالوفات اور طبعیات کیا کیا ہیں اور کیا کیا ہوں گے۔ اس کا بھی پتہ نہیں کہ ایک گھنٹہ کے بعد زمین کے مختلف گوشوں میں بلکہ اپنے ماحول، اپنے شہر، اپنے محلہ اور اپنے گھر میں کیا واقعات پیدا ہو جائیں گے اور اس وقت کن قوانین پر عمل کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ کیا نظریاتِ حیات ہوں گے، کیا ضوابطِ معاشرت ہوں گے، کیا رخ سیاست کا ہوگا۔ پس ایسا محدود العلم، ناقص المعرفۃ، قلیل الوقوف انسان دنیا کے حوائج کو پورا کرنے والے اور عدالت کو پھیلانے والے دستورِ زندگی کیسے بنا سکتا ہے جس کو اپنی ذاتی آنے والی ضروریات، واقعات اور کیفیات کا بھی یقینی علم نہیں۔ ہاں خلاقِ مطلق، فرد، عالمِ کل اور حکیم علی الاطلاق ہے۔ وہ انسانی اعمال سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ اور آئندہ اور گزشتہ احوالِ انسانی کیا ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کیا ہیں اور لوازمِ صلاح و فساد کیا ہیں۔ پس اسی کو حق پہنچتا ہے کہ قوانین رضوابط وضع کرے اور انسانوں میں عدالت و انصاف قائم کرنے کے لئے ان کو جاری کرے مگر یاد رکھو کہ شیطانی دسیسہ کاریاں اور مکاریاں بھی غیر محدود طاقت رکھتی ہیں۔ جب انسان نما شیطان دیکھتے ہیں کہ ان کا خود ساختہ جال ٹوٹ رہا ہے اور کسی بابرکت ہاتھ نے بڑا آلہ لیا ہے کہ روباہ بازیوں کے جال کا تار و پود بکھیر کر بھولے بھالے بندگانِ خدا کی گردنوں کو آزاد کرا دے گا اور سارے ماحول کو جمہور اور انتہا پسندوں کی پرواہ کئے بغیر اس زمین سے ظلم و فساد کو مٹا کر انصاف و صلاح کا جھنڈا نصب کر دے گا تو بندگانِ شیطان دو گروہ بن کر اس کے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ قوموں، منکروں اور جفاکاروں کا ہوتا ہے جو کھلی الاعلان حق سے سرتابی کرتے اور حاملِ حق کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ اس گروہ کو عرفِ شریعت میں کافر کہا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان بدطینتوں کا ہوتا ہے جو ظاہر میں بانیِ اصلاح کے حامی اس کے گروہ میں داخل اور اس کے لائے قانون کے بلند نعرہ لگاتے

زیں گراں کے دل دشمنی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ قوانینِ عدل کی تخریب اور علمبردارانِ صداقت کی تباہی کے لئے دائرۂ اطاعت میں داخل ہوتے
ہیں۔ یہ دونوں گروہ باہم مشورہ کرنے کے بعد کوئی تدبیر اور اسکیم بناتے ہیں اور فریب کاری پر اتر آتے ہیں۔ اول گروہ بانیٔ حق سے کہتا ہے کہ ہماری تمہاری
مخالفت کوئی ایسی چیز نہیں جو دور نہ ہو سکے کچھ تم اپنی ضد کو چھوڑ دو کچھ ہم ہٹ سے دست کش ہو جائیں۔ اگر آپ اپنے نظریات اور تعلیمی اصول میں اتنی
اور لوچ کر دیں کہ ہمارے دستور العمل کا کچھ حصہ اس سے موافق ہو سکے تو درمیانی راستہ نکل سکتا ہے اور یہ بھی نہیں تو کم سے کم اپنے اصول کی گرفت
لے کچھ ڈھیلی کر دیجئے، ہم اپنے اصول آہستہ آہستہ چھوڑنے کو تیار ہیں۔ دوسرا گروہ اول گروہ کے قول کی تائید کرتا ہے اور داعیٔ حق سے کہتا ہے۔ حضور کا
میں ہمارا کیا ہرج ہے۔ یہ ہمارے دائرے میں داخل ہونے کو تیار ہیں۔ ذرا سی بات ہے ہمارے اصول نرم شکل میں یہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ دونوں
گروہوں کی یہ روباہ بازیاں داعیٔ حق کے دماغ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتی ہیں۔ اس کے پیشِ نظر صرف اشاعتِ حق ہوتی ہے۔ وہ خیال کرتا ہے اگر اس
وقت نرمی کی جائے اور چند اصول میں ان کے لئے سہولت کر دی جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ ابھی یہ خوگر نہیں جب مخلص دل والوں سے ان کا اختلاط ہوگا تو
خود ہی پختہ ہو جائیں گے۔ منادیٔ حق کا یہ اجتہاد اگرچہ کچھ زیادہ بُرا نہیں ہوتا لیکن مخالف گروہ چونکہ مکار ہوتا ہے اس لئے بجائے فائدہ اور دائرۂ اشاعت
کی وسعت کے اصولِ دعوت کو نقصان پہنچتا ہے۔ کافروں اور منافقوں کو مخلص دل والوں کے گروہ میں پروپیگنڈا اور ریشہ دوانیاں کرنے کے
مواقع بسہولت حاصل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے بہکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھولے بھالے اطاعت گزار فرماں بردار جلد بازی
دعوت میں بھی سہل انکاری سے کام لینے لگتے ہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ کا کھلا ہوا نقصان ہوتا ہے۔ اس نقصان سے بچنے کے لئے مناسب یہی ہوتا ہے کہ داعیٔ
حق دونوں باطل پرست گروہوں کی بات کان دھر کر نہ سنے۔ ان کی خواہش کو نہ مانے۔ اپنے اصولِ مذہب پر سختی اور استقلال کے ساتھ جما رہے اور
اللہ کو علیم و خبیر جانتے ہوئے اس کے بھیجے ہوئے قوانین کی تبلیغ میں کسی قسم کی نرمی نہ اختیار کرے اور یہ سمجھے کہ قانون میں تبدیلی اور ترمیم کرنے کی
خواہش کرنے والے اس قابل نہیں کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔ اللہ کا علم اعمالِ انسانی کو محیط ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کی عملی ضروریات کیا ہیں اور
کیا ہوں گی اس لئے بطور پیش بندی کے رسولِ اطہر ﷺ کو اللہ سے ڈرنے اور اس پر بھروسہ رکھنے کا حکم دیا اور دونوں باطل پرست گروہوں کا کہنا ماننے سے
روکا اور اپنی وسعتِ علمی کو ظاہر کیا اور صراحت کے ساتھ خواستگارانِ ترمیم کو کافر اور ان کی تائید کرنے والوں کو منافق کہا۔

لیکن جب باطل پرستوں کی مکاریاں اثر انداز نہیں ہوتیں اور تمام فریب کاریاں رائگاں جاتی ہیں اور داعیٔ حق انتہائی دانائی کے ساتھ اپنی دھن
میں لگا رہتا ہے اور کسی دسیسہ کاری کے جال میں نہیں پھنستا اور علمبردارانِ شیطنت کو اپنی شکست کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر ہر طرف سے منادیٔ صداقت اور
اس کی جماعت کو نقصان پہنچانے کے لئے یورش ہونے لگتی ہے۔ ڈرایا جاتا ہے، دھمکایا جاتا ہے، شیطانی مشورے کئے جاتے ہیں۔ غیر جانبدار افراد اور
جماعتوں کو اکسا کر اس کے خلاف صف بستہ کیا جاتا ہے۔ غرض ایسی کوشش کی جاتی ہے کہ علمبردارانِ حق کی زندگیاں تلخ ہو جائیں اور صداقت کا نام تک
آگے ہتھیار ڈال دے۔ ایسے وقت میں داعیٔ حق کو بڑی ہمت جرأت اور شجاعت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک مقصد ہوتا ہے جس کا نام
اعلانِ صداقت اور اشاعتِ حق ہو۔ وہ تمام مادی طاغوتی طاقتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ حق مغلوب نہیں ہو سکتا
حق کا حامی خدا ہے وہی کارساز ہے۔ اسی پر اس کا بھروسہ ہوتا ہے۔ یہ عقیدۂ جرأت، استقلال بالآخر اس کو کامیاب بنا دیتا ہے۔ اسی لئے آیات مذکورہ
میں اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ کارساز ہے اس کی کارسازی ہر دکھ کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ الخ۔ واحدی نے ان آیات کا سببِ نزول ایک خاص واقعہ کو قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ ابو سفیان
عکرمہ اور ابو الاعور سلمی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ ہمارے بتوں کا تذکرہ چھوڑ دیجئے بلکہ یہ ظاہر کیجئے کہ جو ان کی پرستش کرے گا اس کو
ان کی شفاعت نصیب ہو گی۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔ خطیب نے سراج میں اس واقعہ کو مفصل لکھا ہے جس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ بات یہ
ہوئی کہ قریش نے مذکورہ بالا تینوں اشخاص کو مدینہ بھیجا۔ یہ لوگ ابن ابی منافق کے گھر فروکش ہوئے اور خدمتِ مبارک میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔
اجازت ملنے پر انھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ابن سعد اور ابن ابی وغیرہ منافقوں نے ان کی تائید کی۔ حضور ﷺ والا کو ان کی درخواست ناگوار گزری۔ حضرت
عمرؓ نے عرض کیا حضور ﷺ اجازت ہو تو میں ان کو قتل کر دوں۔ ارشاد فرمایا میں ان کو امان دے چکا ہوں البتہ تم ان کو مدینہ سے نکال دو۔ حضرت عمرؓ نے حکم کی تعمیل

کی اور مدینہ سے باہر نکال دیا۔

میرے خیال میں واحدی اور خطیب کا بیان کردہ سبب نزول آیات سے کچھ زیادہ مربوط نہیں ہوتا کیونکہ آیات میں تو تقویٰ پر قائم رہنے، کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ ماننے، وحی کے مطابق رفتار رکھنے اور اللہ کی کارسازی پر مطمئن رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کافروں کی درخواست تو کسی طرح قابل ہی نہ تھی کہ نبی اعظم تو کجا معمولی موحد بھی اس کو قبول کر سکتا۔ چنانچہ حضورؐ کی ناگواری اور حضرت عمرؓ کا غصہ خود روایت میں مذکور ہے پھر مزید حکم نازل ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میرے نزدیک آیات کے سیاق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۵ھ میں جنگ احد کے ایک سال بعد شوال کے مہینہ میں جب اکثر قبائل عرب مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہو گئے اور مدینہ پر چڑھ آئے تو مسلمانوں نے شہر کے آس پاس خندقیں کھود لیں مورچے بنائے کافروں نے محاصرہ کیا اور محاصرہ کی مدت طویل ہو گئی۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ باہر نبردوں کا فراور شہر کے اندر آستین کے سانپ منافق کھانے پینے کی تنگی اور اس پر ہر وقت کی تکلیف اور اپنی حفاظت کا خیال۔ جب مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ کمزور ہو گئی تو حضورؐ کو اس کا صدمہ ہوا اور خیال فرمایا کہ اگر اس وقت یہ بلا سر سے ٹل جائے تو بہتر ہے خواہ صلح مغلوبانہ حیثیت کی ہی ہو۔ اُدھر کافر بھی محاصرہ سے تنگ آ گئے تھے۔ اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ باہر پڑے پڑے مدت گزر گئی تھی اس لئے ابوسفیان نے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد صلح کا پیام بھیجا اور شرائط صلح کی تفصیل ظاہر کی منجملہ دوسری شرطوں کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ کچھ کھجوریں اور غلہ مسلمان کافروں کو ادا کریں۔ یہ خبر سن کر منافقوں نے تائید کی اور عرض کیا حضورؐ! ان کو کچھ دے کر ٹال دینا ہی مناسب ہے۔ بعض مسلمانوں کو اس کی اطلاع ملی تو وہ غضبناک ہو گئے اور بولے اب ان لوگوں کو اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ ہم سے تاوان لینا چاہتے ہیں۔ ہم ایک کھجور نہیں دیں گے۔ منافقوں کے تائیدی بیانات اور مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالت کے سبب حضورؐ کی طبیعت کا میلان بھی کچھ کی درخواست قبول کرنے کی طرف ہو گیا۔ مگر جب مسلمانوں نے جرأت سے کام لیا اور ہر دکھ کو اٹھانے کا اظہار کیا تو آپ نے شرائط صلح کو رد کر دیا اور درخواست مذکور کو ٹھکرا دیا۔ غالباً یہی واقعہ نزول آیات کا سبب ہوا کیونکہ اس میں کافروں اور منافقوں کے کہنا نہ ماننے اور اتباع وحی کرنے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ باقی وہ واقعہ جو خطیب وغیرہ نے لکھا ہے اول تو روایۃً ضعیف ہے پھر درایت کے بھی خلاف ہے۔ رسول اکرم اللہ تعالیٰ شرک کو منظور کرنے کا خیال بھی دل میں لائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ منافق جو بظاہر مسلمان تھے کس طرح مشرکانہ درخواست کی تائید کر سکتے تھے کیا اُن کو اپنی اندرونی حالت کے ظاہر ہو جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

نبی تو بہرحال متقی تھے۔ مزید تقویٰ کا حکم تاکیدی اور تائیدی حکم ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ اے نبی آپ اپنے تقویٰ پر قائم رہیں، کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آئیں، اُن کے کہنے سے کوئی کام نہ کریں۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ مراد یہ کہ وہ اُن کی باتوں کی اندرونی حقیقت سے بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کی نیتیں اور ارادے خراب ہیں۔ یہ بہکانا چاہتے ہیں پس ان کے بہکانے میں نہ آئیں اور:۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الخ۔ جو وحی آپ کے پاس آئے اُس پر چلیں۔ کسی کے کہنے سننے کا خیال نہ کریں۔ رہ گیا مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھ کر دکھ پانا اور کافروں کے حصار اور سخت گیری کا اندیشہ تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ الخ۔ آپ اللہ پر بھروسہ کریں وہ کارساز ہے اور اسی کی کارسازی آپ کے لئے کافی ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ کافروں کی یورش اور حصار اور سخت گیری اور بے پناہ طاقت آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی خود ہم کھا کر چلے جائیں گے۔ شہر کے اندر داخل نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ استعداد حملہ سے تنگ آ کر غیبی کارسازی اور کارفرمائی کے زیر اثر کفار کو بھاگنا پڑا اور مسلمان پہلے کی طرح آزاد ہو گئے۔ پورا قصہ جنگ احزاب کے ذیل میں آئے گا۔

مقصود بیان بغیر نام کے اَلنَّبِیُّ کہہ کر خطاب کرنا حضورؐ کی عظمت شان اور محبت الٰہیہ پر دلالت کر رہا ہے۔ کسی جگہ قرآن میں حضورؐ کا نام لے کر خطاب نہیں فرمایا گویا نبوت کے فرد کامل آپ ہی تھے۔ نبی کہنے کے بعد نام لینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبوت بہت بڑے مرتبہ کا نام ہے۔ تمام خطابات سے بڑھ کر یہ خطاب ہے۔ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ ماننے کا حکم دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کافر اپنے کفر کے سبب اور منافق اپنے نفاق کی وجہ سے مسلمانوں کو ایسا مشورہ نہیں دے سکتے جن سے ان کو قومی عروج دینی برتری اور جمہوری حیثیت سے دنیوی ترقی اور کامیابی حاصل ہو اس لئے اُن کے کسی قول یا مشورہ کو ماننے کے یہ معنی ہوں گے کہ دین میں کمزوری اور مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ

پیدا کی جائے جو بالکل ناجائز ہے۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ سے ایک رابطہ کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ ظاہر کرنا غرض ہے کہ مسلمانوں کا دستورِ زندگی ہر شعبہ میں خواہ وحی جلی (قرآن) ہو یا وحی خفی (یعنی الہام نبی) ہو۔ اپنی رائے سے سیاسی معاشرتی یا اور کسی قسم کا نظام بنانا حرام ہے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ سے یہ تعلیم دینی غرض ہے کہ مادی طاقت کی ہمہ گیری مسلمان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی بشرطیکہ اللہ پر کامل بھروسہ ہو اور اس کی مرضی ہر وقت پیش نظر ہو۔ وغیرہ۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ ۚ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ اللَّائِي تُظَاهِرُونَ

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے دو دل اس کے اندر نہیں بنائے اور نہ تمہاری اُن بیبیوں کو تمہاری مائیں کر دیا ہے جن سے تم ظہار

مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ

کرتے ہو اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا بنایا یہ تمہارے اپنے منہ کی بات ہے اللہ سچی بات

الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۝ ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ ۚ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا

فرماتا ہے اور وہی راستہ دکھاتا ہے اُن لے پالکوں کو اُن کے باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارا کرو اللہ کے نزدیک یہی پورا انصاف ہے اگر تم کو ان کے باپ

آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ ۚ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم

معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے آزاد کردہ غلام ہیں جس بات میں تم غلطی کر جاؤ اس کا تم پر گناہ نہیں

بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

ہے البتہ گناہ اس کا ہے جس کا تمہارے دل قصد کریں اور اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق چند روابط کے زیر اثر ہوتا ہے (۱) رشتہ داری (۲) زوجیت (۳) دوستی (۴) وطنیت (۵) علم انسانیت یہ روابط پانچوں ایسے ہیں کہ ایک آدمی کو دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ سیاسی اقتصادی اور دوسرے کاروباری تعلقات انہی کے فروغ یا اسی سرچشمہ سے پھوٹ کر نکلنے والی نہریں ہیں۔ اسلام نے بھی ان تعلقات کو قائم رکھا اور نہ فقط قائم رکھا بلکہ بہت زور سے ان تمام تعلقات کو حسب مرتبہ مستحکم بنانے کی تاکید کی لیکن بعض اقوام یا افراد غلط فہمی یا کجروی کے تحت ان تعلقات کو صحیح مرتبہ پر نہیں رکھتے۔ ان سب کی خاص حد بندی نہیں کرتے۔ ایک کو دوسرے کی جگہ دیتے ہیں۔ باہم ادغام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً بعض ناشائستہ الفاظ زبان سے نکال کر بیوی کو ماں سمجھنے لگتے ہیں اور ماں کے تعلقات بیوی سے کرتے ہیں اور بیوی کو ماں کی طرح حرام سمجھنے لگتے ہیں۔ یا کسی کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیتے ہیں تو ولدیت کے تمام حقوق اس کو دینے لگتے ہیں سگے بیٹے میں اور اس میں کوئی امتیاز قائم نہیں رکھتے یا دوستی کی دوستی کی اتنی پاسداری کرتے ہیں کہ قریب ترین رشتہ داروں اور عزیزوں پر ان کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ میراث اور دوسرے خاص حقوق بھی ان کو عطا کرتے ہیں اور خاص رشتہ داروں کو محروم کر دیتے ہیں۔

حقیقت میں آدمیوں کی پراگندگی، بے ربطی، منافرت، تفریق اور پھوٹ جس طرح صلاح کو تباہ کرنے والی، عافیت کو برباد کرنے والی اور انسانی سوسائٹی کو ضرر پہنچانے والی ہے اسی طرح روابط کے حدود کی پاسداری نہ کرنی ایک رابطہ کو دوسرے رابطہ کی جگہ دے دینی اور ہر شخص کو اس کا مرتبہ اور مقام نہ دینا اور اعتدال کو چھوڑ کر افراط یا تفریط کے غار میں گرنا بھی انسانیت اور عافیت کو ہلاک کرنے والا ہے۔ معاملات کی اتنی توسیع کر کے حقائق پر غالب آ جائیں تعمیر انسانی کو ڈھا دینے والی ہے۔ بناوٹ فطرت سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اگر آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے گی تو اس عالم

ثابت ہو جائے گا۔ اولاد اسی کی اولاد ہے جس کے نطفہ سے پیدا ہوتی۔ ماں وہی ہے جس کے پیٹ سے آدمی پیدا ہو۔ دوست کو خون کی قرابت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہر رابطۂ انسانی کو ان کے درجہ پر رکھا جائے۔ ماں کو ماں، بیوی کو بیوی، شوہر یا بیٹے کو عزیز ترین خادم، دوست کو دوست اور عزیز کو عزیز سمجھا جائے۔ ہر طبقہ کے حقوق اس کے حد کے اندر ادا کئے جائیں۔ ایک کو دوسرے کے حقوق نہ دیئے جائیں۔ رشتہ دار بہرحال رشتہ دار ہیں لیکن دوستی، صداقت اور رفاقت کا سلوک بھی دوستوں سے لازم ہے۔ لیکن خوب سمجھ لو کہ اسلام نے انسانی سوسائٹی کی تنظیم اور اس عام کے استحکام کے لئے مذکورہ بالا جسمانی روابط کو بھی کافی نہیں سمجھا اور نہ ان کی حد بندی پر ہی عافیتِ عامہ کے تحفظ کو مقصود رکھا اور نہ واقع میں اس نظام انسانی کی حفاظت ہو سکتی ممکن ہے۔ جب تک قانونی طور پر اس کی حفاظت کا ذمہ ہر شخص اپنے اوپر نہ اٹھائے اور ایک ضابطہ میں سب کے سب اپنے کو منسلک نہ کر لیں۔ اس لئے ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جو ہر شخص کے حقوق کی حد بندی کر دے بلکہ دلوں کو اسی کی پابندی کی طرف مائل کر دے سو اسلام میں ایسے قانون کا نام قرآن ہے۔ قرآن نہ فقط جسمانی فسادات اور تباہ کاریوں کو دور کرتا ہے بلکہ دماغی اور قلبی اصلاح کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو قریب یگانگت اور خصوصی تعلق قرآنی کو انسانی عافیت سے ہے وہ باپ کو بیٹے سے، ماں کو بیٹی سے، دوست کو دوست سے، استاد کو شاگرد سے بلکہ کسی کو اپنی ذات سے بھی نہیں ہے۔ کیونکہ شخصی اور نوعی تباہ کاریوں کو دور کرنے والا صرف قرآنی ضابطہ ہے اور جب قرآن کو ہر شخص کی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کو لانے والے اور پھیلانے والے کا تعلق ہر شخص کی ذات سے کتنا قوی ہوگا۔ یہی وہ روحانی، اصلاحی، تعلیمی اور ایمانی تعلق ہے جو ہر مومن کے ساتھ رسول کو ہے اور یہی وہ رابطہ ہے جو تمام مادی اور جسمانی روابط سے بالاتر ہے۔ اسی کو سمجھنے اور سمجھ کر کاربند ہونے پر زندگی کی کامرانی اور سعادت ابدی موقوف ہے۔ پھر جب رسول کو ہر شخص کے ساتھ امتیازی خصوصیت حاصل ہے تو رسول کی بیویاں بھی کچھ نہ کچھ اس قربت واحترام کی مستحق ہیں جو اہلِ ایمان کی ماؤں کو حاصل ہے۔

تحلیل اجزاء مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ۔ آیت بالا میں تعلیم دی تھی کہ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانو اور اللہ کے بھیجے ہوئے احکام پر چلو۔ گویا اہلِ باطل کے قول اور آسمانی وحی میں تضاد ہے۔ ایک کو ماننا اور اس پر چلنا دوسرے کو ماننے اور اس پر چلنے کے منافی ہے مگر اس زمانہ میں بھی ہے اور ہمیشہ سے دستور چلا آیا ہے کہ ہوشمند مصلح اور کامیاب پیر اور موافق کار پیشوا وہی ہوتا ہے جو زمانہ اور ماحول اور سوسائٹی کے موافق کام کرے اور موافقت کرنے کے باوجود آہستہ آہستہ تاثیر اور غیر محسوس رفتار سے اپنے نظریات کو پھیلائے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے بڑے بڑے پروپیگنڈہ کرنے والے اور بلند بانگ علماء اور رعایت اسی راستہ پر چل رہے ہیں اور چلتے رہے ہیں۔ گویا ظاہری موافقت اور باطنی مخالفت تبلیغ و اصلاح کا بہترین پالیسی سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دو دلی، دورنگی اور دو غلا پن کامیابی کا بنیادی پتھر ہے۔ لیکن اسلام چونکہ صاف صورت اور صاف سیرت مذہب ہے؛ اس کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ اس کے کسی کلیہ یا جزئیہ میں کوئی سیاہ داغ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دورنگی اختیار کرنا اقتضائے حقانیت لازمۂ صداقت اور شانِ نبوت کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں صاف صراحت فرما دی کہ کسی انسان کے سینہ میں خدا نے دو دل نہیں پیدا کئے (پھر کیوں ظاہری حالت کو باطنی کیفیت سے جدا کر کے ظاہر کیا جائے اور کیوں اہلِ باطل کے قول کو وحی کے مقابلہ میں مانا جائے یا ان کے کہنے سے پیامِ الٰہی میں ترمیم کی جائے جب دل ایک ہے تو اس میں محبت و اطاعت ہوگی یا بغض اور نفرت دونوں باتیں ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتیں)

عرب کے جاہل آدمی بطور تفاخر کہہ دیا کرتے تھے کہ ہمارے دو دل ہیں۔ مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ابن جریر نے لکھا ہے اور عوفی نے ابن عباس سے بھی اسی کو روایت کیا ہے کہ قریش میں ایک آدمی اپنی کامل دانائی کا دعویٰ رکھتا تھا اور کہتا تھا میرے دو دل ہیں۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اس شخص کا نام ابو معمر جمیل بن معمر فہری تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ قریش کہا کرتے تھے کہ اس کے دو دل ہیں اسی لئے تو اس کی یادداشت اتنی قوی ہے اسی دو دلی پر ناز کرتے ہوئے مدینہ کے منافق دو طرفہ باتیں کیا کرتے تھے مسلمانوں کے جلسہ میں کچھ اور کہتے تھے اور تنہائی میں اپنے آدمیوں کے سامنے کچھ اور بیان کرتے تھے۔ ان سب لوگوں کا رد اس آیت سے ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ آیت آئندہ متصل احکام کے لئے تمہید بھی ہے۔ اگر ایک سینہ میں دو دل نہیں ہو سکتے اور حق و ناحق کا اجتماع ناممکن ہے تو کسی چیز کا اصلی حکم باقی رہتے ہوئے مجازی حکم کیسے جاری ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی کسی کے نطفہ سے نہیں پیدا ہوا تو اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کے پیٹ سے کوئی نہیں نکلا تو وہ عورت اس کی ماں کیسے بن سکتی ہے۔ بس

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ. جن بیویوں سے ظہار کر لیا جائے وہ حقیقۃً مائیں نہیں ہو سکتیں اور جب مائیں نہیں ہو سکتیں تو احکام زوجیت سے خارج بھی نہیں ہو سکتیں۔

اسلام سے پہلے عرب کا دستور تھا کہ وہ خفا ہو کر بیوی کو کہہ دیتے تھے۔ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ تو مجھ پر اسی طرح حرام ہے جس طرح میری ماں کی پشت۔ پشت سے کنایہ ہوتا تھا ستر خاص کی طرف۔ شرم کے سبب ستر خاص کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ایسے الفاظ جاہلیت کے زمانہ میں طلاق سمجھے جاتے تھے۔ اسلام میں ایسی تشبیہات کو ظہار کہتے ہیں۔ فقہ اسلامی میں مذکور ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کے کسی عضو حرام سے تشبیہ دی تو اس سے طلاق نہیں ہو جاتی بلکہ کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔ ایک غلام یا باندی آزاد کرے یا پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے یا ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلائے۔ یہ بیہودہ الفاظ استعمال کرنے کی سزا ہے ورنہ فی نفسہٖ ناشائستہ الفاظ کہنے سے حقیقت زوجیت و امیت بدل نہیں سکتی۔ چنانچہ اگر اس سے بھی آگے بڑھ کر کسی نے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہوں اعوذ باللہ کہا ہو تو ایسا آدمی مکمل بیہودہ فحش گو اور جھوٹا سمجھا جائے گا۔ اس کی بیہودگی کا ازالہ کفارہ سے بھی نہیں ہو سکتا، اسی لئے شریعت نے اس کے لئے کوئی کفارہ مقرر نہیں کیا صرف توبہ سے اس کے گناہ کی معافی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ. منہ بولے بیٹوں کو حقیقی اولاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ خاندان بنی کلب میں حارثہ کا ایک بچہ زید تھا جو کسی جنگ میں قید ہو گیا تھا۔ زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق قید کرنے والوں نے اس کو فروخت کر دیا حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی ام المومنین خدیجہ بنت خویلد کے لئے خرید لیا۔ جب خدیجہ کا نکاح حضور اقدس سے ہوا تو ام المومنین نے وہ لڑکا حضور کو دے دیا۔ لڑکے کے باپ اور چچا کو اطلاع ہوئی تو وہ خریدنے کے لئے آئے لیکن زید نے صاف جواب دے دیا کہ میں ان کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ باپ نے کہا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے۔ حضور نے زید کی اس محبت کو دیکھ کر آزاد کر کے بیٹا بنا لیا اور عام لوگ اس کو زید بن محمد کہنے لگے۔ ہجرت کے بعد حضور نے زید کا نکاح اپنے ہی خاندان میں زینب بنت جحش سے کرا دیا، لیکن زوجین میں موافقت نہ ہوئی۔ زید نے ناگواری کے سبب زینب کو طلاق دے دی تو حضور نے خود ان سے نکاح کر لیا۔ اس بات سے کافروں اور منافقوں کو طعن کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ محمد نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس کے رد میں آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیت کا مقصود یہی ہے کہ بنایا ہوا بیٹا واقعی بیٹا نہیں بن جاتا کہ جو احکام صلبی بیٹے کے ہیں وہ سب بنائے ہوئے بیٹے کے ہو جائیں۔ یہ تحلیل و تحریم کافروں اور منافقوں کی خود ساختہ ہے۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ. وہ اپنی زبانوں سے خود بیٹا بنا لیتے ہیں مگر اس سے خدا کے نزدیک اولاد ہونا ثابت نہیں ہو جاتا کہ تمام احکام وہی جاری ہو جائیں جو حقیقی اولاد کے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِی السَّبِيْلَ. حقانیت اور صداقت تو صرف اللہ کے قول میں ہے۔ سب راستے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ جو انسانوں کی ہلاکت اور بربادی کے راستے ہیں۔ راہِ نجات اور طریق سعادت صرف خدا کا راستہ ہے وہی صلاح اور فلاح کا راستہ بتاتا ہے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ. یعنی اگر منہ بولے بیٹوں کے باپوں کے نام معلوم ہوں تو ان کی نسبت ان کے باپوں کی طرف کر ما طرف کے وقت حقیقی باپوں کا اظہار کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ زید بن حارثہ حضور اقدس کے آزاد کردہ غلام تھے ہم لوگ ان کو زید بن محمد کہا کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن میں آیت اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ نازل ہوئی (رواہ البخاری و مسلم و النسائی)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ سوائے اپنے باپ کے دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرنا کفر ہے یعنی حرام ہے۔ ابن کثیر نے یہی لکھا ہے۔ شیخ نے حضرت عمرؓ کی ایک روایت لکھی ہے کہ ہم لوگ آیاتِ منسوخہ میں سے اس آیت کو بھی پڑھا کرتے تھے وَلَا تَرْغَبُوْا عَنْ اٰبَآئِكُمْ فَاِنَّهٗ كُفْرٌ بِكُمْ اَنْ تَرْغَبُوْا عَنْ اٰبَآئِكُمْ یعنی اپنے باپوں سے منہ موڑ کر دوسروں سے رشتہ نہ جوڑو۔ یہ تمہارے لئے کفر ہے۔

اسلام سے پہلے عرب کا قاعدہ تھا کہ جس کو بیٹا بنا لیتے تھے اس سے ہر طرح برتاؤ بیٹے ہی کا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ گھر کی عورتوں کے ساتھ تنہائی میں بھی دوسرے محارم کی طرح رہا کرتا تھا۔ اسی بنا پر حضرت ابو حذیفہ کی بیوی سہلہ بنت سہیل نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ہم پہلے سالم کو بیٹا کہتے تھے اور وہ بیٹوں کی طرح میرے پاس آیا جایا کرتا تھا لیکن جب خدا نے یہ حکم نازل کر دیا تو اب مجھے ابو حذیفہ کے دل میں ناگواری کے آثار نظر آتے ہیں۔ حضور صلی اللہ

فرمایا تو اس کو دودھ پلادے وہ تیرا محرم ہو جائے گا۔ گویا آیت مذکورہ کے نزول سے جاہلیت کا سابق رواج مسدود کر دیا گیا۔

لیکن محل تحقیق ایک یہ امر ہے کہ جب باپ کی طرف نسبت کرنے کا حکم ہے تو کسی بچہ کو بیٹا کہنا بھی ممنوع ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا قول شفقت اور محبت کے اظہار کے لئے کہا جاتا ہے نسبت بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب حجۃ الوداع میں حضور اقدس صلعم فروکش ہوئے تو خاندان عبدالمطلب کے بچوں کو پہلے منیٰ کی طرف رُخ کر دیا اور فرمایا۔ اے میرے بیٹو! جب تک آفتاب نہ نکلے تم لوگ کنکریاں مارتی۔ فرمودہ کیمو (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) حضرت انسؓ کا قول ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے بیٹا کہہ کے خطاب فرمایا (مسلم، ابوداؤد، ترمذی) غرض یہ کہ اپنا واقعی نسب چھپانے یا کسی دوسری مصلحت کے تحت کسی غیر کو اپنا باپ ظاہر کرنا حرام ہے شفقت اور محبت کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنے ناجائز نہیں ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی ولدیت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر ان کے باپوں کے نام لے کر خطاب کرنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اجنبی کے متعلق کیا معلوم کہ اس کا باپ کون تھا اس لئے ارشاد فرمایا۔ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْكُمْ یعنی اگر تم کو آزاد کردہ غلاموں اور جانے بیٹوں کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو ولدیت ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اُن کو بھائی اور مولیٰ (قرابتدار، عزیز، دوست) کہہ کر پکارو۔ جب سال حدیبیہ کے بعد حضورؐ والا عمرہ کر کے مکہ سے باہر نکلے تو سیدالشہداء حضرت حمزہؓ کی لڑکی چچا چچا کہتی ہوئی حضورؐ کے پیچھے ہو لی۔ حضرت علیؓ نے اس کو گود میں اُٹھا لیا اور سیدۃ النساءؓ سے فرمایا اپنے چچا کی بیٹی کو لیجئے۔ سیدہؓ نے اس کو گود میں لے لیا۔ پھر اس کی پرورش کے متعلق بعض اہل استحقاق میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ میرے چچا کی لڑکی ہے میں اس کا زیادہ حقدار ہوں۔ حضرت زیدؓ نے کہا یہ میری بھتیجی ہے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا۔ اول تو یہ میرے چچا کی لڑکی ہے۔ دوسرے یہ کہ میری بیوی اسماء اس کی خالہ ہے۔ حضورؐ نے لڑکی حضرت جعفرؓ کو دلا دی اور فرمایا خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے اور حضرت علیؓ سے فرمایا تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں اور حضرت زید سے فرمایا تم ہمارے بھائی اور مولیٰ ہو (الحدیث فی الصحیح) بعض اہلِ تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر کسی آزاد آدمی کو پکارنا ہے اور اس کے باپ کا نام معلوم نہیں تو بھائی کہہ کر پکارو اور اگر غلام ہے تو جس کا غلام ہے اس کا مولیٰ کہہ کر بلاؤ۔ زجاج نے مَوَالِیْكُمْ کا ترجمہ اولیاءکم فی الدین کیا ہے۔ مَوَالِیْ مَوْلٰی کی جمع ہے اور مَوْلٰی وَلَاء سے مشتق ہے۔ وَلَاء کے معنی ہیں قرابت اور نزدیکی۔ قرابت نسبی کے علاوہ اسلام نے قرابت سببی کا بھی اعتبار کیا ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں بیان کیں

(۱) قرابت موالاۃ یعنی دو آدمیوں کا باہم ایسا معاہدہ اور ایسی پختہ دوستی جس کے سبب سے ایک دوسرے کے نیک و بد میں شریک ہونا ضروری سمجھے ابتدائے اسلام میں ایسے معاہدہ کے بعد وراثت میں بھی شریک کیا جاتا تھا۔ مدینہ میں پہنچنے کے بعد حضور والا نے مہاجرین و انصار میں ایسی ہی برادری اور دوستی کرائی تھی۔ اب وراثت کی شرکت کا حکم تو باقی نہیں رہا مگر ایسی دوستی کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ عقد موالات قبائل عرب میں ہوا کرتا تھا۔ غیر برادری کے لوگ کسی قبیلہ سے موالات کر کے بڑی عافیت سے زندگی گزارتے تھے۔ جس شخص یا قبیلہ سے موالات کی جاتی تھی تو موالات کرنے والا اسی کا مولیٰ کہلاتا تھا

(۲) قرابت عتاقت۔ جو کوئی کسی کو آزاد کرتا تھا تو آزاد کردہ اسی کی طرف منسوب ہوتا تھا۔ اور اس کو بھی آزاد کرنے والے آقا کا مولیٰ کہا جاتا تھا۔ ولاء کی تیسری قسم ایک اور بھی تھی۔ اگر کوئی کسی کے ہاتھ پر اسلام لاتا تھا یا کسی سے علم دین سیکھتا تھا یا کسی کی ہدایت سے راہ راست پاتا تھا تو وہ بھی اس کا مولیٰ کہلاتا تھا۔ امام ابوحنیفہ اور بعض دوسرے علماء عجم کے بزرگ جب اسلام لائے تو اپنے مرشدوں کے مولیٰ کہلائے جن کو عربی محاورہ سے ناواقف ہونے کی بناء پر لوگوں نے آزاد کردہ غلام سمجھ لیا۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جس قسم کے موالات جس شخص کے حق میں ہوں اسی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو مولیٰ کہو مگر خوب سمجھ لو کہ الفاظ سے اس کی تحقیر نہ ہونے پائے۔ وہ درحقیقت دینی بھائی ہے۔

وَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ الخ۔ بعض اشخاص اپنے نسب کی تحقیق انتہائی کوشش کے ساتھ کرتے ہیں اور تنقیح کے بعد اپنا نسب ظاہر کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کی تحقیق غلط ہوتی ہے اگرچہ ان کی نیت کو اس غلطی میں کوئی دخل نہیں ہوتا مگر واقع میں غلطی ہوتی ضرور ہے۔ بعض لوگوں کے منہ سے غلطی سے بات نکل جاتی ہے اور نادانستہ وہ کسی کو یا اپنے کو کسی شخص سے نسبی طور پر متعلق کر دیتے ہیں اور اس غلطی میں چونکہ نیت کو دخل نہیں ہوتا اس لئے ناقابلِ گرفت ہوتی ہے۔ اسی بناء پر آیت مذکورہ میں معافی کی صراحت فرمائی۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ غلطی سے نادانستہ طور پر اگر غلط انتساب کے الفاظ نکل جائیں یا تحقیق اور کاوش کے بعد بھی اگر غلطی ہو جائے تو ایسی غلطی ناقابلِ مواخذہ ہے۔ قابلِ گرفت وہی خطا ہے جو قصداً ہو۔ غیر ارادی اور نادانستہ خطا کو اللہ معاف کرنے والا ہے۔

غفور رحیم ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ متعدد بیٹوں کا حقیقی بیٹا نہ ہونا بلکہ دینی بھائی ہونا اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا تھا جس سے زید بن حارثہ کا ابن الرسول نہ ہونا مستفاد ہو گیا تھا اب اس جگہ رسول اور امت کا واقعی رشتہ اور تعلق ظاہر فرمایا تاکہ اس بات کی کافی وضاحت ہو جائے کہ اُبوّتِ اور نبوت کا رشتہ کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ نبی کا تعلق اہل ایمان سے اتنا قریبی ہے کہ کسی کا اپنی جان سے بھی نہیں ہے یعنی نبی کریم کی محبت الٰہی ہر مومن کے دل میں اپنی جان سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔ والدین، اولاد اور مال کا تو ذکر ہی کیا ہے بخاری اور مسلم کی حدیث میں ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں اس کی نظر میں اُس کے باپ، اولاد اور جان و مال سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ ایک اور صحیح حدیث ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اپنی ذات کے علاوہ تمام اہل و عیال سے زیادہ حضور مجھ کو محبوب ہیں ارشاد فرمایا عمر ایسا ہرگز نہیں (ہو سکتا یعنی اس سے ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی) تاوقتیکہ میری محبت تم کو اپنی جان سے زیادہ نہ ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اب تو حضورؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ ارشاد فرمایا عمر اب ایمان کامل ہوا۔ بخاری نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے حضورؐ نے فرمایا۔ ہر مومن کے لئے دنیا و آخرت میں میں سب سے اولیٰ (قریبی تعلق رکھنے والا) ہوں اگر اس کا ثبوت چاہتے ہو تو آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ پڑھو۔ جو مومن اپنے انتقال کے وقت مال چھوڑے تو اس کے وارثوں کے لئے ہے اور جو شخص اپنے اوپر قرضہ یا اولاد کو بغیر سرپرست کے چھوڑ کر مر جائے تو وہ میرے پاس آئے میں اُس کا ذمہ دار ہوں۔

مذکورہ احادیث اور آیت کا مغز یہ ہے کہ اطاعتِ رسول ہر شخص کی اطاعت پر مقدم ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ذاتی خواہش اور قلبی پسندیدگی کو بھی حکم رسول پر قربان کر دینا لازم ہے۔ فرمانِ نبوی کے مقابلے میں چون و چرا کرنا اور اپنی ذاتی خواہش کو ترجیح دینا حرام ہے اور حضور گرامی کی امادی محبت ماں باپ بلکہ اپنی ذات سے بھی زیادہ ہونی ضروری ہے۔

وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّہٰتُہُمْ۔ یعنی حضورِ گرامی کی بیبیاں تمام اہلِ ایمان کے لئے ماؤں کا حکم رکھتی ہیں۔ عزت، توقیر، اطاعت، زیست، نکاح اور بعض دوسرے احکام میں حضورؐ کی بیبیاں مومنوں کے لئے حقیقی ماؤں کی طرح ہیں۔ بیبیاں کوئی ہوں کوئی تخصیص نہیں۔ بات یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات چونکہ رسولؐ کی ازواج تھیں اور رسول پاک کا رشتہ ہر مومن کے ساتھ ہر رشتہ سے زیادہ قوی ہے اس لئے ازواجِ پاک کا رشتہ بھی اگرچہ رشتۂ رسالت نہ سہی پھر بھی ہر رشتہ سے زیادہ قوی ہونا لازم ہے۔ لیکن ازواجِ مطہرات کی روحانی عزت تو ظاہر بین نظروں سے پوشیدہ ہے اُس کا صحیح اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا مگر مادی رشتوں میں جو سب سے زیادہ قوی رشتہ ہے کم سے کم اُس کی برابر تو ازواجِ پاک کا رشتہ سمجھنا لازم ہی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ ازواجِ پاک کا ہر حکم ماں کی طرح ہے یہاں تک کہ اُن سے پردہ بھی نہ ہونا چاہیئے اور حقیقی ماں کی طرح اُن کو میراث بھی ملنی چاہیئے آیت میں صرف عزت، احترام، حرمتِ نکاح اور بعض دوسرے احکام میں ازواجِ پاک کو حقیقی ماؤں کی طرح قرار دیا گیا ہے۔

شیخ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ تحریمی حکم بالاجماع امہات المومنین کی لڑکیوں اور بہنوں کی جانب متعدی نہیں ہوتا یعنی اُن کی لڑکیوں اور بہنوں سے مومنوں کا نکاح صحیح ہے۔ دیکھو حضور گرامیؐ نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کیا تھا۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُہُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ الخ۔ یعنی جو مومن مرے اور اُس کا کوئی ایسا رشتہ دار موجود ہو جس کا میراثی حصہ آیت میراث میں بیان کر دیا گیا ہے تو موالاتی بھائیوں کو اُن کے مقابلہ میں میت کے ترکہ میں سے کوئی میراثی حصہ نہیں ملے گا۔ ابن عباسؓ وغیرہ نے بیان کیا کہ حضور اقدسؐ نے مہاجرین کو انصار کا بھائی بنا دیا تھا۔ اگر کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کے قرابتدار میراث نہیں پاتے تھے بلکہ اُس کے دینی بھائی مہاجر کو ہی میراث ملتی تھی مگر اس حکم کو خدا تعالیٰ نے آیت وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُہُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ سے منسوخ فرما دیا۔ سعید بن جبیر اور اکثر تابعین کا یہی قول ہے۔

حضرت زبیر بن عوام نے فرمایا کہ یہ آیت قریش اور انصار کے حق میں خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ ہم لوگ جب گھر بار چھوڑ کر حضورؐ کے ہمرکاب مدینہ میں آ گئے تو ہم بالکل نادار تھے۔ ہم نے انصار سے بھائی چارہ کر لیا اور ان کو بہت اچھا بھائی پایا۔ ابوبکرؓ نے خارجہ بن زیدؓ سے عمرؓ نے ایک اور انصاری سے عثمانؓ نے بنی زریق کے ایک آدمی سے اور میں نے کعب بن مالک سے برادری کر لی۔ ایک روز کعب بن مالک مردہ

حالت میں ہو گئے اگر اس روز مر جاتے تو سوائے میرے کوئی ان کا وارث نہ ہوتا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میراث پھر قرابت داروں کی طرف لوٹا دی گئی (رواہ ابن ابی حاتم) اس روایت میں بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مواخاتی بھائیوں کا وارث ہونا اس آیت سے منسوخ ہو گیا لیکن قتادہ کا قول ہے کہ ہجرت کے بعد مہاجرین میں توارث ہجرت کی بنا پر ہوتا تھا۔ (توارث میں قرابت کو دخل نہ تھا اور مہاجر دوسرے مہاجر کا وارث ہوتا تھا خواہ اس سے رشتہ ہو یا نہ ہو جو لوگ مہاجر نہ تھے ان کو سورۂ انفال کی آیت وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا کے حکم کے تحت مہاجر کی میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن سورۂ انفال کی دوسری آیت اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بغاہی نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ میرے نزدیک سابق قول اور اس قول میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مہاجرین انصار کی میراث بھائی چارہ ہو جانے کے سبب پاتے ہوں تو اس کا نسخ سورۂ انفال کی آیت سے ہو گیا۔ واللہ اعلم

اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا یعنی میراث تو سوائے درجہ وار رشتہ داروں کے اور کسی کو نہیں ملے گی خواہ رشتہ داروں کے علاوہ کوئی مہاجر ہو یا انصاری دینی دوست ہو یا اجنبی۔ ہاں اگر دینی دوستوں سے اپنی زندگی میں کچھ سلوک کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ معروف سے مراد وہ ہبہ ہے جو آدمی اپنی تندرستی کی حالت میں کسی کو کر دے اور وہ وصیت بھی مراد ہے جو اپنے مرنے کے بعد کل مال کا تہائی حصہ دینے کے متعلق کی ہو۔

كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا یعنی اگرچہ دینی برادروں اور بنائے ہوئے بھائیوں کو میراث ملنے کا ذکر دیا جا چکا ہے مگر وہ حکم عارضی تھا۔ علم الٰہی میں وہ حکم ایک خاص زمانہ تک تھا اب اللہ نے اس کو منسوخ فرما دیا۔

مقصود بیان

آدمی کو دو غلا اور دو دلا نہ ہونا چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ مکاری، فریب، دغابازی، ریاکاری، خیانت اور اندرونی خباثت کا ارتکاب اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ یہ سب کے سب دو غلے پن کی قسمیں ہیں۔ جن بیویوں سے ظہار کر لیا گیا ہو وہ حقیقی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ نہ ہمیشہ کے لئے سگی ماؤں کی طرح ان کی حرمت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح منہ بولے بیٹے بھی واقعی اولاد کے حکم میں نہیں ہو سکتے۔ نسب فروشی اور اپنی قوم بدلنی اور دوسرے کے باپ کو اپنا باپ ظاہر کرنا حرام ہے۔ اگر متبنّٰی کا نسب معلوم نہ ہو اور باپ کے نام سے ناواقفیت ہو تو اس کو دینی بھائی اور دینی دوست کہہ کر پکارنا چاہیئے۔ اگر تحقیق نسب کے بعد بھی اپنے یا کسی دوسرے کے انتساب میں غلطی ہو جائے تو ایسی نادانستہ غلطی معاف ہے۔ رسول اللہ کا رشتۂ محبت قرب اور حق ہر مسلمان پر اس کے نفس سے بھی زیادہ ہے۔ حضورؐ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں یعنی ماؤں کی طرح ان کی عزت، احترام اور حرمت نکاح ہے سوائے رشتہ داروں کے دوسرے کو شرعی میراث نہیں مل سکتی خواہ وہ کیسا ہی قریبی دوست ہو۔ ہاں زندگی میں دوست کے ساتھ کچھ سلوک کیا جا سکتا ہے اور اپنے مرنے کے بعد تہائی مال دینے کی وصیت بھی دوست کے متعلق کی جا سکتی ہے۔ آیت اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا میں اسی طرف اشارہ ہے۔ وغیرہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ

نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ

كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا

تعلق رکھتے ہیں بہ نسبت دوسرے مومنین اور مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے کچھ سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی تھی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسَی ابْنِ

اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے بھی اور نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ ابن مریم سے بھی لیا

مَرْیَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۙ لِّیَسْـَٔلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۧ

اور سب سے پکا عہد لیا تاکہ اللہ سچوں سے ان کی سچائی دریافت کرے اور کافروں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

تفسیر انسانی سعادت و فلاح کی راہیں بتانی والا نبی ہی ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ایسا عظیم الشان احسان ہے جس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہو سکتا۔ ہستی، تربیت اور تقلید قسم کے دنیوی و مادی طریقے قابلِ شکر اور اچھی چیزیں ہیں مگر پوری زندگانی کی فلاح و صلاح سے بھر دینا اور ثانوی حیات کو عیش و تنعم پیدا کرنے والے سرمایہ سے مالا مال کر دینا ناقابلِ نظیر انعام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں باپ بھائی بہن اعزہ و اقارب دوست احباب بیوی بچے جس مرتبہ سے ہی انسان کے محسن اور فائدہ رساں ہیں اور سب ہی کی محبت انسان کے دل میں ہوتی ہے مگر جو مرتبہ عزت شرف اور درجۂ قرب و محبت اخلاقی و روحانی محسن یعنی نبی محترم کو حاصل ہے اُس سے سب بے بہرہ ہیں اور اسی لئے تو اسی لئے نبی کو ولی بالمومنین فرمایا تھا لیکن نبی بھی ایک آدمی ہوتا ہے۔ ضروریاتِ بشری کا محتاج ہوتا ہے لیکن لوازمِ انسانیت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ کیفیتِ انسانیت میں فرق یہی مگر نفسِ انسانیت میں دوسرے انسانوں کے ساتھ برابر کا حصہ دار ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو ہر انسان پر اتنی برتری فوقیت اور فضیلت حاصل ہے وہ کونسا احسانِ عظیم ہے جو نبی کو ہر انسان سے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ اُس کے ماں باپ بلکہ اس کی ذات بھی اتنے قرب سے محروم ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ نبی میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک مادی انسانی حیثیت اس میں تو وہ سب انسانوں کی طرح ہوتا ہے۔ فائدہ سے زائد یہ کہ اس کی زندگی دوسرے آدمیوں کی زندگیوں سے زیادہ شستہ اور پاک ہوتی ہے۔ دوسری روحانی حیثیت اس میں نبی سب انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اسکی اخلاقی حالت دوسروں سے بہت اچھی ہوتی ہے اسکی روح کا آئینہ بہت چمکیلا اور درخشاں ہوتا ہے جس میں غیبی نقوش ثبت ہو جاتے ہیں اسی اعتبار سے وہ حاملِ الوحی، واقفِ اسرار، عالمِ رموز اور دائرۂ انسانیت کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری انسانی کائنات کی ہدایت اور کل بگڑے سنوار کو سنوارنے کا کام اُس کے سر پر ڈالا جاتا اسکو مکلف کیا جاتا ہے کہ نہ فقط اپنی حالت کو سنبھالے بلکہ سارے جگ کی بھی اصلاح کرے اور وہ قوانین دنیا میں پھیلائے جو پردۂ غیب سے اسکی روح پر منکشف ہوں پس جب ساری کائنات کو سنوارنے اور سب مُردہ روحوں کو زندہ کرنے کا کام اُس کے سپرد کیا جاتا ہے اور اُس سے اس فرض کو ادا کرنے کا عہد لیا جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگیوں سے عمیق ترین تعلق اس سے زیادہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اب جو لوگ اس کی ہدایت پر چلتے ہیں وہ سعادتِ ابدی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور جو سرکشی کرتے ہیں انکی عذابِ الیم ملتا ہے

تحلیلِ اجزاء وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ الخ۔ آیاتِ مذکورہ کے آغاز میں کافروں کا کہنا ماننے اور انکی مرضی پر چلنے کی ممانعت فرمائی تھی اور وحی کی پیروی کرنے کا حکم دیا تھا اب اسی مطلب کی معنوی تائید ان آیات سے کی جاتی ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے تمام انبیاء سے خصوصاً آپ سے نوح سے ابراہیم سے موسیٰ سے اور عیسیٰ سے محکم عہد لیا تھا یعنی یہ حکم دیدیا تھا کہ جو کچھ تمہارے پاس وحی آئے اُس پر تم خود بھی عمل کرنا اور اپنی اپنی اُمتوں کو وہ پیام پہنچا دینا۔ آیتِ مذکورہ میں بیان طلب دو امور ہیں (۱) انبیاء سے جو عہد لیا تھا وہ کیا تھا؟ (۲) اور کب لیا تھا؟ نمبر اول کے متعلق اہلِ تفسیر کا بیان ہے اور قرینہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ میثاقِ انبیاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے تمام انبیاء کو حکم دیدیا تھا کہ تم سب کا دین ایک ہی ہے تم سب دینِ الٰہی پر قائم رہنا۔ اللہ کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا کوئی حکم چھپا کر نہ رکھنا اللہ کی رضا مندی ہر بات میں مقدم رکھنا فرضِ رسالت کی کوشش کے ساتھ انجام دینا۔ رشتہ داری اور دوستی کی کوئی رعایت تبلیغِ احکام میں نہ کرنا باہم اتفاق رکھنا تکذیب کرنا یا کذب کی تائید کرنا۔ یہی وہ میثاقِ غلیظ تھا اور محکم تھا جو ہر نبی سے اللہ نے لیا تھا۔ نمبر دوم کے متعلق حضرت کعب کا قول ہے کہ یہ عہد اُسی وقت لیا تھا جب روزِ میثاق میں تمام ذریات کو آدم کی پشت سے باہر نکالا تھا اور سب سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا۔ اس عمومی عہد کے علاوہ اُسی روز انبیاء سے خصوصی عہد ادائے رسالت کا بھی لیا گیا تھا۔ مجاہد اور اکثر تابعین کا یہی قول ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بھیجنے کے بعد ہر نبی سے عطائے رسالت کے وقت ایک خاص عہد لیا گیا ہو۔ کیونکہ جب انبیاء کو اسرارِ غیب کا راز داں بنایا جاتا ہے تو حاملِ غیب ہونا اور ادائے فرض کے لئے تمام مادی تعلقات کو نظرانداز کر دینا آسان کام نہیں۔ یہ ایسا مشکل کام ہے جسکی تکمیل کے لئے تقاضائیاتِ نفس اور نفسیات بلکہ لوازمِ البشری کو ہر دم اور ہر پل چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ انسان صاحبِ اختیار ہوتے ہوئے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس کا اپنا ارادہ اپنا اختیار بلکہ اپنی ذات سے کوئی حرکت و سکون باقی نہیں رہتا۔

آیتِ مذکورہ میں پانچ انبیاء کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اُن کی عظمتِ شان ظاہر کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ یوں تو ہر نبی محترم ہوتا ہے مگر ان پانچوں کو جو امتیاز حاصل ہے دوسرے انبیاء کو وہ میسر نہیں۔ نوح آدمِ ثانی تھے۔ زمانہ کے لحاظ سے اس معمورہ کی آبادی میں سب سے مقدم تھے۔ ابراہیم کی خصوصیات حنیف ہونا قہار بادشاہ سے مقابلہ کرنا کعبہ کو تعمیر کرنا اور ابوالانبیاء ہونا وغیرہ محتاجِ بیان نہیں۔ موسیٰ اور عیسیٰ حاملانِ کتبِ الٰہیہ اور مستقل ادیان کے مالک تھے اسلئے انکی امتیازی خصوصیت بھی ظاہر ہے۔ رہے خاتم المرسلین رحمۃ للعالمین حاملِ قرآن تو آپ کی برتری ظاہر کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ آیتِ مذکورہ میں جب تمام ممتاز محترم انبیاء کا تذکرہ فرمایا تو سب سے پہلے حضور کا ہی ذکر کیا اور تاخرِ زمانی کا لحاظ نہیں کیا۔ حضور کے سید الانبیاء ہونے کے متعلق جتنی احادیث نقل کی جاتی ہیں اُن کے سلسلہ رُواۃ میں بعض راویوں کی تضعیف اگرچہ ابن کثیر نے کی ہے اور بعض احادیث سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ تعیین کے ساتھ کسی نبی کا نام لے کر حضور کو اس پر تفضیل و ترجیح نہ دی جائے لیکن بغیر خصوصی نام کے عام انبیاء کے گروہ پر حضور کی فضیلت آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ قویہ سے ثابت ہے۔ لِيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ یہ میثاقِ رسالت لینے اور رسول بنا کر بھیجنے کی اصل غرض

کا بیان ہے۔ صادقین سے مراد ہیں عام اہلِ ایمان نیکوکار دیندار مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پیغمبروں سے پختہ عہد تبلیغ لینے کے بعد ہدایتِ خلق کے لئے بھیجا تاکہ قیامت کے دن سچے مومنوں سے ان کی سچائی اور ایمان کے متعلق سوال کیا جائے اور پھر اُن کو جزا دی جائے اور کافروں سے اُنکی دروغ بافی اور بداعمالی کی بازپرس کی جائے اور اُن کو دردناک عذاب میں ڈالا جائے۔ صادقین سے مراد انبیاء بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی قیامت کے دن خدا تعالیٰ انبیاء سے پوچھے گا کیا تم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور سچی رسالت پوری کر دی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صادقین سے مراد عام اہلِ ایمان ہوں اور صدقہم کی ضمیر انبیاء کی طرف لوٹتی ہو یعنی عام اہلِ ایمان سے خدا دریافت فرمائے گا کہ کیا پیغمبروں نے تمکو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا؟۔

مقصود بیان علاوہ عام اقرارِ ربوبیت کے انبیاء سے خصوصیت کے ساتھ ادائے رسالت کا میثاق بھی لیا گیا تھا۔ پانچ انبیاء حسب مراتب ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن ادائے فرضِ رسالت کی پرسش انبیاء سے بھی ہوگی۔ وغیرہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

مسلمانو! اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر بہت فوجیں چڑھ آئی تھیں تو ہم نے ان پر ایک ہوا اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم کو نظر نہ

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ

آتیں اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسکو دیکھ رہا تھا جب وہ تم پر اوپر اور نیچے سے چڑھ آئے تھے اور آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں

وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝

اور دل حلق کو آگئے تھے اور تم پر طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے تھے اُس جگہ مسلمانوں کی آزمائش کی گئی اور اُن کو سخت جنبش دی گئی

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ

اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہہ رہے تھے کہ جو کچھ اللہ نے اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ سب دھوکہ تھا اور جب

طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ

اُن میں سے ایک گروہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اے یثرب والو تمہارا (یہاں) ٹھکانا نہیں لہٰذا لوٹ جاؤ انہیں کا ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا ہمارے گھر

بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ

خالی ہیں حالانکہ وہ خالی نہ تھے بلکہ یہ بھاگنا ہی چاہتے تھے اگر مدینہ کے اطراف سے دشمن ان پر گھس آتے اور ان سے فساد

سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ

کرنے کو کہا جاتا تو ضرور کرتے اور اس میں توقف بھی کرتے تو تھوڑا سا انھوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا نہ پیٹھ نہ پھیریں گے۔

الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ

اور اللہ سے وعدہ کرنے کی (قیامت کے دن) پرسش ہوگی (اے نبی) کہہ دو کہ اگر تم موت یا قتل سے بھاگ بھی جاؤ تب بھی بھاگنا ہرگز مفید نہ ہوگا ایسی

وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ

حالت میں بہت کم بہرہ اندوز ہو سکو گے　کہہ دو کہ اللہ سے تم کو کون بچائے گا　اگر وہ تمہارے حق میں برائی چاہے　یا تم پر مہربانی کرنے کا ارادہ

رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

کرے　ان کو اپنے لئے　اللہ کے سوا نہ کوئی حامی ملے گا　نہ مددگار۔

تفسیر قانون فطرت ہے کہ جب داعیان حق اعلان صداقت کرتے ہیں اور پرامن طریقہ سے عمومی دعوت دیتے ہیں تو پرستاران باطل سنگ راہ بن جاتے ہیں کذب کی تمام شیطانی طاقتیں برسرعمل آجاتی ہیں۔ کورانہ تقلید آبائی، رسم و رواج، قدامت پرستی، خاندانی وجاہت، قومی سیادت، مالی فوقیت اور دنیوی عزت پیرو کے طاغوتی بت اپنی طرف کھینچتے اور حق کی طرف سے روگرداں ہونے پر آمادہ کرتے ہیں لیکن جب صداقت کا نمایاں اثر کثیر داعیوں پر چھا جاتا ہے اور مقابلہ کے فریق جب اکثر سلیم طبیعتوں والے اظہار حق اور اعلان توحید کرتے ہیں تو کچھ بدباطن توہم پرست منحوس رفتار رکھنے والے آدمی ذاتی اغراض شخصی منافع کی خاطر بظاہر اہل حق کی ہاں میں ہاں ملاتے اور حق پرستوں کی فہرست میں اپنے نام لکھوا دیتے ہیں تاکہ کچھ دنیوی فوائد جو اہل حق کے لئے ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں ان کو حاصل ہو جائیں ان کی نگاہیں کوتاہ اور دماغ کی آنکھیں نابینا ہوتی ہیں اس لئے ان کو اس مقصد یعنی اشاعت صدق اور تبلیغ عدل سے تو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ نہ وہ حق کو حق جان کر اختیار کرتے ہیں۔ نہ اجر آخرت کی ان کو خواہش ہوتی ہے نہ اجر ایمان کا ایمان ہوتا ہے۔ نہ ان کے دلوں میں یقین کی کوئی کرن پرتو انداز ہوتی ہے نہ پرستاران توحید سے ان کو کوئی انس اور لگاؤ ہوتا ہے۔ پس ان کے پیش نظر اپنے دنیوی مفاد کا حصول ہوتا ہے اور ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ صادقین کے گروہ کے اندر گھس کر ان کے بھید و اسرار سے اپنے ہم مشرب شیطانوں کو آمادہ کر دیں اور اہل حق کے منتظم شیرازہ کو درپردہ پراگندہ کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح دو غلے پن اور نفاق آفرین ڈپلومیسی سے سچائی کے پھول کی ایک ایک پتی فضائے بسیط میں بکھیر کر رکھ دیں۔ یہ گروہ منافقوں کا کہلاتا ہے۔ منادیان حق کا مقابلہ اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ تمام سرکش رعونت زدہ دماغ والے اور سارے پرستاران شیطان اپنی پوری فرعونی طاقتوں کو جمع کرکے اہل ایمان کے چاروں طرف سے چڑھائی کر دیتے ہیں۔ تمام نکٹے ناک والوں کو کمر بستہ کرکے کفر کو ان کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے تیار کرکے ابھار کر لے آتے ہیں۔ اہل صداقت کے لئے یہ وقت بہت سخت ہوتا ہے۔ اپنے حلقہ سے باہر دشمنوں اور خون کے پیاسوں کی چند گونہ طاقتیں بربادی اور ہلاکت آفرینی کے لئے کھڑی نظر آتی ہیں اور حلقہ کے اندر مخلص اور منافق کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ دوست دشمن کی شناخت نہیں ہوتی۔ دشمنوں سے کسی اسکیم اور کسی راز کو چھپا کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ منافقوں کا گروہ اپنی پوری دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں میں مشغول ہو جاتا ہے بلکہ کھلا دشمنی کا اظہار کرنے والوں کو حق پرستوں کے اسرار سے ہر وقت واقف کرتا رہتا ہے اور صادقین کے گروہ میں کاذبین کا ہر وقت پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے۔ ان کی ہمتوں کو پست حوصلوں کو ضعیف اور قوت عمل کو افسردہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اہل دانش واقف ہیں کہ تعداد اور اسلحہ کی طاقت سے زیادہ پروپیگنڈہ اثر انداز ہوا کرتا ہے اور دشمن کا پانچواں دستہ یعنی دوستوں کو دشمن بنانے والا گروہ اپنی جماعت کے لئے بہت ہی زیادہ مفید خدمت انجام دیتا ہے۔ اسی کلیہ کے تحت منافقوں کے پروپیگنڈہ کرنے سے ضعیف الاعتقاد اور کمزور ایمان رکھنے والے افراد بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں چونکہ حقانیت کی جوت پہلے ہی سے کمزور شکل میں رونما ہوتی ہے اس لئے جب کفر کی گھٹاٹوپ تاریکیاں اور باطل کی چند در چند اندھیریاں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں تو ان کے سینوں کے اندر خاموشی کے ساتھ ٹمٹماتی ہوئی شمع کی کمزور لو اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے اور کفر کی طوفانی آندھیوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے بجھ جاتی ہے۔ یہ وقت ایمان والوں کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے اور چونکہ یہ بھی قانون قدرت ہے کہ جو لوگ اپنی مدد خود نہیں کرتے، مصائب کے وقت حق پر ثابت قدم نہیں رہتے، ناداری، بیماری، موسمی سردی گرمی، دشمنوں کی یورش اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود استقامت، پائیداری، جفاکشی اور تندہی سے کام نہیں لیتے تو ان کو برباد کر دیا جاتا ہے۔ اللہ بھی ان کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے بودے لوگوں کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ مصائب کی طغیانی اور آندھیوں سے نہیں ڈرتے، طوفانی موجوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ شدائد و آلام کے فلک بوس پہاڑ ان کے راستہ کو نہیں روک سکتے۔ ان کا جینا ہوتا ہے تو اللہ

مقصد کے لئے اور مرنا ہوتا ہے تو اصل غرض کے لئے۔ ایسے لوگ بڑی سے بڑی طاغوتی طاقت پر بھی غالب آجاتے ہیں اور کل عالم کی خیطانی قوت کا دم بھر میں اپنے حوصلوں کی بلندی اور کوششوں کی وسعت دامانی کے سبب ملیامیٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ نصرتِ الٰہیہ آتی ہے ان کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھتی ہے ان کے بدخواہ کو نیست و نابود کرتی ہے۔ بالآخر دنیوی کامرانی اور اخروی سعادت اُن کے قدم چومتی ہے۔ حضورِ اقدس جب ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تو اول سے آخر تک اس ماحول سے گزرنا پڑا۔ چاروں طرف شہر کے اندر منافقوں نے نفاق کا جال بچھا دیا۔ یہود نے بظاہر معاہدہ کر لیا اور بباطن ہی مسلمانوں کے دشمنوں کے حلیف بن گئے قبائل عرب خون کے پیاسے ہو گئے۔ خاندانِ نضیر کے یہودی نجدیوں غطفانیوں اور قریشیوں کو مدینہ پر چڑھا لائے یہاں گھر کے یہودیوں اور منافقوں نے بھی ان کی ہمنوائی شروع کر دی۔ مسلمانوں کو خود اپنی جماعت پر بھی اطمینان نہ رہا۔ ناداری سردی اور بے سر و سامانی کی مصیبت اس پر مزید تھی لیکن مسلمانوں نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ یہ حالت تھی نہ امدادِ الٰہی کی خوشگوار ہوا چلی جو مسلمانوں کے لئے نسیمِ جاں پرور تھی مگر کافروں کے لئے سمومِ ہلاکت آخر نتیجہ یہ ہوئی کا فرمل کو ناکام نامراد بھاگنا پڑا اور مسلمان کامیاب ہوئے

تحلیلِ اجزاء

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ آدمی کی فطرت ہے کہ غیر ناقع کو واقع پر اور مستقبل کو ماضی پر قیاس کرتا ہے۔ دل کے اطمینان اور سکون کے لئے آنے والی نظیر کو پچھلی نظیر کے حکم میں داخل سمجھتا ہے۔ رغبت یا خوف، فتح یا شکست، کامیابی یا ناکامی دونوں چیزوں کا سرچشمہ ماضی کو جانتا ہے۔ گزشتہ پر غور کر کے آئندہ اُمیدوں کی تعمیر کرتا ہے۔ انسان کی معاشی سیاسی اور دوسری قسم کی زندگیاں اسی نظام کے زیر اثر گزر رہی ہیں اور گزرتی رہیں گی اسی عام قاعدہ کے تحت قرآن پاک میں مختلف مقامات پر گزشتہ نافرمان قوموں کی نافرمانی اور سرکشی کے ہلاکت انگیز نتائج بیان فرما کر آئندہ اور موجودہ نسلوں کو تباہی سے روکا گیا ہے اور فرمانبردار نیکوکار اہلِ ایمان کی کامیابی غلبہ اور کامران زندگی کی تصویر کشی کر کے سکون و اطمینان کا سرمایہ فراہم کرنے کے بعد آئندہ خوشگوار زندگانیوں کا یقین دلایا ہے۔ آیت مذکورہ بھی اسی ضابطہ کے تحت بیان فرمائی ہے اور غزوۂ خندق کے عظیم الشان واقعہ کو مجمل طور پر ظاہر کر کے یہ بتایا ہے کہ رسول کی فرمانبرداری کے سبب کافر باوجود اپنی انتہائی طاقتوں کے اجتماع کے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور خائب و خاسر ہو کر واپس ہوئے اور منافق نافرمان ذلیل رسوا اور ناکام رہے جب غزوۂ خندق میں باوجود طاقت کی کمی اور ناداری کے خدا نے غیب سے مسلمانوں کی مدد کی تو آئندہ بھی بشرطِ ایمان و اطاعت وہ نصرت و کامرانی عطا فرمائے گا۔

غزوۂ خندق کا بیان

قرآن پاک احادیث مقدسہ اور کتب سیر نے غزوۂ احزاب کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بقول عقبہ بن موسیٰ ۴ھ میں اور بقول اکثر ۵ھ میں شوال کے مہینہ میں یہ واقعہ رونما ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ مدینہ کے پاس یہودیوں کا ایک قبیلہ بنی نضیر رہتا تھا اور مسلمانوں کو طرح طرح سے دُکھ پہنچاتا تھا۔ اول تو یہودی تمام عالم کے لئے تباہ کن اور مفسد واقع ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اُن کی نیش زنی ہر وقت مصروفِ عمل رہتی ہے۔ پھر یہودیوں میں سے چند خاندان خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی اور ایذا رسانی میں کمال رکھتے تھے جن میں سے ایک خاندان بنی نضیر بھی تھا۔ جب بنی نضیر کی ریشہ کاریاں حد سے بڑھ گئیں اور مسلمانوں کا دُکھ برداشت کے قابل نہ رہا تو حضورِ اقدس نے اُن کو جلاوطن کر دیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ خیبر میں جا بسے۔ خیبر ایک پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو مدینہ سے جنوب و شمال کی جانب چند منزل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ وہاں ایک گڑھی اور کچھ آبادی تھی۔ بکثرت باغات اور چشمے تھے۔ ان سکانِ خیبر میں سے سلام بن ابی الحقیق سلام بن مشکم اور کنانہ بن ربیع مکہ کو گئے اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کیا اور اپنی طرف سے پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر قبائل غطفان کی طرف گئے اور وہاں بھی یہی جال پھیلایا۔ یہ لوگ پہلے ہی سے مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور اللہ کا نام لینے والوں کو برباد کرنے کے درپے تھے فوراً تیار ہو گئے۔ قریش کا سردار ابوسفیان اور قبائل غطفان کا سردار عیینہ بن حصن فزاری ہوا اور تقریباً دس ہزار کا لشکر ٹھاٹھیں مارتا ہوا مدینہ پر چڑھ دوڑا۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے آپ نے مدینہ کے شرقی جانب ایک خندق کھدوائی۔ مخالفین میں سے کچھ لوگ مدینہ کے شرقی جانب کوہ احد کے قریب فروکش ہوئے اور کچھ غربی جانب مدینہ سے اوپر بالائی مقام پر اُترے۔ مدینہ کا ایک رُخ بلند ہے جس کو عوالی کہتے ہیں اور شرقی حصہ نشیبی ہے۔ مدینہ کے لوگ چاروں طرف سے گھر گئے ہر طرح کی تکلیف اور ہر رُخ کے خوف سے سخت پریشان ہوئے۔ تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا۔ اس مدت میں مصالحت کی بھی کچھ گفت گو ہوئی مگر ناکام رہی۔ کافروں کی طرف سے سخت شرائط پیش کی گئیں جو کسی طرح قابلِ تسلیم نہ تھیں لیکن صف بستہ ہو کر دوبدو کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ تیر افگنی اور سنگباری ضرور ہوتی رہی۔ البتہ ایک مرتبہ عمرو بن عبدود پہلوان چند سواروں کا دستہ لے کر خندق پار کر کے مسلمانوں کے قریب آگیا تھا۔ حضرت علیؓ نے مقابلہ پر نکل کر اس کو قتل کر ڈالا۔ منافق جو بظاہر

مسلمانوں کے رانشہ تھے کہنے لگے کہ ہم کو خدا اور رسول نے دھوکہ میں رکھا۔ دوسرا گروہ کہنے لگا اب تم میں مقابلہ کی تاب نہیں چلو گھروں کو لوٹ چلو۔ ایک جماعت کہنے لگی حضرت ہمارے گھر اکیلے ہیں ہمیں گھروں کو چلے جانے کی اجازت دیجئے۔ غرض یہ کشاکش تھی جب تکلیف اور پریشانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ نے ملائکہ کا ایک لشکر مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجا۔ سردی کا زمانہ تھا سرد ہوا کا ایک شدید طوفان بھی اُمنڈ کر آیا اور دشمن کافروں کے لشکر پر آیا سب ڈیرے خیمے اُکھاڑ کر پھینک دیئے انجام کار طلیحہ بن خویلد اسدی بولا۔ محمدؐ نے تم کو سحر میں گرفتار کر لیا ہوا کے علاوہ گھوڑوں اور سواروں کی آہٹ ہر طرف سے معلوم ہوتی ہے بھاگو بھاگو۔ غرض تمام کافر سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔

اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ اول جنود سے مراد کافروں کا لشکر ہے اور دوم جنود سے مراد ملائکہ کی فوج ہے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی ظاہری تسلی کے لئے ملائکہ کی جمعیت کو بھیجا گیا تھا جن کی آہٹ محسوس ہوتی تھی اور گھوڑوں کی سرسراہٹ کا بھی کچھ پتہ چلتا تھا مگر صورتیں نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ ریح سے مراد بادِ صبا ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس قول کی تائید میں وہ حدیث نقل کی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری امداد بادِ صبا کے ذریعہ کی گئی اور قوم عاد کو پچھوا ہوا سے ہلاک کیا گیا (مسلم) حذیفہ بن یمان نے غزوۂ خندق کے متعلق (جس کی تفصیل ہم آگے نقل کریں گے) فرمایا کہ غزوۂ خندق کی ایک رات کو حضورؐ اقدس نے کچھ دیر تک نماز پڑھی۔ پھر ہم لوگوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا۔ ایسا کوئی شخص ہے جو کفار کے لشکر میں جا کر ہمارے لئے خبر لائے کہ اُن کا کیا انجام ہوا؟ ایسے شخص کے لئے اللہ کا رسولؐ یہ شرط کرتا ہے کہ اگر وہ (صحیح سالم بھی) واپس آجائے گا (تب بھی) اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ اس ارشاد کے باوجود (سخت سردی کے سبب) کسی شخص کو اُٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضورؐ پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور دیر تک نماز پڑھتے رہے۔ پھر سلام پھیر کر ہم لوگوں کی طرف رُخ کر کے وہی الفاظ ارشاد فرمائے جو پہلے فرمائے تھے لیکن پھر بھی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ حضورؐ پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور دیر تک نماز میں مشغول رہے۔ پھر سلام پھیر کر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کوئی شخص ہے جو اٹھ کر قوم کفار کی خبر لے کر واپس آجائے۔ اللہ کا رسولؐ اس کے (صحیح سالم کی) واپسی کی شرط کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہو۔ اس فرمان پر بھی ہم میں سے کوئی شخص سخت سردی بھوک کی شدت اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی جگہ سے نہ اُٹھا جب کوئی نہ اُٹھا تو حضورؐ نے مجھے آواز دی۔ جب حضورؐ نے خصوصیت کے ساتھ میرا نام لیا تو مجھ پر اُٹھنا فرض ہو گیا اور اُٹھنے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا سرکار نے فرمایا حذیفہ کفار کے لشکر میں جا کر دیکھو اُن کا کیا حال ہے؟ مگر واپس آنے تک کوئی نیا حادثہ (وہاں) نہ کر بیٹھنا حسب الحکم میں روانہ ہو کر کفار کے لشکر میں چلا گیا میں نے دیکھا کہ ہوا کے طوفان اور جنودِ الٰہی نے آفتِ عظیم مہیا کر رکھی ہے۔ نہ اُن کا کوئی خیمہ ٹھہرتا ہے۔ نہ آگ روشن رہتی ہے، نہ وہ خود کسی جگہ ٹھہر سکتے ہیں اتنے میں ابوسفیان نے کھڑے ہو کر کہا اے گروہِ قریش ہر شخص اس اندھیرے میں اپنے برابر والے کو غور سے دیکھ لے (کہیں کوئی اجنبی جاسوس تو نہیں ہے)۔ حذیفہ کہتے ہیں میں نے اپنے برابر والے کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو کون ہے؟ اس نے اپنا نام مع ولدیت بیان کیا۔ پھر ابوسفیان بولا۔ اے گروہِ قریش واللہ تم ایسے مقام پر آ پہنچے ہو جہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں تمہارے اونٹ گھوڑے مرتے جاتے ہیں اور تباہ ہو رہے ہیں۔ بنو قریظہ (یہودیوں کا ایک خاندان جو مدینہ کے اندر رہتا تھا اور جس نے در پردہ قریش سے سازباز کر کے اُن کو حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اور اپنی امداد کا یقین دلایا تھا) نے ہم سے وعدہ خلافی کی بلکہ ہم کو اُن کی طرف سے ایسی بات پہنچی ہے جو سخت ناگوار ہے اور اس آندھی سے جو مصیبت ہم پر پڑی ہے اس کو بھی تم دیکھ رہے ہو۔ نہ ہماری ہانڈی چولھے پر ٹھہرتی ہے نہ آگ جلتی ہے نہ ہمارا خیمہ ٹھہرتا ہے بس کوچ کر چلو میں تو جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہو کر کوڑا مارا (اونٹ چل دیا) واللہ اگر حضورؐ نے مجھ کو کوئی نیا حادثہ پیدا کرنے کی ممانعت نہ فرمائی ہوتی تو میں اس تاریک رات میں ایک ہی تیر سے اُس کا کام تمام کر دیتا۔ غرض میں نے واپس آ کر حضورؐ سے سارا واقعہ عرض کر دیا (رواہ ابن اسحاق)۔ ہیثمی نے بعض معاجم و مسانید میں اسی روایت کی طرح عمار بن یاسر کی روایت بھی بیان کی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ۔ خطیب نے لکھا ہے کہ قبائلِ غطفان نے مدینہ کی اعلیٰ وادی کو مشرق کی طرف سے گھیر اور قریش نے نچلی طرف بجانب مغرب گھیرا ڈالا تھا یعنی ہر طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ۔ آنکھوں کا ٹیڑھا ہونا ایک محاورہ ہے یعنی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ مطلب یہ کہ اہلِ ایمان کی آنکھیں تو دشمن پر جمی ہوئی تھیں اور منافقوں کی نظر دوسری جانب لگی ہوئی تھیں۔

وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ۔ گلوں تک دلوں کا آجانا بھی ایک محاورہ ہے جو سخت خوف و مصیبت کے وقت بولا جاتا ہے ہماری زبان میں بھی کلیجہ منہ کو آنا

ناک میں دم ہو جانا وغیرہ اسی قسم کے محاورات مستعمل ہیں اس لئے کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ نہ اس تاویل کی ضرورت پڑتی ہے کہ انتہائی خوف کے وقت پھیپھڑے پھول کر گلے تک ابھر جاتے ہیں۔ اگرچہ واقعہ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس تاویل کی ضرورت ہی نہیں۔ محاورات میں حقائق لغویہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا نہ لفظی ترجمہ مراد ہوتا ہے۔

وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا۔ یعنی تم لوگ اللہ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے۔ بقول حسن بصری مخلص اہلِ ایمان تو نصرتِ الٰہی، حقانیتِ دین اور صداقتِ رسولؐ کا یقین ہی رکھتے تھے۔ صرف مصیبت جلد دُور ہونے کا اُن کو انتظار تھا اور منافق یا ضعیف الاعتقاد مسلم اپنے نفاق یا ضعفِ قلب یا پستی حوصلہ کے سبب ناامید ہو گئے تھے اور کفار کی فتح کا ان کو یقین ہو گیا تھا اور رسول کو وہ جھوٹا خیال کرنے لگے تھے۔ اہلِ ایمان کے یقین و ثبات اور اطاعت شعاری کا اندازہ اُس حدیث سے ہوتا ہے جو بروایت عبداللہ بن عمر ابن جریر نے لکھی ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق کی اس رات میں جب کافروں پر سخت آندھی مسلط کی گئی تھی میرے ماموں عثمان بن مظعون نے مجھ کو مدینہ کی بستی میں اس لئے بھیجا کہ میں وہاں سے اُن کے لئے کچھ کھانا اور اوڑھنے کے کپڑے لاؤں میں نے حضورِ اقدس سے اجازت مانگی تو ارشاد فرمایا میرے صحابہ میں سے جو کوئی تم کو ملے اس کو حکم دے دینا کہ جلد لوٹ کر (مسلمانوں کے لشکر میں) چلا جائے (چنانچہ میں روانہ ہو گیا) ہوا تیز چل رہی تھی مجھے جو صحابی ملتا تھا میں اس کو حضورؐ کا حکم پہنچا دیتا وہ فوراً تعمیل کرتا، اتنی بھی تاخیر نہ کرتا کہ گردن موڑ کر دیکھے۔ یہ تو اہلِ ایمان کی حالت تھی۔ رہی اہلِ نفاق اور بعض ضعیف الاعتقاد مسلموں کی حالت اس پر روشنی اُس قول سے پڑتی ہے جس کو ابن جریر ہی نے نقل کیا ہے کہ بعض ایسے ضعیف العقیدہ تھے جن کا گمان یہ ہو گیا تھا کہ اس گردش کے نتیجہ میں اہلِ ایمان برباد ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ معتب بن قشیر انصاری بھی کہنے لگا تھا کہ محمدؐ نے ہم سے تو وعدہ کیا تھا کہ شاہانِ کسریٰ و قیصر کے خزانے تمہارے تصرف میں آ جائیں گے۔ اب یہ کیا ہو گیا کہ ڈر کے مارے ہم میں سے کوئی شخص جنگل کو رفعِ حاجت کے لئے بھی نہیں جا سکتا۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا۔ وہ وقت مخلص مسلمانوں کے لئے بہت سخت تھا۔ کسی کو چین نہ تھا۔ اندر باہر دشمنوں کا جال تھا۔ سردی، بھوک اور تنگ مالی کی تکلیف تھی اور سامان کی مقدار بہت کم تھی۔ پھر جتنے بھی تھے وہ مدینہ کے اندر نہیں رہ سکتے تھے۔ خندق کی حفاظت کے لئے کھلے میدان میں نکل کر ٹھہرا رہنا لازم تھا نہ ڈیرے تھے نہ خیمے نہ پہننے کو کپڑے نہ اوڑھنے کو کمبل نہ بچھانے کو بستر نہ کھانے کو روٹی۔ ہر طرف سے مار مار کی پکار۔ مدینہ کے اندر یہودی قریظہ کی گڑھی تھی اور انھوں نے بھی معاہدہ توڑ کر حملہ کرنے والوں کے اعداد پر کمر باندھ لی تھی بلکہ ابتدا شروع کر دیا تھا مسلمانوں کی عورتیں اور بچے بے یار و مددگار تھے۔ حضورِ اقدس کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے مدینہ کے ٹیکروں کے اندر اپنی پناہ گاہ بنائی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام ساتھیوں سمیت مدینہ کے باہر دشمنوں کے مقابلہ میں فروکش تھے اُن کا وہاں سے ہٹ کر آنا ممکن نہ تھا۔ ادھر بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ کر لڑائی پر کمر باندھ لی تھی۔ اُن سے بچانے کے لئے ہمارا کوئی آدمی نہ تھا۔ ایک روز ایک یہودی نکل کر ہماری ٹیکری کی طرف آیا اور چاروں طرف گھومنا شروع کیا۔ ہم کو اندیشہ ہوا کہ شاید یہ کوئی گھات ہے۔ واپس ہو کر ہماری حالت کی یہودیوں کو اطلاع دے گا مگر مجبوری تھی اس کو دفع کرنے والا کوئی شخص نہ تھا۔ اتنے میں حسان بن ثابت نظر پڑے میں نے اُن سے کہا دیکھو یہ یہودی چکر لگا رہا ہے جاسوسی کا اندیشہ ہے تم جا کر اس کو مار ڈالو۔ حسان نے جواب دیا آپ واقف ہیں میں اس کا مقابل نہیں ہوں۔ حسان کا جواب سُن کر مجبوراً میں نے کمر کس کر خیمہ کی چوب لے کر جا کر اس کو مار ڈالا اور واپس آ کر حسان سے کہا اب تم جا کر اُس کے ہتھیار اور سامان لے لو میں (اس کو چھونے سے) اس لئے مجبور تھی کہ وہ اجنبی مرد تھا۔ حسان نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض یہ اندیشہ ناک حوصلہ شکن حالت تھی۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ حضورِ اقدس نے یہ حال دیکھ کر حارث بن عمرو اور عیینہ بن حصن سردارانِ غطفان کو کہلا بھیجا کہ اگر تم لوگ ہمارے مقابلے سے اپنی جماعتوں کو لے کر چلے جاؤ تو مدینہ کی سالانہ پیداوار میں سے ایک تہائی کھجوریں تم کو عطا کریں گی۔ شرط لکھ کر معاہدہ کا کاغذ لکھ لیا گیا مگر حضورؐ کی مہر ابھی نہ ہونے پائی تھی کہ قبائل اوس و خزرج کے سرداروں سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے آپ نے مشورہ لیا۔ دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہم کو چار و ناچار اس پر عمل کرنا پڑے یا یہ حضورؐ کی رائے ہے؟ اور ہم کو اپنی خوشی سے اس پر چلنے کا اختیار ہے؟ حضورؐ نے فرمایا میں یہ کام تمہارے ہی فائدہ کے لئے کرنا چاہتا ہوں میں نے یہ اس واسطے کرنا چاہا تھا کہ تمام عرب نے متفق ہو کر ایک کمان سے تیر برسانے شروع کر دیئے ہیں اور ہر طرف سے تم پر حملہ کر رہے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ ان کی جماعتوں کو (اس وقت) توڑ دوں۔ سعد بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایک وقت تھا کہ ہم اور یہ سب مشرک تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ نہ ہم اللہ کو پہچانتے تھے نہ اس کی عبادت کرنی جانتے تھے اس وقت بھی ان لوگوں کی یہ طاقت نہ ہوئی کہ ہمارے باغوں میں سے ایک کھجور بھی بغیر خریداری یا مہمانی کے کھا سکیں پھر اب جبکہ اللہ نے ہم کو اسلام کی عزت اور حضورؐ کی ذاتِ مبارک کی برکت عطا فرما دی ہے۔ ہم اپنے مالوں میں سے ان کو حصہ دیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ واللہ ہم سوائے تلوار کے ان کو کچھ دینا نہیں چاہتے یہاں تک کہ اللہ ہمارا ان کا فیصلہ فرما دے۔ یہ کلام سُن کر حضورِ والا خوش ہوئے

اور اسعد سے وہ تحریر لے کر شادی اور کافروں سے کہلا بھیجا کہ تم سے ہمارے خلاف جنگ کو جتنی ہو سکے کرلو۔ ادھر مسلمانوں کی یہ حالت تھی اُدھر منافق اپنی جیسہ کاریوں میں منہمک تھے۔

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ الخ۔ مخلص اہلِ ایمان کے ساتھ بظاہر دو قسم کے مسلمان اور بھی تھے۔ ایک گروہ اہلِ نفاق کا تھا جس کا پہلے ہی سے رسول اللہ کی صداقت اور اسلام کی حقانیت پر ایمان نہ تھا۔ اپنے دنیوی مصالح کے تحت بظاہر کلمۂ اسلام وہ زبانوں سے کہتے تھے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو مریض القلب تھے یعنی ان کا ایمان تھا تو ضرور مگر تھا کمزور اور کہ غزوۂ خندق کے مصائب دیکھ کر جاتا رہا اور وہ پختہ منافق ہو گئے۔ اور دین الہی اور اس کے صداقت پر طعن کرنے لگے اور کھلم کھلا کہنے لگے کہ اب تک ہم سے جو وعدے خدا اور رسول نے کئے تھے وہ دھوکہ دینے کے لئے کئے گئے تھے یعنی لڑائی سے پہلے جو ہم سے کہا جاتا تھا کہ دینِ اسلام سب پر غالب ہو گا تمام ملکوں پر چھا جائے گا مسلمانوں کو بڑی شوکت اور سعادت حاصل ہو گی۔ پھر خندق کھودتے وقت کہا تھا کہ کسریٰ اور قیصر کے خزانے تمہارے تصرف میں آ جائیں گے۔ یہ سب فریب تھا۔ ہم کو اسلام پر قائم رکھنے اور اپنی مدد پر کمر بستہ بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ اس موقع پر منافقوں نے اللہ اور رسول کا جو نام لیا وہ طعن کے طور پر لیا تھا۔ در حقیقت استہزا ان کا مقصود تھی ورنہ حقیقت میں وہ حضور کو رسول جانتے ہی نہ تھے۔ میرے نزدیک ہو سکتا ہے کہ جنگ سے قبل کے زمانے میں دکھانے یا اپنے منافع حاصل کرنے کے لئے جس طرح وہ لوگ رسول اللہ کہا کرتے تھے ویسے ہی جنگ کی حالت اور خطرات کے وقت بھی اُن کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا ہو کیونکہ مسلمانوں کی جمعیت بظاہر داخل ہونے کے سبب وہ رسول اللہ کہنے کے تو عادی ہو ہی گئے تھے۔ عادت کے موافق زبان سے لفظ کا نکل جانا بعید از عقل نہیں اگرچہ اُن کا ضمیر اس کے خلاف تھا۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا۔ جاہلیت کے زمانہ میں مدینہ کا نام یثرب تھا لیکن حضور نے یہ نام لینے کی ممانعت فرما دی اور کہا کہ یثرب کے خطاب کہنے کا حکم دیا اور مدینہ بھی نام رکھا۔

اہلِ تفسیر نے اِس آیت کا مطلب دو طرح سے لکھا ہے (۱) منافقوں نے باہم مشورہ کیا اور کہا اب تم ایمان سے پھر کر اپنے مذہب کی طرف لوٹ جاؤ کیونکہ اب تمہارا ٹھہراؤ اس دین پر نہیں رہ سکتا (۲) منافقوں نے صحابہ سے کہا کہ تم اگلے بستی سے نکل کر کوہ سلع کے پاس خندق پہ پڑے ہو یہاں کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، اس لئے لوٹ کر اب گھروں کو چلو۔ مؤخر الذکر تفسیر سیاقِ آیات کے زیادہ مناسب ہے۔

وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ الخ۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عوس بن قیظی وغیرہ نے حضورِ اقدس سے عرض کیا ہم لوگ جیسے مسلمان ہوئے ہیں ہمارے یہودی بھائی بد ہمارے دشمن ہو رہے ہیں اور ہمارے مکان محفوظ نہیں ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ یہودیوں کی طرف سے ہمیں اندیشہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تردید میں فرمایا کہ ان کے مکان غیر محفوظ اور بے روک ٹوک نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اس بہانہ سے یہ بھاگنا چاہتے ہیں۔ حضرت حذیفہ بن یمان کی طویل حدیث سے (جو ہم عنقریب ذکر کریں گے) معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص حضور سے اجازت کا خواستگار ہوتا تھا آپ اس کو اجازت دے دیتے تھے۔ اس سے غرض یہ تھی کہ مخلص اہلِ ایمان اور بے ایمان منافقوں میں امتیاز کامل ہو جائے اور لوگوں کو صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ کون اجرِ جزیل کا مستحق ہے اور کون قابلِ مواخذہ ہے۔

خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ نعیم بن مسعود بن عامر بن غطفان اسی خطرناک حالت میں نورِ ایمان سے منور ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ سرکار پہ قربان میں مسلمان ہو گیا مگر میری قوم کو میرے مسلمان ہونے کا حال ابھی معلوم نہیں ہے اب جو حضور حکم دیں میں بجا لانے کو حاضر ہوں۔ سرکارِ عالی نے ارشاد فرمایا! تم بھی ہم میں سے ایک شخص ہو اگر تم سے ہو سکے تو کسی خفیہ تدبیر سے کافروں کی ان جمعیتوں کو ناکام واپس کر دو کیونکہ لڑائی داؤں گھات (کا ہی نام) ہے۔ جب الحکم نعیم روانہ ہو کر یہود قریظہ کے پاس گئے زمانہ اسلام سے پہلے یہ ان کی صحبتوں میں بیٹھا کرتے تھے اور کہنے لگے بھائیو تمہارے جو خاص تعلقات ہیں وہ تم کو معلوم ہیں۔ یہودی بولے بیشک ہم کو معلوم ہیں ہم کو تمہاری طرف سے کوئی شبہ نہیں ہے۔ نعیم نے کہا تم لوگ میری بات کو ذرا سمجھو یہ قریش اور غطفان والے اپنا اپنا جماؤ کر کے محمد سے لڑنے آئے ہیں اور تم بغیر سوچے سمجھے ان کی مدد کرنے لگے ہو۔ اُن کا حال تمہارے حال سے جدا ہے وہ پردیس کے رہنے والے ہیں اور تم اسی جگہ کے باشندے ہو یہیں تمہارے اہل و عیال اور مال ہیں تم ان چیزوں کو چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتے۔ ان کے مال اور عیال و اطفال دوسرے ملک میں ہیں اگر اُن کو موقع ملا تو جو کچھ اُن کے ہاتھ لگے گا لوٹ لیں گے اور اگر ان کی لڑائی کا ڈھنگ خراب ہوا تو اونٹوں پر سوار ہو کر اپنے

شہروالے کو چل دیں گے۔ پھر یہاں یہ شخص اور تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ یہاں اس کے ساتھی غالب ہیں اگر تم تنہا رہ گئے تو کسی طرح اس سے نہ لڑ سکو گے۔ میری رائے یہ ہے کہ قریش اور غطفان کے ساتھ ہو کر تم ابھی مت لڑو پہلے ان سے درخواست کرو کہ وہ اپنے چند سرداروں کو تمہارے پاس بطور ضمانت بھیج دیں اور وہ سردار تمہارے قبضہ میں (بطور رہن) پختہ اعتماد پیدا کرنے کے لئے آ جائیں تاکہ قریش و غطفان چار و ناچار تمہارے ساتھ ہو کر محمدؐ سے لڑیں۔ یہودیوں نے نعیم کی رائے کو پسند کیا۔ اس کے بعد نعیم یہاں سے اٹھ کر قریش کے پاس گئے۔ ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو جمع کر کے کہنے لگے تم لوگ خوب واقف ہو جہاں تک میں تمہارا دوست ہوں اور یہ بھی کہ میں محمدؐ سے الگ ہوں مجھے ایک اطلاع ملی ہے بطور خیر خواہی میں اس کو تمہارے سامنے ظاہر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں لیکن اس کو پوشیدہ رکھنا تم پر لازم ہے۔ قریش نے کہا تم مطمئن رہو ہم ایسا ہی کریں گے۔ نعیم کہنے لگے یہودیوں نے اپنی حرکت پر نادم ہو کر پوشیدہ طور پر محمدؐ سے کہلا بھیجا ہے کہ ہم اپنی حرکت پر پشیمان ہیں۔ اب آپ کو راضی کرنے کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں نظر آیا کہ قبائل قریش و غطفان کے چند سرداروں کو ایک خاص تدبیر سے حاصل کر کے آپ کے حوالے کر دیں تاکہ آپ ان کی گردنیں مار دیں پھر آپ کے ہمراہ ہو کر ان سے لڑیں۔ اگر آپ اس طرح ہماری غلطیاں معاف کر دیں تو ہم اس کی تعمیل کریں۔ محمدؐ نے اس بات کو منظور کر لیا۔ پس اے گروہ قریش میں تم کو ہوشیار کرتا ہوں۔ اگر یہ بدکار یہودی تمہارے سرداروں کو بطور رہن کے طلب کریں تو تم ایک شخص بھی ان کو قبضہ نہ دینا۔ اس کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر غطفانیوں کے پاس گئے اور سب کو جمع کر کے کہنے لگے سارے گروہ غطفان تم لوگ میری قوم میرا کنبہ اور میرا خاندان ہو میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میرے دل میں تو اس کا شبہ بھی نہیں ہے کہ تم کو میرے خیر خواہ ہونے میں کچھ شک ہوگا۔ قوم والوں نے جواب دیا۔ اس میں کیا شک ہے نعیم نے کہا میں ایک راز تم پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں مگر تم اس کو پوشیدہ رکھنا۔ سب نے پوشیدہ رکھنا منظور کیا۔ نعیم نے غطفانیوں سے بھی وہی بیان کیا جو قریش سے بیان کر آئے تھے۔ غرض ماہ شوال[1] ۵ھ میں شنبہ کی رات کو ابو سفیان اور سرداران غطفان نے یہود بنی قریظہ کے پاس عکرمہ بن ابی جہل اور چند قریش و غطفان کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ ہم یہاں بے سروسامان آ داخل پڑے ہیں۔ جانوروں کے لئے دانا اور چارہ کا بھی انتظام یہاں نہیں ہے ہمارے گھوڑے اور جانور بہت تباہ ہو چکے ہیں۔ اب زیادہ تاخیر کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ پس یہ قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کل میدان جنگ میں اترو تاکہ محمدؐ پر حملہ کر کے فیصلہ کر دیا جائے۔ یہودیوں نے یہ پیام سن کر جواب دیا کہ کل سنیچر ہے ہم سنیچر کے دن کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں سے ایک گروہ نے ہفتہ کے دن ایک حرکت کی تھی جس کی سزا میں ان کو بندر اور سؤر بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اگر سنیچر کا دن نہ بھی ہوتا جب بھی ہم تمہارے ساتھ ہو کر محمدؐ سے لڑنے پر اس وقت تک رضامند نہیں ہو سکتے جب تک تم ہم کو پختہ میثاق نہ دو اور میثاق یہی ہے کہ اپنے سرداروں میں سے چند آدمیوں کو تم ہمارے قبضہ میں (بطور رہن) دیدو کیونکہ ہم کو قوی اندیشہ ہے کہ جب لڑائی کی چنگاریاں اڑنے لگیں اور مسلمانوں کی تلواروں سے تم پر آگ برسنی شروع ہو جائے تو شاید تم تاب نہ لاؤ اور اپنے وطن کو چلے جاؤ اور ہم کو اس شخص کے ہاتھ اس شہر میں تنہا چھوڑ دو۔ پس تمہاری طرف سے ہمارے پاس رہن ہونا ضروری ہے۔ رہن کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو کر لڑائی میں شریک ہوں گے۔ یہ جواب سن کر عکرمہ وغیرہ نے واپس آ کر یہودیوں کا قول بیان کر دیا۔ قریش اور غطفان آپس میں کہنے لگے لوگو! اب تم کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ نعیم بن مسعود کا قول سچ تھا پھر یہودیوں سے کہلا بھیجا واللہ ہم اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی بھی تم کو نہ دیں گے۔ اگر تم کو منظور ہو تو لڑائی کے میدان میں نکلو ورنہ صاف جواب دو۔ بنی قریظہ کو جب یہ جواب پہنچا تو کہنے لگے واللہ نعیم بن مسعود نے سچ کہا تھا ان لوگوں کا منشا ہی یہ تھا کہ مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں۔ اگر موقع ملے تو خیر ورنہ اپنا راستہ لیں۔ اس کے بعد قریش و غطفان سے کہلا بھیجا واللہ جب تم ہم کو رہن نہ دو گے ہم تمہارے ساتھ ہو کر نہ لڑیں گے لیکن قریش و غطفان نے بالکل انکار کر دیا۔ دوسرے روز ابو سفیان نے منادی کرا دی کہ ہم لوگ پڑے پڑے بے فائدہ تباہ ہوئے تم کو ان یہودیوں سے کوئی امید نہ رکھنی چاہیے یہ تو اپنے پرانے بندروں اور سؤروں کے بھائی ہیں۔ غرض برادران قریش و غطفان نے باہمی مشورہ میں گزار دیا۔ جب رات ہو گئی جس کو لیلۃ الاحزاب کہتے ہیں تو تمام جماعتوں پر اللہ نے آندھی کا طوفان بھیجا۔

اب ہم صحیح مسلم سے نقل کر کے حضرت حذیفہ کی پوری حدیث لکھتے ہیں تاکہ واقعہ احزاب کی صحیح طور پر تصویر کشی ہو جائے۔ حذیفہ نے فرمایا واللہ لیلۃ الاحزاب کی سخت تاریکی اور انتہائی خندت کی سردی تھی کہ ہم سردی کے مارے صف باندھے ہوئے تھے (یعنی اوڑھنے کے لئے کچھ نہ تھا مجبور ہو کر ہم ساتھ ساتھ صف لئے تھے) — ابو سفیان اور اس کے ساتھی مدینہ کے بالائی جانب سے گھیرے ہوئے تھے اور نیچی طرف یہود قریظہ تھے۔ ہم کو ان یہودیوں سے اپنے اہل و اطفال کے متعلق اندیشہ تھا اس رات سے زیادہ اندھیرا ہم نے نہیں دیکھا تاریکی کے ساتھ ہوا بھی تیز چل رہی تھی اور سخت آندھی میں پیہم بجلیوں کی تڑپ اور رعد کی گرج بھی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں

[1] یہ قول بکراحت کے موافق غزوۂ خندق ۵ھ میں واقع ہوا مگر ابن اسحاق اور دوسرے اہل روایت نے ۵ھ کی صراحت کی ہے اکثر تابعین کا بھی قول ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

سو بھتا تھا ہمارے لشکر میں منافقوں نے حضورؐ سے اجازت مانگنی شروع کی اور گھروں کے بے لاگ ٹوک ہونے کا بہانہ کیا حالانکہ یہ غلط تھا۔ حضورؐ نے ہر طالب اجازت کو اجازت دیدی اور اسی بہانہ سے وہ کھسکنے لگے۔ ہم لوگ (یعنی صرف اہل ایمان) تقریباً تین سو ہوں گے۔ حضورؐ ہماری طرف تشریف لائے اور ایک ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے پاس تک پہنچے (یہ آخر شب کا واقعہ ہے جو حذیفہ نے اس جگہ ذکر کیا ہے) جس وقت حضورؐ میرے پاس تشریف لائے میں تو بیٹھا ہوا تھا پر دشمن کے وار کو روکنے کے لئے کوئی ڈھال تھی نہ سردی سے بچنے کے لئے کوئی کپڑا تھا صرف میری بیوی کی ایک اوڑھنی تھی وہ بھی گھٹنوں سے نیچے نہیں پہنچتی تھی میں گھٹنوں کے بل زمین کی طرف (سردی کی وجہ سے) جھکا ہوا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ کون ہے؟ میں نے عرض کیا حذیفہ۔ فرمایا حذیفہ ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا، حذیفہ لشکر کا ایک واقعہ پیش آیا ہے تو جا کر اس کی خبر لا۔ مجھے خوف وہراس سب سے زیادہ تھا اور سردی بھی سب سے زیادہ مجھے ہی لگ رہی تھی لیکن حضورؐ کے حکم دینے کے بعد مجھے تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا میں اٹھ کر چل دیا۔ حضورؐ نے دعا فرمائی۔ الٰہی اس کو آگے پیچھے دائیں بائیں نیچے اوپر ہر طرف سے محفوظ رکھ۔ یہ سنتے ہی بخدا میری یہ کیفیت ہوگئی کہ گویا اللہ نے میرے دل میں خوف پیدا ہی نہیں کیا ہے اور نہ سردی کا نام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حمام میں چلا جا رہا ہوں۔ جب میں چلنے جانے کے لئے منہ موڑا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا حذیفہ میرے پاس واپس آنے تک وہاں کوئی نیا حادثہ نہ کر گزرنا میں روانہ ہو کر کفار کے لشکر کے قریب پہنچا الاؤ کی چنگاریاں نظر پڑیں الاؤ پر ایک فربہ اندام سیاہ فام آدمی اپنا پہلو سینک رہا تھا اور کہہ رہا تھا کوچ کرو! کوچ کرو کوچ کرو میں اس سے پہلے ابوسفیان کو نہیں جانتا تھا میں نے ترکش سے ایک تیر نکال کمان میں لگایا تا کہ الاؤ کے اجالے میں اس کو جہنم رسید کر دوں مگر حضورؐ کا فرمان یاد آگیا میں نے تیر کو ترکش میں رکھ لیا اور لشکر میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے میری ملاقات خاندان بنی عامر سے ہوئی۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کو کوچ کرو کوچ کرو اب تمہارے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہولناک آوازیں، بجلیاں اور ہوا کا طوفان صرف کافروں کے لشکر میں محدود تھا وہاں سے بالشت بھر بھی باہر نہ تھا۔ کافروں کے خیموں کے اندر پتھروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو آندھی کے جھونکوں سے ان پر برس رہے تھے (پھر ابوسفیان کا خفیہ حکم دینا اور سوار ہو کر چل دینا واقع ہوا) آخر کار میں کافروں کے لشکر سے نکل کر حضورؐ والا کی طرف واپس ہونے لگا۔ وسط راہ میں تقریباً بیس سواروں کا ایک دستہ ملا جو عمامے باندھے ہوئے تھے مجھ سے انہوں نے کہا اپنے ساتھی (رسول اللہ) سے کہہ دینا کہ اللہ نے کافروں کو ذلیل کر دیا اور آپ کا کام کر دیا۔ میں خدمت والا میں واپس آیا۔ حضورؐ اس وقت کمبل اوڑھے نماز میں مشغول تھے۔ بخدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں جونہی واپس پہنچا فوراً ٹھنڈ سوار ہو گئی۔ سردی کے مارے میں کانپنے لگا۔ حضورؐ نے نماز ہی میں مجھے ہاتھ کا اشارہ فرمایا میں قدموں کے قریب پہنچ گیا۔ حضورؐ نے کمبل کا ایک کونہ میرے اوپر ڈال دیا۔ جب سلام پھیرا تو میں نے واقعہ عرض کیا اور اللہ نے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ الخ آیات نازل فرمائیں۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا الخ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اہل نفاق اپنے مکانوں کے غیر محفوظ ہونے کا بہانہ سے بھاگ گئے تھے۔ واقع میں ان کے مکان غیر محفوظ نہ تھے بلکہ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنا ہی مقصود تھا۔ وہ اس قدر بداعتقاد تھے کہ اگر بتقدیر الٰہی کافروں کو غلبہ دے دیا جائے اور وہ ان کے مکانوں میں ہر طرف سے داخل بھی ہو جائیں اور پھر ان کو مغلوب کر کے مشرک بنانا چاہیں اور اسلام سے پھر جانے کو کہیں تو فوراً وہ لوگ کافروں کے کہنے کو مان لیں گے اور اسلام چھوڑ کر شرک کو قبول کر لیں گے اور قبول شرک سے بہت کم توقف کریں گے۔ قتادہ عبدالرحمٰن بن زید اور ابن جریر نے آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اگر دنیا میں اللہ ان کی آزمائش کرے اور کافروں کو ان پر غلبہ عطا کر دے اور وہ لوگ ان سے کافر ہو جانے کو کہیں تو یہ فوراً کافر ہو جائیں گے زیادہ توقف نہ کریں گے۔ موت کے ڈر سے خوف سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ گویا دونوں تفسیروں پر فتنہ سے مراد شرک ہے۔ لیکن اگر فتنہ کا مفہوم عام رکھا جائے جو شرک اور جنگ دونوں کو شامل ہو تو میرے نزدیک کچھ خرابی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کافروں کو غلبہ عطا کر دیا جائے اور وہ ان پر تسلط کر لیں اور پھر ان سے خواہش کریں کہ تم مشرک ہو جاؤ اور ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کرو تو یہ فوراً ایسا کر گزریں گے زیادہ تامل نہ کریں گے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا یُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۔ یعنی غزوہ خندق سے پیشتر بدر کی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو کامیاب دیکھ کر انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہم بدر میں شریک نہ ہو سکے لیکن اب کبھی پیٹھ نہ دیں گے دل سے ارادہ الٰہ ہی یقینی بات ہے کہ اللہ سے جو معاہدہ کیا جائے اس کی باز پرس ہوگی۔ پھر اب انہوں نے کیوں بہانہ تراشی کی اور کیوں بھاگے۔

قُل لَّن یَّنفَعَکُمُ الفِرَارُ اِن فَرَرتُم مِّنَ المَوتِ الخ۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تقدیر میں مرنا لکھا ہے تو بھاگنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا موت سے نہیں بچ سکتے اور اگر بالفرض بچ بھی گئے تو کب تک۔ زندگانی چند روزہ ہے۔ یعنی جہاد میں شریک ہونا موت کو دعوت نہیں دے سکتا اور نہ پیٹھ موڑنا باعث نجات نہیں ہو سکتا مؤثر حقیقی اور علتِ اصلی اور فاعلِ مطلق محض ذاتِ باری ہے۔ حیات و موت اور اچھائی برائی، فتح و شکست سب اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ اگر اس نے موت کو مسلط کر دیا تو پھر بچانے والا اور اس کے مقابلے پر آکر نجات دینے والا امداد کر کے کارسازی کرنے والا کوئی بھی نہیں اس لئے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا بہانہ کر کے موت سے ڈر کر راہِ فرار اختیار کرنا بے سود ہے اور شرکتِ جنگ کو موت کا داعی سمجھنا بے بنیاد خیال ہے۔

مقصود بیان غزوۂ خندق کے بیان سے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو ظاہری اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کی جائے عقل و تدبیر کو ناکارہ نہ بنایا جائے۔ حضور والا نے سب مسلمانوں کو میدان میں شہر سے باہر کوہِ سلع کے دامن میں جمع فرمایا حملۂ دشمن کو روکنے کے لئے بمشورہ سلمان فارسی خندق بھی کھدوائی تھی بقدرِ امکان اپنی فوج کو مسلح بھی کیا تھا۔ خندق سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ کرنے کا حکم بھی نہیں دیا تھا دشمنوں میں تفرقہ ڈالنے اور پھوٹ پیدا کرنے کی تدبیریں بھی کی گئیں لیکن اس کے باوجود تدبیر کو کارساز اور مادی طاقت کو حقیقی کارفرما خیال کرنا بھی لغو ہے۔ جو لوگ اپنی امداد خود کرتے ہیں اللہ بھی ان کی غیبی امداد فرماتا ہے۔ دیکھو غزوۂ خندق میں فرشتوں کی جماعت کو مسلمانوں کی تسلی کے لئے نازل فرمایا مگر مسلمانوں کی کوشش اور مستعدی کو بھی ملحوظ رکھا۔ مصائب اور شدائد میں مبتلا کرنا ہمیشہ عتابِ الٰہی کی علامت ہی نہیں ہوتا۔ اہلِ ایمان پر حوادث کا نزول ان کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے ان کے ایمان کو نکھارنے اور جلا دینے کے لئے اور ان کے استقلال کو محکم بنانے کے لئے ملامتی طور پر شدائد کی آگ میں ان کو تپایا جاتا ہے۔ یہ عالم اسباب ہے ظاہری ذرائع سے نتائج وابستہ ہیں۔ مصائب میں پڑ کر کمزور دل اور قوی ایمانی والوں کا امتیاز ہو جاتا ہے۔ اہلِ نفاق اور اہلِ اخلاص جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ تندرست اور بیمار دل والا پہچان لیا جاتا ہے اور آخر کار نصرتِ الٰہی ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو حق پر ثابت قدم اور صداقت پر محکم رہتے ہیں جن کے پاؤں لغزش نہیں کھاتے اور جن کے دلوں میں اپنی بربادی کا ادنیٰ خیال بھی نہیں پیدا ہوتا اور جو قوی ترین دشمن کے انتہائی مظاہرۂ طاقت سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ اس غزوہ میں حضور والا کی ساری سیرت اور مخلص مسلمانوں کا عمل ہم کو بتا رہا ہے کہ انتہائی سختی کے وقت بھی امیرِ برحق کے حکم سے عدول کرنا یا اس کے حکم کی تعمیل میں چون و چرا کرنا حرام ہے۔ جو لوگ اہل و عیال اور دنیوی وبال میں پھنس کر اسلام کو چاروں طرف سے گھرا ہوا دیکھنے کے باوجود قدم پیچھے ہٹاتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے تراش کر اپنے حوصلہ کی پستی اور ایمان کی کمزوری کا ثبوت دیتے ہیں وہ بے ایمان منافق ہیں اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ مال و منال اہل و عیال اور اپنی جان کی حفاظت اسی وقت تک ضروری ہے جب تک اسلام کی تباہی سامنے نہ ہو ورنہ اسلام کی امداد اور اہلِ اسلام اور دین کی حمایت بہر حال لازم ہے۔ آیت وَاِذ یَقُولُ المُنٰفِقُونَ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ خندق کے آغاز میں بکثرت اہلِ نفاق اور ضعیف الاعتقاد مسلم (جو آخر میں منافقوں کے گروہ میں مل گئے) بھی شریک تھے لیکن آخر میں نفاق و ایمان کا امتیاز ہو گیا۔ آیت مَن ذَا الَّذِی الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات و موت اور اچھائی برائی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پیش قدمی اور پسپائی نہ نجات دینے والی ہے نہ ہلاکت پیدا کرنے والی وغیرہ۔

قَد یَعلَمُ اللّٰہُ المُعَوِّقِینَ مِنکُم وَالقَآئِلِینَ لِاِخوَانِہِم ہَلُمَّ اِلَینَا وَلَا یَاتُونَ البَاسَ

اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ اور وہ لڑائی میں بہت کم حاضر

اِلَّا قَلِیلًا ۝ اَشِحَّۃً عَلَیکُم فَاِذَا جَآءَ الخَوفُ رَاَیتَہُم یَنظُرُونَ اِلَیکَ تَدُورُ اَعیُنُہُم

ہوتے ہیں تمہارے مقابلہ میں بخل کرتے ہیں سو جب خوف کا موقع آتا ہے تو چکرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی

کَالَّذِی یُغشٰی عَلَیہِ مِنَ المَوتِ فَاِذَا ذَہَبَ الخَوفُ سَلَقُوکُم بِاَلسِنَۃٍ حِدَادٍ

بیہوشی طاری ہو پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو مالِ غنیمت پر حرص کر کے تم پر اپنی تیز

أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ

زبانیں چلاتے ہیں یہ لوگ ایمان نہیں لائے اس لئے اللہ نے ان کے اعمال برباد کئے اور یہ اللہ پر

يَسِيرًا ۝ يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۖ وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ

آسان ہے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ لشکر ابھی گیا نہیں اور اگر فوجیں آ کر جمع ہوں تو یہ آرزو کریں گے کہ کاش دیہات میں

بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَائِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۝ ع ۱۸

ہیں یہ کہیں صحرانشین ہو جائیں اور تمہاری خبریں پوچھا کریں اگر یہ تم میں شامل بھی ہوتے تب بھی بہت کم لڑتے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَ

تمہارے لئے رسول اللہ (کے طریقے) میں عمدہ پیروی ہے (لیکن یہ) اس شخص کے لئے جو اللہ کی اور روز قیامت کی امید رکھتا ہو

ذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَ

یاد خدا بکثرت کرتا ہو اور جب مسلمانوں نے فوجوں کو دیکھا تو بول اٹھے یہ وہی ہے جس کا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا

صَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝

اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا اس واقعہ نے اُن کے ایمان و فرمانبرداری میں اور اضافہ کر دیا

تفسیر منافق کے اندر تین عیوب خصوصیت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یوں تو اُس کی نفاق انگیزی اور دو رُخا پن اور ظاہر و باطن کا باہمی تضاد اُس کی ان گنت حرکات سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نشست و برخاست اور خواب و بیداری بھی اس کی قلبی کیفیت کی چغلی کھاتی ہے لیکن ایسی غیر محسوس و غیر نمایاں حالت کو سمجھنا اور اُن سے استدلال کرنا دقیق ترین فکر والوں کا کام ہے۔ عام ذہنیت رکھنے والے نقل و حرکت سے اندرونی نفاق کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ ہاں تین باتیں ایسی ہیں جو منافق کے ضمیر کی ترجمانی اور اس کی دورُخی پالیسی کی خاص علامت ہیں۔ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، عہد کے خلاف کرنا۔ یہ تینوں امور منافق کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ منافق کی دونوں مادی قوتیں تحمل اور ایسی غیر منتظم ہوتی ہیں کہ قوتِ روحانیہ اور عقلِ سلیم ان پر اپنا تسلط نہیں جما سکتی بزدل اور جبلی احتیاط گیر ہو جاتا ہے کہ معاہدہ کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ میدانِ جنگ میں نکل کر اپنے ہم عہد لوگوں کے دوش بدوش ہو کر لڑنا تو بہادروں کا کام ہے بزدل اور دنی الطبع افراد تو لڑنے کے نام سے ڈرتے ہیں۔ لڑائی کے نام سے ان کو چکر آتے ہیں۔ آنکھیں پھر جاتی ہیں۔ موت کی ایسی غشی چھانے لگتی ہے اور بالفرض اگر بڑی بہادری سے میدانِ جنگ میں کچھ ٹھہر بھی جاتے ہیں تو چونکہ دل کی دھڑکن، اعضاء کی لرزش، دشمن کا رعب اور موت کا اندیشہ اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس لئے بہت ہی کم وقت کے لئے حاضری دیتے ہیں اور موقع پاتے ہی کھسک جاتے ہیں۔ ان کو اس معاہدہ کا کچھ پاس لحاظ نہیں ہوتا جو پہلے اپنے لوگوں سے کر چکے تھے جس کی دوستی اور شرکت کے دم بھرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ تمام حرکات قوتِ دفاع کی کمزوری اور طاقتِ مقاومت کے ضعف کے نتائج ہوتے ہیں منافق کی قوتِ دافعہ و جذبۂ غالبہ میں بھی اتنی خرابی ہوتی ہے کہ مالی لالچ کے وقت حق ناحق اور اچھے بُرے کا امتیاز اُس کو نہیں رہتا جس طرح اس کے دفاع کی قوت کمزور ہوتی ہے اسی طرح خواہشِ اور جذبِ مالی کی طاقت میں افراط ہوتی ہے۔ میدانِ کارزار میں شریک نہ ہونے اور دشمن کو دفع کرنے میں حصہ نہ لینے اور کسی

قسم کا استحقاق موجود نہ ہونے کے باوجود جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو منافق کہتا ہے لاؤ مجھے دو، لاؤ مجھے دو، اگر کسی کو ایک پائی بھی زیادہ ملتی نظر آتی ہے تو اس وقت اس کے غصہ کا پارہ فرطِ غضب سے چڑھ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کا ذاتی ناقابلِ برداشت نقصان ہو رہا ہے۔ درحقیقت یہ اُس کے لالچ اور کنجوسی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کو کوئی خیال نہیں ہوتا کہ میں اللہ کا اور اپنے دوستوں کا امین ہوں۔ کل مالِ غنیمت مسلمانوں کا مالِ امانت ہے۔ کسی کو اپنے حصہ سے زیادہ لینا جائز نہیں مگر دل کی انتہائی گہرائیوں میں جم جانے والا لالچ کب ادائے امانت اور انجام دہی فریضہ کی اجازت دیتا ہے۔ پھر اس پر مزید یہ کہ جھوٹ بولنا منافق کا خصوصی شعار ہوتا ہے۔ کوئی بات ہو کسی موقع کی ہو فائدہ مند ہو یا نہ ہو جھوٹ بولنے سے وہ نہیں رُکتا۔ خصوصاً فائدہ اُٹھانے کے وقت تو اُس پر جھوٹ بولنا قطعی فرض ہو جاتا ہے۔ مقاتلہ میں شریک نہ ہونے کے باوجود ظاہر کرتا ہے کہ میں معرکہ میں پیہم مصروف رہا۔ سر بکف ٹوٹا رہا، بھاگنے اور جان بچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لایا۔ مجھے مال کا استحقاق سب سے زیادہ ہے۔ میں سرفروش ہوں قربانی کرنے والا ہوں۔ ان تینوں صفات قبیحہ کے علاوہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے بھولے بھالے مسلمانوں کو بہکانے اور دینداروں کو گمراہ کرنے کا کام بھی منافق بہت اچھی طرح سے انجام کو پہنچاتا ہے۔ موت سے ڈراتا ہے دشمنوں کا غلبہ اور طاقت دکھا کر ہمت کو توڑتا ہے حوصلہ کو پست کرتا۔ اہلِ ایمان کی یقینی تباہی دکھا کر لوگوں کو مسلمانوں کا ساتھ دینے سے روکتا ہے۔ یہی تمام اوصاف اُن منافقوں کے تھے جو غزوۂ خندق کے وقت کفار کی یورش کے ایام میں مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ وہ بزدل بھی تھے، لالچی بھی تھے، عہد شکن، دینی خائن اور غدار اور جھوٹے بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں تک ان کی پہنچ ہوتی تھی وہاں تک مسلمانوں کو بہکانے میں کسر اُٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اور تدبیر کے ساتھ ان کو شرکتِ جنگ سے روکتے تھے۔ منافق کے بالکل برعکس مومن کی حالت ہوتی ہے۔ اُس کا ایمان راسخ اور قوتِ عمل حوصلہ افزا ہوتی ہے۔ وہ سخت ترین ہلاکت آفرین شدائد سے بھی نہیں گھبراتا۔ نہ اس کو مالی لالچ ہوتا ہے نہ دروغ بافی اس کا شعار، وہ جو کچھ کرتا ہے جذبۂ ایمان کے تحت کرتا ہے۔ اگر ہولناک ہیبت خیز حوصلہ شکن مصائب کا ہجوم بھی اس پر ہو جاتا ہے تو اس کا حوصلہ پست نہیں ہوتا۔ عزم و استقلال میں کمزوری نہیں ہوتی بلکہ ایمان میں مزید پختگی اور قوتِ عمل میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کا یہ قانون بالکل سچا ہے کہ سونے کا نکھار تپانے سے ہوتا ہے ایمان کا جوہر مصائب کی مدافعت کرنے سے ہی کھلتا ہے، زندگی موت کے میدان میں گھسنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ برتری شدائد کا مقابلہ کرنے سے ہی ملتی ہے۔ ہمہ گیر سطوت دشمنوں کے نرغے میں ثابت قدم رہنے سے ہی نصیب ہوتی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا الخ۔ واحدی نے لکھا ہے کہ علمائے تفسیر نے اس آیت کا نزول منافقوں کے حق میں قرار دیا ہے جو نہ صرف جہاد سے پیچھے ہٹتے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی بہکاتے تھے الخ۔ چونکہ ظاہر میں منافق مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے اس لئے ان کا شمار گویا اہلِ اسلام میں کیا گیا اور مِنْكُمْ فرمایا یعنی جنگ کی شرکت سے روکنے والے بظاہر تمہاری ہی جماعت میں ہیں۔ اہلِ تفسیر نے صراحت کی ہے کہ منافقوں نے کہنا شروع کیا تھا کہ جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں وہ اصحاب کا ایک لقمہ ہیں۔ اگر یہ لوگ گوشت ہوتے تو ابوسفیان کے ساتھی ان کو نوالہ بنا لیتے۔

منافق جو اپنے دوستوں کو اپنی طرف بُلا رہے تھے تو اس سے اُن کی مُراد یہ نہ تھی کہ ہماری پناہ میں آجاؤ بلکہ مطلب یہ تھا کہ جس طرح ہم شرکتِ جنگ سے پیچھے ہٹ رہے ہیں اور ظاہر میں مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں تم بھی اسی طرح نفاق سے کام لو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ مُعَوِّقِيْنَ سے مراد یہود قریظہ ہیں جو منافقوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھار رہے تھے اور کہہ رہے تھے تم ہمارے پاس ہماری گڑھی میں آجاؤ اور مسلمانوں کی جماعت سے کُھلم کُھلا نکل آؤ۔ مگر یہ قول غلط ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ میں معوقین کو مسلمانوں کے گروہ میں فرمایا ہے اور یہودی کبھی مسلمانوں کے گروہ میں شامل نہ تھے۔

وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ یعنی وہ منافق میدانِ جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بس اتنی دیر کو میدان میں آتے ہیں کہ صرف مسلمان دیکھ لیں اور یقین کر لیں کہ یہ بھی جنگ میں شریک ہیں، اس کے بعد میدان سے کھسک جاتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ میدانِ جنگ میں منافقوں کی حاضری کو طوالت و درازی کے باوجود قلیل کہا گیا صرف اس وجہ سے کہ اس کی بنا صدقِ نیت پر نہ تھی۔ بے دلی کی طویل حاضری بھی ہیچ ہے۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ۔ یعنی منافقوں کی حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملہ میں وہ بڑے کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ نہ ان کو کوئی دلی ہمدردی ہے نہ عملی شرکت کرتے ہیں نہ مال خرچ کرتے ہیں۔ سدی نے یہ مطلب لکھا ہے کہ چونکہ منافقوں کو مسلمانوں سے قلبی عداوت ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو مالِ غنیمت حاصل

ہو۔ میرے نزدیک یہ مطلب سیاق آیات کے خلاف ہے ۔ واللہ اعلم ۔

فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ ۔ مفسر حقانی اور بعض دوسرے علماء نے اس آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ جب کافروں کے لشکر نے کو گھیر لیا اور لڑائی کا خوف ہوا تو منافق رسول اللہ کو تکنے لگے اور صرف حضورؐ کو ہی اپنا ملجا اور ماویٰ سمجھنے لگے ۔ مگر یہ مطلب غلط ہے ۔ منافقوں نے کبھی حضورؐ کو اپنا ملجا و ماویٰ نہیں سمجھا بلکہ وہ تو مسلمانوں کی جماعت سے کترا تے تھے اور شریک ہونا بھی نہ چاہتے تھے ۔ پناہ جوئی کی نظر سے دیکھنے کے کوئی معنی ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب موت کا اندیشہ ہو گیا تو اس وقت رسول اللہ کی طرف دیکھنے لگے (گویا نظر سے یہ کہنے لگے کہ آپ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آئی اور موت کا سامنا ہوا) تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ الخ ۔ اُن کی آنکھیں چکرانے لگی تھیں اُن کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کسی پر موت کی غشی چھائی ہو ۔ یعنی اُن کو موت کا یقین ہو گیا تھا ان کی آنکھیں ظاہری حالت کو ہی دیکھتی تھیں ۔ اللہ کی کارسازی اور رسولؐ کی صداقت پر ان کا ایمان ہی نہ تھا ۔ مشرکوں کی طاقت حصار بندی اور چڑھائی کو دیکھ کر منافقوں کی اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی ہلاکت کا اُن کو یقین ہو گیا تھا ۔

فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ الخ ۔ لیکن جب خوف جاتا رہا تو تمہارے ساتھ تیز زبانیاں کرنے لگے اور مالِ غنیمت کے متعلق کنجوسی کرنے لگے یعنی مالِ غنیمت ۔ قتادہ نے فرمایا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت منافق بڑے بخیل اور تیز زبان تھے ۔ یہ یہی کہے جاتے تھے کہ ہم کو دیجئے دیجئے ہم میدان کارزار میں آپ کے ساتھ موجود رہے ہیں لیکن لڑائی کے وقت بڑے بزدل اور بے ایمان تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ احزاب کے بھاگ جانے کے بعد جب اندیشہ دور ہوا تو منافق تیز زبانیاں کرنے اور اپنی شجاعت و پامردی کے واقعات بیان کرنے لگے لیکن اس دروغ بافی کے ساتھ ساتھ مالِ غنیمت کی حرص بھی ان کے دلگیر تھی ۔ ایک ایک چیز اور ایک ایک پائی پر جان دینے لگے ۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا ۔ یعنی ظاہر میں اگرچہ یہ لوگ مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے اور ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر واقع میں ایمان ہی نہ لائے تھے کیونکہ ایمان لانے کی حقیقت تو یہ تھی کہ مسلمانوں کی مدد کرتے ، راہِ اسلام میں جان مال خرچ کرتے ، اسلام کو خطرات سے بچانے کی کوشش کرتے ۔ ان کا مطمح نظر صرف کلمۃ اللہ اور اعلاءِ دین ہوتا ، مالِ غنیمت کی حیثیت اگر کچھ ہوتی تو ثانوی ہوتی مگر ان کی حالت اس کے خلاف تھی ۔ اصل مقصد مالِ غنیمت کا حصول تھا ۔ مسلمانوں سے اُن کو کوئی ہمدردی نہ تھی نہ اسلام سے اُن کو کچھ محبت تھی) ۔

فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۔ یعنی ان منافقوں کے دلوں میں چونکہ ایمان نہیں اس لئے اُن کے ظاہری مسلمانہ اعمال بھی خدا کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہیں نہ ان کی نماز قبول ہے نہ روزہ نہ صدقہ نہ خیرات نہ شرکتِ جہاد نہ دوسرے کارِ خیر ۔ دنیا میں بھی ان کو کچھ نہیں ملے گا ۔ بات یہ ہے کہ کھلے ہوئے کافروں کے پیش نظر چونکہ صرف دنیا ہوتی ہے اور اُن کے تمام کام واضح طور پر دنیا کمانے کے لئے ہوتے ہیں اس لئے اگر وہ دنیا میں کوئی نیکی کرتے ہیں تو اس کا بدلہ دنیا ہی میں اُن کو دے دیا جاتا ہے دنیا کا کچھ عیش ان کو حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے لیکن آخرت میں ہر طرح کے ثواب سے محروم رہیں گے ۔ رہے منافق تو چونکہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے تھے اور فریب دے کر ناجائز منافع حاصل کرنے کے خواستگار تھے اور بغیر استحقاق کے نتائج کے طالب تھے اس لئے اُن کی (ظاہری) نیکیاں ناقابلِ قبول ہیں ۔ نہ دنیا میں ان کو کوئی ثمر مل سکتا ہے نہ آخرت میں ۔

وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۔ شبہ ہو سکتا تھا کہ منافقوں کے اعمال کی بربادی اور اُن کے کارناموں کا بے نتیجہ ہونا تو اسی وقت ممکن ہے جب اُن کا نفاق واضح ہو جائے اور صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ فلاں فلاں اشخاص منافق ہیں لیکن نفاق کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے نیت نام تو پوشیدہ ضمیر کا ہے ظاہری طور پر مسلمان اور منافق دونوں کے اعمال ایک طرح کے ہوتے ہیں ۔ پھر ایک کو دنیوی صلہ عطا کرنا اور دوسرے کو محروم رکھنا کس طرح ممکن ہے ۔ یہ تو بہت ہی دشوار کام ہے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ خدا کے نزدیک منافقوں کی نیکیوں کا بے ثمر ہونا آسان ہے اس کو سب کچھ معلوم ہے ۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے رسول کو اور مخلص مسلمانوں کو منافقوں کے احوال پر مطلع کر سکتا ہے اور اس طرح سب کو معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص منافق ہے یا اللہ کے نزدیک پوشیدہ ضمیر کو ظاہر کرنا اور اعمالِ نفاق کے ظاہری کارناموں کو بے نتیجہ بنا دینا دشوار نہیں ہے ۔

يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۔ منافقوں کی بے ایمانی بزدلی اور دہشت جن کو واضح کرنے کے لئے چند امور پر روشنی ڈالی اول یہ کہ کفار کی جماعتیں اگرچہ محاصرہ اٹھا کر فرار ہو گئیں اور رسول اللہ کے قول کی صداقت اور غیبی امداد کی تاثیر بالکل ظاہر ہو گئی مگر منافقوں کو اب تک یقین نہیں ہے کہ کفار کی

مالی جماعتیں چلی گئیں بلکہ وہ پلٹ کر خود حملہ آور ہوں گی۔ گویا منافقوں کو نہ رسول اللہ کے قول کا یقین آیا نہ غیبی امداد کی تاثیر پر ایمان نہ کافروں کی شکست کا وثوق، اور ان تمام باتوں کی اصل علت وہی اُن کی بزدلی اور بے ایمانی تھی۔

وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِى الْاَعْرَابِ۔ دوم یہ کہ بالفرض اگر کافروں کی جماعتیں دوبارہ حملہ آور ہو جائیں تو ان کی بزدلی اور بے ایمانی کی یہ حالت ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر صحرا میں چلے جانے کی آرزو کرنے لگیں گے تاکہ گنواروں میں مل کر رہیں اور کوئی ان کی شناخت نہ کرے اور اس طرح لڑنے سے بچ جائیں یعنی نہ مسلمانوں کی کچھ حمایت کریں گے نہ کافروں کی مدافعت بلکہ اپنے بچاؤ کی فکر کریں گے یہاں تک کہ اگر ان کو شہر اور وطن چھوڑ کر کچھ زمانہ کے لئے ذلیل گنواروں میں جاکر رہنا پڑ جائے تو اس کو بھی پسند کریں گے مگر راہِ خدا میں جہاد کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے لیکن انکی نامردی اسی حد پر ختم نہ ہوگی۔

يَسْئَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ۔ بلکہ تمہارے احوال دریافت کرتے رہیں گے یعنی صحرا نشینی اور سکونت دیہات کے زمانہ میں بھی اُن کو خیال لگا رہے گا کہ شاید کافروں کو شکست ہو جائے اور مسلمانوں کے ہاتھ مالِ غنیمت لگ جائے اور اس صورت میں ہم مالِ غنیمت سے محروم ہو جائیں اس لئے تمہارے احوال کی خبر رکھیں گے تاکہ مسلمانوں کی فتح کی صورت میں مالِ غنیمت سے محروم نہ ہونا پڑے اور اُن کی یہ بزدلی اور بے ایمانی صرف روپوشی اور غیر حاضری ہی پر محدود نہیں بلکہ

وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا۔ اُن کا موجود رہنا بھی غیر موجود رہنے کے برابر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر بالفرض وہ تمہاری جماعت میں موجود بھی ہوں تب بھی اُن کی موجودگی بیکار ہے (برائے نام) تھوڑے جنگ کے سوا لڑائی کا کام نہیں کریں گے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ الخ۔ منافقوں کے پورے احوال کی تصویر کشی اوپر کی آیات میں فرما کر اب تمام مدعیانِ اسلام کی ہدایت کے لئے ایک عمومی نصیحت کا ضابطہ کلیہ ظاہر فرماتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم کا بنیادی پتھر مبداء اور معاد پر یقین رکھنا ہے اور دنیوی سیاست کو درست کرنا ہے۔ مبداء پر یقین رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کو خالق کل مربی اور تمام عالم کو نیست سے ہست کرنے والا مانا جائے اور معاد کو ماننے کا مفہوم یہ ہے کہ دوسری زندگی ضرور ہوگی اور وہ مادی ہوگی۔ حساب کتاب اور عذاب ثواب بھی ضرور ہوگا۔ یعنی روزِ آخر اپنی تمام کیفیات اور لوازم کے ساتھ ضرور آئے گا۔ رہا دنیوی حیات کو درست کرنا تو اس کے لئے الہامی قوانین کا موجود ہونا ضروری ہے۔ زندگی کے تمام اوقات ساعات اور لمحات کی شائستگی لازم ہے۔ نشست و برخاست بیداری اور خواب حرکت اور سکون غرض ساری زندگانی کو اُن ضوابط میں ڈھالنا جو اللہ نے وحی کے ذریعہ تعلیم فرمائے ہوں ضروری ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر وقت خدا کی یاد رکھنی اور اس کی ہدایت کا لحاظ رکھنا اصلاحِ زندگی کا اصل الاصول ہے۔ ان تینوں ضوابط کے جاننے سمجھنے اور عملی شکل میں نمودار کرنے کے لئے صرف انسانی دماغ کافی نہیں ہے (اس کو ہم ایک سے زائد مرتبہ لکھ آئے ہیں) بلکہ ایک رسول من اللہ کا ہونا ضروری ہے جو سب سے پہلے اپنی علمی اور عملی زندگی کو ہدایتِ الٰہیہ کے مطابق سنوارے پھر دوسروں کو اپنی زندگی کی پیروی کرنے کی تعلیم دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مدعیانِ اسلام پر فرض ہے کہ رسولِ پاکؐ کی پاک زندگی کی پیروی کریں۔

مقامِ غور ہے کہ دینِ الٰہی کی نصرت اور کلمۃ اللہ کے اعلان کے لئے جب رسولِ خدا نے تکلیفیں اُٹھائیں، دُکھ سہے، کافروں کی ایذاؤں پر صبر کیا پتھر کھائے وطن چھوڑا، گھر بار سے منہ موڑا، قربانی کے پیہم فاقے کئے، بھوک کی تکلیف کے سبب دو دو تین تین پتھر پیٹ پر باندھے لیکن استقلال اور پامردی کو ہاتھ سے نہ دیا پس جب ہادیٔ برحق اور مقتدائے اسلام نے اتنی قربانیاں کیں تو پھر تمام علمبردارانِ اسلام پر لازم ہے کہ حضورِ والا کی پوری سیرت کی پیروی کریں اور راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی کریں۔ مصائب سے گھبرا کر کافروں کے مقابلہ سے راہِ فرار اختیار کرنا اور دہشت زدہ ہو کر طریقِ اسلام سے پھر جانا اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ الخ۔ اللہ نے واقعۂ احزاب کو نمونۂ امتحان بنایا تھا تاکہ اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق کا امتیاز ہو جائے۔ منافق حیلے بہانے کر کے میدان سے روگرداں ہوئے۔ کمزور عقیدہ کے مسلمانوں کو بھی بہکایا اور کہنے لگے ہم سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ محض فریب اور دھوکہ تھے۔ عنقریب کافروں کی تلواروں سے تمہاری زندگی کا بنیاد منقطع کی جائیں گی۔ بہت سے ضعیف الاعتقاد مسلمان منافقوں کے بہکانے سے گمراہ ہو گئے اور اُن کے دلوں سے نورِ ایمان محو ہو گیا لیکن مخلص اہلِ ایمان کی حالت منافقوں کے برعکس تھی۔ حضورِ والا نے پہلے سے بتا دیا تھا کہ قبائلِ عرب لشکر کشی کرنے والے ہیں۔ مدینہ کے باہر لشکر کو روکنے کے لئے خندق کھود دو۔ تم کو سخت تکلیفیں اُٹھانی پڑیں گی لیکن آخر کار تم منصور اور فتحیاب ہو گے۔ کسریٰ اور قیصر کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے۔ اللہ تم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔ ان تمام باتوں پر مومنوں کا ایمان تھا۔ چنانچہ جب قبائل نے لشکر کشی کی اور اہل نے ان کو دیکھا تو بلا تامل کہنے لگے ہم سے تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس کا وعدہ فرمایا تھا یعنی تکلیف و مشقت کے بعد فتح و کامرانی کا حصول ہمارے لئے ضرور ہے کیونکہ اللہ نے اور اس کے رسول نے اس

کا وعدہ فرمایا ہے اور خدا اور رسول کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ یعنی احزاب کے اجتماع اور قبائل عرب کی چڑھائی سے مسلمانوں کے ایمان میں نہ کمزوری آئی نہ قوت عمل میں بلکہ ان کے یقین میں پختگی اور فرمان پذیری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اللہ نے سورۂ بقر میں مومنوں کو آگاہ فرمایا تھا اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ الخ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تم جنت میں یونہی چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہاری حالت ویسی نہیں ہوئی جو تم سے پہلے لوگوں کی ہوئی تھی۔ اُن کو سختیاں اور تکلیفیں اتنی پہنچیں اور اس طرح ان کو ہلایا گیا تھا کہ پیغمبر اور پیغمبر کے ساتھی اہلِ ایمان کہہ اٹھے تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (ایسی تکلیفوں کے بعد اُن سے کہا گیا کہ اب خبردار ہو جاؤ اللہ کی مدد قریب ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ احزاب کفار کو دیکھ کر مسلمانوں نے مطلب سمجھ لیا کہ ہمارے لئے وہ وقت یہی ہے (جس کے متعلق سورۂ بقرہ میں تنبیہ فرمائی تھی) لامحالہ غلبہ ہمارا ہی ہو گا۔

مقصودِ بیان

جنگ احزاب کے دوران میں مسلمانوں کے لئے منجملہ دیگر مصائب کے بڑی قومی مصیبت یہ تھی کہ آستین کے سانپ ان کی جماعت میں موجود تھے جو خود بھی منافق تھے مسلمانوں کے دشمن تھے اور دوسرے ضعیف العقیدہ مسلمانوں کو بھی بہکاتے تھے۔ ظاہری طور پر مسلمان ہوتے ہوئے پھر بھی مسلمانوں کی بیخ کنی کے درپے تھے۔ وہ بزدل بھی اتنے تھے کہ قبائل عرب کے وقت ان کی آنکھیں چکرانے لگی تھیں اور موت کی سی بے ہوشی ان پر طاری ہو گئی تھی (اور لالچی بھی اس قدر تھے کہ جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور کفار بھاگ گئے تو آگے بڑھ بڑھ کے مال غنیمت کے متعلق تیز زبانیاں کرنے لگے۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا میں صاف صراحت ہے کہ منافق مومن نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی نیکی قابلِ اعتبار نہیں۔ نہ دنیا میں اس کی کوئی جزا مل سکتی ہے نہ آخرت میں کوئی معاوضہ گویا منافق کی نیکی کافر کی نیکی سے بھی بدتر ہے۔ کافر کو نیکی کی جزا دنیا میں تو مل جاتی ہے مگر منافق اس سے بھی بے بہرہ ہے۔ حضورِ اقدس کے زمانے میں بلکہ ہر زمانہ میں اہلِ نفاق کے نفاق کی شناخت دشوار ہے۔ کسی کے ضمیر کو صحیح طور پر جانچنا آسان کام نہیں مگر خدا کے نزدیک سب کچھ آسان ہے۔ قبائل عرب کی واپسی کے بعد بھی منافقوں کا یہ خیال تھا کہ ابھی وہ گئے نہیں ہیں واپس آکر حملہ کریں گے۔ گویا حملہ آوروں کا رعب ان پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ وہ ان کی شکست کو بھی شکست نہیں سمجھتے تھے۔ آیت لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ الخ سے رسول اللہ کی پیروی کا وجوب مستفاد ہوتا ہے۔ حضورؐ کے فرمان عمل اور سکوت سب ہی کی اقتدا لازم قرار پاتی ہے کیونکہ یہ تینوں اسوۂ حسنہ کی قسمیں ہیں۔ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ پاک کی پیروی کے بغیر اللہ سے امید کرنی یا نجات آخرت کی آرزو کرنی یا ذکرِ الٰہی کو مفید سمجھنا بیہودہ خیال ہے پس اس سے تنبیہ حاصل کرنا چاہیئے فرقۂ قرآنیہ کو جو احادیث نبویہ کا انکار کرتے ہیں اور صرف قرآن کو تکمیلِ دین کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقتدا رسول کا وجوب قرآن ہی سے ہوتا ہے لیکن اکثر آیات تفسیر کی محتاج ہیں اور تفسیر کے لئے صاحب وحی کا قول ہی باوثوق ہو سکتا ہے۔ مخلص اہلِ ایمان نے کافروں کی چڑھائی دیکھ کر صداقتِ رسول کا مزید یقین کر لیا تھا۔ اس سے ان کے ایمانوں میں پختگی اور جذبۂ فرمانبرداری میں استحکام ہو گیا تھا گویا مصائب و شدائد مومن کے ایمان کو نکھارنے والی چیزیں ہیں۔ وغیرہ

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے وہ بات سچ کر دکھائی جس کا وعدہ اللہ سے کیا تھا تو اُن میں سے بعض لوگ تو اپنا کام پورا کر چکے اور بعض لوگ

مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ

منتظر ہیں (مگر) انھوں نے (عہد میں) کچھ رد و بدل نہیں کیا اللہ سچوں کو اُن کی راستبازی کی جزا دے گا اور منافقوں کو اگر چاہے گا تو

اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ

سزا دے گا اور ان کو توبہ کی توفیق دے گا بلاشک اللہ غفور رحیم ہے اور اللہ نے کافروں کو اُن کے غصہ میں لوٹا دیا کچھ بھلائی

لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ

ان کے ہاتھ نہ لگی اور مسلمانوں کی طرف سے لڑائی میں اللہ کافی ہوگیا اللہ زبردست اور غالب ہے اور جو اہلِ کتاب

ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا

کافروں کے مددگار ہوئے تھے اللہ اُن کو اُن کے قلعوں سے نیچے اتار لایا اور اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ ایک فریق کو تم

تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا

قتل کرنے لگے اور دوسرے فریق کو قید کرنے لگے اور تم کو اُن کی زمین کا اور اُن کے گھروں کا اور اُن کے مالوں کا اور ایسی زمین کا

لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۚ ع ۱۹

وارث کردیا جسمیں تمہارا قدم بھی نہ پہنچا تھا اور اللہ سب کچھ کرسکتا ہے

تفسیر جب علمبرداران حق اور داعیانِ صداقت پر شدائد و آلام کا ہجوم ہوچکتا ہے اور مصائب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں اور اُن کے پاؤں اپنی جگہ سے لغزش نہیں کھاتے اور حوادث کی طوفانی آندھیاں اور آتش بار گھٹائیں ان کے ثبات و استقلال میں کوئی ضعف نہیں پیدا کرسکتیں اور ان کی ہمتوں میں کسی طرح کی کمزوری اور بلند حوصلوں میں کسی قسم کی پستی نہیں آتی اور وہ اپنی بات پر جمے رہتے ہیں اور حق سے روگرداں نہیں ہوتے اور ساری زندگیاں حصولِ مقصد کے لئے وقف کردیتے ہیں اور کامیابی کی صورت کا اُن کو ہر وقت انتظار رہنے لگتا ہے۔ گویا اُن کا مقصد بہت بلند ہوتا ہے جو اس زندگی اور اس کی بالائی سطح سے بھی بہت اونچا ہوتا ہے اس لئے موت ان کی نظروں میں محبوب ہوتی ہے اور زندگی قابلِ نفرت مردار جانور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی بلکہ زندگانی ان کو ان کے مقصد سے روکنے والا پہاڑ نظر آنے لگتی ہے جس کو کاٹنے کے وہ ہر وقت مشتاق ہوجاتے ہیں تو ایسی حالت میں نسیم نصرتِ الٰہی چلتی ہے جو اہلِ حق کے دل کی کلیاں شگفتہ کردیتی ہے۔ اُن کے دلوں میں روحِ حیات پھونکتی ہے، ان کے دماغوں کو زندگی عطا کرتی ہے، اُن کی رگوں میں سعادتِ ابدیہ کا خون دوڑاتی ہے۔ دنیا سے ہی ان کی کامیابی شروع ہوجاتی ہے۔ اُن کے دشمن مقہور ذلیل اور خستہ حال کردیئے جاتے ہیں۔ اُن کی آبادیاں کوٹھیاں عمارتیں باغات مویشی مال منال اور سلما جاہ و جلال اہلِ حق کو دے دیا جاتا ہے۔ اس وقت باطل پرستوں کی کوئی تدبیر پیش نہیں جاتی۔ کوئی اسکیم بارور نہیں ہوتی اور کوئی جسمانی مادی طاقت قابلِ حفاظت ثابت نہیں ہوتی۔ غزوۂ خندق میں جن مومنوں نے حصہ لیا تھا اور جاں نثاری یا جاں سپاری کی تھی ان کی حالت بھی یہی ہوئی۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، تکلیفوں کی گھٹاؤں نے آگ کا مینہ برسایا، ہلاکت کے طوفانی جھکڑ چلے مگر استقلال کے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی نتیجہ وہی رہا جو فطرت کے مطابق تھا۔ دشمن بھاگے ناکام بھاگے۔ یہودیوں کے سروں پر مسلمانوں کا رعب چھا گیا۔ انھوں نے اپنی جانیں اپنی اولاد اور مال سب مسلمانوں کے ہاتھ میں دیدیئے۔ بہت سے اعدائے دین مارے گئے بہت سے گرفتار ہوئے۔ غرض مسلمان فاتح اور کفار مفتوح ہوگئے۔ یہ تو دنیوی سعادت کا ایک حصہ تھا جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا۔ رہا اخروی حساب تو اس کی کیفیت اور کمیت ناقابلِ بیان ہے۔

تحلیل اجزاء مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیاتِ سابقہ میں خدا تعالیٰ نے منافقوں کی بد عہدی کا ذکر فرمایا تھا اب اِن آیات میں مخلص اہلِ ایمان کے وفائے عہد کی مدح فرمائی کہ بعض اہلِ ایمان نے اس کو سچ کر دکھایا جو اللہ سے انھوں نے کیا تھا۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ جس عہد کو وفا کرنے کی مدح آیت میں کی گئی ہے اُس سے کس طرف اشارہ ہے اور معاہدہ کرنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں؟۔

بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ عہد سے مراد وہ عہد ہے جو لیلۃ العقبہ میں انصار نے کیا تھا۔ ہجرت سے پہلے حج کے زمانے میں قبائل اوس و خزرج کے کچھ آدمی مکہ میں آئے اور کوہِ منا کی گھاٹی میں حضور ﷺ سے بیعت کی۔ بیعت کی شرائط میں سے یہ بات بھی تھی کہ بوقتِ جہاد حضور ﷺ کی معیت میں جانبازی کریں گے حضور ﷺ کو نہیں چھوڑیں گے۔ پس جس عہد کو پورا کرنے کی مدح کی گئی ہے وہ یہی عہد تھا لیکن اس صورت میں آیت مذکورہ کا نزول صرف انہی انصاریوں کے متعلق قرار پائے گا جو بیعتِ عقبہ میں شریک تھے، حالانکہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ مخلص صحابہ کی ایک جماعت نے عہد کیا تھا کہ اگر حضور ﷺ کی ہمرکابی میں کافروں سے لڑنے کا ہم کو کبھی موقع ملا تو ہم ثابت قدم رہیں گے۔ منہ نہ موڑیں گے۔ اس قول پر بھی صحابہ کی ایک جماعت مخصوص طور پر مُراد قرار پاتی ہے اور بغیر کسی وجہ کے تخصیص لازم آتی ہے۔

میرے نزدیک حق یہ ہے کہ جن اقوال سے تخصیص پیدا ہو رہی ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ آیت میں کوئی لفظ کسی جماعت کو خاص طور پر ظاہر نہیں کر رہا ہے بلکہ تمام مخلص اہلِ ایمان مراد ہیں اور عہد سے مراد عہدِ ایمانی ہے۔ ہر مومن مخلص کا اللہ سے عہد ہوتا ہے کہ مرتے دم تک اللہ کی خوشنودی کو مقدم سمجھے گا، ایمان پر ثابت قدم رہے گا، راہِ خدا میں مال جان اور اولاد صرف کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہی وہ میثاق ہے جس کو پورا کرنا ہر مومن پر لازم ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ بعض صحابیوں نے اس میثاقِ ایمانی کے علاوہ مزید عہد کیا تھا جس کو انھوں نے پورا کیا اور مزید مدح کے مستحق قرار پائے لیکن اس سے آیت کے عموم میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب حضور ﷺ نے بدر میں کافروں سے جہاد کیا (فوراً روانگی سے پہلے صحابہ میں عمومی اعلان نہیں فرمایا تھا، کچھ لوگ سامنے تھے انہی کو ہمرکاب لے کر قریش کے قافلے کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت ہمراہیوں کی تعداد کچھ اوپر تین سو تھی۔ بہت سے صحابہ کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ ہمرکاب چلنے سے معذور رہے) میرے چچا انس بن نضر بھی ساتھ جانے سے معذور رہے اور ان کو اپنی غیر حاضری بہت شاق گزری۔ کہنے لگے یہ پہلا جہاد تھا کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے اور میں محروم رہا۔ آئندہ اگر کبھی حضور ﷺ کی معیت میں اللہ نے مجھے جہاد کا موقع نصیب کیا تو اللہ دیکھے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کہنے کو تو اتنی بڑی بات کہہ گزرے مگر کہہ کر پشیمان بہت ہوئے۔ اس بات کی ہیبت سے نادم ہو کر انھوں نے چاہا کہ کاش کاش یہ لفظ کہا ہوتا (کیونکہ معلوم نہ تھا آئندہ کیا ہونا ہے) مگر اللہ نے اُن کی بات پوری کر دی۔ پھر جنگِ احد کے دن میرے چچا کو شرکت نصیب ہوئی۔ جب مسلمانوں نے میدان چھوڑ دیا تو چچا نے آگے بڑھ کر عرض کیا پروردگار میرے ساتھیوں سے جو حرکت سرزد ہوئی میں تیری بارگاہ میں ان کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں اور مشرکوں کے فعل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر مشرکوں کی طرف بڑھے۔ درمیان میں انصار کے سردار سعد بن معاذ تھے۔ چچا نے اُن سے کہا ابو عمرو کہاں جا رہے ہو۔ خدا کی قسم مجھے تو کوہِ اُحد کے اُدھر سے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ واہ واہ سبحان اللہ کیسی اچھی خوشبو ہے۔ یہ کہہ کر کافروں کے لشکر کی طرف بڑھ کر ایسے لڑے کہ جب آخر میں حضور ﷺ نے معرکے سے شہیدوں کو نکالا تو انس بن نضر کے بدن میں تلوار اور نیزے اور تیروں کے زخم اسّی سے زائد تھے۔ میری پھوپھی ربیع بنت نضر کہتی تھیں کہ میں نے اپنے بھائی کو صرف انگلیوں سے شناخت کیا تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بڑے بڑے صحابی کہا کرتے تھے کہ انس بن نضر اور اُن کے ساتھیوں ہی کے حق میں آیت مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ نازل ہوئی تھی (یعنی آیت کے عموم میں یہ حضرات خصوصیت کے ساتھ داخل تھے) (رواہ البخاری ومسلم والترمذی واحمد والنسائی وابن جریر وابن ابی حاتم بوجوہ متعددۃ وطرق کثیرۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ غزوۂ احد سے مدینہ کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں مصعب بن عمیر کا جنازہ پڑا پایا۔ اُسی وقت حضور ﷺ نے آیت مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ الخ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں شہداء ہیں، تم لوگ ان کے یہاں آیا کرو، ان کی زیارت کیا کرو۔ قسم ہے اللہ عزوجل کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے قیامت تک جو کوئی ان پر سلام (دعائے رحمت) کرے گا ضرور یہ اس کے سلام کا جواب دیں گے (رواہ الحاکم والبیہقی من حدیث ابی ذر وابن مردویہ من حدیث خباب تعارقویا)

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ احد سے واپس آ کر منبر پر چڑھ کر حضور ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا فرمائی۔ شہدائے احد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دی ان شہیدوں کو اللہ نے جو حرمت و ثواب عنایت فرمایا اس کا اظہار فرمایا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (رواہ ابن جریر والترمذی وحسنہ)

فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ الخ۔ اس آیت میں چونکہ لفظ نحب کے ترجمہ میں اختلاف ہے اس لئے مطلب میں بھی کسی قدر اختلاف ہے۔ امام بخاری نے نحب کے معنی عہد لکھے ہیں کیونکہ حضور والا نے حضرت طلحہ کو بھی جو جنگ احد میں شہید نہیں ہوئے تھے اس آیت کا مصداق قرار دیا تھا۔ چنانچہ حضرت طلحہ کی مذکورۂ بعد روایت کے آخر میں اتنا اور بھی ہے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ یہ (عہد کو پورا کرنے والے) کون لوگ ہیں؟ اتنے میں میں سامنے آ گیا۔ اس وقت میں دو سبز کپڑے پہنے تھا حضور نے دریافت کرنے والے کو آواز دی اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ یہ شخص بھی انہی میں سے ہے۔ اس روایت سے امام بخاری نے حضرت طلحہ کو وفائے نحب (عہد) کرنے والوں میں شمار کیا اور اسی بنا پر نحب کا ترجمہ عہد قرار دیا مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ استدلال صحیح نہیں ہوتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حضور نے طلحہ کو انہی لوگوں میں شمار کیا ہو جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے معاہدہ کو سچ کر دکھایا یا اور آیت کی صراحت کے موافق ایسے با وفا لوگوں کی دو قسمیں ہیں کچھ لوگ وفا کر چکے اور کچھ لوگ منتظر ہیں اور چونکہ حضور والا کو پہلے سے معلوم تھا کہ حضرت طلحہ (جنگ جمل میں) شہید ہونے والے ہیں اس لئے آپ کو بھی وفا کرنے والوں کی فہرست میں شمار کیا۔ گویا حضرت طلحہ کا شمار معاہدہ کو پورا کرنے والے گروہ میں تو ہوا مگر اس گروہ کی اس شاخ میں ہوا جو بوقت بشارت منتظر تکمیل تھے۔ اسی بنا پر قتادہ حسن بصری نے فرمایا کہ تکمیل عہد کی صورت صرف یہ ہے کہ بغیر تبدیلی کے صدقِ عہد پر وفات یا شہادت ہو اس لئے حضرت طلحہ کو باوجود زندہ ہونے کے عہد کی تکمیل کرنے والوں میں سے شمار کیا۔ قتادہ بن زید نے نحب کا ترجمہ نذر کیا ہے۔ نذر اور عہد قریب المعنی ہیں اس لئے امام بخاری کی صراحت اور قتادہ کے قول میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے مجاہد سے بخاری کے قول کے موافق ترجمہ منقول ہے۔

آیت کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل ایمان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس معاہدہ کو پورا کر دیا جو انہوں نے اللہ سے کیا یعنی ایمان پر ثابت قدم رہے۔ بوقت جہاد کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ میدان سے منہ نہ موڑا۔ مسلمانوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اپنے مال اور جان کی پرواہ نہ کی۔ اب ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ لوگ وفائے عہد کی حالت پر مرنے کے منتظر تھے۔

جب غزوۂ احد میں حضور اقدس کے چاروں طرف کافروں نے ہجوم کیا اور تیر و تلوار کی بارش شروع کر دی تو حضرت طلحہ تن تنہا حضور کے لئے سپر بن گئے زخم کھا کر گرتے تھے پھر اٹھ کر بیچ میں کھڑے ہو کر کافروں کے حملوں کو روکتے تھے یہاں تک کہ آپ کے بیالیس زخم آئے اور ہاتھ شل ہو گیا۔ پس آپ نے انتہائی جانبازی کا مظاہرہ فرما کر معاہدہ کی وفا کر دی اور کافروں کو دفع کرنے کی کوئی امکانی کوشش اٹھا نہ رکھی اس لئے باوجود جنگ احد میں شہید نہ ہونے کے آپ کا نام وفاداروں میں شمار کیا گیا۔

وفائے عہد کی تکمیل کرنے والے اور پختہ ایمان پر ثابت قدم رہنے والے موت کے مشتاق ہی ہوتے ہیں موت ان کو محبوب ہوتی ہے۔ حضرت علی پر جب ابن ملجم نے حملہ کیا تو آپ نے فرمایا اٹھتے فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ۔ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ امام ابو اسمٰعیل ازدی نے بروایت معاذ بن جبل بیان کیا کہ جس رات کی صبح کو صدیق اکبر کی وفات ہونے والی تھی آپ بدلات کو ما بعد اپنی لونڈی سے پوچھتے تھے کیا صبح ہو گئی؟ جب صبح ہو گئی تو فرمایا مرحبا موت کو مرحبا ایسی زیارت کرنے والے کو جو مشتاق کے واسطے نعمت شوق کی حالت میں آتی ہے جو کوئی اس سے نادم ہوا اس کا برا ہو۔ سچ ہے اہل صدق و صفا کا یہی حال ہوتا ہے۔

لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ الخ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی آزمائش خوفناک ہول انگیز مصائب نازل فرما کر کرتا ہے تاکہ پاک اور ناپاک کا امتیاز ہو جائے۔ اگرچہ خدا عالم الغیب ہے لیکن وہ اپنے علم کی بنا پر کسی کو عذاب نہیں دیتا جب تک مخلوق کو خود بھی واضح طور پر معلوم نہ ہو جائے اسی لئے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ مَّا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ یعنی اللہ اہل ایمان کو یونہی مخلوط حالت میں چھوڑنے والا نہیں تاوقتیکہ پاک ناپاک جدا جدا نہ کر دے۔ مطلب یہ کہ مخلص اور منافق نیکوکار اور بدکار فرماں پذیر اور نافرمان کا باہمی امتیاز مخلوق کی نظر میں فرد ہے اور عذاب و ثواب کو بنا عمومی امتیاز اور واضح تفریق پر رہے۔ پس غزوۂ احزاب میں مسلمانوں پر مصائب کا نزول اور شدائد کا ہجوم اس لئے ہوا کہ صادقین اور کاذبین کا کھلے طور پر لوگوں کو بھی امتیاز ہو جائے۔ جو لوگ واقعی سچے ہیں وہ اپنے سچ پر قائم رہیں اور صبر و استقلال کے ساتھ وفائے عہد کرنے کا ثواب ان کو ملے اور منافقوں کی حالت بھی سب پر عیاں ہو جائے۔ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ وہی ناپاک افراد ہیں جنہوں نے اللہ سے معاہدہ کرنے کے بعد توڑا۔ اب ان کا خدا کو اختیار ہے۔ ان کے کردار و اطوار تو عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ اللہ چاہے گا تو ان کو سزا دے گا یعنی جن حالات کا صدور ان سے ہوا ہے برابر یہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ مرنے کے بعد جہنم میں جائیں گے اور اگر خدا چاہے گا تو ان کو گزشتہ بداعمالیوں سے توبہ کرنے کی توفیق عنایت فرما دے گا۔ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے پس باقتضاء رحمت ہو سکتا ہے کہ وہ اہل نفاق کے دلوں سے نفاق کو دور کر کے خالص ایمان بھر دے اور بداعمالی کی جگہ اعمال صالحہ لیں

کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے۔ پس منافقوں کو اپنی گزشتہ حرکات کے سبب سے بالکل مایوس نہ ہو جانا چاہیئے بلکہ اللہ کی صفت مغفرت و رحمت کو امید و سمجھ کر صدق و اخلاص سے توبہ کر کے حسن عمل اختیار کر لینا چاہیئے۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا۔ یعنی کفار بڑے غیظ و غضب کے ساتھ چڑھ کر آئے تھے لیکن اللہ نے ان کو ناکام واپس لوٹایا جس غیظ کو لے کر آئے تھے اسی غیظ کو لے کر لوٹنا پڑا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قبائل کفار نے ہوائے نفسانی کے زیر اثر عداوت پر کمر باندھی تھی پس اسی کی مناسبت سے اللہ نے تند ہوا کو ان پر مسلط فرمایا اور ان کے جتھوں کو دم بھر میں توڑ دیا اور ناکام و نامراد لوٹنا پڑا۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ یعنی مسلمانوں کو اُن سے لڑنے کی نوبت نہ آئی۔ اللہ نے مسلمانوں کا کام بغیر ان کے لڑے پورا کر دیا۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ (جب احزاب کفار کے محاصرہ کو ایک ماہ کے قریب مدت گزر گئی اور مسلمان بہت تنگ حال مصیبت زدہ اور کبیدہ ہو گئے تو) رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے بددعا فرمائی اور فرمایا:۔ اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتٰبِ سَرِيْعَ الْحِسَابِ اَهْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ (ترجمہ) اے کتاب نازل فرمانے والے جلد حساب لینے والے اللہ ان جماعتوں کو بھگا دے اُن کو توڑ دے اور ان کے پاؤں اکھاڑ دے (صحیحین) حضورؐ کی بددعا کارگر ہوئی اور کفار بے سر و پا بدحواس ہو کر بھاگے۔

حضور اقدس اکثر سفر سے واپس تشریف اور مدینہ میں داخل ہوتے تو داخل ہوتے وقت یہ الفاظ فرماتے:۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَاَعَزَّ جُنْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ فَلَا شَيْءَ بَعْدَهٗ۔ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اپنے بندہ کو فتحیاب بنایا، اپنے لشکر کو غلبہ عطا فرمایا۔ خود تنہا کافروں کی جماعتوں کو بھگایا۔ اُس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے (صحیحین) فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع میں کوہ صفا پر بلند آواز سے حضورؐ نے یہی الفاظ فرمائے تھے۔

وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا۔ یعنی اللہ کو کسی مادی مدد کی ضرورت نہیں وہ خود قوی اور غالب ہے سب مخلوق اس کے پنجۂ قدرت میں مقہور ہے حدیث مبارک میں آیا ہے بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں مقہور ہیں۔ جس طرح جنگل میں سوکھی پتی کو ہوا جس طرف چاہتی ہے اڑا کر لے جاتی ہے اسی طرح بندوں کے دلوں کو اللہ جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا۔ غطفان، اہل نجد وغیرہ قبائل جب ناکام ہو کر واپس ہوئے اور بنو قریظہ تنہا رہ گئے تو چونکہ انھوں نے کافروں کی مدد کی تھی اس لئے اللہ نے اُن کو اور ان کی گڑھیوں اور پناہ گاہوں سے باہر نکال دیا اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب جما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں سے کچھ لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارے گئے اور باقی قید ہو گئے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل ہم تفسیر ابن کثیر تفسیر سراج اور بعض دوسری کتابوں سے نقل کرتے ہیں تاکہ آیات کا مطلب بھی واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ کونسا سنگین جرم تھا جس کی سزا یہودیوں کو اس بے دردی کے ساتھ دی گئی تھی۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہود بنی نضیر کو حضورؐ والا نے خیبر سے نکال دیا تھا اس کے علاوہ اُن کے دلوں میں پہلے سے اسلامی عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی اسی بنا پر ان کا سردار حیی بن اخطب نضری بنو قریظہ کے پاس اُن کے قلعہ میں آیا اور قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے مل کر کہنے لگا میں تم کو دنیا بھر کی عزت دینے آیا ہوں۔ قبائل قریش، غطفان اور ان کے ساتھیوں کو چڑھا کر لا رہا ہوں۔ وہ لوگ جب تک مسلمانوں کی بیخ کنی نہ کر دیں گے یہاں سے نہ جائیں گے۔ کعب نے جواب دیا ایسا ہرگز نہیں ہے تو زمانہ بھر کی ذلت ہم پر لایا ہے۔ کمبخت تو منحوس ہے ایسی باتیں تو ہم سے دُور رکھ۔ حیی نے کعب کی بات نہ مانی اور اس قدر اصرار کیا کہ آخر اس کو معاہدہ شکنی پر آمادہ کر لیا اور یہ شرط کر لی کہ اگر بالفرض یہ قبائل یہاں سے بغیر کار برآری کے چلے گئے تو میں اسی قلعہ میں تمہارے ساتھ رہ پڑوں گا اور جو کچھ گزرنی ہے تمہارے ساتھ مجھ پر بھی گزرے گی۔ غرض بنی قریظہ نے مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدہ کو توڑ دیا۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع پہنچی تو بہت ناگوار ہوا اور مسلمانوں کو بھی یہ بدعہدی شاق گزری لیکن جب اللہ نے نتیجہ برآمد کیا تو وہ بہت خوشگوار تھا اور یہودیوں کو اُن کی گدیوں سے اُتار کر گردنیں ماریں۔ صورت یہ ہوئی کہ جب قبائل رات ہی رات میں بھاگ گئے تو صبح کو حضور اقدس نے حصار خندق سے چل کر مدینہ کی طرف رُخ کیا مسلمان امداد و حفاظت الٰہی کے شکر گزار تھے۔ جب حضورؐ نے ہتھیار کھول دیئے اور ام المومنین ام سلمہ کے مکان میں غسل کرنے لگے۔ اتنے میں جبرئیل باریک ریشم کا عمامہ باندھے ہوئے سفید خچر پر سوار تھے۔ خچر پر دریائی کی زین پڑی تھی۔ آکر کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ نے ہتھیار کھول دیئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ جبرئیل نے کہا مگر ملائکہ نے

قوابھی ہتھیار نہیں کھولے اور کفار کی جماعتوں کے تعاقب سے میں ابھی واپس آیا ہوں۔ اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ بنی قریظہ کی طرف رُخ کیجئے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کو متزلزل کر دوں (ابن کثیر) اب میں ان کی طرف جاتا ہوں۔ اللہ نے اُن کو اس طرح بتاہ کر دیا ہے۔ جیسے انڈا کوہ صفا پر پٹک دیا جائے پس آپ اپنے ساتھیوں کو کوچ کرنے کا حکم دیجئے کہ وہ بنی قریظہ (کے حدود) میں پہنچ کر عصر کی نماز پڑھیں (سراج) حضورؐ نے فوراً لوگوں کو بنی قریظہ کی طرف روانہ ہونے کا حکم دے دیا اور یہ بھی حکم دیدیا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی بنی قریظہ کی زمین پر پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھے۔ یہ واقعہ ظہر کی نماز سے بعد کا تھا۔ بنی قریظہ کا قلعہ مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا جب الحکم لوگ روانہ ہوئے۔ عصر کی نماز کا وقت راستہ میں آگیا۔ کچھ لوگوں نے تو راستہ میں نماز پڑھ لی اور کہنے لگے کہ اس حکم سے حضور کی مراد یہی تھی کہ ہم روانگی میں جلدی کریں۔ دوسرے صحابیوں نے کہا ہم تو حضورؐ کے حکم کے موافق وہیں جاکر عصر کی نماز پڑھیں گے۔ حضورؐ نے دونوں گروہوں میں سے کسی کو بُرا نہیں فرمایا (ابن کثیر) بعض صحابی چلتے چلتے (بنی قریظہ کی زمین میں) عشاء کے وقت پہنچے اور اس وقت پہنچ کر عصر کی نماز پڑھی۔ حضورؐ نے ان کو بھی قابلِ ملامت نہ قرار دیا۔ (سراج) غرض سرکارِ عالی نے عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا کو اپنا جانشین بنایا جو مسجد نبوی میں معذورین وغیرہ کو نماز بھی پڑھاتے تھے اور لشکر کا نشان حضرت علیؓ کو دیا (ابن کثیر) علیؓ نشان لے کر نکلے تو صحابہ خوشی خوشی نشان کے نیچے جمع ہو گئے۔ علیؓ چل دیئے جب بنی قریظہ کے قلعہ کے نزدیک پہنچے تو قلعہ کے اندر سے حضورؐ کی شان میں کوئی نامزا بات سُنی۔ لوٹ کر خدمت گرامی میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اس میں کیا حرج ہے اگر حضورؐ اپنے خیمہ میں فروکش ہوں اور ناپاک یہودیوں کی طرف سے نہ گزریں فرمایا شاید تم نے اُن کی زبان سے کوئی ناگوار بات سُن لی۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو کچھ نہ کہتے۔ غرض حضورؐ چلتے چلتے ان کے قلعہ کے پاس پہنچے اور فرمایا اے بندروں کے بھائیو! جان لو کہ اللہ نے تم کو خوار کیا اور اپنا عذاب تم پر اُتارا ہے۔ کہنے لگے ابوالقاسم! تم تو سخت زبان نہ تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کیا کوئی سوار تمہاری طرف سے گزرا ہے؟ بولے ہاں آپ کا صحابی دحیہ بن خلیفہ سفید خچر پر سوار جس پر دیبائی کی زین پڑی تھی اس طرف سے گزرا تھا۔ ارشاد فرمایا وہ جبرئیل تھا جس کو بنی قریظہ (کے دلوں) میں رعب ڈالنے اور ان کے قلعوں کو ہلا دینے کے لئے بھیجا گیا ہے (سراج) پھر حضورؐ نے ان کا محاصرہ کیا اور ۲۵ روز تک محاصرہ قائم رکھا (ابن کثیر) علمائے سیر نے لکھا ہے کہ جب یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ آنحضرتؐ بغیر لڑائی کے واپس نہ جائیں گے تو کعب بن اسد نے یہودیوں کو جمع کر کے کہا جو آفت تم پر پڑی ہے وہ تمہارے سامنے ہے (حُیَی بن اخطب کی طرف اشارہ کر کے کہا) یہ سب اس شخص کی نحوست ہے تم نے اس منحوس کے کہنے سے معاہدہ شکنی کی اور مجھے بھی مجبور کیا۔ اب میں تمہارے سامنے تین باتیں کہتا ہوں تم ان میں سے کسی ایک بات کو اختیار کر لو۔ اول یہ کہ ہم لوگ جاکر محمدؐ کی بیعت کر لیں اور ان کو پیغمبر آخر الزماں مان لیں کیونکہ خدا کی قسم تم پر یہ امر روشن ہو چکا ہے کہ وہ پیغمبر مرسل ہیں اور وہی ہیں جن کا تذکرہ تم کو اپنی کتاب میں ملتا ہے اس سے تم کو ایمان نصیب ہوگا اور امن کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر بال بچوں میں رہ کر عیش کرو گے۔ یہودی بولے خدا کی قسم ہم تو یہودی مذہب سے ہرگز نہ پھریں گے اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو اختیار نہ کریں گے۔ کعب نے کہا اگر تم اس سے انکار کرتے ہو تو دوسری بات یہ ہے کہ آؤ ہم سب مل کر اپنے بال بچوں اور عورتوں کو قتل کر کے ایک دم محمدؐ کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ہمارے پیچھے کوئی ایسا بوجھ نہیں ہے گا جس کی ہم کو فکر ہو پس دل کھول کر ننگی تلواروں سے مقابلہ کرو تاکہ جو کچھ منظورِ الٰہی ہو ہو جائے۔ اگر ہم سب بھی مارے گئے تب بھی ہم کو رانڈوں اور یتیموں کی فکر نہیں اور اگر ہم غالب ہوئے تو اپنی جان کی قسم عورتیں اور بچے بہت پیدا ہو جائیں گے۔ یہودی کہنے لگے اگر ہم ان بیچاروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیں تو پھر ان کے بعد زندگی کا کیا لطف ہے۔ کعب نے کہا اگر تم اس سے بھی انکار کرتے ہو تو تیسری بات یہ ہے کہ آج سنیچر کی رات ہے غالباً مسلمان ہماری طرف سے بے فکر اور غافل ہوں گے اسی غفلت کی حالت میں قلعہ سے اتر و شاید غلبہ پانے کا موقع ہم کو مل جائے۔ یہودی بولے یہ بات کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے روزِ سبت (سنیچر) کی حرمت کو نہیں توڑا۔ اب تم ہم سے کہتے ہو کہ آج کی رات لڑائی کریں واللہ ہم بزرگوں کی چال نہیں چھوڑیں گے۔ جب کعب نے یہ جواب سُن لئے تو یہودیوں کو اُن کی رائے پر چھوڑ دیا۔ علمائے تاریخ نے لکھا ہے کہ ۲۵ روز کے محاصرہ میں یہودیوں کی حالت دگرگوں ہو گئی (سراج) مسلمانوں نے ابھی یہودیوں کو جلانے اور تنگ کرنے کے لئے اُن کے نخلستان کو کاٹنا اور کھیتوں کو اجاڑنا شروع کیا تاکہ وہ کسی طرح قلعہ سے نکل کر میدان میں آجائیں اور یہ کام اللہ کے حکم سے کیا گیا تھا۔ خداتعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ یہودیوں نے معاہدہ شکنی کی تھی اور ارادہ کیا تھا کہ قریش و غطفان سے مل کر مدینہ سے مسلمانوں کی جڑ اکھاڑ دیں لیکن اللہ نے اُن کو رُوسیاہ کیا اور مقابلہ سے ڈر کر محصور ہوئے۔ حضورؐ نے ان سے کہلا بھیجا کہ میرے حکم پر راضی ہو کر قلعہ سے اُترو یعنی بلا شرط

قلعہ سے باہر آؤ میں تمہارے متعلق جو فیصلہ مناسب سمجھوں گا کروں گا۔ یہودیوں نے انکار کیا۔ اس وقت بنی عمرو بن عوف کا خاندان نہایت صادق الایمان خاندان تھا۔ زمانہ جاہلیت میں اُن سے اور بنو قریظہ سے عہد و پیمان تھا۔ اسی خاندان کے ایک شخص ابولبابہ بن عبد المنذر تھے۔ یہودیوں نے حضورؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ ابولبابہ کو ہمارے پاس بھیج دیجئے تاکہ ہم ان سے مشورہ کرلیں (حضورؐ نے بھیج دیا) جب ابولبابہ اُن کی گڑھی کے پاس جاکر کھڑے ہوئے تو اُن کے سامنے مردوں عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کیا۔ ابولبابہ کا دل پسیج گیا۔ جب یہودیوں نے دریافت کیا کہ ہم محمدؐ کے حکم پر اُتر آئیں؟ تو ابولبابہ نے جواب دیا ہاں مگر اُنگلی سے حلق کی طرف اشارہ کردیا۔ مراد یہ تھی کہ قتل کردیئے جاؤ گے۔ ابولبابہ کا بیان ہے کہ مجھ سے یہ حرکت بیساختہ سرزد ہوگئی۔ واللہ میرے پاؤں وہاں سے ہٹے بھی نہ تھے کہ مجھ پر زبردست خوف طاری ہوا کہ میں نے اللہ اور رسولؐ کی خیانت کی تھی۔ اس کے بعد ابولبابہ سیدھے مسجد میں گئے۔ حضورؐ کی خدمت میں بھی حاضر نہ ہوئے اور جاکر مسجد کے ستون سے اپنے کو بندھوا دیا اور بارگاہِ الٰہی میں عہد کیا کہ جب تک اللہ میری توبہ قبول نہیں فرمائے گا میں نہیں ہٹوں گا اور یہ بھی عہد کیا کہ اب کبھی بنو قریظہ کی سرزمین میں نہیں جاؤں گا۔ ایسی زمین پر کبھی خدا مجھ کو نہ دیکھے گا جہاں میں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خیانت کی ہے۔ ابولبابہ کے آنے میں دیر ہوئی تو حضورؐ نے اُن کی حالت دریافت فرمائی اور کیفیت معلوم ہوئی تو فرمایا اگر وہ میرے پاس آتا تو میں اس کے لئے استغفار کرتا اب جبکہ اُس نے خود اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے تو جب تک خدا تعالیٰ خود اس کی توبہ قبول نہ فرمائے گا میں اس کو نہیں کھولوں گا۔ (ابولبابہ کو صرف نماز کے لئے کھولا جاتا تھا۔ جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اور آیت یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ الخ نازل فرمائی) اس کے بعد حضورؐ نے بنو قریظہ کو حکم بھیجا کہ تم سعد بن معاذ کے فیصلہ پر راضی ہوکر اُترو جو انصار میں سے قبیلہ اوس کے سردار ہیں۔ بنو قریظہ نے اس کو منظور کرلیا کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں اوس اور خزرج کے قبیلوں میں باہم اتفاق تھا اور بنو قریظہ کے یہودیوں نے قبیلہ اوس سے پیمان کیا تھا۔ اسی لحاظ سے انھوں نے خیال کیا کہ سعد بن معاذ ہماری طرفداری کریں گے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ محاصرہ مدینہ کے زمانہ میں کافروں کے ہاتھ سے سعد کی اکحل رگ کٹ گئی تھی جس کا خون بند نہیں ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اکحل رگ کٹنے کے بعد زندگی ناممکن ہوجاتی ہے لیکن سعد نے دعا کی تھی کہ الٰہی اگر قریش کی لڑائی میں سے تو نے کچھ حصہ باقی رکھا ہے تو مجھے ابھی زندہ رکھ اور اگر تو نے اُن کو مغلوب کردیا تو میرے اس زخم کو جاری کردے مگر اُس وقت تک میری موت نہ بھیج جب تک بنو قریظہ کے کافروں کی طرف سے میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوجائیں۔ اللہ نے سعد کی یہ دعا قبول فرمالی۔ بات یہ ہوئی کہ جب حضورؐ کو سعد کا خون بند نہ ہونے کی حالت معلوم ہوئی تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے رگ پر داغ لگایا جس سے خون بند ہوگیا اور مسجد میں ایک خیمہ کے اندر سعد کو اتارا گیا۔ غرض حضورؐ نے سعد کو مدینہ سے طلب فرمایا۔ سعد کو ان کی قوم والے ایک خچر پر زم زین کس کر سوار کرکے چلے اور راستہ میں (اہل تعلق) یہ کہتے ہوئے آرہے تھے کہ سردار! یہ لوگ آپ کے حلیف اور ہم عہد ہیں آپ ان کے حق میں بھلائی کرنا۔ اس قسم کی دوسری باتیں کرتے چلے آرہے تھے مگر سعد خاموش تھے کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ جب لوگوں نے سعد سے زیادہ کہا تو آپ نے جواب دیا۔ واللہ سعد کے لئے اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کرے گا۔ لوگوں نے یہ الفاظ سن کر سمجھ لیا کہ اب سعد بنی قریظہ کو باقی نہیں چھوڑیں گے۔ الغرض سعد جب اس خیمہ کے قریب پہنچے جس میں حضورؐ تشریف فرما تھے تو سرکارؐ نے انصار سے فرمایا۔ تم لوگ کھڑے ہوکر اپنے سردار کا استقبال کرو۔ مسلمانوں نے کھڑے ہوکر عزت و احترام کے ساتھ سعد کو اُتار کر بٹھایا۔ حضورِ اقدس نے بنی قریظہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سعد سے فرمایا سعد! یہ لوگ تمہارے حکم پر راضی ہیں۔ پس جو کچھ تمہارا دل چاہے ان کے حق میں فیصلہ کرو۔ سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میرا حکم ان لوگوں پر نافذ ہے؟ فرمایا ہاں۔ سعد نے عرض کیا کیا اُن لوگوں پر بھی میرا حکم نافذ ہے جو اس خیمہ کے اندر ہیں یعنی مسلمان۔ فرمایا ہاں۔ سعد نے اس طرف رُخ کرکے جدھر حضورؐ تشریف فرما تھے عرض کیا۔ کیا ان پر بھی نافذ ہے؟ فرمایا ہاں۔ سعد نے عرض کیا۔ تو میں فیصلہ کرتا ہوں کہ بنو قریظہ میں سے جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں (یعنی جوان آدمی) اُن کو قتل کیا جائے اور بوڑھے اور عورتیں اور نابالغ بچے اور ان سب کا مال مالِ غنیمت سمجھا جائے۔ یہ فیصلہ سن کر حضورِ گرامیؐ نے بلند آواز سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا اور فرمایا تم کو وہ حکم دینا نصیب ہوا جو اللہ کو ان کے حق میں پسند تھا۔ بالآخر سعد کے حکم کے موافق یہودیوں کو نکلنا پڑا۔ ان کے دلوں پر ایسی ہیبت چھاگئی کہ باوجودیکہ ان میں آٹھ سو نو سو جوان جنگجو موجود تھے اور مسلح بھی تھے لیکن سعد کے فیصلہ کے بعد ان میں سرتابی کی ہمت نہ رہی۔ کھائیاں کھدوائی گئیں مشکیں باندھ کر ان کو لایا گیا اور ایک ایک کو کھائی کے کنارے کھڑا کرکے گردن ماری گئی اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوئی۔ رہے وہ لوگ جو لڑنے کے قابل نہ تھے یعنی بوڑھے عورتیں اور بچے ان کو مالِ غنیمت سمجھا گیا اور قید کرلیا گیا۔ بچوں میں عطیہ قرظی بھی تھے۔ ان کا خود بیان ہے کہ یومِ قریظہ میں مجھے حضورؐ کی خدمت میں پیش

کی گئی۔ لوگوں کو میرے بالغ ہونے کا شبہ تھا حضور نے حکم دیا۔ دیکھو اس کے زیر ناف بال جمے ہیں یا نہیں؟ حکم کی تعمیل کی گئی تو میرے بال نہیں جمے تھے حضور نے مجھے چھوڑ دینے کا حکم دیا اور مجھے عورتوں اور بچوں میں شامل کر دیا گیا۔ (احمد و نسائی و ترمذی)

اس ساری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ احزاب کفار سے لڑنے کی ضرورت مسلمانوں کو نہیں پڑی۔ اُن کو خدا نے ویسے ہی بھگا دیا۔ رہے بنی قریظہ کے یہودی تو اُن کی بربادی مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کے جوان آدمیوں کو قتل کیا گیا اور باقی گروہ کو قیدی بنا لیا گیا اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کا رُعب ایسا چھایا کہ باوجود کافی تعداد اور ہتھیار بند ہونے کے سعد کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہوئی۔ فَاللّٰہُ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ۔

وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ۔ یعنی اللہ نے بنی قریظہ کے املاک جائداد اور مال کا وارث مسلمانوں کو بنا دیا۔ ان کی ہر چیز مسلمانوں کے جائز قبضہ میں آگئی اور مفت میں ہاتھ لگی جس طرح میراث مفت ملتی ہے۔

وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا۔ اور ایسی زمین بھی خدا نے مسلمانوں کو عطا فرمائی جس میں اس سے پہلے ان کے قدم بھی نہیں پہنچ گئے تھے۔ اس زمین سے کونسی زمین مراد ہے؟ بقول ابن کثیر علمائے سلف کے اس میں مختلف اقوال ہیں۔ کیونکہ بنی قریظہ کی سرزمین کی طرف تو اس سے اشارہ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ فتح سے پہلے وہاں مسلمان بہت مرتبہ گئے تھے۔ اسی وجہ سے کسی نے ارض خیبر کسی نے مکہ کسی نے ممالک روم و فارس کی صراحت کی ہے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ یہ سب ممالک مراد ہیں۔ تخصیص بلا وجہ ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ یعنی اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے۔ اس کے لئے دشوار نہیں کہ کمزور قلیل نادار مخلص جماعت کو قوی کثیر دولتمند بے دین جماعت پر غالب کر دے۔ صدق اللہ ورسولہ۔

مقصود بیان ایمان پر پختہ رہنے والوں کی مدح ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کی تعریف جنھوں نے احد کے معرکہ میں امکانی کوشش کرنے میں دریغ نہیں کیا تھا جنھوں نے جان اور مال کی قربانی کی تھی اور جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے معاہدہ کو ذرہ برابر نہیں بدلا تھا۔ صادقین کا گروہ یہی تھا۔ آیت اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ سے ثابت ہوتا ہے کہ منافق کی توبہ قابل قبول ہے۔ سچی توبہ کرنے سے اللہ گزشتہ جرائم کو معاف فرما دیتا ہے۔ اس میں در پردہ تنبیہ و توبیخ ہے اُن منافقوں کو جنھوں نے گزشتہ ایام زندگی میں منافقانہ روش اختیار کی تھی۔ آیت وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوق میں کمزور غیبی طاقت ہے۔ کافروں کا اتنا عظیم الشان جتھہ غزوہ خندق کے موقع پر بے نیل و مرام واپس چلا گیا اور مسلمانوں کو اُن سے لڑنا بھی نہ پڑا۔ یہ غیبی طاقت کی کارفرمائی نہیں تو اور کیا تھا۔ آیت وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ سے واضح ہوتا ہے کہ زبردست دشمن کو مقہور کرنے والی اور تعداد میں پُر شوکت طاقت کو کمزور بنا دینے والی اور اُن کے دلوں میں خوف جما دینے والی طاقت بس اللہ ہی کی ہے۔ بنی قریظہ کے یہودیوں کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب جم گیا۔ انھوں نے بغیر چون و چرا کے سعد کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ مارے گئے، قیدی بنے۔ یہ سب کچھ اللہ کے حکم کے تحت ہوا۔ بنی قریظہ کے یہودیوں کو جو سزا دی گئی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ معاہدہ کو توڑنے والی بے ایمان جماعت یا حکومت کو سنگین ترین سزا دینی چاہیئے۔ جو لوگ اسلام کی جڑ کھودنے کے درپے ہیں اور عملی طور پر اسلام کی بربادی کی کوشش کر چکے ہیں اگر وہ توبہ نہ کریں تو ان کی جڑ کاٹ دینی چاہیئے۔ ایک حکم اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم طاقتوں کے نزاع کے وقت حَکَم مقرر کرنا جائز ہے مگر حَکَم کو مسلمان ہونا چاہیئے۔ ایک یہ امر بھی مستفاد ہوتا ہے کہ حَکَم کا حکم واجب النفاذ ہے۔ آیت وَاَوْرَثَکُمْ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ بدطینت حربی کافروں کا مال مسلمان کے لئے حلال ہے بلکہ اس کو قتل کرنا اور عورتوں بچوں کو قیدی بنانا بھی جائز ہے۔ وغیرہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ

اے نبی اپنی بیبیوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیوی زندگانی اور اُس کی آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ

اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّا

سامان دیدوں اور خوش اسلوبی سے تم کو رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت

الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيْمًا ○ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ

کو چاہتی ہو　تو اللہ نے　تم میں سے　نیکوکار عورتوں کے لئے　اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے　اے پیغمبر کی بیبیو!　تم میں سے　جو کوئی

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○

صریح بے حیائی کی مرتکب ہوگی　اُس کو دوہرا　عذاب دیا　جائے گا　اور یہ　اللہ پر　آسان ہے

تفسیر جمہوری حکومتیں ہوں یا نیم جمہوری انتخابی ڈھنگوں کی جماعت ہو یا شخصی ڈکٹیٹر، بہرحال نظمِ حکومت کسی کے ہاتھ میں ہو لیکن آئینی حکومت انسانی دماغوں کا تراشیدہ اور ماہرینِ سیاست و انتظام کا ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ حاکمِ اعلیٰ کے لئے کچھ آئینی خصوصیات ضرور ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے نوابوں اور مہاراجوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کی حکومتوں کی تو بنا ہی آئین پر نہیں۔ ان کی زبانیں قانون ہیں، پبلک خزانے ان کے موروثی املاک ہیں۔ تمام محصول اور زمین کا لگان ان کی مملوکہ میراث ہے۔ تمام رعایا ان کی باندی غلام ہے۔ ہر شخص کی آبرو، جان اور مال پر تصرف کرنے کا ان کو اختیار ہے۔ انسان کی فلاکت سے بچنے کو بچانے والا انسان کی دستبرد سے سرتابی کرنے والا باغی، مستحقِ قتل و واجب الدار ہے۔ وہاں کا تو کہنا ہی کیا جہاں تاریکی کو روشنی اور ظلم کو انصاف کہا جاتا ہے اور حق کو حق کہنے والا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ جہاں انصاف تہذیب اور انسانی آزادی کا راگ الاپا جاتا ہے، امریکہ کی متحدہ ریاستیں ہوں یا یورپ کی مستقل حکومتیں سب کی حالت ایک جیسی ہے۔ قانونی استثناء ہر ملک کے مروجہ آئین میں موجود ہے۔ حکمران کی ذاتی خصوصیات ہر جگہ ملحوظ ہیں۔ بیش قرار تنخواہیں، فلک بوس کوٹھیاں، شرقی اور غربی کمالات کا جامع فرنیچر، عیش و طرب کے تمام سامان اور اہل و عیال کی آسائش کے کل اسباب ان کو میسر ہیں۔ پھر ہر جگہ آئینی طور پر ان کی ذاتی وجاہت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض جمہوری آئینی حکومتوں میں کٹ پتلی غیر مختار شاہ شطرنج کو کوئی اور حکمرانی کا اختیار نہیں اتنا ضرور ہے کہ اگر وہ اپنے کسی ملازم کو کسی قصور پر قتل بھی کر دے تو اس کی شخصیت قانونی گرفت سے اس کو مستثنیٰ کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے مگر خدا ساختہ آسمانی الٰہی حکمرانی کے قوانین جدا ہیں۔ اس میں کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو حاکم غیر مختار تو کیا مختار مطلق حکمران کی بھی کوئی رعایت روا رکھے۔ اور تو اور حضورِ گرامی جو شارعِ مطلق، حاکمِ مختارِ عام رسول تھے قانون نے اپنی ہمہ گیر حکومت سے ان کو بھی آزاد نہ رکھا، کوئی رعایت نہ برتی، عظمت و وجاہت، عزت اور شخصیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا بلکہ ان کے لئے خصوصی قیود میں چند در چند اضافہ کر دیا۔ نہ ان کی گرانقدر تنخواہ جاری کی، نہ شاہی محلات کی تعمیر اور ان میں سکونت کی اجازت دی، نہ بیش قیمت لباس زیب تن کرنے کا اختیار دیا، نہ لذیذ قیمتی غذا فراہم کرنے اور کھانے پینے کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ اور پست ترین افراد کو اجازت ہے کہ جس قدر روپیہ جائز طریقہ سے پیدا کر سکتے ہوں کریں اور جہاں پر صرف کرنا چاہیں کریں خود بھی مشام نواز خوشگوار مزیدار نقری کھانے کھائیں اہل و عیال کو بھی کھلائیں خود بھی عمدہ قیمتی لباس پہنیں، بیوی بچوں کو بھی پہنائیں۔ اچھے شاندار مکانوں میں خود بھی رہیں اور گھر والوں کو بھی رکھیں۔ غرض ہر جائز آسائش سے خود فائدہ اٹھائیں اور ان کو بھی تمتع اندوز ہونے کا موقع دیں جن کے عیش و آرام پر آدمی اپنے راحت و چین کو قربان کرتا ہے لیکن ان جائز نعمتوں سے اگر کوئی محروم رہ سکتا ہے تو اللہ کا پیارا نبی اُمت کا سرپرست قوم کا پیشوا رفایا کا والی قانون لانے اور پھیلانے والا دنیا و دین کا بادشاہ نہ اُس کے پاس خادم، نہ مخدوم حشم نہ عمدہ کھانا نہ فاخرہ لباس یہاں تک کہ اُس کی بیبیوں کے پاس بھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو ٹکڑا اور تن بھر پہننے کو کپڑا موجود نہیں۔ یہ عمدہ ضروری آسائش کے سامان کا تو ذکر ہی کیا ہے اور اگر کسی بی بی نے بتقاضائے بشریت کھانے کو پیٹ بھر روٹی یا پہننے کو کسی قدر دیدہ زیب کپڑا اور ادنیٰ شان و شوکت کا تقاضا کیا تو اس قدر سخت دھمکی دی گئی کہ اگر سلک زوجیت میں رہنا ہے، اگر شہنشاہِ دارین کی بی بی ہونے کے شرف کو تم کافی سمجھتی ہو تو دنیوی شان و شوکت و زینت، محلات، مال و دولت یونہی فقر و فاقہ پر صبر کرو ورنہ ہر قسم کی آسائش اور بنے سنورنے کا سامان تم کو دیا جا سکتا ہے مگر یاد رکھو کہ پھر رسول کے گھر میں تمہاری سکونت نہیں رہ سکتی نبی کی زوجیت کے رشتہ میں تم منسلک نہیں رہ سکتیں۔ تم میں اور اُمت کی دوسری بیبیوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ سکتا۔ تم کو اعلیٰ فضیلت نہیں ہو سکتی۔ پس یا تو محکومیتِ عامہ کے دائرہ میں چلی جاؤ اور حسبِ خاطر سامان لے لو یا حاکمیت کی سطح پر رہو اور ناداری کا شکوہ نہ کرو۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ نبی کو تنبیہ دے اُن کی بیبیوں کو یہ سخت حکم بھی سُنا دیا کہ تمہاری حالت دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں کی طرح نہیں ہے۔ اُن سے اگر خلافِ قانون کوئی حرکت سرزد ہو جائے گی تو اکہری سزا ملے گی اور تم اگر کسی کھلے ہوئے پاپ میں مبتلا ہو جاؤگی تو دوہری سزا دی جائے گی۔ اللہ اکبر یہ ہے اسلامی قانون کا انصاف کہ کمزور بیکس رعایا کو تو اکہری سزا اور بادشاہ اعظم کی بیبیوں کو دوہری سزا۔

تحلیلِ اجزاء يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا۔ امرائے قوم کا ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے کہ اپنے لئے قوم سے الگ کچھ خصوصی مراعات محفوظ کر لیتے ہیں۔ خصوصاً مالی حقوق میں اضافہ کا تو عادل سے عادل حکمران بھی طالب ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی خانگی زندگی نہایت آرام سے گزرے۔۔۔ بہترین غذا، فاخرہ لباس، ممتاز فرودگاہ اور سب سے اعلیٰ استعمال کا سامان اس کو حاصل ہے اس کی بیبیوں اور بچوں کو کل اسبابِ راحت بیسر ہوں۔ نوکر چاکر حشم خدم سب ہی موجود ہوں۔ یہ جذبہ ہر بادشاہ ہر امیر ہر حاکم اور ہر سردار میں ہوتا ہے خواہ ظالم ہو یا عادل مختارِ مطلق ہو یا قوم کا نمائندہ۔ جمہوری طاقت اُس کی پشت پر ہو یا استبداد کا دیو اُس کے سر پہ۔ گویا قانونی عدل اور عمومی انصاف کے خلاف ورزی ذاتی آرام کی حد تک ہر علمبردار انصاف کرتا ہے۔ گھریلو آسائش کو قربان کرنا اور خانگی مساوات کا عملی نمونہ بننا خود ساختہ آئین کے حامیوں کا کام نہیں۔ لیکن قرآنی تعلیم کی حالت اس سے بالکل جدا ہے وہ حکمران یا قومی پیشوا کو قوم کا خادم کہتا ہے۔ اس لئے خدمت کے جو لوازم ہیں اُن سے قوم کے سردار کو خالی دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ افرادِ قوم کو تو اس کی اجازت دیتا ہے کہ مالی فرقِ مراتب قائم رکھیں، طبقات میں امتیاز قائم رکھیں، آرام اور تکلیف تنگ حالی اور فراخدستی، مالداری اور ناداری کے تفاوت کے لحاظ سے گھریلو زندگیاں مختلف طور پر گزاریں۔ جس قدر ہاتھ فراخ ہو اتنا ہی خانگی آرام اُٹھائیں۔ بچوں اور بیبیوں کو بہترین حلال غذائیں کھلائیں۔ بہترین عمدہ لباس پہنائیں۔ اُن کی آسائش کے بیش از بیش جائز اسباب فراہم کریں لیکن قوم کے پیشوا کی حالت اس سے بالکل جدا ہونی چاہیئے۔ اُس کو اپنی جائز لذتوں سے بھی کنارہ کش ہونا ضروری ہے۔ اس کے ذاتی مال کا بیشتر حصہ قوم کے کام میں آنا چاہیئے اُس کی خانگی زندگی عسرت سے گزرنی لازم ہے۔ اُس کی بی بی اور بچوں کے لئے راحت وسعت اور لذت ناجائز ہے۔ اُس کی آنکھیں بیبیوں اور بچوں کے بدن پر فاخرہ لباس اور قیمتی زیور نہیں دیکھ سکتیں۔ اُس کے دسترخوان پر کسی بی بی کے گھر سے اعلیٰ کھانا نہیں آسکتا۔ اگر کوئی بی بی ان چیزوں کی خواستگار ہو اور دنیوی عیش و طرب کی طلبگار اور راحت و آرام کی جویاں ہو تو اُس کو سردار کی زوجیت سے علیٰحدہ ہو جانا چاہیئے۔ گویا سردار کی بیوی اس وقت رہ سکتی ہے جب فقر و فاقہ تنگ حالی اور جسمانی تکلیف پر صبر کر سکے۔ اسی تعلیم کو عام کرنے کے لئے آیات مذکورہ میں سید المسلمین حاملِ قرآن رسولِ برحق اور سب سے بڑے علمبردارِ عدل کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیبیوں سے صاف طور پر کہہ دیں کہ اگر دنیوی طرب و عیش اور وسعتِ مالی کی خواستگار ہو تو میں تم کو سب کچھ دے سکتا ہوں لیکن پھر میرے ساتھ تمہارا رہنا سہنا نہیں ہو سکتا میری زوجیت سے خارج ہونا پڑے گا۔ اور اگر صرف خدا اور اس کے رسول کی خواستگار ہو اور ثوابِ آخرت ہی پیشِ نظر ہے تو یقیناً تم میں سے جو نیکوکار ہیں اُن کو اللہ اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ مواہب لدنیہ میں مذکور ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت حضور کی نو بیبیاں تھیں۔ (۱) عائشہ بنت صدیق اکبرؓ (۲) حفصہ بنت فاروق اعظمؓ، (۳) اُم حبیبہ بنت ابوسفیان۔ (۴) ام سلمہ (۵) سودہ (۶) صفیہ بنت حیی بن اخطب خیبری (۷) میمونہ ہلالی (۸) زینب بنت جحش اسدی (۹) جویریہ بنت حارث مصطلقی۔

بات یہ ہوئی کہ حضورؐ کے پاس مقررہ مصارف کی جو سالانہ رقم یا جنس آتی تھی اُس کا کچھ حصہ تو حضورؐ سامانِ جنگ کی فراہمی کے لئے صرف کرتے تھے کچھ فقراء و مساکین کو عطا فرماتے تھے اور کچھ مساوی طور پر تمام اُمہات المؤمنین کو تقسیم کر دیا کرتے تھے لیکن وہ حصہ اتنا کافی نہیں ہوتا تھا کہ مصارف پورے ہو سکیں۔ کسی بیوی کے پاس فاخرہ لباس نہ تھا، اعلیٰ مکان نہ تھا، اچھی غذا میسر نہ تھی۔ یہاں تک کہ کئی کئی روز تک بعض گھروں میں آگ بھی نہ جلتی تھی صرف کھجوروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ یہ تنگ حالی تھی اور اس پر مزید یہ کہ بعض بیبیاں اپنے والدین کے گھر بہت آرام اُٹھا چکی تھیں، نازپروردہ تھیں، صفیہ یہودی نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں۔ عائشہ عرب کے تاجرِ اعظم کی صاحبزادی تھیں۔ ہمیشہ پیدل چلنے والے کو پیدل چلنے کی کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوتی لیکن شہسوار سے پیدل نہیں چلا جاتا۔ اعلیٰ خاندانوں اور امیر گھرانوں کی صاحبزادیاں اور اس تنگ حالی سے گزارہ بہت دشوار تھا لیکن کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ صحبتِ رسولؐ نے اُن کو بہت کچھ فقر و فاقہ کا عادی بنا دیا تھا لیکن بعض بیبیوں کو اپنے والدین کے گھروں سے کچھ سامان مل جاتا تھا جس سے ان کی زندگی کسی قدر کچھ آسانی سے گزر جاتی تھی اور حقیقتِ حال سے ناواقفیت کے سبب یہ بات دوسری بیبیوں کو ناگوار گزرتی تھی اس لئے ایک دفعہ بعض بیبیوں نے باہم

انفاق کر کے توسیع مصارف کی درخواست حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ شاہ مصر نے پاس اپنے گھر کے مصارف کے لئے کیا رکھا تھا تو سیع کرنا تو درکنار یہ درخواست ہی حضورؐ کو ناگوار گزری اور ایک مہینہ تک تمام بیبیوں سے کنارہ کشی رہنے کی قسم کھا لی۔ ایک مہینہ ختم ہوا تو آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔

تفسیر معالم و سراج میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے ایک مہینہ کے لئے سب بیبیوں سے ایلاء کر لیا یعنی قسم کھالی کہ اتنی مدت تک کسی سے تعلق نہیں رکھیں گے اور مسجد کے قریب ایک بالاخانہ کوٹھے پر جا کر یکسو ہو کر مقیم ہو گئے اور باہر آ کر صحابیوں کے جلسوں میں بھی شرکت کرنی چھوڑ دی۔ صحابیوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ بعض خائنوں نے مشہور کر دیا کہ حضورؐ نے امہات المومنین کو طلاق دیدی۔ تمام صحابہ کو اس کا صدمہ ہوا۔ بعض خالص مسلمان بھی دھوکے میں پڑ کر اس کا تذکرہ کرنے لگے۔ انہی دنوں میں یہ خبر بھی مشہور تھی کہ ملک شام کا غسانی بادشاہ قیصر روم کے اشارہ سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے سواروں کا ایک بڑا لشکر جمع کر رہا ہے۔ حضرت عمرؓ کی سکونت بالائی مدینہ میں تھی اور آپ کے پڑوس میں ایک انصاری رہتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ ایک روز صبح سے شام تک خدمت مبارک میں حاضر رہتے اور دن بھر کی نازل شدہ آیات اور فرمودہ احادیث شام کو جا کر اپنے پڑوسی انصاری کو سنا دیتے۔ دوسرے روز خود اپنے معاشی کاروبار میں مصروف رہتے اور انصاری دوست خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دن بھر کی آیات اور احادیث سن کر شام کو جا کر حضرت عمرؓ سے کہہ دیتے۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا حسب معمول ایک روز میرا ہمسایہ انصاری آیا لیکن گھبرا کر اس نے زور سے دروازہ بجایا اور کہا عمر ہیں؟ میں گھبرا کر باہر نکلا اس سے پوچھا کیا غسانی مسلمانوں پر حملہ کر آگیا؟ انصاری نے کہا نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم واقعہ رونما ہو گیا حضورؐ نے اپنی بیبیوں کو طلاق دیدی مجھے یہ سن کر سخت رنج ہوا میں نے کہا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو حفصہ بہت بدنصیب ہے۔ غرض صبح کو میں چل دیا میں نے حفصہ کو بیٹھے روتا دیکھا۔ پوچھا کیا تجھے رسول اللہؐ نے طلاق دیدی؟ حفصہ نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ میں نے کہا حضورؐ کہاں ہیں؟ حفصہ نے کہا اس بالاخانے پر۔ میں نے کہا تجھے اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہئے کہ تیرے ساتھ والی خوبصورت اور حضورؐ کی محبوبہ ہے (یعنی حضرت عائشہؓ) پھر میں نے ام سلمہؓ سے جا کر کہا، تم کو اس نعمت کی قدر نہیں کہ تم رسول اللہ کی بیبیاں ہو۔ واللہ اگر وہ تم کو طلاق دیدیں تو تم سے بہتر ازواج خدا تعالیٰ ان کو عطا کر دے گا۔ ام سلمہؓ کو یہ سن کر جوش آگیا "عمر! تم ہر بات میں دخل دیتے دیتے اب رسول اللہ کی بیبیوں کے معاملہ میں بھی دخل دینے لگے ہو۔" میں خاموش ہو گیا اور نکل کر مسجد میں آیا، وہاں ممبر کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تذکرہ کر رہے تھے اور بعض رو رہے تھے۔ میں نے کہا اس بات کی تحقیق کیا انکشاف میں تمہارے لئے کرتا ہوں (صبر کرو) میں وہاں سے کاشانہ نبوت پر آیا۔ حضورؐ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک شخص دربانی کر رہا تھا میں نے اس سے کہا میرے لئے جا کر حاضری کی اجازت طلب کرو۔ اس نے واپس آ کر کہا حضورؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنے میں ابوبکرؓ آئے مگر ان کو بھی حاضری کی اجازت نہیں ملی۔ میں واپس آ کر مسجد میں بیٹھ گیا لیکن رنج کے سبب صبر نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حاضر خدمت ہو کر اجازت کا خواستگار ہوا تو حضورؐ نے اجازت دیدی۔ اللہ ابوبکرؓ کو بھی اجازت مل گئی۔ میں نے دیکھا کہ حضورؐ کے اردگرد بیبیاں بیٹھی ہیں مگر سر جھکائے خاموش ہیں۔ میں نے چاہا کہ کوئی ایسی بات کروں جس سے خوش ہو کر حضورؐ ہنس دیں اس لئے میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا حضورؐ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فلاں کی بیٹی (یعنی میری بیوی) نے مجھ سے خرچ (زیادہ) مانگا تو میں نے اس کی گردن مروڑ دی۔ یہ سن کر حضورؐ کھلکھلا کر ہنس دیئے یہاں تک کہ اگلے دندان مبارک نمودار ہو گئے۔ پھر فرمایا یہ عورتیں بھی میرے پاس بیٹھی خرچ مانگ رہی ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ عائشہؓ کی طرف اور میں حفصہؓ کی طرف یہ کہتے ہوئے مارنے کے لئے بڑھے کہ تم حضورؐ سے ایسی چیز مانگتی ہو جو موجود نہیں ہے مگر حضورؐ نے دونوں کو منع کر دیا۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے حضورؐ کو خوش کرنے کے بعد موقع پایا تو عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا حضورؐ نے بیبیوں کو طلاق دیدی؟ فرمایا نہیں۔ میں نے خوشی سے تکبیر کہی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں مسجد میں گیا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ رسول پاکؐ نے امہات کو طلاق دیدی۔ اب کیا میں بالاخانے سے اتر کر لوگوں کو اطلاع دیدوں کہ ایسا نہیں ہوا ہے۔ فرمایا اچھا اگر تمہارا جی چاہے تو جاؤ۔ میں نے مسجد کے دروازہ سے ہی پکار کر بلند آواز سے کہا، حضورؐ نے (اپنی بیبیوں کو طلاق نہیں دی۔ اسی پر آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ نازل ہوئی ہم حضورؐ ۲۹ روز تک اسی بالاخانہ میں رہے۔ ۳۰ کی صبح کو اتر کر سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور اللہ نے جو آیت تخییر (یعنی مندرجہ بالا آیت جس میں بیبیوں کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے) نازل فرمائی تھی اس کو بیبیوں تک پہنچانا چاہا اور فرمایا میں تمہارے سامنے ایک بات رکھتا ہوں تم کو اس کے فیصلہ میں جلدی نہ کرنی چاہئے اپنے والدین سے مشورہ کر لو۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے میں نے عرض کیا۔ وہ کیا بات ہے؟ حضورؐ نے آیت یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ الخ تلاوت فرمائی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا حضورؐ کے بارے میں اپنے ماں باپ سے میں کوئی مشورہ لوں گی؟ مجھے مشورہ کی ضرورت نہیں

میں تو اللہ اس کے رسول اور دار آخرت کو پسند کرتی ہوں۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جو چیز میں نے پسند کی ہے اس کی اطلاع حضور کسی بی بی کو نہ کریں فرمایا مجھے سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو سکھانے اور سہولت پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مجھ سے جو کوئی پوچھے گی میں بتا دوں گا (اس کے بعد حضور نے سب بیبیوں کو آیت مذکورہ سنائی اور سب نے وہی بات پسند کی جو حضرت عائشہؓ نے اپنے لئے پسند کی تھی)

آیت مذکورہ میں حیاتِ دنیا سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا کو پا کر تم نجاتِ آخرت سے محروم ہو جاؤ گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم دنیوی زندگی کی چاہت رکھتی ہو تو تم کو میری زوجیت سے دستبردار ہونا پڑے گا اور میں تم کو آزاد کر دوں گا اور آخرت میں جو مراتب زوجیتِ رسول کے ساتھ مخصوص تھے ان سے تم محروم ہو جاؤ گی صرف مومن اور نیکوکار ہونے کا ثواب ملے گا اور دوسری مومن عورتوں سے بروزِ قیامت تمہارا کوئی ممتاز درجہ نہ ہوگا۔

فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ یعنی اگر تم کو سامانِ دنیا پسند ہے تو آؤ میں تم کو سامان دے کر اچھی طرح سے آزاد کر دوں۔ یہاں تمتع سے مراد لباس متعہ ہے جو مطلقہ کو دیا جاتا ہے اور اس کی مقدار نصف مہر سے زائد نہیں ہوتی۔ کما ہو مذکور فی کتب الفقہ۔

مبحث تخییر علماء نے اختلاف کیا ہے کہ اگر عورت کو طلاق کا اختیار دیا جائے اور وہ طلاق کو اختیار کرے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اکثر فقہاء وجب کے قائل ہیں۔ تفویضِ طلاق کی صورت میں اگر بیوی طلاق کو اختیار کرے تو طلاق ہو جاتی ہے اور شوہر کو پسند کرے تو طلاق نہیں ہوتی لیکن آیت میں اپنی مرضی کا اظہار فرمایا ہے جس میں شوہر نے طلاق کا اختیار دیا ہے اس صراحت سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے جو اپنی بیویوں کو اختیار دیا تھا وہ طلاق کا اختیار نہیں دیا تھا کیونکہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا تم جلدی نہ کرنا اپنے والدین سے پہلے مشورہ کر لینا۔ گویا اسی وقت جواب دینے کی ممانعت فرما دی تھی لہٰذا یہ تخییر طلاق نہ تھی بلکہ ان کی مرضی دریافت کی تھی اور مرضی کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اور چونکہ رسولِ اکرمؐ کا وعدہ تھا اس لئے یقیناً حضورؐ وعدہ کو وفا کرتے۔ اگرچہ ہمارے لئے اس قسم کے وعدہ کا ایفا واجب نہیں۔ خطیب نے لکھا ہے کہ حسن قتادہ اور اکثر علماءِ سلف کا یہی قول ہے۔

اب رہی یہ تنقیح کہ تفویض کی صورت میں اگر عورت شوہر کو اختیار نہ کرے اور اپنے نفس کو اختیار کرلے تو طلاق رجعیہ ہوتی ہے یا بائنہ؟ حضرت ابن عمر، ابن مسعود، ابن عباس، عمر بن عبدالعزیز اور مسروق کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طلاق ہوگی یعنی رجعیہ۔ ابن ابی لیلیٰ، سفیان اور شافعی بھی طلاق رجعیہ کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طلاق بائنہ ہوگی کیونکہ تخییر یا تفویض کے الفاظ صریح طلاق تو یقیناً نہیں بلکہ کنایہ ہیں اور کنایات سے بالاتفاق بائنہ طلاق ہوتی ہے۔ رجعت صرف صریح لفظِ طلاق کے ساتھ لازم ہے۔

وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ الخ۔ یعنی جو بیبیاں رسولؐ کی جدائی اور اسبابِ دنیا کو پسند نہیں کرتیں بلکہ خدا اور رسول اور اجرِ قیامت کو پسند کرتی ہیں ان کو خدا تعالیٰ ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا مگر ان میں بھی درجات متفاوت ہوں گے کیونکہ صرف زوجیتِ رسولؐ کو اختیار کر لینا ہی تکمیلِ درجات کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ عملِ صالح بھی لازم ہے اور اعمال کے درجات میں تفاوت ہے۔ تمام نیکیاں ایک ہی درجہ کی نہیں ہوتیں۔ پس جو عورتیں کامل نیکوکار رہیں ان کو ایسا عظیم الشان اجر ملے گا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں۔ رہیں دوسری کم درجہ کی عورتیں تو وہ زوجیتِ رسول کے اجر سے محروم نہ رہیں گی۔ میرے نزدیک لفظ مُحْسِنَات کو معرف باللام اور لفظ اجر کو نکرہ لانے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا محسنات سے مراد ہیں کامل نیکوکار اور اجر سے مراد ہے ایسا اجر جس سے کوئی بھی واقف نہیں یعنی کسی کے گمان میں بھی نہیں۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ الخ۔ جس کی عزت اور بزرگی زائد ہوتی ہے اس کے لئے قیود بھی سخت ہوتے ہیں۔ ہم شروع آیت کی تحلیل میں لکھ آئے ہیں کہ ازواجِ مطہرات کو اچھا کھانا اور اچھا پہننا بھی میسر نہ تھا اور بعض نے باقتضائے بشریت اس کی خواہش کی تھی تو چونکہ کاشانۂ رسول میں زینتِ دنیا کی گنجائش نہ تھی اس لئے صاف حکم دے دیا گیا کہ دنیا کی خواستگار ہو تو زوجیتِ رسول سے کنارہ کشی کرو اور حسبِ خاطر سامان لے کر نبوت خانہ سے چلی جاؤ ورنہ یہاں تو یہی افلاس اور ناداری ہوگی اور فقر و فاقہ سے روزانہ دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اس سے بھی زیادہ دھمکی دی گئی اور آیتِ مذکورہ میں صاف صراحت کر دی گئی کہ تم کو جرم کی سزا دوہری ملے گی۔ گویا ایک تو دوسری عورتوں کو اچھا کھانے اچھا پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کی اجازت کے باوجود تم کو ان تمام باتوں کو چھوڑنا پڑے گا اور دوسرے قانون کی حکومت بھی تم پر سخت ہوگی۔ ہر عورت کو جرم کی سزا اکہری اور تم کو دوہری ملے گی۔ بالفرض اگر تم سے کوئی برا کام سرزد ہوگا تو دوگنی سزا پاؤ گی۔

فاحشہ مبینہ سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد زنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض تم سے زنا کا صدور ہو جائے تو دوہری سزا پاؤ گی۔ اگرچہ امہات المومنین سے زنا کا صدور نہیں ہو سکتا تھا بلکہ بقول ابن عباس کسی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نوح اور لوط کی بیویاں بھی باوجود کافر ہونے کے زانیہ نہ تھیں مگر حکم مذکور فرض کی بنا پر ہے اور سخت تہدید مقصود ہے جس طرح حضور اقدس کو خطاب کر کے دوسری آیت میں کہا ہے لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ۔ یعنی اگر بالفرض آپ سے شرک ہو جائے تو سارا کیا کرایا ملیامیٹ ہو جائے گا۔ نبی سے شرک کا صدور محال ہے لیکن حکم ذکر فرض کی بنا پر ہے اور اس سے غرض شرک کی سخت مذمت کرنی ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات سے اگرچہ زنا کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا تعالیٰ اپنے نبی کی عزت کا محافظ تھا مگر حکم فرض پر مبنی ہے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ فاحشہ مبینہ سے مراد ہے سرتابی سرکشی نافرمانی شوہر کی مخالفت حقوق زوجیت کا ادا نہ کرنا وغیرہ۔ زنا مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اہل لغت نے صراحت کی ہے کہ جب عربی میں الفاحشۃ یعنی الف لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو زنا یا لواطت مراد ہوتی ہے۔ اور اگر فاحشہ بغیر الف لام کے استعمال ہو تو باقی گناہ مراد ہوتے ہیں۔ اور اگر فاحشہ کے لفظ کے ساتھ کوئی صفت آ جائے تو جیسی صفت ہوگی ویسا ہی مطلب ہوگا۔ چنانچہ اس جگہ فاحشہ بغیر الف لام کے استعمال کیا گیا ہے اور صفت بھی مذکور ہے تو اس سے مراد ہوگی۔ شوہر کی نافرمانی بدخلقی وغیرہ۔ اس صراحت کے مواقف کوئی اعتراض ہی نہیں ہوتا۔

مقصود بیان دنیا اور آسائشِ دنیا کو مطمحِ نظر بنانے کی ضمنی ممانعت در پردہ اس بات کا اظہار کہ قوم کا پیشوا اور حاکم اعلیٰ ہونا آسان کام نہیں پیشوائی بقدرِ ایثار ملتی ہے۔ جس کی جتنی قربانیاں زائد ہوں گی اُتنا ہی وہ پیشوائی کا مستحق ہوگا اور جس امام میں قربانی کا جذبہ نہیں وہ امامت کا اہل نہیں۔ امام قوم کے لئے لازم ہے کہ اُن جائز فوائد سے دست کش ہو جائے جو افرادِ قوم کے لئے جائز ہوں، اچھا کھانا اچھا پہننا اور عیش و آرام سے تمتع اندوز ہونا سب کے لئے جائز ہے مگر قوم مسلمین کے سردار کے لئے جائز نہیں، جانشین رسول کے لئے زیبا نہیں۔ رسولِ پاکؐ کی بیبیاں ان نعمتوں سے دست کش تھیں اور اُن کو ان کی طلب کی اجازت بھی نہ تھی۔ خود حضورؐ کا تو ذکر ہی کیا ہے پیشوائی کی عزت اور عیش و طرب کا اجتماع ناممکن ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مسلمان بادشاہوں، نوابوں، حاکموں، عالموں، لیڈروں اور پیشواؤں پر حسبِ مرتبہ جفاکشی لازم ہے۔ ان کی خانگی زندگیاں اور ذاتی معاملات قوم کے لئے نمونۂ عمل ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ خلفائے راشدین نے مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد وہ تمام راحتیں ترک کر دیں جو خلافت کے حصول سے پہلے ان کو میسر تھیں۔ بس اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے اس زمانہ کے حکمرانوں، مولویوں، واعظوں، لیڈروں اور پیشواؤں کو جن کی امامت کا مغز صرف ذاتی اور خانگی عیش و طرب ہے اور وہ ماتحتوں کے حقوق چھین کر اپنے لئے آرام کا بیش از بیش سامان فراہم کرنے کی کوشش ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امہات المومنین کی زندگیاں نہایت عسرت سے گزرتی تھیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے محبتِ رسول پر سب کچھ قربان کر رکھا تھا کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس سے ظاہر ہو سکے کہ امہات المومنین نے زوجیتِ رسول سے کنارہ کش ہونے کو پسند کیا ہو۔ پس اس سے بعض اس گمراہ فرقہ کو عبرت ہونی چاہیے جو بعض امہات المومنین پر طعن کرتا ہے وغیرہ۔

(اکیسواں پارہ ختم ہوا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَيَانُ السُّبْحَانِ

کا

پارہ نمبر ۲۲

وَمَنْ يَّقْنُتْ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

عطاء الرحمٰن صدّیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی)

قیمت :- =/۶ روپے

بائیسواں ۲۲ پارہ جزو اوّل

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا

اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی ہم اس کو دوہرا اجر

مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ○

دیں گے اور اس کے لئے عزت کی روزی ہم نے تیار کر رکھی ہے

تفسیر اس آیت کا ربط گزشتہ آیات سے ہے۔ اس لئے کسی جدید تفسیری مقالہ کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ آیات میں صراحت کے ساتھ تہدید فرمائی تھی کہ سرکشی اور نافرمانی کرنے پر تم کو دوگونہ عذاب دیا جائے گا۔ جس کے معنی بقول مقاتل یہ ہیں کہ آخرت میں دو چند سزا دی جائے گی اور بقول ابن جبیر دوہری حد دنیا میں سزا دی جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ جس کو قانون کی پابندی کرنے پر اس قدر مجبور کیا جائے کہ بصورت خلاف ورزی دوہری سزا دی جائے تو بصورت پابندی جزا بھی دوگنی ہونی چاہیئے، اس لئے آیاتِ مذکورہ میں فرمایا کہ امہات المومنین میں سے جو عورت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی یعنی حکم الٰہی کے مطابق فرائض زوجیت ادا کرے گی اور رسول ؐ کی فرماں بردار رہے گی۔ کاشانۂ رسول میں رہکر تمام مصائب پر صبر کرے گی اور فقط یہی نہیں بلکہ نیک کام بھی کرتی رہے گی۔ نماز روزہ اور دیگر فرائض کو ادا کرے گی اور اندرونی و بیرونی گناہوں سے کنارہ کش رہکر اخلاقی اور معاشرتی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرے گی تو اس کو دوگونہ اجر ملے گا۔ دنیا میں بھی وہ تمام عورتوں کی پیشوا سردار رہے گی۔ سب کی نظر میں تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ مکرم و معظم ہوگی اور آخرت میں بھی اس کو عزت، حرمت اور وسعت کے ساتھ روزی ملے گی۔ اخروی رزق کی تو کیفیت مجہول ہے۔ دنیوی رزق کی کیفیت کتب سیر و تواریخ پڑھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ حضور ؐ کی وفات کے بعد امہات المومنین کیلئے رزق کی وسعت غیر معمولی طور پر ہو گئی تھی۔ اتنی فراخی ہوئی کہ بعض بیبیاں ہزاروں روپیہ بعض سائلوں کو عطا فرماتی تھیں۔ اگرچہ وہ خود اس وسعتِ رزق سے بے نیاز ہو گئی تھیں اور شام کے کھانے کو بھی بعض وقت کچھ باقی نہ رکھتی تھیں، لیکن خلافت کی طرف سے نقد و جنس اُن کے لئے مقرر تھا وہ بہت کافی تھا اور پھر اُمراء و سلاطین کے ہدایا تحائف اس پر مزید تھے۔

ایک سوال:۔ سیرت پاک پر اعتراض کرنے والے غیر مسلم اس جگہ خصوصیت کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں۔ اُن کے اعتراض کی دو شقیں ہیں:۔

(۱) رسول کریم ؐ کی نو بیبیاں تھیں اور عام مسلمانوں کے لئے چار۔

(۲) باوجود کثرتِ ازدواج کے کسی کو کھانے پینے کو نہ دیتے تھے اور سب کو تنگ رکھتے تھے اور کوئی مانگتی تھی تو سخت ڈانٹ بتاتے تھے۔

غرض کثرتِ ازدواج اور پھر ازدواج کا فقر و فاقہ اعتراض کرنے والوں کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ اول شق سے ان کی نظر میں شہوت پرستی کا اظہار ہوتا ہے اور دوم شق سے معاشرتی ظلم۔

جواب یہ دونوں اعتراض لغو ہیں۔ نمبر دوئم کی بنا محض کج فہمی یا عناد پر ہے کیونکہ دنیا میں ایسا کون آدمی ہے جو اپنے عیال و اطفال کو بغیر کسی سخت کدورت کے ہمیشہ کیلئے تنگ حال دیکھنا پسند کرتا ہو۔ اُس کو کافی دولت میسر ہو، مرفہ الحال ہو، جتنا چاہے صرف کر سکتا ہو، اُس کے اشارۂ ابرو پر مال کے انبار جمع ہو سکتے ہوں جگہ وہ اچھے خاصے ملک کا خود مختار بادشاہ بھی ہو، لیکن اس کے باوجود وہ ملک کی دولت دوسروں کو تقسیم کر دے خود کچھ نہ لے اور ایسی تو اسی کہ تنگ حالی کے ساتھ گزارہ کر سکے۔ نہ خود پیٹ بھر کر کھائے نہ بیوی بچوں کو کھلائے نہ خود عمدہ لباس پہنے اور نہ اپنے متعلقین کو پہنائے نہ خود اپنے لئے شاندار محلات بنائے نہ اپنے گھر والوں کے لئے۔ ذاتی اور نسبتی دونوں قسموں کی راحت .... سے خود باختیار خود دست کش ہو۔ مقام انصاف ہے کہ رسول پاک ؐ کی حیثیت مخالفوں کی نظر میں پیغمبر کی نہ سہی اتنی بات کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضور والا جزیرۃ العرب کے بیشتر حصے کے خود مختار حکمران تھے۔ آپ کے اشارہ پر لاکھوں انسان قربانیاں کرنے

کو تیار تھے۔ اگر چاہتے تو ملک کا سرمایہ اپنے تصرف میں لا سکتے تھے۔ اگر یہ بھی نہ کرتے تو مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اتنا کافی تھا کہ آرام کے ساتھ اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگیاں گزار سکتے تھے۔ بیبیاں تو کیا سو بیبیوں کو بھی زر و جواہر اور دیبا و حریر سے آراستہ کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہ کیا۔ خود ملک سے ایک پیسہ لیا نہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اپنے تصرف میں لائے۔ ہتھیار گھوڑے اور دوسرے ضروریاتِ جنگ کو مالِ خُمس سے خریدا۔ اصحابِ صفہ (جن کی تعداد کم سے کم ستر اور زیادہ سے زیادہ تین سو ہوتی تھی اور جن کی پوری ذمہ داری حضورؐ ہی کی ذات پر تھی) کے کھلانے پلانے میں صرف کیا اور دوسرے مساکین کو عند الحاجۃ عطا فرمایا اور آخر میں کچھ حصہ اپنے اور .... اپنے متعلقین کے صرف میں بھی لائے۔ کیا ایسے شخص کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو کسی ذاتی غرض کے تحت تنگ حال رکھتا ہو۔ اگر خود کھا لیتے اور متعلقین کو بھوکا رکھتے، خود پہن لیتے اور گھر والوں کو برہنہ رکھتے، خود آرام اٹھاتے اور ازواج کو تکلیف دیتے یا کوئی چیز میسر نہ آتی اور اس وجہ سے بیویاں تنگ حال رہتیں تو شاید اعتراض کی کوئی گنجائش نکل سکتی، لیکن واقعہ تو اس کی تائید نہیں کرتا۔ فی الحقیقت تنگ حال رہنے اور تنگ حال رکھنے کی بنا محض ایثار، جفاکشی اور قربانی پر تھی۔ حضورؐ اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگیوں کو اُمتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنانا چاہتے تھے اور قوم کے پیشواؤں کو درس دینا مقصود تھا کہ سربراہِ قوم کو پہلے اپنی زندگی سُدھارنا اور ایثار کے جوہر کو بروئے عمل لانا چاہیے اور صرف قول سے نہیں بلکہ عمل سے بھی دوسروں کو نصیحت کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ بیویوں کو بھی یہ تعلیم دینی غرض تھی کہ امامِ وقت اور سردارِ قوم کی بیوی بننے کا شوق ہے تو عیش و راحت کی گندگیوں سے اپنے دلوں کو پاک و صاف رکھو۔ امتیازی درجہ بغیر امتیازی قربانی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اچھا کھانے پہننے اور فراخ دستی سے صرف کرنے کی خواہش تو ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے، لیکن تمہاری حالت اس سے جدا ہونی چاہیے۔ تمہارے پیشِ نظر صرف اُمت کی بیویوں کی اصلاح و فلاح ہونی لازم ہے۔ اگر تمہارے ذاتی جذبات بھی ویسے ہی ہوں گے جیسے دوسروں کے ہیں اور تم بھی پرستارانِ اکل و شرب رہو گی تو تم میں اور دوسری عورتوں میں کیا فرق رہے گا اور تم کو قوم کی بیویوں کی سردار بننے کا حق نہ ہوگا۔ غور کرو کہ اگر کوئی خود مختار بادشاہ یا کم سے کم کسی اسٹیٹ کا راجہ یا نواب پھوس کے جھونپڑے میں رہنے لگے جس کی دیواریں کچی اور نیچی ہوں اور جس کی چھت مٹی اور کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی ہو اور اسی میں اپنے اہل و عیال کو بھی رکھے اور سوائے چٹائی یا بوریا کے گھر کے اندر کوئی فرش بھی نہ ہو اور اس کا بستر زائد سے زائد کمبل کا ہو اور سر کے نیچے رکھنے کو کھجور کے پوست سے بھرا ہوا چمڑے کا سخت تکیہ ہو اور اس کے پاس پہننے اوڑھنے کو ایک تہبند اور ایک پیراہن کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو اور یہی حالت اس کے اہل و عیال کی ہو اور ملک کے کل محاصل وہ رعایا پر صرف کرے تو کیا ایسے بادشاہ کی مذکورہ زندگی کا کوئی پہلو قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے، کیا کوئی خوردہ گیر خوردہ گیری کر سکتا ہے۔ کیا ایسی زندگی گزارنی، ایثار قربانی اور احترامِ نفس کا اعلیٰ مظاہرہ نہیں ہے۔ جب معمولی بادشاہ اور اس کی بیگمات کے لئے مذکورہ بالا طرزِ زندگی قابلِ ستائش اور نمونۂ تقلید ہے تو پھر رسولِ پاکؐ جو ہر اصلاح کے علمبردار اور اخلاقی معاشرتی اور روحانی زندگیوں کو سُدھارنے اور سنوارنے والے اور ساری اُمت کی ناؤ کو کھینے والے تھے جن کی زندگی کا ہر پہلو قیامت تک ہر مسلمان کے لئے نمونۂ عمل تھا اور جن کی بیویوں کا طرزِ عمل اور پوری رفتارِ حیات اُمتِ اسلامیہ کی کل عورتوں کے لئے شاہراہِ عمل بنانے والی تھی اُن پر کورانہ اعتراض کرنا نابینائی عقل کی علامت نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا امرِ اول یعنی شہوت پرستی کا الزام تو تعددِ ازواج کے دو رُخ ہیں۔ ایک عام اُمت کے لئے دوسرا خاص رسولِ پاکؐ کے لئے۔ عام مسلمانوں کے لئے تعددِ ازواج کی اجازت کے وجوہ بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ معترضین جو خواہ مخواہ کوشش کر کے حضورِ والاؐ پر شہوت پرستی کا الزام لگاتے ہیں یہ اُن کی کم دانستی ہے۔ سوچو اور ٹھنڈے دل سے بغیر تعصب کی حرارت کے سوچو کہ پچیس ۲۵ سال کی عمر تک جو عین جوش کا زمانہ ہے چال چلن کی خرابی کوئی متعصب غیر مسلم بھی نہیں پکڑ سکا۔ پھر پچیس ۲۵ سال کی عمر میں نکاح کیا جاتا ہے تو چالیس سالہ ادھیڑ عمر کی عورت یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے، مدت تک وہی نیک بی بی دو دو چار چار روز کا کھانا پہنچا دیتی ہیں اور اُنہی پر قناعت ہے نہ کسی طرف نظر اُٹھتی ہے نہ دوسرے نکاح کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عقل کے اندھے یہ کہیں کہ اُن کی دولت کی وجہ سے [illegible] نکاح کیا تھا تو پھر اُن کے انتقال کے بعد ایک سیاہ فام عمر رسیدہ عورت (حضرت سودہؓ) سے نکاح کیا جاتا ہے اور باون برس کی عمر تک دوسرے نکاح کا وہم بھی نہیں آتا۔ کیوں؟ کیا جوانی نہیں آئی اور نہیں گزری۔ کیا حُسن و جمال میں کچھ کمی تھی، کیا کوئی اپنی بیٹی دینے پر رضامند نہ تھا، کیا خاندان اور شرافت میں کوئی کمی تھی۔ قریش نے تو بہت کچھ لالچ دیا۔ سردارانِ مکہ اپنی بیٹیاں دینے پر تیار تھے۔ البتہ ہجرت سے کچھ پہلے صدیق اکبرؓ نے اپنی استدعا سے اپنی چھوٹی بچی (حضرت عائشہؓ) کا نکاح حضورؐ سے کر دیا تھا۔ مگر رخصت نہ ہوئی تھی نہ بچی کی عمر رخصت کے قابل تھی)۔ غرض باون برس کی عمر یوں ہی گزاری جاتی ہے۔ ہاں ہجرت کے بعد متعدد نکاح کئے جاتے ہیں اور مختلف قبائل و اقوام میں کئے جاتے ہیں۔ مدینہ پہنچ کر طرزِ زندگی بدلنے کی وجہ کیا تھی؟ شہوت رانی کا تو زمانہ نہیں، جوانی کی قوتوں میں جوش نہیں، شباب کی اُمنگیں نہیں، معلوم ہوتا ہے کوئی دوسری وجہ تھی جو مکہ کی زندگی میں موجود نہ تھی مدینہ پہنچ کر پیدا ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ مکہ کی زندگی میں......

تو عورتوں میں تبلیغ اسلام کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مکہ کے مرد ہی ایمان نہیں لائے تھے تو عورتوں کا کیا ذکر ہے۔ صرف انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل چند افراد ایمان لائے تھے تو اُن کا بھی بیشتر حصہ کافروں کے ہاتھوں تنگ اور ایذا کا نشانہ بن رہا تھا۔ جب مدینہ پہنچے اور جوق در جوق لوگ مسلمان ہوئے اور اطراف ملک سے مختلف قبائل مسلمان ہونے کو آئے تو عمومی تبلیغ کی ضرورت پڑی۔ مردوں میں تو باہر چبوترہ پر دو تین سو آدمیوں کی سکونت ہر وقت اسی غرض سے رہتی تھی کہ خود مسائل دین سیکھ کر اطراف ملک میں جا کر تبلیغ دین کریں مگر عورتیں اس فیض سے محروم تھیں۔ اجنبی عورتیں اور وہ بھی مختلف قبائل کی نہ تو خود نسوانی شرم کے مسائل براہ راست حضورؐ سے پوچھ سکتی تھیں نہ حضورؐ اُن کو کھول کر بتا سکتے تھے۔ پھر شاگردوں کا خلوت و جلوت میں ہر وقت سامنے رہنا ضروری ہے تاکہ ہر فعل اور قول سے تعلیم حاصل کر سکیں۔ زندگیاں سدھارنے کے لئے خواب و بیداری نشست و برخاست بلکہ ہر حرکت و سکون اور گفتار و رفتار کے سیکھنے کی ضرورت ہے اور اجنبی عورتیں ہر وقت ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں۔ ان کی ہر وقت معیت مشتبہات پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مردوں کی جماعت تو تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں اپنی روزی کا بندوبست کسی حد تک کر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو لکڑیاں کاٹ کر ہی جنگل سے لاکر بازار میں فروخت کر سکتی تھی۔ کسی کے کھیت یا باغ کو دو چار گھنٹے پانی دے کر ایک وقت کی روٹی فراہم کر سکتی تھی لیکن یہ ضعیف الخلقت نازک بدن عورتوں کو ایسے ذرائع کس طرح مہیا ہو سکتے تھے اور کیونکر وہ اپنی روزی کا خود بندوبست کر سکتی تھیں اور اگر وہ شوہر والیاں ہوتیں تو اوّلا توان کے شوہر ہمہ وقت حاضری کی اجازت نہیں دے سکتے تھے دوسرے تربیت اولاد، حالت حمل اور امور خانہ داری کی تکمیل اتنی حاضر باشی کی رخصت نہیں دے سکتی تھی۔ اسلئے مختلف قبائل میں سے مختلف عورتوں کے ساتھ نکاح کیا گیا تاکہ پراگندہ قبائل کی عورتیں اپنے قبیلہ والی بی بی کے ذریعہ سے مسائل خاص دریافت کر سکیں اور عمومی تبلیغ میں کوئی حرج نہ واقع ہو۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ والا کے ساتھ سلسلۂ زوجیت کو قائم کرنے کے لئے لفظ نکاح کی بھی ضرورت نہ تھی بلکہ لفظ ہبہ یا اسی قسم کا کوئی دوسرا لفظ رشتۂ زوجیت کے قیام کے لئے کافی تھا اور نہ حضورؐ پر عورتوں کی باری مقرر کرنا لازم تھا۔ کیونکہ مقصود اصلی ازدواجی تعلقات نہ تھی بلکہ عمومی تبلیغ اور تعلیم اسلامی کی اشاعت کے لئے یہ مصلحت ایک حیلہ تھا۔ اگرچہ حضور گرامیؐ حقوق ازدواجی ادا کرنے میں مساوات کا لحاظ رکھتے تھے مگر حضور کی خود برداشتہ مراعات تھی وجوب نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ازواج نبی تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو یعنی تمہاری ازدواجی غرض دوسری ہے اور باقی عورتوں کی دوسری۔ تم اسلامی تعلیم حاصل کرنے اور دوسری عورتوں کو دین کے مسائل سکھانے کے لئے رشتۂ زوجیت میں آئی ہو۔ تمہارے پیش نظر دینی تعلیم و تعلیم ہے، دنیوی زینت و تجمل نہیں ہے۔ پس اللہ اور رسول کی اطاعت ہر بات میں تم پر لازم ہے۔ مقام غور ہے کہ اس سخت حکم کے بعد بھی کسی بی بی نے رشتۂ زوجیت کو منقطع کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ دُکھ اُٹھائے کھانے پینے اور پہننے کی تنگی برداشت کی، مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائیں اور باقتضائے بشریت ایک مرتبہ ایسا ہوا تو سخت وعید کے ساتھ نبی کے ساتھ رہنے یا رشتۂ زوجیت منقطع کر لینے کا اختیار دے دیا گیا۔ اب کون عقل کا اندھا کہہ سکتا ہے کہ حضور والا نے ازواج کی کثرت شہوت رانی کے لئے کی تھی اور نبوت خانہ کی معاشی تنگی ازواج کی حق تلفی تھی یا کچھ میسر نہ آنے کی وجہ سے بیبیوں کو اتنا تنگ حال رکھا جاتا تھا بلکہ ان مصائب کو دیکھتے ہوئے بھی کسی ایسی عورت نے سلک زوجیت میں منسلک ہونے کو ناپسند نہیں کیا۔ جس کو حضورؐ نے پیام نکاح دیا ہو بلکہ بعض عورتوں نے تو خود بخود اپنے نفس کا اختیار بغیر نکاح اور بغیر مہر کے ہمیشہ کے لئے حضور کو دے دیا صرف ایک عورت ایسی کہی جا سکتی ہے جس نے حضورؐ کی ہم بستری کو دوسری بیبیوں کی تکالیف دیکھ کر ناپسند کیا تھا اور حضورؐ نے اس کو مکان سے الگ کھجوروں کے باغ میں ٹھہرایا تھا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ

اے نبی کی بیبیو! تم معمولی عورتوں میں سے کسی کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگار ہو تو (اجنبی مرد سے) بولنے میں نزاکت مت کرو نہ وہ جس

الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ

جس شخص کے دل میں مرض ہے وہ (کچھ اور) آرزو کرنے لگے گا اور معقول بات کہو اور اپنے گھروں میں رہا کرو اور اگلے زمانہ کی طرح

تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَ

سنگھار بنا کر دکھاتی نہ پھرو اور نماز ٹھیک ٹھیک پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی

وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿۳۳﴾

اطاعت کرو اے اہلِ بیت اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تم کو بالکل پاک صاف بنا دے

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿۳۴﴾

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور دانائی کی باتیں جو تلاوت کی جاتی ہیں اُن کو یاد کیا کرو۔ بے شک اللہ باریک بین باخبر ہے

تفسیر دنیا میں فضیلت و شرافت کا معیار مختلف چیزوں کو قرار دیا گیا ہے۔ (۱) جسمانی قوت جس کے اعضا تندرست ہیں، اعصاب اور عضلات مضبوط ہیں، ہڈیاں سخت ہیں، جوڑ بند کسے ہوئے ہیں، بدن میں چستی ہے، بازوؤں میں طاقت ہے، دل کی حرکت ہموار ہے، تنفس میں یکسانی ہے، ہاضمہ اور بصارت تیز ہے، کرمیں جان ہے، وہ ضعیف الجثہ نحیف، الاغر، سست قدم بدہضم خمیدہ پشت، اکہرے گراں گوش، ڈھیلے کمزور انسان سے افضل اور برتر مانا جاتا ہے۔ (۲) حسن صورت متناسب الاعضاء، متوازن القویٰ، جاذب قلب با مرہ نواز شکل رکھنے والا آدمی اس شخص سے بہتر مانا جاتا ہے جس کے اعضاء بے ڈول، صورت بدوضع اور شکل نفرت انگیز ہو، جس کو دیکھنے سے کراہت اور استفراغ پیدا ہوتا ہو۔ (۳) حسن صوت جس شخص کی آواز گلو سوز اور دل نشین ہو، جو رگ رگ کو تڑپا دے، اور گنگنے رونگٹے کو بیدار کر دے اس کو اس شخص پر برتری حاصل ہوتی ہے جو کریہ الصوت خنجرہ شگاف ناہموار آہنگ ہو۔ (۴) رنگ جس شخص کا رنگ گورا شاندار سرخ اور چمکیلا ہو وہ سیاہ فام کم رو میلے رنگ والے سے برگزیدہ ہوتا ہے۔ (۵) دولت۔ مالدار باوجاہت آدمی مفلس نادار آدمی سے زیادہ عزت والا سمجھا جاتا ہے اور دنیا کے تمام طبقات میں یہ تفاوت اسی نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ نادار فقیر کو نقاد ذلیل انسان ہی نہیں بلکہ آدمی کا بھی خیال کیا جاتا اور ہر سوسائٹی، ہر جلسہ، ہر انجمن میں دولت کی پوجا کی جاتی ہے۔ (۶) نسب۔ تمام ایشیا، افریقہ بلکہ مغربی ممالک میں بھی نسبی تفاوت کا آنا چرچا اور اعتبار ہے کہ بجائے شناخت اور تعارف کی غرض کے قبیلہ بندی کو معیار شرافت قرار دے دیا گیا ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے معاملات میں تو اس فرق مراتب کا اتنا دخل ہے کہ گویا معاشرت، مدنیت، اخلاق، تہذیب اور کلچر کی بنا ہی اس تفاوت پر قائم کر لی گئی ہے۔ (۷) نسبتی امتیاز انسانی ان نسبی امتیازات کی ساری دنیا میں تسلیم ہیں۔ معزز حاکم کے پاس بیٹھنے والا، بادشاہ کا مقرب، اونچی سوسائٹی کا ممبر، بڑے آدمی کی بیوی اور باوجاہت شخص کا دوست ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

لیکن اسلام نے ان تمام امتیازات کو بالکل ناقابلِ اعتبار تو نہیں قرار دیا مگر ان کو معیارِ شرافت و فضیلت بھی نہیں قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک معیارِ فضیلت کوئی دوسری چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دولت، قوت، رنگ، صورت، آواز، نسب اور نسبت سے اسلام کے بعض احکام میں فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً نماز کی امامت کا مستحق وہ ہوتا ہے جو خوش رو، محفوظ النسب، خوش گلو اور باوجاہت ہو۔ لیکن یہ چیزیں معیارِ فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار ایک اور ہی چیز پر ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دراصل برگزیدگی کی کسوٹی تقویٰ اور طہارتِ نفس ہے۔ یہی وہ اعلیٰ جوہر ہے کہ جس شخص کے پاس ہو اس کو برتری اور فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو اس سے بے بہرہ ہو وہ ذلیل اور پست ہوتا ہے۔ فضیلت اولیٰ اسی جوہر کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری چیزیں ثانوی ثالثی اور ذیلی درجہ رکھتی ہیں۔ اگر کوئی شخص تقویٰ اور طہارتِ روحانی کا حامل ہو تو پھر دوسرے فضائل اس کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام دیتے ہیں ورنہ ہر سفید چیز کو چاندی خیال کرنا بے سود ہے۔ قریشی النسب ہونا، رسولِ پاکؐ کی بیوی ہونا، حسین و جمیل ہونا سب ہی فضائل ہیں۔ مگر امتیازِ کامل صرف تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے شک رسول اللہؐ کی (اولاد اور ازواج) بہت افضل ہیں۔ لیکن اسی وقت جبکہ اُن کے اندر تقویٰ ہو ورنہ صرف نسب اور نسبت فضیلتِ تام پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ آیاتِ مذکورہ پکار کر کہہ رہی ہیں کہ امہات المؤمنین معمولی درجہ کی عورتیں نہیں، تمام مسلمانوں کی عورتوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے۔ کوئی مومن عورت اُن کی ہمسری نہیں کر سکتی، مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ اُن کے اندر تقویٰ ہو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرتی ہوں، باقاعدہ نماز پڑھتی ہوں، بشرطِ استطاعت زکوٰۃ دیتی ہوں، اللہ کے احکام اور رسولِ پاکؐ کے فرمودات کو یاد رکھتی ہوں۔ حیا، شرم، عزت اور پاکدامنی کے تمام لوازم ان کے اندر موجود ہوں۔ یہاں تک کہ کسی غیر مرد سے چبا چبا کر باتیں بھی نہ کریں، جو بات کریں صاف کریں، دورِ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر بناؤ سنگھار کرنے سے پرہیز کریں، اور اپنے گھروں کے اندر عزت و احترام کے ساتھ رہیں، غرض طہارتِ روحانی و جسمانی کی پوری شرائط و لوازم کے ساتھ مکمل طور پر پابند ہوں۔ مقامِ غور ہے کہ جب امہات المؤمنین ازواجِ رسول اور ذریت کاشانۂ نبوت کا یہ حال ہے تو دوسرے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، جن کو معاشرتی نسبتی شرف بھی اس درجہ کا حاصل نہیں جتنا ان مقدس بیبیوں کو حاصل تھا۔

تحلیلِ اجزاء

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ اس آیت میں خصوصی خطاب امہات المومنین کو ہے اور اُن اوصافِ حمیدہ کی بھی تعلیم دی ہے جو عورت کے اسلام کے لئے امتیازی شعار ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے زوجاتِ رسول تم معمولی عورتیں نہیں ہو یعنی تمہارا درجہ دوسری سب عورتوں سے بلند ہے (مگر یہ نہ سمجھنا کہ اس طرح رتبت اور فضیلت کا کمل سبب تمہارا زوجہ رسول ہونا ہے اور تمہارے اعمال کیسے ہی ہوں یہ فضیلت علیٰ الرغم تم کو حاصل رہے گی ایسا ہرگز نہیں ہے (شرف زوجیت کے ساتھ) اگر تم تقویٰ رکھوگی (تو تم کو یہ فضیلت حاصل ہوگی ورنہ صرف زوجیت رسول کی نسبت فضیلت عامہ کے حصول کے لیے کافی نہیں ہے۔ تقویٰ کے مراتب اور مدارج مختلف ہیں۔ عورتوں کے تقوے کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔ مردوں کے تقوے کی صورت الگ ہوتی ہے۔ اولیاء کا تقویٰ، انبیاء کا تقویٰ عام کا تقویٰ، جاہلوں کا تقویٰ، جو شخص شرک کو چھوڑ کر مسلمان ہو جائے وہ بھی صاحب تقویٰ ہے۔ جس نے کبیرہ گناہوں کو ترک کر دیا ہو وہ بھی متقی ہے۔ جس نے صغائر اور کبائر سب چھوڑ دئیے ہوں وہ بھی حامل اتقاء ہے۔ جس نے تہ جاتی تو بہتہ ترک کر دی ہو اور سب دنیا سے منہ موڑ کر صرف اللہ سے رشتہ جوڑ لیا ہو وہ بھی متقی ہے۔ جس نے اپنے ارادہ کو ارادۂ باری تعالیٰ میں اور اپنی مرضی کو مرضئ الٰہی میں فنا کر دیا ہو وہ بھی متقی ہے۔ غرض تقوے کے مراتب گوناگوں ہیں۔ یہاں تقویٰ سے مراد صرف یہ ہے کہ جن کاموں کو کرنے کا خدا نے حکم دیا ہو اُن کو کیا جائے اور جن کو کرنے سے روکا ہو ان کو نہ کیا جائے۔ لیکن اوامر و نواہی کی کیفیت اور کمیت ہر صنف کے لیے الگ الگ ہے۔ عورتوں کے لئے جدا اور مردوں کے لئے جدا۔ اور روئے سخن صرف عورتوں کی طرف ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ چند امور کو بیان فرمایا۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے یہ آداب اگرچہ امہات المومنین کو سکھائے ہیں، مگر اُمت کی عورتیں ان احکام میں ذیلی طور پر داخل ہیں۔ کیونکہ تمام عورتیں ازواجِ مطہرات کی تابع ہیں۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ سدی وغیرہ علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ تم اُمت کے مردوں سے نرم کلام مت کرو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر طرح کے آدمی حاضر ہوتے تھے۔ مومن، منافق، اچھے، بُرے، نیک چلن، بد چلن۔ خصوصاً وفات شریف کے بعد تو اکثر آدمی مسائل پوچھنے کے لئے امہات المومنین کے دروازوں پر آنے لگے تھے، اس لئے خدا تعالیٰ نے پہلے سے ہی فرما دیا کہ غیر مردوں سے نرم کلام مت کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے کلام کی نرمی پا کر بیمار دل والا یعنی منافق اپنے دل میں کچھ اور لالچ کرے اور اس کے دل میں نفسانی اغراض کا اظہار ہو جائے بلکہ جب کبھی کچھ کہنا ہو تو معمول کے موافق کہہ دو یعنی ٹھیک بات مسئلہ کا صاف جواب اور امورِ شرع کی سادہ وضاحت کر دو۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ۔ مطلب یہ کہ بغیر کسی شدید دینی ضرورت کے گھروں سے پیدل باہر نہ نکلو۔ مختلف احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے امور تو بجائے خود رہے نماز کے لیے مسجدوں میں آنے سے بھی عورت کا گھر کے گوشہ کے اندر نماز پڑھنا افضل ہے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تھا اللہ کی بندیوں کو مسجد سے نہ روکو، لیکن عورتیں جب مسجد کو آئیں تو میلی کچیلی اور پراگندہ حالت میں آئیں (بہم) اُن کی کوٹھریاں اُن کے لئے بہتر ہیں۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ کچھ عورتوں نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا حضور جہاد اور دوسرے فضائل کے مالک تو مرد ہی بن گئے ہم کو کوئی ایسی بات میسر نہیں جس سے ہم کو جہاد کا ثواب ملے۔ ارشاد فرمایا جو عورت گھر میں بیٹھی رہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب پاتی ہے (رواہ البزار) حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا عورت سراسر شرمگاہ ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تکتا ہے اور جب تک اپنی کوٹھری کے قعر میں رہتی ہے اس وقت تک وہ اللہ کی رحمت سے بہت ہی قریب رہتی ہے (الترمذی، والبزار) حضورؐ نے ارشاد فرمایا عورت کی نماز اپنے خلوت خانہ میں کوٹھری میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور کوٹھری میں نماز پڑھنی دالان میں نماز پڑھنے سے افضل ہے (البزار و ابو داؤد)

ہم آیتِ حجاب کی تفسیر میں لکھ آئے ہیں کہ مدنی زندگی کے آغاز میں گھروں کے اندر حاجت خانے نہیں تھے، اس لئے امہات المومنین رفع حاجت کے لئے باہر صحرا میں جایا کرتی تھیں، لیکن آیتِ حجاب کے نزول کے بعد صحرا کو جانا موقوف کر دیا گیا اور باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ اس آیت سے ممانعت خروج کی مزید تائید ہو گئی۔ اور بغیر کسی خاص ضرورت کے باہر نکلنے سے بالکل روک دیا گیا، لیکن یہ خطاب امہات المومنین کو ہے جن میں سے کوئی بھی پیرِ فرتوت کے درجہ تک نہیں پہنچی تھی، اس لئے اُمت کی عورتوں میں وہی اس حکم کی پابند ہیں جو بالغ ہوں اور بہت زیادہ بوڑھی نہ ہو گئی ہوں۔ بچیاں اور بہت ضعیف العمر عورتوں کو آیت میں خطاب ہی نہیں کیا گیا ہے، اس لئے اُن کو حکمِ ممانعت شامل نہیں ہے۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ۔ اس آیت کی تشریح میں بحث طلب دو امر ہیں۔ تبرج جاہلیت سے کیا مراد ہے اور جاہلیت اولیٰ کا زمانہ کون سا تھا

نمبر اوّل کے متعلق مجاہد نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں مردوں کے سامنے اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ تبرج جاہلیت سے یہی مراد ہے۔ قتادہ نے فرمایا عورتیں گھروں سے بن سنور کر نکلتیں اور آنکھیں چمکاتی، اعضاء کی نمائش کرتی، لچک دار چال سے چلتی پھرتی تھیں۔ اللہ نے اس کی ممانعت فرمادی۔ مقاتل بن حیان نے فرمایا جاہلیت کے زمانے میں عورتیں پاجامہ اور ایک دراز کرتہ پہنتی تھیں اور اوڑھنی (نہیں پہنتی تھیں صرف) برائے نام سر پر ڈال کر بغیر باندھے باہر نکلتی تھیں۔ اس سے اُن کے گلے اور بازو اور ہاتھ پاؤں کی نمائش اجنبی مردوں کے سامنے ہوتی تھی۔ یہ ہی تبرج جاہلیت تھا۔

رہی یہ بات کہ جاہلیت اولیٰ کا کون سا زمانہ تھا اور اس کے مقابلے میں جاہلیت اُخریٰ کا زمانہ کون ہوگا؟ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت مذکورہ پڑھ کر بتایا نوحؑ اور ادریسؑ کے درمیانی ہزار سالہ دور میں یہ تبرج موجود تھا۔ بات یہ ہوئی کہ حضرت آدمؑ کے ایک بیٹے کی اولاد تو پہاڑوں میں جا بسی اور دوسرے بیٹے کی اولاد نے میدانوں میں سکونت اختیار کی۔ پہاڑی مرد خوبصورت اور عورتیں بدشکل تھیں۔ لیکن میدانی باشندوں کی حالت اس سے خلاف اُن کی عورتیں خوبصورت اور مرد بدشکل تھے۔ شیطان ایک لڑکے کا بھیس بنا کر دیسی آدمیوں میں آیا اور ایک شخص کے پاس خدمت گاری کی نوکری کرلی اور ہر وقت اسی دُھن میں تھا کہ کسی طرح ان میں بدکاری پھیلائے۔ بالآخر اُس نے چرواہوں کی ایک بانسری بنائی اور اُس کو بجانا شروع کیا۔ لوگوں نے ایسی آواز کبھی نہیں سُنی تھی۔ چاروں طرف خبر مشہور ہوگئی۔ رفتہ رفتہ لوگ دُور دُور سے سُننے کے لئے آنے لگے اور شیطان کے پاس بڑا مجمع ہونے لگا۔ اسی طرح کچھ زمانے کے بعد سالانہ میلہ لگنے لگا اور عورتیں و مرد ایک جگہ بکثرت جمع ہونے لگے اور عورتوں نے جاہلیت کا بناؤ سنگھار شروع کیا۔ اتفاق سے ایک بار پہاڑی آدمیوں میں سے ایک شخص میلے میں پہنچ گیا اور واپس جاکر عورت کے حسن و جمال اور میلے کے عیش و طرب کی اطلاع دی۔ دوسرے سال پہاڑی باشندے بھی میلے میں شریک ہوئے اور پہاڑی مرد دیسی عورتوں کو دیکھ کر فریفتہ ہوگئے اور اس طرح بدکاری کی بنیاد پڑی۔ اللہ نے اسی جاہلیت اولیٰ کے تبرج سے منع فرمایا ہے (اس روایت کی اسناد میں کوئی ضعف نہیں ہے) ابن عباس کا دوسرا قول ہے جو زیادہ قوی ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے مراد فترت کا زمانہ ہے یعنی تقریباً پانچ سو ستر سال کا وہ دور جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے بعثتِ محمدیؐ تک تھا۔ ابوالعالیہ نے فرمایا اُس زمانے میں عورتیں موتیوں کی جھالر لگی ہوئی قمیص پہن کر نکلتی تھیں تاکہ مرد ان کی خوبصورتی دیکھیں (سراج)

یہ تو جاہلیت اولیٰ کا زمانہ تھا اس کے مقابلے میں جاہلیت اُخریٰ کا زمانہ مسلمانوں کے بگڑ جانے اور دینی احکام کو چھوڑ دینے کا زمانہ ہے۔ مسروق کی روایت ہے کہ اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب اس آیت کو تلاوت فرماتی تھیں تو اتنا روتی تھیں کہ اوڑھنی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی (کیونکہ آپؓ نے حضورؐ والا سے اُمتِ اسلامیہ کے بگڑ جانے کی حالت سُنی تھی)

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ ۔ اوپر کے جملوں میں تو وہ تعلیم تھی جو عورتوں کے ساتھ مخصوص تھی اور دونوں جملوں میں اگرچہ خطاب عورتوں کو ہے، مگر تعلیم وہ ہے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہے۔ تمام بدنی عبادتوں میں نماز اصل ہے اور مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کا رتبہ سب سے اوّل ہے۔ دوسرے نافلہ صدقات اس کی شاخیں ہیں، اس لئے ان دونوں کے ذکر پر اکتفا کیا۔ زکوٰۃ کا حکم اگرچہ اس وقت امہات المومنین پر عائد نہیں ہوتا تھا، پیٹ بھر کر روٹی ہی ملنی دشوار تھی۔ زکوٰۃ کے قابل سرمایہ کہاں تھا، لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ آئندہ ان کے پاس دولت کے انبار آئیں گے، اس لئے زکوٰۃ کا حکم پہلے سے دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ آیت کا نزول اگرچہ ازواج مطہرات کے حق میں ہوا، لیکن رُوئے سخن تمام عورتوں کی طرف ہے فقط ازواج پاک ہی مراد نہیں ہیں بلکہ اُمتِ اسلامیہ کی عورتیں اُس وقت مالدار بھی تھیں اور نادار بھی۔ اس لئے مالداروں کو ادائے زکوٰۃ کا حکم ضمنی طور پر دے دیا گیا۔

وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ اوپر کے فقروں میں چند مختصر احکام بیان فرمائے تھے سارے احکام کی تفصیل کے لئے تو مفصل قرآن موجود ہی ہے ایک جگہ سب کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ بوقت خطاب جن احکام کی زیادہ اہمیت تھی اُنہی کو ظاہر کیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ تکمیل تقویٰ کے لئے فقط پردہ کرنا اور صلوٰۃ و زکوٰۃ ادا کرنا کافی نہیں ہے، اس لئے مجمل طور پر عمومی حکم دے دیا گیا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو یعنی اُن کے ہر حکم کو مانو۔ اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اندرونی اور بیرونی معاملات، مالی تصرفات، صلح اور جنگ، رضامندی اور ناراضی غرض ہر رفتار، گفتار اور سارے اطوار میں اللہ اور اُس کے رسول کے فرمان پر چلو۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ الخ ۔ اس آیت میں ارادہ سے مراد ہے پسندیدگی۔ کیونکہ علمائے کرام نے صراحت کی ہے کہ کوئی بُرا کام بھی بغیر اللہ کے ارادے کے نہیں ہوتا ہاں اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اللہ کی مرضی صرف نیک کام کی ہوتی ہے۔ پس اللہ چاہتا ہے یعنی پسند کرتا ہے کہ رسول اللہ کے گھر والے بالکل پاک صاف ہو جائیں۔ ہر قسم کی ظاہری اور باطنی، جسمانی اور روحانی کثافت اُن سے دُور ہو جائے۔ جس کی صورت صرف یہ ہے کہ دنیا کی محسوس نجاستوں اور غیر محسوس اشیاء کی نجاستوں کو اپنے دل، ضمیر، روح بلکہ اپنی ہستی سے باہر نکال کر پھینک دیا جائے۔ نااتفاقی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزاء، طمع، اسراف، عیاشی، بے اعتباری، بدگمانی، بُخل اور ادائے فرائض میں سُستی کی پلیدی کو نیک نیتی، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، بردباری، کفایت شعاری، سچائی، راست بازی، ادب، صلح، سچی محبت، بلندیٔ حوصلہ اور شوقِ عبادت کے پانی سے دھو کر پاک کر دیا جائے۔ حاصل یہ کہ طبع، رجس (یعنی نفس امارہ) کی کثافت کو اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے پاک پانی (نفس لوامہ) سے دھو کر ادائے فرائض کی چادر یا روحانی روشنی

(نفس مطمئنہ) کے رومال سے صاف اور خشک کر دیا جائے۔ بس یہی کمال طہارت ہے۔ بدن کی پاکیزگی اور دل کی طہارت دونوں ضروری ہے، مگر تکمیل طہارت باطنی طہارت کی تکمیل سے ہوتی ہے۔ پس اللہ پسند کرتا ہے کہ رسول اللہ کے گھر والوں کو ہر قسم کی نجاست سے پاک صاف کر دے، اُن کے ظاہری اعضاء اور احوال کو شستہ بنا کر باطن کو طاہر بنا دے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا۔ خلاصہ اُس ساری تعلیم کا جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ پاکباز نیک اور مقدس بیبیاں حضور اکرمؐ کے دینی مدرسہ بیت العلم میں داخل کی گئی تھیں۔ اس کی آیات میں جو تعلیم دی گئی تھی اس کا تعلق ازواج پاک کی ذات سے تھا۔ اُن کو تہذیب، شائستگی ادب، صحبت، حُسنِ معاشرت اور ادائے فرائض کی تلقین کی گئی تھی اور اس آیت کے مقصد کا تعلق عام اُمتِ اسلامیہ کے مفاد سے ہے۔

آیات اللہ سے مراد قرآنی آیات اور حکمت سے مراد قولی اور فعلی احادیث ہیں (قرطبی) اور یاد کرنے سے مراد ہے دوسروں کو ان کو پڑھ کر سنانا، بتانا، تعلیم دینا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو آیات قرآن اور احادیث نبوی تمہارے گھروں کے اندر پڑھی جاتی ہیں اور جن احکام اسلامی کا تم کو علم ہوتا ہے اُن کی تبلیغ تمہارا فرض ہے۔ دوسری عورتوں اور مردوں کو بتانا اور اندرونی تعلیم سے لوگوں کو واقف کرنا تم پر واجب ہے۔

اہل بیت کی تنقیح

اہل بیت کے لغوی معنی گھر والوں کے ہیں۔ عرب کی اصطلاح میں اس لفظ کا اطلاق بیوی پر ہوتا ہے گو گھر میں بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی اور نوکر چاکر بھی ہوں۔ قرآن پاک میں ایک اور آیت میں اہل البیت کا لفظ حضرت ابراہیم کی بیوی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۖ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ عرب والے جب کسی کی خیریت پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کَیْفَ اَھْلُکَ اُردو میں بھی اہلِ خانہ گھر والی بیوی کو کہتے ہیں، اس لئے علمائے اسلام کی کثیر جماعت کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ میں اہل البیت سے مراد حضورؐ کی بیویاں ہیں۔ ابن عباس، عکرمہ، عطاء، کلبی، مقاتل اور سعید بن جبیر اسی کے قائل ہیں۔ ابن کثیر نے تو عکرمہ کا قول یہاں تک نقل کیا ہے کہ عکرمہ بازار میں پکار کر کہتے تھے کہ آیت إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ خاص ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم) بلکہ عکرمہ تو اُن لوگوں کو مباہلہ کی دعوت دیتے تھے جو آیت مذکورہ کا مورد ازواج پاک کے علاوہ کسی دوسرے کو قرار دیتے تھے (ابن ابی حاتم) عکرمہ کا یہ استدلال ہے کہ اس سے پہلے جتنے خطابی الفاظ ہیں اُن کی مخاطب ازواج ہیں۔ دیکھو لَسْتُنَّ۔ فَلَا تَخْضَعْنَ۔ قُلْنَ، قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ لَا تَبَرَّجْنَ۔ أَقِمْنَ۔ آتِينَ۔ أَطِعْنَ۔ ان تمام الفاظ میں رسول اللہ کی بیویاں ہی مخاطب ہیں اور کسی کو اس سے انکار کرنے کی مجال نہیں۔ پھر آیت کے بعد دوسری آیت میں بھی ازواج مطہرات ہی مخاطب ہیں۔ دیکھو وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ میں روئے سخن ازواج ہی کی طرف ہے۔ پس جب اول آخر خطاب کے صیغوں کا رُخ بصراحت لفظ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ درمیانی فقرہ میں مخاطب کوئی اور ہو جس کا ذکر پہلے ہوا ہی نہیں ہے۔ مخاطب مجہول کو خطاب نہیں کیا جا سکتا۔

ابو سعید خدری، مجاہد، قتادہ اور کل شیعہ کہتے ہیں کہ اہل بیت سے مراد اس جگہ فقط حضرت علیؓ، سیدہؓ اور حسنینؓ ہیں۔ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں عَنكُمُ اور يُطَهِّرَكُمْ مذکر کی ضمیریں ہیں جن کی مخاطب ازواج پاک نہیں ہو سکتیں۔ اوّل گروہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ اہل بیت مذکر ہے۔ اس کی رعایت سے تذکیر کے صیغے کلام میں آ جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی پر اہل البیت کا اطلاق جب کیا گیا تو اسی کے ساتھ عَلَيْكُمْ جمع مذکر کا صیغہ بھی استعمال کیا گیا۔ امام ابن کثیر نے اس طرح جواب دیا ہے کہ جب عورتوں کو تکریم آمیز خطاب کیا جاتا ہے تو جمع مذکر کا صیغہ کلام عرب میں بولا جاتا ہے۔ محاورات عرب اس کے شاہد ہیں۔

فریق ثانی کے استدلال میں مختلف احادیث بھی مروی ہیں جن کو حضرت اُم سلمہؓ، حضرت عائشہؓ اور واثلہ بن اسقع سے بطرق مختلفہ ترمذی، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابن ابی شیبہ، احمد اور مسلم وغیرہم نے بیان کیا ہے۔

منجملہ دیگر احادیث کے ایک حدیث[1] کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے حضرت علیؓ، حضرت سیدہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ایک سیاہ دھاری دار کمبل میں لپیٹا کر یہ آیت پڑھی اور پھر فرمایا اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان کی ناپاکی دور کر دے اور ان کو بالکل پاک صاف کر دے۔

ایک حدیث[2] اس طرح آئی ہے کہ سرکار رسالتؐ فجر کی نماز کو جب مسجد میں تشریف لے جاتے تھے تو سیدۃ النساء کے گھر پر کھڑے ہو کر یَا اَھْلَ الْبَیْتِ اَلصَّلٰوۃَ اَلصَّلٰوۃَ کہہ کر یہی آیت پڑھتے تھے۔ اس سے بھی حضرات اربعہ کا اہل البیت میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔

امام احمد[3] نے حضرت اُم سلمہ کا بیان نقل کیا ہے۔ اُم المومنین نے فرمایا کہ حضور میرے گھر میں تشریف فرما تھے اتنے میں فاطمہ ایک ہانڈی میں خزیرہ پکا کر لائیں حضورؐ نے فرمایا اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کو بلا لو وہ بلا لائیں آ گئے۔ سب نے مل کر خزیرہ کھایا۔ حضورؐ اس وقت ایک خیبری کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے اور میں حجرہ میں نماز پڑھ

ہی تھی۔ پس اللہ نے یہی آیت نازل فرمائی۔ حضورؐ نے کملی کے باقی حصہ سے ان لوگوں کو ڈھانک لیا اور آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا۔ میں نے بھی اپنا سر نکال کر عرض کیا یا رسول اللہؐ! میں بھی تو آپ کے ساتھ ہوں۔ فرمایا تو بہتری میں ہے تو بہتری میں ہے۔
اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ حضرات اربعہ ہی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور امہات المومنین کے حق میں نازل نہیں ہوئی ورنہ ام سلمہؓ کی درخواست معیت کے کیا معنی ہو سکتے تھے (اس حدیث کو ابن جریر نے بروایت ابوہریرہ عن ام سلمہ اور بروایت حکیم بن سعد عن ام سلمہ بیان کیا ہے)
ایک حدیث اور ہے ام سلمہؓ نے فرمایا یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی ہے اور علیؓ اور فاطمہؓ اور حسنؓ اور حسینؓ موجود تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! کیا میں اہل بیت میں سے نہیں ہوں؟ فرمایا تو تو بہتری میں ہے۔ تو تو رسول اللہؐ کی ازواج میں سے ہے۔ (اسنادہ صحیح فقد رواہ ابن جریر بطریق عدیدۃ صحیحۃ عن ام سلمہؓ)
اس حدیث سے بھی حضرات اربعہ کے ہی حق میں آیت مذکورہ کا نزول ثابت ہوتا ہے۔
ایک حدیث حضرت واثلہؓ سے مروی ہے۔ واثلہ کہتے ہیں میں حضورؐ کی خدمت میں جا رہا تھا، لیکن پہلے میں نے جا کر سیدۃ النساء سے حضرت علیؓ کو دریافت کیا۔ سیدہؓ نے فرمایا وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں گئے ہیں۔ میں انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں رسول اللہؐ حضرت علیؓ اور حسنینؓ کو ساتھ لئے ہوئے تشریف لائے اور بیٹھ گئے پھر حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو دائیں بائیں بلا لیا اور حسنینؓ کو ران پر بٹھا کر اس کملی میں سب کو داخل کر لیا جو آپ اوڑھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دعا کی:۔
اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان کی ناپاکی دور کر دے اور ان کو بالکل صاف کر دے اور میرے اہل بیت (پاک ہونے کے) زیادہ حقدار ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! خدا آپ پر رحمت نازل فرمائے۔ میں بھی تو آپ کے اہل میں سے ہوں۔ فرمایا ہاں تو بھی میرے اہل میں سے ہے (رواہ ابن جریر بوجوہ) اس حدیث میں بھی صاف صراحت ہے کہ حضور اقدسؐ نے اہل بیت حضرات اربعہ کو قرار دیا۔

محاکمہ

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں صرف ازواج یا حضرات اربعہ کو داخل کرنا غلطی ہے۔ مختلف احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں فریق اہل بیت ہیں۔ رہا مذکورۂ بالا احادیث کا جواب تو کسی حدیث سے اہل بیت کے لفظ کا حصر حضرات اربعہ میں نہیں ثابت۔ نمبر دوم و سوم و چہارم کی حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حضرات اربعہ کو اہل بیت قرار دیا لیکن اس سے ازواج کے اہل بیت ہونے کی نفی کا استخراج نہیں ہو سکتا اور کیونکر استخراج صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ حضور اقدسؐ نے نمبر چہارم کی حدیث میں حضرت ام سلمہؓ کو جواب دیا کہ تو بہتری میں ہے تو ازواج میں سے ہے۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اہل بیت کا اصل مصداق ازواج ہی تھیں جب ہی تو حضورؐ نے ام سلمہؓ سے فرمایا تو ازواج میں سے ہے تو بہتری میں ہے۔ یعنی جب تمام ازواج اہل بیت ہیں تو تو بھی ان میں شامل ہے پھر تجھ کو صراحت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث کساء میں حضورؐ نے ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فرمایا۔ اگر اہل بیت کا لفظ لغوی اعتبار سے داماد بیٹی نواسوں کو شامل ہوتا تو دعا میں اس صراحت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صراحت سے تمام لوگوں کو مطلع فرمانا مقصود تھا کہ تم کہیں صرف ازواج کو ہی اہل بیت نہ سمجھ لینا بلکہ میرے اہل بیت یہ چار بھی ہیں۔
ہاں نمبر چہارم کی حدیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں حضرات اربعہ کے حق میں آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور بعض دیگر احادیث سے آیت مذکورہ کا نزول ازواج کے حق میں ثابت ہوتا ہے اور قرآن کا سیاق سباق اور ماقبل مابعد کے فقرات بھی یہی بتا رہے ہیں اور چونکہ دونوں قسم کی احادیث صحیح ہیں، اس لئے کسی کو غیر معتبر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نا موافقت دور کرنے اور روایات میں توافق پیدا کرنے کے لئے تفسیر کا وہی کلیہ پیش کرنا ہوگا جو مسلم الثبوت ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض آیات کا نزول مکرر ہوا ہے۔ سورۂ فاتحہ اول مکہ میں نازل ہوئی پھر مدینہ میں بوقت تحویل قبلہ نازل ہوئی (بیضاوی) آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ بھی دو مرتبہ نازل ہوئی۔ اول بار نزول کے وقت جو شدت اور تکلیف ہوئی تھی وہ مکرر نزول کے وقت نہیں ہوئی تھی۔ درحقیقت ثانوی نزول اول نزول کی یاد دہانی ہوتی ہے۔ بات یہ ہوتی تھی کہ جب ایک واقعہ کے متعلق ایک آیت نازل ہو جاتی تھی تو اس واقعہ کا حکم معلوم ہو جاتا تھا پھر اسی قسم کا دوسرا واقعہ پیش آتا تھا تو حضورؐ اس کے حکم کے منتظر ہوتے تھے۔ اس انتظار کو دور کرنے اور تعیین کو محکم بنانے کے لئے اسی آیت کا دوبارہ نزول ہو جاتا تھا۔ پس ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے آیت مذکورہ کا نزول ازواج مطہرات کے حق میں ہو گیا ہو اور منجملہ دیگر صراحت بھی ان کے متعلق کر دی گئی ہو پھر انتہائی شفقت کے زیر اثر حضور والاؐ نے حضرات اربعہ کے متعلق دعا کی اور ان کو اپنا اہل بیت قرار دے کر اس کی خواہش کی تو ام سلمہؓ کے گھر میں دوبارہ آیت مذکورہ کا نزول ہو گیا۔ ام سلمہؓ کے گھر میں دوبارہ آیت مذکورہ کا نزول ہو گیا۔ ام سلمہؓ کو اس دعا اور نزول سے خیال پیدا ہوا کہ شاید اس کلامت کے مستحق صرف حضرات اربعہ ہیں۔ اس لئے آپ نے معیت اور شمولیت کی درخواست کی۔ اس پر حضورؐ نے صراحت فرمادی کہ تو تو ازواج میں سے ہے یعنی تم لوگوں کے متعلق تو اس آیت کا نزول ہو چکا ہے مزید شمولیت کی ضرورت

نہیں ۔ کیونکہ وہ غرض حاصل ہو چکی ضرورت تو ان حضرات کو شامل کرنے کی تھی تو وہ پوری ہو گئی ۔ رہی پانچویں حدیث تو اس سے کسی طرح حصر مستفاد نہیں ہوتا صرف حضرات اربعہ کا اہل بیت میں شامل ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کو بھی پہلی ہی بار ضمنی طور پر اہل بیت میں سے شمار کر لیا گیا تھا ۔

ایک اور حدیث سے حضرت انس اور حضرت زید کا بھی ضمنی طور پر اہل بیت میں شامل ہونا معلوم ہوتا ہے ، لیکن ان سے ازواج پاک کے اہل بیت ہونے کی نفی کا استخراج کسی طرح نہیں ہو سکتا ۔ پس

قول فیصل یہ ہے ازواج مطہرات کے حق میں اول بار آیت کا نزول ہوا اور دوسری بار حضرات اربعہ کے حق میں یا ایک ہی بار آیت نازل ہوئی اور حکم آیت میں سب کو شامل کر دیا گیا (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایمان دار مرد اور ایماندار عورتیں فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں

وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ

سچے مرد اور سچی عورتیں صابر مرد اور صابر عورتیں خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں

وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ

خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد

وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ○

اور حفاظت کرنے والی عورتیں اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے

تفسیر اسلام محض قیاسی اور خیالی نظریات کا نام نہیں جن کو عمل زندگانی سے کوئی تعلق نہ ہو اور چند فکری خیالات اور علمی عقائد کا صحیح حل کر لیا جائے ۔ بلکہ اسلام زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کے طریقے سکھاتا ہے ۔ ایسے اصول کی تعلیم دیتا ہے جو اس حیات میں بکار آمد ہوں ۔ جس سے انسانی تعمیر میں اضافہ ، امن میں عموم اور رفاہیت میں ہمہ گیری پیدا ہو ۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فکری اصلاح بھی ہو ۔ مبدء و معاد کے متعلق اس کی دماغی کجروی راستی سے بدل جائے اور عملی درستی بھی ہو جائے ۔ امور تباہی کن فساد اور تخریب کائنات کے باعث ہیں اُن سے آدمی پرہیز کرے اور جو امور اعتدال فطرت کے موافق ہیں اُن پر کاربند ہو جائے ۔ یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ نوع انسان کی دو صنفیں ہیں مرد اور عورت ۔ اسلام نے فطری اعتدال اصلاح کے قوانین دونوں صنفوں کے لئے پیش کئے ہیں کیونکہ اس زمین کو آباد کرنے اور آباد رکھنے میں دونوں کا مساوی حصہ ہے ۔ لیکن فطری اور اعتقادی تعلیم تو دونوں صنفوں کو ایک ہی طرح کی دی ہے ، اس لئے کہ مبدء و معاد کے متعلق عقیدہ رکھنے سے اصل غرض عملی خیر اور فعلی صلاح کی طرف مائل کرنا ہے اور خیر کی رغبت دونوں کو دلانا مقصود ہے ، اس لئے نظری عقائد میں تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ہے نہ اس تعلیم میں کوئی تفرقہ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ بعض عملی فرائض دونوں صنفوں کے جدا جدا ہیں ۔ ہر صنف کو اپنی قوت حالت طبیعت مزاج اور کیفیات کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے اُن فرائض کی تکمیل کی ضرورت ہے جن کو ادا کرنا دوسری صنف کے لئے نہ فقط غیر ضروری ہے بلکہ ضرر رساں ہے ۔ جن آیات کی اس جگہ ہم تفسیر کرنی چاہتے ہیں اُن کے اندر ایسی عملی تعلیم عورتوں کو دی گئی ہے جس پر کاربند ہونا مردوں کا بھی فرض ہے ۔ اور جن کو ادا کرنے کی ترغیب دونوں صنفوں کے لئے مشترک ہے ۔ آیت کے ہر لفظ کی مفصل تشریح تو ہم تحلیل اجزا کے ذیل میں کریں گے ۔ یہاں بالاجمال اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ سب سے پہلے ظاہری انقیاد و اطاعت اور عملاً اسلام کی حقانیت کا اظہار ہر شخص پر فرض ہے ، لیکن ہو سکتا ہے کہ ظاہری اطاعت کسی ذاتی مصلحت پر مبنی ہو ۔ حکومت یا قوم کے دباؤ سے یا کسی مالی لالچ سے یا محض تقلید اسلاف سے یا بغیر سمجھ بوجھ کے اطاعت کا اظہار کر دیا جائے اور

اہلِ اسلام کے رشتہ میں اپنے کو منسلک بنا دیا جائے چونکہ ایسا اسلام درحقیقت اسلام ہی نہیں ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ظاہری فرماں پذیری کے ساتھ دل میں بھی ایمان راسخ ہو اور اسلام کی حقانیت کا قلبی یقین ہو، لیکن ایمان کے مدارج بھی مختلف ہیں۔ سب سے اعلیٰ درجہ وہ ہے جس پہنچ کر انسان کی روح کو سکون، دل کو اطمینان اور ایمان میں لذت حاصل ہو جائے۔ اس اطمینان قلبی کا نتیجہ یقینی طور پر صدق نیت، صدق قول اور صدق عمل کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ اس سچائی پر قائم رہنے کے لئے بڑے بڑے شدائد اور حوصلہ شکن مصائب کی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یقینی الحصول ناجائز مرغوبات سے نفس کو روکنا پڑتا ہے۔ یہ کام بڑی دلیری اور دلاوری کا ہے۔ لامحالہ اس سے نفس میں غرور پیدا ہو جاتا ہے، لیکن غرور کو دل سے دور کرنا اور باوجود جفاکشی، برداشت مصائب، تحمل شدائد اور امتناع نفس کے اللہ کے احکام اور مخلوق کی خدمت کے لئے عاجزی اختیار کرنی بڑی مردانگی ہے۔ بہت قابل ہے ناریخی ہیں وہ ہستیاں جو باوجود علو مرتبہ شرف مکانی اور حصول عزت وجاہ کے عاجزانہ خدمت خلق کرتی اور اللہ کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتی ہیں۔ درحقیقت آدمی کو غرور پر آمادہ کرنے والی اور تباہی کے گڑھے میں گرانے والی تین چیزیں ہیں۔ مال کی کثرت، جسمانی طاقت کی افزونی اور اجتماع صنفی کی حد سے بڑھتی ہوئی رغبت۔ لیکن اللہ کی نیک بندیاں اور بندے عزت وجاہ وحکومت وسلطنت، صحت وطاقت اور دولت وراحت کے حصول کے بعد بھی مغرور نہیں ہو جاتے۔ مال کی محبت صدقہ زکوٰۃ دے کر اور ہمہ وقت غریبوں کی امداد کر کے دور کرتے ہیں۔ جوش صنفی اور حرص شکم کا علاج ضروری واجبی روزے رکھ کے کرتے ہیں اور حد اعتدال سے بڑھ کر اجتماع صنفی کی رغبت سے گریز کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ سارے علم وعمل کے کمالات اُن کو حاصل ہو جاتے ہیں اور ان کا مطمح نظر دنیا کی کوئی چیز نہیں رہتی۔ نہ عزت نہ حکومت نہ دولت نہ جسمانی طاقت نہ اجتماع صنفی کی لذت نہ دنیاوی راحت نہ کھانے پینے کی کثرت بلکہ وہ خدا کے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل، اُن کی زبانیں اور ان کے تمام اعضاء ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی پیدائش کی اصل غرض کو سمجھ جاتے ہیں۔ باہم ہوتے ہوئے بھی بے ہم ہو جاتے ہیں، لیکن دماغ میں ہر وقت ایک جدا خیال لہریں مارتا ہے، اس لئے اُن کو سب سے الگ کہا جا سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اس آیت کے نزول کے متعلق چند واقعات کا تذکرہ اہلِ تفسیر نے کیا ہے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ام المومنین حضرت اُم سلمہؓ خود راوی ہیں کہ میں نے رسول پاکؐ سے عرض کیا تھا۔ یا رسول اللہ! قرآن مجید میں مردوں کے ذکر کی طرح ہم عورتوں کا تذکرہ نہیں آیا۔ اتفاقاً ایک روز میں اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ حضور گرامیؐ کی آواز منبر پر سنائی دی۔ میں فوراً بال لپیٹ کر حجرے کے دروازے پر گئی اور کیواڑ کی دراز سے کان لگا کر سنا۔ حضور منبر پر فرما رہے تھے لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ الخ رواہ احمد والنسائی وابن جریر) ابن عباس سے مروی ہے کہ عورتوں نے حضورؐ والا سے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا تذکرہ فرماتا ہے اور مومنات کا کوئی ذکر نہیں فرماتا۔ اس پر آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الخ نازل ہوئی۔ (رواہ ابن جریر) قتادہ سے بھی یہ قول تھوڑے تغیر کے ساتھ مروی ہے۔ تفسیر معالم میں ہے کہ ایک بار ام المومنین حضرت ام سلمہؓ اور نسیبہ بنت کعب انصاریہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا وجہ ہے کہ مردوں کی طرح ہمارا ذکر قرآن میں نہیں [illegible] اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ ام عمارہ انصاریہ کہتی ہیں۔ میں نے عرض کیا [illegible] کسی چیز کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا۔ اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ (رواہ عبد بن حمید والطبرانی والترمذی وقال حدیث حسن)

ان تمام روایات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عورتوں کی درخواست اور استفسار کے بعد مذکورہ نزول ہوا اور ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ ایک حکم کے نزول کے مختلف الگ جیسا اسباب ہو سکتے ہیں۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام وایمان میں تفاوت ہے۔ اسلام عام ہے اور ایمان خاص۔ دوسری آیت میں خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ یعنی دیہاتی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے کیونکہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ ہاں یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص۔ اس کے علاوہ حدیث صحیحین میں آیا ہے۔ لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی زانی بوقت زنا مومن نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ عمل زنا ایمان کے خلاف ہے۔ اس لئے زانی زنا کرنے کے وقت مومن نہیں رہتا۔ حالانکہ باجماع علماء مسلم رہتا ہے۔ کافر نہیں ہو جاتا مرتکب

کبائر کو کافر نہیں کہا جاتا۔ ایک اور حدیث آتی ہے جس کو بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن حبان، ابن خزیمہ، ابو عوانہ، امام احمد، ابو نعیم، طبرانی اور دوسرے علماء نے متعدد وجوہ سے بطریق مختلفہ نقل کیا ہے اور جو حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل نے آدمی کے بھیس میں آکر حضور اقدس سے اسلام، ایمان اور احسان کی تفسیر دریافت کی تو حضور والا نے فرمایا کہ اسلام نام ہے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی شہادت دینے کا اور ٹھیک ٹھیک پابندی کے ساتھ نماز پڑھنے کا اور زکوٰۃ دینے کا اور خانہ کعبہ کا حج کرنے کا اور رمضان کے روزے رکھنے کا اور ایمان یہ ہے کہ تم یقین رکھو اللہ پر۔ اس کے فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر اور اس بات پر کہ خیر و شر کی تقدیر خواہ گوارہ ہو یا نہ ہو اللہ ہی کی طرف سے ہے اور احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ (گویا) خدا کو دیکھ رہے ہو اور یہ (درجہ حاصل) نہ ہو تو کم از کم اتنا ہو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں تفاوت ہے۔ اس لئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اسلام تو ظاہری قول و فعل کا نام ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قلبی اعتقاد ہو تو مسلمان کہا جائے ورنہ نہ کہا جائے یہی وجہ ہے کہ منافقوں کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا گیا۔ تاوقتیکہ اُن کے ظاہری قول و فعل سے اُن کے قلبی اعتقاد کے اختلاف کا ثبوت نہ ہو گیا اور ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ گویا اسلام کا نام قوتِ عملیہ کا ہے اور ایمان کا نام قوتِ نظریہ کا۔

جمہور اہلِ سنت کے نزدیک اسلام اور ایمان میں مصداق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی حقیقی مسلمان ہو اور مومن نہ ہو یا مومن ہو اور پکا مسلم نہ ہو۔ جن آیات و احادیث سے دونوں میں تفاوت معلوم ہوتا ہے وہ تفاوت مصداق کے لحاظ سے نہیں۔ بلکہ ظاہر کے لحاظ سے ہے۔ گویا جو شخص سچا مومن نہ ہو وہ ظاہری لحاظ سے مسلم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام کے لغوی معنی انقیاد۔ فرماں پذیری اور اطاعت ہیں۔ خواہ سچے دل سے ہو یا ناگواری کے ساتھ۔ اسی لئے جن دیہاتیوں کے دلوں میں ایمان راسخ نہ ہوا تھا یعنی وہ پکے مسلمان نہ ہوئے تھے اُن کو ایمان کے دعوے سے روک دیا گیا۔ اور صرف ظاہری اطاعت و انقیاد کے دعوے کی اجازت دی گئی۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گزشتہ آیات میں اُمہات المومنین یا اہلِ بیت کی خصوصیات اور مراتب کا اظہار فرمایا تھا اور ان کو خطاب کرتے ہوئے خصوصی احکام بھی دیئے تھے۔ اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید رسول پاک سے رشتہ اور قرابت استثنائی احکام کی حامل ہے اور عام اُمت کی عورتیں اور مرد باوجود انتہائی فرماں پذیری کے حصول مراتب سے محروم ہیں۔ اس شبہ کو دور کرنے اور عام اُمتِ مسلمہ کو تسلی دینے کے لئے آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ اس آیت میں تین تدریجی اسلامی مراتب کا ترتیب وار تذکرہ فرمایا ہے جن کا بیان حدیث جبرئیل میں بھی آیا ہے۔ پہلا درجہ صرف ظاہری انقیاد کا ہے۔ چار و ناچار طوعاً و کرہاً اسلام کے دائرہ میں داخل ہونا ہی احکامِ کفر کو دور کر دیتا ہے۔ نکاح، بیاہ اور دوسرے معاملات میں وہ مسلمانوں کی طرح ہو جاتا ہے۔ جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ اس کے تمام معاملات کا فیصلہ اسلامی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے قبرستان میں اس کو دفن کیا جاتا ہے۔ اس کی میراث مسلمان کی میراث مانی جاتی ہے اور اس کو مسلمانوں کی طرح میراث بھی ملتی ہے۔ ظاہراً توحید و رسالت کی قولی شہادت اور ارکانِ اربعہ کی عملی ادائیگی مسلم کہلانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ ایمان کا ہے۔ ظاہری قول و عمل سے ترقی کر کے باطنی افکار و خیالات کی تصحیح کرنی دل سے خدا کی ذات و صفات کو صحیح طور پر ماننا اور رسالت پر یقین رکھنا خصوصاً خدا کو واحد اور خالق خیر و شر یعنی صاحب علم و ارادہ، حامل قدرت، مالکِ کل، آمرِ مطلق، نافذ الحکم اور متقن جاننا اور وعید و معاد کو تسلیم کرنا ایمان کہلاتا ہے۔ در چونکہ آمر، مالک اور نافذ الحکم ہونے کے لئے اور ساری کائنات کا انتظام کرنے کے لئے قوانین و ضوابط کی بھی ضرورت ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ اُن ضوابط کو انسانوں تک پہنچانے والے درمیانی ذرائع ہوں، اس لئے فرشتوں پیغمبروں کو بھی ماننا ضروری ہے۔ گویا کل عالم کو ہر چیز میں محتاج اور اللہ کو محتاج الیہ، ساری کائنات کو فقیر اور اللہ کو فیاض سمجھنے کا نام ایمان ہے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ احسان کا ہے۔ جب ایمان کی کیفیت دل میں راسخ ہو جاتی ہے تو پھر ساری قومی اور عملی زندگی خلوص اور سچائی کے ساتھ ایمان کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جس طرح چراغ کے لئے سب سے پہلے تیل بتی اور دوسرے لوازم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر دیا سلائی گھس کر چراغ کی لو پیدا کی جاتی ہے اور اس کے بعد روشنی، نورانیت اور ایک خاص کیفیت انجلائیہ نمودار ہوتی ہے جس سے ماحول کا کامل انکشاف ہو جاتا ہے اور گرداگرد کی ہر چیز دکھنے لگتی ہے۔ اور ہر روشنی پر ایک خاص چمکیلی کیفیت چھا جاتی ہے۔ اسی طرح ظاہری اطاعت و انقیاد کے تیل بتی کے بعد ایمان کی لو دل میں چمکنے لگتی ہے۔ اور پھر سارے اقوال و اعمال ... ایمان کی جھلک سے روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ہر نقل و توقف اور ہر حرکت و سکون یہاں تک کہ دماغی تصور و ارادہ میں بھی ایمان کی چمک نظر آنے لگتی ہے۔ گویا ابتدائی اسلامی درجہ ظاہری یقین

کا ہوتا ہے اور دوسرا ایمانی درجہ علم الیقین، فکری صحت، خیالی استقامت اور نظری راستی کا ہوتا ہے اور تیسرا احسانی درجہ حق الیقین یا کم از کم عین الیقین کا ہوتا ہے اور اس درجہ میں پہنچ کر مشاہدہ، معائنہ اور مکاشفہ ہو جاتا ہے۔ دلائل سے بے نیاز ہو کر انسان ہر چیز کو بلکہ خدا کو بھی خدا ہی کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس تیسرے درجہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کی نورانیت یا معائنۂ یقین کا پرتو مختلف اعضاء کے مختلف اعمال پر مختلف طور پر پڑتا ہے دل کو سکون روح کو اطمینان اور طاعت میں حقیقی لذت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ قنوت کا درجہ ہے۔ قول و فعل میں سچائی، ریاکاری سے نفرت، وعدہ کی وفا، عہد کی پختگی، غیبت اور نمامی سے اجتناب، فحش اور بیہودہ گوئی سے پرہیز، نفاق سے دشمنی، فضول افسانوں، بیہودہ حکایتوں اور شہوانی اقوال سے کراہت طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ طبیعت میں پاکیزگی، خیالات میں راست بازی، ارادوں میں صلاحیت اور تمام اعمال میں خلوص نمودار ہو جاتا ہو جاتا ہے۔ یہ درجہ صدق کا ہوتا ہے۔ راہ حق میں جو شدائد بھی پیش آئیں اُن کی برداشت، ناجائز امور سے نفس میں رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ دماغ اور دل میں بے چینی پیدا کرنے والے اسباب کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کاہلی، سستی اور پژمردگی و افسردگی دور ہو کر حوصلہ کی بلندی و ہمت کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مرتبہ صبر کا ہوتا ہے۔ وہ بارگاہ الٰہی کی طرف جھک جاتا ہے، اُس کو عالم بالا سے اُنس ہو جاتا ہے، دنیا نظروں میں ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ غیبی قوت قاہرہ کے سامنے وہ سر نیاز جھکا دیتا ہے۔ عاجزی، فروتنی اور خوف الٰہی اُس کے دماغ اور بدن کے ذرہ ذرہ میں رچ جاتا ہے۔ یہ منصب خشوع کا ہوتا ہے۔ وہ حق اور علمبرداران حق کی امداد بوقت ضرورت کرتا ہے۔ محتاجوں کی حاجت روائی کرتا ہے۔ مسکینوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا اور پیاسوں کو پانی پلاتا ہے۔ طلبگاران حق کو تعلیم دیتا ہے۔ راہ حق ڈھونڈنے والوں کو راہ حق دکھاتا ہے۔ اہل جہاد کی مالی اور عملی ہمدردی کرتا اور جان و مال کی قربانی کرتا ہے۔ اہل و عیال، اقارب، احباب، اجانب غرض ہر طبقہ کی اُس کے درجہ کے موافق خبرگیری کرتا اور ہر ایک کے دُکھ کو بقدر امکان دور کرتا ہے۔ یہ مرتبہ تصدق کا ہے۔ زبان اور پیٹ کو حرام روزی بلکہ جہاں تک طاقت اجازت دیتی ہے حلال خوراک سے بھی بچاتا ہے۔ نگاہ اور تمام اعضا کو غیر محرم سے روکتا ہے اور عفت و حیا کو اختیار کرتا ہے۔ سال میں ایک ماہ تو لازمی طور پر ایسا کرتا ہے اور اس کے علاوہ بھی جتنی طاقت رکھتا ہے اس کی پابندی کرتا ہے۔ کبھی ہر مہینہ میں تین دن، کبھی ہر ہفتہ میں دو دن غرض اپنی قوت کے مطابق روزے رکھتا ہے یہ مرتبہ صوم کا ہے۔ وہ ہمیشہ حرام اور ناجائز شہوت رانی سے بچتا ہے۔ حلال تعلق کے علاوہ کبھی حرام کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا۔ یہ مرتبہ حفظ فروج یا عفت شہوانی کا ہوتا ہے۔ الغرض ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر پل وہ اللہ کے تصور، یاد اور ذکر کو اپنے دماغ، دل، زبان اور جسم کے رونگٹے رونگٹے پر مسلط کر لیتا ہے۔ اُٹھتا ہے تو خدا کی یاد میں، بیٹھتا ہے تو خدا کی یاد میں، لیٹتا ہے تو خدا کی یاد میں، چلتا یا رُکتا، دوڑتا یا ٹھہرتا، کھاتا یا پیتا، سوتا یا جاگتا ہے تو خدا کی یاد میں۔ اس کی شادی، زندگی اور زندگی کے سارے ایام اور ایام کے تمام ساعات اور لمحات یاد الٰہی سے خالی نہیں ہوتے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے خدا کے واسطے کرتا ہے، دوستی ہو کہ دشمنی، خوشی ہو یا رنج سب کچھ خدا کے لئے ہوتا ہے۔ ہر جگہ ہر وقت اور ہر چیز میں اس کو خدا کی کارفرمائی بلکہ خدا کا نور بلکہ خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔ یہ مرتبہ ذکر اللہ کا ہے۔ ان تمام مراتب میں سے ہر مرتبہ بجائے خود خوبی کا حامل ہے اور ہر وصف جزا کا مستحق بناتا بلکہ جزا دلواتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر نفاق کے ساتھ بھی ظاہر ارکان اسلام کی پابندی کی جائے تو کم از کم دنیا میں جان و مال کی حفاظت تو ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کے گروہ میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، لیکن حُسن کامل اسی شخص کو حاصل ہے جس میں تمام ترتیبی اوصاف اور تدریجی مراتب پائے جائیں۔ اسی لئے مسلم کے بعد مومن کو اور مومن کے بعد اہل احسان کو ذکر فرما کر اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ کہ اگرچہ حسب حیثیت اجر تو مسلم اور صرف مومن ہی کو ملتا ہے اور ملے گا، مگر اجر عظیم اسی کو ملے گا جو ہمہ صفات موصوف ہو کر اہل احسان کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ہماری بیان کردہ تفسیر پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور عام طور پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم مومن سے جدا مفہوم رکھتا ہے اور قانت، خاشع، صابر وغیرہ مومن کے علاوہ دوسرے اشخاص ہیں۔ یہ شبہ ہماری تفسیر سے دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عام پر خاص کا عطف اور عام کے ذکر کے بعد خاص کا ذکر عربی زبان میں عام طور پر رائج ہے۔ قرآن پاک میں بھی جابجا ایسا آیا ہے۔ تمام ملائکہ کے ذکر کے بعد خاص جبرئیل کو بصورت عطف ذکر کیا گیا ہے۔ پس اسی قاعدہ کے تحت اولاً مسلم مرد اور مسلم عورت کو پھر اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو پھر اہل احسان کو مع ان کی تمام صفات کے ترتیب وار بصورت عطف ذکر فرمایا اور چھوٹے درجہ کو بیان کرنے کے بعد اوپر کے درجہ کو ظاہر کیا۔ صرف ظاہری مسلم سے

کلام کو شروع کیا اور خصوصیات بڑھاتے بڑھاتے یا داِلہی کرنے والے پر کلام کو ختم کر دیا اور آخر میں تمام اوصاف کے حاملین کے لئے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا۔

وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قنوت کے معنی طاعت ہیں، لیکن اس جگہ قانت سے مراد وہ شخص ہے جو تعلقات غیر اللہ سے فارغ ہو کر دل کو امن و سکون کے ساتھ طاعتِ الٰہی میں اس طرح قائم رکھے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا بھی ہو اور اس کی رحمت کا امیدوار بھی ہو۔ صحابۂ کرام کو خطاب کرتے ہوئے ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے بعد ایمان اور ایمان کے بعد احسان کی پہلی سیڑھی پر چڑھنے کا حکم فقرہ مذکورہ میں دیا ہے۔

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ۔ صدق و صداقت کے معنی ہیں سچائی جس کے مقابلے میں کذب کا استعمال ہوتا ہے۔ صدق قولی بھی ہوتا ہے اور عملی بھی۔ اہلِ بلاغت کہتے ہیں کہ کلام اگر واقع کے مطابق ہو تو ایسے کلام کو سچا اور ایسے کلام کے قائل کو صادق کہتے ہیں۔ گویا اہلِ ادب کے عرف میں صدق کا تعلق صرف قول اور تلفظ سے ہوتا ہے اور واقع کے ساتھ مطابق ہونا ہی صداقت کے لئے کافی ہے۔ قائل کا اعتقاد کلام کے مطابق ہو یا نہ ہو، لیکن عرف شریعت میں خصوصاً آیت مذکورہ کے استعمال میں صدق کا مفہوم دوسرا لیا گیا ہے۔ اول تو کلام کے مطابق قائل کا عقیدہ بھی ہونا چاہئے۔ دوسرے کلام صحیح الاطلاق کے مطابق بھی ہو۔ پس اگر کوئی مشرک کہتا ہے کہ خدا ہیں یا خدا کا کوئی شریک ہے تو چونکہ اس کا کلام واقع کے مطابق اور صحیح نہیں ہے، اس لئے اس کو کاذب کہا جائے گا اسی طرح اگر کوئی منافق اوپرے دل سے خدا کو ایک کہے تو اگرچہ اس کا کلام صحیح ہوگا، مگر قائل کو صادق نہیں کہا جائے گا۔ نہ اس کو صادق کا درجہ حاصل ہوگا۔ لہٰذا عرف شریعت میں صدق کلام کے لئے اعتقاد قلبی اور صحت کلامی دونوں کی ضرورت ہے کیونکہ صدق کا حصر فقط قول ہی نہیں ہے بلکہ عمل میں بھی صدق وکذب ہوتا ہے۔ جو عمل واقع میں صحیح الاصول کے عقیدے کے موافق ہے اس کو صادق اور اس کے عامل کو بھی صادق کہا جائے گا اور جو عمل واقع میں بظاہر صحیح ہے، مگر اس کا عامل بغیر اعتقاد کے کرتا ہے تو ایسے شخص کو صادقین کے گروہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمام غیبت استہزاء، دروغ بافی، ریاکاری، نفاق، عہد شکنی، بد اخلاقی وغیرہ کذب کے اقسام ہیں اور اس کے خلاف وفائے وعدہ، تکمیل عہد، راست گفتاری راست کرداری، خلوص قلبی، نیت کی پاکیزگی، سچے علوم کی اشاعت وغیرہ وغیرہ انواع صدق ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے جس نے سچ بولا نجات پائی، جو جھوٹ بولا ہلاک ہوا۔ دوسری حدیث میں آیا ہے صدق نیکی کا راستہ ہے اور نیکی جنت کو پہنچاتی ہے۔ تم لوگ کذب سے ہوشیار رہو۔ کذب بدکاری کا راستہ ہے اور بدکاری جہنم میں پہنچاتی ہے۔ آدمی برابر سچ بولتا اور سچائی ہی کا قصد رکھتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کو صدیق لکھا جاتا ہے اور آدمی برابر جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ ہی کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اس کو کذاب لکھا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق و کذب میں نیت اور ارادہ کو دخل ہے۔ اگر نادانستہ بغیر ارادہ کے کوئی صحیح یا غلط کلام زبان سے نکل جائے تو ایسے آدمی کو صدیق یا کذاب نہیں کہا جاتا۔

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ۔ صبر دو طرح کا ہوتا ہے (۱) اوامر پر نفس کو قائم رکھنا۔ (۲) مناہی سے نفس کو روکنا۔ تعمیل اوامر کے راستے میں کتنی ہی دشواریاں پیش آئیں، لیکن سب کو خوشی خاطر بلندی حوصلے کے ساتھ برداشت کیا جائے اور ممنوعات کی طرف طبیعت کو کتنی ہی رغبت ہو اور کتنے ہی فوائد نظر آئیں، مگر ان سے نفس کی باز داشت کی جائے تو ایسے شخص کو صابر کہا جاتا ہے۔

وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ۔ خشوع کے معنی ہیں جھکنا، عاجزی اور فروتنی کرنا یعنی جن کے دل دماغ اور تمام اعضاء اللہ کے حکم کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور جن کا مرکز توجہ اور سبب اطمینان محض خدا کی ذات ہے۔

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ صدقہ دینے سے یہ مراد ہے کہ جو محتاج بے کس لوگ نادار ہیں اور ان کی کوئی کمائی نہیں ان کو مالدار آدمی اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دیں اور دینے کے بعد احسان نہ جتلائے نہ شکر گزاری کا خواستگار ہو نہ عوض کا طالب ہو اور اس طرح چھپا کر دے کہ گویا اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو ایسے صادق الایمان صدقہ دینے والے کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ جس روز اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اس روز اللہ اس کو اپنے سایہ میں لے لے گا۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ گناہوں کو صدقہ اس طرح مٹا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ ابن کثیر نے صدقہ کا حصر صرف مالی صدقہ میں کیا ہے۔ میرے نزدیک حصر کی کوئی وجہ نہیں۔ صدقہ مالی بھی ہوتا ہے علمی اور جسمانی بھی۔ پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں فرض اور نفل۔ آیت کا فقرہ مذکورہ تمام اقسام اور انواع کو محیط ہے۔ مالی

فرض صدقہ تو شرعی زکوٰۃ، فطر، عشر وغیرہ ہے اور نفل میں ہر قسم کی جائز مالی امداد داخل ہے، لیکن یاد رکھو کہ کبھی نفل صدقہ موقع اور وقت کے لحاظ سے فرض بھی ہو جاتا ہے۔ اگر اسلام پر کوئی نازک وقت آجائے اور شرعی خلافت اسلامیہ تباہ ہونے لگے تو اس وقت سب کچھ دے دینا فرض ہو جاتا ہے۔ مالی صدقہ کے علاوہ علمی صدقہ بھی ہوتا ہے۔ مسائل دین بتانے اور دریافت کرنے والوں کو سکھانے فرض ہیں۔ کسی دینی مسئلے کو پوچھنے والے سے چھپانا جائز نہیں بلکہ ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت فرض ہے۔ دینی اشاعت کی مختلف صورتیں اور تدریسی یا تقریری تعلیم قرآن کو علمی نوافل کے مسلک میں منسلک کیا جا سکتا ہے۔
تیسری قسم جسمانی صدقہ ہے اس میں بیماروں کی دوا، تیمارداری، ہر قسم کی خدمت، عیادت، غریبوں اور کمزوروں کی جسمانی مدد، کسی مستحق تک حق میں کلمۂ خیر زبان سے ادا کرنا، سفارش کر کے یا دباؤ ڈال کے مظلوم کا حق ظالم سے دلوانا وغیرہ، تمام صورتیں جسمانی صدقہ کی ہیں اور صدقہ مذکورہ سب کو شامل ہے۔
وَالصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ۔ صوم کے معنی ہیں طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانا پینا اور قربت کرنا چھوڑ دینا۔ رمضان کے پابندی کے روزے تو ہر حال واجب ہیں۔ ان کے علاوہ ہر ماہ میں ایام بیض کے خصوصاً اور عموماً جتنی طاقت ہو روزے رکھنے نوافل ہیں۔ یہ روزے تو وہ ہیں جو عرفی شرعی روزے ہیں، لیکن اہل قرب اور ارباب ولایت کے روزے اور ہی قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے لئے افطار کبھی نہیں ہوتا۔ وہ تمام جائز خواہشات سے بھی دست کش ہو جاتے ہیں جبکہ ما سوا اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے روکنے والی ہوں۔ یہ روزے اہل حال کے ہوتے ہیں۔
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ یعنی غیر محرم سے عفت رکھنے والے مرد اور عورتیں۔ بیبیاں اور ان کے شوہر اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح اپنی اپنی باندیوں سے اختلاط بھی چونکہ جائز ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ الخ۔ اس لئے حکم مذکور کا حصر صرف اُن لوگوں پر ہے جو بیبیوں اور اپنی باندیوں سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے اپنی عفت کو بچاتے ہیں۔
وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ۔ ذکر الٰہی کی تفصیل ہم شروع آیت کی تفسیر میں کر آئے ہیں۔ کثیر ذکر الٰہی کی کیا حد ہے؟ اس کی کوئی تشریح احادیث میں موجود نہیں۔ ذکر الٰہی کے متعلق چند اقوال و اعمال پر ہم اس جگہ روشنی ڈالنی چاہتے ہیں۔
ابو سعید خدریؓ نے فرمایا اگر مرد نے رات کو اپنی عورت کو جگایا اور دونوں نے دو رکعتیں پڑھیں تو اس رات میں ان دونوں کو کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والوں میں لکھا جائے گا (ابن ابی حاتم، ابو داؤد، نسائی و ابن ماجہ من حدیث ابی ہریرۃ) ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر درجہ والا کون ہوگا؟ فرمایا وہ بندے جو اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ لوگ راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ فرمایا اگر غازی کافروں اور مشرکوں کو اپنی تلوار سے اتنا مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون آلودہ ہو جائے تو اس سے بھی اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والا افضل ہے (احمد) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے حضور اقدس ﷺ مکہ کے راستہ پر چل رہے تھے جمدان میں پہنچے تو فرمایا یہ جمدان ہے آگے بڑھو اہل تفرید سبقت لے گئے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اہل تفرید کون ہیں؟ فرمایا وہ بندے جو اللہ کو بکثرت یاد کرتے ہیں۔ (رواہ احمد و مسلم) معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو ایسا عمل بتاؤں جو تمہارے سب اعمال سے افضل اور مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے اونچے درجہ والا ہے اور سونا چاندی خیرات کرنے سے بھی تمہارے لئے بہتر ہے اور اس جہاد سے بھی برتر ہے جس میں تم مشرکوں کو مارو اور مشرک تمہیں ماریں۔ صحابہ نے عرض کیا ضرور بتائیے ارشاد فرمایا وہ اللہ کی یاد ہے (احمد) معاذ بن انسؓ سے مروی ہے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کس غازی کو ثواب زیادہ ملتا ہے۔ فرمایا جو اللہ کی یاد زیادہ کرتا ہے۔ سائل نے عرض کیا روزے رکھنے والوں میں کس کو زیادہ ثواب ملتا ہے؟ فرمایا جو اللہ کی یاد زیادہ کرتا ہے۔ سائل نے نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ کے متعلق اسی طرح دریافت کیا اور حضورؐ نے یہی جواب دیا۔ یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا اس صورت میں تو جو لوگ اللہ کی یاد کثرت سے کرتے ہیں وہی سب بھلائی لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں تم نے سچ کہا (احمد) یاد الٰہی کی فضیلت میں بکثرت احادیث مروی ہیں جن کی تفصیل موجب تطویل ہے۔
اب تنقیح طلب یہ امر ہے کہ ذکر سے مراد زبانی یاد ہے یا قلبی یاد۔ لفظوں میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ زبانی یاد قلبی یاد سے افضل ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ایک شخص کو ہدایت فرمائی تھی کہ تیری زبان ذکر الٰہی سے تر رہے۔ اس کے علاوہ عرفی محاورہ میں بھی ذکر صرف زبانی یاد کو کہتے ہیں۔ قلبی یاد کو فکر کہا جاتا ہے ذکر نہیں کہا جاتا۔ لیکن [illegible] معنی میں ذکر قلبی بھی داخل ہے۔ کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ کی روایت میں ہے

کہ حضور ہر وقت یادِ الٰہی کرتے تھے (یذکر اللہ علی کل احیانہ) تو ظاہر ہے کہ رفعِ حاجت یا قربتِ منفی کے وقت زبانی یاد نہیں ہو سکتی۔ پھر دنیا میں گوناگوں مشاغل ہیں۔ کلام، سلام، طعام اور قعود و قیام سب ہی کام ہیں۔ زبانی یاد کیسے ممکن ہے، اس لئے امام بخاری نے ام المومنین کے کلام میں ذکر سے قلبی ذکر مراد لیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ لیکن قلبی ذکر ہر وقت زبانی یاد سے مستغنی نہیں بنا سکتا۔ بلکہ مجبوری کے وقت صرف قلبی ذکر کافی ہوگا اور بغیر مجبوری کے زبانی یاد ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ یعنی تمام صفات مذکورہ کے جو لوگ حامل ہیں ان کے لئے اللہ نے دوہرا ثواب مقرر فرما دیا ہے۔ ایک تو ان کے گناہوں کی عمومی معافی۔ دوسرے ان کے اعمال کا اجرِ عظیم۔ گویا وہ بغیر سزا کے جزا پائیں گے اور جزا بھی عظیم الشان جزا۔

مقصودِ بیان: مسلم ظاہری کا درجہ مومن حقیقی سے کم ہے۔ یعنی ظاہری ارکانِ اسلام کی پابندی سے مسلم کا اطلاق ہو جائے گا، مگر عند اللہ اس وقت تک مسلم نہ ہوگا جب تک دل میں ایمان نہ ہو۔ سہل نے فرمایا اسلام سے ایمان افضل ہے۔ ایمان سے ایمان مع التقویٰ بہتر ہے اور ایمانی تقویٰ میں درجۂ یقین بلند ہے اور مراتبِ یقین میں صدق برتر ہے۔ یہ بھی شیخ سہل نے فرمایا احکام کی اتباع اسلام ہے اور اصل بنیاد ایمان ہے اور درجۂ احسان اس کا ثمرہ ہے خلاصہ ایمان اگرچہ گوناگوں ہیں مگر مندرجۂ ذیل خصائل سب کے اصول ہیں۔ قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، صوم، عفت۔ ذکرِ الٰہی لفظ قنوت وغیرہ کا مدعا پیرایۂ بیان میں تذکرہ تعلیم دے رہا ہے کہ طاعتِ الٰہی میں مومن کے دل کو سکون، روح کو اطمینان، رحمت کی امید اور عذاب کا خوف ہونا چاہیئے۔ قولی اور عملی صداقت لازم ہے، نفاق، ریاکاری اور کذب ممنوع ہے، راہِ حق میں شدائد پر صبر رکھنا اور ممنوعات سے نفس کو روکنا ضروری ہے حکمِ الٰہی کے سامنے عجز و انکسار اور فرمان پذیری میں فروتنی کرنی شعارِ ایمان ہے۔ علمی، مالی اور جسمانی تصدق واجب ہے۔ مسائلِ دین کی تلقین، ارشاد و ہدایت، زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی، کارِ خیر کا اجراء، بیماروں کی تیمارداری، بیکسوں اور مجبوروں کی خدمت لازم ہے۔ پیٹ، شرمگاہ اور زبان کا روزہ اور عصمت کی حفاظت فرض ہے اور ان تمام امور کا سرچشمہ نیز آخری نتیجہ ذکرِ الٰہی ہے جس کی کثرت پختگی ایمان کی علامت ہے۔ پوری آیت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا تذکرہ بتا رہا ہے کہ اللہ کی فرمان پذیری اور خصائلِ حمیدہ کا حصول ہر صنف پر واجب ہے۔ الحاصل افکار و خیالات کی نظافت، اخلاق کی نفاست و شستگی، معاشرت کی خوبی، مذہب کی صلاحیت اور عام انسانی زندگی کی پاکیزگی آیت مذکورہ کا لبِ لباب ہے۔ اب کہاں ہیں اسلامی تعلیم پر اعتراض کرنے والے وہ ذرا اس آیت پر غور کریں، اور اصول مذکورہ کی تمام شاخوں کو سمجھیں اور خود انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں کہ انسانیت کو سدھارنے کے لئے اسلام سے بہتر کون مذہب ہو سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ

جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو کسی مومن مرد و عورت کو یہ سزاوار نہیں کہ ان کو اپنے کام میں خود اختیار

اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ

ہو اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (یاد کرو اے محمد) جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا

پر اللہ نے فضل کیا تھا اور تم نے بھی اس کو نعمت دی تھی کہ اپنی بی بی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جس کو

اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا

اللہ ظاہر کرنے والا تھا تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پس جب زید نے اس عورت سے اپنی حاجت

وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ

پوری کرلی تو ہم نے اُس سے تمہارا نکاح کردیا تاکہ اپنے منہ بولے بیٹوں سے نکاح کرنے میں مسلمانوں پر تنگی نہ ہو

اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

بشرطیکہ وہ اپنی حاجت پوری کرچکیں اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہتا ہے

تفسیر حکیم افلاطون سے کسی شاگرد نے انسان کی تعریف پوچھی۔ افلاطون نے جواب دیا۔ انسان دوپایہ جانور ہے جس کے پر نہیں ہوتے۔ حکیم دیوجانس کلبی کو افلاطون کے اس قول کی اطلاع ملی۔ تعجب کیا اور ایک مرغ لے کر اُس کے بال و پر نوچ کر، کپڑے میں چھپا کر افلاطون کے حلقہ درس کی طرف چل دیا۔ افلاطون پڑھا رہا تھا۔ دیوجانس نے سب کے سامنے کپڑے میں سے مرغ کو نکال کر وسط حلقہ میں چھوڑ دیا اور کہا یہ افلاطون کا بتایا ہوا انسان ہے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ بھی دوپایہ جانور ہے جس کے پر نہیں ہیں۔ حکیم سقراط نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جو دیوی کی نذر مانی تھی اس کو ضرور پورا کیا جائے۔ ایسی ضعیف الاعتقادی اور قولی غلطی ایسے عظیم الشان فلاسفروں سے کیوں ہوتی ہے صرف اس لئے کہ ان کے تمام علوم اکتسابی، تحصیلی، فکری اور دماغی زائیدہ ہوتے ہیں۔ وحی، کشف اور الہام کو ان میں دخل نہیں ہوتا۔ سوچنے، غور کرنے اور مقدمات کو مرتب کرنے کے نتائج نکالنے میں غلطی ہو جاتی یقینی چیز ہے۔ البتہ آسمانی، الٰہی اور الہامی علوم میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ انتہائی عملی اور فکری ریاضت کرنے کے بعد بھی غلطی سے بچاؤ ناممکن ہے۔ جب تک نفس انسانی کے اندر فطرۃً کوئی جوہر ایسا نہ ہو جو فکر و عمل کی غلطی سے بچانے والا نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ علوم صحیحہ اور معارف حقہ سے روکنے والا اور عقل کے کام میں وہم کی مداخلت کرنے والا کوئی نہ کوئی غیر محسوس سبب ضرور ہوتا ہے یا فکر صحیح نہیں ہوتی یا نفس کی توجہ منزل مقصود سے ہٹ کر کسی دوسری طرف ہو جاتی ہے یا جسمانی خواہشات میں انہماک زیادہ ہوتا ہے یا بدنی ریاضت اُس قدر بڑھ جاتی ہے کہ صحیح مراقبہ کا وقت ہی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ہیں جو نفس کو صحیح علوم سے روکتے ہیں، لیکن انبیاء اور مرسلین کے نفوس قدسیہ اپنی جوہریت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں کے نفوس سے ممتاز ہوتے ہیں اور خلقی طور پر وہ عملی اور فکری غلطی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ان کو جو علوم حاصل ہوتے ہیں وہ بغیر فکر و نظر کے محض فیضان الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کو اشیاء کی تحلیل تجزیہ یا ترکیب و جمع کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ گویا ان کے لئے علوم نظریہ بھی بدیہی علوم کی طرح ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معلومات اور ان کے لائے ہوئے قوانین میں غلطی نہیں ہوتی۔ حکماء، عقلاء اور فلاسفروں کے علوم میں تو اختلاف بھی ہوتا ہے، فکر و نظر کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ سوچنے، سمجھنے اور جاننے کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ وہ تاریکی میں تیر چلاتے ہیں یا یوں سمجھو کہ کسی تاریک کمرہ میں ایک ہاتھی کو بند کر دیا جائے اور وہاں کچھ اندھوں کو داخل کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ اندر جا کر معلوم کرو کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ سب اندر جا کر ہاتھوں سے ٹٹول کر ہاتھی کی ساخت اور جسمانیت اور شکل معلوم کریں۔ کوئی جا کر پاؤں کو پکڑے کوئی سونڈ کو کوئی کان کو کوئی پیٹ پر ہاتھ پھیرے اور کوئی دُم پر۔ غرض یہ سارا گروہ جب باہر نکلے گا تو ہاتھی کی شکل جدا جدا بیان کرے گا اور واقع میں کسی کا بیان بالکل صحیح نہ ہوگا، لیکن جب آنکھوں والا اندر جا کر ہاتھی کو دیکھے گا اور پھر باہر آکر اس کی تصویر کشی کرے گا تو وہ بالکل صحیح ہوگی۔ بس یہی حالت خود ساختہ اور دماغی زائیدہ علوم کے حاملوں کی ہے جو اندھوں کی طرح حقائق کی تصویر کشی کرتے ہیں، مگر انبیاء اور مرسلین آنکھوں والے ہوتے ہیں وہ خود دیکھ کر آتے ہیں، اس لئے ان کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط غلطی سے پاک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیم کے خلاف کسی کو اپنی رائے پر چلنے کا کوئی حق بھی نہیں۔ خواہ اس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنی رائے کے کتنے ہی فوائد اور منافع محسوس ہوتے ہوں۔ بیمار کی رائے کیا اعتبار۔ مسیح کی تجویز اور تشخیص اگرچہ بظاہر ناگوار اور غیر مفید معلوم ہوتی ہو، مگر وہ حق ہوتی ہے۔ وہ سر کے درد کا علاج معدہ کی اصلاح کرکے کرتا ہے بیوقوف یہ سمجھتا ہے کہ درد سر میں ہے اور علاج پیٹ کا کیا جاتا ہے یہ کیسی اُلٹی تدبیر ہے۔ پس جب اللہ کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دے جو در حقیقت اللہ کا ہی فیصلہ ہوتا ہے تو پھر کسی بے وقوف یا دانش مند عورت یا مرد کو اس کے خلاف کرنے کا حق نہیں رہتا۔ بشرطیکہ وہ نبی کو نبی اور الہامی علوم کا حامل سمجھتا ہو اور یقین کرتا ہو کہ نبی کو جو حقائق امور کی معرفت ہے وہ غلطی سے پاک ہے۔

نبی کا کام فقط یہی نہیں ہوتا کہ وہ مبدء و معاد کے متعلق فکری اور اعتقادی غلطی سے لوگوں کو بچائے اور قبل الخلقت یا بعد الموت واقعات کی صحیح تعلیم دے۔ بلکہ اس کا خاص کام یہ ہوتا ہے کہ وہ عمرانِ بشری اور انسان کی موجودہ حیات کو سنوارنے والے قواعد کی بھی تعلیم دے اور تمام امور کو دنیا سے نابود کر دے جو تباہی انگیز اور ہلاکت خیز ہوں۔ اسی بنا پر قومی تعامل ملکی رسوم اور قبائلی رواج کی اصلاح بھی اُس کے فرائض کی اوّلین منزل قرار پائی۔ وہ امور جن پر عمل کرنا پشت در پشت سے انسانی آبادی کے لئے باعثِ فخر بنا ہوا تھا اور ان کے خلاف کرنے کا تصور بھی کسی کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور واقع میں وہ افراط یا تفریط کے حامل اور راہِ اعتدال سے بالکل منحرف تھے۔ اُن کی اصلاح اختیار نہ کی، کسی رواج کو تو یک دم ختم کر دیا اور کسی کی اصلاح ایک خاص حد تک کی۔ اُس کا اصل وجود تو برقرار رکھا اور جو افراط و تفریط لوگوں نے قائم کر دی گئی تھی اس کو دور کر دیا اور چونکہ ایسے رواجوں کو یک قلم مٹا دینا یا اُن کی صورتوں کو مسخ کر دینا جو قبائل و افراد کی گھٹی میں پڑے ہوں معمولی تبلیغ و تلقین سے ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے انبیاء نے سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا اور خود اپنی ذات سے اس کا آغاز کیا۔ چنانچہ حضور اقدس نے بھی ایسا کیا۔ سینکڑوں برس سے عرب کا رواج تھا کہ بنایا ہوا بیٹا تمام احکام میں صلبی بیٹے کی طرح مانا جاتا تھا اور اس کی بیوی حرمت میں اصل بیٹے کی بیوی کی طرح قرار دی جاتی تھی۔ حضورؐ نے اس کے خلاف تعلیم دی۔ بیٹا بنانے کے دستور کو تو برقرار رکھا، لیکن احکام میں فرق کر دیا۔ خود حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا اور کفار کے رواج کی بالکل پرواہ نہ کی۔

تحلیل اجزاء وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ ان آیات کے نزول کے متعلق مختلف علماء نے مختلف واقعات نقل کئے ہیں:-

(۱) عقبہ بن ابی معیط ایک قریشی سردار اور سخت کافر تھا، لیکن اس کی لڑکی اُمِ کلثوم مخلص مومنہ تھی۔ ۷ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد عورتوں میں سب سے پہلے ہجرت کر کے اور مکہ سے بھاگ کر اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اُمِ کلثوم مدینہ میں آگئیں اور اپنے نفس کے اختیارات حضورؐ کو ہبہ کر دیئے۔ سرکارِ عالی نے زید بن حارثہ سے اُن کا نکاح کرا دینا چاہا، لیکن اُمِ کلثوم اور ان کے بھائی نے اس بات کو پسند نہیں کیا کیونکہ زید حضور والا کے آزاد کردہ غلام تھے اور اُمِ کلثوم ایک قریشی النسل سردار کی بیٹی۔ اس پر بروایت عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم آیت وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ الخ۔ نازل ہوئی۔ عبد الرحمٰن نے فرمایا آیت کا نزول تو خاص اُمِ کلثوم کے واقعہ کے متعلق ہوا، لیکن بعد کو حکم عمومی ہو گیا۔

(۲) امام احمد نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا اور مسلم و نسائی نے بھی اسی روایت کا کچھ حصہ نقل کیا ہے کہ جلیبیب ایک مخلص مومن تھے۔ اُن کے نکاح کے لئے ایک انصاری کی لڑکی کو حضورؐ نے انتخاب فرمایا .... اور انصاری سے فرمایا تم اپنی لڑکی مجھے دے دو۔ انصاری نے عرض کیا بہت خوب چشم ما روشن دل ما شاد۔ یہ میری عزت افزائی ہے۔ ارشاد فرمایا میں اپنے لئے نہیں چاہتا جلیبیب کے لئے چاہتا ہوں۔ انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس کی ماں سے مشورہ کر لوں۔ پھر جا کر اپنی بیوی سے کہا رسول اللہ تیری لڑکی مانگتے ہیں۔ بیوی نے کہا اس جلیبیب کیلئے ابھی جلیبیب کیلئے۔ واللہ ہم اس کو نہیں دیں گے۔ لڑکی پس پردہ یہ گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے کہا پیغام کہاں سے آیا ہے۔ ماں نے بیان کیا۔ لڑکی نے کہا۔ تم دونوں چاہتے ہو کہ حضور کا پیام رد کر دو۔ ایسا نہ کرو مجھے حضورؐ کے سپرد کر دو۔ سرکار عالی مجھے ضائع نہیں فرمائیں گے۔ جب حضور کو پسند ہے تو تم بھی حسب الحکم نکاح کر دو۔ انس نے فرمایا اس لڑکی نے گویا اپنے والدین کی مشکل حل کر دی۔ والدین بولے بے شک یہ لڑکی سچ کہتی ہے۔ اس کے بعد انصاری نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر اظہارِ رضامندی کر دیا۔ اور جلیبیب کے ساتھ لڑکی کا نکاح کر دیا۔ حافظ ابو عمر بن عبد البر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ اسی واقعہ کے متعلق آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

حضرت انسؓ نے فرمایا پھر ایک جہاد میں حضور کی معیت میں جلیبیب شریک ہوئے۔ فتح کے بعد حضورؐ والا نے صحابہ سے فرمایا دیکھو تم میں کون کون مفقود ہے صحابہ نے عرض کیا حضور فلاں گم ہے فلاں گم ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا دیکھو ان کے علاوہ بھی کوئی مفقود ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اور تو کوئی مفقود نہیں ہے۔ فرمایا تم کو اور کوئی گم نہیں نظر آتا اور میں جلیبیب کو ڈھونڈتا ہوں۔ جاؤ لاشوں میں تلاش کرو۔ چنانچہ میدان کارزار میں ڈھونڈا گیا تو سات کافروں کی لاشوں کی برابر جلیبیب کا جنازہ ملا۔ صحابہ نے عرض کیا حضور ان سات کافروں کو جلیبیب نے قتل کیا اور پھر شہید ہو گئے۔ حضور تشریف لا کر جلیبیب کے سرہانے کھڑے ہو گئے اور فرمایا اس نے سات کافروں کو مارا پھر کافروں نے اس کو شہید کر دیا۔ پھر دو یا تین مرتبہ فرمایا یہ میرا اور میں اس کا۔ اس کے بعد جلیبیب کو اپنے مبارک بازوؤں پر اٹھا لیا۔ حضور کے بازوؤں کے علاوہ جلیبیب کے لئے اور کوئی تختہ تابوت نہ تھا۔ پھر گڑھا کھودا گیا اور حضورؐ نے جنازے کو اپنے بازوؤں سے قبر میں اتار دیا۔

تقریباً ایک سال حضرت زینب حضرت زید کے نکاح میں رہیں، لیکن زینب تند مزاج تھیں، اس لئے زید نے ایک روز حاضر ہو کر حضور گرامی سے زینب کی شکایات کی۔ حضور سمجھاتے رہے (ابن کثیر) امام ابوبکر بزار کی روایت سے ثابت ہے کہ ایک روز حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ مسجد میں تشریف لائے اور اسامہ بن زید سے کہا ہمارے لئے اجازت طلب کرو۔ اسامہ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا عباسؓ اور علیؓ حاضر ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تم جانتے ہو کہ ان کے آنے کی کیا غرض ہے؟ اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے معلوم نہیں۔ فرمایا مجھے معلوم ہے۔ پھر آپ نے بلا لیا (یا) اجازت دے دی۔ دونوں بزرگوں نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! ہم چاہتے ہیں کہ حضور ہم کو اتنا بتا دیں کہ اہل میں سے سب سے زیادہ محبت حضور کو کس سے ہے؟ فرمایا فاطمہ بنت محمد کو میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم فاطمہ کے متعلق نہیں عرض کرنا چاہتے۔ فرمایا تو پھر اسامہ بن زید کو۔ یہ زید وہ ہے جس پر اللہ نے اور میں نے احسان کیا۔ اللہ کا احسان جو زید پر تھا وہ تو ظاہر ہی ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائی گئی اور حضور کا احسان گونا گوں تھا۔ آزاد کیا، بیٹوں کی طرح پرورش کیا۔ اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی لڑکی زینب سے نکاح کرایا اور خود ہی مہر ادا کیا وغیرہ۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ ایک روز حضور اقدس زید کے گھر میں تشریف لے گئے۔ گھر کے اندر اچانک زینب کو کھڑی ہوئی دیکھا۔ زینب کا رنگ گورا اور قد و قامت موزوں تھا۔ دیکھتے ہی فرمایا سبحان اللہ مقلب القلوب۔ زینب نے عرض کیا یا رسول اللہ تشریف لائیے، مگر حضور واپس ہو گئے۔ اتنے میں زید گھر میں آئے تو زینب نے ان سے واقعہ کا تذکرہ کیا۔ زید کچھ سمجھ گئے اور اسی وقت سے زینب کی طرف سے دل ہٹا لیا اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ حضورؐ نے فرمایا کیا وجہ ہے؟ کون سی بات تم کو ناگوار گزرتی ہے؟ زید نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ویسے تو میں نے ان کی طرف سے ہر طرح سے بھلائی ہی دیکھی، مگر بات صرف اتنی ہے کہ وہ شرف نسب کی وجہ سے گھمنڈ کرتی ہیں اور اپنی زبان سے مجھے ایذا دیتی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ اس آیت کی تشریح میں ابو جریر اور ابن ابی حاتم نے عجیب بے سر و پا روایات لکھی ہیں۔ جو بقول ابن کثیر ضعیف راویوں سے بھری ہوئی ہیں اور بالکل غلط ہیں اور انہی ضعیف روایات کو لے کر معاندین اسلام کو نکتہ چینی اور خورده گیری کا موقع ملا ہے۔ امام احمد نے بھی حضرت انس کے حوالے سے ایک روایت اسی قسم کی لکھی ہے جو بالکل غریب منکر ہے۔ اللہ رحم فرمائے ہمارے مفسرین پر جنہوں نے اس موقع پر روایات پر تنقیدی نظر ڈالی نہ درایت کو دخل دیا نہ یہ خیال کیا کہ ان روایات سے ایک دھبہ حضور والا کی پاک زندگی پر لگتا ہے۔ صحیح روایت سے جس کو امام بخاری نے بحوالہ انس بن مالک لکھا ہے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول زینب بنت جحش اور زید ہی کے حق میں ہوا اور بس۔

آیت کا صحیح مطلب وہ ہے جس کو امام زین العابدین نے فرمایا ہے اور ابن ابی حاتم نے اس کو روایت کیا ہے اور رجال روایت بھی سب ثقہ ہیں۔ علی بن زید بن جدعان کہتے ہیں مجھ سے علی بن حسین (امام زین العابدین) نے فرمایا آیت وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ الخ کی تفسیر حسن بصری نے کیا بیان کی ہے؟ میں نے حسن بصری سے جو کچھ سنا تھا بیان کر دیا۔ امام نے فرمایا یہ تفسیر نہیں ہے بلکہ بات یہ تھی کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ ہم زینب بنت جحش کو تیری ازواج میں داخل کریں گے (اور حضورؐ نے اس وحی کا تذکرہ لوگوں سے نہیں کیا کیونکہ زینب اس وقت زید کے عقد میں تھیں اور زید کی پرورش حضورؐ نے ہی کی تھی اور خود ہی نکاح کرایا تھا، اس لئے یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اگر اس کی اطلاع لوگوں کو ہو گی تو وہ کہیں گے کہ پہلے ہی سے زینب سے نکاح خود کیوں نہ کر لیا۔ زید کے عقد میں دینے کی ضرورت ہی کیا تھی) پھر جب زید نے زینب کی شکایت حضورؐ سے کی تو ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو علیحدہ نہ کر۔ پس اللہ نے آگاہ کر دیا کہ ہم نے تم کو اطلاع دے دی تھی کہ زینب عنقریب تمہاری بیوی ہو گی، مگر تم نے اس بات کو ظاہر نہ کیا جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ تم نے لوگوں کا خوف کیا، حالانکہ اللہ ہی کا خوف کرنا چاہیے تھا۔

ابن ابی حاتم نے کہا سدی سے بھی اس کی تائیدی روایت منقول ہے۔

تنقیح مبحث

مؤلف فتح البیان نے تفسیر قرطبی کا خلاصہ اس جگہ اس طرح لکھا ہے کہ محققین اہل تفسیر نے مثلاً زہری، قاضی ابوبکر قشیری اور قاضی ابوبکر بن عربی وغیرہم نے آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ قتادہ اور ابن زید اور ابن جریر وغیرہ علماء کی روایتوں سے ثابت ہے کہ جس زمانے میں زینب زید کے عقد میں تھیں، اتفاقاً رسول اللہ نے زینب کو دیکھ کر پسند فرمایا اور چاہا کہ اگر زید طلاق دے دیں تو خود ان سے نکاح کر لیں۔

پھر جب زید نے زینب کی شکایت کی تو حضورؐ نے فرمایا اللہ سے ڈر اور نکاح سے خارج نہ کر اور یہ بات آپ نے دل میں مخفی رکھی کہ زید طلاق دے دے تو میں نکاح کر لوں۔ آیات کا یہ مطلب چند وجوہ سے غلط ہے۔

۱۔ زینب حضورؐ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں۔ سینکڑوں مرتبہ نکاح سے پہلے دیکھا ہوگا، لیکن کبھی پسند نہیں کیا۔ اگر پسند کیا ہوتا تو زید سے نکاح کیوں کراتے خود کیوں نہ کر لیتے، اس لئے یہ بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ سینکڑوں مرتبہ دیکھی ہوئی عورت کو آخر مرتبہ صرف ایک مرتبہ دیکھنے سے ایسی محبت دل میں جم گئی کہ طلاق دلوا کر نکاح کر لینے کا ارادہ کر لیا۔

۲۔ آیت میں صراحۃً ارشاد ہے کہ جو چیز اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس کو آپ نے چھپا رکھا تھا۔ اس سے صاف یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس بات کو حضورؐ نے چھپا رکھا تھا اس کا تذکرہ بعد کو خدا تعالیٰ نے کر دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ نے کس بات کا تذکرہ فرمایا۔ آیات میں تو صرف اتنی صراحت ہے کہ جب زید نے زینب سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کو تمہارے عقد میں دے دیا تاکہ اہلِ ایمان کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیبیوں سے نکاح کرنے میں کوئی دشواری اور تنگی نہ رہے۔ ان آیات میں تو کہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کہ رسول نے زینب کی محبت دل میں چھپا رکھی تھی اور چاہا تھا کہ زید اس کو طلاق دیدیں تو خود نکاح کر لیں۔ پس جب خدا نے باوجود وعدۂ اظہار کے اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا تو چونکہ خدا تعالیٰ کا وعدہ دروغ نہیں ہو سکتا، اس لئے اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ حضورؐ نے زید کی طلاق اور اپنے نکاح کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔

۳۔ اگر حضورؐ کا یہ ارادہ تھا کہ زید طلاق دے دیں اور خود نکاح کر لیں تو پھر زید کو اللہ سے ڈرنے اور بیوی کو طلاق نہ دینے کی نصیحت کیوں کی تھی؟ کیا دل میں کچھ اور تھا اور نصیحت اس کے خلاف کی۔ یہ حرکت تو منافقانہ ہے اور کوئی مسلمان حضورؐ کی طرف نفاق کی نسبت نہیں کر سکتا۔ پس صحیح تفسیر وہی ہے جو امام زین العابدین سے مروی ہے۔ خطیب اور کرخی نے بھی اسی تفسیر پر وثوق کا اظہار کیا ہے۔

بعض متقدمین ابن عباس کا قول پیش کرتے ہیں کہ حضورؐ کے دل میں زینب کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ ابن کثیر نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ روایت ناقابلِ اعتماد ہے۔ اس کے راوی غیر معتبر ہیں۔ محی السنہ نے معالم میں لکھا ہے کہ اگر روایت صحیح بھی مان لی جائے تب بھی اس میں کوئی عیب نہیں۔ کیونکہ محبت غیر اختیاری چیز ہے۔ خازن نے اس جواب کو پسند کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبت اور قلبی میلان پر تو کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے، لیکن محبت کے یہ معنی بھی نہیں کہ زنا کی محبت ہو یا زید سے طلاق دلوا کر خود نکاح کر لینے کی محبت ہو۔ آدمی کو اپنی ماں، اپنی بہن، اپنی بیٹی، اپنے بیٹے کی بیوی اور دوسری رشتہ دار عورتوں سے نفرت بھی ہوتی ہے البتہ محبت بھی۔ محبت صرف عشق کا نام تو نہیں ہے۔ بندہ اللہ سے بھی محبت کرتا ہے اور اللہ بندے سے بھی۔ بلکہ حضورؐ کو تو تمام امت کے مردوں عورتوں اور بچوں سے بھی محبت تھی تو کیا یہ تمام محبت محبتِ نکاح تھی۔ اس قسم کی بات تو دیوانہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ:

جب خدا تعالیٰ نے آیت مَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ الخ سے کفر و شرک کی رسم کو مٹا دیا تو اس تعلیم کو فقط نظری تعلیم ہی نہ رکھا بلکہ زید کی بیوی سے نکاح کرا کے عملی طور پر منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور حلت قولی کو حلت فعلی سے مؤکد کر دیا۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا۔ یعنی جب زید نے زینب کو طلاق دے دی تو ہم نے ان کا عقد تمہارے ساتھ کر دیا۔ اس جگہ اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اس تزویج کی ولایت اللہ نے خود کر لی۔ زینب کی طرف سے خود ولی ہو گیا اور بغیر عقد و مہر اور بدون گواہ کے زینب کو حضورؐ کی بیوی بنا دیا۔ میرے نزدیک اس تفسیر کی بنا محض اس خیال پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے زینب کی تزویج کی خود صراحت فرمائی ہے، مگر اس سے عقد مہر اور گواہ کی نفی کا استنباط صحیح نہیں۔ اس عقد کا تذکرہ تو صرف زینب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کیا ہے اور اس احسان کا ذکر فرمایا ہے جو زینب پر کیا تھا۔ وہ نہ صرف عقد بلکہ ہر کام بفضلِ الٰہی ہوتا ہے، لیکن اس سے ظاہری اسباب کی نفی تو نہیں سمجھی جاتی اور نہ ظاہری لوازم و شرائط کو غیر ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے زینب کو باضابطہ پیام بھیجا تھا۔ امام احمد نے حضرت انس کی روایت سے لکھا ہے کہ جب زینب کی عدت پوری ہو چکی تو حضورؐ نے زید بن حارثہ کو ہی حکم دیا کہ جا کر زینب کو میرا پیام نکاح پہنچاؤ۔ حسب الحکم زید گئے۔ زینب اس وقت آٹا گوندھ رہی تھیں۔ زید نے زینب کو دیکھا تو ان پر زینب کی ایسی عظمت چھائی کہ نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ فوراً دروازہ کی طرف کو منہ کر کے اور زینب کی طرف پشت موڑ کے پیام ادا کیا اور کہا زینب تم کو بشارت ہو کہ رسول اللہؐ نے اپنے واسطے تم کو پیام دیا ہے۔ زینب نے کہا جب تک میں اپنے رب سے مشورہ نہ پا لوں گی کوئی کام نہیں کروں گی۔ یہ کہہ

جائے نماز پر گئیں اور نماز کو کھڑی ہو گئیں۔ اُدھر آیت کا نزول ہو گیا۔

عام اہلِ تفسیر کے مذکورہ بالا خیال کا اصلی باعث مندرجہ ذیل روایات کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۱) حضرت انس سے مروی ہے کہ حضرت زینب دوسری ازواج مطہرات پر فخر کرتی تھیں اور فرماتی تھیں تمہارا تو تمہارے آدمیوں نے حضور والا سے نکاح کرایا ہے اور میرا عقد سات آسمانوں کے اوپر اللہ نے کر دیا ہے (بخاری)

(۲) حضرت زینب فرماتی تھیں مجھے حضور کی وجہ سے تین شرف حاصل ہیں جو کسی دوسری بیوی کو حاصل نہیں ہیں۔ میں اور حضور ایک ہی دادا (عبدالمطلب) کی اولاد ہیں۔ مجھے اللہ نے حضور کے عقد میں دیا ہے۔ میرے معاملے میں درمیانی شخص جبرئیل ہیں۔ کذا قال الشعبی (ابن جریر)

مگر ان دونوں روایتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے ظاہری عقد اور مہر کی نفی معلوم ہوتی ہو۔ صرف تزویج سماوی کا تذکرہ ہے جو حضرت زینب کے شرف کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ واللہ اعلم۔

لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ یہ وہ اصلی غرض اور حکمت ہے جس کی تکمیل کی غرض سے حضرت زینب کو ازواج مطہرات میں داخل کیا گیا۔ اسلام سے قبل عرب میں تبنی کرنے کا دستور تھا۔ وہ منہ بولے بیٹے کو اصل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے اصلی باپ کا نام لینا چھوڑ دیتے تھے اور بنے ہوئے باپ کی طرف منسوب کرتے تھے اس کی بیوی سے مصنوعی باپ کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کو میراث ملتی تھی، لیکن تصنع بے حقیقت نہیں بدل سکتی اور اسلام حقائق پر مبنی ہے، اس لئے اس نے اس قلب حقیقت سے روک دیا۔ زید بن محمد کی جگہ زید بن حارثہ کہنے کا حکم دیا اور زید کی بیوی سے حضور کو عقد کرنے کا حکم دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانے میں دوسرے مسلمان بھی تھے جنہوں نے اسلام سے پہلے مختلف لڑکوں کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کے لئے بھی حضور کا عمل اور قرآن کا قانون شمع ہدایت بن گیا اور ان کے لئے بھی اجازت ہو گئی کہ اگر ان کے بنائے ہوئے بیٹے اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں اور عدت پوری ہو جائے تو وہ ان عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔

اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں المؤمنین کا لفظ عام ہے۔ حضور کے زمانے کے اہلِ ایمان کو بھی شامل ہے اور قیامت کے دن تک تمام مسلمان بھی اس میں شامل ہیں۔ سب کے لئے عمومی اجازت ہے۔ اس سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ بیٹا بنانے کے دستور کی ممانعت اسلام نے نہیں کی۔ منہ بولا بیٹا بنانا قیامت تک تمام اہلِ ایمان کے لئے جائز ہے۔ البتہ حقیقی بیٹے کا حکم دینا ناجائز ہے۔ نسب کے بیان وقت حقیقی باپ کی طرف متبنیٰ کی نسبت کی جائے گی۔ اس کو فرضی باپ کے ترکہ میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ اس کی بیوی سے فرضی باپ کا نکاح صحیح ہے وغیرہ۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا۔ یعنی اللہ کا حکم اور ارادہ تو پورا ہو کر رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ ظاہر میں اگر اسباب نہ ہوں اور بظاہر کام ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہو مگر مشیتِ الٰہی اور امرِ خداوندی ضرور پورا ہوتا ہے۔ غیب سے مشیت کے مطابق سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زینب کی طرح حسین جمیل عورت سے زید کے دل میں نفرت پیدا کرنا اور ان سے طلاق دلوانا اور پھر رسول پاک سے زینب کا عقد کرانا یہ سب کچھ بامرِ الٰہی ہوا اور مشیتِ الٰہی پوری ہو کر رہی۔

مقصودِ بیان

قرآنی آیت یا صراحتِ رسول کے بعد کسی مومن کو اپنی رائے پر چلنا حق کے خلاف ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ قیاس اور تقلید حرام ہے قیاس تو آیت وحدیث کی توضیح کے لئے کیا جاتا ہے اور تقلید بھی خدا اور رسول کے احکام سے ناواقف ہونے کی بنا پر ضروری قرار دی جاتی ہے۔ جو شریعت کا کماحقہ علم رکھتے ہیں، آیاتِ قرآنی سے واقف ہیں اور احادیث کے رواۃ کو کامل طور پر جانتے ہیں اور جرح و تعدیل کر سکتے ہیں اور تعارض، نسخ، تقدیم و تاخیرِ حکم سے بے علم نہیں ہیں۔ ان کے لئے تو کورانہ تقلید حرام ہے۔ جو قیاس مخالف نص ہو وہ دیوار پر مار دینے کے قابل ہے۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اس تمام نہاد روشن خیال ماڈرن تعلیم کے علمبردار طبقہ کو جو قرآن وحدیث کے احکام کو اس زمانے کے مصالح کے خلاف سمجھتا اور کہتا ہے کہ یہ ضوابط و احکام تو دورِ جاہلیت کے لئے تھے اب ان پر چلنے سے زندگانیاں تلخ ہو جائیں گی، اس لئے ان میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ آیت سے اس قرآنیہ گروہ کے عقیدہ کا بھی رد ہوتا ہے جو رسول اللہ کو صاحبِ امر نہیں جانتا اور محض قرآن ہی کو شاہراہِ عمل خیال کرتا ہے اور رسول کے اتباع کو غیر ضروری قرار دیتا ہے اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ کا قول و فعل خلاف قرآن نہیں بلکہ قرآنی مراد کو واضح کرنے والا ہے۔ حضور والا شریعت کے حامل بھی تھے، اس کو پھیلانے والے بھی تھے اور حقائقِ شریعت کے چہرے سے نقاب اٹھانے والے بھی تھے۔ آیتِ مذکورہ کو خود فیصلہ کرنے کا حق رسول اللہ کو دے رہی ہے۔ پس

فیصلہ رسول پر چلنا تو درحقیقت فیصلہ قرآنی ہے ۔

رسوم جاہلیت جس حد تک مُضر تھے اُسی حد تک اسلام نے ان کی اصلاح کر دی ۔ مُنہ بولا بیٹا بنانے کا دستور بجائے خود بُرا نہ تھا ، اس لئے اس کی بندش نہ کی ۔ البتہ متبنّٰی کرنے سے جو غلط نتائج نکال رکھے تھے اور اصل و نقل کا فرق دور کر دیا تھا اس کا ازالہ کر دیا ۔

آیت وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ حضورؐ نے اپنے دل میں حضرت زینب کی محبت اور زید کی طلاق کے بعد ارادۂ نکاح چھپا رکھا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وحی کے ذریعہ حضورؐ کو زینب کا ازواج مطہرات میں داخل ہونا معلوم ہوا تو معترضوں کو کافروں کی بدگوئی کا خوف ہوا اور اس خوف کو آپ نے اپنے دل میں چھپائے رکھا وغیرہ ۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ

نبی پر اُس بات میں کوئی مضائقہ نہیں جو اللہ نے اُن کے لئے حلال کر دی ہے اللہ کا یہی دستور اُن پیغمبروں میں رہا ہے جو اس سے پہلے

قَبْلُ ؕ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۝ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

گزر چکے ہیں اور اللہ کا کام اندازہ پر مقرر کیا ہوا ہے یعنی ان پیغمبروں میں رہا ہے جو اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے

وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيبًا ۝ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ

اور سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے تمہارے مردوں میں سے محمد کسی کے باپ

رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝ ع

نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ سب کچھ جانتا ہے

ع ۲/۲

تفسیر

(۱) اگر کوئی چھت یا کوئی اور حجاب حائل نہ ہو ۔ یہاں تک کہ بادل کا پردہ بھی نہ ہو تو سورج کی روشنی اور چمک دمک براہ راست ہر چیز پر پڑتی ہے ، لیکن اگر چھت یا کوئی حاجب دوسرا موجود ہو تو براہ راست روشنی وہاں نہیں پہنچ سکتی ۔ کوٹھڑیوں ، کمروں اور تہ خانوں کی تاریکی اسی بنا پر ہوتی ہے ۔ اب اگر دن میں کسی تاریک کمرے کے اندر یا کسی چھت کے نیچے ہم کو سورج کی روشنی پہنچانی مقصود ہو تو اس کی مختلف تدبیریں ہیں ۔ مختلف آلات سے کام لے کر ایسا کر سکتے ہیں ۔ مثلاً ایک آئینہ جس کی پُشت پر مناسب مصالحہ چسپاں ہو لیکر سورج کے مقابل ذرا ترچھے طور پر رکھیں گے ۔ اس طرح کہ سورج کا عکس آئینے پر پڑے اور کمرہ کی طرف منعکس ہو جائے اور اس طرح روشنی کمرہ کے اندر پہنچ جائے ۔ غرض آئینہ کی وساطت کے بغیر کمرہ میں سورج کی روشنی پہنچانا ناممکن ہے ۔ پھر ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ کمرہ کے جتنے حصہ کو روشن کرنا مقصود ہوگا اتنا ہی بڑا اور اتنی ہی طاقت کا آئینہ لیں گے ۔ چار گز جگہ کو روشن کرنا ہے تو دو انچ کا آئینہ کام نہ دے گا ۔ آئینہ بھی چار گز کا ہی ہونا چاہیئے اور اس سے کم و بیش جگہ پر عکس پہنچانا ہے تو اسی کے مناسب آئینہ کی ضرورت ہوگی اور آئینہ کی طاقت کا لحاظ بھی لازم ہوگا ۔ صرف زیرو یا ایک یا دو نمبر کا آئینہ ایک میل تک روشنی کو نہیں پہنچا سکتا ۔ اس کے لئے دوربینی آئینہ ضروری ہے ۔

۲۔ ایک بات یہ بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ ساری عنصری کائنات پر سورج کا اثر پڑتا ہے ۔ روشنی گرمی اور دوسری تاثیرات سے جمادی یا نباتی یا حیوانی مخلوق بے بہرہ نہیں ہے ، لیکن ایسی روشنی جس سے مختلف چیزیں دکھ جائیں ، اچھے بُرے کی تمیز ہو جائے ۔ خوبصورت ، بدصورت ، کثیف ، لطیف ، نجاست ، نظافت ، زیر و زبر ، شرق و غرب ، راست و چپ ، صغر و کبر اور بعد و قرب کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جائیں اسی وقت ممکن ہے جب کوئی رکاوٹ نہ ہو اور براہ راست سورج کا سامنا ہو یا مذکورۂ بالا طریقہ سے آئینے کو روشنی پہنچانے کا ذریعہ بنایا جائے اور بالواسطہ تحصیل نور کی جائے ۔

ایک امر یہ بھی واجب الفہم ہے کہ جو آئینہ سورج کے سامنے ہوتا ہے اس پر جو عکس پڑتا ہے اور جیسا پڑتا ہے وہ آئینہ ہی اور ویسا ہی عکس تاریک کوٹھڑیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ کمی بیشی اور رشدت و صنعت اس کے اختیار سے خارج ہوتا ہے۔ کسی خاص چیز کی خاص مراعات اس کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ آئینہ کے عکس کے سامنے کوئی بھی چیز ہو اچھی ہو یا بری، لطیف ہو یا کثیف، کسی نوعیت، کسی خاصیت اور کسی شکل کی ہو آئینہ کو کسی حالت میں پہلو تہی نہیں ہوتی۔ اس کا رُخ تو براہِ راست سورج کی طرف ہوتا ہے۔ اسی سے اس کا تعلق ہوتا ہے اس سے وہ نور حاصل کرتا ہے۔ دوسری چیزوں کے لئے تو وہ عکس ریز ہوتا ہے اور جو نور اس کو آفتاب کی طرف سے پہنچتا ہے اس کی عکاسی اس کا فرض ہوتا ہے۔

اس تمہیدی تمثیل کو سمجھنے کے بعد غور کرنا چاہیئے کہ آفتابِ ازل تمام کائنات پر اپنی فیض پاشی کر رہا ہے۔ تخلیق، تربیت، انتظام اور باقی رکھنا اسی کا کام ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک عرش و فرش کے درمیان کی ساری مخلوق اس کی ممنونِ کرم، محتاج اور دست نگر ہے۔ اس کا فیض ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے۔ صبح شام، رات دن، مشرق و مغرب، یمین و شمال اور فوق و تحت اسی کے نشانِ صنعت اور برہانِ قدرت ہیں۔ چاند سورج اور ستاروں میں روشنی، تری اور خشکی اسی نے پیدا کی۔ پھل پھول، پتیاں اور بوٹے اسی نے بنائے۔ بے جان اور جاندار، خوبصورت اور بدصورت، کالے اور گورے اسی کی خلاقی کا نمونہ ہیں۔ اونچا آسمان اور چوڑی زمین اسی کی دست کاری کے آثار ہیں۔ غرض پتہ پتہ، قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ اسی کا منت کش ہے۔ اس احسان اور انعام کا تقاضہ تو یہ تھا کہ عقل و ہوش رکھنے والا انسان اس کے کرم نوازیوں سے سرتابی نہ کرتا۔ جب سارا سنسار اس کا فرماں بردار ہے تو ہوشمند انسان کو سب سے پہلے اس محسن کا امر پذیر اور اقتضائے فطرت کا ادا کار ہونا چاہیئے تھا، لیکن نافرمان انسان ایسا نہیں کرتا وہ اپنی فرزانگی اور دانائی کو قانونِ قدرت کی شکست و ریخت میں صرف کرتا ہے۔ اپنی دماغی اور جسمانی طاقتوں کو فطرت سے مقابلہ کرنے میں خرچ کرتا ہے اور دانستہ طور پر فطرت شکنی کے گناہِ عظیم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس نے قادر نے چاہا کہ اپنی عمومی رحمت اور ہمہ گیر فیض سے آگے بڑھ کر اس سرکش انسان پر مزید عنایتوں کی بارش کرے۔ اس کو غلط کاریوں پر متنبہ کرے۔ اس کو کج راہی سے روک کر سیدھا راستہ دکھلا دے۔ نیچرل کائناتی قوانین کی شرح آسان الفاظ میں کر دے تاکہ سرگرداں بدفہم انسان درسِ بصیرت حاصل کرے اور اگر خود اپنی دانش و فہم سے مقصودِ فطرت کو نہیں سمجھ سکتا تو ہدایاتِ لفظیہ کو سُن کر راہِ صداقت پر گامزن ہو جائے۔ لیکن یاد رکھو کہ ہر انسان خصوصاً سرکش اور نافرمان انسان میں اتنی قابلیت نہیں کہ عمومی رحمت کی منزل سے آگے بڑھ کر اللہ کے پیام کا حامل بن سکے۔ انسان کی خباثت، اس کے دماغ کی نجاست، اس کی روح کی کثافت اور اس کے اخلاق و اعمال کی گندگی اس کو اجازت نہیں دے سکتی کہ اپنے خالق سے اتنا گہرا تعلق قائم کر سکے کہ براہِ راست نداء غیب کو سُن لے اور ہدایاتِ لفظیہ کو حاملِ وحی سن کر اپنے دماغ میں جگہ دے سکے۔ ممکن و واجب، حادث و قدیم، مخلوق و خالق، ظلمت و نور اور نجاست و لطافت کا واضح تضاد گندہ انسان کو بارگاہِ قدس میں باریاب نہیں بنا سکتا۔ عقائدِ باطلہ، افکارِ کاذبہ اور اعمالِ خبیثہ کا ایسا زبردست موٹا اور قوی حجاب جو آفتابِ ازل سے بلاواسطہ نور حاصل ہونے کی اجازت فطرت شکن انسان کو نہیں دے سکتا اور نہ آفتابِ عالم تاب کی کوئی خصوصی رحمت اس کے سر پر پڑ سکتی ہے۔ اس لئے ایک ایسے کامل روشن آئینے کی ضرورت ہے جو ایک رُخ روشن اور دوسرا تاریک رکھتا ہو۔ ایک ایسے انسان کی وساطت درکار ہے جو روشن ترین روح کا مالک اور کثیف جسم کا حامل ہو۔ ایک ایسی ہستی ضروری ہے جو ایک رُخ سے براہِ راست آفتابِ قدم کی کرنیں جذب کرے اور رُخ کو ذرا موڑ کر بعینہٖ وہی شعاعیں دوسرے انسانوں پر ڈال دے۔ یہی ہستی آئینہ نبوت کہلاتی ہے۔ تمام انبیاء و مرسلین کا ایک رُخ روشن ہوتا ہے۔ محض روحانیت اور عالمِ عقل سے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لیکن ان کا انسان ہونا بھی لازم ہے۔ لوازم اور خصوصیاتِ بشری کی بھی ضرورت ہے کیونکہ محض روحانی اور عالمِ عقلی مخلوق اگرچہ خود انوارِ الٰہیہ کو آسانی سے حاصل کر سکتی ہے، مگر دوسروں کو اس سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آئینہ کی پشت پر اگر چہ مصالحہ نہ ہو تو وہ اگرچہ جذبِ شعاع کر سکتا ہے، مگر عکس ریزی کر کے تاریک کرہ کو روشن نہیں کر سکتا جس طرح شعاع پذیری کے لئے سامنے والے رُخ کا روشن ہونا ضروری ہے اسی طرح عکس انگنی کے لئے پچھلا رُخ تاریک اور کثیف ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے انبیاء انسانی ہدایات کے لئے بھیجے گئے وہ سب انسان ہی تھے اور لوازمِ انسانیت کے حامل۔ یہ اتنا سمجھنے کے بعد یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ نبی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جو ہدایات اور اصلاحی پیغام اس کو اللہ کی طرف سے ملیں ان کو ظاہر کرنے، پھیلانے، پہنچانے یا خود عمل کرنے سے کچھ دریغ کر سکے وہ تو حاملِ وحی اور روز چین ہوتا ہے۔ وحی میں ترمیم، تنسیخ اور روز یا نسخ میں ملی بھگت کرنے والا نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس کا فرض ہوتا ہے کہ جو روحانی روشنی میں اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کی شعاعوں کو جذب کرے پھر اس پر خود عمل کرے اور اس کے بعد وہ تمام ہدایات عام لوگوں تک پہنچائے

تبلیغ اور پیام رسانی میں اس کو کسی کا لحاظ پاس نہ ہو۔ کسی سے خوف اور اندیشہ ہو۔ چنانچہ تمام انبیاء کا یہی دستور العمل رہا ہے۔ ان کا رُخ براہِ راست اللہ کی طرف تھا۔ ان کے پاس جو پیغام آتا تھا پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے اور پھر دوسروں تک بعینہٖ پہنچا دیتے تھے۔ خود عمل کرنے یا دوسروں تک پہنچانے سے ان کو کوئی چیز روک نہیں سکتی، وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اسی دستور العمل پر حضور والا بھی چلے۔ جب متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کیا اور پھر سب لوگوں کو اس حکم کے مطابق عام اجازت دے دی اور یہ بھی فرما دیا کہ زید میرا صلبی بیٹا نہیں ہے متبنّٰی ہے اور متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ کسی کافر کی خوردہ گیری اور کسی منافق کی طعن و تشنیع کا خوف حضور والا کو اس حکم کی تعمیل سے نہ روک سکا۔

اب یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ جب سلسلۂ انبیاء آغازِ انسانیت سے جاری تھا اور ہر نبی کے کچھ زمانے کے بعد دوسرے نبی کو بھیجنے کا دستور چلا آیا تھا تو پھر حضور کے بعد کسی جدید نبی کو کیوں بھیجنے کی بندش کر دی گئی اور کیوں آپ کو خاتم المرسلین بنا دیا گیا؟

اس سوال کا جواب ہمارے تمہیدی بیان سے خود نکالا جا سکتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ تاریک کمرے کے جتنے حصہ کو روشن کرنا اور جتنی جگہ پہ روشنی پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طاقت اور مقدار کا آئینہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بس یہی صورت تمام گزشتہ انبیاء کی تھی۔ جس ملک یا جس شہر یا بستی یا خاندان یا قوم کو اصلاح کی ضرورت ہوئی اور ان کے تاریک عقائد و اعمال پر ہدایت کی روشنی ڈالنی درکار ہوئی تو اسی قوت کا نبی بھیج دیا گیا۔ کسی نبی کو صرف ایک خاندان یا ایک قوم کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا۔ کسی کو ایک بستی، ایک شہر یا ایک ملک کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا، مگر کوئی بھی ہمہ گیر اثر لے کر نہیں آیا اور نہ عمومی ہدایت کی کبھی ضرورت واقع ہوئی، لیکن جب قانونِ فطرت سے سرتابی عام ہو گئی تو ہمہ گیر اثر رکھنے والے نبی کی ضرورت پڑی اور ایسی تعلیم دینی پڑی جو شرق و غرب اور جنوب و شمال سب کو فائدہ پہنچا سکے۔ اس ہمہ گیر تعلیم کا نام قرآن ہے جس کے بیانات کسی ملک کسی قوم کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہمہ گیر اور ہر زمانی ہیں اور چونکہ گزشتہ انبیاء کی تبلیغ زمانی اور مکانی تھی، اس لئے کچھ ہی مدت کے بعد مشیت الٰہیہ لوگوں نے اس کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ بنا لیا۔ اصل تعلیم تحریف کی سیاہی میں چھپ گئی اور مزید جدید تعلیم کی ضرورت ہوئی ایک کے بعد دوسرے نبی کے پیدا ہونے کا سلسلہ جاری رہا، لیکن قرآنی تعلیم زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی اس لئے تحریف سے آزاد رکھا گیا اور حفاظت کا وعدہ کر لیا گیا۔ اب کبھی کسی جدید نبی کی ضرورت نہ رہی اور حضورؐ کو خاتم المرسلین بنا دیا گیا۔ البتہ بیدار کرنے کے لئے کچھ واعظوں اور مذاکرنے والوں کی ضرورت ہر زمانے میں رہتی ہے اور ایسے لوگوں کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تحلیلِ اجزاء

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں صلبی بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کو حرام کر دیا تھا۔ اس سے اگرچہ بنائے ہوئے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کی حرمت مستفاد نہیں ہوتی تھی، لیکن صدیوں سے عرب اپنے دستور العمل کے مطابق بنائے ہوئے بیٹوں کی بیویوں سے بھی نکاح کو حرام سمجھتے تھے اور اس قدر حرمت غلیظہ کے قائل تھے کہ صراحۃً اس سورۂ احزاب میں متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کو حلال کرنا پڑا اور بحکم الٰہی حضور گرامیؐ نے حضرت زید کی بیوی سے نکاح کیا۔ اس پر کفار اور منافقوں نے طعن و تشنیع شروع کر دی۔ ان کے نزدیک جو دستور العمل ناقابلِ انکار اور واجب الانتقال تھا اس کی ایسی زبردست قولی اور عملی شکست ان سے دیکھی نہ گئی اور حضور والا کی پاک معاشرت پر ناپاکی کا دھبہ لگانے لگے۔ حضور اس سے دل گرفتہ ہوئے، مگر خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ یہ نکاح ہم نے کیا ہے یعنی ہمارے حکم سے ہوا ہے اور ایسا ہونا لازم تھا جو کچھ خدا کو کرنا ہوتا ہے اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تم کافروں اور خوردہ گیروں کی عیب چینی سے اور بدگوئی سے نہ ڈرو۔ اب طعن کرنے والوں کے دل پر ایک ضربِ مطرقہ کی ضرب لگاتا ہے اور فرماتا ہے کہ:

جب اللہ نے ایک امر مقرر کر دیا اور نبی پر اس کی تعمیل لازم ہو گئی۔ اب تو معاشرت کے دائرہ کو تنگ کرنا اور فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنی نبی کے لئے کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ الخ یعنی ہمیشہ سے قانونِ الٰہی یوں ہی چلا آیا ہے اور تمام انبیاء اسی پر مامور رہے کہ اللہ کے تمام احکام کو اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ خواہ کسی کو اچھا معلوم ہو یا بُرا۔ کسی کے دستور العمل معمولِ زندگی اور مسلمہ رواجوں کی شکست ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، کوئی مخالفت کرے یا نہ کرے ان کو کسی کی پرواہ اور کسی سے اندیشہ نہیں ہوتا اُن کو خوف ہوتا ہے تو صرف خدا کا۔ اسی کو وہ اپنا کارساز جانتے ہیں۔ (اسی عام سنتِ انبیاء کے مطابق محمد رسول اللہ نے بھی تبلیغِ احکام میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ کافروں اور منافقوں کا کوئی اندیشہ نہ کیا۔ اللہ کی کارسازی اور کارفرمائی پر پختہ اعتماد رکھا اور

بحکم الٰہی کافروں کے اس دستور العمل اور قومی رواج کو توڑ دیا جو معاشرت کے دائرہ کو مزید خاص طور پر تنگ کرنے والا اور حلال کو حرام بنانے والا تھا۔ اب رہی حضور کی دل گرفتگی اور کبیدہ خاطری تو وہ حکم الٰہی کی تبلیغ میں نہ تھی نہ اس اندیشہ سے تھی کہ کفار مخالفت کریں گے بلکہ صرف یہ خیال تھا کہ کافروں اور منافقوں کے غلط پروپیگنڈہ سے شاید مسلمان متاثر ہو جائیں یا مخلص مومنوں کے دلوں میں بھی کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے، اس لئے خدا تعالیٰ نے صاف طور پر فرمادیا کہ اللہ مدد کرنے والا ہے۔ وہی کافی ہے۔ اس کی نصرت کے ہوتے ہوئے کسی کے بگاڑے سے کچھ بگڑ نہیں سکتا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ غلط انتساب کی حرمت سے پہلے لوگ زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہنے لگے تھے کیونکہ حضور نے زید کو بیٹا بنایا تھا جب غلط انتساب کی ممانعت کا حکم نازل ہو گیا تو لوگوں نے پھر زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا اور اس کے بعد حضرت زینب سے نکاح کا واقعہ ہوا اور کفار نے بدگوئی شروع کر دی تو کفار کی بدگوئی کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے (کہ زید تو بجائے خود رہا) محمد تو (اس وقت) تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں یعنی اس وقت ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ قاسم اور طیب جو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے پیدا ہوئے اور ابراہیم جو حضرت ماریہ کے بطن سے ہوئے ان کی وفات بلوغ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس آیت کے نزول کے وقت موجود نہ تھے۔ رہی نرینہ اولاد نہ ہونے کی حکمت تو اس کی طرف ذیل کے جملے میں اشارہ فرماتا ہے۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ غرض یہ ہے کہ محمد رسول اللہ پر نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ تمام انبیاء کے بعد حضور کو بھیجا گیا اور اسمائے انبیاء کی فہرست پر آپ کے نام کو خاتم کے ثبت کر دیا گیا۔ اب اگر آپ کی کوئی نرینہ اولاد ہوتی تو آپ کی شانِ نبوت کا تقاضا تھا کہ وہ نبی ہوتے۔ بڑے بڑے انبیاء کی اولاد کو عموماً تاجِ نبوت عطا کیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے صاحبزادگان اسماعیل و اسحاق کو، حضرت اسحاق کے صاحبزادے یعقوب کو، حضرت یعقوب کے بیٹے یوسف کو، حضرت موسیٰ کے بھائی ہارون کو نبی بنایا گیا۔ غرض ہر بڑے نبی کی جلالتِ قدر عام طور پر اسی کی مقتضی رہی ہے کہ اگر کوئی خاص مانع نہ ہو تو اس کے بیٹے، بھائی، بھانجے یا بھتیجے کو نبی بنا دیا جائے۔ پس حضور کی عظمت و جلالت تو بدرجۂ اتم اس توارث کی مقتضی تھی اور اللہ کی حکمت حضور کو سید الانبیاء بنانے کی غرض سے چاہتی تھی کہ آپ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ کر دے اور سب انبیاء کے لئے آپ کو سند بنا دے۔ پس اسی بنا پر آپ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی اور نسلی سلسلہ صاحبزادی کے بطن سے قائم کیا گیا۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ یعنی اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔ غرض یہ ہے کہ نبوت کوئی اکتسابی چیز نہیں کہ جو ریاضت و عبادت زیادہ کرے وہ نبی ہو بلکہ ایک وہبی چیز ہے اللہ ہی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے نبی بنائے اور اس کی حکمت کا جو تقاضہ ہے اس کو پورا کرے اور انبیاء میں سے بھی جس نبی کو چاہے شرف و فضیلت عطا فرمائے۔

امام احمد ..... ترمذی، ابوداؤد طیالسی، امام بخاری، امام مسلم، عبدالرزاق اور بکثرت دوسرے علمائے روایت نے متعدد طریقوں اور کثیر اسانید سے بکثرت احادیث لکھی ہیں جن میں حضور اقدس نے صراحت کی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی اور رسول نہ ہوگا بلکہ مجدد ہوں گے جو دین کو تازہ کرتے رہیں گے اور نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہاں منامات صادقہ باقی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نے اپنی چھ خصوصیات کا تذکرہ فرمایا۔ جن میں چھٹی یہ تھی کہ حضور نے فرمایا کہ انبیاء کو میری ذات سے ختم کر دیا گیا (رواہ مسلم و ابن ماجۃ والترمذی وقال حسن صحیح)

حضرت جبیر بن مطعم کہتے ہیں میں نے خود سنا حضور فرما رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے میرے چند نام ہیں۔ میں محمد اور احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں کہ اللہ نے میرے سبب کفر کو مٹا دیا۔ میں حاشر ہوں کہ میرے قدموں پر لوگوں کا حشر ہوگا اور میں عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں (صحیحین) حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ حضور نے فرمایا میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (رواہ احمد وغیرہ)

ایک اور صحیح حدیث میں آیا ہے حضور نے فرمایا میرے بعد تقریباً تیس جھوٹا دعویٰ پیدا کرنے والے دجال پیدا ہوں گے۔ ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں۔ حالانکہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہے۔ امام غزالی نے کتاب الاقتصاد میں لکھا ہے کہ آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ نص صریح قطعی ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوگا۔ احادیث متواترہ سے بھی یہی ثابت ہے اور اسی پر سلف و خلف تمام امت کا اجماعِ قطعی ہے۔

ہوشیار رہو کہ بعض دجالیوں نے یہ عقیدہ پھیلایا ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی ا[illegible] رسول نہ ہوگا ظلی نبی ہو سکتے ہیں یہ محض کا فریب ہے

قرآن حدیث اور اجماع کے خلاف اہل ایمان کو دھوکہ دینا اور جوبات کہی جھوٹ کہی۔ رہا حضرت عیسیٰ بن مریم کا نزول جو صحیح احادیث سے ثابت ہے تو اس سے عیسیٰ کا بحیثیت نبی نازل ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ حاکم عادل بنا کر ان کو بھیجا جائے گا جو دجال کا مقابلہ کریں گے اور اس کو قتل کریں گے۔ چنانچہ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ اگرچہ اپنے عہد میں خود پیغمبر تھے، مگر جب ان کو اس امت میں بھیجا جائے گا تو اس وقت وہ آنحضرت کی شریعت پر خود عمل کریں گے اور اس شریعت کو درست کریں گے۔

آیت مذکورہ میں لفظ خاتم النبیین دو طرح سے مروی ہے۔ خاتِم بکسر تا اور خاتَم بفتح تا۔ اوّل روایت سے تو صاف طور پر حضور کا آخری نبی ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری روایت پر خاتَم کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ختم کرنے والا اور مہر۔ کیونکہ عربی زبان میں خاتَم بمعنی مَا یُختَمُ بِہٖ آتا ہے یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ سے کسی چیز کو ختم کیا جائے اور ختم کرنے کے دو معنی ہیں تمام کرنا اور مہر لگانا۔ درحقیقت دوسرا معنی اوّل معنی کو شامل ہے کیوں کہ گزشتہ بلکہ موجودہ دستور کے مطابق بھی مہر (سیل) اسی وقت کی جاتی تھی اور کی جاتی ہے جبکہ کسی چیز کو تمام کر دیا جائے اور لپیٹ کر یا بند کر کے وثوق سند یا اعتماد ظاہر کرنا اور اس چیز کی عظمت کا اظہار کرنا مقصود ہو۔ پس خاتم کے معنی تمام کرنے والا کیے جائیں گے یا مہر قرار دئے جائیں گے۔ بہر طور حضور کا آخری نبی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس نے اپنی ذات کو قصر نبوت کی آخری اینٹ قرار دیا تھا (بخاری)

مقصود بیان لفظ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰہُ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زینب سے نکاح کرنا اللہ کی طرف سے حضور والا پر واجب تھا۔ آیت میں کفار کی بکواس کا دندان شکن جواب دیا ہے اور صاف صراحت فرما دی ہے کہ احکام خداوندی کی تبلیغ ہر نبی پر لازم ہے۔ انبیا سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ احکام الٰہی کی ضرور اشاعت کرتے ہیں۔

وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا سے وعدۂ نصرت کا اظہار مقصود ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دینی غرض ہے۔

آیت مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور والا کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی۔ لفظ خاتم النبیین سے حضور کا آخری نبی ہونا ثابت ہوتا ہے وغیرہ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًاۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا هُوَ الَّذِیْ

اے ایمان والو! اللہ کی بکثرت یاد کیا کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کیا کرو وہی ہے جو تم

یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ

پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لائے اللہ مسلمانوں پر مہربان

رَحِیْمًا تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِیْمًا

ہے جس دن وہ اللہ سے ملیں گے تو ان کی دعائے خیر سلام علیک ہوگی اس نے تمہارے لئے عزت کا ثواب تیار کر رکھا ہے

تفسیر۔ ساری کائنات کا نظام ایک منظم قانون کے تحت چل رہا ہے۔ عنصری اور غیر عنصری، محسوس اور غیر محسوس، ارضی و سماوی غرض کل مخلوق غیبی قوتوں کی کارفرمائی کے زیر اثر اپنی رفتار کو قائم کئے ہوئے ہے۔ ہر چیز کے اندر ایک پوشیدہ قوت ہے جو نظام نوعی کی تکمیل میں مشغول ہے اور پھر ساری انواع کی اندرونی قوتیں زنجیر کے حلقوں کی طرح باہم مربوط اور وابستہ ہیں اور سارے سلسلہ کے عام نظام کو قائم کرنے میں مدد کر رہی ہیں۔ ان غیبی پوشیدہ قوتوں کو مادہ پرست طبقہ قدرتی کے نام سے موسوم کرتا ہے، مگر ہم ملائکہ کے مفہوم کی تحقیق کے ذیل میں چند جگہ انہی قوتوں کو مدبرات امر، منتظم عالم اور خدام کائنات کہہ چکے ہیں۔ یہی وہ پیامبر اور رسول ہیں جن کا کام ہر وقت یہ ہے کہ محیط کل طاقت (یعنی اللہ) کے پیام کو خفیف ترین ذرات، حقیر ترین قطرات اور صغیر ترین پتیوں کو پہنچا دیں۔

کسی نبی تک وحی کو پہنچانا تو فرشتہ کا کام ہی ہے۔ جو تمام اہل نظر جانتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ہر چیز کے دقیق ترین اجزا بھی اس غیبی مخلوق کی پیام رسانی سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ اگر یہ غیبی قوتیں نہ ہوں اور ان کی کارفرمائی نہ ہو تو شیرازۂ عالم درہم برہم ہو جائے نہ بقائے شخصی ہو نہ حفظ نوعی۔

یوں تو ساری کائنات کی ہستی اور تغیرات الٰہی ملائکہ کے ممنونِ کرم اور دست نگر ہیں، مگر چونکہ ساری کائنات کا خلاصہ انسان ہے اور سارے انسانوں کا حاصل حیات اہل ایمان کا وجود ہے، اس لئے اہل ملائکہ کو جو وابستگی خصوصی کا تعلق اور ربط اہل ایمان سے ہے وہ کسی دوسری مخلوق سے نہیں۔ ہمارے نزدیک اہل ایمان کے ساتھ اسی خصوصی ربط کو عقل کی دنیا میں صلوٰۃ الملائکہ کہا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی کی تفریق اور رحمت و استغفار وغیرہ کا امتیاز تو اہل لغت کا کام ہے۔ ترجمانی اور عقلی تنقیح میں اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہو یا ملائکہ کی طرف سے۔ ایک خاص قسم کی عنایت، تربیت اور رحم و کرم کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے حقیقۃً اور ملائکہ کی طرف سے بامرِ الٰہی اہل ایمان کے شامل حال ہوتا ہے۔ اس غیبی کرم فرمائی کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان لاعلمی کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں آجائے اور سارے نظامِ کائنات پر غور کر کے اپنی ہستی کے ذرہ ذرہ کو ایک غیبی ہمہ گیر طاقت کا ممنونِ کرم سمجھے اور یہ یقین کرے کہ ساری عنایتیں صرف اس لئے ہیں کہ ہم کو اپنے خالق کی معرفت اور رب کی توحید کی شناخت ہو جائے اور ایمان برہانی سے ایمان شہودی تک ترقی مل جائے۔ اگرچہ اللہ کی ہمہ گیر قدرت و ارادہ اور فرشتوں کی ساری کارفرمائی اور خدمت تمام جہان کو ایک خاص نظم پر چلا رہی ہے اور نوبت بہ نوبت آہستہ آہستہ ہر چیز کو درجۂ کمال تک پہنچا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کی ہر چیز طوعاً و کرہاً دانستہ یا نادانستہ قدرتِ قاہرہ کے سامنے سربسجود ہے، مگر سارے سنسار میں انسان پر جو خاص عنایت ہے وہ کسی پر نہیں۔ عقل و فہم کا روشن چراغ راہِ حقیقت کی تلاش کے لئے جو اس کو عطا کیا گیا ہے وہ کسی کو نہیں دیا گیا، لیکن تمام انسانوں میں سے خصوصیت کے ساتھ اہل ایمان پر ہمہ گیر رحمتِ الٰہیہ کا جو خاص فیضان ہے اور اللہ کے مکرم فرشتوں کا جو خاص تعلق ان کے ساتھ ہے اس سے دوسرے انسان بھی محروم ہیں۔ اللہ کی طرف سے اہل ایمان کے دلوں، دماغوں اور روحوں پر فرشتوں کی معرفت جو نور کی بارش ہوتی ہے وہ کسی اور پر نہیں ہوتی۔ وہ علمی، کشفی اور غیبی طور پر یا القائے ملائکہ حقائق اشیاء سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے سروں اور سینوں کے اندر ہر وقت ایک چراغِ معرفت روشن رہتا ہے جس کی روشنی اور کیفیت انجلائیہ الہام ربانی اور القائے ملائکہ کی ممنون ہے۔ پس اس نورِ ایمانی کا تقاضہ یہ ہے کہ حاملِ ایمان ہر وقت ہر آن اور ہر پل اپنے دل و زبان، ہاتھ اور پاؤں بلکہ تمام بیرونی اور اندرونی اعضاء کو یادِ الٰہی میں مشغول رکھے۔ اللہ کو عجز جہالت اور اندادِ اور ان کے لوازم سے پاک جانے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حجب ظلماتی حجاب اٹھ جائے گا اور مادی عوائق دور ہو جائیں گے اور کثیف جسمانی پردہ روح کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائے گا، اور انسان روحانی دنیا کی سرزمین میں پہنچ جائے گا تو اس وقت وہی قدوسی ملائکہ جو اس کے دل میں نورِ ایمان کی شمع روشن کر رہے تھے اس کا استقبال کریں گے اور ہر قسم کی تکلیف وابتلاء سے محفوظ رہنے کی بشارت دیں گے اور نہ فقط فرشتے ایسا کریں گے بلکہ ساری کائنات کے خلاق و حاکم کی طرف سے بھی اس کو سلامتی اور نجات کی بشارت کی آواز پردۂ غیب سے سنائی دے گی اور کوئی رکاوٹ ایسی باقی نہ رہے گی جو ملیک مقتدر سے دور رکھنے کا باعث ہو بلکہ وہ عظیم الشان نایاب فقید المثال نعمتیں اس کو میسر آئیں گی جن کی صورت اس مادی زندگی میں نہ اس نے دیکھی ہوگی نہ کیفیت سنی ہوگی۔ نہ کبھی اس کے دماغ کی رسائی وہاں تک ہوئی ہوگی۔ درحقیقت وہ ایسا اجر کریم ہوگا جس کی حقیقت سے سوا اللہ کے کوئی واقف نہ ہوگا۔

تحلیل اجزاء: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا — اوپر کی آیت میں رسول پاک کے خاتم الانبیاء ہونے کی صراحت فرما دی تو اس سے امتِ محمدیہ کا آخری امت ہونا اور قرآن پاک کا آخری کتاب ہونا لازم آیا اور یہ بات مسلمانوں کے لئے بڑی فضیلت و شرف کا باعث ہوئی کیونکہ ان کی کتاب تمام کتب کی ناسخ اور خود ناقابل نسخ قرار پائی اور ان کا دستورِ زندگی ہر ترمیم و تغیر سے پاک ہو گیا اور عام طور پر لوگ اس بہتان سے بھی چھوٹ گئے جو جدید مدعی نبوت کے دعوی سے ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ کسی سچے نبی کی نبوت سے انکار کرنا جس طرح موجب کفر اور باعث تباہی ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹے مدعی کی نبوت کا اقرار بھی ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر جدید نبوت کا دعوی کرنے والے کے دور میں لوگ سخت آزمائش میں پڑ جاتے ہیں۔ معجزات اور استدراج میں فرق کرنا اور جھوٹے کو سچے سے ممتاز بنانا ہر آدمی کے بس کی چیز نہیں، مگر حضور کے خاتم الانبیاء ہونے کے بعد یہ امتحان بھی نہ رہا اور شاہراہِ ہدایت بالکل واضح ہو گئی۔ پس ایسے عظیم الشان احسان کا شکریہ واجب ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ اہل ایمان اللہ کی یاد بکثرت کرو اور صبح شام اس کی پاکی بیان کرو۔ بکثرت یادِ الٰہی کرنے کا مفہوم مفصل طور پر ہم نے آیت وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ کے ذیل میں بیان کر دیا ہے، اس لئے مزید طوالت کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اتنا جان لینا چاہیئے کہ ایمان اور اقرارِ توحید و رسالت سوائے خود یادِ الٰہی ہے اور جب آدمی اس حد

تک یادِ الٰہی کرنے لگتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر کم از کم پانچ وقت یادِ الٰہی کرے اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ہر وقت دل، زبان اور سارے اعضائے جسم کو ذکرِ الٰہی میں مشغول رکھے۔ جب بندہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو درحقیقت اسی وقت بکثرت یادِ الٰہی کرنے والوں کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے، مگر صرف پنجگانہ پابندی اور خشوع سے نماز پڑھنے والے بھی اس لقب کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا درجہ نیچے ہے۔ تاہم صحیح روایات کی رُو سے ہم ان کو بھی بکثرت یادِ الٰہی کرنے والا کہہ سکتے ہیں۔

مذکورۂ بالا آیت میں دو لفظ آئے ہیں ذکر اور تسبیح۔ بظاہر ذکر کے بعد تسبیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ تسبیح بھی ایک طرح کا ذکر ہے۔ شاید ذکر کے بعد تسبیح کا حکم دینے کی وجہ یہ ہو کہ ذکر کے دو پہلو، دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ منفی اور مثبت۔ یعنی اگر اللہ کو تمام عیوب و نقائص سے منزہ کہا جائے اور ہر برائی سے اس کو پاک سمجھا جائے تو یہ ذکر منفی ہے اور اگر تمام صفاتِ کمال (الوہیت و ربوبیت، علم، حیات وحدت قدرت وغیرہ) کا ثبوت اس کی ذات کیلئے کیا جائے تو یہ ذکر مثبت ہوگا۔ پس ذکر کے بعد تسبیح کا حکم دینا گویا عام کے بعد خاص کا بیان ہے جو اہمیت اور عظمتِ شان پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی ہر طرح یاد کرو خصوصاً تمام عیوب و نقائص سے اللہ کو پاک سمجھو۔ شرک، عجز، جہل وغیرہ سے اس کو منزہ مانو۔ یا یوں کہا جائے کہ ذکر سے مراد ذکر مثبت ہے اور تسبیح سے مراد ذکر منفی۔ واللہ اعلم۔ لیکن :۔

مجاہد نے تسبیح کی تفسیر ذکر منفی اور ذکر مثبت کے مجموعے سے کی ہے اور تسبیح کے معنی بیان کئے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کو پڑھنا۔ اس صورت میں ذکر اور تسبیح قریب المعنی ہوں گے اور ایک کے بعد دوسرے کا تذکرہ مزید تاکید کے لئے ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ صبح اور شام تسبیح بیان کرنے سے کیا مراد ہے تو لفظ اگرچہ عام ہے، مگر خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ قتادہ اور ابن جریر کے نزدیک اس سے فجر اور عصر کی نماز مراد ہے۔ محی السنہ نے معالم میں لکھا ہے کہ تسبیح سے مراد خاص فجر اور عصر کی نمازیں نہیں ہیں بلکہ اس میں یہ دونوں نمازیں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔ کلبی کا قول ہے کہ شام کے وقت تسبیح کرنے کے حکم میں ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی سب نمازیں شامل ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت ایسی ہی ہے جیسی آیت فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْہِرُوْنَ ہے کہ علماء نے اس آیت سے پانچوں وقتوں کی نمازوں کا حکم استنباط کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ جو شخص ایک دن میں سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ پڑھتا ہے اس کے گناہ ساقط ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ سمندر کے کف کے برابر ہوں۔ (صحیحین)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کیا روزانہ ایک ہزار نیکیاں کرنے سے تم لوگوں میں سے کوئی شخص عاجز ہے حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ روزانہ ایک ہزار نیکیاں کر سکیں۔ فرمایا ہاں روزانہ سو بار تسبیح پڑھنے والے کے لئے ہزار نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور ایک ہزار گناہ ساقط کئے جاتے ہیں (احمد، مسلم والترمذی وغیرہم)

حضرت ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسا عمل بتاؤں جو سب سے افضل اور مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجات میں سب سے اعلیٰ ہے اور تمہارے لئے اس جہاد سے بھی افضل ہے جس میں دشمن تمہاری گردنوں پر وار کریں اور تم ان کی گردنوں پر۔ صحابہ نے عرض کیا حضور ضرور فرمائیے وہ کون سا عمل ہے؟ ارشاد فرمایا وہ ذکرِ الٰہی ہے (صرح بہ ابن کثیر بروایت احمد والترمذی وابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن بسر سے مروی ہے کہ دو اعرابی حاضرِ خدمت ہوئے۔ ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں کون شخص سب سے بہتر ہے؟ ارشاد فرمایا جس کی عمر دراز ہو اور اعمال نیک ہوں۔ دوسرے نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسلام کے فضائل اعمال تو بہت ہیں مجھے کوئی بات بتا دیجئے جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ فرمایا تمہاری زبان ہمیشہ ذکرِ الٰہی سے تر و تازہ رہے (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا تم لوگ یادِ الٰہی کی اتنی کثرت کرو کہ لوگ تم کو دیوانہ کہنے لگیں (رواہ احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ذکرِ الٰہی کی اتنی کثرت کرو کہ منافق تم کو ریاکار کہنے لگیں (رواہ البغوی)

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے حضورِ گرامی سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کس بندہ کا مرتبہ زیادہ ہوگا؟ فرمایا اُن لوگوں

کا جو یادِ الٰہی بکثرت کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کیا یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہوں گے؟ فرمایا اگر غازی نے اپنی تلوار سے کافروں اور مشرکوں پر اتنے وار کئے کہ تلوار خون آلود ہو کر ٹوٹ گئی تو اس سے بھی اللہ کو بکثرت یاد کرنے والا افضل ہے (رواہ احمد والترمذی والبیہقی)

امام نسائی، ہو رلوزی نے ذکرِ الٰہی کی فضیلت میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سب سے بہتر نووی کی کتاب "الاذکار" ہے۔ مزید نقل موجب تطویل ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ امام بخاری نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ مجمع ملائکہ میں اللہ اپنے بندہ کی ثنا فرماتا ہے۔ صلوٰۃ اللہ کے یہ ہی معنی ہیں۔ ربیع بن انس سے بھی یہی قول مروی ہے۔ دوسرے علمائے تابعین نے کہا کہ صلوٰۃ کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے تو رحمت مراد ہوتی ہے۔ امام ترمذی نے سفیان کا قول نقل کیا ہے کہ صلوٰۃ اللہ کے معنی ہیں۔ رحمت اللہ اور صلوٰۃ ملائکہ کے معنی ہیں استغفار اور صلوٰۃ الذکر کے معنی ہیں دعا۔ بہرحال آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ ایمان اللہ اور اس کے فرشتے تم پر مہربان ہیں۔ اللہ تم پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے تمہارے لئے استغفار کرتے ہیں۔

لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کی علت ہے۔ اللہ اپنی رحمت اور ملائکہ کے استغفار کی وجہ سے انسانوں کو جہالت اور گمراہیوں کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت و یقین کے نور تک پہنچاتا ہے۔ اس کی رحمت اہلِ ایمان کے لئے عام ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تو اس طرح کہ جہالت نفاق اور شرک سے نکال کر نور کا راستہ دکھایا اور اہلِ کفر و بدعت سے جدا کر کے اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل کیا اور آخرت کی رحمت خوف و عذاب سے بچاتا اور نور و کامرانی سے ہم کنار بناتا ہے۔

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں جن میں ایک حصہ تمام دنیا میں نازل فرمایا ہے اسی کے سبب سے ماں اپنے بچہ پر شفقت کرتی ہے اور مخلوق باہم رحمت کرتی ہے اور ننانوے حصے خدا کے پاس محفوظ ہیں۔ قیامت کے دن ننانوے حصوں کے ساتھ دنیوی حصہ بھی ملا کر مومن بندوں کو عطا کیا جائیگا۔

تنبیہ:- تاریکی سے نکال کر نور میں لانے کے درجات مختلف کیونکہ تاریکی اور روشنی اضافی چیزیں ہیں۔ ہر زیریں درجہ بالائی درجہ کے اعتبار سے تاریک ہے کفر اور شرک زیریں ترین درجہ جو بہت ہی تاریک ہے اس سے نکال کر اللہ نورِ ایمان عطا کرتا ہے۔ پھر ایمان کے درجات میں اللہ ترقی عطا فرماتا ہے اور جس قدر ایمان کے درجات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی قدر حسنِ اعمال کی مزید توفیق ملتی جاتی ہے۔ یہاں تک آخر میں بندہ ہر چیز کو اللہ ہی کے نور سے دیکھتا ہے بلکہ نورِ الٰہی کو دیکھنے کا ذریعہ بھی نورِ الٰہی ہی ہوتا ہے۔ یہ سب سے اونچا درجہ ہے جو کامل معرفت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔

تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ وَّاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا کَرِیْمًا ۝ یومِ ملاقات سے مراد یوم الموت ہے یا دخولِ جنت کا دن۔ اول قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت براء بن عازب سے منقول ہے کہ القائے الٰہی کا دن وہ ہے جس دن موت کا فرشتہ روح کو قبض کرنے کے لئے آتا ہے۔ پس جب مومن کی روح قبض کرنے آتا ہے تو سب سے پہلے اس کو سلام کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی فرمایا کہ ملک الموت جب کسی مومن کی روح قبض کرنے آتا ہے تو پہلے اللہ کی طرف سے اس کو سلام پہنچاتا ہے (سراج) دوسرے قول کو ترجیح ابن کثیر نے دی ہے، لیکن اس صورت میں بھی سلام کے معنی دو طرح سے بیان کئے گئے ہیں۔ قتادہ نے کہا جب دارِ آخرت میں بحضورِ الٰہی مومنوں کی باہم ملاقات ہوگی تو وہ آپس سلام کریں گے۔ ابن جریر نے اسی معنی کو پسند کیا ہے۔ اس معنی کے ثبوت میں آیت وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ پیش کی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جنت کے اندر اللہ کی طرف سے مومنوں کو تحفۂ سلام ملے گا۔ اس قول کی تائید آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ سے ہوتی ہے۔ اجرِ کریم سے مراد ہے وہ جزا اور ثوابِ عظیم جس کی حقیقت کوئی نہیں بتا سکتا۔ کوتاہ نظر رکھنے والوں کے لئے تو نایاب کھانا پینا، فاخرہ لباس، شاندار مسکن، جاذبِ نظر خدام اور وسیع حکومت اجرِ کریم ہے، مگر اہلِ نظر کے لئے جنت میں وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی نے دیکھیں نہ سنیں نہ کبھی ان کا تصور انسانی دماغ میں آیا۔

مقصودِ بیان غیر محدود طور پر یادِ الٰہی کرنے کا حکم کیونکہ کثرت کی کوئی خاص حد نہیں اور اس بات کی طرف در پردہ ایما کہ ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ ہر وقت یادِ الٰہی کی جائے یعنی اس زندگانی میں ہر کام اور حرکت و سکون اللہ کی خوشنودی کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جائے۔ تسبیح کرنے کا حکم بتا رہا ہے کہ تمام عیوب و نقائص سے خدا پاک ہے اور تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے۔ صبح اور شام تسبیح کا امر اشارہ کر رہا ہے اس بات کی طرف کہ یہ دونوں وقت عبادت کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ آیت هُوَ الَّذِیْ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نیکی کی توفیق یہاں تک کہ کفر کے دائرہ سے نکل کر ایمان کے حلقہ میں داخل ہونا بھی اللہ کے رحم پر موقوف ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے فرشتے بھی استغفار کرتے ہیں۔ جنت یا دارِ آخرت میں یا قبض

رُوح کے وقت اہلِ ایمان کو اللہ کی طرف سے تحفۂ سلام ملنے کی صراحت آخری آیت میں کر دی گئی ہے وغیرہ۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ

اے نبی ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور

وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝ وَلَا

روشن چراغ (بنا کر) بھیجا ہے مسلمانوں کو مژدہ سنا دو کہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے بڑا فضل ہے اور کافروں

تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

کا اور منافقوں کا کہنا نہ مانو اور اُن کو ستانا چھوڑ دو اور اللہ پہ بھروسہ رکھو اور اللہ کافی کارساز ہے

تفسیر لوگوں کے عقول و آراء کا تعارض، رسم و رواج کا اختلاف اور تجارب کی کشاکش انسانی دماغوں کو حق و باطل کے متعلق متفقہ فیصلہ کرنے سے عاجز بنا رہی ہے نہ کوئی متحدہ غرض حیات متعین ہے نہ کوئی خود ساختہ قانونِ عدل مقرر کیا جا سکتا ہے، اس لیے اللہ نے اپنی طرف سے مختلف اشخاص کو حقائقِ اشیاء سے باخبر اور حق و باطل سے واقف بنا کر بھیجا۔ ان مبارک ہستیوں نے اپنے علم و کشف کے مطابق لوگوں کو راہِ راست بتائی حق و باطل اور صحیح و غلط کا فیصلہ کیا۔ سرتابی کرنے والوں کو ابدی ہلاکت سے ڈرایا اور فرماں پذیری کرنے والوں کو سعادتِ لازوال کی بشارت دی اور کل دنیا کے سامنے کھول کر بیان کر دیا کہ انسان کی تخلیق کی اصل غرض معرفت خالق ہے، خدا تک پہنچنا مقصود کل ہے، اس لئے اُن چیزوں سے اجتناب ضروری ہے جو اللہ تک پہنچنے سے روکنے والی ہیں اور ان چیزوں کا اختیار کرنا لازم ہے جو خدا تک پہنچانے والی ہیں۔ کچھ قوموں نے اپنے پیشواؤں کے حکم کے مطابق مادیت اور لوازمِ مادیت کو ترک کرنا، غذا، لباس اور دیگر ضروریات کو چھوڑنا اور سادھو بن کر جسم اور اعضائے جسم کو خشک بوسیدہ بنا لینا ہی موجب نجات سمجھ رکھا تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے نفس کو مطلق العنان کر دینا اور بغیر حرام و حلال کی تفریق کے ہر شے سے فائدہ اٹھانا مقتضائے فطرت خیال کر لیا تھا، مگر یہ طریقے حکمِ الٰہی کے خلاف تھے۔ ان میں سے کسی طریقے سے خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ روحِ انسان سوار اور بدن سواری ہے۔ جس طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے سواری کو راستہ میں قتل کر دینا اور لق و دق صحرا میں پیدل ہو جانا موجب ہلاکت ہے۔ اسی طرح سواری کو مطلق العنان چھوڑ دینا (کہ جہاں اور جس خندق میں چاہے گرے جس طرف کو چاہے چلی جائے جس پتھر سے چاہے ٹکرا جائے) موت کو دعوت دینے والا ہے۔ پس اللہ کی طرف سے شاہد نے آ کر افراط و تفریط کا فیصلہ کیا اور اللہ کی طرف پہنچنے کا سیدھا راستہ بتایا، مگر بد باطن، معاند اور خبیث طینت دشمن کب اہلِ حق کو قرار سے بیٹھنے دیتے ہیں اور کس طرح ان کو اپنے عقائد و رسوم کی بوسیدہ دیوار گرتی دیکھ کر صبر آ سکتا ہے، اس لئے انہوں نے ایذا رسانی اور تکلیف دہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور پوری اجتماعی طاقت سے ضرر رسانی پر کمربستہ ہو گئے، مگر اہلِ حق کا حامی خدا ہوتا ہے، اس لئے انہوں نے اس ضرر رسانی کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہر وقت اللہ پر بھروسہ رکھا۔

تحلیلِ اجزاء يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ۔ آیتِ مذکورہ میں سات الفاظ قابلِ تشریح ہیں۔ نبی۔ اَرْسَلْنَاكَ۔ شاهد۔ مبشر۔ نذیر۔ داعی اور بِإِذْنِهِ ہم ہر ایک کی تنقیح کرتے ہیں تاکہ تفسیری مضمون واضح طور پر سمجھ میں آ جائیں۔

ہم نے چند جگہ لکھ دیا کہ جن علماء نے نبی اور رسول میں خود ساختہ فرق قائم کیا ہے وہ غلط ہے نہ شرعی اور قرآنی محاورہ کے موافق ہے نہ لغت کے۔ نبی وہی شخص ہوتا ہے جو وحی کے ذریعہ سے اسرارِ الٰہیہ سے باخبر ہو۔ جس کو خیر و شر، راستی و غلطی، صواب و خطا اور حق و باطل میں تفرقہ و امتیاز وحی کے ذریعے

سے بنا دیا گیا ہو جس کو علم اکتسابی اور تحصیل نظری کی ضرورت نہ ہو۔ بدیہی طور پر اس کو حقائقِ اشیاء سے واقفیت ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ اللہ تک پہنچنے والی شاہراہ سے وحی کے ذریعہ سے خود بھی واقف ہوا اور اس پر چلتا ہو اور دوسروں کو بھی حق کا راستہ دکھائے اور اس راستے پر چلنے کا حکم دے۔ رسول مرسل اور پیغمبر کا کام بھی اس کے علاوہ نہیں ہوتا وہ بھی اللہ کی طرف سے ایک قاصد ہوتا ہے جو پیامِ وحی کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اگر نبی اور رسول میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے تو وہ محض اعتباری ہے۔ حقیقی فرق نہیں ہے۔ کسی شخص کو اس کی ذاتی واقفیت اور اسرارِ وحی کا عالم ہونے کے لحاظ سے نبی کہا جاسکتا ہے اور پیامِ وحی کی تبلیغ و اشاعت کے لحاظ سے رسول اور مرسل۔

شاھد کے معنی عربی کلام میں مختلف آتے ہیں۔ اس جگہ شاہد کا ترجمہ گواہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ گواہ کا کام ہوتا ہے کہ جس شخص کے متعلق وہ اچھائی برائی کا اظہار کرتا اور نیک یا بد ہونے کی صراحت کرتا ہے۔ حاکم عادل اس کی گواہی پر اعتماد کرتے ہوئے ویسا ہی فیصلہ کر دیتا ہے۔ پھر شاہد کے شہود اور شاہد ہونے کی شرط ہے۔ کسی واقعہ کے متعلق شہادت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک وہ واقعہ گواہ نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو اور ظہورِ واقعہ کے وقت وہ موجود نہ ہو۔ سماعی، قیاسی اور عقلی شہادت درحقیقت شہادت نہیں۔ رسولِ پاک شاہد تھے یعنی حق و باطل، خیر و شر، راستی و کجی کا حضور نے خود مشاہدہ کیا تھا۔ آپ کی واقفیت محض قیاسی اور سماعی نہ تھی۔ حقائقِ اشیاء کو خود دیکھا تھا۔ اللہ کے فرشتے نے اسرارِ وحی کو آپ کے دل میں ڈالا تھا۔ آپ کا ہر علم کشف معائنہ اور بداہت پر مبنی تھا۔ جس طرح آگ کی حرارت اور سورج کی روشنی بدیہی ہے۔ اس طرح آپ کا ہر علم اکتساب و نظر سے پاک تھا۔ اہلِ فلسفہ کی طرح علمِ نبوت قیاسی اور برہانی نہ تھا۔ جس میں غلطی کا امکان اور وقوع ہوتا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ جن باتوں کی آپ تعلیم دیتے تھے ان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور ان کی سچائی کا معائنہ کر لیا تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ پس آپ اللہ کی طرف سے شاہد تھے۔ جو خیر و شر حق و باطل اور راستی و کجی کے متعلق شہادت دینے آئے تھے۔ جس چیز کو آپ نے حق ثواب خیر اور راست فرمایا وہ واقع میں بھی ویسی ہی ہے اور جس چیز کو باطل، غلط، شر اور کج قرار دیا درحقیقت اسی طرح ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب شاہد عادل نے مشاہدہ کے بعد کسی واقعہ کا اظہار کر دیا تو چونکہ اس کا اظہار مبنی بر صداقت ہے، اس لئے منصف حاکم بھی اسی کی شہادت کے مطابق اپنا فیصلہ دے گا۔ سزا دے یا جزا۔ رہا کرے یا قید۔ جو کچھ بھی کرے گا شاہد کی شہادت کے موافق کرے گا تو فی الحقیقت شاہد کی شہادت یا تو فوز و کامرانی اور فتحیابی کی بشارت ہوگی یا تباہی، بربادی اور شکست کا پیغام۔ شاہد یا مبشر ہوگا یا منذر۔ خوشی کی خبر سنانے والا ہوگا یا ہلاکت کی۔

عدالتی شہادت کے علاوہ شہادت کا ایک پہلو اور بھی ہے اور اس کا اچھا برا نتیجہ عمل کرنے والوں کے عمل پر موقوف ہے۔ شاہد کا کام تو صرف بتا دینا ہے۔ اس کے قول پر چلنا نہ چلنا اُن لوگوں کا کام ہے جن کے سامنے شاہد نے شہادت دی ہو۔ اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ زید سچا آدمی ہے اور وہ ایک مجمع کے سامنے بحلف کہتا ہے کہ میں دو راستے طے کرکے آ رہا ہوں۔ ایک راستے میں تو تاریک غار، خندقیں اور خس پوش کنوئیں۔ جو شخص اُدھر جائے گا غار میں گر کر ہلاک ہو جائے گا کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اس راستے میں نوکیلے پتھر اور کانٹے بھی بہت ہیں جو پاؤں کو زخمی کر دیں گے۔ اس کے علاوہ بکثرت سانپ اور بچھو بھی ہیں جو ہر گزرنے والے کو لازمی طور پر کاٹ لیتے ہیں۔ لاتعداد خونخوار درندے بھی وہاں ہیں جن کے پنجے سے رہائی ناممکن ہے اور دوسرا راستہ بالکل محفوظ ہے۔ ہر طرف پھول ہیں۔ کانٹا نام کو نہیں۔ راستہ بالکل ہموار ہے۔ کوئی روڑا، پتھر، غار، پہاڑ یا خندق نہیں ہے نہ وہاں کوئی موذی جانور ہے نہ رہزن کا خوف۔ پہلے راستہ پر چلنے والا یقینی طور پر ہلاک ہو جائے گا اور دوسرے راستہ پر چلنے والا امن اور آرام کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ شاہد کی شہادت اس حد پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اب اس کی شہادت پر یقین کرنا یا نہ کرنا اور دونوں راستوں میں سے کسی ایک پر چلنا اہلِ مجلس کا کام ہے۔ جیسا کوئی کرے گا ویسا بھرے گا۔ رسولِ پاک کی شہادت اس معنی کی بھی حامل تھی۔ جنت اور دوزخ کے بعد اجداد نے اپنے بتا دیے۔ ہر ایک کی کیفیت ظاہر کر دی۔ نجات و ہلاکت کو بھی کھول کر بیان کر دیا۔ پس آپ مبشر تھے ان لوگوں کے لئے جو آپ کے قول کو مان لینے والے تھے اور نذیر اُن لوگوں کے لئے جو سرتابی اور سرکشی کرنے والے تھے۔

دعوت الی اللہ کے معنی ابن کثیر نے دعوت الی عبادت اللہ لکھے ہیں اور ابن عباس نے دعوت الی التوحید قرار دیئے ہیں (طبرانی) بہرحال انسانی اعمال و عقائد و احکام کی حلت و حرمت اور طریقِ زندگی کی راستی و کجی کا فیصلہ کرنا اور صحیح حقائق کا بیان کرنا اپنے اندر کوئی خاص مقصد اور غرض رکھتا ہے اور انسانی دماغوں کے تنوع کے اعتبار سے مقاصد میں گوناگوں اختلاف موجود ہے۔ تاجر کی غرض دیانت و امانت سے صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کی تجارت کو فروغ ہو اور مال بکثرت فروخت ہو۔ ملازم کی غرضِ دیانت سے عزت میں افزونی اور تنخواہ میں بیشی ہوتی ہے اور یہی دیانت ایک حکیم اور فلاسفر کی نظر میں ہر غرض سے خالی ہوتی ہے۔ صرف دیانت چونکہ دیانت ہے

سی امر سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، اس لئے اچھی چیز ہے۔ اسی طرح اظہارِ شجاعت سے مقصود کسی کی نظر میں تو مستقل حکومت کا حصول ہوتا ہے۔ کسی کی نظر مال کے جمع کرنے کی طرف ہوتی ہے۔ کوئی صرف شہرت، وعزت کا طلبگار ہوتا ہے۔ اسی پر تمام احکام حرمت وحلت اور سارے انسانی نظریات واعمال کو قیاس کرنا چاہیئے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ تمام افرادِ انسانی کسی ایک چیز کے حُسن وقبح پر ایک عرض کے تحت متفق الرائے ہوئے ہوں بلکہ میرا یہ کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ تنوعِ اغراض کے باوجود تمام انسانوں کا اجتماع کسی ایک چیز کے حسن یا قبح پر نہیں ہوا۔ ہر چیز میں اختلاف موجود ہے۔ مبدء معاد یہاں تک کہ موت کے متعلق بھی اقوال متضاد ہیں۔ پس شارع نے اگر فضائل ورذائل اور معائب ومناقب میں تو فرق بتا دیا۔ حرام اور حلال کی بھی تفصیل کر دی۔ مبدء معاد کی بھی صحیح توضیح کر دی، لیکن صرف حق وباطل کا فرق اور صحیح غلط کا امتیاز ہی کافی نہ تھا بلکہ تمام افرادِ انسانی چونکہ انسانیت میں برابر کے حصہ دار تھے، اس لئے باوجود تنوع کے سب کے مقاصد کی وحدت بھی ضروری تھی۔ اس وحدت مقاصد کی صراحت اللہ کے بھیجے ہوئے نبی نے کر دی اور سب کا مقصدِ حیات ایک ہی قرار دیا۔ اگرچہ اس مقصد تک پہنچنے کے ذرائع اور وسائط مختلف تھے۔ اعمال کی نوعیت جدا جدا تھی اور زندگی کے معمولات میں تعدد تھا اور مرغوباتِ حیات الگ الگ تھے، مگر سب کے مرکزی نقطہ ایک ہی چیز کو قرار دیا۔ وہ ہے اللہ تک پہنچنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا۔ زراعت اپنی تمام شاخوں کے ساتھ ہو یا تجارت اپنی تمام لائنوں کے ساتھ یا ملازمت اپنے سارے لوازم کے ساتھ یا حکومت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ۔ بہرحال تمام معاملات، عبادات کا اصل مقصد خدا کو پہچاننا اس سے ملنا اس کے قرب میں پہنچنا اور سعادتِ ابدی حاصل کرنا ہے۔ کاشتکار اگر رسولِ پاک کی بتائی ہوئی لائن پر چلتا اور کھیتی کرتا ہے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کو اپنے پیشے کا مقصد قرار دیتا ہے تو ایسی زراعت اس کے لئے عبادت ہے۔ اگر یہی مقصد ہو تجارت، ملازمت، حکومت بلکہ ہر صحت، بیماری، ضعف، توانائی، خادمیت، مخدومیت۔ یہاں تک کہ زندگی کے ہر سکون وحرکت قرار دیا جائے اور سارے انسانوں کے پیشِ نظر زندگی کے کل ساعات ولمحات میں اللہ کی مرضی کا حصول ہو تو کل زندگی عبادت ہی عبادت ہے اور اسی مقصد کی تبلیغ کے لئے رسولِ پاک تشریف لائے تھے اور دعوت الی اللہ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن رسولِ پاک کو اپنی طرف سے مقصدِ انسانی کے مقرر کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ انسانیت عظمیٰ کا مرکزی مقصد کوئی شخص اپنی طرف سے مقرر نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ انسان کامل اور سارے عقلمندوں سے عقلمند ہو۔ یہ حق تو صرف خدا ہی کو ہے کہ وہ اپنی مخلوق کا مقصدِ حیات مقرر فرما دے کیونکہ وہ خالق کل ہے اور اس کا علم ہمہ گیر ہے اور وہ مختارِ مطلق ہے، اس لئے دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ کے بعد بِاِذْنِہٖ بھی فرما دیا۔ یعنی اللہ کے حکم سے اور اس کی وحی سے رسول اللہ نے اللہ ہی سے رشتہ جوڑنے کو انسانی حیات کا مقصد قرار دیا ہے۔

وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ عربی محاورہ میں سراج منیر (روشن چراغ) آفتاب کو کہتے ہیں۔ حضور گرامی کی ذات کو اس آیت میں آفتاب فرما دیا، اس لئے کہ جس طرح آفتاب کی روشنی اور شعاعیں ہر چیز پر پڑتی ہیں اور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ہر شے نور چیں اور اثر پذیر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آفتاب ہدایت کا پرتو بھی تمام عالمِ انسانی بلکہ کل کائنات پر پڑا اور ہر ایک نے اپنے اپنے ظرف اور حوصلہ کے موافق اثر قبول کیا۔ جن لوگوں نے اپنی فطری قابلیت کو بالکل مردہ کر لیا تھا اور زیغ وزیغ کی حد سے آگے بڑھ کر عناد اور تعنت کے دائرہ میں داخل ہو گئے تھے اور اُن کا آئینۂ روح اس قدر کثیف اور زنگ آلود ہو چکا تھا کہ اس کی صفائی ناممکن تھی۔ ان کو تو آفتاب رسالت کی کرنوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ وہ بدستور قعر کفر وجہالت کی تاریک وادیوں میں گھومتے رہے اور جن کے دلوں پر معمولی زنگ آیا تھا اور طغیان وعصیان کے دائرہ میں وہ ابھی داخل نہ ہوئے تھے اور ان کی کثافت قابلِ ازالہ تھی ان کو آفتاب عالمتاب کے نور سے بقدر قابلیت فائدہ پہنچا۔ انہوں نے اپنے دلوں کے زنگ صاف کئے۔ شرک اور فسادِ عقیدہ کے میل کو دور کیا۔ منہیات کی گندگی سے اندرونی اخلاق اور بیرونی اعمال کو پاک کیا اور ادائے فرض اور حسن خصائل کے ذریعہ سے آراستہ ہو کر چمکدار دل اور روشن روحیں لے کر سعادتِ ابدی سے ہمکنار ہو گئے۔ اور ان سے بھی بڑھ کر جن کے ضمیر سادہ اور روحیں صاف تھیں اتنا زیادہ میل نہ تھا کہ رگڑتے مانجھنے اور صاف کرنے کی ضرورت ہوتی بلکہ ان کی فطری صلاحیتیں صرف افسردہ تھیں مردہ نہ ہوئی تھیں تو انہوں نے آفتابِ ہدایت کی نور پاشی سے اتنی زیادہ ضوء اندوزی کی کہ ان کا آئینۂ روح خود بھی روشن ہو گیا اور دوسروں پر بھی اپنا عکس ڈال کر روشن کر دیا۔ یہ سب آفتابِ رسالت کی نور پاشی کا طفیل تھا۔ پس وہ ایسا سراج منیر تھا کہ آسمانی آفتاب کی روشنی بھی اسی کی عکس ریزی کا مظہر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ سراج منیر کا ترجمہ آفتاب کرنا اگرچہ اپنے اندر غیر معمولی عظمت رکھتا ہے، مگر جو علمی فضلی ترجمہ میں یا ہے وہ عرف عام کے معنی میں نہیں چراغ

کے اندر جو کمال ہوتا ہے ۔ آفتاب میں وہ کمال نہیں ہوتا ۔ اگر آفتاب نکل یا تاریکی شب کے پردے میں غائب ہو جائے تو اس کی روشنی بھی زائل ہو جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ چاند کا درجہ آفتاب کی عکاسی کا ممنون ہے وہ مقابلے کے وقت حاصل ہوتا ہے اگر دونوں کے درمیان زمین حائل ہو جائے تو چاند نورانیت سے خالی ہو جاتا ہے ، مگر چراغ میں یہ نقص نہیں ہوتا اس سے ہزاروں لاکھوں بلکہ غیر محدود چراغوں کو روشن کیا جا سکتا ہے اور پھر ان روشن شدہ چراغوں سے دوسرے چراغ جلائے جا سکتے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہ سکتا ہے ۔ صرف چراغوں میں فطری قابلیت کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پس حضور گرامی کی ذات وہ شمع ہدایت تھی جس نے اپنی زندگی میں لاکھوں چراغوں کو روشن کر دیا اور جب وہ شمع پردہ پوش ہو گئی تو روشن چراغوں نے کروڑوں روشن چراغوں کو روغنی علائی اور یہ نور پاشی اور نور چینی کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا ۔ واللہ اعلم ۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۔ اوپر کی آیت میں صراحت فرمائی تھی کہ ہم نے نبی کو مبشر بنا کر بھیجا ہے ۔ لیکن یہ نہیں فرمایا تھا کہ کس کو بشارت دینے کے لئے نبی کو بھیجا اور بشارت دینے کی کیا وجہ ہے اور کس قسم کی بشارت دینے کے لئے نبی کو مبعوث کیا ۔ اس آیت میں انہی امور کی تفصیل ہے ۔ اہل ایمان کو بشارت دینے کا حکم نبی کو دیا ۔ گویا سبب بشارت ایمان کو قرار دیا ۔ علماء کے نزدیک شرعی ایمان ان امور کی تصدیق کو کہتے ہیں جو بداہتاً دین اسلام کے ارکان ہیں ۔ شاید علماء نے اجمالی ایمان کی یہ توضیح کی ہے ۔ ورنہ تفصیلی ایمان تو ان تمام امور کی تصدیق کا نام ہے جو رسول پاک پر نازل ہوئے ہیں ۔ خواہ وہ مسئلہ کیسا ہی چھوٹا ہو ، مگر جب اس کا حکم قرآن میں نازل ہو گیا تو اس کی صحت و حقانیت کی تصدیق لازم ہے اور انکار و تکذیب کفر ہے ۔ اس موقعہ پر اگرچہ مومنین کا لفظ عام ہے اور عام مومنوں کو بشارت دینے کا حکم ہے مگر سیاق کلام اور سباق آیات بتا رہا ہے کہ متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کا جواز اور حضور اقدس کا حضرت زینب سے نکاح کر لینا اہل ایمان کے لئے ناقابل انکار مسائل ہیں ۔ مومنوں پر لازم ہے کہ ان دونوں باتوں کو برا نہ سمجھیں اور منافقوں کی طرح احکام عادلہ کو تنقید کی نظر سے نہ دیکھیں ۔ ایسے ایمان والے واجب البشارت ہیں ۔ آخری ٹکڑے میں بشارت کی نوعیت کو بھی ظاہر کر دیا اور صراحت فرما دی کہ اہل ایمان کو فضل کبیر حاصل ہوگا ۔ فضل کبیر جو آخرت میں ہوگا اس کی تفصیل تو ناممکن ہے ۔ دنیا میں اہل ایمان پر اللہ کا جو فضل ہوتا ہے وہ بھی گوناگوں ہے ۔ کافروں پر غلبہ حکومت عامہ جاہ و جلال ، شوکت و اقبال خصوصاً معمولاتِ زندگی کی سہولت اور احکام شرع کی آسانی فضلِ کبیر کے ادنیٰ مظاہر ہیں ۔

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ ۔ اس آیت میں خطاب رسول اللہ کو ہے ، مگر روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے ۔ خورد گیری ، نکتہ چینی اور بدگوئی کافروں اور منافقوں کا شعار تھا ۔ بے بنیاد بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور مذہب اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ حضرت زینب سے نکاح کا واقعہ ہوا تو اس میں طرح طرح سے رنگ آمیزی کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرنے لگے اور ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو بہکانے اور حضور والا کی طرف سے بدگمان بنانے کی کوشش میں مشغول ہو گئے ۔ اس سے رسولؐ پاک اور عام اہل ایمان کو دکھ پہنچا ، اس لئے استقامت اور صبر کی تعلیم دینے کے لئے حکم ہوا کہ کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانو اور ان کی ایذا رسانی کی کچھ پرواہ نہ کرو وہ تمہارا کچھ نہیں بنا سکتے ۔ جھک مارتے ہیں مارنے دو ۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۔ تمہارا کارساز خدا ہے ۔ تمہارے لئے اس کی کارسازی کافی ہے تم اللہ پر بھروسہ رکھو ۔

تنبیہ :— بعض اہل علم نے شاهد کے لفظ سے اپنے مدعا پر غلط استدلال کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ شاهد کا مصدر شہود ہے اور شہود کا معنی ہے حضور ۔ معلوم ہوا کہ حضور اقدس کو خدا تعالیٰ نے تمام کائنات پر حاضر بنا کر بھیجا ہے اور حضور دو طرح کا ہوتا ہے حضور جسمانی اور حضور علمی ۔ اول معنی حقیقی اور دوسرا مجازی ہے ۔ بہتر تو یہ ہے کہ حضور جسمانی ہی مراد لیا جائے اور اس پر ایمان رکھا جائے کہ سرکار عالی کائنات کی ہر چیز کو اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر رہے تھے ہیں بلکہ کر رہے ہیں ۔ اور بالفرض حقیقی معنی نہ مراد لیا جائے تو مجازی معنی کی طرف تو رجوع کرنا تو لازم ہی ہے اور حضور والا کو حاضر العلم اور کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم بالفعل اور کل ماضی و استقبال کا واقف سمجھنا قطعی ہے ۔

یہ استدلال غلط ہے ۔ اہل تفسیر کے اقوال ، اجماعِ صحابہ ، فرمانِ رسولؐ اور نصوص آیات کے خلاف ہے ۔ شاهد ہونے اور شہادت دینے کی متفق علیہ تفسیر اور روایت و درایت کے مطابق توضیح ہم تفسیری مقالے میں اور تکمیل اجزا کے ذیل میں لکھ چکے ہیں ۔ من شاء فلیطالع

مقصود بیان

حضور اقدس نبی بھی تھے اور رسول بھی ۔ حضور کو شاہد یعنی حق و باطل میں امتیاز اور فیصلہ کرنے والا قیامت کے دن انبیاء اور ان کی امتوں کے متعلق عدل و صداقت کے ساتھ گواہی دینے والا بنا کر بھیجا گیا تھا ۔ آپ مبشر بھی تھے اور منذر بھی ۔ اہل ایمان کی ہو جائے

کی بشارت دینے کے لئے آئے تھے کہ اگر تم میرے لائے ہوئے عقائد اور دستور کو مانو گے تو دونوں جہان میں کامرانی تمہارا استقبال کرے گی اور اللہ کا عظیم الشان فضل تم کو ملے گا ورنہ تباہ کر دیئے جاؤ گے اور آخرت میں جہنم رسید ہو گے۔ پس اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہیئے ماڈرن تعلیم کے ان علمبرداروں کو جو قوانین اسلام پر عمل کرنے اور نظریات اسلام کو تسلیم کرنے کو قدامت پرستی کہتے اور اسلامی تعلیم کو دور حاضر کے لئے جہالت آفریں، بربریت خیز اور شاہراہ ترقی کے لئے روڑا خیال کرتے ہیں۔ سلمان کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ فضل کبیر تو اہل ایمان کے شامل حال رہا ہے اور رہے گا بشرطیکہ وہ مومن ہوں اور سارے جہان پر غالب ہوں گے۔ اگر قرآن کے بتائے ہوئے قوانین کو مانیں اور ان پر چلیں

اس وقت مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس پیچھے ہٹنے میں ہے۔ دنیا کا سل مارکس اور لینن کی تعلیم جہالت کی طرف لے جانے والی ہے اور قرآن کی روشنی شاہراہ ترقی دکھانے والی ہے۔

آخری آیت میں غیر مسلموں کے اقوال کو ماننے اور ان پر چلنے کی ممانعت اور اللہ پر بھروسہ رکھنے اور اس کی تعلیم پر چلنے کی ہدایت ہے وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

مسلمانو　جب تم مسلمان عورتوں سے　نکاح کرو　پھر　ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے　طلاق　دے دو

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا

تو ان پر تمہاری عدت کا کوئی حق نہیں ہے کہ تم اس کا شمار کرو　بلکہ ان کو کچھ سامان دیدو　اور خوش　اسلوبی سے　رخصت کرو

تفسیر اسلام نے جہاں مبدء و معاد کے متعلق صحیح افکار کی تعلیم دی ہے۔ وہاں نظام انسانی کو عدل کے ساتھ قائم رکھنا بھی اس کا مقصود ہے۔ کیونکہ ہوشمند انسان جب ایک دوسرے کی حق تلفی کرنے لگے اور باہم دست تعدی دراز ہونے لگے تو دوسری مخلوق جو اس سے پست درجہ پر ہے کس طرح اپنے عقائد کو قائم رکھ سکے گی۔ نظام انسانی کی مختلف شاخیں ہیں، اس لئے کہ انسانی عمرانیت گوناگوں ضرورتوں سے وابستہ ہے۔ سیاست ملکی مدنیت، تہذیب اخلاق اور معاشرت سب ہی اس کی انواع ہیں، لیکن اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو اخلاق معاشرت اور سیاست وغیرہ سب آپس میں مربوط اور ہر ایک کا حلقہ دوسرے حلقے سے وابستہ ہے، مگر ان سب کی جڑ اور بنیادی پتھر عورت و مرد کے حقوق کی تفصیل اور باہم ادائے فرض کے قوانین کی تعلیم ہے۔ دونوں کے اختلاط سے ہی نسل انسانی کی افزائش اور سطح زمین کی آبادی ہوتی ہے۔ مرد کا مرد سے اور عورت کا عورت سے۔ والدین کا اولاد سے اور اولاد کا والدین سے۔ راعی کا رعایا سے اور رعایا کا راعی سے۔ دوست کا دوست سے اور دشمن کا دشمن سے کیا تعلق ہونا چاہیئے اور ہر ایک کا فرض کیا ہے۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ درحقیقت صنفی تعلقات کی خوشگواری کا نظام انسانی کا راس المال ہے۔ انسان کے صنفی تعلقات کی رسی اگر یوں ہی چوپایوں کی طرح ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور کوئی حد بندی نہ کی جائے تو علاوہ اخلاق کی تباہی اور معاشرت کی بربادی کے امراض متعدیہ کی کثرت، زہریلے جراثیم کی افزونی اور رقیبانہ قتل کے کیسوں کی فراوانی ہونی لازم ہے، اس لئے صنفی تعلقات میں خصوصیت اور ان کی حد بندی لازم ہے۔ اسی بنا پر مختلف مذاہب و اقوام نے اشتراک نسوانی کی اجازت نہ دی اور اسلام نے بھی اس حد بندی کی مزید تائید کی اور اس خصوصیت صنفی کا نام نکاح رکھا، لیکن خصوصیت صنفی کو خوشگوار بنانا بھی تعمیر انسانی کے لئے ضروری تھا اور خوشگوار بنانے کے لئے مرد اور عورت دونوں کے حقوق کی حد بندی اور پاسداری لازم تھی اور بصورت ناموافقت ترک تعلق کے بغیر بھی چارہ نہ تھا اور ترک تعلق کے لوازم کا بیان بھی لابدی تھا اور انقطاع تعلق کے احکام کی تفصیل اور اس کے مختلف اقسام کا جدا جدا فیصلہ کرنا بھی واجب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نکاح، طلاق بعد النکاح اور بعد الطلاق احوال پر مفصل واضح روشنی ڈالی۔ انہی مسائل میں سے ایک دشوار ترین مسئلہ یہ تھا کہ اگر مرد عورت سے کوئی صنفی فائدہ نہ اٹھا سکے تو اور کسی بنا پر تعلق منقطع کرنا پڑ جائے تو مرد کا عورت پر اور عورت کا مرد پر کیا حق ہوتا ہے اور اس حالت میں تعلق توڑنے کے بعد عورت سے کس قسم کا سلوک کیا جائے۔ اسی کی تفصیل آیت مذکورۂ بالا میں کی ہے۔ والعلم عند اللہ

تحلیل اجزاء:- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ

عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ خطیب نے سراج میں ربط آیات کے متعلق لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے اپنے حقوق کی تعلیم دی اور فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ الی آخرہ۔ پھر حضور کی بیویوں کے متعلق فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ الخ۔ پھر عام اہلِ ایمان پر احسان رکھتے ہوئے فرمایا یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا الخ۔ یہ تمام صفات و احکام تو براہِ راست حضور کی ذات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن قرآن کا قاعدہ ہے کہ حضور والا کے تذکرہ کے ساتھ اہلِ ایمان کے خصوصی فائدہ کے لئے کچھ ہدایت فرماتا ہے۔ چنانچہ چند آیات سے پہلے ارشاد فرمایا تھا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا الخ۔ اور اس جگہ مومنوں کی بیویوں کے متعلق آیتِ مذکورہ میں چند احکام ظاہر فرمائے۔

ہم آیت کے ہر ٹکڑے کی تشریح تفسیری مطلب بیان کرنے سے پہلے بیان کرنی چاہتے ہیں۔

نکاح کا لفظ عرب میں مشترک ہے۔ عقد اور جماع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ با جماع اہلِ تفسیر اس جگہ عقد مراد ہے۔ اسی طرح مس کرنے اور چھونے سے مراد ہے جماع کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ نکاح کرنے کے بعد اگر بیوی کو بغیر جماع (یا قائم مقام جماع یعنی خلوتِ صحیحہ) کے طلاق دے دی تو بیوی پر عدت لازم نہیں ہے۔ یعنی اس کو حق ہے کہ وہ بغیر انقضائے عدت کے انتظار کے فوراً کسی سے اپنا نکاح کر لے البتہ اس کو پورا مہر نہ ملے گا بلکہ متعہ ملے گا۔ یعنی اگر اس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو متوسط درجہ کے ایک جوڑ کپڑے دینے ہوں گے اور خوبصورتی کے ساتھ بغیر سختی اور درشتی کے اس کو رخصت کر دینا ہوگا اور اگر مہر مقرر ہو تو اس کو کل مہر کا نصف دینا ضروری ہے۔ ابن کثیر نے اس جگہ چند امور کی تنقیح کی ہے۔ نمبر۱ آیت میں چونکہ مومنات سے نکاح کرنے اور ان کو طلاق دینے کا ذکر ہے، اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کتابی عورت (یہودی یا عیسائی) سے نکاح کیا اور بغیر خلوتِ صحیحہ کے اس کو طلاق دے دی تو اس پر عدت لازم ہے اور شوہر کے ذمہ اس کو متعہ دینا واجب نہیں ہے، لیکن یہ استنباط غلط ہے۔ آیت میں مومنات کی قید محض واقعہ کے طور پر ہے احترازی نہیں ہے۔ کتابیہ پر عدت گذارنی تو بدرجۂ اولیٰ غیر لازم ہے اور متعہ کا حکم دونوں میں مشترک ہے کسی کی تخصیص نہیں۔ نمبر۲ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ میں چونکہ لفظ ثُمَّ آیا ہے جس کا مطلب بظاہر یہ نکلتا ہے کہ اگر نکاح کے بعد عورت کو طلاق دی تو عدت اور تکمیل مہر لازم نہیں۔ پس اگر کسی نے نکاح سے پہلے طلاق دے دی اور یہ الفاظ کہے کہ اگر میں ہندہ سے نکاح کروں تو ہندہ کو طلاق ہے اور پھر ہندہ سے نکاح کیا اور لفظ مذکور کے کہنے کے سبب طلاق ہوگئی تو اب ہندہ پر عدت لازم ہونا چاہیئے کیونکہ یہ طلاق نکاح سے پہلے ہوئی ہے یا کلام مذکور کو لغو قرار دیا جائے۔

اس بحث کی کسی قدر فقہی تنقیح ضروری ہے۔ ابن عباس، سعید بن مسیب، حسن بصری، امام زین العابدین، شافعی، احمد بن حنبل اور دوسرے جلیل القدر علماء نے اس آیت سے استنباط کیا ہے کہ طلاق نکاح کے بعد ہوتی ہے نکاح سے پہلے نہیں ہوتی۔ ایک بار سعید بن جبیر نے ابن عباس سے دریافت کیا کہ اگر کسی نے کہا میں جس عورت سے بھی نکاح کروں وہ طالقہ ہے اور پھر اس نے نکاح کیا تو کیا حکم ہے؟ ابن عباس نے فرمایا اس کا یہ کلام لغو ہے۔ دیکھو اللہ نے خود فرمایا ہے اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ الخ۔ پس اللہ نے طلاق کو نکاح کے بعد فرمایا ہے (ابن ابی حاتم) لہٰذا نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے (ابن اسحاق) قول مذکور کے قائلوں نے دو حدیثیں بھی اپنے مسلک کی تائید میں پیش کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں حضور والا نے ارشاد فرمایا لا طلاق لابن آدم فیما لا یملک۔ یعنی جہاں ملکیت نہ ہو وہاں طلاق نہیں ہوتی (رواہ احمد وابو داؤد وابن ماجۃ والترمذی) دوسری روایت حضرت علی اور حضرت مسور بن مخرمہ نے بیان کی کہ حضور نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں (رواہ ابن ماجۃ) امام شافعی نے اتنی توضیح مزید کی کہ اگر کسی مبہم یا معین عورت کے متعلق کسی نے کلمات مذکور کہے تو چونکہ ابھی اس عورت سے نکاح ہی نہیں ہوا اور محل طلاق موجود ہی نہیں ہے لہٰذا کلام لغو ہو جائے گا، لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا قول ہے کہ کلام لغو نہ ہوگا بلکہ معلق رہے گا۔ جب محل موجود ہو جائے گا اور نکاح کا تحقق ہو جائے گا تو طلاق بھی واقع ہو جائے گی اور یہ قول احادیث مذکورہ کے خلاف بھی نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مطلب تو یہ ہے کہ نکاح کے تحقق کے بغیر طلاق کا تحقق نہیں ہوتا اور ہم بھی اس کے قائل ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق کو معلق کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ پس طلاق کا تحقق نکاح کے بعد ہی ہوتا ہے خواہ طلاق کی تعلیق نکاح سے پہلے کی جائے یا نہ کی جائے۔ صورت مذکورہ میں تعلیق طلاق قبل از نکاح بالفعل ہوتی ہے وقوع طلاق بالفعل نہیں ہوتا۔ پس تعلیق طلاق نکاح پر مرتب ہوگی اور وقوع طلاق وقوع نکاح پر۔ اس کے متعلق امام ابوحنیفہ اور امام مالک میں باہم اختلاف رائے ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مذکورہ فیصلہ عام ہے۔ خواہ معین عورت ہو یا مبہم۔ مثلاً اگر اس طرح کہا کہ میں ہندہ سے نکاح کروں تو اس کو طلاق ہے یا یوں کہا جائے کہ میں جس عورت سے نکاح کروں وہ طالقہ ہے۔ دونوں کا حکم ایک ہی ہے، لیکن امام مالک پہلی صورت میں تو امام ابوحنیفہ کی رائے سے متفق ہیں اور موخر الذکر صورت میں کلام کے لغو ہونے کے قائل ہیں۔

بہرحال امام ابوحنیفہ کے مسلک پر آیت کی تفسیر میں اس طرح کہا جائے گا کہ اس جگہ وقوع طلاق کو وقوع نکاح پر مرتب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب تم نکاح کرو اور پھر طلاق دے دو۔ اس صراحت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تعلیق طلاق تعلیق نکاح پر مرتب ہوگی اور طلاق کو نکاح پر معلق کرنا صحیح ہوگا۔

۳ غیر مدخولہ مطلقہ پر عدت لازم نہیں ہے وہ جب چاہے نکاح کرلے، لیکن اگر غیر مدخولہ کا شوہر مرجائے تو نفی عدت کا استخراج آیت سے نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے علماء کا اجماع ہے کہ اگر غیر مدخولہ کا شوہر مرجائے تو عدت ضروری ہے۔

۴ فَمَتِّعُوْهُنَّ کی تشریح میں اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ چونکہ دوسرے پارہ میں اس غیر مدخولہ مطلقہ کے متعلق جس کا مہر مقرر کردیا گیا ہو نصف مہر دینے کی صراحت آگئی ہے اور فرمایا ہے۔ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ الخ۔ اس لئے اس جگہ جو متعہ دینے کا حکم ہے وہ دونوں کو عام ہے یعنی اگر مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو شرعی کپڑے دینا ہوں گے اور مہر مقرر ہو تو نصف مہر دینا ہوگا۔ علی ابن طلحہ نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اگر عورت کا کچھ مہر مقرر کردیا ہو تو اس عورت کو نصف مہر کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا اور اگر مہر مقرر نہ کیا ہو تو شوہر اپنی تنگ دستی اور فراخ دستی کے لحاظ سے اس کو متعہ دے دے۔ یہی سراح جمیل ہے۔ (ابن کثیر)

۵ غیر مدخولہ مطلقہ جوڑا دینا واجب ہے یا مستحب؟ خطیب نے لکھا ہے کہ علماء کے اقوال میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض علماء نے ظاہر آیت کا لحاظ کرتے ہوئے بہرحال واجب کہا ہے، لیکن اکثر علماء نے صراحت کی ہے کہ جس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہے اس صورت میں کپڑے دینا مستحب ہے اور جس صورت میں نصف مہر دینا واجب نہیں اس میں کپڑے دینے واجب ہیں۔

۶ احناف میں سے بعض متاخرین کا فتویٰ ہے کہ متعہ دینے میں شوہر اور بیوی دونوں کی وسعت و تنگی کا لحاظ رکھنا لازم ہوگا اوسط قائم کر کے کپڑے دیے جائیں گے، لیکن حق یہ ہے کہ صرف شوہر کی حالت کا لحاظ ضروری ہے۔ زوجہ کی فراخ دستی اور تنگ دستی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا جو قول نقل کیا ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی صریح نص میں یہی وارد ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ــــ لیکن یہ تفصیل اس وقت ضروری ہے جب متعہ دینا واجب ہو جس صورت میں وجوب نہ ہو۔ استحباب ہو تو شوہر کی مرضی پر موقوف ہے عورت کو مطالبہ کا ہی حق نہیں ہے تو حیثیت مطالبہ تو بجائے خود رہی۔

مقصودِ بیان عورت مسلمان ہو یا کتابی۔ اگر اس کا نکاح کسی مسلمان سے ہوجائے اور جماع یا خلوتِ صحیحہ نہ ہوسکے اور مرد طلاق دے دے اور مہر بھی مقرر نہ کیا گیا ہو تو متعہ واجب ہے اور اگر مہر مقرر ہو تو صرف نصف مہر ادا کرنا لازم ہے، لیکن دونوں صورتوں میں سے کسی صورت میں عدت واجب نہیں ہے۔ طلاق دینے کے بعد عورت کو زبردستی روکے رکھنا یا کسی طرح کی زیادتی کرنی حرام ہے۔ ضروری ہے کہ خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردیا جائے اور اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے۔

تنبیہ:- جو لوگ اسلامی تہذیب کو عورتوں کے حق میں ظلم انگیز اور حق شکن کہتے ہیں ان کو آیتِ مذکورہ کے مغز کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ باوجودیکہ مرد عورت سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکا نہ عورت کو کوئی جسمانی یا مالی یا خاندانی ضرر پہنچا، مگر قانونِ اسلام نے پھر بھی عورت کی اتنی پاس داری کی کہ اس کو جوڑا یا نصف مہر دلوانا لازم قرار دیا۔ اس لحاظ سے کہ شاید طلاق کا نام لگنے سے ہی عورت کی دل شکنی ہوگئی اور کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کی صورت میں اس کی کچھ سبکی ہو رہی ہو، لیکن مرد کو باوجود نصف مہر یا جوڑا دینے کے اتنا حق بھی نہ دیا کہ تین مہینے بے نکاح بیٹھے رہنے پر وہ عورت کو مجبور کرسکے، اس لئے کہ عورت کو طلاق میں کوئی دخل نہیں ہے طلاق مرد کے ہاتھ میں ہے اور قربت کا اختیار بھی اسی کو ہے۔ اگر عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے اس نے قربت سے اجتناب کیا اور خود طلاق دے دی تو اب اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دینے کے حکم سے ان جاہلوں یا جاہل نما مولویوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جو بے کس عورتوں کو طلاق دینے کے بعد بھی زیادتی کرتے اور ان کو دوسری جگہ نکاح کرنے سے روکتے ہیں وغیرہ۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ

اے نبی! ہم نے تمہارے لئے وہ بیبیاں جن کا مہر تم دے چکے ہو اور تمہاری وہ باندیاں جو اللہ نے

مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ

تم کو بلاجنگ کے مفت عنایت کی ہیں حلال کردی ہیں اور (تمہارے لئے نکاح حلال کردیا ہے) تمہاری چچا کی بیٹیوں سے اور تمہاری پھوپی کی بیٹیوں سے اور

هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡوَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ

ماموں کی بیٹیوں سے اور خالہ کی بیٹیوں سے جنہوں نے تمہارے ہمراہی میں ترک وطن کیا اور کوئی مسلمان عورت اگر اپنے نفس کا اختیار بلامہر نبی کو دیدے اور نبی اس سے نکاح

يَّسْتَنْكِحَهَا ۚ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ

کرنا چاہیں تو یہ (عورت) خصوصیت کے ساتھ تمہارے ہی لئے حلال ہے نہ اور مسلمانوں کے لئے ہم کو علم ہے جو کچھ ہم نے مسلمانوں پر ان کی بیبیوں اور

اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا

لونڈیوں کے بارے میں فرض کردیا ہے (اے محمد یہ حکم اس لئے دیا) تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ غفور رحیم

رَّحِيْمًا ۝ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ

ہے اُن عورتوں میں سے تم جس کو چاہو موقوف رکھو اور جس کو چاہو اپنے پاس جگہ دو اور جس سے تم نے کنارہ کشی کی تھی پھر اسکو

عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ

(نکاح میں) لانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں لگتا ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور وہ سب کی سب اس

بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝

چیز سے راضی رہیں جو تم نے اُن کو دیا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور اللہ دانا با علم ہے

تفسیر تخلیق انسانی کے آغاز سے لیکر اب تک انتظام معاشرت اور سوسائٹی کو خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قانونی دوڑ تمام ہوشمند کائنات انسانی کی اور کر رہی ہے۔ اصول معاشرت وضع کئے گئے۔ باہمی تعلقات کی درستگی اور اصلاح کے ضوابط بنائے گئے۔ ایسے قوانین کی تعلیم دی گئی جو کمزوریوں کو دور کر کے سوسائٹی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کریں۔ باہمی فتنہ وفساد کا مبدء حصول زر وطلب جاہ اور قبضۂ اراضی تھا۔ اس فساد کو دور کرنے کے لئے اختلاف، املاک، عمل عام اور مباحث ارضی کے قوانین بنا کر ہر چیز کی حد بندی کردی گئی۔ زر، زور اور زمین کا غیر مفید اشتراک تباہی خیز تھا۔ ہر شخص اپنے حق سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا تھا، اس لئے تفرقۂ ملک ضروری تھا۔ پھر تفرقۂ ملک کے ساتھ املاک کے منافع کی تحدید بھی لازم۔ پس بعض منافع مشترک قرار دیے گئے اور بعض شخصی۔ مفروض وضع قوانین کی جہاں تک حد تھی اس حد تک طبقاتی جنگ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور چونکہ انسانوں کے دماغ مختلف ہیں، اسلئے وضع قوانین میں بھی اختلاف ہوا اور متفق علیہ دستور العمل تیار نہ ہو سکا جس کو معدلت عامہ کا علمبردار کہا جا سکے۔ گویا مختلف قوانین نے مختلف اقوام اور پراگندہ طبقات کے جذبات کا مظاہرہ کیا اور ایک ہوشمند کا بنایا ہوا قانون دوسرے کے وضع کردہ آئین کی ضد قرار پایا اور طبقاتی جنگ دور نہ ہو سکی۔ مجبوراً ہمہ گیر قدرت کے قانون کی طرف رجوع کرنا پڑا اور آسمانی قانون نے آکر دنیا کی باہمی اور کشاکشی کا خاتمہ کردیا، لیکن زر، زور اور زمین کے جھگڑوں کے علاوہ دنیا میں تباہ کاریوں کا

سب سے پہلا اور سب سے بڑا سرچشمہ فساد تھا۔ جس سے تمام انسانوں میں فساد کی نہریں بہ رہی تھیں۔ خون ریزی، سفاکی، نسل کشی، تعدیۂ امراض اور ان کے علاوہ طرح طرح کی خرابیاں اسی سرچشمہ سے پھوٹ پھوٹ کر نکلی تھیں۔ وہ تھا مرد و عورت کا صنفی تعلق اور زن و مرد کے ربط و وابستگی کی کیفیت۔ اس فساد نے ہر ملک، ہر بستی، ہر گھر اور ہر دل میں ہلچل ڈال دی۔ انسانی عمارت کی ایک ایک اینٹ کو منتشر کر دیا۔ راحت و چین کے پھول کی ایک ایک پتی فضا نے بسیط میں بکھر گئی۔ سکون ارواح مفقود ہو گیا اور اطمینان قلوب کافور بن کر اُڑ گیا۔ پس ہوشمندوں نے راحت دل، سکون روح اور امن عالم پیدا کرنے کے لئے اپنے اپنے خطرات اور افکار کے مطابق صنفی ربط و ضبط کے قوانین بنائے۔ اس وقت سب سے پہلے بحث طلب دو چیزیں قرار پائیں۔ (۱) کیا ہر مرد کو ہر عورت سے اور ہر عورت کو ہر مرد سے تمتع اندوز ہونے کا حق ہے اور عورت کی ہستی کا شمار منافع عامہ میں سے ہے اور پانی، ہوا، دھوپ اور ستاروں کی روشنی کی طرح کسی مرد کی کسی عورت سے خصوصیت نہیں۔ اشتراک نسوانی و رجالی عمومی ہے نہ کوئی کسی کی بیوی ہے نہ کوئی کسی کا شوہر نہ صنفی تمتع اندوزی کی کوئی حد ہے۔ ماں بیٹی بہن دادی نانی پوتی نواسی بھانجی بھتیجی غرض ہر عورت دنیا میں عورت ہے اور ہر مرد کے لئے عورت ہے۔

۲ یا عورت کی حیثیت شیرینی کی طرح نہیں کہ جس کسی کو استعمال کرنا آتا ہو وہ استعمال کرے۔ عورت کی ہستی مرد کے لئے تفریحی شکار کی نہیں ہے کہ جب اور جس کو چاہا شکار کیا۔ یہ بازار کی مٹھائی نہیں کہ جس نے روپیہ صرف کیا اُس نے خرید کر کھا لیا۔ عورت کے خمیر میں حیا، شرم اور رقت قلب داخل ہے اور یہ چیزیں اس کو عمومی رہ گزر اور شاہراہ کے مرتبے پر نہیں دیکھ سکتیں۔ عورت نہ پبلک پارک ہے نہ آب رواں نہ نسیم صبا نہ جلوۂ ماہتاب نہ ضیائے شمس نہ برساتی بارش نہ موسمی حرارت نہ فصلی برودت نہ کسی کی خصوصیت ہی نہ ہو اور ہر شخص مساویانہ فائدہ اٹھا سکے۔ عورت جاندار ہے، صاحب ارادہ اور مالک شعور، حامل عقل اور راحت کی خواستگار مخلوق ہے۔ مرد کی طرح اس کو بھی سکون روح اور اطمینان قلب کی جستجو ہے۔ اس کو تحتانی حیوانوں سے برتر درجہ حاصل ہے، اس لئے صنفی تعلقات کی حد بندی لازم ہے تاکہ امتیاز نسل ہو سکے، تعدیۂ امراض سے حفاظت ہو جائے۔ سکون روح مردوں عورتوں دونوں کو حاصل ہو جائے۔ اخلاق تباہ نہ ہوں۔ معاشرت گندی نہ ہو۔ سوسائٹی میں دماغ سوز مکروہ بو نہ آئے۔ دنیا تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے۔ صنفی قوتوں کا حد سے بڑھا ہوا جوش اپنے دائرہ سے نکل کر دست درازی نہ کر سکے۔ عزت، حیا اور عفت کا موتی آبرو باختہ نہ ہونے پائے۔ شق اول الذکر اگرچہ ایران کے مشہور فلاسفر مزدک اور اس کے ہم نواؤں کی تھی، لیکن چونکہ اشتراک نسوانی کا نظریہ دنیا کو تباہی کے غار میں گرنے کی دعوت دے رہا ہے اور عافیت انسانی کو پیدا کرنے کے عوض امن عالم کو برباد کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے تمام عالم کے ہوشمندوں نے اس حیا سوز غیرت کش فکریہ سے اتفاق نہیں کیا اور اس کو زندگی کا دستور العمل بننے کی اجازت نہ دی۔ اول الذکر کی جگہ دوسرے نظریہ کو عافیت انسانی کے لئے ضروری قرار دیا۔ اشتراک نسوانی کی بجائے امتیاز نسوانی کو نسل، اصل، صحت، امن، سکون، غیرت، عصمت اور تفرقہ حقوق کے لئے لازم قرار دیا۔ آسمانی کتابوں اور خدائی مذہب کے پیامبروں نے بھی اسی کی تائید کی اور اس کو حیات انسانی کا جزو لاینفک بتایا۔ اور اس کا نام قانون نکاح رکھا اور اس طرح صنفی تعلقات کو خاص آئین کی رسی سے باندھ دیا۔ لیکن اس کے بعد بھی دو امور حل طلب پیدا ہو گئے۔

۱ کیا ایک مرد کا نکاح ایک ہی عورت سے ہونا چاہیئے اور ایک عورت کے لئے ایک ہی مرد کافی ہے یا اس کے خلاف ایک مرد متعدد عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے یا ایک عورت ایک وقت میں متعدد مردوں کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔ گویا اس نمبر کی چار شقیں ہو گئیں۔ ایک عورت کے لئے ایک مرد اور ایک مرد کے لئے ایک عورت اور ایک مرد کے لئے متعدد عورتیں اور ایک عورت کے لئے متعدد مرد۔ دوسری شق کو دنیا کے تمام مذاہب اور عقلاء نے پسند کیا اور لازم قرار دیا۔ صرف ہندوؤں میں بعض فرقے ایسے ہیں جو ایک عورت کے لئے ایک وقت میں ایک مرد سے زائد کے ساتھ عقد ازدواج کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ چیز اچھی ہے یا بری۔ یہ اس وقت تفسیر آیات کے مقابلے کے موضوع سے خارج ہے۔ پہلی شق کو بعض قوموں نے ضروری قرار دیا ہے اور بعض قوموں نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے۔ اسلام ان مذاہب میں سے ہے جس نے کثرت ازدواج کی اجازت دی ہے، مگر سخت شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ ہم آیت مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کے ذیل میں کثرت ازدواج کی مصلحت و حکمت بیان کر چکے ہیں، تکرار غیر مفید ہے۔

جب اسلام نے کثرت زوجیت کی اجازت دے دی تو اب حل طلب یہ امر ہے کہ کیا سب کے لئے یہ اجازت عمومی ہے اور سب کو اختیار ہے کہ جتنی بیبیاں چاہیں رکھیں یا اس کی کوئی خاص حد بندی ہے اور تعداد محدود ہے۔ عمومی اجازت نہ فقط غیر مفید بلکہ مضرت رساں ہے۔ علم، جسم، صحت، مدنیت،

معاشرت سب کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ شہوانی قوتوں کو مطلق العنان چھوڑ دینا تباہی کا پیش خیمہ ہے، اس لئے تعدد زوجیت کی حد بندی ضروری ہے۔ اسی لئے اسلام نے حد بندی کر دی۔ عام لوگوں کے لئے غرض زوجیت چار سے پوری ہو جاتی تھی، اس لئے ان کو چار سے زائد کی اجازت نہ دی، مگر رسول پاک کی حالت اور آپ کے فرائض دوسروں سے جدا تھے۔ آپ دنیا میں روح انقلاب پھونکنا چاہتے تھے۔ پیام اصلاح لے کر آئے تھے اور دونوں صنفوں کی اصلاح آپ پر فرض تھی۔ صرف نسل کشی، لذت اندوزی اور بقائے جسم ونوع کی کوشش آپ پر فرض نہ تھی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بہت بلند اور برتر مقصد آپ کے پیش نظر تھا۔ تمام افراد انسانی کو علمی اور عملی گمراہیوں سے نکالنا اور راہ روشن دکھانی معمولی کام نہ تھا۔ ایک فرقہ ایک خاندان ایک ملک ایک قوم ہی کو آپ کی ضرورت نہ تھی بلکہ سارا معمورۂ انسانی آپ کا ضرورتمند تھا، اس لئے آپ کے لئے دائرۂ ازدواج کی توسیع لازم تھی۔ جوق در جوق اور گروہ در گروہ مردوں کی اصلاح تو بہر طور ممکن تھی۔ ہر سمت سے لوگ آتے تھے اور دربار نبوت میں آکر پڑ جاتے تھے۔ اصحاب صُفّہ طالبان دین ہی کا ایک گروہ تھا جو ہر وقت تحصیل دین کے لئے نبوت خانہ سے باہر حاضر رہتا تھا۔ جس کی تعداد کم سے کم ستر اور زیادہ سے زیادہ تین سو تک پہنچ جاتی تھی اور یہاں سے پوری تعلیم حاصل کر کے اطراف ملک میں جا کر تبلیغ کرتے تھے۔ بغرض وقتی طور پر مختلف مسائل دریافت کرنے کے لئے حاضر ہونے والے ان کے علاوہ تھے۔ گویا کاشانۂ نبوت سے باہر ایک عظیم الشان یونیورسٹی تھی جس کو ہم صُفّہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ جس میں ہر قوم، ہر سمت اور ہر شہر کے طالب علم تھے اور ہر قسم کے علم کے خواستگار۔ مردوں کی اصلاح کے دائرہ کی توسیع تو اس طرح ہو رہی تھی لیکن عورتوں کی اصلاح کا تو یہ طریقہ نہ تھا کوئی ایسا آشرم نہ تھا جس میں کنواریاں اور شادی شدہ عورتیں سب کی سب جمع ہوں اور ہر وقت جمع رہیں۔ یہ چیز انتہائی اخلاق سوز اور عفت کش تھی۔ موجودہ آشرموں اور اسپتالوں کی تنقیح کرنے کے بعد اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ اسلام رہبانیت کی تلقین نہیں کرتا اور عورتیں بھی اپنے اندر جذبات شہوانی رکھتی ہیں اور پورے مذہب کی تعلیم ایک دو دن یا ایک دو ماہ میں ناممکن ہے۔ پھر کس طرح غیر عورتوں کو ہمیشہ حاضر رہنے کی اجازت دی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ضروریات زندگی بھی ہر وقت کی حاضر باشی سے مانع تھیں۔ لامحالہ دائرۂ زوجیت کو وسیع کرنے کی اجازت دینی ضروری تھی۔ اس توسیع کی اجازت طلبگاران علم کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ قطار در قطار اور گروہ در گروہ عورتیں دین کی مشتاق تھیں۔ بہتوں کی تمنا تھی کہ حضور انہیں زوجیت کے سلسلے میں منسلک فرمالیں، مگر ہر ایک کی خواہش کیسے پوری کی جا سکتی تھی۔ ازدواجی انتظام کے لئے ادائے مہر لازم تھا اور ادائے مہر کے لئے رقم کی فراہمی ناممکن، اس لئے جب تعداد زوجیت بیک وقت نو پر پہنچی تو باوجود ضرورت تبلیغ کے سلسلۂ ازدواج کی بندش کا حکم ہو گیا اور چونکہ موجودہ ازواج کا کوئی قصور نہ تھا کہ ان میں سے کسی کو جدا کر کے ان کی بجائے دوسری عورت کو رشتۂ زوجیت میں داخل کر لیا جاتا، اس لئے تبدیل ازواج کی بھی ممانعت ہو گئی، مگر عورتوں کا بڑھتا ہوا مذہبی شغف اور تبلیغ نسوانی کی ضرورت مجبور کرتی تھی کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو اور عورتوں میں دین کو بکثرت پھیلایا جائے، اس لئے اجازت دے دی گئی کہ اگر کوئی عورت اشتیاق علمی سے مجبور ہو کر بغیر ادائیگی مہر کے رسول اللہ کے سلسلۂ زوجیت میں داخل ہونا چاہے تو اس کو اس کی اجازت ہے۔ واہبات النفس عورتوں سے ازدواج کی اجازت ایک اور وجہ سے بھی دی گئی تھی سلسلۂ نکاح بند ہو جانے کے بعد چونکہ اشاعت وتبلیغ ضروری تھی اور عورتوں کی اصلاح لازم، اس لئے باندیاں رکھنے کی اجازت مقررہ شرائط کے ساتھ دی گئی، مگر باندیوں کا حصول آسان نہ تھا۔ جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں عموماً آزاد کر دی جاتی تھیں اور خرید کر رکھنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی جو موجود نہ تھا، اس لئے باوجود اجازت کے کاشانۂ نبوت میں ایک یا دو سے زائد کنیزیں داخل نہ ہو سکیں۔ لامحالہ آزاد عورتوں کی طرف رجوع کرنا پڑا، مگر کنیزوں کا دروازہ بھی بند نہ کیا گیا کیونکہ عملی طور پر اس دروازہ کا کھلا رہنا بجائے خود کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہ تھا اور اتنی تعداد فراہم ہی نہ ہوتی تھی کہ مزید کی ممانعت کر دی جاتی۔ پس یہ وجہ تھی کہ حضور والا کے لئے مذکورہ تینوں اقسام کی عورتوں کی اجازت ہوئی اور آخر میں دائرۂ نکاح کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

۲۔ مرد اور عورت کی نکاحی وابستگی کے کیا معنی ہیں؟ کیا نکاح ایک سادہ معاہدہ ہے جس کی وجہ سے ایک صنف دوسری صنف کے ساتھ مخصوص صحبت سے وابستہ ہو جاتی ہے اور اس وابستگی کے علاوہ معاشی اور مالی کفالت کسی کی کسی کے ذمہ نہیں ہوتی یا نکاح ایسا رنگین معاہدہ ہے جو حیات نو پیدا کرتا ہے اور بکثرت مالی اور غیر مالی ذمہ داریاں ایک کی دوسرے پر ڈالتا ہے۔ اوّل الذکر خیال کے حامی غالباً دنیا میں موجود نہیں۔ نکاح کے بعد طرفین پر مختلف ذمہ داریاں عائد ہونے کے قائل دنیا کی ہر قوم ہے، لیکن ذمہ داریوں کی نوعیت چونکہ گوناگوں ہے، اس لئے مختلف اقوام کے خیالات بھی اس کے متعلق مختلف ہیں۔ بعض اقوام کے نزدیک بوقت نکاح کوئی صنف دوسری صنف کو کسی قسم کی مالی قیمت دینے پر مجبور نہیں اور نکاح کے بعد آئندہ زندگی میں معاشی

کفالت عورت کے ذمہ ہوتی ہے ۔ عورت کمانے پر مجبور ہے اور مرد خانگی انتظام پر۔ بعض قوموں کے نزدیک نکاح کا معاوضہ تو طرفین میں سے کسی پر عائد نہیں ہوتا ۔ مگر نکاح کے بعد کھانے پینے پہننے اور دوسری ضروریات فراہم کرنے کے مصارف مرد کے ذمہ ہوتے ہیں ۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب کا قانون ہے اور ہندوؤں کا دستور العمل بھی کہ صنفی معاہدہ سے پہلے کچھ رقم عورت کی طرف سے مرد کو دی جاتی ہے اور تکمیل معاہدہ کے بعد عورات کے تمام مصارفِ حیات کا بار مرد پر ہوتا ہے گویا مرد کا مہر ہوتا ہے عورت کا مہر نہیں ہوتا ، مگر مصارفِ زندگی کی ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے ۔

اسلام کا دستور ان تمام قوانین معاشرت سے جدا ہے ۔ اسلامی قانون نکاح کے وقت مرد کو حکم دیتا ہے کہ عورت و مرد کے درمیان ٹھہرائی ہوئی رقم عورت کو بطور مہر ادا کی جائے ، اور اس کے مصارفِ زندگی کا کفیل بھی خود مرد ہی ہے ۔ بغیر وجوب مہر کے نکاح ناممکن ہے ۔ بات یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لئے نکاح لذتِ صنفی کا دروازہ کھول دیتا ہے اور دونوں اس میں برابر کا حصہ لیتے ہیں ، مگر قربت جنسی کے بعد عموماً جو شدائد و آلام عورت کو برداشت کرنے ہوتے ہیں مرد اُن سے بالکل آزاد رہتا ہے ۔ ایام حمل اور وضع حمل کی تکلیف کا دفع حمل کے بچہ کی پرورش ، دودھ پلانا یعنی اپنے بدن کا خون پلا کر پالنا ، بچہ کو طاقت پہنچانے کے لئے اپنے بدن کو کمزور کرنا اور اس کے آرام کی خاطر خود دکھ سہنا اور ہر وقت اس کی سیوا کرنا ۔ ان تمام تکالیف سے مرد عموماً آزاد ہوتے ہیں ، اس لئے قربتِ صنفی کی قانونی اجازت دینے کا کچھ نہ کچھ معاوضہ دینا بھی عورت کا لازمی حق ہونا چاہیئے اور آئندہ زندگی میں چونکہ عورت باوجود تخلیقی موانع کے مرد کے گھر کا انتظام اور اس کے مال و اولاد کی نگرانی کرتی ہے ، اس لئے اس کے مصارف کا بار بھی مرد پر رہنا چاہیئے ۔ اسی سبب سے آیات میں عورت کے تقررہ حقوق کی صراحت فرمائی ہے ۔

حضور اقدس کے کثرتِ ازدواج اور نکاح بلا مہر اور بندشِ ازدواج کی اصلی وجوہ کی تفصیل آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ کے تفسیری مقالہ میں آتی ہے وہاں پڑھنا چاہیئے ۔

تحلیل اجزاء يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ چونکہ حضرت زید کی بی بی زینب سے نکاح کرنے پر کافروں اور منافقوں نے بدگوئی شروع کر دی تھی ، اور اس کی کامل تردید گذشتہ آیات میں کر دی گئی تھی ، اس لئے عام اہل اسلام کی ہدایت اور کافروں کے پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنے کیلئے ان عورتوں کی تفصیل جو اللہ نے اپنے رسول کے لئے حلال فرمائی تھیں اس جگہ فرما دی ، اس لئے کہ اہل کتاب کے نزدیک بعض عورتوں سے نکاح کرنا درست تھا اور قرآن نے اس کو حرام قرار دیا اور بعض عورتوں سے ان کے نزدیک نکاح حرام تھا اور قرآن نے اس کو جائز رکھا ۔ اسی طرح نکاح کے الفاظ اور کیفیت عقد میں بھی کمی بیشی تغیر و تبدل اور اختلاف تھا اور پھر مہر کی وضاحت بھی ضروری تھی ۔ نکاح بلا مہر ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ اگر ہو سکتا ہے تو نکاح کے بعد مہر مثل دینا پڑے گا یا نہیں ۔ یہ تمام مسائل دنیا کے مذاہب رائجہ میں مختلف طور پر بتائے گئے تھے ۔ اللہ نے اس جگہ ان جھگڑوں کا اٹل فیصلہ فرما دیا جس سے دشمنوں کی زبان بند ہو گئی اور مسلمانوں کو شرعی علم ہو گیا اور کافروں کو یہ موقعہ ہی نہ رہا کہ وہ مسلمانوں کو بہکا سکیں ۔ آیت مذکورہ میں ان عورتوں کی قسم اول کا بیان ہے جو رسول پاک کے لئے جائز کی گئی تھیں ۔

مجاہد وغیرہ علماء نے صراحت کی ہے کہ آیت میں اُجُوْر سے مراد مہر ہیں ، اس لئے حلت متعہ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا کی کسی روایت سے کسی فرقہ کے نزدیک حضور اقدس کا کسی عورت سے متعہ کرنا ثابت نہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو اُجُوْر سے وقتی اجرت مراد لی جا سکتی تھی ۔

زوجات سے وہ تمام بیبیاں مراد ہیں جو نزول آیت کے وقت حضور کے عقد زوجیت میں داخل تھیں ۔ حضور والا نے جن عورتوں سے نکاح کیا تھا اُن کا مہر دو طرح کا تھا ۔ مالی اور غیر مالی ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض ، حضرت عائشہ صدیقہ رض ، حضرت ام سلمہ رض ، حضرت ام حبیبہ رض ، حضرت حفصہ رض ، حضرت سودہ رض وغیرہ ۔ ایسی عورتیں تھیں جن کو مالی مہر ادا کیا گیا تھا ۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب نضیری قبائل کے یہودیوں میں سے تھیں ۔ فتح خیبر کے وقت یہودی قیدیوں میں یہ بھی شامل تھیں ۔ حضور ؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا اور آزادی ہی مہر قرار پائی ۔ حضرت جویریہ بنت الحارث بھی ایک بی بی تھیں جو بنی مصطلق کے قیدیوں میں شامل تھیں اور تقسیم غنیمت کے وقت حضرت ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی تھیں ۔ ثابت نے ان کو مکاتب کر دیا پھر حضور ؐ نے اپنی طرف سے زر کتابت ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا ۔

یہ بھی واضح رہے کہ حضور کی ہر بی بی کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ یعنی پانچ سو درہم تھا ۔ البتہ ابو سفیان کی بیٹی حضرت ام حبیبہ جو اپنے والدین کی مرضی کے خلاف مسلمان ہو کر ہجرت کر کے حبش کو چلی گئی تھیں اور وہاں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا تو حضرت نجاشی شاہ حبش نے ان کا نکاح غائبانہ حضور والا سے

کر دیا تھا اور مہر کے چار سو دینار اپنے پاس سے ادا کئے تھے۔

وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ۔ یہ عورتوں کی دوسری قسم ہے جو اللہ نے اپنے نبی کے لئے حلال فرمائی تھیں یعنی وہ عورتیں بھی اللہ نے اپنے نبی کے لئے حلال فرما دیں جو جہاد کے مالِ غنیمت میں حضورؐ کے ہاتھ آئیں۔ یہ حلت بملک رقبہ ہے۔ چونکہ غنیمت سے حاصل شدہ عورتوں کی ملکیت حضورؐ کو حاصل تھی اس لئے اس قسم کی عورتیں حلال کر دی گئیں۔ حضور کے پاس اس قسم کی دو عورتیں تھیں۔ ایک حضرت ماریہ قبطیہ جن کو مقوقس شاہ مصر نے بطور ہدیہ حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تھا اور ان سے حضورؐ نے نکاح بھی نہیں کیا تھا اور حضور والاؐ کے صاحبزادے ابراہیم ان کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ دوسری حضرت ریحانہ بنت شمعون تھیں جن سے اگرچہ حضورؐ نے نکاح نہیں کیا، مگر متمتع اندوز ہوئے۔

حضرت ریحانہ بقول ابن کثیر خاندان نضیر کی یہودی تھیں بعد کو مسلمان ہوگئیں۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ حضرت ریحانہ قرظی تھیں، نضیری نہ تھیں۔ نضیر کو تو حضورؐ نے جلا وطن کر دیا تھا۔ بنو قریظہ مدینہ میں موجود تھے اور بسبب شکست معاہدہ کی وجہ سے ان کو قتل و گرفتار کیا گیا تو ان کی عورتیں بطور کنیز مسلمانوں کے ہاتھ آئیں اور یہ بھی مروی ہے کہ ریحانہ کے مسلمان ہونے سے پہلے حضورؐ نے ان سے قربت کی تھی (المواہب) اس سے معلوم ہوا کہ باندی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، مگر اہل کتاب میں سے ہونا ضروری ہے۔

آیت مذکورہ میں مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ کی قید اتفاقی ہے ورنہ جو لونڈی خریدی گئی ہو یا ہبہ سے حاصل ہوئی ہو وہ بھی حلال تھی۔ جہاد میں گرفتار ہو کر آنا ضروری نہ تھا۔

تنبیہ ہمارے بعض مفسرین نے حضرت صفیہ اور حضرت جویریہ کو مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ کے سلک میں منسلک کیا ہے مگر یہ ان کی غلطی ہے ان دونوں بیبیوں سے تو حضورؐ نے نکاح کر لیا تھا۔ شروع میں ضرور مملوکانہ آئی تھیں، لیکن نکاح کے بعد تو مملوک نہ رہیں۔ پھر ان دونوں کا مہر بھی حضورؐ نے ادا کیا تھا۔ حضرت صفیہ کی آزادی کو ہی مہر قرار دیا تھا اور حضرت جویریہ کا زرِ کتابت ادا کیا تھا، اس لئے ان کو مملوکات اور باندیوں کے تحت میں داخل کرنا غلطی ہے۔

مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ سے تو وہ عورتیں مراد ہیں جو حضورؐ کی مملوک تھیں۔ آپ نے ان کو آزاد نہیں کیا اور نہ ان سے نکاح کیا نہ ان کا مہر مقرر کیا اور مالکانہ حیثیت سے تصرف کیا۔ ایسی عورتیں صرف دو تھیں۔ حضرت ماریہ اور حضرت ریحانہ بنت شمعون۔

وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِىْ هَاجَرْنَ مَعَكَ یہ عورتوں کی تیسری قسم ہے جن سے حضورؐ کو نکاح کرنے کے بعد تمتع اندوز ہونے کی اجازت دی گئی۔ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیاں بھی حضورؐ کے واسطے حلال تھیں (لیکن نکاح سے پہلے نہیں بلکہ نکاح کے بعد)

عیسائیوں کے نزدیک کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح اس وقت درست ہوتا تھا جب دونوں کے درمیان کم از کم سات پشت کا فرق ہو اور کہیں اشتراک نہ ہوا ہو۔ اس کے خلاف یہودی حقیقی بھانجی اور بھتیجی سے نکاح کو بھی صحیح خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجوسی تو حقیقی بہن اور بیٹی سے بھی حلت نکاح کے قائل تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک اعتدالی راستہ بتا دیا نہ عیسائیوں کی طرح افراط سے کام لیا نہ یہودیوں اور مجوسیوں کی طرح حد سے بڑھی ہوئی نرمی اختیار کی۔

لیکن حلت نکاح کی ایک شرط یہ لگا دی کہ انہوں نے رسول کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ ساتھ ہجرت کرنے سے یہ مراد نہیں کہ بوقت ہجرت وہ ہم رکاب اور ساتھ ہوں۔ کیونکہ ہم رکاب ہو کر مکہ کو چھوڑنے والے تو صرف صدیق اکبرؓ کے سوائے اور کوئی بھی نہ تھا۔ بلکہ بقول ابن کثیر مطلب یہ ہے کہ ہجرت کر کے وہ مدینہ میں پہنچ گئی ہوں۔ فتح مکہ سے پہلے انہوں نے اپنا وطن چھوڑ دیا ہو۔ اسی بنا پر جب حضرت ام ہانی بنت ابو طالب سے جب حضورؐ نے نکاح کرنا چاہا اور انہوں نے اپنی پیرانہ سالی کا عذر کر کے معافی چاہی اور پھر آیت مذکورہ نازل ہوئی تو فرمانے لگیں میں تو رسول اللہؐ کے لئے حلال رہ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں نے حضورؐ کے ساتھ ہجرت نہیں کی تھی بلکہ میں تو مکہ کے آزاد کردہ لوگوں میں سے تھی۔ (ابن جریر والترمذی) ابو رزین اور قتادہ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے۔ معیت کی قید کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آیت میں صرف ہجرت کی شرط لگائی ہے۔ حبش یا مدینہ کی تخصیص نہیں کی۔ پس معیت کی قید لگانے سے ہجرت مدینہ مراد ہوگئی اور ہجرت حبش ناقابلِ اعتبار رہی۔

وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِىِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِىُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا حضورؐ کے واسطے جو عورتیں حلال کی گئی تھیں یہ ان کی چوتھی قسم ہے مطلب

یہ ہے کہ جو عورت اپنا نفس نبی کو بخش دے یعنی یہ کہہ سکے میں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تو وہ نبی کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ مگر صرف اس کا یہ کہنا حضور کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ آپ اس کو خواہ مخواہ اپنی زوجیت میں داخل ہی کر لیں۔ بلکہ آپ کی مرضی پر منحصر تھا۔ اگر اس سے نکاح کرنا منظور ہوتا تو اس کا ہبہ کرنا ایجاب نکاح اور آپ کا اظہار رضامندی قبول سمجھا جائے گا اور اس طور پر عقد ہو جائے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت مومنہ ہو۔ چونکہ عقد بلفظ ہبہ ایک قسم کا نکاح ہے اور حضور کے ساتھ نکاح کرنا دینی و دنیوی عزت و کرامت کا انتہائی ذریعہ ہے اور کافرہ عورت خواہ کتابیہ ہی ہو اس عزت کی سزاوار نہیں، اس لئے مومنہ ہونا ضروری ہے۔ ابوبکر بن العربی نے صراحت کی ہے کہ کافرہ آزاد عورت حضور والا پر حرام تھی۔ مجھے تعجب ہے ان علماء پر جو کتابیہ عورت سے عقد ہبہ کو حضور پاک کے لئے جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن کی آیت مذکورہ میں مومنہ کی قید موجود ہے۔ اب تحقیق طلب یہ امر ہے کہ کیا حضور والا کے پاس کوئی ایسی عورت تھی جس نے حضور کو اپنے نفس کا ہبہ کیا ہو اور آپ نے اس کو قبول کر لیا ہو۔ ابن عباس اور مجاہد نے فرمایا سرکار عالی کے گھر میں کوئی ایسی عورت نہ تھی، جس نے عقد ہبہ کیا ہو، جتنی عورتیں موجود تھیں وہ سب نکاحی بیبیاں تھیں۔ اور آیت میں جو اجازت مذکور ہے وہ بطور شرط و جزا کے ہے کہ اگر کوئی عورت ایسا کرے تو جائز ہے نہ یہ کہ کسی نے ایسا کیا بھی تھا۔ بعض علماء کہتے ہیں ایسی عورتیں موجود تھیں، لیکن وہ کون تھیں؟ تو کسی نے ام المساکین زینب بنت خزیمہ انصاریہ کا نام کیا ہے۔ عروہ نے خولہ بنت حکیم سلمی کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کو ہبہ کیا تھا۔ ابن کثیر نے بروایت ابن ابی حاتم مرسل بیان کیا ہے کہ میمونہ بنت الحارث حضور کے گھر میں تھیں اور ان سے عقد ہبہ ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ کاشانۂ نبوت ایک درس گاہ تھی۔ مختلف متعدد و بکثرت عورتیں اس درس گاہ میں داخل ہو کر تحصیل علم کرنے کی خواہش مند تھیں اور حضور سے نکاح کر لینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حقوق زوجیت طرفین پر عائد ہوتے ہیں خود باندی بن جانا بھی ان کی قدرت سے خارج تھا۔ آزاد عورت باندی کیسے بن سکتی تھی۔ محض خادمہ بننے اور ہر وقت درس گاہ میں رہنے سے افلاس مانع تھا۔ کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کو فراہم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے شوق دینی سے مجبور ہو کر اپنے نفس کو ہبہ کرتی تھیں تاکہ ادائے مہر کا بار بھی حضور پر نہ پڑے اور حصول علم کی غرض بھی پوری ہو جائے، مگر حضور نے ایسی کسی عورت کو قبول نہیں فرمایا کیونکہ حق زوجیت صرف ادائے مہر ہی نہیں بلکہ تمام مصارف پورے کرنے اور تعلقات صنفی کو قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مانع تھی کہ حضور نے جس عورت میں دینی استعداد اور فطری صلاحیت ملاحظہ فرمائی اور اس کے ذریعہ سے اشاعت و تبلیغ کا کام چلتا ہوا نظر آیا اس کو مشرف کیا ورنہ کوئی توجہ نہ فرمائی۔ کسی عورت کی طرف سے نفس کو ہبہ کر دینا اور ادائے مہر سے سبکدوش بنا دینا حضور کی توجہ کو جذب نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا ثبوت اس روایت سے ہوتا ہے جس کو امام احمد اور بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت انس نے فرمایا ایک روز ایک عورت نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! کیا حضور کو میری حاجت ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میری ایک لڑکی ایسی ایسی ہے (یعنی اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کیا) اور میں نے اس کے لئے حضور کا انتخاب کیا ہے۔ حضور نے فرمایا میں نے اس کو قبول کیا وہ عورت برابر اپنی لڑکی کی تعریف کرتی رہی۔ آخر میں کہنے لگی حضور کبھی اس کے سر میں درد بھی نہیں ہوا اور نہ وہ خشکی مزاج ہے۔ یہ سن کر حضور نے ارشاد فرمایا مجھے تیری لڑکی کی ضرورت نہیں ہے، شرح میں جب حضور سے اس عورت نے اپنی لڑکی کے اوصاف بیان کئے تو آپ نے قبول کر لیا یعنی قبول کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن آخر میں جب اس نے لڑکی کی مکمل صحت اور عدم شک یعنی قوتِ حافظہ کی سلامتی کا اظہار کیا تو آپ نے انکار کر دیا۔ صرف اس لئے کہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں تندرست رہنا مومن کی شان کے خلاف ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کے جسم اور مال کو دکھ پہنچتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو کر دنیا سے نکل جاتا ہے۔ پس جب حضور والا نے ملاحظہ فرمایا کہ اس لڑکی کے اندر خداداد دینی صلاحیت نہیں ہے تو باوجود حسن و جمال کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پس صحیح یہ ہے کہ حضور والا نے کسی واہبۃ النفس عورت کو قبول نہیں فرمایا۔ ہاں حضرت میمونہ بنت الحارث نے جب اپنے نفس کو ہبہ کیا تو حضور نے ان کو قبول فرمالیا، مگر نکاح کر لیا۔ صحاح وسنن میں یہ روایت موجود ہے کہ حضور نے حضرت میمونہ سے احرام کی حالت میں نکاح کیا اور احرام کھولنے کے بعد مکہ سے باہر مقام سرف میں زفاف کیا۔ اس کے علاوہ حضرت میمونہ حضرت ابن عباس کی خالہ تھیں اور ظاہر ہے کہ ابن عباس سے زیادہ خبر کسی اور کو نہیں ہوگی۔ اور ابن عباس کا قول اوپر ہم نے ذکر کر دیا کہ حضور کے گھر میں کوئی عورت ایسی نہ تھی جس نے حضور کو اپنا نفس ہبہ کیا ہو۔

خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ سعید بن مسیب، زہری، مجاہد، عطاء، ابن ربیعہ، شافعی، مالک اور شعبی وغیرہم نے فرمایا کہ لفظ ہبہ سے

نکاح کا منعقد ہوجانا رسول اللہ کی خصوصیت تھی۔ پس آیت کا تفسیری مطلب یہ ہوگا کہ نکاح بلفظ ہبہ کی اجازت اور واہبۃ النفس عورت صرف آپ کیلئے خاص ہے اور مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں۔ ابراہیم نخعی، ابوحنیفہ اور دوسرے علماء نے کہا کہ عام مسلمانوں کا نکاح بھی ہبہ اور تملیک کے لفظ سے منعقد ہوتا ہے۔ اس میں رسول پاک صلعم کی ہی خصوصیت نہ تھی، مگر حضور صلعم کے نکاح اور عام مسلمانوں کے نکاح میں فرق ہے۔ اگر بوقت نکاح مہر کا تذکرہ نہ ہو یا نکاح کا انعقاد ہبہ کے لفظ سے ہوا ہو اور بیوی نے وَهَبْتُ لَكَ نَفْسِي کہا ہو اور پھر شوہر وطی کرے تو مہر مثل کا ادا کرنا شوہر کے ذمہ واجب ہوجاتا ہے، مگر حضور کے لئے خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی عورت نے اپنے نفس کو ہبہ کیا اور حضور نے قبول کرلیا تو مہر مثل کسی حالت میں واجب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ حضور کا نکاح واہبۃ النفس عورت کے ساتھ بغیر گواہوں کے بھی ہوسکتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے گواہوں کا حضور شرط ہے۔ پس ان حضرات کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی عورت اپنے نفس کو ہبہ کردے اور رسول اللہ اس کو قبول کرلیں تو بغیر وجوب مہر اور بلا حضور شہود کے بھی نکاح کا انعقاد ہوجائے گا اور اس قسم کی اجازت رسول اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ عام مومنوں کو نہیں ہے۔ اس مطلب کی تائید آئندہ فقرہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ۔ یعنی مذکورہ اجازت صرف نبی کو کیوں ہے اور عام مومنوں کو کیوں نہیں، اس لئے کہ ہم ان حقوق سے واقف ہیں جو مومنوں پر ان کی بیبیوں اور ان کی باندیوں کے ہم نے مقرر کر رکھے ہیں۔ اب حل طلب یہ امر ہے کہ وہ حقوق کیا ہیں؟ تو اہل علم کہتے ہیں کہ وہ حقوق مختلف ہیں۔ بی بی کا حق تو مہر ہے خواہ بصورت مالی ہو یا بصورت تعلیم قرآن۔ چونکہ متعدد احادیث میں وارد ہے کہ حضور نے بعض آدمیوں کے نکاح میں عورت کا کوئی مہر مقرر نہیں فرمایا بلکہ شوہر کے ذمہ بطور مہر یہ فرض کردیا کہ وہ بیوی کو قرآن پڑھائے، اس لئے مہر مالی بھی ہوسکتا ہے اور تعلیم قرآن کو بھی مہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ بی بی کا دوسرا حق اس کا صرف برداشت کرنا ہے۔ رہی باندی تو اس کے لئے کوئی مہر نہیں صرف تعلقات شرعیہ کی برداشت ہی آقا کے ذمہ قرار دی گئی ہے، مگر احناف کہتے ہیں کہ آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے بیبیوں اور باندیوں کے حقوق مقرر ہیں اور وہ حقوق صرف مالی ہیں۔ بی بی کا مہر مالی اور نفقہ اور باندی کا صرف نفقہ۔ کیونکہ تعلیم قرآن کو بھی اگر مہر قرار دینا صحیح ہو تو اس کی کوئی حد نہیں۔ نہ اللہ نے کوئی حد بندی کی ہے۔ ایک آیت، ایک جملہ یا سارا قرآن۔ اس سے معلوم ہوا کہ بی بی کے لئے مہر مالی شرعاً مقرر ہے، لیکن کتنا؟ اس کے متعلق علماء میں باہم اختلاف ہے۔

تنقیح مہر

امام شافعی کہتے ہیں کہ جو چیز بیع و شریٰ میں قیمت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ مہر بھی بن سکتی ہے۔ پیسہ، روپیہ، کوئی کپڑا، جوتہ، صندوق برتن وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا مہر کی زیادتی کی تو شرعاً کوئی انتہا اور حد نہیں، مگر کم از کم دس درم ہونا لازم ہے اور یہی کمی کی حد شریعت کی مقرر کردہ ہے، اس لئے کہ فرض کے معنی لغت میں قطع کے ہیں۔ اس کا استعمال کبھی بمعنی ایجاب ہوتا ہے اور کبھی بمعنی تقدیر یعنی اندازہ کرنا۔ اخیر معنی میں اس کا استعمال اس قدر کثیر ہوا کہ منقول ہونے کے بعد گویا حقیقت عرفیہ بن گیا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں پر ان کی بیبیوں کے حقوق کا اندازہ ہم نے کردیا ہے اور حقوق میں عموم ہے قربت صنفی کے حقوق آرام پہنچانے کے حقوق، خرچ دینے کے حقوق اور مہر دینے کے حقوق۔ مقدم الذکر تینوں حقوق کی کوئی خاص حد نہیں۔ شوہر کی حیثیت اور طاقت کے مطابق خدا نے مقرر کئے ہیں۔ آخر الذکر یعنی مہر کی زیادتی بھی محدود نہیں۔ ڈھیروں چاندی اور سونا بھی مہر میں دیا جاتا ہے، مگر لفظ فرض بتا رہا ہے کہ مہر کی حد بندی شرع کی طرف سے ہے ضرور۔ پس جب بیشی کی جانب حد بندی نہیں ہے تو کمی کی جانب کم از کم کوئی خاص مقدار مہر کی مقرر ہونی لازم ہے کہ اس سے کم مہر مقرر کرنا ناجائز ہو اور چونکہ مہر ایک مخصوص عضو کی قیمت ہے اور شرع نے انسانی اعضاء کی کم از کم جو قیمت مقرر کی ہے وہ دس درم ہے۔ دیکھو دس درم سے کم چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ہاں دس درم یا اس سے زائد چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ لہٰذا اس عضو کی قیمت بھی کم سے کم دس درم ہونی چاہیئے۔ اس سے کم مہر مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ آثار صحیحہ اور اقوال صحابہ میں بھی اس کا بیان آگیا ہے۔

مبحث غلامی کی تحقیق

احکام اسلامیہ پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ باندی غلام بنانا اور انسانی آزادی کو سلب کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ انسانوں کی خرید و فروخت اور بہائم کی طرح ان سے خدمت لینا بدترین جرم ہے۔ گزشتہ شرائع نے بھی اس کو جائز نہیں رکھا۔ نہ دنیا کی کوئی تہذیب اس کی اجازت دیتی ہے، مگر شریعت اسلامیہ نہ فقط مجوز ہے بلکہ اس کا مؤید بھی ہے۔ پیغمبر اسلام نے بھی عملاً اس کی تائید کی ہے خود باندی غلام رکھے ہیں۔

بعض علمائے اسلام نے اس اعتراض کا جواب انکاری صورت سے دیا ہے ۔ انہوں نے صاف کہدیا کہ اسلام میں یہ فعل کبھی نہیں ہوا ۔ اس گروہ نے اُن آیات واحادیث کی خود ساختہ تاویلیں کی جن سے غلامی کا ثبوت ملتا ہے ، مگر پھر بھی جواب کو نہ نباہ سکا ۔ مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ اور بعض دوسری آیات ناقابلِ تاویل ہیں پھر مملوک کا پورا باب اور کتاب الشہادۃ میں مملوک کے حقوق کی تفصیل سب کی سب لغو قرار پاتی ہے اور یہ اجماعِ امت کے خلاف ہے ۔ اسلام میں غلامی کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ میرے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ غلامی کے وجود کا تو اقرار کرلیا جائے ۔ مگر نوعیت غلامی کی قدرے تفصیل کردی جائے ۔

عرب کے لٹیروں کا قاعدہ تھا کہ مخالف قبیلہ میں سے جس کا بچہ یا عورت یا اونٹ بکری اور مال جہاں بھی مل جاتا اس پر قبضہ کرلیتے تھے اور اپنے تصرف میں لے آتے تھے ۔ اگر چاہتے تو اس کو باندی غلام کی طرح فروخت کردیتے ورنہ اپنی خدمت کے لئے رکھ چھوڑتے ۔ یہ رواج عموماً عرب کا تھا ۔ حضرت زید کو بھی بعض لوگوں نے پکڑ کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے وکیل کے ہاتھ فروخت کردیا تھا اور ام المومنین نے حضور والا کو ہبہ کردیا تھا اور اس طرح حضرت زید سرکار رسالتؐ کی خدمت میں پہنچے تھے ۔ بلکہ بعض غارت گر قبائل تو سرحدی علاقہ میں جاکر چھاپہ مارتے تھے اور بچوں بڑوں کو گرفتار کرکے منڈیوں میں لاکر فروخت کردیتے تھے ۔ حضرت صہیب رومی ، حضرت بلال حبشی اور حضرت سلمان فارسی اسی دست برد کا شکار ہوئے تھے اور چونکہ یہ رواج تمام عرب کا تھا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ کسی کو شکایت کا موقعہ ملتا تھا ۔ اگر کسی کو اپنے خاندان کے آدمیوں کو رہا کرانا منظور ہوتا تھا تو سوائے قیمت ادا کرنے کے اور کوئی سبیل نہ تھی ۔ لیکن اسلام نے اس رواج کو قطعاً مسدود کردیا ۔ تاریخ اسلام میں کوئی نظیر نہیں مل سکتی ۔ جس سے ثابت ہو کہ قرنِ اول میں سے کسی نے اس طرح بچوں کو گرفتار کرکے غلام بنایا ہو نہ کوئی اسلام کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے ۔ دشمن ہو یا دوست ، حریف ہو یا رفیق اور یا کسی کے بچے کو دھوکا اور فریب اور سرقہ سے گرفتار کرکے غلام بنالینے کی اجازت قانونِ اسلام نہیں دیتا گویا عملاً اور قولاً اسلام نے اس غارتگری اور سرقۂ انسانی کے رواج کو مسدود کردیا ۔ غلامی کی دوسری صورت عرب میں جنگی قیدیوں کی تھی ۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرتا اور قتل وقتال کے بعد جتنے قیدی ہاتھ لگتے ان کو باندی غلام بنالیتا ۔ غلامی کی تیسری صورت خرید وفروخت کی تھی ۔ منڈیوں اور بازاروں سے باندی غلام خرید کئے جاتے اور نفع سے ان کو فروخت کیا جاتا یا خدمت کیلئے ان کو رکھ لیا جاتا تھا ۔

متوسط الذکر کی اجازت اسلام نے دی ۔ قرنِ اول میں بعض غزوات کی فتوحات سے مسلمانوں کے ساتھ کچھ قیدی آگئے تھے اور اسلام نے ان کو باندی غلام کی حیثیت سے قائم رکھا اور مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کیا لیکن اتنی اصلاح کی کہ عید کا جو عمومی دستور تھا اس کی تفصیل کردی ۔ جہاں تک ممکن ہوا قیدیوں کو بھی آزاد کیا اور آزاد کرنے کی ترغیب دی ۔ جنگی قیدیوں کو آزاد کرنے اور خرید کر آزاد کرانے کا ثواب بیان کیا اور مال زکوٰۃ کا ایک مصرف فک الرقاب کو بھی قرار دیا ۔ مقامِ غور ہے کہ جب قبیلۂ ہوازن کے نمائندے اپنے سیکڑوں رشتہ داروں کو رہا کرانے آئے اور درخواست پیش کی تو حضورؐ نے لوگوں کو ترغیب دے کر سب قیدیوں کو آزاد کرادیا ۔ فتح مکہ ہوجانے کے بعد عرب کے قاعدہ کے مطابق تمام اہلِ مکہ مسلمانوں کے مملوک ہوگئے تھے جن کی تعداد ہزاروں تھی اور اس زمانے کے لحاظ سے کروڑوں روپے کی مالیت تھی ، مگر حضور نے فتح کے بعد فوراً سب کو آزاد کردیا اور فرمایا اذھبوا انتم الطلقاء جاؤ تم سب آزاد ہو ۔ اسی طرح حضرت جویریہ کے رشتہ داروں کی تعداد سو سے بھی زائد تھی ۔ اور وہ سب مسلمانوں کے دشمن قبیلہ یعنی بنی مصطلق کے افراد تھے ۔ مسلمانوں نے ان کو آزاد کردیا ۔ اسی طرح سیکڑوں مثالیں اسلام کے قرنِ اول کی تاریخ میں ملیں گی کہ مسلمانوں نے مختلف جہادوں میں دشمنوں کو قتل کرنے بعد جو قیدی بنائے ان کو آزاد کردیا ۔ لیکن اس کے باوجود جنگی قیدیوں کو باندی غلام بنانے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔

تیسری صورت بھی اسلام نے قائم رکھی اور اس کی ممانعت نہیں کی ، مگر اس کی اصلاح ضرور کی ۔ چوپایوں اور جانوروں کی طرح خرید وفروخت کی اجازت نہیں دی ۔ نہ غلاموں کی کثرت کو دولتمندی کا ذخیرہ بنایا ۔ اب قابلِ غور یہ بات ہے کہ اسلام نے کن شرائط کے تحت باندی غلام رکھنے کی اجازت دی ہے اور غلام کو اسلامی شریعت میں کیا درجہ حاصل ہے ؟

خوب سمجھ لو کہ اسلام نے انسدادِ غلامی کا براہِ راست تو اعلان نہیں کیا کیونکہ وحشی قبائل خصوصاً عرب کے تند خو درشت مزاج افراد اس کو فوری طور پر برداشت نہیں کرسکتے تھے ۔ اسلام کی اصلاحات حکیمانہ طریقہ سے ہوتی ہیں ۔ دعوتِ انقلاب اور آہنگ ہیجان بلند کرنا اسلام کا شیوہ نہیں ۔ اسلامی تبلیغ

کا نتیجہ ضرور مکمل انقلاب ہوتا ہے، مگر اس طرح غیر محسوس طریقہ سے کہ کسی پر بار نہ پڑے اور سب قبول کر لیں ۔ اسلام نے غلامی کا بھی انسداد کیا، مگر تلوار کی ضرب یا قید کا خوف دلا کر نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی اصلاح کا پیام دے کر غلاموں کو رکھنے اور ان کو خدمات پر مامور کرنے کی اولین شرط یہ لگائی کہ کھانے پینے اور پہننے میں آقا جو کچھ خود پہنے وہ غلام کو بھی پہنائے ۔ جو خود کھائے ویسا ہی غلام کو بھی کھلائے پلائے ۔ اگر کوئی کام دشوار ہو تو اس کو غلام پر نہ ڈال دے بلکہ خود بھی سرانجام دہی میں مدد کرے ۔ اب نظر انصاف کی ضرورت ہے ۔ کیا غلام اسی کو کہتے ہیں ۔ یہ درجہ تو اولاد کو بھی بہت کم نصیب ہوتا ہے ۔ الفاظ کا پھیر ہے ورنہ اسلام کے غلام اس زمانے کے نوکروں، خادموں اور عام طور سے بدرجہا بہتر حالت میں تھے ۔ کون آقا ایسا ہے جو نوکر سے بہتر ضروریات کا خواستگار نہیں ۔ اور کون نوکر ایسا ہے جو کھانے پینے اور پہننے میں آقا کی برابری کا استحقاق ظاہر کر سکتا ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب اخلاقی طور پر جو اسلام نے دی ہے وہ بجائے خود اہم ہے ۔ روزہ ٹوٹنے کا کفارہ، حج میں قصور ہو جانے کا کفارہ، جھوٹی قسم کا کفارہ اور اسی طرح ہزاروں گناہوں کا کفارہ غلام کے آزاد کرنے کو قرار دیا ۔ کیا یہ غلامی کے رواج کی بندش کی عملی دعوت نہ تھی ۔ اگر نہ تھی تو پھر کیا تھا ۔ حضور والا نے تو تمام عمر نہ کوئی غلام خریدا نہ فروخت کیا ۔ نہ سوا حضرت ماریہ کے کسی باندی غلام کو رقیت کی حالت میں اپنے پاس رکھا ۔ حضرت زید کو آزاد ہی کر دیا تھا ۔ حضرت صفیہ کو بھی آزاد کیا تھا ۔ اور بہتوں کو آزادی کی نعمت عطا فرمائی تھی، لیکن اگر اپنے پاس بھی رکھتے تو وہ غلامی سینکڑوں آزادیوں سے بہتر تھی وہ برتاؤ ہی نہ تھا کہ کسی کو شکایت کا موقع ملتا ۔ کسریٰ، قیصر، فرعون اور نمرود کی حکومت نہ تھی ۔ جابرانہ تسلط نہ تھا ۔ بلکہ کریمانہ اور ناصحانہ تربیت تھی ۔ کاشانۂ نبوت میں تو مملوک غیر مملوک کا امتیاز نہ تھا ۔ حضرت انس خادم تھے اور آزاد تھے ۔ ابن عباس خادم تھے اور آزاد تھے، لیکن جویریہ اور ماریہ سے ممتاز درجہ پر نہ تھے ۔ حضرت اسامہ کی زیر سیادت اور تحت قیادت بڑے بڑے جلیل القدر اور شریف الاصل مسلمانوں کا لشکر حضور نے مرتب فرمایا تھا اور صدیق اکبر نے حضور کے باندھے ہوئے جھنڈے کو کھولنے کی اجازت نہ دی تھی ۔ اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ ہوئی ۔ اسی تعلیم اور عملی درس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت غلام مسلمانوں کے حکمراں ہوئے ۔ اندلس، مصر اور ہندوستان میں مدتوں تک غلاموں کی سلطنت رہی اور کسی نے چوں بھی نہ کیا ۔

پس غور کرو کہ اسلام کے اندر یہ رسم غلامی کا ابقا تھا یا درس آزادی ۔ رقیت کی تعلیم تھی یا پیام حریت ۔ ذرا دوسرے مذہبوں کو بھی عقل کی روشنی میں دیکھو ہندوؤں کی جاتی کی تقسیم اور شودروں کو جانوروں سے زیادہ برا سمجھا گائے بیل بندر یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کو پاک جاننا اور اچھے خاصے انسانوں کو ملیچھ اور پلید خیال کرنا اور نہ فقط خیال کرنا بلکہ اس پر عمل کرنا ۔ اپنی سوسائٹی، معاشرت یہاں تک کہ عبادت گاہوں سے ان کو نکال دینا کیا سینکڑوں غلامیوں کا مجموعہ نہیں ہے ۔ عیسائیوں، یہودیوں اور دوسری قوموں میں بھی نیچے اونچے اور شریف و رذیل کی تقسیم درس غلامی اور انسانی حریت کی شکست نہیں تو اور کیا ہے ۔ سارے یورپ، امریکہ اور ایشیا کے حکما اور فلاسفر طبقاتی جنگ کا کوئی علاج نہ کر سکے اور ان کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ نسلی اور وطنی امتیازات کو مٹا دینے کی آواز ہی نکالیں ۔ زائد سے زائد کسی نے آواز بلند بھی کی تو صرف طبقاتی امتیاز کو دور کرنے کے لئے ۔ مگر اسلام نے نسلی امتیاز کو مٹا دیا اور غلاموں کو احرار کے دوش بدوش چلایا ۔ کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلامی کی رسم کو دنیا میں باقی رکھا ۔

لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ الخ ۔ اس فقرہ کا ربط خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ سے ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر وجوب مہر اور بلا حضور گواہان کے نکاح کی اجازت ہم نے خصوصیت کے ساتھ آپ کو اس لئے دی کہ آپ کے لئے کوئی تنگی نہ رہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول پاک کے لئے تنگی نہ ہونے کے معنی کیا ہیں ۔ کیا یہ مطلب ہے کہ خدا نے اپنے رسول کو مطلق العنان چھوڑ دیا تھا اور ان کی صنفی خواہشات کی کوئی حد بندی نہ کی تھی اور عام مسلمانوں کے حدود نکاح سے ان کو آزاد کر دیا تھا اور اس طرح جذبات نفسانیہ کو پورا کرنے میں امداد کی تھی ۔ یا تنگی نہ ہونے کا کوئی اور مقصد ہے ۔ اگر اول الذکر مقصد ہوتا تو پھر عورت کی طرف سے ہبہ کرنے اور رضامندی ظاہر کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی ۔ جس عورت سے چاہتے متمتع اندوز ہوتے خواہ وہ راضی ہوتی یا ناراض، لیکن قرآن نے تو آیت مذکورہ میں ہبہ کی قید لگائی ہے اور عورت کی طرف سے اظہار رضامندی کو شرط کیا ہے ۔ ہاں صرف ہبہ کو کافی قرار دیا ۔ مہر کے وجوب اور حضور شہود سے رسول پاک کو مستثنیٰ کر دیا ۔ اس کی وجہ ہے؟

بات یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کے دائرہ کو وسیع کرنا ہر وقت پیش نظر تھا ۔ مردوں کے ذریعہ سے ہو یا عورتوں کے ذریعہ سے، عمومی تبلیغ مقصود تھی ۔ مرد تو جوق جوق مجلس اقدس میں بلکہ باب گرامی پر پڑے ہی رہتے تھے ۔ عورتیں مجبور تھیں چاہتی تھیں کہ ابر کرم کی بارش ان پر بھی ہو اور کوئی چھینٹا ان پر

پڑجائے ۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا ۔ ہر ایک کی سیرابی اور ہر وقت کی حاضر باشی ناممکن تھی ۔ خود دولت مند نہ تھیں کہ اپنا کھاتیں اور اپنی ضروریات کو خود پورا کرتیں اور تحصیل علم کرتیں اور رسول پاک بھی کوئی دنیوی صاحب بادشاہ نہ تھے کہ ملک کا روپیہ لوٹ کر عیش پرستی میں اڑاتے ۔ وہاں تو معمولی مصارف کے لئے نقد و جنس کی آمدنی تھی اور بس پھر طلبگار عورتوں کے مہر کی ادائیگی کس طرح ممکن تھی ، اس لئے اس تنگی کو دور کرنے کے لئے اور عورتوں کے تحصیل علمی کے شوق کو پورا کرنے کے لئے بغیر وجوب مہر کے نکاح کی اجازت دیدی اور اشاعتِ تبلیغ میں جو رکاوٹ اور تنگی ہو سکتی تھی اس کو دور کر دیا ۔ اہل تفسیر نے اس جگہ عجیب بے سروپا باتیں بیان کی ہیں اور بعض غیر مفید روایات نقل کی ہیں جو اسلام اور تہذیب دونوں کے خلاف ہیں اور حضور کی پاک زندگی پر بدنما دھبہ ہے ۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ۔ اس آیت اور اس کے بعد والی آیات کے متعلق علمائے تفسیر کے تین اقوال ہیں (۱) آیات کا نزول ان عورتوں کے حق میں ہوا جو اپنے نفوس کو حضور کے لئے ہبہ کریں ۔ اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام احمد اور بخاری نے نقل کیا ہے ۔ عروہ کہتے ہیں میری خالہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ان عورتوں کے قول سے غیرت آتی تھی جو اپنے نفوس کو رسول اللہ کے لئے ہبہ کرتی تھیں ۔ آپ فرماتی تھیں کیا عورتوں کو شرم نہیں آتی کہ بغیر مہر کے اپنے نفوس کو پیش کرتی ہیں ۔ اس کے بعد آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ الخ نازل ہوئی تو حضرت عائشہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ! میں دیکھتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی مرضی پہلے سے پوری کر دیتا ہے ۔

(۲) آیاتِ مذکورہ کا نزول ازواج مطہرات کے متعلق ہوا ۔ ازواج کی جو باریاں مقرر تھیں وہ ایک ایک دن حضور نے تقسیم کر دیا تھا اس کے متعلق آیت میں حکم ہے کہ آپ کے لئے باری باری تقسیم کرنی واجب نہیں ۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے ۔ اس قول کی تائید حضرت عائشہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ام المومنین نے فرمایا تھا کہ آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الخ نازل ہونے کے بعد بھی رسول اللہ اپنی بیبیوں سے ان کی باری میں اجازت مانگتے تھے یعنی اگر کسی بی بی کی باری میں ان کے گھر رہنا منظور ہوتا تھا تو ان سے اجازت لے لیتے تھے ۔ مطلب یہ کہ اگرچہ آیت کے مطابق باری مقرر کرنی حضور پر واجب نہ تھی لیکن عدل و مساوات کا لحاظ کرتے ہوئے ہر بی بی کی باری کا خیال رکھتے تھے اور اس کی پابندی کرتے تھے اور اگر ناغہ کرتے تھے تو اجازت لے کر ۔

(۳) آیات کا نزول ازواج مطہرات اور واہبات نفوس دونوں کے لئے ہوا ہے ۔

وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ۔ عامر شعبی نے فرمایا کہ کچھ عورتوں نے اپنے آپ کو رسول پاک کے لئے ہبہ کیا تو کسی کو حضور نے اپنے پاس جگہ دی اور کسی کو ٹال دیا (یعنی انکار تو نہ کیا ، مگر اقرار بھی نہ کیا) جن عورتوں کو ٹال دیا انہوں نے پھر کسی جگہ نکاح ہی نہ کیا ۔ انہیں میں سے ام شریک بھی تھیں (ابن کثیر) یعنی اُن کو تحصیل دینی کا شوق اور محبت ایمانی کا استغراق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ جب ان کی درخواست پر حضور نے انکار نہ کیا تو اُن کی آس نہ ٹوٹی اور انہوں نے ساری عمر اسی اُمید پر گزار دی کہ شاید کسی وقت حضور والا شرف بہ نکاح کریں ۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ۝

قول اوّل کے موافق مجموعۂ آیات کا حاصل مطلب یہ ہوگا کہ جو عورتیں اپنے نفوس کو رسول اللہ کے لئے ہبہ کریں اور اشتیاق دینی سے مجبور ہو کر بلا مہر نکاح کی درخواست کریں تو رسول اللہ کو اختیار ہے کہ جس کو اپنے پاس رکھنا چاہیں تو قبول کر لیں اور نہ رکھنا چاہیں تو ٹال دیں ۔ امید شکن جواب نہ دیں ۔ جیسی مصلحت ہو ویسا کریں پھر جن عورتوں کو قبول نہیں کیا اگر ان میں سے کسی کی ضرورت ہو (اور مصلحتِ دینی اس کی طلبگار ہو) تو اس کو طلب کر لیں ۔ اس میں کچھ حرج نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ درخواست کرنے والی عورتوں میں سے کسی کو قبول کر لینا اور کسی کو ٹال دینا اور آس نہ توڑنا عورتوں کے لئے امید شکن اور غم آفرین نہیں ہے ۔ اس سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل خوش رہیں گے اور عطائے رسول سے سب راضی رہیں گی ۔ (مگر یاد رکھو) کہ اللہ دلوں کی حالت جانتا ہے ایسا نہ ہو کہ دل میں کچھ اور ہو اور ظاہر میں کچھ کیا جائے ۔ طلب دین کی آڑ میں حصولِ دنیا کی خواہش پوری کرنی مقصود ہو ۔ نہ رسول کے لئے جائز ہے کہ تبلیغ دین کی غرض کو چھوڑ کر لذتِ نفس کے درپے ہوں نہ عورتوں کے لئے جائز ہے کہ تحصیل دین کا تو بہانہ کریں اور مقصود ہو ازواجِ مطہرات کو دکھ دینا یا رسول کے گھر میں رہنے کے سبب مسلمانوں سے اپنی تعظیم کرانی یا کوئی اور دنیوی مقصد)

دوسرے قول کے بموجب تفسیری مطلب اس طرح ہوگا کہ بیبیوں میں کسی باری اور تقسیم ایام رسول پر لازم نہیں جس کو جس روز چاہیں اپنے پاس رکھیں اور جس کی باری چاہیں ٹال دیں اور جس کی باری نہ ہو اگر اس کو بھی طلب کرنا چاہیں تو طلب کر سکتے ہیں ۔ اس عدم انقسام اور باری کے واجب نہ ہونے کا نتیجہ

یہ نکلے گا کہ سب راضی رہیں گی اور یہ سمجھیں گی کہ خدا کی طرف سے تو ہماری باری مقرر نہیں۔ رسول پر ایام کی پابندی واجب نہ ہے۔ اب جو کچھ رسول اللہ ﷺ ہم کو دیدیتے ہیں اور جس روز ہم کو طلب کرتے ہیں تو یہ ان کی عنایت ہے۔

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ اپنی بیبیوں کی باریاں بہت عدل وانصاف سے مقرر فرماتے تھے۔ پھر دعا کرتے تھے کہ الٰہی جو امر میرے امکان میں ہے اس میں میرا یہ فعل ہے اور جو امر (محبت) میرے امکان میں نہیں اس پر مجھ کو ملامت نہ فرما۔ (رواہ احمد والاربعہ) اور (دل) میرے قبضہ میں ہے (ابوداؤد)

میرے نزدیک اول قول زیادہ صحیح اور سیاق آیات کے زیادہ مناسب اور مومنین کی زبان بندی کرنے والا اور واہبات النفوس کے بعد [illegible] غرض کو بیان کرنے والا ہے۔ اگرچہ دوسرا قول اکثر علماء کا ہے۔ رہا تیسرا قول وہ بہرحال ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

تذییل مذکورہ آیات میں چار قسم کی عورتوں کا ذکر فرمایا ہے (۱) وہ نکاحی بیبیاں جن کا مہر مقرر کر دیا گیا ہو (۲) باندیاں خواہ زر خرید ہوں یا [illegible] میں پکڑی ہوئی یا کسی کی دی ہوئی (۳) چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیاں جب ان سے نکاح کر لیا جائے (۴) وہ عورت جس نے بلفظ ہبہ بغیر مہر کے اپنے نفس کا اختیار دیا ہو۔ ان چاروں میں سے اول الذکر دو قسمیں صرف رسول پاک کے لئے مخصوص نہ تھیں بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ تیسری قسم بھی عام ہے، مگر حضور والا کے لئے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح ہونے کی یہ شرط تھی کہ انہوں نے ہجرت کی ہو اور مکہ چھوڑ کر حضور کے پاس مدینہ میں فتح مکہ سے پہلے آگئی ہوں ورنہ ان سے نکاح جائز نہ تھا۔ چوتھی قسم کی محض حضور کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ بر قول احناف ہر مسلمان کے ساتھ نکاح بلفظ ہبہ ہو سکتا ہے، مگر قربت کے بعد پورا مہر مثل ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ حضور کے لئے واہبات النفس بغیر وجوب مہر کے حلال تھیں۔ نہ وہاں گواہوں کی ضرورت تھی نہ مہر واجب تھا۔

مقصود بیان رسول پاک کے لئے نکاحی بیبیوں کے علاوہ باندیوں سے متمتع اندوز ہونے کی اجازت تھی۔ چچا، پھوپھی، خالہ اور ماموں کی لڑکیوں سے حضور کا نکاح اس شرط پر جائز تھا کہ انہوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت کی ہو۔ نکاح بلفظ ہبہ حضور کیلئے جائز تھا، مگر شرط یہ تھی کہ جو عورت اپنا نفس حضور کو ہبہ کر دے یعنی بلا مہر اپنے نفس کا اختیار دے دے اس کو حضور بھی قبول کر لیں۔ عورت کی طرف سے بلا مہر اختیار دینا اور حضور کا قبول کر لینا ہی نکاح ہے۔ اس قسم کے نکاح بلا مہر کی اجازت صرف رسول پاک ﷺ کو ہی تھی اور کسی مسلمان کو نہیں ہے۔ بیبیوں اور باندیوں کے حقوق ان کے شوہروں اور آقاؤں کے ذمہ واجب ہیں۔ (یعنی بغیر حقوق مقررہ کی ادائیگی کے حلت نہیں ہوتی) مَا فَرَضْنَا کے لفظ میں اشارہ ہے اس طرف کہ مہر وغیرہ کا ادا کرنا مسلمانوں پر واجب ہے اور مہر کی کم از کم مقدار شریعت الٰہی کی مقرر کردہ ہے۔ اسی طرح باندیوں کے حقوق کی ادائیگی بھی لازم ہے۔ اس [illegible] بصیرت حاصل کرنا چاہیے ان اعتراض کرنے والوں کو جو اسلام کو غلامی کا مددگار قرار دیتے ہیں اور نہیں غور کرتے کہ غلام اور باندیوں کے حقوق کی خاص نگہداشت قرآن کی ہے۔ جس کی تفصیل شریعت میں دوسری جگہ موجود ہے۔ آیات میں اس طرف بھی ایماء ہے کہ نفوس کا اختیار بلا مہر دینے والی یا مہر کے ساتھ نکاح کی اجازت دینے والی عورتوں میں سے ہر ایک کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو تھا، لیکن اصل غرض (اشاعت اسلام) پیش نظر رکھنی لازم تھی۔ جذبات نفس کے تحت اس اختیار سے فائدہ اٹھانا جائز نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

(اے نبی) اس کے بعد تمہارے لئے اور عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے عوض اور عورتیں کر لو اگرچہ تم کو ان کا حسن بھلا لگے۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِيْبًا ۝

ہاں جو تمہاری مملوک ہوں (وہ حلال ہیں)، اور ہر چیز کا اللہ نگران ہے

ع ۳

تفسیر رسول اور نبی کامل ترین انسان ہوتا ہے۔ اس کی تمام قوتیں اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ قوت روحانیہ اور عقلیہ، اندرونی حواس اور تمام مشاعر بہت بلند
مرتبہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کو دہرا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ اپنے نفس کی اصلاح اور دوسروں کی اصلاح۔ اس کی بعثت کی غرض ہی تعمیری قوانین اور اعلیٰ تعلیمات
کی اشاعت ہوتی ہے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست بتانا ہی اس کا مطمح نظر قرار دیا جاتا ہے، اس لئے لازم ہے کہ اس کی ساری زندگی اور زندگی کے تمام داخلی
اور خارجی مشاغل صرف اصلاح خلق کے لئے وقف ہوں۔ بیویاں ہوں یا بچے اعزا اقارب ہوں یا اجنبی اہل وطن ہوں یا پردیسی۔ سب سے اس کے تعلقات
صرف اصلاحی مقصد کی تکمیل کے لئے ہونے چاہئیں۔ زر اندوزی، افزائش نسل، تحصیل لذت اور تسلط عمومی اس کے مقاصد حیات میں داخل نہیں ہوتے
اسی لئے اس کو کثرت بیویوں سے اختلاط کی اجازت ہوتی ہے۔ حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور بعض دوسرے اسرائیلی پیغمبروں کی کثرت ازدواج
کے یہی وجوہ تھے۔ رسول پاکؐ کے لئے بھی دس سے کم بیویوں کی اجازت اسی غرض کی تکمیل کے لئے تھی۔ حضورؐ نے متعدد بیویاں کیں۔ ہر عمر کی عورت سے نکاح
کیا لیکن لذت نفس کے حصول کے لئے نہیں بلکہ دائرۂ اشاعت کی توسیع اور بعثت کی اصلی غرض کی تحصیل کے لئے، مگر یاد رکھو کہ معمولی سلاطین اور حاکموں اور دولتمندوں
سے نکاح کرنے کی خواہشمند اور اعلیٰ طبقہ سے ازدواجی تعلقات پیدا کر کے دولت و عزت کی بلند سطح پر پہنچنے کی طلبگار عورتیں بکثرت ہوتی ہیں۔ مال اور
عزت کے لئے اپنے نفوس کی قربانیاں کرنے والیاں اس معمورہ میں کم نہیں۔ شاہی حرم سرا کے اندر خواہ ہزاروں خواتین موجود ہوں، مگر پبلک کی عورتوں میں سے
بکثرت عورتیں پھر بھی شاہی زنجیر کی کڑی بننے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ یہ تو ان عورتوں کا تذکرہ ہے جن کے افکار، عقائد اور جذبات میں کوئی جدید انقلاب نہیں
ہوتا اور ان کی رگ و پے میں حیات جدیدہ کا کوئی خون نہیں دوڑتا۔ رسول پاکؐ تو پیام انقلاب لے کر آئے تھے۔ آپ کی تعلیم نے افکار، عقائد، تخیلات
اور جذبات کی دنیا بدل دی تھی۔ ہر عورت اور مرد کے دماغ پر ایک ایسا کیف آور، ہوش کن، مسرت بار نشہ چھایا ہوا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے ہر آرزو
اور ہر خواہش مردہ ہو گئی تھی۔ انقلاب افکار کی روح ان کے رگ و پے میں خون کے ساتھ دوڑنے لگی تھی۔ ان کو نہ مال کی خواہش باقی رہی تھی نہ حکومت و استبداد،
تسلط اور لذت گیری کی بلکہ رسول کی صحبت میں ہر وقت حاضر رہنا اور مذہبی استفادہ کرنا ان کا مقصد زندگی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی مقصد کو لے کر جس طرح مردوں کے
گروہ نوبت بہ نوبت آتے اور مدینہ میں مستقل سکونت کے خواستگار اتنے ہوتے تھے کہ مجبور ہو کر مدینے میں مستقل سکونت پذیر ہونے کی ممانعت کر دی گئی اور حکم
ہو گیا کہ طلب دین کے لئے جو لوگ آئیں وہ مدینہ میں مستقل طور پر پڑے نہ رہیں۔ اس سے مدینہ والوں کو تکلیف ہو گی۔ اسی طرح عورتیں جوق در جوق مدینہ کے
اندر اور باہر سے مسائل دین کی تحصیل کے لئے آتی تھیں اور امہات المومنین میں سے جس بی بی پر ان کی نظر انتخاب پڑتی ان کی معرفت مسائل دریافت کرتی
تھیں، لیکن وقتی سوال جواب سارے اصول حیات کی تعلیم کے لئے کافی نہ تھے، اسی لئے کاشانۂ نبوت میں مستقل رہنے کی خواہشمند رہیں۔ ان کو مال کی
ضرورت نہ تھی، آرام کی ضرورت نہ تھی۔ اولاد، والدین اور شوہروں کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے دماغوں، دلوں اور سارے مشاعر پر تو تحصیل دین کا شوق مسلط
تھا۔ رگ رگ میں عشق اسلام بس گیا تھا۔ پھر ہادی اور بانی اسلام سے محبت بھی اتنی ہو گئی تھی کہ حضور گرامیؐ کی زبان سے ایک لفظ بھی سننا ان کی نظر میں اعادۂ
شباب سے افضل تھا، اس لئے چاہتی تھیں کہ ازدواجی سلک میں منسلک ہو جائیں اور داخلی خارجی ہر طرح سے راز دار بن جائیں۔ گویا حامل رسالت کے اسرار رسالت
کی حامل ہو جائیں، مگر سارے گروہ کی یہ خواہش پوری کرنی کس طرح ممکن تھی نہ حضورؐ اتنا ازدواجی سلسلہ وسیع کر سکتے تھے۔ نہ شاہانہ دولت اور غاصبانہ مال حضورؐ
کے پاس تھا کہ مصارف میں غیر معمولی وسعت کر سکتے، مگر خواہشمندوں کی خواہشوں کو ٹھکرا دینا اور ارادتمندوں اور مشتاقوں کی دل شکنی کرنی بھی فطرت نبوت کے خلاف
تھی۔ پروانوں کا اشتیاق بڑھ رہا تھا اور شمع ایک تھی کس کس کو جان نواز پیام دیتی۔ پھر مشتاق عورتیں حسن و جمال میں بھی بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان کا حسن باصرہ نواز اور
دلفریب [illegible] اصلی غرض کی تکمیل کا ذریعہ تھی اور غرض کی تکمیل گوناگوں دشواریوں کی حامل۔ بالآخر قرآن نے صراحت فرما دی کہ اب دائرۂ ازدواج
کی توسیع [illegible] کو بند کر دو جتنی تعداد ہے اسی پر قناعت کرو۔ کیسی ہی حسین جمیل عورت ہو تو اس کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھو، لیکن ایک
صورت [illegible] ازواج میں سے کسی کو چھوڑ کر عورت سے نکاح کر لیا جائے۔ اس طرح تعداد میں اضافہ بھی نہ ہو اور اشاعت دین کی غرض
بھی پوری ہوتی رہے۔ کیا قصور ہے کسی کو چشمۂ فیض سے دور کر کے پیاسا رکھا جائے۔

تحلیل اجزاء لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ ۔ اس آیت کی تفسیر کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ہم
بالترتیب ذکر کرتے ہیں:

(۱) ابن عباس، مجاہد، ضحاک، قتادہ، ابن زید اور ابن جریر وغیرہم کا قول ہے کہ جب رسول پاکؐ نے بحکم الٰہی اپنی بیبیوں کو سلسلہ زوجیت میں باقی رہنے دیا۔ اس کو منقطع کر لینے کا اختیار دے دیا اور کاشانہ نبوت کے اندر رہنا نہ رہنا ان کی مرضی پر چھوڑ دیا اور انہوں نے زین کو دنیا پر ترجیح دی اور عیش دنیا کو ٹھکرا کر حضورؐ کی زوجیت میں رہتے ہوئے فقر و فاقہ کے ساتھ زندگیاں گزارنی قبول کر لیں تو اس کے عوض اللہ نے اپنے نبی کو حکم دے دیا کہ اب تمہارے لئے بھی ان کے علاوہ کسی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں اور نہ ان کے عوض دوسری کسی عورت کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنا حلال ہے۔

جن ازواج پر اقتصار کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان کی تعداد بقول ابو سعود حسب صراحت ذیل نو تھی۔

عائشہ بنت صدیق اکبرؓ، حفصہ بنت فاروق اعظم رضؓ، ام حبیبہ بنت ابو سفیان، سودہ بنت زمعہ، ام سلمہ بنت ابو امیہ، صفیہ بنت حیی بن اخطب خیبری، میمونہ بنت حارث ہلالی، زینب بنت جحش اسدی، جویریہ بنت حارث مصطلقی

اس قول پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ موجودہ بیبیوں کے علاوہ کسی عورت سے نکاح کرنا حضورؐ کے لئے جائز نہیں نہ ان کے انتقال کے بعد نہ ان کو طلاق دے کر۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس آیت کے نزول کے بعد حضورؐ نے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا مگر خدا تعالیٰ نے بعد میں ازدواج کے اس حکم کو اس کے بعد منسوخ کر دیا تھا اور حضورؐ کو مزید نکاح کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور اقدسؐ کی وفات سے پہلے خدا تعالیٰ نے آپ کے لئے دوسری عورتوں سے نکاح حلال کر دیا تھا (احمد والترمذی والنسائی) حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ حضورؐ کی وفات سے پہلے ہی خدا تعالیٰ نے سوا محرم عورتوں کے دوسری عورتوں سے نکاح کرنا حلال کر دیا تھا کہ جن عورتوں سے رسول اللہ چاہتے ہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے خود فرما دیا تھا تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ الآیۃ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہ کے قول کے موافق نسخ کرنے والی آیت پہلے ہے اور منسوخ پیچھے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے (کیونکہ ترتیب کا نزول کے موافق ہونا لازم نہیں ہے) سورۂ بقرہ میں وفات شوہر کی عدت کے بارے میں بھی ناسخ اور منسوخ دو آیتیں ہیں۔ ناسخ ترتیب میں پہلے ہے اور منسوخ بعد کو۔ (۲) ابی بن کعبؓ، عکرمہ، ابو رزین، ابو صالح، حسن، سدی اور مجاہد و ضحاک و قتادہ کے ثانوی اقوال کے بموجب آیت کا مطلب یہ ہے کہ اقسام اربع مذکورہ کے بعد کسی اور صنف کی عورتیں تمہارے لئے حلال نہیں ہیں۔ ایک شخص نے حضرت ابی بن کعب سے دریافت کیا کہ کیا ازواج مطہرات کے انتقال کے بعد بھی رسول پاک مزید نکاح نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت ابی نے جواب دیا کیوں نہیں کر سکتے تھے سائل نے کہا اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے فرما دیا تھا لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ حضرت ابی نے فرمایا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جن اقسام کی عورتوں کو اللہ نے آیت إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الخ میں رسول اللہ کے لئے حلال کر دیا تھا۔ ان قسموں کے علاوہ کسی اور صنف سے نکاح کرنا جائز نہ تھا۔ (رواہ ابن جریر و عبداللہ بن احمد) اس مطلب کے موافق ازواج کے معنی اصناف و اقسام کے ہوں گے۔ یعنی اقسام مذکورہ کے مبادلہ میں اگر دوسری قسموں کی عورتوں سے نکاح کرنا چاہو تو جائز نہیں۔ مثلاً واہبات النفوس سے تو نکاح نہ کرو بلکہ کسی یہودن سے کر لو یا واہبات النفوس جو مہاجرہ بھی ہیں ان کو چھوڑ کر غیر مہاجرہ سے نکاح کر لو یا موجودہ نکاحی بیبیوں کو طلاق دے کر کسی دوسری صنف کی عورت سے نکاح کر لو۔ یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔

ابن زید کا قول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں منکوحہ بیبیوں کا باہم مبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ ایک شخص اپنی بی بی کسی دوست کو دے دیتا تھا اور اس کی بی بی خود لے لیتا تھا۔ نحاس نے اس رواج کا انکار کیا ہے۔ اگر صحیح مان لیا جائے تو اس رواج کی ممانعت عدم تبدیلی کے حکم سے ہو جائے گی اور مبادلۂ ازواج کی نہی آیت سے مستفاد ہوگی۔

(۳) مجاہد سے مروی ہے کہ آیت مذکورۃ الصدر میں واہبۃ النفس عورت کی حلت کے لئے اس کا مومن ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ اس آیت میں ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مومنہ کے بعد کوئی یہودی یا عیسائی کافرہ حلال نہیں۔

(۴) ابو صالح کا قول ہے کہ مذکورہ عورتوں کے بعد کوئی پردیسی عورت (کافرہ ہو یا مومنہ) حلال نہیں۔

(۵) ابن جریر نے اول الذکر دونوں قولوں کو پسند کیا ہے اور لکھا ہے کہ آیت قدسی موجودہ ازواج اور مذکورہ اقسام چہ کو شامل ہے۔ ابن کثیر نے اس قول کو قوی لکھا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ موجودہ ازواج اور مذکورہ اقسام کے بعد کسی قسم کی عورت سے آپ کو نکاح جائز نہیں نہ یہ جائز ہے کہ کسی بیوی یا مذکورہ اقسام میں سے کسی قسم کی عورت کی بجائے آپ کسی غیر عورت سے نکاح کریں۔ ابن جریر کے اس قول سے نتیجہ نکلا کہ ازواج مطہرات کو چھوڑ کر رسول پاکؐ

کرنے جائز نہ تھا۔ پھر کیا وجہ کہ حضور والا نے حضرت حفصہ کو طلاق کی دھمکی دی اور رجوع فرمایا اور کبھی حضرت سودہ کو چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ اس اعتراض کا جواب مختصر یہ ہے کہ یہ تمام واقعات نزول آیت سے پہلے کے ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ آیت میں تو تبدیل ازواج کی ممانعت ہے ترک ازواج کی ممانعت نہیں۔

میرے نزدیک اول الذکر مطلب تمام مطالب سے زیادہ واضح مستغنی از تاویل، دل نشین، سیاق کے مطابق اور ہر تکلف سے خالی ہے۔ واللہ اعلم

مقصود بیان ازواج مطہرات کو طلاق دینے کے بعد یا ان کے انتقال کے بعد یا ان کی موجودگی میں بہرحال کسی طرح اس آیت کے نزول کے بعد رسول پاک کے لئے کسی جدید عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں رہا تھا۔ آیت سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ حضور والا کے لئے تعدد ازواج کی اجازت اس لئے نہ تھی کہ حضور کے لئے عیش پرستی کے مظاہر کی کثرت فراہم کی جائے بلکہ کسی خاص مصلحت کے تحت تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ازدواج کی حد بندی نہ کی جاتی اور نکاح کا دروازہ بند نہ کیا جاتا۔

آیت مذکورہ سے بر رائے ابی بن کعب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چار اقسام کی عورتوں کے علاوہ کسی پانچویں قسم کی عورتیں حضور کے لئے جائز نہ تھیں۔ خواہ ان کا حسن و جمال نقش و خال کیسا ہی مرغوب اور جاذب ہو وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ

ایمان والو! نبی کے گھروں میں نہ داخل ہوا کرو تاوقتیکہ تم کو کھانا کھانے کی اجازت نہ دی جائے (اپنی کے گھر بیٹھ کر) اس کے پکنے کا انتظار

نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ

کرنے والے نہ ہو البتہ جس وقت تم کو بلایا جائے تو اندر چلے جاؤ۔ اور جب کھانا کھا چکو تو چلے جاؤ اور بات چیت کرنے کے لئے

لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ

(وہاں) نہ بیٹھو تمہاری یہ بات نبی کو تکلیف دیتی تھی اور وہ تم سے شرم کرتے تھے مگر اللہ حق بات (کہنے) سے نہیں شرماتا

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔـلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ

اور جب تم پیغمبر کی بیبیوں سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کی آڑ میں سے مانگو یہ طریقہ تمہارے دلوں کو بھی خوب پاک

وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ

رکھنے والا ہے اور انکے دلوں کو بھی اور تم کو جائز نہیں کہ رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ جائز ہے کہ اُن کے بعد کبھی ان کی بیبیوں

بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا شَـيْـــًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ

سے نکاح کرو یہ اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے اگر تم کسی بات کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ۔ بہر

اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَاۗىِٕهِنَّ وَلَآ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ

صورت اللہ ہر چیز سے واقف ہے اُن عورتوں پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے باپوں کے سامنے آجائیں اور اپنے بیٹوں کے سامنے اور اپنے بھائیوں

وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ

کے سامنے اور اپنے بھتیجوں کے سامنے اور اپنے بھانجوں کے سامنے اور اپنی عورتوں کے سامنے اور اپنی لونڈیوں کے سامنے

وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

عورتو! اللہ سے ڈرو اللہ ہر چیز سے واقف ہے

تفسیر انسانی وجدان کی تشویش، اخلاق کی بربادی اور سوسائٹی کی تباہی چونکہ اشتراکِ نسوانی سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے امتیازِ نسوانی ضروری ہے یعنی ہر عورت کی صنفی قانونی وابستگی اور ایسا خاص تعلق ضروری ہے کہ پھر اس عورت سے قانونی فرد کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مرد کا تعلق نہ ہونے پائے۔ خلاصہ یہ کہ کسی کی بیوی سے غیر مرد کا ناجائز ربط ضبط نہ ہو بلکہ صرف زوج اور زوجہ باہم وابستہ ہوں۔ اس صنفی مخصوص وابستگی کے لئے دو امور اہم ہیں۔ (۱) زوج و زوجہ کے درمیان کوئی مانع نہ ہو۔ دونوں کو باہم ملنے سے کوئی روک نہ ہو۔ کیونکہ جب دونوں نے باہم قانونی معاہدہ کر لیا تو پھر کسی تیسرے کو اس معاہدہ کی تکمیل میں دخل انداز ہونا نہ چاہیئے۔ اس مداخلت بیجا سے تکمیلِ معاہدہ اور فرضِ معاشرت کی ادائیگی میں نقصان پیدا ہوتا ہے۔ اور معاشرت کے نقصان سے اخلاق اور سوسائٹی کو ضرر پہنچتا ہے۔ پس یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اگر ایک کمرہ میں قانونی جوڑا موجود ہو اور تنہائی کا خواستگار بھی ہو تو کوئی غیر شخص اندر داخل ہو جائے اور ان کی خلوت میں حارج ہو جائے۔ اگر کسی غرض سے اندر بلایا جائے اور اجازت مل جائے مثلاً کمرہ کے اندر غیر مردوں کو کھانا کھانے کے لئے طلب کیا جائے تو داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس سے زوجین کے فرضِ زوجیت کی ادائیگی میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کی مرضی کے موافق وقتی طور پر ایک کام کی سرانجام دہی ہوتی ہے اور بس۔ لیکن اجازت داخلہ ملنے کے بعد بھی یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اصل کام پورا کرنے کے بعد بھی اندر ہی بیٹھک بنالی جائے۔ اور خواہ مخواہ ادھر ادھر کی گپوں میں اپنا بھی وقت ضائع کیا جائے اور زوجین کو بھی تکلیف دی جائے۔ یہ بات آدابِ معاشرت کے خلاف ہونے کے علاوہ زوجین کے ادائے فرض میں خلل انداز ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کسی کو کھانے پر بلایا جائے اور اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے تو یہ جائز نہیں کہ کھانا کھانے کے بعد بھی جہان کمرے کے اندر بیٹھے باتیں کرتے رہیں اور میزبانوں کو دکھ پہنچائیں۔ اور جب کھانا کھانے کے بعد بیٹھا رہنا آدابِ انسانیت کے خلاف ہے تو کھانا تیار ہونے سے پہلے پہنچ جانا اور کھانے کے انتظار میں کمرے کے اندر بیٹھا رہنا بھی جائز نہیں۔ اس سے بھی وہی نقصان پیدا ہوتا ہے جو تکمیلِ غرض کے بعد بیٹھے رہنے سے ہوتا ہے۔ (۲) ان تمام امور کی بندش کر دی جائے جو طرفین کے لئے حقوقِ زوجیت کے ادا کرنے سے مانع ہوں اور دونوں کی صنفی وابستگی توڑنے میں کچھ بھی دخل رکھتے ہوں اور غیر مرد یا عورت کے دل میں کسی قسم کا ناجائز وسوسہ پیدا کرنے میں مددگار ہوں اور زوجین کی حیاتِ زوجیت میں کوئی ناخوشگواری پیدا ہونے کا سبب بن جائیں مثلاً کسی غیر مرد کے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ کسی غیر محرم عورت کو بے پردہ بغیر نقاب کے آنکھ بھر کر دیکھے یا اس کے خلوت خانہ میں بغیر اجازت کے داخل ہو یا اس سے لاطائل گفتگو کرے۔ البتہ اگر بات کرنے کی کوئی خاص ضرورت ہی ہو تو دروازہ کے باہر سے پردہ کی آڑ سے، حجاب کے پیچھے سے بقدرِ ضرورت بات کر سکتا ہے۔ نہ آمنا سامنا ہوگا نہ فتنہ کا دروازہ کھلے گا نہ زوجین کی تزویجی زندگی تلخ ہوگی نہ اخلاق گندہ ہوں گے نہ معاشرت تباہ ہوگی نہ سوسائٹی کی بربادی ہوگی نہ امن عالم سوختہ ہوگا۔ گویا بلا حجاب غیر عورت کو دیکھنا یا غیر عورت کا غیر مرد کو دیکھنا امن سوز فتنہ کا دروازہ کھولنا ہے۔ دونوں صنفوں کے دلوں کی طہارت اسی بات میں ہے کہ بقدر امکان احتیاطی تدابیر پر عمل کیا جائے لہٰذا جہاں تک ضرورتِ انسانی اجازت دے کم سے کم ربط باہم رکھا جائے۔ سرچشمہ کو چھوٹا سمجھ کر آزاد نہ چھوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ آگے چل کر اس کا چشمہ پھیل کر دریا بن جانا یقینی ہے۔ پہلا سوت کھلا دیکھ کر ہی بند کر دینا لازم ہے، لیکن احتیاطی تدبیر عمل کرنے کے یہ معنی بھی نہیں کہ نسوانی زندگی تلخ ہو جائے۔ عورت اپنے شوہر کے علاوہ دوسرے مرد کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جائے اور کسی عورت کے نکاح ہو جانے کا یہ مطلب ہو کہ اس کے تمام اہلِ قرابت مر گئے یا اہلِ قرابت کے لئے وہ مر گئی۔ باپ، بھائی، چچا، بیٹا، دادا، نانا اور تمام اصول فروع اس کے لئے

اجنبی ہوگئے اور سب سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا، گھر کا خادم اس کی خدمت کرسکتا ہے نہ کوئی سرپرست اس کی خبر لے سکتا ہے۔ زندگانی کی یہ تلخی تو عقل ونقل درایت و روایت، فطرت اور مذہب کسی کے نزدیک بھی گوارا نہیں۔ اعتبار شبہ کے مظالم پر کی جاتی ہے یا کسی ایسی جگہ کی جاتی ہے جہاں شبہ کا پیدا ہونا ممکن ہو۔ اس سے زیادہ احتیاط تو وقیہ ہے، انسانیت کش اور ظلم آفرین ہے، اس لئے اصول اور فروع یا گھر کے بے تکلف بوڑھے خادموں سے زیادہ احتیاط کرنی ضروری نہیں کیونکہ ان سے ربط ضبط رکھنا سوسائٹی کی ترقی کا سبب ہے۔ معاشرت کو تباہ کرنے والا نہیں ہے۔

تحلیل اجزاء يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ یہاں سے حجاب کی آخری آیات تک آداب معاشرت تہذیب اور عورتوں کے پردے کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ آیات حجاب انہی آیات کو کہا جاتا ہے۔ بقول قتادہ و واقدی ماہ ذیقعدہ ۵ھ میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمہ کے بعد ان کا نزول ہوا۔

حضرت انس راوی ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تو لوگوں کو کھانے کے لئے مدعو کیا۔ زینب کا ولیمہ سب سے بہتر ولیمہ تھا۔ میں لوگوں کی دعوت کرنے گیا۔ لوگ آنے لگے۔ ایک قوم آتی اور کھانے کے بعد چل جاتی۔ دوسری آتی وہ بھی کھا کر چلی جاتی۔ میں برابر لوگوں کو بلاتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے کوئی آدمی بلانے کے لئے نہ ملا سب کھا چکے۔ حضور ﷺ نے حکم دیا اپنا کھانا اٹھاؤ۔ اس وقت تین آدمی (حضرت زینب کے) حجرہ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ حضور ﷺ اٹھ کر باہر تشریف لائے اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف جا کر فرمایا السلام علیکم یا اہل البیت ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ یا رسول اللہ آپ نے اپنی بی بی کو کیسا پایا، خدا مبارک کرے۔ اسی طرح حضور ﷺ سب بیبیوں کی حجروں کی طرف گئے اور حال پوچھا۔ فارغ ہو کر واپس آئے پھر وہی تینوں آدمی بیٹھے باتیں کرتے نظر آئے اور بی بی دیوار کی طرف رخ کئے گوشے پر بیٹھی تھیں۔ سرکار عالی بیت بامروت تھے۔ اس لئے زبان سے کچھ نہ فرمایا اور دوبارہ نکل کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف تشریف لے جانے لگے اتنے میں ان لوگوں کے چلے جانے کی اطلاع ملی تو واپس آگئے۔ دروازہ میں ایک قدم داخل کیا تھا اور ایک قدم باہر ہی تھا کہ حضور ﷺ نے فوراً ہی میرے اور اپنے درمیان پردہ کھینچ دیا اور فوراً یہی آیت حجاب نازل ہوئی (بخاری و مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اس سے زیادہ مفصل ہے۔ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب حضور نے ایک بی بی رضی اللہ عنہا سے زفاف کیا تو میری والدہ ام سلیم نے ایک کونڈا حلوہ یا ملیدہ بنا کر مجھے دیا اور کہا اس کو حضور کی خدمت میں لے جا اور میری طرف سے بعد سلام کے عرض کرنا کہ یہ ہماری طرف سے تھوڑا کھانا حاضر ہے۔ اس زمانے میں لوگ تنگ حال تھے۔ میں وہ کھانا لے کر خدمت گرامی میں پہنچ کر عرض کیا یا رسول اللہ ام سلیم نے یہ بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ حضور کو ان کا سلام پہنچا کر عرض کروں کہ یہ قلیل کھانا ہے (قبول فرمائیے) حضور ﷺ نے نظر مبارک سے دیکھ کر فرمایا اچھا اس کو رکھ دو۔ میں نے اندر ایک کونے میں رکھ دیا۔ ارشاد فرمایا میری طرف سے فلاں فلاں کی دعوت کر آؤ۔ حضور ﷺ نے بہت کم لوگوں کے نام لئے تھے اور پھر فرما دیا تھا جو مسلمان تم کو ملے اس کی دعوت کر آؤ۔ میں نے جا کر نامزد لوگوں کی دعوت کی اور پھر جو مسلمان ملا اس کو بھی مدعو کر دیا۔ واپس آ کر دیکھا کہ صحن، دالان اور کوٹھری سب آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ (راوی کے سوال کے جواب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تین سو کے کچھ زائد تعداد ہوگی) اس کے بعد حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا وہ حلوہ لاؤ۔ حسب الحکم میں نے لا کر حاضر کر دیا۔ حضور ﷺ نے دست مبارک اس پر رکھا اور جو کچھ خدا کا حکم تھا وہ الفاظ پڑھ کر دعا فرمائی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا الفاظ فرمائے۔ پھر حکم فرمایا دس دس آدمیوں کا حلقہ بنالو اور بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دو اور ہر آدمی اپنے سامنے سے کھائے۔ لوگوں نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا یہاں تک کہ سب سیر ہوگئے (یعنی باری باری سے ہر ٹولی نے کھایا اور سب سیر ہوگئے) اس کے بعد مجھے حکم دیا جا کر اس کھانے کو اٹھالو۔ میں نے جا کر وہ کونڈا اٹھایا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جس وقت میں نے رکھا تھا اس وقت اس میں کھانا زیادہ تھا یا جس وقت اٹھایا اس وقت زائد تھا۔ کھانے کے بعد بھی کچھ لوگ حضور کی کوٹھری میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور بی بی بھی اسی کوٹھری میں دیوار کی طرف رخ کئے بیٹھی تھیں۔ ان آدمیوں نے باتوں کو اتنا طول دیا کہ حضور ﷺ کو ان کا بیٹھنا ناگوار ہونے لگا، مگر حضور ﷺ سب سے بامروت تھے۔ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے اور اپنی بیبیوں کے حجروں پر جا کر ان کو سلام کیا جب ان لوگوں کو حضور کے تشریف لے جانے کا علم ہوا تو سمجھے کہ حضور کو ان کا بیٹھنا ناگوار گزرا، اس لئے فوراً جلدی جلدی دروازہ سے باہر نکل گئے۔ حضور واپس تشریف لائے پردہ چھوڑ دیا اندر داخل ہوئے۔ میں حجرہ کے باہر رہ گیا۔ کوٹھری میں تھوڑی ہی دیر ٹھہرے تھے کہ اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور حضور ان آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ سب سے پہلے بیبیوں کو یہ آیت سنائی اور سب نے [illegible] اس آیت کو [illegible] (حدیث صحیح رواہ مسلم والبخاری والنسائی والترمذی وابن جریر وغیرہم) بطرق کثیرۃ ایک اور روایت

میں آیا ہے کہ حضور والا ؐ نے گوشت روٹی کی دعوت کی تھی ۔ گویا روٹی اور حلوہ دونوں چیزیں تھیں ۔

بیوت النبی سے وہ تمام مکانات مراد ہیں جن میں حضور ؐ خود سکونت پذیر تھے یا حضور کی بیبیاں ؓ رہتی تھیں ۔ ازواج کے مسکونہ مکانات کو نبی کے مکانات کہنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بی بی کی ملک میں ان کا مسکونہ مکان داخل نہ تھا ۔ حضور نے ان کو بطور ہبہ مالک بنا دیا تھا ۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسلمانو! جب تک تم کو اندر پہنچ کر کھانے کی اجازت نہ مل جائے اس وقت رسول اللہ ؐ کے مکانوں میں داخل نہ ہو ۔ بغیر اجازت کے داخلہ کی ممانعت اگرچہ رسول پاک ؐ کے گھروں کے متعلق صراحتہً ہے ، مگر مقصود عمومی تہذیب کی تعلیم ہے ۔ عام مسلمانوں کے لئے آپس میں بھی یہی حکم ہے ۔ کوئی کسی کے مکان میں بغیر اجازت داخل ہونے کا اختیار نہیں رکھتا ۔

غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ ۔ مجاہد اور قتادہ نے اس فقرہ کی تفسیر میں فرمایا یعنی کھانا پکنے اور تیار ہونے کے انتظار میں نہ بیٹھے رہا کرو ۔ مطلب یہ کہ کھانے نہ تکتے رہا کرو کہ کب کھانا تیار ہو اور ہم کھائیں ۔

وَلٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا ۔ یعنی کھانا اگرچہ پہلے سے پک کر تیار رکھا ہو ، مگر تم اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تم کو اندر بلایا نہ جائے ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے لوگ بے تہذیب تھے ۔ پہلے سے پہنچ کر کھانا پکنے کا انتظار کرنے لگتے تھے ۔ جب کھانا تیاری کے قریب آجاتا تو بغیر اجازت کے اندر چلے جاتے ۔ کیونکہ عورتوں کے پردے کا رواج نہ تھا ۔ اس آیت سے طفیلی بن کر دعوت میں جانے اور کھانا کھانے کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے ۔

فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا ۔ یہ حکم وجوبی ہے ۔ کھانا کھا چکنے کے بعد منتشر ہو جانا اور میزبان پر مزید بار نہ ڈالنا واجب ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا جب تم میں سے کوئی اپنے کسی بھائی کی دعوت کرے خواہ دعوتِ ولیمہ ہو یا اور کسی قسم کی دعوت ہو تو اس کو قبول کر لینا چاہیئے (مسلم) اور جب تم لوگ دعوت کھا کر فارغ ہو جایا کرو تو گھر والوں کا بار ہلکا کر دیا کرو ۔ اٹھ کر چلے آیا کرو (صحیح)

وَلَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ جس طرح کھانا تیار ہونے سے پہلے پہنچ جانے اور کھانا تیار ہونے کا انتظار کرتے رہنے کی ممانعت اوپر کی آیت میں کر دی گئی ۔ اسی طرح کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خوش فعلیاں اور گپیں کرنے کی ممانعت اس فقرہ میں فرما دی گئی ۔ کیونکہ یہ دونوں عمل تہذیب انسانیت اور عزت نفس کے خلاف ہیں ۔ اس کے علاوہ میزبان کی تکلیف کا بھی باعث ہیں اسی لئے فرمایا :-

اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ ۫ وَاللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ ابن کثیر نے مطلب اس طرح لکھا ہے کہ بغیر اجازت کے تم لوگوں کا گھر کے اندر داخل ہونا رسول اللہ پر گراں گزرتا تھا اور اس سے آپ کو دکھ پہنچتا تھا ، مگر کمال شرم کی وجہ سے وہ تم کو منع کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے ۔ گویا شیخ کے نزدیک ذٰلِکُمۡ سے اشارہ داخلہ بلا اجازت کی طرف ہے ۔ میرے نزدیک اگر اشارہ میں تعمیم کر دی جائے تو زیادہ مناسب ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر اجازت کے رسول ؐ کے گھر میں جانا اور کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد بھی دیر تک وہاں بیٹھ کر باتوں میں مشغول رہنا نبی ؐ کے دکھ کا سبب تھا ، مگر شرم کی وجہ سے وہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہتے تھے ۔

وَاللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ۔ مگر اللہ امر حق کو بیان کرنا ترک نہیں کر سکتا اس کو کوئی چیز اظہار حق سے نہیں روک سکتی ۔ لہٰذا اس نے سچی بات فرما دی اور صحیح حکم دے دیا اور تم کو مذکورہ بدتہذیبی سے منع کر دیا ۔

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡہُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡہُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ جب مکان کے اندر بغیر اجازت کے داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی اور سب لوگ اس کے خوگر تھے تو ان کو غیر معمولی تکلیف ہوئی ۔ اگر کوئی کام پڑ جائے تو کیا کریں ۔ مختلف مسائل کے متعلق استفسار روزانہ کا معمول تھا جب داخلہ بند ہو گیا تو مسائل کیسے دریافت کریں ۔ کچھ مانگنا ہو تو کیسے مانگیں ، اس لئے حکم دیا گیا کہ اگر امہات المومنین ؓ سے کچھ دریافت کرنا یا مانگنا ہو تو پردہ کی اوٹ اور حجاب کے پیچھے سے دریافت کر لیا کرو ۔ آمنا سامنا نہ ہونا چاہیئے یعنی ان کو نگاہ بھر کر نہ دیکھنا چاہیئے ، اس لئے کہ :-

ذٰلِکُمۡ اَطۡہَرُ لِقُلُوۡبِکُمۡ وَقُلُوۡبِہِنَّ ؕ یہ معمول طرفین کے دلوں کی طہارت کا سبب ہے ۔ بات یہ تھی کہ حضور اقدس ؐ کے زمانہ میں مخلص مومن تھے اور بے ایمان منافق بھی کاشانۂ نبوت میں سب ہی آدمی حاضر ہوتے تھے ۔ اچھے بھی برے بھی نیک طینت اور پاک خصلت والے بھی اور کسی کی پیشانی پر لکھا نہ تھا کہ یہ مخلص مومن ہے یا دغا باز منافق ۔ سچے مومن بھی منافقوں کی ظاہری حالت کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں ۔ امہات المومنین ؓ بھی آخر انسان ہی تھیں ان کو علم غیب نہ تھا ۔ دلوں کا حال تو خدا جانتا ہے ۔ وہ تو سب کو مومن ہی جانتی تھیں ۔ اس لئے زیادہ احتیاط نہیں کرتی تھیں ۔ سب ان کی اولاد کی طرح تھے ۔ وہ سب کی مائیں تھیں ۔ اب ہو سکتا تھا

کہ کوئی منافق بے ادبی کرے اور شیطانی وسوسہ اپنے دل میں لائے۔ شیطنت منافقوں کے دلوں میں ابھری ہوئی تھی۔ مگر گلستان میں کہ شراب پینے سے قرآن بیچ کر شراب پینا بدرجہا بہتر ہے۔ اگرچہ فعل دونوں برے ہیں۔ نفاق ہر جگہ اور ہر وقت مذموم ہے۔ مگر امہات المومنین کے دربار میں پہنچ کر تو مذموم ترین تھا۔ وہ مقام ادب تھا۔ پس اسی بنا پر دریافت مسائل کرنے کے لئے بھی اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی اور صاف حکم دے دیا گیا کہ کچھ دریافت کرنا ہو تو باہر سے دریافت کرو۔ اس سے امہات المومنین کے دلوں میں تمہاری گستاخی کے سبب کوئی کدورت نہ پیدا ہو گی۔ کسی گستاخی کا موقعہ ہی نہ ملے گا اور تمہارے دلوں میں بھی کوئی شیطانی وسوسہ نہ پیدا ہوگا۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ یعنی تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو دکھ پہنچاؤ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بلا اجازت رسول کے گھروں کے اندر داخل ہونا یا بدتہذیبی کا مظاہرہ کرنا یا کھانے کے بعد دیر تک باتوں میں مشغول رہنا یا بلا پردہ امہات المومنین کے سامنے جانا اور وہاں بے تکلف کلام کرنا یہ تمام باتیں رسول پاک کو دکھ دیتی ہیں اور یوں تو کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچائے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ مومن کی تو یہ شان ہی نہیں۔ اس کے لئے تو کسی طرح زیبا نہیں کہ رسول کو دکھ دے۔ لہٰذا وہ تمام باتیں جن سے رسول کو دکھ پہنچتا ہو واجب الترک ہیں۔

وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا۔ رسول پاک کو ایذا پہنچانے کی ممانعت گذشتہ آیت میں فرما دی تھی۔ ایذا رسانی کی اقسام گوناگوں ہیں۔ حضور کی مرضی کے خلاف ہر کام کرنے سے سرکار رسالت کو دکھ پہنچتا تھا۔ ہر قانون اسلامی سے سرتابی اور فرمان نبوی سے سرکشی رسول اللہ کے دکھ کا موجب تھی۔ آیت سابقہ میں ہم سب کی ممانعت ہو گئی۔ مگر نزول آیت کے وقت کافروں اور مسلمانوں دونوں کی عجیب حالت تھی۔ کافروں میں منافق بھی داخل تھے۔ علانیہ یا در پردہ حضور کے سخت ترین دشمن تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا کوئی دقیقہ ایذا رسانی کا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے دلوں میں لا محالہ طور پر یہ تمنا ہوتی ہو گی کہ رسول کا انتقال ہو جائے اور ان کی بیبیوں پر ہم جائز یا ناجائز طریقہ سے قبضہ کر لیں اور مسلمان اس قدر دین کے شیفتہ اور تحصیل مذہب کے دلدادہ تھے کہ ہر قربانی کر کے مسائل دین کو سیکھنا چاہتے تھے۔ اس شیفتگی اور والہانہ شوق سے مجبور ہو کر ممکن ہے کسی نے اپنے دل میں یہ خیال کر لیا ہو کہ حضور کی بی بی سے نکاح کرنا حصول شرف اور کمال دینی کا موجب ہے، اس لئے اگر حضور کے بعد ہمارا نکاح ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ حرکت انتہائی بے ادبی اور بدتہذیبی کی تھی۔ ایسا خیال دل میں لانا بھی حضور کو دکھ پہنچنے کا باعث تھا۔ کافروں کی بیہودہ تمناؤں اور برے اصل تخیلات کی بندش تو ممکن نہ تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی نہ (بر مذہب احناف) اسلامی احکام کا رخ ان کی طرف ہوتا ہے۔ البتہ مسلمان اسلامی احکام پر مکلف ہیں۔ ان کو بے ہودہ خیالات سے روکنا ضروری تھا، اس لئے پہلے تو مجمل طور پر فرما دیا تھا کہ رسول اللہ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ اس حکم کا لازمی نتیجہ تھا کہ حضور کے بعد ان سے کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ممکن تھا کوئی یہ خیال کرنے لگے کہ رسول اللہ کی ازواج مسلمانوں کی دینی مائیں ہیں حقیقی مائیں نہیں ہیں۔ ان کے مبارک پیٹ سے کوئی پیدا نہیں ہوا ہے، اس لئے ماؤں کے تمام احکام جاری ہونے ضروری نہیں۔ اس غلط خیال کے ازالہ کے لئے صراحت فرما دی کہ رسول اللہ کی ازواج سے کبھی نکاح مت کرنا یہ حرمت دائمی ہے۔

مِنْۢ بَعْدِهٖ کا لفظ دو معنی کو حاوی ہے۔ اوّل یہ کہ رسول اللہ کے طلاق دینے کے بعد کوئی شخص آپ کی مطلقہ سے کبھی نکاح نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد کوئی آپ کی بیوہ سے نکاح نہ کرے۔ چونکہ دونوں طرح سے نکاح کرنا حرام تھا، اس لئے کسی معنی کی تصریح نہ فرمائی اور آخر میں ارشاد کر دیا کہ ازواج رسول سے نکاح کرنا خدا کے نزدیک بڑا جرم ہے۔ عامر شعبی سے مروی ہے کہ حضور والا کی ملک میں ایک باندی تھی جس کا نام قتیلہ بنت اشعث بن قیس تھا۔ حضور کی وفات کے بعد جب عرب کے بعض قبائل اسلام سے پھر گئے تو اہل ارتداد میں سے اس عورت کا قبیلہ بھی تھا اور اپنے خاندان کے ساتھ یہ بھی مرتد ہو گئی تھی۔ پھر صدیق اکبر نے جب لشکر کشی کی اور مرتد از سر نو مسلمان ہوئے تو قتیلہ کا خاندان بھی مسلمان ہوا اور قتیلہ خود بھی مشرف بہ اسلام ہوئی اور حضرت عکرمہ بن ابوجہل نے اس سے نکاح کر لیا۔ صدیق اکبر کو اس کی اطلاع ملی تو آپ بہت ہی برافروختہ ہوئے۔ فاروق اعظم نے امیر المومنین کا غصہ دیکھ کر فرمایا خلیفۂ رسول اللہ! وہ عورت ازواج مطہرات میں داخل نہ تھی۔ غور تو کیجئے کہ رسول اللہ نے آیت تخییر اس کے سامنے تلاوت نہیں کی (یعنی اس کو اختیار نہیں دیا کہ تیرا دل چاہے تو میرے ساتھ رہ اور نہ دل چاہے تو اپنے والدین کے پاس چلی جا۔ حالانکہ تمام ازواج پر حضور نے آیت تخییر پیش کی تھی) نہ کبھی حضور نے اس کو پردہ میں رکھا۔ پھر وہ اپنی قوم کے ساتھ مرتد بھی ہو گئی تھی۔ یہ تقریر سن کر حضرت ابوبکر صدیق کا غصہ سرد پڑا (ابن جریر) اس روایت سے معلوم ہوا کہ

حضورؐ کی منکوحہ بی بی سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لئے حرام تھا۔ سرکار کی کسی باندی سے نکاح کرنا حرام نہ تھا۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ یہ سابقہ آیت کے مضمون کی مزید تاکید ہے مقصود یہ ہے کہ ازواج مطہراتؓ سے نکاح کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ اور ارادہ کو چھپا کر بھی نہ رکھو۔ کیونکہ نیت کو اگر مسلمانوں سے چھپا لوگے، مگر خدا تو ظاہر و باطن سب سے واقف ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ جب حجاب کا حکم نازل ہوا تو ازواج مطہراتؓ کے بیٹوں اور دوسرے قرابت داروں نے کہا کہ اب ہم بھی رسول اللہ کی بیبیوں سے پردہ کی اوٹ سے بات کیا کریں گے۔ وجہ یہ تھی کہ بظاہر حکم عام تھا اور عموم نص حجت ہے اس لئے ازواج پاکؓ کے رشتہ داروں نے سمجھا کہ اب ہمارے لئے بھی روبرو گفتگو کرنے کی ممانعت ہوگئی، لیکن ایسا حکم مصلحت کے خلاف تھا۔ کنبہ داری اور صلۂ رحم کے خلاف تھا۔ رشتہ داروں سے قطع تعلق پر مبنی تھا، اس لئے قریب ترین رشتہ داروں کو اس حکم سے مستثنیٰ فرما دیا۔ فقرۂ مذکورہ میں آباء سے مراد تمام اصول ہیں۔ باپ دادا، پردادا، چچا، ماموں، رضاعی باپ اور رضاعی چچا کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ افلح بن ابی قعیسؓ نے جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کہا کہ آپ کیلئے مجھ سے پردہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ آپ میرے بھائی کی بیٹی ہیں تو ام المومنینؓ نے نہ مانا اور فرمایا مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے مرد نے نہیں پلایا۔ جب حضور تشریف لائے تو ام المومنین سے فرمایا وہ تیرا (رضاعی) چچا ہے۔ وہ تیرے پاس آسکتا ہے۔

وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ۔ ابناء سے مراد ہیں عورتوں کے وہ لڑکے جو ان کے پیٹ سے ہوں اور ان کے تمام فروع یعنی پوتے نواسے اور پوتوں نواسوں کی تمام نسل۔ غرض کسی عورت کا اپنی اصل اور نسل میں سے کسی سے پردہ نہیں ہے۔

وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ۔ بھائیوں سے بھی پردہ کی ضرورت نہیں ہے حقیقی ہوں یا علاتی یا اخیافی یا رضاعی۔ ماموں چچا خالہ اور پھوپھی کے بیٹے بھائی نہیں ہیں۔ ان سے نکاح جائز ہے، اس لئے ان سے پردہ بھی واجب ہے۔

وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ۔ بھتیجے اور بھانجے بھی اس آیت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حقیقی علاتی، اخیافی اور رضاعی بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے اور ہر قسم کے بھائی بہن کی پوری نسل اس حکم میں داخل ہے۔ ہر قسم کے بھائی بہن کا پوتا نواسا پڑپوتا پڑنواسا اور ساری کی ساری نیچے کی نسل کا یہی حکم ہے کسی سے پردہ لازم نہیں ہے۔

تنبیہ:- شرعاً وہی رضاعت معتبر ہے جو دو برس کے اندر ہو۔ جمہور علماء کا یہی متفق علیہ فیصلہ ہے، مگر ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام المومنین حضرت حفصہؓ نے فرمایا کہ اگر بالغ کو بھی دودھ پلا دے تو پردہ کے حق میں رضاعی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حذیفہ کی بیویؓ نے سالم کو بیٹا بنا لیا تھا اور سالم گھر کا ممبر سمجھا جاتا تھا کوئی پردہ گوشہ نہ تھا، لیکن جب پردہ کا حکم نازل ہوا تو حضرت حذیفہؓ کو بے روک ٹوک سالمؓ کا گھر کے اندر آنا برا معلوم ہوا۔ حذیفہؓ کی بیویؓ نے حضور والا سے مسئلہ پوچھا۔ ارشاد فرمایا تم اس کو اپنا دودھ پلا دو۔ اسی حدیث کی بنا پر حضرت عائشہؓ اگر کسی کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینی چاہتی تھیں تو اپنی بھتیجی کو حکم دیتی تھیں کہ وہ اس شخص کو اپنا دودھ پلا دے اور وہ آپ کی بھتیجی کا رضاعی بیٹا ہو جائے، لیکن دوسری ازواج مطہراتؓ نے اس استدلال کو قبول نہیں کیا اور فرمایا سالمؓ کا واقعہ صرف حذیفہؓ کی بیوی کے لئے مخصوص تھا عمومی حکم نہ تھا۔

وَلَا نِسَآئِهِنَّ۔ یعنی ازواج پاک کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنی عورتوں سے پردہ کریں۔ اپنی عورتوں سے مراد تمام مسلمان عورتیں ہیں۔ خواہ قرابتدار ہوں یا اجنبی۔ کافر عورتیں اجنبی مردوں کی طرح ہیں، مگر علماء شافعیہ میں سے شیخ نووی نے کہا کہ گھر کا کام کاج کرنے والی عورتیں اگرچہ کافر ہوں، مگر اتنا بدن دیکھ سکتی ہیں جتنا عموماً کام کرنے کے وقت کھل جاتا ہے۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ علمائے حنفیہ نے یہ بھی کہا کہ جو عورتیں بے پردہ باہر پھرتی ہیں خواہ وہ مسلمان ہی ہوں ان سے پردہ نہ کرنا مکروہ ہے۔

وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ۔ سعید بن مسیبؒ نے فرمایا اس جگہ مملوک سے مراد صرف باندیاں ہیں یعنی غلاموں سے پردہ کرنا لازم ہے۔ علمائے حنفیہ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ بعض علماء نے اپنے غلاموں سے پردہ نہ کرنا اسی آیت سے جائز قرار دیا ہے۔ بہرحال باندیوں سے اور ان غلاموں سے جو نابالغ ہوں یا بہت زیادہ بوڑھے ہوں بالاتفاق پردہ واجب نہیں ہے۔ مذکورہ بالا پردہ کا حکم اگرچہ بظاہر امہات المومنینؓ کے لئے ہے کیونکہ بالذات رُوئے سخن انہی کی طرف

ہے، مگر باجماع علماء تمام مسلمان عورتوں کے لئے یہی حکم ہے۔
وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۔ امہات المومنینؓ کی رفتار و اطوار پر توکسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ حضورؐ کے اہل بیت کو
تو اللہ نے ہر کدورت اور خرابی سے پاک ہی کر دیا تھا۔ آیت التطہیر میں اس کی وضاحت فرمادی ہے، مگر ہم لکھ چکے ہیں کہ امت کی تمام عورتوں کو ہدایت کرنی مقصود
ہے اس لئے عام مومنات کو تقویٰ کا حکم دیا۔ تقویٰ اگرچہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ضروری ہے، مگر اس جگہ روئے سخن صرف عورتوں کی طرف ہے۔ اس کی
وجہ خطیب نے یہ لکھی ہے کہ فتنہ اکثر عورتوں کی جانب سے ہی اٹھتا ہے۔ مرد کسی عورت سے اس وقت تک نہیں بول سکتا جب تک اس کی چال ڈھال اور رنگ
ڈھنگ سے اپنی کامیابی کا یقین نہ کرے اور عورت کے چال چلن کو تاڑ نہ جائے اور اس کی طرف سے عرض مدعا کا موقعہ نہ پالے، اس لئے عورت کی نیت اور ارادہ
کی صفائی ضروری ہے۔ فتنہ کے دروازوں کو کھول دینا یا بند کر دینا اسی کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ پس خداتعالیٰ نے عورتوں کو تقویٰ کا حکم خصوصیت کے ساتھ دیا
اور آخر میں اپنے حاضر ناظر ہونے کی صراحت فرمادی تاکہ عورتوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ پردہ کا حکم طہارت معاشرت اور فساد سے بچاؤ کے لئے ہے۔ اس کا
مقصود فتنہ کا دروازہ بند کرنا ہے۔ لہٰذا نیتوں اور ارادوں کو پاک رکھنا ضروری ہے۔ یہ نہ خیال کرلینا کہ ظاہر میں پردہ کرلینے سے حکم شریعت کی تعمیل ہو جاتی ہے۔
در پردہ ہم جو چاہیں کریں۔ کوئی دیکھنے بھالنے والا نہیں ہے۔ اللہ دانا بینا ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

مقصودِ بیان آداب معاشرت کی شستہ تعلیم۔ حضورؐ کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل ہونے کی ممانعت۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ ازواج
پاک کے مسکونہ مکانات حقیقت میں رسول اللہؐ کے ہی مکانات ہیں۔ کوئی بی بی مالک نہیں ہے۔ اس امر کی صراحت کہ بدتہذیبوں
اور فقیروں کی طرح پہلے سے آکر بیٹھ جانا اور اس طرح اس کو دکھ پہنچانا جائز نہیں۔ حضور اقدسؐ کو کسی قسم کا دکھ پہنچانا حرام ہے۔ ازواج مطہراتؓ سے امہات الامت
کا نکاح ہمیشہ کے لئے ناجائز تھا۔ حضورؐ بہت بامروت تھے (اگرچہ حقوق اللہ میں سے کسی مروت اور رعایت کو کام میں نہ لاتے تھے مگر) اپنے حقوق کے معاملہ میں
مسلمانوں کو تکلیف پہنچانی نہ چاہتے تھے۔ عورتوں کو عموماً پردہ کا حکم آیت میں دیا گیا ہے، مگر تمام اصول و فروع اور گھر کے پیش خدمتوں کو مستثنیٰ فرما دیا ہے۔ پردہ
کا سبب طہارت قلوب کو قرار دیا ہے۔ گویا اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس پردہ سے طہارت نفس حاصل نہ ہو وہ درحقیقت پردہ ہی نہیں ہے۔ محض رسم ہے
جسم کے پردے سے پہلے دل کا پردہ لازم ہے وغیرہ۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

اللہ اور اس کے فرشتے یقیناً نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اُن پر درود و سلام بھیجو

تفسیر ہم لفظ صلوٰۃ کی مکمل تنقیح آیت "هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰۗىِٕكَتُهٗ" کے تفسیری مقالہ میں لکھ چکے ہیں، اس لئے اس جگہ صرف تحلیل اجزاء پر اکتفا
کرنا مناسب ہے۔ ہاں اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ ہر نبیؐ اپنی امت کے لئے مصلح ہوتا ہے اور اس کے قوانین اصلاحیہ مردوں کو زندہ
کر دیتے ہیں۔ وہ مردہ دلوں میں روح حیات پھونکتے ہیں۔ ابدی ہلاکت سے بچاتے ہیں۔ دائمی لعنت کو دور کرتے ہیں۔ انسانیت کبریٰ کو تباہی سے محفوظ
رکھتے ہیں۔ اس معمورہ کو فتنہ، فساد، بربادی اور خونریزی سے خالی کر دیتے ہیں۔ سارے عالم میں امن عافیت اور چین کو پھیلاتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے
انسان کو سیدھا راستہ بتاتے ہیں۔ یتیموں، فقیروں، بیواؤں، بیکسوں اور بے بسوں کی خبرگیری کر کے ان کے دکھ سکھ کو بدل دیتے ہیں۔ تاریک دلوں
کو روشن اور بے حس جامد ہستیوں کو حساس اور باشعور بنا دیتے ہیں۔ مظلوموں کی حمایت کر کے ظالموں کو تباہ کرتے ہیں۔ حقوق انسانی میں عادلانہ مساوات
کرتے ہیں اور ہر طاقت ور کو دست درازی سے روک دیتے ہیں اور بالآخر بچھڑے ہوئے انسانوں کو ملیک مقتدر سے ملا دیتے ہیں۔ یہ کرشمہ ہوتا ہے نبوت کا
اور یہ نگہت و شفقت ہوتی ہے۔ نبیؐ کی ایسی شفقت نہ ماں کو اپنے بچہ سے ہوتی ہے۔ نہ باپ کو اپنی اولاد سے نہ زوجین کو ایک دوسرے سے نہ بھائی کو بہن سے
نہ بہن کو بھائی سے نہ استاد کو شاگرد سے نہ شاگرد کو استاد سے۔ پس اس پیکر رحمت اور مجسمۂ کمال شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو امت کے تمام افراد
نبیؐ کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ تمام دماغی جسمانی اور مالی طاقتیں نبیؐ کی خدمت کے لئے صرف کر دیں۔ ہر آن ہر پل ہر جگہ اور ہر مکان میں نبیؐ کی خوشنودی

حاصل کرنے کو دنیا اور تمام موجودات دنیا کے مقابلے میں ترجیح دیں بلکہ ضرورت کے وقت اپنے نفس کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کریں، لیکن دماغی، جسمانی جانی اور مالی قربانی کے مواقع تو کم آتے ہیں اور ہر شخص کا اتنا ظرف بھی نہیں ہے کہ اس قربانی کو درجہ کمال تک پہنچائے اور غیر نفسانی غرض کے ہر چیز سے ہاتھ اٹھا کر مرکز توجہ ایک ہی کو بنالے۔ منہ سے کہہ دینا آسان ہے۔ دعویٰ بھی مشکل نہیں، مگر کرنا دشوار ہے۔ ہاں کم از کم اتنی بات تو سہل ہے کہ جب اپنے محسن کا نام آئے تو ان کے لئے اللہ سے دعا کرے اور روح اعظم پر رحمت کی بارش ہونے کا اللہ سے خواستگار ہو یعنی درود پڑھے اور اس سے بخل نہ کرے۔

تحلیل اجزاء

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ الخ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ملائکہ صلوٰۃ یعنی برکت بھیجتے ہیں (بخاری وابن ابی حاتم) امام ترمذی نے سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے کہ صلوٰۃ ملائکہ استغفار ہے۔ یہاں چند امور تحقیق طلب ہیں۔ ابن عباسؓ سے باسناد جید مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کیا آپ کا رب آپ پر صلوٰۃ بھیجتا ہے؟ اللہ نے موسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ ان سے کہہ دو کہ میں اور میرے ملائکہ انبیاء اور رسولوں پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ ابن عباسؓ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر پیغمبر کے متعلق صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے۔ امام نووی نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے بلکہ قرآنی آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسلام کا استعمال عام اہل ایمان کے حق میں بھی جائز ہے۔ ارشاد ہوا ہے هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ ایک اور آیت میں ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ صحیح حدیث میں آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ یعنی دائیں طرف والے مقتدیوں پر اللہ اور اس کے ملائکہ صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب حضرت ابو اوفیٰؓ اپنی قوم کا مال زکوٰۃ لائے تو حضورؐ نے ان کو دعا دی: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰٓى اٰلِ اَبِيْ اَوْفٰى۔ ایک بار حضرت جابرؓ کی بیوی نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ میں اور میرا شوہر (دعا کے امیدوار ہیں) ارشاد فرمایا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلٰى زَوْجِكِ۔ اللہ نے خود اپنے نبیؐ کو بعض اہل ایمان پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم دیا ہے فرمایا ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ لیکن جمہور علماء کی اصطلاح یہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ کا استعمال صرف حضورؐ کے لئے کیا جائے اور سلام کا اطلاق باقی انبیاءؑ پر کیا جائے اور صحابہ کے متعلق رضی اللہ عنہم کہا جائے اور عام مومنوں کے لئے رحمہم اللہ بولا جائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ علماء کی اس اصطلاح کی اصل کہاں ہے اور کیوں ایسا کیا گیا۔ قرآنی الفاظ احادیث کی صراحتیں اور عربی کے عام محاورات تو اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ بہرحال آیت مذکورہ میں النبی سے حضور اقدسؐ کی ذات مراد ہے۔ گزشتہ امتوں کو انبیاءؑ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم ملا ہو یا نہ ملا ہو امت محمدیہ کو ضرور حکم ملا ہے کہ ہادی برحق پر درود وسلام بھیجیں۔

(۲) چونکہ آیت مذکورہ میں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف احادیث میں بھی حکم ہوا ہے، اس لئے علماء نے صراحت کی ہے کہ کم از کم تمام عمر میں ایک بار درود پڑھنی ہر مسلمان پر واجب ہے۔ بعض علماء نے اس مسئلہ پر اجماع ہونے کی صراحت کی ہے، لیکن اگر ایک ہی مجلس میں بار بار حضور والا کا نام لیا جائے تو ہر مرتبہ درود واجب نہیں صرف ایک بار واجب ہے، مگر طحاوی اور حلیمی ہر مرتبہ وجوب صلوٰۃ کے قائل ہیں۔

(۳) ذکر الٰہی کے بعد صلوٰۃ وسلام سے بڑھ کر کوئی وظیفہ نہیں۔ ایک آیت میں اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا کا حکم دیا گیا ہے اس آیت میں درود وسلام کا امر ہے۔ وہاں ذکر کثیر کی ہدایت ہے اور یہاں سلام بھیجنے کی تاکید۔ کیونکہ سَلِّمُوْا کے بعد لفظ تَسْلِيْمًا صرف تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

عامر بن ربیعہؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا جب تک کوئی مجھ پر درود بھیجتا رہتا ہے ملائکہ بھی اس وقت تک اس پر صلوٰۃ بھیجتے رہتے ہیں۔ اب جس کا دل چاہے کم حصہ لے یا زیادہ (ابن کثیر اسنادًا الی ابن ماجۃ واحمد) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا قیامت کے دن میرا سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود پڑھتا ہے (ترمذی) حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں دو تہائی رات گئے حضورؐ اٹھتے اور فرماتے لوگو! اللہ کو یاد کرو اللہ کو یاد کرو زلزلہ والی ساعت آگئی ہے۔ اس کے پیچھے دوسرا جھٹکا بھی آپہنچا۔ موت اپنے پورے سامان کے ساتھ آپہنچی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اکثر رسول پر درود بھیجتا رہتا ہوں۔ فرمائیے میں اپنی دعا کا کتنا حصہ درود کے لئے مقرر کردوں۔ فرمایا جتنا تیرا جی چاہے۔ میں نے عرض کیا چوتھا حصہ؟ فرمایا دل چاہے تو اور بڑھا دے تیرے لئے بہتر ہوگا؟ میں نے عرض کیا نصف حصہ؟ فرمایا تیرا دل چاہے تو اور بڑھا دے تیرے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا اچھا دو تہائی فرمایا دل چاہے تو اور بڑھا دے۔ میں نے عرض کیا تو کیا میں اپنی کل دعا حضورؐ پر درود بھیجنے پر وقف کر دوں۔ فرمایا ایسا کرے گا تو تیرے تمام دکھ دور ہو جائیں گے اور گناہ بخش دیئے جائیں گے (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے مروی ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا جبرئیلؑ نے مجھ سے آکر کہا میں آپ کو خوشخبری دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے آپؐ پر درود بھیجا میں اس پر درود بھیجتا ہوں اور جس نے آپؐ پر سلام بھیجا میں اس پر

سلام بھیجتا ہوں (حضورؐ نے فرمایا) پس میں نے شکر کا سجدہ کیا (رواہ اسمٰعیل بن اسحاق القاضی)

حضرت عمرؓ کی روایت میں اسی حدیث میں اس طرح آیا ہے۔ جس نے آپ کی امت میں آپ پہ ایک بار درود بھیجا اللہ اس پہ دس بار درود بھیجے گا۔ اور اس کے دس درجات بلند کرے گا۔ ابو طلحہ کی وہ روایت جس کو امام احمد اور نسائیؒ نے بیان کیا ہے۔ اس کی مؤید ہے سا الفاظ کا کمی تغیر ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے جس نے مجھ پر ایک بار درود بھیجا اللہ اس پہ دس بار درود بھیجتا ہے (مسلم والبوداؤد والترمذی وقال حسن صحیح) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا غبار آلود ہو اس شخص کی ناک جس کے سامنے میرا تذکرہ آیا اور اس نے مجھ پر درود نہ پڑھا (رواہ الترمذی وقال حسن والبخاری فی الادب) ابن عباس سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا جو شخص مجھ پہ درود پڑھنا بھولا وہ جنت کا راستہ چوک گیا (رواہ ابن ماجہ)

(۴) درود پڑھنے کے اوقات اور مواقع۔ مندرجہ ذیل اوقات اور مواقع میں درود پڑھنا مسنون ہے۔ مؤذن کی اذان کے بعد۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا جب تم مؤذن کی اذان سنو تو جیسا وہ کہتا ہے تم بھی ویسا ہی کہو پھر مجھ پر درود بھیجو الخ۔ (احمد و مسلم والبوداؤد والترمذی وغیرہم) ۲۔ مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت ۳۔ جنازہ کی نماز میں ۴۔ نماز کے اندر تشہد اول میں ۵۔ التحیات کے بعد بھی درود پڑھنا احناف کے نزدیک تو سنت مؤکدہ ہے۔ طبری طحاوی قرطبی قاضی عیاض اور خطابی الشافعی کے بھی یہی اقوال ہیں اور جمہور کا بھی یہی مسلک ہے، مگر بقول ابن کثیر حضرت ابن مسعود، حضرت ابو مسعود بدری، حضرت عامر شعبی، امام باقر، مقاتل، امام احمد، امام شافعی، اسحاق بن راہویہ، ابن المواز مالکی اور بعض دیگر حضرات وجوب کے قائل ہیں۔ ۶۔ بعض روایات میں نماز عید کی ہر تکبیر کے ساتھ درود پڑھنا مسنون قرار دی گئی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے ولید بن عقبہ کو نماز عید طور سے سکھائی تھی۔ حضرت حذیفہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری موجود تھے اور دونوں بزرگوں نے ابن مسعود کے قول کی تائید کی تھی (رواہ اسمٰعیل القاضی وقال ابن کثیر اسنادہ صحیح) ۷۔ ہر دعا کے آغاز اور وسط اور انتہا پہ درود پڑھنا بھی سنت ہے۔ دعائے قنوت کے آخر میں الفاظ صلوٰۃ نسائی سے مروی ہیں۔ ۸۔ جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن میں بھی درود پڑھنا مسنون ہے۔ اوس بن اوس ثقفی کی روایت احمد ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان دارقطنی اور نووی وغیرہ نے نقل کی ہے۔ ۹۔ جمعہ کے دن دونوں خطبوں میں درود پڑھنے کا تاکیدی حکم ہے۔ ۱۰۔ رسول پاکؐ کے روضہ پہ جانے کے وقت درود پڑھنا مستحب ہے۔ ابوداؤد نے اس مضمون کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ان مقامات اور اوقات کے علاوہ اور مقامات بھی ہیں جہاں درود پڑھنا مستحب ہے۔ خلاصہ اس طرح سمجھو کہ ہر ذکر خیر اور عبادت کے وقت اور مقدس مقاموں میں پہنچنے کے بعد درود پڑھنی چاہیے اور حج وغیرہ کے موقع پر تو بعض شوافع وجوب کے قائل ہیں واللہ اعلم۔

(۵) پانچواں امر یہ تنقیح طلب ہے کہ درود کے ساتھ لفظ سلام بھی کہا جائے یا صرف ایک لفظ ہی کافی ہے۔ آیت مذکورہ میں چونکہ صلوٰۃ و سلام دونوں کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے نووی اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ دونوں لفظوں کو اکٹھا بولا جائے، مگر عام علماء کے نزدیک اجتماع کی قید ضروری نہیں۔ نہ آیت سے معیت زمانی معلوم ہوتی ہے۔ درود و سلام دونوں کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ایک وقت میں ساتھ ساتھ ہو یا متفرق طور پر۔

(۶) چھٹا امر یہ ہے کہ درود کون سے الفاظ میں پڑھی جائے۔ مختلف احادیث میں اس کے متعلق مختلف الفاظ آئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے لئے لفظی حد بندی اور حصر نہیں ہے۔ بہتر تو وہی درود ہے جو نماز کے آخر میں پڑھی جاتی ہے اور اس کے علاوہ تمام وہ طریقے درود خوانی کے جائز ہیں جن میں حضور والا کے نام نامی تہذیب اور ادب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو۔ ابن مسعودؓ نے لوگوں کو تنبیہ فرمائی تھی اور ارشاد فرمایا تھا کہ ادب اور تعظیم کے الفاظ کے ساتھ درود پڑھا کرو تم سمجھو کہ شاید وہ درود حضور کے دربار میں پیش ہو۔

مقصود بیان

اللہ اور اس کے ملائکہ رسول پاک پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں یعنی اللہ رحمت نازل فرماتا اور ترقی درجات عنایت کرتا ہے اور فرشتے دعائے رحمت اور ترقی درجات کی درخواست کرتے ہیں صیغہ امر سے عرف اہل ایمان کو خطاب کر نا بتا رہا ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ حضور پر درود و سلام بھیجیں۔ اگرچہ صلوٰۃ و سلام کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان بلکہ ہر زبان میں دوسرے الفاظ بھی ہیں اور حضور کے لئے دعا کرتے وقت ان الفاظ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس طرح دعا کی جائے اے خدا اپنے رسول کریم کو مقام قرب میں سب سے اعلیٰ درجہ عنایت کر۔ اے خدا اپنے نبی اعظم کو جنت میں اس جگہ پہ پہنچا جو سب سے افضل اور برتر ہو۔ اے خدا جس طرح تیرے حبیب نے ہم کو شرک

پاک اور بداخلاقیوں سے صاف کیا اسی طرح تو بھی ان پر رحمت نازل فرما وغیرہ۔ مگر آیت مذکورہ اور مختلف احادیث کی بنا پر اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ یا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ قرآن پاک میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں اور احادیث کے بھی یہی مطابق ہے۔ شیخ ابن عطاء نے کہا کہ مومنوں کے درود پڑھنے سے مراد ہے اتباع رسول کرنا اور حضور سے محبت کرنا یعنی جس شخص کے دل میں حضور کی محبت نہ ہو اور وہ حضور کے فرمان کے مطابق نہ چلے تو اس کا درود پڑھنا قابل اعتبار نہیں۔ واقعی آیت میں درود وسلام بھیجنے کی ہدایت کرنے سے مقصود یہی ہے کہ عام مومن بغیر استثناء کے رسول پاک سے انتہائی محبت کریں۔ بھلائی ادب اور خیر کے ساتھ بار بار حضور کا تذکرہ کریں اور اللہ سے آپ کے لئے دعا کریں۔

اسی لئے شیخ عبداللہ نے کہا کہ لاکھ بار درود پڑھنے سے بھی حضور پر کچھ احسان نہیں ہوتا بلکہ اس نعمت کے ادائے شکر کا مظاہرہ ہوتا ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ نے ہم کو عنایت فرمائی وغیرہ۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ

جو لوگ اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اُن پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت کی ہے اور اُن کے لئے

عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا

ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کئے ایذا دیتے ہیں

فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ع

ع ۷ / ۴

تو وہ ایک بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر اُٹھاتے ہیں

تفسیر جب انسانوں نے قانونِ فطرت سے سرتابی شروع کر دی۔ ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ مارنے لگا۔ قدرتی حد بندی سے آگے بڑھ کر دوسرے کے دائرۂ حقوق میں داخل ہونے لگا اور بداعمالی اس حد تک پہنچ گئی کہ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا جاننے لگا اور باہمی حق تلفیوں نے عمومی رواج قومی رسم اور قانونی تعامل کی شکل اختیار کر لی اور انسان کی ضرر رسانی انسانوں کے دائرہ سے نکل کر دوسری مخلوق تک پہنچ گئی۔ دوسرے حیوان بلکہ درخت بھی انسانی دست درازی سے محفوظ نہ رہ سکے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر افکار وخیالات اور نظریات واعتقادات میں بھی خرابی آ گئی۔ کائنات اور اس کے مبدء ومعاد کے متعلق غلط طور پر سوچ بچار کیا جانے لگا۔ مظہر پرستی کو چھوڑ کر مظہر پرستی کی طرف دنیا دوڑنے لگی۔ ستاروں کو مؤثر حقیقی اور زمانہ کی گردش کو فاعل مختار سمجھنے لگی۔ غرض آپس میں بھی ایک نے دوسرے کو دکھ دیا۔ دوسری مخلوق کو بھی اذیت دی اور خدا کی ایذا رسانی کی شکل پیدا کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایسی حالت میں رحمتِ الٰہیہ اور عطوفت ربانیہ نے انبیاء اور پیغمبروں کو بھیجا اور پیغمبروں نے ہر طرح کی ایذا رسانی سے روکا۔ علم اور عمل کو سدھارنے کی ہدایت کی۔ صحیح افکار وعقائد کی تعلیم دی۔ صالح اعمال سکھائے اور تمام تباہی انگیز رسم ورواج اور فساد آفریں عملیات سے بندش کی، لیکن بدباطن شریر اور کھوٹے دل والے کافروں کو کہنے کی گنجائش کب اور کس طرح گوارا ہو سکتی۔ نقطان کے اجسام ہی بیمار نہ تھے دل اور دماغ بھی آفت رسیدہ ہو گئے تھے، اس لئے انبیاء کے پیام کو انہوں نے کان دھر کر سنا بھی نہیں بلکہ الٹے دشمن ہو گئے۔ اہل ایمان کو اور زیادہ دکھ پہنچانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی آبروریزی کرنے کی کوشش سے بھی نہ چوکے۔ ان کے چال چلن اور رفتار واطوار پر تہمت لگائی اور اوصاف طینت پاک بندوں کو دنیا کے سامنے داغ دار بنا کر ظاہر کیا۔ پھر ان دریاؤں اور نہروں میں ہی گندگی ڈالنے پر انہوں نے اکتفا نہ کی بلکہ ان کے سرچشمہ کی طرف بڑھے۔ معصوم نبی کو داغ دار بنانے کی کوشش کی۔ جسمانی، مالی اور روحانی اذیتیں پہنچائیں۔ کسی کو نفس پرست کہا کسی کو کاذب، ساحر اور شاعر کسی کو سیادتِ قومی کا خواستگار کسی کو جاہ ومال کا طلب گار، کسی کو پاگل اور دیوانہ۔ غرض جتنا بس چلا دکھ پہنچایا۔ پھر

اس سے بھی بلند بلکہ رب العالمین کو اپنی دریدہ دہنی کا نشانہ بنایا۔ اس کو جورو بچوں والا قرار دیا۔ کسی نے اس کے خالق ہونے کا ہی انکار کر دیا۔ کسی نے فرشتوں کو اس کی بیٹیاں بتایا۔ کسی نے ربوبیت اور الوہیت میں اس کے شریک اور سہیم مقرر کئے۔ اس سے خدا کا تو کچھ نہ بگڑا وہ تمام تاثرات سے پاک تھا۔ اس کو بدباطن کافر کیا دکھ پہنچا سکتے، مگر انہوں نے دکھ پہنچانے کی کوشش میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ اس کا وبال خود انہیں کو بھگتنا پڑا۔ ہمیشہ کے لئے ملعون ہو گئے، کافروں اور منافقوں کے یہی حالات رسول پاکؐ کے زمانے میں تھے وہ بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اسی سزا کے مستحق قرار پائے جو ان کے بزرگوں کو دی گئی تھی۔

تحلیلِ اجزاء

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ۔ گزشتہ آیات میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کی ممانعت فرمائی تھی اسی سلسلے میں اس جگہ ایک عام فیصلہ فرماتا ہے۔ ایذا کے بظاہر تین بڑے افراد ہیں۔ اللہ کو ایذا دینا، رسول کو ایذا دینا، عام اہل ایمان کو ایذا دینا۔ ایذا کی اور بلا تعداد صورتیں بھی ہیں جن کی اسلام نے اجازت نہیں دی، مگر یہ تین افراد بڑے بڑے تھے، اس لئے ان کو ظاہر کر دیا۔ درحقیقت ان تینوں افراد کی صورتیں جدا جدا ہیں، مگر حقیقت سب میں مشترک ہے۔ مومن کو ایذا دینے سے خدا کا عتاب ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کی ناراضی رسول اللہؐ کے ایذا پانے کا سبب ہے اور حضورؐ کا دکھ تمام مومنوں کو دکھی کر دیتا ہے۔ تاہم صورتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہر ایک کو مستقل طور پر اس آیت میں بیان فرمایا۔

اللہ کو ایذا پہنچانی تو ناممکن ہے۔ وہ تمام تاثرات سے پاک اور ہر دکھ سکھ سے منزہ ہے، اس لئے اذیت الٰہیہ سے واقعی اور حقیقی دکھ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے خلاف اور اس کی شانِ جلیل و تقدس پر بٹہ لگانے کے لئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کو دکھ پہنچا رہے ہیں۔ گویا يُؤْذُونَ سے مراد ہے اللہ کی شان کے خلاف کوئی قول یا عمل کرنا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ کو ایذا دینے سے مراد ہے اس کے اسماء و صفات کی بے حرمتی کرنی اور اس کی شان میں گستاخی کرنی۔

ابن عباسؓ نے ایذائے الٰہی کی مثال میں بیان فرمایا کہ یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اور کہتے تھے يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ یعنی اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ اسی طرح نصاریٰ مسیح کو ابن اللہ کہتے تھے اور مشرک ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور مخلوق کو اس کی الوہیت میں شریک بناتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا اللہ فرماتا ہے آدمی مجھے ایذا دیتا ہے وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے۔ حالانکہ زمانہ تو میں ہی ہوں میں ہی اس کے رات دن بدلتا ہوں (بخاری و مسلم)

ابوہریرہؓ کی دوسری مرفوع روایت ہے کہ اللہ فرماتا ہے فرزند آدمؑ نے میری تکذیب کی جو اس کو جائز نہ تھی، میری شان میں بدگوئی کی جو اس کے لئے جائز نہ تھی۔ وہ کہتا ہے جس نے مجھے شروع میں پیدا کیا وہ اس طرح دوبارہ مجھے پیدا نہ کرے گا (یعنی نہ کر سکے گا) حالانکہ آغاز آفرینش اعادۂ آفرینش سے آسان نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنے لئے بیٹا بنایا ہے۔ حالانکہ میری شان احد الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ہے (صحیح)

یہ تمام صورتیں اذیت الٰہیہ کی ہیں، مگر ان میں ہی حصر نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی ایسی صورتیں ہیں جو ایذائے الٰہی کا موجب ہیں۔ اسی لئے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ کے احکام کی مخالفت، ممنوعات کا ارتکاب اور اس پر اصرار سب موجب عتاب الٰہی ہے اور رسول پاکؐ کی کسی قسم کی توہین حضورؐ کی شان کی تنقیص یا کسی طرح کی عیب چینی سب موجب ایذائے رسولؐ ہے اور ملعون بنا دیتی ہے۔

عوفی نے بقول ابن عباسؓ آیت کی شان نزول میں ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب خیبر کی فتح کے وقت یہودی اسیروں میں شامل کر کے لائی گئیں تو حضور ﷺ نے ان کا انتخاب اپنے لئے کر لیا اور خود نکاح کر لیا۔ اس پر یہودیوں اور منافقوں نے طعن کرنے شروع کئے اور رسول اللہ کو اس سے دکھ ہوا تو آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ آیت کا نزول اس واقعہ کے زمانہ میں ہوا، مگر ایذائے رسولؐ کا اس واقعہ پر ہی حصر نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی ایذا رسانی کی ممانعت کو یہ آیت شامل ہے۔

لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ یعنی اللہ اور اس کے پیغمبر کو دکھ پہنچانے والوں پر دونوں جہان میں پھٹکار ہے۔ آخرت میں لعنت کے معنی

تو رحمت سے محرومی کے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ آخرت میں نجات سے محروم ہوں گے اور دنیا میں لعنت سے مراد قتل، قید، جلاوطن ہونا اور مختلف مصائب میں مبتلا ہونا اور واقعہ بھی ایسا ہی ہے کہ جن لوگوں نے حضورؐ والا کو دکھ پہنچایا تھا خواہ جسمانی یا روحانی یعنی جن لوگوں نے خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی تھی ان کا وجود جزیرۂ عرب میں نابود ہوگیا۔ بڑے بڑے کافر سردار مارے گئے۔ کچھ قید ہوئے کچھ خود ہی غارت اور برباد ہوئے۔ کچھ مسلمان ہوگئے اور نسلیں تو سب ہی کی مسلمان ہوئیں۔ بہرحال لعنت خدا میں ماخوذ ہوئے۔ جن مفسرین نے آیت کو عام قرار دیا ہے اور قرنِ اوّل کے کافروں کے ساتھ خصوصیت نہیں ظاہر کی ہے انھوں نے اس جگہ لعنت سے مراد لی ہے۔ اللہ کی ناراضگی یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے اور ان کو دکھ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ان سے دونوں جہان میں اللہ ناراض ہوتا ہے۔

میرے نزدیک اول توضیح زیادہ مناسب ہے۔ حضورؐ کے زمانے کے کافروں پر حکم مذکور کا صدق محتاجِ تاویل نہیں۔

اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا۔ اس فقرہ میں اخروی عذاب مراد ہے۔ لعنت کا لفظ اگرچہ عذاب کو شامل تھا، لیکن شبہ ہوسکتا تھا کہ رحمت سے محروم ہونے کا نتیجہ شاید صرف اتنا ہو کہ جنت میں داخل ہونا نصیب نہ ہو اور بس۔ اس لئے فرما دیا کہ صرف نجات سے ہی محرومی نہ ہوگی بلکہ سخت عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا۔ اوپر کی آیت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کو دکھ پہنچانے والوں کی سزا کا بیان تھا۔ اس آیت میں عام اہلِ ایمان کو اذیت پہنچانے والوں کو وعید ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ام المومنین حضرت عائشہؓ کے واقعہ کے متعلق ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی کے واقعہ کا تذکرہ سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ اس تہمت بندی سے ام المومنینؓ کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ یہ قول درایت کے خلاف ہونے کے علاوہ روایت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ قابلِ وثوق نہیں ہے۔ حصر اور تخصیص کا نہ کوئی قرینہ ہے نہ کوئی سبب، اس لئے تمام بہتان تراشی اور تہمت بندی کرنے والے اس میں داخل ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک روز حضور اقدسؐ نے صحابہؓ سے دریافت کیا (بتاؤ) اللہ کے نزدیک سب سے بڑا سود کون سا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کو خوب معلوم ہے۔ ارشاد فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے بڑا سود یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان مرد کی (یا حرمت) آبرو کو حلال بنا لے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آیت مذکورۃ الصدر تلاوت فرمائی (رواہ ابن ابی حاتم) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کسی نے بدنام کیا اور اس سے اس کی آبروریزی ہوئی تو بدگوئی کرنے والے کو سخت عذاب ہوگا اور جس کی بدگوئی کی گئی ہے اس کے گناہ معاف ہو کر نیکیوں میں اضافہ ہوگا۔ پس بدنامی کے عوض نیکیوں کا اضافہ اور جنت کا داخلہ بہترین سودا ہے اور بدنام کرنے والے کے لئے بہت منحوس اگر سودا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے خدمتِ گرامی میں عرض کیا گیا یا رسول اللہؐ غیبت کیا ہے؟ فرمایا اپنے بھائی کا اس طرح تذکرہ کرنا کہ اس کو ناگوار ہو۔ عرض کیا گیا جس بات کی نسبت بھائی کی طرف کی جائے اگر اس کے اندر وہ بات موجود ہو (تب تو غیبت نہ ہوگی) فرمایا اگر وہ بات اس میں موجود ہوگی تب تو غیبت ہوگی اور موجود نہ ہوگی تو پھر بہتان تراشی ہوگی (رواہ ابوداؤد والترمذی) فضیل بن عیاض نے فرمایا سبب کتے اور سور کو ناحق دکھ پہنچانا جائز نہیں تو پھر خیال کرو کہ اہلِ ایمان کو دکھ پہنچانا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مومن مرد ہو یا عورت جس کسی پر بہتان تراشی کی جائے گی اور جو بات اس نے نہیں کی اس کی نسبت اس بے چارہ کی طرف کی جائے گی تو یہ تہمت بندی ہوگی اور تہمت لگانے والا سخت گناہ گار ہوگا۔

مقصود بیان اللہ اور رسولؐ کو دکھ پہنچانے کی مبالغہ آمیز پر زور بندش اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت وعید۔ عام اہلِ ایمان پہ بہتان بندی کرنے کی ممانعت اور تہمت تراشی کے اثم مبین ہونے کی صراحت وغیرہ۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ لَىٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ

اس سے لگتا ہے کہ ان کو پہچان لیا جائے اور ان کو ایذا نہ دی جائے اور اللہ غفور رحیم ہے اگر منافق

الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ

اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بُری خبریں پھیلانے والے باز نہ آئیں گے تو (اے محمد) ہم تم کو ان کے پیچھے

بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ مَّلْعُوْنِیْنَ ۚۛ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا

لگا دیں گے پھر مدینہ میں وہ تمہارے پاس نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دنوں وہ ملعون ہوں گے جہاں پائے جائیں پکڑے جائیں اور قتل کئے

تَقْتِیْلًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝ الربع

جائیں اللہ کا یہی دستور تھا ان لوگوں میں جو پہلے گزر گئے اور تم اللہ کے دستور میں تبدیلی نہ پاؤ گے

تفسیر اصول اخلاق اور آداب معاشرت تو چند در چند ہیں جن کی تعلیم قرآن میں مختلف مقامات پر دی گئی ہے اور اندرونی امراض کا علاج بتایا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ خبیث بیماری اخلاقی طور وہ ہے جس سے اپنی باطنی کثافت اور گندگی کے علاوہ دوسروں کو بدترین ضرر پہنچے۔ جو حرکت روح کو تاریک دماغ کو زنگ آلودہ اور دل کو ناپاک کرے وہ تو اخلاقی مرض بہر حال ہے، لیکن جس حرکت سے ان نقصانات کے علاوہ دوسروں کی آبروریزی، مالی نقصان، داخلی فساد، مذہبی ضعف اور دماغی پراگندگی پیدا ہو وہ بدترین جرم ہے۔ ان بدترین مذموم حرکات کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ مخلوق کو جس سے زیادہ نقصان پہنچے وہ جرم بڑا ہے اور جس سے کم ضرر پہنچے وہ جرم کسی قدر خفیف ہے۔ بدترین جرائم تین قسم کی حرکتوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱ دوغلا پن یعنی باطن ظاہر کرنے کے خلاف ہو۔ ظاہر میں دوستی، اطاعت، نرمی اور فرماں پذیری کی جائے اور دل میں دشمنی، سرکشی، درشتی اور نافرمانی کی آگ چھپی ہو ایسا آدمی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ دشمن کی دشمنی اگر ظاہر ہو جائے اور اس کی عداوت کا یقین بھی ہو جائے تو پھر اس کا کوئی قول فعل اہل ہوش کی نظر میں قابل اعتبار نہیں ہوتا اور نہ کوئی عقلمند علی الاعلان فریب خوردہ ہو سکتا ہے، لیکن دوغلا آدمی اپنی نفاق آفرینی سے دوستوں کو بہت آسانی کے ساتھ تباہ کر دیتا ہے۔ لوگوں کو اس کا ظاہر دیکھ کر اس کی باتوں کا اطمینان ہوتا ہے اور وہ موقع پا کر ایسا شتابہ لگاتا ہے کہ اعتماد کرنے والے کی بستی جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ ۲ دوسروں کی آبرو کو تاکنے والا اور پرائی عورتوں کو چھپ چھپ کے بہکانے والا اس شخص کی مخفی دسیسہ کاری قوم کی قوم کو غارت کر دیتی ہے۔ پاک دامن عفیفہ عورت کو بہکا کر یہ اپنے ہوس کا آلہ کار بناتا ہے جس کی وجہ سے اس عورت کے مردوں کی حرمت برباد ہو جاتی ہے اور پھر اس عورت کو بھی اپنے جائز شوہر کی طرف رغبت نہیں رہتی اور شوہر جب عورت کی بے رغبتی دیکھتا ہے تو وہ دریافت حقیقت کی کوشش کرتا ہے۔ اگر حقیقت کھل گئی تو گھر برباد ہو جاتا ہے اور نہ کھلی تو دوسری عورت کی طرف نظر اٹھاتا ہے۔ ادھر سب سے اول فساد کا بیج بونے والا جب دوسری عورتوں کے پیچھے پڑتا ہے تو اس کی بیوی ہونا دوسرے مردوں کی تاک گھات میں رہتی ہے اور اس طرح خاندان کا خاندان بلکہ ساری قوم برباد ہو جاتی ہے کسی کا نسل قابل اعتبار نہیں رہتی۔ اقتصادی بدحالی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمدنی امراض کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ خانگی سکون و عافیت کا نام نہیں رہتا اس کے علاوہ بعض اوقات وہ واقعات پیدا ہوتے ہیں جو حرمت ریزی کی بدولت آئے دن عدالتوں میں آتے رہتے بلکہ کبھی قتل اور خون ریزی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جدید تعلیم چونکہ بزدل بنا دیتی ہے، اس لئے اب ایسے قصے کم سنائی دیتے ہیں۔ اب سے پہلے تو آئین روز قتل کا سرچشمہ اسی قسم کے واقعات ہوا کرتے تھے۔ ۳ جھوٹا پروپگنڈا کرنے والا اور بے بنیاد یا بے ہودہ باتیں مشہور کرنے والا۔ یہ شخص بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ انہونی بات کو مشہور کرنا بدترین جرم ہے۔ افواہیں لوگوں کو بزدل، کم ہمت، پست اخلاق اور بے بار کر دیتی ہیں۔ بلاوجہ اور بلا اصل کسی بات کو پھیلانے سے عام بلکہ خاص لوگوں کو اس کا یقین آ جاتا ہے اور یقین کرنے کے بعد وہ اپنا طریق زندگی بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گویا پہلے سیدھے راستہ پر چل رہے تھے اور افواہ پر یقین آنے کے بعد غلط راستہ پر چلنا اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح گمراہ ہو جاتے

ہیں۔ پھر اس گمراہی کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے وہی لازم ہے جانی مالی مذہبی نقصان، خانہ بربادی، قومی تباہی، رسوائی، ذلت اور خود اپنے ہاتھوں (یعنی دشمنوں کے حملہ کرکے) ہلاکت ۔ یہ تین اندرونی امراض ہیں جن میں مبتلا ہونے والے نہ صرف خود ہلاک ہوتے ہیں بلکہ دوسرے کو بھی اپنے ساتھ ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان کی کیا تدبیر ہونی چاہیئے۔ عقلمند دنیا اس کے لئے کیا تجویز کرے گی۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ اول ایسے بیماروں سے کہا جائے کہ لازم علاج کرو، دوا استعمال کرو اور اس بیماری کو اپنے اندر سے نکال پھینکو اگر وہ ایسا کریں گے تو خیر خود بھی اچھے ہو جائیں گے اور دوسرے بھی ان کی ہمسائیگی سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اور نہ مانیں گے تو پھر ان پر ہر طرف سے پھٹکار برسنی چاہیئے ان کو رسوا اور ذلیل کیا جائے۔ اپنے اپنے محلے، بستیوں اور شہروں سے نکال دیا جائے اور اس پر بھی نہ [illegible] جہاں میں قتل کر دیئے جائیں ان کے ناپاک وجود سے روئے زمین کو خالی کر دیا جائے۔ عقل و درایت کا یہی قانون ہے۔ فطرت کا یہی ضابطہ ہے۔ [illegible] کا یہی دستور العمل ہے۔ سنت الہیہ یوں ہی جاری ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ بکثرت موجود تھے۔ ان کی شر انگیزی سے محفوظ رہنے کی ہدایت مسلمانوں کو کی گئی۔ مختلف تدبیرات کی گئیں۔ ان کی شناخت بھی ایک حد تک کرائی گئی۔ لیکن مرض متعدی سے محفوظ رہنے کیلئے صرف یہ تدبیر ہی کارآمد نہیں ہوتی ہے کہ متعدی امراض کے مبتلا شدہ مریضوں سے اجتناب کیا جائے کیونکہ یہ صحیح طور پر ہر شخص کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون کون متعدی امراض میں مبتلا ہے اور کس کس سے پرہیز رکھا جائے۔ بلکہ ایسے مریضوں کے علاج کی بھی ضرورت ہے تاکہ بیماری کا وجود ہی نہ رہے۔ تلخ سے تلخ دوا بھی پلانی لازم ہیں اور مریض اگر پینے سے انکار کرے تو قوت اور زور کے ساتھ دوا استعمال کرائی جائے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا جائے۔ پس ایک طرف تو مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی طرف سے متنبہ کیا گیا۔ آبرو کو محفوظ رکھنے کے لئے پردہ کا حکم دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف بیماروں کو نصیحت کی گئی کہ اب بھی باز آجاؤ۔ علاج کرو ورنہ جلا وطن کر دیئے جاؤ گے اور پھر بھی نہ مانو گے تو ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔

تحلیلِ اجزاء

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۔ خطیب نے سراج منیر میں بحوالہ کلبی و ضحاک لکھا ہے کہ مدینہ کے اطراف میں کچھ بدکار منافق ایسے تھے جو مدینہ کی آبادی سے باہر راستوں پر اور نشیبی زمینوں میں اس غرض سے چکر لگاتے رہتے کہ جب باندیاں رفع حاجت کیلئے ادھر آئیں تو ان کو چھیڑیں بہکائیں اور ان کو اپنی بدوضعی کا آلہ بنائیں۔ چنانچہ رات کو جب عورتیں اپنی ضرورت کیلئے وہاں جاتیں تو یہ بدکار ان پر آوازے کستے۔ چھیڑتے ہاتھ سے دباتے اور اشارے کرتے۔ اگر وہ چپ ہو جاتیں تو ان کے پیچھے ہو لیتے اور اگر جھڑک دیتیں تو بھاگ جاتے۔ مقصد تو ان کا صرف یہ ہوتا تھا کہ لونڈیوں باندیوں کو چھیڑیں کیونکہ وہی رات کے اندھیرے میں وہاں جاتی تھیں اور انہی سے مطلب براری کی کچھ امید ہو سکتی تھی۔ مگر رفع ضرورت کے لئے جانے پر آزاد عورتیں بھی مجبور تھیں اور لباس میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ کرتہ اور اوڑھنی باندی کا لباس بھی تھا اور حرّہ کا بھی۔ اس لئے باندیوں کے دھوکہ میں کبھی آزاد شریف زادیوں کو ان کی بدقماشی سے تکلیف پہنچتی تھی اور واپس جاکر وہ اپنے شوہروں سے شکایت کرتی تھیں، مگر یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں، اس لئے مجبور ہوکر کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کرتے رہتے۔ منافقوں کی اس بدقماشی کو دور کرنے کیلئے ان آیات کا نزول ہوا۔

منافقوں کی دو حرکتیں اور بھی تھیں جن سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ ایک تو وہ دوغلاپن کرتے تھے۔ ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے اور کبھی جہاد میں بھی شریک نہ ہوتے تھے اور اسلامی خیر خواہی کا بہت زیادہ دم بھرتے تھے۔ مگر درپردہ کافروں سے ملے ہوئے تھے ان کے خفیہ جلسوں میں شریک ہوتے اور مسلمانوں کے سربستہ راز ان سے بیان کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں کی اسکیم کو نقصان پہنچتا۔ دوسری حرکت غلط روایت اور افواہوں کی اشاعت تھی۔ منافقوں کی خصوصیت تھی کہ جھوٹی خبریں اڑا کر مسلمانوں کے دلوں میں رعب یعنی زلزلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اگر مسلمانوں کا کوئی دستہ جہاد پر جاتا تو غلط طور پر اڑا دیتے کہ ان میں سے بہت سے آدمی مارے گئے یا شکست کھا کر بھاگ نکلے حالانکہ واقعہ ایسا نہ ہوتا تھا۔ اس سے غرض یہ ہوتی تھی کہ مدینے میں رہنے والے مسلمانوں کے دل ٹوٹ جائیں اور ان کو دوہرا رنج ہو۔ اسلامی جماعت کے مغلوب ہونے کا اور اپنے عزیزوں کے مارے جانے کا۔ کبھی مسلمانوں کی ہمتیں توڑنے اور ان کو پست حوصلہ بنانے کے لئے کافروں کی شوکت، عظمت اور کثرت کی خبریں پھیلاتے تھے۔ چنانچہ ایک خبر مشہور کر دی تھی کہ ملک نام کا غسانی بادشاہ ساٹھ ہزار سواروں کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا ہے۔ اس خبر نے مسلمانوں میں بہت اضطراب پھیلا۔ ہر شخص کو علم مل گیا کہ ہر وقت ہتھیار بند رہے۔ یہاں تک کہ حضور نے

وقت بھی ہتھیار نہ کھولے۔ معلوم نہیں دشمن کس وقت حملہ کر دے۔ اسی خبر کا نتیجہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ نے مسلمانوں کی پوری طاقت کو ساتھ لے کر سرحد پر پہنچ کر بمقام تبوک دشمن کو روکنے کا ارادہ کیا بلکہ سخت گرمی اور مسلمانوں کی ناداری کے باوجود لشکر کشی کر کے تبوک پہنچ گئے اور جب وہاں دشمن کا نشان بھی نہ ملا تو واپس آ گئے۔ مذکورہ بالا تبدیل مذموم حرکات سے باز داشت کے لئے آیات مندرجۂ عنوان کا نزول ہوا۔

بقول ابن کثیر آیت مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ فرمان جاری کرنے کا حکم دیا ہے کہ نبی کی بیبیاں اور بیٹیاں خصوصیت کے ساتھ اور عام اہل ایمان [illegible] خواہ ان کی بیبیاں ہوں یا بیٹیاں یا بہنیں یا ماں چادروں کا استعمال کریں۔ باہر نکلنے کے وقت جلباب اس طرح اوڑھ لیا کریں کہ نیچے تک لٹکی رہے تاکہ (جاہلیت کی عورتوں اور باندیوں سے) ان کی امتیازی شناخت ہو جائے اور ان کو کوئی نہ ستائے۔

ا[illegible]، عبیدۃ السلمانی، حسن بصری، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطاء خراسانی اور ان کے علاوہ بکثرت علماء کا قول ہے کہ جلباب اس چادر [illegible] کو کہا [illegible] اوڑھنی کے اوپر استعمال کیا جاتا ہے۔ ابن عباس نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ مومن عورتوں کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ گھروں سے نکلتے [illegible] سروں پر چادریں ڈال کر بال، چہرہ اور ایک آنکھ ڈھانک لیا کریں۔ صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں۔ ابن سیرین کے سوال کے جواب میں عبیدۃ السلمانی [illegible] نے اپنا سر اور چہرہ چھپا کر دکھایا اور بائیں آنکھ کھلی رکھی۔ عکرمہ کا بھی یہی قول مروی ہے۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ مذکورہ آیت کے نزول کے بعد انصار عورتیں سیاہ کملیاں اوڑھ کر نکلیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقار اور شان کے سیاہ کوے ان کے سروں پر بیٹھے ہیں۔ یونس بن یزید کے دریافت کرنے پر زہری نے فرمایا کہ اگر باندی منکوحہ ہو تو صرف اوڑھنی پہن سکتی ہے۔ اوڑھنی کے اوپر چادر نہیں پہن سکتی کیونکہ اس سے حرہ عورتوں کی مشابہت پیدا ہوتی ہے جو مکروہ ہے (ابن ابی حاتم) شیخ ابن کثیر نے سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے کہ کافرہ عورتیں قابل احترام نہیں۔ ان کی زینت دیکھنا ممنوع نہیں۔ جلباب پہننے کا حکم صرف مومنوں کی عورتوں کو ہے، مگر کافرہ عورتوں کو دیکھنے سے چونکہ فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے نظر کرنا بھی ممنوع ہے۔

بات یہ تھی کہ اسلام سے پہلے عرب میں پردہ کا رواج ہی نہ تھا، ہر عورت بے پردہ پھرتی تھی۔ اسلام نے مسلمانوں کو پردہ کا حکم دیا اور کافر عورتوں کے پردہ کے ساتھ یا بے پردہ پھرنے سے کوئی تعرض نہ کیا۔

ایک بار ایک باندی اوڑھنی اوڑھے باہر نکلی۔ حضرت عمرؓ سمجھے کہ یہ حرہ ہے اور اس طرح باہر نکلی ہے تو آپ نے سزا دینے کیلئے درہ اٹھایا، لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ باندی ہے تو فرمایا الق عنك الخمار یا وقار پھر حضرت حفصہ سے جا کر کہا تم لوگ اپنی باندیوں کو حرہ کا لباس پہنا کر مت باہر نکالا کرو۔ مجھے اس سے دھوکہ ہو جاتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ)

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ یعنی جب ان عورتوں نے باہر نکلنے کے وقت چادر اوڑھ لی اور تمام بدن چھپ گیا تو یہ امتیازی شناخت کی قریب ترین وضع ہو جائے گی۔ اس سے سب پہچان لیں گے کہ یہ حرہ ہیں، باندیاں ہیں، مسلمہ ہیں۔ کافرہ نہیں ہیں۔ پس پھر کسی بدکار منافق کی ہمت نہ ہوگی کہ ان کو چھیڑ سکے، مگر اس سے پہلے جو عورتیں بے پردہ باہر نکلتی تھیں اور رنگا رنگ کی اچھی بری نظریں ان پر پڑتی تھیں تو خدا غفور رحیم ہے۔

لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ اوپر کی آیت میں مسلمانوں کو آبروریزی سے محفوظ رکھنے کے لئے عورتوں کو چادر اوڑھ کر نکلنے کی تعلیم دی تھی۔ اب مسلمانوں کے دشمنوں کو چیرہ دستی اور شر انگیزی سے روکنے کیلئے تہدید آمیز ہدایت کی جاتی ہے۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت میں تین قسم کے لوگوں کو بیجا حرکتوں سے روکا ہے (۱) منافق (۲) بیمار دل والے (۳) جھوٹی خبریں پھیلا کر مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے والے۔ درحقیقت یہ تین اقسام نہیں ہیں بلکہ ایک ہی قسم یعنی اہل نفاق کے تین صفات ہیں اور چونکہ ہر حالت بجائے خود مستوجب سزا اور انتہائی قبیح ہے، اس لئے اختلاف صفت کو اختلاف ذات کے قائم مقام قرار دے کر حرف عطف کے ساتھ جدا جدا بیان کیا۔ میرے نزدیک یہ توجیہ دل چسپ نہیں، اس لئے کہ منافقوں کی جماعت تو کثیر تھی، مگر مؤخر الذکر دونوں صفات سب منافقوں میں نہ تھیں نہ ہر منافق زنا کا رتھا نہ غلط افواہیں پھیلانے والا۔ توجیہ مذکور یعنی اتحاد ذات اور اختلاف صفات کا قول تو اس وقت صحیح ہوتا جب تمام منافقوں میں مؤخر الذکر دونوں ضمنیں لازمی طور پر موجود

ہوتیں۔ پس صحیح قول یہ ہے کہ منافق تین طرح کے تھے ایک تو وہ گروہ تھا جو صرف منافق اور دوغلا ہی تھا۔ دوسرا طبقہ جو زناکار بھی تھا۔ مسلمان عورتوں کو چھیڑا کرتا تھا
تیسری وہ جماعت تھی جو غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو خوف زدہ کیا کرتی تھیں۔ ان تینوں گروہوں کو ان کے افعال شنیعہ سے آیت مذکورہ میں باز داشت کی ہے۔
قلبی مرض سے مراد اس جگہ بقول عکرمہ و شہر بن حوشب زنا ہے اور مرجفون سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر اہل اسلام کے دلوں
میں رجفہ یعنی دہشت اور زلزلہ پیدا کرتے تھے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اگر یہ منافق اپنی حرکات بد سے باز نہ آئے اور انہوں نے دوغلاپن اور پاک دامن
عورتوں کو چھیڑنا اور غلط افواہیں اڑا کر مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا نہ چھوڑا تو دیکھیں کہ ہم اپنے رسول کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے
کہ فتح مکہ کے بعد جب سورۂ برارت نازل ہوئی تو حضور اقدسؐ نے سب لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور خطبہ کے بعد نام بنام فرمانا شروع کیا:۔ اے
فلاں تو منافق ہے یہاں سے نکل جا اور فلاں تو منافق ہے۔ حضورؐ نے جب یہ حکم دیا تو منافقوں کے ان قرابتداروں نے جو مخلص مومن تھے منافقوں کو
پکڑ کر ذلت و خواری کے ساتھ مسجد سے نکال دیا، لیکن خدا تعالیٰ نے کچھ زمانے کے بعد مسلمانوں کے دلوں سے ان کے ناموں کو محو کر دیا تاکہ ان کی مومن نسل کیلئے
عار باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدسؐ کو ہر منافق کا نام اور اس کے احوال بتا دیے گئے تھے اور آیت مذکورہ میں بعدم باز داشت کی صورت
میں تہدید کی گئی ہے، وہ صرف تہدید ہی کی حد تک نہ تھی بلکہ اس کا وقوع بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَّلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ یعنی منافق بدکار یا تو اپنی حرکات سے باز
آ جائیں ورنہ رسول پاکؐ کو ان پر مسلط کر دیا جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ مدینہ میں نہ رہ سکیں گے۔ ان کو وطن چھوڑنا پڑے گا اور اگر کچھ لوگ
رہ بھی جائیں گے تو تھوڑی مدت کیلئے پھر بھی ٹھکانے سے نہیں گے۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ان کو پارہ پارہ کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے
کہ اسلام غالب ہو گا۔ منافقوں کو کہیں ٹھکانا اور پناہ کا مقام نہ ملے گا۔ جزیرۂ عرب میں ان کا وجود نہ رہے گا۔ اور واقع میں ایسا ہی ہوا تھی۔ حضورؐ کے
آخری دور حیات میں اہل نفاق کم ہو گئے تھے جو تھے ان کو بھی مدینہ سے باہر بھاگنا پڑا۔ پھر صدیق اکبرؓ نے اپنی خلافت میں تو ان کا نام مٹا دیا۔ مرتدوں کو قتل
کیا یا ان کو توبہ کرنی پڑی اور اس طرح سارا عرب اہل نفاق سے کم ہو گیا اور اب بھی ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے عرب کے اندر مکر کا فروں سے
سازش کی اور ان کا آلہ کار بنے ان کا نتیجہ سوائے رسوائی ذلت اور بربادی کے کچھ نہ ہوا جلاوطن ہونا پڑا۔ کچھ قبروں میں مرا کوئی کہیں اور جو بچے وہ تلوار کے
گھاٹ اتارے گئے یا توبہ کر کے خالص مومن بن گئے۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ ہمیشہ سے قانون الٰہی یہ رہا ہے کہ جو احکام فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں
پہلے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ طرح طرح سے نصیحت اور فہمائش سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کو اصلاح حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ قسم قسم کی رعایتیں کی جاتی ہیں۔
پھر بھی اگر وہ باز نہیں آتے تو برباد کر دیے جاتے ہیں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور آدم ثانی حضرت نوحؑ کی قوموں سے بھی یہی سلوک کیا گیا اور اب بھی
یہی قانون جاری ساری ہے۔ قحط، مرض، خانہ بربادی، خون ریزی اور اقوام کا باہم دست بہ گریبان ہونا اور کروڑوں انسانوں کا آتش ریزاشیا سے
ہلاک ہونا یہ سب کچھ قانون الٰہی یا نیچرل ضابطہ کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ اسی کی صراحت آیت میں فرمادی کہ منافقوں اور بدکاروں کی بربادی اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا
درحقیقت نتیجہ ہے قانون الٰہی سے سرتابی کا اور اس نتیجۂ بد کا شکار صرف یہ لوگ ہی نہیں ہونے والے ہیں بلکہ ان سے پہلے تمام بدکار اقوام کو یہی نتیجہ بھگتنا پڑا
ہے۔ قانون الٰہی ایک ہی ہے۔ زمانہ کے اختلاف سے اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (البتہ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ اختلاف زمان و مکان سے صورت
میں تغیر و تبدل ہو جاتا ہے، لیکن لباس کی تبدیل سے صاحب لباس نہیں بدل سکتا)

مقصودِ بیان

باہر نکلنے کے لئے جلباب اوڑھنے کا عورتوں کے لئے عمومی حکم۔ اور جلباب کو نیچے تک لٹکانے کا امر۔ اس امر کی طرف اشارہ کہ عورتوں
کو چادر اوڑھنے کا حکم ان کی آبرو بچانے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس کی غرض یہ ہے کہ کوئی بدطینت بدکردار ان کو نہ چھیڑ سکے۔
پس اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے ان برقعہ پوش عورتوں کو جو باہر نکلنے کے وقت برقعہ تو استعمال کرتی ہیں، مگر وہ بجائے خود اتنا جاذب نظر ہوتا ہے
کہ لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ اس طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اور دیکھنے والوں میں سے بدباطن لوگوں کے دلوں میں شیطانی خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہی
برقعہ جو حفاظت آبرو ریزی کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا۔ مزید آبرو ریزی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو زرق برق کا برقعہ ترک کر کے معمولی [illegible]

برمحل استعمال کرنا چاہیئے۔

منافقوں کو باز داشت اور خلاف ورزی کرنے کی صورت میں برباد ہوجانے کی دھمکی اور درپردہ اس بات کی پیشین گوئی کہ عنقریب کوئی منافق باقی نہ رہے گا۔ سب مارے جائیں گے، پکڑے جائیں گے اور ہر جگہ ان پر پھٹکار پڑے گی۔ وغیرہ۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ

تم سے لوگ قیامت کی بابت دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اس کی خبر اللہ کو ہے اور تم کیا جانو شاید قیامت قریب ہی

قَرِيْبًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا

ہو کافروں پر اللہ کی لعنت ہے اس نے ان کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے نہ ان

يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ

کو کوئی حمایتی ملے گا نہ مددگار جس روز ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے تو کہیں گے کاش ہم

اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا

اللہ کا اور رسول کا کہنا مانتے اور کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں کا اور بڑوں کا کہنا مانا انہوں نے ہم

السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ ع

کو گمراہ کر دیا اے ہمارے رب ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر

تفسیر قدم دہری کا قائل کہتا ہے کہ کسی وقت نظامِ کائنات برباد نہیں ہوسکتا۔ ستاروں کی رفتار اور سفیدی آمیز نیلگوں روشنی یوں ہی قائم رہے گی پھولوں کی خوشبو، درختوں کی بار آوری اور سایہ داری، سمندروں کی طغیانی، دریاؤں کی روانی، بیابانوں کی ریگ زاری اور باغوں کی فرح زائی میں فرق نہیں آئے گا۔ چرندوں، درندوں اور پرندوں کا توالد اور تناسل اور انسانی دماغ کی تلک پیمائی اس طرح ہمیشہ باقی رہے گی۔ جب اس کوتاہ بین انسان کو مادی لہروں کے تغیرات اور ذرہ ذرہ میں ہر وقت بپا ہونے والا انقلاب دکھا کر فساد عالم اور ہمہ گیر بربادی کے امکان کا قائل کیا جاتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کسی چیز کے ممکن ہونے سے اس کا وجوب اور لازمی وقوع ضروری نہیں۔ قیامت کا آنا ممکن سہی، لیکن جب تک کوئی وجوبی سبب پیدا نہ ہو قیامت نہیں آسکتی اور اگر آسکتی ہے تو بتاؤ کب آئے گی اور کیوں آئے گی بھلا غور تو کرو کہ یقینی وقت اور دن تاریخ بتانے سے سوا نقصان کے فائدہ ہی کیا ہے۔ جب دنیا کو صحیح ٹائم معلوم ہوجائے گا تو سب آدمی بے غم ہوجائیں گے۔ نیکی کی رغبت اور بدی سے نفرت کس طرح ہوگی۔ خیال کریں گے کہ قیامت دور ہے ابھی بہت وقت ہے۔ توبہ کرلیں گے برائی کی تلافی نیکی سے کرلیں گے۔ اس مدت العمر غفلت کا پردہ دماغوں پر پڑا رہے گا۔ تمام عالم فساد، ظلم اور شر سے بھر جائے گا۔ بھلائی اور خیر متاع کاسد بن جائے گی، اس لئے یہ سوال تو بالکل ہی بے جا ہے کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔ ہاں کیوں کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر وہ آدمی جو قیامت کا انکار کرتا یا کم از کم اس کا مقرر وقت دریافت کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ مدت دراز تک اپنی عیش پرستیوں اور خواہش آفرینیوں میں غرق رہے۔ احکامِ فطرت سے سرتابی کرتا رہے اور قانونِ قدرت کو توڑتا رہے۔ خالق سے منہ موڑے اور مخلوق کو اپنے ظلم اور ناجائز حرکتوں سے ستاتا رہے

تحلیلِ اجزاء

یَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ - کم عقل کوتاہ بصیرت والا آدمی کبھی اپنی بے وقوفی یا عناد سے ایسے سوال کر بیٹھتا ہے جس کا جواب اُس کے لئے نہ مفید ہے یا بلکہ مضر رساں ہوتا ہے، اس لئے اس کو جواب نہیں دیا جاتا۔ مثلاً کبھی تقدیر کے متعلق بحث کرتا ہے۔ کبھی شہادت کتنی کا طالب ہوتا ہے اور کبھی قیامت کے مقررہ وقت کی بابت استفسار کرتا ہے۔ قیامت کی بابت سوال کرنے والے تین قسم کے آدمی تھے۔ ایک وہ تھے جو اللہ کی طرف سے مامور کر کے بشری صورت دے کر بھیجے گئے تھے تاکہ لوگوں کے سامنے حضور اقدسؐ سے قیامت کے متعلق دریافت کریں اور حضورؐ کا انکاری جواب سن کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قیامت کا وقت پردہ خفا میں ہے۔ سوا اللہ کے کسی کو یقینی علم نہیں۔ ان علاماتِ قیامت معلوم ہیں۔ اسی کے سوال کا ثبوت اس حدیث سے ہوتا ہے جو حدیث جبرئیل کے سبب صحیحین میں مروی ہے۔ دوسرا سوال کرنے والا وہ گروہ تھا جس کا واقعی ایمان قیامت پر تھا۔ لیکن جذبۂ شوق اس کو اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ اس قسم کے سوال کرے۔ جس طرح کہ ایک اعرابی نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا تھا یا رسول اللہؐ قیامت کب ہوگی؟ سرکار نے ارشاد فرمایا تم نے قیامت کے لئے کیا توشہ فراہم کیا ہے۔ سائل نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس تو نہ نماز ہے نہ روزہ ہے مگر اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ ارشاد فرمایا تم اپنے محبوب کے ساتھ ہو گے۔ صحابہ یہ جواب سُن کر بہت خوش ہوئے (رواہ اصحاب الصحاح والسنن بطرق متعددۃ وانسانید صحیحۃ) تیسرا گروہ ان کافروں اور مشرکوں اور منکروں کا تھا جن کا ایمان تو قیامت پر نہیں تھا، مگر استہزاء اور انکار کے طور پر قیامت کو دریافت کرتے تھے۔ آیتِ مذکورہ میں سوال کرنے والوں سے یہی تیسرا گروہ مراد ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ - اس سوال کے جواب میں یہ بات کہنے کا حکم دیتا ہے کہ قیامت کا علم یعنی تعین تاریخ کے ساتھ سوا خدا کے کسی کو نہیں۔ سورۂ اعراف میں جو مکی ہے یہی جواب دیا تھا اور اس سورت میں بھی (جو مدنی ہے) یہی جواب دیا ہے۔ حدیث جبرئیل میں بھی حضورؐ نے ایسا جواب دیا تھا جس سے اپنی بلکہ اللہ کے مقرب فرشتے یعنی جبرئیل کی بھی ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ صرف علامات بیان فرمائی ہیں۔ پھر اعرابی کے سوال کے جواب میں توشۂ آخرت دریافت فرمایا اور وقتِ قیامت ظاہر نہ فرمایا۔ تاہم اس آیت میں باوجود اس صراحت کے کہ اللہ کے سوا کسی کو قیامت کا علم نہیں۔ دوسری صورت میں یہی جواب دیتا ہے جس کے اندر خوف آمیز وعید پوشیدہ ہے۔ فرماتا ہے :-

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا - یعنی آپ کو تو قیامت کا وقت معلوم نہیں ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ قیامت قریب ہی ہو۔ انسانی زندگی کتنی ہی طویل ہو اور قیامت چاہے ہزاروں برس بعد آئے، مگر جو چیز یقینی طور پر آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے۔ محاورہ میں گزری ہوئی چیز کو خواہ کتنی ہی طویل مدت گزر گئی ہو قریب ہی کہا جاتا ہے۔ اور آنے والی مصیبت یا راحت کو بھی دور نہیں کہا جاتا۔ اس کے علاوہ انسانی دورِ حیات بہت طویل نہیں ہے۔ اور اس زندگی کے خاتمہ کے بعد نیک و بد کام کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور آئندہ صرف جزا سزا کا موقع رہتا ہے، اس لئے اگرچہ قیامتِ عامہ دور ہو، مگر ہر شخص کی قیامت انفرادی طور پر تو قریب ہی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے من مات فقد قامت قیامتہ یعنی جو مرا اس کی قیامت ہو گئی۔ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ امر اللہ سے مراد قیامت ہے۔ چونکہ قیامت یقینی الوقوع ہے، اس لئے صیغۂ ماضی استعمال کیا گیا۔ بعض لوگوں کو چونکہ قیامت کا یقین نہ تھا، اسلئے بطور استہزاء یا بر سبیل انکار بہت جلد فیصلۂ زندگانی کے خواستگار تھے۔ پھر بعض آدمی انکاری لہجہ میں قیامت کا مقررہ وقت بھی دریافت کرتے تھے۔ ان سب کے جواب میں فرماتا ہے کہ قیامت کو جلد طلب نہ کرو۔ اس کے آنے کی جلدی نہ مچاؤ۔ حکمِ خداوندی آپہنچا، قیامت گویا آ چکی۔ یعنی تمہارے لئے وقوعِ قیامت کہ سوا نقصان کے فائدہ نہیں کیونکہ قیامت کو جلد طلب کرنے اور اس کا وقت دریافت کرنے کا اصل منشا کیا ہے صرف یہ کہ اس کی تیاری کر لی جائے اور چونکہ تم منکر ہو اور تمہارے پاس توشۂ آخرت نہیں ہے، اس لئے تم کو قیامت کے دن تکلیف کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ :-

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا - اللہ نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ یعنی پہلے سے فیصلہ کر دیا ہے کہ کافر اس کی رحمت کے دائرہ کے اندر قیامت کے دن داخل نہ ہوں گے اور ان کے لئے اس نے جہنم سوزاں اور آتش فروزاں تیار کر رکھی ہے نہ کبھی ان کو فنا ہوگی نہ دوزخ ختم ہوگی نہ وہاں سے رہائی نصیب ہوگی۔ ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہنا ہوگا۔

لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا - قوت کے ساتھ مدد کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ قرابتدار اور اجنبی یگانہ اور بیگانہ پھر دونوں قسموں میں سے ہر ایک دو طرح کا ہوتا ہے۔ کارسازی اور نصرت پر قدرت رکھنے والا اور مجبور کمزور۔ اس آیت میں نفی امداد کی صراحت فرماتے ہوئے دو لفظ ذکر کئے ہیں

ولی اور نصیر۔ ولی سے مراد وہ قرابتدار ہیں جو کارسازی پر قدرت رکھتے ہیں اور نصیر سے مراد وہ اجنبی ہیں جو نصرت کر سکیں۔ مطلب یہ کہ قیامت کے دن کافروں کی کوئی حمایت اور کارسازی نہ کرے گا۔ کوئی آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جو مدد کر سکے اپنا نہ غیر۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا۔ اس وقت کافر حسرت کریں گے۔ مختلف آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مختلف مقامات پر کافروں کو حسرت ہوگی اور بالآخر کشاں کشاں جب دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو وہاں یہ حالت ہوگی جو آیت میں بیان کی گئی ہے کہ کباب کی طرح الٹ پلٹ کر کے ان کو بھونا جائے گا۔ اس وقت خصوصی طور پر ان کو حسرت ہوگی اور کہیں گے کہ کاش ہم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے تو آج اس عذاب میں گرفتار نہ ہوتے۔ وہاں ان کے طاغوتی پیشوا اور شیطانی مقتدا بھی موجود ہوں گے۔ ان کو سامنے دیکھ کر غصہ کی آگ اور بھڑکے گی تو کہیں گے۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ اے ہمارے رب ہم نے تو اپنے سرداروں اور بزرگوں کا کہنا مانا تھا انہوں نے ہم کو راہ راست سے بہکا دیا۔ یہ قول سب کافروں کا ہے۔ مگر یہ معذرت قابل محبت نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے جب ہوش حواس اور دلی علمی طاقتیں عطا فرمائی ہیں تو ہر ایک کو سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کے بعد صحیح راستے پر چلنے کی آزادی ہے۔ بہکانے والے کا کام گمراہ کرنا نہیں بلکہ صرف بہکانا ہے، اسلئے غلط نما پیشوا کو اس کی غلط نمائی کی سزا دی جائے گی۔ مگر غلط راستے پر چلنے والا بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتا، اس لئے حدیث میں آیا ہے لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق یعنی کسی مخلوق کے پاس لحاظ یا حکم ومشورہ سے خالق کی نافرمانی جائز نہیں۔ مگر کافروں کا مقصود تو در پردہ تخفیف عذاب کی استدعا کرنے کے ساتھ اپنے پیشواؤں پر غضب وغیظ کا اظہار کرنا ہوگا، اس لئے وہ کہیں گے۔

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۔ اے رب ان کو ہمارے عذاب سے دوگنا عذاب دے۔ یعنی ایک خود غلط چلنے کا دوسرا بہکانے کا اور ان کو رحمت ونجات سے بالکل دور کر دے۔ ابن ابی حاتم نے طاؤس کا قول نقل کیا ہے کہ کافروں کے قول میں سَادَتَنَا سے مراد ہیں ان کے سردار اور امیر اور كُبَرَآءَنَا سے مراد ہیں گمراہ کن عالم اور درویش۔ طاؤس کی مراد یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے دو گروہ ہی ہوتے ہیں یا تو کھلم کھلا علی الاعلان بغیر کسی پردے کے یا دینی علمی اور اصلاحی پردہ کے اندر رہ کر، اس لئے کافروں نے دونوں گمراہ کن راہنماؤں پر دوگونہ عذاب ہونے کی دعا کی۔

مقصود بیان قیامت کی تاریخیں اور صحیح وقت کا علم سوا خدا کے کسی کو نہیں، مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہے قریب۔ رفتار کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ قیامت کے متعلق استفسار ممنوع ہے۔ کافروں کو دوزخ سے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔ کافر علاوہ عذاب جہنم کے حسرت اور غیظ وغضب کی آگ میں بھی جلیں گے اور جل کر اپنے پیشواؤں کو کوسیں گے وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ

مسلمانو! تم اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو ایذا دی مگر اللہ نے اُس عیب سے موسیٰ کو بری کر دیا جو انہوں نے کہا تھا

عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ

موسیٰ خدا کے نزدیک ممتاز تھے مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو وہ تمہارے لئے

لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

تمہارے اعمال کو ٹھیک کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا جس شخص نے اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانا اس نے بڑی کامیابی حاصل کی

تفسیر:۔ انسانی زندگی کی تین خصوصیات ہیں (۱) دماغی تصورات وافکار وخیالات (۲) زبانی قول (۳) ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضائے

جسم کا حرکت و سکون۔ ساری اچھائیاں یا برائیاں، نیکیاں اور بدیاں انہی تینوں کے صحیح یا غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ خیر و شر، صلاح و فساد اور راستی و کجی کا مدار یہی تینوں ہیں۔ شریعت الٰہیہ نے بھی انہی تینوں کی اصلاح کا حکم دیا ہے، لیکن ان تینوں کے ترتیبی درجات میں تفاوت ہے۔ سب سے پہلے دماغی اصلاح کی ضرورت ہے۔ دماغ حاکم ہے اور باقی اعضاء محکوم۔ دماغ بادشاہ ہے اور سب رعیت۔ انسان ہر اچھا برا کام قلبی عزم اور دماغی تصور کے بعد ہی کرتا ہے، اس لئے شریعت الٰہیہ نے سب سے پہلے ایمان کا حکم دیا یعنی یہ ہدایت کی کہ حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھو۔ اور یقین کرو مبدء و معاد اور اس زندگی کے تمام احوال کے متعلق جو خدا نے فیصلہ کر دیا ہے اس کو مانو۔ اس کے بعد عمل کا درجہ ہے اور تمام اعمال میں زبانی قول کو تقدم حاصل ہے۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ انسان سمجھتا تو صحیح ہے اس کا علم تو غلط نہیں ہوتا، ایمان اور یقین میں تو کوئی خرابی نہیں ہوتی، مگر بے ساختہ کوئی بات غلط زبان سے نکل جاتی ہے جس سے دوسروں کو دکھ پہنچ جاتا ہے اور بلاوجہ یہ لوگ اذیت اٹھاتے ہیں، اس لئے زبان کی روک تھام ضروری ہے۔ جب زبان قابو میں ہوگی تو جو بات نکلے گی وہ ٹھیک، درست اور صحیح نکلے گی۔ تیسرا درجہ اعمال بدن کا ہے۔ اعمال کی اصلاح بھی لازمی چیز ہے، مگر تنوع اعمال کی اصلاح بھی نامکمل ہے۔ کسی نہ کسی عمل میں غلطی ہر انسان سے ہو جانا یقینی ہے۔ تاہم کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو تمام اعمال درست ہو جائیں، لیکن ذکر عقائد اور اقوال کی درستگی کے نادانستہ طور پر کوئی عملی یا فعلی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ قابل چشم پوشی اور مستوجب معافی ہے، مگر جذبہ اصلاح کا ہونا لازم ہے اگر نیت اصلاح ہے تو بیڑا پار ہے۔ امکانی عمل و قول کی درستی اور نیت کی صحت موجب کامیابی ہے۔

حضرت موسیٰ جلیل القدر پیغمبر تھے بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ نے احکام الٰہیہ اپنی قوم کو پہنچائے شروع میں لوگوں نے سرکشی کی، مگر کچھ مدت کے بعد مان گئے اللہ کو واحد اور موسیٰ کو پیغمبر برحق جان گئے، مگر ایمان یقین اور فکری اصلاح کے بعد بعض لوگوں کو اپنی اپنی زبان پر قابو حاصل نہ ہوا۔ اگر صرف ایمان کی خرابی ہوتی تو رفتہ رفتہ اصلاح کے بعد بھی جو خرابی رہ جاتی وہ قابل معافی قرار دے دی جاتی، مگر انہوں نے تو زبان کی بھی روک تھام نہ کی اور تو اور خود موسیٰ پر بعض لوگوں نے تہمت تراشی کی۔ موسیٰ برہنہ غسل نہیں کرتے۔ قوم والے ننگے نہاتے تھے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی شرم نہ آتی تھی، مگر نبوت کے لئے شرم تو جزو لازم ہے۔ اس پر کہنے لگے موسیٰ کو کوئی اندرونی مرض ہے جب ہی تو برہنہ سب کے سامنے غسل نہیں کرتے مگر اتفاق سے بحکم الٰہی نادانستہ طور پر موسیٰ کو لوگوں کے سامنے برہنہ آنا پڑا اور اس طرح ان کی دہن بندی ہوئی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کوہ طور پر موسیٰ اپنے بھائی ہارون کو خود قتل کرا آئے ہیں۔ غور کرنے کا مقام تھا کہ موسیٰ نے دعا کر کے تو اپنے بھائی کو نبوت دلوائی اور پھر خود ہی ان کو قتل کر دیتے، مگر مارتے کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا ہے بولتے کی زبان کون پکڑے۔ اس تہمت سے بھی خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو بچایا اور تحقیقات کے بعد تہمت کی غلطی لوگوں کو معلوم ہوئی اسی طرح حضور اقدس نے جب لوگوں کو مخلص مومن بننے کا حکم دیا تو بہت کثرت سے لوگ حلقہ بگوش ہو گئے، مگر بعض لوگوں نے اپنی زبان بندی بھولے پن کی وجہ سے نہ کی۔ سیدھے آدمی تھے۔ منافقوں کے غلط پروپیگنڈہ کا بعض وقت شکار ہو جاتے تھے۔ منافقوں کی پیشانی پر ان کا نفاق لکھا نہ تھا کہ ان کو دشمن سمجھ جاتے، اس لئے کبھی منافقوں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے۔ حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے پر منافقوں نے طعن کرنے شروع کئے تو بعض مسلمان بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کو تقسیم کے وقت ایک منافق کہنے لگا کہ یہ تقسیم انصاف کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر ایک انصاری کے منہ سے بھی یہی بات نکل گئی۔ اسی طرح کی بعض اور باتیں بھی منافقوں کی پیدا کی ہوئی تھیں جن کو بعض مسلمان بھی نقل کر دیا کرتے تھے اور اس سے حضور والا کو تکلیف پہنچتی تھی۔ مسلمانوں کا نقصان درحقیقت حضور کی اذیت یابی کا سبب ہوتا تھا، اس لئے ہدایت کر دی گئی کہ موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح تم لوگ رسول اللہ کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ جو بات زبان سے نکالو ٹھیک اور درست نکالو۔ رسولؐ کے ہر عمل کو درست سمجھو۔ یہ ہی ساری کامیابیوں کا ذریعہ ہے۔ رہی بعض اعمال کی نادانستہ غلطی تو اس کو خدا معاف فرما دے گا۔

تحلیل اجزاء

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰی فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوۡا۔ اس آیت کی تشریح میں دو امور تنقیح طلب ہیں (۱) حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل نے کیا اذیت دی تھی۔ آیت میں کس اذیت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ قارون نے ایک بدکار عورت کو لالچ دے کر آمادہ کیا کہ مجمع عام میں شہادت دے کہ موسیٰ نے اس سے بدکاری کی ہے۔ قارون سے چونکہ موسیٰ نے زکوٰۃ کا مال طلب کیا تھا، اس لئے قارون کو آپ کی طرف سے کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک روز عام مجمع میں حضرت موسیٰ تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے

تو قارون بھی اس عورت کو لے کر آ پہنچا۔ عورت چاہتی تھی کہ سب کے سامنے کھڑی ہو کر موسیٰؑ پر زنا کی تہمت لگائے، مگر اللہ نے اس کی زبان کو پھیر دیا اور بجائے تہمت تراشی کے اس نے قارون کا سارا راز فاش کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ کو یہ سن کر جلال آیا اور آپؑ نے بددعا کی جس کے سبب سے قارون زمین میں دھنس گیا۔ اس طرح اس فریب کے جال سے موسیٰؑ کو اللہ نے بچا لیا۔ آیت میں یہی اذیت مراد ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا موسیٰؑ بہت شرمیلے تھے اور حیادار آدمی تھے۔ یہ حیا ہی تھی کہ (غسل کرتے وقت) ان کے بدن کا کوئی حصہ کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ بعض اسرائیلیوں نے ان کو دکھ پہنچایا اور کہنے لگے یہ شخص (غسل کرتے وقت) پردہ رکھتا ہے لامحالہ اس کی کھال پر کچھ خرابی ہے خواہ برص کے سفید داغ ہوں یا فتق ہو یا کوئی اور مرض ہو۔ اللہ نے چاہا موسیٰ کو اسرائیلیوں کی بدگوئی سے پاک کر دے (اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز (جنگل میں) تنہائی کے وقت موسیٰ نے نہانے کے لئے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے۔ جب نہا چکے تو کپڑے پہننے کے لئے پتھر کی طرف بڑھے۔ فوراً پتھر سب کپڑے لے کر بھاگا، ہی اپنا عصا لے کر اس کے پیچھے دوڑے اور پتھر کو آواز دے کر اپنے کپڑے مانگنے لگے۔ بالآخر پتھر ایسی جگہ جا کر ٹھہرا جہاں بنی اسرائیل کا مجمع تھا۔ انہوں نے موسیٰ کو برہنہ دیکھ کر جان لیا کہ یہ بے عیب اور لوگوں کی بدگوئی سے پاک ہیں۔ موسیٰ نے وہاں پہنچ کر کپڑے پہن لئے اور پتھر کو مارنا شروع کیا جس کی وجہ سے واللہ چار یا پانچ نشان پڑ گئے (رواہ البخاری من حدیث انس و رواہ البزار و ابن الانباری و ابن مردویہ عن ابن عباس) ابوہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد یہی فرمایا تھا کہ آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى الخ میں یہی مراد ہے وقد رواہ عبد بن حمید وابن جریر واحمد۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب ہارونؑ کی وفات کا وقت آیا تو موسیٰؑ ان کو پہاڑ پر لے گئے وہاں ہارونؑ کا انتقال ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے بھی بھائی کو مار ڈالنے کی تہمت موسیٰؑ پر لگائی۔ حضرت موسیٰؑ کو اس سے دکھ پہنچا۔ پس اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت ہارونؑ کا تابوت لے کر بنی اسرائیل کی طرف سے گزریں۔ جب فرشتے تابوت لے کر گزرے اور ہارونؑ نے اپنی وفات کی حالت لوگوں سے بیان کی اس کے بعد ہارونؑ کا مزار کسی کو معلوم نہ ہوا (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم عن ابن عباس) ابن جریر نے لکھا ہے کہ مرفوع حدیث سے جو امر ثابت ہے وہی اولیٰ ہے (یعنی پتھر کے کپڑے لے کر بھاگنے کی روایت) اور شاید وفاتِ ہارون کا قصہ مراد ہو۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیت میں صرف بنی اسرائیل کی گستاخی اور موسیٰ کو دکھ پہنچانے کا تذکرہ ہے، کسی واقعہ کی تعیین نہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ سب واقعات مراد ہوں۔

(۲) رسول پاکؐ کو اہل ایمان نے کیا دکھ دیا تھا؟ آیت میں کس ایذا رسانی کی ممانعت ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں کسی خاص ایذا رسانی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ نہ اہل ایمان نے کوئی خاص دکھ حضورؐ کو ایسا دیا تھا جس کی ممانعت آیت میں کی گئی ہو بلکہ خدا تعالیٰ نے ایک عام اصلاحی حکم دیا ہے جو کسی شانِ نزول کا محتاج نہیں ہے۔ اکثر مفسرین نے خاص خاص اذیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ آیت میں عام ایذا پہنچانے کی ممانعت کی گئی ہے، مگر مورد نزول خاص واقعات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک روز حضورؐ نے غنیمت کا مال تقسیم کیا۔ ایک انصاری کہنے لگا یہ تقسیم لوجہ اللہ نہیں ہے۔ میں نے حضورؐ سے جا کر اس کا تذکرہ کیا۔ سنتے ہی چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا اللہ موسیٰؑ پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ دکھ دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے صبر کیا (احمد، بخاری، مسلم) خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ جنگ حنین کی غنیمت کے بٹوارے کا تھا۔

صحیحین میں مروی ہے کہ تقسیم غنیمت کے موقعہ پر ایک مرتبہ ایک تمیمی شخص نے بڑا حضورؐ سے کہا تھا انصاف کیجئے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو اس قدر غصہ آیا کہ حضورؐ سے اجازت مانگنے لگے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ حضورؐ نے اجازت نہ دی اور فرمایا اس شخص کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے ہیں جن کی نمازوں کے مقابلہ میں تم لوگ اپنی نمازیں اور ان کے روزوں کے مقابلے میں تم اپنے روزے ہیچ سمجھو گے، مگر وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہوں گے جیسے نشانہ میں سے تیر بے داغ نکل جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت تراشی کا واقعہ اس جگہ ذکر کیا ہے کسی نے لکھا ہے کہ حضور والاؐ نے جب حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تو بعض لوگوں نے نکتہ چینی کی جس سے آپؐ کو دکھ پہنچا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کی تعیین نہ کی جائے۔ مذکورہ بالا تمام واقعات بلکہ ان کے علاوہ اور بھی حوادث حضورؐ کی اذیت یابی کا موجب تھے جن کے پھیلانے والے عموماً منافق ہوتے تھے اور سادہ لوح مسلمان بھی منافقوں کو مخلص مومن سمجھ کر ہو سکتا ہے کہ متاثر ہو کر بیہودہ باتوں کو نادانستہ زبان پر لے آتے تھے۔ اس کی ممانعت آیت میں کر دی گئی۔

وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا۔ یعنی اللہ کے نزدیک موسیٰ باوجاہت تھے۔ حسن بصری نے فرمایا وجیہ ہونے سے مراد ہے مستجاب الدعوات تھے۔ حسن بصری کے قول کی تشریح کرتے ہوئے بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اگرچہ ہر نبی باوجاہت اور مستجاب الدعوات ہوتا ہے، مگر موسیٰ کی دعا ... عظیم الشان قبولیت کی حامل ہوئی ایسی کسی نبی کی دعا نہ ہوئی۔ موسیٰ کی دعا سے ہارونؑ کو نبوت ملی اس کی نظیر میں کسی اور نبی کی دعا کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ۔ ہم تفسیری فوائد میں لکھ چکے ہیں کہ جن چیزوں کی اصلاح کے لئے اسلام آیا ہے۔ دل و دماغ کے عقائد ... اقوال اور اعضاء کے افعال، ایمان لانے کے بعد قلب کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ مگر صرف دعویٰ کافی نہیں ہے۔ جب تک دل سے تقویٰ اور غیر صحیح عقائد سے پرہیز نہ ہو ایمان ناقابل اعتبار ہے، اسی لئے فرمایا اے ایمان والو! یعنی اے وہ لوگو جو گروہ اہل ایمان میں داخل ہونے کے مدعی ہو دل سے تقویٰ رکھو یعنی غیر صحیح عقائد سے اجتناب کرو۔ ابن عباسؓ نے فرمایا جس کو اپنے رب کی نظر میں بزرگی حاصل کرنی پسند ہو وہ اللہ سے ڈرے۔ بعض اہل علم کا قول ہے شرک جلی سے بچنا اور لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا یقین رکھنا تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے اور عارف کا تقویٰ یہ ہے کہ جب اس کو امانت معرفت مل گئی تو تمام مخلوق کا خیال اس کے دل سے ساقط ہو جائے۔ شیخ واسطی نے فرمایا تقویٰ کے چار اقسام ہیں۔ عوام کے لئے تقویٰ شرک سے اجتناب رکھنا ... معصیت سے پرہیز رکھنا خواص کا تقویٰ ہے اور اپنے نیک افعال کو بھی ذریعہ نجات نہ سمجھنا اولیاء کا تقویٰ ہے اور اللہ سے اللہ ہی کی پناہ ... ہے یعنی اللہ کے غضب سے بھاگ کر اللہ کی رحمت کا سہارا تلاش کرنا کامل تقویٰ ہے۔

وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ یہ اصلاح نفس کا دوسرا درجہ ہے بعض اہل علم کے نزدیک قول سدید سے مراد ... نے محض رضائے مولا کا حصول مراد لیا ہے۔ بعض نے اصلاح بین الناس سے قول سدید کی تعبیر کی ہے، عکرمہ نے لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کو قول سدید کہا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے صدق اور بعض نے صواب یعنی راستی کو قول سدید قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک موخر الذکر دونوں تشریحی لفظ نہایت جامع ہیں۔ توحید و رسالت کا اقرار، مبدء و معاد اور اللہ کی ذات و صفات کے متعلق صحیح قول ہر بات میں سچائی اور ہر لفظ میں راست بازی لفظ صواب و صدق میں داخل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی۔ سلام پھیرنے کے بعد ہم لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہم بیٹھ گئے۔ ارشاد فرمایا میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور جو بات زبان سے نکالو وہ قول سدید ہو۔ پھر عورتوں کی جماعت کی طرف تشریف لائے اور فرمایا مجھے اللہ نے تم کو یہ ہدایت کرنے کا حکم دیا ہے کہ تم اللہ سے ڈرو اور زبان سے درست بات کہا کرو (رواہ ابن ابی حاتم واحمد والطبرانی)

يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ۔ یہ اصلاح کا تیسرا درجہ ہے جو اول الذکر دونوں اصلاحوں کا عمومی نتیجہ ہے۔ عقیدہ کی صحت اور قول کی راستی کے بعد عموماً اعمال جسمانی حرکات، سکنات اور زندگی کے اکثر افعال درست ہو جاتے ہیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصلاح اعمال کے معنی اعمال کا مقبول ہو جانا۔ گویا مطلب یہ ہوگا کہ جب آدمی قلبی تقویٰ کے ساتھ زبان کی درستی کرے گا تو اللہ اس کے جسمانی افعال کو اس قابل بنا دے گا کہ ان کو قبول فرمائے۔

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ لیکن یاد رکھو کہ زندگی کے تمام اعمال ان گنت ہیں۔ تنوع اور گوناگونی کے لحاظ سے ناقابل حصر ہیں، اس لئے تمام اعمال کا درست ہو جانا باوجود انتہائی کوشش کے انسانی دائرہ اختیار سے خارج ہے۔ گناہ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے اس لئے انبیاء کے سوا بغیر معرفت الٰہیہ کے چارہ کار نہیں۔ جب تک اللہ چشم پوشی اور درگذر نہ فرمائے نجات ناممکن ہے، اسی لئے فرمایا کہ تقویٰ اور راست گفتاری کے بعد اللہ تمہارے اعمال کو خود ٹھیک کر دے گا اور اس پر بھی تمہاری جو غلطیاں اور فروگذاشتیں ہوں گی ان کو معاف فرما دے گا۔ شیخ سہل نے فرمایا جس شخص کو اللہ ترک اعمال کی توفیق دے تو یہ اس کے گناہ معاف ہونے کی علامت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ اس آیت میں مذکورۂ بالا تینوں اصلاحی تعلیموں کا مجمل مغز اور اصل نچوڑ ظاہر فرمایا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان پر چلنا عظیم الشان کامیابی کا موجب ہے۔ اطاعت خدا و رسولؐ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہر قسم کی فطری، قومی اور عملی اطاعت اس کے اندر داخل ہے۔ اللہ کی اطاعت درحقیقت اس کے رسولؐ کی اطاعت ہے اور رسولؐ کی اطاعت واقع میں اللہ کی اطاعت ہے۔ مگر بعض کور دماغ شاید یہ سمجھ سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے بعد رسولؐ کی ضرورت نہیں۔ قولی اور عملی سنت بے کار ہے یا رسولؐ کو بھیجنے کے بعد قرآن کی کیا ضرورت ہے۔ ان دونوں باطل خیالوں کا استیصال اس فقرہ سے کر دیا کہ اللہ اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنا موجب فلاح ہے۔ یعنی صرف قرآن کو ماننا ...

رسول کو غیر ضروری قرار دے کر قولی اور عملی سنت کا انکار کر دینا یا بغیر پیام وحی کے رسول کی ذات کو کافی سمجھنا دونوں باتیں غلط ہیں ۔

مقصودِ بیان کوئی ایسی حرکت کرنی جائز نہیں جس سے حضور کو دکھ پہنچے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث پر طعن کرنا اہل بیت صحابہ علمائے حقانی اور صلحائے امت سے بغض رکھنا یا ان کو برا کہنا سب حرام ہے ۔ بلکہ ہر چیز کی مخالفت اور ہر شر کی موافقت ناجائز اور ایذائے رسول کا موجب ہے ۔ دل، زبان اور اعمالِ جسمانی کی تعلیم اسلام کا اصل مقصد ہے ۔ خلوصِ قلب راست گفتاری اور درست اعمال لازمی چیزیں ہیں ۔ اس کے بعد باقی لغزشیں معاف ہیں ۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت موجب کامرانی ہے ۔ وغیرہ ۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ

ہم نے آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر امانت پیش کی مگر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے

مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۙ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ

مگر انسان نے اس کو اٹھا لیا بلاشبہ انسان بڑا بے باک نادان تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ منافق

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے گا اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر

وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ع

مہربانی فرمائے گا اور اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر کائنات کا ذرہ ذرہ قانونِ تنظیم کے تحت مفوضہ خدمات کی سرانجام دہی میں منہمک ہے ۔ عنصریات کے مادۂ اولیٰ کی ادنیٰ لہر سے لے کر عرشِ بریں کی سطحِ معلیٰ تک ہر چیز کی تخلیقی غرض کی تکمیل کر رہی ہے اور جہاں تک ہر شے کے دائرۂ فطرت کے حدود ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے وہ شئی فطرت کی کارگذار اور فرماں بردار ہے ۔ تمثیلاً مندرجہ ذیل شواہد پر غور کرو ۔

پانی اور ہوا عناصر اجسام سے مرکب ، دونوں میں سے ہر ایک کے جراثیم مختلف خاصیات ، مختلف کیفیات اور مختلف طبیعتوں کے حامل ہیں ۔ جراثیم کی ایک خاص نوع ، مناسب مقدار اور موزوں تعداد کے ساتھ مرکب ہو کر مخصوص خصوصیات کی مالک بنی ہے جس کا نام پانی یا ہوا رکھا گیا ہے ۔ یہ مرکب خصوصی فوائد اور فطری وظائف کے پورا کرنے میں سرگرم ہے ۔ خفت ، سیلان ، نباتات اور حیوانات کی بقائے حیات ، نشوونما ، تازگی ، سرسبزی ، تازگی ، رونق اور دوسرے منافع اسی مرکب سے وابستہ ہیں ۔ ہوا اور پانی کی شکل اور خصوصیات میں تبادل اور تعاون بھی ہوتا رہتا ہے ۔ ایک دوسرے سے تعاون اور تخالف بھی کرتا ہے ۔ غرض فرائضِ تخلیقی کو پورا کرتا رہتا ہے ۔ مگر انہیں فرائض کی جو اس کی نوعی حدود کے متعلق ہیں ۔ دوسری انواع اور ارتقائے انواع کا اس کو کچھ پتہ نہیں نہ اس کو اپنی حدود سے خارج دوران یا شعور ہے ۔ اگر ہے تو اپنی ہی ذات ، اجزائے ذات اور فرائض ذات کا ۔ عام کائنات سے اس کو شعوری وجدانی یا علمی تعلق نہیں ۔ پھر یہ جو فرائض کو پورا کر رہا ہے وہ اضطراری طور پر ۔ اس کے اندر قوتِ ارادی نہیں نہ اختیار نہ ان فرائض میں کمی بیشی کا کوئی حق ۔ تاز آفرینش سے اس کی جو اچھی بری مفید مضر حالت اور خصوصیت ہے وہ بدستور اب تک قائم ہے ۔ نہ اس میں نقصان ہے نہ افزونی ۔

آگ اور مٹی کو بھی پانی اور ہوا پر قیاس کرنا چاہیے ۔ ان کے اجزائے اولیں سے جو مرکبات بنے ہیں وہ اپنی خاص خصوصیات اور کوائف کے مالک ہیں ۔ آگ کے مرکب میں خفت ، عروجی حرکت ، تمازت ، صنوبری ہیئت اور احراق کی قوت ہے ۔ مٹی کے مرکب ، ثقل ، ہبوطی حرکت ، برودت ، کروی ہیئت

اور جمودی حالت ہے ہر ایک کے اجزائے ترکیبی اپنے فرائض کو ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے۔ محدود نوعی کی قیدوں میں جکڑے ہوئے۔ ان کا شعور یا وجدان یا اقتضائے طبیعت بیرونی جزئیات سے متعلق ہیں۔ مٹی کے اندر اجزائے مٹی کی طرف کھینچتے ہیں اور آگ کے اندر اجزائے آگ کی طرف مگر ایک کو دوسرے کی خواہش کا پتہ نہیں۔ ہر ایک کی دنیا الگ دنیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ فرائض کو ادا کرنے میں کوئی بھی کمی نہیں کرتا۔ اپنی خصوصیات سے کوئی بھی غافل نہیں۔ لیکن ان کے ذاتی اجزاء جو کچھ کر رہے ہیں وہ اضطراری طور پر۔ ارادہ و اختیار کو تکمیل فرائض میں دخل نہیں۔ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ آغاز آفرینش یا وسطی دور میں آگ کا کام جلانا اور گرمی پہنچانا تھا اور اب ختم ہوگئی یا ابتدائی تخلیق میں مٹی میں وزن ثقل نمو اور نوعی خصوصیات زیادہ تھیں اور اب وہ نہیں رہیں یا کم ہوگئیں۔ غرض عنصری اجزاء اپنی اپنی خدمات روز اول سے شروع سے اب تک انجام دے رہے ہیں۔ مگر ارادہ و اختیار کے بغیر۔ ان کو اگر شعور ہے تو اپنا اور اپنی مفوضہ خدمت کا۔ ان کو معرفت عامہ اور علم کائنات نہیں نہ دوسرے کے فرائض سے یہ واقف ہیں نہ عمومی ارادہ اختیار سے ان کا کام سرانجام پاتا ہے۔ نہ قانون تنظیم سے سرتابی کرنے کی ان کو مجال ہے۔

(۲) جب چاروں عناصر اپنے تمام اجزاء اور ساری کیفیات و خصوصیات کے ساتھ باہم ملتے ہیں اور تناسب کے ساتھ ملتے ہیں تو مختلف معدنی مرکبات برسر ظہور آتے ہیں۔ اجزائے عنصریہ کی تعداد اور قوت کے اختلاف کی وجہ سے معدنیات میں اختلاف ہوتا ہے۔ سونا چاندی لوہا تانبہ، پارہ، رانگ، گندھک اور بے شمار معدنی چیزیں عناصر اربعہ اور ان کے فطری اجزاء ہی کی ممنون کرم ہیں۔ ہر نوع جماد انہی کے اختلاط سے نمودار ہوتی ہے اور مختلف خصوصیات کی مالک بنی ہے۔ مگر مختلف انواع اور غیر محدود معدنیات میں سے کوئی بھی اپنی فطری حد سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی اور کوئی بھی نوعی خصوصیت میں کمی بیشی کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ کسی کو بھی عمومی ارادہ و اختیار اور ہمہ گیر معرفت حاصل نہیں۔ صرف اپنی نوعی ضروریات کا علم ہے اور شاید محدود اختیار بھی حاصل ہو، مگر نوعی حدود سے باہر کی دنیا کا ان کو ذرہ برابر پتہ نہیں اسی وجہ سے ان کے عمل اثر، مزاج اور خصوصیات میں کبھی نہ فرق ہوا نہ ہو سکتا ہے۔

(۳) دو عنصروں کے اختلاط سے ایک نیا مرکب بنتا ہے۔ جب ہوا اور پانی کے اجزاء مناسب مقدار اور موزوں تعداد کے ساتھ باہم امتزاج کرتے اور انفرادی کیفیت کو کھو کر اتحادی اور اختلاطی کیفیت حاصل کرتے ہیں تو خاص گیس تیار ہو جاتا ہے جس کو بخار یا بھاپ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آگ اور مٹی کے اجزاء جب بقدر ضرورت قوت و تعداد کے ساتھ باہم مل کر نیا گیس بناتے ہیں تو اس کو دخان یا دھواں کہتے ہیں اور اجزائے بخاریہ اور اجزائے دخانیہ سے کائنات فضائی کی تخلیق ہوتی ہے۔ ابر، بجلی، اولا، برف، پالا انہی کے اختلاط کے مظاہر ہیں۔ دخان بخار اور ان کی پیداوار میں ضرور اجزاء کے تناسب توازن اور خصوصیات کو دخل ہے، مگر یا تو شعور علم وجدان اور ارادہ کو قطعاً ان کی تخلیق سے کوئی فاعلی تعلق نہیں۔ یا ہے تو صرف نوعی علم اور نوعی ارادہ کو۔ بخار دخان اور دونوں کے اجزاء اور ان سے پیدا شدہ اشیاء میں سے کسی کو عمومی علم اور کائناتی ارادہ حاصل نہیں۔ ان کو اگر علم ہے تو اپنے نوعی ضروریات اور ان کو پورا کرنے کا۔ اگر ارادہ ہے تو اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے متعلق ایک کے علم و ارادہ کا دوسرے کے علم و ارادہ سے کوئی تعلق نہیں نہ ایک کو دوسرے کی خبر ہے۔

(۴) سبزہ کی ساری کائنات گھاس سے لے کر درخت کدو اور مونگے تک ایک ہی طبیعت اور ایک ہی کیفیت اور ایک ہی خاصیت کے اجزاء سے بنی ہے۔ اس کے تمام اجزاء باہم وابستہ اور فرائض کی تکمیل کے لئے وابستہ ہیں۔ تناسب، توازن اور ضرورت نوعی کے تحت نشو و نما، طول و عرض اور عمق میں بڑھاؤ ان کی ذاتی خصوصیت ہے۔ ہر نوع کا سبزہ اور اس کے اجزائے تخلیقی اپنی نوعی غرض کو پورا کرنے میں سرگرم عمل ہیں اور ابتدائے آفرینش سے جس نوع کا سبزہ جس طبیعت خاصیت مزاج اور فوائد کا حامل ہے۔ آج تک اس میں فرق نہیں آیا اور کسی سبزہ نے اپنی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا نہ رکھنے کی اس میں طاقت ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ قانون تنظیم کے تحت ہر سبزہ کی خدمت گزاری اور کارگزاری عمومی علم اور ارادہ و اختیار کے تحت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے بلکہ واقع میں ایسا ہے بھی کہ ہر سبزہ کے اجزاء کا باہم ربط اور فرائض کی سرانجام دہی اور خدمت مفوضہ کی ادائیگی خاص نوعی علم کے زیر اثر ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادائے خدمات میں خاص نوعی ارادہ کو بھی دخل ہو، مگر عمومی اختیار اور معرفت عامہ کسی سبزہ کو میسر نہیں۔ کائنات کی عمومی تنظیم میں کسی کا دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نوع کے سبزہ کے ادائے فرائض خصوصیات اور مزاج و طبیعت میں آج تک سر مو تفاوت نہ ہو سکا اور ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر سبزہ کا ذاتی اقتضاء (خواہ ارادہ کے تحت ہو یا بغیر ارادہ کے) ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی طرح کا ہے۔

(۵) سلسلہ حیوان اپنے اندر غیر محدود اور ان گنت انواع رکھتا ہے۔ بحری، بری، فضائی، ارضی اور آتشی جانور ناقابل شمار ہیں۔ ہر جانور کی جسمانی

ساخت مختلف قسم کے جراثیم کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک کے اجزا میں باہم ربط ضبط یگانگت اور میل فطری طور پر ہے، مگر کوئی فرد بھی نوعی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ خواب وخور اور صنفی قربت سے ہر نوع کا جانور تقریباً واقف ہے۔ ہر نوع کے تمام افراد باہم گفتگو بھی کرتے ہیں۔ اپنی ضروریات سے دوسروں کو واقف کرتے اور دوسروں کی ضروریات سے خود واقفیت حاصل کرتے ہیں، کچھ جانور فن مساحت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ کتنے ہی تعمیری اصول کے تحت ماہر انجنیئر کی طرح اپنے آشیانے اور سکونت گاہیں بناتے ہیں۔ بہت ایسے ہیں جو رنگ کی گوناگونی، ذائقہ کے تنوع، صورت کے حُسن وقبح اور بو کی اچھائی برائی سے بھی واقف ہیں۔ ان جانوروں کی تعداد بھی کم نہیں جو زندگی کے لوازم فراہم کرنا جانتی اور فراہم کرتی ہیں۔ دوست دشمن اور مکروہ و مرغوب کی شناخت بھی کثیر جانوروں کو ہوتی ہے۔ اچھی بری آواز کو سننا اور سردی وگرمی اور سختی ونرمی کا احساس کرنا تو ان گنت حیوانوں کا خاصہ ہے ہی، لیکن ان تمام خصوصیات کوائف، اور لوازم کے ہوتے ہوئے بھی ساری کائنات کی معرفت عامہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ اپنی نوع سے باہر نکل کر موجودات عالم پر غور کرنا استقرائی، تمثیلی یا برہانی شکل میں قیاس کرنا، نتائج کلیہ کا استنباط کرنا، حاضر پر غائب یا غائب پر حاضر کو ڈھالنا، کائنات کی ہر نوع کے خصوصیات معلوم کرنا، کاوش اور تنقیح سے کام لینا، ہر قسم کے اصول وضوابط بنانا اور اپنی مآل اندیشی اور ہر طرح کی اختیاری وارادی، تصوری دوڑ لگانی اپنی اپنی نوع اور پھر دوسری کائنات کی آغاز آفرینش پر غور کرنا اور معاد کو بصیرت کی نظر سے دیکھنا ان سب چیزوں سے حیوانی دنیا بے بہرہ ہے۔ محرک باطنی کے زیر اثر دماغی اور جسمانی حرکت کرنی تو شیوۂ حیوانی ہے، مگر اس حرکت کو ہمہ گیر بنانا اور کہربائی لہر کی طرح تصوری موج کو اس جہان کے کونہ کونہ میں پہنچا دینا کسی جانور کے بس کی بات نہیں۔ غرض عقل فطری اور استنباط فکری سے ہر حیوان خالی ہے اور عمومی علم کسی کو میسر نہیں۔

(۶) آسمان اور ان کی تمام موجودات خاص مادہ کے خاص ذرات سے بنی ہوئی ہے۔ تمام ذرات میں کہربائی لہروں کے ساتھ باہم وابستگی ہے اور ہر ذرہ بجائے خود دوری حرکت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، مگر ذرات کا ہر مجموعہ (یعنی ہر کرہ) ضرور دوامی دوری حرکت کر رہا ہے۔ ذرات کی کہربائی لہروں اور کروں کی دوری حرکت سے جو فوائد پیدا ہو رہے ہیں ان کی مکمل تصویر کشی نہیں کی جا سکتی مختصر الفاظ میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عالم عناصر کے تمام حرکات، سارے تغیرات، کل انقلابات غرض ہر چیز کی ہستی اور بقائے عالم بالا کی عکس ریزی اور پرتو افگنی کا نتیجہ ہے۔ موسمی تبدیلیاں، سبزے، غلے اور میوے کا پیدا ہونا اور پکنا تو سیاروں کی روشنی اور حرارت کا بدیہی نظارہ ہے۔ جمادی اور حیوانی کائنات نے بھی اپنا وجود انہی سے خریدا ہے، لیکن عالم بالا کے اولین مادہ کے ادنیٰ ترین ذرہ کی لہر سے عرش اعظم کی حرکت تک کیا کسی ارادہ اور اختیار کے تحت ہے یا اضطراری اور اتفاقی ہے۔ اس بحث کو اگر نہ چھیڑا جائے اور بالفرض ارادی اور اختیاری اور شعوری حرکت مان لی جائے تب بھی نور پاشی، ضیا افگنی، حیات بخشی اور فائدہ رسانی کائنات سماوی کے حدود واختیار اور دائرۂ معرفت سے خارج ہے۔ کوئی ستارہ، کوئی سیارہ اور کوئی کرہ اپنے ارادہ اور اختیار سے زیریں کائنات کو نہ روشنی پہنچا رہا ہے نہ کوئی فائدہ۔ اور اگر فائدہ رسانی کو بھی ارادہ واختیار کے زیر اثر مان لیا جائے اور تمام بالائی کائنات کی کارفرمائی ان کی اندرونی با اختیار طاقتوں یا نفوس کو قرار دیا جائے۔ تب بھی اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ کائنات عنصری کے تمام مادی تصرفات، صنائع، بدائع، اعجوبہ کاریاں اور ندرت انگیزیاں عالم بالا کے حدود علمی سے خارج ہیں۔ نہ کسی ستارہ کو معرفت عامہ حاصل ہے نہ کسی سیال کو ہمہ گیر علم نہ کسی کرہ کو محیط کل واقفیت نہ اخذ نتائج، استنباط کلیات اور ترتیب جزئیات کو کوئی جانتا ہے نہ کیمیاوی تحصیل ترکیب اور عالم کے حل وعقد کو سمجھتا ہے۔ اگر ان کو شعور ہے تو اپنی ذات اور ضروریات ذات کا اور اختیار ہے تو اپنی اور اپنے اجزا کی لہروں اور حرکتوں کا۔ اسی بنا پر سب کی رفتار ہمیشہ سے ایک جیسی ہے نہ تنوع ہے نہ گوناگونی۔ ستاروں اور سیاروں کا طلوع وغروب ہر مقررہ تاریخ کو مقررہ وقت پر مقررہ سمت سے ہے اور رفتار میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں۔

(۷) ملائکہ کیا ہیں اور ان کی کیا حقیقت ہے؟ ان کی کیا خدمت ہے؟ اس کی مکمل تشریح ہم اس پارہ میں کر چکے ہیں۔ مزید تحقیق اور انکشافی تحقیق سے قطع نظر کر لی جائے اور متقدمین کی تصریحات پر ہی اعتماد کیا جائے تو ملائکہ سے وہ نفوس قدسیہ مراد ہوں گے جو مادی نہیں ہیں نورانی ہیں۔ لوازم مادہ سے پاک ہیں۔ عقل اور علم کے حامل ہیں۔ ان کی مفوضہ خدمات مختلف ہیں۔ کچھ تو عبادات الٰہیہ میں غرق ہیں۔ کسی ساعت، کسی منٹ اور کسی سیکنڈ غافل نہیں۔ کچھ عرش اعظم کے حامل ہیں۔ کچھ مینہ برسانے، ہوا چلانے، ابر کو ہنکانے اور دوسری انتظامی خدمتوں پر مامور ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں۔ ان کو خود کوئی اختیار نہیں۔ جو حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔ ایک فرشتہ دوسرے فرشتے کی خدمت کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ حکم الٰہی کی

خلاف ورزی ہوئی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مفوضہ خدمت کے علاوہ دوسری خدمت انجام دینے کی طاقت ہی نہیں دی گئی۔ گویا ہر فرشتہ کا ہر عمل اضطراری ہے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ تمام فرشتوں میں حکم و قدرت سے سرتابی کی طاقت ہی نہیں ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ فرشتے لوازم مادہ سے پاک ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ پہنتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ جاگتے ہیں۔ نہ اُن میں کوئی نر ہے نہ مادہ نہ بوڑھا نہ بچہ۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ فرشتوں کو عقل کلی شاید ملی ہو تو ملی ہو، عقل جزئی نہیں عطا کی گئی۔ سیاست ملکی مدنیت، تہذیب خانگی، اخلاق کی شستگی، تعمیری قوانین، ضوابط مدل، تحقیقات کیمیاوی اور فلسفہ و سائنس کے انکشافات سے ناواقف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض فرشتوں کو بعض چیزوں کا علم ہو اور یہ بھی واقعہ ہے کہ معرفتِ الٰہیہ ان کو ایک حد تک حاصل ہے، مگر جتنا علم ان کو دے دیا گیا اتنا ہی ہے اس میں زیادتی کوئی نہیں ہوتی۔ ان کا علم کسبی اور نظری نہیں ہے، محض وہبی ہے۔ ان کو تمام انواعِ اشیاء کی عمومی معرفت حاصل نہیں۔ ان کے علم کو ترقی نہیں جتنی معرفتِ الٰہیہ ان کو مل چکی ہے بس اتنی ہی ان کو حاصل ہے۔ مزید اضافہ ناممکن ہے۔ ادنیٰ ترین ذرہ کی حقیقت پر غائرانہ نظر ڈال کر تدریجی ترقی کر کے حقائقِ کائنات کا انکشاف کرنا اور آخر میں موجدِ کائنات کے صفات، افعال اور نتائجِ افعال کو سمجھنا اور سمجھنے میں رفتہ رفتہ ترقی کرنا فرشتوں کے حدودِ تخلیقی سے خارج ہے۔ خلاصہ یہ کہ فرشتوں کو قانونِ فطرت کی شکست کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کا علم ہمہ گیر نہیں ان کی واقفیت کسبی نہیں۔ ان کی معرفت ترقی پذیر نہیں۔ ان کے علمی اور عملی مراتب میں اضافہ ناممکن ہے ان کو غور و خوض کرنے کی طاقت نہیں۔ وہ جزئی کو جزئی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ وہ استقرار اور تلاشِ جزئیات سے بھی قاصر ہیں۔

(٨) ہم نے مختصر الفاظ میں ساری کائنات کا تخلیقی نقشہ کھینچ دیا۔ اب آیئے اُس نوع پر بھی اُچٹتی نظر ڈالیں جس کو ایک طرف امانتِ الٰہیہ کا حامل اور دوسری طرف ظلوم و جہول کہا گیا ہے۔ انسان کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سی امانت ہے جس کا حامل اس کو قرار دیا گیا ہے۔ انسان کے تخلیقی خمیر اور سرشت میں دو چیزوں کو دخل ہے جسم اور روح۔ پاک و خبیث اور نورانیت یا جہالت اور علم یا نابینائی اور بینائی یا مادیت و تجرد۔ الفاظ بہت ہیں۔ مطلب سب کا تقریباً ایک ہی ہے۔ ہم دونوں حصوں کی کسی قدر تنقیح کرتے ہیں۔ (١) انسان کی جسمانی ساخت میں کیا اجزاء اور کیا خصوصیات ہیں؟ ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے اجزاء اولیہ وہی عناصر ہیں جو ہیئتِ ترکیبی قبول کر لینے کے بعد گیس یعنی بخارات اور دخان کے نام سے موسوم ہوئے تھے۔ فضائی ہمہ گیریات اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ آدمی کی جسمانی ساخت میں موجود ہیں۔ ان کی کثافت بجلی کی لطافت، مینھ کی طغیانی، ہوا کی روانی، برف کی خنکی، اولے کی گلاوٹ، صاعقہ کی تڑپ اور شبنم کی تراوٹ سب کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ آگے بڑھ کر دیکھئے تو تمام ارضیات اور معدنی پیداوار اپنی تمام خوبیوں، خاصیتوں اور کیفیتوں کو لئے ہوئے انسانی ساخت میں داخل ہیں۔ سونے کی آب و تاب لوہے کی طاقت، چونے کی کھرکھراہٹ، گندھک کی تیزابیت غرض معدنیت کے تمام اعلیٰ اقسام کچھ نہ طاقتوں کے ساتھ انسانی جسم کے قوام میں داخل ہیں۔ نباتی دنیا پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنس نبات کے تمام لوازم کا انسانی جسم حامل ہے۔ روئیدگی، بالیدگی، غذا اندوزی، تن پروری، بارآوری، تخم آفرینی اور نسل کشی ہر آدمی کی ساخت میں موجود ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر حیوانی شعور، ارادہ، احساس، واقفیت، جذبات رغبت و نفرت، خوف و امید، سکون و حرکت، غرض حیوانی دور کی ہر کیفیت کا مالک انسانی جسم نظر آتا ہے۔ دانت آنت، ہڈی پٹھا، خون، گوشت، کھال، بال، دل، جگر، معدہ، دماغ، چہرہ مہرہ ہر چیز کو انسانی ساخت عطا کی گئی ہے۔ خوشی، رنج، دکھ، سکھ، جفاکشی آرام طلبی، خواب و بیداری، گرسنگی، سیری، ہستی اور سستی ہر کیفیت کا حامل انسانی قوام ہے۔ سماوی کائنات کی بھی کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کا انسان مالک نہ ہو۔ جذب و انجذاب، تاثیر و تاثر، فعل و انفعال، ہبوط و صعود، ترقی و انحطاط، عروج و زوال ہر چیز کا مظہر آدمی کا بدن اگر آسمانوں، ستاروں اور سیاروں کو بے جان کرہ نہ مانا جائے اور ان میں نفوس شاعرہ اور ارادی قوتیں تسلیم کر لی جائیں تب بھی آدمی کی جسمانی ساخت ان سے پیچھے نہیں۔ اس کے اندر بھی محرکات ہیں، متحرکات ہیں، فاعلی قوتیں ہیں۔ انفعالی طاقتیں ہیں، پورا ارادہ ہے، شعور ہے، تمیز اور اختیار ہے۔ غرض اشتراکی طور پر وہ سب کچھ ہے جو عالمِ بالا کو حاصل ہے (٢) آدمی کی جسمانی ساخت کی تنقیح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ فرش سے عرش تک اور ذرہ سے آفتاب تک کل مادی کائنات کو جس قدر تعلق مادہ اور مادہ کے لوازم اور مادہ کی خصوصیات سے ہے اُس سے کم انسان کی جسمانی ساخت کو بھی نہیں ہے۔ جو کچھ سارے مادی عالم کو ملا ہے وہ ہی انسان کو مادی اعتبار سے ملا ہے، لیکن ہر شئی کے اندر ایک روح فاعل کارفرما ہے اور اس روح کے تصرفات کی ایک خاص حد ہے۔ اس کے علم اور اختیار کا بھی مخصوص دائرہ ہے۔ مثلاً تمام معدنیات کے اندر ایک ایسی پوشیدہ قوت ہے جو جسمانی اجزاء کو شکست و ریخت اور تحلیل و پراگندگی سے اقتضاءِ طبع کی حد کے اندر روکے رکھتی ہے

خاص تک محفوظ رکھتی ہے۔ یا سبزہ کے اندر ایک مخفی طاقت ہے جس کا کام علاوہ حفظ ترکیب کے نشو و نمو بھی ہے۔ اسی طرح جانوروں میں تحفظ ذات اور نشو و نمو کے علاوہ احساس، ارادہ اور شعور کی طاقت بھی ہے اسی پر تمام کائنات کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ پھر ہر چیز کے ترکیبی اجزا میں باہمی ربط و ضبط بغیر واقفیت اور علم کے ناممکن ہے (خواہ اس کو طبعی احتیاج کہو یا اقتضائے طبیعت یا اور کچھ) یاد رکھو کہ تمام کائنات کی ساری انواع اور ہر نوع کے کل افراد کے ہر جز میں علم ہے، مگر اتنا کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے اور فرد یا نوع کے اقتضاء کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں تک کہ فرشتوں کو بھی (جو مادہ اور مادیات سے پاک ہیں) معرفت عامہ اور ہمہ گیر علم اور عمومی اختیار میسر نہیں، مگر انسان کی علمی، روحانی، نورانی، لطیف، کشفی حیثیت سب سے الگ ہے، سب سے ممتاز ہے اور سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کے اندر بھی پوشیدہ علمی اور عملی قوتیں کارفرما ہیں، لیکن ان کا دائرہ علم و عمل محدود نہیں۔ اس کا تصور بلند پرواز اتنا ہے کہ منٹ کے ہزارویں حصہ میں عرش بریں کے اوپر پہنچتا ہے۔ اس کی قوت عمل اتنی ہمہ گیر ہے کہ زمین کے طبقات کو پہاڑوں کی جڑوں کو اور سمندروں کی اندرونی تہ کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ریگستان کے ذروں اور درختوں کی پتیوں کو شمار کر لیتا ہے۔ رات کو دن اور دن کو رات بنا دیتا ہے۔ انسانی دماغ کی کرشمہ سازیاں اور اعجوبہ نمائیاں ناقابل بیان ہیں۔ لاکھوں بوٹیوں اور جڑوں اور پتیوں کے خواص اور راز ان کو دریافت کرنا، ہوا اور پانی کے دباؤ کو معلوم کرنا ہر چیز کی کہرائی میں اتی لہروں کو سمجھنا اور ان کی مقدار کو جاننا حیات بخش اور ہلاکت بار چیزوں کی تنقیح کرنی، طبعیات، ریاضیات اور فلکیات کا کامل انکشاف کرنا اور زمین پر رہتے ہوئے ہر کرہ کی سیر کرنی انسان کے علم جزئی کا ادنیٰ مظاہرہ ہے۔ پھر ان علوم جزئیہ سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے علم مجرد کے دائرہ میں قدم رکھنا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر افعال اور صفات کے مدارج طے کر کے ذات الٰہیہ تک پہنچنا اور نور کے حجابوں کو پھاڑنا اس کی روحانی، عقلی، علمی طاقت کا نتیجہ ہے۔ یہ بات نہ فرشتوں کو میسر ہوئی نہ کسی دوسری مخلوق کو۔ پس انسان ہی قانون فطرت کی شکست کرتا ہے۔ اس کا علم ہمہ گیر ہے، اس کی واقفیت کسبی ہے، اس کی معرفت عمومی اور ترقی پذیر ہے۔ اس کے علمی اور عملی مراتب میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک درجہ کو طے کر کے دوسرے درجہ میں پہنچتا ہے۔ کبھی اوپر چڑھتا ہے کبھی نیچے گرتا ہے۔ نیچے گرتا ہے تو اتنے گہرے پستی کے غار میں پہنچ جاتا ہے جو ادنیٰ ترین کیڑے کے درجے سے بھی ذلیل ہوتا ہے اور اوپر چڑھتا ہے تو اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ جبرئیل کی بھی وہاں رسائی نہیں ہوتی۔ اس کو غور و خوض کرنے کی طاقت دی گئی ہے۔ اس کے اندر استنباط کلیات کی طاقت ہے۔ یہ جزئی کو جزئی پر قیاس کر سکتا ہے۔ یہ استقراء اور تلاش جزئیات سے کبھی قاصر نہیں ہے۔ غرض علم کی اکتسابی ترقی، عمومی معرفت، حقائق کائنات کا انکشاف، دوسری کائنات سے اپنے تعلق کی شناخت اور اس کا اندازہ اور اختیار کی ہمہ گیری انسان ہی حقائق کا انکشاف کر سکا اور معرفت کے تمام درجات طے کر کے حقیقت الٰہیہ کے چہرۂ نور کے حجاب اٹھا کر اس کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ علی الاعلان رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ کہنے لگتا ہے اور جب ادھر سے لَنۡ تَرٰىنِیۡ کی آواز آتی ہے تو پھر لوٹ کر نور الٰہی کو نور ہی کی حقیقت میں دیکھ کر خودی کو کھو کر مدہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ انسان ہی عرش بریں سے گزر کر لامکان میں پہنچ کر قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی کے علمی تخت پر جا کر بیٹھتا ہے اور اس وقت فرشتوں کو قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی حقیقت کھلتی ہے۔ پھر علمی ہمہ گیری، عمومی معرفت اور غیر محدود اختیار پر ہی یہ قناعت نہیں کرتا بلکہ علم کی دنیا سے بھی اوپر محبت کی دنیا کو بساتا ہے۔ جذب شوق اور غلبہ عشق اور درد محبت سے مجبور ہو کر علم و معرفت کی تمام منزلوں اور نشانوں کو مٹا کر خودی کو خدائی میں اور خدائی کو خودی میں ادغام کر دیتا ہے اور دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں چھوڑتا، لیکن ہر آدمی ایسا نہیں کرتا۔ اکثر آدمی اپنی فطرت، عزت، کرامت اور وسعت معرفت سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ اپنی شرافت اور فضیلت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ فطری اقتضاء کو برباد کر کے اور سرشتی قابلیت کو مٹا کے محض ناواقف اور عملی حیثیت سے ناحق کوش ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ندا آتی ہے کہ اے انسان تو ناحق کوش ہے۔ اپنے امتیاز، اعزاز اور فضیلت کے موافق کام نہیں کرتا۔ تو نادان ہے۔ تجھے اپنی وسعت علمی فراموش ہو گئی۔ بلاشبہ تو ظلوم و جہول ہے۔ واللّٰہ اعلم وعلمہ اتم۔ ہذا ما عندی والمقام مزلۃ الاقدام۔

تحلیل اجزا

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا۔ تشریح آیت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امانت کے متعلق تنقیح کر دی جائے جس کو آسمان و زمین نے اٹھانے سے ڈر کر انکار کر دیا تھا۔ انسان نے اپنی نادانی اور ناحق کوشی کے سبب اس کو اٹھا لیا۔

اہل تفسیر نے اس کے متعلق بہت کچھ قیل و قال کی ہے۔ ہم ابن کثیر، حقانی، خازن، بیضاوی، نیشاپوری اور بعض دوسری تفسیروں سے بطور خلاصہ کسی قدر

نقل کرتے ہیں:

بروایت عوفی ابن عباسؓ کا قول ہے کہ امانت سے مراد طاعت ہے۔ مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک، حسن بصری اور بعض دوسرے تابعین کا بھی یہی قول ہے کہ اس سے مراد ان فرائض کا ادا کرنا ہے جن کے بجالانے اور ادا کرنے پر ثواب اور ترک کرنے یا خیانت کرنے پر عذاب ہے۔ بقول قرطبی جمہور کا یہی قول ہے۔ پھر ادائے فرائض کو بنظرِ اہمیت مختلف اقوال میں امانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ پنجگانہ نماز پڑھنی، زکوٰۃ دینی، روزہ رکھنا، حج کرنا، سچ بولنا، قرض ادا کر دینا، انصاف کرنا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا یہ سب امانتِ الٰہی ہے۔ ابوالعالیہ نے فرمایا اموراتِ کو ادا کرنا اور ممنوعات سے باز رہنا امانت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے فرمایا شرم گاہ امانت ہے، کان امانت ہیں، آنکھیں امانت ہیں، زبان امانت ہے، پیٹ امانت ہے، ہاتھ پاؤں امانت ہیں۔ درحقیقت یہ تمام اقوال ادائے فرائض اور طاعت کی تفاصیل ہیں۔

ان اقوال کی بنا پر برداشت امانت سے ساری کائنات کا انکار اور انسان کا اقرار یہ معنی رکھتا ہے کہ آسمان وزمین کو ان فرائض کے ادا کرنے پر مامور نہیں کیا۔ ان میں افعالِ اختیاری کے بجالانے کا مادہ نہ تھا۔ یہ مادہ نہ ہونا زبانِ حال سے گویا اس کی ذمہ داری سے انکار کر دینا ہے اور انسان میں اس کا مادہ نہ ہونا گویا اقرار کرنا ہے اور یہ اقرار گویا اس کے مادہ کی وجہ سے ہوا کہ جس میں شہوانیہ اور غضبیہ قوتیں بھی ہیں جو ظلم اور جہالت کی جڑ ہیں۔ بیضاوی اور نیشاپوری نے لکھا ہے کہ اطاعت جو بندوں پر فرض ہوئی چونکہ وہ واجب الاداء ہے، اس لئے اس کو امانت کہا گیا۔ گویا یہ معنی ہوئے کہ طاعت وعبادت چونکہ عظیم الشان تھی اس لئے اگر آسمان وزمین ایسے بھاری اجسام پر بھی ڈالی جاتی اور ان کو عقل وشعور ہوتا تو وہ ان کے اٹھانے سے انکار کرتے اور ڈر جاتے۔ کیونکہ عبادت وطاعت ایک تکلیف ہے اور خلاف طبیعت کام پر مامور ہونے میں تکلیف ہوتی ہے۔ پس اس قسم کی تکلیف اٹھانے کی طاقت آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں میں نہیں ہے، اس لئے کہ آسمانوں سے خلاف طبیعت کام مثلاً نیچے کو اترنا اور زمین سے اوپر کو چڑھنا اور پہاڑوں کا ذاتی حرکت کرنا ہو نہیں سکتا۔ جس کام پر قضا وقدر نے ان کو لگا دیا ہے اسی پر لگے ہوئے ہیں، لیکن باوجود ضعیف البنیان ہونے کے انسان نے اس کو ٹھیک اٹھا لیا۔ پس جو اس کو بجا لایا امانت ادا کر دی اور دارین میں فلاح پائی اور جس نے اس کو ادا نہ کیا وہ ظلوم وجہول ہے پس امانت کو پیش کرنے اور کائنات کو اٹھانے سے انکار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان اجسام میں اس کی قابلیت اور صلاحیت ہی نہیں ہے۔ گویا کلام حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ ایک تصویر اور تمثیل ہے۔ انسان کی حالت اور اس کی ہیئت تکلیفیہ کو ایک حالت مفروضہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اگر وہ تکلیف ان اجرام پر پیش کی جاتی تو اس سے انکار کر بیٹھتے۔

بعض کا قول ہے کہ امانت سے مراد وہ فطری استعداد ہے جو ہر ایک مخلوق کو تخلیقی طور پر عطا کی گئی ہے اور امانت کو اٹھانے سے مراد ہے امانت میں خیانت کرنا اس کو ادا نہ کرنا۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ تمام مخلوق کو خدا تعالیٰ نے فطری استعداد عطا کی اور سب نے اس استعداد کے موافق احکامِ الٰہی کی تعمیل کی، مگر انسان نے فطرت شکنی کی اور تخلیقی استعداد کے موافق حکمِ الٰہی کی تعمیل نہ کی، اسی لئے وہ ظلوم یعنی بڑا ناحق شناس اور ناحق کوش اور بڑا نادان یعنی مقتضائے فطرت سے ناواقف ٹھہرا دیا۔ یوں کہو کہ انسان ظلوم ہے یعنی فطری استعداد کو بے محل صرف کرنے والا اور جہول ہے یعنی فطری استعداد کے بے محل صرف کرنے کے برے نتیجے کو نہ جاننے والا۔ بہرحال آخر الذکر مطلب صحیح مانا جائے یا بیضاوی اور نیشاپوری کی توضیح کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا اول الذکر قول کی طرف میلان کیا جائے۔ الانسان سے مراد ہر صورت منافق، کافر اور فاسق ہیں، انبیاء، اولیاء، صلحاء اور مخلص مومن مراد نہیں ہیں کیونکہ یہ گروہ فرماں بردار اطاعت شعار، اقتضائے فطرت کو سمجھنے والا اور تخلیقی استعداد کو برمحل صرف کرنے والا ہے۔ نیشاپوری اور بیضاوی رحمہم اللہ نے یہی صراحت کی ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے۔

ایک مفسر نے اس جگہ کسی قدر تفصیلی توضیح کی ہے لکھا ہے کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ عالم علوی سے لے کر سفلی تک ذرہ سے آفتاب تک اسی کے ہاتھ کی کاریگری ہے اسی کے جمال جہاں آرا کا آئینہ ہے۔ اس نے اس عالم میں کسی چیز کو بیکار پیدا نہیں کیا ہر ایک شئی کو اپنی ایک صفت کا مظہر بنایا اور ہر ایک کو ایک خاص کام پر لگایا ہے۔ یہ نظامِ عالم اس بات کا مقتضی تھا کہ اس میں ایک شخص ایسا بھی ہو جو تمام عالم کا مجموعہ بن کر خدا تعالیٰ کی جمیع صفات کا مظہر اور اس کے جمال باکمال کا کامل آئینہ صافی ہو جائے۔ پس وہ حضرت آدم ہیں۔ اسی لئے صحیح بخاری میں ایک حدیث آئی ہے کہ ان اللہ خلق آدم علی صورتہ اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ صورت سے مراد سیرت ہے اور اس معنی میں یہ لفظ زبان عرب اور ان کے اسلوب کلام میں بہت وارد ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ صورت وشکل سے پاک ہے۔ آیات تنزیہات اس بات کی صاف گواہی دے رہی ہیں اور اس لئے قرآن مجید میں جیسا کہ آیاتِ الٰہیہ کے ملاحظہ کے لئے آفاق کے صحیفہ کے مطالعہ

ہر ایک طرح کا حکم دیا ہے اسی طرح انسان کو اپنے نفس میں غور و تامل کرنے کا حکم دیا ہے اور انہی معنی سے انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ یہی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آدم میں
کی قوت ودیعت رکھی ہے۔ قوت ادراکیہ، قوت غضبیہ، قوت شہوانیہ وغیرہا اور ان قویٰ کی ترکیب اور ان کی اصلاح سے اس میں وہ صفات پیدا ہوئے کہ جو
نہ آسمان و زمین کو حاصل ہیں نہ جن کو نہ فرشتہ کو۔ منجملہ ان کے ایک درد دل اور محبت اور جذب ہے جو کسی میں نہیں۔ یہی سوز نہانی ہے جو شب بیداروں کو رات
بھر جگاتا اور صبح کو سجدہ میں سر رکھوا کر پھوٹ پھوٹ کر رلاتا ہے اور اسی لئے شیطان نے ایک گناہ کیا تو شانہ گیا۔ برخلاف آدمؑ کے کہ اس قدر عبادت الٰہی نہ کی تھی
جو سر کو فرشتوں کا مسجود بنایا گیا، دارالقرار میں بسایا گیا۔ ان انعامات پر گناہ کر لیا جس کی جس قدر سزا ہوتی تھوڑی ہوتی اور ابد تک بخشش نہ ہوتی تو بجا تھا، مگر ان
کے درد دل نے سبب اس کو جوش دلایا اور ابر کی طرح رلایا اور منہ سے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ہ نکلوایا
تو فوراً دریائے رحمت جوش میں آیا۔ ایک گناہ تو کیا اگر ایسے ہزار گناہ ہوتے اور زمین بھر کے ہوتے تو سب معاف ہو جاتے۔ شعر:

واہ رے شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک   استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

ملائکہ نے صرف قوت غضبیہ اور شہوانیہ پر نظر کر کے بارگاہ کبریائی میں عرض کیا تھا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کیونکہ اس مجموعۂ خوبی و گلدستۂ محبوبی کے اسرار
کی خبر نہ تھی۔ جواب ملا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ پس وہ امانت الٰہی یہی درد دل ہے اور یہی اس کے قویٰ مودع ہیں جن کے
قابل نہ آسمان و زمین تھے نہ مجرد شجر نہ کوئی اور۔ اسی کو ازل میں سب کے سامنے کر کے دکھایا گیا کہ کون ہے جو ہماری اس امانت کو لیتا ہے۔ پھر کسی میں کیا قابلیت تھی
جو اس کو لیتا اور اس بار گراں کو اٹھاتا۔ یہ خلیفۃ اللہ ہی کے حصہ میں آیا۔ اسی نے اس کو اٹھایا اور کیوں نہ اٹھاتا یہ اسی لئے پیدا ہوا تھا۔ سب سے اول اسی نے
سر جھکایا اور عرض کیا مجھے دیجئے۔ آپ دیں اور میں لوں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ ملائکہ اور دیگر لوگوں پر تعریض ہے کہ یہ وہی ہے جس کو تم جاہل و ظالم سمجھتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے بار گراں کو اٹھانا
اور اس بلا و محنت کا گلے میں ڈالنا دانشمند اور دور اندیش سے کب ہو سکتا ہے ایسے ہی لوگوں کا کام ہے جو اپنی جان پر مصیبت گوارا کر لیں اور دور اندیشی نہ کریں ؎

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں   ما نمی خواہیم ننگ و نام را

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ حضور گرامیؐ نے ارشاد فرمایا جب تجھ میں چار باتیں ہوں تو دنیا میں کوئی چیز بھی تجھ سے جاتی رہے کچھ حرج نہیں ہے۔
حفظ امانت، صدق گفتار، حسن اخلاق، پاک طعام (رواہ احمد وقد رواہ الطبرانی ولکن جعلہ من حدیث عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ) حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ حضور
اقدسؐ نے ہم سے دو حدیثیں ارشاد فرمائی تھیں ایک تو یہ فرمایا تھا کہ امانت کا نزول مردوں کے دلوں کے وسط میں ہوا پھر قرآن اترا۔ لوگوں نے قرآن اور سنت سے
(امانت کو) جان لیا (لیکن یہ امانت اٹھالی جائے گی) آدمی ایک نیند سو کر اٹھے گا کہ امانت اس کے دل سے اٹھالی جائے گی صرف اتنا اثر رہ جائے گا جیسے پاؤں
پر چنگاری پڑ کر ڈھلک جانے سے پھولا پڑ کر رہ جاتا ہے اور اٹھا ہوا دکھتا ہے۔ حالانکہ اس میں کچھ نہیں ہوتا۔ لوگوں کا یہ حال ہو گا کہ صبح کو آپس میں خرید و فروخت
کریں گے، لیکن کوئی امانت کو ادا کرنے والا نظر نہ آئے گا۔ یہاں تک کہ مثال کے طور پر کہا جائے گا کہ فلاں شخص فلاں قوم میں بڑا امانت دار ہے (قد اختصرناہ من
روایۃ احمد والبخاری ومسلم) اسلام سے پہلے لوگ امانت کی قسم کھایا کرتے تھے، مگر اسلام میں اس کی ممانعت کر دی گئی۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے حضورؐ نے
فرمایا جس نے امانت کی قسم کھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے (رواہ ابوداؤد) سلمہ بن سہیم کہتے ہیں میں زیاد بن حدیر کے ساتھ جمعہ سے چلا، دوران گفتگو میں نے
امانت کی قسم کھائی۔ زیاد خوب روئے۔ میں سمجھا مجھ سے کوئی بڑا گناہ ہو گیا، اس لئے عرض کیا کیا یہ امر مکروہ ہے؟ فرمایا ہاں۔ حضرت عمر بن خطابؓ امانت کی قسم
کھانے سے سخت منع کرتے تھے (رواہ ابن المبارک فی کتاب الزہد) میرے نزدیک جو امانت کے متعلق صحیح تنقیح تھی وہ تفسیری مقالہ میں گزر چکی۔ اس لئے اس جگہ تکرار
لا حاصل ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا
یہ نتیجہ ہے کلام سابق کا اور اصل غرض ہے عطاء امانت کی۔ حاصل کلام یہ نکلا کہ اللہ نے انسان کو امانت سپرد کی اس نے نادانی کے سبب اس کو اٹھا لیا۔
یہ عطائے امانت درحقیقت ایک آزمائش تھی فرماں بردار اور نافرمان کی۔ ایک امتحان [illegible] کا۔ اس سے مقصود موحد و مشرک اور مومن و کافر کا امتیاز

تھا۔ بس یہ غرض پوری ہوگئی۔ اہل شرک ونفاق نے تو اس امانت میں خیانت کی۔ نہ رسول خدا کو پہچانا، قرآن کو جھٹلایا، اللہ سے بدعہدی کی نتیجہ میں عذاب میں گرفتار ہوئے۔ اس گروہ کے خلاف اہل ایمان نے اس امانت کو ادا کیا جہاں تک ان کے دلوں کے اندر حق اور قرآن نے اور اللہ کے رسول نے اس کی توضیح کی تھی۔ ظلم وجہالت سے اس کی خیانت نہ کی۔ اللہ نے بھی ان کو جزائے خیر دی اور کوششوں کو مشکور فرمایا، ایمان اور خلوص نیت کے بعد اگر ان سے کوئی لغزش بھی ہوگئی تو اللہ نے معاف فرما دی کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔

مقصود بیان امانت الٰہیہ بہت زیادہ عظیم الشان اور وزنی چیز ہے جس کو اٹھانے سے ساری کائنات نے سوا انسان کے انکار کر دیا اور نہ صرف انکار کر دیا بلکہ کل دنیا اس بار گراں کو برداشت کرنے سے خوف زدہ ہوگئی۔ مگر انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ انسان نے یہ کام تو نادانی کا کیا اور بے محل کیا، اس لئے عموماً انسان نادان اور ناحق کوش ٹھہرے۔ مگر جن لوگوں نے اس امانت کو صحیح طور پر ادا کیا یا ادائیگی کی امکانی کوشش کی توان سے بڑھ کر مرتبہ عزت اور فضیلت میں تمام مخلوق میں سے کسی کو نہیں حاصل ہو سکتی۔ کیونکہ ذلت ہو یا عزت بقدر ظرف ہوتی ہے۔ پس اسی بنا پر كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ اور خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اور نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي کا مصداق انسان ہی ٹھہرا اور یہ شرف صرف اسی کو حاصل ہوا۔ آیت لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آغاز تخلیق میں ہی فیصلہ ہو چکا تھا۔ موحد ومشرک اور مخلص ومنافق کی جزا وسزا مقرر کر دی گئی تھی۔ تفصیلی وقوع اس کا اگرچہ بعد کو ہوا، مگر اجمالی حکم پہلے سے دیدیا گیا تھا۔ اللہ کا غفور رحیم ہونا بتا رہا ہے کہ مومن یعنی باعمل مومن یا وہ مومن جس کی نیت خالص اور نیک ہو اللہ کے نزدیک قابل مغفرت ہے۔ اگرچہ اس سے لغزشیں ہو جائیں کیونکہ جب تخلیقی طور پر انسان ظلوم وجہول ٹھہرا تو کامل طور پر حقوق الٰہیہ کو کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا قصور ضرور ہوگا۔ ایسے قصور کو خدا معاف فرمانے والا ہے۔ وغیرہ۔

سُورَةُ السَّبَإِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَخَمْسُونَ آيَةً وَسِتَّةُ رُكُوعَات

سورۂ سبا مکہ میں نازل ہوئی اس میں پچپن آیتیں اور چھ رکوع ہیں

اس سورت میں پچپن ۵۵ یا چھپن ۵۶ آیات آٹھ سو نواسی ۸۸۹ کلمات اور چار ہزار پانچ سو بارہ ۴۵۱۲ حروف ہیں۔ ابن عباس نے سورۂ سبا کو مکہ میں نازل ہونا فرمایا۔ قرطبی نے صراحت کی ہے کہ باتفاق علماء یہ سورت مکی ہے، صرف آیت وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ میں اختلاف ہے۔ یعنی بعض علماء نے اس کو مدنی فرمایا ہے۔ صحیح روایت سے اس کا مدنی ہونا ثابت نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ جن علماء نے اس کو مدنی قرار دیا ہے انہوں نے آیت کی معنویت کا لحاظ کرتے ہوئے مدنی کہا ہو اور چونکہ مکہ میں علمائے اہل کتاب موجود نہ تھے، اس لئے یہ فرمانا کہ اہل علم قرآن کی حقانیت سے واقف ہیں۔ کافروں اور بت پرستوں سے خطاب کے وقت کچھ مناسب نہیں ہے۔ یہ فقرہ تو اہل کتاب کے سامنے کہنا مناسب ہے۔ خطیب نے سراج میں بھی اسی آیت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ ۚ

اسی اللہ کو ہر تعریف زیبا ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اسی کا ہے اسی کو آخرت میں تعریف زیبا ہے

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ

وہ حکمت والا باخبر ہے جو چیز زمین داخل ہوتی ہے اور جو چیز اس سے نکلتی ہے اور جو چیز آسمان سے اترتی

السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا

ہے اور جو چیز اس پر چڑھتی ہے اسکو وہ جانتا ہے وہی مہربان اور بخشنے والا ہے کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں

السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ

آئے گی تم کہدو کیوں نہ آئے گی قسم ہے اپنے رب کی جو عالم الغیب ہے تم پر وہ ضرور آئے گی ذرہ برابر کوئی چیز اس سے نہ آسمانوں

فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ

میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی بڑی کوئی چیز ہے کہ روشن کتاب میں

مُبِينٍ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ

نہ ہو (مقصد یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اُن کو صلہ دے یہی وہی ہیں جن کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی

كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ أَلِيمٌ ۝ وَيَرَى

ہے اور جن لوگوں نے ہرانے کے لئے ہماری آیتوں میں دوڑ لگائی اُن کے لئے دکھ دینے والا مصیبت کا عذاب ہے جن لوگوں

الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اور خدائے غالب مستحق حمد کا راستہ بتاتا ہے

تفسیر اسلام کا اصل مقصد اصلاحِ اعمال ہے۔ انسانی زندگی کو شستہ بناتا ہے، اسبابِ تخریب کو دور کرکے سطحِ زمین کو امن عافیت اور چین سے معمور کرتا ہے اور ہر قسم کی دراز دستیوں سے انسان کو روکتا ہے، لیکن عملی زندگی کی اصلاح، عقائد اور نظریات کی درستگی کے بغیر ناممکن ہے جسمانی اعمال اور تمام اعضاء کی حرکات افکار و خیالات کے تابع ہیں علت کے بغیر معلول کا وجود اور مبادی کے بغیر نتائج کا ظہور محال ہے۔ پس اصلاح اعمال کے ضوابط و قوانین کو جاننے اور عمل پیرا ہونے سے پہلے دو باتوں کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے (۱) قانون بنانے والا فاعل، مختار، قادرِ مطلق، خلاق، برتر، مالک کل اور مصالح عالم سے واقف ہے۔ آسمان و زمین اور سماوی ارضی کائنات اور ساری کائنات کا ہر سکون و حرکت اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ ہر چیز مخلوق ہے اور وہ خالق۔ ہر چیز مقدور ہے اور وہ قادر، ہر چیز مملوک ہے اور وہ مالک اور عالم کون کے ذرہ ذرہ میں اسی کی حکمت سرایت کئے ہوئے ہے۔ (۲) انسانی زندگی بیکار نہیں اس کا کوئی سکون و حرکت رائگاں اور بے ثمر نہیں۔ تمام اعمال کی جزا سزا لازم ہے۔ اس زندگی میں جیسا کوئی کرے گا آئندہ زندگی میں ویسا ہی بھرے گا۔ نیکوں کو نجات و کامرانی اور بدوں کو ہلاکت و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ صلاح کار انسان رزق کریم کا مالک ہوگا اور بدکار آدمی کو عذاب ابدی گھیرے گا۔ مگر یاد رکھو کہ تعزیری قول اور تشدد انگیز وعیدیں اور سزا کی دھمکیاں ظاہری قانون شکنی کو روک سکتی ہیں۔ کل زندگی کی اصلاح نہیں کر سکتیں کھلم کھلا اور ظاہری طور پر بدکرداری سے آدمی اس حد سے رک سکتا ہے کہ جزا سزا کا مختار اس بدکرداری سے واقف ہو جائے گا تو تکلیف دہ سزا دے گا۔ لیکن انسانی زندگی صرف ظاہری اعمال ہی کا نام نہیں بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ظاہری اعمال کا سرچشمہ باطنی حرکات اور اندرونی دواعی ہیں۔ گویا زندگی نام ہے باطنی حرکات محض اعمال اور پوشیدہ حرکات کا۔ پس جب تک باطنی اعمال کی اصلاح کی تدبیر نہ کی جائے اس وقت تک پوری زندگی کا شستہ ہونا محال ہے۔ تم روزانہ دیکھتے ہو کہ چوری، کھلی بے ایمانی، فریب دہی، غارت گری، سفاکی، خونریزی اور دوسرے ظاہری جرائم سے پولیس کا خوف، قانونی تعزیر کا اندیشہ، پڑوسی

کی جاسوسی اور چوکیدار کی آنکھیں آدمی کو روک دیتی ہیں، مگر بدنیتی، محض جھوٹ، اندرونی مکر اور باطنی خباثت سے چونکہ کوئی واقف نہیں ہوتا اور نہ کسی کے واقف ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس لئے کوئی قانون بھی باز داشت نہیں کرسکتا، اس لئے اگر کل خرابیاں، ساری بدکاریاں، تمام ستم زائیاں اور بے ایمانیاں انسانی زندگی سے دور کرنی چاہیں تو لازمی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری نشست برخاست، رفتار گفتار، بیداری خواب جسمانی، قلبی خطرات غرض تمام آثار حیات سے جزا دینے والا واقف ہے۔ اس سے ہمارا کوئی عمل، کوئی فعل، کوئی قول اور کوئی نیت پوشیدہ نہیں۔ بلکہ آسمان زمین اور ان سے درآمد برآمد کا تعلق رکھنے والی ہر چیز بلکہ کل کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ عقیدہ انسانی دماغ میں راسخ ہو جائے گا اور رگ میں خون کے ساتھ گشت کرے گا اور ساتھ ہی ساتھ نتائج بد کا قطعی ناقابلِ زوال یقین بھی ہو جائے گا تو پھر کسی طرح کوئی آدمی بدکرداری کی جرأت نہیں کرسکتا اور زندگی کو درست کرنے کی ہر ممکن تدبیر کرنی اس کے لئے لازم ہو جائے گی۔ اور اس طرح ہر شخص اپنی زندگی کو درست کرے گا اور جب ہر شخص انفرادی طور پر اپنی اصلاح کرے گا تو تمام افراد کی اصلاح ہو جائے گی۔ اور سطح زمین امن عافیت اور چین سے بھر جائے گی اور اسلام کا مقصد پورا ہو جاوے گا۔ اصلاح اعمال کا یہ طریقہ عوام کے لئے ہے۔ اہل علم کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی وہ چونکہ واقف ہوتے ہیں کہ قانون کی کتاب عقل اعظم کی بھیجی ہوئی ہے۔ لامحالہ واجب العمل اور صحیح راستہ دکھانے والی ہے۔ سزا جزا کا خوف تو ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ ارباب علم اس سے پہلے ہی قانونِ اصلاح کو برحق سمجھ کر اس پر عمل کرنے لگتے ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ۔ قرآن پاک میں پانچ سورتیں ہیں جن کا آغاز الحمد للہ کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ فاتحہ، انعام، کہف، سبا، ملائکہ۔

حمد کیا ہے؟ اس کی تحقیق چند مرتبہ گزر چکی۔ اللہ اپنی حمد خود کرتا ہے۔ بظاہر یہ بات قابل نکتہ چینی نظر آتی ہے، لیکن واقع میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اول تو ثبوت حمد کے بیان سے مراد ہے۔ استحقاق حمد یعنی ایسی قطعی دلیل بیان کرنی جس سے اللہ کا استحقاق حمد ثابت ہو جائے اور استحقاق حمد کے ثبوت سے الوہیت کا ثابت ہو جانا یقینی ہے۔ پس جس کلام کو حمد سے شروع کیا گیا ہے اس سے اللہ کی الوہیت عامہ اور ہمہ گیر انعام کا اظہار مقصود ہے اور ربوبیت عامہ دلیل ہے الوہیت کی۔ اس طرح توحید کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کلام کو سننے والے حمد کا ثبوت اللہ کے لئے کریں اور خدا ہی کو قابل حمد جانیں۔ اس آیت میں دو جگہ حمد کا ثبوت اللہ کے لئے کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح ساری کائنات کی تخلیق، حکومت اور انتظام موجب حمد ہے اسی طرح اس عالم کو فنا کے بعد دوبارہ تخلیق بھی موجب حمد ہے۔ اگر دوبارہ تخلیق نہ ہوتی تو نیکوکار کی نیکی اور بدکار کی بدی بے ثمر اور لاحاصل ہو جاتی اور تمام افعال انسانی کا بے نتیجہ ہونا ہر قسم کی دراز دستی اور جور و تعدی کی اجازت دے دیتا اور اس طرح عالم کی تخریب ہو جاتی اور حیاتِ انسانی برباد ہو کر رہ جاتی۔ پس جس طرح آسمان، زمین اور ان کی تمام موجودات کی آفرینش، انتظام اور تصرف اور ملکیت اللہ کو مستحق حمد قرار دے رہی ہے۔ یہی جزا سزا کے لئے آخرت کا وجود بھی انسان کے لئے بڑی نعمت ہے اور اس زندگی کو سدھارنے کے لئے اعلیٰ ترین سبب ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو چیز بھی آسمانوں میں ہے یعنی خود آسمان ہوں یا ستارے یا ملائکہ یا آسمانی تاثیرات یا عالم ارواح وغیرہ اور جو کچھ زمین میں ہے یعنی مٹی، ہوا، پانی، آگ اور ان کے اختلاط سے بنی ہوئی کل مخلوقات سب اللہ کے زیر تخلیق، زیر تصرف، زیر حکم، زیر ملکیت، زیر حکمت اور زیر اختیار ہے۔ کوئی چیز سرتابی نہیں کر سکتی۔

وَهُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ زہری نے اس فقرہ کی تفسیر میں کہا کہ اللہ اپنے امر کا حکیم اور خلق سے باخبر ہے (رواہ مالک) میں کہتا ہوں کہ چونکہ آیت میں کوئی صراحت یا قرینہ ایسا نہیں جس سے زہری کی تفسیر اخذ کی جا سکے۔ نہ کوئی حدیث اس قسم کی آئی ہے، اس لئے یہ تفسیر بالرائے ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔ حقیقت حکیم اور خبیر کے مفہوم کی طرف توجہ نہ کی گئی۔ حکمت کا تعلق حقائق اور کلیات سے ہے اور خبر کا تعلق جزئیات یا یوں کہو کہ حکمت ذاتی طور پر بلاواسطہ واقفیت کا نام ہے اور خبر اس اطلاع کو کہتے ہیں جو کسی ذریعہ سے حاصل ہوئی ہو۔ پس اول صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تمام حقائق عامہ اور جزئیات خاصہ سے واقف ہے۔ دوسری تشریح پر اس طرف اشارہ ہوگا کہ اللہ کا حضوری ذاتی کشفی علم ہمہ گیر ہے۔ وہ علیم ہے، لیکن اس کے پاس ایسے ذرائع وسائط اور کارکن بھی ہیں جو تمام کائنات کی اطلاع اس کو دیتے ہیں۔ اگرچہ اس کو اطلاع کی ضرورت نہیں مگر کارخانۂ قدرت ہی اس طرح جاری ہے کہ ملائکہ اور غیبی مخلوق اپنی مفوضہ خدمت کو سرانجام دیتی رہتی ہیں۔ عالم امر ہو یا عالم خلق، مجردات ہوں یا مادیات، روحانیات اور عالم بالا کے رہنے والے ہوں یا خلقیات اور زیریں دنیا کے ساکن۔ سب کو اس کا علمی دائرہ سمیٹے ہے۔ ان دونوں لفظوں کی تشریح آئندہ آیت میں مذکور رہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا۔ یعنی زمین کے اندر داخل ہونے والی اور زمین سے خارج ہونے والی ہر چیز سے اللہ واقف ہے، کیڑے مکوڑے، ہر قسم کا بیج، بارش کی بوندیں، دھوپ، روشنی اور ہر قسم کی تاثیر، ہوا، حرارت، و مختلف کیفیات ہر چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے کتنی داخل ہوتی ہے، کیسے داخل ہوتی ہے، کس طرح داخل ہوتی ہے، کتنی داخل ہوتی ہے، کیسے داخل ہوتی ہے، کہاں داخل ہوتی ہے، کیوں داخل ہوتی ہے داخل ہونے سے کیا نتائج تفصیلی پیدا ہوتے ہیں۔ بے سوا خدا کے کون جانے۔ اس طرح کیڑے مکوڑے، جواہر، معدنیات، ابلتا ہوا پانی، بخارات، سبزہ درخت، کھیتی، ہر قسم کی گرمی سردی کا اثر سب کچھ زمین سے نکلتا ہے، لیکن کیفیت، کمیت، نوعیت، خاصیت اور تمام خصوصیات و عوارض سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔

وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا۔ آسمان سے جو کچھ اترتا ہے فرشتے وحی کتاب، انتظام عالم کے احکام یہاں تک کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ظہور پیدائش، پرورش، ترقی، تنزل اور رضا کے متعلق جزئی جزئی فرمان سب کو اللہ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح ہر جو چیز آسمان پر چڑھتی ہے مثلاً فرشتے، بندوں کے اچھے برے اعمال وغیرہ ان کا بھی خدا ہی کو علم ہے۔

وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ۔ اور ظاہر ہے کہ انسان دانستہ یا نادانستہ قانون فطرت اور حکم فطرت سے سرکشی کرتا رہتا ہے تخریب عالم کی کوشش کرتا ہے۔ امانت الٰہیہ کو ادا نہیں کرتا۔ فرمان خداوندی سے کھلم کھلا بغاوت پر کمربستہ رہتا ہے، مگر پھر بھی اللہ اپنی رحمت کے دروازے اس کے لئے کھولے رکھتا ہے۔ تمام کائنات کو اس کی حیات کو برقرار رکھنے کے لئے ہر وقت مصروف رکھتا ہے۔ رزق، صحت، عزت، حکومت اور طاقت عطا کرنے میں انسانی بداعمالی سبب کبھی نہیں کرتا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ گناہ کی طرف ہر قدم اٹھانے اور ہر حرکت کرنے کے وقت پاداش اور سزا کی رسی کھینچ لیتا اور اتنی مضبوط گرفت کرتا کہ گناہ گار انسان پھڑپھڑا کر تڑپ تڑپ کر جان توڑ دیتا و گلو خاصی نہ ہوتی، مگر خدا پردہ پوش ہے، مہربان ہے۔ اس کی مہربانی اور درگزر کو انسانی بدکرداری نہیں روکتی۔ پس تمام عالم کا مطیع فرمان ہونا اور سارے تغیرات و حوادث کا ظہور پذیر ہونا صاف بتا رہا ہے کہ ہر دم اور ہر قدم پر ہر چیز میں قیامت برپا ہے لیکن:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ۔ جن لوگوں کے دماغوں پر جہالت کے پردے پڑے ہیں جن کا نور عقل وہم کی تاریکی میں چھپا ہوا ہے جو منکر قدرت اور کافر نعمت ہیں جو اللہ کی ربوبیت تامہ اور الوہیت عامہ سے ناواقف ہیں۔ جو منکر ہیں نہیں کفر سے کام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمومی انقلاب محال ہے، عام تغیر ناممکن ہے قیامت نہیں آئے گی۔

قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ۔ ان سے کہدو کہ خدا کی قسم ضرور بالضرور تم پر قیامت بپا ہو گی۔ شیخ ابن کثیر نے کہا کہ وقوع قیامت کو قسم کے ساتھ مؤکد کر کے سارے قرآن کے اندر صرف تین مقامات پر بیان کیا ہے۔ ایک تو اسی آیت میں دوسرے سورۂ یونس کی آیت میں قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ میں تیسرے سورۂ تغابن کی آیت قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ میں پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ تینوں آیتوں میں لفظ رَبّ کی ہی قسم کھائی ہے۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ قیامت بھی ایک نعمت اور رحمت ہے۔ اگرچہ اکثر انسانوں نے اپنی بداعمالی سبب اس کو زحمت اور وبال بنا رکھا ہے، لیکن عقل اور برہان قیامت کو ربوبیت عامہ کا ایک مظاہرہ اور عطوفت تامہ کا ایک اثر ثابت کرتی ہے، اس لئے ایسے موقعہ پر لفظ رَبّ ہی مناسب تھا۔ وقوع قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہ کیا جاتا تھا اور اب بھی کیا جاتا ہے کہ جب انسانی ذرات پراگندہ ہو گئے مٹی کے ذرے مٹی میں مٹی۔ ہوا کے ہوا میں، پانی کے پانی میں اور آگ کے آگ میں جا ملے تو پھر اب کس کو معلوم ہو کہ جسم انسانی کا کون سا ذرہ کہاں گیا اور بغیر علم کے سب کو صحیح طور پر جمع کرنا محال ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے:

عَالِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ۔
خدا عالم الغیب ہے۔ ہر چھپی چیز سے واقف ہے۔ مخلوق کی نظر و عقل سے جو چیز مخفی ہے اللہ اس کو جانتا ہے۔ بالائی کائنات ہو یا زیریں کوئی ذرہ برابر اور ذرہ سے چھوٹی بڑی چیز اس کی علمی کتاب سے خارج نہیں۔ اس کی کتاب العلم خود بھی روشن ہے اور ہر چیز کو ظاہر کرنے والی بھی ہے۔ پس انسان کے پراگندہ اجزا اور پریشان ذرات بھی اس کے احاطۂ علمی سے خارج نہیں ہو سکتے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔ لیکن شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس قیامت کو برپا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں موجودہ کائنات کی تخریب اور دوسری تعمیر کی جائے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرماتا ہے کہ قیامت کی اصلی غرض جزا سزا ہے۔ نیکوکار اہل ایمان جزا پائیں گے۔ ان کی تمام لغزشیں اور سارے وہ گناہ جن سے انہوں نے توبہ کرلی ہوگی معاف کر دیے جائیں گے۔ اور فقط یہی نہیں کہ عذاب اور سزا سے ان کو محفوظ رکھا جائے گا بلکہ ثواب جمیل اور بہترین حصہ ان کو عطا کیا جائے گا۔ وہ ثواب جمیل کیا ہوگا تفصیل کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس ہوگا اتنا عظیم الشان کہ دنیا میں کوئی اس سے واقف نہیں اور اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔ آیت مذکورہ میں ان اہل ایمان کے لئے وعدہ فرمایا جو نیکوکار ہوں یعنی وہ اہل ایمان جو اوامر و نواہی کے پابند ہوں مغفور ہوں گے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) کافر مغفور نہیں ہو سکتے ان کو کبھی عذاب سے رہائی نہیں مل سکتی۔ کیوں کہ آیت مذکورہ میں مغفرت وغیرہ کا حصر صرف اہل ایمان کے لئے کیا گیا ہے (۲) مومن سے وعدۂ مغفرت ہونے کے لئے نیکوکاری شرط ہے۔ یعنی فاسق مومن سے مغفرت اور عطائے رزق کریم کا وعدہ نہیں۔ اللہ کو اختیار ہے کہ سزا دے یا معاف کر دے۔ اس سے وہ خوارج استدلال نہیں کر سکتے جو فاسق اہل قبلہ کو دائمی دوزخی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ نیکوکار اہل ایمان کے لئے دو چیزوں کے مجموعہ کا حصر آیت میں کیا گیا ہے۔ مغفرت اور رزق کریم۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاسق مومن کے لئے اس مجموعہ کا وعدہ نہیں۔ یعنی ثواب جمیل اور جزا کے اعلیٰ مرتبہ سے وہ محروم رہے گا۔ مغفرت سے محروم ہو جانا اور دائمی دوزخی بن جانا آیت سے نہیں معلوم ہوتا۔

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ۔ اوپر کی آیت میں نیک اہل ایمان کی جزا کی صراحت تھی۔ اس آیت میں بدکار کافروں کی سزا کا اظہار ہے۔ آیات الٰہیہ میں دوڑنا یعنی غور و خوض کرنا دو طرح سے ثابت ہوتا ہے اول راہ حق معلوم کرنے اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے۔ دوسرے نکتہ چینی، خوردہ گیری، عیب جوئی اور تکذیب و مخالفت کے لئے۔ اول فعل ناجائز نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔ دوسری حرکت مجرمانہ ہے۔ ایسے مجرم دوگونہ جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ خود بھی راہ حق سے منہ موڑتے ہیں اور دوسروں کو بھی اعتراف صداقت سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ ان کا جرم نہایت ناپاک ہے، اس لئے مطابق اعمال ناپاک سزا بھی ان کو دی جائے گی۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ۔ اہل علم کی تقلید اور روشن بصیرت رکھنے والوں کی پیروی انسان کے خمیر میں داخل ہے۔ خود تنقیح اور اجتہاد بہت کم لوگوں کا حصہ ہے۔ لیڈروں کی شخصیت اور ان کی پسندیدگی عام طبقہ کے لئے راہ عمل کھول دیتی ہے۔ خواہ نظریات کچھ بھی ہوں۔ اچھے ہوں یا برے، صحیح ہوں یا غلط۔ عوام اپنے سرداروں کی رفتار و گفتار کو دیکھتے ہیں۔ دستور العمل کی اچھائی برائی پر غور نہیں کرتے چونکہ قرآن کو سننے والا اور سن کر ماننے والا طبقہ بیشتر عوام ہی کا تھا اور اس دستور حیات کا بیشتر فائدہ انھیں کو پہنچتا تھا اس لئے بطور ترغیب فرمایا کہ اہل علم ہی اس قرآن کو برحق اور خدا تک پہنچنے کا صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کے مفہوم کا تعلق آخرت سے ہے یعنی جو لوگ اہل علم تھے، اللہ کے پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لائے تھے اور اللہ کی بیان کردہ سزا جزا کا ان کو یقین تھا قیامت کے دن وہ اپنی آنکھوں سے اپنے علم کی صداقت دیکھ لیں گے اور کہیں گے۔ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ اسی مضمون کی تائید آیت هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ سے ہوتی ہے۔ میرے نزدیک ابن کثیر کا قول صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ قیامت کے دن تو مومن اور کافر عالم اور جاہل سب ہی پیغمبروں کے اقوال کو اور پیش کردہ پیغاموں کی صداقت دیکھ لیں گے۔ اہل علم پر ہی معائنہ کا حصر نہیں ہے۔ پھر مخالف روایت کے باوجود ابن کثیر کا بیان کردہ مطلب سیاق و سباق کے بھی موافق نہیں، اس لئے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا تعلق آخرت سے نہیں بلکہ اس سے عوام کے خیال کو دور کرنا مقصود ہے۔ ہر زمانے میں کافروں کی تعداد اہل ایمان سے زیادہ رہی ہے، اس لئے خواہ مخواہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن حق ہوتا تو اس کو سب لوگ یا کم از کم بیشتر تعداد حق سمجھتی۔ کثرت رائے اس کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صحیح نہیں نہ پیام الٰہی ہے۔ اس خیال کو زائل کرنے کے لئے فرمایا کہ اہل علم تو قرآن کو برحق جانتے ہیں اور جاننا بھی کیسا اس کی صداقت کو دیکھتے ہیں یعنی اہل علم کے مقابلے میں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو جاہلوں کا قول خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زائد ہو کسی طرح قابل پذیرائی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہل علم سے مراد وہ علمائے اہل کتاب ہوں جو اپنی مذہبی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کا اپنی مذہبی کتابوں پر ایمان رکھنا گویا قرآن کو ماننا ہے۔ کیونکہ ان کتابوں میں قرآن اور

حامل قرآن کے متعلق پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ اصلاحی اصول اور تعلیمی قوانین اللہ کی تمام کتابوں میں مشترک ہیں۔ پس ایک کتاب میں ان کو ماننا ان سب کتابوں کی تصدیق کو حامل ہے جو مشترک اصولوں کی تعلیم دے رہی ہے۔

وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ بعض چیزیں برحق ہوتی ہیں ان کا انتساب صحیح ہوتا ہے، لیکن لوگوں کو ان کی حقانیت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ مثلاً زید کا ایک باغ ہے اور کوئی کہنے والا کہدے کہ یہ زید کا باغ ہے۔ یہ قول واقع میں سچا ہے، انتساب صحیح ہے، لیکن تصدیق کرنے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں فائدہ اس وقت ہو سکتا ہے جب زید مشہور سخی ہو اور اس کا باغ عام لوگوں کے لئے وقف ہو اور کوئی بھوکا باغ میں جاکر پھل کھانا چاہتا ہو اور اس سے کوئی کہدے کہ یہ زید کا باغ ہے تم پھل کھا سکتے ہو۔ ایسی صورت میں بھوکے کو اس قول سے فائدہ پہنچ سکنے کی امید ہے۔ قرآن پاک بھی دو خصوصی اوصاف کا حامل ہے۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے دوسرے راہ نجات دکھاتا ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے اور اللہ چونکہ فیاض اور بے منت نعمت دہی میں عدیم المثال بے نظیر ہے، اس لئے اس سے زیادہ کوئی مہربان بھی نہیں۔ پس وہی اس قابل ہے کہ اس کی ستائش کی جائے اور اس کی قدرت قاہرہ اور غلبہ ظاہرہ بھی اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس سے زیادہ قوت کسی کو حاصل نہیں۔ پس وہی اس قابل ہے کہ اس کو غالب اور باعزت کہا جا سکے۔ اب چونکہ قرآن برحق کتاب ہے اور اس اللہ تک پہنچنے کا راستہ بتاتی ہے جو عمومی غلبہ اور حقیقی حمد کا سزاوار ہے، اس لئے اہل علم اللہ کی کتاب کے دونوں اوصاف پر ایمان رکھتے ہیں۔ بلکہ ان اوصاف کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسا اہل علم اور ارباب معرفت کی یہ حالت ہے اور وہی دوسرے طبقہ کے امام ہیں۔ انہیں کا قول فعل اور رد و قبول تقلیدی دماغ رکھنے والوں کے لئے قابل استدلال ہے۔ پس عوام کو بے چون و چرا قرآن پر ایمان لانا اور اس کی صداقت کو ماننا چاہیئے۔

مقصود بیان آسمان اور زمین اور ان کے تمام کائنات اللہ کی مملوک اس کے زیر تصرف اور تحت حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا حقیقی مالک کوئی بھی نہیں نہ کسی کو امارت و تعبیر حاصل ہے یعنی کسی حاکم کو یا عالم کو قوانین زندگی بنانے کا کوئی حق نہیں۔ اللہ مالک مالک مطلق اور خالق کل ہے۔ اسی کے قوانین کو خلق میں جاری ہونا چاہیئے۔ آسمان اور زمین کے زیر تصرف ظاہر کرنے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ جب قوانین الٰہیہ تمام کائنات میں جاری ہیں اور کسی کو سرتابی کی مجال نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی زندگی ضوابط قدرت اور آئین حکمت سے جدا ہو سکے۔ اور وہ اپنے لئے دستور حیات خود بنائے۔ دنیا میں اگرچہ ظاہری طور پر اللہ کے علاوہ دوسری مخلوق بھی سزاوار حمد قرار دی جاتی ہے، مگر آخرت میں تو اللہ کے سوا کوئی بھی مستحق حمد نہیں۔ یعنی ظاہری حمد بھی آخرت میں خدا ہی کے لئے ہوگی۔ اس خصوصیت پر وَلَهُ الْحَمْدُ کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ آخرت میں حمد کو اللہ کا مستحق قرار دینے سے یہ بات بھی مترشح ہوتی کہ یوم آخرت اور حشر نشر وغیرہ بھی خدا کی بڑی نعمت ہے۔ یہ ایسا احسان ہے جس کی وجہ سے انسان کی ساری دنیوی زندگی بکار آمد ہو جاتی ہے۔ حکیم اور خبیر کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ کو بغیر ذریعہ کے بھی اور فرشتوں وغیرہ اور فرشتوں کے ذریعہ سے بھی ہر طور ہر چیز کا علم ہے۔ زمین ہو یا آسمان ان کی اندرونی بیرونی ساری مخلوق سب سے خدا بخوبی واقف ہے۔ غفور اور رحیم کے الفاظ سے اس طرف ایما ہو سکتا ہے کہ اللہ کو علم تو ہر چیز کا ہے۔ انسان کا کوئی گناہ بھی اس سے مخفی نہیں، مگر یہ اس کی رحمت عامہ اور کرم گستری ہی ہے جو باوجود سرتابی اور سرکشی کے انسان کو بقدرہ موت تک باقی رکھتی ہے۔ کتاب مبین کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ کی علمی کتاب (خواہ اس کو لوح محفوظ کہو یا نامہ اعمال یا اللہ کا علم اجمالی یا صفت علم یا اور کچھ) بہرحال ہر چیز کو کھول کر ظاہر کر دے گی۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ انسان کا کوئی عمل اس میں درج نہ ہو یا غلط درج ہو۔ محاجتین کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب حق کے لئے آیات الٰہیہ میں غور کرنا ممنوع نہیں اللہ تک پہنچنے کے لئے منبع ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَى رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ

کافر کہتے ہیں | کیا ہم تم کو | ایسا آدمی | بتائیں | جو تم کو | بتاتا ہے | کہ جب تم | ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے | تو ضرور پھر

لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

نئی پیدائش میں آؤ گے کیا اس نے دانستہ اللہ پر دروغ بندی کی ہے یا اس کو جنون ہے بات یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کا یقین

بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ۝ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا

نہیں رکھتے وہ عذاب میں اور بڑے درجے کی گمراہی میں ہیں کیا انہوں نے اپنے آگے پیچھے کی چیزیں یعنی آسمان

خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ إِن نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ

و زمین کو نہیں دیکھا اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان

كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝

کا کوئی ٹکڑا گرا دیں اس میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لئے ایک عبرت ہے

تفسیر جس شخص کے دل میں نیکی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس کو اپنے حسنِ کردار کی جزا کی طلب ضرور ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نیکی کے صلہ میں شہرت، عزت، حکومت، دولت اور وقتی نیک نامی کے خواستگار ہوتے ہیں اور کچھ آئندہ زندگی کے سدھار کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور سب سے بلند خیال اور روشن بصیرت رکھنے والے مرنے کے بعد دوسری زندگی کا امن چین چاہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ جذبۂ خیر سے خالی اور نفسانی اغراض کو جائز ناجائز طریقے سے پورا کرنے کے طالب ہوتے ہیں، جن کی طبیعتیں شر پسند اور جن کی سرشت بدشعار اور زشت اطوار ہوتی ہے۔ ان کو انجام اور سزا کا یقین تو درکنار، بدکرداری کی سزا بھگتنے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دوسری زندگی اور جزا سزا کا تصور بھی تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے اگر کوئی کسی ثبوت اور قطعی دلیل کے ساتھ ان سے کہتا ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور ہر اعمال کی سزا جزا برداشت کرنی ہوگی تو وہ انتہائی تعجب اور خود پنداری کے لہجہ میں قائلِ حق کو توہین آمیز نظر سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے ذرا اس کو دیکھنا کیسی خلافِ عقل باتیں کرتا ہے۔ بھلا جب آدمی کی لاش گل سڑ کر زمین کا پیوند ہوگئی۔ تمام اجزائے جسم پراگندہ ہوگئے تو پھر از سرِنو تخلیق کیسے ممکن ہے۔ اجزائے پریشان کیسے اکٹھے ہوسکتے ہیں اور کس میں ایسا کرنے کی قوت ہے کروڑہا کروڑ انسانوں کے لامحدود اور ان گنت اجزا کو جمع کرکے نئے سرے سے روح پھونکنی کس کے بس کی بات ہے۔ شاید اس انسان کا دماغ خراب ہوگیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے یا دانستہ تعمداً اللہ پر بہتان بندی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس کوربصیرت کا یہ قول عقل کی انتہائی گمراہی ہے اس کا دماغ خود بہکا ہوا ہے جس کی سزا اس کو برداشت کرنی ضرور ہوگی۔ ایک تو بدکرداری پھر بدکرداری کی اخروی سزا کا انکار سخت ترین جرم ہے۔ اس تاریک دماغ کے آدمی کو اپنا آگا پیچھا نہیں سوجھتا۔ اس کو خیال ہی نہیں ہوتا کہ جس نشہ میں یہ مست ہے اور جس خودی پر اس کو ناز ہے وہ بالکل ہیچ ہے۔ قہرِ قدرت کا ایک طمانچہ اس کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اوپر سے آسمانی صاعقہ، بجلی اور علوی ثقیل اجسام کا کوئی ٹکڑا گر جائے یا نرم زمین اس کو گود میں لے کر دھنس جائے اور سارا پندار و انکار ریوں ہی رہ جائے۔ جب غیبی قدرت عالم کو برباد کرسکتی ہے تو پھر تخلیقِ ثانوی کیا دشوار ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ۔ جب حضورِ اقدس نے اعلان فرمایا کہ ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ تمام زمین و آسمان اور کل جاندار تباہ ہوجائیں گے اور پھر تمام آدمیوں کے جسم کے پراگندہ اجزا و ذرات کو جمع کیا جائے گا اور ان میں جان ڈال کر دنیوی اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد سزا جزا دی جائے گی تو کوربصیرت انسانوں کو یہ قول عجیب معلوم ہوا اور حضورِ اقدس کا مزاح بنانے کے لئے بطورِ استہزا ایک دوسرے سے کہتا تھا۔ آؤ ہم تم کو ایسا آدمی بتائیں جو کہتا ہے کہ انسانی لاش کے بوسیدہ فرسودہ، پراگندہ اجزا کو دوبارہ اکٹھا کرکے تمہاری دوسری تخلیق کی جائے گی۔ اس گروہ کا مطلب یہ تھا کہ جب بدن گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوگیا تو پھر اس کی جدید

تخلیق کس طرح ممکن ہے۔

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ قیامت کا قول اور اقرار کافروں کی نظر میں قوتِ واہمہ کے تصرف اور دماغی وسواس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، مگر حضور اقدس کی دانشمندی، بصیرت افروزی اور لوز دماغی کو دیکھتے ہوئے پاگل اور حواس باختہ کہہ دینا خود بدحواسی اور دیوانگی کی علامت تھی، اس لئے قطعی طور پر دیوانہ کہنے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی۔ سننے والوں کو اس قسم کی بات کا کسی طرح یقین نہ آسکتا تھا۔ بلکہ کافروں کے مقصد کے خلاف اس قول کا نتیجہ نکلنے کا قوی احتمال تھا۔ وہ تو رسول پاکؐ کی طرف سے یگانہ و بیگانہ کو پھیرنا چاہتے تھے اور اس طرح کہ بہتان تراشی کو سن کر ہر ایک شخص سمجھ سکتا تھا کہ یہ عداوت کا مظاہرہ ہے۔ رسول پاکؐ میں جنون کی کوئی علامت نہیں اور یہ لوگ دیوانہ کہہ رہے ہیں۔ یہ سراسر تہمت آفرینی اور بہتان تراشی ہے، اس لئے کافر مجبور ہوئے کہ اس طرح اپنے مقصد کا اظہار کریں جس سے سننے والوں کو رسول پاکؐ کے قول کا جھوٹ ہونا ثابت ہو جائے اور کسی کو اعتراض کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔ کہنے لگے یہ شخص جو اعلانِ قیامت اور اظہارِ حشر و نشر کر رہا ہے اس کی یہ بات اس قدر بے حقیقت اور عجیب ہے کہ معلوم ہوتا ہے یا تو اس نے دانستہ خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ خود اپنے تراشیدہ اقوال کو حکمِ خداوندی ظاہر کر رہا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو کسی قسم کا جنون ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ :۔

بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ۔ حقیقت میں یہ ان لوگوں کی بے ایمانی ہے۔ قیامت کے ماننے کو دل نہیں چاہتا تو رسول اللہ پر بہتان تراشی کرتے ہیں۔ رسول پر کذب یا جنون کی تہمت لگانے کا اصل سرچشمہ انکارِ قیامت ہے یعنی قیامت کو ماننے اور جزا سزا کا قائل ہونے کے بعد رسول اللہ کی رسالت اور آپ کے قول کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ پس اس انکار ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ دنیوی زندگی میں گمراہی کے آخری درجہ میں پہنچ گئے ہیں اور قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ جب محاسبۂ اعمال اور جزا سزا کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ روزِ حساب کا یقین ہی نہیں تو پھر بے روک ٹوک بغیر تامل کے ہر قسم کی ہوا پرستی کا دروازہ عام لوگوں کے لئے کھل جاتا ہے اور اس طرح آدمی پہلے درجہ کی گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا خَلْفَہُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ کافروں نے انکارِ قیامت صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ اجزائے پریشان کا اجتماع ان کی نظر میں محال تھا گویا تخلیقِ جدید کا انکار درحقیقت قدرتِ الٰہی کا انکار تھا۔ اس لئے ہمہ گیر قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے اپنے آگے پیچھے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا یعنی کیا ان کو نہیں دکھتا کہ اللہ نے کیسا اونچا اور وسیع (اور محیطِ کل) آسمان بنایا اور کیسی وسیع زمین کو پیدا کیا (اس میں سبزہ کو اگا کر خاک کیا پھر خاک کر کے اگایا) ایسے قادرِ مطلق کے نزدیک ضعیف نحیف انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے (کذا قال ابن کثیر روایا عن قتادہ)

اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِہِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْہِمْ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ تخلیقِ جدید کے ثبوت کے لئے آسمان و زمین کی تخلیق کافی استدلال ہے اور ہمہ گیر قدرت کے اظہار کے لئے واضح برہان ہے۔ اس آیت میں طریقِ استدلال کو بدل کر فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو زمین میں اس کو دھنسا دیتے۔ یا آسمان کا کوئی ٹکڑا ان پر گرا دیتے یعنی قدم قدم پر ان کو ہلاک کر دینا ہمارے قبضہ میں ہے۔ آسمان اور زمین بھی ہماری قدرت سے خارج نہیں۔ آن کی آن میں ہم ان کافروں کی ہستی خاک میں ملا سکتے ہیں۔ پس جب فنا کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو دوبارہ پیدا کرنا احاطۂ قدرت سے کس طرح خارج ہوسکتا ہے۔ ایک اعرابی نے حضورِ اقدس سے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کے دن مُردے کس طرح اٹھائے جائیں گے؟ فرمایا کیا تمہارا گزر کسی چٹیل ریگستان یا وادی کی طرف کبھی نہیں ہوا۔ ہوا ہے۔ سائل نے عرض کیا جی ہاں۔ ارشاد فرمایا تم نے اسی وادی کو پھر کسی ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ بارانِ رحمت سے اس میں سبزہ لہلہا رہا ہو؟ سائل نے عرض کیا جی ہاں درست ہے۔ فرمایا یونہی بعثتِ قیامت ہوگی (السنن)

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ۔ قدرتِ الٰہی کی کارسازیاں اور اعجوبہ نمائیاں اپنے اندر گوناگوں ذخائرِ عبرت رکھتی ہیں۔ براہینِ فطرت کائنات کے ذرہ ذرہ میں موجود ہے، لیکن سمجھنے اور سبق حاصل کرنے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے (۱) طلبِ حق ہو، حقائقِ کائنات پر غور کر کے خلاقِ کائنات کی طرف لوٹنا مقصود ہو۔ مصنوع سے صانع، مخلوق سے خالق اور معلول سے علت تک رسائی مطلوب ہو۔ جو لوگ قلبِ منیب اور دماغ رسا نہیں رکھتے وہ غور کرنے کے بعد بھی اس سلسلۂ کائنات کی عظمت اور حوادث کا تنوع ان کی نظر میں دوری حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جس کا نہ کوئی مبدء ہے نہ انتہا نہ آغاز ہے نہ انجام

نہ کوئی فاعل ہے نہ مقصود، لیکن اصحاب انابت اور حلت کی طرف رجوع کرنے والے ہر پتہ کو معرفت کردگار کا دفتر سمجھتے ہیں ۔ ہر قطرہ کو عرفان بے پایاں کا سمندر جانتے ہیں ۔ ۲۔ قدرت کو محیط کل سمجھنا ہی کافی نہیں ہے ۔ افکار اور خیالات کی درستگی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ اصلی مقصود تو عمل زندگانی کا ہے اور اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب کہ انانیت اور رعونت کا نشہ اتر جائے اور فرماں پذیری عبودیت اور عبدیت کی کیفیت پیدا ہو جائے ۔ اللہ کی ذات صفات اور احکام کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم عبد ہیں وہ معبود اور عابد کو مولا اور معبود کے احکام سے سرتابی کرنے کا کوئی حق نہیں ، اسی لئے فرمایا کہ عبد منیب کے لئے قدرت کے اندر ہدایت و حقانیت اور مبدء و معاد کی عظیم الشان نشانی موجود ہے ۔

مقصود بیان کافروں کو نظریۂ قیامت پر اتنا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اس قول کے قائل کو مفتری کذاب یا مجنون اور پاگل کہتے تھے اور توہین آمیز لہجہ میں حضور اقدس پر طعنہ زنی کرتے تھے ۔ عقیدۂ قیامت کو نہ ماننا پہلے درجہ کی گمراہی ہے یعنی گناہوں اور بدکاریوں کا سرچشمہ ہے ۔ آسمان اور زمین کی عظمت ، وسعت اور بلندی اور پستی حوادث و تغیرات اللہ کی قدرت ، عظمت ، وحدت اور الوہیت کے ناقابل انکار براہین ہیں اور پھر ان ہلاکات کی موجودگی میں انسانی زندگی کو وقت خاص تک باقی رکھنا قدرت کی ہمہ گیری اور کارسازی کا مزید ثبوت ہے ۔ دلائل فطرت سے معرفت حاصل کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے جسم کی عبدیت اور دل کی انابت ان دونوں چیزوں کے بغیر دلائل فطرت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۝ اَنِ

ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بزرگی عطا کی تھی اور حکم دیا تھا کہ اے پہاڑو داؤد کے ساتھ تسبیح پڑھو اور پرندوں کو بھی (حکم دیا) اور لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا اور کہہ دیا کہ

اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

وسیع زرہیں بناؤ اور اندازہ سے حلقے بناؤ اور تم سب نیک عمل کرو میں تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہوں

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ؕ وَمِنَ

اور ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا ہوا کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ اور شام کی منزل ایک مہینے کی راہ تھی اور ہم نے اُن کے لئے تانبے کا چشمہ رواں کر دیا اور

الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ

بعض جنات اُن کے پیش دست ان کے رب کے حکم سے کام کیا کرتے تھے ان میں سے جو کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کرتا تھا تو ہم اُس کو دوزخ کے

عَذَابِ السَّعِیْرِ ۝ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ

عذاب کا مزہ چکھائیں گے سلیمان جو چاہتے تھے جنات ان کے لئے بناتے تھے قلعے مورتیاں حوضوں کے برابر پیالے اور

وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ ۝

ایک جگہ جمی ہوئی دیگیں ۔ اے آلِ داؤد شکر کرو اور بہت سے بندوں میں شکرگزار کم ہیں

تفسیر ہر آدمی کا نفس ناطقہ یا روح مالک ہے اور بدن محکوم ۔ نفس فرماں روا اور جسم فرماں پذیر اور جسمانی انتظام نفس کے زیر نگرانی ہوتا ہے ۔ اگر یہ دیدبان اپنی ڈیوٹی سے ایک منٹ کے لئے غافل ہو جائے تو سارا نظام جسمانی تباہ ہو جائے ۔ نفس جسم کی تربیت اور پرورش کرتا ہے جسم کے

اجزا اور ذرّے بھی مختلف حرکات کے ذریعہ سے تحلیل ہوتی ہیں۔ نفس بصورت غذا و ہوا ان کا بدل فراہم کر کے جسم کو بدستور قوت دیتا ہے۔ مختلف زہریلے جراثیم سے بچاؤ کرنا اور اپنی تمام طاقتوں کو دشمن کی مدافعت پر آمادہ کرتا ہے۔ گویا ہر شخص کے نفس کا کام ہے اس کے جسم پر حکومت کرنا اور فطرت کے مطابق وقت خاص تک اس کی پرورش کرنا۔ یہ رفتار تو ہر آدمی کے نفس ناطقہ کی ہے، لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن کے نفوس آغاز تخلیق ابتدا ہی سے فطرت سے بہت زیادہ روشن اوصاف، صاحب قدرت، مالک تصرف، طاقتور اور پر شکوہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق عالم بالا سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ان کو تخلیقی طور پر خصوصی قوت حاصل ہوتی ہے۔ جو تعلق ہر شخص کے نفس کو اس کے بدن سے ہوتا ہے وہی تعلق یا اس سے کسی قدر کم و بیش ان نفوس قدسیہ کو تمام کائنات سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ جس طرح ہر شخص کے نفس کو اپنے بدن پر تصرف اور حکومت کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان روشن نفوس کو تمام کائنات سماوی ارضی اور فضائی پر اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے نفوس انبیاء اور اولیاء کے ہوتے ہیں۔ بغیر مادی وسائل کے انبیاء اور اولیاء کا تصرف بعض اوقات دوسری مخلوق پر ہوتا ہے۔ شق القمر، انگلیوں سے اتنا پانی نکلنا کہ ایک جرار لشکر سیراب ہو گیا، لکڑی کے ستون کا رونا، کھانے کا کلام کرنا، لاٹھی کا سانپ ہو جانا، بعض غیبی چیزوں کو ظاہر کرنا، مُردوں کا زندہ ہو جانا، آگ کا گلزار بن جانا، بحر قلزم کا پایاب ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ تمام تصرفات انہی نفوس قدسیہ کے ہوتے۔ اگر یہ کائناتی تصرف انبیاء سے ہوتا ہے تو معجزہ کہلاتا ہے اور اولیاء کے ہاتھ سے ہوتا ہے تو کرامت کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ حضرت داؤد کے ہاتھ میں موم کی طرح لوہے کا نرم ہو جانا، پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح پڑھنا اور حضرت سلیمان کو ہوا اور جنات پر حکومت حاصل ہونا (اور پرندوں کی بولی سمجھنا) اسی قسم کے مظاہرات تھے۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا اوپر کی آیت میں بیان کیا تھا کہ جو بندہ قلب منیب رکھتا ہے، اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو قدرت کی نشانیاں دکھتی ہیں۔ اس انابت وعبدیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آخرت میں عبد منیب کے جو مراتب ہوں گے اُن کی تفصیل تو ناممکن ہے۔ دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ مزہ ضرور ملتا ہے۔ جو خدا کا ہو جاتا ہے تمام مخلوق اس کی ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں عبد منیب ایسے گزرے ہیں کہ ان کو اسی خاکی زندگی میں کسی قدر کائناتی تصرف حاصل ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک داؤد بھی تھے۔ اللہ نے اپنی طرف سے یعنی ان کے استحقاق کے بغیر محض اپنی عنایت سے عظیم الشان برتری عطا کی تھی یا یوں کہو کہ داؤد کو جو برتری حاصل ہوئی تھی اور جو کمال ملا تھا وہ کسی مخلوق کا نتیجۂ کرم نہ تھا بلکہ محض خداداد تھا۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ۔ اس جگہ سے اس فضل کا بیان ہے جس کو پہلی آیت میں مجمل طور پر ظاہر کیا تھا۔ حضرت داؤد کے دو خصوصی معجزات یا بغیر مادی اسباب کے دو کائناتی تصرفات تھے۔ ۱۔ جب آپ شہر سے باہر نکل کر زبور پڑھتے تھے تو آپ کے ساتھ پرندے اور پہاڑ بھی تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ اور بعض دوسرے علماء نے فرمایا اَوِّبِيْ کے معنی ہیں سَبِّحِيْ تاویب کے معنی تسبیح ہے۔ ہمارے بعض روشن فکر معتزلی خیال کے مفسرون نے لکھا ہے کہ جب داؤد زبور پڑھتے تھے تو ان کی آواز سے پہاڑوں میں گونج پیدا ہوتی تھی اس کو آیت میں تسبیح بیان کیا گیا ہے۔ درحقیقت اس قول کی بنا معجزات کا انکار ہے۔ کیونکہ اس طرح پہاڑوں کی گونج تو معمولی بات ہے۔ داؤد ہی کی کیا فضیلت تھی۔ ہر شخص جب پہاڑوں یا صحراؤں میں جا کر کچھ گاتا ہے تو آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ یہ فضیلت ہی کیا ہوئی اور کلام کی رفتار نیز فضل کی صراحت بتا رہی ہے کہ اللہ نے داؤد کو غیر معمولی فضیلت عطا فرمائی تھی۔ پھر پہاڑوں کی تسبیح کو اگر صدا اور آواز بازگشت قرار دیا جائے تو پرندوں کی تسبیح کو کیا کہا جائے گا۔ کیا وہ بھی لوٹ کر آوازیں دیتے ہیں۔ یہاں تو ضرور معجزہ ماننا پڑے گا۔ پس صحیح تفسیر وہی ہے جو خطیب نے بروایت ابن منبہ لکھی ہے کہ داؤد بہت خوش آواز تھے۔ زبور کی تلاوت فرماتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ تسبیح میں شریک ہوتے تھے اور یہ ویسا ہی معاملہ تھا جیسے رسول پاکؐ اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے ہاتھ میں سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے یا کھانا حضورؐ کے سامنے تسبیح پڑھتا تھا۔ پتھر اور درخت آپ کو سلام کرتے تھے یا دروازہ کی چوکھٹ اور گھر کی دیواریں آپ کی دعا پر آمین کہتی تھیں یا اونٹ آپ کے سامنے سجدہ کرتا اور کبھی مالک کی شکایت کرتا تھا یا لال (ایک قسم کا پرندہ) نے حاضر ہو کر شکایت کی تھی کہ فلاں شخص نے میرے انڈے لے لئے ہیں اور آپ نے واپس دلوانے کا حکم دیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بکثرت معجزات روایات سے ثابت ہیں اور عقلی طور پر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ تفسیری مقالہ میں ہم لکھ چکے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ خود ردّ تاویل اور آیت کے مطلب میں تحریف کی جائے۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ۔ یہ حضرت داؤد کے دوسرے معجزے کی صراحت ہے۔ حسن بصری، قتادہ، اعمش وغیرہ نے فرمایا کہ داؤد کے ہاتھ میں پہنچ کر لوہا نرم ہو جاتا تھا۔ ان کو اس کی حاجت نہ تھی کہ ہتھوڑی سے کوٹیں یا آگ میں ڈالیں بلکہ ڈورے کی طرح لوہے کو ہاتھ سے بٹ لیتے تھے۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ۔ یہ لوہے کو نرم کرنے کا بیان ہے۔ یعنی ہم نے داؤد کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا تاکہ وہ مکمل وسیع زرہیں بنا کریں۔ حضرت داؤد مسلمانوں کے بیت المال میں سے کچھ نہ لیتے اور متعلقین کی پرورش کے لئے اپنے ہاتھ سے کمائی کرتے تھے۔ اللہ نے ان کو لوہے کی زرہیں بنانا سکھا دیا تھا۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ۔ یعنی ہم نے داؤد کو تمہارا (جنگی) لباس یعنی زرہیں بنانا سکھا دیا تھا۔ ابن شوذب کا قول ہے کہ داؤد روزانہ ایک زرہ بنا لیا کرتے تھے اور چھ ہزار درہم کو فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار اپنے متعلقین کے مصارف کے لئے رکھ لیتے تھے اور چار ہزار بنی اسرائیل کو دیتے تھے (ابن ابی حاتم)

وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ۔ اس جملہ کا تفسیری مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ابن ابی عتیبہ نے فرمایا کہ سرد (بناوٹ) میں اندازہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ کڑیوں کو جوڑنے والی کیلیں نہ زیادہ موٹی ہوں نہ زیادہ باریک نہ ایسی ہوں کہ کڑی ٹوٹ جائے نہ ایسی ہوں کہ کڑی نکل جائے۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ زرۂ داؤدی کی کڑیاں کیلوں کے ذریعہ سے باہم وابستہ ہوتی تھیں۔ لیکن علی بن ابی طلحہ نے جو قول ابن عباس سے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرد میں اندازہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ کڑیوں کو متوسط رکھنا یعنی کڑیاں نہ بہت موٹی ہوں نہ باریک۔ اسی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ کیونکہ بقول بغوی زرۂ داؤدی میں کیلیں نہیں ہوتی تھیں صرف کڑیاں ہوتی تھیں۔ وہ کڑیوں کو جس طرح چاہتے موڑ دیتے تھے۔

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ یہ خطاب حضرت کے گھر والوں کو ہے۔ اس جگہ آلِ داؤد کا تذکرہ نہیں ہے، مگر رفتارِ کلام سے پتہ چلتا ہے۔ دوسری جگہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ گویا اللہ نے آلِ داؤد کو روزی سے فارغ البال کر دیا اور بطور ادائے شکر نیک کام کرنے کا حکم دیا اور قلب میں چستی اور نشاط پیدا کرنے کے لئے یہ بھی فرما دیا کہ میں تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہوں۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ اوپر کی آیت میں ان فضائل کا تذکرہ تھا جو خصوصی طور پر حضرت داؤد کے بیٹے اور جانشین تھے اور بنی اسرائیل میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ ان آیات میں آپ کے فضائل اور ان نعمتوں کا بیان ہے جو رب العالمین نے خصوصی طور پر عنایت فرمائی تھیں۔ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کا زمانہ صناعی، آرٹ اور علمی تحقیقات کا زمانہ تھا۔ حکمتِ طبعیہ کی مختلف شاخوں کے ماہر ایشیا اور یورپ کے بعض حصوں میں موجود تھے۔ صوریا کے معمار اور مصر کے صناع اور یونان کے محقق طبعیات خاص امتیاز رکھتے تھے۔ حکیم مطلق کا قاعدہ ہے کہ ہر پیغمبر کو اس کے ماحول اور زمانے کے مناسب معجزے عطا فرماتا ہے تاکہ مدعیانِ کمال کو بھی پیغمبر کے سامنے سرِ نیاز جھکانا پڑے اور وہ یقین کر لیں کہ الٰہی علم اور فطری حکمت کی آخری حد پر تو ہم پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر پیغمبر کی معرفت بھی نظری ہوتی تو ہم اس کے مقابلے سے عاجز نہ ہوتے۔ یہ محض فضلِ الٰہی اور علمِ وہبی ہے۔

حضرت سلیمان نے ایک تخت بنایا تھا جس کے نیچے کچھ غلاف تھے ان کے اندر ہوا بھر جاتی تھی اور تخت کو اٹھاتی تھی اور حضرت سلیمان جہاں چاہتے تھے ہوا تخت کو وہیں پہنچا دیتی تھی اور چونکہ یہ سفر ہوائی ہوتا تھا اس لئے ایک ماہ کا راستہ آدھے دن میں طے ہو جاتا تھا۔

کتاب التواریخ ثانی باب ۹ (درس ۱۷) میں اس تخت کا تذکرہ آیا ہے۔ لکھا ہے کہ سلیمان نے ہاتھی دانت کا ایسا تخت بنایا تھا کہ جو زمین کے سب بادشاہوں سے سبقت لے گیا تھا۔ اگرچہ عہدِ عتیق و جدید سے ثابت نہیں کہ یہ تخت ہوا پر اڑتا تھا۔ مگر قرآنی صراحت، احادیث کے منصوصات اور اسلامی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور فلسفہ کائنات کی متواتر شہادتیں بھی اس کی تائید کر رہی ہیں پھر شک کی کوئی وجہ نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ سلیمان بنی اسرائیل تاریخ کے تذکروں میں سلیمان حکیم کے نام سے مشہور رہیں اور مشہور عالم حکیم فیثاغورث کو حضرت سلیمان کا شاگرد کہا جاتا ہے۔ پس یقینی طور پر ہوا بطور معجزہ حضرت سلیمان کے حکم کے تابع تھی۔ بعض کوتاہ نظر مفسرین نے تسخیر ہوا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ صور کے بادشاہ حورام کی طرف سے صنوبر، سرو اور صندل کے تختے لبنان پہاڑ سے مسجد اقدس کی تعمیر کے لئے بادبانی جہازوں میں لاد کر بحرِ شام سے آیا کرتے تھے اور یافہ میں آ کر بیڑا اترتا تھا۔ ان مفسرین کی یہ کوتاہ نظری اور مادہ پرستی ہے جو نبی کی قوتِ معجزہ اور معجزہ کا انکار کرتے ہیں اور اب تو کسی مادہ پرست کو بھی اس قسم کے معجزات کا انکار کرنا نہیں چاہئے جبکہ مشاہدہ اور تجربہ کی شہادت تسخیر ہوا کی متعدد مثالیں پیش کر رہی ہے۔

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ۔ قطر کا ترجمہ عام مفسرین اور اہلِ لغت نے تانبا کیا ہے۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، عطاء، زید بن اسلم، عبدالرحمٰن بن زید، قتادہ اور سدی کا یہی قول ہے۔ مجاہد کا دوسرا قول ہے کہ قطر پیتل کو کہتے ہیں۔ بہرحال تانبے یا پیتل کا چشمہ حضرت سلیمان کے کام کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے جاری کر دیا تھا۔ یہ کلام یا تو مجازی ہے یعنی اللہ نے سلیمان کے لئے تانبا پیتل اتنا فراہم کر دیا کہ گویا اس کا چشمہ بہ نکلا۔ یا کلام حقیقی ہے کسی پہاڑ سے اس وقت

کوئی چشمہ اس مادہ کا پھوٹ نکلا ہو اور حضرت سلیمان کے کاریگروں نے تعمیر کی ضروریات کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا ہو۔ قتادہ اور سدی نے صراحت کی ہے اور مؤخر الذکر قول کو پسند کیا ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ یہ چشمہ ملک یمن میں نکلا تھا۔ سدی نے فرمایا صرف تین شبانہ روز جاری رہا تھا۔ واحدی نے فرمایا بطور معجزہ تین شبانہ روز وہ چشمہ جاری رہا۔

حضرت سلیمان کی حکومت جب عام ہوگئی تو آپ نے ہیکل کی تعمیر شروع کی۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت داؤدؑ نے شروع کی تھی۔ قدِ آدم دیواریں اٹھانے پائے کہ فرشتۂ اجل آگیا۔ حضرت سلیمانؑ نبوت اور اشاعتِ دین کے وارث ہوئے تو آپ نے مسجد کی تکمیل کرنی شروع کی۔ بڑے بڑے پیتل کے حوض، ستون، دیگیں اور دوسرے ظروف ڈھلوائے اور ان چیزوں کو ڈھالنے والے شہر صور (شام) کے کاریگر تھے جن کو شاہ حورام نے بھیجا تھا۔ پھر ایک ڈھلا ہوا بحر یا حوض بنایا جو اردگرد گول تھا اُس کا قطر دس ہاتھ بلندی پانچ ہاتھ اور گھیر تیس ہاتھ تھا اُس کے نیچے بارہ بیلوں کی مورتیں تھیں جن کو کسی دھات سے بنایا تھا۔ دوسری کتاب التواریخ کے تیسرے باب میں ہے اور اس نے پاک ترین مکان میں دو کروبیوں کو تراش کر بنایا تھا اور ہیکل بھی بنائی تھی جس میں محرابیں اور بھاٹک اور کیواڑ لگائے اور تمری کاریگری خرچ کی اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں پردیسیوں (یعنی اجنبی کاریگروں اور مزدوروں) کو گنوایا تو ایک لاکھ ترپن ہزار چھ سو نکلے۔ ان میں سے ستر ہزار کو باربرداری پر اور اسی ہزار کو سنگ تراشی پر مقرر کیا اور تین ہزار اور چھ سو مقرر کئے کہ ان سے کام لیں۔

مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْہِ بِاِذْنِ رَبِّہٖ۔ قوم جن کا ثبوت اسلام کا مسلم الثبوت مسئلہ ہے۔ قرآن کی متعدد آیات صراحت کے ساتھ اس پر دلالت کر رہی ہیں۔ منجملہ دیگر آیات کے یہ آیت بھی صاف طور پر وجودِ جن کو ظاہر کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بحکمِ الٰہی کچھ جن سلیمان کے فرماں بردار اور کام گزار تھے۔ بطور مشقت بہت کام کیا کرتے تھے۔ جن کے وجود کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ قوم عمالقہ کے آدمیوں کو ان کی قوتِ جسامت اور اجنبیت کی وجہ سے جن کہا ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ آدمی تھے۔ اس تاویل کی بنا غیبی مخلوق کے انکار اور صرف محسوس پر مبنی ہے۔ قرآنی آیات صاف بتا رہی ہیں کہ جن و انس دونوں میں خدا نے بنائی ہیں جنات کی تخلیق بھڑکتی ہوئی آگ سے اور انسان کی ساخت چپ دار مٹی سے ہوئی ہے۔ حضرت سلیمان کے حکم سے مشکل کاموں کی انجام دہی جنات ہی کے متعلق تھی۔ تختِ بلقیس کے لانے کا وعدہ بھی ایک جن ہی نے کیا تھا۔ کانوں اور سمندروں سے موتی اور سونا چاندی لانے کا کام بھی جن ہی کیا کرتے تھے۔ بہرحال حضرت سلیمان کا یہ معجزہ تھا کہ کچھ جنات آپ کے مسخر تھے۔

وَمَنْ یَّزِغْ مِنْھُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْہُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ۔ مراد دوزخ کا ہی عذاب نہیں ہے بلکہ دنیا میں ہی بطور سزا آگ میں جلانا مراد ہے۔ حضرت سلیمان کا حکم درحقیقت خدا کا حکم تھا۔ پس سلیمان کے حکم سے سرتابی کرنی حقیقت میں اللہ کے حکم سے سرتابی کرنی تھی۔ اسی لئے فرمایا کہ جنات میں سے جو کوئی ہمارے حکم یعنی سلیمان کے حکم سے سرکشی کرتا تھا ہم اس کو آگ میں جلاتے تھے یعنی سلیمان اس کو آگ میں جلانے کی سزا دیتے تھے۔ جیل خانہ میں بند کرنا ہتھکڑی، بیڑی طوق و سلاسل میں جکڑنا، بید اور کوڑے مارنا اور اس قسم کی دوسری سزائیں تو جنات کو دکھ نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ ان کے لئے کوئی تکلیف و سزا تھی تو صرف جلانے کی۔ یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ۔ یعنی جب سلیمان کے بیش خدمت بھی تھے اور ان کی منشاء کے مطابق دوسرے تعمیری کام بھی انجام دیتے تھے۔ بڑے بھاری بھاری کام وہی کرتے تھے مثلاً:-

مِنْ مَّحَارِیْبَ اونچی اونچی عمارتوں کا بنانا بھی ان کے متعلق تھا۔ ضحاک کے نزدیک محاریب سے مراد مسجد اقدس کی عمارت ہے۔ اہلِ لغت نے محراب کا ترجمہ بلند عمارت کیا ہے (ابن کثیر) قتادہ نے فرمایا قصر و مسجد دونوں مراد ہیں۔

وَتَمَاثِیْلَ عرفی، ضحاک، سدی وغیرہ نے لکھا ہے کہ تماثیل تمثال کی جمع ہے اور تمثال کا معنی ہے مورت۔ مجاہد نے فرمایا کہ تانبے کی مورتیاں سلیمان نے بنوائی تھیں۔ قتادہ نے کہا مٹی اور شیشہ کی بنوائی تھیں۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ کروبیوں اور بیلوں وغیرہ کی مورتیں حضرت سلیمان نے بنوائی تھیں۔ شریعتِ سلیمانی میں مورتوں کا بنانا اور بنوانا جائز تھا۔

وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ۔ جواب جابیہ کی جمع ہے۔ جابیہ بڑے حوض کو کہتے ہیں۔ عوفی، مجاہد، حسن، قتادہ، ضحاک وغیرہ کا قول ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے قبے سے بڑے پیالے مثل حوض کے بنوائے تھے۔

وَقُدُوْرٍ رّٰاسِیٰتٍ ۔ یعنی اتنی بڑی بڑی دیگیں جو اپنی جگہ پر رکھی رہتی تھیں ۔ اٹھائی نہ جا سکنے کے قابل نہ تھیں ۔ مجاہد، ضحاک وغیرہ سے یہی تفسیر مروی ہے ۔ عکرمہ نے فرمایا ان دیگوں کے دیگ دان بھی بنوائے تھے ۔ عکرمہ کا مطلب یہ ہے کہ دیگ دانوں پر دیگیں چڑھی رہتی تھیں اتاری نہیں جاتی تھیں ۔ (غالباً اتنی بڑی دیگیں سارے لشکر کا کھانا ایک جگہ اور ایک دم پکوانے کے لئے بنوائی گئی تھیں)

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۔ حضرت سلیمانؑ کو براہِ راست اور آپ کے ذریعہ سے تمام خاندانِ داؤد کو خدا تعالیٰ نے مذکورہ بالا نعمتیں اور عزت و کرامت عطا فرمائی تو یہ تمام فارغ البالی اور خوش حالی اور عزت افزائی غافل اور عیش پرست بنانے کے لئے نہ تھی ۔ فسق انگیز، معصیت آفرین نعمت تو لعنت ہے رحمت نہیں ہے ۔ اللہ کا کرم نبی اور رسول کا خاندان دنیوی گندگیوں کی آلائش سے پاک تھا ۔ نعمت وہی ہے جس کا حق ادا کیا جائے ۔ انعام شکر کا موجب ہے ، کفرانِ نعمت شرک ہے ۔ اسی لئے حضرت سلیمانؑ کے خاندان کو حکم دیا گیا کہ اے آلِ داؤد شکر کے کام کرو ۔

عمل شکر کا لفظ اپنے اندر خاص بلاغت رکھتا ہے ۔ قولی، قلبی اور تمام جسمانی مظاہر شکر کو حاوی ہے ، اسی لئے ابو عبدالرحمٰن سلمی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا نماز شکر ہے ، روزہ شکر ہے اور عمل الٰہی سب سے افضل شکر ہے (ابن ابی حاتم و ابن جریر) حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت سلیمان کی والدہ نے کہا تھا بیٹے راتیں زیادہ نہ سو ۔ زیادہ سونے سے قیامت کے دن آدمی نادار ہو جائے گا (ابن ماجہ) گویا عمل شکر سے مراد ہے مجسم شکر بن جانا ۔ قلب، جوارح اور تمام اندرونی بیرونی قوتوں کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنا اور مرکز توجہ اسی کو قرار دینا ۔

وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ ۔ ایسے آدمی بہت ہیں جو دنیوی مال و منال، جاہ و جلال اور دولت و اقبال کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیے ہوئے ہیں اور راحت و عیش کی سہولتوں میں اتنے آلودہ ہیں کہ دوسری طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملتا ۔ ایسے افراد بہت کم ہیں جو دنیا اور عیش دنیا کو روح کو صاف کرنے اور انسانیت کو سنوارنے کے لئے استعمال کرتے ہوں اور دارِ فانی کو رہ گزر یا منزلِ مقصود تک پہنچنے اور زندگی کے دریا کو پار کرنے کا پل خیال کرتے ہوں ۔ اس لئے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے شکر گزار کم افراد ہیں ۔ ظاہر ہے حقیقت رس، دانشمند، مآل اندیش ، انجام بیں افراد کم ہی ہیں ۔ دوسری زندگی بہت کم آدمیوں کے پیش نظر ہے ۔

مقصودِ بیان

پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح پڑھا کرتے تھے ۔ لوہا بھی آپ کے ہاتھ میں پہنچ کر نرم ہو جاتا تھا ۔ آپ لوہے کی زرہیں حلقہ دار بنایا کرتے تھے ۔ گویا آپ کو خدا تعالیٰ نے ایک طرف نبوت و حکومت عطا کی تھی تو دوسری طرف بہادر اور جفاکش سپاہی بھی بنایا تھا ۔ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ خاندان میں کسی بزرگ کا بڑا مرتبہ ہونا دوسرے ارکانِ خاندان کو عمل صالح سے بے نیاز نہیں بنا سکتا ۔ جس قدر فضیلت اور عزت کسی خاندان کی زائد ہو اتنی ہی اس کو نیک اعمال کی کوشش کرنی چاہئے ۔ ہوا حضرت سلیمانؑ کے حکم کے تابع تھی آدھے دن میں ہوا آپ کو ایک ماہ کی مسافت طے کرا دیا کرتی تھی ۔ جنات بھی آپ کے مسخر تھے اور پیشِ خدمت ہونے کے علاوہ بڑے بڑے تعمیری کام کیا کرتے تھے ، کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی ۔ آخری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کافروں کی تعداد دنیا میں زیادہ ہے اور اہلِ ایمان کم ہیں ۔

فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ

جب سلیمانؑ کی موت کا ہم نے حکم جاری کیا تو اُن کی موت سے جنات کو آگاہ نہ کیا مگر گھن نے جو اُن کی لاٹھی کو کھاتا رہا

فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ؁

بالآخر جب وہ گر پڑے تو جنات کی حالت کھل گئی کہ اگر ان کو علم غیب ہوتا تو ذلت کی تکلیف میں اتنے دنوں نہ رہتے

تفسیر

ہر درخت جب اُگتا ہے اور تخم کی بیرونی سطح کو پھاڑ کر اس کے اندر نشوونما کا مادہ وسعت اور پھیلاؤ کی اندرونی طاقت خاص انداز کے مطابق موجود ہوتی ہے ۔ تخم پر جیسی اور جس قسم کی قوت بند ہوتی ہے وہی اور اتنی ہی طاقت درخت میں تخلیقی طور پر منتقل ہو کر آتی ہے جو متناسب غذا

کی مدد پاکر ہر سر عمل آتی اور مقدار مقررہ تک اس درخت کے جسم کو بڑھاتی ہے۔

پس اگر مناسب غذا کی مدد نہ ملی اور غذا اور ناموافق ہوئی تو درخت کے بڑھاؤ میں اسی قدر نقصان یا خرابی پیدا ہو جاتی ہے جس تناسب سے غذا کی ناموافقت ہوتی ہے۔ غذا درحقیقت فاعل نمو نہیں بلکہ مادۂ نمو ہے۔ فاعل نمو اندرونی فطری طاقت ہے جو درخت میں موجود ہوتی ہے اور غذا کی شکل بدل کر شجری ساخت کا جز بناتی ہے۔ اب اگر غذا ناموافق ہوئی تو اس کو شجری ساخت کے بنانے میں زیادہ مقدار قوت کی ضرورت پڑتی ہے اور فطری طاقت بہت جلد صرف ہو جاتی ہے اور اگر غذا موافق ملتی رہی تو طاقت جب بھی صرف ہوتی ہے مگر کم۔ اس طرح پہلی صورت میں درخت کی زندگی جلد ختم ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں مدتِ زندگی طویل ہو جاتی ہے مگر بالآخر فطری طاقت کے ختم ہونے پر یہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ جس قدر درخت کی زندگی آگے بڑھتی جاتی ہے یعنی درخت جس قدر پرانا ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی بقیہ زندگی کا زمانہ کم ہوتا جاتا ہے، اس لئے کہ فطری طاقت (جس پر درخت کی زندگی موقوف ہے) میں کمی آتی جاتی ہے۔ گویا درخت کا نمو اور مادہ کا جزو بنانا فی الواقع مدارجِ زندگی کو طے کرنا ایک گھن ہے جو زمین ہی کی پیداوار ہے اور درخت کی زندگی کو رفتہ رفتہ کاٹ رہا ہے اور انجام کار درخت کی زندگی کی جڑ کو کاٹ کر چھوڑتا ہے بالکل درخت کی طرح۔

انسان کی جسمانی ساخت بھی ایک شاخ یا ایک تنہ ہے جو فطری طاقت کے زیر اثر غذا کی مدد پاکر حد خاص تک بڑھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ درخت کو چونکہ روحانی اور عقلی زندگی حاصل نہیں ہے اس لئے جسمانی زندگی ہی اس کی زندگی ہے اور انسانی زندگی صرف جسمانی زندگی نہیں اس کو روحانی اور عقلی زندگی بھی حاصل ہے۔ پس انسان کی دو زندگیاں ہیں روحانی اور جسمانی۔ روحانی زندگی کو اگرچہ فنا نہیں، مگر اس عالم میں اس کا ظہور جسمانی زندگی پر موقوف ہے۔ گویا انسانی ساخت کا درخت ایک عصائے حیات ہے جس پر روحانی زندگی کی ٹیک ہے۔

ابتداء عمر کا گھن اور ترقی زندگی کا کیڑا جس طرح درخت کی زندگی کھا رہا ہے بالکل اسی طرح انسان کی جسمانی ساخت کے عصا کو بھی برابر بغیر کسی وقفہ کے کاٹ رہا ہے اور جب اس عصا کو کاٹ چکتا ہے تو روحانی زندگی کا تعلق بھی اس جسم سے ٹوٹ جاتا ہے اور انسان مردہ ہو جاتا ہے۔ حضرت سلیمان کے عصائے حیات کو بھی اسی ارضی کیڑے نے کھایا تھا اور ہر شخص کی روحانی زندگی کی ٹیک کو بھی یہی گھن کھاتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ۔ حضرت سلیمان کی حکومت نہر فرات سے لے کر مصر اور فلسطین کے ملک تک تھی چالیس سال حکومت کی۔ دنیا بے ثبات ہے۔ موت مقرر سب کو آتی ہے، مگر موت موت میں فرق ہے۔ ایک کی موت دنیا کو اس کی ستم رانی اور ظلم و بیداد سے نجات دیتی ہے اور عالم طمانیت کا سبب ہوتی ہے۔ دوسرے کی موت سے دنیا کی خیر و برکت اُٹھ جاتی ہے۔ اہلِ عالم امن اور عافیت کو روکنے لگتے ہیں۔ غافل انسان دونوں موتوں میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن اہلِ نظر دونوں کے فرق کو جانتے ہیں۔ نیکی اس لئے اچھی نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی کو ابدی بناتی ہے اور موت عرفی سے بچاتی ہے بلکہ نیکی اس لئے اچھی ہے کہ اس عیش فانی کے بعد ابدی زندگانی عطا کرتی ہے۔ حیاتِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ دنیا میں اس کی وجہ سے انصاف، امن و راحت پھیلتی ہے۔ قرآن نے اس جگہ دونوں موتوں کی تصویر کشی کی ہے۔ حضرت سلیمان کی موت کی تشریح اس جگہ کی ہے اور قوم سبا کی بربادی کی تفصیل اس کے بعد کی ہے۔ نیک اور بد، خیر اور شر اور فاسد دونوں کے عروج و زوال کو دکھانے سے مقصود صرف ترہیب و ترغیب ہے۔

آیتِ مذکورہ کا معنی دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ عام اہلِ تفسیر نے لکھا ہے اور یہی حقیقی مطلب بھی ہے کہ حضرت سلیمان عبادت کے لئے مہینوں تخلیہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ دورانِ تخلیہ میں کسی کو باریاب ہونے کی اجازت نہ تھی یہاں تک کہ خصوصی خادم بھی اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ آخری بار جب تخلیہ کیا اور عبادت شروع کی تو ٹھوڑی کے نیچے لاٹھی لگا کر اس کے سہارے سے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ حکم خداوندی آپہنچا اور روح نکل گئی، لیکن کچھ مدت تک کسی کو اطلاع نہ ملی۔ سب لوگ بدستور عبادت میں خیال کرتے تھے۔ جب لکڑی کو دیمک یا گھن نے کاٹ ڈالا اور لکڑی ٹوٹ گئی تو جنازۂ مبارک بھی گر پڑا۔ انبیاء کا بدن عفونت سے ہر حال محفوظ ہوتا ہے، اس لئے جنازۂ مبارک خراب بھی نہ ہوا تھا۔ اخفائے موت کے چند اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ عام طور پر لوگ جنات کو غیب دان خیال کرتے تھے۔ حضرت سلیمان کی موت کا علم جنات کو نہ ہو سکا تو لوگوں نے سمجھ لیا کہ جنات غیب نہیں جانتے۔ دوم اس تسخیری منفعت اور

تعمیری تکلیف میں کیوں اب تک رہتے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ مسجد کی تعمیر یا سلطنت کا انتظام یا بنی اسرائیل کا کوئی دوسرا کام ناقص رہ گیا تھا۔ جنات اور دوسرے ممالک کے آدمیوں کو اس کو پورا کرنا مقصود تھا۔ اگر اصل وقت پر آپ کی وفات کی اطلاع ہو جاتی تو وہ کام ناقص رہ جاتا۔ یہ تفسیری مطلب تو عام بلکہ تمام اہلِ تفسیر نے لکھا ہے، لیکن ایک اور نازک لطیف و عبرت انگیز توجیہ بھی ہو سکتی ہے۔ دیمک یا گھُن سے مراد ہے عمر کی درازی، حوادث کا دوران، لیل و نہار کا تعاقب اور ایام و ساعات کا مرور۔ عصا سے مراد ہے زندگی کے عصا کو دیمک کا کھانا یہ ہے کہ حوادث کا دوران اور عمر کی رہائی زندگی کے اوقات کو کم کر رہی ہے۔ جتنی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے کم ہوتی جاتی ہے۔ زندگی گھٹتی ہے بدن کی قوتوں میں اضمحلال اور ضعف آتا جاتا ہے۔ بالآخر جب مرورِ ایام کی دیمک اور دورانِ حوادث کا گھُن زندگی کی لاٹھی کو کاٹ دیتا ہے تو موت آ جاتی ہے۔ حضرت سلیمان کی عصائے زندگی کو بھی تغیرات کا گھُن کھا رہا تھا اور بالآخر زندگی فنا ہو گئی۔

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ افسوس ہے کہ اس آیت کی تشریح اکثر اہلِ تفسیر نے غلط کی ہے عام مفسروں نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ جب سلیمان گر پڑے تو جن سمجھے کہ اگر ہم غیب داں ہوتے تو اس دکھ میں اب تک نہ رہتے۔ گویا حضرت سلیمان کے گرنے کے بعد جنات کو معلوم ہوا کہ ہم غیب سے واقف ہیں۔ یہ مطلب بالکل مضحکہ خیز ہے، اس لئے کہ جنات کا غیب داں ہونا نہ ہونا ان کو پہلے ہی سے معلوم تھا کوئی شخص اپنے دماغی علم یا علمی سے واقف نہیں ہوتا دیوانہ بھی اتنا جانتا ہے پھر موتِ سلیمانؑ سے لاعلم رہنے سے جنات کو اس بات کا علم ہوا کہ ہم غیب داں نہیں ہیں۔ ایک لچر بات ہے۔ اس قسم کے واقعات تو بکثرت پیش آئے ہوں گے اور جنات کو اپنی لاعلمی پہلے سے معلوم ہو گی۔ پھر یہ مطلب اس بات کے ثبوت کا بھی محتاج ہے کہ جنات کو غیب داں ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس کے علاوہ الفاظ سے بھی یہ مطلب نہیں نکلتا۔ تَبَيَّنَتْ فعل لازم ہے متعدی نہیں ہے۔ تبینت میں ظہرت یا انکشفت۔ علمت یا فہمت اس کا ترجمہ غلط ہے۔ پس صحیح یہ ہے کہ الجن مبدل منہ ہے اور اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الخ اس سے بدل ہے اور پورا جملہ تَبَيَّنَتْ کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلیمان کے گرنے کے بعد جب یعنی ان کی یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب داں ہوتے تو سلیمان کی موت کا علم ان کو ہو جاتا اور عوام کے اس غلط عقیدہ کا ابطال ہو گیا کہ جنات غیب داں ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جنات نسلی اور موروثی طور پر سرکش اور حق و صداقت سے گریز کرنے والے فطری اعتبار سے واقع ہوئے ہیں۔ حقانیت کو تسلیم کرنا ان کا فطری اقتضا نہیں ہے، لیکن بطور معجزہ یا از روئے کرامت بعض جنات بعض انبیاء اور اولیاء کے مسخر ہو جاتے ہیں اور بعض مخلصانہ ایمان بھی لے آتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم پر بعض جنات کا ایمان لے آنا اور بعض اولیاء کا جنات کو تسخیر کرنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ حضرت سلیمان جلیل نبی تھے ان کے ہاتھ پر جنات ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں، مگر اتنا یقینی ہے کہ قادرِ مطلق نے ان کی دعا قبول فرمائی تھی اور بہت جنات کو ان کا مسخر بنا دیا تھا۔ مسخر ہونے والے جنات مجبور تھے۔ اگر حکمِ سلیمانی سے سرکشی اور فرماں پذیری سے انکار کرتے تھے تو حضرت سلیمان کے حکم سے بطور سزا ان کو آگ میں جلا دیا جاتا تھا، اس لئے ان کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ حضرت سلیمان نے ان کو ایسے سخت کاموں پر مامور کر دیا تھا جن کی سر انجام دہی بھی اس وقت کے آدمی قاصر تھے۔ پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر ڈھونا، سمندروں کی گہرائیوں میں گھس کر موتی نکالنا، عظیم ترین ظروف اور مستحکم ترین عمارتیں بنانا جنات کا کام تھا۔ وہ ہر وقت اس قسم کی مشکل ترین خدمات کو انجام دینے میں مشغول رہتے تھے۔ اسی لئے ہر وقت وفاتِ پیغمبر کے طلبگار متمنی اور دعاگو رہتے تھے تاکہ ان کی گلو خلاصی ہو جائے، لیکن اللہ کی مصلحت کچھ اور تھی، اس لئے سلیمان کی موت کو پوشیدہ رکھا گیا، اور جنات واقف نہ ہو سکے اور برابر سخت ترین کاموں میں مشغول رہے۔ آیت میں سخت ترین کاموں کو ہی عذاب مہین فرمایا ہے۔

مقصودِ بیان

موت کے پنجے سے پیغمبر بھی نہیں بچ سکتے۔ حضرت سلیمان کا طریقۂ انتقال بتا رہا ہے کہ مصلحتِ الٰہیہ سے عالم کا کوئی ذرّہ خارج نہیں ہر چیز کی نقل و حرکت پوشیدہ حکمت کے تحت ہوتی ہے۔ بعض عالم الغیب نہیں ہوتے۔ صداقت اور حقانیت کی قوتِ قاہرہ ہر جبروتی، طاغوتی، قوت پر غالب آتی ہے۔ یہاں تک کہ جنات کی شیطانی طاقت بھی انسان کی حقانی طاقت کے سامنے برابر نہیں ہو سکتی۔ تسخیرِ جنات سے اس بھی واضح ہوتا ہے کہ شیطان کی ذریات جن کا کام انسان کو بہکانا اور گمراہ کرنا ہے انسانِ کامل یعنی انبیاء اولیاء کی فرماں پذیر ہو جاتی ہے اور سرکشی و نافرمانی نہیں کر سکتی وغیرہ۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ

بیشک قوم سبا کے لئے ان کی بستیوں میں ہماری قدرت کی نشانی تھی دو باغ تھے دائیں بائیں (ہم نے اُن سے کہا تھا) اپنے رب کا رزق

رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ

کھاؤ اور اُس کا شکر کرو پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے والا پروردگار ہے لیکن اُنھوں نے روگردانی کی تو ہم نے اُن پر زور کا سیلاب بھیجدیا

وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝

اور اُن کے دونوں باغوں کے عوض اُن کو ایسے دو باغ دیئے جن کے پھل بدمزہ تھے اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں

ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى

اُن کے کفر کرنے کی پاداش میں ہم نے انکو یہ سزا دی اور ہم ناشکر کو ہی سزا دیتے ہیں ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان جن میں

الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا

ہم نے برکت رکھی تھی بہتیری بستیاں سرِ راہ بنائی تھیں اور اُن کے پڑاؤ وہاں سفر کے لئے مقرر کئے تھے (اور کہدیا تھا) کہ ان میں رات دن امن سے سیر کرو

آمِنِينَ ۝ فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ

مگر وہ کہنے لگے اے ہمارے رب ہمارے سفروں میں دُوری پیدا کردے انھوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا اس لئے ہم نے ان کو افسانہ بنادیا

وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

اور اُن کو پارہ پارہ کردیا اس میں ہر صابر و شاکر کے لئے بہتیری نشانیاں ہیں۔

تفسیر اگر دماغ میں بطور خود غور و خوض کرنے کی طاقت نہ ہو۔ اگر قوتِ فکر بجائے سوچ بچار کے حق و صداقت کا انکشاف نہ کر سکے۔ اگر فطری بصیرت کی روشنی فی نفسہ اتنی کم ہو کر راہِ حق نہ ڈھونڈ سکے۔ اگر ذہن کی علمی طاقت اس قدر نارسا ہو کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے مبدء اور معاد اور خلاق عالم کے متعلق صحیح افکار و خیالات تک نہ پہنچ سکے تو قدرت نے اس کی رہنمائی، عبرت اندوز، نصیحت پذیری اور حق پرستی کے لئے فطری طور پر دو رہنما و چراغ راہ دو منادی مقرر کر رکھے ہیں۔ قوموں کا دکھ اور سکھ، بربادی اور آبادی، عروج و زوال، ترقی اور تنزل، بلندی اور پستی، خوشی اور غم، عزت اور ذلت، دولتمندی و ثروت، افلاس اور ناداری اور بالآخر زندگی اور موت۔ یہ دونوں چراغ راہ ہیں اور برہانِ متین ہیں۔ حوادثِ دہر بے کار نہیں، انقلاباتِ زمانہ رائگاں نہیں، گردشِ لیل و نہار فضول نہیں۔ اشخاص و اقوام کی زندگی اور موت لاحاصل نہیں اور ان کا نہ کسی کی بیجا طرفداری کا جذبہ نہیں۔ نہ کینہ توزی، بغض پروری اور ستم رانی کا داعیہ ہے نہ وہ کسی کا دوست ہے نہ کسی کا دشمن۔ انسان کے اچھے کردار اور بُرے کرتوت ہی اس کے دوست دشمن ہیں۔ اسکے نیک بد اعمال ہی خدا کو دوست یا دشمن بناتے ہیں اور قدرت کے ہاتھوں سزا جزا دلواتے ہیں۔ خدا عیش دیتا ہے، آرام دیتا ہے۔ کوٹھیاں، لہلہاتی کھیتیاں شاداب باغ، پھل دار درخت، حکومت، عزت، اقبال اور جاہ و جلال دیتا ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کی اعلیٰ چوٹی پر پہنچا تا ہے، لیکن جب انسان قدرت کے عطیہ کی قدر نہیں کرتا، اللہ کی ناشکری اور قانونِ فطرت سے سرتابی کرنے لگتا ہے، صحت، دولت، عزت، حکومت اور طاقت کے نشہ سے چور ہو کر سر نخوت اٹھاتا

ہے اور اپنی جبروتی قوتوں کو ساتھ لے کر فطرت کے قلعوں پر چڑھائی کرتا ہے تو قدرت اس بے وقوف انسان کو دھکیل دیتی ہے۔ اس کی اونچی عمارتیں کھنڈر بن جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں جل جاتی ہیں، سرسبز باغ پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ پھل [illegible] ہو جاتے ہیں۔ دولت اور حکومت زائل ہو جاتی ہے۔ عزت برباد اور اقبال فنا ہو جاتا ہے اور تمام جاہ و جلال مٹ جاتا ہے۔ کفرانِ نعمت کی یہی سزا ہے۔ والظرات [illegible]۔ قوم سبا کی آبادی اور بربادی، ترقی اور تنزل، زندگی اور موت بھی اسی زمانے کی ایک کڑی تھی۔ بصیرت اندوز دماغ رکھنے والوں کے لئے قوم سبا کی حالت باعث عبرت ہے۔

تحلیلِ اجزاء

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ اوپر کی آیت میں حضرت سلیمانؑ کی عظمت، جلالت، نعمت اور شکر گزاری کا تذکرہ فرمایا تھا۔ اب اس کے مقابل میں قوم کا ذکر فرماتا ہے جو فارغ البالی، عیش، آرام اور سکون میں تمام عرب میں امتیازی شان کے ساتھ مشہور ہوئی، مگر احکامِ الٰہی سے سرتابی کرنے کی وجہ سے برباد کر دی گئی۔ جس طرح حضرت سلیمانؑ شکر گزار اور فرماں بردار تھے اسی طرح قوم سبا کافرِ نعمت اور نافرمان تھی۔ اس واقعہ کا تذکرہ عبرت اندوزی اور نصیحت پذیری کے لئے فرمایا۔ ہم تفسیری مقالے میں لکھ چکے ہیں کہ دولت و افلاس، حکومت و غلامی، راحت و رنج، سختی نرمی اور عیش و نکبت دونوں کی تصویر کشی قرآن اس لئے کرتا ہے کہ آدمی کے جذبات، رغبت و نفرت اور دوامی امید و بیم میں بیداری پیدا ہو اور ڈر کر بدی سے بھاگے اور امیدوار ہو کر نیکی کی طرف دوڑے اور چونکہ ماضی مستقبل کا آئینہ دار ہے، اس لئے سلف کے قصے خلف کے لئے موجبِ عبرت ہیں۔ یہاں دو امور تنقیح طلب ہیں:-

(۱) سبا کون شخص تھا۔ عرب کی دو شاخیں مشہور ہیں۔ قحطانی اور عدنانی۔ پھر قحطان کی دو شاخیں ہیں ربیعہ اور مضر۔ سبب تقاضۂ قحطان کو کسی نے قحطانی اور کسی نے عدنانی قرار دیا۔ سبا نے چونکہ سب سے پہلے قید کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور سبا کے معنی قید کرنے کے ہیں اس لئے اس لقب سے مشہور ہوا۔ دراصل نام اور نسب اس طرح تھا عبد شمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔ بعض کا قول ہے کہ سب سے پہلے اسی نے تاج پہنا (سراج)

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام احمد نے ابی لہیعہ کے طریق سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدسؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہؐ یہ سبا کوئی مرد تھا یا عورت یا کسی زمین کا نام تھا۔ ارشاد فرمایا نہیں وہ مرد تھا۔ اس کی دس اولادیں ہوئیں (یعنی کچھ بیٹے کچھ پوتے کچھ زیریں نسل والے۔ چونکہ یہ دس مشہور ہوئے، اس لئے حضورؐ نے دس کا تذکرہ فرمایا ورنہ اس کی نسل سے تو کروڑوں انسان ہوئے) جن میں چھ نے یمن میں سکونت رکھی اور چار شام میں رہنے لگے۔ یمن میں سکونت رکھنے والے مذحج، کندہ، اَزد، اشعر، انمار اور حمیر تھے اور شام میں رہنے والے لخم، جذام، عاملہ اور غسان تھے (رواہ عبد بن حمید باسناد حسن وابن عبد البر) دوسری اسناد سے یہی روایت کسی قدر تغیر کے ساتھ مروی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ انمار ہی کو بجیلہ اور خثعم کہتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے طول کے ساتھ نقل کرنے کے بعد حدیث حسن غریب کہا ہے اور ابن عبد البر نے بروایت تمیم داری بھی اس کو لکھا ہے۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ علماءِ انساب نے قحطان کے نسب کے متعلق تین قول لکھے ہیں۔ ۱۔ قحطان ارم بن سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ ۲۔ عابر یعنی ہود علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ ۳۔ اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے تھا۔ قول سوئم کا سلسلۂ اتصال حافظ ابو عمر بن عبد البر النمری نے کتاب الانتباہ میں نقل کیا ہے۔ لیکن بظاہر قوم سوئم بعید معلوم ہوتا ہے اور علمائے تاریخ کے اجماع کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اسماعیل کا نکاح قبیلۂ جرہم میں ہوا تھا اور جرہم کا قبیلہ عرب عاربہ کی ایک شاخ تھی۔ جو حضرت اسماعیل سے پہلے موجود تھی۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کو عرب مستعربہ کہا جاتا ہے، لیکن بخاری کی ایک روایت سے قول سوئم کی تائید ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضور اقدسؐ قبیلہ اسلم کی طرف سے گزر رہے جو تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ فرمایا اے اولادِ اسماعیل تیر بازی کرو۔ تمہارا باپ بھی تیر انداز تھا۔

ظاہر ہے کہ قبیلۂ اسلم انصار کا ایک خاندان تھا اور تمام انصار یعنی اوس و خزرج نسب میں غسانیوں کے ساتھ شریک تھے۔ صرف اتنی بات ہوئی تھی کہ سیلاب آنے کے بعد جب قبائل یمن متفرق ہوئے تو بجائے شام کو جانے کے یہ لوگ یثرب میں آکر آباد ہو گئے۔ پس اوس و خزرج اور غاسنہ کا مورثِ اعلیٰ قحطان تھا۔ اب جبکہ حضورؐ نے انصار کو اولادِ اسماعیل قرار دیا تو ظاہر ہے کہ قحطان حضرت اسماعیل کی اولاد میں تھا یا اسماعیل قحطانی النسل تھے۔ مؤخر الذکر قول تو بالکل ہی غلط ہے، اس لئے اول قول کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہاں ایک ضعیف تاویل اس طرح کی جا سکتی ہے کہ قبیلۂ اسلم کو تیر اندازی کی مشق کرتے دیکھ کر حضورؐ نے دوسرے عرب یعنی مہاجرین وغیرہ کو خطاب کر کے بطور ترغیب فرمایا ہو کہ تم بھی تیر اندازی کی مشق کرو۔ مہاجرین کو چونکہ زیادہ مشق شمشیر زنی کی تھی تیر اندازی کی نہ تھی (جیسا کہ

قبائل ہوازن سے جنگ کرنے کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے) اس لیے حضورؐ نے ان کو تیر اندازی کی ترغیب دی اور وقتی طور پر اس فرمان کا باعث قبیلۂ اسلم کی تیر اندازی ہوئی۔ شیخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ علمائے انساب کی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا مومن موحد تھا اور شاید کسی نبی سے سن کر حضور اقدسؐ کے متعلق مندرجہ ذیل چند اشعار اس نے کہے تھے۔ یہ اشعار ہمدانی نے کتاب الاکلیل میں نقل کئے ہیں۔ ان میں سبا نے بطور بشارت پیشین گوئی کی ہے کہتا ہے :-

سیملك بعدنا ملك عظیم ۔۔۔ نبی لا یرخص فی الحرام
ویملك بعده منهم ملوك ۔۔۔ یدینوه القیاد بكل دام
ویملك بعد هم منا ملوك ۔۔۔ یصیر الملك فینا بانقسام
ویملك بعد قحطان نبی ۔۔۔ تقی سید خیر الانام
یسمی احمد ایالیت انی ۔۔۔ اعمر بعد مبعثه بعام
فاعضده واحبوه بنصری ۔۔۔ بكل مدجج وبكل رامی
متی یظهر فكونوا ناصریه ۔۔۔ ومن یاتاه یبلغه سلامی

سبا کی حسن نیت کو اللہ نے قبول فرمایا کیونکہ انصار جو غسانیوں کے چچیرے بھائی تھے سبا ہی کی نسل میں سے تھے اور انہی کے ذریعہ سے اللہ نے اپنا دین پھیلایا۔

سبا کے آباؤ اجداد یمن اور اطراف یمن کے حکمران تھے اور اس کی نسل میں بھی بکثرت سلاطین ہوئے۔ شداد بن الملطاط بن سبا بڑا جبار بادشاہ تھا۔ شداد کے بھائی لقمان بھی موحد کامل مومن تھے اور یمن کے بادشاہ ہوئے۔ لقمان کے بعد ذوسدد بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد حارث الرائش تخت نشین ہوا۔ اس کا لقب تبع اول تھا پھر تبع اول کا بیٹا صعب یعنی ذوالقرنین بادشاہ ہوا پھر اس کا بیٹا ذوالمنار ابرہہ پھر اس کا بیٹا افریقیس پھر اس کا بھائی ذوالاذعار پھر اس کا بھائی شرحبیل پھر اس کا بیٹا ہدہاد پھر اس کی بیٹی بلقیس حکمران ہوئی۔ حضرت سلیمان کے زمانہ میں یمن کی حکمران یہی تھی اور ایمان کے بعد شرف زوجیت اسی کو حاصل ہوا۔ شاہان تبع بلکہ شاہان یمن میں سے کچھ لوگ موحد تھے کچھ مشرک۔ ان میں سے بعض کے حدود حکمرانی مصر شام اور ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

شاہان تبع نے بڑی بڑی یادگاریں اپنے بعد چھوڑی تھیں۔ قصر غمدان مشہور عمارت انہی کی یادگار تھی جو خلافت عثمان تک باقی تھا۔ یہ بند جس کا تذکرہ آیت میں آیا ہے انہی نے بنایا تھا۔ مسلمانوں کی کتب جغرافیہ میں اس بند کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے۔ کتاب المسالک والممالک کتاب البلدان احسن التقویم میں مفصل ذکر آیا ہے۔

(۲) وہ کون سی عظیم الشان نشانی تھی جس کی صراحت آیت میں فرمائی ہے۔ قوم سبا بلاد مآرب ملک یمن میں آباد تھی۔ چاروں طرف ان کا تسلط تھا بڑے بڑے بادشاہ ملکہ بعض شہنشاہ ان میں ہوتے تھے۔ ان کا تمدن بہت بلند تھا۔ بہت اونچے پختہ شاندار مکانوں میں رہتے تھے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک وادی تھی جس میں دونوں کے اوپر سے پانی آتا تھا۔ بادشاہ سبا نے پہاڑوں کے پانی سے فائدہ اٹھانے کی یہ تدبیر کی کہ وادی کے آگے کے رخ سے ایک بند باندھا۔ دائیں بائیں اور پیچھے سے تو قدرتی طور پر کوہستانی دیواریں موجود ہی تھیں۔ آگے مصنوعی بند قائم کر دیا گیا۔ بند میں شگاف ور زیں اور موری بقدر ضرورت بنا دیئے۔ جو وقتاً فوقتاً کھلتے اور بند ہوتے رہتے تھے۔ اس بند سے جو پانی نکلتا تھا اس کو دریاؤں اور نہروں کی شکلوں میں تمام علاقوں میں پھیلا دیا گیا تھا جس کے سبب سارا ملک سرسبز مرفہ الحال اور شاداب ہو گیا تھا۔ یہ بند اس وقت دنیا کے عجائبات میں سے تھا۔ جس طرح اس زمانہ میں نہر سویز اور نہر پانامہ انسانی قدرت کی اعجوبہ آفرینیوں کا ایک عظیم مظاہرہ سمجھی جاتی تھیں اس طرح وہ بند بھی اللہ کی ایک عظیم الشان نعمت تھی۔ باوجود کثرت رطوبت کے ملکی آب و ہوا میں کوئی خرابی نہ تھی۔ زہریلے کیڑے مکوڑے اور جراثیم موجود نہ تھے۔ سب لوگ صحت، قوت اور دولت سے مالا مال تھے۔ اس بند کے پانی سے یوں تو سارا ملک سرسبز اور شاداب ہو گیا تھا۔ ہر چیز کی پیداوار کا مدار اسی پر تھا، مگر خصوصیت کے ساتھ باغوں کی کثرت، افزائش، بار آوری، سایہ افگنی اور فواکہ بہتات ناقابل نظیر تھی۔ آیت مذکورہ میں مساکن سے مراد مآرب کی بستیاں ہیں۔ یعنی قوم سبا کے ملک میں قدرت کی بڑی عظیم الشان نشانی موجود تھی جس کی مختلف صورتیں تھیں خصوصاً جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّشِمَالٍ ۔ دائیں بائیں باغات تھے، گھنے درخت تھے یعنی وسط میں آبادی تھی دونوں طرف پہاڑ تھے اور ڈھلوان پہاڑوں پر دونوں طرف دائیں بائیں قدرتی اور صنعتی باغ تھے۔ قتادہ اور بعض دوسرے علمائے تابعین نے لکھا ہے کہ درختوں کے میوے اس قدر کثرت سے تھے کہ اگر

کوئی عورت سر پر ٹوکری رکھ کر درختوں کے نیچے پھل چننے کے لئے جاتی تو کثرت کی وجہ سے اس قدر پکے پھل اوپر سے گرتے تھے کہ بغیر چنے اور جمع کرنے کے ٹوکری سر پر ہی بھر جاتی تھی۔

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۔ یعنی ان کو خود رو درختوں کے پھل اور نشانیدہ پودوں کے ثمرات عطا فرمائے اور کہہ دیا کہ خداداد رزق کھاؤ، مگر شرک نہ کرنا شکر ادا کرنا۔ شکر ادا کرنے کی تشریح ہم اسی پارہ میں ایک جگہ کر آئے ہیں۔ ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ تمہارا یہ شہر پاکیزہ ہے (یہاں نہ زہریلے جراثیم ہیں نہ قحط نہ کسی چیز کی کمیابی اور گرانی نہ غیر اقوام کی حکومت نہ کسی کا زور۔ ہر تکلیف وایذا رساں چیز سے تمہارا ملک پاک ہے) پھر تمہارا پروردگار بھی مہربان، منعم اور معمولی گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اگر شکر ادا کرتے رہو گے تو نعمتِ الٰہی سے سرفراز ہو گے، مگر:

فَاَعْرَضُوْا ۔ انہوں نے دادائے فکر، راہِ حق، افکار صحیحہ اور عقائد صادقہ سے روگردانی کی اور اللہ کے خلاف دوسروں کی پرستش کرنے لگے۔ چنانچہ حضرت سلیمان وبلقیس کے قصہ میں ہُدہُد کا یہ قول آیت میں آیا ہے۔ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ الخ ۔ یعنی ہُدہُد نے حضرت سلیمان سے کہا کہ میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو وہاں کا حکمران پایا اس کو ضرورت کی ہر شے میسر ہے۔ اس کے پاس ایک تخت بھی ہے۔ اس کی قوم کو شیطان نے پُرفریب نظارہ دکھا کر گمراہ کر دیا ہے اور وہ سورج کی پوجا کرتی ہے۔ محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ قوم سبا کو ہدایت کرنے کے لئے اللہ نے تیرہ پیغمبر بھیجے۔ سدی نے اس سے زیادہ تعداد بیان کی ہے۔ بہر حال وہ قوم گمراہ باوجود تنبیہ اور ہدایت کے راہِ راست پر نہ آئی تو:-

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ ۔ عرم پانی کی کثرت۔ بعض نے کہا عرم گھونس کو کہتے ہیں یعنی وہ سیلاب جس کے آنے کا باعث چوہے ہوئے تھے۔ ابن عباس، قتادہ اور ضحاک وغیرہ سے مروی ہے کہ جب اللہ نے قوم سبا کو تباہ کرنا چاہا تو پانی کے بند پر چوہوں اور گھونس کو مسلط کر دیا یعنی گھونس اور چوہوں نے بند میں اتنے سوراخ کر دیئے کہ پھر پانی کی روک دیوار نہ روک سکی۔ بند ٹوٹ گیا۔ پانی بہہ نکلا اور چاروں طرف کی آبادی میں گھس گیا۔ باغوں اور کھیتوں کو تباہ کر دیا۔ بستیاں برباد ہو گئیں۔ مویشی ہلاک ہو گئے۔ آبادی کی جگہ ویرانی اور شادابی کی جگہ ریت کے ٹیلے ہو گئے۔ سرسبز میدان ریگستان بن گئے اور بلند پختہ مکان کھنڈر ہو گئے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ شام، عراق اور یثرب میں جا بسے اور کچھ دوبارہ وہیں اسی میں آ پڑے۔ سیل عرم کی تفسیر میں ابن ابی نجیح اور مجاہد سے مروی ہے کہ ایک سرخ پانی آیا جس نے بند کو شق کر دیا۔

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۔ خمط کے معنی ہیں بدمزہ، کسیلا۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، عطائے خراسانی، حسن بصری، قتادہ اور سدی نے کہا کہ اکل خمط سے مراد ہے پیلو اور بریر کا درخت جس میں کسیلے پھل آتے ہیں۔ ابن عباس نے اثل کا ترجمہ جھاؤ کیا تھا۔ بعض علماء نے کہا کہ اثل جھاؤ کے درخت کو نہیں بلکہ اور درخت کو کہتے ہیں جو جھاؤ کے مشابہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف کے پہاڑ والے میدان اور سڑکوں کے دونوں جانب جو پھیلے بارآور سایہ افگن درخت تھے ان کو اللہ نے برباد کر دیا اور ان کی جگہ کچھ جنگلی درخت پیدا کر دیئے جو عموماً ریگستان میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پیلو، جھاؤ، جھربیری وغیرہ۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۔ کفرانِ نعمت بُری بلا ہے۔ راحت ونعمت کی فراوانی، کور بصیرت، غافل آدمی کو مغرور اور سرکش بنا دیتی ہے۔ اور سرکشی کا آخری نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، قدرت کو کسی سے عداوت نہیں ہوتی، مگر قانون جزا وسزا اٹل ہے۔ نعمت کا حق ادا نہ کرنے والے سے نعمت چھین لی جاتی ہے، اس لئے فرمایا کہ قوم سبا کی بربادی ان کے کفر کی وجہ سے کی گئی کیونکہ اللہ کی عادت ہے جو نعمت کا حق ادا نہیں کرتا صرف اسی کو یہ سزا دی جاتی ہے۔ کفور سے مراد ہے کافر نعمت خواہ وہ مشرک ہو یا برائے نام مومن۔ کوئی جو نعمت کا حق ہر کوئی نہیں ادا کرتا اسی کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے بعض اہلِ تفسیر نے چونکہ کفور کی تفسیر کافر کی ہے، اس لئے مسلمانوں اور ایمان والوں کی بربادی کی تاویل کرنے کی ان کو ضرورت پڑی۔ کسی مومن کی تباہی اس کے گناہ کا کفارہ ہوتی ہے۔ حسن بصری نے فرمایا یہ برابری برابری کا بدلہ ہے یعنی برابری کا بدلہ انہی لوگوں سے لیا جاتا ہے جو کافر ہوں

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً ۔ قوم سبا پر مرحمت الٰہی رحمت کی فراوانی کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ چپہ چپہ پر شادابی قریب قریب آبادی تھی۔ سب خوف رہتے۔ نہ چور کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر نہ پیاس کی تکلیف نہ مسافر کو بے جگہ شام ہونے کا اندیشہ۔ سڑک کے دونوں

طرف سایہ دار اور ثمر ریز درختوں کی قطاریں نہ جھاڑ نہ جھنکاڑ۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گاؤں قصبے اور شہر آباد۔ مسافر جہاں اترتا وہاں ہر طرح کے پھل موجود۔ میدان پُرفضا صحراء دلکشا راحت افزا۔ ابو مالک اور ابن منبہ نے کہا کہ مبارک دیہات سے مراد وہ آبادیاں ہیں جو صنعاء (تخت گاہ یمن) کے علاقہ میں واقع تھیں۔ مجاہد، حسن بصری، سعید بن جبیر، زید بن اسلم، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن زید کا قول ہے کہ شام کی سرزمین مراد ہے (کثرتِ انبیاء اور سرسبزی کے سبب قرآن میں ملک شام کو ارضِ مبارکہ فرمایا ہے) مطلب یہ ہے کہ یمن سے شام تک مسلسل سرِ راہ دیہات آباد تھے۔ اس زمانہ میں یمن اور شام کے درمیان ریتیلے ٹیلے اور ناہموار وادیاں ہیں۔ اسی سبب سے بعض مفسروں نے ابو مالک کے قول کو ترجیح دی ہے، مگر یہ قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کیونکہ قرآن کی صراحت سے تو خود معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دشوار گزاری قوم سبا کی سرکشی کا نتیجہ ہے۔ سیلاب آتا ہے تو عموماً ریت کے ٹیلے جا بجا پیدا ہو جاتے ہیں پھر سیل العرم کے بعد اگر ایسا ہو گیا تو کیا تعجب ہے۔ سیل العرم سے قبل ضرور ملک سرسبز اور راستے پُرفضا ہوں گے۔

وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ۔ مراد یہ ہے کہ قدرتی طور پر باہم آبادیوں اور بستیوں کا فاصلہ تھا کہ معمولی رفتار کے بعد مسافر ایک آبادی سے دوسری آبادی میں پہنچ جاتا تھا۔ راستہ میں ناقابلِ قیام جگہ یا غیر محفوظ صحرا میں اس کو ٹھہرنا نہ پڑتا تھا۔ فرودگاہیں اور منزلیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مقرر تھیں اور راستہ میں چور، قزاق اور صحرائی درندوں کا کوئی اندیشہ بھی نہ تھا۔ رات دن یعنی ہر وقت جس کا جہاں جی چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ واقعی امن بھی عجیب نعمت ہے۔ طاقتور اور جتھے والے آدمی تو ہر جگہ جا سکتے ہیں۔ مگر کمزور، بے بس عورتیں اور اکیلے دکیلے ضرور تمند مسافر غیر محفوظ خطرناک راستہ پر چلنے سے معذور ہوتے ہیں۔ خصوصاً صحرائے عرب میں تو مسافروں کا چلنا پھرنا بہت ہی خطرناک تھا۔ عموماً قبائل عرب کی روزی ہی شکار یا غارتگری سے وابستہ تھی ان کے لئے امنِ راہ تو ناقابلِ نظیر نعمت تھی، اس لئے آیۂ مذکور میں قوم سبا کے تذکرہ کے ذیل میں بطور منت یہی امن راہ کا ذکر فرمایا۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ــــ ابن عباس، مجاہد اور حسن بصری وغیرہم نے فرمایا کہ قوم سبا خداداد نعمت سے اکتا گئی ان کی خواہش ہوئی کہ عرب کی طرح ہمارے میدان بھی لق و دق بے آب و گیاہ صحرا ہوں تاکہ ان کو طے کرنے کے لئے زادِ راہ کی ضرورت ہو۔ راستہ میں گرمی ہو تو ہوا بھی ہر طرح کے خطرات ہوں۔ یہ گنجان آبادیاں اور چشموں اور نہروں کی فراوانی۔ سایہ دار درختوں کی افراط، لذیذ میووں کی کثرت اور تمام وہ اسباب کی فراہمی مفہوم سفر کے خلاف ہے۔ ایسے سفر کا کیا مزہ جس میں تکلیف نہ ہو، پس انہوں نے خداداد نعمت کی ناشکری اور خود اپنا نقصان کیا۔ ایک تو ناشکری خود ہی وبالِ آخرت کا سبب ہے دوسرے موجودہ نعمت کو بھی تباہ کرنے والی ہے۔

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ کفرانِ نعمت ہلاکت انگیز ہے۔ خواہ خدا پرست گروہ کی طرف سے ہو یا کافروں کی طرف سے آیت مذکورہ کی صراحت بتا رہی ہے کہ قوم سبا خدا کو کارساز اور فاعل مختار جانتے تھے، مگر خداداد نعمت کی قدر نہ کرتے تھے، اسی لئے انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے سفر کی مسافت کو دور کر دے۔ پس یہ ان کی ناحق شناسی اور معصیت کوشی تھی، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ نے سیل عرم بھیجا ان کی بستیاں ویران اور جماعتیں پراگندہ ہو گئیں نہ وہ مدنیت رہی نہ راحت آفرینی کا سامان، سب پارہ پارہ کر دیے گئے۔ ابن ابی حاتم نے شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ سیل عرم سے جب قوم سبا کی بستیاں غرق ہو گئیں تو جو لوگ بچے تھے وہ ادھر ادھر چل دیے۔ غسان کا خاندان (یعنی اولاد جفنہ) تو ملک شام میں جا کر آباد ہو گیا۔ قبیلہ اَزد عمان میں ساکن ہو گئے۔ خزاعہ (راستہ ہی سے کٹ لئے اور) تہامہ (حجاز) میں رہ پڑے۔ خزیمہ نے عراق میں بودوباش اختیار کی۔ عمرو بن عامر (مشہور کاہن) اپنی اولاد اوس و خزرج کو یثرب میں لے آیا۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ یمن سے شام تک چار ہزار سات سو آبادیاں تھیں۔ جن کو اللہ نے اجاڑ دیا۔

شعبی کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ سیل عرم کے بعد قوم سبا نے یمن کی سکونت چھوڑ دی اور اطراف میں پراگندہ ہوئی تھی، لیکن بعض آثار سے پتہ چلتا ہے کہ عمرو بن عامر کاہن نے پہلے سے سیلاب کے آنے کی اطلاع دے دی تھی اور اس کی اطلاع پر قوم والوں نے یمن کی سکونت ترک کر دی تھی۔ اس کاہن کی داستان اور پیشین گوئی کے الفاظ بلیغ بھی بعض کتب تاریخ میں مروی ہیں، مگر یہ بات درایت کے خلاف ہے۔ ایک کاہن کی پیشین گوئی پر سب لوگوں کا متفرق ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر اس قول کا سلسلۂ روایت بھی بقول ابن کثیر غریب ہے، اس لئے قابلِ اعتبار نہیں اور شعبی کی روایت ہی صحیح ہے۔ ہاں اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ قوم سبا عمرو بن عامر کاہن کی اتنی معتقد اور گرویدہ تھی کہ اس کے قول کو کسی طرح بھی غلط نہیں مانتی تھی اور وحیٔ الٰہی کی طرح سمجھتی تھی اور اس روایت کا ثبوت بھی ہو جائے

تو تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں، مگر سربستہ مجہول روایات کو ہم قابلِ اعتبار نہیں مانتے ۔ محمد بن اسحاق بن یسار نے کتاب السیرۃ میں سیل عرم کے آنے سے پہلے قوم سبا کے متفرق ہونے کا تذکرہ آیا ہے ۔ اس روایت میں حفنہ کو عمرو بن عامر کا بیٹا کہا ہے اور ان کی دو شاخیں قرار دی ہیں ۔ ایک شاخ کی سکونت سراۃ میں قرار دی ہے ۔ اور دوسری شاخ کا محل نزول عمان کو کہا ہے ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ عمرو بن عامر کی پیشین گوئی کے بعد اس کی ہدایت کے موافق خاندان مساد عدبن کا اس یا کرو رکی سرزمین میں اور خاندان عوف بن عمرو یعنی بارق ارض الشن میں اور خزاعہ ارزین (یعنی حجاز) میں اور اوس وخزرج یثرب میں اور بنو حنیفہ کوفے اور بصرہ (شام) میں جاکر سکونت پذیر ہو گئے ۔ ابن اسحاق نے یہ بھی لکھا ہے کہ قصۂ مذکور عمرو بن عامر کی بیوی طریفہ کی طرف بعض اہلِ تاریخ نے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کاہنہ تھی اور اسی نے پیشین گوئی کی تھی ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ - تذکرۂ سلف عبرتِ خلف کا موجب ہوتا ہے ۔ داستانِ عیش وطرب اور قصۂ ہلاک وتباہی بیان کرنے کا اصل مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مصیبت زدہ قوم اپنی حالت کو درست کرے ۔ اضطراب وبے چینی کے ساتھ نہیں بلکہ انفرادی اعمال کی اصلاح، معاشرت کی درستگی، سوسائٹی کی راستی اور محنت کاوش استقامت کے ساتھ صبر کا یہی مفہوم ہے اور جو قوم راحت وچین سے بہرہ اندوز ہو وہ نعمت کی قدر کرے، اس کے محل پر صرف کرے۔ نخوت وغرور کے نشہ میں سرشار نہ ہو جائے اور انجام کی طرف سے غافل ہو کر اسبابِ حیات کو چھوڑ کر تباہی کے غار میں نہ گرتی چلی جائے ۔ قوم سبا کے عروج وزوال ترقی وتنزل آبادی وبربادی اور راحت ورنج بھی اپنے اندر گوناگوں نشان رکھتا ہے ۔ مگر مصیبت زدہ، صابر اور راحت رسیدہ شاکر کے لئے ۔

مقصودِ بیان قوم سبا کی آبادیاں بہت تھیں ۔ ان کا تمدن بہت بلند تھا، ان کا ملک شاداب اور سرسبز تھا، ہر طرف عیش ہی عیش تھا ۔ نافرمانی کی وجہ سے ان کی خوشحالی بدحالی سے بدل گئی ۔ بار آور درختوں کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو گئے ۔ وَھَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفرانِ نعمت یعنی نعمت کی آرزو نہ کرنی، اس کو بے محل صرف کرنا اور شکر ادا نہ کرنا نعمت کو برباد کر دیتا ہے ۔ ورنہ نعمت کے قدردان سے بطور سزا نعمت نہیں چھینی جاتی ۔ قوم سبا کی بستیاں قریب قریب بانداز منازل تھیں ۔ لفظ رَبَّنَا بتا رہا ہے کہ قوم سبا والے خدا کو ضرور مانتے تھے ۔ بلکہ رب اور فاعل مختار جانتے تھے ۔ مگر کافرِ نعمت تھے ۔ قوم سبا اللہ کی ناراضگی کے سبب برباد ہو گئی ۔ ان کے اجتماعات اور جتھے اطراف میں پراگندہ ہو گئے اور ان کا وطن گھر بار مال واموال و ملک نذرِ تباہی ہو گیا اور داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے ۔ قوم سبا کی ترقی وتنزل کی داستان عروج وزوال کی حکایت اور آبادی وبربادی کی نقل باعثِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو شدائد پر صبر رکھتے اور عیش وراحت کا شکر ادا کرتے ہیں ۔ اُن کے لئے جو ناجائز لذتوں سے نفس کو روکتے اور جائز مسرتوں کے حق کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کے اندر مختلف قصوں کا بیان محض درسِ عبرت دینے اور سرمایۂ نصیحت جمع کرنے کے لئے ہے

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

شیطان نے اُن پر اپنا خیال پورا کر دیا پس سوائے ایمانداروں کے ایک گروہ کے سب شیطان کے پیچھے لگ گئے

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَیْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ

شیطان کا اُن پر کچھ زور نہ تھا مگر ہم کو معلوم کرنا تھا کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون آخرت

هُوَ مِنْهَا فِیْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۝ ع

ع ۱۲ ۸

کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے اور تمہارا رب ہر چیز کا نگہبان ہے

تفسیر :- خالقِ حکیم نے انسان کو دوسری مخلوق کے ہوتے ہوئے اس زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر اس لئے بھیجا کہ عدالت کو قائم کرے اور اللہ کے احکام جاری

کرے۔ اس مقصد کے لئے انسان کو روحانیت اور عقل عطا فرمائی، لیکن صرف روحانیت اور عقل قیام عدالت کے لئے کافی نہیں۔ محض روحانیت تو فرشتوں میں بھی موجود تھی۔ عدالت اس اعتدالی اور درمیانی صفت کا نام ہے جو جانبین کے افراط و تفریط کو فنا کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اسی غرض سے انسان کو مادی کثیف تاریک قوتیں بھی دی گئیں۔ اس طرح انسان کے اندر تین قوتیں ہو گئیں (۱) عقل و روحانیت (۲) وہ قوت جس سے جسمانی مرغوبات کو حاصل کیا جاتا ہے (۳) وہ قوت جس سے جسمانی دکھ پہنچانے والے دشمنوں کو دفع کیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر دونوں قوتیں جسمانی ہیں اور اول طاقت روحانی۔ جسمانی قوتیں روحانی طاقت کو اس کے فعل سے روکتی ہیں۔ اور روحانی طاقت جسمانی طاقتوں پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر روحانی طاقت غالب آجاتی ہے تو جسمانی طاقتوں کو اس کا فرماں بردار ہو جانا پڑتا ہے۔ اس وقت انسان کی شہوانی اور غضبی قوتیں عقل کے زیر اثر کام کرتی ہیں اور عقل ان کو نہ اس قدر کمزور ہونے دیتی ہے کہ انسانیت کا مادی جز فنا ہو جائے نہ اتنا قوی بننے دیتی ہے کہ وہ اس کے اثر سے خارج ہو جائیں بلکہ ان دونوں قوتوں میں ایک اعتدالی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح اپنے اندر بھی افراط و تفریط کو چھوڑ کر متوسط حالت پیدا کر لیتی ہے۔ اسی اعتدالِ انسانیت کا نام عدالت ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ عقل کو عدالت قائم کرنے سے روکنے والی خود انسان کے اندر دو قوتیں موجود رہیں اور عدالت کو قائم کرنے والی ایک قوت ہے، لیکن اندرونی قوتوں کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی کچھ انس و جن شر کی طرف دعوت دینے والے اور کچھ حق و صداقت کے منادی موجود ہیں۔ اول گروہ کا کام اغوا کرنا اور بہکانا ہے اور دوسرے گروہ کا کام راہِ حق دکھانا ہے مغوی گروہ کے سردار کا نام ابلیس ہے۔ کیونکہ خالق حکیم نے انسان کو زمین پر اپنا جانشین بنایا ہے، اس لئے اس کے مراتب کے بڑھانے کے لئے اس کے اندرونی اور بیرونی دشمن بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ہر مخلوق کے مرتبے کی ایک خاص حد ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق کی قوتوں کی تخلیق اور اس کے اعمال محدود ہیں۔ اچھے ہیں یا بُرے مگر انسانی قوتوں کے اختیار اور عملِ خیر و شر کی کوئی خاص حد نہیں، اس لئے اس کے مراتب کی بھی کوئی حد نہیں۔ پس انسان کو مکلف بنانا تکلیف دینے کے لئے نہیں بلکہ آزمائش کے لئے ہے۔ انسان کے بہکانے پر ابلیس کو قدرت دینا بھی اسی مصلحت سے ہے۔ پس ابلیس اور اس کی ذریات اسی شخص کو بہکا سکتے ہیں جس کی روحانی قوت مغلوب ہو اور اعتدالِ انسانیت ان کو میسر نہ ہو۔ جو لوگ مخلص مومن ہیں یعنی غالب عقل رکھتے ہیں ان لوگوں کو کوئی گمراہ کرنے والا گمراہ نہیں کر سکتا۔

تحلیلِ اجزاء — وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ جب خدا تعالیٰ نے تمام ملائکہ اور ابلیس کو سجدۂ آدم کا حکم دیا اور ابلیس نے انکار کیا اور اللہ نے اس کو مردود بارگاہ قرار دے کر نکل جانے کا حکم دیا تو ابلیس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ یعنی تیری عزت کی قسم میں سوا تیرے منتخب کے اور سب کو گمراہ کر دوں گا۔ یہ بھی اس نے کہا تھا۔ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ یعنی ان میں سے تو اکثر کو شکر گزار نہ پاؤں گا۔ ابلیس نے جو یہ الفاظ کہے تھے تو اپنے گمان اور خیال سے کہے تھے اور آئندہ کے متعلق اس کو کوئی علم نہ تھا۔ پھر جب اکثر انسانوں نے اس کی پیروی کر لی اور اس کے فرمان پذیر بن گئے تو اس کا گزشتہ گمان سچ ہو گیا اور اس نے اپنا قول پورا کر لیا۔ ابن قتیبہ نے یہی فرمایا (سراج) گویا ابن قتیبہ کی یہ تفسیر مجاہد کے قول کے موافق ہے کہ یہ آیت اہلِ سبا کے متعلق نہیں ہے بلکہ عام آدمیوں کے متعلق ہے اور آیتِ مذکورہ میں عَلَيْهِمْ کی ضمیر قوم سبا کی طرف راجع نہیں بلکہ عام آدمیوں کی طرف راجع ہے جو معنیً مذکور ہیں، لیکن خطیب نے سراج میں صراحت کی ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک ضمیر مذکور اہلِ سبا کی طرف راجع ہے اور سیاقِ کلام یہی بتا رہا ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ قوم سبا میں اکثر آدمی گمراہ ہو گئے تھے۔ اور کچھ لوگ ایمان دار بھی تھے۔ جن کو شیطان گمراہ نہ کر سکا تھا۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ۔ اکثر مفسرین نے اس جگہ لفظ سلطان کا ترجمہ تسلط کیا ہے۔ چونکہ آیت مذکورۂ بالا سے خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید شیطان کو عام لوگوں کو گمراہ کرنے اور اپنا دعویٰ پورا کرنے کا اختیار ہے اور وہ بالجبر اکثر آدمیوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرما دیا کہ کسی قسم کا جبری تسلط اور قہری حکومت ابلیس کو انسانوں پر حاصل نہیں۔ حسن بصری نے اسی تفسیر کی تائید کرتے ہوئے فرمایا واللہ ابلیس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ان کو زبردستی مجبور کر سکے۔ اور نہ اس نے کبھی ان لاٹھی یا کوڑے سے مارا بلکہ اس کو تو صرف اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ دلوں میں امیدیں پیدا کر کے اور لالچ دے کر دھوکہ میں ڈالے، لیکن ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس جگہ سلطان کے معنی ہیں حجت یعنی دلیل اور برہان۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کے پاس انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے کوئی دلیل اور حجت نہیں صرف اوہام ہیں اور اوہام ہیں، فریب اور دھوکہ ہے، مطلب دونوں قولوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔

إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ۔ یہ ابلیس کو فریب دہی کا اختیار دینے کی علت کا بیان ہے۔ جمہور اہلِ سنت نے معالم میں اور

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جگہ علم بمعنی تمیز ہے ۔ اللہ نے تفصیلی تمیز کیلئے اور اس بات کو واضح طور پر جاننے کے لئے کہ کس کو آخرت پر ایمان ہوگا اور کس کو نہ ہوگا شیطان کو اغوا کرنے کا اختیار دیا ۔ اس قول کی غرض یہ ہے کہ علم اجمالی تو خدا کو پہلے ہی تمام کائنات کے ہر ذرہ کا تھا ، مگر تفصیلی علم جو عدم سے وجود میں لانے ، پیدا کرنے اور ہر آدمی کے نیک بد عمل کرنے پر موقوف ہے اور اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس بات کا محتاج تھا کہ انسانوں کو آزمائشی دور میں ڈالا جائے اور شیطان کو اغوا کرنے بہکانے اور دھوکہ دینے کا اختیار دیا جائے ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ کے جاننے سے مراد اس جگہ عذاب ثواب کے لئے جاننا ہے ۔ اگرچہ خدا عالم الغیب ہے ، ذرہ ذرہ سے واقف ہے ، مگر اس کے علم پر عذاب ثواب مرتب نہیں ہو سکتا ۔ وقوع سے پہلے سزا جزا خلافِ عدل ہے ، اس لئے انسانوں کو پیدا کرنے اور شیطان کو اغوا کا اختیار دینے اور پھر انسانوں کو گمراہ ہونے یا نہ ہونے کی ضرورت ہوئی ۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مومنوں اور کافروں کو جزا سزا دینے کے لئے ہم نے شیطان کو اغوا کرنے اختیار دیا ۔ شیطان کو جبری تسلط انسانوں پر حاصل نہیں بلکہ امتحانی تسلط حاصل ہے ۔

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۔ یعنی شیطان کو انسان پر مسلط کرنے سے مقصود ہے جزا سزا سے تعلق رکھنے والا علم تمیزی حاصل کرنا ورنہ محض علم تو خدا کو ہر چیز کا حاصل ہے اور حصول بھی کیسا اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے ہر چیز اس کے سامنے حاضر ہے ۔ پس شیطانی وسوسہ کا فر کا انکار اور مومن کا ایمان بھی اس کو پہلے ہی سے معلوم ہے اور اس کے علم ازلی کے مطابق ہی سب کچھ ہوتا ہے ۔

مقصودِ بیان ابلیس ایک زندہ مخلوق انسانی مادی قوتوں کے علاوہ ہے ۔ جو صاحب علم و ارادہ ہے ، مگر اس کو آئندہ کا یقینی علم نہیں ۔ صرف ظن اور گمان ہے جو کہیں پورا ہو جاتا ہے اور کہیں نہیں ۔ مخلص اہلِ ایمان کو ابلیس نہیں بہکا سکتا ۔ انسان پر شیطان کا کوئی جبری تسلط نہیں اس کو صرف اغوا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ۔ اللہ کو سب کچھ تخلیق عالم سے پہلے ہی معلوم تھا ، مگر انسان کو پیدا کر کے شیطان کو اس کے بہکانے پر مسلط کرنے سے صرف آزمائش مقصود ہے یعنی ایسا امتحان لینا مقصود ہے جس پر عادلانہ جزا سزا مرتب ہو سکے ۔ پس وہ لوگ غلطی پر ہیں جو شیطان کی تخلیق کو بے فائدہ یا ضرر رساں خیال کرتے ہیں یا انسانی گناہ کا مجرم خدا کو قرار دیتے ہیں کیونکہ شیطان کی تخلیق کی غرض صرف امتحانِ انسان ہے اور شیطان کسی کو مجبور نہیں کر سکتا صرف لالچ اور فریب دے سکتا ہے اور تخلیق سے پہلے اگرچہ خدا کو سب کچھ معلوم تھا ، مگر اس کا علم واقعی ہونے کے ساتھ ساتھ مجبور کن نہ تھا وغیرہ ۔

٭

(اس پارہ کا دوسرا جزو جلد ہی پیش کیا جائیگا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبْحَانْ

کا

پارہ نمبر ۲۲

(جزو ثانی)

وَمَنْ يَّقْنُتْ

از

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدائم جلالی

عطاء الرحمن صدیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند۔ یو۔ پی

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی) سے شائع کیا۔

بائیسواں پارہ جزو ثانی

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا

(اے محمدؐ) کہہ دو کہ اللہ کے سوا اُن کو پکارو جن کو تم شریک خیال کرتے ہو اُن کو ذرہ برابر اختیار نہیں نہ آسمانوں میں

فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

زمین میں اور نہ آسمان و زمین میں ان کا کچھ ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور نہ اللہ کے ہاں سفارش کام

عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا

آئے گی .. سوائے اُس شخص کے جس کو اللہ اجازت دے یہاں تک کہ جب اُن (سفارش کرنے والوں) کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاوے گی تو وہ کہیں گے تمہارے

الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ

رب نے کیا فرمایا دوسرے جواب دیں گے حق فرمایا وہی عالیشان اور بزرگ ہے (محمدؐ) کہو کہ آسمان و زمین سے تم کو کون روزی دیتا ہے کہہ دو کہ اللہ دیتا ہے

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قُلْ لَّا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا

اور ہم یا تم ضرور ہدایت پر ہیں یا صریح گمراہی میں کہہ دو کہ جو ہم نے گناہ کئے اُن کی باز پرس تم سے نہ ہوگی

وَلَا نُسْـَٔــلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَ

اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کی پرسش ہم سے نہ ہوگی کہہ دو کہ ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارا باہمی فیصلہ انصاف کرے گا وہی

هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ۝ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

فیصلہ کرنے والا دانا ہے کہہ دو کہ جن کو شریک ٹھہرا کر تم اللہ کے ساتھ ملاتے ہو مجھے تو اُن کو دکھاؤ ہرگز نہیں بس وہی اللہ غالب حکمت والا ہے

تفسیر توحید حقیقی کا انکار کرنے والوں کے شرک آمیز خیالات مختلف تو جیہوں کے ہو سکتے ہیں۔ ۱۔ اس کائنات کا مالک اللہ کے سوا کوئی اور ہو۔ ۲۔ اگر مستقل مالک نہ ہو تو اللہ کے ساتھ ملکیت میں شریک ہو۔ کائنات کچھ حصہ ایک کا ہو اور کچھ دوسرے کا۔ ۳۔ یا یہ صورت ہو کہ مستقل مالک اللہ ہی ہو اور اس کا کوئی شریک بھی نہ ہو مگر اس عظیم الشان سلطنت کا کام چلانے اور انتظام حکومت قائم رکھنے میں اس کا کوئی مددگار اور پشت پناہ ہو جیسے دنیوی حکومت کا انتظام قائم رکھنے کے واسطے بادشاہوں کے وزیر اور حکام ہوتے ہیں۔ سراغ رسی اور گرفتاری کے لئے پولیس، فیصلہ کے لئے جج اور تحصیل وصول کے لئے محکمہ مال کے کارکن ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان یا جنات یا فرشتے یا ستارے یا عناصر یا اور کوئی غیبی مخلوق اللہ کا ہاتھ بٹانے والا ہو۔ ۴۔ اگر انتظام کائنات میں کوئی دخیل بھی نہ ہو اور اللہ کا کوئی مددگار بھی نہ ہو تو کم از کم اتنا ہو کہ اس کا کوئی خاص مقرب اور دربار ی ہو جو موقع بے موقع سفارش کر دے۔ ۵۔

اچھا ملکیت، انتظام، سفارش کچھ بھی نہ سہی، تخلیق اور قیام زندگی کا کسی غیر سے کوئی تعلق بھی نہ ہو اور نفع نقصان اور دکھ سکھ کا تعلق بھی محض اللہ ہی سے، مگر لین دین اور کمانے پینے کا تعلق بھی اللہ کے سوا کسی اور سے ہو اور جب اس کو خوش کیا جائے تو وہ ہمارے رزق میں وسعت کر دے گا۔ اچھا یہ بھی نہ سہی لیکن اتنا ہی ہو کر اعمال کی جزا سزا یا جزا سزا کی تبدیلی میں کسی کو کوئی دخل ہو اور اس سے اس کے پرستاروں کو فائدہ پہنچ جائے۔ بہرحال شرک کی کوئی صورت ہو تی الجملہ فائدہ سے خالی نہیں۔

اہل باطل کا یہ تنوع بیان دھوکہ ہے، فریب ہے، وہم اور سفسطہ ہے۔ اللہ ہی مالک کل ہے۔ نہ اس کا ملکیت میں کوئی ساجھی ہے نہ کوئی وزیر اور مددگار نہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کر سکتا ہے۔ سفارش کرنے کی جرأت کرنی تو بجائے خود رہی اس کی عظمت و جلالت کی تو یہ حالت ہے کہ جب عالم غیب کے کارندوں کو کوئی حکم ملتا ہے تو ان کے ہوش بجا نہیں رہتے۔ حکم کو ٹالنا اور اس میں دخل دینا تو درکنار رہا حکم کو سنتے ہی سب کو حقانیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ رہا لین دین اور عطائے رزق تو اس کی کنجی بھی اسی کے پاس ہے، وہی رازق ہے اس کے علاوہ کسی کے قبضہ میں کچھ نہیں۔ اور آخرت کی جزا سزا کو کہو تو اس کا واسطہ بھی اسی سے پڑے گا۔ کسی کو اس میں دخل نہیں۔ جزا سزا کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ غرض یہ کہ تخلیق ملکیت، انتظام حکومت، رزق اور جزا سزا ان سب کا اختیار اسی کو ہے پس وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔

تحلیل اجزاء

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ۔ فرماں برداروں پر جود و کرم کی بارش اور نافرمانوں کی تباہی کی تصویر کشی گزشتہ آیات میں کر دی گئی جس سے واضح طور پر اللہ کا مالک کل، حاکم مطلق اور متصرف حقیقی ہونا ثابت ہو گیا، لیکن جن کے دلوں پر جہالت کے سیاہ پردے ہیں ان کو نور حق نظر نہیں آتا۔ بیرونی روشنی کو پانے کے لئے اندرونی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ ایسے کور باطن لوگوں کو توحید کا عقیدہ عجیب معلوم ہوتا ہے، اس لئے وہ ذہن رسائی کرتے الجھتے ہیں۔ اکثر لوگ اعتقادی طور پر تو خدا کو واحد جانتے ہیں، مگر عملی طور پر شرک کرتے ہیں۔ مشرکوں میں ایسے ہی آدمیوں کی کثرت ہے۔ اعتقادی مشرک تو بہت کم ہیں عملی مشرک زیادہ ہیں۔ بہرحال رد سب کا کرنا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرنی باوجودیکہ اللہ کے سوا کسی میں الوہیت کا شائبہ بھی نہیں۔ کھلا ہوا شرک ہے۔ اب انسان جب کسی کے سامنے سر نیاز جھکاتا اور اس کی پرستش کرتا ہے تو اس پرستش اور اعتراف عظمت کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ اسی لئے مذکورہ جملہ میں خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو براہ راست اور دوسرے اہل توحید کو بالواسطہ حکم دیا کہ ان تمام مشرکوں سے کہو کہ تم اپنے معبودوں کو پکارو (یعنی کسی فائدہ حاصل کرنے یا ضرر کو دفع کرنے کے لئے پکارو اور دیکھو کہ وہ تمہاری کچھ بھی مدد بھی کر سکتے ہیں یقینی طور پر وہ تمہاری کچھ بھی مدد نہ کر سکیں گے)

لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ۔ آخر پرستش کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ لالچ یا خوف پرستش کا باعث ہو سکتا ہے اور لالچ یا خوف کی بنا اس امر پر ہے کہ معبود کی ملکیت میں کوئی چیز ہو جس کا لالچ یا جس سے خوف ہو اور چونکہ اس تمام کائنات میں سے ذرہ برابر چیز کا کوئی مالک نہیں اس لئے اس کی پرستش کرنی باطل ہوئی۔

وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ۔ ایک وجہ عبادت غیر اللہ کی یہ ہو سکتی تھی کہ اللہ کے ساتھ اس کائنات کی ملکیت میں کوئی دوسرا شریک ہوتا۔ تب بھی اس کو کسی قدر الوہیت و معبودیت کا استحقاق حاصل ہو جاتا، مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ کوئی اس کا شریک بھی نہیں۔ یہودیوں کا اعتقاد تھا کہ عزیر خدا کا بیٹا تھا۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ مسیح ابن اللہ تھا بلکہ ان میں سے ایک گروہ کا تو یہ خیال تھا کہ الوہیت کے اقانیم ثلثہ ہیں۔ باپ بیٹا بیوی ان تینوں کے مجموعہ کا نام اللہ ہے۔ بعض قبائل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اس تمام خرافات کا فقرہ مذکورہ سے رد ہو گیا۔ کسی کو کائنات کی تخلیق اور ملکیت میں کوئی حصہ حاصل نہیں۔ پھر الوہیت کا حصہ کیسے مل سکتا ہے۔

وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ۔ بکثرت اسرائیلیوں کا خیال تھا کہ اللہ کو انتظام عالم قائم رکھنے کے لئے مددگاروں کی ضرورت ہے۔ بس غیبی مخلوق میں سے تو فرشتے یا کواکب کی روحانیت اس کی معاون ہے اور انسانوں میں سے برگزیدہ آدمی اس کے مددگار ہوتے ہیں اور چونکہ مختلف مورتیاں، ستاروں کی روحانیت کے نام پر بنائی جاتی ہیں۔ اور کچھ انبیاء و صلحاء کے شکل کے بت ہوتے ہیں یا ان کے نام کے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان تمام مورتیوں اور بتوں کو اپنے اصول سے خاص تعلق پیدا ہوتا ہے، اس لئے مورتیوں کی پرستش مددگاران الوہیت کی خوشنودی حاصل کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ گویا خدا دنیوی بادشاہ ہے جس کو کاروبار اور

کارگزاروں کی ضرورت ہے۔ بغیر تحتانی حکام کے حکومت کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ پس سب سے پہلے زیریں کارندوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ ان کے ذریعہ سے اوپر تک رسائی ہو سکے۔ یہ خیال آج کل بھی بہتیرے مسلمانوں کا ہے۔ بلکہ بعض علماء کا بھی ہے اور اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمیوں کو خیالات نے فریب کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ وہ الٰہی حکومت کو شاہی حکومت کی طرح محتاج سمجھنے لگے ہیں۔ ان تمام بیہودہ خیالات کا ازالہ فقرۂ مذکورہ میں فرمادیا کہ مخلوق میں سے اللہ کا کوئی مددگار نہیں یعنی اگر اللہ کا کوئی مددگار اور ہاتھ بٹانے والا ہوتا تو وہ اس سے بڑا یا کم از کم ہم پلہ یعنی واجب القدیم ہوتا۔ مخلوق اور حادث سے کس طرح اس کو مدد مل سکتی ہے اور کس طرح وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا محتاج ہو سکتا ہے۔ تمام مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے جب وہ بے نیاز تھا کسی کی اس کو حاجت نہ تھی اور تنہا اس نے سب کچھ بنا دیا تو اب بنائی ہوئی چیز کا انتظام قائم رکھنے کے لئے اس کو مددگار کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔

وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ۔ یہودی کہتے تھے کہ ہم گناہوں کی پاداش میں اگر دوزخ میں جائیں گے تو صرف چند روز کے لئے۔ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد انبیاء گزرے ہیں۔ قیامت کے دن وہ اپنی اولاد کو سفارش کر کے بچا لیں گے۔ عیسائی کہتے تھے کہ مسیح ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گئے۔ مجوس اپنے مذاہب کے مدعی تھے۔ مسلمانوں میں فرقۂ شیعہ امام حسینؓ کو امت کے گناہوں کا کفارہ خیال کرتا ہے۔ بکثرت جاہل سنی بھی اولیائے عظام مرشدین کرام خصوصاً حضور اقدسؐ کی شفاعت کے بھروسہ پر بداعمالیوں میں غرق ہو رہے ہیں۔ اس باطل خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ شفاعت اور سفارش سے خدا کے سامنے کام نہیں چلے گا اور چلے گا تو صرف انہی لوگوں کا جن کے متعلق سفارش کرنے کی اجازت خدا تعالیٰ دے گا اور ظاہر ہے کہ سفارش کرنے والے کو جب منصب شفاعت حاصل ہو گا تو وہ اس شخص کی شفاعت کس طرح کرنے کی جرأت کرے گا کہ جو اللہ کا باغی ہو گا۔

قرآن پاک کی دوسری آیت میں شفاعت ملائکہ کے متعلق آیا ہے۔ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ یعنی کثرت ملائکہ کی سفارش سود مند نہ ہو گی سوائے ان لوگوں کے جن کی سفارش کرنے کی اجازت خود خدا دے اور سفارش کنندگان کے حق میں پسند کرے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ یعنی ملائکہ خدا کے خوف سے ڈرتے ہوں گے اور سوائے ان لوگوں کے جن کے حق میں شفاعت کو اللہ پسند فرمائے اور کسی کی سفارش نہیں کریں گے۔

پس شفاعت کا مدار بھی اللہ کی مرضی پر ہے۔ تو پھر درمیانی وسائل قائم کرنا اور اس لالچ سے ان وسائل کی پرستش کرنی کہ یہ ہماری سفارش کریں گے اور ہم کیسی ہی سرکشی کریں، خدا کی نافرمانی کریں، اس کو ناراض کریں ان وسائط اور وسائل کی شفاعت ہم کو بچا لے گی ایک خام خیالی ہے۔

اس سے عام شفاعت کی نفی نہیں ہوتی۔ شفاعت غیر مرضی کی اور بلا اذن سفارش کی نفی نکلتی ہے۔ اس لئے رسول پاکؐ کی شفاعت کا انکار کرنا غلط ہے۔ احادیث صحیحہ سے حضورؐ کی شفاعت ثابت ہے۔ اور یہ شفاعت باذنہٖ ہے اور انہی لوگوں کے حق میں ہے جن کو رہائی دینی خدا چاہے گا۔ ہر کس و ناکس کی نہ ہوگی۔

• حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ابن عباس، ابن عمر، ابوعبدالرحمٰن سلمی، شعبی، نخعی، ضحاک، حسن، قتادہ اور بکثرت مفسرین تو اس طرف گئے ہیں کہ قلوبہم کی ضمیر ملائکہ کی طرف راجع ہے۔ اور آسمانی فرشتوں کی جو حالت پیام الٰہی کے نزول و سماعت کے وقت ہوتی ہے اس کا اظہار ہے یعنی اللہ کے سامنے اس کی عظمت کا تو یہ حال ہے کہ جب کوئی پیام نازل ہوتا ہے اور حاملان عرش سے لے کر آسمان دنیا تک فرشتے اس کو سنتے ہیں تو ہیبت کے مارے بیہوش ہو جاتے ہیں۔ کوئی کلمہ کوئی زبان نہ۔ جب کچھ دیر کے بعد ان کے ہوش بجا آتے ہیں تو نیچے درجہ والے فرشتے بڑے درجہ والے فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ فرمایا حق فرمایا۔ وہ بہت عظیم الشان اور عالی مرتبہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا جب اللہ آسمان میں کوئی حکم جاری فرماتا ہے تو حکم کی تعظیم کے لئے فرشتے اپنے پر ولا ہیت سمجھ میں گر پڑتے ہیں پھر جب دلوں سے ہیبت دور ہوتی ہے تو پوچھتے ہیں۔ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ (دوسرے فرشتے) کہتے ہیں الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

• امام زین العابدین نے بروایت ابن عباسؓ بیان فرمایا کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا جب ہمارا رب کسی امر کا حکم دیتا ہے تو حاملان عرش تسبیح پڑھتے

ضلال خاص بلاغت رکھتا ہے۔ سب تک پہنچنے کا راستہ ملے گا یا نہ ملے گا۔ جس کو ملے گا وہ ہدایت پر ہے جس کو نہ ملے گا وہ گمراہی میں رہا۔

قتادہ نے فرمایا اصحاب رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں کو اس طور پر سمجھایا تھا کہ واللہ ہم اور تم ایک امر پر متفق نہیں ہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک طریق ضرور ہدایت پر ہے۔

یہ کلام بطور شک نہیں بلکہ مشرکوں کو حق کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے عکرمہ اور زید بن ابی مریم نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تو ضرور ہدایت پر ہیں اور تم بلاشبہ کھلی گمراہی میں ہو۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یہ بطور اتمام حجت کلام کا تتمہ ہے۔ کفار اہل اسلام کو مجرم سمجھتے تھے۔ اس لئے کلام کو ختم کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان سے کہدو ہمارے جرم کی تم سے باز پرس نہ ہوگی اور تمہارے کام کا ہم سے سوال نہ ہوگا۔

قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ قیامت کے دن جب اللہ ہم سب کو جمع کرے گا تو خود کھرا کر فیصلہ فرمائے گا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہم سب کی حالتوں سے بخوبی واقف ہے۔ یعنی فیصلہ کرنے والے اور اعمال کی جزا سزا دینے والے تمہارے معبود نہیں ہیں۔ ان کے قبضہ میں عذاب ثواب نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے وہی فیصلہ کرے گا پس جب ثابت ہو گیا کہ:۔

قُلْ اَرُوْنِیَ الَّذِیْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا تمام کائنات کا خالق، مالک، متصرف، ناظم اور رازق اللہ ہی ہے اور حق و باطل کا فیصلہ کرنا اور ہر شخص سے اس کے اعمال کی باز پرس کرنی اسی کا کام ہے اور ان کاموں میں سے کسی ایک میں سے بھی اس کا شریک حصہ دار نہیں۔ نہ کسی میں یہ مجال کہ سفارش کر کے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرالے۔ تو اب ان مشرکوں سے پوچھنا چاہیئے کہ جن (فرضی خیالی معبودوں) کو تم نے اللہ کا شریک اور ساجھی قرار دے کر الوہیت میں اس کے ساتھ ملا رکھا ہے وہ کہاں ہیں کیا کرتے ہیں۔ ذرا ہم کو بھی دکھاؤ ان کو اور ان کے نتائج الوہیت کو ہم بھی دیکھیں۔ اس کا جواب مشرکوں کی طرف سے کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ اللہ کا کوئی شریک، نظیر، مثیل موجود ہی نہیں ہے تو دکھائے گا کون کیا اور لائے گا کوئی کہاں سے۔ ہرگز کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔

بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ بلکہ اللہ ہی یگانہ ہے، قدرت غالبہ اور قوت حاکمہ اور ملکیت عامہ اور حکومت تامہ اور علم محیط اور حکمت بالغہ اسی کو حاصل ہے۔ وہ عزیز ہے یعنی قادر مطلق، حاکم کل اور مالک برحق ہے۔ وہ حکیم ہے یعنی اس کا علم ہمہ گیر ہے، پُر از مصلحت ہے۔ پھر اس کو شریک کی ضرورت ہے۔ بلکہ شریک کا کیا امکان۔

مقصود بیان قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ سے آخر تک بلیغ ترین طرز بیان کے ساتھ برہانی طور پر توحید الوہیت کو ثابت کیا ہے اور شرک جلی وخفی یہاں تک کہ اعتقادی اور عملی شرک کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے اور بار بار مشرکانہ عقائد کو دلیل سے ثابت کرنے کی دعوت دی ہے۔ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ کے اندر تازیانۂ عبرت ہے ان علم نما جاہلوں اور جاہل نما عالموں کے لئے جو حکومت الٰہیہ کو دنیوی حکومتوں کی طرح وزیروں اور مددگاروں کی محتاج جانتے اور اولیاء و انبیاء کو کارخانۂ قدرت کا مختار خیال کرتے ہیں۔ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ الخ سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے ان بے دقوف لوگوں کو جو ہر پیر فقیر اور ہر قبر اور بت کو ذریعۂ شفاعت جانتے ہیں۔ اور اولیاء و انبیاء خصوصاً حضور اقدس ﷺ کی شفاعت کا اپنی عصیاں کوشی اور بداعمالیوں کی آڑ بناتے ہیں اور خوب اچھی طرح سے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ کوئی ولی اور کوئی نبی اللہ کی مرضی کے خلاف شفاعت نہیں کر سکتا اور بالفرض شفاعت کرے بھی تو سودمند نہیں ہو سکتی۔

حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ الخ سے عظمت الٰہیہ کی تصویر کشی مقصود ہے اور یہ ظاہر کرنا غرض ہے کہ حاملان عرش ایسی جلیل القدر ہستیاں اللہ کی ہیبت سے لرزتی اور خوف سے بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کی مرضی کے خلاف کون کسی کی سفارش کر سکتا ہے۔ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ الخ سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ آسمانی کائنات ارضی موجودات اور ان دونوں کی کارفرمائیاں ہیچ ہیں۔ رازق نہ آسمان ہے نہ زمین نہ ان کے حوادث بلکہ رازق صرف خدا ہے۔ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ ہدایت نام ہے مالک کائنات تک پہنچانے والے راستہ پر چلنے کا اور گمراہی راہ ہدایت گم کر دینے کا نام ہے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○

(اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر ہی بھیجا ہے مگر اکثر لوگ واقف نہیں

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا

یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا کہہ دو تمہارے لئے ایک خاص دن مقرر ہے جس

تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ۝ ع

ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہو نہ آگے بڑھ سکتے ہو

تفسیر کتاب کائنات کے نقوش بہت جلی ہیں۔ اس کا ہر ورق دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے اور ہر سبق خزانۂ معرفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر اس کو پڑھنا اور سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اس کو مطالعہ کرنے اور مطلب نکالنے کے لئے بصارت کی روشنی، قلب کا نور اور روح کی ذکاوت کی ضرورت ہے اور ان چیزوں سے بعض خواص کو چھوڑ کر باقی سب آدمی بے بہرہ ہیں۔ عوام میں نہ قوتِ مطالعہ ہے نہ ذکاوت روح نہ نورِ قلب۔ پس سمجھانے کے لئے استاد کی ضرورت ہے جو خود مصنف سے پڑھ کر آیا ہو اور جو کچھ مصنف نے اس کو سمجھایا ہو وہ دوسروں کو سمجھا دے۔ اسی مقصد کے لئے انبیاء مبعوث ہوئے۔ مختلف زمانوں میں جب کمزور حافظہ والے آدمیوں نے پڑھا ہوا سبق فراموش کر دیا اور عقیدہ و عمل کی امتحان گاہ میں فیل ہونے لگے تو کتابِ کائنات کے مصنف نے اپنے خاص شاگردوں کو پڑھا کر بھیجا اور حکم دیا کہ نونہال سمجھ والوں کو کتاب کا ایک ایک حرف پڑھاؤ اور وضاحت سے مطلب سمجھاؤ۔ چنانچہ تمام اطرافِ عالم میں تلامیذ الرحمٰن نے جا کر اپنے پڑھے ہوئے اسباق کا درس دیا، سمجھایا بجھایا اور عالم بنایا۔ تلامیذ الرحمٰن یعنی مصنف سے پڑھے ہوئے شاگرد بھی مختلف استعداد اور قابلیت کے افراد تھے۔ کسی کی استعداد زیادہ تھی کسی کی کم کسی کو جوہر قابل قوی ملا تھا کسی کو ضعیف۔ پس استعداد اور قابلیت کے موافق کام بھی سپرد کیا گیا۔ کسی کو صرف ایک بستی کی تعلیم سپرد کی کسی کو ایک شہر کی کسی کو ایک ملک کی۔ جعۃ بقدر جثہ، کام بقدر قوت۔ غرض اس طرح رفتہ رفتہ دنیا کی ساری بستیاں پیغمبروں کی جولان گاہ عمل بن گئیں مگر ایک وقت اور ایک زمانہ میں کبھی بھی کسی خاص الخاص شاگرد رادی کے متعلق تمام دنیا کو درس دینے کا کام نہیں سپرد کیا گیا۔ کیونکہ کسی میں ایسا جوہر قابل قوت برداشت، تعلیمی استعداد اور عملی طاقت نہ تھی جو ساری دنیا کو پوری کتاب کی شرح حواشی سمیت سمجھا سکتا۔ ادھر بھولے بھالے عوام کی حالت یہ تھی کہ مختلف استادوں کی تعلیم کا مطلب ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ سمجھا۔ تمام استادوں کی تعلیم کا مطلب واقع میں ایک ہی تھا کیونکہ سب ایک استاد کے شاگرد تھے اور استاد بھی سب کے خود مصنف تھا اس لئے فہم مطالب میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا، مگر تعلیمی الفاظ میں ضرور اختلاف تھا اور عوام کی سمجھ کمزور تھی، اس لئے اختلاف الفاظ سے دھوکہ میں پڑ گئے اور مطلب کے سمجھنے میں اختلاف کرنے لگے۔ اسی طرح آپس میں پھوٹ پڑ گئی بالآخر اس پھوٹ، تفرقہ اور باہمی مخالفت کو دور کرنے کے لئے ایک ایسے عظیم المرتبہ استاد کی ضرورت ہوئی جو قابلیت اور استعداد میں تمام اساتذہ سے بڑھ کر ہو اور تعلیم ... میں یکتا بھی ہو اور از سرِ نو سب لوگوں کو درسِ حقیقت دے کر گزشتہ غلط فہمیوں کو دور کر دے۔ اس استادِ کل کا نام نامی محمد تھا جن کو رب العالمین نے تمام دنیا میں ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ اب کسی کو حضور کے فرمان سے سرتابی کرنے اور باہم اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں۔

تحلیلِ اجزاء وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ بعض اہل کتاب کا خیال تھا کہ اگر محمد سچے پیغمبر بھی مان لئے جائیں تب بھی صرف عرب کے لئے ہوں گے۔ ہمارے لئے ان کو ماننا ضروری نہیں۔ اس زعم باطل کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ہم نے تم سب لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ آیتِ مذکورہ میں لفظ کافۃ کے دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) رسالت کافۃ یعنی عامۃ (۲) کافۃ میں تا مبالغہ کی ہے اور معنی ہیں روکنے والا یعنی حضور کی رسالت عام ہے یا حضور کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کی ضرورت نہیں۔ آپ کی ذات کافی ہے۔ اول الذکر معنی کی تائید حدیث کے اس فقرہ سے ہوتی ہے جو صحیحین میں بروایت جابر موجود ہے کہ حضور نے اپنی پانچ خصوصیات ظاہر فرمائیں۔ پانچویں خصوصیت یہ فرمائی کہ گزشتہ پیغمبر (صرف) اپنی قوم کی اصلاح کے لئے بھیجے جاتے تھے اور مجھے سب لوگوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضور نے فرمایا مجھے اسود و احمر (سیاہ و سرخ یا گورے کالے) کی طرف بھیجا گیا ہے۔ ابن عباس نے اس آیت سے تمام پیغمبروں پر حضور کی فضیلت کو ثابت کیا ہے۔

خوشخبری دینے اور ڈرانے کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ حضور کو سچا نہ جانیں اور فرمان پر عمل نہ کریں وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے اور جو لوگ ایمان کے

ساتھ فرمانبرداری کریں گے وہ نجات پائیں گے ۔ بہرحال فرمانبرداری یا نافرمانی کا نتیجہ برداشت کرنا ہوگا اور سزا جزا ضرور ہوگی ۔ مگر اکثر آدمی بے علم ہیں نادان ہیں ۔ وہ نہیں جانتے کہ حضور کے ساتھ رسالت کو ماننا اور قیامت پر یقین رکھنا کیا ضروری ہے اور سزا جزا کیوں ضروری ہے ۔ اور گزشتہ انبیاء سے بڑھ کر حضور کا دائرہ عمل کیوں محیط کل ہے

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اگر تم رسالت اور وقوع قیامت کے دعوے میں سچے ہو اور خدا کی طرف سے تم کو یہ اطلاع ملی ہے کہ قیامت ہوگی اور سزا جزا کے بعد ہوگی تو بتاؤ یہ وعدہ قیامت کب پورا ہوگا ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ :-

قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ۔ اُن سے کہیئے تمہارے وعدے کا ایک دن مقرر ہے اُس سے گھنٹہ بھر آگا پیچھا نہیں ہوسکتا ۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کبھی ہو دس ہزار برس کے بعد ہو یا دس برس کے بعد تمہارا اصلی عمل تو یہی میدان زندگی ہے ۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے اس سے تقدیم تاخیر ناممکن ہے ۔ اب تم کو جو کچھ کرنا ہے کر لو ۔ تمہارے لئے قیامت تو وقت موت ہے ۔ مرنے کے بعد کچھ نہ کر سکو گے پھر قیامت کا وقت اور مدت دریافت کرنا بے سود ہے ۔ جب آئے گی آ جائے گی ۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک میعاد یوم سے مراد قیامت ہے ۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ

کافر کہتے ہیں　کہ ہم اس قرآن پر ہرگز　ایمان نہیں لائیں گے　اور نہ اُس کتاب پر جو پہلے تھی　کاش تم ان کو

إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ

دہ حالت دیکھو　جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور میں کھڑے کئے جاویں گے　کہ ایک دوسرے کی　بات کی تردید کریں گے اور کمزور لوگ

اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا

سرکشوں سے　کہیں گے　تم نہ ہوتے تو　ہم ضرور　ایماندار　ہوتے　وہ　سرکش

لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ۝

کمزوروں سے　کہیں گے　جب ہدایت تمہارے　پاس آگئی تھی　تو کیا ہم نے تم کو اس سے روکا تھا بات یہ ہے کہ تم خود ہی مجرم تھے

وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا

کمزور لوگ　سرکشوں سے　کہیں گے　نہیں بات یہ ہے کہ　(تمہارے) رات دن کے مکر نے (ہم کو روکا) جب کہ

أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ

تم ہم کو حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کو نہ مانیں اور اس کے شریک قرار دیں　جب وہ عذاب کو دیکھیں گے　تو پشیمانی کو　چھپائیں گے ۔

وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

اور ہم کافروں کی گردنوں میں　طوق ڈالیں گے　جیسا وہ کرتے تھے　ویسی ہی اُن کو سزا دی　جائے گی ۔

بڑا خیال کیا جاتا تھا کہیں گے کہ تمہاری وجہ سے ہم تباہ ہوئے۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آتے اور مومن ہو جاتے۔ یعنی تمہارے مال کی فراوانی جتھے کی کثرت قوت تجارت کی کامیابی اور حکومت کی طاقت کو دیکھ کر ہم سمجھے تھے کہ تم کو حق پرستی علم و معرفت اور صداقت کی شناخت کا بھی وہی امتیازی درجہ حاصل ہے جو دنیوی مشاغل و مدارج میں حاصل ہے۔ تم جو کچھ کہتے تھے اور جو کچھ سمجھتے تھے ہم اس کو صحیح جانتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہم تباہ ہو گئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ مغرور، کمظرف، گمراہ بلند آہنگ دعوی کرنے والے جب نتیجہ میں اپنی شکست نظر آتی ہے اور وہ خود بے بس ہو جاتے ہیں تب بے بنیاد غرور کے تمام ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنے نفوس کی براءت ظاہر کرنے کے لئے اپنے گناہوں کی ایسی تاویلیں کرنے لگتے ہیں جن سے خطا کاریوں کے وزن میں کسی قدر تخفیف ہو جائے۔ پس جب کمزور طبقہ قیامت کے دن اپنے سرداروں پر اپنی گمراہی اور تباہی کا الزام لگائے گا تو بڑا بنا رعب و غرور بھول جائیں گے اور جواب دیں گے۔

کیا ہم نے تم کو راہ راست سے (زبردستی) روکا تھا۔ ہدایت کا پیام تو تمہارے پاس پہنچ چکا تھا (اگر تم ایمان لانے والے ہوتے تو ہدایت تمہارے دلوں میں اتر جاتی اور ہم تمہاری قلبی حالت کو نہیں بدل سکتے تھے) واقع میں تم خود مجرم تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ کمزور طبقہ والے بطور رد الجواب کہیں گے تم نے ہم کو زبردستی نہیں روکا تھا۔ بلکہ تمہاری شبانہ روزی مکاریاں، بعد اطراز بیان، ضلالت انگیزیاں ہماری گمراہی اور تباہی کا موجب ہوئیں (قتادہ و زید بن اسلم) یعنی تم نے جو ہم کو الزام دیا کہ تم خود مومن نہ تھے۔ تمہارے دلوں سے ایمان کو ہم نے زبردستی نہیں نکالا۔ تمہارا یہ قول غلط تھا۔ تم نے ہم کو ہر طرح سے راست سے بہکایا۔ ہمارے سامنے ایسے قول و فعل کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے دلوں میں ایمان داخل نہ ہو سکا۔ یہ درحقیقت زبردستی روکنا ہی تھا۔

اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا۔ یاد کرو کہ ہم کو تم دو باتیں سمجھایا کرتے تھے ایک تو کفر دوسرے شرک (کفر میں تمام اقسام کفر داخل ہیں۔ قیامت یا کیفیت قیامت کا انکار اللہ کے سوا کسی دوسرے کی ملک تصرف یا حکومت ماننا، اقوال اسلاف کو قوانین الٰہی جاننا وغیرہ اور شرک دونوں طرح کے شرک کو شامل ہے۔ شرک الوہیت شرک ربوبیت۔ اللہ کا شریک بنانا، اس کی طرح کسی کو نہ جاننا کسی کے تعبد میں کچھ سمجھنا، کسی کی پرستش اس غرض سے کرنی کہ وہ سفارش کر کے اللہ کے پاس پہنچا دے گا۔ ہوا پرستی یعنی خواہشات کا نفس کا بندہ بن جانا۔ حاصل مطلب یہ نکلا کہ کمزور طبقہ والے اونچے طبقہ والوں سے کہیں گے تم ہم کو بہکاتے تھے اور غلط مشورہ دیتے تھے۔ کبھی کہ بالکل اللہ کو نہ ماننے کی تعلیم دیتے تھے۔ طرح طرح سے قیامت اور سزا جزا کا انکار کرنے پر آمادہ کرتے تھے اور کبھی خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی معبودیت اور پرستش میں شریک قرار دیتے تھے)

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ۔ اونچے اور نیچے بڑے چھوٹے، مخدوم، خادم، آقا، غلام غرض ہر درجہ کے کافر عذاب کو دیکھ کر دل میں پچھتائیں گا اور حقانیت کا مشاہدہ کرنے کے بعد ندامت کو چھپائیں گے۔ اسی وجہ سے مذکورہ بالا گفتگو کریں گے اور اپنی غلطی کو دوسرے پر ڈالیں گے۔

وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ ندامت کو چھپانا کافروں کے لئے مفید نہ ہوگا۔ ان کی گردنوں میں ان کے عقائد باطلہ اور اعمال قبیحہ کے آتشی طوق ڈالے جائیں گے۔

هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ مگر تمام کافروں کی سزا ایک طرح کی نہ ہوگی جتنی جس کی بدکرداری ہوگی اتنا ہی اس کو عذاب ہوگا یعنی گمراہ ہونے والوں کو ایک عذاب اور گمراہ کرنے والوں کو دوہرا عذاب۔

مقصود بیان

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ کے الفاظ کافروں کو بتاتے ہیں کہ کافر اپنی خواہشات اور رسم و رواج کے بندے ہو جاتے ہیں۔ کسی آسمانی کتاب پر ان کا ایمان نہیں ہوتا۔ ایک بات یہ بھی مترشح ہوتی ہے کہ تمام آسمانی کتابیں عقیدہ قیامت اور اصول ہدایت پر متفق ہیں۔ ایک کو نہ ماننا سب کے انکار کرنے کو لازم ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ سے یہ مراد نہیں کہ کافروں کو اللہ کے قرب میں کھڑا کیا جائے گا۔ قرب الٰہی تو ان کو حاصل ہی نہ ہوگا بلکہ مراد یہ ہے کہ بروز قیامت جب اختیاری دنیا ختم ہو جائے گی اور سزا کے لئے میدان حشر میں ان کو بلایا جائے گا جہاں براہ راست حکم الٰہی جاری ہوگا اور فیصلہ کے لئے ان کو کھڑا کیا جائے گا۔ قیامت کے دن کوئی کافر کسی کافر کا ساتھ نہ دے گا۔ جو لوگ دنیا میں سربر آوردہ اور اونچے تھے وہ اپنے مظلوموں اور زیر دستوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سے ثابت ہوتا ہے کہ اغوا کرنا بڑا جرم ہے۔

گردن کے بھکانے والا ایکسے والے ہم سے الگ ... اور قیامت کے دن کافروں کے دلوں میں پشیمانی ہوگی یہی ظاہر
پشیمانی کا احساس کے عدم یا تعلق اس آیت میں کوئی صراحت نہیں ہے۔ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں ... سزا ... کی
... گردنوں میں طوق بدکرداری کے ہوں گے گویا بدکرداری مختلف عذابوں کی شکل میں ہوگی۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِى قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَـٰفِرُونَ ۝

اور ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے ضرور کہا کہ جو پیام تم کو دے کر بھیجا گیا ہے ہم اسکے یقیناً منکر ہیں۔

وَقَالُوا۟ نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَٰلًا وَأَوْلَـٰدًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ قُلْ إِنَّ رَبِّى يَبْسُطُ

اور بولے ہم (ایمان داروں سے) مال و اولاد میں بہت زیادہ ہیں ہم کو عذاب نہیں ہوگا تم کہہ دو کہ میرا رب جس کی چاہتا

ٱلرِّزْقَ لِمَن يَشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ع وَمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ

ہے روزی فراخ اور تنگ کردیتا ہے مگر اکثر آدمی نادان ہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد

أَوْلَـٰدُكُم بِٱلَّتِى تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰٓ إِلَّا مَنْ ءَامَنَ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا فَأُو۟لَـٰٓئِكَ لَهُمْ

ایسی چیز نہیں جو مرتبہ میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے ہاں جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے تو چونکہ انہوں نے عمل کیا

جَزَآءُ ٱلضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا۟ وَهُمْ فِى ٱلْغُرُفَـٰتِ ءَامِنُونَ ۝ وَٱلَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِىٓ ءَايَـٰتِنَا

اس لئے ان کے لئے دوگنا ثواب ہوگا اور بہشت کے بالاخانوں میں وہ چین سے ہوں گے اور جو لوگ ہرانے کے لئے ہماری آیتوں کے

مُعَـٰجِزِينَ أُو۟لَـٰٓئِكَ فِى ٱلْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۝ قُلْ إِنَّ رَبِّى يَبْسُطُ ٱلرِّزْقَ لِمَن يَشَآءُ

(مقابلہ کی) کوشش کرتے ہیں وہی عذاب میں حاضر کئے جائیں گے تم کہہ دو کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں جس کا چاہتا ہے

مِنْ عِبَادِهِۦ وَيَقْدِرُ لَهُۥ ۚ وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَىْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ۝

رزق فراخ اور تنگ کرتا ہے اور جو کچھ تم راہ خدا میں خرچ کروگے وہ اس کا عوض دیتا ہے وہی سب سے بہتر روزی دینے والا ہے

تفسیر

مال ومتاع کی فراوانی، جاہ وحشم کی کثرت، اولاد کی افزائش اور عیش وتنعم کی بہتات عام طور پر آدمی کے دماغ کو تباہ کر دیتی ہے۔ وہ خیال کرتا ہے بلکہ یقین کرتا ہے کہ میں حق پر ہوں صداقت میری آغوش میں ہے ... میں اللہ کا محبوب ہوں خدا کو مجھ سے محبت ہے میں مرنے کے بعد اللہ کے قریب ہی پہنچوں گا۔ اس شخص کی نظر میں اعتقاد صحیح اور درست عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ فکر وعمل کی صحت کو بھی سمجھتا ہے ... حقیقت اور اپنی ہر حرکت کو ترجمان صداقت جانتا ہے۔ اگر اس کو کوئی صحیح قوانین کی تعلیم اور منطق وضاحت آیات پر غور کرنے اور ان کو ... کی دعوت دیتا ہے تو صرف اپنی بات کو اونچا کرنے اور اپنے بول کو بالا کرنے کے لئے آیات حق میں بے بنیاد شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ طرح طرح کے خود ساختہ اعتراض کرتا ہے۔ اور اصل صداقت کو ہرانے کے لئے دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔ یہ بے وقوف نہیں جانتا کہ رزق کی تنگی فراخی اور اولاد کی کثرت وقلت

کو نظر یاب سعادت اور قوانین نجات سے کیا علاقہ۔ کیا مال کی فراوانی اور اولاد کی زیادتی اللہ کے قرب میں پہنچا سکتی ہے۔ اصل مقصد تک کو مرکز تک پہنچنا ہے اور امتحان گاہ حیات میں صحیح امتحان دینے کے بعد تمام مصائب سے چھوٹ کر قرب خداوندی تک پہنچنا انسانی تخلیق کا اصل نقطۂ نظر ہے۔ اب غور طلب دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اولاد کی افزائش اور مال کی کثرت ہے دوسری افکار و اعمال کی صحت ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی چیز کو سعادت و نجات کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جانوروں کے بچے بھی بہت ہوتے ہیں اور ان کو بھی اسباب راحت میسر ہوتے ہیں، مگر کون بے وقوف ان کو فائز المرام اور انسانیت کبریٰ کی اعلیٰ چوٹی پر پہنچنے والا کہہ سکتا ہے ہاں دوسری چیز ضرور معیاری ہے۔ مبدء و معاد اور آغاز و انجام کے متعلق صحیح خیالات، درست عقائد اور صائب افکار اس زندگی کو درست کرنے والے اور مرنے کے بعد عذاب سے بچا کر قرب الٰہی میں پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح عمل زندگی کی ہمواری اور درستی بھی حصول سعادت کا مستحکم ذریعہ ہے۔ رہی رزق کی تنگی فراخی تو یہ معمولی چیز ہے، اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ کثرت مال کا اقتضاء تو یہ ہے کہ خداداد دولت کو صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے، کہ اس کو عزت و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے۔

تحلیلِ اجزاء وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ الخ بعض بلکہ اکثر کم فہم کو بصیرت آدمی خیال کرتے ہیں کہ دنیوی مال و متاع کی کثرت، جتھے کی فراوانی اور اولاد کی افزائش، جانوروں اور مویشیوں کی افزونی اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ آدمی محبوب ہے، مستحق ہے اور مقرب ہے۔ اور فقر و افلاس، بیچارگی، درماندگی اللہ کے عتاب اور ناراضگی کی علامت ہے۔ کسی کا نادار ہونا ہی اس کے بطلان عقائد اور بد روی کی نشانی ہے، جو [illegible] مردود ہے اور تونگر دولتمند حق پرست ہے۔ اس گمراہی میں حضور اقدس کے زمانے کے اکثر کفار بھی پڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی ناداری اور کمزوری [illegible] اپنی بلندی کی کثرت نعمت، سرمایہ داری کا مشاہدہ کر کے وہ دعویٰ کرنے لگے تھے کہ ہم حق پر ہیں ہم کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ ہم یہاں خدا کے محبوب ہیں [illegible] محبوب ہوں گے۔ اگر ہمارا مسلک اور دین صحیح نہ ہوتا تو مسلمانوں کی طرح ہم بھی ننگے بھوکے ہوتے۔ اس خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے ان آیات کا نزول ہوا جن کے اندر فلسفۂ حقانیت کا اظہار کر کے اور ناداری و دارائی کی اصل وجہ بیان کر کے در پردہ اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فراخ دستی اور مالی وسعت حق کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے نہیں چاہتا نہیں دیتا۔ اصل چیز مال نہیں بلکہ مالی مصرف ہے۔ ذریعہ نجات دولت کی فراوانی اور اولاد کی کثرت نہیں بلکہ ایمان اور خوش کرداری ہے۔

حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ دو آدمی تجارت میں شریک تھے۔ ایک تو ساحل کی طرف چلا گیا۔ دوسرا مکہ میں ہی رہا۔ جب حضور اقدس مبعوث ہوئے تو اول الذکر شخص نے اپنے شریک سے کیفیت دریافت کی اور خط بھیج کر واقعہ معلوم کیا۔ مؤخر الذکر آدمی نے جواب میں لکھا کہ قریش نے تو مدعی نبوت کا ساتھ نہیں دیا کسی نے تصدیق کی۔ ہاں کچھ ذلیل رذیل لوگ ساتھ ہو گئے ہیں۔ جب ساحلی تاجر کو خط پہنچا تو وہ کاروبار چھوڑ کر مکہ میں آیا اور درخواست کی کہ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ جب خدمت گرامی میں حاضر ہوا تو عرض کیا آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ حضور نے بیان فرمایا (یعنی توحید، اقرار قیامت، مکارم اخلاق وغیرہ کی تلقین کی) وہ شخص فوراً بول اٹھا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا تم کو کیسے معلوم ہوا؟ اس نے عرض کیا حضور اب تک جو پیغمبر بھی مبعوث ہوا ہے اس کا ساتھ (شروع میں) نیچے کے لوگوں نے دیا ہے۔ اس کے بعد اللہ نے آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ نازل فرمائی۔ حضور اقدس نے اس شخص سے کہلا بھیجا کہ تمہاری تصدیق اللہ نے کر دی (ابن ابی حاتم) یہ ساحلی تاجر غالباً عیسائی رومی تھے جو آسمانی کتابوں سے واقف تھے اسی بنا پر مختلف پیغمبروں کی بعثت دعوت کو جانتے تھے۔

• شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہرقل کے سوال کے جواب میں ابو سفیان نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کی پیروی کچھ ذلیل لوگوں نے کی ہے یہ بات سن کر ہرقل نے کہا پیغمبروں کا ساتھ دینے والے (شروع میں) کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں (بخاری وغیرہ)

آیت مذکورہ میں مذیر سے مراد پیغمبر ہے۔ بات یہ ہے کہ ترغیب سے زیادہ موثر ترہیب ہوتی ہے۔ ہلاکت سے نجات ترقی درجات سے بڑھ کر رتبہ رکھتی ہے پیغمبروں کا کام بشارت بھی ہے اور انذار بھی، مگر تبلیغ کا آخری درجہ انذار ہے۔ اس لئے قرآن میں پیغمبروں کے لئے بشیر سے زیادہ نذیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ خوشحال طبقہ اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کے نشہ میں مست ہوتا ہے۔ نہ ندائے حق کو سننا گوارا نہیں کرتا اور حق کا طلب گار نہیں ہوتا، اس لئے جب دعوت صداقت کی آواز اس کے کان میں آتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی کہا تھا۔ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا

بَادِیَ الرَّاْیِ ۔۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی کسی نبی کو ہم نے کسی بستی کی ہدایت کے لئے بھیجا تو وہاں کے خوشحال طبقہ نے تکذیب کی اور نہ مانا یعنی قریش اور سرداران مکہ کا انکار کوئی نئی بات نہیں ۔ ہمیشہ سے پیغمبروں کے ساتھ کافروں کا یہی سلوک رہا ہے ۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۔ یعنی خوش حال طبقہ نے جب پیغمبر کی ندائے حق کو نہ مانا اور ان کے دعوے کی تکذیب کی اور دعویٰ کیا کہ ہمارا مسلک ہی راہِ حق ہے تو اس دعوے کے ثبوت میں ایک دلیل پیش کی جس کی بنا محض پندار و غرور پر تھی ۔ انہوں نے دنیوی طاقت و راحت اور دولت کو حق و صداقت کا معیار قرار دیا ۔ مال کی کثرت اور اولاد کی افزائش سے یہ نتیجہ نکالا کہ آخرت میں ہم پر عذاب نہ ہوگا ۔ اگر ہم پر خدا کا عتاب ہوتا اور خدا کو ہمارا دین و مسلک ناپسند ہوتا تو ہم کو یہ سرمایہ اور کثرتِ نسل کس طرح میسر ہوتی ۔ کافروں کا یہ خیال بالکل غلط تھا ۔ دنیا اور اسبابِ دنیا کی افزائش قابلِ فخر اور علامت صداقت نہیں بلکہ کافروں اور بدکاروں کے لئے مزید وبال کا سبب ہے ۔ ایک آیت میں آیا ہے ۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۔ یعنی کافروں کے مال و اولاد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو بات صرف اتنی ہے کہ دنیوی زندگی میں اللہ ان کو دکھ دینا اور کفر کی حالت میں ان کی روحوں کو کھینچنا چاہتا ہے ۔ ایک اور آیت میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے ۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۔ یعنی کافروں کا یہ خیال ہے کہ ہم جو ان کے مال اور نرینہ اولاد کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں تو (گویا) ہم ان کو بھلائیاں پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں ۔ (ایسا ہرگز نہیں)

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۔ فراخ دستی اور تنگ حالی کی وجہ اس آیت میں بیان فرمائی جس سے التزاماً کافروں کے اس خیال کی تردید ہوگئی جس کی بنا پر ان لوگوں نے خوشحالی اور بدحالی کو معیارِ حق و باطل سمجھ رکھا تھا ۔ مومن و کافر دونوں کبھی مال دار ہوتے ہیں کبھی نادار ۔ مال دار کافر کا اصل مقصد مال ہی ہوتا ہے ۔ آخرت پر اس کا عقیدہ ہی نہیں ہوتا ، اس لئے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور مومن کا مطمحِ نظر عیش دنیا ہی نہیں ہے وہ نجاتِ آخرت اور سعادتِ ابدی کا خواستگار رہتا ہے ، اس لئے اس کی نظر میں ناداری اور مال داری دونوں برابر معلوم ہوتی ہیں ۔ جو ناداری شاید مقصود سے ہٹا کر دے وہ اس مال دار شخص سے اس کی نظر میں بہتر ہوتی ہے جو سعادتِ اخروی سے محروم ہو جانے کا سبب ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ فقر و دولت دونوں کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے وہ مفلس ہونے کی حالت میں بھی خوش رہتا ہے اور مال داری میں بھی اس کا بھروسہ مال پر نہیں ہوتا ۔ حضرت عمرؓ جب ملک شام کو تشریف لے گئے تو وہاں کے امراء و رؤساء نے دعوتیں کیں ، لیکن سپہ سالارِ اعظم حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ نے دعوت نہ کی ۔ حضرت عمرؓ نے دعوت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو قائدِ اعظم نے کہا امیر المومنین ! میری دعوت میں آپ کو دکھ ہوگا ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آخر تم دعوت کرو ۔ ابو عبیدہ نے حکم کی تعمیل کی ۔ امیر المومنین نے امیر شام کے گھر پہنچ کر کیا دیکھا کچھ ہتھیار اور گھوڑے کا ساز اور بس ۔ قائدِ اعظم نے مٹی کا لوٹا پیش کیا ۔ طاق سے خشک روٹی کے ٹکڑے اتار کر اور کچھ پسا ہوا نمک اور پانی کا آب خورہ لا کر حاضر کیا ۔ حضرت عمرؓ یہ کیفیت دیکھ کر رو دیے اور قائدِ اعظم کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا تم ہی میرے بھائی ہو ۔ میں دیکھتا ہوں کہ دوسرے ساتھیوں نے دنیا سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا اور دنیا نے ان سے لیا ، مگر تم اپنے حال پر قائم رہے ۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی کافر نہیں جانتے کہ دولت و افلاس کا اصل گُر کیا ہے اور کیوں کسی کو تنگ دست اور کسی کو فراخ دست رکھا جاتا ہے وہ حقیقت اور مصلحت سے ناواقف ہیں ۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى ۔ یہ اصل معیارِ حق و باطل کا بیان ہے ۔ کافروں کی نظر میں مال کی کثرت ، اولاد کی افزائش ، قوم اور جتھے کی فراوانی اور جاہ و حشم کی بہتات صداقت و حقانیت کی علامت ہے ، مگر اہلِ نظر ان چیزوں کو بے حقیقت فنا پذیر اور ناقابلِ اعتبار جانتے ہیں ان کے نزدیک معیارِ حق و باطل ان چیزوں سے ارفع و اعلیٰ ہے ۔ تمام شرائع اور کل فلسفۂ الٰہیات قائل ہے کہ تمام انسانی روحیں جب تک اپنے مرکز پر نہ پہنچ جائیں ان کو سکونِ حقیقی حاصل نہیں ہو سکتا ۔ جو بخارات سمندر سے اٹھتے ہیں جب تک وہ مختلف شکلیں اور کیفیتیں اختیار کرنے کے بعد دوبارہ سمندر میں آکر نہ مل جائیں ان کی حرکت اور موجی اضطراب دور نہیں ہو سکتا ۔ تمام روحیں نورِ الٰہی کا خاص پرتو ہیں جہاں سے ان کا آغاز ہوا ہے اگر وہاں تک ان کی رسائی انجام کار نہ ہو جائے تو ان کا اضطراب زائل نہیں ہو سکتا ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا متاعِ دنیا اور اسبابِ دنیا کے حصول کے بعد کیا روح کے اندر سکونِ حقیقی پیدا ہو سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ کروڑ پتی تاجر ، شہنشاہِ وقت ، سب سے بڑا فوجی جنرل اور فخرِ زماں پہلوان سب کے سب مضطرب ہیں ۔ کیوں ؟ صرف اس لئے

پوشیدہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ مرکز میں شامل ہونے کے لئے ۔ پس جب دنیوی جاہ و مال اور اولاد و راحت سے سکونِ قلبی نہیں ہوتا تو ان چیزوں کو معیارِ حق و باطل بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ پس وہ کیا چیز ہے جو قرب میں پہنچانے والی اور مرکز سے ملانے والی ہے ۔ وہ صرف افکار و خیالات کی صحت یعنی ایمان اور نیک اعمال ہیں ۔ اللہ کے قرب میں پہنچنے اور پراگندہ خطروں کے مرکز میں شامل ہونے کا یہی زینہ ہے ، لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام دنیوی ساز و سامان بے کار ہے ۔ کیا قربِ الٰہی تک پہنچنے میں اس کو کوئی دخل نہیں ۔ اس خیال کی تنقیح کے لئے فرمایا :-

اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا ۔ یعنی کثرتِ اولاد اور افزونیِ مال بذاتِ خود تو قربِ الٰہی تک پہنچنے کا سبب نہیں البتہ جو لوگ نیکوکار اہلِ ایمان ہوں تو ان کے مال کی کثرت اور اولاد کی افزائش مراتبِ اخروی کے مزید ہونے کی علت ہوسکتی ہے ۔ مقصود یہ کہ حقیقت میں بارگاہِ الٰہی تک پہنچانے والی چیز تو ایمان کے ساتھ خوش رفتاری پر قائم رہنا ہے ، لیکن اگر نیکوکار مومن مالدار اور کثیر الاولاد بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے ۔ اس کا مال ان مراتب کے حصول کا سبب بن جاتا ہے جو بغیر مال کے حاصل نہیں ہوسکتے ۔ مصارفِ خیر ، زکوٰۃ ، صدقات اور دوسرے وہ تمام کام جو بغیر مال کے انجام نہیں پاسکتے ، مال دار مومن ہی کر سکتا ہے ، اس لئے اس کا مال مراتب کے دوگونہ ہونے کا سبب ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح نیک اولاد اشاعتِ دین اور تبلیغِ اسلام کرنے والی اولاد والدین کے لئے دعائے خیر اور استغفار کرنے والی اولاد بھی ماں باپ کے مراتب میں افزونی کا سبب ہے ، مگر اصل سبب ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ ہیں ۔ ضِعف کا ترجمہ ہم نے دوگونہ کیا ہے ۔ اس سے مراد صرف دوہرا حصہ نہیں ہے بلکہ اصل سے زائد جس قدر بھی ہو سب ضِعف میں شامل ہے ۔ کم سے کم دوہرا اور زیادہ سے زیادہ سات سو بلکہ اس سے بھی زائد جتنا خدا چاہے سب کو یہ لفظ محیط ہے ۔

وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۔ غرفات ، بالاخانے ، منازلِ عالیہ ، بالائی طبقہ ، نیکوکار اہلِ ایمان کو نیکیوں کا صلہ تو چند در چند ان کو ملے گا جس کی صراحت اوپر کی آیت میں کردی گئی ۔ اس آیت میں مراتبِ عالیہ پر فائز ہونے کے بعد زوال فنا ، نقصان اور عتاب وغیرہ سے پُرامن رہنے کی صراحت فرمائی ہے ۔ جس راحت کے ساتھ اندیشۂ رنج ہو جو نعمت خوفِ زوال سے مکدر ہو اور جس بلند مرتبہ پر پہنچ کر آدمی کو چھینے جانے کا خطرہ ہو وہ پُرلطف اور کامل طور پر لذت بخش نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیوی راحت و عیش اور طرب و نعمت لاطائل اور ہیچ ہے کیونکہ فنا ، بربادی اور زوال سے گھری ہوئی ہے ۔ اس کو پائیداری اور دوام نہیں ، مگر اہلِ صلاح کے مراتبِ عالیہ لازوال ہوں گے ان کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا ۔

وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۔ اہلِ نعمت کے مقابلے میں اہلِ نکبت اور اصحابِ فوز کے مقابلے میں خسران نصیب طبقہ مذکور ہوا ہے اور اول الذکر طبقہ کی کامیابی اسی وقت شوق انگیز ہوسکتی ہے جب مؤخر الذکر گروہ کی حرماں نصیبی ظاہر کردی جائے ، اس لئے اس آیت میں ان بدباطن ، بدکیش ، باطل پرست گروہ کے سزا کی صراحت فرمائی جو نہ فقط خود گمراہ ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے ۔ آیاتِ الٰہیہ کے ساتھ کھیلتا اور احکامِ ربانی پر نکتہ چینی ، خوردہ گیری کے لئے بے قرار پھرتا ہے ۔ اس کا مقصود طلبِ حق نہیں ہوتا یہ حق کا جویاں ہی نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بہکانا اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے ۔ پس اس کا نتیجہ بدیہہ ہوگا کہ ہر وقت عذاب میں رہے گا ۔ کبھی عذاب سے غائب نہ ہوگا ۔ اب رہا افلاس و دولت کا اصل گر اور اس تفاوت کی اصل وجہ ۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ ۔ تو اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی تو پروردگار کی مشیت پر موقوف ہے وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے ۔ آخر ہیں تو سب اس کے بندے اور سب کا خالق وہی ہے ۔ جب تخلیق کے تفاوت میں کسی استحقاق کو دخل نہیں تو رزق کے تفاوت کو کس طرح معیارِ حق و باطل قرار دیا جاسکتا ہے ۔ وہ رب ہے اور پرورش کسی علت کی محتاج نہیں ۔ بہتیرے کافر مال دار ہوتے ہیں اور بہت سے مسلمان دولتمند ۔ کافر بھی نادار ہوتا ہے اور مومن بھی ۔ پس معلوم ہوا کہ مالی تفاوت موجبِ تفاخر نہیں ہوسکتا ۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی کو پروردگار نے مال عنایت کیا تو اس نے اس کو خرچ کس طرح کیا ۔ کیا اصل مقصد اور حقیقی مرکزِ توجہ اور غایتِ زندگانی سمجھ کر کنجوسی کے ساتھ اس کو بند کر رکھا یا نیک راستوں میں شرعی حدود کے اندر اس کو صرف کیا ۔ عند اللہ مال عزّت و وجہ فضیلت اور موجبِ فلاح ہے ، مگر اسی شخص کے لئے جو راہِ خیر میں اس کو صرف کرے ۔ ایسی صورت میں اللہ اس کے عوض (علاوہ ثوابِ آخرت کے دنیا میں بھی) اور عنایت کرتا ہے ۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ فرماتا ہے تو (لوگوں پر) خرچ کر تجھے دیا جائے گا ۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے

کہ بغیر انکار کے خرچ کرو اور مالکِ عرش کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ روزانہ صبح کو دو فرشتے آتے ہیں ایک کہتا ہے الٰہی خرچ کرنے والے کو عوض عطا کر۔ دوسرا کہتا ہے الٰہی کنجوس ممسک کو برباد کر دے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت حذیفہؓ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہے آگاہ رہو تمہارے اس زمانے کے بعد ایک زمانہ دانتوں سے پکڑنے کا آئے گا۔ مال دار آدمی کے پاس جو کچھ ہوگا وہ اس کو خرچ ہوجانے کے خوف سے دانتوں سے پکڑ کر رکھے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (رواہ ابو اسماعیلی ایضاً)

تنبیہ آیت مذکورہ میں فضول خرچ کرنے اور مال کو بے وجہ برباد کرنے کی تلقین نہیں کی گئی ہے کیونکہ اسراف کی تو قرآنی صراحت میں سخت ممانعت فرمائی گئی ہے۔ بلکہ سخاوت، ایثار اور اعتدال کی تعلیم دینی مقصود ہے اور ضرورت شرعی کے وقت مال کو بچا کر نہ رکھنے کی ترغیب دینا اصل غرض ہے، اس لئے سعید بن جبیر نے فرمایا کہ جو خرچ بغیر اسراف اور کنجوسی کے اعتدال کے (ساتھ) ہوتا ہے اللہ اس کے عوض دوسری چیز عنایت فرماتا ہے۔ مجاہد نے فرمایا ہر شخص کا رزق تقسیم شدہ ہے اب اگر فراخ دستی کے ساتھ کوئی شخص سب کچھ خرچ کر دے تو ممکن ہے اس کے حصہ میں اتنا ہی ہو جتنا اس نے خرچ کر دیا ایسی صورت میں وہ تنگ دست ہو جائے گا، اس لئے مناسب ہے کہ درمیانی چال چلے۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں آیا ہے ہر امر معروف صدقہ ہے آدمی جو کچھ اپنی ذات یا اپنے اہل وعیال پر صرف کرتا ہے وہ اس کے لئے صدقہ ہے جس نے مال کے ذریعہ سے آبرو بچائی وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ مومن جو کچھ خرچ کرتا ہے اللہ اس کے عوض کا ضامن ہے سوا اس صرف کے جو کسی عمارت بنانے یا اللہ کی نافرمانی کرنے میں کیا جائے۔ اس حدیث کے راوی عبدالحمید نے محمد بن منکدر سے آبرو بچانے کے لئے مال خرچ کرنے کی تفصیل دریافت کی تو محمد بن منکدر نے کہا اس کی مثال یہ ہے جیسے کوئی شخص کسی منہ پھٹ شاعر کو اس کی بدزبانی سے بچنے کے لئے کچھ دے دے۔

مقصود بیان قبول حق سے انکار کرنے والا سب سے اول دولتمند عیش پرست گروہ ہوتا ہے وہ اپنی دولت، عزت اور جاہ وحشمت کے غرور میں اپنے کو حق پرست جانتا ہے اور دنیوی مال واولاد کی کثرت اللہ کی رضامندی کی نشانی نہیں نہ افلاس ولا ولدی ناراضگی اور باطل پرستی کی علامت ہے۔ بلکہ رزق کی فراخی اور تنگی مشیتِ الٰہی کے تابع ہے، اور تفاوتِ مالی کی حکمت سے وہ واقف ہے۔ انسان کا اصلی مقصد اور انسانیت کا حقیقی منتہائے نظر قرب الٰہی کا حصول اور فوز ابدی ہونا چاہیئے اور اللہ تک پہنچانے والی چیز صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ مال واولاد بذریعہ قرب نہیں ہاں اگر مال واولاد ایمان وعمل صالح کے ساتھ موجود ہوا اور صحیح مصرف پر اس کو صرف کیا جائے تو زیادتی درجات کا موجب ہے۔ اللہ کا تخلیقی تعلق سب مخلوق سے برابر ہے۔ وہ مساوی طور پر سب کا رب ہے، اس لئے ایمان وکفر سے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا نہ کافر کا قلیل الاولاد یا نادار ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ راہِ خدا میں جو کچھ صرف کیا جاتا ہے اللہ اس کے عوض دوسرا مال دنیا میں ہی عطا فرما دیتا ہے وغیرہ۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا

جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا اور فرشتوں سے فرمائے گا کیا یہی لوگ تمہاری پرستش کیا کرتے تھے فرشتے

سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ

کہیں گے تو پاک ہے تو ہمارا کارساز ہے نہ وہ یہ تو جنات کی پرستش کرتے تھے ان میں اکثر انہی کے

مُّؤْمِنُوْنَ ○ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

معتقد تھے پس آج کے دن تم میں سے کوئی کسی کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے

ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِىْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝

کہ جس آگ کو تم جھٹلایا کرتے تھے اس کے عذاب کا مزہ چکھو ۔

تفسیر اللہ چونکہ کافر اور مومن سب کا خالق اور رب ہے، اس لئے تخلیقی اعتبار سے اس کی نظر میں کوئی قابل ترجیح نہیں ۔ اب اگر قربی تعلق اور تفصیلی ربط کسی شخص یا کسی گروہ سے پیدا ہو سکتا ہے تو وہ صرف طرز زندگی اور طریق عمل کے تفاوت کے سبب ۔ جو لوگ راہ فطرت پر گامزن ہیں اللہ کو واحد یکتا اور خلاق کل مانتے اور قوانین عدل پر چلتے ہیں ۔ وہ خالق کائنات سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور جو مخلوق کو خالق کا شریک اور محتاج کو غیر محتاج کا ہم پلہ قرار دیتے اور راہ اعتدال سے ہٹ کر چلتے ہیں وہ مردود بارگاہ سمجھے جاتے ہیں ۔ دنیا میں داعیان شرک کے مختلف گروہ ہیں ۔ جو علم پست درجہ کے دماغ رکھتے ہیں ۔ مورت پرستی صورت پرستی عناصر پرستی، جماد پرستی، نبات پرستی حیوان پرستی، کواکب پرستی، ارواح پرستی، شیطان پرستی، ملائکہ پرستی غرض مختلف پرستشوں میں یہ لوگ مبتلا ہیں ۔ جو جتنا زیادہ جاہل ہے وہ اتنا ہی کوتاہ بصر بھی واقع ہوا ہے اور جس کی جس قدر نظر کوتاہ ہے اتنی ہی پستی اس کی پرستش میں بھی ہے محسوسات کا ابتدائی درجہ ہے لیکن غیر محسوس کے انتہائی درجہ تک اس بے وقوف انسان کے لئے معبود موجود ہیں ۔ سب سے اقل نمبر تو بت پرستی کا ہے ۔ اس کے آگے مورت پرستی صورت پرستی کا مرتبہ ہے ۔ پھر اس سے اوپر عناصر پرستی اور جماد پرستی وغیرہ کے درجات آتے ہیں ۔ بالآخر جو لوگ زیادہ عقلمندی کے دعوے کے ساتھ مخلوق کی پرستش کی طرف مائل ہیں وہ محسوسات سے نظر اونچی کر کے غائبانہ غیر محسوس طاقتوں کی تلاش کرتے ہیں اور ان کو مختلف کارفرماؤں اور حکمرانیوں کا مالک جان کر معبود بنا لیتے ہیں ۔ مدعیان فہم کے اس گروہ میں سب سے اونچا درجہ ان لوگوں کا ہے جو فرشتوں اور غیر مرئی غیر مادی طاقتوں کی پرستش کرتے ہیں ۔ ان کی نظر میں جماد اور نباتات سے تعلق رکھنے والی کوئی مخلوق قابل پرستش قرار نہیں پاتی، مگر سب وہ مافوق الفطرت طاقتوں کو اس نظام کائنات کا حکمران مانتے ہیں اور ان کو کارساز درحقیقی حاکم اور متصرف خود مختار سمجھتے ہیں اور چونکہ خود مختارانہ تصرف اور آمرانہ حکمرانی ہی مستحق پرستش ہوا کرتی ہے، اس لئے وہ غیر مادی طاقتوں کے سامنے سر نیاز جھکا دیتے ہیں اور ان کو معبود حقیقی جاننے لگتے ہیں ۔ مگر ان کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل رہ جاتی ہے کہ آلات تصرف بننا دوسری بات ہے اور خود مختار حکمران ہونا دوسری بات ہے ۔ ملائکہ اور غیبی طاقتیں ضرور آلات تصرف اور نظام کائنات کو چلانے کے ذرائع ہیں مگر سب ایک ہمہ گیر طاقت کے حکم کے مسخر ہیں ۔ خود مختار کوئی بھی نہیں ۔ نفع نقصان پہنچانے کا اختیار بطور خود کسی کو بھی نہیں ۔ کارسازی اور کار فرمائی کسی کے حدود اختیار میں داخل نہیں ۔ حق چونکہ عادل ہے، اس لئے وہ قیامت کے دن فرشتوں سے خود کہلوا دے گا ۔ اور وہ اپنے عجز و نیاز کا خود اظہار کریں گے اور اللہ کو اپنا کارساز کہیں گے اور اس مشرک طبقہ کے فعل سے اظہار برأت کریں گے ۔ اس وقت سوا حسرت و یاس اور عذاب میں مبتلا ہونے کے ان ناحق شناسوں کے لئے چارہ کار نہ ہوگا ۔

تحلیل اجزاء وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ اللہ علام الغیوب ہے ۔ اس کو اپنے بندوں کے ہر عمل کا تفصیلی علم ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ فرشتے اس کی پاک مخلوق ہے ۔ اور کوئی فرشتہ شرک کو پسند نہیں کرتا نہ مشرک کا طرف دار بن سکتا ہے ۔ مگر تسلی بخش ثبوت کے وہ اپنی مخلوق کو عذاب بھی نہیں دیتا ۔ اس لئے قیامت کے دن فرشتوں سے فرمائے گا کہ یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے یعنی کیا تم نے ان کو اپنی پرستش کا حکم دیا تھا یا تمہارے حکم کے بغیر یہ خود گمراہ ہوئے تھے؟ سورۂ فرقان کی ایک اور آیت میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ فرشتوں کو خطاب کر کے فرمائے گا ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِىْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۔ یعنی کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راستہ سے بھٹک گئے تھے ۔

• قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۔ فرشتے جواب دیں گے تو ہر عیب، نقص اور شرک سے پاک ہے ۔ تو ہمارا کارساز اور مالک ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں ۔ شرک تو کیا ہر عیب اور نقص سے تیری ذات پاک ہے اور تو ہمارا مولیٰ، آقا، کارساز اور مالک ہے اور ہم تیرے بندے ہیں ۔ معبود بنائے جانے کے قابل نہیں ۔ پھر کس طرح ہم ان کو اپنی پرستش کا حکم دے سکتے تھے ۔ ہم ان سے اور ان کے فعل سے بیزار ہیں ۔ یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے

بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ بلکہ شیطانوں کی عبادت کرتے تھے ۔ فرشتوں کے اس جواب پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرک تو ملائکہ کی عبادت کرتے تھے پھر فرشتے کس طرح انکار کر سکیں گے ۔ اس سوال کا ازالہ یہ ہے کہ درحقیقت انتہائی فرماں برداری تذلل، اظہار عجز اور اطاعت کا نام عبادت ہے ۔ آدمی نے جس کی اطاعت کی اسی کو معبود بنایا اور چونکہ فرشتوں کے حکم کی اطاعت مشرک نہیں کرتے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملائکہ کی عبادت بھی نہیں کرتے بلکہ شیطانوں کی عبادت کرتے

ہیں کیونکہ انہیں کا کہنا مانتے اور انہیں کی اطاعت کرتے رہے۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز کی پرستش شیطانوں کے بہکانے سے کرتے ہیں۔ پس حقیقت میں وہ کسی کی پوجا نہیں کرتے محض شیطانوں کی کرتے ہیں۔

اَکْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ۔ یہ گزشتہ جملہ کا بیان اور تشریح ہے یعنی اکثر لوگ شیطانوں کو مانتے اور ان کے کہنے پر چلتے تھے۔ پس درحقیقت وہ انہیں کی عبادت کرتے تھے۔ اسی مطلب کو ایک اور آیت میں بیان فرمایا وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا لَّعَنَهُ اللّٰهُ۔

فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِکُ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ پس اس گفتگو کے بعد تمام مشرکوں کو ناامیدی ہو جائے گی اور کوئی کسی کی تکلیف دور نہ کر سکے گا نہ کوئی کسی کو فائدہ پہنچا سکے گا۔

ہم نے تفسیری مقالہ میں تشریح کردی ہے کہ مشرک طبقہ محسوس، غیر محسوس، مادی اور مجرد، ادنیٰ اور اعلیٰ سب ہی مخلوق کی پرستش کرتا ہے مگر تمام ان چیزوں میں جن کی یہ عبادت کرتا ہے اعلیٰ درجہ ملائکہ کا ہے۔ مورت، صورت، جماد، نباتات، حیوان اور عناصر وغیرہ کی پرستش کی کوئی توجیہ اور تاویل تو ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں انسان کے تحت اور اس کے زیر حکم ہیں پھر ادنیٰ کا اعلیٰ کی پرستش کرنا مسلم الثبوت حماقت ہے۔ مگر فرشتوں کی نوع بظاہر انسان سے ارفع اور برتر معلوم ہوتی ہے اسی لئے سمجھدار مشرک دوسری مخلوق سے عموماً منہ موڑ کر صرف ملائکہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور غیبی کارفرما طاقتوں کی پرستش کرتے ہیں اور عقلی طور پر اس کی توجیہ بھی کرتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن ملائکہ بھی ان کے عمل سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور بازپرس ہونے کے وقت ذکر اللہ کی پاکی بیان کریں گے۔ جب ملائکہ بیزاری کا اعلان کریں گے اور مشرکوں کی طرفداری نہ کریں گے تو دوسری وہ تمام مخلوق جس کی مشرک پوجا کرتے تھے بدرجۂ اولیٰ بیزاری کا اعلان کرے گی۔ عیسیٰ، عزیر، مریم، مختلف اولیاء اور تمام ذی اختیار مخلوق جن کو معبود قرار دیا جاتا ہے مشرکوں سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرے گی۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا نہ عذاب سے بچا سکے گا نہ ثواب دلوا سکے گا۔ نہ شفاعت سے نہ دباؤ سے نہ لالچ دے کر نہ خود اپنے اوپر بار لے کر بہرحال کسی طور پر بھی کوئی کسی کا فریضہ کچھ نہ کر سکے گا اور مکمل خوف کے بعد آخری حکم دے گا۔

وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ کُنْتُمْ بِهَا تُکَذِّبُوْنَ۔ ان ظالموں حق ناشناسوں کو اس آگ کا مزہ چکھاؤ جس کو دنیا میں یہ نہیں مانتے تھے۔ کافروں کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو آخرت کے عذاب ثواب کا قائل ہے، مگر قرآن کو برحق نہیں جانتا اور رسالتِ محمدیہ کا اقرار نہیں کرتا۔ اور قیامت کا یقینی اس تفصیل سے نہیں کرتا جس تفصیل سے شریعتِ اسلامیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آخرت کے عذاب و ثواب کا قائل ہی نہیں۔ درحقیقت دونوں گروہ عذابِ آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو عموماً عذاب کی نفی کرتا ہے۔ دوسرا تفصیلی کیفیت کا منکر ہے۔ پس قیامت کے دن جس طرح اہل حق کو دوہرا ثواب ملے گا اسی طرح مشرکوں کو دوگونہ عذاب دیا جائے گا۔ اول تو ان کو ان باطل معبودوں کی امداد و اعانت کی طرف سے مایوسی ہوگی جن کا بھروسہ کرکے وہ دنیا میں ان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ یہ پہلا عذاب یا عذاب کا پیش خیمہ ہوگا دوسرا عذاب دوزخ کا ہوگا جس کی صراحت آیتِ مذکورہ میں فرمائی ہے۔ دوزخ میں عذاب تو چند در چند اور گوناگوں ہوں گے، مگر سب سے بڑا عذاب آگ کا ہوگا، اس لئے عذاب النار کی تصریح آیت مذکورہ میں کی ہے۔ اس کے تحت عذاب کے تمام اقسام داخل ہیں۔

مقصود بیان قیامت کے دن خصوصیت کے ساتھ فرشتے (اور عموماً تمام ذی اختیار عابد جن کی پرستش دنیا میں کافر کیا کرتے ہیں) اپنی عبادت کرنے والوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ فرشتوں کی طرف سے یہ اظہار برأت صرف اتمام حجت کیلئے ہوگا تاکہ کسی کافر کو عذر پیش کرنے کا موقع ہی نہ رہے۔ کافر اللہ کو چھوڑ کر جس کی بھی پرستش کرتا ہے درحقیقت وہ شیطان کی پرستش ہوتی ہے کیونکہ شیطان کے اغوا سے ہوتی ہے قیامت کے دن باطل معبودوں میں سے کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا نہ نفع پہنچائے گا نہ ضرر دور کر سکے گا۔ نفع و ضرر کی نفی سے ابطال شرک کی یہ دلیل مستنبط کی جا سکتی ہے کہ کسی کی عبادت کسی نفع کے حصول یا ضرر سے بچنے کے لئے کی جا سکتی ہے اور جب اللہ کے علاوہ کوئی بھی نفع نقصان کا مالک نہیں تو لامحالہ کوئی معبود بننے کا مستحق نہیں۔ اگلی آیتوں میں بھی ابطال شرک کے دلائل کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے وغیرہ۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ

جب اُن کے سامنے ہماری صاف صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں یہ شخص تو بس تم کو اُس چیز سے روکنا چاہتا ہے جس کی پرستش تمہارے باپ دادا

آبَاؤُكُمْ وَقَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۚ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا

کرتے رہے اور کہتے ہیں یہ (قرآن) تو سراسر تراشا ہوا جھوٹ ہے حق بات جب کافروں کے پاس آگئی تو کہتے ہیں یہ بس کھلا ہوا

سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ۝ وَكَذَّبَ

جادو ہے ہم نے نہ تو اُن کو کتابیں دی تھیں جن کو یہ پڑھا کرتے اور نہ (اے محمد) تم سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا بھیجا اُن سے پہلے

الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۝

والوں نے جھٹلایا تھا جو چیزیں ہم نے ان کو دی تھیں تو اُس کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچے پہلے والوں نے بھی میرے رسولوں کو جھٹلایا تھا پس کیسا میرا عذاب ہوا

تفسیر داعی حق جب پیام صداقت دیتا ہے اور اہل باطل کو ان کی باطل پرستی پر متنبہ کرتا ہے اور اس خرافات سے جو لوگوں کی کوتاہ نظری کے سبب محض تقلید اسلاف اور رسم قومی کی وجہ سے شاہراہ زندگی بن جاتی ہے اور مذہبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ بے وقوفوں کو روکتا ہے اور ستھرا ہوا صاف پاک مفید مسیح لائحہ زندگی پیش کرتا ہے تو عام لوگ سننے کے ساتھ یوں کہنے لگتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے، افترا ہے، بہتان تراشی ہے، اللہ کی طرف سے غلط لگا رہا ہے، لیکن جب ان سے سوال کیا جاتا ہے یا سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر جدید پیام الٰہی نہیں بشری ہے، خدا کا بھیجا ہوا نہیں ہے۔ انسان کا دماغی تراشیدہ ہے تو آخر یہ فوق البشریت، معجز انگیز، خیرہ کن قوت کیوں ہے؟ کون سی غیبی طاقت کارفرما ہے جو سب لوگوں کو مقابلے سے عاجز بنانے والی اور جو حق در جوق حلقہ گوش حق کو گرویدہ اور مسخر کر دینے والی ہے چونکہ عوام خصوصاً کو باطل عوام حقانیت کی طاقت اور سچائی کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور بزرگوں سے سنتے چلے آتے ہیں کہ انسانیت سے بالاتر جادو کی طاقت ہوتی ہے جو لوگوں کو مسخر کر لیتی ہے اور انسانی دماغ عموماً وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، اس لئے پرانا، بوسیدہ، فرسودہ معمولی جواب دے دیتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے، لیکن اس کے بعد جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ آخر نیا طریق زندگی قائم کرنے اور پرانی سڑک مٹانے سے اس شخص کو کیا حاصل ہے وہ کیوں نیا پیام دیتا اور پرانی خرافات مٹا کر نیا چلانا چاہتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں اور ایسا جواب دیتے ہیں کہ عوام کے جذبات کو برانگیختہ کریں اور داعی حق کے خلاف سب کو کمر بستہ لا کر کھڑا کر دیں۔ وہ کہتے ہیں یہ تم لوگوں کو اسلاف کے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ بزرگوں کے اثر کو مٹا کر اپنا اثر قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ جواب کیوں دیتے ہیں؟ محض طاقت کے بل بوتے پر۔ مال کی کثرت، جتھے کی افزونی، دنیوی ساز و سامان کی بہتات اور حکومت و سطوت کے دور میں، لیکن ان بے وقوفوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ اگر یہی چیزیں حقانیت کو کچلنے اور صداقت کی آواز کو دبانے کے لئے کامیاب ہتھیار ہوتے تو گزشتہ زمانہ میں جو بڑی بڑی پُر شوکت طاقتور اور مالدار آخر بیت میں گزری ہیں جن کے تمدن اور حکومت اور طاقت کے مقابلے میں ان لوگوں کی طاقت اور دولت دسویں حصہ کے برابر بھی نہیں ہے وہ بھی بنائے حق کو پست کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ مختلف زمانوں میں بڑی زبردست طاقتور قوموں کے خلاف داعیان حق اور انبیائے کرام نے آواز اٹھائی اور اپنی بل بلی طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر کسی کی پیش نہیں گئی اور بالآخر باطل کو نیچا دیکھنا پڑا۔ پس حق کا مقابلہ دنیوی ساز و سامان اور شوکت و جلال سے ناممکن ہے۔ مگر کسی داعی حق کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو صرف دلائل براہین کتب الٰہیہ اور صراحت آسمانی کو پیش کر کے اور جب کوئی آسمانی صراحت کوئی الہامی شہادت اور کوئی عقلی دلیل داعی حق کے خلاف موجود نہیں تو پھر اس کا مقابلہ اور مقابلے کی کوشش نہ صرف بے سود ہے بلکہ تباہی سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ حضور اقدس کے زمانہ میں بھی بالکل ایسا ہی واقعہ ہوا جب آپ نے جدید اسلامی پیام دیا اور غلط روی پر تنبیہ کیا تو لوگ جادوگر کہنے لگے اور سب لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے ہوئے حضور اقدس کی مخالفت پر کمر بستہ کرنے کے لئے کہنا شروع کیا یہ شخص تم کو تمہارے اسلاف کے طریقہ سے ہٹانا چاہتا ہے اور غلط طور پر اپنا

رائے اور اپنے کلام کو خدا کی طرف سے منسوب کر رہا ہے۔ حالانکہ حضور اقدسؐ سے پہلے نہ کوئی نبی ان کی اصلاح کے لئے آیا تھا نہ کوئی کتاب آسمانی ان کے زیر تلاوت تھی۔ ان کو تو شکر کرنا چاہیے تھا کہ اللہ کی وہ نعمت جس سے ہم اب تک محروم تھے اب ہم کو عطا کی گئی، مگر وائے رماغی افلاس کہ انہوں نے احسان خداوندی کی قدر نہ کی اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ نہ سوچا کہ گزشتہ قوموں کی طاقت کے مقابلے میں ہماری طاقت دسویں حصہ کے برابر بھی نہیں، جب وہ اللہ کے فرستادہ کا مقابلہ نہ کر سکیں ہم کیا کر سکیں گے۔ جس طرح وہ تباہ ہوئیں نبی برحق کی مخالفت کرنے سے ہم بھی تباہ ہو جائیں گے۔

تحلیلِ اجزاء

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ۔ کفار مکہ خصوصاً، عام کفار عموماً ہٹ دھرمی کرتے تھے۔ قرآن پاک کی آیات سن کر جب لاجواب ہو جاتے اور کوئی دلیل نہ پیش کر سکتے تھے تو حضورؐ کی توہین پر اتر آتے تھے۔ کہتے تھے یہ معمولی انسان (جس کو نہ کوئی مالی وجاہت حاصل ہے نہ سیادت نہ اس کا کوئی جتھا ہے نہ طاقت) حالانکہ آیات کا اعجاز بالکل واضح تھا۔ کھلی ہوئی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ الفاظ معجز، معانی پر کیف بلیغ اور ذخیرہ کن ہونے کے ساتھ دل نشین اور مستی آفرین تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اصول ہدایت مفید اور اصلاحی تھے اور اس قدر اصلاحی تھے جس کی نظیر نہ صرف ان کے رسم و رواج اور تعامل میں مفقود تھی بلکہ دوسری اقوام کے دستور حیات میں بھی معدوم تھی۔ اس قدر وضوح حقیقت کے بعد کلام کی برتری کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے ان کے لئے سوا لاحاصل کوشش کرنے اور حضورؐ کی ذات پر نکتہ چینی کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار والا کو توہین کی نظر سے دیکھتے اور معمولی انسان کہتے تھے۔

يُرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ۔ کھلی ہوئی حقیقت اور ناقابل تردید حقانیت کا انکار آسان کام نہ تھا۔ طلب گاران حق کو روکنا اور مخالفت پر صف آراء کرنا اور اپنے قول کی تائید پر آمادہ بنا لینا بہت مشکل تھا۔ عموماً جاہل آدمیوں کی فطرت افتادہ یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے رسم و رواج اور طریق عمل کو برا کہا جائے اور پرانی لکیر پیٹنے سے باز داشت کی جائے تو ان کے جذبات عناد برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ جب کافروں کو انکار حقیقت کرنے اور قرآن کی طرف سے لوگوں کو روگرداں بنانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو کہنے لگے کہ یہ شخص تو تم کو ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا ان کی مراد یہ تھی کہ یہ شخص تمہارے باپ دادا کو بے وقوف باطل پرست اور غلط رو کہتا ہے اور تمہارے بزرگوں کی جو وقعت اس کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہے۔

وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى۔ کافروں نے لوگوں کے جذبات عناد کو گزشتہ قول سے برانگیختہ کرنے کی کوشش کی، مگر کلام کی حقانیت و برتری کا جواب اس سے بھی نہ نکلا، اس لئے کہنے لگے یہ شخص مفتری اور جھوٹا ہے۔ اس نے یہ کلام خود ہی بنایا ہے اور اللہ کی طرف سے منسوب کر دیا ہے۔ گویا ان کی غرض یہ تھی کہ اس شخص میں دو عیب ہیں۔ ایک تو حقیر آدمی ہوتے ہوئے تمہارے بزرگوں کے معمول حیات سے روکتا ہے۔ دوسرے جھوٹا بھی ہے اور اتنا بڑا جھوٹا ہے کہ خدا پر اس نے جھوٹ باندھا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں باتوں سے حضور اقدسؐ کی ذات کی توہین مستفاد ہوتی تھی۔ کلام حق کی حقانیت پھر بھی ناقابل تردید حقیقت ہو سکتی تھی۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ اگر یہ کلام خود ساختہ ہے تو دوسرے آدمی کیوں مقابلے سے عاجز ہیں کیوں اس کے اندر فوق البشریت طاقت کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔ اس سوال کو دور کرنے کے لئے کافروں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ بات یہ تھی کہ انسانی طاقت سے بالاتر چیز بے وقوفوں کو نظر آتی ہے وہ اس کو جادو یا اسی سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ کہہ دیتے ہیں کیونکہ روحانیت کے بلند درجات اور نبوت کی حقیقت تک ان کی دماغی رسائی ہوتی نہیں۔ محسوسات سے اوپر نگاہ نہیں اٹھتی، اس لئے حق کو بھی جادو ہی کہتے ہیں۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ۔ قومی رسم و رواج اور آبائی تعامل کی بنیاد اگر کتاب الٰہی کی تعلیم اور نبوت کی تلقین پر ہو تو بے شک حق ہوتی ہے اور اگر خود ساختہ نظریات حیات پر ہو تو عموماً غلط ہوتی ہے۔ عرب مستعربہ میں نہ تو کوئی آسمانی کتاب بھی نہ کسی نبی کو بھیجا گیا تھا۔ عدن سے بصرہ تک بلکہ وادی حجر اور مکہ کے درمیان عاد و ثمود کی قومیں اپنے زمانہ میں بکثرت آباد تھیں اور بڑے بڑے تمدنوں کی مالک تھیں اور ان کی اصلاح کے لئے صالح اور ہود ایسے پیغمبروں کو بھی بھیجا گیا تھا مگر وہ عرب مستعربہ نہ تھے۔ عرب مستعربہ نہ حامل کتاب تھے نہ فیض یاب نبوت۔ اس لئے ان کے رسم و رواج اور مذہبی تعامل کی بنا محض خود ساختہ نظریات پر تھی اور ایسے خود ساختہ نظریات واجب الترک ہوتے ہیں۔ پس قومی رسم و رواج اللہ

ان کے آبائی دستورِ حیات کو غلط ثابت کرنے کے لئے فرمایا کہ ہم نے ان کو اس سے پہلے نہ تو کتابیں دیں جن کو یہ تلاوت کرتے ہوں اور ان کی ہدایتوں پر چلتے ہوں نہ ان کے پاس کوئی نبی بھیجا تھا کہ اس کی تعلیم کے موافق ان کے باپ دادا نے قانونِ زندگی بنایا ہو اور اس پر عمل درآمد کیا ہو۔ پس ایسی صورت میں ان کے اسلاف کا دستورِ زندگی سراسر غلط اور اس پر چلنا بالکل حماقت ہے۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ کافروں کی سرکشی اور باطل کوشی کی عموماً دو وجوہ ہوتی ہیں۔ اول جاہلانہ خودرائی، خودپسندی اور برخود غلطی۔ دوئم مال، اولاد، حکومت، سلطنت اور طاقت کا غرور اور پندارِ نفس۔ عرب کے کافروں میں یہ دونوں مذموم اخلاق تھے۔ وہ خودپسند، جاہل، خودرائے اور اڑیل ضدی بھی تھے اور ہر طرح کی برتری کا بھی ان کو غرور تھا۔ آیتِ مذکورہ میں ان کے اسی خیال کی تردید ہے حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ ان سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کی طاقت سطوت، عزت، حکومت، دولت، مدنیت، غرض دنیوی برتری کی تمام چیزیں ان کافروں سے دس گونہ زائد تھیں یہ ان کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچے ہیں، لیکن جب انہوں نے اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور ان کو ستانا جانا تو آخر تباہ کر دیئے گئے۔ پس کیا یہ کافر پیغمبر برحق کی تکذیب کرنے کے بعد تباہی سے بچ سکتے ہیں اور کسی قسم کی فلاح پا سکتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

مقصودِ بیان

کفار کو نبی کی ظاہری صورت نظر آتی تھی اور ظاہری شکل چونکہ دوسرے آدمیوں سے ممتاز نہیں رکھتی تھی، اس لئے وہ نبی کو معمولی آدمی جانتے تھے ان کو نورِ نبوت اور روحانیت کو جاننے اور سمجھنے کا سلیقہ ہی نہ تھا۔ وہ رسول اللہ کے فقط مخالف ہی نہ تھے بلکہ عادی بھی تھے۔ اسی لئے اپنے ہم مشرب لوگوں کے جذبات عناد کو برافروختہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پیغمبروں کی تکذیب موجب تباہی ہے۔ کوئی قوم اس تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ اقوام ماضیہ کی تباہی کا اظہار کر کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاندوں کو ان کی ہلاکت و بربادی سے ڈرانا مقصود ہے وغیرہ۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ مَا

تم کہہ دو کہ میں تم کو صرف ایک نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کے واسطے دو دو ایک ایک ہو کر کھڑے ہو پھر غور کرو کہ تمہارے رفیق کو

بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ قُلْ

کوئی جنون نہیں ہے وہ تو بس سخت عذاب کے آگے آگے تم کو ڈرانے والا ہے کہدو

مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

کہ جو کچھ میں نے تم سے مزدوری مانگی وہ تم ہی کو (مبارک ہو) میری اجرت تو اللہ کے ذمہ ہے وہی ہر چیز سے واقف ہے

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا

کہہ دو کہ میرا رب (میرے دل میں) حق بات ڈالتا ہے وہ غیب داں ہے کہہ دو کہ دین برحق آپہنچا اور ناحق

يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ۝ قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۚ

کا تو نہ پہلا نہ دوسرا کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں تو اپنے ہی برے کو گمراہ ہوں گا

وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ۝

اور ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بدولت جو میرا پروردگار مجھے بھیجتا ہے۔ بیشک وہ سننے والا اور قریب ہے

تفسیر دیوانہ کی بڑ نا قابلِ توجہ ہوتی ہے اور پاگل مرفوع القلم بھی ہوتا ہے وہ جو کچھ کہتا ہے بے باکی کے ساتھ کہتا ہے کیونکہ نتائج پر صحیح غور کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ کوئی طاقت اس کو اظہارِ خیال سے نہیں روک سکتی۔ شاہوں کا جاہ و جلال اور طاقتور قوموں کی جبروت طاقت اس کی نظر میں ہیچ ہوتی ہے، اس لئے وہ جو کچھ چاہتا ہے کہتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ پس اگر واعظ دیوانہ ہو تو کسی طرح اس کے قول کو کان دھر کر نہیں سنا جا سکتا۔ خواہ وہ کیسی ہی بے باکی سے بیان کرے۔ دیوانہ کو چھوڑ کر ہوشمند ناصح دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کا دل لوگوں کی خستہ حالی، بدحالی اور بربادی کو دیکھ کر کڑھتا ہے۔ دوسرا وہ جو خود غرض اور ذاتی مفاد کا خواستگار ہوتا ہے۔ نصیحت و وعظ کرتے ہیں، مگر اول الذکر کی نصیحت پُر خلوص ہوتی ہے۔ اس کا کوئی ذاتی لالچ نہیں ہوتا۔ وہ نہ سیادت قومی چاہتا ہے نہ دولت نہ عزت نہ حکومت اور موخر الذکر کی نصیحت کا مغز صرف لیڈرشپ کے حصول پر ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کو رہنما اور رہبر کہیں۔ اپنا سردار بنا کر عزت کریں اور ساری قوم کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ اول الذکر کا کلام رفتار اور طریقِ زندگی حق ہوتا ہے اور موخر الذکر ذاتی مفاد کے حصول کا طلبگار ہوتا ہے، اس لئے اس کی نصیحت باطل، اس کی رفتار غلط اور اس کا نقطۂ نظر پُر فریب ہوتا ہے۔ اول الذکر چونکہ حق پرست مخلص ہوتا ہے، اس لئے ہر قسم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ حامل حق ہوتا ہے، مالکِ صداقت ہوتا ہے اہلِ حقیقت ہوتا ہے، اس لئے وہ باطل سے ٹکر لینے سے نہیں ڈرتا اور نہ کوئی باطل اس کے مقابلے میں سر بر آ ہو سکتا ہے اور موخر الذکر ذرا مقابلے کے وقت ترساں و لرزاں ہوتا ہے۔ اس کو اشاعتِ حق اور اصلاحِ خلق سے زیادہ پیارا اپنا فائدہ ہوتا ہے گویا خود غرض ناصح نفس پرست ہوتا ہے، اس لئے اس کا کلام کیسا ہی صحیح ہو مگر نفس پرستی پر مبنی ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ کیونکہ نفس پرستی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے اور مشفق، مخلص ناصح کی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اس کو اللہ کی طرف سے ہدایت ہوتی ہے وہ ربانی رہنمائی کے تحت خود بھی چلتا ہے اور لوگوں کو بھی چلاتا ہے۔ رسولِ پاک نے جب اعلانِ حق کیا اور لوگوں کو نتائجِ بد سے ڈرایا اور عذاب سے ڈرایا اور کافروں کی کسی جمعیت کسی طاقت اور کسی حکومت کی پرواہ نہ کی تو لوگوں نے دیوانہ کہنا شروع کر دیا اور اتنا غور نہ کیا کہ اگر یہ شخص پاگل ہوتا تو جنون کا دورہ کہیں اس سے پہلے بھی اس پر ہوتا۔ کسی اور بات میں بھی اس کے پاگل پن کا ظہور ہوتا۔ گفتار رفتار اور اطوار میں کسی طرح تو اس کا جنون برسرِ اظہار آتا۔ یہ تو عام طبقہ کا خیال تھا، لیکن جو لوگ کسی قدر ہوش کی دنیا میں رہتے تھے انہوں نے مجنون کہنے سے تو گریز کیا، مگر اقرارِ حق کو دل سے نہیں چاہتا تھا، اس لئے کہنے لگے یہ شخص قوم کا سردار اور حاکم بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ حضور والا نے نصیحت کا کوئی معاوضہ ان سے طلب نہ کیا۔ نہ اپنی سیادت، حکومت اور شاہی تسلیم کرنے کی ان سے خواہش کی نہ پیسہ مانگا۔ صرف جذبۂ حق طلبی نے اظہارِ حق پر مجبور کیا اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ باوجود باطل کی غیر معمولی ظاہری طاقت کے آپ نے کبھی پرواہ نہ کی اور باطل کے سر پر حق کا پتھر ایسا مارا کہ وہ چکنا چُور ہو گیا۔ لوگوں نے حضور کو تنہا کمزور اور بے یار و مددگار دیکھا، مگر یہ خیال نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ہر حالت سے واقف ہے۔ وہ علام الغیوب ہے، وہ حاضر ناظر ہے۔ اسی کی غیبی طاقت کی یہ کارفرمائی ہے کہ حق کے مقابلے میں باطل سر نہیں اٹھا سکتا۔ ان کو غور کرنا چاہیے تھا کہ کیا یہ شخص خود غرضی اور نفس پرستی کی وجہ سے تمام قوم کے خلاف اعلان کر رہا ہے۔ یہ غیبی ہدایت اس کو ایسا کرنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ گمراہی تو نفسانیت اور خود پرستی سے پیدا ہوتی ہے جب خود غرضی کا شائبہ بھی نہ ہو تو یقین کر لینا چاہیے تھا کہ جذبۂ خلوص اللہ کا انتخاب ہے غیبی امداد ہے وحی ربانی اور ہدایت الٰہی ہے، اس لئے سرتابی کرنا نہ صرف بے سود ہے بلکہ تباہی انگیز ہے۔ کاش انھیں اتنی سمجھ ہوتی کہ وہ ناصح شفیق اور خود غرض رفیق میں امتیاز کر سکتے اور ضلالت و ہدایت میں فرق کر لیتے۔

تحلیلِ اجزاء قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ۔ کچھ دیوانے آدمی حضور والا کو دیوانہ کہتے تھے، اس لئے کہ اشاعتِ توحید اور اعلانِ حق آپ بے باکی کے ساتھ کرتے تھے اور کافروں کی کسی طاقت کو بھی خیال میں نہیں لاتے تھے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے ان آیات کا نزول ہوا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ جب کافروں نے قرآن کی آیات کو سُنا اور عرب کے تمام ادیب اور شاعر انگشت بدنداں حیرہ و ساکت رہ گئے

تو انہوں نے کہنا شروع کیا اس شخص پر جن آتا ہے اور جن القا کرتا ہے۔ بات یہ تھی کہ عربوں کا اور خصوصاً عربی شاعروں کا عام خیال تھا کہ شاعروں کو القا کرنے والا کوئی جن ہو سکتا ہے جس کی غیبی امداد کی وجہ سے شاعر شعر کہتا ہے اور بیوقوف جاہل چونکہ قرآن کو بھی شاعری اور شریعت کا مل مظاہرہ سمجھتے ہیں، اس لئے حضور کو جن رسیدہ کہتے تھے۔ اس زعم باطل کا ازالہ بھی ان آیات سے ہو جاتا ہے۔ اللہ اپنے رسول کو خطاب کر کے فرماتا ہے ان سے کہہ دو کہ میں تم کو صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔

اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا مَا بِصَاحِبِکُمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ وہ یہ کہ تم بجائے خود انفرادی اور اجتماعی حالت میں غور کرو کہ کیا وہ شخص جو تمہارے ساتھ رہتا ہے اور رہتا چلا آیا ہے گویا تمہارا ساتھی ہے تمہاری سوسائٹی کا ایک فرد ہے۔ کسی طرح کا بھی مجنون ہے کسی طرح کا بھی جنون اس کو ہے، مگر شرط یہ ہے کہ جذبات عناد و مخالفت اور عداوت و بغض سے سینوں کو خالی کر کے محض مخلص دلوں اور صاف دماغوں سے صرف خدا کے واسطے غور کرو تم کو خود معلوم ہے کہ کبھی تمہارے ساتھی پر جنون کا دورہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ رہنے والا تھا تم اس سے بے خبر نہ رہتے۔ آخر اس قدر بے باکی اور نڈری کی کیا وجہ ہے۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ لَّکُمۡ بَیۡنَ یَدَیۡ عَذَابٍ شَدِیۡدٍ بات صرف یہ ہے کہ وہ یعنی رسول آئندہ سامنے آنے والی سخت تکلیف سے تم کو ڈراتا ہے۔ (اس کو تمہاری تباہی دکھ رہی ہے اس لئے تم کو اس سے بچانا چاہتا ہے) ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک روز حضور والا کوہ صفا پر چڑھے اور بلند آواز سے یا صباحاہ پکارا۔ سب لوگ آپ کے گرد آکر جمع ہو گئے اور کیفیت دریافت کی۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ دشمن کا لشکر صبح یا شام تم پر چھاپہ مارنے والا ہے تو کیا تم میری بات سچی نہیں مانو گے۔ لوگوں نے جواب دیا کیوں نہیں۔ فرمایا پھر میں تم کو ڈراتا ہوں کہ تمہارے سامنے سخت عذاب ہے (رواہ البخاری) حضرت بریدہ سے مروی ہے حضور والا باہر تشریف لائے اور فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ میری اور تمہاری مثال کیا ہے؟ حاضرین نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول کو ہی بخوبی علم ہے۔ ارشاد فرمایا میری اور تمہاری مثال یہ ہے کہ جیسے کسی قوم کو دشمن سے خوف ہو کہ وہ اپنا لشکر لے کر ان کی طرف آرہا ہو پس انہوں نے اپنا ایک آدمی دیکھنے بھالنے اور دیدبانی کرنے کے لئے بھیجا ہو۔ دیدبان نے جا کر دشمن کو آتا ہوا دیکھا اور اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے آیا مگر اس کو خیال ہوا ہو کہ شاید میری اطلاع سے پہلے دشمن ان پر آپہنچے، اس لئے کپڑا ہوا میں اڑانے لگا الخ (رواہ احمد)

قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَکُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ دنیا طلب خیرخواہ اور مخلص واعظ میں خود غرضی اور اخلاص ہی کا بڑا فرق ہوتا ہے۔ پس لالچ اور لالچ سے آزادی ہی دونوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ کافر، بدباطن کور دماغ کافر حضور کو عزت حکومت دولت کا طلب گار جانتے تھے اور کہتے تھے سرداری اور مال حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ ڈھونگ بنایا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر میں کوئی معاوضہ تم سے مانگوں تو وہ تمہارے لئے ہے یعنی تم کو حق ہے کہ تم مجھ سے چھین کر لے لو، قبضہ کر لو۔ مطلب یہ کہ اب تک تو میں نے تم سے کچھ مانگا نہیں۔ اگر آئندہ طلب کروں تو وہ تم کو ہی مبارک ہو۔ میں اپنے لئے کوئی چیز بطور معاوضہ طلب نہیں کروں گا۔ میں تو معاوضہ کا طالب اللہ سے ہوں اسی کے ذمہ میرا اجر ہے اور میرے اس قول کا گواہ اللہ ہے وہ ہر چیز کا حاضر ناظر ہے۔ اسی تعلیم کی وجہ سے حضور والا نے صدقات و زکوٰۃ کے مال کو اپنے اور اپنی اولاد کے لئے حرام قرار دے دیا تھا۔ تاکہ لوگوں کو بدظنی کا موقع ہی نہ ملے اور صاف فرما دیا کہ اس مال صدقہ میں سے آل محمد کے لئے کچھ حلال نہیں بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ جہاں کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے وہیں کے محتاجوں کو بانٹ دی جائے۔

تنبیہ آیت مذکورہ سے ایک لطیف نکتہ حل ہوتا ہے لوگ عموماً کہتے ہیں کہ جب ابوجہل ابولہب اور دوسرے کافروں کے ایمان لانے سے مایوسی تھی اور اللہ کو معلوم تھا کہ وہ کسی طرح ایمان نہیں لائیں گے تو تبلیغ کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں ان کو بار بار لاحاصل ہدایت کی گئی۔ آیت سے اس شبہ کا حل مستفاد ہوتا ہے بات یہ ہے کہ تبلیغ کے دو فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جس کو ہدایت کی جائے وہ اس کو قبول کرے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ تبلیغ کرنے والے کو اللہ کی طرف سے اجر ملنے کا استحقاق ہو جائے اور اس کے مراتب میں اضافہ ہوتا رہے کیونکہ مبلغ اور ہادی کی اجرت اللہ کے ذمہ ہے۔ مخلوق سے کوئی معاوضہ لینے کی اس کو ممانعت ہے۔ پس اگر کوئی شخص ہادی کی ہدایت پر چلے اور حکم کو مانے تو دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں ورنہ مؤخر الذکر فائدہ تو بہرحال مبلغ کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود مایوسی کے تبلیغ کا حکم برابر قائم رہا اور حضور والا نصیحت کرتے رہے۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوبِ مقاتل نے یقذف کا ترجمہ یتکلم کیا ہے اور قتادہ کے نزدیک حق سے مراد ہے وحی۔ یعنی اللہ (انبیاء کے پاس وحی بھیجتا) ہے اور وہ علام الغیوب ہے خوب جانتا ہے کہ وہ پیدا ہی کس کو بنایا جائے اور نبی بننے کی کس میں صلاحیت ہے۔ گویا اس جملہ سے کافروں کے ایک غلط گمان کی تردید ہو گئی۔ کافروں کا قول تھا کہ مکہ یا طائف کے کسی سردار کو نبی ہونا چاہیے تھا نہ کہ اس حقیر کم رتبہ آدمی کو۔ اللہ نے اس کا جواب دے دیا کہ ہم عالم الغیب ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ رسول بننے کی کس میں صلاحیت ہے اور کس پر وحی اترنی چاہیے۔ چونکہ مذکورہ تفسیر کسی مرفوع حدیث یا قول صحابی پر مبنی نہیں ہے اور تخصیص بلا دلیل ہے، اس لئے میرے نزدیک اگر آیت کو عمومی صورت میں لے لیا جائے تو بہتر ہے۔ سیاقِ کلام کے لحاظ سے یہی مناسب ہے۔ مطلب یہ کہ نبی جو ہدایت کرتا ہے وہ کسی ذاتی لالچ سے نہیں کرتا۔ اس کا اجر تو خدا کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہ صرف باطل کے مقابلہ میں حق کو پیش کرتا ہے اور وہ خود نہیں پیش کرتا بلکہ پروردگار کے حکم سے ایسا کرتا ہے۔ اللہ علام الغیوب ہے اس کو باطل کی طاقت اور حق کا زور معلوم ہے پس وہ حق کے ذریعہ سے باطل کا سر کچل دیتا ہے۔

تنبیہ۔ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسالت کوئی کسبی چیز نہیں نہ کوئی پیشہ ہے بلکہ اللہ کا انتخاب ہے وہ جس کو چاہتا ہے تبلیغ پر مامور فرما دیتا ہے۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ۝ اگر کوئی چیز بے نشان اور معدوم ہو جائے تو عربی محاورہ میں مایبدئ ومایعید کہا جاتا ہے یعنی فلاں چیز کا نہ ابتدائی ظہور رہے نہ دوبارہ ظہور ہوگا۔ جس وقت مکہ میں کافروں کا زور شور اور گرم بازاری تھی اور ہر طرف ان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس وقت آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور صاف اعلان کر دیا گیا کہ حق آ گیا اور باطل بے نشان ہو گیا گویا یہ ایک پرزور پیشین گوئی تھی کہ عنقریب اسلام کو غلبہ اور کفر کو شکست ہوگی۔ اسلام کی فتح اور کفر کی ہزیمت اتنی یقینی ہے کہ گویا ہو چکی۔ چنانچہ فتح مکہ کے روز جب حضور کعبہ میں تشریف لے گئے اور وہاں بتوں کو رکھا دیکھا اور ایک کنارے سے ان کو ٹھوکر مارتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (رواہ البخاری ومسلم والنسائی والترمذی) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ باطل کا عمل بالا یا برتری یا گفتگو نہیں رہی۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ کا یہ قانون ہی ہے اور عادت الہیہ یوں ہی جاری ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل فروغ نہیں پاتا۔ اللہ حق کی چوٹ باطل پر مارا کرتا ہی ہے۔ پس اب حق آ گیا اور باطل بے نشان ہو جائے گا۔ خواہ ظاہری اسباب اس وقت تک کچھ بھی نہ ہوں، مگر اللہ عالم الغیب ہے وہ جانتا ہے کہ حق کو باطل پر کس طرح غلبہ ہوتا اور ہو سکتا ہے۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ۔ اس آیت میں حق و باطل اور سچ جھوٹ میں امتیاز کرنے کی ایک کھلی نشانی اور ناقابلِ شک دلیل بیان فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو طریقِ زندگی خود ساختہ ہو جس کا مدار نفس پرستی پر ہو اور جو بیجا نفسانیت پر مبنی ہو وہ ضلالت وگمراہی ہے اور جس کا مدار وحی ربانی پر ہو اور ایجاد دماغی کو اس میں دخل نہ ہو وہ ہدایت ہے یعنی قوانین کی ساخت اور اصولِ زندگانی کی ایجاد اگر انسانی دماغ کی ممنون ہو تو وہ گمراہی ہے اور اگر آئین ساز خدا ہو اور اس نے قوانین وضع کر کے وحی کے ذریعہ سے بھیجے ہوں تو وہ ہدایت ہے۔ پس چونکہ میں جو کچھ ادا کر رہا ہوں وہ میرے نفس کی طرف سے نہیں ہے اور وحی الٰہی پر مبنی ہے، اس لئے یقینی ہدایت ہے اور نفسانی شائبہ کو اس میں دخل نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو ماننے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔

مقصود بیان
أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ اگر خالص دل اور محض حق جوئی کی نیت سے تنہائی میں یا دو مخلص دل والوں کے ساتھ مل کر غور کیا جائے تو کلام اللہ کی حقانیت اور رسول پاک کی صداقت کھل جاتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ غور و فکر خالص لوجہ اللہ ہو۔ جذبۂ عناد اور داعیۂ تعصب کارفرما نہ ہو۔ مَا بِصَاحِبِكُمْ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ محمد تمہارا مصاحب ہمیشہ رہے ہیں اور سب ہی ان کی خصلت اور حالات سے واقف ہو۔ اگر یہ جنون زدہ یا دماغ رسیدہ ہوتے تو تم کو ضرور علم ہوتا۔ پس جو شخص ہر معاملہ میں فرزانہ ہے تو اصولِ ہدایت بیان کرنے میں کس طرح دیوانہ ہو سکتا ہے۔ قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ سے دو باتیں مستفاد ہوتی ہیں (۱) مبلغ، واعظ اور معلم قرآن و حدیث کے لئے اجر لینی یا اجرت لینے کی تمنا کرنی ناجائز ہے۔ ہاں اگر بغیر نیتِ اجرت کے بقدر کفاف اس غرض سے لے لے کہ زندگانی کا کوئی سہارا نہ ہو اور بغیر لئے تبلیغ کا جاری رہنا صورت مستثنیٰ ہے۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے پیشہ ور واعظوں، بوالہوس پیروں اور زر دار علماء کو جو محض دنیوی لالچ کی وجہ سے دین کو لا کر رہے ہیں اور کہتے ہیں علمائے متاخرین نے اس کا فتویٰ دے دیا ہے۔ ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ علماء نے ایسا دین فروشی کا فتویٰ نہیں دیا اور اگر فتویٰ دے

دین تو کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ جب صراحتِ قرآنی مخالف ہے تو پھر کسی کو دم مارنے کی کیا مجال ہے۔ اگر کوئی پیشہ ور مبلغ تبلیغ محض مال اندوزی کے لئے کرے تو اس کا مال وقف ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر تبلیغ سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچے اور کوئی نہ مانے تب بھی واعظ اجر کا مستحق ہو جاتا ہے اور تبلیغ کا ایک طرفہ فائدہ بہرحال حاصل ہوتا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ سے بہ تفسیر قتادہ و مقاتل یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کسبی نہیں وہبی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ ریاضت و عبادت کی کثرت سے اس کا حصول نہیں ہوتا۔ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ سے ضمنًا یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حق کے مقابلے میں انجام کار باطل کو شکست ہو جاتی ہے۔ حق غالب اور باطل بے نشان ہو جاتا ہے۔ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اگر ہدایات یا طریقِ زندگی کی اصلاح میں نفسانیت کو دخل ہو گا تو وہ ہدایت نہ ہو گی گمراہی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی قوانین کسی انسان کا کام نہیں کیونکہ کوئی انسان لوازم بشریت سے خالی نہیں۔ ہاں تبلیغ انسانی کا کام ہے، مگر خلوص کے ساتھ بغیر خود غرضی اور نفس پرستی کے وغیرہ

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا

اور تو (تعجب کرے) اگر دیکھے جب یہ لوگ گھبرا اٹھیں گے پھر بھاگ بھی نہ سکیں گے اور پکڑ لئے جائیں گے پاس کے پاس سے یہ کہنے لگیں گے کہ ہم اس (قرآن)

بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۚ وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ

پر ایمان لائے حالانکہ ایسے دور مکان پر ان کی دسترس کہاں ہو سکتی ہے اس سے پہلے اس کا انکار کرتے تھے

وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا

اور بے دیکھے دور سے نشانہ پر تیر چلا رہے تھے اس وقت ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جن کی یہ

يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝

خواہش کریں گے آڑ کر دی جائے گی جیسا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا جائے گا جو ان سے پہلے تھے بلاشبہ یہ سب قوی شک میں تھے

تفسیر نادان انسان کی نظر انجام اور مستقبل کی طرف سے بند ہوتی ہے۔ وہ مابعد زندگی کا صحیح تصور نہیں کر سکتا۔ اس کے فہم و دانش میں اتنی روشنی نہیں ہوتی کہ خود آئندہ زندگی کے واقعات کا انکشاف کر سکے۔ اگر کوئی دور رس نظر رکھنے والا اس کے سامنے حیاتِ ثانیہ کی تصویر کشی کرتا بھی ہے تو وہ اپنے دماغی زنگ کے لاتعداد سیاہ داغ اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات کرتا اور بن دیکھی حقیقت کو قابلِ یقین نہیں سمجھتا ہے۔ مگر جب حقیقت سامنے آ جاتی ہے اور واقعات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے تو اس کو یقین آتا ہے، مگر اس وقت یقین آنا بے سود ہے۔ عمل کا وقت ضائع ہو چکتا ہے، اصلاحِ اعمال کی دنیا ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت سوا حسرت و یاس کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کافروں کی یہی حالت تھی۔ ان کے دل مردہ، دماغ پژمردہ اور روحیں پژمردہ تھیں۔ ان کی نظر میں جو کچھ تھی یہی زندگی تھی۔ آخرت کا ان کو یقین نہ تھا۔ حضور والا نے ان کو بہا کش کی۔ حیاتِ ثانیہ اور اس کے عذاب و ثواب کا یقین دلایا، مگر ان کو یقین نہ آیا اور اضطراب انگیز شک میں پڑے رہے جگہ بن دیکھے بغیر یقینی علم کے محض قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ جب قیامت ہو گی اور ان کو عذاب سامنے دکھے گا اور پکڑ ہو گی اس وقت ان کو یقین ہو گا اور وہ مانیں گے، مگر کیا فائدہ عمل کی دنیا باقی نہ ہو گی۔ سوا نامرادی کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

تحلیلِ اجزاء وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ۔ یعنی مرنے کے بعد جب دوبارہ کافروں کا حشر ہو گا تو ان کی حالت عجب ہولناک اور ہیبت انگیز ہو گی۔ ان کو عذاب سے بچنے اور پناہ لینے کا کوئی موقع نہ ملے گا اور آسانی کے ساتھ فوراً پکڑ لئے جائیں گے۔ حسن بصری نے فرمایا یہ گرفتاری قبروں سے نکلتے ہی ہو گی۔ مجاہد، عطیہ اور قتادہ نے فرمایا وہ قدموں کے نیچے سے گرفتار کر لئے جائیں گے۔ ضحاک اور عبدالرحمٰن کے نزدیک

آیت مذکورہ کا نزول کفار بدر کے متعلق خصوصیت سے ہوا ہے۔ ابن کثیر فرماتا ہے کہ واقعہ مذکورہ قیامت کے دن ہوگا۔ مگر بدر میں قتل ہونے کے بعد سے جو عذاب شروع ہوا وہ اسی آخروی عذاب سے متصل ہے۔ اس لئے ضحاک نے آغاز عذاب قتل بدر کے بعد سے قرار دیا۔ میرے خیال میں تعیین فضول اور بے وجہ ہے۔ اصل واقعہ تو قیامت میں ہی ہوگا۔ دنیوی عذاب بہرحال مراد نہیں ہے۔ لیکن من مات فقد قامت قیامتہ چونکہ مسلم حقیقت ہے۔ اس لئے اُخروی زندگی کا آغاز مرنے کے بعد سے ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد ہی ہر شخص کی قیامت بپا ہو جاتی ہے۔

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ۔ اُس وقت کافر کہیں گے ہم نے اب روز قیامت کو مان لیا۔ بہٖ کی ضمیر روز قیامت کی طرف راجع ہے۔ جو فی الجملہ بطور سیاق مذکور ہے۔ ممکن ہے کہ حضور کے قول یا قرآن کی صراحت کی طرف راجع ہو۔ مطلب بہرحال ایک ہے۔

وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ۔ یعنی اس وقت مشاہدہ کے بعد ان کو ایمان کا موقع کہاں ہاتھ آئے گا۔ مکان بعید سے مراد دنیا ہے۔ زہری، مجاہد، حسن بصری اور اکثر تابعین کا یہی قول ہے۔ چنانچہ زہری نے آیت کا مطلب یہ لکھا ہے کہ وہ ایمان کہاں سے پائیں گے۔ حالانکہ دنیا منقطع ہو چکی ہوگی۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ لوگ دنیا میں واپس جانے کی درخواست کریں گے تاکہ توبہ کر سکیں، مگر دنیا لوٹنے اور توبہ کرنے کا موقع نہ ہوگا۔ گویا جب عمل کی دنیا اُن سے دور ہو گئی تو پھر وہاں لوٹنا ناممکن ہوگا۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِن قَبْلُ ۖ وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ۔ اس آیت میں بھی مکان بعید سے مراد دنیا ہے۔ قتادہ اور مجاہد نے مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ حشر سے پہلے دنیوی زندگی میں تو وہ قیامت کے قائل نہ تھے اور اپنے گمان کے موافق غیبی تیر چلاتے تھے اور کہتے تھے کہ حشر نشر اور جنت دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ گویا دنیا میں ہی بیٹھے بیٹھے بغیر علم کے آخرت کے متعلق باتیں بناتے تھے۔ پس جب قیامت ہوگی اور وہ اقرار کریں گے تو ایمان و اقرار کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ۔ یعنی کافروں کی خواہش پوری نہیں کی جائے گی۔ ان کے اور ان کی خواہش کے درمیان روک کر دی جائے گی۔ مایشتہون سے مراد کیا ہے اور قیامت کے دن کافر کس چیز کی خواہش کریں گے۔ اس کی تعیین علماء نے اپنے تفسیری اقوال میں اپنی طرف سے کی ہے۔ حسن بصری اور ضحاک نے فرمایا وہ لوگ اس وقت ایمان کی خواہش کریں گے۔ سدی نے ایمان کی جگہ توبہ کا لفظ فرمایا۔ ابن جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ مجاہد نے فرمایا مال و اولاد کی جو خواہش ان کو دنیا میں تھی وہ قیامت کے دن روک دی جائے گی۔ ابن عمر، ابن عباس، ربیع بن انس وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ امام بخاری نے اسی کو پسند کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں وہ مال و اولاد کی خواہش رکھتے تھے، مگر قیامت کے دن ان کو کچھ نصیب نہ ہوگا۔ میرے نزدیک تعیین بلاوجہ ہے۔ دنیوی خواہشات بھی قیامت کے دن ممنوع ہوں گی اور توبہ و ایمان کا موقع بھی نہ ملے گا۔ نہ دنیا میں واپس جانے کی خواہش پوری کی جا سکے گی۔ اس لئے عام تفسیر بہتر ہے۔

كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن قَبْلُ۔ اشیاع سے مراد ہیں گزشتہ کفار۔ یعنی رسالت محمدیہ کے کافر قیامت کے دن اسی طرح مایوس المراد ہوں گے جس طرح ان سے پہلے گزشتہ اقوام کے کافر۔

إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ۔ یعنی دنیا میں یہ کافر قیامت کے متعلق شک کرتے رہے اور اضطراب انگیز تردد میں پڑے رہے۔ پس عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان قبول نہ ہوگا۔ قتادہ فرمایا کرتے تھے لوگو شک و تردد سے پرہیز رکھو۔ کیونکہ جو شخص شک پر مرا وہ شک پر ہی اٹھایا جائے گا اور جو یقین پر مرا اس کا حشر بھی یقین پر ہوگا۔

مقصودِ بیان — کافروں کے اخروی عذاب اور حسرت ناک حالت کی تصویر کشی۔ اس چیز کی در پردہ صراحت کہ غائبانہ قیاسی تیر چلانا اور قیامت کے متعلق شک و شبہ کرنا حماقت ہے وغیرہ۔

سُورَةُ فَاطِرٍ وَهِيَ مَكِّيَّةٌ خَمْسٌ وَأَرْبَعُونَ آيَةً وَخَمْسُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ فاطر مکی ہے اس میں ۴۵ آیات اور ۵ رکوع ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ الملائکہ بھی ہے۔ اس میں پینتالیس۴۵ یا چھیالیس۴۶ آیات ہیں۔ بقول قرطبی باتفاق علماء یہ سورت مکی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ سورۃ فاطر کا نزول مکہ میں ہوا۔ (بیان القرآن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ

ہر تعریف اسی اللہ کو زیبا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور دو دو تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو پیغام

ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ

بنانے والا ہے پیدائش میں جس چیز کو چاہتا ہے زیادتی کر دیتا ہے بلاشبہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے لوگوں کے واسطے

لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اللہ جو رحمت کھول دے کوئی روکنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو جاری کرنے والا نہیں وہی غالب اور حکمت والا ہے

تفسیر خلاق کائنات نے اس کائنات کے دو حصے بنائے ہیں۔ ظاہر اور باطن، مادی اور غیر مادی، جسمانی اور نورانی یا ناسوتی اور ملکوتی۔ اول حصہ محکوم ہے اور دوسرا حکمران۔ اول بے طاقت ہے اور دوسرے کا نام طاقت ہے۔ اول حصہ کا کوئی ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔ اپنی کوئی کیفیت، کمیت، وضع، ہیئت اور مکان بدل سکتا جب تک حکمران حصہ کی طاقت کار فرما اور مددگار نہ ہو۔ اول حصہ محض قابل، مستعد اور فرماں بردار ہے اور دوسرا حصہ فاعل، کارکن اور فرماں روا۔ اول حصہ کے چھوٹے بڑے لاکھوں بلکہ ان گنت مدارج ہیں۔ عالم مادی بخارات گیس کے اول ترین زینہ سے شروع ہو کر آسمان بریں کی آخری چوٹی تک مختلف مراتب رکھتا ہے۔ تمام اجسام جمادی حیوانی اور انسانی اسی عالم کی مختلف قسمیں ہیں، لیکن ان میں سب سے بڑی مخلوق آسمان و زمین کی ہستی ہے۔ اس جسمانی کائنات کی مرکزی حیثیت زمین کو حاصل ہے اور اس کا محیط الدائرہ آسمان سے بنتا ہے۔ پانی، ہوا، آگ اور ان عناصر سے پیدا شدہ تمام کائنات محیط الدائرہ کے اندر ہی پیدا ہوتی ہے اور اندر ہی رہتی ہے، مگر یاد رکھو کہ یہ جسمانی کائنات ازلی اور غیر فانی نہیں۔ اس کا آغاز ایک خاص وقت اور خاص حالت سے ہوا ہے۔ اس کے تمام اولین اجزاء عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ نیست سے ہست ہوئے ہیں۔ اللہ نے ان کو بغیر مثال اور بغیر کسی سابق مادہ کے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے اس کو فاطر کہا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کا مادہ پہلے سے تھا اور مختلف صورتیں مادہ پر آتی رہی ہوں۔ جیسا کہ قدیم فلاسفہ یونان اور ہندوستان کے آریہ کا خیال ہے بلکہ اللہ نے ان کو کچھ نہ ہونے کے باوجود بنایا ہے۔ عالم کا دوسرا حصہ محض غیبی حواس سے مخفی اور عقل و فہم کی رسائی سے خارج ہے، مگر درحقیقت حکمراں وہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہر ذرہ کے اندر ایک طاقت ودیعت فرمائی ہے۔ بعض دہریہ کا قول ہے کہ طبیعت فاعل مطلق ہے۔ ہر چیز کی نیچر کی یہ تمام کرشمہ سازیاں ہیں۔ مادہ کی تمام لہریں، نو بہ نو اور رنگ برنگ وصف طبیعت کی ممنون کرم ہیں۔ دیمقراطیس اور اس کے گروہ کا عقیدہ ہے کہ یہ تمام تغیرات و حرکات محض اتفاقی ہیں یعنی ان کا فاعل مجہول ہے، لیکن یہ تمام الفاظ مغز سے خالی ہیں۔ اور بہر حال کوئی ان حرکات کا محرک، ان تغیرات کا فاعل اور ان احکام کا حکمراں ہے۔ اس کائنات میں کوئی مخفی طاقت اور غیبی قوت کار فرما ضرور ہے جس میں اس سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ نظم عالم کا مدار ہے۔ اسی غیبی طاقت کا شرعی نام ملائکہ ہے جو با شعور ہیں، ذی فہم ہیں، الوہی فرد ہیں کار فرما ہیں اور عالم مادی کا کوئی ذرہ بھی ان کی حکومت سے خارج نہیں۔ کوئی قطرہ، کوئی پتہ یہاں تک کہ ابتدائی گیس کا کوئی جزو تو مر اس غیبی طاقت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ رنگ بدل نہیں سکتا، اپنی مقدار کو گھٹا بڑھا نہیں سکتا، کسی کیفیت میں رد و بدل پیدا نہیں کر سکتا، اپنی مقدار کو گھٹا بڑھا نہیں سکتا، کسی کیفیت میں رد و بدل پیدا نہیں کر سکتا۔ مینہ کا ہر قطرہ اوپر سے نیچے خود نہیں اترتا بلکہ ملائکہ کا غیبی ہاتھ اس کو پکڑ کر لاتا ہے۔ سمندروں کے پانی کی

ہر قطرہ ہر یکساں طور کیسے ریت کا ہر ذرہ، درختوں کی جڑوں کا ہر سوتا، پھول کی پتیوں کا ہر ریشہ ہر فعل اور ہر حال میں ملائکہ کی امداد کا محتاج ہے اور کس طرح محتاج نہ ہو جبکہ کسی میں فاعلی طاقت نہیں، صرف قابلیت ہے تاثیر نہیں۔ تاثر ہے حکومت نہیں۔ محکومی ہے فرماں روائی نہیں فرماں پذیری ہے۔ پھر یہ تمام غیبی طاقتیں بھی خود حکم نہیں کر سکتیں۔ ان سب کا ایک مرکز، ایک پاور ہاؤس اور ایک مخزن ہے۔ تمام ملائکہ (غیبی طاقتیں) اسی کے تابع ہیں جس کو جتنا حکم ملتا ہے اسی مادی عالم میں اتنا اور ویسا ہی تصرف وہ کرتا ہے۔ گویا یہ مخفی طاقتیں جن کو ملائکہ کہا جاتا ہے پیامبر اور قاصد ہیں۔ رب مطلق اور حاکم مختار سے جو حکم ملتا ہے اس کو کائنات کے ہر ذرہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ حکم ملتا ہے فلاں پھول کی فلاں پتی کا فلاں حصہ اتنا سرخ اور اتنا سفید ہو جائے اور اتنی خوشبو اس کے اندر ہو جائے۔ غیبی طاقت یہ پیام لے کر پھول اور اس پتی تک آتی اور اس کو حکم کے موافق بدل دیتی ہے۔ حکم ہوتا ہے مینہ کا فلاں قطرہ فلاں زمین کے فلاں حصہ تک فوراً پہنچا دو۔ فوراً حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اگر حکم ملتا ہے کہ اس نازل شدہ قطرہ کو فلاں سبزہ یا درخت کے فلاں ریشہ تک پہنچا دو اور اس ریشہ میں اس قطرہ کے ذریعہ سے اتنا نمو کر دو اور یہ کیفیت بدل دو۔ بلا تامل فرمان قبول کیا جاتا ہے اور ویسا ہی کر دیا جاتا ہے۔ اگر حکم ملتا ہے کہ فلاں پیغمبر کے پاس ہمارا یہ پیام ہدایت پہنچا دو اور اس کے دل میں القاء کر دو یا فلاں ولی کو الہام کر دو یا فلاں شخص کے دل میں یہ بات ڈال دو۔ بغیر توقف کے آن کی آن میں ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ یہ حکمرانی اور پیغمبری کا سلسلہ ہر سیکنڈ جاری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ (فرشتے) ہر سیکنڈ فرض رسالت کو انجام دے رہے ہیں۔ خود حکمران یا کارساز نہیں۔ بلکہ حکم بردار اور کارسازی کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ان کے فرض رسالت میں یکسانی نہیں۔ ہر فرشتہ کی خدمت جدا جدا ہے، کام جدا جدا ہیں، اس لئے تکمیل اور رسالت کی نوعیت بھی جدا جدا ہے کوئی فرشتہ مینہ کا قطرہ نیچے لاتا ہے، کوئی ریت کا ذرہ بناتا یا اس کو حرکت دیتا ہے، کوئی سمندر کے قطرہ کی ساخت، ہیئت اور جسامت کی تخلیق کرتا یا اس میں سیلان اور روانی پیدا کرتا ہے۔ کوئی سبزہ کے ریشہ ریشہ اور سوتے سوتے میں کیفیات اشکال الوان اور مقدار کا تغیر کرتا ہے۔ کسی کا کام الہام یا القاء یا وحی باللہ کا واضح کلام پہنچانا ہے۔ کوئی انسانی تصور اور خیال میں تبدیل و تغیر کرتا ہے۔ بہرحال جتنے کام اتنے ہی کارفرما اور کارکن ہیں اور چونکہ مادی کائنات کے کام ان گنت ہیں، اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ملائکہ بھی لامحدود ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ سب ملائکہ میں ایک جیسی طاقت نہیں۔ قوت اور کارفرمائی کے بازو سب کو برابر نہیں ملے کیونکہ تمام کام ایک جیسے نہیں۔ کوئی کام آسان ہے، کوئی مشکل کوئی بہت زیادہ دشوار۔ پس ملائکہ کو جو طاقت عطا کی گئی ہے وہ حقیقتاً قدرتی بازو یا سرانجام دہی خدمت کے جناح ہیں وہ قوت و مقدار میں مختلف ہیں کسی کو دوگنی طاقت یا دو بازو، کسی کو تین گنا طاقت یا تین بازو۔ کسی کو چار گنا طاقت یا چار بازو لیکن چار پر حصر نہیں نہ اس کا حصر کیا جا سکتا ہے۔ سہولت اور دشواری کار کے تنوع کے لحاظ سے طاقتوں میں بھی تنوع ہے۔ اللہ خود ہی جانتا ہے اور خود ہی اپنی مشیت کے موافق عطا کے طاقت میں اضافہ فرماتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک مادی کائنات اپنی ساخت کے لحاظ سے متفاوت ہے۔ کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی، کوئی ذرہ جزؤں یا دو جزؤں سے مرکب ہے۔ کوئی تین سے کوئی چار سے کوئی ان گنت جراثیم یا اصول سے۔ پھر مقداری تفاوت کے علاوہ کیفیات میں بھی نمایاں فرق ہے۔ لاکھوں کروڑوں اشکال ہیں، الوان ہیں، روائح اور طعوم ہیں۔ افادی اور استفادی حیثیات ہیں۔ خوبصورت، بدصورت، خوش رنگ، بدرنگ، خوشبو، بدبو، خوش ذائقہ، بدذائقہ، مفید، مضر، اچھا، برا، روشن، تاریک، چکنا کھردرا، سخت نرم، سرد گرم، تر خشک، ادنیٰ اعلیٰ غرض تفاوت کے بکثرت اقسام ہیں اور ہر قسم کے غیر محدود مراتب ہیں۔ یہ اختلاف کیسا ہے۔ مادہ میں نوعی صنفی اور شخصی اختلاف کس نے پیدا کیا اور کس سبب سے کیا۔ اس کا جواب آج تک دنیا کا کوئی حکیم اور فلاسفر نہ دے سکا۔ ہر دانشمند نے اندھیرے میں تیر چلایا، مگر نشانہ پر کسی کا تیر نہ بیٹھا۔ صاف صحیح جواب یہی ہے کہ یہ اللہ کی مشیت ہے۔ اللہ نے بغیر کسی کے استحقاق اور بغیر سبب موجب کے جس کو جس قدر چاہا اپنی رحمت سے سرفراز فرمایا۔ کسی کو خوبصورت خوش رنگ، چمکدار اور جاذب نظر بنایا۔ کسی کو بھیانک، بدرو، کوزہ پشت، سیاہ درشت اور نفرت انگیز شکل کا حامل بنایا۔ کائنات میں سے کسی کو محض پتھر یا کیمیا کی شکل عطا کی۔ کسی کو معدنی کسی کو نباتی، کسی کو حیوانی اور انسانی صورت دے کر سرفراز فرمایا۔ کوئی اکرہ الاشکال کا حامل بنا، کوئی احسن تقویم کا مالک۔ پستی و بلندی، صعود و ہبوط، ترقی و تنزل، اور عروج و زوال سب کچھ اسی کے دست قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس نے اپنی رحمت کا دروازہ جس کے لئے کھولنا چاہا کھول دیا تو اس کو کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس دروازہ کو بند کر دیا اس کو کوئی کھولنے والا نہیں۔ یہی حال تفاوت قوتی یا اختلاف ملکوتی یا تفرقہ روحانی کا بھی ہے۔ قوت باطنی اور غیبی طاقتیں اللہ کی رحمت عظیم ہے۔ اسی پر نظام عالم کا مدار ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کائنات میں حرکت ہی نہ ہوتی۔ تمام عالم زندگی سے محروم ہوتا۔ مادہ میں نہ کوئی گہرائی پیدا ہوتی نہ زندگی کی برقی طاقت قوت ملکوتی اور غیبی مدد سے ہی بے حس کو حساس، ساکن کو متحرک اور مردہ کو زندہ بنایا اور تمام مادی کائنات کو ایک خالق و مختار سے ملایا۔ یہیں تک کائنات کا

ہر ذرہ فیضِ ملکوتی کا مرہون ہے ۔ اور اللہ کی رحمت سے کوئی حقیر ترین مادی جرثومہ بھی مستغنی نہیں ، مگر رحمتِ ربانی اور ربوبیتِ روحانی کی سب سے بڑی حامل وہ ہستی ہے جو وحی و پیام سے سربلند ہے جس کے پاس علاوہ مادی قوتوں کے فیضان کی روحانی نورپاشیوں اور جلوہ افشانیوں کا ذخیرہ کامل ہے ۔ فرشتوں کی پیامبری سے زندگی کا سانس لینے والا ہر ذرہ ہے ، مگر روحانی پیام سوا مخصوص ترین اشرف الکائنات کے کسی کے پاس نہیں آتا ۔ پھر افرادِ انسانی بھی سب ایک جیسے نہیں ۔ مراتب کا ، تفاوت اور درجات کا اختلاف نمایاں طور پر ہے ۔ تصور ، تخیل ، تعقل ، القاء ، الہام اور وحی ہر درجہ دوسرے سے ممتاز ہے اور ہر مرتبہ ترقی در ترقی کے گوناگوں لاکھوں کروڑوں منازل کا حامل ہے ۔ سب سے بلند اور اعلیٰ مرتبہ نبوت و رسالت کا ہے ۔ انبیاء و مرسلین رحمتِ الٰہیہ کے مظہرِ اتم ہیں ، لیکن یاد رکھو کہ یہ فیضِ قدسی اور رحمتِ باطنی بھی کسی علتِ موجبہ اور سببِ مقتضی پر موقوف نہیں بلکہ مختار اور رحمٰنِ مطلق جس کو چاہتا ہے اپنی اس رحمت سے سرفراز فرماتا ہے ۔ اس کی رحمت کو کوئی روکنے والا نہیں اس نے اگر کسی کو نبوت نہ دی تو کوئی دلوانے والا نہیں اور دے دی تو کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ۔

تحلیلِ اجزاء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ مجاہد کی روایت ہے ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مجھے تحقیق نہ تھی کہ عرب لفظ فاطر کس موقع پر بولتے ہیں ۔ اتفاق سے دو اعرابی ایک کنوئیں کے متعلق مقدمہ لے کر میرے پاس آئے ۔ ایک نے کہا میں اس کا فاطر ہوں یعنی ابتدا میں میں نے ہی اس کو کھودا ہے (رواہ الثوری) گویا فاطر کے معنی ہوئے بغیر مثال اور بلا نظیر کے شروع سے پیدا کرنے والا ۔ ضحاک کا قول ہے کہ قرآن میں فاطر بمعنی خالق ہے ۔ (ابن کثیر) بظاہر اول قول صحیح ہے ۔ ہم تفسیری مقالہ میں لکھ چکے ہیں کہ عالمِ مادی میں سب سے بڑی عظمت آسمان و زمین کو حاصل ہے ۔ آسمان محیطِ کل ہے اور زمین مرکز ہے ۔ اگر مرکز نہ ہوتا تب بھی یہ کرہ نہ بن سکتا اور محیط نہ ہوتا تب بھی تکمیل نہ ہوتی ۔ باقی تمام عناصرِ بسیطہ اور اجسامِ مرکبہ آسمان و زمین کے درمیان واقع ہیں ۔ ہوا ، پانی ، آگ تمام فلزات ، معدنیات ، سمندر اور خشکی کی پیداوار نباتات ، حیوانات وغیرہ سطحِ زمین پر زیرِ آسمان رہتے ہیں ۔

پس جب اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کا فاطر ہے تو درمیانی کائنات کا فاطر بدرجۂ اولیٰ ہے ۔ فلاسفۂ قدیم اور ہنود تعلیم کا خیال ہے کہ خدا فاطر نہیں ، مادہ اور روح پہلے سے موجود تھے ۔ یہ دونوں ازلی اور قدیم ہیں ۔ اللہ نے ان میں جوڑ اور ربط پیدا کر دیا ۔ تخلیق سے یہی مراد ہے ۔ یہ خیال باطل ہے اس سے تعددِ قدماء اور کثرتِ وجباء لازم آنے کے علاوہ نقصِ الوہیت مستفاد ہوتا ہے ۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ تمام عالم کا مادہ بھی خدا نے پیدا کیا ۔ اسی لئے لفظ خالق کو چھوڑ کر اس جگہ فاطر کا لفظ کہا گیا ۔ جب صورتِ جسمانیہ اور طبیعتِ نوعیہ کی تخلیق خدا نے کی اور مادہ پر نوبہ نو صورتوں کا پیہم آنا ایک صورت کا بگڑنا اور دوسری کا آنا اللہ کی کارسازی کا نتیجہ ہے تو مادہ کی ایجاد کیا محال ۔ کائنات سماوی و ارضی کا نام ہے مادہ اور صورت کے مجموعہ کا ۔ فلاسفہ کے نزدیک صورت میں کسی قدر فاعلیت کا عکس ہے ۔ اور مادہ محض قابل ہے ۔ اثر پذیری کی حد سے آگے نہیں بڑھتا تو جب صورتِ فاعلہ کو خدا عدم سے وجود میں لایا تو مادہ کی اختراع کس طرح خود بخود ہو سکتی ہے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ سب کا فاطر ہے اسی نے مادہ کو ایجاد کیا ۔ اسی نے جسمانی اور نوعی صورتیں بنائیں ، لیکن یاد رکھو کہ مادی ڈھونگ اور سانچہ بنا لینے سے ہستی کو ہستی نہیں کہا جا سکتا ۔ جب تک اس میں حرکت نہ ہو ، کیفیات کی پیہم لہریں نہ ہوں ، کائناتی زندگی نہ ہو مظاہری وجود بے معنی ہے ۔ جب تک اندرونی قوت کا ظہور نہ ہو ۔ چھوٹا بڑا ، سیاہ سفید ، خوبصورت بدصورت ، خوش خلقت بدخلقت ہونا اور دیگر گوناگوں صفات سے متصف ہونا خود بخود نہیں ہو گیا ۔ عالمِ مادی کی افادی اور استفادی حیثیت خود بخود نہیں بن گئی بلکہ اس کا کوئی فاعل ہے ۔ فاعل کون ؟ اس وادی میں اہلِ فلسفہ خوب سرگرداں ہوئے ہیں ۔ دیمقراطیس نے کہا یہ تمام وصفی اختلاف اور نوعی اختراعات محض اتفاقی ہیں ۔ اجزائے اولیہ اتفاق سے جیسے جڑ گئے ویسی ہی اس جسم کی شکل اور خواص ہو گئے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیمقراطیس کو اس تنوع اور تعدد صفاتی کی کوئی علت معلوم نہ تھی ۔ اتفاق سے ایسا ہو گیا سبب مجہول ہے ۔ دوسرے فلاسفروں کا خیال ہے کہ طبیعت نوعیہ یا قدرتِ منوعہ کی یہ کارسازی ہے ۔ اسی نے اشکال ، الوان ، روائح ، طعوم اور دوسرے خواص میں نوعی تناسب کے ساتھ اختلاف کر دیا ۔ یہ قول بھی جہالت پر دلالت کرتا ہے ۔ آخر نوعی صورتوں میں اختلاف کیوں ہے ، طبائع جدا جدا کیوں ہیں ؟ اس کا جواب سوا خاموشی کے اور کچھ نہیں ، مگر قرآن اگرچہ فلسفہ کی کتاب نہیں ، مگر جہالت نامہ بھی نہیں ۔ اصلاحی رنگ میں سب کچھ کہہ دیتا ہے ۔ جہاں اعمال کی اصلاح اس کے پیشِ نظر ہے وہاں افکار و خیالات کی درستی بھی ضروری بلکہ اول الذکر کے لئے سنگِ بنیاد ہے ۔ اسی لئے فرمایا :-

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ۔ لفظ ملائکہ کی تحقیق ہم اسی پارہ میں پہلے بھی کر چکے ہیں اور تفسیری مقالہ میں بھی کچھ اشارات کر دیئے ہیں ۔ اس جگہ صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ ملائکہ وہ نورانی ہستیاں ہیں جن پر کائنات زندگی کی نشوونما نوعی شکلی اور کیفی اختلافات کا مدار ہے جو مادہ کے ہر ذرہ کو حرکت دے رہی ہیں ۔ ان کا وجود

اتنا ظاہر ہے کہ آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، سمندر، ہوا، آگ، پہاڑ، درخت، سبزہ اور ہر جانور اور ہر انسان اور ان کا ہر جزو فرشتوں کے زیرِ حکم ہے۔ وہ غیبی طاقتیں اور نورانی قوتیں جو اس تمام کائنات کو چلا رہی ہیں اُن کا نام ملائکہ ہے، مگر ملائکہ خود بخود اس عالم کو نہیں چلا رہے ہیں بلکہ وہ بھی خود ایک اور محیطِ کل طاقت کے زیرِ فرمان ہیں جس کو اللہ کہا جاتا ہے عرشِ الٰہی سے جو کچھ اس کو حکم ملتا ہے وہ حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ گویا ملائکہ درمیانی پیغامبر ہیں خود کارساز نہیں ہیں۔ پس اس سے ظاہر ہوگیا اس باطل خیال کا جس میں بہت گروہ مبتلا ہیں۔ کوئی گروہ ارواحِ کواکب کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی عنصری قوتوں کی، کوئی فرضی غیبی طاقتوں کی۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ غیبی طاقتیں تو پیامبر ہیں۔ خود مختار نہیں، کارساز نہیں، ان کی پرستش بے سود ہے۔ ان کے قبضہ نہ خود نفع پہنچانا ہے نہ ضرر دینا۔ محیطِ کل طاقت تو دوسری ہے۔ مظہر کو مُظہر سمجھنا اور شعاع کو آفتاب جان لینا حماقت ہے۔ بعض مفسرین نے اس جگہ ملائکہ کی تخصیص کی ہے۔ چنانچہ یحییٰ بن سلام نے اسی آیت کی تشریح میں فرمایا اللہ ان ملائکہ کو اپنے انبیاء و اولیا کے پاس وحی پہنچانے اور الہام کرنے اور سچے خواب دکھانے کے لئے بھیجتا ہے۔ سدی نے فرمایا کہ اللہ ملائکہ کو اپنے بندوں کے پاس رحمت یا عذاب پہنچانے کے لئے بھیجتا ہے یا وہ اس کے بندوں کو آثارِ صنعت پہنچاتے ہیں۔ سدی کے قول میں یحییٰ کے قول سے عموم ہے، مگر پھر بھی کچھ تخصیص ضرور ہے۔ انبیاء و اولیاء یا انسانوں ہی کی کچھ خصوصیت نہیں۔ فرشتے تو کائنات کے ذرہ ذرہ کو اللہ کا فرمان پہنچاتے ہیں۔ اور اس عالم کے ہر جزو کو چلانے کے لئے جیسا حکم ہوتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔ وہ اس کائنات کی عملی طاقتیں ہیں کہ حکمِ الٰہی کی سخر ہیں لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ لیکن یاد رکھو کہ سب فرشتوں کا کام ایک ہی طرح کا نہیں ہے۔ تنوعِ خدمات اور فرقِ مراتب ضرور ہے کوئی فرشتہ بارش کا قطرہ لے کر زمین پر آتا ہے کوئی درخت کی جڑ کے ریشہ کو پیامِ الٰہی پہنچاتا ہے۔ کوئی پھول کی پتی کی باریک رگ کو مخصوص رنگ اور بُو پہنچاتا ہے۔ کوئی پتھر کے جگر کے اندر رہنے والے کیڑے میں نمو اور حرکت دینے کا پیغام دیتا ہے۔ کوئی انسانی دماغ میں تصور، تخیل اور تعقل کی لہریں بحکمِ خداوندی پیدا کرتا ہے۔ کوئی اہلِ ایمان کے دلوں میں نور ڈالتا ہے۔ کوئی اولیا کی روحوں کو صاف شفاف کرتا اور ان کو غیبی الہامات سے سرفراز کرتا ہے اور سب سے بڑا فرشتہ انبیاء و مرسلین کو وحی منطوق پہنچاتا ہے جس کا نام جبرئیل ہے۔ گویا اللہ نے ملائکہ کو تمام امور قضا جاری کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے لیکن تمام ملائکہ پیغامبر نہیں بلکہ بعض کے متعلق دوسری خدمات ہیں۔ کچھ ملائکہ رسول ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔ خود فرمایا ہے اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ آیتِ مذکورہ سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس عالم میں جو کچھ کار فرمائی ہے وہ خدا کی ہے نہ تو ایسا ہے کہ اللہ نے مادہ کو صورتِ جسمیہ اور طبیعتِ نوعیہ دینے کے بعد فراغت حاصل کر لی ہو اور مادہ میں جو حرکتیں پیدا ہوتی ہوں ان کا فاعل خود اس کی صورت یا طبیعت ہو اور خدا الگ تھلگ معطل لے کار بیٹھا ہو اور عالم کو بقائے وجود میں اس کی ضرورت ہی نہ ہو نہ ایسا ہے کہ طبعی قوتیں اور ملائکہ خود مختار کارساز ہوں جو چاہیں کریں جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔ نہیں نہیں عالم کا ذرہ ذرہ ہر آن خدا کا محتاج ہے۔ ایجاد تو ایک دفعہ ہوگئی، مگر بقاءِ وجود کے لئے سیکنڈ بھر کے لئے بھی خدا سے استغنا نہیں ہے اور ملائکہ صرف امور قضا جاری کرنے کے وسائط اور درمیانی رسول ہیں، مگر:۔

اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ۔ سب فرشتے تو ایک مرتبہ کے نہیں ہیں۔ درخت کی جڑ کے ریشہ کو پیغام پہنچانے والا اس فرشتہ کے برابر کیسے ہو سکتا ہے جو انبیاء کے پاس وحی لے کر آتا ہے۔ پس ان میں باہم فرقِ مراتب ضرور ہے کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین کسی کے چار بلکہ اس سے بھی زائد جتنے خدا چاہتا ہے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے جبرئیل کے سو پر دیکھے تھے، لیکن فرشتے چونکہ نورانی ہیں، اس لئے ان کے پر اور بازو بھی نورانی ہیں اعلیٰ و جبریل کی حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بازو سے مراد غالباً طاقت ہے پرندہ بازو کی طاقت سے اڑتا ہے۔ فرشتوں میں بھی طاقت کے اعتبار سے تفاوت ہے۔ کوئی ادنیٰ طاقت رکھتا ہے کوئی اعلیٰ جیسا کام ویسی طاقت۔ یا یوں کہا جائے کہ بازو سے مراد جہت ہے۔ ہر فرشتہ کم از کم دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک رخ اللہ کی طرف جہاں سے پیام حاصل کرتا ہے۔ دوسرا رخ اس مادی مخلوق کی طرف جس کو پیام پہنچاتا ہے مگر بعض فرشتے جلیل القدر ہیں وہ اللہ کا پیام لا کر براہِ راست ادنیٰ مخلوق کو نہیں پہنچاتے بلکہ کم مرتبہ والے فرشتوں کو پہنچاتے ہیں اور وہ فرشتے اپنے زیرِ حکم فرشتوں کو پہنچاتے ہیں اس طرح مادی مخلوق تک پیام پہنچ جاتا ہے۔ ایسے جلیل القدر فرشتوں کے دو بازو نہیں بلکہ زائد ہوتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ فرشتے اللہ کے احکام مادی مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ جب عالمِ امر سے عالمِ خلق میں آتے ہیں تو ان کے لئے سرعتِ سیر بھی ضروری ہے۔ اسی سرعتِ سیر اور نفاذ کو بطورِ استعارہ بازو اور پر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

آیت کی تشریح مذکور اکثر مفسرین کے قول کے موافق ہے جن کے نزدیک یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ کا تعلق اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ فرشتوں کے بازو دو یا تین یا چار ہوتے ہیں اور چار سے بھی زائد جتنے جس کے اللہ چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے آیت مذکورہ میں خلق یعنی مخلوق قرار دے کر آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق میں جو کچھ چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے یعنی علم و جسم کے اعتبار سے کسی کو کم کسی کو زائد کسی کو بہت زائد کسی کو سب سے زائد حصہ عطا فرماتا ہے۔ اس مقصد کی بنا پر بطور تمثیل مَا یَشَآءُ کی تشریح میں زہری نے کہا ہے کہ اس زیادتی سے مراد خوش آوازی ہے (رواہ البخاری فی الادب) قتادہ نے کہا اس سے آنکھ ناک منہ اور چہرے کی خوبصورتی مراد ہے۔ کسی نے بالوں کی خوبصورتی، عقل، تمیز اور سنجیدگی کو مراد قرار دیا ہے۔ مگر یہ سب اقوال مَا یَشَآءُ کی تعیینی تشریح نہیں ہیں بلکہ بطور مثال ہر مفسر نے جدا جدا تفسیر کی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اللہ مخلوق کو جو کچھ زیادہ دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔ مثلاً کسی کی آنکھ ناک منہ اور چہرے کو خوبصورت بناتا ہے۔ کسی کو خوش آوازی عطا کرتا ہے۔ کسی کو عقل، تمیز اور سنجیدگی کا وافر حصہ دیتا ہے۔ شیخ ابن عطاء نے کہا مومنوں میں محبت الٰہی، عارفوں میں فنا، معرفت، علماء میں تواضع۔ تونگروں میں سخاوت، فقیروں میں سوال سے پرہیز اور صادقوں میں صدق نیت بھی اسی ازدیاد عطاء کے ذیل میں داخل ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کوتاہ بین نارسا ذہنیت والے اصل علت اور خلاق مطلق تک نہیں پہنچتے۔ ظاہر پرستوں کی آنکھ ظاہری اسباب کو دیکھتی ہے، اس لئے وہ دریا، پہاڑ، درخت، عناصر اور ستاروں کی محسوس طور پر پرستش کرتے ہیں۔ ظاہر سے آگے بڑھ کر کسی قدر اونچی نظر رکھنے والے کچھ غیبی قوتوں تک پہنچتے ہیں اور ان کو اپنا کارساز، ارزاق اور حاجت روا سمجھ کر انہی کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ یہ گروہ بھی کوتاہ بینوں کا ہے۔ وسائط اور درمیانی کارندوں کو اصل کارساز سمجھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اصل علت اور کارساز مطلق تو محیط کل طاقت ہے جس کی قدرت ہمہ گیر ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے اسی لئے نظم عالم چلانے کے لئے موجودہ دستور قائم کیا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ان وسائل اور وسائط کے بغیر بھی نظام عالم کو چلا سکتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَہَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ یہ آیت تائید ہے آیت اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی اور کثرت معانی کو حاوی ہے۔ جسمانی اور روحانی رحمتیں اللہ کی گوناگوں ہیں۔ کوئی آدمی ہو یا جن یا فرشتہ یا ستارہ یا سیارہ یا پہاڑ، دریا اور درخت بہرحال کائنات میں سے کوئی بھی اللہ کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے دروازۂ رحمت کو کوئی بند نہیں کر سکتا اور بند دروازہ کوئی کھول نہیں سکتا۔ مغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہ کو لکھا تھا کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد حضور اقدس ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اَللّٰہُمَّ لَا مَانِعَ لِمَآ اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔ (رواہ احمد باسنادہ وقد نقل ابن کثیر) ابو سعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو پڑھتے۔ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ اَللّٰہُمَّ اَہْلَ الثَّنَآءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَکُلُّنَا لَکَ عَبْدٌ اَللّٰہُمَّ لَا مَانِعَ لِمَآ اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ (رواہ مسلم) ابوہریرہ سے مروی ہے کہ جب بارش ہوتی تو حضور ﷺ فرماتے کہ ہم پر یہ بارش اللہ کی کشایش سے ہوئی ہے پھر پڑھتے۔ مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَہَا الخ۔ (رواہ ابن ابی حاتم) اس آیت میں کفار قریش کو بھی تنبیہ ہے جو کہا کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبوت و رسالت کسی کو عطا کرنی ہی تھی تو محمد کو کیوں دی۔ اس کے اہل تو اور بڑے بڑے آدمی تھے۔

وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ یعنی اللہ تمام کائنات پر غالب بھی ہے اور اس کا ہر فعل پُر حکمت بھی ہے۔ قدرت اور حکمت دونوں وصف اللہ ہی کو زیبا ہیں، اس لئے تقسیم رحمت پر نکتہ چینی کرنی یا اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا بے سود ہے۔

مقصود بیان

اللہ نے کائنات کو مع مادہ کے پیدا کیا ہے یعنی کائنات کے مادہ کو بھی تخلیق فرمایا ہے۔ مادہ قدیم نہیں ہے۔ ملائکہ اس عالم مادی اور خدا کے درمیان پیامبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ذرہ تک ہر وقت پیام الٰہی پہنچاتے ہیں۔ رُسُلًا کہنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فرشتے کارندے ہیں کارساز نہیں ہیں۔ کارگزار ہیں۔ قاضی الحاجات نہیں ہیں۔ اس سے فرشتوں کے وجود کا بھی یقینی ثبوت ملتا ہے۔ جو عالم ملکوتی کا انکار کرتا ہے وہ غلطی پر ہے اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ کے لفظ سے فرشتوں کے بازو ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن حقیقی بازو یا مجازی اس کی کوئی صراحت نہیں۔ تمام مادی یا غیر مادی کائنات کی تخلیق اور نظام عالم کا قیام حمد الٰہی کو واجب کرتا ہے یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ سے اللہ کا مختار مطلق اور کائنات کا محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے۔ آیت

مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ سے امور قضا کا ناقابلِ مخالفت اجرا معلوم ہوتا ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ کی طاقت ہمہ گیر ہے اور اس کا ہر فعل پُر حکمت ہے وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ

لوگو! اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو آسمان و زمین سے تم

وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ

کو رزق دیتا ہو اس کے سوا کوئی معبود نہیں تم کہاں اُلٹے جا رہے ہو اگر یہ لوگ تمہاری تکذیب کریں تو تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں

قَبْلِكَ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ

کی تکذیب کی جا چکی ہے اور اللہ کی طرف سب کام لوٹائے جائیں گے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے تم کو دنیوی زندگانی فریب نہ

الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا

دے اور نہ اللہ کے بارے میں دھوکہ باز شیطان دھوکہ دے شیطان تمہارا قطعی دشمن ہے تم اُس کو دشمن ہی سمجھو وہ

يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ

اپنے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ سب دوزخی ہو جائیں جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اُن کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے

تفسیر اللہ تعالیٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ گوشت، دودھ، گھی، پنیر، سبزی اور غلہ آدمی کی غذا ہے جس سے خون اور دوسرے اخلاط بنتے ہیں اور اخلاط سے مختلف اعضا کی خوراک تیار رہتی ہے اور ہر عضو سے تھوڑی تھوڑی رطوبت کھنچ کر انسانی نطفہ بنتا ہے اور شکمِ مادر میں ٹھہر کر گاڑھا ہوتا ہے پھر بستہ ہوا جتا پھر بوٹی کی شکل قبول کرتا پھر سارا بدن آنکھ ناک کان ہاتھ پاؤں پنڈلی ران دل دماغ معدہ جگر کھال بال درست ہو کر جان پڑتی ہے اور جیتا جاگتا آدمی پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو تخلیقِ انسانی کا عام قاعدہ ہے، لیکن سب سے پہلا آدمی بغیر ماں باپ کے صرف خاک سے کچھ دوسری چیزیں ملا کر گوندھ کر بنایا گیا تھا اور ایک آدمی قدرتی طور پر بغیر باپ کے نطفہ کے فقط ماں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوا تھا۔ بہرحال انسان کو پیدا کرنے اور بنانے میں کوئی دست کاری اور انسانی صنعت کو دخل نہیں نہ کوئی دوسری ظاہر اور پوشیدہ مخلوق خالقِ بشر ہے۔ ایجاد اور تخلیق کام محض خدا کا ہے۔ جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے رزق کی فراہمی کون کرتا ہے اور کس طرح ہوتی ہے۔ ماں جو غذا کھاتی ہے اس سے دودھ کا بننا اور پستانِ مادر میں دودھ کھنچ کر آنا اور بچے کا اس کو چوسنا محض قدرتی دست کاری کا نتیجہ ہے۔ ماں کو غذا کہاں سے ملتی ہے۔ وہ غذا کہاں اور کیسے پیدا ہوتی ہے۔ آسمانی بارش، فضا کی ہوا اور زمین کی خاک کو اس میں کتنا دخل ہے یہ سب کچھ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ پانی ہوا اور مٹی سے روئیدگی ہوتی ستاروں کے طلوع و غروب اور سیر و سکون کو بھی اس میں بڑا دخل ہے یا زندگی اور موت آوری سب کچھ آسمانی اور زمینی تاثیر و تاثر کا ہی نتیجہ ہے۔ یہی سب

کر پھل پھول دانہ اور ترکاری کی شکل میں آکر حیوانی اور انسانی غذا بنتا ہے۔ اب غور کرو کہ فراہمی رزق کا یہ منظم سلسلہ کس نے قائم کیا۔ کس کی کارسازی اور مجوزہ کاری تربیت بشری کی کفیل ہے پھر شیر خوارگی کے زمانے سے لے کر وقت موت تک ہر قسم کی غذا اور لباس آرام دہ سامان زندگی اور اسباب راحت کون دیتا اور رزق کو کون پیدا کرتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب ہم کا رہی ایک خالق ہے۔ پس اس کے سوا کوئی ایسی نہیں جس کے سامنے سر نیاز جھکایا جا سکے اور کوئی ایسی نہیں جو معبود اور ملجا ہونے کے قابل ہو۔ وہ واحد قدوس ہے الہ المعبود ہے، خالق مسجود ہے، وحدہ لا شریک لہ لا ندلہ ولا مثیل لہ۔ یہاں تک تو انسان کا خدا سے فطری تعلق ہے جو بلا سوچے سمجھے ہر بالغ نابالغ، مجنون و عاقل اور جاہل و عالم کا ہے۔ اضطراری غیر اختیاری ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ تعلق ہر حال قائم ہے، لیکن شعور و فہم کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ ربط رکھنے کا ضرورت مند ہے۔ باہم وابستگی اکثر باہم آویزش کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنی چاہتا بلکہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو اپنے شخصی اور صنفی حقوق کی طلب ہوتی ہے اور ... حقوق کی دوسرے کے حقوق سے کامل تمیز کرنی خود بخود ناممکن ہے۔ ہر آدمی کی سمجھ بوجھ کی مقدار جدا ہے، خواہشات الگ الگ ہیں۔ اپنی عقل و دانش کو بالاتر سمجھنا سرشتی چیز ہے، ایسی حالت میں قوانین حیات خود وضع کرنا اور معاشرتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات کو اجتماعی یا انفرادی طور پر صرف دماغی قوتوں کے ذریعہ پر درست کر لینا طاقت انسانی کے حدود سے خارج ہے۔ لامحالہ قدرتی قانون اور آسمانی ضابطہ کی ضرورت پڑی جو سب کے حقوق کا کفیل، اصلاح عام کا ضامن اور نقص و ظلم سے پاک ہو۔ لیکن فطری قانون کو سمجھنا بھی ہر شخص کا کام نہیں۔ بجز ایسی سلیم عقل رکھنے والے جو درس مطلوب اور منشائے قدرت کو سمجھ سکے۔ ناچار سمجھانے والا سکھانے والا اور پڑھانے والا قدرتی طور پر آنا چاہیئے جو پیام الٰہی اور قانون فطرت کو خود سمجھا ہوا اور دوسروں کو سمجھا سکتا ہو۔ اس معلم کو اصطلاح میں پیغمبر یا نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ لیکن پیغمبر کی پیغام رسانی اور واضح تعلیم اور درس کے باوجود بعض کوتاہ فہم، تاریک دانش، کور بصیرت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی کم فہمی نافہمی یا تعصب و ضد کے سبب پیغمبر کے سبق یا طریق درس یا مفہوم تعلیم یا معلم کی شخصیت پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور ہر وقت نقص و عیب کے جویاں رہتے ہیں اور پیغمبر کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ نکموں کی تکذیب و مخالفت اور عداوت و استہزاء سے پیغمبر کی ذات اور اس کی تعلیم کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس کو بہرحال اللہ جل شانہ کی طرف سے تسلی دی جاتی رہتی ہے اور پیام پہنچاتا رہتا ہے کہ ان لوگوں کی تکذیب سے شکستہ خاطر نہ ہو۔ اس سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا چلا آیا ہے۔ بہرحال برائی تکذیب و تصدیق اور مخالفت و موافقت غرض ہر امر کا رجوع آخر ہماری ہی طرف ہوگا ہم خود فیصلہ کر دیں گے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر قانون فطرت پر چلنے اور تمیز حقوق کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدا کو ماننا نہ ماننا ایک دعویٰ زیادہ ماننا کیا نتیجہ خیز ہے۔ خیر و شر اور نفع و نقصان کے امتیاز سے کیا حاصل ہے۔ جائز ناجائز کے حدود میں مقید ہو نا کون سا فائدہ رساں امر ہے۔ عقائد و افکار صحیح ہوں یا غلط، قوانین حیات راست ہوں یا دروغ، اعمال اچھے ہوں یا برے۔ ان سے کیا غرض۔ ضرورت تو صرف عیش و آرام کی ہے، مزے اڑانے کی ہے اور آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے کی ہے۔ حرام و حلال کی زنجیروں میں جکڑ کر زندگی کو بند کر دینے سے زیادہ برا کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ یہ سوال ہی کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔ درحقیقت یہ زندگی تو اگلی زندگی ہے۔ یہ مکان تو کرشش و کردار کا گھر ہے۔ نتیجہ اور ثمرہ کے حصول کا مقام نہیں۔ حصول نتائج کا عالم تو اس کے بعد آنے والا ہے جہاں پر اس زندگی کے صحیح و غلط خیالات اور اچھے برے کردار کا نتیجہ ملے گا۔ وہ عذاب و ثواب کا گھر ہے۔ ثواب اور نتیجہ عمل کے متعلقات اور دو زندگیاں جدا جدا ہیں۔ اسلام کے پیش کردہ یہی تین اصول ہیں۔ توحید ذاتی و صفاتی تصدیق رسالت و نبوت اور اقرار قیامت ایمان کے ضروری ارکان ثلاثہ ہیں۔ آیات مذکورہ میں انہی سہ گانہ اصول کی تعلیم دی ہے۔

تحلیل اجزاء

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ۔ عام آدمی لالچ کے بندے ہیں بلکہ خواص بھی محسن کے غلام بن جاتے ہیں۔ حسن سلوک اور احسان ہی ایسی چیز ہے جو سرکشوں کے سروں کو نیچا کر دیتی اور ان کی گردنوں میں طوق اطاعت ڈال دیتی ہے۔ سب سے بڑا ہوشمند اور دانا ترین بے وقوف یہاں تک کہ اکثر جانور بھی اپنے احسان کرنے والے کے فرماں بردار بن جاتے ہیں۔ ڈرانا، دھمکانا اور سخت سست کہنا ممکن ہے زیادہ ہوشمند آدمی کو گردن جھکانے پر مجبور نہ کر سکے مگر حسن سلوک اس کو فرماں پذیر بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آیت مذکورہ میں تمام آدمیوں کو خطاب کر کے اپنے احسان کی یاد دلائی ہے۔ اللہ کے احسان آدمی پر کتنے ہیں اس کا کوئی شمار نہیں۔ موہبی، کسبی، اخلاقی، روحانی، مالی، بدنی غرض بہت قسمیں ہیں اور ہر قسم کے تحت ان گنت احسان داخل ہیں جو ناقابل احاطہ ہیں، لیکن مجمل طور پر ہم تمام احسانوں کا احاطہ دو لفظوں میں کر سکتے ہیں۔ ایجاد و بقاء، پیدائش اور پرورش عطاء زندگی اور بقاء زندگی۔ غرض مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آدمی کو پیدا کیا اور اس کی زندگی کو ایک وقت خاص تک باقی رکھنے کے لئے تمام لوازم ضروریات کو

فراہم کیا۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ. خلق یا تخلیق کے معنی ہیں اندازہ کرنا۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک خاص اندازے کے ساتھ بنایا ہے۔ ہر جنس ہر نوع ہر صنف، ہر شخص اور ہر فرد ایک خاص اندازے کے تحت عالم وجود میں آیا ہے۔ ہر قسم کا پتھر جدا خصوصیات اور خاص اجزاء رکھتا ہے۔ ایک قسم کے پتھر کا کوئی جزو دوسرے میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ہر معدنی چیز اپنی مخصوص حیثیت، کیفیت اور خاصیت رکھتی ہے۔ ہر درخت اپنی نوعی خصوصیات کا حامل ہے، ہر سبزہ اپنی نوع سے یگانہ اور دوسرے سے بیگانہ ہے۔ ہر پتی ہر پھول کی ہر رنگ اور ہر رگ کا ہر ریشہ اپنے مخصوص ضروریات لوازم خاص اور تاثیرات کا مخزن ہے۔ آسمان، زمین، ستارے، سیارے، ہوا پانی آگ دھواں غرض ہر چیز ایک خاص اندازہ اور تقدیر کے زیر اثر فرمان پذیر اور عمل پیرا ہے۔ یہ سارا نظام کائنات اور اس کی ساری کیفیات دلالت کر رہی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عدم سے وجود تاریکی سے روشنی اور مجہول سے معروف کرنے والا ایک خدا ہے۔

يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. گزشتہ فقرہ میں اللہ کا خالق اور موجد ہونا ظاہر فرمایا تھا۔ اس فقرہ میں نعمت بقا کی صراحت کی ہے تخلیق کے بعد اگر بقائے حیات کے اسباب نہ فراہم کئے جاتے تو وجود لبعد العدم کے بعد پھر عدم بعد الوجود ہو جاتا۔ ہستی کچھ ہی دیر میں نیستی سے بدل جاتی۔ غور تو کرو کہ آسمان سے علوی قوتوں کا فیضان نہ ہوتا۔ اگر ستاروں اور سیاروں کی مختلف تاثیریں اس عنصری کائنات پر نہ ہوتیں اگر بارش نہ ہوتی یا تمام فاعلی قوتیں برسر عمل ہوتیں، مگر عالم سفلی میں اثر قبول کرنے کی استعداد نہ ہوتی، زمین علویات کے اثر سے متاثر نہ ہوتی اور مینہ کے پانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی تو کہاں سے غذا ملتی۔ کس طرح زندہ انسان کی پرورش ہوتی۔ نمو اور جسمانی نشو و نما اور ترکی نہ ہو کر تا تو اجزائے تخلیقی کی ترکیب ہی کیسے باقی رہتی۔ بدن کو آرام دینے والا، سردی گرمی سے بچانے والا لباس کس طرح فراہم ہوتا، سکونت کے والا مکان اور راحت آفریں اسباب زندگی کس صورت سے ملتے۔ یہ اللہ ہی کی نعمت تو ہے کہ اس نے اوپر نیچے یا آسمان و زمین سے رزق یعنی بقائے حیات کے اسباب مہیا فرمائے۔ آسمان اور آسمانی مخلوق کو تاثیر اور فعل کا حکم دیا۔ زمین اور اس کی تمام قوتوں کو اثر پذیر بنایا اور پھر اس تاثیر و تاثر سے انسانی رزق پیدا کیا ہے ؎ ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ. جب خالق خدا رازق خدا زندگی دینے والا خدا، زندگی کو باقی رکھنے والا خدا، نفع پہنچانے والا خدا، ضرر دینے والا خدا ہو تو معبود بھی خدا، اللہ بھی خدا، انسانی عمل و قول کا مرکز بھی خدا تو یہ کس قدر دیوانگی ہے کیسی حق سے روگردانی ہے کہ احسان کرے خدا اور آدمی گن گائے دوسرے کے احسان فراموشی اور حق کوشی ہے۔ جس کے دست قدرت میں نفع نقصان اور عنان زندگی ہے اس سے منہ موڑ کر ایسی چیزوں سے تعلق جوڑا جائے جو کچھ بھی اختیار نہیں رکھتیں۔ یہاں تک توحید، الوہیت و ربوبیت کا ثبوت اور واہمۂ شرک کے ازالہ کا بیان تھا، لیکن کوتاہ فہم بلکہ روشن عقل رکھنے والے بھی عقل کی سلامت روی سے بعض اوقات محروم ہوتے ہیں اور پیام فطرت کو براہ راست نہیں سن سکتے، اس لئے آئینۂ حق نما کا وجود ضروری ہے جس کو عرف میں رسول یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ پیغمبر حق کی جلوہ ریزی کا آئینہ ہوتا ہے۔ بہرے کانوں میں آہنگ فطرت پہنچانے کا بسیط آلہ ہوتا ہے۔ عرش بریں سے فرش زمیں کے تعلقات سمجھانے والا ہوتا ہے، اس لئے نابینا انسانوں کو عصائے رسالت کے بغیر راہ حق پر چلنا ناممکن ہوتا ہے۔ پس آفتاب رسالت چمکتا ہے۔ شمع ہدایت روشن ہوتی ہے۔ آئینۂ نبوت جلوۂ حق کی پرتو افگنی کرتا ہے جس سے نابینا گراں گوش حق نیوش اور مفقود البصیرت واجد النور ہو جاتے ہیں، لیکن پیغمبر کی زبانی پیام فطرت کو سمجھنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ اکثر اشخاص اتنے کم فہم و نا فہم ہوتے ہیں کہ ان کو پیام فطرت کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اپنے کو قانون الٰہی سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور خلق کا خالق سے رشتہ جوڑنا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ یہی دورِ حیات ہوتا ہے وہ دوسری زندگی کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ حساب کتاب اور عذاب ثواب ان کے نزدیک جنون اور خیال ہوتا ہے یا عذاب ثواب اور جزا عقاب کی اہمیت کو تو وہ جانتے ہیں۔ اس زندگانی کے بعد دوسری زندگی کے بھی وہ قائل ہوتے ہیں، مگر پیام فطرت کو خود سمجھنے کے باوجود سمجھانے والے کی ذات، شخصیت اور امامت پر نکتہ چینی کرتے اور دروغ بافی سے کام لے کر دعوت رسالت کو پائے تکذیب سے ٹھکرا دیتے ہیں اور پیغمبر کی پیام رسانی کو وہ جھوٹا جانتے ہیں۔ یہی دو صورتیں انکار صداقت کی ہوتی ہیں۔ مؤخر الذکر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ. حسب دستور قدیم مکہ کے قریش اور دوسرے کافروں نے حضور والا کی دعوت حق کو نہ مانا بلکہ رسالت کی تصدیق سے بھی انکار کر دیا اور ظاہر ہے کہ اگر سچے بہی خواہ کی خیر خواہی اور مشفق ناصح کی نصیحت کو وہ شخص جھوٹا اور مبنی بر غرض سمجھے جس کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ناصح نصیحت کرتا ہے اور بجائے احسان مند ہونے کے معاند بن جاتا ہے تو صادق النیت بہی خواہ اس عمل سے بہت زیادہ دل شکستہ ہوتا ہے

کافروں نے حضور کی رسالت سے انکار کر کے سرکار رسالت کو پریشان خاطر اور دل شکستہ کر دیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ حضور صلعم کی رسالت میں اس انکار سے کوئی کمی آگئی یا امر تبلیغ میں کچھ نقص پیدا ہو گیا بلکہ اس سبب سے کہ بے وقوف بھٹکے آگے ہی بڑھ رہے تھے اور رحمت عالم کے بچانے سے بھی نہیں بچتے تھے۔ اس کبیدگی خاطر کو دور کرنے کیلئے تسلی بخش حکم ملا کہ اگر یہ لوگ آپ کو سچا نہیں جانتے اور آپ کی پیام رسانی کو صادق نہیں مانتے تو آپ کا کوئی حرج نہیں۔ نفسانی سرکشی ہمیشہ سے یوں ہی ہوتی چلی گئی ہے۔ پیغمبران حق کی تکذیب کرنے والے یوں ہی تکذیب کرتے رہے ہیں، مگر آخری نتیجہ کیا ہوا؟ ہر قطرہ دریا میں، ہر حرکت مرکز نور میں اور ہر چنگی اپنی اصل سے جا ملی۔ پیدا کرنے والے نے سب کو اپنی طرف آخر میں کھینچ لیا۔ کیونکہ ہر امر کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔ ابتدا وہاں سے ہوئی تو انتہا بھی وہیں ہوئی۔ زندگی کے تمام کرتوت کا ریکارڈ اس کے پاس موجود ہے۔ ہر عمل اس کے پاس ہی لوٹ کر جایا کرتا ہے۔ پس اس تکذیب کا نقصان تکذیب کرنے والوں کو ہی پہنچے گا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ اس آیت میں تکذیب رسالت کی اول الذکر علت کی طرف اشارہ اور اس کے ازالہ کی صراحت ہے۔ اخروی جزا و سزا کا انکار عقلی اور برہانی طور پر تو کوئی کر سکتا ہی نہیں۔ ہاں برخود غلط ہو کر انکار کر بیٹھتا ہے۔ یا تو اس کے پاس مال و منال، جاہ و جلال، حشم و خدم، حکومت و عزت، سطوت و جبروت، حسن و طاقت اور دوسرے حیات کے اسباب اتنے وافر ہوتے ہیں کہ وہ مواخذۂ آخرت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خود فریبی، برخود غلطی اور پندار نفس کی وہ اس چوٹی پر پہنچ جاتا ہے کہ سوائے خودی اور خود نمائی کے اس کو اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ مست افراموش اتنا ہوتا ہے کہ خود ہی کے انجام کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ خود نمائی اور خودداری میں اس کو فرق نہیں دکھتا۔ درمیانی سیڑھیاں اس کو اتنا مشغول رکھتی ہیں کہ چوٹی کے زینہ پر اس کی نظر نہیں پہنچتی۔ بس یہی دنیاوی حیات مستفاد ہوتی ہے اور وہی سکھ اور عیش کے جھگڑے ہوتے ہیں اور اس کا سرشاریاں یا اس کو اپنی علمی اور دماغی سرمایہ پر ناز ہوتا ہے۔ وہ سفسطہ کو فلسفہ، وہم کو خیال کو عقل سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے مدارک، اس کے مشاعر اور اس کے تمام ذہنی آلات وجود آخرت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ شیطان آہ شیطان وادیٔ حیرت اور صحرائے جہالت میں اس کو سرگرداں کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کی ہمہ گیری، احاطۂ قدرت بلکہ ہستی ہی کا انکار کر دیتا ہے اور ہر چیز کے وجود و عدم کو طبیعت، نیچر یا اتفاق کے ہاتھوں میں مرہون جانتا ہے۔ اس کو شمسی اختیار اور پوشیدہ کار فرمائی نظر ہی نہیں آتی۔ پس یہ فریب نفس شیطانی اغوا، طاغوتی اضلال اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن پیغام فطرت کو نہ سننے کی یہ دو علتیں خود فریبی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اس لئے دونوں سے بچنے کا حکم آیت مذکورہ میں دیا گیا اور صاف فرمایا اے انسانوں اللہ کا وعدہ برحق ہے یعنی قیامت ضرور آئے گی پس تم دنیوی زندگی کے فریب میں نہ آؤ۔ فریب دینے والے شیطان، علمی ذخیرہ اور فلسفی پندار کے جال میں نہ پھنسو۔ ابن عباس اور زید بن ثابت نے فرمایا کہ اس کی مراد شیطان ہے، لیکن اس قول کا مطلب یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ شیطان فقط ابلیس ہی ہے، شیاطین بکثرت ہیں۔ بعض جن بھی شیطان ہیں اور بعض انسان بھی بلکہ ہوا و ہوس، باطل افکار، نفس امارہ اور اس کی تمام قوتیں شیطان ہیں اور یہ سب نیک آدمی کی دشمن ہیں۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا۔ شیطان تمہارا دشمن ہے (تمہارے باپ سے اس کی دشمنی ہو چکی ہے اور تمہارے بہکانے کا وعدہ کر چکا ہے) لہٰذا تم اس کو دشمن ہی قرار دو یعنی اس کے کہنے کو نہ مانو اگر اس کی پیروی کرو گے تو تم کو ہلاکت کے غار میں جا گرائے گا اور برباد کر دے گا اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے گروہ یعنی اپنے سے مناسبت رکھنے والے کفار اور نفس امارہ کی اطاعت کرنے والے کو اپنی طرف بلائے۔

اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِیَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ۔ تاکہ (جس طرح وہ جہنمی ہے اسی طرح) سب ہی جہنمی ہو جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی بھڑکتی آگ میں جلتے بھنتے رہیں۔ شیخ واسطی نے فرمایا کہ آدمیوں میں سے حزب الشیطان وہ لوگ ہیں جو محبت سے دنیا پر جھک پڑے اور اس پر مطمئن ہو کر فخر کرتے ہیں۔ سہل نے فرمایا کہ حزب الشیطان اہل بدعت اور گمراہ فرقے ہیں جو عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی باتیں کان لگا کر شیطان سے سنتے ہیں۔ شیخ واسطی نے یہ بھی فرمایا کہ شیطان کو دفع کرنے کا آسان طریقہ اللہ نے یہ بتا دیا کہ فرائض پر قائم رہو اور حدود شریعت کی پابندی رکھو۔ جو شخص جنگل میں اپنی بکریوں سے غافل ہوا تو بھیڑیا اس کے گلہ کا چرواہا بن جاتا ہے۔ حزب الشیطان کی تعیین کے متعلق اقوال مختلف ہیں۔ الحاصل حزب الشیطان اور حزب الرحمٰن کی صحیح توضیح وہی ہے جو ذیل کی آیات میں خود خدا تعالیٰ نے فرما دی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ۔ کافر۔ کون کافر جنہوں نے کفران نعمت کیا۔ اللہ نے پیدا کیا اور اسباب زندگی فراہم فرمائے، مگر انہوں نے دوسروں کو اپنا معبود بنایا۔ اللہ کے بھیجے ہوئے پیام کو ٹھکرا دیا، رسول کی پیغمبری کو حق نہ جانا۔ قانون الٰہی کو کسی دفعہ کو توہین کی نظر سے دیکھا۔ قباحت

اور سزا جزا کو بازیچۂ اطفال سمجھا۔ یہ ہیں کور باطن، سیاہ درون اور نورِ حق پر باطل کی ظلمت کو چھا دینے والے۔ ایسے لوگوں کے واسطے خصوصیت کے ساتھ سخت عذاب ہے (کیونکہ حقیقت میں یہ ہی شیطانی گروہ اور باطل کا پرستار ہے۔ رہے گناہ گار مومن وہ اگرچہ بعض وجوہ کے لحاظ سے شیطانی گروہ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر وہ شیطان کے دشمن بھی ہیں۔ وہ کامل طور پر شیطان کے پیرو نہیں ہیں۔ نورِ ایمان اپنی کمزور روشنی کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ پس دائمی طور پر وہ دوزخی نہیں ہو سکتے)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔ مومن۔ کون مومن جو اللہ کو منعم، محسن، متصرف، کل قاضی الحاجات، وحدہٗ لاشریک، ربِ مطلق، الٰہ برحق جانتے، اس کے رسول کی رسالت کو بتمامہ مانتے، اس کے پیامِ حق کو سمجھتے اور اخروی جزا پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر وہ نیکوکار، فرمانبردار، اطاعت شعار اور عبادت گزار ہیں تو وہ حزب الرحمٰن ہیں۔ اگر ان سے کوئی فروگذاشت اور چھوٹا گناہ اور کسی قدر لغزش ہو بھی گئی ہوگی تو اللہ اس کو معاف کر کے دامنِ رحمت سے ڈھانک لے گا اور ان کو بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

نوٹ بعض محرفین نے آیت يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ سے یہ مطلب سمجھا کہ ہوش حواس اور اعضائے جسمانی کو معطل رکھ کر اور کمائی کے تمام راستوں کو چھوڑ کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ کیونکہ خدا رزاق ہے جتنا رزق مقدر ہے ضرور پہنچے گا۔ اللہ آسمان اور زمین سے رزق عطا فرمائیگا۔ طلبِ رزق میں دوڑنا بوالہوسی ہے جو توکل کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جمہور صحابہ اور تمام علمائے تابعین کی صراحتوں کے خلاف آیت کا یہ مطلب سمجھنا غلطی، رائے یا پستی حوصلہ پر مبنی ہے جب خود طلبِ رزق سے دست کش ہو کر دوسروں کا دستِ نگر بننا جائز بلکہ ضروری ہے تو بھیک لینے کے لئے ہاتھ پھیلانا، پہننے کیلئے ہاتھ پھیلانا، سردی گرمی سے بدن کو بچانا، کھانا پکا کر منہ میں لے جا کر چبانا اور نگلنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہ بھی تو توکل کے خلاف ہے۔ بغیر کھائے ہوئے بھی بدن کو ضروری غذا پہنچ سکتی ہے۔ خدا بہر حال رازق ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آنکھوں سے دیکھنا، زبان سے اچھا بُرا مزہ چکھنا بلکہ دماغ سے کام لینا، خیر و شر اور مفید و مضر کو سوچنا بھی توکل کے خلاف ہے۔ اگر حصولِ رزق اور بقائے زندگی کے لئے یہ تمام فطری اسباب ضروری ہیں تو پھر طلبِ رزق کرنا اس کے حصول کے لئے جائز سعی کرنی کیوں واجب الترک ہے۔ کھانا کھانا اور رکھا کر معدہ میں پہنچانا پرورشِ جسم کے لئے لازم ہے تو منہ تک لقمہ پہنچانے اور لقمہ کو فراہم کرنے کے لئے ضروری اسباب کو کام میں لانا بھی ضروری ہے۔ ہاں کوشش اور فراہمی اسباب کو مؤثر اور رازق سمجھنا جرم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی رازق نہیں ہے۔ مگر اسبابِ رزق گوناگوں ہیں

مقصودِ بیان ایمان کے ارکانِ ثلاثہ یعنی توحید، رسالت اور قیامت پر یقین رکھنے کی تعلیم۔ اللہ کے احسانات پر غور کرنا اپنی آفرینش اور طریقِ پرورش کو سوچنا۔ اللہ کی الوہیت، ربوبیت اور وحدانیت کو ثابت کرتا ہے۔ لفظ اذکروا اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ ہی خالق اور رزاق ہے۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ کسی ولی، نبی، عارف، مقرب یا فرضی دیوتاؤں سے بچہ ملنے کی درخواست کرنی یا روٹی رزق مانگنا اس عقیدہ کے ساتھ ناجائز ہے کہ ان کے قبضہ میں آفرینش یا عطائے رزق ہے۔ رسولِ اقدس کو تسلی۔ تمام امور کا مرکز خدا ہے۔ لفظ ترجع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر شے کا آغاز بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اختتامی نقطہ بھی وہی ہے۔ قیامت کی حقانیت کی صراحت۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمْ سے اس امر کی طرف در پردہ تلقین کہ دنیا بڑی پُر فریب ہے۔ راحت و عیش، جاہ و جلال، عزت و حکومت اور سطوت و جبروت کا نشہ بہت کیف آور ہے۔ اس سے پرہیز رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ سے معلوم ہوتا ہے کہ مردِ راہ کو بہت سے اغوا کرنے والے ہیں۔ شیطان گھات میں لگا ہوا ہے انسان کا شیطان بھی شکار کرنے کے درپے افکار و خیالات کو علمی، مالی اور مادی لالچ دے کر راہِ مستقیم سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ لفظ حِزْبَهٗ سے ثابت ہے کہ شیطان کا گروہ ہے جو دوزخی ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

بھلا جس شخص کی بدکاریاں اُس کے لئے آراستہ کر دی گئی ہوں اور وہ اُنکو اچھا سمجھنے لگا ہو کیا مومن صالح کی طرح ہو سکتا ہے، بلاشبہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ

ہدایت دیتا ہے تو (اے نبی) اپنے انہیں کے لئے تمہاری جان نہ جاتی رہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے اللہ ہی ہوائیں چلاتا ہے پھر

الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذَٰلِكَ

وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اس بادل کو مردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے خشک ہو جانے کے بعد زمین کو تر و تازہ کر دیتے ہیں

النُّشُورُ ۝ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ

اسی طرح (قیامت کے دن) اٹھنا ہوگا جو شخص عزت چاہتا ہے تو سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے اسی کی طرف پاکیزہ باتیں چڑھتی ہیں اور نیک عمل اس کو

الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ

(اور) بلند کر دیتا ہے اور جو لوگ بری تدبیریں سوچتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کی تدبیر ہی برباد

يَبُورُ ۝ وَاللَّهُ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ

ہو جائیگی اللہ نے تم کو مٹی سے بنایا اس کے بعد نطفہ سے پھر تم کو جوڑے جوڑے کر دیا اور جو کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے

وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

اور جو وضع حمل کرتی ہے تو وہ اللہ کے علم میں ہے اور کسی شخص کو بڑی عمر نہیں دی جاتی اور نہ کسی کی عمر کم ہوتی ہے مگر یہ سب کتاب میں موجود ہے بلاشک یہ بات اللہ کے لئے سہل ہے

تفسیر اچھائی برائی اور نیکی بدی کو جانچنے اور باہم امتیاز کرنے کا معیار فطری طور پر دانش اور سمجھ ہے۔ سمجھنے کے بعد ہی اچھائی برائی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن فطری سمجھ اور سادہ سلیم عقل سے آدمی بے بہرہ ہیں۔ خواہشات اور جذبات نے ان کی عقل کو داغدار کر دیا ہے اور سادہ صاف ذہنیت کو حرص و ہوس کے میل سے آلودہ کر دیا ہے۔ اس لئے کسی چیز کے متعلق دیکھنے کے بعد یہ فوراً کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ تجربہ اور مشاہدہ اور عمل کے بعد نتائج کی طرف دوڑتے ہیں۔ اگر ظاہری نتیجہ اچھا نکلا تو اس چیز یا عمل کو اچھا کہہ دیتے ہیں اور نتیجہ برا نکلا تو اس عمل کو برا کہہ دیتے ہیں، لیکن نتیجہ کا اچھا برا ہونا اور بات ہے اور اس کو اچھا یا برا سمجھنا اور بات ہے کسی چیز کی ظاہری شکل آراستہ پیراستہ اور نظر نواز ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ وہ چیز واقع میں بھی اتنی ہی فائدہ بخش ہے جتنی ظاہر میں نظر آ رہی ہے۔ بیمار اگر کسی غذا کو لذیذ پا کر اس کے مفید ہونے کا فیصلہ کرے تو کون شخص اس کے فیصلہ کو صحیح کہہ سکتا ہے۔ بہت کاموں کے نتائج ظاہر میں فرحت بخش، خوشگوار اور حسین نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت وہ تباہی انگیز ہوتے ہیں۔ کج رفتاری ایک غلطی ہے اور کج رفتاری کو راست روی سمجھنا دوسری غلطی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی سمجھنی ضروری ہے کہ تحصیل نتائج دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک فوری طور پر دوسرے کچھ مدت کے بعد۔ اکثر پست حوصلہ کوتاہ بین اشخاص فوری نتیجہ کے خواستگار ہوتے ہیں اور نقد کو نسیہ پر نہیں بیچتے۔ ان کے نزدیک آج کا ایک روپیہ کل کے ایک ہزار روپیہ سے زیادہ باوقعت ہوتا ہے۔ حالانکہ اکثر فوری قلیل منافع کا حصول آئندہ کثیر منافع کے حصول سے محروم کر دیتا ہے۔ انسانوں کا کوتاہ نظر بے وقوف گروہ یہی حالت رکھتا ہے۔ وہ دنیوی اعمال کا نتیجہ فوری طور پر اسی جگہ طلب کرتا ہے۔ اگر اس کو غلطی رائے یا ارتکاب جرم سے کوئی قلیل نفع فوراً حاصل ہو گیا تو وہ اپنی کوششوں کو صحیح اور بارآور خیال کرتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی کھلی ہوئی گمراہی ہوتی ہے۔ وہ مآل کار سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس کو سزا کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا نہ دنیوی کوششوں کی اخروی بارآوری کا کوئی یقین ہوتا ہے۔ اس کی نظر اسی دور حیات پر جمی ہوتی ہے۔ وہ آخرت کی جزا سزا

کو ناممکن سمجھتا ہے حالانکہ دن رات کا مشاہدہ ہے کہ مردہ زمین کو ماں ہُوئیں اور آبی ہوائیں رونما نہ زندگی دیتی رہتی ہیں اور قطرات سحاب سے بے جان زمین کو روئیدگی بالیدگی ہوتی ہے اور مادہ قابل تمام عنصری کائنات کا ایک ہی ہے پھر بعثت آخرت کس طرح ناممکن ہو سکتی ہے۔ کیا ذراتِ بدن کا اجتماع ناممکن ہے یا اس کا جان دار ہونا محال ہے یا خدا قادر نہیں ہے عاجز ہے۔ جب دوبارہ زندگی یقینی ہے تو اخروی جزا سزا سے غافل ہو کر فوری نتیجہ پر ہمت کو محصور رکھنا گمراہی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بدعقیدہ بداعمال آدمی اپنی بدبینداریوں اور بدکرداریوں کے باوجود مال و منال اور جاہ و جلال سے دنیا میں بہرہ مند ہو جائے اور اس بہرہ مندی کے سبب وہ بر خود غلط بن جائے اور اپنی تدبیر کو مؤثر اور سعئ باطل کو نتیجہ خیز کہنے لگے اور غریب مومن صالح کو پلے تحقیر سے ٹھکرا دے اور عزت و جاہ کے جوش میں سرِ نخوت بلند کرنے لگے، مگر اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تمام ظاہری خوش تدبیریاں اور کارگزاریاں برباد ہونے والی ہیں عزت تو وہی عزت ہے جو اللہ کے نزدیک عزت ہو اور آخرت میں ملنے والی ہو اور اس کا حصول دو چیزوں پر موقوف ہے۔ زبان سے بُری بات نہ کہی جائے اور بالخصوص ذکرِ الٰہی اور دیگر اذکار کو ہر بُرے کام سے بچا کر نیک عمل میں مشغول رکھا جائے۔ قول و فعل کی اچھائی ہر عزت کے حصول کی جڑ ہے۔ اچھی بات اوپر کو چڑھتی ہے اور اچھا کام اس کو اٹھاتا ہے۔ قول و فعل کی اچھائی کے بغیر شیطانی دسیسہ کاریوں اور مکاریوں کے بل بوتہ پر حصول عزت کی کوشش کرنی تباہ کن اور بربادی خیز ہے۔ ماں کے پیٹ سے لے کر گور کے تختہ تک انسان کی جو حالت گزرتی ہے اللہ اس سے ناواقف نہیں ہے۔ جو کچھ ہونے والا ہے اللہ کو پہلے سے معلوم ہے۔ اُس کے احاطۂ علمی سے کوئی چیز خارج نہیں۔ تو پھر یہ بدکاریاں، مکاریاں اور چال بازیاں کس طرح مؤثر اور مفید ہو سکتی ہیں۔ عزت و ذلت تو خدا دادہ ہے حصولِ عزت کی خواہش میں اپنے قول و فعل کو برباد کر لینا اور ابدی ہلاکت کا سرمایہ فراہم کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

تحلیل اجزاء

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ۔ خیر و شر، اچھائی و برائی گمراہی و ہدایت اللہ ہی نے پیدا کی وہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے یعنی اچھے بُرے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور دونوں پر چلنے کی طاقت آدمی کو دے دی گئی اور اختیار دے دیا گیا کہ جس راہ کو چاہے آدمی پسند کر لے، مگر فاعل مطلق تو خدا ہے۔ نیکی بدی کو اختیار کرنے کی قوت موجود ہونے کے باوجود کسی ایک طرف ارادہ اور میلان اور پھر اس ارادہ کا عملی جامہ پہننا بالکل تخلیق کے بغیر ناممکن ہے پس حقیقت میں گمراہی اور ہدایت اسی کے قبضہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کوشش کرتا ہے اور نتیجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر بُرے نتیجہ کو اچھا سمجھنے لگتا ہے اور جب بُرے نتیجہ کو اچھا سمجھتا ہے تو حصول نتیجہ کی بری کوشش کو بھی اچھا جانتا ہے پس وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ شرک، محسوس پرستی، ظاہری کارسازی اور اللہ کی غیبی طاقتوں کو چھوڑ کر محسوس یا مرئی طاقتوں کے سامنے سر جھکانا اس کو مفید مطلب نظر آتا ہے، اس لئے آدمی اپنی فکری اور عملی کوششوں کو بار آور سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ کسی بزرگ یا ولی کی کوئی منت مانی اور کام ہو گیا تو عقیدہ جم گیا کہ فلاں ولی کارساز ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ منت پوری کرنی ضروری ہے۔ اب اگر منت پوری کر دی گئی اور اتفاق سے بہ تقدیرِ الٰہی کوئی آفت آ گئی تو بے وقوف سمجھتا ہے کہ منت پوری نہ کرنے کی وجہ سے یہ آفت آئی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ سب کچھ حکمِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ کارسازی، حاجت روائی یا نزولِ مصائب میں اس ولی کو کوئی دخل نہیں ہوتا، مگر چونکہ نادار کو بھی اپنی بدکرداری آراستہ اور پیراستہ شکل میں دکھائی دیتی ہے، اس لئے گمراہ ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ سود خوار کو سود خواری افزائش مال کا ذریعہ نظر آتی ہے۔ وہ سود کھاتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ کماتا ہے۔ بڑی بڑی جائیدادوں کا مالک بن جاتا ہے، مگر قوم کی تباہی اس کے اندر اس کو نظر نہیں آتی۔ وہ نہیں جانتا کہ سود سرمایہ داری اور سنگ دلی پیدا کرتا ہے اور سرمایہ داری سے صرف سرمایہ دار کی ہستی ... ہے باقی قوم دیوالیہ ہو جاتی ہے۔ سب کا روپیہ ایک ہی شخص کے پاس آ کر جمع ہو جاتا ہے۔ تمام آدمی دولت کے منافع سے محروم ہو جاتے ہیں، مگر کروڑپتی تاجر اور عظیم الشان تعلقہ دار ہونے کی ظاہری ٹیپ ٹاپ سود خوار کی نظر کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ سود خواری کو کمائی کا بڑا زرخیز سنہری آلہ جانتا ہے۔ اسی طرح بے ایمان کی بے ایمانی، چور کی چوری، سٹہ باز کا سٹہ، زناکاروں کی بدکاری، مکاروں کا مکر، بوالہوسوں کی ہوس اور دنیاداروں کی دنیاداری ہے۔ بظاہر پُرفریب ہے خوبصورت، فائدہ رساں اور دلکش ہے۔ شیطان سنہری جال سامنے بچھا دیتا ہے، مگر اس جال میں پھنسنے کے بعد سوائے تباہی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ۔ رسول پاک ﷺ رحمۃ للعالمین تھے۔ ہر شخص کو دوزخ سے بچنے، باطل عقیدے اور معصیت رساں عمل سے اجتناب رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اہل عناد اور سرکش کافر ایک نہ سنتے تھے۔ کہ حضور ﷺ کی مخلصانہ بہی خواہی کو طمع پر محمول کرتے تھے۔

اور بہت سخت شست الفاظ استعمال کرتے تھے ۔ حضور والا اکثر سے پکڑ پکڑ کر آگ کے غار میں گرنے سے روکتے تھے ، مگر پتنگوں کی طرح نادان گرنے کے لئے انتہائی زور آزمائی کرتے تھے ۔ اس سے رحمۃ للعالمین کو انتہائی افسوس ہوتا تھا ۔ اکثر افسردہ خاطر اور پژمردہ مزاج ہو جاتے تھے ۔

چونکہ حضور کی اتنی افسردہ دلی اور افسوس سے دوسرے لوگوں کی ہدایت میں فرق آنے کا خطرہ تھا ، اس لئے کافروں کی معاندانہ حالت اور مآل کار پر افسوس کرنے کی ممانعت ہوگئی اور صاف حکم آگیا کہ آپ ان پر افسوس کر کے اپنی جان نہ دے دیں ۔ کہیں ان پر رنج کرنے میں آپ کی جان نہ جاتی رہے ۔ آپ کیوں افسوس کرتے ہیں ۔ اللہ ان کی حرکات سے بخوبی واقف ہے ۔ اسی کے علم و حکمت پر ان کی حالت کو چھوڑ دیجئے ۔ وہ جو کچھ چاہے گا کرے گا ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اپنا کچھ نور ان پر چھڑکا پس جس تک اس نور کا کچھ حصہ پہنچ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جو محروم رہ گیا وہ گمراہ ہوا ۔ اسی وجہ سے تو میں کہتا ہوں کہ جو کچھ اللہ کے علم میں ہے اسی کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا (رواہ ابن ابی حاتم)

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۔ خود فریبی سو پنداری اور خود فریبی کی اصل وجہ ناعاقبت اندیشی ہے ۔ آدمی اپنی غلطی کو راستی اور گمراہی کو ہدایت جانتا ہے ۔ باوجودیکہ اس کے کرتوت انجام کے لحاظ سے تباہ کن ہوتے ہیں ۔ تمام اہل کفر کا یہی حال ہے ۔ وہ حشر جسمانی کے منکر ہیں ۔ اُن کے نزدیک جسم کے پراگندہ اجزا کا اجتماع اور دوبارہ زندہ ہونا محال ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزا سزا سے غافل ہو کر جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں ۔ اللہ نے اس آیت میں بداعمالی کی اصل جڑ یعنی انکار قیامت کی بیخ کنی فرمائی ہے ۔ غور کرو کہ اگر کسی قریہ خشک بنجر زمین کو زندگی عطا کرنی مقصود ہوتی ہے ۔ سبزہ کی روئیدگی اور درختوں کی بالیدگی سے محروم قطعۂ ارض کو شاداب اور سرسبز کرنا ہوتا ہے تو کہاں کہاں اور کس کس طرح اس کے لئے سرمایہ زندگی فراہم کیا جاتا ہے ۔ اول ہوائیں کو چھوڑا جاتا ہے کیسے اور کہاں سے اس کی تفصیل فلسفۂ عنصریات میں پڑھو ۔ بہرحال ہوا چلتی ہے ۔ ابر کے بڑے سمندروں اور نشیبی غاروں سے اٹھنے والے بخارات یا مان سون کو یہ ہوا کسی خاص رخ پر لے کر چلتی ہے ۔ اس مخصوص رخ پر کیوں لے کر چلتی ہے ، اس لئے کہ ادھر کوئی خشک قطعۂ زمین بے آب و گیاہ بستی ہوتی ہے ۔ وہاں کی زمین مردہ ہوتی ہے ۔ اس میں زندگی کی روح پھونکنی مقصود ہوتی ہے تاکہ بستی کے تمام جاندار زندہ رہ سکیں ۔ ہواؤں کے زور سے اُٹھے ہوئے بادلوں کا رخ اس ارض غیر ذی زرع کی طرف ہو جاتا ہے ۔ وہاں پہنچ کر ابر رحمت برستا ہے ، خشک زمین شاداب ، قطعہ سرسبز اور مردہ بے جان کھیت دشت میدان زندگی کا سانس لینے لگتے ہیں ۔ غور کرو کہ زمین کو زندہ کرنے کا سامان کہاں سے اور کیسے آیا ۔ کہاں سے ہوائیں چلیں ، کہاں کہاں اور کس کس طرح ان کو برسایا گیا ۔ پس اس سے سمجھ لو کہ یونہی خلاقِ مطلق آدمیوں کو دوبارہ جسمانی زندگی عطا کرے گا ۔ اس کے حکم قادر تمام اجزائے پریشان جمع ہو کر تخلیق ثانوی کا مواد تیار کر لیں گے اور زندہ انسان اٹھ کھڑا ہو گا ۔ بے وقوف انسان خشک چٹیل میدان کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ کبھی سرسبز نہ ہوگا ، کبھی اس میں زندگی کی روح نہ پیدا ہوگی ، مگر ابر رحمت جب اس کو زندہ کر دیتا ہے وہ سبزہ نما ہو کر لہلہانے لگتا ہے تو منکر انسان اچنبھے میں رہ جاتا ہے ۔ اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے آب حیات برسائے گا جو تمام زمین پر پھیل جائے گا اور جس طرح زمین سے دانے اُگتے ہیں اسی طرح مردہ اجسام زندہ ہو کر ابھریں گے ۔ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ابو رزین نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ صلعم کس طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا اس کی تفصیل کیا ہے ۔ ارشاد فرمایا ابو رزین کیا تم اپنی قوم کی وادی میں کبھی گزرے ہو جبکہ وہ چٹیل میدان ہو اور پھر دوبارہ ایسے وقت تمہارا گزر ادھر سے ہوا ہو جب وہ سبزہ زار ہو کر لہلہا رہا ہو ۔ ابو رزین نے عرض کیا جی ہاں ۔ فرمایا پس یوں ہی اللہ مُردوں کو زندہ فرمائے گا (صحیح)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۔ آدمی تخلیقی طور پر بلندی ، عروج اور غلبہ کا خواستگار رہتا ہے ۔ کس چیز میں غلبہ ، کیسی بلندی اس کا کوئی شمار نہیں ۔ مال کی بیشی اور افزونی کی خواہش یا دنیوی علوم کی غیر متناہی افزائش کی تمنا یا ہمہ گیر حکومت کی طمع یا روز افزوں حسن ، صحت اور طاقت کی آرزو ، سب ایک ہی نوع کے مختلف اقسام اور ایک ہی درخت کی پراگندہ شاخیں ہیں ۔ مرکز سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے یعنی غلبہ کی طلب و درخواست ، یہی خواہش باعث قتل ، خون ریزی ، سفاکی ، تباہی انگیز معرکہائے جنگ ، چوری ، رہزنی ، استحصال بالجبر ، خیانت ، بے ایمانی ، دغا فریب ، جھوٹ اور ان کے علاوہ اکثر سوء الاعمال کی منبع اور سرچشمہ ہے ۔ انسان کی طبیعت اس فانی عزت اور فنا پذیر سربلندی سے ایسی وابستہ اور لپٹی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے ہوشمند اور دور رس نظر رکھنے والے فلاسفر ، زاہد ، انجام بین ، حکیم ، حقیقت شناس ، واعظ اور اصلاحی تراغیب کے حامل پیغمبر ہر چند نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں یہ سراب ہے ۔ اس سے پانی کا دھوکہ نہ کھاؤ ۔ کوڑے کے ڈھیر پر جمی ہوئی سبزی ہے اس کو چمنستان نہ سمجھو ۔ یہ حقیقت قطرۂ آب ہے اس کو اصلی موتی نہ جانو یہ پانی پر اٹھے

والاحباب ہے قصر بلند نہیں۔ چمکتا ہوا جگنو ہے لعل شب چراغ نہیں۔ اگر اس سے وابستہ رہو گے تو شہد میں پھنس جانے والی مکھیوں کی طرح ہلاک ہو جاؤ گے۔ مگر ناعاقبت اندیش، کور دماغ انسان ہوش میں نہیں آتا۔ عارضی سربلندی اور جاہ و جلال کا وقتی نشہ اس کو اس قدر سرگرداں کر دیتا ہے کہ وہ سر نخوت کو کسی طرح نیچے جھکانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ انجام بینی تو رہی الگ۔ وہ انجام ہی سے انکار کر دیتا ہے۔ مآل اندیشی کی اس کو فرصت ہی نہیں ہوتی۔ سزا جزا کا تصور اس کے لئے بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ پس اس سرچشمۂ سرگرانی و سرمستی کو مٹانے اور نخوت و سربلندی کی جڑوں کو سوتوں سمیت اکھاڑ پھینکنے کو قرآن کہتا ہے کہ:۔

جو شخص عزت (یعنی غلبہ) کا خواستگار ہے تو اللہ ہی کی قائم کردہ عزت کی طلب اس کو ہونی چاہیئے کیونکہ ہر قسم کی عزت کا منبع اور مالک خدا ہی ہے یعنی اس عارضی اور فنا پذیر عزت کی ہلاکت انگیز آرزو ہیچ ہے بے فائدہ ہے۔ حقیقی عزت اور غیر فانی غلبہ مرکز کشش ہونا چاہیئے، لیکن وہ حقیقی عزت کس کو حاصل ہے یا کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کو اور اس کے رسول کو اور اہل ایمان کو وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کیوں، اس لئے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ یہ سب کچھ صحیح، لیکن اس عزت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ:۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط پاکیزہ قول، عمدہ بات، پاک کلام زبان سے نکلے۔ کیونکہ بلندی رفعت پاکیزہ الفاظ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کی طرف اچھی باتیں ہی چڑھتی ہیں۔ اچھی باتوں سے کیا مراد ہے؟ آیت میں اس کی کوئی خصوصی صراحت نہیں۔ کلمۂ توحید، تمجید، تنزیہ تسبیح تحمید، اقرار رسالت و قیامت، ذکر خیر اور ہر سچی ستھری بات کو الکلم الطیب شامل ہے۔ سب کا عروج اللہ کی طرف ہے یعنی بلندی اور برتری کی جانب ہوتا ہے، مگر بعض بزرگوں نے بطور تشریح اس کی مثال بھی بیان کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب مومن سبحان اللّٰه وبحمده ولا اله الا اللّٰه واللّٰه اکبر کہتا ہے تو ایک پاک فرشتہ ان کلمات کو بازوؤں میں لے کر آسمان کو صعود کرتا ہے اور جس گروہ ملائکہ کی طرف سے اس کا گزر ہوتا ہے وہ پڑھنے والے کے لئے استغفار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ وجہ اللہ (دربار الٰہی) تک ان کو پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ نے آیت مذکورہ تلاوت کی (رواہ ابن جریر عن یعقوب عن ابراہیم عن ابن علیہ عن سعد الجریری عن عبداللہ بن شقیق عن کعب الاحبار وصححہ ابن کثیر) نعمان بن بشیر سے مروی ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جو لوگ اللہ کی یاد کرتے ہیں خواہ جلال الٰہی کا ذکر کرتے ہوں یا تسبیح تکبیر یا تحمید یا تہلیل (بہر صورت) یہ کلمات عرش کے آس پاس پہنچتے ہیں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان کی آواز ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے نام کے ساتھ ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اب تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اس امر کو پسند نہ کرے کہ اللہ کے پاس کسی چیز کے ذریعہ سے اس کا تذکرہ کیا جائے (رواہ ابن ماجہ واحمد) مگر یاد رکھو کہ صرف پاکیزہ باتیں اور عمدہ کلمات بلندی کے تمام درجات پر فائز نہیں کرتے نہ پوری بلندی ان سے حاصل ہوتی ہے بلکہ حصول بلندی کا تکمیلی جزو ایک اور بھی ہے۔ وہ کیا؟ نیک کام اچھے فعل، عمدہ رفتار زندگی، گفتار کی اچھائی کے ساتھ رفتار کی درستی بھی ضروری ہے۔ قول اور عمل دونوں حصول بلندی کے تکمیلی زینے ہیں۔ اچھی بات کی اونچائی اچھے کام سے ہوتی ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ کی یہ تفسیر وہی ہے جو اکثر مفسرین نے بیان کی ہے۔ مجاہد، ابوالعالیہ، عکرمہ، ابراہیم نخعی، ضحاک، سدی، ربیع بن انس اور شہر بن حوشب کا یہی قول ہے۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت میں ابن عباس کا قول مذکور ہے کہ کلم طیب ذکر الٰہی ہے جس کو بارگاہ الٰہی میں اٹھایا جاتا ہے اور عمل صالح ادائے فرائض ہے ادائے فرائض کے ساتھ جس نے اللہ کی یاد کی تو یہ عمل صالح اس کے ذکر کو بارگاہ الٰہی تک اونچا کر دیتا ہے اور جس نے فرائض ادا نہ کئے صرف ذکر کیا تو اس کا ذکر اس کے عمل پر لوٹا دیا جاتا ہے اور اسی کے پاس پڑا رہتا ہے۔ ایاس بن معاویہ نے تو یہاں تک کہدیا کہ اگر عمل صالح نہ ہو تو کلم طیب کو اونچا نہیں کیا جاتا۔ حسن اور قتادہ نے صراحت کی ہے کہ کوئی قول بغیر عمل کے قبول نہیں ہوتا۔ ابن کثیر نے صرف یہی تفسیر کی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے یَرْفَعُ کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے اور مفعول کی ضمیر عمل صالح کی طرف پھیری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عمل صالح کو اللہ اونچا کرتا ہے۔ یہاں ایک تفسیری قول اور بھی ہے وہ یہ کہ یرفع کا فاعل کلم طیب ہے اور مفعول کی ضمیر عمل صالح کی طرف پھرتی ہے۔ مطلب یہ کہ کلم طیب خود تو اوپر چڑھتا ہی ہے اس سے بڑھ کر یہ عمل صالح کو بھی اونچا کرتا ہے اور درجۂ قبولیت پر پہنچاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بغیر اقرار توحید و رسالت وغیرہ کے کوئی نیک کام بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ ایمان نہ ہو تو نیکی آخرت میں رائگاں جائے گی۔ پس نیک کام کو قبول کرنے والا پاکیزہ قول ہی ہے۔ بہر حال خلاصہ مطلب یہ نکلا کہ حقیقی عزت کے حصول کا ذریعہ قول کی درستگی اور عمل کی صلاحیت ہے نہ کہ مال و جاہ کی طمع اور نخوت و غرور۔

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ط وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ۔ مجاہد، سعید بن جبیر اور شہر بن حوشب نے کہا اس آیت میں ایسے

لوگوں کا بیان ہے جو دکھاوے کے لئے نیک کام کرتے اور دھوکہ دیتے ہیں تاکہ ان کے ظاہری نیک کاموں کو دیکھ کر خیال کیا جائے کہ یہ لوگ طاعتِ الٰہی میں سرگرم ہیں۔ اللہ کے نزدیک ایسے آدمی مبغوض ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید اسلم نے کہا اس آیت میں مشرکوں کا بیان ہے۔ میرے نزدیک دونوں قولوں میں بلاوجہ تخصیص و تعیین ہے آیت بظاہر سب مکاروں، ریاکاروں، بدی کو نیکی کا اور برائی کو اچھائی کا جامہ پہنا کر پیش کرنے والے کو شامل ہے۔ پاک بات اور پاک عمل بہت صبر آزما کسوٹی ہے۔ اس پر سچا اترنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نتیجہ اور انجام یقینی طور پر بہترین فائدہ رساں اور نجات بخش ہوتا ہے مگر قولی اور عملی سچائی کا سنجات بخش زینہ بہت حوصلہ فرسا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قول و عمل کی گندگی اور گفتار و رفتار کی خرابی شروع میں فائدہ رساں ہوتی ہے۔ فریب، عیاری، ملمع سازی اور دسیسہ کاری بہت سود مند نظر آتی ہے۔ پُر فریب دغاباز اور جھوٹے مکار، لہلہاتا سبزہ زار خوشبودار چمنستان، نظر نواز میدان اور دل پرور سامانِ راحت سامنے دکھاتے ہیں، مگر انجام کار پردہ کے پیچھے ہلاکت، بربادی، تباہی اور خسران کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسی لئے آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا کہ بدکاریوں کا فریب دینے والوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ سخت عذاب ہے اور یہ تمام مکاری فنا ہو جائے گی (نہ اس سے عزت حاصل ہوگی نہ اور کچھ)

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ قیامت کا عقلی طور پر انکار کرنے والے تین شبہات کے تاریک وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کیا انسانی بدن کا اصلی مادہ قابلِ فصل و وصل ہے۔ کیا تغیرات کا باہم توارد کوئی عارضی چیز ہے یا ذاتی۔ کیا خدا کو ایسا ہمہ گیر علم ہے کہ انسانی جسم کے اجزائے پریشان کو تمام پوشیدہ مقامات سے چن چن کر پھر جمع کر کے تخلیقِ ثانی کر سکے۔ کیا اللہ میں اتنی قدرت اور اتنی طاقت ہے کہ ایسا عظیم الشان ناقابلِ ظہور کام انجام دے سکے۔ آیاتِ مذکورہ میں تینوں شبہات کا ازالہ فرمایا ہے۔ انسان کی تدریجی تخلیقی کیفیت، زندگانی کی کوتاہی اور طوالت غرض انسان کے وجود و بقا کی ساری روئیداد دستِ قدرت میں ہے اور ظہورِ فعلی سے پہلے چھوٹی سے چھوٹی بات اور حقیر ترین واقعۂ زندگی علمِ الٰہی میں موجود تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادۂ بشری ذاتی طور پر فصل و وصل اور تغیرات کے قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا اور اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے اور اس کا علم محیطِ کل ہے۔ پس دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے دشوار نہیں۔ جب پہلی زندگی اور اس کے تمام مدارج کی تکمیل خدا کے لئے آسان ہے تو ثانوی زندگی کیا مشکل ہے۔

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے یا تو یہ کہ سب سے پہلے آدمی کو مٹی سے بنایا یا یہ کہ ہر آدمی کی تخلیق تو تمام مٹی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ جو کچھ کھاتے پیتے ہیں وہ زمین ہی کی پیداوار ہوتی ہے۔ غذائی صورت کے بعد نطفہ بنتا ہے، نطفہ سے دوسرا آدمی بنتا ہے۔ کوئی نر کوئی مادہ۔ لڑکا لڑکی عورت اپنے پیٹ میں کیا رکھتی ہے کوئی بتا نہیں سکتا۔ کس منٹ اور کس سیکنڈ میں بچہ پیدا ہوگا کسی کو کیا معلوم۔ عمر کتنی ہوگی کوئی کیا جانے۔ اللہ کی ازلی کتاب اور اسکی علمی تختی میں یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے کہ ماں کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ اللہ کے علم سے خارج نہیں۔ ہر شخص کی عمر خدا کو معلوم ہے۔ پس قیامت کا ہونا بھی برحق ہے۔ علم اور کتاب کی تشریح اہلِ تفسیر نے تقدیر سے کی ہے یعنی نر و مادہ ہونا اور عمر کی کمی بیشی مقدر ہے جس میں تغیر ناممکن ہے۔ نہ کم عمر زیادہ ہو سکتی ہے نہ زیادہ عمر کم (کذا فسر ابنِ عباس و ضحاک) زید بن اسلم نے کہا ناقص العمر سے گرا ہوا بچہ مراد ہے۔ ابن عباس کی تفسیر کے موافق عمر مقدر میں کمی بیشی کسی طرح نہیں ہو سکتی نہ رہیں عمر میں بعض اعمال کی وجہ سے زیادتی ہونے کی احادیث تو وہ خاص معنی کی حامل ہیں۔ مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے بروایت انس بن مالک بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا جس شخص کو خوشی معلوم ہو کہ اس کے رزق میں کشایش کی جائے اور اس کا نشان (ذکر نام اور دوسرے آثار) مٹانے میں تاخیر کی جائے وہ رشتہ داروں سے جوڑ رکھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابو درداء بیان کیا کہ حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا جب کسی کا وقت آجاتا ہے تو اللہ اس کو تاخیر نہیں دیتا اور عمر کی زیادتی تو نیک اولاد سے ہوتی ہے جس کو خدا نصیب کرے اس کے بعد اولاد اس کے لئے دعا کرتی رہتی ہے اولاد کی دعائیں اس کو قبر میں پہنچتی رہتی ہیں۔ یہی اس کی عمر کی زیادتی ہے۔

ابو مالک، سدی اور عطائے خراسانی نے آیت وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ الخ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر عمر والے کے لئے جو مقدارِ عمر مقرر کی گئی ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے اور اس کی عمر میں سے جو حصہ کم ہو جاتا ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ مثلاً ایک سال کم ہوا، ایک گھنٹہ کم ہوا، ایک مہینہ کم ہوا۔ بہرحال جتنا حصہ کم ہو جاتا ہے اللہ اس سے واقف ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ تخلیق کی چگونگی اور ہر چیز کی تفصیلی کیفیت کو قبل از ظہور جاننا اللہ کے لئے آسان ہے۔ یعنی

علم اور قدرت ہمہ گیر ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نشوونما و حشر یکسانی اللہ کے لئے آسان ہے۔ اول معنی سیاق و سباق اور قرائن کے لحاظ سے قوی ہے۔

مقصود بیان

آیت أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ برے کو اچھا اور شر کو خیر جاننا بھی اللہ کے علم اور قدرت سے پھرتا ہے بندہ خود مختار مطلق انسان نہیں ہے۔ آیت فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ بتا رہی ہے کہ کافروں کی اخروی بربادی پر افسوس نہ کرنا چاہیئے۔ آیت أَرْسَلَ الرِّيَاحَ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہواؤں کا چلنا بھی طبعی یا اختیاری نہیں بلکہ بحکم الٰہی ہے الی بَلَدٍ مَّيِّتٍ میں بھی لفظ بلد سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمین پر پانی برسانے اور پھل پھول گھاس پات پیدا کرنے سے اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہاں کے رہنے والے آدمی جانور زندہ رہیں۔ محض زمین کو شاداب کرنا مقصود نہیں ہوتا کیونکہ بلد صرف زمین کو نہیں کہتے بلکہ بستی کو کہتے ہیں۔ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ سے یہ تعلیم مستفاد ہوتی ہے کہ تعلیم قرآنی پر چلنا حقیقی عزت ہے۔ دنیوی عزت اسلام میں ناقابل اعتبار ہے۔ آخری آیات سے اللہ کے علم اور قدرت کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے اور مسئلہ تقدیر واضح ہوتا ہے الخ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ

اور دونوں سمندر برابر نہیں یہ شیریں پیاس بجھانے والا ہے اس کا پینا خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) کھاری تلخ ہے مگر ہر ایک میں سے

تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا

تم تازہ گوشت (یعنی مچھلیاں) نکال کر کھاتے ہو اور زیور نکال کر پہنتے ہو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں (پانی کو) چیرتی ہیں تاکہ تم

مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ

اللہ کا فضل طلب کرو اور شکر کرو وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج چاند

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ

کو اس نے کام پر لگا رکھا ہے ہر ایک وقت مقرر تک چلتا ہے یہی اللہ ہی تمہارا رب ہے اسی کی بادشاہت ہے اور اللہ کے سوا

تَدْعُونَ مِن دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِن قِطْمِيرٍ ۝ إِن تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ

جن کو تم پوجتے ان کو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کا بھی اختیار نہیں ہے اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری آواز نہ سنیں اور

سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝

سن لیں تو تمہارا کہنا نہ کر سکیں اور قیامت کے دن تمہارے شرک سے منکر ہو جائیں گے (اے شخص) تجھے ایک باخبر شخص کی طرح کوئی نہیں بتائیگا

تفسیر

اس روئے زمین پر اہل ایمان اور پاک باز بھی رہتے ہیں اور سیاہ باطن بدکار فرقے بھی۔ زندگی کی منزلیں دونوں طے کر رہے ہیں۔ کافر کی زندگی ایک پر فریب ہے۔ راحت و عیش اور سامان طرب سب ہی اس کو میسر ہیں۔ دولت بھی ہے عزت بھی صحت بھی اور طاقت بھی حکومت و سیادت بھی اور رفاہ و فراغت بھی، مگر تجربہ اور انجام کے اعتبار سے اس کی زندگی کے سمندر کا مزہ تلخ نکلتا ہے۔ انجام کار بربادی اور تباہی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں۔ رہا مومن تو اس کا یہی حال ہے اس کی زندگی بھی بکثرت منافع کی حامل ہے وہ خود اپنی زندگی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسرے بھی اس سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں۔ لذیذ خوراک، زیب و زینت کے اسباب اور راحت و تزئین سامان اس کو خود بھی حاصل ہیں اور دوسرے اشخاص بھی اس سے متمتع ہوتے ہیں، مگر اس کی فائدہ اندوزی

اس کی حد پر ختم نہیں ہو جاتی نہ اس کی فائدہ رسانی ہی کے اندر بند ہے بلکہ حقیقی اور باطنی خوبی اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس کی زندگی ثمر ور ہے۔ اندرونی طور پر لذیذ ہے۔ اس کے کارنامۂ حیات کا سمندر چکھنے میں شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے۔ اس کا انجام نہایت بہترین فلاح و سعادت ہے۔ شیریں آب حیات ہے جس کو مور و ملخ اور مرغ و مردم مزہ لے لے کر پیتے ہیں وہ دنیا کے واسطے پیام راحت ہے اس کی زندگی تعمیری زندگی ہے۔ ظاہر میں کافر اور مومن دونوں کی زندگیاں ایک طرح کی معلوم ہوتی ہیں مگر دونوں برابر نہیں۔ اندرونی فرق عظیم الشان فرق ہے۔ بربادی اور آبادی کی تخریب و تعمیر، فساد و صلاح، غارت و امن اور ہلاکت و سعادت میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی دونوں کی زندگیوں میں ہے۔ بات یہ ہے کہ مومن کے افکار صاف اور خیالات صحیح ہوتے ہیں اور ایسے خدا کی پرستش کرتا ہے اس کا مطمح نظر وہ مالک مختار ہے جس کے دستِ قدرت میں سارے نظامِ کائنات کی عنان ہے۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا آنا اسی کے تصرف کی نشانی ہے۔ چاند اور سورج اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ کوئی اس کے فرمان سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ اسی کے قانون کے موافق شمس و قمر اپنے وقتوں پر چلتے ہیں حکومتِ عامہ اسی کی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مختار اور حکمران نہیں ہے۔ رہا کافر تو اس کے خیالات بیخ و بن سے ہی کمزور ہیں۔ وہ ہرگز معبودیت ایسی چیزوں کو قرار دیتا ہے جو بے حس لایعقل اور محض محض ہیں ان میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ اپنے معبود اور پرستاروں کی پکار کو سن بھی سکیں۔ کبھی پانی، ہوا، آگ، زمین، درخت اور پتھروں کو معبود گردانتا ہے کبھی چاند سورج، ستاروں اور سیاروں کو، کبھی کبھی سنیاسیوں یا اسی قسم کے لوگوں کو درجۂ الوہیت دیتا ہے اور کبھی غیبی ارواح یا مخفی کارندگانِ قدرت کو حالانکہ یہ سب مجبور ہیں، مخلوق ہیں، کسی کی پکار کو سننے کی تاب نہیں اور بعض اوقات سن بھی لیں تو قبول نہیں کر سکتے۔ امداد و کارسازی ان کے بس کی بات نہیں۔ اور کارسازی اور قضائے حاجات ان کے اختیار میں نہیں بلکہ کافر کے یہ باطل معبود چونکہ خود اپنی معبودیت سے ... راضی نہیں وہ خود جانتے ہیں کہ ہم خالق نہیں مخلوق ہیں۔ معبود نہیں عابد ہیں۔ مختار نہیں مجبور ہیں۔ کارساز نہیں کارندے ہیں، اس لئے انجام کار وہ خود اپنے پرستاروں سے بیزار ہوں گے اور قیامت کے دن مشرکوں کے شرک سے انکار کر دیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ہم کو معبود بنا لو ہمارا تمہارا کچھ تعلق نہیں ہے اس وقت کافر اور غلط خیالات رکھنے والے کافر کو اپنی دنیوی زندگی کی غلط کاری، غلط اندیشی اور بدانجامی نظر آئے گی اور سوا حسرت کے کوئی چارہ نہ ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۔ سطح بین نظر رکھنے والے کو مومن اور غیر مومن میں کوئی فرق نہیں نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر، انجینئر، ہوائی ارضی اور آبی طبقات کا ماہر، عناصر کا محقق، ہر قسم کا کاریگر، حاکم اور محکوم، ملک کا خادم مخدوم، زوردار نادار، تاجر، کاشت کار، سپاہی، پیشہ ور غرض مومن سب کچھ ہوتا ہے اور کافر بھی کسی شعبۂ حیات میں اس سے پیچھے نہیں۔ اچھا کھانا، خوشگوار پینا، خوبصورت آرام دہ لباس پہننا، اچھے محلوں میں رہنا، دنیا کی ہر جائز خواہش سے خود متمتع اندوز ہونا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانا مسلمان کا بھی شیوہ ہے اور کافر کا بھی۔ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی پرورش کرنا، سکھ دینا، ان کی طبعی محبت کا بھی اقتضاء ہے اور کافر کا بھی۔ غرض دنیوی افادہ و استفادہ، انتفاع و استنفاع، گھٹنا بڑھنا، تقدم و تاخر، مد و جزر، اور زندگی کی ہر دوڑ میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس مساوات کو دیکھ کر کمزور نظر والے خیرہ ہو جاتے ہیں ان کو عرفان، ایمان اور اصلاح و عصیان کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اپنے عقیدہ کی تائید میں وہ قدرتی فیضان کی مساوات کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں صحت، حسن، طاقت، رعنائی، تناسب اعضاء اور وہ تمام امور جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا۔ جب قدرت کی طرف سے مساویانہ طور سے مومن اور غیر مومن، صالح اور فاسق سب کو تقسیم کر دیے گئے۔ اور عطائے قدرت کا دروازہ کسی پر بند نہیں تو پھر عبدیت اور ایمان کی ذلت اور انسانیت کی توہین گوارا کیوں کی جائے۔ بلکہ بعض اوقات جبکہ اس کو مسلمان نادار، کمزور اور میدانِ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نظر آتا ہے تو وہ نہ فقط ایمان کو غیر ضروری کہتا ہے بلکہ قدرتی جرم اور قانونِ حیات کی خلاف ورزی قرار دیتا ہے۔ یہی مومن و کافر کا امتیازی فرق بیان کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے ایک واضح تمثیل سے کام لیا جس کو سمجھنے کے بعد سارے اشتراکات کے باوجود امتیاز کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے غور کرو کہ:-

سمندر شور بھی ہیں اور شیریں بھی۔ کسی کا پانی آسانی اور خوشگواری کے ساتھ حلق میں اتر جاتا ہے اور کسی کا پانی کڑوا اور نمکین ہوتا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آبِ خوشگوار وہ پانی ہے جو دریاؤں، چشموں، پہاڑوں اور میدانوں میں پایا جاتا ہے جس سے درختوں کی نشو و نما اور جانداروں کی زندگی ہے اور شور سمندر وہ ہیں جو کہ خشکی کے جانور نہیں پی سکتے۔

وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ لحمًا طریًّا سے مچھلی مراد ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شور و

شیریں ہر قسم کے سمندر میں مچھلیاں پیدا ہوتی ہیں جن کو آدمی کھاتے ہیں۔ مچھلیوں کی پیداوار اور انسانی خوراک کی فراہمی میں کوئی فرق نہیں۔
وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا۔ زیور سے مراد ہے موتی، مونگا یعنی سمندر سے موتی مونگا بھی نکلتا ہے جس کو آدمی بطور زینت پہنتے ہیں (خصوصاً شور سمندر میں مونگا بکثرت پیدا ہوتا ہے)

وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ سمندروں میں بلا استثناء کشتیاں اور جہاز بھی چلتے ہیں۔ دریائی سفر بھی کئے جاتے ہیں جس کے دو مقصد ہوتے ہیں تجارت وغیرہ کے ذریعہ مال حاصل کرنا اور شکر الٰہی کی ادائیگی۔ بہرحال بہت باتوں میں دونوں مشترک ہیں، مگر باوجود ظاہری اشتراک کے ایک چیز مابہ الامتیاز بھی ہے۔ شیریں سمندر کا پانی مردم و مرغ طرح و مور بلکہ سب جاندار پیتے ہیں اور شیرینی و خوش گواری کے ساتھ پیتے ہیں۔ رہا شور سمندر کا پانی تو اس کو کوئی حلق کے نیچے نہیں اتارتا۔ پس مومن شیریں سمندر ہے اور کافر بحر شور۔ ظاہری شکل و صورت، رنگ، وسعت، طاقت، عزت، حکومت، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور حکمت وغیرہ میں دونوں مشترک ہیں، مگر اندرونی تجزیہ اور باطنی تحلیل کے بعد ایک روشن طبع، مطمئن قلب اور سلیم فطرت کا حامل ہے اور دوسرے کا دماغ تاریک قلب، متردد اور روح کثیف ہے۔ مآل کار یہ تاریک چلنا و تمند فائز المرام اور حیات حقیقیہ کا مالک ہوگا اور دوسرا ہلاکت آب خاسر الاعمال اور ہلاکت ابدیہ سے دوچار ہونے والا۔

يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ۔ مومن و کافر کا باطنی فرق اور انجام کار کے لحاظ سے امتیاز آیت گزشتہ میں واضح کر دیا گیا تھا۔ اس جگہ سے آخر آیت تک عقلی اور برہانی فرق ظاہر فرمایا مومن کے عقیدہ و عمل کی حقانیت اور کافر کے افکار و طریق حیات کا بطلان تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مومن کا ایمان اللہ پر ہوتا ہے۔ اس کی ہمہ گیر قدرت و حکومت اور محیط کل حکمت و علم پر ہوتا ہے۔ مومن یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے حکم اور تصرف سے رات دن میں اور دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ یعنی رات کا کچھ حصہ گھٹ کر دن میں داخل ہو جاتا ہے، اس لئے رات چھوٹی اور دن بڑا ہو جاتا ہے۔ پھر سردی کے موسم میں دن کا کچھ حصہ رات میں شامل ہو جاتا ہے اور اس طرح رات بڑی اور دن چھوٹا ہو جاتا ہے اور اللہ ہی نے چاند سورج کو مسخر رکھا ہے یعنی دونوں اسی کے حکم کے تابع ہیں خود کارسازی اور تاثیران کے قبضہ میں نہیں نہ طلوع غروب اور تغیر و تبدل ان کے اختیار میں ہے (ہر ایک کی مقرر مقدار اور مقرر میعاد اللہ ہی کے حکم سے ہے) پس سورج کا ۳۶۹ والا دورہ اور فصلوں کا تغیر اور چاند کا گھٹنا بڑھنا اور نباتات و حیوانات کا ان پر خصوصی اثر سب اللہ کے حکم و قدرت سے ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا علم و حکم اور قدرت و حکمت ہمہ گیر ہے۔ پس جب ہر قسم کا تصرف اس کائنات پر خدا کا ہے اور ہر وقت بقائے حیات اور تربیت میں انسان خدا کا محتاج ہے تو وہی معبود مسجود اور الٰہ مطلق بھی ہے۔ یہ ہے مومن کا عقیدہ جو بالکل برہانی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ رہے کافر تو ان کے افکار و عقائد سراسر وہم پر مبنی اور حقیقت سے دور ہیں۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، عطائے عطیہ، حسن بصری اور قتادہ وغیرہ سے مروی ہے قطمیر کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کو کہتے ہیں۔ عربی زبان میں تحقیر کی مثال میں اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ کافر کبھی تو پتھروں کے سامنے سر نیاز کو جھکاتا ہے اور رفقائے کار کے لئے ان کو پکارتا ہے۔ کبھی پانی، ہوا، آگ، درخت، ستاروں اور سیاروں کو اپنا کارساز جانتا ہے۔ کبھی فرشتوں اور غیبی روحوں کو حکمران اور کارفرما خیال کرتا ہے۔ کبھی بڑے بڑے آدمیوں کو اوصاف الوہیت کا حامی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کسی کے قبضہ و ملک میں ذرہ برابر چیز نہیں۔ مسیح ہوں، عزیر، کرشن ہوں یا گوتم، سورج چاند اور دوسرے ستارے ہوں یا سیارے، عناصر و جمادات کوئی بھی ہو ہر ایک محتاج، معذور اور بے دست و پا ہے۔ ان کو اپنا ہی کامل اختیار نہیں وہ دوسروں کی کارسازی کیا کر سکتے ہیں۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ۔ اول تو وہ کسی کی پکار سنتے ہی نہیں، یا تو یہ وجہ ہے کہ ان میں سننے اور جاننے کی قابلیت ہی نہیں ہے سونا چاندی اور دوسرے معدنیات نباتات آگ پانی ہوا مٹی بلکہ ... وغیرہ سننے کی قوت سے بے بہرہ ہیں یا سننے کی قابلیت تو ہے مگر وہ غائب ہیں۔ پکارنے والے کی پکار کے وقت حاضر نہیں۔ جنات، مسیح، ... وہ تمام اولیاء جو گزر گئے اور ملائکہ وغیرہ ہر وقت ہر جگہ اور ہر زمانہ موجود نہیں پھر پکار کیسے سنیں یا حاضر بھی ہیں، مگر پکارنے والے کی پکار کی طرف سے غافل ہیں، اور جب نہیں سنتے پھر کسی کی کارسازی کس طرح کر سکتے ہیں

وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔ (اسجابالفرض) اگر وہ سن بھی لیں تو دعا کو قبول کرنا اور جواب دینا ناممکن ہے کیونکہ ان کے قبضہ میں کچھ بھی نہیں ہے پس ایسی وہمی اور حقیقت سے خالی پرستش کس کام کی جس سے نہ فائدہ کا حصول ہوسکتا ہے نہ ضرر کا دفع۔ اس پر مزید یہ کہ :۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ۔ قیامت کے دن وہ اس شرکت الوہیت سے انکار کریں گے اور کافر جو خیال کرتا ہے کہ وہ ہماری کارسازی کرتے ہیں بروز حشر وہ صاف کہدیں گے کہ ہم نہ تمہارے کارساز تھے نہ ہم کو تمہاری اس پرستش کا علم نہ ہم نے تم کو اس کا حکم دیا بلکہ اُلٹے دشمن بن جائیں گے۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَهُمْ عَنْ عِبَادَتِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝ مومن وکافر کا یہ فرق برہانی ہے اور نہایت واضح ہے

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ۔ قتادہ نے فرمایا یہاں خبیر سے مراد اللہ ہے۔ عربی میں یہ لفظ بطور مثل مستعمل ہوتا ہے۔ جب کوئی جاننے والا نہ جاننے والے کو کوئی بات بتاتا اور نصیحت کرتا اور انجام کار سے آگاہ کر دیتا ہے تو آخر میں تنبیہ کرتا ہے کہ اس بات کو گرہ میں باندھ لیں اس سے باخبر ہوں۔ میرا تجربہ ہے اور واقف کار کی طرح کوئی بات کہنے والا تمہیں نہیں ملے گا۔ بہرحال اللہ نے اپنے کو باخبر فرماتے ہوئے ہر شخص کو تنبیہ فرمائی کہ جو کچھ بتایا گیا وہ صحیح ہے غلط نہیں سچ ہے جھوٹ نہیں۔ قیامت کے دن پچھتانا ہوگا اگر نہ مانے گا آخر میں برباد ہو جائے گا۔ اگر خلاف ورزی کرے گا۔

مقصودِ بیان

مومن اور کافر کا باطنی فرق تمثیلی اور برہانی شکل میں مسلمان کو شیریں سمندر سے تشبیہ دینا اپنے اندر بیش بہا حقائق رکھتا ہے، افادۂ عام تزئین عالم روحوں اور دلوں کی پیاس بجھانا مسلمان کا معمولی کرشمہ ہے تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً سے موتی مونگے وغیرہ کا زیور پہننا بطور جواز مستفاد ہوتا ہے۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ سے دریائی سفر کا جواز مستفاد ہوتا ہے اور درپردہ رزق حلال کی تلاش اور پاک کمائی کے حصول کی کوشش کی ترغیب وتعلیم بھی مستفاد ہوتی ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں صراحت ہے اس امر کی کہ پانی پر جہازوں کا چلنا اور دریائی سفر کے ذریعہ مال کا حاصل ہونا ادائے شکر کا موجب ہے۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور چاند ساکن نہیں متحرک ہیں۔ اور ان کی حرکت اپنے کرہ کے محور پر ہی نہیں بلکہ جریانی اور مکانی ہے۔ لیکن زمین کے آس پاس حرکت کرنا یا زمین کا سورج کے گرد گھومنا اس آیت سے نہیں نکلتا نہ اس کی تردید نکلتی ہے۔ رَبُّكُمْ اور لَهُ الْمُلْكُ سے پتہ چلتا ہے کہ عمومی تربیت اور حکومت موجب الوہیت ہے۔ یعنی زندگی، ابقائے زندگی اور تصرفاتِ زندگی کا جس سے تعلق نہ ہو وہ الوہیت کا مستحق نہیں۔ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی کوئی چیز کسی کے قبضہ میں نہیں کسی کو حقیقی تصرف کرنے کا اختیار نہیں۔ اس سے عبرت پکڑنی چاہئے اس بھولے بھالے سادہ لوح مسلمان کو جو اپنی حاجت روائی یا دفع مصائب کے لئے صلحاء اور اولیاء کی قبروں پر جا کر دہائی دیتا، فریاد کرتا اور پکارتا رہتا ہے۔ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کسی کے قبضہ میں (زندگی میں کچھ نہیں تو مرنے کے بعد بدرجۂ اولیٰ) کچھ نہیں۔ پھر کیوں کسی زندہ مردہ کی دہائی دی جائے اور کیوں کسی کو فریادرس غوث اور غیاث قرار دیا جائے۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ الخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کافروں کے معبود کچھ پکار نہیں سنتے یعنی ان میں سننے کی طاقت نہیں اور اگر طاقت ہے تو وہ حاضر نہیں رہتے اور حاضر بھی ہوں تو جواب دینے اور مدد کرنے کی توفیق ان کو نہیں۔ پس خوب سمجھ لو کہ حضور ارواح غیبیہ کا عقیدہ غلط ہے اور یہ سمجھنا گمراہی ہے کہ انبیاء یا اولیاء یا اور کوئی غیبی مخلوق ہر وقت ہمارے احوال کو دیکھ رہی ہے اور ہماری حقیقی کارسازی کر رہی ہے۔ اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی اور زندہ مردہ کو پکارے گا تو کبھی فائز المرام نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے غیبی ارواح یا ملائکہ یا شہداء اولیاء اور انبیاء کو حاضر سمجھ کر پکارنے کی فی الجملہ ممانعت مستفاد ہوتی ہے۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ سے کافروں مشرکوں کی اخروی حسرت ناک حالت کی تصویر کشی مقصود ہے۔ باطل پرستوں کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معبود دنیا اور آخرت میں ہمارے کارساز ہیں۔ لیکن اس یقین کے خلاف قیامت کے دن ان کے معبود ان کے کرتوت سے بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔ اس وقت بے وقوفوں کو سوا حسرت کے کوئی چارہ نہ ہوگا وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ

لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز سزاوار حمد ہے اگر وہ چاہے تم کو فنا کردے اور نئی

بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ

مخلوق کو لے آئے اللہ پر یہ دشوار نہیں ہے اور کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور اگر بوجھ میں لدا

مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ

ہوا اپنا بوجھ اٹھانے کو پکارے گا تب بھی اس کا کچھ بوجھ نہ بٹایا جائے گا اگرچہ وہ رشتہ دار ہی (اے محمدؐ) تم صرف انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو اپنے رب سے

رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝

غائبانہ ڈرتے ہیں اور نماز ٹھیک پابندی سے پڑھتے ہیں جو شخص پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے پاکی حاصل کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ

جاتا ہے نابینا اور بینا برابر نہیں اور نہ اندھیرا اور اجالا برابر ہیں نہ سایہ اور دھوپ برابر ہیں

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ

اور نہ زندے اور مردے برابر ہیں اللہ جس کو چاہتا ہے سناتا ہے اور تم ان کو سنانے والے نہیں

مَّن فِي الْقُبُورِ ۝ إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن

جو قبروں میں ہیں تم تو بس ڈرانے والے ہو ہم نے تم کو دین حق دیکر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر) بھیجا اور کوئی

مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ

امت ایسی نہیں جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو ان سے پہلے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں ان کے پاس

رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۝ ع ۱۲ ۱۵

ان کے پیغمبر معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر پہنچے اس کے بعد میں نے کافروں کی پکڑ کی تو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا

تفسیر تنگ سمجھ رکھنے والے، پست ذہنیت کے حامل عموماً کہتے ہیں کہ اللہ کو ہمارے معاملاتِ زندگی میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اللہ ہم سے عبادت کرا کے اور اپنے قانون پر چلا کے ہم سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا ہمارے خود ساختہ خیالات اور خود تراشیدہ اعمال حیات سے اس کو ضرر پہنچتا ہے۔ آخر ہمارے لئے یہ اوامر و نواہی اور یہ جکڑ بندیاں کیوں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خدا کا کچھ فائدہ مخفی ہے۔ یہ بیہودہ خیالات اور باطل اقوال اس گروہ کے ہیں جو مآلِ کار سے غافل، غلط اندیش اور کور راجا ہے جس کو روشنی اور تاریکی، زندگی اور موت، سایہ اور دھوپ کا فرق ہی معلوم نہیں۔ جو اللہ سے بالکل بے خوف اور اپنی تباہی سے قطعاً ناواقف ہے جس کو نہ دنیوی سزا کا کچھ اندیشہ ہے نہ آخرت کے عذاب کا جس کا ایمان ایسی حرکت پر ہی ہلتی وہ موت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ وہ اتنا کور بصیرت اور کور بصر ہے کہ مخالفت انبیاء کے گزشتہ بد نتائج سے بھی عبرت نہیں پکڑتا۔ ہر قوم اور ہر گروہ میں آکر اللہ کے پیغمبروں نے دعوت دی، مگر اس کے کانوں تک کوئی دعوت نہ پہنچی اور پہنچی تو عناد سے اس نے ٹھکرا دی۔

بات یہ ہے کہ اللہ کو ہماری ہستی اور اصلاح ہستی کی تو کوئی ضرورت نہیں ۔ وہ چاہے تو ہم کو فنا کر کے دوسری مخلوق ہماری جگہ لا سکتا ہے ۔ وہ ہمارا محتاج نہیں ۔ زندگی، بقائے زندگی اور اصلاح زندگی میں اس کے دستِ نگر ہیں ہم کو اپنے فائدہ کے لئے نفس کو پاک کرنے، خیالات اور افکار کو سدھارنے اور اعمال کو درست کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے ہر زمانہ اور ہر قوم میں اس نے اپنے معلم پیغامبر بھیجے ۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی قوم ایسی گزری کہ اس میں پیغمبر کو نہ بھیجا گیا ہو ۔ پیغمبروں نے آ کر ہم کو اچھے برُے میں تمیز کرنی بتائی تاکہ ہماری زندگیوں میں تباہ کاری نہ پیدا ہو پھر جن لوگوں نے حکم نہ مانا وہ برباد ہو گئے ۔ یہ تو اللہ کی مشیت اور رحمت تھی نہ کہ غرض اور حاجت ۔ نفع نقصان تو ہمارا اپنا ہے خدا کا نہیں ۔ جو اپنے نفس کو اعتقادکو اور اعمال کو پاکیزہ بنائے گا وہ اپنے لئے پاکیزہ بنائے گا ۔ گندہ بنائے گا اپنے لئے گندہ بنائے گا ۔ خدا کا اس میں کیا فائدہ کیا ضرر ۔ اپنی کرنی اپنی بھرنی ۔ خدا نے تو ہم کو یہ بتا دیا اور پیغمبروں نے آ کر کہدیا کہ تم سب اپنے اپنے کارناموں کے ذمہ دار ہو، دوسرے کا کفیل نہیں ۔ جب قیامت ہوگی تو کوئی وہاں دوسرے کا بار اپنے اوپر نہ اٹھا سکے گا، اس لئے دنیوی تعلقات میں مشغول رہ کر اپنی اصلاح سے غافل نہ ہو اور علائق محبت و قرابت کو تزکیۂ نفس کے راستے کا پتھر نہ قرار دو۔

اس پیام کو سنا تو سب نے مگر گوش ہوش سے ان ہی لوگوں نے سنا جن کے دل زندہ تھے، جن کی روحیں روشن تھیں جن کے دلوں میں چمک تھی جو اللہ پر یقین رکھتے تھے جو بن دیکھے خدا کو مانتے تھے جو اس کی گرفت سے ڈرتے ۔ باقی جو لوگ زندہ ہونے کے باوجود مردہ تھے، جن کے دل مُردہ تھے، جن کی روحیں تاریک تھیں جن کے ہوش و حواس افسردہ ہو گئے تھے وہ اس پیام ہدایت کا کیا اثر لیتے ۔ سنا اور سنی ان سنی کر دی ۔ دیکھا اور نابینا بنے رہے ۔ نتیجہ میں ہلاک ہوئے اور دوسروں کے لئے عبرت اندوزی کا سامان چھوڑ گئے ۔

تحلیلِ اجزاء

يَآيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ فقرہ کے معنی ہیں ناداری احتیاج ۔ صرف مال کی ہی ناداری نہیں، دولت ہی کی احتیاج نہیں بلکہ ہر چیز کی احتیاج ۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی اور بقائے ہستی اور صفتِ ہستی میں بھی کسی دستِ نگر ہونا فقر کہلاتا ہے اور ہر چیز میں ہر ایک سے بے نیازی، غنا اور تو نگری ہے ۔ پس فقر نقصان ہے اور غنا کمال، لیکن کمال دو طرح کا ہوتا ہے (۱) کسی دوسرے کا عطا کیا ہوا کمال جس طرح سورج روشنی میں کامل ہے، چاند حسن میں کامل ہے، آگ حرارت میں کامل ہے، پانی رطوبت میں کامل ہے وغیرہ وغیرہ ۔ مگر یہ کمال حقیقت میں کمال نہیں ہوتا بلکہ احتیاج کمال یا کمال احتیاج ہوتا ہے ۔ کسی کی دست نگری واقع میں کمال نہیں ۔ اس کمال کا مطلب تو واقع میں یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کے اندر کوئی خاص وصف اتنا قوی اور زیادہ ہے کہ دوسری وہ تمام چیزیں جن کو اس وصف کا کوئی حصہ ملا ہے سب اس سے پیچھے رہ جاتی ہیں ۔ سورج سے زیادہ روشنی آگ سے زیادہ گرمی اور چاند سے زیادہ حسن کسی اور چیز کو نہیں دیا گیا، اس لئے کہدیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں ان خصوصیات میں کامل ہیں ۔ ورنہ ان کا کمال بھی دینے والے کا محتاج ہے ۔

(۲) کمال ذاتی یعنی ایسا کمال جس میں دوسرے کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے خود بخود ہو ۔ ان دونوں قسموں سے ہٹ کر کمال کی دو صورتیں اور بھی ہیں ۔

(۱) کسی ایک اچھائی اور عمدہ صفت میں کمال ہونا اور باقی اوصاف میں ناقص ہونا ۔ مثلاً چاند خوب صورتی میں کامل ہے، مگر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے یہ اس کا نقصان ہے ۔ سورج کی روشنی سے اس کی روشنی کم ہے ۔ یہ بھی نقصان ہے اس کو گہن لگ جاتا ہے یہ بھی نقصان ہے ۔ سورج سب سے زیادہ روشن ہے یہ بھی کمال ہے، مگر جلا دیتا ہے، اور چیزوں کو سڑا دیتا ہے ۔ ابر میں چھپ جاتا ہے یہ تمام صفات نقصان ہیں ۔ زید سب سے بڑا عالم ہے یہ اس کا کمال ہے، لیکن مفلس ہے، بدصورت ہے، کمزور ہے، چھوٹا ہے، بوڑھا ہے، بداعمال ہے یہ سب نقائص ہیں ۔

(۲) تمام اوصاف میں کمال یعنی تمام کمالوں کا ایک ذات میں جمع ہو جانا ۔

اب غور کرو کیا انسان کمالِ ذاتی کا حامل ہے ۔ ایسا ہرگز نہیں ہے ۔ صحت، طاقت، حُسن، عزت، وجاہت، حکومت، دولت، علم، معرفت غرض اس کے تمام بہترین اوصاف ۔ یہاں تک کہ پیدائش اور ہستی اور ہستی کا بقا اور ہستی کے تمام لوازم خود ساختہ خود اندوختہ اور خود پرداختہ نہیں ۔ ہر چیز میں اس کو غیبی امداد کی ضرورت ہے ۔ اس کی ہر چیز خداداد ہے ۔ عدم سے نکال کر وجود میں لانا، شکم مادر سے لے کر بطن قبر تک پرورش پہنچانا اور ہر مرغوب چیز کو عطا کرنا خدا کا کام ہے ۔ پس ہر انسان فقیر ہے، لیکن اللہ غنی ہے یعنی وہ کامل ہے اور اس کا کمال ذاتی ہے اور نہ فقط ایک صفت اور جہت میں کامل ہے بلکہ تمام اچھے اوصاف میں کامل ہے ۔ اس کی ہر صفت قدیم ہے، لازوال ہے، کامل ہے، اس کو کسی کی ضرورت نہیں ۔ یہی تو وجہ ہے

کہ وہ غنی ہونے کے ساتھ قابلِ حمد بھی ہے۔ ستائش تو اس کمال کی کی جاسکتی ہے جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے کامل ہو اور ذاتی ہو، اسی لئے فرمایا کہ لوگو! تم اللہ کے محتاج
ہو، اللہ محتاج نہیں بے نیاز ہے اور بے نیازی کے ساتھ محمود بھی ہے۔ یعنی وہ مستحق ستائش بھی ہے۔

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝ ہر آدمی خدا کا محتاج ہے۔ اللہ نے ہم کو ہر چیز دی۔ ہستی اور ہستی کے تمام
لوازم دیئے۔ جسمانی طاقت اور صحت دی۔ عزت، مال اور حکومت دی، علم و حکمت دی۔ ہدایت و معرفت دی۔ ایمان و اسلام کی توفیق دی، مگر کیا اس سلسلۂ
عطا سے خدا کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ انسانی تخلیق اس کے لئے باعثِ کمال ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ورنہ وہ مجموعۂ کمالات ہی نہ ہوگا وہ تو غنی حمید ہے اس کو ہماری تخلیق
سے کیا فائدہ۔ پھر کیا ہم کو بے کار پیدا کیا؟ یہ سمجھنا بھی جہالت ہے۔ اللہ اپنی ذاتی عظمت اور کمالِ صفات سے اور ہر صفت میں کمال اس کو حاصل ہے۔ پھر کیسے ممکن
ہے کہ بلا فائدہ اس نے ہم کو پیدا کر دیا اور قوانینِ حیات عطا کئے۔ حقیقت میں اس کا وصف خلاقی حکمت سے خالی نہیں۔ ہم کو فائدہ پہنچانے کے لئے پیدا کیا اور ہدایت
کی۔ ورنہ:-

اگر وہ (چاہتا تو ہم کو پیدا ہی نہ کرتا کبھی اور کو پیدا کر دیتا یا) چاہتا تو پیدا کرنے کے بعد ہم کو فنا اب ہم کو فنا کر دیتا اور کسی دوسری قوم یا دوسری نوع کو پیدا
کر دیتا۔ اگر وہ ہم سب کو فنا کر دیتا تو اس کا کچھ نہ بگڑتا۔۔ اس کی صفتِ خلاقیت میں کوئی دھبہ نہ آتا۔ وہ تو ہر حال خلاق ہے۔ مخلوق ہم ہوں یا کوئی اور۔ اللہ
کے لئے یہ تبدیل تغیر دشوار نہیں۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ [illegible] اس زندگانی کا یہ تو ادنیٰ فائدہ
ہے۔ حقیقی فائدہ تو سعادتِ ابدی کا حصول ہے، اسی لئے خیر و شر اور اچھائی برائی بتانے والی کتاب اس نے نازل فرمائی تاکہ جو لوگ اپنے احوال کی اصلاح
کر لیں وہ سعادت مند ہو جائیں اور جو خلاف ورزی کریں وہ اپنی گراں قدر پونجی ساری برباد کر لیں اور گناہوں کا بوجھ لے کر میدانِ قیامت میں جائیں اور اپنے کرتوت
کی سزا بھگتیں۔ وہاں:-

کوئی کسی کا بار اپنے اوپر نہ اٹھائے گا نہ اٹھانا چاہے گا نہ اٹھا سکے گا۔ قریب ترین رشتہ دار، باپ بیٹا، بیوی، ماں بہن کوئی بھی بارِ گناہ کو نہ بٹائے
مطلب یہ کہ کوئی شخص کسی کا بار اپنے اوپر اپنی خوشی سے نہ اٹھائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مظلوموں کے گناہ ظالموں پر عذاب ڈال دے یا بہکانے والوں پر بہکنے
کے گناہ اس طرح ڈال دیے جائیں کہ اصل بہکنے والوں کے عذاب میں بھی کمی نہ ہو اور بہکانے والوں کا بار بھی بڑھ جائے۔ درحقیقت یہ دوسرے کا گناہ اٹھانا نہ
ہوا بلکہ اپنے ہی بہکانے کی سزا ہوئی۔ اسی لئے ایک اور آیت میں آیا ہے۔ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ۔ یعنی گمراہ کرنے والے اپنے بار اٹھائیں
اور اپنے بار کے ساتھ بہت سے بوجھ اٹھائیں گے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس نے اسلام میں بدچلن نکالا اس پر اس کا گناہ ہوگا اور قیامت تک جو لوگ اس بدچلن
پر چلیں گے سب کا وبال بھی اس پر ہوگا، مگر بدچلن چلنے والوں کے بار میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت میں ہے حضور اقدسؐ نے حجۃ الوداع میں فرمایا آگاہ ہو جو مجرم جرم کرتا ہے وہ صرف اسی پر پڑتا ہے۔ والد کا جرم لڑکے
کا جرم والد پر نہیں پڑتا (احمد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی)

حضرت ابو رمثہ کا قول ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوا۔ حضور اقدسؐ نے مجھے دیکھ کر میرے باپ سے فرمایا کیا یہ تمہارا بیٹا ہے
والد نے عرض کیا جی ہاں ربِ کعبہ کی قسم یہ میرا بیٹا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کا جرم تم پر نہ ہوگا اور نہ تمہارا جرم اس پر۔ اس کے بعد حضور
اکرمؐ نے یہ آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ پڑھی۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے دن ماں باپ اپنے بیٹے سے ملیں گے اور کہیں گے فرزند! ہمارے کچھ گناہ بٹالے۔ وہ کہے گا یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا
کچھ مجھ پر ہے وہ ہی بہت بھاری ہے۔ الحاصل کوئی کسی کے گناہ اپنے اوپر لینا ہی نہ چاہے گا اور اگر چاہے گا بھی تو اٹھا نہ سکے گا اور گناہوں سے دبا ہوا آدمی ہر
اپنے قرابت داروں کو پکارے گا، مگر کوئی بھی بارِ گناہ اٹھانے پر رضامند نہ ہوگا۔

تنبیہ: اس آیت سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ شفاعت تو معافی کی سفارش کا نام ہے نہ کہ اپنے اوپر دوسروں کے گناہ اٹھانے کا۔

إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ اللہ ہمارا رب ہے، پروردگار ہے، معبود ہے۔ ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ

پہنچانے والا ہے۔ ہم کچھ نہ تھے اس نے بنایا۔ ہم کمزور تھے اس نے توانا کیا۔ ہم کچھ نہیں جانتے تھے اس نے علم عطا کیا۔ ہم ابتدائی شعور کے مالک بنے تو اس نے فہم سمجھ دی اور ہم جوان ہو کر ہوش مند اور دانا بن گئے۔ عقل روشن ہو گئی۔ بُرے بھلے کی کامل تمیز کرنے لگے۔ صحیح غلط کو پہچاننے لگے، لیکن ہر کمال کے زوال ہے۔ ہر آغاز کا انجام ہے۔ آخر میں تو یہی ضعیف ہو گئیں۔ سارا جسم نحیف ہو گیا۔ گوشت پوست گھل گیا، دماغ بے کار ہو گیا، مشین کے پرزے گھس گئے اور جانتے کے بعد انجان بن گئے۔ آغاز میں دستِ قدرت کی کارفرمائیوں کی ایک کرشمہ سازی تھی۔ تکمیل بھی اسی کا مظاہرہ تھی اور زوال بھی اسی کے کمال کو دکھا رہا ہے۔ ایسے مربی، محسن اور خالق کے اس تصرف کو دیکھ کر نہ لرز جانا اور خوف نہ کرنا اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ کر سرِ رعونت اٹھانا اور جزا سزا سے غافل ہو کر انابت کا جھنڈا بلند کرنا جہالت ہے، کم دانشی ہے۔ ایسے جاہل کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے۔ رب کو رب نہ جاننے والے ڈرانے سے نہیں ڈرتے۔ ڈراتے دھمکانے اور جزا سزا کی یاد دلانے کا فائدہ تو انہیں لوگوں کو ہے جو عمل کی دنیا میں آ کر قیامت کے آنے اور یقینی آثارِ موت کے نمودار ہونے سے پہلے اللہ کی معیار کل طاقت سے ڈرتے اور جزا سزا کا اندیشہ رکھتے اور یہی باطنی لرزہ اور غائبانہ خوف انہیں کے سروں کو معبودِ برحق کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ اقرارِ عظمت کے لئے انسان کو سیدھا کھڑا رکھتا ہے۔ مظاہرۂ عبدیت کے لئے ان کی کمر کو جھکا دیتا ہے۔ زمین پر ناک اور پیشانی رگڑوا کر انسانی ذلت اور مسکنت کے احساس کو پیدا کراتا ہے اور ادنیٰ غلاموں کی طرح دو زانو بٹھا دیتا ہے۔ اظہارِ عظمت کے تمام طریق عمل میں اللہ احساس کو پیدا کراتا ہے اور ادنیٰ غلاموں کی طرح دو زانو بٹھا دیتا ہے۔ اظہارِ عظمت کے تمام طریق عمل میں اللہ کی بڑائی اور بڑائی کا اعتراف زبان اور دل سے کراتا اور غیبی ہدایت نامے کے کم از کم چند الفاظ بطور اظہارِ محبت زبان سے پڑھواتا ہے، اسی لئے تو فرمایا کہ:-

تمہارے ڈرانے کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو اپنے رب سے غائبانہ ڈرتے اور نماز ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ گناہوں کی کثافت سے پاک اور خطاؤں کے بار سے ہلکے ہو جاتے ہیں، مگر خدا کو نہ ان کے ایمان کی ضرورت ہے نہ غائبانہ خوف کرنے کی نہ اطاعت و فرماں برداری کی، وہ تو غنی و حمید ہے۔

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ۔ روح، دل، دماغ، افکار، اخلاق، اعمال، خصائل اور اقوال کی پاکیزگی سے تو خود انسان ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ تزکیۂ نفس خود نفس کے لئے مفید ہے۔ اللہ کو کچھ نفع نہیں۔ ان کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے اور یقینی طور پر جانا ہے۔ وہاں اس پاکیزگی کا نفع خود آدمی ہی کو ملے گا۔

وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ ۙ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۙ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۚ وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ۔ کافر اور مومن میں مابہ الامتیاز چند امور ہیں۔ کھانا پینا چلنا پھرنا، نسل کشی اور تمام جسمانی خواص کی یگانگت کے ہوتے ہوئے دونوں میں سے ہر ایک کی جدا جدا چند خصوصیات ہیں ان ہی خصوصیات کی تصویر کشی کے لئے آیت مذکورہ میں چند مثالیں دی ہیں۔

(۱) یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اندھا اور بینا برابر نہیں۔ آنکھیں ظاہری طور پر دونوں کی ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے ظاہری مادی پردے، حلقے اور پتلیاں ہر ایک کے پاس ہوتی ہیں، مگر ایک نور سے محروم ہوتا ہے، دوسرا روشن نگاہ رکھتا ہے۔ یہی کافر نابینا اور مومن بینا ہے۔ کافر کی نگاہِ عقل معدوم ہے اور مادی ہوا و ہوس کے پردے چشمِ بصیرت پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ اس کی فطری نظر بھی ماری گئی ہے۔ اس کو نہ اپنا آغاز دکھتا ہے نہ انجام نظر آتا۔ اس کی نظر پہنچتی ہے نہ معاد تک نہ اس کی چشمِ شعور کا اس دید میں اللہ کی کارسازی، غیبی صناعی، ربوبیت اور ہمہ گیر قدرت دکھتی ہے۔ نہ قانونِ قدرت سے سرتابی کرنے والوں کی تباہی، لیکن مومن دور رس نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک نگاہ میں فرش سے عرش تک ہر چیز کے اندر اللہ کی الوہیت، صنعت، حکمت، قدرت کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اپنے آغاز کو بھی جانتا ہے اور انجام کو بھی۔ وہ ابتدائے آفرینش سے بھی واقف ہے اور مآل سے بھی غافل نہیں۔ روزِ ازل سے لے کر جنت دوزخ کا آخری میدان اس کی نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ پس یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

(۲) تاریکیاں۔ تہ بہ تہ تاریکیاں۔ گھٹا ٹوپ تاریکیاں ہمہ رس روشنی کی برابری نہیں کر سکتیں۔ روشنی تو ایک ہی ہے۔ یعنی وہ نور جس سے تمام تیرگی کا فور ہو جائے مگر تاریکی کے پردے ان گنت ہیں۔ جس میں ہر پردہ بجائے خود ظلمت کامل ہے۔ پس کافر تہ بہ تہ پیہم متواتر تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی روح تاریک ہے، دماغ تاریک ہے، دل تاریک ہے، عقل و دانش تاریک ہے۔ افکارِ خبیثہ کی تاریکی، اعمالِ خبیثہ کی تاریکی، اقوالِ کاذبہ کی تاریکی، پہلے تک کے مبدء اور معاد کی تاریکی اس پر چھائی ہوئی ہے۔ پس اس کو زندگی کی سیدھی شاہراہ نہیں دکھتی۔ ادھر ادھر تاریک پگ ڈنڈیوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔

جو اس کو تباہی کے تاریک غاروں میں گرانے والی ہیں اور مومن کی ساری کائنات روشن ہے اس کی تمام زندگی پر ایک روشنی چھائی ہوئی ہے اس کی روح اطمینان وسکون کے نور سے منور ہے۔ اس کا قلب ایمان وعرفان کی روشنی سے روشن ہے۔ اس کی دانش صحیح علوم ومعارف کی روشنی سے چمک رہی ہے۔ اس کا دماغ عقائد صائبہ اور افکار صحیحہ کی برق تابانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ اس کے افعال واقوال خیرہ کن روشنی کے حامل ہیں۔ غرض اس کے ہر طرف سے ایک بقعۂ نور اٹھتا ہے جو اس کی ساری زندگی پر چھایا جاتا ہے۔ مبدأ ہو یا معاد، ازل ہو یا ابد، دنیا ہو یا آخرت ہر طریقہ اور ہر نتیجہ کا ظہور اس کے سامنے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کافر کا انجام دوزخ کی تاریکیوں میں پھنسنے کے سوا کچھ نہیں اور مومن کا نتیجہ جنت کے اندر آفتاب قدس کی ضیا چینی اور تجلی الٰہی کی جلوہ اندوزی ہے۔

(۳) سایہ ٹھنڈا، سایہ خنک فرحت بخش، سایہ گرم ہوا، لو کی لپٹ اور جلا دینے والے جھکڑوں سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ دونوں برابر نہیں ہیں ایک حیات بخش، فرحت بخش اور سکون بخش ہے اور دوسرا تباہ کن، موت آور اور سوختہ کر دینے والا۔ پس مومن ایک پر کیف سایہ ہے، حیات نواز راحت آفرین اور فرحت بیز ظل بارد ہے۔ اس کی روح کو چین، دماغ کو طمانیت، دل کو فرحت اور ساری زندگی کو سکون حاصل ہے۔ ایمان وعرفان کی خنک ہوائیں ہر وقت اس کی روح کو تازہ رکھتی ہیں۔ سختی، نرمی، سردی، گرمی، نا داری اور سرمایہ، دکھ اور سکھ، بیماری اور صحت، کمزوری اور قوت، جوانی اور پیری، موت اور زندگی غرض ہر چیز کے اندر اس کو غیبی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ خدا رحمان ہے، مہربان ہے، پروردگار اور کارساز ہے۔ ظالم نہیں، جفا کوش نہیں جو کچھ کرتا ہے بہتری کے لئے کرتا ہے چونکہ اس کو ہر وقت سکون رہتا ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کو تباہ کرنے اور دنیا میں فساد پھیلانے کی کوشش نہیں کرتا۔ صبر آزما اور حوصلہ فرسا مصائب کے باوجود اس کو فطرت کے مقرر کردہ شخصی حدود سے آگے بڑھنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے لئے دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہیں کرتا اور تمام کائنات اس کی طرف سے مطمئن اور پرسکون رہتی ہے۔

رہا کافر بد اندیش کا فرد وہ ایک گرم لو ہے، ہوائے سوزاں ہے، بے چین ہے، مضطرب ہے، ہوا وہوس کی گرمی اس کو جلائے ڈالتی ہے۔ لا محدود خواہشات کے شعلے اس کو پھونکے دیتے ہیں۔ سکھ میں بھی اس کو سکھ حاصل نہیں، کسی چیز پر اس کو قناعت نہیں۔ عقیدہ پختہ نہیں، دکھ میں ہائے ہائے اور مصیبت میں وائے وائے کرتا ہے۔ وہ خدا کو کارساز نہیں جانتا۔ حوادث اور انقلاب دہر کا ادنیٰ اثر اس کی زندگی کے شیرازہ کو بکھیر دیتا ہے۔ وہ ہر ایک کے پاس پناہ لینے کے لئے جاتا ہے اور در در کاسہ لیسی اور سجدہ ریزی کرتا ہے۔ ہر چیز کے سامنے سجدہ ریزی کرتے اس کو شرم نہیں آتی۔ یہاں تک کہ بے جان پتھروں کی طرف دوڑنے اور قدم فرسائی کرنے میں بھی اس کو ننگ نہیں ہوتی۔ پس اس کی سکھ کی دنیا بھی مضطرب ہوتی ہے، اور دکھ کی دنیا بھی غیر مطمئن، غیر ساکن اور چونکہ اس کی دماغی اور عملی زندگی بے قراری کے ساتھ گزرتی ہے۔ نہ افکار میں سکون اور چین ہوتا ہے نہ اعمال میں، اس لئے یہ دوسروں کا چین بھی برباد کر دیتا ہے۔ عالم میں فساد پھیلاتا ہے۔ اللہ کی مخلوق کو اپنی گرمی سے سوختہ کر دیتا ہے۔ اگر خود رسیدہ اور مصیبت زدہ ہوتا ہے تو دنیا کو مصیبت زدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کا مال آبرو اور جان اس سے محفوظ نہیں ہوتا۔ غرض وہ تیز ہواؤں کے جھکڑوں کی طرح خود بھی آتش زیر اور سوختہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی شعلہ باری سے سوختہ کر دیتا ہے۔

(۴) مومن زندہ ہے کافر مردہ۔ کافر کا روح مردہ ہے دل مردہ ہے دماغ مردہ ہے، حواس مردہ ہے سکون وعرفان اس کی روح کو حاصل نہیں۔ نہ عرفان اس کے دل کو میسر نہ افکار صحیحہ نہ عقائد صادقہ اس کے دماغ میں جاگزیں نہ تصورات واقعیہ اس کے حواس میں نمودار۔ وہ قانون فطرت سے ہر آن سرتابی کرتا ہے۔ اور قدرت کی مخالفت حقیقی موت ہے، آدمیت کی موت ہے۔ اگرچہ اس کے سر کے اندر دماغ نام کا لوتھڑا زندگی کا سانس لے رہا ہے۔ ایک گوشت کا ٹکڑا زندگی کے اندر روح حیات کا سرچشمہ اور دورانِ خون کا مبدأ ہر وقت متحرک ہے سطحی نظر رکھنے والے اس کو جاندار بھی کہتے ہیں۔ مگر یاد رکھو وہ مردہ ہے۔ فطرت سے سرکشی اور نظام کائنات میں خلل ڈالنے کی کوشش موت ہے۔ جسمانیت کی نہیں۔ انسانیت، شعور، ادراک، معرفت اور سکون واطمینان کی۔ اس کے برعکس مومن کی روح بیدار، قلب پرسکون، دماغ جوہر انسانیت سے آراستہ اور حواس صحیح تصورات کے حامل ہیں۔ وہ صرف دیکھنے ہی میں زندہ نہیں ہے بلکہ حقیقی حیات انسانیت کی حیات اس کو حاصل ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝ صراحت مندرجہ بالا سے معلوم ہو گیا کہ کافر مردہ ہے اس کے پاس

عرفان طلب روح نہیں، صداقت پسند دل نہیں، حق پرست دماغ نہیں، جلوۂ حق اس کو نہیں دکھتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ندائے فطرت اور صدائے قدرت اس کو ساری کائنات میں کسی کی طرف سے نہیں سنائی دیتی۔ پس اس میں اور قبر کے مُردے میں کوئی فرق نہیں اور مُردے کو آواز سنانی کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہاں اللہ جس کو چاہے سنوائی عطا کر سکتا ہے۔ کسی نبی کا کام حقیقت کو بدل دینا نہیں۔ یہ کام تو صرف اللہ کا ہے نبی کا کام تو صرف ڈرانا ہے۔ قانونِ فطرت سے سرکشی کرنے والوں کو ابدی ہلاکت کا خوف دلانا ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں ارشاد ہوا کہ اللہ جس کو چاہے آہنگِ صداقت اور نغمۂ حق سنا سکتا ہے۔ آپ قبر کے مُردوں کو نہیں سنا سکتے آپ تو صرف نذیر ہیں۔

نوٹ:- ہر نبی بشیر بھی ہوتا ہے، لیکن انذار کا درجہ بشارت سے اعلیٰ ہے جب سزا سے ڈرنا مجرم کو جرم سے نہ روک سکتا ہو تو کسی چیز کا لالچ بدرجۂ اولیٰ نہیں روک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں حضورؐ کو صرف نذیر فرمایا ورنہ حضورؐ کا کام بشارت دینا بھی تھا۔ جیسا کہ آئندہ آیت میں مذکور ہے۔

تنبیہ:- ہم اسی تفسیر میں چند مقامات پر سماعِ موتیٰ کی کامل تنقیح کر چکے ہیں۔ اس جگہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۔ باجماعِ اہلِ تفسیر اس آیت میں نذیر سے مراد پیغمبر ہیں۔ کافروں کا دعویٰ اختلافاً تین نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک گروہ تو نبوت کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔ دوسرا گروہ نبوت کو تو ضروری خیال کرتا ہے، مگر عرب میں نبی کا وجود غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ ریگستانی وادی غیر ذی زرع اور وحشی قبائل جن میں نہ مدنیت نہ تہذیب نہ علم نہ انسانیت۔ تیسرا گروہ عرب میں کسی کے نبی ہونے کا تو منکر نہیں، لیکن حضورِ اکرمؐ کی نبوت کا منکر ہے۔ تینوں گروہوں کے اقوال کا جواب آیتِ مذکورہ میں ہے جب تمام اقوام میں داعیانِ حق آئے اور کوئی قوم کوئی ملک پیغمبر سے محروم نہ رہا تو عرب نے کیا قصور کیا تھا کہ ان کے پاس پیغمبر نہ بھیجا جاتا۔ جو کام دوسرے پیغمبروں نے کیا وہی کام عربی پیغمبر کا بھی تھا۔ کام میں یکسانی اقوام میں یکسانی تو پھر جہالت و علم، بربریت و تہذیب، بدویت اور مدنیت رحمتِ الٰہیہ میں تفریق نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم جاہل ہو یا عالم، وحشی ہو یا مہذب، جنگلی ہو یا شہری قانونِ قدرت سے فائدہ اٹھانے کی مساویانہ حقدار ہے۔ رہی نبوت کی ضرورت تو یہ بھی کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں۔ افکار کی اصلاح یا فساد اقوال کی صداقت یا کذب اعمال کی حقانیت یا بطلان نتیجہ سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ نقصان کا اندیشہ اور فائدہ کی امید خیر و شر اور اصلاح و فساد کی جڑ ہے نفس کا ارادہ دماغ کی سوچ حرکت اور اعضاء کے تعمیری یا تخریبی فعل سزا جزا سے بے نیاز ہو کر ناممکن ہیں۔ اگر فائدہ نہ ہو تو کیوں تعمیر اور اصلاح کی کوشش کی جائے۔ کون ہے جو بغیر لالچ اور خوف کے مصائب کو برداشت کرتا، قیود اور حدود کا پابند ہوتا اور صبر آزما قربانیاں کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ نتیجہ سے غافل ہو کر کوئی دماغی یا جسمانی کام نہیں ہو سکتا۔ پس انبیاء کا آنا بھی ضروری ہے تاکہ قوانینِ حیات کی تعلیم دینے کے ساتھ وہ لوگوں کو ان کے نتائج سے بھی واقف کر دیں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو ابدی ہلاکت سے ڈرائیں اور اطاعت کرنے والوں کو سعادتِ ابدی اور فائز المرامی کی بشارت دیں۔

آیتِ مذکورہ میں رسولِ پاکؐ کو تسکین بھی ہے اور اس امر کی صراحت بھی کہ رسولِ اقدسؐ کو برحق نبی بنا کر پیامِ حق دے کر بھیجا ہے اور گزشتہ انبیاء کی طرح بشیر و نذیر بنایا ہے۔ لہٰذا نبی برحق کی نبوت کا انکار موجبِ وبال ہے۔

وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۔ بینات سے مراد ہیں کھلے ہوئے معجزات اور زُبُر کے معنی ہیں کتابیں یعنی وہ صحیفے جو مختلف انبیاء کے پاس بھیجے گئے تھے۔ بعض اہلِ روایت نے لکھا ہے کہ سب صحیفے ایک سو نازل کئے گئے۔ ۵۰ حضرت شیثؑ پر ۳۰ حضرت ادریسؑ پر ۱۰ حضرت ابراہیمؑ پر اور ۱۰ حضرت موسیٰؑ پر نزولِ تورات سے پہلے، لیکن حق بات یہ ہے کہ صحیفوں کی صحیح تعداد بتائی نہیں جا سکتی۔ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں صحیفوں کی کوئی تفصیل اور تعداد نہیں لکھی جس طرح چار کتابوں کے جن کے نام قرآن پاک اور احادیث مقدسہ میں آگئے ہیں۔ اور کتابوں کا وجود ممکن ہے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ دوسری کتابیں بھی نازل کی گئی ہوں جن کے نام معلوم نہیں اسی طرح صحیفوں کی تعداد بتانی بھی خود تراشیدہ ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں رسولِ پاکؐ کو تسلی اور کافروں کو وعید ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جب گزشتہ پیغامبروں نے رسالت کا دعویٰ کیا اور دعوے کے ثبوت میں مختلف معجزے پیش کئے اور آسمانی صحیفے اور کتاب روشن یعنی زندگی سدھار نے کے آسمانی قوانین اور غیبی نوشتے بھی سامنے لائے تو کافروں نے ان پیغمبروں کو نہ مانا ان کو جھوٹا قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کی سخت گرفت

کی دنیا میں بھی ان کو تباہ کیا اور مرنے کے بعد بھی عذاب میں گرفتار کیا۔ بس اگر اے نبی! آپ کے زمانہ کے کافر قریش وغیرہ آپ کو سچا نہیں جانتے اور مخالفت کرتے ہیں تو شکستہ خاطر اور بد دل ہونے کی کوئی بات نہیں۔ قدیم دستور سے ہی یہ چلا آیا ہے۔ یہ بھی تکذیب نبی کی سزا بھگتیں گے جس طرح گزشتہ کافر اپنی سزا کو پہنچے۔

تذییل جو لوگ دو پیغمبروں کے درمیانی دور زمانہ فترت میں پیدا ہوئے اور انہوں نے پہلے پیغمبر کا سا زمانہ پایا اور جدید پیغمبر ان کے زمانہ میں مبعوث نہیں ہوا۔ وہ اگر پہلے پیغمبر کی ہدایت کے خلاف چلے ہوں یا انہوں نے پیغمبر کی رسالت کو نہ مانا ہو یا پیغمبری تعلیم میں قطع برید اور تحریف کی ہو تو ان کا حشر کیا ہوگا۔ کیا وہ معذور سمجھے جائیں گے یا گنہگار؟ یہ بحث اختلافی ہے۔ شیخ ابن حجر نے شرح الہمزیہ میں لکھا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ ایسے لوگ معذور ہیں گنہگار نہیں۔ اگر انہوں نے شرک کیا ہو تب بھی ماخوذ نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اللہ کا کوئی فرستادہ نہیں پہنچا اور پہلے پیغمبر کا دور ختم ہو گیا۔ سوائے حضور خاتم الانبیاء کے ہر پیغمبر کی پیغامبری اس کی زندگی تک ہوتی تھی۔ وفات کے بعد اس کے قول کو ماننا لازم نہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ سے جب فرعون نے دریافت کیا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ یعنی گزشتہ لوگوں کا جو تمہارے دعوے سے پہلے مر گئے کیا حال ہوگا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ یعنی ان کے کافر مومن ہونے کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ گویا حضرت موسیٰ نے ان کو کافر نہ قرار دیا۔ رہی بعض کافروں کی کفر کی صراحت جو احادیث میں آئی ہے مثلاً عمرو بن لحی یا امرء القیس شاعر کے متعلق جہنمی ہونے کی تصریح یہ خصوصی صراحت ہے۔ اسے عمومی حالت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

حق یہ ہے کہ شرک کسی طرح کسی وقت معاف نہیں۔ عاقل بالغ ہوتے ہوئے شرک کرنا موجب جہنم ہے۔ آیت إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ میں مشرک کو قطعاً ناقابل مغفرت قرار دے دیا گیا۔ خواہ کوئی مشرک ہو۔ کسی زمانہ کا اور کسی ملک کا ہو۔ بات یہ ہے کہ عقل و دانش ملنے کے بعد ہر شخص توحید کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی پیام یا آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں۔ اگر دعوت رسالت کسی کو نہ بھی پہنچی ہو تب بھی وہ توحید کا فطری مکلف ہے اور شرک پر ماخوذ۔ رہے دوسرے گناہ تو زمانہ فترت میں ممکن ہے قابل مواخذہ نہ ہوں۔ مشعل راہ (پیغمبر کی ہستی) نہ ہونے کی صورت میں اندھیرے غار میں گر جانا قابل ملامت نہ قرار پائے۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ رہا فرعون کا سوال اور حضرت موسیٰ کا جواب تو ظاہر ہے کہ موسیٰ سے پہلے لاکھوں کروڑوں آدمی مر چکے تھے۔ کوئی موحد تھا کوئی مشرک۔ کوئی نیک کوئی بد۔ کسی کا ایمان پہلے نبی پر تھا کسی کا نہ تھا۔ حضرت موسیٰ اس کی تفصیل کس طرح بتا سکتے تھے اور حضرت کو کیا معلوم تھا کہ کون مومن گزرا اور کون کافر۔ کون جنتی اور کون دوزخی۔ اس لئے آپ نے ایک جامع جواب دے دیا اور اللہ کے علم پر تفصیل کو محول کر دیا۔ حضرت موسیٰ کے قول سے قرون اولیٰ کو معذور قرار دینا اور زمانہ فطرت کے کافروں کو غیر ماخوذ سمجھنا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ ہر نبی کی دعوت اسی کے دور حیات تک تھی وفات کے بعد اس کا ماننا ضروری نہ تھا۔ بجائے خود قابل طلب ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ کسی پیغمبر کی دعوت عمومی نہ تھی اور نہ دوامی تھی۔ ہر قوم اور ہر ملک کے لئے پیغمبر جدا جدا ہوا کرتا تھا اور ایک زمانہ تک اس کی پیغمبری رہتی تھی، لیکن سوال یہ ہے کہ گزشتہ ایک پیغمبر ہی نہیں بلکہ تمام پیغمبروں کو سچا ماننا ضروری تھا یا نہیں اور وفات پیغمبر کے بعد اس کی یا کسی گزشتہ پیغمبر کی رسالت کا انکار کرنے والے معذور ہیں یا ماخوذ۔ اس میں سے ہر شق استدلال کی محتاج ہے ہم تو واضح طور پر جانتے ہیں کہ آخری پیغمبر کی دعوت اگر پہنچ گئی ہو تو اس کی تصدیق لازم ہے تکذیب کفر ہے۔ تفصیلی ہدایت نامہ اور ہدایت کے موافق اصلاح اعمال اور چیز ہے اور رسالت کی تصدیق یا تکذیب اور چیز ہے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ زمانہ فترت کے مشرک جہنمی ہیں۔ خواہ ان کو کسی کی زبانی پیام توحید پہنچا ہو یا دپہنچا ہو اور گزشتہ انبیاء کی تکذیب کرنے والے بھی کافر ہیں اگر ان کو دعوت نبوت پہنچ گئی ہو۔ ہاں تفصیلی دعوت نہ پہنچنے کی صورت میں اعمال شرعیہ کے مکلف نہیں۔ والعلم عند اللہ۔

مقصود بیان سب آدمی ہر چیز میں اللہ کے محتاج ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء اولیاء بھی اللہ کے محتاج ہیں۔ خود ان میں کچھ بھی طاقت نہیں۔ اگر ان کو کشف، الہام یا علم سینہ ملتا ہے تو وہ بھی اللہ ہی کی عنایت ہے۔ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں کامل ہے۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مخلوق کو پیدا کرنے یا اس کی اطاعت کرنے سے اللہ کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں۔ نہ اس مخلوق کو پیدا کرنے سے اس کا کچھ فائدہ ہے۔ الْحَمِيدُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ کی بے نیازی محمود ہے یعنی جب مخلوق کو پیدا کرنے سے اس کی کوئی غرض متعلق نہیں اور جو کچھ اس نے مخلوق کو دیا وہ مخلوق ہی کے نفع کے لئے دیا۔ ایسا لاپرواہ پروردگار واجب الحمد بھی ہے۔ آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بروز قیامت کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو مسیح کو اپنی امت کا کفارہ یا امام حسینؑ کو امت محمدیہ کے گناہوں

کا معروض خیال کرتے ہیں ۔ اس آیت سے یہ بھی بات مترشح ہوتی ہے کہ کسی غیر مجرم کو کسی مجرم کے گناہ کی دنیوی سزا بھی نہیں دی جا سکتی ۔ خواہ وہ دونوں آپس میں باپ بیٹے ہوں یا بھائی بھائی ۔ پوری آیت میں قیامت کی ہولناکی کی تصویر کشی ہے تاکہ اہلِ باطل کا یہ عقیدہ بالکل اکھڑ جائے کہ ہمارے معبود ہم کو عذاب سے بچالیں گے اور ہمارے پیر ہمارا سنگتا ہ پیٹ اوپر اٹھالیں گے ۔ آیت وَمَا يَسْتَوِي الْخ میں کافروں کو اندھوں سے اور گرم لوہ سے اور تاریکیوں سے اور مُردوں سے تشبیہ دی ہے اور اہلِ ایمان کو انکھیاروں اور سایہ سے اور نور سے اور زندوں سے ۔ آیت وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ میں صراحت ہے کہ انبیاء کی تعداد صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی قرآن و حدیث میں آگئی ہے بلکہ ہر قوم کے لئے پیغمبر کو بھیجا گیا اگرچہ تم کو اس کا نام معلوم نہ ہو وغیرہ ۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ

کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر ہم اُس سے پھل پیدا کرتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں میں سفید و

جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ

سُرخ گھاٹیاں ہوتی ہیں جن کے رنگ جُدا جُدا ہوتے ہیں اور (بعض) نہایت سیاہ ہوتی ہیں اسی طرح آدمیوں ۔ بھیڑوں اور چوپایوں کے رنگ

مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ○

مختلف ہوتے ہیں اللہ سے بس وہی ڈرتے ہیں جو اس کے بندوں میں عالم ہیں بلاشک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے

تفسیر ان سوال اٹھتے ہیں جن کی تقویم فلسفہ کی نظر میں آبی اور ہوائی اجزا سے ہوتی ہے ۔ سردی سے ان میں کثافت اور پھر وابستگی آتی ہے ۔ سحابی شکل بن جاتی ہے ، بوجھ پیدا ہو جاتا ہے ، ثقل کے سبب بادل نیچے کو جھکتا ہے ۔ حرکت اور ہوا کی حرارت سے پگھلتا ہے ۔ قطرات آب کی شکل بن کر برستا ہے ۔ آدمی اس کو مینھ کہتے ہیں ۔ خشک زمین مُنہ کھولے منتظر ہوتی ہے ۔ مینھ پڑتے ہی پانی کو چوس لیتی ہے ۔ پانی اور مٹی سے مل کر ایک قوام بنتا ہے ۔ سبزہ ، کھیتی اور درخت اُگتے اور بڑھتے ہیں ۔ پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں ۔ کوئی ہرا کوئی پیلا ، کوئی سُرخ کوئی نیلا کوئی گلابی ، بنفشی ، نرگسی اور پیازی کوئی سفید ، سُرمئی ، شربتی اور نارنجی ۔ ہر ڈھنگ نرالا ہر ڈھنگ نرالا ۔ پانی کے قدیمی اجزا ، ایک طبیعت اور ایک خاصیت کے حامل ۔ مٹی کا مادہ ایک مزاج ایک صورت اور ایک نوعیت کا مظہر ۔ مخلوط قوام ایک طرح کا ۔ درخت کا بیج ایک ، درخت ایک ، درخت کی غذا ایک ، لیکن پھل رنگ برنگ اتنے رنگ کہ فلاسفہ کی عقل رنگ کا اختلاف کس نے کیا ، کیوں کیا ، کیسے کیا ؟ یہ تین سوال ہیں ۔ اوّل کا جواب نابینا فلسفہ نے کچھ دیا کہ اختلاف صورت نوعیہ نے کیا ۔ لیکن کور دانش نہ سمجھے کہ صورت نوعیہ پورے درخت کی ایک ہی ہے ۔ پھر صورت نوعیہ کے اقتضا میں تفاوت اور اختلاف کیوں ہوا ۔ (اچھا اقتضائے صورت کا اختلاف صحیح لیکن صورت نوعیہ ذی شعور نہیں ۔ عاقل و فرزانہ نہیں ، خود مختار و مطلق العنان نہیں ۔ پھر ایسا کیوں ہوا کیوں نہیں کہہ دیتے کہ بالا دست قلبی حکمراں محیط کل قہار مختار علیم قادر مطلق کے حکم سے ۔ آخری دونوں سوالوں کا جواب دینے سے طبعیات کے محقق خاموش ہیں ۔ نباتات کی حقیقت جاننے کی مدعی انگشت در دہاں ہیں کون جانے کہ اختلافات رنگ کی کیا غرض ہے کیا فائدہ ہے اور یہ تغیر کس طرح ہوا ہے نہ کوئی اختلاف رنگ کا فائدہ بتا سکتا ہے نہ طریقہ اور کیفیت ۔ اللہ نے کیا ہے اللہ ہی جانے ۔ اندھیرے میں اوہام کے تیر چلانے بے سود ہیں ۔

پہاڑ کیسے بنے ، کس نے بنائے ، کیوں بنائے ان تمام کاوشوں کو جانے دو پتھر کیسے بنے ، کتنی قسموں کے ہوتے ہیں ، کس نے بنائے ، کہاں کہاں بنائے اس بحث سے بھی کنارہ کش رہو ۔ پہاڑوں میں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کی پیدائش کا سبب کیا ہوتا ہے ، ان کے خواص کیا کیا ہوتے ہیں ۔ اس دلدل میں نہ پھنسو ۔ تمام تحقیقات ، تنقیحات ۔ دماغ سوزی اور نکتہ بیزی کو چھوڑ کر اور گہرائیوں سے ابھر کر سطح پر آ کر ظاہری نظر سے دیکھ کر صرف اتنا بتا دو کہ پہاڑ کے پتھروں میں جو مختلف رنگ ہوتے ہیں کوئی سفید کوئی سرخ کوئی سیاہ اس کی کیا وجہ ہے ؟ ایسا کس نے کیا ہے ۔ ہر ایک پتھر نہ مختلف رنگ کی ان گنت

دھاریاں کس نے بنائی ہیں؟ پہاڑی راستوں میں جو ہر رنگ نرالا نظر آتا ہے اس کا رنگریز کون ہے، یہ کس کا اثر صناعی ہے۔ صورت توجیہ کے قلم نے تو ایسا نہیں کیا۔ سورج کی حرارت تو ایک ہی طرح کی پڑتی ہے۔ اثر قبول کرنے والے اجزاء بھی ایک ہی طرح کے ہیں۔ طبیعت غیر مختار اور بے دانش ہے پھر ایسا کیوں کیا۔ صاف کہہ دو خاموش کیوں ہو۔ یہ ساری کرشمہ سازی نیرنگی، رنگ ریزی اللہ ہی کی ہے پھر کہاں بھٹکے پھرتے ہو۔

سبزہ زار میں گھوڑا بھی چرتا ہے، بھینس بھی گائے بھی، بکری بھی۔ ایک ہی رنگ کا گھاس سب کھاتے ہیں، لیکن نوعی اختلاف اپنا رنگ جدا ہی رکھتا ہے۔ غذا، چرا اور تمام ہوا و حیات اگر ایک جیسے بھی ہوں تب بھی ہر نوع کے جانور کا رنگ جدا جدا ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے اس کا جواب تو دماغ زدہ فلاسفر بھی نہیں دے سکتے۔ بھینس سفید کیوں نہیں ہوتی، گائے کا رنگ سبز کیوں نہیں ہوتا، بکری کا رنگ نیلا نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اتحاد و مظاہر نوعی رنگوں سے کیوں خالی ہوتا ہے، کون جانے، لیکن ایسا کرتا کون ہے؟ اس کو تلاش کرنے کے لئے وہم کی گھٹا ٹوپ وادیوں میں سرگرداں رہو۔ جہالت اور نادانی کے سمندر میں غوطے کھاؤ، مگر شاہد مراد اور در مقصود ہاتھ نہ آئے گا: اس کا جواب صرف ایک ہے کہ اللہ ہی نے ایسا کیا۔ وہ خود مختار ہے جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔ تمام چوپائے اپنے خاص خاص نوعی رنگ رکھتے ہیں۔ نروں کے جدا اور مادیوں کے جدا، مگر بچے اپنے باپ اور ماں کے رنگوں سے ہٹ کر جداگانہ لے کر آتے ہیں۔ نہ وہاں فلسفۂ توارث جاری ہوتا ہے نہ تسلسل نوعی کے بے حقیقت نظریات، نہ دست طبیعت کی فعالی نظر آتی ہے نہ سماوی اور ارضی تاثیرات کی کار فرمائی۔ یہ حکمرانی ہے تو بس اللہ کی۔

انسانوں میں بھی ایک غذا ایک ہوا، ایک فضا، ایک ماں ایک باپ کے ہوتے ہوئے اور ماحول کی یگانگت کے باوجود رنگ کا اختلاف بالکل نمایاں ہے۔ کالا، گورا، سفید اور پیلا، مٹیالا اور نکھرا ہوا آدمی کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ پھر ہر رنگ میں ہر آدمی ممتاز حیثیت اور جدا درجہ رکھتا ہے۔ سب حبشی کالے ہوتے ہیں، لیکن ہر شخص کی سیاہی دوسرے سے جدا درجہ رکھتی ہے۔ نوعی صنفی ملکی غذائی ہوائی آبی یگانگت کے باوجود کوئی بہت کالا ہے کوئی اس سے کم کوئی اس سے بھی کم، کوئی بہت کم۔ یہ تدریجی فرق مراتب کیوں ہے، کس نے کیا؟ رومی سرخ ہوتے ہیں لیکن سرخی میں تفاوت ہوتا ہے۔ تجزیہ اور تحلیل کے بعد نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ہر شخص کا رنگ دوسرے سے بالکل ممتاز ہوتا ہے۔ شکل صورت، آواز، مزاج، طبیعت، قوت جسمانیہ اور قواء کے اختلافات کو جانے دو۔ صرف رنگ کا اختلاف بھی اپنے اندر وہ علمی خزانہ پوشیدہ رکھتا ہے جس کے اندر سب سے بڑا در یتیم ایک ہی ہے۔ یعنی سب کچھ اللہ نے اپنے اختیار اپنی قدرت اور اپنی حکمت سے کیا، لیکن کور بصیرت کیا جانے بے دانش کیا سمجھے، نادان کیا بوجھے۔ یہ قصہ تو جاننے والوں کا ہے۔ ان کا ہے جن کے دماغ حقیقت شناس، نظریں دوررس، بصیرت روشن اور قوت فکریہ برسر عمل ہے۔ جو نتیجہ کو دیکھ کر فاعل کی جستجو، اثر سے مؤثر کی تلاش اور تلون کیفیات کو دیکھ کر مکیف کی طلب کرتے ہیں۔ کیوں اور کیسے اور کب کی تحقیقات تو پیچھے کرتے۔ سب سے پہلے کون اور کس کی جستجو ان کو ہوتی ہے۔ نکتہ رسی اور ماہیت شناسی کا مرتبہ تو بعد کا ہے۔ اول درجہ تو ہر فعل کے فاعل کا ہے۔ پس تغیرات سے متغیر پر، مصنوع سے صانع پر، مخلوق سے خالق پر اور کائنات سے کون پر استدلال کرنا علماء کا کام ہے۔ یہی ایمان ہے، عرفان ہے برہان ہے، تصدیق و ایقان ہے۔ ایمان و علم کے بعد ہی اللہ کی ہمہ گیر قدرت و سطوت نظر آتی ہے جس کو دیکھ کر دانش مند لرز جاتا ہے، ڈر جاتا ہے، اس کو اپنی ہستی دریا کا ایک قطرہ، ریگزار کا ایک ذرہ اور چمنستان کی ایک پتی سے زیادہ قوی نظر نہیں آتی۔

تحلیل اجزاء

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا آثار فعل کی نیرنگی فاعل کی قدرت بسیط پر دلالت کر رہی ہے۔ صنعت کی انجوبہ کاری، صانع کے قادر الکل ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ مقام غور ہے کہ ؎ پانی کا مرکز نیچے ہے، لیکن برستا اوپر سے ہے۔ اوپر کس طرح پہنچتا ہے، کیسے پہنچتا ہے، کیوں پہنچتا ہے؟ اس کا پتہ اہل حکمت کچھ بتاتے ہیں۔ مانسون اٹھتے ہیں، بخارات چڑھتے ہیں۔ اوپر پہنچ کر ان کا قلب ماہیت یا تغیر کیفیت ہوتا ہے اور پانی کی شکل بن کر برسنے لگتا ہے۔ ان میں سے ہر چیز بے اختیار داعی موجود اور فلسفی کا وضول کی مرہون ہے۔ بہت کچھ طبیعاتی تنقیح کرنے کے بعد سمجھ میں آئی ہے، لیکن ان کا سمیع کوئی بھی نہ بتا سکا۔ بے شعور طبیعت یا مجبول مطلق اتفاق تو پر حکمت صناع نہیں ہو سکتا۔ منعم کا فلسفہ تو اپنے اندر دانش و بصیرت کے ہیں بہا خزانے مخفی رکھتا ہے۔ یہ فیض تو جواہر معنوی اور ذاتی نرا پر ہے بلکہ واقعی اور حقیقی ہیں۔ ارادہ، علم، اور بصیرت اور حکمت کے بغیر یونہی بلا سوچے سمجھے محض اتفاق سے بارش کا نزول مجنونانہ تخیل ہے۔ یہ اتفاقی نہیں ہو جاتی جو مجبول اتفاق سے پیدا ہوتے ہیں وہ بلا وجہ اور بغیر کسی امتیاز کے کہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دوسری کیفیات کے اختلاف و اتحاد سے قطع نظر کر کے

صرف رنگ میں ہی یگانگت ہونی چاہیے تھی۔ ایک پانی، ایک قوام، ایک غذا، ایک ماحول، ایک طرح کا بیرونی اثر۔ پھر رنگ کا اختلاف کیوں ہے۔ کوئی پھل سرخ ہے کوئی سفید، کوئی زرد، کوئی سبز، کوئی یک رنگ، کوئی دو رنگ، کوئی ہزار رنگ۔ ایسا کیوں اور کس لئے ہے؟ تمام اعجوبہ کاریاں اہلِ بصیرت کے نزدیک بیکار ہیں، اور صرف نظر فریبی کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اچھا النظر فریبی ہی صحیح۔ بہر حال اس کا فاعل تو کوئی ہے جو صاحبِ بصیرت بھی ہے، حکیم بھی ہے، خود مختار بھی ہے مالک ارادہ بھی ہے۔ قادر العمل بھی ہے۔ اسی کا نام تو اللہ ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ جس طرح نباتات میں پھلوں کی نیرنگی اپنے اندر درسِ بصیرت رکھتی ہے۔ اسی طرح پہاڑی پتھروں کے مختلف رنگ اور پہاڑی راستوں کا رنگ برنگ ہونا بھی معرفت آفریں ہے۔ پہاڑی راستے سفید (سنگ مرمر وغیرہ) سرخ اور بالکل سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ ذرا سوچو تو کہ ایسا کرنے والا کون ہے اور اس اختلاف کی کیا غرض اور کیا فائدہ ہے؟ (فرائض اور فوائد ان گنت ہیں۔ طبعیاتی تحقیق کئے جاؤ۔ پھر بھی احاطہ ناممکن ہے۔ کیسے اختلاف ہوتا ہے اس کی چھان بین میں بھی ساری عمر کھپا دو پھر بھی مکمل تنقیح نہیں ہو سکتی۔ کس نے اختلاف کیا۔ اس کے لئے قریب ترین سبب پھر اس کی علت پھر علت علت، غرض ہر سبب کا دوسرا سبب نکالتے جاؤ۔ یہاں تک کہ انتہا ایک ایسے سبب پر ہوگی جس سے پہلے کوئی سبب نہ ہوگا۔ ایک ایسے رنگ ریز کی رنگ ریزی نظر آئے گی جس سے اول کوئی دوسرا رنگ ریز دکھائی نہیں دے گا۔ پس صباغ اول کو مالک ارادہ، قادر، عالم اور واحد کہنا پڑے گا۔ اور اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ سب کچھ اللہ نے کیا۔ عکرمہ، ابو مالک، عطائے خراسانی اور قتادہ نے کہا کہ غرابیب سے مراد ہیں بلند سیاہ پہاڑ۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ غربیب اسود سخت سیاہ چیز کو کہتے ہیں۔ کوئی چیز ہو، مگر اس جگہ سیاہ پہاڑ مراد ہیں۔ حاصل دونوں قولوں کا ایک ہی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ آدمی، کیڑے، کوڑے، چرند پرند چوپائے بھی پھلوں اور پہاڑوں کی طرح مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کے رنگوں کے اختلاف کا فائدہ، کیفیت اور شمار بیان کئے جائیں تو کہیں بھی نقطۂ انتہا نہ ملے گی۔ اور سبب اختلاف دریافت کرو گے تو سب کی انتہا خالق بے چون مالک کل، علام الغیوب، صناع، کارساز اور صباغ بے نیاز پر ہوگی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ ایسے رنگ سے رنگتا ہے کہ اس میں کچھ نقص نہیں ہوتا (ابن مردویہ)

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ اوپر کی آیات میں پہاڑوں، پھلوں، آدمیوں اور تمام چرندوں پرندوں کے اختلافِ رنگ پر غور کرنے کی دعوت دی گئی تھی اور تفاوت لون سے کارسازِ بے نیاز کے وجود پر استدلال کیا گیا تھا۔ اور چونکہ حقیقت شناسی اور نکتہ رسی ہر شخص کا کام نہیں نہ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اختلافِ رنگ سے اللہ کا ارادہ، علم، قدرت، وحدت اور وجود کا ثبوت کس طرح ہوتا ہے، اس لئے علماء کی فضیلت، علم کی برتری اور مدارِ تحقیق یعنی معرفتِ الٰہیہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ بندے تو اللہ کے سب ہی ہیں، مگر اس کے بندوں میں سے جو اللہ کے جاننے والے ہیں اُنہی کو اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ علماء سے کون سے علماء مراد ہیں۔ اصحابِ ظاہر کہتے ہیں کہ یہی علماء مراد ہیں جن کا پیشہ درس و تدریس ہے، مگر یہ غلط ہے۔ علماء سے مراد وہی لوگ ہیں جو حقیقت شناس اور معرفت کوش ہوں۔ یوں تو علماء بکثرت ہیں، مگر ان کو اللہ کا خوف نہیں۔ ان کے دلوں میں خشیۃ اللہ متمکن نہیں۔ علم کے بعد تقویٰ لازم ہے، مگر وہ متقی نہیں، اس لئے شیخ سہروردی نے معارف کے تیسرے باب میں لکھا ہے کہ جو اللہ کا خوف نہ کرے اس کا علم نادار ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عالم ربانی وہ شخص ہے جو شرک نہ کرے۔ حرام کو حرام اور حلال کو حلال سمجھے۔ قوانینِ الٰہیہ کی پابندی کرے اور یقین رکھے کہ اللہ سے ضرور ملنا ہے وہ تمام کاموں کا حساب لے گا۔ حسن بصری نے یہی آیت پڑھی۔ ابن مسعود نے فرمایا کثرتِ احادیث بیان کرنا علم نہیں ہے۔ علم یہ ہے کہ بہت زیادہ اللہ سے خوف کرے۔ امام مالک نے فرمایا روایات کی کثرت علم نہیں۔ علم ایک نور ہے جس کو اللہ اپنے بندے کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ مسروق نے فرمایا خشیت (ہر خوف کو نہیں کہتے) اس کو کہتے ہیں جو گناہ کرنے سے روکے۔ مسروق کی یہ تشریح ناقابلِ انکار ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عالم تین قسم کے ہوتے ہیں ۱۔ عالم بامر اللہ یعنی اللہ کے احکام کو جاننے والا ۲۔ عالم باللہ یعنی وہ شخص جس کو ظاہری حلت اور حرمت کا تو علم کم ہو یا نہ ہو، مگر اللہ کے جلال سے واقف ہو اور اس کی شانِ کمال کا عارف ہو۔ ۳۔ عالم باللہ و بامر اللہ یعنی ظاہر و باطن کا جامع۔ قسم اول اللہ سے نہیں ڈرتا قسم دوم کچھ ڈرتا ہے اور قسم سوم واقعی آیت کا مصداق ہوتا ہے اور وہی مراد بھی ہے۔ یہی درجہ اس حکمت کا ہے جس کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق حضور نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جانتا اور اس کا خوف رکھتا ہوں (بخاری و مسلم)

درحقیقت خشیۃ ایک وقت آمیز خوف کو کہتے ہیں جس میں ایک طرح کی محبت ملی ہوتی ہے۔ جس طرح بچہ اپنے باپ سے ڈرتا ہے۔ اہل علم بھی اللہ سے اسی طرح ڈرتے ہیں۔ اللہ کی معرفت اور اس کی شانِ ربوبیت جاننے والوں کو اس کی طرف دوڑاتی ہے، مگر اس کی عظمت وکبریائی ڈراتی ہے۔ پس جس قدر علم زیادہ ہوتا ہے اسی قدر خوف بھی بڑھتا ہے۔ اسی لئے شیخ ابن عطاء نے فرمایا کہ خوف سے خشیۃ زیادہ کامل ہوتا ہے۔ خوف تو عوام کو ہوتا ہے اور خشیہ علماء کو۔

اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ۔ پس اللہ کا ہمہ گیر غلبہ اور محیط کل قدرت دیکھ کر اس کی شانِ ربوبیت نظر آتی ہے اور سارے ملک کی عاجزی، کوتاہی اور بے بضاعتی مشاہدہ کر کے اللہ کی شان کو عفو دکھائی دیتی ہے، اس لئے فرمایا کہ اللہ غالب اور غفور ہے۔

مقصود بیان

تمام عنصری پیداوار کے رنگ کا اختلاف آیت قدرت ہے، اس لئے اللہ کی ربوبیت، الوہیت اور توحید ثابت ہوتی ہے۔ آیت اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ الخ۔ دعوت دے رہی ہے کہ کائنات کی حقیقت، خواص اور کیفیات پر غور کرو۔ یہ ضمنی ترغیب ہے تجربہ طبعیات کی اور عنوان الفلکیات کی اور ندائے عام ہے اسرارِ کائنات کو معلوم کرنے کی، کوشش کرنے اور فوائد خلق کو جاننے کی سعی کرنے کے لئے۔ لفظ اِنَّمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہل عارف نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کے دل میں خشیہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس آیت سے عبرت پکڑنی چاہیئے ان علماء نما جاہلوں کو جو ظاہری شکل علماء کی رکھتے اور دینی کتابیں پڑھتے پڑھاتے کے باوجود کورے جاہل ہیں۔ منہیات کے ارتکاب سے ان کا علم ان کو نہیں روکتا، اوامر کی تعمیل پر ان کی دینی واقفیت آمادہ نہیں کرتی۔ درحقیقت وہ عالم نہیں جاہل ہیں۔ نیز سبق حاصل کرنا چاہیئے ان جاہل درویشوں، پیروں اور صوفیوں کو جو علوم دینیہ سے ناواقف ہونے کے باوجود معرفت کے مدعی ہیں اور علمائے حق کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ ایک تازیانہ ہے ان نیم ملاؤں کے لئے جو سائنس کی تحقیقات کیمکل اور فلکیل تحقیقات جغرافیائی ریسرچ اور مادیات کی تحلیل کو لغو ناکارہ بلکہ خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں وغیرہ۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ

جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک نماز پڑھتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے کچھ پوشیدہ اور

عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۝ لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ

ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اللہ سے غیر فانی تجارت کے امیدوار ہیں تاکہ اللہ ان کو ان کا ثواب پورا دیدے اور اپنے فضل سے زیادہ بھی دے

اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ۝ وَ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا

بلاشک وہ بخشنے والا قدردان ہے اور جو کتاب وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی ہے وہ برحق ہے اگلی کتابوں کی تصدیق

بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ۝

کرتی ہے یقیناً اللہ اپنے بندوں سے باخبر اور دیکھنے والا ہے

تفسیر

قانونِ حیات کی کتاب پڑھنی یعنی اس کو سمجھنا، اس پر غور کرنا، اس کا بار بار اعادہ کرنا، اس کو یاد کرنا، زندگی کے تمام مراحل طے کرنے کا چراغ ہے، مشعلِ راہ ہے۔ قانون کا علم جس قدر کم ہوگا اسی قدر لاپرواہی کے ساتھ خلافِ قانون حرکات کا صدور آدمی سے ہوگا اور دفعات قانون واقفیت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی خلافِ قانون قدم اٹھانے میں جھجک ہوگی۔ چونکہ دستورِ حیات وضع کرنے کا کام اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور آئین زندگی بنانے کا اسی کو حق بھی ہے (اس کو ہم بار بار اس کتاب میں لکھ چکے ہیں) اس لئے اس نے مختلف اقوام کی ہدایت کے لئے، مختلف زمانوں میں مختلف کتابیں اور صحیفے اتارے۔ پیغمبروں نے اللہ کے بھیجے ہوئے قوانین لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور سمجھائے، مگر ایک یا دو یا دس بیس مرتبہ کا پڑھانا سمجھانا کچھ روی سے برا

نہیں روک سکتا۔ جب تک کہ زیادہ سے زیادہ قانون کو یاد نہ کیا جائے اور نہ پڑھا جائے، اس لئے کلام الٰہی یا قانونِ آسمانی کی تلاوت بار بار کرنی اور بہت زیادہ تکرار کرنی لازم قرار پائی، لیکن یاد رکھو کہ قانون کا رخ صرف منفی ہی نہیں ہوتا۔ اس کا دوسرا پہلو مثبت بھی ہوتا ہے۔ وہ اگر بعض امور کی ممانعت کرتا ہے تو بعض امور کے کرنے کی پرزور ہدایت بھی کرتا ہے۔ دنیا کی یہ آبادی اجتناب سے ہی نہیں قائم رکھی جا سکتی۔ بعض امور کا ارتکاب بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ناجائز امور کے ترک کے ساتھ ضروری الوجود کاموں سے بھی دست کش ہو جائے تو دنیا صرف تخریب کا نام ہو کر رہ جائے تعمیر کہیں بھی نہ ہو، اس لئے اگر منہیات کو چھوڑنا ضروری ہے تو مامورات کو کرنا بھی واجب ہے، لیکن منفی اور منہی امور کو تو انگلیوں پر شمار کر لیا جاتا ہے جن سے اجتناب رکھنا ضروا نہیں۔ امور مثبت اور جائز امور کی تعداد تو غیر معدود ہے۔ کیا کرنا چاہیئے۔ یہ کوئی حصر کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ ہر شخص کی زندگی لاکھوں جزئی افعال سے معمور ہے۔ صرف کھانے پینے، کھلانے اور پہنانے اٹھنے اور بیٹھنے، سونے اور جاگنے اور ملنے ملانے کے تفصیلی احوال کے مفصل احکام بیان کئے جائیں تو بڑے بڑے دفتر سیاہ ہو جائیں، اس لئے بطور اختصار چند امور کو بیان کرنا اور جان لینا ضروری ہے۔ باقی تمام احکام انہیں کی شاخیں ہیں۔ انسان کا ذاتی عمل کیا ہے۔ مساوات، اخوت، تنظیم اور انکسار نفس کی عملی تعلیم ہے۔ اس کو کس قدر حصہ ملا ہے امیر اور امام کی اطاعت، قانون دان کی جاہل پر فضیلت، جسمانی ورزش، عظمتِ الٰہی کا عملی اور قولی اقرار، قانون کی کتاب کا کوئی قانون یا عبارت یاد کر کے اس کو پڑھنا اور تمام عالم سے خیال کو ہٹا کر تھوڑی دیر کے لئے محض قانون ساز کی ذات و صفات کا مطالعہ کرنا ان تمام چیزوں کی تکمیل آدمی کا فرض ہے۔ ان سب کا مجموعہ نماز کہلاتا ہے۔ پس نماز پڑھنا ایک قسم کی بدنی ریاضت بھی ہے، قلبی نورانیت بھی ہے، اخلاق کی طہارت بھی ہے اور روح کی نظافت بھی، اس لئے کتابِ الٰہی کی تلاوت اور یادداشت کے ساتھ نماز ادا کرنی بھی ضروری ہے۔ مگر صرف ہاتھ پاؤں اور زبان اور دل سے تو تکمیل فرض نہیں ہوتی۔ تعمیرِ انسانیت تو مالی قربانی کو بھی چاہتی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں کہ آدمی کی بدنی زندگی بغیر مال کے ممکن ہی نہیں۔ پس انسانی برادری کی تربیت اور نگہداشت کے لئے اپنے مال سے خود فائدہ اٹھانا نہ دوسرے کو فائدہ پہنچانا مقتضائے فطرت کے خلاف اور قانونِ عقل سے بغاوت ہے، اس لئے ظاہر اور باطن، علانیہ اور خفیہ اہلِ حق کو ان کے حقوق پہنچانے لازم ہیں۔ یہ ہے ایک مومن یا ایک راہِ انسانیت پر چلنے والے انسان کی تجارت اور سود مند تجارت۔ اس کا فائدہ غیر فانی ہے۔ جو انسان منشائے انسانیت کو کو پورا کرتا ہے انسان کا فاطر اس کو بہت کچھ دیتا ہے۔ جتنا آدمی دیتا ہے اس سے زیادہ اس کا صلہ اپنی مہربانی سے اس کو عنایت کرتا ہے۔ یاد رکھو کہ قوانینِ الٰہیہ کی شاخیں کتنی ہی ہوں اصول اوامر اور ضوابط نواہی بھی گوناگوں اور چند در چند ہوں، مگر یہ تینوں امور اصل الاصول ہیں۔ تعداد اور تحلیل میں فرق ہے، کیفیات میں اختلاف ہو، مگر راس المال ہر کتاب کا یہی ہے انہی امور کی قرآن نے تصدیق کی ہے۔ اصل قوانینی کتابیں بدل دی گئیں۔ مٹ گئیں، فرسودہ ہو گئیں۔ کچھ سے کچھ بنا دی گئیں، مگر قرآن نے آ کر ان سب کو زندہ کر دیا۔ پس قرآنی ہدایت کو ماننا اس پر چلنا اور زندگی کے لئے اس کو رہنما سمجھنا لازم ہے۔ گویا قرآن کو ماننے والا تمام الہامی کتابوں کو مانتا ہے اور اس پر عمل کرنے والا ہر آسمانی کتاب پر چلتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ۔ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہے۔ قرآن کی تلاوت صرف زبان سے بھی ہوتی ہے اور صرف دل سے بھی اور دل و زبان دونوں سے بھی۔ تلاوت کا اصل مقصد قانونِ الٰہی کو جاننا اس کو سمجھنا اور یاد رکھنا ہے اور اس مقصد کے پیشِ نظر زبان کی تلاوت کافی نہیں۔ اسی لئے زبان و دل دونوں کی تلاوت ضروری ہے پس کلامِ الٰہی کو بار بار پڑھنا اور سمجھنا قابلِ مدح فعل ہے اور شاید اس جگہ یہی مراد بھی ہے۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ۔ نماز میں روحانیت کی پاکیزگی، معرفت اور مطالعۂ ذات و صفات۔ بہت امور ایسے ہیں جن کا تعلق انسانی معاشرت اور سماج کی اصلاح سے ہے۔ اس لئے قانون کو سمجھنے اور یاد رکھنے کے بعد نماز کا درجہ سب سے پہلے ہے۔ اقامۃ الصلوٰۃ کے یہ معنی ہیں کہ نماز میں صحیح ارکان کو ادا کیا جائے۔ خیالات کو یکسو رکھا جائے، [illegible] ہو، پابندیٔ وقت کے ساتھ ہو یعنی ایسی نماز ہو جو اللہ کو محبوب اور مرغوب ہو۔

وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً۔ مال کو خرچ کرنے کے بغیر معاشرت درست ہو سکتی ہے نہ باہم ملاپ ہو سکتا ہے نہ دنیوی کام ہو سکتے ہیں۔ نہ ارکانِ الٰہی کی تکمیل ہو سکتی ہے نہ [illegible] ہو سکتا ہے نہ اعتقادی اصلاح [illegible] ہو سکتا ہے۔ [illegible] نظامِ عالم قائم ہو سکتا ہے۔ اس لئے صرف خرچ کرنا ضروری ہے۔ لیکن کتنا اور کیسے خرچ کیا جائے۔ اگر اپنا کل مال خرچ کر دے تو کوئی بات ہے کہ اگر آئندہ اس کو مال نہ ملا تو سوال

ضرورت واسطے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اللہ پر توکل کے بہانے سے متوسط حوصلہ والوں کا کل مال خرچ کر دینا حماقت ہے اور آئندہ کو ندامت ہے۔ اسلام فضول خرچ یا برباد کرنا نہیں سکھاتا۔ قرآن کی تعلیم میانہ روی اور اعتدال کی ہے۔ نہ کنجوس ہو نہ برباد کرو۔ کچھ رکھو کچھ دوسروں کو دو۔ اسی لئے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ فرمایا۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ آدمی کے پاس جو مال ہوتا ہے وہ اس کا پیدا کیا ہوا یا خود آوردہ نہیں ہوتا۔ لوگ بے وقوفی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارے دماغ یا بازو کی پیداوار ہے۔ درحقیقت کل مال خدا داد ہوتا ہے۔ آدمی کے ہاتھ پاؤں اور جسمانی اعضاء اس کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں۔ آدمی حقیقت میں مال کا اصل مالک ہی نہیں ہوتا۔ ہر چیز کا مالک اللہ ہے وہ اپنی عنایت سے جس کو جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اس لئے رزق دینے کی نسبت اپنی جانب کی۔ پس دینا والا حقیقت میں خدا ہے، آدمی دینے کا ایک ذریعہ اور مشین ہے۔ اس پر بھی اگر وہ کنجوسی کرے تو کتنی بڑی غلطی ہے۔ کسی کو دینے کی دو صورتیں ہیں (۱) خفیہ چھپا کر۔ (۲) علی الاعلان ظاہر طور پر۔ اول صورت بہت اچھی ہے، لیکن اگر کوئی مال دار آدمی راہِ خدا میں مال ہمیشہ چھپا کر دے اور کسی سے نہ کہے تو دوسرے لوگوں کو ترغیب نہ ہو سکے گی۔ اور لوگ کہیں گے کہ جب اتنا بڑا مال دار آدمی کسی کو کچھ نہیں دیتا تو ہم جب کہ ہمارے پاس اس کے برابر مال بھی نہیں ہے کیوں کسی کو کچھ دیں۔ اس لئے بعض اوقات کھلم کھلا خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض صورتیں ایسی سامنے آجاتی ہیں بلکہ آتی رہتی ہیں کہ ان میں خفیہ خرچ ممکن ہی نہیں ہوتا، جیسے گھر، بیاہ، کھانا، غلام، بیوی بچے اور دوسرے تمام مستحقوں کو چھپا کر ہی دینا کیسے ممکن ہے، اس لئے دونوں طرح سے دینا قابلِ مدح ہے۔

يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ۔ تجارت میں سب سے پہلے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے پھر خریدا ہوا مال فروخت کیا جاتا ہے۔ کبھی نفع ہوتا ہے کبھی نقصان۔ نقصان ہونے کی صورت میں اصل راس المال بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ یہی تجارت کی تباہی ہوتی ہے، لیکن ہوشمندی کے ساتھ اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر تعلیمِ قرآنی کے موافق جو لوگ خرچ کرتے ہیں وہ کبھی ضرور کچھ خریدتے ہیں بلکہ اللہ کی راہ میں ہاتھ پاؤں دل و دماغ اور مال سے جو کوشش کرتے ہیں وہ سب ایک قسم کا بیوپار ہے جس میں نقصان کا اندیشہ ہی نہیں۔ یہ تجارت کبھی تباہی انگیز نہ ہوگی۔ اللہ پورا پورا نفع آخرت میں دیگا جس کی مقدار دس گونہ سے لے کر سات سو گونہ تک احادیث میں بیان کی گئی ہے بلکہ:

وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ اس سے بھی بڑھ کر اپنی مہربانی سے جس کو جو کچھ چاہے گا عنایت کرے گا۔ اس کے فضل کی کوئی حد نہیں۔ خطیب نے تفسیر سراج میں اس آیت کی تشریح میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ فضل کی زیادتی سے مراد وہ نعمت ہے جس کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور شاید اس سے دیدارِ الٰہی مراد ہو۔

- اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ باوجود انتہائی کوشش، اخلاص اور حسنِ نیت کے آدمی سے پھر بھی کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اعمالِ خیر کی تکمیل سے آدمی عاجز ہو ہی جاتا ہے۔ دانستہ نادانستہ حدودِ شرعی سے نکل ہی جاتا ہے، مگر ایسی صورت میں اللہ اس کی گرفت نہیں کرتا معاف فرما دیتا ہے اور خلوص کے ساتھ قلیل عمل کیا جائے تو اس کو بھی قدر کے ساتھ قبول فرما لیتا ہے یعنی وہ غفور شکور ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ۔ گزشتہ آیات کے آغاز میں کتاب پڑھنے والوں کا تذکرہ مدحیہ انداز میں فرمایا تھا۔ پھر کتاب پڑھنے والوں کے خصوصی اوصاف بیان فرما کر نتیجہ ظاہر کیا تھا جس سے فی الجملہ یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ آسمانی کتاب کا نزول ناممکن نہیں بلکہ واقعی ہے۔ اب اسی آسمانی کتاب یعنی قرآن کی حقانیت کی دو دلیلیں بیان فرماتا ہے (۱) یہ کتاب جو وحی کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کو عطا کی گئی ہے یعنی شیطانی وحی نہیں ہے رحمانی ہے۔ اختراع و رائی نہیں ہے آسمانی ہے۔ پوری کتاب یعنی الفاظ و معانی کا مجموعہ ربانی اور الہامی ہے اور سچا ہے (حق بمعنی صادق) اس میں غلطی اور کجی نہیں۔ مطلب یہ کہ اس کے قوانین اور ضوابط راہِ راست پر چلانے والے، زندگی کو سدھارنے والے، سعادت مند اور فائز المرام بنانے والے ہیں۔ فساد اور تباہی کو مٹانے والے، امن و عافیت پھیلانے والے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب اس کے ضوابط و ہدایات انسانی سعادت کے واحد کفیل ہیں۔ تو اس کی صداقت حقانیت اور واجب العمل ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۲) ہر آدمی کا دماغ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر قوم کا میلانِ طبع دوسری قوم سے جدا ہوتا ہے۔ ہر زمانے کا رنگ دوسرے زمانے سے مغایرت رکھتا ہے اسی وجہ سے افکار، خیالات، قومی رسوم اور معاملات میں فرق ہوتا ہے، لیکن آسمانی کتابیں سب ایک خدا کی بھیجی ہوئی

پڑتی ہیں۔ ان میں باہم اصولی اختلاف نہیں ہوتا۔ فروعی اختلاف تو اقتضاء زمانہ کے اختلاف کے سبب ہو سکتا ہے بلکہ ضروری ہے۔ بنیادی مغایرت ناممکن ہے۔ اور کسی الہامی کتاب کی صداقت کو جانچنے کا یہی معیار ہے کہ وہ دوسری آسمانی کتابوں کی تکذیب نہ کرتی ہو اور اس کے پیش کردہ اصول سے مغایر نہ ہو۔ اب قرآن کا صحیح مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام گزشتہ صحیح آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ ان کو برحق کہتا ہے ان کے قوانین اور اصول کو صحیح بتاتا ہے۔ اس کی اصولی تعلیم ان کی تعلیم کے موافق ہے جس سے نمایاں طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قرآن بھی آسمانی کتاب ہے۔ لیکن

اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ۔ جب پہلے کتابیں بھیج دی گئیں۔ یاددداشتیں اور ہدایت نامے بھیج چکے تو مزید کتاب کی کیا ضرورت تھی؟ اس خبہ کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب باخبر ہے اور خوب ان کو دیکھ رہا ہے یعنی وہ ان کی ضروریات سے واقف ہے۔ جب آخری دور میں حفظ و عظ و نصیحت کرنے والے پیغمبروں کا بھیجنا مفید نظر آیا اور کتاب ہی بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے قرآن نازل کیا۔ بات یہ ہے کہ اہل کتاب نے اپنی خواہش اور میلان طبع کے موافق اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں میں تبدیلیاں کریں اور صرف معانی میں ہی تغیر تبدل اور توڑ مروڑ نہ کی بلکہ الفاظ بھی بدل ڈالے اور تحریف کتاب کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکمران افراد یا جماعتیں جب اپنے مطلب کے موافق کتاب کو بگاڑ دیتیں اور تبدیل کردہ نسخوں کو صحت کا جامہ پہنا کر پبلک کے سامنے لانا چاہتیں تو تصدیق اور ثبوت کے لئے علماء سے دستخط کراتی تھیں۔ علمائے سوء تو بلا تامل دستخط کر دیتے تھے اور علمائے حق اپنی جانیں بچانے کے لئے روپوش ہو جاتے۔ یہاں تک کہ بعض اہل حق جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں عزلت نشین بن جاتے تھے۔ ابن الجوزی نے کتاب الاذکیاء میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم سے تحریف کردہ نسخہ کی تصدیق کرانے کے لئے حکومت نے دستخط کرانے کی کوشش کی اور اتنا مجبور کیا کہ بصورت انکار اس کو اپنی جان کا خوف ہو گیا تھا۔ اس حق پرست عالم نے جان بچانے کے لئے یہ چالاکی کی کہ صحیح کتاب کے پہنا معلق اپنے سینہ پر کپڑوں میں چھپا لئے اور جب عام مجمع میں دستخط کرانے کے لئے اس کو بلایا گیا تو اس نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں اور یہ سچی کتاب ہے۔ اس تدبیر سے اس غریب کی گلوخلاصی ہوئی

پس جب اصل آسمانی کتاب صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی، مٹ گئی اور انسانی تصنیفات و تحریفات نے ان کی جگہ لے لی تو انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اور ان کو سعادت سے ہمکنار کرنے اور امن عالم کو قائم رکھنے کے لئے صحیح آسمانی کتاب اور ہدایات کی ضرورت پڑی۔ اللہ کی نظر میں تو سب آدمی برابر ہیں سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اسی کے بندے ہیں۔ صحیح کتاب حاصل کرنے اور اس پر چلنے کا پہلے آدمیوں کو ہی حق نہ تھا پیچھے آنے والی نسلیں بھی برابر کا حق رکھتی ہیں۔ اللہ کو اپنے آئندہ بندوں کے استحقاق اور دنیاوی زندگی کا بخوبی علم تھا۔ اس لئے اس نے صحیح اصلی کتاب زمانے کے اقتضاء کے پیش نظر پھر بھیجدی اور اسی کا نام قرآن ہے۔ قرآن اصولی طور پر بعینہٖ تورات، انجیل اور زبور ہے۔ فرق صرف کیفیات، زمانیات اور مصالح کا ہے۔ اسی بنا پر قوانین میں کچھ تغیر ہے ورنہ اصل سب کی ایک ہی ہے۔

مقصودِ بیان

کتاب اللہ کی تلاوت ضروری ہے۔ بے فائدہ نہیں۔ یعنی سمجھ کر غور کر کے اس کو بار بار پڑھنا اور یاد کرنا چاہیئے۔ بدنی عبادت اور مالی مناسب خرچ، مذہب سماوی کے بنیادی پتھر ہیں، لیکن کل مال خرچ کر دینا اور خیرات کر دینا مناسب نہیں۔ اپنی ذاتی اور خانگی ضرورتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ اس بات کا خیال بھی لازمی ہے کہ تمام مال خداداد ہے۔ بندہ اس کا حقیقی مالک نہیں ہے۔ یہ اس کی عنایت ہے کہ اسے تصرف کرنے کا مجاز کر دیا ہے۔ پس قرآنی نظر کے مطابق مال کا حقیقی ملک حقیقۃً کوئی بھی نہیں نہ فرد نہ جماعت صرف اللہ ہے وہ جیسا حکم دے ویسا ہی صرف کرنا چاہیئے۔ یَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ کے الفاظ کا عموم بتا رہا ہے کہ آخرت میں تو جو کچھ فضل الٰہی ہو گا وہ ہو گا دنیا میں بھی صحیح مصرف پر خرچ کرنے سے تباہی اور مال کی بربادی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی ہوتی ہے۔ اللہ اپنی مہربانی سے اور زیادہ دیتا ہے ظاہر میں کمی دکھتی ہے اگرچہ غیب سے مال میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ھُوَ الْحَقُّ سے قرآن کی سچائی ظاہر ہوتی ہے اور اس کی افادیت ضرورت اور موجب سعادت ہونے پر روشنی پڑتی ہے مِنَ الْکِتٰبِ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کتاب یعنی الفاظ اور معانی کا مجموعہ آسمانی ہے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو معانی کو الہامی اور الفاظ کو انسانی خیال کرتے ہیں بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ معانی کا القاء بغیر الفاظ کے ناممکن ہے، اس لئے الفاظ کا الہامی ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی وجہ سے لفظ کتاب استعمال کیا گیا۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ سے یہ استخراج نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن سے پہلے جتنی غلط سلط تحریف کردہ کتابیں آسمانی کتب کے نام سے پیش کی گئیں، قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ اہل کتاب پر جو آسمانی کتابیں پہلے نازل کی جا چکی ہیں قرآن ان سب کو حق بتاتا ہے۔ ان کو قوانین آسمانی کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ گویا مذہب اسلام قدیم ہے کوئی نیا مذہب نہیں۔ توحید، رسالت، قیامت، حشر جسمانی، جنت دوزخ، جزا سزا، وجود ملائکہ، انبیاء، بدنی ریاضت، مالی صرف اور دوسرے امور خیر، تمام کتابوں کا مشترک سرمایہ ہے۔ قرآن بھی انہی امور کو پیش کرتا ہے۔ قرآن چیزوں کی سچائی کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ قرآن کی سچائی کی دوسری دلیل ہے۔ اس سے فی الجملہ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ آسمانی کتابوں میں بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ انسان کے خود ساختہ قوانین میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ اسلام تمام آسمانی مذاہب کا احترام کرتا اور ان کے وقت میں ان کو صحیح کہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی احوال، ضروریات وقت اور اقتضاء مصلحت کے پیش نظر اللہ کتاب نازل فرماتا ہے اس کو معلوم ہے کہ کب اور کیسی کتاب کی ضرورت آدمیوں کو ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ اللہ اپنی عنایت سے قوانین ہدایت عطا کرتا ہے۔ پس بد قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے دماغی زائیدہ اور اختراع کردہ ضوابط پر عمل کرتے اور قوانین الٰہی کو لیٹے استغفار سے عدم ضرورت کا بہانہ کر کے ٹھکرا دیتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ وغیرہ۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ

پھر ہم نے قرآن اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو دیا جن کو ہم نے منتخب کر لیا ان میں کوئی تو اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی درمیانی چال چل رہا ہے

وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ

اور کوئی بحکم خدا نیکیاں لے کر آگے بڑھ رہا ہے یہی بڑا فضل ہے جنتیں ہیں جن میں

یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ۝ وَقَالُوا

یہ داخل ہوں گے وہاں ان کو سنہری کنگن اور موتیوں کا زیور پہنایا جائے گا اور اُن کا لباس وہاں ریشم کا ہوگا اور کہیں گے

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ

اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا ہمارا رب بلاشک بخشنے والا قدر دان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے سدا رہنے

مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ

کے گھر میں فروکش کیا جہاں ہم کو نہ کچھ تکلیف ہوگی نہ کسی قسم کی تکلیف ہوگی اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے لیے

نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ

جہنم کی آگ ہوگی نہ تو اُن کا کام تمام کر دیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ عذاب النار (جہنم) اُن کے لیے تخفیف ہوگی ہر ناشکر کو ہم یوں ہی

كُلَّ كَفُوْرٍ ۝ وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ

سزا دیتے ہیں اور وہاں چلائیں گے ہمارے رب ہم کو نکال تاکہ ہم جو اعمال کرتے تھے ان کے خلاف نیک عمل کر لیں

أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ﴿٣٧﴾

ع ۱۱ ۱۶

(حکم ہوگا) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں جس کسی کو سوچنا ہو سوچ لے اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا اب مزہ چکھو ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

تفسیر جب اللہ اپنے بندوں کو ہدایت کرنی چاہتا ہے تو اپنا پیام کسی صحیفے یا کتاب کی شکل میں بھیجتا ہے۔ نزول کتاب کے بعد آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں۔ اول گروہ تو وہ ہوتا ہے جو اس کتاب کی حقانیت وصداقت سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ گروہ جہنمی ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ کتاب کو سچا اور برحق مانتا ہے، مگر کتاب کے موٹے موٹے بعض عملی قواعد پر بھی عمل نہیں کرتا۔ ہدایت نامے کے اوامر ونواہی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہ گروہ نجات سے بالکل محروم تو نہیں ہوتا مگر ظالم ضرور ہوتا ہے۔ سعادتِ اخروی کا حصہ اس کو ملے گا مگر کم۔ تیسرا گروہ درمیانی چال چلنے والا ہوتا ہے۔ کتاب کی صراحت کردہ ہدایتوں پر چلتا ہے۔ اوامر ونواہی کی پابندی کرتا ہے مگر کبھی اس سے فروگذاشت بھی ہو جاتی ہے۔ یہ گروہ معتدل ہوتا ہے۔ اللہ سے امید ہے کہ اس کی فروگذاشت کو معاف فرما دے۔ چوتھا گروہ برائیوں اور گناہوں سے بھاگنے والا نیکیوں اور بھلائی کی طرف دوڑنے والا ہوتا ہے یعنی اول تو فطرت ہی نیکی کی طرف مائل اور شر سے متنفر ہوتی ہے۔ دوسرے کتاب اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ پس وہ نیکیوں کا پیش رو ہو جاتا ہے۔ یہی گروہ صاحبِ فضلِ کبیر ہے۔

تحلیلِ اجزاء ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء پر کتابیں اور صحیفے اتارے گئے۔ ہر کتاب کے بعد دوسری کتاب یا صحیفہ بھی بھیجا گیا۔ سب کے آخر میں قرآن پاک نازل ہوا۔ واجب البیان دو باتیں ہیں۔ ۱۔ اسلام سے پہلے قرآن نازل نہیں کیا گیا تھا۔ پھر کتاب یعنی قرآن کی میراث ملنے کے کیا معنی؟ میراث تو وہ چیز ہوتی ہے جو کسی میت کا ترکہ ہو۔ قرآن گزشتہ انبیاء یا پارینہ اقوام کا ترکہ نہیں پھر سلسلۂ توارث جاری ہونے کا کیا مطلب؟ ۲۔ وارثین کن لوگوں کو دیا گیا وہ کیسے تھے جن کو قرآن کا وارث بنایا گیا؟

نمبر اول کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آسمانی کتابیں اصول میں باہم مختلف نہ تھیں۔ تمام گزشتہ صحیفوں اور کتابوں میں جن اصول کی تعلیم دی گئی تھی انہیں اصول کی تعلیم قرآن نے دی۔ پس قرآنی توارث سے مراد ہے اس تعلیم کا توارث جو سابقہ کتابوں نے دی تھی۔ قرآن کے اصول گزشتہ کتابوں میں بیان کئے گئے تھے۔ گویا ان میں بھی قرآن کی تعلیم دی گئی تھی۔ فروعی طور پر جو نقصان تھا اس کی تکمیل مکمل قرآن کے نازل ہونے سے ہوگئی۔

نمبر دوم کے متعلق زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ امتِ مسلمہ امتِ معتدلہ ہے اس کو امتِ وسط کہا گیا ہے جس طرح حضور خاتم النبیین کو دوسرے انبیاء پر فضیلت حاصل ہے اسی طرح اس امت کو دوسری تمام امتوں پر برتری حاصل ہے۔ پس قرآن پاک بطور توارث گزشتہ امتوں سے لے کر اس امت کو عطا کیا گیا ہے اور ساری امت کو یہ سربلندی حاصل ہوئی ہے، مگر عقائد کی پختگی اور ضعف، اعمال کی صلاحیت وفساد اور اقوال کی صحت غلطی کے اعتبار سے تمام افراد ایک سے نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک کا ظرف اور حوصلہ جدا ہے۔ پھر ہر ایک کے متعلق اللہ کا حکم مختلف ہے، اس لیے علم، عمل اور نتیجہ میں بھی اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے:۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ۔ جن لوگوں کو اللہ نے منتخب فرما کر قرآن عطا کیا تھا (یعنی امتِ مومنہ) اس آیت میں ان کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ۱۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ (۲) وہ لوگ جو درمیانی چال چلتے ہیں۔ (۳) وہ لوگ جو نیکیوں کی جانب بڑھتے ہیں۔

نمبر اول کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ لوگ امتِ محمدیہ میں داخل نہیں ہیں اور اسلام سے قطعاً خارج ہیں۔ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے اس کی تغلیط کی ہے اور صراحت کی کہ تینوں اقسام امتِ مومنہ کے ہی ہیں۔ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ کو امتِ مومنہ سے خارج قرار دینا احادیث کی روشنی میں بھی غلط ہے، ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ حضور والا نے آیت ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا الخ تلاوت کر کے فرمایا یہ سب آدمی بمنزلۂ واحد ہیں اور سب جنتی ہیں۔ (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح وقد رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم۔ ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ حضور والا نے آیتِ مذکورہ پڑھ کر فرمایا سابقین بے حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور جو مقتصد ہیں ان کا حساب آسان ہوگا وہ درازی محشر میں روکے جائیں گے پھر اللہ اپنی رحمت سے اُن کی تلافی

فرمائے گا۔ الخ۔ (رواہ ابن ابی حاتم واحمد والطبرانی والحاکم) اسامہ بن زید نے فرمایا کہ آیت فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ کے متعلق سرکار نے فرمایا یہ سب آدمی اسی امت مسلمہ کے ہیں۔ (طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی) عوف بن مالک کی روایت ہے حضور والا نے فرمایا میری امت کے تین گروہ کئے جائیں گے۔ ایک تہائی بلاحساب کتاب جنت میں داخل ہوگا۔ ایک تہائی کا حساب آسان ہوگا پھر جنت میں جائے گا۔ ایک تہائی کو معاف کیا جائے گا پھر ملائکہ عرض کریں گے کہ ہم نے ان کو لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک کہتے ہوئے پایا۔ اللہ خوب سے وہ فرمائے گا۔ ہاں یہ سچ کہتے ہیں کہ میرے سوا کوئی اللہ نہیں ان کو لا الٰہ الا اللہ کہنے کے عوض جنت میں داخل کرو الخ۔ عوف بن مالکؓ راوی نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا اس کی تصدیق سورۂ فاطر میں موجود ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا۔ الخ (رواہ ابن ابی حاتم والطبرانی) احادیث مقدسہ کے علاوہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے بھی ان تینوں گروہوں کا مسلم ہونا ثابت ہوتا ہے تفصیل موجب تطویل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تینوں گروہوں کی تقسیم عملی طور پر کس طرح ہوئی اور ہر گروہ کے کیا امتیازات وخصوصیات ہیں اور ہر گروہ کی حدبندی کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وہ گروہ ہے جن سے بعض واجبات کو ادا کرنے میں قصور ہوا ہو اور سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ وہ لوگ ہیں جنہوں نے واجبات اور مستحبات کا احاطہ کرلیا ہو اور مکروہات ومحرمات سے الگ رہے ہوں۔ حسن بصری نے فرمایا ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وہ ہے جس کی برائیاں نیکیوں پر غالب ہوں۔ مُقْتَصِدٌ وہ ہے جس کی نیکی اور بدی برابر ہو اور سَابِقٌ وہ ہے جس کی نیکیاں غالب ہوں۔ مقاتل نے فرمایا ظَالِمٌ وہ ہے جو اعتقاد توحید کے باوجود کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو۔ مُقْتَصِدٌ وہ ہے جس نے کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور سابق وہ ہے جس نے اعمال صالحہ کی جانب سبقت کی ہو۔ سہل بن عبداللہ نے فرمایا ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ جاہل ہے۔ مُقْتَصِدٌ وہ ہے جو علم حاصل کرتا ہے اور سابق وہ ہے جو عالم ہو۔ شیخ ذوالنون مصری نے فرمایا ظالم وہ ہے جو صرف زبان سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔ مُقْتَصِدٌ وہ ہے جو دل سے اللہ کو یاد کرتا ہو اور سَابِقٌ وہ ہے جو کسی وقت اپنے رب کو نہ بھولتا ہو۔ شیخ انطاکی نے فرمایا صرف صاحب اقوال ظالم ہے، صاحب اعمال مقتصد ہے اور صاحب اقوال سابق ہے۔

اسی طرح اور بہت تفسیری اقوال ہیں جن کو ذکر کرنا موجب طوالت ہے۔ ان تمام اقوال میں تقریباً ایک جز مشترک ہے یعنی ظالم کا صاحب کبیرہ ہونا مگر اکثر بڑے بڑے صحابہ کا قول ہے کہ صاحب کبیرہ وہ ہے جو صغیرہ کا مرتکب ہو۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عائشہؓ کا یہی مسلک ہے بلکہ ایک مرتبہ کسی سائل کے جواب میں حضرت عائشہ نے ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کی شکل میں اپنی ذات گرامی کو پیش کیا تھا (ابو داؤد عن عقبۃ بن صہبان الہنائی)

میرے نزدیک ان تمام اقوال سے بہتر حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہے جس کو علی بن ابی طلحہ نے نقل کیا ہے کہ ظالم کی مغفرت اللہ فرمائے گا اور جو مقتصد ہے اس کا حساب آسان ہوگا اور جو سابق ہے وہ بے حساب جنت میں جائے گا۔ اور شاید یہی مراد ہے اس شخص کی جس نے کہا کہ ظالم وہ ہے جو امید مغفرت پر چھوڑا گیا۔ اللہ کو اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ مقتصد وہ ہے جس کے نیک اور بد اعمال مخلوط ہوں اور سابق وہ ہے جو مخلص ہو شیخ نسفی نے تفسیر مدارک میں اس قول کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تینوں اقسام اللہ نے گیارہویں پارہ میں خود بیان فرمادیے۔ سابق کے متعلق فرمایا وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الخ اور اس کے بعد مقتصد کے متعلق فرمایا وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا پھر ظالم (امیدوار مغفرت) کے متعلق فرمایا وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ الخ۔ احمد، طبرانی، ابن ابی حاتم، اور حاکم نے ابو درداءؓ کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے جس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں اس سے بھی ابن عباس کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؕ یعنی ظالم ہونا یا مقتصد یا سابق ہونا سب اللہ کے ارادے سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے ارادہ اور مشیت سے اس امت کو عطائے قرآن کے لئے منتخب فرمایا اور پھر اس کے تین درجات قائم کئے اور تمام گزشتہ اقوام کی میراث امت مسلمہ کو عطا فرمائی۔ یہی فضل کبیر ہے کہ سارا گزشتہ علمی ذخیرہ مع تکمیل زیادتی کے قرآن کی شکل میں اس امت کو دے دیا اور اس کو وارث بنادیا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ کھانے پینے کے بعد آدمی کے لئے سب سے زیادہ ضروری جاذب توجہ لباس اور لباس کے بعد جسمانی آرائش ہے الناس باللباس نقل مشہور ہے۔ حسن وجمال کی جلوہ باری اور بدصورتی کی پردہ پوشی

کپڑے سے ہی ہوتی ہے۔ آدمی انسانی ماحول میں رہتے ہوئے، غیر مادی دماغ نہیں رکھتا اور نہ ان روحانی پُر کیف لذتوں کی اصل تصویر کو دیکھ سکتا ہے جس کا
حقیقی عکس انسانی دماغ پر پڑنا ناممکن ہے۔ اگر آدمی غیر مادی حقائق اور مجرد موجودات کی قریب حقیقت حالات کو سمجھ سکتا ہے تو صرف مادی لباس میں
ملبوس دیکھ کر اور معقول کو محسوس کی شکل میں پا کر۔ یہی وجہ ہے کہ جنت اور دار الثواب کی حقیقی کیفیت تو یہی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے
سنی نہ کسی دماغ میں اس کا تصور ہوا، مگر جنت کی نعمتوں کا بیان بھی ضروری ہے ورنہ نیکی کی رغبت کس طرح جذبۂ ایمان میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ہر انسان
کے تخلیقِ قوام کے بیشتر عناصر یہی مادی جذبات ہیں۔ نیکی کو جزا سے بے نیاز رہتے ہوئے کرنا فطرتِ انسانیہ کے خلاف ہے۔ پس اخروی لذتوں کا
کسی قدر اظہار لازم ہے۔ لباس کی وضع اور ہیئت کچھ بھی بنالی جائے، انسانی صنف جس صورت کا لباس چاہے بنالے اس سے قیمت میں تفاوت
کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اصلی امتیازی چیز کپڑے کے تخلیقی اجزا ہیں۔ شیروانی، کوٹ، پاجامہ، پتلون، کرتہ، غرض مختلف اشکال کے کپڑے مختلف
اشخاص کی طبعی یا رواجی پسندیدگی کا اظہار ضرور کرتے ہیں، مگر قیمتوں کے کچھ زیادہ تفاوت کو نہیں بتاتے۔ ہاں کپڑے کی قیمت اور کمی بیشی کا مدار جنسیت
کے اختلاف پر ہے۔ سوتی، اونی یا مخلوط یا ریشمی کپڑا جدا جدا قیمت رکھتا ہے۔ کپڑے کی ساخت کی سب سے اعلیٰ قسم ریشم ہے۔ قدرتی
پیداوار میں کپڑے کی قوامی جنس حریر سے بڑھ کر کوئی اور موجود نہیں، اس لئے اگر اہلِ جنت کے لئے کوئی خارج از تصور لباس ہوگا اور ضرور ہوگا تو اس کو
دنیوی کپڑے میں ریشم ہی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جسمانی آرائش کی چیزوں (زیور) کی تیاری چاندی، سونے، پیتل، کانسی، مختلف جواہرات اور موتیوں
سے ہوتی ہے، مگر معدنیات منطرقہ میں جو قیمت سونے کو اور غیر منطرقہ میں جو قدرتی موتی کو حاصل ہے وہ کسی دوسری چیز کو نہیں، اس لئے جسمانی آرائش
کیا، اگر اعلیٰ ترین کوئی چیز آدمیوں کی زبان میں کوئی چیز کہی جا سکتی ہے تو وہ سونا اور موتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہلِ بہشت ہر طرح کے کسبی اور صنعتی زیب
و آرائش سے آراستہ ہوں گے۔ ان کا لباس ریشم کا اور سجاوٹ کا زیور سونے اور موتی کا ہوگا۔

نوٹ بعض فریب خوردگان مادہ محسوس پرست اشخاص قرآن کے ترغیبی انعامات کو مضحکہ انگیز سمجھتے اور قابلِ اعتراض خیال کرتے ہیں اور حریر و زیور
کو غیر قبیح نظر سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ قرآن اپنے پیش کردہ نظریات و عقائد کی صحت اور افادی حیثیت کسی دلیل سے پیش نہیں کرتا بلکہ
ڈرا کر اور لالچ دے کر لوگوں کو ماننے پر مجبور کرتا ہے اور لالچ بھی وہ جس کو دنیا کے عقل مند قوتِ حیوانیہ کا پست ترین مظاہرہ جانتے ہیں۔ یہ بندگانِ
مادیت حقائقِ قرآنیہ سے ناواقف ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ غیر محسوس، ناقابلِ ادراک اخروی نعمتوں کی تصویر کشی بغیر مادی تمثیل کے کس طرح ممکن ہے اور جزا
سے بے نیاز ہو کر کون سا جاہل یا دانشمند آدمی نیکی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ فوائد دنیوی ہوں یا دوسری زندگی میں حاصل ہونے والے بہرحال فوائد ہیں
اور فوائد کے تصور کے بغیر افعالِ ارادیہ کا صدور ناممکن ہے۔ قرآن اگر جنت کی تصویر کشی سادہ عرفی محاورات میں کرتا ہے تو یہ ترغیب کا بدترین مظاہرہ
قرار دیا جاتا ہے۔ اور مادہ پرستوں کے بنائے ہوئے تمدنی قوانین اگر امنِ عام، تہذیب، دولت، آسائش اور فارغ البالی کے ذلیل ترین لالچ دے کر
اپنی حقانیت سادہ لوح انسانوں سے تسلیم کراتے اور بصورتِ انکار سخت ترین سزا کی دھمکیاں دیتے ہیں تو یہ صداقت کہلاتی ہے۔ یا للعجب۔
ریشمی لباس، سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار (اور وہ بھی محض رسمی اور زبانی حد تک، ورنہ واقع میں انسانی تصور سے بہت بلند) تو قوتِ حیوانیہ کے
انتشار کو پیدا کرنے کا ذلیل ترین سمجھا جاتا ہے اور میل آلود کھوٹے سکّے، جلد کو چھیل ڈالنے والے اونی ملبوس اور آگ سے پکی ہوئی مٹی کی اینٹوں سے
چنی ہوئی عمارتیں اور دوسرے بے حقیقت اسبابِ عیش پرستی، مدنیتِ فاخرہ کا بلند ترین معیار قرار دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے کی آنکھ کا تنکا (اور
وہ بھی اپنی کوتاہ نظری کی غلطی کا نتیجہ) تو ان کوتاہ نظر ضعیف البصر لوگوں کو دکھائی دیتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقولہ اس گروہ کا ہوگا جو گناہگار رہا ہوگا اور اللہ
اپنی رحمت سے اس کو معاف کر کے جنت میں داخل فرمائے گا۔ مگر آیت کا سیاق و سباق اس تخصیص سے انکار کرتا ہے اور اس قسم کی تفسیر بالحدیث
کا ثبوت صحیح روایات سے ملتا نہیں۔ بلکہ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ توحید کے تمام قائل یہ بات کہیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور
اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا لا الٰہ الا اللہ والوں پر کوئی وحشت نہیں نہ موت کے وقت نہ قبر میں نہ حشر نشر کے وقت۔ گویا کلمۂ توحید والوں کو میں دیکھ رہا ہوں
جب کہ صور کی آواز سے اٹھے ہیں اور اپنے سروں سے خاک جھاڑ رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (رواہ ابن ابی حاتم والطبرانی)

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ ابن عباسؓ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا وہ کیسا بڑا غفور ہے کہ بہت گناہوں کو معاف فرمایا اور کیسا بڑا شکور ہے (قدر دان) ہے کہ خفیف نیکیوں کو بھی قبول فرمایا۔ آیتِ مذکورہ میں حزن (خوف یا غم) سے کیا مراد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوف مراد ہو جو ہر مومن کے دل میں مرتے وقت رہتا ہے کہ خدا جانے کہ ایمان پر میرا خاتمہ ہوتا ہے یا نہیں اور معلوم نہیں کہ قیامت کے دن کیا حال ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قبر والے اُٹھنے کے بعد ہولناک منظر دیکھ کر جو ہیبت اور خوف و غم دلوں میں ہوگا اور جنت میں داخل ہونے کے بعد دور ہو جائے گا وہی حزن مراد ہو۔

اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ دار المقام سے مراد جنت عدن۔ یعنی نا قابلِ زوال قیام گاہ۔ مقصد یہ کہ اگر ہمارے اعمال جنت کے مستحق نہ تھے، مگر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو یہاں داخل فرمایا۔ صحیح حدیث ہے۔ حضور والاؐ نے فرمایا تم میں سے کسی کو اس کے اعمال جنت میں داخل نہ کریں گے صحابہ نے عرض کیا اور حضور کو فرمایا نہ میں۔ مگر اس وقت جبکہ اللہ اپنی رحمت اور فضل سے مجھے ڈھانک لے۔ (بخاری وغیرہ)

لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ یعنی جنت میں ہم کو نہ دکھ، رنج اور رنج پہنچا تو در کنار چھوئے گا بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جنت میں کوئی ناخوش گوار بات کبھی نہ پیش آئے گی، اسی لئے شداد بن اوسؓ نے فرمایا کہ ہر عذاب، تکلیف اور دکھ کو اللہ نے جہنم میں جمع کر دیا اور ہر طرح کی راحت، عیش، بھلائی اور خوبی جنت میں اکٹھی فرما دی۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ۔ اہلِ سعادت کے احوال اخروی گزشتہ آیات میں بیان کر دیے گئے، لیکن فرماں برداروں کے نتائج حسنہ کا اظہار کسی حکم پر وجوبی عمل کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ سرکشوں اور نافرمانوں کی دردناک سزا کی تصویر کشی نہ کر دی جائے۔ اسی لئے اہلِ سعادت کے احوال کو بیان کرنے کے بعد اہلِ شقاوت کی اخروی سزا کو آیت میں ظاہر کیا ہے۔

لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا الخ سے مراد یہ ہے کہ کسی طرح عذاب اور تکلیف سے کافروں کو رہائی نہ ہوگی۔ رہائی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ۱۔ عذاب کو دور کر دینا اور دکھ کو سکھ سے بدل دینا۔ ۲۔ عذاب بھگتنے والے کو قیدِ حیات سے رہائی دینا کہ نہ مریض رہے اور نہ مرض کی تکلیف۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے جہنم کے اندر کافروں کے لئے کوئی صورت نہ ہوگی نہ مریں گے نہ عذاب دور ہوگا۔ عذاب دور ہونا تو کیا عذاب میں تخفیف بھی نہ ہوگی۔ اور یہ سزا محض چند کافروں کو نہ ہوگی بلکہ ہر کافر کی ہوگی۔ خواہ وہ کسی زمانے میں ہوا ہو اور کسی ملک کا باشندہ ہو اور کوئی نسب رکھتا ہو۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ اہل النار جو درحقیقت جہنمی ہیں ان کے لئے نہ جہنم میں موت ہے نہ حیات (مسلم) ایک اور آیت میں آیا ہے کہ کافر مالک یعنی ناظمِ جہنم سے درخواست کریں گے کہ کاش ہم کو موت ہی آجائے۔ مالک ان کو جواب دے گا تم اسی میں پڑے رہو گے۔ وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ الخ۔

وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ عذاب سے نجات نہ ہوگی عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ اور گزشتہ زندگی کی بداعمالیوں کا نتیجہ سامنے آجائے گا تو اس وقت کافروں کے لئے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ مجبوراً خدا کی طرف رجوع کریں گے اور چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب تو ہم کو یہاں سے نکال دے۔ ہم جو کام پہلے کرتے تھے اس کے خلاف نیک کام کریں گے۔ مشاہدہ کے بعد ایمان معتبر نہیں۔ عذاب قیامت میں مبتلا ہونے کے بعد کوئی وعدہ مفید نہیں پھر وعدہ بھی جھوٹا۔ کیونکہ ایک اور آیت وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ میں صاف صراحت ہے کہ دوبارہ دنیا میں بھیجنا بھی ان کے لئے مفید نہ ہوگا۔ وہ پھر انہی چیزوں کا ارتکاب کریں گے جن کی ممانعت کر دی گئی ہے، اس لئے جواب ملے گا۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِیْرُ۔ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں نصیحت کرنے والا نصیحت حاصل کر لیتا اور مزید یہ کہ ڈرانے والا بھی تمہارے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں قابلِ تفصیل دو امر ہیں (۱) نصیحت حاصل کرنے کی عمر کی مقدار کیا ہے اور آیت میں کتنی عمر مراد ہے؟ (۲) نذیر سے کیا مراد ہے؟ نمبر اول کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ اور ابو غالب شیبانی نے اٹھارہ برس۔ وہب بن منبہ نے بیس برس، حسن بصری نے چالیس برس، اور ابن جریر کی روایت میں ابن عباس کے نزدیک بھی چالیس معذرت کی آخری مدت ہے۔ ابن جریر کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت علیؓ کے نزدیک رفعِ معذرت کی آخری عمر ساٹھ سال ہے۔ بعض روایات میں ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ چنانچہ ابن عباس راوی ہیں کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا، جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا ساٹھ سال کی عمر والے کہاں ہیں اور یہی وہ عمر ہے جس کو اللہ نے آیت اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ میں بیان فرمایا ہے (رواہ ابن جریر والطبرانی) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے حضور والاؐ نے فرمایا جس بندے کو اللہ نے اتنا

زندہ رکھا کہ وہ ساٹھ یا ستر برس تک پہنچ گیا تو اللہ نے اس کا عذر زائل کر دیا۔ اس لفظ کو حضورؐ نے تین بار فرمایا (رواہ احمد والبخاری والنسائی وابن جریر والبزار وابن ابی حاتم) لیکن ۱۸ یا ۲۰ یا ۴۰ یا ۶۰ یا ۷۰ بہر حال کوئی عمر بھی رفع معذرت کی قرار دی جائے۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ کافر معذور ہے جس کی عمر ۱۸ سال سے کم ہو اور مر گیا ہو۔ کیا قیامت کے دن اس کی کم عمری کا عذر قبول کر لیا جائے گا اور وہ دوزخ نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عاقل ہونے کے بعد اگر کسی کفر کی حالت میں مر جائے تو خواہ اس کی عمر ۱۸ سال سے کم ہوئی ہو، مگر قیامت کے دن معذور نہ ہوگا اور جہنمی ہوگا۔ اسی لئے امام زین العابدین نے فرمایا کہ ۱۷ سال کی عمر تذکر (نصیحت پکڑنا) کے لئے آدمی پر حجت ہے۔ پس روایات مذکورہ اگر صحیح ہوں تو مطلب ان میں اس عمر کو بیان کیا گیا ہے جو اس امت کی آخری عمر (اوسط) ہے۔ گویا اکثر افراد امت کی عمر ۶۰ یا ۷۰ سال کی ہوتی ہے۔ اور تذکر کی ابتدائی عمر ۱۸ سال ہے اور غفلت کرنی شروع ہو جائے تو کوئی عذر ہونے کی وجہ سے اس کا کفر شاید قابل مواخذہ نہ قرار پائے۔ وجہ ۱۸ یا ۲۰ یا ۴۰ یا ۶۰ سال کے اقوال تو وہ مرجوح ہیں۔ نذیر کا ابن عباسؓ، عکرمہ، امام باقر، قتادہ اور سفیان نے فرمایا کہ نذیر سے مراد پیری ہے۔ پیری کا زمانہ آخرت سے ڈرانے والا ہے۔ اور سدی اور عبدالرحمن بن زید نے فرمایا نذیر سے مراد رسول پاکؐ کی ذات گرامی ہے۔ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے اور سیاق آیت کے مناسب بھی یہی قول ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کفر یا بداعمالی کی معذرت دو طرح پیش کی جا سکتی ہے۔ اول یہ کہ ہم کو سوچنے سمجھنے اور حقانیت کے اختیار کرنے کے لئے عقل اور سمجھ ہی نہیں دی گئی جس سے ہم حق و باطل کے درمیان امتیاز کر سکتے۔ اس کا جواب آیت اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ الخ میں کر دی گئی۔ دوم یہ کہ ہماری عقل ناقص تھی، نظر کوتاہ تھی، حق تک خود رسائی نہ ہو سکتی تھی اور کوئی سمجھانے والا موجود نہ تھا، اس لئے ہم معذور ہیں۔ اس کا جواب آیت وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ میں فرما دی۔ اس طرح دونوں عذروں کا ازالہ ہو گیا۔

فَذُوقُوا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ یہ آخری فیصلہ ہے۔ ظلم کو کفر میں۔ لغت میں ظلم کے معنی روکنے کے ہیں (بیضاوی) پس جو اپنی ذات کو یا دوسرے کو حق سے روک دے وہ ظالم ہے۔ اگر ظلم کا انتہائی درجہ کفر اور شرک ہے۔ توحید سے زیادہ نمایاں حقانیت اور کوئی نہیں۔ اسی لئے کافروں کو ظالم کہا گیا۔

مقصودِ بیان آیت ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الخ بتا رہی ہے کہ امت مسلمہ اللہ کی منتخب امت ہے۔ اس کو برگزیدگی حاصل ہے۔ لفظ اَوْرَثْنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اصول ہدایت میں دوسری آسمانی کتابوں سے جدا نہیں ہے۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ سے امت اسلامیہ کے مختلف الاعمال تینوں گروہوں کی صراحت کرنی مقصود ہے۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوا ہے کہ گناہگار مسلمان بھی (چونکہ صحیح عقیدہ رکھتا ہے اس لئے) اس امت سے خارج نہیں جس کو اللہ نے برتری عطا فرمائی ہے یعنی کافر نہیں۔ اس سے فرقہ خوارج وغیرہ کے عقیدہ کی تغلیط ہو گئی جو مرتکب کبائر کو کافر قرار دیتے ہیں یا کم از کم اہل ایمان کی فہرست سے خارج سمجھتے ہیں۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ نیکی اور بدی، خیر اور شر سب کچھ اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہوتا ہے۔ پس نیکوں کو اپنی نیکی پر مغرور نہ ہونا چاہیئے بلکہ نیکی کی توفیق کو بھی اللہ کی طرف سے سمجھنا چاہیئے۔ آیت مذکورہ میں سونا اور موتی اور ریشم جو مذکور ہے وہ صرف سمجھانے اور اخروی نعمتوں کے پیرایہ میں ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دنیوی چیزیں کی نعمتوں سے مشابہت نہیں رکھ سکتیں۔ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ سے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان کو ہر وقت آخری انجام کا غم ہوتا ہے اور یہ غم ہمیشہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ہی جائے گا۔ گویا نڈر ہو جانے اور انجام سے مطمئن ہو جانے کا نام ایمان نہیں ہے۔ مِنْ فَضْلِهٖ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ فضل الٰہی کے سبب ہوگا۔ لَا يَمَسُّنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے اندر کوئی کدورت پیدا کرنے والی چیز نہ ہوگی۔ درحقیقت ترغیب ہے اس بات کی کہ اسلام کے راستہ میں اس دور حیات میں مسلمانوں کو جو کوشش کرنی پڑے اور جو دکھ پہنچے اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے کیونکہ آئندہ زندگی میں اس کے لئے سکھ ہی سکھ ہے۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ سے ثابت ہوتا ہے کہ کافروں کو دوزخ میں عذاب ہوگا، مگر موت نہ آئے گی۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی درازی کا مزید عذاب کا موجب ہے اور عمر طویل ہونے اور پیغمبر کی ہدایت پہنچنے کے بعد کوئی عذر باقی نہیں رہ سکتا جس کو پیش کیا جا سکے وغیرہ۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ

اللہ آسمان و زمین کی مخفی چیزوں کا جاننے والا ہے وہ سینوں کے راز کو بخوبی جانتا ہے اسی نے تم کو زمین پر

خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

جانشین بنایا پس جو کوئی کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا اور کافروں کے حق میں ان کا کفر ان کے رب کے نزدیک

إِلَّا مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ

غصہ ہی زیادہ کرتا ہے اور ان کا انکار ان کے حق میں نقصان ہی بڑھاتا ہے (اے نبی) کہہ دو ذرا اپنے شریکوں کو دیکھو جن کی اللہ

تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ

کے سوا تم عبادت کرتے ہو مجھے دکھاؤ تو انہوں نے زمین میں کس چیز کو پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں ان کا ساجھا ہے

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا

یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی سند پر ہیں بات یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو کچھ وعدہ کرتے ہیں وہ دھوکا

غُرُورًا ﴿﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ

ہے اللہ آسمانوں کو اور زمین کو تھامے ہوئے ہے تاکہ کہیں وہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر ٹل جائیں تو کیا

أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿﴾

اس کے بعد ان کو کوئی تھام سکتا ہے وہ بڑا شفیق مہربان بخشنے والا ہے

تفسیر آسمانی کتابوں کا سب سے بڑا اور اولین مقصد توحید ہے۔ توحید کے ثبوت کے لئے کوئی برہان ماوراء العقل تو پیش ہی نہیں کی جا سکتی۔ نفسی مجرد کا وجود ہی نہیں تو اس کو سمجھے گا کون۔ رہی برہان لمی اور علت سے معلول پر استدلال تو یہ اس وقت ممکن ہے جب وجود باری کی کوئی علت دوسری ہو اور ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ کی کوئی علت نہیں، اس لئے لمی دلیل بھی ممکن نہیں۔ شیخ ابن سینا ر ایسا مشہور فلسفی بھی اس کا قائل ہے۔ اب توحید کو ثابت کرنے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ معلول سے علت پر مخلوق سے خالق پر، مصنوع سے [illegible]، آثار سے مؤثر پر اور موجودات سے وجود پر استدلال کا طریقہ ہے۔ خواہ نفسی مطالعہ کو برہانی طور پر پیش کیا جائے یا آفاقی فکر و نظر کو۔ بہر حال طریق استدلال اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی کائنات کو دیکھ کر خالق کا ثبوت، لیکن قرآن کا طرز استدلال کچھ اس ڈھنگ کا ہے کہ وحدت اور الوہیت کے ثبوت ذیل میں دوسری صفات کو بھی اس طرح پیش کرتا ہے کہ خواہ مخواہ ان کو ماننا پڑتا ہے اور نتیجہ میں شرک فی الالوہیت کا احتمال [illegible] آ جاتا ہے۔

معبود برحق الا مطلق اور مرکز الوہیت صرف ایک ہی ذات ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ معبود ہونے کے لئے جن خصوصی اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب اس ذات میں موجود ہیں۔ جو صفات استحقاق الوہیت کا موجب ہیں۔ وہ اگرچہ گوناگوں اور چند در چند ہیں۔ مگر مرجع سب کا تین اوصاف ہیں۔ جن کو مذکورہ آیات میں بیان کیا ہے (۱) احاطہ علمی یعنی ہر ظاہر، باطن، صدری اور کائناتی حقائق و واقعات کا کامل ترین علم اور

مادیاتی، تصوراتی، تخیلاتی، غرض ہر طرح کی مخفی ترین تہ در تہ پوشیدہ حکمتات کی عمومی واقفیت اور عالم موجودات کی ہر بلندی و پستی کا ہر وقت اور ہر حالت میں بس کے سامنے حضور۔ (۲) ساری کائنات کی ایجاد، تربیت، تکمیل اور لوازم ایجاد و تربیت کی فراہمی، خصوصاً انسان کی تخلیق، نوعی توارث اور گزشتہ مخلوق کا جانشین بنانا۔ (۳) بقائے حفاظت یعنی کائنات کو تغیر عطا کرنے کے باوجود عمومی تباہی سے بچانا، ایک خاص نظم سے چلانا اور عام تصرف کرنا۔ یہ تینوں اوصاف موجب الوہیت ہیں۔ الوہیت کے ضروری لوازم ہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی نہ ہو تو الوہیت کا دعویٰ غلط ہے۔ اللہ میں یہ تینوں اوصاف موجود ہیں۔ وہ عالم کل ہے، واقف اسرار ہے، اس کا علم محیط ہے، اس نے سارے عالم کو بنایا ہے۔ خصوصاً انسان کو گزشتہ مخلوق کی جگہ دی ہے، آسمان، زمین اور تمام موجودات کا نظم بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔ اگر وہ ان کی حفاظت کرنی چھوڑ دے تو کوئی تباہی سے ان کو نہیں بچا سکتا، اس لئے وہ اللہ برحق ہے، معبود مطلق ہے اور چونکہ کوئی دوسرا کسی چیز کا خالق نہیں، موجد نہیں، ایجاد میں شریک بھی نہیں، متصرف اور حافظ بھی نہیں، اس لئے الوہیت کا استحقاق کسی کو نہیں۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، اس آیت میں وحدت الوہیت کو برہانی رنگ میں پیش کیا ہے اور الوہیت کے تین لوازم بیان فرمائے ہیں۔ (۱) زمین آسمان میں کیا پوشیدہ چیز ہے۔ یہ لفظ عام ہے۔ آنکھوں کے مشاہدہ اور دماغ کی رسائی سے جو چیز خارج ہے وہ سب اس میں داخل ہے۔ اس عالم کا ایک ظاہر رخ ہے ایک باطن ہے۔ ظاہر پہلو محکوم، مادی اور مرئی ہے اور باطن پہلو حاکم، نورانی اور غیر مبصر ہے۔ انسانی دماغ مادہ کی سیر کرتا ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں اور ان سب کو طبعی تغیرات کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ گویا آدمی کے یہ تمام انقلابات اور استحالات غیر شعوری طور پر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے مادی کائنات کے اندر صاحب شعور اور با ارادہ قوتیں مخفی ہیں جو ظاہری تمام تغیرات کا سرچشمہ ہیں۔ رنگ کا تغیر ہو یا بو کا، شکل کی تبدیلی ہو یا حرکت و سکون کی حقیقت میں یہ کارفرمائی ان مخفی قوتوں کی ہے جو مادی کائنات کا باطنی رخ ہے اور جہاں تک انسانی دماغ نہیں پہنچ سکتا ہے، مگر اللہ کو پوشیدہ حقائق کا بھی علم ہے۔ وہ ذرہ ذرہ کی ظاہری حالت کو تو جانتا ہی ہے، مگر باطنی حقائق کا اس کو علم ہے کسی دوسرے کو نہیں۔ رہے انسانی معلومات اور ان کے تغیرات، تمام دماغی تصورات اور ذہنی تخیلات یہاں تک کہ دماغ کی ہر لہر اور دماغ کا ہر خطور جو اکثر ارادی ہوتا ہے اور بعض غیر ارادی۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ انسانی ارادہ اور ضمیر کی آواز تو وہ بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ پس الوہیت کا استحقاق بھی اللہ ہی کو ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز ناقص العلم ہے اور ناقص العلم کو استحقاق الوہیت نہیں ہو سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ (۲) الوہیت کی یہ دوسری دلیل ہے۔ اللہ نے انسان کو اس زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا۔ کسی قدر اپنے اوصاف عطا کئے۔ اگرچہ انسانی صفات، صفاتِ کمالیہ نہیں بلکہ ناقص ہیں، مگر اللہ کی صفات کمالیہ کا پرتو ضرور ہیں۔ علم، قدرت، اختیار، ارادہ، ملکیت، تصرف وغیرہ تمام اوصاف انسان کو دیے گئے۔ گویا ہر آدمی کو اس سرزمین پر بسایا یا اس طرح کہنا چاہیئے کہ موجودہ آدمیوں کو گزشتہ آدمیوں کی جگہ دی۔ بہرحال یہ کارفرمائی اللہ کی ہے۔ انسان کا وجود کسی دوسرے کا منت کش نہیں۔ اللہ ہی نے اس کو پیدا کیا ہے اور تخلیق انسانی کی غرض تکمیل خلافت یا ادائے فرض خلافت ہے۔

فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا، اب اگر کوئی ادائے فرض سے انکار کرتا ہے۔ اللہ کو نہیں مانتا، اللہ کا خلیفہ اپنی ذات کو نہیں سمجھتا۔ بلکہ دوسروں کے سامنے سر نیاز جھکاتا ہے۔ اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود بناتا ہے تو اللہ کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور اللہ کی ناخوشی اپنے لئے بڑھاتا ہے۔ کفر کا خمیازہ اسی کو اٹھانا ہوگا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ... اس آیت میں (۱) تخلیق الوہیت ہونے والے دوسرے وصف کی مزید توضیح ہے۔ جو لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کی پرستش کرتے ہیں ان کو اپنا کارساز جانتے ہیں ان کو پکارتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے اس عقیدہ اور عمل کی کوئی دلیل ہونی چاہیئے۔ علم کا نقصان تو ناقابل شک ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی کامل العلم نہیں یہ چیز آیت بالا میں بیان کر دی گئی تو شاید تخلیقی قوت و قدرت ان کے معبودوں کو حاصل ہو، مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ زمین اور آسمان کے

کسی جز کی تخلیق میں کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ نہ پتھروں کا نہ درختوں کا نہ عناصر اور ستاروں کا نہ انس و جن اور ملائکہ کا۔ پھر کس کو الوہیت کا حق ہو سکتا ہے۔

اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۔ بعض کم فہم آدمی اپنے عقیدہ اور مسلک کی حقانیت کو دلیل عقلی کی روشنی میں نہیں ظاہر کر سکتے تو ثبوت نقلی کو اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمارے باپ دادا یوں ہی کرتے تھے اور وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ اللہ نے براہ راست ان کو ایسا ہی ماننے اور کرنے کا حکم دیا تھا اور جب اللہ کا حکم ایسا ہی ہے تو ہماری عقل میں آئے یا نہ آئے ثبوت ہو یا نہ ہو ہم بہر حال ایسا ہی کریں گے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ حق ہے۔ اس کی تردید کے لئے فرماتا ہے کہ کیا ان لوگوں کو ہم نے کوئی کتاب دی ہے۔ ایسا نہیں۔ ان کے پاس کوئی کتاب الٰہی نہیں جس کی روشنی میں یہ شرک کر رہے ہیں اور ثبوت میں کتاب الٰہی کو پیش کرتے ہیں بلکہ یہ ان ظالموں کا فریب ہے۔ بعض بعض کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یعنی یہ اپنے خیالات اور ہوا و ہوس کے پیرو ہیں۔ ان کے سربرآوردہ لوگ اپنے ماتحتوں کو دھوکہ دیتے اور ان سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ نہ ان کے پاس کتاب الٰہی ہے نہ اللہ کا حکم۔

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَ لَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۔ وحدت الوہیت کے ثبوت کی تیسری دلیل ہے۔ حفاظت اور بقائے کائنات اللہ کی قدرت ظاہرہ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آسمان و زمین کس کی قدرت سے اپنی جگہ قائم ہیں اور کون ان کو تھامے ہوئے ہے۔ زمین کا ایک خاص مقام ہے، آسمان کا بھی ایک مکان ہے۔ ہر ایک کا جدا جدا محور ہے اور اگر افلاک کی شکل مستدیرہ ہے تو ہر ایک کا محیط بھی ہے۔ یہی آسمان زمین میں سے کوئی بھی اپنے محور، اپنے محیط، اپنے مرکز اور اپنے مقام سے ہٹتا نہیں۔ سب اللہ کی حکمرانی ہے۔ اللہ ان کو تھامے ہوئے ہے۔ لیکن اگر اللہ ان کو ان کے محور، محیط، مرکز سے اور مقام سے ہٹا دے تو پھر ان کو کوئی تھام نہیں سکتا۔

شیخ ابن کثیر نے ابن جریر سے نقل کرتے ہوئے ابو وائل تابعی کی ایک روایت لکھی ہے کہ ایک شخص ابن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن مسعود نے فرمایا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا شام سے۔ ابن مسعود نے فرمایا تم وہاں کس سے ملے تھے؟ اس نے کہا کعب احبار سے (علامہ علماء الیہود) ابن مسعود نے فرمایا پھر انھوں نے تم سے کیا فرمایا۔ اس شخص نے کہا انھوں نے بیان کیا کہ یہ سب آسمان ایک فرشتے کے کاندھے پر گھوم رہے ہیں۔ ابن مسعود نے فرمایا پھر تم نے اس قول کو سچا جانا یا جھوٹا؟ اس شخص نے کہا میں نے اس بات کی تصدیق کی نہ تکذیب۔ ابن مسعود نے فرمایا کاش تم اپنی سواری مع سامان خیرات کر کے اس سفر کی نحوست سے چھوٹ جاتے۔ کعب نے تم سے غلط کہا (یعنی یہ قول غلط ہے یہودیوں کی روایت ہے اسلامی حکم نہیں کعب نے غلطی سے اس کو اسلامی صراحت سمجھ لیا) اللہ نے سچ فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۔ الخ۔

شیخ ابن کثیر نے کہا کہ سیر الفقہا (مصنفہ یحیی بن ابراہیم بن مزین) میں میں نے خود پڑھا ہے کہ ابن مسعودؓ کی مذکورہ روایت سے مستنبط ہوتا ہے کہ آسمان گردش نہیں کرتا ہے۔ امام مالک بھی اسی روایت کی بنا پر آسمان کے نہ گھومنے کے قائل تھے۔

میں کہتا ہوں ابن مسعود کے قول میں تو فرشتے کے کاندھے پر آسمان کے گھومنے کی تکذیب ہے۔ نفس گردش فلک کا نہ اقرار ہے نہ انکار۔ نہ آیت کا کوئی ٹکڑا سکون یا حرکت کو بیان کر رہا ہے۔ نہ کسی قسم کا استنباط اس سے صحیح ہے۔ امساک کے معنی عدم دوران کے تو نہیں ہیں۔ امساک کے سکون سمجھ لینا غلطی ہے۔ صحیح مطلب جو جمہور مفسرین نے بیان کیا ہے وہ ہے جو میں نے اوپر بیان کر دیا۔ واللہ اعلم۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا۔ یعنی الوہیت کے تینوں صفات خدا تعالیٰ ہی میں موجود ہیں۔ اس کے سوا کسی میں ایک صفت بھی موجود نہیں یعنی وہ واحد بے ہمتا اور لاشریک ہے۔ لیکن اس پر بھی لوگ شرک کرتے ہیں، مگر اللہ بڑا بردبار ہے کہ ان کو رزق دیتا ہے اور زندہ رکھتا ہے۔ یہ اس کے حلم کا نتیجہ ہے کہ وہ جلد گرفت نہیں کرتا۔ رہے اہل ایمان تو وہ بھی خطاکار ہیں، معصوم مطلق کوئی نہیں۔ اللہ ان کی فروگذاشتوں کو معاف کرنے والا اور غلطیوں سے درگزر کرنے والا ہے۔

مقصود بیان:۔ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے وہ باطنی قوتیں مراد ہیں جو نظام کائنات کو بامر الٰہی چلا رہی ہیں۔ آسمان و زمین کے غائب

احوال کو تو اہل بصر جانتے ہیں۔ مگر باطنی قوتوں کی تفصیل سے سوا خدا کے کوئی واقف نہیں۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دل کے خطرات، دماغ کے تصورات اور رفتار تخیلات کا بھی اللہ کو علم ہے یعنی اس کا علم ہمہ گیر ہے۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ الخ میں اس امر کی صراحت ہے کہ انسان کی پیدائش دست قدرت کی کارفرمائی ہے اور وجہ تخلیق صرف نیابت (الٰہیہ) ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ نائب کو اپنے اصل کے حکم کے خلاف نہ چلنا چاہیئے۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کے کفر کی سزا اس کے والدین یا اولاد کو برداشت کرنی نہ ہوگی۔ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ الخ سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ شرک کفر اور معصیت کی طرف میلان ایک فریب اور دھوکہ ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں وغیرہ۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ

انھوں نے اللہ کی بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر ان کے پاس پیغمبر آیا تو وہ ضرور ہر امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ

لیکن جب اُن کے پاس پیغمبر آگیا تو ان کی وہ نفرت ہی بڑھی کیونکہ یہ ملک میں سرکشی کرتے اور بُری تدبیریں کرتے تھے۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ

اور بُری تدبیر کا وبال بُری تدبیر والوں ہی پر ہوتا ہے تو کیا لوگ اگلوں کے دستور ہی کے منتظر ہیں سو (اے محمدؐ)

تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى

تم اللہ کے دستور میں تبدیلی نہ پاؤ گے اور اللہ کے طریقہ کار میں کوئی تغیر نہ دیکھو گے کیا انھوں نے ملک میں چل پھر کر

الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ

نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیسا ہوا حالانکہ وہ قوت میں اُن سے سخت تھے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا

اور اللہ ایسا نہیں کہ آسمانوں میں اور زمین میں اُس کو کوئی عاجز کر دے بیشک وہ دانا صاحب قدرت

قَدِيْرًا ۝ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ

ہے اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کی سزا میں پکڑتا تو روئے زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا۔

وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

مگر ایک وقت معین تک وہ اُن کو ڈھیل دیتا ہے۔ جب اُن کا وقت آپہنچے گا (تو اُن کو بدلہ دے گا) اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

تفسیر:۔ آدمی جب صاحب مال و اولاد [illegible] ہے عہدہ، امارت، حکومت، وجاہت اور [illegible] جس کو حاصل ہوئے ہیں تو

اس وقت خصوصیت کے ساتھ دوسرے اشخاص اور اپنی اقوام وقبائل پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ یوں تو خوردہ گیری اور طعن کا دروازہ ہر طرح سے کھلا ہوتا ہے۔ مگر مخصوص طور پر دوسروں کی کج روی اور عقیدہ وعمل کی غلطی اس مرفہ الحال طبقہ کے پیش نظر سب سے پہلے ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ لوگ بھی کس قدر جاہل ہیں، کیسے سرکش ہیں ان کو اصلاح عمل اور درستی کے کیسے ذرائع حاصل ہوئے۔ اچھا بیشتر مصلح اور پیغامبر ان میں پیدا ہوئے اور سب دانشمندوں نے ان کی جہالت دور کرنے کی کوشش کی۔ صراطِ مستقیم بتائی، حق وباطل میں امتیاز کرنا سکھایا مگر ان احمقوں نے ایک نہ مانی۔ مشفق پیشواؤں کی ہدایت کو ٹھکرا دیا، ان کے حکم سے سرتابی کی اور بدستور جہالت کی وادی میں سرگرداں رہے۔ اگر ہماری قوم میں کوئی نبی فرستادہ پیدا ہوتا کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا۔ کوئی مصلح آتا تو تمام اقوام عالم سے زیادہ ہم اس کے فرمان بردار ہوتے۔ عقیدہ وعمل کی درستگی کرتے اور راہِ راست پر چلنے والوں میں نمبر اول ہمارا ہوتا۔ دوسروں پر نکتہ چینی اور غیروں کی خوردہ گیری سے اگر نظر ہٹالی جائے تو کسی پیغمبر کے مبعوث ہونے اور مصلح کے پیدا ہونے کی تمنا کرنی روحانیت کی چمک پر دلالت کرتی ہے۔ اور طلب ہدایت کا بہترین مظاہرہ کہلانے کی مستحق ہے، مگر یہ جاہ پسندی اور سیادت طلبی کا ایسی طلب بھی ہدایت کی آرزو اور جذبۂ سیادت پسندی کے تحت ہوتی ہے۔ طلب گارانِ دنیا کا ارمان حق جوئی، تمنائے برتری کا نتیجہ بھی بے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس وقت ان کے ہم جولہم سوا اپنی قوم میں داعی برحق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ پیامِ صداقت ان کے پاس بھیجتا ہے اور راہِ مستقیم پر چلنے کی سب کو دعوت دیتا ہے تو حق پرستوں کا یہی گروہ جو چند سال یا چند ماہ یا چند ساعت پہلے بعثت پیغمبر کی تمنا کیا کرتا ہوں اور امام برحق سے سرتابی کرنے پر دوسروں کو ملامت کرتا تھا، برسرِ خصومت آجاتا ہے۔ داعی برحق کی دعوت قبول کرنے میں اس کو اپنی قومی سیادت بے انتہا دولت نمایاں وجاہت اور تباہی انگیز حکومت کا زیاں نظر آتا ہے۔ وہ تو بعثتِ رسول کی خواہش صرف اس لئے کرتے تھے کہ اگر ان کے خاندان میں کوئی نبی ظاہر ہو جائے گا تو ان حمایان اور ان کے اہلِ قرابت کا حلقہ دوسروں پر چھا جائے گا تمام اقوام سے ان کی قوم ممتاز ہو جائے گی۔ وہ سارے قبائل کے امام ہو جائیں گے سب دنیا ان کے نقشِ قدم پر چلے گی اور شہنشاہوں سے بڑھ کر عظمت ان کی لوگوں کے دلوں میں ہو جائے گی، لیکن جب دوسری بستی، دوسری قوم یا دوسرے کنبہ میں حسب مشیتِ الٰہیہ رسول کی بعثت ہو جاتی ہے تو ان کو اپنی سابقہ حکومت، سیادت اور وجاہت خطرہ میں پڑتی نظر آتی ہے۔ تمنا بھی ناکام کی اور مذکورہ صورت میں جنا پڑتا ہے موہوم اور مفقود۔ یعنی چونکہ حق طلبی کی تمنا ہی شیطانی جذبات کی کامل ترین کار فرمائی کا نتیجہ تھی، اس لئے دعوتِ حق پر لبیک کہنے کی بجائے وہ بادۂ نخوت سے سرگراں ہو کر انتہائی غرور سے پیامِ صداقت کو ٹھکرا دیتے ہیں اور مزید یہ کہ آہنگ حقانیت کو دبانے اور نورِ حقیقت کو بجھانے کے لئے طرح طرح سے وسیلہ کاریاں فریب سازیاں اور مکاریاں کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام غلط پنداریوں اور بد اطواریوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ہر مکاری الٹی پڑتی ہے۔ تاریخ اس پر گواہ ہے وہ اپنے جال میں خود پھنس جاتے ہیں دوسروں کے لئے کھودے ہوئے کنوئیں میں خود گر پڑتے ہیں۔ اور حق سے سرتابی کرنے والوں کے متعلق جو طریقہ ربانیہ گزشتہ زمانہ سے جاری ہے اسی دستورِ الٰہی کے موافق ان کو بھی بربادی، ذلت، شکست اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر کچھ مدت تک باوجود حق سے مخالفت اور داعی حق سے سرتابی کرنے کے وہ روئے زمین پر آرام اور فراغت خاطر کے ساتھ زندہ بھی رہتے ہیں اور متاع الحیوٰۃ ان کے قبضہ میں بھی رہتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ مالکِ کائنات کمزور ہے یا قہارِ مطلق ان کی طاقت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اللہ کی طاقت تو ہمہ گیر ہے، اس کے احاطۂ قدرت سے تو کوئی چیز خارج نہیں۔ آسمان وزمین میں کوئی چیز اس کو عاجز بنانے والی نہیں۔ بات صرف یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے اپنی عمومی رحمت وراحت کے قانون کے تحت ہر شخص کی زندگی کی ایک مدت مقرر فرما دی ہے۔ کوئی فرماں برداری کرے یا نافرمانی، اطاعت گزار ہو یا سرکش، وقت مقرر سے پہلے اللہ کسی کو ہلاک نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کی بد اطواری کی سزا اللہ تعالیٰ کسی کو فوراً دے دے تو روئے زمین پر کوئی جاندار زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اور ساری زندہ مخلوق تباہ ہو جائے۔ بس اللہ کی عمومی رافت بدکردار خطاکار لوگوں کو وقت مقرر تک زندہ رکھتی ہے۔ حضور والا کے تشریف فرما ہونے سے پہلے مدینہ کے رہنے والے یہود پر طعن وتشنیع کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم لوگ گمراہ ہو جلیل القدر انبیاء تمہاری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے، مگر تم بدستور اپنی سرکشی پر قائم ہو۔ کاش پیغمبر برحق ہمارے زمانے میں پیدا ہو جائے تو اس وقت ہم دکھائیں کہ ہماری صادق ہدایت۔ آخری پیام پر سب سے بڑا عامل کون ہے۔ اگر اللہ کا پیغمبر ہمارے پاس آجائے تو تمام اقوام عالم سے زیادہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہم ہی ہوں گے۔ قبائل مدینہ میں یہ جوش کی آرزو دو قبیلوں سے پیدا ہوتی تھی۔

یہودیوں کا غلبہ تھا اوس، خزرج اور بعض دوسرے قبائل مغلوب تھے اور یہودیوں کی زبانی پیغمبر آخر الزمان کی یقینی بعثت کا علم ان کو ہو چکا تھا۔ پس یہودیوں کی دست درازی سے چھوٹنے اور ان پر غالب آجانے کے لئے بعثت پیغمبر کی خواہش کیا کرتے تھے۔ ۲۔ یہودیوں کو چھوڑ کر باہم قبائل میں خود بھی جذبۂ سیادت کارفرماں تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے کا دشمن تھا۔ اس لئے ہر ایک کہتا تھا کہ نبی آخر الزمان اگر ہم میں مبعوث ہو گئے اور یقیناً ہماری ہی قوم میں پیدا ہوں گے تو اس وقت ہم تم سے انتقام لیں گے، لیکن جب حضور اقدس ﷺ تشریف فرماں ہوئے تو آرزومندان بعثت ہی دشمن بن گئے۔ ان کو اپنی وجاہت، قومی سیادت اور نمایاں عزت زائل ہوتی نظر آئی اور جذبۂ شیطنت کے پورا ہونے کی کوئی شکل دکھائی نہ دی۔ پس داعیٔ برحق کی دعوت کو پائے استحقار سے انہوں نے ٹھکرا دیا اور طرح طرح کی مکاریاں اور دسیسہ کاریاں اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف کرنے لگے تھے اور بالآخر دشمنانِ حق اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔

تحلیلِ اجزاء

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا۔ ابن ابی ہلال کا قول ہے کہ قریش کہا کرتے تھے کہ اللہ اگر ہم میں سے کسی کو نبی بنا کر بھیجے گا تو ہم اس کی اور اس کی کتاب کی ایسی اطاعت اور پابندی کریں گے کہ کسی امت نے کسی نبی کی ایسی نہ کی ہوگی۔ پھر جب حضور مبعوث ہو گئے تو سخت منکر ہو گئے اور دشمنی پر کمر باندھ لی۔ (ابن ابی حاتم) اس قسم کی بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ اہلِ مکہ کے حق میں نازل ہوئیں۔ پھر سورۂ فاطر کا ہونا اہلِ مکہ کو موردِ نزول قرار دیئے جانے کا مزید قرینہ ہے، لیکن متعدد روایات سے ثابت ہے کہ مدینہ کے بعض قبائل بھی جدید نبی کی بعثت کے بہت منتظر تھے اور مدینہ کے یہودیوں سے ان کو اطلاع مل چکی تھی کہ پیغمبر آخر الزماں مبعوث ہونے والے ہیں، اس لئے وہ پیغمبر کے مبعوث ہونے کے نہ فقط متمنی تھے بلکہ اپنے خاندان میں پیدا ہونے پر یقین رکھنے والے اور بعثت نبی کو اپنے خاندانی اقتدار و تسلط کا غائبانہ ذریعہ بنانے والے بھی تھے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ آیات میں ان کی حالت کا بیان کیا گیا ہو یا موردِ آیات قریش ہوں اور مفہومِ آیت کا انطباق بعض قبائلِ مدینہ پر بھی ہو۔ آیتِ مذکورہ کے مضمون کو بعض دوسری آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ آیا ہے۔ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ دوسری جگہ ہے۔ وَلَوْ اَنَّا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّا اَهْدٰى مِنْهُمْ غرض مطلب یہ ہے کہ بعثتِ نبوی سے پہلے مکہ یا مدینہ یا دونوں مقاموں کے کچھ آدمی انتہائی قلبی آرزو کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے اور پختہ قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا یعنی اللہ کا فرستادہ آجائے تو ہم ہر ایک قوم سے زیادہ راہِ راست اختیار کر لیں گے اور پیغمبر کی ہدایت پر چلیں گے، لیکن جب پیغمبرِ الٰہی ان کے پاس آپہنچا تو حق و صداقت سے اور بھاگنے لگے۔ بعثتِ پیغمبر سے ان کی نفرت از حق میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے دو سبب ہوئے۔

اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ اس اضافۂ نفرت از حق سے بھاگنے کا سبب تو ان کا غرور و تکبر تھا۔ ایک معمولی آدمی جو بازار میں سودا سلف اور تجارتی کاروبار کرتا پھرتا تھا جس کی کوئی ظاہری تعلیم بھی نہ تھی۔ جو صاحبِ ثروت و جاہ بھی نہ تھا۔ جو حکومت، دنیوی وجاہت اور دولت و طاقت میں نام آور بھی نہ تھا۔ جو قبائل کی جنگ، شراب خواری اور قمار بازی کی مجالس، رقص و سرود کی مجالس، شاعروں کی بزم، لٹیروں کی رزم اور عشق بازوں کی صحبت کا سردار یا سربراہ کار ہونا تو درکنار معمولی رکن بھی نہ تھا اور کبھی ایسے جلسوں میں شریک بھی نہ ہوا تھا، وہ نبی بن جائے اور ساری قوم کا سردار بن جائے اور پیشوا ہو جائے۔ باکمال شاعر، ماہر قمار باز، فیاض شرابی، جنگجو مقاتل، نبرد آزما بہادر، باوجاہت سردارِ قبائل، لکھپتی امیر اور نسلی رئیس اس کے پیرو اور زیر دست ہو جائیں۔ حاکم محکوم، شیر بھیڑ اور فرماں روا فرماں پذیر بن جائیں۔ سرکش کافروں کی غیرت اس کو مانتی نہ تھی۔ وہ بر خود غلط تھے۔ وہ بادۂ پندار سے سرگرداں تھے۔ اتباعِ رسول میں ان کو اپنی ذلت اور قوت و ریاست کا یقین تھا۔ اسی سرگردانی اور بدمستی نے انکو تعلیمِ نبوی سے بھاگنے پر آمادہ کیا۔

وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۲ کافر اور غلط اندیش کافروں رات ہر وقت پیامِ حق کو دبانے، نورِ حق کو بجھانے اور تعلیمِ حق کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ علی الاعلان مخالفت کی، دل میں دشمنی اور بغض کو کام میں لائے۔ بانیٔ حق کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے خلاف دسیسہ کاریاں کرنے لگے۔ ان کے دماغوں میں جو شیطانی تدابیر اور طاغوتی مکاری آئی اس پر عمل کرنے سے نہ چوکے، مگر اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

نورِ حق کے شعلوں کو منہ کی پھونک سے بجھانے کی کوشش کی مگر اس سے روشنی اور چمک اٹھی اور یہ مزید روشنی ان کے لئے مزید وبال بن گئی ۔ وہ حق سے اور زیادہ بھاگنے لگے ۔ نورِ حق ان کے منہ کی پھونکوں سے نار بن گیا جس سے انہیں مکاروں ، دغابازوں ، فریب کاروں اور وسیہ شعاروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا ۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ پیامِ حق کو دبانے کی کوشش کرنے سے اسلام میں اور تیزی ہو گئی ۔ چند ہی روز میں مکہ سے مدینہ تک پہنچ گیا ۔ اگر کفار حضور اقدس اور مخلص اہلِ ایمان کو ہجرت پر مجبور نہ کرتے تو اتنی جلد حبشہ اور مدینہ تک اسلام کیسے پہنچتا ۔ بدر وغیرہ میں سردارانِ کفر کیوں مارے جاتے ۔ یہ ان ہی کی مکاری کی آگ تھی جس نے گھیر کر انہیں کو ہلاک کر دیا ۔ اسی مفہوم کی صراحت آیتِ ذیل میں کی ہے

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ کہ بری تدبیر مکاری پر الٹ پڑتی ہے یعنی کنواں کھودتا ہے دوسروں کے لئے اور گر تا خود ہے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ سردارانِ قریش جنگِ بدر میں چن چن کر مارے گئے ۔ ارادہ کیا تھا رسولِ پاک کو شہید کرنے کا اور مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا ، مگر تباہ ہوئے خود ۔

فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۝ قانونِ قدرت اٹل ہے ۔ قدرت سے سرتابی کا انتقام یقینی ہے ۔ فطری ہدایت سے سرتابی موجبِ ہلاکت ہے ۔ گزشتہ اقوام عاد ، ثمود ، طسم ، جدیس ، جرہم اولٰی وغیرہ قدرتی ہدایت سے سرکشی کرنے ہی کی وجہ سے تباہ ہوئیں ۔ تو ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت وہی قدیم ہے ، اس میں تغیر نہیں پھر ان سرکشوں کا بچنا کیسے ممکن ہے ۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی ۔ جرم کسی کا ہو اور پڑے دوسرے پر ۔ ایک کے قصور کی سزا دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا ... إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۔ تک منکر دماغ اور معبر ذہنی تو ہوش مندوں کے پاس ہوتا ہے ۔ کور دل تو گیا جا ہیں بے بصیرت کیا سمجھیں ۔ قادر کی قدرت اور بداعمال کی فطری سزا کو جاننے کے لئے تو بیدار حواس کی ضرورت ہے ۔ افسردہ روح اور مردہ عقل والے باریک نظر نہیں رکھتے ۔ ان کو آنکھوں سے مشاہدہ کی ضرورت ہے ۔ آپ بیتی نہ سہی جگ بیتی ہی دکھا دی جائے ۔ اس لئے بطور تعریض تنبیہ کرنے کے لئے آیتِ مذکورہ میں ملک میں چل پھر کر بدکاروں کی بدانجامی اور تباہ کاروں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی دعوت دی اور صراحت کر دی کہ گزشتہ افراد و اقوام ان لوگوں سے زیادہ طاقتور تھے یعنی ان کے پاس مال تھا ، صحت تھی ، جسمانی طاقت تھی ، جاہ و جلال تھا ، زیل ڈول تھا ۔ وسیع حکومت تھی ، افرادِ قبائل کی کثرت تھی ، بلند تمدن تھا ، زمین پر غیر معمولی تسلط تھا ، مگر اللہ کے انتقام کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی ۔ وہ کیا اللہ ہرانے والا اور عاجز بنانے والا تو سارا ہی کائنات میں کوئی بھی نہیں ۔ کوئی اس کی گرفت سے باہر نہیں اور کس طرح باہر ہو سکتا ہے جب کہ اللہ علیم و قدیر ہے ۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی غفلت اور لاعلمی کی وجہ سے بے خبری کی حالت میں انتقام اور مواخذہ سے بچ جائے ۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی طاقت کھل پڑنے پر اللہ سے ٹکرا کر گے محفوظ رہ جائے کیونکہ اس کا علم ہمہ گیر ہے اور قدرت محیطِ کل ہے ۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ رہا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ جب قانونِ قدرت اور پیامِ خدا سے سرتابی کرنے کی سزا اٹل ہے اور تم کو پیامِ حق کا علمبردار ہونے کا دعویٰ ہے اور تمہاری نظر میں ہم سرکش ، باغی اور قانون شکن ہیں تو پھر ہماری گرفت کیوں نہیں کی جاتی اور کیوں ہمیں غارت کر دیا جاتا تو اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ اگر انسان کی بداعمالی کی سزا فوراً اللہ تعالیٰ دیتا یعنی ہر کرتوت پر آدمیوں کی گرفت کرتا تو روئے زمین پر کوئی جاندار نہ بچتا (انسانی بداعمالی کی نحوست اور وبال پر بھی اثر کرتی ۔ مثلاً بارش نہ ہوتی ، کال پڑ جاتا ۔ سبزہ ، غلہ ، پھل پھول ترکاریاں نہ پیدا ہوتیں کنویں تالاب اور نہریں خشک ہو جاتیں اور ساری زندہ مخلوق بلبلا اور تلملا کر مر جاتی اور نظامِ کائنات برباد ہو جاتا ، مگر انسانی بداعمالی کا یہ نتیجہ بد دوسری مخلوق کیوں برداشت کرے اور ایک کے کرتوت کی سزا دوسرے کیوں بھگتیں ۔ بے قصور کو مجرم کے جرم میں کیوں پکڑا جائے ۔ ایسا کرنا قانونِ عدل اور مصلحتِ تخلیق کے خلاف ہے ۔ اللہ نے اسی لئے بداعمال انسانوں کو چھوڑ رکھا ہے ، لیکن کب تک یہ رسی ڈھیلی رہے گی اور کس وقت تک گرفت نہ ہو گی تو سمجھ لو کہ یہ ڈھیل دوامی نہیں ہے)

وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ۝ بلکہ میعادِ مقررہ تک ہے (آغازِ آفرینش کے وقت اللہ نے ہر ایک کی جو مدت مقرر فرما دی ہے اس مدت تک مہلت دیتا رہتا ہے ۔ پھر جب مقررہ میعاد ختم ہو جائے گی اور اجلِ معین آ جائے گی تو سرکشوں کو ہلاک کر دیا جائے گا ، مگر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عمومی ہلاکت اس وقت بھی ہو گی تو برے کے ساتھ اچھے ، بدکاروں کے ساتھ نیکوکار اور نافرمانوں کے ساتھ

فرماں بردار بھی تباہ ہو جائیں گے پھر قانونِ عدل کہاں رہا اور انصاف کا اقتضا کب پورا ہوا تو اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھتا ہے یعنی اس کی نظر میں اچھے بروں سے اور فرماں بردار نافرمانوں سے ممتاز ہیں۔ اس کو دھوکہ اور اشتباہ نہیں ہو سکتا۔ جیسی اس کی مصلحت ہوگی ویسا کرے گا۔

مقصودِ بیان

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ الخ سے چار باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔ ۱۔ بعثتِ نبوی سے پہلے قریش کو اپنی غلط روی اور ضرورت نبوت کا احساس تھا اور ان کی خواہش تھی کہ نبی ہماری قوم میں ظاہر ہو۔ ۲۔ زمانۂ جاہلیت میں انتہائی قسمیں اللہ کی کھائی جاتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ہستی اور اس کی عظمت کا عقیدہ اہلِ جاہلیت کے دلوں میں بھی تھا۔ ۳۔ اہلِ جاہلیت یا قریش دوسری کتابوں اور قوموں کو فرمانِ الٰہی سے سرکش اور حق فراموش اور باطل کردار جانتے تھے۔ اس لئے تو اپنی کامل راہ یابی کا وعدہ کرتے ہوئے چند دوسروں پر تعریض کی۔ ۴۔ عربی محاورہ میں نذیر اس شخص کو کہتے تھے جو اپنی قوم کو قبل از وقت دشمن قوم کے ارادوں سے اس کی یورش اور چڑھائی سے مطلع کر دیتا تھا۔ جب کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرتا اور غفلت کی حالت میں اس پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تھا تو حریف قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طرح خبر پا کر اپنی قوم کو جا کر اطلاع کر دیتا اور اگر خطرہ بہت زیادہ اہم اور قریب ترین ہوتا تھا تو بالکل برہنہ ہو کر قبیلے کے سارے محلہ میں گھوم کر پکارتا پھرتا تھا۔ گویا آنے والی تباہی پر تنبیہ کرنے والے کو نذیر کہتے ہیں۔ نذیر کی پکار سن کر ہر گھر والے چوکنے ہو جاتے تھے۔ ہتھیار باندھ کر مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ اور اگر دشمن کی طاقت ان کو زیادہ نظر آتی تھی تو فوراً ڈیرے خیمے اٹھا کر، سامان باندھ کر، اہل و عیال کو ساتھ لے کر اس جگہ سے بھاگ جاتے تھے۔ جس طرح امرو القیس کندی کے حملہ کرنے سے پہلے صرف خبر پا کر بنی اسد بستی کو خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ اللہ کا پیغمبر بھی چونکہ انسانوں کو آگ میں جلنے، اُخروی عذاب میں مبتلا ہونے اور دنیوی بربادی میں ماخوذ ہونے سے ڈراتا ہے اور بچاؤ کے اصول بھی بتاتا ہے اس لئے اس کو بھی نذیر کہا جاتا ہے۔ پس نذیرِ الٰہی کے قول کا جن لوگوں کو یقین آجاتا ہے اور اس کی ہدایتوں پر جو لوگ عمل کرتے ہیں وہ تو بربادی سے بچ جاتے ہیں اور جو آدمی اس کو سچا نہیں جانتے۔ کاہن، ساحر، شعبدہ باز وغیرہ خیال کرتے ہیں اور اس کے کہنے پر عمل نہیں کرتے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ کفارِ قریش کو نذیر کے قول کی اہمیت اور صدق کا علم تھا اور خلاف ورزی کی سزا بھی معلوم تھی، اس لئے قسمیں کھا کر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمارے پاس کوئی نذیرِ الٰہی آیا تو ہم اس کی بات کو سچ مانیں گے اور سب سے زیادہ اس کے کہنے پر چلیں گے۔ اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبرِ برحق کی مخالفت کفار دو وجہ سے کرتے تھے ایک تو وہ مغرور اور سرگرداں تھے۔ پیغمبر کو حقیر جانتے تھے۔ دوسرے انہوں نے مکاریاں اور حق کو دبانے کی بری تدبیریں بھی کیں اور جب پیہم ناکامی سے دوچار ہوتے گئے تو عناد کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ سے واضح ہوتا ہے کہ بری تدبیر یعنی شیطانی وسیسہ کاری حق کو مغلوب نہیں کر سکتی بلکہ مکار پر ہی الٹی پڑتی ہے۔ اس آیت سے تنبیہ حاصل کرنی چاہیئے مکار خانقاہ نشینوں، دھوکہ باز مولویوں و فریب کار واعظوں اور شیطنت کردار لیڈروں کو جو طاغوتی تدبیروں سے پبلک کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور حیل سازیوں سے اہلِ حق کو دباتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ عارضی کامیابی قابلِ اعتبار نہیں بلکہ ان کی خود آوردہ ہلاکت و ذلت کا پیش خیمہ ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا سے قانونِ الٰہی کا اٹل ہونا ثابت ہوتا ہے یعنی ازل سے قانونِ قدرت ناقابلِ تغیر قرار پایا ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون پلٹ نہیں سکتا اور ایک کی سزا دوسرے پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ۴۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا سے دریں دہ تعلیم ہے۔ آفاقی قدرت کے مشاہدہ کی جگہ مبلغ کو دیکھ کر اپنے احوال کو اس پر قیاس کرنے کی۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ۔ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت غضب پر، رافت عامہ انتقام پر اور حکمت بالغہ تعلق کے استحقاقِ عذاب پر غالب ہے۔ اسی لئے فوری گرفت نہیں کی جاتی۔ ورنہ انسانی اعمال کی نحوست ساری کائناتِ ارضی کی بربادی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وغیرہ۔

سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّخَمْسُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ یٰسٓ مکی ہے اس میں ۸۳ آیات اور ۵ رکوع ہیں

اس سورت کی آیات ۸۲ اور بقول معتبر ۸۳ ہیں۔ ۷۲۹ کلمات اور ۳۰۰۰ حروف ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ قرطبی نے کل سورت کے مکی ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ مگر بعض اہل علم نے آیت وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ کو بنی سلمہ کے حق میں نازل شدہ قرار دے کر اس آیت کو مدنی کہا ہے۔

سورہ یٰسٓ کا نام خطیب نے قلبؔ، دافعہؔ، قاضیہؔ اور معممہؔ لکھا ہے۔ چونکہ یہ سورت قلب القرآن ہے۔ تلاوت کرنے والے کی ہر مصیبت اس کے پڑھنے سے دفع ہوجاتی ہے جس کا انجام اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور وہ حاجت پوری ہوجاتی ہے جس کا انجام اس کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔ نیز حسنات کے وہ بیش بہا خزائن اس میں جمع ہیں، اس لئے مذکورہ بالا ناموں سے موسوم ہے۔

فضائل حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے حضور والا نے فرمایا ہر چیز کا قلب ہے اور قرآن مجید کا قلب یٰسٓ ہے (رواہ البزار والدارمی والطبرانی والبیہقی) حضرت ابوہریرہ سے حسن بصری نے روایت کی ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا جس نے رات کو یٰسٓ پڑھی تو مغفرت کی حالت میں وہ صبح کرے گا۔ حضرت جندب بن عبداللہ سے روایت ہے جس نے رات کو سورہ یٰسٓ رضائے الٰہی کی طلب میں پڑھی اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (ابن حبان) معقل بن یسار سے مروی ہے حضور والا نے (طویل حدیث میں) فرمایا یٰسٓ قلب القرآن ہے۔ جو شخص اللہ اور دار آخرت کا طالب ہو اور اس کو پڑھے تو ضرور اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ تم لوگ اپنے مردوں پر اس کو پڑھا کرو۔ (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت ہے حضور گرامی نے فرمایا میری دلی آرزو ہے کہ یہ سورت میری امت کے ہر آدمی کے دل میں ہو (بزار) حضرت صفوان نے کہا ہمارے بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ میت کے پاس جب سورہ یٰسٓ پڑھی جاتی ہے تو اس کی برکت سے اللہ اس پر آسانی فرما دیتا ہے (رواہ احمد)

لفظ یٰسٓ میں دو حروف ہیں یا اور سین اور یہ دونوں حروف مقطعات میں سے ہیں۔ اور حروف مقطعات کی تین قسمیں ہیں ۱ الف سے ذال تک ۹ حروف ۲ را مہملہ سے غین منقوطہ تک دس حروف ۳ فا سے یا تک ۹ حروف۔ قسم اول میں سے الف اور حا مذکور ہیں۔ باقی سات حروف متروک ہیں اور دو حروف متروک۔ قسم آخیر میں سے سات حروف مذکور ہیں اور دو حروف متروک اور قسم دوم میں سے پانچ پانچ غیر منقوطہ مذکور اور پانچ حروف منقوطہ متروک۔ یہ ترتیب اور حسن صنعت محض اتفاقی نہیں۔ اس کے اندر اسرار اور رموز ہیں جن کی حقیقی تشریح سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں (کذا نقل مفسر السراج عن الشیخ ابن عادل۔ فرقہ مرجیہ مقطعات کی تشریح کے لئے مختلف تاویلیں کرتا ہے، لیکن تمام تاویلیں ذہنی آزادی اور دماغی کاوش کی حدود سے آگے نہیں بڑھتیں۔ انسانی عقل کی رسائی اسرار وحی کے دائرہ کے اندر زیادہ نہیں ہے۔ راسخین فی العلم کی جولانی طبع بھی وحی کے حدود میں پہنچ کر فرو ماندہ ہو جاتی ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس کو علم الٰہی پر محوّل کر دیا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ تَنْزِيْلَ

یٰسٓ قسم ہے حکمت والے قرآن کی (اے محمد) یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو سیدھے راستہ پر ہو یہ (قرآن) اللہ غالب

الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى

مہربان کا اتارا ہوا ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے اسلاف کو نہیں ڈرایا گیا پس وہ غافل ہیں یقیناً ان میں سے اکثر پر وعدہ

أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ

ثابت ہو چکا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائینگے ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں اور وہ طوق ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں اس لئے وہ سر

مُّقْمَحُونَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ

اُٹھائے ہوئے ہیں (جھکا نہیں سکتے) ہم نے اُن کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور اُن کے پیچھے بھی ایک اور اوپر سے بھی ان کو ڈھانک دیا ہے

فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ إِنَّمَا

اس لئے اُن کو کچھ سجھائی نہیں دیتا (اے نبی) اُن پر یکساں ہے کہ تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ایمان نہیں لائیں گے تم تو

تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ ۖ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ۝

صرف اُسی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر چلے اور رحمٰن سے بے دیکھے ڈرے تم اس کو مغفرت اور عزت کے اجر کی خوشخبری سنا دو

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ۝ ع ۱۸

ہم ہی بے جانوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے پہلے بھیجدیا اور نیز انکے قدموں کے نشانوں کو لکھ لیتے ہیں اور واضح کتاب (لوح محفوظ) میں ہم نے ہر چیز کا احاطہ کر دیا ہے

تفسیر (عقل کی نارسائی) کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکان بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بناتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں۔ وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی فرو کرنے کے لئے خود ہی کوئی شربت کیمیا تجویز کر لے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی رہنمائی کرتی ہے۔ اخلاق اور روحانیت کے راستے میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت بن سکتی ہے اور اس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کا اثر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل ہو نقص سے پاک نہیں ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے ناقص ہے۔ اس بنا پر اس کی کوئی قوت بھی مظاہر لکھدیا باطنی، مادی، شعوری یا روحانی من کل الوجوہ کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ عصمت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص اور یاد کے ساتھ سہو و فراموشی کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ جس طرح انسان رنگ اور شکل میں باہم مختلف ہیں اسی طرح اپنی فکری اور باطنی قوتوں میں بھی مختلف اور جدا جدا ہیں۔ عقل کی اس کوتاہی اور نارسائی کا اعتراف بڑے بڑے فلاسفروں نے کیا ہے۔ ... کا قول ہے۔ کوئی بات سچ نہیں ہے اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔ ڈیوڈ ہیوم کہتا ہے انسانی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں مگر اس باب میں اس کی وسعت۔ واقعات دونوں حیثیات سے بہت کم اپنی فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔ سقراط کا مقولہ ہے ہم اتنا کچھ جان چکے کہ

(اقتباس از وحی الہٰی مؤلفہ سعید احمد ایم اے و فہم انسانی از پروفیسر عبد الباری)

(موجبات تسکین و تعین) عقل، منطق اور فلسفہ کے دروازہ سے مایوس ہونے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اطمینان و سکون کا وہ سر اللہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے۔ اس کا جواب خود مغرب کے بڑے بڑے فلسفیوں کی زبانوں سے سنئے۔ ہم کو حصول صداقت سے مایوس ہو جانا چاہیئے۔ بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہ راست خود اس ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے یعنی خود خدا کی طرف سے اور یہی وہ آخری حل تھا جو نو فلاطینیوں (افلاطون نے فلسفہ و مذہب کو مخلوط کر دیا اور اس کا نام فلسفۂ اشراق رکھا۔ ۲۰۴ء میں مصر میں ایک حکیم پیدا ہوا اور ۲۷۰ء میں روم میں مر گیا اس کا نام فلاطینس تھا۔ یہ فلسفۂ اشراق

کا علم بردار تھا۔ اس کے پیرو نو فلاطینی کہلاتے ہیں) نے اختیار کیا اور ہیوم نے (ڈیوڈ ہیوم ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی مسئلہ یقینی نہ تھا اس سے پہلے بھی بکثرت سوفسطائی گزرے ہیں جو کسی چیز کی حقیقی واقعیت کے قائل ہی نہ تھے) نے ناگزیر کر دیا تھا۔ عقلی تفکر کی راہ سے حصول یقین کی مایوسی ہی اس بات پر منتج ہو سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے (جائنٹ کی تاریخ، مسائل فلسفہ ص۱۱۴) ایک اور فلسفی کہتا ہے انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں۔ ہاں خدا کے پاس ہے مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے (لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص۸۲) اس سے ثابت ہوا کہ اصل صداقت و حقانیت اور کامل اطمینان و سکون کا سراغ صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی اس سرچشمۂ ہدایت کے آب زلال سے بجھ سکتی ہے۔ وحی الٰہی کا مجموعہ دنیا میں مختلف ناموں سے پیش کیا گیا۔ کبھی اس کا نام تورات رکھا گیا، کبھی انجیل اور اس سورت میں اس کو القرآن الحکیم کے لقب سے ملقب فرمایا گیا۔ وحی الٰہی کا یہی وہ ظہور کامل ہے جو انسانی قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جاں فروز کیفیت پیدا کرتا ہے اور یہی تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ہے۔ قرآن حکیم اول کس کے پاس آیا۔ اور کون مورد ربانی وحی تھا۔ وہ معمولی انسان تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔ معمولی درجہ کا آدمی جب عقل و بصیرت کی خیرہ کن روشنی کو جذب کرنے اور اٹھانے کی کامل طاقت اپنے دل و دماغ میں نہیں پاتا تو پھر خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیاں اس کے لئے باوجود ذاتی صلاحیتوں کے فقدان کے کس طرح قابل برداشت ہو سکتی ہیں۔ وہاں وحی کی نور بیزیوں کی جولان گاہ وہ ہی ہستی بن سکتی ہے جو خود آئینہ کی طرح روشن ہو، انصاف کی نگاہ اور عدل کی تنقید اس کی زندگی کے کسی حرکت و سکون میں سیاہ داغ نہ دکھا سکے۔ وہ امین ہو، پاک باز ہو، اس کی شاہراہ حیات سیدھی ہو۔ غرض وہ صراط مستقیم پر ہو۔ یہی قسم ہے قرآن حکیم کی سید البشر، مرسل برحق تھے، صراط مستقیم پر تھے، اس لئے تو تنزیل رب العالمین کے فرودگاہ قرار پائے۔ آئینہ کی طرح وحی الٰہی کے نور کو انہوں نے خود جذب کر لیا اور پھر دوسروں پر عکس ریزی کی، مگر فطری کم نصیبی کو کیا کیجئے۔ قرآن حکیم آفتاب قدس کا ایک جلوۂ شب تاب ضرور تھا۔ ذات رسالت آب آئینہ عکس نما بھی ضرور تھی، مگر فطری اور عقلی بے بصیرتی کون دور کر سکتا ہے اور مادر زاد نابینا کس طرح بینا بن سکتا ہے۔ جب خواہشات نفس کی سنگین دیوار آگے کھڑی ہے اور عقلی کجروی کی محکم بندش پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے تو پھر پیش و پس کی شمع فروزاں کیسے دکھائی دے سکتی ہے اور کس طرح تاریکی میں روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں ایمان، اذعان، یقین اور عرفان کی کوئی جھلک محروم ازلی کو نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس لئے کہ ان کے دلوں میں میلان جھکاؤ، رغبت اور التفات ہی نہیں ہے۔ یقین صدور میلان خاطر کا نام ہے۔ جب میلان خاطر مفقود ہے تو عرفان و یقین کیسا۔ اب غلط روی اور باطل اندیشی کے کیسے ہی مہلک نتائج کی تصویر کشی کی جائے اور سزائے اعمال و افکار سے کتنا ہی ڈرایا جائے، مگر تخلیقی نامرادوں کو کوئی بہرہ سعادت حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کو اب سے ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ برے کرتوت اور غلط سوچ بچار کا تلخ نتیجہ بیان کرنا تو ان لوگوں کو راہ راست پر لا سکتا ہے جن کے دلوں میں فروتنی، جھکاؤ اور میلان حق ہو جو حواس اور دانش سے بلند ہو کر سیدھے میدان روحانیت میں پہنچ کر اور حسی و عقلی ہستی سے غائب ہو کر یعنی وجہ د مثالی ذات اور بقول غزالی عالم خیالی کی دنیا میں حاضر ہو کر رحمٰن سے ڈرتے ہیں پس انہی کو ڈرانا مفید ہے۔ ان کی عقلی اور حسی زندگی سدھار نے والا ہے۔ افکار و اعمال کو درست کرنے والا ہے۔

تحلیل اجزاء يٰسٓ ۚ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَكِيۡمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ؕ مالک نے زید بن اسلم کا قول بیان کیا ہے کہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ابن عباس، عکرمہ، حسن بصری اور سفیان بن عیینہ نے فرمایا یٰسٓ کے معنی ہیں انسان (ابن کثیر) ابن الانباری نے کہا کہ جو شخص یٰسٓ کے معنی انسان کہتا ہے وہ یٰسٓ پر وقف نہیں کرتا۔ وقف وہی کرتے ہیں جو اس کو حروف مقطعات میں سے کہتے ہیں۔ واحدی نے کہا کہ ابن عباس اور اکثر مفسرین کے نزدیک یٰسٓ بمعنی انسان کے ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا یٰسٓ کے معنی ہیں یا سید البشر۔ تقریباً یہی معنی جعفر صادق کے قول میں بیان کئے گئے ہیں جس کو ابو عبد الرحمٰن سلمی نے نقل کیا ہے۔ جن علماء نے یٰسٓ کو بمعنی انسان قرار دیا ہے ممکن ہے ان کی مراد بھی انسان سے انسان کا فرد کامل یعنی سید البشر ہو، اس صورت میں دونوں قولوں کا تعارض دور ہو جائے گا، لیکن مذکورہ بالا تمام اقوال کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ کے اسماء توقیفی ہیں جن کی تعداد ۹۹ ہے ان میں یٰسٓ نہیں ہے، اس لئے اول قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اور ...

یٰسٓ کے معنی یا سید البشر بھی نہیں ہیں ۔ اور نقل شرعی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے اور مجازہ کا کوئی علاقہ بھی نہیں ہے ، اس لئے واحدی اور ابوبکر وراق کی روایت یا تو صحیح نہیں یا قول تاویلی ہے ، تحقیقی نہیں ، اسی لئے محلی نے لکھا ہے کہ اس لفظ کی واقعی مراد کو اللہ ہی خوب جانتا ہے ۔ خطیب نے ابن عادل کا قول جو سراج میں نقل کیا ہے جس کو ہم نے آغاز سورت میں لکھ دیا ہے ۔ حروف مقطعات کے متعلق وہی صحیح قول ہے ۔

آیات مذکورہ کے تین حصے ہیں ۔ (۱) قرآن حکیم کی قسم (۲) قرآن حکیم کی قسم کے ساتھ حضور والا کی رسالت کی صراحت (۳) حضور اقدس کا صراط مستقیم پر ہونا ۔ دانش کی روشنی میں سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کی قسم کیوں کھائی اور لفظ حکیم کیوں استعمال کیا ؟ تو اس کی وضاحت اس طرح ہو سکتی ہے کہ قسم یا تو اس چیز کی کھائی جاتی ہے جو متکلم کو پیاری اور محبوب ہو ، معشوق کے زلفوں کی ، خد و خال کی ، سرا در جان کی یا اس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے جو متکلم کی نظر میں قابل وقعت اور عظیم الشان ہو تو ظاہر ہے کہ وہ نظام کائنات کا دستور العمل جس کا نام قرآن ہے اس سے زیادہ اللہ کی نظر میں محبوب اور باعظمت اور کیا چیز ہو سکتی ہے ۔ اس لئے قرآن پاک کی قسم کھانے سے صرف آرائش کمال اور بیان کی سلاست مقصود ہے ۔ بلکہ یہ دکھانا بھی غرض ہے کہ قرآن دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ اللہ کو محبوب اور ہر شے سے زیادہ پُرعظمت ہے ، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی دنیا کو ضرورت ہی کیا ہے ۔ ہر قوم کے پاس اپنا دماغی خود ساختہ دستور العمل ہوتا ہے جو اس کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے تو اس شبہ کو دور کرنے کے لئے قرآن کی صفت حکیم ظاہر فرمائی ۔ یعنی قرآن پُرحکمت ، محکم اور اٹل کتاب ہے ۔ بات یہ ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کی سہولت ، آسائش بلکہ بقا دانش وحکمت پر ہے ۔ دانش کے بغیر انسان انسان نہیں بلکہ حیوان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے بلکہ بعض وقت حیوانیت سے بھی نیچے گر جاتا ہے ، اس لئے آدمی کی زندگی پُرحکمت دستور العمل اور مبنی بر دانش قانون کے تحت ہی صحیح زندگی کہلائی جا سکتی ہے ۔ اور یہ ایک سے زیادہ مرتبہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ آدمی کی انفرادی یا اجتماعی کاوش اپنے لئے مفید ترین اٹل ناقابل تغیر دستور حیات نہیں فراہم کر سکتی ، اس لئے آسمانی ہدایات اور وحی آسمانی کی ضرورت پڑتی ہے ۔ پس اب دو چیزیں بظاہر متضاد پیدا ہو جاتی ہیں ۔ وحی اور فلسفہ یا آسمانی ہدایت اور انسانی دانش ، لیکن انسانی دانش تو تنہا کافی نہیں ۔ فقط فلسفہ سے تو روحانی تشنگی نہیں بجھتی ۔ نہ عمومی زندگی سدھر سکتی ہے اور دانش کی دنیا میں رہتے ہوئے وہ وحی بھی بیکار ہے جو دانش کے خلاف یا سمجھ میں آنے کے قابل نہ ہو ، اس لئے زندگی کو درست کرنے اور مادی و روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایسے دستور العمل کی ضرورت ہے جو وحی اور دانش کا مجموعہ ہو ۔ آسمان سے اترا ہوا ہو ، اللہ کا بنایا ہوا ہو ، مگر عقل کی دنیا سے بھی باہر نہ ہو اور مادی عمرانیت کو انتہائی عروج تک پہنچانے والا ہو ۔ قرآن سے پہلے جو کتابیں مختلف پیغمبروں کے پاس بھیجی گئیں وہ عمومی دستور العمل کی حیثیت نہ رکھتی تھیں ۔ مقامی یا وقتی تھیں ۔ تبدیل مقام یا مرور زمانہ کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں ، اس لئے تغیر پذیر تھیں ۔ عام انسانی دانش ہر زمانہ میں اس کو قبول نہ کر سکتی تھی ، مگر قرآن حکیم یعنی پُرحکمت ، اٹل اور محکم ہے ۔ ہر زوال اور تغیر کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ۔ اس کی تعلیم روح اور سر (بقول شاہ ولی اللہ دہلوی قلب کا بالائی رُخ روح اور عقل کا بالائی رخ سر کہلاتا ہے) دونوں کے لئے واجب الاذعان اور واجب القبول ہے ۔ پس جب قرآن اس قدر باعظمت اور پُرحکمت اور محکم دستور العمل ہے تو ظاہر ہے کہ جس کو یہ قرآن دے کر بھیجا گیا وہ ضرور مرسل من اللہ تھا ۔ قرآن کا پُرحکمت ہونا ضرور حامل قرآن کی صداقت کو ثابت کر رہا ہے ، لیکن قرآن کی حکمت اور افادی حیثیت کو دیہات کے رہنے والے بے پڑھے لکھے کورے جاہل کیا سمجھیں پھر وہ قرآن سے کس طرح صداقت رسول کو جان سکتے ہیں ۔ یہ کام تو بڑے بڑے دانش مندوں اور غور و فکر سے کام لینے والوں کا ہے ۔ چھوٹی سمجھ رکھنے والوں کی نظر تو بہت کوتاہ ہوتی ہے ۔ جاہل حکیمانہ تعلیم کو کیا سمجھیں وہ تو سطحی خارجی احوال کو دیکھتے ہیں پس ان کو رسول اللہ کی رسالت کا صدق کیسے معلوم ہو ، اس لئے صراحت فرما دی کہ اے رسول تم سیدھے راستہ پر ہو یعنی فطری طور پر نزول قرآن سے پہلے بھی تمہاری شاہراہ زندگی سیدھی تھی ۔ تمہاری کتاب زندگانی کی کسی سطر کے کسی فقرہ کو کوئی ٹیڑھے سے ٹیڑھا شخص بھی نہ پکڑ سکتا تھا ۔ سادہ ، صاف ، روشن طریق حیات پر کوئی شخص بھی حقیر ترین سیاہ داغ نہ دکھا سکتا تھا ۔ پس اس زمانہ میں جب کہ صلاح کامل اور زندگی کے بے عیب ہونے کا دعویٰ بھی رسول اللہ کو نہ تھا ۔ کوئی شخص خوردہ گیری نہ کر سکا نہ کر سکتا تھا تو اس حالت میں جبکہ صرف صلاح کامل کا نہیں بلکہ اصلاح کامل کا رسول برحق نے دعویٰ کیا کس طرح وہ دروغ بافی کر سکتا ہے ۔ سیدھا راستہ تو اس کی زندگی کا پہلے ہی تھا ۔ اب بھی فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے خود سیدھے راستہ پر گامزن تھا ، مگر برحق ہونے کا یقین کے ساتھ دعویٰ نہ تھا ۔ اب نزول قرآن کے بعد اپنی صلاحیت روی کا یقینی دعویٰ بھی ہے ۔ پس قرآن

حکیم رسول اللہ کی حقانیت وصداقت کو ثابت کر رہا ہے اور سطحی نظر سے دیکھنے والوں کیلئے رسول پاک کی زندگی خود مجسمۂ صداقت ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۔ غور کرو کہ قرآن کا حکیم ہونا اور راہِ اسلام کا مستقیم ہونا محض روحانی قول ہی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ کلام کی عظمت عموماً قائل کی عظمت سے ہوتی ہے۔ افادی حیثیت کے پیشِ نظر سوچنا چاہیئے کہ دستورِ حیات بنانے کا حق کس کو ہونا چاہیئے۔ اسی کو جس کی طاقت سب سے زیادہ ہو اور اس کا غلبہ ہمہ گیر ہو وہ سب کی نظر میں باعزت بھی ہو۔ ایسی ذات کا اثر ہی قانون قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے، مگر شاید خیال کیا جائے کہ کوئی ظالم ظالمانہ قانون جو لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہو اپنی طاقت کے بل بوتہ پر پھیلا دے تو اس سے قانون کی حقانیت لازم نہیں آتی اور نہ ایسا قانون واجب القبول ہوتا ہے تو نہیں ایسا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ قانون بنانے اور پھیلانے والا صرف طاقت اور غلبہ میں ہی سب سے قوی نہیں بلکہ وہ مہربان بھی ہے۔ جن لوگوں کے لئے اس نے قانون بنایا ہے ان کے مصالح اور فوائد کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ پس وہ اللہ جو غالب ہوا ہے اور رحیم بھی یہ قرآن اسی کا بھیجا ہوا ہے پھر کس طرح پُر حکمت اور اٹل نہ ہوگا اور کیونکر راہِ اسلام مستقیم نہ ہوگی۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ عام مفسرین نے اس آیت میں لفظ ما کو نافیہ قرار دیا ہے۔ یہ آیت بعثتِ نبی العربی کا اصل غایت ہے۔ یوں تو عرب میں حضرت صالح حضرت ہود وغیرہ پیغمبران مبعوث ہوئے۔ خود حضرت اسماعیل جو عدنانی عرب کے جد اعلیٰ تھے مکہ میں ہی مبعوث ہوئے۔ مگر جب حضرت اسمٰعیل کی صحیح تعلیم کو عربوں نے بگاڑا اور ملتِ اسماعیلیہ سے منہ موڑا اس وقت سے کوئی نبی ان کی ہدایت کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ البتہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کچھ کچھ وقفہ کے بعد پیہم انبیاء آتے رہے۔ پس پیامِ خداوندی اسرائیلیوں کے لئے تو نیا نہ تھا اسماعیلیوں کے لئے جدید ضرور تھا۔ اسی لئے آیت میں فرمایا کہ جس قوم کے آباؤ اجداد کے پاس کوئی نذیر نہیں بھیجا گیا آپ کو اسی قوم کے ڈرانے کے لئے قرآن دے کر بھیجا گیا۔ لیکن یہاں یہ شبہ نہ کرنا چاہیئے کہ آیت مذکورہ سے رسول اللہ ﷺ کا خاص عرب کے لئے پیغمبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے لئے ماننا ضروری نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس وقت روئے سخن عربوں کی طرف تھا دوسری قومیں مخاطب نہ تھیں، لیکن اس سے دوسروں کی ہدایت کی نفی بھی مستفاد نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ دوسری آیات پکار کر تمام انسانوں کے لئے حضور اقدس ﷺ کا پیغمبر ہونا ثابت کر رہی ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا اور كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا الخ میں صاف صراحت ہے کہ حضور کی بعثت عمومی تھی اور قرآن پاک تمام آدمیوں کے لئے دستورِ حیات ہے۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ قوم غفلت کی حالت میں پڑی ہوئی تھی تو نذیر آکر اس کو دشمن کی ناگہانی یورش کی اطلاع دیتا تھا۔ یہی حالت عرب کی تھی۔ حضرت اسمٰعیل کے بعد ان کے پاس کوئی نذیر نہ آیا تھا۔ وہ بادہ جہالت سے سرگراں خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے تھے کہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے تشریف لا کر ان کو علمی اطلاع دی اور ڈرایا، مگر بُرا ہو غرور اور بدخو غلطی کا اکثر نے پیامِ رحمت کو ٹھکرا دیا اور نخوت کی گردن موڑنے لگے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور آئندہ تفسیری مقالہ میں بھی لکھیں گے کہ انسانوں کے تیسرے طبقہ کی کثرت ہے۔ شہوانیات وغضبیات کے پرستار، ہوش وخرد کی بجائے مادی قوتوں کے زیرِ اثر کام کرنے والے اس دنیا میں ہمیشہ زیادہ رہے ہیں پاک باطن صاف ضمیر کے آدمی تو کروڑوں میں ایک دو ہوتے ہیں۔ حواس وخرد کی روشنی میں چلنے والے اور نظر و فکر سے کام لینے والے بھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اسی لئے تو اللہ کا ازلی قول ہے کہ جہنم کو کافروں سے بھر دوں گا۔ پس مکہ کے اندر بھی اہلِ جہالت اور پرستارانِ ہوا و ہوس کی کثرت تھی جن سے ایمان لانے اور ماننے کی کوئی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔ ان میں قبولِ حق کی طبعی صلاحیت ہی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ باوجود دیکھنے کے حق کے ظہور اور قرآن ہدی کے نزول نے وہ لوگ سیدھے راستے پر نہ آئے اور قرآن کے بھیجنے والے نے انسان کی فطری قابلیت کی کمزوری دیکھتے ہوئے پہلے سے فرما دیا کہ ان میں سے اکثر پر اللہ کا ازلی قول پورا ہو گیا۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ آیت فطری عدم صلاحیت کے اعلان کے ساتھ عدمِ ایمان کی معجزانہ پیشین گوئی بھی ہے جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِىْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا ۔ جن کافروں نے حضور اقدس ﷺ کی رسالت کو ماننے سے باوجود برہان واضح کے انکار کر دیا۔ ان کی سرکشی حالت کی تصویر کشی کے لئے اللہ نے دو تمثیلیں بیان فرمائیں جن میں سے ایک یہ ہے اور دوسری اس کے بعد آتی ہے۔ اَغْلٰلًا غل کی جمع ہے اور غل اس آہنی طوق کو کہتے ہیں جس کو گردن میں ڈال کر دونوں ہاتھوں کو اس سے ملا کر جکڑ دیتے ہیں تاکہ گردن نیچی نہ ہو سکے اوپر ہی اوپر اٹھی رہے۔ شیخ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ

کسی شخص کی گردن میں بھاری طوق ڈال کر دونوں ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے جکڑ دیئے گئے ہوں جس کی وجہ سے وہ نہ سر جھکا سکتا ہو اور نہ کار برآری کے لئے ہاتھ پھیلا سکتا ہو بالکل بے بس ہو اسی طرح ان کافروں کی حالت تھی کہ فطری عدم صلاحیت اور فقدان ارادہ کے سبب وہ تحصیل ایمان کی جانب نہ ہاتھ بڑھا سکتے تھے نہ غور کرنے کے لئے گردن جھکا سکتے تھے۔

فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ۔ عام مفسرین نے لکھا ہے کہ ھِیَ کی ضمیر اغلال کی جانب راجع ہے یعنی طوق گردن کی نچلی جڑ سے شروع ہو کر بالائی سرے یعنی ٹھوڑیوں تک پورے حصہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور پوری گردنیں طوق میں پھنسی ہوئی ہیں اسی وجہ سے وہ گردنوں کو جھکا ہی نہیں سکتے۔ لیکن ابن جریر، طبری اور جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ ضمیر ہاتھوں کی طرف راجع ہے۔ ہاتھ کا لفظ اگرچہ صراحۃً مذکور نہیں، لیکن غل چونکہ اس طوق کو ہی کہتے ہیں جس میں گردن کے ساتھ ہاتھ بھی جکڑے ہوئے ہوں اس لئے مرجع معنیً مذکور ہے۔ ابن کثیر کا مذکورہ بالا معقول بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ مجاہد نے بھی فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا کی تشریح میں ہاتھوں کی بندش اور چسپیدگی کا ذکر کیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ بیضاوی نے لکھا ہے کہ کافروں کی حالت کی یہ دوسری تمثیل ہے۔ اللہ نے ان کو حق سے اس طرح روک دیا جس طرح کوئی شخص دو دیواروں کے درمیان محبوس ہو اور آگے پیچھے کی کوئی چیز نہ دیکھ سکتا ہو۔ پس وہ لوگ بھی آیات حق کو دیکھنے سے ممنوع تھے کہ کوئی معجزہ ان کے لئے کافی نہ تھا۔ مجاہد نے فرمایا حق کو آڑ میں کر لینے کے لئے ان کے آگے پیچھے دیواریں قرار دیں۔ جن کے اندر وہ سرگرداں رہتے ہیں۔ نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں نہ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے فرمایا اللہ نے ان کے اور ایمان و اسلام کے درمیان دیوار حائل کر دی جس کی وجہ سے وہ نیکی کی حد میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دوسری آیت میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ۔ یہ تینوں تفسیری اقوال تقریباً متحد المفہوم ہیں۔ مگر میرے خیال میں کسی قدر ناقص ہیں۔ آیت مذکورہ میں تین لفظ استعمال کئے ہیں۔ آگے دیوار، پیچھے دیوار اور اوپر سے ڈھانک لینا اور پھر نتیجہ میں فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ فرمایا، مگر مذکورہ اہل تفسیر نے صرف دو دیواروں کا تذکرہ کیا اور فَأَغْشَيْنَاهُمْ کا لفظ پیش نظر رکھا۔ حالانکہ اس لفظ کا لحاظ کئے بغیر تشبیہ کامل نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ حق ایک نور ہے، آفتاب ہدایت کی شعاع ہے اور آفتاب کی شعاع تین اطراف سے دکھ سکتی ہے آگے سے، پیچھے سے اور اوپر سے۔ آگے دیوار اور پیچھے اس لئے آگے کی اور پیچھے کی دھوپ نظر نہیں آ سکتی۔ ہاں اوپر کی چمک دکھائی دے سکتی ہے۔ جب تک اوپر کا رخ بھی کسی پردے یا چھت وغیرہ سے بند نہ ہو، اس لئے دونوں دیواروں کے ذکر کے بعد فَأَغْشَيْنَاهُمْ فرمایا اور اب عدم رویت کا نتیجہ صاف نکل آیا۔ رہا جنوب اور شمال تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا نصف حصہ پچھلے رخ میں اور نصف حصہ آگے کی سمت میں داخل ہے۔ گویا پس و پیش کا ذکر کرنے سے پورا احاطہ ہو گیا اور فَأَغْشَيْنَاهُمْ فرمانے کے بعد کامل بندش ہو گئی۔

یہاں تک وہ تشریح تھی جو کسی شان نزول کی محتاج نہ تھی اور جس سے آیت مذکورہ کو بطور تمثیل ذکر فرمانا ثابت ہوتا تھا۔ مگر بعض مفسروں نے آیت کو حقیقت پر محمول کیا ہے اور خاص سبب نزول لکھا ہے۔

ابن جریر طبری نے عکرمہ کی روایت لکھی ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے کہا اگر میں نے مسجد حرام میں محمد کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ایسی تیسی کر ڈالوں گا۔ یعنی ہر کچل دوں گا۔ اس پر اللہ نے آیت إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ سے لَا يُبْصِرُونَ تک نازل فرمائی۔ اس کے بعد کعبہ میں حضور اقدس ﷺ نماز میں مشغول ہوتے اور ابوجہل سے جا کر لوگ کہتے کہ دیکھو وہ محمد ﷺ (نماز میں مشغول) ہیں۔ تو وہ دوڑ کر آتا اور ٹٹول ٹٹول کر چلاتا اور کہتا وہ کہاں ہیں مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا اس روایت کے موافق آیت کا نزول ابوجہل وغیرہ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ قرار پاتا ہے اور نہ دیکھنے سے مراد ہوگا حضور والا کو نہ دیکھنا میرے نزدیک تعمیم تخصیص سے بہتر ہے۔ کیونکہ اگر روایت کو معیار مان لیا جائے تو آیت جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا آخر تک اس واقعہ سے مربوط ہو گی مگر إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ کا کوئی ربط نہ رہے گا۔ ہاں اگر مندرجہ ذیل روایات ثابت ہو جائیں تو پوری آیت کا ربط قصہ سے ہو جائے گا۔

(۱) ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ مسجد حرام میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے ایک روز اونچی آواز سے تلاوت [illegible]

فرمائی۔ قریش کے کچھ ملعونوں کو اتنا ناگوار گزرا کہ پتھر لے کر مارنے کو اٹھے جب قریب پہنچے تو ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور ہاتھ گردنوں سے بندھ گئے۔ ایسی حالت میں گھبرا کر بھاگے اور اُن کے رشتہ دار اُن کو ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرابت کا واسطہ دیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضور نے دعا فرمائی ان کی وہ حالت جاتی رہی اور سورۂ یٰس فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ تک نازل ہوئی۔ ابن عباس نے فرمایا ان لوگوں میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا۔

(۲) خطیب نے لکھا ہے کہ ابوجہل نے قسم کھائی تھی کہ اگر محمدؐ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا تو اس پتھر سے سر کچل دوں گا۔ ایک روز حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ وہ مردود آیا اور مارنے کے لئے ایک پتھر اٹھایا۔ اچانک اس کا ہاتھ اس کی گردن پر جھکا اور ہاتھ سمیت پتھر گردن پر چمٹ گیا وہ گھبرا کر بھاگا اور ساتھیوں سے جا کر واقعہ کہا فوراً وہ پتھر چھوٹ کر اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ ایک شخص بولا یہ صرف تیرے ڈر جانے کی وجہ ہے۔ تو ڈر گیا لا میں پتھر میں جا کر مارتا ہوں۔ وہ شخص پتھر لے کر حضور کے قریب پہنچا۔ حضور والا نماز میں مشغول تھے۔ مارنے کا ارادہ کیا تو اندھا ہو گیا۔ فوراً لوٹ کر بھاگا کہ ساتھی بھی نظر نہ آتے تھے۔ جب لوگوں نے اس کو پکارا اور دریافت کیا تو بولا مجھے کچھ نظر نہیں آیا صرف کلام سنتا تھا اور یہاں سے آواز آتی تھی اس سے ورے ایک نر شیر مجھے دکھائی دیا۔ اگر آگے بڑھتا تو وہ مجھے کھا جاتا۔ اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔

مذکورہ دونوں روایات میں سے اگر کوئی صحیح ثابت ہو جائے تو آیات کا قصہ سے ربط بالکل ظاہر ہے۔ ورنہ آیات کو تمثیل قرار دینا اولیٰ ہے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ اگر گزشتہ آیت کو بعض افرادِ قریش کے حق میں مخصوص قرار دیا جائے تو یہ آیت بھی انہیں کے ساتھ مختص ہو گی اور اگر اس کو عموم پر بغیر کسی تعیین کے رکھا جائے تو یہ آیت بھی عموم پر ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ جب کفار میں فطری صلاحیت ایمان لانے کی مفقود ہو گئی اور نذیر کی دعوت کی طرف وہ التفات ہی نہیں کرتے اور نہ منادیٔ برحق کی ندا کو سچ جان سکتے ہیں تو پھر ایسے لوگوں کو آئندہ تباہی سے ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں وہ نذیر کے پیام کو کبھی سچ نہ جانیں گے۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب کفار کو ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں اور ایمان نہ لانے کی صراحت کر دی گئی تو پھر ان کو کیوں دعوتِ حق دی گئی اور بے فائدہ تبلیغ کیوں کی گئی اور بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کا حکم کیوں دیا گیا۔ اس کا حل یہ ہے کہ تبلیغ کے دو فوائد ہیں: (۱) ایک اس شخص کو جس کو ہدایت کی جائے۔ بشرطیکہ وہ ہدایت قبول کرلے (۲) دوسرے تبلیغ کرنے والے کو اجرِ آخرت کا حصول اور عند اللہ مراتب کی زیادتی۔ اول فائدہ ضرور مایوس الایمان لوگوں کو تبلیغ کرنے میں مفقود ہے مگر رسولِ پاکؐ کی محنت اور کوشش رائگاں نہیں جا سکتی۔ حضور کو اجرِ آخرت ضرور دیا جائے گا۔ کامیابی یا ناکامی تاثیر یا عدم تاثیر رسول کے فرائض سے خارج ہے۔ فرضِ رسالت تبلیغ ہے کسی کا ماننا نہ ماننا فرضِ پیامبری سے متعلق نہیں۔ اسی لئے سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ فرمایا سَوَآءٌ عَلَيْكَ نہیں فرمایا کیونکہ کافروں کے لئے تبلیغ اور عدم تبلیغ برابر تھی، مگر رسولِ پاکؐ کے لئے تو تبلیغ از حد اجر کا باعث تھی بے سود نہ تھی۔

ایک بات یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ انذار اور عدم انذار کی مساوات غیر مفید ہونے میں ہے یعنی ڈرانا اور نہ ڈرانا بایں معنی برابر ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ ورنہ انذار کے بعد بھی ایمان نہ لانا کافروں کے لئے مزید وبال کا سبب ہے اور آخری حجت کا اتمام ہے جس کے بعد قیامت کے دن ان کو کوئی عذر بھی باقی نہ رہے گا۔ اس لئے کفار کے حق میں بھی انذار عدم انذار کے مساوی نہیں بلکہ اول الذکر موخر الذکر سے زیادہ مضرت رساں ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ۔ تبلیغ اور پیامبری تو سرکش اور نافرمان کافروں کے لئے ہی تھی اور عذاب سے ڈرانا انہی کو چاہیے بھی تھا۔ سوتوں ہی کو جگایا جاتا ہے جاگتے کو جگانے کے کیا معنی، مگر بظاہر فقرۂ مذکور میں اس کے خلاف مضمون معلوم ہوتا ہے۔ یہ شبہ سرسری نظر سے فقرہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے یہ جاننا چاہیے کہ جب پیغمبر آتا ہے تو اس وقت تمام انسان سوتے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بیدار بھی ہو تو اس کی بیداری بھی خواب آلود اور خمار آگیں ہوتی ہے۔ اول تو کوئی موحد ہوتا نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو مبدء، معاد اور [illegible] کے متعلق اس کے تفصیلی خیالات راستی سے بہت دور ہوتے ہیں۔ گویا اس کی توحید اگرچہ توحید ذاتی ہو مگر توحید صفاتی نہیں ہوتی۔ پس ان سب سونے والوں میں دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہوتا ہے کہ جب اس کو آواز دی جاتی ہے تو خفیف یا ثقیل

آواز سن کر چونک جاتا ہے، اٹھ بیٹھتا ہے اور جگانے والے کی ہدایت کے مطابق آنے والے عذاب سے بچنے کی تیاری کر لیتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے خواب غرگوشی میں نہیں خواب مدہوشی میں سرگراں ہوتا ہے۔ گویا اس پر موت کی نیند طاری ہوتی ہے۔ کتنا ہی پکارا جائے اور کتنا ہی جھنجوڑا جائے، مگر اس میں بیداری کی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ پس جگانے کا فائدہ اول گروہ کو پہنچ سکتا ہے۔ دوسرا گروہ بالکل محروم ازلی ہے۔ اگرچہ ندائے بیداری دونوں کے لئے ہے۔ آیت میں بھی اول گروہ ہی مراد ہے۔ عام مفسرین کے نزدیک ذکر سے مراد قرآن ہے، لیکن اگر ذکر سے مراد نصیحت او عمومی یادداشت لی جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ مطلب بہرحال یہ ہے کہ اگرچہ اے رسول تم سب کو ہی ڈراتے رہو، مگر حقیقت میں ان لوگوں کو ہی ڈراتے ہو جو تمہاری نصیحت اور قرآنی یادداشت پر چلتے ہیں۔

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔ اس جگہ دو باتیں تحقیق طلب ہیں (۱) خشی کے ساتھ لفظ رحمٰن کا استعمال کیا گیا باوجودیکہ رحمٰن کی جگہ قہار یا معذب یا کوئی اور ایسا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ جس کے مفہوم میں گرفتاری، انتقام، سزادہی اور دکھ پہنچانے کو دخل ہوتا ہے، اس لئے کہ خوف اور خشیت رحمت سے نہیں بلکہ عذاب اور قہر سے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے خشیۃ ہر خوف کو نہیں کہتے بلکہ اس خوف کو کہتے ہیں جو التجا آمیز اور امید آفریں ہو اور ظاہر ہے کہ اطاعت گزار مسلم اگر عذاب خداوندی سے ڈرتا ہے تو امید رحمت بھی دل میں ہوتی ہے گویا خشی کا لفظ خود جو تلقین کر رہا ہے، مگر رحمٰن کا لفظ پیام رحمت بھی دے رہا ہے اور خوف و رجا کے مجموعہ کا نام ایمان ہے۔ پس خشی الرحمٰن کے معنی ہوئے امن ایماناً صحیحاً۔ (۲) غیب سے کیا مراد ہے۔ لفظی معنی ظاہر ہے۔ مرادی معنی توضیح کا محتاج ہے۔ رسول اللہ سے یا مسلمانوں سے غائب ہونے کی حالت میں اللہ سے ڈرنا یا تنہائی کی حالت میں خدا سے خوف کرنا بہرحال کوئی تعین نہیں۔ اگر خشی الرحمٰن کا معنی آمن ایماناً صحیحاً ہو تو غیب سے مراد حسب معاد، ملائکہ، وحی، اللہ کی ذات صفات، جزا سزا، جنت دوزخ۔ غرض وہ تمام امور ہوں گے جو انسانی نظر و فکر سے غائب اور ایمان کے ضروری اجزا ہیں۔

ایک توجیہ لطیف اور بھی ممکن ہے کہ غیب سے مراد سر ہو۔ بات یہ ہے کہ عام فلاسفہ کے نزدیک علم و ادراک کے ذرائع حواس اور عقل ہی ہیں۔ بدیہیات میں غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی اور نظریات کا حصول نظر و فکر کا محتاج ہے، مگر قرآنی اصطلاح میں مذکورہ بالا آلات ادراک کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہے جس سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جس کا محل قلب ہے۔ جب فلاسفہ کے تمام آلات ادراک عاجز اور بعض منہیات کے ادراک سے فرماندہ ہو جاتے ہیں تو قلبی وجدان بر سر عمل ہوتا ہے اور وہ ایک مخفی راز ہے جس کو انسان اپنے اندر پاتا ضرور ہے۔ مگر اس کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کر سکتا۔ اشراق نوری اور انکشاف روحانی اسی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ تمام مغیبات کی اصل تصویر روح کے سامنے آ جاتی ہے اور استدلالی حدود سے آگے بڑھ کر وجدانی یا انکشافی حدود میں آدمی داخل ہو جاتا ہے۔ اسی آلۂ ادراک کو سر کہتے ہیں۔ غیب اور سر کا لغوی معنی تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں کے مفہوم میں خفا یا ماخوذ ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حقیقت میں ڈرانے کا فائدہ انہی لوگوں کو پہنچتا ہے۔ جو نصیحت پر چلنے والے اور رحمٰن سے اپنے وجدان و سر کے ذریعہ ڈرنے والے ہیں یعنی مناظرانہ رنگ منطقیانہ ڈھنگ اور استدلال عقلی کے حدود سے آگے بڑھ کر سب کو پیچھے چھوڑ کر روحانی وجدان کے ذریعہ سے اللہ کی رحمت کو جانتے اور اس کے عذاب کو پہچانتے ہیں اسی لئے عذاب سے ڈرتے اور رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ۔ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ فروگذاشت ضرور ہو جاتی ہے۔ شرک اور کبیرہ گناہوں سے آدمی بچ سکتا ہے اور بچتا ہے صغیرہ گناہوں سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے، مگر اجتہادی غلطی معمولی لغزش غلط فہمی نسیان اور سہو سے بچنا ناممکن ہے۔ یہ فروگذاشت عقلاً قابل مواخذہ ہے، اس لئے کہ غلطی ضرور ہے، مگر شریعت اسلامیہ نے اس کو قابل مواخذہ نہیں قرار دیا اور قرآن پر چلنے والوں کو بشرطیکہ ان کے دلوں میں رحمت الٰہیہ کی امید اور عذاب خداوندی کا خوف ہو۔ اس فروگذاشت کی معافی بشارت دی ہے اور نہ فقط عفو قصور کا اعلان کیا ہے بلکہ ثواب جمیل کی خوشخبری دی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى۔ گزشتہ آیات میں دو باتوں کی تفصیل دی تھی۔ اول ان لوگوں کا احوال بیان تھا جو فطری طور پر صلاحیت ایمانی سے محروم ہیں۔ پھر ان لوگوں کا تذکرہ تھا جو اتباع قرآن اور ایمان صحیح رکھنے کے بعد سعادت اخروی پانے والے ہیں۔ لیکن رسالت تبلیغ اور ہر قسم کی نصیحت کا اصل فائدہ قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ نیکی بدی اور ایمان و کفر کا ثمرۂ طیبہ یا خبیثہ آئندہ زندگی میں حاصل ہوگا۔ گویا سزا جزا کا اصل دن قیامت کا

ہوگا، لیکن اسلامی سزا جزا دو باتوں پر موقوف ہے۔ اول یہ کہ اس کی زندگی کے بعد دوسری زندگی ہو اور آدمی مر کر معدوم نہ ہو جائے۔ دوسرے اچھے بُرے اعمال محفوظ رہیں۔ کوئی یادداشت ایسی ہو جس میں آدمی کے ہر سکون و حرکت کا اندراج ہو اور اسی کے موافق عذاب و ثواب ہو۔ اول الذکر کا بیان مذکورہ بالا فقرہ میں ہے کہ بلاشبہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے یعنی آدمی مر کر بالکل فنا نہیں ہو جائے گا بلکہ آئندہ پھر زندہ کیا جائے گا۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ۔ یہ مؤخر الذکر امر کا بیان ہے۔ اس آیت کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ آیت کے معنی عام ہیں۔ مرنے سے پہلے آدمی جو کچھ کرتا ہے گویا اُن اعمال کو پہلے بھیج دیتا ہے۔ ان اعمال میں بعض عمل ایسے ہوتے ہیں جن کا اچھا یا بُرا اثر آدمی کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ مثلاً کنواں، سرائے، پُل، مدرسہ، وقف وغیرہ اعمالِ خیر ہیں جن کے فوائد آدمی کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور لوگ ان سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں بلکہ ہر قسم کی مؤثر تبلیغ اور کارِ خیر کی ہدایت اپنا ثمرۂ طیبہ چھوڑ جاتی ہے اور اعمالِ شر کی شان بد رسوم قبیحہ ہیں جن کو آدمی خود جاری کرتا ہے خود بھی ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی عامل بناتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو وہ رسوم باقی رہ جاتے ہیں۔ اور لوگ نسل در نسل گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پس مَا قَدَّمُوْا سے تو وہ اعمالِ خیر و شر مراد ہیں جو آدمی اپنی زندگی میں کرتا اور آئندہ زندگی کے لئے بھیجتا ہے اور اٰثَارَهُمْ سے وہ نتائجِ حسنہ و قبیحہ و ثمراتِ طیبہ و خبیثہ مراد ہیں جو مرنے کے بعد آدمی چھوڑ جاتا ہے۔ آدمی کے اعمال اور آثارِ اعمال دونوں باعث ثواب و عذاب ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے اسلام میں کوئی اچھا راستہ نکالا اس کے لئے اپنے ذاتی عمل کا بھی ثواب ہوگا اور ان لوگوں کے اعمال کا بھی ثواب ہوگا جو اس نیک راستہ پر چلیں گے لیکن ان لوگوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں بُری راہ نکالی اس پر اپنی بدکاری کا بھی عذاب ہوگا اور جو اس کے بعد اس کے قائم کئے ہوئے راستہ پر چلیں گے ان سب کا بھی گناہ ہوگا مگر ان بدکاروں کے عذاب میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔ یہ حدیث فرمانے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ تلاوت فرمائی (مسلم و ابن ابی حاتم)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے حضورِ والا نے ارشاد فرمایا آدمی کا ہر عمل مرنے کے بعد منقطع ہو جاتا ہے صرف تین طریقوں سے منقطع نہیں ہوتا۔ (۱) اس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے (اس کے مرنے کے بعد) نفع اٹھایا جاتا ہو (۲) کوئی فرزند صالح چھوڑا ہو جو اس کے لئے دعا کرتا ہو (۳) اپنے بعد کوئی صدقہ جاریہ چھوڑا (مسلم) حضورؐ نے یہ آثارِ خیر بیان فرمائے جو مرنے کے بعد باقی رہتے ہیں انہی پر اعمالِ شر کو بھی قیاس کر لینا چاہیے کیونکہ دوسری حدیث میں اعمالِ شر کے آثار باقی رہنے کی بھی صراحت آ گئی ہے۔ سعید بن جبیر وغیرہ نے آثار کی تفسیر یہی کی ہے۔ محی السنہ نے بھی معالم میں اسی کو پسند کیا ہے۔ مفسرین کا دوسرا گروہ جس میں مجاہد، حسن بصری اور قتادہ بھی شامل ہیں۔ کہتا ہے کہ آثار سے مراد ہیں قدموں کے نشان یعنی ہم ان کے اعمال کو (یہاں تک کہ) قدموں کے (اچھے بُرے) نشانات کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ نشاناتِ قدم جو طاعت یا معصیت کی طرف چلنے سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی لکھ لئے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے مکان سے سو قدم چل کر مسجد یا مدرسہ کو گیا تو اس کے نامۂ اعمال میں سو آثار نیک لکھے جائیں گے۔ اور اگر سو قدم شراب خانہ یا قمار خانہ وغیرہ کی طرف گیا تو سو آثار بدکاری لکھے جائیں گے۔ اسی وجہ سے حضرت قتادہ نے فرمایا اے بندۂ خدا تیرے کسی حال کو اگر اللہ بے لکھا چھوڑ دیتا تو وہ یہی نشانِ قدم ہوتا جو ہوا کے چلنے سے مٹ جاتا ہے۔ پس جب کہ تیرے آثارِ قدم بھی نیکی یا بدی میں شمار ہوتے ہیں تو پھر تجھ کو اپنے دوسرے اعمال سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ آثار سے آثارِ قدم مراد لینے کی تائید مختلف احادیث اور اقوالِ صحابہ سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ مسجدِ نبوی کے آس پاس زمین کے کچھ قطعات خالی پڑے تھے۔ انصار کے خاندان بنی سلمہ نے چاہا کہ اپنا محلہ جو مسجد سے دور تھا چھوڑ کر مسجد کے قریب آ بسیں۔ یہ خبر حضورِ والا کو پہنچی تو بنی سلمہ سے ارشاد فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم اپنا محلہ چھوڑ کر مسجد کے قریب آنا چاہتے ہو۔ بنی سلمہ نے عرض کیا جی ہاں، بلاشبہ ہمارا یہ ارادہ ہے۔ ارشاد فرمایا یا بنی سلمۃ دیارکم تکتب آثارکم دیارکم تکتب آثارکم اے بنی سلمہ اپنے محلہ میں بسے رہو، تمہارے آثارِ قدم لکھے جائیں گے۔ یہ الفاظ دو مرتبہ فرمائے۔ (احمد و مسلم) حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ خاندان بنی سلمہ مدینہ کے کنارہ پر رہتا تھا اس نے مسجد کے قریب آ کر رہنا چاہا اس پر نازل ہوا اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ الخ حضورِ اقدس ﷺ نے بنی سلمہ سے ارشاد فرمایا تمہارے نشاناتِ قدم لکھے جاتے ہیں۔ اس حکم پر وہ لوگ اپنے محلہ سے منتقل نہیں ہوئے (ترمذی، بزار) روایت میں ہے کہ بنی سلمہ نے حضورؐ سے شکایت کی تھی کہ ہمارے گھر مسجد سے دور ہیں اس پر آیت وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ نازل ہوئی۔ یہ فضیلت سن کر وہ لوگ اپنے محلہ میں

لیے رہے ۔ ابن عباس کا بھی یہی قول مروی ہے (ابن جریر، طبرانی) ثابت البنانی کہتے ہیں حضرت انس کے ساتھ نماز کے لئے جا رہا تھا ۔ راستہ میں میں نے لمبے قدم اٹھانا شروع کئے ۔ حضرت انس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگے ۔ جب نماز سے فارغ ہو گئے تو حضرت انس نے فرمایا میں زید بن ثابت کے ہمراہ جا رہا تھا میں نے چلنے میں تیزی کی تو زید نے فرمایا انس تم کو معلوم نہیں کہ آثار قدم لکھے جاتے ہیں (ابن جریر)

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک امام مبین سے مراد لوح محفوظ ہے جس کو ام الکتاب بھی کہا گیا ہے ۔ لیکن مجاہد، قتادہ اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ اعمال نامے مراد ہیں ۔ بعض دیگر ائمہ تابعین سے بھی یہی قول مروی ہے ۔ دوسری آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چھوٹا بڑا عمل اعمال نامے میں درج ہوتا ہے ۔ ایک آیت میں آیا ہے ۔ وَوُضِعَ ٱلْكِتَٰبُ فَتَرَى ٱلْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَٰوَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا ٱلْكِتَٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّآ أَحْصَىٰهَا ۚ وَوَجَدُوا۟ مَا عَمِلُوا۟ حَاضِرًا

دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں، لیکن لوح محفوظ میں انسانی زندگی میں ہونے والے تمام اعمال پہلے سے درج ہیں اور دونوں اندراج باہم موافق ہوتے ہیں ۔ غرض یہ ہے کہ آدمی کے اعمال یعنی ہر حرکت و سکون کو شامل نہیں بلکہ ایک کتاب یا اعمال نامے میں ان کا اندراج ہوتا ہے اور قیامت کے دن اعمال نامہ تمام کرتوت ظاہر کر دے گا ۔

مقصودِ بیان

وَٱلْقُرْءَانِ ٱلْحَكِيمِ میں لفظ حکیم قرآن کے پُرحکمت اور اٹل ہونے پر دلالت کر رہا ہے ۔ العزیز الرحیم معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جب غالب اور مہربان ہے ۔ گویا قرآنی صوابط کی ہمہ گیری اور افادیت اس وجہ سے ناقابل شک ہے کہ عزیز و رحیم کا نازل کا نازل کیا ہوا ہے ۔ آیت لَقَدْ حَقَّ ٱلْقَوْلُ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ اول تو یہ ایک پیش گوئی ہے جو صداقت قرآن پر دلالت کر رہی ہے ۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضلالت و گمراہی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جس کے متعلق آغاز آفرینش سے ہی پہلے گمراہی کا حکم لکھا جا چکا ہے ۔ وہ کبھی ہدایت پر نہیں آ سکتا ۔ اس سے فرقۂ قدریہ کے اس عقیدہ کا بطلان ہو گیا کہ انسان مختار مطلق ہے ۔ انسانی اعمال میں قدرت الٰہیہ کو دخل نہیں ہے ۔ نیز معتزلہ کے اس عقیدہ کی بھی غلطی ظاہر ہو گئی کہ ضلالت شر ہے اور شر کا خالق خدا نہیں بندہ ہے ، اس لئے کہ اس آیت سے حکم ضلالت کا پہلے سے متحقق ہونا معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ اس کا ظہور اور تفصیل اعمال پر انطباق انسانی عمل کے بعد ہوتا ہے ۔ اس کی مزید توضیح آیت إِنَّا جَعَلْنَا فِىٓ أَعْنَٰقِهِمْ اور وَجَعَلْنَا مِنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا میں فرمادی ۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جن کے متعلق پہلے سے گمراہ ہونے کا حکم ہو چکا ہے وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے خواہ ان کو کتنی ہی نصیحت کی جائے ۔ آیت إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ ٱتَّبَعَ ٱلذِّكْرَ میں اگر نصیحت پر چلنے سے ظاہری اعمال میں اتباع مراد لیا جائے تو خَشِىَ ٱلرَّحْمَٰنَ سے اس طرف اشارہ ہوگا کہ جب تک دل میں رقت خوف نہ ہو تو ظاہری اتباع کچھ مفید نہیں ۔ لفظ رحمٰن میں اس جانب ایماء ہے کہ اللہ سے خوف کرنا چاہیئے ، مگر اس کو سب سے بڑا مہربان سمجھ کر ، دشمن ، ظالم اور ستمگار سمجھ کر نہیں ۔ بِٱلْغَيْبِ سے شانِ الٰہی کی طرف اشارہ ہوگا کہ مناظرانہ اور منطقیانہ رنگ کا ایمان اگرچہ حقیقی ہو ، مگر شرعاً کافی نہیں جب تک وجدان کی تصدیق نہ ہو ۔ استدلالی یقین ناکافی ہے ۔ یعنی مومن کامل کے لئے لازم ہے کہ علم الیقین سے آگے بڑھ کر عین الیقین بلکہ حق الیقین تک پہنچنے کی کوشش کرے ۔ بِمَغْفِرَةٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے ڈرانے والے اور قرآن کی پیروی کرنے والے لوگوں سے بھی فروگذاشت ضرور ہو جاتی ہے جو قابل عفو ہے ۔ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا۟ سے تمام اعمال یہاں تک کہ مرنے کے بعد بقیہ آثار اعمال کا اعمال نامے میں مکتوب ہونا اور واجب المواخذہ ہونا ثابت ہوتا ہے جس کی صراحت اس سے آگے وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ میں فرمادی ۔ یعنی ہم نے ہر ہر عمل کو اعمال نامے میں لکھ لیا ہے وغیرہ ۔

وَٱضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَٰبَ ٱلْقَرْيَةِ إِذْ جَآءَهَا ٱلْمُرْسَلُونَ ۝ إِذْ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمُ

ان کے سامنے ایک گاؤں کا قصہ بیان کرو — جبکہ اس بستی میں پیغمبر پہنچے تھے — جس وقت ہم نے ان کے پاس دو

اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ○ قَالُوا مَا أَنتُمْ

دو پیغمبر بھیجے تو انہوں نے ان دونوں کو جھوٹا جانا ہم نے ان کی تائید تیسرے سے کی اور تینوں نے کہا واقعی ہم تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں وہ کہنے لگے تم تو ہماری طرح

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ○ قَالُوا

جیسے آدمی ہو رحمٰن نے کوئی چیز نہیں نازل کی تم تو جھوٹ بولتے ہو پیغمبروں نے

رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ○ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ○ قَالُوا

کہا ہمارا رب واقف ہے کہ بیشک واقعی ہم کو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اور ہمارے ذمہ تو فقط کھول کر حکم پہنچا دینا ہے وہ بولے

إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِن لَّمْ تَنتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تم کو دردناک تکلیف پہنچے گی

قَالُوا طَائِرُكُم مَّعَكُمْ أَئِن ذُكِّرْتُم بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ○

پیغمبروں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے کیا ہماری نحوست اس وجہ سے ہے کہ تمکو سمجھایا گیا بات یہ ہے کہ تم حد سے بڑھ جانیوالے لوگ ہو

تفسیر آدمیوں کے تین طبقات ہیں بلند ذہنیت، روشن دماغ، پاک روح اور سادہ دل والا طبقہ اول ہے۔ پاک باطن حکماء، صاف ستھری رکھنے والے علماء اور دانشمند اس فہرست میں داخل ہیں۔ اس طبقہ کا وجود بہت کم ہے۔ قبول ہدایت کے لئے اس گروہ کو منطقی دلائل اور مناظرانہ براہین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ادنیٰ توجہ اور فکر و تدبر کی التفات نفس ان کو قبول حق پر آمادہ کر دیتا ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کے حواس مادیہ سالم، عقل فطری کسی قدر صحیح اور ادراک نفس کسی قدر صالح ہوتا ہے۔ اس گروہ کو دنیوی امور میں کافی دخل، خواص کائنات کو دریافت کرنے میں طبعی جولانی، اجزائے خارجیہ کی تحلیل، تنقیح اور تحقیق میں خصوصی مہارت اور احساسیہ کی ترغیب میں طبعی ہمت حاصل ہوتی ہے۔ اس گروہ کا سب سے اونچا حصہ تنقیح علوم کرتا ہے، سائنس کے نظریات کو حل کرتا ہے۔ علوم ریاضیہ، مدنیہ، سیاسیہ اور اقتصادیہ کے میدانوں میں بہت تیزی کے ساتھ دوڑتا ہے اور پست ترین حصہ لطافت حسن، توازن جسم، لذت ماکولات و مشروبات، جسمانی طاقت کی کمی بیشی، دولت و مال کی کثرت، شہرت، دنیا اور جاہ و تعظیم کا طالب ہوتا ہے اور اسی ذیل کی دوسری چیزیں اس کی نظر میں مایہ الافتخار ہوتی ہیں۔ اس دوسرے طبقہ کے اونچے نیچے تمام درجات اگرچہ عقل اور فلسفہ کی دنیا میں رہتے ہیں، مگر عقل کی سب سے اونچی چوٹی پر ان کی پہنچ نہیں ہوتی اور دل کے میدان میں ان کو قدم رکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ منطقی مناظرہ اور فکری جولانی ان کے لئے منتہائے نظر ہوتی ہے۔ تاہم اگر براہانی شکل میں ان کے سامنے حق و صداقت کو لایا جائے اور حقانیت کو ان کے ذہن نشین کر دیا جائے تو بعض سعید روح رکھنے والے حق کو قبول کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ دل کے میدان میں دوڑنے لگتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو محسوسات پال، شہوانیات و شہیات میں مطلق العنان، مکار، خائن، سیاہ درون، تاریک باطن، عادی گنہگار اور دماغ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ نور دل اور قلب کے سبزہ زاروں میں سیر کرنا ان کے لئے ممکن ہوتا ہے نہ عقل و فکر کے میدانوں میں ان کو دوڑنا نصیب ہوتا ہے۔ علوم نظریہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا ان کی حد حیوانیت اور بہیمیت کی حد سے قریب ہوتی ہے۔ ایسے لوگ نہ حق کے طالب ہوتے ہیں نہ حق کو قبول کر سکتے ہیں۔

اللہ کے پیغمبر جب مخلوق کو سدھارنے کے لئے آتے ہیں اور پیام ہدایت آدمیوں کے مختلف طبقات کو پہنچاتے ہیں تو اول طبقہ بلا چون و چرا اسے بغیر برہانی منطقی دلائل کے طلب کے فوراً صداقت و حقانیت کو سمجھ لیتا ہے اور مان لیتا ہے۔ تیسرا گروہ بالکل انکار کر دیتا ہے۔ وہ پیام الٰہی کو قابل

توجہ بھی نہیں سمجھا اور پیغمبر ان برحق کی کوئی اہمیت اس کی نظر میں نہیں ہوتی۔ جب مرسل من اللہ اس کے سامنے اپنا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہے تو وہ بلا تامل کہہ دیتا ہے تم جھوٹے ہو اور دعوے کی تصدیق کی دلیل بھی نہیں مانگتا نہ کسی قسم کا شبہ کرتا ہے بلکہ فوراً رد کر دیتا ہے اور کذب رُسُل پر یقین رکھتا ہے۔ آیات مذکورہ میں اوّل طبقہ کا تو تذکرہ ہی نہیں ہے۔ صرف مؤخر الذکر دو طبقات کا بیان ہے۔ پیغمبروں نے جب دونوں گروہوں سے اپنا فرستادہ ہونا ظاہر کیا تو تیسرے گروہ نے بلا تامل بغیر طلب دلیل اور بدون ایراد شبہات کے پیغمبروں کو جھوٹا کہہ دیا۔ لیکن جب دونوں پیغمبروں کے ساتھ تیسرے پیغمبر کو بھیجا گیا اور دعوے میں پختگی ہو گئی۔ ممکن تھا دو آدمی جھوٹ پر متفق الرائے ہو جائیں، مگر تیسرے کی شرکت سے احتمال کذب میں کسی قدر کمزوری ہو گئی۔ اس لئے دوسرے طبقہ کے آدمیوں نے کچھ شبہات وارد کئے، مگر اپنی دماغی وسعت کے موافق کہنے لگے تم صرف ہماری طرح آدمی ہو یعنی اقتضائے جسمانی اور فکری قوتوں میں تم کو ہم پر کسی برتری نہیں پھر ممکن نہیں کہ اللہ اپنا پیام تمہارے اوپر اتارے۔ اللہ نے تم کو پیامبر نہیں بنایا، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس طبقہ کی رسائی عقل کی اس بلند چوٹی تک نہ تھی جس کو عالم روح کہا جاتا ہے نہ دل کے اس میدان میں اس کو دخل تھا جس کو میدان سر کہتے ہیں اور یہ دو قوی مراتب طے کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں اس لئے پیغمبروں نے دعوے کو پر زور بنانے کے لئے خدا کو گواہ کر کے اپنے دعوے کو دوبارہ پیش کر دیا۔ اس وقت بعض وہ آدمی ہیں جن کو سعادتِ فکری حاصل تھی دوڑے ہوئے گئے اور حقانیت کو سمجھ کر دوسروں کو بھی دلالت کے ساتھ سمجھانے لگے جن کا بیان آئندہ مقالے میں آئے گا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ اِذْ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْا مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَاۤ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَمَا عَلَيْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ آیات میں جو قصہ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بستی کے رہنے والوں کے پاس ان کو ہدایت کرنے کے لئے اللہ نے دو پیغمبر بھیجے۔ بستی والوں نے دونوں کی تکذیب کی۔ اللہ نے ان دونوں کی تائید کے لئے تیسرا پیامبر بھیجا، مگر پھر بستی والوں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح کے آدمی ہو اللہ نے کوئی حکم نہیں اتارا، بس تم جھوٹ بولتے ہو۔ پیغامبروں نے جواب دیا ہم کو تمہارے پاس ضرور پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کو خدا جانتا ہے ہمارا کام تو واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ تفسیری تنقیح کرنے سے پہلے دو باتوں کی تشریح ضروری ہے (۱) بستی سے کون سی بستی مراد ہے (۲) اور جن لوگوں کو پیغامبر بنا کر بھیجا گیا وہ کون تھے۔ کیا سب ہی پیغمبر تھے یا کسی نبی کے قاصد۔ عام اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ قریہ سے مراد شہر انطاکیہ ہے۔ سکندر رومی کے بعد شاہ انٹیوکس نے اس کو آباد کیا تھا۔ اس شہر کے لوگ بت پرست تھے اور جوپٹر دیوی کی پرستش کیا کرتے تھے۔ رومی لوگوں کا مدت سے یہی مذہب تھا۔ یہ ایشیا کوچک میں ہے۔ (اور آجکل ترکی کی عملداری میں داخل ہے۔ اس کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی بڑی شان و شوکت کا شہر ہو گا۔ حضرت عیسٰی کے بعد حواری دین کو پھیلانے کو اطراف و جوانب میں پہنچے تو دو حواری اس شہر میں بھی آئے۔ لوگوں نے ان کی تکذیب کی۔ ان دونوں کے بعد تیسرا حواری بھی آکر شامل ہو گیا۔ اسی عرصہ میں ایک اور شخص بھی آیا اور ان کی تصدیق کرنے لگا۔ اس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں قریہ کا نام اور پیغامبروں کا حواری ہونا مذکور نہیں۔ ہاں اسرائیلی روایات میں ضرور موجود ہے۔ کتاب اعمال کے باب ۱۱ درس ۲۷ میں لکھا ہے۔ انہی دنوں کئی نبی یروشلم سے انطاکیہ میں آئے۔ کتاب اعمال کے آٹھویں باب سے ثابت ہے کہ استیفان کی شہادت کے بعد فیلبوس اور شمعون پطرس سامریہ میں وعظ کہنے لگے اور قیصریہ تک پہنچے۔ پطرس کا ساتھ میں ہونا اسی باب سے ثابت ہوتا ہے اور کتاب اعمال کے گیارہویں باب میں تو صاف صراحت ہے کہ پھرتے پھرتے فینیکی اور کپرس اور انطاکیہ میں پہنچے تب ان لوگوں کی خبر یروشلم کے کان میں پہنچی اور انہوں نے برنباس کو بھیجا کہ انطاکیہ کو جائے۔ وہ پہنچ کے اور خدا کا فضل دیکھ کے بہت خوش ہوا اور ان سب کو نصیحت کی (اس قول سے مترشح ہوتا ہے کہ دو رسول فیلبوس اور شمعون پطرس اور تیسرا برنباس تھا) بعض کا قول ہے کہ دو رسول شمعون پطرس اور یوحنا تھے۔ بہرحال یہ قصہ انطاکیہ کا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ مرد مومن استیفان تھا جس کو یہودیوں نے یروشلم میں شہید کر دیا تھا اور قریہ سے مراد یروشلم ہے اور شمعون و یوحنا پہلے دو رسول وعظ کہنے آئے تھے اور تیسرا برنباس ان کی مدد کو گیا (ملخصاً از حقانی)

حقانی اور بعض دیگر اہل تفسیر کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریہ سے مراد انطاکیہ اور رسولوں سے مراد حواری ہیں خواہ ان کے نام کچھ بھی ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ علماء نے انجیل کا مطالعہ تو بہت گہری نظر سے کیا، مگر قرآنی آیات پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور توڑ مروڑ کر کے صراحت

قرآنی کو کتاب الاعمال کی روایت سے مطابق لفظ مطابق کرنے کی سعی بے جا کی۔ حالانکہ قرآنی صراحت پکار کر کہہ رہی ہے کہ جن پیغامبروں کو بھیجا گیا تھا وہ اللہ کے پیغامبر تھے۔ کسی پیغمبر (عیسیٰ) کے قاصد نہ تھے۔ صاف ارشاد ہے کہ ہم نے ان کو مرسل بنایا تھا، ہم نے ان کو بھیجا تھا۔ اس صراحت کی تاویل اسرائیلیات کی تصدیق کرنے والوں نے اس طرح کر دی کہ اللہ کے پیغمبر کا فرستادہ ہونا درحقیقت اللہ ہی کا فرستادہ ہونا ہے۔ لیکن اہل تحقیق نے غور نہیں کیا کہ یہ واقعہ تو حضرت عیسیٰ کے بعد کا ہے۔ عیسیٰ نے ان کو نہیں بھیجا تھا (حقانی ص ۱۲۳، سطر ۱) ہاں وہ حواری ضرور تھے، لیکن حواری ہونے سے ان کا خواہ مخواہ قاصد و ایلچی ہونا لازم نہیں آتا۔ جب مسیح کے بعد کا واقعہ ہے تو وہ فرستادہ مسیح کیسے ہو گئے اور کیوں انہوں نے اپنے کو مرسلون کہا۔ دوسری وجہ جو فرستادہ پیغمبر ہونے سے انکار کر رہی ہے اور واقعی طور پر ان کا مشرعی نبی ہونا ثابت کر رہی ہے یہ ہے کہ بستی والوں نے جب ان کی تکذیب کی تو دو لفظ کہے اول تو یہ کہا تم محض ہماری طرح بشر ہو۔ دوسرا لفظ یہ کہا کہ اللہ نے کوئی پیام (تم پر) نہیں اتارا۔ اگر وہ نصیحت کرنے والے حضرت عیسیٰ کے قاصد ہوتے تو کافروں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ تم ہماری طرح آدمی ہو۔ مسیح کے قاصد بہر حال آدمی ہی تھے اور حواری ہونے میں کوئی شک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور حواریوں کو اپنے نبی ہونے کا دعویٰ بھی نہ تھا پھر کیوں کافروں نے ان کی بشریت کو کذب کا سبب قرار دیا۔ گویا آدمی ہونا جھوٹا ہونے کی علامت ہے۔ بات صرف یہ تھی کہ عموماً انبیاء کی دعوت کا جواب کافر انہیں الفاظ میں دیتے چلے آئے ہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ عموماً انبیاء کی دعوت کا جواب کافر انہی الفاظ میں دیتے چلے آئے ہیں اور بشریت کو منافی نبوت خیال کرتے رہے ہیں۔ صالح، ہود، شعیب اور خود حضور اقدس ﷺ کے زمانہ کے بعض کافروں کا بھی یہی خیال تھا۔ ان انبیاء کے واقعات تبلیغ جو قرآن میں مذکور ہیں اس قول کا واضح ثبوت ہیں۔ سبھی کافروں نے اپنے زمانے کے پیغمبروں کو نبوت کے دعوے میں جھوٹا قرار دینے کے لئے بشر کہا تھا۔ ورنہ کسی پیغمبر کے قاصد ہونے کی تکذیب تو بشر ہونے سے نہیں ہوتی۔ تعجب کہ عام اہل تفسیر اسرائیلی جھوٹوں کے سیلاب میں بہ گئے۔ خصوصاً مفسر حقانی نے تو بلند آہنگی کے ساتھ مرسلوں کو موسیٰ کا حواری ثابت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن کثیر اور اس جیسے دوسرے محتاط مفسروں نے لکھا ہے کہ یقیناً وہ حواری نہ تھے بلکہ اللہ کے پیغمبر تھے۔ اگر معلوم نہیں کہ قریہ کا کیا نام تھا اور پیغمبر کون تھے اور مومن جس کو کافروں نے شہید کر دیا کون شخص تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہاں اگر مسیح کے دو حواریوں کا شرعی نبی ہونا ثابت ہو جائے جیسا کہ اہل کتاب کا خیال ہے اور مطولی وحید الزماں حیدر آبادی نے تبویب القرآن میں اس آیت کی تفسیری لاسٹ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بغیر حوالہ کے منسوب کیا ہے تو ممکن ہے کہ قریہ سے مراد انطاکیہ اور مرسلون سے مراد حواری ہوں مگر محض فرستادہ نبی قرار دے کر اسرائیلیات سے تطبیق دینے کی تو بہر حال گنجائش نہیں ہو سکتی۔

اب ہم توضیح اجزا کرتے ہیں:- ضرب المثل سے مراد عرفی ضرب المثل نہیں ہے بلکہ بطور تمثیل و تشبیہ اصحاب القریہ کا قصہ بیان کرنا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قریہ والوں کے پاس انبیاء گئے اور انہوں نے تکذیب کی اور خشائے تکذیب انبیاء کا بشر ہونا قرار دیا اور صاف کہہ دیا کہ تم ہماری طرح آدمی ہو نبی کس طرح ہو سکتے ہو اور آخر میں ایک مرد مومن کو جس نے انبیاء کی تصدیق کی تھی اور توحید الٰہی کو دلائل کی روشنی میں ثابت کیا تھا شہید کر دیا۔ مگر اس شہید کو اپنی شہادت کا کوئی دکھ نہ پہنچا بلکہ فوراً جنت میں پہنچ گیا اور اپنی قوم کو بشارت دینے کا آرزومند ہوا اور مآل کار میں اللہ نے انبیاء سے سرکشی کرنے والوں کو ہلاک کر دیا اور نافرمانی کا نتیجہ سوا بربادی کے کچھ نہ ہوا۔ یہی حال مکہ کے کافروں کا ہے۔ ان کو بھی رسول اللہ کی بشریت نبوت کے منافی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اہل ایمان کو طرح طرح سے ستاتے تھے اور رسول خدا کو بھی دھمکیاں دیتے تھے۔ نتیجہ ان کا بھی وہی ہوگا جو اصحاب القریہ کا ہوا اور ان کو بھی بربادی اسی طرح گھیر لے گی جس طرح قریہ والوں کو گھیر لیا تھا۔ گویا اس قصہ کو بیان کرنے کا اصل مدعا کافروں کو ہلاکت کی دھمکی دینا اور مسلمانوں کو ہر طرح کے دکھ پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنا اور آئندہ زندگی کے عیش گوار ہونے کی بشارت دینا ہے۔

فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ کا شاید یہ مطلب ہے کہ پہلے دونوں پیغمبروں کو اظہار معجزات کی اجازت نہ تھی اور تیسرے پیغمبر کے ہاتھ پر معجزے کا اظہار کر دیا۔ یا یہ کہ دو کا قول کافروں کی نظر میں قابل پذیرائی نہ تھا۔ ممکن تھا دونوں کذب پر متفق ہو گئے ہوں، لیکن کم از کم تیسرے کی تائید ان دونوں کی قوت کا سبب بن گئی اور عرفی طور پر مجبوری کا پورا پیچ ہو گیا۔ یا یہ کہ تیسرا آدمی دنیا کی وجاہت اور عزت کے لحاظ سے کافروں کی نظر میں بھی ممتاز ہو اور پہلے دونوں غریب محض آدمی ہوں اور دولت مند یا وجیہ کی تائید کافروں کی نظر میں غریبوں کے قول کو مقبول بنا سکتی تھی۔ بہر حال کافروں نے عقل کی خوشی کو نہ دیکھا

بھی انکار کر دیا اور وہی توہم شبہ میں کہا کہ تم (ظاہر میں) ہماری طرح آدمی ہو اور چونکہ آدمی ہو، اس لئے اللہ اگرچہ رحمان ہے، مہربان ہے، مگر اس نے تم پر کوئی حکم نہیں نازل فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم نبوت کے دعوے میں بالکل جھوٹے ہو۔ جب پیغمبروں نے دیکھا کہ دو پیغمبروں کا قول انہوں نے نہ مانا اور پھر تیسرے پیغمبر کی تائید کے بعد بھی تکذیب و انکار سے نہ ہٹے۔ اب کسی انسان کی مزید شہادت بالکل بے سود ہے اور دلائل و بصائر کو سمجھنے کی ان میں استعداد و صلاحیت نہیں ہے۔ ان کی عقل کی کوتاہی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کو نبوت بشریت کے منافی نظر آتی ہے، اس لئے آخر میں خدا کو گواہ کر کے کہنے لگے کہ ہمارا رب واقف ہے کہ ہم اس کے پیغامبر ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ۔ مقاتل کا قول ہے کہ کافروں کی بداعمالی اور حق سے روگردانی کا ظاہری نتیجہ عبرت انگیزی اور نصیحت آفرینی کے لئے یہ نکلا کہ تین برس تک سخت قحط میں مبتلا ہوئے اور پانی نہ برسا اور زمین پر سبزی نام کو نہ رہی۔ اس نشانِ قدرت کو دیکھ کر چاہیے تو یہ تھا کہ بداعمالی سے توبہ کرتے، پیغمبرانِ حق کی اطاعت کرتے اور اپنے گناہوں کی نحوست دور ہونے کی اللہ سے دعا کرتے، مگر انہوں نے عبرت نہ پکڑی بلکہ الٹا مورد الزام انبیاء کو قرار دیا اور اس قحط کو انبیاء کی نحوست کہنے لگے۔ گویا یہ تو یقین رکھتے تھے کہ یہ خشک سالی بطور سزا ہے، مگر اپنے اعمال قبیحہ کی سزا نہ سمجھے۔ بلکہ اپنے باطل معبودوں کی ناراضگی اور پیغمبروں کی دعوت حق کا نتیجہ کہنے لگے، اس لئے پیغمبروں کی صرف تکذیب پر اکتفا نہ کیا بلکہ دھمکیاں دینے لگے۔

لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یعنی اگر تم باز نہ آؤ گے تو ہم تم پر پتھراؤ کر دیں گے اور ہماری طرف سے تم کو دردناک سزا ملے گی۔ گویا حق کی آواز کو انہوں نے دھمکیوں سے دبانا چاہا۔ قتادہ نے فرمایا رجم سے کافروں کی مراد تھی۔ پتھر مار مار کر مار ڈالنا۔ مجاہد نے فرمایا رجم سے زبانی رجم کرنا مراد تھا۔ یعنی زبان سے سخت سست کہنا، آبروریزی کرنا۔ مطلب یہ کہ کافروں نے درشت کلامی سے بھی ڈرایا اور جسمانی سزا سے بھی۔

قَالُوْا طَاۗىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ۔ قتادہ اور وہب بن منبہ کے نزدیک طائر سے مراد اعمال ہیں۔ یعنی پیغمبروں نے فرمایا یہ (قحط سالی) تمہارے اعمال ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں۔ مقصد یہ کہ یہ نحوست ہماری پیغمبری اور ہدایت و اصلاح کی نہیں بلکہ تمہاری بداعمالی کی ہے نہ تمہارے کرتوت خراب ہوتے نہ یہ عذاب آتا۔

اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ۔ کیا نصیحت کرنے کا عوض یہی ہے۔ یعنی ہم نے تمہاری خیر خواہی کی، تم کو نصیحت کی، سیدھا راستہ بتا دیا، وہ گر بتائے جن سے ابدی سعادت حاصل ہو اور تم نے ہم کو منحوس سمجھا، بدفالی کی، پتھراؤ کرنے اور دکھ پہنچانے سے ڈرایا، ایذا رسانی کے درپے ہو گئے۔ کیا ہماری خیر خواہی کا بدل یہی ہے۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ ہماری نحوست نہیں بلکہ تم بے ہودہ ہو۔ بداعمالی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہو یعنی تمہاری بدکیشی اور غلط اندیشی اس حد کو پہنچ گئی کہ تم کو خیر خواہ بدخواہ اور بھلائی برائی نظر آنے لگی اور حقیقی دوستوں کے تم دشمن بن گئے۔ یہ تمہارا اسراف عن الہدایۃ و تجاوز عن الحق ہے۔

مقصود بیان اصحاب القریہ کا تذکرہ کرنے سے سرکش کافروں کو تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ جس طرح پیغمبروں کی نافرمانی کرنے سے وہ تباہ ہو گئے اور ان کا زر و زور کچھ کام نہ آیا۔ اسی طرح قریش اور ان کے حامی پیغمبر برحق کی مخالفت کی سزا بھگتیں گے۔ ان کا جتھا اور بستی کا اتحاد کام نہ آئے گا۔ تین پیغمبروں کا ایک بستی کی ہدایت کے لئے ایک زمانہ میں پہنچنا بتا رہا ہے کہ بعض مقامات اور بعض اوقات ایک ہی قوم کیلئے ایک سے زیادہ انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ دو کی تائید کے لئے تیسرے کو بھیجنے سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ناواقفوں کے سامنے اگر واقف اشخاص کچھ کہیں تو ثبوت کے لئے واقف گواہ کی بھی ضرورت ہے۔ اور دو آدمیوں کی بات میں جھوٹ بولنے کا اگر کچھ احتمال ہو سکتا ہو تو تیسرے کی تصدیق سے احتمال کذب میں کمزوری آجاتی ہے۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں ایک سے زائد مبلغوں کی ضرورت ہو تو تین مبلغوں کا وفد بھیجنا چاہیے۔

فَقَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملحد اکثر بدکیش جاہلوں کی نظر کوتاہ اور قوت فکریہ محسوسات کی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ روحانیات کے قائل ہی نہیں ہوتے ان کو نور باطن نظر ہی نہیں آتا۔ ان کی نگاہ صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ ان کو انبیاء اور اصحاب معرفت تمام چیزوں میں اپنی ہی طرح دکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کافر بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ گویا پیام الٰہی انسان کے پاس آ ہی نہیں سکتا۔ تیسرے یہ کہ اصحاب القریہ کے پاس جو پیغامبر گئے تھے وہ مسیح یا کسی دوسرے پیغمبر کے قاصد نہ تھے بلکہ خود نبی تھے اور

نبوت کے مدعی تھے۔ اسی لیے لوگوں نے ان کی دعوے کی تردید کے لیے کہا تھا کہ تم تو ہماری طرح آدمی ہو۔ قَالُوٓا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِکُمْ الخ سے تین امور ظاہر ہوتے ہیں۔ ۱ بد اعمالی اور پیغمبروں کی ابتدائی نافرمانی کی سزا میں اصحاب القریہ کی ہلاکت سے پہلے کوئی تنبیہی عذاب آیا تھا جس کو کافروں نے پیغمبروں کی نحوست خیال کیا۔ وہ کیا عذاب تھا اسلامی روایات میں اس کی صراحت نہیں۔ بعض تابعین نے سہ سالہ قحط کی صراحت اہل کتاب کی روایات سے اخذ کر کے کی ہے۔ ۲ کرتا دین جاہل جب لاجواب ہو جاتا ہے اور دلائل کے مقابلے میں دلائل نہیں پیش کر سکتا تو جہالت پر اتر آتا ہے اور جسمانی دکھ پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ ۳ بد فالی عقیدۂ کفر ہے۔ کافر کو تہ گیر غیبی طاقت کی حکمرانی اور تصرف نہیں دکھتا۔ وہ مختلف ظاہری یا مخفی اسباب کو کارساز مطلق خیال کرتا اور اعمال کی غیبی یاداش سے غافل رہتا ہے۔ قَالُوْا طَآئِرُکُمْ مَّعَکُمْ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نحوست خصوصاً صلحا اور اصحاب معرفت کے وجود سے نحوست اخذ کرنا بے بنیاد ہے۔ ہر شخص کی نحوست و صداقت اس کے اعمال ہیں جو اس کے ساتھ ہیں۔ اعمال کی سزا میں دکھ پہنچتا ہے وغیرہ۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ۝

اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا کہنے لگا اے میری قوم پیغمبروں کے کہنے پر چلو

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُکُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝

اُن لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کچھ اُجرت نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں

تفسیر استعدادی اور حق کی افتادوں میں کچھ سعادت مند باہوش روحیں بھی ہوتی ہیں کہ جب ان کے کانوں میں صدائے حق پہنچ جاتی ہے تو خواہ کتنی ہی دور ہوں اور حق کا منادی ان سے کتنے ہی فاصلے پر ہو، مگر وہ لبیک کہتی ہوئی دوڑتی ہیں۔ پیام صداقت پر غور کرتی ہیں اور جب غور کر کے اس صداقت کو سمجھ جاتی ہیں تو پھر ان استعدادی انسانوں کا شک یقین سے بدل جاتا ہے اور مخالف حق انسان حق کا داعی بن جاتا ہے اور دلائل و براہین کے ساتھ حق کا اعلان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے لوگو دیکھو داعیانِ حق کا پیام کیسا ہے، ان کی غرض کیا ہے وہ کیا کہہ رہے ہیں وہ تمہارے نظریات و عملیات ہوش و خرد سے کتنا حصہ رکھتے ہیں۔ غور کرو کہ حق کے منادی جس راستہ پر چلنے کی تم کو دعوت دے رہے ہیں کیا خود بھی اس پر چل رہے ہیں یا تم کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب خود بھی اسی راہ پر گامزن ہیں جس پر چلنے کے لیے تم کو بلا رہے ہیں تو ظاہر ہے یہ ہلاکت انگیز فریب نہیں ہے۔ تم کو گرفتار کرنے کا جال نہیں ہے۔ اچھا تو کیا وہ اپنے ارادتمندوں کا حلقہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا حکومت، وجاہت، عزت اور مال کے خواستگار ہیں۔ آخر اس نصیحت اور خیر خواہی سے ان کی کیا غرض ہے۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں کیوں قومی معمولات و عقائد کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جب یہ امر مسلم ہے کہ وہ کسی بدل کی خواہش مند نہیں نہ حکومت و سیادت چاہتے ہیں نہ مال و منفعت تو معلوم ہوا کہ محض جذبۂ حقانیت اور داعیۂ صداقت ان کو اعلانِ حق پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہ تم کو ہلاکت سے بچانا چاہتے ہیں صرف اس لیے کہ اللہ نے ان کو اس فرض ادا کرنے پر مامور کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ مرسل ہیں۔ سچے مرسل ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کہیں بے وقوفی کی بات تو نہیں کہہ رہے ہیں، کہیں خود تو غلط راستہ پر نہیں چل رہے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ ان کے پیش کردہ نظریات بجائے خود غلط ہوں اور وہ خود بھی غرق ہوں اور تم کو بھی لے کر ڈوبیں۔ تو ظاہر ہے کہ پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور آخر میں اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ آغاز و انجام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ سمندر سے پانی نکل کر سمندر میں پہنچتا ہے۔ بس اسی ہستی کی پرستش کرنے کی وہ دعوت دے رہے ہیں اور بصیرت کی روشنی میں اسی کی پرستش ہونی بھی چاہیے۔ پس کون سی وجہ ہے کہ ہم اُس کی پرستش نہ کریں۔ اب یہ سوچو کہ تمہارے نظریات و معمولات میں کیا نقص ہے۔ تم جن دیوتاؤں کی پرستش کر رہے ہو کیا وہ واقعی داتا ہیں۔ کیا نفع نقصان پہنچانا اُن کے قبضہ میں ہے۔ اگر اللہ تم کو کچھ دکھ پہنچانا چاہے تو کیا تمہارے معبود اس دکھ کو دور کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ ایسا ہرگز

نہیں ہے ۔ خدا کے سامنے ان کی چل نہیں سکتی ۔ اگر اللہ کے ارادہ کے خلاف یہ کچھ سفارش کرنا چاہیں تو ان کی سفارش مانی نہیں جاسکتی ۔ ان کی سفارش کا کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا ۔ پس ایسی صورت میں اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکڑنا کھلی ہوئی گمراہی ہے ۔ یہ بصیرت آفرین وعظ بمبرا دل کے جاہلوں کے لئے کچھ سودمند نہیں ہوتا ۔ دیوانہ ہوشمند کی بات کیا سمجھے ۔ مادر زاد نابینا کی آنکھوں میں شب چراغ ۔ اندھیارے کی آنکھوں کی روشنی کب ہوتی ہے ۔ بھینس کے سامنے بین بجانے سے کیا فائدہ ۔ اندھے کو چراغ دکھانا بے سود ہے ۔ پس کور و نابینا تیرہ درون دانش مند دوامی حق کے دشمن بن جاتے ہیں ۔ اور دشمنی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اس صادق مصدق کے جان لینے کے درپے ہو جاتے ہیں ، مگر چاند پر خاک ڈالنے سے اس پر خاک نہیں پڑتی ۔ پہاڑ کو ٹکر سے نہیں ہلایا جاسکتا ۔ کوہِ صداقت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں وہ پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا ۔ بدکیش کافر اس کو شہید کر دیتے ہیں ، مگر یہ شہادت اس کی فائز المرامی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کا اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور سعادت ابدی کے دروازے اُس کے لئے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ انبیاء کی دعوتِ حق کو عموماً بستی والوں نے ٹھکرا دیا ، مگر کم نصیبوں میں کوئی سعادت مند بھی ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے وہ ازلی محرومی کی وجہ سے متمتع اندوز نہیں ہوتے ۔ ان کو قرب رشتہ وجاہت اور ظاہری ہوش وخرد کی برتری کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ وہ فردیا افراد فائدہ اٹھاتے ہیں جو دور کے رہنے والے اور ظاہری وجاہت وعزت سے بے بہرہ ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اصحاب القریہ نے عموماً انبیاء کی نصیحت کو نہ مانا ، مگر بستی کے آخری کنارہ پر رہنے والا ایک سعادت مند شخص تھا وہ اگرچہ ظاہر وجاہت سے محروم تھا ۔ صحت ، دولت اور عزت سے بھی نمایاں بہرہ نہ رکھتا تھا ۔ مگر ازلی سعادت اس کے حصہ میں تھی ۔ وہ آہنگِ صداقت سن کر دوڑتا ہوا آیا ۔ اہل تفسیر نے اس کا نام حبیب لکھا ہے اور بخاری پیشہ بتایا ہے ۔ یہ بھی صراحت کی ہے کہ وہ جذامی تھا انبیاء کی دعا سے اچھا ہو گیا ۔ مفسرین کی اگر یہ روایت صحیح ہو تو ایک جذامی بیمار کا ہدایت یافتہ ہونا اور دوسرے مال دار ، باوجاہت ، تندرست ، طاقت ور آدمیوں کا محروم رہنا ازلی سعادت وحرمان کو ظاہر کر رہا ہے ۔ بہرحال اس نے بصیرت کی روشنی میں قوم کے سامنے پرزور لہجہ میں انبیاء کی رسالت کو ثابت کیا اور پیروی کی تلقین کی ۔ علمائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ رسالت کا ثبوت اور اس کی شناخت کے دو طریقے ہیں ۔ ۱ معجزات دیکھ کر ۔ ۲ پیغمبر کی رفتار ، گفتار ، اطوار دیکھ کر اور تعلیم پر غور کر کے ۔ پہلا طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں ۔ نہ پیغمبر معجزہ دکھانے کے لئے بھیجا جاتا ہے ۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی ہے اور منشائے الٰہی بھی ہوتا ہے تو چونکہ پیغمبر حاملِ توجیہ ہوتے ہیں ، اس لئے ان کے دستِ حق پرست سے خرقِ عادت کا ظہور ہو جاتا ہے ۔ لیکن چونکہ خوارق عادت کا ظہور منکر نبوت گروہ کے ہاتھ سے بھی ممکن ہے جس کو استدراج کہا جاتا ہے ۔ اس لئے معجزہ واستدراج میں فرق کرنا مشکل ہوتا ۔ لامحالہ تعلیم کی صداقت اور پیغمبر کے اطوار وگفتار کی طرف پھر بھی رجوع کرنا پڑتا ہے اور معیارِ صداقت معجزہ نہیں بلکہ پیغمبر کی تعلیم اور عمل ہوتا ہے ، اسی لئے مرد مومن نے انبیاء کے معجزات کی نہ خود طلب کی نہ کافروں کو دعوتِ حق دیتے وقت معجزات کا ذکر کیا بلکہ چار لفظ کہے اول تو یا قوم کہا ۔ گویا یہ لفظ کہہ کر اس نے حاضرین اور بستی والوں کے متعلق اپنی شفقت کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ میں تمہارا مخلص دوست ہوں ۔ (قریبی) یا دوست نما دشمن نہیں ہوں ۔ تم میرے ہم وطن ہو ۔ وطنی ہمدردی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں تمہارے سامنے اظہارِ حق کروں ۔ دوسرا لفظ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ کہا ۔ یعنی پیغمبروں کا کہنا ماننے اور پیروی کرنے کا مشورہ دیا اور اہل بصیرت کو دعوت دی کہ مرسلوں کو دیکھنا ہی اتباع کو واجب کر دیتا ہے ۔ مزید غور وفکر کی ضرورت نہیں ۔ پیغمبرانِ حق کے چہرے چھپا نہیں کرتے ۔ یہ بھی بتایا کہ اگر تم انکی پیروی کرو گے تو کچھ ذلت نہیں ۔ یہ معمولی لیڈر نہیں ، خود پسند مشیر نہیں بلکہ اللہ کے پیغمبر ہیں ۔ لہٰذا ان کی پیروی کرو ۔ تیسرا لفظ مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا کہا یہ معمولی ربط رکھنے والوں کے لئے ثبوتِ رسالت کی پہلی دلیل تھی ۔ ہر نظریہ کا علمبردار اور ہر اصلاح کا حامل اپنی تبلیغ اشاعت اعلان ، وردعایت کا کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر رکھتا ہے ۔ کوئی دولت کا طالب ہوتا ہے کوئی وجاہت ، عزت یا حکومت کا خواستگار ۔ کم از کم حلقۂ ارادت کی توسیع ہی پیش نگاہ ہوتی ہے ۔ بغیر کسی ذاتی یا خاندانی مقصد کے محض خیرخواہی اور اصلاح عامہ کے جذبات کے زیر اثر تبلیغ کرنی اگرچہ تمام دنیوی نظریات اور عملی اصلاحات کے علمبرداروں سے ممکن ہے ، مگر ثبوت واقعیت کے لئے ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی ۔ ہاں اللہ کے پیغمبروں کے دل ہر دنیوی مقصد سے خالی ہوتے ہیں ۔ وہ تبلیغ کی کوئی اجرت نہیں چاہتے نہ سردارِ قوم بننا چاہتے ہیں نہ سرمایہ دار نہ حکمران مطلق ۔ ان کی صداقت کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہوتا ہے کہ

ان کا مشن ہر لالچ سے آزاد ہوتا ہے ۔ یہی بات مردمومن نے کہی ۔ جو تھا لفظ ذہم مہتدون کہا یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ممنوط الحواس احمق کی نظر کے سامنے کوئی دنیوی لالچ نہیں ہوتا، اس کا دماغ بلند سطح تک پہنچ نہیں سکتا ۔ اس کی تعلیم نہ فقط افادیت سے خالی ہوتی ہے بلکہ گمراہ کن ہوتی ہے ۔ دیوانہ کی بڑ کو قابلِ اعتبار سمجھنا اور اس کی پیروی کرنی تباہی انگیز ہے ۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مردمومن نے کہا کہ حاملانِ رسالت خود ہدایت یافتہ ہیں گمراہ یا گمراہ نہیں ہیں ۔ پس اُن کا اتباع لازم ہے ہدایت یافتہ ہادی ہوا اور ہر لالچ سے آزاد پھر اس کی پیروی نہ کرنی حماقت ہے (بائیسواں پارہ ختم ہوا)

ضروری اعلان

۱۔ تفسیر بیان السبحان کا عام ہدیہ ۲ روپے فی پارہ ہے جس پر تقریباً سوا روپیہ محصول ڈاک رجسٹری صرف ہوتا ہے۔

لیکن

۲۔ مستقل خریداروں کو جو ایک روپیہ فیس ممبری بھیج کر ہمارے باضابطہ ممبر بن جاتے ہیں ان کو تفسیر بیان السبحان کے تمام پارے ایک روپیہ فی پارہ کے حساب سے ہم سپلائی کرتے ہیں لیکن محصول ڈاک وی پی ہر حال میں ممبر صاحبان کو بھی تقریباً سوا روپیہ ہر ماہ ادا کرنا پڑتا ہے اس طرح تفسیر روپے میں پہنچتی ہے۔ اس لئے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اگر کئی ممبر ایک ساتھ فیس ممبری بھیج کر ہمارے ممبر بن جائیں تو ایک جلنے ہوئے تمام ممبروں کے لئے تفسیر بیان السبحان ہم ایک ہی پیکٹ میں ارسال کر سکتے ہیں اس طرح محصول میں سب کو بچت ہو جائے گی ورنہ سوا روپیہ ہر ماہ ہر ممبر کو بلا وجہ محصول برداشت کرنا پڑتا ہے۔ رسید کوپن پر ممبر حضرات اپنا پتہ انگریزی میں صاف تحریر کریں۔

۳۔ بحمد اللہ تفسیر بیان السبحان کے بائیس ۲۲ پارے مکمل ہو چکے ہیں ہم نے ممبران کے اصرار پر پہلے سے دسویں پارہ تک اور گیارھویں سے بیسویں پارہ تک یکجا کر کے دو جلدیں بندھوا دی ہیں۔ جو صاحب منگوانا چاہیں وہ ہر وقت طلب کر سکتے ہیں۔ دس پاروں کا ہدیہ دس روپے، جلد بندھوائی دو روپے، ڈاک خرچ تین روپے۔ یہ جلد ہم آپ کو رجسٹری سے ارسال کر دیں گے۔ آپ پندرہ روپے کا منی آرڈر کر دیجئے۔ اس کا وی پی نہیں بھیجا جائے گا۔ ممبری فیس ایک روپیہ الگ ہے۔

۴۔ ممبران صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بوجہ گرانی کاغذ اور دوسرے اشیاء کے بنا پر تفسیر کے پارہ کا ہدیہ دو روپیہ کے بجائے دو روپیہ پچیس پیسے سابقہ اقساط کا ہدیہ بھی دو روپیہ پچیس پیسے ہوگا۔ ممبران کرام کو ایک پارہ کی وی۔ پی۔ پچاس فی صدی رعایت کی بنا پر مع محصول دو روپیہ پچیس پیسے ارسال ہوگی جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ فقط۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبْحَانْ

کا

پارہ نمبر ۲۳

وَمَالِیَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے اصرار پر

قیمت ...... بصورتِ پارہ ۳/۵۰

وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی) سے شائع کیا

تیئیسواں ٢٣ پارہ (جزو اول)

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ

اور کیا وجہ جو میں اس کی پرستش نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اُسی کے پاس تم سب کو لوٹ کر جانا ہے کیا میں اُس کو چھوڑ کر

دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ

ایسے معبودوں کو اختیار کروں کہ اگر رحمن مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو اُن کی سفارش نہ میرے لئے مفید ہو سکے اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں

اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝ قِيْلَ ادْخُلِ

ایسی صورت میں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا پس تم میری سُن لو اُس سے کہا گیا کہ جنت

الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝

میں چلا جا کہنے لگا کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت والوں میں شامل کر دیا۔

تفسیر وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ مردِ مومن نے گزشتہ کلام میں رسالت کو بصیرت کی روشنی میں دکھایا تھا۔ اس جگہ تعلیمِ رسالت یعنی توحیدِ الوہیت کو دلیل سے ثابت کیا ہے۔ تمام انبیاء کی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہوتی ہے۔ اصحاب القریہ کے انبیا نے بھی توحید کی تعلیم دی تھی۔ چونکہ مردِ مومن سب سے پہلا مومن تھا، اس لئے اس نے انبیاء کی نمائندگی کرتے ہوئے دلیل کے ساتھ توحید کا اعلان کیا۔ آغاز اور انجام مبدا اور معاد اوّل اور آخر انسان کا کیا تھا اور کیا ہوتا ہے۔ کہاں سے ہے اور کہاں تک ہے۔ انسانی زندگی کے دونوں کنارے کس کے ہاتھ میں ہیں۔ کون خالق ہے اور کون منتہائے سفر۔ سب سے بڑی نعمت آدمی کی ہستی ہے۔ وجودِ انسانی کے لئے لامحدود اسباب کی تخلیق ضروری ہے۔ مادہ، صورت، ہیئت، شکل، کیفیت، حالت اور ان تمام عوارض کے اسباب مولدہ پیدا کرتے ضروری ہیں۔ پس آغازِ آفرینش جس کے ہاتھ میں ہے، وہی معبودِ برحق ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس دورِ زندگانی کے اختتام کے بعد مآل کار کس کے قبضہ میں ہے۔ مر کر آدمی کہاں جاتا ہے، کون اس کو مختار ہوتا ہے۔ آئندہ زندگی کا تعلق کس سے ہے۔ پس جس سے آئندہ زندگی کا تعلق ہوگا جو دورِ ثانی یعنی اُخروی کے نفع نقصان کا مالک مختار ہوگا اسی کو نفع نقصان کا مالک مختار ہوگا۔ اسی کو معبودِ برحق ہونا چاہیے۔ اس سے ثابت ہوا کہ معبودِ برحق سوا خدا کے کوئی نہیں کیونکہ آغاز و انجام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی نے بغیر مادہ کے تخلیق کی تھی اور تم سب کو بھی اسی نے پیدا کیا اور اسی کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ان آیات میں اثباتِ الوہیت کا دوسرا رنگ اختیار کیا ہے۔ معبود میں دو وصف ہونے لازم ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ سب سے بڑا مہربان ہو اور اس کی رافت و عطوفت عام ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور اور قوی ہو اس کی گرفت سے کوئی چیز خارج نہ ہو۔ معبود میں ان دونوں صفتوں کا تحقق لازم ہے ورنہ پرستش یعنی انتہائی عاجزی اور فروتنی نہ فقط غیر مفید ہے بلکہ انسانیتِ کبریٰ کی تذلیل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات جان لینی بھی ضروری ہے کہ اگر معبودِ برحق کی پرستش کو چھوڑ کر یا اس کی پرستش کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی پرستش کی جائے تو کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں۔ اگر کچھ بھی فائدہ ہو تو شرک

فی العبادۃ میں کیا ہرج ہے ۔ انتہائی عجز زبانی، قلبی اور عملی قیود کی پابندی اسی وقت مناسب ہے ۔ جب معبود کی ذات سے کسی قسم کا نفع وابستہ ہو ۔ پس سب سے بڑا مہربان اور قادر مطلق تو سوا خدا کے کوئی نہیں ۔ اب اگر اس کی پرستش کے ساتھ دوسروں کو معبود قرار دیا جائے گا تو لامحالہ کسی نفع کی امید پیہاں کی پرستش کی جائے گی ۔ پس ان کے ہاتھ میں نفع رسانی کی طاقت ہونی چاہیے، لیکن مگر اللہ نہ چاہے اور کسی کو عذاب پہنچانے اور دکھ دینے کا ارادہ کرے تو پھر کسی کی طاقت تو بجائے خود رہی التجا اور سفارش بھی کارآمد نہیں ہو سکتی ۔ اس صورت میں دوسروں کی عبادت محض ہونی گمراہی ہے ۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۔ بقول ابن اسحاق حضرت ابن عباس، حضرت کعب الاحبار اور وہب بن منبہ نے فرمایا کہ اس مرد صالح نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے تھے ۔ گویا اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم مانو یا نہ مانو خوب سن لو کہ اللہ تمہارا رب ہے اور میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں ۔ اس آخری فقرہ میں بھی اللہ کی الوہیت کو ثابت کرنے کے لئے اس کی ربوبیت عامہ کو ذکر کر دیا ۔ شیخ ابن جریر نے لکھا ہے کہ دوسرے اہل تفسیر نے صراحت کی ہے کہ وہ مرد صالح کا مذکورہ خطاب انبیاء سے تھا گویا اس نے ایمان و اطاعت کا گواہ بنانے کے لئے انبیاء کو خطاب کیا ۔

ابن کثیر نے اسی تفسیر کو زیادہ واضح قرار دیا ہے ۔ ابن کثیر نے بروایت ابن اسحاق حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ دلیل سن کر بستی والے یک دم اس مرد صالح پر ٹوٹ پڑے ۔ قتادہ نے فرمایا کہ پتھروں سے مار کر شہید کر دیا ۔ حسن بصری نے فرمایا آگ میں جلا کر شہر پناہ پر لٹکا دیا ۔ واللہ اعلم ۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انتقال اپنی موت سے ہوا یا کسی نے شہید کر دیا ۔

ایک ضروری تنقیح ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباس کی طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار نو سو برس[۱۹۰۰] کا فصل تھا ۔ اس انیس سو سال کی مدت میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کوئی پیغمبر موجود نہ رہا ہو یا احکام شریعت بالکل مٹ گئے ہوں پھر حضرت عیسیٰ اور رسول برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پانچ سو انہتر[۵۶۹] سال کا فصل تھا ۔ اس مدت کے اندر حضرت عیسیٰ کے بعد ابتدائی ایک سو پینتیس[۱۳۵] سال میں اللہ نے تین پیغمبر بھیجے جن کا بیان اس جگہ اصحاب القریہ کے تذکرہ میں موجود ہے باقی چار سو چونتیس برس نبوت سے خالی رہے ۔

ابن عساکر اور ابن سعد کی اس روایت کی تائید کسی دوسرے راوی کے قول سے نہیں ہوتی ۔ اسی لئے عام جمہور مفسرین و علمائے اُمت کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد دور محمدی تک کوئی پیغمبر نہیں آیا ۔ اس کے علاوہ حضور اقدس کا خود فرمان موجود ہے کہ میں عیسیٰ بن مریم کے ساتھ اقرب ہوں ۔ میرے اُن کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں ۔ (او کما قال رواہ البخاری فی صحیحہ)

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۔ بروایت محمد بن اسحاق حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ کافروں نے اس مرد صالح کی نصیحت کے عوض اس کو پاؤں سے روند ڈالا ۔ یہاں تک کہ اس کی آنتیں نکل پڑیں (شہادت کے بعد) اللہ نے اس کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی وہ جنت میں چلا گیا ۔ وہاں رزق جمیل (جو شہیدوں کے ساتھ مخصوص ہے) پاتا ہے ۔ اللہ نے اس کی ہر دنیوی بیماری اور دکھ درد کو بھی دور کر دیا ۔ قتادہ نے فرمایا جنت میں بھی اس نے تمنا کی کہ کاش اس کی قوم کو خداداد عزت و برکت کا علم ہو جائے ۔ ابن عساکر نے فرمایا کہ اس نے زندگی میں اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور پیغمبروں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیا ۔ اور مرنے کے بعد بھی یہ تمنا کی کہ کاش اُس کی قوم کو خداداد عزت و مرتبہ کی اطلاع ہو جاتی (رواہ ابن ابی حاتم) ابو مجلز نے بیان کیا کہ اس نے اپنی اطلاع قوم کو پہنچانے کے لئے اس لئے تمنا کی کہ اس کی قوم انبیاء کا حکم مان لے اور ان کی اطاعت کرے ۔ عبد الملک بن عمیر کی مرسل روایت ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفی نے عرض کیا یا رسول اللہ ! حضور حکم دیں تو میں اپنی قوم کو جا کر تبلیغ کروں ۔ ارشاد فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہیں وہ تم کو قتل کر دیں ۔ عروہ نے عرض کیا اگر وہ مجھے سوتا پائیں گے تو بیدار بھی نہ کریں گے (یعنی وہ میری بہت عزت کرتے ہیں پھر قتل کرنے کی ہمت نہ کریں گے) ارشاد فرمایا اچھا جاؤ ۔ عروہ گئے اور لات و عزیٰ (دو مورتیوں کے نام ہیں) کی طرف سے گزرے تو فرمایا کہ کل تم پر مصیبت آئے گی ۔ قوم ثقیف یہ الفاظ سن کر مشتعل ہو گئی ۔ عروہ نے کہا اے قوم ثقیف لات اور عزیٰ بیچ ہیں تم اسلام لے آؤ سلامت رہو گے ۔ اے گروہ ثقیف عزیٰ اور لات ہیچ ہیں، مسلمان ہو جاؤ، بچ جاؤ گے ۔ یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے ۔ اچانک ایک کافر نے تیر مارا آپ شہید ہو گئے ۔ حضور والا کو اطلاع ہوئی تو ارشاد فرمایا جس طرح یٰس والے

مردِ صالح نے کہا تھا: قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ یہ بھی حالتِ نزع کی ہے۔ رواہ ابن ابی حاتم۔ ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ مردِ صالح نے مرنے کے بعد اپنی قوم کو اپنی حالت کی اطلاع دینے کی تمنا کی تھی، مگر بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ سے آخر تک اس شخص کا قول اسی زندگی میں تھا چونکہ وہ کامل مومن تھا۔ انبیاء نے اس کو جنت کی قطعی بشارت دے دی تھی۔ اس پر اس نے تمنا کی کاش اس کی قوم کو بھی اسی بشارت اور عطائے عزت کا علم ہو جاتا۔ یہ قول مذکورہ اقوال و آثار کے خلاف ہے اور ظاہر آیات کے بھی منافی ہے واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

شقیانِ ازلی کو پند و نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ نہ قرب، رشتہ اور ظاہری عزت و وجاہت کام آتی ہے بلکہ وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے حصہ میں ازلی سعادت ہوتی ہے۔ خواہ وہ ظاہری وجاہت و عزت سے محروم ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسا کہ اصحاب قریہ کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ قابلِ پرستش وہی ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں آغاز و انجام کا اختیار ہو۔ اللہ ہی نے انسان کے مادۂ اولی کو پیدا کیا اور وہی سب کو مرنے کے بعد اپنے پاس جمع کرے گا اور معبودانِ باطل کو کسی بات کا اختیار نہیں لہٰذا پرستش کے قابل اللہ ہی ہے نہ کہ معبودانِ باطل۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ۵۶۹ برس کا فاصلہ ہوا۔ اسی دوران میں حضرت عیسیٰ کے بعد ابتدائی ۱۳۵ سال میں اللہ نے تین پیغمبر بھیجے۔ جن کا ذکر اس جگہ اصحاب القریہ کے تذکرہ میں ہے۔ باقی ۴۳۴ برس نبوت سے خالی رہے۔ نیک اور پاک ارواح کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کے عیش و تنعم کے حالات سے ان کے اعزہ مطلع ہو جائیں۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ اِنْ

اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں کیا اور نہ ہم اتارنے والے تھے وہ تو

كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ

فقط ایک سخت آواز تھی جس سے وہ اسی دم بجھ کر رہ گئے بندوں پر افسوس ہے ان کے پاس جو

مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ

رسول آتا ہے وہ اس کی ہنسی ہی اڑاتے ہیں کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو

الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ ع

ہلاک کر چکے ہیں کہ وہ ان کے پاس لوٹ کر نہیں آ سکتے اور جتنے بھی ہیں سب کے سب ہمارے حضور میں حاضر کئے جائیں گے۔

ع ۲ / ۱

تفسیر

سطحی نظر رکھنے والے آدمی کی نگاہ صرف ظاہری اسباب کے سلسلے پر ہوتی ہے۔ عادی اور معمولی واقعات کا تسلسل اس کو دکھائی دیتا ہے اور ہر سبب کو محسوس سبب سے وابستہ دیکھ کر وہ کہنے لگتا ہے کہ عالم طبیعت کا طبعی قانون ہی یہی ہے۔ ہر چیز کا تعمیری وجود دوسری چیز کے تخریبی عدم کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایک معمولی اور طبعی عوامل کے زیر اثر فنا ہوتا اور دوسرا پیدا ہوتا ہے۔ انسان محسوس اسبابِ طبعیہ کے زیر تصرف پیدا ہوتا، بڑھتا، جوان ہوتا ہے۔ پھر انحطاط اور فرسودگی کی حد تک پہنچ کر طبعی اسباب کے تحت مر جاتا ہے۔ چراغ کا تیل ختم ہو جاتا ہے چراغ بجھ جاتا ہے۔ کوتاہ نظر آدمی کے پیش نظر اسباب کے تسلسل میں غیبی طاقت کی کارفرمائی نہیں دکھائی دیتی وہ اس نظام کائنات کی زنجیر کو حلقہ در حلقہ اور باہم پیوستہ و وابستہ دیکھنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ پسِ پردہ کسی حکمران طاقت کا قائل ہی نہیں رہا، اس لئے شر و خیر، فساد و صلاح اور بربادی و

آبادی کا قرار اس کے لئے بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا ہے ۔ دریاؤں کا غیر معمولی طغیان ہوا کے جھکڑوں کا طوفان وبائی امراض سے اموات کی کثرت ، بادشاہوں کی لشکر کشی سے بے دریغ انسانی خون کا بہاؤ ، ابر رحمت کا زحمت بن جانا یا کال پڑ جانا یہ سب چیزیں بعد افراموش آدمی کے لئے عبرت اندوزی کا ذخیرہ اپنے اندر نہیں رکھتیں اور منکر قدرت انسان ہر حادثہ کی دل بہلانے والی تاویل کرنے کا عادی بن چکا ہے ، لیکن قادر کی قدرت ہمہ گیر ہے ۔ اس کا علم اور مہربانی بھی محیط کل ہے ۔ انسان کی انتہائی سرتابی اور خدا فراموشی کے باوجود وہ ظاہری اسباب کے تسلسل و تواصل کے خلاف کبھی کبھی ایسے حوادث بھی رونما کر دیتا ہے اور اعمال کی پاداش اس طرح بھی دے دیتا ہے کہ کوتاہ بین انسان کو کوئی توجیہ کرتے بن نہیں پڑتی اور جب کوئی خاص سبب اور سبب کی کڑی دماغی قبضہ میں نہیں آتی تو اپنی لاعلمی اور جہالت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک مہمل بے معنی لفظ "اتفاق" کہہ دیتا اور فہم خارج از فہم حوادث کو اتفاق پر محمول کر لیتا ہے ۔ چنانچہ اصحاب القریہ کی بداعمالی انتہائی درجہ پر پہنچ گئی ۔ انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی ، ان کو مارنے کے درپے ہو گئے ۔ مرد مومن کو قتل بھی کر دیا اور خدا جانے کیا کیا ۔ آخر میں غضب خداوندی اُن پر چھا گیا ۔ قحط سالی کو انہوں نے پیغمبرانِ برحق کی نحوست قرار دیا تھا اب وقت آ گیا تھا کہ ان کے ناپاک وجود سے سطح زمین کو صاف کر دیا جائے ۔ ایک غیبی مجہول الاسباب چیخ پیدا ہوئی جس کے سب ہلاک ہو گئے ۔ اللہ کو اُن کی بربادی اور تباہی کے لئے آسمانی لشکر نہ بھیجنا پڑا ۔ دنیا کے لئے عبرت اندوزی کا سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ایک چیخ ہی کافی ہو گئی ۔ مذکورہ آتش فشاں پھٹا نہ زلزلہ آیا نہ بجلی گری نہ سمندر میں طوفان آیا نہ تیز ہواؤں کا طغیان ہوا مگر غیبی قہار قدرت کے زیر تصرف سرکش کافر دوسروں کے لئے ذخیرۂ سبق آموزی بن گئے ۔ آہ ! انسان بھی کیسا مرکب غلط اور خدا فراموش واقع ہوا ہے ۔ اللہ کا جو فرستادہ آتا ہے اس کا مذاق اڑاتا ہے ۔ اس نے پیامِ الٰہی اور پیغمبرِ الٰہی کو بازیچۂ استہزاء بنا رکھا ہے ۔ وہ اپنی تباہی سے غافل ہے ۔ گزشتہ سرکش اقوام و اشخاص کی تباہی اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ۔ وہ اپنے پاؤں پہ اپنے ہاتھ سے تبر مارتا ہے ، مگر ایک روز ضرور اس کو خدا کے سامنے جانا ہو گا ۔ نہ کوئی جماعت بچے گی نہ فرد ۔ سب کو منتقم حقیقی کے سامنے جانا پڑے گا اور اپنے کرتوت کی جزا سزا اٹھانی ہو گی ۔

تحلیل اجزاء

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ○ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس فرد کے بعد اس کو ہلاک کرنے کے لئے لشکر کو نازل نہیں کیا ، فرشتوں جیسوں کو ہلاک کرنے کے لئے ہم کو اس کی ضرورت نہ تھی وہ تو بے حقیقت لوگ تھے جن کو ہلاک کرنا دشوار نہ تھا ۔ دوسرے اہل تفسیر کے نزدیک وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ میں اس کی قوم کی تباہی کے لئے فرشتوں کو اتارنے کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ عام قانونِ قدرت کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ کسی قوم کو ہلاک کرنے کے لئے پورے آسمانی لشکر کو بھیجنے کا طریقہ اللہ کا نہیں بلکہ ایک یا چند فرشتوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے اور وہ نحس نحس کر دیتے ہیں ۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ○ بس ایک (غیبی) چیخ پیدا ہوئی اور تمام بستی والوں کی زندگانی کا چراغ بجھ گیا اور آتشِ حیات سرد ہو گئی ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بستی والے بالکل ہلاک کر دئے گئے ۔ یعنی اصحاب القریہ سے مراد اہل انطاکیہ نہیں کیونکہ اہل انطاکیہ کسی عمومی تباہی میں گرفتار نہیں ہوئے ۔ بلکہ وہ چار شہر (انطاکیہ ، اسکندریہ ، روما ، قسطنطنیہ) جو مسیح پر ایمان لائے تھے ان میں نمبر اول انطاکیہ کا ہی تھا ۔ سب سے پہلے اس بستی کے باشندے مومن ہوئے تھے بلکہ حضرت ابو سعید خدری اور دوسرے اکابر علماء نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ نزولِ توریت کے بعد سے کبھی بھی انبیاء کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے کسی قوم کا عمومی طور پر ہلاک نہیں کیا پھر مسیح کے بعد انطاکیہ کس طرح برباد ہو سکتا تھا اس سے ثابت ہوا کہ اصحاب القریہ اہل انطاکیہ نہیں اور اگر اہل انطاکیہ ہی مراد ہیں تو اس انطاکیہ کے باشندے مراد نہیں جو اس وقت موجود ہے بلکہ کوئی بستی اس نام کی تھی جو برباد کر دی گئی ۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ حسرت افسوس کرنے کو کہتے ہیں اور افسوس بمجبوری کسی چیز کے فائع ہونے پر ہوتا ہے اور اللہ مجبور نہیں ، اس لئے وہ کس طرح افسوس کر سکتا ہے ۔

اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے ابن عباس نے حسرت کے معنی ذلیل اور خواری کے بیان کئے ہیں یعنی بندے بھی کیسے خوار ہیں اور ان کی یہ حرکت کیسی تباہ کن ہے کہ جو پیغمبر بھی ان کے پاس پہنچتا ہے اس کی ہنسی بناتے ہیں ۔ قتادہ نے فرمایا بندوں کو اپنی جان پر افسوس ہے

مقابلہ اس نافرمانی کے جس کا ارتکاب انہوں نے کیا (ابن کثیر) گویا ابن عباس کے قول پر حسرت کے معنی ہلاکت و خرابی ہے جس کا صدور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور قتادہ کے نزدیک حسرت بمعنی افسوس ہے جس کا صدور خود بندوں سے ہوتا ہے اور یہ حسرت و افسوس کی وجہ ان کی نافرمانی اور استہزا بالرسل ہے۔

تیسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صرف محاورہ کا لفظ ہے حقیقی معنی مقصود نہیں۔ کسی چیز کی خستہ حالی اور زبوں حالی ظاہر کرنے کے لیے حسرت وافسوس کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اگرچہ حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ زبوں حالی کی تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو بڑی ندامت ہوگی کہ کیوں انہوں نے اللہ کے حکم کے خلاف کیا اور پیغمبروں کو نہ مانا۔ بہر حال خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر جتنے بھی آئے۔ ہر ایک کے ساتھ اس زمانے کے کافروں نے استہزا کیا۔ ہنسی اڑائی، مگر اس کا نتیجہ انہی کے لئے برا نکلا، خوار و ذلیل ہوئے اور اپنا ٹھکانہ خود دوزخ میں بنایا۔

ہدایت

کلام کا سیاق ایک ہے۔ اصحاب القریہ اور ان کے رسولوں کی حالت اوپر کی آیات میں بیان کی گئی اور آیات کے آخر میں رسولوں کی مخالفت کی پاداش میں ان کا ہلاک ہونا ذکر فرمایا اور اس آیت میں رسول سے استہزا کرنے کو ذلت و ہلاکت کا سبب قرار دیا ہے اور شاید بلا اختلاف اس جگہ رسول سے اللہ کا نبی ہے۔ نبی کا قاصد مراد نہیں ہے۔ یہی ظاہر ہے کہ اصحاب القریہ کی ہدایت کے لئے جن لوگوں کو بھیجا گیا تھا ان سے اصحاب القریہ گستاخی سے پیش آئے تھے اور جن کی مخالفت کی سزا میں اصحاب القریہ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ سب انبیاء تھے سیاق اور سباق یہی بتا رہا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ جو مر جاتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ خصوصاً وہ شخص جو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر پیغمبروں کی تکذیب کی سزا میں ہلاک کیا گیا وہ لوٹ کر آتا ہی نہیں۔ ان سب کی حاضری اللہ کے یہاں ضرور ہوتی ہے۔ اسی مطلب کو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا ہے کہ کیا کفار (عبرت کی آنکھوں سے) نہیں دیکھتے (اور نصیحت اندوز دماغوں سے نہیں سمجھتے) کہ ہم نے کتنی قومیں ان سے پہلے (پیغمبروں کی تکذیب کی پاداش میں) ہلاک کر دیں کہ وہ ان کے پاس لوٹ کر نہیں آسکیں، مگر ان میں سے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں کہ ہمارے پاس اس کی حاضری نہ ہوئی ہو۔ غرض یہ ہے کہ کوئی شخص پھر اس دنیا میں دوبارہ نہیں آتا نہ آواگون کی صورت میں اور نہ کسی اور طریقے سے، مگر اللہ کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں۔ مرنے کے بعد بالکل معدوم نہیں ہو جاتا۔ جانا سب کو خدا کے پاس ہی پڑتا ہے۔ پس اس سے عبرت پکڑنی چاہیئے ان کافروں کو جو پیغمبروں کی مخالفت کرتے ہیں اور عذاب خداوندی سے نڈر ہیں۔

مقصود بیان

وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کو ہلاک کرنے کے لئے اللہ کو کسی غیبی سماوی طاقت کی بھی احتیاج نہیں

اِنْ كَانَتْ .... سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصحاب القریہ کی تباہی ایک چیخ سے ہوئی تھی ....

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ الخ میں عموماً انسانوں کی سرکشی، حق ناشناسی اور جہالت کا بیان ہے اور یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ پیغمبروں کو دیکھ کر پہچان لینا عام لوگوں کا کام نہیں۔ ان کے پیش نظر معیار بزرگی صرف دنیوی وجاہت، ثروت اور حکومت وغیرہ ہوتی ہے، مگر اس سے نفس حقیقت نبوت مستغنی ہے۔ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا الخ میں درس عبرت ہے ان کافروں کے لئے جو ماضی پر مستقبل کو قیاس نہیں کرتے اور قرون ماضیہ کی تباہی کو عبرت اندوزی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ سے عقیدۂ تناسخ کا ابطال ہوتا ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝

اور ان کے لئے ایک نشانی مردہ زمین ہے ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس سے اناج پیدا کیا اسی اناج میں سے یہ لوگ کھاتے ہیں

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ۝ لِيَأْكُلُوا

اور زمین میں کھجوروں کے اور انگوروں کے ہم نے باغ بنائے اور اس میں چشمے بہائے تاکہ یہ اس کے

مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ۝ سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ

پھل کھائیں اور اس کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا اس پر بھی شکر نہیں کرتے پاک ہے وہ ذات جس نے

الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ۝

کی روئیدگی میں سے اور ان آدمیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جن کو وہ نہیں جانتے ہر چیز کے جوڑے بنائے

تفسیر فلسفی ہوں یا کوتاہ نظر تنگ سمجھ رکھنے والے سب کے دلوں میں اسلامی نظریۂ قیامت اور نظریۂ جزا و سزا کے متعلق یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب زندگی کا تیل ختم ہو گیا اور چراغ بجھ گیا اور عناصر کی باہم پیوستگی اور وابستگی زائل ہو گئی اور نوعی صورت میں انقلاب ہو گیا۔ ہوا کا جزو ہوا میں، پانی کا جزو پانی میں، آگ کا جزو آگ میں اور مٹی کا جزو اعظم مٹی میں شامل ہو گیا۔ اور ساری طاقتیں بوسیدہ فرسودہ ہو کر معدوم ہو گئیں۔ تو پھر فردہ انسانی کو کس طرح از سر نو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ معدوم محض کا اعادہ محال ہے۔ ماضی لوٹ کر نہیں آسکتا۔ اگر ذرا غور کی نظر سے دیکھا جائے اور دماغ کو یکسو کر کے کسی قدر تامل کیا جائے تو یہ شبہ ہیچ ہے۔ سراب ہے، یا در ہوا ہے اور دھوکے کا سبزہ ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انسانی موت کو اہل شک نے معدوم محض سمجھ لیا ہے حالانکہ مرنے کے بعد انسانی زندگی معدوم ضرور ہو جاتی ہے، مگر معدوم محض نہیں ہوتی۔ انسانی مادہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور باقی رہتا ہے۔ ہیئت ترکیبی ضرور فنا ہو جاتی ہے۔ عناصر کی وابستگی زائل ہو جاتی ہے۔ تفرق اور پراگندگی آجاتی ہے، صورت و اشکال میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ خواص اور کیفیات میں تغیر آجاتا ہے۔ بایں ہمہ انسانی اجزا، انسانی قوام، انسانی عناصر اصلیہ، انسانی مادہ بالکل فنا نہیں ہوتا۔ اختلاف شکل، تحلیل قوام، تغیر صفت، تبدل حالت اور تنوع خاصیت کا نام فنا نہیں تبادل ہے، تعادل ہے، تناوب ہے، ادل بدل ہے اور فساد و بگاڑ ہے۔ فساد، تغیر، تبدل اور تنوع کے بعد از سر نو ترکیب اعضا، خاصیت، عطائے قوت اور افادہ حیات ناممکن نہیں۔ اسی کا ساتی زندگی میں واقع ہے۔ زمین مردہ ہوتی ہے خشک ہو جاتی ہے، سبزہ کا نام نہیں ہوتا۔ بالیدگی کیا روئیدگی سے بھی محروم ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا، لیکن رب العالمین کی قدرت اور نشانِ قدرت کے قربان جایئے۔ ابر رحمت اٹھتا ہے برستا ہے، ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ ندی، نالے، کھائی، خندق بھر جاتے ہیں۔ جل تھل لبریز ہو جاتے ہیں۔ خشک زمین سے چشمے ابل پڑتے ہیں۔ پودہ پودہ سر سبز اور ڈالی ڈالی ہریالی ہو جاتی ہے۔ مردہ زمین زندہ بن جاتی ہے نہ فقط زندہ ہو جاتی ہے بلکہ دوسروں کی زندگی کا سامان بھی پیدا کرتی ہے۔ ہری بھری کھیتی میں غلہ اور لہلہاتے باغوں میں پھل، میوہ، انگور، کھجور وغیرہ پیدا ہوتے ہیں تاکہ انسان (منکر قدرت انسان) کھائے۔ زندہ رہے اور رب العالمین کا شکر ادا کرے۔ کیا یہ کارسازی کسی آدمی کی ہے۔ اس میں اللہ کے سوا کسی کی دست کاری کو دخل ہے پھر ذرا غور تو کرو کہ فقط زمین کی پیداوار ہی یکرنگ کی نہیں ہوتی بلکہ خود یہی غلہ پھل پھول سبزی کھانے والے آدمی گوناگوں ہوتے ہیں۔ ہر شخص کا رنگ جدا، شکل جدا، قوت جدا، مزاج جدا، خاصیت جدا اور یہ اختلاف رنگا رنگی صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ بکثرت مستور الکال مجہول الکیفیات مخلوق بھی نو بہ نو رنگ برنگ اور مختلف الاشکال ہے جس سے آدمی واقف نہیں۔ پس جب زمین اور کائنات زمین از سر نو زندہ ہوتی رہتی ہے تو پھر قیامت کے وجود میں کیا استحالہ ہے۔ مرنے کے بعد نہ آدمی معدوم محض ہو جاتا ہے کہ اعادۂ حیات ناممکن ہو نہ زمین کا سبزہ اپنا قوامی مادہ فنا کر دیتا ہے کہ دوبارہ روئیدگی اور بالیدگی محال ہو۔ یہ بھی ممکن وہ بھی ممکن۔

تحلیل اجزا۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ۔ آخرت کا حشر نشر اور بعث جسمانی بہت لوگوں کو تعجب انگیز اور ناقابل فہم نظر آتا ہے، اسی

لئے وہ قیامت کا انکار کر دیتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حشر و نشر کی صحیح تصویر کشی اور پوری توضیح ناممکن ہے اور ممکن بھی ہو تو اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ کیونکہ ایسا عظیم الشان انقلاب جہانِ زندگی میں کبھی نہیں ہوا نہ قیامت کی طرح بربادی و فنا ہی ہوئی نہ کسی کو دوبارہ زندگی عطا کی گئی اب کتاب اور جزا سزا کے لئے پیش کیا گیا۔ مگر باین ہمہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے ان کے فہم کے مطابق پیش نظر حقائق اور مظاہر کائنات میں بعض چیزوں کو بطور تمثیل بیان فرما دیا تاکہ استدلالی اور قیاسی نظر رکھنے والوں کے لئے تمثیلات مشعلِ راہ کا کام دیں اور نادیدہ کو دیدہ پر قیاس کیا جا سکے۔ اس جگہ حشر و نشر کو سمجھانے تغیر عالم اور انقلاب تام کو ممکن ثابت کرنے کے لئے بطور تمثیل زمین کا تذکرہ فرمایا۔ دیکھو اور چشم عقل کے لئے نشانِ راہ سمجھو کہ دیکھو کہ زمین مردہ ہوتی ہے یعنی خشک ہوتی ہے۔ کوئی سبزہ، درخت، کھیتی اور پھل پھول اس پر نہیں ہوتا۔ گزشتہ فصل کی ہر روئیدگی دستِ خزاں سے تاراج ہو چکی ہے لیکن اَحۡیَیۡنٰهَا وَ اَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ یَاۡكُلُوۡنَ ہ اللہ اس کو پھر زندہ کرتا ہے یعنی ابرِ رحمت بھیج کر مینہ برساتا ہے جس سے خشک زمین ہری ہو جاتی ہے اور کھیتیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے طرح طرح کے دانے حاصل ہوتے ہیں۔ انہیں میں بعض دانے انسانوں کے کھانے کے کام آتے ہیں۔ جن کو غلہ کہا جاتا ہے۔

وَجَعَلۡنَا فِیۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ۔ اور غلہ پر ہی کیا منحصر ہے۔ باغ اور گھنے باغ بھی تو اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ کھجوروں اور انگوروں وغیرہ کے علاوہ [illegible] اور نخلستان بکثرت اس سرزمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

وَّ فَجَّرۡنَا فِیۡهَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ زمین خشک، بے جان، بنجر، مردہ کو زندہ کرنا اور سبزہ کھیتی پھل پھول پیدا کرنا یہ تو انقلاب کائنات کی واضح دلیل ہے [illegible] کو ثابت کرتا ہے اس کے علاوہ خشک زمینوں اور پتھروں سے چشموں کا پھوٹ نکلنا، بہنا اور دریا بن کر رواں ہونا بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ زمین میں سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے ایک خشک دوسرا تر، ایک جامد دوسرا سیال، ایک ساکن دوسرا متحرک۔ گویا ایک مردہ دوسرا زندہ قدرت کی کیسی پرکاری ہے۔

لِیَاۡكُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ۔ یہ سب کچھ کیوں۔ صرف اس لئے کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے حاصلاتِ ارضی آدمی کھائیں۔ غور کرو کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ ہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

وَمَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡكُرُوۡنَ ہ کیا حاصلِ ارض کی پیداوار کسی انسانی دستکاری کی ممنون ہے۔ کیا کسی آدمی نے غلہ یا پھل پھول بنائے ہیں۔ ابن کثیر نے اس آیت کے دو معنی بیان کئے ہیں۔ ایک تو یہی جو ہم نے لکھ دیئے۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا یہی قول ہے اور شیخ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسرے معنی اس طرح ہوں گے کہ مَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ میں ما کو موصولہ قرار دیا جائے اور ثمرہ پر اس کا عطف کیا جائے۔ مطلب یہ کہ اللہ نے زمین میں پیداوار کی، اس لئے کہ آدمی قدرتی پیداوار اور خود اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو کھائیں اور شکر ادا کریں۔ قدرتی پیداوار تو غلہ، پھل وغیرہ بالکل ظاہر ہے اور انسانی صنعت کی پیداوار سے بھی ہر شخص واقف ہے۔ مٹھائیاں، چٹنیاں، اچار، طرح طرح کے سالن، چٹنیاں، جوارشیں، عرق اور دوسرے مرکبات سب انسانی دستکاری کا نتیجہ ہیں۔ مگر اللہ اگر غلہ، پھل وغیرہ پیدا نہ کرتا تو انسانی صنعت کچھ بھی نہ کر سکتی۔ خام مواد تو اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ پس شکر بہر حال واجب ہے۔ کیونکہ نعمت بلا واسطہ اور نعمت بالواسطہ میں کوئی فرق نہیں۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ہ آیات مذکورہ اور زمین انقلاب عالم اور تغیرات کائنات کی تصویر کشی کر کے اپنی قدرت قاہرہ اور ہمہ گیر خلاقیت کو ثابت کیا تھا اور ذیلی طور پر اپنے گوناگوں واجب الشکر انعامات کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ اس آیت میں تین امور ذکر کر کے تنزیہ ذات و صفات کو ظاہر فرمایا ہے۔ (۱) اللہ نے زمین کی روئیدگی کو متنوع کیا۔ ہر قسم کے پھل، پھول، اناج، گھاس، جڑی بوٹیاں، دوائیں پیدا کیں۔ طرح طرح کے آدمی بنائے۔ گورے، کالے، زرد، سرخ، بدرو، خوش رو۔ پھر ان کی مختلف عادتیں، بے شمار زبانیں، گوناگوں مذاق یہ سب اللہ کی خلاقی ہے۔ (۳) بکثرت ایسی مخلوق پیدا کی جس سے آدمی ناواقف ہے۔ زمین کے اندر لاکھوں قسم کے کیڑے مکوڑے، سمندروں کے اندر ان گنت جانور، ہوا میں باریک باریک جانور سب کو اللہ نے بنایا۔ نہیں وہ

پاک ہے۔ ہر عیب ونقص سے ہر شرک وعجز سے ہر امداد واعانت سے۔ لہٰذا ہر آیت کا یہی مطلب ہے، لیکن گہری نظر سے دیکھنے کے بعد آیت کے اندر بیش
بہا مضامین اور ناقابلِ شکست دلائل کا برقی خزانہ پوشیدہ ہے۔ غور کرو کہ یہ کائنات تین طرح کی ہے۔ افراد، اشخاص، اصناف اور انواع کے لحاظ سے
تو کوئی گنتی کر ہی نہیں سکتا۔ مگر اجناس کے اعتبار سے سارے مشمار کی تین قسمیں ہیں:— اول ارضی پیداوار۔ اس میں سبزہ، اناج، پھل، پھول، درخت
بیل اور ہر قسم کی روئیدگی داخل ہے۔ پانی ہوا اور زمین پر بسنے والے تمام جانداروں کا شمار بھی ذیل میں ہے۔ تم جانوروں کا گوشت پوست، ہڈی پٹھا
رگ، بال بلکہ ہر طرح کا نمو ارضی مواد سے ہی ہوتا ہے۔ انسانی جسم سے لے کر زیرین طبقہ کے ادنیٰ ترین جاندار تک سب ہی ارضی روئیدگی کے ممنون
ہیں بلکہ تمام جانوروں اور آدمیوں کی مادی قوتیں بھی زمین ہی کی پیداوار ہیں۔ آدمی کے مادی اعضا اور جسمانی ہمہ کی تمام قوتیں اور حرکتِ کیفی وکمی کی تمام طاقتیں
جانوروں کا شعور، احساس اور ساری باطنی قوتیں غرض عنصری کائنات کل کی کل زمین پر یا اس کے ماحول میں پیدا ہوتی، بڑھتی، جیتی اور پروان چڑھتی ہے۔
۲ آدمی کا تعلق ایک اور مادی مخلوق سے بھی ہے جو مافوق الطبعیات ہے اس کو نفس ناطقہ کہو یا قوتِ ادراکیہ یا روح یا عقل مجرد یا اور کچھ۔ بہر حال
آدمی کی آدمیت درحقیقت اسی سے ہے۔ وہی حکمراں اور فرماں روا ہے، وہی متصرف اور قادر ہے وہی فاعل اور خود مختار ہے۔ وہ انسانی ساخت
کو بناتی اور سنوارتی ہے وہ ہی جانتی اور پہچانتی ہے وہ سوچتی اور سمجھتی ہے۔ غرض انسان وہ ہی ہے۔ انسان کی جان اور ذات وہ ہی ہے وہ عنصری
پیداوار نہیں۔ مادی مخلوق نہیں۔ زمین ہوا آگ اور پانی کی ممنونِ کرم نہیں، بلکہ ان سب کے اوپر ہے اور پھر کمال یہ کہ تمام انسانوں میں وہ ایک جیسی نہیں
ہے۔ اخلاق عادات اور تصورات وخیالات اور افکار و آراء کا تفاوت بتا رہا ہے کہ وہ خود مختلف ہے۔ ہر انسان کی غیر مادی قوت جدا جدا ہے یا
کم از کم مظاہر میں فرق ہے۔ رنگ، زبان اور مادی طاقتوں کا اختلاف اسی کی وجہ سے ہے۔ ادنیٰ اعلیٰ کالا گورا نیلا پیلا سوکھا گیلا تمام اختلافات
افتراقات اور امتیازات مافوق الطبعیات طاقت کے ذاتی یا صفاتی تفاوت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ۳ نفس ناطقہ روح اور عقل مجرد کے علاوہ غیبی
کائنات اور بھی ہے۔ جس کی ذات اور صفات اور کیفیات سے انسان ناواقف ہے۔ بعض چیزوں کے آثار اور افعال کو صرف آنکھوں سے دیکھا
اور حواس سے متاثر ہوتا ہے، مگر واقعیت سے جاہل ہے۔ چاند سورج تمام سیارے اور ستارے آسمان اس کے طبقات زمین کی طرح غیر معلوم اگر
اور ان پر بسنے والی کائنات مجہول الذات ضرور ہے بلکہ بعض مجہول الکیفیات اور مستور الاحوال بھی۔ پھر جواہر مجردہ ملائکہ اور جن کی حقیقت،
نوعیت، صورت، حالت اور تخلیقی مادہ سے تو آدمی کورا جاہل ہے۔ ملائکہ کے فرائض کس نے سمجھے؟ جن کی حقیقت کس نے جانی؟ روحانیت کی
کس نے سیر کی؟ الا ماشاء اللہ یہ اللہ کی غیبی خلاقی، قدرتِ قاہرہ، ہمہ گیر سطوت اور انتہائی جبروت ہے جس نے سب کو بنایا پروان چڑھایا، نظم
کو قائم رکھا، زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے وابستہ کیا اور ساری کائنات کو حرکت میں لایا۔ پس اس کی ذات پاک ہے۔ ہر حالت: اضطرار
مجبوری اور کمزوری سے۔ اس کی قدرت پاک ہے عجز سے اور اس کا کمال پاک ہے ہر نقص اور عیب سے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ

اور ان کے لئے قدرت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم رات میں سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو یکایک وہ اندھیرے میں ہو جاتے ہیں اور سورج اپنی مقررہ راہ پر چلتا

لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۭ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ

رہتا ہے یہ خدائے غالب دانا کا اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔ یہاں تک کہ کھجور کی پرانی شاخ کی

الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ

طرح (آخر ماہ میں) ہو جاتا ہے نہ سورج سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو آ پکڑے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے

وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۝ (۷۱)

اور کل کے کل (ستارے) ایک دائرے میں تیر رہے ہیں اور اُن کے لئے ایک قدرت کی نشانی یہ بھی ہے کہ ہم ان کی نسل کو ایک بھری کشتی میں سوار کرتے

وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ۝ وَإِن نَّشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ

اور ان کے لئے کشتی ہی کی طرح ہم نے کئی چیزیں پیدا کر دی ہیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو اُن کو غرق کر دیں پھر نہ ان کا کوئی فریاد رس ہو اور نہ اُن کو رہائی

يُنقَذُونَ ۝ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ۝

مل سکے مگر ہماری مہربانی ہے اور ایک وقت تک بہرہ اندوز کرنا ہے

اس سنسار میں روزانہ منودار ہونے والے حوادث اور رونما ہونے والے نو بہ نو تغیرات متلونات اور انقلابات بتا رہے ہیں کہ اس کی کسی چیز کو قرار اور ثبات نہیں، بقا و دوام نہیں۔ ایک کی موت دوسرے کی زندگی کی علت ہے۔ ایک کا فنا ہونا دوسرے کے موجود ہونے کا سبب ہے۔ ہر رنگ کا زوال دوسرا رنگ پیدا کرتا ہے اور ہر ڈھنگ کا بگاڑ دوسرے ڈھنگ کی ہستی بناتا ہے۔ دنیا کے ہوشمند اور دانا متحیر ہیں۔ انگشت بدنداں اور ششدر رہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے کیسے ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ شب و روز کا تبادل، سورج اور چاند کا طلوع و غروب، تاریکی اور روشنی کی کشاکش صحیح طور پر ساری کائنات کے تغیرات کی عریاں تصویر سامنے لاتی ہے اور بڑے بڑے فلاسفروں کو حیران بناتی ہے۔ انتہائی غور کرنے کے بعد اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے یا اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ علت و معلول اور سبب و مسبب کا یہ سلسلہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ایک زنجیر ہے جو حلقہ در حلقہ اور کڑی در کڑی ازل سے ابد تک کھنچتی جا رہی ہے۔ نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا نہ انجام۔ جو حلقہ نظر کے سامنے آ گیا وہ موجود یا حال کہلایا اور جو نظر سے گزر گیا وہ مُردہ، فنا شدہ یا ماضی ہو گیا جو ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں آیا وہ مستقبل ہے۔ پس موت و حیات، ہستی و نیستی اور بگاڑ بناؤ اعتباری چیزیں ہیں، نظر بندی کے مظاہر ہیں۔ فریب نگاہ ہیں، کوتاہی بصر کے نتائج ہیں۔ واقع ہو محض ایک زنجیر ہے جس کی حرکت دوری ہے اور اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے اس طرح وابستہ ہے کہ کہیں سلسلہ اور ربط باہمی نہیں ٹوٹتا لیکن پھر وہی اول سوال لوٹ کر پیدا ہوتا ہے کہ یہ زنجیر کیا ہے؟ ایک کڑی کا نظر سے چھپنا اور دوسری کا نمودار ہونا اور ہر حلقہ کا دوسرے سے وابستہ ہونا اور علت و معلول کا باہم مربوط ہونا کیوں ہے، کیسے ہے؟ اس کی علت کیا ہے، کون اس کا متحرک ہے۔ کون ایسا طاقتور قدرت والا ہے کہ اتنے بڑے سنسار کی ہر کڑی کو خاص نظم اور خاص رفتار سے چلا رہا ہے؟ وقت، جگہ اور پروگرام کیا چیزیں ہیں۔ اور مقررہ وقت مقررہ مقام اور مقررہ پروگرام پر کون ایسا عظیم الشان اعجوبہ کار قادر مطلق ہے جس کی صناعی، بے پایاں علم اور لامتناہی قدرت کے یہ آثار ہیں، نشانات ہیں اور نتائج ہیں۔ بہت سوچا بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دیمقراطیس ایسا مجرم بے پایاں انکار بول اٹھا اس سنسار کی زنجیر کا نہ کوئی خالق ہے نہ موجد۔ یہ سلسلہ یوں ہی تھا یوں ہی ہے اور یوں ہی رہے گا نہ کوئی فاعل اول ہے نہ مختار مطلق نہ قادر حقیقی۔ علت و معلول کا باہمی ارتباط اور سبب و مسبب کی وابستگی محض اتفاقی ہے۔ ثالیس ملطی جیسا حکیم قدیم بھی اسی گرداب میں پڑ گیا۔ اس نے بھی عالم کو قدیم کہا اور دہر یا زمانہ یا طبیعت کی نیرنگیاں ان تمام تغیرات کو قرار دیا، مگر دہر یا طبیعت کے مفہوم کی صحیح تعبیر وہ بھی نہ کر سکا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیمقراطیس نے اپنی لاعلمی کو چھپانے کے لئے لفظ اتفاق بولا اور ثالیس ہری نے لفظ دہر کہا۔ نتیجہ دونوں کے قول کا ایک ہی ہے کہ ہم اس زنجیر کی تخلیق رفتار اور حلقوں کے باہمی ارتباط اور کشش کا سبب نہیں بتا سکتے نہیں سمجھ سکتے، نہیں جان سکتے۔ بس یوں ہی ہے۔ اتفاقی ہے یا طبعی ہے۔

ثالیس ملطی کا شاگرد انکیمونس مشہور ہونے والا مشہور عالم حکیم۔ فیثاغورس نے بھی بہت کچھ گرہ کشائی کر دی کہ اس نے سکھایا: عالم کے اندر لاکھوں گول گول کُرے ہیں، زمین بھی کُرہ ہے۔ چاند بھی کُرہ ہے اور سورج بھی کُرہ ہے، غرض ہر ستارہ اور سیارہ کُرہ ہے اور ہر کُرہ بجائے خود معلق ہے۔ اپنے محور پر حرکت

گردش ہے، ہر سیارہ گردش میں ہے۔ علاقۂ جذب سب کو تھامے ہوئے ہے۔ توازن کشش کے سبب کوئی کسی سے بھی نہیں ٹکراتا، لیکن فیثاغورس کا یہ قول بھی حقیقت بتانے سے قاصر رہا۔ جذب کیوں ہے، جذب کیا ہے، خالقِ جذب کون ہے، باہمی جذب اور ارتباطی کشش کا توازن کس لئے قائم کیا، یہ کب سے ہے، کیسے ہے۔ اس کا جواب بھی فیثاغورث کے فلسفہ میں معدوم ہے۔

صاحبِ مجسطی حکیم بطلیموس نے بھی اکہتر برس کی زندگی میں بہت کچھ دماغ زنی کی۔ ایک نظامِ ہیئت قائم کیا، اجرامِ فلکی کی تحقیق کی، رصد بنائی۔ تہ بہ تہ طبقہ بہ طبقہ نو کرے بھی بنائے۔ زمین کو ساکن اور باقی کروں کو متحرک بھی دکھایا۔ سورج کے طلوع و غروب اور ستاروں کے ظہور و بطون کو موجبِ لیل و نہار کی علت بھی قرار دیا، مگر دماغی تسکین کا سامان پھر بھی مہیا نہ کیا۔ افلاک کی حرکت کی علت کیا ہے۔ ایک تابع دوسرا متبوع۔ ایک علت دوسرا معلول۔ ایک کا طلوع دوسرے کا غروب کیوں ہے؟ اس کا جواب بطلیموس کی ہیئت میں ابھی نہیں ہے۔ اسی تردد اور ذہنی کشاکش سے مجبور ہو کر فرقۂ اہلِ تشکیک کے امام اور سوفسطائیہ کے سرگروہ حکیم فروجان ایلیس یونانی نے مسیح سے دو سو چالیس برس پہلے ساری کائنات کی واقعی ہستی ہی سے انکار کر دیا اور تمام انسانی تحقیقات کو محض خیالی بلند پروازی اور اعتباری ہمہ گیری کا نتیجہ قرار دیا۔

ہاں ان نافہم، کم فہم، کج فہم حکیموں اور دانش مندوں کے علاوہ روشن دماغ اور صداقت روح رکھنے والے فلسفی بھی ہوئے ہیں، جنہوں نے انتہائی تگ و دو کرنے کے بعد حقیقت اور صداقت کی ابتدائی منزل پر قدم رکھ لیا تھا۔ مثلاً حکیم سقراطیس نے عالمِ اجسام کو عالمِ ارواح کا ایک شعبہ قرار دیا اور عالمِ ارواح کو حصارِ قدرت میں محصور سمجھا اور حصارِ قدرت کو ایک دائرہ کہا جس کا مرکز قضائے نامتناہی کو ثابت کیا۔ حقیقت کا انکشاف اگرچہ ایسے ہوش مندوں کی ژولیدہ بیانی سے بھی نہ ہو سکا۔ تاہم حقیقت کے آس پاس ذہن کو پہنچنے کا موقع مل گیا۔ صرف مادہ پرستوں سے آگے بڑھ کر ایک اور عالم کا پتہ ملا جو عالمِ ارواح کہلاتا ہے جو اجرام علوی و سفلی میں کارفرما ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عالم بھی مختارِ مطلق نہیں وہ بھی کسی غیبی قدرت کے اندر ہے اور حصارِ قدرت کا ایک مرکز بھی ہے۔ مرکزِ قدرت کون ہے، اس کے اوصاف کیا ہیں، وہ صاحبِ اختیار ہے یا مجبور، واقف کار اور صاحبِ علم ہے یا نادان، طاقتور اور حکمران ہے یا عاجز اور کمزور۔ وہ رحیم و مہربان ہے یا ظالم و سفاک۔ اس نے یہ نظم کائنات بنایا اور چلایا، مگر کب تک چلائے گا۔ کیا ہمیشہ کے لئے یا کسی خاص مدت کے لئے؟ ان تمام باتوں کا جواب سقراطیس جیسے دانشمندوں نے بھی کچھ نہیں دیا۔ اگر کچھ ذہنی پیاس بجھانی ہے تو قرآن کے چشمہ میں اترو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ شب و روز کی گردش یہ چاند اور سورج کا طلوع و غروب یہ اسبابِ موت و حیات کی کشاکش اور یہ نور و ظلمت کا تبادل خود ساختہ اور خود آفریدہ نہیں۔ ازلی ابدی نہیں۔ خود اختیاری اور طبعی نہیں، اتفاقی اور دہری نہیں۔ اس نظم متحرک کا محرک ایک مختارِ مطلق طاقتور عالمِ کل ہے جس کے علمی اور حکمی اندازہ کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ سورج اپنے مقرر مقام اور مقرر پروگرام پر چلتا ہے، نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ نہ وقتِ طلوع سے پہلے نکلتا ہے نہ وقتِ غروب سے پہلے ڈوبتا ہے۔ اور چاند کا گھٹنا اور بڑھنا بھی ضابطۂ قدرت کے تحت ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ خدائے برتر و غالب و عالم کے اندازہ کے موافق ہوتا ہے۔ اس نے جس چیز کی رفتار کا جو اندازہ مقرر کیا ہے سر مو اس سے فرق نہیں ہو سکتا ہے اور آنکھوں دیکھی چیز اختیاری بھی نہیں ہو سکتی بلکہ ہر چیز اللہ کے علم و قدرت اور ارادہ پر دلالت کر رہی ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ سلخ بکری وغیرہ کی کھال اتار نے کو کہتے ہیں۔ اور سلب کر کے کھینچ لینا بھی اس کے معنی ہیں۔ اللہ کی عظیم الشان نشانیوں میں سے ایک نشانی شب و روز کی گردش بھی ہے۔ دن جاتا ہے رات آتی ہے۔ رات جاتی ہے دن آتا ہے۔ یہ گردش اور لیل و نہار کا تبادل بتا رہا ہے کہ عالم کی ہر چیز زوال پذیر ہے اور متغیر اور فنا آگیں ہے۔ قدرتِ الٰہیہ کی ہمہ گیری اور صنعتِ غیبیہ کی کارفرمائی کی یہ کھلی ہوئی نشانی ہے کہ اللہ دن کو سلب کر لیتا ہے، ساری کائنات کی نورانیت زائل ہو جاتی ہے۔ گویا ہر چیز پردۂ غفلت میں ہو جاتی ہے اور سب آدمی اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ پس کیا ساری کائنات کی روشنی زائل کرنے اور دوسرے روز دوبارہ پھر کل جہان کو روشن کرنے سے بھی زیادہ مشکل انسان کی تخلیق ثانوی ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر جسمانی اور مادہ حیات کس طرح ناممکن ہو سکتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ اس جملہ میں دو باتیں تشریح طلب ہیں (۱) عبداللہ بن عمرو، عبداللہ ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے کہ آفتاب کا مستقر اس کی شبانہ روز کی رفتار ہے جس میں کوئی توقف نہیں ہوتا۔ گویا آفتاب کی پیہم رفتار کا وقت مستقر ہے۔ اس معنی کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور والا کے ساتھ تھے۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ارشاد فرمایا ابوذر تجھے معلوم ہے کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بخوبی واقف ہیں۔ فرمایا یہ عرش کے نیچے پہنچ کر حضورِ الٰہی میں سجدہ کرتا ہے۔ پھر اجازت مانگتا ہے تو اس کو اجازت دی جاتی ہے (لیکن) عنقریب اس سے کہہ دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ جا۔ پس اس وقت یہ مغرب سے نکلے گا۔ یہی اللہ نے فرمایا ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (رواہ الائمۃ الستۃ واحمد) عبدالرزاق نے بروایت عبداللہ بن عمرو اس حدیث کے بعد اتنا اور نقل کیا ہے کہ اس روز اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا اور اجازت چاہے گا تو اجازت نہ ملے گی۔ سورج کہے گا راستہ دراز ہے اور مجھے اجازت نہیں ملتی۔ اس کے بعد حسب مشیتِ الٰہی سورج رُکا رہے گا پھر حکم ہوگا جہاں غروب ہوا ہے وہیں سے طلوع کر۔ اس وقت سے قیامت تک کسی غیر مومن کا اسلام قبول نہ ہوگا۔ ۲۔ تقدیر اندازہ کو کہتے ہیں۔ علمائے طبعی کا سرگروہ حکیم دیمقراطیس کہتے ہیں کہ تمام کائنات کا نظام ازلی ابدی ہے اس کا کوئی ناظم نہیں، اس پر کوئی قوتِ قاہرہ مسلط نہیں۔ اس کا نہ کوئی خالق ہے نہ فرماں روا۔ خود بخود بہ اقتضائے فطرت یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ ادنیٰ ترین جمادات سے لے کر اعلیٰ ترین علویات تک سب اپنی اپنی طبیعت کے زیرِ حکم بلا ارادہ چل رہے ہیں۔ لیکن آسمانی مذاہب خصوصاً اسلام اس عقیدہ کا سخت منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظامِ کائنات حادث ہے۔ اس عالم میں ہر ایک کی حرکت اگرچہ نظمِ فطرت کے تحت ہے، مگر ارادی ہے خود بخود نہیں ہے بلکہ غیبی قوتِ الٰہیہ کے تابع ہے۔ اللہ فرماں روا اور مسرت ہے۔ ہر چیز اس کی پاکی اپنی نوعی زبان سے بیان کرتی ہے اور اس کو سجدہ کرتی ہے اور ہر چیز کا سجدہ اس کی نوعی مناسبت سے ہے۔ اطاعت انقیاد اور فرماں کا مفہوم ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ ہر وقت حکم دیتا ہے تو اس عالم کی حرکت عرش سے لے کر فرش تک اور آفتاب سے لے کر قطرہ تک ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے گا اس کو روک دیگا۔ وہ خوب جانتا ہے ہر قطرہ، ہر ذرہ، ہر پتی اور ہر کیڑے کا اس کو علم ہے۔ وہ ہر چیز کے حقیر ترین حال سے بھی ہر وقت واقف ہے اور اس علم کے ساتھ اس کی قوتِ قاہرہ بھی ہر چیز کو محیط، سب پر غالب اور ساری کائنات پر مسلط ہے اور سارا نظم اسی کے اندازہ کے مطابق چل رہا ہے۔ گویا ہر چیز بے ارادہ، بے شعور اور بے اختیار بھی ہے اور باشعور با ارادہ اور با اختیار بھی ہے۔ یعنی ہر چیز کا شعور ارادہ اور اختیار ارادۂ الٰہیہ کے تابع ہے۔ سب کو تقدیرِ الٰہی حاوی ہے۔ اس تشریح کو سمجھنے کے بعد آیت کا مطلب صاف ہو گیا کہ آفتاب اپنے مقرر وقت یا مقرر مقام یا مقررہ نظام کے موافق چلتا ہے، مگر خود مختار اور بے نیاز نہیں، اندازۂ الٰہیہ کے تابع ہے۔ اللہ سب پر غالب ہے اور خوب دانا ہے۔ اس کے حکم کے مطابق آفتاب کی رفتار، وقتِ رفتار، مقامِ رفتار اور طریقِ رفتار ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ یوں تو تمام ستاروں کا طلوع و غروب، حرارت اور روشنی موالیدِ ثلاثہ کے مختلف تغیرات و حوادث کا ظاہری سبب ہے اور اللہ نے ہر کڑی کو دوسری کڑی سے وابستہ کر دیا ہے، مگر دریاؤں کا اتار چڑھاؤ، فضا کی روشنی، حیوان انسان اور نباتات کا نشو و نما، حرارت اور طاقت، رات دن کا تبادل، منٹ، گھنٹے، ایام و لیالی، ہفتے اور مہینے اور برس ان سب پر نمایاں اثر آفتاب و ماہتاب کا ہے۔ سورج کی رفتار کا بیان اوپر کی آیت میں ہو گیا۔ اس آیت میں چاند کی رفتار کا اظہار ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں پہلے ہلال نکلتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے بدرِ کامل بن جاتا ہے اور چودھویں کا چاند پورا ہو جاتا ہے پھر گھٹتے گھٹتے اٹھائیس تک گھٹتا ہے پھر چھپا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دو روز کے بعد مغرب سے بشکلِ ہلال نکلتا ہے۔ حقیقت میں چاند کی منزلیں کوئی فرودگاہ، مقام، مسکن یا اینٹ پتھر وغیرہ کا برج نہیں ہے بلکہ سیر گاہ کی ایک خاص مقدار ہے جس کو منزل کہا جاتا ہے۔ از روئے حساب تو سیر گاہ کی تقسیم ۲۹ یا ۳۰ پر ہوتی ہے، مگر چونکہ چاند کا ظہور اس عالم میں صرف ۲۸ رات ہوتا ہے، اس لئے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اٹھائیس منزلیں ہونے کی صراحت فرمائی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ چاند کی رفتار کا گھٹاؤ بڑھاؤ اور طلوع و غروب بھی بلندازۂ الٰہیہ ہے خود بخود نہیں ہے۔ اللہ نے چاند کی روزانہ فرودگاہیں اور مقدارِ مسافت مقرر فرما دی ہے۔ یہاں تک آخر میں رفتہ رفتہ گھٹ کر کھجور کی خشک خمیدہ ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نور بھی کم رکھتا ہے، حجم میں بھی کمی

ہو

آجاتی ہے اور ذرا سا کنارہ مثل خمیدہ کمان کے نظر آتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی غیبی قدرت ہمہ گیر تصرف اور محیط کل علم کی نمایاں برہان ہے اور حشر جسمانی کے ثبوت کی کھلی ہوئی نشانی ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ اوپر کی آیات میں سورج اور چاند کی اپنی اپنی رفتار کا بیان تھا۔ آگے اس آیت میں دونوں کی رفتار کی حد بندی کا اظہار ہے۔ گویا اللہ کی حکمت عامہ اور قدرت قاہرہ کی یہ ایک مستقل نشانی ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ چاند اور سورج میں سے ہر ایک کے واسطے ایک حد ہے جس سے کوئی ایک بھی تجاوز نہیں کر سکتا نہ کمی کر سکتا ہے۔ جب سورج نکلتا ہے تو رات نہیں رہتی نہ چاند کی روشنی رہتی ہے۔ جب رات آنے لگتی ہے تو سورج غروب ہونے لگتا ہے۔ حاصل یہ کہ آفتاب چاند کے عمل کے اوقات اور حدود میں داخل نہیں ہو سکتا نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے یعنی اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۔ فلک کرہ یا دائرہ کو کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ، عکرمہ، ضحاک، حسن بصری، قتادہ اور عطاء خراسانی نے فرمایا ہر ایک فلک سماوی پر دور کرتا ہے۔ اس قول سے مراد یہ ہے کہ چاند اور سورج کا کرہ یا دائرہ یا ذاتی سیرگاہ مستقل ہے جو آسمان میں ہے اور یہ دونوں سیارے اپنے دائرہ میں تیرتے ہیں۔ یعنی ہموار غیر محسوس حرکت کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ ہر ایک اس فلک میں چکر لگاتا ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ اس قول سے مراد یہ ہے کہ چاند اور سورج کا دائرہ اور ذاتی رفتار کا مقام ان کا اپنا کرہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے آسمان میں نہیں ہے۔ بہر حال دونوں قولوں کی بنا پر آیت مذکورہ میں فلک سے مراد آسمان نہیں بلکہ وہ محور یا دائرہ مراد ہے جو چاند سورج کا سیر گاہ ہے۔ پس اس سے رد ہو گیا اس عامی خیال کا کہ آسمان ایک ٹھوس کھلا جرم یا ہوا اور پانی کی طرح قابل نفوذ جسم ہے جس میں سیارے تیرتے ہیں۔ درحقیقت اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ فلک سے آسمان عرفی مراد لے لیا گیا۔ قرآن ہیئت یا نجوم کی کتاب نہیں نہ فلسفۂ طبیعیات کی تنقیح اور فیصلے کیلئے اس کو اتارا گیا ہے کہ وہ آسمان کے اندر سیاروں اور ستاروں کے پیوست ہونے یا تیرنے سے بحث کرتا اور کوئی رائے ظاہر کرتا۔ یہ درس بصیرت اور اصلاح اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے۔ مابعد الطبیعیات کے متعلق چند مختصر عقائد کو اصول مسلمہ کے طور پر بدیہی طرز ادا کے ساتھ پیش کرتا ہے ابن کثیر نے کتاب البدایہ والنہایہ میں ابن حزم اور ابن جوزی وغیرہ علماء کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت سے آسمان کا کرہ مستدیرہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس قول کو ابن حجر نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ بحث بالکل موضوع قرآن کے خلاف ہے اور علماء کی محض قیاس آرائی ہے۔ قرآن کو کوئی تعلق نہیں کہ آسمان مدور ہے یا مسطح۔ یہ اوہام پرست فلسفیوں سے اور تنگ بند اہل ہیئت سے دریافت کرو کہ انسانی فلاح و صلاح کا اس سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔

وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ۝ بالائی اور زیری تخلیقی نشانیاں (جن میں انسان کی دست کاری کو دور رس دخل بھی نہیں) بیان کرنے کے بعد اس آیت میں ایک اور نشان قدرت ظاہر فرمایا ہے جس میں بظاہر انسانی صنعت کا دخل نظر آتا ہے، لیکن اگر سطح سے اتر کر گہری نظر ڈالی جائے تو انسانی ظاہری صنعت کے اندر قدرتی تخلیق اور الٰہی کارسازی دکھائی دیتی ہے۔ آدمی جو سواری اپنے سوار ہونے اور سامان لادنے کے لئے استعمال کرتا ہے وہ پانی کی بھی ہیں اور خشکی کی بھی۔ بحری بھی اور بری بھی۔ کشتیاں اور جہاز، دریاؤں اور سمندروں میں رواں دواں ہوتے ہیں۔ ہزاروں آدمی مع ہزاروں ٹن سامان کے کشتیوں اور جہازوں پر سوار ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتے ہیں۔ اسی طرح اونٹ، ہاتھی، بیل، گھوڑا، خچر، ریل خشکی میں سواری کے اور بوجھ اٹھانے کے کام آتے ہیں۔ اور اب تو فضائی نقل و حرکت سواری اور بار برداری کے لئے سب کچھ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہونے لگی ہے۔ ان سب چیزوں کا خالق اللہ ہے۔ لکڑی، لوہے اور ربڑ کی بنی ہوئی کشتی اپنے انفرادی اجزا کے لحاظ سے پانی کی سطح پر یا تو تیر ہی نہیں سکتی یا وہ دیر تک ٹھہر بھی نہیں سکتی۔ غیر معمولی وزن اس کو غرق کر سکتا ہے، لیکن یہ اللہ کی صناعی اور احسان ہے کہ اس نے انسان کو منفرد اجزا کو اس طرح جوڑنا سکھایا اور دریائی پر کشتی کو اس طرح رواں کیا کہ ہزاروں ٹن وزن اور بحر مواج کا تلاطم بھی اس کو غرق نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ چاہے تو سب کو غرق کر دے اور کوئی بچانے والا فریاد رس بھی نہ ہو۔

آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے (۱) ذریت سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ طاقتور مرد تو جیسے تیسے تیر کر غوطہ مار کر پار جا بھی سکتے ہیں، مگر کمزور مخلوق جیسے چھوٹے بچے اور نازک عورتیں مجبور ہیں۔ اللہ نے ان کی سواری کے لئے خصوصیت کے ساتھ کشتیاں اور جہاز فراہم کئے اور بحری سفر کے علاوہ

بری اور فضائی کے لئے دوسری سواریاں بنائیں۔ اس تفسیر کی بنا پر ذریت سے مراد اولاد، عورتیں اور بالفلک سے مراد عام کشتیاں اور جہاز اور من مثلہ سے مراد کھیتوں کی سواری اور بار برداری کے جانور خچر، اونٹ، ہاتھی، گھوڑا، بیل اور ہوائی جہاز وغیرہ ہیں۔

(۲) واحدی نے صراحت کی ہے کہ ذریت کا اطلاق جس طرح اولاد پر ہوتا ہے اسی طرح آبا و اجداد پر بھی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ابومالک اور ابوصالح نے کہا کہ الفلک سے کشتی نوح کی طرف اشارہ ہے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے موجودہ انسانوں کے آباؤ اجداد کو کشتی نوح پر سوار کرکے بچالیا اور کشتی نوح کی طرح اس کے بعد دوسری کشتیاں اور جہاز ان کی سواری کے لئے بنائے۔ میرے نزدیک اوّل تفسیر زیادہ جامع عام تخصیص سے زیادہ مستغنی اور اولیٰ ہے۔

وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ ۔ اوپر کی آیات میں اپنی خلاقی، کارسازی، قدرت اور حکمت کو ظاہر فرمایا تھا۔ اس آیت میں اپنی وحدتِ تصرف، خود مختاری، حکومتِ مطلقہ اور سطوتِ قاہرہ کو بیان فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی مہربانی کی بھی صراحت کی اور اپنے بنائے قانون کا بھی اظہار کر دیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں یعنی کوتاہ فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کشتی کی موجودہ ہیئت اور جہاز کی موجودہ صنعت لوگوں کو ڈوبتے پانی کے اندر تہ نشین ہونے اور لہروں کے تلاطم سے بچنے کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ڈوبنے سے بچانا اللہ کا کام ہے۔ سبب ظاہری کی ڈور سبب باطن کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ ڈبونا چاہے تو کشتی اور جہاز بہ ہیئت موجودہ کبھی تلاطم امواج اور طوفانِ ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جہاز ساز اپنی حکمت و صنعت کے باوجود نہیں بچ سکتے۔ پھر غیبی ارواح عالم مادیات کے پوشیدہ کارندے، فرضی دیوتا، تمام جن و انس بلکہ ساری کائنات کے سب فرضی معبود فریاد رسی نہیں کر سکتے اور کوئی نہیں بچا سکتا۔ مصیبت کو اللہ کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں صرف اسی کی رحمت بچا سکتی ہے۔ پس وہی نقل و حرکت اور سواری اور بار برداری کے لئے جہاز سازی اور جہاز رانی سکھانے والا ہے۔ وہی حوادث آبی و ہوائی کو دفع کرنے والا اور جہاز کو بچانے والا ہے اور یہ سب کچھ اسی کی رحمت کا طفیل ہے ورنہ کسی کا کوئی استحقاق نہیں، کسی کی حفاظت کرنی اس پر واجب نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے قانون بنا دیا ہے کہ وقتِ خاص یعنی اجلِ مقرر کے آنے تک آدمی زندگی کے کاروبار چلاتا رہے۔ کافر ہو یا مومن نیک ہو یا بد، فرماں پذیر ہو یا نافرمان کسی کو اجلِ مقرر سے پہلے اللہ ہلاک نہیں کرتا اور سب کو مدت تک زندگانی سے تمتع اندوز ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اسی قانونِ الٰہی کا اقتضا ہے کہ کافروں کا جہاز بھی باوجود ان کے کفر و فسق کے تلاطم امواج اور طوفان ہوتے ہوئے بھی ڈوبنے سے بچ جاتا ہے۔

مقصودِ بیان عمومی تخلیق کائنات کے مطالعہ کی تعلیم۔ لفظ آیت سے اس طرف ایما ہے کہ طبقات کائنات کی تحلیل دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لئے اگرچہ صحیح ہے۔ مگر درحقیقت بصیرت و فکر کی اصل غرض معرفتِ الٰہیہ ہے۔ خواص اشیاء اور ماہیت اعیان کی محض تنقیح کافی نہیں ہے۔ جب تک علم الکائنات سے اللہ کی ذات و صفات پر استدلال نہ کیا جائے۔ نَسْلَخُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دن کے بعد رات کا آنا محض فطری غیر اختیاری نہیں اور نہ یہ صورت ہے کہ خدا شبانہ روز کی دورانی حرکت اور نظم لیل و نہار قائم کرنے کے بعد گوشۂ عافیت میں کنارہ کش ہو کر بیٹھ گیا ہو نہ اس کو نظم عالم کا علم ہو نہ اس میں کچھ دخل۔ تَقْدِيْرُ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ سورج کی رفتار ارادۂ الٰہیہ کے اندر ہے۔ بے اندازہ نہیں اور ظاہر ہے کہ اندازہ بغیر علم و ارادہ کے ناممکن ہے۔ اس لئے رفتار لیل و نہار اللہ کے علم و ارادہ اور اندازہ کی تابع ہے۔ اَلْعَزِيْزِ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اندازۂ الٰہیہ کے خلاف رفتار لیل و نہار ناممکن ہے۔ اَلْعَلِيْمِ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اندازۂ الٰہی غلط نہیں بلکہ علم کے بعد ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ وَمَا

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس (عذاب) سے ڈرو جو تمہارے آگے اور تمہارے پیچھے ہے شاید تم پر رحم کیا جائے اور ان کے

تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ

پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے اُس سے منہ ہی پھیر لیتے ہیں اور جب اُن سے کہا جاتا ہے

أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ

کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اُس میں سے کچھ (اُس کی راہ میں) خرچ کرو تو کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھلائیں کہ اگر اللہ

يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

چاہتا تو اُن کو کھلا دیتا بس تم صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو

تفسیر

انسان کوتاہ فہم انسان بے عقل چیزوں کی طرح اپنی موت دوامی موت اور اپنے اعمال و اقوال کو شدت پر آب خیال کرتا ہے کہ فنا ہونے کے بعد ان کا اعادہ اور ظہور نہیں ہو سکتا۔ اس کو معلوم نہیں کہ ہاتھ یا پاؤں یا زبان کی کوئی حرکت فنا نہیں ہو سکتی چھپ جاتی ہے۔ مادی نظم نظر سے ہوا کی برقی لہروں میں اُن کی ہستی باقی رہتی ہے اور روحانی روشنی میں دفتر فضا میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے اور یہ انعکاس یا اندراج صرف اقوال و اعمال کا ہی نہیں ہوتا بلکہ ذہن اور دماغ کی ہر لہر اور تصور کی ہر حرکت اپنا اثر پیدا کرتی اور اپنا نقش چھوڑتی ہے کیونکہ عالم واقع کی ہر چیز عدم محض سے انکار کرتی ہے صرف ظہور و خفا کا فرق ہو جاتا ہے۔ موت انسانی مادی حیات کے خفا کا نام ہے اور پوشیدہ چیز کا ظاہر ہو جانا ناممکن نہیں۔ قدرت کی تمام نیرنگیاں مخفی ہو جانے کے بعد پھر نمودار ہو جاتی ہیں۔ ہر رنگ پس پردہ ہونے کے بعد پھر نظر کے سامنے آجاتا ہے تو کیا وجہ کہ انسانی فکریات اعمال اور اقوال مخفی ہونے کے بعد معدوم ہو جائیں اور دوبارہ سامنے نہ آئیں اور جزا سزا نہ ملے بعض وہ آدمی جو سزا جزا کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ بھی اللہ کی الوہیت، اختیار اور قدرت مطلقہ کے انکار کرنے میں منکرین جزا سزا سے پیچھے نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مختار مطلق اور اپنے ارادہ و عمل کو کارساز حقیقی جانتے ہیں۔ غم و مسرت اور الم و راحت کو اپنی مساعی کا لازمی اور واجبی نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں اللہ کی الوہیت خود مختار نہیں ہوتی بلکہ مجبور الوہیت ہوتی ہے۔ جزا سزا کا اختیار اللہ کو نہیں ہوتا بلکہ انسانی مساعی اور کردار اللہ کو مجبور رکھتے ہیں کہ کردار کے موافق نتیجہ برآمد ہو۔ اس گروہ کے نزدیک نہ اللہ متصرف قرار پاتا ہے نہ فاعل حقیقی نہ مختار مطلق بلکہ اللہ پر واجب ہو جاتا ہے کہ اعمال کے موافق جزا سزا دے۔ ورنہ ان کی نظر میں خدا ظالم قرار پاتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اعمال اور قوت اعمال کا خالق بھی تو خدا ہی ہے اور عمل کرنے کی توفیق بھی تو خدا ہی دیتا ہے اب اگر وہ خود نیک عمل کی توفیق دے کر اچھے نتیجہ کا وعدہ فرماتا ہے تو یہ اس کی رحمت ہے، عنایت ہے ورنہ اس پر کسی کا وجوبی استحقاق نہیں پس ہم سب سے پہلے ہر انسان کو اگر وہ پاگل نہیں ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اعمال کی جزا سزا ضرور ملے گی پھر یہ عقیدہ اور یقین ضرور رکھنا چاہیے کہ نیک عمل کی اچھی جزا محض رحمت الٰہیہ پر موقوف ہے نیک کردار موجب نجات نہیں۔۔۔

مگر بڑا بے غافل انسان کا گروہ برخود غلطی کے نشہ میں اتنا سرشار ہے کہ قدرت کی تمام نیرنگیاں، اعجوبہ کاریاں اور بلند آہنگیاں اس کو بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں۔ وہ یا تو اسباب و مسببات اور علت و معلول کی وابستگی کا ہی انکار کر دیتا ہے۔ تمام عناصر اور ان کے مرکبات، جماد، نبات، حیوان اور فضائی کائنات میں علت اور معلول کا ہمہ گیر سلسلہ دیکھتے ہوئے قانون قدرت سے سرتابی کرتا اور اپنے اعمال و اقوال کو اخروی جزا سزا سے بے نیاز سمجھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں مختلف اسباب پیدا ہونے کی وجہ سے مختلف تغیرات دیکھتا ہے: جیسے برے الفاظ کا اچھا برا اثر دیکھتا ہے۔ محبت میں کشش اور عداوت میں نفرت کا مشاہدہ کرتا ہے تریاق سے زندگی اور زہر سے ہلاکت کا بھی معائنہ کرتا ہے۔ تمام جسمانی قوتوں کو اعتدال کے ساتھ صرف کرنے سے خوشگوار صحت کا ثمرہ حاصل کرتا اور جسم کی قوت کو افراط و تفریط کے ساتھ خرچ کرنے سے صحت کو برباد کر دیتا ہے۔ غرض نفسی اور آفاقی ارضی اور سماوی، جسمانی اور روحانی ہر طرح کی نشانیاں اس کو جزائے اعمال اور حشر نشر کی حقانیت کا اقرار کرنے کی دعوت دے رہی ہیں، مگر وہ کسی طرف

نظر نہیں دوڑاتا کسی طرف کان نہیں لگاتا کسی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا اور کسی طرف قدم نہیں اٹھاتا۔ انبیاء آئے، انبیاء کے نائمند سے دنیا میں پہنچے، کتابیں اتریں ان کے ترجمے اور تفسیریں شائع ہوئیں، داعیانِ صداقت نے بیش قیمت عمریں اور قیمتی عمریں قربان اوقات غافل انسان کو ہوشیار کرنے میں صرف کر دیے، مگر وہ ایسا بیہوش نہ تھا کہ اس کا نشہ اُتر سکتا، اس کی غفلت خواب نہ تھی موت تھی اور موت کے بعد کسی بلند آواز سے بھی جاگنا ناممکن ہے۔

اگر بے وقوف انسان اچھے اعمال کی جزا سزا کا قائل ہوتا ہے تو ایسا کہ خود مختار الاطلاق اور خالق اکبر کو بھی باہر نکال کر پھینک دیتا ہے۔ وہ بجائے اللہ کو مسبب الاسباب کے ہر کوشش کو حقیقی کارساز جاننے لگتا ہے۔ اس کی انانیت الوہیت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ آسمان زمین اور درمیانی فضا میں دن رات دیکھتا ہے کہ بکثرت اسباب نتائج نہیں پیدا کرتے اور بہت سی کوششیں بے ثمر ہو جاتی ہیں۔ بہت عقلمند بھوکے مرتے اور بہت بے وقوف بغیر کسی کوشش کے دولت کے انبار وں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ تمام آیاتِ قدرت اور براہینِ فطرت کو دیکھنے کے بعد بھی اُن کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے اور دعوتِ حق کے مقابلہ میں آستینیں چڑھا کر خم ٹھوک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور حق وصداقت کا مقابلہ واہیہ تراشیوں اور زبانی بے حقیقت تمسخروں سے کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی سے کہا جائے کہ اللہ نے تم کو مال متال دیا، علم و کمال دیا، تم پر لازم ہے کہ خداداد نعمت میں سے اللہ کے ضرورت مند بندوں کو کچھ نہ کچھ دو اور اللہ کے قانون انفاق کی تعمیل کرو تو وہ بجائے اطاعت کرنے اور ماننے کے انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ کہنے لگتا ہے کہ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ ان بھوکے اور محتاجوں کی پرورش کی جائے اور ضرورت مندوں کو کچھ دیا جائے تو وہ خود ان کو دیتا جب اُس نے خود ہی ان کو کچھ نہ دیا تو ہم کس طرح دیں، مگر یہ بے وقوف آدمی کتنا بڑا گمراہ ہے، اُس کی گمراہی کتنی واضح ہے۔ نادان نہیں جانتا کہ خدا براہِ راست آسمان سے ہُن نہیں برساتا۔ زمین کی پیداوار بغیر کسی استحقاق کے بعض آدمیوں کو دیتا اور ان سے کسی کو دلواتا ہے۔ ہر شخص کے پاس دولت دوسروں کے ذریعہ سے آتی ہے۔ اگر ہر شخص اپنے مال کا کوئی حصہ بھی کسی دوسرے کو نہ دے تو زندگی کی ضروریات کیسے پوری ہوں اور دنیا میں انسانی مدنیت کس طرح استوار ہو۔ بیشک دینے والا خدا ہی ہے۔ مگر خدا کی دین کا طریقہ ایک ہی نہیں۔ اللہ کی دین سے کبھی صرف پرورش ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ قانون مساوات و ہمدردی کا اجراء اور اجراء کے بعد لوگوں کی تعمیل و عدم تعمیل کی آزمائش کرنی بھی مقصود ہوتی ہے۔ اسی لئے اس نے غریبوں کو دینے اور اُن کی امداد کرنے کا حکم دیا ہے۔

تحلیلِ احزار

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اوپر کی آیات میں تخلیق اور تربیت کے لحاظ سے مختلف آیات کا تذکرہ فرمایا تھا جس سے دو باتیں مستفاد ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ قانونِ قدرت ذرے سے لے کر آفتاب تک اور فرش سے لے کر عرش تک سب کو حاوی ہے۔ کوئی جاندار یا بے شعور، ذی شعور، مفکر، غیر مفکر مخلوق قانونِ الٰہی سے نہ مستغنی ہے نہ کسی کی مجال ہے کہ سرتابی کر سکے۔ لہٰذا انسان بھی قانونِ الٰہی کا محتاج ہے اور نظامِ کائنات کی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے اُس کا فرض ہے کہ منشائے قدرت کے موافق رفتارِ حیات کو جاری رکھے۔ دوم یہ کہ ہر چیز کی تکمیل و تعمیر کسی ہمہ گیر طاقت کا ثبوت پیش کر رہی ہے اور کائنات کی رنگین ساخت اُس کے محیطِ کل علم اور مختار ارادہ کو ظاہر کر رہی ہے، اس لیے حشر ثانوی ناممکن نہیں جب یہ دونوں باتیں معلوم ہو گئیں تو اب اعمال اور ان کی جزا سزا، زندگانی اور اس کے اُخروی ثمرات کی باہم وابستگی کو ظاہر کرتے ہوئے زندگی کو سدھارنے کی تلقین فرماتا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد پوری زندگی کے گناہ ہیں اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد اُخروی انجام بد ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ سے مراد برا انجام ہے جو قیامت کے دن پیش آنے والا ہے اور مَا خَلْفَكُمْ سے وہ اعمال مراد ہیں جو مرنے کے بعد آدمی اپنے پیچھے چھوڑ کر آتا ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ کافروں سے جب کہا جاتا ہے کہ دنیوی زندگی میں کفر و شرک اور گناہوں سے بچو اور اُخروی عذاب سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، مگر وہ التفات نہیں کرتے یعنی شرک سے بچنا اور گناہوں کو چھوڑنا اگرچہ سبب نجات نہیں۔ اللہ پر بندہ کا کوئی حق اس سے بھی پیدا نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ ایمان اور نیک عمل بھی اللہ ہی کی توفیق اور اس کی مہربانی سے نصیب ہوتا ہے۔ ایمان عطا کرنا اور نیکی کی توفیق عنایت کرنی بھی اللہ کا عظیم الشان احسان ہے یہ بندہ کی کوئی ذاتی کارگزاری نہیں مگر ایمان کے ساتھ حسنِ عمل اور گناہوں سے اجتناب اور خوفِ عذابِ آخرت رحمتِ الٰہیہ کے حصول کا ذریعہ ہیں پس کافروں کو چاہیے کہ وہ شرک اور معاصی سے اجتناب کریں۔ عذابِ آخرت سے ڈریں اور اس کو حصولِ رحمت کا ذریعہ جانتے ہوئے اُمیدوارِ رحمت ہوں۔

وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ اللہ نے اپنی توحید اور اپنے رسول کی رسالت اور وقوعِ قیامت اور جزا سزا کی حقانیت کی نشانیاں بکثرت نمایاں فرما دی ہیں۔ ہزاروں آثارِ قدرت موجود ہیں بلکہ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ نشانِ الوہیت و ربوبیت ہے۔ خصوصاً رسولِ اقدس کے معجزات اور قرآن پاک کی آیات تو بالکل واضح دلائل ہیں۔ مگر کفار بد اطوار کسی کی طرف توجہ نہیں کرتے اور عدم التفات کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ حق سے روگردانی گویا ان

کی صفت لازم بن گئی ہے، اسی لیے فرمایا کہ پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی کافروں کے سامنے نمودار ہوتی ہے وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ امیر و غریب رزق سب کو خدا دیتا ہے۔ امیروں پر اُس کا خاص کرم یہ ہے کہ اُس نے بغیر کسی استحقاق کے ضرورت سے زائد مال عطا فرما کر ان کو امیر کر دیا باوجود یکہ تخلیقی قوتوں میں نیکی اور صلاحیت اور نیکی میں وہ غریبوں سے بالاتر درجہ نہیں رکھتے، مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو مالی امتیاز عطا فرمایا۔ درحقیقت اللہ کی طرف سے انسانوں کی آزمائش دو طرح سے لی جاتی ہے (۱) مفلس اور محتاج کر کے (۲) مالدار بنا کے۔ غریبوں کی آزمائش، صبر، استقامت اور قناعت سے کی جاتی ہے۔ اور دولتمندوں کا امتحان جود و سخا اور امداد فقراء کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غریبوں کو بغیر انسانی احسان کے اللہ رزق عطا فرما دے، مگر اس کو امیروں کی آزمائش کرنی ہوتی ہے کہ کون اُس کے دیے ہوئے مال میں سے فقیروں کو دیتا ہے اور کون حیلے بہانے کر کے ٹال دیتا اور محتاجوں کی امداد سے انکار کر دیتا ہے۔ کافر دماغ کوتاہ بیں اس حکمت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ غریبوں کو دینے کا حکم اُن کو رزق پہنچانے کے لیے ہے۔ چونکہ انھوں نے نظریۂ امداد کا گر نہیں سمجھا، اس لیے خود فہمیدہ نظریہ پر خود ہی اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے ہم اللہ مشیت کے خلاف کیوں کریں اللہ کو منظور ہوتا تو خود غریبوں کو دیتا جب اُسی نے نہ چاہا تو ہم کیوں دیں۔ بے وقوف اتنا نہ سمجھے کہ بے شک اگر اللہ چاہتا تو غریبوں کو بغیر انسانی احسان کے دے دیتا۔ رزق پہنچانا اُسی کا کام ہے۔ وہ رزاق علی الاطلاق ہے، مگر امیروں کو جود و سخا اور امداد وغیرہ کا ثواب کس طرح ملتا اور انسانی فیاضی کا مظاہرہ کس طرح ہوتا۔ چنانچہ حضورؐ کے زمانے کے کفار خصوصاً یہودی بھی اسی قماش کے تھے۔ اُن کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور غریبوں کی مدد کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا تو بدبخت کنجوس بجائے مشورہ کے عمل کرنے کے اپنی بدعملی اور غلطیٔ فکر پر دلیل لاتے اور مشیت الٰہیہ کو سمجھ جانے کے مدعی بن جاتے تھے۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ تمہارے پاس جو مال ہے خدا داد ہے تمہارا اخود آوردہ نہیں، اس لیے (اگر اللہ نے تم کو اس میں سے کچھ خیرات کرنے کا حکم دیا ہے تو کیا بے جا ہے سب نہیں) کچھ مال غریبوں کو دے دو۔ وہ جواب میں کہتے کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ خود ان کو دے دیتا۔ جس کو خدا نہ دینا چاہے ہم اُس کو کیسے دیں۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ شیخ ابن جریر نے لکھا ہے کہ یا تو یہ قول کفار کا ہے۔ یہ کافروں کی انتہائی گمراہی تھی کہ وہ اُلٹا مسلمانوں کو گمراہ کہنے لگے یا یہ اللہ کی طرف سے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے ان کے قول کا جواب ہے۔ مؤخر الذکر قول پر کافروں کی کھلی ہوئی گمراہی کی دو دلیلیں اُنہی کے کلام میں موجود ہیں۔ پہلی دلیل تو وہی ہے جو ہم بیان کر چکے کہ امداد کا فائدہ صرف غریبوں ہی کو نہیں پہنچتا امیروں کو بھی ملتا ہے بلکہ امیروں کو فقیروں سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اُن کو سخاوت و جود کا ثواب ملتا ہے۔ اسلام کے قانون مساوات و مواسات پر عمل کرنے کا جزا ان کو ملتی ہے۔ ضرورت مندانِ اسلام کی ہمسری کرنے سے اسلام کی عزت محفوظ رہتی ہے اور دشمنانِ اسلام کی نظر میں مسلمان ذلیل نہیں ہوتے، مگر بدفہم کافر اپنی گمراہی کے سبب امداد فقراء کا فائدہ صرف غریبوں کی پرورش کو خیال کرتے ہیں۔ اور اپنی اس کج فہمی کے سبب حکم اسلام پر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ پس ایک تو نظریۂ امداد کو سمجھ کر غلط اور پھر غلط بنیاد پر غلط تعمیر کی۔ یہ گمراہی پر گمراہی ہوئی۔ اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی اور کیا ہوگی۔ (۲) فعل سے پہلے نتیجہ کا معلوم کرنا اور مشیت الٰہی کو معلوم کرنے کا مدعی ہونا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ فعل سے پہلے کسی کو نہیں معلوم کہ اللہ کی مشیت کیا ہے۔ آدمی پر فرض ہے کہ ارادہ مستحکم کرے۔ اسباب فراہم کرنے کی کوشش کرے، حواس اور اعضاء کو کام میں لائے۔ پھر نتیجہ موافق نہ نکلے تو مشیتِ الٰہیہ پر محمول کرے۔ بیمار کا علاج کرنا، حفظِ صحت کی تدبیر کرنی، سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس پہننا، بھوک دفع کرنے اور بدن کو قوت پہنچانے کے لئے کھانا کھانا قرینۂ فطرت ہے۔ اس کے بعد بیماری نہ جائے، صحت بگڑ جائے اور آدمی مر جائے تو سمجھنا چاہیے کہ مشیت الٰہیہ یونہی تھی۔ دریا کنویں میں ڈوب جانا، آگ میں گھس کر جل جانا، خود درندہ یا گزندہ کا لقمہ بن جانا، برف میں پڑ کر اکڑ جانا، بھوکا رہ کر مر جانا اور مشیت کو بدنام کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ اگر مشیت ہوتی تو موت نہ آتی۔ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ کافر غلط اندیش کا فر اسی کج فہمی میں مبتلا تھے۔ قبل از ظہور مشیت کو جاننے کے مدعی تھے۔ یہ اُن کی واضح گمراہی تھی۔

مقصودِ بیان آیۃ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ دلالت کر رہی ہے کہ اُخروی نتائج دنیوی اعمال کے ثمرات ہیں۔ انسان پر لازم ہے کہ آخرت کے نتائج بد سے ڈرتا رہے اور اعمال حیات کو سنوارتا رہے لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کی درستی اور نیکی بھی نجات کو واجب کرنے والی نہیں۔ نیک اعمال کے باوجود رحمت کی ضرورت ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ زندگی کی رفتار کو درست رکھتے ہوئے رحمت کا

میں اشارہ ہے کہ مالداروں کا مال بھی خداداد ہے ۔ خود آمدہ اور ذاتی تخلیق کو اس میں دخل نہیں ۔ اس لئے مال کو امانت الٰہیہ یا مستعار چیز سمجھتے ہوئے بحکم الٰہی دوسروں کو دینا لازم ہے ۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مال تصرف کے متعلق حکم الٰہی کا صادر ہونا عقل کے موافق ہے ۔ یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ کل مال خیرات کرنے کا حکم نہیں بلکہ کچھ مال بطور امانت غریبوں کو دینا ضروری ہے ۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مترشح ہوتا ہے کہ قبل از وقوع مشیت الٰہیہ کو جاننے کا دعویٰ کرنا اور رائے زنی کرنی کفر ہے ۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ سے واضح ہوتا ہے کہ غریبوں کی امداد سے صرف اس بنا پر دست کش ہونا کہ ان کی امداد کرنی مشیت الٰہیہ کے خلاف ہے کھلی ہوئی گمراہی ہے وغیرہ

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً

وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا بس وہ تو ایک سخت آواز کے منتظر ہیں جو ان

تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ○ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ○

کو آلے گی ایسے وقت میں آکر کہ باہم جھگڑ رہے ہوں پھر نہ کوئی وصیت کر سکیں اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکیں

وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا

اور صور پھونکی جائے گی تو یک دم وہ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑیں گے کہیں گے ہائے ہماری کمبختی ہم کو کس نے

مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً

ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا وہ بس ایک سخت آواز ہوگی

فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

تو یکدم وہ سب کے سب ہمارے حضور میں حاضر کئے جائیں گے پس آج کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور تم کو انہی کی جزا دی جائیگی جو تم کرتے تھے

تفسیر انسانی دماغ اگرچہ بہت بلند پرواز اور وسیع الظرف واقع ہوا ہے ۔ اس کائنات کا ہر ممکن الوقوع تصور دماغ میں آسکتا اور آتا ہے ، لیکن بعض افراد اور بعض احوال کو اگر خصوصیت کے ساتھ پیش نظر کر کے دیکھا جائے تو یہی فلک پیما اور عنقا طائر اور برق مجسم آنا عاجز درماندہ بلکہ کج فہم ہو جاتا ہے کہ اس وقت کسی احمق ترین جانور کے دماغ میں فرق کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ اس میں زندگی کے ماسول ضروریات کے متعلق ہم کبھی ایسی فاش غلطیاں کرنے لگتے ہیں کہ بچوں کو کیا ، بندروں کو بھی ہنسی آجائے ۔ خصوصاً مبدء اور معاد کی خاطر تو بڑے بڑے دماغوں میں اس قدر الجھاؤ ہے جس کو سلجھانے کے لئے اللہ کے منتخب بندوں کی فہمائش اور کوشش بھی ناکام رہی ہے ۔ رہے جاہل اور صحرائی جاہل ان کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ زندہ دنیا کے احوال اور زندگانی کے تعمیری اصول سے ناواقف ہیں تو قبل الحیات اور بعد الممات کی تو لیدگیوں کو کیسے سلجھا سکتے ہیں ۔ جو عقلمند یا بے وقوف اعمال کی جزا سزا کے قائل ہیں ۔ ان کے افکار و نظریات گوناگوں اور چند در چند ہیں ۔ ان میں سب سے بڑے اور ممتاز گروہ تین ہیں : ۔ (۱) حکمائے اشراقیہ کا سرگروہ ارسطو کا استاد افلاطون اعظم کہتا ہے کہ اسی معاد دنیا سے آگے کوئی دوسرا انحصار نہیں ہے ۔ انسان اسی دائرہ میں رہ کر مختلف جنم اور روپوں سے دوچار ہوتا ہے ۔ اچھے برے اعمال کی اچھی بری سزا جزا بھی ضروری چیز ہے مگر کہاں ؟ اسی دنیا میں جیسے کرتوت ہوتے ہیں ویسا آئندہ جنم ملتا ہے ۔ تمام نفوس جنم چکر میں گرفتار ہیں ۔ بداعمال اور بدعقیدہ انسان اپنی ذلت کے مطابق کسی نہ کسی حیوان چرندہ پرندہ یا درندہ کی شکل میں جنم لیتا رہتا ہے بلکہ کبھی اس سے بھی نیچے اتر جاتا ہے ۔ مختلف نباتات اور جمادات کی دنیا

یوں جا پہنچتا ہے اور پھر اُس کی کثافت رفتہ رفتہ دُور ہوتی رہتی ہے اور وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ انسانی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر بتدریج ذلیل رذیل آدمی کے جسم اور شکل سے نکل کر بلند ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی رِشی مُنی دِدوان اور اوتار کے جامہ میں آجاتا ہے اور آخر میں جب بالکل پاک صاف روشن اور چمکدار ہو جاتا ہے تو واجب الوجود، قدیم بالذات علت العلل اور روح کائنات کے قرب میں پہنچ جاتا ہے۔ پس نفس انسانی کا ہبوط اور نزول اس کے اعمال بد کی بنا پر ہے۔ اور اس کی رفتہ رفتہ ترقی اور بلندی نیک اعمال کی جزا ہے اور سب سے بڑی جزا قرب خداوندی کا حصول ہے۔ افلاطون کے اس خیال مؤید تمام آریہ، سناتنی بلکہ سارا ہندو ازم ہے۔ بدھ مت بھی اسی کا قائل ہے۔ گو یا تناسخ گروہ کے نزدیک حشر نشر جسمانی ہوتا ہے، سزا جزا جسمانی ہوتی ہے مگر اسی دنیا میں دوسرے عالم کا وجود ڈھکوسلا ہے۔ نہ کوئی آخرت ہے نہ قیامت نہ جنت نہ دوزخ وغیرہ۔

(٢) ارسطو، ارشمیدس، ابناذ قلیس بلکہ یونان کے اکثر علماء کہتے ہیں کہ اعمال کی جزا سزا ضروری چیز ہے، مگر جسمانی جزا سزا نہیں ہو سکتی، صرف روحانی الم و راحت کا نام جزا سزا ہے۔ بدکار نفوس مقام قرب سے محروم رہتے ہیں۔ اُن کے اندر مادیت کی آلائش باقی رہتی ہے، اس لئے مادی کثافت کے سبب نورِ مطلق تک اُن کی پہنچ نہیں ہوتی اور مدت دراز تک حسب اعمال اسی الم میں ان کو مبتلا رہنا پڑتا ہے اور جب وہ زیادہ مدت الم اور دکھ برداشت کرنے کے بعد ہر مادی آلائش سے پاک ہو جاتے ہیں، تو قرب خداوندی میں پہنچ جاتے ہیں۔ قرب میں پہنچ کر ان کو روحانی راحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ نیک روحیں چونکہ دورِ حیات کو ختم کرکے پاک صاف ہو گئی ہیں، ان کو قرب الٰہی میں فوراً رسائی مل جاتی ہے اور دوری کا کوئی دکھ اٹھانا نہیں پڑتا۔

(٣) تمام انبیاء اور آسمانی کتابیں قائل ہیں کہ دنیا عمل کی جگہ ہے نتیجہ کی جگہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی کسی کسی کو اسی دنیا میں کچھ سزا مل جائے۔ مال داری اور ناداری، صحت اور بیماری، عزت اور ذلت، حکومت، ذلت اور تنگیت، آبادی اور بربادی سب کچھ اسی زندگی میں آدمی پاتا رہتا ہے اور اسی دورِ حیات کے مختلف اعمال کے مختلف نتائج کبھی ان صورتوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ دنیا کھیتی ہے، کاٹنے کا زمانہ دوسری زندگی میں آئے گا۔ کھلیان اور خرمن عالم آخرت میں ہوگا۔ آدمی مرنے کے بعد بالکل معدوم نہیں ہو جاتا۔ اس کی روح باقی رہتی ہے۔ ایک دن ضرور ایسا آنے والا ہے کہ اس زمین کی ساری آبادی ہلاک کر دی جائے گی اور دوبارہ از سر نو پھر اُن کی روحوں کو جسم عطا کئے جائیں گے۔ دنیا کی طرح وہاں توالد و تناسل کا سلسلہ نہ ہوگا بلکہ اللہ کی طرف سے جب نئے دورِ حیات کا آغاز ہوگا اور فطری قدرتی آہنگ زندگی کو سنبھالے گی جس کو اہل شرائع کے عرف میں صُور کہا جاتا ہے تو سب آدمی جہاں جہاں سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت ان کی حساب فہمی ہوگی۔ دنیوی زندگی میں جو کچھ کر چکے ہوں گے چونکہ وہ فنا نہیں ہوگا اُس کا پورا ریکارڈ موجود ہوگا وہ سارا ریکارڈ سامنے آئے گا اور جس کے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی اس کا انجام ہوگا۔ نیکوں کو جنت میں اور کافروں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ یہ دونوں زندگیاں بالکل الگ الگ ہیں۔ دونوں کے احوال اور کیفیات اور خصوصیات جدا جدا ہیں جس طرح آغاز و انجام، سعی و نتیجہ بونے اور کاٹنے میں فرق ہوتا ہے۔ آغاز کے وقت انجام نہیں ہوتا۔ سعی کے وقت نتیجہ کی فوری طلب فضول ہے۔ بونے کے وقت کاٹنا ناممکن ہے۔ اسی طرح آخرت کی سزا جزا کھینچ کر دنیا میں نہیں آسکتی۔ یہ عالم اپنی خصوصیات جُدا رکھتا ہے اور اس عالم کے امتیازات جُدا ہیں۔ دوزخ اور جنت یا اُخروی راحت و رنج یا یوں کہو کہ قیامت کا دُکھ اور سکھ اس زندگی میں نہیں آسکتا۔ دونوں زندگیوں کے درمیان ایک پردہ ہے۔ روک ہے، عالم برزخ ہے عالم مثال ہے۔ آغاز انجام کی طرف جا رہا ہے۔ انجام اپنی جگہ قائم ہے۔ وہ ادھر کھنچ کر نہیں آسکتا، مگر وہ کور دانش گروہ جس کو حقیقت میں دوسری زندگی اور اس میں پیش ہونے والے عذاب ثواب کا یقین ہی نہیں ہے۔ وہ اوکار انبیاء اور آسمانی کتابوں کے نظریات کا مذاق اڑاتا ہے اور عالم آخرت کے احوال کو اپنی بے دانشی کے سبب اس زندگی میں کھینچ کر لانے کی درخواست کرتا ہے۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ جب عمل کی دنیا ختم ہو جائے گی اور انجام کا وقت آئے گا تو اس وقت کسی عمل کا موقع ہی نہیں ملے گا نہ اس دنیا میں کوئی لوٹ کر آسکتا ہے نہ بات کرنے کا وقت مل سکتا ہے نہ اتنی فرصت مل سکتی ہے کہ کوئی اپنے گھر والوں سے کچھ کہے، اس لئے بڑی حماقت ہے اگر آخرت کے احوال کو دنیا میں طلب کیا جائے۔ اوّل تو اس خواہش کا پورا ہونا ہی ناممکن ہے اور اگر پورا ہونے کی کوئی صورت بالفرض نکل آئے تو یہ عمل بلکہ معترضانہ سوال ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ کافروں سے مسلمان کہا کرتے تھے کہ پیغمبر جیسی کی مخالفت کا نتیجہ خراب ہے۔ گزشتہ اقوام نے پیغمبروں کی نافرمانی کی تو تباہ کر دی گئیں۔ اگر تم بھی سرکشی کرتے رہو گے تو اللہ تم کو تباہ کر دے گا۔ اس صورت

ہیں هٰذَا الْوَعْدُ سے مراد وعدۂ عذاب دنیوی ہوگا اور ممکن ہے عذابِ آخرت کی وعید مراد ہو۔ جس کا تذکرہ قرآن میں جابجا آیا ہے۔ بہرحال نادان کفار اس قدر کوتاہ نظر واقع ہوئے ہیں کہ وعدۂ عذاب یا وعدۂ قیامت کا ایفاء ناممکن مانتے تھے اور بطور استہزاء یا تنبیہ لہجہ میں یا واقعی اعتبار سے مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اچھا اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ دھمکی کب پوری ہوگی۔ مطلب یہ کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے آؤ ہم کو تباہ کرادو۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ اگر وعدہ سے مراد عذابِ دنیا کا وعدہ ہو تو بظاہر اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ صرف اس انتظار میں ہیں کہ اچانک یکدم ایک چیخ یا گرج پیدا ہو اور ان کو آپس کے جھگڑے چکانے اور باہم فیصلہ کرنے کا موقع بھی نہ ملے اور کوئی وصیت بھی نہ کر سکیں اور لوٹ کر گھر والوں کے پاس بھی نہ پہنچ سکیں اور سخت چیخ ان کا کام تمام کر دے (جس طرح بعض گزشتہ قومیں عذاب الصیحہ سے ہلاک کر دی گئی ہیں وہی حالت ان کی بھی ہو جائے) اور اگر وعدۂ عذاب سے مراد وعدۂ قیامت ہو تو بقول ابن کثیر شاید صیحۂ واحدہ سے مراد اول مرتبہ کی صور کی آواز ہوگی۔ جس کو نفخۃ الفزع بھی کہا جاتا ہے۔ کفار حسبِ معمول اپنے بازاروں میں دنیوی مشاغل میں باہم جھگڑتے ہوں گے یک دم صور کی آواز کان میں آئے گی۔ سب لوگ کان لگا کر سنیں گے اور گھبرا جائیں گے۔ صور کی آواز بہت لمبی ہوگی پھر ایک آگ نمودار ہوگی جو سب آدمیوں کو میدانِ حشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی کسی کو وصیت کرنے یا گھر جا کر اہل و عیال سے ملنے کی مہلت بھی نہ ملے گی بالآخر نفخۃ الموت سے سب مر جائیں گے۔ یہ مضمون متعدد احادیث میں وارد ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ قیامت ایسی حالت میں بپا ہوگی کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت میں مشغول ہوں گے۔ کوئی کپڑا ناپتا ہوگا، کوئی دودھ دوہتا ہوگا کوئی دوسرے مشاغل میں ہوگا۔ یہی اللہ نے فرمایا ہے فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ زبیر بن عوام سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دو آدمی کپڑے کی خرید و فروخت میں مشغول ہوں گے اور ہنوز تہ نہ کرنے پائیں گے کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔ آدمی اپنا حوض درست کر چکا ہوگا، مگر ہنوز پانی بھرنے کی نوبت نہ آئے گی کہ قیامت بپا ہو جائے گی (بخاری و مسلم وغیرہ)

وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ اس آیت میں نفخ صور سے نفخ بعث مراد ہے جو نفخ موت کے بعد ہوگا۔ لیکن کتنی مدت بعد ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ اس نفخ کے اور اول نفخ کے درمیان چالیس (راوی کو دن یا ماہ یا سال یاد نہیں رہا۔ معلوم نہیں حضورؐ نے چالیس دن فرمایا یا چالیس ماہ یا چالیس سال) کی مدت ہوگی۔ بعث کی کیفیت کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ نفخۃ الموت کے بعد حسب مشیت اللہ اوپر سے پانی برسائے گا جس سے زمین کے اندر سے اجسام سبزہ کی طرح اگیں گے۔ آدمی میں کوئی چیز ایسی نہیں جو سڑ گل کر فنا نہ ہو جائے، سوا ایک خفیف ہڈی کے جس کو دُمچی کی ہڈی کہتے ہیں۔ قیامت کے دن مخلوق (کے اجزاء) اسی سے جوڑ دیے جائیں گے (اور جسم بنا دیا جائے گا) (بخاری و مسلم وغیرہ)

بہرحال صور پھونکنے کے ساتھ ہی لوگ مٹی کے ڈھیروں اور قبروں سے نکل پڑیں گے اور اپنے رب کی طرف یعنی میدانِ حشر کی طرف چل کھڑے ہوں گے (کافروں کو جب اپنی ہلاکت سامنے نظر آئے گی تو) کہیں گے ارے ہماری خرابی ہوگئی ہم کو خواب گاہ سے کس نے اٹھا دیا۔ مرقد خواب گاہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب، مجاہد، حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے کہ جو لوگ قیامت بپا ہونے کے سبب سے نفخۃ الموت کی وجہ سے مریں گے اور دوسرے نفخہ سے ان کو اٹھایا جائے گا وہ اسی (درمیانی مدت کی) خواب کو مرقد کہیں گے۔ عام علماء کا قول ہے کہ آغاز آفرینش سے قیامت تک جتنے کافر مرے ہوں گے وہ اپنی قبروں میں جہاں بھی ہوں گے اور جو عذاب بھی ان پر ہوگا وہ قیامت کے عذاب کے مقابلے میں خوابِ راحت نظر آئے گا، اس لئے برزخی زندگی کو وہ خواب گاہ سے تعبیر کریں گے۔ حضرت ابی بن کعب کی ایک روایت میں آیا ہے کہ نفخۂ اول سے لے کر نفخۃ البعث تک لوگ ایک خفیف نیند سوئیں گے۔ ابوصالح کی روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ نفخۂ اول کے بعد اہل قبور سے عذاب اٹھا لیا جائے گا۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اس طرف سے کافروں کو جواب دیا جائے گا۔ خواہ ملائکہ جواب دیں گے (حسن بصری) یا اہل ایمان جواب دیں گے (ابن جریر و ابن کثیر) کہ یہ وہی چیز ہے جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ جب کافروں کو یقین ہو جائے گا تو وہ خود یہ الفاظ کہیں گے۔

إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ۝ کافروں نے بطورِ طعن یا از روئے استہزاء، یا واقعی طلب علم کے لئے کہا تھا مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ۝ اس سوال کا جواب اس آیت میں خدا تعالیٰ نے دیا کہ قیامت تو صرف ایک چیخ ہوگی اور فوراً تمام لوگ بارگاہِ الٰہی میں حاضر کر دیئے جائیں گے۔ یعنی قیامت بپا کرنے اور قبروں سے اٹھا کر زندہ کرنے کے لیے سرو سامان اور اسباب فراہم کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی وہ تو پلک مارتے بپا ہوگی۔ ایک نفخِ صور کافی ہوگا۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ یہ آیت گذشتہ آیات کا تتمہ اور وجودِ قیامت کی علت غائی ہے اور بہت سے باطل خیالات کی جڑ اکھاڑنے والی ہے۔ مالداروں کا خیال ہوتا ہے کہ ہماری یہ بداعمالی ضرر رساں نہیں۔ ہم اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ علماء کا گروہ اپنے کو برتر اور نجات یافتہ کہتا ہے۔ یہودی، نصاریٰ، ہندو، مسلم سب ہی نجات کے مدعی ہیں۔ بعض غریب اپنے کو کمزور سمجھتے ہوئے فلاحِ آخرت کی طرف سے بھی کچھ متردد ہو جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کا خیال ہوتا ہے کہ جانے قیامت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی جزا سزا ہو یا نہ ہو۔ ذرا سی بات کی کیا باز پرس ہوگی۔ ان سب وہمیات کا ازالہ اس آیت سے ہو گیا۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ قیامت کے دن کسی کی بالکل حق تلفی نہ ہوگی اور سب کو وہی ملے گا جیسا وہ کرتے تھے۔

مقصودِ بیان

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب منکرینِ قیامت زچ ہو کر بجائے صحیح اعتراض کرنے کے دو جاہلانہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اوّل تو اہلِ ایمان پر طعن استہزاء اور اہانت آمیز طور پر حملہ کرتے ہیں، دوسرے حقیقت کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو وہ بھی ظاہرہ کفر کے ساتھ اور عداوت آگیں طریقے سے۔ دوسرے حقیقت طلبی میں بھی اپنی جہالت اور حماقت کی آمیزش کر دیتے ہیں۔ آئندہ اس دنیا کی میعادِ زندگی مقرر کراتا اور بربادیٔ عالم کا وقتِ معین دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کی خواہش اور استفسار کے مطابق جواب بھی دے دیا جاتا ہے اور قیامت کا مقررہ وقت بھی بیان کر دیا جاتا تب بھی ان کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ ان کو اپنی زندگی کی مدت بہرحال معلوم نہ ہوتی اور اس خیال میں مدہوش رہ کر کہ ابھی بہت زندگی باقی ہے اور قیامت دُور ہے وہ ہر نیکی کی طرف سے غافل بن جاتے مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً الخ پر بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کفار قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ پھر ناگہاں قیامت کے آجانے کے منتظر کیسے ہو سکتے تھے۔ یہ اعتراض سطحی ہے۔ کلام کا یہ مطلب ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت سے مقصود قیامت کے ہیبت ناک منظر کی تصویر کشی ہے اور یہ دھمکی دینی غرض ہے کہ قیامت کوئی ذرا سی واقعہ نہ ہوگا، اچانک آجائے گی اُس وقت کسی مشغلے کی مہلت نہ ملے گی نہ دنیوی کاروبار کی نہ نیکی کی۔ یہ جواب بھی فی الحقیقت ان کے سوال کے مطابق ہے انہوں نے طعن آمیز سوال کیا تھا ویسا ہی جواب اُن کو دیا گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اُس کے انتظار میں ہو جو بالکل لاحاصل ہے تو تم کو قیامت کے وقت دریافت کرنے سے کیا فائدہ۔

إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فٰكِهُونَ ۚ هُمْ وَأَزْوٰجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ عَلَى الْأَرَآئِكِ

آج جنت والے　ایک تفریح میں　خوش ہیں　وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں　تختوں پر تکیہ لگائے

مُتَّكِـُٔونَ ۝ لَهُمْ فِيهَا فٰكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ۝ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ۝ وَامْتٰزُوا

بیٹھے ہیں　جنت میں اُن کے لئے میوے اور جو کچھ ان کی خواہش ہے موجود ہے　مہربان پروردگار کی طرف سے انکو سلام کہا جاتا ہے اور اے

الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ

مجرمو! آج تم (ان سے) الگ ہو جاؤ　اے اولادِ آدم! کیا میں نے تمہارے پاس تاکیدی حکم نہیں بھیجا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا دشمن ہے

عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ وَّأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ

دشمن ہے — اور میری عبادت کرو — یہی سیدھا رستہ ہے — اور شیطان نے تم میں سے بہتوں کو گمراہ کر دیا تھا

أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۝ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ

کیا تم سمجھتے نہ تھے — یہ وہی جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا — آج اپنے کفر کرنے کی پاداش میں اس

تَكْفُرُونَ ۝ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا

میں داخل ہو — اُس روز ہم اُن کے منہوں پر مہر لگا دیں گے — اور اُن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور اُن کے پاؤں اُن اعمال کی شہادت دیں گے

يَكْسِبُونَ ۝ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ۝

جو وہ کیا کرتے تھے — اور اگر ہم چاہیں تو اُن کی آنکھیں بے نور کر دیں — پھر وہ رستہ کی طرف دوڑیں مگر اُن کو سجھائی کیسے دے

وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ۝ ع

اور اگر ہم چاہیں تو اُن کی جگہ پر اُن کو مسخ کر دیں — پھر وہ نہ آگے چل سکیں — اور نہ پیچھے لوٹ سکیں

وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ۝

اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اس کو کبڑا کر دیتے ہیں — کیا یہ سمجھتے نہیں

تفسیر ہم ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ یہ دنیا جولانگاہِ عمل ہے میدانِ امتحان ہے۔ اللہ نے انسان کو خیر و شر کی طاقتیں عنایت کی ہیں۔ اچھے بُرے اعمال کا اختیار دیا ہے۔ جہاں گمراہ کرنے والی ہلاکت آفریں قوت دی ہے وہاں رشد انگیز سعادت خیز طاقت بھی دی ہے۔ دانش و خرد اور فہم و علم کا خزانہ بھی عطا کیا ہے۔ بُرے بھلے کو دیکھنے کیلئے آنکھیں، مفید اور مضر آوازیں سننے کے لئے کان اور مرغوب و مکروہ میں امتیاز کرنے کے لیے دوسرے ظاہری اور اندرونی حواس مرحمت فرمائے ہیں۔ اور سب سے زیادہ عبرت اندوز دماغ اور نتیجہ آفریں ذہن بخشا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیطان اور شیطانی طاقتوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی شیطان ہر وقت آمادۂ اغوا رہیں ہلاک کرنے کے در پے ہیں۔ اگر اللہ انسان کو برباد کرنا چاہتا اور اس کو منظور ہوتا کہ آدمی ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائے تو وہ دوسری مخلوق کی طرح آدمی کی تمام اندرونی اور بیرونی قوتیں مسخ کر دیتا۔ فقط صورت اور شکل ہی نہیں بلکہ سوچنے اور سمجھنے اور امتیاز پیدا کرنے والے حواس کو بھی غارت کر دیتا یا کم از کم اتنا ضرور کر دیتا کہ سرکش انسانوں کی ظاہری اور باطنی آنکھیں اندھی کر دیتا پھر ان کو نہ ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کے واسطے دکھائی دیتے نہ سعادتِ علمی اور نجاتِ روحانی کی راہیں دکھائی دیتیں۔ اسی طرح اگر وہ سب کو فائز المرام بنانا چاہتا تو شیطان کو نہ پیدا کرتا۔ مگر اُس نے نہ وہ کیا نہ یہ بلکہ انسانی اختیار کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی اور شیطانی اغوا میں آ کر ہلاک ہونے والی اقوام کا انجامِ بد بطورِ عبرت خونریز حوادث و انقلابات کی شکل میں آدمی کی آنکھوں کے سامنے نمودار کیا، مگر برا ہو خوابیدہ حواس، مردہ دل انسان کا جس نے نہ خود اپنے دماغ اور حواس سے خیر و شر میں امتیاز کیا نہ دوسروں کے انجامِ بد کو دیکھ کر عبرت حاصل کی۔ شیطانی اغوا سے ہلاک ہونے والی قوموں کی تباہی دیکھی اور نصیحت نہ حاصل کی۔ اقوامِ عالم کا ہر دو ظہور اور حوادثِ دہر کا انقلاب دیکھا، ہلاک شدہ گروہوں کے سچے قصے سنے، مگر دیکھا اَن دیکھا اور سنا اَن سنا کر دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا وہی ابدی تباہی ہوگی

بلاکت، اور لازوال عذاب جو بدکردار، بالخصوص سرکش قوموں کے لئے مقرر ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو اہلِ حق اور راست بازوں اور ظلم کی جماعتیں جدا جدا کر دی جائیں گی ہر جماعت اور ہر فرد کا کیا کرایا سامنے آجائے گا۔ اہلِ بہشت بہشت میں جائیں گے جہاں ہر طرح کی نعمتیں میں گی جن کی تعبیر اور تشریح اس دنیا میں عام فہم الفاظ میں ناممکن ہے۔ کیونکہ آخرت کی ہر چیز اُسی عالم سے مخصوص ہے۔ اس کو یہاں نہ کسی نے آنکھوں سے دیکھا نہ کانوں سے سُنا نہ دماغ میں اُس کا تصور کیا، پھر افہام اور تفہیم کس طرح ممکن ہو۔ ہاں سمجھانے کے لئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عیش و تنعم کے تمام اسباب مثلاً اعلیٰ ترین تخت، چھپرکٹ، کامل ترین خوبصورت بیبیاں، کھانے پینے کی ہر مرغوب چیز اور ہر وہ شے جس کی طلب انسانی دماغ کو ہو سکتی ہے جنت میں ملے گی اور سب سے بڑھ کر محبوب حقیقی کا وصل اور اس کی طرف سے رحم آمیز ملاطفت آمیز پیام سلام ہوگا جو انسانی زندگی کا اصل مدعا ہے۔ رہے دوزخی تو ان کی حالت اس کے خلاف سمجھنی چاہیئے۔ اُن کو طرح طرح کے جسمانی اور روحانی دکھ ہوں گے جن کی اصل تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ سمجھنے کے لئے عرفی مصائب پر قیاس کر لینا کافی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ الۡیَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰکِہُوۡنَ ۚ ہُمۡ وَ اَزۡوَاجُہُمۡ فِیۡ ظِلٰلٍ عَلَی الۡاَرَآئِکِ مُتَّکِـُٔوۡنَ ۚ لَہُمۡ فِیۡہَا فَاکِہَۃٌ

اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ کسی کی حق تلفی بالکل نہ کی جائے گی جیسا کسی نے کیا ہوگا ویسا بدلہ اس کو ملے گا۔ ان آیات سے ہر گروہ کی تفصیل شروع کر دی۔ جس طرح دنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہیں، نیک اور بد۔ اسی طرح قیامت کے دن دو گروہ ہوں گے۔ جزا پانے والے اور سزا اٹھانے والے۔ اوّل گروہ اہلِ جنت کا ہوگا دوسرا گروہ دوزخیوں کا۔ اوّل خوش عیش ہوں گے اور دوسرے تلخ کام۔ اصحابِ جنت یعنی وہ لوگ جو ہمیشہ جنت میں رہیں گے شغل میں ہوں گے۔ حسن بصری اور اسماعیل بن خالد نے شغل میں ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس عذاب اور تکلیف میں دوزخی ہوں گے اس سے اہلِ جنت خالی ہوں گے اور نعمت عیش میں مشغول ہوں گے۔

بات یہ ہے کہ لفظ شغل کا استعمال عربی میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی اس لفظ کے بعد لفظ فی آتا ہے کبھی لفظ عَنۡ۔ اوّل صورت میں بھرنے کے معنی ہوتے ہیں دوسری صورت میں خالی ہونے کے اور چونکہ آیت میں شغل کے بعد نہ لفظ فِیۡ ہے نہ لفظ عَنۡ اس لئے دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں یعنی جنتی اہلِ جہنم کے مصائب سے خالی اور نعمت و عیش سے بھرے ہوں گے۔ فٰکِہُوۡنَ کا ترجمہ ابن عباس، قتادہ اور مجاہد نے خوش عیش کیا ہے یعنی پیالہ میں بچھونے دسمائیں گے۔ عیش و نعمت کی تمثیل میں ابن مسعود، ابن عباس، ابن مسیب، عکرمہ، حسن، قتادہ، اعمش اوزاعی اور سلیمان تیمی نے فرمایا کہ اس کو پاکیزہ ازواج سے قربت حاصل ہوگی۔ فِیۡ ظِلٰلٍ کی تشریح میں ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، محمد بن کعب، حسن بصری اور قتادہ نے فرمایا کہ جنت بالکل ظلال یعنی عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہے، مگر اس میں بھی نفیس قبہ کی صورت کے کچھ عروسی حجلے ہوں گے جن کے اندر شاہی تخت ہوں گے اور اہلِ جنت مع ازواج کے ان پر متمکن ہوں گے۔

وَّ لَہُمۡ مَّا یَدَّعُوۡنَ نعمتوں کا تنوع اور لذتوں کی نیرنگی گوناگوں ہے جن کا حصر نہیں کیا جا سکتا اور نہ کل تفصیل ممکن ہے، اس لئے اجمالی طور پر فرمایا کہ جو کچھ خواہش ہوگی وہ چیز اہلِ جنت کو ملے گی۔

ابن ابی حاتم نے بروایت اسامہ بن زید بیان کیا کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا جنت بے بہا ہے۔ رب کعبہ کی قسم وہ جگمگاتا ہوا مکمل نور ہے، لہلہاتا خوشبودار پھول ہے، خوب صورت محل ہے، لہراتے ہوئے پانی کی جاری نہریں ہیں، پختہ میوے ہیں، خوبصورت ازواج ہیں، ابدی سکونت کا مقام ہے، سلامتی کا گھر ہے، تروتازہ پھل اور بے اندازہ نعمتیں ہیں۔ (وقد رواہ ابن ماجۃ من حدیث الولید بن مسلم عن محمد بن مہاجر و ھو اسناد حسن ابنؤ)

سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ جنت میں انسانی تعبدی خواہش کی تکمیل ہر طرح ہوگی یعنی شکمی، لسانی، بدنی اور دماغی ہر قسم کا عیش میسر ہوگا لیکن ان سب سے بالاتر ایک روحانی کیف اور بھی ہوگا وہ اللہ کی طرف سے براہِ راست یا ملائکہ کی وساطت سے پیام عافیت کلام رحمت یعنی سلام شفقت ہوگا جو اہلِ ایمان کے دلوں کا سرور یعنی حضورِ رب غفور ہوگا۔

وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ یہ دوسرے گروہ کا بیان ہے۔ مجرموں سے مراد کافر ہیں۔ داؤد بن جراح نے کہا کہ مسلمانوں سے اہلِ جرم کو علیحدہ کیا جائے گا۔ لیکن اہلِ ہوا یعنی خوارج و روافض و اہلِ بدعت بھی مجرموں کے ساتھ رہیں گے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مومنوں سے مجرموں (کافروں) کو علیحدہ کر دیا جائے گا یعنی مذکور بالا خطاب کافروں کو ہی ہوگا کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَ یَوۡمَ نَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا مَکَانَکُمۡ

اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ـــ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکوں میں تفرقہ کر دیا جائے گا۔ ایک اور آیت ہے یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ یعنی قیامت کے دن وہ لوگ (کفار) گروہ درگروہ ہو جائیں گے۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو علیحدہ کر دیا جائے گا۔ شیخ علی اندلسی نے کہا کہ خطاب مذکور ملائکہ کی معرفت ہوگا کیونکہ براہِ راست اللہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا۔ ضحاک نے کہا کہ فرقوں میں سے بھی ہر فرقہ الگ الگ کر دیا جائے گا یہودی جدا، عیسائی جدا، مجوسی الگ، بُت پرست علیحدہ وغیرہ۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ مجرم گروہ اپنے جرم کی دو تاویلیں قیامت کے دن کر سکتا تھا اور دو عذر پیش کر پاتا تھا۔ اوّل یہ کہ ہم کو نہ کسی کام کرنے کا حکم دیا گیا تھا نہ کسی بات سے روکا گیا تھا۔ ہم سمجھے کہ ہر چیز ہمارے لئے مباح ہے۔ کسی بات کی بندش نہیں (٢) لئے شیطان نے جو کچھ ہم سے کہا ہم نے کیا۔ جس راستہ پر وہ لے گیا ہم چلے۔ دوسرا عذر یہ ہو سکتا تھا کہ ہم کو اچھے بُرے اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کی سمجھ کب دی گئی تھی ہم عقل کب رکھتے تھے۔ غرض فقدانِ عقل یا امر و نہی نہ ہونے کی صورت میں کافروں کو عذر کی گنجائش مل سکتی تھی۔ دونوں عذروں کا ازالہ اللہ نے اس دنیا میں کر دیا ہے۔ دانش و فہم بھی عطا فرمایا اور پیغمبروں کی معرفت کتابیں بھیج کر امر و نواہی کی تفصیل بھی کر دی۔ شیطان کو دشمن قرار دیا اس کی پیروی کی ممانعت کر دی اور اپنی پرستش کو راہِ مستقیم بتایا۔ بات یہ ہے کہ اللہ کی ہدایت کے انواع اگرچہ ان گنت ہیں مگر بیں اجناس کے لحاظ سے چار جنسیں ترتیب وار قائم کی جا سکتی ہیں۔ (١) اللہ نے سب آدمیوں کو سوچنے سمجھنے کی قوتیں دیں۔ باطنی اور ظاہری حواس اور ادراکی قوتیں عطا کیں تاکہ بُرے بھلے میں تمیز کر سکے۔ ہدایت کا یہ ابتدائی مرتبہ ہے۔ (٢) انسان کے اندر اور باہر دلائل قدرت پیدا کیں۔ براہین وحدانیت نمودار کیں یعنی انفس اور آفاق میں ایسے شواہد نمایاں کئے جن میں غور و فکر کرنے کے بعد آدمی راہِ مستقیم پر گامزن ہو سکے۔ ہدایت کا یہ دوسرا مرتبہ ہے۔ (٣) پیغمبروں کو بھیجا، کتابیں نازل فرمائیں اور اوامر و نواہی کی تفصیل کی، قوانینِ عدل کی تعلیم دی تاکہ جو لوگ حسن اپنی عقل سے شواہد قدرت کو دیکھ کر راہِ حق پر نہیں چل سکتے ہیں وہ حق و باطل میں فرمانِ پیغمبر اور صراحتِ کتاب کی وجہ سے امتیاز کر سکیں۔ ہدایت کا یہ تیسرا نمبر ہے (٤) جب انسان کو تیسرے درجہ کی ہدایت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی نظر میں اچھائی برائی کا فرق کھل جاتا ہے اور وہ آسمانی کتاب کے بیان کردہ قوانین کا پابند ہو جاتا ہے اور اوامر و نواہی کو اپنا دستورِ زندگی بنا لیتا ہے تو پھر اس کے دل سے پردے بالکل اٹھا لئے جاتے ہیں۔ وہ اسرارِ حق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اللہ کے نور کو اسی کے نور سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ ہدایت کا چوتھا مرتبہ ہے جو صرف انبیاء، اولیاء اور حق پرست حکماء کو حاصل ہوتا ہے۔ پہلے دونوں درجوں میں اگرچہ باہم تمایز ہے اگر کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فہم و دانش کی قوتیں اور حواسِ ظاہرہ و باطنہ اور نفوس و آفاق میں نمودار ہونے والے شواہد قدرت یہ لازم و ملزوم ہیں۔ سمجھنے کی طاقت دماغ میں نہ ہو تو تمام براہینِ عقلیہ بیکار ہیں اور براہینِ عقلیہ نہ ہوں تو صرف دانش کیا کر سکتی ہے۔ تیسرا درجہ پہلے دونوں درجوں سے ممتاز ہے۔ ہدایت کے اس نمبر کا مدار صرف عقل پر نہیں بلکہ نقل کی ضرورت ہے۔ پیغمبروں کے اقوال اور کتبِ الٰہیہ کی صراحت درکار ہے۔ اللہ نے ہدایت کے ان تینوں درجات سے فائدہ ہر شخص کو دیا ہے اسی لئے آیت مذکورہ میں ہدایت کے ان دونوں درجات کو میثاق و عہد قرار دیتے ہوئے خلاف ورزی اور عہد شکنی کرنے والوں کو الزام دیا ہے۔

آیت مذکورہ میں بنی آدم سے مراد یا تو صرف کفار ہیں۔ اگر رائے سے بعض کافروں کی طرف قرار دیا جائے یا عام آدمی مراد ہیں۔ گویا کافروں کے جرم پر شہادت دینے کے لئے عام آدمیوں کو جن میں اہلِ ایمان بھی داخل ہیں۔ مخاطب کیا تاکہ علی رؤس الاشہاد کافروں کا جرم ثابت ہو جائے۔

جس عہد کا تذکرہ آیت مذکورہ میں ہے اس سے عہد ازل مراد لینا دعوی بلا دلیل ہے بلکہ عہد سے وہ نصیحت مراد ہے جو ہر پیغمبر کی زبانی اور ہر آسمانی کتاب میں اللہ نے کی ہے۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ میں اشارہ پوری نصیحت کی طرف ہے۔ یعنی شیطان کی پرستش نہ کرنی اور اللہ ہی کی پوجا کرنی۔ شیطان کی پرستش کے معنی صرف عرفی پرستش کے ہی نہیں ہیں کیونکہ کافروں کا بیشتر طبقہ تو شیطان کا پرستار نہیں ہے۔ کوئی بُت پرست ہے کوئی ستارہ پرست۔ کوئی آتش پرست، کوئی آدمیت پرست، کوئی جانور پرست وغیرہ وغیرہ۔ شیطان کو معبود بنانے والے تو بہت کم ہیں۔ درحقیقت شیطان کی پیروی کرنی اور اس کے بہکاوے میں آنا، اس کے کہنے پر چلنا اور حکم الٰہی کو نہ ماننا اور ہدایت پر نہ چلنا۔ یہ سب پرستشِ شیطان کے مظاہر ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے اولادِ آدم کیا میں نے تم کو نصیحت نہ کر دی تھی کہ شیطان کا کہنا نہ ماننا اور اس کی پیروی نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ میری ہی پرستش کرنا، میرے حکم پر چلنا اور میرے پیغمبروں

کے فرمان کو ماننا۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا۔ ماضی پر حال کو اور حال پر استقبال کو قیاس کرنا انسانی دماغ کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے حال پر اپنے حال کو، دوسرے غیروں کے نتائج کو دیکھ کر عبرت اندوز ہونا بشریت کا اقتضاء ہے۔ اس دنیا میں بکثرت آدمی شیطانی جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمیشہ پھنسے رہے ہیں۔ اس کا نرغہ ہے کہ ان گمراہیوں کے احوال دیکھ کر ان کے نتائج سے عبرت اندوز ہوں۔ حاصل ارشاد یہی ہے کہ بہت آدمیوں کو شیطان نے گمراہ کر دیا تھا۔ بتیناً وہ انسانوں کا کھلا دشمن تھا پھر اس کی پیروی کیوں کی اور راہِ مستقیم سے کیوں بھٹکے۔

اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ۔ اس فقرہ میں کافروں کے دوسرے عذر کا استیصال فرمایا ہے کہ کیا تم عقل نہ رکھتے تھے سمجھتے نہ تھے، تم کو سمجھنے کی طاقت نہ دی گئی تھی۔ پھر کیوں شیطانی پھندے میں گرفتار ہوئے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ جس طرح چند آیات سے پہلے اہلِ جنت کے اعلیٰ نتائج اور عیش گوار عیش کا تذکرہ کیا تھا۔ اسی طرح اس آیت میں دوزخیوں کی سزا اور سزا کی علت کو بیان فرمایا ہے۔ یہ کافروں کے حق میں آخری فیصلہ ہوگا اور دنیا میں جو عذاب غیر مرئی تھا اور نہ دیکھنے کی وجہ سے کافر اس کو نہ مانتے تھے۔ قیامت کے دن وہ سامنے ہوگا۔ آنکھوں سے دیکھے گا۔ پس حکم ہوگا کہ یہ سامنے وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا تھا۔ اب آج اپنے کفر کی پاداش میں اس میں داخل ہو جاؤ۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ہم خدمت گرامی میں حاضر تھے یکدم حضورؐ اتنے ہنسے کہ دندان مبارک نمودار ہو گئے۔ پھر ارشاد فرمایا تم جانتے ہو میں کیوں ہنسا؟ حاضرین نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بخوبی واقف ہے۔ فرمایا میں اس لئے ہنسا کہ قیامت کے دن بندہ اپنے رب سے جھگڑے گا کہے گا پروردگار کیا تو نے حق تلفی سے مجھے نجات نہیں دی۔ اللہ فرمائے گا ہاں میں نے حق تلفی سے تجھے بری کیا ہے۔ بندہ عرض کرے گا میں اپنے نفس پر سوا اپنے کسی کی گواہی نہیں مان سکتا۔ حکم ہوگا اچھا تیرا نفس ہی تجھے محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے اور شہادت کے لئے کراماً کاتبین کافی ہیں۔ پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اعضاء کو حکم ہوگا کہ اس کے کام بتاؤ۔ اعضاء اس کے اعمال بیان کریں گے اس کے بعد اس کی زبان کی مہر کھول دی جائے گی تاکہ بات کر سکے۔ اس وقت وہ اپنے اعضاء سے کہے گا ملعونو! تمہاری خرابی ہو، تمہاری ہی طرف سے تو میں جھگڑا کر رہا تھا (مسلم والنسائی وابن ابی حاتم) ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ آخر میں آیا ہے کہ پھر کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا اور اعمال سامنے لائے جائیں گے۔ وہ کہے گا پروردگار تیری عزت کی قسم فرشتہ نے ان کا کام بھی لکھ لیا ہے۔ فرشتہ کہے گا کیا فلاں وقت فلاں جگہ فلاں کام تو نے نہیں کیا۔ جب وہ ایسی حرکت کرے گا تو اللہ اس کے منہ پر مہر کر دے گا اور اس کے اعضاء گواہی دیں گے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ پہلے اس کی دائیں ران بولے گی (ابن جریر) معاویہ بن حیدہ بہزی کی روایت میں دونوں ران اور دونوں ہاتھوں کا تذکرہ ہے (عبدالرزاق والنسائی) ابوہریرہؓ کی روایت میں ران، گوشت اور ہڈیوں کے بولنے کی صراحت ہے۔ (مسلم والوداؤد) عقبہ بن عامر کی روایت میں ہے کہ پہلے بائیں ران بولے گی (احمد) حقیقت میں ہاتھوں اور پاؤں کی ہی تخصیص نہیں شاید شہادت کا آغاز ان سے ہو ورنہ باقی اعضاء سبھی گواہی دیں گے۔ ایک آیت میں آیا ہے۔ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا الخ

۔۔ مدعیانِ دانشِ نیچر پرست بلکہ بندگانِ جہالت ہاتھ پاؤں اور دوسرے جسمانی اعضا کی شہادت کا اقرار نہیں کر سکتے۔ ان کو قرآن کی اس صراحت میں صداقت کا شائبہ بھی نظر نہ آئے گا کیونکہ قدرتی قانون اور طبعی عادت کے بموجب بولنے کے لئے انسان کو زبان دی گئی ہے اور طبعی لوازم کی مخالفت ناممکن ہے۔ لیکن ان بیوقوفوں کو اتنا معلوم نہیں کہ تمام مخارج حروف زبان ہو یا بالائی تالو یا حلق یا لب یا دانت سب کے سب کھال، گوشت، عضلات، اعصاب اور ہڈی وغیرہ کے مادہ سے بنے ہیں۔ حلق سے جو ہوا خارج ہوتی ہے اور مخارج حروف سے خاص خاص نسبت کے ساتھ ٹکراتی ہے اس سے الفاظ بنتے ہیں [illegible] عضلات وغیرہ میں بولنے کی طاقت پیدا کر دی۔ باوجودیکہ ان کا قوامی وجود دوسرے اعضاء کے قوامی مادہ سے کچھ زیادہ [illegible] دوسرے اعضاء کو گویائی کی طاقت عطا نہیں فرما سکتا۔ یہ کیسی دانش ہے کہ جو [illegible]

آیا اس کو مان لیا اور جو نظر سے غائب ہے اس کو باوجود عقلی ممانعت نہ ہونے کے ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی کور دانشی کو دور کرنے اور احمقوں کو جواب دینے کیلئے فرمایا ہے۔ اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِھِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ ۝

اس آیت کی تشریح کے ذیل میں حسن بصری نے لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِھِمْ کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا اگر اللہ چاہے تو ان کی آنکھوں کا نشان مٹا دے، لیکن سدی مجاہد، ابو صالح اور قتادہ نے لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِھِمْ کے معنی صرف اندھا کر دینے کے لکھے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقل کی آنکھیں اندھی ہیں، اسی لئے ان کو باوجود رسول اللہ کی رہنمائی اور کتاب اللہ کی ہدایت کے راہ حق نہیں سوجھتی۔ پس جس طرح یہ کور دانش ہیں اسی طرح اگر ہم چاہیں تو ان کو کور چشم بھی کر سکتے ہیں۔ اس وقت یہ راستے کی طرف چلیں گے ان کو کچھ سجھائی نہ دے گا اس مطلب میں الصراط سے مراد راہ حق ہے۔ ابن زیاد نے یہی تشریح کی ہے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰھُمْ عَلٰی مَکَانَتِھِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّلَا یَرْجِعُوْنَ یہ تہدید وعید کا تکملہ ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مسخ علی المکان سے مراد ہے جائے قیام پر مار ڈالنا یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کی جگہ پر ان کو مار ڈالیں۔ وہ جہاں ہوں وہیں مرے کے مرے رہ جائیں۔ ابو صالح نے کہا اس سے مراد ہے پتھر کر دینا۔ حسن بصری اور قتادہ نے کہا اس سے مراد ہے لنجا اور شل کر دینا یعنی ہم ان کو لنجا اور شل کر سکتے ہیں کہ وہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے لوٹ سکیں۔ میرے نزدیک یہی تفسیر احسن ہے۔ اگرچہ ابن عباس کا قول بھی لغت کے خلاف نہیں، مگر ابو صالح کی تفسیر کی کوئی وجہ نہیں تخصیص بدون مخصص ہے۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَکِّسْهُ فِی الْخَلْقِ۔ حشر جسمانی کے ثبوت کے لئے یہ نئے طرز کا استدلال ہے۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ حال پر استقبال کو قیاس کرنا دماغی شیوہ ہے بس آدمی کو اپنی بدنی ساخت پر غور کرنا چاہیئے۔ بچہ کمزور تھا پرورش کے لئے دوسروں کا محتاج تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جوانی آئی رعنائی آئی، سرو کی طرح سیدھا ہوا، اعضاء میں قوت اور بدن میں توازن پیدا ہوا پھر اضمحلال آیا، سراپا جلال آیا، تمام اعضاء میں کمزوری آئی۔ طبیعت پر افسردگی چھائی، ایک ایک کر کے دانت گرے۔ سب بال سفید ہوئے۔ جسم کا تناؤ جاتا رہا، توازن بگڑ گیا۔ کمر خمیدہ اور ہیئت ناپسندیدہ ہوگئی۔ کیا یہ کہیں اور جانے کی تیاری نہیں ہے۔ کیا یہی قوت وہ مرکز محیط کل نہیں۔ کیا اس کے سامنے آدمی سپر انداز نہیں۔ کیا یہ تغیرات ہر آن تخلیق جدید کے شاہد نہیں۔ عدم سے وجود ضعیف ضعف سے قوت اور قوت کے بعد ضعف دلالت نہیں کر رہا ہے کہ انسانی تخلیق کا مدعا کچھ اور ہے۔

مقصود بیان

اصحاب جنت کے عیش اور اہل جنت کے عذاب کی تصویر کشی۔ اَزْوَاجُھُمْ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اہل ایمان کے پاس ان کی بیبیاں بھی ہوں گی۔ خواہ حوریں ہوں یا دنیوی عورتیں۔ لَھُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ میں اس بات کی صراحت ہے کہ قرآن میں جو نعمتیں مذکور ہیں صرف وہی نہ ہوں گی بلکہ ہر شخص کو حسب خواہش ہر چیز ملے گی سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر اللہ کا سلام رحمت ہوگا یعنی پیام عافیت اور کلام تہنیت، مگر یہ سلام دعائیہ نہ ہوگا۔ اللہ کو دعا دینے کی کیا ضرورت بلکہ اللہ کے متعلق مفہوم دعا کی نسبت ہی کفر ہے وہاں عجز کہاں اور دعا بغیر مفہوم عجز کے کہاں۔ بلکہ سلام الٰہی پیام بشارت ہوگا۔ رحمت سرمدی ہوگی۔ عنایت ابدی ہوگی۔ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ کے بعد وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ صرف ترک شر ہی صراط مستقیم نہیں بلکہ عمل خیر کی بھی ضرورت ہے۔ نفی اور اثبات تخلیہ اور تحلیہ دونوں لازم ہیں۔ نواہی اور اوامر دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ دخول جہنم کا سبب کافروں کا کفر ہے۔ زبان پر مہر لگنا اور ہاتھ پاؤں کا شہادت دینا قابل تاویل ہے۔ اس سے قدرت الٰہیہ کی ہمہ گیری بھی ثابت ہوتی ہے اور اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کافر کراماً کاتبین کی شہادت سے انکار کریں گے تو بطور اتمام حجت اللہ ان کے اعضاء سے خود ان پر شہادت دلوائے گا جس کے بعد انکار کی گنجائش نہ رہے گی وغیرہ۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ۭ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ
ہم نے محمد کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ شاعری اُن کو زیبا ہے یہ تو فقط نصیحت اور روشن قرآن ہے تاکہ جو زندہ ہو اُس کو

حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا

ڈرائے اور کافروں پر وعدہ ثابت ہو جائے ۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دست قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے انکے لئے

فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ○ وَلَهُمْ

چوپائے پیدا کئے ہیں یہ ان کے مالک ہیں اور ہم نے ان کو ان کا تابع کر دیا تو ان میں سے کوئی تو ان کی سواری ہے اور کسی کو یہ کھاتے ہیں اور ان میں

فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً

ان کے لئے بہت سے فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں پھر اس پر بھی یہ کیوں شکر نہیں کرتے ۔ اللہ کے سوا انھوں نے اور معبودوں کو اختیار کر رکھا ہے

لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ○

تاکہ ان کی مدد کی جائے ۔ حالانکہ وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ ان کو ان کا لشکر (تابع) بنا کر حاضر کیا جائے گا

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○

(اے محمد) تم کو ان کی باتیں رنجیدہ نہ کریں جو کچھ یہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں ہم اس سے واقف ہیں

تشریح انسان کے باطنی آلات شعور خصوصاً قوت خیال سارے عالم ظہور و خفا کا خزانہ ہے ۔ یہی وہ قوت ہے جس کی جسولی آدمی کو بہت اونچی چوٹی پر پہنچا دیتی ہے تخیل اور شعور کیا ہے اس کی تعریف ہم یہاں نہیں کرنی چاہتے ۔ تخیل اور شعور سے مراد ہماری وہ تخیل و شعور نہیں جو ارسطو کے دماغ کے دائرہ فکر کی خاص اصطلاحی چیز ہے جس کو اس نے ادراک اور عقل سے نیچے کا درجہ دیا گیا ہے ۔ ہمارا تخیل سے مراد وہ درمیانی کڑی ہے جو ذی اور غیر مادی یا محسوس اور غیر محسوس یا کثیف اور لطیف یا حاضر اور غائب عالموں کے درمیان وابستگی اور ربط پیدا کرنے والی علمی طاقت ہے ۔ یہی وہ عالم برزخ ہے جس کے ذریعہ سے عالم بالا یا غیبی قوت کا فیضان عالم زمین یا مادی عالم پر ہوتا ہے ۔ اسی طرح برزخی پر عالم بالا کے وہ علمی حقائق جو مادی اور مستقل کی قیدوں سے پاک ہیں منشبہ ہو جاتے ہیں اور پھر عالم شہود کو بھی علمی مواد حاصل ہوتا ہے ۔ فلسفی کو چھوڑتے ہوئے جس کو تخیل اور وجدان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ حقائق [illegible] عقلی تصرفات کی روشنی میں حاصل کرتا ہے اور اکثر غلطی میں پڑ جاتا ہے ۔ ہم صرف اس طبقہ کی حالت بتانی چاہتے ہیں جو صاحب وجدان [illegible] شعور اور اہل تخیل ہوتا ہے ۔ تخیل یا شعور ایک بے کیف علم اور سادہ وجدان باطنی ہے جو علمی مقدمات کی ترتیب یا نظر و استدلال سے حاصل نہیں ہوتا [illegible] برہانی طریق ذہنی کو اس کے حصول میں دخل ہوتا ہے بلکہ عالم مادی سے ذہنی توجہ ہٹانے اور تمام عقلی تصرفات کو چھوڑ کر عالم غیب یا [illegible] ارواح کے افق کی طرف توجہ کرنے سے بصورت الفاظ و الہام حاصل ہوتا ہے ۔ یہ ایک کشف دفعتاً حاصل ہو جاتا ہے اور کچھ دیر تک استفادہ علمی کا سلسلہ باقی رہتا ہے ۔ یہی باطنی شعور اور قلبی وجدان ہوتا ہے ۔ اس قسم کا وجدان کم و بیش ہر آدمی کو کسی وقت حاصل ہوتا ہے ۔ سچے خواب اسی کے مختلف مظاہر ہیں ۔ مگر ہر شخص کو یہ قدرت نہیں ہوتی ۔ اور نہ ہر آدمی میں ایسا ملکہ ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے مادیات سے اپنی توجہ ہٹا لے اور مافوق المادیات کی طرف متوجہ ہو جائے ۔ ہاں خاص خاص افراد ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں کم و بیش یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیال کو ساری کائنات سے ہٹا کر یکسو ہو کر عالم بالا کی طرف متوجہ ہو جائیں ۔ ایسے قادر الخیال گروہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۔ شاعروں کا گروہ ۔ یہ طبقہ بہت بلند پرواز ہوتا ہے ۔ تھوڑی دیر کے لئے تمام ضروریات مادی سے بے نیاز ہو کر بلند ترین مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے ۔ مگر اس کی بلند پروازی اور تخیل کی برتری اکثر حقیقت سے

خالی ہوتی ہے۔ اس کا نفس اور قلب ان کو دھوکا دیتا ہے اور خود بھی دھوکا کھاتا ہے۔ صحیح کو غلط اور کاذب کو صادق جانتا ہے۔ اس کا شعور غیر واقعی شعور ہوتا ہے۔ اسی لئے جیان الشعراء تلامیذ الرحمٰن کہا جاتا ہے وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ بھی شعراء ہی کے متعلق آیا ہے۔ شاعر بعض وقت صادق ہوتا ہے ورنہ اکثر صداقت سے خالی۔ ۲۔ کاہنوں، جوگیوں اور مسمریزم کے ماہروں کا گروہ۔ ۳۔ اولیاء اور انبیاء کا گروہ۔ مؤخر الذکر دونوں گروہ بھی باہم مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت باہم اشتباہ زیادہ ہو جاتا ہے جب کسی شخص کے اندر باطنی قوت روشن ہو اور حقائق غیبیہ مادی تصویروں کی شکل میں اس کے سامنے آ جائیں اور اس کے تصار خیال میں اشباح مثالیہ مستحضر ہو جائیں پھر وہی حقائق غیبیہ مادی اشکال سے متشکل ہو کر عالم حس میں اتر آئیں اور حواس مادیہ ان سے متاثر ہو جائیں۔ پس وہ غیبی صورتوں کو آنکھوں سے مشاہدہ کرنے لگے اور ان کی آوازیں اپنے کانوں سے سن کر ان کو عین کلام کہنے لگے۔ یہ وقت بڑے اشتباہ کا ہوتا ہے۔ صدق و کذب اور حق و باطل کا امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن اہل بصیرت پرکھ لیتے اور کھرے کھوٹے سے شناخت کر لیتے ہیں۔ بشری تعلیم کے بغیر علم تو دونوں گروہوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کیا ہر گروہ کا معلم ایک ہی ہوتا ہے یا جدا جدا۔ دونوں کا معلم ایک تو ہو نہیں سکتا۔ ورنہ تعلیم، کیفیت تعلیم اور مقاد تعلیم میں فرق بلکہ تضاد کیوں ہوتا۔ ارشاد و اغوا، اصلاح و افساد، تعمیر و تخریب کا دونوں تعلیموں میں فرق ہو جاتا ہے کہ ہر ایک گروہ کا معلم الگ الگ ہے۔ ایک کا معلم رحمان ہے دوسرے کا شیطان۔ ایک کا استاد فرشتہ نوری ہے، دوسرے کا جن ناری۔ ایک کا الہام الہام صحیح ہے اور دوسرے کا القاء القائے طاغوتی۔ پھر سب سے زیادہ نمایاں فرق فضائل و رذائل کا ہوتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء کا گروہ مالک صدق و دیانت اور حامل عفت و امانت ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم خود ان کو حمیدہ اور شمائل پسندیدہ سکھاتی ہے اور دوسرا گروہ عموماً اچھے صفات اور صدق و صفا کے ملکات سے خالی ہوتا ہے۔ یہ فرق ایسا نمایاں اور واضح ہوتا ہے کہ ادنیٰ بصیرت رکھنے والا بھی سچے جھوٹے میں امتیاز کر لیتا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ شاعری تو انبیاء کے لئے مناسب ہی نہیں ہے۔ اگر بعض اولیاء بلند شعور رکھتے ہوں اور ان کی بلند پروازی شعریت کی صورت میں ظاہر ہو جائے تو وہ عموماً صادق ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقت سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ تلامیذ رحمٰن ہوتے ہیں۔ مرید شیطان نہیں ہوتے ہوتے ہے۔ انبیاء خصوصاً سید الانبیاء ان کو تو شاعری سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کا فرض تبلیغی ہوتا ہے اس لئے ان کو اشتباہ سے بہت دور رکھا جاتا ہے۔ ان کے علوم حاصلہ اور ان علوم کی تعلیم محض اصلاحی اور حیات بخش ہوتی ہے اور انکار کرنے والوں پر دوامی ہلاکت کی مہر ثبت کر دینے والی۔ مثلاً ان کو بتایا جاتا ہے اور وہ دوسروں کو بتاتے ہیں کہ رب العالمین نے انسان کی پرورش کے تمام اسباب پیدا کئے۔ عنصری، جمادی اور نباتی لوازم کے علاوہ صرف حیوانی مخلوق ہی ایسی پیدا کی جس سے انسان کی غذائی اور لباسی ضرورتیں گوناگوں وابستہ ہیں۔ پس معبود، مسجود، الٰہ ہونے کا استحقاق بھی اسی کو ہے۔ وہی نفع اور ضرر کا مالک ہے۔ وہی کارساز اور حاجت روا ہے۔ دوسروں سے امداد کی امید رکھنی اور غیروں کو نفع نقصان کا مالک سمجھنا سراسر کفر ہے۔ اللہ کے مقابلے میں کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ بلکہ بے جان پرستاروں کے معبود تو اپنے معبودوں سے زیادہ طاقت ور ہیں ان کی حمایت کرتا اور گروہ در گروہ ان کے جنبہ دار ہوتے ہیں وغیرہ۔

تحلیل اجزاء وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ۔ قرآن کے الفاظ کی بندش، معانی کی بلاغت، طرز ادا کی پرکاری، مضامین کی شستگی اور دل نشینی تمام دنیا والوں کو کھینچنے والی اور باطل کی دنیا کو پلٹ دینے والی ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اس کی تاثیر اور دلگیری کا انکار نہیں کر سکتے۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مجبور ہو کر بعض لوگوں نے اس کو شاعری کہنا شروع کیا۔ شاعروں کی تعداد جزیرۂ عرب میں صحرا نشین بدویوں اور اہل حضارت شہریوں میں ناقابل انکار تھی وہ مافوق البشریۃ وحی الٰہی سے ناواقف تھے۔ نبوت کی روشنی ان کو دکھیتی نہ تھی۔ اور شاعروں کے کلام کو سحر آفرین جانتے تھے، اس لئے قرآن کو نتیجہ شاعری اور رسول پاک ﷺ کو شاعر کہتے تھے۔ قرآن نے ان کی تردید کی اور مدلل تردید کی۔ فرمایا ہم نے رسول اللہ کو شعر کہنا نہیں سکھایا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ معاند دشمن بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ حضور والا نے کبھی کوئی شعر کہا ہو اور اگر شعر کہنا آتا تو کبھی تو کوئی شعر کہتے۔ جو فن کسی کو آتا ہے اس کا ظہور کبھی تو ہوتا ہی ہے۔ شعبی کا قول ہے کہ عبد المطلب کی اولاد میں سے ہر شخص اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار شعر میں کرتا تھا مگر رسول پاک ﷺ شعر گوئی سے پاک تھے (رواہ ابن عساکر) حسن [illegible] سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے کسی شاعر کا یہ مصرعہ [illegible] نقل کیا۔ کفی بالاسلام والشیب للمرء ناھیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ موزوں مصرع اس طرح کہا ہے :- کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا۔
پھر شاید حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ حضور کی رسالت کا ثبوت یہ بھی کافی ہے جس طرح خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ۔ (رواہ ابن ابی حاتم) ایک بار حضور اقدس ﷺ نے عباس بن مرداس سلمی سے فرمایا حنین کے دن تم نے یہ کہا تھا۔ اتجعل نھبی ونھب العبید بین الاقرع وعیینۃ ابن مرداس نے عرض کیا وہ مصرع اس طرح ہے
بَیْنَ الْعُیَیْنَۃِ وَالْاَقْرَعِ ۔ فرمایا دونوں برابر ہیں (بیہقی) کسی سائل نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول پاک ﷺ کسی موقع پر کسی شاعر کا قول نقل فرماتے تھے ۔ ام المومنین نے فرمایا حضور کو شعر سب سے زیادہ ناپسند تھا ہاں کبھی کبھی قبیلہ قلیس کے شاعر کا مصرع زبان پر لاتے تھے ، مگر اس کے اول کو آخر اور آخر کو اول کر دیتے تھے ۔حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ شاعر کا مصرع تو اس طرح ہے ۔ فرمایا میں شاعر نہیں ہوں اور اللہ نے شاعری کو میرے مناسب نہیں قرار دیا ۔ (ابن جریر واحمد)

۔ فرمایا شاعری ان کے لئے سزاوار نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ شاعر کسی صنف کا ہو ، ہجائیہ شعر کہے یا مدحیہ ۔ واقعہ نگاری ہو یا رزم و بزم کی تصویر کشی ۔ اخلاقی شاعری کرے یا انقلاب دہر کو بیان کرے ۔ بہر حال اس کا کوئی شعر یا شعر کا کوئی حصہ مبالغہ آمیز اور جھوٹ ضرور ہوگا ۔ پھر بیان میں نثر سے زیادہ اشکال مضمون آفرینی اور بلند پروازی بھی ہوگی ۔ اس کے علاوہ ادبی شعر کی بنا محض تخیل و محاکات پر ہے ۔ جذبات رغبت و نفرت کو برانگیختہ کرنا شاعری کا اصل مقصد ہے ۔ ادبی شعر کا قضایا صادقہ سے مرکب ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض اہل ادب کے نزدیک ممنوع ہے ۔ اگر شعر میں تخیل نہ ہو اور صرف وزن ہو تو (دندان تو جملہ در دہانست چشمان تو زیر ابروان است) کی قسم کا شعر ہوگا اور اہل ادب کے نزدیک ساقط الاعتبار پس واقعی طور پر جذبات و نفرت و رغبت کو برانگیختہ کرنا اور محض تخیلی طور پر بلند پروازی کرنی شایان نبوت نہیں ۔ الحاصل رسول اللہ ﷺ شاعر نہ تھے تو پھر قرآن کو نتیجہ شاعری کسی طرح کہا جا سکتا ہے ۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ رسول پاک ﷺ شاعر نہ تھے ، لیکن اس سے قرآن کا شعر نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ ممکن ہے کسی دوسرے شاعر نے کہلوا لیا ہو ۔ اسی فرضی خیال کا ازالہ آیت مذکورہ میں فرمایا ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ شعر اور شاعری مضمون آفرینی ، بلند پروازی اور مبالغہ آمیزی سے پاک نہیں ہوتی ۔ آج تک اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی یا کسی دوسری زبان کی شاعری کیسی ہی مبنی بر حقیقت ہو ، کسی منظر کی تصویر کشی کی گئی ہو ، کسی واقعہ کو نظم کیا گیا ہو یا اخلاق کا درس دیا گیا ہو ۔ بہر حال حسن تخیل سے خالی نہیں ہوتی اور ادبی شعر کی تعریف کا لحاظ کرتے ہوئے بلند پروازی خالی بھی یہ ہونا چاہئے ، مگر قرآن محض ایک یادداشت ہے ، نصیحت نامہ ہے صداقت سے لبریز تذکرہ ہے ، نصیحت آفرین اور حقانیت آگیں تذکرہ ہے ۔ اس کتاب اور دیوان شعر میں منافات ہے ۔ اس کے علاوہ عموماً شعر نثر سے دشوار ہوتا ہے ۔ شعر کتنا ہی سادہ ہو یہاں تک کہ حارث بن حلزہ یشکری کی شاعری ہو یا عمرو بن کلثوم تغلبی کی ۔ بہر حال بند آزاد کے مقابلے میں اور مرکب بسیط کے موازنہ میں مشکل ضرور ہوتا ہے اور چونکہ قرآن ایک عظیم الشان نصیحت آفرین یادداشت ہے ، اس لئے اس کو واضح اور نمایاں سادہ عبارت میں ہونا چاہئے تھا اور ہر آورد سے آزاد ہونا لازم تھا ۔ شعر میں مضمون کی آمد اگرچہ فی الجملہ ہوتی ہے ، مگر ادائے مضمون پھر بھی بندش اور آورد سے خالی نہیں ہوتا ۔ پس قرآن کا سادہ واضح عبارت میں بشکل یادداشت ہونا شعر نہ ہونے کا کافی ثبوت ہے ۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔ یہ نزول قرآن کی غرض کا خلاصہ ہے ۔ ہم نے مفہوم موت و حیات کی تحقیق اسی مضمون میں بعض بعض مقامات پر کر دی ہے جن میں ثابت کیا ہے کہ کافر حقیقت میں مُردہ ہیں اور مومن زندہ ۔ یعنی کافر ولو کی انسانیت مُردہ ہے اگرچہ حیوانیت زندہ ہے اور اہل ایمان کی انسانیت زندہ ہے ۔ خواہ حیوانیت کے لحاظ سے وہ کمتنے ہی گئے گزرے ہوں قرآن اور حامل قرآن مثل ابر رحمت ہیں ۔ جس سے پانی ایک طرح کا برستا ہے اور ہر جگہ پڑتا ہے ۔ پس جس زمین میں زندگی کی صلاحیت ہے وہ زندہ ہو کر سرسبز ہو جاتی اور لہلہانے لگتی ہے ۔ اور جو زمین شور ہے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ۔ وہ بدستور رہتی ہے ۔ اور فطرت کے لحاظ سے جو اس کو محروم ہے وہ آب رحمت کے بدلے بھی ویسی ہی رہتی ہے ۔ یہی حال اہل ایمان اور اہل کفر کا ہے ۔ اہل الذکر کے قلوب زندہ ہوتے اور زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ پس ہدایت

قرآن سے انکو فائدہ پہنچتا ہے اور مؤخر الذکر مردہ دل ہیں ان کے دلوں میں زندگی کی صلاحیت ہی نہیں ۔ اس لئے قرآن سے بھی ان کو فائدہ نہیں پہنچتا ۔ پس نزول قرآن ان کے حق میں بعد اتمام حجت کے ہوتا ہے اور بالآخر اللہ کی بات ان کے حق میں پوری ہو جاتی ہے ۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۔ سرکش مغرور انسان خودی اور خود پرستی کے نشے سے چور ہو کر اس قدر بے باک ہو جاتا ہے کہ مختلف اقسام کی مصنوعات اور طبیعیاتی تحقیق کے نتائج کا مالک اپنے کو خیال کرنے لگتا ہے ۔ اہل نظر اور حقیقت شناس تو جانتے ہیں کہ ذرہ سے لے کر عرش بریں تک ہر چیز کے اندر غیبی قدرت کی دستکاری برسر عمل ہے ۔ جب انسان خود نہیں بنا تو اس کا کوئی فعل بھی بغیر تخلیق الٰہی کے کس طرح بر منظہور آسکتا ہے ۔ لیکن ہر چیز ، ہر عمل اور ہر ارادہ کے اندر غیبی طاقت چھپی ہوئی ہے آنکھوں سے نہیں دکھتی ۔ مادی کان ان کی آہٹ نہیں پاتے ناک اس کی بو نہیں آتی ۔ ہاتھوں کے چھونے ٹٹولنے سے اس کا احساس نہیں ہوتا ۔ پس مغرور برخود غلط انسان کو انکار قدرت کا موقع ملتا ہے اور وہ علی الاعلان کہہ دیتا ہے کہ یہ سب میری کارسازی ہے ، مگر دنیا میں بیشتر چیزیں ایسی ہیں جن کی تخلیق میں انسانی دانشمندی عمل اور دستکاری کو کوئی دخل نہیں نہ وہ انسانی ارادہ کی محتاج ہیں نہ صناعی اور کارسازی کی ۔ اور اس کے ذریعہ انسان کے بیش از بیش فائدوں سے وابستہ ہیں ۔ اگر وہ نہ ہوں تو انسان بکثرت فوائد سے محروم ہو جائے ۔ مثلاً چوپائے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے ، دودھ پیا جاتا ہے ان سے لباس بنایا جاتا ہے ۔ ہڈی ، گدی ، نس ، پٹھے سب چیز کام میں لائی جاتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی دست بشر کا ممنون نہیں ۔ پس غیبی قدرت کی کارفرمائی عمومی ربوبیت اور برحق الوہیت کو ثابت کرنے کے لئے آیت مذکورہ میں بطور تمثیل چوپایوں کا تذکرہ فرمایا ۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے یعنی بغیر انسانی دخل کے چوپایوں کو بنایا ۔ کیا لوگوں کو یہ بات نہیں دکھتی ۔ پھر آدمی ہی ان کے مالک ہوتے ہیں ۔ ہر قسم کے تصرف کرنے کا ان کو اختیار دیدیا ۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝ اور چوپایوں کو آدمیوں کے بس میں کر دیا ۔ کسی سے سواری کا کام لیتے ہیں ۔ کسی کا گوشت کھاتے ہیں ۔ گھی ، پنیر ، مکھن کام میں لاتے ہیں ۔ دودھ پیتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے فوائد بھی چوپایوں سے وابستہ ہیں ۔ بوجھ اٹھانا ، گاڑی کھینچنا ، زمین جوتنا ، چوپایوں کی ہڈیاں ، بال ، کھال ، پٹھے ، آنتیں ، لعاب دار رطوبت ، خون وغیرہ سب ہی کام کی چیزیں ہیں ۔ انسانی منافع ان سے وابستہ ہیں ۔ اب ذرا غور کرنے کا مقام ہے اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے اور کیسی زبردست قدرت و طاقت ہے کہ چوپایوں کو انسان نے نہیں بنایا ۔ مادہ صورت کوئی چیز انسان کے دست کرم کی ممنون نہیں بلکہ انسانوں کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ۔ پھر انسان کیوں شکر ادا نہیں کرتے ، کیوں شرک کرتے ہیں ۔ کیوں شکر نہیں کرتے کیوں کفر کرتے ہیں ۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرنے والے کہتے ہیں کہ بے شک خالق خدا ہے ۔ آسمان زمین اس نے پیدا کئے ۔ ہوا ، پانی اور آگ ، مٹی کو اسی نے بنایا ۔ چرندے ، پرندے ، درندے اسی کی خلاقی کے نمونے ہیں ۔ ہماری زندگی کے ہر نفع کا حصول اس کے دست کرم کا محتاج ہے ، لیکن اس کے باوجود ہمارے اور خدا کے درمیان بہت وسائل ہیں ۔ ہم کہاں خدا کہاں ۔ دکھ کے وقت ہم کو خدا کے عذاب سے کون بچائے گا ۔ وہ ہماری کس طرح سنے گا ۔ ہم اپنے بزرگوں اور دیوتاؤں ، اوتاروں ، پیغمبروں ، فرشتوں اور کائناتی مظہروں کی اس لئے پوجا کرتے ہیں کہ مصیبت کے وقت وہ ہمارے کام آئیں ۔ ہماری مدد کریں ۔ دنیا اور آخرت میں ہماری اعانت کریں اور عتاب خداوندی سے ہم کو بچا لیں ۔ باطل پرست اس قسم کے شبہات پیدا کرتا اور شیطانی اغوا میں آکر اپنی باطل پرستی کی وجہ جواز پیدا کرتا ہے ۔ آیت مذکورہ میں اس وسوسہ کو دور کیا ہے اور صاف صراحت کر دی ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنانے والے اس امید پر ان کی عبادت کرتے ہیں کہ ان کے معبود ان کی مدد کریں ۔ مگر ان میں مدد کرنے کی طاقت ہی نہیں ہے وہ ان کی اعانت نہیں کر سکتے لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ کے دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہی جو ہم نے بیان کئے کہ مشرکوں کے معبود مشرکوں کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ دوسرے یہ کہ مشرکوں کے معبود خود اپنی مدد نہیں کر سکتے یعنی وہ خود ان کی طرح عاجز ہیں ۔ بے کس ہیں ۔ پھر دوسروں کی مدد کیا کر سکتے ہیں :

حضرت معاذ بن جبلؓ ایک نوجوان مومن انصاری تھے ، مگر ان کے والد ایمان نہ لائے تھے ۔ باپ کے پاس ایک بت تھا جس کی وہ پوجا کرتے تھے ۔ اس کی پرستش میں لگے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی پرستش پر آمادہ کرتے اور ترغیب دیتے تھے ۔ ان کا یہ عمل حضرت معاذ کو بہت برا لگتا تھا ۔ اکثر سمجھاتے

تھے مگر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ انھیں کے ہم نام ایک اور مومن انصاری تھے۔ ایک روز دونوں مسلم نوجوانوں نے مشورہ کر کے اس مورتی کی تذلیل کی ٹھان لی۔ رات کو خفیہ طور پر حضرت معاذ نے جا کر اس بت کو اوندھا گرا دیا اور جس پولی پر وہ نصب تھا اس چوکی کو بت کے اوپر رکھ دیا۔ صبح کو بوڑھے باپ نے جب یہ ناشائستہ حرکت دیکھی تو بہت شور و غل مچایا، مگر کرنے والے کا پتہ نہ چلا۔ خاموش ہو رہا اور مورتی کو اٹھا کر پھر پہلی حالت پر رکھ دیا۔ دوسری بار حضرت معاذ کے ساتھی نے رات کو خفیہ طور پر اس بت کو نجاست آلودہ کر دیا اور سرنگوں کر کے گرا دیا۔ صبح کو معاذ کے والد نے اپنے معبود کی یہ خالت زار دیکھ کر پہلے سے زیادہ غصہ کا اظہار کیا، مگر مجبور ہو کر پھر نہلا دُھلا کر اصلی جگہ رکھ دیا اور ایک تلوار اس کے پاس رکھ دی اور بت سے کہا تم اتنی درگذر کیوں کرتے ہو اب کہ سے جو شخص گستاخی کرے اس کی گردن تلوار سے اڑا دینا۔ تیسری مرتبہ حضرت معاذ اور ان کا ساتھی متفق ہو کر ایک مردہ کتا گھسیٹ کر لائے اور بت کی ٹانگ سے کتے کی ٹانگ باندھ دی۔ تلوار سے بت کی ٹانگ کاٹی اور دونوں کو ایک غار میں لٹکا دیا۔ صبح ہوئی اور بوڑھے باپ نے مورتی کو اس کی جگہ پر نہ پایا تو تلاش شروع کی۔ رفتہ رفتہ کھوج کا نشان پا کر غار کے اندر سے بت کو کھینچا تو کتے کی لاش بھی ساتھ کھنچ کر آئی۔ اُس وقت کہنے لگے ہم کو معلوم ہو گیا کہ تمہارے اندر کوئی طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر پھینک دیا اور مسلمان ہو گئے۔

آیت مذکورہ کے مؤخر الذکر مطلب کی تائید اس قصہ سے ہوتی ہے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۔ اس جملہ کا مطلب بھی دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ حسن بصری اور قتادہ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر بتوں کو کوئی گالی دے مارے تو خود تو ان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی مدد خود نہیں کر سکتے بلکہ ان کے لئے ان کے پوجنے والے جتھے بنا کر ان کی لڑتے ہیں۔ اور سب کو جمع کر کے ان کی مدد کیلئے لاتے ہیں۔ مجاہد نے فرمایا کہ قیامت کے دن کافروں کے تمام باطل معبودوں کو جمع کر کے لایا جائے گا تاکہ ان کے سامنے کافروں کو عذاب ہو۔ ابن کثیر اور ابن جریر نے اول مطلب کو پسند کیا ہے۔ میرے نزدیک بھی وہی زیادہ صحیح ہے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۔ کفار بداطوار حضور اقدس کی نصیحت نہ مانتے تھے۔ حضور والا جتنی کوشش کرتے اتنی ہی وہ سرکشی کرتے تھے بلکہ دشمنی پر کمربستہ ہو کر مسلمانوں کو دکھ پہنچاتے اور ذلیل کرنے کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ حضور اقدس رحمۃ اللعالمین تھے کافروں کا انجام اور ان کی تباہی کا انجام اور ان کی تباہی حضور والا کے سامنے تھی۔ پھر مسلمانوں کی ذلت کا بھی احساس تھا، اس لئے پریشان اور غمگین رہتے تھے اور کافروں کی باتوں سے بہت رنجیدہ۔ تسلی کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی اور حکم دیا کہ کافروں کی باتوں سے رنجیدہ خاطر نہ ہو۔ ہم ان کی ظاہری اور باطنی حالت سے واقف ہیں۔ یعنی ان کے ظاہری قول و فعل اور باطنی حرکت و حیلہ کا ہم کو علم ہے۔ ہماری حکمت و مشیت ہے۔ ہمارے ہی ذمہ ان کا محاسبہ ہے آپ پر ان کا محاسبہ نہیں۔ پس آپ کو ابھی صبر کرنا چاہیے۔

مقصودِ بیان

حضور والا کو اللہ کی طرف سے شاعری کی تعلیم ہی نہیں دی گئی تھی نہ شاعری حضور کو زیبا تھی، اس لئے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ہر چیز کا علم اللہ کی طرف سے حضور کو نہیں دیا گیا تھا۔ جس چیز کا علم یا جو چیز حضور کے مناسب نہ تھی اس سے ناواقف رکھا گیا تھا۔ آج سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے اس احمق گروہ کو جو حضور کے جوش محبت سے مجبور ہو کر یا حضور سے عناد اور عداوت کی وجہ سے حضور کو کان و ما یکون یعنی ہر چیز کا عالم قرار دیتا ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک اور عرش سے لے کر فرش تک ہر شے کو سرکار عالی کے پیش نظر جانتا اور سید الانبیاء کے علم کو محیط کل کہتا ہے۔ یہ آیت اس کے عقیدہ کے خلاف برہان ناطق ہے جس کی تاویل ناممکن ہے۔ صاف صراحت فرما دی ہے کہ ہم نے رسول اللہؐ کو شاعری نہیں سکھائی بلکہ ساتھ ہی شاعری کی تعلیم نہ دینے کی وجہ بھی بیان کر دی کہ شاعری آپ کے لئے زیبا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر نازیبا علم اور غیر مفید فن سے اللہ نے اپنے رسول کو ناواقف رکھا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک یادداشت یا نصیحت نامہ ہے یعنی دیوان شعر نہیں جس میں جھوٹ سچ بھرا ہو۔ اہل فلسفہ کی خرافات نہیں طبیعیات کی نامکمل ناقص تحقیقات نہیں۔ اختراعی غلط مباحث الٰہیات نہیں۔ خوش و ت معانی بیان بدیع عروض ریاضی نجوم منطق ہر حال کسی علم اور کسی فن کے قواعد کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ عقائد کو سنوارنے اور اعمال کو سدھارنے کا ایک کھلا ہوا پیام ہے اور اس کی غرض صرف یہ ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا اہل ایمان و اصحاب عمل کو حیات ابدیہ حاصل ہو جائے اور کافروں کے مقابلے میں حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن ان کو کوئی عذر باقی نہ رہے۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے یہ مقصود ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت یا استعانت بھی ناجائز ہے۔ اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا عزت حاصل کرنا وہ خواہ بکالانہ ہو یا جو اہل قبور سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کو حاجت روا سمجھتے ہیں وغیرہ۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ۝ وَضَرَبَ

کیا انسان نہیں جانتا کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا تو یکایک وہ صریح جھگڑالو بن گیا اور ہم پر

لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي

بات مارتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا کہتا ہے کہ گلی ہوئی بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا (اے محمد) کہہ دیجئے ان کو پہلی

أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ

مرتبہ پیدا کیا تھا وہی تو زندہ کرے گا وہ سب بناوٹ سے واقف ہے اسی نے تو سبز درخت سے تمہارے لئے آگ بنائی

نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ ۝ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ

جس سے تم روشنی تیار کرتے ہو کیا جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان

عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا

کی مانند پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا (ضرور رکھتا ہے) کیوں نہیں رکھتا وہی خلاق اعظم اور دانا ہے جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو اس کا فرمان

أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

بس یہ ہوتا ہے کہ ہو جا وہ چیز ہو جاتی ہے پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کے پاس تم سب کو لوٹ کر جانا ہے

تفسیر ہم ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ آسمانی اصلاحی قوانین کی ضرورت اور افکار و نظریات کی درستگی کی حاجت اسی وقت ہوتی ہے جب صحیح غلط افکار و عقائد کے اخروی نتائج اور اچھے برے اعمال کی جزا سزا کو مانا جائے اور جزا سزا کا عقیدہ وجود قیامت کے امکان بلکہ وجوب پر مبنی ہے۔ اگر قیامت محال قرار دی جائے تو پھر جزا سزا کیسی اور جزا سزا کی ضرورت نہ ہو تو قیامت اور حساب کتاب کی کیا ضرورت۔ بہرحال جزا سزا اور قیامت میں باہم لزوم ہے۔ جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں وہ دو قسم کے دلائل پیش کر سکتے ہیں (۱) مادی ذرات کے منتشر ہو جانے کے بعد ان کا جوڑنا ناممکن ہے اور خدا محال پر قادر نہیں (۲) جب کوئی چیز موجود ہی نہیں رہی تو حکم خداوندی کا تعلق اس سے کیسے ہو سکتا ہے معدوم سے خطاب کرنے کو کون ہوش مند صحیح مان سکتا ہے۔ یہ خلاصہ ہے ان طویل دلیلوں کا جو منکرین قیامت کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر غور سے کام لیا جائے اور عقل و مشاہدہ کی ترازو میں ان دلائل کو تولا جائے تو ان دلائل میں کوئی وزن نہ نکلے گا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ انسان خود پہلے کچھ نہ تھا اس کے تخلیقی ذرات پریشان تھے پریشان ذرات کو اللہ نے اجمالی اجتماع کی شکل عطا کی جس کو نطفہ کہا جاتا ہے۔ نطفہ کے اندر اجمالی طور پر تمام اجزاء انسان کو فراہم کیا پھر تفصیل دیکر ان کو پھیلایا پوشیدہ کو ظاہر اور معدوم الظہور کو برونے کار لایا۔ اور اس طرح جیتا جاگتا قوی ہیکل آدمی پیدا ہوا۔ تو جس خدا کی صناعی کے یہ تمام مظاہر ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے کیا وہ خدا تخلیق ثانوی سے عاجز ہو سکتا ہے۔ اتنی وقت نظر اور عمیق مطالعہ سے کام لینا چاہو تو جانے دو ایسی چیز کا مشاہدہ کرو جس کو بیوقوف اور عقلمند سمجھدار عوام اور باقی عورت اور مرد غرض ہر آدمی ظاہرات دیکھتا ہے۔ شعر کے دو لکڑی جلتی ہے اس سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ لکڑی سے آگ کا پیدا ہونا کتنی عجیب چیز ہے۔ لکڑی کی تخلیق تو اجزاء سے ہوتی ہے اگر اس میں تری نہ ہو تو کس طرح ہوا اور ایک تخم سے اتنا بڑا درخت کیسے برآمد ہو جائے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ لکڑی کی تخلیق اگرچہ

تا جزا ہے ہوتی ہے، مگر اس کے اندر خود کسی قسم کی حرارت چھپی ہوئی ہوتی ہے جو درخت سے کٹنے کے بعد بھی لکڑی کے اندر باقی رہتی ہے الا جب اس کو معمولی طور پر کسی بیرونی آتش انگیز چیز سے رگڑا جائے تو مخفی حرارت ظاہر ہو کر لکڑی کو آگ کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جب یہ بات بالکل بدیہی اور ناقابل انکار ہے تو پھر کیا انسانی جسم کے پریشان ذرات میں کسی پوشیدہ طاقت کا اسی طرح چھپا رہنا محال ہے جو کسی قدر اقتضاء ذاتی کے زیر اثر باہم جمع ہو کر دوبارہ انسانی شکل میں نمودار ہو جائیں۔ اس سے بھی قطع نظر کرو، اس سے بھی زیادہ واضح حقیقت کو دیکھو اتنی عظیم الشان بلندیاں جن کو آسمان کہا جاتا ہے اور ایسی چوڑی چکلی زمین تو ہر شخص دیکھتا ہے ان کو کس نے بنایا؟ اللہ نے۔ تو پھر وہی اللہ کیا انسان کو دوبارہ نہیں بنا سکتا۔ تخلیق ثانوی میں شبہ تو اس وقت ہو سکتا تھا جب اللہ کی قدرت تخلیق یا علم میں کوئی کمی ہوتی اور جب اللہ میں صفت تخلیق قدرت اور علم بدرجۂ اکمل موجود ہے تو ایسی صورت میں شبہ کی گنجائش ہی کیا ہو سکتی ہے۔ رہا معدوم محض کو خطاب کرنا تو یہ بھی غلط ہے۔ سوچنا، پھر ارادہ کرنا، پھر زبان سے حکم دینا یہ تدریجی عملی و قولی تو ممکنات میں ہوتی ہے۔ مخلوق کے تمام اوصاف جدا جدا ہوتے ہیں۔ اور افعال و صفات میں ترتیب زمانی ہوتی ہے۔ مخلوق پر خالق کو اور ممکن پر واجب کو، حادث پر قدیم کو اور انسان پر خدا کو قیاس کرنا بیوقوفی ہے باری تعالیٰ کا قول، عمل اور ارادہ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ عالم میں جب کچھ نہ تھا تو اللہ نے معدوم محض کو موجود کیا۔ کیونکہ یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور صورت یا مادہ کو اللہ نے نہیں بنایا۔ یہ دونوں یا دونوں میں سے ایک واجب الوجود اور قدیم ہے۔ اس صورت میں وہی شرک لازم آنے کا جس کا استحالہ اہل عقل کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے یا ماننا پڑے گا کہ کائنات میں سے کچھ نہ تھا اور اللہ نے اس کو نیست سے ہست کیا لیکن نیست سے اس نے ہست کیسے کیا؟ کیا تخلیق کے وقت علم و ارادہ کے بعد خطاب قولی سے کام لیا تو یہ ناممکن ہے۔ معدوم کو خطاب کرنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں یا وہی بات ہے جو ہم نے ابھی کہی ہے کہ اس کا ارادہ قول اور تخلیق جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو فوراً وہ شے ہو جاتی ہے۔ ارادہ کے بعد کسی مزید عمل یا قول کی ضرورت نہیں پڑتی اس کے ارادہ کا نام ہی امر ہے۔ پس جس طرح صفت ارادہ کے لئے مراد کا پہلے سے خارج میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح باری تعالیٰ کے قول اور خطاب کے لئے مخاطب کا موجود ہونا لازم نہیں۔ اس کی مزید تشریح اور سہل الفہم تفسیر ہم آیت اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔـا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ کے تحت عنقریب کریں گے۔ یہاں اجمالی طور پر اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کی صفات ذاتیہ کے لحاظ سے افعال و اقوال سے جدا نہیں ہیں۔ یعنی ان میں زمانی تقدم و تاخیر نہیں۔ ذاتی تقدم تاخر ضرور ہے۔ یہ بحث بہت طویل ہے۔ صفات واجب کو صفات ممکن پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔ یوں سمجھو کہ ہمارے دماغ میں کسی چیز کا تصور ہوتا ہے تو وہ چیز موجود ہو یا نہ ہو صرف ممکن الوجود ہو ہم اس کا تصور کر لیتے ہیں۔ تصور کرنے میں ہم کو مزید سامان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پس دماغ کی ایک خاص لہر کا نام تصور یا کسی چیز کا وجود ذہنی ہے۔ یعنی ہم جس چیز کو ذہن میں موجود کرنا چاہتے ہیں تو اس کا تصور کرتے ہیں۔ ہمارے اس تصور کا نام ہی وجود ذہنی ہے۔ اسی طرح باری تعالیٰ جب کسی چیز کو خارج میں موجود کرنا چاہتا ہے تو اس کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے۔ پس ارادہ کرنا ہی اس چیز کا وجود خارجی ہے۔ ارادہ کی لہر اٹھنے کا نام ہی وجود کائنات ہے۔ پس جب خدا نے معدوم محض کو موجود کیا اور نیست کو ہست بنایا تو کیا جب انسان مر کر فنا ہو جائے اور موجود سے معدوم ہو جائے یعنی اس کے ذرات منتشر ہو کر دوسری صورتیں اختیار کر لیں تو دوبارہ اس کی تخلیق ناممکن ہے۔ مرنے کے بعد آدمی بالکل معدوم نہیں بن جاتا۔ اس کے جسم کے ذرات منتشر ہو کر کہیں کسی شکل میں تو باقی رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا اعادہ کرنا اور لوٹا کر لا دینا اور دوبارہ زندگی عطا کرنا کس طرح محال قرار دیا جا سکتا ہے۔

تحلیل اجزاء

اَوَلَمۡ يَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِىَ خَلۡقَهٗ ؕ قَالَ مَنۡ يُّحۡىِ

ابومالک، [illegible]، مجاہد، عکرمہ، عروہ بن زبیر، سدی اور قتادہ نے فرمایا کہ ابی بن خلف [illegible] ایک بوسیدہ ہڈی لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور ہڈی کو ہاتھ سے مل کر ہوا میں اڑا کر کہنے لگا محمد کیا تم یقین کرتے اور کہتے ہو کہ اللہ اس کو زندہ کر دے گا؟ حضور نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تجھ کو [illegible] کے بعد سورۂ یٰسٓ کے آخر میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ ابن ابی حاتم نے بوساطت سعید بن جبیر از ابن عباسؓ یہ واقعہ [illegible] ممکن ہے کہ اس واقعہ کے وقت ابی بن خلف اور عاص بن وائل دونوں ساتھ ہوں اور دونوں نے حضور والا سے قول مذکور کیا ہو۔ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ بہر حال واقعۂ نزول کچھ ہو۔ آیت کا مفہوم ہر منکر حشر کے لئے عام ہے۔ سطحی نظر رکھنے والوں کے دماغوں میں ہمیشہ یہ وسوسہ گزرتا ہے کہ حشر جسمانی کس طرح ہو گا؟ جسم کے ذرات منتشر ہو جانے کے بعد کیسے جمع کئے جا سکیں گے۔ بوسیدہ فرسودہ ہڈیوں میں از سر نو جان کیونکر پڑے گی اور کس طرح معدوم محض موجود ہو جائے گا، مگر ایسا وسوسہ رکھنے والے انسان اتنی بدیہی بات کو بھی نہیں دیکھتے کہ ایک قطرہ سے اللہ نے ان کو بنایا۔ یہ لمبا چوڑا جسم ایک

نطفہ سے کیسے بن گیا ۔ آخر نطفہ کے ایک قطرہ میں اتنا طول و عرض کیسے پیدا ہو گیا ۔ اس میں غذائی اجزاء بھی ایک ایک کر کے بڑھتے ہیں اور قطرہ آب اپنے تمام مددگار ذرات سے مل کر ایک انسانی جسم بن جاتا ہے ۔ رہا یہ سوال کہ اجزاء کے ازدیاد سے جسم بن گیا ، لیکن فرسودہ ہڈیوں میں روح حیات کیسے پڑے گی ۔ تو

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ پہلے روح زندگی کہاں سے پڑی تھی ، کس نے پھونکی تھی ؟ جس نے پہلے بے جان ہڈیوں کو جان دار بنایا وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے ۔

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۔ اب رہا یہ شبہ کہ بدن کے اجزاء منتشر ہو کر نامعلوم مقامات کو چلے گئے ۔ ذرات خاک خاک میں ، ہوائی اجزاء ہوا میں ، آبی اجزاء پانی میں اور آگ کے اجزاء آگ میں مل گئے بلکہ فرسودہ بدن کے پراگندہ اجزاء سے خدا جانے کیا کیا چیزیں بنیں ۔ کمہار نے برتن بنائے یا اینٹیں بنائی گئیں یا کھاد بن کر سبزی اور درختوں کی غذا بنی ۔ اور ان کے پھل پھول آدمیوں اور جانوروں نے کھائے اور ہزار در ہزار تغیرات ہو گئے ۔ تو ایسے ہزارہا انقلاب دیدہ اجزاء کو جمع کر کے از سر نو ترکیب نیا جسم بنانا کس طرح ممکن ہے ؟ اس کا جواب آیت میں دے دیا گیا کہ اللہ ہر مخلوق یا ہر طریقہ تخلیق سے بخوبی واقف ہے ۔ یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں نہ تخلیق کے طریقہ سے وہ ناواقف ہے نہ اجزائے تخلیقی سے نہ جسم تخلیقی سے ۔ پس وہ ذرہ ذرہ کو ہر جگہ سے جمع کر کے جسم بنا کے از سر نو زندہ کر کے کھڑا کر سکتا ہے ۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا میں نے حضور اقدس کو یہ فرماتے سنا کہ اگلے زمانے میں ایک ایمان دار آدمی تھا ۔ جو کفن چور تھا ۔ جب اُس کے مرنے کا وقت آیا اور وہ زندگی سے نا اُمید ہو گیا تو اُس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو لکڑیوں کا ایک بڑا انبار اکٹھا کر کے اس میں آگ لگا کر مجھے اس میں ڈال دینا ۔ جب میرا گوشت پوست جل کر ہڈیاں کوئلہ بن جائیں تو ان کو ہاں پیس کر آدھا خشکی میں اور آدھا سمندر میں تیز ہوا میں اُڑا دینا ۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو اہل و عیال نے وصیت پوری کی ، مگر اللہ نے سمندر کو حکم دیا تو سمندر نے اس شخص کی خاک کے ذرات جس قدر اس میں تھے سب اکٹھے کر دیئے اور خشکی کو حکم دیا تو اُس نے بھی ذرات جمع کر دیئے ۔ اس کے بعد اللہ نے اس کو ہو جانے کا حکم دیا ۔ وہ زندہ ہو گیا ۔ اللہ نے فرمایا تو نے یہ حرکت کیوں کی ؟ اُس شخص نے جواب دیا پروردگار ! تو دانا ہے ۔ میں نے یہ حرکت تیرے خوف سے کی اور میں جانتا ہوں کہ تو سب کچھ کر سکتا ہے ۔ اللہ نے اس کو بخش دیا (بخاری و مسلم)

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۔ حشر جسمانی کا ثبوت گزشتہ آیت میں ابتدائی تخلیق اوّل کو پیش کر کے دیا تھا ۔ اس آیت میں ثبوت مدعا کا دوسرا رنگ اختیار کیا ہے ۔ سبز درخت سے اللہ نے آگ پیدا کی یعنی درخت کو سبز کیا ۔ اس میں پتیاں بکثرت دار کیں ، پھول اور پھل پیدا کئے ۔ ایک وقت تک وہ سبز رہا پھر رفتہ رفتہ وہ خشک ہو گیا اور اس کا ایندھن بنایا گیا جو جلانے کے کام میں لایا جاتا ہے ۔ یہ تغیرات ، تنوعات اور بصیرت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں ۔ مقام غور ہے کہ زمین کا مزاج سرد خشک ہے ، پانی سرد تر ہے اور مٹی کے ملنے اور مخلوط قوام تیار ہونے سے درخت کی غذا فراہم ہوتی ہے ۔ درخت پرورش پاتا ، بڑھتا ، سرسبز ہوتا ، پھلتا اور پھولتا ہے ۔ پھر وہی درخت جو سرد تر قوام سے بنا تھا ۔ اتنا خشک ہوتا ہے کہ آگ پکڑ لیتا ہے نہ برودت اصلیہ مانع ہوتی ہے نہ رطوبت غذائیہ ۔ یہ اللہ کی خلاقی اور صناعی ہے کہ اس تخلیق صنعت کو دیکھتے ہوئے دوبارہ حشر جسمانی کیا محال ہے ۔ وہاں تو کچھ مانع بھی نہیں ہے ۔ صرف اجزائے پریشان کو جمع کرنا اور جسم کو زندہ کرنا ہے ۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ الشجر الاخضر سے مرخ اور عفار کے درخت مراد ہیں جو حجاز میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر آگ کی ضرورت پڑتی ہے تو ان درختوں کی دو سبز لکڑیاں لیکر آپس میں رگڑ کر چقماق کی طرح آگ نکال لی جاتی ہے ۔ میں کہتا ہوں مرخ اور عفار پر ہی منحصر نہیں ہے ۔ بلکہ ہر طرح کے سبز درخت جب ان کے اندر آپس میں رگڑتے ہیں تو ان سے آگ پیدا ہو کر جنگل کے جنگل کو جلا دیتی ہے ۔ اس صورت میں آیت کے مفہوم کی تصدیق کے لئے صرف سرزمین حجاز صحیح نہیں بلکہ ہر ملک کا بن کافی ثبوت پیش کرتا ہے ۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۔ انسان اپنی تخلیق پر غور نہیں کرتا ۔ اور اگر غور کرتا بھی ہے تو اس کے دل میں بے بنیاد شبہات پیدا ہوتے ہیں اور تخلیق اوّل و ثانی میں اس کو فرق نظر آتا ہے ۔ اسی طرح درخت مرخ و عفار یا عام درختوں سے آگ نکلتے دیکھنا بھی ہر شخص کا کام نہیں اور اگر ہر درخت کی خشک لکڑی سے آگ برآمد ہونے پر غور کرنے کی دعوت دی جائے تو نباتات کے ماہر شاید

طرح طرح کی موشگافیاں کرنے لگیں۔ یہ تمام ثبوت اگرچہ حشر جسمانی کے امکان کی کافی شہادتیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کسی قدر خفا ہے اور غور کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں ایسا بدیہی ثبوت پیش کیا ہے جس کا انکار بڑے بڑے فلاسفر اور ادنیٰ احمق دیہاتی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ آسمان و زمین تو بہر حال اللہ نے اپنی قدرت سے بنائے اس کا کسی کو انکار (دہریہ کا ذکر) نہیں۔ پس جس خدا نے آسمان و زمین پیدا کیا وہ کس طرح انسانوں ایسی ہستیاں پیدا کرنے سے عاجز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں خلاقیت کی صفت بدرجہ اکمل موجود ہے اور اس کا علم بھی کامل ہے۔ پس قدرت، صنعت اور علم کا احاطہ تخلیق ثانی کے لئے کافی ہے۔

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝ فَسُبْحَٰنَ ٱلَّذِى بِيَدِهِۦ مَلَكُوتُ كُلِّ شَىْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ کمہار مٹی کے برتن بناتا ہے۔ مختلف صناع لوہے، پیتل، تانبے، چاندی، سونے، المونیم، ربڑ یا کسی دوسری چیز سے برتن کھلونے یا زیور وغیرہ بناتے ہیں۔ مگر ان سب کا قوامی مادہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ صورت بنادینا کاریگر کا کام ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اللہ خالق ہے۔ عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ نہ پہلے مادہ تھا نہ صورت۔ خدا نے یہ کائنات پیدا کی۔ اس کا قوامی مادہ پیدا کیا۔ اس کی صورت کی۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر مرنے کے بعد بھی یہی صورت ہے کہ ذرات فنا ہو جاتے ہیں یا پریشان ہو کر کالعدم بن جاتے ہیں تو ان کا اجتماع کیسے ممکن ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے شبہات سطحی نظر رکھنے والوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر کچھ لوگ کہنے لگے کہ حشر جسمانی ناممکن ہے سزا جزا صرف روحانی ہوگی۔ روحانی اذیت والم کا نام سزا جزا ہے (حکمائے یونان) کوئی تناسخ اور آواگون کی طرف دوڑا (حکمائے ہند و اشراقیہ) کسی نے تخلیق اوّل کا ہی انکار کر دیا۔ عالم کو قدیم مانا، اللہ کی ہستی کو ہیچ جانا۔ وجود باری کو صرف نتیجۂ توہم بتایا اور عالم کو خود بخود بغیر کسی فاعل مختار اور خلاق حکمران کے خیال کیا (دیمقراطیس وغیرہ) کسی نے اللہ کو محض حکمران سمجھا، اس کے خالق ہونے سے انکار کر دیا۔ دنیوی صناعوں پر اس کو قیاس کیا۔ مادہ اور روح کو قدیم سمجھتے ہوئے دونوں میں ربط پیدا کر دینے والا اللہ کو قرار دیا اور تخلیق کے یہی معنی بیان کئے (آریہ) یہ تمام انکار باللہ اور عقائد فاسدہ صرف اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ انہوں نے تخلیق خداوندی کو تخلیق انسانی پر قیاس کیا۔ ان کا ذہن اونچا نہ جا سکتا تھا۔ وہ بلند نظر نہ رکھتے اس لئے تباہی کے غار میں گر گئے۔ غور کرو کہ دریا میں حباب اٹھتے ہیں، سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں، روشنی پیدا کرتی ہیں۔ پانی کے حباب کیا ہیں؟ لہروں کی نیرنگی کے نتائج۔ حباب کو پیدا کرنے کے لئے نہ کسی خارجی مادہ کی ضرورت ہے نہ عملی اور دستی عمل کی۔ سورج، چاند اور ستاروں سے کرنیں نکلنے کیلئے کسی قوامی مادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف آفتاب، ماہتاب اور نجوم و کواکب کی ہستی کافی ہے۔ آگ سے روشنی پیدا ہونے کے لئے کسی دوسرے مادہ کو ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ اسی طرح تمام اجسام کی تمام کیفیات ہیں۔ پھولوں کی خوشبو کا کوئی مادہ نہیں۔ رنگ کا کوئی جدا قوام نہیں۔ حرکت، زمانہ، سردی، گرمی، آواز اسی طرح کے تمام حالات درحقیقت اجسام کے خاص خاص حالات کا نام ہے۔ تمام اعراض کا مادہ کوئی جدید نہیں ہوتا۔ اجسام کے مادہ کی ہی یہ تمام نیرنگیاں ہیں۔ یہ تمام نیرنگیاں اضطراری ہیں۔ ان میں اجسام کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ پانی کے حباب کی ہستی اور نیستی پانی کے اختیار میں نہیں۔ سورج کی کرنیں، آگ کی گرمی، پھول کی خوشبو، ہوا کی حرکت وغیرہ وغیرہ غیر اختیاری ہے نہ سورج کو اپنی شعاعوں پر اختیار ہے نہ آگ کو اپنی گرمی پر اقتدار ہے نہ پھول کو اپنی خوشبو پر تسلط حاصل ہے نہ ہوا کو حرکت پر حکومت۔ حقیقت سے قریب پہنچنے کے لئے بطور تمثیل بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کائنات میں اجسام جوہریہ کے علاوہ تمام نیرنگیاں جدید مادہ کے وجود سے مستغنی ہیں۔ ان کا اپنا کوئی مادہ نہیں۔ لیکن کیا اس کائنات کا وجود اصل سے حقیقی ہے، مستقل ہے، واجب ہے، غیر محتاج ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھ رکھا ہے ان کو طرح طرح کے تاریک شبہات نے گھیر رکھا ہے، مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ سارا سنسار اپنی ہستی نہیں رکھتا۔ اس کا وجود مستقل نہیں۔ یہ ایک اور ہستی کا تابع ہے اور حقیقت میں اسی ہستی کا نام وجود ہے۔ وہ ہستی (ایک ہی) ہے۔ یہ تمام کائنات اس کی ذات کی لہریں، کرنیں اور پرتو ہیں۔ اور جس طرح کوئی جسم بغیر خاص احوال اور کیفیات اور نیرنگیوں کے نظر نہیں آ سکتا ہے اگرچہ واقع میں موجود ہے۔ اسی طرح وہ یگانہ ہستی ہزار باطنی اور نوری پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور اس کا ظہور اس کا ئناتی شکل و کیفیت میں ہوتا ہے۔ ہاں پانی کا مادی جسم ہے۔ اس کے مادہ میں غیر اختیاری لہریں اٹھ کر حباب کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ سورج بھی مادی جسم ہے۔ اس کی کرنیں بھی بے اختیار اس سے نکلتی ہیں۔ آگ اور پھول اور تمام مادی اجسام بھی اسی طرح مادہ رکھتے ہیں اور ان کی خاص خاص کیفیات بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ مگر واجب الوجود ہستی کی لہریں، شعاعیں اور خوشبو مادی اجسام کی لہروں اور شعاعوں اور خوشبو کی طرح نہیں۔ اس کے ذات میں ارادی کی لہر اٹھتی ہے، مادہ کی نہیں۔ اس کی ذات سے اختیاری شعاع نکلتی ہے اضطراری نہیں۔ پس اس کے ارادہ کا ذات میں نمودار ہونا ہی وجود کائنات ہے۔ اس کی ذات جب کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتی ہے وہ چیز نمودار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ

اُس کا ارادہ ایک ذاتی لہر ہے، ایک ذاتی شعاع ہے - اس لہر اور شعاع کا نام ہی سنسار ہے - پس فرق اختیار اور اضطرار کا ہے - اس کی ارادی شعاعیں اُس کے قبضہ و اختیار میں ہیں، اُس کی لہریں اُس کے زیرِ حکم ہیں اور مادی شعاعیں اور لہریں مادی اجسام کے اختیار میں نہیں۔ پھر جس طرح شعاعیں سورج سے نکلتی ہیں اور سورج ہی کی طرف لوٹ جاتی ہیں جس کو لوگ دھوپ کا چھپ جانا کہتے ہیں جس طرح پانی سے لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی ہی میں لوٹ جاتی ہیں۔ جس کو آدمی حبابوں کا لوٹ جانا کہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے ارادہ ذات کی لہریں ذات سے اُٹھتی ہیں جس کو لوگ کائنات اور سنسار کہتے ہیں۔ اور لوٹ کر وہیں مل جاتی ہیں جہاں سے نمودار ہوتی ہیں اس کو لوگ کائنات کی موت کہتے ہیں۔ پس تخلیقِ الٰہی صرف اس کا ارادۂ ذاتی ہے۔ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے وہ چیز ہو جاتی ہے - ہر چیز کی حکومت اور اختیار اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور ہر چیز اُسی کی طرف لوٹ کر چلی جاتی ہے۔

مقصود بیان اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ سے اس امر کی تعلیم دینی مقصود ہے کہ قدرتِ الٰہیہ کے مطالعہ کرنے کے لئے انسان کو اپنی حالت اور تخلیقی کیفیت پر غور کرنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ تخلیقِ ثانی تخلیقِ اول سے مشکل نہیں ہے جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا سے قدرت کی اعجوبہ کاری دکھانی مقصود ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ سے تخلیق خداوندی کی صحیح کیفیت معلوم ہوتی ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ کائنات صرف ارادہ الٰہیہ کے پیدا ہونے کا نام ہے - جب ارادہ خداوندی ہو گیا، کائنات ہو گئی - پہلے سے مادے کی ضرورت ہے نہ اجزائے اولیہ کی - اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام عالم کا وجود اصلی نہیں ظلی ہے - وجود عالم میں ایک ہی ہے - اُسی وجود کی ارادی لہروں کا نام کائنات ہے وغیرہ -

سُوْرَةُ وَالصّٰٓفّٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً خَمْسُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ صافات مکہ میں نازل ہوئی اس میں ۸۲ آیتیں اور پانچ رکوع ہیں

ابن عباس نے فرمایا سورۃ الصافات مکی ہے۔ قرطبی نے اس کے مکی ہونے پر اتفاق علماء نقل کیا ہے - اس سورت میں ۱۸۲ آیات ہیں - ۸۶۰ کلمات اور ۳۸۲۶ حروف ہیں

حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو نماز (امامت) میں تخفیف کا حکم دیتے تھے (یعنی زیادہ طویل قرأت سے امام کو منع فرماتے تھے اور خود امامت کے وقت سورۂ الصافات پڑھتے تھے (رواہ النسائی) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ نسائی اس روایت میں متفرد ہیں، مگر بیہقی نے بھی اسی کو روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا جس شخص نے جمعہ کے روز سورۂ یٰسٓ اور والصافات پڑھ کر اللہ سے مراد مانگی اللہ اس کو عطا فرماتا ہے۔ (رواہ ابی ابی داؤد وابن النجار)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ④

ترجمہ: ان جماعتوں کی جو (عبادت خدا میں) صف بستہ رہتی ہیں پھر قسم ہے ان جماعتوں کی جو (اللہ کے حکم سے) حرب ڈانٹتی ہیں پھر قسم ہے ان جماعتوں کی جو قرآن کی تلاوت

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ⑤ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ

کرتی ہیں یقیناً تمہارا معبود ایک ہے وہ آسمانوں کا اور زمین کا اور ان کی درمیانی کا مالک ہے اور مشرقوں کا رب ہے، ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی آرائش سے

الْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ

سجایا اور ہر شیطان سرکش سے حفاظت کے لیے بھی (اس) کو بنایا کہ وہ عالم بالا کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے

يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ اِلَّا مَنْ خَطِفَ

ہر طرف سے بھگانے کے لیے ان پر مار پڑتی ہے اور اُن کے لئے دائمی عذاب ہے ہاں جو شیطان ایک کر شی

الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ

بھاگے تو اُس کے پیچھے دہکتا ہوا انگارا لگ جاتا ہے (سلئے محمد) ان سے پوچھو تو کیا ان کی پیدائش زیادہ دشوار ہے

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۪ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا

یا اُن کی جن کو ہم نے پیدا کیا ہم نے ان کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا بات یہ ہے کہ تم (انکی حالت پر) تعجب کرتے ہو اور وہ مذاق اُڑاتے ہیں اور جب انھیں

يَذْكُرُوْنَ ۪ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

سمجھایا جاتا ہے تو مانتے نہیں اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ہنسی اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس یہ تو کھلا جادو ہے

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۙ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ نَعَمْ

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا پھر بھی ہم کو زندہ کر کے اُٹھایا جائیگا یا ہمارے اگلے باپ دادا کو زندہ کیا جائیگا تم کہہ دو ہاں

وَّاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۚ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ

اور تم ذلیل بھی ہو گے بس وہ تو ایک سخت نعرہ ہوگا اور وہ یکدم (زندہ ہو کر) دیکھنے لگیں گے اور کہیں گے ہائے ہماری خرابی یہ تو

الدِّيْنِ ۝ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۧ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ

روز جزا ہے یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھوٹا کہتے تھے ظالموں کو اور ان کے ہمراہیوں کو اور اُن کو جن کی

ع ۲۱ / ۵

اَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ وَقِفُوْهُمْ

یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے جمع کرو اور دوزخ کے راستے پر لے جاؤ اور اُن کو

اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۙ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ۝ وَاَقْبَلَ

الربع

کھڑا رکھو ان سے پوچھ گچھ ہوگی تمہارا کیا حال ہے کہ (اب) ایکدوسرے کی مدد نہیں کرتے وہ سب اُس دن گردن جھکائے ہوئے ہوں گے اور ایک دوسرے

بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ○ قَالُوْا

کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے کہیں گے کہ تم ہمارے پاس دائیں طرف سے آتے تھے (یعنی ہمارے سردار تھے) وہ کہیں گے

بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا

نہیں بلکہ تم خود ہی بے ایمان تھے ہمارا تم پر کچھ زور نہ تھا بات یہ ہے کہ تم خود ہی سرکش لوگ

طٰغِيْنَ ○ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ○ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ○

تھے بلاشبہ ہم پر ہمارے رب کا وعدہ صادق آ گیا کہ یقیناً ہم سب کو مزہ چکھنا ہے ہم نے تم کو گمراہ کیا واقعی ہم ہی گمراہ تھے

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ○ اِنَّهُمْ

اس روز وہ سب عذاب میں شریک ہوں گے ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں ان کی

كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا

حالت تو یہ تھی کہ جب ان سے لا الٰہ الا اللہ کہا جاتا تھا تو سرکشی کرتے تھے اور کہتے تھے کیا ہم ایک دیوانہ شاعر کی وجہ سے اپنے

لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ○ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ

معبودوں کو چھوڑ دیں گے نہیں بلکہ (نبی) دین حق لائے ہیں اور انھوں نے پیغمبروں کی تصدیق کی ہے تم ضرور دردناک عذاب کا مزہ

الْاَلِيْمِ ○ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ○

چکھو گے اور اسی کی سزا پاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ہاں جو اللہ کے منتخب بندے ہیں۔

تفسیر

اہل عقل کہتے ہیں کہ کائنات سفلی وعلوی میں باہم ارتباط ہے۔ زمین پر جو کچھ ہوتا ہے وہ آسمان اور موجودات آسمان کی تاثیر سے ہوتا ہے سمندروں کا مدوجزر، سبزہ کی روئیدگی، بالیدگی، درختوں کا نمو، دلنشو، پھلوں کی پیداوار، تر سوتری اور پختگی، کھیتوں کی سرسبزی، شادابی اور خشکی، غلہ کی پیدائش، افزائش اور تیاری، جانوروں کی نسل کشی، افزودنی اور بقائے زندگی یہاں تک کہ ان کے تھنوں میں دودھ کا ابھرنا یا سوکھ جانا اور انسانوں کے تمام جسمانی تغیرات، ستاروں کے طلوع و غروب، ہبوط و عروج اور رفتار و طریق رفتار سے وابستہ ہیں اگر اتنا ہی عقیدہ ہوتا اور بجائے خود دلائل طبعیہ سے اس کو ثابت کر دیا جاتا تو اس کو طبعی انکشافات اور علمی تحقیق کہا جاتا، مگر اہل علم کی تنقیحات سے دشواری یہ پیدا ہوئی کہ علمائے طبعیات کا ایک گروہ دہریہ ہو گیا۔ اس نے ان تمام تغیرات کو طبعی ذاتی اور قدیمی تغیرات سمجھ لیا۔ علویات کو خود مختار فاعل اور کارساز مطلق قرار دیا۔ اور سفلیات کو فرماں پذیر خادم۔ یہ فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کی زنجیر ان کے نزدیک نہ آغاز رکھتی ہے نہ انجام نہ کسی کے دست قدرت کی محتاج ہے نہ خالق موجد اور اور بیرونی فاعل مختار کی ضرورت مند۔ جو کچھ ہے کائنات ارضی کا مادہ اور صورت ہے اور اجرام علویہ کی گردش اور ان کی تاثیر۔ عوام ہمیشہ خواص کے پیرو ہوتے ہیں۔ جب دہریہ گروہ اپنے علمی انکشاف کے بل بوتے پر گمراہ ہو گیا تو جاہل ہمارے کس شمار وقطار میں ہیں۔ انھوں نے سیارات اور ستاروں کو فاعل مختار اور مؤثر حقیقی کہنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اجرام سماویہ کی پرستش کی جانے

تھی۔ اور ان کو حاجت روا سمجھ کر مرادیں مانگی جانے لگیں۔ اس سارے گروہ کی نظر مادہ کی پستی سے اوپر نہ اٹھی۔ اندرونی غیبی قوتیں اس کو دکھائی نہ دیں۔ اور تار کی حرکت انہوں نے بذاتِ خود خیال کر لیا۔ محرک تک اُن کے دماغ کی رسائی نہ ہوئی۔ بجلی کے قمقمے روشن دیکھ کر انہوں نے اثبات و نفی کے تاروں کو خلاقِ برق جان لیا یا یہ سمجھا کہ پاور ہاؤس اور بجلی گھر کہاں ہے اور کہاں سے روشنی تقسیم ہو رہی ہے۔ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔ کچھ ذکی الفہم ذرا اونچی نظر رکھنے والے تھے اُن کے ذہن کی جولانی فقط مادی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اور آگے بڑھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ہر ذرہ میں ایک پوشیدہ طاقت ہے۔ طاقت کے بغیر کوئی فعل پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ طاقت مادی نہیں ہے۔ مادہ کی آلائش سے پاک ہے۔ ریگستان کے ذرے، سمندر کے قطرے، درختوں کے پتے، رگیں اور ریشے گھاس کے تنکے، ہوا اور مٹی کے چھوٹے سے چھوٹے حصے، ستاروں اور سیاروں کی کرنیں غرض سارے سنسار میں مختلف طاقتیں حکمراں ہیں۔ وہ اگرچہ آنکھوں سے نہیں دکھتیں۔ کانوں سے نہیں سنائی دیتیں۔ ہاتھوں سے نہیں ٹٹولی جاتیں۔ ناک سے نہیں سونگھی جاتیں، زبان سے نہیں چکھی جاتیں۔ غرض کسی حس سے ان کو دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کی کارفرمائی ہے ضرور۔ ان کے آثار آنکھوں سے دکھائی دیتے، کانوں سے سنے جاتے اور تمام حواس سے دریافت کئے جاتے ہیں۔ ساری کائنات میں ہر وقت ایک حرکت دکھائی دیتی ہے۔ تاثیر، تاثر اور بناؤ بگاڑ کا سلسلہ جاری ہے اور یہ تمام تغیرات، تلونات، تصورات اور حادثات غیبی طاقتوں کی کارفرمائیاں ہیں اور اعجوبہ کاریاں ہیں۔ اس حد تک تو اس ذکی الفہم کا علمی انکشاف صحیح تھا۔ مگر آگے بڑھ کر یہ گروہ بھی ہلاکت و ضلالت کے اسی غار میں گر پڑا جس میں اول گروہ گرا تھا۔ اس نے اجرام علویہ کو خود مختار کارساز سمجھ لیا تھا۔ اس دقیق الفطانۃ گروہ نے غیبی روحانی طاقتوں کو مستقل فرماں اور خود مختار حکمراں قرار دیا۔ چیونٹی نے قلم سے گرتی ہوئی روشنائی کاغذ پر دیکھ کر روشنائی کو لکھنے والا سمجھا یا قلم کو دونوں کی غلطی ایک ہی ہے۔ کسی نے شروع ہی غلطی کی کسی نے ذرا اوپر پہنچ کر۔ یہ خیال نہ کیا کہ قلم کی حرکت تو ہاتھ کی حرکت کے تابع ہے۔ محرک تو ہاتھ ہے قلم نہیں، لکھنے والا تو کاتب ہے روشنائی نہیں یہی حال ان دونوں گروہوں کا ہے۔ اسلام کی نظر ان دونوں سے اونچی ہے وہ کہتا ہے کہ ان بلند خلاؤں میں ستارے اور سیارے ہیں اور ضرور ہیں۔ اُن کی طبعی اثر انگیزیاں کچھ بھی ہوں، مگر وہ خود مختار نہیں۔ ان کا طلوع اور شروق خود بخود نہیں۔ وہ کسی مخفی ذات کے غیبی حکم کے تابع ہیں۔ خلاق علی الاطلاق نے جو منافع ان کے مقرر کئے ہیں وہی فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ سرمو فرق نہیں ہو سکتا۔ ان سے بالاتر غیبی روحانی طاقتیں ہیں۔ ذرہ ذرہ پر وہ چھائی ہوئی ہیں پتہ پتہ پر ان کا تسلط ہے اور قطرہ قطرہ میں ان کا دخل ہے، مگر خود اختیار ان کو بھی حاصل نہیں وہ بھی خدمت گذار ہیں ان کی فرماں روائی احکم الحاکمین کے تابع ہے بے شک ان کی جماعتیں اپنی اپنی خدمات کو سرانجام دینے کے لئے ہر وقت کمربستہ اور صف بند رہتی ہیں۔ اور حسب الحکم انتظام عالم میں سرگرم رہتی ہیں اور امر الٰہی کو یاد رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے تابع اور پیچھے بھی ہے، مگر باایں ہمہ وہ کارساز مطلق متصرف حقیقی اور خود مختار نہیں۔ وہ ملائکہ ہیں۔ نظم عالم کا ملاک یعنی مدار ان پر ہے، مگر حقیقت میں وہ قاصد اور پیامبر ہیں۔ خالق کا حکم مخلوق تک پہنچانے والے پیک ہیں۔ خلاق برحق، ربّ مطلق اور الٰہ کل تو ایک ہی ہے جو کچھ اس جہان میں ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے پس مظاہر قدرت یا آلات کی پرستش بے جا ہے۔ اصل مظہر اور رب کی عبادت ہی مناسب ہے۔ دوسروں کی مدد پر بھروسہ کرنے والے گمراہ ہیں۔ جزا سزا کے دن کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا نہ کرے گا بلکہ اپنی برأت کا اظہار کرے گا۔ اُس وقت حسرت و پشیمانی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ جہنم ہوگا اور مجرموں کے گروہ۔ جو شخص صحیح عقیدہ کی تعلیم دیتا ہے وہ شاعر مجنون نہیں بلکہ بہت صحیح شعور رکھنے والا اللہ کا پیامبر ہے۔ اُس کی بات دیوانہ کی بڑ نہیں۔ اس نے جو کچھ پیش کیا وہ حق ہے۔ وہ تمام پیغمبروں کو سچا بتاتا ہے۔ کیا کوئی دیوانہ ایسا کر سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، مسروق، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، سدی، ربیع بن انس اور اکثر علماء صحابہ و تابعین سے مروی ہے کہ اس آیت میں ملائکہ کی جماعتیں مراد ہیں جن کے تین اوصاف بیان کئے گئے ہیں :-

(۱) کامل طور پر صف بندیاں کرنے والیاں یا مقام عظمت میں عبادتِ الٰہی کے لئے فرشتے صف بندی کرتے ہیں یعنی جو ان کی اگلی یا درمیانی یا پچھلی صفیں مقرر ہیں (جن کا علم اللہ ہی کو ہے) ان میں سے کسی صف میں رخنہ باقی نہیں رہتا۔ حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگ ویسی صفیں نہیں باندھتے جیسی حضورِ الٰہی میں ملائکہ صف بندی کرتے ہیں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا حضور! رب الٰہی میں ملائکہ کیسے صف بندی کرتے ہیں؟ ارشاد فرمایا اگلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور صف ملی ہوئی بغیر رخنہ کے رکھتے ہیں (رواہ مسلم والوداؤد والنسائی)

(۲) جو زجر کرنے والیاں یعنی فرشتوں کی جماعتیں بادلوں کو زجر کرتی ہیں (یعنی ہنکاتی)۔ سدی کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے بادلوں کو زجر کرتے ہیں تو بادل
چلتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تمام عالم طبعیات کی حکومت غیبی روحانی قوتوں کے ہاتھ میں ہے جن کو ملائکہ کہتے ہیں ظاہر میں مادہ اور مادیات دکھائی
دیتے ہیں مگر ان میں قوت فاعلہ نہیں ہے۔ یہ محکوم ہیں حکمران طاقت اندرونی ہے۔ یعنی ان کو حرکت اور کام دیتی ہے۔ ربیع بن انس اور زید بن اسلم
نے کہا جن چیزوں سے قرآن میں اللہ نے زجر کیا ہے ان سے ہی فرشتے بھی زجر کرتے ہیں۔ بعض اہل علم کے نزدیک فرشتوں کی وہ جماعتیں ہیں جو احکام الٰہی
کی مخالفت سے زجر کرتی ہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ صافات وہ ملائکہ ہیں جو مقام عبودیت میں اپنے اپنے مرتبہ پر صف بستہ ہیں جن پر انوار ربوبیت
کی بارش ہوتی ہے اور جو حکم الٰہی کے منتظر رہتے ہیں اور زاجرات وہ ملائکہ ہیں جو اجرام علوی و سفلی کے انتظام پر مامور ہیں۔ یا وہ مراد ہیں جو
آدمیوں کو نیک الہام کرتے ہیں اور معصیت سے زجر کرتے ہیں یا آتشی جنات اور خاکی انسانوں میں جو پردہ قدرت ہے اور شیاطین اس پردہ کو
پھاڑنا چاہتے ہیں تو فرشتے شیطانوں کو زجر کرتے ہیں۔

(۳) ذکر کو تلاوت کرنے والیاں۔ سدی نے کہا وہ فرشتے جو اللہ کی طرف سے کتاب آدمیوں کو پہنچاتے ہیں۔ بیضاوی نے بھی یہی
مطلب بیان کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ تلاوت قرآن کا حق اللہ نے ... یہی وجہ ہے کہ سیر کرنے والے فرشتے جس جگہ حلقہ تلاوت پاتے
ہیں اس کو گھیر کر خاموشی سے سنتے اور ... یہ مضمون احادیث صحیحہ میں آیا ہے اور مجمع البحار میں بھی مذکور ہے
اس جگہ ذکر کی تلاوت کرنے والوں سے قرآن پڑھنے والے ... قرآن پہنچانے والے فرشتے مراد ہوں گے۔

بیضاوی نے ان آیات کی تشریح میں لطیف اشارات کئے ہیں جن کو اگر تفصیل سے کہا جائے تو ... لکھا ہے کہ صافات سے مراد نفوس علمائے
عاملین اور زاجرات سے مراد وہ علماء حق جو اپنے مواعظ اور دلائل سے لوگوں کو کفر و بدکاری سے زجر کرتے ہیں اور تالیات سے مراد تلاوت آیات کرنے
والے علماء مراد ہوں تو بعید نہیں اور ممکن ہے کہ مجاہدین کی طرف اشارہ ہو جو جہاد میں صف بستہ ہوتے ہیں۔ گھوڑوں کو زجر کر کے دشمنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور
میدان جنگ میں تلاوت آیات کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ تمام عظیم الشان روحانی جماعتوں کی قسم یا تبلیغ کتاب اللہ کرنے
والوں یا عالم روشنی کرنے اعلاء کلمۃ اللہ کرنے والوں کی قسم کھانے کے بعد ایک انتہائی عظیم الشان مضمون بیان فرمایا جس کا اعلان اصل مقصود ہے کتب
سماویہ کے نزول، ورود انبیاء، مقدسین کی بعثت کی حقیقی اولین اور آخرین غرض یہی یعنی توحید الوہیت و ربوبیت۔ توحید ربوبیت توحید الوہیت کی دلیل
ہے۔ شرک فی الذات کا قائل تو شاید دنیا میں کوئی مذہبی انسان نہیں ہے۔ جو عام طور پر افراد و اقوام میں شرک پایا جاتا ہے وہ صفاتی شرک ہے۔ صفتی
شرک دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ غیر اللہ کو کسی چیز کا پروردگار، خالق قرار دیا جائے۔ دوسرا شرک یہ کہ غیر اللہ کو کسی چیز کا رازق، اعانت پر قادر
حقیقی دکھ سکھ کا مالک اور نفع نقصان پہنچانے کا مختار قرار دیا جائے۔ اول الذکر شرک میں بعض قومیں مبتلا ہیں اور موخر الذکر شرک کے قائل کثیر گروہ اور افراد
ہیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے بھی بہت سے آدمی اسی جاہلانہ عقیدہ میں مبتلا ہیں۔ اولیاء و انبیاء اور بزرگان ملت کو کارساز، دو جہاں دکھ سکھ پر
قادر جانتے ہیں اور نفع نقصان کا مختار مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ کو کارخانۂ قدرت کا مختار عام خیال کرتے اور سیدنا و مولانا محی الدین جیلانی
کو غوث اعظم اور بعض بزرگوں کو قطب عالم سمجھتے ہیں۔ چونکہ شرک فی الذات کا قائل شاید دنیا میں کوئی بھی نہ ہو اس لئے قرآن نے جہاں جہاں
شرک کی ممانعت اور توحید کا اثبات کیا وہ شرک فی الصفات اور توحید صفتی ہے۔ صفتی توحید کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول توحید الٰہ یعنی ایک معبود
کا عقیدہ رکھنا۔ دوسرے توحید رب یعنی ایجاد، لوازم ایجاد اور ضروریات بقاء کا مالک ایک خدا کو جاننا۔ اسی مضمون کو آیت مذکورہ میں بیان
کیا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ آسمان و زمین یعنی ساری کائنات کا رب ہے۔ لیکن بعض نادان ... دعویٰ کرتے
ہیں کہ چونکہ سورج چاند اور بعض دوسرے ستارے اپنی حرارت، روشنی اور ... سے اس عنصری عالم کو پرورش کر رہے ہیں، سبزہ، کھیتی، درخت
حیوان اور انسان بلکہ معدنی چیزیں بھی اپنی مختلف کیفیات کے ظہور اور نشو و نما میں ستاروں کی محتاج ہیں بلکہ بے بصیرت دانشمندوں نے تو ستاروں
کی نحوست ثابت کی ہیں اس لئے آیت کے آخر حصہ میں وَرَبُّ الْمَشَارِقِ فرمایا یعنی ستاروں کے طلوع کے مقامات کا مالک مختار بھی خدا ہے۔ مطلب

یہ کہ ستاروں میں طلوع یا غروب کوئی اثر نہیں رکھتا نہ ان کی کوئی حقیقی تاثیر ہے ۔ ان سب کا بلکہ ان کے طلوع کے مقامات کا مالک، حکمراں اور متصرف بھی تو اللہ ہی ہے ۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ۔ اوپر کی آیت میں رب السموات والارض وما بینہما ورب المشارق فرمایا تھا، گویا کائنات کی ایجاد اور انتظام کو اجمالاً بیان کیا تھا ۔ اس جگہ سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ کائنات کی تصویر کشی فرمائی ہے ۔ دانشمند اور بے وقوف، تیز نظر اور کم نظر، عورت، مرد اور بچہ اور ہر بینا شخص اگر اس کی آنکھوں میں کچھ نور ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے اوپر اس بلندی پر جو کہ ارض سے بہت دور ہے، چمکتے ستارے ہر رات کو کھلے ہیں ۔ عرف میں ان کو آسمان کے تارے کہا جاتا ہے، لیکن سما لغت میں بلندی کو کہتے ہیں اور عرفی آسمان بھی بلند ہے، اس لئے وہ آسمان مراد لیا جائے جس کو قدیم نجومی اور پرانے ہیئت داں فلکِ قمر کہتے تھے اور اگر اس کو غلط ثابت کر دیا جائے تو مطلقاً بلندی مراد لی جائے ۔ بہر حال آیت میں کوئی تعیین نہیں ۔ صرف اتنی صراحت ہے کہ قریب ترین سما کو ہم نے ستاروں سے سجایا ہے ۔ ستاروں سے بالائی فضا پر جو زینت ہوتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے ۔ اگر کسی گنبد کے اندر چھت پر ان گنت بجلی کی قندیلیں نصب کر دی جائیں اور سب کو روشن کر دیا جائے تو وہ سجاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی جو ستاروں سے بلند فضا میں ہوتی ہے ۔ اگر چمن کی روش روش گل بداماں ہو یا قصرِ شاہی سنہری اور روپہلی چینی کاریوں سے رشکِ قمر ہو، یا کوئی حسین ترین دوشیزہ جواہرِ ثمینہ اور لباسِ حریری سے آراستہ ہو کر مجسمۂ عریاں ہو تب بھی ان سب کا حسن و جمال اور زیب و زینت ستاروں کی سجاوٹ کو نہیں پہنچتا ۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ ستاروں کا مذکورۂ بالا فائدہ صرف ظاہر بین اور سطحی نظر رکھنے والوں کے سمجھنے کے لئے پیش کیا گیا ۔ جو سطح سے آگے بڑھ کر جو لوگ کسی قدر گہری نظر رکھتے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے ان آیات میں دوسرا فائدہ بیان فرمایا ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اس مادی عالم یعنی ناسوتی کائنات کے اوپر ایک اور عالم ہے جس کو عالمِ اشباح یا عالمِ مثال یا عالمِ ارواح کہا جاتا ہے اور عالمِ مثال سے اوپر کچھ نفوسِ قدسیہ مجردہ اور ہیں جن کو عالمِ ملکوت کہتے ہیں اور ان سب سے اوپر عالمِ لاہوت ہے ۔ عالمِ لاہوت سے نظمِ عالمِ ناسوت کے متعلق کوئی حکم نازل ہوتا ہے تو سب سے پہلے عالمِ ملکوت میں آتا ہے اور پھر وہاں سے تدریجاً عالمِ ناسوت تک پہنچتا ہے اور اس کے مطابق ملکوتی دنیا کے رہنے والے عمل کرتے اور عالمِ ناسوت کا انتظام کرتے ہیں ۔ چنانچہ عالمِ لاہوت سے جب کوئی حکم فرشتوں کو ملتا ہے تو اوپر والے فرشتے نیچے والوں کو اور وہ مزید زیریں گروہ کو مطلع کرتے ہیں اور اس طرح ان میں چرچا ہو جاتا ہے یا پیامِ الٰہی کے نزول کے وقت ایک طرح کی غشی طاری ہو جاتی ہے اور جب ہوش آجاتا ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتا ہے کیا حکم ہوا؟ وہ حکم کی تفصیل بتاتا ہے ۔

اسی ناسوت میں ایک نوع ایسی بھی ہے جس کے افراد ہیں تو جسمانی مگر ان کو دخان آمیز نورانیت بھی دی گئی ہے ۔ ان کی تخلیق بھڑکتی ہوئی آگ سے کی گئی ہے ۔ گویا ان کے دو رخ ہیں، ایک رخ مادی اور جسمانی اور دوسرا رخ ناری یا نورانی ۔ اول پہلو کی رعایت سے ان کا اختلاط بعض ہم مشرب انسانوں سے ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہم خیال آدمیوں کے دوست بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے دلوں میں کوئی بات ڈال دیتے ہیں اور دوسرے پہلو کی رعایت سے ان کا تعلق عالمِ بالا یا عالمِ ملکوت سے بھی کسی قدر ہوتا ہے ۔ ان کی مادیت کا پہلو اگرچہ عالمِ ملکوت تک پہنچنے سے ان کو روکتا ہے لیکن ان کی اعلیٰ نورانیت اپنی مادیت کی روشنی عالمِ ملکوت تک پہنچنے میں ان کی مدد کرتی ہے اور چھپ چھپا کر عالمِ ملکوت کے قریب پہنچ کر عالمِ ناسوت کے آئندہ نظام کے متعلق کوئی نہ کوئی بات وہ سن پاتے ہیں اور چونکہ ان کی باطنی قوت دخان آمیز نورانیت میں کمی بیشی ہوتی ہے اس لئے کچھ زیادہ نورانیت والے عالمِ ملکوت کے قریب پہنچتے اور ان سے کم نورانیت والے ان کے نیچے ہوتے ہیں اور اسی طرح انحطاط کرتے کرتے سب سے ادنیٰ طبقہ کے افراد عالمِ ناسوت کے انسانی دوستوں تک پہنچ کر اپنے اعلیٰ گروہ سے سنی سنائی باتیں انسانوں کو پہنچا دیتے ہیں اور وہ آدمی جنات سے سنی ہوئی باتوں میں مزید خود ساختہ جھوٹ ملا کر اپنے حلقہ والوں سے بیان کرتے ہیں اور چونکہ ان کے اقوال میں بعض باتیں سچ بھی ہوتی ہیں، اس لئے عام آدمی ان کے معتقد ہو جاتے ہیں ۔ اور اس طرح شیطانی جال میں آدمی پھنس جاتے ہیں ۔

اللہ نے عالم ملکوت کے راز کو محفوظ رکھنے کے تقاضا سے اعلیٰ میں نورانی تاروں کو بنایا ہے۔ کواکب کی ذاتی روشنی شیطانوں کی فطری تاریکی کی ضد ہے عالم ملکوت تک پہنچنے کے لیے کواکب کی دنیا سے گزرنا پڑتی ہے اور یہ ناممکن ہے۔ ان کی فطری تاریکی ستاروں کی روشنی پر غالب نہیں آسکتی اور نہ مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان جنوں کی اصل نورانیت ہے مگر ان کی نورانیت دخان آمیز ہے۔ خالص نور نہیں ہے۔ بس اول تو کواکب کی دنیا میں ان کی رسائی ہی نہیں ہوتی اور نظم عالم ناسوت کے متعلق کوئی حکم فرشتوں سے سن نہیں سکتے۔ ہر طرف سے نور اور ہر جانب سے جھنکار رہتی ہے۔ لیکن اگر چھپ چھپا کر زیادہ نورانیت والا جن تاسمانیت حن فرشتوں سے سن پاتے ہیں جو کواکب کی دنیا میں ہیں ان سے نیچے رہتے ہیں تو شہاب ثاقب یعنی نوٹنے والے انگارے ان پر پیچھے سے پڑتے اور وہ جل جاتے ہیں۔ اب اگر اپنے ساخت کو سنا چکنے کے ان پر انگارہ پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ جل جاتے ہیں۔ پہلے وہ حکم زیریں شیطانوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے اور اگر سنانے اور پہنچانے سے پہلے شہاب ثاقب سے جل گئے تو راز محفوظ رہتا ہے۔ الحاصل عالم ناسوت کے متعلق احکام کو چھپانے اور قبل از وقت ظاہر ہونے سے روکنے اور عالم بالا تک شیطانوں کی رسائی بند کرنے کیلئے اللہ نے ستاروں کو بنایا اور اس پر بھی اگر شیطان کسی بات کو اڑا لاتا ہے تو اس پر شعلہ ثاقب پڑتا ہے۔ مادہ پرست ذہنیت رکھنے والوں کو یہ باتیں خیالی دنیا کی سیر سے زیادہ با وقعت نہ معلوم ہوں گی کیونکہ ان کی نظریں اسی ناسوتی دنیا کی ناقص سیر میں بند ہیں۔ روز نظم کائنات کردہ ایک نامعلوم مجہول المعنی لفظ یعنی نیچر کے منافی سمجھتے ہیں۔ بے شک مظاہر فطرت اور قانون تمام کائنات کو ہمہ گیر ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کا باطن کیا ہے۔ مادہ تو محسوس ہے۔ مادیات بھی محسوس ہیں۔ مگر کیا مادی طاقت کبھی آنکھوں سے دکھتی یا کانوں سے سنائی دیتی یا کسی طرح محسوس کی جاسکتی ہے یا نہیں اور وہ طاقت کیا ہے۔ ظاہر ہے یا باطن۔ مادی ہے یا غیر مادی۔ اگر مادی ہے تو مادی طاقت کیلئے مزید مادی طاقت کی ضرورت ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہوگا اور غیر مادی ہے تو اس کا تعلق اصل کس عالم سے ہے۔ یہاں پہنچ کر مادہ پرست اہل نظر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر قرآن صرف مادی کائنات کی نہیں بلکہ کل عالم کی اجمالی تصویر کشی کرتا ہے۔ اگرچہ فلسفہ کی کتاب نہیں مگر کہیں کہیں پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ غور کرنے کے بعد بہت سی علمی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور بند دماغ اس روحانی دنیا کی سیر کرنے لگتا ہے۔ پس شیطانوں کا پیام الٰہی سننے کی کوشش کرنا اور ستاروں کی وجہ سے عالم ملکوت تک نہ پہنچ سکنا اور جیسے چوری کسی بات کو لے کر اڑ جانا اور شہاب ثاقب کا ان پر گرنا۔ غرض اس محسوس دنیا کے اوپر غیر محسوس دنیا کا منظم طور پر موجود ہونا ایسی حقائق ہیں جن کو محض محسوس پرست نہیں سمجھ سکتے۔ مگر قرآن نے ان حقائق پر بطور اشارہ اور کہیں اجمالی صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ واللہ اعلم

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ۔ گزشتہ آیت میں ستاروں کے فوائد کسی قدر بیان کئے گئے تھے۔ شیطانوں کا ملاء اعلیٰ تک نہ پہنچ سکنا بھی ظاہر کیا تھا اور آسمان و زمین کی ناقابل انکار تخلیق کی صراحت کی گئی تھی۔ اب حشر جسمانی کا ثبوت برہان خالقیت سے فرماتا ہے کہ جو چیزیں ہم نے بنائیں یعنی آسمان، زمین، ملاء اعلیٰ اور شیاطین وغیرہ کیا ان کی تخلیق زیادہ دشوار اور زیادہ مضبوط ہے یا آدمیوں کی تخلیق۔ آدمی تو چپچپی مٹی اور لیس دار کیچڑ سے بنے ہیں۔ یعنی ان کی تخلیق کا غالب عنصر لیس دار مٹی ہے اور ستاروں یا ملائکہ یا کواکب یا جنات کی تخلیق اور قوام تخلیق میں مٹی کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے۔ بلکہ ان کا قوام خالص نورانی یا نور آمیز ہے۔ تو ظاہر ہے کہ انسانی ساخت اتنی دشوار اور مضبوط نہیں جتنی دوسری علوی کائنات کی ہے۔ پس جس خدا نے ایسی مضبوط کائنات کو بنایا وہ کمزور سے کمزور انسان کو دوبارہ کس طرح بنانے سے عاجز ہو سکتا ہے۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ۔ تخلیق ثانی کا امکان اتنا بدیہی تھا کہ اس سے انکار کرنا ہر عقلمند کے لئے تعجب انگیز تھا۔ اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے انکار پر تعجب ہوتا تھا۔ مگر وہ لوگ حقیقت واقعیہ کو ہنسی میں اڑا دیتے تھے اور دلائل کی روشنی میں ان کو سمجھایا جاتا تھا تو سمجھتے نہ تھے۔ اسی لئے فرمایا بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ الخ یعنی محکم اور عظیم ترین کائنات کی تخلیق پر یقین کر لینا ضرورت ہوا اور اس کا انکار نہ کرنا اور کمزور تخلیق سے خدا کا عاجز ہونا اور اس سے انکار کرنا تعجب خیز بات ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب ہوتا تھا مگر کافروں کے دماغوں میں سمجھ بوجھ نہیں۔ بیشتر اس بات کو سمجھتے ہی نہیں بلکہ حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنسی میں اڑا دیتے ہیں

وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۔ ان سے باز پرس کی جائے گی ۔ ان کو روک لو یعنی جہنم کے راستے پر جمع کر کے ٹھہرائے رکھو تاکہ ان سے باز پرس کی جائے ۔

ابن عباس اور ضحاک نے فرمایا ٹھہرائے رکھنے سے مراد ہے حساب کے لئے روک کے رکھنا ۔ چونکہ کافروں کے ساتھ فاسق مسلمان بھی ہوں گے ، اس لئے ابن عباس نے حساب کے لئے روکے رکھنے کا حکم فرمایا ۔ دوسرا مشہور قول علماء کا یہ ہے کہ کافروں سے جزوی اعمال کا حساب نہ ہوگا ۔

حضرت انس سے مروی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کسی کو کسی چیز کی طرف بلائے گا وہ اسی کی طرف ہوگا نہ اُس سے الگ ہوگا نہ کم ہوگا ۔ خواہ کسی شخص نے ایک ہی شخص کو بلایا ہو ۔ اس کے بعد حضور نے آیت وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ تلاوت فرمائی (ترمذی وابن جریر)

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۔ سوال کیا جائے گا تم کو کیا ہوگیا ۔ باہم مدد کیوں نہیں کرتے ۔ کافروں کی طرف سے سب کچھ جواب نہ ہوگا ۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ۔ تو اللہ کی طرف سے خود ہی ارشاد ہوگا ۔ یہ لوگ آج گردن جھکائے ہوئے فرماں بردار بنے ہوئے ہیں ۔ یعنی ان کو شیطانی رعونت و تکبر اور اطاعت غیر اللہ کا خیال زائل ہوگیا ۔ اب کچھ نہیں بن پڑتا ۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۔ قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ۔ جب جہنم میں پہنچنے کا یقین ہو جائے گا اور مفر کی کوئی صورت نہ ہوگی تو آپس میں ملامت کریں گے ۔ کافروں کے سردار شیطانوں سے کہیں گے اور عام کافر اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ تم اپنی طاقت سے ہم پر غالب آجاتے تھے ۔ بعض علماء معانی نے بیان کیا ہے کہ یمین سے مراد قسم ہے ۔ یعنی تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ کفر و شرک کا یہ طریقہ حق ہے اس وجہ سے ہم تمہارے فریب میں آجاتے تھے ۔ واحدی نے کہا اہل تفسیر نے کہا کہ آیت میں یمین کے یہ معنی نہیں بلکہ دائیں جانب ترجمہ کیا ہے اور داہنی جانب سے مراد بطور کنایہ ملکیت ہے ۔ قدرت ، غلبہ اور قوت ہے ۔ عربی محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ یہ اس کی ملک یمین ہے یعنی اس کا غلام ہے ۔

(بروایت ابن کثیر) ابن عباس سے منقول ہے کہ کافر اپنے سرداروں سے کہیں گے تم اپنی قوت سے ہم پر جبر کرتے تھے تم قوت والے تھے اور ہم کمزور تھے ۔ یا یمین سے بطور کنایہ حق مراد ہے ۔ چنانچہ مجاہد سے مروی ہے کہ کافر اپنے پیشواؤں سے کہیں گے کہ تم ہمارے اور حق کے درمیان آڑ بن کر آتے تھے ۔ یا یمین سے مراد بھلائی اور خیر ہے ۔ عرب ہر بھلائی کو یمین کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ چنانچہ حسن بصری سے مروی ہے کہ کفار اپنے سرداروں سے کہیں گے تم ہمارے اور ہر خیر کے درمیان آڑ بن کر آتے تھے یا یمین سے مراد بھلائی اور خیر ہے ۔ عرب ہر بھلائی کو یمین کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ چنانچہ حسن بصری سے مروی ہے کہ کفار اپنے سرداروں سے کہیں گے تم ہمارے اور خیر کے درمیان آڑ بن کر ہم کو بھلائی سے روکتے تھے ۔ ابن زید نے کہا یمین سے مراد ایمان اور اعمال صالحہ ہیں ۔ یعنی تم ہمارے اور ایمان و اعمال صالحہ کے درمیان حائل ہو کر ہم کو منع کرتے تھے ۔ حسن بصری اور ابن زید کے قول میں بہت معمولی فرق ہے ۔ عکرمہ نے فرمایا یمین سے مراد ہے امن ۔ یعنی کافر اپنے سرداروں سے کہیں گے ہم تمہاری طرف سے امن میں رہ کر دھوکہ کھاتے تھے ۔ واللہ اعلم

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۔ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَاۤ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ۔ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ۔ مذکورہ بالا جواب کافروں کے سرداروں کی طرف سے کافروں کو ملے گا ۔ حاصل یہ ہے کہ کافروں کے پیشوا کہیں گے ۔ در حقیقت تم خود ہی ایمان لانے والے نہ تھے ، ہم نے تم پر کچھ زبردستی نہ کی تھی نہ اس کی ہم کو طاقت تھی ۔ (تم خود ہی سرکش تھے اور دیدہ و دانستہ ہم نے تم کو گمراہ نہیں کیا تھا ہاں ہم خود ہی گمراہ تھے ۔ لہٰذا ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا ۔ اسی طرح ہمارے رب کی بات پوری ہوگئی کہ ہم سب عذاب کا مزہ چکھیں گے ۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا کے دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ اول یہ کہ دنیا میں اللہ نے اپنے پیغمبر کی معرفت یہ کہلوا دیا تھا کہ جو شخص ایمان نہ لائے گا قیامت کے دن اس پر عذاب ہوگا ۔ گمراہ ہونے والے اور گمراہ کرنے والے دونوں جہنم میں جائیں گے ۔ چنانچہ یہ بات آج پوری ہوگئی ۔ اب ہم سب کو عذاب کا مزہ چکھنا ہے ۔

دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے ازل میں یہ بات کہہ دی تھی کہ تم ہرگز ایمان نہ لاؤ گے اور جہنم میں جاؤ گے اور تم کو بھی بہکاؤ گے ۔

اور جہنم میں لے جائیں گے ۔ وہ بات آج پوری ہو گئی ۔ ہمارا اصل عیب کچھ تھا وہ یہی ازلی فیصلہ ۔ کہ اہل تم خود مومن نہ تھے ، سرکش تھے ، راہ ہدایت پر نہ تھے ، گمراہ تھے ۔ ہم بھی گمراہ تھے ۔ تیڑھا راستہ بتانے والے تھے

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ یہ آخری فیصلہ ہے اور آخر میں ایک ہیبت ناک وعید اور قانون الٰہی کی بھی صراحت ہے ۔ اوپر کی آیت میں گمراہ ہونے والوں کے مکالمہ کا بیان تھا اس جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ سب عذاب میں شریک ہوں گے یعنی کفر و ضلالت کا عذاب دونوں گروہوں پر ہوگا اگرچہ عذاب کے درجات میں فرق ہوگا اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی معاملہ کریں گے ۔ خواہ گمراہ ہوں یا گمراہ کرنے والے عذاب سے کوئی بچ نہیں سکتا کیونکہ ان کا جرم چند در چند ہے ۔ اول تو یہ کہ

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ جب ان سے لا الٰہ الا اللہ کہا جاتا تھا تو وہ تکبر کرتے تھے یعنی صرف منکر ہی نہ تھے بلکہ توحید الوہیت سے چڑ ھتے تھے اور اپنے مسلک شرک کو صحیح سمجھتے ہوئے صدائے حق کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے تھے اور کہتے تھے ۔

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۝ کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک دیوانہ شاعر کی وجہ سے چھوڑ دیں ۔ مجنون کے دو معنی ہو سکتے ہیں اول بالکل مخبوط الحواس ۔ رسول پاک کو کافر مخبوط الحواس کہتے تھے مجنون کا دوسرا معنی جن رسیدہ بھی ہے ۔ عرب کا عموماً خیال تھا کہ شاعروں کو جنات الہام کرتے ہیں اور با لقاء جن وہ اچھے اچھے شعر کہتے ہیں ۔ جیسے امرء القیس وغیرہ شعراء کے متعلق اس قسم کے خیالات کی صاحب کتاب الاغانی نے صراحت کی ہے ۔ جب عربوں نے حضور کو شاعر کہا تو عرب میں دوسرے شاعر بھی تھے ، مگر کوئی بھی قرآن کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا ۔ اس لئے ایک امتیازی وصف بھی بیان کر دیا کہ یہ معمولی شاعر نہیں بلکہ جنات ان کو الہام کرتے ہیں ۔ خدا تعالیٰ اس بیہودہ خیال کی تردید فرماتا ہے کہ یہ رسول شاعر مجنون نہیں ۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ بلکہ یہ پیام برحق لایا ہے اور تمام پیغمبروں کی اس نے تصدیق کی ہے یعنی مصلح اعظم ہے ۔ اس کا کلام شاعروں کی بڑ نہیں بلکہ پیام برحق ہے ۔ شاعروں کے کلام میں جھوٹ ، ترنگ ، مبالغہ ، بیہودگی ، بے جا مدح ، خلاف واقعہ ذم ، محبت کا نوحہ ، بے واقعات ، تفاخر ، بزم و رزم کی تصویر کشی اور اس قسم کی دوسری خرافات ہوتی ہے ۔ معاشرت ، اخلاق ، سیاست اور مذہب کی اصلاح کے حال اور لغو و لغویت سے پاک ہیں ۔ طرز بیان سحر آفرین اور پاک ۔ اور عبادت کی بندش معجزہ آفرین ہے ۔ پس قرآن سراسر حق ہے پیام اعلیٰ ہے ۔ اس کا نزول برحق ہے ۔ اس کے علاوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام اگلے پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں ۔ یعنی ان کا پیام کوئی نیا نہیں ۔ ان کی تعلیم اجنبی نہیں ۔ (پچھلے پیغمبر جن کے برحق ہونے کو دنیا کے کثیر آدمی مانتے ہیں) یہی تعلیم دے چکے ہیں ۔ ہر شاعر کو اپنی جودت خیال اور نئے مضمون کی بندش پر فخر ہوتا ہے ۔ مگر یہ شاعر کیسا ہے جو اسی مضمون کی تعلیم دیتا ہے جس کی تعلیم گزشتہ انبیاء دیتے چلے آئے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شاعر نہیں بلکہ رسول برحق ہے

إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ۝ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ اوپر کی آیات میں بزبان ملائکہ کافروں پر بروز قیامت عتاب کرنے اور ان کے عذاب میں مبتلا ہونے کا بیان تھا ۔ اس آیت میں تمام آدمیوں کو کافر ہوں یا مومن ، نیک ہوں یا بد خطاب ہے اور صاف صراحت ہے کہ تم سب کو اپنے کئے کی ضرور جزا ملے گی یعنی زیادتی نہ ہوگی کسی کی حق تلفی نہ ہوگی ۔ اور سب کو سخت عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا ہاں ۔ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ اللہ کے خاص بندے اس سے مستثنیٰ ہیں جو ہر طرح کی ناگواری سے بچے رہیں گے ۔ یوں تو کافر و مومن سب ہی اللہ کے بندے ہیں ، مگر خصوصیت کے ساتھ اللہ کے بندے وہ ہیں جو اللہ کے اوامر و نواہی پر ہر طرح کی نافرمانی سے بچتے ہیں جو اللہ کے علاوہ کسی کے عابد نہیں ۔ اللہ کے سوا نہ کسی کو رب مانتے ہیں نہ معبود ۔ عباد اللہ میں اضافت خصوصیت مضاف کو ظاہر کر رہی ہے ۔

وَالصَّافَّاتِ صَفًّا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عظیم الشان روحانی قوتیں یا اللہ کے اوامر و نواہی کی تبلیغ کرنے والے یا میدان جہاد میں سرفروشی کرنے والے اللہ کو بہت زیادہ محبوب ہیں کہ ان کی قسم کھاتا ہے ۔ ۳۶ اعلیٰ مقصود بیان

کی طرف بھی اشارہ ہے کہ روحانی قوتیں یعنی ملائکہ بھی مقدم صلاحیت میں سرافگندہ ہیں اور اپنی مفوضہ خدمت پر سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ اہل نظر نے یہ بھی کہا ہے کہ مقام محبت میں مبدء ازل کی طرف رخ کرکے صف بستہ ہونا اور منزل انس میں آ کے مرکز کی طرف لوٹ کر جانے کے لئے صف بستہ ہونا سب ہی صف بندی کے اقسام ہیں۔ ان سب کی طرف لفظ والصافات سے اشارہ ہو سکتا ہے۔ گویا قلوب اہل محبت، عقول اہل معرفت اور ارواح اہل توحید سب ہی صف بستہ ہیں۔ اس صف بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الہامات صادقہ نازل ہو کر اہل حق کے دلوں کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے روکتے ہیں اور زجر کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں قلوب حاضرہ فہم قرآن میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ سے توحید الوہیت اور رَبُّ السَّمٰوٰتِ الخ سے توحید ربوبیت کی وضاحت کی ہے۔ اہل شرک کے معبود جن کو وہ اپنا کارساز جانتے ہیں یا مادہ ارضی کی پیداوار ہیں جیسے اصنام، درخت، پانی اور مختلف قسم کے حیوانات۔ یا مادہ سماوی کی پیداوار ہیں جیسے چاند، سورج، ستارے یا آسمان زمین کے درمیان فضائی مخلوق ہیں جیسے ملائکہ، ارواح اور غیبی قوتیں۔ پس اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان سب کا رب اللہ ہے۔ کوئی مختار کارساز نہیں۔ اس سے ہر قسم کے مشرکانہ عقیدہ کا ازالہ ہو گیا اور غیر اللہ کی ربوبیت کی نفی ہو گئی۔ پس غلطی پر ہیں وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز و قاضی الحاجات، کارخانۂ قدرت کا مختار عام اور کل کائنات کا متصرف جانتے ہیں۔ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا میں دنیوی یا کرہ باحیت مراد ہے جو زمین پر رہنے والے انسانوں سے قریب ہے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہو کسی کی تخصیص نہیں۔ بِزِيْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ الخ سے کواکب کے دو فائدے بیان کرنے مقصود ہیں۔ ظاہری، محسوس اور مرئی فائدہ تو زینت ہی ہے اور دوسرا غیر محسوس، غیر مبصر اور باطنی فائدہ شیاطین کو عروج سے روکنا اور اسرار نظم کائنات پر قبل از وقوع مطلع ہونے سے باز داشت کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کو انتظام عالم کے احکام ملتے ہیں اور شیطان پہلے سماں کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اللہ نے ان کو روکنے کا انتظام موجودہ مادی اسباب کے تحت کر دیا ہے کیونکہ انہیں مادی اسباب میں باطنی غیبی قوتیں کارفرما ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ستارہ ٹوٹ کر گرنا اہل طبیعیات کے نزدیک خواہ کوئی حقیقت رکھتا ہو اور وہ کچھ ہی علتیں اس کی قائم کریں۔ شہاب ثاقب کو اجزائے دخانیہ کے اشتعال کے مظاہر قرار دیں یا اجزائے بخاریہ کی تیزی کے نتائج۔ بہرحال ان کی اندرونی اغراض اور پوشیدہ فوائد ان کی تخلیق کیفیت کے علاوہ اور ہیں جو طبیعیاتی علماء کی بیان کردہ حقیقت سے بالکل الگ ہیں اور سطحی عناصر کے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی ہے۔ آیت بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ میں کافروں کی ہنسی کرنے کا جس لہجہ میں تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ اور کلام ربانیہ کو سن کر مذاق اڑانا اور ہنسی میں ٹالنا کفر ہے۔ يَسْتَسْخِرُوْنَ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزات دیکھ کر کافروں کو کسی قدر یقین تو آ جاتا تھا سچائی تو ظاہر ہو جاتی تھی، مگر ان کے دل قبول نہیں کرتے تھے اس لئے ہنسی بنا کر جھٹلا دیتے اور اڑا دیتے تھے۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں سحر کا عقیدہ موجود تھا اور قرآن کی آیات کے مقابلے میں وہ بے بس ہو گئے اور معجزات اور آیات بینات کا انکار ان کو بن نہ پڑتا تھا۔ اس لئے جادو کہتے تھے۔ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا وقوع یک دم ہو جائے گا۔ تمام مردے یک دم زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ترتیب وار ایک کے بعد دوسرا اس کے بعد تیسرا زندہ نہ ہوگا، لیکن ہو سکتا ہے کہ زندہ ہونے میں کچھ غیر معمولی فرق ہو۔ چند منٹ کا تقدم تاخر ہو۔ مگر زمانی ترتیب نہ ہوگی۔ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو کسی خاص مقام مثلاً دوزخ کے راستے پر سب کو اکٹھا جمع کرنا دوسری بات یہ ہے کہ کافروں کے ہم مشرب یعنی شیاطین یا کافرانہ اعمال رکھنے والے مسلمان بھی کافروں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے۔ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ سے ثابت ہوتا ہے کہ دوزخ میں پہنچانے سے پہلے کسی قدر بازپرس کے لئے کافروں کو کسی مقام پر روکا جائے گا اور بازپرس کی جا سکے گی۔ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ میں لفظ مَا سے واضح ہوتا ہے کہ کافروں کے غیر ذی عقل معبودوں کو بھی ایک ریلے میں ان کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا۔ یعنی ملائکہ، ارواح، انبیاء، عزیر، مسیح اور تمام ذی عقل معبود جن کو کافروں نے معبود بنا رکھا تھا اور خود انہوں نے اپنے معبود بنائے جانے کا حکم نہیں دیا تھا کافروں کے ساتھ جمع نہیں کئے جائیں گے۔ بے جان معبودوں کو جمع کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس جگہ صرف اصنام مراد ہوں۔ کیونکہ حضور والا کے زمانے میں بت پرستی کا ہی عام رواج تھا انہی کو شرک کا اکھاڑا تھا اور انہیں کی تردید میں ان آیات کا نزول ہوا ہے۔ اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے ہر مشرک کو آیت کا حکم شامل ہے کسی کی تخصیص نہیں۔ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ میں استفہام اپنے حقیقی معنی پر محمول

مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ لِمِثْلِ

نہیں مرنے کے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا۔ یہ بیشک بڑی کامیابی ہے ایسی ہی کامیابی کے لئے

هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○ اَذٰلِكَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ○ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ○

عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔ بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کیلئے موجب امتحان بنایا ہے

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ﴿۶﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ○ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ

وہ ایک درخت ہے جو دوزخ سے نکلے گا۔ اس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے پھن تو وہ لوگ اس سے کھلادیں گے

مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ ﴿ج﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ

اور اس سے پیٹ بھریں گے۔ پھر ان کو کھولتا ہوا پانی (پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا۔ پھر آخر ٹھکانا اُن کا

لَاِلَى الْجَحِیْمِ ○ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ ﴿۶﴾ فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ یُهْرَعُوْنَ ○ وَلَقَدْ ضَلَّ

دوزخ ہے (کیونکہ) انھوں نے اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا پھر یہ بھی انہی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے اور ان سے

قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۶﴾ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ ○ اِلَّا

پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر ہو چکے ہیں اور ہم نے بھی ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تھے سو دیکھ لو ان لوگوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا جنکو ڈرایا گیا تھا

عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۶﴾

ہاں مگر خدا کے خاص کئے ہوئے بندے تھے

تفسیر عموماً آدمی بہت سادہ لوح اور بیوقوف ہوئے ہیں چونکہ سوچنے پرکھنے اور حق کو باطل سے ممتاز کرنے کی طاقت سے کام لینے والے بہت کم ہیں، اس لئے عام آدمی دوسرے حیوانی دماغوں سے کچھ ہی بلند دماغ رکھتے ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ جب اللہ نے پیغامبر اور حق کے داعی عوام کو پیامِ حق سناتے اور دعوتِ حق دیتے ہیں تو ان کی تعلیم میں کم فہم آدمی طرح طرح کے شبہات کرتا ہے۔ سچائی کے علمبردار اللہ کی الوہیت و ربوبیت کو ظاہر کرتے اور اس کی توحید کو ثابت کرتے ہیں مبدء و معاد کے متعلق سچی تعلیم دیتے ہیں۔ دوبارہ زندگی اور اس میں جزا اور یقینی الوقوع کہتے ہیں تو بیوقوف آدمی کبھی توحید کی تعلیم کو ساقط کی نظروں سے دیکھتا ہے اور گوناگوں کج بحثیاں کرتا ہے۔ کبھی دوبارہ زندہ ہونے کو محال بتاتا ہے، لیکن جب اس بیوقوف آدمی کو بیہودہ رسوم اور لغو طریق زندگی سے روکا جاتا ہے اور اس کے اعمال زندگی پر محققانہ نکتہ چینی کیجاتی ہے تو اسوقت اسکی (بزعم خود) تحقیق طلب عقل اور موشگافی کرنے والی سمجھ افسردہ بلکہ مردہ ہو جاتی ہے سابقہ انانیت کا دعویٰ مٹ جاتا ہے اور ہر خود غلطی پیدا کرنے والا جذبہ معدوم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عقیدے اور عمل کی سچائی عقل کی روشنی میں نہیں بلکہ کورانہ تقلید کی تاریکی میں ثابت کرتا ہے وہ کہتے ہیں ہمارے آباؤ اجداد کے یہی عقائد تھے اور یہی دستورِ زندگی تھا ہم نے اُن کو اسی طرح پایا۔ کیا وہ غلطی پر تھے۔ گویا اس نادان کے نزدیک اس کے آباؤ اجداد انسان نہ تھے فرشتے تھے یا فرشتے تھے یا آدمی تھے تو معصوم تھے۔ غلطی کے ارتکاب سے پاک تھے۔ اس قسم کی تقلید سخت ترین جاہلانہ بلکہ کورانہ تقلید ہے اور ہم کئی جگہ اسی تفسیر میں لکھ

آتے ہیں کہ علم حق اور حکمت صادقہ کے حصول سے جہاں چار موانع اور ہیں وہاں اسلاف کی کورانہ تقلید اور ایسی پیروی جس سے عقل کی قربانی ہو جائے سب سے بڑا مانع ہے۔ تمام موانع علم کا ازالہ ممکن ہے۔ مگر کورانہ جذبۂ تقلید کو دور کرنا بہت دشوار ہے۔ ہر قسم کا غلط رو آدمی تعلیم کے بعد اپنی غلط روی چھوڑ سکتا ہے۔ مگر اندھے مقلد کی نابینائی کا کچھ علاج نہیں ہوتا اور گمراہ اسلاف کی غلط پیروی سے روک دینے کا ہر راستہ بند ہو جاتا ہے تو ایسے پرستارانِ باطل کا تختہ تاراج کر دیا جاتا ہے۔ عذاب سے ڈرانے کا جب کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو انجام کار ان کو غیبی حوادث سے برباد کر دیا جاتا ہے اور ان کی بربادی کو آئندہ نسلوں کے لئے موجب عبرت اندوزی بنا دیا جاتا ہے۔ رہے مخلص بندے وہ بھی اگرچہ مرتے ہیں مگر ان کی موت عذابی نہیں ہوتی۔ عذاب کی موت نہیں ہوتی بلکہ خوابِ راحت ہوتی ہے پس اول گروہ دوزخ میں اور مؤخر الذکر طبقہ جنت میں جائے گا۔

تحلیلِ اجزاء

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ فَوَاكِهُ وَهُم مُّكْرَمُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ۔ اس مادی زندگی میں رہتے ہوئے آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جو تمام عمر کے لئے مادی لوازم و ضروریات سے مستغنی رہا ہو اور صرف روحانی کیفیت کی دنیا میں اس نے زندگی بسر کی ہو۔ تارک الدنیا اولوالعزم پیغمبر اور صاف باطن حکماء سب ہی اس زندگی میں مادی کوائف و لوازم کے محتاج رہے پس انسانی مادی تصویر میں دکھ سکھ اور لذت و الم کی جو تصویر آ سکتی ہے وہ پیش نظر کوائف سے خالی نہیں ہو سکتی۔ راحت و رنج اور اذیت و مسرت کا احساس خالص روحانی طور پر بغیر اقتضائے جسمانی کی آمیزش کے ممکن نہیں اور اگر ممکن بھی ہو تو اس کی تصویر کشی ناممکن ہے پس انسان کو اگر نفرت اور خوف ہو سکتا ہے تو اس زندگی کے مختلف مظاہر خوف و عذاب سے اور رغبت ہو سکتی ہے تو اسی کے کیف و سرور اور لذت و راحت کی اس لئے قرآن میں جہاں آخرت کے عذاب و ثواب کو بیان کیا گیا ہے وہاں تمثیلی طور پر دنیوی لذت و الم کے مختلف مظاہر کا جامہ پہنا کر ثواب و عذاب کی تصویر کشی کی گئی ہے تاکہ انسانی دماغ اس کو سمجھ سکے ورنہ حقیقت میں جو کیفیت آخرت کی ہے اس کو سمجھنا تو اس دورِ حیات میں ناممکن ہے علاوہ خوش لباسی کی خواہش اور ملک گیری کی ہوس کے انسان کا جذبۂ راحت اندوزی مختلف مظاہر سرور کا خواہشمند ہوتا ہے مثلاً سیادت عزت، خوش مزہ کھانا پینا، مکان، دوستوں سے موانست وغیرہ اس جگہ مختصر طور پر انہی چیزوں کو بیان کیا ہے۔

قتادہ اور سدی نے کہا کہ رزق معلوم جنت میں ہوگا۔ یعنی حصۂ مقررہ جنت میں ملے گا۔ وہ کیا ہوگا۔ قسم قسم کے پھل ہوں گے یہ تو کھانے پینے ہوں گے۔ رہی سیادت اور عزت تو اس کے متعلق فرمایا کہ آرام و راحت کے باغوں میں اہل جنت کا اعزاز کیا جائے گا۔ یعنی خاص باغ جن کو شریعت میں جنت کہتے ہیں، رہنے کیلئے دیئے جائیں گے۔ اور فقط جنت کی سکونت ہی نہیں نصیب ہوگی بلکہ وہاں اعزاز و تعظیم کا سامان بھی ہوگا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۝ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ۝ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ۝ اہل جنت شاہی نشستوں پر ایک دوسرے کی طرف رخ کئے ہوئے ہوں گے۔ مجاہد نے مُتَقَابِلِينَ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھیں گے ابن ابی حاتم نے زید بن ابی اوفیٰ کی روایت سے اسی تفسیر کے مطابق ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے مگر وہ غریب ہے۔ پاکیزہ صاف سفید لذیذ شراب کا دور چلتا ہوگا۔ لیکن وہ شراب دنیوی شرابوں کی طرح نہ ہوگی جس سے سر میں درد، پیٹ میں مروڑ اور دماغ میں بدمستی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ جنت کی شراب میں عیوب نہ ہوں گے۔ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ابن زید کا قول ہے کہ غول سے مراد ہے پیٹ کا درد۔ ابن عباس کے دوسرے قول میں سر کا درد کہا گیا ہے ابن عباس نے یہ بھی فرمایا کہ دنیوی شراب میں نشہ، درد، سر، قے اور بدبو ہوتی ہے۔ آخرت کی شراب ان خرابیوں سے پاک ہوگی وہ خوش مزہ، خوش رنگ اور خوش سرور ہوگی وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ۝ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ۝ یہ صنفی خوش عیشی کا بیان ہے۔ بیض مکنون کا ترجمہ در مکنون کیا گیا ہے، لیکن سدی، سعید بن جبیر اور عطاء خراسانی نے کہا کہ بیض مکنون سے انڈے کی اندرونی سفیدی مراد ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِينُونَ ۝ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ قرآن کا اسلوب بیان ہے کہ جس جگہ اور طرح کے ساتھ ایک فریق کا تذکرہ کرتا ہے اسی جگہ مخالف فریق کا تذکرہ بھی اسی طرز کے ساتھ کرتا ہے اور انجام میں تفصیلی تفاوت دکھا کر رغبت و خوف

کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے حسب معمول اس جگہ بھی ایسا ہی کیا ہے اس سے اہل جہنم کے اقوال کی تصویر کشی کی تھی پیروی کرنے والوں کی اس گفتگو کو نقل کیا تھا جو وہ اپنے سرداروں سے کہیں گے اور سردار جواب دیں گے۔ اور اعانت کرنے سے مجبور ہوں گے اور اپنے گمراہ ہونے کی بھی صراحت کریں گے اور پھر ان سب کا جو انجام بد ہوگا اس ساری حالت کو تفصیل وار بیان کیا تھا تاکہ عبرت اندوز دماغ اور نصیحت آموز دل کج روی چھوڑ کر راہِ راست پر آجائیں۔ اب ان آیات میں اہل جنت کے احوال کی پوری توضیح اسی لہجہ میں کرتا ہے جسمیں اہل جہنم کے حالات کو بیان کیا تھا۔ فرمایا ہے اہل جنت باہم احوال دریافت کریں گے ایک شخص کہے گا کہ دنیا میں میرا ساتھی تھا۔ جو بعث حشر قیامت اور جزا سزا کی طرف سے مجھے دھوکہ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ خیال محال ہے جب خاک ہو گئے۔ ہڈیاں رہ گئیں تو بس مر چکے۔ دوبارہ زندگی ممکن نہیں۔ اب ذرا جھانک کر دیکھو تو کہاں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دنیوی ساتھی کو عرفات کی دیوار سے جھانک کر دیکھے گا تو اسکو وسطِ جہنم میں پالے گا۔ مجاہد نے فرمایا مرد مومن کو بہکانے والا ساتھی شیطان تھا۔ ابن عباس نے فرمایا وہ ایک مشرک تھا جو مومن کا ہمسایہ تھا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مجاہد کی مراد بھی شیطان کہنے سے یہی ہے۔ یعنی وہ آدمی شیطان تھا۔

قَالَ تَاللّٰہِ اِنْ کِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۝ وَلَوْلَا نِعْمَۃُ رَبِّیْ لَکُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ۝ مرد مومن اپنے ہمسایہ کا ذکر دوزخ میں دیکھ کر کہیگا خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے بھی ہلاکت کے غار میں گرا دیتا۔ اللہ نے مجھ پر مہربانی کی کہ میں تیرے وسوسہ میں نہ آیا۔ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو آج ایسا ہی گرفتار ہوتا جیسے اور گرفتار ہیں فرات بن ثعلبہ نے اور سدی نے اس آیت کی تفسیر کے موقع پر بنی اسرائیل میں سے دو آدمیوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے ایک کافر تھا اور دوسرا مومن۔ ان دونوں آدمیوں کی مفصل گفتگو اور انجام کا خلاصہ وہی ہے جو ان آیات میں بیان کر دیا گیا ہے بعض اہل تفسیر کو اسرائیلی قصہ پڑھکر دھوکہ ہوا کہ شاید قرآن میں جس مرد مومن اور کافر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہے فرات بن ثعلبہ اور سدی نے موقعہ کی مناسبت سے ایک واقعی قصہ جو اسرائیلی دور کا تھا نقل کر دیا تھا ان بزرگوں کی یہ مراد نہیں ہے کہ قرآن میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ اسرائیلیوں کا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ۝ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ صحیح یہ ہے کہ اس کلام کا روئے سخن اس کافر کی طرف نہیں ہے حسن بصری نے فرمایا مومن کو دغدغہ ہوا کہ ہر نعمت فنا ہو جاتی ہے تو اس نے یہ الفاظ کہے۔ ابن عباس رضؓ نے فرمایا اہل جنت باہم خوشی سے کہیں گے کہ کیا ہم لوگ سوا اول موت کے مرنے والے نہیں ہیں اور اب تو ہم پر عذاب نہ ہوگا گویا ابن عباس رضؓ کے نزدیک یہ قول عام اہل جنت کا ہوگا۔ صرف اس مرد مومن کا نہ ہوگا جس کا قصہ اوپر آیات میں بیان کیا گیا ہے اور کلام مذکور میں استفہام تقریری ہے۔ لیکن حسن بصری کا مقصد یہ ہے کہ مذکور کلام مرد مومن کا ہے اور استفہام اپنے اصلی معنیٰ پر ہے اسی لئے حسن بصری نے فرمایا کہ ملائکہ اس مرد مومن کو بشارت دینے کے لئے کہیں گے۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ ابن عباس نے اس جملہ کو بھی اہل جنت کے باہمی کلام کا جز قرار دیا ہے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ سے اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ تک مرد مومن کا کلام ہے اور اس نے سوال جواب اپنے نفس سے کئے ہیں۔

لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝ قتادہ نے اس جملہ کو بھی اہل جنت کے کلام کے جزو قرار دیا ہے۔ مگر ابن جریر نے اسکو پسند نہیں کیا بلکہ عام لوگوں کو نصیحت کرنے کے لئے اللہ کا قول قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیوی فوائد کے حصول کے لئے لوگ عمریں گنواتے ہیں اور بیش قیمت وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی نعمتیں مآل کے اعتبار سے فانی ہیں اس لئے ان کو چاہئے کہ ایسی نعمتِ لازوال کے لئے جس کی تصویر کشی کی گئی عمل کریں۔

اَذٰلِكَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰھَا فِتْنَۃً لِّلظّٰلِمِیْنَ ۝ اِنَّھَا شَجَرَۃٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ شجرۃ الزقوم کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں (۱) زقوم خاص درخت ہے جس کی شاخیں تمام دوزخ میں پھیلی ہوئی ہیں جسطرح طوبیٰ ایک خاص درخت ہے جس کا سایہ جنت کے تمام مکانوں میں ہے (۲) زقوم سے کوئی خاص درخت مراد نہیں بلکہ اس جنس کا درخت مراد ہے جو جہنم کے ہر درجہ میں علیحدہ علیحدہ ہوگا۔ جسطرح آیت وَشَجَرَۃً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ میں کوئی خاص درخت مراد نہیں بلکہ زیتون کا عام درخت مراد ہے۔ یہی معنیٰ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ دوسری آیت میں ہے لَاٰکِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ اس آیت میں زقوم کی قسم

درخت مراد ہے۔ کوئی معین درخت مراد نہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ایک بار حضورؐ تشریف فرما تھے۔ ادھر سے ابوجہل گزرا، حضورؐ نے یہ آیت پڑھی
اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ابوجہل نے منہ پھیر کر کہا۔ محمدؐ کس کو ڈراتے ہو؟ ارشاد فرمایا تجھے۔ بولا کس سے ڈراتے ہو؟ فرمایا عزیز
وکریم سے۔ بولا کیا میں عزیز وکریم نہیں ہوں۔ اس پر اللہ نے آیت اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ سے ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ
تک نازل فرمائی۔ ابوجہل کو اطلاع ملی تو دل میں ڈرا مگر دلیر بن کر خرما اور مسکہ نکال کر آیا اور کہنے لگا۔ اسکو ملا کر کھاؤ ہم تو اسی
کو زقوم کہتے ہیں جس سے محمدؐ ہم کو ڈراتے ہیں۔ اس پر آیت اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ نازل ہوئی۔ (ابن مردویہ) قتادہ نے فرمایا
زقوم آگ ہی سے پیدا ہوا۔ اور آگ ہی اس کی غذا ہے۔ جب درخت زقوم کا ذکر قرآن میں آیا تو گمراہوں نے بہکانا شروع کیا کہ
دوزخ میں درخت زقوم ہے۔ درخت کو تو آگ جلادیتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ دوزخ کے اندر زقوم کا درخت۔ اس تذکرہ سے کافروں
کی آزمائش کرنی مقصود ہے کہ کون اس کو یاد کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے درخت زقوم کو جہنم کے اندر کافروں
کی تکلیف اور عذاب کے لئے بنایا ہے۔ اول صورت میں فتنہ کے معنی آزمائش اور دوسری تقدیر پر فتنہ کا معنی تکلیف و عذاب ہوگا۔
طَلْعُهَا کَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ زجاج اور فراء نے کہا عربی زبان میں شیاطین ایک قسم کے سانپ ہوتے ہیں جن کے سر پر بال اور
پیچھے ہوتے ہیں اور بہت ہی بدصورت ہوتے ہیں۔ زقوم کے پھلوں کو ان سانپوں کے سروں سے تشبیہ دی گئی ہے عام مفسرین نے لکھا کہ
یہ جملہ محاورہ عربیہ کے طور پر کہا گیا ہے۔ شیاطین یعنی مفروضہ یا موہومہ بھوت عام طور پر بہت بدشکل ہیبت ناک اور کریہ المنظر
مشہور ہیں اسی شہرت کی بناء پر عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے شگوفہ زقوم کو بھوت کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے۔
فَاِنَّهُمْ لَاٰکِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جہنمیوں پر جب بھوک کا غلبہ ہوگا۔ اور زقوم وغیرہ
کے علاوہ کوئی غذا اُن کو نہ ملے گی۔ تو مجبور ہو کر اسی کو کھا کر پیٹ بھریں گے۔ ابن عباس سے مروی ہے حضور والاؐ نے یہ آیت تلاوت
فرما کر ارشاد فرمایا لوگو! اللہ سے ایسا خوف کرو جیسا اُس سے خوف کرنا چاہیئے۔ زقوم کا اگر ایک قطرہ (یعنی زقوم کے دودھ کا ایک قطرہ)
دنیوی سمندروں میں پڑجائے تو اہل زمین کی معیشت خراب ہوجائے۔ اس سے اُن لوگوں کی حالت کا اندازہ کرو جن کی غذا ہی یہ ہوگی
(رواہ النسائی وابن ماجہ وابن ابی حاتم والترمذی وقال حدیث حسن صحیح)
ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ عام طور پر حمیم کا ترجمہ گرم پانی کیا گیا ہے، مگر یہ غلط ہے عربی میں حمیم ضرور گرم پانی کو کہتے
ہیں، مگر یہ معنی یہاں مراد نہیں۔ ورنہ لَشَوْبًا کی جگہ لَشُرْبًا کہا جاتا ہے حمیم درحقیقت پینے ہی کی نہ ہوگی۔ بظاہر رقیق شکل میں پینے کے قابل
نظر آئے گی۔ مگر واقع میں وہ ایسی چیز ہوگی۔ جس کی معمولی آمیزش سے آنتیں کٹ کر گر پڑیں گے۔ گویا زقوم کھانے کے بعد حمیم کا مخلوط
قوام پینے کے لئے دیا جائیگا حمیم غساق (پیپ لہو وغیرہ) کے آمیختہ کا نام ہے۔ ابو امامہ باہلی کی مرفوع حدیث اور سعید بن جبیر کے قول میں
حمیم کی بہت شدید حالت بیان کی گئی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حمیم کے قوام کو منہ کے قریب لانے سے سر کی کھال گل کر گر پڑے گی اور
پینے سے آنتیں کٹ کر نکل پڑیں گی۔ — ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَی الْجَحِیْمِ یعنی زقوم کھانے اور حمیم پینے اور سخت ترین کھانے
پینے کی تکلیفیں اٹھانے کے بعد پھر حمیم کی کوٹھریوں میں لیجا کر ان کو بند کر دیا جائے گا۔
اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ فَهُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ یُهْرَعُوْنَ اس جملہ میں کافروں کے دوزخی ہونے کے اصلی سبب کا
بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کافروں نے اپنے اسلاف کو گمراہی پر پایا تب بھی ان کی محبت پر جمے رہے۔ بغیر سوچے سمجھے بلا دلیل
ان کی تقلید کرنے اور ان کے نقش قدم پر دوڑے جانے لگے۔ سدی نے آیت مذکورہ کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ آیت
اِنَّهُمْ اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ میں کافروں کے دنیوی جرم کا بیان ہو اور آیت فَهُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ یُهْرَعُوْنَ میں اُخروی نتیجہ کا یعنی
کافروں نے اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ پانے کے باوجود ان کی تقلید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن جہنم کی طرف جانے میں وہ ان
کے پیش رو ہوں گے۔ اور یہ اُن کے نقش قدم پر جہنم کی طرف دوڑے چلے جائیں گے وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

اس جملہ کو ربط اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ سے ہے کافر اپنے اسلاف کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ گمراہی کا سلسلہ آج کا نہیں ہے بلکہ گذشتہ زمانے میں بھی اکثر متقدمین گمراہ تھے (ہدایت یافتہ گروہ تعداد میں تو ہمیشہ کم رہا ہے)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ اور ان کی ہدایت کے لئے عذاب الٰہی سے ڈرانے والے پیغمبروں کو بھی بھیجا تھا یعنی جس طرح اس زمانے میں لوگ گمراہ ہیں اسی طرح گذشتہ زمانے میں بھی گمراہ تھے اور جس طور پر ان لوگوں کی اصلاح و ہدایت کیلئے پیغمبر کو بھیجا گیا اسی طرح گذشتہ اقوام کی ہدایت کیلئے بھی پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ حاصل یہ کہ ضلالت و ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ سے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے اسلاف راہ مستقیم پر ہی گامزن رہے ہوں۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۔ اب غور کرو اور عبرت کی نگاہ سے دیکھو کہ جن لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا تھا۔ ان کا کیسا انجام ہوا۔ اور کس طرح ان کو تباہ کر دیا گیا۔ ہاں اللہ کے جو خاص بندے تھے جن کو پیغمبر کے حکم کے مطابق ایمان لانے، توحید کا یقین رکھنے اور راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت ہوتی تھی ان کو عمومی عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ اس سے آگے بطور تمثیل متعدد جلیل القدر پیغمبروں کا اور ان کی سرکش اقوام کی بربادی کا اور فرماں برداروں کی نجات و سعادت کا تذکرہ فرمایا ہے تاکہ عبرت اندوز دماغ والوں کے لئے ہدایت یابی کا ذخیرہ فراہم ہو جائے اور انسان کی رغبت و خوف کی قوتیں ابھر جائیں اور سعادت و ضلالت کی راہوں میں امتیاز ہو جائے۔

مقصود بیان

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل جنت کے انعامات اور درجات مساویانہ نہ ہوں گے بلکہ ہر درجہ کے آدمی کا حصہ مقرر ہوگا۔ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صرف تن پروری اور خوش عیشی کا سامان ہی جنت میں فراہم نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے جنتیوں کا اعزاز بھی ہوگا۔ اعزاز کیسا ہوگا؟ حور و غلمان اور دوسرے خدام تعظیم و خدمت کیلئے مامور ہوں گے یا ملائکہ استقبال کریں گے یا اللہ کی طرف سے بلا توسط ملائکہ اعزازی پیام لائیں گے۔ اس جگہ اس کی کوئی تفصیل نہیں کی۔ تفصیل نہ کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ہر شخص کا اعزاز ایک طرح کا نہ ہوگا۔ تفاوت مرتبہ کے لحاظ سے اعزاز کی نوعیت اور کیفیت میں بھی تفاوت ہوگا جس کا جدا جدا تفصیلی بیان ناممکن ہے۔ لَا فِيْهَا غَوْلٌ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی شراب دنیوی شراب کی خرابیوں سے پاک ہوگی۔ درحقیقت جنت کی شراب کو عرفی شراب کہنا ہی غلط ہے وہ خمر نہ ہوگی بلکہ ایک پاک ستھرا نکھرا، خوشبودار، خوش ذائقہ شربت ہوگا۔ اسی لئے قرآن پاک شراب جنت کے لئے خمر کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ شراب (شربت) کہا گیا۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ سے صراحۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہل جنت کو جو عورتیں صنفی خوش عیشی کے لئے دی جائیں گی وہ صرف یہ دنیوی عورتیں ہی نہ ہوں گی جو نساء کہلاتی ہیں اور آدم کی اولاد میں سے ہیں۔ بلکہ لوازم تانیث سے متصف کچھ دوسری عورتیں بھی ہوں گی جو اولاد آدم سے نہ ہوں گی یعنی حوریں ہوں گی۔ اگر صرف اولاد آدم کی صنف نازک ہی مراد ہوتی تو اس کی صراحت کر دی جاتی لفظ ابہام معنی کے عموم پر دلالت کرتا ہے فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ سے ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کے اندر سے دوزخ کی کیفیت جھانک کر دیکھنی ممکن ہوگی شاید یہ صورت ہو کہ جنتوں کا محل وقوع بلند اور دوزخ کا محل وقوع پست یا کچھ اور ہو واللہ اعلم تفصیلی کیفیت سمجھنی اور سمجھانی اس مادی تصوری دنیا میں نہ کرنا ممکن ہے وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت بھی اللہ کی مہربانی پر موقوف ہے۔ اگر اس کی فیضیاب ہونا انسان کی قدرت سے خارج ہے تاوقتیکہ توفیق الٰہی نہ ہو۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ سے اس بات کی صراحت ہے کہ اخروی سعادت ہی حقیقی کامیابی اور فائز المرامی ہے یعنی دنیوی کامیابی بھی اگرچہ کامیابی کہلاتی ہے مگر آخرت کی کامیابی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ہر قسم کے نقص، عیب اور خوف و زوال سے۔ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ میں اس امر کی تصریح ہے کہ انسان کو اخروی یعنی حصول جنت کے لئے عمل کرنا چاہیے (کسی غلطی پر ہیں)، وہ لوگ جو جنت کو ہیچ سمجھتے اور جنت کی تن آسانی کو آرزو خیال کرتے ہیں۔ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے اندر درخت کا ہونا ناممکن نہیں ہے ایسے درخت ہونے ممکن ہیں جن کی ساخت غذا اور پرورش آگ سے ہی ہو۔ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ الخ سے زقوم کی ہیبت ناک شکل کا اظہار مقصود ہے اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ الضَّآلِّيْنَ الخ سے کورانہ تقلید کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے۔ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اسلاف کو راہ ہدایت پر ہی ماننا اور عقلمند ہی سمجھنا حماقت ہے۔ ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ گذشتہ زمانے میں بھی گمراہوں کی تعداد ہدایت یافتہ طبقہ سے زیادہ تھی ہے اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ

سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ اپنے خاص بندوں کو عذاب آمیز ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ مرتے وہ بھی ہیں، مگر عذاب میں مبتلا ہو کر نہیں مرتے وغیرہ۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝

اور ہم کو نوح نے پکارا سو ہم خوب فریاد سننے والے ہیں — اور ہم نے ان کو اور اُن کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے نجات دی

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور ہم نے باقی اُنہی کی اولاد کو رہنے دیا — اور ہم نے اُن کے لیے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝

والوں میں ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں — بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے — پھر ہم نے دوسرے لوگوں یعنی کافروں کو

تفسیر اس زمین پر اللہ نے خیر و شر اور صلاح و فساد مکرّر اور نیکی و بدی کا تصادم نسلِ انسانی کے پھیلنے کے وقت سے جاری کر رکھا ہے جہاں کروڑوں انسان بدی اور فساد کے علمبردار ہوں وہاں کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ، حق کا پرستار صداقت کی دعوت دینے کیلئے بھی کھڑا ہو گیا۔ ظاہری شان و شوکت، عزت حکومت، طاقت مال و دولت، عیش و راحت اور کثرت چونکہ باطل پرستوں کے ساتھ ہمیشہ سے رہی ہے۔ اس لئے وہ برخود غلطی کے نشہ میں اس قدر چور ہوتے ہیں کہ داعی حق کی فقط قلبی مخالفت ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ زبانوں اور ہاتھوں کو بھی کام میں لاتے ہیں طرح طرح سے اسکو ستاتے اور دکھ پہنچاتے ہیں اور نادان سمجھتے ہیں کہ یہ حقیر فقیر آدمی بالکل کمزور اور بے یار و مددگار ہے اللہ بھی اُنکو ڈھیل دیتا ہے۔ آزمائش کے طور پر ان کی دولت میں افزونی، طاقت میں زیادتی، اولاد میں افزائش اور تسلط میں بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس ان کی نخوت و پندار کا نشہ اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ ادھر حق کا علمبردار بیوقوفوں کی حماقت پر دل ہی دل میں کبھی ہنستا اور کبھی افسوس کرتا ہے اور نادان جانوروں کی طرح ان کی ہر خطا سے چشم پوشی کرتا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ مادی لذتوں کے پرستار کوتاہ بین ہیں ان کی نگاہ بلند نہیں۔ ان کو میرا مرتبہ معلوم نہیں۔ یہ اللہ کی طاقت سے ناواقف ہیں۔ اس لئے کافروں سے ذاتی انتقام لینے کا خیال اس کے دل میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا اور پیدا ہونا بھی کیسے ممکن ہے، جبکہ وہ اپنی ذات اور دنیاوی لذات کو حق پر قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ بلکہ قربان کرتا رہتا ہے۔ نرمی اور محبت سے سمجھاتا پھرتا رہتا ہے۔ آگ میں گرنے والے پروانوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر باہر کھینچتا ہے۔ مگر نادان پتنگے زبردستی آگ میں گرتے ہیں آخر مشیت الٰہیہ کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اپنے نیک محبوب بندہ کی زیادہ تکلیف اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ آزمائش کا دور ختم ہو جاتا ہے تو حکم دیا جاتا ہے، اس قوم کو غارت کیا جائے گا۔ آئندہ اس کے راہ راست پر آنے کی امید نہ رکھو۔ یہ سب گمراہ ہیں اور گمراہ رہیں گے۔ پیغمبر حق کیلئے یہ وقت بڑی بے چینی کا ہوتا ہے اسکے نزدیک اپنی قوم اپنے بچوں کی طرح ہوتی ہے اس کے دل میں قوم کیلئے رقت و محبت کا جذبہ ہوتا ہے پس حقیقت کے علم کے بعد وہ ناامید ہو جاتا ہے اور جذبۂ محبت داعیۂ عداوت سے بدل جاتا ہے۔ خاندانی انسیت و قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ اور وطنیت و قومیت کا جوش سب کچھ زائل ہو جاتا ہے اور وہ قوم سرکش کے خلاف بارگاہ الٰہی میں وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کئے ہوتے۔ تیر کمان سے نکل کر ٹھیک نشانہ پر لگ جاتا ہے۔ اللہ کا فرمانبردار بندہ جب اسکو پکارتا ہے تو اللہ کبھی اس کی دعوت رد نہیں کرتا۔ اپنے بندہ کی مدد کرتا ہے۔ اور قدرتِ غیبی پوشیدہ عذاب کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں ہر بلا اپنا منہ کھول کر کافروں کے سامنے آ جاتی ہے اور سارا کا سارا لقمۂ عذاب بن جاتے ہیں۔ حضرت نوح کا واقعہ بھی ایسا ہی ہوا مدت دراز تک آپ نے سمجھایا، نصیحت کا جواب پتھروں سے پایا بلکہ پہنچانے کی کوشش کی تو ادھورے دکھ پایا۔ آخر مایوس ہو کر بددعا کی سارے کافر

غرق ہو گئے۔ کوئی نہ بچا۔ کفر سے روئے زمین پاک ہو گیا۔ از سرِ نو آبادی ہوئی اور صداقت کی روشنی پھیلی۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ

تحلیل اجزاء یہاں مختلف پیغمبروں کا تذکرہ محض حق و باطل کا امتیاز دکھانے کیلئے فرمایا ہے۔ نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، موسیٰ، ہارون، الیاس، یونس، لوط اور ان سب کی اقوام کے احوال اور نتائج کا اظہار کیا ہے۔ بیان میں عموماً ترتیب زمانی لحاظ رکھا ہے مثلاً حضرت نوح سب سے پہلے تھے۔ ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ ان کے بعد حضرت اسمٰعیل وغیرہ لیکن بعض انبیاء کے تذکرہ کو مقدم و مؤخر بھی کر دیا ہے مثلاً لوطؑ کا ذکر موسیٰ ہارون اور الیاس سے مؤخر کیا ہے۔ باوجودیکہ زمانہ کے اعتبار سے لوط مقدم تھے۔ حضرت آدم کے زمانے میں تو کوئی مشرک ہی نہ تھا اس لئے ان کا اور ان کی امت کا تذکرہ اسکے مناسب نہ تھا۔ حضرت شیث اور حضرت ادریس کی قوموں میں ضرور کچھ سرکش آدمی تھے مگر ان پر عذاب کے نزول کی کوئی معتبر شہادت نہیں۔ اس لئے اُن کا تذکرہ بھی اس جگہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد حضرت نوح کا دور آتا ہے۔ آپ آدمِ ثانی کہلاتے ہیں۔ عمر بھی بہت دراز پائی تکلیفیں بھی بہت اٹھائیں۔ قوم نے بہت دکھ دیا۔ دنیا کی غرقابی بھی آپ ہی کی بددعا سے ہوئی اور بالآخر اس دنیا کی آبادی بھی اُن مومنوں کی نسل سے ہی ہوئی جو آپکے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے تھے۔ حضرت ابراہیم کی اہمیت مسلم الثبوت ہے۔ عرب کے مشرک خصوصاً قریش بھی اپنے مذہب کو مذہب ابراہیمی کہتے تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی حضرت ابراہیمؑ کو اپنا ہادی اور مورثِ اعلیٰ جانتے تھے بلکہ بعض بے وقوف آپؑ کو یہودی اور عیسائی خیال کرتے تھے۔ حضرت لوطؑ ایک خاص قسم کے گناہ سے بازداشت پر مامور کئے گئے تھے جس کا رواج آپکے دور سے پہلے نہ تھا اور حضرت اسماعیل کی مفروضہ مورت کعبہ میں اسے پہلے موجود تھی۔ اور قریش آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور تمام حجازی قبائل کا سرچشمہ ہونے کے سبب آپ کو اپنا مقتدا سمجھتے تھے۔ حضرت موسیٰ، ہارون، الیاس اور یونسؑ اسرائیلی انبیاء تھے۔ اول الذکر دونوں پیغمبروں کو ایک قہار بادشاہ کا مقابلہ کرنا پڑا تھا حضرت الیاسؑ اپنی مشہور غیوبت کیوجہ سے اور حضرت یونس علیہ السلام اپنی امت کو خصوصی توبہ کے مقبول ہونے کے سبب غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان پیغمبروں کا بہ مصلحت اس جگہ ذکر کیا گیا یوں تو ہر پیغمبر بجائے خود اہمیت اور جلالتِ قدر کا مالک ہوتا ہے۔ مگر چیدہ چیدہ احوال کے لحاظ سے مذکورہ پیغمبروں کا ذکر نازیب نہیں ہے۔

حضرت آدم کے زمانے میں تو کوئی سرکش نافرمان ہی نہ تھا۔ آپ کی وفات کے بعد بھی تمام لوگ زاہد، متقی اور صالح رہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا مشاغلِ زندگی بڑھتے گئے اور عبادتِ الٰہی میں کمی نہیں تو تساہل ضرور ہونے لگا۔ مگر بزرگانِ ملت کی برابر تاکید رہی کہ مشاغلِ فانیہ میں پھنسکر عبادتِ الٰہیہ سے غافل نہ ہو بلکہ اپنے اسلاف کی طرح زندگیاں گذارو۔ رفتہ رفتہ بزرگانِ دین کی پاک صورتیں نظروں سے غائب ہونے لگیں تو لوگوں نے ان کی عبادت، نیکوکاری اور مجاہدۂ نفس کو یاد رکھنے کے لئے اور پیروی کرنے کے لئے ان کی تصویریں مسجدوں اور عبادت خانوں کے دروازوں اور دیواروں پر بنائیں، تاکہ نیکوں کی تصویریں دیکھ کر نیکیوں کی رغبت پیدا ہو۔ پھر کچھ مدت بعد تصویروں سے مورتیں بنا لی گئیں۔ یہ کام بدعت تھا۔ مگر غرض اچھی تھی۔ گھروں میں مورتیاں صرف نیکی کی یاد اور ترغیب کے لئے رکھی جانے لگیں لیکن نادان بچے پاک لوگوں کی مورتیاں اپنے لئے کھلونا سمجھنے لگے اور مورتیوں کے ساتھ کبھی کبھی بے باکی کے ساتھ بیہودگیاں بھی کرنے لگے اس وقت شیطان کو موقع ملا جب کوئی بچہ کسی بیماری میں مبتلا ہو کر مرجاتا تو بیوقوف لوگ خیال کرتے کہ فلاں بزرگ کی مورت سے چونکہ اس نے بے ادبی کی تھی اسلئے مر گیا یہ عقیدۂ باطلہ پھیلتا گیا۔ ہوتے ہوتے نادان آدمیوں نے مورتیوں کو نفع نقصان کا مختار سمجھنا شروع کیا۔ اسطرح شرک کی بنیاد پڑی اور بعثتِ انبیاء کی ضرورت پڑی۔ آدمیوں کے دو گروہ ہو گئے۔ موحد اور مشرک، نیک اور بد اور چونکہ اہل عقل کی تعداد ہمیشہ نادانوں سے کم رہی ہے اسلئے اہل توحید کم ہوتے رہے اور مشرکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ انبیاء مبعوث ہوئے انھوں نے نصیحت کی اللہ کے احکام سنائے پہنچائے عذاب سے ڈرایا اور نجات کا راستہ دکھایا۔ مگر بیوقوفوں نے ان کی نصیحت نہ مانی۔ مخالفت و عناد کی بناپر باوللہ بکثرت شرک کے مجسمے بنا لئے اور ان کے مختلف نام بھی رکھ لئے اور وہ مسجدیں جو ایک اللہ کی عبادت کے لئے تھیں بت خانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جب کفر و شرک کا طغیان ہوا تو بالآخر ایک جلیل القدر نبی مبعوث ہوئے جن کا نام نوح تھا آپنے نو سو پچاس برس وعظ کیا۔

اس ساری طویل مدت میں قوم کے ہاتھوں سے بڑی بڑی روحانی اور جسمانی تکلیفیں اٹھائیں۔ تقریباً ہزار سالہ نصیحت کا اثر بہت ہی کم ہوا قلیل ترین تعداد نے آپ کا کہنا مانا اور کثیر گروہ دشمنی اور سرکشی پر کمر بستہ رہا جب بوحیٔ الٰہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ اب کوئی ایمان نہیں لائیگا جو ایمان لا چکا وہ لا چکا مومنوں کی تعداد میں اضافہ کی اب امید نہیں۔ تو اتنی کثیر تعداد کو جہنم میں جاتے دیکھ کر آپ کو بڑا دکھ پہنچا۔ بڑی بے چینی ہوئی، مگر کیا کرتے۔ مجبوری تھی۔ اس زمین کو کافروں سے صاف کرنا ہی ضروری معلوم ہوا تاکہ اہل ایمان کی نسل سے دوبارہ اس زمین کی آبادی ہو سکے۔ بددعا کی۔ اللہ کو پکارا عرض کیا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ تیر نشانہ پر لگا۔ دعا مقبول ہوئی۔ آخر خدا کو پکارا تھا۔ اللہ سے بڑھکر کون دعا کو قبول کرنے والا ہو سکتا ہے۔ کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی سب مومنوں کو کشتی پر سوار کر لیا۔ طوفان اٹھا، ساری بستیوں کو غرق کر دیا۔ روئے زمین پر کوئی کافر نہ بچا۔ طوفان اترا اور مومن کشتی سے نکلے۔ اس جگہ دو باتیں قابلِ تشریح ہیں

(۱) اہل سے مراد کیا ہے؟ بظاہر وہ تمام مؤمن مراد ہیں جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے۔ ان میں آپ کی اولاد بھی تھی اور غیر بھی تھے۔ البتہ آپ کا ایک بیٹا کنعان اور بیوی نہ تھی۔ گویا جو شخص آپ کے طریقہ پر چلنے والا تھا وہ تو آپ کی اہل میں داخل تھا خواہ اس سے نسبی تعلق کچھ بھی نہ تھا۔ اور جو آپ کے طریقہ پر نہ تھا۔ اگرچہ وہ آپ کا بیٹا تھا، مگر آپ کی اہل میں داخل نہ تھا۔ یہاں تک کہ بیوی بھی اہلِ بیت سے خارج تھی۔ معلوم ہوا کہ مذہبی رشتہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا رشتہ ہے اور نسبی رشتہ ہیچ ہے۔

(۲) کرب عظیم یعنی بڑی بے چینی۔ اس سے مراد عام اہل تفسیر کے نزدیک طوفان ہے۔ مگر بقول ابن کثیر یہ غلط ہے۔ طوفان سے حضرت نوح کو کوئی بے چینی نہ تھی۔ آپ کا ایمان کامل تھا۔ آپ عارف باللہ تھے۔ آپ کو اہل کشتی کی نجات کا پورا یقین اور ناقابلِ تردد اطمینان تھا۔ بلکہ کرب عظیم سے مراد یہ ہے کہ جب کافروں کی طرف سے آپ کو بالکل مایوسی ہو گئی اور وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ آئندہ کوئی ایمان نہ لائیگا تو آپ کو بڑی بے چینی ہوئی۔ نو سو پچاس برس اس امید پر دکھ اٹھاتے رہے کہ شاید کوئی مومن ہو جائے۔ کسی اذیت کی پرواہ نہ کی۔ نہ اللہ سے کسی تکلیف کی شکایت کی۔ رات دن اور صبح شام وعظ و پند میں مشغول رہے مگر جب ناامید ہو گئے اور ناامیدی الیقین کی حد تک پہنچ گئی تو اپنی کوشش رائیگاں جاتے دیکھ کر اور انسانوں کی عظیم الشان تعداد کو دوزخی جان کر بے چین ہو گئے۔ مزاج میں جلال تھا۔ اور کب تک نہ ہوتا ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے۔ نو سو پچاس برس کی مدت بہت طویل ہوتی ہے۔ غصہ میں بھر گئے، مگر پھر رافت نبوت اور عطوفت رسالت کارفرما ہوئی اور بہت زیادہ بے چین ہو گئے۔ ہاں اگر یہ مراد ہو کہ طوفان تھا ہیبت ناک اور بڑی مصیبت۔ خواہ نوح کے لئے اس سے بے چینی پیدا نہ ہوئی، مگر واقع میں وہ چیز عمومی بے چینی کی تھی تو ممکن ہے کہ کرب عظیم سے طوفان مراد لے لیا جائے۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ تفسیر سراج میں حضرت ابن عباس کا قول مذکور ہے کہ طوفان کے بعد جب حضرت نوح کی کشتی ٹھہری اور نوح اپنی اولاد اور دوسرے مومنوں سمیت کشتی میں سے اترے تو کچھ مدت کے بعد دوسرے مومن مع اپنی بیوی بچوں کے مر گئے صرف حضرت نوح کی اولاد اور ان کی نسل باقی رہی۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت میں ابن عباسؓ کا قول ہے کہ سوا ذریت نوح کے کوئی باقی نہ رہا۔ قتادہ نے فرمایا یہ سب آدمی نوح کی ذریت سے ہیں۔

سمرہ بن جندب سے مروی ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا نوح کی ذریت سام، حام اور یافث ہیں (رواہ الترمذی وابن جریر و ابن ابی حاتم) امام احمد نے بروایت سمرہ بن جندب روایت کی کہ حضورؐ نے فرمایا سام عرب کا باپ تھا۔ حام حبش کا اور یافث رومیوں کا (رواہ الترمذی) حافظ ابو عمر ابن عبد اللہ نے عمران بن حصین کی روایت سے اسی مضمون کی مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید ذریت نوح سے مراد حضرت نوح کی نسل اور وہ تمام مومن ہیں جو حضرت کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے تھے کشتی سے اتر کر دوسرے تمام مومنوں کا مرجانا کسی معتبر سے ثابت نہیں کیونکہ دوسری آیت میں صاف مذکور ہے ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ یعنی اللہ نے موجودہ لوگوں کو خطاب کر کے نوح کے ساتھیوں کی اولاد قرار دیا۔ صرف نوح یا اولادِ نوح کی نسل نہیں قرار دیا۔ سراج میں جو ابن عباسؓ کا قول مروی

ہے۔ اس کا سلسلۂ روایت مجہول ہے۔ علی بن زید بن جدعان کی روایت بھی ثابت نہیں۔ رہی سمرہ بن جندب اور عمران بن حصین کی مرفوع حدیث تو اس کی اسناد میں سعید بن بشیر ضعیف راوی ہے۔ اگرچہ ترمذی نے حسن کہا ہے، مگر سعید بن بشیر کا ضعف ناقابل انکار ہے۔ البتہ سعید بن ابی عروبہ نہیں ہے اور بالفرض اگر روایت کو قوی مان بھی لیا جائے تب بھی اتنا ثابت ہو سکتا ہے کہ مذکورہ ممالک کے باشندے حضرت نوح کی تین بیٹوں کی نسل سے تھے۔ رہے دوسرے ممالک تو ان کے متعلق کوئی صراحت نہیں کہ وہ حضرت نوح کے ساتھیوں کی نسل سے ہیں یا حضرت نوح کی اولاد کی نسل سے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت نوح کے ساتھی اپنی نسل سمیت مر گئے اور روئے زمین پر سوائے نسل نوح کے کوئی باقی نہ رہا۔ واللہ اعلم

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ حضرت نوح کا ذکر خیر اس عالم میں قیامت تک باقی رہے گا۔ کوئی قوم اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو حضرت نوح کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ نہ کرتا ہو، اسی لئے فرمایا کہ نوح پر ساری دنیا میں سلامتی رہے۔ باقی آیات کا مطلب ظاہر ہے۔ آخری آیت کو نوح کو مومنین میں شمار کیا۔ یوں تو مومن ہر قول (شامل) ہر وہ شخص ہے جس نے شرک کو چھوڑ دیا ہو۔ اعمال کیسے ہی ہوں۔ نفس ایمان میں اعمال کو دخل نہیں۔ مگر کامل الایمان وہ نیک بندے ہیں جو مضبوط قوتِ ایمانیہ رکھتے ہوں۔ جن کو کوئی جبروتی طاغوتی طاقت حق سے نہ روک سکے اور سارے زمانہ کی شیطانی قوت اگر ان کے مقابل ہو تب بھی ان کے ایمان میں تزلزل اور ضعف نہ پیدا ہو سکے۔ مزید برآں ان کی ساری زندگانی کی ہر عقل و حرکت حکمِ الٰہی کے مطابق ہو اور ان کی عملی زندگی صلاح و اصلاح پر مبنی ہو۔ حضرت نوح مومن کامل تھے اور آیت میں یہی مراد ہے۔

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ۔ اوپر کی آیت میں حضرت نوح اور آپ کے ایماندار ساتھیوں کے حال کا بیان تھا۔ اس آیت میں فریق مخالف کے غرق ہونے کی صراحت ہے۔ اہل علم میں اختلاف ہے کہ طوفانِ نوح سارے عالم میں آیا تھا یا صرف بلادِ عربیہ میں۔ مجوسی، کلدانی، ہندو اور چینی بلکہ تمام مشرق کے باشندے طوفان آنے کے ہی منکر ہیں۔ کچھ اہل فارس نے اقرار کیا ہے، مگر صرف یہ صراحت کی ہے کہ شام اور مغربی حصہ میں طوفان آیا تھا۔ عقبہ حلوان (کوفہ) سے اوپر نہیں آیا۔ یہ زمانہ طہمورث کا تھا۔ اسی بادشاہ نے اصفہان میں کچھ اونچے ٹیلوں کے اندر علوم و فنون کی کتابیں طوفان کے خوف سے دفن کرا دی تھیں۔ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ ۳۰۰ھ کے بعد اصفہان میں بعض ٹیلوں کے اندر سے درخت چھالوں کا بہت بڑا ذخیرہ نکلا تھا جن پر تحریروں کے نشانات تھے، مگر باوجود کوشش کے کسی سے کچھ نہ پڑھا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا کے اہل تاریخ طوفان کا انکار کریں یا اقرار۔ بہرحال یہ یقینی بات ہے کہ حضرت نوح کے بعد کی کوئی تاریخ روئے زمین پر موجود نہیں اور سوائے آسمانی صراحت کے اس زمانے کے واقعات کا علم ممکن نہیں۔ تدوین واقعات کا زمانہ بہت پیچھے ہے۔ اگر تاریخ قدیم کا کوئی ذخیرہ ہند، فارس اور چین میں موجود بھی ہے تو وہ بھی محض خرافات اور توہمات سے بھرا ہوا مثلاً فردوسی کا شاہنامہ جو اسلام کے وسطی دور کی لکھی ہوئی کتاب ہے، لیکن خود مصنف کے قول کے مطابق "دو صد زاں نیرزد بیک مشت خاک"۔ اب کوئی اقرار کرے یا نہ کرے، ہم قرآنی صراحت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب حضرت نوح نے اپنی دعا میں عرض کیا تھا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ تو ظاہر ہے کہ روئے زمین پر کافروں کی کوئی بستی طوفان سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بغیر کسی صراحت کے تاویل کی جائے اور الارض سے ارض شام یا عراق مراد لی جائے مگر یہ تخصیص خود ساختہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ حضرت نوح کے زمانے میں انسانوں کی آبادی ساری زمین پر پھیلی بھی نہ تھی۔ حضرت آدم کا زمانہ کچھ دور نہ تھا۔ دو ہزار سال سے کم مدت میں گنے چنے آدمیوں کی نسل کل روئے زمین پر نہیں پھیل سکتی۔ اب بھی زمین کا بہت بڑا حصہ ویران ہے۔ باوجود آباد ہونے کی صلاحیت اور زرخیزی کے آبادی سے خالی ہے۔ براعظم آسٹریلیا باوجود ہندوستان سے ڈیڑھ گونہ رقبہ رکھنے کے آبادی میں ساٹھ ستر لاکھ سے زائد نہیں۔ وہاں کا تمام کوہستان اور ترائی کی زمین ویران پڑی ہے۔ رہے ریگستان تو منچوریہ، سائبیریا، صحرائے افریقہ یا وسط ریگ زار آبادی سے گویا یکسر خالی ہیں۔ نئی دنیا میں ارجنٹائن کا رقبہ تقریباً ہندوستان کے برابر ہے، مگر آبادی بہت کم، زیادہ ویران ہے۔ اس سے اغلب ہے کہ حضرت نوح کے زمانے میں صرف قرب و جوار کی سرزمین تک آبادی محدود ہو۔ بحیرہ کیسپین اور سرحد بلوچستان سے آگے نہ بڑھی ہو۔ ایران، عراق، ایشیا، کوچک، شام، فلسطین اور زمانہ بعد میں مصر میں آبادی ہو اور طوفان سے یہی غرق ہو گئی ہو۔ مشرق بعید، مشرق متوسط یعنی ہندوستان، افغانستان اور یورپ ازلیہ

آسٹریلیا، امریکہ وغیرہ آبادی سے خالی ہوں۔ ادھر بحر اسود سے پار آبادی نہ ہو۔ پس دنیا کس طرح طوفان کا انکار کر سکتی ہے جبکہ اس کل سرزمین آدمیوں کی بستی سے ہی خالی تھی اور آثار انسانیہ میں سے کوئی نشان باقی ہی نہیں رہ سکتا تھا۔

مقصود بیان حق و باطل کے امتیاز، اہل ایمان و یقین کی برتری، نجات اور فلاح، کافروں کی تباہی اور شان و شوکت کی بربادی دکھانے کے لئے حضرت نوح کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے کافروں کو ڈرانا اور اہل ایمان کو لطافت آمیز بشارت دینی بھی مقصود ہے کہ نوح اور ان کی پارٹی اگرچہ کم تھی اور کافروں کی طاقت اور تعداد بہت تھی، مگر بالآخر اللہ نے مومنوں کو نوازا۔ طوفان سے بچایا اور کافروں کو تباہ کر کے ان کا جانشین اہل ایمان کو بنایا۔ فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ خلوص اور نیکوکاری اور کامل ایمان کے ساتھ اگر اللہ کو پکارے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ الخ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اللہ کے نزدیک اعتبار صلاحیت اور نیکوکاری کا ہے نسبی رشتہ کا نہیں۔ تمام اہل ایمان باوجود نسبی تعلق نہ رکھنے کے نوح کی ذریت میں داخل تھے۔ دوسرے یہ کہ حضرت نوح کی ذریت ہی باقی رکھی۔ کوئی کافر باقی نہ رہا۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ

اور نوح کی راہ پر چلنے والوں میں ابراہیم بھی تھے جب وہ اپنے رب کے حضور میں بے عیب دل لیکر آئے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہنے لگے تم کس کی

مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝ أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ۝ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

پرستش کرتے ہو کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ معبودوں کو چاہتے ہو تو رب العالمین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۝ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝ فَرَاغَ إِلَى آلِهَتِهِمْ

پھر ابراہیم نے ستاروں پر ایک گہری نظر ڈالی اور بولے میری طبیعت خراب ہے وہ لوگ ابراہیم کی طرف سے پشت پھیر کر چل دیئے ابراہیم ان کے بتوں کی طرف گھس

فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ۝

اور بولے تم کھاتے کیوں نہیں تمہیں کیا ہو گیا بولتے بھی نہیں پھر ان پر جھک پڑے اور داہنے ہاتھ سے توڑنے لگے (دیر کے بعد) وہ لوگ دوڑتے ہوئے ابراہیم

قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۝ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝

پاس آئے ابراہیم نے کہا کیا تم ایسی چیز کو پوجتے ہو جن کو خود تراشتے ہو حالانکہ تم کو اور ان چیزوں کو جنکو تم بناتے ہو اللہ نے پیدا کیا ہے وہ لوگ کہنے لگے ابراہیم (کو سزا دینے) کیلئے

فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ رَبِّ

ایک عمارت بناؤ پھر بڑی آگ میں اس کو ڈال دو غرض ابراہیم سے انہوں نے فریب کرنا چاہا مگر ہم نے انہی کو زیر کر دیا ابراہیم بجوشیہ میں اپنے رب کی طرف (ہجرت کر کے) جا رہا ہوں

هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي

وہ راہ دکھانے والا ہے اے میرے رب مجھے نیک فرزند عطا فرما ہم نے انکو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی جب وہ لڑکا اپنے باپ کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو ابراہیم نے کہا

أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ

بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تو سوچ لے تیری کیا رائے ہے بیٹے نے کہا ابا جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے اسے کر ڈالیے مجھے خدا نے

کمیں اصلاح دشوار سمجھ کر انہوں نے اپنی ساری زندگیاں بزرگوں اور پیشواؤں کی اندھی تقلید پر قربان کر دیں۔ اس عمومی کثرت کے برخلاف ہر زمانے میں کچھ دانشمند ایسے بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی خرابیاں دیکھیں اور سمجھ گئے کہ کوئی آدمی کسی علمی، عقلی انفرادی یا اجتماعی طاقت سے ایسا قانون نہیں بنا سکتا، جو سارے عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔ جذبات مادی کا غلبہ، نسلی اور قومی اور وطنی تعصبات کے پردے، ہمہ گیر علم کا فقدان اور عمومی رواداری، ایثار کا عدم یہ تمام چیزیں انسانی قوانین ناجائز ثابت کرتی اور ان کو ناقابل عمل قرار دیتی ہیں۔

پس انہوں نے ہر معبود کی اقتدا سے منہ موڑا۔ ہر بادشاہ، قومی پیشوا، عیار رہنما، وطنی دیوتا اور نفسانی خدا کو چھوڑا بلکہ کائنات کی ہر چیز کو بے بس، بے کس، عاجز اور محکوم جانتے ہوئے سب سے رشتہ توڑا اور فوق الکائنات کی طرف رُخ کیا اور اسی یگانہ بے ہمتا ہستی کے قوانین کو امن انسانی کا کفیل قرار دے کر جاری کیا اور ہر قسم کی مداری کو ترک کر کے صرف ایک معبود کی عبدیت کو پھیلایا۔ اس دانشمند گروہ کے افراد اور اس توحیدی زنجیر کے حلقے الگ الگ زمانے میں پیدا ہوئے، مگر مطمح نظر، طریق کار اور فکری نظریات سب کے ایک جیسے تھے۔ ایک کے بعد ایک آیا اور ہر ایک نے اپنے زمانے کی بادشاہ پرستی، قوم پرستی، نسل پرستی، وطن پرستی، اسلاف پرستی اور نفس پرستی استقلال کے پہاڑ اور عزم کے موجزن سمندر تھے۔ ان پر کسی مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے معبود کی طرف سالم دل اور ہر چیز سے بے نیاز دماغ اور بے داغ روح لے کر متوجہ ہوتے تھے، اس لئے ان کے حوصلوں کو نہ کسی خوفناک دکھ نے پست کیا نہ شرمناک لالچ نے۔ یہ تمام ہوشمند انسان ایک ہی گروہ کے تھے۔ کبھی ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ تو کبھی نہ ہوا تھا مگر ان کی عقلیں اور سوجھ بوجھ کی طاقتیں آپس میں متفق واقع ہوئی تھیں۔ مبدء معاد اور جزا سزا کے متعلق سب کا ایک ہی تصور تھا، ایک ہی وشواس تھا، ایک ہی عقیدہ تھا اور انسانی زندگی کے قوانین کے متعلق بھی ان کا ایک ہی خیال تھا کہ خدا کے بتائے ہوئے صنوابط اور آسمانی قوانین کو ہر انسان کے لئے دستور العمل بنا ضروری ہے۔ آدمی کے بنائے ہوئے قانون کو مٹا دینا ضروری ہے۔ توحید کی الوہیت کا یہی مغز تھا اور شرک کی بیخ کنی کا یہی گر تھا۔

اسی عقلمند گروہ میں سے حضرت ابراہیم بھی تھے جنہوں نے سب کو چھوڑا، اپنی قوم اور سوسائٹی سے رشتہ توڑا۔ وطن اور قرابت کی پرواہ نہ کی۔ حکومت کا خوف نہ کیا۔ کسی دکھ سے پست ہمت نہ ہوئے اور کوئی لالچ ان کو جگہ سے نہ ہلا سکا اور تو اور اعزاز و اقربا، قوم اور کنبہ والے تو درکنار انہوں نے قانون الٰہی کی تعمیر میں عزیز ترین اگر تے لخت جگر کی محبت سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور اس کو بھی قربان کرنے لگے۔ یہی عبدیت کی آخری تکمیل اور الٰہی قانون کی آخری بلندی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کی۔ نہ فقط اپنے زمانے میں اور اپنے ملک میں بلکہ کثرت انسانی برادری میں سارا مغرب اور امریکہ اور بیشتر مشرق حضرت ابراہیم کو ہوشمند مصلح اور برحق ریفارمر کہتا ہے۔

تحلیل اجزاء وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ حضرت نوح کے بعد حضرت ابراہیم سے پہلے کوئی ایسا جلیل القدر عظیم الشان نبی نہیں ہوا جس کو کسی قہار، جابر، متمدن سلطنت سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ عاد، ثمود وغیرہ اقوام کی ہدایت کے لئے حضرت ہود و صالح بھیجے گئے۔ مگر ان حضرات کو اس قدر صبر آزما مصائب برداشت کرنی نہ پڑیں جیسی حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو برداشت کرنی پڑی تھیں۔

پیغمبران برحق کی مخالفت کے سبب کافر سرکش اقوام کو ہلاک کر دیا گیا۔ مگر دوسرے پیغمبروں پر کافروں کے ہاتھوں سے ایسی حوصلہ فرسا بلائیں نہیں ٹوٹیں جیسی ان دونوں بزرگوں پیغمبروں کے زمانے کے کافروں کے ہاتھوں سے مافوق الانسانیت شدائد کی بارش ہوئی۔ یوں تو تمام پیغمبروں کا دین ایک ہے۔ طریقہ ایک ہے، مطمح نظر ایک ہے، مگر جو ہمہ جہتی اور مناسبت حضرت ابراہیم کو حضرت نوح سے حاصل تھی۔ وہ کسی دوسرے گذشتہ پیغمبر کو نہ تھی، اس لئے فرمایا کہ نوح کے طریقہ پر چلنے والوں میں بلاشبہ ابراہیم تھے۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ کوئی پیغمبر دوسرے پیغمبر کا مقلد نہیں ہوتا۔ پیغمبر کیلئے تقلید حرام ہے۔ کیونکہ تقلید کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں راہ راست ذہن میں نہ آتی ہو، اور چونکہ ہر پیغمبر کے پاس وحی کا آنا لازم ہے، اس لئے تقلید کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ جواز۔ اس کے علاوہ دقایق مذہب اور حقائق شریعت سمجھنے کے لئے بھی تقلید کی طرف سے روشن روح اور روحانی دماغ لے کر آتے ہیں، اس لئے ان کو ضرورت ہی تقلید کی نہیں ہوتی۔

اب کلام ربانی میں جہاں جہاں بعض انبیاء کو دوسرے انبیاء کی تقلید کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا ایک نبی کو دوسرے نبی کے گروہ میں سے کہا گیا ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ جس طرح پہلے پیغمبر کی آمد، اعلان توحید اور ازالہ شرک کیلئے ہوئی تھی۔ اسی طرح دوسرے پیغمبر کی بعثت اسی غرض کے لئے ہوئی تھی۔

فرق صرف زمانے کا تھا۔ متقدم زمانے والے کو امام اور مؤخر زمانے والے کو مقتدی کہا گیا ہے۔ یعنی وہ زمانے کے لحاظ سے پہلے تھا اور یہ زمانے کے لحاظ سے مؤخر ہے۔ بیشن دونوں کا ایک ہی تھا، اس لئے آیت مذکورہ کا مطلب علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ بیان کیا کہ ابراہیم نوح کے دین والوں میں سے تھے۔ یعنی دونوں کا دین ایک تھا۔ مجاہد نے فرمایا کہ نوح کے طریقے پر ابراہیم بھی تھے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ ہر پیغمبر کے دو فرض ہوتے ہیں ایک تو خود اپنی فکری اور عملی اصلاح، اللہ سے براہِ راست تعلق جوڑنا۔ کل دنیا سے منہ موڑنا اور تمام ماسوی اللہ کو چھوڑنا۔ دوسرا فرض اصلاح خلق کا ہوتا ہے جس کا آغاز اپنے گھر سے ہونا لازم ہے۔ حضرت ابراہیم بھی پیغمبر تھے۔ ان میں بھی دونوں صفات کا موجود ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ پہلی صفت تو آیت مذکورہ میں بیان کر دی اور دوسری صفت کا بیان اس سے متصل آیات میں آتا ہے۔ قلب سلیم کے جو معنی ہم نے بیان کر دیئے وہ ان تمام معانی کو حاوی ہیں جو مختلف علماء نے بیان کئے ہیں۔ مثلاً ابن عباس کا قول اس آیت کی تشریح میں ہے کہ ابراہیم نے اپنے رب کی وحدانیت اور الوہیت کو پہچانا۔ عوف بن ابی جمیلہ نے محمد بن سیرین سے قلب سلیم کے معانی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا کہ اس بات کا یقین رکھنا کہ اللہ برحق ہے اور قیامت ضرور آنے والی ہے اور اللہ قبروں سے مردوں کو اٹھائے گا۔ یہی قلب سلیم لے کر آتا ہے۔ (رواہ ابن ابی حاتم) حسن بصری نے فرمایا قلب سلیم وہ قلب ہے جو شرک سے پاک ہو۔ ان اقوال کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ہیں، مگر سب کو شامل وہ معنی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ۔ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ پیغمبری کا دوسرا فرض تھا جس کو حضرت ابراہیم نے ادا کیا اول تو خود توحید الوہیت و ربوبیت کا مشاہدہ کیا اور ہر قسم کا آمیزش شرک سے دل کو پاک کر کے محض اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو برہانی طور پر توحید کی تعلیم دی اور شرک سے باز داشت کی اور خاص طور پر فرمایا کہ کیا تم خود تراشیدہ معبود بنانا چاہتے ہو۔ جب دوسروں کو تم نے معبود بنایا تو رب العالمین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ تمام عالم کا رب تو ایک ہی ہے اور تم نے دوسروں کو معبود بنا لیا ہے۔ یہ سراسر فکری اور عملی غلطی ہے۔ درحقیقت جو رب العالمین ہے اسی کو نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار ہے۔ اور جو نفع و ضرر کا مالک مختار ہے وہی تنہا معبود بھی ہے کس قدر غلط ہے یہ عقیدہ کہ رب العالمین تو ایک ہی ہے اور معبود دوسرے ہوں۔ سر جھکاؤ دوسروں کے سامنے طواف کرو دوسروں کا، منتیں اور نذریں مانو دوسروں کی اور ساری زندگی کا کفیل ہو ایک رب العالمین۔

بہرحال اس طرح کی نصیحت حضرت ابراہیم کافروں کو کرتے تھے، مگر ازلی گمراہوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور دیوانے کی بڑ سمجھ کر ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا۔ بلکہ بعض اعزا اقارب اور احباب نے تو بتوں کی پھٹکار اور بادشاہ کے غضب سے ڈرایا۔ کچھ مدت کے بعد ایک قومی تہوار آیا اور سب لوگ میلے میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ حضرت ابراہیم سے بھی چلنے کے لئے کہا۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ۔ حضرت نے ستاروں پر ایک گہری نظر ڈالی اور فرمایا میری حالت غیر ہے۔ اس بات کو سن کر کافر سمجھے کہ ابراہیم بیمار ہیں، اس لئے منہ پھیر کر چل دیئے۔

یہاں دو باتیں قابل تشریح ہیں۔ (۱) حضرت ابراہیم نے ستاروں پر گہری نظر کیوں ڈالی۔ (۲) کیا واقعی حضرت ابراہیم بیمار تھے۔ اگر بیمار نہ تھے تو غلط طور پر اپنے کو سقیم کیوں کہا۔ اول بات کی تشریح یہ ہے کہ خلیل وجوہ دونے صراحت کی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کی تدبیر میں مستغرق ہو جاتا ہے تو عربی زبان میں بولا جاتا ہے نظر فی النجوم۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ابراہیم کچھ دیر کے لئے مراقبہ میں مستغرق ہو گئے یا حقیقی طور پر ستاروں کو بغور دیکھنا ہی مراد ہے۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی کچھ سوچنے میں منہمک ہوتا ہے تو کوئی داڑھی کریدنے لگتا ہے کوئی نظر نیچی کر کے زمین کریدتا ہے کوئی سر کھجانے لگتا ہے اور عموماً کسی جواب کو سوچنے کے لئے اوپر کو سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے جب کافروں نے میلے میں چلنے کو کہا حضرت نے ستاروں کو دیکھنا شروع کر دیا کہ ان کو کیا جواب دیا جائے، اس لئے آسمان کی طرف سر اٹھا کر یا دھوکے میں ڈالنے کے لئے ستاروں اور سیاروں کا مطالعہ شروع کر دیا ہو۔ بلاد بابل کے رہنے والے عموماً ستارہ پرست تھے۔ اور سیاروں سے مناسبت رکھنے والے کچھ بت بھی انہوں نے سیاروں کے ہی نام پر بنا

رکھے تھے۔ جن کی پوجا کرتے تھے۔ پس قوم کی دعوت کا جواب دینے کے لئے انہوں نے ستاروں کا مشاہدہ شروع کر دیا۔ تاکہ لوگ سمجھیں کہ ابراہیمؑ ستاروں کی چال دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے نجوم کا مطالعہ کرنے کے بعد گویا تاثیراتِ کواکب کو سمجھا اور کہہ دیا انی سقیم۔ ان تینوں جوابوں میں اول شرح لغت محاورہ سیاق اور مراد کلام کے زیادہ مناسب ہے جس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

رہا اپنے کو سقیم کہنا تو اس لفظ کا نہایت مناسب ترجمہ وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھ دیا۔ اس لفظ سے حضرت کی مراد یہ تھی کہ میری حالت غیر ہے۔ یعنی میں ان مشرکانہ تہواروں کا قائل نہیں۔ میں میلے میں شرکت نہیں کر سکتا۔ تم لوگوں کی مشرکانہ رسوم اور شرک آفرینیوں سے میرا دل بگڑا ہوا ہے طبیعت خراب ہے۔ میں آج تمہارے معبودوں کی تذلیل کر کے تمہارے افکار و عقائد کی غلطی تم پر واضح کرنی چاہتا ہوں، مگر کافر یہ سمجھے کہ ابراہیم بیمار ہیں۔ ان کا نظام صحت بگڑا ہوا ہے۔ بہرحال لفظ ایہام۔ اور توریہ کا تھا۔ متکلم نے ایسا لفظ بولا کہ اگر متکلم کی مراد کے اس کا معنی لیا جائے تو بالکل صحیح اور مظہر حقیقت ہو اور مخاطب اگر اپنی جہالت سے دوسرا معنی مراد لیں تو اس پر حقیقت نہ کھلے۔ لفظ میں دونوں معنی کا احتمال ہو۔ اور چونکہ توریہ کا لفظ بولنا جرم نہیں۔ صورت میں کذب ضرور ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کذب نہیں ہوتا، اس لئے اگر ابراہیم نے بیمار نہ ہونے کے باوجود اپنے کو سقیم کہا تو غلط نہیں کہا۔ قصور سمجھنے والے کا ہے نہ کہ متکلم کا۔

دوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انی سقیم کہنے سے بالفعل بیمار رہنا مراد نہیں بلکہ آئندہ بیمار ہو جانے کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ چونکہ اسم فعل کا اطلاق عربی زبان میں اتصاف بالفعل کے موقع پر بھی ہوتا ہے اور اتصاف فی الاستقبال کے موقع پر بھی۔ مثلاً حضرت زبیر نے جنگ جمل کے دن صبح کو سوار ہوتے وقت اپنے بیٹے سے کہا تھا میں اپنے بیٹے کو شہید دیکھ رہا ہوں۔ حالانکہ اس وقت تک شہید نہیں ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ حضرت ابراہیم نے تو آئندہ کے لحاظ سے اپنے کو بیمار ظاہر کیا تھا اور کافر بالفعل ان کو بیمار سمجھے۔

رہا کافروں کا منہ پھیر کر چلا جانا تو اس کے متعلق بیضاوی ثوری کا قول ہے کہ بابل میں طاعون ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم کے قول کے مطابق وہ لوگ سمجھے کہ ان کو طاعون ہو گیا، اس لئے مرض کے متعدی ہو جانے کے خوف سے چھوڑ کر چل دیئے۔ عوفی نے ابن عباس کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم ان بزرگوں کو کہاں سے یہ بات معلوم ہوئی۔ آیت یا حدیث میں تو اس کی کوئی صراحت نہیں۔

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ جب کافر چلے گئے اور حضرت ابراہیم کو تنہا چھوڑ گئے اور آپ کو اطمینان ہو گیا۔ تو بتوں کی طرف چلے یا بتوں کے پاس آئے (ابو مالک) یا بتوں کی طرف رخ کیا (کلبی) یا خفیہ تیزی سے بتوں پر جا پہنچے۔

فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنطِقُونَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ بتوں کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یوم باطل کا فر بتوں کے سامنے کھانے کی کچھ چیزیں رکھ جایا کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ سونگھ لیتے ہیں اور ان کے کھا لینے سے کھانے میں برکت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا باہم تقسیم کر کے گھروں کو کھاتے تھے اور اس کو تمام گھر کے لئے باعث برکت سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک سب سے سادہ صورت یہ ہے کہ بتوں پر مختلف قسم کی مٹھائیاں اور پھل وغیرہ چڑھائے جاتے ہوں گے۔ جس طرح آج کل مندروں میں رواج ہے بلکہ مسلمان بھی بزرگوں کے مزاروں پر کرتے ہیں اور اس مٹھائی یا پھل یا کھانے کو جوٹھا کہتے ہیں اور وہ سڑ جائے اس میں بدبو آ جائے پھپھوندی جم جائے، مگر متبرک کہہ کر حصول برکت کے لئے باہم تقسیم کرتے، کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کے زمانے کے کافروں کا بھی یہی دستور ہوگا۔ بتوں کے آگے مٹھائیاں رکھی ہوں گی۔ پس اول بطور استہزا، آپ نے بتوں سے دریافت کیا تم کھاتے کیوں نہیں۔ جب بتوں نے کچھ جواب نہ دیا تو فرمایا تم بولتے کیوں نہیں۔ پھر جھک کر داہنے ہاتھ سے ایک کاری ضرب لگائی، سب کو توڑ ڈالا اور بڑے بت کے کندھے پر تبر یا ہتھوڑا رکھ دیا۔ شام کو بت خانے کے پجاری میلے سے واپس آئے، بتوں کی شکستہ حالت دیکھ کر پریشان ہوئے اور باہم مشورہ کرنے لگے کہ یہ حالت کس نے کی۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان نے ایسا کیا ہوگا۔

فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ۝ اس وقت لپکے ہوئے حضرت ابراہیم کی طرف آئے اور غضب ناک لہجہ میں آپ سے باز پرس کی۔ آپ نے بطور طعن فرمایا کہ اگر یہ بولتے ہیں تو ان سے دریافت کر لو کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ آپ کا یہ قول بطور طعن تھا۔ خبر کاذب نہ تھی۔ واقعیت کو ظاہر

کرنا مقصود نہ تھا، مگر بظاہر کلام خبری تھا، اس لئے صورت کذب ضروری تھی، مگر لہجہ کے تفاوت سے حقیقت کلام بدل جاتی ہے۔ آپ جانتے تھے کہ میرے اس قول کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ ایک بیوقوف آدمی بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس بات کے کہنے سے آپ کا مدعا یہ تھا کہ کافروں کو اپنی حماقت پر تنبیہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ کا مطلب پورا ہو گیا۔ کافر اپنے دل میں شرمندہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ واقعی بات تو سچی ہے۔ ان میں نہ بولنے کی طاقت ہے نہ کچھ کرنے کی۔ حضرت ابراہیم کو ان کے سوچ میں پڑ جانے سے نصیحت کا مزید موقع مل گیا

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ فرمایا تمہارا اور تمہارے اعمال و اخلاق کا خالق تو ہے خدا اور تم تراش کر ان بتوں کو بناتے ہو اور خود ساختہ بتوں کی پوجا کرتے ہو۔ یعنی اعلیٰ اور برترین طاقت کو چھوڑ کر اسفل ترین بے جان مخلوق کی پرستش کرتے ہو۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ اللہ نے تم کو پیدا کیا اور وہی تمہارے اعمال کا خالق ہے اور بتوں کو تراش تراش کر تم بناتے ہو۔ پس بت تو تم سے کمزور ہیں۔ تم ان کے صانع ہو۔ پس خود ساختہ چیز کی پرستش اور خالق کی عبادت سے روگردانی دانش کے خلاف ہے۔ اس طرح نصیحت اور برہانی وعظ کا اثر کافروں پر کچھ مرتب نہ ہو۔ بلکہ کہنے لگے تم جانتے ہو کہ بات نہیں کر سکتے، لیکن ہم نے آباؤ اجداد کو انہیں کی پرستش کرتے پایا، اس لئے ہم تو انہیں کی عبادت پر قائم رہیں گے

اس کے بعد بادشاہِ وقت سے استغاثہ کیا۔ ابراہیم علیہ السلام گرفتار کئے گئے۔ دربارِ شاہی میں پہنچ کر بادشاہ سے مناظرہ ہوا۔ بادشاہ مغلوب ہو گیا۔ حضرت ابراہیم کو قید خانہ بھیج دیا گیا۔ وہاں جیل خانہ میں آپ نے تبلیغ کی۔ بالآخر سب کافروں کی بالاتفاق رائے ہوئی۔ کہ ابراہیم ہم کو عذابِ جہنم سے ڈراتا ہے۔ لہٰذا ہم کو بھی اپنے معبودوں کی طرف سے ایک آتش کدہ بنا کر ابراہیم کو اس میں ڈال کر اپنے معبودوں کا زور دکھانا چاہیئے۔

فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ۔ پھر لکڑیوں میں آگ لگا کر دہکتی آگ میں ابراہیم کو ڈال دو۔ جب مشورہ عمل کیا گیا۔ مدت تک آگ بھڑکتی رہی۔ حضرت ابراہیم کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ آگ بجھی آپ باہر نکلے۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ۔ بادشاہ نے منہ کی کھائی۔ حقیقت سے کسی قدر واقف ہو کر دل میں ڈرا، لیکن رعایا میں بھرم رہنے کے لئے مقابلے کی ٹھانی اور رب العالمین کے دیکھنے کے لئے ایک اونچا مینار بنوانے کا حکم دیا۔ لطائف الحیل ابراہیم کے پیامِ حق کو ٹالنا ہو رہا تھا۔ آسمان تک اونچا مینار کیسے بن سکتا۔ ہزاروں برس میں بھی اس کی تعمیر ناممکن تھی۔ کچھ اونچا اٹھایا گیا، لیکن ایک حد پر پہنچ کر وہ گر گیا۔ کثرت مخلوق دب گئی۔ تدبیر ناکام رہی۔ تو لشکر کشی کی سوجھی۔ غرض غیبی مچھروں کی فوج سے عام لشکری مر گئے۔ نمرود بھی جہنم رسید ہو گیا۔ تدبیریں بنائی تھیں ابراہیم کو زیر کرنے کی، مگر خدا نے ان ہی کو نیچا کر دیا۔ پھر بھی عام لوگ ایمان نہ لائے۔ حضرت ابراہیم کے باپ آزر بھی کفر پر ہی رہے۔ جب آپ مایوس ہو گئے تو ترکِ وطن کا ارادہ کیا۔ نیک لوگ بدوں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ نیک اور بد کا کوئی رشتہ نہیں۔ خواہ بھائی بھائی ہوں یا باپ بیٹے۔ حضرت ابراہیم دل برداشتہ ہو گئے۔ بوحی ربانی یا باجتہاد قلبی ترکِ وطن کی ٹھان لی۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ اور فرمایا میں اپنے رب کی طرف جاؤں گا وہ مجھے راستہ بتا دے گا۔ رب کی طرف جانے سے مراد ہے تمام اعزا و احبا، مال و منال و گھر بار اور وطن کو محض اللہ کی خوشنودی کے لئے چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر جا لینا جہاں اللہ کا حکم ہو، اس لئے فرمایا کہ وہی مجھ کو رستہ دکھا دے گا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آخری فقرہ سے آپ کی مراد یہ تھی کہ دین کے تفصیلی احکام، اوامر و نواہی اور قوانین شریعت اللہ مجھے بتا دے گا۔ کیونکہ ابراہیم ہجرت سے پہلے نبی اور صاحب وحی ضرور تھے، مگر صاحب شرع نہ تھے، مگر بظاہر یہ قول سیاق کلام کے بھی خلاف ہے اور خود ساختہ تخصیص بے دلیل بھی ہے۔ خود مجھ کو بتا دے گا کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کہاں پہنچنا چاہیئے۔ راستہ اور منزل مقصود خدا بتا دے گا

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کے تفصیلی احکام اور مقامِ سکونت دونوں کی رہنمائی مقصود ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک لطیف مطلب اس آیت کا اور بھی ہو سکتا ہے جس کی تنقیح کے لئے ہدایت کا مفہوم اور اس کے انواع کی تفصیل کرنی ضروری ہے۔ اہلِ

دانش جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کم و بیش ہر ذی ہوش بالغ کو سمجھنے اور سوچنے کی قوت عطا فرمائی ہے ۔ اگر آدمی بچہ اور دیوانہ نہ ہو اور اصلی اثر سے بھی پاک ہو تو اس کی سادہ عقل بجائے خود اللہ کی توحید، صناعی اور قدرت کو سمجھتی اور یگانہ ہستی کی ذاتی و صفاتی وحدت پر یقین رکھتی ہے۔ فقط اپنی تخلیق پر غور اور اپنے نفس کا مطالعہ انسانی بصیرت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور مطالعہ نفس کے لئے آفاقی براہین پر بھی غور کیا جائے اور اپنی ذات کے علاوہ بیرونی کائنات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو راہ معرفت پر گامزن ہونے کے لئے سارا عالم چراغ راہ کا کام کرتا ہے ۔ یہ دونوں ہدایتیں حضرت ابراہیمؑ کو حاصل تھیں ، لیکن ہدایت الٰہیہ اسی درجہ پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد ملی کارسازی کرتی ہے سچے خواب ، الہام ، وحی اور آسمانی پیغاموں کے ذریعہ اپنے بندوں کو اللہ ہدایت فرماتا ہے ۔ حلال احرام کے قوانین بناتا اور حق و باطل کے فیصلے نازل فرماتا ہے ۔ بعض اوقات انکشاف روحانی بھی ہوتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ باطنی حواس اور عقل کی کوشش ایک خاص حد رکھتی ہے ۔ ہدایت کے اول اور دوسرے درجہ میں تو صرف عقل ہی کام کرتی ہے ۔ اور آدمی سوچ بچار کی طاقت ہی سے راہِ راست پاتا ہے اور اس پر چلتا ہے ، لیکن تیسرے درجہ کی حالت مشترک ہے ۔ آسمانی صحیفہ اور کتابیں حلال و حرام کے تفصیلی ہدایت نامے اور حق و باطل کے سماوی فیصلے ایسی چیزیں نہیں کہ ہر ایک کو ہر ایک کی عقل سمجھ سکے ۔ اخلاقی اور مدنی قوانین اور سیاسی ضوابط کو ضرور آدمی سمجھتا ہے اور عقل کے موافق پاتا ہے ، مگر مابعد الموت اور ماقبل التخلیق اور مافوق الطبیعات حقائق کو تفصیلی طور پر جاننا عقل کی حدود سے خارج ہے ۔ ان چیزوں کا علم الیقین صرف روحانی انکشاف اور وجدانی علم سے ہوتا ہے ۔ یعنی الہام اور وحی سے براہ راست عقل کے توسط کے بغیر قلب متاثر ہوتا ہے ۔ پھر ان کے علاوہ بعض انکشافات تو محض قلبی ہی ہوتے ہیں ۔ مثلاً جس شخص نے کبھی واشنگٹن یا نیویارک یا بیکن شہر کو نہ دیکھا ہو نہ ان شہروں کے احوال پڑھے ہوں یا سنے ہوں ۔ کبھی روحانی مراقبہ اور قلبی روشنی کے سبب وہ گھر بیٹھے بیٹھے ان کا معائنہ کر لیتا ہے اور اس کا معائنہ غلط نہیں ہوتا ہے ۔ کرامت اولیاء اور معجزہ انبیاء اسی وجدانی علم کی مختلف شاخیں ہیں ۔ حضرت ابراہیمؑ کو قلبی الہام تو ہجرت سے قبل یقینی طور پر ہوتا تھا ۔ اور قومی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نبی بھی ہو چکے تھے اور آپ کے قلب پر وحی کا نزول بھی ہونے لگا تھا اور پیام الٰہی براہ راست آنے لگے تھے اور روحانی علم کے بعض درجات پر آپ فائز بھی ہو گئے تھے ، لیکن الٰہی ہدایت کا آخری درجہ باقی تھا ۔ آثار کو دیکھ کر آپ نے افعال الٰہیہ کی سیر کی تھی اور مشاہدہ افعال سے صفاتِ قدسیہ تک پہنچ چکے تھے ، مگر سیر ذات باقی تھی اور جب تک ہدایت کے انتہائی درجہ تک پہنچ نہ ہو اس مرتبہ پر فائز ہونا ممکن بھی نہیں ۔ پس آخری کوشش کی ضرورت تھی تاکہ بیتاب روح کی تسکین ہو سکے ۔ خدا تعالیٰ نے ایک اور آیت میں خود فرمایا ہے ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ یعنی جو لوگ آثارِ الٰہیہ کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اللہ ان کو اپنے افعال تک پہنچنے کا راستہ بتا دیتا ہے اور جو افعال کی سیر کرتے ہیں تو ان کو معرفت صفات عطا فرماتا ہے اور جو صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو معرفت صفات عطا فرماتا ہے اور وہ اللہ کے نور کو نور سے دیکھتے ہیں اور جمالِ الٰہی کا ملاحظہ نورِ جمال سے ہی کرتے ہیں ۔ حضرت ابراہیمؑ اسی چوتھے درجہ پر پہنچنے کے مشتاق تھے ، لیکن اس چوٹی پر پہنچنے کے لئے کوئی صبر آزما حوصلہ فرسا شرطوں کی تکمیل ضروری تھی ۔ اعزاء و اقارب اور اہلِ وطن کی دشمنی تو پہلے ہی سے ہو چکی تھی ۔ جبار بادشاہ اور سرکش حکام سے ایک غریب بے کس آدمی کا جبروتی مقابلہ بھی ہو چکا تھا ۔ آگ کے عظیم الشان ڈھیر میں بھی آپ کو ڈالا جا چکا تھا ۔ اور قید و بند کی سخت تکلیفیں بھی اٹھا چکے تھے ۔ تمام مصائب کو ثبات قلب کے ساتھ برداشت کرنے سے معرفت کی ترتیب وار سیڑھیاں طے کرتے جاتے تھے ۔ اب آخری درجے پر پہنچانے کے لئے بلا رسیبی اور بہت کڑی آزمائش کی ضرورت تھی جس کا آغاز مال و منال اعزاء ، اقارب اور مکان و جائیداد کو ترک کرنے سے محبت کا ثبوت بہم پہنچانا تھا ۔ اسی لئے آپ نے فرمایا میں اپنے رب کی طرف جانا چاہتا ہوں ۔ وہ مجھے خود راستہ بنا کر مقصود تک پہنچا دے گا یعنی ذات کی سیر کرنی چاہتا ہوں ، لیکن نور ذات کا مشاہدہ کیسے ہو گا اور کس طرح پرخار سنگلاخ ہفت خواں سے گزرنا ہو گا ، خود میرا رب بتا دے گا ۔ غرض ابراہیم چل دیئے ۔ آپ کی بی بی سارہ اور بھائی یا بھتیجے لوط بھی ہمراہ تھے ۔ بابل سے چل کر مصر پہنچے ۔ وہاں جو پیش آیا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے ۔ مصر سے ہاجرہ کو ساتھ لیا ۔ فلسطین پہنچ کر مقیم ہو گئے ۔ عمر کا آخری دور آیا تو اولاد کی تمنا ہوئی ۔ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ اے رب مجھے کوئی صالح بیٹا عنایت کر ۔ حضرت ابراہیمؑ کا دل اللہ کے علاوہ ہر چیز کی محبت سے خالی ہو چکا تھا

کثیر ذات مقصود تھی۔ جس کا ابتدائی زینہ ہجرت پھر مصر میں پہنچ کر ہاجرہ کو پانا پھر اولاد کی تمنا کرنا تھا۔ اس لئے بالہام الٰہی آپ نے دعا کی۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ۔ مستجاب الدعوات بزرگوں کی دعا رد نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم نے دعا کی۔ اللہ نے بلا تاخیر قبول فرمائی اور حلیم ہونے والا لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دی۔ فبشرناہ میں عدم تاخیر دلالت کر رہی ہے۔ حلیم کا اطلاق بچے پر نہیں ہوتا۔ گویا اس لفظ میں پیدا شدہ لڑکے کے زندہ رہنے اور جوانی تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے۔ غلام حلیم سے مراد حضرت ابراہیم ہیں۔ اس کا ثبوت کیا ہے۔ اس کو ہم آگے بیان کریں گے۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے۔ عموماً اہل کتاب کے نزدیک بشارت کا تعلق حضرت اسحاق کی پیدائش سے تھا۔ اور حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو ذبح کرتے خواب میں دیکھا تھا اور انہیں کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے۔ مگر توریت سفر پیدائش ۱۷ باب ۲۰ درس میں مذکور ہے کہ اسماعیل کے حق میں۔ میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اسے آبرومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس سے بڑی قوم بناؤں گا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ غرض ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل پیدا ہوئے۔ بحکم الٰہی ہاجرہ اور اسماعیل کو مکہ میں پہنچا دیا گیا اور دونوں حضرات مدت تک وہاں رہے۔ یہاں تک کہ اسماعیل جوانی کے قریب پہنچ گئے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء خراسانی اور زید بن اسلم وغیرہم نے آیت مذکورہ کا مطلب یہ فرمایا ہے کہ اسماعیل جوان ہو چلے، ہاتھ پاؤں نکالے اور باپ کی طرح کام کرنے کی قوت حاصل ہو گئی۔ گویا سعی کو پہنچنا محاورہ کا لفظ ہے۔ اس سے مراد ہے کام کرنے کے قابل ہو جانا۔

قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ اس جگہ دو چیزیں قابل تنقیح ہیں۔ حضرت ابراہیم کا خواب کس لڑکے کے متعلق تھا۔ اسماعیل کے یا اسحاق کے۔ توریت سفر پیدائش کے بائیسویں باب میں مذکور ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا خواب حضرت ابراہیم نے دیکھا تھا۔ وہ حضرت اسحاق تھے۔ علمائے اسلام میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، ابن مسعود، کعب احبار، قتادہ، سعید بن جبیر، مسروق، عکرمہ، زہری، سدی اور مقاتل وغیرہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابن جریر نے بھی اسی قول کی تائید کی ہے، لیکن حضرت ابن عباس۔ ابن عمر، سعید بن مسیب، حسن بصری، شعبی، مجاہد، قلبی اور دوسرے علماء کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت اسماعیل کا تھا۔ شیخ جلال محلی اور شیخ ابن کثیر نے اسی قول کو پسند کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اول الذکر علماء کا قول جو نقل کیے جاتے ہیں وہ ضعیف اسناد والی روایات پر مبنی ہیں۔ یعنی جن بزرگوں کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ ذبح کا واقعہ اسحاق کا تھا اسماعیل کا نہیں تھا، اس نسبت میں ضعف ہے۔ اور اگر بعض روایات قابل سماعت بھی ہوں تو ان کی بنا اسرائیلی منقولات پر ہے۔ علمائے یہود نے مسلمان ہونے کے بعد توریت کی صراحت مسلمانوں کے سامنے نقل کی۔ اور مسلمانوں نے حسن ظن کی بنا پر اس صراحت کو تفسیر قرآن سمجھ لیا۔ حالانکہ قرآن پاک یا احادیث مقدسہ میں کسی بھی جگہ واقعہ ذبح یا رؤیا، ذبح حضرت اسحاق سے متعلق نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ ذبح اسماعیل کا ثبوت چند دلائل سے ہوتا ہے۔

عبرانی توریت میں موجود ہے کہ اللہ نے ان کو حکم دیا ہے کہ اپنے بکر اور وحید کو میرے نام پر قربانی کرو۔ عبرانی اور عربی زبانوں میں بکر اس پھل کو کہتے ہیں جو درخت سے سب سے پہلے اترتا ہے اور وحید کا ترجمہ اکیلا یا اکلوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسماعیل پیدا ہوئے تھے اور اسحاق کی پیدائش سے پہلے وہ اکلوتے بھی تھے۔ اسحاق نہ اکلوتے تھے نہ سب سے اول پیدا ہوئے تھے۔

(۲) حضرت ابراہیم نے دعا کی ربِّ ہب لی من الصالحین۔ اس کے بعد اللہ نے فرمایا فبشرناہ بغلام حلیم۔ اس کے بعد فرمایا فلما بلغ معہ السعی الخ سے معلوم ہوا کہ پورا کلام باہم مربوط ہے۔ جس فرزند کے لئے ابراہیم نے دعا کی تھی اسی کو ہی اللہ نے غلام حلیم فرمایا اور وہی جب جوانی کے قریب پہنچا تو حضرت ابراہیم نے اسی کے متعلق خواب دیکھا اور اسی کو ذبح کرنے کے لئے لے چلے۔ اس کے بعد فرمایا فبشرناہ باسحاق نبیا من الصالحین۔ اگر اول بشارت کا تعلق اسحاق سے ہوتا تو دوبارہ بشارت دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ غلام حلیم اسماعیل تھے اور غلام حلیم کو ہی ذبح کرتے ہوئے حضرت ابراہیم نے خواب میں دیکھا تھا۔

(۳) حضرت اسحاق کی بشارت کے ساتھ یعقوب کے پیدا ہونے کی بھی بشارت تھی۔ گویا بشارت میں مذکور تھا کہ اسحاق پیدا ہو گا، جوان ہو گا، نکاح کرے گا اور اس کے بیٹا ہو گا جس کا نام یعقوب ہو گا۔ جب اسحاق کا زندہ رہنا، جوان ہونا اور شوہر ہونا پیدائش سے پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ تو

پھر ذبح کے امتحان سے کیا ذبح ہوسکتا ہے اور کیوں واقعہ ذبح کو بلاد مبین فرمایا۔

(۴) اسحاق کا مکہ کو آنا نہ بائیبل سے ثابت ہے نہ قرآن اور احادیث مقدسہ سے۔ اہل کتاب اس واقعہ کا مقام موریہ پہاڑ کی قربان گاہ کو قرار دیتے ہیں۔ مگر اہل اسلام تو سب متفق ہیں کہ ذبح کا قصہ مقام منا میں مکہ کے قریب ہوا۔ پھر کس طرح اسحاق کے ساتھ اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ جب اسحاق کا مکہ کو جانا ثابت ہی نہیں اور نہ سارہ مکہ کو آئیں، شام سے لاکر منا میں ذبح کرنے کا ارادہ کرنا عقل سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری بات قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم نے کیا صراحۃً ذبح اسماعیل کو خواب ہی میں دیکھا تھا۔ اور کسی نے خواب میں ان سے کہا تھا کہ اسماعیل کو راہ خدا میں قربان کر دو۔ اللہ کا یونہی حکم ہے۔ یا کسی دوسرے مقامی واقعہ سے حضرت ابراہیم نے ذبح اسماعیل کا استنباط کیا تھا۔ یہ تو بالکل واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو بیداری میں ذبح اسماعیل کا حکم نہیں ملا تھا۔ لیکن چونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے (رواہ ابن ابی حاتم باسناد صحیح) اس لئے خواب اور بیداری کے امر میں کوئی فرق نہ تھا۔ اہل تحقیق کا قول ہے کہ شروع میں خواب صریحی نہ تھا در پردہ تھا۔ متاع عزیز کو قربان کرنے کا حکم تھا۔ لیکن دوسرے یا تیسرے روز صریحی خواب تھا، اسی لئے حضرت ابراہیم نے اسماعیل سے فرمایا کہ میں نے تم کو ذبح کرتے خواب میں دیکھا ہے۔ یہ آزمائش تھی اور بڑی آزمائش تھی۔ اکلوتے بیٹے کی قربانی اور وہ بھی نوجوان کی عجیب ابتلا تھا۔ مگر اس کسوٹی پر صرف ابراہیم کو کسنا ہی مقصود نہ تھا۔ بلکہ اسماعیل کی آزمائش بھی غرض تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے بطور طلب مشورہ اسماعیل سے فرمایا۔

فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى۔ ابراہیم تو پختہ کار تھے، نبی تھے، وحی آتی تھی، غیبی مخلوق کو دیکھتے تھے، حق الیقین کے مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے، ناسوتی پردے ان کے دماغ سے اٹھ چکے تھے۔ جلال روحانیت کی قربان گاہ پر تمام خواہشات کو قربان کر چکے تھے، مگر اسماعیل نوخیز تھے اس وقت نبی بھی نہ تھے۔ یا ان کو شیطانی وسوسے بھی ہو سکتے تھے۔ اس لئے سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کا حکم ان کو دیا تاکہ سونا تپانے کے بعد کندن بن جائے اور فطرت سلیمہ کا حکم بروئے کار آجائے۔

قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ جس کی فطرت سلیم ہو اس کی نسبت اور صحبت فاسد ہو (؟) ہے۔ حضرت اسماعیل پاک نفس اور روشن روح لے کر آئے تھے پھر بڑے پیغمبر کے بیٹے تھے اور ان کی صحبت میں رہ چکے تھے، اس لئے دماغ اور قلب پر کثافت کا نام ہی نہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے اپنا خواب بیان کیا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کہتا کہ حضرت یہ خواب ہے اس کا کیا اعتبار۔ کہیں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم بلکہ جواز کبھی کسی گذشتہ پیغمبر کے لئے بھی ہوا ہے۔ انسانی قربانی دین الٰہی میں نہیں ہو سکتی۔ یہ شیطانی وسواس ہے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ باپ نے خواب بیان کیا تو فوراً سمجھ گئے کہ پیغمبر کا خواب جھوٹ نہیں بلکہ وحی ہوتی ہے۔ اللہ نے اپنے پیغمبروں کو شیطانی اغوا سے معصوم بنایا ہے، اسی لئے فرمایا جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے وہی کیجئے۔ انشاء اللہ میں ثابت قدم رہوں گا، استقلال میں لغزش نہ ہوگی۔ حضرت اسماعیل نے اس جگہ انشاء اللہ جو فرمایا وہ شک کے طور پر نہیں بلکہ وعدہ کو پختہ کرنے کے لئے فرمایا اور یہ ظاہر کر دیا کہ میں اور میرا وعدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا جب تک اللہ کی توفیق اور اس کی مشیت نہ ہو۔

فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ آہ یہ بڑا سخت وقت تھا۔ ساری عمر کا سرمایہ، آنکھوں کا نور، دل کا سرور، صحیح جانشین، بڑھاپے کا سہارا، فرماں بردار نوجوان بیٹا ہاتھوں سے جا رہا تھا بلکہ خود پیش کیا جا رہا تھا اور اس طرح پیش کیا جا رہا تھا کہ ابرو پر بل نہ آئے، پیشانی پر شکن پیدا نہ ہو، دل میں میل نہ آئے، دل کے شوق سے اور دماغ کے سکون سے اور ارادہ کی پختگی سے پیش کیا جا رہا تھا۔ فطری جذبہ محبت کو عشق الٰہی کی قوت نے پیچھے ہٹا دیا تھا۔ راحت و رنج اور مسرت و الم کے جذبات فطری ہیں۔ ان کے آثار کا ظہور بھی غیر اختیاری ہے، مگر اس وقت سخت آزمائش تھی۔ ساری کائنات سے منہ موڑا جا رہا تھا۔ اور دونوں باپ بیٹوں کو ایک یگانہ بے ہمتا خلاق و قادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمام بندھن توڑ دینے کو قربان کر کے اسی کی طرف رخ کرنا تھا۔ بس دونوں نے سارے عالم سے منہ موڑا، باپ بیٹے کا رشتہ توڑا، ایک اللہ سے تعلق جوڑا اور ابراہیم نے اسماعیل کو پیشانی کے بل سرنگوں زمین پر لٹا دیا۔ تاکہ ذبح کرتے وقت چہرہ سامنے نہ ہو اور محبت پدری جوش زن نہ ہو سکے اور حکم الٰہی کی تعمیل میں سستی بھی پیدا نہ ہو۔ اس جگہ سدی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اسماعیل کی گردن پر چھری چلائی تھی، مگر چھری نے کچھ نہیں کاٹا کیونکہ درمیان

تا ہے کہ تمنہ حائل ہو گیا، مگر سدی کا یہ قول کسی حدیث سے ثابت نہیں ۔ شاید اسرائیلی روایات پر مبنی ہے جو ناقابل قبول ہے

وَنَادَيْنَٰهُ أَن يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ..... غیب سے ندائے الٰہی آئی یا پس پردہ کسی فرشتے نے بحکم الٰہی آواز دی ۔ ابراہیم تو نے خواب پورا کر دیا ۔ یعنی خواب سے جو مقصود تھا وہ پورا ہو گیا ۔ ابن کثیر ۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ابراہیم اور اسماعیل جذباتِ نفسانیہ کی قربانی میں پورے اترے ۔ اللہ نے ان کو دنیا میں دوامی ذکر خیر، نسل کی برکت، عزت، امامت اور آخرت کے درجات عطا فرمائے ۔ یہ ان کی نیکوکاری کا صلہ تھا، اس لئے فرمایا ہم یونہی اہل احسان کو اچھا معاوضہ دیتے ہیں ۔

احسان کیا چیز ہے ؟ اللہ کی ذات و صفات پر اتنا یقین کرنا کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے یا کم از کم اتنا یقین رکھنا کہ وہ حاضر و ناظر ہے ۔ زبان سے کہنے کو تو ہر شخص اللہ کو حاضر و ناظر کہتا ہے، مگر اگر ایسا قلبی یقین ہو جائے تو پھر کسی گناہ کی جرأت ہی نہ ہو شہنشاہ اعظم، مالک کل، قہار مطلق محیط کائنات اور متصرف خود مختار کے سامنے اور اس کے حکم کے خلاف کرنے کی ہمت کیسے ہو سکتی ہے ۔ پھر اللہ کو حاضر ناظر جاننا تو احسان کا پست ترین درجہ ہے ۔ اونچا مرتبہ تو اول ہے ۔ جس پر دونوں بزرگ فائز ہو چکے ہیں اسی لئے تو فرمایا ۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْبَلَٰٓؤُا۟ ٱلْمُبِينُ ۝ بڑا امتحان یا انعام تھا ۔ بلا کے دونوں معنی آتے ہیں ۔ آزمائش اور انعام اول سیاق کلام کے مناسب ہے اور دوسرے میں خاص لطافت ہے ۔ دونوں معنی ہو سکتے ہیں ۔ امتحان بھی ایسا تھا کہ کسی باپ بیٹے کا آغاز آفرینش سے ایسا نہ ہوا اور انعام بھی ایسا تھا کہ کسی کو نہیں ملا ۔ دنیا کی تمام کتابی اقوام اتباع ابراہیمی کی مدعی ہیں ۔ یہودی بھی، نصاریٰ بھی اور مسلمان بھی ۔ ہر گروہ ابراہیم کی ملت پر چلنے کو باعث فخر جانتا ہے ۔ یہ انعام کس کو نصیب ہوا ۔

وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اسماعیل کو ذبح کرنا چاہا تو فوراً پیچھے سے آواز آئی ۔ ابراہیم تو نے خواب کو سچا کر دکھایا ۔ ابراہیم نے فرشتہ کی آواز سن کر منہ پھیر کر دیکھا تو ایک سفید مینڈھا کھڑا پایا جس کے سینگ لمبے اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں ابن عباس نے فرمایا مجھے خوب معلوم ہے کہ ہم لوگ قربانی کے لئے ایسے ہی مینڈھے تلاش کیا کرتے تھے (احمد باسانید صحاح) عثمان بن طلحہ کا قول ہے کہ مجھے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جس وقت میں کعبہ کے اندر داخل ہوا تھا تو میں نے مینڈھے کے سینگ دیکھے تھے ۔ میں ان کے ڈھانکنے کے لئے تم سے کہنا بھول گیا ۔ اب تم ان کو ڈھانک دو ۔ کیوں کہ بیت اللہ کے اندر نمازی کے دل کو لبھانے والی کوئی چیز نہ ہونی چاہیئے (ذکر ابن کثیر بروایت احمد) ۔ امام احمد نے سفیان بن عیینہ سے کہا کہ مینڈھے کے سینگ برابر خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے ۔ جب کعبہ فتنہ حجاج ثقفی میں جلا تو سینگ بھی جل گئے ۔ (رواہ احمد) مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جس مینڈھے کی قربانی کی تھی اس کے سینگ حجاج کے زمانے تک کعبہ میں آویزاں تھے ۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى ٱلْءَاخِرِينَ ۝ سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ۝ حضرت ابراہیم کا امتحان ہو چکا ۔ وہ امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ تو ان کو علاوہ اجر آخرت کے دنیا ہی میں دو انعاموں سے سرفراز کیا گیا ۔

(۱) حضرت ابراہیم کا ذکر خیر دنیا کے ہر اہل کتاب کی زبان اور قلم پر جاری ہے ۔ اور قیامت تک جاری رہے گا ۔ یہودی ہوں یا عیسائی سب ابراہیم کے لئے دعا کرتے ہیں ۔ اور مسلمانوں کے لئے تو ہر نماز میں آپ کا ذکر کرنا لازم ہی ہے ۔ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَعَلَىٰٓ ءَالِ إِبْرَٰهِيمَ ۔ اللہم بارک ... كَمَا بَارَكْتَ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَعَلَىٰٓ ءَالِ إِبْرَٰهِيمَ کون سا مسلمان نماز میں نہیں پڑھتا ۔ اور کون سا اہل کتاب ابراہیم حنیف کی ملت پر ہونے کا مدعی نہیں ہے ۔

مذکورہ بالا آیت میں سلام علی ابراہیم ترکنا کا مفعول ہے ۔ یعنی یہ ان لوگوں کا مقولہ ہے جو حضرت ابراہیم کے بعد آنے والے تھے ۔ مطلب یہ کہ ابراہیم کے بعد آنے والی نسلیں ابراہیم پر سلام بھیجیں گی اور یہ اللہ نے ابراہیم کو نوازنے کا یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رکھا ۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ یہ جملہ ترغیبی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت کا حصر صرف ابراہیم ہی پر نہ تھا ۔ جو نیکوکار اہل احسان ہوں ان کو یونہی سرفراز کیا جاتا ہے ۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ یہ دوسرے انعام کا ذکر ہے ۔ پیرانہ سالی کے زمانے میں جب کہ طبعی نقطۂ نظر سے اولاد کا ہونا ناممکن تھا، اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت ملی ۔ جس طرح اسماعیل ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اسی طرح اسحاق سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ سارہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں ۔ اولاد کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی ۔ فرشتہ نے آکر بشارت دی تو سارہ کو تعجب ہوا ۔ فرطِ تعجب اور انتہائی مسرت سے اپنا منہ نوچ لیا ۔ اور کہنے لگیں کیا بانجھ بڑھیا کے اولاد ہوگی ۔ فرشتہ نے کہا ہاں اللہ کا یونہی حکم ہے ۔ چنانچہ اسحاق پیدا ہو گئے ۔ اسماعیل کی نسل سے حجازی اور یمنی عرب ہوئے جن میں فخرِ کائنات سید الموجودات بھی ہوئے ۔ اسحاق کی نسل سے تمام بنی اسرائیل ہوئے جن میں لاتعداد انبیاء ہوئے ، بادشاہ ہوئے ۔ آج جس قدر ابراہیمی نسل دنیا میں ہے اور کسی کی نہیں ۔ جس طرح اسماعیل حلیم اور صالح تھے اسی طرح اسحاق بھی نبی اور مومن تھے ۔ یعنی کمال ایمان کے درجہ میں فائز تھے ، اس لئے فرمایا نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ نبی تھے اور صالح تھے ۔ عقائد اعمال بلکہ تمام عمل اور فکری قوتوں میں صلاح تھی ۔ ۔ ۔ نہ تھا پھر ان دونوں بھائیوں کو خدا تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی ۔ اسماعیل اور اسحاق کی نسل سے عالم کی بیشتر آبادی ہوئی ۔ عظیم الشان تمدن ، بہت بلند تہذیبیں اور زبردست حکومتیں بنیں اور آج تک ہیں ۔ مگر دنیاوی شان و شوکت ، تعداد کی کثرت ، جسم کی طاقت ، دماغ کی فطانت ، تہذیب کی بلندی ، مدنیت کی ہمہ گیری سب فضول ہیں ۔ اگر اعمال و افکار میں حسن معنوی نہ ہو صلاح و استقامت نہ ہو ، اس لئے فرمایا ۔ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ ۔ دونوں کی نسل میں کچھ لوگ نیکوکار خوش اطوار ہیں ۔ اور کچھ لوگ ناحق کوش اور برکت الٰہیہ سے محروم ہیں ۔

مقصودِ بیان

حضرت ابراہیم کے پورے قصہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنی ہر چیز سے اولیٰ ہے ۔ اس قصہ میں دونوں گروہوں کے لئے نصیحت ہے ۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ تم کو ہر شیطانی طاقت کا مقابلہ جفاکشی ، استقلال ، اور استقامت سے کرنا چاہیئے ۔ حق کے راستے میں کوئی بھی آجائے اس کو ہٹا دو ۔ باپ ہو یا بھائی ، کنبہ برادری ہو یا ہم قوم اور ہم وطن ۔ یہاں تک کہ شہنشاہِ وقت بھی ہو تو اس کی پرواہ نہ کرو ۔ دولت و جاہت ، سیادت ، طمع مال اور خوفِ جان حق کے مقابلے میں ناقابلِ التفات چیزیں ہیں ۔ بلکہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے عزیز ترین متاع ، یہاں تک کہ اپنے جگر پاروں کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرو اور یقین رکھو کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہونے کے بعد آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ترقی ، عزت اور حکومت تم کو ہی ملے گی اور قیامت تک تمہارا ذکر خیر باقی رہے گا ۔ محبتِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ کے حصول کے لئے تیار رہو ۔ عاشق ہو تو تقاضائے عشق کو پورا کرو ۔ ممکن ہے کہ اس طرف بھی اشارہ ہو کہ آئندہ تم کو دوست احباب اور شاید اہل و عیال کو چھوڑ کر ترکِ وطن کرنا پڑے گا ۔ کافروں کی بیش از بیش طاقت سے ٹکرانا ہوگا ۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے بادشاہوں سے مقابلہ کرنا ہوگا ۔ قید و بند اور جدال و قتال کی تکلیفیں اٹھانی ہوں گی اور بالآخر مصائب کا دور ختم ہوگا اور عیش کا زمانہ آئے گا ، مگر امتحان کا سلسلہ ختم نہیں ہو جائے گا ۔ سختی اور نرمی ، سردی اور گرمی ، محکومیت اور حکومت ، افلاس و دولت ہر حالت میں تمہاری آزمائش کی جائے گی جس طرح ابراہیم کی کی گئی ، مگر تم ثابت قدم رہنا ۔ تمہارے پائے استقلال کو لغزش نہ ہونے پائے ۔ نہ مصائب سے گھبرا جانا نہ عیش میں سرمست ہو جانا ۔ سخت ترین شدائد پر بھی ماتھے پہ بل نہ آئے ، پیشانی پر شکن نہ پیدا ہو ، دل میں میل نہ ہونے پائے ۔ خوشی خوشی ہر مصیبت کو راحت اور دکھ کو سکھ سمجھ کر برداشت کرنا اور راحت میں غافل نہ بن جانا ۔ رہے کافر تو ان کے لئے اس طرح درس و عظ دیا گیا کہ تم ملتِ ابراہیمی اور ملتِ اسماعیل پر چلنے کے مدعی ہو ۔ حالانکہ تم مشرک ہو ، باطل پرست ہو ۔ انہوں نے غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑا تھا ۔ اور تم نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف رخ کیا ۔ انہوں نے راہِ خدا میں جان مال اور قوم و وطن کی بھی پرواہ نہ کی اور تم دوسرے باطل معبودوں کی راہ میں ہر طرح کی قربانی کرتے ہو ۔ تم طریقۂ ابراہیمی پر کس طرح ہو سکتے ہو ۔ تم کو دعوتِ اسلام بری معلوم ہو سکتی ہے ، مگر وہ نئی نہیں جو مسلک ابراہیم و اسماعیل کا تھا وہ مسلک بانی اسلام کا ہے جو انہوں نے کہا تھا وہی یہ کہتے ہیں جو انہوں نے کیا تھا وہی یہ کرتے ہیں ۔ وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نوح اور ابراہیم کے اصولِ دین ایک ہی ہیں ۔ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ یہ لفظ تعلیم دے رہا ہے کہ جس دل میں اللہ کی محبت ہو اور کچھ نہ ہو وہ قلبِ سلیم ہے ۔ حضرت ابراہیم کا اپنی قوم کو صرف نصیحت کرنا اور موقع پا کر بتوں کو توڑ ڈالنا بتا رہا ہے کہ اہلِ حق باطل پرستی کو آنکھوں

سے نہیں دیکھ سکتے۔ مجبوری کے وقت زبان سے کہتے ہیں اور موقعہ ملنے پر ہاتھ کو کام میں لاتے ہیں۔ تاکہ ہر ممکن طریقے سے اعلانِ حق ہو جائے۔ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ کامل حق پرست انسان انجام کار غالب رہتا ہے اور بڑی سے بڑی شیطانی طاقت اس کے مقابلے میں ناکام رہتی ہے۔ سیہدین سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت یعنی رہنمائی اور رہبری اور منزل پر پہنچانا [illegible] اللہ کے اختیار میں ہے۔ راہِ زندگی اور راہِ معرفت دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ الخ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اسلاف پر فخر بے سود ہے۔ باپ سب کے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق تھے، مگر باہم فرق اپنی اپنی رفتارِ زندگی کا ہے۔ کوئی اچھا ہے کوئی برا، کوئی نیک کوئی بدکار

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۞ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۞

اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر بھی احسان کیے اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑے غم سے نجات دی

وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۞ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۞ وَهَدَيْنٰهُمَا

اور ہم نے ان سب کی فرعون کے مقابلہ میں مدد کی یہی لوگ غالب آئے اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب دی اور ان دونوں کو

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِى الْاٰخِرِيْنَ ۞ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۞

سیدھے راستے پر قائم رکھا اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۞ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک دونوں وہ ہمارے کامل ایماندار بندوں میں سے تھے

تفسیر نیکوں کی بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے اور بدوں کی بھی۔ بدوں کی آزمائش مصائب میں مبتلا کر کے بہت کم ہوتی ہے عموماً ان کا امتحان ڈھیلی رسی چھوڑ کر ہوتا ہے۔ ہر نعمت و راحت کی افزائش ہوتی ہے۔ دولت میں وسعت، عزت و جاہ میں ترقی اور اولاد کی بہتات ہوتی جاتی ہے جسمانی صحت بھی نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی حکومت بھی ہمہ گیر میسر آ جاتی ہے اور فرعون کی طرح آخری نتیجہ ہوتا ہے۔ رہے اللہ کے نیک بندے ان کو مدتوں تک دکھ اٹھانے پڑتے ہیں پیہم مصائب آتے ہیں۔ بیماری، تنگدستی، [illegible] خانہ بدوشی، معاشی تنگی، دنیاداروں سے ان کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور جب وہ بتوفیق الٰہی ہر مصیبت پر ثابت قدم رہتے اور ہر دکھ کو جھیل چکتے ہیں تو غیبی امداد کی بارش ہونے لگتی ہے۔ قدسی انوار ان کی روحوں کو جگمگا دیتے ہیں اور فیوض الٰہیہ سے ان کے دماغ اور ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کو سیدھا راستہ مل جاتا ہے۔ وہ آثارِ الٰہیہ اور افعالِ الٰہیہ اور ذاتِ الٰہیہ کی سیر کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس براہِ راست الہام یا وحی کی شکل میں غیبی پیام آنے لگتے ہیں۔ ان کو ایسا جاہ و جلال اور قوتِ دفاع عطا کی جاتی ہے کہ ان کے مقابلے میں بڑے بڑے سرکش، پرجبروت بادشاہوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں اور ایسی دانش و فہم مرحمت ہوتی ہے کہ بڑی بڑی گمراہ قوموں کی وہ قیادت کرنے اور ان کو راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ ورنہ آدمی کی کیا طاقت ہے اور کیا مجال ہے کہ راہِ راست پر آ سکے اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہ سکے اور اپنے کو عنایتِ الٰہیہ کا مستحق ثابت کر سکے۔ یہ محض اللہ کا احسان ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی طاقت اور ہمہ گیر عقل و ذکا اور ناقابلِ مغلوبیت شوکت و جلال عطا فرماتا ہے اور وحی و الہام کے ذریعہ سے ہدایت کے پیام دیتا اور اصلاحِ قوانین نازل فرماتا ہے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دو بزرگ ہستیاں اپنے اوصاف کی حامل تھیں۔ حضرت موسیٰ کی پیدائش کسی مخصوص طرح سے ہوئی۔ پرورش کس طرح

ہوئی، تربیت کیسے پائی پھر مصر سے کس طرح بے بسی اور انتہائی تنہائی کی حالت میں بھاگے۔ لق و دق صحرا میں کس طرح گھومتے پھرے بیار ناچار غریب الوطن اور بے یار و مددگار رہے تھے مدتوں حضرت شعیب کی بکریاں مصر کے شاہزادے نے چرائیں۔ لیکن جب آزمائش کا دور ختم ہو گیا تو نبوت ملی، رسالت ملی، فرعون پر غلبہ حاصل ہوا۔ روشن کتاب ملی۔ بنی اسرائیل کی ہدایت، اور قیادت کرنے کی طاقت ملی۔ یہ سب کچھ اللہ کی عنایت سے ملا۔ ورنہ موسیٰ اور ہارون معمولی اسرائیلی تھے جن کی لاکھوں تھے یہ دونوں بھائی بھی تھے

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ حضرت یوسف کے بعد حضرت یعقوب کی اولاد میں سے حضرت موسیٰ ہی پہلے پیغمبر گزرے ہیں۔ آپ سے قبل کوئی پیغمبر بنی اسرائیل میں نہ تھا۔ پھر پیغمبر بھی بڑے شکوہ و سطوت کے اور اس مرتبہ اور محبت کے کہ آپ ہی کی درخواست پر آپ کے بھائی ہارون کو بھی پیغمبر بنا دیا گیا۔ ان دونوں پیغمبروں پر اللہ کا کتنا بڑا احسان تھا۔ بنی اسرائیل کسی ذلت و خواری میں تھے۔ آپ کی پیدائش بالکل پوشیدہ رکھی گئی کہ کہیں ظالم فرعون کو نہ خبر ہو جائے اور وہ معصوم جان کو ستم گار ہاتھوں سے قتل کر دے۔ صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ صندوق بہتا بہتا فرعون کے محل میں پہنچا۔ فرعون کی بیوی نے نکلوا کر بیٹا بنا لیا۔ ناز و نعمت میں شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ پرورش ہونے لگی۔ اسی عیش میں جوان ہوئے۔ ایک قبطی کو سر راہ مار دیا۔ اگرچہ غیر ارادی قتل تھا، مگر ناحق تھا۔ فرعون پہلے سے بدگمان تھا۔ حیلہ ڈھونڈ رہا تھا۔ شاہی گرفت سے ڈر کر بھاگ نکلے۔ حضرت شعیب کے پاس پہنچے۔ ان کی لڑکی سے نکاح ہوا۔ بارہ سال وہاں رہے پھر لوٹ کر آئے تو طور پر نبوت ملی۔ خطاب الٰہی سے سرفراز ہوئے۔ فرعون کے پاس جانے اور اس کی ہدایت کرنے اور بنی اسرائیل کو رہا کرانے کا حکم ہوا اور آپ نے بھائی کے لئے نبوت کی درخواست کی تو ان کو بھی ذیلی نبی بنا دیا گیا۔ کتنا بڑا احسان ہے کہ دشمن بادشاہ کی گود میں عیش و راحت کے ساتھ جوانی تک پرورش کرائی۔ پھر نبی زادی سے نکاح کرایا۔ بارہ سال نبی کی صحبت میں رکھا اور روح مبارک پر فیضِ قدس جاری رکھا۔ آخر میں نبوت عطا کی اور نبوت بھی کس جلال اور کیسے جمال کی کہ خدا سے ہم کلامی کا فخر عطا کیا گیا۔

وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے بنی اسرائیل بڑی مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ فرعون شاہ مصر طرح طرح کی تکلیفیں ان کو دیتا تھا۔ وہ مصر سے ہجرت کر کے اپنے آبائی وطن یعنی شام کو جانا چاہتے تھے تو اس کی اجازت بھی نہ تھی۔ بنی اسرائیل کیلئے کوئی شہری قانون نہ تھا۔ تجارت، ملازمت وغیرہ کی راہیں بند تھیں۔ البتہ خدمت گاری کی سبیل کھلی تھی اور صرف ان ہی مصائب پر بس نہ تھا۔ بلکہ نجومیوں نے اس پاگل جاہل سے کہہ دیا تھا کہ تیری حکومت کی بربادی ایک اسرائیلی کے ہاتھوں ہو گی جو عنقریب پیدا ہونے والا ہے، اس لئے اس نے نمبر میں عام حکم دے دیا کہ جو اسرائیلی لڑکا پیدا ہو اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس ظالمانہ حکم کے سبب ہزاروں اسرائیلی بچے تہ تیغ ہو گئے اور بکثرت ننھی ننھی روحیں ظلم کا شکار ہو گئیں۔ حضرت موسیٰ پیدا ہو گئے۔ جوان ہوئے، مدین گئے، واپس آئے۔ نبوت ملی اور بحکم الٰہی فرعون کی ہدایت کے لئے مصر آئے۔ مقابلہ ہوا۔ فرعون کو ہر مقابلوں میں زچ ہونا پڑا۔ غضب ناک ہو کر بنی اسرائیل پر مزید ظلم کرنے لگا۔ بیچارے اسرائیلی ناقابل برداشت دکھ اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گئے۔ کہنے لگے حضرت ہم برسوں سے آپ کی پیدائش اور بعثت کا آسرا لگائے ہوئے تھے اور آپ کے دم سے ہماری رہائی کی امید وابستہ تھی، مگر ہماری آس یاس سے بدل گئی۔ ہم پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس سے پہلے ہی ہماری حالت کچھ بہتر تھی۔ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ ایک مقرر تاریخ پر سب اسرائیلیوں کو پوشیدہ طور پر نکال لے جاؤ گویا اجتماعی طور پر قانون شکنی کرنے کا یہ پہلا حکم تھا۔ حسب الحکم حضرت موسیٰ سب کو لے کر مصر سے چل دیئے۔

وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ صبح کو قبطیوں کو معلوم ہوا تو فرعون نے لشکر کشی کا حکم دے دیا اور جرار فوج لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے پہنچا تو اسرائیلیوں کو دریا کے پار دیکھ کر خود بھی عبور کا پورا ارادہ کر لیا۔ اور چونکہ دریا خشک ہو گیا تھا۔ اس لئے ہمت میں مزید پختگی پیدا ہو گئی۔ سب کو لے کر دریا میں گھس پڑا۔ ایک لہر آئی، پانی برابر آ گیا۔ سب غرق ہو گئے۔
بقول اہل تاریخ کے مصر کے تمام باغات اور محلوں کے وارث اسرائیلی ہو گئے اور قبطیوں پر اسرائیلیوں کا غلبہ ہو گیا۔

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ اسرائیلیوں کے تعامل کے لئے دستور العمل کی ضرورت تھی جب بنی اسرائیل موسیٰ کے ساتھ شام آ رہے

تھے۔ تو راستہ ہیں کوہ طور کی طرف سے الواح تورات عطا کی گئیں۔ بڑی تاریکی کا زمانہ تھا۔ بنی اسرائیل بہت ضعیف العقیدہ اور فاسد الاعمال ہو گئے تھے۔ معمولی تنبیہی احکام ان کی درستگی کے لئے کافی نہ تھے۔ واضح مفصل قانون کی۔ تورات دونوں اعتبار سے روشن تھی۔ لکھی لکھائی اتری تھی۔ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کی ہدایات روشن تھیں۔ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لانے والی تھیں۔ غلط عقائد اور بداعمالی کی کثافت دور کر کے دل کو روشن اور روح کو صاف کرنے والی تھیں۔ یہی وہ عظیم الشان احسان تھا جو حضرت موسیٰ سے پہلے کسی قوم پر نہیں ہوا ہو۔ تورات کی طرح کوئی کتاب اس سے پہلے نہیں بھیجی گئی۔ وہ تبیان تھی، فرقان تھی، عقائد اور اعمال کی اصلاح کے لئے اس میں مفصل واضح قوانین بیان کئے گئے تھے۔ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ سیدھا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اللہ تک پہنچانے والا صرف انبیاء کا راستہ ہے۔ یہی مقرب راستہ اللہ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو بھی بتایا اور دونوں بزرگوں کی وساطت سے بنی اسرائیل کو بھی بظاہر یہ احسان موسیٰ اور ہارون پر تھا، مگر واقع میں سب قوم پر تھا۔ صالحین، شہداء اور صدیق جتنے بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے وہ سب انہی دونوں بزرگوں کے طفیل میں۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔ حضرت موسیٰ اور ہارون کا ذکرِ خیر عزت اور وجاہت قیامت تک اہلِ کتاب کی زبانوں، تحریروں اور دلوں میں قائم رہے گی۔ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان سب دونوں بزرگوں کے لئے دعائے خیر کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ خصوصاً مسلمان تو ہمیشہ موسیٰ اور ہارون کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہتے اور لکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ دنیا میں اہلِ احسان کو یونہی جزا دیتا ہے۔ قیامت تک ان کا ذکرِ خیر اور درود و سلام نیک انسانوں اور فرشتوں کی زبانوں پر جاری رہے گا۔

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اس آیت میں عباد کی نسبت اپنی ذات کی جانب محبت، عظمت اور خصوصیت کے اظہار کے لئے ہے یوں تو ادنیٰ و اعلیٰ ہر ایک مومن کہلایا جاتا ہے جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے اس کا شمار اہلِ ایمان میں ہے، مگر ایمان ایمان میں بڑا فرق ہے۔ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ایمان کے اجزا نہیں۔ ایمان کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ایمان بقول اشاعرہ دل کی ایک بسیط ناقابلِ تجزی کیفیت کا نام ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ مگر اس کے باوجود تمام کیفیات کی طرح ایمانی کیفیت میں بھی قوت، ضعف، بلندی پستی کا نام ہے۔ تصدیق و وثوق یا یقین میں ہبوط و صعود اور تنزل و ترقی ضرور ہوتی ہے۔ پس حضرت موسیٰ اور ہارون بھی مومن تھے اور اللہ کے بندے بھی، مگر عبدیت کی انتہا پر پہنچے ہوئے اور ایمان کی آخری چوٹی پر فائز۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ دونوں بلاشک و شبہ ہمارے خاص محبوب بندوں میں سے تھے۔

ولقد مننا علی موسیٰ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ کی پیدائش سے لے کر آخری روز تک ہر نعمت محض عطیہ

مقصود بیان یعنی اللہ کے انعام میں بندہ کے استحقاق پر کوئی دخل نہیں۔ پرورش، عزت، عطاء عزت و جاہ، حفظ جسمانی، ہدایت، معرفت یہاں تک کہ نبوت بھی وہبی چیز ہے ان میں سے کوئی چیز کسبی نہیں۔

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ۔ تورات اگرچہ موسیٰ پر نازل ہوئی، مگر ہارون بھی چونکہ اس وقت نبی ہو چکے تھے۔ اگرچہ ذیلی تھے اور ان کی زندگی کا دستور العمل بھی تورات ہی تھی، اس لئے دونوں کو موردِ تورات قرار دیا گیا۔ گویا موسیٰ پر بلاواسطہ توریت نازل ہوئی اور ہارون پر موسیٰ کی وساطت سے۔ ایک بات یہ بھی آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ تورات بالکل واضح، روشن اور پرنور کتاب تھی۔ یعنی توریت سے پہلے جو صحیفے نازل ہوئے تھے وہ مکمل دستورِ زندگی نہ تھے اور توریت کامل دستورِ زندگی تھی۔ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) موسیٰ اور ہارون کا راستہ کوئی جدید راستہ نہ تھا۔ وہی سیدھا راستہ تھا۔ جو گذشتہ انبیاء کا تھا۔ اس لئے الصراط الف اور لام کے ساتھ فرمایا۔ (۲) ہدایت کرنا اللہ کا کام ہے۔ انبیاء کی روحیں اگرچہ تخلیقی طور پر بہت روشن ہوتی ہیں۔ اور ان کی فطرت سادہ اور قلبِ سلیم ہوتا ہے، مگر راہِ حق بتانا اور بتا کر راہِ حق پر چلانا اور چلا کر منزل پر پہنچانا اللہ ہی کا کام ہے۔ پورے قصے میں مسلمانوں کو مصائب پر صبر رکھنے کی تلقین ہے غلبۂ حق کے امید رکھنے کی تعلیم ہے۔ کافروں کی بربادی اور زبوں حالی کی پیشین گوئی میں حق و باطل کے مقابلے میں تصویر کشی کی ہے اور اہلِ حق کے لئے راحت ہے وغیرہ

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ أَتَدْعُونَ بَعْلًا

اور الیاس بھی (بنی اسرائیل کے) پیغمبروں میں سے تھے جب انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے کیا تم بعل کو پوجتے ہو اور

وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۝ فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ

اس کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے اللہ معبود برحق ہے تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے باپ داداوں کا بھی رب ہے سو ان لوگوں نے ان کو

لَمُحْضَرُونَ ۝ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ

جھٹلایا سو وہ لوگ پکڑے جائیں گے مگر جو اللہ کے خالص بندے تھے اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ آل یاسین

إِلْ يَاسِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَ

پر سلام ہو ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بے شک وہ ہمارے کامل ایماندار بندوں میں سے تھے اور

إِنَّ لُوطًا لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ۝

بیشک لوط بھی پیغمبروں میں سے تھے جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا کے یعنی ان کی زوجہ کہ وہ رہ جانے

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ۝ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ ۝ وَبِاللَّيْلِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ ع ۴ ۲۵ ۸

والوں میں رہ گئی پھر ہم نے سب کو ہلاک کر دیا اور تم تو ان کے دیار و ساکن صبح ہوتے اور رات میں گزرتے ہو تو کیا پھر بھی نہیں سمجھتے ہو

تفسیر

خالق اور مخلوق عابد اور معبود یعنی انسان اور خدا کے درمیان خاص تعلق ایسا ہے جو دوسری کائنات اور خدا کے درمیان نہیں ہے۔ اللہ کی ذات میں تمام صفات کمالیہ موجود ہیں۔ وجود اور علم سے لے کر تربیت اور وجود تک ہر صفت بدرجۂ اکمل اللہ میں متحقق ہے۔ کچھ ذاتی صفات ہیں کچھ ذاتی صفات ہیں کچھ فعلی۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ اللہ کی ہر صفت کا کچھ نہ کچھ پرتو ہر انسان پر پڑا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں ہر صفت کامل ہے یہاں ناقص۔ وہاں قدیم یہاں حادث۔ وہاں واجب یہاں ممکن۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس فرق کو نہ سمجھتے ہوئے بعض بیوقوف آدمی خدائی کا دعوی کر بیٹھتے ہیں۔ ان کو اپنی ہستی سے بڑی کوئی مخلوق نظر نہیں آتی۔ سارے سنسار میں سے کسی میں بھی ان کو اپنے سے زیادہ طاقت اور خود مختاری نہیں دکھائی دی۔ اس لئے ان کے جذبۂ انانیت نے ان کو یہ وحدی ولافیری کہنے پر آمادہ کیا۔

یوں تو تمام آدمیوں پر اللہ کی صفات کا پرتو پڑا ہے اور کم و بیش ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصہ ملا ہے۔ مگر آدمی آدمی میں بھی فرق ہے۔ بعض آدمیوں کا فطری جوہر بہت زیادہ روشن، طاقتور اور صاف ہوتا ہے۔ ان کی ذات میں صفات الٰہیہ کی جلوہ اندوزی کی بدرجۂ کامل صلاحیت ہوتی ہے جس طرح ہر نوع کے افراد میں باہم نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایسا ہی انسانی افراد میں بھی بڑا تفاوت ہے۔ نباتات ہوں یا حیوان ہر نوع کے بعض اشخاص بلند ترین درجہ رکھتے ہیں اور بعض سب سے نیچے ہوتے ہیں۔ مثلاً انار، سیب، کیلا، امرود وغیرہ یا گلاب، چمیلی، جوہی، بیلا وغیرہ پھلوں اور پھولوں کی مختلف نوعیں ہیں۔ اور ہر نوع کے کچھ پھل اور پھول ذاتی طور پر بہت ہی اچھے اور اعلیٰ ہوتے ہیں اور کچھ بہت ہی برے اور ادنیٰ۔ انار قندھاری کی اعلیٰ قسم جنگلی انار سے کتنے ہی درجہ بلند ہوتی ہے۔ خود رو دیسی بدمزہ کیلے سے چینی کیلا بہت ہی ممتاز ہوتا ہے۔ یہ ہی حال حیوانوں کا سمجھو بلکہ ہر حیوانی نوع کو اسی پر قیاس کر لو۔ پس دوسری انواع کی طرح انسانی نوع کے افراد میں باہم اتنا تفاوت ہے کہ ادنیٰ ترین اور

اعلیٰ ترین انسانوں کو دیکھ کر دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ پست ترین آدمی شاید انسان نہیں کوئی جانور ہے یا اعلیٰ ترین انسان آدمی نہیں کوئی اور بالا مخلوق ہے۔ پس نوعِ انسانی کے اعلیٰ ترین افراد کا خطاب انبیاء ہے۔ انبیاء باوجود باہمی تفاوت اور مرتبہ کی کمی بیشی کے سب کے سب صفاتِ الٰہیہ کے مظہر اور نورِ قدرت کے آئینے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے تمام انبیاء میں اللہ کی تمام صفات ایک جیسی پرتو انداز اور نمودار نہیں ہوتی ہیں بلکہ کسی میں کسی صفت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے۔ اور کسی میں کسی صفت کا۔ اللہ کی ذات مختلف صفات کی حامل ہے وہ رحیم و کریم بھی ہے اور قہار و ذو الجلال بھی وہ علیم و رؤف بھی ہے اور صاحبِ بطش بھی۔ پس مختلف انبیاء ظہورِ صفات کے تفاوت کی وجہ سے مختلف اوصاف کے حامل تھے۔ کسی میں رحم، حلم اور رافت کا پرتو زیادہ تھا۔ قوم نے ان کو کتنی بھی تکلیفیں دیں، دکھ پہنچائے، مگر ان کے جذبۂ کرم اور داعیہ حلم نے ان کو اجازت نہ دی کہ قوم کو تباہ کر دیں یا قوم کی بربادی کی خواہش اللہ سے کریں اور کسی نبی میں قہر و جلال کا ظہور زیادہ تھا، انہوں نے قوموں کے لئے تباہی کی خواہش کی اور ان کی بددعا سے سرکش کافر ہلاک کر دیئے گئے۔ حضرت الیاس اور حضرت لوط میں بھی فرق تھا۔ الیاس کو قوم نے سچا نہ مانا اور تجربہ و مشاہدہ کے بعد بھی ان کی اطاعت نہ کی بلکہ الٹے ان کی جان لینے کے درپے ہو گئے تو آپ تنگ آ گئے، مگر بددعا نہ کی ہدایت کی برابر کوشش کرتے رہے یہاں تک کہ خود واصل بحق ہو گئے۔ حضرت لوط کسی قدر پُر جلال آدمی تھے۔ انہیں قہاری کی صفت کا پرتو زیادہ تھا۔ اس لئے سرکش ملعون قوم ان کے مقابلے پر تباہ ہو گئی۔ اگرچہ خود آپ نے بددعا نہ کی، مگر ناخوش ہو کر اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی نجات اور خلاصی کی دعا کی۔ گویا آپ کو دکھ رہا تھا کہ اس ملعون قوم پر عذاب آئے گا، اس لئے آپ نے سب کو ان کی حالت پر چھوڑا اور اہلِ ایمان کے علیحدہ ہو جانے کی استدعا کی۔

تحلیلِ اجزاء وَاِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ یہ چوتھا قصہ حضرت الیاس کا ہے۔ آپ کی پیغمبری بھی عجب شان کی تھی اور آج تک آپ کی ہستی پردۂ خفا میں ہے۔ کوئی اب تک زندہ کہتا ہے کوئی مُردہ۔ کوئی آسمان پر چڑھ جانے کا قائل ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مقدسہ میں آپ کے متعلق کوئی تفصیل نہیں۔ موجودہ بائیبل کی کتاب السلاطین میں آپ کا تذکرہ موجود ہے اور کچھ علمائے اسلام خصوصاً محمد بن اسحاق اور قتادہ وغیرہ نے بھی پرانی بائیبل یا یہودیوں کی زبانوں سے سن کر آپ کا قصہ لکھا ہے، لیکن قابلِ اعتبار نہ یہ ہے نہ وہ۔ بقول ابن کثیر ہم نہیں جانتے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ قصہ کا جو حصہ توحید کے خلاف نہ ہو ہم اس کو جھوٹا نہیں کہتے۔ کیونکہ ہم کو یہی حکم ہے کہ اس کی تصدیق بھی نہ کریں اور تکذیب بھی نہ کریں اور ہم اہلِ کتاب کا بیان کردہ قصہ بطور اختصار نقل کرتے ہیں۔ پھر بعض علمائے اسلام کے اقوال نقل کریں گے۔

کتاب السلاطین کے سترھویں باب میں حضرت الیاس کے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ جلعاد علاقہ شام کے رہنے والے تھے۔ حضرت عیسیٰ سے تقریباً نو سو دس برس پہلے اسرائیلی بادشاہ اخی اب والی شہر سمرون کے زمانے میں یا ہو نبی کے بعد مبعوث ہوئے۔

دوسری کتاب السلاطین کے پہلے باب میں ہے کہ اخی آب کا بیٹا اخیزیاہ نامی بیمار تھا۔ اس نے عقرون کے معبود بعل زبوب (ایک بت کا نام) کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے چند قاصد بھیجے کہ میں اس بیماری سے اچھا ہو جاؤں گا یا نہیں۔ راستہ میں حضرت الیاس نے بحکم الٰہی قاصدوں سے فرمایا تم جا کر کہہ دو کہ تو نے خدا کو چھوڑ کر بعل سے پوچھا تو اپنے بستر پر مرے گا۔ قاصد بادشاہ نے اس کا حلیہ پوچھا قاصدوں نے کہا اس کے بال بہت تھے۔ چمڑے کے تسموں سے اپنی کمر کسے ہوئے تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ تسبیمی ایلیاہ تھا۔

کتاب السلاطین ۱۷ باب میں یہ بھی ہے کہ الیاس نے اخی آب کے زمانے میں سخت کال پڑنے کی خبر بھی دی تھی۔ آپ کو وادی کریب میں رہنے کا حکم ہوا تھا۔ وادی کریب یردن ندی کے سامنے تھا۔ وہاں صبح شام کوئی شخص گوشت روٹی لا کر دے جاتا تھا۔ آپ اس کو کھاتے اور وادی کا پانی پیتے تھے۔ جب وادی (پہاڑی نالہ) بھی خشک ہو گیا تو حکم ملا اٹھ کر صیدا شہر کو جاؤ وہاں ایک بیوہ تیری پرورش کرے گی۔ الیاس بیوہ کے یہاں پہنچے اور کھانے پینے کو کچھ مانگا۔ اس نے کہا مٹکے میں کچھ آٹا اور لوٹے میں کچھ تیل ہے جس سے ایک ٹکیہ تل جا سکتی ہے۔ آپ نے کہا میرے پاس لاؤ وہ لے آئی اور آپ کی برکت سے پورے قحط کے زمانے تک وہ آٹا اور تیل کم نہ ہوا۔ اس بیوہ کا بیٹا مر گیا۔ آپ کی دعا سے وہ بھی زندہ ہو گیا۔

دوسری کتاب السلاطین کے دوسرے باب میں ہے کہ اخی آب شاہ سمرون نے سینکڑوں نبی مروا ڈالے تھے، مگر اس کا وزیر اعظم عبدیاہ نیک تھا۔ چند انبیاء کو اس نے بچایا تھا۔ بادشاہ کو ایلیا کی تلاش تھی۔ بحکم الٰہی ایلیا ہیں... اخی آب سے ملے اور گفتگو کی۔ بعل کے کئی سو پجاریوں سے مقابلہ ٹھہرا۔ ایلیا غالب آئے کرمل پہاڑ پر مقابلہ ہوا تھا۔ ایلیاہ نے پجاریوں کو وادی قیسون میں لاکر قتل کیا اور بارش کی دعا کی۔ قحط دور ہوا۔ بادشاہ کا ایک وزیر ایزبل تھا جو بہت شریر اور بُت پرست تھا۔ وہ ایلیاہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایلیاہ وہاں سے بیر سبع آئے اور پھر جنگل کو چلے گئے۔ پھر حورب پہاڑ کے کسی غار میں جا چھپے اور کچھ دن بعد حکم ملا کہ دمشق کو جاکر حزائیل کو مسوح کر تاکہ وہ ارام کا بادشاہ ہو اور مسنی کے بیٹے یاہو کو مسوح کر کے اسرائیل کا بادشاہ ہو اور مسقط کے بیٹے الیسع کو مسوح کرکے تیسری جگہ نبی ہو۔ چنانچہ ایلیا نے ایسا ہی کیا۔ پھر الیسع کو ساتھ لے کر اردن پار اترے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ ایک آتشی رتھ آتشی گھوڑے جو تے ہوئے نمودار ہوا اور اس میں بیٹھ کر ایلیا آسمان پر چلے گئے۔

اب ہم اہل اسلام کی بعض کتابوں میں ان تصریحات کو نقل کرتے ہیں جو علمائے اسلام نے قدیم آسمانی کتابوں یا اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے لکھی ہیں۔

وہب بن منبہ نے کہا کہ الیاس بن نسی بن فنحاص بن ہارون بن عمران، حزقیل کے بعد بنی اسرائیل کے پیغمبر ہوئے۔ خطیب نے سراج المنیر میں لکھا ہے کہ حزقیل پیغمبر کی وفات کے بعد بنی اسرائیل میں شرک پھیل گیا۔ شہر بعلبک کی آبادی کے مقام پر پہلے بنی اسرائیل کا ایک شہر آباد تھا جو بعل بُت کی پوجا کرتا تھا۔ اس کے بادشاہ کا نام لاجب تھا۔ بعل بیس گز لمبا تھا۔ اس کے چار سر اور بائیس ہاتھ تھے۔ بُت کے پیٹ کے اندر شیطان گھس کر بولتا اور لوگوں کو گمراہ کرتا تھا۔ اس کے چار سو پچاس پجاری یا خادم تھے۔ حضرت الیاس نے اس قوم کو سمجھایا مگر بادشاہ کے علاوہ کوئی توحید پر نہ آیا۔ اس بادشاہ کی ایک بیوی بازمیل تھی جو نہایت حسین بدکار اور بڑی ظالم تھی اور بادشاہ کی اتنی منہ چڑھی تھی کہ بجائے بادشاہ کے تخت پر بیٹھ کر خود حکم چلاتی تھی۔ شاہی قصر کے قریب ایک اور اللہ کا نیک بندہ رہتا تھا جس کا نام مزدکی تھا مزدکی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ بازمیل کو اس باغ کا لالچ تھا۔ اتفاقاً بادشاہ کہیں جنگ پر گیا تھا۔ بازمیل کو اچھا موقع مل گیا اور اس نے بہانے سے مزدکی کو بلا کر قتل کرا کے اس کے باغ پر قبضہ کر لیا۔ لاجب واپس آیا تو شروع میں بازمیل پر غصہ ہوا، لیکن بالآخر عورت کی مکاری کا شکار ہوکر باغ مذکور پر عورت کا قبضہ جائز رکھا۔ اس وقت حضرت الیاس کو حکم ملا کہ اس بادشاہ کو کہہ دو کہ تم دونوں کی یہ حرکت اللہ کو پسند نہیں تو یہ کرو اور مزدکی کے وارثوں کو باغ اور مقتول کی دیت دے دو۔ لاجب کو یہ پیام پہنچا تو بہت غضبناک ہوا۔ اور حضرت الیاس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ آپ پہاڑ کے ایک غار میں چھپ گئے اور صحرائی پھلوں سے بسر اوقات کرتے رہے۔ سات برس یونہی گزر گئے۔ جب آپ مایوس ہو گئے تو فیا مگا ... کی دعا کی۔ حکم ہوا۔ ابھی زمین کو تیرے وجود سے خالی کرنے کا وقت نہیں آیا۔ الیاس نے عرض کیا قبضہ میں سات برس تک باران رحمت کر دیا جائے۔ اللہ نے تین برس تک باران رحمت پر الیاس کا قبضہ دے دیا اور باران رحمت موقوف ہو گیا۔ قحط کے دوران میں آپ کا گزر ایک بڑھیا کی طرف ہوا۔ اس سے کچھ کھانے کو مانگا۔ بڑھیا نے تھوڑا سا آٹا اور روغن زیتون پیش کیا۔ آپ نے دعا کی تو اس آٹے اور روغن زیتون میں اتنی برکت ہو گئی کہ بڑھیا کے روزانہ کے مصارف سے بھی ختم نہ ہوتا تھا۔ لوگوں نے بڑھیا کی حالت کو تعجب سے دیکھا۔ بڑھیا نے کل ماجرا کہہ سنایا اور سارا حلیہ بتایا۔ الیاس کا گزر ایک اور بڑھیا کی طرف ہوا جس کے شوہر کا نام اخطوب اور بیٹے کا نام الیسع تھا اور بیٹا بیمار تھا۔ بڑھیا نے آپ کو خفیہ چھپا رکھا۔ آپ کی دعا سے اس کا بیٹا اچھا ہو گیا اور فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آیا اور ساتھ ہو لیا۔ اس کے بعد الیاس لوگوں کے سامنے نمودار ہو گئے اور فرمایا اگر تمہارا دین حق ہے اور بتوں کی پرستش صحیح ہے تو تم ان سے پانی برسواؤ ورنہ میں دعا کر کے باران رحمت برسواؤں۔ پجاریوں نے یہ بات مان لی، مگر ان کی دعا سے کچھ نہ ہوا اور الیاس کی دعا سے پانی برسا اور قحط دور ہوا، لیکن بنی اسرائیل کا شرک دور نہ ہوا۔ بالآخر آپ نے قوم بدکار سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جانے کی دعا کی۔ اور پہاڑ کے قریب پہنچے۔ الیسع ساتھ تھے وہاں ایک آتشی سا گھوڑا نمودار ہوا آپ اس پر سوار ہو گئے۔ عالم بالا کو چل دیئے اور الیسع پر چلتے وقت اپنی کملی ڈالتے گئے۔

سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ وہب بن منبہ کے قول کے مطابق خضر کی طرح الیاس کو عمر طویل عطا کی گئی ہے اور وہ قیامت تک زندہ رہیں گے

واللہ اعلم۔ ان نقلوں میں کہاں تک صداقت ہے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ الیاس پیغمبر تھے۔ حضرت عیسیٰ سے پہلے تھے اور ان کی زندگی کا واقعہ عجیب
گذرا ہے۔ اسی وجہ سے خاص طور پر حضرت موسیٰ کے قصہ کے بعد یوشع اور حزقیل وغیرہ انبیاء کا تذکرہ چھوڑ کر حضرت الیاس کا ذکر فرمایا۔
حاصل ارشاد یہ ہے کہ الیاس یقیناً پیغمبر تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو بطور تنبیہ کہا تھا کہ تم ڈرتے نہیں یعنی شرک کرتے ہو اور اللہ کی گرفت کا تم
کو ڈر نہیں۔
اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ۔ اَللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ کس قدر بلیغ پُر استدلال اور اثر آفرین نصیحت
ہے۔ مختصر ترین فقرہ اور معانی خیز ادا۔
حضرت الیاس نے سب سے پہلے قوم کے معبود بعل کا تذکرہ کیا اور فرمایا کیا تم بعل سے دعا کرتے ہو اور اس کو پکارتے ہو۔ یہ استفہام بطور استفسار
نہ تھا کیونکہ بعل کی پرستش کا علم آپ کو پہلے سے تھا بلکہ بطور تعجب تھا یعنی تعجب ہے کہ تم بعل کو پوجتے ہو۔
اس کے بعد فرمایا اور اس احسن الخالقین کو تم نے چھوڑ رکھا ہے۔ جو تمہارا اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد کا رب ہے۔ یعنی ایجاد استقرار
زندگی، بقائے زندگی، لوازم زندگی سب اسی کا عطیہ ہے۔ جب وہ موجود ہے، مربی وہ ہے، خیر و شر نفع و نقصان، موت و زندگی اور ہر حالت
کا مالک وہ ہے، کارساز وہ ہے، قاضی الحاجات وہ ہے، دافع البلیات وہ ہے تو پھر معبود بھی وہی ہے (رب کا نقصان ان تمام معنی کو حاوی ہے)
تعجب ہے کہ کھاؤ اس کا اور گاؤ دوسرے کا۔

ایک شبہ احسن الخالقین کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق بہت ہیں اور اللہ سب سے بہتر خالق ہے۔
(۱) لغت میں خلق کے معنی ہیں اندازہ کرنا۔ اگر کوئی حقیقی اندازہ کے مطابق جوتے کا چمڑا کاٹے تو خلق النعل کہا جاتا ہے پس
لغوی معنی کے لحاظ سے خالق بکثرت ہیں، لیکن اندازۂ الٰہیہ سب سے اعلیٰ، افضل اور صحیح ترین ہے۔ تمام مخلوق کے ارادہ میں کچھ نہ کچھ غلطی ضرور
ہوتی ہے کبھی واقعیت کے خلاف ہوتا ہے، مگر اللہ کا اندازۂ الٰہیہ سب سے اعلیٰ افضل اور صحیح ترین ہے۔ تمام مخلوق کے اندازے میں
کچھ نہ کچھ غلطی ضرور ہوتی ہے، کبھی ہوتی ہے۔ کبھی واقعیت کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر اللہ کا اندازہ صحیح درست اور واقعہ کے مطابق ہوتا ہے۔
جیسا خدا اندازہ کرتا ہے مخلوق کی ہستی ویسی ہی ہوتی ہے
(۲) خالقین سے مراد فرضی خالق ہیں۔ مشرکوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی بارش کا دیوتا ہے، کوئی ہوا کا، کوئی آگ کا، کوئی سردی کا، کوئی گرمی کا۔ یہاں
تک کہ حسن و علم اور مختلف کیفیات کے دیوتا بھی جدا جدا فرض کیے جاتے ہیں۔ پس اگر فرض کر لیا جائے کہ دیوتا اور خالق بکثرت ہیں۔ تب بھی اللہ سب
سے بہتر اور خالق ہے۔ کوئی مختار، متصرف حقیقی اور لوازم ہستی کو پیدا کرنے والا نہیں۔ ہاں اللہ کارساز مطلق، خلاق حقیقی، متصرف علی الاطلاق
اور موجد کل ہے۔
فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۔ جب عقل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور عالم نور کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور
عالم ملکوت سے کوئی تعلق نہیں رہتا تو برہان حق، دلیل صداقت اور حجت یقین آفرین بھی بے سود ہوتی ہے۔ اسی قاعدہ کے تحت قوم الیاس بھی تھی
وہ کور باطن، کور دانش اور سیاہ درون ہو چکے تھے۔ ان کے لئے ہر طرح کی روشنی بے کار تھی۔ نبی جو دلوں کو روشن کرنے کے لئے اللہ کی شمع
ہوتا ہے۔ اس سے وہ نور چینی نہ کر سکے پیغمبر زبان نبی سے جو پیام ہدایت آفرین نکلا اس سے ان کے دلوں کا زنگ دور نہ ہوا۔ بالآخر حضرت الیاس
کو انہوں نے جھوٹا بتایا، مگر اس تکذیب سے کیا حقیقت بدل سکتی تھی۔ آفتاب کے انکار سے کیا آفتاب کی ہستی معدوم ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔
پس انہوں نے اگرچہ توحید اور قیامت کا انکار کیا مگر ان کا انکار بے کار تھا، قیامت ضرور آئے گی۔ سب مُردے زندہ کیے جائیں گے اور سب
کو واحد بے ہمتا لاشریک کے سامنے جانا ہوگا۔ پس یقیناً ان کو بھی پکڑ کر بلایا جائے گا۔ ہاں جو اللہ کے پسندیدہ برگزیدہ بندے ہیں جیسے
الیاس، الیسع وغیرہ ان کو نہیں پکڑا جائے گا یعنی جائیں گے وہ بھی اللہ کے سامنے، مگر عزت کے ساتھ۔ پکڑ کر نہیں لے جائے جائیں گے۔
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ۔ بعد تر

نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں الیاس کو الیاسین ابی کہتے ہیں جس طرح عبرانی زبان میں ایلیاہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اہل عرب اسماعیل کو اسماعین اور میکائیل کو میکائین - اسرائیل کو اسرائین اور سینا کو سینین کہہ دیتے ہیں۔

نوٹ: بعض قراتوں میں الیاسین کی آل یٰسین آیا ہے اور اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یٰسٓ سے مراد ہے حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی اور حضور ﷺ کی آل میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو پیرو ہیں خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء یا عام اہل ایمان، مگر یہ تفسیر کلام کی رفتار اور قرینہ کے خلاف ہے۔ محض حسن ظنی اور عقیدت پر مبنی ہے۔ حضور و آل ﷺ کا تذکرہ اس آیت میں کسی جگہ اشارۃً بھی نہیں ہے، اس لئے قراء اور دوسرے علماء نے آل یٰسین سے مراد اصحاب یٰسین یعنی وہ لوگ جو یٰسین پر ایمان لائے تھے اور آپ کی پیروی کی تھی۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ سے معلوم ہوتا ہے کہ الیاس رسول تھے۔ ایک امر یہ بھی منقح ہوتا ہے کہ نبی اور رسول کا جو فرق مشہور ہے کہ نبی ہر صاحب وحی کو کہتے ہیں اور رسول صرف وہ نبی ہوتا ہے جس پر کتاب بھی نازل ہو۔ یہ قول غلط ہے۔ کیونکہ الیاس مرسل تھے اور کسی کتاب کا آپ پر نازل ہونا ثابت نہیں ہے۔ وَإِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ الآخرۃ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت الیاس نے اول اپنی قوم کو ڈرایا - گویا شرک کے بطلان پر بالاجمال تبصرہ کیا - پھر مدلل بیان کے ساتھ شرک کے غلط ہونے کی تردید کی اور اللہ کی الوہیت پر اس کی تخلیق اور ربوبیت سے ہی استدلال کیا - گویا ربوبیت الٰہیہ کی ناقابل انکار تھی اور ایجاد و تخلیق کا فاعل علی الاطلاق بھی بالاتفاق اللہ ہی تھا اور جب یہ دونوں مقدمات تسلیم شدہ تھے تو الوہیت کی وحدت خواہ مخواہ ماننی پڑتی تھی، مگر حکماء، انبیاء اور دوسرے بزرگ ترجیح ریف مرمنطقی استدلال سے گریز کرتے ہیں اور خطابیات میں وہ چیز بیان کرتے ہیں جو منطقی استدلالات میں کہتے ہیں، اس لئے حضرت الیاس نے عام فہم طریقے سے الوہیت کی یکتائی کو ثابت کر دیا۔ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ سے معلوم ہوتا ہے کہ لمحضرون سے مراد ذلت سختی اور جبر کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش کرنا ہے ورنہ حضور الٰہی میں پیشی تو سب کی ہوگی اچھے ہوں یا بُرے پھر استثناء کی کوئی وجہ نہ تھی - آخری فقرے حضرت الیاس کے متعلق وہی استعمال کئے جو حضرت موسیٰ اور ہارون کے متعلق استعمال کئے تھے - اس سے معلوم ہوا کہ باوجود باہمی تفاوت و درجات کے انبیاء کے درمیان ما بہ الاشتراک ایک مرتبہ ہے یعنی احسان اور کمال ایمان وغیرہ۔

تحلیل اجزاء وَإِنَّ لُوطًا لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ - پانچواں قصہ حضرت لوطؑ کا ہے۔ حضرت لوطؑ کا تذکرہ مفصل طور پر ہم اس کے مقام پر کر چکے ہیں۔ یہاں مختصر طور پر اتنا جان لینا چاہیے کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھانجے یا بھتیجے تھے اور حضرت پر ایمان لائے تھے اور آپ کے ہمرکاب حضرت سارہ کی معیت میں ترک وطن کیا تھا۔ اور حضرت ابراہیم کے حکم سے مصر سے واپسی کے بعد بحیرۂ مردار کی طرف سدوم اور عمورہ وغیرہ پانچ بستیوں کی اصلاح کے لئے گئے تھے۔ آپ کو ذیل پیغمبر بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے آیت بالا میں رسل سے مراد رسل از جانب ابراہیم نہیں بلکہ مرسل من اللہ ہے۔ بحیرۂ مردار کے کنارے کے باشندے بہت بدکار تھے۔ رہزن تھے، سرِ راہ مسافروں کو تنگ کرتے تھے۔ تجارت و زراعت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ لڑکوں سے منہ کالا کیا کرتے تھے بلکہ فطرت کے خلاف اس طریقے کی ایجاد انہوں نے کی تھی۔ اس سے پہلے کوئی واقف بھی نہ تھا۔ حضرت لوط نے ان کو نصیحت کی، انہوں نے مذاق میں آپ کی نصیحت اڑا دی اور طعن اور استہزاء کرنے لگے۔ حضرت لوط نے قوم بدکار سے جدا ہو جانے کی دعا کی۔ عذاب الٰہی آیا۔ علی الصباح فرشتوں نے ساری آبادی کو الٹ دیا اور اوپر سے اظہارِ لعنت کے لئے پتھراؤ کر دیا۔ حضرت لوط کو اہل و عیال سمیت نکل جانے کا پہلے ہی حکم مل چکا تھا۔ مگر آپ کی بیوی بڑھیا کافرہ تھی وہ اپنی قوم سے ملی ہوئی تھی۔ ممکن ہے ظاہر میں ایمان لے آئی ہو اور در پردہ کافرہ ہو۔ اور قوم کی طرف دار ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت کافرہ سے نکاح درست ہو۔ کہا جاتا ہے کہ بڑھیا حضرت کی معیت میں آبادی سے نکلی تھی اور جو لوگ بستی کے اندر باقی تھے ان ہی میں وہ رہ گئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نکل چکی تھی، مگر منہ پھیر کر دیکھتی جاتی تھی اور کافروں کی ہمدردی میں اشک حسرت بہاتی تھی۔ بہرحال حضرت لوط کے ساتھ سب مومن بچ گئے اور بڑھیا چونکہ دل سے یا ظاہری طور سے کافروں کے ساتھ تھی، اس لئے انہی کے ساتھ ہلاک کر دی گئی۔ آیت اذ نجینا واہلہ میں اہل سے مراد وہ تمام مومن ہیں جو حضرت لوط کی نصیحت سے متاثر ہو کر ایمان لائے تھے۔ صرف گھر والے ہی مراد نہیں ہیں۔ یہاں ایک نکتہ سمجھنے کے لائق ہے جب

تک کوئی قوم پیغمبر وقت کی آبروریزی اور قتل وغارت پر تیار نہیں ہو جاتی اس وقت تک اس پر سخت عذاب نہیں آتا۔ دیکھو تو کہ جب تک قریش حضور اقدس کے دشمن جانی نہیں ہوئے تھے اس وقت تک جڑ سے اکھاڑ دینے والا کوئی عذاب نہیں آیا تھا قحط آیا۔ بلائیں آئیں، مگر تباہ کن عذاب نہیں آیا۔ جب قتل پر اتفاق کر لیا اور حضور نے خفیہ ہجرت کی تو عمیر مدر میں سرزمین مکہ صرف اللہ قریش سے محروم ہو گئی۔ اور کوئی نام اور قریشی کافر نہ بچا۔ یہی صورت حضرت لوط کی ہوئی - آپ نصیحت کرتے تھے، کافر سرتابی کرتے تھے۔ مخفی چھوٹے چھوٹے عذاب آتے تھے، مگر ان کی عقل نابینا تھی عبرت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آخر میں جب لوط کی آبروریزی کے درپے ہو گئے اور آپ کے مہمانوں پر دست درازی کا عملی ارادہ کیا تو تباہ کن عذاب آیا۔ وہ لوط کے مہمان نہ تھے فرشتے تھے۔ اتمام حجت کے لئے لڑکوں کی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زمین کا تیزابی مادہ ابل پڑا تھا زمین کے اندر گندک وغیرہ کا قدرتی ذخیرہ جمع تھا۔ وہ زمین کو پھاڑ کر ابھر آیا تھا، اس لئے زمین الٹ گئی تھی اور جس طرح جوالا مکھی پہاڑوں کا اندرونی حرارت کی شدت سے الٹ اڑ کر گرتا ہے۔ اسی طرح اس زمین پر بھی پتھراؤ ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ سب صحیح ہے۔ اگر ہمارا عقیدہ ہے کہ مادی تغیرات بغیر اندرونی غیبی تصرفات کے نہیں ہوتے ہیں۔ مادیات کے گوناگوں تغیرات کا کون انکار کرتا ہے، مگر ہر مادہ کے اندر غیبی حکمران طاقت موجود ہے جو ہر وقت کارفرما رہتی ہے تم اس کو فطرت کہو یا نیچر یا طبائع۔ بہرحال وہ شعور اور قدرت رکھتی ہے۔ اس کو بے شعور کہنا بے شعوری کی بات ہے۔ وہ صاحب شعور وارادہ ہے۔ پس ہر مادی چیز کی اندرونی باشعور صاحب ارادہ مخفی طاقت کارفرمائی کرتی ہے۔ مگر اس کی کارفرمائی اپنے سے بالا ہمہ گیر غیبی طاقت کے زیر حکم ہوتی ہے۔ غیبی کارفرما باشعور صاحب ارادہ طاقتوں کا نام ملائکہ ہے۔ اس کو ہم چند جگہ ثابت کر چکے ہیں اور تمام ملائکہ مالک کے حکم کے تابع ہیں۔ کوتاہ بینش والے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ زمین کے اندر ایک خاص قسم کا گیس جمع ہو گیا تھا۔ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلا اور سطح زمین کے باشندے تباہ ہو گئے، مگر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جناب یہ گیس زمین کے اندر ہی کیوں جمع ہو گیا۔ کیا دوسرے سمندروں کے کنارے نہ تھے۔ پھر قوم سرکش کی آبادیوں کو ہی کیوں اس نے نشانہ بنایا تو وہ جواب دیتے ہیں تو یہ محض اتفاق ہے کبھی کوئی آبادی تباہ ہو جاتی ہے کبھی کوئی۔ گویا اس بیوقوف طبقہ کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں۔ زہریلے مواد کے اجتماع اور خروج کو تو تباہی کی علت قرار دیتا ہے جس کے ہم بھی قائل ہیں۔ یہاں تک تو اس کے قائم کردہ اسباب کی کڑی سے کڑی ملتی ہے اور زنجیر بنتی ہے، مگر اس سے آگے بڑھ کر علل واسباب کی کڑیوں کا سلسلہ یکدم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اپنی لاعلمی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اتفاق کا لفظ بول دیتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب اسباب بتانے میں قاصر ہوں۔ یونہی ہو گیا۔ ہمارے اس مختصر تبصرہ سے واضح ہو گیا کہ سلسلۂ اسباب باہم وابستگی عذاب الٰہی کے نزول کے منافی نہیں۔ ضرور گیس یا زہریلے مواد کے خروج سے قوم لوط تباہ ہوئی، لیکن اس کا خروج فرشتوں کے ہاتھوں سے بحکم الٰہی اس قوم کی بداعمالی کے سبب ان کو ہلاک کرنے کے لئے ہوا۔

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ مکہ والے ایک شام کو تجارت کے لئے جاتے تھے۔ سر راہ بحیرۂ مردار کے کنارے قوم لوط کی الٹی ہوئی آبادیاں پڑی تھیں۔ مکہ والوں کا ادھر سے گذر کبھی صبح کو کبھی شام کو ہوتا تھا اور عبرت اندوز نظر رکھنے والوں کے لئے بیش بہا سرمایۂ عبرت ان کھنڈروں میں پوشیدہ تھا۔ پیغمبر کی تکذیب، مخالفت اور بداعمالی کی پاداش زندہ شکل میں سب کے سامنے آجاتی تھی، مگر کوئی بھی عبرت کا سبق اس سے حاصل نہ کرتا تھا۔ آیت میں اہل مکہ کو خصوصاً اور عام لوگوں کو عموماً اسی درس عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مقصود بیان

لوط مرسل تھے یعنی رسول خدا تھے اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو بھی قرآنی اصطلاح میں مرسل کہا گیا ہے۔ آیت اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا رسول اور رسول کے فرماں بردار بندے عمومی عذاب سے محفوظ رہتے ہیں اور اگرچہ کبھی کبھی بدوں کے ساتھ طبعی موت کا شکار ہو جاتے ہیں، مگر عذاب کی موت سے ہلاک نہیں ہوتے بلکہ جہاں حق وباطل اور ایمان وکفر کا مقابلہ ہو وہاں وہاں تو اہل حق بالکل سالم رہتے ہیں۔ ان پر عذاب کی آنچ بھی نہیں آتی۔ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی بیوی ہونا بھی بغیر ایمان اور اطاعت رسول کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ دوسرے متعلقین کا تو کیا ذکر ہے۔ ایک بات یہ بھی

معلوم ہوتی ہے کہ لوط کی بیوی باوجود پیغمبر کی بیوی ہونے کے کافرہ تھی یا کم از کم دل میں کافر ضرور تھی ۔ اگر پہلی صورت مان لی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ شریعت ابراہیمی میں مومن کا نکاح کافرہ سے درست تھا ۔ شریعتِ اسلامیہ کے حکم کی طرح شریعتِ ابراہیمی کا حکم نہ تھا ۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ سے واضح ہوتا ہے کہ قوم لوط میں سے کچھ لوگ زمین کے اُلٹ جانے کے باوجود زندہ رہ گئے تھے ۔ جن کو پتھراؤ کر کے ہلاک کر دیا گیا تھا ۔ یہ مقصود اس وقت ہوگا جب آخرین سے وہ لوگ مراد قرار دیئے جائیں گے جو زمین کے اُلٹ جانے کے بعد بچ رہے تھے اور اگر آخرین سے مراد کل فریق آخر یعنی تمام گروہ کفار ہو تو مقصود یہ ہوگا کہ اہلِ ایمان کو تو بچا لیا باقی بچے کافر ان کو ہلاک کر دیا گیا ۔ آیت وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْهِمْ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط کے برباد شدہ مکان اور کھنڈر نزول قرآن کے زمانے میں موجود تھے اور مکہ والے ان کی طرف سے گزرتے اور ان کو دیکھتے تھے ۔

پورے قصہ میں مسلمانوں کے لئے درپردہ بشارت ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ آخر میں تمہارا غلبہ ہوگا اور کافر برباد ہوں گے ۔ کافروں کو تنبیہ ہے کہ رسولِ برحق کی مخالفت تباہی انگیز ہے ۔ تم پیغمبر کو کمزور مت سمجھو ۔ اس کی مدد کے لئے غیبی طاقتیں موجود ہیں ۔ وہ ظاہر میں تنہا یا تھوڑے جتھے والا ہے ، مگر واقع میں اس کی طاقت اتھاہ ہے ۔ اللہ اس کا حامی ہے ۔ قوم لوط کی حالت کو عبرت کی نظر سے دیکھو ۔ کہیں تمہارا حال اسی طرح کا نہ ہو جائے وغیرہ ۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ

اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے تھے جبکہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے سو یونس ہی شریک قرعہ ہوئے تو

الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴿۱۴۳﴾

یہی ملزم ٹھہرے پھر ان کو مچھلی نے ثابت نگل لیا اور یہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے سو اگر اس وقت وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے

النصف

لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً

تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہتے ۔ سو ہم نے اُن کو ایک میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت مضمحل تھے اور ہم نے اُن پر ایک

مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۴۸﴾

بیلدار درخت اگا دیا تھا اور ہم نے انکو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے انکو ایک زمانے تک

تفسیر

بہت سے فلسفی کہتے ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق اضطراری ہے ۔ خدا صاحب ارادہ اور مالکِ اختیار نہیں ۔ جس طرح سورج سے کرنیں نکلتی ہیں اور نہ سورج کا کوئی ارادہ ہے نہ اختیار نہ اس کے ارادہ و اختیار کو شعاعوں کے نکلنے میں کوئی دخل ہے ۔ اسی طرح اللہ کی ذات سے سارے جہان کا ظہور ہوا ۔ پانی میں روانی ، آگ میں گرمی ، ستاروں میں چمک اور پھولوں میں خوشبو جس طرح بے ارادہ ہے ۔ بالکل اسی طور سے اللہ کی ذات سے کل سنسار کا خروج و تخلیق بے اختیاری ہے ۔ کچھ وہمیات کو عقلیات سمجھنے والے قائل ہیں کہ اللہ نے مادہ میں استعداد اور قابلیت بنادی اور صورت جسمانیہ اور نوعیہ کو فاعلیت اور تاثیر اور ارتقاء کی طاقت عطا کر دی ۔ بس اتنا کام خدا کا ہے ۔ اس سے آگے رنگ برنگ ۔ اور چند در چند حادثات و مکان کو مدود سے خارج ہے اور کائنات کو تمام تغیرات عالم میں خدا کو کوئی دخل نہیں ۔ اس کا فعل زمان و مکان کی حدود سے خارج ہے ، اور کائنات کے تمام تصرفات اور تغیرات انقلابات ، حادثات ، نیرنگیاں ، نوخیز تبدیلیاں اور اعجوبہ

کاریاں زمانی ہیں مکانی ہیں ۔ ۔ کمی ہیں، کیفی ہیں اور وصفی ہیں ان سارے تصرفات میں خدا کو کوئی دخل نہیں نہ امر خداوندی کو نہ ارادۂ خداوندی کو نہ مشیت خداوندی کو ۔ نہ تصرف خداوندی کو یہ مادہ کی ذاتی تبدیلیاں ہیں اور صورت کی خود مختار کارگذاریاں قوت فاعلہ اور منفعلہ کے کسر و انکسار واجبی نتائج ہیں اور تاثیر و تاثر کی طاقتوں کی نیرنگیاں ۔ ایک سادہ لوح گروہ کہتا ہے کہ نہیں یہ سب غلط ہے ۔ یقیناً اللہ صاحب ارادہ ہے، مالک اختیار ہے، متصرف ہے، خالق ہے، مگر اس نے اس دنیا کے انتظام کے لئے اپنے نائب چھوڑ رکھے ہیں براہ راست نائبوں کی مرضی کے خلاف خدا کچھ نہیں کرتا کر سکتا ہے مگر کرتا نہیں ہے ۔ نائبوں کو اس کی مرضی میں دخل ہے ۔ اس کے نائب اس کی مرضی کو پلٹ سکتے ہیں ۔ تقدیر الٰہی نائبوں کی مرضی سے بدل سکتی ہے اور بدل جاتی ہے، اس لئے نائبوں کی خوشامد کرنی اور ان کو راضی رکھنا اور ہر کام میں ان سے چارہ جوئی کرنی ۔ اور زندگی کے تمام مشاغل میں انہی کو پکارنا واجب ہے ۔ وہی متصرف ہیں، مختار عالم ہیں نظم کائنات ان ہی سے متعلق ہے اور ان کے توسل بلکہ تصرف کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ۔ اوّل الذکر گروہ نے خدا کے ارادہ اور تصرف کی نفی کر کے اس کو معطل سمجھ لیا ہے ۔ اس لئے لازمی طور پر نہ خدا کو الٰہ ماننے کی ضرورت ہے نہ اس کی عبادت کرنے کی نہ اس سے دعا کرنے کی نہ اس کے قوانین اور شرائع کی نہ آسمانی مذہب کی نہ حشر و نشر کی نہ جنت و دوزخ کی نہ اس کو راضی رکھنے کی ۔ کوئی معنی ہیں نہ ناراض کرنے کا کوئی مفہوم ۔ وہ بالکل بے کار ہے ۔ اس کی ہستی خالص بیگار ہے ۔ کیسی مخلوق اور کہاں کا خالق ۔ ساری کائنات اس سے پیدا ہوئی، مگر وہ پیدا کرنے والا نہیں ۔ ہر چیز کی زندگی اس سے وابستہ ہے، مگر وہ منعم اور محسن نہیں ۔ تخلیق سب اس کی ہے، مگر وہ پروردگار اور بخشنے والا نہیں ۔

یہ خدا اکثر فلسفیوں کا ہے ۔ دوسرا گروہ اگرچہ خدا کو خالق کہتا ہے ۔ فاعل و مختار مانتا ہے اور متصرف جانتا ہے، مگر اس کی نظر میں خدا محدود خالق ہے ۔ مقید مختار ہے ۔ یعنی خدا کبھی خالق تھا اب نہیں کبھی متصرف تھا اس وقت نہیں ۔ مادہ اور صورت کی تخلیق اس کا کام تھا ۔ ان دونوں کو مخصوص قوتیں عطا کرنا بھی اسی کا ارادہ اور اختیار کا نتیجہ تھا، مگر اب وہ بے کار ہے، معطل ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے ۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مرضی مشیت اور اختیار کو اس میں دخل نہیں ۔ سورج نکلے یا ڈوبے ۔ چاند کا طلوع ہو یا غروب ۔ ستاروں کا ظہور ہو یا اختفاء کائنات کا ہر کرہ دوری حرکت کرے یا نہ کرے ۔ سمندروں سے بخارات اٹھیں یا نہ اٹھیں یہ مادہ کی رنگینیاں ہیں اور صورت کی کارفرمائیاں، فطرت کی بغیر فاطر کے دخل کے سب کچھ کرتی ہے اور سارا استمرار اب خدا کا ضرورت مند نہیں پس اس کی پرستش کیسی، آسمانی کتابوں کی کیا ضرورت ۔ الٰہی مذہب کی کیا حاجت ہے ۔ کہاں کی جنت کیسی دوزخ، کون اس سے دعا کرے اور کیوں اس کے آگے سر جھکائے وہ نہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے نہ کسی سے کچھ لے سکتا ہے نہ کسی کا نفع اس سے وابستہ ہے نہ نقصان، اس لئے اس سے طمع کیوں رکھی جائے اور خوف کیوں کیا جائے ۔ یہ معطل خدا بھی بعض فلسفہ زدہ دماغوں کا ہے ۔ مؤخر الذکر عقیدہ ہندوؤں کا ہے ۔ زردشتیوں کا ہے ۔ بدھ مت والوں کا ہے، اکثر عیسائیوں کا ہے اور بکثرت مسلمانوں کا ہے ۔ ہندوؤں اور بدھ مت والوں کے ہزاروں دیوتا ہیں ۔ ان گنت بخشنے والے ہیں ۔ ہر چیز کی اندرونی قوت پروردگار ہے ۔ فاعل اور مختار ہے ۔ غیبی قوتیں اس دنیا کی کارفرما ہیں، اوتار بھی عملی خدا ہیں کارساز ہیں ۔ بغیر اوتاروں کے توسل کے کسی آدمی کا تعلق خدا سے نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح زرتشت کے پیرو سیاروں کے روحانیات اور عناصر کی روحانی طاقتوں کو متصرف جانتے ہیں اکثر عیسائیوں کا مسیح سے تعلق بھی تقریباً یہ ہے عقیدہ ہے بلکہ مسیح ان کے نزدیک خدا ہی کی ایک صفت کا نام ہے ۔ رہے مسلمان تو ان میں سے اکثر جاہل انبیاء، اولیاء اور پیروں فقیروں کو خزانۂ قدرت کا مالک جانتے ہیں ۔ ان کو بادشاہوں کے وزیروں کے قائم مقام مانتے ہیں ۔ بہت سے آدمی تو ان کو خود کارساز و قاضی الحاجات، مجیب الدعوات، دافع البلیات اور مالک نفع و ضرر تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ذرا اونچے درجہ کے دماغ رکھنے والے مختار کل اور ۔۔ مطلق تو نہیں کہتے، مگر دنیا کے ہر معاملے میں ان کو سفارشی خیال کرتے ہیں اور فقط سفارشی نہیں بلکہ ان کی سفارش کو واجب القبول سمجھتے ہیں اور ان کی ہر دعا کو مستجاب نا قابل رد جانتے ہیں ان کے نزدیک عام انسانوں کا ان سے بغیر واسطہ ۔۔ اور ہر دعا کے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا ۔۔ ہو سکتا ہے اگر صرف دینی معاملات اور مذہبی

احکام کے حصول اور ہدایتِ الٰہیہ کے وصول تک یہ گروہ انبیاء اور اولیاء کو لازمی وسیلہ خیال کرتا ہے اور بغیر بزرگوں کے توسل کے ہدایتِ الٰہیہ کا ماننا ناممکن جاننا تو کچھ ہرج نہ تھا۔ اس بے وقوف طبقہ نے غضب تو یہ کیا کہ خالق و مخلوق کا وہ رشتہ جو آغاز آفرینش سے قائم ہے منقطع کر دیا اور بلا توسل کتنا ہی کوئی خدا کو پکارے اس کی دعا کو ناقابلِ شنوائی قرار دیا اور انسان کے دلی علاقہ کو خالق پروردگار سے توڑ دیا۔ یہاں تک کہ آدمیوں اور چوپایوں کے رزق اور انسان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا واحد علت وجود اولیاء کو قرار دیا۔ گویا اس گروہ نے اولیاء اللہ کو قولاً نہ سہی تو عملاً ضرور کارخانۂ قدرت کا حکمران اور مختارِ عام مان لیا اور چونکہ اس صورت میں خدا کی کچھ ذیادہ ضرورت نہیں رہتی۔ وزیر ہی سے کام چل جائے تو وزیروں کی معرفت بادشاہ کو عرضی دینے کی کیا ضرورت رہتی ہے، اس لئے اس نادان نے گویا خدا سے منہ موڑ لیا اور مخلوق سے رشتہ جوڑ لیا۔ حالانکہ خدا پر کوئی چیز واجب نہیں۔ ہر ولی یہاں تک کہ نبی کی اچھی بری دعا کو خدا رد کر سکتا ہے اور اپنی مشیت اور مصلحت کے تحت رد کر بھی دیتا ہے۔ یونس کی دعا کو رد کر دیا اور ان کی قوم کو معاف کر دیا۔ شرائع اور احکام کو براہِ راست بغیر توسل انبیاء کے قبول کرنے کی قابلیت تو ہر شخص میں نہیں ہو سکتی۔ نہ ہر ایک کے پاس اللہ کا فرشتہ وحی لے کر آ سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اللہ دانا بینا اور غنوا ہے۔ اس سے کوئی ادنیٰ ترین انسان اور اس کی حالت پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور مصلحت ہوتی ہے تو قبول بھی کرتا ہے۔

انسان کا دل خانۂ خدا ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے "دل گذرگاہ جلیل اکبراست" اگرچہ ہر آدمی کا دل ایک طرح اور ایک رتبہ کا نہیں روشنی اور تاریکی، لطافت اور کثافت کا بڑا فرق ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ اگر اللہ کی مصلحت ہو تو کسی سچائی کی پکار بے کار نہیں جاتی۔ ہر دل سے اللہ کا براہِ راست تعلق ہے۔ اسی وجہ سے باوجود یونسؑ کی ناراضگی کے اللہ نے ان کی قوم کی پکار کو سنا اور عذاب سے بچا دیا۔

تحلیلِ اجزاء

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عبرانی زبان میں یونس کو یونہ کہتے تھے۔ آپ کا زمانہ تخمیناً ۸۶۲ سال قبل مسیح تھا۔ والد کا نام متی تھا۔ شہر نینوہ علاقہ موصل میں آپ معبوث ہوئے۔ قوم نے سچا نہ جانا۔ آپ نے عذاب الٰہی آنے کی تنبیہ کی اور تین روز کی میعاد مقرر کی۔ اور خود آبادی سے باہر چلے گئے۔ کیونکہ اہل ایمان عذاب کے مقام پر نہیں ٹھہرا کرتے۔ عذاب کے پہلے ہی دن عذاب کے آثار دیکھ کر سب خورد و کلاں اور عورتوں و مردوں نے جنگل میں نکل کر سر برہنہ ہو کر بالوں کو پھیلا کر انتہائی عاجزی سے گڑگڑا کر بارگاہِ الٰہی میں توبہ کی۔ اللہ نے رحم فرمایا اور عذاب دور ہو گیا۔ حضرت یونس کو کسی نے اطلاع دے دی۔ آپ ازالۂ عذاب کی خبر سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور خیال کیا اب میں کیا منہ لے کر قوم کے سامنے جاؤں گا۔ لوگ مجھے جھوٹا کہیں گے۔ یہ سوچ کر شہر ترسیس کو پہنچنے کے ارادہ سے چل دیئے اور یافہ سے جہاز میں سوار ہو کر ترانس کا رخ کیا۔ راستہ میں جہاز طوفان میں آ گیا۔ ملاح نے سمجھا جہاز میں بار زیادہ ہے، اس لئے جہاز جھکولے کھا رہا ہے۔ جہاں تک ممکن تھا، سامان سمندر میں پھینک کر بار ہلکا کیا، مگر جہاز کے چکر میں کوئی کمی نہ آئی۔ مجبوراً اس نے رواج کے مواقف عمل کرنا چاہا۔ شاید ان لوگوں کا رواجی عقیدہ تھا کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگ کر جہاز میں سوار ہوتا ہے تو طوفان میں پھنس جاتا ہے۔ اس عقیدے کے زیر اثر مفرور غلام کی تلاش ہوئی۔ کسی اقرار نہ کیا۔ صرف حضرت یونس نے فرمایا میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا غلام ہوں مجھے سمندر میں ڈال دو۔ مگر نیکوں کی صورت چھپی نہیں رہتی کسی نے یقین نہ کیا آخر قرعہ ڈالا۔ قرعہ آپ کے نام پر نکلا۔ مکرر سہ کرر قرعہ ڈالا تب بھی پہلی مرتبہ کی طرح نتیجہ نکلا۔ مجبور ہو کر آپ کو پانی میں ڈال دیا گیا کہ ایک بڑی مچھلی نے بحکم الٰہی آپ کو صحیح سلامت نگل لیا۔ آپ نے کچھ مدت شکم ماہی میں توقف فرمایا۔ حواس درست ہوئے تو اللہ کی پاکی بیان کی۔ مچھلی نے کنارے پر آ کر اگل دیا۔ بدن نحیف، زرد اور گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہو گیا تھا۔ دھوپ اور مکھیوں سے دکھ پانے کا اندیشہ تھا۔ اللہ نے کدو کا بیلدار پودہ پیدا کر دیا جس کے پتوں کے سائے میں آپ نے آرام کیا اور حکم ہوا جاؤ فرض رسالت ادا کرو۔ آپ دوبارہ نینوا آئے۔ لوگ تو مشتاق ہی تھے۔ سب مسلمان ہو گئے۔ یہ ہے قصہ کا خلاصہ۔ مفصل ہم بیان کر چکے ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ یونس پیغمبر تھے۔ یہاں بھی یونس کے مرسل ہونے سے مراد پیغمبر ہوتا ہے۔ لغوی معنی مراد نہیں۔ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝ یونس اس قوم میں سے ایسے بھاگے جیسے کوئی

غلام بھاگتا ہے اور ایک لدے ہوئے جہاز پر سوار ہو گئے ۔ یعنی ترسیس کو جانے کے ارادہ سے یافہ کے جہاز میں بیٹھ گئے ۔ جہاز پر بہت زیادہ بار تھا آدمی بھی بہت تھے اور سامان بھی کثیر تھا ۔ کشتی کو ہلکا کرنے کے لئے حسب دستور قرعہ ڈالا تو یونس کا نام نکلا ۔ آپ کو دریا میں پھینک دیا گیا ۔ بعض مفسرین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے وحقانی دہلوی وغیرہ کا کلام بھی اسی بات راجع ہے کہ حضرت یونس عذاب کے آنے یا نہ آنے کا انتظار کرنے سے پہلے محض اس خیال سے کہ اللہ غفار وعلیم ہے کافر توبہ کرلیں گے تو عذاب نازل نہ فرمائے گا چل دیئے تھے ۔ مگر یہ اقوال قطعی بے بنیاد ہیں ۔ اول تو روایت اور سیاق قرآنی کے خلاف ہیں دوسرے انبیاء کا ایمان ویقین بہت پختہ ہوتا ہے ۔ وہ اللہ سے دعا یقین کے ساتھ کرتے ہیں بعض گمان پر ایسا نہیں کرتے ۔ اگر آپ کو اپنی دعا کے قبول ہونے کا یقین نہ ہوتا تو دعا ہی کیوں کرتے اور قوم کو عذاب آنے کی تنبیہ کس طرح کرتے ۔ حضرت یونس کی یہ عاجز رائے اجتہادی تھی ۔ دعا کے انتظار سے پہلے محض اپنی رائے کے مطابق قوم سے ناراض ہو کر عذاب سے نجات پانے کی خبر سن کر حضرت یہ خیال پیش نظر رکھ کر چل دیئے تھے کہ میں قوم کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا ۔ بس اتنا قصور تھا ۔ یا فرو گذاشت تھی جس پر اتنا عتاب ہوا ۔ آپ نے یہ نہ سوچا کہ ضرور کوئی خاص وجہ ہے کہ اللہ نے میری قوم سے عذاب دور کر دیا ۔ سرکشوں اور نافرمانوں سے مقررہ عذاب نہیں ٹلتا ۔ شاید انہوں نے سرتابی چھوڑ دی ہے اور شرک سے توبہ کر کے سچے دل سے بارگاہ الٰہی میں رجوع کیا ہے ۔ درحقیقت کوئی جرم نہ تھا ۔ ہم دن میں بیسوں بار رات میں بیسیوں غلطی کرتے ہیں اور عتاب الٰہی سے محفوظ رہتے ہیں ، مگر حسنات الابرار سیئات المقربین ۔ عوام بلکہ خواص کی نیکیاں اہل قرب کے لئے گناہوں میں شمار کی جاتی ہیں ۔ یونس پیغمبر تھے ان کے کرنے کی نہیں تھی ۔ ان کو سمجھنا مشکل ہے یہ ناز تھا یا اجتہادی غلطی ۔ بہرحال یونس کے لئے باعث عتاب ہو گیا مگر اتنا یقین ہے کہ عذاب ٹلنے کی خبر سن کر بھاگے تھے ورنہ محض یہ خیال کر کے کہ خدا غفار حلیم ہے معاف کر دے گا کبھی نہ بھاگتے ۔ خدا کا غفار و حلیم ہونا تو اس وقت بھی معلوم تھا جب عذاب کی دعا کی یا جس وقت قوم کو عذاب آنے کی خبر بھی ملی تھی ۔ مگر خدا کو غفار وحلیم جاننے کے باوجود وقت مقرر کر دیا گیا سب کچھ بغیر یقین عذاب کے کیا تھا ۔ واللہ اعلم ۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ۔ یونس اپنی حرکت پر نادم تھے ۔ پشیمان تھے کہ پانی میں گرنے کے ساتھ ہی مچھلی نے نگل لیا ۔ قتادہ کے قول میں تین دن امام جعفر صادق کے نزدیک سات دن ۔ ابو مالک کے نزدیک چالیس دن اور مجاہد کے نزدیک ایک دن سے کچھ کم مچھلی کے پیٹ میں رہے ۔ بہرحال شکم ماہی میں آپ نے اللہ کی لو لگی اور عتاب الٰہی سے رہائی پائی ۔

فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ یعنی اگر یونس تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے ۔ یعنی مچھلی کا پیٹ ہی آپ کی قبر بن جاتا اور وہیں دفن کر دیے جاتے ۔

مسبحین میں سے ہونے کے معنی وہی ہیں جو سورہ انبیاء میں بیان کئے گئے ہیں کہ یونس نے شکم ماہی میں اپنے رب کو پکارا اور کہا لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ یہ تسبیح یونس ہے ۔ جس کی وجہ سے آپ کو مسبحین میں سے شمار کیا گیا ۔ اس جگہ چند تفسیری اقوال دوسرے بھی ہیں جو اگرچہ غیر واضح ہیں ، مگر قابل اعتبار ضرور ہیں ۔ ضحاک ، ابوالعالیہ ، وہب اور قتادہ نے فرمایا معنی یہ ہیں کہ بلا گھیرنے سے پہلے یونس صالح الاعمال تھے ۔ اگر وہ سکتہ کے وقت نیک کردار نہ ہوتے تو دکھ کے وقت ان کا چھٹکارا نہ ہوتا ۔ انتہی یعنی اللہ کے منظور نظر بندے تھے گزشتہ نیکیاں اور فرماں برداریاں مصیبت کے وقت ان کے کام آئیں ۔ ابن عباس ، سعید بن جبیر ، ضحاک ، عطاء بن سائب ، سدی ، حسن اور ایک روایت کے بموجب قتادہ کا بھی یہی قول ہے کہ مسبحین سے مراد ہیں نمازی ۔ یعنی گرفتار ہونے سے پہلے یونس نمازی تھے اور اپنے رب کو پکارا کرتے تھے یعنی مچھلی کے پیٹ میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے نماز پڑھی اور رب کو پکارا ۔ قوی ترین تفسیر اول ہے ۔ جس کی تائید سورہ انبیاء کی آیت بھی کرتی ہے ۔

فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ یعنی دعا قبول ہوئی ۔ مچھلی نے بحکم الٰہی ایک میدان کے کنارے یعنی بحر روم کے ساحل ریگستان میں اگل دیا ۔ تو اس وقت آپ خستہ حال تھے یعنی صحت ، صورت اور حالت بگڑ گئی تھی وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ ۔ ابن مسعود بن عباس اور اکثر علماء نے لکھا ہے کہ یقطین کدو کے درخت کو کہتے ہیں ۔ اللہ نے یونس کی حفاظت کے لئے کدو کے درخت کو پیدا کیا جس کے پتوں کا

سایہ آپ پر ہو گیا اور بقول بیضاوی یونس نے کدو کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانک لیا کر مکھیاں نہیں بیٹھیں ، سعید بن جبیر نے فرمایا ہر بیلدار درخت کو یقطین کہتے ہیں
وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ اس جگہ دو باتیں تنقیح طلب ہیں ، اس آیت کا تعلق ماقبل کی آیت سے ہے یا نہیں ۔ اگر ہے تو ترتیب بیان کے موافق ترتیب واقعات تھی یا تقدم تاخر تھا ۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس عتاب سے رہائی پانے کے بعد رسول بنا کر بھیجے گئے یا پہلے بھیجے گئے جس کو قرآن نے اس جگہ بیان کیا ہے ، ابن عباس کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ عتاب میں مبتلا ہونے سے پہلے نبی بنائے گئے تھے جب مچھلی کے پیٹ سے رہائی ہوئی تو نبی بنا کر بھیجے گئے ، مجاہد کا قول اس کے خلاف ہے ۔ مجاہد نے نبوت سابقہ کی صراحت کی ہے ۔ قرآنی سیاق درایت اور اکثر اہل تفسیر کے اقوال مجاہد کے قول کی تائید کرتے ہیں (۲) رہائی کے بعد یونس کو کسی قوم کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا ۔ اول قوم یعنی نینوہ میں رہنے والے یا کسی اور قوم کے لئے ۔ محی السنۃ معالم میں دوسرے قول کی صراحت کی ہے مگر ارجح بلکہ صحیح اول قول ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے ۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ الخ اور اس جگہ فرمایا فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ دونوں آیتوں میں ایک ہی قوم کے ایمان کا بیان ہے ۔ ایک ضروری تحقیق ملاحظہ ہو :-

اللہ حاضر و ناظر ہے اس کا علم یقینی ہے ۔ کسی چیز میں اس کو شک نہیں ہو سکتا ۔ اس کے باوجود اللہ نے فرمایا ہم نے یونس کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا ۔ تعداد کا یہ بیان تو شک پر دلالت کرتا ہے ۔ بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ زجاج اور اخفش نے کہا عدد کا یہ شکیہ اظہار صرف محاورہ کی بات ہے تخمینہ کا بیان دیکھنے والے کے محاورہ کے موافق ہے ۔ یعنی دیکھنے والا اگر یونس کی قوم کو دیکھتا تو کہتا کہ یہ ایک لاکھ یا اس سے زائد ہیں ۔ ابن عباس نے فرمایا اس جگہ لفظ اَوْ بمعنی بل ہے یعنی قوم یونس کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد تھی ۔ گویا لفظ اَو کثرت تعداد کو ظاہر کرنا مقصود ہے نہ کہ شک کو ظاہر کرنا ۔ یہ قول نہایت مناسب ہے ۔ فراء ابو عبیدہ ، مقاتل ، کلبی اور اکثر اہل لغت اور علمائے معانی نے اس کی تائید کی ہے ۔ ابن عباس نے بیس ہزار کی زیادتی بیان کی ہے ۔ مکحول کے قول میں دس ہزار آئی ہے (ابن ابی حاتم) ابی بن کعب نے بیس ہزار فرمایا تھا ۔ اس قول کو ابن جریر نے نقل کیا ہے ۔ مگر ترمذی نے روایت کرنے کے بعد اس کو حیثیت غریب قرار دیا ہے ۔ کتاب بدء باب ۴۴ ۔ درس ۱۱ ۔ میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ آیا ہے ۔ واللہ اعلم ۔

مقصود بیان

یونس پیغمبر برحق تھے اور قرآن نے ان کو رسول کہا ہے ۔ حضرت یونس کو قرعہ ڈالنے کے بعد سمندر میں پھینک دیا گیا تھا اور مچھلی نے آپ کو نگل لیا تھا پھر کنارہ پر اگل دیا تمام واقعات ان آیات کے موافق صحیح ہیں ۔ وھو ملیم سے یہ استنباط غلط ہے کہ یونس صاحب معصیت تھے بلکہ اس جگہ ملیم کے معانی نادم ہیں کہ باوجود معمولی فرد گذاشت اور فروگذاشت کے یونس کے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی اتنی سخت گرفت کی گئی ۔ اور یہ قصہ لئے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں جن کے مراتب زیادہ ہوتے ہیں ان کی گرفت بھی سخت ہوتی ہے اور ان کی معمولی فرد گذاشت سنگین جرم قرار دی جاتی ہے ۔ اس سے یہ بات بلا ارادہ متکلم مترشح ہوتی کہ عالی رتبہ اور بلند قدر آدمیوں سے اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے ۔ راہبر یا داعظ خلیفہ حاکم وقت ، قاضی ، مذہبی پیشوا غرض ہر اونچے آدمی ہو یا چھوٹا سزا میں تفاوت ہو تو سخت ترین سزا دی جائے ۔ یہ بات اگرچہ عمومی قانون اسلام نہیں کیونکہ اسلام میں ہر جرم کی سزا معین ہے خواہ مجرم بڑا آدمی یا چھوٹا سزا میں تفاوت نہیں ہے ۔ مگر نقشہ سے بطور ترمیم ایمان کے طور پر امر مذکور کو مترشح ہوتا ہے ۔ گویا اس کو ہیں استعمال ہے ۔ اس مذہبی ، سیاسی ، اخلاقی ، رواجی ان کا جو تمام مذہبی کتابیں رکھنے والوں کا معمول ہے اور ہر انفرادی یا اجتماعی حکومت کرنے والوں میں جاری ہے کہ مذہبیت یا حکومت و وجاہت کے اعتبار سے جو آدمی بڑا سمجھا جاتا ہے اس کو سزا بالکل نہیں دی جاتی یا ہلکی دی جاتی ہے ۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۝

سو ان لوگوں سے پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں اور تمہارے لئے بیٹے ہاں کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور ان کے بننے کے وقت تم دیکھ رہے تھے

أَلَآ إِنَّهُم مِّنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ ٱللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَـٰذِبُونَ ۝ أَصْطَفَى ٱلْبَنَاتِ

خوب سن لو وہ لوگ اپنی سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً بالکل جھوٹے ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلے

عَلَى ٱلْبَنِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ سُلْطَـٰنٌ

میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیا بیہودہ حکم لگاتے ہو پھر کیا تم عقل اور سوچ سے کام نہیں لیتے ان کیا تمہارے پاس اس پر کوئی

مُّبِينٌ ۝ فَأْتُوا۟ بِكِتَـٰبِكُمْ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ۝ وَجَعَلُوا۟ بَيْنَهُۥ وَبَيْنَ ٱلْجِنَّةِ

واضح دلیل موجود ہے سو تم اگر اس میں سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو لوگوں نے اللہ اور جنات میں بھی رشتہ داری قرار دی ہے اور جن کو خدا کا شریک ٹھیرا رکھا ہے

نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ ٱلْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ سُبْحَـٰنَ ٱللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ إِلَّا

ہیں ان جنات کا خود یہ عقیدہ ہے کہ ان میں جو کافر ہوں گے وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہوں گے اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں مگر جو

عِبَادَ ٱللَّهِ ٱلْمُخْلَصِينَ ۝ فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ۝ مَآ أَنتُمْ عَلَيْهِ بِفَـٰتِنِينَ ۝ إِلَّا مَنْ

اللہ کے خاص ایمان والے بندے ہیں سو تم اور تمہارے سارے معبود خدا سے کسی کو نہیں پھیر سکتے مگر اسی کو جو کہ جہنمی

هُوَ صَالِ ٱلْجَحِيمِ ۝ وَمَا مِنَّآ إِلَّا لَهُۥ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ۝ وَإِنَّا لَنَحْنُ ٱلصَّآفُّونَ

ہی جہنم رسید ہونے والا ہے تم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے اور خدا کی عبادت کے ہم صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں

وَإِنَّا لَنَحْنُ ٱلْمُسَبِّحُونَ ۝ وَإِن كَانُوا۟ لَيَقُولُونَ ۝ لَوْ أَنَّ عِندَنَا ذِكْرًا مِّنَ

اور ہم خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت کی کتاب پہلے لوگوں کی کتابوں کی

ٱلْأَوَّلِينَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ ٱللَّهِ ٱلْمُخْلَصِينَ ۝ فَكَفَرُوا۟ بِهِۦ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

طرح آتی تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے پھر یہ اس کا انکار کرنے لگے سو ان کو انجام معلوم ہوئے جاتا ہے

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا ٱلْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ ٱلْمَنصُورُونَ ۝ وَ

ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی مقرر ہو چکا ہے بے شک وہی غالب کئے جائیں گے اور

إِنَّ جُندَنَا لَهُمُ ٱلْغَـٰلِبُونَ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ

ہمارا لشکر غالب رہا کرتا ہے بس آپ تھوڑے عرصہ ان کا اور خیال نہ کیجئے اور ان کو دیکھتے رہئے سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے

يُبْصِرُونَ ۝ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ

ہمارے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں سو عذاب جب ان کے روبرو نازل ہوگا تو وہ دن جن کو ڈرایا جا چکا ہے

الْمُنذَرِينَ ۝ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝ سُبْحَانَ رَبِّكَ

بہت برا ہوگا آپ تھوڑے عرصہ ان کا اور خیال نہ کیجئے اور دیکھتے رہئے عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے آپ کا رب جو بڑی

رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ کافر بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے

تفسیر برا ہو مجنونانہ جہالت کا جس کے بھنور گرداب سے عموماً انسانی دماغ بچ کر نہیں نکل سکتا۔ طبیعاتی اور عنصریاتی تخیل سے لے کر فضائی اور سماوی تصور تک آدمی کا دماغ دوڑتا ہے۔ اس پرخار سنگلاخ راستہ میں اکثر ٹھوکریں کھاتا۔ اور منہ کے بل گرتا پھر اٹھتا پھر گرتا ہے۔ دنیا کی تفتیش اور اندرونی و بیرونی تحقیقات سخت پتھر ہے جس کو ہلکا وزن رکھنے والے دماغ برداشت نہیں کر سکتے۔ موشگافی اور نکتہ رسی کرنے والے دماغ جب نظم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو ایک مسلسل زنجیر یا تہ بہ تہ چنی ہوئی اینٹوں کی ایک مکمل عمارت دکھائی دیتی ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے اور ہر اینٹ دوسری اینٹ سے وابستہ اور پیوستہ ہے۔ تفتیش طلب دماغوں کا فکر محدود تصویر یہاں تک پہنچ کر رک نہیں جاتا بلکہ برقی رفتاری کے ساتھ اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ بہت اونچا اڑنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظاہری تنظیم خود ساختہ خود آفریدہ اور خود قائم کردہ نہیں۔ اس پوری زنجیر کو حرکت دینے والی اندرونی مخفی طاقتیں ہیں جو ذرہ ذرہ میں کارفرما حکمران اور متصرف ہیں۔ لیکن سب کا یہ عجیب اتحاد و توافق کیا ہے کس لئے ہوا، کس طرح ہوا، کیوں ہے اور کس طرح ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی اندرونی طاقت کسی دوسری طاقت کی ایسی مخالفت نہیں کرتی کہ یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے اور سب کھیل بگڑ جائے۔ کیوں سب مل کر یک دل یک جہتی اور ایکا کے ساتھ اس نظام کو چلا رہی ہیں باہم ٹکراؤ کیوں نہیں ہوتا۔ سب کا منشا اور مقصد ایک کیوں ہے اور حصول مقصد کا ایک راستہ کس نے بنایا ہے۔ اس جگہ پہنچ کر تخیل اور تصور کا اسپ تیز رفتار ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ کبھی دائیں مڑتا ہے، کبھی بائیں، کبھی پیچھے ہٹتا ہے اور کبھی دو ایک قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے ہٹنے اور دائیں مڑنے والا تصور نادانی کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے اور مذکورہ سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ دو ایک قدم آگے بڑھ کر حقیقت تلاش کرنے والا خیال ایک زبردست قادر مخفی ہمہ گیر حکمران طاقت موجود پاتا ہے جو تمام مخفی طاقتوں کے اوپر ہوتی ہے اور سب اس کے زیر حکومت ہوتی ہیں یہاں تک کہ خیال ہر کس و ناکس کا صحیح ہوتی ہیں، لیکن مزید تفتیش کی جائے تو یہ تصورات بھی اکثر گمراہی کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ جب ان سے تحتانی حکمران طاقتوں اور فوق الکل قوت حاکمہ کا فرق تعلق اور امتیاز دریافت کیا جاتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ ماتحت طاقتوں میں فوقانی طاقت حلول کئے ہوئے ہے۔ حکمران ایک ہی طاقت ہے، مگر براہ راست نہیں بلکہ مختلف طاقتوں میں تقسیم ہو کر۔ یہ گروہ وہ ہے جو اوتاروں اور پاک انسانوں اور مخفی مخلوق میں خدا کے حلول کرنے یا دوسرے القاب میں یوں کہو کر دخیل ہو جانے اور رہیں جانے کا قائل ہے۔ کوئی کہتا ہے ماتحت طاقتیں بجائے خود مستقل ہیں یا اقتدار میں صرف بالائی طاقت کی ماتحت ہیں گویا بادشاہ ہیں اور مؤخر الذکر وزیر ہیں۔ تمام تحتانی وزراء اور حکام نظم کائنات کو چلا رہے ہیں۔ اگرچہ وزارت عطا کی ہوئی فوقانی طاقت کی ہے۔ دنیا کے اکثر باطل پرست فرقے اسی شرک فی الصفات میں مبتلا ہیں ایک اور گروہ ہے جو بہت جھوٹا اور نہایت بیوقوف ہے وہ کہتا ہے کہ تحتانی طاقتیں فوقانی طاقت کی خادم ہیں اور اس سے خاص تعلق رکھتی ہیں۔ خدمت کسی نوکر یا غلام کی طرح نہیں کرتیں بلکہ اولاد کی طرح کرتی ہیں۔ اور اولاد بھی وہ جیسے سرا [illegible] قوت والی نہیں ہوتی یعنی مونث اس حقیقت میں تمام حکمران طاقتیں یعنی ملائکہ فوق الکل طاقت یعنی اللہ کی بیٹیاں ہیں جو اس کے اشارے پر چلتی ہیں۔ اور سب اللہ کے حکم کے تحت متحد اور متفق ہو کر خود

مفوضہ انجام دیتی ہیں۔ یہ تمام بیہودہ خیالات بے بنیاد اور غلط ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نظم کائنات کو اللہ کے حکم سے چلایا جا رہا ہے۔ ان میں خود کوئی طاقت نہیں اور وہ سرمو حکم الٰہی سے انحراف نہیں کر سکتے جس کی جو خدمت مقرر ہے وہ انجام دیتا ہے اور حقیقت کرنے والا خدا ہے اور یہ تمام آلات غیر مختار ہیں۔

تحلیل اجزاء

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ۝ مقام تعجب ہے کہ عام آدمی وحدت سے بھاگتا اور کثرت کی طرف دوڑتا ہے۔ شرک صفاتی کے قائل اتنے زیادہ ہیں کہ جن کو شمار کرنا بہت مشکل ہے۔ پانی، ہوا، آگ، مٹی، مورتی، غرض ہر عجیب یا عجیب چیز کے سامنے باوجود ان کو اللہ نہ سمجھنے کے سجدہ ریزی کرنا شرک صفاتی ہی ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر شرک ذاتی بھی بعض اشخاص اور اقوام کے قول سے لازم آتا ہے۔ قریش میں قبائل سلیم، خزاعہ اور جہینہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان سے مدد مانگتے اور ان کی مورتیاں بناکر پوجتے تھے۔ (ضحاک از ابن عباس) معلوم نہیں ان بیوقوفوں کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔ اول تو اللہ کی اولاد ہونا ہی اللہ کی ربوبیت وجوب ذاتی اور قدم کے منافی ہے پھر اولاد میں بھی وہ صنف جو دوسری صنف سے گھٹیا کمزور سمجھی جاتی ہے عقل، علم، جسم غرض ہر امر انسانی کمال میں اسکا درجہ پست ہے۔ اگر کوئی مؤنث مذکر سے برتر اور وسیع العلم نکل بھی آئی ہے تب بھی مجموعہ صنف مؤنث بزرگی کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت کے باوجود بیوقوفوں نے اللہ کی بیٹی ہونے کا قول کیا اور اپنے لئے بیٹیوں کو ناپسند کیا۔ فیصلہ اور فتویٰ وہی صحیح ہوتا ہے جو علم کی روشنی میں ہو اور چونکہ ملائکہ پرستوں کا عقیدہ محض جہالت پر مبنی تھا، اس لئے فرمایا ان سے علمی روشنی میں دریافت کرو کہ اللہ کے لئے بیٹیاں اور تمہارے لئے بیٹے۔ یہ کیسی بات ہے۔

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ۝ کسی قول کی صداقت ثابت کرنے کے صرف تین طریقے ہیں یا آدمی نے خود دیکھا اور مشاہدہ کیا ہو یا کوئی عقلی دلیل ہو یا کسی یقینی واجب الاعتبار کتاب کی صراحت ہو۔ اگر تینوں طرح کا ثبوت نہ ہو تو وہ بات بلاشبہ غلط ہوتی ہے۔ اسی آیت میں اول قسم کا ثبوت طلب کیا گیا ہے کہ بتاؤ ہم نے جس وقت فرشتوں کو بیٹیاں پیدا کیا تھا تو کیا تم اسی وقت حاضر و ناظر تھے۔ تو دیکھا ہو کر رہے تھے۔ یقیناً ایسا نہیں تھا۔

أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ اس آیت کا تعلق پہلی آیت سے ہے۔ گویا اس کا تتمہ ہے۔ فرشتوں کو بیٹیاں کہنے والے درحقیقت جھوٹ بولتے ہیں خود ساختہ اور دماغی تراشیدہ خیال کو عقیدہ بناکر حقانیت ثابت کرنے کے لئے اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مشاہدہ ان کا نہ تھا سچائی کی کوئی دلیل ان کے پاس نہ تھی، اس لئے پرزور طور پر تاکید کے ساتھ ان کے جھوٹے کی صراحت اس آیت میں کی ہے۔

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ اس آیت میں دوسری قسم کا ثبوت طلب کیا گیا ہے اور غور و تامل کی دعوت دے کر عقل کو کام میں لے کر اظہار حقیقت کی طرف بلایا ہے۔ مقام غور ہے کہ اللہ نے اپنا بیٹا کسی فرشتہ کو نہ بنایا۔ سب کو بیٹیاں بنایا اپنے لئے بیٹیاں چاہنا شاہی اور آدمیوں کی پسند کے لئے بیٹے چھوڑ دیئے۔ اسی مضمون کو دوسری آیت میں بیان کیا ہے أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا۔ اول تو والد ہونا کہنا غلط قول ہے پھر اپنے لئے بیٹیاں ہی بیٹیاں انتخاب کرنا غلط در غلط ہے غور و خوض کے بعد کوئی عقل سلیم اس کا فتویٰ نہیں دے سکتی۔

أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُبِينٌ ۝ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ اس آیت میں تیسری قسم کا ثبوت طلب کیا گیا ہے۔ ملائکہ پرستوں کے پاس اپنے عقیدہ کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کسی نبی کا کوئی صحیفہ نہ تھا۔ کوئی آسمانی کتاب نہ تھی۔ کسی برحق بزرگ کی کوئی دستاویز اور صراحت نہ تھی۔ پھر روشن دلیل اور برہان قاطع کہاں سے آتی، اس لئے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے اور تم سچے ہو اور تمہارا سچا ہی کوئی کتاب ہے اور اس میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ تو لاؤ۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قبائل خزاعہ و جہینہ وغیرہ کے پاس کوئی آسمانی کتاب یا پیغمبری صحیفہ تھا جس کو طلب کیا گیا جیسے یہودیوں اور عیسائیوں سے۔ کبھی کبھی ان کی کتابیں لانے اور اپنا دعا ثابت کرنے کے لئے

ان کتابوں کی تصریحات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ قریش کے پاس تو ان کے دستور زندگی کی کوئی کتاب ہی نہ تھی مطلب کتاب کے حرف یہ معنی ہیں کہ اگر تمہارے پاس کوئی کتاب ہو اور اس فرشتوں کا بیٹیاں ہونا لکھا ہو تو پیش کرو، مگر یہ دونوں باتیں محال تھیں۔ اول تو ان کے پاس کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور بالفرض اگر کوئی آسمانی کتاب ہوتی بھی تو اس میں شرک اور مشرکانہ عقاید کی صراحت محال تھی۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًاؕ مجاہد سے مروی ہے کہ جب مشرکوں نے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تو حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ پھر ان کی مائیں کون ہیں۔ انہوں نے کہا جنات سرداروں کی بیٹیاں۔ اللہ سے ڈرو تم کیا کہتے ہو تم کو سمجھ نہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ملائکہ بیٹیاں ہیں تو ان کی مائیں کہاں ہیں۔ یہ سن کر بد عقیدہ مشرک کہنے لگے کہ نسب کے جنات سرداروں کی بیٹیاں ملائکہ کی مائیں ہیں۔ مطلب یہ کہ جنات کی بیٹیاں اللہ کی بیویاں ہیں نعوذ باللہ۔

قتادہ اور ابن زید نے فرمایا مشرکوں نے کس بے حیائی کے ساتھ جنوں کا رشتہ اللہ سے ملا دیا۔ ابن عباس نے فرمایا بعض مشرکوں کا عقیدہ تھا کہ ابلیس اور اہرمن دونوں بھائی ہیں۔ یعنی مجوس عقیدہ کہتے ہیں کہ نور اور خیر مطلق کا نام یزدان ہے اور ظلمت و شر کا نام اہرمن۔ بعض عرب کے بعض قبائل نے اتنا اور اضافہ کیا کہ اہرمن جن ہے اور یزدان کا بھائی ہے۔ مجاہد کے قول کے مطابق نسب سے مراد ہوگا اللہ اور جنات کے درمیان رشتہ زوجیت کا قائم کرنا اور ابن عباس کے قول پر نسب سے مراد ہوگا اللہ اور جنات (یزداں و اہرمن) کے درمیان رشتہ برادری قائم کرنا۔ شاید دوسرا قول زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اول قول پر دو باتوں کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔

(۱) رشتہ زوجیت کو عربی میں نسب کہا جاتا ہے (۲) عرب کے مجوسیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ملائکہ کی مائیں جنات کی بیٹیاں ہیں اور یہ دونوں باتیں قوی ثبوت نہیں رکھتیں اول بات کی اجازت عربی زبان نہیں دے گی اور دوسری بات کسی تائیدی قوی روایت سے ثابت نہیں۔ بہرحال اول تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ ان مشرکوں نے صرف ایک ہی شرک نہیں کیا بلکہ ان کا مشرکانہ شرک کا عقیدہ دوگونہ شرک کا حامل ہے۔ ملائکہ کو بیٹیاں کہنا شرک ہے پھر اللہ کی بیویاں قرار دینا اور جنات کو اللہ کے سسرالی رشتہ دار کہنا شرک در شرک ہے۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ مشرکوں نے اللہ اور جنات کے درمیان رشتہ اخوت قائم کر رکھا ہے۔ یعنی جنوں کے سردار کو اللہ کا بھائی کہتے ہیں۔ گویا اس صورت میں ملائکہ پرستوں کے علاوہ دوسرے مشرکانہ عقیدہ کا اظہار ہوگا۔ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۝ آیت مذکورہ کا ورود ابن عباس کی روایت کو قرار دیا جائے گا یا مجاہد کی روایت کو ایسی آیت میں دونوں کا جواب ہے۔ مطلب یہ کہ جنوں کو خوب معلوم ہے کہ اس قول کے قائل قیامت کے دن پکڑے جائیں گے۔ یعنی جن خوب واقف ہیں کہ کافر جھوٹے ہیں نہ جن اللہ کا بھائی ہے نہ جنات سسرالی رشتہ دار۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن خوب جانتے ہیں کہ ہم نہ اللہ کے بھائی ہیں نہ رشتہ دار بلکہ محکوم و مخلوق ہیں۔ قضا و قدر کے آگے عاجز ہیں پہلی صورت میں انہم کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہوگی اور محضرون کے معنی ہوں گے قیامت کے دن کافروں کا گرفتار ہو کر آنا۔ اور دوسرے معنی پر انہم کی ضمیر جنات کی طرف راجع ہوگی اور محضرون کے معنی ہوں گے محکوم اور عاجز ہونا

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۝ یہ کافروں کے عقیدے کی پرشوکت تردید ہے۔ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ بیان کرتے ہیں اللہ کا ولادت زوجیت و ولدیت وغیرہ سب خرافات ہیں۔ اللہ اس سے پاک اور دور ہے۔ یعنی جب اللہ اللہ ہے، جامع صفات کمالیہ ہے تو صفات نقصان سے وہ یقیناً دور ہیں۔ اور نہ زوجیت کا تعلق ہو یا والدین اور ولدیت دونوں نقصان و احتیاج کی نشانیاں ہیں حدوث اور امکان کی علامات ہیں۔ قدم اور وجوب کے منافی ہیں۔ الوہیت کی شان سے بعید ہیں۔ پس اللہ ان کے بیان کردہ عقائد سے پاک ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۝ یہ استثناء یا متصل ہے یا منقطع۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ سب لوگ اللہ کے متعلق بیہودہ باتیں بیان کرتے ہیں۔ اللہ ان سے پاک ہے۔ ہاں اللہ کے خالص مخلص بندے وہ باتیں نہیں کہتے۔ اللہ ان کے بیان صفات سے پاک نہیں شاید استثناء منقطع اس جگہ اولیٰ ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ۝ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ۝ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ۝ آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے کہ

بعض عقائد و نظریات اس کے نزدیک غلط ہوتے ہیں۔ مگر اپنی کاربراری کے لئے انہی غلط خیال، عقیدہ اور لوگوں کو ان کا قائل بناتا ہے۔ یہ شیطانی گروہ کسی قدر کم ہے۔ دوسرا فرقہ وہ ہے جو اپنے مسلمہ افکار و خیالات کا پروپیگنڈہ کرنا اور سب کو انہی عقائد پر دیکھنا چاہتا ہے اول گروہ تو کھلا تباہ کار ہے اپنے مطلب کے لئے جہان کو لوٹتا اور تباہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ بلا شبہ نتیجہ کے اعتبار سے مفسد ہے۔ اس کے غلط افکار و نظریات کا انجام اور غیر فکری انجام تباہی ہے۔ پس گویا غلط عقائد کے حامل سب کے سب مفسد مغوی اور بہکانے والے ہیں۔ چنانچہ جنات ملائکہ کے پرستار، اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان رشتۂ زوجیت و ولدیت اور اخوت قائم کرنے والے سب کے سب تو افکار و تباہی آفریں اور مفسد تھے، مگر اللہ کے مقابلے میں ان کی تباہ کاری پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ تباہی کے جال کا شکار ہر آدمی نہیں ہو سکتا نہ ہر شخص کو بہکایا جا سکتا ہے۔ وہی آدمی بہکتے اور تباہ ہوتے ہیں جن کے خمیر میں ابدی ہلاکت پوشیدہ ہوتی ہے۔ جن کے دماغوں اور دلوں میں فطری طور پر مادہ فساد موجود ہے جو فساد و فتور کے زیر اثر جہنمی ہیں جن کو اللہ نے پہلے سے جہنم میں داخل ہونے کیلئے پیدا کیا ہے، اس لئے فرماتا ہے کہ اے انسانوں کافر انسانو) تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم پرستش کرتے ہو (پتھر ہوں، آدمی ہوں، شیطان ہوں، ملائکہ ہوں، کوئی بھی ہوں) اللہ کے خلاف بہکا نہیں سکتا۔ نہ فساد مچا سکتا ہے) کارخانہ قدرت کا بگاڑنا اور سنوارنا کسی مخلوق کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ ان کو جہنم میں داخل ہونا ہی ہے۔ یعنی روز ازل میں جس کے مقدر میں دوزخی ہونا لکھا جا چکا ہے اس کو تم بہکا سکتے اور بگاڑ سکتے ہو۔ مطلب یہ کہ جس مخلوق کو تم خدا کی بیٹیاں بیٹے، بیویاں، بھائی بند اور رشتہ دار قرار دیتے ہو وہ بیچارے تو بے بس، بے کس، عاجز اور مجبور ہیں۔ ان کو کچھ اختیار نہیں۔ پھر ان سے اور خدا سے زوجیت ولدیت اور اخوت کا تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ فرشتوں کا بے کس اور عاجز اور مخلوق ہونا اس قول سے معلوم ہوتا ہے جو خود فرشتوں کا ہے اور اللہ نے ان کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔

اس آیت میں فرشتوں کے تین اوصاف کا اظہار کیا۔ نمبر ا ہر فرشتہ کا ایک مقرر درجہ ہے جس کا علم اللہ کو ہے۔ خواہ وہ درجہ انتظام عالم سے تعلق رکھتا ہو یا عبادت و ریاضت سے۔ غرض یہ ہے کہ ہر فرشتہ کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ اس مرتبہ پر رہتے ہوئے وہ اپنی مفوضہ خدمت کو انجام دیتا ہے۔

۲۔ فرشتے صف بستہ رہتے ہیں یعنی جو خدمت اور کام ان کے متعلق ہے اس کو سرانجام دینے کے لئے صف بند اور تیار رہتے ہیں۔ سستی نہیں کرتے، سرتابی نہیں کرتے، غفلت نہیں کرتے۔

۳۔ سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سبحان اللہ و بحمدہ کہتے ہیں۔ اللہ کو ظاہرا اور باطن قول و عمل اور علم کے ذریعہ عبودیت عبدیت اور عجز خدمت اور فروتنی کا اظہار ہر ممکن طریقے سے کرتے ہیں۔ نہ ان کو اللہ کی اولاد ہونے کا دعویٰ ہے نہ قاضی الحاجات اور دافع البلیات اور مختار کل ہونے کا، مگر بیوقوف انسان ان کو حاجت روا، مالک کل، مختار مطلق متصرف حقیقی اور اولاد خدا قرار دیتے ہیں۔

حضرت علاء بن سعد سے مروی ہے کہ ایک روز حضورؐ نے صحابہ کے سامنے فرمایا۔ آسمان چرچرایا اور چرچرانا اس کو زیبا ہے۔ کیونکہ قسم ہے اس کی اس میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ رکوع یا سجود میں نہ ہو۔ پھر حضورؐ نے آیت وما منا الا له مقام معلوم الخ تلاوت فرمائی (ابن عساکر) حضرت ابوذر سے مروی ہے حضور نے فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے جو میں سنتا ہوں وہ تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچراتا ہے اور چرچراتا اس کو زیبا ہے کہیں اس میں چار انگل کی جگہ باقی نہیں جہاں فرشتہ اپنی پیشانی سجدہ میں نہ رکھے ہو (ترمذی ابن ماجہ، ابن مردویہ) حضرت عائشہ سے مروی ہے حضور نے فرمایا آسمان دنیا پر کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ سجدہ میں یا کھڑا ہوا نہ ہو اور یہی اللہ نے فرمایا وما منا الا له مقام معلوم الخ۔ ابن مسعود کی روایت میں بس یہی ہے الفاظ میں کچھ تغیر ہے (ابن ابی حاتم وغیرہ)

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ قرآن پاک کی تبلیغ اور طریقہ تبلیغ نہایت بلیغ اور کامل ترین ہے۔ اوپر کی آیات میں بعض کافروں کے مشرکانہ عقائد کی تردید پر زور مدلل خطابی پیرایہ میں بیان کی تھی۔ اب دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے بعض قبائل والے بعثت نبوی سے پہلے اسرائیلیوں کی کتابوں اور ان کی سرتابیوں کے احوال سن کر تمنا کیا کرتے تھے۔ کاش ہمارے پاس گزشتہ آسمانی کتابوں کی طرح کوئی کتاب ہوتی تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہو جاتے اور اس کے احکام کی پابندی کرتے۔ کافروں کی اس گزشتہ تمنا کو اللہ نے یاد دلایا اور بطور تنبیہ ارشاد فرمایا کہ یہ تو پہلے کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس گزشتہ کتابوں میں سے کوئی کتاب ہوتی تو ہم بلاشبہ اللہ کے با اخلاص پرستاروں میں سے ہو جاتے۔

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ لیکن جب وہ یادداشت یعنی پیغمبر اور قرآن اس کے پاس پہنچے تو ان کو سچا جاننے اور ماننے سے انکار کر دیا اب اس انکار کا نتیجہ ان کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا۔ یعنی دنیا میں بھی برباد، ذلیل اور خستہ حال ہوں گے اور آخرت میں بھی تباہ۔ اس مضمون کو ایک اور روایت میں بیان کیا ہے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ یعنی انہوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہا تھا کہ اگر ہمارے پاس کوئی پیغمبر آیا ہوتا تو ہم ہر ایک قوم سے زیادہ اسی کو قبول کرتے اور سب کے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جاتے۔ لیکن جب پیغمبر آیا تو بجائے ہدایت ان میں حق سے نفرت کا اضافہ ہوا۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ میں کافروں کو بالاجمال تباہی سے ڈرایا تھا اور ان کی بربادی کی خبر دی تھی۔ اس آیت میں وضاحت کے ساتھ اٹل فیصلہ کر دیا بلکہ اپنی مشیت کا عمومی ضابطہ بنا دیا۔ جس کی خلاف ورزی محال ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے پیغمبروں کا فتحیاب ہونا اور اللہ کے لشکر کا غالب ہونا۔ ایک اور آیت میں فرمایا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ یعنی دنیا میں اور آخرت میں ہم اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو فتحیاب کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ کا روئے خطاب اگرچہ قریش یا اہل مکہ یا ان قبائل کی طرف ہے جو حضور والا کے مخالف تھے، مگر قرآنی ضابطہ اور تفسیری قاعدہ ہے کہ علم کا مورد مخصوص ہونے کے باوجود حکم عام ہوتا ہے بشرطیکہ تخصیص کی کوئی ضروری وجہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ حکم بھی قیامت تک تمام اہل ایمان اور اہل کفر کے لئے حتمی وعدہ اور قطعی فیصلہ ہے۔ بدر میں شکست پاکر قریش کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ غزوہ احزاب میں مزید ہمت پست ہوئی فتح کا لے نو آخری فیصلہ کر دیا اور قریش ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے۔ اس کے بعد اکناف عرب میں تبلیغ کی گئی اور مخالفوں کو زیر کیا گیا۔ پھر عرب سے فارغ ہونے کے بعد اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ روم۔ شام۔ فارس، مصر وغیرہ کو دعوت نامے بھیجے گئے تبوک تک لشکر کشی کی گئی۔ یہ سب کچھ اللہ کی نصرت کے وعدہ کے اعتماد پر ہوا اور رسالت کے بعد حضرت ابوبکر نے جو مادی طاقت نہ ہونے کے مرتدوں پر چڑھائی کی۔ ان کو راہ راست پر لائے اور ایران و روم کے مقابلے میں فوجیں روانہ کیں، ہتھیار نہ تھے فوج زیادہ نہ تھی، مال نہ تھا۔ ظاہری حکومت کی شان و شوکت اور طاقت نہ تھی قلعے، مورچے اور پناہ گاہیں نہ تھیں۔ عظیم الشان شہنشاہوں سے مقابلہ نہ تھا۔ مگر کچھ پرواہ نہ کی اور خلافت اول کے بعد حضرت عمر نے وعدہ نصرت کے بھروسے پر پوری فوج کشی سے کام لیا۔ بالآخر روم اور ایران کو زیر کیا۔ تباہ کیا۔ اسلام اور حاملان اسلام یعنی پیغمبر اسلام کا بول بالا ہوا اور وعدہ الٰہی پورا ہوا کہ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔

ایک شبہ آیت مذکورہ کی صداقت میں دو طرح سے شک ہوتا ہے۔ پیغمبران زکریا، یحییٰ اور بعض دوسرے پیغمبر مثلاً دانیال یرمیاہ وغیرہ کافروں کے مقابلے میں مغلوب ہوئے، شکست پائی، قتل اور قید ہوئے کیا وہ پیغمبر نہ تھے۔ اگر تھے تو آیت مذکورہ میں جو ضابطہ بیان کیا ہے اس کے خلاف کیوں ہوا اور ان کو فتحیاب کیوں نہ کیا گیا۔

۱۔ اللہ کا لشکر جس کے غالب ہونے کی صراحت کی ہے اہل ایمان ہی ہیں مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ صدہا برس سے مسلمان ذلیل و خوار، مغلوب اور کافروں کے مقابلے میں تباہ حال ہیں۔ آیت مذکورہ کا ضابطہ ان کے لئے کیوں صحیح نہیں ہوا۔

جواب (۲) نصرت کے معنی غلط سمجھ لئے۔ نصرت یہ سمجھ لیا کہ لشکر کشی میں کامیاب ہونا اور کافروں کو شکست ہو جانا (ہی) وہ نصرت الٰہیہ ہے۔

جس کا وعدہ پیغمبروں سے کیا گیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کافروں کے مقابلے میں فتحیاب ہونا اور حکومت و تسلط حاصل کر لینا ضرور نصرت کی ایک قسم ہے۔
مگر یہ نصرت اگر فی الفور حاصل نہ ہو تو عدم نصرت سمجھ لینا اور ضابطۂ الٰہیہ کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ یوں تو حضور کے زمانے میں بعض غزوات میں
عارضی طور پر مسلمانوں کا پلڑا کافروں کے مقابلے میں ہلکا رہا۔ صلح حدیبیہ اور غزوہ احد وغیرہ اس کی مثالیں کافی ہیں۔ مگر انجام کار پیغمبر برحق کو غلبہ ہوا
اور حقیقت نصرت الٰہیہ کا نام ہے مشن کے کامیاب ہو جانے سے پیغمبر کا مشن ناکام نہیں رہا کرتا۔ باوجود کثیر مخالفتوں اور دشمنیوں کے وہ اعلان حق
میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا دین غالب رہتا ہے ستر سال یا باون سال تک بخت نصر کا بیٹا بلتنصر رات ہی کو مارا گیا۔ زکریا و یحییٰ کا انتقام
کیسا لیا اور شہید ہونے کے باوجود نصرت الٰہیہ ان کے لئے شامل حال رہی۔ اس کا مطالعہ تاریخ بنی اسرائیل میں کرو۔ نبی کی شہادت عدم نصرت
کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ مشن کی ناکامی اور انجام کار اہل حق کی مغلوبیت عدم نصرت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ مگر انجام کار کسی پیغمبر کا مشن مغلوب نہیں ہوا
مسیح کو ہی دیکھ لو کہاں کہاں بھاگنا، روپوش ہونا اور قید ہونا اور گرفتار ہو کر دکھ ہونا پڑا۔ مگر انجام کیا ہوا جو دشمن تھے وہی حامی بن گئے
پطرس جس نے رد در رد آخر وقت آپ کے خلاف شہادت دی تھی مسیح کے جانے کے بعد آپ کا اوّل ترین حواری بننے کا مدعی ہوا اور اپنے
اوپر روح القدس کے نزول کا دعویٰ کرنے لگا اور اس طرح تھوڑی مدت میں مسیح کے پیرو کروڑوں ہو گئے۔ آغاز کار میں تو ہر علمبردار حق کو
دشواریاں پیش آتی ہی ہیں فریق مخالف کے پاس دولت کثرت طاقت اور مادی سر و سامان ہوتا ہے، اس لئے حق کا پہلو کمزور نظر آتا ہے۔
مگر رفتہ رفتہ تھوڑی یا بہت مدت میں حق کو غلبہ اور باطل کو شکست ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے نصرت الٰہیہ بروئے کار آتی ہے۔ مگر ہر
فعل کا انجام چونکہ مقررہ مدت نہیں رکھتا۔ کسی کام کا انجام ہونا کسی کا چند گھنٹوں میں، کسی کا چند دنوں میں اور کسی کا برسوں میں نکلتا ہے، اس لئے
کوتاہ نظر سے دیکھنے والے کو آغاز بصورت انجام نظر آتا ہے اور وہ ابتدائی یا درمیانی دور کا انجام سمجھ لیتا ہے پیغمبروں کی شہادت، گرفتاری
اور قید درمیانی دور کے مظاہر تھے۔ انجام کار نہ تھا۔ انجام کار پیغمبروں کے مشن کے موافق نکلا بڑے بڑے جبار بادشاہوں کا جو قسر ذرائع میں غالب
آئے تھے اور جنہوں نے پیغمبروں کو شہید یا قید کیا تھا تختہ تاراج ہو گیا اور دین الٰہی بحال کر دیا۔

(۴) اللہ کا لشکر جماعت اہل ایمان کی حیثیت ہے۔ یعنی جو لوگ رسول برحق کے فرماں بردار کتاب اللہ کو سچا جاننے والا اس کے ہر فکری اور عملی
ضابطہ پر حقیقتاً کاربند ہونے والے اور اپنی زندگیاں اللہ کے لئے وقف کرنے والے ہیں۔ جو یقیناً اللہ کی فوج ہے، اس کو بھی امداد ملتی
ہوتی ہے۔ انجام کار کافروں پر غلبہ اور سرکشوں پر تسلط اس کو عنایت کیا جاتا ہے۔ اسلام کے نام لیوا جب تک حقیقتاً کتاب اللہ پر عامل اور
رسول اللہ کے فدائی تھے۔ اللہ کے حرام کو حرام سمجھ کر پرہیز کرنے اور حلال کو حلال جان کر اختیار کرتے تھے جن کو اگر بھروسہ تھا تو اللہ پر۔ اگر اعتماد تھا
تو فرمان رسول پر ایک در کے علاوہ کسی در پر سجدہ ریز نہ تھے اور ایک پیشوا کے سوا کسی کو اپنا نہ جانتے تھے۔ یعنی جو واقع میں مسلم تھے جنہوں نے اپنا
رُخ اللہ کی طرف کر لیا تھا کثرت سے منہ موڑ کر وحدت سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ پس اس وقت دن ان کا تھا۔ دنیا ان کی تھی، خالق ان کا تھا۔
تمام مخلوق ان کی تھی۔ وہ اللہ کے ہو گئے تھے۔ ساری کائنات ان کی ہو گئی تھی۔ ایک تہائی دنیا پر ان کا قبضہ تھا، شوکت ان کی تھی، عزت ان کی تھی، بلکہ
جب انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا تھا تو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے رسول اللہ کی اطاعت سے منہ موڑا، دنیا نے ان کے رشتہ اطاعت کو توڑا
انہوں نے مسلمانی کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی اسلام کی راہ ترک کر دی۔ اللہ نے ان کے مدعی اسلام ہونے کے باوجود ان کی امداد ترک کر دی۔ پس نہ
وہ اللہ کی فوج رہے نہ ان سے نصرت کا وعدہ۔ جب تک وہ کتاب اللہ کو اپنا دستور العمل اور سنت رسول اللہ کو اپنا شعار نہ بنائیں گے نصرت
الٰہیہ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ نکبت، تباہی، آشفتہ حالی اور بدنامی یونہی رہے گی۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ۔ اس آیت میں کس بلاغت آمیز طرز بیان میں رسول پاک کو تسکین، کافروں کو
عذاب کی تنبیہ اور فی الجملہ مسلمانوں کو ابتلائے کفار پر صبر کی تلقین کی ہے جس میں تنوین تقلیل کے لئے ہے یعنی تھوڑی مدت تک منہ پھیر نے
اور اعراض کرنے سے مراد ہے صبر رکھنا اور مدت مقررہ کے اختتام کا منتظر رہنا۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑی مدت تک صبر کرو۔ ان کی موجودہ حالت کو
دیکھتے رہو۔ جو کچھ ان کا انجام ہونے والا ہے قریب ہی وہ دیکھیں گے۔ کیا دیکھیں گے۔ تباہی، قحط، بدر کی لڑائی میں سربر آوردہ وہ لوگوں کا چن چن کر

قتل حکومت سے محکومیت، عزت سے ذلت اور مرنے کے بعد عذاب آخرت، آیت میں کسی انجام بد کی خصوصیت کے ساتھ صراحت نہیں، اس لئے ہر آئندہ بربادی مراد لی جاسکتی ہے

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝

اوپر کی آیات میں کافروں پر عذاب آنے اور ان کے برباد ہونے کی فی الجملہ وعید تھی۔ فرمایا تھا فسوف یعلمون فسوف یبصرون۔ کافروں کو غیبی عذاب کا آنا اور اپنی طاقت وجمعیت کا برباد ہونا بالکل محال نظر آتا ہے۔ ایک تو ان کو اپنی طاقت کثرت، دولت شجاعت وجاہلانہ عصبیت پر ناقابل شکست ناز تھا۔ دوسرے فریق مخالف بہت کمزور قلیل بے یار و مددگار اور خصوصیت کے ساتھ ان کی نظر میں ناقابل قبول اصلاح کا علمبردار تھا۔ ایسی حالت میں وہ کس طرح عذاب اور ہلاکت کی دھمکیوں سے مرعوب ہو سکتے تھے۔ اسی بنا پر عذاب کی وعید کا مذاق اڑاتے اور استہزاء کے لہجے میں کہتے تھے کہ اچھا تو عذاب کیوں نہیں آجاتا کہیں آبھی چکے۔ اس استخفاف واستہزاء کے جواب میں اس آیت کا نزول ہوا جس کا حاصل یہ ہے کہ عذاب کی فوری طلب یہ کیوں کرتے ہیں۔ جب ان کی بستیوں اور گھروں میں عذاب آجائے گا تو وہ ان کا برا دن اور وہ صبح بری صبح ہوگی اس وقت نہ توبہ کا موقع ہوگا نہ اصلاح خیال اور درستی کردار کا۔ لہٰذا آپ ان کے استہزاء کی کچھ پرواہ نہ کیجئے، صبر کیجئے اور ایک مقررہ مدت تک انتظار کیجئے۔ ان کی موجودہ (متکبرانہ، معاندانہ، ظالمانہ، بے باکانہ، سرمستانہ) حالت کو دیکھتے رہیئے۔ یہ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔ اس آیت میں ابصرہم فسوف یبصرون مکرر فرماکر مزید تسلی دی ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو مزید طمانیت قلب ہوجائے یا پہلی آیت میں کافروں کی دنیاوی تباہی اور اس آیت میں آخری تباہی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال ایسے سربرآوردہ اشخاص مارے گئے کہ مکہ کے ہر گھر میں پیٹنا پڑ گیا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ کافروں کے دماغوں میں اور زبانوں پر تین باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اللہ ایک دنیوی بادشاہ کی طرح تمام کائنات پر حکمران ہے اور ہر بادشاہ کی طرح اس کے مددگار، رفقاء، وزیر اور معین وعمال بھی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض کافروں نے تو آدمیوں کی طرح اللہ کے بیٹے بیٹیاں اور بیوی ہونے کا عقیدہ بھی جما رکھا تھا۔ اور زبانوں سے بھی کوئی مسیح یا عزیر کو خدا کے بیٹے اور کوئی ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتا تھا اور مریم کو خدا کی بیوی قرار دیتا تھا۔ دوسرے اللہ کو آدمیوں کی اصلاح کے لئے کسی قانون کے بھیجنے کی ضرورت ہے نہ انبیاء کی حاجت، ہم ہیں اور ہماری سوسائیٹی، ہمارے آباؤ اجداد کی رسمیں اور زندگی کی تمام ضروریات وکیفیات۔ خدا کو ان سے کیا واسطہ۔ تیسرے ہماری طاقت جسمانی صحت، تعداد کی کثرت، مال کی فراوانی، حکومت کی عزت و شوکت، عقل کی روشنی اور حواس کی بیداری عدیم النظیر ہے۔ ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ پیغمبر جو بازاروں میں پھرتا، سودا سلف خریدتا اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے، اس کی بات ماننی ہماری توہین ہے۔ یہ ذلیل ہم باعزت۔ یہ کمزور ہم طاقت ور۔ یہ نادار ہم زوردار، یہ تنہا ہم جتھے والے۔ بھلا برابر اور اس کا توازن ہی کیا۔ ہم پر اس کو کبھی غلبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تین خیال بیوقوفوں کے دماغوں میں گردش کرتے تھے اور آج بھی بعض جاہلوں کے دلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان فاسد خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا (۱) تیرا رب ان کافروں کے تمام بیان کردہ اوصاف سے پاک ہے۔ یعنی اس کی بیوی ہے نہ بچے نہ اس کو وزیر و مددگار کی ضرورت ہے نہ کسی جانشین اور مخبر وجاسوس کی۔ (۲) وہ رب ہے اور رب کا کام ہے کہ اپنے مربوب اور مخلوق کی جسمانی اور روحانی ترقی کے تمام ذرائع عنایت کرے۔ پس جس طرح اس نے جسمانی پرورش کے لئے نباتی اور حیوانی غذائیں پیدا کیں۔ غذائیں پیدا کرنے کے اسباب پیدا کئے۔ بدن کے اندر بقائے شخصی کی تمام قوتیں، رگیں، پٹھے، کھال وبال، ہڈی، گوشت، عقل وغیرہ پیدا کی۔ اسی طرح روحانی تربیت، اخلاقی اصلاح، معاشرتی درستی اور فکری صحت وصلاح کے لئے اس نے پیغمبر کو بھیجا۔ کتابیں، صحیفے اور یادداشتیں نازل کیں۔ کیونکہ یہ سب لوازم ربوبیت ہیں ان کا انکار حقیقت میں ربوبیت تامہ کا انکار ہے۔ (۳) عزت اور عزت کے تمام اسباب اسی نے پیدا کئے۔ غلبہ کا مالک وہی ہے۔ اولاد اور خدام کی کثرت کسی کے بس کی چیز نہیں۔ مال کی کثرت، جسمانی طاقت اور حکومت کے جلال پر کسی کو کامل اختیار اور خود مختاری نہیں۔ پس ان عارضی چیزوں پر ناز نازیبا ہے۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے جس کو چاہے گا دے گا۔ اس کی رحمت کاملہ پیغمبروں کے شامل حال ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں کافروں کی حکومت عزت ودولت

مدی اور تعداد کی کثرت ہیچ ہے ۔ بس حقیقت میں وہ معبود برحق ہے الٰہ مطلق ہے ، خلاق کائنات ہے اور پروردگار عالم ہے اور ہر قسم کی ستایش کا مستحق ہے ۔ ستایش اور حمد اسی کو زیبا ہے ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

مقصود بیان الربّك البنات الخ میں استفہام انکاری ہے ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے جس کا ثبوت ان کے پاس نہ عقلی تھا اور نہ نقلی ۔ وجعلوا بینه وبین الجنة نسبًا ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کافروں نے شیطان (اہرمن) کو خدا (یزدان) کا بھائی قرار دے رکھا تھا ۔ یا جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو خدا کی بیویاں اور فرشتوں کی مائیں فرض کر رکھا تھا ۔ بہرحال اللہ کے اور جنات کے درمیان رشتۂ زوجیت یا رشتۂ قرابت بنا رکھا تھا ۔ اس آیت سے مجوسیوں کے اس فلسفہ آمیز عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے جس کی رو سے وہ اللہ کو خیر اور نور اور شیطان کو شر اور ظلمت قرار دے کر دونوں یزدان اور اہرمن کو بھائی بھائی کہتے ہیں ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ میں کافروں کے ہر بیہودہ قول اور بے بنیاد بکواس سے اظہار پاک ہونے کو ظاہر فرمایا ہے ۔ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی ہو یا جن یا کوئی اور شیطان مخلوق کسی میں کسی کو بہکانے کی طاقت نہیں ہاں روز ازل میں جو شخص دوزخی ہونا مقرر ہو گیا ہے اس کو بہکانے والے بہکا سکتے ہیں ۔ ہر شخص کو نہیں بہکا سکتے ۔ وما منا الا له مقام معلوم ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتہ کی عبادت ، خدمت اور مرتبہ مقرر ہے اور عالم ملائکہ میں ایک خاص نظم ہے ۔ وان کانوا لیقولون الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے کچھ باشندے قریش ہوں یا کسی اور قبیلہ کے حضور کی بعثت سے پہلے آرزو مند تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس اللہ کی کوئی یادداشت گزشتہ اقوام کی طرح آئی ہوتی تو ہم اس کے حرف حرف پر عمل کرتے ولقد سبقت کلمتنا الخ سے ایک عام ضابطۂ قدرت کلیا کرنا مقصود ہے کہ اہل حق کی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی ہے ۔ اہل باطل ان پر غالب نہیں آسکتے حق پھیل کر رہتا ہے اور باطل ہمیشہ مغلوب ہوتا ہے ۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو جو ظلم جسیم ، عزت ، حکم غرض ہر کمال میں کافروں سے مغلوب ہیں ۔ ان سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم حق کے پرستار کامل طور پر نہیں ہیں ورنہ یہ ذلت و نکبت ہم پر مسلط کیوں ہوتی فتولّ عنهم حتّٰی حین سے کافروں کی ایذاء رسانی پر مسلمانوں کو وقت نصرت تک صبر رکھنے کی تلقین ہے اور فی الجملہ وعدۂ نصرت بھی ہے ۔ رب العزت کے لفظ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر طرح کی عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ کافروں کی عزت و جاہت ہیچ ہے وغیرہ ۔

سُوْرَةُ صٓ ۳۸

یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے ابن عباس کا بھی یہی قول ہے ۔ قرطبی نے اس کی صراحت کی ہے ۔ اس میں چھیاسی یا اٹھاسی آیات ہیں ۔ سات سو بیاسی الفاظ ہیں اور تین ہزار ننانوے حروف ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ

قسم ہے اس قرآن سمجھانے والے کی بلکہ جو لوگ منکر ہیں غرور میں ہیں اور مقابلہ میں بہت غارت کر دیں ہم نے

قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ

ان سے پہلے جماعتیں پھر لگے پکارنے اور وقت نہ رہا تھا خلاصی کا اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ڈرانے

مِّنْهُمْ ۖ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا

والا انہی میں سے اور کہنے لگے منکر یہ جادوگر ہے جھوٹا کیا اُس نے کردی اتنوں کی بندگی کو ایک ہی کی بندگی یہ بھی بڑے تعجب

لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ

کی بات ہے اور چل کھڑے ہوئے کئی پنچ ان میں سے کہ چلو اور جمتے رہو اپنے معبودوں پر بے شک اس بات

هٰذَا لَشَیْءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

میں کوئی غرض ہے یہ نہیں سُنا ہم نے اس پچھلے دین میں اور کچھ نہیں یہ بنائی ہوئی بات ہے

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا

کیا اسی پر اُتری نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں ان کو دھوکا ہے میری نصیحت میں کوئی نہیں ابھی انہوں نے چکھی

عَذَابِ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ

نہیں میری مار کیا ان کے پاس خزانے ہیں تیرے رب کی مہربانیوں کے جو زبردست بخشنے والا ہے یا ان کی حکومت ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۝ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ

اور زمین میں اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے تو ان کو چاہیے کہ چڑھ جائیں رسیاں تان کر ایک لشکر یہ بھی وہاں تباہ ہوا ان سب لشکروں

مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝

میں جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد و فرعون میخوں والا

وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ۭ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ۝ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ

اور ثمود اور لوط کی قوم اور ایکہ کے لوگ بڑی بڑی فوجیں یہ جتنے تھے سب نے یہی کیا کہ جھٹلایا

الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ۝

رسولوں کو پھر ثابت ہوئی میری طرف سے سزا اور راہ نہیں دیکھتے یہ لوگ مگر ایک چنگھاڑ کی جو بیچ میں دم نہ لے گی۔

تفسیر جہالت بری بلا ہے۔ دانش و فہم کو نابینا اور بصیرت و عقل کو مردہ کر دیتی ہے۔ اس سے سوچنے اور غور کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ روح پر زنگ اور کثافت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ جاہل انسان دیکھنے میں انسان اور حقیقت میں جانور ہوتا ہے جہالت کے تین نتائج لازمی ہیں۔ (۱) غرور و رعونت۔ جاہل اپنے زمانے کے آدمیوں میں سے کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ ممکن ہے کہ وہ مال و دولت میں دوسروں کو اپنے سے بڑا سمجھتا ہو، مگر علم و دانش قوت و عزت میں کسی کو اپنے مساوی یا خیال نہیں کرتا۔ اگر شرافت نسبی ہوتی ہے تو اس کا

خاندانی وقار ہوتا ہے تو اس کی اگر شخصی وجاہت اور قومی سیادت ہوتی ہے تو اس کی غرض ہر وقت وہم جو من دیگرے نیست کا نعرہ بلند کرتا ہے اور اس کی وجہ محض پیدائشی کم علمی اور کوتاہ فہمی ہوتی ہے ۔ ۲۔ کورانہ تقلید اس کی قوتِ اجتہاد مردہ ہو جاتی ہے ۔ سوچ کر نتائج نکالنے کی طاقت افسردہ بلکہ بے حس ہو چکی ہے ، اس لئے وہ اپنے مردہ اسلاف کی مردہ نقطوں پر اپنے زندہ دماغ کو قربان کر دیتا ہے ۔ جو کچھ اس کے بزرگ کرتے چلے آئے ہیں ۔ وہ اسی کا گرویدہ ہوتا ہے ۔ آبائی رسوم اور رواج بعلاج اس کی نظر میں نا قابلِ اصلاح اور مستغنی از تبدیل ہوتا ہے کیونکہ جب وہ خود اجتہاد اور غور و خوض سے کام نہیں لیتا یا نہیں لے سکتا تو کسی دوسرے صائب الرائے مفکر کے اجتہاد اور اصلاح کو کب قابلِ پذیرائی خیال کر سکتا ہے ۔ (۳) اس کا عقیدہ خام ہوتا ہے ۔ اس کی ذہنی قوت بہت کمزور ہوتی ہے ۔ اس کا تصور محدود ہوتا ہے ، اس لئے وہ ہر فرضی اور موہومی ہستی کو اپنا معبود سمجھ لیتا ہے ۔ ہر اختراعی معبود کے سامنے سربسجود ہوتا ہے ۔ در در کاسۂ گدائی لئے پھرتا ہے اور ہر چوکھٹ پر پیشانی رگڑتا ہے ۔ اس کو وحدتِ خیال میسر ہی نہیں ہوتی ۔ اس کو نظمِ کائنات میں عمومی ترتیب نظر ہی نہیں آتی ، اس لئے اس کا معبود ایک نہیں ہوتا ۔ دانشمند صائب الرائے نے حقیقت شناس زندہ انسانوں کے علاوہ تمام بڑے بڑے حکمراں ۔ دولت مند آدمی اس کے علی خدا اور وہی غیبی طاقتیں اس کی معبود اور کائنات کی ہر جاندار بے جان چیز اس کی مسجود ہوتی ہے ۔ مطلب یہ کہ مادی طاقت کے سامنے وہ سر جھکاتا ہے یا فرضی وہمی دیوتاؤں کے سامنے ۔ دانشمندوں کی صحیح رائے اور ہادیانِ برحق کا صحیح قول اس کے لئے نا قابلِ قبول ہوتا ہے ۔ یہ تین نتائج ہر جہالت کے اوّل ترین پھل ہیں ۔ حضورِ اقدس کے زمانے میں قریش ، کنانہ ، خزاعہ اور دوسرے قبائل کے آدمی بھی سخت جاہل تھے حضورِ والا کی شخصیت ، عقل ، اصلاح کوئی بھی ان کے لئے جاذب توجہ نہ تھی اور مخالفت کرتے تھے اور جاہلانہ مخالفت کرتے تھے ۔ نبوت کا مستحق اس شخص کو جانتے تھے جو مادی لحاظ سے طاقتور ہو ۔ توحید کو تعلیمِ نبوت کے خلاف جانتے تھے اور اپنے اسلاف کے تعاون اور تعامل کو ہر اصلاح اور ترمیم سے بالاتر خیال کرتے تھے ۔ یہ بات ان کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی کہ کوئی غیر ذی اقتدار شخص بھی خدا کا مرسل ہو سکتا ہے ۔

تحلیلِ اجزاء صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ جب ابوطالب مرضِ موت میں مبتلا ہوئے اور آخری وقت قریب آیا تو قریش کے تقریباً نو آدمی جن میں ابوجہل بھی تھا ابوطالب کے سامنے آئے اور کہنے لگے ، تمہارا بھتیجہ ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے اور ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے ۔ اچھا ہوتا اگر تم اس کو بلا کر فہمائش کر دیتے ۔ ابوطالب نے آدمی بھیجا ۔ حضورِ والا کو بلوایا ۔ آپ تشریف لائے ۔ ابوطالب کوٹھری میں تھے اور ان کے پاس ایک آدمی کی جگہ خالی تھی ۔ ابوجہل کو اندیشہ ہوا کہ شاید حضورِ والا ابوطالب کے پاس خالی جگہ پر جا کر بیٹھ جائیں اور ابوطالب پر جادو کر دیں ، اس لئے وہ خود آگے بڑھ کر خالی جگہ پر بیٹھ گیا ۔ مجبوراً سرکار دروازہ کے پاس ہی بیٹھ گئے ۔ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے کیا وجہ کہ تمہاری قوم تمہاری شکایت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ ہمارے معبود کو برا کہتا ہے ۔ حضور نے فرمایا چچا میں ان لوگوں سے صرف ایک بات کہتا ہوں ۔ اگر یہ سب اس بات کو مان لیں گے تو سارے عرب والے ان کے سامنے گردنیں جھکا دیں گے ۔ اور ان کے فرمان بردار ہو جائیں گے اور عجم والے ان کو جزیہ دیں گے ۔ یہ سن کر سب لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی اور کہنے لگے ایک بات کیا ۔ ہم تمہارے باپ کی قسم ایسی دس باتیں ماننے کو موجود ہیں ۔ کہو وہ کیا بات ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ ۔ یہ سننا تھا کہ سب کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اس نے سب معبودوں کو ایک کر دیا ۔ یہ عجیب بات ہے ۔ حضورِ اقدس تشریف لے آئے ۔ اس پر آیت مذکورہ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ تک نازل ہوئی (رواہ احمد وابن ابی شیبۃ والنسائی والترمذی وقال حسن صحیح وعبد بن حمید والحاکم وصححہ ابن مردویہ والبیہقی وابن جریر وابن المنذر) اب ہم ذیل میں آیت کی تشریح کرتے ہیں ۔

صٓ سیوطی محلی اور اکثر اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ صٓ متشابہات میں سے ہے جن کی حقیقی تاویل کسی کو نہیں بتائی گئی ۔ متشابہات بھی بہت بڑی دقیق معانی کو حامل ہیں ۔ جن کی تنقیح علمائے قرآن نے مختلف روایات اور انکشافی درایت کے تحت کی ہیں ۔ ہم بعض علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں ۔

صاد ۔ یعنی صدق اللہ اللہ نے سچ کہا (ضحاک) ۔ محمد نے سچ کہا (عطار) قتادہ نے کہا صاد اللہ کے ناموں میں سے ایک

نام ہے ۔ محمد بن کعب نے کہا کہ ص اللہ کے نام کی مفتاح ہے ۔ سعید بن جبیر نے کہا صاد ایک سمندر ہے جس سے اللہ مردوں کو زندہ کرے گا ۔ ضحاک اور عطا کی تشریح اس آیت کے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے ۔ یعنی کافروں کے جواب میں اللہ یا اُس کے رسول نے سچ کہا ۔

والقرآن ۔ واؤ قسمیہ ہے ۔ قرآن عظیم الشان اور محبوب ترین چیز ہے ، اس لئے اس کی قسم کھائی ۔ اگرچہ کافروں کی نظر میں قرآن باعظمت نہ تھا ، مگر متکلم کی نظر میں واجب العظمت تھا اور قسم کھانے والے کی نظر میں کسی چیز کی عظمت اس کی قسم کھانے کے جواز پیدا کر دیتی ہے ذی الذکر یعنی شرف والا (ابن عباس سعید بن جبیر اسماعیل بن خالد ابن عیینہ ابوحصین ۔ ابوصالح (سدی) قتادہ اور ضحاک نے فرمایا قسم کا نصیحت کرنے والا ۔ ابن جریر نے اسی ترجمہ کو پسند کیا ہے ۔ قسم کا جواب بقول قتادہ آئندہ آیت بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں ہے (ابن کثیر) لیکن شیخ مکی اور اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ جواب محذوف ہے یعنی نصیحت والے قرآن کی قسم کھاتے آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں ۔ یا بلاشبہ یہ قرآن حق ہے یا یہ قرآن ناقابل شک ہے ۔ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ یہ جملہ کلام محفوظ سے اضراب ہے یعنی بل اضراب کے لئے ہے یا ترقی کے لئے ہے ۔ اول صورت ظاہر ہے ۔ دوسری شق پر یہ مطلب ہے کہ کافر فقط کافر قرآن اور منکر رسالت ہی نہیں بلکہ تکبر اور شقاق میں پڑے ہیں ۔ بعض مفسرین نے شقاق کا ترجمہ ضد لکھا ہے ، مگر ابن جریر ، ابن کثیر اور اکثر علماء تابعین نے انکار کرنے والے ۔ گویا اللہ کی تمام خصوصی صفات کا انکار کرتے ہیں ۔ نہ اس کو قادر مانتے ہیں نہ قاہر نہ حکیم نہ علیم ۔ نہ رازق نہ خالق ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر صرف ظاہری شان و شوکت ، دولت و وجاہت ، تعداد کی کثرت ، عزت و حکومت پر ہوتی ہے اور اسی ناز بیا اور ناروا غرور سے وہ سرمست ہو لیتے ہیں ۔ یہ سرگرانی دو طرح کے بُرے نتائج پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص چونکہ مال و منال اور وجاہت و حکومت کے درپے ہوتا ہے اور ہر شخص کو ہر خواہش کا مل جانا ناممکن ہوتا ہے اس لئے خواہ مخواہ دوسرے سے حسد و جلن پیدا ہوتی ہے ۔ باہمی بغض اور عداوتیں نمودار ہو جاتی ہیں ۔ رقابتیں اور کینہ توزیاں اپنا اثر دکھاتی ہیں ۔ یہاں تک کہ دوستوں ، عزیزوں اور بھائیوں میں بھی پھوٹ پڑ جاتی ہے ۔ دنیا طلب لوگوں میں یہ تمام باتیں دلدادت دیکھنے میں آتی ہیں یہ سب کچھ نتیجہ انکار توحید کا ہوتا ہے ۔ اگر تمام لوگ ایک مرکز پر جمع ہوتے اور ان کے پیش نظر معرفت الٰہیہ کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا اور رب کا اصل مقصد اللہ کی ذاتی اور صفاتی توحید کا اقرار رہتا تو ہر چیز سے منہ موڑ کر ایک ہی کے طالب ہو جاتے ، مگر برا ہو کفر کا اور انکار کا جس نے قوم کا قوام خراب کر دیا ۔ انسان کو انسان سے نامانوس بنا دیا اور متمدن انسان کو پراگندہ حال بنا کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ۔ دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جب سب کا عقیدہ ایک نہیں ہوتا اور اللہ سے ہٹ کر دوسروں کی طرف جھکتا ہے تو ظاہر ہے کہ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ اور الناس فیما یعشقون مذاهب اور ہر شخص کا میلان طبع دوسروں سے جدا ہوتا ہے اور ہر آدمی کی سوجھ بوجھ بھی دوسرے سے الگ ہوتی ہے ۔ پس ہر شخص کا معبود بھی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔ کوئی پتھروں کے سامنے سجدہ ریزی کرتا ہے ۔ کوئی پانی درختوں کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے ۔ کوئی ڈنڈوت کرتا ہے ۔ کوئی آگ کو پوجتا ہے کوئی ستاروں کو کارساز اور فاعل خیال کرتا ہے ۔ کوئی مصاحبات سے ہٹ کر غیبی ارواح کو متصرف مانتا ہے اور کوئی اپنے گزشتہ بزرگوں کو انسانیت کی بالائی سطح سے کچھ اونچا کر کے خدائی درجہ تک پہنچاتا ہے ۔ اسی پراگندہ خیالی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر خود غلط انسان اپنے کو حق پر اور سارے عالم کو باطل پر خیال کرتا ہے اور دوسروں کو بے وقوف جاہل اور دوزخ کا کندہ سمجھنے لگتا ہے ۔ اس طرح دلوں میں پھوٹ اور خیالات میں تفرقہ پیدا ہو کر وحدتِ انسانیہ کا شیرازہ بکھر جاتا ہے ۔ آئے دن کی سیاسی لڑائیاں اور فرقہ بندی کے نام پر تبرا نمائیاں اسی فساد و عقیدہ کے سبب برسرکار آتی رہتی ہیں ۔ اگر رسولِ خدا کے بیان کے موافق سب لوگ ایک عقیدہ پر جم جائیں اور ایک بارگاہ کو چمٹ جائیں اور ایک کے ہو جائیں تو کسی طرح باہم نفاق نہیں پیدا ہو سکتا ۔ بس کفر میں باہمی پھوٹ کا اصلی سبب ہے ۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اپنی طاقت اور بل بوتے پر ان کو ناز تھا ۔ دولت اور کثرت کے نشہ میں سرگرداں تھے ، مگر ان کی کثرت ، دولت ، حکومت ، عزت اور جسمانی طاقت ایسی نہ تھی جتنی گزشتہ اقوام کو حاصل ہو چکی تھی ۔ بابل کا تمدن ، مدائن کا عروج ، عاد اور ثمود کی جسمانی طاقت ، فرعون کی ہمہ گیری اور ان کے علاوہ دوسری قوموں کی قوت کو

کے کافروں کی عزت اور طاقت سے کہیں زائد تھی ۔ مگر رسول برحق کی مخالفت کے سبب سب کو غارت کر دیا گیا ۔ ابراہیم کے دشمن بابلیوں کا تمدن کہاں گیا ۔ ہارون کے حریفوں کی ہمہ گیری کس گوشۂ گمنامی میں جا بیٹھی ۔ صالح اور ہود کی ہدایت سے سرتابی کرنے والوں کو برباد کیا گیا ۔ تاریخ کے صفحات سے پوچھو ۔ اپنی بربادی کا یقین آیا ۔ سر پر اٹل تباہی آپہنچی ۔ تمام اسباب منقطع ہو گئے اور بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی تو سرکش نافرمانوں نے گردنیں جھکا دیں اور اس وقت رب العالمین کو پکارنے لگے ۔ مگر قضا کا تیر قدرت کی کمان سے نکل چکا تھا ۔ ہونے والا ہو چکا تھا ۔ رہائی کا وقت گزر چکا تھا ۔ اس وقت پکارنا بے سود تھا ۔ سب کو ہلاک کر دیا گیا ۔ یہی حال مکہ کے کافروں کا ہو سکتا ہے ۔ اللہ کے زور کے مقابلے میں ان کا زور نہ چلے گا ۔ ...
رسول اللہ کی نافرمانی اپنا رنگ دکھائے گی ۔ اسی مضمون کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا کہ ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا ۔ ہلاک ہوتے وقت انہوں نے واویلا کی اور ہم کو پکارا ، مگر چھٹکارے کا وقت نہ رہا تھا ۔ سب غارت کر دیے گئے ۔ آیت فنادوا ولات حین مناص کی تشریح اہل تفسیر نے مختلف طور پر کی ہے ۔ طیالسی نے ابن عباس کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں پکارا کہ وہ مہلت اور فرار کا وقت نہ تھا ۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت میں ابن عباس کا قول اسی طرح ہے کہ انہوں نے ایسے وقت فریاد کی جب کہ فریاد کا وقت نہ تھا ۔ عکرمہ کی روایت میں ابن عباس کا قول اس طرح ہے کہ انہوں نے ایسے وقت فریاد کی کہ فریاد کرنی ان کو سود مند نہ تھی ۔ یہ تمام الفاظ مختلف ہیں ۔ مگر شاید حاصل سب کا ایک ہی ہے ۔ محمد بن کعب نے کہا کہ انہوں نے اللہ کی توحید کا اقرار اس وقت کیا ۔ جب دنیا نے ان سے پیٹھ پھیری اور توبہ کے واسطے اس وقت مہلت مانگی جب انہوں نے دنیا سے پشت موڑ لی ۔ یعنی مرنے کے وقت قتادہ نے کہا ۔ جب انہوں نے عذاب دیکھا توبہ کی مگر توبہ کا وقت نہ تھا ۔ مجاہد ، سعید بن جبیر ، ابو مالک وغیرہ نے کہا انہوں نے اس وقت اقرار کیا جب قبولیت کا وقت نہ تھا ۔ یہ قول محمد بن کعب کے قول سے ملتا جلتا ہے ۔ زید بن اسلم نے کہا لات حین مناص کے معنی یہ ہے کہ انہوں نے بے وقت پکارا ۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۔ رسول پاک کی رسالت میں کافروں کو چند وجوہ سے شک تھا ۔ اول یہ کہ وہ خدا سے کسی کا گہرا تعلق ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھے کہ ان کو پیغمبر بنا دیا جائے ۔ وہ تعجب کر کے کہتے تھے ۔ ارے ہم میں کا ایک معمولی آدمی خدا کا قاصد کس طرح ہو سکتا ہے ۔ کہنے کو تو یہ بات کہہ دی ، مگر رسول اللہ کی روحانی طاقت ، ہمہ گیر سطوت اور قرآن مجید کی معجز بلاغت کا ان کو کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا ، اس لئے کچھ نہ سوجھی تو مجبوراً کہنے لگے ۔

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۔ یہ بڑا جھوٹا اور جادوگر ہے یعنی جو باتیں ہمیں دکھاتا اور بتاتا ہے جھوٹی ہیں ۔ یہ جادو کا زور ہے ۔ گویا ان کی نظر میں جادو کے زور سے سب کچھ ہو سکتا تھا ۔ یہاں تک کہ قرآن ایسا معجز کلام بھی بنایا جا سکتا تھا اور قرآن کی طرح کلام بنانے کی قوت بھی سلب کی جا سکتی تھی اور تمام لوگوں کو ان کی ادنیٰ انسانی قابلیتوں کو بے بہرہ بھی بنایا جا سکتا تھا ۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (۲) کافروں کو رسالت کے متعلق یہ دوسرا شک تھا کہ تمام معبودوں کی معبودیت مٹا دینا اور سب لوگوں کے لئے ایک معبود قرار دینا بھی ایک عجیب حیرت انگیز امر خلاف عقل بات ان کو نظر آتی تھی ۔ یہ شبہ بظاہر تعلیم رسالت پر تھا ۔ یعنی ان کو توحید کی تعلیم انوکھی اور نرالی معلوم ہوتی تھی ۔ اگر حقیقت میں اس شبہ کا رجوع بھی نفس رسالت کی طرف تھا ۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ یہ شخص کس طرح اللہ کا پیغمبر ہو سکتا ہے ۔ جب کہ اس کی تعلیم اس قدر غلط ہے کہ تمام معبودوں کو ہٹا کر سب کی جگہ ایک معبود کو دینا چاہتا ہے ۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (۳) کافر سمجھتے تھے کہ رسالت کا دعویٰ کرنے سے محمد کا مقصد یہ ہے کہ خاندان اور قوم میں سب سے زیادہ مالدار اور باعزت ہو جائے ۔ سب لوگ اس کا حکم ماننے لگیں ۔ گویا اس نے حصول مال و جاہ کے لئے رسالت کا ایک پر فریب جال بنایا ہے جس میں لوگوں کو پھنسانا چاہتا ہے ، اس لئے تم لوگوں کو چاہیے کہ اپنے دین پر قائم رہو ، اپنی چال چلو اور اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو ، ان کی عبادت پر جمے رہو ۔ ابن جریر نے آیت مذکورہ کا یہی مطلب بیان کیا ہے ، مگر بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہذا کا اشارہ رسالت کے دعوے کی طرف نہیں ہے بلکہ عبادت اصنام پر قائم رہنے کی طرف ہے یعنی سرغنہ کافروں نے کہا کہ تم چل کر اپنے معبودوں

کی پرستش پر جمے رہو۔ ہمارا اصل مقصود یہی ہے کہ ہم اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ابن جریر کی تشریح قرینہ کے مناسب ہے اور سیاق کا کلام سے بھی برابر یہی مطلب واضح ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ سر فنہ کون کون تھے۔ اس کی تفصیل اس آیت میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں۔ سدی کا قول ہے جس کو ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ ابوجہل بن ہشام، عاصی بن وائل، اسود بن مطلب اور اسود بن یغوث وغیرہ تھے۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ اندھے مقلد عقل اور فہم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک بزرگوں کے زمانہ کا پہلے ہونا۔ ہر چیز میں ان کی اولیت اور برتری کے لئے کافی ہوتا ہے۔ باپ دادا، پردادا، سکڑ دادا زمانہ میں پہلے تھے تو ان کی عقل و دانش قوت اور ہر چیز زائد تھی۔ یہ ایک ایسا عمیق غار ہے جس میں ہر جاہل ضرور گرتا ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ اسلاف میں بھی آدمی تھے، ہم بھی آدمی ہیں۔ وہ بھی غلطی سے پاک نہ تھے۔ ہم بھی غلطی سے پاک نہیں۔ جو قوتیں ان کو دی گئی تھیں وہی ہم کو دی گئی ہیں۔ وہ قوت قدسیہ اور طاقت غیبیہ کے حامل نہ تھے معصوم نہ تھے، فرشتے نہ تھے پھر صرف قدامت زمانہ ان کے ہر عقیدہ کو کس طرح صحیح ثابت کر سکتی ہے۔ آخر وہ بھی اپنے زمانے میں ایسے ہی تھے جیسے ہم اپنے زمانے میں ہیں۔ کل قدیم حدیث تھی زمانہ اپنے زمانہ میں جدید ہوتا ہے۔ یہ اندھی تقلید آدمی کی عقل کی آنکھوں کو اس قدر نابینا کر دیتی ہے کہ اس کی فقط عمل کی طاقت ہی مردہ نہیں ہو جاتی بلکہ سوچنے کی قوت بھی سلب ہو جاتی ہے وہ صرف رسوم اسلاف پر ہی کاربند نہیں ہوتا بلکہ سوچ بچار میں بھی انہی کی دماغی رفتار کا غلام ہوتا ہے۔ اس کو نہ آزادیٔ عمل حاصل ہوتی ہے نہ حریت رائے۔ پس وہ ہر جدید نوخیز حقانیت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے اور پیام جدید کی صداقت کے باوجود کہتا ہے کہ ہم نے یہ بات کبھی اپنے اسلاف سے نہیں سنی۔ کیا وہ غلطی پر تھے کیا ان کو اتنی بات بھی نہ سوجھی تھی۔ رسول اللہ کے زمانے کے کفار بھی اسی اندھی تقلید میں گرفتار تھے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ جو پیام محمد ہم کو دیتے ہیں اور جو عقیدہ وہ پیش کرتے ہیں یہ تو ہم نے اپنے بڑوں سے کبھی سنا نہیں۔ یہ محض ان گھڑت اور جھوٹ ہے۔ یہ شبہ بھی بظاہر تعلیم رسالت پر کیا جاتا تھا، مگر درحقیقت اس کا رجوع بھی نفس رسالت کی طرف تھا۔ جب تعلیم رسالت غلط قرار پائی تو مدعی رسالت بلاشبہ اپنے دعوے میں جھوٹا قرار پایا۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ۔ کفار سادہ نخوت سے سرشار کافر رسول پاک کو استخفاف اور استحقار کی نظر سے دیکھتے تھے اور حضور والا کی ناداری اور کمزوری ان کو سب سے زیادہ قابل ذلت اور باعث عیب معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی قومی سیادت، جسمانی طاقت، خاندانی افراد کی کثرت، حلیفوں کی قوت اور مال و اولاد کی افزائش پر نازاں تھے کہ ہر روحانیت کا مستحق اپنے کو جانتے۔ یہاں تک کہ برتقدیر امکان رسالت وہ خیال کرتے تھے کہ نبی ہونے کی کامل صلاحیت بھی ہم ہی میں ہے۔ اس لئے ان کو تعجب اور انکار انگیز تعجب ہوتا تھا جبکہ محمد رسول اللہ کو وہ مدعی رسالت پاتے تھے یا کہتے ہمارے ہوتے ہم میں سے اس فقیر و ذلیل نادار و کمزور شخص پر قرآن رسالت اور وحی کا نزول ہوا یہ ناممکن ہے۔ ہم اعلیٰ ہیں، افضل ہیں، اقویٰ ہیں اور اولیٰ ہیں۔ یہ ادنیٰ ہے کمزور ہے یہ نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک اور آیت ہے جس میں کافروں کے قول کو نقل کیا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یعنی یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

یہ پہلے دوسرے اور چوتھے شبہ کا جواب ہے کہ آدمی کو نااہل نبوت خیال کرنا یا توحید الوہیت کو ناممکن جاننا یا عقائد اسلاف کی خلاف ورزی کا بہانہ کرنا تینوں باتوں کی بنا صرف اس بات پر ہے کہ اللہ کی وحی کا ان کو انکار ہے۔ کافروں کو اللہ کی بھیجی وحی کا یقین نہیں اور شک کی وجہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کا مزا انہوں نے نہیں چکھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کو ماننے کو ان کا دل نہیں چاہتا، اس لئے کبھی تو آدمی کو نبوت کو ہی محال قرار دیتے ہیں۔ کبھی توحید الوہیت کی تعلیم کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کبھی اس کو عقائد سلف کے مخالف سمجھ کر ناقابل قبول کہتے ہیں۔ یہ سب بہانے ہیں۔ حقیقت میں ان کو وحی الٰہی ماننا ہی منظور نہیں۔ ان کے تسلیم وحی کی صرف ایک صورت تھی وہ یہ کہ اپنی آنکھوں سے اللہ کے عذاب کو دیکھتے اور ان پر اللہ کا عذاب آ جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ پس انہوں نے وحی الٰہی کے انکار کے بہانے کئے۔ تیسرا شبہ اتنا لغو تھا کہ اس کا جواب دینا ہی فضول تھا۔ حضور والا

نہ مال کے طالب تھے نہ عزت وجاہ کے نہ قومی سیادت کے نہ کسی اور اجرت کے پانچواں شعبہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا ۔ پہلا حصہ مال، جمال، عزت، صحت وغیرہ کا تھا ۔ دوسرا حصہ حکومت، سیادت اور کافروں کا دعویٰ تھا کہ ہم مالدار ہیں ۔ عزت والے ہیں ۔ تندرست ہیں پھر محمد کو نبوت کیوں ملی جبکہ اس کے پاس ہماری طرح نہ مال ہے نہ عزت وجاہت نہ جسمانی صحت ۔ کافر یہ کہتے تھے کہ جو حکومت، سیادت اور دنیوی طاقت ہم کو میسر ہے اس سے محمد محروم ہیں ۔ پھر ان کو رسالت کا استحقاق کس طرح ہو سکتا ہے ۔ پہلے حصے کا جواب دینے کے لئے فرمایا ۔

أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۔ یعنی اللہ پر کسی کا کچھ حق نہیں ۔ بندہ کی کوئی چیز اللہ پر واجب نہیں ۔ وہ وہاب ہے خود مختار ہے پھر اس سے زیادہ عزت والا کسی کی نہیں ۔ بلکہ حقیقت میں عزت اسی کی ہے کوئی عزت کا مستحق نہیں ۔ پھر وہ رب ہے ہر طرح کی جسمانی اور روحانی تربیت کرنا اسی کا کام ہے ۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی رحمت کے خزانے ان گنت ہیں ۔ اگر کسی کے پاس کچھ مال جمال عزت ہے تو وہ اللہ کی رحمت ہے ۔ اگر اللہ کی رحمت ہے اسی پر بند نہیں ۔ اس کی رحمت طرح طرح کی ہے ۔ مال جمال اور عزت بھی رحمت کی شاخیں ہیں ۔ اور فہم، عقل، علم، روح وجدان سلیم بھی رحمت الٰہیہ ہے ۔ پس اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہر قسم کی رحمت کا خزانہ کافروں کو مل گیا ہے ۔ عقل ووجدان کے سب سے بلند مراتب پر بھی یہ فائز ہیں ۔ اور ظاہری دولت وعزت کی آخری چوٹی پر بھی پہنچ گئے ہیں یقیناً ایسا نہیں ۔ پھر اپنے کو برتر سمجھ کر مستحق نبوت قرار دینا حماقت ہے ۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے ۔ وہ خود مختار ہے، وہاب ہے، رب ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۔ دوسرے حصے کا جواب دینے کے لئے فرمایا ۔

أَمْ لَهُم مُّلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ۔ یعنی کافروں کو جو اپنی حکومت، سیادت، جاہ وجلال اور طاقت پر ناز ہے اور اس وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنے آپ کو نبوت کا حقدار جانتے ہیں تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ ان کی حکومت اور طاقت کتنی ہے کیا کل زمین پر ان کی حکومت ہے یا آسمان ان کے قبضہ میں ہیں یا آسمان وزمین کی درمیانی کائنات پر ان کا تصرف ہے ۔ اگر ایسا ہے تو سیڑھیاں لگا کر چڑھیں اور اوپر جا کر ساری کائنات کا انتظام کریں ۔ مگر ان کے لئے نہ تو سیڑھیاں لگانے کا امکان ہے نہ اوپر جانے کا نہ وہاں کے انتظام کرنے کا ۔ زمین ان کی محکوم ہے نہ آسمان نہ درمیانی کائنات ۔ پھر ذرا سی عارضی حکومت وسیادت اور معمولی طاقت کی وجہ سے اپنے آپ کو نبوت کا مستحق سمجھنا اور محمد رسول اللہ کی نبوت کو نہ ماننا بے عقلی ہے ۔ ابن عباس مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر اور ضحاک کے نزدیک اسباب سے مراد ہیں آسمان تک راہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کائنات پر ان کی حکومت ہے تو آسمانی راستوں سے اوپر چڑھ کر اپنے احکام جاری کریں اور جس کے پاس چاہیں وحی بھیجیں اور جس کو چاہیں پیغمبر بنائیں ۔

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۔ یعنی زمین، آسمان اور درمیانی کائنات کی حکومت کیسی ۔ ان کو تو اپنی موجودہ طاقت قائم رکھنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ ان گروہوں کا ایک بڑا لشکر وہاں شکست پا چکا ۔ گویا اس آیت میں کافروں کی آئندہ شکست اور تباہی کی دھمکی دی گئی ہے اور بالواسطہ رسول پاک سے کافروں کی طاقت توڑ کر اسلام کی ترقی وفتح کا وعدہ بھی کیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس وعدہ اور وعید کو جنگ بدر میں پورا کیا گیا ۔ بدر میں مسلمان کم اور ان کا سامان بہت کمزور تھا ۔ اور کافروں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور ان کے پاس سازوسامان بھی عمدہ اور بکثرت تھا ۔ حضور اقدس نے سجدہ میں دعا کی اور یہ آیت سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ پڑھتے ہوئے برآمد ہوئے ۔ شیخ رازی نے لکھا ہے کہ آیت میں لفظ ہنالک (یہاں یا وہاں) موجود ہے جس سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ جس جگہ کافروں نے کھڑے ہو کر حضور والا سے مذکورہ بالا گفتگو کی تھی اسی جگہ ان کو شکست ہوگی ۔ اور یہ شکست فتح مکہ کے دن ہوئی تو گویا آیت میں فتح مکہ کی پیشین گوئی ہے ۔ میرے نزدیک بھی رازی کا بیان کیا ہوا مطلب زیادہ مناسب ہے ۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۔ کفار کی اپنی جماعت بندی، کثرت تعداد اور طاقت پر نازاں تھے اوپر کی آیات میں ان کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھایا گیا ۔ نرمی اور گرمی دونوں اختیار کی گئیں اور برہان کو خطابی رنگ دے کر قابل فہم بنایا گیا مگر ان کا تقاضا باقی ہے کہ اپنی جذباتی طاقت، انتقامیات جذبات کی قربانی کے بعد عقلی دلائل کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے ۔ ایسے وقت

ہیں اس کو باطل سے روکنے کے سوا اس کی کوئی سبیل نہیں ہوتی بلکہ دوسرے باطل پرست آدمیوں کے نتائج بد کی تصویر کشی کر کے اس کو بھی ہلاکت اور بربادی سے ڈرایا جاسکے، اس لئے اس آیت میں اللہ نے چند کافر اقوام کی تباہی کا تذکرہ فرمایا۔ اہل تفسیر نے ذوالاوتاد کے تین معانی بیان کئے ہیں۔ (۱) فرعون کے اوتاد اور اس کے لشکر والے اور ارکان دولت تھے جس طرح میخیں ٹھونک کر کسی چیز کو مضبوط کیا جاتا ہے اسی طرح فرعون نے اپنی سلطنت کا استحکام اپنے ارکان دولت، فوج اور پولیس سے کیا تھا۔ (۲) قلعوں اور مکانوں کو میخوں کی طرح مضبوط بنا رکھا تھا۔ فرعون جب کسی پر غصہ ہوتا تھا تو اس کو میخ میں گاڑ دیتا تھا۔ ذوالاوتاد کہنے کی یہی وجہ ہے تینوں معانی اچھے ہیں، لیکن آخری معانی پر مجاز کی طرف رجوع کرنا نہیں پڑتا اور جب حقیقی معنی صحیح طور پر بن سکتے ہوں اور مجازی معنی مراد لینے کی کوئی خاص وجہ بھی نہ ہو تو مجاز کی طرف رجوع کرنا نہ چاہیئے، اس لئے میرے نزدیک آخری تفسیر اولیٰ ہے۔

عاد سے مراد وہی عاد اول ہے جس کی ہدایت کے لئے حضرت ہود کو بھیجا تھا اور بالآخر عذاب کی آندھی نے ان کا تختہ تاراج کر دیا۔ اب ان کا نشان بھی باقی نہیں۔ عرب میں عاد کی تباہی مشہور تھی۔

وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ۔ قوم ثمود وہی قوم تھی جو وادی القرٰی میں رہتی تھی جس نے پہاڑیوں کے اندر پتھر تراش کر مکان بنائے تھے۔ اور اس کی ہدایت کے لئے حضرت صالح کو بھیجا گیا، مگر قوم سرکش نے صالح کی ہدایت کو نہ مانا اور ایک غیبی چیخ سے سب کی سب مر کر رہ گئی

یہی قوم لوط تو وہ بحرِ مردار کے کنارے آباد تھی۔ سدوم وغیرہ ان کی پانچ بستیاں تھیں۔ حضرت لوط کی نصیحت نہ ماننے کی وجہ سے اللہ نے وہاں کی زمین الٹ دی اور پھر ان پر کنکروں کی بوچھار کی، اس طرح وہ سب مر گئے۔ اصحاب الایکہ حضرت شعیب کی قوم کہلاتی ہے جو بن میں رہتی تھی اور حضرت شعیب کی نافرمانی کے سبب تباہ ہو گئی۔

أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ إِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ یعنی مذکورہ بالا اقوام سب کی سب جتھہ بندی میں ایک گروہ طاقتور اور پارٹیاں بڑی بڑی تھیں، مگر عذاب الٰہی کے مقابلے میں ان کی طاقت کچھ نہ چل سکی۔ ان پر عذاب آیا اور ٹھیک آیا۔ اور صرف اس وجہ سے آیا کہ ان میں سے ہر ایک قوم نے پیغمبروں کو نہ مانا۔ پس پیغمبر کی تکذیب کی پاداش میں ان کو غارت کر دیا گیا۔ اگرچہ ہر قوم نے اپنے زمانے کے پیغمبر کو نہ مانا تھا۔ گزشتہ پیغمبروں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا نہ اسلاف کی انہوں نے تصدیق کی نہ تکذیب، مگر ایک پیغمبر کا انکار درحقیقت کل پیغمبران کا انکار ہے۔ تعلیم اور مشن سب کا ایک ہے۔ ہر ایک دوسرے کا مؤید ہے اور مصداق ہے، اس لئے آیت میں فرمایا ہے کہ ہر قوم نے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔

وَمَا يَنْظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ نصیحت کے تمام ابواب ختم ہو گئے۔ برہانی، خطابی، ترغیبی اور تہدیدی، تمثیلی اور غیر تمثیلی ہر طریقہ سے نصیحت کر دی گئی، مگر کافروں کا سر پر خود دھر نہ ہوا تو اب فرماتا ہے کہ گزشتہ احزاب و اقوام کی تباہی سے بھی کافروں نے سبق نہ لیا اور حال کو ماضی پر قیاس نہ کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کو ناگہانی عذاب اور موت کا انتظار ہے اس وقت یہ مانیں گے۔ جب ناگہانی عذاب آ جائے گا تو دم لینے کی فرصت نہ ملے گی۔ اس وقت ماننا اور یقین کرنا بیکار ہوگا۔ صیحۃ سے مراد ناگہانی عذاب دنیوی یا قیامت یا وقت موت ہے۔ اہل تفسیر کے جواب مختلف ہیں۔

مقصود بیان و شقاق کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ کے کافر ہٹ دھرم تھے۔ محض ضد کے سبب رسالت اور الوہیت کا اقرار نہ کرتے تھے۔ کوئی عقلی یا نقلی دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ ایک بات بالالتزام یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کفر باہمی پھوٹ کا سرچشمہ ہے۔ کافر پراگندہ خیال، پراگندہ رائے اور مختلف عقائد رکھنے کی وجہ سے مرکزی اتحاد سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کا ظاہری اتفاق ہوتا ہے تو وہ بھی خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے اور خود غرضی خود روئی کا سنگ بنیاد ہے اور خود روئی پھوٹ کی اصل جڑ ہے۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ سے رسالت اور تسلیم رسالت پر کافروں کو جو شبہات اور وجوہ شبہات تھے ان کا بیان کیا ہے اگر کل عبارت کو تحلیل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو مندرجہ ذیل شبہات تھے۔

آدمی خدا کا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ محمدؐ کے پاس رسالت کی طاقت نہیں بلکہ سحر کی قوت ہے۔ توحید الوہیت صداقت کے خلاف ہے۔ رسالت کا دعویٰ کرنے سے محمدؐ کا منشا کچھ اور ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے یہ فریب کیا ہے۔ محمد کی تعلیم ہمارے اسلاف کے عمل اور دستور العمل کے خلاف ہے۔ محمد کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ اگر اللہ کو کسی کو پیغمبر بنانا تھا تو ہم ہی سے کسی کو چنتا۔ ہم ہر اعتبار سے محمد سے اعلیٰ اور اولیٰ ہیں۔ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انکار رسالت کے متعلق تمام دلیلیں سرد ہیں۔ حقیقت میں ان کو اللہ کی وحی کے نزول اور انسانوں کی اصلاح کے لئے اسی قانون کے نفاذ میں شک ہے اور اس کی وجہ ان کی کج فہمی اور ضد ہے اور ضد کو دور کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی عذاب الٰہی کا وقوع چونکہ ابھی تک عذاب الٰہی نہیں آیا اور ان کو آنکھوں سے نہیں دکھا دیا اس لئے ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ الخ میں رسول پاکؐ کی فی الجملہ تسلی اور کافروں پر عذاب نازل ہونے کی تنبیہ ہے۔ ہنالک کے لفظ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے جس جگہ کافروں نے اکھٹے ہو کر حضور والا سے مذکورہ گفتگو کی تھی وہیں ان کی بربادی ہو گی یعنی مکہ میں وغیرہ۔

پارہ نمبر ۲۳ کا جزو اول ختم ہوا۔ جزو ثانی کا انتظار کیجئے انشاء اللہ جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔

ضروری اعلان

۱۔ تفسیر بیان السبحان کا عام ہدیہ =/۶ فی پارہ ہے جس پر تقریباً سوا روپیہ محصول ڈاک رجسٹری صرف ہوتا ہے۔
لیکن

۲۔ مستقل خریداروں کو جو ایک روپیہ فیس ممبری بھیج کر ہمارے باضابطہ ممبر بن جاتے ہیں اُن کو تفسیر بیان السبحان کے تمام سپارے فی پارہ کے حساب سے ہم سپلائی کرتے ہیں لیکن محصول ڈاک وی پی ہر حالی میں ممبر صاحبان کو ہی سوا روپیہ ہر ماہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح تفسیر =/۴ میں پہنچتی ہے اس لئے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اگر کئی ممبر ایک ساتھ فیس ممبری بھیج کر ہمارے ممبر بن جائیں تو ایک جا بنے ہوئے تمام ممبروں کے لئے تفسیر بیان السبحان ہم ایک ہی پیکٹ میں ارسال کر سکتے ہیں۔ اس طرح محصول میں سب کو بچت ہو جائے گی ورنہ سوا روپیہ ہر ماہ ہر ممبر کو بلا وجہ محصول برداشت کرنا پڑتا ہے۔ رسید کوپن پہ ممبر حضرات اپنا پتہ انگریزی میں صاف تحریر کریں۔

۳۔ بحمداللہ تفسیر بیان السبحان کے پارے مکمل ہو چکے ہیں ہم نے ممبران کے اصرار پر پہلے پارے سے دسویں پارے تک اور گیارھویں سے بیسویں پارے تک یکجا کر کے دو جلدیں بندھوائی ہیں جو صاحب منگوانا چاہیں وہ ہر وقت طلب کر سکتے ہیں۔ دس پاروں کا ہدیہ دس روپے، جلد بنوائی دو روپے ڈاک خرچ تین روپے۔ یہ جلد ہم آپ کو رجسٹری سے ارسال کریں گے۔ آپ پندرہ روپے کا منی آرڈر کر دیجئے۔ اس کا وی۔ پی نہیں بھیجا جائے گا ممبری فیس ایک روپیہ الگ ہے۔

ہمارے یہاں ہر قسم کی درسی اور غیر درسی کتابیں ملتی ہیں۔

عطاء الرحمٰن صدیقی

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۲۳

جزو ثانی

وَمَالِیَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

بصورتِ پارہ ...... قیمت ۳/۵۰

پبلشر بابو عطاء الرحمٰن صدیقی مالک

وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی) سے شائع کیا

تیئیسواں ۲۳ پارہ (جزو ثانی)

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ○ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ

اور منکر یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارا حصہ ہم کو حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔ اے نبی ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور ہمارے

عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ اِنَّهٗ اَوَّابٌ ○ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ

بندے داؤد کو یاد کیجئے جو بادجود قدرت وحشمت کے ہماری طرف بڑے رجوع تھے ہم نے ان کے لئے پہاڑوں کو بھی تابع کر دیا تھا جو ان کے ساتھ شام وصبح تسبیح کرتے تھے

وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ ○ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ○

اور پرندوں کو بھی تابع کر دیا جو پرا باندھے رہتے تھے ہر ایک اس کے تابع تھا اور ہم نے اُن کی سلطنت کو مضبوط کر دیا تھا اور انکو حکمت اور فیصلہ کرنے کا سلیقہ بھی عطا کیا تھا

تفسیر حق ناشناس باطل کی ہدسیاہ مردوں کا فرقہ جب انبیاء برحق کی روشن دلائل کے مقابلے میں عاجز ہو جاتے ہیں اور ان کو کوئی عقلی ونقلی صحیح جواب بن نہیں پڑتا۔ اور اللہ اپنے خاص بندوں کو روحانی عقلی اور برہانی کمالات کے علاوہ ظاہری شوکت، جلال اور غلبہ بھی عطا کر دیتا ہے تو کافر بدسرشت کا فر مذاق کرنے لگتے اور اہل حق کی دعوت حق کو ہنسی میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اس جاہلانہ ٹھٹھول سے بھی کام بنتا نظر نہیں آتا اور انبیاء کے مقابلے میں عہدہ برآ ہونا نصیب نہیں ہوتا تو شیطانی رعایت اور طاغوتی اغوا کے زیر اثر انبیاء کو بدنام کرنے اور ان کی اخلاقی زندگی کو داغ دار بنانے کے لئے جھوٹا پروپگنڈہ اور غلط الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا وہ طاقتور، پُرجلال پیغمبر جس کا نام داؤد تھا اور جس کو اللہ نے دانش وفہم، نتیجہ کو پہنچنے والا دماغ، فیصلہ کی ذہنیت سحر آفرین قوت کلام اور طاقتور حکومت عطا فرمائی تھی اور جو ہر معاملہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں، کارگذاری کے ہر میدان میں اللہ کے احکام کی طرف رجوع کرتا اور نور حق کا طلبگار رہتا ہے۔ اس معصوم ہستی پر بھی کافروں نے تہمت تراشی کی اور جھوٹے الزام لگانے سے باک نہیں کیا۔ ایسے مجسمہ شرافت اور حامل روحانیت کو نفس پرست شیطان کی طرح دوسروں کی عصمت پر دست درازی کرنے والا قرار دیا اور مکر کے ساتھ پرائی بیویاں چھیننے والا کہا۔ کہاں پاک دامن اور روشن روحانیت رکھنے والا اللہ کا خاص بندہ داؤد اور کہاں یہ نفس پرستانہ شیطانی حرکت، مگر نادان جاہل کچھ نہ سمجھے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، کس کے متعلق کہہ رہے ہیں، ہمارے کہنے کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ ان کا مقصد تو داؤد کو قلبی دکھ پہنچانا تھا۔ حق ناحق سے ان کو غرض نہ تھی۔ ہو سکتا تھا کہ کافروں کو اس تہمت تراشی اور آبرو ریزی کے جرم میں اللہ کا طاقتور پیغمبر عبرتناک سزا دیتا۔ مگر داعی صداقت ذاتی جذبۂ انتقام سے بلند تر ذہنیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی دشمنی اور دوستی اپنے نفع ونقصان کے لئے نہیں ہوتی، اسی لئے نبی برحق نے کوئی انتقام نہیں لیا اور کافروں کی ضرر رسانی پر صبر کیا۔ ایسا ہی ہر پیغمبر صادق کو اس کے زمانے کے کافر ستاتے رہے اور پیغمبر نے ثابت قدمی سے کام لیا ہے اور صبر کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے رسول برحق، خاتم المرسلین کو بھی کافروں کی دریدہ دہنی، بدزبانی، بدسگالی پر صبر رکھنے کا قوی حکم ملا۔ خاطر خاطر کی تسلی کے لئے تمثیل کے طور پر حضرت داؤد ایسے جلیل القدر ممتاز پیغمبر کا تذکرہ فرمایا تاکہ ایک طرف پیغمبر کے لئے تسکین کا سرمایہ ہو جائے اور دوسری طرف اسرائیلی لٹریچر کی غلطی واضح ہو جائے، اور جتنا واقعہ تھا اسی حد تک بیان کر دیا جائے اور حقیقت سے آگے بڑھ کر جتنی الزام تراشیاں کی گئی تھیں ان کا غلط ہونا ظاہر ہو جائے اور تاریخ کی عظیم الشان غلطی دور ہو جائے۔

تحلیل اجزاء

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ٥ جب آدمی کی روح زنگ آلود اور دل تاریک ہو جاتا ہے تو اس کی قوتِ فکریہ کی چولیں بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ وہ صحیح طور پر سوچ بچار بھی نہیں کرتا بلکہ فہم و نظر کو کام میں نہیں لاتا۔ اس کے دماغ کی ہر موجی حرکت جاہلانہ ہو جاتی ہے۔ وہ فریقِ مخالف کی بات پر غور کرنا تو درکنار اس کو دیوانہ جانتا اور اس کی باتوں کو مجنوں کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں دیتا اور صادق الفکر، صادق القول کی ہر بات کا مذاق اڑاتا ہے۔

حضور اقدس نے عقل و بصیرت کی روشنی میں اپنی رسالت، اللہ کی الوہیت اور پیام الٰہی کی صداقت ثابت کی۔ گزشتہ انبیاء کے احوال بطور تمثیل بیان کئے اور کافروں کو تنبیہ کرنے کے لئے سرکش اقوام کا عبرت انگیز نتیجہ بھی دکھایا اور بالآخر کافروں کو عذابِ الٰہی کی دھمکی دی اور عذاب مقررہ کے آنے کی صراحت بھی کر دی۔ ایسے وقت میں مناسب تو یہ تھا کہ یہ بدباطن کافر اپنی کج فہمی کو چھوڑ کر دلائل نبوت پر غور کرتے اور وعید عذاب سے مرعوب ہو کر اپنے نتیجہ کو سوچتے، مگر بر اہو جاہلانہ اور تکبر معاندانہ کا جس نے ان کو اس کا موقع بھی نہ دیا۔ وہ سمجھے کہ رسول پاک ہم سب کو ہلاک ہو جانے اور دنیوی عذاب سے تباہ ہو جانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اس لئے بطور استہزاء کہنے لگے کہ قیامت کے دن کا جھگڑا کیا۔ عذابِ آخرت کا انتظار کون کرے۔ ہم کو تو قیامت کے دن جو حساب ہوتا ہے اور آخرت میں ہلاکت کا جو حصہ ہم کو ملتا ہے تو اسی زندگی میں روزِ حساب آنے سے پہلے ہم کو دے دو۔ دیکھیں وہ کیسا ہے؟

بے وقوفوں نے سمجھا کہ قیامت بھی ہنسی ٹھٹھا ہے۔ ایک جہان کا عذاب دوسرے جہان میں آسکتا ہے اور ایک زندگی کا خصوصی احوال دوسری زندگی کی طرف منتقل ہو سکتے ہیں۔ حضور والا نے ان کو عذابِ آخرت اور ہلاکتِ ابدی سے ڈرایا تھا اور عذابِ دنیوی کی جو دھمکی تھی اس کا نہ کوئی وقت مقرر تھا اور نہ اشخاص کی تعیین کی تھی کہ فلاں فلاں آدمی پر عذاب آئے گا۔ ایسی صورت میں سوال مذکور بے جا تھا اور فوری عذاب کا مطالبہ لغو۔ اگرچہ بعض صورتوں میں حضور نے نام لے کر عذاب سے ڈرایا تھا، مگر یہ بددعا کی صورت میں تھا۔ وعید کی شکل میں نہ تھا۔ مثلاً ابولہب کے بیٹے عتبہ کے متعلق یہ دعا کی تھی کہ الٰہی اس پر کسی کتے کو مسلط فرما۔ چنانچہ قریش کا قافلہ بسلسلۂ تجارت ایک شام کو گیا اور راستہ میں پڑاؤ پڑا تھا گرچہ عتبہ کے چاروں طرف نگراں سو رہے تھے، مگر کسی جنگلی شیر نے اس کو پھاڑ کھایا۔

یا قریش کے کچھ آدمیوں نے حضور کی گردن مبارک پر سجدہ کی حالت میں اونٹ کا اوجھ ڈال دیا۔ آپ نے ان کے لئے بددعا کی اور نام بنام بددعا کی۔ بدر کے دن وہ سب مارے گئے کوئی نہ بچا (صحیح) اس قسم کے عینی عذابوں میں بعض مخصوص کافر خصوصیت کے ساتھ ہلاک ہوئے مگر عام طور پر حضور نے یقین کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہونے کی دھمکی دی تھی نہ تاریخ عذاب مقرر کی تھی، مگر کافروں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا بلکہ ایک زندگی کے عذاب کو دوسری زندگی کی طرف منتقل ہونے کو ممکن جانا اور دنیا میں عذابِ اخروی مانگنے لگے۔ ایسے جاہلوں کا جواب سوائے صبر اور خاموشی کے کیا ہو سکتا تھا، اس لئے فرمایا۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ۔ کہ ان کے قول پر صبر کرو یعنی کافر جو بیہودہ باتیں بکتے ہیں ان سے زیادہ رنجیدہ نہ ہو۔ یہ بیہودہ باتیں کر کے تمہاری صداقت کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ۔ رسول پاک کو تسکین دینے کے لئے اس جگہ داؤد علیہ السلام کا کچھ ذکر فرماتا ہے۔ شروع میں حضرت داؤد کی آٹھ خصوصی صفات کی صراحت فرمائی۔ پھر ایک ایسا قصہ بیان کیا جس کی حقیقت کچھ بھی نہ تھی۔ حضرت داؤد کی معمولی لغزش یا فروگذاشت تھی نہ گناہ تھا نہ فسق و فجور۔ مگر بے دین جاہل اسرائیلیوں نے ایسے جلیل اس قدر عالی رتبہ حامل صفاتِ حمیدہ، پیغمبروں کی شان میں کیسی کیسی بہتان تراشیاں اور افترا پردازیاں کیں جن کو معمولی آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ ایک عظیم الشان حامل کتاب پیغمبر برحق۔ پس حضرت داؤد کے مدحیہ صفات کا تذکرہ اور تذکرہ صفات کے بعد ایک ایسے قصہ کا اظہار جس کو بے انتہا رنگ آمیزیاں کرنے کے بعد لوگوں نے بیان کیا اور اللہ کے پیغمبر کو ناپاک شیطان قرار دیا۔ ایک ایسا عجیب اور عبرت آفریں درس ہے جس کو پڑھنے کے بعد رسول پاک کے اپنے زمانے کے کافروں کے اقوالِ بیہودہ پر صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

فقرۂ مذکورہ میں حضرت داؤد کو خدا کا بندہ کہا ہے ۔ یوں تو سب ہی اللہ کے بندے ہیں ۔ لیکن عبدیت عبدیت میں فرق ہے جس کو نام لے کر اپنا بندہ فرمائے ۔ اس کی عبدیت آخری عبدیت ہوتی ہے اور انسانیت کی آخری چوٹی پر وہ فائز ہوتا ہے ۔ انسانیت کا کمال ہی عبدیت ہے۔

ذَا الْاَیْدِ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ۔ اس فقرہ میں حضرت داؤد کے دو وصف ذکر فرمائے ۔ اید کا ترجمہ اس جگہ ابن عباس ، سعدی اور ابن زید نے قوت کیا ہے ۔ جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ یعنی بقوۃ ، مجاہد نے قوت کو عبادت کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے ۔ یعنی حضرت داؤد عبادت اور بندگی میں قوی تھے ۔ قتادہ نے عبادت اور معرفت الٰہیہ کی قوت سے تفسیر کی ہے ۔ یعنی وہ بہت زیادہ خدا شناس اور صاحب معرفت تھے اور عبادت میں طاقتور تھے ۔ قتادہ نے یہ بھی کہا کہ حضرت داؤد تہائی رات نماز میں کھڑے رہتے تھے اور ہر مہینہ میں پندرہ دن کے روزے رکھتے تھے ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ صحیحین میں ایک مرفوع حدیث ہے کہ حضور اقدس صلعم نے فرمایا اللہ کو سب نمازوں سے زیادہ پسند داؤد کی نمازیں ہیں ۔ اور روزوں سے زیادہ محبوب داؤد کے روزے ہیں ۔ داؤد آدھی رات تک سوتے ۔ پھر تہائی رات تک نماز پڑھتے ۔ پھر بقیہ چھٹے حصے میں سوتے رہتے اور ایک دن روزہ رکھتے ایک دن نہ رکھتے ۔ حضرت کی دوسری صفت اوّاب ہونا بیان فرمائی ۔ یعنی ہر کام میں داؤد اللہ کی طرف رجوع کرتے فقط عبادات میں ہی نہیں بلکہ کل معاملات میں بھی اللہ سے رجوع کرتے تھے ۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ۔ اس آیت میں حضرت داؤد کی چوتھی صفت اور صفت کے ساتھ خصوصی انعام کا تذکرہ فرمایا ۔ یعنی داؤد جب ذکر الٰہی یا تلاوت زبور کیا کرتے تو شام اور اشراق کے وقت ان کے ساتھ پہاڑ بھی اللہ کی پاکی بیان کرتے تھے اور پہاڑوں کو اللہ نے ان کا تابع بنا دیا تھا اور جب پہاڑ داؤد کے ساتھ صبح شام تسبیح پڑھتے تھے تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ داؤد بھی صبح شام اللہ کی یاد یا تلاوت کتاب اللہ کرتے تھے ۔ آیت میں تین باتیں کسی قدر تنقیح طلب ہیں ــــ ہزار پہاڑوں کو اللہ نے داؤد کے تابع کر دیا ۔ کس بات میں کیا ، ہر طرح سے یا صرف تسبیح کرتے ہیں ۔ بظاہر ثانی شق ہی مراد ہے ۔ ہر بات میں تابع ہونا آیت سے ثابت نہیں ۔ یسبحن کا لفظ خود دلالت کر رہا ہے کہ پہاڑ حضرت داؤد کے ساتھ اللہ کی پاکی بیان کرتے تھے ۔ تسخیر کے یہی معنی ہیں ۔ اس کے علاوہ کسی قسم کی تسخیر آیت سے ثابت نہیں ۔ داؤد کے حکم سے پہاڑ کا حرکت کرنا ، چلنا پھرنا ، اپنی اندرونی پیداوار کو چھپانا یا نمودار کر دینا اور تمام معدنیات کو الٹ دینا وغیرہ ۔ کسی آیت سے ثابت نہیں نہ کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر ہے ۔

۲ ۔ پہاڑ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے تھے ۔ جس کس طرح کرتے تھے ۔ گویا پہاڑ بولتے تھے ۔ ان کی آواز ہوتی تھی اور اپنی نوعی زبان میں تسبیح کرتے تھے جس کو کوئی انسان نہیں سمجھتا تھا ۔ یا ان کی تسبیح حالی ہوتی تھی یعنی ان کا مخلوق ہونا ، ایک نظام کے تحت قائم رہنا ، خالق سے سرتابی نہ کرنا اللہ کی پاکی پر دلالت کرتا تھا ۔ موخر الذکر معنی مراد لینا میری رائے میں صحیح نہیں ۔ ایسی تسبیح تو پہاڑ کیا ہر چیز ہر وقت کرتی ہے ۔ نہ داؤد کی جلالت ، اعزاز و نبوت کو اس میں دخل ہے ، نہ آپ کے معجزے کو نہ آپ کی تلاوت اور ذکر کو ۔ دوسرے نمبر کی تسبیح بھی ہر وقت ہر چیز کرتی ہے ۔ اپنی نوعی زبان میں ہر شے اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے ۔ ایک اور آیت میں ہر چیز کی تسبیح (یعنی تسبیح مقالی) کرنے کی صراحت موجود ہے ۔ ارشاد ہوا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ الخ ۔ پھر پہاڑوں کی اور حضرت داؤد کی کیا خصوصیت ہے ، اس لئے اوّل معنی ہی مراد لینا صحیح ہے ۔ رہی یہ بات کہ ان کی آواز کوئی سنتا تھا یا نہیں سنتا تھا ۔ اس کی صراحت نہ کسی آیت میں ہے نہ کسی حدیث میں ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے اور عقل و قرینہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ عام لوگ پہاڑوں کی تسبیح کی آواز نہیں سنتے صرف حضرت داؤد کا معجزہ تھا ۔ خاص اعزاز تھا ۔ واللہ اعلم و علمہٗ اتم ۔

وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ یہ بھی حضرت داؤد کی ایک خصوصیت اور عزت و کرامت تھی کہ جب آپ تلاوت زبور یا ذکر الٰہی

کرتے تو اڑتے جانوروں کو اللہ جمع کر دیتا ۔ اور سب تلاوتِ داؤد کو سنتے ۔ بعض مفسرین نے جو اس جگہ لکھا ہے کہ اللہ اڑتے جانوروں
کو تلاوتِ داؤد کے وقت جمع کر دیتا تھا اور سب تلاوتِ داؤد کو سنتے ۔ بعض مفسرین نے جو اس جگہ لکھا ہے کہ اللہ اڑتے جانوروں
کو تلاوتِ داؤد کے وقت جمع کر دیتا تھا ۔ اور سب پرندے داؤد کے ساتھ شریک ہو کر تسبیح کرتے تھے تو اس آیت سے یہ مضمون ثابت
نہیں ۔ یہاں تو پرندوں کا صرف جمع ہو جانا مذکور ہے ۔ تسبیح کرنے یا نہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں ۔ البتہ پہاڑوں کی تسبیح کا تذکرہ ہے ۔
نہ پرندوں کے مسخر ہونے کی کوئی صراحت ہے ۔ ممکن ہے کہ اللہ نے داؤد کو ایسی خوش الحانی اور مؤثر آواز دی ہو کہ بوقت تلاوت
سب پرندے جمع ہو جاتے ہوں ۔ آپ کی آواز خاص طور پر سریلی ہو ، نغمہ آفرین ہو ایسی کہ کسی دوسرے کو نہ ملی ہو ۔ پس یہی
آپ کی خصوصی عزت اور کرامت ہو ۔ ایسی صورت میں جو بوقت تلاوت پرندوں کے غول جمع ہو جانا بعید از عقل نہیں ۔ بلکہ مبنی بر
واقعہ ہے ۔ پرندوں کی تسبیح کا دعویٰ کرنا اختراعِ دماغی ہے نقل سے ثابت نہیں ۔

ایک شبہ کا ازالہ :- جو لوگ **معجزات** انبیاء کو خلافِ عقل قرار دیتے ہیں اور ان کی رکیک تاویلیں کرتے ہیں انہوں نے تسبیح جبال
کا معنی اس جگہ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد شہر سے باہر جا کر پہاڑوں میں اللہ کی یاد کرتے اور کتاب اللہ کی تلاوت فرماتے تھے ۔
اور پہاڑوں میں آواز نکالی جائے تو صدائے بازگشت ضرور آتی ہے ۔ پس جو تلاوت داؤد کرتے تھے وہی آواز لوٹ کر آتی
تھی ۔ پہاڑوں کے تسبیح کرنے سے یہی مراد ہے ۔ مگر ان منکرین معجزات نے اتنا غور نہیں کیا کہ اگر پہاڑوں کی تسخیر اور تسبیح کے یہی
معنی ہیں تو اس میں داؤد کی خصوصیت کیا ہے ۔ بہت سے پیغمبر فلسطین اور شام کے پہاڑوں میں ذکرِ الٰہی کرتے ہوں گے ۔
اور آواز بازگشت پیدا ہوئی ہوگی ۔ ہمارے حضور نے بھی پہاڑ کی غار میں ذکرِ الٰہی کیا ہے ۔ کوہِ احد پر بھی ، فاران پر بھی اور مکہ
کے بیرونی پہاڑوں پر بھی ۔ بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس سے اور اس سے بھی بڑھ کر حضرت ابراہیم کے وقت سے حج کا طریقہ ہر سال
جاری ہے ۔ جس میں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں میں اللہ کی یاد ضرور کی جاتی ہے اور صدائے بازگشت بھی ضرور پیدا ہوتی ہوگی ۔ پس
ایسی عمومی حالت کو حضرت داؤد کی عزت آفریں خصوصیت قرار دینا غلط ہے ۔ پہاڑوں پر یا دروں میں جا کر ذکرِ الٰہی کرنا کوئی
کمال نہیں ۔ پس صدائے بازگشت کسی طرح موجبِ تسکین ہو سکتی ہے ۔

كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۔ اس فقرے کا ربط پہلے فقرے سے ہے ۔ سعید بن جبیر ، قتادہ ، زید بن اسلم اور ابن زید نے اوّاب
کا ترجمہ مطیع کیا ہے ۔ یعنی ہر پہاڑ اور پرند حضرت داؤد کا فرماں بردار اور مطیع تھا ، کس قسم کی اطاعت کرتا تھا اس کی کچھ
صراحت نہیں ۔ غالباً اطاعت سے تسبیح میں اطاعت کرنی مراد ہے ۔ قرینہ اور کلام کی رفتار اسی کی مقتضی ہے ۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ ۔ یہ بھی حضرت داؤد کی ایک قابلِ مدح صفت کا اظہار ہے ۔ یعنی ہم نے داؤد کی سلطنت کو مضبوط کیا
تھا ۔ معلوم نہیں مضبوطی سے کون سی مضبوطی مراد ہے ۔ اہل تفسیر نے اپنے اپنے خیال کے مطابق مضبوطی کی تشریح کی ہے ۔ کسی
نے کہا ہے کہ داؤد کی سلطنت کا رعب بہت تھا ۔ کسی نے کہا لڑائیوں میں ان کو فتح حاصل ہوتی تھی ، اس لئے دشمن ڈرتے تھے ۔
مجاہد نے کہا داؤد کی حکومت اس زمانے کی حکومتوں میں سب سے قوی تھی ۔ سدی نے کہا داؤد کے محل کا پہرہ ہر روز ہزاروں آدمی
دیتے تھے ۔ چار ہزار ڈیوٹی والے تھے یا ۳۳ ہزار یا ۴۰ ہزار ۔ مختلف روایات ہیں ۔

ابن جریر ، ابن ابی حاتم اور عبد بن حمید نے اس جگہ حضرت ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے فقرۂ مذکورہ کا مطلب
زیادہ واضح ہو جاتا ہے ۔ ابن عباس نے فرمایا " دو اسرائیلیوں کا باہم جھگڑا تھا ۔ ایک نے حضرت داؤد کے سامنے دوسرے
کے خلاف نالش کی اور کہا کہ اس نے میرا بیل چھین لیا ہے ، دلوایا جائے ۔ حضرت داؤد نے اس روز فیصلہ ملتوی کیا ۔ معاملہ پر غور
کرتے رہے ۔ رات کو خواب میں اللہ کی طرف سے حکم ملا کہ مدعی کو قتل کر دو ۔ انبیاء کا خواب بھی وحی اور واجب العمل ہوتا ہے
حضرت داؤد نے صبح کو دربار کیا تو فریقین کو طلب فرمایا اور مدعی کو قتل کرنے کا حکم دیا وہ چلانے اور شور مچانے لگا اور عرض کیا

اے نبی اللہ میرا کیا قصور ہے ۔ میرا بیل تو اس شخص نے چھینا ہے مجھے کیوں قتل کیا جاتا ہے ۔ حضرت داؤد نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تیرے قتل کا حکم دیا ہے ۔ اس لئے میں ضرور حکم کی تعمیل کروں گا ۔ مدعی کہنے لگا ۔ یا نبی اللہ میں اصل واقعہ عرض کرتا ہوں ۔ بے شک میرا بیل اس شخص نے چھینا ہے ، مگر میں نے بھی اس کے باپ کو خفیہ طور پر قتل کر دیا تھا ۔ یہ واقعہ ہے حضرت داؤد نے اقرار کے بعد مدعی کو قتل کرا دیا ۔ یہ خبر جب بنی اسرائیل میں پھیلی تو لوگوں کے دلوں میں حضرت داؤد کی حکومت کی ہیبت پیدا ہو گئی اور یہی اللہ نے فرمایا وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ معلوم نہیں ابن عباسؓ کے اس بیان کا سرچشمہ کہاں ہے ۔ اگر روایت صحیح ہو اور روایت کا ماخذ بھی معتبر ہو تو پھر فقرہ مذکورہ کا مطلب صاف ہو جاتا ہے ۔

وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ یہ بھی حضرت داؤد کی مدحیہ صفت اور اللہ کے خاص انعام کا تذکرہ ہے ۔ حکمت سے مراد عام مفسرین کے نزدیک نبوت اور معرفت ہے ۔ بعض نے زبور اور شریعت توریت مراد لی ہے ۔ مقاتل نے فہم و علم ۔ مجاہد نے عدل اور ابوالعالیہ نے علم کتاب الٰہی مراد ہونے کی صراحت کی ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ حکمت سب کو شامل ہے ۔ کسی کا یقین خود ساختہ یقین ہے ۔ واقعی سچا علم ، حکمت کا ترجمہ ہے ۔ خواہ وہ علم کتاب اللہ کا ہو یا قوانین الٰہیہ کا یا براہین وفاقی کا یا اپنے نفس اور احوال نفس کا یا عالم غیب اور مجردات کا یا اللہ کی ذات اور صفات کا یا نبوت اور روحانیت کا یا معمولی طبیعات کا یا الٰہیات اور فوق الطبیعات کا ۔ بہرحال لفظ سب کو شامل ہے اور ہر طرح کا صحیح مفید علم اور قابل مدح ہیں ۔

حضرت داؤد کے حکیم ہونے کے متعلق اگرچہ ہمارے پاس کوئی تاریخی معتبر شہادت نہیں ، مگر حکمت کی کتابوں میں اتنا ضرور مذکور ہے کہ مشہور عالم حکیم فیثاغورس حکیم سلیمان کا شاگرد تھا اور اہل حکمت حضرت سلیمان کو سلیمان حکیم کہتے ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ سلیمان داؤد کے بیٹے تھے تو غالباً تعلیم حکمت حضرت سلیمان کو حضرت داؤد سے حاصل ہوئی ہوگی ۔ اور حکمت کا سرچشمہ داؤد ہی ہوں گے ۔ واللہ اعلم ۔

وَفَصْلَ الْخِطَابِ یہ ٹکڑا بھی ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت داؤد ایک وصف امتیازی کے حامل تھے اور اللہ کا ایک خاص انعام ان پر تھا ۔ فصل الخطاب وہ کلام ہے جو حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہے اور دودھ کو پانی سے الگ کر دینے والا ہے ، لیکن اس جگہ اس لفظ سے کیا مراد ہے ۔ اس کے متعلق اہل تفسیر کے مختلف اقوال ہیں ۔ مجاہد اور سدی نے کہا سمجھ کر ٹھیک فیصلہ کرنے والا فصل الخطاب ہے ۔ شریح اور شعبی نے کہا فصل الخطاب گواہ اور قسم ہے ۔ قتادہ نے اس کی تائید میں کہا کہ مدعی اور مدعا علیہ کو باہمی عتاب خطاب اور جھگڑا دو صورتوں میں ایک صورت سے ختم ہوتا ہے ۔ یا مدعی اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کرے یا مدعا علیہ سے قسم لے ۔ بس گواہ اور ابی بن کعب سے بھی یہی منقول ہے ۔ تمام اقوال کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے ، اجمال اور تفصیل کا فرق ہے یعنی کلام فیصل اور حکم فیصل مطلب یہ کہ حضرت داؤد کو جھگڑا ختم کرنے اور ٹھیک فیصلہ کرنے کی ایک امتیازی قوت عطا کی گئی تھی ۔

مقصود بیان

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّل الخ سے کافروں کی جرأت جاہلانہ اور کلام احمقانہ کا اظہار وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ سے رسول پاک کو کافروں کی اذیت رسانی اور بیہودہ کلامی پر صبر کرنے کی تلقین وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ سے رسول کریم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ داؤد اگرچہ ہمارا ممتاز اور مورد انعامات خصوصی تھا ، مگر کافروں نے اس پر کیسی عظیم الشان بہتان تراشیاں اور افترا بندی کی ۔ ان کافروں کی بیہودہ کلامی اور الزام تراشی سے اتنا بڑا بندہ بھی محفوظ نہ رہ سکا ، اس لئے تم بھی صبر کرو اور وقت خاص کا انتظار رکھو ۔ اس سے آگے ان آٹھ احسانات کا بیان ہے جو حضرت داؤد پر کئے گئے تھے ۔ واللہ اعلم

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا

اور کیا پہنچی آپ کو وہ جھگڑنے والوں کی خبر پہنچی ، جب وہ دیوار پھاند کر آئے جب وہ داؤد کے پاس داخل ہوئے تو وہ ان سے گھبرا گئے انھوں نے

لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى

کہامت ڈرو۔ ہم دو جھگڑنے والے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے پس آپ انصاف سے ہم میں فیصلہ کر دیں اور بے انصافی نہ کریں اور ہم کو سیدھا راستہ

سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝ اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ

بتا دیں یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے پھر اس نے کہا کہ اس کو بھی

اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ

میرے حوالے کر دے اور مجھ سے بدزبانی بھی کی داؤد نے کہا البتہ اس نے تجھ پر ظلم کیا جو تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کا سوال کیا اور اکثر

كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ

شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں رہتے ہیں مگر وہ جو ایمان والے اور انہوں نے نیک کام بھی کئے (وہ نہیں کرتے) اور ایسے بہت کم ہیں

ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ

اور داؤد سمجھ گئے کہ ہم نے انکو آزمایا ہے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر پڑے اور توبہ کی ہم نے پھر انکو معاف کر دیا اور البتہ داؤد کے لئے ہمارے پاس مرتبہ اور اچھی منزل ہے

تفسیر کمزوری کا احساس قوت اور اقتدار پیدا کرتا ہے۔ بے کسی اور بے بسی کے بطن سے غلبہ نمودار ہوتا ہے۔ گناہ کا احساس دل کو روشن اور روح کو پاک صاف بنا دیتا ہے، معاش یا معاشرے کے سلسلے میں غلط اندیشی یا غلط روی کا احساس ایک لطیف اشارہ ہوتا ہے اس بات کی طرف کہ اسباب نمارسیہ نے احساس مرکب پیدا کر دیا گیا ہے۔ جو صرف ذہن یا عملی واقعات کو غلط ترتیب، کو آزمائش سمجھنے لگا ہے اور پھر آزمائش کو آزمائش جانتے ہوئے گزشتہ غلطی کو چھوڑ کر سامنے آنے والی سچائی کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ حضرت داؤد پیغمبر تھے، مقرب بارگاہ تھے، لطیف روح اور پاکیزہ دل رکھتے تھے۔ عوامی گناہوں سے معصوم بھی تھے۔ راست کردار اور اونچی معرفت کے حامل تھے۔ لیکن انسان تھے۔ پیغمبرانہ فرو گزاشت ان سے ہو سکتی تھی۔ معاش یا معاشرہ میں اگرچہ غلط روی اگرچہ ان سے ممکن نہ تھی، لیکن غلطی فکر کا امکان تھا اور اسی کے ساتھ ان کا احساس بیدار تھا۔ وہ اپنے مرتبہ کو جانتے تھے وہ خوب سمجھتے تھے کہ پیغمبر فرشتہ نہیں ہوتا جس کے اندر معاشریات اور معاشیات کو سوچنے یا کرنے کی تخلیق ہی نہیں۔ انسان بہرحال انسان ہے، مگر احساس کی بیداری انسان کو فرشتوں سے اونچا کر دیتی ہے۔ احساس بھی مرکب احساس۔ غلطی فکر آزمائش انسانی سمجھنا اسی بنا پر حضرت داؤد نے اپنی پیغمبرانہ فروگزاشت کو (جو شاید عام مومنین کے لئے معراج کمال ہوتی ہے) آزمائش اور امتحان الٰہی سمجھ لیا۔ کیسا امتحان۔ انسانی امتحان۔ ایمانی امتحان۔ صدیقی امتحان اور پیغمبری امتحان اس گناہ کے احساس سے دل میں مزید روشنی اور روح میں دوبالا پاکیزگی پیدا ہو گئی پھر کیا تھا اللہ سے استغفار کی اور عیب کو ڈھانکنے کی درخواست کی۔ احساس غلطی نے راستی کی طرف لوٹ جانے پر آمادہ کیا۔ عرفان پاش آفتاب نور جو انسانی فرو گزاشت کی ظلمت میں کسی قدر روپوش ہو گیا تھا۔ دوبارہ تجلیوں کی بارش کرتا ہوا سامنے آ گیا۔ داؤد نے اس کی طرف نظر اٹھائی۔ فوراً سربسجود ہو گئے۔ نتیجہ میں پھر وہی قرب حاصل ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے گناہ کی تاریکی نے عرفان کی چمک کو چھپا لیا تھا۔ اب پھر مغفرت کا نور گناہ کی ظلمت پر چھا گیا۔

معافی مل گئی کیسی معافی وقفہ راہ و منزل والی معافی نہیں بلکہ جادہ منزل سے گذر کر منزل قرب تک پہنچانے والی معافی اور بچھڑے ہوئے کو دوبارہ راہ حق پر گامزن کر کے شاید مراد سے ہمکنار بنا دینے والی معافی سچ ہے احساس بیدار ہو تو مقام قرب اور حسن مآب حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

ایک تنقیح اصحاب القصص نے حضرت داؤد کے متعلق اسرائیلیات سے اخذ کر کے ایک داستانِ عیش تصنیف کی ہے جس کو بعض تبع تابعین، بعض تابعین بلکہ بعض صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ظالموں نے تو حضرت انس کے حوالے سے ایک خرافات کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔ علماء ربانیین اور ارباب صداقت کا قول نقل کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کی گٹھڑی کا کچھ حصہ کھول کر بیان کر دیں۔ ہمارے بعض قدیم مفسر عجیب سادگی اور بھولے پن سے تمام دوسری اسرائیلیات کو بغیر کسی چھان بین کے اپنی تفسیروں میں نقل کر دیتے ہیں۔ وہاں اس بہتان اور افترا کو بھی۔ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے اور انتقاد و تنقیح سے روگردانی کرتے ہوئے نقل کر دیا۔ (اعاذنا اللہ منہا) ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور حاکم نے بروایت ابن عباس بیان کیا ہے۔ کہ داؤد کے دل میں ایک دن خیال آیا کہ اگر میرا امتحان لیا جائے گا اور جس طور پر امتحان ہوگا وہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ اپنی احتیاط کرو۔ امتحان کی تاریخ آئی۔ داؤد زبور لے کر بیت المقدس کی محراب میں بیٹھ گئے۔ دروازہ بند کرا دیا۔ ایک دربان ڈیوڑھی پر مامور کر دیا۔ تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ اچانک ایک سنہری پرندہ آیا (یا شیطان سنہری پرندہ کی شکل میں) نمودار ہوا۔ اور داؤد کے قریب آ گیا۔ داؤد نے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پرندہ پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور بڑھے وہ اور ہٹا۔ آخر کار حضرت داؤد نے زبور بند کر دی۔ اور پرندے کو پکڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پرندہ کھڑکی پر جا کر بیٹھ گیا، داؤد ادھر لپکے وہ بالاخانے پر جا پہنچا۔ داؤد بالاخانہ پر چڑھے تو قریب کے مکان میں ایک حسین عورت برہنہ غسل کرتی نظر آئی۔ عورت نے داؤد کو دیکھ کر شرم سے اپنے بال بدن پر بکھیر دیئے۔ یہ اوریا کی بیوی تھی۔ اوریا فوج کے ساتھ کسی لڑائی میں گیا ہوا تھا۔ داؤد کے دل میں عورت کی محبت پیدا ہو گئی اسلامی لشکر میں تابوت بردار جماعت فرنٹ میں ہوتی ہے۔ جب اس میں سے کوئی مارا جاتا ہے تو پچھلے کو اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا ہے حضرت داؤد نے کمانڈر کو لکھا کہ اوریا کو تلاش کر کے اصحاب تابوت میں شامل کر دو۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ اوریا کام آ گیا تو عدت کے بعد حضرت داؤد نے اس عورت سے نکاح کرنا چاہا۔ عورت نے اس شرط سے رضامندی ظاہر کی کہ مجھ سے جو لڑکا ہوگا اس کو آپ اپنا جانشین مقرر کریں گے۔ اور بنی اسرائیل میں سے پچاس آدمیوں کو اس اقرار کا گواہ بنائیں گے۔ داؤد نے منظور کر لیا۔ نکاح کے بعد اس عورت کے بطن سے حضرت سلیمان پیدا ہوئے۔ اس کے بعد کا قصہ قرآن میں مذکور ہے اور حاکم نے کسی قدر تغییر کے مستدرک میں اس روایت کو دوسرے طریقہ سے نقل کیا ہے جس کو بیہقی نے بھی لکھا ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اس خرافات کو بیان کیا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے تو حضرت انس کے حوالے سے اس کے مرفوع ہونے کی صراحت کی ہے جس کی اسناد ضعیف ہے۔ خطیب نے نمک مرچ چھڑک کر اور بھی قصہ کو طول دیا ہے اور نقل کے بعد تردید بھی کی ہے۔ ہم آگے لکھیں گے۔

ہمارے سادہ لوح مفسروں کی یہ تمام روایات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ افترائیات، بہتانات اور خرافات کا مجموعہ ہیں۔ اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث ہے نہ قرآنی صراحت۔ داؤد اور اوریا کے قصہ کا کسی صحیح ماخذ میں پتہ نہیں۔ ننانوے اور بھیڑوں کے قصے کو پڑھ کر حضرت داؤد کی توبہ، وانابت کی صراحت دیکھ کر اسرائیلی روایات کو قرآن سے منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔

صاحب کشاف نے قصہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس طرح کے قصے اتنے قبیح ہیں کہ نیک اور صالح مسلمانوں سے بھی ان کا صدور نہیں ہوتا نہ صلحائے امت کے متعلق کوئی ایسا گمان کرتا ہے۔ انبیاء اور ایسی لغو حرکتوں کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں۔

قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ اس داستان کی طرف التفات کرنا بھی حلال نہیں۔ یہ یہودیوں کی من گھڑت ہے۔ مشہور جلیل القدر تابعی سعید بن مسیب اور حارث اعور نے لکھا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جس طرح یہودی قصے بیان کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہودی تم سے داؤد کے متعلق ایسا قصہ بیان کرے گا تو میں اس کو ایک سو ساٹھ کوڑے ماروں گا۔ انبیاء پر بہتان طرازی کی یہی سزا ہے

نسفی نے مدارک میں لکھا ہے کہ قرآن کی بیان کردہ تمثیل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید حضرت داؤد نے اس عورت کے شوہر سے طلاق دینے اور خود نکاح کرنے کی خواہش کی تھی۔ اور یہ بیان بھی بطور تمثیل و تعریض ہے اس سے زیادہ کچھ بھی صراحت نہیں۔ ابو مسعود نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اوریا کی بیوی سے نکاح کے لئے حضرت داؤد کی طرف جس مکاری اور حیلہ سازی کو منسوب کیا جاتا ہے وہ ایسا بہتان ہے جس کو کان سن بھی نہیں سکتے۔ امام رازی نے اس داستان کو بہت طویل دلالت سے ثابت کیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد کے اس قصے سے پہلے اللہ نے اپنے رسول پاک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اِصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ..... ظاہر ہے کہ اگر مذکورہ افترائیات صحیح ہیں تو تلقین صبر کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں۔ داؤد نے ایک مکاری کی، اس میں کامیاب ہو گئے۔ ایک مسلمان کو قتل کرا دیا اس کی بیوی پر قبضہ کر لیا پھر ایسے پرستار ہوس کی اقتدا کا حکم کیا معنی رکھتا ہے۔

پھر داؤد کے آٹھ اوصاف گزشتہ آیات میں بیان کیے گئے۔ کیا اوصاف مذکورہ کا مالک ایسا ہی نفس پرست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انہی آیات کو آخر میں فرمایا۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ کیا مقام قرب اور حسن مآب ایسے بد اندیش فاسق کو عطا کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ آئندہ آیات میں حضرت داؤد کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا۔ کیا ایسا جفا کش ظالم پرائی عورتوں کو زبردستی تصرف میں لانے والا خلیفۃ اللہ ہو سکتا ہے۔ ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود کی خرافات محض بہتان ہے اور حقیقت سے کوسوں دور۔

ابن عباس کی طرف مذکورہ بالا جس روایت کا انتساب کیا جاتا ہے اس کے خلاف ایک قوی روایت یہ بھی منسوب کی جاتی ہے کہ داؤد نے اوریا سے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو گے تو میں اس سے نکاح کر لوں گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ ابن مسعود سے بھی اتنا ہی قول مروی ہے۔

خطیب وغیرہ علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے اول حضرت داؤد کے اوصاف جمیلہ بیان فرمائے اور آخر میں اپنے دنیوی و دینی انعام و اکرام سے سرفراز کرنے کی صراحت فرمائی پھر وسط میں اتنے بڑے عیب اور فعل قبیح کا اظہار کس طرح جائز سمجھا۔ یہ تو بلاغت کلام اور حسن نظام کی کھلی ہوئی شکست ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ساری روایات ہذیان اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ قرآنی بیان میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ غالباً صرف اتنی بات تھی (بشرطیکہ اوریا اور اس کی بیوی اور حضرت داؤد کا کوئی واقعہ ہو) کہ اوریا سے حضرت داؤد نے فرمایا تم (بیوی کی بد خلقی کے شاکی ہو یا تم کو اس کے ساتھ گذارا کرنا ناگوار ہے) اگر تم اس کو طلاق دے دو گے تو میں اس سے نکاح کر لوں گا۔ (یعنی بیوی میں کوئی خرابی نہیں اس کا کوئی جرم نہیں) اوریا نیک آدمی تھا اس نے قول مذکور کو پیغمبری مشورہ یا حکم سمجھا اطاعت میں بیوی ہاتھ سے جاتی تھی اور نافرمانی میں عذاب آخرت کا خوف تھا اوریا اسی تردد میں تھا کہ محراب کا واقعہ ہو گیا اور حضرت داؤد نے اللہ کی طرف سے اس کو تنبیہ اور امتحان سمجھ کر توبہ استغفار کیا۔ اب رہا یہ شبہ کہ اگر حضرت داؤد سے کسی جرم کا صدور نہیں ہوا تھا تو توبہ استغفار اور انابت تضرع کی بنیاد کیا تھی تو اس کا ازالہ بالکل ظاہر ہے۔ داؤد پیغمبر تھے۔ دل میں وسوسوں کا پیدا ہونا اور نہ ہونے دینا انسانی اختیار سے بالاتر ہے کوئی وسوسہ پیدا ہوا ہو گا۔ ممکن ہے کہ یہ ہی خیال پیدا ہوا ہو کہ اوریا اگر اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو میں اس سے نکاح کر لوں گا۔ اور اس طرح میری بیویاں سو ہو جائیں گی۔ یہ خیال بجائے خود گناہ نہیں۔ لیکن مرتبہ نبوت اور مقام قرب سے سرفراز ہونے والوں کی شان سے بعید ہے۔ خلیفۃ اللہ اور صاحب فصل الخطاب کے برتر اوصاف اس سے انکار کرتے ہیں۔ اس پر غیبی تنبیہ ہوئی۔ حضرت داؤد نے تنبیہ سے متنبہ حاصل کیا اور غبار قلبی کو آنکھوں کے پانی سے دھو کر صاف کر لیا۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

تحلیل اجزاء:- وَهَلْ اَتٰكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ٥ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ۔ گناہ ملزمی گمناہ یعنی

معصوم جس کے بعد کفر و شرک کا درجہ ہوتا ہے۔ ایسے گناہ سے ہر پیغمبر معصوم ہے۔ نفسانی ناجائز خواہشات، دنیوی جاہ و جلال اور عیش و تنعم کی پرستاری، مال و منال اور صنفی رجحانات کی دلدادگی کسی نبی کا شیوہ نہیں۔ ہاں گناہ خواص کا گناہ، اہلِ مودت و قرب کا گناہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مقربین کا ارادہ اور ارادی حدود میں مرضی الٰہی کے خلاف نہیں ہوتا۔ اگر خطوری اور وسوسی شکل میں بھی کسی پاک پیغمبر کا ارادہ مرضی الٰہی کے خلاف اور مرتبہ نبوت سے گرا ہوا ہو تو پیغمبر کے لئے وہ بھی جرم ہے۔ لیکن ایسا گناہ لطیف گناہ۔ خفی گناہ۔ فروگزاشت۔ لغزش قلبی۔ غبار روحی اور کس قدر پردہ دماغی ہوتا ہے۔ عوامی گناہ اور عوام کے لئے گناہ نہیں ہوتا۔ ادب شناس انبیاء ایسے گناہ پر بھی ماخوذ ہوتے ہیں۔ لیکن مواخذہ بھی حسین مواخذہ اور لطیف مواخذہ ہوتا ہے۔ اگر بیدار قلوب پر کوئی چھینٹا اونگھ کا پڑ جاتا ہے۔ اگر نورانی روحوں پر کچھ غبار آتا ہے۔ اگر روشن حس رکھنے والے دماغوں کو کچھ ذہول ہو جاتا ہے تو قلبی تنبیہ کی جاتی ہے۔ لیکن تنبیہ کی شکل میں نہیں بلکہ مرتبہ نبوت کا لحاظ رکھتے ہوئے بطور تمثیل اور تعریض کے حضرت داؤد جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بارگاہِ قدس کے رمز شناس تھے۔ کوئی ایسا وسوسہ ان کے دل میں گذر چکا تھا جو روحی غبار اور بیدار قلب کی اونگھ کا سبب بن گیا تھا۔ ادا شناس دوست کی یہ روحانی کیفیت محبوب حقیقی کو ادا شناسی کے خلاف نظر آئی۔ گناہ تھا حسین اور لطیف، اس لئے روح کو بیدار کرنے کے لئے ہلکی سی باطنی آہٹ کی گئی۔ لطیف اور نورانی فرشتوں کو انسانی لباس پہنا کر مدعی اور مدعا علیہ کی شکل میں بھیجا گیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ خصم (فریق معاملہ) ایک شخص ہو یا ایک جماعت سب کو کہا جاتا ہے۔ بقول نحاس جبریل و میکائیل مدعی و مدعا علیہ کی شکل میں بھیجے گئے۔ مسجد کا بیرونی دروازہ بند تھا۔ پہرہ دار بیٹھا تھا لیکن فرشتوں کو کون روک سکتا ہے۔ دیوار پھاند کر محراب مسجد تک اپنی جماعت دیگر ملائکہ سمیت پہنچ گئے۔ حضرت داؤد نے جھجک محسوس کی۔ آپ کو دشمنوں کا خوف نہ تھا کسی بداندیش کا ڈر نہ تھا۔ پھر دروازہ بھی بند تھا۔ پہرہ دار ڈیوڑھی پر مامور ہی تھا۔ یقیناً آپ نے سمجھا ہوگا کہ (جس طرح قوم لوط کو غارت کرنے کیلئے کچھ فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے اسی طرح) کوئی واقعہ نمودار ہونے والا تو نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آنے والا تو نہیں کہیں فتنہ اور آزمائش تو مقصود نہیں۔ اس پر آنے والوں نے کہا۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ۔ آپ کچھ اندیشہ نہ کریں۔ آیت میں لاتخف کا مفعول ذکر نہیں کیا یعنی یہ نہیں کہا کہ آپ ہم سے اندیشہ نہ کریں۔ نہ یہ کہا کہ آپ اپنی یا اپنی قوم کی باتوں کا اندیشہ نہ کریں، اس لئے شاید مقصود یہ تھا کہ آپ کسی قسم کا خوف نہ کریں۔ ہماری آمد کا مقصد طلبی ہے۔ ہم دو فریق ہیں۔ ایک فریق نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارا صحیح فیصلہ کر دیں۔ انصاف سے تجاوز نہ کریں۔ مبنی برحق کا فیصلہ جنبہ داری کی ہر آمیزش سے پاک ہوتا ہے۔ پیغمبر کے متعلق کسی مومن کے دل میں ناحق کوشی اور حق فراموشی کا کوئی خیال نہیں آسکتا۔ حضرت داؤد کی نبوت ناقابل شک تھی۔ فریقین بھی مومن تھے۔ پھر دادطلبی کے وقت مبنی بر انصاف فیصلہ کی استدعا اپنے اندر کوئی معنی رکھتی ہے۔ شاید فرشتوں نے (جو بصورت فریقین آئے تھے) حضرت داؤد کے قلبی خطور کی غلطی کی طرف لطیف اشارہ کیا ہو۔ یعنی یہ تنبیہ کی ہو کہ اوریا کی بیوی کے متعلق جو وسوسہ آپ کے دل میں گزرا ہے وہ سچائی اور حقانیت سے ہٹا ہوا ہے اسی لئے تو تفصیلی مقدمہ شروع کرنے سے پہلے مدعی نے کہا۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ۔ بلاشبہ یہ میرا بھائی ہے۔ یعنی میرے اور اس کے حقوق میں یگانگت ہے۔ میرا اس پر حق ہے کہ جو چیز اس کو پسند ہے اس میں میری حق تلفی نہ کرے۔ بھائی کو بھائی کا خیرخواہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی اوریا آپ کا بھائی ہے۔ اگر آپ کے دل میں اس کی بیوی کے متعلق کوئی وسوسہ پیدا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ وسوسہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ اوریا کا حق ہے اور اوریا کی حق تلفی آپ کے لئے جائز نہیں۔

لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً۔ نعجہ بھیڑی کو کہتے ہیں اور بطور استعارہ عورت کو بھی۔ ظاہر مراد تو بھیڑی ہے۔ لیکن کنایہ اوریا بن حنان کی

بیوی کی طرف ہے۔ لفظ تسع وتسعون سے واضح ہوتا ہے کہ شاید اس وقت داؤد علیہ السلام کی ننانوے عورتیں تھیں۔ خواہ بیویاں ہوں یا کچھ بیویاں ہوں یا باندیاں ہوں۔ اَکْفِلْنِیْهَا۔ یعنی ایک بھیڑی کو بھی میری کفالت میں دے دو۔ مجھے اس کا سرپرست بنا دو۔ اپنی ذمہ داری سے نکال کر میرے سپرد کرا دو۔ میں اس کا ولی بن جاؤں۔ اس قول سے بھی کنایہ حضرت داؤد کے اس قول کی جانب ہے جس کو ہم ابن عباس کی دوسری قوی روایت اور ابن مسعود وغیرہ کے حوالے سے اوپر نقل کر چکے ہیں۔ عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ کا یہ مطلب ہے کہ گفتگو میں اس کو برتری اور غلبہ حاصل ہے۔ اس کی بات کو لوٹانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اب کیا کروں اس کی بات مانتا ہوں تو اپنی بھیڑی سے دست بردار ہوتا ہوں، نہیں مانتا ہوں تو بے ادب قرار دیا جاتا ہوں۔ اس لفظ سے بھی کنایہ حضرت داؤد اور اوریا کے مراتب کے تفاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ سے وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ انسانی معاشرت بغیر معاشی تعاون کے ناممکن الحیات ہے۔ سماجی زندگی نام ہے امدادِ باہمی کا۔ باہمی امداد کے ہی زیر اثر فرائض زندگی کی تقسیم اور پیشوں کا اختلاف ظہور میں جلاہا، موچی، درزی، لوہار، بڑھئی، کسان اور انسانی معاشرت کے تمام کل پرزے اسی جذبۂ تعاون کے تحت اپنے اپنے فرائض سرگرمی سے ادا کر رہے ہیں۔ اقتصادی اور مالی تقسیم کا سرچشمہ بھی یہی باہمی کو آپریشن ہے۔ اگر انصاف کے ساتھ ہر شخص اپنا فرض تعاون ادا کرتا رہے اور کام سے زیادہ اجرت کا طالب نہ ہو تو حق تلفی، ناحق کوشی اور ظلم کی بنیاد ہی دنیا میں قائم نہ ہو اور باہم دراز دستی کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔ لیکن انسان کی راحت طلبی اور جذبہ خواہشات نے اکثر آدمیوں کو صحیح سماجی فرض ادا کرنے سے غافل بنا رکھا ہے۔ اپنے حق یعنی بقدر محنت اجرت پر اکثر آدمی قناعت نہیں کرتے۔ عموماً لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے حق سے آگے بڑھ کر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ماریں، دراز دستی کریں، کم محنت یا بغیر محنت کے زیادہ سے زیادہ ضروریاتِ زندگی بلکہ لوازم استبداد اور خود سری اور فرعونی رعونت کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی کی بدولت اللہ یہ سرزمین انسانی اور حیوانی خون سے لالہ زار بنی رہی ہے۔ سرسبز کھیتیاں، شاداب باغ، چہکتے چمنستان اور لہکتے مرغزاروں اور چٹیل میدانوں میں اسی جذبۂ ستم شعاری نے بدل دیئے۔ بکثرت پیارے نونہالوں کو بے کس یتیم اور نئی نویلی ماہ پارہ دلہنوں کو بے بس بیوہ اسی نے بنایا۔ اونچوں کو نیچا اور نیچوں کو اونچا اسی نے کیا۔ عزت والے کو ذلیل اور ذلت والے کو معزز ہونا اسی کی وجہ سے نصیب ہوا۔ ہاں کچھ آدمی ایسے بھی ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ انسان آئین سازی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی بشکل ملوکیت ہو یا بلباس جمہوریت، ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کی صورت میں ہو یا مزدک اور روسو کے پنچایتی بھیس میں انسان کے اس دکھ کا علاج نہیں۔ انسانی آبادی کے انفرادی اور سماجی حقوق کی تعیین اور حال و مستقبل کو ہر قسم کی دراز دستی سے محفوظ رکھنے کا ذمہ کسی آدمی کا دماغی زائیدہ جنبہ داری، بے آزادی کی ضرورت ہے، اس لئے ہمہ گیر علم، عمری رافت اور ہر قسم کے جذبۂ رافت اور رحمتِ ہمہ گیر اور سارے انسانوں کی تکوینی اور تخلیقی تعلق ایک جیسا ہے۔ وہ ہر قسم کے جذبۂ قرابت، عاطفۂ مودت، میل زوجیت اور داعیہ وطنیت و قومیت سے پاک ہے۔ بس ایسے خدا کی ہستی، وحدانیت، خلاقی، رزاقی اور شارعیت کا ان کو یقین ہوتا ہے اور فکری و عملی زندگی میں اپنے حق سے بڑھ کر دوسروں کے حق کی طرف نظر اٹھانا اور ہاتھ بڑھانا ناجائز جانتے ہیں اور اس طرح اس زمین میں اہل زمین کا بگاڑ بناؤ سے اور فساد صلاح سے بدل جاتا ہے، مگر ایسے آدمیوں کی تعداد ہمیشہ کم رہتی ہے۔ اسی مطلب کو آیتِ مذکورہ میں بالاجمال بیان کیا ہے۔ مفسرین نے آیتِ مذکورہ کو حضرت داؤد کے قول کے جزو اور تتمہ قرار دیا ہے، لیکن میری رائے میں ہو سکتا ہے کہ یہ داؤد کا قول نہیں بلکہ اللہ نے دنیا کی سماجی اور معاشرتی زندگی پر ایک صحیح ریمارک کیا ہو۔ جو واقعہ میں بالکل صحیح ہے۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ سے حُسْنَ مَاٰبٍ۔ مقرب بارگاہ رمز شناس ہوتا ہے۔ شاہی ابرو کے اشارات کا مفہوم اہل دربار ہی سمجھتے ہیں۔ کون جانے ادب سلطانی بغیر ادب شناس کے اور کون سمجھے۔ محبوب کی ادا ناز آگیں بغیر عاشق انداز شناس کے داؤد بارگاہ قدس کے رازدار تھے۔ شانِ الوہیت کی یک رنگی کو بھی جانتے تھے اور رنگا رنگی کے بھی لطف آشنا، مگر عتاب شناس بھی تھے۔ پہلے آدمی دیوار کود کر آگئے۔ مقدمہ پیش کیا۔ فیصلے کے طالب ہوئے۔ داؤد کا احساس دماغ چونک پڑا۔ لطیفہ قلب نے انگڑائی

لی۔ نورانی روح کے چہرے سے غبار اٹھا۔ غالب خیال پیدا ہوا کہ آزمائش کی گئی ہے۔ نبی کا خواب بیا ظن مرتبہ میں یقین سے کم نہیں ہوتا۔ کہاں مقدمہ کی پیشی اور اس کا فیصلہ اور کہاں روحانی اونگھ اور دماغی ذہول کا زوال۔ عام طور پر افراد اور اقوام کا عروج وزوال۔ زندگی اور موت، بلندی اور پستی، آبادی اور بربادی، اقبال اور ادبار۔ غرض ہر قسم کا تغیر اور انقلاب مردہ اور مفلوج دماغوں کو زندہ اور متحرک نہیں بنا سکتا ہے مردہ روح کا زندہ ہونا مشکل ہے اور بے حس دماغ کا حساس بننا سخت دشوار، مگر جس کی چشم باطن وا ہو وہ ادنیٰ سے اشارے اور پُر لطف ایماء کے بعد حقیقت پس پردہ کو انکشاف کر سکتا ہے۔
حضرت داؤد متنبہ ہو گئے۔ فوراً سجدے میں گر پڑے۔ بارگاہِ عتاب آفرین پر سرِ روح جھکا دیا۔ چشم التفات کو پھرا دیکھا تو خشم آگیں محبوب کی چوکھٹ پر دل کی پیشانی رکھ دی۔ لرز کر قدم پکڑ لئے۔ تمام دنیا سے منہ موڑ کر رشتے توڑ کر اپنی ہستی کے ذرہ ذرہ کو محبوب کے قدموں پر ڈال دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ رُخِ گردانی رونمائی سے بدل گئی۔ رحمت نے عتاب کی جگہ لے لی۔ بچھڑے ہوئے کو خاک سے اٹھا کر مقامِ قرب عطا کیا گیا۔ ایک ناز تھا عتاب کی شکل میں جس کے سامنے نیاز آیا۔ عبدیت کے لباس میں زحمت دور ہوئی رحمت چھا گئی۔ داؤد نے سفرِ زندگی میں ایک آن کے لئے روحانی رُخ پیچھے کی طرف موڑا تھا، لیکن فوراً ہی سمت منزل کو سمجھ گئے، لوٹ پڑے اور خوب لوٹے۔ جس سے اچھا لوٹنے کا رخ ممکن ہی نہ تھا۔ محبوب کا وصل چار بازگشت اس سے بہتر پلٹ اور کیا ہو سکتی ہے۔
باتفاق اہلِ تفسیر آیت مذکورہ میں رکوع کا معنی سجود ہے۔ اکثر مفسروں نے چالیس روز تک گڑ گڑاتے اور توبہ کرتے رہنے کی بھی صراحت کی ہے۔ معلوم نہیں اس قول کا ماخذ کیا ہے۔ شاید کوئی اسرائیلی روایت ہو۔ صحیح حدیث میں تو تعین مدت وارد نہیں۔

ایک ضروری توضیح حضرت داؤد نے خیال کیا کہ اللہ نے ان کی آزمائش کی ہے۔ اس فقرہ کا مطلب دو طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ داؤد نے خیال کیا کہ بند مسجد کے اندر دیوار پھاند کر یہ لوگ مقدمہ لے کر آئے ہیں، ضرور اس کی تہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات ہے۔ حضرت داؤد فریقین کو بہر حال آدمی سمجھے تھے۔ اور مقدمہ کے فیصلے تک آدمی ہی سمجھتے رہے ہے۔ ورنہ مقدمہ کی سماعت کیوں کرتے اور کیوں فیصلہ دیتے اور کیوں اکثر آدمیوں کے ناخوش ہونے پر ریمارک کرتے اور کیوں مومنین اور صالحین کو مستثنیٰ قرار دیتے۔ یہ تمام امور بتا رہے ہیں کہ آخر تک حضرت داؤد کی نظر میں فریقین مقدمہ آدمی ہی تھے۔ ہاں چند آدمیوں کا تنہائی کے موقع پر آنا اور ایسی صورت میں مقدمہ پیش کرنا جو حضرت داؤد کے اپنے کیس سے ملتی جلتی تھی یقیناً حضرت داؤد کیلئے تنبیہ آفرین تھی۔ فوراً آپ کا دماغ اپنے کیس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اتفاقی حادثے کو اتفاقی حدود سے نکال کر آپ نے کرشمۂ خداوندی قرار دیا۔ اور یہ بات حقیقتاً ثابت ہے یہی کہ کور نظر آدمی اچانک واقعہ کو یا تو اتفاق یعنی مجہول الاسباب قرار دیتا ہے یا اگر کسی قدر لطیف نظر سے کام لیتا ہے تو اسبابِ مادیہ کی ایک کڑی سے دوسری کڑی کو وابستہ کر کے مسلسل زنجیر کے ہر آئندہ حلقہ کو گزشتہ حلقہ کا نتیجہ سمجھتا ہے، لیکن وقت آفرین اور تہ کو پہنچنے والی نظر میں حوادث عمل ہی نہیں ہو سکتا۔ (اسی بنا پر وہ کہتے ہیں اول الفکرۃ آخر العمل و اول العمل آخرۃ الفکرہ۔ یعنی جو غرض کسی چیز کے ظہور سے پہلے سوچی جاتی ہے۔ اس کا حصول تکمیل عمل کے بعد ہوتا ہے اور جب آدمی کسی چیز کے متعلق سوچ سکتا ہے تو عمل کا آغاز کرتا ہے) تو قدرتی حوادث اور واقعات کی زنجیر کا حلقہ در حلقہ حکیم کائنات کے ارادے کے بغیر ہونا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ حضرت داؤد نے پیش آمدہ واقعہ پر گہری نظر ڈالی، لیکن حادثہ کو وہ اتفاقی قرار دے کر وہ اس طرف سے غافل ہو جاتے یا فقط مدعا علیہ کی دراز دستی پر محمول کر کے چشم پوشی کر لیتے ایسا نہیں کیا بلکہ حادثہ کی پیشی کا اور تنہائی میں پیشی کا اصل سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ واقعہ کی اچانک پیشی کی تہ میں ان کو علیمی حکمران حکیم مطلق اور شہنشاہ عادل کا ہاتھ کارفرما نظر آیا اور سمجھ گئے کہ اس وقت اس کی یہ جرم صورت حضرت داؤد سے کیوں ظاہر ہوئی اور ننانوے عورتوں کی موجودگی میں اور زیر تصرف ہونے کے باوجود کیوں محض حسن رعنا نے حضرت داؤد نے دماغی توجہ کے کسی گوشہ میں جگہ حاصل کی یا حاصل کرنے کی کوشش کی۔

بہرصورت اللہ کی طرف سے امتحان نبوت ، ابتلا رعصمت اور آزمائش عدالت کا ایک مظاہرہ تھا جس پر داؤد نے متنبہ ہو کر توبہ کی۔ واللہ اعلم

آیت خَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ آیت سجدہ ہے ۔سورۂ ص میں یہی سجدہ معروف ہے ، لیکن واجب ہے یا سنت ۔ اس کے متعلق اختلاف وشواقع کا اختلاف ہے ۔ بربنائے قول ابوحنیفہ وقدیم قول شافعی واجب ہے ۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا اور فرمایا داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا اور ہم اس کو شکر کے طور پر کرتے ہیں (رواہ النسائی) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں ۔ ابن عباس کی ایک اور روایت ہے حضور والا کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک شخص نے عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک درخت کی آڑ میں نماز پڑھ رہا ہوں ۔میں نے آیت سجدہ پڑھی اور سجدہ کیا تو ساتھ ساتھ درخت نے بھی سجدہ کیا میں نے خود سنا کہ درخت سجدہ میں اس طرح کہہ رہا تھا۔ اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَضَعْ بِهَا عَنِّيْ وِزْرًا وَاقْبَلْهَا مِنِّيْ كَمَا قَبِلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاؤُدَ ۔یعنی اے اللہ میرے لئے اپنے پاس اس سجدے کا اجر لکھ دے ۔ اور اس کو اپنے پاس میرے لئے جمع رکھ اور اس کی وجہ سے میرا بوجھ دور کر ۔ اور جس طرح تو نے اپنے بندے داؤد کا سجدہ قبول فرمایا میرا بھی یہ سجدہ قبول فرما۔ ابن عباس کہتے ہیں میں نے دیکھا حضور نے کھڑے ہو کر آیت سجدہ پڑھی پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں وہی درخت والے الفاظ کہے ۔ (رواہ الترمذی)

ابو سعید خدری کی روایت ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں سورۂ ص لکھ رہا ہوں اور لکھتے لکھتے اسی آیت (سجدہ) پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دوات قلم اور جو چیزیں میرے سامنے موجود تھیں سجدہ میں گر پڑیں ۔ میں نے حضور والا سے عرض کیا ۔میری گذارش کے بعد سرکار عالی اس آیت پر برابر سجدہ کیا کرتے تھے ۔ (رواہ احمد)

ان تمام احادیث سے سورۂ ص میں اس آیت پر سجدہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے ۔ لیکن امام شافعی کا دوسرا آخری قول یہ ہے کہ جس طرح قرآن میں کسی جگہ سجدہ واجب نہیں ہر جگہ سنت ہے اسی طرح اس آیت کا سجدہ بھی واجب نہیں سنت ہے ۔کیونکہ ابن عباس کا قول ہے کہ سورۂ ص کا سجدہ عزائم سجود (واجب سجود) میں سے نہیں ہے ، مگر میں نے حضور کو اس سورت کی تلاوت میں اس آیت پر سجدہ کرتے دیکھا ہے (رواہ احمد ۔بخاری مسلم)

اس روایت سے ثابت ہے کہ آیت مذکورہ پر سجدہ سنت ہے واجب نہیں ۔ ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ منبر پر حضور نے سورۂ ص تلاوت فرمائی ۔ آیت سجدہ پر پہنچے تو اتر کر سجدہ کیا ۔ساتھیوں نے بھی سجدہ کیا ۔پھر ایک بار دوسرے جلسہ میں اتفاق ہوا کہ حضور نے سورۂ ص پڑھی اور آیت سجدہ پر پہنچے تو لوگوں نے سر اٹھا کر سجدہ کے لئے انتظار کیا اور تیار ہو گئے ۔ حضور نے فرمایا یہ تو ایک پیغمبر کی توبہ ہے ، مگر میں تم لوگوں کو رغبت کے ساتھ سجدہ کے لئے آمادہ دیکھ رہا ہوں ۔ اس کے بعد منبر سے اتر کر سجدہ کیا (ابوداؤد) اس روایت سے بھی اس سجدہ کا سنت ہونا ثابت ہو رہا ہے ۔ واجب تو لوگوں کو آمادگی اور خواہش کی آمادگی میں دخل نہ ہوتا۔

مقصود بیان مجموعہ آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اوریا بن حنان کی بیوی سے حضرت داؤد کے عشق کی داستان بے حقیقت اور جھوٹ ہے ۔ تسورا کے لفظ سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ ملائکہ کا ملائکہ ہونا داؤد کے علم میں لانا مقصود نہ تھا ۔ ورنہ فرشتوں کو دیوار کود کر چھپنے کی ضرورت کیا تھی ۔ وہ ملکی حالت میں مقفل دروازوں ، مستحکم چھتوں اور صحن کی کھلی ہوئی فضاؤں سے جس طرح چاہتے داخل ہو سکتے تھے اور اندر پہنچ کر آن کی آن میں بشری شکل اختیار کر سکتے تھے ، مگر دیوار پھاند کر پہنچنے سے حضرت داؤد کو یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ ملائکہ ملائکہ نہ تھے بلکہ آدمی ہی تھے۔

پورا قصہ بتا رہا ہے کہ امتحان الٰہی سے انبیاء بھی خارج نہیں ہوتے ۔ ان کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور دماغی تکریات پر بھی ان کا ابتلا ہوتا ہے ، لیکن انبیاء کی آزمائش بھی مرتبہ نبوت کا لحاظ رکھتے ہوئے کی جاتی ہے ۔جو اپنے اندر لطیف تنبیہ بھی رکھتی ہے۔

اِنَّ کثیرًا الخ سے انسانی سماج کی دراز دستی اور ناحق کوشی کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ الا الذین آمنوا الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ آئینِ الٰہی پر یقین رکھ کر عمل کرنے والے ناحق کوش نہیں ہوتے۔ وظن داؤد و انا فتناہ سے حضرت داؤد کے پیغمبرانہ فہم و ذکاوت کا ترشح ہوتا ہے۔ ان لہٗ عندنا لزلفیٰ سے حضرت داؤد کا علوِ مرتبہ ظاہر ہو رہا ہے اور ان تمام گستاخیوں اور ہرزہ سرائیوں کی بیخ کنی ہو رہی ہے جو اسرائیلی روایات میں داؤدؑ کے متعلق مذکور ہیں۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے پس تم انصاف سے لوگوں میں فیصلہ کیا کرو اور خواہشِ نفس پر نہ چلنا وہ تم کو اللہ

عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۝

ع ۱۲ / ۱۱

کے رستے سے گمراہ کردے گی جو لوگ اللہ کے رستے سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انہوں نے یومِ حساب کے دن کو بھول گئے تھے

تفسیر اشخاص کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی شخصی ضروریات کی فراہمی ہو یا اجتماعی حوائج کی تیاری بہرحال باہمی تعاون کے بغیر لوازمِ حیات کا میسر آجانا ناممکن ہے۔ لیکن آپس کی دراز دستی سو سائٹی سے بچانے کے لئے چند عمومی قوانین اور ہمہ گیر ضوابط کا موجود ہونا بھی ضروری ہے اور ہر شخص کا انفرادی اور سماجی طور پر ایک محیط کل آئین کا پابند ہونا لازم ہے۔ اگر ضابطہ عامہ نہ ہو۔ ہمہ گیر قانون تمام افراد کو اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے نہ ہو۔ ہر شخص راہِ زندگی کو طے کرنے میں آزاد ہو اور ذاتی منافع کے حصول کی کوشش میں دوسروں کی حق تلفی اور ناحق کوشی کی پرواہ نہ ہو تو اللہ کی یہ سرزمین فتنہ و فساد سے بھر جائے۔ آباد بستیاں اجاڑ ہو جائیں۔ پانی کی جگہ ہر شخص دوسروں کا خون پینے سے گریز نہ کرے اور ایک انسان دوسرے کے مال کو ہی نہیں بلکہ گوشت و پوست کو بھی اپنے دلِ گرسنگی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے دریغ نہ کرے۔ لیکن ضابطۂ حیات کون بتائے۔ شخصی فلاح سماجی اصلاح سے معاشرتی رفاہ اور سیاسی گتھیوں کا سلجھاؤ کسی کے بنائے ہوئے آئین کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق مختلف نظریات و فکریات اور گوناگوں خیالات ہیں۔ جن کی چھان بین کرنے کے بعد ہم نے دو نظریئے سمجھے ہیں۔ مذہبی اور غیر مذہبی یا الٰہی اور انسانی۔ جو لوگ انسان کی شخصی اور سماجی زندگی کو درست کرنے کے لئے عقل و نظر کے بنائے ہوئے قانون کو کافی سمجھتے ہیں اور انفرادی یا شورائی آئین گری ان کے خیال میں انسانی اصلاح اور آپس کی چیرہ دستی کو روکنے کی کفیل بن سکتی ہے۔ وہ غیر مذہبی ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ گروہ براہمہ کا تھا۔ اور آج کل خدا کا انکار کرنے والے اور سوسائٹی کو خدا سے بے نیاز کرنے سمجھنے والے روسی کمیونسٹ یا کارل مارکس روسو اور ہیگل کے سچے پیرو ہیں بلکہ ذاتی اخلاق اور چند رسمی نقوشِ عبادت کو چھوڑ کر باقی معاملاتِ زندگی میں خدا کو غیر ضروری سمجھنے والے اور ہر قسم کی ملکی اور اجتماعی قانون کو عقلِ بے لگام کے ہاتھوں میں سپرد کر دینے والے تمام جمہوری ممالک ہیں۔ جن کا لیجسلیچر انسانوں کا ساختہ پرداختہ ہے اور اللہ کی ہر کتاب سے روشنی حاصل کرنے کو وہ حماقت تصور کرتے ہیں۔ براہمہ مزدک ایرانی اور سب سے آخر میں مارکس اور اس کے پیرو زندگی کے تغیرات کو ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے افکار کے محل اس بنیادی مفروضہ پر تعمیر کرتے ہیں کہ انسانی زندگی میں معاش اور صرف معاش کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ ساری انسانی زندگی کے دوسرے شعبے نظامِ معیشت کی تخلیق ہیں۔ دیگر شعبہ جاتِ زندگی کا مقصد صرف کسی نظامِ معیشت کا تحفظ ہے اور بس گویا صرف مادی عوامل ہی تغیرات کا باعث ہوتے ہیں اور مادی عوامل کا مرکز پیٹ ہے۔ ہم ذیلی طور پر اتنا بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان مفکرین کی نظر میں صنفی تعلقات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ عمرانی زندگی کی ابتدا معاش سے نہیں بلکہ صنف سے ہوتی ہے۔ جنس کی اہمیت، معاشرہ کی تشکیل۔ اور تغیرات میں اس قدر زیادہ ہے کہ وہ معاشی

تعلقات کی نوعیت کو متعین کرتی ہے اور ہر انسانی افکار کی اہمیت سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ انسان صرف ماحول کا غلام ہی نہیں ہے بلکہ وہ ماحول کو بھی کچھ دیتا ہے۔ وہ مجبور ہی نہیں مقتدر بھی ہے۔ بہر حال اگر انسانی احوال کی درستگی کے لئے خدا کی ضرورت نہیں اور آدمی کی سوچ وبچار کی قوتیں خود اس کی اور اس کی جماعت کے لئے کافی ہیں۔ تو بنیادی حیثیت معاش کو ہی حاصل ہوا اور ہر شعبۂ زندگی معاش ہی کا پیدا وار ہو یا صنفی تعلقات اور افکار انسانی کی اہمیت بھی تسلیم کی جائے۔ کچھ بھی ہو انسان کے ہر فیصلہ اور نظر کا جھکاؤ خود غرضی، قوم پرستی، فرقہ پرستی، نسل پرستی اور وطن پرستی اور انہیں کی طرح ان گنت پرستشوں کی طرف ضرور ہوگا اور ہر صحیح آئین گری سے یہ گوناگوں جذبات وعوامل روکیں گے۔ خواہش سے آزاد اور اغراض سے بے نیاز عقل دنیا میں مفقود ہے۔ بے داغ سوچ وبچار کی طاقت کس میں ہے۔ وہ کون شخص ہے جس کی نظر میں دشمن دوست، مخالف موافق، اپنا باپ اور دوسرے کا باپ اپنی اولاد اور دوسرے کی اولاد، اپنی محبوب بیوی اور دوسرے کی بیوی غرض ہر انسان ایک حیثیت رکھتا ہو۔ پھر ایسا آئین جو رافت عامہ، عطوفت تامہ، رحمت شاملہ اور حکمت کاملہ پر مبنی ہو۔ کوئی بتا سکتا ہے اس کے علاوہ ہمہ گیر علم اور محیط کل قدرت کس کو حاصل ہے یا حاصل ہو سکتی ہے۔ ازل سے ابد کی کڑی ملی ہوئی کس کی نظر کے سامنے ہے۔ اور کائنات کے دس کروڑ کرے اور ان کا تکوینی نظم کس کے دست قدرت میں ہے۔ جب عقل انسانی اتنی عاجز، اتنی بے علم اور اس قدر تعلقات کی یگانگت اور بیگانگت میں آلودہ ہے تو اس کا سوچا ہوا آئین اصلاح صرف ہوا وہوس کا پلندہ ہوگا۔ اور بس۔ دوسرا گروہ مذہبی سے ہو۔ اصلاح انسانی کی دو شاخیں بتلاتا ہے روحانی اور جسمانی، علمی اور عملی، احساسی اور وجدانی بہ جسمانیات اور عملیات میں بھی معاش یا صنفی تعلقات کو مرکزی نقطہ اور زندگی کا محور نہیں قرار دیتا بلکہ اخلاقیات اور سیاسیات کا باب اس کے خیال میں بہت کشادہ اور رنگ برنگ رنگینیوں کا حامل ہے اور ان سب کی درستی کے لئے اس کو ایسے آئین کی ضرورت ہے جس کے بنانے والے کا کسی سے خاص تعلق نہ ہو۔ وہ اپنے دشمن کو بھی اتنی ہی روزی اور اس زمین کی وہی نعمتیں عطا کرے جو دوست کو دیتا ہے۔ وہ نہ کسی کا باپ ہو نہ کسی کا بیٹا نہ اس کی کوئی ماں ہو نہ بیوی۔ سب کو پالتا ہو اس کو کوئی نہ پالتا ہو۔ سب پر احسان کرتا ہو وہ کسی کا ممنون نہ ہو۔ سب پر مہربان ہو اور سب سے زیادہ بے نیاز اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اور پھر اس کے علم سے ازل وابد کا کوئی ذرہ چھپا ہوا نہ ہو۔ کائنات کا سارا نظام ہمہ وقت اس کی نظر میں ہو۔ کبھی سوتا ہی نہ ہو اور اس کو اونگھ بھی نہ آتی ہو۔ دلوں میں گذرنے والے خیالات اور تصورات کی لہروں سے واقف ہو لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ اس کے علاوہ قدرت بھی ہمہ گیر رکھتا ہو۔ ایسا قہار کہ اس کی قدرت کے سامنے دس کروڑ کرے سربسجود اور روبا نقیاد ہوں۔ کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ۔ ایسا علیم وخبیر، بے نیاز وصمد رب السموات والارض رازق بلاحساب رحمٰن ورحیم آئین گر بن سکتا ہے اور ہے اس کے بھیجے ہوئے آئین کی روشنی سے الگ۔ جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ہوا ونفس اور جذباتی جھکاؤ پر مبنی ہوگا، لیکن اصحاب ہوا وہوس کی طرف سے ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر جذباتی جھکاؤ، نفسانی میلان اور خود غرضی کے عواطف میں خرابی کیا ہے۔ چوری یا سینہ زوری کیوں ہو رہی ہے۔ لوٹ مار، غبن، رشوت اور خیانت کیوں چھوڑی جائے۔ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ مارنے سے کیوں گریز کیا جائے اس الٰہی قانون کی حدود کی زنجیریں کیوں نہ توڑی جائیں۔ قتل اور سفاکی، سنگدلی اور ستم شعاری کیوں قبیح ہے یا جنت کوشی سے اعراض اور جفاکیشی کو اختیار کرنا کیوں ممنوع ہے۔ بڑا درخت، چھوٹے پودے اور زیر سایہ سبزے کی خوراک خود ہضم کر جاتا ہے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ قوی درندہ کمزور چرندے کو پھاڑ کھاتا ہے۔ طاقتور اور کمزور کا تقابل اسی طرح ہو رہا ہے۔ پھر زبردست انسان زیردست کو تمام ذرائع حیات سے کیوں نہ محروم کر دے۔ کیا انسان بڑھیا قسم کا حیوان نہیں ہے۔ جب شیر ہرن پر رحم نہیں کرتا بھیڑیا بکری کو نہیں چھوڑتا۔ مور سانپ کو اپنا لقمہ بنا لیتا ہے تو انسان کیوں کسی پر رحم کرے۔ یہ دنیا طاقت ور کی ہے۔ طاقت حق ہے اور کمزوری ناقابل معافی جرم۔ انسان کے پاس تو ہوش وحواس کا خزانہ ہے۔ ہر حیوان سے زائد فہم و دانش ہے سب سے بالاتر ہوش وخرد کا تقاضہ یہی ہے کہ زبردست اور ناتواں کو مغلوب کرتے ہیں کسی دسیسہ کاری بہانہ جوئی، حیلہ سازی اور فریب دہی سے دریغ نہ کیا جائے۔ اس قسم کے خیالات انہی لوگوں کے ہو سکتے ہیں جو انسانی زندگی کے تمام ایام، ساعات، لمحات کو گردش

لیل و نہار کا معمولی حصہ قرار دیتے ہوئے نتائج سے بے نیاز جانتے ہوں۔ جن کی نظر میں نباتاتی فطرت، حیوانی سرشت اور انسانی طبیعت میں سرمو فرق نہ ہو۔ اگر ہو تو صرف ادنیٰ و اعلیٰ کا۔ ایک زنجیر کی سب ہی کڑیاں ہوں۔ صرف چھوٹے بڑے حلقے کا تفاوت ہو۔ عمل اور پاداش، کردار اور اجر بے معنی الفاظ اور حقیقت سے خالی ہوں، اس لئے آئینی نظر بندیاں اور قانونی قید آفرینیاں انکی نظر میں ہیچ ہوں۔ جب محاسبہ کا اندیشہ نہیں تو حساب کی صحت کی کیا ضرورت۔ ہم اسی گروہ سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ انسان کو صد ہزار طاقتوں کا مجموعہ سلیقہ کس نے بنایا۔ وہ کون ہے جس نے اس کائنات ارضی میں ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ دیا اور طاقت پر غرور کرنے والے بتائیں کہ اگر طاقت ہی حق ہے اور کمزوری گناہ۔ تو وہ کون سا آدمی ہے جو دنیا میں مجرم نہیں۔ طاقت کا مدبر حاصل ہے پھر کس آدمی کو زندہ رہنے کا حق کہاں سے پیدا ہوا۔ ہر طاقت ور سے زیادہ طاقت ور اور ہر بالادست سے زیادہ بالادست موجود ہے یہاں تک کہ شہنشاہ اعظم بھی غیبی کائنات کا محکوم۔ ہوا، پانی، روشنی اور تغیر فصول کا محتاج ہے۔ اس کو خود زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ چھوڑ دینے کا استحقاق کس طرح پہنچتا ہے۔ حقیقت میں اس برخود غلط ہوا پرست کے پاس گوش حق نیوش نہیں کہ سن سکیں۔ چشم بینا نہیں کہ دیکھ سکیں۔ قلب بیدار نہیں کہ سمجھ سکیں۔ خواہشات نفس نے ان کو بیکار رکھا ہے اور شاہراہ زندگی سے ہٹا دیا ہے۔ پس سرگرداں پھرتے ہیں۔ جدھر چاہتے ہیں اور بھٹکتے رہتے ہیں جہاں سینگ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں واقف کہ جس خدا نے ان کو صد ہزار طاقتوں کا مجموعہ بنایا وہ ان سے انہی طاقتوں کے استعمال کا حساب بھی لے گا۔ کیا یہ طاقتیں اور اقتدار ان کا خود آوردہ ہے کہ جسے چاہیں اور جو چاہیں کریں۔ ہوا و نفسانی کجی کا جس نے ان کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ انسان کا اقتدار اعلیٰ خود آوردہ نہیں اور عقل کا رفرما اس کی مول لی ہوئی باندی نہیں۔ یہ سب کچھ خدا داد ہے اور خدا ہی اعمال انسانی کا محاسب ہے اور حساب فہمی کا ایک دن مقرر ہے۔

تحلیل اجزاء یَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ خلیفہ سے مراد اس جگہ وکیل اور نائب مختار نہیں۔ کیونکہ نائب مختار اور وکیل اپنی رائے سے تصرف کرتا ہے اور اس کا اچھا برا تصرف موکل پر لازم ہوجاتا ہے۔ موکل کی پیروی کرنے کا وہ وعدہ کرتا ہے، لیکن پیروی کے طریقوں میں وہ آزاد ہوتا ہے جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ موکل وکیل کا محتاج ہوتا ہے خود نہیں کرسکتا۔ وکیل اس کی طرف سے کرسکتا ہے اور اللہ کسی کا محتاج نہیں۔ اپنی مخلوق میں جس طرح چاہتا ہے تکوینی اور تشریعی تصرف کرتا ہے۔ خلیفہ کو یہی کام کرنے اور احکام پہنچانے اور خود عمل پیرا ہونے کی تعلیم وہی دیتا ہے، اس لئے خلیفہ کے معنی یہاں خود مختار نائب یا وکیل کے نہیں۔ بلکہ احکام خداوندی کے مبلغ اور داعی اور نگران کے ہیں۔ اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ خلیفہ صرف داؤد ہی تھے یا تمام انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے یا ہر انسان خلیفہ ہے۔ بعض کوتاہ نظر اہل تفسیر نے انسان کو خلیفہ بایں معنی کہا ہے کہ انسان سے پہلے جو مخلوق اس زمین پر آباد تھی اس کا جانشین انسان ہے یا آئندہ نسل گزشتہ نسل کی جگہ لیتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر شخص اپنے باپ کا خلیفہ ہے۔ میری نظر میں یہ معنی رکیک ہیں۔ اس صورت میں انسان سے پہلے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کو خلفاء کہنا چاہیے بلکہ ہر جانور سابق جانور کا خلیفہ ہونا چاہیے۔ انسان ہی کی کرامت اور عزت خلافت میں مضمر نہ ہونی چاہیے۔ صحیح معنی یہی ہیں کہ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ اس کے احکام کا پابند، نگران، داعی اور مبلغ ہے۔ حدیث میں وارد ہے کلکم راع وکلکم مسئول یعنی تم میں سے ہر شخص داعی اور نگران ہے۔ جس سے اس کی رعیت کی بازپرس ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص احکام الٰہیہ کا مکلف ہے۔ لیکن مدارج تکلیف میں فرق ہے۔ سب سے پہلے آدمی اپنے نفس کا نگران بنایا گیا ہے۔ افکار، اعمال، وجدانیات، اخلاقیات باطنیہ اور اعمال خارجیہ کو ہدایت الٰہیہ کے زیر اثر درست کرنے کے بعد اس کا فرض ہے ملکات نفسانیہ، اخلاق باطنیہ اور اعمال خارجیہ کو ہدایت الٰہیہ کے زیر اثر درست کرنے کے بعد اس کا فرض کچھ آگے بڑھتا ہے اور ماحول کو درست کرنا اس پر لازم آتا ہے۔ گردوپیش میں بیوی بچوں کی اصلاح کا فرض سب سے مقدم ہے۔ پھر دوسرے اعزاء اہل محلہ، دارین اور بستی میں رہنے والوں تک اللہ کے اوامر و نواہی میں پہنچانا اور ہر ممکن طریقہ سے

شریعت الٰہیہ کے پیش نظر اصلاح کی کوشش کرنی ضروری قرار پاتی ہے۔ اس طرح ہر مدیر، ناظم، عالم، آمر، وزیر اور بادشاہ تک فرائض میں چند در چند اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا ادنیٰ انسان سے لے کر جلیل القدر تک ہر شخص بقدر مرتبہ شرائع الٰہیہ پر عمل کرنے اور ان پر دوسروں کے عمل کرانے اور عمل کرنے کی تعلیم دینے کا مکلف ہے اور ہر شخص عزت، خلافت سے اپنے درجہ کے موافق مشرف ہے۔ حضرت داؤد پیغمبر اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ ان کا فرض صرف اپنی اصلاح ہی نہیں تھا۔ بلکہ چند در چند صد گونہ فرائض ان سے وابستہ تھے — وہ روئے زمین کی محدود بستیوں کے عوام اور خواص کی اصلاح پر مامور تھے اور جو فرض دوسرے انبیاء کا تھا وہ آپ کا بھی تھا۔ اس لئے دوسرے انبیاء کی طرح آپ بھی زمین پر اللہ کے خلیفہ تھے اور فرائض خلافت انجام دینے پر مامور۔ یوں تو ہر شخص اللہ کا بنایا ہوا خلیفہ ہے، لیکن بعض کی خلافت براہ راست خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان کے انتخاب اور سوسائٹی کی تفویض کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ بعض کی خلافت براہ راست نہیں ہوتی۔ اوّل درجہ انبیاء کا ہے۔ اور دوسرا درجہ دوسرے لوگوں کا۔ آیتِ مذکورہ میں اسی لئے خلیفہ بنانے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔ پھر حضرت داؤد کو اکثر انبیاء سے زائد ایک خصوصیت یہ حاصل تھی کہ نبوت اور تعلیمی خلافت کے ساتھ قوتِ حاکمہ اور طاقت تدبیرہ بھی عطا کی گئی تھی۔ پیغمبری کے ساتھ بادشاہ بھی بنایا گیا تھا، اس لئے صراحت کے ساتھ خلافت فی الارض کا تذکرہ فرمایا اور آئندہ آیت میں طریق حکمرانی بھی بتایا۔ لیکن یاد رکھو کہ خلافت سے مراد خلافت تکوینی نہیں۔ اللہ نے تخلیق کائنات کے سلسلے میں کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا نہ نظم بقائے عالم کسی کے سپرد کیا۔ چاند سورج کواکب اور نجوم کی تخلیق اور طلوع و غروب میں کسی کو دخل نہیں۔ نہ آسمان اور زمین، ہوا، پانی، مٹی اور آگ غرض مادی اور غیر مادی سنسار کی پیدائش اللہ کے علاوہ کسی کی ممنونِ تخلیق ہے نہ ہر نوع کائنات اور ہر فرد نوع اور ہر جزو فرد کو اپنی مفوضہ خدمت سر انجام دینے میں کسی خلیفہ کی دست نگری ہے۔ خلافت سے مراد صرف خلافت تشریعی بشری ہے یعنی تشریعات میں خلافت ہے اور وہ بھی آئین سازی اور وضع قانون کی حد تک نہیں، انسانی سماج کی درستگی اور فلاح بشری کے تمام شرائع اور قوانین کی وضع اور آئین کی ساخت تو اللہ ہی کا کام ہے۔ ان قوانین الٰہیہ کا صحیح نفاذ اور معاشرتی یا مدنی معاملات کا ضوابط خداوندی کے مطابق فیصلہ کرنا خلیفہ کا کام ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

فَاحْكُمْ سے فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ داؤد لوگوں کے حق کے مطابق فیصلہ کرو یعنی اللہ نے جو احکام اور قوانین تمہارے پاس بھیجے ہیں ان کی روشنی میں لوگوں کے فیصلے کیا کرو۔ فرائض شخصیہ اور اجتماعیہ کی ادائیگی انہی کے موافق ہونی چاہیئے۔ اپنے جذباتی جھکاؤ، قرابتی میلان، مودتی رغبت، قومی جھکاؤ، لسانی، وطنی اور نسلی امتیاز کو حقوق انسانی کے فیصلوں میں دخل نہ ملنا چاہیئے۔ ان میں سے جس چیز کا اگر اثر قبول کرو گے تو راہ حق کھو بیٹھو گے۔ راہ حق تو وہی ہے جو اللہ نے بتائی ہے۔ جو تمام انسانی عواطف و دواعی سے آزاد ہے۔ جھکاؤ، نفسانی جھکاؤ کسی طرح کا بھی ہو، گمراہی کی طرف لے جانے والا اور اللہ کے احکام سے بہکانے والا اور راہ حق سے ہٹانے والا ہے۔ راہ حق کو کھو دینے کا یہی مطلب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سے يَوْمَ الْحِسَابِ تک جذبات و عواطف اور انسانی جھکاؤ و میلان کا اثر قبول کرنا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ تمام انسانی رشتے اور تعلقات اور آپس کے فیصلے بالکل دوامی ہیں۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی آنے والی ہی نہیں۔ جس قدر شخصی، ذاتی، نفسانی یا قومی وطنی نسلی فوائد حاصل کرنا ہیں اسی زندگی میں حاصل کر لیئے جائیں، آئندہ زندگی تو حاصل ہونے والی ہی نہیں۔ جو مرا وہ گیا یا یہ مطلب ہے کہ انسان کو یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے کردار، اطوار ناقابل عوض اور ہر مواخذہ و محاسبہ سے آزاد ہیں۔ کبھی ان کی بازپرس نہ ہوگی۔ بہر صورت دونوں اعتبار سے یوم حساب اور یوم مواخذہ کا انکار یا کم از کم اس کی طرف سے غفلت اور اس کے خیال کو نظر انداز کر دینا اور بھول جانا لازم آتا ہے اور یہ بات تخلیق انسانی کی منشا کے خلاف ہے۔

ایک شبہ ظاہر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب شدید کی وجہ یوم الحساب کو فراموش کر دینا ہے تو کیا اگر کوئی حساب کتاب یعنی روز قیامت کا اقرار کرے تو عذاب شدید سے محفوظ رہے گا۔ کیونکہ رفع علت رفع حکم کا مستلزم ہے۔

جب نسیان قیامت نہیں تو عذابِ شدید میں ماخوذ بھی نہیں ہو سکتا ۔ اسی کا نتیجہ صاف ہے کہ جو لوگ فاسق فاجر ہیں وہ عذاب شدید سے محفوظ ہیں ۔

شبہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ کیا جو لوگ بعض امور میں خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں وہ یوم الحساب کو فراموش کر دیتے ہیں ۔ یعنی کیا ہر مومن فاسق یوم حساب کا منکر ہے ۔

ازالہ مجمل جواب کے لئے ایک توضیح وہ ہے جو سیدی وغیرہ اکابر نے بیان کی ہے کہ نسیان یوم الحساب سے مراد ہے یوم الحساب کے لئے نیک کام کا ترک ۔ یعنی چونکہ راہِ حق سے منہ موڑنے والوں نے خواہش نفس کی پیروی کی اور نیک اعمال ترک کر دیئے تو گویا یوم الحساب کو بھول گئے ۔ اگر یوم حساب ان کے پیش نظر ہوتا تو نیک کام ترک ہی کس طرح کرتے ۔ یا سدیؒ کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے نیک عمل کو ترک کر دیا جائے ۔ یہاں تک کہ یوم الحساب کا یقین ہی دل میں نہ ہو اور لا محالہ روزِ قیامت کا انکار ہی جرائم کا سرچشمہ قرار پائے گا ۔ میری نظر میں یہ توجیہات رکیک ہیں اور آیت پر قلت تدبر کا نتیجہ ہیں ۔ پوری آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے لوگوں کے باہمی فیصلے سیاسی، سماجی، مدنی اور معاشرتی جھگڑے چکانے میں اگر شریعت الٰہیہ کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو اور خود ساختہ قوانین کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں تو اس قسم کے فیصلے خواہش نفس پر مبنی ہوں گے ۔ یا کم سے کم نفسانی میلان (خواہ شخصی ہو یا نسلی یا قومی یا خاندانی یا کسی اور طرح کا ہو) کو ان میں دخل ہوگا اور جب زندگی اور زندگی کے تمام جھگڑوں کے فیصلوں کو قانون الٰہی سے بے نیاز مان لیا جائے تو نبوت و رسالت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ انسان خود تراشیدہ احکام و آئین پر عمل کر کے ہر قسم کے اجر و پاداش سے آزاد ہو سکتا ہے اور نبوت کا انکار اور رسالت کی ضرورت سے سرتابی نقصان دہ نہ قرار پائی ہو تو روزِ قیامت کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے ۔ جب عمل کے لئے خدائی قانون کی ضرورت نہیں تو نتیجہ عمل جزا و سزا کے لئے روزِ قیامت کی کیا ضرورت ۔ غلط فہمی کا سنگِ بنیاد صرف یہ ہے کہ ضلال عن سبیل اللہ کو عام ضلال سمجھ لیا گیا ہے اور چونکہ ہر گنہگار کا منکر روز حساب ہونا ضروری نہیں، اس لئے غلط فہمی پیدا ہوئی ۔ حالانکہ ضلال سے مطلق ضلال مراد نہیں بلکہ وہی ضلال مراد ہے جو سماجی اور معاشرتی و مدنی غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسان کے بنائے ہوئے قانون کو کافی سمجھنے اور شرع الٰہی سے بے نیاز ہونے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور ایسی گمراہی یقیناً کفر ہے ۔ عذاب شدید کا مستحق بنانے والی اور انکار قیامت کی موجب ہے ۔ عام گنہگار اہلِ ایمان اور صداقت احکام اللہ کا اقرار کرنے والے اہلِ معصیت سے اس آیت کا تعلق ہی نہیں ہے یا عذاب شدید کی خصوصیت صرف اہلِ انکار کے ساتھ ہے ۔ بداعمال اہلِ اقرار اس میں شامل نہیں ۔ اس لئے شبہ کی اول شق صحیح ہے اور نا قابلِ انکار ۔ ہاں دوسری شق غلط ہے ۔

مقصودِ بیان بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے داؤد کو خصوصیت کے ساتھ زمین پر اپنی طرف سے خلیفہ اور نگرانِ حقوق بنایا تھا ۔ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ انسان کو حکمرانی اور اقتدار اس زمین پر حاصل ہے وہ زورِ بازو، ذہانت اور فطانت تدبیر کا مرہون نہیں ۔ محض خداداد ہے ۔ اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ روئے زمین پر اللہ کے بھیجے ہوئے قوانین اور نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق انسانوں کا باہم تصفیہ حقوق ہونا چاہیئے ۔ انسانی ساختہ پرداختہ قوانین نا قابلِ عمل ہیں ۔ ایک یہ مسئلہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ اللہ کے احکام کو چھوڑ کر خود ساختہ آئین کے زیر اثر فیصلہ کرنا ! و افراد یا جماعت کا بطور خود قانون بنانا ہوا پرستی اور نفسانی جھکاؤ پر مبنی ہے ۔ مطلق ہوا کا لفظ باجمال دلالت کر رہا ہے اس امر پر ہر قسم کی ہوا پرستی کو خواہ نسلی، قومی اور وطنی صورت میں ہو یا ازدواجی، مودتی اور مذہبی شکل میں ۔ دشمن دوست، ہم مذہب اور مخالف مذہب اپنے اور پرائے یہاں تک کہ اپنے ذاتی معاملات میں بھی دخیل نہ بنانا چاہیئے ۔ یہ سخت گمراہی ہے ۔ آیت کے آخری فقرے سے معلوم ہو رہا ہے کہ حساب کا ایک دن مقرر ہے ۔ اور نفسانی جھکاؤ روز حساب کا انکار کا باعث ہے یا روز حساب کے انکار کا نتیجہ ہوا پرستی ہے ۔ پس عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان احبار نما علماء امت کو اور سادھو نما مشائخ طریقت کو جو اپنے ہر قول کو خواہ مخواہ قانون الٰہی کا ہم پلہ بلکہ اس سے افضل قرار دیتے

ہیں اور ہر اختراع دماغی کو نص آسمانی سمجھتے ہیں ۔ فویل لہم وغیرہ ۔

ع ۲ / ۱۱

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے نکما تو پیدا کیا ہے نہیں ۔ یہ گمان تو ان کا ہے کہ جو کافر ہیں ۔ پس سو کافروں کی خرابی

کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ

ہے جو آگ ہے ۔ کیا جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام بھی کئے ہم ان کو ان کے برابر کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں کیا

الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ ۝ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے ہرگز نہیں یہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی تاکہ عقلمند ان آیتوں پر غور کریں اور سمجھیں

تفسیر اللہ کی الوہیت تکوینی سے الوہیت تشریعی ثابت ہوتی ہے ۔ آسمان اور زمین، ہوا، پانی، مٹی، آگ، بادل، بجلی، کڑک، گرج، بارش، برف، بالا، اولہ، لطیف گیس، کثیف بخارات، ثقیل دخان بھاری پتھر اور پہاڑ معدنیات اور فلزات مختلف الجواہر جڑی بوٹیاں، زمین پر پھیلی ہوئی بیلیں، سر بفلک درخت بارآور اور لہلہاتا سبزہ ۔ مہکتے پھول، چٹکتے غنچے، لطیف نسیم، رواں چشمے، اتھاہ سمندر، لق و دق ریگستان، ریگستانوں کے ان گنت ذرے، سمندروں کے بے شمار قطرے گوناگوں درندے، چرندے اور پرندے چوپایوں سے بدتر اور فرشتوں سے برتر انسان ۔ یہ تمام چیزیں، ان کے رنگ، ان کی شکلیں ان کے مزاج، ان کی خصوصیات کس نے بنائیں ۔ اللہ نے ان سب کو ایک جیسے نظام میں جکڑنے والا اور ہر چیز کو اس کے لوازم وجود تکثیف و تجسیم کے سبب لطیف کر دینے والا کون ہے ۔ اللہ چاند، سورج، مریخ، عطارد، زہرہ و مشتری، زحل جیسے تمام ستارے اور سیارے کس کے حکم سے اپنی خاص وضع، خاص ہیئت اور خاص حالت کے ساتھ نور افشاں اور متحرک ہیں ۔ اللہ کے ۔ پس کیا ان کی تخلیق و تکوین پکار پکار کر اعلان نہیں کر رہی کہ اللہ کے ارادی، اختیاری قانون میں سب جکڑے ہوئے ہیں ۔ کسی کو سرمو سرتابی کی مجال نہیں ۔ پھر کیا ساری کائنات کی تکوین اور پورے سنسار میں اللہ کا بنایا ہوا نظام غافل انسان کی چشم بصیرت کھولنے کے لئے کافی نہیں کیا سعادت مند دل، ہوشمند دماغ اور روشن ذہن رکھنے والوں کو اب بھی یقین نہیں آتا کہ انسان کی ہدایت اس کی شخصی اصلاح اور سماجی بہبود اللہ کی رہنمائی، رشد آفرینی اور کرم فرمائی کے بغیر ناممکن ہے ۔ کیا تمام جہان میں اللہ کی الوہیت تکوینی، الوہیت تشریعی کی دلیل نہیں ۔ پھر انسان اس قانون سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتا ہے ۔ جب اس کو پیدا کرنے والا خدا ہی تو ہے تو اس کی زندگی کا نظام نامہ مرتب کرنے والا اور تمام اصلاح داموں کھینچنے والا بھی خدا ہی کو ہونا چاہئے ۔ لیکن یہ واضح حقیقت کا انکار کرنے والوں کا خیال ہے اس کے خلاف ہے ۔ وہ اس سارے سنسار کو بے کار اور حکمت سے خالی سمجھتے ہیں ۔ ان کو اسی عالم میں اللہ کا ارادہ اور اقتدار کار فرما نظر نہیں آتا ۔ وہ تمام جہان کے اس پُر حکمت نظام کو طبعی غیر ارادی چکر کہتے ہیں ۔ اور بس وہ کہتے ہیں کہ جو مر سو گیا وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا حساب کتاب ڈھکوسلہ ہے ۔ جنت دوزخ اور عذاب ثواب کا تصور حماقت ہے ۔ نیک کردار اور خوش اطوار بننے کے لئے خدا اور اس کے قانون کی ضرورت نہیں ۔ اور جب خدا نہیں تو اس کا اقتدار کیسا وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن کیا حقائق کے منکر، بدکیش، بد اطوار ان لوگوں کی طرح سے ہو سکتے ہیں جو صحیح الافکار اور خوش اطوار ہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ یہ بدفہم قانون الٰہی کے منکر تو چاہتے ہیں کہ ساری کائنات کی حقیقت کو الٹ دیں ۔ دنیا کو تباہ کر ڈالیں ستاروں کو باہم ٹکرا کر سنسار کو برباد کر دیں ۔ جب صاحب ارادہ، مالک اختیار، عالم کل

خدا نہ ہوگا اور اس کے تصرفات کارفرما نہ ہوں گے تو کل جہان کا یہ بناؤ کیسے رہے گا اور اگر انسان کو خود رائے چھوڑ دیا جائے تو خواہشات کے تصادم، افکار کے ٹکراؤ اور اطوار زندگی کے مقابلے سے کس قانون کی حکمرانی بندیاں روکیں گی۔ اور کس طرح انسانی سماج میں تعاون اور تصادی پیدا ہو سکے گی۔ اور کیسے ممکن ہے کہ بربادی اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ انسانی گروہوں سے مسلط نہ ہو جائے۔ ایسے ایسے مفسدوں کی طرح صلاح کار اہل ایمان کس طرح قرار دیے جا سکتے ہیں اور کیسے بے دھڑک اوباشوں کی صف میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ ان اہل تقویٰ کو جن کو قدم قدم پر پرائی حق تلفی کا اندیشہ لگا رہتا ہے جو زندگی کے تمام اوقات میں قانون عدل الٰہی کی حدبندیوں کو توڑنے سے ڈرتے رہتے ہیں۔ پس ذرات کائنات کا یہ نظام بتا رہا ہے کہ انسانی سدھار کیلئے ایک بابرکت نظام نامہ اور کتابچہ اللہ کا فرستادہ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کے اصول ہدایت اور طرق رشد تمام انسان افراداً اور اجتماعاً غور کریں۔ سوچیں سمجھیں اور ان کی افادی حیثیت کو دیکھیں اور دانشمند مداحیان مغز اس سے فوائد حاصل کریں۔ اس مبارک نظام نامہ کا نام قرآن ہے۔

تحلیل اجزاء وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ اس آیت میں باطل سے مراد ہلاکت پذیر، فانی، بے حقیقت نہیں۔ کیونکہ ساری کائنات فانی اور ہلاکت پذیر ہے۔ بلکہ لغو و بے فائدہ ہیچ اور حکمت و مصلحت سے خالی یا اسی قسم کے دوسرے معانی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیق عالم بے فائدہ اور لغو نہیں۔ کائنات کا وجود اپنے اندر گوناگوں فوائد رکھتا ہے بیشمار کا یہ چکر خود بخود نہیں نہ غیر ارادی اور بے شعوری کو اس کے نظام تخلیق میں دخل ہے۔ اگر یہاں کی پیدائش بے فائدہ، لغو اور غیر مرتب ہوتی۔ اور ایک جیسا قانون سب کو حاوی نہ ہوتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا اور نظام عالم کو چلانے والا کوئی نہیں۔ اور ہے تو بے اختیار، بے شعور، بے علم اور بے ارادہ۔ پس جب آسمان، زمین اور درمیانی موجودات کی تخلیق بے سود اور غیر منظم نہیں ہوتی تو اس سب کو بنانے اور چلانے والا مختار عالم، صاحب ارادہ اور مالک متصرف ہے جو اپنی حکمت کے تحت اپنے ارادہ اور اختیار سے سارے جہان کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ عالم کے بے سود اور بے نتیجہ ہونے کا خیال تو ان لوگوں کا ہے جو حقائق کے منکر ہیں۔ خالق اور ناظم کے وجود کے قائل نہیں جو مر گیا وہ گیا نہ اس جہان کو خدا کی ضرورت نہ رسول کی۔ تمام اعمال ہیچ ہیں۔ فہم و دانش آئین گری کے لئے کافی ہے۔ نہ حساب کتاب نہ عذاب ثواب۔ دنیا اسی طرح چلی آئی ہے اور چلی جائے گی۔ کفروا کے لفظ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ فطری حدود کے اندر کوئی کافر نہیں نہ خالق کائنات کا انکار کر سکتا ہے۔ حقائق کا انکار خود ساختہ ایجاد اور اختراعی عقیدہ ہے۔ پیدائشی کوئی بھی کافر نہ تھا۔ عقائد باطل اور اعمال بد کی وجہ سے لوگ کافر ہو گئے۔ پھر منکرین خالق کا یہ عقیدہ بھی یقینی نہیں بلکہ توہمات کو تعقلات کا درجہ دے کر جو انہوں نے لچر دلیلیں قائم کی ہیں ان کی صداقت کا خود بھی ان کو یقین نہیں۔ صرف ظن غالب گمان اور تخمینی خیال ہے۔ طبعی اور دہری عقیدہ رکھنے والے مادہ پرست لیے دیے تجربات کی اینٹوں سے اپنے قصر علم کی تعمیر کرتے ہیں۔ عقلی براہین سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور تجربات کے نتائج برہان نہیں ہوتے ظنی ہوتے ہیں۔ واقعی یقینی اور قطعی صداقت کو ان میں دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیمقراطیس سے لے کر اس زمانے تک یورپین فلاسفر کبھی بھی کسی ایک نقطہ پر جمع نہیں ہو سکے بلکہ ہر آنے والے فلسفی نے گذشتہ فلسفی کی تردید اور تغلیط کی اور علم و فلسفہ کو ترقی پذیر ثابت کیا۔ حالانکہ یہ ترقی نہیں تردید اور تفسیر سے کسی علم کی قطعیت اٹل ہوتی ہے۔ اختلاف زمان و مکان اور تعدد عقلاء سے اس میں تغیر نہیں آتا جس طرح اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء اصولی عقائد و افکار میں تغیر پیدا نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کسی پیغمبر کے عقائد و احکام کی بنیاد تجربے اور تلاش و کاوش پر نہ تھی نہ انسان کی انفرادی و اجتماعی رفتار دماغی اور استقرائیات کو انہیں کوئی دخل تھا۔ ہر ایک کے پیش نظر تعلیم الٰہی کا نفاذ اور قوانین خداوندی کا اظہار تھا اور اللہ کا ہمیشہ سے ایک ہی قانون ہے جو لازوال ہے۔ پس تخلیق کائنات کا باطل ہونا تو یقینی ہے اور اس کے خلاف منکرین حقائق کا گمان ہے۔ تجربات کا نتیجہ اور استقرائیات کا ثمرہ۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ۔ یعنی منکرین حقائق کے انکار سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ واقعیت بہرحال واقعیت ہے۔

خواہ اس کا کوئی بھی انکار کرے ۔ جب تخلیق کائنات بے ثمر نہیں اور ان تمام ذرات کا اثر بے نتیجہ نہیں تو انسان کی تصوراتی بہترین زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور ہاتھ پاؤں اور چشم وابرو اور ہر بن مو کی جزا اور ابدی زندگی قطعی ضروری ہے اور جو اہل انکار ہیں ان کو سوختنی اور الم آفرین سزا ملے گی ۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۔ دونوں کا نتیجہ ایک طرح کا نہیں ہو سکتا ۔ ایک وہ گروہ ہے جو اللہ کے بیان کردہ حقایق رکھتا ہے ۔ خدا کے بنائے ہوئے اور بھیجے ہوئے قوانین کو صحیح جانتا ہے اور ان ہی حقایق اور قوانین کی روشنی میں اپنی زندگی گزارتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جن سے دنیا میں تباہی نہ پھیلے ۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے افکار خود فاسد اور فساد آفرین جس کے اعمال زندگی تباہی سے لبریز اور بربادی انگیز یعنی جو حقایق کا منکر اور روحانی احتیاطات کا قایل ہے اور اپنے افکار واعمال کے موافق سوسائٹی کے فیصلے کرتا ہو سراسر نظام عافیت وامن کو درہم برہم کر دینے والے ہیں ۔ اور ان دونوں کا نتیجہ ایک قسم کا کس طرح ہو سکتا ہے ۔

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (غور کرو) کہ ایک گروہ تو مطلق العنان، بے لگام کا گھوڑا، بے مہار کا اونٹ آزاد بنا پھرتا ہے ۔ علی الاعلان جس کا پاتا ہے کھاتا ہے، اپنے پرائے کی اس کو تمیز نہیں ۔ محرم نامحرم کا فرق نہیں ۔ دوسرا گروہ ہر قسم کی حق تلفی سے ڈرتا ہے اور بچتا ہے ۔ اللہ کے حقوق ادا نہ ہونے کا اس کو ڈر، بندوں کے حقوق کا اس کو اندیشہ ۔ شرک سے اس کو اجتناب بڑے چھوٹے گناہوں سے اس کو پرہیز ۔ یہاں تک کہ اپنے نفسانی خطور اور قلبی وسوسوں سے بھی اعراض اور آخری درجہ میں ماسوی اللہ سے انحراف اور صرف اللہ ہی کی طرف رُخ ۔ ان دونوں گروہوں میں برابری کس طرح جائز ہو سکتی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں دونوں مساوی ہوں ۔ بدکاروں، اوباشوں کو چیرہ دستی حاصل ہو جائے اور شان وشوکت، راحت و دولت اور حکومت ان کو مل جائے، لیکن وہ عالم جو عالم جزا ہے ان میں دونوں کو کردار زندگی کی پاداش ایک جیسی اور مساوی حیثیت کی ملے یہ کیسے ممکن ہے ۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ جب ذرہ ذرہ میں اللہ کی کارفرمائی ثابت ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ قانون الٰہی سارے نظام کائنات کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے تو انسانی زندگی کی درستگی کے لئے بھی اللہ کا بنایا اور بھیجا ہوا کوئی آئین ضرور ہونا چاہیئے ۔ پس یہ دستاویز اور تحریر اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ پر اتاری ہوئی ہے اور بابرکت ہے ۔ اس آیت میں چار باتوں کی صراحت فرمائی ۔ اول تو یہ کہ ایک کتاب اور تحریر ہے اور اتارنے کے وقت اگر قرآن کتاب نہ تھا اور نہ مجموعی طور پر نازل کیا گیا تھا جس کو کتاب کہا جاتا لیکن نزول کے بعد بصورت کتاب اس کو لکھا گیا تھا ۔ اور حضور نے لکھوا دیا تھا، اس لئے کتاب کہنا صحیح ہوگا ۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے نازل فرمایا یعنی یہ رسول کی خود ساختہ اور تصنیف کردہ نہیں نہ اس کے معانی رسول کے دماغ کے تراشیدہ ہیں نہ الفاظ ۔ نہ جبرئیل نہ کسی دوسرے فرشتے نے اپنی طرف سے بنا کر نازل کئے نہ کسی آدمی نے حضور کو سکھایا ۔ تیسری بات یہ کہ رسول اللہ پر یہ کتاب نازل ہوئی ۔ مورد کوئی اور نہ تھا نہ نازل کرنے والے فرشتے کو غلطی ہوئی کہ بھیجی ہوئی کتاب کسی اور کی اور کو پہنچا دی ۔ رسول اللہ ۔ چوتھی بات یہ کہ یہ کتاب برکت والی ہے ۔ بڑھوتری والی ہے ۔ اس پر عمل کرنے سے کامیابی میں زیادتی فلاح اور بہبودی میں بڑھوتری ہوگی ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ گویا یہ کتاب انسانی زندگی کا کامیاب دستور العمل ہے ۔ تعمیر انسانیت اور نظام آفرینی غرض کلی برکت اس کتاب کی خصوصیت ہے ۔

لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ قرآن کا مبارک اور موجب فلاح ہونا عملی طور پر اس پر عمل کرنے اور نتائج حاصل ہونے کے وقت ہی ظاہر ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ یہ نظریۂ حیات ہے اور تمام انسانوں کے لئے ہے اور سب کو بغیر کسی استثناء کے اسی پر غور کرنا چاہیئے ۔ اس کے قوانین کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ اس کے قوانین کا گہری نظر سے مطالعہ اور سوچ وچار کرنے

کی ضرورت ہے ۔ اور روئے زمین کے تمام دانشمند سوچیں، سمجھیں اور تدبر سے کام لیں ۔ پس دماغ والے ہیں، ہوشمند ہیں، عقل سلیم والے ہیں جن کے فہم و دانش پر ضد ہٹ دھرمی، جنبہ داری اور جہالت کا پردہ نہیں پڑا ہے جو بات کی تہ اور منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور ان کو ضرور اس سے نصیحت حاصل ہوگی ۔ بھولے ہوئے آئینِ زندگی کی یاد (تذکر) ہو جائے گی ۔ اور فطرت کی سادہ راہ کو پھر انہوں نے مادی علائق اور تقلیدی عوائق کے پھندے میں پڑ کر فراموش کر دیا ہے ۔ دوبارہ وہی بھولی ہوئی راہ ان کو یاد آجائے گی ۔

مقصود بیان کائنات کی تخلیق بے سود نہیں ۔ انسان کی چشمِ بصیرت کھول دینے کیلئے ان میں گوناگوں فوائد ہیں ۔ الوہیت تکوینیہ الوہیت تشریعیہ پر دلالت کر رہی ہے ۔ قرآن رسالت اور اسلام کے منکر درحقیقت کائنات کی تخلیق کو بے سود سمجھتے ہیں ۔ نیک کردار مومن تعمیرِ انسانیت کے لئے آیا ہے اور یہ کردار کافر انسانیت کی تخریب کرتا ہے ۔ ایک کے پیش نظر بناؤ اور دوسرے کا مقصد بگاڑ ہے ۔ گویا مومن کے ہاتھ میں مثبت خالق ہیں اور کافر کی نظر میں منفی رُخ ہے ۔ منفی مثبت کے برابر نہیں ہو سکتا ۔ پھر کافر اس میں مومن کی طرح کس طرح ہو سکتا ہے ۔ آیت میں تنبیہ ہے ان لوگوں کو جو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو تعمیری سمجھتے ہیں ۔ اور تازیانۂ نصیحت ہے اور بدکرداروں پر بھی جو شتر بے مہار بن کر زندگیاں گذارتے ہیں ۔ ہوا و ہوس کی پرستش کرتے ہیں ۔ علی الاعلان بداطواریاں کرتے ہیں اور پھر کامیابی کی تمنا رکھتے ہیں ۔ متقین کے لفظ کو مجمل چھوڑنا اور مراتب تقویٰ کی صراحت نہ کرنا بتا رہا ہے کہ اگرچہ سب سے افضل اور مقصود کل تقویٰ کا اعلیٰ درجہ یہی صرف اللہ کی طرف رُخ کرنا اور ماسویٰ اللہ سے بالکل منہ موڑ لینا ہی ہے، لیکن ابتدائی درجہ یعنی شرک کو چھوڑنا، اللہ کو آئین ساز اور شارحِ حیات سمجھنا اور رسالت و قیامت پر ایمان لانا بھی قابلِ ستائش اوصاف ہیں ۔

کتاب کی تنوین بتا رہی ہے کہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے اور اتنی معروف ہے کہ اس کو معرفہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں ۔ اس لفظ میں اندرونی ہدایت یا بشارت ہے ۔ آیات قرآنی کے مکتوب ہونے اور بصورت کتاب ملنے کی ۔ مبارک کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن صرف رسمی کتاب نہیں بلکہ اپنے اندر انسانوں کے لئے چند در چند فوائد رکھتی ہے ۔ لیدبروا آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ آیاتِ قرآنی پر ہر شخص پر لازم یا جائز ہے ۔ پس کور دانش ہیں وہ جو احکامِ الٰہیہ پر غور کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں یا فقہی دفاتر کی الجھنوں میں ایسے گرفتار ہیں کہ آیاتِ قرآنیہ کا مطالعہ نہیں کر سکتے وغیرہ۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَٰنَ ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا ۔ بہت اچھا بندہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ۔ جب اس کے سامنے شام کے وقت تیز رو گھوڑے

الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّىٰ تَوَارَتْ

پیش کئے گئے اور ان کے معائنے میں وہ نماز سے غافل ہو گئے تو کہنے لگے کہ میں نے ان کی محبت کو یادِ الٰہی سے عزیز سمجھا یہاں تک کہ

بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ۝

آفتاب پردوں میں چھپ گیا حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹاؤ پھر تو ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ مارنے لگا

تفسیر بعض مخصوص آدمیوں کو اللہ ہر طرح کا مال و منال جاہ و جلال عزت و حشمت، حکومت و شوکت، راحت و عافیت اور صحت و طاقت عنایت فرماتا ہے اور وہ اپنے اندرونی ضعف بنیاں اور کمزوریوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے انانیت اور رعونیت کی سرمستیوں میں غافل ہو کر استقلال قوت، استبداد رائے اور خودی کے مدعی بن جاتے ہیں ۔ اور ان کی یہ خودی حقیقت میں بر خود غلط ہوتی

ہے ۔ جو خدا سے ان کو غافل بنا دیتی ہے ۔ وہ بنیادی بیچارگی کے باوجود جو عارضی قدرتی طاقت پر ایسے مغرور ہو جاتے ہیں کہ خدائی خصوصیات کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں ۔ عبد ہوتے ہوتے معبود سے رشتہ توڑ لیتے ہیں ۔ مخلوق اور مربوب ہونے کے باوجود رب خالق سے منہ موڑ لیتے ہیں ، لیکن کچھ خاص بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دنیوی شان و شوکت اور حکومت و سلطنت ان کی آنکھوں پر جہالت کا پردہ نہیں ڈال سکتے ۔ ان کو روشن رائے ، اتھاہ بصیرت ، ہمہ گیر طاقت اور ہمہ اقتدار حکومت کی طرف رجوع نہیں کرتے ۔ وہ عبد ہوتے ہیں اور اچھے پرستار غلام ہوتے ہیں اور سچے غلام ۔ وہ ہر داخلی و خارجی زندگی میں اپنے معبود کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ اگر ان کی زندگی کا کوئی خاص وقت پروردگار کی یاد سے سہواً خالی رہ جاتا ہے تو ان کو افسوس اور پشیمانی ہوتی ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ عبد بہر حال عبد ہے ۔ مطلق العنان اور آزاد نہیں ۔ اس کی زندگی کے تمام اوقات حامل عبدیت ہیں ۔ اس کو ہر وقت اپنے آقا کے سامنے عبدیت کا مظاہرہ کرنا چاہیئے ۔ وہ رونگٹے رونگٹے سے اپنے رب کی یاد کرتے ہیں ۔ اور تمام شواغل و موانع کو اپنے حساس دل اور باشعور وجدان سے دور رکھتے ہیں اور براہِ راست اپنے ہوش و حواس مافوق الشعور طاقتوں کو مولیٰ ہی کی یاد میں مستغرق رکھنا چاہتے ہیں ۔ اگر کبھی اتفاقاً مولیٰ کی براہِ راست یاد سے کوئی چیز خواہ وہ بیرونی لوازم بندگی ہی ہو جیسے جہاد کی کوشش اور اسبابِ جہاد کی تیاری اور اسی کا معائنہ وغیرہ روکتی ہے تو ان کو یہ بھی گوارا نہیں ہوتا ۔ راست آفرینی بزم ہو یا شدتِ آگیں رزم بہر حال ان کے پیشِ نظر ان کا نقطۂ خیال مولیٰ کی یاد اور براہِ راست یاد ہوتی ہے ۔ حضرت سلیمان بھی انہی ہوشمند ، سعادتمند انسانوں میں سے تھے ۔ شاہ ذی جاہ بھی تھے اور نبی برحق بھی ۔ نبوت کی باخبری سے بھی سرفراز تھے ۔ اور حکومت و سلطنت سے بھی ۔ لیکن کسی وقت شوکت و جلال ان کے قلبی دیتے کو معبود کی طرف سے ہٹا کر انانیت کی جانب مائل نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ عبد تھے ، اچھے عبد اور راجع الی اللہ تھے ہمہ وقت ۔

تحلیلِ اجزاء وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ۔ حضرت داؤد کی اولاد تو اور بھی ، لیکن میراثِ علم و نبوت کے وارث حضرت سلیمان ہی ہوئے تھے چنانچہ دوسری آیت میں آیا ہے ۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ سلیمان کا ذکر فرمایا ۔ اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اولاد عطیۂ الٰہی اور موہبت خداوندی ہے ۔ کثرتِ انسان کو اس میں دخل نہیں نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۔ حضرت سلیمان پیغمبر تھے ، لیکن وصفِ نبوت کو چھوڑ کر اس آیت میں دو خصوصی صفات کا تذکرہ فرمایا ۔ حسن عبدیت اور رجوع الی اللہ حقیقت میں عبدیت کا طبہت بڑا درجہ ہے ۔ عبدیت فطریہ تو تمام کائنات کو حاوی ہے ۔ لیکن عبدیت ارادیہ اختیاریہ سے متصف صرف اہلِ ایمان ہیں ۔ اور عبدیت میں بھی حسن عبدیت کا درجہ خاص ترین لوگوں کو حاصل ہوتا ہے ۔ حضور اقدس کے بارے میں جو آیت سبحان الذی اسریٰ بعبدہ میں لفظ عبد استعمال کیا ہے وہ بھی اسی عزت و خصوصیت کا حامل ہے ۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کی غیر معمولی نعمتوں سے سرفراز اور حکومت و دولت کا مالک بنتا ہے اور اس کو اپنے زمانے میں اپنے سے بڑا کوئی نہیں دکھتا تو کم ہی ایسے آدمی ہوں جو اپنی تخلیقی بے چارگی اور فطری کمزوری کا لحاظ رکھتے ہوئے عبدیت کی حدود سے اپنا تصوری قدم آگے نہ اٹھاتے ہوں ۔ انانیت ، کبر و رعونت اور ہم چون دیگرے نیست کا شیطانی طاغوتی جذبہ عموماً بڑے آدمیوں میں برسر ظہور آ ہی جاتا ہے ۔ اس وقت وہ اپنے کو عبد نہیں کہتے ۔ اور کہتے ہیں تو جانتے نہیں ہیں تو عجز عبدیت کو سمجھتے نہیں ۔ وہ اپنی زبان قانونِ انسانی اور اپنے اشارہ چشم و ابرو کو وحی و مشیت سمجھنے لگتے ہیں ۔ ایسی حالت میں ان کا تعلق خدا سے ٹوٹ جاتا ہے اور خدا کی طرف ان کی توجہ ہونے کی بجائے نفس کا رخ الٹ کر نفسانیت کی طرف ہو جاتا ہے ، لیکن خاص خاص بندے ایسا نہیں کرتے ۔ انہی میں سے حضرت سلیمان بھی تھے ۔ کیونکہ نبوت و سلطنت سے سرفراز ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی بندگی اور عجز اور اللہ کی الوہیت اور قوت کی چشم یقین سے دیکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی عبدیت کو ربوبیت میں اور عبادت کو الوہیت میں گم کر دیا اور انانیت کو پگھلا دیا ۔ اور اللہ کے آئین و حکم کو اپنے ہر ہر امر میں کارفرما دیکھ کر سر نیاز جھکا دیا ۔ یہ تھی آپ کی عبدیت اور رجوع الی اللہ ۔ لکھو لتے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کا

ایک مکالمہ نقل کیا ہے جس سے حضرت سلیمان کے عبد کامل اور راجع الی اللہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ آپ بچپن میں ہی کس قدر زرین عبدیت کے حامل تھے۔ حضرت داؤد نے پوچھا سب سے بہتر کیا چیز ہے۔ حضرت سلیمان نے جواب دیا اللہ کی طرف سے ایمان اور سکون قلب حاصل ہونا۔ سوال کیا سب سے شیریں کیا چیز ہے۔ جواب دیا اللہ کی رحمت کا نزول۔ سوال کیا سب سے زیادہ خوشگوار کیا چیز ہے جواب دیا اللہ کی رحمت کا نزول۔ سب سے خوشگوار کیا چیز ہے۔ جواب دیا اللہ سے استغفار اور طلب عفو اور آپس میں ایک دوسرے کا قصور معاف کر دینا۔ رواہ مسلم۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ۔ قتادہ نے کہا کہ صافات قوت سے کھڑے ہونے والے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ مجاہد کے نزدیک ایک پاؤں اٹھا کر صرف تین ٹانگوں پر کھڑے ہونے والے گھوڑے کو صافن کہا جاتا ہے جیاد جواد کی جمع ہے جس کا مادہ جودت ہے۔ یعنی عمدہ تیز رفتار گھوڑا یا جیہ سے ماخوذ ہے۔ اس آیت کی تشریح میں اہل تفسیر نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کے لئے خاص قسم کے گھوڑے پیدا کئے گئے تھے کسی نے کہا دریائی گھوڑے تھے۔ ابراہیم تیمی نے کہا بیس ہزار پردار گھوڑے تھے۔ بعض کا قول ہے کہ دمشق اور نصیبین کے جہاد میں حضرت سلیمان نے کافروں سے چھینے تھے۔ وہ حضرت سلیمان کے پاس بطور میراث آئے تھے۔ کسی نے بیان کیا کہ حضرت داؤد نے عمالقہ سے گھوڑے چھینے تھے۔ تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ کسی نے صرف بیس کہا ہے۔ ابن جریر نے ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ بیس ہزار تھے۔ ابن ابی حاتم نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو واقعہ صرف اتنا تھا کہ عصر کے وقت حضرت سلیمان جہادی گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہوئے اور اتنی دیر مشغول رہے کہ نماز کا وقت جاتا رہا اور نماز کا خیال نہیں رہا۔

فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ یعنی حضرت سلیمان نے افسوس کر کے کہا کہ آفتاب پردۂ افق میں چھپ گیا، شام ہو گئی اور میں گھوڑوں کی محبت میں ایسا منہمک رہا کہ نماز کا بھی خیال نہیں رہا۔ خیر ہر نیکی کو کہتے ہیں اور مال کو بھی اور اس کا اطلاق گھوڑوں پر بھی ہوتا ہے، خیل (گھوڑوں) کی پیشانی سے خیر کا وابستہ ہونا احادیث میں مصرح ہے (صحیحین) اب سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمان پیغمبر ہونے کے باوجود دنیوی مال متاع کے معائنہ میں ایسے مشغول ہوئے کہ نماز کو بھی بھول گئے۔ کیا یہ ممکن ہے اس کا جواب صاف ہے کہ حضرت سلیمان نے جہادی گھوڑوں کا معائنہ فرمایا تھا جو بجائے خود نیک کام ہے۔ دنیوی مال و منال کا معائنہ نہ تھا۔ نہ کوئی پیغمبر بلکہ ہر مومن دنیا سے محبت کرتا ہے۔ ایسا کہ خدا کو بھول جائے اور ادائے فرض سے بھی غافل ہو جائے۔ پھر بھی یہ شبہ ضرور باقی رہتا ہے کہ فرض نماز سے غفلت اور کسی نفلی چیز سے انہماک کس طرح جائز ہے۔ ابن جریر نے حضرت سلیمان کے اس فعل کو فعل عمد قرار دیا ہے اور لفظ احببت سے عدد مقصد کا مفہوم مستنبط کیا ہے اور اس کو جائز بھی قرار دیا ہے اور ابن عباس کے عمل کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ابن عباس کے متعلق مروی ہے کہ کہیں وعظ و نصیحت میں مشغول رہنے کی وجہ سے آپ کی نماز مسنون وقت سے مؤخر ہو جاتی تھی بلکہ مسلم نے ابن عباس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے مدینہ بغیر کسی عذر کے اور بلا بارش وغیرہ کے ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا ہے۔ تاکہ امت کو (ابتدائے وقت میں نماز پڑھنے کی) دشواری نہ ہو، لیکن عام اہل تفسیر حضرت سلیمان کے اس فعل کو سہواً اتفاق پر محمول کیا ہے اور ابن عباس کی مذکورہ روایت کو نا قابل عمل (بقدر امکان) قرار دے کر تاخیر صلوٰۃ کی ممانعت کی ہے۔ ترمذی نے اس کو معضل لکھا ہے) ابن کثیر نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے اور حضرت سلیمان کی تاخیر نماز کو ویسا ہی قرار دیا ہے۔ جیسا جنگ احزاب مشغول رہنے کی وجہ سے حضور والا کی عصر کی نماز میں تاخیر ہو گئی اور غروب کے بعد آپ نے ادا فرمائی۔ دیکھو حضرت جابر کی روایت جو صحیحین میں موجود ہے۔

میری نظر میں ابن کثیر کا یہ قیاس غلط ہے۔ کیونکہ حضور والا نماز کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے بلکہ تاخیر کرنے پر مجبور تھے گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ نماز کی طرف توجہ ممکن ہی نہ تھی۔ چنانچہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ حبسونا عن صلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر

مَلَأَ اللّٰہُ بُیُوْتَھُمْ وَقُبُوْرَھُمْ نَارًا ۔ انہوں نے ہم کو درمیانی عصر کی نماز سے روک دیا۔ اللہ ان کے گھروں اور قبروں میں آگ بھر دے ۔ اور صلوٰۃ الخوف کے نزول سے پہلے کا یہ واقعہ تھا۔ بلکہ اب بھی بکثرت علماء نے جائز قرار دیا ہے کہ شدت قتال کے وقت نماز میں تاخیر کرنی درست ہے ۔ تستر کے قلعہ کی فتح کے وقت فجر کی نماز میں مسلمانوں نے ضرورت سے مجبور ہو کر تاخیر کر دی تھی ۔ بکثرت صحابی بھی فوج میں موجود تھے ۔ اور کسی نے اس کو ناجائز نہیں قرار دیا (رواہ ابوداؤد فی السنن) اس لئے حضور اقدس کے فعل کو ...... حضرت سلیمان کے فعل سے مشابہ قرار دینا غلط ہے ۔ حضرت سلیمان جہادی گھوڑوں کے معائنے میں مشغول تھے ۔ جو ارادی اور اختیاری فعل تھا ۔ اور حضور والا شدتِ قتال سے مجبور تھے ۔ بہر حال قول فیصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان کا عمل سہواً یا بطور ذہول تھا ، اسی لئے آپ کو ندامت ہوئی ۔ لیکن نیت بخیر تھی اور عمل صالح میں مشغول بھی رہتے تھے ، اس لئے تاخیر صلوٰۃ پر مواخذہ نہ ہوا بلکہ آپ کے احساس غلطی اور رجوع الی اللہ کو آداب کے لفظ سے مدح کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ۔ یہ ایک فروگذاشت تھی پیغمبرانہ جس کے بعد انابت ، اور رجوع الی اللہ ضروری تھا تاکہ جس عبدیت کا کامل مظاہرہ ہو جائے

رُدُّوْھَا عَلَیَّ ، فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ گھوڑوں کے شوق میں حضرت سلیمان کی نماز میں تاخیر ہو گئی تھی ، اس لئے آپ نے گھوڑوں کی گردنیں اڑا دیں اور ٹانگیں کٹوا دیں ۔ حسن بصری ، قتادہ اور سدی وغیرہ کا بھی یہی قول ہے ۔ اس قول پر مسح کے معنی قتل کے ہوں گے ۔ لیکن اہلِ نظر نے اس مطلب کو غلط قرار دیا ہے بلکہ مسح کے معنی غبار صاف کرنے کے ہیں ۔ یعنی گھوڑوں کی عیال اور کونچوں سے غبار صاف کرنے لگے ۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت ہے کہ اور اس کا بھی قول منقول ہے ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اور لکھا ہے کہ بے قصور جانوروں کو سلیمان پیغمبر ہوتے ہوئے کیسے دُکھ دے سکتے تھے ۔ امام رازی نے بھی اپنی تفسیر کبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے اور طویل تقریر کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ روایت و درایت کے بھی مطابق ہے ۔

مقصودِ بیان حضرت سلیمان کا ظرف وسیع تھا جو نبوت و سلطنت حاصل ہونے کے بعد بھی عبدیت کو فخر سمجھتے اور اپنے مولیٰ کے اشارات کی طرف ہر معاملے میں ہر وقت اپنا قلبی میلان رکھتے تھے ۔ کم ظرف نہ تھے کہ انا و لا غیری کہنے لگتے ۔ اور نہ اس قدر تنگ دامن تھے کہ عرفان کی شعاعوں کو برداشت نہ کر سکتے ۔ اور ایک ہی جام میں سرشار ہو کر انا الحق پکار اٹھتے خاتم المرسلین نے فرمایا ۔ مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ اور سرکار کے ایک کفش بردار کی زبان سے نکلا سُبْحٰنِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے ۔ تبریزی نے رومی سے دونوں کا فرق پوچھا ۔ رومی نے کہا بایزید کا ظرف اتنا ہی تھا ۔ ظہور نور سے چھلک گیا اور خود فراموش ہو گئے اور آقا کے قلب کی پہنائی اپنے اندر ساری کائنات کو ذرہ سے بھی کم سمجھتی تھی ۔ پس قلب مبارک نے جلال احدیت والوہیت کو برداشت کر لیا ۔ شروع آیت میں تنبیہ ہے ان جاہل مشائخ طریقت اور کور دانش علمائے شریعت کو جو انبیا اور اپنے محبوب ائمہ کو خصوصاً حضور گرامی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو عبد کہتے ہوئے شرماتے اور معبود کے درجہ سے جا ملاتے ہیں اور احد و احمد میں صرف میم کا پردہ حائل سمجھتے ہیں اور کچھ بدعتی کہتے ہیں کہ مدینے کی گلیوں میں خدا چلتا پھرتا تھا ۔ آیت سے نصیحت حاصل کرنا چاہیئے ان کم ظرف مدعیانِ علم و عرفان کو جنہوں نے بندوں کا رشتہ خدا سے توڑ دیا ہے اور خود وسائط بن بیٹھے ہیں ۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بندہ بہر حال بندہ ہے ۔ خدائی کے اختیارات و تصرفات نہیں رکھتا ۔ نہ آداب تازیانہ ہے ان خود رائے اہلِ قیاس کے لئے جو انسانی سماج میں پیش آمدہ مسائل کا حل انسانی دماغوں میں ڈھونڈتے ہیں ۔ اور انفرادی یا شورائی فیصلوں کو قرآنی احکام سے بے نیاز ہو کر انسانوں میں رائج کرتے ہیں ۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ عظیم القدر پیغمبر بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لئے محتاج تھے ۔ اور یہی ان کے لئے وصف کمال تھا ۔ انانیت اور استبداد رائے ان کا شعار نہ تھا ۔ وغیرہ ۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ○ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ

اور ہم نے سلیمان کو آزمایا　اور ان کے تخت پر ایک جسم ڈال دیا پھر سلیمان رجوع بخدا ہوئے اور دعا کی اے رب مجھے بخش دے　اور بخشے

لِىْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِىْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِىْ

ایسی بادشاہت عطا کر جو میرے بعد اور کسی کو سزاوار نہ ہو بے شک تو جو ہے تو بہت دینے والا ہے　پھر ہم نے ان کے لئے ہوا کو تابع کر دیا

بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ○ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ○ وَّاٰخَرِيْنَ

سلیمان کے حکم سے جہاں لے جانا چاہتے تھے نرم نرم چلا کرتی تھی　اور شیطانوں کو بھی تابع کر دیا تھا ہر ایک عمارت بنانیوالا اور غوطہ لگانیوالا تھا اور بھی تابع کر دیئے

مُقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ ○ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

تھے جو بیڑیوں میں جکڑے رہا کرتے تھے اور ہم نے کہا یہ ہے ہماری بے حساب بخشش خواہ آپ کسی　کو دیں　یا نہ دیں

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ

اور البتہ سلیمان کے لئے ہمارے پاس مرتبہ اور عمدہ مقام ہے　اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو　جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ

مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ○ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ

مجھے بیماری اور تکلیف دینے کے لئے شیطان نے چھو لیا ہے　ہم نے حکم دیا کہ زمین پر لات مارو جس سے چشمہ نکل آیا　ہم نے فرمایا تمہارے نہانے اور پینے کے لئے

وَّشَرَابٌ ○ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ○

یہ چشمہ موجود ہے جس سے ان کو شفا ہوئی اور ہم نے ان کو ان کے اہل و عیال اور اتنے ہی اور بھی عنایت فرمائے　تاکہ عقلمندوں کے لئے یادگار رہے

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ○

اور حکم دیا اپنے ہاتھ میں جھاڑو کا مٹھا لے کر مارو　اور قسم میں جھوٹے نہ ہو　ہم نے ایوب کو صابر پایا وہ بڑے اچھے بندے خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

تفسیر یہ دنیا رنج و راحت، دکھ اور سکھ، فقر اور دولت، افلاس اور امارت، غلامی اور آقائی، محکومی اور حکومت غرض اثر آفرین اور نتائج انگیں عوامل سے بھری ہوئی ہے۔ ظلمت و نور کی کشمکش بھی جاری ہے اور خیر و شر کے تصادم کی علت در حلقہ زنجیر بھی آغاز و اختتام کا کوئی ممتاز نقطہ نہیں رکھتی۔ طبیعت اور دہریت کے پرستار کمزوری یا احساس کمزوری کے بطن سے قوت کو نمودار دیکھتے ہیں۔ ہر آنے والی چیز کو گذشتہ کا نتیجہ اور ضروری نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ علل و معلومات اور اسباب و مسببات کا تسلسل ان کی نظر میں غیر محدود ہے اور غیر ارادی و بے شعوری کے تحت جاری ہے۔ ہر شے گذشتہ شے کا اضطراری نتیجہ بھی ہے اور آئندہ شے کے لئے بے شعور علت بھی۔

کچھ کوتاہ بین، قاصر النظر انسان کی زندگی سے ماورا کچھ نہیں دیکھتے۔ آفاقی حکمت پر غور نہیں کرتے۔ لیل و نہار و طلوع و غروب کا دوران کے لئے جاذب نہیں۔ صرف انسانی زندگی اور ان کی کشش اور میلان طبع کا مرکز ہے اور وہ بھی صرف اس قدر کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ اسی زندگی کا دکھ سکھ اور رنج و راحت بد نصیبی یا خوش نصیبی کی مرکزی کیل ہے جس پہ

جس پر زندگی کا چکر چل رہا ہے عموماً ہندوستان کا فلسفہ اور یونان کی حکمت کے کچھ سرپرست (افلاطون وغیرہ) قائل ہیں کہ کائنات کا چکر بجائے خود کچھ بھی غرض نہیں رکھتا ہو۔ طلوع و غروب اور روشنی و تاریکی سے کچھ بھی نتائج برآمد ہوتے ہوں تبادلِ فصول اور تغیر فضائی کی تاثیرات نجوم و کواکب کا ممنون ہو اور اس کے کچھ ثمرات نمودار ہوں۔ بہرحال انسان کی یہ زندگی اور اس کے آرام و آلام گذشتہ زندگی کا اچھا برا نتیجہ ہیں۔ اس زندگی میں جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ بیمار اور فقیر اس لئے بیمار اور فقیر ہے کہ گذشتہ جنم میں اس نے گناہ آفریں اعمال کئے تھے۔ طاقتور حسین اور بادشاہ اس لئے طاقتور اور حکمران ہے کہ پچھلی زندگی کا کردار اس کا اچھا تھا۔ اس گروہ کے نزدیک یہ زندگی اور اس کے تمام اطوار گذشتہ زندگی کے نتائج اور آئندہ زندگی کے لئے سنگ بنیاد ہیں۔ ہر خیر و شر، راحت و تکلیف اور عزت و ذلت کا حلقہ در حلقہ تسلسل خود ہی نتیجہ ہے اور خود ہی علت۔ اس گروہ کا خیال اہل دہریت کے خیال سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ اصحاب دہریت ساری کائنات میں غیر ارادی اور بے شعوری تسلسل کے قائل تھے۔ اور سنسار کے اس چکر کو انسان کے اختیاری کردار کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے مصرحات میں اللہ کی نگہبانیاں، قدرتی کارفرمائیاں، اختیار کی چکوتگی اور علم غیبی پرتو اندازیاں ناقابل توجہ ہیں۔ کسی نے ان تلونات، تغیرات اور جیون چکر میں اللہ کے دست قدرت کی ہمہ گیری اور ارادہ و مشیت کی تاثیر کی جھلک نہیں دیکھی نہ کسی کو پردہ کے پیچھے تار ہلانے والا نظر آیا۔ واقعات کو مرتب دیکھا۔ بغیر ترتیب دینے والے کے اور سنسار کا باہمی ربط سمجھا، بغیر ربط کو پیدا کرنے والے اور ربط کو توڑ دینے والے کے۔ صرف قرآن نے درس حقیقت دیا اور سوچ وچار کرنے والوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور بتا دیا کہ خدا عالم ہے کہیں خوابیدہ نہیں۔ صاحب ارادہ ہے، مضطر و مجبور نہیں۔ اس کا تعلق سارے جہان سے ہر وقت موجود ہے۔ اس سنسار کے انتظام اور غرض و غائت سے وہ غافل نہیں۔ ابتدائی مادی عنصر ہوا سے لے کر درمیان مدارج (چرند پرند وغیرہ) کو طے کرتے ہوئے سب سے اونچی مخلوق یعنی انسان تک اور آخر میں کائنات کے بادشاہ یعنی حامل وحی جلیل القدر پیغمبر تک کوئی بھی اس کے علم تصرف سے باہر نہیں۔ اس کو حق ہے کہ ہر گروہ کائنات کا امتحان لے تاکہ عملی طور پر اظہار ہو جائے کہ یہ عالم کبیر کا مجموعہ اور سنسار کا بادشاہ راحت و عیش میں پڑ کر کہیں خود سر تو نہیں ہو گیا۔ کہیں حکومت و سلطنت کے نشہ سے سرشار ہو کر اپنی مقدار خودی کو تو نہیں کھو بیٹھا۔ کہیں اپنے نفس کو خود مختار حکمران اور مستقل آزاد فرماں روا تو نہیں سمجھنے لگا یا کہیں ایسا واقعہ تو نہیں کہ اگر اس کو جسمانی اور قلبی دکھ پہنچ جائے تو منزل مقصود کو بھول جائے اور بادۂ منزل کے اندر بیٹھ کر پاؤں سے کانٹے نکالنے لگے کہ غایت منزل میں جلوہ آفریں شاہد مراد کی اسے پرواہ بھی نہ رہے۔ پس کسی کو سکھ اور کسی کو دکھ دے کر اس نے جانچا اور اس کا اس کو حق ہے۔ سب کچھ دے کر چھوٹے بڑے انسان کا امتحان لیا۔ کہ کہیں اس کی خودی خدائی کی مدعی تو نہ بن بیٹھی اور سب کچھ لے کر بھی اس نے کسی بالاترین ہستی کی آزمائش کی کہ کہیں مصائب کے سیلاب میں بہہ کر اپنے ہوش کی آنکھیں اور بصیرت کے کان تو نہیں کھو بیٹھا۔ پہلے گروہ کے تشکر کا امتحان تھا اور دوسرے گروہ کے صبر کا۔ جب دونوں امتحان میں پورے اترے۔ دونوں نے بطور عبدیت اور عبودیت کا اظہار کیا اور دونوں نے ہر وقت غیبی کارفرمائی کی، اللہ کی اختیاری اور ارادی اور ہمہ گیری اور قدرتی فعالی کو جان لیا۔ اور مان لیا تو دونوں کو مقام قرب پر فائز کیا اور بزم ہستی میں شاید کل کی جلوہ ریزیوں سے پرتو اندوز ہونے کا اس سے اچھا کوئی مقام نہیں۔

تحلیل اجزاء — وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ قرآن پاک میں اس سے زیادہ کوئی آیت یہود یوں کی داستان گوئی اور ہرزہ سرائی کی آماجگاہ نہیں بنی۔ اکثر مفسرین نے اسرائیلیات سے نقل کر کے وہ بے سروپا اور عجیب من گھڑت داستانیں لکھی ہیں۔ جن پر عقیدہ رکھنا اور سچ جاننا تو یقیناً کفر ہے نقل کرنا بھی آمیزش گناہ سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس اتنا بے کار وقت نہیں۔ اور نہ اتنا کہ تفسیر قرآنی کو داستانِ خیال بنا کر پیش کریں۔ صرف مختصراً اجمالی داستان نقل کر کے وجوہ تردید پر روشنی ڈالیں گے اور پھر صاف ستھرا مطلب نکالیں گے۔

سبب فتنہ کیا تھا۔ دوران فتنہ میں کیا واقعات پیش آئے اور انجام کیا ہوا۔ یہ تمام تفصیل خود اس جگہ مذکور ہے جس کو

ہم بیان کریں گے۔ مختلف اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

حضرت سلیمان کی ایک بیوی جس کا نام جرادہ تھا مشرکہ تھی اور بت پرستی کرتی تھی۔ روایت ابن عباس کسی بیوی سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس کے رشتہ داروں کا ایک مقدمہ آیا جس میں حضرت سلیمان نے بیوی کی طرف کے رشتہ داروں کی طرف داری میں فیصلہ کرنے کی نیت کی تھی (حاکم فی المستدرک وغیرہ) تین روز تک حضرت سلیمان عدالت میں نہیں بیٹھے اور اہل معاملہ پریشان رہے۔

گھوڑوں کو قتل کرایا تھا اور یہ جرم تھا (کعب بحوالہ یہود)

کسی عورت سے حیض کے زمانے میں قربت کرلی تھی۔ (حسن بصری)

کسی غیر اسرائیلی عورت سے نکاح کرلیا تھا۔ حالانکہ صرف اسرائیلی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت تھی۔

ایک روز سلیمان نے کہا آج رات سو عورتوں سے قربت کروں گا۔ اور ہر ایک کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ کیونکہ انشاء اللہ نہیں کہا تھا، اس لئے کسی عورت کے بطن سے اس رات کا کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا۔ صرف ایک عورت کے ناقص الجسم مردہ بچہ پیدا ہوا (یہ روایت زیادہ قوی ہے)

بہرحال اسباب فتنہ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح بیان کی ہے جس میں آخری وجہ قرین عقل ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ صحیح حدیث میں مذکور رہے، اس لئے ممکن ہے کہ پیغمبر کی یہ خلاف شرع حرکت خواہ کسی نسیان یا غفلت کی وجہ سے ہو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنی اور آزمائش کی گئی۔

فتنہ کی صورت کیا ہوئی۔ بیشتر اہل تفسیر نے مختلف روایات کے تسلسل سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی انگوٹھی جس کے زور پر آپ حکومت کرتے تھے۔ کسی جن کے ہاتھ لگ گئی۔ کیسے ہاتھ لگی۔ اس کے متعلق لمبی لمبی داستانیں ہیں۔ جو مختلف البیان ہیں۔ ہم سب کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جن کا نام کسی نے صخر، کسی نے آصف، کسی نے مرد کسی نے عقیق لکھا ہے۔ بہرطور جب اس جن کے ہاتھ انگوٹھی لگ گئی تو وہ سلیمان کی کرسی پر سلیمان کی شکل بن کر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا۔ اور سلیمان آوارہ پھرنے لگے۔ پھر کسی طرح ایک مچھلی کے پیٹ سے انگوٹھی برآمد ہوئی اور جن کے ہاتھ لگ گئی اور حکومت واپس مل گئی اور جن کو قید کر دیا گیا۔

جسد سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک وہ انگوٹھی والا جن ہے تمام داستانوں کی تردید اہل تحقیق نے کی ہے روایتاً بھی اور درایتاً بھی۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ طولانی قصہ اگرچہ سعید بن المسیب اور زید بن اسلم وغیرہ تابعین سے مروی ہے لیکن پورا کا پورا یہودیوں کے قصے سے لیا گیا ہے۔ نسفی نے مدارک میں لکھا ہے کہ انگوٹھی اور جن کی داستان یا سلیمان کی کسی بیوی کا بت پرستی کرنا سب یہودیوں کی تصنیف ہے۔ خطیب نے بھی سراج میں اس کی تغلیط کی ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں مشرح طور پر اس داستان کی تکذیب کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ شیطان پیغمبر کی شکل کیسے اختیار کرسکتا ہے۔ ورنہ پھر کسی پیغمبر کا اعتبار نہ رہے گا۔ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ مدعی نبوت کون ہے اور تعلیم ہدایت کرنے والا اصلی پیغمبر کون ہے۔ پھر جن نے جب حضرت سلیمان کی صورت بن کر حکومت کرنی شروع کر دی تو سلیمان کی بیویوں سے قربت کیوں نہ کرسکا۔ جرادہ کافرہ سے سلیمان نے نکاح کس طرح کیا اور اس کا کفر کھل گیا تو اپنے گھر میں کیسے رکھا وغیرہ۔

میں کہتا ہوں کہ خاتم سلیمان کی داستان ہی لغو ہے بادشاہوں کی مہر ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان کی بھی ہوگی، لیکن سلطنت انگوٹھی میں بند ہوگی اور انگوٹھی والے کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس سے زیادہ بیہودہ بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ کیا پیغمبری اور سلطنت سلیمان کو ملی تھی یا انگوٹھی کو۔ اللہ کی نظر میں شرف وعزت سلیمان کو حاصل تھی یا انگوٹھی کو۔ الحاصل جب انگشتری اور جن کی داستان ہی جھوٹی ہے تو جسد سے شیطان مراد لینا (جس طرح عام تابعین کی طرف نسبت کرتے ہوئے اکثر اہل تفسیر نے بیان کیا ہے) بھی غلط ہے۔ پھر آیت کی تشریح کیا ہوگی۔ اس کے متعلق دو احتمال ہیں اور دونوں صحیح ہو سکتے ہیں۔

اول احتمال یہ ہے کہ جسد سے مراد ناتمام بچہ کا مردہ جسم ہو اور یہ...... ناتمام بچہ وہی ہے جس کا تذکرہ صحیح حدیث کے

حوالے سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اور ابن کثیر نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ ہم نے سلیمان کی آزمائش کی اور (بطور سزا یا عبرت کے لئے) ناتمام بچہ کا مردہ جسم انکی کرسی پر ڈال دیا تاکہ ان کو ثابت ہو جائے کہ انشاء اللہ نہ کہنے کی سزا یہ ہے۔

دوسرا احتمال وہ ہے جس کو امام شافعی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ جس طرح دنیا کی دوسری مصائب کا نزول اللہ کی طرف سے نیک لوگوں کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے۔ آیۃ مبارکہ میں آیا ہے۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف الخ۔ اسی طرح بہت زیادہ کمزور اور ناتواں کر دینے والی بیماری بھی جس سے انسان مضغہ بیجان ہو کر رہ جائے۔ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان کی آزمائش اسی طرح کی گئی۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ ہم نے سلیمان کو سخت بیمار کر دیا (اس طرح ان کی آزمائش کی) اور مضغہ بیجان بنا کر اسی کو کرسی پر ڈال دیا۔ کچھ وقفہ بعد وہ تندرست ہو گئے۔ پس جسد سے مراد مضغہ بے جان اور اناب سے مراد ہے حالت صحت کی طرف لوٹنا۔ جب سلیمان تندرست ہو گئے تو دعا کی۔

یہ مطلب بالکل واضح ہے۔ محاورات کے مطابق جھوٹی داستانوں سے پاک اور نبی برحق کے متعلق توہین و تکفیر اور تہمت تراشی سے مبرا ہے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي۔ اگر فتنہ سے بیماری اور اناب سے حالت صحت کی طرف رجوع مراد ہو تو مغفرت کا کیا معنی ہوگا۔ مغفرت بغیر گناہ کے کسی اسی شبہ کا ازالہ ظاہر ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ شان نبوت بہت بلند ہوتی ہے۔ انبیاء کا مطلب استغفار سے طلب نور ہوتا ہے جو ظلمات کو دور کرتا چلا جائے اور عرفان کے مدارج میں گوناگوں اضافہ ہوتا ہے۔ حضور والا کو تو خدا نے تمام اگلے پچھلے گناہوں سے معافی دے دی تھی۔ پھر حضور نے کیوں فرمایا تھا کہ میں روزانہ اللہ سے ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ صحابہ کے دریافت کرنے پر حضور نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں کیا اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

پس حضرت سلیمان کے استغفار کے معنی ہوئے طلب نور استقامت علی الحق کی خواہش۔ دل میں اللہ کا خوف اور محبت جم جانے کی درخواست۔ ابو عبید نے بسلسلہ شیخ علی بن ثابت از جعفر بن برقان، صالح بن سما البصری جدری کا قول بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد کی وفات کے بعد اللہ نے سلیمان علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی تھی کہ جس چیز کی حاجت ہو مجھ سے درخواست کرو۔ سلیمان نے دعا کی میرے رب میرا دل ایسا کر دے جو تجھ ہی سے خوف و خشیت رکھے۔ جیسے میرے باپ کا دل تھا اور میرا دل ایسا کر دے جو تجھ ہی سے محبت کرے جیسے میرے باپ کا دل تھا۔ ارشاد ہوا میرے بندے کو دیکھو میں نے اپنا رسول بھیج کر اس سے اس کی حاجت دریافت کی اور اس نے مجھ سے میرا ہی خوف اور محبت مانگا الخ۔ اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ سلیمانؑ نے کس بات کی معافی چاہی تھی، لیکن ان قلبی وسوسوں اور اندرونی میلانات و عواطف سے جن کا خطرہ بحیثیت بشریت آپ کو لگا ہوا تھا (ابن کثیر) شیخ محی الدین ابن عربی نے اس آیت کی تفسیر کے ساتھ لطیف توضیحی اشارات لکھے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فتنہ سے مراد امتحان تلوینی ہے اور طلب مغفرت سے مراد تسکین کی خواہش اور امتحان تلوینی بھی ویسا ہی ہوا جیسے کسی نبی کے لئے زیبا تھا۔ ابن عربی کا مطلب بھی صاف ہے کہ تلوین بصورت اغوا شیطانی یا اضلال نفسانی نہ تھی بلکہ مخصوص امتحان گاہ تھی۔ مخصوص امتحان کا طریقہ، مخصوص امتحان کا سوال اور مخصوص امتحان دینے والا اور مخصوص طور پر کامیابی کی درخواست کرنے والا۔ الٰہی ایسا نور عطا فرما کہ ہم تجھ کو تیرے ہی نور سے دیکھیں۔

وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ۔ اس جگہ سلطنت سے مراد سلطنت روحانیت اور بے نظیر مرتبہ قرب کا حصول نہیں۔ کیونکہ ایسی دعا اگر حضرت سلیمان کی ہو تب بھی قبول نہیں کی گئی۔ حضرت عیسیٰ اور حضور خاتم المرسلین کو ان سے زیادہ مراتب روحانیت و قرب عطا ہوئے بلکہ دنیوی سلطنت بھی ہے جو انوکھے انداز میں اللہ سے حضرت سلیمان نے مانگی تھی۔ پھر قابل غور یہ امر ہے کہ حضرت سلیمان کی درخواست کیا دنیوی جاہ و جلال اور مال و منال کے لئے تھی۔ سلیمان اپنے ہوا پرست اور پرستار نفس تھے کہ دنیا میں اپنے لئے سب سے بڑی سلطنت کے خواہشمند ہوئے یا دعا کا مطلب کچھ اور تھا۔ اوّل صورت تاریخی حقائق اور ایمانی

درایت کے بالکل خلاف ہے۔ سلیمان پیغمبر تھے نفس پرست نہ تھے۔ نہ ان کو کل روئے زمین کی حکومت دی گئی۔ ایشیا میں کچھ تھوڑا سا حصہ ان کے زیر نگیں تھا۔ عراق، شام، یمن یا شاید مصر بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کل روئے زمین پر حکومت کرنے کی ان کو تمنا نہ تھی صحیح مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے علاوہ بعض مادی عناصر اور اس غیبی مخلوق کو مسخر کرنے کے خواہشمند تھے جس کو لوگ جن کہتے ہیں۔ آخری فقرے کی تائید صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ بخاری مسلم وغیرہ میں بروایت ابو ہریرہ ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا رات ایک عفریت (شیطان سرکش جن) نے میری نماز خراب کرنی چاہی۔ اللہ نے اس کو میرے قابو میں کر دیا۔ میں نے چاہا کہ مسجد کے ستون سے اس کو باندھ دوں تاکہ صبح کو بچے اس سے کھیلیں اور تم بھی اس کو دیکھو، لیکن مجھے اپنے بھائی سلیمان کی بات یاد آگئی کہ ھب لی ملکا لاینبغی لاحدٍ من بعدی الخ۔ میں نے اس مردود کو باندھنا مناسب نہ سمجھا اور اللہ نے اس کو خوار کر دیا۔

ابو درداء کی روایت ہے کہ حضورؐ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے کہ خلاف معمول ہم نے حضور سے یہ الفاظ سنے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ پھر تین مرتبہ فرمایا میں لعنت الٰہی تجھے ملعون کرتا ہوں۔ پھر اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے کسی چیز کو پکڑنا چاہتے ہیں۔

نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے آج حضور سے ایسے الفاظ سنے جو آج سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اور حضور نے دست مبارک بھی بڑھایا تھا۔ کیا بات تھی۔ فرمایا اللہ کا دشمن ابلیس ایک انگارہ میرے سامنے لایا تھا۔ میں نے اعوذ باللہ پڑھا اور اس پر لعنت کی (یعنی اس سے کہا دور ہو۔ جب وہ نہیں بھاگا تو میں نے اس کو گرفتار کرنا چاہا۔ واللہ اگر میرے پاس میرے بھائی سلیمان کی دعا نہ ہوتی تو وہ بندھا پڑا ہوتا کہ مدینے کے بچے اس سے کھیلتے۔ (رواہ مسلم)

ابو سعید خدری سے مروی ہے حضور کو فجر کی نماز میں اشتباہ ہو گیا۔ میں بھی نماز میں پیچھے کھڑا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کاش تم دیکھتے کہ ابلیس کا کیا حال ہوا۔ وہ ملعون میری نماز خراب کرنے آیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گلا ایسا گھونٹا کہ اس کے لعاب کا اثر میری دونوں انگلیوں کے درمیان آگیا۔ اگر میرے بھائی سلیمان کی دعا نہ ہوتی تو صبح کو تم دیکھتے کہ وہ مسجد کے ستون سے بندھا پڑا ہوتا اور مدینہ کے بچے اس سے کھیلتے۔ الخ۔ (رواہ احمد و ابو داؤد)

ان تمام احادیث کی صحت میں اہل حدیث کو کوئی کلام نہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے جس حکومت کی خواہش کی تھی وہ حکومت ہی کچھ انوکھی تھی۔ پرستاران دنیا کی طرح ان کی خواہش نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سرکش شیطانوں اور بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے والے غیبی جنوں پر ان کا اقتدار ہو جائے تاکہ ان کے زمانے میں شرک کی بیخ کنی ہو جائے۔ چنانچہ جنات پر حکومت آپ کی ہو گئی اور ساتھ ساتھ ظاہری اقتدار تو پہلے ہی تھا۔ عموماً بادشاہوں اور حاکموں کو بندگانِ خدا کے فیصلے کرنے میں شیطان بہکاتے اور حق کو ناحق کرا دیتے ہیں، مگر سلیمان اس سے محفوظ ہو گئے۔ آپ کا ہر فیصلہ الٰہی فیصلے کے مطابق ہوتا تھا (انہ اواب) وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے فیصلوں میں شیطانی اغوا کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہ تھی۔ دوسرے انبیاء اجتہاد رائے کے وقت کوئی .... فروگزاشت ہو جائے حضور والا کو اس کا اعتراف تھا۔ اور فرمایا تھا بعض لوگ دوسروں سے زیادہ فصیح البیان ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ میں بحیثیت انسان ہونے کے کوئی ڈگری دے دوں، لیکن جیتنے والے کے لئے وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہوگا۔ او کما قال۔

مدینہ میں کھجور کے درخت کو قلم لگانے کی ممانعت اور پھر اس سال کھجور کی پیداوار میں کمی اور پھر یہ ارشاد کہ تم لوگ اپنی دنیا سے خوب واقف ہو۔ دنیوی معاملات میں میری رائے کا اتباع لازم نہیں۔ صاف بتا رہا ہے کہ دنیوی جھگڑوں میں ظاہر کو دیکھ کر اجتہاد رائے کی غلطی جو حقیقت میں قابل گرفت نہیں نہ گناہ ہے) پیغمبروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن حضرت سلیمان کے فیصلے مبنی بر حقیقت ہوتے تھے حضرت سلیمان کی دعا کا مطلب ہمارے خیال میں یہی ہے

اب رہی یہ بات کہ جنات وشیاطین جو حضرت سلیمان کے مسخر تھے ۔ وہ کون تھے ۔ کوئی مستقل نوع رکھتے تھے ۔ انسانوں سے الگ یا خبیث بدکار، بدمعاش، بدکیش کافروں کو شیاطین کہا گیا ہے ۔ تو جو لوگ وجود جن کے منکر ہیں ان کی رائے میں آخر قول بہتر ہے ۔ لیکن ظاہر آیات اور واضح احادیث کی روشنی میں اصحاب تحقیق اہل تفسیر کا قول اول ہے اور وہی صحیح بھی ہو سکتا ہے کہ وسواس خناس انسان ہی ہوں، مگر جنات کا وجود، ان کا اغوا اور حضرت سلیمان کا ان کو مسخر کر لینا بھی اپنے اندر حقیقت رکھتا ہے ۔ صرف انسان کی مادی شیطانی عزلوں کو شیطان کہنا غلط ہے ۔ اجمع علیہ المفسرون ۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ تسخیر جنات کا بیان آئندہ آیت میں آئے گا ۔ اس آیت میں تسخیر ہوا کا بیان ہے حضرت سلیمان کے مادی اقتدار کی چند صورتیں تھیں انسانوں پر خود مختار حکومت ۔ ۲ ۔ ہوا کا فرماں بردار ہونا ۔ سرعت رفتار کے باوجود جھٹکے اور ناہمواری نہ ہونا ۔ ایک اور آیت میں مقدار سرعت کی تشریح آئی ہے ۔ غدوھا شہر ورواحھا شہر ۔ دوپہر میں ایک ماہ کی مسافت اور چار پہر میں دو ماہ کی مسافت طے کرتے تھے ۔ نمبر ۳ کا بیان یہاں نہیں کیا گیا یعنی پرندوں کی بولیاں سمجھنا اور ان پر حکومت کرنا ۔ ۴ ۔ یعنی تسخیر شیاطین کا بیان ۔ اگلی آیت میں ہے معتزلہ ایسے عقل زدہ لوگ جو اعجاز کے منکر ہیں ایسی باتوں کا یقین نہ کریں تو نہ کریں ۔ اہل حق تمام کے تمام ایمان رکھتے ہیں کہ انبیاء کو عموماً اور ان کے علاوہ بعض اولیاء کو بھی خداوند تعالیٰ نے ایسی طاقت عطا فرمائی ہے ۔ جو اپنے بدنی نظم ونسق اور پرورش وبقا کے علاوہ بیرونی مادی کائنات میں بغیر مادی اسباب کے کام میں لائے ہوئے اور بدون طبیعاتی امداد کے بحکم خدا تصرف کر سکتے ہیں ۔ انبیاء سے اس کا ظہور ہمیشہ ہوا ہے اور اولیاء سے کبھی اتفاقاً ہماری عقل بھی جائز سمجھتی ہے ۔ اس بات کو کہ جب ہر شخص کی اندرونی طاقت جس کو طبیعت کہا جاتا ہے بلا ارادہ وشعور کے اپنے بدن کی تربیت اور حد نوعی تک نشوونما اور بقا میں مشغول رہتی ہے ۔ اور اپنے بدنی تصرفات کرتی رہتی ہے تو ممکن ہے کہ بعض نفوس قدسیہ فطرتاً یا موہبتاً ایسے ہوں جو مادہ کائنات میں خصوصی تصرفات بعض اوقات کر سکیں اور وہ امور جن کا ظہور عموماً آدمیوں سے بالکل نہیں ہو سکتا یا بغیر طبیعاتی امداد اور مادی اسباب کے استعمال کے نہیں ہوتا ۔ ان کا ظہور اللہ کے خاص بندے کی قوت قدسیہ سے بحکم خدا ہو جائے ۔ اور اس کو طبیعاتی امداد بھی نہ لینی پڑے ۔ معجزہ اور کرامت سے سنت الٰہیہ اور فطرت کائنات کی مخالفت لازم نہیں آتی ۔ ہاں عادات عوام کی شکست ضرور لازم آتی ہے ۔

وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ ۝ وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۔ اس آیت میں سرکش جنات کے فرماں بردار ہونے کا ذکر ہے جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ اول حصہ اہل عمل کا اور کاریگروں کا قرار دیا جو حضرت سلیمان کے حکم سے تعمیر مکان اور غوطے مار کر سمندر سے موتی نکالنے کی خدمت انجام دیتے تھے ۔ یہ حصہ غالباً کم سرکش ہوگا ۔ جن کی آزادی خطرناک ہوگی اور ان کو بندھا رکھنا ہی مناسب ہوگا ۔ بعض مفسرین نے اول حصہ کو اہل ایمان قرار دیا ہے ۔ چنانچہ یحییٰ بن سلام کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ زنجیروں میں وہ شیاطین باندھے جاتے تھے جو تمرد اور شرارت کرتے تھے ۔ لیکن جب وہ ایمان لے آتے تھے تو ان کو رہا کر کے پہلے گروہ میں شامل کر دیا جاتا تھا ۔ ان بزرگوں نے آیت پر غور نہیں کیا ۔ جن کی وجہ سے اول گروہ کو مومن قرار دیا ۔ آیت میں تو شیاطین کا اطلاق دونوں گروہوں پر کیا گیا ہے اور مومن کو شیطان کس طرح کہا جا سکتا ہے ۔ اہل تفسیر نے بعض دوسری آیات اور احادیث کی روشنی میں لکھا ہے کہ عمارت بنانے والے شیاطین بڑی بڑی مورتیاں محرابیں حوض کے برابر پیالے اور جھیلوں کی برابر دیگیں بھی بناتے تھے ۔

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ حسن بصری اور ضحاک نے اس آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اللہ نے فرمایا یہ ہمارا عطیہ ہے اب تم جس کو چاہو دو چاہو نہ دو (دینے نہ دینے کا تم سے حساب نہ ہوگا) ابن عباس کی ایک روایت میں مطلب کی توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ جن جن کو چاہو آزاد کر دو جس کو چاہو قید رکھو ۔ تم سے حساب نہ ہوگا ۔ ان دونوں وضاحتوں کی بنا اس امر پر ہے کہ بغیر حساب کا تعلق فامنن اور امسک سے قائم کیا گیا ہے ۔ میری نظر میں دونوں مطلب ضعف سے خالی نہیں ۔ حساب فہمی سے مستثنیٰ کوئی بھی نہیں ۔ صاف صراحت ہے ۔ ان کان مثقال ذرۃ خیرا یرہ وان کان مثقال ذرۃ شرا یرہ ۔ پھر حضرت سلیمان کو اتنی بڑی حکمرانی کی حساب فہمی

سے کس طرح آزاد کیا جا سکتا تھا حسن ضحاک یا ابن عباس کا بیان کیا ہوا۔ مطالب روایت اور دوسری آیت سے متصادم ہو رہا ہے یہ باتیں ہی صحیح نہیں۔ پھر روایت کی صحت نقل ہی محل تامل ہے۔ سلسلہ اسناد مجہول ہے۔ اس لئے صحیح تفسیر اس طرح ہے کہ بغیر حساب کا تعلق عطاءنا سے ہے۔ اور درمیان کے دونوں فقرے بطور جملہ معترضہ کے ہیں۔ یعنی اللہ نے فرمایا۔ ہمارا عطیہ ہے جو گمان سے بالاتر ہے (اللہ اپنے راستہ سے دیتا ہے جو گمان سے باہر ہوتے ہیں۔ اب تم اس کو منقطع کر دو یا باقی رکھو یعنی ناشکری کرو گے تو یہ عطیہ منقطع ہو جائے گا۔ شکر کرو گے تو باقی رہے گا جس کو چاہو دو جس کو چاہو نہ دو۔ واللہ اعلم۔

وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ۔ مقصد یہ کہ باپ کی طرح بیٹا بھی ثابت قدم نکلا۔ حضرت داؤد کی آزمائش ہوئی انہوں نے بے قرار ہو کر درِ رحمت کھٹکھٹایا اور اندر سے ندائے قبول آئی سلیمان کی بھی آزمائش ہوئی۔ انہوں نے بھی اپنی عبدیت کا بہترین مظاہرہ کیا اور رونگٹے رونگٹے کا رُخ اللہ ہی کی طرف کر دیا۔ نتیجہ میں سلطنت ملی، امارت ملی، جن وانس اور پرند وچرند پر حکومت ملی اور ان تمام انعامات کے علاوہ آخرت میں بھی اونچا درجہ دیا گیا۔ مقام قرب پر خصوصیت کے ساتھ فائز کیا گیا۔ انہوں نے حسن عبدیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اللہ کی طرف سے حسن انجام عطا فرمایا گیا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ۔ حضرت ایوب کا نسب نامہ مختلف ہے۔ خطیب نے سراج نے ایوب بن روم بن یعقوب بن اسحاق لکھا ہے۔ بیضاوی نے ایوب بن یعقوب بن اسحاق اور جمل میں بحوالہ تحبیر۔ سیوطی ایوب بن اموص بن رعیل بن عیص بن اسحاق مذکور ہے، لیکن سورۃ انعام کی تفسیر میں ایوب بن اموص بن سارخ بن عیص بن اسحاق مذکور ہے، لیکن سورۃ انعام کی تفسیر میں ایوب بن رازح بن عیص بن اسحاق آیا ہے۔ بیوی کا نام لیا۔ بنت حضرت یعقوب یا رحمت بن افراہیم بن حضرت یوسف تھا۔

إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ۔ آیات کی تفسیر سے پہلے ہم حضرت ایوب کا خلاصہ قصہ نقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ آیات کے سمجھنے میں غلطی نہ ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ ایوب کا دکھ اور بیماری کیا واقعی بہ تسلط شیطان تھی یا کیا۔

امام احمد نے کتاب الزہد میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اور ابن عساکر نے تراجم میں حضرت ابن عباس کی روایت لکھی ہے کہ ایک روز ابلیس نے اپنے مقام خطاب میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ اے رب تیرے مخلص بندوں میں ایسا کون ہے کہ اگر تو اس کو میرے پنجہ میں دے دے تو وہ میرا اثر قبول نہ کرے۔ ارشاد ہوا ایوب۔ ابلیس نے ایوب کو بہکانا شروع کیا۔ ایوب نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ابلیس نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ ایوب نے میری طرف التفات نہیں کی۔ اس کا دل اللہ ہونے کی وجہ سے مطمئن ہے۔ مجھے اس کے مال پر تسلط عطا فرما۔ درخواست قبول ہوئی۔ ایوب بڑے مالدار تھے۔ ان کے مویشیوں اور کھیتوں کی بربادی شروع ہو گئی۔ ایک کے بعد ایک تباہ ہونے لگے۔ ابلیس دوست بن کر آیا۔ اور دوستانہ دلسوزی کرنے لگا۔ ایوب نے فرمایا مجھے کچھ افسوس نہیں۔ اللہ ہی نے دیا تھا۔ اللہ ہی نے لے لیا۔ اس کا شکر ہے۔ وہ بہرحال واجب الحمد ہے۔ اس کے بعد ابلیس کی درخواست پر حضرت ایوب کی اولاد اس کے قبضہ میں دے دی گئی۔ سب بچے ایک کے بعد ایک مرنے لگے اور شیطان وہی دوستانہ دلسوزی کرتا رہا اور استقلال کے پہاڑ سے ٹکرانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور حضرت ایوب نے وہی پہلے الفاظ فرما دیئے۔ مال واولاد کی تباہی کے بعد جسم مبارک پر ابلیس کو تسلط عطا کیا گیا۔ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو گئیں۔ سارے بدن میں کیڑے پڑ گئے۔ سب آدمی گھن کرنے لگے۔ آپ نے بستی سے باہر ایک جھونپڑی بنا لی۔ بقول ابن کثیر جسم مبارک میں سوئی کے ناکہ کے برابر کوئی جگہ سالم نہیں رہی۔ کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ لیکن بی بی برابر ساتھ دیتی رہی۔ وہی کچھ محنت مزدوری کر کے لاتی اور آپ کو کھلاتی پلاتی اور خدمت کرتی تھی۔ باقی حصہ آیات کے ذیل میں لکھیں گے۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے ابلیس کو ایوب کے مال ومتاع اولاد اور جسم پر مسلط فرما دیا تھا اور آپ پر جو مصائب آئے وہ ابلیس کے ہاتھوں سے آئے۔ لیکن خطیب نے سراج میں اور امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ شیطان کسی کو بیمار نہیں ڈال سکتا۔ کسی کو مار سکتا ہے نہ کسی کی خانہ ویرانی کر سکتا ہے اور نہ کسی کو کسی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری اور موت شیطان کی آوردہ ہے یا خدا

فرستادہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری آیت میں شیطان کا قول صاف طور پر مذکور ہے جو قیامت کے دن اپنا عذر پیش کرتے ہوئے وہ کہے گا۔ ما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم یعنی میرا تم پر کچھ تسلط نہ تھا۔ صرف اتنی بات تھی کہ میں نے تم کو گناہ کی دعوت دی۔ تم نے قبول کرلی۔ اب ہم آیت کی تشریح کرتے ہیں۔

قتادہ اور مقاتل کا قول ہے کہ نصب سے مراد ہے جسمانی تکلیف اور عذاب سے مراد ہے مالی بربادی، لیکن ان بزرگوں نے اولاد کی تباہی کا ذکر نہیں فرمایا۔ شاید عذاب کا لفظ اس کو بھی شامل ہو۔ اول طویل روایت کی بنا پر حضرت ایوب نے اپنی دعا میں اپنی جسمانی تکلیف اور مالی اور عیالی تکلیف اور تباہی کو شیطانی حرکت قرار دیا اور خطیب و رازی وغیرہ کے قول پر نہ نصب سے مراد جسمانی تکلیف ہے نہ عذاب سے مراد مال اور اولاد کی تباہی نہ مس سے مراد تکلیف دینا بلکہ مراد یہ ہے کہ شیطان نے اپنے وسوسوں سے مجھے ایسا دکھ پہنچایا کہ قریب تھا کہ مجھے دوزخ کے عذاب میں مبتلا کردیتا یعنی مس الشیطان سے مراد فاسد خیالات اور وسوسے پیدا کرنا یا یوں کہا جائے کہ مکروہات اور بدمستیوں اور خبیث امراض کو شیطان کی طرف منسوب کر ہی دیا جاتا ہے۔ حدیث میں عورتوں کے استحاضہ کو رکض الجن نیز وبا و طاعون کو وخز الجن کہا گیا ہے اور نفث وغیرہ بیماریوں کو بھی شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ.... بیماریاں شیطان کی آوردہ ہیں یا شیطان کے تسلط سے پیدا ہوتی ہیں یا شیطان کو ان میں دخل ہے۔ میری نظر میں تحقیق یہ ہے کہ شیطان ہو یا انسان شر اور برائی کی نسبت سب کی طرف مجازی ہوتی ہے۔ کوئی برائی کا خالق نہیں۔ خالق خیر و شر کا ایک ہی ہے۔ حقیقت میں کسی کو تسلط حاصل نہیں ہے۔ سوء ادب ہوتا۔ اگر شر کی نسبت اللہ کی طرف کردی جاتی ہے، اس لئے بیماری اور دکھ میں مبتلا کرنے والا اللہ کو نہیں قرار دیا گیا۔ ورنہ انبیاء کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ شیطان کو خصوصیت کے ساتھ ان کے معاملات میں کچھ دخل نہیں تھا یہ تو اللہ کی براہ راست آزمائش تھی۔ اللہ اور اس کے نبی کے درمیان ایک ناز تھا، راز تھا اور نیاز تھا۔ کون جانے کون سمجھے۔ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ امتحان کی مدت دراز ختم ہوگئی۔ حضرت ایوب ثابت قدم نکلے۔ اس وقت بحر رحمت جوش میں آیا اور درخواست پر حکم ہوا۔ اپنے پاؤں سے زمین پر ٹھوکر مارو۔ حضرت ایوب نے حکم کی تعمیل کی۔ فوراً چشمہ نمودار ہوا۔ حکم ہوا اس میں غسل کرو۔ غسل کیا تو تمام بیماری جاتی رہی۔ دوبارہ ٹھوکر مارنے کا حکم ہوا اور حکم کی تعمیل کی گئی۔ ایک اور چشمہ برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس کا پانی پیو۔ حضرت ایوب نے پانی پیا۔ سب کمزوری اور نقاہت جاتی رہی (ابن کثیر) صاحب معراج میں لکھا ہے کہ دو چشمے نمودار ہوئے تھے۔ ایک میں نہائے دوسرے کا پانی پیا۔ قتادہ اور حسن بصری سے یہی مروی ہے۔ قتادہ نے تو یہ بھی کہا کہ سرزمین جابیہ علاقہ شام میں یہ چشمے نکلے تھے۔ ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر، ابن ابی حاتم، حضرت انس کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا۔ ایوب نبی اللہ اٹھارہ سال تک مصیبت میں ایسے مبتلا رہے کہ دور اور قریب والوں نے چھوڑ دیا۔ صرف دو خاص دوست صبح شام ایوب کے پاس آجایا کرتے تھے۔ ایک روز ایک دوست نے دوسرے سے کہا کہ شاید ایوب نے کوئی اتنا بڑا گناہ کیا ہے کہ دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ اٹھارہ برس گذر گئے، مگر اللہ نے ابھی تک رحم نہیں فرمایا کہ بیماری زائل ہوجاتی۔ شام کو جب دونوں ایوب کے پاس آئے تو اس شخص سے رہا نہ گیا اور اس نے دن والی بات کا ایوب سے تذکرہ کیا۔ پیغمبر نے کہا کہ تیری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اللہ خوب واقف ہے کہ جب دو آدمیوں کو میں آپس میں لڑتے دیکھتا تھا اور وہ اللہ کا نام لیتے (یعنی قسم کھاتے) تھے تو میں واپس آکر دونوں کی طرف سے کفارہ دیتا تھا۔ کیونکہ سوائے حق بات کے اللہ کا نام استعمال کرنا ناگوار ہوتا تھا۔ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا ایوب بیماری سے اتنے زار و نزار ہوگئے تھے کہ قضائے حاجت کے بعد اٹھتے تو بیوی ہاتھ تھام لیتی تھی اور سہارا دے کر واپس جگہ پر لاتی تھی۔ ایک روز حضرت ایوب قضائے حاجت کو گئے۔ نیک بخت عورت حسب معمول واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ دیر ہوگئی اور کوئی آواز نہیں آئی۔ ادھر ایوب کے پاس وحی آئی۔ ارکض برجلک ہذا مغتسل بارد و شراب دیرتک انتظار کے بعد عورت ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایوب تندرستی کی حالت میں آرہے ہیں۔ عورت پہچان نہ سکی

کہنے لگی ۔ اے شخص اللہ تیرا بھلا کرے کیا تو نے اللہ کے اس بیمار پیغمبر کو دیکھا ہے ۔ جب وہ تندرست تھا تو واللہ بالکل تیری شکل پر تھا۔ ایوب نے کہا میں وہی تو ہوں ۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا کہ ایوب کے دو خرمن تھے ۔ ایک میں گیہوں اور دوسرے میں جو بھرے تھے ۔ اللہ نے ابر کے دو ٹکڑے بھیجے ۔ ایک ٹکڑا گیہوں کے اجڑے ہوئے خرمن پر آ کر برسا اور اس سے اتنا سونا برسا کہ سونے سے خرمن بھر گیا ۔ اور دوسرا ٹکڑا جو کے اجڑے ہوئے خرمن پر برسا ۔ اس سے بھی اتنا سونا برسا کہ خرمن بھر گیا ۔ (یہ روایت صحیح الاسناد ہے)

ہمام بن منبہ نے بروایت ابوہریرہ بیان کیا کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب ایوب برہنہ نہا رہے تھے تو اچانک ان پر سونے کا ٹڈی دل برسنے لگا اور ایوب نے لپ بھر کر اس کو کپڑے میں سمیٹنا شروع کیا ۔ اللہ کی طرف سے ندا آئی ۔ ایوب کیا میں نے تجھے اس سے بے نیاز نہیں کر دیا ۔ ایوب نے عرض کیا ۔ پروردگار ! یہ ٹھیک ہے ، لیکن مجھے تیری برکت سے بے نیازی نہیں ہو سکتی ۔ (رواہ بخاری)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ اس آیت کی تشریح میں اہل تفسیر کے دو قول ہیں ۔ (۱) حضرت ایوب کی مردہ اولاد کو زندہ کر دیا گیا اور اتنی ہی اولاد اور بھی دی گئی ۔ (۲) مردہ اولاد زندہ نہیں کی گئی بلکہ مرے ہوئے بچوں کے علاوہ اور بچے دیدیئے گئے اور ان کو دو چند کر دیا گیا ۔

اول قول ظاہر آیات کے موافق ہے ۔ کسی تاویل کا محتاج نہیں ۔ حضرت ابن عباس کی روایت سے بھی اسی کا ثبوت ملتا ہے ۔ حسن بصری اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے ۔ خطیب نے سراج المنیر میں اسی کو اختیار کیا ہے ۔ دوسرا قول ضعیف ہے ۔ بے وجہ تاویل کرنی پڑتی ہے ۔ اس صورت میں مضاف محذوف ماننا پڑے گا اور اھلہ سے مراد ہو گی مثل اہلہ ۔ اگرچہ عربی ترکیب کے اعتبار سے یہ جائز ہے ، مگر خواہ مخواہ عبارت میں ثقل پیدا ہو رہا ہے ۔ اصل عبارت اس طرح ہو گی وَوَهَبْنَا لَهٗ مثل اهله ومثلهم معهم یہ عبارت ثقل سے خالی نہیں ۔ صحیح مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ایوب کو دوبارہ ان کے بچے اور اتنے اور عطا فرمائے اس عطیہ کے سبب اللہ کی رحمت تھی ۔ یعنی ایوب کے صبر اور ثابت قدمی پر اللہ کو رحم آ گیا ۔ یہ اہل دانش کے لئے ایک یادداشت اور درس نصیحت بھی ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں کہ اللہ کی طرف سے جو مصیبتیں آتی ہیں وہ امتحانی ہوتی ہیں ۔ خدا کو کسی سے خاص دشمنی نہیں کہ بے وجہ دکھ پہنچائے ۔ دکھ دیکر جانچنا مقصود ہوتا ہے ۔ اور اس آیت سے اچھے اچھے نبی بھی مستثنیٰ نہیں رہے ، لیکن امتحان کے بعد جو شخص ثابت قدم رہتا ہے اور صبر کرتا ہے ۔ اللہ اپنی رحمت سے اس کی تکلیف دور کرنے کے غیبی اسباب پیدا کر دیتا ہے ۔ اور اس کے لئے رحمت کے وہ دروازے کھول دیئے جاتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کے لئے بند ہیں ۔ یہاں تک کہ جن صورتوں کو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں اور فطرت کے خلاف جانتے ہیں ثابت قدم اہل صبر کے لئے وہ صورتیں بھی ممکن بنا دی جاتی ہیں ۔ جس طرح مردوں کو دوبارہ لوٹ کر زندہ ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے اور قانون فطرت کے خلاف تصور کیا جاتا ہے ، مگر اللہ نے ایوب کے لئے اس کو ممکن بنا دیا ۔ مگر اس کے سمجھنے والے اور درس عبرت حاصل کرنے والے صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے سروں میں مغز اور دلوں میں نور بصیرت ہے ۔ بے عقلے کو بصیرت کیا سمجھیں ۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کسی وجہ سے غصہ میں آ کر ایوب نے قسم کھائی تھی کہ بیوی کو سو لکڑیاں ماروں گا ۔ بیوی پاکیزہ خیال ، پاک دامن ، پاک نفس ۔ اللہ نے قسم پوری کرنے کی یہ تدبیر بتا دی کہ سو لکڑیاں لے کر ان کی گڈی بنا کر ایک مرتبہ مار دو قسم پوری ہو جائے گی ۔ آیت کا یہی مطلب ہے ۔ مارنے کی قسم کیوں کھائی تھی ۔ اس کے مختلف نقلیات ہیں ۔ قوی یہ ہے کہ چونکہ دوا دارو اور کھانے پینے کے لئے کچھ موجود نہ تھا ، اس لئے پاک بیوی روز جا کر محنت مزدوری کر کے لاتی اور ایوب کو کھلاتی تھی ۔ ایک روز بستی میں حسب معمول پہنچی ۔ ایک امیر کے گھر میں محنت مزدوری کی جستجو میں داخل ہوئی ۔ گھر کی عورتوں نے کہا ۔ تمہارے بال بہت لمبے لمبے ہیں ۔ ہم تم سے اور کوئی خدمت لینے کو تیار نہیں صرف اپنے بال کاٹ کر ہمارے ہاتھ فروخت کر دو ۔ پاک طینت بیوی کو اپنے حسین بال ویسے ہی تو بال کھنے راضی

ہوگئی) اور کاٹ کر دیدیئے۔ قیمت لے کر واپس آئی اور حضرت ایوب نے صورت دیکھی تو غصہ میں آکر سو چھڑیاں مارنے کی قسم کھا بیٹھے
بعض اہل نقل نے قسم کھانے کی دوسری وجہ بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا شرعی حیلہ جائز ہے فقہا نے اس کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ جائز سمجھنے والے مذکورہ بالا آیت کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اور ابو امامہ بن سہل کی روایت کردہ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ایک کمزور آدمی نے زنا کا ارتکاب کیا۔ کسی انصاری سردار نے عرض کیا کہ یہ شخص سو دُرّوں کی ضرب برداشت نہ کر سکے گا۔ ارشاد فرمایا سو تسمے یکجا باندھ کر مار دیئے جائیں۔ (رواہ احمد والطبرانی)

اکثر فقہا نے حیلہ سازی کو ناجائز قرار دیا ہے اور ان کا قول ہے کہ حیلہ بہانہ کر کے احکام شرعیہ کو ٹالنے سے تحریف احکام لازم آتی ہے۔ اور اس قسم کی حرکات بالکل یہودی حرکات ہیں صحیح حدیث میں آیا ہے اللہ یہودیوں پر لعنت کرے۔ چربی کھانا ان کے لئے حرام کیا گیا تو انہوں نے چربی پگھلا کر فروخت کر کے اس کے دام کھانا شروع کر دیئے۔ (رواہ النحاسی)
اگر حیلہ سازی کو جائز قرار دیا گیا ...... تو قانون زکوٰۃ معطل ہو جائے گا۔ اور ہر فریق مقدمہ دوسرے کی حق تلفی کے حیلے تلاش کرے گا اور اس طرح حقوق انسانی پر ڈاکہ پڑنا شروع ہو جائے گا۔ امیروں کو اپنی کج روی اور خواہشات نفس کو پورا کرنے کے بہت سے راستے ہاتھ آجائیں گے اور فقیر مر جائیں گے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ شرعی حیلے کے جواز کی چند شرطیں ہیں۔ نیت خالص ہو، کسی کی حق تلفی نہ ہو، حرام سے بچنا منظور ہو یا حلال کا حصول پیش نظر ہو یہ شرطیں نہ ہوں گی تو ایسا حیلہ شرعی حیلہ نہ ہوگا، فریب دہی اور مکاری ہوگی۔ جو اجماعاً حرام ہے۔ رہا حضرت ایوب کا واقعہ تو اس میں بدنیتی کو دخل نہ تھا۔ ایک پیغمبر کی قسم شکنی کے گناہ سے اور بے قصور عورت کو ضرب کے دکھ سے بچانا مقصود تھا۔ کسی کی حق تلفی بھی نہ تھی۔ اسی طرح احمد اور طبرانی کی روایت میں بھی کسی کی حق تلفی نہ تھی۔ نہ امیرانہ شہوت رانی کو اس میں کوئی دخل تھا نہ حرمت اللہ کی شکست تھی نہ تحریف حکم تھی صرف ایک اور آدمی کو موت کے پنجے سے بچانا مقصود تھا۔

نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔ حضرت سلیمان کے متعلق بھی یہی جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ سلیمان عیش و نشاط میں خدا کو نہ بھولے اور ایوب نے دکھ اور مصیبت سے گھبرا کر باب رحمت سے منہ نہ موڑا۔ انہوں نے بھی عبادت کی تکمیل کر دی اور انہوں نے بھی پس دونوں کو ایک ہی لقب سے سرفراز کیا گیا۔ سلیمان کی سلطنت، حکومت اور ایوب کی بے کسی اور بے بسی اللہ کی نظر میں مساوی درجہ رکھتی تھیں۔ دونوں کو ایک ہی خطاب ملا۔

مقصود بیان ہوا اور جنات حضرت سلیمان کے فرماں بردار تھے۔ سلیمان کے حکم سے جنات کے متعلق خدمات کی انجام دہی لازم تھی۔ اللہ سے دنیاوی مراتب اور کثرت مال کی دعا ممنوع نہیں بلکہ سنت سلیمان ہے۔ اسی طرح مصیبت دور ہونے کی خواہش اور اس کے لئے دعا بھی جائز اور سنت ایوبی ہے۔

رازی نے لکھا ہے کہ سلیمان اور ایوب کے قصوں میں اہل نظر کے لئے درس عبرت ہے کہ اللہ نے دنیاوی احوال کا انتظام ایک طرح نہیں کیا۔ دولت اور حکومت دے کر بھی آزمائش کی جاتی ہے اور مصیبت دکھ دے کر بھی۔ خوش نصیب ہیں وہ خاص بندے جو دولت و راحت اور نکبت و مصیبت میں خدا کی یاد رکھتے ہیں۔ پیغمبر کا اقتدار اس غیبی مخلوق پر بھی ہو سکتا ہے جو دوسرے انسانوں کے احاطہ حکومت سے خارج ہے۔ جن وغیرہ پیغمبر کے لئے ان ہونی بات بھی پیدا کر دی جاتی ہے۔ ایوب کی صحت اور اولاد کی دوبارہ زندگی وغیرہ دونوں قصوں کا اجمالی تصور بتاتا ہے کہ حقیقی فرماں روا اللہ ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں معمول کے خلاف بھی تصرف کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ ایک چشمہ حیات میں غسل سے دوبارہ بغیر دوا و علاج کے لاعلاج بیماری کو دور کر سکتا ہے۔ بندہ کو لازم ہے کہ نعمتوں کو خود آورد اور لازوال سمجھ کر مغرور اور مدہوش غافل نہ ہو جائے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرے اور ہر تغیر

خداداد سمجھے اور حدود اللہ کے اندر رہ کر ان میں تصرف کرے۔ اگر مبتلائے مصائب ہو جائے تو گھبرا نہ جائے۔ صبر و استقامت سے کام لے اور اللہ سے مصیبت دور کرنے کی دعا کرے۔ حضرت ایوب کی دعا سے یہ بات مستنبط کی جا سکتی ہے کہ بیماری اور مصیبت کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے۔ اگرچہ دکھ اور مصیبت بھیجنے والا بھی اللہ ہی ہے، لیکن ادب الٰہی کا لحاظ رکھتے ہوئے) بیماری ہلاکت مال و اولاد اور تمام مصائب کا سرچشمہ شیطان یعنی شیطانی حرکات کو سمجھے اور اعتراف کرے کہ شیطان یا شیطانی حرکات کے سبب مجھے یہ تکلیف پہنچی ہے۔ اس میں میرا ہی قصور ہے۔ رَحْمَةً مِّنَّا سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی کا دکھ دور کرنا اور دعا قبول کرنا اللہ پر لازم نہیں بلکہ اس کی مہربانی اور رحمت ہے کہ مصائب کو دور فرماتا ہے۔ ہمارا اس پر واجب حق نہیں۔ ذکریٰ لاولی الالباب سے سمجھ میں آتا ہے کہ انبیاء کے قصص داستانیں نہیں جو بغیر کسی وجہ کے بیان کی گئی ہوں بلکہ ان سے نتیجہ اخذ کر کے نصیحت قبول کرنا لازم ہے اور نصیحت پذیری صرف دانشمندوں کا کام ہے۔ عوام تو قصہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ

اور ہمارے بندوں ابراہیم اسحٰق اور یعقوب کو بھی یاد کرو جو کہ ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے ہم نے ان کو ایک خاص بات کے لئے

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۗ وَاذْكُرْ

جو دارِ آخرت کا یاد کرنا ہے منتخب کر لیا تھا اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک لوگوں میں سے تھے اور اسمٰعیل

اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۭ هٰذَا ذِكْرٌ ۭ

اور یسع اور ذی الکفل کو بھی یاد کرو اور یہ سب لوگ نیک لوگوں میں سے تھے یہ نصیحت ہے

تفسیر

ہم نے گزشتہ تحریروں میں بارہا ذکر کیا ہے کہ انسان کی زندگی بیکار نہیں۔ تخلیق کائنات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سنسار کا یہ چکر بے نتیجہ نہیں۔ پھر انسان کی زندگی کس طرح رائیگاں اور بے سود ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان کی زندگی کا فائدہ کیا ہے۔ کچھ بے بصیرت آدمی تو کھانے پینے، آرام کرنے اور بچے پیدا کرنے کو ہی مقصد زندگی سمجھتے ہیں۔ نفس پرستی، قوم پرستی، وطن پرستی، عورت پرستی، محبت پرستی، جاہ پرستی اور خصوصاً سرمایہ پرستی کا اساسی پتھر اسی گڑھے میں رکھا جاتا ہے۔ طبقاتی جنگ کی بنیاد اسی جگہ سے پڑتی ہے۔ افکار میں تضاد اور نظریات میں تصادم یہیں سے رونما ہوتا ہے۔ حق تلفی اور تغلب و جبر کا خمیر اسی مادہ سے اٹھتا ہے اور اللہ کی پاک زمین پر ہرج و مرج اور فتنہ و فساد کی نجاستیں اس عفونت پاش مرکز سے پھیلتی ہیں۔ انجام سے لاپروائی اور دوسری زندگی سے بے نیازی انسان کو مطلق العنان بنا دیتی ہے اور یہ عبد عبدیت کے دائرے کے اندر نہیں رہتا اور اس کی خودی خدائی کی مدعی بن جاتی ہے۔

کچھ لوگ آخرت کے تصور کو بھی کبھی کبھی اپنے کسی دماغ کے گوشہ میں جگہ دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ مذکورہ بالا کور بصیرت گروہ سے کچھ زیادہ حساس نظر آتے ہیں۔ نظری و فکری اور علمی حدود میں ان کو آئندہ زندگی کا اعتراف ہوتا ہے، لیکن ان کی عملی زندگی فکری زندگی سے جدا ہوتی ہے۔ صرف ذہنی عیاشی یا زیادہ سے زیادہ فلسفیانہ سوچ وچار کے طور پر وہ دار آخرت کے قائل ہوتے ہیں۔ مگر گفتار، کردار اور زندگی کے سارے اطوار میں ان کے فکری نظریہ کی کوئی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ وہ ایک حد تک آنکھوں والے ضرور ہوتے ہیں، لیکن آنکھوں سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے پاس عملی طاقتیں ہوتی ہیں جن سے وہ کردار کو درست کرنے کا کام لے سکتے ہیں، مگر طاقتوں کو کام میں لا کر زندگی کو درست نہیں کرتے۔ ایسے لوگ بھی کسی برتری لیڈری امامت اور برگزیدگی کے اہل نہیں۔ قرار دیئے جا سکتے۔ لیکن ایک

تیسرا گروہ اور بھی ہے جو آخرت کی زندگی کو اسی زندگی میں اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسری زندگی کیلئے تیاری کرنا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ وہ بصیرت وفہم، تصور وتخیل، حرکت وسکون اور خواب وبیداری میں دارِ آخرت کا ذکر کرتا ہے۔ کسی پل غافل نہیں ہوتا۔ اس کا ہاتھ یعنی جسمانی طاقتیں اور اس کی آنکھیں یعنی فہم ودانش کی قوتیں ہر دم اسی تیاری میں لگی رہتی ہیں۔ یہی گروہ حقیقت میں برگزیدگی اور سرداری کا مستحق ہے اور اللہ کی خصوصی عبدیت اسی کو حاصل ہے۔ یہ گروہ انبیاء کا ہے جس کو یادداشت آخرت کیلئے چن لیا گیا ہے۔

تحلیل اجزاء وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ حضرت سلیمان اور حضرت ایوب کے شکر وصبر کو تفصیل قصص کے ساتھ اوپر کی آیات میں بیان کرنے کے بعد ان آیات میں چند انبیاء کے نام اور ان کے مجمل درجات کا تذکرہ فرمایا۔ انبیاء میں ہر ایک کو ابتلا کی وادی عبور کرنی پڑتی تھی اور ہر ایک کا ایک امتحانی دور گزرا ہے۔ لیکن ان کی استقامت اثباتِ نفس، رجوع الی اللہ اور وحدت مقصد میں فرق نہ آیا نہ کوہ نما مصائب کا سیلاب ان کے ایمان اور عمل میں تزلزل پیدا کر سکا نہ دنیا کا یہ عیش کدہ ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکا۔ حضرت ابراہیم سے پہلے جو انبیاء گزر گئے ان کی تعداد بھی صراحت قرآنی کے بموجب کچھ زیادہ نہ تھی اور آپ کے بعد جتنے پیغمبروں کے نام قرآن واحادیث میں مذکور ہیں وہ سب آپ ہی کی نسل میں سے تھے۔ گویا آپ بیشتر انبیاء کے باپ تھے۔ اسحاق اور یعقوب کا نسب نامہ ہم کئی جگہ لکھ چکے ہیں۔ حضرت یوسف کو مفقود الخبر کر کے کیسا سخت امتحان لیا گیا۔ بہرحال یہ تینوں پیغمبر عمل صالح، علم نافع، قوت طاعت اور دینی بصیرت میں ممتاز تھے۔ (ابن کثیر) علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اولی الاید والابصار سے مراد ہے قوت۔ یعنی قوت عمل اور دینی سمجھ۔ مجاہد نے کہا عبادت میں قوت اور معرفت حق میں بصیرت رکھتے تھے۔ قتادہ نے معرفت حق کی بجائے دینی بصیرت لکھا ہے۔ مطلب سب کا تقریباً ایک ہی ہے جس کا مجموعہ ابن کثیر نے لکھ دیا۔ اگر استقامتِ عمل اور ثباتِ ایمان یا عام صحت عمل وعلم مراد لی جائے تب بھی کوئی ہرج نہیں۔

إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ اس آیت کی تفسیری مراد میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو اپنا ایسا خالص بندہ کر لیا کہ وہ آخرت ہی کے واسطے عمل کرتے تھے۔ سوائے آخرت کے ان کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ سدی نے کہا ہم نے ان مخلصین کا تذکرہ آخرت ہی کے لئے کیا اور آخرت ہی کے اعمال کی ان کو توفیق دی۔ سعید بن جبیر نے کہا دارِ آخرت کیلئے ان کو خالص کر کے ان کا تذکرہ کیا۔

مالک بن دینار اور عطا خراسانی نے کہا ان بندوں کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے دلوں سے دنیا کا ذکر ہی نکال دیا تھا اور آخرت ہی کی محبت اور یاد کے لئے ان کو خالص کر لیا تھا۔ قتادہ نے کہا کہ ذکر الدار سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ خالص خیرخواہی سے بندوں کو دارِ آخرت کی یاد دلاتے اور اسی کے لئے عمل کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ابن زید نے کہا ان کے لئے دارِ آخرت میں خالصہ کو مقرر کر دیا۔ یعنی دارِ آخرت میں بلند مراتب عطا فرمائے۔ گویا ابن زید کے نزدیک خالصہ سے مراد آخرت میں کوئی بلند مرتبہ۔ بعض کا قول ہے کہ دارِ آخرت میں تذکرہ کرنے کے لئے ان لوگوں کو مخصوص کر لیا۔ (مدارک نسفی) ہمارے نزدیک صحیح مطلب وہی ہے جس کو تفسیری مقالہ میں اشارۃً بیان کر چکے ہیں کہ انبیاء کے پیش نظر صرف دارِ آخرت کی یاد تھی یعنی وہ اس دنیا کو رہ گزر اور پل جانتے تھے۔ حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی کو سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کا ہر عمل آخرت ہی کے لئے ہوتا تھا اور آخرت اور دوسری زندگی کے قائل تو کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن نظریاتی اور فلسفی حد تک۔ زندگی کے کردار پر اور ان کے دعائی مسلمہ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا۔ اور کچھ دوسرے آدمی جزا وسزا کے قائل ہیں۔ مگر اس کے لئے کسی دن کی تعیین کے مقر نہیں۔ تناسخی چکر ان کی نظر میں سزا وجزا کے لئے کافی ہے، لیکن اللہ نے ان پیغمبروں کو یہی خصوصیت کے ساتھ خالص صحیح دارِ آخرت کے اقرار اور عمل کے لئے چن لیا۔ اور ان کی زندگی کا مقصد ہی خاص طور پر دارِ آخرت کی یاد کو قرار دیا۔ پس کردار اور علم وفکر کے لحاظ سے یقیناً

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۔ اور اللہ کی نظر میں منتخب برگزیدہ اور نیک لوگوں میں سے تھے ۔ بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب نکالا ہے کہ انبیاء ازل میں ہی نیک منتخب تھے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ ازل کی یہ تحقیقیں کس لفظ سے مترشح سمجھی گئی ہیں ۔ سیاق کلام سے تو صاف ظاہر ہے کہ اللہ نے انبیاء کی صحیح معرفت اور قوی کردار کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کے خصوصی مراتب کا تذکرہ فرمایا ہے ۔ انتخاب ازل کی حکایت تو نہیں کی ۔ حضرت داؤد کے ذکر سے لے کر ذوالکفل تک سب کا ذکر مدحیہ لہجہ میں فرمایا اور اپنے انعامات سے سرفراز فرمانے کا تذکرہ بھی ۔ بعض پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ کیا ۔ اس رفتارِ کلام میں کہیں بھی حکایت ازلی کا پتہ نہیں چلتا ۔ نہ اس کی آیت سے عصمت انبیاء پر استدلال کیا جا سکتا ہے ۔ جیسا کہ امام رازی نے سمجھا اور تفسیر کبیر میں لکھا ہے ۔ برگزیدہ ، منتخب اور نیک ہونے کے یہ معنی نہیں کہ صغیرہ گناہوں اور معمولی لغزشوں کا سہو بھی انبیاء سے صدور نہ ہو سکے ۔ بلکہ اگر بعثت سے قبل کبیرہ گناہ کا ارتکاب بھی انبیاء سے ہو جائے اور پھر اس کو شیطانی حرکت قرار دے کر توبہ کر لیں تو اصطفا اور برگزیدگی میں کیا فرق آئے گا ۔ حضرت موسیٰ نے قبطی کو نبوت سے پہلے بلا ارادہ ہلاک کر دیا جو شیطانی حرکت تھی ، مگر خود ہی پشیمان ہوئے اور اس کو شیطانی عمل قرار دیا اور توبہ کر لی اور اس سے آئندہ ملنے والی نبوت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی ۔ عصمت انبیاء کا مسئلہ بجائے خود مستحق ہے ۔ اس آیت سے اس کا استنباط نہیں کیا جا سکتا ۔

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ ۔ حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم نزاری حجازی عربوں کے اولین باپ تھے ۔ مکہ کے ریگستان میں باپ سے جدا ہو کر پرورش پائی ۔ کوئی آدمی سرپرست نہ تھا ۔ ان کے احوال ، اطوار اور عقائد و اعمال کا مطالعہ لازم ہے تاکہ لوگ اپنے عقائد و اعمال اور فقر و ثروت کے احوال کا حضرت اسماعیل کے فکر و نظر اور زندگی کے نشیب و فراز سے موازنہ کر کے اپنی کجراہی کو سمجھیں ۔

وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۔ الیسع بن اخطوب کو حضرت الیاس نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا ۔ ان کا تذکرہ حضرت الیاس کے ذکر میں گزر چکا ہے ۔ ذوالکفل الیسع کے چچا زاد بھائی یا حضرت ایوب کے بیٹے کا لقب ہے جن کا نام بشر تھا ۔

وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۔ اس فقرہ کا تعلق یا تو مؤخر الذکر تینوں انبیاء سے ہے یا حضرت داؤد سے لے کر ذوالکفل تک سب ہی کے متعلق یہ صراحت ہے ۔

هٰذَا ذِكْرٌ ۔ اس جملہ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے ۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ ہٰذا سے قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنی یہ قرآن شریف یادداشت اور نصیحت ہے ۔ (تمام انسانوں کے لئے دستورِ حیات اور دستاویز زندگی ہے) لیکن اس مطلب کا ربط چونکہ پہلی اور آئندہ آیات سے کچھ نہیں نہ گزشتہ آیات میں قرآن کا تذکرہ ہے نہ اگلی آیات میں ، اس لئے بعض اہل تفسیر نے ہٰذا کا مشار الیہ انبیاء کے گزشتہ تذکرہ کو قرار دیا اور اس طرح مطلب کی توضیح کی کہ انبیاء کے جو احوال خصوصی اور مراتب و اوصاف کا تذکرہ گزشتہ آیات میں کیا گیا ۔ دنیا میں یہ سب کچھ ان کے ذکر کا ذریعہ ہے ۔ یعنی دنیا میں انبیاء کا شرف اور ان کی نیک نامی مذکور ہے ۔ میرے نزدیک یہ مطلب بھی تراش خراش اور توڑ مروڑ سے خالی نہیں نہ اس کی کوئی خاص افادی حیثیت ہے ۔ زیادہ واضح مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے حالات کا مختلف تذکرہ اور ان پر مصائب کا نزول اور نزول پر صبر کا بیان نعمتوں سے سرفراز کرنے اور سرفراز ہونے کے بعد ان کے شکر ادا کرنے کا اظہار اور مختلف انبیاء کے امتیازی اوصاف اور خصوصی خطابات کی صراحت ۔ یہ سب کچھ حکایات ، داستان اور قصہ نہیں کہ وقت کاٹنے وقت تفریح اور لذت حاصل کرنے کے لئے کہا اور سنا جائے ۔ اس کے علاوہ اس کا کچھ حاصل نہ ہو بلکہ یہ ایک موعظت نامہ اور یادداشت ہے ۔ ان تمام واقعات سے نتائج کا استنباط اور ان پر عمل کرنا لازم ہے واللہ اعلم ۔

مقصودِ بیان :۔ لفظ ذکر سے مترشح ہو رہا ہے کہ انبیاء کا تذکرہ اپنے اندر کافی افادیت اور موعظت رکھتا ہے ۔ ...

اولی الایدی والابصار صاف دلالت کر رہا ہے کہ ابراہیم اسحاق اور یعقوب قوت اور روشن رائے کے ایک ممتاز درجہ پر فائز تھے۔ یوں تو ہر پیغمبر صاحب علم و عمل اور مالک فکر و استقامت ہوتا ہے، لیکن ان تینوں بزرگوں کو کوئی خاص امتیاز حاصل تھا۔ بخالصۃ ذکری الدار سے واضح ہے کہ ان انبیاء کے پیش نظر خصوصیت کے ساتھ آخرت کی یاد تھی۔ من المصطفین سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں میں بھی کوئی خاص درجہ ہے جس پر پہنچنے والے بزرگوں کو اللہ چن لیتا ہے اور چن لینا اللہ کا کام ہے۔ ھٰذا ذکر سے تنبیہ ہے ان غافلوں کو جو قرآن کو فلسفہ، منطق، ادب یا تاریخ کی کتاب سمجھتے ہیں اور اس کے بیان کئے ہوئے قصوں کو داستان سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کوئی افسانہ نہیں، ڈرامہ نہیں۔ موعظت نامہ اور یادداشت زندگی ہے، دستور حیات اور لائحہ عمل ہے۔ اس کے بیان کردہ قصوں کو نصیحت اندوز بصیرت سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ نہ قرآن صرف رٹائی کی کتاب ہے کہ الفاظ یاد کرنے کے بعد معانی کو سمجھنے کی ضرورت نہ ہو نہ یہ تعویذ، گنڈہ، ٹوٹکا اور منتر ہے کہ باندھ لیا یا پڑھ لیا اور کامیابی ہوئی بلکہ نسخۂ شفا ہے جس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے وغیرہ۔

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا

البتہ پرہیزگاروں کے لئے　عمدہ مقام ہے　جنت عدن جس کے دروازے پہلے ہی سے ان کے لئے کھلے ہونگے وہ وہاں تکیہ لگا کر بیٹھیں گے

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ۝ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ۝ هٰذَا

وہاں بہت سے میوے اور شراب طلب کریں گے اور ان کے پاس ہم عمر عورتیں ہوں گی مسلمانو!

مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ هٰذَا ۭ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ

جس کا تم سے قیامت کے دن کے لئے وعدہ کیا جاتا ہے　یہ وہ نعمتیں ہیں جو کبھی ختم نہ ہونے پائیں گی　(یہ بات ہے اور سرکشوں کا برا ٹھکانا

مَاٰبٍ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۝ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ

ہے　جہنم، کہ جس میں آن کر گرنا ہوگا پھر کیا ہی برا ٹھکانا ہے　یہ ہے پھر وہ اس کو چکھیں گے جو کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے　اور اس شکل میں اور بھی

اَزْوَاجٌ ۝ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا

طرح طرح کی چیزیں ہونگی فرشتے کہیں گے تمہیں اکیلے نہیں بلکہ تمہارے ساتھ تمہارے پیروؤں کا بھی ایک گروہ ہے انپر خدا کی مار جو تمہارے ساتھ جہنم میں گھسنے والا ہے

بِكُمْ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا

پیرو اپنے سرغنوں سے کہیں گے بلکہ تم پر خدا کی مار تم اس بلا کو ہمارے سامنے لائے ہو جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے پیرو کہیں گے کہ اے ہمارے رب جو اس بلا کو ہمارے آگے لایا اسکو

فِي النَّارِ ۝ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝ اَتَّخَذْنٰهُمْ

آگ میں دوگنا عذاب دے اور دوزخی جہنم میں جاکر کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم نے دنیا میں برا سمجھا تھا ہم کو دکھائی نہیں دیتے　کیا ہم نے ناحق انکو ذلیل سمجھ رکھا تھا

سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ۝ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ۝

جو جہنم میں نہیں آئے ۔ یا ہماری آنکھیں ہی چوندھیا گئی ہیں ۔ بے شک جہنمیوں کا باہم جھگڑنا واقعی برحق و درست ہے ۔

تفسیر سوائے پیٹ پال اور بندگانِ نفس کے جب ساری دنیا کے دانشمند آدمی عقیدۂ آخرت پر متفق ہیں اور دوسری زندگی کو ضروری خیال کرتے ہیں تو حل طلب مسئلہ اب یہ ہے کہ دوسری زندگی کیسی ہوگی ۔ ان کی کیفیات اور حالات کیا ہوں گی وہ مادی ہوگی یا غیر مادی ۔ پھر کیا سب کو ایک دم زندہ کیا جائے گا ۔ یا ہر شخص کی موت کی طرح اس کی زندگی کے اوقات بھی مقرر ہیں ۔ اور اس قسم کے دوسرے سوالات بھی قابل حل ہیں ۔ یونانیوں کا ایک عقلمند گروہ ہزاروں برس پہلے یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ انسان کو اس کے فکر و عمل کی جزا و سزا ضرور ملتی ہے ، مگر وہ جسمانی مادی نہ ہوگی بلکہ روحانی اور غیر مادی ہوگی ۔ مرنے کے بعد قربِ خالق میں پہنچنا سب سے بڑی جزا اور اس سے محرومی سزا ہے ۔ نفسِ انسانی جب غیر عقلی مادی کثافتوں میں آلودہ ہو جاتا ہے تو اس آلودگی کی حالت میں مقامِ قرب تک نہیں پہنچ سکتا ۔ اس کی مہجوری کا الم ہوتا ہے ۔ یہی اس کے لئے عذاب ہے اور اس کی ایک خاص مدت ہے ۔ آخر اس کو ان کثافتوں اور کدورتوں سے نجات مل جاتی ہے ۔ یہی اس کے لئے ثواب ہے ۔ ارسطو اور اس کے پیرو حکماء اشراقیہ اور ہندوستان کے کل فلاسفر آئندہ زندگی کو مادی خیال کرتے ہیں ۔ نفس کی اچھی بری اثر پذیری جس طرح اس زندگی میں مادہ اور جسم کے ذریعہ سے ہوتی ہے اسی طرح دوسری زندگی میں بھی بغیر وساطت مادہ کے نہیں ہوگی ۔ لیکن اس گروہ کے نزدیک حشر اجساد کا کوئی دن مقرر نہیں ۔ نہ آنے والی صرف ایک زندگی ہے بلکہ لاتعداد زندگیاں ہیں جن میں ہر ایک گزشتہ پیوستہ زندگی کا نتیجہ ہے ۔ موجودہ اچھی بری زندگی مختلف قدر و حیثیت کے لحاظ سے آئندہ زندگی کو اچھا اور برا کر سکتی ہے ۔ آئندہ زندگی کے کردار اس سے اگلی زندگی کی اچھائی برائی پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں موجودہ جنم کا فقیر ایک امیر کبیر بن جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موجودہ جنم کا امیر اپنی بداعمالی کے سبب اگلے جنم میں فقیر ہو ۔ بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ انتہائی بداعمال آدمی اگلے جنم میں کسی ذلیل ترین کیڑے کے قالب میں نمودار ہو اور انتہائی نیک کردار آدمی آئندہ زندگی میں رشی منی یا پیغمبر کے لباسِ ہستی میں برآمد ہو ۔ اس طرح یہ جنم چکر اور تناسخ کا ۔۔۔ اور آواگون کا ہیر پھیر ازل سے چلا آیا ہے اور چلتا رہے گا ۔ تاوقتیکہ انسان نفس کے گناہوں کی آلودگی سے بالکل پاک صاف نہ ہو جائے ۔ جب کسی خاص درجہ میں پہنچ کر کسی جنم میں انسان سر تا پا کامل اور عفونت و غلاظت سے پاک ہو جاتا ہے تو مقامِ قرب میں پہنچ کر وحدت میں کثرت تحلیل ہو جاتی ہے ۔ اسی درجہ کو مکتی کہتے ہیں ۔

اسلام کی برادری یعنی تمام انبیاء اور ان کی لائی ہوئی کتابیں جزا و سزا کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی جزا و سزا کا زن ان کے خیال میں مقرر ہے ۔ جوابی تمام تر تشریحات کے ساتھ تو اسی وقت سمجھ میں آسکے گا جب سامنے آئے گا ، مگر اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ انسان کے تمام مرغوبات یا مکروہات سے حصہ ملے گا ۔ ہو سکتا ہے کہ نورانی غیر مادی جزا بھی آخر میں اس کو مل جائے اور بعض لوگ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر کے درجہ پر بھی پہنچ جائیں ، لیکن مادی سزا یا جزا سے سب کو دوچار ہونا ضرور پڑے گا ۔ اول ذرہ ذرہ عمل و قول کی حساب فہمی اور بازپرس ہوگی ۔ پھر زندگی کے کردار بصورت عذاب ثواب سامنے آئیں گے ۔ رہی یہ بات کہ وہ مادی زندگی کی خصوصیات سے الگ ہوگی تو اس کو سمجھنے کے لئے اتنا جان لینا چاہیئے کہ حقیقت میں آخرت کی کیفیت سے تو واقف کوئی بھی نہیں ۔ نہ کسی آنکھ نے ان کو دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی دماغ میں اس کا تصور آیا نہ کسی کی قوت وجدان ان حقائق تک پہنچ سکی ۔ ہاں تصویر کشی تمثیل اور تخیل کیلئے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ راحت و آرام اور رنج و آلام دینے والی چیزوں کے جو نام ہم نے اپنی زبانوں میں بنا رکھے ہیں ان ناموں کی کل اعلیٰ ترین چیزیں وہاں ہوں گی ۔ اگرچہ ان کی حقائق تاثیرات مقادیر اور خصوصیات سے جدا ہوں گی ۔ مگر نام یہی ہوں گے اور شکلیں بھی

انہی سے ملتی جلتی ہوں گی ۔ لیکن اس دنیا کے مادہ اور مادہ کی تلونات کو وہاں رسائی نہیں ہو گی وہاں کی ہوا، پانی، آگ، مٹی اور ان کے مرکبات، اس دنیا کے عناصر اور مرکبات کی طرح ہوں گے ، مگر پھر بھی وہ سب چیزیں مادی ہوں گی ۔ انسانی مرغوبات کو ہم یہاں چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ شاندار مسکن ، لذیذ ترین کھانا خوش گوار خوش تاثیر نبیذ اور حقیقی خواہشات کی تکمیل کے لیے حسین ترین صنفی جوڑا اہل ثواب کے لئے یہ سب چیزیں وہاں ہوں گی اور انسانوں کی اصطلاح میں ان مرغوبات کے جو اعلیٰ ترین جاذب طبع نام رکھ لئے گئے ہیں اس نام کی سب چیزیں آخرت میں ملیں گی ۔ اسی طرح مکروہات میں سانپ بچھوؤں کا ڈسنا آگ سے جلنا، لہو اور پیپ جیسی مکروہ خوردنی ، نوشیدنی اشیاء اور انتہائی دکھ پہنچانے والے جیل خانے وغیرہ وغیرہ ۔ جو نام جن چیزوں کے یہاں رکھ لئے گئے ہیں آخرت میں متقین عذاب کے لئے ان ناموں کی سب چیزیں ہوں گی ، مگر کیفیت و کم ۔ وضع اور حقیقت میں بالکل بدلی ہوئی اور موجودہ زندگی کی ضرر رساں چیزوں سے کہیں زیادہ دکھ پہنچانے والی اور نفرت انگیز ۔ یہ ہے قرآن کا فیصلہ بلکہ تمام آسمانی کتابوں اور انبیاء کے صحیفوں کی صراحت اور آخرت کے معاملے میں پیغمبروں کا نظریہ ۔

تحلیلِ اجزاء وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ اس آیت میں اہل تقویٰ کے لئے حسن مآب کی خصوصیت ظاہر ہو رہی ہے ۔ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا انبیاء متقین میں داخل ہیں یا گنہگار مسلمانوں کی نہیں کیونکہ وہ متقین نہیں گناہوں سے بچتے نہیں ۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ جو شخص شرک سے اجتناب رکھے اور اللہ ہی کو خلاق مطلق سمجھ کر اسی کو مقنن حیات جانے وہ اسلامی اصطلاح میں متقی ہے ۔ اگرچہ اس کو تقویٰ کا ابتدائی درجہ حاصل ہے ۔ معرفت الٰہیہ کا کمال تو ناممکن ہے ، لیکن پھر بھی کفر و ایمان کے درمیان ایک حد فاصل ہے ۔ توحید اور اصحاب التوحید ...... سے محبت اور اعتراف شرک اور اصحاب شرک سے بیزاری کفر و ایمان کے درمیان بھی حد فاصل ہے ۔ اس سے آگے تقویٰ کے مظاہر ہیں اور ہر درجہ تکمیلی ہے ۔ کبائر سے اجتناب صغائر سے پرہیز اور آخر میں تمام نفسانی وسوسوں اور طاغوتی دعوتوں سے روگردانی اتقا کے یہ سب تکمیلی مظاہر ہیں سب سے پہلے اس گروہ میں انبیاء شامل ہیں بلکہ وہ سرگروہ ہیں اور ان کو کمال تقویٰ حاصل ہے اور ان کے بعد حسب درجہ تمام اہل ایمان داخل ہیں ۔ پس آیت میں للمتقین کے معنی ہوئے للمومنین ۔

حسن مآب یعنی نیک انجام اچھا ٹھکانا ۔ عمدہ جگہ یا اس طرح کا کوئی تفسیری ترجمہ کیا جائے مگر لفظی ساخت کا صحیح مفہوم اس سے ادا نہیں ہوتا مآب کا مادہ ہے اوب جس طرح عتاب کا توب اور مثاب کا مادہ ثوب ہے اور ان الفاظ کا صحیح ترجمہ لوٹنا ہے ۔ لوٹنا واپس آنا جہاں سے ابتداء ہوئی تھی وہیں پر انتہا ہونا ۔ آغاز سیر کا نقطہ اور انتہاء سیر کا نقطہ ایک ہو جانا ۔ یہ الفاظ اصل مفہوم کو ادا کرتے ہیں گویا مبدا اور معاد جائے خروج اور جائے رجوع ایک ہی ہیں ۔ اسی لفظ سے ایک ناقابل انکار حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کا اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ایک عقلی مسلمہ ہے جب اپنی طرف سے اللہ نے لباس ہستی عطا فرمایا تو اس لباس کو اتار کر اصل حالت میں اپنی طرف بلا لینا بھی اسی کا کام ہے ۔ پھر حسن مآب کیا چیز ہے ۔ لفظ بالکل مبہم یا مطلق ہے ۔ ہر شخص حسن مآب کی عقلی تعین کرتا ہے جو ترجم بالنسب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔ حقیقت میں حسن مآب وہ ہے جس کی تعین اللہ نے کی ہے یعنی ۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۔ عدن کے معنی ہے اقامت یعنی رہنے کے گھنے باغ ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ۔ جنت میں ایک قصر ہے جس کو عدن کہتے ہیں ۔ اس کے گرد پانچ ہزار برج اور سبزہ زاروں کے دروازے اور ہر دروازے پر پانچ ہزار صحنچیاں ہیں اور ان میں رہنے والے پیغمبر یا صدیق یا شہید یا عادل بادشاہ ہوں گے ۔ ان کے سوا اور کوئی نہ ہوگا (رواہ ابن حاتم) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عدن ایک خاص قصر کا نام ہے ۔ باغ کیسے ہوں گے ، کتنے ہوں گے ۔ ان میں درخت اور سبزہ زار کس قسم کے ہوں گے ہم نہیں جانتے ۔ کوئی بھی نہیں جانتا ۔ اس کثیف زندگی میں عام مثال پا کر آخرت کی باتیں کون سمجھے ، کون بوجھے ہم آنکھوں سے نہیں دیکھیں ، کانوں سے الفاظ سنے حقیقت نہیں جانی ۔ دماغ کی لغتوی رسائی وہاں تک نہ ہو سکی پھر کیا معلوم تفصیلی حقائق کیا ہیں الفاظ

ہیں مانوس مستعمل حقائق ہیں مجہول ادراک کی بلندی سے اونچی۔

مُتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا۔ مسہریوں اور تختوں پر منبتی تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔ کیا تخت کیا تکیہ کیسی نشست اللہ جانے۔ آمنا وصدقنا۔

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ۔ کھانے کے لئے قسم قسم کے کثیر فواکہ اور پینے کے لئے طرح طرح کے شربت منگائیں گے فوراً ملیں گے، خواہش کرتے ہی حاصل ہو جائیں گے سب کی کیفیت اور ماہیت مجہول اور الفاظ معلوم ہیں۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ۔ منفی خواہشات کی تکمیل کے لئے حوریں نیچی نظر والیاں نوجوان ہر ایک کے پاس ہوں گی۔

ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن کعب اور سدی نے تفسیری معنی اس طرح بیان کئے کہ عفت و پاکدامنی کا اظہار اُن کی نیچی نظروں سے ہوگا اور حسن و جمال کا ظہور ترو تازہ ہونے سے ان کی سیرت بھی اچھی ہوگی اور صورت بھی۔ حوریں عورتیں ہوں گی آدم زاد یا کوئی اور نوع معلوم نہیں قاصرات کا لفظ تو مؤنث ہے ہر تشریح مجہول ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ۔ جنت میں اہل جنت کو اللہ کی طرف سے خطاب ہوگا کہ دنیا میں انہی چیزوں کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا یعنی وہ وعدہ غلط نہ تھا۔ وعدے کے موافق ہر چیز تم کو دے دی گئی۔ اس تشریح پر لفظ کنتم محذوف ماننا پڑے گا۔ اصل کلام اس طرح تھا۔

هٰذَا مَا كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توعدون ماضی کا صیغہ نہیں مضارع کا صیغہ ہے اور ترجمہ ماضی بعید کا کیا گیا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس فقرہ کا استعمال جنت میں نہیں بلکہ اسی وقت کیا جا رہا ہے یعنی ماضی کی حکایت نہیں بلکہ اہل ایمان سے خدا تعالیٰ وعدہ فرما رہا ہے کہ ان چیزوں کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ قیامت کے دن جنت میں یہ چیزیں ملیں گی لیکن ابن کثیر کی تفسیر پر توعدون کی جگہ یوعدون یعنی غائب کا صیغہ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ اوپر کی آیات میں کہیں اہل ایمان کو خطاب نہیں کیا گیا متقین کے احوال اور اجر آخرت کا بیان کیا گیا ہے اس لئے ضمیر بھی غائب ہی کی ہونی چاہیئے۔

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ۔ ہر طرح کی راحت و حکومت اور عیش و تنعم میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ خیال آجائے کہ یہ راحت فنا پذیر ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہر قسم کا عیش چھین لیا جائے گا کدورت قلب پیدا کرنے والے اس تصور کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ سارا عیش فنا پذیر نہیں دوامی ہوگا۔

هٰذَا ۚ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ۔ طغیان حد سے تجاوز کرنا۔ حدود سے تجاوز کرنے والے کون لوگ ہیں وہی جو قوانین الٰہیہ کی حدود کو توڑ کر انسان کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ اس حد شکنی سے پرہیز نہیں رکھتے۔ حدود شکنی سے اجتناب کرنے والوں کا نتیجہ اچھا اور سرتابی کرنے والوں کا برا ہوگا۔ شر اور خیر ہونا اصطلاحی چیز ہے جس کی بنا افادیت اور ایذا رسانی پر ہے۔ راحت آفرین خیر ہے اور اذیت انگیز شر۔ مطلب یہ ہے کہ حدود الٰہیہ سے تجاوز کرنے والوں کا انجام دُکھ سے بھرا ہوا ہوگا۔ وہ کیا ہوگا۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا۔ دنیا کے کوتاہ نظر یا وسیع ہونے کے مدعی بڑے انجام کے معنی کی تعیین کچھ بھی کریں۔ برا جہنم سمجھیں یا مجبوری کا کام قرآن کی نظر میں شر مآب جہنم ہے جس میں شریر لوگ داخل ہوں گے جہنم کیا ہوگا ہم نہیں جانتے۔ لوگ کہتے ہیں آگ سے بھرا ہوا کوئی غار ہوگا۔ لیکن آتش کدہ۔ اور دوامی آتش کدہ ہلاکت آفریں ضرور ہوتا ہے اور جہنم میں جلنے والے کبھی نہیں مریں گے۔ مرنے سے تکلیف کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اہل جہنم کی تکلیف غیر محدود اور ناقابل انقطاع ہوگی۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا قعر آتش ہوگا۔ اس کی آگ کس شدت کی حامل ہوگی۔ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ موجودہ سائنس نے حرارت کے جو آخری درجات بیان کئے ہیں جہنم کی حرارت ان سے بھی زیادہ ہوگی۔

سائنس کی روشنی میں جہنم کا تصور

اگر ہم زمین کے اندر اترنا شروع کر دیں تو ہر تیس میٹر (ایک میٹر ۳۹ انچ کا ہوتا ہے) کے بعد زمین کا درجہ حرارت ایک کے حساب سے بڑھتا جائے گا اور تین سو میٹر درجہ حرارت دس ہوگا۔ تین ہزار کی گہرائی میں سو اور پچیس ہزار کی گہرائی میں درجہ حرارت ایک ہزار تک پہنچ جائے گا۔ جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی اس وقت درجہ حرارت دس ہزار سے اوپر تھا۔ لاکھوں سال کے بعد زمین کا بیرونی حصہ ٹھنڈا پڑا لیکن علمائے فطرت کہتے ہیں کہ بطن زمین میں تیرہ سو

درجہ حرارت کی آگ اب بھی موجود ہے۔ آتش فشاں پہاڑوں کے منہ سے جو لاوا باہر ٹپکتا ہے وہ اندرونی آگ کی وجہ سے پگھلا ہوا ہوتا ہے پس جہنم کا تصور سائنس کی روشنی میں ہم یوں کر سکتے ہیں کہ ایک شدید زلزلہ (زلزلۃ الساعۃ) کی وجہ سے بطن زمین سے باہر آجاتا ہے اور ہر طرف آگ کے متلاطم سمندر لہریں لینے لگتے ہیں۔ یہ بھی اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر زمین کا بطن باہر آجائے تو دفعتہ سمندر کھولنے لگے (جہنم و غساق) نباتات جمادات میں آگ بھڑک اٹھے اور تمام فضا سرخ انگارے کی طرح دہکنے لگے۔

کائنات میں تقریباً دس کروڑ آفتاب ہیں اور ہر آفتاب کے گرد کم و بیش تین زمینیں گھوم رہی ہیں۔ اس حساب سے تیس کروڑ زمینیں موجود ہیں۔ پس ممکن ہے کہ ان تیس کروڑ زمینوں سے آگے کوئی نئی زمین کسی آفتاب سے نکل آئے جو بے انتہا گرم ہو یا اس روز سورج زمین کو اس قدر قریب کھینچ لے کہ ہزاروں درجے کی حرارت پیدا ہو کر یہ تمام بحر آتشیں بن جائے اور سب سے زیادہ احتمال اس کا بھی ہے کہ تیس کروڑ زمینیں سب کی سب ایک وقت میں اپنے بطن کی حرارت باہر نکال دیں جس کا مجموعہ کروڑوں درجہ حرارت سے بھی زائد ہوگا۔ اس مجموعہ کا تصور کرنے سے دانشمندوں کا دماغ جل جاتا ہے اور اس بے پایاں حرارتوں کے مجموعہ کا نام جہنم ہونا ممکن ہے۔ واللہ اعلم

فَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ مہاد پالنا، جھولنا یا جھولا جس میں بچوں کو آرام سے لٹایا اور سلایا جاتا ہے۔ لیکن دوزخیوں کے لئے جہنم بڑا جھولنا ہوگا۔ کسی وقت کسی کروٹ قرار نہ ہوگا۔ پیاس لگے گی تو حکم ہوگا

فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ۔ اب اس کا مزہ چکھو، مزہ چکھنے سے مراد ہے کھانا پینا۔ یہ حمیم اور غساق ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے حمیم سخت گرم کھولتا ابلتا جوش مارتا پانی اور غساق لہو جو دوزخیوں کی کھال سے بہے گا۔ کعب الاحبار نے کہا جہنم میں ایک چشمہ ہے جس کا نام غساق ہے۔ اس میں ہر زہریلے جانور کا زہر جمع ہے۔ دوزخیوں کو لاکر اس میں غوطہ دیا جائے گا تو بدن کی کھال اور گوشت ہڈیوں سے چھوٹ کر قدموں میں گر پڑے گا۔ گویا کعب الاحبار کے نزدیک غساق کے چشمے میں دوزخیوں کو غوطے دیئے جائیں گے۔ پلایا نہ جائے گا۔ حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے حضور اقدس نے فرمایا۔ اگر غساق کا ایک ڈول اس دنیا میں بہا دیا جائے تو دنیا والے بدبو سے سڑ جائیں۔ (رواہ الترمذی وغیرہ)

مجاہد اور مقاتل کا قول ہے کہ جس طرح حمیم انتہائی کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں جس کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے اسی طرح غساق سے مراد ہے اسی قدر سرد برف جس کی ٹھنڈک ناقابل برداشت اور قاتل ہو۔ ابن کثیر نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی تائید اگلے فقرے سے بھی ہوتی ہے۔

وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ۔ یعنی حمیم اور غساق کے عذاب پر ہی حصر نہیں ہے بلکہ اسی طرح کے اور قسم قسم کے عذاب ہوں گے، جو جوڑے جوڑے ہوں گے۔ یعنی کیفیت کمیت اور تاثیر کے لحاظ سے ہر عذاب اپنی ضد کے ساتھ موجود ہوگا۔ مثلاً کھینچ کر اتنا لمبا کر دیا جائے گا کہ کھینچاؤ اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جائے گا، پھر دبا کر اتنا دبا دیا جائے کہ سر ٹخنوں میں گھس جائے یا ان کو اس قدر روشنی میں رکھا جائے جو ہر روشنی سے زیادہ روشن اور خیرہ کن ہو یا اس قدر گھٹا ٹوپ تاریکی میں بند کر دیا جائے جو ہر ظلمت کدہ سے زیادہ اندھیری اور دم گھونٹنے والی ہو۔ حسن بصری نے ازواج کے معنی جوڑے جوڑے نہیں بلکہ انواع انواع لکھے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حمیم اور غساق کی طرح مختلف اقسام کے عذاب اور بھی ہوں گے جیسے زمہریر، زہر، زقوم، کوہ آتشی پر چڑھانا اتارنا وغیرہ۔

هَٰذَا فَوْجٌ مُقْتَحِمٌ مَعَكُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ جب کوئی گروہ جہنم میں داخل ہو چکے گا اور پیچھے دوسرا گروہ آئے گا تو اگلا گروہ پچھلے گروہ کے متعلق یہ الفاظ کہے گا جو آیت میں مذکور ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے کہا ہے یہ قول ان ملائکہ کا ہوگا جو جہنم پر مامور ہوں گے۔ جب کفر کا پیشوا اور سردار جہنم میں داخل ہو چکے گا اور پیچھے سے پیروی کرنے والے آئیں گے تو ملائکہ کفر کے سرداروں سے کہیں گے۔ لو یہ گروہ بھی تمہارے ساتھ جہنم میں دھنسنے کو آ گیا۔ شیخ ابن کثیر نے اول مطلب کو ترجیح دی ہے۔ اگلی آیت اسی کی تائید کرتی ہے۔

قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۖ أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ یعنی پیچھے آنے والے پہلے آنے والوں کا کلام سن کر جواب دیں گے تم ہی اس کے مستحق ہو۔ تمہاری ہی دیکھا دیکھی اور تمہاری ہی تقلید سے ہم اس مصیبت میں پڑے یا تم نے ہی ہم کو بہکا کر اس بد انجام کو

پہنچایا۔ جب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر چکیں گے تو پھر افسوس اور حسرت سے کہیں گے۔ اب تو ہم سب کا یہ برا ٹھکانا ہے۔

قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ۔ یعنی گمراہ ہونے والے عوام، گمراہ کرنے والے پیشواؤں کے متعلق یہ دعا کریں گے اور کہیں گے پروردگار جنہوں نے ہم کو اس بلا میں ڈالا ان کو جہنم میں ہم سے دوگنا عذاب دے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ خود بھی گمراہ تھے اور ہم کو بھی گمراہ کیا اس لئے دوگنے عذاب کے مستحق ہوئے۔

وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْأَشْرَارِ ۝ أَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ۔ حسد بری بلا ہے۔ خود سوختہ ہونے کے باوجود دوزخیوں کے خیال سے نیکوں کی دشمنی دور نہ ہوگی وہ کہیں گے وہ لوگ کہاں ہیں جن کو ہم دنیا میں اہل شر قرار دیتے تھے ان کی ہنسی اڑاتے تھے یعنی کیا واقعی ہماری ہنسی اڑانی غلط تھی اور مذاق ہی مذاق تھا۔ حقیقت میں وہ لوگ سچے تھے اور ان کا یہ مقام ہی نہیں ہے یا ہماری نظر چوک رہی ہے وہ یہیں کہیں موجود ہیں اور ہماری ہنسی بالکل صحیح تھی۔

إِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ۔ دوزخی دوزخ میں جلیں گے طرح طرح کے دکھ اٹھائیں گے موت سے بڑھ کر ان پر تکلیفیں ہوں گی پھر ایک دوسرے کو برا کہنے کا ان کو ہوش کیسے ہوگا۔ آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت اور کانوں میں سننے کی قوت اتنی سخت مصیبتوں اور شدید دکھوں سے باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر دوسرے کو پہچاننا اور اس کی حالت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے اس لئے دوزخیوں کے باہم جھگڑے کا بیان بالکل غلط ہے۔ اس قسم کے شبہات دانش زدہ لوگوں کی طرف سے کئے جا سکتے ہیں۔ مگر غیر مرئی کو مرئی پر قیاس کرنا۔ اور ان دیکھی بے سنی نہ سمجھی ہوئی بات کو دیدنی شنیدنی اور فہمیدنی قرار دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ جنت دوزخ عذاب ثواب حساب کتاب بلکہ قیامت کے تمام احوال کی تفصیلی کیفیات کو اس دنیا میں رہ کر جاننا ناممکن ہے۔ اس مادہ کی آنکھیں آخرت کے حالات نہیں دیکھ سکتیں، یہ کان ان آوازوں کو سن نہیں سکتے۔ یہ دل ان حقائق کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے جو کچھ خدائے برحق نے رسول صادق کی زبانی اطلاع دیدی اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی بے سود ہے۔ اسی لئے ن اور لام کے ساتھ اس فقرے کو مکمل مؤکد کر دیا ہے۔ اگرچہ مؤکد کلام اسی وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شک یا انکار کرنے والا ہو۔ اور یہاں دوزخیوں کے باہم جھگڑنے کا انکار کرنے والا کوئی مذکور نہیں۔ مگر چونکہ دنیا کے بیشتر دماغ زدہ لوگ انکار کر سکتے تھے اور اب تو اس زمین کی بیشتر آبادی ممکن ہے اس لئے پرزور طریقے سے اس انکار کا ازالہ آیت میں کر دیا۔

مقصود بیان جائے بازگشت اور واپسی کا مقام ہر انسان کا ضروری ہے مگر جدا جدا۔ شرک نہ کرنے والوں کے لئے حسن مآب ہے اور شرک کرنے والوں کے لئے شر مآب۔ حسن مآب قرآن کی نظر میں جنت ہے جنت میں رہنے کے لئے اعلیٰ ترین مکان استعمال کے لئے عمدہ فرنیچر، کھانے پینے کے لئے مرغوب طبع فواکہ اور شربت اور جنسی مقاربت کے لئے نیچی نظر والی نوجوان حوریں ہوں گی۔ جنت ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو شرک سے بیزار اور پرہیزگار ہوں۔ لیوم الحساب سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن حساب فہمی ضرور ہوگی۔ ما لہ من نفاد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جنت کا آرام فنا پذیر نہیں۔ نہ اس کا کبھی خاتمہ ہوگا۔ شر مآب جہنم ہے۔ حدود الٰہیہ اور ضوابط سماویہ کو توڑنے والے متقی مؤمن نہیں طاغی مشرک ہیں اور انہی کے ساتھ شر مآب مخصوص ہے۔ دوزخ کے اندر دوزخیوں میں باہم جھگڑا ہوگا۔ اور گمراہ ہونے والا گروہ گمراہ کرنے والے کے لئے عذاب کے دوچند ہونے کا خواستگار ہوگا۔ جنت اور دوزخ کا حال بیان کرنا ترغیب اور ترہیب کے فوائد اپنے اندر رکھتا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

کہہ دو میں جو ہوں ایک ڈر سنانے والا اور یہ کہ خدائے واحد قہار کے سوا　کوئی معبود نہیں　جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان میں

وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ۝ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ

ہے سب کا زبردست بخشنے والا پروردگار ہے۔ کہہ دو کہ یہ ایک　بڑی خبر ہے　تم ہو کہ اس سے منہ پھیر　لیتے ہو

تفسیر اس بھری پُری دنیا میں آغازِ آفرینش سے اب تک دو عقیدوں کے آدمی چلے آتے ہیں۔ ایک گروہ تو وجودِ باری کی کوئی ضرورت تسلیم نہیں کرتا اور کائنات کی اس کڑی در کڑی زنجیر کا نہ سرِ آغاز مانتا ہے نہ نقطۂ انتہا۔ دوسرا گروہ ایک واجب اور قدیم ہستی کا قائل ہے جس کو وہ الٰہ کہتا ہے اور اس کائنات کا خالق اس کو مانتا ہے۔ لیکن الٰہ یعنی وہ ہستی جس کے سامنے سرِ نیاز جھکایا جائے اور ہر دُکھ شکھ میں اسی کا دامن پکڑا جائے۔ تنہا ایک ہے یا مظاہرِ الوہیت مختلف اور متعدد ہیں۔ اس کے متعلق چند در چند گوناگوں افکار و خیالات ہیں۔ کوئی اس سنسار میں ہر عجیب اور مفید اور ہیبت انگیز چیز کے سامنے سر جھکانا اور اس کی پرستش کرنا جائز قرار دیتا ہے۔ درخت ہو یا پتھر پانی ہو یا آگ، ستارے ہوں یا کوئی فرضی غیبی کارساز غرض اس مشین کا ہر خیالی مفید پُرزہ اس کی نظر میں قابلِ سجدہ ہے۔ اس محسوس یا نیم محسوس یا موہوم پرست طبقہ کے لئے فرضی نفع رسانی یا ضرر دہی کی طاقت ہی موجبِ عبادت ہے۔ معبود کا واقعی اقتدار اور حقیقی ربوبیت ضروری نہیں ہے۔ یہ بے وقوف مجبور کو مختار، بے بس کو طاقتور، پرزوں کو کاریگر اور قبلہ نما کو قبلہ سمجھتا ہے۔ انبیاء کی نظر میں یہ تمام گروہ باطل پرست ہیں۔ نبوت اعلان کرتی ہے کہ خدا ایک ہے اور تنہا ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں۔ اقتدارِ اعلیٰ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کامل متصرف اور حکمراں ہے۔ پھر اس کی حکومت ظالمانہ نہیں۔ وہ کائنات کا خالق بھی ہے اور رب کارساز بھی۔ وہ طاقتور بھی ہے اور مہربان بھی صرف وہی معبود ہونے کا مستحق ہے۔ کسی کے سامنے سر جھکانا جائز نہیں۔ کسی کو معبود بنانا درست نہیں۔ ساری دنیا آسمان ہوں یا زمین اسی کی زیرِ نگیں ہیں۔ زیرِ نگیں ہی نہیں عاجز و بے بس ہیں۔ وہی ان سب پر غالب ہے۔ لیکن کیا معبودِ برحق صرف اسی کا مستحق ہے کہ اس کے سامنے دُکھ شکھ میں سر جھکا دیا جائے، مصیبت کے وقت اس کو پکار لیا جائے۔ اس کو اپنا خالق رازق اور مددگار سمجھ لیا جائے اور چند مخصوص اوقات میں خاص شکل کے ساتھ اس کی پرستش کر لی جائے یا اس سے آگے بڑھ کر ہماری زندگی کے مختلف اطوار اور ادوار و اوقات اور حالات بھی اس کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ اس کو ہمارے نظامِ زندگی میں بھی دخل ہے۔ ہم کو زندگی کے مختلف مدارج طے کرنے کے لئے بھی اسی کے قانون کی ضرورت ہے۔ دستورِ زندگی بنانا بھی اسی کا کام ہے۔ وہ ہمارا خالق ہے تو ساتھ ہی ساتھ آئینِ حیات بنانے والا اور زندگی کے فرائض بتلانے والا بھی وہی ہے۔ کچھ نافہم مدعیانِ توحید کی نظر میں تو اتنا کافی ہے کہ بس اللہ کو معبود سمجھا جائے اور اس کے صفاتِ مخصوصہ میں کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ معاشرتی تعلقات میں انسان آزاد ہے جیسا چاہے اُسے اپنے لئے قانون بنائے۔ لیکن اسلام کے خیال میں اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ خدا کو خالق رزاق، نافع، ضار، قہار اور رب جاننے کے بعد اس کو شارع اور آئین سازِ حیات اور قانونِ عمل بنا کر اس کا حساب فہمی کرنے والا قرار دیتا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ تحلیل اجزاء میں پڑھیئے۔

تحلیل اجزاء قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ۔ گزشتہ آیات میں دوزخ اور دوزخیوں کے احوال کسی قدر تفصیل سے بیان کئے تھے۔ اس آیت میں بعثت اور رسالت کے فرض کو ظاہر فرمایا ہے۔ شاعر کا مقصود بلندیٔ تخیل اور حسن و حرکات کے ذریعہ سامعین کے جذبات سے کھیلنا، ان کو اُبھارنا اور صداقت و واقعیت سے بے نیاز ہو کر عواطف ترغیب و تنفر کو بھڑکانا ہوتا ہے۔ کاہن کا مدعا ہوتا ہے غیبی خبروں کو مسجع الفاظ کا جامہ پہنا کر لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا۔ ساحر اپنی شعبدہ کاریوں اور نیرنگ آفرینیوں کا جامہ پہنا کر لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرتا اور داعیوں کو حیرت اور حواس کو اچنبے میں ڈالتا ہے۔ اس طرح یہ تینوں گروہ قوم پر اپنی سیادت اور برتری کو قائم کرتے اور رکھتے ہیں۔ لیکن نبی کی غرض ان سب سے الگ ہوتی ہے اور اس کا مقصود لوگوں کے جذبات سے کھیلنا، فخر و شجاعت کے اشعار کہہ کر حمیت و جاہلیت کا مظاہرہ کرنا یا مرثیہ کہہ کر جہانِ غم کی تصویر کھینچنا یا تمثیل اور ڈرامائی انداز میں سامعین کے عواطف و میلانات میں آثار چڑھاؤ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر اپنی جانب دلوں کا کھنچاؤ یا کسی کے حواس پر اثر انداز ہونا بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ انسانوں کے لئے دستورِ زندگی پیش کرتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کے راستے بتاتا ہے، نیک بختی اور بدبختی کی راہیں دکھاتا ہے، ضوابطِ حیات کی تعلیم دیتا ہے۔ پھر فرمانبردار اور نافرمان کا جداجدا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ دستور پر چلنے والوں کو فلاحِ دین و دنیا کی بشارت دیتا ہے اور سرکشوں کو ابدی بربادی سے ڈراتا ہے۔ پس نبی کا کام ہے قانونِ زندگی پیش کر کے فرمانبرداروں کو کامیابی کی خوشخبری دینا اور نافرمانوں کو دائمی ہلاکت سے ڈرانا۔

مگر انسان اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ اسلاف کی کورانہ تقلید اپنے مسلمہ نظریات و معمولاتِ زندگی کی پابندی اور بے لگام رہبروں کو چھوڑ کر وہ اصلاحِ افکار اور درستی فکر و عمل کی طرف مائل کرتا ہے لیکن یہ تصورِ انجام بہت ہی کم لوگوں کا کام ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کے بعد درستی فہم و کردار کی طرف لوٹنا صرف اہلِ دانش ہی کی خصوصیت ہے۔ وقلیل ما ھم ان یقینی آنے والی ہلاکت کا ڈر بہت جلد تاثیر کرتا ہے۔ ابدی بربادی کا خوف نفسیاتی طور پر بہت زیادہ دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ اس لئے آیت میں حصر کے ساتھ فرمایا اور رسول کو حکم دیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس ڈرانے والا ہوں۔ یہ حصر بشارت کے مقابلہ نہیں ہے۔ نبی تو بشیر بھی تھے اور نذیر بھی۔ آیت سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ میں بشیر نہیں ہوں صرف نذیر ہوں بلکہ اس لفظ (انما) سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ میں نبی ہوں (ساحر، کاہن اور شاعر یا بادشاہ اور سیادت و کرامت کا طلبگار نہیں ہوں) شبہ مذکور کے ازالہ کے لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت مطلق ہے مگر اس کی تقیید دوسری آیت میں کر دی گئی ہے۔ یعنی اس جگہ صرف رسولِ پاک کو نذیر بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں کافروں مشرکوں اور سرکشوں کے لئے نذیر فرمایا ہے۔ رہے نیکوکار اہلِ ایمان تو ان کے لئے حضور بشیر تھے۔ گویا بشارت اور انذار دونوں کا محل جدا جدا ہے۔

وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ۔ انسانی زندگی کو بنانے یا بگاڑنے والا صرف ایک مسئلہ ہے۔ وہ یہ کہ دستورِ حیات کون بنائے۔ ہم اپنی اختیاری زندگی کی لگام کس کے ہاتھ میں دیں۔ کس کے حکم کو مانیں اور کس کی اطاعت کریں۔ دنیا میں کچھ لوگ تو اللہ کی حکومتِ تکوینیہ ہی نہیں مانتے حکومتِ تشریعیہ کا قائل ہونا تو درکنار رہا۔ ان کی نظر میں یہ تمام کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ نہ کوئی خالق ہے نہ مخلوق۔ نہ کوئی رب نہ مربوب۔ کچھ لوگ اللہ کی ہستی مانتے ہیں، اس کی الوہیت کے بھی قائل ہیں مگر الوہیت کی قسمیں انھوں نے بنا رکھی ہیں۔ حقیقی اور مجازی۔ حقیقی الوہیت تو صرف اللہ ہی میں ہے اور مجازی الوہیت کے مالک انبیاء، اولیاء، ائمہ، ملوک اور سلاطین، ستارے بعض عناصر، بعض درخت، کچھ حیوان اور غیبی موجودات سب ہی ہیں۔ اس لئے ہماری زندگی کا دستور یہ خدا بنا سکتے ہیں اور خدا کی طرح ان کی اطاعت اور فرمان پذیری بھی لازم ہے۔ مگر قرآن کا بنیادی نظریہ ان سب کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات کا مختار کل اسی کے بنائے ہوئے ضوابطِ زندگی ہیں وہ تنہا ہے۔ اس کے سوا کسی میں نہ مجازی الوہیت ہے نہ حقیقی۔ وہ اکیلا اور یگانہ ہے لیکن ہم اس کی وحدتِ الوہیت کو کیوں مانیں اس لئے کہ:۔

الْقَهَّارُ۔ وہی قہار ہے۔ ہر چیز کا خالق عدم سے وجود میں لانے والا اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے والا کسی کو سرکشی کرنے اور دم مارنے کی مجال نہیں۔ کوئی اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کر سکتا۔ سب طابع ہیں۔ اس کی مشیت پر چلنے والے لیکن کیا اس کی یہ ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل طاقت مخلوق کو تباہ کر رہی ہے۔ کیا اس کا مقصود کائنات کو برباد کرنا ہے۔ کیا اس کے تصرفات اس سنسار کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کیا واقعی نوعی کمال کے حصول سے وہ کسی کو روک کر زوال کی طرف سب کی یا کسی کی لگام موڑ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ کیوں، اس لئے کہ وہ

رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ رب السماوات والارض ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کو عدم سے وجود میں وہی لایا اور سب کو تکمیلِ درجات تک پہنچانا اسی کا کام ہے۔ ہم اس نگارستان کی تصویر کشی ذرا تفصیل سے کرنی چاہتے ہیں۔ آؤ ذرا تم بھی سیر کرو۔ آسمانوں کے سات طبقے نظر آتے ہیں پہلے طبقہ میں چار بڑے بڑے ستارے ہیں، دوسرے میں ستائیس، تیسرے میں ۷۳، چوتھے میں ۱۹۱ پانچویں میں ۶۵۰ چھٹے میں ۲۲۰۰ اور ساتویں میں تین ہزار سے زائد۔ اس سے آگے کے طبقات بغیر دوربین آلات کی مدد کے نہیں دکھائی دیتے لیکن دوربینی آلات ہم کو بیسیوں طبقات دکھا سکتے ہیں اور اس وقت تک دس کروڑ کے قریب ستارے نظر آ چکے ہیں۔ یہ ستارے کیا ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک آسمان ہے۔ کچھ ستارے تو ہماری زمین سے چھوٹے ہیں۔ لیکن کروڑوں ستارے اس زمین سے لاکھوں گنا بڑے ہیں۔ صرف مشتری زمین سے بارہ سو گنا بڑا ہے۔ یاد رکھو کہ صاحبِ جبروت قہار نے فضاؤں میں کروڑوں آسمان محوِ پرواز بنا رکھے ہیں۔ ہر آسمان نہایت شکوہ و عظمت کے ساتھ چکر کاٹ رہا ہے۔ پھر یہ خیال کرنا کہ ان کروں میں زندگی نہیں غلط ہے۔ یہ زمین ان گھومتی ہوئی گیندوں کے مقابلے میں صرف کھلونا ہے۔ یہ بھی سمجھ لو کہ یہ گیندیں صرف دس کروڑ ہی نہیں ہیں بلکہ ہر آسمان کے ادھر ادھر تقریباً تین زمینیں بھی چکر کاٹ رہی ہیں۔ گویا صرف زمین ہی ایک نہیں ہے بلکہ تیس کروڑ اور ہیں، اور سب اپنی جگہ گردش میں مصروف ہیں۔ الٰہی ربوبیت کا اندازہ کرنے والو غور کرو کہ اس فضا میں کوئی ستون اور ٹیکی نہیں جس

پر کوئی آسمان یا زمین قائم ہو۔ بلکہ ہر ایک کے اندر ایسی قوت کشش ہے جو اپنی جگہ اس کو تھامے ہوئے ہے اور سب میں ایسا توازن موجود ہے جو کسی کو کسی سے ٹکرانے نہیں دیتا۔ اگر واحد قہار کی ربوبیت عامہ نہ ہوتی تو جذب اور کشش کا توازن باقی نہیں رہتا اور یہ گیندیں آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جاتیں۔ یہ صرف اللہ واحد کا غلبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی حدود میں دخل اندازی سے روکتا ہے اور اس کائنات کو روکے ہوئے ہے کیا یہ اس کی ربوبیت نہیں کہ سارے جہان میں جتنی بجلی صرف کی جا رہی ہے جس سے لندن، نیویارک، پیرس، بمبئی، کلکتہ اور تمام بڑے بڑے شہر اور بستیاں جگمگا رہی ہیں۔ ہزاروں بارس یا دریائی کرنٹ سے چلنے والی مشینیں شبانہ روز مصروف کار ہیں۔ ان گنت دکان بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ لاکھوں بیٹیل میدان بجلی کے کنوؤں کی وجہ سے مرغزار اور لہلہاتے سبزہ زار ہو رہے ہیں۔ اس سب بجلی کو یکجا کر کے اگر مخصوص آلات وزن سے تولا جائے تو سال بھر کی بجلی کا وزن پاؤ چھٹانک ہوگا لیکن رب الارض کی ربوبیت سورج سے جو روشنی ہم کو عطا فرما رہی ہے اگر اس سے ایک دن کے صرف کا لحاظ کیا جائے تو ۴۸۰۰۰ من ہوگا ماشاء اللہ کیا رب الارض ہے جو اس زمینی بستی کو بلا اجرت ہزاروں من روشنی نچھاور کر رہا ہے۔

دعوت فکر ہے اہل نظر کو کہ زمین کا فاصلہ سورج سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ ایک گاڑی چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے یہاں سے سورج کی طرف جائے تو ۲۶۵ سال میں وہاں پہنچے گی پھر آفتاب میں جتنی روشنی ہے اس کا دو ارب واں حصہ زمین پر پڑ رہا ہے باقی روشنی اور ستاروں کی طرف جا رہی ہے۔ ذرا اللہ کے عظمت و جلال اور ربوبیت پر چشم بصیرت سے گہری نظر ڈالو اور سوچو کہ اگر آفتاب ہم سے زیادہ قریب ہوتا تو ہم بھن جاتے جھلس جاتے یا اگر روشنی کا ایک حصہ اور ہم پر پہنچتا تو بھی ہم سوختہ ہو جاتے۔ یہ اللہ کی ربوبیت ہے جو ہم کو بچائے ہوئے ہے۔ ارض و سما کے اس توازن و تناسب کو دیکھنے کے لئے ایک تدرس نگاہ کی ضرورت ہے ہم فرط حیرت سے فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کس کی زیادہ تعریف کریں اس حسابی عدل و توازن اور ربوبیت و عطوفت کی جو بقائے کائنات کا سبب ہے یا سنسار کی بناوٹ کے حسن و جمال کی موزونیت فطرت ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ ایک ایسا رباب ہے جس سے الہی ربوبیت کے ترانے نکل رہے ہیں جو سننے والوں کے ہوش و خرد کو سرمست بنانے کے لئے کافی ہیں سننے والے سنتے ہیں اور بے خود ہو کر جھومتے ہیں۔ سچ ہے کہ اللہ کے اس نظام کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک نظم ہے جس میں یک رنگی اور ہم آہنگی کے ساتھ خوشگوار اختلاف ہے اور ایک صداقت ہے جس کی مختلف تعبیریں ہیں۔ وہ ربوبیت سے بھری ہوئی مشیت جو قطرے کو آنسو بنا کر آنکھ سے لڑھکا دیتی ہے وہی مشیت زمین کو فضا میں تھامے ہوئے ہے اور معینہ گزرگاہوں پر ستاروں کی حفاظت اور نگرانی کر رہی ہے۔ اللہ رب السموات والارض۔

تھامسن نے کیا خوب کہا ہے کہ تمام ترتیب و تبدیلات یا کہ ایک لازوال طاقت نے مخفی طور پر باہم باندھ رکھا ہے۔ جب تم ایک پھول کو چھیڑو گے تو فضائے گردوں میں ایک ستارہ کانپ اٹھے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ مطالعۂ کائنات پر صرف کیا ہوا ہر لمحہ ہمیں سرشار کن اور بیخودی آفریں کیف و مستی کا پیام دے رہا ہے۔ ہم سب اسی حسین منزل کی طرف بڑھتے ہی جاتے ہیں اور بڑھتے ہی جائیں گے جو تماشا گاہ ربوبیت اور جلوہ گاہ وحدت ہے۔

کائنات کی اس لرزہ فگن ہیئت پر نظر ڈالنے کے بعد جرمنی کا مشہور مفکر آئن اسٹائن پکار اٹھا۔ کائنات پر ایک زبردست دماغ حکومت کر رہا ہے۔ یہ دماغ ریاضی داں کا ہے یا مصور کا یا شاعر کا یا ان سب کا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ہماری حیات کو پر معنی بناتی ہے اور جہاں علم کی روشنی ناکام رہے وہاں ہمارے یقین کو اور زیادہ مضبوط کرتی ہے۔ پس جو انسان کائنات پر اظہار تعجب کے لئے نہیں ٹھہرتا اور اس پر خشیت و تقدیس کی کیفیت طاری نہیں ہوتی وہ مر چکا ہے اور اس کی آنکھیں نور بصارت سے محروم ہو چکی ہیں۔

ہماری تفسیر تصویروں کا البم نہیں، شاعری کا دیوان نہیں، نہ فلسفہ کی دقائق بیز کتاب ہے ورنہ ہم یہ بتاتے کہ دنیا ایک نگارستان ہے جس میں خریب نظر نقوش و تصاویر فردوس نگاہ بنی ہوئی ہیں۔ ایک مرقع ہے جس کا ہر شاہکار لاجواب ہے۔ ایک دیوان ہے جس کا ہر شعر کیف انگیز اور وجد آور ہے۔ ایک سحر فروش رباب ہے جس کا ہر نغمہ مسحور کن اور مستی آفریں ہے۔

وَمَا بَيْنَهُمَا - زمین و آسمان کے درمیان کیا ہے، چمکدار مہیب شہاب ہیں - ابر ریزاں، رعد لرزاں اور برقِ تپاں ہے۔ مست ہوائیں، نغمہ خواں فضائیں، ترنم ریز نغمے آفریں پرندے، مستِ شباب جھومتے ہوئے درخت، لہلہاتے سبزہ زار، شاداب مرغزار اور ریگستان کا سیل رواں اور دریائی موجوں کی برق رواں ہے - اتھاہ سمندر اور زمین کے سینے کو چیرنے والے فلک بوس پہاڑ ہیں - پھولوں سے مہکتے ہوئے گلزار ہیں - چٹانوں پر گرتے ہوئے آبشار ہیں - آتشِ سیّال کے لالہ زار ہیں اور فضا کی ہر لہر میں رباب کے تار ہیں - ہمالیہ کے بلند اور دہشت ناک سلسلے کے سامنے کھڑے ہو کر عمیق نظر رکھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی ہیبت انگیز قہار کے پرعظمت دربار میں سہما ہوا کھڑا ہے - ہر سو چوڑی گہرائی ڈراؤنی وادیاں، حیرت اور رعب پیدا کرنے والی گہرائیاں اور دیو ہیکل بلندیاں اور غاروں میں روشن سورج کے ہوتے ہوئے شب کی اندھیریاں ہیں -

کیا ان ساری ہیبت ناکیوں کی خالق وہی ہستی ہے جس نے کشمیر کے دل کش حسن پاش جمال افروز خطے کو اپنی رعنائیوں کا مظہر بنایا - پھولوں کی عطر بیزیاں، آبشاروں کی ترنم ریزیاں، جھرنوں کے داؤدی ترانے اور ندیوں کے مسحور کن گانے جہاں رنگ برنگ، جہاں بہ ہر جا دو سو، جہاں پتی پتی ڈالی ڈالی، سوتی ہوئی جھیل، پتھروں سے پھسلتی چاندنی، شب ماہتاب کی خاموشی، عطر میں بسی ہوئی، دریا کنارے سویا ہوا ہر منظر وجد آور اور ہر سماں کیف و نشاط سے لبریز - یہ ہے رب کی ربوبیت فاطر کی فطرت، لیکن اندرونی حقیقت کون دیکھے، صورت دیکھی راز و حکمت کون جانے - شہاب سے لے کر لالہ صحرا تک سب کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے، سب کی پیدائش ایک ہی نفس (منفیات) سے ہوئی - پھر بُو خُو صورت سیرت رنگ طبیعت مزاج اور خاصیت کے چند در چند اختلاف اپنے اندر کیوں مثبت حقیقت رکھتے ہیں - کہربائی لہریں اور برقی موجیں کیوں رنگ برنگ کی جلوہ آفرینیاں کر رہی ہیں - یہ ساری کارگاہ انسان کی تربیت گاہ ہے تاکہ انسانی پودا آگے چلے بڑھے اور بڑھے یہاں تک کہ عرش سے بھی اوپر پہنچ جائے -

اَلْعَزِيْزُ - وہی غالب عزت والا حکمراں اس کی عزت اور غلبہ دیکھنا ہو تو کروڑوں آسمانوں میں دیکھو، لاتعداد زمینوں میں دیکھو، سورج کی چمکیلی آتشیں شعاعوں سے پوچھو، چاند کی خنک سکون بخش روشنی سے پوچھو، کرنوں کا زینہ بنا کر آسمانوں سے اترنے والے چمکاروں سے سلام کرو - باغ و راغ، دشت و جبل، ریت کا ذرہ، پھول پتی، پتی کی رگ رگ، سیپ کا موتی، شبنم کا قطرہ، سمندر کی ہر لہر اور برقی موجوں کی ہر کرن تم کو غیبی ہستی کی عزت اور غلبہ کی اطلاع دے گی - کیا تم کو بن دیکھی اور ان دیکھی طاقت، پھول کی ہر مہک، نسیم کی ہر لپک اور شعاعوں کی ہر چمک میں نہیں دکھتی - دیکھو کالے بادل میں بجلی تڑپی اور تڑپ کر چھپ گئی - سمجھے کون چمکا - کس کا نور دمکا اور کون جھپکا - شاہدِ مستور نے اپنے نورانی ہاتھوں کو ظلمات کے سیاہ برقعے کے اندر سے نکال کے نورِ نظر سے زیادہ تیز حرکت دی اور چھپا لئے - یہ غلبہ، یہ تصرف، یہ حکومت اس کی عزت و ربوبیت کی قسم ہر آن ہے ہر زمان ہے ہر شان میں ہے - یہ کیف اور ہر شکل میں ہے - اسی لئے تو العزیز فرمایا - صفت مشبہ کا صیغہ بولا - نہ ماضی نہ مستقبل ہر زمانہ کی قید سے آزاد اور ہر مکان کی خصوصیت سے بالاتر -

اَلْغَفَّارُ - ہر پتی انوارِ ربوبیت دیکھ رہی ہے - ہر ذرہ آفتابِ الوہیت کی شعاعوں کا مطالعہ کر رہا ہے - ہر قطرہ کھول کھول کر اسرارِ عزت سمجھاتا جا رہا ہے - ساری کائنات کا دل الوہیت کا نشیمن ہے - کل سنسار کی آنکھیں تجلیاتِ ربانی سے خیرہ ہیں - عرش سے فرش تک ہر چیز اس کی تسبیح و تہلیل کے نغموں سے گونج رہی ہے - تمام جہان دستورِ ربوبیت پر چل رہا ہے - لیکن آہ سرکش انسان قدم قدم پر آئینِ فطرت کو توڑ رہا ہے - بادہ خوری و خود پرستی سے سرشار جھومتا چلا جا رہا ہے اور انانیت کے پاؤں سے تشریعی ربوبیت کو پامال کر رہا ہے - پھر بھی ربّ دو جہاں کی ربوبیت اس پر مہربان ہے - سرکش باغی کو بھی اپنے دامنِ عافیت میں چھپائے ہوئے ہے - ہر لغزش پر اس کو سنبھالتی اور ہر ٹھوکر پر اس کو تھامتی ہے - مغرور انسان کے جرائم پر سارے سنسار کا رب تہ بہ تہ پردے ڈال رہا ہے - ہر سانس اور ہر آن اس کی خطاؤں کو معاف کر رہا ہے - وہ بہت ہی پردہ پوش اور معاف کرنے والا ہے -

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ - مجاہد، قتادہ اور مقاتل نے کہا - ھو ضمیر قرآن مجید کی جانب راجع ہے - یعنی قرآن مجید ایک عظیم خبر ہے - مرجع اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں لیکن معمور ذہنی ہے - ان بزرگوں نے قرآن کو اطلاعِ عظیم قرار دیا - بہت خوب کیا

حقیقت میں قرآن کس اطلاع کس خبر اور کس تعلیم کا حامل نہیں۔ یہ صحیفہ فطرت ہے، درسِ شریعت ہے عین حقیقت ہے درسِ حیات نہیں۔ مجسم زندگی ہے۔ علامہ شعرانی نے کہا تھا کہ اسلام یعنی تعلیم اسلام آغاز میں محض شریعت تھی اور آخر میں حقیقت بن جائے گی۔ قرآن مبدء کا صحیح پتہ دیتا ہے۔ معاد کی سچی تصویر کشی کرتا ہے۔ عبدیت عبادت، اخلاق اور سیاست کے احوال ڈیڑھ سو آیات میں ظاہر فرماتا ہے مگر ایسے جامع طریقہ سے کہ لیجسلیچر اور قوانینِ زندگی بنانے والی دنیائے انسانیت حیران ہے۔ صحیفۂ کائنات کے ورق ورق کو الٹتا ہے تو اس طور پر کہ ہر سبزے کی ہڈیاں، پٹھے، خون، بال، کھال، پتیاں، شگوفے، پھول، خوشے، رس، پھل اور مزہ غرض کوئی کیفیت چشمِ بصیرت سے اوجھل نہ رہے۔ آیاتِ فطرت کو ۷۵۶ مقامات میں بیان کرتا ہے تو ایسی وسعتِ نظر کے ساتھ کہ کتاب سائنس کے قدیم و جدید مفسر انگشت بدنداں اور محوِ حیرت ہیں لیکن جاہل اور احمق انسان، کور بصیرت اور بے بصر انسان دیکھتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ پڑھتا ہے اور پرواہ نہیں کرتا۔ سنتا ہے اور سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ قرآن مجید ایک عظیم الشان اطلاع اور ہر چیز کا مکمل خبرنامہ ہے۔

عقل کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر دوڑنے والے کہیں خندق و غار میں گر رہے تھے، کہیں نوکیلے پتھروں سے ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ کہیں پہاڑوں سے ٹکرا کر زخمی ہو رہے تھے۔ کون جانتا تھا زندگی کیا چیز ہے۔ کھانا پینا سونا اور مشینی بچے پیدا کرنا زندگی کا محور تھا۔ اسی محور پر انسانی حیات گھوم رہی تھی۔ جزا سزا عذاب ثواب غرض شجرِ حیات کے ہر پھل کا تصور ناممکن تھا۔ کچھ قانونِ پاداش کی شدھ بدھ رکھنے والے تھے بھی تو کور چشم احول اور کج دماغ۔ قرآن نہ ہوتا تو یہ الہیاتی حقیقت طبیعیاتی جامہ کس طرح پہنتی۔ مافوق الشعور کو ماتحت الشعور کون بناتا۔ اتنی بڑی اطلاع اور فوق الادراک حقیقت کی لفظوں میں تصویر کشی قرآن نے ہی تو کی۔ سر بے نیازی گھمانے والو تمہیں خبر قرآن کی عظمت کا احساس کیسے ہو۔ تم نے اس کائنات کے اوراق کو ہی کب پڑھا ہے۔ تم نے دستورِ حیات ہی کا کب مطالعہ کیا ہے۔ تم نے درسِ انسانیت ہی کب سیکھا ہے۔ تم تو ہر سبق سے رخ موڑ رہے ہو۔ ہر موعظت سے گردن پھیر رہے ہو۔ تمہاری عادت ہی یہ ہے کہ حق و صداقت سے روگردانی کرتے رہو کیا نہیں کہ پہلے تم اہلِ اعراض تھے، اب صاحبِ توجیہ بن گئے۔ نہیں تمہاری تو حالت ہی یہی ہے کہ علم اور عظیم الشان ہیبت و جلالت والے علم کی طرف سے صفحۂ رخسار کو گھما لیتے ہو۔

بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ نبأ عظیم سے مراد ہے قیامت۔ بیشک قیامت بھی بڑی ہولناکیوں اور عظمتِ شان سے بھری ہوئی۔ ہیبت انگیزیوں کی ایک اطلاع ہے۔ نظامِ کائنات کا درہم برہم ہونا، جہانِ مادیت کا ورق ورق بکھرنا، قانونِ توازن کا ٹوٹ جانا، آسمانوں ستاروں اور تمام معلق گیندوں کی کشش، طاقت کا کمزور ہو جانا اور غالب و مغلوب ہو کر باہم دیگر ٹکرا جانا کتنا بڑا حادثہ ہوگا۔ پھر عملی زندگی کا خاتمہ اور پاداشی زندگی کا آغاز، تغیرات و انقلابات کی انتہا اور دوامی حیات کی ابتدا کیسا عظیم الشان سانحہ ہوگا۔ شبِ زندگی کا صبحِ قیامت سے تبادلہ نبأ عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

مقصودِ بیان اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ کے الفاظ اور ترکیب سے کئی امور مستنبط ہو رہے ہیں (۱) رسولِ پاک مقلب القلوب اور متصرف کارساز نہ تھے صرف عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے تھے (۲) حضورؐ ساحر، شاعر، کاہن وغیرہ نہ تھے بلکہ نبی تھے (۳) نبی کا کام (بشارت کے ساتھ) ڈرانا بھی ہے۔ آیت مامن الٰہ الا اللہ الواحد میں نفی و اثبات مفید حصر ہے اور الوہیت مجازی ہو یا حقیقی سب کی ماسوا اللہ سے نفی ہے۔ واحد کا لفظ وحدت کا حصر ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی وحدتِ حقیقیہ اللہ ہی کو حاصل ہے دوسری چیزوں کو واحد کہنا مجازی ہے۔ واقع میں کوئی بھی واحد نہیں۔ القہار سے عمومی تسلط و اقتدار اور رب سے عمومی رافت و ربوبیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ قہار مبالغہ کا صیغہ ہے اور مفعول مذکور نہیں۔ اس سے ہمہ گیر اقتدار اور محیطِ کل تصرف کی طرف ایما ہے۔ العزیز ذاتی عزت و قوت کو ظاہر کر رہا ہے جو قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہے۔ الغفار سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں سے جرائم اور خطاؤں کا صدور دانستہ نادانستہ ہوتا ہی رہتا ہے جن کو خدا معاف فرماتا ہے۔ نبأ عظیم سے مراد اگر قرآن مجید ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک بہت بڑا اطلاع نامہ، دستورِ زندگی، مبدء و معاد اور طبعیات و الہیات کی انکشافی دستاویز ہے وغیرہ۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ○ إِنْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ

جبکہ عالم بالا کے لوگ آپس میں بحث کر رہے تھے تو مجھے انکی کچھ بھی خبر نہیں تھی مجھے تو بس وحی کیا گیا ہے کہ میں تمہیں صاف صاف

مُبِينٌ ○ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِينٍ ○ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ

ڈر سناؤں جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں پھر جب اس کو پورے طور پر

فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ○ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ○ إِلَّا إِبْلِيسَ

بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اسکے لئے سجدہ میں گر پڑنا پھر سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ایک ابلیس نے ایسا نہ کیا

اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ○ قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ

غرور میں آگیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے ہم نے پوچھا کہ اے ابلیس تجھ کو اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا

بِيَدَيَّ ۖ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ○ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِنْ

کس نے منع کیا کیا تو نے غرور کیا یا تو بلند مرتبہ لوگوں میں تھا اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بہتر ہوں مجھ کو آپ نے آگ سے

نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ○ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ○ وَإِنَّ عَلَيْكَ

بنایا اور اس کو مٹی سے بنایا فرمایا پھر تو یہاں سے نکل باہر ہو کیونکہ تو ہمارے دربار سے راندہ گیا اور تجھ پر قیامت

لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ○ قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ

تک میری لعنت ہے اس نے عرض کیا کہ اے رب مجھے مُردوں کے زندہ ہونے کے دن تک تو مہلت دے فرمایا جا تجھ کو

الْمُنْظَرِينَ ○ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ○ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ

ایک وقت معین تک مہلت ہے اس نے عرض کیا کہ مجھے بھی آپ کی عزت کی قسم ہے ان سب بنی آدم کو گمراہ ہی کر کے

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ○ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ

چھوڑوں گا بجز آپکے ان بندوں کے جو ان میں خالص ہیں فرمایا حق بات یہ ہے اور میں حق بات ہی کہا کرتا ہوں کہ میں تجھ سے اور جو ان میں تیری

مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ○

پیروی کریں گے سب سے جہنم بھر دوں گا

تفسیر جو لوگ اللہ کی ہستی کے قائل ہیں ان کی دو شاخیں ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو اس ساری کائنات کا سرچشمہ اللہ کی ذات کو جانتا ہے لیکن بلا ارادہ بلا اختیار وہ خلا سے اس جہان کا صدور اسی طرح جانتا اور مانتا ہے جیسے سورج سے شعاعوں کا، آگ سے حرارت کا، پھول سے خوشبو کا۔ دوسرا گروہ اللہ کو خود مختار متصرف اور صاحب ارادہ خالق سمجھتا ہے۔ وہ اللہ کی حکومتِ کونیہ کا قائل ہے لیکن جہاں تک مخلوق کے ارادہ واختیار کا تعلق ہے وہ مخلوق کو مختار خیال کرتا ہے۔ عقل فہم اور رائے کو آزاد جانتا ہے اور نظامِ زندگی کو بنانے بگاڑنے والے قوانین واصول کو وضع کرنے میں اپنی دانش و تجربے کو واحد کفیل سمجھے ہوئے ہے۔ اس کی نظر میں اہلِ دانش کی دانش حکمرانِ مطلق ہے۔ ہر خیر وشر عقلی ہے۔ اچھائی برائی کو جانچنا اور دونوں کا فرق جاننا عقل کا کام ہے۔ اللہ کو نظامِ معیشت، قانونِ مدنیت اور ضابطۂ سماج میں کوئی دخل نہیں۔ حکومتِ کونیہ اگرچہ خدا کی ہے لیکن حکومتِ تشریعیہ کے لئے انسانوں بلکہ تمام دانشوروں کو خدا کی ضرورت نہیں۔ پہلی شاخ خشک دماغ فلاسفہ کی ہے۔ دینِ الٰہی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرا خیال اگرچہ کسی قدر صحیح ہے لیکن اپنی تمام ٹہنیوں اور برگ و بار کے ساتھ صحیح نہیں۔ تیسرا خیال یہ ہے کہ جس طرح اللہ کائنات کا خالق اور خود مختار حکمراں ہے۔ اسی طرح صاحبِ اختیار مخلوق کے لئے ضابطۂ حیات بنانا بھی اسی کا کام ہے۔ اسی کے اوامر و نواہی واجب الاطاعت ہیں۔ کسی کا دماغ ان کو قبول کرے یا نہ کرے۔ ماننا اور تعمیل کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔ تعمیل کے بعد حکمت اور مصلحت اور فوائد و ثمرات پر غور کرنا چاہیئے۔ تعمیل سے پہلے تردد کرنا جرم ہے۔ یہ نظریہ قرآن اور ہر دینِ حق کا ہے۔ ابلیس نے تعمیلِ عمل سے پہلے تردد کیا اور تردد عقلی نے انکار امر تک پہنچایا۔ نتیجہ میں جہنمی ہوا۔ وہ بھی اور اس کی پیروی کرنے والے بھی۔ ملائکہ نے سرِ نیاز جھکا دیا۔ پس جو انسان امر الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے وہ شیطان ہیں اور شیطان کے ساتھی۔ اللہ کی حکومتِ تشریعیہ کا منکر سرکش باغی ہے۔

تحلیلِ اجزاء مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول اور لفظ اختصام کی مراد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اختصام سے مراد قریش کا جھگڑا ہے اور یختصمون کا فاعل بھی کفار قریش ہی ہیں اور بالملاالاعلیٰ کا تعلق یختصمون سے ہے۔ قریش ملائکہ کے متعلق مختلف خیال رکھتے تھے۔ کوئی ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتا اور کوئی جنوں کا۔ ابتداء آیت میں اسی کی نفی ہے۔

بعض علماء نے آیت کی تشریح میں ایک حدیث نقل کی ہے جو روایت کے اعتبار سے صحیح ہے۔ معاذ بن جبل کی روایت ہے ایک روز فجر کی نماز کے لئے باہر تشریف لانے میں حضور کو غیر معمولی دیر ہو گئی۔ ہم منتظر تھے اور ایسا وقت ہو گیا کہ سورج کی نکاس دیکھنے کے لئے ہم نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ اتنے میں سرکار تشریف لائے۔ اقامت ہوئی۔ حضور نے نماز پڑھائی مگر مختصر۔ سلام پھیر کر ارشاد فرمایا۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ اس کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا آج رات میں نماز کو کھڑا ہوا اور جتنی مقدر تھی اتنی پڑھی پھر سو گیا اور اب جاگا۔ میں نے خواب میں اپنے رب کو حسین ترین صورت میں دیکھا۔ اللہ نے مجھ سے فرمایا۔ محمد تم جانتے ہو کہ ملاء اعلیٰ کس بات میں اختصام (جھگڑا، اختلاف) کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا میرے رب میں واقف نہیں۔ یہ سوال جواب تین بار ہوئے۔ اللہ نے اپنا ہاتھ میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا۔ کہ انگلیوں کے پوروں کی خنکی مجھے اپنے سینے میں محسوس ہونے لگی اور ہر چیز کا انکشاف وعرفان ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ نے فرمایا محمد ملاء اعلیٰ کس بات میں اختصام کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کفارات میں (یعنی ان چیزوں کے متعلق جن سے گناہ کی تلافی ہو جاتی ہے) فرمایا کون کون چیزیں گناہوں کی تلافی کرنے والی ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ نماز باجماعت کے لئے قدموں سے چلنا اور مسجد میں نمازوں کے بعد (دوسری نماز کے انتظار میں) بیٹھنا اور ایسے وقت پورا وضو کرنا جس میں وضو کرنا نفس پر بار ہو۔ فرمایا درجات کیا ہیں۔ میں نے عرض کیا کھانا کھلانا، نرمی سے بات کرنا۔ جب اور لوگ سوتے ہوں اس وقت نماز پڑھنا۔ فرمایا کچھ درخواست کرو۔ میں نے عرض کیا پروردگار میری درخواست ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیاں چھوڑنے کی مجھے توفیق دے۔ مسکینوں سے مجھے محبت ہو تو مجھے بخش دے اور رحم فرما۔ اور اگر کسی قوم کو تو آزمائش میں ڈالنا چاہے تو مجھے آزمائش سے بے وفات دینا۔ میں تجھ سے چاہتا ہوں تیری محبت اور تجھ سے محبت کرنے والوں کی محبت اور ایسے کام سے محبت جو تیری محبت کے

حصول کا ذریعہ ہو۔ اس کے بعد حضور والا نے ارشاد فرمایا۔ یہ جواب سچا ہے اس کو سیکھو اور سکھاؤ (رواہ احمد والترمذی وعبدالرزاق وعبد بن حمید وابن نصر والطبرانی والحاکم وابن مردویہ) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ شیخ ابن جوزی نے بھی سلسلۂ روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں آیت میں اختصام سے مراد ہے ملائکہ کا کفارات میں جھگڑا کہ کون عمل کفارۂ گناہ ہے اور کون عمل کفارہ نہیں۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ملائکہ باہم اختصام کرتے ہیں یعنی اُن اعمال کی طرف مسابقت اور پیش قدمی کرتے ہیں جو گناہوں کی تلافی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جن اعمال سے گناہوں کی تلافی ہوتی ہے جب مسلمان وہ اعمال کرتے ہیں تو ان کو لے جانے کے لئے ملائکہ باہم پیش قدمی کرتے ہیں اور ہر ایک ان اعمال کو لے جاکر بارگاہِ الٰہی میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ میرے نزدیک ان تمام شارحین نے آیات کے سیاق و سباق پر غور نہیں فرمایا۔ ہو سکتا ہے کہ فرشتے کفارات میں مسابقت کرتے ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اختصام کسی نیکی کی جانب پیش قدمی کو بھی کہتے ہیں لیکن حضور والا نے حدیث میں کہیں بھی نہیں فرمایا کہ آیت میں ملاء اعلیٰ کے اختصام سے کفارات میں اختصام مراد ہے۔ نہ خواب بیان فرمانے کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے اُس خواب اور اس آیت کا کوئی لگاؤ ثابت ہو سکتا۔ خود ساختہ تعیین ناقابلِ التفات ہے۔ ہاں ان آیات میں ملائکہ کا آدم کے متعلق اختصام مذکور ہے اور سورہ بقرہ کے شروع میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے بلکہ وہاں ملائکہ کا انسان کے متعلق یہ قول بھی مذکور ہے کہ یہ زمین پر خون ریزی اور فساد کرے گا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آیت میں اختصام سے مراد بھی اختصام نہ ہو جو یہاں مذکور ہے۔

اس کے علاوہ ملاء اعلیٰ سے مراد صرف ملائکہ لینا بھی بے ثبوت تعیین ہے۔ ابلیس [illegible] ملاء اعلیٰ کی صف میں شامل تھا اور اللہ سے اُس نے گستاخی بھی کی تھی اور بے ادبی کے ساتھ مکالمہ بھی کیا تھا اس لئے اختصام کرنے والوں میں ابلیس کو بھی داخل کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

آیت سے سُلجھا ہوا استنباط اس امر کا کیا جاسکتا ہے کہ کافر اور مومن کا جھگڑا نیا نہیں [illegible]۔ تخلیقِ آدم کے بعد ہی ابلیس نے حکمِ الٰہی سے سرتابی کی تھی اور ملائکہ نے بھی (نافرمانی کی نیت اور گستاخی کے ارادہ سے نہیں بلکہ) [illegible] کے لئے کچھ سوال کئے تھے۔ ان تمام باتوں کا علم رسول اللہ کو بغیر وحی کے نہیں ہو سکتا تھا پس رسول کی پیش کردہ یادداشت سے منہ پھیرنا اور الٰہی موعظت نامے سے گردن موڑنا.... حقیقت میں اللہ کے حکم سے گردن کشی اور اعراض ہے جس کی سزا وہی ہے جو سب سے پہلے نافرمان ابلیس کے لئے مقرر کی گئی تھی اور ملاء اعلیٰ کے اختصام کے وقت اس کو ظاہر کر دیا گیا تھا پس رسول کا فرض ہے۔

اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ کا فرض وحیِ الٰہی کے ذریعہ صرف اتنا ہے کہ وہ کھول کر (ابلیس والی سزا سے) نافرمانوں کو ڈرا دیں اور واضح طور پر بیان کر دیں کہ شیطان کو دوست نہ بناؤ ورنہ اسی کے گروہ میں تم بھی شامل کر دیئے جاؤ گے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ٥ تخلیقِ آدم سے پہلے اللہ نے فرشتوں سے مشورہ نہیں لیا تھا بلکہ تخلیق کے بعد چونکہ ملائکہ کو سجدۂ آدم کا حکم دینا تھا اس لئے اپنے ارادہ کا اظہار پہلے سے کر دیا۔ طین سے مراد ہے گوندھی ہوئی مٹی، گارا۔ خالق کے معنی ہیں اندازہ کے ساتھ بنانے والا۔ بشر سے مراد ہیں آدم۔ یہ لفظ معنی کے لحاظ سے جن کی ضد ہے۔ جن کے معنی ہیں پوشیدہ اور بشر کے معنی واضح، ظاہر، کشادہ وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی سے پہلے اس زمین پر جن آباد تھے۔ جب جنوں کو جزائر اور بیابانوں کی طرف نکال دیا گیا تو اس زمین پر آدمیوں کو آباد کرنا چاہا۔ اس جگہ آیت میں فرشتوں کا جواب اور پھر اللہ کی طرف سے رد الجواب کچھ بھی مذکور نہیں۔ یہ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ٥ اللہ نے فرشتوں سے تخلیقِ آدم کا ارادہ ظاہر فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ جب آدم کے قالب کو ٹھیک کر کے اپنی طرف سے اس میں رُوح پھونک دوں تو تم اس کو سجدہ کرنا۔ ملائکہ کی حقیقت کیا ہے۔ کن فرشتوں کو اطلاع دی گئی تھی۔ سجدہ کرنے کا حکم کن کن کو تھا۔ سجدہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی سیر حاصل بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔ اعادہ موجبِ طوالت ہے۔ یہاں رُوح کی حقیقت اور یاءِ متکلم کی طرف اضافت اور لفظ نفخ کے معنی کی تنقیح کرنی ہے اور روحی پر سجدہ کیوں لایا گیا اس کو بتانا ہے۔

کرخی نے صراحت کی ہے کہ جمہور متکلمین کے نزدیک روح ایک لطیف جسم ہے جب وہ کثیف مادی جسم میں داخل ہوتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں علمائے شافعیہ کا بھی یہی قول بتایا ہے اور اس قدر زائد لکھا ہے کہ لطیف جسم کا خاکی جسم میں ساری ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سبز ٹہنی میں پانی کی طراوٹ۔ اہلِ فلسفہ اور اکثر صوفیا کہتے ہیں کہ روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ ایک جوہر ہے جو بذاتِ خود قائم ہے اور انسانی بدن کا انتظام اسی سے متعلق ہے۔ غزالی اور راغب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ خازن نے لکھا ہے کہ بعض اہلِ علم کے نزدیک روح وہ جوہرِ قدسی ہے جو بدن میں ایسی ہی ساری ہے جیسے مکان میں روشنی پھیلتی ہے۔ اکثر علمائے اسلام روح کو ناقابلِ حل عقدہ سمجھتے ہیں۔ مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ علماء ربانیین کو روح کا علم ہو سکتا ہے اور آیتِ قرآنیہ میں جو ما اوتیتم من العلم روح کے متعلق وارد ہے تو اس میں یہودیوں کو علمِ روح سے مایوس کیا گیا ہے۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ کیا روح کا حلول جسم میں ہے تو متکلمین اور شوافع وغیرہ کے قول پر جواب اثبات میں ہوگا۔ اس صورت میں روح کوئی خفیف ترین چیز قرار پائے گی جو پھونکی جانے کے قابل ہوگی۔ لیکن اکثر صوفیا اور غزالی وغیرہ کے مسلک پر روح سے بدنی انتظام کا تعلق ہے اور بس۔ حلول و دخول نہیں۔ پھر نفخ کے کیا معنی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ نفخ حقیقی نہ ہوگا بلکہ کوئی تشبیہی معنی یا بطور استعارہ خاص کیفیت مراد ہوگی۔ مثلاً کامل اثر انداز اور متصرف بنانا جسمانی نظام کو روح کے سپرد کر دینا، خاکی بدن کو زندہ بنا دینا وغیرہ۔ میرے خیال میں صوفیاء کی رائے کچھ کچھ قرینِ صحت ہے۔ حقیقت میں روح پھول کی خوشبو نہیں، سبز ٹہنی کی طراوت نہیں، سورج کی روشنی نہیں، ستاروں کی چمک اور بجلی کی دمک نہیں، دماغ کا تصور نہیں، قلب کا وجدان نہیں، شراب کا نشہ نہیں، بدمست کی مستی نہیں، لطیف ترین نسیم نہیں، غیر مرئی آتشیں سیال نہیں، حیوانی طاقت نہیں، طبعی قوت نہیں، نفسانی بخار نہیں، خون سے اٹھنے والا گیس نہیں، سادہ کیفیت نہیں، مرکب حقیقت نہیں، پھر کیا ہے، کیسی ہے، کہاں ہے۔ یہ ناقابلِ حل گرہ ہے۔ لہروں کا اٹھان، دماغ کا عرفان اور قلب کا وجدان تو اس کا ثانوی اثر ہے۔ شاید وہ غیر محسوس کشش ہے جو حقیقت سے لبریز ہے، ناقابلِ تصور وائرلیس ہے جو انفعال و فعل اور تاثر و تاثیر کا سرچشمہ ہے۔ غیر مادی ہے مادہ کی حکمران، مادی ہے جس کا مادہ ہے خالص عرفان۔ اہلِ دانش کہتے ہیں اس کا شمار کائناتِ امر میں ہے۔ میں کہتا ہوں وہ جلوۂ قدرت ہے، لمعۂ حکمت ہے۔ نورِ الٰہی کا پرتو ہے۔ یونہی تو اس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔ بدن میں ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں۔ ہر کیفیت کا منبع ہے اور ہر کیفیت سے خالی۔ تمام زمانی مکانی قیود سے آزاد اور تغیر و انقلاب سے پاک۔ ایک حقیقتِ مستورہ ہے جس کے مظاہر ان گنت ہیں۔ ایک عرفان پاش شمع ہے جس کی کرنیں لاتعداد ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہے۔ میرے خیال میں تو نہ جوہر ہے نہ عرض۔ نہ بدن کے اندر ہے نہ باہر، نہ اس کی کوئی شکل ہے نہ رنگ نہ بو نہ مقدار، لیکن ہر رنگ سے رنگین، ہر مقدار میں نمودار، ہر شکل میں نمایاں، اور ہر بو میں ہویدا اور اس کے باوجود ہر کثافت سے مبرا اور ہر آلائش سے آزاد۔ خدا جانے وہ کونسی حقیقت ہے جو متضاد طاقتوں کا منبع اور مختلف حالتوں کا مخزن ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ نہ روح ہے نہ روحانی بلکہ روح اس کا ایک خاص کرشمہ اور ایک مخصوص پرتو ہے۔ تمام مخلوقات کو اللہ سے وہ تعلق نہیں جو روح کو حاصل ہے۔ پس اللہ نے خاکی پتلا بنا کر اپنا مخصوص پرتو جس کو روح کہا جاتا ہے اس پر ڈالا اور وہ زندہ ہو گیا۔ اللہ علیم ہے کہ پھونکنے سے کیا مراد ہے۔ بظاہر تو یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ واقع میں روح کی حقیقت ناقابلِ بیان ہے۔ اصحابِ کیف وجدانی طاقت سے کچھ حاصل کر لیں تو کر لیں جیسا کہ شاہ صاحب کا مسلک ہے ورنہ علوم کسبیہ کے تمام مددگار اس جگہ بیر انداز ہیں۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ کلہم سے تمام ملائکہ کی تاکید ہوئی اور اجمعون سے بقول زمخشری (فی الکشاف) یہ مفہوم مستفاد ہوا کہ سبھوں نے ایک ساتھ سجدہ کیا۔ سجدہ کرنے کا وقت جدا جدا نہ تھا۔ باقی تشریح پہلے گزر گئی۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ۔ استثناء منقطع ہے۔ حقیقت میں ابلیس ملک نہ تھا بلکہ ملائکہ میں شامل ہونے کی وجہ سے مامور بالسجود تھا۔ ایک اور آیت میں استکبر سے پہلے ابیٰ بھی آیا ہے یعنی ابلیس نے انکار کیا اور انکار کی وجہ صرف سرتابی نہ تھی بلکہ اس کی خود پسندی اور

برخود غلطی تھی۔ اُس نے اپنی ذات کو بڑا سمجھا۔ حکم کا مقابلہ اپنے اجتہاد اور خود تراشیدہ حجت سے کیا۔ اول تو غلط طور پر یہ سمجھ لیا کہ میں آدم سے اعلیٰ اور برتر ہوں۔ گویا آگ کی برتری مٹی پر اور اپنی تخلیقی برتری آدم پر اُس نے ذاتی سمجھی۔ پھر اپنے مفروضہ پر اپنی حجت کی بنیاد رکھی اور امر کے مقابلہ میں تخلیقی برتری کو پیش کیا۔

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ یعنی ابلیس کافروں اور احسان فراموش کرنے والوں اور امر الٰہی کی صداقت و وجوب کا انکار کرنیوالوں میں سے تھا۔ مطلب یہ کہ اللہ کو پہلے ہی سے علم تھا کہ یہ احسان فراموش ہے۔ خداداد فضیلت کو ذاتی فضیلت سمجھ کر تعمیل امر سے انکار کریگا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ آیت میں کَانَ کے معنی ہیں صَارَ یعنی تعمیلِ حکم کا انکار کرنے اور حکمِ الٰہی کا مقابلہ اپنی اٹکل سے کرنے کے سبب ابلیس کافروں میں سے ہوگیا۔ پہلے اگرچہ عابد اور وصفِ ملائکہ میں داخل تھا لیکن برخود غلطی اور انکار و استکبار نے اس کو کافر بنا دیا۔

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۖ یعنی اللہ نے ابلیس سے فرمایا میں نے خود جس کو بنایا (اس کی تخلیق کسی دوسرے کی ممنون نہیں) اور تجھے سجدہ کا حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ دو چیزیں سجود سے مانع ہوسکتی تھیں (۱) یا تو وہ میری مخلوق نہ ہوتا اور کسی دوسرے خالق کو اس کی پیدائش میں دخل ہوتا تو تیرے لئے سجدہ نہ کرنے کی ایک وجہ پیدا ہوسکتی کہ جس کی تخلیق میں اللہ کو دخل نہیں، جس کی پیدائش اور ہستی کا کوئی تعلق خدا سے نہیں اس کو سجدہ کرنا کیسا (۲) یا میں نے سجدہ کرنے کا حکم نہ دیا ہوتا تب تجھے اپنی رائے اور اجتہاد پر چلنے کا حق پہنچ سکتا تھا۔ جب دونوں وجوہ میں سے کوئی وجہ مانع نہیں تو انکار کا کیا سبب۔

أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ۝ اس فقرہ کا مطلب دو طرح بیان کیا جا سکتا ہے (۱) اللہ نے فرمایا کیا تو نے سجدے سے سرتابی اس وجہ سے کی کہ تو اپنی ذات کو بڑا جانتا ہے یا واقع میں تو بڑا ہے (۲) دوسرا مطلب یہ کہ تو پہلے ہی سے کیا بڑوں میں شامل تھا اور اپنے آپ کو قدیم سے بڑا جانتا تھا یا اس وقت تیرے اندر انانیت اور غرور پیدا ہوا اور تو اپنے کو بڑا سمجھنے لگا۔ پہلا مطلب نہایت واضح ہے۔ اس آیت میں سوال طلبِ علم کے لئے نہیں ہے بلکہ استفہام سے مقصود ہے زجر و توبیخ اور باز پرس۔

ایک ضروری تنبیہ بعض مفسروں نے آیتِ مذکورہ میں ید کے معنی قدرت، صنعت اور حکمت وغیرہ لکھے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے ایسے ہاتھ نہیں جیسے ہمارے ہیں۔ جب اُن پر اعتراض کیا گیا کہ ہر چیز کو اللہ نے اپنی قدرت اور حکمت سے بنایا ہے۔ اس موقع پر آدم کی تخلیق کو کیوں خصوصی اثرِ قدرت قرار دیا تو نیک طینت اہلِ تفسیر نے اس خصوصیت کو شرفِ آدم پر محمول کیا اور فضیلت آدم کا اس سے استنباط کیا مگر بے چارے شاید قرآن کے دوسری آیات کی طرف سے غافل تھے ورنہ اس لفظ کو شرفِ آدم کا ذریعہ نہ قرار دیتے۔ اللہ نے تو چوپایوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ سورۂ یٰسین میں آیا ہے۔ اولم یروا انا خلقنا لهم مما عملت ایدینا انعاما الخ۔ اس صورت میں اگر خدائی ہاتھوں کی ساخت آدم کے لئے باعثِ شرف ہے تو چوپایوں کے لئے کیوں وجہِ فضیلت نہیں۔ اصل نکتہ وہی ہے جو ہم نے مطلب کی تشریح کے ذیل میں لکھ دیا کہ جب ابلیس اور آدم دونوں کو اللہ نے پیدا کیا۔ دونوں میں سے کوئی بھی کسی غیر کی مخلوق نہیں تو امر کے بعد سجدہ سے انکار بے بنیاد ہے۔ بِيَدَيَّ کہنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آدم کی ساخت میں حقیقۃً تو کسی کو دخل ہے ہی نہیں۔ ظاہری تخلیق بھی کسی درمیانی طاقت اور وسیلہ کی ممنون نہیں۔ نہ ملائکہ سے آدم کا پتلا بنوایا نہ کسی اور سے بلکہ خود بذاتِ خود بلا توسطِ غیر پیدا کیا۔ پھر انکارِ سجود کی کوئی وجہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

ایک اشارہ کیا اللہ کے ہاتھ ہیں۔ یہ مبحث اشاعرہ، ماتریدیہ، حنابلہ اور دوسرے علمائے اسلام کا معرکۂ اختلاف ہے۔ محدثین جن میں ابنِ تیمیہ بھی داخل ہیں کوئی تاویل نہیں کرتے۔ ید کے معنی ہاتھ ہی بیان کرتے ہیں۔ مگر آدمی کی طرح گوشت پوست اور ہڈی پٹھے والا ہاتھ نہیں بلکہ دستِ خدا، وہ ہاتھ جو خدا کے لئے مناسب ہے۔ دوسرے علماء تاویل کرتے ہیں۔ قدرت، طاقت، صنعت وغیرہ معانی بیان کرتے ہیں۔ میری نظر میں دونوں معانی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ جس طرح آدم کا پتلا بنانا اس میں اپنی طرف سے روح پھونکنا، ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینا، ابلیس کا انکار کرنا، ابلیس کا ملائکہ کی صف میں شامل ہونا پھر وہاں سے نکالا جانا، مہلت مانگنا، مہلت ملنا، اُس کا قسم

کہا کہ آدمیوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کا اعلان کرنا اور اللہ کو چیلنج دینا اور مقابلہ پر آکر سوال جواب کرنا ایسی باتیں ہیں جن کی تفصیل اور تشریح اپنی جائے سے نہیں کی جاسکتی۔یہ الفاظ ہیں پُر معنی یا مغز لیکن مغز کیا ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔معلوم نہیں یہ سارا قصہ اپنے حقیقی معانی پر محمول ہے یا تشبیہًا اور استعارۃً اور مجازاً کچھ اور معنی مراد ہیں۔اسی طرح اللہ کے ہاتھ کی حقیقت کیا ہے اور مراد کیا ہے نہیں معلوم۔لفظ ہے معروف المعنی مجہول الحقیقت۔اگر ہاتھ کے معنی مجازاً قدرت صنعت مراد بھی لے لئے جائیں تب بھی حقیقت مجہول رہتی ہے۔اللہ کی قدرت اور صنعت اُس کا قادر اور صانع ہونا بجائے خود نامعلوم الحقیقت ہے اس لئے علماء کا اختلاف کسی اکشافی نتیجہ تک نہیں پہنچاتا شروع سے ہی حقیقی معنی پر محمول کر کے معنی کو مجہول الحقیقت قرار دیا جائے یا مجازی معنی پر محمول کر کے مجازی معنی کو مستور الحقیقت سمجھا جائے دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ یعنی ابلیس نے امر کا مقابلہ حجت اور غلط حجت سے کیا۔اُس نے استکبار اور غرور کا اقرار نہیں کیا۔نہ اس نے انکار کیا کہ اللہ نے آدم کو خود بنایا ہے بلکہ جواب میں کہا مجھے بھی تو نے بنایا اور آدم کو بھی۔یعنی میری تخلیق بھی کسی غیر کی ممنون نہیں مگر بنیاد تخلیق میں فرق اور امتیاز ہے۔میری تخلیق نار سے اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اس لئے میں اس سے بہتر ہوں۔آگ مٹی سے افضل ہے یا نہیں۔یہ بات بجائے خود محلِ تامل ہے۔اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی تو یہ نار کو برتری حاصل نہیں۔کثافت لطافت سے کیسے افضل ہو سکتی ہے۔ملائکہ نورانی ملائکہ نور خالص سے بنائے گئے۔اگر تخلیقی برتری کو حجت میں پیش کرتے تو وہ پیش کرتے۔ابلیس کو اپنی برتری ظاہر کرنے کا کیا حق تھا۔سب سے بڑی غلطی ابلیس نے یہ کی کہ قیاس کو نص کے مقابلے میں پیش کیا اور اُس پر جم گیا۔اجتہاد اور قیاس کو ملائکہ نے بھی پیش کیا تھا مگر اول تو امر اور نص سے پہلے پیش کیا تھا اور انسان پر اپنی برتری (تسبیح وتقدیس) کو ظاہر کیا تھا۔دوسرے فرشتوں کا کلام سرکشی کی ہر آمیزش سے پاک تھا۔اُن کا مقصود طلب علم تھا۔وجہ خلافت کا ظہور ان کا منشار تھا۔حقیقت میں وہ امر کے بندے تھے قیاس اور رائے کے پرستار نہ تھے۔ابلیس نے امر اور قیاس کا توازن کرنے کے وقت قیاس کو ترجیح دی۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ حکم ہوا نکل جا تو ملعون ہے۔منہا کی ضمیر کا مرجع اہلِ تفسیر نے مختلف بیان کیا ہے۔جنت یا زمرۂ ملائکہ، یا قربِ الٰہی کی حالت۔رجم لغت میں سنگسار کرنے کو کہتے ہیں۔مرجوم کے معنی ہوئے پتھراؤ کیا ہوا۔مراد ہے پھٹکار زدہ ملعون۔لفظ رجیم بھی کسی خاص زمانے کو ظاہر نہیں کرتا تو کیا ابلیس جس وقت زمرۂ ملائکہ میں داخل ہو کر عبادت کیا کرتا تھا اس وقت بھی رجیم تھا۔اس کا جواب اثبات میں ہے۔مرجوم اور ملعون اس وقت بھی تھا حقیقت میں وہ ملعون ہی تھا البتہ ملعون ہونے کا ظہور سرکشی اور انکار کے بعد ہوا۔

وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اس جگہ لعنت سے مراد ہے رحمت سے مکمل محرومی۔آیت کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی لعنت ابلیس پر صرف قیامت تک رہے گی اور یوم الدین شروع ہونے پر اس کو نجات مل جائے گی۔بلکہ قیامت تک اس دنیا کی زندگی عمل کی زندگی ہے۔اس میں ہر شخص اچھے برے کام کرنے کا مختار ہے۔قیامت کا دن جزا سزا کا دن ہے عمل کا دن نہیں ہے۔جب قیامت تک پوری دنیوی زندگی ملعون مردود اور مطرود ہونے میں گزر جائے تو اس عملی زندگی کے بعد اچھے نتیجہ کی کیا امید ہو سکتی ہے۔مطلب یہ کہ قیامت کا دن ابلیس کے لئے گرفت اور ابدی ہلاکت کا ہے کیونکہ اس زندگی میں قیامت تک اس کو توبہ کی توفیق نہ ہوگی۔پھٹکار میں رہیگا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔جواب میں ابلیس نے اپنے لئے مہلت کی خواہش کی اور مہلت بھی روزِ قیامت تک۔یوم البعثۃ یعنی وہ دن جب لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا جس کے بعد موت نہ ہوگی۔اصل میں ابلیس کی یہ دعا بڑی پُر فریب تھی۔وہ جانتا تھا کہ یوم البعثت آجائے گا تو نظامِ موت ختم ہو جائے گا۔پھر مجھے موت ہی نہیں آئے گی اور بغیر مرے آخرت کے عذاب میں ماخوذ ہونا

عمل اور جزائے عمل کے ضابطہ کے خلاف ہے۔ اس لئے نہ میری موت ہوگی، نہ مجھ پر عذاب۔ شاید اُس کا مطلب یہ بھی ہو کہ بنی آدم میں سے کوئی بھی میری زد سے باہر نہ رہنے پائے۔ یوم البعث پر تو نظامِ تناسلی ختم ہو جائے گا۔ نسلِ آدم میں افزائش بند ہو جائے گی۔ اس طرح تمام اولادِ آدم پر میں اپنے وار کر سکوں گا۔ اللہ چونکہ علیم و خبیر ہے اس سے کسی کی نیت پوشیدہ نہیں اس لئے فرمایا:

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۔ بے شک تو مہلت پانے والوں میں سے ہے (لیکن یوم بعثت تک نہیں بلکہ) وقت معلوم کے دن تک۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب قیامت آنے والی ہوگی تو ایک صور پھونکا جائے گا جس سے تمام مخلوق یہاں تک کہ ملائکہ بھی مر جائیں گے اور اللہ واحد قہار کے سوا کوئی باقی نہیں رہے گا (یعنی اُس وقت ابلیس بھی مر جائے گا) پھر دوبارہ صور پھونکنے سے سب زندہ ہو جائیں گے۔ گویا ابلیس نے تو آخری صور پھونکنے تک کی مہلت مانگی تھی مگر اُس کو مہلت ملی اول صور کے وقت تک۔ اس آیت سے ابلیس کے تکبر کا استیصال بھی ہوتا ہے کہ اول صور تک زندہ رہنا صرف تیری ہی خصوصیت نہیں بلکہ کچھ اور مخلوق (ملائکہ) بھی ہے جو اُس وقت تک زندہ رہے گی اور جب وہ مر گئی تو تیری مہلت کی میعاد بھی ختم ہو جائے گی۔

ایک لطیف تنبیہ اس دنیا میں نور و ظلمت اور خیر و شر کی دو قوتیں کارفرما ہیں۔ انسان کے اندر بھی یہ دونوں طاقتیں ہیں اور باہر بھی یہ دونوں حکمراں ہیں۔ ملک نام ہے خیر کی طاقت کا اور ابلیس نام ہے شر کی طاقت کا۔ انسان جب کسی اچھے کام کی نیت کرتا ہے تو خیر کی اندرونی اور بیرونی طاقتیں اس کی مددگار ہو جاتی ہیں اور برے کام کا ارادہ کرتا ہے تو شر کی اندرونی اور بیرونی طاقتیں اس کی مدد کرتی ہیں اور اس کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہیں۔ بیرونی اسبابِ خیر میں ملائکہ، انبیاء، کتبِ الٰہیہ اور تمام آفاقی موعظت نامے داخل ہیں اور بیرونی اسبابِ شر میں گمراہ کرنے والے آدمیوں اور ابلیس و جنودِ ابلیس کا شمار ہے۔ اندرونی خیر و شر کی انسانی قوتیں بہر حال ہر شخص کو عطا فرمائی گئی ہیں اور بیرونی خیر و شر کا راستہ دکھانے والے آدمی اور دوسری محسوس مخلوق بھی موجود ہے جہاں انبیاء اور صلحاء سیدھا راستہ بتانے والے ہیں وہاں بد عقیدہ، بد کردار انسان نما شیطان بھی قدم قدم پر موجود ہیں۔ رہے غیبی پوشیدہ مددگار تو اگر ابلیس کو تنہا قیامت تک بہکانے کے لئے زندہ چھوڑ دیا جاتا اور پوشیدہ معاونِ خیر نہ ہوتے تو انسان کی تباہی قدم قدم پر سامنے آتی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے یہ گوارا نہیں کیا کہ شر کی بیرونی پوشیدہ طاقتیں تو ہر وقت انسان کو گمراہ اور تباہ کرنے کے لئے آزاد رہیں اور بیرونی غیبی کوئی معاونِ خیر اس کو میسر نہ ہو اس لئے فرمایا کہ تو بھی اسی گروہ میں شامل ہے جس کو نفخِ صور تک کی مہلت دیدی گئی ہے یعنی تجھے یوم النفخ تک اگر اغوا کی آزادی ہے تو کچھ اور معاونِ خیر بھی اُس وقت تک رہیں گے جو آدمی کو خیر کے راستے بتاتے رہیں گے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ o اللہ کے کلام سے ابلیس سمجھ گیا کہ تمام اولادِ آدم تک تو اس کی رسائی ہو نہیں سکتی۔ مہلت یافتہ گروہ اور بھی ہے جو ابلیس کے علاوہ ہے اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اللہ کی ذاتی عظمت و قوت کا مقابلہ اس کے لئے ناممکن ہے اس لئے بولا تیری عزت کی قسم تیرے مخلص منتخب بندوں کے علاوہ میں ان سب کو کج راہ بنا دوں گا، راہِ راست سے ہٹا دوں گا۔ کج راہ بنا دینے کا اختیار تو واقع میں کسی کو بھی نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی خالق اور متصرف نہیں اس لئے کج راہ بنا دینے سے مراد ہے ٹیڑھا راستہ دکھانا۔ ایسے وسوسے پیدا کرنا کہ آدمی ٹیڑھے راستے پر چلنے لگے۔ المخلصین کون لوگ ہیں۔ احادیث میں اس کی کوئی تشریح نہیں۔ شاید انبیاء کی جماعت مراد ہو۔ کیونکہ باجماعِ علماء انبیاء معصوم ہیں۔ اللہ نے ان کو شیطانی وسیسہ کاریوں اور وسوسوں سے محفوظ کر دیا ہے۔ دری اللہ کے چھانٹے ہوئے مخصوص بندے ہیں۔ ممکن ہے کہ عام اہلِ ایمان مراد ہوں۔ کیونکہ شیطان کا کامل تسلط تو کسی مومن پر نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی ایمان والا پورا پورا گمراہ ہو سکتا ہے۔ صحتِ عقیدہ اور ایمان باللہ و رسولہ بھی تو خلوص کی ایک شاخ ہے۔ ایمان دار کیسا ہی بد اعمال ہو اگر اس کا عقیدہ ایمانیہ ہے تو جمہور اہلِ سنت کی نظر میں اس کو کافر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ o۔ اللہ نے فرمایا سچائی (واقعیت) کی قسم (اور میں سچی بات ہی کہتا ہوں) جہنم میں تجھے (اور تیرے پیچھے چلنے والے سب لوگوں کو ضرور بھر دوں گا۔ یعنی تجھے بہکانے کی آزادی ہے۔ لیکن یاد

رکو کہ سزا کا وقت ضرور آئے گا۔ تجھے اور تیرے ساتھیوں کو ضرور سزا دی جائے گی اور تم سب دوزخ میں بھرے جاؤ گے۔ یہ بات بالکل سچی ہے اور اللہ سچی بات کہتا ہے۔ ابلیس نے عزت الٰہی کی قسم کھا کر گمراہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اللہ نے حقانیت کی قسم کھا کر سزا کی صراحت فرمائی۔ حق کا اطلاق حقیقت میں صرف اللہ پر ہے۔ وہی حقیقی الوجود ہے۔ یعنی اللہ اپنی تمام صفات سمیت حق ہے۔ ہر سچی واقعی بات کو بھی حق کہتے ہیں اس لئے دوسرے لفظ حق سے تو سچی بات ہی مراد ہے اور اول لفظ حق سے ذات مع جمیع صفات یا صدق قول یا صدق قول وعمل۔

مقصود بیان: آیت مَا كَانَ لِيَ الخ میں صاف صراحت ہے کہ رسول اللہ کو گروہ ملائکہ کے احوال کی تفصیلی اطلاع نہ تھی اور ملائکہ نے جو اختصام کیا تھا حضور کو اس کی اطلاع صرف اس لئے دی گئی کہ انسان شیطان کو اپنا دشمن سمجھ کر اس کی پیروی نہ کریں اور اغوائے شیطان سے گمراہ نہ ہوں۔ اِنْ يُّوْحٰى الخ سے مترشح ہو رہا ہے کہ حضور والا کی بعثت نہ اس لئے تھی کہ آپ کو یا آپ کے گروہ کو دنیا میں اقتدار اور انسانوں پر حکومت حاصل ہو جائے۔ نہ جتھہ بندی اور سیادت تو پیش نظر تھی، نہ زبان و رنگ اور وطن و قوم کے جھگڑوں میں پڑنا مقصود تھا بلکہ صرف ایک دستورِ حیات پیش کر کے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ابدی تباہی سے بچانا مقصود تھا۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ سے تخلیق آدم سجدۂ ملائکہ اور انکارِ شیطان کا تفصیلی قصہ بیان فرمایا ہے جس سے چند امور مستنبط ہوتے ہیں (۱) ملائکہ اور ابلیس، آدم سے الگ کوئی مخلوق ہے اور مستقل ہستی رکھتی ہے۔ جن لوگوں نے آدمی کی طاقتِ خیر کو ہی فرشتہ اور طاقتِ شر کو ابلیس قرار دیا ہے اُن کا قول غلط ہے۔ یہ خیر و شر کی طاقتیں انسان سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں (۲) اللہ نے ملائکہ کو تیار رہنے کے لئے تخلیقِ بشر کی اطلاع ان کو دی تھی، گویا پورے گروہ ملائکہ کو جس میں اُس وقت ابلیس بھی شامل تھا عبدیت کا امتحان دینے کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس امتحان میں فرشتے کامیاب ہو گئے اور ابلیس ناکام رہا (۳) انسان اور ابلیس کی دشمنی ازلی ہے (۴) تمام آدمیوں کے لئے اس تعریض میں درسِ نصیحت ہے کہ اللہ کے حکم کو ماننے سے ابدی نجات حاصل ہوتی ہے اور شیطان کا ساتھ دینا دوامی تباہی کا سبب ہے۔ اس ٹکڑے پر خصوصیت کے ساتھ اُن مدعیانِ فقاہت کو غور کرنا چاہیے جو منصوصاتِ قرآن و حدیث سے ہٹ کر یا اُن کو توڑ موڑ کر اپنی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور قولِ امام کو (اس حسنِ ظن کی بنا پر کہ امام سے قرآن اور تمام احادیث پوشیدہ نہ تھیں) احادیث پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ زیادۃ القیاس علی الکتاب کے قائل ہیں۔ اُن کو رباطن تیرہ درون صوفیوں کو بھی اس قصہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے جو شریعتِ الٰہیہ کو ترک کرتے اور طریقت کا وجود شریعت سے جدا مانتے ہیں۔ شریعت نام صرف اوامرِ الٰہیہ کا ہے اور طریقت اگر بعینہ یہی ہے تو بہتر ہے ورنہ شیطانی اغوا ہے۔ اُن مسلم مدعیانِ سیاست کو بھی اس سے تنبیہ حاصل کرنی چاہیے جن کی سیاست کی بنا قرآن پر نہیں بلکہ انفرادی یا اجتماعی رائے پر ہے۔ اُن کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ انسان صرف امر کا بندہ ہے۔ امرِ الٰہی کے خلاف امر بنانا یا امر دینا شیطانی فعل ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ سے تمام کائنات کے فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُنہی ملائکہ کا سجدہ کرنا ثابت ہوتا ہے جو مخاطب ہوئے تھے۔ اِلَّا اِبْلِيْسَ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کا شمار ملائکہ میں تھا اگرچہ حقیقت میں وہ ملک نہ تھا۔ استکبر کے لفظ سے معلوم ہوا کہ شیطان کا جرم دُہرا تھا۔ ترکِ تعمیل اور خود پسندی۔ اسی خود پسندی اور غرور نے اس کو کافر بنا دیا۔ وہ صرف ترکِ تعمیل سے کافر نہیں بنا بلکہ امرِ الٰہی کی توہین اور اپنے کو بڑا سمجھنے نے اُسے کافر بنا دیا۔ اَنَا خَيْرٌ الخ شیطان کا مقولہ ہے جس کو ذم کے پیرایہ میں اللہ نے بیان فرمایا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ تخلیقی برتری اور نسلی فضیلت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ افضل وہ ہے جو امر کی تعمیل پر کمربستہ ہو اللہ کے حکم کو ماننا اور اُس پر چلنا اصل بزرگی ہے۔ نور سے بنایا نار سے کوئی بھی وجہ برتری نہیں۔ جو لوگ اس آیت سے مٹی پر آگ کی برتری کا انکار مترشح سمجھتے ہیں اُن کا فہم غلط ہے۔ آیت میں مٹی اور آگ کے تفاضل سے اشارۃً بھی کوئی بحث نہیں کی گئی۔ سیاقِ بیان سے صرف اتنی روشنی پڑتی ہے کہ تخلیقی برتری پر فخر اور امر کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دینی جرم ہے۔ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ الخ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ شیطان کی توبہ کبھی قبول نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک وہ اللہ کی لعنت کا مورد رہے گا۔ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ سے واضح ہو رہا ہے کہ نفخ صور

تک بقائے زندگی صرف ابلیس ہی کی نہیں بلکہ ایک گروہ اور بھی ہے جو یوم النفخ تک نہیں مرے گا۔ الی یوم الوقت المعلوم سے معلوم ہو رہا ہے کہ موت شیطان کو بھی آئے گی اور خاتمۂ عالم کا ایک دن مقرر ہے جو اللہ کو معلوم ہے۔ الا عبادک سے روشنی پڑ رہی ہے اس بات پر کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو شیطان کی زد سے باہر ہیں۔ ابلیس کی طاقت اگرچہ ہمہ گیر ہے لیکن کچھ مخصوص لوگ اس کے دائرے کے اندر نہیں ہیں اور اللہ نے ان کا بچاؤ خود کر لیا ہے وہ اللہ کی طرف سے مخلص ہیں یعنی چھانٹے ہوئے۔ وہ کون ہیں اللہ کے مخصوص عبد عبد ہیں تو کا مجسمہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطانی وسوسوں اور دسیسہ کاریوں کا بھی ایک خاص درجہ ہے اور زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہے جو طاغوتی گمراہیوں کی شکار ہیں۔ بات یہ ہے کہ کثیر میں سے قلیل کا استثنا کیا جاتا ہے جب عباد مخلصین کا استثنا کر دیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کی تعداد کم ہے اور غیر مخلصین کی تعداد زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل صداقت کم ہوتے ہیں۔ والحق اقول سے صراحتہً ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ حق اور سچی بات ہی کہتا ہے۔ اس کی طرف کذب کا احتمال بھی جرم ہے۔ امکان کذب والوں کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور امکان کی وہ کچھ بھی تاویل کریں مگر اس لفظ کو ہی اللہ کی شان میں جرم سمجھنا چاہیئے۔

اہل نظر کو سوچنا چاہیئے کہ ابلیس اللہ کو واحد جانتا تھا۔ اس کے ہمہ گیر اقتدار اور الوہیت تامہ کو بھی مانتا تھا۔ وہ تمام صفات الٰہیہ کا قائل تھا۔ اس کے عقیدہ میں کوئی غلطی نہ تھی۔ صرف استکبار کی وجہ سے جہنم رسید ہوا۔ اس نے اللہ کے حکم کا مقابلہ اپنے قیاس سے کیا اور اپنی رائے پر چلا۔ پس کہاں ہیں وہ اہل ہوس، نفس اور نفسانیات کے پرستار جو اوامر الٰہیہ کو بآسانی استکبار سے ٹھکراتے ہیں اور پھر مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ نا ہم واعظو سوچو کہ تم ان کو کون سی مدہوش کن نیند پلا رہے ہو۔ سوتوں کو تھپکی دے کر اور سلا رہے ہو۔ قدم قدم پر وہ اللہ کے احکام کی توہین کر رہے ہیں۔ کہیں قولی اہانت اور اکثر عملی اہانت مگر تم ان کو جنتی ہونے کی بشارت دیئے جا رہے ہو۔ فویل لکم۔

قُلْ مَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُتَكَلِّفِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ

اے نبی کہہ دو میں تم سے اس پر کچھ مزدوری تو مانگتا نہیں　اور نہ میں جھوٹ باتیں بنانے والا ہوں　یہ تو ان کو تمام

لِّلْعَٰلَمِينَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُۥ بَعْدَ حِينٍۭ ع

جہان کے لئے نصیحت ہے　اور اس کا حال تم کو تھوڑے سے زمانے کے بعد معلوم ہو جائیگا

ع ۵ / ۲۳ / ۱۴

تفسیر بہت سے آدمی ہیں جو ہدایت کا لبادہ اوڑھ کر بھولے بھالے کمزور اور بھوکے انسانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم انسانوں کو فلاح و صلاح کے علمبردار ہیں ہم رہنما ہیں، ہم لیڈر ہیں ہم کامریڈ ہیں۔ لیکن ان تمام چمکدار میٹھے رسیلے الفاظ کی تہہ میں ان کی شیطانی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ اقتدار اعلیٰ کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ وہ ملوکیت و حکومت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ وہ دولت و مال کی ہوسناکیوں میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی گمراہوں کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ سوتوں کو سوتا نہیں جگا سکتا۔ بادہ مستی سے سرشار دوسرے بے ہوش کو نہیں سنبھال سکتا۔ پاگل دوسرے پاگل کا علاج نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ اس شکاری کا جال اگر شکار سے بھر بھی جائے تب بھی بھولی بھٹکی انسانیت کو اس کی تعلیم سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اصلاح کا جھنڈا بلند کرنے والے کو اور اس کے جانشینوں کو کچھ ذاتی منافع حاصل ہو جائیں گے۔ گو دنیائے انسانیت تباہ ہو جائے گی۔ یہ مردار کا طلبگار ہزاروں تدبیریں کرے گا۔ اور چند در چند قوانین اپنی طرف سے ایسے بنائے گا یا بنے ہوئے قوانین کو اپنی طرف سے بگاڑے گا جس میں اس کی نفسانی اغراض کی آمیزش ہو اور ذاتی یا قومی یا وطنی و نسلی مقاصد کا حصول جس سے وابستہ ہو لیکن عام انسانیت اس سے بہرہ مند ہونے کی بجائے زہر خسران مآل اور ہلاکت بردوش ہوگی۔ عزیز النفس ذلیل الاعمال بن جائیں گے اور سیدھے راستے پر چلنے والے گمراہی اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جو لوگ انسان کو شارع آئین ساز اور ضابطہ گر مانتے ہیں اُن کی ہلاکت انہی افکارِ باطلہ اور اعمالِ سئیہ کا نتیجہ ہے۔ انسان اگر خود ساختہ قوانین جاری کرے اور دوسروں کو اپنی تراشیدہ ہدایتوں پر کاربند بنانے کا خواہشمند ہو تو آلائشِ اغراض سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کو اگرچہ کچھ ثمرۂ طیبہ حاصل ہو جائے تب بھی ساری قوم بلکہ کل انسانیت تباہی کے جہنم کدہ سے سوختہ ہو جائے گی۔ ہاں اگر انسانوں کی بہبودی اور سعادت کا علمبردار نفسانی اغراض سے پاک ہو۔ اس کے پیشِ نظر نہ اپنے لئے دنیا کا کوئی مفاد ہو۔ نہ اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور اولاد و والدین کے لئے۔ اور اس کے دماغ کو پیامِ اصلاح میں خورد برد کرنے کا کوئی حق نہ ہو تو اس کا پیام ضرور بارآور اور مخلوق کے لئے نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کے بعد دیکھنا ہوگا کہ وہ پیامِ اصلاح جس کو ایک بے غرض آدمی اپنی دماغی تراش خراش کے بغیر پیش کر رہا ہے وہ کیسا ہے۔ انسانیت کی واقعی فلاح کا حامل ہے یا نہیں۔ ضروریاتِ حیات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ وقتی مصالح کو پیش کر رہا ہے اور اس کا مبلغ اثر صرف مخصوص زمانہ اور مخصوص قوم ہے یا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے اور اس کی فائدہ رسانی بین الاقوامی ہے۔ عام انسانیت کی تشنگی اور گرسنگی کو وہ دور کر سکتا ہے۔ ان تمام امور پر غور کرنے کے لئے وقت چاہیئے۔ گوناگوں علمی تنقیحات پیہم مشاہدات اور مسلسل تجربات کی ضرورت ہے۔ ہر قوم اور ہر زمانہ والے اُس پیام میں اپنی بہبود و نجات کے راستے ڈھونڈ سکتے ہیں اور ایک کے بعد ایک اُس پیام کی صداقت و افادیت سے فائدہ اندوز ہو سکتا ہے۔ چاروں آیات میں انہی ٹھوس حقائق کی تصویر کشی کی ہے۔

تحلیل اجزاء قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ گزشتہ آیات میں آدم و ابلیس کے قصہ سے پہلے فرمایا تھا کہ رسول اللہ کا کام انذار ہے یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے قانونِ خیر و شر کی تبلیغ اور اس سے لوگوں کو واقف بنانا۔ پھر فرماں برداروں اور سرکشوں کے جُدا جُدا نتائج کو ظاہر کر دینا فرضِ رسالت ہے۔ رسول کا کام اور مقصود اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس آیت میں کھول کر اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ نبی کے پیشِ نظر نہ قومی سیادت کا حصول ہے، نہ ملکی قیادت نہ تسلط ملوکیت نہ شاعرانہ سحر آفرینی اور دلکشی، نہ کاہنوں کی اعجوبہ کاری اور غیب دانی کا دعویٰ بلکہ اس کا مقصود ہے اس دستورِ زندگی کو پیش کرنا جو اللہ نے اُس کے پاس بھیجا ہے اور اس دستورِ حیات کی پیش کش بھی مُفت ہے۔ نہ کسی سے مال منال کی تمنا؛ نہ استبداد و عظمت کی خواہش نہ سیادت و قیادت کی آرزو۔ تبلیغِ قانون کی کوئی اُجرت وہ لوگوں سے لینا نہیں چاہتا۔ صرف خدا سے اجر کا خواستگار ہے۔

غور طلب ہے حضور والا کا وہ قول و عمل جو حضورؐ نے اس آیت کی روشنی میں اختیار کیا۔ زکوٰۃ اور صدقات کی کوئی رقم اپنے لئے نہیں حاصل کی بلکہ اپنے ہاشمی رشتہ داروں پر بھی حرام کر دی۔ فتوحات و غنائم میں سے بھی حصّہ رسدی کے موافق حاصل کیا۔ امیرِ لشکر اور بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کے جو ظالمانہ حصّے اسلام سے پہلے مقرر تھے ان کو مٹا دیا۔ یہ بھی اعلان فرما دیا کہ نہ ہم کسی کے وارث نہ کوئی ہمارا وارث، اس نے دنیوی خواہشات کی جڑیں کاٹ دیں۔ نہ خود کسی کا مال بطور وراثت لیا، نہ اپنے بعد کوئی نقد جنس اور منقول غیر منقول جائداد چھوڑی کہ کسی کو میراث مل سکتی۔ ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ کچی جھونپڑی کو کاشانۂ نبوت قرار دیا۔ کھجور کی پتیوں سے بنی ہوئی کھردری چٹائی کو ریشمی قالین کا درجہ دیا۔ گدھے اور اونٹ کی غیر متوازن سواری کو اسپِ تازی پر ترجیح دی۔ فوج میں ایک سپاہی کی طرح برابر کا حصّہ لیا۔ خندقیں کھودیں، پتھر توڑے۔ مٹی اٹھائی، گڑھے سے نکال کر خود باہر پھینکی۔ غرض نبوت، رسالت، ہدایت، تبلیغ اور تعلیم شریعت کی بال برابر کوئی اُجرت نہ حاصل کی بلکہ تحائف و ہدایا کے قبول کرنے میں جو نذرانوں اور چڑھاووں کا اشتباہ ہو جاتا ہے اس کو بھی دور فرما دیا۔ جتنا ہدیہ ایک وقت کسی کا قبول فرمایا اُس سے زیادہ دوسری شکل میں دوسرے وقت اُس کو دیا۔ اگر تحفہ قبول کرنے کا دروازہ کھلا تھا تو دینے کا ہاتھ اس سے زیادہ فراخ رکھا۔ تبلیغ کرنے والوں اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو بھی اگر اجرت لینے کی اجازت دی تو وہ بھی اتنی کم جس سے ادنیٰ ترین آدمی وقتی طور پر شکم سیر ہو سکے۔ اب کہاں ہیں پیٹ پال مولوی، بندگانِ شکم واعظ، نفس پرور خانقاہ نشین اور پرستارانِ ہوس پیر جن کو سیرتِ رسول پر چلنے کا دعویٰ ہے مگر سیرت کا بیسواں حصہ بھی ان کے اندر موجود نہیں۔ مردار دنیا کے حصول کے پیچھے پڑے ہیں مگر علم، عرفان اور حدیث و قرآن کا لبادہ پہن کر کیا اصحابِ شریعت اور ارباب طریقت کی یہ اونچی پختہ عمارتیں، یہ شاداب بارآور باغ، یہ آرام دہ سواریاں

بیٹیوں کے یہ دس دس ہزار کے جہیز اور بیٹوں کی شادیوں میں یہ بے دریغ زرپاشی، یہ قیمتی لبے، لمبے چغے اور سلکی عمامے، یہ روغنی غذائیں کیا ان میں سے کسی میں بھی کردارِ رسول کی جھلک ہے۔ یہ دین فروشی نہیں تو اور کیا ہے۔ کلابِ دنیا تمہارے قلوب کیوں بے حس ہو گئے تمہارے دماغ کیوں ٹھٹھر گئے، تمہاری عقلوں پر کیوں فالج گر گیا اور تمہاری روحیں کیوں مُردہ ہو گئیں۔ زندگی کی کروٹ لو سیرتِ رسول سے اپنے اندر زندگی کی لہر پیدا کرو۔

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝ ۔ گزشتہ آیت میں نفی اجرت کا اعلان کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس آیت میں یہ ظاہر کر دینے کا حکم دیا کہ میں اپنی طرف سے کوئی بناوٹ نہیں کرتا۔ خودساختہ کلام اور خود تراشیدہ دستور پیش نہیں کرتا۔ یعنی وہی کہتا ہوں جو اللہ کی طرف سے مجھے حکم دیا جاتا ہے۔

ایک سوال جس معاملہ میں حضور کے پاس وحی نہیں آئی تو کیا حضور اُس کا فیصلہ اجتہاد سے نہیں کرتے تھے۔ اگر کرتے تھے تو یہ تکلف اور خودساختہ حکم نہ تھا تو اور کیا تھا۔

ازالہ علماء اصول فقہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ پہلے حضور انتظار فرماتے تھے۔ جب کسی پیش آمدہ معاملہ کے متعلق وحی نہیں آتی تھی تو اجتہاد فرماتے تھے۔ اہلِ اصول کا یہ جواب ناقص ہے کیونکہ اجتہاد کے معنی ہیں مختلف نصوص آیات و احادیث کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کرنا۔ لیکن صورتِ سوالیہ میں اجتہاد کے یہ معنی متحقق نہیں ہو سکتے۔ جب انتظار کر چکنے کے بعد بھی وحی نہ آئی تو وحی کی روشنی میں کسی مسئلہ کا استنباط کیسے ممکن ہے بلکہ اس وقت اجتہاد کے معنی ہوں گے قیاس کے یعنی کسی شرعی ضابطہ کے تحت علت جہت اور سبب کے اشتراک کی وجہ سے کسی خاص مسئلہ کو داخل سمجھنا اور عام ضابطہ کے حکم کو خاص جزئیہ پر جاری کرنا۔ لیکن ایسا اجتہاد قیاسی وہ اجتہاد نہیں جس کو اہلِ اصول اجتہاد کہتے ہیں اور اگر اجتہاد کے یہی معنی اصولیوں کو مسلم ہیں تو ہم اس کو وحی کا درجہ ہی دیں گے اور بعض علمائے اصول کا وہ قول صحیح ثابت ہوگا کہ جو حکم حضور دیتے تھے وہی شریعت ہو جاتا تھا یعنی وحی جلی میں اگرچہ اُس کا صراحتہ تذکرہ نہ تھا لیکن حضور کو وحی خفی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں حکم فلاں مسئلہ میں ایسا ہے۔ آیتِ پاک میں صاف موجود ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ پس سرکار کی زبان سے جو لفظ نکل جاتا تھا وہ ہوائے نفس پر مبنی نہیں ہوتا تھا بلکہ نصِ شرعی کا مرتبہ رکھتا تھا۔ حدیث حج میں آیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا حج ہر سال واجب ہے۔ حضور سُن کر خاموش رہے۔ سائل نے تین مرتبہ سوال کیا۔ تیسری مرتبہ حضور نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال فرض ہو جاتا اور تم ادا نہ کر سکتے اور گمراہ ہو جاتے (صحیحین) ایک اور حدیث میں آیا ہے۔ ارشاد فرمایا تم لوگ سفارش کیا کرو۔ اللہ اپنے رسول کی زبان پر جو چاہے گا جاری فرما دے گا۔ ایک اور حدیث میں وارد ہے۔ فرمایا اللہ میری زبان پر حق جاری فرماتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلبِ مبارک آئینۂ کلامِ ربانی تھا اور زبانِ مبارک ترجمانِ وحی۔ پس آیتِ مذکورہ میں تکلف کے معنی ہیں۔ خود تراشیدہ دماغی ساختہ حکم نافذ کرنا اور ایسی بات کرنا جس میں نفسانی بناوٹ کا لگاؤ ہو۔ اجتہاد و نبوت نہ یہاں مراد ہے۔ نہ تکلف کے ساتھ اجتہاد کا کوئی لگاؤ ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ سعید بن جبیر نے ابن عباس کے حوالے سے فرمایا۔ اس جگہ عالمین سے جن و انس مراد ہیں۔ یعنی قرآنِ پاک جن و انس کے لئے ہدایت نامہ ہے کوئی مزدوری یا معاوضہ کی چیز نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر عالمین کے معنی کو اپنی پوری وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یعنی قرآنِ پاک دستورِ کائنات ہے، نظامِ جہان ہے، قانونِ فطرت ہے۔ سارے سنسار کے صحیح معلومات کا کامل ذخیرہ ہے۔ اس کائنات کی حیات کا کوئی دستور ایسا نہیں جو اس کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔ کسی کے جاننے نہ جاننے سے اس کی جامعیت میں فرق نہیں آتا۔ اس کو مشرح طور پر ہم چند آیات سے پہلے لکھ آئے ہیں۔ اگر زیادہ وسعتِ علم کی ضرورت ہو تو سائنس کی روشنی میں تفسیر الجواہر للطنطاوی کا مطالعہ کرو۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ سعید بن جبیر کی روایت کے موافق یہ مطلب ہوگا کہ مرنے کے بعد قرآن کی صداقت تم کو خود معلوم

ہو جائے گی (قتادہ) یا قیامت کے دن تم کو اس کی صداقت معلوم ہو جائے گی (عکرمہ) کلبی نے کہا قرآن مجید کی دی ہوئی وہ خبریں جو آئندہ آنے والی ہیں زندہ رہنے والے زندگی میں جان لیں گے اور جو مر جائیں گے وہ مرنے کے بعد جان لیں گے۔ سدی نے اس کی مثال میں کہا کہ جیسے جنگِ بدر کے دن قریش کو جو تہدید کی گئی تھی وہ اُن پر ظاہر ہو گئی۔ میں نے جو مطلب اوپر والی آیت کا پسند کیا تھا اس کی روشنی میں اس آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ (اگر اپنی کم علمی اور ماحول کی خرابی کی وجہ سے قرآن پاک کے عالی انکشافات اور ساری کائنات کے لئے دستورِ حیات ہونے سے ناواقف ہو تو) کچھ مدت بعد اس کی دی ہوئی خبر تم کو معلوم ہو جائے گی اور جان لوگے کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عین صداقت ہے۔ اس وقت نبأ کا لفظ اپنی پوری وسعتِ معنی کے ساتھ ادا ہو گا۔ اس میں پیشین گوئیاں مبدء و معاد کے متعلق صراحتیں، انکشافاتِ علمیہ سیاسی مدنی اور اخلاقی آئین اور ساری کائنات کے متعلق قرآنی رسالہ سبھی شامل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان تبلیغ اور موعظت کی اُجرت مانگنی اور لینی حرام ہے۔ جب رسولؐ کے لئے جائز نہ تھی تو دوسرے علماء کے لئے کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ حضورؐ کا کوئی فیصلہ خود ساختہ اور بناوٹی نہ ہوتا تھا بلکہ اس کی بناء وحی جلی یا خفی پر ہوتی تھی۔ پس وہ لوگ غلطی پر ہیں جو حضورؐ کے احکام کو قیاسی کہتے ہیں۔ قرآن پاک سارے جہان کے لئے شمعِ ہدایت ہے کل کائنات کی صحیح حقیقت اس میں بیان کی گئی ہے۔ شاعروں کا شعر، راجزوں کا رجز، افسانہ نگاروں کا افسانہ اور فلسفہ کی الجھی ہوئی گتھیاں نہیں بلکہ سارے سنسار کی ایک سچی یادداشت ہے۔ اس کے اصولی ضوابط، تصریحات، انکشافات اور حقائقِ کونیہ کے تذکیے تو بتدریج سمجھ میں آتے چلے جائیں گے اور بقول شعرانی جو چیز آغاز میں صرف شریعت اور قانون کی حد تک تھی آخر میں حقیقت اور واقعیت بن جائے گی۔ اور دنیا جان لے گی کہ قرآن مکمل صداقت کا حامل ہے۔ وغیرہ

سُورَۃُ زُمر

اس سورۃ کا نام سورۃ الغرف بھی ہے۔ سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا معیار اکثر علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو پوری سورۃ یا سورۃ کا بیشتر حصہ کہیں نازل ہوا ہو تو وہ سورت اُسی مقام کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورت کی ابتدائی چند آیات مکہ یا مدینہ میں نازل ہوئیں اور اس لحاظ سے اس کو مکی یا مدنی قرار دے لیا گیا۔ باقی سورۃ کہیں بھی نازل ہوئی ہو اس کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ سورۃ زمر مکی ہے۔ نحاس نے اپنی کتاب ناسخ و منسوخ میں ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ صرف قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم الخ تین آیات جو وحشی بن حرب کے متعلق مدینہ میں نازل ہوئی تھیں مدنی ہیں۔ اکثر علماء نے سات آیات کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس سورۃ کی آیات ۷۲ یا ۷۵ ہیں۔ خطیب نے سراج المنیر میں آخری قول اختیار کیا ہے۔ کلمات ۱۱۹۲ اور حروف ۴۷۰۸ ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ہر رات کو سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر پڑھ لیا کرتے تھے (نسائی) ترمذی کی روایت ہے کہ حضورؐ سوتے نہ تھے جب تک سورۂ زمر و بنی اسرائیل نہ پڑھ لیتے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ

اس کتاب کا نازل کرنا اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے ہے ہم نے آپ کی طرف کتاب برحق نازل کی ہے پس آپ اللہ

اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّیۡنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَالَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ

کی عبادت خاص اسی کی طرف جھک کر کئے جاؤ　دیکھو اللہ ہی کے واسطے خالص عبادت ہے　اور جنہوں نے اللہ کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں)

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ فِیۡ مَا هُمۡ فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ۬ؕ

کہ ہم ان کی اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کر دیں گے　بیشک جن باتوں میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اللہ ان کا فیصلہ کر دے گا

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ هُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۝ لَوۡ اَرَادَ اللّٰهُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی

بے شک جو جھوٹا ناشکرا ہے　اللہ اس کو ہدایت نہیں کرتا　اگر اللہ بیٹا ہی بنانا چاہتا تو اپنی مخلوقات میں سے جس کو چاہتا

مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۝

برگزیدہ کر لیتا　لیکن وہ پاک ہے　وہ اکیلا خدا ئے زبردست ہے

تفسیر جو لوگ برائے نام اللہ کے پرستار ہیں ان میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں ایک ان کا معبود چند مذہبی رسموں کا مرکز ہوتا ہے اور بس عملی زندگی میں وہ اپنے معبود سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ جو دل چاہتا ہے وہ کرتے ہیں اور دل نہیں چاہتا نہیں کرتے۔ شتر بے مہار ہیں۔ آوارہ نفسی، نہ سزا کا اندیشہ نہ پاداش کا ڈر، نہ حشر پر ایمان، نہ دوبارہ زندگی کا یقین۔ معبود کو اپنی رسوم کا محوری نقطہ بھی انھوں نے صرف دنیوی فوائد حاصل کرنے کے لئے بنا رکھا ہے۔ معبود کا اگر ان کو کچھ پاس و لحاظ ہے تو مال اور نسل کی افزائش، مقدمات میں کامیابی اور اسی طرح کے دوسرے لالچ کے پیش نظر وہ اپنے معبود کے فرمانبردار نہیں۔ ان کا معبود ان کی کرداری زندگی کا فرماں روا ہی نہیں۔ وہ خود کوزہ اور خود کوزہ گر، خود آئین ساز حیات اور خود ساختہ آئین کے خود ہی پابند۔ وہ نہیں جانتے کہ معبودیت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو تخلیقی ہمہ گیر طاقت اور نظمی پر حکمت مصالح کا مالک ہو جو ہر طرح کی احتیاج، کمزوری، جہالت اور شرکت سے پاک ہو اور کائنات کا خود مختار آفرینندہ اور حکمراں ہو (۲) ان کا معبود زیادہ سے زیادہ ایک شہنشاہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی نر و مادہ اولاد بھی ہے۔ کچھ وزیر، نائب وزیر، تحصیلدار، تھانیدار، فوجدار، خدمتگار، چوبدار اور دوسرے نظمی عہدیدار بھی ہیں۔ کچھ مخبر جاسوس اور کاتب اسرار بھی ہیں۔ کچھ اہل کار، سکریٹری اور پیشکار بھی ہیں۔ خدا نے ان سب کو مقررہ الگ الگ ڈیوٹی پر لگا رکھا ہے۔ سب سے کام لے رہا ہے۔ ملائکہ اس کی بیٹیاں ہیں۔ عزیر اور مسیح اس کے بیٹے ہیں۔ مریم اس کی بیوی ہے۔ غیبی مؤکل اور کچھ چھپی ہوئی ہستیاں اندرونی کارگزار ہیں۔ غوث، قطب، ابدال، اوتار اور خدا جانے کون کون سے فرضی نام تجاویز بنیاد کچھ قیدی کچھ آزاد اس زمین پر ناظم حاکم اور راج پرکھ ہیں۔ گویا یہ مخلوق اس کی مخلوق نہیں وہ آئینی گورنر ہے اور سب سے نشان اس کی رعایا۔ وہ راجہ ہے اور سب پرجا۔ بغیر مخبروں کے اس کو کوئی علم نہیں۔ بغیر وزیروں کے اس کی حکومت نہیں۔ بغیر کارندوں کے وہ مجبور ہے۔ بغیر پیرو کاروں کے وہ بے بس ہے۔ ستاروں کی روحیں اور چھپی ہوئی موہوم ہستیاں ان عالم کی کارساز ہیں۔ انبیاء، اولیاء، اوتار، مہاتما اور خدا کی بیٹیاں بیٹے فرماں روا ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں میں خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے اور خود عرش بریں کے کسی گوشے میں محو خواب اور استراحت فرما ہے۔ پس ستاروں کو پوجو، عناصر کے سامنے جھکو۔ شیاطین اور بتوں کو مرکز تخیل بناؤ۔ انبیاء اور اولیاء سے مرادیں مانگو۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے سامنے سجدہ ریزی کرو۔ فرش سے عرش تک ہر چیز کے سامنے سر عبدیت خم کرو اور خدا کے سامنے سر بلند رہو یہ نیز مت اس کو ملے کیۂ بغیر بہت

پر پہنچنا ناممکن ہے۔ یہ وسائل ہیں۔ بغیر وسیلہ کے بادشاہ تک رسائی کیسی۔ یہ زنجیر کی کڑیاں ہیں حلقہ در حلقہ تسلسل کے بغیر سرے تک پہنچ جانا محال۔ یہی ذرائع قرب ہیں۔ مقربانِ بارگاہ ہیں۔ اہل دربار ہیں۔ اربابِ اقتدار ہیں۔ ان کی خوشامد ثمر آور ہے۔ ان کی رضامندی دنیا میں کامیاب اور آخرت میں سرخرو کرنے والی ہے۔ پس انہی کا کہا مانو۔ انہیں کو وسائلِ قرب جانو۔ میں کہتا ہوں اس کانی عقل اور چپٹے مغز والے گروہ کو نہیں معلوم کہ اللہ کی طاقت غلبہ اور عزت کس قدر عظیم الشان ہے۔ اُس کی حکمت کیسی ناپیدا کنار ہے۔ اُس کو کسی مددگار، مستشار اور صاحبِ بصیرت وزیر کی ضرورت نہیں۔ وہ عاجز اور کمزور نہیں کہ دستگیری کے لئے بیٹے کا محتاج ہو۔ وہ ناواقف اور جاہل نہیں کہ جلیسوں اور مخبروں کا ضرورتمند ہو۔ وہ بیکس و ناتواں نہیں کہ نائبوں اور معاونوں کے بغیر نظمِ عالم نہ چلا سکے۔ آخر تخلیقِ کائنات کے وقت کس نے اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ کس نے اس کی مشیت میں دخل دیا تھا۔ وہ جیسا چاہتا ہے بناتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اگر اس کو اپنے لئے اولاد ہی کا انتخاب کرنا تھا تو سلسلۂ تناسل اور جورو بیٹے کی کیا ضرورت تھی وہ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا چھانٹ لیتا۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا نہ کوئی وزیر ہے نہ مشیر، نہ بیٹا بیٹی نہ مددگار نہ پیشکار۔ وہ تخلیق کائنات میں جس طرح کسی کا محتاج نہیں اسی طرح انتظام کرنے اور اس سلسلہ کو چلانے میں بھی کسی کی دستگیری کا ضرورتمند نہیں۔ پس کیوں کسی کے سامنے سر جھکایا جائے۔ کیوں کسی غیر کی اطاعت کی جائے کیوں کسی کے تراشیدہ خراشیدہ قانون کو مانا جائے۔ کیوں زندگی اور زندگی کے دستور العمل کا ساز ندہ اور کارندہ کسی مخلوق کو قرار دیا جائے تمام سنسار کی زندگی کا اُٹھان اور بہاؤ اور قانونِ زندگی کا چلاؤ اور پھیلاؤ اسی کے دستِ قدرت اور قبضۂ حکمت میں ہے اس لئے صرف اسی کی اطاعت کرو۔ اُسی کے سامنے جھکو اور سر جھکاؤ۔ اُسی کے قانون کو مانو، اُسی کو کتابِ حیات کا مصنف جانو۔ اس پر بھی اگر تم کو سیدھی راہ نہ ملے تو سمجھ لو حق پوش ناحق کوش جھوٹے کو اللہ کی طرف سے راہِ راست پر چلنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔

تحلیل اجزاء تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ اس آیت میں الکتب سے مراد قرآن مجید اور تنزیل کے معنی ہیں رفتہ رفتہ تھوڑا تھوڑا اُتارنا۔ یعنی اللہ عزیز حکیم نے یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے۔ آیت کے پانچ جزو ہیں۔ ہم ہر جزو کی جدا جدا ضروری تنقیح کرنی چاہتے ہیں۔ نمبرا۔ لفظ تنزیل سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کسی اونچی جگہ سے پستی کی جانب بھیجا گیا ہے۔ تنزیل کے معنی ہیں اُتارنا اور اُتارنے کا یہی مفہوم ہے تو کیا واقعی قرآن مجید کہیں اونچی جگہ رکھا ہوا تھا۔ بظاہر تو یہ معنی غلط ہیں قرآن مجید یا اس کے الفاظ اور معانی اللہ کا کلام ہے۔ اور کلام کا نہ جسم ہے نہ مادہ نہ لمبائی نہ چوڑائی، نہ اس کا انتقال مکانی ممکن ہے۔ ایک صوتِ سرمدی ہے۔ اوتار الصوت سے بے نیاز ہو کر ایک ندا ابدی ہے۔ حلقومِ منادی سے بے لاگ۔ ہوا کا جھونکا نہیں پانی کی لہر نہیں شعلۂ جوالہ نہیں۔ خاک کا بگولا نہیں۔ مراد ہے اس فرشتے کا اُتارنا جو قرآن سیکھ کر سکھانے اور لے کر پہنچانے آتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ نور کدۂ تجرد سے نکل کر دائرہ مادیت تک پہنچنا یہی نزول اور ہبوط ہے۔ یا یوں کہو کہ کلام قدیم قدم سے آیا ہے۔ حدوث کی طرف بے لفظی سے آیا۔ لفظ کی طرف بے کیفی سے آیا۔ کیف کی طرف بے آہنگی سے آیا۔ صوت و آہنگ کی طرف۔ اللہ نے بھیجا رسول کی طرف، اور رسول پاک نے سنایا گنہگار کانوں کو سکھایا خطا وار دلوں کو پڑھایا۔ غلط کار زبانوں پر لوگوں نے سُن کر پڑھا اور پڑھایا۔ سیکھا اور سکھایا۔ جانا سمجھا اور پھیلایا۔ یہ سب مدارجِ نزول اور مراتبِ ہبوط نہیں تو اور کیا ہیں۔ اگر کلام اللہ نیچے نہ اُترتا تو انسان اوپر کیسے چڑھتا۔ کلام نیچے اُترا انسان اُوپر اُٹھا۔ دونوں میں تعلق پیدا ہو گیا۔ ورنہ خالق اور مخلوق میں کیا لاگ کیا لگاؤ کیا مناسبت۔ دوسری بات یہ کہ رسول اللہ پر مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا قرآن اُتارا گیا۔ بقول رازی و خطیب اگرچہ منشاءِ الٰہی تھا کہ حضور والا کو پورا قرآن عطا فرمایا جائے اور بقول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر پورا قرآن الکریم نازل کیا گیا لیکن حضور والا تک بہرحال سورت سورت اور آیت آیت کر کے تھوڑا تھوڑا قرآن حسبِ ضرورت مختلف اوقات میں نازل فرمایا گیا۔ اسی وجہ سے اس جگہ لفظ تنزیل فرمایا۔

الکتب سے مراد باجماع مفسرین قرآن مجید ہے۔ لیکن قرآن لکھا لکھایا اور جمع کیا کرایا تو نازل ہوا نہ تھا۔ نہ جبریل نے حضورؐ کو لکھا ہوا ایک پرچہ کبھی دیا۔ نزول کے وقت تو قرآن تمام اصلاحی نقوش اور حروفِ صوتی سے آزاد تھا۔ پھر اس کو کتاب کہنے کی وجہ سوا اس کے اور کوئی نہیں کہ

آئندہ چونکہ قرآن لکھا جانے والا تھا اور اس کا مکتوب ہونا یقینی تھا اس لئے لفظ کتاب فرما دیا۔ تو گویا لفظ کتاب میں قرآن کے آئندہ مکتوب محفوظ اور مجموع ہونے کی اشارۃً ایک پیشین گوئی اور اخبار عن الغیب اور پردۂ ہدایت دام ہے۔

۲۔ من اللّٰہ۔ اخلاقِ انسانی کو سدھارنے اور عمرانِ بشری کو جور و گمراہی سے بچانے کے لئے بہر حال ایک قانون کی ضرورت ہے۔ لیکن قانون بنانے والا کون ہو۔ آدمی خود اپنے لئے انفراداً یا اجتماعاً قانون بنا لیں یا تخلیقِ انسانی کی طرح اعمال و افکار کو سدھارنے کے لئے بھی اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی ضرورت ہے۔ یہ مبحث ہمیشہ سے اختلافی چلا آ رہا ہے۔ انسانوں کی بیشتر آبادی اپنے افکار و کردار اور اطوار کو خدا سے الگ تھلگ رکھنا چاہتی ہے۔ اپنی تخلیق اور ہستی میں اگرچہ اس کو کوئی دخل و اختیار نہیں مگر اپنی رفتارِ زندگی کو وہ خدا سے بے نیاز سمجھتی اور خود اپنے لئے آئین سازی اپنا حق قرار دیتی ہے لیکن قرآن کی نظر میں یہ خیال لچر اور بیہودہ ہے۔ قانون بنانے والے کے ذاتی اوصاف سب سے اول کامل ہونے چاہئیں ورنہ ناقص دوسروں کے نقصان کا ازالہ کس طرح کر سکتا ہے۔ سوتے کو سوتا کب بیدار کر سکتا ہے۔ مفلوج الاعضا کیسے دوسروں کے ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ جب تمام انسان ناقص الصفات ہیں اور جذباتِ انسانیہ سے کوئی بھی خالی نہیں۔ کسی کا علم ہمہ گیر نہیں۔ کسی کی طاقت ہر جہتی نہیں۔ کسی کو کمالِ تصرف کا اختیار نہیں تو انسانوں کی زندگیاں اور زندگیوں کی رفتار اور رفتار کا نظم کسی کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا حق ہے۔ اسی ٹکڑے میں اللہ نے فرمایا کہ یہ قانون اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے یعنی انسانی زندگیوں کا دستور العمل اللہ نے بھیجا ہے۔ یہ دعویٰ اپنے اندر خود ہی دلیل بھی چھپائے ہوئے ہے یعنی اتنا واضح ہے کہ کسی بیرونی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اللہ کہتے ہی اس ذات کو ہیں جس کے تمام اوصاف کامل ہوں، ہمہ دان ہو۔ ہمہ گیر ہو، ہمہ رحم اور ہمہ غضب ہو، ہمہ ظہور ہمہ بطون، ہمہ اول ہمہ آخر، غرض ہمہ وجود ہو۔ پس اللہ نے اپنے ہمہ صفات ہونے کی وجہ سے ہی یہ دستور العمل بھیجا ہے۔

۳۔ العزیز۔ الوہیت کے لئے تو ہمہ صفات موصوف ہونے کی ضرورت ہے لیکن انسانوں کی درستگی کے لئے آئین بنانے کے واسطے آئین ساز میں دو وصف کامل طور پر خصوصیت کے ساتھ موجود ہونے ضروری ہیں۔ آئین بنانے والا عزت، غلبہ، شوکت، سطوت، اور طاقت والا ہو کمزور نہ ہو۔ عاجز نہ ہو۔ ذلیل نہ ہو اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اللہ سے زیادہ عزت و سطوت والا کوئی نہیں۔ ساری کائنات بیانِ حال اس کی عزت کا اقرار کرتی ہو۔

۴۔ الحکیم۔ آئین بنانے والا خصوصیت کے ساتھ عارفِ کلِ مصلحت ہیں اور حقائقِ واقعیہ سے پورا پورا واقف ہو۔ اور چونکہ اللہ صفت میں حکیم اور حکمت میں کامل ہے اس لئے اُس کو ہی آئین بنانے کا حق ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ اللہ کا ہر کام بے غرض ہے میں کہتا ہوں بے غرض ہونے سے بے حکمت ہونا تو لازم نہیں آتا۔ کچھ مذاہب اور جوگی کہتے ہیں۔ اللہ نے اچھا کیا یا برا کیا، انصاف کیا یا ظلم جو کچھ کیا وہاں انصاف کے لئے دم مارنے کی مجال نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ خیال بیہودہ ہے۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے کامل انصاف اور حکمت سے لبریز ہوتا ہے۔ ظلم اور جہالت کا وہاں شائبہ بھی نہیں۔ ہاں اس کی حکمت سے انسان واقف نہ ہو، تو نہ ہوں لیکن جس قدر علم بڑھتا جاتا ہے حکمتِ الٰہیہ اور عدلِ قدرت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گھڑی ساز کی حکمت کو نہیں جانتا۔ گھڑی بنانے والا اصولِ علاج سے ناواقف ہوتا ہے لیکن اس ناواقفیت سے اصولِ صنعت و علاج کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔ پس خوب یاد رکھو کہ تکوینات ہوں یا تشریعات ہر ایک میں خدا کا عدل و حکمت کارفرما ہے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ۔ کوئی کہتا تھا۔ رسول اللہ کو قرآن جن بتا جاتے تھے۔ کوئی جبریل کی خود ساختہ تلقین قرار دیتا تھا۔ کوئی دماغی تراشیدہ کہتا اور تخیلی محاکات تصور کرتا۔ کوئی نامعلوم غیبی مخلوق کی تعلیم سمجھتا اور قرآن کو کہانت جانتا تھا۔ کوئی عیسائی غلام کو سکھانے کا نتیجہ خیال کئے ہوئے تھا۔ کسی نے قرآن کو مفہوم خدا کا اور الفاظ حضور کے سمجھا۔ کسی نے کہا جبریل سے غلطی ہو گئی۔ قرآن بھیجا گیا تھا علی کے پاس اور دے دیا گیا محمد رسول اللہ کو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں جتنے بھیجے اتنی ان کی تراش خراش۔ اللہ نے اس آیت میں صاف صراحت فرما دی کہ اللہ نے

ہی یہ قرآن رسول اللہ کے پاس بھیجا ہے۔ کسی مخلوق کو اس کی ساخت میں دخل نہیں۔ نہ مرسل الیہ کوئی دوسرا ہے۔
بِالْحَقِّ۔ یعنی قرآن برحق اور سچا ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ خواہ اصولِ فکر یہ ہوں یا قوانینِ طبیہ معارفِ طبیعات ہوں یا معارفِ الٰہیات ابتدائے تخلیق کے متعلق تذکرے اور تبصرے ہوں یا حشر و نشر جزا و سزا اور معاد و منتہا کی بابت مباحث سب برحق ہیں۔ ان میں انہیں غلطی غیر واقعیت اور جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ لیکن کیا اللہ کی الوہیت قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ کی رسالت کو حق جاننا اور صحیح ماننا ہی انسانی صلاح و فلاح کے لئے کافی ہے۔ کیا خدا کا واحد ہونا، رسول کا رسول بنایا جانا اور قرآن کا نازل کرنا صرف اسی لئے ہے کہ واحد جانو، رسول مانو، برحق کلامِ الٰہی سمجھو اور بس۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ خدا کی وحدانیت، قرآن کی صداقت اور رسول کی رسالت کا وجوبی تقاضا ہے کہ۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ انسان ہر انسان اللہ ہی کی اطاعت اور عبادت کرے۔ اپنی زندگی کا علمی اور عملی رخ اسی کی طرف موڑ دے۔ عبادت نام صرف ارکانِ اربعہ کا نہیں۔ یہ تو عبادت کے چند نمایاں خد و خال ہیں۔ عبادت اور اطاعت تو پوری زندگی کو حاوی ہونی چاہئیے۔ خلوصِ اطاعت کا مطلب آئندہ آیت کی تشریح سے سمجھو۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ یعنی خالص اطاعت کا حق صرف اللہ ہی کو ہے یا یہ مطلب جاننا چاہو آخر کار ہر چیز اللہ ہی کی اطاعت کرتی ہے۔ دوسری تشریح سے پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔ ہم ایسی تفصیل کرنی چاہتے ہیں جس سے دونوں مطلبوں پر پوری روشنی پڑ سکے یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر چیز اپنی ہستی اور بقا میں نظامِ فطرت کی محتاج ہے اور نیچرل انتظام نے سنسار کی ہر مشینری کے متعلق جو خدمت مقرر کر دی ہے کسی مشین کا کوئی پرزہ اس سے بال برابر سرتابی نہیں کر سکتا۔ مکمل اطاعت اور خالص فرمانبرداری کا قانون قطرے سے آفتاب تک اور قطرے سے سمندر تک ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس سنسار میں چالیس کروڑ کروں کی پیمائش اور ہوا کا مقررہ چکر اور ہر چکر کی مقدار اور کیفیت اور ہیئت اور نتیجہ غرض ہر چیز غیبی دستِ قدرت میں ہے اور ہر چیز اپنی قدرتی راہ پر چل رہی ہے لیکن قدرتی اطاعت اور فطری فرماں برداری کے علاوہ انسان کو ارادہ، اختیار اور تمیز کی قوتیں بھی دی گئی ہیں۔ اچھے برے راستے سے واقف بھی کیا گیا ہے۔ صحیح راستے پر چلنے کا حکم بھی دے دیا گیا ہے۔ خار دار جھاڑیوں اور تمیزی قوتوں کو استعمال کرنے میں انسانی افراد اور سوسائٹیاں چند در چند اور گونہ در گونہ ہو گئیں۔ کچھ لوگ تو اختیارِ مجازی سے دھوکا کھا کر اختیارِ حقیقیہ کے مدعی بن بیٹھے اور اپنی عقل و ارادہ کو انہوں نے حکمرانِ مطلق قرار دے دیا کتنے ہی آدمیوں نے خدا کے احکام کے آگے سر جھکا دیا۔ خدا کو واحد لاشریک کہا۔ پیغمبروں کو پیغمبر اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو اللہ کی کتابیں جانا۔ لیکن عبد و معبود اور خالق و مخلوق کی حدِ فاصل نہ معلوم کر سکے۔ جس مخلوق میں ان کو خالق کی جھلک نمایاں نظر آئی اور جو عہد واضح طور پر جلوہ گاہِ ربوبیت دکھائی دیا اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ کبھی عناصر نورانی عنصر یعنی آگ کی پوجا کی۔ کبھی چاند سورج اور ستاروں کو کارساز سمجھا۔ کبھی فرشتوں کو دیوتا قرار دیا۔ طاقتور درختوں کو، دریاؤں کو پہاڑوں کو، ابر باراں کو اور بادِ لرزاں کو پوجا۔ اور سانپ بیل کنٹھو اور دوسرے قومی جانوروں کے سامنے ڈنڈوت کی۔ کچھ مزید بے وقوفوں نے ہر عجیب چیز کو قربان گاہِ انسانیت بنا لیا۔ کچھ سمجھدار اور ہوشمند تھے تو انہوں نے خیال کیا ہر بادشاہ کے دربار میں پہنچنے اور عرض پیش کرنے کے لئے وزیر مشیر امیر مصاحب عمالِ حکومت ارکانِ دولت خدمتگار چوبدار پیادے شاہزادے شاہزادیاں بیگمیں اور حرم میں غرض کوئی توسل ضرور ہونا چاہیئے۔ سفارش ضرور درکار ہوتی ہے۔ بادشاہ کے پیش دست طبقہ کو بادشاہ کی مرضی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ وزیر اور مصاحب، حواشی اور نقیب بادشاہ کو کسی سے ناراض اور کسی سے راضی کر دیتے ہیں۔ اس لئے حکم خدا کا اور حکومت ان کارندوں سازندوں کی دینے والا وہ مگر خوشامد اور لابہ گری ان آئندوں روندوں کی بس ملائکہ، مریم، مسیح ستاروں کی روحیں انبیاء اولیاء اور تمام حاضرین در بلند قابلِ پرستش ہیں اس لئے کہ ان کے توسل کے بغیر خاطر خواہ مانی نہیں ہو سکتا۔ یہی رحمت کے دروازے ہیں۔ الوہیت کے دربار تک بغیر درواندوں کے رسائی کس طرح ممکن ہے۔ بعض بیباک لوگوں نے تو کھولکر رجال و ستارے کو ہنستے کہتے ہوئے کہا کہ خدا کے احکام ہمارے پاس خود نہیں آئے ہم اس قابل ہی نہ تھے۔ ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور دینی پیشواؤں

ذریعہ بے آئے۔ پھر خدا تک ہماری رسائی ان لیڈروں کے بغیر کیسے ممکن ہے اس لئے انبیاء اولیاء کی منت ماننی نذر نیاز کرنی ان سے اور وہ سامنے موجود نہوں تو اُن کی روحوں سے مدد مانگنی ضروری ہے۔ اُن کی دہائی دینی لازم ہے۔ ان کو پکارنا واجب ہے۔ اس سارے باطل پرست گروہ نے اللہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اس کو بادشاہ کی طرح عاجز ناواقف سفارشی ٹٹو اور ہوائے نفس کا بندہ سمجھا۔ اللہ کو قادر سبحانہ علیم و خبیر رزاق رحمن و رحیم عزیز و حکیم نہ خود مختار واحد قہار بلکہ ایک بے حس و حرکت مردہ یا خوابیدہ پیر فرتوت یا کمزوری سے کراہنے والا بیمار قیم یا ظالم خونخوار اور جابر ستمگار قرار دیا۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ ان تمام فرقوں میں کوئی بھی اللہ کا مخلص فرمانبردار نہیں۔ شرک کی آمیزش سے پاک اطاعت گزار نہیں، تجارت بردار نہیں۔ کچھ لوگ دنیوی اغراض کے حصول کو اطاعت الٰہیہ اور امر خداوندی کی تعلیم کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں یزید الرقاشی کی روایت ہے ایک شخص نے عرض کیا۔ یارسول اللہ۔ اگر ہم اس نیت سے مال دیں کہ ہمارا نیک نام باقی رہے تو کیا کچھ ثواب ملے گا؟ فرمایا کچھ نہیں۔ سائل نے عرض کیا یارسول اللہ اگر ہم ثواب کی نیت بھی کریں اور نیک نامی کے حصول کی بھی تو کیا حکم ہے۔ فرمایا اللہ سوائے اس خیرات کے کوئی خیرات قبول نہیں فرماتا جو خالص اُسی کے نام پر ہو۔ اس کے بعد حضور نے یہی آیت تلاوت فرمائی (رواہ ابن مردویہ) یعنی خلوص اطاعت خلوص نیت پر مبنی ہے۔ اگر نیت خالص نہ ہو تو اطاعت خالص نہ ہوگی مذکورہ بالا تفسیری حدیث سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر اتفاق سے انسانی ساختہ قانون خدائی قانون کے موافق ہو جائے اور کوئی شخص قانونِ انسانی کی پابندی کی نیت کرے تو ثواب سے محروم رہے گا۔ یہ اللہ کی فرمانبرداری نہ ہوگی بلکہ انسانی قانون کی اطاعت ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اطاعت میں شرک ہو جائے گا یہاں سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جس قیاس کا ماخذ قرآن نہ ہو اس کو ماننا خلوص اطاعت کے منافی ہے۔

تنبیہ کی خالص دین ورسوفی بنیہ اطاعت سے اتنے مغلوب الحواس ہوئے کہ اطاعت کی رسی ہی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جب انھوں نے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا اور اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ آیات پڑھیں تو تقدیر کے سیلاب میں تشریع کو بہا دیا۔ انسانی ارادہ و اختیار کو معطل کر بیٹھے۔ قوتِ تمیز کو مردہ کر دیا اور ہر قسم کے تصرف خیر سے اُٹھا لیا۔ اعترافِ تقدیر نے نیکی پر اُبھارنے کی بجائے اُن کے عمل کی دنیا تباہ کر دی اور تشریعات کو تکوینیات سے ممتاز نہ کرنے کی وجہ سے بے جان چیزوں کی طرح انھوں نے اپنے کو مجبور سمجھ لیا۔ ہم اس ژولیدہ مسئلہ کو اس جگہ کسی قدر سلجھانا چاہتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ تقدیر نام ہے اللہ کے اس علمی اندازہ کا جو تخلیق کائنات سے پہلے ہر چیز ہر واقعہ اور ہر چھوٹے بڑے حادثہ کے متعلق خدا نے قائم کر رکھا ہے اور چونکہ اللہ کا علمی اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس عالم میں جو کچھ اچھا برا سیاہ سفید واقعہ ہوتا ہے وہ اللہ کے علمی اندازہ کے خلاف نہیں ہوتا۔ واقعہ کے حدوث سے پہلے اللہ جیسا کسی چیز کو جانتا تھا حدوث واقعہ اسی طرح ہوتا ہے لیکن اس سے کسی کی عملی طاقت سلب نہیں ہو جاتی۔ مثلاً یوں سمجھو کہ پیدائشِ عالم سے پہلے اللہ جانتا تھا کہ فلاں تاریخ زید پیدا ہوگا اور جوان ہونے کے بعد مسلمان نہ ہوگا۔ جب زید پیدا ہوا تو جوان ہونے کے بعد مسلمان نہ ہوا لیکن اسلام لانے کی عملی طاقت اس میں بہرحال موجود ہے۔ جس طرح خالد، ولید اور بکر میں مسلمان ہونے کی فطری طاقت ہے ویسی ہی زید میں بھی ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اللہ کو زید کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے مسلمان نہ ہونے کا علمی یقینی اندازہ تھا لیکن پیدائش کے بعد زید اسلام پر مکلف رہا اور طاقتِ عمل سلب ہونے کی وجہ سے تمام تشریعات پر مامور قرار پایا یا یوں سمجھو کہ اللہ کو زید کی پیدائش سے پہلے معلوم تھا کہ یہ سنکھیا کھا کر یا خود پیٹ میں چھرا گھونپ کر مریگا لیکن پیدائش کے بعد زید کے تمام ہوش و حواس بکر اور خالد کی طرح درست تھے۔ دیوانہ ماؤف الدماغ نہ تھا اور خودکشی سے اس کو منع کر دیا گیا تھا۔ اب اگر خلافِ حکم زید خودکشی کرے گا تو ماخوذ ہوگا بلکہ اگر اللہ کو بعلم تقدیری زید کا زہر کھانا اور نہ مرنا معلوم ہے تو یقیناً زہر کھانے کے بعد بھی زید کی موت نہ ہوگی۔ مگر چونکہ شرع کے خلاف اس نے خودکشی کی کوشش کی اور زہر کھایا اس لئے خدائی مجرم ضرور ہوگا گویا تشریعات کا مدار عملی طاقت نیت اور عمل پر ہے اور تقدیر کا تعلق صمیم واقعات و حوادث سے ہے۔ تشریعات تکلیفات اور الامر و نواہی کو تقدیر کے سیلاب میں بہا کر سبکدوش بن جانا کور دانشی اور حیلہ جوئی ہے۔ ہم کو تقدیرِ الٰہی کا علم تو واقعات کے ظہور کے بعد

ہوتا ہے۔ زہر کھانے سے زید نہیں مرا۔ نہ مرنے اور زہر کے تاثیر نہ کرنے کا علم تو زید کے نہ مرنے سے ہوا۔ اس لئے زید کا کسی واقعہ کے حدوث سے پہلے تقدیر پر چلنے کا دعویٰ کرنا غیب دانی کا اقرار ہے۔ زید کو واقعہ کے ظہور سے پہلے کیسے معلوم ہوا کہ میری تقدیر میں زہر کھانا لکھا ہے اس لئے مجھے زہر کھانا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ تقدیری علم پردۂ راز میں ہے اور انسان عالم اسرار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ صحیح القویٰ ہونے کے بعد ظاہری اوامر و نواہی پر مکلف ہے۔ تقدیر الٰہی تکلیف انسانی کو ساقط نہیں کرتی۔

آیت زیر بحث کا تعلق تقدیر سے نہیں ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ باعتبار فطرت و تخلیق ہر چیز اللہ کی اطاعت کرتی ہے اور اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہے اور اس کا علم پیدا کرنے سے پہلے ہی اللہ کو تھا مگر آیت میں اس چیز کو نہیں بیان کیا گیا بلکہ اس جگہ حکم تعبدی کا بیان ہے کلام بصورت خبر ہے مگر معنی انشائی ہیں یعنی زندگی کے تمام اطوار میں اطاعت صرف اللہ ہی کی ہونی چاہیئے: اللہ ہی کی تشریعات؟ قوانین کی پابندی کرنی لازم ہے۔ اپنی طرف سے آئین بنانے اور امر و نہی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ جو لوگ کائناتی مشین کے رواں دواں پرزوں کو کار ساز ہستی اور آمر و ناہی سمجھ کر ان کی طرف جھکتے اور ان کی دہائی دیتے ہیں اور ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کی پوجا کرتے ہیں۔ جب ان کی حماقت پر ان کو متنبہ کیا جاتا ہے اور پوچھا جاتا ہے کہ مخلوق کو معبود بنانے کی کیا وجہ تو وہ جواب دیتے ہیں ہم ان کی پوجا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ کے دربار تک ہماری رسائی ان کے ذریعہ سے ہو جائے۔ یہ مقربانِ بارگاہ ہیں۔ اللہ کے چہیتے ہیں۔ منظورِ نظر ہیں۔ محبوب سبحانی ہیں۔ خدا کے بیٹے ہیں۔ ارکانِ دربار ہیں۔ ان کو خوش کرنا ہمارا فرض ہے۔ گویا اصل معبود تو قرب الٰہی تک پہنچنا ہی ہے مگر بادشاہ تک رسائی بغیر ارکان دربار کی سفارش کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ممبرانِ اسٹاف شاہی کو خوش کر کے ان سے سفارش کرانی ضروری ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری دنیوی فریادیں اور ان کی عرضیاں خدا تک ان درمیانی وسائل کے بغیر نہیں پہنچ سکتیں۔ ہم اللہ سے اپنی حاجتیں پوری کرانی چاہتے ہیں مگر ان کی دعاؤں اور سفارشوں سے۔ بہرحال اس مشرک گروہ نے اپنا تعلق خدا سے توڑ لیا۔ قانونِ تشریعی کو لغو قرار دیا۔ اعمال کو بے سود سمجھا۔ اللہ کو شارع اور دستوریات کا مقنن نہیں یقین کیا۔ وحدت الوہیت کا عقیدہ رکھا مگر عملی شرک کیا۔ عبد و معبود کی کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی۔ مخلوق کو خالق کی کرسی پر لا بٹھایا اور عاجز کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ۔ اہل شرک کے مختلف گروہ ہیں اور ہر گروہ کا عقیدہ جدا ہے۔ کوئی ستاروں کے ناموں پر مورتیاں بناتا اور ان کا ستاروں سے خاص تعلق جانتا ہے کوئی دینی پیشواؤں کی فرضی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا کرتا ہے کوئی ستاروں کو دیوتا سمجھتا ہے۔ کوئی مسیح کو خدا کا بیٹا اور مسیح کے مصلوب ہونے کو تمام عیسائیوں کے گناہ کا کفارہ جانتا ہے۔ کوئی عزیر کو ابن اللہ قرار دیتا اور اپنی قوم میں سینکڑوں انبیاء کے مبعوث ہونے پر اکڑا پھرتا ہے۔ غرض اسی تراش خراش اور من گھڑت میں ہر گروہ مبتلا ہے۔ ان کا باہمی فیصلہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کر دے گا۔ اور ہر مشرک کو دوزخ میں ڈالنے کا حکم دے دیگا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ۔ ان کھلے دماغ والوں کی دانش ہی زنگ آلود ہے۔ ان کا جرم دوہرا ہے مثبت اور منفی۔ اللہ کے علاوہ دوسروں کی پوجا کرنی، ان کو وسائل قرب سمجھنا اور حاجت روا یا حاجت روائی کا ذریعہ سمجھ کر ان سے فریاد کرنا پکارنا دہائی دینا اور ان کو مربی رب، ان کو دخیل جاننا مثبت جرم ہے۔ اس قسم کی جھوٹی باتیں بنانا بجائے خود مجرمانہ عقیدہ ہے۔ پھر جب پیغمبر برحق نے ان کو ربوبیت کی زندگی کو سدھار کے قانون پیش کیا، اللہ کو واحد قدیر اور علیم رحیم بتایا، فرضی دیوتاؤں کی پوجا سے روکا اور تمام درمیانی وسائل توڑ کر سیدھا بندہ کو اس کے رب سے ملانے کی کوشش کی۔ تو ان احمقوں نے نہ کتاب الٰہی کو سچا مانا، نہ رسول کو برحق مانا اور نہ اللہ کی اس نعمت کا شکریہ ادا کیا بلکہ آبِ رحمت اور آفتابِ ربوبیت سے ان کے کفر کی بدبو اور بڑھ گئی۔ اگر پہلے کافر تھے تو اب

دل کو فر ہو گئے۔ یہ ظنی جرم ہے۔ اس دوگونہ جرم کے بعد ان کی ہدایت کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ اللہ ان کی خطا، فکری اور عملی کی طاقت سلب کر لے۔ انسانی اختیار و ارادہ کی قوتیں اُن سے چھین لے اور زبردستی ان کے دلوں، زبانوں اور ارکان و جوارح کو حق کی جانب موڑ دے۔ لیکن خدا ایسے لوگوں کو زبردستی ہدایت نہیں کرتا یعنی ارادہ و اختیار کو سلب نہیں کرتا۔ ہدایت یاب ہونے پر مجبور نہیں کرتا۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ اس آیت میں عقیدہ ابوت و بنوت کی مدلل تردید فرمائی ہے۔ ہندو ازم میں بھی کہیں کہیں تناسل الوہیت کے عقیدہ کی جھلک نظر آتی ہے اور عیسائی تو بالاتفاق اس کے قائل ہی ہیں۔ باپ، بیٹا، روح القدس سب کو مسلم ہے کچھ تاویل کر کے اقانیم ثلاثہ کے مرکب کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ یہودیوں میں سے بھی کچھ لوگ عزیر کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ عرب کے بعض گروہ بھی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے۔ اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ اللہ کو اگر کسی کو اپنی اولاد ہی قرار دینا منظور ہوتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا چھانٹ لیتا یعنی اس کو توالد تناسل کے سلسلہ کی ضرورت نہ تھی جب ساری کائنات اس کی مخلوق ہے تو اس کا بیٹا تناسلی سلسلہ سے کیوں وابستہ ہوتا بلکہ اسی مخلوق میں سے جس کو چاہتا بیٹا بنا لیتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ والدیت نقص الوہیت کا موجب ہے۔ باپ بیٹے کا محتاج ہوتا ہے اور خدا ہر نقص و عیب سے پاک ہے۔ وہی یگانہ بے ہمتا ہے اس کا کوئی شریک، ساجھی، انداز، مثل نہیں۔ حقیقی وحدت اسی کی ہے اور ہر ساری کائنات اس کے دستِ قدرت میں مقہور ہے مطیع اور مسخر ہے ایسی حالت میں اس کو ولد کی ضرورت کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آیت میں چار طرح اس عقیدہ کی تردید فرمائی۔ (۱) ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے اور مخلوق بغیر تناسلی سلسلہ کے نہیں ہوتی۔ وہ باپ کی نسل ہوتی ہے اس کی مخلوق نہیں ہوتی (۲) عقیدۂ توالد نقص الوہیت کا موجب ہے اور اللہ ہر نقص سے پاک ہے (۳) اللہ ہی واحد ہے۔ اگر اس کا بیٹا ہوگا تو وہ بھی اللہ ہوگا۔ اس طرح اللہ کی حقیقی بے ہمتائی باقی نہیں رہے گی۔ (۴) اللہ قہار ہے۔ ہر چیز کی ہستی اور ہستی کے تمام اطوار پر اللہ کا دباؤ ہے بیٹے کی ہستی پر باپ کا دباؤ نہیں ہوتا۔ بیٹا جوان ہو کر باپ سے کمزور نہیں ہوتا بلکہ باپ بیٹے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ پس قہار خدا کا بیٹا ہونا محال ہے۔

مقصودِ بیان

اللہ کی طرف سے رسول پاک پر قرآن کے نازل ہونے کی صراحت۔ قرآن کے ہر ٹکڑے کے برحق اور سچا ہونے کی شہادت۔ زندگی کے تمام اطوار میں احکامِ الٰہی پر چلنے کی ہدایت اور ہر طاعت میں خلوص رکھنے کی نصیحت اور آمیزش کی ممانعت کسی مخلوق کو قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے پوجنے سے بازداشت۔ اس سے ہر اس شخص کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو انبیاء، اولیاء، ائمہ اور ملائکہ کو ارکانِ دربار اور مقربانِ مختار سمجھتے ہوئے اُن کی دہائی دیتا ہے۔ اُن سے فریاد کرتا ہے۔ حاجت روا جان کر پکارتا ہے۔ اُن کے نشانوں اور قبروں کو پوجتا ہے، چومتا ہے، طواف کرتا ہے۔ اس باطل پرست انسان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حاکمِ مختار اور واحدِ قہار سوا خدا کے اور کوئی نہیں اور کوئی بھی اس کی مرضی بدل نہیں ہو سکتا وغیرہ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ

اُس نے آسمان و زمین کو درستی سے بنایا رات کو دن میں لپیٹ لیتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹ لیتا ہے اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ

آفتاب اور چاند کو محکوم کر دیا ہر ایک اپنے اندازے سے چلتا ہے سنو! وہی ہے زبردست معاف کر دینے والا تم کو ایک شخص (آدم)

نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ

سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور چارپایوں میں سے تمہارے لئے آٹھ جوڑے اتارے

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ

اور تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک طرح کے بعد دوسری طرح تین اندھیروں میں بناتا ہے وہ ہے تمہارا اللہ

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝

تم کو پرورش کرنے والا اسی کے لئے بادشاہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بہکے چلے جاتے ہو

تفسیر قرآن کریم کا دستور ہے کہ وحدتِ الوہیت اور انفرادِ معبودیت کو ثابت کرنے کے لئے ایجادِ عالم، نظمِ عالم، تخلیقِ انسان اور تربیت کو پیش کرتا ہے۔ گویا ایجادِ عام اور ربوبیتِ تام سے وحدتِ الوہیت پر استدلال کرتا ہے۔ غرض یہ کہ فطری طور پر جب انسان اور ماورائے انسان کی عنانِ اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تکوین کے لحاظ سے کوئی چیز خدا سے بے نیاز نہیں اور پھر سارے سنسار کا فطری انتظام بھی اللہ ہی کے قبضہ میں ہے اور قانونِ تکوین بھی اُسی کا بنایا ہوا اس کائنات میں جاری ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ارادی اور اختیاری زندگی میں انسان خود اپنا حکمران بن جائے یا اللہ کے علاوہ کسی اور کی حکومت اور قانون کو تسلیم کرے۔ اگر انسان تکوینی نظام میں مجبور ہے اور بلا اختیار اللہ کی الوہیت کے سامنے سر بسجود ہے تو شرعی نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے اور خود شارع بننے یا دوسروں کو شارع بنانے کا اختیار اس کو کس طرح ہو سکتا ہے۔

مقامِ غور ہے کہ یہ بلندیاں اور پستیاں جن کو آسمان و زمین کہا جاتا ہے کس قدر ٹھیک ٹھیک مصلحت آگیں اور حکمت آفرین ہے۔ سورج اور چاند کی مقررہ روش اور لیل و نہار کا گھٹنا بڑھنا اللہ کی قدرتی ہمہ گیری اور کمالِ علمی کو بے حجاب کر رہا ہے اور اس ملمّع کی تیلیوں کے اندر سے اللہ کی عزت، اقتدار اور رحمت و عطوفت کی کتنی جلوہ پاشیاں ہو رہی ہیں۔ اہلِ دانش اور اربابِ فہم کے لئے چند امور بہت زیادہ بصیرت افروز ہیں۔ (۱) پہلا انسان خواہ وہ کسی چیز سے بنا لیکن کیسے بنا آخر وہ نفسِ واحدہ کیا تھا۔ اس میں زندگی کا تنفس کس طرح پیدا ہوا (۲) پہلا انسان نر تھا۔ اس کے تمام اجزاء و اعضاء، ہڈی گدی، گوشت پوست یہاں تک کہ قوامی ذرات بھی نرینہ ہی تھے۔ پھر مادہ کی تخلیق اس کے اندر سے کیسے ہوئی (۳) تمام آدمیوں کا سرچشمہ اس ایک نفس کو کیسے بنایا گیا۔ کیا ان گنت انسان اس کے اندر بالفعل موجود تھے یا بالقوۃ۔ یہ قوت کیا چیز ہے۔ یہ کیسا اجمال تھا جس کی تفصیل کروڑوں انسانوں کو پھیلا رہی ہے۔ تجزیہ نہیں، تحلیل نہیں، تشریح نہیں۔ پھر وہ کیسا دفینہ اور خزانۂ مخفیہ تھا کہ جس کے پھیلاؤ سے ایک کے بعد ایک ان گنت جواہر ریزے نکلتے چلے آتے ہیں (۴) سلسلۂ توالد و تناسل کیا ہے۔ ماں کا پیٹ کیسی کال کوٹھری ہے جس سے ایک بے جان قطرہ گوناگوں تبدیلیوں کے بعد جیتے جاگتے انسان کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ چند در چند تخلیقیں کیسے ہوتی ہیں۔ قطرہ کیسے بنتا ہے۔ کہاں سے چلتا ہے۔ تخلیق، تبدیل اور تغیر کی کتنی منزلیں طے کرتا ہے۔ کن کن تاریک پردوں کے اندر رہتا ہے اور کتنی دشوار ترین راہوں کو طے کرتا ہوا انسانیت کی سطح تک پہنچتا ہے۔ یہ سب کچھ کس طرح ہو جاتا ہے کہنے کو تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ تمام آدمی ماں کے پیٹ میں بنتے ہیں لیکن حقیر ترین نطفہ آدمی کیسے بن جاتا ہے اور کون اس کو آدمی بناتا ہے۔ یہ کس کاریگر کی کاریگری ہے اور کس حکیم کی حکمت ہے۔ یہ بات بہت کچھ محلِ نظر ہے (۵) دنیا میں لاکھوں جانور ہیں ہر ملک اور ہر زمین کے جانور جدا جدا ہیں لیکن چار قسم کے مویشی تو بالکل نظر کے سامنے ہی ہیں۔ بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ۔ ان کی بناوٹ، نسل کشی اور ساخت پرداخت کیسی ہوتی ہے۔ سب سے پہلا جانور کیسے بنا اور کس نے بنایا اور کس خصوصیت کا بنایا۔ پھر وہ خصوصیت مختلف تطورات، تغیرات اور نیرنگیوں کے مدارج طے کرتی ہوئی کہاں پہنچی اور عموماً حیوانی سرشت انسانی جبلت سے نیچے کیسے رہی اور کس نے اس کو انسان سے نچلا بنایا۔ مادہ ایک تھا، تغیرات اور تطورات بھی وہی تھے پھر ایک دفینہ نیچے کیوں باقی رہ گیا اور آن تغیرات اور تطورات کا عمل رک گیا اور کیوں انسانی منافع کے لئے اس کو پیچھے ہی

کہا گیا ہو سکتا تھا کہ حیوانی تخلیق کچھ اور ہو کر اٹھتی اور انسانی دائرے میں داخل ہو جاتی اور کوئی چوپایہ انسان کے کسی کام میں نہ آتا۔ تعجب ہے کہ حیوان کی تخلیق پیٹ کے اندر تمام مراحل اور منازل تخلیقی طے کرنے اور تمام تاریک پردوں میں رہنے کے بعد بھی حیوان ہی رہے اور انسانی بناوٹ وہی مراحل، منازل اور ظلمات ثلاثہ طے کرنے کے بعد انسان ہو جائے اور اس طرح اول محکوم دوسری حاکم اول رذیل اور دوسری شریف اول بے عقل اور دوسری ہوشمند بن جائے۔ آخر ایسا کون کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔ یہ تمام صنعت حکمت قدرت مصلحت حکومت کس کی ہے، کون ولی، نبی، اوتار، مہاتما، پیشوا، جن، فرشتہ ایسا کرتا ہے۔ کس کے ہاتھ میں یہ سارا نظم و نظام ہے۔ کس دیوتا اور موہومی معبود کا یہ تصرف ہے۔ یقیناً اللہ ہی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہی سب کا کرتا دھرتا ہے۔ اسی کی ربوبیت اور حکومت ہے۔ وہی مالک اور وہی ملک ہے۔ اسی کی ملک اور اسی کا ملک ہے۔ پس اسی کو پوجو، اسی کو معبود جانو، اسی کا حکم مانو اور اسی کی فرماں برداری کرو۔ جانتے ہوئے انجان نہ بنو۔ فطری اعترافِ الوہیت کرتے ہوئے اختیاری انکار نہ کرو۔ سوچو فطرت کی سیدھی شاہراہ سے ہٹ کر کہاں کج رو آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر مارے مارے پھر رہے ہو اور کیوں فکر و عمل کے صحیح راستہ سے منہ موڑ رہے ہو۔

تحلیلِ اجزاء

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ گزشتہ آیات میں توحید الوہیت کو بیان کیا تھا۔ اس جگہ سے اَنّٰی تصرفون تک اپنی وحدت اقتدار قہاریت نظم اور حکومت کو مدلل طور پر ظاہر فرمایا ہے۔ آسمان اور زمین کی تخلیق یعنی عدم محض سے عالم وجود میں لانا پھر ستاروں خصوصاً چاند اور سورج کو مقررہ رفتار پر چلانا اور رات دن کا گھٹانا بڑھانا۔ اس کے بعد انسان اول کی ابتدائی تخلیق اور دوسرے چوپایوں کی پیدائش، پھر عام انسانوں کا سلسلہ توالد و تناسل اور اس کی کیفیات اور اس کی تفصیل کے بعد اپنی ربوبیت و حکومت کا بطور نتیجہ اظہار اور آخر میں ربوبیت تامہ و حکومت عامہ سے وحدتِ الوہیت کا اثبات ان آیات میں کیا گیا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کو برحق ٹھیک ٹھیک پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس نتیجہ اور غرض اور خدمت کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے اس خدمت کو ادا کرنے پر یہ ہر وقت کمربستہ ہیں اور تخلیقی نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔ نہ آسمان کو بیکار پیدا کیا گیا نہ زمین کو بے فائدہ بنایا گیا۔ نہ پیدا کرنے کے بعد ان سے اپنا اقتدار اٹھالیا۔

یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ ۔ راغب نے کہا تکویر کے معنی ہیں عمامہ کی طرح کسی چیز کو پیچ در پیچ لپیٹنا۔ یہاں مراد ہے ایک کا دوسرے پر چھا جانا۔ ایک کے پیچھے دوسرے کا آنا ایک اور آیت میں آیا ہے۔ یغشی اللیل النهار الخ جب رات دن پر چھا جاتی ہے تو دن گھٹ جاتا اور رات بڑھ جاتی ہے اور دن رات پر چھا جاتا ہے تو دن بڑا اور رات چھوٹی ہو جاتی ہے۔ غرض رات دن کا تبادل اور تعاقب اللہ کے حکمت آمیز اقتدار کی واضح نشانیاں ہیں۔ اگر یہ تبادل نہ ہوتا اور برسوں لمبی رات یا برسوں لمبا دن ہوتا تو جاندار دنیا تباہ ہو جاتی۔ ۲۱ جون کا برسوں لمبا دن کائنات میں آگ لگا دیتا اور ۲۱ دسمبر کی لمبی رات حیوانات و نباتات کی رگوں میں خونِ حیات کو منجمد کر دیتی۔ سچ ہے اللہ نے شب و روز کی آمد و رفت ایک خاص انداز سے مقرر کر رکھی ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ۔ چاند اور سورج مقررہ رفتار پر بحکمِ الٰہی چل رہے ہیں۔ ہر خطۂ زمین پر ان کا طلوع اور غروب ایک خاص تاریخ اور خاص وقت پر ہوتا ہے۔ آفتاب غروب نہیں ہوتا بلکہ ایک خطۂ زمین سے چھپ کر دوسرے حصۂ ارضی پر طلوع ہو جاتا ہے اس لئے ہر حصہ پر ہر وقت صبح اور شام کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ مدراس کی صبح چند دقیقوں بعد دہلی، لاہور، پشاور، ایران، عرب، افریقہ ہوتی ہوئی بحر اٹلانٹک کو پار کر کے امریکہ جا پہنچتی ہے۔ مدراس میں شام کے ۲۲-۵ ہوں تو میکسیکو میں صبح کے ۲۰-۵ بجے ہونگے لندن میں دوپہر ڈھل گئی یہاں شام کے ۶-۷، مصر میں ۴-۱۲ (بعد از دوپہر) آسٹریلیا میں رات اور برلن میں دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ جزائر کیلیفورنیا میں سورج ڈوب رہا ہو تو مصر میں نکل رہا ہوگا۔ ایک گھنٹہ پہلے خلیج فارس دو گھنٹے پہلے افغانستان تین گھنٹے پہلے جنوبی بحر ہند چار گھنٹے پہلے، چین پانچ گھنٹے پہلے وسط چین چھ گھنٹے پہلے دریائے زرد سات گھنٹے پہلے جاپان آٹھ گھنٹے پہلے آسٹریلیا نو گھنٹے پہلے کالیڈونیا دس گھنٹے پہلے جزائر طابین گیارہ گھنٹے پہلے جزائر سندوِچ اور بارہ گھنٹے پہلے جزائر کیلیفورنیا میں طلوع ہوتا ہے۔ سورج کے

قرب و بعد سے ایک ہی وقت میں کہیں سردی کہیں گرمی کہیں بہار اور کہیں برسات ہوتی ہے گرمیوں میں افریقہ کی گرمی سے بچنے کے لئے آدمی یورپ کے کسی حصہ میں جا سکتا ہے اور روس کی برف جھلسا دے تو ہندوستان یا آسٹریلیا میں آ سکتا ہے اگر سورج کی مقررہ رفتار میں کمی بیشی ہوتی اور ایک جیسا موسم رہتا تو انسان گھبرا اُٹھتا اور شدتِ سرما یا شدتِ گرما سے ہلاک ہو جاتا۔ سچ ہے چاند سورج ایک خاص حساب سے چل رہے ہیں۔ سیب سردیوں میں اور خربوزہ گرمیوں میں پکتا ہے اگر ہمیشہ سردی رہتی تو گرمائی غذائیں کہاں سے آتیں اور ہمیشہ گرمی رہتی تو سرمائی میوے کیسے پیدا ہوتے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اجل مسمی سے مقدار رفتار مراد نہیں بلکہ قیامت مراد ہے یعنی چاند سورج کے رواں ہونے کی حد ختم دنیا ہے۔ میرے نزدیک یہ معنی مرجوح ہیں۔ راجح تفسیر وہی ہے جو میں نے اوپر لکھ دی۔ حاصل مطلب بالکل صاف ہے کہ کائنات زمین خدا نے بنائے اور ان کے اندر تمام تصرفات اپنے قبضہ میں رکھے۔ کوئی لمحہ کوئی ساعت اور کوئی دن اس کی تنست سے باہر نہیں گویا اس نے سنسار کی مشین بنائی اور مشین کے ہر پرزہ کی رفتار کو بھی اپنے قبضہ میں رکھا اور ہر پرزہ کا کام کام کی مقدار اور کام کی رفتار مقرر کر دی تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی پرزہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے یا بذاتِ خود خود مختارانہ اپنی چال پر چلے یا مشین کو چلانے میں آزاد ہو۔ یا کسی دوسرے پرزے کو اپنی آزاد رفتار کی کمی بیشی یا قوت و ضعف سے نفع نقصان پہنچا سکے۔ جب یہ بات ہے تو چاند سورج اور ستاروں سیاروں کی پرستش محض جہالت ہے۔ ان کو کارساز سمجھنا حماقت ہے اور زمین پر بھی تمام بے جان اور جاندار مخلوق کو خود مختار حکمران سمجھ کر معبود قرار دینا دانش کی قربانی ہے۔ غرض یہ کہ علویات اور سفلیات، فلکیات اور عنصریات میں سے کوئی بھی خود مختار نہیں۔ پھر انسانیت کی بھینٹ اس کے نام پر کیوں چڑھائی جائے۔

اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ۔ جب اللہ کے اقتدار کی ہمہ گیری ظاہر ہو گئی تو نتیجہ صاف نکل آیا کہ وہی قوی قادر اور ہر چیز پر غالب ہے۔ لیکن انسان کور باطن انسان سیاہ درون جاہل انسان اللہ کے اقتدار کو نہیں سمجھتا نہیں دیکھتا اور نہیں مانتا۔ قدرت کی حکمرانی اور وحدت کی جہانبانی کا اعتراف کرنے والے بہت کم ہیں بیشتر تعداد منکروں اور نابیناؤں کی ہے جو قدم قدم پہ قدرتِ الٰہی اور عزتِ خداوندی سے بغاوت کرتے ہیں لیکن اللہ باوجود اپنی اتھاہ طاقت لامتناہی عزت اور ہمہ رس اقتدار کے ان کی گرفت نہیں کرتا۔ یہ اس کی محض رحمت اور پردہ پوشی ہے۔ وہ غفار ہے سرکش انسان کو متنبہ ہو کر توبہ کر لینے کا موقع دیتا ہے اور اپنی مغفرت کا اظہار فرماتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ۔ ہمارے اسلاف نے نفس واحدہ سے آدم اور زوج سے حوا اور آٹھ ازواج سے آٹھ نر و مادہ یعنی کل چار جوڑ بھیڑ بکری گائے اونٹ مراد لئے ہیں گویا ارض و سما اور علویات کی تخلیق و نظم کو ظاہر کرنے کے بعد اس آیت میں خدا تعالیٰ نے انسان کی ابتداءِ تخلیق اور انسان کے کام میں آنے والے چار قسم کے چوپایوں کا تذکرہ فرمایا۔ جب ہم نے ان چار جانوروں کی خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ پوچھی تو محترم بزرگوں نے جواب دیا کہ سر زمین عرب میں یہی چوپائے کام میں آتے تھے اس لئے انہی کا تذکرہ کیا۔ میں کہتا ہوں شاید اس کے علاوہ تخصیص کی وجہ یہ بھی ہو کہ نباتاتی غذاؤں کے علاوہ آدمی کی حیوانی غذا زیادہ تر انہی جانوروں سے حاصل ہوتی ہے۔ پرندے تو کمیاب ہیں۔ صحرائی شکار بھی عام طور پر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اونٹ گائے (جس میں بھینس بھی داخل ہے) بھیڑ بکری انہی چاروں کا گوشت، دودھ، چربی، گھی، مکھن، پنیر ہوی انسان استعمال کرتا ہے آدمی کو پیدا کرنے کے بعد اس کی حیوانی غذا کا انتظام بھی ضرور ہونا چاہئے تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے ان جانوروں کو پیدا کر دیا۔ رہا یہ سوال کہ کیا ان جانوروں کو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور انسان کو یہیں پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو انسان کے لئے لفظ خلق اور چوپایوں کے لئے لفظ انزل کیوں استعمال فرمایا تو اس کا جواب مفسرین نے یہ دیا ہے کہ انزل کے معنی ہیں اَوْجَدَ خَلَقَ (ابن کثیر) میرے خیال میں یہ جواب ناقص ہے۔ لفظ انزل کے استعمال کی وجہ پھر بھی نہیں معلوم ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ان جانوروں کی تخلیق اور تخلیقی درجہ، انسان کی تخلیق اور تخلیقی درجہ سے نیچا ہے۔ پس انزل کہنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ اللہ نے ان مویشیوں کو بھی پیدا کیا مگر انسان کی تخلیق سے کمتر درجہ پر۔ اسی وجہ سے انسان کو ان پر دسترس دیا اور آدمیوں کے لئے ان کے مختلف اجزاء کو غذا قرار دیا۔ آیت مذکورہ کی ہم نے یہ کل

تشریح قدیم مفسرین کی تشریحات کی روشنی میں کی ہے۔ لیکن زیادہ گہری نظر سے بنظر علمی مطالعہ کرنے کے بعد جو کچھ مزید انکشافات ہوتے ان کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محترم علماء ان تفسیر کو خود ساختہ تفسیر اور بالرائے تفسیر قرار دیں۔

حیوانات و نباتات کا غور و بین معائنہ کرنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ تمام حیوانات و نباتات خلیوں (خلیہ کے معنی ہیں جو ہر، اصلی ریشہ، چھوٹا دانہ، سوتا وغیرہ) سے بنے ہیں۔ یہ خلیے سمندر کے ایک جیلی والے مادہ سے تیار ہوئے تھے جو سمندر کے ساحل پر ہوتا ہے۔ پھر حیوان و نبات ایک خلیہ سے بنے اور کچھ متعدد خلیوں سے۔ سب سے پہلے جیلی والے مادہ سے ایمیبا بنا۔ ایمیبا ایک خاص بنا ہوا جاندار ہے جو صرف کیچڑ (طین لازب) میں ملتا ہے۔ اس کے بعد دو تین چار پانچ سو ہزار لاکھ کروڑ غرض ان گنت خلیوں سے مختلف جانور بنائے گئے۔ انہی حیوانات میں چوٹی کا حیوان انسان ہے۔ حیوانات کا موجودہ تنوع اس واحد الخلیہ مخلوق (ایمیبا) کے ارتقاء کا نتیجہ ہے اور نفس واحدہ سے یہی ایمیبا مراد ہے۔ ایمیبا سے ہی اس کی مادہ بھی بنی ہے۔ ایمیبا کے تکوینی اجزاء ہیں کاربن، نائٹروجن، ہائیڈروجن، آکسیجن۔ اور انسان کے اجزائے تعمیر میں بھی یہی ہیں۔ پانی اور ہوا کے عناصر تکوینی بھی ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانی زندگی کی ابتدا سمندر سے ہوئی تھی۔ توریت کے باب پیدائش میں آیا ہے پھر ہم نے پانیوں کو حکم دیا کہ جاندار اور متحرک مخلوق پیدا کرو۔ قرآن حکیم کی ایک اور آیت میں آیا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ ہم نے جاندار اشیاء کو پانی سے پیدا کیا۔ جاندار چیز کونسی سب سے پہلے بنی۔ یہی واحد الخلیہ ایمیبا۔ ایمیبا نے ترقی کرتے کرتے تکوین آدم تک حسب ذیل مراتب طے کئے۔

(۱) خلیوں سے نباتات بنی (۲) پھر حیوانی نباتات کا ظہور ہوا یعنی وہ نباتات جن کی بناوٹ گوشت سے ہوئی اور بعض حیوانی اجزاء موجود تھے۔ مثلاً زعانیت یا اخطبوط (۳) پھر رینگنے والے کیڑے پیدا ہوئے (۴) اس کے بعد صدف اور جونکیں وغیرہ آئیں (۵) پھر سرطان البحر (کیکڑا) موجود ہوا (۶) اس کے بعد مچھلی، مگرمچھ اور دوسرے آبی حیوان بنے (۷) پھر زندگی نے خشکی پر قدم رکھا۔ کیڑے مکوڑے، مکڑی، بچھو، چوپائے، پرندے، چرندے، درندے اور آخر میں انسان پیدا ہوا۔ اس تنقیح سے واضح ہو گیا کہ جاندار تخلیق کا آغاز ایمیبا سے ہوا اور انتہا انسان پر ہوئی۔ طین لازب (ساحلی دلدل لیسدار کیچڑ) میں ایمیبا نمودار ہوا۔ انسان کے ابتدائی نر و مادہ کا نقطہ آفرینش یہی ایمیبا ہے۔ پھر چڑھتے چڑھتے انسان تک پہنچنے سے ایک درجہ پہلے حیوانوں کا درجہ ہے۔ حیوان یوں تو ان گنت ہیں جن میں سے اکثر انسان کے کام آتے ہیں یا آ سکتے ہیں لیکن واضح طور پر عموماً یہی چاروں چوپائے جن کا آیت میں تذکرہ فرمایا ہے انسان کے بہت زیادہ کام آتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کی غذائی ضرورت کا بہت کچھ یہ جانور پورا کرتے ہیں۔

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ۔ اول ترین آدمی کی آفرینش کا تذکرہ اوپر کی آیت میں تھا۔ اس آیت میں سلسلہ توالد و تناسل کی مجمل کیفیت بیان فرمائی ہے۔ مفسرین نے خلقا بعد خلق سے وہی مدارج مراد لئے ہیں جو دوسری آیت میں نطفہ علقہ اور مضغہ کے الفاظ میں ظاہر فرمائے ہیں۔ اور تین تاریکیوں سے مراد ہیں شکم مادر، رحم مادر اور غشاء جنین (بچہ پر لپٹی ہوئی جھلی) کی ہیں کہا گیا۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، ابو مالک، ضحاک، قتادہ، سدی اور ابن زید وغیرہ سے یہی تفسیر مروی ہے۔ میں کچھ مزید تنقیح کرنی چاہتا ہوں۔

اللہ کی حکمت، قوت صنعت اور ہمہ دانی کے قربان جائیے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ رحم مادر میں بالکل وہی عناصر موجود ہیں جو سمندر میں تھے۔ ماہرین تولید نے ہزارہا تجارب اور مشاہدات کے بعد یہ ایمان افروز اعلان کیا ہے کہ جس طرح آغاز میں زندگی مختلف مدارج طے کرتی ہوئی منزل انسانیت تک پہنچتی ہے بالکل اسی طرح کا ایک حیرت انگیز سلسلہ ماں کے پیٹ میں بھی کارفرما ہے۔ نطفہ رحم مادر میں پہلے ایک خلیہ سا ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند مدارج سے گزر کر جونک بنتا ہے۔ پھر بوٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر پرندوں کی طرح ایک چونچ سی نظر آنے لگتی ہے پھر مچھلیوں کی شکل بنتی ہے۔ چوتھے مہینے ہاتھ پاؤں کے ہمراہ ایک چھوٹی سی دم نکل آتی ہے۔ پانچویں مہینے دم غائب ہو جاتی ہے۔ چھٹے مہینے بال اور ناخن کی تیاری ہوتی ہے۔ آٹھویں مہینے انگلیاں کھلتی ہیں۔ اس تفصیل سے ایک موٹی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ رحم مادر میں نمایاں تغیرات تین ہوتے ہیں۔ (۱) نطفہ (۲) علقہ جونک کی شکل۔ عربی محاورہ ہے۔ اُعلِقَ۔ جونک لگائی۔ عُلِقَ۔ جونک لگائی گئی (۳) مضغہ عربی زبان میں مضغہ

گھوڑے کے باندوں کو کہتے ہیں، عام طور پر مقصد کا ترجمہ تو ترا ایا بونی کیا جاتا ہے)، تخلیق انسانی کے آغاز میں زندگی کو تین نمایاں مدارج کی تاریکیوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ایمیا کا درجہ، نباتی درجہ، حیوانی درجہ۔ ایسے ہی تین پردے یا تین تاریکیاں نمایاں طور پر رحم مادر میں بھی ہوتی ہیں جن سے ہر انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔ نطفہ کی حالت، علقہ کی حالت، مضغہ کی حالت۔ اس کے بعد وہاں بھی خلق آخر ہوتی ہے اور رحم مادر میں بھی نئی تخلیق یعنی ہیئت جاکا انسانی نمودار ہو جاتا ہے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ تین تاریکیوں سے شاید اُن تین حالتوں کی طرف اشارہ ہے جس سے ہر جنین کو گزرنا پڑتا ہے۔ یوں تو خلق بعد خلق رحم میں ہوتی ہی ہے۔ بارہ تیرہ حالات سے بچے کو دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن واضح تبدیلیاں یہی تین ہوتی ہیں اس لئے خلقاً من بعد خلق کے عموم کے بعد خصوصیت کے ساتھ فی ظلمات ثلٰث فرمایا۔ گویا ان تین حالتوں کی اہمیت شان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تعمیم کے بعد خصوصی ذکر بعض چیزوں کا کیا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۔ یعنی یہی سارے سنسار کا خالق اور ناظم تمہاری جسمانی و دماغی نشو و نما اور بقاء و تحفظ کا ذمہ دار ہے۔

لَهُ الْمُلْكُ ۔ لہٰذا ساری کائنات میں اُسی کا تصرف حکم اور آئین جاری ہے۔ وہ سب کا حکمران ہے۔ یعنی جب پیدا اللہ نے کیا اور ہر قسم کی پرورش اور بقا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی کرتا ہے تو اسی کا حکم اور آئین بھی چلنا چاہیے۔ کھانا اس کا اور گُن گانا دوسرے کے۔ خلق اور حکم اُس کا اور حکومت کسی اور کی۔ یہ بات غلط ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ یعنی جب اللہ اپنی ربوبیت اور حکومت میں واحد ٹھہرا اور کوئی دوسرا ان چیزوں میں اس کا ساجھی نہیں تو ضروری ہے کہ ساری زندگی میں اسی کی اطاعت اور فرماں برداری کی جائے۔ وہی اکیلا معبود (مطاع واجب الاطاعت) ہے۔ خلاصہ یہ کہ تخلیق عالم، نظم عالم، ترتیب عالم اور تصرف عالم سے اللہ ہی کا تنہا واجب الاطاعت نافذ الحکم اور معبود ہونا ثابت ہوتا ہے۔

فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۔ بس سیدھی راہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر ٹیڑھی پگڈنڈیوں کی طرف کہاں گھومتے اور مُڑتے ہو۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمان پذیری میں کسی اور کو کیوں شریک کرتے ہو اور اس کے سوا کسی اور کو کارساز یا ناحق سفارشی یا کفارۂ گناہ کیوں سمجھتے ہو۔

مقصودِ بیان تخلیق عالم نہ بیکار ہے نہ ناقص۔ جس کے متعلق جو خدمت کر دی گئی ہے وہ اس کو حسب الحکم انجام دیتا ہے اور بال برابر سرتابی نہیں کرتا۔ کل یجری سے واضح ہو رہا ہے کہ چاند کی طرح سورج بھی حرکت کرتا ہے۔ بطلیموسی حکماء و مشائیہ سورج کی حرکت اور زمین کے ساکن ہونے کے قائل تھے۔ موجودہ فلکیات نے اس وقت تک زمین کی حرکت اور سورج کے سکون کو ثابت کیا ہے۔ زمین کی حرکت یا سکون سے اس آیت میں کوئی بحث نہیں کی گئی۔ صرف چاند اور سورج کو مسخر اور فلک پر رواں ظاہر کیا ہے۔ سورج کی حرکت زمین کے آس پاس ہے یا خود اپنے محور پر ہے اس کی کوئی صراحت نہیں فرمائی۔ اس سے آگے انسان اول کی پیدائش اور بعد میں نسل چلانے والی کی تخلیق اور پھر عام انسانوں کے سلسلۂ توالد و تناسل کو بیان کر کے نظم کائنات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہونا دکھایا ہے اور پھر ربوبیت و حکومت سے الوہیت پر استدلال کر کے آخر میں ربوبیت یا حکومت یا الوہیت میں شرک کرنے والوں کو غلطی پر متنبہ فرمایا ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ

اگر تم ناشکری کرو گے تو اللہ کو بھی تمہاری پرواہ نہیں اور وہ اپنے بندوں کی ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ تم سے

لَكُمْ ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

خوش ہو گا اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم کو اپنے رب کے پاس جانا ہے پھر وہ تم کو بتلا دے گا جو تم کیا کرتے

تَعْمَلُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ

تھے کیونکہ وہ دلوں کی باتیں جانتا ہے اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارتا ہے

مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ

اسی کی طرف رجوع ہو کر پھر جب وہ اس کو اپنی نعمت عطا کرتا ہے تو جس کے لئے پہلے پکارتا تھا اس کو بھول جاتا ہے اور اس کے

أَندَادًا لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِ ۚ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۝

کے لئے شریک بناتا ہے تاکہ لوگوں کو بھی اس کے راستے سے بہکائے۔ کہہ دو اپنے کفر کے اور چند روز مزے اُڑا لو پھر تو آگ میں رہے گا

تفسیر کچھ لوگ کہتے ہیں اللہ کو ہماری فرماں برداری سے کیا تعلق۔ ہم اس کو واحد کارساز کہیں یا نہ کہیں اس کو اس سے کچھ نفع نقصان نہیں پہنچتا۔ پھر کیوں اس کے حکم کو مانیں، کیوں اس کو معبود جانیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جنتا کا عذاب ثواب راجہ کے، قوم کی رحم لیڈر کے ہاتھ میں۔ لیڈر اور نیتا کی قربانی سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہمارے پیشوا قربانی پیش کر چکے۔ اپنا مال آرام یہاں تک کہ جان بھی تج چکے پھر ہم کو کیا پرواہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکا۔ کوئی کہتا ہے اللہ کو ہمارے اعمال کی کیا خبر۔ وہ ہماری رفتار سے ناواقف ہے اور واقف بھی ہو تو ہم مر جائیں گے ہمارے زندگی کے اعمال ختم ہو جائیں گے۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گے۔ پھر جزا سزا کیسے ہو گی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سزا جزا کو مانتے ہیں۔ اللہ کی ہستی، الوہیت اور کارسازی کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں، مصیبت پڑے اس کو خلوص اور سچائی کے ساتھ پکارتے بھی ہیں لیکن اُدھر دُکھ ختم ہوا، مصیبت دور ہوئی، سُکھ ملا، چین نصیب ہوا۔ ادھر وہ خلوص غائب ہوا، اللہ کی کارسازی کو بھول گیا۔ طرح طرح کے اپنی دلی تعلق کو گڑھ لیا اور عیش و راحت میں پڑ کر اللہ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ مذکورہ بالا آیات میں ان تمام بیہودہ افکار گفتار اور اطوار کی سنجیدگی کے ساتھ تردید فرمائی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۖ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ عام طور پر کور باطن آدمیوں کے دماغوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو ہمارے کفر یا اسلام سے کیا تعلق۔ ہماری نیکی اور بدی سے اس کا کیا لگاؤ۔ کیا اس کو ہمارے عقائد اور اعمال کی اچھائی برائی سے کوئی نفع ضرر پہنچتا ہے اگر نہیں پہنچتا تو پھر ہمارے متعلق کیا نئے اوامر و نواہی کیوں ہیں اور ہم کیوں اس کے احکام کے پابند ہوں۔ اس شبہ کا ازالہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ بے شک کسی کے کفر سے اللہ کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔ اللہ کو کسی کے اعمال تو کیا کسی کی ذات کی بھی حاجت نہیں۔ وہ ہر احتیاج سے پاک ہے اور کسی کی اطاعت سے اس کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے (ان شرک) کو وہ ناپسند اور شکر (اطاعت) کو پسند فرماتا ہے اور یہ پسندیدگی ناپسندیدگی بھی آدمیوں کے نفع نقصان کی خاطر ہے یعنی وہ ہر تاثر اور انفعال سے منزہ ہے لیکن چونکہ وہ معبود ہے اور سب اس کے بندے ہیں عبدیت اور معبودیت کا علاقہ چاہتا ہے کہ عبد کے فائدہ اور نقصان کا لحاظ معبود کے پیش نظر ہو اس لئے اللہ کو اپنے بندوں کا کفر پسند نہیں اور شکر پسند ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کا قول نقل فرمایا ہے۔ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ۔ صحیح مسلم کی ایک حدیثِ قدسی میں اللہ کا فرمان وارد ہے۔ میرے بندو اگر تمہارے اگلے پچھلے تمام انس و جن بدترین شخص کے قلب کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کوئی نقصان نہیں آئے گا۔

تنبیہ: اس آیت سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی مشیت اور ارادہ سے جدا چیز ہے۔ رضا اور عدم رضا کا تعلق

اُن اوامر و نواہی سے ہے جو اعمال و انکار سے متعلق ہیں اور مشیت و ارادہ کا تعلق تخلیق سے ہے پس ارادۂ الٰہیہ اور مشیت خالق کا تعلق ہر چیز کی تخلیق سے ہے۔ دنیا میں کسی اچھی بُری چیز یا اچھے بُرے عمل کی تخلیق اللہ کی مشیت اور ارادہ کے بغیر نہیں ہو سکتی لیکن اللہ کی رضامندی اور ناراضی کی وابستگی اطاعت و معصیت سے ہے۔ احکام کی پابندی کو اللہ پسند فرماتا ہے اور نافرمانی کی مذمت فرماتا ہے اور اس کو بُرا جانتا ہے الا چونکہ اوامر و نواہی کی بنا آدمیوں کے نفع نقصان پر ہے۔ امر و نہی سے اللہ کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں اس لئے آدمیوں کے ہی فائدہ کے لئے اطاعت کو پسند فرماتا اور معصیت کو ناپسند قرار دیتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ یعنی کوئی بدکار نفس دوسرے بدکار نفس کا بار اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا۔ مطلب یہ کہ کسی کے گناہ کا بار اپنے اوپر اس طرح اوڑھ لے کہ گناہ کرنے والا آزاد اور اس کی جگہ غیر مجرم مجرم بن جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ خواہ ہم مشرک ہوں، کافر ہوں، گناہگار ہوں کچھ بھی ہوں قیامت کے دن صرف اتنا ہوگا کہ جہنم کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہم کو دوڑایا جائے گا۔ پھر بکثرت انبیاء بنی اسرائیل سفارش کر کے اپنی قوم کو جہنم سے نکلوالیں گے اور ہماری جگہ مجوسی، عیسائی اور مسلمانوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا فتح خیبر والی حدیث میں آیا ہے کہ اس وقت جب یہودیوں نے اس قسم کے بیہودہ عقیدہ کا اظہار کیا تو حضور نے فرمایا۔ کم بختو جاؤ دور ہو واللہ ہم کبھی تمہارے قائم مقام (جہنم میں) نہیں ہوں گے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ مسیح کا مصلوب ہونا ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گیا یعنی ہمارے گناہوں کا بار مسیح نے خود اپنے اوپر اٹھا لیا۔ بعض مسلمان جاہلوں کا بھی عقیدہ ہے کہ حضور نے حالت نزع کی ساری سختی اپنے اوپر لے لی تھی۔ بعض فرقوں کا خیال ہے کہ امام حسینؓ کی شہادت اُمت کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔ اس طرح کے خیالات کا ازالہ آیتِ مذکورہ سے ہوتا ہے۔

ایک شبہ:۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جو کوئی کسی کو قتل کرتا ہے تو قاتل پر قتل کا گناہ تو ہوتا ہی ہے لیکن اُتنا ہی گناہ آدم کے فرزند اول پر بھی ہوتا ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص (دین میں) کوئی برا طریقہ نکالے گا اُس پر اپنے فعل کا تو گناہ ہوگا ہی باقی اُن لوگوں کے تمام گناہوں کا بھی وبال ہوگا جو قیامت تک اُس طریقہ پر چلیں گے۔ مگر اس سے اصل مجرم کی سزا میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ اس قسم کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک گناہگار کے گناہ کی سزا دوسرا شخص اُٹھائے گا۔

ازالہ:۔ آیتِ مذکورہ اور احادیث صحیحہ میں کوئی تعارض نہیں آیت کی جو تفسیر ہم نے کی ہے وہی صحیح ہے یعنی کسی مجرم کے جرم کا وبال دوسرے شخص پر اس طرح نہیں پڑے گا کہ اصل مجرم بری ہو جائے اور غیر مجرم مجرم کی جگہ لے لے۔ احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ اول مجرم کی سزا میں اضافہ بعد کو جرم کرنے والے کے جرم سے ہوگا لیکن دوسرا مجرم بری ہو جائے یا اُس کی سزا میں تخفیف کر دی جائے ایسا ہرگز نہ ہوگا گویا مجرم اول دوسرے مجرم کے جرم کی سزا کو اپنے اوپر اوڑھ کر اس کو بری کرا دے ایسا ہرگز نہ ہوگا۔

تکملہ:۔ آیتِ مذکورہ میں ایک عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے جو عمومی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ قیامت کے دن غیر مجرم کو مجرم قرار دے کر اصل مجرم کو بری کیا جائے گا۔ نہ دنیا میں مجرم کو چھوڑ کر غیر مجرم کو اس کی جگہ پکڑا جا سکتا ہے۔ یہ الٰہی قانون اٹل ہے۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ یونانی فلسفہ کا منہ چڑانے والے کہتے ہیں کہ اللہ کو جزئی جزئی تفصیلی واقعات کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ بحیثیتِ عموم تو وہ واقف ہے لیکن الگ الگ ہر چھوٹی چھوٹی بات اس کو معلوم نہیں (نعوذ باللہ)۔ حضورؐ کے زمانے میں بعض اندھیرے دماغ اور کالی روح کے آدمی بھی خدا کو آدمی ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ کوئی کہتا تھا خدا کو ساری باتوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا چھپی ڈھکی باتیں وہ نہیں جانتا۔ کھلی ہوئی باتیں اور پکار کی آواز جانتا ہے کوئی کہتا ہمارے دلوں کے اسرار کا اُس کو کیا پتہ جب کوئی بات ہم منہ سے نہیں نکالیں گے اور ہاتھ پاؤں سے کچھ نہیں کریں گے تو سینوں کی باتیں خدا کو کیسے معلوم ہوں گی۔ اس تمام جہالت کوش حماقت زدہ کشش طبقہ نے یہ نہیں سمجھا کہ ساری کائنات کی جزئی جزئی چھوٹی سے چھوٹی حالت کیفیت اور ہستی آئی کہاں سے اور آئی کہاں سے ہے۔ سب چیزیں چھوٹی بڑی تو بنائیں اللہ نے اور وہی ہر چیز کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ آدمی تو صرف کام کرتا ہے کرنے

پھر ہی پکڑا جاتا ہے۔ اس کام کی طاقت اور خود اس کام کو پیدا تو خدا ہی کرتا ہے۔ پھر بغیر جانے وہ کیسے پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً ہاتھ سے تنہائی میں شراب کا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں کو لگایا یا چپکے چپکے لب و زبان کے نیچے ہی نیچے کوئی بات کہی یا دماغ میں کوئی تصور اور دل میں کوئی خیال پیدا ہوا تو ہاتھ، شراب گلاس، ہاتھ کی حرکت اور گرفت اور گرفت کی طاقت خدا ہی نے تو پیدا کی اور بنائی اور دی۔ اسی طرح زبان و لب دونوں کی خاص جنبش اور ان کے پٹھوں کی حرکت سب کچھ خدا کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ملحض ذرا دماغ و دل اور ان دونوں کی تصوری طاقت اور تصورات کی لہر اور ہر لہر کی کیفیت سوائے خدا کے کس نے پیدا کی۔ جب ہر چیز خداداد ہے تو ضرور وہ واقف اور عالم بھی ہے۔ پس تمام انسان مع ان کے اعمال اللہ کی طرف سے اس دنیا میں نمودار ہوئے ہیں اور وقت مقرر کے بعد سب کو اللہ واپس بلائے گا اور واپسی کے بعد ہر ایک کو اس کے جنم کرم بتا کر سزا جزا دے گا۔ آدمی خواہ اپنے گزشتہ اعمال بھول جائے مگر خدا سے تو اس کے اعمال غائب نہیں ہو سکتے، اس لئے مرنے کے بعد قیامت کے دن ہر عمل سامنے آئے گا۔

وَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ سے لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ تک۔ انسانوں میں کچھ تو خالص موحد ہیں جن کے رونگٹے رونگٹے سے اللہ کی توحید کا اعتراف پھوٹ کر نکلتا ہے۔ کچھ کھلے ہوئے مشرک ہیں لیکن ایک تیسرا فرقہ اور بھی ہے جو بہت زیادہ احمق یا خود فریبی ہے۔ جہاز میں سوار ہوا جہاز بھنور میں پھنس کر چکر کاٹنے لگا۔ اس وقت پیر فقیر، ولی نبی، مسیح، رام کرشن اور ہر دیوتا کو پکارنا بھول گیا۔ کسی سے فریاد کرتا دہائی دیتا دور کنار نام بھی دماغ میں نہ آیا، لگا خدا کو پکارنے گڑگڑانے چلانے اور فریاد کرنے۔ اللہ کو سرکش بے وقوف پر رحم آ گیا۔ جہاز کو بھنور سے نکال لیا۔ کنارے لگا دیا۔ ساحل پر اترا تو پھر غائب۔ بھوت سامنے آ گئے۔ کسی کی منت مانی، کسی کے نام پر بھینٹ چڑھائی، کسی کے کونڈے کئے، کسی کی نیاز دلائی۔ فراغت اور راحت کے وقت چھوٹے ہوئے معبود یاد آ گئے۔ دکھ کے وقت کوئی یاد نہ آیا۔ ایک پاؤں جیل میں تھا، وکیلوں نے جواب دے دیا تھا، پولیس مخالف تھی، جج دشمن تھا۔ فیصلہ کی تاریخ آئی۔ بھولا بے وقوف خدا کی طرف دوڑا۔ سب چھوڑ اللہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جج کی مخالفت پولیس کی دشمنی وکیلوں کی ترش روئی کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اللہ نے مدد کی صاف چھوٹ گیا۔ فوراً کسی مندر میں پہنچا یا کسی مزار پر جا دھمکا اور لگا چڑھاوے چڑھانے، چادر منڈھنے۔ کس نے کارسازی کی، احمق نے کس کا شکریہ ادا کیا اور کس کی پوجا کی۔ پاؤں قبر میں لٹک گئے۔ گوشت کے ساتھ ہڈیاں بھی گھل گئیں، کھال ہڈیوں سے چمٹ گئی۔ ڈاکٹر حکیم لاعلاج سمجھ کر بالیں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نامراد اور مایوس ہو کر ہر طرف سے منہ موڑا، رب کو پکارا۔ لبیک کی آواز آئی۔ رفتہ رفتہ صحت ہو گئی۔ ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آئیں، شادیانے بجے، دیوتاؤں، پیروں اور دیویوں کی نیاز دلائی گئی۔ مزار شریف پر بکرا چڑھایا گیا۔ مندر میں کسی مورتی کو بھینٹ دی گئی۔ وہ جاہل بے وقوف خدا کو بھول گیا۔ بچایا خدا نے نیازیں اور چڑھاوے دیئے دوسروں کے نام پر۔ جس کسی نے کامیابی، اچانک صحت اور بچاؤ کی وجہ پوچھی تو لگا دیوتاؤں پیروں فقیروں اور مزاروں کے نام لینے۔ فلاں پیر کی میں نے منت مانی تھی، فلاں کے نام کا توشہ کرنے کا عہد کیا تھا، گیارہویں والوں کے صدقے، خواجہ صاحب کے طفیل، شیخ سدو کی برکت اور صابر صاحب کی وجہ سے میں بچ گیا۔ پوچھنے والوں نے سنا اثر لیا۔ وہ بھی اللہ کا راستہ چھوڑ کر در بدر ٹھوکریں کھانے لگے۔ کم بخت خود گمراہ تھا دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔

قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِيۡلًا ۖ اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ۔ بعض علمائے تفسیر نے، عتبہ بن ربیعہ کے متعلق اس آیت کا نزول لکھا ہے۔ بعض نے کسی دوسرے کا ذکر کا نام لیا ہے لیکن روایت کوئی محقق نہیں۔ سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ جس احسان فراموش کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا تھا وہی یہاں بھی مراد ہے۔ خطاب رسول پاک کو اور بطور نیابت ہر مومن مخلص کو ہے۔ تمتع قلیل کی کوئی مقدار آیت میں نہیں بیان فرمائی، کیونکہ عمر اگر سینکڑوں برس سے گزاری تب بھی تمتع قلیل ہی رہا۔ دنیوی عمر کتنی ہی لمبی ہو آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔ کفر و معصیت سے دنیوی مال و دولت اور عیش و راحت میں زیادتی نہیں ہو جاتی۔ نہ ایمان و طاعت سے اسباب دنیا میں کچھ کمی آ جاتی ہے لیکن کوتاہ نظر ظاہری احوال پر نگاہ کو محصور رکھنے والا اپنے ماحول کا پرستار ایمان اور طاعت کو (چند ظاہری اسباب دیکھ کر) موجب فقر و الم خیال کرنے لگتا ہے اور کبھی اپنے مال کو رزق کی فراوانی اور مال کی کثرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ آیت میں کافر کے عقیدہ اور خیال کے مطابق فرمایا کہ کچھ مدت تک

یا کسی قدر اس کفر میں یا اس کفر کے ذریعہ سے مزے اٹھالے۔ مرنے کے بعد ضرور تجھے دوزخ کا کندہ بننا پڑے گا اور ہمیشہ آگ میں رہنا ہوگا۔

مقصود بیان

اللہ کو کسی کے کفر بلکہ تمام اہل کفر کی ہستی سے بھی کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ نہ کسی کے شکر و طاعت سے کوئی نفع پہنچتا ہے۔ ناشکری اور شکر سے نقصان نفع بندوں کو ہی پہنچتا ہے۔ بندوں کے نفع نقصان کے لئے اللہ کفر کو ناپسند اور شکر کو پسند فرماتا ہے۔ لعبادہ کے لفظ سے مستفاد ہوتا ہے کہ معبود کو اپنے بندوں کے نفع نقصان کا پاس ہے اور یہی عبدیت معبودیت کا رشتہ ہے جس نے اللہ کی نظر میں بندوں کی اطاعت اور معصیت کو پسند اور ناپسند قرار دیا۔ آیت میں کفر کے مقابل شکر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان کے ساتھ اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی شکر ہے صرف زبان سے شکریہ ادا کرنا کافی نہیں ہے۔ حقیقت میں شکر نام ہے قلبی تصدیق اور عملی اطاعت کا۔ ہستی اور بقائے ہستی، زندگی اور اسباب زندگی عطیہ الٰہی ہے جس کا اعتراف اور عملی زندگی میں نافرمانی نہ کرنی اس نعمت کا شکریہ ہے۔ جو شخص منکر اور کافر ہے وہ خداوند نعمت کا منکر اور احسان فراموش ہے۔ آیت لاتزر سے واضح ہے کہ کوئی کسی کا جرم اپنے اوپر نہیں اوڑھ سکتا۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ حدود و قصاص میں کفالت درست نہیں۔ مجرم کو چھوڑ کر قاضی کفیل کو نہیں پکڑ سکتا اور کفالت بالمال میں بھی اصل قرضدار (قرض) سے بری نہیں ہو سکتا۔ مرجعکم کے لفظ سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندگی اور سازندگی کا ہر عمل خدا کی طرف سے آیا ہے اور آخر میں اسی کی جانب سب لوٹ جائیں گے۔ آیت واذا مس الانسان سے شرک کرنے والوں کی کجراہی کا بیان اور اس بات کی صراحت مقصود ہے کہ غیر اللہ کے پجاری دکھ کے وقت سب کو چھوڑ کر خدا ہی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ان کی یہ شرک آفرینی اور معبود تراشی صرف عافیت اور راحت کا نتیجہ ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ انبیاء، اولیاء ائمہ اور دوسرے مشائخ کے نام پر بھینٹ چڑھانے والوں کو، غیر اللہ سے مرادیں مانگنے والوں کو اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے منتیں ماننے والوں کو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ در بدر جبہ سائی لاحاصل ہے۔ کوئی بھی کارساز نہیں۔ لیضل عن سبیلہ میں گمراہ آدمی کی گمراہ کنی کا ذکر ہے۔ بھٹکے ہوئے آدمی کی غلط روی، دوسروں کے اغوا اور گمراہی کا باعث ہو جاتی ہے وغیرہ۔

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ

کیا وہ ناشکرا بہتر ہے یا وہ جو رات کے اوقات میں سجدہ اور قیام کرکے عبادت کرتا اور آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید کرتا ہے کہہ دو کیا علم

يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۹﴾ ع

ع ۹ / ۱۶

والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں سمجھتے تو وہی ہیں جو عقل والے ہیں

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ

اے رسول میری طرف سے کہہ دو کہ اے میرے ایماندار بندو اپنے رب سے ڈرتے رہو جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ہے ان کے لئے اچھا بدلا ہے

وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

اور اللہ کی زمین فراخ ہے صبر کرنے والوں ہی کو ان کا بدلہ بے حساب دیا جائے گا

تفسیر

مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مآل اندیش ہوتا ہے اور مآل زندگی چونکہ پوشیدہ ہے اس لئے اس کو کسی وقت نتیجہ کی طرف سے سکون اور چین نہیں ہوتا۔ کبھی اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی طرف دیکھتا ہے تو سزا کا ڈر لگتا ہے۔ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے آہ و بکا، خشوع

اور خضوع، توبہ اور استغفار کے جذبات اس کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ کھڑا ہو کر خدا کے سامنے زاری کرتا ہے، زمین پر گر کر ماتھا رگڑتا ہے۔۔
غرض رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزر جاتا ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ یہ کروڑوں آسمان اور زمینیں، یہ چاند اور سورج، یہ لمحہ لمحہ بدلتی ہوائیں، یہ ابر باراں، یہ روشنی کا طوفان، یہ لہلہاتا سبزہ، یہ گل جمال چمنستان، یہ کشمیر در کنار ہر خواہ اللہ نے تمام انسانوں کے لئے اپنی رحمت سے بغیر کسی حق اور خدمت کے پیدا کئے۔ ہر ایک اس عمومی رحمت اور ہمہ گیر عطوفت سے تمتع اندوز ہے۔ سرکش باغی اور فرمانبردار مومن اس نعمت سے فائدہ اٹھانے میں برابر ہیں۔ اللہ نے اپنی رحمت سے کسی کو محروم نہیں کیا تو اس کا دل کھل جاتا ہے۔ اس کی امید بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی خطاکاریوں اور معصیت اندوزیوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اس رحمت الٰہیہ پر نظر ڈالتا ہے جو ہر طرف سے اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے تو کمال کی طرف سے اس کو کسی قدر اطمینان ہوتا ہے۔ غرض اسی کشاکش اور رغبت و خوف میں اس کی زندگی گزر جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت اور غضب کی تصویریں یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن کوتاہ نظر ملحد سے بے بہرہ فکر سے محروم کافر کی آخری منزل یہی زندگی ہوتی ہے۔ اسی کا ذکر شکر اس کے تیر نظر کا انتہائی نقطہ ہوتا ہے اس لئے وہ دوسری زندگی کے متعلق کبھی نہیں سوچتا۔ نہ اس کو اپنی غلط کاریوں کی سزا کا اندیشہ ہوتا ہے، نہ اللہ کے رحم کی امید۔ گویا وہ اللہ کی حکومت اور ملوکیت کا ہی منکر ہوتا ہے۔ نہ قدرتی قانون عدل کا یقین رکھتا ہے۔ نہ اپنے افکار اور اعمال کو قابل سزا و جزا جانتا ہے۔ خود رو سبزہ، بے بہا قطرہ، بے حس ذرہ اور بے جان خشک پتہ کہاں سے آیا معلوم نہیں کہاں جائے گا۔ پتہ نہیں کیوں آیا، کیوں جیا، کیوں مرے گا، کچھ واقفیت نہیں۔ کیوں پردۂ جنین سے نکل کر غوں غوں کرنا شروع کیا، کیوں گھٹنوں کے بل چلا، کیوں سن شعور کو پہنچا، کیوں شباب کی رعنائیوں اور تنومندیوں سے ہمکنار ہوا، آخر میں کیوں خزاں آئی، کمر جھکی اور مسلوب الحواس پیر فرتوت ہو کر قبر میں پہنچا، کچھ شعور نہیں۔ ایسا آدمی دکھ میں مایوس اور سکھ میں مغرور رہتا ہے۔ نہ اس کا حوصلہ بلند، نہ عزم محکم، گھبرانے والا، اترانے والا طفلِ نابالغ بلکہ بے شعور چوپایہ سے بھی زیادہ راہِ زندگی سے ناواقف۔ نہ اللہ کا یقین، نہ رب کا ڈر، نہ ہمدردی کا جذبہ کارفرما، نہ صبر و استقامت کی طاقت مددگار۔ ایسے آدمی کے سر میں بھیجا نہیں ہوتا۔ دل میں دانش نہیں ہوتی پھر اپنی زندگی اور کل زندگی پر غور کرے تو کیسے کرے۔ خالق و مخلوق کے رشتہ کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔ اللہ کی رحمت اور غضب کو دیکھے تو کیسے دیکھے۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا۔ اوپر کی آیات میں مشرکوں کے احوال رنج و راحت کو بیان کیا تھا اور مصیبت پڑنے پر جو کچھ ان کی کیفیت ہوتی ہے اور پھر مصیبت ٹلنے پر جو تغیر ان کی حالت میں ہوتا ہے اس سب پر روشنی ڈالی تھی۔ اس آیت میں اہل ایمان کے امتیازی بنیادی اوصاف کو بیان فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا مطیع ہو وہی قانت ہے۔ گویا ابن مسعود کے نزدیک قنوت کے معنی ہوئے اطاعت۔ لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اس لفظ کا ترجمہ خشوع و خضوع ہے۔ ایک حدیث میں تلاوتِ قرآن کو قنوت قرار دیا گیا ہے۔ احمد اور نسائی کی روایت ہے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا جس شخص نے رات کو سو آیتیں پڑھیں اس کے لئے اس رات کا قنوت لکھا جائے گا۔ یہ روایت تمیم داری کی ہے۔ مختلف اقوال کا حاصل یہ ہے کہ نہ فقط خشوع اور خضوع ہی کامل قنوت ہے نہ بغیر خشوع اور نیت خالص کے قرآن کی تلاوت اور نماز کے قیام و سجود ہی کو پورا پورا قنوت کہا جا سکتا ہے بلکہ نیت خالص، قلب حاضر، خشوع باطنی، خضوع حواس پھر تلاوتِ قرآن اور نماز کا قیام و سجود ان سب کا مجموعہ بشرطیکہ اطاعت رسول کے جذبہ کے ساتھ بجا لایا ہو قنوت کہلاتا ہے۔

اٰنَآءَ الَّيْلِ۔ اوقاتِ شب۔ اس سے مراد ہے وسط شب (حضرت عبداللہ بن عباس، حسن بصری، سدی اور ابن زید) یا مغرب و عشاء کا درمیانی وقت (منصور) یا پوری رات (قتادہ) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت میں قنوت کی دو حالتیں بیان فرمائیں۔ سجود اور قیام لیکن آیت وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ میں صرف قیام کا ذکر فرمایا، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قنوت قیام کے ساتھ مخصوص ہے۔ ابن کثیر کا مؤخر الذکر آیت سے استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دونوں آیتوں کا منشا جدا جدا ہے اور مؤخر الذکر آیت میں کوئی تعارض نہیں۔ اول آیت میں قنوت کی دو حالتیں بیان فرمائیں سجود اور قیام اور

مؤخرالذکر آیت میں قنوت کو قیام سے مقید نہیں فرمایا۔ بلکہ قیام کو مشروط بقنوت کیا یعنی قیام کی حالت بیان کی۔ اس کے علاوہ سجود اور قیام کا ذکر احترازی نہیں بلکہ مثالی ہے۔ یعنی قنوت کو نہ صرف سجود کے ساتھ مخصوص کرنا مقصود ہے نہ فقط قیام کے ساتھ بلکہ اس سے مراد ہے پوری عبادت میں خشوع و خضوع اور تضرع و زاری کرنا۔ بہرحال آیت میں مومن کے دماغ کی لگن، دل کی تڑپ اور روح کی بے تابی کی تصویر کشی مقصود ہے کہ جب ساری دنیا محو استراحت ہوتی ہے اس وقت بھی مردِ مومن کے دل کی تڑپ اس کو سونے نہیں دیتی۔ اس کی نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ بیتابی کی حالت میں کبھی سجدے میں گر پڑتا ہے کبھی دست بستہ سر افگندہ کھڑا رہتا ہے۔

آیتِ مذکورہ میں اگرچہ صرف استفہام مذکور ہے مگر حقیقت میں نازآگیں طلب مقصود ہے۔ یعنی اللہ مردِ مومن کو خشوع و زاری اور قیام و سجود کی دعوت دے رہا ہے۔

يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ۔ گزشتہ آیت میں مومن کے قنوت کی ظاہری ہیئت بیان کی تھی۔ اس آیت میں باطنی حالت کا اظہار فرمایا۔ یعنی مومن کے قنوت کی ظاہری شکل تو وہ ہوتی ہے کہ راتوں کو سجدہ میں پڑا گڑگڑاتا اور مؤدب کھڑا لرزتا ہے اور اندرونی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف آئندہ زندگی کی تباہی کا اندیشہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے اور دوسری طرف رحمتِ پروردگار کی ہمہ گیری دیکھ کر اس سے آس لگائے رہتا ہے۔ مقصد یہ کہ مایوس بھی نہیں ہوتا اور مغرور بھی نہیں ہوتا بلکہ غرور اور یاس سے بچ کر امید اور خوف کی حالت سے ہر وقت دوچار رہتا ہے۔

ابن کثیر نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبادت کے لئے خوف اور امید دونوں ضروری ہیں بلکہ زندگی میں خوف کا پہلو غالب رہنا چاہیے اور مرنے کے وقت امید میں قوت ہونی چاہیے۔ اسی لئے آیتِ مذکورہ میں خوف کو امید سے پہلے ذکر کیا۔ صحاح و سنن میں بکثرت احادیث مذکور ہیں کہ نماز تہجد میں حضور قرآن پڑھتے تو آیتِ عذاب پر ٹھہر کر پناہ مانگتے اور آیتِ رحمت پر ٹھہر کر دعا مانگتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آیتِ مذکورہ پڑھ کر فرمایا تھا۔ اس آیت کا مصداق عثمان بن عفان ہیں (رواہ ابن ابی حاتم) حضرت عمر کی مراد یہ نہیں ہے کہ آیتِ مذکورہ حضرت عثمانؓ کی بابت نازل ہوئی تھی بلکہ مقصد یہ ہے کہ آیت میں جس مفہوم کا تذکرہ ہے اس مفہوم کا تحقق حضرت عثمان میں ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ اوپر کی آیت میں اس مردِ مومن کا ذکر جس پیرائے میں فرمایا جس کے پیشِ نظر راتوں کے سکون کے وقت بھی آئندہ زندگی کا اندیشہ اور اللہ سے رحمت کی امید رہتی ہے۔ گویا ایسا آدمی انجام اندیش، انجام فہم اور انجام بین ہوتا ہے جو اس زندگی کی اصل غرض اور منتہا سے بخوبی واقف اور حقیقت میں عالم کہے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن اس کے خلاف وہ خود فراموش آدمی بھی ہوتا ہے جو اپنے انجام کے متعلق کبھی نہیں سوچتا۔ بدنامی سے نہیں ڈرتا۔ نہ غیبی کارسازی کی رحمت اس کو دکھتی ہے۔ غافل، خوابِ جہالت میں مدہوش، بادۂ خود پرستی سے سرشار، نہ اس کے پاس قلب نہ لب، دل میں روشنی آنے کا راستہ بند، روح زنگ آلود، حیوانی حواس تیز مگر حسِ لطیف معدوم، نظر حقیقت رس نہیں، گوشِ حق نیوش نہیں، دل عبرت اندوز نہیں۔ راتوں کو گاتا ہے۔ نشہ میں بدمست ہے، دنیوی عیش پر اتراتا ہے کھاتا پیتا غراتا ہے۔ صبح اٹھ کر وہم کے در پر عقل کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ بے جان مورتیوں، زمینی دیوتاؤں اور خودساختہ کارسازوں سے منتیں مانگتا۔ فریادیں کرتا اور ان کے سامنے کتوں کی طرح گڑگڑاتا ہے۔ ایسا آدمی حقیقت میں جاہل احمق ہے اُس کی روح بیدار، اس کی روح خوابیدہ، اُس کا دل روشن، اس کا ذہن تاریک۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ بیدار اور خوابیدہ ہم مرتبہ نہیں مردہ اور زندہ مساوی نہیں، مغز والے کھوکھلے سروالوں کی طرح نہیں

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ۔ خطاب حضور کو اور بطور نیابت ہر مومن کو ہے۔ یہ دنیا صرف نظریات اور فکریات کی دنیا نہیں صحیح عقیدہ بھی بغیر عمل کے بے سود ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر عمل کی تعمیر نظریہ کی بنیاد پر ہوتی ہے اس لئے نظریہ اصل ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ صرف بنیاد بغیر تعمیر کے سردی گرمی اور برسات سے نہیں بچا سکتی۔ دنیوی اور دینی نتائج اُن اعمال سے وابستہ ہیں جو افکار و عقائد پر مبنی ہوں مومن کا جب ایمان صحیح ہو گیا اور خدا کو اس نے بنورِ بصیرت پہچان لیا اس کے مرتبہ کی شناخت کر لی اور مخلوق و خالق میں امتیاز کر لیا اور عبد و معبود کی حدِ فاصل سے اس کو واقفیت ہو گئی تو وہ عقیدۃً بجا طور پر اللہ کا ہو گیا۔ لیکن صحیح تصوری ماننے کے بعد عمل کی ضرورت رہتی ہے اس لئے

قدم قدم پر اس کو قوانین الٰہیہ اور ضوابط شرعیہ کا لحاظ رکھنا پڑے گا سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے چوکنا رہنا ہوگا وہ دیکھے گا کہ کہیں تصورات ماضی یا واردات قلبی یا ملفوظات زبانی یا حرکات جسمانی یا ملکات روحانی یا اخلاق باطنی کا کوئی حصہ کسی مخلوق کے قول فعل اور خود ساختہ آئین سے تو متاثر نہیں۔ کہیں خود رائی خود نمائی اور ہوا پرستی کی تو کسی حرکت و سکون میں آمیزش نہیں۔ کہیں خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم سے کوئی قدم ادھر اُدھر تو نہیں پڑ جاتا۔ ان امور کی نگہداشت ہر مومن کا فرض ہے اور یہی حقیقی تقویٰ ہے۔ اسی لئے ہر مومن کو مبلغ کے پیرایہ خطاب سے سرفراز فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اے میرے مومن پرستارو! اپنے رب سے تقویٰ رکھو۔ یعنی اس ژولیدہ زندگی کے پیچ در پیچ جھاڑ میں پھنس کر لغزش نہ کھا جانا، شیطانی وسوسوں میں نہ آجانا اور صراطِ مستقیم سے بھٹک نہ جانا۔ جب ایمان رکھتے ہو تو ایمان کے تقاضے بھی پورے کرنا۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

دنیا میں کثرت سرکش کافروں کی ہے۔ اہل ایمان بہت کم ہیں اور جن کو ایمان کا دعویٰ ہے ان میں بھی نیکوکار حق شعار کم ہیں، عام اہل ایمان کو کہیں کہیں اہل کفر کے غلبہ کی وجہ سے تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اور کم ہمت یا ضعیف القوت آدمیوں کے پائے استقامت میں لغزش آنے کا اندیشہ ہوتا ہے بعض مقام ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں ایمان اور صلاح حالی کی تلقین نہ صرف بے سود بلکہ مضرت رساں ہوتی ہے اور مومن کو یہ اجازت نہیں ہو سکتی... کہ مصائب سے تنگ آکر ایمان یا نیکوکاری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے اور بگڑنے والوں سے متاثر ہو کر خود بھی بگڑ جائے اس لئے وطن، گھر بار، مال متاع اور ہر قیمتی سامان کو چھوڑ کر ایمان اور نیکی کی دولت کو بچانے کے لئے زمین کے کسی دوسرے خطہ میں پناہ گزین ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے لیکن ترک وطن آسان نہیں۔ جائداد اور مال و متاع سے منہ موڑنا سہل نہیں، فقر و فاقہ اور ہر طرح کا جسمانی اور دماغی دکھ اٹھانا پڑتا ہے اور ہر مصیبت کو عزم اور استقلال کے ساتھ جھیلنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں نیک کام کرنے اور ایمان و صلاح کو بچانے کے لئے وطن چھوڑنے اور تمام مصائب پر صبر رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آیت کے تین ٹکڑے ہیں۔ اول ٹکڑا ہے۔ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ اس میں احسنوا کے معنی ہیں بھلائی کی۔ یا یہ معنی ہیں کہ کسی کام کو بھلائی اور احسان کے درجہ میں کیا یعنی خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر پورے ادب و احترام کے ساتھ حکم شریعت کے ماتحت ادا کیا۔ دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں، اس میں حکم شریعت کا لحاظ، خشوع قلب اور ناظر کے حاضر ہونے کا عقیدہ کارفرما ہے پہلا معنی عام ہے جو انسانی کی خود ساختہ نیکی (اگر اس کو نیکی کہا جائے) کو بھی شامل ہے۔ گویا پہلی تشریح اس مسئلہ پر مبنی ہوگی کہ اعمال و افعال کا حسن و قبح شرعی ہوتا ہے جس کو شریعت نے اچھا کہہ دیا وہ اچھا ہے جس کو شریعت نے برا کہا وہ برا ہے خواہ انسانی فہم اس کو اچھا جانے یا برا۔ دوسری تفسیر کا ماخذ معتزلہ کا خیال ہے کہ اشیاء کا حسن و قبح عقلی ہے۔ اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنے والا مرد دماغ ہے اس سے آگے فی ہذہ الدنیا کا لفظ ہے۔ اس لفظ کا تعلق یا تو احسنوا سے ہے یا حسنۃ سے۔ پہلی صورت میں کوئی دقیق اور لذیذ مطلب نہ ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ بھلائی کی جاتی ہے وہ اسی دنیا میں کی جاتی ہے۔ آخرت میں تو نہ کوئی بھلائی کی جا سکتی ہے نہ برائی۔ دنیا ہی دار العمل ہے اور آخرت صرف دار الجزا۔ دوسری صورت میں مطلب نازک اور لطیف پیدا ہوگا۔ یعنی بھلائی کرنے والوں کو اسی دنیا میں عظیم الشان بھلائی ملتی ہے۔ مطلب یہ کہ آخرت میں جو ثواب ملے گا وہ تو ہر حال ملے گا۔ اس دنیا میں بھی ان کی نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔ قوانین شریعت پر عمل کرنا اور خلوص نیت کے ساتھ خدا کو حاضر ناظر جان کر عمل کرنا بیکار نہیں جاتا۔ اس سے دنیا میں بھی سرخروئی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ کافروں کا غلبہ ہو اور انتہائی کوشش کے بعد بھی کامیابی کی صورت دکھائی نہ دے اور دارالکفر میں رہ کر اشاعت اسلام اور تبلیغ احکام ممکن نہ ہو تو پھر اس جگہ کی سکونت ترک کر دینی چاہئے جس کی صراحت دوسرے ٹکڑے میں ہے کہ اللہ کی سرزمین تنگ نہیں ہے، کشادہ ہے۔ جہاں دین کا بچاؤ ہو سکے وہاں چلے جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ وطن چھوڑ کر دوسری جگہ وطن بنا لو۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ لیکن ترک وطن آسان کام نہیں۔ تمام املاک و اموال سے منہ موڑ لینا، دوستی اور قرابت کے رشتوں کو توڑ دینا، جائے بود و باش اور مسقط الراس سے کنارہ کش ہو جانا، پھر سفر کی مشقتیں اٹھانا، نیا وطن بنانا، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنا بڑا صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہے تاہم اس کا اجر بھی بے حساب ہے۔ اسی لئے تیسرے ٹکڑے میں فرمایا کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر ملے گا یعنی دنیا میں بھی اجر ملے گا کامیابی ہوگی اور آخرت کے اجر کا

زمینکا تناہی نہیں ہے، اس کی کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ہر اطاعت گزار کو ثواب کسی خاص اندازے سے دیا جائے گا مگر صبر کرنے والوں کو بے حساب دیا جائے گا۔ اوزاعی نے اجر بے حساب کو سیلاب کے بہاؤ سے تشبیہ دی۔ سدی نے اس اجر کو جنت قرار دیا۔ ایک حدیث میں آیا ہے جو لوگ مکلیفوں پر صبر کرتے ہوئے اطاعت پر قائم رہے ان کا نہ کوئی وزن ہوگا نہ ان کا دفترِ اعمال کھولا جائے گا بلکہ بے گنتی اجر دیا جائے گا۔ یہ مطلب اس صورت میں ہوگا کہ بغیر حساب کا ترجمہ بے گنتی کیا جائے۔ لیکن اگر بغیر حساب سے مراد بے گمان لیا جائے جیسا کہ دوسری آیت ویرزقہ من حیث لا یحتسب میں آیا ہے تو مطلب میں مزید تکلف پیدا ہو جائے گا اور اجر کی تخصیص صرف آخرت کے ساتھ نہ ہوگی۔ حاصل مطلب یہ ہوگا کہ مصائب پر صبر اور احکامِ الٰہیہ پر استقامت رکھنے والوں کو بے گمان اجر ملے گا ایسے راستوں سے ان کی کوشش بار آور ہوگی جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

اپنے اعمال کی برائی اور اللہ کی رحمت کی وسعت پر نظر رکھنے کی دعوت اور دونوں پر نظر رکھتے ہوئے قیام خوف اور سجود لیل کی نا آگیں طلب۔ اپنے اعمال کا محاسبہ اور رحمتِ الٰہیہ کی پہنائی پر نظر رکھنا علم کی نشانی ہے جو شخص اس سے محروم ہے وہ جاہل ہے جس کیلئے مفوز ہے، نصیحت اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے بعد احکامِ شرع کی پابندی یعنی تقویٰ لازم ہے۔ شرع کی پابندی کی روشنی میں ادب و احترام کے ساتھ اللہ کو حاضر ناظر جان کر نیکی کرنی ضروری ہے جس کا اجر دنیا میں بھی ضرور ملے گا کوشش بیکار نہیں جائے گی۔ یہیں غلطی ہے یہیں وہ لوگ جو شرع کی پابندی کو دنیا میں ناکامی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ہاں تکلیفیں بہت سخت اُٹھانی پڑتی ہیں جو شخص مصائب سے تنگ آ جائے اور دینی بچاؤ ممکن نہ ہو اس کو ترکِ وطن کا حکم لطیف ترین عبارت میں دیا گیا ہے کہ اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے یعنی زمین تو اللہ کی ہے۔ اگر کوئی خطۂ زمین ناموافق ہو تو دوسرے خطہ کی طرف چلے جاؤ۔ ایک بستی نہیں دوسری بستی سہی دینی بچاؤ بہر حال ضروری ہے اور ترکِ وطن میں جو مصائب پیش آئیں ان کو استقامت اور صبر کے ساتھ اٹھاؤ کوشش بیکار نہیں جائے گی اُن راستوں سے کامیابی حاصل ہوگی جو گمان و خیال میں بھی نہ ہوں گے۔

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴿۱۱﴾ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ

کہہ دو مجھ کو تو یہی حکم ہوا ہے کہ میں خالص اُسی کا ہو کر اللہ کی عبادت کیا کروں اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے

الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ

فرمانبرداری کروں۔ کہہ دو اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہہ دو

اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ

میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں خالص اسی کا ہو کر پھر تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو

تفسیر

طلبِ مساوات کا جذبہ عام انسانوں میں کارفرما ہے نیکی ہو یا بدی، اچھائی ہو یا برائی، دوسرے کی ریس سے عامی آدمی کرنا چاہتا ہے کلام اور پیام کی اچھائی برائی اور نفع و ضرر پر غور کرنے والے بہت کم ہیں۔ بات یہ ہے کہ فہم و دانش سے بہرہ کم لوگوں کو ملا ہے اس لئے کسی چیز کی افادیت یا ضرر رسانی کو گہری نظر سے دیکھ کر سمجھنا اور سمجھ کر عمل کرنا عام آدمیوں کا شیوہ نہیں۔ وہ تو ہدایت کرنے والے کی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ ہدایت پر غور بہت کم کرتے ہیں۔ ہدایت کرنے والے کی خصوصیت اس کے مرتبہ کی بلندی، اس کے ذاتی احوال اور زندگی کے غیر معمولی فرائض کو بھی ان کوتاہ بینوں کے سامنے نہیں ہوتے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ لیڈر اور ریفارمر کا طرزِ زندگی کیا ہے

ہم کو جس راہ پر چلانا چاہتا ہے کیا خود بھی سب سے پہلے اس پر گامزن ہے یا نہیں۔ اگر اُن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ پیام دینے والا جب سے پہلے خود بھی اس پر عامل ہے تو اُس وقت وہ غور کرتے ہیں کہ کیا آباؤ اجداد کے طریقہ کے خلاف تو اس کا عمل نہیں ہے۔ اگر بزرگوں اور بوسیدہ ہڈیوں کی رسم و رواج کے خلاف ہادی کا پیام اور اس کا عمل ہوتا ہے تو اس کو گرانہ تقلید کی طرف کھینچ کر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت بھی کم بخت پیام کی حقانیت پر غور نہیں کرتے حالانکہ اصحابِ فہم۔ اربابِ دانش، علماء، انبیاء اور آسمانی کتابوں کا یہ طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ پکار پکار کر پیام پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ہدایت نامہ کی اصل غرض کو صداقت و کذب کی کسوٹی قرار دیتا ہے مگر چونکہ اس کو عوام کی اصلاح کرنی مقصود ہوتی ہے اس لئے اُنہی کے مذاق کے موافق اپنے نفس کو اُس ہدایت کے سلسلہ سے وابستہ دکھاتا ہے اور اپنی ذات پر ڈھال کر اُن کو نصیحت کرتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء: قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ۔ مقاتل کی روایت ہے کہ کفارِ قریش نے جب حضور سے عرض کیا کہ آپ کے باپ دادا اور دوسرے بڑے بڑے آدمی لات و عزیٰ کی پوجا کرتے چلے آتے ہیں تم اُن کے راستے پر کیوں نہیں چلتے۔ تو اس کے جواب میں یہ حکم نازل ہوا۔ اس مورد کی اس تخصیص کو اگر صحیح مان لیا جائے تو خطاب صرف رسول اللہ کو ہوگا اور اگر شانِ نزول کو صحیح نہ قرار دیا جائے تو براہِ راست خطاب حضور کو اور بطورِ نیابت تمام مسلمانوں کو ہوگا۔ رسول اللہ کا رتبہ عوام تو بجائے خود ہے، تمام اہلِ فاضل اور عالی مرتبہ لوگوں میں بھی ممتاز ہوتا ہے اور وہ خود روح القدس کے ہم نشین ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ خود کسی ہدایت پر اپنا کاربند ہونا ظاہر کریں تو دوسروں کے لئے رغبت اور میلانِ طبع کا ذریعہ ہو سکتا ہے اور اگر وہ اپنی ذات کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے دوسروں کو اُس حکم کی رسی میں باندھنا چاہیں تو جھوٹ یا کم از کم عدم مساوات کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے اس لئے آیت مذکورہ میں حضور کو سب سے پہلے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اللہ کی خالص اطاعت اور فرماں برداری کا حکم دیا گیا ہے۔ میں خود اس پر مامور ہوں کہ محض خدا کی عبادت کروں۔ اس کی اطاعت میں کسی کو شریک نہ کروں۔ یعنی آباؤ اجداد ہوں یا بزرگانِ قوم یا ملکی رواج یا نفس کی خواہش، میں کسی کو اللہ کے حکم کے مقابلہ میں مان نہیں سکتا۔ زندگی کے دستور کی کسوٹی صرف اللہ کا حکم ہے۔ کسی دوسرے کا قول نص یا عقیدہ معیار نہیں۔ اور جب میں خود اس پر مامور اور مکلف ہوں تو پھر تم کو بھی اس پر کاربند ہونا چاہیے۔

وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ بلکہ مجھے تو (یہ خصوصی) حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر میں ہی اس کی اطاعت کروں۔ اپنا رُخ اس کی طرف پھیر دوں، اپنے فکر و عمل کی کل طاقتیں اُسی کے حکم کے تحت کر دوں۔ آیت مذکورہ میں اولیت مرتبہ کے لحاظ سے بھی مراد ہے اور پوری قوم میں زمانہ کے تقدم کے لحاظ سے بھی یعنی اولیتِ درجہ اور اولیتِ زمانیہ دونوں مراد ہیں۔ دوبارہ امرت کا لفظ اسی خصوصیت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا۔ پہلا امر تو عام تھا جس میں تمام انسان داخل تھے اور پیغمبر کو بھی وہ حکم شامل تھا اور دوسرا امر صرف پیغمبر کے لئے ہے۔ بات یہ ہے کہ الہام القاء، وحی خفی و جلی پیغمبر کو ہی ہوتی تھی۔ وہی بچشم روح ابنوہ قلب اور بعین وجدان جانتے اور یقین کرتے تھے کہ یہ پیام رحمانی ہے شیطانی وسوسہ نہیں ہے۔ پھر پیغمبر کی وساطت سے دوسرے لوگوں تک وہ پیغام پہنچتا تھا اور ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کے لئے اس کا یقین بالمشاہدہ نہ تھا۔ اس لئے ایمان میں اولیتِ درجہ بھی پیغمبر کو حاصل تھی اور اولیتِ زمانیہ بھی۔ رہی یہ بات کہ مسلمین سے تمام جہان کے اہلِ اسلام مراد ہیں جن میں گزشتہ انبیاء اور ان کی اُمتوں کا بھی شمار ہے یا صرف امتِ محمدیہ مراد ہے۔ تو عقیدہ اور صحیح ذریعہ نزول ہے۔ اگر یہ عقیدہ میں غلو کرنے والوں نے پہلا مطلب بھی مراد لیا ہے مگر وہ سیاقِ قرآنی کے خلاف ہے بجائے خود صحیح ہو یا غلط اس آیت کی تفسیر کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ اوپر والی آیت کا حکم مثبت تھا۔ اس آیت میں سلبی رُخ دکھا کر اس کے انجامِ بد کی تبلیغ آمیز وعید ہے۔ ترجمہ ظاہر ہے۔ قیامت کا دن اپنی شان کے لحاظ سے بھی عظیم ہوگا اور دشوار و ترتیب کے لحاظ سے بھی۔ مقصد یہ ہے کہ رب کی نافرمانی پیغمبر کو بھی قیامت کے عذاب سے محفوظ نہیں رہنے دے گی۔ بات یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں کسی انسان کے عالی مرتبہ ہونے کا معیار

صرف زبان پر جاری ہے۔ جب سبب عزت مفقود ہو گیا تو پھر ذلت سے کون چیز بچا سکتی ہے۔ آیت میں معصیت رسول کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ جس طرح قضایا شرطیہ میں شرط و جزاء اپنی اپنی جگہ محال ہوتی ہیں لیکن ملانے کی صورت میں شرطی کلام صحیح ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کلام بھی ہے مثلاً اگر خدا کمزور ہوتا تو محتاج ہوتا۔ دونوں ٹکڑے اپنی اپنی جگہ جھوٹے ہیں۔ نہ خدا کمزور ہے نہ محتاج۔ لیکن باہم ملانے کے وقت کلام شرطی صادق ہے۔ اس تنبیہ سے واضح ہو گیا کہ اس آیت سے عدم عصمت رسول پر معتزلہ کا استدلال غلط ہے۔ معصیت رسول اس آیت سے ثابت نہیں۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِىْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ۔ اُعْبُدُوْا امر کا صیغہ ہے لیکن اس سے غیر اللہ کی پرستش کی اجازت مراد نہیں ہے بلکہ شرک پر وعید و توبیخ اور زجر مقصود ہے۔ طوعاً اطاعت کے معنی ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کی چند صورتیں ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح علماء اور درویشوں کے احکام کی پابندی اور ان کے فتووں پر عمل کرنے کو فرض جاننا۔ خواہ اللہ کی کتاب کے موافق ہوں یا مخالف۔ اسی طرح اولیاء اور دینی پیشواؤں کو حاجت روا کارساز یا اللہ سے روزی، اولاد دلوانے والا، دنیوی مصائب کو ٹالنے والا سمجھنا، وقت میں کام آنے والا خیال کرنا یا غیبی موکلوں اور موہوم دیوتاؤں کو مددگار سمجھنا، ان کو پکارنا، ان کے نام پر قربانیاں کرنا، بھینٹ چڑھانا، ان کی منتیں ماننا، نیازیں دینا، یا سلسلۂ عالم کی حلقہ در حلقہ کڑیوں کے ہاتھ میں نظمِ کائنات کو سمجھنا اور عناصر یا نباتات یا جمادات یا حیوانوں کو خدا یا اللہ کی کتاب کی موجودگی میں کسی دوسرے انسان کے خود ساختہ قانون کو زندگی کا دستور العمل قرار دینا وغیرہ

مقصود بیان

قُلْ اِنِّىْۤ اَخَافُ الخ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے حکم سے سرکشی اور اس کی نافرمانی اتنی سخت چیز ہے کہ عوام تو بجائے خود ہے اگر بالفرض پیغمبر برحق سے بھی اس کا صدور ہو جائے تو وہ بھی راندۂ درگاہ ہو جائے۔ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ سے شرک اور توحید کے جھگڑے کو ختم کرنا مقصود ہے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ زبردستی مشرک کو موحد بنانا اور کسی کے مذہب کو تبدیل کرانا اسلام کی نظر میں درست نہیں بلکہ عمل اور فکر کی اسلام نے پوری آزادی دی ہے۔ آدمی زندگی کے جس راستے پر چاہے گامزن ہو۔ دنیا میں اس کو کوئی روکنے والا نہیں وغیرہ

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ

کہہ دو کہ پورے زیاں کار وہی لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے قیامت کے روز خسارہ میں پڑے یاد رکھو کہ صریح

الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ

خسارہ یہ ہے ان کے لئے ان کے اوپر سے بھی آگ کے شعلے محیط ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی آگ کے محیط شعلے ہوں گے یہ وہی عذاب

يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا

ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو مجھ سے ڈرو اور جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے رہے (مراد غیر اللہ کی عبادت ہے) اور

وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ

اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ مستحق خوشخبری سنانے کے ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام (الٰہی) کو کان لگا کر سنتے ہیں پھر اس کی اچھی اچھی

اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ اَفَمَنْ حَقَّ

باتوں پر چلتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں بھلا جس شخص پر عذاب کی بات محقق ہو چکی

عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ

تو کیا آپ ایسے شخص کو جو (علم الٰہی میں) دوزخی ہے چھڑا سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے اُن کے لئے (جنت میں) بالاخانے ہیں

غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ

جن کے اوپر اور بالاخانے ہیں جو بنے بنائے تیار ہیں۔ اُن کے نیچے نہریں چل رہی ہیں۔ یہ اللہ نے وعدہ کیا ہے اور اللہ وعدہ میں خلاف نہیں کرتا۔

تفسیر یہ زندگی ایک تجارت گاہ ہے۔ ایک منڈی ہے۔ جہاں انسان کے افکار و اعمال کی جنس فروخت ہوتی ہے۔ اور انجام کار نفع ہوتا ہے یا گھاٹا۔ دورانِ تجارت میں نفع یا نقصان کیا۔ زندگی میں آرام بھی ناقابلِ بھروسہ اور دکھ بھی بے اعتبار۔ تجارتی زندگی کی فائنل رپورٹ کو نفع اور خسارہ کہا جاسکتا ہے۔ کسی نے اس زندگی میں دربدر سجدہ ریزی کی۔ جاندار اور بے جان کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور دستگیری کی اپنے خیال میں دھجیاں اُڑادیں۔ حرام حلال کا فرق اُٹھادیا۔ خوب کمایا خوب کھایا۔ جس کا پایا اُڑادیا۔ نادان اپنی زندگی کو کامیاب سمجھا۔ آخر قوت نے جواب دیا۔ دھیرے دھیرے موت کا پیام آگیا۔ سارا شکم کا فوری کی خوشبو بن گیا۔ مال چھوٹا، حکومت گئی اور خدمتگار اور جاں نثار بچھڑے۔ سب دوستوں نے بارِ دوش سمجھ کر گڑھے میں پھینک دیا۔ قیامت کے دن زندگی کی آخری رپورٹ سامنے آئی۔ قدم قدم پر ہر بیوپار میں گھاٹا ہی دکھائی دیا۔ خود دیوالیہ ہوگیا ساتھ میں بیوی بچوں کو نادار بنادیا۔ سب کا ٹھکانا دوزخ بنا۔ یہی خسران مبین ہے کھلا ہوا گھاٹا۔ پھر اور لوگوں نے زندگی کی سودے بازی کی۔ جیون داؤں لگایا لیکن ان کے بیوپار کا رنگ ڈھنگ ہی دوسرا تھا۔ انھوں نے دھوکے گراوٹ نہیں کی۔ ایک ماہرِ تجارت کی ہدایت پر عمل کیا۔ اول نقصان پہنچانے والے تمام راستے بند کئے۔ چور، خائن اور جعلسازی کرنے والے تمام کارندوں کو زندگی کی دوکان سے الگ کردیا۔ ہر طاغوت کو جدا پھینک دیا۔ تجارتی قانون کے ماہر کی طرف رجوع کیا۔ اسی سے مدد لی اسی کی ہدایتوں کو شش کر عمل کیا۔ آخر تجارتی رپورٹ اُن کے سامنے بھی آئی۔ انھوں نے بھی زندگی کے ہر لمحہ کی خرید فروخت کا نتیجہ دیکھا۔ دست و پا اور دماغ کی کوئی حرکت اُن کو نقصان رساں نظر نہ آئی۔ ہر سودے میں نفع ہی نفع کی خوشخبریاں ملیں۔ ہر قدم پر فائدہ ہی کی بشارت آئی۔ بس پھر کیا تھا نفع کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ ایسا نفع تو نہ کبھی دیکھا تھا نہ سُنا تھا نہ دماغ میں اس کا تصور آیا تھا۔ اونچی اونچی کوٹھیاں جن کا ہر کرہ ستاروں کی طرح چمکیلا اور چمکدار، زمین سے بڑے بڑے باغ جن کا ہر پھل مزے اور خوشبو میں نرالا، اور ہر درخت جوشِ روئیدگی سے متوالا۔ دودھ اور شہد کے اُبلتے چشمے، بہتی نہریں۔ سونے چاندی اور موتی مونگے کے مکان، خدمت کے لئے سورج سے زیادہ چمکدار چہروں والی اچھوتی حوریں اور خوش خبر قمر رُو لڑکے اور ختمِ رپورٹ پر شہنشاہِ مطلق کی خوشنودی کی مہر۔ دوستو یہ داستان نہیں، افسانہ نہیں، دیوانہ کی بڑ نہیں، چرسی بھنگڑی کی بکواس نہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے جس کا پورا ہونا لازم اور نہ پورا ہونا محال ہے۔

تحلیلِ اجزاء قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن آدمی سے صرف اسی کے ذاتی اور شخصی کردار و گفتار کی ہی باز پرس نہ ہوگی بلکہ اُس کے متعلقین کی ہدایت و ضلالت اور نیکی بدی کا سوال بھی اس سے ہوگا۔ کیونکہ انسان اپنی غلطی فکر اور بدکرداری سے نقصان اُٹھانے والا نہیں بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی غرق کرانے والا ہے۔ اسی لئے حدیث میں کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ وارد ہے۔ پس اس تجارت گاہِ حیات میں جنسِ اعمال کی خرید و فروخت کا نتیجہ قیامت کے دن نکلے گا۔ جو لوگ اُس روز گھاٹے میں رہے حقیقت میں وہی خاسر ہیں اور بالکل کھلا ہوا نقصان ہے۔

أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔ روزِ قیامت کا ہی خسارہ ہے۔ متاعِ فانی کی تجارت کا خسارہ بھی فنا پذیر ہو تو اس کو کھلا ہوا خسارہ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ خسارہ کے بعد پھر بھی نفع ہوجائے لیکن اگر نقصان لازوال ہو جس کے ازالہ کا امکان ہی نہ ہو تو ایسا خسارہ کھلا ہوا

خسارہ ہوگا۔ قیامت کے دن جماعتیں عذاب میں مبتلا ہوں گے ان کو عذاب سے کبھی رہائی نہیں ملے گی۔ پس ان کے لئے متاعِ حیات کی تجارت بالکل نقصان رساں ثابت ہوگی اور نقصان بھی وزوال۔ یہی خسران مبین ہے۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ۔ ظلل ظلۃ کی جمع ہے۔ ظلۃ کے معنی ہیں سایہ یا سائبان، چھتہ، پردہ۔ مشرکوں کے اوپر بھی عذاب ہوگا اور نیچے بھی۔ مطلب یہ کہ ہر طرف سے عذاب میں گھرے ہوئے ہوں گے یہ آتشی غلاف اوراگ کے نیچے بالائی پردے اتنے کسے ہوئے ہوں گے جیسے دو آہنی پتروں کے شکنجہ میں کتاب۔

ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۔ یعنی عذاب کی یہ تصویر کشی بیکار نہیں۔ نہ مبالغہ آمیز شاعری ہے بلکہ جو لوگ اللہ کے پرستار اور عبادت گزار ہیں ان کو ڈرانا مقصود ہے۔ مطلب یہ کہ جو لوگ سخت دل ہیں اور جن کی روحیں زنگ آلود ہوچکی ہیں ان کو تو کوئی تخویف و ترہیب فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں جو واقعی خدا کے پرستار ہیں اور جو اپنے کو بندہ سمجھتے ہیں ان کو غلبۂ خوف سے کھاتہ ثبات ایمان اور استقامت عبدیت کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پس اگرچہ بیانِ عذاب ہر فریق کی تخویف کا سبب ہے لیکن اس تخویف سے فائدہ صرف پرستاران خدا کو پہنچتا ہے۔ اس لئے حقیقت میں انہیں کو ڈرا کر شرک و معصیت سے بچانا مقصود ہے۔ اس کے بعد رحمت آمیز پیارے بھرے ہوئے لفظوں میں بندوں کو خطاب کر کے ہر قسم کے تقوے کی ہدایت فرمائی اور اپنی ذات سے ڈرنے کا حکم دیا ہے۔ واقع میں اللہ کی ذات تو بڑی مہربان ہے۔ اس سے ڈرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ڈر نا صرف برا اعمالی اور اس کی سزا سے ہے اور سزا جزا کا مالک چونکہ اللہ ہے اس لئے اپنی ذات سے ڈرنے کا حکم دیا۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا۔ اوپر کی آیات میں اہلِ شرک و معصیت کے عذاب کا بیان تھا۔ اس آیت میں اہلِ توحید اور صالحین کے خصوصی احوال اور اُن کے ثواب کو ظاہر فرمایا۔ آیت کا نزول بقول ابن کثیر بروایت زید بن اسلم ابوذر غفاری، سلمان فارسی اور زید بن عمرو بن نفیل یا (ایک نسخہ میں) سعید بن زید بن عمرو کے حق میں ہوا ممکن ہے مورد مخصوص ہو مگر حکم میں عموم ہے۔ طاغوت کیا ہے؟ شیطان بت بلکہ ہر وہ چیز اور عمل جو اللہ کی طرف خالص توجہ کرنے سے مانع ہو۔ کھلا ہوا طاغوت یہ ہے کہ عناصر یا ستاروں یا بتوں یا انسانوں کو معبود قرار دیا جائے مگر اس سے خفی یہ ہے کہ علمائے دین و صلحائے قوم اور اولیا کو مخلوق و خالق کے درمیان آڑ قرار دے کر اللہ کے احکام کو چھوڑ دیا جائے اور انہی پیشوایانِ مذہب کے حکم کو مانا جائے یا کسی کو گنج بخش کسی کو غریب نواز کسی کو ان داتا کسی کو حقیقی مددگار اور کارساز قرار دیا جائے۔ اس سے زیادہ خفی اللہ کے احکام کے خلاف دنیوی قوانین کی اطاعت اور بندش ہے اور زیادہ خفی بارش کو پیداوار کا حقیقی سبب جاننا، ہواؤں کو، ستاروں کے طلوع و غروب کو اور ظاہری تدبیروں کو نتائج کا اصلی موجب سمجھنا ہے۔ آخر میں سب سے زیادہ خطرناک اپنی عزت و دولت قرابت زوجیت انسانی صورت حکومت سیادت قیادت اور نفسانیت کی پرستش طاغوت ہے۔ یہ وہ طاغوت ہے جس سے بکثرت خالص توحید کا دعویٰ کرنے والے بھی خالی نہیں۔ آیت کا عموم سب کو شامل ہے۔

وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ۔ نفی کے بعد اثبات ضروری ہے۔ شرک سے نجات کے بعد معرفت کے درجات کا حصول لازم ہے معرفت کے درجات غیر محدود ہیں۔ ہر نچلا درجہ بالائی درجہ کے مقابلہ میں قابلِ پذیرائی نہیں۔ اہلِ معرفت کے احوال مختلف ہیں سب سے اونچا رتبہ انبیاء کا ہے حضرت یوسف نے بادشاہ کے ساقی سے سفارش کرانی چاہی۔ فوراً عتاب ہوگیا۔ واقعی یہ فعل انابت الی اللہ کے منافی نہ تھا مگر درجۂ نبوت کے مناسب نہ تھا پس شرک سے نجات کے بعد اسی کے مناسب انابت الی اللہ کا حصول ضروری ہے۔ انابت کی آخری چوٹی یہ ہے کہ انسان کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہے۔ نہ تصورات کا ورود اس کے اپنے داخلی عمل کا نتیجہ ہو۔ گویا کثافت انسانیہ سے وہ بالکل پاک ہو جائے اور ماسوا اللہ اس کی نظر سے متروک ہو جائے۔ اس کے مقابل ابتدائی درجہ یہ ہے کہ ظاہری شرک اور کبائر سے اجتناب کے بعد ظاہری شرائع کی پابندی کی جائے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى۔ ایسے ہی بندوں کے لئے ہر قسم کی بشارت ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں یہ بشارت اچھے خواب اور الہامات کی صورت میں ہوتی ہے اور مرنے کے وقت ملائکہ کی زبان سے۔ پھر قبروں سے اٹھانے جانے کے وقت بھی ملائکہ کی زبانی ہوگی اور جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ خوان کو بشارت دے گا۔ اہلِ تفسیر نے عام آیات اور احادیث کی روشنی میں لفظ بشریٰ سے مغفرت اور ترقی درجات کی بشارت مراد

ان ہے درحقیقت ہیں چونکہ اس سے بڑھ کر اور کوئی بشارت ممکن نہیں، اس لئے مفسرین کی صراحت مبہم ہی ہے لیکن میرے نزدیک تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، دنیاوی عزت برتری اور حکومت وغیرہ کی بشارت بھی قرآن پاک نے نیک اور صالح مومنوں کو دی ہے۔ اس لئے لفظ البشریٰ کو عام چھوڑ دیا اور البشریٰ کا الف لام استغراق کے لئے قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ لہم کی تقدیم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جو لوگ صفات مذکورہ سے محروم ہیں بشارت سے بھی محروم ہیں۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ (۱) احسن القول سے محکمات مراد ہیں (۲) سدی کی روایت میں ہے کہ جو حکم ان کو دیا جاتا ہے اس میں سے احسن (اولا افضل) کو اختیار کرتے ہیں (۳) اچھی بری ہر قسم کی باتیں سنتے تو ہیں مگر سن کر بری بات سے زبان روک لیتے ہیں اور اچھی بات زبان سے نکالتے ہیں (۴) قرآن کو بھی سنتے ہیں اور کافروں کی باتیں بھی، پھر قرآن پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کے اقوال کو ٹھکرا دیتے ہیں (۵) حکم الٰہی میں عزیمت اور رخصت دونوں پاتے ہیں مگر عزیمت (یعنی اولیٰ) پر عمل کرتے ہیں اور اجازت و رخصت سے فائدہ نہیں اٹھاتے (۶) خطیب نے سراج میں لکھا ہے آیت میں ان لوگوں کی مدح ہے، جو فضل و افضل کی شناخت رکھتے ہیں۔ اگر ایک طریقہ واجب اور ایک مستحب ان کے سامنے آتا ہے تو مستحب کو ترک کرتے اور واجب کو اختیار کرتے ہیں یا مستحب اور مباح میں سے مستحب کو لیتے اور مباح کو چھوڑتے ہیں۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ مختلف اقوال جو کہا ہیں سے اس قول اور مسلک کو اختیار کرتے ہیں جو قرآن و حدیث سے زیادہ موافق ہوتا ہے۔ زمخشری کی مراد یہ ہے کہ اجتہاد مطلق یعنی کسی فقہی مذہب و مسلک کا نوعی اجتہاد ہو یا کسی فقہی مذہب و مسلک کے اندر رہ کر اجتہاد ہو یا کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد ہو یا کسی خاص مسئلہ میں اجتہاد ہو یا کسی خاص مذہب کے خاص مسئلہ میں اگر چند اقوال ہوں تو ان میں سے کسی قول کی ترجیح ہو۔ بہر حال وہ اسی قول پر عمل کرتے ہیں جو قرآن و حدیث سے زیادہ موافق ہوتا ہے۔ ان تمام تفسیری اقوال میں باہم تو آپس میں صرف توضیح ابہام اور تفصیل اجمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ ملتے جلتے ہیں اور چند میں نمایاں فرق ہے۔ بہر صورت احسن القول سے قرآن کے موافق اور زیادہ موافق قول مراد لینے میں کسی کو تامل نہیں ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ عزیمت میں رخصت کی بہ نسبت دشواری اور رخصت میں عزیمت سے سہولت ہوتی ہے اور شیخ ابن الہمام نے ہدایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضور اقدس اپنی امت کے لئے آسانی کو پسند فرماتے تھے۔ پھر عزیمت کو اختیار کرنے اور رخصت کو ترک کرنے والوں کی مدح آیت میں کس طرح ہو سکتی ہے اور پانچواں تفسیری قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ احادیث میں سہولت پسندی کی صراحت عوام کے لحاظ سے ہے۔ عوام کے لئے تو جی سخت کری آخر میں ادائے واجب کی طاقت کو بھی زائل کر دیتی ہے۔ ہمیشہ قائم اللیل اور صائم الدہر آدمی آخر میں فرض نماز و روزہ ادا کرنے کی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہاں جس شخص کے دل میں نور ایمان اپنی انتہائی جلوہ پاشیوں کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ اس میں روحانی نفاست بڑھ جاتی ہے اور دل میں شوق تقرب اتنا زیادہ ہو جاتا ہے اور قوت قلب میں اتنی ترقی ہو جاتی ہے کہ خود بخود انسان اعمال عزیمت اور طریقہ سنت کا پتلا بن جاتا ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ رخصت کو چھوڑ کر عزیمت کو اختیار کرنے لگتا ہے۔ نفاست روحانی، ضعف جسمانی پر غالب آتی ہے اور پھر ترک واجب تو کیا معمولی مستحب بھی اس سے چھوٹنے نہیں پاتا اور یہ مرتبہ کامل العرفان لوگوں کا ہے اسی کی مدح آیت میں کی گئی ہے۔

تنبیہ اتباع احسن میں ہر شخص کی استعداد اور قابلیت کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہو جاتا ہے۔ بعض کے لئے ایک کام کرنا احسن ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے اس کا ترک احسن ہوتا ہے مثلاً ایک تہجد گزار اپنی جسمانی کمزوری یا نیند پر قابو نہ رکھنے کی وجہ سے فجر کی نماز کے وقت سو جاتا ہے اور فرض ادا نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کے لئے تہجد کا ترک احسن ہے۔ اگرچہ واقع میں تہجد کی نماز احسن ہے یا ایک شخص تہجد پڑھنے کا تو شوقین ہے لیکن مطالعہ قرآن اور احکام شرع حاصل کرنے کی طرف اس کی رغبت نہیں تو اس کے واسطے بجائے تہجد کے نوافل پڑھنے کے قرآن کا مطالعہ اور احکام شرع کی تحصیل اور دینی معلومات میں ترقی احسن ہے بہر حال قابلیت کے اختلاف سے احسن کا حکم بدلتا جاتا ہے۔

اصحابِ معرفت کی تشریح

اونچے مرتبہ والوں نے گزشتہ تفسیری اقوال کو صحیح سمجھتے ہوئے بھی کچھ مزید تشریح کی ہے اصحابِ معرفت کہتے ہیں کہ عبادت میں خصوصاً نیت تین طرح ہوتا ہے (۱) دوزخ کے عذاب سے ڈر کر (۲) جنت کی آرزو میں (۳) سب سے قطع نظر کر کے صرف اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے۔ تینوں امور میں اگرچہ اچھی ہیں لیکن اتباعِ احسن تیسری شق میں ہے۔ قرآن پاک میں تذکرہ جنت کے بعد آیا ہے: ورضوان من اللّٰہ اکبر۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی خوشنودی رضامندی بھی تمام جنتوں سے بڑی اور قابلِ قدر ہے۔ ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ قیامت کے روز نجات یافتہ گروہ کے تین حصے کئے جائیں گے۔ ایک گروہ سے کہا جائے گا۔ تم نے جہنم کو سچ جانا اور اس کے خوف سے اللہ کی عبادت کی آج ہم نے تم کو جہنم سے نجات دے کر جنت میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ جاؤ جنت میں چلے جاؤ۔ دوسرے گروہ سے خطاب ہوگا تم نے جنت کو صحیح سمجھا۔ اس کی آرزو میں عبادت کی۔ تم بھی جنت میں جاؤ۔ تیسرے گروہ سے ارشاد ہوگا تم نے اللہ کے حق الوہیت کو پہچان کر عبادت کی۔ تمہارے لئے جنت میں فضل عظیم رضوان رب اور دیدار کی خاص نعمتیں ہیں۔ (رواہ احمد وغیرہ)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی انہی لوگوں کو اللہ نے سیدھا راستہ دکھایا۔ ورجہ جہاں ان کے دلوں میں نور بڑھایا اور شیطان کی وسیسہ کاریوں سے بچایا بات یہ ہے کہ ہدایت تامہ کی موجودگی اور احادیث رسول اللہ سے واقفیت اللہ کی دی ہوئی توفیق کے بغیر بیکار ہے۔ دل میں نورِ ہدایت پیدا کرنا تو اللہ ہی کا کام ہے۔ اسفار شریعت بلکہ خود صاحبِ شریعت کا وجودِ پاک ہدایت یاب ہونے کے لئے کافی نہیں۔ سنن کی ایک حدیث ہے کہ جب حضورِ والا نے قرآن کی نگہداشت کے متعلق بار بار نصیحت فرمائی تو ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ حضور کو اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہیے۔ قرآن ہم خود پڑھتے ہیں۔ اپنی اولاد کو پڑھائیں گے۔ پھر ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی اس طرح یہ سلسلہ ترقی کرتا رہے گا۔ ارشاد فرمایا۔ اوہ نادان تو تو اہلِ مدینہ میں سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہود و نصاریٰ کی بغل میں کتاب ہے لیکن ان کو اس سے کچھ فائدہ نہیں۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ یعنی طاغوت ظاہر طاغوت باطنی۔ طاغوت جلی طاغوت خفی اور ہر شرک و بدعت سے بچ کر قرآن کے موافق افضل طریقہ کو اختیار کرنے والے اہلِ عقل ہیں۔ اللہ نے انہی کی طبیعت کو پاکیزہ طینت کو نورانی اور عقل کو روشن فرمایا ہے۔ اور حقیقت میں مغز والے یہی لوگ ہیں۔ اگرچہ دنیوی بصیرت اور حرفتی عقل بہت لوگوں میں ہوتی ہے اور دانشمند ہونے کی وہ بھی ایک شاخ ہے لیکن مبدء کا سوچ مآل کی فکر خالق کی پہچان، احکام خداوندی کی پیروی، ہوا و ہوس کا ترک، قوانین الٰہیہ کی ضرورت کا احساس اور احساس کے بعد ان کی پابندی، غرض انسانیتِ کاملہ کی تکمیل کی کوشش ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ صرف روشن حواس، نورانی عقل اور چمکدار روح رکھنے والوں کی خصوصیت ہے۔ بس صرف یہی لوگ اربابِ عقل اور اصحابِ بصیرت ہیں۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ۔ اوپر کی آیت میں فرمایا تھا کہ شرک سے بچ کر طریق احسن پر چلنے والوں کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ اس آیت میں فریقِ مخالف کا بیان ہے کلمۃ العذاب سے اہلِ تفسیر کے نزدیک اللہ کا وہ وعدہ مراد ہے جو شیطان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا تھا کہ میں جہنم میں تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو بھر دوں گا۔ میرے خیال میں اگر تقدیرِ ازلی مراد لی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یعنی جن کی طبیعت اللہ نے پاکیزہ نہیں بنائی، جن کی روحوں کو روشن نہیں کیا وہ جہنمی ہیں۔ آن کو آگ سے بچانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہاں تک کہ سید المرسلین بھی ان کو ہدایت یاب بنانے سے عاجز تھے۔ اس تفسیر سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ (۱) تقدیرِ ازلی غالب ہے اس کو کوئی پلٹ نہیں سکتا (۲) آگ سے چھڑانے سے مراد ہے ہدایت یاب بنا دینا کیونکہ ہدایت یافتہ ہو جانے کے بعد جہنم میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس سے مسئلہ شفاعت کی حقانیت اور گناہگار اہلِ ایمان کو دوزخ سے نکالنے کی تردید نہیں ہوتی۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ

اللّٰہ المیعاد ۔ باغوں میں دو منزلہ کوٹھیاں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں ایک دلکش نعمت ہے جس طرح ثمرہ فنا ما علی لباس ، لذیذ غذا ، شربت ، کریم
دلکش ، حسین اور فرمانبردار خادم اور غیر معمولی عزت جاذب قلب چیزیں ہیں ۔ لیکن یہ تمام الفاظ غیر مرئی حقائق کو قریب الفہم بنانے کے لیے استعمال
کیے گئے ہیں ، ورنہ صحیح تصویر کشی اور واقعی کیفیات کا اظہار کسی زبان کے الفاظ میں ممکن نہیں ۔ کوئی عبارت جنت کی نعمتوں کو کما حقہ بیان
نہیں کر سکتی ۔ تقویٰ کی حقیقت ہم اوپر لکھ چکے ہیں ۔ بہرحال ابتدا میں ہر موحد متقی ہے اور آخر میں سب سے اوپر سید المرسلین اور امام الناس
کا درجہ ہے ۔ قرآن میں دوسری جگہ ہم فی الغرفات آمنون آیا ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول پاک نے فرمایا جنت میں ایسے غرفات
(کوٹھے بالاخانے) ہیں جن کے اندر سے باہر کی چیز اور باہر سے اندر کی چیز نظر آئے گی ۔ ایک بدوی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ
یہ غرفات کس کے لیے ہوں گے فرمایا ایسے بندوں کے لیے جنہوں نے پاکیزہ کلام کیا ، محتاجوں کو کھانا کھلایا اور راتوں کو جب لوگ سوتے
ہوتے تھے انہوں نے نمازیں پڑھیں (رواہ الترمذی و احمد) ابو مالک اشعری کی روایت میں ہے ۔ یہ غرفات ان بندوں کے لیے ہیں ، جو
محتاجوں اور مستحقوں کو کھانا کھلاتے ، نرم کلام بولتے ، پیہم روزے رکھتے اور لوگوں کی خواب غفلت کے وقت نمازیں پڑھتے ہیں (رواہ
احمد) سہل بن سعد کی روایت ہے ۔ حضور نے فرمایا جس طرح تم تاروں کو دیکھتے ہو اسی طرح اہل جنت جنت میں بالا خانوں کو اشارہ
کر کے دکھائیں گے ۔ ابو سعید خدری کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں جس طرح تم تارے کو دیکھتے ہو جو شرقی یا غربی افق میں ڈوبتا
ہوتا ہے (رواہ احمد والبخاری و مسلم) ابو ہریرہ کی روایت سے ثابت ہے کہ یہ مختلف مرتبے والوں میں ایک کی دوسرے پر فضیلت کو بیان
ہے ۔ ابو ہریرہ کی یہ بھی روایت ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مراتب تو انبیاء کے ہوں گے ۔ فرمایا قسم ہے اس کی جس کے
قبضہ میں میری جان ہے یہ ان مومنوں کو بھی ملیں گے جنہوں نے اللہ کو مانا اور اس کے پیغمبروں کو سچا جانا (رواہ احمد والترمذی بسند حسن صحیح)

تصوف و بیان

خسروا انفسھم واھلیھم سے معلوم ہو رہا ہے کہ متعلقین کا خسران بھی سرپرست کی وجہ سے ہوتا ہے خسران
مبین سے بر طریق مفہوم مخالف ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی خسارہ حقیقت میں ناقابل اعتبار ہے اور آخرت کا
خسارہ ہی حقیقت میں خسارہ ہے ۔ یا عباد میں تقویٰ کی ناز آفریں لذت آفریں ترغیب ہے ۔ اجتنبوا الطاغوت سے اشارہ ہے نفس کو غیر اللہ
کے ہر رنگ سے صاف کر لینے کی طرف اور اناب سے اشارہ ہے جلا دینے اور پالش کرنے کی جانب ۔ یعنی اول سے مراد ہے تخلیہ اور دوسرے
سے مراد ہے تحلیہ اور تجلیہ ۔ لہم البشریٰ میں اہل انابت کے لیے ہر بشارت کی تخصیص ہے ۔ یعنی جو اہل انابت نہیں وہ بشارت سے بھی محروم
ہیں فبشر عباد کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی زبان سے بولنا چاہتا ہے ۔ اور بشارت رسول حقیقت میں بشارت خدا ہے ۔
رہتے ہوں اور ۔۔۔ ہوں سے ظاہر ہے کہ تمام احکام شرع کو سننا جاننا اور پھر ان میں سے افضل پر عمل کرنا قابل مدح ہے ۔ پس غلطی پر
ہیں وہ لوگ جو تقلید کو بار سمجھ کر یا بند بننا چاہتے ہیں ۔ طالب علم اور حصول علم اور حصول کے بعد عالی ذاتی کی تمیز کا حق ہر متقی سے چھیننا
چاہتے ہیں ، اولٰئک الذین ھداھم اللہ سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ۔ (۱) ہدایت دینا اللہ کا کام ہے (۲) پرہیزگاری ہدایت اللہ کا سبب ہوتی
ہے ۔ ھم اولوا الالباب ۔ کا حصر بتا رہا ہے کہ اہل شرک حقیقت میں بے مغز ہیں ۔ افمن حق سے تقدیر ازلی کا اٹل ہونا ثابت ہو رہا ہے
(لا یخلف اللہ المیعاد میں صراحت ہے کہ اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا بلکہ جھوٹ ہونا ناممکن ہے ۔ کیونکہ یہ آیت خود خبر دے رہی ہے کہ اللہ
کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا اور اللہ کی دی ہوئی خبر کا جھوٹ ہونا محال ہے ۔ لہٰذا اللہ کا اپنے وعدے سے خلاف بھی محال ہے وغیرہ ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ

(مخاطب) کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کی سوتوں میں داخل کر دیتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے

کردے تو کوئی مددگار فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ آخرکار اللہ اُس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اس کا بھوسہ بن جاتا ہے۔ حطام کے معنی ایندھن بھی ہیں اور چورہ بھی۔ اس جگہ آخر معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اہلِ دانش جب اس سب نظام پر غور کرتے اور حیرت افزا آثار کو دیکھتے ہیں تو اُن کو اس میں اپنے لئے ایک یادداشت عبرت آفرین انکشافات واضح استدلالات اور اللہ کی حکمت قدرت رحمت اور ہمہ گیری کے یقینی شواہد ملتے ہیں اُس وقت اُن کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور دل میں اللہ کی طرف سے ایک نور پیدا ہو کر دنیا کی بے ثباتی دکھ جاتی ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ اس آیت میں ابن کثیر اور بعض دوسرے اہلِ تفسیر نے مَنْ کو شرطیہ قرار دے کر جزا کو محذوف مانا ہے۔ کچھ مفسروں نے مَنْ کو استفہام طلبی کے لئے کہا ہے۔ اول صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور اللہ کی طرف سے اس کو نورِ معرفت حاصل ہو گیا کیا وہ اُس کا فر کی طرح ہو سکتا ہے کہ جس کے کفر کے سبب اللہ نے اس کے دل پر مہر کر دی۔ دوسری شق پر مطلب کی توضیح اس طرح ہوگی کہ دیکھو وہ کون (کیسا عظیم الشان) آدمی ہے جس کو اللہ نے روشنی عطا فرمائی اور اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلعم نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو ہم لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ سینہ کی کشادگی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ فرمایا نور جب دل میں داخل ہوتا ہے تو سینہ نور کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی شناخت کیا ہے۔ فرمایا دارالخلد (آخرت کی زندگی) کی جانب رجوع کرنا دارالغرور (دنیا) سے منہ پھیر لینا اور موت سے پہلے اُس کی تیاری کرنا (رواہ ابن مردویہ) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ سب سے بڑا دانشمند کون مومن ہے۔ فرمایا جو موت کو سب سے زیادہ یاد رکھ کر سب سے اچھا سامان اس کے لئے تیار رکھے۔ نور جب دل میں آتا ہے تو دل اس کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی پہچان کیا ہے فرمایا دارالخلد کی طرف مائل ہونا۔ دارالغرور سے منہ پھیر لینا اور موت آنے سے پہلے اُس کا سامان تیار کرنا (ترمذی) قتادہ کا قول ہے کہ نور سے مراد کتابِ الٰہی ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے اسلام کے لئے سب سے پہلے حضرت ابوبکر کا سینہ کشادہ فرمایا۔ حدیث مذکور اور آیت کو ملا کر خلاصۂ مطلب یہ نکلا کہ جس شخص کا سینہ اللہ کھول دیتا ہے اس کو رب کی طرف سے ایک نور حاصل ہو جاتا ہے یعنی اسلام حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا نور اور اسلام ایک ہی چیز ہے اور اس نور کے حاصل ہونے کی شناخت یہ ہے کہ دل دنیا سے وابستہ نہ رہے۔ آئندہ زندگی ہر وقت پیشِ نظر رہے اور موت سے پہلے تیاری کرے۔ گویا اگر دل دنیا میں پھنسا رہے، آخرت سے وابستہ نہ ہو اور موت کی تیاری کی طرف سے غافل بنا رہے تو ایسا آدمی نورِ اسلام سے محروم ہے اگرچہ ظاہر طور پر مسلمانوں کے گروہ میں داخل ہو اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے۔

فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ یعنی آبِ رحمت کی ریزش تو ہر شخص کے لئے برابر ہے لیکن بعض لوگوں کے دلوں کی سرزمین بہت سخت ہوتی ہے۔ آبِ رحمت کو پتھر جذب نہیں کرتا۔ ایسے سنگدلوں میں اللہ کی یاد نہیں ہوتی۔ اُن کے دلوں کا زنگ صاف نہیں ہوتا۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ نفس جب خبیث ہو جاتا ہے تو اللہ کا ذکر تو حید سُن کر اس میں قساوت بڑھ جاتی ہے جیسے دھوپ سے موم تو پگھل جاتا ہے مگر مرم اور نمک سوکھ جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کو سُن کر اہلِ ایمان کے دل نرم ہو جاتے ہیں اور کافروں کے دلوں میں مزید سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ کی یاد کے علاوہ زیادہ کلام نہ کیا کرو۔ اس سے دل میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور جو دل سخت ہو جائے وہی اللہ سے بہت دور ہوتا ہے (ترمذی، ابن مردویہ، بیہقی) یحییٰ بن معاذ رازی کا قول ہے۔ شہوت پرستی سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ شک اور سختی دل کا عذاب ہے۔ شیخ صبیحی نے کہا۔ مباح چیز کو بھی اگر لذت کے لئے استعمال کیا جائے تو تین قسم کی سزا ملتی ہے۔ مفت کی مشقت، عمر کی بربادی، دل کی سختی۔

مقصودِ بیان۔ آسمان سے پانی برسانا اور زمین کی رگوں میں پیوست کر کے رواں دواں بنانا اور چرسوتوں اور سلسوں سے بہا کر

بنانا محض اللہ کا کام ہے۔ نجومی ستاروں کی تاثیر کے قائل، اسباب تغیر پر شیفتہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ مادی کرشموں کو بغیر محرک کے متحرک ماننے والے سوچیں کہ سمندروں میں عمل تبخیر کیسے ہوا، جواب کیسے بنی، بھاپ سے ابر تراکم اور سحاب لبتہ کس طرح تیار ہو کر بجا کس عمل اور کس کے حکم سے اصلی شکل میں آئی اور سمندر سے نکلی ہوئی بھاپ کس تدبیر سے پانی بن کر خشک زمین کی رگوں میں داخل ہو کر باعث حیات بنی۔ سوچو، غور کرو اور سمجھو کہ سمندر کا شور پانی عمل تبخیر کے ذریعہ اوپر پہنچ کر کیسے شیریں بن گیا۔ اسی لئے تو ابن عباسؓ نے فرمایا تھا جو شخص شور پانی کو شیریں بنانا چاہے وہ پانی کو اوپر پہنچا دے۔ سبحان اللہ خود پانی اوپر پہنچا شیریں ہو گیا۔ نیچے آتا شیریں اترا شیریں پانی زمین نے پیا اور سبزے کو پلایا۔ طرح طرح کا غلہ اور پھل پھول پیدا ہوئے۔ یہ تمام کام کیسے ہوا، کس نے کیا۔ بکارا ایک، ابر ایک پانی ایک زمین ایک پھر روئیدگی کا اختلاف کیوں۔ نوعیت، لذت، کیفیت، رنگ، شکل اور خاصیت کا امتیاز کس طرح۔ یہ اللہ کی قدرت، کارسازی، حکمت اور رحمت نہیں تو اور کس کی ہے۔ غیبی ارواح موہوم دیوتاؤں، مدارس بزرگوں اور حادث چیزوں کو کارساز سمجھنے والے بتائیں کہ اس سارے عمل میں کس کی کارسازی، کس کی رحمت اور کس کی برکت کو دخل ہے۔ کائنات عنصری اور فرازمی فضا کا یہ نظام کس کا ممنون کرم اور مرہون عمل ہے۔ ثم یخرج بہ زرعا الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ خالق اور کارساز یقیناً اللہ ہے۔ وہی مختار مطلق ہے۔ لیکن اسی نے واقعات کی ایک کڑی دوسری سے وابستہ کر دی ہے۔ ایک کو علت دوسرے کو معلول، ایک کو سبب، دوسرے کو نتیجہ قرار دے رکھا ہے جبھی تو پانی سے کھیتی کو پیدا کرتا ہے۔ پانی خود زراعت کو پیدا نہیں کرتا، نہ خدا بغیر پانی کے سبزے کو پیدا کرتا ہے بلکہ حکومت اور تصرف خدا کا ہے۔ کارسازی اور قدرت بھی اسی کی ہے۔ مگر قدرت کا عمل اس طرح ہے کہ زمین کی زندگی کو پانی سے وابستہ کر دیا ہے۔
افمن شرح صدرہ الخ میں صراحت ہے کہ دلوں کی گرہ کھولنا، ان میں نور پیدا کرنا اور ان کو کشادہ بنانا اور اسلام کی توفیق دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ ہادی خالق ہدایت اور قبول ہدایت کی صلاحیت پیدا کرنے والا وہی ہے۔ اس تخلیق میں کسی اور کو دخل نہیں۔ وغیرہ

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ

اللہ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے بار بار دہرائی گئی ہے جس سے ان لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ

کانپ اٹھتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل نرم (اور منقاد) ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس

بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

کے ذریعے سے ہدایت کرتا ہے اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں بھلا جو شخص اپنے منہ کو قیامت کے روز سخت عذاب کی

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

سپر بناوے گا اور ایسے ظالموں کو حکم ہوگا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو (تو کیا یہ معذب اور جو ایسا نہ ہو برابر ہو سکتے ہیں) جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے

فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ

انہوں نے بھی (حق) کو جھٹلایا تھا سو ان پر (ایسی) طرح سے عذاب آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا سو اللہ نے ان کو اسی دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا

الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ٥

اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا (اور سخت) ہے کاش یہ لوگ سمجھ پاتے

تفسیر بولتا قرآن، خاموش فرقان : شرمیلی کلیوں، مہکتے پھولوں اور لہکتے سبزہ کی قسم، بلکی بھینی اُبھاری زرشش، نکھلتے چاند اور ڈوبتے سورج کی قسم، فضائی بلندیوں، بکھرے ستاروں اور ٹوٹتے انگاروں کی قسم، جھومتی گھٹاؤں، مست ہواؤں اور گونجتی فضاؤں کی قسم، برستے بادلوں، تڑپتی بجلی اور تھرکتی بوندوں کی قسم، چڑھتے فراٹے دریاؤں، بل کھاتی لہروں، اُگتے آبشاروں اور لپکتے قطروں کی قسم، ویران صحراؤں، سنسان ریگستانوں اور تپتے چمکتے ذروں کی قسم، آتی شام اور جاتے دن کی قسم، آہستہ سرکتی رات اور سانس لیتی صبح کی قسم، اس حسین کائنات اور اس کے حسین معمار شمس کی قسم، یہ سارا نگارستان اور اس کا نقاش گواہ ہے کہ صحیفۂ فطرت خاموش فرقان ہے۔ ایک معنون ہے دوسرا عنوان، ایک متن دوسرا شرح، ایک توضیح دوسرا ابہام، ایک تفصیل دوسرا اجمال، ایک ناچتی تھرکتی جیتی سورتی ہے، دوسری ساکت زیرِ مبا سکراتی تصویر، ایک اعلٰی عمل ہے دوسرا قول، اور قول بعینہٖ عمل۔ کیسی اچھی بات ہے اور کیسا اچھا بات کہنے والا، کیسا اچھا عمل ہے اور کیسا اچھا عامل۔ کتاب منقوش صحیفۂ فطرت کی ہم شکل ہے۔ ہم شکل ہی نہیں، اس کا عکس اور نقل مطابق اصل۔ قرآن آفاقی کی آیات پڑھو، ہر ایک سامنے رکھو اور شرح کا مطالعہ کرو، عقل و بصیرت سے کام لو۔ ذرہ سے سورج تک، قطرہ سے سمندر تک، تحت الثریٰ سے فوق الثریا تک، فرش سے عرش تک سب صحیفۂ فطرت کی آیات بینات ہیں۔ جملی آیات، متحرک اور رواں دواں آیات۔ قرآن نے ان سب کو آیات فرمایا ہے۔ اللہ کی حکمت، عظمت، رحمت، قدرت، ربوبیت اور الوہیت کی نشانیاں اور شواہد۔ پھر اس قرآن کتابی کو پڑھو، اس کی آیات کا مطالعہ کرو، سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیات آفاقی آیات کی کاپی ہیں، ہو بہو نقل ہیں۔ بکھری ہوئی آیات کی سچی ترجمانی اور مکمل تعبیر و تفسیر۔ کائنات کی ہم آہنگی اور یک رنگی کو دیکھو۔ ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک قوانین کی پیروی ہے، ہر ایک دوسرے کی محتاج، پانی کی سطح ہر جگہ برابر، بھا ہر جگہ پانی سے ہلکی، سیب کے درخت میں ہر جگہ سیب، انگور کی بیل میں انگور، آدمی کا بچہ آدمی، گھوڑے، گدھے، گائے، بھینس، ہرن، شیر، چیتا، کبوتر، مرغابی، باز، شاہین ہر ایک کو قدرتی نظم ایک رنگ، ایک ڈھنگ سے چلا رہا ہے۔ بہار و خزاں، موت و حیات، طلوع و غروب، گردشِ نجوم، ظلمتِ شب اور نورِ نہار کی ہم آہنگی پکار کر کہہ رہی ہے کہ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ تخلیقِ الٰہی میں تمہیں کہیں ناہمواری اور عدم تناسب نظر نہیں آئے گا۔ ارض و سما اور لیل و نہار کے تناسب و توازن کو دیکھنے کے لئے ایک تدبر نگاہ کی ضرورت ہے۔ اب آیاتِ قرآن کی یک رنگی دیکھو۔ ایک طرزِ بیان، ایک طرح کی تمثیل، ایک سوچ، ایک فکر، باہم تضاد نہیں، تناقض نہیں، صفاتِ ذات کا ہر آیت میں ایک طرح اظہار، مبدء و معاد پر ایک تبصرہ، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور فکری تعلیم میں بالکل وحدت، معادن ارضیہ، دفائنِ جبال، خزائنِ بحار، نسلی امداد کی ایک جیسی صراحت۔ جس طرح عالم نباتات صرف فطرت کا مطالعہ کر سکتا ہے، حقیر ترین ذرے اور ذلیل ترین چیونٹی کی تخلیق نہیں کر سکتا، اسی طرح عالم قرآن اپنی پوری علمی قوت کے ساتھ آیاتِ فرقانیہ پر غور و تدبر کر سکتا ہے، اس ساغر ناب کے دو چار گھونٹ پی کر سرمست ہو سکتا ہے، روح کی انتہائی گہرائیوں میں کیف و انبساط کی لہر پہنچا سکتا ہے لیکن اپنی ساری انفرادی و اجتماعی طاقت صرف کرنے کے بعد بھی ایک آیت بنا نہیں سکتا۔ کیا اب بھی صحیفۂ قرآن اور صحیفۂ فرقان کے تشابہ میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔ مرحلۂ ضمیمہ ہے کہ ارض و سما کی ہستی اگر چند انسانوں کے دستِ تصرف میں ہوتی تو ان کی حالت خراب ہو جاتی۔ صلاح کی جگہ فساد اور بناؤ کی جگہ بگاڑ پیدا اور کاروبارِ ہستی برباد ہو جاتا۔ پھر یہ بات کیوں غلط ہے کہ اگر قرآن خدا کی بنائی اور بھیجی ہوئی کتاب نہ ہوتی تو اس کی آیات میں باہم تعاکس، تخالف اور تضاد ہوتا اور کلام کی یکرنگی فوت ہو جاتی اور بعض آیات بعض سے ٹکرا جاتیں۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا پر یقین رکھنے والو وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا کی سچائی پر شک نہ کرو۔

اور اوائل سورت آلِ عمران میں جس کے متعلق وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ الخ آیا ہے۔
بلکہ اس جگہ اس لفظ کی تحقیق مختلف طور پر کی ہے۔ قتادہ نے کہا ایک آیت دوسری آیت سے اور ایک کلمہ دوسرے کلمہ سے مشابہ ہے۔ حسن بصری
نے اتنا اور اضافہ کیا کہ ایک سورۃ میں ایک آیت آتی ہے تو دوسری سورت میں دوسری آیت اُس کے مشابہ ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے
فرمایا۔ قرآن کی بعض آیات بعض کی مشابہ ہیں اور تفسیر کے لئے ایک آیت کا رخ دوسری آیت کی طرف پھیرنا چاہیئے۔ اس قول سے علماء نے استخراج کیا
ہے کہ قرآن کی تفسیر میں قرآن ہی سے مدد لی جائے کیونکہ اگر ایک آیت مرموز یا مجمل ہوتی ہے تو دوسری آیت میں اس کی تفسیر اور تبیین بھی ہوتی ہے۔
عام علماء نے لکھا ہے کہ حسن، کمال، احکام اور اعجاز میں ہر آیت دوسری کی طرح ہے۔ یہی تمام آیات میں وجہِ تشبیہ مشترک ہے۔ اسی بنا پر
قرآن کو متشابہ فرمایا۔ رہا مثانی کہنے کا بیان تو اس کے متعلق بھی علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ضحاک نے کہا اللہ نے امثال اور قصص کو مکرر فرمایا۔
عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے صرف قصص کی تکرار کو مثانی کہنے کے لئے کافی سمجھا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں مثانی کہنے کی توجیہ اس طرح کی ہے
کہ اللہ کا ربوبیت اور عبادیت کے علاوہ ہر چیز کا جوڑ موجود ہے۔ مثلاً امر اور نہی، خاص اور عام، مجمل اور مفصل، ارض و سماء، جنت اور
دوزخ، نور اور ظلمت، لوح اور قلم، عرش اور کرسی، ملائکہ اور شیاطین، وعدہ اور وعید، امید اور خوف وغیرہ۔ ان سب کا بیان قرآن میں ہے اس لئے
مثانی فرمایا۔ سب سے لطیف نکتہ سفیان بن عیینہ سے مروی ہے۔ سفیان نے کہا۔ قرآن کی رفتار اور طرزِ ادا کے دو طریقے ہیں (۱) مختلف
سورتوں میں مختلف آیات مذکور ہیں مگر سب کی رفتار ایک سی ہے۔ سیاق کی وحدت باقی رہتی ہے۔ مثلاً ذات و صفات کی آیات ہر سورت میں
ایک سی طرزِ بیان، ایک ہی مضمون اور ایک ہی سیاق کے تحت ہیں۔ وحدتِ سیاق میں کوئی آیت دوسری سے مختلف نہیں۔ ان مضامین کی
آیات پر نظم و وحدتِ رفتار میں باہم متشابہ ہیں اس لئے ان کو متشابہ فرمایا (۲) سیاق کی وحدت باقی نہیں رہتی یعنی بکثرت آیات ایسی ہیں جن
کے ساتھ ان کی ضد کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً مومنوں کے ساتھ کافروں کا بیان، جنت کے ساتھ جہنم کا، ابرار کے ساتھ فجار کا، علیین
کے ساتھ سجین کا، متقین کے حسنِ مآب کے ساتھ طاغین کے شرِ مآب کو اسی طرح بکثرت آیات کے ساتھ ان کے اضداد کو بھی بیان کیا ہے
انہی آیات کی وجہ سے مثانی فرمایا۔ اس تنقیح کا خلاصہ یہ ہے کہ پورا قرآن نہ متشابہ ہے نہ مثانی۔ کچھ آیات متشابہ ہیں اور کچھ مثانی
اور متشابہ و مثانی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے تو گویا متشابہ و مثانی اکا مجموعہ کتاب کی صفت ہے۔ امام رازی کی تقریر بھی اسی کے قریب ہے
چونکہ سطحی نظر سے دیکھنے کے بعد بھی یہ تفسیری اقوال رکیک اور خود تراشیدہ دکھائی دیتے ہیں اور کسی صحابی سے کوئی با وثوق تفسیر اس آیت
کی صحیح اسناد سے مروی نہیں ہے نہ کوئی مرفوع حدیث ہے اس لئے تمام اقوال سے ہٹ کر جو صحیح تفسیر ہماری نظر میں تھی وہ ہم تفسیری مقالہ
میں لکھ چکے۔ یعنی تمام آیاتِ قرآنیہ آیاتِ آفاقیہ کے مشابہ ہیں۔ صرف نطق اور سکوت یا توضیح و ابہام کا فرق ہے اس لئے قرآن کو متشابہ
فرمایا اسی طرح آیاتِ فطرت اور قوانینِ کائنات کا متن بھی قرآن ہے۔ یعنی قرآنی بیان بعینہ کائناتی حقائق کے مطابق ہے گویا نظامِ
کائنات متن ہے اور قرآن اس کی شرح کا پی۔ اسی بنا پر مثانی فرمایا۔ واللہ اعلم۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ: قرآن پاک کی ایک خصوصیت
اس آیت میں بیان فرمائی۔ قرآنی تلاوت اور آیاتِ قرآنی میں غور و تدبر سے اللہ کی عظمت، جبروت، عزت، اقتدار، قہاریت اور اسی کے ساتھ رحمت
علم، رأفت اور عمومی شفقت کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ مطالعۂ عظمت و حکمت اور مشاہدۂ رحمت و علم نعمت سے مومن کے دل میں رحمت آمیز
خشیہ کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس سے دو خصوصی اثر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اول خوف و محبت کے مخلوط جذبہ سے زیر اثر بدن کے
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو قلبی ہیبت اور اندرونی خوف کی غمازی کرتے ہیں۔ دوسرے جذبۂ اطاعت و انقیاد پر عمل آجاتا ہے۔ کمال
یعنی بیرونی اعضاء میں بھی فرمانبرداری کی طرف لپک پیدا ہو جاتی ہے اور دل یعنی حسی ارادہ اور وجدان کی ساری طاقتیں اطاعت کی طرف
جھک جاتی ہیں اور جب تک کیفیتِ خشیہ کے واسطے ادب لازم ہے اسی لئے مردِ مومن ادب و احترام کا مجسمہ بن کر با جانی ہیں تن من سے منہمک
اور مستغرق ہو جاتا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مردِ مومن منافق کی طرح شور و غل نہیں کرتا ورنہ جاہل صوفیوں کی طرح ناچتا ہے اور

ہونے کے نعرے لگاتا ہے۔ معمر کا قول ہے کہ قتادہ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا۔ یہ اولیاء الٰہی کی حالت کا بیان ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور یاد الٰہی سے اُن کے دل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کی عقلیں زائل ہو جاتی ہیں یا بیہوش ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ حرکت تو شیطانی ہوتی ہے۔ (ابن کثیر) حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا میں نے اپنی نانی سے پوچھا کہ تلاوت قرآن کے وقت صحابہ کی کیا کیفیت ہوتی تھی جواب دیا وہی کیفیت ہوتی تھی جو اللہ نے قرآن میں بیان فرمائی ہے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا یہاں کچھ لوگوں پر تو تلاوت کے وقت وجد اور مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے نانی نے یہ لفظ سنتے ہی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک عراقی کو بیہوش پڑا دیکھا۔ فرمایا اس کا کیا حال ہے لوگوں نے عرض کیا۔ قرآن مجید یا ذکر الٰہی کو سننے سے یہ گر جاتا ہے۔ فرمایا ہم لوگ بھی اللہ سے ڈرتے ہیں مگر غافل ہو کر نہیں گرتے۔ ابن عمر نے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ ان کے پیٹ میں شیطان گھس جاتا ہے۔ صحابہ ایسی حرکت نہیں کرتے تھے۔ ابن زبیر کی روایت اور ابن عمر کے قول میں وجد اور غشی سے مصنوعی وجد و غشی مراد ہے کیونکہ اضطراری غشی پر تو کسی کو اختیار ہی نہیں اور غیر اختیاری فعل قابلِ مذمت نہیں۔ اسی لئے ابن سیرین نے بیہوش ہونے والے آدمی کے متعلق فرمایا تھا کہ کسی اونچی دیوار پر بٹھا کر اس کو بٹھایا جائے پھر اول سے آخر تک قرآن سنایا جائے۔ اگر وہ نیچے گر پڑے تو سچا ہے۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک مجہول الاسم بزرگ نے کہا تھا اصل مقصود عذاب نہیں ثواب ہے اس لئے امید کی تجلی خوف کی تجلی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ ایک اور عارف نے کہا اور خوب کہا کہ عظمت و جلال کو دیکھ کر خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رحمت و جمال کو دیکھ کر دل میں رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی رونگٹوں کا کھڑا ہو جانا اور دل میں رقت پیدا ہو جانا دونوں الگ الگ حیثیت کے زیر اثر ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ ذٰلک سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے یا ایمان کے مذکورہ بالا اوصاف کی جانب۔ بہرحال اس آیت میں اللہ نے کسی کو ہدایت یاب اور کسی کو گمراہ بنا دینے کا اختیار خصوصیت کے ساتھ اپنے دست قدرت میں ہونا ظاہر فرمایا ہے اللہ ہی فرما رہا ہے کہ مشیت الٰہیہ کو کوئی پلٹ نہیں سکتا وہ قرآن کے ذریعے جس کسی کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کسی کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ اس آیت میں نیکوکار مومن کا جذبہ حق اور قیامت کے دن عذاب سے محفوظ رہنے کی صراحت نہیں کی ہے جملہ کی ترکیب وہی ہے جو آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کی تھی وجہ سے مراد یا تو ذات ہے یا خاص چہرہ مراد ہے تو تخصیص کی وجہ مجاہد نے یہ بیان کی کہ کافر کو دوزخ میں منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔ ابن عباس اور عطاء نے فرمایا مشکیں باندھ کر آگ میں پھینکا جائے گا تو پہلے آگ اس کے چہرے کو ہی لگے گی۔ میرے نزدیک وجہ سے مراد رخ لینا زیادہ مناسب ہے اور اس سے ایک لطیف معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مومن صالح ہر قسم کے شرک بدعت اور بدکاری سے اس دنیا میں اپنا رخ پھیر لیتا ہے کسی گناہ کی طرف مائل نہیں ہوتا وہ قیامت کے عذاب کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے۔ بدکاری اور کفر کے رخ پر قیامت کا عذاب ہے جب دنیا میں اس نے گناہ سے اپنا منہ پھیر لیا رخ موڑ لیا تو یقیناً عذاب کی طرف سے بھی اس کا رخ مڑ گیا۔ اسی مطلب کو آیت میں بیان کیا ہے۔ اس کے خلاف بدکار کافروں کا رخ گناہ اور شرک کی طرف نہیں گویا ان کا رخ عذاب کی طرف ہے۔ اس مطلب کو آئندہ آیت میں بیان فرمایا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جیسے مومن مخلص موحد اللہ کا فرمانبردار ہے۔ دوسرا مشرک خطا کار ہوا و ہوس کی خرمستیوں میں گرفتار یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اول کا رخ جنت اور مرتبۂ قرب کی طرف ہے۔ دوسرے کا رخ ذلت ہلاکت اور عذاب کی جانب۔ اس لئے اول شخص کو قیامت کے دن سوءِ عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا معمولی فروگزاشتوں پر کچھ سرزنش ہو تو ہو یا حساب فہمی سے کچھ معمولی دکھ پہنچ جائے تو پہنچ جائے سوء عذاب یعنی جہنمی سزا سے وہ بچا رہے گا دوسرا شخص تو چونکہ اس کے

وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۔ دل اس کے دماغ اس کی زبان اور اس کے دست و پا کی ہر حرکت بیجا تھی وہ ظالم تھا

اس لئے اس کو اپنے کئے کا مزہ چکھنا پڑے گا ظالمین سے مراد مشرک ہیں شرک بڑا ظلم ہے۔ دل کی حرکت یعنی قلبی عقیدہ اور دماغ کی حرکت یعنی تمام نظریات اور زبان کی حرکت یعنی گفتار اور اعضاء کی حرکت یعنی اعمال اگر ان میں سے کوئی بھی غلط اور بیجا ہو تو ظلم کہلائے گا لیکن ظلم کی جڑ عقیدۂ قلبی اور فکر دماغی کی غلطی ہے۔ قول و عمل تو شاخیں ہیں اس لئے سب سے بڑا ظالم مشرک ہے۔ کسب کا لفظ عمل و قول کو حاوی ہے۔ مشرک کے اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) ظاہری طور پر اچھے جیسے غریبوں کی مدد، خیرات، رفاہ عام کے کام وغیرہ (۲) ظاہری صورت میں بُرے جیسے مردم آزاری، حق تلفی، قتل و غارت وغیرہ۔ مؤخر الذکر فسق تو بہر حال بُرے ہی ہیں لیکن مشرک کے وہ اعمال جن کو بھی نظر رکھنے والے عقیدہ اور اچھا خیال کرتے ہیں حقیقت میں اصل خوبی سے خالی ہیں۔ عقیدہ ہر عمل کی جڑ ہے۔ نیت پر ہر کام کی اچھائی بُرائی کا مدار ہے۔ جب تک کام میں اطاعت خداوندی کی نیت کارفرما نہ ہو اور حساب آخرت کا صحیح عقیدہ نہ ہو اور زندگی کے تمام اعمال پر اللہ کی فرمانروائی تسلیم نہ کی جائے تو کسی نیک کام سے مقصود صرف ذاتی شہرت، نیک نامی اور سیاست کاری ہوتی ہے یا دنیوی فوائد کا حصول یا جذبۂ قرابت و محبت کی تسکین۔ غرض نیت میں جس چیز کا حصول ہوتا ہے وہی دنیا میں مل جاتی ہے۔ آخرت میں ایسی نیکی بھی باعث عذاب ہوگی۔ کسی کو تذکرۂ مالدار کو لوٹ کر غریبوں کو دولت تقسیم کرنا کسی سزا سے نہیں بچا سکتا کیوں صرف اس لئے کہ اس نیکی میں بھی چوری کا جذبہ کارفرما ہے۔ ملکی قانون کی خلاف ورزی اور جمہوری یا شاہی ضابطے سے سرتابی اصل جرم ہے۔ اس نیکی میں بھی اصل جرم اپنی جگہ قائم ہے۔ ظاہر ہے غریبوں کی پرورش اچھی چیز ہے لیکن اس پرورش پر ابھارنے والا جرم اور جذبۂ باغیانہ عمل ہے اس لئے قابل گرفت ہے۔ ایسا فعل بھی حقیقت میں اچھا فعل نہیں ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں مَا تَكْسِبُونَ سے مشرک کا ہر قول و عمل مراد ہے خواہ ظاہری شکل اس کی اچھی ہو یا بری۔ چکھنے سے برداشت کرنا مراد ہے۔ اور اعمال سے چکھنے سے مراد ہے اعمال کی سزا پانا۔ مشرک اپنے اعمال و افعال کو صحیح سمجھتے تھے لیکن قیامت کے دن جب اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ جن پھلوں کی خوبصورتی اور خوش رنگی پر وہ ریجھا تھا مزہ میں وہ کس قدر تلخ تھے۔ اعمال کی ظاہری شکل اگرچہ رنگین اور دل کو لبھانے والی تھی لیکن باطنی طور پر ان کا مزہ کسیلا اور کڑوا تھا۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ اوپر کی آیت میں قیامت کے دن مشرکوں کے سزا پانے کا تذکرہ تھا لیکن قیامت کب ہوگی کسی نے دیکھی۔ سزا ملے گی یا نہیں۔ اس کو کون دیکھ کر آیا۔ قیامت کی جزا سزا کا یقین ہو تو مشرک شرک ہی کیوں کرے۔ آخرت میں پاداش عمل پر ایمان ہو تو کافر کفر کی کس طرح اختیار کرے۔ قیامت کا تذکرہ تو مومن کے دل کو لرزا دیتا ہے۔ مشغول منکر پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ منکر کی نظر تو اسی دنیا کی سزا جزا کو دیکھتی ہے۔ یہیں پاداش عمل کے قانون پر یقین رکھ سکتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ گزشتہ اقوام و افراد نے بھی اللہ کی فرمانروائی یکتائی اور ماس تک پہنچے ہوئے آئین کو نہیں مانا تھا۔ نتیجہ میں اسی دنیا میں اس طور پر برباد ہوئے کہ ان کو احساس بھی نہ ہو سکا کہ کدھر سے ان کی گرفت ہوئی اور کس طرح ان پر عذاب آیا۔ یعنی اللہ کی طرف سے پاداش عمل کا قانون اس دنیا میں بھی جاری ہے۔ ان گنت قومیں جب اللہ کے قانون فطرت سے منہ موڑ کر عیش و عشرت میں پڑ کر اپنی بد مستیوں میں مبتلا ہو گئیں صحیح نظر و فکر اور قول و عمل کو انہوں نے چھوڑ دیا تو قدرتی سزا نے ان کو آ گھیرا۔ ان کو احساس بھی نہ تھا کہ عیش و راحت کے یہ راستے ہماری ہلاکت کا سبب بن جائیں گے۔ نتیجہ میں رسوائی، ذلت، نکبت، قید، قتل اور طرح طرح کی ہلاکت آفریں بیماریوں سے دوچار ہونا پڑا محکوم غلام بنے۔ ذلیل قیدی ہوئے۔ نفرت انگیز بیماریوں کا شکار بنے دانہ دانہ کو محتاج ہو گئے۔ صورتیں بگڑ گئیں عشرتیں خاک میں مل گئیں، نسلیں برباد ہو گئیں اور آخرت کا عذاب تو بہر حال بہت ہی بڑا ہے۔ اس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ دنیوی پاداش عمل اور انکار صداقت کی سزا کو دیکھ کر آخرت کے عذاب پر یقین اور یہاں کی تکلیفوں سے وہاں کے دکھ کا اندازہ ناقابل شک ہے۔ وہ اس سے کہیں بڑا ہے۔ یہاں تو موت کے بعد ہر ذلت، نکبت، قید اور ناداری سے نجات مل گئی۔ موت پر ہر سزا کا خاتمہ ہو گیا۔ چند روزہ دکھ تھا جاتا رہا۔ آخرت کا عذاب غیر متناہی ہے۔ نہ اس کی مقدار کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شدت کا۔ وہ دوامی ہے ختم نہ ہونے والا۔ اتنا بڑا کہ دنیا میں کوئی سزا اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یا قانون عمل کا قانون گزشتہ اقوام ہی کے لیے تھا۔ انکار صداقت اور اللہ سے سرتابی کی سزا انہی کو برداشت کرنا پڑی تھی ہم محفوظ رہیں گے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ماضی کو کلام میں اگر سوچنا چاہیے ان ناپاک حواس کی سطح سے اوپر اٹھ کر صرف عقل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے خود معلوم ہو جائے گا کہ فطرت ایک ہے، قانون ایک ہے، عروج و زوال اور موت و حیات کا معیار ایک ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو پکڑے جائیں اور ہم بچ جائیں۔ وہ برباد ہوں اور ہم آباد رہیں۔ وہ سرتابی کی سزا بھگتیں اور ہم کو جرم کا بدلہ نہ ملے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کاش اگر یہ لوگ اس بات کو سمجھ لیتے اور ہلاکت و نجات کے قانون کو جانچ لیتے۔

مقصود بیان کلام مجید پر لفظ حدیث اور کتاب کا اطلاق صحیح ہے۔ مُتَشَابِهًا مَّثَانِيَ سے جو ہدایت مستنبط ہوتی تھی وہ تو ہم تفسیر میں لکھ چکے۔ یہاں ایک نئی لطیف بات کا بھی استخراج کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آسمانی کتابوں نے بھی مبدء معاد اور خدا کی ذات و صفات اور تزکیۂ اعمال و اخلاق کے متعلق چند اصول پیش کیے تھے۔ قرآن نے بھی انہی اصول کو پیش کیا اور انہی عقائد کو دہرایا۔ گویا یہ قرآن بالکل گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے مشابہ ہے انہی کا مثنیٰ ہے جزئیاتی فرق ناقابل توجہ ہے۔ اصولی اختلاف بالکل نہیں صرف ایک جدید یادداشت ہے۔ نئے سرے سے گزشتہ کتابوں کے اصول کو اکٹھا کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ تقشعر منها جلود الذين الخ سے تلاوت قرآن کے وقت مومن مخلص کے جذبات خوف و رجا کی کارفرمائی۔ یعنی ایمان کامل کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ ذٰلِكَ هُدَى اللَّهِ۔ اگر ذٰلک کا اشارہ قرآن کی طرف ہو تو یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن پاک مجسمۂ ہدایت ہے اور ہدایت بھی اللہ کی طرف سے۔ اس کا اثر قرآن پڑھنے والے اور اس کا سننے والے پر ہی ہوتا ہے نام بخشیت الٰہی باعث ہدایت بھی ہوتا ہے اور سبب گمراہی بھی۔ گویا اصل چیز اللہ کی مشیت ہے قرآن ذریعہ ہے۔ آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح ہدایت یاب کرنا اللہ کا کام ہے اور راستہ بتانا قرآن کی صفت ہے اسی طرح گمراہ کر دینا یعنی گمراہ بنا دینا بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ سوء العذاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شقی جہنم کے عذاب میں گرفتار نہ ہوگا اس سے ہر قسم کی توبیخ اور معمولی زجر کی نفی مستفاد نہیں ہوتی۔ ظالمین کے لفظ سے یہ بتانا غرض ہے کہ مشرکوں اور کافروں پر اللہ کا عذاب بے وجہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے غلط افکار، باطل عقائد اور بے جا اعمال سبب عذاب ہیں۔ مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ کا عموم بتا رہا ہے کہ کام ہر عمل خواہ ظاہر میں اچھا ہی ہو قابل مواخذہ اور مستوجب عذاب ہے۔ كَذَّبَ الَّذِينَ سے ضابطۂ فطرت کو ظاہر کرنا غرض ہے کہ حق کا انکار اور فکری و عملی تکذیب موجب ہلاکت ہے۔ اگرچہ انسان اپنی بربادی کی وجہ نہ جانتا ہو اور پہلے سے اس کو موجبات ہلاکت کا احساس بھی ہو۔ فاذاقهم میں اس بات کی صراحت ہے کہ بدکار، قانون شکن، باغیان فطرت دنیا میں بھی ذلیل، خستہ اور رسوا ہوتے ہیں۔ قانون فطرت سے ٹکرانے کو موجب کامیابی سمجھنے والے اس سے عبرت حاصل کریں اور سمجھ لیں کہ اللہ کا کسی سے کوئی خاص رشتہ سوائے تخلیقی اور فطری رشتے کے اور کوئی نہیں۔ فطرت کی خلاف ورزی کرنے والا دنیا میں بھی ضرور روسیاہ ہوتا ہے اور آخرت میں بھی عذاب اکبر میں گرفتار ہوگا۔ لو كانوا يعلمون سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اقوام پارینہ کے اعمال کے نتائج بد کو ذکر کرنا زیب داستان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے درس حیات دینا مقصود ہے۔ یعلمون کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعور احساس اور حواس ما بہ کے ادراک سے بلند ہو کر علم کے دائرہ میں پہنچ کر ہر تقلید اور پیروی (اقوام) سے آزاد ہو کر محض سادہ عقل کی روشنی میں سمجھنا اور ضابطۂ فطرت پر غور کرنا چاہیے اقوام گزشتہ کے تذکرہ سے یہی مقصود ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ قُرْآنًا

اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضامین بیان فرمائے ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ

عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ

عربی قرآن ہے جس میں ذرا کجی نہیں لا ورا تا کہ یہ لوگ ڈریں اللہ تعالیٰ نے (موحد و مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص غلام ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جنمیں باہم ضد

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

جو اور ایک شخص ہے کہ پورا ایک ہی کا (غلام) ہے (تو) کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے الحمد للہ بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (ع)

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ

آپکو بھی مرنا ہے اور اُن کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے (اسوقت عملی فیصلہ ہو جائے گا)

تفسیر وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۔ مثل کے تین معنی ہیں (۱) وہ کلام جس کا اقدام استعمال مقام وضع کے موافق ہو محل استعمال اور محل وضع میں مناسبت ہو۔ یعنی اگر کسی معنی کو ادا کرنے کے لئے کوئی کلام بنایا گیا اور کچھ مدت کے بعد اس کلام کا استعمال وسیع کیا گیا تو جہاں جہاں جس جس مقام پر اس کلام کا استعمال کیا گیا وہ اصلی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ مثلاً عربی کا ایک جملہ ہے۔ مُغَنِّيَةُ الْحَيِّ لَا تُطْرِبُ ۔ اگر محلہ میں کوئی گانے والی عورت رہتی ہو اور دن رات گاتی ہو تو محلہ والوں کے لئے اس کے گانے میں کوئی لذت باقی نہیں رہتی خواہ اس کی آواز کیسی ہی دلکش اور طرزِ غنا کتنا ہی دلفریب ہو۔ اس کلام کا محل وضع کوئی گانے والی عورت ہوگی لیکن اسی جملہ کے استعمال میں جب توسیع کی گئی تو صرف گانے والی عورت ہی کے متعلق اس کا استعمال کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ہر ماہر کامل جو کسی فن میں ممتاز ہو اگر دن رات ہمارے ساتھ رہتا ہے اور ہم اس کی مہارت کو دیکھنے کے خوگر ہو گئے ہیں تو پھر اس کے کمال کی قدر ہم کو نہیں رہتی۔ نہ اس کے فن میں ہمارے لئے کوئی خاص لطف باقی رہتا ہے۔ محلہ کا ایک سحر بیاں خطیب ایک علامہ و ہر فاضل، ایک طبیب حاذق ایک نادر الوجود آرٹسٹ، ایک بے نظیر شاعر ہمارے لئے اتنا جاذب نہیں رہتا جتنا دوسرے مقام والوں کے لئے ہوتا ہے۔ ان تمام مواقع میں ہم مندرجہ بالا کہاوت کا استعمال کر سکتے ہیں۔ یا اردو کی مثل ہے گھر کی مرغی دال برابر۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ گھر کی مرغی کیونکہ کہیں سے مول نہیں آتی۔ نہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کچھ تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اس لئے اس کی قدر ہم کو نہیں ہوتی اور دال سے زیادہ ہم اس کی وقعت نہیں کرتے۔ پس ہر وہ قیمتی چیز جس کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو مشقت اٹھانی نہیں پڑتی، خواہ ہمارے گھر میں رہنے والا کوئی ماہر ڈاکٹر ہو یا خاندان کا وہ فاضل بے بدل جس کی شہرت عالمگیر ہو یا کوئی اور ماہر فن۔ بہر حال ہم اس کو اتنی وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے جو دوسروں کی نظر میں اس کی ہوتی ہے۔ ان تمام مواقع میں ہم مندرجہ بالا کہاوت کا استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ اصل محل وضع اور موجودہ مقام استعمال میں مماثلت اور مناسبت ہو۔ بے تکا بے محل استعمال نہ ہو۔ (۲) مثل کسی عظیم الشان حالت اور بلند مرتبہ کو بھی کہتے ہیں۔ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۔ اللہ کی شان سب سے اونچی ہے (۳) عام حالت یا کیفیت یا کوئی قصہ۔ مثل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ غیر محسوس چیز محسوس کا جامہ پہن کر سامنے آجاتی ہے۔ معقول مبصر بن جاتی ہے۔ تخییل اور محض عقلیت کے دائرے سے نکل کر رغبت اور خوف کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ مثلاً آدمی سمجھ کر نیک عمل کا نتیجہ کامرانی عزت، حکومت اور دولت ہے۔ بداعمالی کی پاداش، ذلت، نکبت، غلامی اور افلاس ہے۔ یہ ایک عقلی ضابطہ ہے جس کو سمجھ کر صحیح ماننے والے بہت کم ہیں۔ سادہ عقل اور سوچ وچار کرنے کی سالمیت دماغ قوت کا استعمال ہر شخص کا کام نہیں۔ نہ ہر شخص فلاسفر اور حکیم ہے، جو محض عقل اور قوت دانش سے ضوابط عامہ سے نتائج خاصہ کا انتباہ کر سکے۔ پس اگر ہم کو مذکورہ بالا دونوں قاعدوں کی صحت دل نشین کرا کے نیک اعمال کی رغبت اور بدکاری سے نفرت پیدا کراتی ہے تو

اچھی بری مختلف اقوام اور نیک و بد مختلف اشخاص کے کردار اور کردار کے نتائج کو بطور مثال ذکر کرنا ہوگا جس سے مذکورہ قاعدوں کا ثبوت ہوتا ہو اور گزشتہ اقوام و اشخاص کے احوال کو پڑھ کر لوگ سمجھ جائیں کہ اچھے برے نتائج سے دوچار ہونے کا سبب ان کا کردار اور طرز زندگی تھا۔ اس درجہ پر پہنچ کر سننے والوں کے جذبات نفرت و رغبت اور ترک و اختیار کی قوتوں میں بیداری پیدا ہوگی۔ مردہ حس والے زندہ بن جائیں گے اور حسب مقصد نتیجہ برآمد ہو جائے گا۔ قرآن پاک میں بھی عبرت اندوزی اور سبق آموزی کے لئے گزشتہ اقوام و اشخاص کے قصے بطور مثال بیان کئے گئے ہیں۔ کوئی قصہ بھی بطور داستان نہیں بیان کیا گیا۔ پھر مثال کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے افراد و موادِ کار واقعی ہوں اور ان کا کوئی واقعہ ہوا بھی ہو۔ اگر واقعیت ہو تب تو اثر انگیزی اپنے وسیع ترین عمل کے ساتھ سامنے آ ہی جاتی ہے لیکن اگر افراد کار غیر واقعی ہوں، لیکن لوگوں کے رسم و رواج و طبائع، عادات اور حالات کے اعتبار سے ان کا واقع ہو جانا ناممکن نہ ہو اور دنیا میں اس قسم کے واقعات ہو سکتے ہوں تب بھی تاثیر اور برانگیختگی میں کچھ نمایاں کمی نہیں آتی۔ قرآن مجید میں دونوں طرح کی مثالیں بیان کی گئی ہیں جہاں موسیٰ اور فرعون، ابراہیم اور نمرود کے قصص ہیں وہاں مکڑی، مچھر اور شہد کی مکھی اور فرمانبردار و نافرمان غلاموں کے احوال کو بھی بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

آیت مذکورہ میں مثل سے یا تو قصہ اور واقعی یا غیر واقعی کسی کا کوئی خاص کردار مراد ہے۔ اس صورت میں کل مثل کا مطلب ہوگا ہر اچھے برے موضوع کی مثل یا مثل سے مراد حالت ہے۔ اس شق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہم کو کچھ تفصیل کرنی ہے۔ کیونکہ دنیا کی ہر حالت کا تفصیلی بیان تو قرآن میں موجود نہیں پھر کل مثل کا کیا مطلب ہوگا۔ اس مطلب کو سمجھنے کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ دنیا میں انسانوں کے دو طرح کے احوال ہیں اور ہر حال کا نام یہ ہے (۱) اچھی فکر، اچھا نظریہ، صحیح عقیدہ، درست عمل، کامل اور صحیح کوشش (۲) غلط فکریہ، باطل عقیدہ، بدعمل، غیر صالح کردار۔ اول کا نتیجہ دنیا میں کامرانی اور برتری اور آخرت میں عذاب سے نجات اور فلاح لازوال کا حصول ہے۔ دوسرے کا ثمرہ دنیا میں ذلت، بربادی، افلاس، بیماری اور غلامی ہے۔ اور آخرت میں فلاح سے محرومی اور عذاب میں گرفتاری۔ انسانی عقائد و اعمال کی صرف یہ دو قسمیں ہیں اور ہر قسم کا نتیجہ اسی کے مناسب برآمد ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ چھوٹی چھوٹی تفصیلی حالات اور ذرہ ذرہ کردار کو بیان نہیں کیا گیا۔ نہ اس کا امکان تھا لیکن خیر و شر اور بقا و فنا کے جو لازوال ناقابل شک ضوابط قرآن نے پیش کر دیئے۔ ان کے اندر تمام جزئیاتی اور انفرادی احوال آگئے اس صورت میں کل مثل سے مراد ہوگی ہر خیر و شر اور صلاح و فساد کی عمومی حالت۔

قرآنا عربیا۔ عربی زبان میں پڑھی جانے والی کتاب۔ ہر قوم جدا جدا زبانیں بولتی ہے اور انہی کی خوگر ہوتی ہے۔ انہی کو آسانی سے سمجھتی ہے اور اثر قبول کرتی ہے۔ زبانیں ہزاروں ہیں۔ ہر زبان میں قرآن کا نزول ممکن نہ تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ قرآن کا نزول تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت ہوا۔ پھر کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی تھی۔ اللہ نے عربی کو قرآن کی زبان بنایا۔ کیوں؟ اس کی بنا پر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں (۱) ملک عرب جہالت اور فساد انسانیت کا اڈا تھا۔ اس میں مختلف مذاہب کے پیرو بگڑی ہوئی حالت میں تھے۔ بت پرست بھی تھے۔ نباتات اور عناصر پرست بھی، ستارہ پرست، اور ملائکہ پرست بھی، جنات اور روحوں کے پجاری بھی، خیالی دیوتاؤں کے پرستار بھی، صابی، مجوسی، یہودی اور عیسائی بھی اور چند خالص موحد بھی۔ پھر ملک وقوع بھی وسطانی تھا۔ مشرق و مغرب کے ڈانڈے اسی سرزمین پر ملتے تھے۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کا سنگم اسی جگہ تھا۔ پھر اقوام و افراد کا بگاڑ بھی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ پھر آغاز آفرینش سے ملک عرب کے باشندے ملوکیت اور عمومی حکومت سے آزاد رہے تھے۔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور شاہیت کا شکار نہیں ہوئے تھے گویا سادہ فطرت کے ترجمان تھے (۲) اگرچہ عادت اور ضمیر کے اختلاف کی وجہ سے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن عربی زبان کی سادگی کسی زبان میں نہیں ہے۔ فیلالوجی کے ماہر جانتے ہیں کہ عربی حروف نے تمام بسیط مخارج کا احاطہ کر لیا ہے۔ انتہائے حلق سے لے کر ہونٹوں کے آخری کنارے تک کسی سادہ مخرج سے کوئی بسیط حرف سے نکلنے والا ایسا نہیں جو عربی زبان میں نہ ہو۔ دوسری زبانوں نے یا تو بعض مخارج کو بیکار چھوڑ دیا ہے یا مرکب حروف کو بھی بسیط کا جامہ پہنا دیا ہے۔ پھ، دھ، ٹھ، گھ وغیرہ مرکبات ہیں جن کو بسائط قرار دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں فقہ اللغۃ اور الفاظ کی تراش خراش اور تعیین معانی سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی صرف مخارج اصوات اور ادائیگی کے لحاظ سے کوئی دوسری زبان عربی کی ہم وزن نہیں ہے۔ تفصیل موجب طوالت ہے۔ اس کے لئے چند طویل مجلدات کی ضرورت ہے۔

الغرض ان دونوں وجوہ کا لحاظ کرکے قرآن کو عربی زبان کا لباس پہنایا گیا۔

غَيْرَ ذِي عِوَجٍ - ہر زبان کے بعض الفاظ کے تلفظ میں گرانی اور بعض جملوں کی ساخت میں ژولیدگی اور الجھاؤ ہوتا ہے جس سے مطلب واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔ عربی زبان بھی اس عیب سے خالی نہیں۔ اس کے بعض الفاظ میں بھی کرختگی اور درشتی ہے اور بعض جملوں کی ساخت میں الجھاؤ اور تعقید بھی ہے اور متکلم کی قوت کلامیہ کی کمزوری کی وجہ سے ادائے معانی کے لئے سادہ و روشن عبارت کی جگہ حلقہ در حلقہ الجھا ہوا کلام نکل سکتا ہے لیکن قرآن کے عربی میں نہ تنافر اور ثقیل حروف ہے، نہ کلام گلو بستہ اور الجھا ہوا، نہ معانی کے فہم میں کوئی دشواری اور گرانی ہے، نہ ایسے الفاظ نادرہ کا استعمال جو صرف کسی ایک ہی بستی میں بولے جاتے ہوں اور دوسری جگہ کے رہنے والے ان کو نہ سمجھتے ہوں۔ پھر ہر زبان کا لٹریچر کچھ گندہ بودا اور اخلاق کو برباد کردینے والا بھی ہوتا ہے۔ آخر فحش معانی فحش الفاظ کا ہی جامہ پہنتے ہیں۔ انسانیت کو ہلاک کرنے والی تعلیم بھی زبان اور اس کے الفاظ میں ہی دی جاتی ہے۔ عربی زبان بھی اس عفونت سے پاک نہ تھی بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ پر عربی زبان کو تو جاہلانہ جوش، بے جا فخر، انسانیت کش جدال و قتال، از سرتا پا بیہودہ رجز، خماری، قمار بازی اور طرح طرح کے تباہ کن اخلاق کی تعلیم میں تو امتیازی تمغہ حاصل تھا لیکن قرآن کی عربی پاک صاف شستہ رفتہ ہے۔ ان تمام خرافات سے منزہ اور طاہر۔ نہ اس میں عمرو بن کلثوم کے قصائد جیسا بے جا جاہلانہ جوش ہے، نہ عنترہ کی جھوٹی دلیری اور رجیوٹ پن کا اظہار، نہ اعشیٰ کے خمریات اور لالچ، نہ امرؤ القیس کی فحاشی، نہ مہلہل بن ربیعہ کی نوحہ خوانی، نہ زہیر کی خوشامد اور ملامہ گری۔ اس طرح کی ہر کجی سے پاک اور خرابی سے مبرا ہے۔ پھر ہر زبان میں کچھ فلسفیانہ حقائق اور حکیمانہ افکار کا بھی اظہار کیا جاتا ہے اور طریقہ اظہار نہایت خشک ہوتا ہے۔ اصطلاحی و دقیق الفاظ، افکار بلند۔ ایسی حالت میں سمجھنے میں دشواری اور اصل مقصد تک پہنچنے میں بڑی مزاحمت ہوتی ہے۔ سادہ مطلب آسانی کے ساتھ زبان بولنے والوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اردو میں غالب کا کلام ہی اٹھا کر دیکھ لو۔ اچھے اچھے زبان دان اس کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اسی طرح اقبال کے کلام کا کچھ حصہ ہے عسیر الفہم خشک۔ قرآن پاک بہت بلند معانی اور دقیق حقائق کو بیان کرتا ہے لیکن اس طرح کہ سننے اور پڑھنے والے کو سمجھنے اور سادہ مطلب اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ نہ اس میں حکیمانہ خشکی ہے نہ فلسفیانہ اصطلاحات۔ ہاں اسرار و رموز کے انکشافات میں ذہن کی جولانی، دماغ کی ذکاوت اور انتہائی غور و فکر کی ضرورت ہے مگر سادہ مراد سمجھنے میں کوئی کجی اور غلط روی حائل نہیں ہو سکتی۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ - اوپر کی آیت میں یتذکرون فرمایا تھا اور اس جگہ یتقون فرمایا۔ مثل کے لئے تذکرہ یاد دہانی، عبرت اندوزی اور نصیحت پذیری ہی مناسب تھی بلکہ مثل کا بیان ہی سبق آموزی کے لئے ہوتا ہے۔ دوسروں کے نتائج قبیحہ دیکھ کر ان کے کردار و اطوار سے خود پرہیز کرنا اور اپنی حالت کو درست رکھنا تمثیل کی اصل غرض ہوتی ہے لیکن قرآن نام ہے مجموعہ ضوابط کا، عقائد و اعمال کی جامع تعلیم کا زندگی کے دستور العمل کا، اور ذیلی طور پر احوال جنت، کیفیات جہنم، تفصیل حشر و نشر اور چند پیشین گوئیوں کا۔ افکار و اعمال کی جو تعلیم قرآن میں دی گئی ہے اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مطالعہ کائنات کی دعوت دی گئی ہے اور چند امثال و قصص بیان کرکے اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ قرآن صرف اُن سطح بین لوگوں کے لئے ہی پیام ہدایت نہیں ہے، جو اصول زندگی اور اعمال و افکار کے حسن و قبح پر خود غور نہیں کر سکتے بلکہ دوسروں کے نتائج کو دیکھ کر زندگی کے راستے پر چلنا شروع کر دیتے ہیں اس گروہ کو راہ راست پر چلانے کے لئے تو صرف مخصوص ضوابط کو محسوس امثال کا جامہ پہنا کر دکھانے کی ضرورت پڑتی ہے گہری نظر رکھنے والے خود ضوابط الٰہیہ اور قوانین عملیہ پر غور کرتے ہیں۔ دوسری طرف مظاہر کائنات کو دیکھتے ہیں۔ جب دونوں کو ہم آہنگ پالیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تعلیمی اصول انسانیت کو صعود دلانے والے ہیں تو ان پر چلتے ہیں اور ہر غلط روی سے اجتناب کرنے لگتے ہیں۔ پس قرآن کے ساتھ یتقون ہی کہنا مناسب تھا اور امثال کے ساتھ یتذکرون کا ہونا تھا۔ آیت سے مراد یہ ہے کہ نزول قرآن کی اصل غرض اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ زندگی کی غلط روی سے لوگ پرہیز رکھیں، آخرت اور دنیا کی تباہی سے بچ جائیں۔ اس کے علاوہ خدا کی اپنی کوئی ذاتی غرض نہیں۔ یہ اپنے فائدے کے لئے اس نے قرآن بھیجا۔ رعایا کی وفاداری اور سرکشی سے بادشاہوں کو نفع یا ضرر پہنچتا ہے مگر خدائی قانون کے نفاذ اور اس کی اطاعت یا نافرمانی

ہے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ توحید و شرک کا فرق دکھانے کے لئے خدا نے اس آیت میں ایک فرضی مگر ممکن الوقوع مثال بیان فرمائی ہے۔ آیت کی کوئی خاص شانِ نزول نہیں، نہ رجل سے کوئی معین آدمی مراد ہے۔ خلاصہ تمثیل یہ ہے کہ ایک غلام کے چند آقا ہوں، سب کی شرکت اس غلام میں ہو اور تمام مالک ہوں بھی ضدی اور جھگڑالو۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ اُس غلام سے اپنی خدمت لینی چاہتا ہو۔ بیچارے غلام کی جان پر عجیب مصیبت ہو، کس کس کا کام کرے، کس کس کو خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ مثل مشہور ہے متعدد قصابوں میں گائے مردار۔ شرکت کی ہانڈی چوراہے میں پھوٹے اور چونکہ تمام مالک کم ظرف اور جھگڑالو ہیں اس لئے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ایک اور غلام ہے جس کا ایک ہی آقا ہے۔ اسی کے حکم کی بجا آوری غلام کے ذمے ہے۔ آقا کا حکم بجا لایا اور آرام کیا۔ اپنی نیند سویا اپنی نیند اٹھا۔ نہ دل کو دکھ نہ جان کو مصیبت۔ ان دونوں غلاموں کی حالت ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ اول پراگندہ دل، دکھ اور مصیبت میں گرفتار، نہ کھانے کا مزہ نہ پینے کا۔ نہ سونے میں آرام نہ جاگنے میں سکھ۔ ہر وقت دل میں تردد کہ فلاں آقا مجھ سے ناراض ہو گیا۔ مجھے مارے گا، ستائے گا۔ پھر فکر ہوتی۔ دوسرا آقا اپنے حکم کی تعمیل نہ دیکھ کر میرا کھانا بند کر دے گا۔ غرض اسی بے چینی میں اس کے رات دن گزرتے ہیں لیکن دوسرے کا شب و روز اطمینان سے کٹتا ہے اُس کو نہ پٹنے کا ڈر نہ فاقے کا اندیشہ، نہ آقا کی ناراضگی کا ڈر۔ تن دہی سے خدمت انجام دی اور بے فکر ہو کر آرام کیا۔ موحد اور مشرک کی بعینہ یہی حالت ہے۔ مشرک کی جان ہر وقت ضیق میں رہتی ہے اور ڈنڈوت کرتا پھرتا ہے، ہر استھان پر جھکتا اور سجدے لگاتا ہے۔ ہر خیالی معبود کے نام کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ کسی کی منت مانتا اور کسی کی دہائی دیتا ہے۔ دل میں اطمینان نہیں دماغ میں یکسوئی نہیں، اُٹھتے بیٹھتے، چھینکتے کھانستے، کھاتے پیتے، ہر وقت شیطان اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے۔ ذرا بیمار ہوا یا مقدمہ میں کمزوری آئی یا باد و باراں کی بے اعتدالی سے فصل میں خرابی آئی یا تجارتی بازار بڑھاؤ کے زیر سلسلہ کسی بیوپار میں گھاٹے کی شکل دکھائی دی تو لگا وہم کرنے۔ میں نے فلاں دیوتا کے نام کی بھینٹ نہیں دی۔ خرابی کی اصل جڑ یہی ہے۔ فلاں ولی کی نذر نہیں مانی اس لئے یہ بیماری آئی یا تجارت میں نقصان ہوا۔ فلاں دیوی مجھ سے ناراض ہے اس لئے اچھی خاصی فصل برباد ہو گئی۔ غرض ہر نفع نقصان اور صحت و بیماری کو کسی فرضی معبود کی رضامندی و ناراضی کی جانب منسوب کرنا اور ہر وقت بے چین رہنا مشرک کا شیوہ ہے۔ موحد ان میں سے کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ نہ کسی شگون کا قائل، نہ قمر در عقرب کی تاثیر کا عقیدتمند، نہ کسی دیوی دیوتا پیر ولی اوتار شیطان خبیث کی کارسازی کا یقین رکھنے والا، نہ حوادثِ دہر کو کسی مخلوق کی خوشنودی اور ناراضگی کی طرف منسوب کرنے والا۔ اُس کو راضی رکھنا ہوتا ہے اور ناراضگی کا ڈر لگا رہتا ہے تو ایک کی، اطاعت کرتا ہے تو ایک کے حکم کی اور قانون پر چلتا ہے تو ایک کے۔ وہ پراگندہ دل نہیں، پریشان خیال نہیں، خبطی مزاج نہیں، اُس کے دماغ میں یکسوئی، دل میں اطمینان اور روح میں سکون ہوتا ہے۔

زندگی سکھ سے کس کی گزرتی ہے، بازار کی طوائف کی جس کو چند در چند دوستوں کو راضی رکھنا پڑتا ہے اور اپنے اخلاق، اطوار اور عادات میں گرگٹ کی تبدیلیاں کرنی ہوتی ہیں، یا اس عفت مآب معصومہ کی جس کے پیش نظر صرف ایک شوہر کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ نہ اُس کو اپنے اطوار میں چند در چند انقلاب اور تغیرات کرنے پڑتے ہیں۔ نہ روپ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف ایک کی مرضی اور مرضی کے حصول کا طریقہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور بس۔

الحمد للہ۔ یعنی کارساز تو خدا ہے، پروردگار تو خدا ہے۔ رب تو خدا ہے۔ رازق اور قاضی الحاجات تو خدا ہے۔ تمام الاہ اور دائرۂ امکان انسان کا ہر شخص سے فرش تک۔ اسی کا حکم نافذ ہے۔ ذرہ ذرہ اسی کے دست کرم کا محتاج ہے۔ پس ہر حمد و ستائش کا استحقاق اسی کو ہے۔ ہر ثنا اسی کو زیبا ہے۔ پھر کیوں دوسرے فرضی آلاؤں کی خوشامد کی جائے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی ثنا کے گن گائے جائیں۔ ہر طرح کی کارسازی، مدد اور پرورش تو خدا کرے اور تعریف کے گیت گائے جائیں دوسروں کے۔ اس کی وجہ کوئی عقلی نقلی نہیں۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ بلکہ جہالت اور نادانی ہے۔ اکثر آدمی بے وقوف ہیں، نادان ہیں، عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے سمجھ

نہیں کرتے۔ غلط اور صحیح میں امتیاز نہیں کرتے ہم غرض مرتے دم تک۔ تمام انسان ایک عقیدہ اور ایک عمل پر نہیں آسکتے اور زندگی میں کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ - بالآخر اے پیغمبر آپ کو بھی مرنا ہے اور یہ لوگ بھی ضرور مریں گے۔ پھر قیامت کے دن تم سب کا جھگڑا اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے (وہی اس روز فیصلہ کر دے گا) تختصمون کا خطاب صرف کافروں سے نہیں بلکہ عام انسانوں سے ہے خواہ کافر ہوں یا مسلمان۔ ہر شخص جس کا جھگڑا اس دنیا میں کسی سے تھا قیامت کے دن اپنی دادطلبی اللہ کے دربار میں کرے گا اور دوسرا شخص اپنے حق کی پیروی کرے گا۔ آخر میں خدا فیصلہ کر دے گا۔ ہماری یہ تفسیر ابن کثیر کے ایک قول کے موافق ہے لیکن عام مفسرین کی تشریح اور ابن کثیر کے قول ثانی کے خلاف ہے۔ عام اہل تفسیر کی رائے ہے کہ یہ جھگڑا صرف کافروں اور مسلمانوں میں خدا کے سامنے ہوگا۔ جس طرح دنیا میں مومن و غیر مومن دو فریق تھے اسی طرح قیامت کے دن بھی الگ الگ اپنا معاملہ پیش کریں گے۔ ظاہر آیت سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن صحیح روایات کی روشنی میں وہی تفسیر زیادہ صحیح ہے جو ہم نے کی ہے۔ اسی لئے آخر میں ابن کثیر نے عمومی تفسیر کو چھوڑ کر خصومت میں عموم کو اختیار کیا ہے اور خصومت کی خصوصیت فریق مومن و کافر کے درمیان نہیں رکھی بلکہ عام انسانوں کی دادطلبی مراد لی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا۔ جب یہ آیت اتری تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا آخرت میں دوبارہ ہمارا جھگڑا ہوگا۔ فرمایا ہاں۔ ابن زبیر نے کہا تب تو معاملہ بہت سخت ہے (رواہ احمد و ابن ابی حاتم) اس حدیث کو ترمذی نے بھی لفظوں کے کچھ تغیر کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مطلب یکساں ہی ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت عبداللہ بن عمر کا قول نقل کیا ہے۔ عبداللہ نے فرمایا جب یہ آیت اتری تو ہم نے (دل میں) کہا ہماری اہل قرآن سے خصومت نہیں۔ آپس میں متحد ہیں پھر قیامت کے دن کس سے جھگڑا ہوگا لیکن جب فتنے (وہ لڑائیاں اور خانہ جنگیاں جن کا آغاز حضرت عثمان کی شہادت سے ہوا) پھیلے تو ہم نے کہا یہی وہ واقعات ہیں جن کا جھگڑا پیش ہوگا جس کی صراحت ہمارے رب نے کی ہے (رواہ ابن ابی حاتم والنسائی) ابن عمر کا دوسرا قول ہے کہ نزول آیت کے بعد ایک مدت تک ہم کو اس کا مطلب معلوم نہیں ہوا۔ جب باہم لڑائیاں شروع ہوئیں تب پتہ چلا کہ ان کا مخاصمہ ہوگا (رواہ النسائی) ابو سعید خدری کا قول ہے یہ آیت اتری تو ہم اپنے دل میں کہتے تھے۔ ہمارا رب ایک، دین ایک، پیغمبر ایک۔ پھر جھگڑا کس بات میں ہوگا یہاں تک کہ جنگ صفین ہوئی اور ہم میں سے ایک نے دوسرے پر تلوار سونتی تب ہم کو معلوم ہوا کہ جھگڑا یہ پیش ہوگا۔ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو صحابہ نے کہا ہم تو بھائی بھائی ہیں ہم لوگ کیوں خصومت کریں گے۔ یہاں تک کہ جب حضرت عثمان شہید ہوئے تب صحابہ کہنے لگے کہ اس طرح جھگڑا پیش ہوگا۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا سب سے پہلے جھگڑا کرنے والے وہ دو شخص ہوں گے جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں گے (رواہ احمد منفردا) ابو سعید خدری سے مروی ہے حضور نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے برابر جھگڑوں کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ دو بکریاں اگر سینگوں سے باہم لڑی ہیں تو اس کا بھی فیصلہ ہوگا (رواہ احمد) ابو ذر سے مروی ہے۔ حضور نے دو بکریوں کو سینگوں سے لڑتے دیکھ کر فرمایا۔ ابو ذر تجھے معلوم ہے یہ بکریاں باہم کیوں لڑتی ہیں؟ میں نے عرض کیا جی نہیں فرمایا اللہ جانتا ہے اور عنقریب دونوں کا فیصلہ فرمائے گا (رواہ احمد) انس سے مروی ہے۔ حضور نے فرمایا قیامت کے دن ظالم خائن حاکم کی پیشی ہوگی اس کی رعایا اس کے خلاف دادطلبی کرے گی اور غالب آجائے گی۔ حکم ہوگا اس کو دوزخ کی ٹاٹ بنا دو (رواہ ابوبکر والبزار) ابن عباس سے مروی ہے قیامت کے دن سچے اور جھوٹے ظالم اور مظلوم، ہدایت یافتہ اور گمراہ، فرمانبردار اور سرکش میں مخاصمہ ہوگا (رواہ ابن ابی طلحہ)۔ ابو ہریرہ سے مروی ہے حضور نے فرمایا جس شخص پر اس کے بھائی کی آبرو یا مال کا کوئی حق ہو تو آج ہی اس کو معاف کرا لینا چاہیے اس دن کے آنے سے پہلے کہ وہاں نہ دینار ہوگا نہ درہم۔ اگر ظالم کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی تو بقدر ظلم اس سے لے لی جائیں گی اور نہ ہوئیں تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس (کی گردن) پر ڈال دی جائیں گی (رواہ البخاری) دوسری روایت میں ہے حضور نے فرمایا کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے۔ حاضرین نے عرض کیا ہمارے عرف میں تو مفلس وہی ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ اور سامان نہ ہو۔ فرمایا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، زکوٰۃ اور روزہ تو لے کر آئے گا لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان تراشی کی ہوگی۔ کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا۔ پس اس کی نیکیاں لے کر ...

برابر حق کو دی جائیں گی۔ پھر ادائے حقوق سے پہلے اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں تو مظلوموں کی برائیاں اُس پر ڈالی جائیں گی اور اس کو آگ میں جھونک دیا جائے گا (رواہ مسلم)

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ آیت کے ظاہر ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے پیش ہو کر جھگڑوں کا فیصلہ ہوگا تو کیا دنیا میں ہم سب اس کے سامنے حاضر نہیں۔ حاضری اور پیشی کے معنی ہی کیا ہیں۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ وہاں پیشی براہ راست فیصلہ کے لئے ہوگی۔ قیامت کا دن روزِ جزا ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں بھی خدا سے کوئی چیز غائب نہیں اور کبھی کبھی یہاں بھی کسی قدر سزا ہو جاتی ہے لیکن پوری سزا جزا اور حقوق کا فیصلہ قیامت کے دن دربارِ الٰہی ہی میں ہوگا۔ اس کے علاوہ کافر ومسلم کا خصوصی فیصلہ تو یہاں ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ یہاں پر خدائی فیصلہ کو کافر مان سکتا ہے۔ وہ تو اپنی ذات کو بھی خدا سے ایسا ہی غائب سمجھتا ہے جیسا خدا اُس کی نظر سے غائب ہے۔ قیامت کے دن یہ پردۂ غفلت اُٹھ جائے گا اور جو یہاں نظر نہیں آتا وہاں آنکھوں سے دکھ جائے گا۔ کافر کو بھی اسی فیصلہ کا یقین ہو جائے گا۔

تنبیہ صحیح مسانید اور سنن سے ثابت ہے کہ جب اہلِ ایمان پل صراط سے پار ہو جائیں گے تو ایک پُل پر ان کو روکا جائے گا تا کہ جو حقوق ایک کے دوسرے پر تھے ان کو بدلا جائے جب پاک صاف ہو جائیں گے تو جنت میں داخلہ ملے گا۔ اس حدیث کے مصداق سب سے اول صحابہ تھے۔ تمام کبار صحابہ آپس کے جھگڑوں اور اُن کے نتائج سے پہلے ہی واقف تھے۔ حضرت عمرؓ سے تو حضرت حذیفہ نے کہہ دیا تھا کہ آپ کے اور فتنوں کے درمیان ایک بند دروازہ ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا۔ جب وہ دروازہ ٹوٹ جائے گا تو قیامت تک بند ہونے کی امید نہیں۔ حضرت عثمان بھی اپنی شہادت سے واقف تھے۔ حضرت علی کو بھی ان فتنوں کا علم تھا۔ عمران بن طلحہ جب آپ کے پاس آئے تو آپ نے مرحبا کہہ کر بٹھایا اور فرمایا مجھے اُمید ہے کہ فردا قیامت میں میں اور تیرا باپ اس طرح بیٹھے ہوں گے جیسا خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین۔ یہ سُن کر ایک گوشہ سے حارث اعور نے کہا۔ کل باہم قتال آج باہم بھائی بھائی۔ خدا اس سے زیادہ عادل ہے۔ حضرت نے یہ لفظ سُن لئے مگر عمران سے پھر وہی پہلی بات فرمائی۔ اس بار حارث نے ذرا چلا کر اپنے کلام کا اعادہ کیا۔ حضرت کو سن کر اتنا غصہ آیا کہ سخت الفاظ سے حارث کو ڈانٹا۔ راوی کا بیان ہے واللہ میں ڈر گیا کہ کہیں چھت پھٹ کر نہ گر پڑے۔ پھر حضرت نے حارث کے سر پر چھڑی مارتے ہوئے فرمایا۔ بے وقوف کانے اگر یہ آیت ہمارے حق میں نہ ہوگی تو پھر کس کے حق میں ہوگی۔ ایک بار حضرت عثمانؓ کا لڑکا بھی حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور آپ نے مرحبا کہہ کر اس کو بٹھایا تھا۔ اتنے میں مالک اشتر نے حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت نہ دی اور فرزند عثمان رضہ سے باتیں کرتے رہے۔ پھر اُس کو رخصت کرتے وقت آدمی ساتھ کر دیا۔ اس کے بعد مالک کو اجازت دی۔ مالک نے عرض کیا میرا خیال ہے اسی شخص کی وجہ سے مجھے داخل ہونے کی اجازت آپ نے نہیں دی تھی۔ آپ اپنے دوستوں کو محروم اور دشمنوں کو مسرور کرتے ہیں۔ اس بات کو سنتے ہی حضرت کو غصہ آگیا اور فرمایا خاموش رہو تم نہیں جانتے وہ میرا بھتیجہ ہے۔

حضرت زبیرؓ نے بھی اپنی شہادت کے دن بیٹے کو بُلا کر فرمایا تھا میرا خیال ہے کہ آج میں مظلوم قتل کیا جاؤں گا۔ اس کے بعد ادائے قرض کی وصیت فرمائی۔ حضرت زبیر کا قاتل جب حضرت علی کی خدمت میں قتلِ زبیر کی بشارت دینے حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا افسوس تو جہنمی ہے۔ قاتل کو یہ الفاظ سن کر غصہ آیا اور کہنے لگا۔ آپ بھی عجیب ہیں آپ کی دوستی بھی خراب اور دشمنی بھی خراب۔ یہ کہہ کر غصہ میں اپنے پیٹ میں خود خنجر گھونپ لیا اور مر گیا۔ امیر المومنین نے فرمایا اللہ اکبر یوں اللہ اپنے پیغمبر کو سچا کرتا ہے۔

ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ صحابیوں کی باہمی خصومت کا ازالہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہو جائے گا اور ان بزرگوں میں سے کوئی بھی جہنمی نہ ہوگا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

تبصرہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ سے بعض لوگوں نے استدلال کیا کہ دوسرے آدمیوں کی طرح انبیاء کی بھی موت ہونا لازم ہے۔ انبیاء اور عام موت میں برابر ہیں۔ ان لوگوں کا یہ استدلال غلط ہے ورنہ شہیدوں کے متعلق زندہ رہنے کی قرآنی صراحت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حیات زائل کبھی منقطع ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیوانی زندگی تو کسی جاندار کی باقی رہنے والی ہی نہیں۔ کافر ہو یا مومن، انبیاء اولیاء ہوں یا بدکار

تا زمان کا فر سب کو اس راہ جانا ہے۔ جان نکلنے کے بعد کوئی بھی حیوانی فوائد سے تمتع پذیر نہیں ہو سکتا۔ مرنے کے بعد نہ کوئی نیک آدمی گوشت روٹی چاول سبزی، پھل میوہ کھاتا ہے نہ بدکار، نہ انبیاء اور اولیاء کو اس غذا کی ضرورت ہے نہ شیاطین و کافرین کو۔ نہ انبیاء اور ائمہ کا توالد تناسل کا سلسلہ جاری ہوتا ہے نہ عوام کا، اس لئے شہداء اور انبیاء کی زندگی کے معنی حیوانی زندگی کے نہیں۔ نہ حیوانی لوازم مرنے کے بعد کسی کو میسر ہو سکتے ہیں بلکہ زندگی سے مراد ہے انسانی زندگی، لوازم انسانیت کی زندگی، اطمینان و سکون اور عیش و راحت کا حصول۔ کافر اور مشرک کی حیوانی زندگی بھی منقطع ہو جاتی ہے اور انسانی زندگی بھی۔ بلکہ انسانی زندگی تو اس کو اس زندگی میں بھی میسر نہ تھی مرنے کے بعد کیا مل سکتی ہے۔ نیک لوگوں کا سانس کا دورا ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ دنیا کی غذا کھاتے پیتے نہیں۔ وہ دوسرے آدمیوں کی طرح جلسوں میں شرکت نہیں کرتے، گلی کوچوں اور بازاروں میں نہیں گھومتے، کھیتی باڑی اور تجارتی لین دین نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود وہ زندہ رہتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کو ان کے مناسب رزق ملتا ہے۔ ان کو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ بادۂ رحمت سے ان کی حیات مثالی اور برزخی زندگی کی رگ رگ پر کیف ہوتی ہے یہی ان کی زندگی ہے۔ آیت میں صرف حیوانی زندگی کا انقطاع مراد ہے۔

مقصودِ بیان

قرآن پاک نے ہر خیر و شر کی تصویر کھینچ کر دکھا دی ہے۔ من کل مثل کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ الناس کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی یہ تصویر کشی لوگوں کے فائدہ کے لئے ہے۔ خواہ کوئی فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ قرآن کا مقصد صرف ہدایت آموزی ہے۔ غیر ذی عوج کی تنکیر بتا رہی ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کجی نہیں، نہ لفظی نہ معنوی۔ نہ اس کی عربی عبارت کا کوئی جزو قابل گرفت ہے، نہ تعلیم و ہدایت کا کوئی ضابطہ۔ دو غلاموں کی تمثیل سے مقصود کافر و مومن کی فکری اور عملی حالت کا اظہار ہے۔ ایک فارغ البال دوسرا بدحال۔ الحمد للہ کا استغراق بتا رہا ہے کہ تمام صفات محمودہ کا حصر اللہ میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی کسی صفت میں کامل نہیں۔ اگر کسی میں کوئی اچھی صفت دکھائی دیتی ہے تو وہ مستعار ہے۔ انک میت میں انبیاء کی حیوانی زندگی کے انقطاع کی طرف اشارہ ہے۔ تختصمون سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے دربار میں تمام مدعی مدعا علیہ حاضر ہوں گے۔ مظلوم کی مظلومیت رائیگاں نہ جائے گی حق تلفی کرنے والے کو تاوان بھگتنا ہوگا۔ وغیرہ (ختم)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَيَانُ السُّبْحَانْ

کا

پارہ نمبر ۲۴

فَمَنْ اَظْلَمُ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

یہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقاعدہ ماہ شائع ہو رہی ہے

مولوی کے اصرار پر

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی)

سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے کہ اس شخص کا عقیدہ اور عمل بنیادی طور پر چونکہ درست ہوتا ہے اس لئے فردعی فروگذاشتیں اور لغزشیں واہرہ قابل عفو قرار پاتی ہیں۔ اگر جس کو دنیا اس کا بدترین عمل کہتی ہے۔ وہ بھی خدا کی نظر میں بدترین نہیں رہتا۔ اور جس عمل کو لوگ معمولی نیکی قرار دیتے ہیں اس کی اس معمولی نیکی کو بھی اللہ بہترین عمل قرار دے کر اعلیٰ جزاء عنایت فرماتا ہے۔ جب اصل بنیاد درست اور سیدھی ہو تو اس پر ایک ایک اینٹ کی تعمیر بھی قابل پذیرائی اور فائدہ رساں ہو سکتی ہے اور ٹیڑھی بنیاد پر تعمیر کی ہوئی اونچی دیوار بھی آسمان تک ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ پس تصدیق حق اقرار صدق اور اصلاح عمل کے بعد اس کی گزشتہ زندگی کا کوئی جرم خواہ کتنا ہی بڑا ہو ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔

تحلیل اجزاء

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ۚ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ

اس آیت میں چند امور قابل طلب ہیں:- (۱) ظلم کیا ہے، ظالم کون ہے اور اظلم کون (۲) کذب علی اللہ کیا ہے (۳) تکذیب صدق کیا ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرک اور موحد کی تصویر کشی ایک مثال دے کر کی تھی اور صراحت فرمائی تھی کہ قرآن میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے۔ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں موحد و مشرک اور مصدق و مکذب کا فرق دکھاتے ہوئے دونوں کی سزا جزاء پر توجہ فرمائی ہے۔ فَمَنْ میں مَن اور اَلَيْسَ میں ہمزہ استفہام تقریر کے لئے ہے۔ یعنی مشرک مکذب سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ ظلم کی تفصیل ہم آیت کے تفسیری متعلقہ میں لکھ آئے ہیں۔ یعنی بے جا حرکت، حق کی خلاف ورزی۔ ادنیٰ لغزش سے لے کر اللہ کی ہستی کے انکار تک سب ہی بے جا حرکات اور حق کی خلاف ورزیاں ہیں لیکن باہم مدارج اور مراتب میں بڑا فرق ہے ظلم کا سب سے اونچا درجہ کیا ہے سطور بالا میں ہم اس کی کافی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ کذب علی اللہ اور اللہ پر بہتان تراشی اور ناز یبا صفات سے اس کو متصف قرار دینا سخت ظلم ہے اور قرآن بلکہ اللہ کی تمام کتابوں اور صحیفوں اور ہدایت ناموں کا انکار یا ان کو غلط قرار دینا ظلم کی منتہی شاخ ہے اور جب کسی شخص میں یہ دونوں طرح جمع ہو جائیں تو اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔ حقائق واقعیہ کا انکار اور وہمیات غیر واقعیہ کو حقائق صادقہ سمجھنا ظلم عظیم ہے۔ انسان کے خود ساختہ شرک آفریں عقیدے اور دماغ سے تراشے ہوئے عملی آئین اور پھر ان کو خدائی تعلیم قرار دینا بڑا جرم ہے۔ پھر اللہ کے بھیجے ہوئے ہدایت ناموں اور دستور العمل کو خدائی احکام نہ قرار دینا یا قرار دیتے ہوئے ان کو انسانی زندگی کے لئے غیر مفید سمجھنا بھی ظلم کبیر ہے۔ رہے اس سے نیچے کے درجے تو وہ بھی ہزاروں ہیں اور ہر ایک ظلم ہے اور ہر بے جا حرکت عقلاً قابل مواخذہ بھی ہے مگر اللہ نے اپنی رحمت سے مذکورہ بالا کذب و تکذیب کے علاوہ کسی جرم کو لازمی اور وجوبی طور پر قابل مواخذہ نہیں قرار دیا بلکہ جہنم کا ٹھکانا مسکن اور قرار گاہ صرف کافروں کے لئے بنایا یعنی کافروں کے کفر کی وجہ سے دوزخ کو ان کا مسکن تو ضرور قرار دیا باقی مسلم گناہگاروں کے لئے جہنم کو ٹھکانا نہیں بنایا ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض کو ان کی بداعمالی کی پاداش میں جہنم میں عارضی طور پر جانا پڑے جہنم ان کا ٹھکانا نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے جرائم معاف فرما دیئے جائیں دوزخ سے وہ بالکل ہی محفوظ رہیں۔

دیکھنا یہ بات ہے کہ کن کن عقائد و اعمال سے اللہ پر بہتان تراشی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں ان گنت ہیں جو تمام دنیا کے مذہبی فرقوں میں موجود ہیں۔ غیر اللہ کی پرستش کو ذریعہ تقرب خدا قرار دینا خواہ وہ بنیت الوہیت ہو یا بامید تقرب خدا یا بتوقع نجات اللہ پر تہمت بندی ہے غیر اللہ کے نام پر نذر نیاز چڑھاوے چڑھانے کو ہدایت الٰہیہ سمجھنا کسی مرتبہ یا فرضی دیوتا کو حاضر اور کارساز مان کر پکارنے کو تعلیم خداوندی قرار دینا کسی کو اللہ کی اولاد بنانا اللہ کے ہدایت ناموں میں اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے اصلی کتاب میں ہیر پھیر کرنا ہر صورت کذب علی اللہ کی ہے غلام برگزیدہ چیزوں کی اللہ نے تعلیم نہیں دی ان کو الٰہی تعلیم خیال کرنا یہاں علی اللہ کا سرچشمہ ہے جس سے ہزاروں نہریں پھوٹ کر بہتی ہیں۔ باقی لفظ صدق اگرچہ عمومی حیثیت میں ہر واقعی خبر کو شامل ہے مگر آیت میں خبر نبوت، اعجاز نبوت اور قرآن مراد ہے۔ دوسری اطلاعات جو بعض انسان کی باہمی گفت و شنید ہوں مراد نہیں۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اس آیت کا مفہوم گزشتہ آیت کے مفہوم کے برعکس ہے تشریح آیت میں اہل تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے جَآءَ بِالصِّدْقِ اور صَدَّقَ بِهٖ کا فاعل جدا جدا قرار دیتے ہیں۔ کچھ علماء کے نزدیک

دونوں کا فاعل ایک ہی ہے۔ اوّل شق کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک سچائی کو لانے والے رسول اللہ اور اس کی تصدیق کرنے والے حضرت ابو بکرؓ ہیں۔ مجاہد نے کہا کہ سچائی کو لانے والے سے مراد حضور والا کی ذات گرامی ہے اور تصدیق کرنے والے سے مراد حضرت علی ہیں۔ قتادہ، مقاتل اور ابن زید کا قول ہے کہ اول سے مراد یقیناً حضورؐ ہی کی ذات ہے اور دوئم سے مراد تمام اہل ایمان ہیں۔ ہمارے نزدیک ان تینوں اقوال میں کچھ اختلاف نہیں کیونکہ حضرت ابوبکر یا حضرت علی میں تصدیق بالقرآن کا حصر کر دینا کسی کا بھی مقصود نہیں۔ لیکن جوانوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے تصدیق کی تھی اور بچوں میں سب سے اول سچ جاننے والے حضرت علی تھے اور آخر میں تصدیق کرنے والے تمام اہل ایمان ہیں اس لئے ہر قول کا محمل الگ الگ ہے کسی نے بلوغ مصدق کو پیش نظر رکھا کسی نے طفولیت کو اور کسی نے مآل کار کو۔ خاص مورد بیان کرنا کسی کا بھی مقصود نہیں کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اولئک اسم اشارہ جمع کے لئے ہے۔ ھُمْ بھی ضمیر جمع ہے اور المتقون بھی جمع کا صیغہ ہے اگر وحدت مورد میں حصر کرنا مقصود ہوتا پھر مشار الیہ اور مرجع کی وحدت کے لحاظ سے اشارہ اور ضمیر اور خبر سب کو واحد ہی ہونا چاہئے حاصل تشریح یہ کہ صدق بہ سے کوئی خاص شخص مراد نہیں۔ ہاں اس کا اولین مصداق جوانوں میں حضرت ابوبکر اور بچوں میں حضرت علی تھے

دوسری شق پر جاء بالصدق اور صدق بہ کا فاعل ایک ہی ہے اور عام اہل ایمان مراد ہیں۔ صدق کو لانا اور اس کو سچ ماننا ایک ہی شخص کی دو صفتیں ہیں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کی ذاتی صفت صدق ہے اور جب قرآن کا نزول ہو گیا تو اس کو بھی انہوں نے سچ جانا۔ ایسے ہی آدمی متقی ہیں۔ شیخ ابن جریر نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ مومن کی طینت اور افتاد طبع ہی صدق کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی سرشت ہی اللہ پر بہتان تراشی اور افترا بندی سے گریز کرتی ہے۔ وہ فطرتاً قول و عمل سے سچائی کو ہی پیش کرتا ہے۔ یہ تو اس کی ذاتی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر جب اللہ کی کتاب اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کو سچا جانتا اور مانتا ہے۔ حقیقت میں فطری اور عملی تقوی ایسے ہی آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ ابراہیم نخعی کا ایک قول مروی ہے کہ آیت میں تمام مومن مراد ہیں ہر مومن قرآن کی تصدیق کرتا ہے اور قیامت کے دن اسی سچے قرآن کو پیش کرے گا۔ گویا جآءَ بالصدق سے مراد ہے قیامت کے دن قرآن کو پیش کرنا۔ ہمارے نزدیک نخعی کا یہ قول ضعیف ہے۔ نہ سیاقِ کلام اس کی تائید کرتا ہے۔ نہ گزشتہ آیت

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ - اس آیت کے تین ٹکڑے ہیں - (۱) لہم ما یشاؤن (۲) عند ربہم (۳) المحسنین۔ اوّل فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا اہل تقوی جو کچھ چاہیں گے ان کو ملے گا۔ یعنی اللہ کی طرف سے جن نعمتوں کا بیان قرآن میں آچکا ہے وہ تو بہر حال ملیں گی اُن کے علاوہ بھی لینے والے کی مشیت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جو کچھ اُس کی مرضی ہوگی وہی اُس کو ملے گی گویا جس طرح اُنہوں نے اللہ کی مرضی کے موافق اپنی زندگی گزاری تھی اُسی طرح آخرت میں اُن کی مرضی کے موافق اللہ اُن کو جزا عنایت فرمائے گا اسی لئے آخری ٹکڑے میں ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ فرمایا کہ اہل احسان اور مرضیٔ الٰہی کو ہر قول و عمل میں پیش نظر رکھنے والوں کی یہی جزا ہوگی۔ زندگی میں وہ اللہ کے رضا جو رہے آخرت میں اللہ ان کو خوشنود کر دے گا۔ دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اللہ اُن کی مرضی کے موافق جزا دے گا یعنی ان کو جزا آخرت میں ملے گی۔ دنیا میں ہمیشہ راحت و عیش دینے کا وعدہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اہل احسان اس زندگی میں بھی عیش و راحت اور شان و شوکت کے ساتھ گزارا کریں اور کچھ نیک لوگ یہاں دکھوں میں مبتلا رہیں لیکن آخرت میں حسب مرضی ہر چیز اُن کو حاصل ہوگی۔ پھر یہاں تو قدرتی رنج و راحت بغیر ظاہری اسباب کے کسی کو نہیں پہنچتا۔ سورج نکلتا ہے روشنی ہوتی ہے پانی برستا ہے۔ کھیتی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی تجارت یا کھیتی باڑی کرتا ہے تو نفع نقصان پہنچتا ہے۔ جوانی آتی ہے گزر جاتی ہے۔ جوانی جاتی ہے کہ زوری آتی ہے۔ لیل و نہار کا چکر، بہار و خزاں کا تبادل، موسموں کا تغیر، حکومتوں کے نظام یا عدل و انصاف غرض تغیر حالت کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے لیکن آخرت میں یہ ظاہری ذرائع مفقود ہوں گے۔ بے محنت خلق سب کچھ ملے گا۔ اللہ کے ہاتھ میں براہ راست سزا و جزا ہوگی۔ تیسرے فقرے سے دو باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اول یہ کہ اللہ کی یہ عنایت بہ رحمت اہل احسان کے اعمال کے بدلے میں ہوگی۔ یعنی اللہ کسی کے نیک اعمال کو ضائع نہیں فرمائے گا جزا ضرور دے گا۔ دوئم یہ کہ محسنین اور متقین سے مراد ایک ہی قسم کا

گروہ ہے۔ تقویٰ اور احسان ایک ہی چیز ہے پہلی آیت میں جن لوگوں کو متقی فرمایا تھا اس آیت میں انہیں کو محسن قرار دیا۔
لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ آیت کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ تقوے کے نتیجہ میں اللہ متقیوں کے بدترین گناہ معاف فرما دے گا اور بہترین عمل کی جزا دے گا۔ اس مطلب پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ بدترین گناہ کی معافی اور بہترین عمل کی جزا سے درمیانی اور نچلے درجہ کے گناہوں کی معافی اور کم حسن والے اعمال کی جزا ملنی لازم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے بڑا گناہ معاف کر دیا جائے باقی گناہ معاف نہ کئے جائیں اور بہترین نیکیوں کی جزا مل جائے کم رتبہ نیکیوں کی جزا نہ ملے اس اعتراض سے بچنے کے لئے عام اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اسوا اور احسن اگرچہ تفضیل کے صیغے ہیں لیکن تفضیلی معنی مراد نہیں عام بدی اور نیکی مراد ہے۔ خطیب نے سراج میں مطلب کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسوا اور احسن تفضیل کے صیغے ہیں اور تفضیلی معنی ہی مراد ہیں اور باحسن میں باء تقابل کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی اللہ بدترین عمل کو معاف کر دے گا۔ جب بدترین عمل معاف کر دیا گیا تو معمولی گناہ کی معافی بدرجۂ اولیٰ لازم ہے لیکن یہ بدترین گناہ حالت اسلام کا مراد ہے یا اسلام سے پہلے کا بظاہر دونوں ہی کا مراد ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کے بعد حالتِ کفر کے گناہ خواہ کتنے ہی بڑے ہوں بہرصورت معاف ہو جاتے ہیں۔ صحیح احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے لیکن دورِ اسلامی کے گناہوں کی معافی بھی اس سے مستفاد ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ تصدیق صحیح اور ایمانِ صادق کے بعد کوئی گناہ قابلِ گرفت رہتا ہی نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہر مسلمان کو ہر گناہ کی کھلی اجازت مل جاتی ہے اس لئے گناہوں کی معافی سے حالتِ کفر کے گناہوں کی معافی مراد لینی بہتر ہے۔ رہا دوسرا فقرہ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نیکوں کو نیکی کا اجر تو ہر حال دے گا لیکن کتنا اس کا معیار بہترین عمل ہے۔ بہترین عمل کی جزا دس گنا سے سات سو گنا تک مقرر ہے اور حدیث میں وارد ہے۔ فَالْحَسَنَةُ بِعَشْرَةِ اَمْثَالِهَا ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر نیکی کی جزا کم سے کم دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملے گی اور اس سے آگے خدا کی رضا ہے جتنی بھی عنایت کرے پس آیت کا مطلب اس طرح ہوا کہ اہلِ تقویٰ کو اللہ ان کی نیکی کا اجر عطا فرمائے گا۔ سب سے اچھے عمل کے اجر کے برابر۔ یہ تفسیر مقاتل سے بھی مروی ہے۔

میرے نزدیک دونوں آیتوں کی ایک لطیف توضیح اور بھی ہے۔ یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ بدترین گناہ کفر ہے اور بہترین نیکی خالص اسلام پس اسوء سے مراد کفر اور احسن سے مراد اسلام ہے۔ اب مطلب صاف ہو گیا کہ متقین اور محسنین کو اسلام کے بعد اعمالِ کفر کی کوئی سزا نہیں دے گا اور اسلام کی پوری پوری جزا ملے گی اور خوب ترین جزا۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان اللہ پر بہتان تراشی کرنی اور الٰہی ہدایت نامہ کا انکار بدترین جرم ہے۔ صدقِ طینت اور ہدایتِ الٰہیہ کو ماننا حقیقی تقویٰ ہے۔ لهم ما يشاءون سے درپردہ ہدایت مل رہی ہے کہ دنیوی زندگی میں اللہ کی رضا جوئی لازم ہے تاکہ آخرت میں اللہ بندہ کی مشیت و رضا کے موافق عنایت فرمائے۔ آیت جاء بالصدق میں هم المتقون کہنے سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ تقویٰ کا مدار دو چیزوں پر ہے اول صدقِ طینت اور صلاحِ طبیعت دوسرے اعترافِ حق۔ آیت ليكفر الله سے دو باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ جس قدر یقین توحید میں پختگی اور عقیدہ میں استحکام ہوتا جائے گا اسی قدر گناہوں کی مغفرت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ مومن ہونے سے آدمی گناہوں سے معصوم نہیں ہو جاتا۔ مومن سے گناہ کا ارتکاب ہو سکتا ہے لیکن اگر کسی کے دل میں سچی تصدیق موجود ہو تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اللہ نے اس پر بڑی عنایت فرمائی ہے تاکہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے وغیرہ۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت) کیلئے کافی نہیں اور یہ لوگ آپ کو ان (جھوٹے معبودوں) سے ڈراتے ہیں جو خدا کے سوا (تجویز کر رکھے ہیں)

لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۝

اور جسکو خدا گمراہ کرے اُس کا کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کا کوئی گمراہ کرنے والا نہیں کیا خدا تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا

اور اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے آپ (اُن سے) کہیئے کہ بھلا

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ

پھر یہ تو بتلاؤ کہ خدا کے سوا تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے کیا یہ معبود اُس کی دی ہوئی تکلیف دور کر سکتے ہیں یا اللہ تعالیٰ

بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے کیا یہ معبود اُس کی عنایت کو روک سکتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اس سے ثابت ہو گیا کہ میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَنْ يَّاْتِيْهِ

کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ تم اپنی حالت پر عمل کئے جاؤ میں بھی عمل کر رہا ہوں سو اب جلدی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب

عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

آیا چاہتا ہے جو اُس کو رُسوا کر دے گا اور (بعد مرگ) اس پر دائمی عذاب نازل ہو گا

تفسیر

انجام یعنی حیات آخرت پر غور کرنے والے آدمی کم ہیں۔ ان دیکھی زندگی اور اُس کی کیفیات کس کے سامنے ہیں۔ بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں۔ سرشت جاہ کی طاقت پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ صرف ظاہری حیوانی حواس کام کر رہے ہیں اور ان آلات شعور میں نظر و فکر کی طاقت نہیں۔ پھر غیر مرئی کو مرئی کیسے مان لیا جائے۔ ہاں یہ زندگی اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ نظروں کے سامنے ہے لیکن اس میں بھی خدا کی شکل کہیں نہیں دکھائی دیتی۔ کیف و کم اور زمان و مکان کی ہر قید سے آزاد خدا کہاں دکھائی دے کیسے دکھائی دے اور کب دکھائی دے۔ جو خدا چھوا نہ جائے دیکھا نہ جائے چکھا نہ جائے سُنا نہ جائے پکڑا نہ جائے سُونگھا نہ جائے اس کو کون جانے کون مانے۔ اگر مان بھی لیا جائے تو وہ کس کام کا۔ سینکڑوں ہزاروں معبودوں کے مقابل وہ کیا کر سکتا ہے اور کر بھی سکے تو اس کو اطلاع کس طرح ہو۔ اطلاع ہو بھی سکے تو اس کو خبر ہونے تک ان دیوتاؤں کی ناراضی ہم کو برباد کر کے رکھ دے گی۔ وقت نکلے جن کی مدد چاہے کس کام کی۔ کھیتی سوکھنے کے بعد برسات لے کر اس سے یوجہ رکھتے ہوئے خداؤں کو اور ذرد سفلی اور علوی معبودوں کی ناراضگی ہے۔ اس قسم کے شیطانی وسوسے جو کڑی کے جال سے زیادہ بودے ہیں کور بصیرت نارسا دی الفہم لوگوں کے دماغوں پر چھائے رہتے ہیں جن کے زیر اثر وہ خود بھی مورتیوں، صورتیوں، پتھروں، دریاؤں، درختوں، ستاروں، مٹی کے ڈھیروں اور موہومی خداؤں سے ڈرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی ڈراتے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو نہیں معلوم کہ ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے جس کو خدا ہدایت کرنی چاہے اُسے کون گمراہ کر سکتا ہے اور جس کو خدا ہی راستے پر نہ چلائے اور سیدھے کی توفیق نہ دے اُسے کون چلا سکتا ہے۔ ہر قسم کا نفع نقصان اُسی کے قبضہ میں ہے۔ خدا دکھ دے تو کون روک دے اور خدا سکھ بخشے تو کون چھینے دیکھو سب سے پوچھ دیکھو۔ آسمان زمین کس نے بنائے۔ یہ چمکتے دمکتے تارے کس نے رچائے۔ یہ لہلہاتا سبزہ اور ہر بیل مرغزار کس نے اُگائے

کس نے بڑھائے اور کس نے پھیلائے ۔ کیا اکیلا خدا اپنے پرستار کے لئے کافی نہیں ، کیا کسی اور نے اس کو پیدا کیا پرورش کی ، جسمانی دماغی اور روحانی تربیت دی ، زندگی کے قدم قدم پر اُس کی دستگیری کی ۔ وہ اللہ ہے اپنے عبد کی خبر رکھتا ہے ۔ اس کے سوا کون ہے جو کارسازی کر سکے اہلِ ایمان کسی مخلوق پر بھروسہ نہیں کیا کرتے ہیں ۔ ان کا بھروسہ صرف خدا پر ہوتا ہے ۔ اللہ کے علاوہ وہ کسی کے ہاتھ میں بناؤ بگاڑ نہیں جانتے یہ روشن دلائل اور واضح ثبوت بھی اگر بدفہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو تبدیلِ خیال اور تغیرِ اعمال پہ جبر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ہر شخص کو اپنا اپنا اختیار ہے جس کا جس راہ پر دل چاہے چلے ۔ دنیا اور آخرت میں خود معلوم ہو جائے گا کہ دُکھ کس پہ آتا ہے ۔ خدا کو ناخوش کر کے دیوتاؤں کی خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرنے والوں پر یا دیوتاؤں کو پلٹے استحقار سے ٹھکرا کر اللہ ہی پر بھروسہ رکھنے والوں پر ۔ بہرحال ان دیوتا پرستوں پر دنیا میں بھی ایسا عذاب آئے گا جو اُن کو ذلیل کر دے گا اور آخرت میں بھی ان کا دُکھ لازوال اور اٹل ہوگا ۔

تخلیلِ اجزاء

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۔ دلائل کی روشنی میں توحید کا ثبوت ہو چکا ۔ مصدق و مکذب کا فرق کر کے دونوں کی سزا جزا کا بیان بھی کر دیا گیا ۔ شرک کے کمزور جال کا تانا بانا بکھیر دیا لیکن انسانی ہستی کو نہ سمجھنے والے کم حوصلہ ، استقامت اور عزم سے محروم سطح بین کوتاہ نظر کور مقلد دلائلِ عقلیہ براہینِ فطریہ اور شواہدِ نظریہ سے مطمئن نہیں ہوتے ۔ ان کے دل و دماغ شیطان کی جولانگاہ ۔ . . بنے ہوتے ہیں ۔ ان کو خدا کی ہمہ گیر طاقت عظمت حکمت کچھ بھی سُجھائی نہیں دیتی ۔ وہ تقلیدِ اسلاف اور توہم پرستی کے گندے نالے میں ایسے ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہر فرضی دیوتا ہر بے حس بے بس بے جان معبود اُن کو اپنا کارساز اور نفع نقصان کا مالک نظر آتا ہے ۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے دربدر کی گدائی چھوڑ کر ایک در کو پکڑ لیا تو پھر ان لاکھوں معبودوں کے خشمِ عتاب سے ہم کو کون بچائے گا ، کون دستگیری کرے گا ، کون دُکھ سُکھ میں کام آئے گا ۔ ہم کو یہ معبود اور دیوی دیوتا ہلاک کر دیں گے ، برباد کر دیں گے ۔ یہ طاغوتی وسوسے ہر جاہل کم بین کور بصیرت زنگ آلود دانش والے کے دماغ میں آتے ہیں اور راہِ حق پر چلنے سے روکتے ہیں ۔ اس طرح کے وسوسوں اور دغدغوں کو دور کرنے کے لئے اُن آیات کا نزول ہوا ۔

خطیب نے سراج میں جو سببِ نزول لکھا ہے وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔ خطیب نے لکھا ہے کہ مشرکینِ قریش نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ہمارے معبودوں کو بُرا کہنے سے آپ باز آجائیے ورنہ ہم آپ کو دُکھ پہنچائیں گے اور ممکن ہے آپ کو جنون ہو جائے (اور آپ پر دیوتاؤں کی مار پڑے) بعض تفسیروں میں بسلسلۂ نزول یہ قصہ بھی لکھا ہے کہ خالد بن ولید عزّٰی (ایک دیوی کا نام) کو توڑنے کے لئے بحکمِ حضور پہنچے تو پجاری نے کہا ۔ آپ عزّٰی دیوی کے پاس بھی نہ جانا ان کا مزاج بڑا غضب ناک ہے ۔ خدا کے واسطے اپنی جان کو بچائیے ۔ حضرت خالدؓ نے جھلا کر عزّٰی کی ناک توڑ دی اور پھر اُکھاڑ کر پھینک دیا ۔ بعض مفسرین نے اول شانِ نزول کو ترجیح دی ہے ۔ کیونکہ اگر آیات کا نزول حضرت خالدؓ کے متعلق ہوتا تو اگلی آیت میں یخوفونک سے خطاب رسول اللہ کو نہیں کیا جاتا ۔ میرے نزدیک یہ قول قوی نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ خالد کا واقعہ بھی ہوا ہو اور حضور کو بھی مشرک دیوتاؤں سے ڈراتے ہوں ۔ یہی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس طرح کے کئی واقعات رونما ہوئے ہوں ۔ کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے بعد چند آیات کے نزول سے ہمارے نیک اسلاف کو موردِ نزول ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے اور وہ صرف اُسی پیدا شدہ واقعہ کو موردِ نزول قرار دینے لگتے ہیں ۔ حالانکہ اکثر مواقع نزول میں ایسا نہیں ہوتا ۔ پھر یہ تو تفسیر کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ مورد کی تخصیص سے حکم کی تخصیص نہیں ہو جاتی ۔ موردِ نزول کی طرح جہاں اور جب بھی کوئی واقعہ ہوگا وہ آیات کے مورد ہی کے حکم میں داخل سمجھا جائے گا ۔ اس لئے کسی قصہ کو خصوصی مورد قرار دے کر اُسی زمانے کے اُسی طرح کے واقعہ کے مورد ہونے کا انکار زیبا نہیں ۔ حاصلِ ارشاد صاف ہے کہ اپنے بندہ کے لئے اللہ کافی ہے یعنی اول اللہ کا بندہ ہونا ضروری ہے ۔ جذبۂ عبدیت کامل ہو ۔ اس کے پیشِ نظر صرف اللہ کی فرمانبرداری ہو ۔ پھر وہ اپنی ہر علمی جسمانی روحانی طاقت کا رُخ اللہ کی طرف کر دے اس وقت اللہ ہر طرح اس کی مدد کرتا ہے ۔

وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۔ یہ عقیدہ کمزور خیال وہم پرست آدمی خدا اور خدا کی طاقت سے تو ناواقف ہوتے ہیں اُن کا جھکاؤ انسان کے ساختہ خداؤں کی طرف ہوتا ہے ۔ انہی کے ہاتھوں میں وہ دکھ سکھ اور نفع نقصان کی طاقت جانتے ہیں ۔ اس لئے جو اُن کے خود تراشیدہ

معبودوں کی بے بسی اور بے بسی ظاہر کرتا ہے۔ اس کو وہ اپنے دیوتاؤں کے عتاب سے ڈراتے ہیں۔ کسی سے کہتے ہیں کہ ان کو ناراض کیا تو تمہیں پٹ کر دیں گے۔ کسی سے کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں دولت ہے علم ہے صحت ہے یہاں تک کہ زندگی اور موت ہے۔ ان کو خوش رکھو بھینٹ دو نیاز دلاؤ، منتیں مانو، ورنہ یاد رکھو ان کی ناخوشی تم کو مفلس کر دے گی، بیمار بنا دے گی، پاگل ہو جاؤ گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔ کم بخت خود تو باطل پرست گمراہ ہوتے ہی ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ پس ایسے کجرووں کو کوئی راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ جس کو اللہ ہدایت کی توفیق نہ دے اس کو ہدایت کرنے والا کوئی نہیں۔ خبثِ طینت اور نجاستِ طبع کے ہاتھوں وہ گمراہ ہوتے ہیں۔ خدا بھی ان کو گمراہ چھوڑ دیتا ہے۔ زبردستی کسی کے فطری اختیار کی طاقتیں چھین کر راہِ راست پر لانا خدا کا شیوہ نہیں۔ جب خدا کسی کی خیر و شر کی سرشتی طاقت سلب نہیں کرتا تو پھر کون طینت شر کو بدل سکتا ہے

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ۔ اور جس کو خدا ہدایت یاب فرمائے یعنی جس کے دل میں اللہ ہدایت یاب ہونے کی تخلیق فرما دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ ہدایت کو مٹا کر گمراہی کو کون کے دل میں پیدا کرنے کی کس کو مجال ہے۔ تخلیق کام تو خدا ہی کا ہے۔ رہی یہ بات کہ جھوٹے معبود ناراض ہو کر ضرر پہنچائیں گے اور خدا کی ناراضگی اور نافرمانی کے باوجود ان موہومی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیئے

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِی انْتِقَامٍ۔ کیا اللہ سب جہان پر غالب نہیں اور کیا وہ عذاب نہیں دے سکتا۔ یعنی اس کو ہمہ گیر قوت حاصل ہے۔ وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے اور جس سے چاہے انتقام لے سکتا ہے۔ پھر اس کی ناراضگی پر مطمئن رہنا اور دیوتاؤں کی ناخوشنودی سے ڈرنا محض حماقت اور خود فریبی ہے۔ غور طلب یہ حقیقت ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ تخلیقِ عالم اور تصرف تام دونوں صفتیں اللہ ہی کی ہیں۔ اول کا ثبوت یہ کہ اگر ان ہی مشرکوں سے کوئی دریافت کرے کہ یہ ساری کائنات کس نے بنائی تو جواب میں یہ بھی فوراً کہیں گے کہ اللہ نے بنائی یعنی ان کو بھی اللہ کے خالقِ کائنات ہونے کا اقرار ہے تو اللہ کی ہمہ گیر طاقت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ منکر بھی اس کے اقرار پر مجبور ہے۔ پس جب آسمان و زمین یعنی کل سنسار کو پیدا کرنے والا سوائے خدا کے کوئی نہیں تو مشرکوں کے فرضی خدا بھی اللہ ہی کی مخلوق قرار پائے۔ کائنات سے باہر تو وہ نہیں ہیں اور مخلوق ہونا بے بسی اور عجز کی علامت ہے جو خود اپنی ہستی کے لئے دوسرے کا محتاج ہو وہ خدا کے مقابلہ میں کسی کو نفع ضرر کس طرح پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے وجود کا خود ہی ساز ندہ نہیں تو دوسروں کا کارساز کیسے خود اختیاری کے ساتھ بن سکتا ہے۔ دوسری بات کا ثبوت یہ ہے کہ۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ۔ اگر اللہ کسی کو دکھ دینا چاہیں تو یہ منہ بولے دیوتا اس کو دفع نہیں کر سکتے۔ اور اگر اللہ کسی پر مہربانی کرنی چاہے تو وہ روک نہیں سکتے۔ اللہ کے ہمہ گیر اقتدار اور ان فرضی منہ بولے دیوتاؤں کی بے بسی اور کمزوری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ پس جب کسی کا نفع و ضرر ان کے قبضہ میں نہیں تو پھر ان سے ڈر کس بات کا اور کس بنیاد پر۔ آیت میں دو لفظ تشریح طلب ہیں۔ ۱۔ ھن کاشفات اور ھن ممسکات مؤنث کے صیغے ہیں۔ چونکہ عرب کے بت اکثر عورتوں کی شکل کے تھے۔ عزیٰ جس کو خطیب نے نزولِ آیت کا سبب قرار دیا ہے اور حضرت خالد کی روایت میں بھی اسی کا تذکرہ آیا ہے۔ لات و منات وغیرہ مؤنث ہی کے صیغے ہیں اور یہ مورتیاں عورتوں ہی کی شکل کی تھیں۔ ان کے علاوہ بعض قبائلِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر پوجتے تھے۔ اس لئے آیت میں مؤنث کے صیغے اور ضمیریں استعمال کی گئیں۔ ایک عام جواب یہ بھی ہے کہ اللہ کے علاوہ دوسری کائنات کے پجاری علوی اور سفلی مخلوق کی پوجا کرتے تھے اور کرتے ہیں اور یہ تمام کائنات بحیثیت جماعت مؤنث ہی ہے اس لئے عالم کے لفظ کو چھوڑ کر باقی جتنے الفاظ بھی اس کائنات کے لئے مستعمل ہیں وہ مؤنث ہی ہیں۔ مثلاً لفظ کائنات، ممکنات دنیا اسی جہان کو پیر زال اور عجوز (بڑھیا) سے تشبیہ دینی بھی اسی مناسبت سے ہے۔ ۲۔ بضر اور برحمۃ میں تنوین تحقیر کے لئے ہے۔ یعنی ادنیٰ دکھ اور کمترین رحمۃ یا تعمیم کے لئے یعنی کسی طرح کا دکھ اور کسی قسم کی رحمت واللہ اعلم۔ حضرت

ابن عباس نے فرمایا حضور والا نے مجھ سے ارشاد فرمایا تھا۔ لڑکے اللہ کو یاد رکھنا وہ تیری نگہبانی فرمائے گا۔ اللہ کو یاد رکھنا اس کا رُخ تو اپنی طرف پائے گا۔ عیش کی حالت میں تو اس کی معرفت رکھنا رنج کی حالت میں وہ تیری نگہداشت کرے گا۔ اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ ہی سے مانگ۔ اللہ ہی سے مدد طلب کرنا خوب جانیئے کہ اگر سب لوگ تجھے دُکھ پہنچانے پر اکٹھے ہو جائیں اور خدا نے تیرے لئے دُکھ نہیں لکھا ہے تو تجھے دکھ نہیں پہنچا سکتے اور اگر سب تجھ کو نفع پہنچانے کے لئے جمع ہو جائیں اور خدا نے تیرے لئے نفع نہیں لکھا ہے تو نفع نہیں پہنچا سکتے تقدیر کی تحریریں سوکھ گئیں، قلم اُٹھا لئے گئے۔ یقین کے ساتھ تم کو اللہ کے شکر کے واسطے کام کرنے چاہئیں۔ خوب جان لے جو امر تیرے نفس پر شاق ہے اس پر صبر کرنے سے تیرے واسطے بہتری ہے۔ صبر سے کامیابی ملتی ہے۔ تکلیف سے کشائش حاصل ہوتی ہے اور سختی کے ساتھ آسانی ہوتی ہے۔ (ابن حاتم)

قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ - حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جب یہ تمام وہمی نراشیدہ خدا بے بس ہیں تو پھر ان کی مجھے کیا پرواہ۔ یہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اللہ میرے لئے کافی ہے اور میرے ہی لئے فقط نہیں بلکہ بھروسہ کرنے والے اہلِ ایمان اسی کا بھروسہ رکھتے ہیں اور وہ سب کی مدد کرتا ہے۔ حضرت ہود کے قصہ میں وارد ہے کہ ہود سے ان کی قوم نے کہا۔ ہمارا یقین ہے کہ دیوتاؤں نے تمہارا دماغ پاگل کر دیا ہے۔ ہود نے جواب دیا میں خدا کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ تم اور تمہارے دیوتا سب مل کر مجھے مار ڈالنے کی فکر کرو اور ذرا بھی مُہلت نہ دو۔ مجھے اپنے رب کا بھروسہ ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہر جاندار کی جان اسی کے قبضہ میں ہے۔ گرہستی سے منہ موڑ کر سادھوؤں کی زندگی پسند کرنے والے صوفیوں نے اس آیت سے اندھے توکل کی تعلیم پر استدلال کیا ہے مگر یہ ان کی کج فہمی ہے۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ نہ آیت میں اس کا کوئی ثبوت ہے نہ حدیث میں۔ مقصد تو یہ ہے کہ مومن اگرچہ دنیوی تدبیر اور اسباب کی فراہمی کرتا ہے مگر اس کا بھروسہ کسی چیز پر نہیں ہوتا۔ وہ نفع و ضرر کا مالک کسی کو نہیں جانتا۔ اس کو ہر چیز میں اللہ کی کار فرمائی اور حکومت نظر آتی ہے اس لئے اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے اور اسی کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتا ہے۔ حضرت ابن عباس کی ایک روایت ہے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا۔ وہ شخص سب سے زیادہ طاقتور ہونا پسند کرتا ہو۔ اس کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اور جو سب سے زیادہ تونگر ہونا چاہے اس پر لازم ہے کہ جتنا بھروسہ اس کو اپنے ہاتھ کے مال پر ہو اس سے زیادہ بھروسہ اس چیز کا ہو جو اللہ کے دستِ قدرت میں ہے اور جو ان سب سے زیادہ بزرگ ہونا چاہے اس کو اللہ سے تقویٰ رکھنا چاہیئے (رواہ ابن ابی حاتم) اس حدیث سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ مومن کے لئے اپنی ذات اور مال پر بھروسہ کرنے سے زیادہ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ کسی طرح بھی ترشح نہیں ہوتا کہ اعضاءِ جسم کا استعمال اور حصولِ مال کی کوشش ترک کر دینی چاہیئے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ - اس آیت میں کافروں کو وعید و تہدید ہے۔ اعملوا اگرچہ صیغہ امر ہے مگر مفہوم تہدید اور توبیخ کا ہے۔ جب ہٹ کو کوئی روشن دلیل باطل پرستی سے نہ روک سکی اور ہدایت کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہا تو آخر بطور زجر فرمایا کہ تم اپنے طریقہ پر کام کئے جاؤ میں اپنے طریقہ پر عمل پیرا ہوں۔ یعنی میرا راستہ الگ تمہارا راستہ الگ۔ رہی دیوتاؤں کی خوشی ناخوشی اور دکھ سکھ تو

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ. تم کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں کس پر خوار کرنے والا دُکھ آئے گا اور آخرت میں۔

وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ - اٹل عذاب کس پر نازل ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ دنیا میں خواری کرنے والا عذاب آئے گا اور اگر نہ آیا تو آخرت میں بہر طور اٹل عذاب ضرور آئے گا۔ یہ تفسیری مطلب بالرائے ہے اور غلط ہے۔ کیونکہ دونوں جملوں میں واو عاطفہ جامعہ موجود ہے جس سے دونوں عذابوں کی دھمکی دی گئی ہے۔ اَو نہیں کہ اول نفی کی صورت میں دوسرے عذاب کا تحقق ہو۔ گویا آیت میں دھمکی کے ساتھ پیش گوئی بھی ہے کہ تم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے درپے ہو۔ مگر سمجھ لو اللہ کا عذاب دنیا میں ہی تم پر آئے گا اور اس کو دیوتا

دفع نہ کرسکیں گے۔ اس قول کی سچائی تم کو خود معلوم ہوجائے گی۔

مقصود بیان

زندگی کے تمام اوقات میں بندہ کا بھروسہ اللہ پر ہی ہونا چاہیئے۔ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ جس کو چاہے گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے۔ ولئن سألتھم سے ظاہر ہورہا ہے کہ حضور کے زمانے کے مشرک بھی اللہ کو خالقِ کائنات جانتے تھے۔ اس آیت سے اللہ کی عمومی خلاقیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور آیت افرءیتم ما تدعون سے اللہ کی ہمہ جہتی حکومت اور تصرف تام کی صراحت ہو رہی ہے۔ آیت قل حسبی اللہ سے عزم استقلال جرأت خود اعتمادی کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور صاف اعلان ہے اس بات کا کہ خدا کی حفاظت و نگرانی بندہ کے لئے کافی ہے اس لئے اس کو کسی بڑی سے بڑی طاقت سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ آیت یتوکل میں صحیح توکل یعنی اپنے اختیارات اور تمام بیرونی اسباب کا مالک خدا کو قرار دینے کی سچی اور دلیرانہ تعلیم ہے مگر افسوس ہے ان جاہل صوفیوں کی حالت پر جنہوں نے اسی آیت کو بزدلی پستی حوصلہ عزم شکنی اور ترکِ دنیا کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ خود بھی گمراہ ہوئے اوران پڑھوں کو بھی گمراہ کیا۔ توکل کی تعلیم صرف اس لئے تھی کہ کسی خطرناک ہلاکت گاہ اور کسی جبروتی ظالم طاقت سے مردِ مومن نہ ڈرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ دکھ سکھ کا وہی مالک ہے۔ بغیر اس کے حکم کے نہ موت آئے گی، نہ ہلاکت۔ کوئی بڑی سے بڑی طاقت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ لیکن صوفی نے دنیا سے بے تعلقی یعنی ہاتھ پاؤں توڑ کر گوشہ میں بیٹھ کر دوسروں کی کمائی چٹخارے لے لے کر کھانے اور تحفے، نذرانے، چڑھاوے اینٹھنے حاصل کرکے مزے اڑانے کو توکل سمجھ لیا۔ یہ توکل نہیں عیش طلبی ہے، آرام پسندی ہے۔ روزی اپنی کمائی کی نہ ہو تب بھی کھانے کے لئے منہ میں لقمے لے کر چبانا تو پڑتا ہی ہے۔ معدہ کو ہضم کرنے کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ پھیپھڑے بھی تنفس کا کام کرتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کمائی کے کام میں نہ لائے جائیں تو کیا ان کا استعمال بالکل ترک کیا جاسکتا ہے یا کام و دہن معدہ دماغ و دل جگر اور دوسرے اعضائے شریف و رذیل کو کام سے روکا جاسکتا ہے۔ اگر ذرائع اسباب اور درمیانی کڑیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے تو سب اعضاء اور قوتوں کو معطل بنایا جائے اور خودکشی کرلی جائے۔ اور خودکشی بھی کس طرح ممکن ہے۔ یہ دست و پا زبان کی حرکت ہی سے تو ممکن ہے۔ خدا سمجھائے ان مت مارے ہوئے لوگوں کو کہ توکل کے صرف یہ معنی ہیں کہ اسباب کو حقیقی مؤثر نہ سمجھا جائے صرف مشینی پرزے اور زنجیر کی کڑیاں قرار دیا جائے۔ مؤثر تو حقیقی محرک اور صانع خلاق ہے۔ اور یہ اس کی ذرائع تخلیق۔ آیت فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب سے روشنی پڑتی ہے اس بات پر کہ اللہ سے سرکشی کرنے والوں پر دنیوی پھٹکار پڑتی ہے اور اس کے فطری احکام سے سرتابی کرنے والے ذلیل کن تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ صحت کی بربادی ہو یا ہمالی خاندانی کا فقدان یا بے مانگی اور افلاس یا قید و بند یا غیروں کی غلامی اور دوسروں کی محکومی۔ طرح طرح کی نکبت اور بے عزتی سب قانونِ فطرت اور تعلیمِ الوہیت سے روگردانی اور سرکشی کے نتائج ہوتے ہیں۔ اگرچہ آیت میں رسول اللہ کی مخالفت کرنے والے ان مشرکوں کو وعید خاص طور پر ہے جو حضور کے زمانہ میں تھے لیکن عام طور پر ہر سرکش کے لئے اس سے تہدید و وعید کا استنباط کیا جاسکتا ہے وغیرہ۔

إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ

بیشک آپ پر یہ کتاب لوگوں کے (نفع کے) لئے اتاری جو حق کو لئے ہوئے ہے سو جو شخص راہ راست پر آوے گا تو اپنے نفع کے واسطے اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا

فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۞ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا

بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال) اسی پر پڑیگا اور آپ ان پر کچھ بطور ذمہ داری کے مسلط نہیں کئے گئے اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے (اُن) جانوں کو ان کی موت کے وقت

وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ

اور اُن جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی اُن کے سونے کے وقت پھر اُن جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو

اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○

ایک میعادِ معیّن تک کے لئے رہا کر دیتا ہے۔ اس میں اُن لوگوں کے لئے جو کہ سوچنے کے عادی ہیں دلائل ہیں

تفسیر انسان کی انفرادی اور اجتماعی دانش تجربہ مدیب اور قیاس لنگڑے ہیں۔ زندگی کے میدان میں دوڑنے پھلنے بلکہ خراماں روی سے بھی عاجز ہیں یا کج پا ہیں کج رفتار دماغ گنگ ہیں گم ہیں۔ راہِ حیات کو دیکھ کر طے کرنے سے قاصر۔ نشانِ میل قائم کرنے سے بے بس۔ منا رو غور میں فرق کرنے سے بے بہرہ، غار اور غور میں امتیاز کرنے سے کوتاہ، پھر اچھائی بُرائی کا اندازہ کیسے ہو۔ حق کو باطل سے جدا کس طرح کیا جائے، نفع و ضرر کے پرکھنے کی کیا صورت ہو۔ کون انسانی زندگی کی مشعل روشن کرے، کون زندگی کا راستہ دکھائے اور کون راستہ طے کرنا سکھائے۔ بس یہ کام تو اللہ ہی کا ہے۔ اللہ ہی کو حق ہے کہ انسانوں کی زندگی کے لئے ہدایت نامہ بھیجے اور اچھائی کو بُرائی سے الگ کرنا سکھائے۔ لیکن خدائی ہدایت نامہ کس کے پاس آئے۔ کیا گھر گھر در در کوچہ کوچہ اللہ کا فرشتہ کتاب ہاتھ میں لے کر ہر آدمی کے پاس آئے اور ہدایت نامہ پہنچائے۔ ایسا تو ممکن نہیں۔ لاکھوں میں سے ایک کا سینہ بھی نورِ فطرت اپنی اصلی سادگی میں جلوہ ریز نہیں، خواہشات اور میلانات کی کثافت کی وجہ ان پر تیرگی چھائی ہوئی ہے۔ نورِ روحانیت دبی ظلمتوں کی تہ بہ تہ پردوں میں گم ہے۔ عموماً آئینۂ رُوح زنگ آلود ہے۔ پھر آفتابِ ہدایت کی خالص نورانی شعاعوں سے کون پرتو انداز ہو سکتا ہے جلوہ پذیری کے لئے تو ایسے آئینے کی ضرورت ہے جو پشت پر مادّی کثافت رکھنے کے باوجود سامنے کا رُخ شفاف اور خالص بے رنگ نورانی رکھتا ہو۔ یہی آئینہ رسالت ہے جو جلوہ پذیر بھی ہے اور جلوہ ریز بھی۔ وجدانِ سادہ کا مالک بھی اور حسی دنیا والوں کے لئے حواسِ سلیم کا حامل بھی۔ لیکن تعلیم الٰہی ہو یا انسانی، لوگوں کو اس سے فائدہ کیسے پہنچے۔ یہ واجب التسلیم حقیقت صحیح کہ فطرت کا فاطر قانونِ حیات کا مقنن بھی ہے لیکن وضعِ آئین کے بعد عملی دنیا میں آئین کا فائدہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی آئین پر چلے۔ آئین پر ہی کاربند نہ ہو اور قانون شکنی کرے تو بربادی اور تباہی کے علاوہ کیا ہاتھ آئے گا۔ مطلب یہ کہ تشریع اور آئین سازی اگرچہ خدا کا کام ہے مگر قانون کی اطاعت یا مخالفت کا آدمی کو اختیار ہے۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ کوئی سیدھی راہ نہ چلے اور بتانے والے کی راہ نمائی کو نہ مانے تو خود ہی گم کردہ راہ ہو گا۔ رسول اور پیغمبر کا کام تو آئینِ خسروانی بتا دینا اور پیغام پہنچا دینا ہے۔ اس سے آگے اس کی ذمّہ داری نہیں۔ کوئی مانے گا نفع پائے گا، نہ مانے گا گھاٹے میں رہیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کو تشریعِ حیات کا اختیار کس بل بوتے پر ہے۔ کیوں اپنی ساری زندگی کی نکیل ہم اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ کیا ہمارے بڑے بڑے آدمی روشن دماغ رکھنے والے دانش مند، چوٹی کے فلاسفر، چمکدار روحیں رکھنے والے مرشد اور پیشوا، زندگی کو سدھانے والے رہبر اس قابل نہیں کہ ہماری مدد کر سکیں اور ہماری زندگی کے لئے مشعلِ راہ بن جائیں۔ اس کا جواب بالکل صاف ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ کسی کا کارخانۂ حیات نہیں۔ موت اور زندگی کا نظام بلکہ خواب اور بیداری کا تبادل کسی کے دستِ قدرت میں نہیں۔ نہ اپنا نہ دوسرے کا۔ پھر بھوکا بھوکے کو روٹی کہاں دے سکتا ہے، ننگا ننگے کی ستر پوشی کیسے کر سکتا ہے۔ اپاہج دوسرے اپاہج کو ہاتھ پاؤں دیدے محال ہے۔ اندھا اندھے کی رہبری کرے ناممکن ہے۔ یہ کام تو اللہ کا ہے۔ وہی نظام و انتظام کا مالک ہے، وہی اس ساری فطرت کا فاطر ہے اور زندگی اور موت کے یہ سارے آئینہ اسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے بھولے گم صم انسان کی وہی راہ نمائی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ وہی آفرینندہ ہے وہی کارندہ ہے اور وہی آئینِ زندگی کا سازندہ ہے۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ۔ اس آیت میں تیقیع طلب چند امور ہیں ۱۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا۔ کوئی کہتا تھا کہ کوئی عجمی غلام حضورِ والا کو سکھا دیتا ہے اور آپ اس کو اللہ کا کلام کہہ کر لوگوں کو بتلاتے ہیں۔ کوئی القاء جن، کوئی تخیلِ ذہنی اختراع اور کوئی معانی قرآن کو اللہ کا کلام اور معانی اور الفاظ قرآن کو رسولِ پاک کا کلام لفظی کہتا تھا۔ ان تمام غلط باتوں کی اس لفظ سے تردید ہوتی ہے۔ ایک بات یہ بھی اس لفظ سے ثابت ہوتی ہے کہ قرآن مجید اگرچہ وحی متلو ہے اور جبریل کی وساطت سے حضور کریم کو بھیجا گیا تھا لیکن حقیقت میں بھیجنے والا اللہ ہے۔ جبریل کا کلام نہیں۔ فرشتہ کا ذریعہ صرف اس وجہ سے اختیار کیا کہ الفاظ یا معانی چونکہ کیفیات

ہیں اور کیفیات بھی ایسی کہ انسانی صورت اور دماغی صلاحیتوں کو ان میں دخل نہیں۔ پھر ان کے نزول کے کوئی معنی ہی نہیں سوائے اس کے کہ کسی ایسی ہستی کو جو نورِ مجرّد ہو القا کردیا جائے اور وہ ہستی حضورؐ کے قلب پر فیضان کردے۔ ایک یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ لفظ نزول کا استعمال مادّی جسمانی چیزوں میں ہوتا ہے اور کلام کوئی مادی چیز نہیں۔ نہ خدا کسی اونچے مقام پر ہے کہ وہاں سے کسی چیز کو نیچے اتار رہا ہو۔ بلکہ عالم قدم سے عالم حدوث کی جانب وجوب سے امکان کی طرف نور سے ظلمت کی سمت اور تجرد سے مادّیت کے رُخ پر کسی چیز کا آنا حقیقت میں اونچے مرتبے سے نیچے رتبے کی طرف آنا ہے۔ اللہ کا کلام بھیجنا اور جبریل کی وساطت سے رسول اللہ تک پہنچانا اسی معنی کو حامل ہے۔

۲۔ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ۔ یعنی اللہ نے رسولِ پاک کو اپنی کتاب بھیجی یعنی معانی کو الفاظ کا جامہ پہنا کر نازل فرمایا۔ کتاب نام صرف معانی کا نہیں تعبیری الفاظ ہونے ضروری ہیں۔ اس لئے غلط ہے یہ خیال کہ معانی الہامی ہیں اور الفاظ رسول اللہ کے خودساختہ۔ پھر الکتاب کے لفظ کو پیشین گوئی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ قرآن آئندہ ضرور کتابی شکل میں لکھا جائے گا بلکہ درپردہ ایماء بھی اسی طرف ہوسکتا ہے کہ قرآن کو ضرور لکھا جائے۔ اگرچہ لفظ امر نہیں، بلکن قرآن فرقان سفر اور زبر وغیرہ کو چھوڑ کر لفظ کتاب کو ذکر کرنے سے اس طرف ایماء ہوسکتا ہے۔

۳۔ للناس۔ یعنی لوگوں کو فائدے کے لئے مطلب یہ کہ قرآن بھیجنے سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں۔ نہ اس کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ بقول فلاسفہ و متکلمین اس کا کوئی فعل معلل بالعرض ہوتا ہے۔ بلکہ انسان مختلف الخیال اور قاصر العلم انسان اپنی معاشرت سوسائٹی مدنیت اور سماجی تعلقات کو درست رکھنے کے ضوابط عامہ ہمہ گیری کے ساتھ نہیں بنا سکتا تھا۔ نہ مبداء اور منتہا اور آغاز و انجام کے متعلق اس کی عقلِ نارسا کوئی صحیح فیصلہ کرسکتی تھی۔ اس لئے اللہ نے انسان کی دنیاوی فلاح اور اخروی بہبودی کے لئے کتاب پاک نازل فرمائی۔

بالحق۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ اس لفظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ اول یہ کہ انزلنا سے اس کو متعلق کیا جائے یعنی اللہ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی۔ مطلب یہ کہ طریقۂ نزول معجزہ ہے۔ شاعروں کی طرح تخیل کی بلند پردازی نہیں۔ نہ القاء جن کو اس میں دخل ہے۔ نہ اختراع انسانی سے اس کا تعلق ہے بلکہ اصولِ ہدایت، طرزِ بیان اور اظہارِ ضوابط میں قرآن کا رنگ معجزہ ہے۔ مخلوق کی طاقت سے خارج۔ دوسری صورت یہ کہ اس لفظ کو الکتاب کی صفت قرار دیا جائے یعنی قرآن سچا اور برحق ہے اس کے کسی نقطہ کو کذب اور بطلان چھو نہیں سکتا۔ زبردستی حقوقِ خدائی کو کام میں لاکر خدا نے اپنے احکام لوگوں پر ٹھونس دیئے ہوں ایسا نہیں ہے بلکہ واقعی انسانیت کی فلاح و نجات جن ضوابطِ حیات پر موقوف تھی انہی کو بلا کم و بیش بیان کیا ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا۔ اوپر کی آیت میں قرآن کی عمومی دعوت کا تذکرہ تھا جس کا معنی یہ تھا کہ اللہ نے کسی پر جبر نہیں کیا بلکہ تمام انسانوں کی اصلاح فکر و عمل کے لئے ایک ضابطہ مقرر فرما کر بھیج دیا۔ گویا آئین سازی اور لیجسلیچر میں انسان خدا کا محتاج اور مجبور ہے خود مختار نہیں۔ اس آیت میں انسان کی حدود اختیار کی تعیین فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئین کے مطابق عمل کرنے نہ کرنے میں انسان مختار ہے مجبور نہیں۔ ہدایت یابی اور راہِ مستقیم سے سرتابی دونوں انسان کے اختیار میں ہیں اور اس کا نفع نقصان اسی کے انتخاب و عمل سے وابستہ ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ۔ اس آیت میں رسول اللہ کو تسکین دی ہے۔ حضور والا کو لوگوں کی سرتابی کج روی اور مخالفت سے قلبی دکھ پہنچتا تھا جس کا بیان مختلف آیات میں خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اور تسکین بھی دی ہے۔ ایک آیت میں وارد ہے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ دوسری آیت میں آیا ہے۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا۔ اور ایک آیت میں ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ اس آیت میں حضور والا سے ذمہ داری کو ساقط فرما دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو عمل یا ترک عمل پر مجبور نہیں کیا اور صرف آئین نامہ بھیجنے پر اکتفاء کی تو پھر رسول اللہ پر کسی کے عمل یا ترک عمل کی ذمہ داری نہیں۔ رسول کا کام بھی آئین الٰہی پیش کرنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔ اس آیت میں نفس سے مراد جان ہے۔ اہل تفسیر کا قول یہی ہے۔ واقع میں نفس کیا چیز ہے اور روح و نفس میں کیا فرق ہے۔ یہ بحث بہت طویل الذیل ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں جو

ہو گو یا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس انسانی ایک روحانی روشن جوہر ہے جس کی روشنی بدن پر پڑتی ہے اور تمام اعضا جگمگا جاتے ہیں۔ اعضاء کی اسی روشن پذیری کا نام زندگی ہے۔ بیداری میں بیرونی اور اندرونی تمام اعضاء نفس کی روشنی سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور نیند کی حالت میں اندرونی اعضاء ضرور روشن رہتے ہیں مگر بیرونی اعضاء بعض وجوہ کے اعتبار سے روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہاں موت کی حالت میں جسم کے تمام باطنی اور ظاہری اعضاء سے نفس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی روشنی باقی نہیں رہتی گو یا نیند میں بھی بدن سے نفس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن صرف بیرونی اعضاء سے اور وہ بھی ہر حیثیت سے نہیں بلکہ بعض اعتبارات کا لحاظ کرتے ہوئے۔ مثلاً خوشبو بدبو محسوس نہیں ہوتی۔ حقیقت آواز کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے یا مفقود ہو جاتا ہے۔ بینائی اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے وغیرہ۔ رہے اندرونی اعضاء تو ان سے نفس کا تعلق بدستور قائم رہتا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوتی اور موت کی صورت میں نفس کا کوئی تصرف باقی نہیں رہتا۔

امام رازی کی تشریح کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حالت موت یا نیند دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ انسانی نفوس کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے یعنی بیداری کی حالت میں ظاہری اور باطنی اعضاء میں تصرف کرنے اور ان کو روشن بنانے کی جو آزادی انسانی نفوس کو دے رکھی ہے اس آزادی کو سلب کر لیتا ہے لیکن آزادی بالکل چھین لیتا ہے۔ یا کچھ حصہ باقی چھوڑ دیتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ

فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى - موت دینی ہوتی ہے تو آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے اور نفس کو دوبارہ بدن سے تعلق پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور نیند کی حالت میں پوری آزادی سلب نہیں کرتا بلکہ آزادی کا کچھ حصہ چھیننے کے بعد پھر دوبارہ واپس چھوڑ دیتا ہے اور آدمی بیدار ہو کر ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا سونے سے پہلے تھا۔ مسلم و بخاری میں ایک حدیث آئی ہے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا۔ (اگر کوئی اپنے بستر پر جائے تو) اس طرح کہے پروردگار تیرے نام کے ساتھ میں بستر پر پہلو رکھتا ہوں اور تیرے نام پر اس کو اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری جان (کو اپنے پاس) روک لے تو اس پر رحم فرمانا اگر تو آزادی عطا فرمائے تو جس چیز سے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے اسی سے میری بھی نگرانی کرنا

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى - اس ٹکڑے کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ (۱) اجل مسمیٰ سے مراد ہے ہر شخص کا وقت موت اس تقدیر پر الی اجل مسمیٰ کا تعلق فَيُرْسِلُ سے ہوگا مطلب یہ ہے کہ اللہ جو نیند کے بعد جان کو واپس کر دیتا ہے تو واپسی روح کا یہ قانون اس شخص کے وقت موت تک جاری رہتا ہے۔ آخر جب موت کا وقت آ جاتا ہے تو پھر نفس کی آزادی چھین لینے کے بعد واپسی نہیں ہوتی (۲) یا اجل مسمیٰ سے مراد ہے قیامت کا دن اس صورت میں پوری آیت سے اس ٹکڑے کا تعلق ہوگا مطلب یہ کہ موت کی حالت میں نفس کی آزادی کو بالکل سلب کر لینا اور واپس نہ کرنا اور نیند کی حالت میں روح کو قبضہ میں لینے کے بعد دوبارہ واپس کر دینا یہ پورا نظام ایک مقرر وقت تک رہے گا جب میعاد مقرر پوری ہو جائے گی تو پھر نہ موت ہوگی نہ نیند۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ - ذٰلک سے اشارہ ہے خواب و بیداری اور موت و زندگی کے سلسلہ کی طرف اس آیت میں دو لفظ زیادہ قابل توجہ ہیں۔ (۱) آیات (۲) یتفکرون۔ فکر کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اتنی وضاحت کافی ہے کہ اس جگہ فکر سے مراد اللہ کی ذات و صفات کی بحث میں غور کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ یونانی فلاسفروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے حکماء اخوان الصفا اور معتزلہ نے کیا ہے۔ لفظ ذٰلک کا اشارہ اس سے انکار کر رہا ہے۔ نہ الٰہیاتی مباحث میں پڑنا اور متشابہات کے درپے ہونا کچھ نتیجہ خیز ہے۔ بلکہ فکر کا مفہوم وہی ہے جو کفر کی ضد ہے یعنی خدا داد نعمت پر پردہ نہ ڈالنا اور خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف اس کو منسوب نہ کرنا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غور کرتے اور سوچتے ہیں کہ ہر شخص کا سلسلۂ موت و حیات اور خواب و بیداری اللہ ہی کے دست قدرت میں ہے اور کسی کو اپنے نظام زندگی کو برقرار رکھنے اور قانون موت کو ٹالنے میں دخل نہیں، نہ خواب و بیداری کا تبادل اور خصوصیات خواب و بیداری کا تغیر کسی کے اختیار میں ہے۔ ایسے مفکرین پر حقائق قدرت کا طرح طرح سے انکشاف ہوتا ہے اور انسان کے عجز کی زندہ تصویر متحرک ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ یہ وہ بے بس انسان کے سامنے خواہ وہ ولی اعظم یا نبی مکرم ہو یا معمولی دیہاتی، بادشاہ ہو یا فقیر دست سوال دراز نہیں کرتے اور کسی کو کارساز حقیقی نہیں سمجھتے اور کسی کے قبضہ میں کوئی چیز نہیں جانتے اور کسی کو متصرف حقیقی نہیں مانتے اور یقین رکھتے ہیں کہ جب کوئی بھی اپنی زندگی

اور نظام زندگی کا مختار نہیں تو دوسروں کی حاجت روائی پر اس کو دسترس کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مطلب کی تائید آئندہ آیات سے ہوتی ہے۔

مقصود بیان اللہ ہی نے رسول پاک پر قرآن مجید یعنی الفاظ و معانی کا مجموعہ نازل فرمایا۔ اس کتاب کا بنانے والا اور بھیجنے والا سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ نہ فرشتہ کو دھوکا ہوا کہ قرآن بھیجا گیا ہو کسی اور کے پاس اور وہ لے آیا ہو محمد رسول اللہ کے پاس للناس کا لفظ بتا رہا ہے کہ انسانوں کے لئے ہدایت نامہ بھیجا اس میں خدا کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ انسانوں کا ہی فائدہ ہے۔ بالحق سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کو ماننا اور اس پر عمل کرنا واقعی انسانی بہبودی کے لئے ضروری ہے۔ قرآن چند حکایات و قصص اور رزمیہ داستانوں کا نام نہیں بلکہ فلاح انسانی کے مکمل واقعی کتابچہ کا نام ہے۔ فَمَنِ اهْتَدٰی الخ سے انسان کے عملی اختیار کی وضاحت ہو رہی ہے۔ اوپر کی آیت سے ظاہر ہوا تھا کہ آدمی اپنی زندگی کا قانون ساز نہیں بلکہ مقننِ حیات خدا ہے۔ اس آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ عمل کرنے کا اختیار انسان کو حاصل ہے۔

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ الخ سے نظام موت و حیات اور سلسلہ خواب و بیداری کو پیش کر کے انسانی عجز اور اللہ کی قدرت کی برتری کو ظاہر کر کے در پردہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جب کسی کو اپنی جان پر بھی اختیار نہیں تو وہ کسی دوسرے کی کارسازی کیا کر سکتا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ۝

ہاں کیا ان (مشرک) لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو (معبود) قرار دے رکھا ہے جو ان کی سفارش کریں گے آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ

بھی علم نہ رکھتے ہوں۔ آپ کہہ دیجئے کہ سفارش تو تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے تمام آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے اور جب

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا

فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل منقبض ہونے ہیں جو کہ آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے

ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

سوا اوروں کا ذکر آتا ہے تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں

تفسیر یہودی عیسائی اور عام مشرک کہتے تھے اور کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ خدائی میں اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ وہ قادر بھی ہے۔ عالم بھی ہے خالق بھی ہے اس نے اپنے نمائندوں کو آدمیوں کی سدھار کے لئے بھیجا۔ ان نمائندوں نے اپنے نمائندے مقرر کئے اور اس طرح دنیا میں نیک آدمیوں کا پھیلاؤ رہا۔ یہی نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں پیارے ہیں دُلارے ہیں کارخانۂ قدرت کے کارندے ہیں ذرائع ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے وسائل ہیں۔ مخلوق و خالق کی درمیانی کڑیاں ہیں۔ ان کے بغیر خدا تک رسائی ناممکن ہے۔ روٹھا ہوا خدا ان کی سفارش سے من جاتا ہے۔ ناراضگی رضامندی سے بدل جاتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ الوہیت میں ان کی شرکت نہیں لیکن ان کی ذات صفات خدا کی مظہر ہے، جلوہ گاہ ہے۔ یہ مرنے کے بعد بھی اس عالم کے کارساز ہیں، کارگزار ہیں، کارندے ہیں، ساز ندے ہیں، ان کی سفارش ٹل نہیں سکتی۔ یہ بے وقوف گروہ یہ نہیں جانتا کہ شفاعت قبول کرنے نہ کرنے میں خدا مختار ہے۔ پیر پیغمبر اوتار مہاتما خدا نہیں پرماتما نہیں۔ خدا کی مرضی میں دخیل نہیں۔ اصل خوشنودی خدا کی ہے وہ کسی کو اذن دے گا تو وہ سفارش کرے گا۔ اجازت نہیں ملے گی تو کوئی چوں بھی نہیں کرے گا ان بیچاروں کے قبضہ میں کیا ہے، اُن کا بس کچھ نہیں چلتا۔ اُن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کون سفارش کا مستحق ہے کس کی شفاعت کرنے کے متعلق اللہ کی مشیت ہے۔ جب ان کا قابو نہیں قدرت نہیں اور شفاعت طلب کرنے والوں کی صلاحیت

اور اللہ کی مشیت کا علم نہیں بلکہ بعض فرضی شفاعت کرنے والوں کو تو عقل و فہم بھی حاصل نہیں۔ پھر وہ شفاعت کیسے کریں گے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ ان بت پرستوں نے لفظ شفاعت کی آڑلی ہے جن کو یہ زبانوں سے شفیع کہتے ہیں۔ دلوں سے ان کو قاضی الحاجات اور مستقل حاجت روا جانتے ہیں۔ منہ سے اُن کی الوہیت کا انکار کرتے ہیں مگر یقین رکھتے ہیں کہ فرائض الوہیت اُن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر ایسا نہیں اور وہ صدق قلب کے ساتھ اللہ کو واحد لاشریک اور قادر مطلق جانتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ جب ان کے سامنے صرف خدا وحدہٗ لاشریک کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ کشیدہ کبیدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں انقباض دماغوں میں پژمردگی اور ہر بن مو میں سمٹاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور جب دوسرے فرضی سفارشیوں کا تذکرہ آتا ہے تو چہروں سے انبساط خطوط پیشانی سے شگفتگی اور رونگٹے رونگٹے سے تری و تازگی کی بارش ہوتی ہے۔ اگر دلوں میں چور نہیں اور واقعی وہ اللہ کو واحد لاشریک اور قادر مختار مانتے ہیں تو صرف نام سنتے ہیں۔ یہ کیفیات کا تفاوت کیوں ہو جاتا ہے۔ اگر چہرے کا انبساط و انقباض اور آثار چڑھاؤ دلی حالات کا ترجمان ہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان مشرکوں کی قلبی حالات زبانی اظہار کے خلاف ہیں وغیرہ۔

تحلیل اجزاء أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ۔ گزشتہ آیات میں اللہ کی وحدانیت تشریعیہ کو ثابت کیا تھا اور انسانی عجز کو بھی ظاہر فرمایا تھا۔ اس پر کفار کی طرف سے یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ ہم اللہ کے علاوہ بتوں دیوتاؤں غیبی کارندوں کی جو پرستش کرتے تھے وہ ان کو خدا سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کے مقرب تھے اور ہیں مگر ہماری نظروں سے غائب ہیں توجہ کو یکسو بنانے کے لئے اُن کو محسوس صورت یا مورت میں ملانا ضروری ہے۔ حقیقت میں یہ مورتیاں اُن ہی مقربان الٰہی کی ہیں ہم ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں صرف اس لئے کہ یہ ہماری سفارش کریں اور خدا کے عتاب و عذاب سے ہم کو بچالیں۔ اس آیت میں ہتی کافروں کے اس باطل قول کی تردید فرمائی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ ہم نے یہ تشریح امام رازی خطیب اور ابو سعود اور بیضاوی وغیرہ کی صراحت کے موافق کی ہے لیکن آیت میں غور طلب ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ کافروں نے جو اپنے معبودوں کو شفیع بنانے کا اظہار کیا تھا حقیقت میں اُن کا نہ یہ عقیدہ تھا نہ عمل بلکہ دلوں سے وہ اُن کو اپنا کارساز مطلق جانتے اور مانتے تھے اور اسی عقیدہ کے مطابق عمل بھی کرتے تھے۔ آیت میں لفظ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بتا رہا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اس سے ہٹ کر اس کی طرف سے رُخ موڑ کر انھوں نے دوسروں سے رشتہ جوڑا تھا۔ شفیع جوڑ کو ہی کہتے ہیں یعنی کافروں نے اللہ کو مرکز توجہ نہیں قرار دیا۔ اس سے تو ہٹ گئے اور دوسروں سے اپنا جوڑ لگا لیا۔ غیروں کو اپنا شفیع (کارساز حاجت روا) قرار دے لیا۔ ہمارے اس مطلب کی تائید لفظ من دون اللہ کے علاوہ آیات کے آخری فقروں سے بھی ہوتی ہے جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اکیلے خدا کا نام ذکر کئے جانے سے کافروں کی طبیعت میں انقباض اور دلوں میں کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے دوسرے معبودوں کا تذکرہ سن کر وہ شگفتہ رُو ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی کیفیت آئینہ اور دلی عقائد کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ شفیع سے اُن کی مُراد تھی کارساز حاجت روا خود مختار یا کم از کم خدا کی مشیت و مرضی کو پلٹ دینے والی ہستیاں لفظ شفیع کے اسی معنی کو پیش نظر رکھ کر آئندہ آیات میں تردید کی گئی ہے۔

قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۔ کفار جن کی شفاعت کے قائل تھے وہ یا تو مورتیاں تھیں بے جان نافہم بے شعور یا وہ مذہبی مقتدا اور غیبی کارندے تھے جو اس زندگی میں ضرور عقل و فہم کے حامل اور ظاہری ملک کے مجاز تھے مگر دنیا میں اُن کی یہ ملکیت و عقل مجازی تھی حقیقت میں اُن کا کوئی دسترس نہ تھا اور قیامت کے دن دربار الٰہی میں بغیر اذن و اجازت کے اُن کا کچھ قابو نہ ہوگا تو حقیقت میں کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت دینے کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ وہ جب چاہے اجازت دے نہ چاہے نہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شفاعت کا اختیار بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو خود ارادی شفاعت کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ یہ تفسیر کا مطلب تمام اہل تفسیر نے لکھا ہے لیکن اس تشریح کی بنا پر آیت میں تردید صرف بت پرستوں کے عمل اور عقیدہ کی ہو سکے گی کیونکہ دنیا اور آخرت میں صرف بت ہی دونوں صفات سے محروم ہیں۔ نہ وہ کسی چیز کے مالک ہیں نہ اُن میں عقل ہے۔ انبیاء، اولیاء، صلحاء اور فرشتے تو ذی عقل ہیں اور مجازاً خدا داد قابو اور طاقت بھی رکھتے ہیں اس کے جواب میں مجبوراً کہنا پڑے گا کہ لایملکون سے مراد ہے انبیاء اولیاء اور مقدس آدمیوں کا مالک حقیقی نہ ہونا اور لایعقلون سے مراد ہے۔ بتوں اور مورتیوں کا بے عقل ہونا مطلب یہ کہ مقدس انسان اور فرشتے یا جن کسی چیز کے حقیقی مالک نہیں پھر اُن سے شفاعت کی امید کس طرح صحیح ہے۔ شفاعت کا بھی اُن کو حقیقی اختیار

ہیں اور مورتیاں بالکل ہی بے عمل ہیں، کسی بات کی سمجھ ان میں نہیں ہے۔ وہ شفاعت کس طرح کر سکتی ہیں، میری نظر میں اس تخصیص اور تاویل کی ضرورت نہیں، صاف مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان ہو فرشتہ، جن ہو یا مورتی صورتی ہو کچھ بھی ہو کارساز اور حاجت روا اسی وقت بن سکتا ہے۔ جب اس کے پاس کچھ ہو وہ کسی چیز کا مالک ہو اور طریق کارسازی سے واقف بھی ہو فہم رسا اور عقل محیط رکھتا ہو اور چونکہ اللہ کے علاوہ کوئی مالک نہیں اور کسی کے پاس عقل محیط نہیں نہ طریق کارسازی سے واقف ہے پھر کس طرح اسی سے جوڑ لگانا اور اللہ سے رشتہ توڑنا تسلیم ہو سکتا ہے اس لئے آگے فرمایا۔

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا۔ بعض تفسیروں کی بنا پر لفظ اذن محذوف ماننا پڑے گا۔ مطلب یہ کہ شفاعت کی اجازت دینی اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔ میرے بیان کردہ مطلب پر یہ معنی ہوں گے کہ رشتہ جوڑے جانے کا حق صرف خدا کو ہے۔ جب خدا ہی حقیقی ملک رکھتا ہے اور اسی کا علم ہمہ گیر ہے تو عبد کا جوڑ اپنے معبود سے ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی کون سفارش کرے، کس کی سفارش کی جائے، کس بنا پر کی جائے، کب کی جائے اس کا مالک و مختار اور علم رکھنے والا خدا ہی ہے پس پوری شفاعت اسی کے ہاتھ میں ہے واللہ اعلم۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اس آیت میں اللہ کا حاکم کل اور متصرف مختار ہونا ظاہر فرمایا ہے۔ گزشتہ آیت سے اللہ کی ہمہ گیر ملکیت اور دوسروں کی ملکیت کی نفی پر روشنی پڑتی تھی۔ اس آیت میں اللہ ہی کی حکومت عامہ کی صراحت فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مالک خدا اور ملک خدا کا ملک اسی کی اور حکم اسی کا پھر یہ شفیع اور فرض کردہ کارساز بیچ میں کیسے آئے اور کہاں سے آگئے۔

ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ دوسروں کی کارسازی کا عقیدہ رکھنے والوں کی تردید کی یہ چوتھی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص مرنے کے بعد خدا ہی کی طرف لوٹتا ہے کسی پیر پیغمبر یا مورتی صورتی کے پاس لوٹ کر نہیں جاتا۔ قیامت کے دن براہ راست اللہ ہی سے واسطہ پڑے گا۔ انسانی ہستی کا اول مرکز ہے جہاں سے سیر کا آغاز ہوا تھا اسی پر سیر حیات ختم ہوگی۔ پھر دوسروں سے آس لگانا اور خدا سے منہ موڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ الخ۔ غیر اللہ کی کارسازی کا عقیدہ رکھتے ہوئے لفظ شفاعت کی آڑ لینے والوں کے متعلق یہ آخری ریمارک ہے۔ شفیع پرستوں کے طرز عمل اور رفتار زندگی سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ پیروں پیغمبروں... کی شفاعت کا نہیں بلکہ ان کی مطلق العنانی خود مختاری اور حاجت روائی ہے۔ یہ ان کو دلوں سے حاجت روا اور خود مختار جانتے ہیں اور اپنی زندگی کی لگام خدا کے ہاتھ سے چھین کر ان کے ہاتھوں میں دینی چاہتے ہیں یا کم از کم اپنی زندگی کی راہ میں خدا کے ساتھ ان کا حصہ بھی مانتے ہیں ورنہ کیا وجہ کہ اگر اللہ وحدہٗ لاشریک کا تنہا ذکر آتا ہے تو ان کے منہ سکڑ جاتے ہیں، پیشانی کی کھال سمٹ جاتی ہے، تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں۔ دلوں پر کبیدگی اور انقباض چھا جاتا ہے لیکن فرض کردہ سفارشیوں کا نام سن کر باچھیں کھل جاتی ہیں، چہرے کھل جاتے ہیں، دل شگفتہ ہو جاتے ہیں اور رونگٹے رونگٹے سے انبساطی کیفیات پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگتی ہیں۔ وہ پژمردگی کیوں اور یہ شگفتگی کس لئے۔ یا تو خدا سے یہ اپنا واسطہ ہی نہیں جانتے یا اللہ کے ساتھ دوسروں کی الوہیت کا بھی رشتہ جوڑتے ہیں۔ ابن عباس نے اس آیت کا مصداق ابوجہل ولید بن عتبہ ابی بن خلف اور صفوان بن امیہ کو قرار دیا تھا۔ یعنی بطور تمثیل مورد آیت ان لوگوں کو قرار دیا تھا۔ اول الذکر تینوں آدمی تو کفر پر ہی مرے البتہ صفوان اس وقت خالص مومن ہو گئے تھے۔ جب حضور ؐ بنی ہوازن کی جنگ سے واپس آرہے تھے اور صفوان کی زرہیں واپس فرمائی تھیں اور صفوان نے گم شدہ زرہ کا تاوان لینے سے انکار کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ اب اللہ نے مجھے وہ راستہ دکھا دیا جو پہلے نہ دکھایا تھا۔ شاید ابن عباس نے نزول آیت کے وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے صفوان کا نام ابوجہل وغیرہ کے ساتھ لیا۔

ایک ضروری تنقیح پوری آیت سے نفی شفاعت مستفاد نہیں ہوتی ہے نہ اس سے کوئی عقیدۂ شفاعت کو باطل قرار دے سکتا ہے بکثرت صحیح احادیث اور صریح آیات سے ملائکہ انبیاء اولیاء و صلحاء و علماء مومنین کا شفاعت کرنا ثابت ہے لیکن اللہ کی اذن کے بعد اور اسی شخص کے لئے جس کے متعلق اللہ چاہے۔ آیت سے شفاعت استبدادیہ جبریہ کی نفی ہوتی ہے۔

مقصودِ بیان: مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ دوسرے مشرکوں کے عقیدۂ شفاعت سے جس کو خدا تعالیٰ نے شرک قرار دیا ہے اور کسی شفیع

کی شفاعتِ استبدادیہ کا یہ عقیدہ نہ رکھنا چاہیئے ۔ نہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ شفیع الامت جس کی چاہیں گے شفاعت کریں گے اور جب چاہیں گے کریں گے ۔ خدا چاہے یا نہ چاہے ایسی شفاعت کا عقیدہ غلط ہے ۔ شفاعت کی کیفیت کمیت اور اجازت خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ خدا کی طرح اہل شفاعت سے محبت اور ان کی کارسازی و حاجت روائی کا عقیدہ رکھنا جرم ہے شرک آفریں ۔ وغیرہ ۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ

آپ کہئے کہ اللہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے باطن اور ظاہر کے جاننے والے آپ ہی (قیامت کے روز) اپنے بندوں

عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

کے درمیان اُن امور میں فیصلہ فرماویں گے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور اگر ظلم (یعنی شرک و کفر) کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں

وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ

اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (بے تامل) انکو دینے لگیں اور خدا کی طرف سے

يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ○ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

انکو وہ معاملہ پیش آویگا جسکا انکو گمان بھی نہ تھا اور (اُس وقت) اُن کو تمام اپنے بُرے اعمال ظاہر ہو جاویں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ انکو آگھیرے گا

تفسیر ہٹ دھرمی کٹ حجتی اور توہم پرستی اچھے اچھے سمجھدار آدمیوں کو سیدھا راستہ اختیار کرنے سے روک دیتی ہے ۔ شواہد و براہین کے تمام مظاہر اپنی بات پر جم جانے والے آدمی کے لئے بے سُود ہوتے ہیں ۔ دلیل فطرت ثبوت عقل دعوتِ مطالعہ اور اظہار ہدایت دماغی عصبیت کے مقابلے میں ہیچ ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ حق و باطل اور کذب و صداقت کا کوئی واجب التسلیم فیصلہ آج تک کبھی نہیں ہوا نہ ہونے کا امکان ہے ۔ آدمیوں کا دماغی اختلاف زندگی کے راستوں کے تنوع کا سبب بنا ہوا ہے ۔ اللہ نے اپنے پیغمبروں کو صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے کے لئے بھیجا ، کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ۔ پیغمبروں اور کتابوں نے انفسی اور آفاقی مطالعے کی دعوت دی ۔ ماضی و حال کو مستقبل کے لئے آئینہ بنا کر پیش کیا ۔ نظریات اور فکریات سے لے کر نہایت واضح بدیہیات تک ہر فطری اور عقلی برہان کی تصویر کشی کے تجربے حدس اور عقلی قیاس پر تیار شدہ دلائل کا ایک تسلسل قائم کیا ۔ لیکن محسوس اور غیر محسوس کی پرستش سے کور مغز اور کج طل اللسان باز نہ آئے اور ایسا کوئی ہمہ گیر فیصلہ آج تک نہ ہو سکا جو روئے زمین پر بسنے والے تمام آدمیوں کے لئے واجب التسلیم ہو جاتا ۔ کمزور خیال رکھنے والا محسوس پرست انسان عقل و خرد کی کسی بلندی پر چڑھنا نہیں چاہتا ۔ اُس کا نورِ فطرت بجھ چکا ہے عقلی اور نقلی چقماق کی کوئی رگڑ اس کے اندر سے فہم کی چنگاری پیدا نہیں کر سکتی ۔ جب تک اس کی غلطی فکر اور بد اعمالی عذاب کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے نہ آ جائے اور بد کرداری سے پیدا ہونے والی آتش سوزاں ہر طرف سے اس کو نہ گھیرے ۔ اس وقت تک اُس کی سمجھ میں اپنی فکری اور کرداری بربادی نہیں آتی لیکن جب کرداری دنیا ختم ہو جائے گی ، عمل کا کوئی موقع باقی نہیں رہے گا اور پاداش کی گھڑی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی اس وقت اگر روئے زمین کے سارے خزانوں سے دوگنی دولت کا مالک بھی وہ ہو جائے گا اور ساری پونجی اپنی بد اطواری کی سزا سے چھوٹنے کے لئے رشوت یا تاوان میں صرف کرنا چاہے گا تو بے سود ہو گا ۔ کوئی معاوضہ قابلِ قبول نہ ہو گا ۔ اس لئے اہل دانش حق پسند اور صراطِ مستقیم پر گامزن گروہ کے لئے مناسب یہی ہے کہ کج فہم حق پوش باطل کوش گروہ کے سامنے پیامِ حق کی تشریح تفصیل و توضیح اور تصویر کشی کرنے کے بعد الجھاؤ میں نہ پھنسے خواہ مخواہ منوانے کے درپے نہ ہو بلکہ اپنے خدا کی ہمہ گیر فطرت و قدرت اور محیط کل علم کا اقرار و اعلان کرتے ہوئے اپنا

رونے خطاب اسی کی طرف کرلے اور حق و باطل کے ہر فیصلہ کا رُخ اُسی کی جانب موڑ دے اور صاف کہہ دے کہ اے خالق کائنات اور اے عالم کل ہماری برہانی قوت عاجز ہے ہم کسی کو زبردستی حق کا قائل بنا نہیں سکتے۔ قیامت کے دن تو ہی اپنے بندوں کے ان اختلافات کا فیصلہ کرے گا۔ اسی وقت یہ حق و ناحق اور صدق و کذب کا فرق سمجھیں گے۔

تحلیلِ اجزاء قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اوپر کی آیات میں اللہ نے اپنی وحدتِ تشریعی کا اعلان کیا تھا اور اس کے لئے جن دلائل کی ضرورت تھی وہ بھی بیان کی تھیں۔ اپنی ہمہ گیر قدرت اور بڑے سے بڑے انسان کے عجز کا بھی اظہار فرمایا تھا۔ فرضی سفارشیوں کے بھروسہ پر جینے والوں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرنے والوں کی بدفکری اور بدکرداری کا انکشاف فرمائی تھی۔ غرض ہر طرح کی عقلی برہان مشاہداتی واقعات اور امکانی دلائل کو کھول کر بیان کیا تھا اب اس آیت میں روئے خطاب پھیر کر اپنے پیغمبر کی طرف کر کے ارشاد فرمایا کہ آپ کو اپنے رب کی ہمہ گیر قدرت اور محیط کل علم کا اعلان کر دینا چاہیئے اور اُسی سے مناجات کرنی چاہیئے۔ اور انسان کے اختلاف کا فیصلہ اسی کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ یعنی انسانوں کا یہ عملی اور نظری اختلاف اس دنیا میں مٹنے والا نہیں۔ آپ کا کام دلائل کی روشنی میں راہِ حق دکھانا ہے اور بس۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے آپ کا تعلق نہیں اللہ ہی نے سارا جہان بنایا وہی ہر شخص کی اندرونی اور بیرونی حالت سے واقف ہے۔ انسانی دماغ و وجدان کی جہاں تک رسائی ہے۔ اُس کا بھی اللہ کو علم ہے اور جو کچھ انسانی عقل کی نظر سے غائب ہے اس سے بھی خدا واقف ہے وہی قیامت کے دن آخری فیصلہ کرے گا۔

لفظ فاطر کے معنی ہیں بلا مثال اور بغیر نمونہ کے پیدا کرنے والا۔ یعنی اللہ سارے جہان کے سارے مادیات اور روحانیات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ پہلے سے مادہ یا روح موجود ہو اور خدا نے دونوں کا باہم ربط اور تعلق کرا دیا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کی بنیاد حدوث علام ہے۔ قدم و وجود سنگ تاسیس نہیں۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) عالم باطن و ظاہر یعنی جو کچھ انسان کی اندرونی اور بیرونی کیفیات ہیں اللہ اُن سے واقف ہے (۲) غیب سے مراد ہے مافوق الشعور و الادراک اور شہادت سے مراد ہے ماتحت الشعور یعنی جن چیزوں تک انسان کی عقل نارسا نہیں پہنچتی اور جن چیزوں کا علم انسان کو ہے سب سے خدا واقف ہے۔

پھر اس کی واقفیت قیدِ زمان و مکان سے پاک ہے اُس کا علم ماضی و استقبال کے احاطہ سے خارج ہے، وہ ہر چیز سے پہلے بھی واقف تھا اب بھی واقف ہے اور آئندہ بھی واقف رہے گا۔ یہاں تک کہ زمانہ جو ہر چیز کو محیط ہے اللہ کا علم اس کو بھی گھیرے ہوئے ہے اسی لئے ماضی و مضارع کو چھوڑ کر لفظ عالم فرمایا۔

اَنْتَ تَحْكُمُ۔ اس لفظ کا مطلب تمام ہی مفسرین نے لکھا ہے اور بظاہر ہے بھی یہی کہ قیامت کے دن اللہ انسانوں کے اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا کہ کس کی راہ سیدھی تھی اور کون کج راہ تھا۔ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ اس کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ لیکن اس لفظ سے اگر ایک لطیف ترین نکتہ کا استنباط کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ سیاقِ آیت بھی اس کے خلاف نہیں ہے یعنی لفظ تحکم سے قیامت کے دن فیصلہ کرنا مراد نہ لیا جائے بلکہ حق و باطل اور صدق و کذب میں اسی دنیا میں فصل کرنا اور ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دینا اور آئین بنا کر نافذ کرنا مراد لیا جائے۔ اس تقدیر پر پوری آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ خالقِ کائنات ہے۔ عالمِ کل ہے اور حاکم و شارع بھی وہی ہے۔ سنسار کی تخلیق میں کسی کا دخل نہیں۔ اللہ کے احاطۂ علم سے بھی کوئی چیز خارج نہیں تو لامحالہ اسی کو شارع اور حاکم و متصرف ہونا چاہیئے۔ پس انسانی عقول و افہام کے باہمی اختلاف کا اسی کے دستِ تشریعت میں ہے۔ گویا آیت میں تخلیق کی ہمہ گیری اور علم کی ہمہ رسی کو حکم و آئین سازی کی علت قرار دے کر تنبیہ فرمایا کہ معمولی بشر یا مومن کا تو ذکر ہی کیا ہے جلیل القدر سید الانبیاء کو بھی اللہ سے یہی مناجات کرنی چاہیئے کہ اے اللہ تو ہی خالق ہے تو ہی عالمِ کل ہے اور تو ہی حاکم و متصرف ہے۔ انسانوں کا باہم فکری و عملی اختلاف کسی چیز کی حقانیت و بطلان کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور اقدس جب رات میں نماز کو کھڑے ہوتے تو ان الفاظ سے نماز شروع فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَئِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ (رواہ مسلم)

ابن مسعود سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا جب بندہ کہتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اِنِّیْ اَعْھَدُ اِلَیْکَ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ فَاِنَّکَ اِنْ تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ تُقَرِّبْنِیْ مِنَ الشَّرِّ وَتُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَیْرِ اِنِّیْ لَآ اَثِقُ اِلَّا بِرَحْمَتِکَ فَاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَکَ عَھْدًا تُوَفِّیْنِیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ تو قیامت کے دن اللہ ملائکہ سے فرمائے گا کہ میرے بندے نے میرے پاس ایک عہد رکھا ہے تم وہ عہد اس بندے کو ادا کر دو (رواہ احمد منفردا) ابو عبدالرحمٰن کا قول ہے کہ حضور والا نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو یہ دعا سکھائی تھی اور فرمایا تھا کہ جب سونے کو جاؤ تو اس کو پڑھ لیا کرو۔ عبداللہ بن عمرو نے ہم کو وہ دعا کاغذ پر لکھی ہوئی دکھائی۔ دعا یہ تھی۔ اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اَنْتَ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْھَدُوْنَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ وَاَعُوْذُبِکَ اَنْ اَقْتَرِفَ عَلٰی نَفْسِیْ اِثْمًا اَوْ اَجُرَّہٗ اِلٰی مُسْلِمٍ (رواہ احمد منفردا) ابو بکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات تعلیم فرما دیجئے جو صبح و شام میں پڑھ لیا کروں۔ ارشاد فرمایا۔ ابو بکر یہ پڑھا کرو۔ اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ وَمَلِیْکَہٗ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَشَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ اَوْ اَقْتَرِفَ عَلٰی نَفْسِیْ سُوْٓءًا اَوْ اَجُرَّہٗ اِلٰی مُسْلِمٍ (رواہ عبداللہ بن عمرو نقلہ احمد والترمذی وقال حسن غریب) سعید بن مسیب تابعی کا قول ہے کہ جب اس آیت کو پڑھ کر دعا کی جائے تو اللہ قبول فرماتا ہے۔ (سراج)

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا الخ۔ اس آیت میں لفظ ظلم کی کسی خاص معنی کے ساتھ خصوصیت ظاہر نہیں فرمائی بظاہر یہ لفظ ہر بے جا حرکت اور گناہ کو شامل ہے۔ لیکن اکثر علماء نے اس جگہ ظلم سے مراد شرک لیا ہے۔ کیونکہ ظلم کا فرد اعظم شرک ہی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا جس دوزخی پر سب سے کم عذاب ہوگا اس سے اللہ دریافت فرمائے گا کہ جو کچھ زمین میں ہے اگر وہ سب تجھ کو مل جائے تو کیا اپنی رہائی کے لئے تو وہ سب کچھ دیدے گا۔ وہ شخص عرض کرے گا بے شک میں سب کچھ دے دوں گا۔ ارشاد ہوگا جب تو آدم کی پشت میں تھا تو اس سے بہت ہی زیادہ آسان بات کی خواہش کی گئی تھی۔ صرف اتنا کہا گیا تھا کہ شرک نہ کیجو۔ مگر تو نے نہ مانا۔ (صحیحین) خلاصہ مطلب یہ ہے کہ روئے زمین کی کل دولت بلکہ اس سے بھی دوگنی بالفرض اگر دوزخی مشرک کے قبضہ میں ہو جائے تو عذاب سے چھوٹنے کے لئے قیامت کے دن وہ سب دولت دینے پر تیار ہوگا۔ گویا اس آیت میں تنبیہ اور وعید ہے دونوں باتوں پر۔

(۱) دنیوی دولت اور مال و منال پر دھجنا اور اس کو وجہ امتیاز سمجھنا اور فخر کرنا غلط ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ بلکہ قیامت کے دن آدمی خود بھی اس کو اپنی تکلیف کے مقابلہ میں ہیچ سمجھے گا۔ (۲) عذاب کی تکلیف بہت سخت ہوگی جس سرمایۂ بے نیازی پر مغرور ہو کر انسان ہر قسم کی چیرہ دستی اور ظلم کو اختیار کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے وجہ اعزاز و برتری سمجھے بیٹھا ہے قیامت کے دن عذاب کے دکھ سے چھوٹنے کے لئے وہ کل سرمایۂ عیش دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وَبَدَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ یعنی ان ظالموں کو جس بات کا گمان بھی نہ تھا اللہ کی طرف سے قیامت کے دن وہ بات ان کے سامنے آجائے گی۔ مطلب یہ کہ اس طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے جو ان کے گمان میں بھی نہ تھا۔ اہل ایمان کے لئے ایک آیت آیا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ الخ حضور اقدس کی ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ ارشاد فرماتا ہے۔ میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسی نعمتیں مہیا فرمائی ہیں جن کو کسی نے نہ آنکھ سے دیکھا نہ کانوں سے سنا نہ کسی کے دل میں ان کا تصور آیا۔ اوکما قال (صحیح) اسی طرح کافروں کے لئے طرح طرح کے عذاب ہوں گے جو دنیا میں ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ہم نے یہ تشریح مقاتل کے قول کے موافق کی ہے۔

مجاہد نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جن اعمال کو وہ اپنے گمان میں نیکیاں سمجھے ہوئے تھے قیامت کے دن ظاہر ہوگا کہ وہ نیکیاں نہ تھیں بدکاریاں تھیں۔ سدی سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ عکرمہ بن عمار کی روایت ہے کہ محمد بن منکدر مرنے کے وقت بہت گھبرائے۔ لوگوں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ مجھے اس آیت کا خوف ہے ایسا نہ ہو کہ میرے گمان کے خلاف حالت ظہور پذیر ہو۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن منکدر بھی آیت کی تفسیر وہی سمجھتے تھے جو مجاہد نے بیان کی ہے۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ آدمی گناہ کرتا ہے اور خوب پھلتا پھولتا ہے۔ دولت بھی ملتی ہے اور عزت بھی، صحت بھی اور حکومت بھی۔ واقع میں گناہ بُری چیز ہے لیکن گناہ کے نتائج اچھے نکلتے ہیں اس لئے وہ بُرائی کو بُرائی نہیں سمجھتا۔ اولاد کی کثرت، مال کی فراوانی اور رسوخ و اثر کی زیادتی گناہ کی طرف مزید میلان پیدا کرتی ہے بلکہ سفاکی اور چیرہ دستی کا نتیجہ۔ عزت و رعب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ خیانت، رشوت، غصب، چوری اور غبن کے پھل دولت و عیش کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آدمی بدکاریوں کی جانب اور بڑھتا ہے اور ڈھیل کو پیش روی، طوفان در طوفان سکون کو راحت اور عقل کی موت کو سکونِ دل سمجھنے لگتا ہے۔ حقیقت میں اس کے فہم کی نارسائی ہوتی ہے۔ اس کی عقل بلکہ اس کا دل بھی نامختون ہوتا ہے۔ وہ عارضی سکون کو دائمی عیش سمجھتا ہے۔ افاقۂ موت کو پیامِ زندگی سمجھنا غلطی ہے اور فالج کو خستگیٔ قلب قرار دینا انتہائی کوتاہ فہمی۔ اسی طرح حماقت پناہ بلادت دستگاہ گروہ اپنی کورباطنی اور تیرگیٔ عقل کی وجہ سے خیر کو شر، حق کو باطل اور روشنی کو تاریکی سمجھنے لگتا ہے۔ پیامِ حق جب دلائل بردوش اس کے سامنے آتا ہے اور سرتابی و انکار کے نتائج بد سے ڈراتا ہے تو وہ دعوت و داعی دونوں کا انکار کرتا ہے۔ دونوں کی تحقیر کرتا ہے۔ دونوں کا مذاق اُڑاتا ہے اور انتہائی بے دانشی و کوتاہ فہمی کے سبب دونوں کی ہنسی بناتا ہے۔ پیامِ حق اور پیامبرانِ حق سے استہزا اس کا شعار بن جاتا ہے۔

لیکن ایک وقت آئے گا کہ ساری پول کھل جائے گی۔ بداعمالیوں کے نتائج بد سامنے آئیں گے اور جس دعوتِ حق اور مغزِ دعوت کا مذاق اُڑایا تھا اس کی صداقت سورج کی روشنی کی طرح ہر طرف سے گھیر لے گی۔ حواس کی کوری اور فہم کی زنگ آلودگی دور ہو جائے گی۔ جہالت کا پردہ ہٹ جائیگا اور نورِ حقیقت چمکے گا۔ اس وقت گناہ بصورتِ گناہ اور پیامِ صداقت بشکلِ حقیقت دکھائی دے گا۔

مقصودِ بیان

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ الخ سے مترشح ہو رہا ہے کہ اعمالِ انسانی کی صداقت و بطلان کا فیصلہ کرنے اور امر و نہی صادر کرنے کا اختیار اسی کو ہونا چاہیئے جو خالقِ کل بھی ہو۔ سب اُسی کی مخلوق ہو اور مخلوق کی ہر حالت اور ہر ڈھکی کھلی بات سے واقف بھی ہو اور اُس کی واقفیت و خالقیت قیدِ زمانی سے آزاد ہو۔ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر عمل کا بدلا اللہ کی طرف سے ملے گا اور وہ عذاب سامنے آئے گا جو دنیا میں گمان سے بھی خارج تھا۔ مَا كَسَبُوْا کا لفظ بتا رہا ہے کہ انسان نتیجۂ بد کا کاسب ضرور ہے۔ اگرچہ خالق آدمی نہیں لیکن کسب پر ہی نتیجہ کا مدار ہے اس لئے کسبِ بدی کو اپنے کئے کا نتیجہ بھگتنا پڑیگا۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ

پھر جس وقت (اس مشرک) آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اسکو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرما دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھ کو (میری) تدبیر سے ملی ہے

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى

بلکہ وہ ایک آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ یہ بات (بعض) اُن لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (جیسے قارون نے کہا تھا)

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ

سو اُن کی کارروائی اُن کے کچھ کام نہ آئی۔ پھر ان کی تمام بداعمالیاں اُن پر آ پڑیں (اور سزایاب ہو گئے) اور ان میں بھی جو ظالم ہیں اُن پر بھی

سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۚ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ○ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ

ان کی بداعمالیاں ابھی پڑنے والی ہیں اور یہ (خدا تعالیٰ کو) ہرا نہیں سکتے کیا اُن لوگوں کو (احوال میں غور کرنے سے) یہ معلوم نہیں ہوا کہ اللہ ہی

الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ع

جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی بھی کر دیتا ہے اس (البسط و قدر) میں ایمان والوں کے واسطے نشانیاں ہیں

تفسیر فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۔ ضر کا لفظ ہر دکھ کو شامل ہے۔ تخویل کے معنی ہیں مہربانی کر کے اپنی طرف سے لینے والے کے استحقاق کے بغیر کسی کو کچھ عطا کرنا (کبیر و ابن کثیر) آیت میں الانسان کا لفظ اگرچہ عام ہے کسی خاص شخص یا مخصوص اوصاف کے آدمی کی تخصیص نہیں۔ لیکن جن اعمال کا بیان آیت میں کیا گیا ہے وہ صرف کافرانہ ہیں اس لئے الانسان سے کافر انسان ہی مراد ہے۔ اس کے علاوہ بعد کو آنے والی آیت قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ بھی اسی خصوصیت پر دلالت کر رہی ہے۔ علیٰ علم سے مراد ہے علمی استحقاق یا وہ استحقاق جس کا علم اللہ کو ہے یا لینے والے کو ہے۔ (رازی)

برخود غلط انانیت اور استبداد کا مدعی انسان ہر قسم کے عیش و طرب۔ دولت و ثروت، صحت و طاقت اور عزت و حکومت کو اپنی خوش تدبیری کا نتیجہ جانتا ہے۔ کسب اور کمائی کو اصل موجب اور موثر خیال کرتا ہے۔ وہب الٰہی اور عطائے غیبی کا تصور بھی اس کے دماغ میں نہیں آتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ سلسلۂ اسباب کی نتائج سے وابستگی ہی نظم عالم کی علتِ حقیقیہ ہے۔ اس کور بصیرت انسان کی عقلی بینائی اور قلبی روشنی چونکہ مردہ افسردہ ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے علم و بصیرت اور حدس و تجربہ کو ہی ثمر آفریں سمجھتا ہے باوجودیکہ یہ ضروری نہیں کہ دنیا کے حاذق طبیب اگر متفق الرائے ہو کر بھی کسی بیمار کا علاج کریں تو وہ شفایاب ہی ہو جائے یا ماہرینِ زراعت اپنی نظری تحقیق کے موافق کد و کاوش کرنے کے بعد کشاورزی کریں تو حسبِ اندازہ ثمر پیدا ہو ہی جائے اور طوفانِ باد و باراں اور محرقاتِ رعد و برق سے کھیتی محفوظ ہی رہے۔ بہار اور خزاں، سورج اور چاند ستاروں اور سیاروں رات اور دن غرض تمام حوادثِ فطریہ کے اثر سے کامل تحفظ کون کر سکتا ہے۔ امکانی خوش تدبیروں سے کام لینا اور پھر خوش کن نتائج سے محروم رہنا کثیر الوقوع نہیں تو نادر بھی نہیں۔ پس جب کوتاہ فہم اور نارسا دانش رکھنے والے برخود غلط انسان کی تدبیر الٹی پڑتی ہے اور کوئی زور کام نہیں دیتی اس وقت اس کو اپنی بےبسی دکھائی دیتی ہے اور مجبور ہو کر وہ خدا کو پکارتا ہے۔ اس وقت بھی یہ کج فہم کارساز سمجھ کر خدا کی بارگاہ میں سر نیاز نہیں جھکاتا بلکہ جس طرح کامرانیوں اور کامیابیوں کا سرچشمہ اپنی علمی بصیرت اور تجربہ کو جانتا تھا اسی طرح خدا کے متعلق اس کو سوء ظن ہوتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ مجھے استحقاق تو کامیابی کا تھا مگر خدا نے میری حق تلفی کی اور مجھے دکھ دیا اور چونکہ خدا سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوتی اس لئے چار و ناچار وہ خدا ہی کو پکارتا ہے کہ وہ اپنی بھیجی ہوئی مصیبت دور کر دے۔ گویا راحت کے وقت تو وہ کامیابی کو اپنا حق اور دست مال جانتا ہے اور دکھ کی صورت میں خدا کو پکارتا ہے تاکہ خدا نے جو اس پر ظلم کیا ہے وہ دور کر دے۔ حالانکہ انسان نہ رنج کا خالق ہے نہ راحت کا، کاسب ضرور ہے اور کاسب ہے تو دونوں کا۔ آیت کا جو مطلب ہم نے بیان کیا وہ تنقیحی خصوصیت کا حامل ہے۔ ایک صاف سادہ مطلب اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ آدمی جب دکھ یعنی فقر و مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کو پکارتا ہے۔ پھر جب اللہ اپنی مہربانی سے بغیر اس کے استحقاق کے اس کو نعمت عطا فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھے تو اس کا حق ہی تھا میں اپنے استحقاق کو جانتا ہی تھا یا یہ معنی کہ جو کچھ مجھے ملا وہ میری بصیرت اور علمی استحقاق کا نتیجہ ہے۔ پھر تبادل رنج و راحت بھی کامیابی و ناکامیابی کا معیار نہیں۔ لیل و نہار تبادلۂ بہار و خزاں اور تمام فطری تبدلات انسان کے حالات میں انقلاب پیدا کرنے کے پیامبر ہیں تندرستی اور بیماری، افلاس اور مالداری، ذلت اور عزت، رنج اور راحت غرض ہر حالت اور ہر کیفیت اپنے اندر امتحانی حقیقت رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کا ذرہ

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۔ آزمائش بردوش اور عبرت در بغل ہے۔ خود پندار خدا فراموش انسان کو بعد لامحالہ شرمندہ یاد و آہی۔

مخلوق کا خالق سے ٹوٹا ہوا تعلق جوڑتا ہے۔ معبودِ فعال کی بارگاہ میں عبدِ عاجز کا سرِ نیاز جھکاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ ہر امتحانی علم سے بے نیاز ہے اس کو آزمائش پر مرتب ہونے والے علم کی ضرورت نہیں لیکن کیا یہ حقیقت امتحان نما نہیں کہ خود کوش خدا فراموش آدمی عیش و طیش اور راحت و مصیبت میں کبھی اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ لیتا ہے اور بھولا ہوا تعلق اس کو یاد ہو جاتا ہے اور کبھی انانیت کا دبو ہر حالت میں دکھ کی ہو یا سکھ کی، تصورِ خدا کو بارِ استغفار سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اول صورت میں انجام کی ٹوٹی ہوئی کڑی آغاز کے سرے سے مل جاتی ہے اور آخر شکل میں منتہی تعلق مبدء سے منقطع ہو جاتا ہے۔ نتیجہ میں فلاح و کامرانی ہاتھ آتی ہے یا خسرانِ مآلی اور بد انجامی سے دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن حقیقت رس دماغ رکھنے والے کم آدمی ہیں۔ اکثر کی نظر کوتاہ اور فہم نارسا ہے اس لئے رنج و راحت کے تبادل اور دکھ سکھ کے تعاقب کی تہ تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ شکر و شرک اور رکوع و فکر کا فرق سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۔ یعنی پہلے بھی بہت سر پھرے لوگوں نے ایسی ہی بات کہی تھی اور خداداد نعمت کو اپنی علمی بصیرت اور روشنیِ تدبیر کا نتیجۂ واجبہ قرار دیا تھا۔ چنانچہ قارون نے بنی اسرائیل سے کہا تھا إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۔ اور قارون پر ہی کیا انحصار ہے بکثرت آدمی ایسے ہی کہتے چلے آئے ہیں لیکن ان کی خود پنداری اور غرور نے جو اعمالِ بد ان سے کرائے جب مال کی بربادی عزت کی تباہی حکمت کی فرسودگی اور موت کا تیر ان کے لگا تو کوئی نہ بچا سکا۔ نہ مال کام آیا نہ حکومت، نہ دانش و حکمت، نہ قوت اور نہ شوکت۔ بالآخر (مرنے کے بعد تو یقیناً اور کبھی کبھی اسی دنیا میں) بد اعمالیوں کا دکھ اٹھانا پڑا اور بدکاریاں مصیبت بن گئیں۔ اسبابِ راحت موجباتِ زحمت ہو گئے۔

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۚ وَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ ۔ پچھلی آیت میں ان بدکیش کافروں کی بداعمالی اور بد اعمالی کے نتائجِ قبیحہ کا تذکرہ تھا جو امتِ محمدیہ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس آیت میں پھر اصل مراد کی طرف رجوع فرمایا۔ قرآن چونکہ درسِ عبرت ہے گزشتہ کی تصویر دکھا کر حال کے متعلق صراحت فرماتا ہے اس لئے اس آیت میں امتِ حاضرہ کے کافروں کے نتائجِ بد کا تذکرہ فرمایا اور نتائجِ بد کی علت کو بھی ظاہر فرما دیا۔ قابلِ توجہ خصوصیت کے ساتھ دو ٹکڑے ہیں۔

علا لفظ ظَلَمُوا اور وَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ ۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ظلم ہی سرچشمۂ عذاب ہے۔ بہت جیلہ جبر اپنے کو مجبورِ مطلق خیال کرتے ہیں اور ہر برائی کا فاعل خدا کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن انانیت اور غرور کا شکار بھی ایک بہت بڑا گروہ ہے جو اپنے ہر فعل اور نتیجۂ فعل کا خالق اپنی ہی ذات کو سمجھتا ہے اور اپنی علمی و عملی قوتوں کو محیطِ کل خیال کرتا ہے۔ یہ دونوں بے جا حرکتیں اور ظلم کی مختلف الشکل دو شاخیں ہیں لیکن آیت میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھتے ہوئے بظاہر دوسری شاخ مراد ہے اس لئے آیت ختم پر فرمایا کہ یہ ظالم (اپنی علمی و عملی قوت سے اللہ کو) ہرا نہیں سکتے۔ اس پر غالب نہیں آسکتے یعنی علم کی وسعت اور عملی طاقت ہمہ گیری کے سبب بدکرداری کے نتائجِ بد سے بچ نہیں سکتے۔

أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ دنیا کی ہر نعمت رزق ہے۔ مال ہو صحت ہو حکومت و عزت ہو علم و دانش ہو اولاد ہو بیوی ہو رشتہ دار اور کنبہ والے ہوں یا ان سب کے علاوہ کچھ اور ہو۔ رزق کی تنگی فراخی میں تفاوت ہے۔ کوئی فراخ دست ہے کوئی تنگ حال کوئی بادشاہ کوئی گداگر کوئی عالم کوئی جاہل، کوئی طاقتور حسین و تندرست کوئی کمزور بدصورت بیمار ایسا کیوں ہے کیا علم و جہالت، دانش اور حماقت کو اس کا سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ورنہ عالم مصیبت میں اور جاہل راحت میں کیوں ہیں بلکہ اکثر کمزور بیمار جاہل فارغ البال اور اکثر طاقتور تندرست عاقل بدحال کس وجہ سے ہیں۔ پھر کیا نیچر طبعی قوتیں اور ستاروں کی نیرنگی اس کا سبب ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ قرانِ السعدین کے وقت پیدا ہونے والا بچہ فقط بادشاہ ہی نہیں ہوتا۔ ہزاروں بیمار فقیر بچے بھی تو بادشاہوں کی پیدائش کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اعمال کا اختلاف فی الجملہ اس میں دخل رکھتا ہے۔ لیکن اصل علت تو عمل کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان کی عقلِ نارسا کی رسائی کچھ زیادہ نہیں عقل کے ساتھ ایمان عقلی بلکہ وجدانِ قلبی ہونا ضروری ہے تاکہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور متصرف لِمَا يَشَاءُ کی کارفرمائیاں نظر آئیں۔ حقیقت میں ہر تنگی فراخی کی اصل علت مشیتِ مختار کی حکمرانی ہے وہی جتنا جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ مشیتِ الٰہیہ ہی وجہ تفاوت ہے کیا خوب

فلا السعد یقضی بنا المشتری   ولا النحس یقضی علینا زحل

ولکنه حکم رب السماء   وقاضی القضاة تعالی وجل

مقصود بیان

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ الخ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ انسان اپنے کو مجبور بھی جانتا ہے اور مختار بھی لیکن اس کے دونوں عقیدے حق جوئی اور صداقت طلبی کے زیر اثر نہیں ہوتے بلکہ خود غرضی اور شیطانی جذبہ کے ماتحت ہوتے ہیں۔ دکھ درد میں عاجز آکر تو خدا کو پکارتا ہے۔ شاید سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت خدا نے بھیجی ہے دکھ درد اس کی طرف سے مجھ پر آتا ہے۔ غالباً وہ اپنی بداعمالی کو باعث دکھ نہیں سمجھتا بلکہ بغیر کسی عمل کے خدا کی طرف سے نازل شدہ مصیبت جانتا ہے۔ پھر جب خدا اس کی سن لیتا ہے اور اپنی رحمت سے اس کا دکھ دور کر دیتا ہے اور نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے تو اس وقت انسان کو اپنی طاقت اپنی دانش اور اپنا اختیار یاد آتا ہے دماغ رعونت سے بھر جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میرا حاصل کردہ ہے۔ میں عالم ہوں میں خوش تدبیر ہوں میں عقیل و فہیم ہوں میں نے اپنی بصیرت اور محنت سے افلاس کو دور کیا، دولت پیدا کی۔ مالدار بنا کامیاب علاج کیا۔ حاذق ڈاکٹروں سے مشورہ لیا، تندرست اور چاق و چست ہوگیا غرض کافر نعمت احسان فراموش اور انانیت کے نشہ سے بے ہوش ہوگیا گویا احمق نے نہ خدا کا انکار کیا بلکہ خالق شر اور موجب مصائب تو اللہ کو سمجھا اور خالق خیر اپنی ذات کو جانا

بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر رنج راحت آزمائش ہے نہ دکھ کی دوائی ہے۔ سکھ ہو یا دکھ کیسا ہی ہو (خواہ انسانی بداعمالی کے سبب آیا ہو لیکن) خدا آدمی کی آزمائش کرنی چاہتا ہے کہ بندہ مصائب سے تنگ آکر خدا کو ظالم و جابر قرار دیتا ہے۔ کفر آمیز کلمات زبان پر لاتا اور خدا سے نفرت کرنے لگتا ہے یا اپنے گناہوں پر نظر کرکے سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ گناہوں سے توبہ کرتا اور خدا سے فرمانبرداری کا عہد کرتا ہے۔ اسی طرح راحت طاقت و دولت حکومت غرض ہر نعمت بھی امتحانی ہے اللہ آزماتا ہے کہ بندہ میری نعمتوں کا اقرار اور شکر کرتے ہوئے صحیح مصارف میں اس کو صرف کرتا ہے یا انانیت اور غرور کے نشہ سے چور ہو کر تکبر کا سر اٹھاتا اور خدا کو بھولتے ہوئے اپنے کو کارساز سمجھتا ہے اور نعمت الٰہیہ کو خود پیدا کردہ جانتے ہوئے قوانین خداوندی سے سرتابی کرتا ہے۔ اپنے کو متصرف مختار خیال کرتا ہے۔ حقیقت میں دونوں امتحان سخت ہیں۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں خدا کو نہ بھولنا چاہیے۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا اس سے واضح ہو رہا ہے کہ خدا خود بخود کسی کو دکھ نہیں دیتا بلکہ انسان کی بداعمالی اس کو دکھ دیتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ اس آیت سے عبرت پکڑنی چاہیے مسلمانوں کو جن کا دعویٰ تو اسلام کا ہے مگر حرکات گزشتہ کافروں ایسی ہیں۔ ظاہر ہے کہ تخم آم کا درخت ہو یا شیریں کا مسلمان بوئے یا کافر پھل بہرحال ویسا ہی ہوگا جیسا تخم ہوگا۔ پھر کس طرح اعمال کا فراز کرنے کے بعد مسلمان نتائج عذاب الٰہی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا میں صاف صراحت ہے کہ ہر نوع کی تنگی فراخی مشیت الٰہیہ کی تابع ہے۔ کمی بیشی انسان کی قدرت سے وابستہ نہیں وغیرہ۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ

آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنہوں نے (کفر و شرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین خدا تعالیٰ تمام

الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ

گزشتہ گناہوں کو معاف فرما دے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور (اسلام قبول کرکے) اس

قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ

کی فرمانبرداری کرو قبل اس کے کہ تم پر عذاب الٰہی واقع ہونے لگے (اور پھر اس وقت کسی کی طرف سے) تمہاری مدد کی جاوے اور تم (کو چاہیے کہ) اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے اچھے اچھے

رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ○ أَن تَقُولَ نَفْسٌ

طرف پر چلو قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ پڑے اور تم کو اس کا خیال بھی نہ ہو کبھی (کل قیامت کو) کوئی شخص کہنے لگے کہ

يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطتُ فِي جَنبِ اللَّهِ وَإِن كُنتُ لَمِنَ السَّاخِرِينَ ○ أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ

افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں کی اور میں تو (احکام خداوندی پر) ہنستا ہی رہا یا کوئی یہ کہنے لگے کہ اگر

اللَّهَ هَدَانِي لَكُنتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ○ أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً

اللہ تعالیٰ (دنیا میں) مجھ کو ہدایت کرتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہوتا یا کوئی عذاب کو دیکھ کر یوں کہنے لگے کہ کاش میرا (دنیا میں) پھر جانا ہو جاوے

فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ○ بَلَىٰ قَدْ جَاءَتْكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ

پھر میں نیک بندوں میں ہو جاؤں ہاں بے شک تیرے پاس میری آیتیں پہنچی تھیں سو تو نے ان کو جھٹلایا اور (جھٹلانا کسی شبہ سے نہ تھا بلکہ) تو نے تکبر کیا

وَكُنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ○ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم

اور کافروں میں (ہمیشہ) شامل رہا اور قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنہوں نے خدا پر جھوٹ

مُّسْوَدَّةٌ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ○ وَيُنَجِّي اللَّهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا

بولا تھا کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے اور جو لوگ (شرک و کفر سے) بچتے تھے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ (جہنم سے)

بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

نجات دے گا ان کو (ذرا) تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے

تفسیر

ہم اسی تفسیر میں چند مباحث کے تنقیحی سلسلہ میں لکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً تین طاقتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک روحانی علمی عقلی وجدانی طاقت دوسری مادی بطنی صنفی اور راحت جسمانی حاصل کرنے والی یا حصولِ مرغوبات کا شوق رکھنے والی طاقت۔ تیسری ہر قسم کے مادی ضرر کو دفع کرنے یا دور کرنے کی کوشش کرنے والی طاقت پھر ان تینوں طاقتوں کو استعمال کرنے کا ایک نظم بھی بتا دیا ہے اور گمراہی و ہدایت کی حدود بھی مقرر فرما دی ہیں اور یہ بھی تعلیم دے دی ہے کہ موخر الذکر دونوں مادی طاقتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا موجب کامرانی ہے اور اعتدال سے ہٹنا موجب تباہی ہے اور اعتدال کی حدود صرف یہ ہیں کہ اول طاقت کے ماتحت اور اس کی رہنمائی اور نگرانی کے زیر اثر رہ کر اگر آخری دونوں طاقتیں اپنا اپنا فرض انجام دیں اور اس پر پہرہ دست نہ بن جائیں تو سمجھ لو کہ یہ نقطۂ اعتدال ہے نفس انسانی کے لئے باعثِ فلاح عیش دوامی کے تمام راستے تمہارے لئے کھل جائیں گے اور اس کے خلاف صورت میں ابدی ہلاکت حاصل ہوگی اور بس۔ پھر نقطۂ اعتدال سے ہٹنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مادی طاقت کو بے لگام چھوڑ کر روحانی قیادت سے منہ موڑ کر خیر و شر اور حقیقی کامرانی و ناکامی سے بے نیاز ہو کر زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ دوسری یہ کہ دونوں طاقتوں کو عقل کے خلاف اندھا دھند بنا لیا جائے یہاں تک کہ اول طاقت کی نگرانی اور رہنمائی پر چلنے سے وہ عاجز ہو جائیں اور اس طرح روحانی طور پر نفس کی انجام دہی اور مدارج علیہ کے حصول میں بھی رکاوٹ پڑ جائے۔

یہی وجہ ہے ضروری ہے کہ مرتبہ اعتدال پہ چلو جب اللہ بھی اللہ کی فطری ہدایت کا پہلو کہلاتا ہے اعتدال سے ہٹ کر افراط اور تفریط کے دونوں مزاج شیطانی ہیں یہی اسراف علی النفس ہے اور نفس کو انہی راستوں میں چلنے سے داخلی نجات کا دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔ کیونکہ مادی طاقتوں کی اتنی تو سے سرتابی اور فطری تعلیم سے ہٹ کر مادیت کا روحانیت پر اور کثافت کا لطافت پر غلبہ بڑی زیادتی ہے۔

پس جن لوگوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہو یعنی مادی قوتوں کو عقلی حکمرانی اور روحانی قیادت سے آزاد کر کے استعمال کیا ہو خواہ افراط کا پہلو اختیار کیا ہو اس طرح کہ مادی طاقتوں کو بے لگام اور خودسر چھوڑ دیا ہو عرفانی روحانی حرمت وعظمت کی پرواہ بھی نہ رکھی ہو واقعی خیر و شر کی حدود وقیود وہی نہ ہو یا تفریط کا رخ اختیار کیا ہو اس طرح کہ مادی طاقتوں کو بے عقلی کے ساتھ مردہ کر دیا ہو کھانا پینا چھوڑ دیا ہو۔ حلال کو بھی ترک کر دیا ہو اور اس طرح عرفان کے مدارج عالیہ کے حصول میں رکاوٹ پیدا کی ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے عدالتی قدرتی سزا تو یہ ہے کہ وہ اور عذاب کے اور کچھ نہیں ہے لیکن عدالتی سزا سے بالاتر اللہ کی رحمت ہے جس کا تقاضا ہے کہ مجرم کو سزا نہ دی جائے اور رحم کر کے اس کو معاف کر دیا جائے اور جتنے جرائم اس سے سرزد ہوئے ہوں ان کو مٹا دیا جائے مگر شرط یہ ہے کہ آئندہ وہ توبہ کرے اپنے گناہوں کا اقرار کرے اللہ کے سامنے عجز و زاری کرے اپنی زندگی کے سارے معاملات۔ تمام افکار اطوار گفتار اور کردار اسی کے سپرد کر دے۔ غرض اسی کو اپنی ساری زندگی کا مرکزی نقطہ بنائے اسی کے گرد اگرد اپنی زندگی کا دائرہ بنائے کسی جگہ مرکزی نقطہ سے زیادہ دوری نہ ہو جائے۔ اس کی قائم کردہ تمام قیود کا پابند ہو اس کے بھیجے ہوئے احکام کی پیروی کرے اور ہر امر اس کے فرمان سے بلا ارادہ سرتابی نہ کرے۔ ایسی صورت میں رحمت الٰہیہ جوش میں آجائے گی اور رحم کے پانی سے پچھلے گناہوں کے تمام داغ دھبے دھل جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن پچھتانا اور ہاتھ ملنا پڑے کہ ہائے میں نے اللہ کی اطاعت کے رخ پر چلنے میں کیوں کمی کی کیوں مادی قوتوں کے افراط و تفریط کے گورکھ دھندے میں پڑ کر خود اپنے اوپر زیادتی کی۔ خوب سمجھ لو کہ اس وقت یہ معذرت نہیں چلے گی کہ اگر خدا مجھے سیدھا راستہ دکھاتا تو میں بھٹکتا پھرتا کیونکہ اللہ تو دنیا میں سیدھا راستہ دکھا چکا اس نے فطری طور پر بھی رہنمائی کی۔ مادی قوتوں کو اعتدال کے ساتھ روحانی سیاست و قیادت کے زیر اثر استعمال کرنے کا راستہ بتا دیا اور اتمام حجت کے لئے آسمان سے کتابیں بھی اتاریں۔ ہر حکم اور اس کے نتیجہ کو کھول کر بیان کیا۔ غرض خاموش اور ناطق ہر طرح کی ہدایت کی مگر تم نے ایک نہ مانی سب کی تکذیب کی سب کو جھوٹا قرار دیا۔ فطری ہدایت پر بھی غور نہیں کیا اور بولتی ہوئی ہدایت کو بھی نہ مانا۔ ایسی صورت میں خدا پر ہدایت نہ کرنے کا الزام دھرنا کارآمد نہیں اور نہ دوبارہ لوٹ کر دنیا میں جانے اور پھر از سر نو زندگی کو سنوارنے کی آرزو کرنا ہی قابل قبول ہوگا۔ ماضی لوٹ کر نہیں آتا۔ گزری ہوئی کرداری زندگی دوبارہ نہیں مل سکتی۔ تخلیق عالم کا جو چکر ختم ہو گیا اس کو اٹھایا نہیں جا سکتا حرکت مقلوب حکمت کے بھی خلاف ہے اور مشیت کے بھی۔ غرض قیامت کے دن نہ یہ عذر قابل سماع ہوگا کہ اللہ نے ہم کو ہدایت نہیں دی اگر وہ رہنمائی کرتا تو ہم ضرور راہ راست پر چلتے نہ دوبارہ دنیوی زندگی ملنے کی تمنا سودمند ہوگی بس سوائے حسرت و افسوس کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن خدا غفور الرحیم ہے۔ وہ تم کو آگاہ کرتا ہے کہ پچھتانے اور افسوس کرنے سے پہلے اس کی رحمت کی طرف قدم بڑھاؤ عدالتی سزایابی کا یقین کر کے اور معافی سے ناامید نہ ہو لیکن نڈر ہو کر آئندہ گناہ اور نافرمانی پر احمقانہ جرأت بھی نہ کرو۔

تحلیلِ اجزاء

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ اس جگہ چند الفاظ غور طلب ہیں۔ (۱) عباد سے کیا مراد ہے (۲) اسراف علی النفس کیا چیز ہے؟ (۳) ناامید ہونے کا کیا مطلب ہے (۴) رحمۃ اللہ کیا ہے (۵) تمام گناہوں کے معاف کر دینے کے کیا معنی ہیں۔ ہم نمبروار ہر ایک کی مختصر تنقیح کریں گے لیکن سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی شان نزول اور شان نزول سے تعلق رکھنے والی ۔ ۔ ۔ کو نقل کر دیں تاکہ تشریح آیت کے وقت خفا باقی نہیں رہے۔

ابن عباس نے فرمایا کچھ مشرکوں نے حالت شرک میں قتل خونریزی اور زناکاری کی اتنی کثرت کی کہ اپنی زیادتی کا انہیں خود احساس ہوا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں وہ ہے تو اچھی لیکن ہماری گزشتہ بدکاریوں کا کفارہ کیا ہوگا اس پر آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ الخ نازل ہوئی

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الخ نازل ہوئی (رواہ سعید بن جبیر بخاری مسلم وابوداؤد ونسائی)

حضرت عمرؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول عیاش بن ابی ربیعہ، ولید بن ولید اور ان چند مسلمانوں کے حق میں ہوا جو مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن کافروں نے تکلیفیں دے کر پھر ان کو پھیر لیا ہم کہا کرتے تھے کہ اللہ کبھی ان کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا کیونکہ پہلے یہ لوگ مسلمان ہوئے اللہ کو پہچانا اور مصیبت پڑی تو پھر گئے۔ ایسے لوگوں کی توبہ تو کبھی قبول نہ ہوگی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ان کو بھجوائی وہ لوگ بھاگ کر چلے آئے اور ہجرت کے بعد مسلمان ہو گئے۔ (محمد بن اسحاق عن نافع عن ابن عمر)

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ حضور اقدسؐ فرمایا کرتے تھے کہ آیت یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الآیہ آیت مجھے دی گئی ہے جس کے عوض دنیا و مافیہا مجھے پسند نہیں ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ جو اگر کسی نے شرک کیا ہو تو کیا اس کو بھی مغفرت کی بشارت ہے؟ حضور کچھ خاموش رہے پھر فرمایا آگاہ ہو وہ بھی جس نے شرک کیا یہ جملہ حضورؐ نے تین بار فرمایا (احمد وابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردویہ والبیہقی)

حضرت اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ حضور والا نے آیت اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا پڑھنے کے بعد فرمایا ولا یبالی (یعنی اللہ لا پرواہ ہے اس کے لئے سب گناہ معاف کر دینے آسان ہیں)

ابن ابی حاتم نے لکھا کہ آیت قولہ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا الآیۃ کے بیان میں ابن عباس نے فرمایا۔ دیکھو اللہ نے اپنی مغفرت کی جانب اس شخص کو بلایا جو اعتقاد رکھتا تھا کہ مسیح ہی اللہ ہے اور مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور جو کہتا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور اللہ کا ہاتھ بخل کی وجہ سے بندھا ہوا ہے اور جو بکواس کرتا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے (یعنی مریم اللہ کی بیوی اور مسیح اللہ کا بیٹا اور اللہ مسیح کا باپ مریم کا شوہر) اس کے بعد جو کوئی اللہ کے بندوں سے توبہ قبول ہونے سے مایوس کرے وہ اللہ کی کتاب کا منکر ہے لیکن یہ جان لو کہ بندہ کو توبہ کی توفیق اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک خدا کا رخ اس کی طرف نہ ہو۔ (ابن کثیر)

حسن بصری فرماتے تھے اس رحم و کرم کو دیکھو کہ جن کافروں اور مشرکوں نے اللہ کے دوستوں کو قتل کیا اللہ ان کو توبہ و مغفرت کی طرف بلاتا ہے

خطیب وغیرہ نے ابن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول حضرت حمزہ کے قاتل ہندہ کے غلام وحشی کے متعلق ہوا تھا جس نے شرک بھی کیا تھا اور جلیل الشان ولی اللہ (حضرت حمزہ) کو شہید بھی کیا تھا۔ اب ہم اصل آیت کے اجزاء کی تشریح کرتے ہیں:۔

(۱) خطیب نے سراج میں اور رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ قرآنی عرف میں جس جگہ اللہ نے عبادی یا عباد الرحمٰن وغیرہ لفظ استعمال فرمایا ہے وہاں صرف اہل ایمان ہی مراد ہیں۔ قرآن کی اصطلاح یہی ہے اس لئے آیت میں عبادی کا لفظ مشرکوں کو شامل نہیں ہے

ابن کثیر وغیرہ بعض مفسرین نے شان نزول کی مختلف روایات کی روشنی میں آیت کے اطلاق میں اہل شرک کو بھی داخل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ آیت قدسی میں اللہ نے تمام کافروں اور گناہ گاروں کو توبہ کرنے کی دعوت دی ہے اور آگاہ فرما دیا ہے کہ جو شخص توبہ کر کے گناہ سے منہ موڑے گا اللہ اس کے کل گناہوں کو بخش دے گا۔ گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ کثیر ہوں یا قلیل۔ یہاں تک کہ سمندر کے جھاگوں کی برابر بھی ہوں گے تب بھی بخش دے گا۔ مگر توبہ شرط ہے۔ ہماری نظر میں ابن کثیر کا قول صحیح ہے۔ اس کی وجہ تفسیری مطلب بیان کرنے کے وقت ہم لکھیں گے

(۲) اسراف علی النفس کیا چیز ہے اور اپنے نفس پر زیادتی کی کیا حقیقت ہے۔ اسراف علی النفس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک شرک اور دوسرے باقی گناہ۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مشرک دل کے سکون، روح کے قرار اور دماغ کے چین سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے اعتقادی کارساز چند در چند ہوتے ہیں کبھی کسی کو پکارتا ہے۔ کبھی کسی کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ کبھی کسی کے در پر سجدہ ریزی کرتا ہے۔ اس کو ہر فرضی دیوتا اپنے اوپر حکمراں نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ ہر ایک کی غلامی کرتا ہے۔ ہر ایک کے سامنے حاضری کرتا ہے۔ ہر در پر گڑگڑاتا اور الحاح و زاری کرتا ہے۔ اس اعتقادی [illegible] ہے اس کی جان قید غلامی میں ہمیشہ جکڑی رہتی ہے۔ وہ نفس جو فطرتاً آزاد تھا جس کی خدمت گزار ساری کائنات تھی۔ بتدریج ماسوا

اللہ کا حکمران تھا رب ۔ کا محکوم بن جاتا ہے ۔ عزت سے ذلت اور بلندی سے پستی میں جا گرتا ہے ۔ آسمان رفعت کا بادشاہ قعر مذلت کا قیدی ہو جاتا ہے ۔ اس سے بڑھ کر نفس پر زیادتی اور کیا ہو سکتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ شرک کے علاوہ دوسرے گناہ تو ظاہر ہے کہ تمام گناہوں کے نتیجے میں کائنات انسانی کا ہر دارش گھر تاریک ہو جاتا ہے قانون عدل اور ضابطۂ اخلاق سے سرتابی کا نتیجہ سوائے انسانی بربادی اور تباہی کے اور کچھ نہیں تھا ۔ ہر شخص کی حق تلفی ۔ ہر شخص ہر چیرہ دستی کا شکار ، ہر شخص طاغوتی طاقتوں کا غلام اور ہر شخص ہلاکت کے دیوتا کی سواری بن جاتا ہے ۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں ہوتی ۔ کسی کی جان لوٹ سے بے فکر نہیں رہتی ، کسی کا مال مامون نہیں ہوتا سچ ہے گناہ سرچشمۂ ہلاکت ہے ۔ مخزن خلاکت ہے ۔ اور منبع ذلت و نکبت ہے ۔ صحت طاقت عزت اور سکون روح کی بربادی سے بڑھ کر نفس پر زیادتی کیا ہو سکتی ہے یہ تو دنیا میں اسراف علی النفس کے نتائج ہوتے ہیں ۔ باقی آخرت میں جو سزا ملے گی اور جس ہولناک عذاب کو برداشت کرنا ہوگا اس کا ذکر ہی کیا ہے ۔

(٣ ، ٤ ، ٥) گہری نظر سے دیکھا جائے تو حاکمانہ طاقت محکوم کے اعمال کی پاداش میں تین طرح کا برتاؤ کر سکتی ہے ۔ (١) ناکردہ گناہ اور بے قصور کو گرفتار کرے اور خود بجور یا جذبۂ رعونت در عب کے زیر اثر بے خطا کو خطاوار قرار دیتے ہوئے سزا دے ۔ اس سلوک کا نام ظلم ہے دنیاوی حکومت بھی اگر ایسی سزا دے تو اس کو ظلم ہی کہا جائے گا ۔ اور آخرت میں بھی اگر ایسی گرفت ہو تو ستم رانی کی ہی تعریف اس پر صادق آئے گی ۔ اور خدا چونکہ جذبۂ انسانیت سے پاک ہے اس ظلم کی نسبت اس کی طرف کی ہی نہیں جا سکتی ۔ (٢) قصوروار کو اس کے قصور کے موافق سزا دی جائے کم زیادہ نہ کی جائے اس کو انصاف کہا جاتا ہے ۔ قانون عدل کا یہی تقاضا ہے ۔ جرم اور سزا کی مساوات قانونی انصاف ہے ۔ روئے زمین کی تمام حکمران طاقتوں کا یہی طرۂ امتیاز ہے ۔ اسی کی تلاش میں انفرادی اور اجتماعی آئین بنتے ہیں اور ناکام ہو کر بگڑتے ہیں ۔ آسمانی شریعت کی کم سے کم تعلیم یہی ہے اور مساوات حقوق ادنیٰ کرشمۂ ہدایت ہے ۔ (٣) مجرم جس کا جرم کرے ، اور قصوروار سے جس کی حق تلفی ہو وہ اپنا حق معاف کر دے اور پاداش جرم کی سزا دینے یا دلوانے سے دست بردار ہو جائے ۔ حاکم قانون شکنی کرنے والوں سے درگزر کرے ۔ باغی کی بغاوت ، سرکش کی سرکشی اور نافرمان کی نافرمانی حاکم کی نظر میں اگرچہ موجب سزا ہو لیکن وہ سزا نہ دے اور بے وقوف قانون شکن کی کمزوری ناچاری اور بے بسی پر اس کو رحم آ جائے اسی کو رحمت کہا جاتا ہے ۔ انسانی قانون میں اس کی گنجائش بہت کم ہے بلکہ بعض اقوام و اشخاص کے آئین میں تو اس کو جرم کہا گیا ہے جن قوانین میں رحم کی گنجائش ہے ان میں بھی رحم کرنے کا حق مخصوص افراد کو ہوتا ہے ۔ عام حاکم اور منصف اس حق سے محروم ہوتے ہیں ۔ لیکن آسمانی شریعت نے اس کو احسان کہا ہے ہر حقدار کو اس کی تعلیم دی ہے ۔ اگرچہ عدالت اور انصاف کے حق سے کسی کو بے بہرہ نہیں کیا لیکن رحم کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے ہر مستحق کو رضاکارانہ دستبرداری حق کی تلقین کی ہے ۔ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۔ ارحموا من فی الارض ۔ وَأَنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۔ اور اسی طرح دوسری نصوص میں صراحت فرما دی گئی ہے کہ طلب حق سے دست برداری ہی بہتر ہے ۔ لیکن یاد رکھو کہ معاف کرنے کا اختیار صرف اسی شخص کو ہوگا جس کو مجرم کی سزا دینے یا دلوانے کا حق ہو یعنی مستحق اپنے حق سے دست بردار ہو سکتا ہے ۔ کسی اجنبی کو کسی مستحق کا حق اس کی رضامندی کے بغیر معاف کر دینے کا کوئی حق نہیں ۔ پرائے حق کو اس کی مرضی کے خلاف معاف کر دینا مجرم پر رحم نہیں بلکہ مستحق پر ظلم ہے ۔

جرم کرنے کے بعد اگر مجرم سزا سے بے خوف ہو جائے اور اس کو یقین ہو جائے کہ مجھے کسی قسم کی سزا نہیں ملے گی تو گویا وہ قانون عدل کے نفاذ کا منکر قرار پائے گا یا عدالت حاکم کا اس کو اقرار نہ ہوگا ۔ اسی طرح اگر مجرم یہ خیال دل میں جمائے کہ جرم کی سزا مجھے ضرور ملے گی اور قانونی سزا سے میں بچ نہیں سکتا اور حاکم کی قانونی سزا سے بچنے کے سب راستے بند ہیں تو گویا وہ حاکم کی رحمت کا منکر ہوگا اور رحمت سے انکار کے معنی حاکم کے اختیار تمیزی کے انکار کے ہیں ۔ اس طرح ہر مجرم کی سزا یابی کا یقین رکھنے والا حاکم کو مجبور بے اختیار اور مضطر عاجز سمجھنے والا قرار ہوگا ۔ لیکن اللہ عادل بھی ہے اور مختار رحیم بھی ۔ اس کے عادل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس نے ہر جرم کی سزا مقرر کر رکھی ہے ۔ کسی جرم کی سزا میں اضافہ نہیں دے گا ۔ نہ کسی بے قصور کو قصوروار قرار دے کر عذاب میں ماخوذ کرے گا ۔ گویا خدا کے عادل ہونے کے معنی میں اس کو قادر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ہر گنہگار اپنے گناہ کی سزا سے ڈرتا ہے اور عادلانہ سزا سے بے خوف نہ ہو ۔ ایسی بیباکی اعمانہ کفر عدالت ہے

اور غفور رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ اپنے حقوق کو معاف فرما دے گا اُن کی قانونی سزا نہیں دے گا لہٰذا مجرم کو اپنی سزا پانے کا یقین نہ رکھنا چاہیئے۔ ایسا یقین اللہ کی رحمت سے مایوسی کے مرادف ہے۔ اگر خدا کو اپنے حقوق معاف کر دینے کا حق نہ ہو تو پھر اُس کے اندر اختیارات تیزی نہ ہوں گے۔ اور ایسا خدا مجبور خدا ہوگا مختار خدا نہ ہوگا اسی بنیاد پر ایمان کی بنیاد بیم و رجاء دونوں پر ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے انسانوں اے بندگان خدا تم نے اپنے اوپر زیادتیاں کیں علمی بھی اور عملی بھی مگر اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو اللہ سب گناہ (خواہ شرک ہو یا کوئی اور گناہ) بخش دے گا کیونکہ وہ (جس طرح عادل ہے اسی طرح) غفور رحیم (بھی) ہے لیکن گناہوں کی معافی کیسے ہوگی۔ اس کی تین صورتیں ہیں (اگر ان پر عمل کرو گے تو گزشتہ اور موجودہ سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اُن کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اللہ کی رحمت عدالت پر غالب آئے گی۔ اول شرط یہ ہے کہ

وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ سچے دل سے شرک اور تمام گناہوں سے توبہ کرو۔ اللہ سے پکا وعدہ کرو کہ آئندہ جرائم نہیں کریں گے تو ہمارے گناہ معاف کر دے ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ

وَأَسْلِمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ۔ اپنے ظاہر و باطن حواس وجدان ادراک کیفیت ادراک عمل اور کیفیت عمل کا رخ خدا کی طرف موڑ دو، سب جہان سے قلبی تعلق توڑ دو۔ ماسوی اللہ سے دل کا لگاؤ چھوڑ دو۔ سوائے خدا کے کسی کو مرکز توجہ نہ بناؤ اللہ کی محبت پر سارے سنسار کی محبت یہاں تک کہ اپنے ماں باپ اولاد اور نفس کی محبت بھی نچھاور کر دو اور خدا کے خوف کے مقابل ہر چیز سے بے خوف ہو جاؤ۔ تم اپنی جسمانی دماغی قلبی اور روحانی طاقتوں کا نقطۂ توجہ خدا کو بنالو یہاں تک کہ تمہاری زندگی بھی خدا کے لئے ہو اور موت بھی خدا کے لئے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ:-

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں، اور پیغمبر کی معرفت جن ہدایات سے سرفراز فرمایا ہے ان کو مانو اور اُن پر چلو اور حکم خدا کے موافق اپنے اعمال کو درست کرلو۔

ان تین باتوں کو تم نے مان لیا تو پھر تم سے جو خطا بھی سرزد ہو چکی ہے خواہ وہ شرک ہی ہو اللہ اس کو معاف فرما دے گا ہم نے جو تفسیری مطلب بیان کیا ہے وہ تمام پیچیدگیوں سے پاک ہے۔ حقیقت میں آیت کا مقصد صحیح توبہ اور اصلاح اعمال کی تلقین کرنا ہے لیکن موجودہ اعمال کی درستی اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کر لینے سے گزشتہ گناہوں کی تلافی کس طرح ہو اور توبہ کے بعد والی زندگی پہلی زندگی کی بداعمالیوں کو کس طرح نامۂ اعمال سے مٹا دے اس کے لئے مایوس نہ ہونے کا حکم دیا اور تمام گناہوں کو معاف کرنے کی صراحت فرما دی۔ سیاق قرآنی سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر اس آیت کی تفسیر میں کہا جائے کہ ذنوب سے شرک خارج ہے کیونکہ شرک کے معاف نہ کرنے کی صراحت آگئی ہے (لا یغفر ان یشرک بہ) اور دوسرے گناہ بغیر توبہ کے معاف کر دیئے جائیں گے۔ توبہ کی شرط نہیں ہے۔ تائب کے ہوں یا غیر تائب کے بہرحال سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس قسم کی تفسیر کرنے والوں نے انابت اسلام اور اتباع قرآن کے حکم پر غور نہیں کیا اگر بعد والے ٹکڑوں کو یغفر الذنوب سے ملا کر غور کرتے تو مطلب صاف نکل آتا۔ فی الواقع آیت کی غرض توبہ کی تلقین اور اصلاح عمل کی دعوت ہے۔ گناہوں پر جرأت دلانی مقصود نہیں ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اگر آیت یغفر الذنوب جمیعا میں بلا توبہ تمام گناہوں کے معاف کرنے اور سزا نہ دینے کا وعدہ کر لیا گیا ہے اور آیت کا یہی مطلب ہے تو پھر انابت الی الاسلام اور اتباع قرآن کا حکم اس کے بعد کیوں دیا گیا۔ حقیقت میں بعض ہمارے قدماء نے معتزلہ کے رد میں اتنی افراط کی ہے کہ بعض آیات کے مطلب کو بھی ژولیدہ بنا دیا۔ اس آیت میں چونکہ معتزلہ نے مغفرت کے لئے خواہ مخواہ توبہ کی شرط لگائی ہے اس لئے ہمارے علماء نے خواہ مخواہ آیت کو بلا توبہ مغفرت کے لئے بھی عام کر دیا حالانکہ ... مغفرت میں توبہ کی شرط ہے نہ بلا توبہ کی صرف تلقین توبہ اور اصلاح عمل کا درس دینا مقصود ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد گزشتہ یا موجود تمام گناہوں کی معافی کا وعدہ ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:- شبہ کیا جا سکتا ہے کہ أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم کے لفظ سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن میں کچھ نظری یا

کا حصہ غیر احسن بھی ہے خواہ حسن ہے یا قبیح اور غیر احسن حصہ واجب الاتباع نہیں بلکہ بعض صورتوں میں ممنوع العمل ہے۔ اس کا جواب امام رازی نے یہ دیا کہ اللہ نے پورے قرآن کو احسن الحدیث فرمایا ہے اس لئے سارا قرآن احسن ہے۔ امام کا یہ جواب بہت مبہم ہے تسلی بخش نہیں۔ قرآن کے احسن الحدیث ہونے سے ماانزل کے بعض حصوں کے غیر احسن ہونے کے شبہ کا ازالہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ اگر تمام ماانزل احسن ہے تو غیر احسن کی طرف احسن کی اضافت کیوں کی گئی۔ بعض مفسرین (ابن جریر وغیرہ) نے لکھا ہے کہ قرآن کے کچھ احکام حسن ہیں اور کچھ احسن مثلاً جرم کا بدلہ جرم لینا حسن ہے لیکن معاف کر دینا احسن ہے۔ اپنا قرض نرمی سے وصول کر لینا حسن ہے برا نہیں لیکن تنگدست کو معاف کر دینا اور ہو سکے تو اس کی مزید مدد کرنا احسن ہے۔ سخاوت اچھی ہے لیکن اپنی ضرورت پر دوسرے حاجتمند کی حاجت روائی کو ترجیح دینا احسن ہے۔ پس آیت میں حسن کو اختیار کرنے سے باز داشت مقصود نہیں بلکہ احسن پر عمل کا حکم دینا مقصود ہے۔ میری رائے میں یہ توضیح بہتر ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ احسن سے مراد ہے ناسخ اور غیر احسن سے منسوخ۔

تنبیہ:۔ آخری جملہ میں اچانک نزول عذاب کے ساتھ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ فرمایا یہ لفظ کسی قدر توضیح طلب ہے۔ شعور ادراک حواس اور احساس کو کہتے ہیں اور کوتاہ بین کم فہم لوگوں کی نظر محسوسات سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ ہر چیز کے وجود کو ظاہری اسباب سے وابستہ جانتے ہیں۔ غیر محسوس اسباب اور موجد اسباب تک ان کی نگاہ تصور بھی نہیں پہنچتی اور اللہ کا بھیجا ہوا عذاب اچانک ہوگا یعنی اس کے ظاہری اسباب نہ ہوں گے۔ کوئی محسوس وجہ معلوم ہوسکے گی۔ غیبی مخفی اسباب تک تو کسی کی نظر نہیں پہنچے گی اور محسوس اسباب مفقود ہوں گے اس لئے پہلے سے اسلام لانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۔ جنب اللہ کی تفسیر حسن بصری نے طاعت اللہ سے کی ہے۔ مجاہد نے امر اللہ اور سعید بن جبیر نے حق اللہ کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ رضاء اللہ مراد ہے یعنی انابت اسلام اور اتباع قرآن کا حکم تم کو اس لئے دیا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن کہیں کوئی یہ نہ کہے کہ ہائے افسوس میں نے وہ پہلو اختیار کرنے میں قصور کیا جس سے اللہ کی رضامندی حاصل ہوتی۔ میں تو اللہ کے احکام اور رسول اللہ کی ہدایت کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مطلب یہ کہ مجھے یقین ہی نہ تھا کہ رسول اللہ سچے ہیں اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ امر اللہ ہے۔

اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ اپنی گزشتہ غلطی اور علمی بے مائگی پر افسوس کافروں کو ہوگا اور حسرت کے ساتھ اپنے جرم کا اقرار کریں گے لیکن بے سود۔ یہ مطلب اوپر کی آیت میں بیان کر دیا گیا لیکن ہوسکتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی اپنی غلطی اور بے راہ روی کا اقرار نہ کرے بلکہ الٹا خدا ہی کو مورد الزام قرار دے اور یوں کہے کہ خدا ہی نے مجھے ہدایت نہیں کی ورنہ میں ضرور متقی بن جاتا۔ اس غلط الزام کا جواب اللہ تعالیٰ نے آئندہ آیت کے بعد دیا ہے۔

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ یعنی عذاب سامنے آنے کے بعد بعض لوگ یوں کہیں گے کہ اگر ایک بار پھر ہم کو دنیا میں جانا مل جاتا تو اس مرتبہ ہم ضرور نیکوکار بن جاتے۔ مطلب یہ کہ فقط ایماندار ہی نہیں بلکہ اہل احسان بن جاتے۔

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ اس الزام کا جواب ہے جو کہ وہ کافر خدا پر لگائیں گے اور کہیں گے خدا نے ہی ہم کو ہدایت نہیں کی ورنہ ہم ضرور متقی ہو جاتے۔ اللہ نے اس الزام کے جواب میں فرمایا کیوں نہیں یہ اللہ کی نشانیاں یعنی فطری آیات قدرت اور آسمانی احکام ضرور تمہارے سامنے آچکے تھے مگر تم نے ان کو نہیں مانا۔ تم ایسے پر غرور غلط اور انانیت پرست تھے کہ تم نے آیات اللہ کو بے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ دنیا میں لوٹ کر جانے کی تمنا کا جواب اس جگہ مذکور نہیں ہے بلکہ ایک اور آیت میں آیا ہے فرمایا ہے۔ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔ یعنی وہ جھوٹ بولیں گے۔ اگر ان کی خواہش کے موافق دوبارہ ان کو دنیا میں بھیج دیا جائے تب بھی وہ یہی شبہات اختیار کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کے نزول کی وجہ صرف یہ ہے کہ اتمام حجت ہو جائے اور کسی کو کوئی عذر یا تمنا پیش کرنے کا موقع نہ ملے۔

مقصود بیان گنہگار بندوں کو مغفرت سے ناامید نہ ہونے کا حکم اور اللہ کے غفور رحیم ہونے کی صراحت۔ عموم بشارت دلالت کر رہا ہے کہ مرتد کی توبہ بھی مقبول ہے۔ آیت اَنِيْبُوْٓا الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے لئے ... تفویض اور اصلاح ظاہر ... آخر کے تینوں آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اور دنیا میں نزول عذاب کے بعد کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا اور ... اسلام ...

کے نزول کے بعد کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہ ہوگی کہ ہم کو خدا نے ہدایت نہیں کی وغیرہ۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْۗءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اس آباد زمین پر دو طرح کے آدمی رہتے ہیں اور رہتے چلے آئے ہیں اور رہتے رہیں گے ایک وہ حقیقت شناس معرفت طلب گروہ ہے جس کو اپنی علمی بے مائیگی اور عملی کمزوری کا اعتراف ہے۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کو ہمہ دان اور محیط کل نہیں جانتا بلکہ قوانین فطرت اور ضوابط قدرت کو سمجھنے اور سمجھ کر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسانی دنیا میں خود ساختہ آئینی انقلاب لانے کا مدعی نہیں ہے اس لئے وہ اپنے فہم و دانش کو آئین حیات کا سازندہ نہیں جانتا بلکہ خوانندہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ضوابط زندگی کے حصول میں اللہ کے خاموش اور بولتے ہوئے فرمان کا محتاج رہتا ہے۔ لیکن اس کی احتیاج اپنے کو ناعمل بنانے اور مجبور یا بیچ ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اس احتیاج سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دانش کو نظام انسانی کا بانی نہیں سمجھتا بلکہ خدا تعالیٰ نے جس طرح یہ نظام بنانے اور بنائے رکھنے کا حکم دیا ہے اس کو سمجھنے اور سمجھ کر عمل پیرا ہونے کو وہ فرض انسانیت جانتا ہے۔ انسان کے اختراع کردہ احکام کو وہ خدائی احکام نہیں کہتا اور نہ خدائی ہدایت کاری کا مختار انسان کو جانتا ہے۔ گویا وہ نہ خدا کو خدائی اوصاف سے خالی مانتا ہے۔ نہ ان اوصاف کا حامل خیال کرتا ہے جو مخلوق کی خصوصیات ہیں۔ مخلوق و خالق اور محتاج و کارساز کے اوصاف کو باہم آمیز کرنے اور مخلوط قوام تیار کرنے سے وہ اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے اور اس خلط ملط کا اس کو کبھی دعویٰ نہیں ہوتا۔ حقیقت میں دانش مند گروہ یہی ہے۔ علم و امتیاز کی روشنی سے اس کا دل نورانی ہے اور دل کے نور سے اس کا ہر بُن مو جگمگا رہا ہے دنیا میں ہی اس کی زندگی کامیاب ہے اور ہر طرح کی کور دانشی و جہالت کے داغوں سے اس کا دامن عقل پاک ہے۔ یہ دنیا ہی اس کا میدان توشے اور آخرت کی تجارت اس کی ہم آغوش۔ ماضی اس کا گرد آلود نہیں، اس لئے قیامت کے دن اس کو اس کا ملال نہیں مستقبل اس کا سیاہ نہیں اس لئے اس کو کچھ دکھ نہیں۔ ہاں ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنے دماغوں کو دقیقہ رس اور اپنی فکر و نظر کو حقیقت شناس جانتا ہے۔ وہ مدعی ہے ایجاد حقائق کا اور تخلیق ضوابط کا۔ وہ جاہل ہے مگر عرفان کا دعویدار۔ وہ علم سے بے بہرہ ہے پر ہمہ دان اور محیط کل ہونے کا جھوٹا علمبردار۔ وہ مغرور ہے کذاب ہے۔ خودی میں اتنا اکڑتا ہے کہ خدا بن بیٹھتا ہے۔ اس نے خدا پر وہ بہتان تراشی اور دروغ بافی کی کہ گویا خدا کی خدائی مٹا دی کبھی خدا کو باپ کہا کبھی شوہر، کبھی بے اختیار مجبور سورج کبھی محتاج جاہل شہنشاہ، کبھی حدود زمان و مکان میں جکڑا ہوا جسم، کبھی ہر ذرہ کائنات میں حلول کرنے والی سیال روح کبھی اتنا گرایا کہ جاہل انسان بلکہ بے حس پتھروں کی برابر لا بٹھایا۔ کبھی اتنا اُٹھایا کہ ضروری اوصاف الوہیت سے بھی اس کو بے بہرہ کر دیا۔ غرض تاریک فکر اور جاہلانہ نظر کی سیاہی اس کے دل پر چھا گئی۔ روشن ادراک کی ہر طاقت مفلوج بن گئی۔ علم و عرفان کی جڑیں سوکھ گئیں۔ روحیں ایسی کالی ہو گئیں کہ قیامت کے دن اس مغرورانہ انانیت پرست گروہ کے چہروں پر باطن کی سیاہی چڑھ آئے گی منہ سیاہ پڑ جائیں گے۔ سیرت تاریک تھی صورت بھی اندھیری ہو جائے گی اور بالآخر ٹھکانا جہنم میں ہوگا۔

تحلیل اجزاء

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ اس جگہ کذب کے معنی ہیں دانستہ خلاف واقع بیان کرنا۔ امام نے دانستہ کا لفظ بڑھا کر آیت کے مفہوم کو بہت محدود کر دیا اور اس کے اندر صرف وہی لوگ شامل رہے جو جان بوجھ کر خدا پر افترا بندی اور بہتان تراشی کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جو خدا کو باپ اور شوہر کہنے والے یا اس کو بادشاہ کی طرح سمجھنے والے اور اس کو ارکان حکومت کا جاننے والے یا اس کی تجسیم یا تعطیل کا عقیدہ رکھنے والے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو نظام انسانی کے لئے قانون الٰہی کو ضروری نہیں سمجھتے اور تمام انبیاء اور آسمانی کتابوں کا انکار کرتے ہیں اور ہر چیز کو غیر شعوری نیچر کے تابع جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی دانستہ خدا پر افترا بندی نہیں کرتا کبھی (معتزلی) نے اس حکم میں فرقہ جبریہ کو داخل قرار دیا اور حسن بصری نے فرمایا کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں۔ بقاعی نے کہا حسن بصری کی اس سے مراد فرقہ معتزلہ (قدریہ) ہے۔ بقاعی نے تشریح آیت کے سلسلہ میں کہا کہ جو شخص دین میں ایسی بات کہے جو قرآن میں ہو نہ حدیث میں نہ اجماع سلف میں وہ بھی آیت کے حکم میں داخل ہے۔ میری نظر میں لفظ کذب کو مقید کرنا ٹھیک نہیں آیت کے حکم میں وہ سب لوگ داخل ہیں جن کے عقائد مشرکانہ اور افکار کافرانہ ہیں۔ اور وہ بھی داخل ہیں جنھوں نے دین تیا

جس حال رکھی ہیں اور خود تراشیدہ عقیدہ و عمل کو تعلیمِ الٰہی قرار دے رکھا ہے ۔قیامت کے دن ان کے عقیدے اور باطن کی سیاہی اُبھر آئے گی اور بیرونی محسوس بن کر چہروں پر چھا جائے گی ۔سیرت کالی تھی صورت بھی کالی ہو جائے گی۔

اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ ۔ ایسے افترا پرداز دروغ باف مغرور متکبر ہیں جو خودی کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں جو اپنی تراشیدہ فکار اور بشری زائیدہ نظامِ زندگی کو خدائی ہدایت کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ تعلیمِ الٰہی کو غیر ضروری سمجھتے ہیں یا ناقص یا اپنے نظریات کو بعینہٖ قانون سماوی جانتے ہیں گویا خدا کی یا تو اُن کو ضرورت ہی نہیں یا وہ قانونِ الٰہی کے مصلح ہیں یا اپنے اندر اوصاف خدا ہونے کے مدعی ہیں یا سارا گروہ سرکش اور مغرور ہے اس کا اصلی مقام جہنم ہے جہاں اس کو ضرور لوٹ کر جانا اور وہیں قرار پکڑنا ہے ۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن متکبروں کو چیونٹیوں کے برابر جسمانیت میں بصورتِ انسانی حشر کیا جائے گا ۔ان کے چھوٹے ہونے کے سبب ہر چیز ان کو روندتی چلی جائے گی بالآخر جہنم کے آتشی در آتشی جیل خانے میں جس کا نام بولس ہے لے جا کر قید کر دیا جائے گا اور دوزخیوں کا نچوڑ پلا دیا جائے گا ۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

وَیُنَجِّی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۔ مذکورہ بالا بہتان تراشیوں کے خلاف جن لوگوں نے دنیوی زندگانی کو میدانِ فوز بنا رکھا تھا یعنی جو ہر قسم کی دروغ بندی اور تہمت تراشی سے بچے رہے تھے جنھوں نے اپنے افکار کو کفر کی آمیزش سے پاک رکھا تھا اور پوری زندگی سیدھے راستے پر بسر کی ان کو قیامت کے دن اللہ ہر عذاب سے محفوظ رکھے گا ۔ہم نے یہ تشریحی مطلب امام رازی کے اتباع میں بیان کیا ہے ۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مفازۃ سے مراد وہ فوزِ سعادت ہے جو ازل سے اللہ نے ان کے لئے مقدر کر رکھا تھا ۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے دنیا کے فانی زندگی میں تقویٰ اختیار کیا تھا ان کے متقی ہونے کا سبب یہ تھا کہ اللہ نے ان کی قسمت میں ازل سے ہی فوزِ سعادت لکھ دیا تھا ان کو قیامت کے دن اللہ نجات دے گا یعنی اللہ نے پہلے سے جن لوگوں کو سعادت مند بنا دیا اور تقدیرِ ازلی کے موافق وہ راہِ مستقیم پر چلے وہ قیامت کے دن عذاب سے محفوظ ہوں گے ۔یہ مطلب بجائے خود دُرست ہو تو ہو ہمیں اس پر اعتراض نہیں تقدیر کے لکھے کے خلاف واقع میں کچھ ہو نہیں سکتا ۔سعادت اور شقاوت ازلی چیزیں ہیں ۔لیکن اس جگہ سیاق کے خلاف ہے ۔یہ مقام مقامِ مدح ہے ۔اللہ نے اپنے نیک بندوں کی کوششوں کو پسند فرمانے کا اظہار کیا ہے اور اسی صلاح و اتقاء کے عوض ان کو عذاب سے محفوظ رکھنے کی صراحت فرمائی ہے اور ازلی سعادت میں اختیارِ انسانی کو دخل نہیں پر اظہارِ خوشنودی کا تقاضا تفسیرِ مذکور کی بنا پر کس طرح پورا ہو سکتا ہے ۔

لَا یَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ حزن یعنی فوتِ مقصد پر غم ۔مطلب یہ کہ مذکورہ بالا اہلِ تقویٰ دُکھ نہیں پائیں گے کوئی ناگواری اُن کو نہ ہوگی ۔اس تکلیف سے محفوظ رہیں گے جس میں کافر مبتلا ہوں گے اور چونکہ ہر مقصد ان کا حاصل ہو جائے گا اور وہ کامیاب ہو جائیں گے اس لئے فوتِ مراد کا غم بھی اُن کو نہ ہوگا ۔

تکلیفیں دو ہی طرح کی ہوتی ہیں ۔دُکھ پہنچنے کی تکلیف اور سُکھ سے محروم ہونے کی تکلیف ۔اول تکلیف دوسری سے سخت ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ دُکھ ان کو چھوئے گا نہیں ۔اور دوسری کے متعلق فرمایا کہ (سُکھ سے محروم ہونے اور زندگی رائیگاں جانے کا) اُن کو غم نہ ہوگا ۔

مقصودِ بیان قیامت کے دن اہلِ کفر کی جو بُری حالت ہوگی اور اہلِ ایمان جس عیش و راحت میں ہوں گے اس کو مجمل بیان کر کے دنیوی زندگی کو سنوارنے سدھارنے اور کفر و معصیت سے پرہیز کرنے کی ضمنی تبلیغ ۔ کَذَبُوْا کا مفعول آیت میں مذکور نہیں علی اللہ کہنے کے بعد اس کی ضرورت ہے ۔آیت میں کذب علی اللہ کی کوئی توضیح نہیں فرمائی ۔کذب علی اللہ کی چوٹی تو یہ ہے کہ خالق کی صفات کسی مخلوق میں یا مخلوق کی صفات خالق میں مانی جائیں یعنی مخلوق کو اتنا بلند کیا جائے کہ خالق کا ہم پلہ قرار دے دیا جائے اور خالق کو اتنا نیچے گرا دیا جائے کہ صفاتِ مخلوق سے متصف اس کو سمجھا جائے ۔دونوں صورتوں میں خالق کی توہین ہوتی ہے ۔کذب علی اللہ کا درمیانی درجہ یہ ہے کہ جس چیز کے کرنے نہ کرنے کا خدا نے حکم نہیں دیا اس کی نسبت خدا کی طرف کی جائے اور اس کو خدائی امر و نہی قرار دیا جائے ۔کذب علی اللہ کی ادنیٰ قسم یہ ہے کہ انسان خود رائی اور استبدادِ عقلی کا شکار ہو جائے اور اپنا نظامِ حیات خود بنانے لگے گویا خودی کو خدائی سے بڑھا کر خدائی اختیارات

طور پر بیٹ سے آیت اس تمام مفہوم کو شامل ہے اور سب کی ضمنی طور پر یاد دلالت کر رہی ہے۔
روسیاہی کا معنی حقیقی بھی ہو سکتا ہے۔ دل کی تاریکی اور باطن کی سیاہی ابھر کر جسم بن کر چہروں کو سیاہ کر دے گی اور ذلت و رسوائی بھی اس سے مراد لی جا سکتی ہے۔
بِمَفَازَتِهِمْ سے متقیوں کی مدح کرنی مقصود ہے کہ ان کی زندگی کے اعمال اُن کے لئے سبب نجات بن جائیں گے اگرچہ نجات دینے والا خود مختار خدا ہی ہوگا۔
وَلَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ الخ سے خفیف اور زیادہ کی دونوں قسموں کی نفی مقصود ہے وغیرہ۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۖ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۝ لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ

اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (اور) اسی کے اختیار میں ہیں کنجیاں آسمانوں اور زمین کی

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ع قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ

اور جو لوگ (اس پر بھی) اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے وہ بڑے خسارہ میں رہیں گے آپ (اُن کے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اے جاہلو کیا پھر بھی تم

اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ

مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کی فرمائش کرتے ہو اور آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن کی طرف بھی یہ (بات) وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اے عام مخاطب

عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝ وَمَا

اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا کام (سب) غارت ہو جائے گا اور تو خسارہ میں پڑ جائے گا (تو اے مخاطب کبھی شرک مت کرنا) بلکہ (ہمیشہ) اللہ ہی کی عبادت کرنا اور (اللہ کا) شکر

قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ

گزار رہنا اور (افسوس ہے کہ) اُن لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہیئے تھی حالانکہ (اس کی وہ شان ہے کہ) ساری زمین اُس کی

بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝

مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں وہ پاک اور برتر ہے اُن کے شرک سے

تفسیر کسی نے کہا خدا کو جزئیات کا تفصیلی علم نہیں کسی نے خدا کو انسانوں کی طرح ایک شہنشاہ قرار دیا۔ ذاتی علم سے بے بہرہ جاسوسوں کا محتاج اور ارکان حکومت کا مزدور دستمند کسی نے اُس کو نر و مادہ اولاد کا باپ قرار دیا اور بیوی کا شوہر۔ کسی نے اس کو چاند سورج اور دوسری نور پاش مشینوں کی طرح ما تا مجبور بے اختیار۔ کسی نے اس میں دوسری مخلوقانہ صفات کا وجود تسلیم کیا اور کسی نے خدائی اوصاف سے بھی خالی تصور کیا کسی نے اس دنیا کے ذرے ذرے میں اس کا حلول اور سرایت و دخول جانا اور کسی نے اس کائنات سے اُس کو بالکل بے تعلق اور بیگانہ سمجھا۔ غرض اختلاف فکر و نظر انسانی ذہنوں کو تاریکی اور نابینائی کے اُس گہرے اتھاہ غار میں گرا گیا کہ جس میں پہنچ کر نہ خدا خدا رہا، نہ ناخدا ناخدا، خدائی اقتدار بشری ظلمت افکار میں گم ہو گئیں۔ جبر و قدر تجسیم اور تشبیہ کے عقائد مذہبی سے بنے۔ دہریت اور انسانی انانیت و کبریائی کی بنیاد اسی جگہ سے قائم ہوئی

یہ افترا بندی یہ بہتان تراشی، یہ خود رائی اور برخود غلطی اور یہ انانیت وکبریائی صرف نادانی اور تاریکی کی ناپیدا کنار وادیوں میں سرپٹ دوڑنے کی وجہ سے بروئے ظہور آئی اور جن لوگوں نے اس الزام تراشی اور استبداد عقلی سے اپنے کو بچائے رکھا وہ کامیاب رہے۔ نور و عرفان سے اُن کے سینے منور ہو گئے۔ بالکل کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ الوہیت کو ہی سرچشمہ ایجاد ہونا چاہیئے۔ دنیا میں کوئی چیز کسی کے لئے اچھی ہو یا بری تم اُس کو خیر کہو یا شر یہ توافقات ہیں، تعلقات اور انتسابات ہیں جو نام چاہو رکھ لو۔ الفاظ کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدلتی، صداقت ایک ہی ہے کہ ہر چیز خدا نے ایک خاص انداز کے ساتھ بنائی ہے، بناتا ہے اور بناتا رہے گا۔

وہی کائنات کے ذرہ ذرہ کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور لا رہا ہے اور لاتا رہے گا۔ کوئی خالق نہیں۔ یہ کائنات کسی دوسرے کے دستِ ایجاد کی ممنون نہیں۔ نہ کسی کو تخلیق میں دخل ہے۔ نہ خدائی تخلیق سے کوئی چیز باہر ہے اور یہ بھی اٹکل صداقت ہے کہ ہر چیز کی تخلیق یونہی بے سوچے سمجھے اور بغیر کائناتی نظم کے لحاظ کئے ہوئے نہیں ہوگئی۔ عرشِ بریں سے فرشِ زمین تک ہر چیز آئیڈیل ہے اور ہر شے کی پیدائش ایک ضابطہ سے بندھی ہوئی ہے۔ ہر شے دوسری شے سے مربوط ہے اور ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ۔ غرض کیفیت کمیت ہیئت وضع مکانیت اور تمام احوال میں کسی چیز کا دوسری چیز سے نامناسب جوڑ نہیں ہے۔

دوسری واضح حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا وکیل ہے۔ الوہیت منبع بقا ہے۔ وہی ہر چیز کا محافظ اور نگراں ہے۔ یہ سارا نظم تکوینی ایک نگراں آنکھ کی زیرِ نگرانی انجام پا رہا ہے۔ پیدا کرنے کے بعد خدا نے کسی کو آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ سب سے اونچے ستارہ کا شکم زمین کے اندر سب سے چھوٹے ذرے سے ارتباط اور ہر گل و خار کا عرشِ بریں سے اندرونی تعلق ہر لمحہ ایک غیبی ناظم کی زیرِ حراست ہو رہا ہے۔ گویا یہ کل سنسار ایک انجن ہے جس کے ہر پرزہ کا دوسرے پرزہ سے ربط ہے۔ ربط کی کیفیت ضرورت اور حالت اور کارگزاری انجن بنانے اور نصب کرنے والے کی دیدبانی کی حدود کے اندر انجام پا رہی ہے۔ ایک بیدار آنکھ سب کو دیکھ رہی ہے۔ تیسری حقیقت یہ بھی مسلّمہ ہے کہ الوہیت کا استحقاق اُسی کو ہو سکتا ہے جو کائنات کا مالک ہو، آسمانوں اور زمینوں کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہو، تمام کائنات کے خزانے اُسی کے دستِ تصرف میں ہوں اور اُسی کے پاس کل عالم کی کنجیاں ہوں، اسی کا حکم جاری اور ساری ہو، اسی کا قانون نافذ ہو، اس کے فرمان سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔ یہ ہیں وہ حقائق ثابتہ جن کا انکار سوائے نادان اور احمق کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ ہیں اللہ کی الوہیت کی وہ نشانیاں جن کا انکار موجب زیاں کاری ہے۔ واقع میں یہ استمراری ضابطہ ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے بڑے سے بڑا پیغمبر بھی اگر خدائی اوصاف میں کسی مخلوق کو شریک سمجھنے لگے بلکہ شرک کی کوئی آمیزش اس کے فکر و نظر میں پیدا ہو جائے تو پھر ہر نیکی بیکار ہے۔ نیکی بجائے خود نیکی صحیح لیکن جب بنیاد صحیح نہیں اور اساسی فکر درست نہیں تو ہر عمل کا سرچشمہ جہالت ہے، وحدت الوہیت کے اقرار کے بعد اقرار نما عمل کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ نیت مشرکانہ کے بعد عمل فرماں بردارانہ کسی اجر کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے نیست سے ہست کیا۔ عدمِ محض سے وجود میں لایا۔ منفی سے مثبت بنایا۔ لاشے کو تقرر پھر تعدد پھر ثبوت پھر وجود کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا اس کے بعد قدم قدم پر ہر آن غیبی اسباب کو حرکت میں لا کر نگرانی کی۔ آدمی کے ایک ایک سانس کے لئے ثریٰ سے ثریا تک ہر ذرہ کو دوسرے ذرہ سے اور ہر برقی لہر کو دوسری برقی لہر سے وابستہ کیا اور اس کی دیدبانی رکھی تاکہ کہیں نظمِ کائنات کا یہ رشتہ بیچ میں سے ٹوٹ کر حیاتِ انسانی کے شیرازہ کے انتشار کا باعث نہ بن جائے۔ سورج کی چمکتی شعاعیں چاند کے خنک پھوارے ستاروں کی تابناک کرنیں تپتے ریگستان جھلستے میدان موجزن ناپیدا کنار سمندروں کے ان گنت قطروں کا مربوط تسلسل بہار و خزاں کا تبادل لیل و نہار کا تعاقب نسیم و سموم کا تغیر اور تمام کائناتی تصرفات و انقلابات آدمی کے رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لئے بپا کئے اور کروڑوں ستاروں کی کہربائی لہریں انسان کی بقائے زندگی کا ذریعہ بنیں۔ کیا یہ مقامِ شکر نہیں۔ کیا ان انعامات غیبی نعمتوں کا دینے والا کوئی اور ہے۔ کیا ایسے منعم مہربان کی موجودگی میں کسی دوسرے کے دروازے پر سر جھکایا جا سکتا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ جس کا حکم ازل سے ابد تک رواں، فرماں اور شاداں ہو کر اختیاراً اور اضطراراً ساری کائنات مان رہی ہے اور اس کے فرمان پر چل رہی ہے انسان اس سے سرتابی کرے اور کسی دوسرے کی اطاعت کرے یہ تو سراسر خسران اور ٹوٹا ہے۔ پیغمبر کی جلالتِ شان بھی اس خسارے سے اس کو نہیں بچا سکتی۔ دوسروں کا ذکر ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے اللہ کی عظمت شان کا لوگوں نے صحیح اندازہ نہیں کیا۔ وہ خدائی جلال کو سمجھے ہی نہیں، انہوں نے اللہ کی ہمہ گیر قدرت کو مانا ہی

ان کے فہم کی اس درجہ تک رسائی ہی نہیں ہوئی کہ جس خدا کے ہاتھ میں حقیر ترین چیز کی طرح قیامت کے دن تمام زمین آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے جو آن کی آن میں تمام کروں کو توڑ مروڑ کر رکھ دے گا۔ اس کی قوتِ قاہرہ کے سامنے انسان کی کیا ہستی اور کیا عدم۔ آہ کافر نعمت انسان اس کے متعلق کیسی کیسی بہتان تراشیاں کرتا ہے جن سے اس کا دامنِ الوہیت بالکل پاک ہے۔

تحلیل اجزاء

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ۔ گزشتہ آیت میں کافروں کو ترہیب اور مومنوں کو بشارت دی تھی اور آسمانی کتابوں کا طرزِ تبلیغ ہے بھی یہی کہ اطاعت گزاروں سے انعام کا وعدہ کیا جاتا ہے اور نافرمانوں کو عذاب کی وعید دی جاتی ہے۔ اس آیت سے استحقاقِ الوہیت کی تین تکمیلی دلائل کو بصورتِ اخبار بیان کرنا شروع فرمایا۔ دلائل کا خلاصہ ہم آگے لکھیں گے۔ اس جملہ میں دو لفظ تحقیق طلب ہیں (۱) خالق (۲) شیٔ۔

خلق ایک خاص اندازے کو کہتے ہیں یعنی اللہ ہی ایجاد کرنے والا اور اس کی ایجاد ایک خاص اندازہ کے تحت ہے وہ بے اختیار یا بالسلم موجد نہیں۔ مطلب یہ کہ خدا صاحبِ ارادہ مالک اختیار اور عالم کل ہے۔ اس نے ہر چیز کا پہلے سے اندازہ کر لیا ہے پھر اپنی علمی ہمہ گیری اور محیط کل اختیار کو کام میں لا کر اشیاء کی ایجاد کی جس کے لئے جن تکمیلی اجزاء اور لازمی یا تحسینی کیفیات ہیئت اور وضع کی ضرورت تھی۔ انہی اجزاء کیفیت رنگ شکل اور فوائد کے ساتھ اس چیز کو بنایا نہ لوازم اور ضروریات میں سے کسی حصہ کو ترک کیا نہ غیر ضروری بیکار کمیت اور کیفیت کی بھرتی کی غرض یہ کہ وہ عالم کل بھی ہے مختار مطلق بھی، حکیم کامل بھی، صاحبِ ارادہ و مشیت بھی اور قدرتِ رسا کا مالک بھی۔ باپ عدم سے وجود میں نہیں لاتا نہ آئندہ پیدا ہونے والی اولاد کی کمیت کیفیت اتحاد مزاجی اور سعادت و شقاوت سے وہ واقف ہوتا ہے اس لئے خدا باپ نہیں ہو سکتا۔ نہ خدا سورج کی طرح بے اختیار و لاعلم منبع نور ہے نہ بے شعور فرض انجام دینے والی مشین، نہ دنیوی بادشاہوں کی طرح محتاج کمزور اور دوسروں کا دست نگر۔

(۲) کُلِّ شَیۡءٍ۔ معتزلہ جہمیہ اور خارجیہ نے کہا کہ انسان اپنے افعال کی خود تخلیق کرتا ہے۔ گویا ان بے دانشوں کی نظر میں دو خالق ہیں انسانی افعال کا خالق خود انسان ہے اور باقی اشیاء کا خدا۔ ان کے اور مانویہ یا ثنویہ کے قول میں معمولی فرق ہے۔ دو خالق ہونے کے دونوں گروہ قائل ہیں لیکن ثنویہ ظلمت و شر کو اہرمن کی تخلیق کہتے ہیں اور نور و خیر کا خالق یزداں کو قرار دیتے ہیں لیکن جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ خود انسان کو خالق شر مانتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندو بھی تعدد خالق کے قائل ہیں۔ رہے پرانے یونانی فلاسفر وہ تو تخلیق کے قائل ہی نہیں کائنات کو مجعول کہتے ہیں مخلوق نہیں کہتے۔ امکان اور حدوثِ ذاتی کے ضرور قائل ہیں مگر اسی کے ساتھ سب سنسار کو قدیم الزمان کہتے ہیں۔ باقی دیمقراطیس اور دوسرے دہریت پرست وہ تو کسی علتِ واجبہ فاعلہ کے قائل ہی نہیں۔ نیرنگی اطوار اور حدوثِ ناپیدا کنار کو خود بخود نیچرل اور طبعی قرار دیتے ہیں۔ کیسا خالق۔ کہاں کا جاعل اور موجد ہر چیز خود رو ہے۔ کائنات کی گول زنجیر حلقہ در حلقہ ہے۔ ہر حلقہ کا نظر سے غائب ہونا دوسری کڑی کے نمودار ہونے کی علت ہے اور یہ سب کچھ اتحادِ طبیعت کے زیرِ اثر ہو رہا ہے۔ قرآن نے مذکورہ بالا دو لفظوں میں اپنے نظریہ کا اعلان کر دیا اور ظاہر فرما دیا کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے پھر خالق کا لفظ استعمال کر کے یہ بتا دیا کہ ماضی اور مضارع دونوں اس کی تخلیق کی حدود ہیں۔ ماضیات کو بھی اسی نے پیدا کیا اور استقبالیات کو بھی وہی پیدا کرے گا۔

وَّ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ۔ یہ دلیل کا دوسرا ٹکڑا یا دوسری مستقل دلیل ہے۔ کیا تخلیقِ کائنات کے بعد خدا غیر متعلق اور آزاد ہو گیا۔ وجود کی قدرت عمومی اور فاعلیتِ ارادہ کی طاقت اللہ نے انسان کو عطا کر دی۔ قوتِ تمیز و عرفان بھی دیدی۔ اسی طرح ساری کائنات کو اس کی نوعی خصوصیات کی طاقتیں عنایت کر دیں۔ قوتِ حافظہ للترکیب قوتِ منمیہ قوتِ حاسیہ اور محرکہ ارادیہ وغیرہ اس کے بعد خدا سے کائنات کا کوئی تعلق نہیں رہا یہ خیال دنیا کے کوتاہ نظر اہل عقل کا ہو تو ہو، معتزلہ وغیرہ اسلامی فرقے بھی فلسفیانہ الجھاؤ میں پھنس کر ژولیدہ عقل بن جائیں تو بن جائیں، شیو و بشنو اور برہما کے بجاری تفریق فرائض کے قائل ہوں تو ہوں، قرآن کی تھیوری ان کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک اللہ نے سب کو بنایا اور اونچے آسمانوں کے شہابی ستاروں سے لے کر زمین کے پیٹ اور سمندر کے قعر میں رینگنے والے خوردبینی کیڑوں تک کوئی بھی اللہ کی نگرانی اور دیدبانی سے باہر نہیں۔ ایک دیدبان بیدار آنکھ سب کو دیکھ رہی ہے پہاڑوں اور ستاروں کا ٹکنا ڈوبنا، چھپنا اور نمودار ہونا، پیچھے ہٹنا اور آگے بڑھنا فضائی لاتعداد صور کا انار

وغیرہ اور تالاب، سمندروں اور دریاؤں کے ان گنت قطروں کی مسلسل مربوط حرکت اور بناؤ بگاڑ، ریگستانوں اور بیابانوں کے بیشمار چمکیلے ذروں
کی بے نظیم اور حرکت و سکون کررہا کرور درختوں کے ان گنت ریشوں سوتوں رگوں اور پتیوں کی تری خشکی نموذبول اور شادابی و پژمردگی، غرض ہر
ذرّہ کائنات کی ہر حرکت اور ہر حرکت کا نتیجہ پھر ہر نتیجہ کا لاکھوں نتائج در لیل ہونا اللہ کی زیرِ حفاظت ہو رہا ہے کیا صحیح نہیں ہے۔ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ الخ۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا الخ۔ مَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ الخ۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ الخ۔ هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اگر وہ ایک آن غافل ہو جائے تو سارا کائناتی نظام درہم برہم ہو جائے۔ سچ ہے کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ مادے کی
ہیئت نہ اس سے پوشیدہ ہے نہ فعال طاقتوں کی فعالیت اس کی نگاہ سے بچی ہوئی ہے۔ نہ تصورات کی موجیں اس کی نظر سے غائب ہیں اور نہ قلبی
معرفت کی نیرنگی اس سے اوجھل ہے۔

لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ دلیل کا تیسرا حصہ یا مستقل تیسری دلیل ہے۔ صاحب کشاف نے کہا ہے کہ مقالید عربی لفظ نہیں عربی
مستعمل ہے۔ اگر عربی ہو تو اس کا مفرد مقلید یا مقلد ہوگا۔ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے بے شمار غیبی خزانے چھپے ہوئے ہیں جن پر قدرتی قفل
لگے ہیں اور کنجیاں اللہ کے دستِ تصرف میں ہیں۔ وہ جس کو جتنا چاہتا ہے اپنے خزانے میں سے دیتا ہے۔ کوئی پودا خشک ہے کوئی تر کوئی نونہال
کوئی نسردہ پژمردہ۔ کسی پتھر میں سونے چاندی ہیرے یاقوت اور نیلم و پکھراج کا انبار ہے، کوئی تیزاب اور شوراب کا دفن، کوئی زمین بنجر ہے کلر ہے
ریگ ہی ریگ ہے۔ ناقابلِ روئیدگی کوئی شاداب ہے سرسبز اللہ کے نور سے روشن۔ اسی طرح حیوانوں اور انسانوں میں صحت و مرض طاقت و ضعف
حسن و قبح عزت و ذلت سیادت و نکبت حکومت و غلامی علم و جہالت ایمان و کفر نیکی اور بدی کی تقسیم ہے۔ اللہ کے تصرف و حکم کی کنجی غیبی تالوں کو کھول کر
حسبِ مشیت جس کو جتنا اور جو چاہتی ہے دیتی ہے۔ خود آسمان اور زمین کے اندر کی موجودات غیبی تقسیم سے بے نیاز نہیں۔ ان گنت ستاروں کی
نور ریزیاں اور شعاع ریزیاں اور زمین کے اندر فتنہ انگیزیاں ہلاکت خیزیاں یا حیات آفرینیاں اور راحت آگینیاں الٰہی خزانوں کی ممنون بکرم ہیں۔
مخشری نے کشاف میں ایک اثر نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان کی مرفوع روایت ہے۔ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ یہ کلمات ہیں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ بِیَدِهِ الْخَیْرُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ الخ۔ ابن کثیر نے بھی اس اثر کو نقل کیا ہے اور غریب منکر قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابو یعلیٰ بھی اس کے ناقل ہیں۔ شیخ
بغوی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی اصل ضرور ہے۔ کیونکہ ابو الحسن قطان اور قاضی ابو یوسف اور ابن سنی اور ابن مردویہ اور ابن منذر نے بھی متعدد
سندوں سے حضرت عثمان سے اس کی روایت کی ہے۔ حاصلِ دلیل یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات نگرانی اور حفاظت اور کامل تصرف و حکمرانی اللہ کا کام ہے
کسی دوسرے نے اس کی تخلیق کی ہے نہ کوئی اور محافظ اور حکمران ہے۔ نہ کسی کے پاس کائناتِ غیبی کے خزانوں کی کنجیاں ہیں کہ جس کو جتنا چاہیں دیں
اور خیر و شر کی اپنی مرضی سے تقسیم کریں۔ اس لئے الوہیت اور معبودیت کا اختیار و استحقاق بھی اللہ ہی کو ہے اللہ کی الوہیت کی یہ واضح نشانیاں ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ ایسی کھلی ہوئی نشانیوں کا انکار موجب زیاں کاری و خسران مآلی ہے۔ اتنی واضح
دلائل الوہیت کا انکار کرنے والے ہی زیاں کار ہیں کیونکہ خلق ملک ملک اور حکم جب سب کچھ خدا کا ہے تو اگر کسی اور کو معبود قرار دیا جائے اور معبودی
کا مستحق مان لیا جائے تو اس سے سوائے نقصان اور کیا حاصل ہوگا۔ جب کسی کے پاس خود ہی کچھ نہیں تو دوسرے کو وہ کیا دے سکتا ہے۔ محتاج
خود دوسرے بھوکے کا کس طرح پیٹ بھر سکتا ہے مُردہ مُردے کو کس طرح زندہ کر سکتا ہے۔ سوتا سوتے کو کیسے بیدار کر سکتا ہے۔ لولا لنگڑا دوسرے
کے سہارے سے کیونکر رواں دواں بنا سکتا ہے جو خود ہی معذور نادار اور بے بہرہ ہو اس کا بھروسہ رکھنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں جو
لوگ الوہیت تصرفِ تام حکومتِ کاملہ ملکیتِ عامہ اور ربوبیتِ شاملہ کے منکر نہ ہوں آغازِ کار میں خواہ وہ کچھ دکھ میں ہوں لیکن مآل کار ان کا اچھا
ہوگا کیونکہ ان کی عقل کا دیوالہ نہیں نکلا، علمی بضاعت تباہ نہیں ہوئی، فکری بے مایگی نے ان کا احاطہ نہیں کیا اس لئے عملی کوتاہی ان کو کامل طور پر تباہ کار
و خسران مآل نہیں بنا سکتی۔ راس المال باقی ہے تجارت کے اصول سے واقف ہیں معاملات کی کجروی نفع میں عارضی کمی کر سکتی ہے لیکن زیاں کار
و خسران مآل نہیں بنا سکتی۔ ہم نے اتنی طویل تشریح اس لئے کی کہ مسلمانوں میں سے بعض فرقے گناہوں پر جرأت دلانے کے قائل ہیں اور ایمان کی موجودگی

ہیں کسی گناہ کو موجب عذاب نہیں جانتے، اور عدم شرک کی حالت میں ان کی نظر میں ہر گناہ مغفور ہے۔ یہ لوگ اپنے مطلب کو ثابت کرنے کے لیے مذکورہ بالا آیت کی طرح مختلف آیات واحادیث پیش کرتے ہیں اور خوارج و معتزلہ کے رد میں جن کے نزدیک ہر گناہ کبیرہ ایمان سے خارج کر دیتا ہے، اتنا غلو کرتے ہیں کہ ان کو امت اسلامیہ کی عملی تباہی کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جن آیات واحادیث میں کافروں ہی کو زیاں کار اور مسلمانوں کو قطعی نجات یافتہ کہا گیا ہے وہ تمام آیات واحادیث صحیح ہیں مگر ان میں زیاں کاری سے مراد کامل خسران اور نجات سے مراد آخری نجات ہے۔ ابتدائی نجات اور ہر دکھ سے برارت کا سارٹیفکیٹ کسی گنہگار مسلمان کو نہیں دیا گیا۔ (بل هو الاضلال مبین)

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ابن ابی حاتم نے بروایت ابن عباس بیان کیا کہ ایک مرتبہ قریش کے سردار جمع ہوئے اور مشورہ کے بعد حضور کی خدمت میں پیام بھیجا کہ اب آخری بار ہم حجت تمام کرتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ ہم چندہ کر کے اتنا مال آپ کو دے سکتے ہیں کہ پھر آپ سے بڑا مالدار کوئی نہ ہوگا اور قریش کی جس لڑکی یا جن عورتوں سے آپ نکاح کے خواستگار ہوں گے ہم ان سے آپ کا نکاح بھی کرا دیں گے اور آپ کو اپنا سردار بھی مان لیں گے اور آپ کے پیچھے پیچھے بھی چلیں گے۔ حضور والا نے اس پیام کو سن کر فرمایا میں وحی کا تابع ہوں۔ اس پر سورۃ کا نزول پوری نازل ہوئی اور آیت اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ کا بھی نزول ہوا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ خدا کے علاوہ دوسروں کی پرستش جہالت ہے تم لوگ نادان اور جاہل ہو کہ خدا کے ہوتے ہوئے دوسروں کی پوجا کرتے ہو تو کیا مجھے بھی اسی جہالت کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہو۔ میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ میرے پاس تو اللہ کا حکم آچکا ہے بلکہ مجھ سے پہلے بھی جتنے پیغمبر گزرے ہیں سب کو یہ حکم مل چکا ہے کہ اگر تم نے کسی قسم کا شرک کیا خدائی ذات اور صفات میں کسی کو خدا کا ساجھی سمجھا یا خدا کے اندر مخلوقانہ اوصاف کو مانا تو تمہارے تمام اعمال (خواہ کیسے ہی اچھے اور تعمیری ہوں) مٹ جائیں گے، اکارت جائیں گے، نابود جائیں گے اور زیاں کاروں بد کاروں تباہ کاروں کے گروہ میں تمہارا بھی شمار ہوگا۔

اس آیت میں اشرکت کا مفعول مذکور نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک کرو یا مخلوق کے ساتھ خدا کو، بہر حال کسی طرح کا شرک کرو، یقیناً اعمال کو تباہ کرنے والا ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ بعض مخلوق کے اندر صفات خداوندی کے حلول کے قائل ہیں۔ اگرچہ برائے نام وہ ظہور کا لفظ زبان پر لاتے ہیں۔ اور خاص انسانوں یا فرشتوں یا غیبی کارندوں کو مظہر صفات قرار دیتے ہیں یا بعض ستاروں سیاروں اور عناصر کو جلوہ گاہ خداوندی کہتے ہیں مگر حقیقت میں اعتقاداً وہ حلولیہ ہیں اور بعض صفات خداوندی کا حلول بعض مخلوق میں مانتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کو مکاتیب انبیاء قرآن مجید اور احادیث مقدسہ میں ایسے ظاہری الفاظ بھی مل جاتے ہیں جن کو پڑھ کر وہ حلولی عقیدے کا استنباط کر لیتے ہیں۔ مثلاً مکتوب حبقوق کے تیسرے باب کا تیسرا جملہ ہے خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔ یا قرآن میں آیا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى یا فرمایا ہے۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ اسی طرح احادیث قدسیہ میں بھی بعض اشتباہی کلمات آئے ہیں۔ ان سب سے وہ بعض انسانوں میں خدا کی ذات یا بعض صفات حلول کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس طرح مخلوق کو صفات میں خالق کا شریک بنا دیتے ہیں۔

کچھ لوگ خدا کے اندر مخلوقانہ صفت کے قائل ہیں۔ ان کو بھی اپنا مدعا حاصل کرنے کے لئے کچھ ظاہری الفاظ مل جاتے ہیں پہلی آسمانی کتابوں میں بھی اور قرآن واحادیث میں بھی اللہ کی داڑھی ہے یا اس کی شکل امرد کی ہے وہ عرش پر آرام کر رہا ہے، یا چھ دن میں مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن اس نے عرش پر آرام کیا یا قرآن میں وجہ اللہ ید اللہ جنب اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح پچھلی رات کو آسمان دنیا پر اللہ کے نزول کا ذکر آیا ہے۔ قیامت کے دن رحمٰن اپنا قدم دوزخ میں رکھے گا وغیرہ۔ اس سے ظاہر پرستوں کو تجسیم اور تشبیہ کا عقیدہ رکھنے کا موقع مل گیا اور علمی بے مائگی کے سبب انہوں نے مجازات استعارات اور کنایات کا دروازہ بند کر کے الفاظ کو ظاہری معانی پر محمول کیا اور اس طرح خدا کو مخلوقانہ اوصاف میں شریک بنا دیا۔ آیت میں لفظ اشرکت تمام اقسام شرک کو شامل ہے، خواہ خالق کو مخلوق کا شریک بنایا جائے یا مخلوق کو خالق کا۔ اسی تعمیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی خاص مفعول کا آیت میں ذکر نہیں فرمایا۔ خوب سمجھ لو کہ خدائی صفات کا کسی مخلوق میں حقیقی ثبوت ماننا جس طرح شرک ہے اسی طرح

مخلوق کی صفات کا خدا میں حقیقی وجود بھی کم شرک نہیں۔ کوئی مخلوق خالق نہیں، مالک نہیں، آئین ساز نہیں، حکمران نہیں۔ اگر ان صفات کی جھلک کسی مخلوق میں پائی جاتی ہے تو حقیقۃً مجازاً۔ اسی طرح تجسم تشکل تلون اور مادہ و مدت کی حدود میں محدود ہونا زمان و زمانیات اور مکان و مکانیات کی قیود میں باندھا جانا مخلوق کی خصوصی صفات ہیں جن سے اللہ پاک ہے۔ اگر کہیں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں صفاتِ خلقیہ کی جھلک نظر آ رہی ہے تو ان کا اطلاق حقیقی نہیں اور استحالۂ حقیقت کی صورت میں مجاز کی طرف رجوع ممنوع ہے۔

حبطِ اعمال کا اکارت جانا اور نتیجہ خیز نہ ہونا تو اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اعتبار انجام کا ہے آغاز کا نہیں اور عمارت کی راستی کا مدار بنیاد کی راستی پر ہے۔ اول تو جس ... کی بنیاد کج ہو اور خود رائی پر تاسیس ہو وہ نیکی نہیں خیر نما شر ہے اور اس کو خیر بھی مان لیا جائے تو اصطلاحی عرفی خیر ہے واقعی حقیقی خیر نہیں۔ سوسائٹی کے دربار سے قانونی فسق و فجور کا جواز اور آئینی قمار و شراب کی حلت اور ان چیزوں کی واقعیت کو نہیں بدل سکتی۔ جب فکری اساس غلط ہے اور مخلوق کو اٹھا کر خالق کی کرسی پر بٹھانے یا خالق کو گرا کر مخلوق کی صفت میں پہنچانے پر جن اخلاقِ اعمال کی بنیاد ہو وہ بہرحال ضعیف البنیان بلکہ پا بہوا ہوں گے جو کسی طرح سود مند نہیں ہو سکتے۔ مجسّم نجاستِ غلیظہ کو دنیا کے کل سمندر اور آبشار بھی پاک نہیں کر سکتے۔ آیت میں بہت قوت اور پختگی کے ساتھ حبطِ عمل کو ظاہر فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے خاسرین کے ساتھ بالکل مساویانہ حیثیت میں شمار کیا ہے۔ بالفرض اگر نبی سے بھی شرک صادر ہو جائے تو نہ فقط یہ کہ اس کا نام دفترِ نبوت سے مٹا دیا جائے گا بلکہ سابقہ نبوت اور گزشتہ زمانہ بزرگی اور جلالتِ شان کا لحاظ کئے بغیر کافروں کے گروہ میں داخل کر دیا جائے گا۔

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ نفی کے بعد اثبات ضروری ہے۔ عبد کے لئے عبدیت بہرحال لازم ہے اور اظہارِ عبودیت کے بغیر بھی چارہ نہیں۔ پس جس طرح دوسروں کو معبود قرار دینا جرم ہے اسی طرح اصل معبود کو معبود نہ سمجھنا جرم ہے اور جس طرح دوسروں کی پرستش کرنا موجبِ خسران ہے اسی طرح اصل معبود کی پرستش نہ کرنا موجبِ کفران ہے۔ وجود عطا کرنا پھر آئینِ حیات کی تعلیم دینا اور ہر وقت حفاظت اور نگہبانی کرنا اتنی بڑی نعمت ہے جس سے بڑا احسان ممکن نہیں اس لئے شکر ادا کرنا لازم ہے اور وہ شکر صرف زبانی نہیں بلکہ ہر بُن مُو سے تن اور دھن سے، حرکت اور سکون سے ہر تصور و تصدیق کی لہر اور ہر قلبی وجدان و عرفان سے غرض اللہ ہی کے سامنے ہر قسم کا تذلل اور اسی کے احکام کی پابندی اور اسی کے ہر فرمان کے سامنے سرافگندگی ضروری ہے۔ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور شکر ادا کرو کہ اس نے اپنا بندہ بننے اور بندگی کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ شیخ حسین اور سہل تستری کا قول ہے کہ عبودیت ہی آخری کمال اور موجبِ عزت ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ۔ جنھوں نے مخلوق کو بڑھا کر خالق کے ساتھ جا بٹھایا، یا خالق کو گھٹا کر مخلوق کے ساتھ لا ملایا۔ انہوں نے اللہ کی قدرت جلال عظمت اور اوصافِ کمال کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ بروایت ابن کثیر بقولِ مجاہد یہ آیت قریش کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر عرض کیا ہم کو معلوم ہوا ہے کہ اللہ تمام آسمانوں کو ایک انگلی پر رکھے گا اور زمینوں کو ایک انگلی پر اور درختوں کو ایک انگلی پر اور تمام بحر و بر کو ایک انگلی پر اور باقی مخلوق کو ایک انگلی پر۔ پھر فرمائے گا کہ میں بادشاہ ہوں۔ حضورؐ والا یہ بات سن کر مسکرا دیئے کہ اگلے دندانِ مبارک نمودار ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الخ۔ (رواہ احمد ومسلم والترمذی والنسائی وقد نقلہ ابن کثیر عن البخاری) شاید حضورؐ نے اس یہودی کی جہالت پر تبسم فرمایا ہو کہ اس نے اپنی رائے سے اللہ کے ہاتھ کی انگلیاں شمار کر کے ہر انگلی پر ایک خاص مخلوق کی برداشت کا ذکر کیا جو حقیقت میں بے اصل بات تھی اور ظاہری مجمل الفاظ کو دیکھ کر وہ شخص تفصیلی تجسیم و تشبیہ میں پڑ گیا اور اس نے بالکل خدا کے ہاتھ کی خصوصیات انسانی ہاتھ کی طرح سمجھ لیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس کی روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ تشریف فرما تھے ایک یہودی ادھر سے گزرا اور حاضر ہو کر اپنے کلمہ کی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا بس روز اللہ آسمانوں کو اس انگلی پر رکھے گا اور زمین کو اس انگلی پر اور پہاڑوں کو اس انگلی پر (غرض تفصیلاً) وہ بات کہتے وقت اپنی ہر ایک انگلی کی طرف اشارہ کرتا جاتا تھا۔ ابوالقاسم بتائیے آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے آیت وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ الآیۃ نازل

فرمائی۔ (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح)

حضرت ابن عباس کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ یہودی کے جواب میں نازل ہوئی اور حضرت ابن مسعود کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ پہلے سے نازل شدہ تھی۔ حضورؐ نے یہودی کے جواب میں تلاوت فرمادی تھی۔ غالباً یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ سورۂ زمر مکی ہے یا یہ کہا جائے کہ اس آیت کا دو مرتبہ نزول ہوا۔

حضرت ابوہریرۃؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضورؐ والا فرمارہے تھے کہ اللہ زمین کو مٹھی میں اور آسمانوں کو تہہ کرکے اپنے دستِ راست میں لے کر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں (آج) وہ زمین والے بادشاہ کہاں ہیں۔ (بخاری و مسلم) نقلہ ابن کثیر۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضورؐ والا نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ ان زمینوں کو ایک انگلی پر اور سب آسمانوں کو یمین (دایاں ہاتھ) پر رکھ کر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں (بخاری و مسلم) صحیح مسلم میں یہ روایت طول سے ہے۔ نسائی ابن ماجہ اور بزار نے بھی اس کو روایت کیا ہے طبرانی نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے لکھا ہے اور صحیح ہونے کی صراحت کی ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ آسمان و زمین کے مقبوض ہونے کی صراحت سے مجسمہ اور مشبہ جیسے گمراہ فرقوں کو اپنے اوہام کی وادی میں سرگرداں پھرنے کا موقع ہاتھ آسکتا تھا اور جسم و جسمانیات کی مشابہت کا اس جگہ سے استخراج کرسکتے تھے اس لئے ان کے وہم کو دور کرنے کے لئے اس آیت میں اپنی تنزیہ و تقدیس ظاہر فرمائی اور اعلان فرمایا کہ اللہ ہر مخلوق کے نقص و لگاؤ سے پاک ہے۔

خطیب نے شیخ ابوسلیمان خطابی کا قول نقل کیا ہے جو اس موقع پر نہایت لطیف ہے کہ آیت میں جو لفظ یمین آیا ہے اس سے یسار کا وہم نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہاں یمین کا وہ مفہوم نہیں ہے جس کا مقابل یسار ہے۔ اللہ کے متعلق ہاتھ یا انگلی یمین سے یہ دھوکا ہی نہ کھانا چاہئے کہ اللہ کے یہ اعضاء ہیں اس لئے صحیح حدیث میں آیا ہے۔ كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ۔ اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ اس حدیث سے ظاہر ہورہا ہے کہ یمین سے دست اور جسمانی عضو مراد نہیں ہے۔ ورنہ دونوں ہاتھوں کے یمین ہونے کے معنی ہی کیا ہوسکتے ہیں۔ انتہی۔

سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ اللہ نے قرآن میں جو کچھ اپنے اوصاف بیان فرمائے ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے ہم اپنے باطل اوہام کو ان میں دخیل نہیں بناتے اور نہ اپنی رائے سے تاویل کرتے ہیں۔

محاکمہ صفات کے متعلق ذیلی طور پر ہم اس جگہ مجبوراً مختصر تشریح کرنی چاہتے ہیں۔ اہلِ اسلام میں سے کچھ لوگ تو خدا کی ذات کو تمام صفات سے خالی خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا حکیم ہے بغیر حکمت کے سمیع ہے بغیر سمع کے بصیر ہے بغیر بصارت کے یہاں تک کہ موجود ہے بغیر صفتِ وجود کے۔ یہ لوگ چونکہ واجب اور قدیم کے تعدد کے شبہ سے بھی بچنا چاہتے ہیں اور تعدد صفات کی تقدیر پر تمام صفات واجب اور قدیم ہوں گی اس لئے انہوں نے نفی صفات کی صراحت کی لیکن صفات پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں اور مختلف صفات سے جو مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں اُن افعال کا سرچشمہ انہوں نے تنہا ذاتِ الٰہی کو قرار دیا اور صاف کہہ دیا کہ اللہ کی ذات مختلف افعال کے صدور کا منبع ہے صرف حیثیات کا اختلاف ہے اور حیثیت و اعتبار کے اختلاف سے افعال کا باہمی اختلاف ہوتا ہے۔ یہ بحث بہت دقیق اور طویل ہے۔ ہم نے مجمل خلاصہ نقل کردیا۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ خدا کی صفات متعدد ہیں۔ ہر ایک کا مفہوم جدا جدا ہے۔ اگرچہ مصداق ایک ہی ہے اس لئے نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات یا یوں کہو کہ عین بھی ہیں اور غیر بھی۔ یہ تو عام صفات کے متعلق اختلاف تھا۔ باقی وہ صفات جن سے بظاہر جسمانیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُن کی توضیح تین طرح سے کی گئی ہے اور ہر فرقہ کا ایک قول ہے

(۱) اللہ کے تمام اعضاء ہاتھ پاؤں انگلی پہلو چہرہ آنکھ کان وغیرہ اسی مفہوم کے ساتھ موجود ہیں جیسے ہمارے ہیں۔ یہ فرقہ مجسمہ اور مشبہ ہے اکثر یہودیوں کا یہی عقیدہ تھا اور ہندوستان کے ہندوؤں کے اقوال بھی اسی سے ملتے جلتے ہیں اور نصاریٰ نے بھی بعض اوصاف مخلوق کا وجود خدا میں تسلیم کیا ہے۔

(۲) علامہ ابن حزم اندلسی امام ابن تیمیہ مصری علامہ ابن قیم جوزی اور اکثر اہل حدیث کا مسلک ہے کہ صفات کے متعلق جتنے الفاظ آئے ہیں وہ

اور عقائد شرکاد پر ضرب لگانے کی ناقابل مقاومت طاقت رکھتا ہے۔ اگرچہ تینوں صفات مثبت ہیں اور سادہ الفاظ میں اللہ کران صفات کا حامل بتایا ہے لیکن حقیقت میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جو ان اوصاف کا حامل نہ ہو وہ سزاوار الوہیت نہیں۔ لفظ خالق سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ایجاد کائنات اندازۂ علمی اور قدرِ حکمت آفرین کے بغیر نہیں ہے۔

کل شیء سے مانویہ، ثنویہ، جہمیہ، صفوانیہ، خارجیہ اور قدریہ فرقوں کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے جو خالق خیر اور خالق شر یا خالق نور اور خالق ظلمت، عرض، دو خالقوں کے قائل ہیں۔ بلکہ بہت سے آدمی تو متعدد خالق مانتے ہیں۔ کسی کو خالق حسن، کسی کو خالق جنگ، کسی کو خالق امن، کسی کو خالق راحت اور کسی کو خالق مصیبت خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ میں کل شیء بتا رہا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی کسی قسم کے نظم تخلیقی اور حفظ کائنات کا ضامن نہیں۔ کائنات کا نظام جسمانی ہو یا عقلی مادی ہو یا روحانی سب کا نگراں خدا ہی ہے۔ کوئی بنتے کو بگاڑ نہیں سکتا اور نہ بگڑتے کو بنا سکتا ہے۔ اس وکالت و حفاظت سے یقینی ترشح ہو رہا ہے اس بات کا کہ اللہ کی حکمت قدرت مشیت اور ارادہ ہمہ گیر ہے دقیقہ رس ہے۔ اس کے ارادہ کے بغیر یہ نظام کائنات رواں دواں نہیں ہے لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے یہ مقصود ہے کہ آسمانوں کی حرکت، سیاروں اور ستاروں کا دور اس سے پیدا ہونے والی ظاہری اور باطنی اثرات فضا، کی ساری لہریں اور اُن کی کائناتی تاثیریں، زمین کی روئیدگی بالیدگی سرسبزی شادابی یا شوریت، بنجرایت، خشکی، افسردگی، پژمردگی اور زمین کے اندرونی مواد کی حیات آفرینیاں ہلاکت انگیزیاں غرض اس کائنات علوی و سفلی میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں ان تمام ذخیروں اور خزانوں کی کنجیاں اللہ ہی کے دست تصرف میں ہیں کوئی بت موہوم موکل فرضی دیوتا پیر پیغمبر حاکم بادشاہ اللہ کی مرضی کے بغیر کسی کو کچھ نہیں دے سکتا پس عبرت حاصل کرنا چاہیے در در سجدہ ریزی کرنے والے مشرکوں کو اور سبق لینا چاہیے عقائد اسلامیہ سے جاہل مسلمانوں کو جو کاسہ گدائی لئے ہر فقیر مزارات مقدسہ آثار متبرکہ اُمراء و سلاطین اور حکام کی غلامی کرتے پھرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ خزانوں کی کنجیاں تو سوائے خدا کے کسی کے پاس نہیں۔ وہ نہ دے تو کون دلوائے اور وہ دے تو کون روکتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقتوں کے انکار کرنے سے خسارے اور نقصان کے علاوہ حاصل کیا ہے خالق محافظ اور مالک متصرف سے منہ نہ موڑنے اور مخلوق محتاج بے اختیار نادار کے دروازوں پر دستک دینے سے کیا مل سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اُوْحِیَ سے مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تک یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ شرک سے بدتر کوئی جرم نہیں۔ یہ نبوت سے انبیاء کو محروم کر دینے والا بلکہ ان کے اعمال کو بھی اکارت بنا دینے والا ہے اس لئے ہر مسلمان کو خصوصاً اور ہر انسان کو عموماً شرک کی بو سے بھی بچنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معمولی شرک تمام عمر کی نیکیوں کو کھا جائے بلکہ شکر گزار ہونا چاہیے کہ اللہ نے اپنا بندہ بننے کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ سے کافروں کی جہالت کو ظاہر کرنا اور یہ بات دکھانا مقصود ہے کہ مشرکوں کے شرک کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی عظمت رفعت اور جلال و کمال سے ناواقف ہیں۔ ان کو الوہیت کا صحیح مرتبہ ہی معلوم نہیں ہے۔ آخر میں دست الٰہی میں زمین کے اور آسمانوں کے لپیٹے ہوئے ہونے سے قوت قاہرہ اور قدرت غالبہ کو ظاہر کرنا غرض ہے وغیرہ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ

اور (قیامت کے روز) صور میں پھونک ماری جاوے گی سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اُڑ جاویں گے مگر جس کو خدا چاہے پھر اس

نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ

(صور) میں دوبارہ پھونک ماری جاوے گی تو دفعۃً سب کے سب کھڑے ہو جاویں گے (اور چاروں طرف) دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جاوے گی اور رکھا

الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝

اعمال نامہ ایک کے سامنے رکھ دیا جائیگا اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جاویں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جاوے گا اور ان پر ذرا ظلم نہ ہوگا

وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ۝ ع

اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلا دیا جاوے گا اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے

تفسیر کائنات میں روزانہ بناؤ اور بگاڑ ہو رہے ہیں۔ ان گنت کیڑے کروڑوں حیوان اور لاکھوں انسان ہر روز پیدا ہوتے اور مرتے ہیں بلکہ کائنات کی جن ذرات کہربائیہ سے تخلیق ہوئی ہے وہ سب جاندار ہیں اور ہر آن مرتے جیتے رہتے ہیں۔ یہ ہولناک انقلاب اگرچہ محسوس اور مرئی ہے لیکن اکثر آدمیوں کی بصیرت پر غفلت کے پردے پڑے ہیں اور آنکھوں کے پردے زنگ آلود ہو گئے ہیں اس لئے کچھ دکھائی نہیں دیتا عموماً آدمیوں کی نگاہ حدوث اور نیرنگیوں کی تہ تک نہیں پہنچتی۔ بادۂ نخوت دہوس سے سرشاری موجب جہالت و پردہ داری بن گئی ہے۔ ہر وقت دردناک مناظر کا پیہم مشاہدہ آدمی کے دل کو سخت اور ہر قسم کی اثر پذیری سے محروم کر دیتا ہے۔ حوادث کے تواتر اور تسلسل سے اُن کی جاذبیت گم یا کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چمکتے سورج کی ہر کرن اور ظلمت شب کی ہر تان آگیں ہر شعاع اگرچہ اپنے اندر ہزاروں ہولناک ہیبت آگیں مناظر رکھتی ہے لیکن خوگر ذہول اس کی طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا۔ خود آدمی کی مادی ساخت میں روزانہ لاکھوں ذرے مرتے اور جیتے رہتے ہیں لیکن کم ہیں اس کو دیکھنے والے اور نادر ہیں اس کو سمجھنے والے اور نایاب ہیں سمجھ کر عبرت حاصل کرنے والے۔ آخر یہ کرداری دنیا ایک دن ختم ہوگی عظیم مرئی انقلاب ہولناک مرئی شکل میں سامنے آئے گا۔ اسلامی نظریہ ہے کہ سزا اور جزا کا ایک دن مقرر ہے۔ جب جاندار کائنات کی عملی زندگی ختم ہوگی تو فیصلہ کن سزا جزا کا دن آئے گا۔ نوبہ نو تغیرات و انقلابات کا سلسلہ ختم ہونے کو ہوگا تو اللہ کا آخری حکم آجائے گا۔ ایک پکار ہوگی کہ کرداری دنیا ختم ہو گئی۔ یہ سنتے ہی زندہ کائنات موت کی آغوش میں سو جائے گی۔ کوئی جاندار نہ رہے گا اُس وقت واحد قہار اپنی انفرادی کبریائی اور ملوکیت کا اعلان فرمائے گا۔ پھر دوسرا دور شروع ہوگا غیبی منادی ہوگی چلو احکم الحاکمین کے دربار کی طرف آخری فیصلہ سننے کے لئے۔ مُردے زندہ ہو جائیں گے۔ موت کی بے ہوشی سے ہوش میں آجائیں گے۔ زمین سے اُگیں گے سبزے کی طرح نکلیں گے پودوں کی مثل زندہ ہو جائیں گے زمین کے کیڑوں کی طرح جوق جوق زمین سے نکلیں گے اُٹھیں گے سمٹیں گے اُبھریں گے بڑھیں گے اور دربار حکم کی طرف دوڑیں گے۔ پولیس کے دستے کوڑیں گے کھینچیں گے صفیں ترتیب دیں گے۔ شہنشاہ اعلیٰ جاہ عرش عدالت پر رونق افروز ہوگا۔ نور تجلی سے زمین جگمگا جائے گی آفتاب نور کی جھلکی کرنیں ہر چیز پہ پرتو فگن ہوں گی ہر شخص کی فرد اعمال پیش ہوں گی۔ اللہ جانے وہ اعمال نامے کیسے ہوں گے اور کس طرح اُن کی پیشی ہوگی۔ ثبوت کے لئے انبیاء کو پیش کیا جائے گا۔ وہ بیان کریں گے کہ ہم نے قانونی اطلاع سب کو دیدی تھی اور آئین سے واقف کر دیا تھا پھر لوگ انکار کریں گے تو انبیاء کی تصدیق کے لئے شاہد سامنے آئیں گے۔ اعمال نامے لکھنے والے فرشتے پہلے ہی شہادت دیں گے۔ دوسرے نیک لوگ خصوصاً اُمت محمدیہ انبیاء کی تصدیق کرے گی۔ دربارِ عدالت سے فیصلہ صادر ہوگا انصاف کا فیصلہ۔ کسی کی حق تلفی نہ ہوگی، کسی پر ظلم نہ ہوگا کسی کے عمل کی جزا کم نہ دی جائے گی زیادہ ہی ملے تو ملے۔ دربار کی یہ تمام کارروائی نہ ہوگی کہ حاکم عدالت کو صحیح واقعات کا علم ہو جائے۔ اس کو تو ہر شخص کے اعمال و افعال پہلے ہی سے معلوم ہیں یہ صرف ضابطہ کی تکمیل ہوگی تاکہ کسی کو کوئی قانونی عذر اور حیلہ باقی نہ رہے۔ واللہ اعلم۔

تحلیل اجزاء وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ صور کیا ہے۔ نفخ صور سے کونسا نفخ مراد ہے۔ صعق کا کیا مطلب ہے اور کون کون بے ہوش ہوگا اور کون بے ہوش نہ ہوگا۔ یہ چار مباحث توضیح چاہتے ہیں۔ (۱) صور قرن سنکھ یا بِگل کو کہتے ہیں۔ صورِ قیامت کی شکل سنکھ کی ہوگی۔ قرآن اور حدیث میں جو لفظ صور آیا ہے اس کے ظاہری معنی یہی ہیں اور یہی مراد ہیں۔ واقع میں صور اور نفخ صور اور اسرافیل یہ تمام الفاظ ہیں جن کے معانی امر الٰہی کے مظاہر ہیں حقیقت خدا جانے کہ کیا ہے۔

ہے یہ کس چیز کا بنا ہوا، کتنا بڑا، اس آلہ کا نام تو اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ امر الٰہی کے اسباب ظہور کا نام صور بھی ہے اور نفخ صور بھی اور اسرافیل بھی بگل کا ناطہ ایک طرف سے کم ہوتا ہے اور دوسرے کنارے سے زیادہ اس طرح پھونکنے میں آسانی ہوتی ہے اور پھر بھی آواز نکلنی شروع ہوتی ہے لیکن جب آواز دوسرے سرے سے نکل کر پھیلتی ہے تو اونچی ہو جاتی ہے اور گونجنے لگتی ہے۔ عرب میں اعلان عام کرنے اور مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے اجتماعی دعوت دینے کے واسطے سنکھ کا ہی استعمال ہوتا تھا۔ اب بھی دنیا کے بعض مذاہب میں عبادتی اجتماع کے لئے اس کو استعمال کیا جاتا ہے اور فاروقی بگل کی شکل میں کچھ بگل جیسی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں قرآن کا نزول ہوا اس لئے عربی ذہنیت فہم اور لغت کا لحاظ رکھنا ضروری تھا وہ امر الٰہی جو فرمانبردار فرشتے اسرافیل کے ذریعہ سے سارے جانداروں کو مارنے اور جلانے کے لئے صادر ہوگا جس طور پر اس کا اعلان و اظہار ہوگا اس کو صور اور نفخ صور سے تعبیر فرمایا ابن ماجہ کی ایک ضعیف الاسناد روایت میں آیا ہے کہ صور پھونکنے والے دو فرشتے ہیں دونوں کے ہاتھ میں دو سنکھ ہیں۔ دونوں نظر لگائے ہوئے نفخ صور کے حکم کے منتظر ہیں اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید خدری ہیں۔ ابو داؤد نے بروایت حضرت ابو سعید خدری بیان کیا کہ حضور نے صور پھونکنے والے کا ذکر فرمایا کہ اس کے دائیں طرف جبرئیل اور بائیں جانب میکائیل ہے (قرطبی) عام صحیح روایات میں کثرت آیا ہے کہ صور پھونکنے والے کا نام اسرافیل ہے اور یہی درست بھی ہے (۳۱۲) صعقہ کے معنی بے ہوشی مراد ہے۔ بیہوش ہو کر مر جانا۔ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا پہلی مرتبہ میں آواز سن کر سوائے مخصوص ہستیوں کے سب بے ہوش ہو کر مر جائیں گے بعض لوگوں نے تین مرتبہ صور پھونکے جانے کی صراحت کی ہے۔ پہلی مرتبہ صور کی آواز سن کر ہول اور گھبراہٹ پیدا ہوگی۔ اور دوسرے صور پر مر جائیں گے یہ قول ضعیف ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس سے دوسرا صور پھونکنا مراد ہے اسی کو نفخۃ الصعق (بے ہوش کر دینے والی پھونک) کہا جاتا ہے اور اس سے زمین آسمان کے جاندار باستثناء مخصوص مر جائیں گے۔ چنانچہ مشہور حدیث الصور میں تفصیل کے ساتھ اس کا بیان آیا ہے۔ اس کے بعد بچے ہوئے مخصوص افراد کی روح قبض کی جائے گی سب سے آخر میں ملک الموت فوت ہوگا اس وقت سوائے حی قیوم وحدہ لا شریک کے کوئی باقی نہیں رہے گا اور تین مرتبہ ارشاد فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آج کس کی حکومت ہے) پھر خود ہی جواب میں فرمائے گا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ پھر فرمائے گا میں اکیلا تھا میں نے ہی سب کو پیدا کیا اور میں نے سب کو فنا ہو جانے کا حکم دیا اس کے بعد مخلوق کو زندہ کرے گا۔ چنانچہ اسرافیل کو سب سے پہلے زندگی ملے گی اور اس کو صور پھونکنے کا حکم ہوگا یہ تیسری بار نفخ صور ہوگا اسی کو نفخۃ البعث بھی کہا جاتا ہے۔ ابن کثیر کی یہ تشریح نفخ صور والی عام حدیث کے خلاف ہے مشہور حدیث میں تین بار صور پھونکنے کا ذکر نہیں ہے۔ حدیث اس طرح ہے امام احمد اور امام مسلم نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے اس کو نقل کیا ہے حضرت عبد اللہ کا بیان ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا ہے میری امت میں دجال نکل کر چالیس دن تک رہے گا۔ راوی نے کہا مجھے یاد نہیں کہ حضور نے چالیس دن فرمایا تھا یا چالیس رات یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا جو صورت میں عروہ بن مسعود ثقفی کی طرح ہیں وہ دجال کو ہلاک کر دیں گے پھر سات برس تک لوگ (امن سے) رہیں گے کہ دو آدمیوں میں بھی عداوت نہ ہوگی۔ اس کے بعد شام کی طرف سے ایک سرد ہوا بھیجے گا جو اور سب لوگوں کی روح قبض کر لے گی جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔ اچھے آدمی سب دار الآخرت کو سدھار جائیں گے جس میں ذرہ برابر بھی خیر ہوگی وہ نہ بچے گا۔ برے لوگ رہ جائیں گے جو پرندوں کی طرح سبک سر اور درندوں کی طرح بے عقل اور بے ہنر ہوں گے جن کو نیک و بد کا کچھ امتیاز نہ ہوگا شیطان آدمی کی شکل میں نمودار ہو کر ان کو ابھار دے گا اور بت پرستی پر آمادہ کرے گا لوگ بتوں کی پوجا کرنے لگیں گے لیکن اس کے باوجود ان کو کثیر روزی ملے گی کہ خوب عیش میں خوش و خرم رہیں گے۔ اس کے بعد اچانک خفیف آواز سے صور پھونکا جائے گا۔ لوگ کان اٹھا اٹھا کر گردنیں کھینچے ہو کر اس کو سنیں گے۔ اس آواز کو سب سے پہلے وہ شخص سنے گا جو حوض درست کر رہا ہوگا وہ بے ہوش ہو جائے گا اور دوسرے سب بیہوش ہو کر مر جائیں گے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ اس کے بعد اللہ (ہلکی یا تیز، راوی کا شک ہے) بارش برسائے گا جس سے لوگوں کے جسم ایسے اگیں گے جیسے زمین میں دانہ اگتا ہے پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ کھڑے ہو جائیں گے حیرت کی نگاہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے اس کے بعد منادی ہوگی لوگو اللہ کی طرف اور حکم ہوگا ان کو روکے رکھو ان سے حساب فہمی ہوگی۔ پھر حکم ہوگا ان میں سے جہنم کا حصہ چھانٹ لو۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آدم کو حکم ہوگا اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ چھانٹ لو۔ عرض کیا جائے گا کتنے چھانٹے جائیں۔ حکم ہوگا (نو سو ننانوے فی ہزار) چھانٹ لو یہ وہ وقت ہوگا کہ لڑکے

وَجِاْیٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ پھر شہادت کے لئے انبیاء کو بلایا جائے گا تاکہ وہ اپنی اپنی اُمّت کے مقابلے میں پیام الٰہی پہنچانے کی شہادت دیں (بغوی قال ابن عباس) انبیاء اظہار کریں گے کہ ہم نے فرض رسالت ادا کر دیا اور لوگوں کو پیام پہنچا دیا لیکن ہر اُمت کا کافر گروہ انکار کرے گا اور کہے گا ہم کو احکام نہیں پہنچائے گئے تو اس وقت انبیاء کے قول کے ثبوت کے لئے

وَالشُّهَدَآءِ گواہوں کو طلب کیا جائے گا۔ انبیاء اپنی تصدیق کے لئے امت محمدیہ کو پیش کریں گے۔ آیت لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا حضورؐ نے یہی مطلب بیان فرمایا تھا اُمّتِ محمدیہ ہی یہ عادل لوگ انبیاء کی طرف سے شہادت دیں گے ابن عباس نے فرمایا عادل سے وہ لوگ مراد ہیں جو دوسروں پر لعن طعن کرنے والے نہیں ہیں مختلف صحیح احادیث کا مفہوم بھی یہی ہے۔

ترمذی نے کہا شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد میں فی سبیل اللہ شہید ہوئے وہ شہادت دیں گے کہ جو لوگ دین الٰہی سے ظلم و شرک کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے اُن سے کافروں نے جنگ کی اور ظلماً اُن کو شہید کیا سدی نے لفظ شہداء کے مفہوم کی جو تخصیص کی ہے آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے اس پر استدلال کیا جا سکے انبیاء کی شہادت کے علاوہ خود منکروں کے ہاتھ پاؤں بھی ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ تکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم کا یہی مطلب ہے۔

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ تکمیل شہادت اور ثبوت کے بعد فیصلہ کا وقت آئے گا اور بغیر کسی پر ظلم کئے صحیح فیصلہ کر دیا جائے گا کسی کو بے جا سزا نہیں دی جائے گی

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ اور جس نے جو اور جتنا کام کیا ہے اس کو وہی یعنی اس کا بدلا پورا پورا دیا جائے گا۔ نیک ہو یا بد ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا پھل ملے گا

ایک شبہ ممکن تھا کوئی اس طرح شبہ کرتا کہ اس تفصیلی پیشی اور شہادت در شہادت کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔ کیا اعمالناموں کی پیشی اور ان کا ثبوت اور شہادت اس کے لئے ضروری ہے کہ خدا کو اس طریقے کے بغیر صحیح علم نہ ہو گا اور صحیح معلومات حاصل ہونے کے بعد وہ فیصلہ کرے گا

ازالہ یہ ترتیب مقدمہ اس لئے نہ ہوگی کہ دنیوی حاکموں کی طرح بغیر پیشی کے اللہ کو لوگوں کے اعمال کا علم نہ تھا اور اعمالنامے سامنے لائے گئے تو زندگی کے کارناموں کا پتہ چلا نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تو لوگوں کے کردار سے بخوبی واقف ہے اس نے خود دوسری جگہ فرمایا ہے۔۔۔ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ بلکہ بقول قرطبی کافروں پر جرم ثابت کرنے کے اور ہر عذر کی جڑ اکھاڑ دینے کے لئے ایسا کیا جائے گا۔ بہر حال مذکورہ بالا شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ:۔

وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۔ جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ یعنی ان درمیانی وسائل کی ضرورت اللہ کو نہیں براہ راست اللہ ہر ایک کے کردار کو جانتا ہے۔

مقصود بیان مذکرہ نفخ صور اللہ کی قوت قاہرہ اور قدرت باہرہ کے ظہور کا حال ہے۔ اول نفخ صور کے نتیجہ سے ایک ہولناک منظر کی تصویر کشی اور دوسرے نفخ سے حیرت آفرین اعجوبہ انگیز نتیجہ کی رونمائی ہو رہی ہے اور یقینی الوقوع مستقبل کی تعبیر ماضی کے قیاس میں بتا رہی ہے کہ قیامت کا قیام صرف کلامی نہیں بلکہ واقعی ہو گا۔ یہ تذکرہ برائے تذکرہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

اشراق ارض کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ ظلم ایک اندھیرا ہے جو قیامت کے دن ظلمت کی شکل میں نمودار ہو گا اور عدل ایک روشنی ہے جس کو نور الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ بالحق سے مترشح ہو رہا ہے کہ اللہ کا تعلق تمام انسانوں سے برابر ہے۔ اُس کے فیصلہ میں کسی مخلوقانہ جذبہ کو دخل نہیں انبیاء اور اہل شہادت کی پیشی کا تذکرہ ظاہر کر رہا ہے کہ بازپرس انبیاء سے بھی ہوگی فرض نبوت کو ادا کرنے نہ کرنے کی حساب فہمی ضرور ہوگی اور صرف انبیاء کا دعویٰ بلا دلیل نہیں مان لیا جائے گا بلکہ ان سے بھی شہادت طلب کی جائے گی۔ اس سے مترشح ہوا کہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو بغیر شہادت کے اُس کے کسی دعویٰ پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا طلب شہادت اس سے بھی ضروری ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مقدمات کی پیشی کے وقت حاکم کو اپنے نائب کی

جنبہ داری نہ کرنی چاہیے بلکہ عام لوگوں کی طرح اُس سے بھی شہادت لی جائے ۔ قیامت کے دن نظام عدالت کی جس ڈھنگ سے ترتیب ہوگی اس کا تفصیلی ذکر تعلیم دے رہا ہے کہ مدعا علیہ اور ملزم کو اپنی بے قصوری اور برأت کا ہر موقع دیا جائے خواہ وہ ملزم کتنی ہی بڑی عظیم الشان ہستی کا ہو، یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی کہ اگر اس پر قتل اور جرم بغاوت اسی پر قائم ہو تب بھی اس کو صفائی پیش کرنے کا حق ہے وغیرہ۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جاویں گے یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو اس وقت اس کے دروازے کھول دیئے

لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ

جائیں گے اور اُن سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہی لوگوں میں سے پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور

لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ○

تم کو تمہارے اُس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا (پھر ان سے) کہا جاوے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے)

قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ○

کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں رہا کرو غرض (خدا کے احکام سے) تکبر کرنے والوں کا بُرا ٹھکانا ہے

تفسیر جج صاحب اپنے بیٹے کو برسوں قانون پڑھاتے ہیں نالائق لڑکا نہیں پڑھتا طبیعت آوارہ صحبت خراب آخر تک جاہل ہی رہتا ہے جج صاحب کے گھر کا پیش خدمت لڑکا اپنے آقا زادے کو پڑھتا دیکھ کر باتوں ہی باتوں میں پڑھ جاتا ہے، سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ آقا زادہ آوارگی اور قانون شکنی کی وجہ سے جیل خانہ میں پہنچ جاتا ہے۔ خدمت گار بچہ پڑھ لکھ کر قابل بن کر قوم کا لیڈر یا کچہری کا مجسٹریٹ یا حکومت کا وزیر بن جاتا ہے۔ اللہ نے اپنے نمائندے بھیجے نمائندے بھی اجنبی نہ تھے۔ دوسری مخلوق میں سے نہ تھے یا انسانوں کی طرح انسان تھے۔ آدمیوں کی شکل کھاتے پیتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے تھے۔ کسی آدمی کے بیٹے بھی تھے اور کسی کے باپ بھی۔ ہم نے ان کو خوب پرکھ لیا۔ وہ کسی طرح ہماری آدمیت سے جدا نہ تھے۔ انھوں نے ہم سے کہا تھا۔ تمہارا ایک رب ہے مہربان وہی روزی دیتا ہے، بیمار کو تندرست بناتا ہے۔ پیاسے کی پیاس پانی سے بجھاتا ہے اور بھوکے کی بھوک دانے سے دفع کرتا ہے۔ وہی سورج چمکاتا اٹھاتا گرا تا پھر نیچے کو جھکاتا اور گرا تا چھپاتا ہے۔ وہی چاند تاروں کو جگمگاتا اور سجاتا ہے۔ وہی پھول کھلاتا پھل اور غلہ کو پکاتا اور تم کو کھلاتا ہے۔ وہ ہر طرح تمہارا رب اور تم پر مہربان ہے۔ اس نے ہم کو اپنے احکام دے کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری زندگی کے لئے دستور العمل عنایت کیا ہے۔ اس دستور کو پڑھو سیکھو جانو مانو اور اس پر چلو۔ حساب کتاب کا ایک دن آئے گا۔ قیامت ضرور ہوگی اس روز تمہاری زندگیوں کے تمام اعمال کے فیصلے ہوں گے۔ جنت یا دوزخ میں جانا پڑے گا۔ قیامت کا دن بڑا ہولناک ہوگا۔ کوئی سفارشی نہ ہوگا۔ کوئی سزا سے بچانے والا نہ ہوگا۔ کوئی رعایت کرنے کرانے والا نہ ہوگا۔ قانون کی پابندی کرو۔ توڑو گے تو جیل خانے جاؤ گے اور پھر کبھی نہ چھوٹو گے۔ ہم نے انبیاء کی تقریر کا مطلب سمجھا۔ کسی نے مان لیا زندگی کو سنوار لیا۔ لیکن بہتوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ ان کو نادان پاگل بتایا۔ معجزات کا مقابلہ نہ کر سکے اور چمکتے سورج کا انکار کر کے نبیوں کو جادوگر کہا اور جھٹلایا۔ زندگی کے کسی رُخ میں روشنی نہیں پیدا کی ہر پَن سر کو کالا ہی رکھا آخر پکڑے ہی گئے۔ بد معاشی میں چالان کیا گیا عدالت سے سزا ہوئی جیل خانے بھیج دیا گیا۔ جیلر اور نائب جیلر نے سوال کیا کیا تم کو کسی نے قانونِ زندگی نہیں بتایا؟ کیا قانون شکنی کی سزا تم کو معلوم نہ تھی کیا تمہارے کسی بھائی برادر نے تمہیں اطلاع دی تھی کہ سزا جزا کا بھی ایک دن ضرور آئے گا اور زندگی کے ہر کرتوت کا حساب فہمی کے بعد بدلہ بھی ملے گا۔ کافروں کے پاس

اس کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا جیسے کر کہنے لگے یہ تو سب کچھ ہوا اگر مقدر کی کھوٹ تھی ہم تو دستور زندگی کو ماننے سے انکار کرتے مگر کیا کہیں قانون نہ ماننے والوں کو سزا دینے کا لبعد تو قانون ماننے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ حاکم اور سب سے بڑے حاکم کی بات غلط کیسے ہوتی اس کو تو پورا ہونا ہی تھا۔ بدمعاشوں کو سزا ملنی ضرور تھی سزا کا ملنا یقینی تھا اس لئے بدمعاشوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ جج صاحب کی تعلیم اپنے بیٹے کو بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ قانون اٹل ہے جیل خانے کا پُر ہونا لازم ہے اور نیک لوگوں کو اس میں بھرا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لئے بدمعاشوں کا ہونا اور جیل میں بھر جانا بھی لازم ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۔ سوق کے معنی ہیں جانوروں کو پیچھے سے ہنکانا۔ یہ لفظ توہین آمیز ہے۔ گویا کافروں کو جانوروں کی طرح ہنکایا جائے گا۔ اپنی خوشی سے جہنم کی طرف نہیں جائیں گے۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ کافروں کو سختی، گھڑکی اور جھڑکی کے ساتھ جہنم کی طرف راندا جائے گا۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ يَوْمَ يُدَعُّونَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا الخ۔ اس وقت جہنمی پیاسے بھی ہوں گے۔ آیت میں وارد ہے۔ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا الخ اور وہ اندھے بہرے اور گونگے بھی ہوں گے اور بہتوں کو منہ کے بل چلایا جائے گا۔ آیت میں آیا ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ۖ مَّأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ الخ

پھر کافروں میں سیکڑوں گروہ ہوں گے کچھ منافق ہوں گے۔ کچھ کھلے ہوئے منکر۔ منکروں میں کچھ بت پرست کچھ ستارہ پرست، کچھ دیوتا پرست، کچھ آدمی پرست پھر ہر ایک گروہ در گروہ ہوں گے اور اپنے اپنے کفر کے موجب عذاب کی شدت درجہ وار برداشت کریں گے اس لئے زمرا فرمایا۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا ۔ جونہی جہنم پر پہنچیں گے فوراً دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ جہنم کیا ہے، کیسا ہے، کہاں ہے اس کے دروازے کیسے اور کس چیز کے اور کتنے بڑے ہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا الفاظ معلوم ہیں معانی کی کیفیت مجہول۔ ہر حال جہنم ایک جیل خانہ ہے ایک عذاب گھر ہے۔ اسی کے مناسب اس کے دروازے بھی ہیں۔ اس کے اندر ہر قسم کا دکھ ہوگا۔ بس اتنا ایمان ضروری ہے۔ حقیقت کی تشریح ناممکن ہے مابعد الطبیعات یا مافوق الطبیعات تک طبیعت یا عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ان چیزوں کی جتنی تفصیل قرآن و حدیث میں آئی ہے۔ اس پر عقل سے بالا تر قلبی ایمان ضروری ہے اور زیادہ غور موجب ضلالت۔

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ ۔ جہنم کے خدام اور نگراں جن کے سردار کا نام مالک ہوگا کافروں سے دریافت کریں گے کہ کیا اللہ کے پیامبر تمہارے پاس نہیں پہنچے تھے جو تم ہی جیسے ہی تھے۔ تم میں سے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے ہم نسب یا ہم وطن یا ہم زبان تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ تمہاری طرح انسان تھے فرشتے نہ تھے۔ کسی دوسری نوع کے نہ تھے کہ ان کی بات سمجھنے اور ماننے میں تمہیں دشواری ہوتی یا ان کی ہیبت سے تمہاری زبانیں گنگ اور سوچنے سمجھنے کے قوتیں مختل ہو جاتیں اور تم ان سے مانوس نہ ہو سکتے جب اجنبیت نہ تھی تو پھر تم نے ان کی بات کیوں نہیں مانی۔ محافظین جہنم کا یہ قول استفہامی نہیں سوال کرنا مقصود نہیں۔ توبیخی ہے زجر مقصود ہے۔

يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ ۔ یعنی کیا تم کو معلوم نہ تھا کہ تمہارا ایک رب ہے جو ظاہر باطن تمہاری پرورش کرتا ہے اور ربوبیت کا تقاضا تھا کہ رب کے احکام تمہارے پاس بھیجے جاتے تو کیا پیغمبروں نے (خود ساختہ اور دماغی تراشیدہ نہیں بلکہ) تمہارے رب کے کھلے ہوئے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے۔

وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۔ اور کیا تم کو نہیں ڈرایا کہ قیامت کا دن پیش آنے والا ہے یعنی ایک دن ضرور آئے گا جس میں اچھے برے کی جزا سزا ملے گی۔

قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ اس آیت کا مطلب اہل تفسیر نے دو طرح سے لکھا ہے۔ (۱) کافروں نے جواب میں اپنا عذر پیش کیا اور جہنم میں داخل ہونے کا اصل سبب خدا کے حکم اور اس کی مشیت کو قرار دیا اور کہنے لگے پیغمبر بھی آئے، احکام بھی لائے، ہم کو حکم بھی سنایا، قیامت سے بھی ڈرایا سب کچھ ہوا لیکن اللہ نے پہلے سے طے کر دیا تھا کہ جہنم کو بھرا جائے گا اور اس میں کافروں کو بھیجا جائے گا۔ اللہ کی یہ بات تو ضرور پوری ہونی تھی ہو گئی۔ ہم نے کفر کیا جسے اسے سمجھتے تو کفر نہ کرتے لیکن شیئت بھگتے کس طرح سب دوزخ میں بھیجا جانا ہی تھا تو کفر کرنا بھی ضروری تھا پس اللہ کی بات پوری ہو گئی

(۲) کافر جواب دیں گے انبیاء آئے احکام لائے ہم کو سب کچھ بتایا سنایا سمجھایا ڈرایا لیکن ہم نے نہ مانا اور نہ ماننے والوں کی سزا اللہ نے جہنم مقرر کر رکھی تھی اس لئے ہم جہنم میں بھیج دیئے گئے۔ یہ مطلب صاف سُلجھا ہوا ہے۔ اول مطلب اس لئے بھی مناسب نہیں کہ اس صورت میں کلمۃ العذاب سے کلمہ وعدۂ عذاب مراد لینا پڑے گا۔ جس کی صراحت آیت لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ میں کی گئی ہے یا ازلی نوشتہ مراد لیا جائے گا اور یہ دونوں بعید ہیں۔ وعدۂ عذاب کلمۃ العذاب نہیں۔ کلمۃ العذاب تو فیصلۂ عذاب ہے اور ازلی نوشتہ ایک مشیت الٰہیہ ہے جس کا اجراء کافروں کے کفر کے بعد ہوگا مشیت کو جواز کفر کی وجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ اس آیت میں تین الفاظ غور طلب ہیں۔ (۱) قیل کا لفظ ہے جس کا فاعل مذکور نہیں ہے۔ حکم دینے والا تو بہرحال خدا ہوگا خطیب نے کہا کہ ملائکہ یا خازنین جہنم اللہ کا یہ حکم اُن کو سنائیں گے۔ ابن کثیر نے کہا کوئی فاعل مخصوص نہیں ہر دیکھنے والے کی زبان سے یہی نکلے گا۔ تمام مخلوق اس پر شاہد ہوگی بلکہ وہ خود بھی اپنے متعلق شہادت دیں گے کہ فیصلہ صحیح ہوا یہی عدل ہے۔

(۲) خالدین۔ خلود غیر منقطع وقت اور دوام کو کہتے ہیں۔ کبھی لمبی وقت کو بھی کہتے ہیں جس میں دوام اور عدم انقطاع کی شرط نہیں ہوتی۔ یہاں اول مراد ہے دوسری آیات اس کی تائید کرتی ہیں۔

(۳) المتکبرین۔ کفر کا باعث غرور خودرائی اور کبر نفس ہوتا ہے اس لئے ہر کافر کا متکبر ہونا ضروری ہے۔ اصول فقہ کا ایک عام قاعدہ ہے کہ اگر کسی صفت سے کسی حکم کو متعلق کیا جائے تو وہ صفت اس حکم کی علت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر زید خالد سے کہے تم اپنے پیارے بھائی عمرو پر رحم کرو تو محبوب بھائی ہونا حکم رحم کی علت قرار پائے گا گویا زید کو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عمرو تمہارا پیارا بھائی ہے اور پیار کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس پر رحم کرو۔ آیت میں جہنمی ہونے کو متکبر ہونے پر مبنی کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے خواہ مخواہ ان کو دوامی جہنمی نہیں بنایا بلکہ اُن کا کبر اس کا باعث ہے۔

مقصودِ بیان

لفظ سِیْقَ سے کافروں کی توہین مترشح ہو رہی ہے۔ گویا کافر جانور ہوں گے جن کو ہنکایا جائے گا۔ زمرا کا لفظ بتا رہا ہے کہ کافروں کے مختلف گروہ ہوں گے گویا کفر کے درجات ہوں گے۔ ہر گروہ کا درجہ دوسرے گروہ سے الگ ہوگا۔ خزنتها کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ دربان ہوں یا دوسری خدمت پر مامور سب پر لفظ خازن کا اطلاق صحیح ہے۔ گویا جہنم سے تعلق رکھنے والے چوکیدار نگراں اور عذاب دینے والے اور مختلف دوزخیوں کو ان کے درجات میں تقسیم کرنے والے سب ہی خازن ہوں گے۔

رُسُلٌ کی تنوین بتا رہی ہے کہ کوئی خاص پیغمبر مراد نہیں۔ اللہ کی طرف سے احکام کو پہنچانا اور روزِ قیامت سے ڈرانا تمام پیغمبروں کا فرض مشترک ہے یعنی اللہ کے قوانین وضوابط کی انسانوں تک تبلیغ اور یوم سزا جزا کی یقینی اطلاع پیغمبروں کے یہ دو فرض ہیں۔ باقی تعلیم انہی اصول کی شاخیں ہیں۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اس مغرور گروہ کو جو رسالت اور قانونِ آسمانی کو غیر ضروری سمجھتا اور انسانی عقل کو حیاتِ انسانی کی اصلاح کے لئے کافی جانتا ہے۔

اَبْوَابَ جَهَنَّمَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے مقرر دروازے ہیں اور باضابطہ دروازوں سے ہی اندر داخلہ ہوگا۔ خٰلِدِيْنَ کا لفظ دوام قیام پر دلالت کر رہا ہے اور مُتَكَبِّرِيْنَ کے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ کا اخروی عذاب خدا کی طرف سے ظلم نہیں بلکہ رعونتِ نفس کی سزا ہے وغیرہ۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جاویں گے یہاں تک کہ جب اُس جنت کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ

پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہاں کے محافظ ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزے میں رہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ

الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ

اور داخل ہوا کریں گے (اور کہیں گے) اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں، تو (نیک)

اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ

عمل کرنے والوں کا اچھا بدلا ہے اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ (حسابکے اجلاس کے وقت) عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہونگے (اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہونگے

رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائیگا اور کہا جائیگا کہ ساری خوبیاں خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے

تفسیر عام قانون فطرت ہے اور تمام آسمانی کتابوں کی اجتماعی تعلیم ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا۔ یہاں جو کوئی کوشش کرے گا آخرت میں اس کا نتیجہ پائے گا۔ عمل اور اجر باہم وابستہ ہیں۔ طیبِ عمل طیبِ حیوٰۃ کا موجب ہے اور خبثِ عمل سے خدی ناپاک ہوتی ہے۔ ظاہر و باطن کی پاکیزگی سے نتیجہ کی پاکیزگی لازم ہے اور اس کی کثافت کو ساتھ لاتی ہے لیکن کردار، اطوار اور رفتار کی پاکیزگی اور عقل و ہوش کی لطافت کا معیار کیا ہے۔ اس کے متعلق اللہ کی شریعت ہر زمانہ میں بغیر کسی ژولیدگی کے صراحت کرتی چلی آئی ہے کہ نفسانی میلان کے سبب دنیوی فوائد کی طرف جھکاؤ اور مادی منافع کو اصل مقصدِ زندگی بنا لینا ہر خباثت اور گندگی کی جڑ ہے۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ ناقابلِ شک حقیقت ہے اور اللہ کی خوشنودی کو زندگی کے تمام اوقات میں اول ترین مقصد قرار دینا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا اور تمام ان چیزوں کو جو اس مقصد کے حصول کے مانع ہوں قربان کر دینا حقیقی طیبِ نفس اور طہارتِ حیوٰۃ ہے۔ رب کے ہاتھ میں ربوبیت عامہ جاننا اور اس احسان کے عوض اس کے احکام کو ماننا حسنِ عمل کی ترشح ہے۔ بڑی اور چھوٹی حیثیتوں کو چھوڑنا اور ادنیٰ اعلیٰ تعلیم پر چلنا اور امر و نہی کے تمام اصول پر زندگی کو کاربند بنانا اور اس سے اوپر اپنے فائدے کی ہر منفعت و مضرت کو من جانب اللہ سمجھتے ہوئے بکشادہ پیشانی خوشی خوشی اس کا استقبال کرنا ارتقاءِ حقیقی ہے۔ دنیا میں یہی تقویٰ پاکیزگی کا معیار ہے۔ خواہ دنیا والے اس کو پاکیزگی قرار دیں یا نہ دیں جن کی نظر آمد کی طرف ہوتی ہے امرِ پُرنور و خوض اُن کا شعار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی عقل کو افکار و اعمال کے حسن و قبح کو جانچنے کی میزان نہیں قرار دیتے۔ گندے تاریک حواس کے بندے صابن کو پسند کرتے ہیں اور روشن روح رکھنے والے مٹی پر تیمم کرنے کو موجبِ طہارت جانتے ہیں۔ فرق صرف معیار اور میزان کا ہے۔ کسی کی نظر میں انانیت اور خردی معیار ہے اور کوئی خدا کے احکام کو اشیاء کی صحت و بطلان کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ پس طیبِ نفسی کا مدار حسنِ عمل ہے اور حسنِ عمل کی بنیاد تقویٰ اور جذبۂ اطاعت و بندگی کے زیرِ اثر زندگی کا بناؤ بگاڑ۔ پھر اسی تقویٰ اور جذبۂ بندگی کے تفاوت سے حسنِ عمل میں تفاوت پیدا ہو جاتا ہے اور حسنِ عمل کے تفاوت سے نفس کی پاکیزگی میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس طرح اہلِ تقویٰ میں مدارج و مراتب میں بلندی و پستی کا ہونا ضروری ہے اور فرقِ مراتب کے پیشِ نظر گروہ در گروہ ہو جانا لازم ہے۔ لیکن قیامت کے دن متقیوں کا کوئی گروہ بھی ہو ادنیٰ ہو یا اعلیٰ پست یا بالا طیبِ جزا ہر ایک کو ملے گی جنت میں داخلہ کی اجازت ہر ایک کے لئے ہوگی۔ اپنے اپنے مرتبہ کے موافق اپنی اپنی جگہ ہر شخص پہچان لے گا اور اپنے محدود رقبے میں جہاں چاہے گا آزادی سے بغیر خطرۂ زوال کے ہمیشہ رہے گا اور ہر دکھ سے محفوظ رہے گا۔ یہی ہے وہ عدالت الٰہیہ جس کو عام قانونِ فطرت کہا جاتا ہے اور جس کی شہادت تمام آسمانی کتابیں دیتی چلی آئی ہیں اور جس کا اعتراف سبوحی حاملینِ عرش بھی کرتے ہیں اور قیامت کے دن ہر شخص کی زبان سے اس کا اعلان ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۔ اس آیت میں لفظ سیق توہین کے لئے نہیں ہے بلکہ اعزاز کی لغول ابن کثیر اس جگہ ہنکانے جانے سے مراد ہے۔ متقیوں کی سواریوں کو ہنکانا گویا متقیوں کو سواریوں پر سوار کر کے جنت کو لے جائے جانے کا ذکر ہوگا۔ زمر کی تشریح میں ابن کثیر نے کہا ہے کہ اہلِ ایمان کے گروہ کے گروہ الگ الگ ہوں گے اور ہر گروہ میں وہی لوگ شامل ہوں گے جو

قریب المرتبہ ہوں گے۔ مثلاً انبیاء کے گروہ میں انبیاء، صدیقوں کے گروہ میں صدیق، شہیدوں کے گروہ میں شہید، مقربین کے ساتھ مقربین اور ابرار کے ساتھ ابرار وغیرہ۔ میرے خیال میں شیخ کی یہ تشریح مناسب نہیں۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سب انبیاء سے پہلے حضور والا جنت میں داخل ہوں گے۔ اور حضور کے ساتھ فقراء مہاجرین ہوں گے (یہ حدیث عنقریب مفصل آتی ہے) ظاہر ہے کہ مہاجرین انبیاء نہ تھے پھر بجائے انبیاء کے حضور کے ہم رکاب یہی ہوں گے۔ ابوداؤد نے بروایت حضرت ابو ذر اور ترمذی نے بروایت حضرت انس لکھا ہے کہ حضور نے فرمایا المرء مع من احب یعنی جس سے آدمی کو محبت ہوگی آخرت میں اسی کے ساتھ ہوگا۔ صحابہ کو یہ الفاظ سن کر اتنی خوشی ہوئی کہ کسی چیز سے نہیں ہوئی یعنی وہ سمجھیں گے کہ جب محب اپنے محبوب کے ساتھ ہوں گے اور ہم محب رسول ہیں اس لئے ضرور حضور کے ساتھ ہوں گے۔ اس صورت میں ابن کثیر کی تشریح کس طرح صحیح ہو سکتی ہے اور لسر ظاہر ہے فرماں بردار رسول محبوب کے ہم مرتبہ یا قریب المرتبہ ہو سکتے ہیں۔

خطیب نے سراج المنیر میں لکھا ہے نفل نماز پڑھنے والوں کی جماعت علیحدہ ہوگی اور روزہ داروں کی علیحدہ اور صدقہ دینے والوں کی علیحدہ۔ اسی طرح دوسرے نیک اعمال والوں میں سے ہر ایک کا گروہ جُدا جُدا ہوگا۔ خطیب کے اس قول کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آیا ہے نمازیوں کو باب الصلوٰۃ سے، صدقہ والوں کو باب الصدقہ سے، روزہ داروں کو باب الریان سے بُلایا جائے گا (یہ دعوت اعزازی ہوگی) اور صدیق اکبر کو ہر دروازہ کی طرف سے دعوت دی جائے گی۔ الحدیث۔ (یہ حدیث لفظ ابواب کے ذیل میں مفصل آرہی ہے)

سب سے اوّل داخل ہونیوالا گروہ

سب سے پہلے جنت میں رسول اللہ داخل ہوں گے۔ حضرت انس کی روایت ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا سب سے پہلے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا وہ میں ہوں گا (مسلم)۔ حضرت انس کی دوسری روایت میں آیا ہے حضور نے ارشاد فرمایا سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھلواؤں گا۔ خازن جنت پوچھے گا آپ کون ہیں میں جواب دوں گا محمد۔ دربان کہے گا بہت خوب مجھے یہی حکم دیا گیا تھا کہ آپ سے پہلے کسی کے لئے جنت کا دروازہ نہ کھولوں۔ (رواہ احمد باسناد صحیح و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جنت میں داخل ہونے والے سب سے پہلے گروہ کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے جنت میں ان کو نہ تھوک (تھوکنے کی ضرورت) ہوگی، نہ ناک کی رینٹھ، نہ بول و براز۔ اس حدیث کے آخر میں ہے۔ ان میں باہم مخالفت اور بغض نہ ہوگا۔ اُن کے دل ایک ہوں گے۔ وہ صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کریں گے (رواہ احمد والبخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ کی دوسری روایت میں آیا ہے۔ جنت میں اول نمبر پر داخل ہونے والا گروہ کے چہرے چودھویں کے چاند جیسے ہوں گے اور اُن سے متصل نمبر دوم پر داخل ہونے والے ایسے ہوں گے جیسے آسمان کا سب سے زیادہ روشن ستارہ۔ اس حدیث کے آخر میں آیا ہے۔ ان کے قد ایک ہی میں ساٹھ ہاتھ ہوں گے۔ (رواہ ابو یعلی والبخاری و مسلم)۔ یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا میری اُمت میں سے جنت میں جس گروہ کا داخلہ سب سے پہلے ہوگا وہ تعداد میں ستر ہزار ہوگا اور اس کے چہرے بدر کی طرح چمکتے ہوں گے۔ یہ سن کر حضرت عکاشہ بن محصن اسدی نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرما دیجئے کہ اللہ مجھے ان میں (شامل) کر دے۔ حضور نے دعا کی الٰہی اس کو بھی انہیں میں (شامل) کر دے۔ اس کے بعد ایک انصاری نے کھڑے ہو کر یہی درخواست کی۔ حضور نے فرمایا عکاشہ تم سے سبقت لے گیا۔ (رواہ البخاری و مسلم)

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے اس حدیث میں ایسے ستر ہزار کا بھی تذکرہ آیا ہے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس، حضرت جابر، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن مسعود، حضرت رفاعہ جہنی، حضرت ام قیس بنت محصن سے نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سہل بن سعد کی روایت اس طرح ہے کہ حضور نے فرمایا میری اُمت میں سے ستر ہزار یا سات لاکھ اس شان سے جنت میں جائیں گے کہ باہم ایک دوسرے کو پکڑے ہوں گے۔ اول سے آخر تک سب جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ان کے چہرے بدر کی طرح روشن ہوں گے (بخاری و مسلم)۔ حضرت ابو امامہ باہلی سے مروی ہے کہ حضور والا فرما رہے تھے کہ اللہ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری اُمت میں ستر ہزار کو داخل فرمائے گا اس شان سے کہ ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار وہ لوگ ہوں گے جن کا نہ حساب ہوگا نہ عذاب اور ان کے ساتھ میرے رب کے تین لپ بھرے ہوئے ہوں گے (رواہ ابو بکر بن عبدالولید بن مسلم)۔ عتبہ بن عبد السلمی سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے (طبرانی)۔ حضرت ثوبان اور حضرت ابو سعید انماری سے بھی اسی طرح مرفوع روایت ہے

حَتّٰی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا۔ جنت کے کتنے دروازے ہیں حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ ذیل روایت میں اس کی کوئی تعین نہیں کی گئی۔ ابوہریرہ کی روایت اس طرح ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے مال میں سے ایک جوڑا صدقہ کیا اُس کو جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور جنت کے دروازے بہت ہیں نمازی کو باب الصلوٰۃ سے خیرات کرنے والوں کو باب الصدقہ سے، مجاہدین کو باب الجہاد سے اور روزہ داروں کو باب الریان سے بلایا جائے گا۔ ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یارسول اللہ یوں تو کسی کا زور نہیں جس دروازے سے بلا لیا جائے لیکن کیا کوئی شخص ایسا بھی ہوگا جس کو سب دروازوں سے بُلایا جائے۔ فرمایا ہاں اور مجھے امید ہے کہ تم اُن میں سے ہوگے۔ (رواہ احمد والبخاری ومسلم)

لیکن حضرت سہل بن سعد کی روایت میں آیا ہے حضورؐ نے فرمایا جنت میں آٹھ دروازے ہیں جن میں ایک دروازہ کا نام باب الریان ہے اس دروازے سے وہی لوگ داخل ہوں گے جو اہل صوم ہیں (بخاری ومسلم) غالباً اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ فرائض و واجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ نوافل میں سے جو لوگ جس خاص عبادت سے لگاؤ رکھتے ہیں اُسی کی نفاست سے جنت میں دروازہ سے داخلہ ہوگا۔

حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا تم میں جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پورا وضو کرے پھر کہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ تو اس کا مرتبہ یہ ہوگا کہ جنت کے آٹھوں دروازے اُس کے لئے کھول دیئے جائیں گے جس دروازے سے چاہے داخل ہوجائے (یعنی اجازت ہر دروازے سے جانے کی ہوگی۔ اگرچہ بطور اعزاز خاص خاص دروازوں سے اُس کو دعوت دی جائے گی) (رواہ مسلم) حضرت معاذ کا قول ہے مجھ سے حضورؐ نے فرمایا جنت کی کنجی لا الٰہ الا اللہ ہے (رواہ الحسن بن عرفہ) یعنی توحید کے بغیر جنت میں داخلہ نہیں ہوسکتا۔

وسعت ابواب جنّت

حضرت ابوہریرہؓ نے طویل حدیث شفاعت کے آخر میں بیان کیا کہ حضور اقدس نے فرمایا قسم ہے اُس خدا کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ جنت کے ہر دروازے کے دونوں بازوؤں کے درمیان اتنی وسعت ہے جتنی مکہ و ہجر کے درمیان۔ دوسری روایت میں آیا ہے جتنی مکہ و بصرہ کے درمیان (صحیحین)

حضرت عتبہ بن غزوان نے بیان کیا کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ باب جنت کے دونوں کیواڑوں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے۔ (مسلم)

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دونوں حدیثوں میں وسعت کی خاص پیمائش بتانی مقصود نہیں ہے بلکہ وسعت کی زیادتی دکھانی مقصود ہے جس طرح جنت کی وسعت کے متعلق آیت میں وارد ہے وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اس میں بھی وسعت کی تصویر کشی مقصود ہے کوئی خاص وسعت مقرر کرنی غرض نہیں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری سے بھی حضرت عتبہ کی روایت کی طرح ایک روایت منقول ہے (رواہ احمد) وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ ابن کثیرؒ نے آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ مسلمان کے اقوال، اعمال اور تمام کوششیں پاکیزہ ہوتی ہیں اس لئے اس کی جزاء بھی پاکیزہ ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ مسلمان کا ظاہر باطن اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کی وجہ سے پاک ہوجاتا ہے۔ ایمان اور عقیدۂ صحیحہ کے سبب باطن پاکیزہ ہوتا ہے اور دل نجاست کفر و شرک سے پاک ہوتا ہے اور تمام اعمال کی بنا حسن نیت پر ہوتی ہے۔ اُس کی ہر حرکت لوجہ اللہ ہوتی ہے۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، کمائی کرنا، بیوی بچوں سے تعلقات دوستوں سے دوستی، اور دشمنوں سے دشمنی، اُٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا آرام اُٹھانا اور تکلیف پانا غرض زندگی اور موت صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ نفسانی اغراض کی نجاست آمیختہ نہیں ہوتی۔ حاصل یہ کہ نور ایمان سے اندرون اور اتباع شریعت سے بیرون پاک ہوجاتا ہے۔ اس لئے جنت کے نگران اُن کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہر دُکھ سے بچاؤ اور ہر ظاہر و باطن کے عوض طیب جزا کی بشارت دیں گے۔

فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ اور اس شان سے داخل ہو کہ وہاں تمہارا قیام دوامی ہوگا۔ اور وہاں رہنے سے تم کبھی نہ اُکتاؤ گے۔ (ابن کثیر) مقصد یہ کہ جنت کی راحت سے کبھی دل برداشتہ نہیں ہوگا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ اہل ایمان دنیا میں اللہ سے دعا کرتے تھے۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ یہ دعا ان کی قبول فرمالی گئی اور اللہ نے آپ سے پیغمبروں کی معرفت جو وعدہ فرمایا تھا جنت میں اس کو پورا کیا تو اس وقت اہل جنت نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔ ابو العالیہ ابو صالح قتادہ سدی اور ابن زید نے کہا آیت میں الارض سے مراد ارض جنت ہے اور نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ اسی کا بیان ہے۔

وارث بنانے کا مطلب بعض علماء نے یہ بیان کیا کہ اللہ نے ہم کو مالک و مختار بنا دیا جنت میں جہاں چاہیں رہیں یعنی اپنے محدود حصہ میں۔ بعض دوسرے علماء نے وراثت کی تعبیر اختیار و تملیک سے نہیں کی بلکہ قائم مقام بنانا مراد لیا ہے۔ جب اللہ نے دوزخ جنت کی تخلیق کی اور آدمیوں کو بھی بنایا تو دونوں مقامات پر ہر ایک کافر و مومن کی جگہ بھی مقرر فرما دی۔ قیامت کے دن ہر شخص اپنے مقرر مکان کو پہچان لے گا۔ پھر جب کافر اپنے کفر کی وجہ سے داخل ہوں اور مومن اپنے ایمان و عمل صالح کے سبب جنت میں داخل ہوگا تو کافر علاوہ اپنے مقرر مکان کے اُس مقام کا دکھ بھی برداشت کرے گا جو مومن کے لئے بصورت اختیار کفر جہنم میں مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح مومن جنت میں اپنی جگہ کے علاوہ اس مقام سے بھی تمتع اندوز ہو سکے گا جو کافر کے لئے بصورت ایمان جنت میں متعین کر دیا گیا تھا۔ اس طرح مومن کافر کا اور کافر مومن کا وارث اور قائم مقام ہو جائے گا۔ آیت کا یہی مفہوم ہے۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ۔ ابن کثیر نے اس جملہ کو اہل جنت کی حمد و ثنا کا تتمہ قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ نے ہمارے عمل کی قدر دانی فرمائی اور اپنا وعدہ پورا کیا اس کا شکر ہے۔ عمل کرنے والوں کے عمل کا اجر کیسا اچھا ہے۔ دوسرے علماء نے اس فقرے کو اللہ کا کلام قرار دیا ہے حَيْثُ نَشَآءُ تک مومنوں کا کلام تھا۔ یہ اللہ کی طرف سے ریمارک ہے کہ ہم نے جو کچھ مومنوں کو دیا وہ ان کی نیکوکاری کا نتیجہ ہے۔ کام کرنے والوں کی قدر دانی ہم بہت کیا کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے یہاں صحیح اسناد کے ساتھ حضرت علی کا ایک اثر نقل کیا ہے جو بہت طویل ہے جس میں مذکور ہے کہ جنت کے دروازوں کے باہر ایک درخت کے تنے کے نیچے سے دو چشمے بہتے دکھائی دیں گے۔ مومن ایک چشمہ میں نہائیں گے تو رحمت کی تازگی اور شادابی اُن پر آجائے گی۔ پھر بدنی تغیرات نہ ہوں گے (یہاں تک کہ) سر کے بال بھر پراگندہ نہ ہوں گے۔ گویا عمدہ تیل بالوں میں پڑ جائے گا۔ دوسرے چشمہ کا پانی پئیں گے تو پیٹ کی کثافت اور غلاظت دور ہو جائے گی۔ (مطلب یہ کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے دنیوی جسمانی لوازم صاف کر دیئے جائیں گے اور جنت میں داخل ہونے اور رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد جنت کے دروازوں پر ان کا استقبال ہوگا اور آیت میں جو کیفیت بیان کی ہے وہ پیش آئے گی۔

مقصودِ بیان

اتقوا ربھم کا لفظ ہر حسن کردار اور اتباع شریعت کو شامل ہے۔ اس لفظ سے مترشح ہو رہا ہے کہ مومنوں کا ایمان اور صلاح عمل ہی جنت میں داخلہ کا سبب ہوگا۔ زمراً سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کے مختلف گروہ ہوں گے اور تفاوت اعمال سے مدارج کا تفاوت ہوگا۔ سلام علیکم کا لفظ کثیر معنی کو جامع ہے یہ اس جگہ بطور دعا استعمال نہیں کیا گیا۔ دعا کا موقع نہیں بلکہ بطور بشارت کہا گیا ہے۔ ہر قسم کا بچاؤ اس کے اندر داخل ہے۔ تمام آلام دنیوی سے بچاؤ۔ دوزخ اور شدائد آخرت سے بچاؤ۔ خوف زوال سے بچاؤ۔ ظالم کے ظلم اور حاکم کے جبر سے بچاؤ۔ غرض ہر امر ناگوار سے بچاؤ مقصود ہے۔ طبتم کا لفظ بشارت بھی ہے اور سلامتی کی علت بھی ہے۔ بشارت اس طرح کہ ہر پاکیزہ جزاء اہل جنت کو ملے گی اور سلامتی کی علت کا اظہار اس طرح کہ عقائد و اعمال کی پاکیزگی حصول جنت کا سبب ثابت ہوئی اس لئے جنت کے نگرانوں نے کہا کہ چونکہ تم دنیا میں پاکیزہ تھے اور علمی و عملی پاکیزگی تمہارے اندر تھی اس لئے آج تم کو ہر دکھ سے سلامتی دی گئی۔ خالدین کا لفظ بتا رہا ہے کہ اہل جنت جنت میں ہمیشہ رہیں گے نہ کبھی کوئی ان کو نکلنے پر مجبور کرے گا نہ خود ان نعمتوں سے دل برداشتہ ہو کر اور اکتا کر تبدیل حالت کے خواستگار ہوں گے صدقنا وعدہ اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو کچھ دنیوی احوال یاد ہوں گے اور پیغمبروں نے اللہ کی طرف سے جس آخروی کامیابی کا وعدہ کیا تھا وہ ان کو یاد آجائے گا اور کیفیت و حالت کی تبدیلی اس کثیف دنیا کی کچھ باتیں یاد رکھنے سے مانع نہ ہوگی۔ اور ثنا الارض سے ثابت ہو رہا ہے کہ جنت میں زمین بھی ہوگی، خواہ کیسی ہی ہو اور اس کی کیفیات کچھ ہی ہوں مگر ہوگی ضرور زمین۔ نعم اجر العاملین۔ اُس بے عمل انسان کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو تقدیر پر بھروسہ رکھتے ہوئے عمل کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ وغیرہ

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔ آیات مذکورہ بالا کی تلاوت سے یہ امر واضح ہو گیا کہ مومنوں کو جنت میں اُن کے مقام پر اور کافروں کو جہنم میں اُن کی جگہ بھیج دیا جائے گا اور جزا سزا کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اس آیت میں اللہ کی جبروتی شان اور رُعب جلال

ہیبت کا بیان فرمایا ہے جس کے سامنے جلیل القدر حاملین عرش الٰہی تعظیم و تقدیس تمجید و تحمید میں مشغول دکھائی دیں گے ملائکہ اگرچہ ہمیشہ تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے ہیں لیکن انسانوں کی آنکھوں پر حجاب ظلمت ہونے کی وجہ سے وہ نظر نہیں آتے قیامت کے دن تاریکی دُور ہو جائے گی اور اس عالم کی کثافت زائل ہو کر ہر آنکھ میں عالم آخرت کی لطافت پیدا ہو جائے گی اس لئے وہ سب کو تسبیح و تحمید میں مشغول دکھائی دیں گے اور عجیب پرشکوہ جلال آگیں جبروتی سطوت والا منظر ہوگا۔

ضروری تنبیہ

اگرچہ ملائکہ بے شمار ہیں اور ہو سکتا ہے کہ لاتعداد حاملان عرش الٰہی کے بے کیف اور منزہ عن الجہت تخت کو پورا گھیرے ہوئے ہوں لیکن اس جگہ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ اس لئے فرمایا ارشاد یہ اس وقت انسانی بصر و بصیرت فرشتوں کے اُس احاطۂ عرش کو جو جہت جسمانیت رنگ اور کیف سے منزہ ہے ہر طرف سے نہ گھیر سکے اور کوئی آنکھ عرش خداوندی کا احاطہ نہ کر سکے اس لئے وہ عرش کے کچھ فرشتے نظر آئیں گے اور باقی دکھائی نہ دیں گے۔

بعض اہل تفسیر نے یسبحون کا فاعل ملائکہ کو قرار نہیں دیا بلکہ مذکورہ بالا اہل جنت کو تسبیح پڑھنے والا قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ تمام مخلوق خواہ ناطق ہو یا غیر ناطق وہاں اللہ کی قدرت اور عدل کو دیکھ کر سب کی زبانوں پر حمد الٰہی جاری ہوگی اس لئے آیت میں قِیلَ کا کوئی مخصوص فاعل ذکر نہیں فرمایا۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ حمد کرنے والے اہل جنت ہوں گے اور یہ غرض سرور ان کی آخری دعا بھی ہوگی جس طرح کہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ قتادہ کا قول ہے کہ اس سورت کا اول آخر ایک ہی ہے۔ آغاز بھی الحمد للہ سے کیا تھا اور خاتمہ بھی اسی حمد پر کیا۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضور اقدس نے سورۂ زمر کو ممبر پر تلاوت فرمایا تو ممبر کو دوبارہ جنبش ہوئی۔ (کما فی الصحاح)

مقصودِ بیان

قیامت کے روز اللہ کی ہیبت جلالت اور پھر جبروت شان آنکھوں سے دکھائی دے گی اور حاملان عرش کی تسبیح و تحمید نظر آئے گی جس کی وجہ سے ہر شخص (بقول ابن کثیر موافق اور مخالف دونوں) اللہ کی حمد کریں گے حاملان عرش کی تحمید و تمجید کو ظاہر کرنے سے بقول شیخ ابو علی جوزجانی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مقام قرب بہت ہیبت ناک ہے۔ اہل قرب ہر وقت ذات پاک کی تنزیہ اور تسبیح میں غرق رہتے ہیں اور نہ فقط اُن کو تنزیہی استغراق ہوتا ہے بلکہ وہ استغراق اور تسبیح کو بھی اللہ کی نعمت سمجھتے ہیں۔ اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ استغراق تنزیہی کے باوجود اُن میں انانیت اور عجب نہیں پیدا ہوتی اور بس عبادت سے وہ اللہ پر کوئی احسان نہیں رکھتے۔ بلکہ تسبیح و عبادت کی توفیق کو اللہ کی طرف سے جانتے ہوئے وہ نعمتِ توفیق پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مقام قرب اتنا پُر جبروت ہے کہ مقربان بارگاہ کو تسبیح و حمد میں مشغول دیکھ کر دیکھنے والے بھی بے ساختہ حمد کرنے لگتے ہیں وغیرہ۔

سُورۂ مومن

یہ سورت پوری مکی ہے عطاء، جابر اور عکرمہ کا یہی قول ہے کتاب اسباب النزول میں ہے کہ ابن عباس نے فرمایا سورۂ حم المومن نزول کر میں ہوا سمرہ بن جندب سے مروی ہے کہ تمام حم (والی سورتوں) کا نزول مکہ میں ہوا حسن بصری سے مروی ہے کہ آیت وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الآیۃ کو مکی ہونے سے مستثنیٰ کرنا چاہئے۔ کیونکہ نمازوں کا نزول مدینہ میں ہوا قتادہ اور (ایک روایت میں) ابن عباس سے مروی ہے کہ دو آیات مدینہ میں نازل ہوئیں یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ الآیۃ۔ اور اس کے بعد والی آیت سیوطی نے اتقان میں یہی لکھا ہے۔ اس سورت کا نام سورۃ الطول اور سورۂ غافر بھی ہے۔ آیات کی تعداد بیاسی یا پچاسی ہے۔ کلمات ایک ہزار ایک سو ننانوے اور حروف چار ہزار نو سو ساٹھ ہیں۔

محمد بن نصر مروزی اور ابن مردویہ نے حضرت انس کی روایت بیان کی ہے کہ حضور فرماتے تھے مجھے تورات کے بجائے [illegible] عنایت کیا اور زبور کی جگہ طواسین عنایت کیا اور انجیل کی بجائے حم والی سات سورتیں اور [illegible] مجھے مرحمت فرمائے (یعنی حم والی سات سورتیں) اور [illegible]

ہے حوامیم تک (قرآن) عطا کیا اور فضیلت میں مجھے حوامیم اور مفصل (سورتیں) دی گئیں جن کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا ہر چیز کا مغز ہے اور قرآن کا مغز حم (والی سورتیں) ہیں۔ اتقان اور اسباب النزول میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا حوامیم (حم والی سورتیں) قرآن کی دیباج (یعنی رونق) ہیں۔

سعد بن ابراہیم نے فرمایا حوامیم (حم والی سورتیں) کو عرائس (دلہنیں) کہا جاتا تھا۔ (رواہ الدیلمی)

خلیل بن مرہ سے مروی ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا حوامیم سات ہیں اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں۔ ہر حم جہنم کے (کسی) ایک دروازے پر آکر کہے گی الٰہی اس دروازے سے ایسے بندے کو داخل نہ کر جو مجھ پر ایمان رکھتا اور مجھے تلاوت کرتا تھا۔ (بیہقی فی الشعب) حضرت ابو درداءؓ دمشق میں مسجد بنا رہے تھے کسی شخص نے پوچھا آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ فرمایا آل حم کی وجہ بنا رہا ہوں۔ (رواہ ابو عبید) یعنی کفار سے حفاظت کے لئے آل حم کی برکت سے اس کو بنا رہا ہوں۔ چنانچہ آج تک کبھی دمشق پر کافروں کا قبضہ نہیں ہوا یہاں تک کہ تاتاری بھی دمشق کو فتح نہ کر سکے جبکہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

حضرت ابو مہلب بن ابی صفرہ نے فرمایا۔ مجھ سے ایک بزرگ نے خود حضور اقدسؐ سے سن کر بیان کیا۔ حضور فرما رہے تھے کہ آج رات اگر تم پر شب خون مارا جائے تو تم حم لا ینصرون کہنا۔ (رواہ ابو داؤد والترمذی) دوسری مفصل روایت میں آیا ہے کہ غزوۂ خندق میں جب تمام قبائل عرب متفق و مجتمع ہو کر چڑھ آئے اور آخر ایک ماہ کے بعد آندھی کی تباہ کاری کے سبب خوار ہو کر بھاگ گئے تو اسی زمانے میں ایک روز حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اگر آج کی رات یہ کافر تم پر چھاپہ ماریں تو تم حم لا ینصرون کہنا۔

حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو تمہارا شعار جنگ حم لا ینصرون (کا نعرہ یا نشان یا دعا) ہونا چاہئے بزرگوں کا تجربہ بھی ہے کہ ہر مصیبت کے وقت حم لا ینصرون پڑھنا بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ

حم (اس کے معنی اللہ ہی معلوم ہیں) یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے ہر چیز کا جاننے والا ہے گناہ کا بخشنے والا ہے اور توبہ کا

التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

قبول کرنے والا ہے سخت سزا دینے والا ہے قدرت والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اسی کے پاس (سب کو) جانا ہے

تفسیر اللہ کی قہاریت اور عزت و غلبہ کے سامنے سارا جہان مقہور ہے۔ زمین و آسمان ستارے چاند سورج آگ پانی ہوا مٹی تمام روشن اور تاریک مخلوق اس کے غلبۂ ملکیت اور عزت قدرت کے سامنے سرافگندہ ہے۔ کسی میں سرتابی کی مجال نہیں۔ لیکن یہ غلبۂ سلطنت اور قہر عزت بے جا اور غلط نہیں جابرانہ اقتدار اور احمقانہ تسلط نہیں بلکہ سارے سنسار کی ہم آہنگی اور یک زبانی ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے جس سے واضح ثبوت ملتا ہے اس امر کا کہ یہ سب غلبہ و اقتدار پُر حکمت، پُر مصلحت اور علم محیط کے زیر اثر ہے۔ یاد رکھو کہ عرش سے فرش تک کسی ادنیٰ اعلیٰ اور زبردست کا کوئی واجبی حق خدا پر نہیں جس کی ادائیگی خدا پر لازم ہو۔ بلا ارادہ بغیر اختیار و قصد کے آگ کی گرمی پانی کی تری مٹی کے ثقل اور ہوا کی روانی کی طرح یا سورج چاند اور ستاروں کی روشنی کی مثل خدائی ہے قہاریت اور سلطنت و قوت کی محسوس، نیم محسوس اور غیر محسوس شکل ہماری نگاہ عقل اور چشم

کے سامنے آئی ہے بلکہ اللہ صاحب فضل ہے مہربان ہے مالک احسان ہے بااختیار نوازش کنندہ اور ارادہ والا عزیز علیم ہے پس اس کی ہمہ گیر قدرت بے پایاں تھاریت پر حکمت اور پر فوائد تخلیق و تنظیم کا ارادی اور اختیاری تقاضا ہے کہ انسانیت کو سدھارنے والے قوانین بھیجے اور قدم سے حدوث کی جانب یا عالم نور سے جہانِ مادیت کی طرف یا بارگاہ معبودیت سے حاشیہ نشینان عبدیت کی سمت اپنے فرمان اُتارے۔ اس کے بعد جو کوئی اُن فرمانوں کو جان کر ماننے کے لئے جانے اس کو تو بہرحال کامیابی ہوگی۔ لیکن جو نافرمان جاہل نہ جانتے اور نہ مانتے ہوں ان پر لازم ہے کہ اپنی سرتابی اور نافرمانی چھوڑ دیں اور رب کو چھوڑ کر اللہ کی طرف دوڑیں اللہ توبہ قبول فرماتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ اللہ چونکہ بڑا مہربان ہے اس لئے توبہ کے بعد توبہ سے پہلے کے تمام چھوٹے بڑے گناہ بھی چھپا دیتا ہے ڈھانک دیتا ہے ان کی بازپرس نہیں کرے گا اور محاسبہ کے لئے مغفور اور مستور گناہوں کو سامنے نہیں لائے گا۔ اس پر بھی اگر کوئی بدنصیب توبہ نہ کرے اور اللہ کی صفتِ عزت و فضل کو دیکھتے ہوئے بھی اس کی طرف سچے دل سے رجوع نہ کرے تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کی سزا سخت ہے وہ شدید العقاب ہے۔ ہٹی مجرم کو اپنے کیے کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ زندگی اور اس کے تمام اعمال یونہی مٹ جائیں گے دوبارہ کبھی خدا سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ اس کے پاس جانا نہ ہوگا۔ یہاں جو دل چاہے کر لیا جائے۔ موت وقت پر آئے گی اور میرے پیچھے زندگی کی تمام بدکرداریاں بھی مر جائیں گی۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا بلکہ اللہ کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہوگا۔ اسی کے پاس سے تو سب آئے تھے اس لئے نقطۂ آغاز پر ہی سیرِ زندگی کا انجام ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء

حٰمٓ شیخ محلی اور سیوطی کے نزدیک ان حروف کا متشابہات میں سے شمار کرنا اولیٰ ہے جن کی حقیقی مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اہلِ تنقیح نے لکھا ہے کہ حقیقی مراد سے مایوسی لازم نہیں آتا کہ روشن دل علماء کو اصل مراد کی جانب کچھ اشارات کرنے سے بھی اللہ نے مایوس کر دیا اور تمام علماء مفہوم متشابہات کے ایمانی علم سے بھی بے بہرہ مقفول القلب اور مقلوب العقل بنا دیئے گئے۔ اسی لئے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک حٰمٓ اللہ کا اسم ہے۔ اس کی تائید ابن عباس کے اس قول سے ہوتی ہے جس کو خطیب نے روایت کیا ہے کہ حٰمٓ اللہ کا اسمِ اعظم ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ الٓر اور حٰمٓ اور نون کا مجموعہ الرحمٰن ہے۔ بعض علماء نے حٰمٓ کو سورت کا نام قرار دیا ہے۔ ایک رمز شناس کا کہنا ہے کہ حٰمٓ کا مطلب ہے حُمَّ الامر یعنی اہل ایمان سے اللہ کی مدد اور کافروں سے اللہ کا عذاب قریب ہوگیا۔

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ۔ الکتاب سے مراد قرآن ہے جو آئندہ مرقوم یا مؤلف ہونے والا تھا۔ اس آیت کے نزول کے وقت جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا اور آئندہ جتنا نازل ہونے والا تھا سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ قرآن کی تنزیل نہ تنزیل جسمانی ہے نہ تنزیل مکانی بلکہ ایک تلقف روحانی اور الہام ربانی ہے۔ جو ایک روح امین اور رسول کریمؐ کی معرفت دوسرے صادق امین اور رسول کریمؐ کے قلب پر بے کیف و بے رنگ اور بے شکل فیضان کی شکل میں نمودار ہوا اور بارگاہ الوہیت سے حاشیہ نشینانِ عبدیت کی جانب یعنی نورانیت سادہ سے کثافت بردوش مادہ پرستی نورانیت کی طرف اُتارا گیا۔

مِنَ اللّٰہِ۔ یعنی اس قرآن کا مصنف یا مؤلف نہ کوئی فرشتہ ہے نہ جن نہ آدمی نہ کوئی دوسری مخلوق بلکہ اللہ ہی نے اس کو بھیجا ہے اس لئے العزیز کہ اللہ عزیز ہے عزت تسلط غلبہ اقتدار سب کچھ اس کو حاصل ہے۔ ساری کائنات اس کے سامنے مقہور اور اس کے ہاتھ میں مقدور مغلوب اور حقیر و ذلیل ہے۔ کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ تکوینی ضابطہ کو نہیں توڑ سکتا ہے۔ اس کی بارگاہِ عزت کے سامنے فطرت سرکشی کا پرچم سر نہیں اٹھایا جا سکتا۔ پھر ارادی اصلاحیات اور انسانیت کو اختیاری سدھار دینے اور سنوارنے والے قوانین کون بنا سکتا ہے۔ آئینِ تکوین اس کا نافذ ہے تو ضابطۂ تشریع بھی اسی کا جاری ہونا چاہیئے۔

الْعَلِیْمِ۔ لیکن یاد رکھو کہ اللہ کی یہ غیر محدود اور غیر ممتد اور تمام زمانہ و زمانیات سے آزاد عزت (العزیز صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے جس کا مفہوم ہر زمانہ کو محیط ہے۔ صرف استقبال کے ساتھ مخصوص نہیں) اور ہمہ گیر اقتدار جاہلانہ احمقانہ یا محض اتفاقی غیر ارادی نہیں بلکہ اس کا علم بھی محیط ہے وہ ہر چیز کو ہر وقت بلکہ وقت کو بھی جانتا ہے۔ اس کی عزت پُر حکمت ہے مصلحت سے لبریز ہے۔ بس اس سے کون پوچھے کہ ایسا

صفت عزت کے سامنے سارے جہان کو مقہور بنایا۔ خیر کے ساتھ شر کو بھی پیدا کیا اور جذبات فرمان پذیری کے دوش بدوش عواطف نافرمانی کی بھی تخمیر کی پھر خود ہی اصلاحی قوانین بھیجے اور نظم غیر ارادی کے ساتھ ساتھ نظم ارادی کو بھی آزاد نہیں چھوڑا۔ اب جو مانتا ہے ماننے نہیں مانتا اور صرف جانتا پہچانتا اور تصدیق کرتا ہے تو اللہ عملی گناہوں کو چھپا دینے اور بخشنے والا ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ ۔ یہ لفظ شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو شامل ہے لیکن معتزلہ کے نزدیک توبہ شرط ہے اور اشاعرہ گناہوں کی مغفرت کو توبہ پر موقوف نہیں قرار دیتے بلکہ اللہ اپنی رحمت سے ہر گناہ کو شرک کے علاوہ بغیر توبہ کے معاف کرنے والا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا جس بندے نے (صدق دل سے) لا الٰہ الا اللہ کہا اس کے لئے اللہ غافر الذنب ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آیت میں حصر اور استغراق کا کونسا لفظ ہے بنیادی غلطی یہ ہے کہ غافر الذنب اور قابل التوب کو دو غیر مربوط ٹکڑے قرار دیدیا گیا ہے۔ واقع میں ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توبہ کے معنی ہیں گناہوں اور نافرمانیوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف لوٹنا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا سچائی کے ساتھ وعدہ کرنا۔ گویا آئندہ زندگی کو فرمان پذیری کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کرنا توبہ ہے لیکن توبہ سے پہلے جو گناہ سرزد ہو چکے ان کی سزا از روئے ضابطہ ضرور ملنی چاہیئے۔ واقعات ماضی کے نقوش صفحات ماضی سے کیسے مٹائے جا سکتے ہیں۔ یہ تو قانونی عدل ہے لیکن خدا تعالیٰ غافر الذنب ہے اور قابل التوب بھی ہے۔ یعنی اگر کوئی سچے دل سے آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے۔ یہاں تک کہ شرک کو بھی ترک کر دے تو اللہ اس کے وعدہ کو قبول کر لیتا ہے اور پچھلی زندگی کی سیاہی اس کی آئندہ زندگی کو تاریک نہیں بناتی بلکہ گزشتہ تمام گناہوں کو یہاں تک کہ شرک کو بھی بخش دیتا ہے اور توبہ سے پہلے کا ماضی جیسا بھی ہو معاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر توبہ ہی نہ کرے اور نافرمانیوں پر جما رہے۔ شَدِيدِ الْعِقَابِ اور سرکشی نہ کرنے کا وعدہ ہی نہ کرے۔ تو پھر وہ سمجھ لے کہ اللہ کی سزا سخت ہے اس کو عذاب سخت دیا جائے گا۔ رہا توبہ کا قبول کرنا اور توبہ سے پہلے گناہوں کا توبہ کے بعد معاف کر دینا یہ قانون کے تقاضے کے تحت نہیں ہے۔ سبب مسبب علت معلول عمل اور نتیجہ کا ضابطہ مغفرت ماضی اور قبول مستقبل پر مجبور نہیں کرتا بلکہ یہ خدا کی ذی الطول مہربانی ہے اس کا فضل و احسان ہے کہ وہ اپنی رحمت سے معاف فرما دے۔

(نوٹ) بات صرف اتنی ہے کہ مختلف علمائے تابعین نے ذی الطول کے معنی کی تشریح مختلف الفاظ میں کی ہے۔ حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ ابن عباس نے فرمایا وسیع الکرم اور غنی مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ یزید بن اصم نے کہا صاحب خیر کثیر عکرمہ نے کہا۔ صاحب احسان قتادہ نے کہا صاحب نعمت و فضل لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۔ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ہی نہیں ہے۔ کوئی واجب الاتباع آقا ہی نہیں پھر سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کی آخری حاضری اس کی عدالت میں نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر اللہ اپنے خصوصی جرائم معاف نہ کرے اور خود مہربانی نہ فرمائے تو اس کے اور کون معاف کر سکتا ہے۔ مجرم غلام کے جرائم اگر اس کا آقا معاف نہ کرے تو ہو سکتا ہے کہ غلام کہیں بھاگ جائے اور ہاتھ ہی نہ آئے۔ یا کوئی دوسرا طاقتور آقا اپنی حمایت میں اس کو لے لے اور اصلی آقا کو دسترس نہ دے لیکن اللہ ایسا آقا نہیں بلکہ معبود ہے الٰہ ہے اس کی برابر کا تو کیا واقع میں کوئی دوسرا معبود ہی نہیں ہے اور نہ کوئی اس کی عدالت سے روپوش ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی توبہ قبول اور خطاؤں کو معاف کر سکتا ہے تو وہ اللہ ہی ہے۔ ابن کثیر اور خطیب نے لکھا ہے کہ ایک ایلچی بارگاہ فاروقی میں آیا کرتا تھا۔ آدمی مجاہد تھا۔ اتفاق سے مدت تک ایک بار غیر حاضر رہا تو حضرت عمرؓ نے وجہ دریافت کی لوگوں نے عرض کیا وہ شراب خواری میں پڑ گیا پیہم مخمور رہتا ہے۔ آپ نے کاتب کو حکم دیا کہ اس کو اس طرح خط لکھ دو۔ من عمر (فلاں بن فلاں) سلام علیک اما بعد انی احمد اللہ لا الٰہ الا ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۔ خط دے کر ایلچی سے فرمایا خط اس وقت دینا جب وہ ہوش میں ہو۔ پھر حاضرین سے فرمایا اس کے لئے توبہ کی دعا کیا کرو۔ غرض خلافت نامہ اس شخص کو پہنچا اور اس نے پڑھا تو کہنے لگا اللہ نے مجھ سے مغفرت کا وعدہ فرمایا اور اپنے عذاب سے ڈرایا ہے۔ بار بار آیت کو پڑھتا اور روتا رہا بالآخر توبہ کی اور شراب خواری چھوڑ دی۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو فرمایا تم لوگ اسی طرح کیا کرو جب دیکھو کہ تمہارے کسی بھائی کا پاؤں پھسل رہا ہے تو اس کو سہارا دو اور سیدھا کرو اور اللہ سے اس کے لئے دعا کرو کہ خدا اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان کے مددگار بن جاؤ۔ (رواہ ابو نعیم)

ابوبکر بن عیاش نے کہا مجھ سے شیخ ابو اسحاق سبیعی نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ امیر المومنین! میرے ہاتھ سے ایک قتل ہو گیا کیا میرے لئے بھی توبہ ہے۔ حضرت نے آیت حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ الخ تلاوت فرمائی اور فرمایا اللہ کے بندے توبہ کر۔ ناامید مت ہو (رواہ ابن ابی حاتم و ابن جریر)۔

ثابت البنانی تابعی (حضرت انسؓ کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ میں حضرت مصعب بن زبیر کے ساتھ علاقہ کوفہ میں تھا۔ ایک روز ایک باغ میں دو رکعت نماز کی نیت باندھی اور سورۂ حٰم المومن شروع کی جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ پر پہنچا تو اچانک دیکھتا کیا ہوں کہ میرے پیچھے کوئی شخص یمنی حلہ پہنے سفید خچر پر سوار کھڑا کہہ رہا ہے جب تو غَافِرِ الذَّنْبِ کہے تو کہا کر اے غافر الذنب میرے گناہ بخش دے اور قَابِلِ التَّوْبِ پڑھے تو کہا کر اے قابل التوب میری توبہ قبول فرما اور جب تو شدید العقاب پڑھے تو کہا کر اے شدید العقاب مجھے عذاب نہ دینا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے منہ موڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا۔ تلاش میں باغ کے دروازے پر پہنچ کر لوگوں سے پوچھا۔ کسی نے یمنی حلہ پہنے کسی شخص کو جاتے دیکھا ہے۔ لیکن سب نے انکار کیا۔ لوگوں کا خیال تھا وہ الیاسؑ تھے۔ (رواہ ابن ابی حاتم باسناد حسن)

چند لطیف حقائق

شیخ سہل تستری نے تفسیری اشارات میں فرمایا۔ اللہ عزیز ہے مخلوق کے تصورات کی رسائی سے بالاتر۔ علیم ہے جو کچھ اس نے پیدا کیا اور جس کے لئے جو اندازہ کیا اُس کے مبنی بر مصلحت ہونے سے خوب واقف ہے۔ غافر الذنب ہے جس کے گناہ چاہتا ہے چھپا لیتا ہے۔ قابل التوب ہے۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ علم سنت سے واقف ہو کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ قبول فرماتا ہے۔ ذی الطول ہے سب سے اور سب کی عبادت سے پاک اور بے نیاز ہے۔

بعض مشائخ نے کہا۔ گناہوں کا بخشنا اُس کا کرم ہے۔ توبہ قبول کرنا اس کا فضل ہے۔ عذاب دینا اس کا عدل ہے۔ الوہیت اس کے لئے ہے اور الیہ المصیر اُس کے وعدے کی تصدیق ہے۔

ایک نورانی روح والے عالم کا قول ہے۔ گناہوں کی بخشش گناہگاروں کے لئے توبہ قبول کرنا مسلمان ہونے والوں کے لئے، شدید العقاب کافروں کے لئے اور ذی الطول نیکوں کے لئے۔ ایک دوسرے عارف نے کہا غافر الذنب سے ان موحدوں کو اُمید ہے جو گناہ پر اصرار کرتے ہیں اور قابل التوب ان لوگوں کے لئے جو پشیمان ہو کر گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور شدید العقاب ان منکروں کے لئے جو متکبر ہیں اور ذی الطول ان موحدوں کے لئے جو اہل عرفان ہیں۔ ایک تیسرے حقیقت شناس نے کہا شدید العقاب ہے نفسانی حجاب والوں کے لئے کہ اصل مرجع کی طرف نہیں لوٹتے اور ذی الطول ہے حجاب نفسانی دور کر دینے والوں کے لئے جو قرب کمال میں پہنچ کر کشفِ جمال کے وقت مشرف بہ ارادت ہوتے ہیں اور لا الٰہ الا ہو اُس کی ذات شرک و اضداد سے پاک ہے معاف کرنے اور عذاب دینے میں خود مختار ہے اور الیہ المصیر یعنی اس مغفرت و عذاب کی حکمت سے وہی واقف ہے اور ہر مصلحت کا اسی کی طرف رجوع ہے۔ خاتم۔

مقصود بیان

قرآن مجید اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ نہ کلام جن ہے نہ تالیفِ انس۔ اس کے قوانین اور ہدایات بھی من جانب اللہ ہیں: انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی ممنون نہیں۔ اللہ چونکہ صاحب اقتدار غالب اور علیم کل ہے اس لئے قرآن بھیجنے کا اُس کو حق تھا۔ گناہگار کیسا ہی گناہگار ہو اللہ اُس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور گزشتہ تمام گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ کسی ضابطہ کو جبر کے زیر اثر نہیں بلکہ اُس کی مہربانی اور فضل کا یہی تقاضا ہے۔ شدید العقاب کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے تجویز کردہ سزا سخت ہوتی ہے۔ کل کائنات کی ہستی کے باہمی اختلاف اور ہر خیر و شر کا رجوع اللہ کی ذات یا اُسکی عدالت کی طرف ہے۔ وہی انجام کا آخری نقطہ ہے۔ وغیرہ

مَا يُجَادِلُ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ كَذَّبَتْ

اللہ تعالیٰ کی اُن آیتوں میں (یعنی قرآن میں) وہی لوگ (ناحق کے) جھگڑے نکالتے ہیں جو (اس کے) منکر ہیں سو اُن لوگوں کا شہروں میں (امن و امان سے) چلنا پھرنا آپ کو

قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ۪ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ

انبیاء میں نہ ڈالے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور دوسرے گروہوں نے بھی جو ان کے بعد ہوئے (جیسے عاد و ثمود وغیرہ ہم نے) دینِ حق کو جھٹلایا تھا اور ہر امتوں میں سے جو لوگ ایمان لائے

وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ

تھے انہوں نے اپنے پیغمبر کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس ناحق سے حق کو باطل کر دیں سو میں نے (آخر کار) ان پر داروگیر کی سو دیکھو میری طرف سے (ان کو) کیسی سزا

حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

ہوئی اور اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے پروردگار کا یہ قول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لوگ (آخرت) میں دوزخی ہوں گے

تفسیر کسی بات کے حق و باطل ہونے کا معیار کیا ہے۔ سچ کو جھوٹ سے اور حقیقت کو حقیقت نما فریب سے ممتاز کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس کے متعلق انسانوں کے دو مختلف الخیال گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے اونچی کوٹھیاں سیم و زر کے انبار دیبا و حریر کی طغیانی، خدم و حشم کا ہجوم باد رفتار برق شعار سواریاں، مرغزار سبزہ زار تفریح گاہیں ثمر آور جھومتے باغ لہلہاتے کھیت غرض ہر راحت نعمت اور تن آسانی کے اسباب کی فراہمی یہی معیار صداقت ہے نشانِ حقانیت ہے۔ مدارج ترقی سیادت قیادت اور کوس لمن الملکی کی ہیبت ناک آواز حقیقت ہے۔ صداقت اور حق ہے نا قابل تردید یقیناً سیادت طاقت راحت اور حکومت حق ہے۔ اس کے علاوہ ہر تعلیم باطل ہر پیام ہدایت ہیچ۔ ثمرات خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہیں تو درخت یقیناً صحیح الاصل اور صالح ہے۔ سیندھ تھوہر اور آکھ کے درخت کو کون اچھا کہہ سکتا ہے۔ جس تعامل زندگی کا فوری نتیجہ خوش کن راحت آفریں مسرت انگیز طرب افزا اور تمام جسمانی طاقتوں کی تشنگی دور کر کے پُر کیف سکون بخشنے والا ہے اس کی حقانیت میں کیا کلام کیا جا سکتا ہے۔ جس چیز کو آیت اللہ کہا جاتا ہے، ہدایت غیبی تصور کیا جاتا ہے اور تنزیل من اللہ مانا جاتا ہے اس میں ذلت نکبت فلاکت اور افلاس اور خستگی حال و بال کے سوا اور کیا ہے۔ ایسی ہدایت کا دعویٰ کرنے والے اور ایسی بے مغز تعلیم کو پھیلانے کی خواہش رکھنے والے ذلیل ہیں فقیر ہیں حقیر ہیں، بدبخت اور باطل پرست ہیں۔ ہم ہیں اللہ کے محبوب اور پیارے قدرت کے منظورِ چشم اور دلارے۔ یہ ننگے بھوکے مصیبت کے مارے در در ٹھوکریں کھانے والے کیا انسانیت کو سدھاریں گے کیا معاشرت کو سنواریں گے۔ ان کو ذلیل کرو کوئی منہ بھی نہ لگاؤ۔ تھانیں نو مارو، مار کر نکال دو۔ پتھر مار کر لہو لہان کر دو پھر بھی چُپ نہ ہوں تو قتل کر دو۔

دوسرا گروہ کہتا ہے یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی ہر مصیبت اور راحت آنی جانی ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا اونچی کوٹھیوں کو نیچے گرا دیتا ہے ایک رات میں چاندی سونے کے ڈھیر چوری ہو جاتے ہیں۔ ایک گرم ہوا لہلہاتے کھیتوں سر سبز مرغزاروں اور پھلدار شاداب باغوں کو جلا دیتی ہے۔ چند منٹ میں ممالک محروسہ میں بغاوت کی آگ بھڑک جاتی ہے۔ شاہی فوج خود شاہی اقتدار کو مٹا دیتی ہے۔ آخر وقت آ گیا تباہی آ گئی موت آ جاتی ہے۔ آدمی تخت سے تختہ پر اور زریں کرسی سے آہنی دار پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ کیا عیش ہے بے حقیقت۔ کیا راحت و تنعم ہے بے اصل۔ کیا حکومت و اقتدار ہے زوال پذیر۔ اس پر پھولنا جھومنا اور مست ہونا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یاد رکھو قانونِ الٰہی اٹل ہے۔ اس کا پیام لازوال ہے۔ دنیا اور دنیا والوں کی پوجا ہلاکت آفریں ہے۔ تخلیق کو دیکھو، آثارِ تخلیق کو دیکھو۔ کہیں آسمان و زمین کی پیدائش میں کسی قسم کی خامی تم کو نظر آتی ہے۔ پھر دیکھو غور سے، دیکھو ستاروں، سیاروں اور کائناتِ فضائیہ کی رفتار کو دیکھو۔ بہتے ہوئے دریاؤں اچھلتے آبشاروں زمین دوز فلک بوس پہاڑوں اور تند و نرم ہواؤں کو دیکھو۔ کسی جگہ بھی سیاہ نقطہ ہے کہیں بھی نقص ہے۔ ہوا میں اڑتے پرندوں زمین کے پیٹ میں رینگتے کیڑوں اور بیابانوں میں دوڑتے چوپایوں کو روزی کون دیتا ہے، کہاں سے دیتا ہے کیسے دیتا ہے۔ ابروں سے پانی کون برساتا ہے۔ سبزہ کون اگاتا ہے۔ بیج کون جماتا ہے۔ ان میں سے سوئی کون نکالتا ہے۔ پھر تنے پر اس کو کون کھڑا کرتا اور تھامتا روکتا ہے۔ پھر اس میں ان گنت دانے کون ترتیب سے چن کر

پیدا کرتا ہے۔ بیماری کون بھیجتا ہے اور تندرستی کون دیتا ہے۔ غرض ساری کائنات اور خواص کو نہ کس کے قبضہ میں ہیں۔ کیا اس کے سامنے سر جھکانا بیوقوفی ہے۔ اس کے فرمانوں کو ماننا جہالت ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھانا دانشمندی ہے۔ یہ دنیوی تاج و تخت یہ جھوٹی عزت و ذلت، یہ خود ساختہ حکومت و غلامی سب ضعیف البنیان بلکہ بے بنیاد ہے۔ اس پر نہ پھولو۔ حق اور اہلِ حق کی ایک آن اس کو خاکستر کر دے گی۔ اللہ کی نشانیوں میں جھگڑا، اس کے احکام کا انکار اور اس سے سرتابی نہ کرو۔ ورنہ چند روز میں نخوت بھرا سر زمین پر آ جائے گا۔ اس وقت خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شبہ ہو تو گزشتہ قوموں کے نتائج دیکھ لو۔ اللہ نے ان کی سرکشی کی کیسی سزا دی۔ اہلِ حق کو ذلیل سمجھ کر دکھ دینے والوں پر کیسی مار پڑی۔ حق پرستوں کو مارنے کا ارادہ کرنے والے خود مارے گئے اور جہنم رسید ہوئے۔

تحلیل اجزاء مَا يُجَادِلُ فِيۡۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا۔ آیت کا تفسیری مطلب اور گزشتہ آیات سے ربط ظاہر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدال کی تشریح کر دی جائے۔ جدال اور مجادلہ کا لغوی معنی ہے ایک حریف کا دوسرے حریف کو پچھاڑنے کی کوشش کرنا لیکن اس جگہ خصوصاً اور علما کے محاورات میں عموماً جدال کے معنی مباحثہ اور مقابلہ کے آئے ہیں۔ جدال بمعنی مباحثہ دو طرح ہوتا ہے۔

(۱) خواہ مخواہ جھگڑنا۔ خواہ جنگ برائے جنگ ہو یا محض نفسانی فوقیت اور جھوٹی شہرت اور ناجائز غلبہ حاصل کرنے کے لئے اور فریب دروغ اور ہٹ دھرمی یا کسی دوسری شیطانی تدبیر سے اہلِ حق کو شکست دینے کے لئے۔

(۲) امرِ حق کو واضح کرنے ژولیدگی، شبہات، جہالت اور غوایت کو دور کرنے کے لئے۔ اول الذکر کی ہر قسم حرام ہے۔ موخر الذکر بعض صورتوں میں جائز اور بعض صورتوں میں واجب ہے۔ یہی جہادِ علمی ہے۔ اعلانِ حق ہے، اعلائے کلمۃ اللہ ہے، دینی تبلیغ ہے، رشد و ہدایت ہے، وعظ و تذکیر ہے۔ قرآن مجید کے مشکل الفاظ اور معانی کو حل کرنے کی کوشش کرنا، اس سے لطیف معانی نکالنا، دوسرے علماء کے شبہات کو دور کرنا، محکم اور متشابہ کو بیان کرنا استنباطِ فروع کے لئے اصول تفقہ قائم کرنا قیاس کے لئے کلام اللہ یا کلام الرسول میں وجوہ کی جستجو کرنا یا علل جامعہ کو استنباط کرنا یہ سب صورتیں جدال جائز مستحسن یا واجب کی ہیں۔ جادلھم بالتی ھی احسن۔ ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن۔ اور اسی قسم کے دوسرے فقرے قرآن میں موجود ہیں۔ جن میں جدال احسن کا حکم دیا گیا ہے۔ صحابہ کا رسول اللہ سے مسائلِ دین کو دریافت کرنا اور شبہات سامنے رکھ کر حل کرنے کی کوشش کرنا استاذ سے شاگردوں کا اپنے اپنے دینی شبہات پیش کر کے ازالہ کی طلب کرنا استاذ کا جواب دینا پھر شاگردوں کا اعتراض کرنا اور دلائل کی روشنی میں استاذ کا فیصلہ کرنا ایک عالمِ حق کا دوسرے عالمِ حق سے مباحثہ وغیرہ میں بحسن نیت اختلاف کرنا ایک مجتہد کا دوسرے مجتہد کے خلاف اجتہاد کرنا اور دلائل قائم کرنا ان میں سے ہر ایک جدال کا احسن طریقہ ہے جو بعض صورتوں میں وجوب کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اول جدال کی بنا محض اٹکل تخمینِ کاذب، ضد، وہم، اغوا کی کوشش اور اسی طرح کے دوسرے لوازم جہالت پر ہوتی ہے اور دوسری قسم کے جدال کا مدار روشن دلائل واضح براہین بدیہی حقائق قوانینِ فطرت اور ضوابطِ عقل پر ہوتا ہے۔ حضرت نوح بھی اپنی قوم سے جدال کیا تھا اور ان کی قوم نے ان سے کہا تھا یا نوح قد جادلتنا الخ۔ لیکن اسی جدال کی بنا، نبوت کی پیش کردہ روشن دلائل اور واضح حقائق پر تھی اور اس کے مقابل قوم کے جدال کی بنا محض جہالت ہٹ اور عداوت پر تھی۔ نمرود اور حضرت ابراہیمؑ کا مناظرہ بھی اسی قسم کا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کھلی ہوئی حقیقت بیان کی تھی۔ اور فرمایا تھا۔ ربی الذی یحیی ویمیت یعنی سانس ڈالنے اور نکالنے کا کام خدا کا ہے۔ یہ کتنی واضح حقیقت تھی۔ لیکن ضدی جاہل نے اپنی ضد کا مظاہرہ کیا ایک واجب القتل قیدی کو چھوڑ دیا اور دوسرے کو قتل کرا دیا۔ یہ کتنی بے تکی بات تھی۔ کہاں سانس نکالنا اور ڈالنا اور کہاں آلاتِ جارحہ سے مارنا ۔۔۔۔۔ یہ جہالت اور ہٹ دھرمی دیکھ کر حضرت نے جدال کا رخ بدلا اور پہلی صورت سے زیادہ واضح صورت پیش کی اور فرمایا ان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب اس وقت ایسی کھلی ہوئی نشانی دیکھ کر ہٹ دھرم مدعی الوہیت لاجواب ہو گیا ہکا بکا رہ گیا مگر دوسری قسم کی جہالتوں پر اتر آیا۔

ایک ضروری تنبیہ :- ائمہ فقہ کا باہم جدال نمبر دوئم میں داخل ہے جس کی بنا قرآن و حدیث پر یا قرآن و حدیث کی صراحت کردہ وجوہ جامعہ

پر یا ان ہی سے استنباط کردہ علل کلیہ پر ہے۔ یعنی ائمہ کے اجتہاد اور اختلاف کا مبنی خود رائی بے جا ہٹ آپس کی عداوت حصولِ شہرت کی تمنا سیادت کی طلب اور قومی قیادت کی خواہش نہیں بلکہ اللہ کی مراد کلام اللہ کے مغز تک رسائی کی کوشش مد نظر ہے گویا چشمہ ایک ہی ہے سیراب ہونے کے گھاٹ الگ الگ ہیں۔ ایک نے صحیح ابن حبان کی قوی الاسناد حدیث پڑھ کر نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا حکم دیا۔ دوسرے نے حضرت علیؓ کے عمل کو دیکھ کر زیر ناف ہاتھ باندھنے کا فیصلہ کیا یا کسی نے سود والی مشہور حدیث پر غور کر کے علتِ جامعہ جنس و قدر کے اتحاد کو قرار دیا اور دوسرے نے اسی حدیث کو دوسرے رُخ سے دیکھ کر طعم و ثمنیت کو علتِ جامعہ مانا۔ خلاصہ یہ کہ اجتہادِ فقہی کا مدار صرف بے بنیاد اٹکل اور بے تکے تخمین پر نہیں بلکہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی روشنی سے اقتباس کی کوشش ہر مجتہد نے کی ہے۔ واجرھم علی اللہ۔

جدال کی تشریح کے بعد اب آیات کے معنی کی توضیح ضروری ہے۔ اللہ کی آیات کیا کیا ہیں یہ طویل بحث ہے۔ یہاں آیات اللہ سے مراد قرآن اور نبوت اور توحید کی کھلی ہوئی دلائل ہیں۔ جب بدیہی طور پر کسی نشان کا آیت اللہ ہونا سامنے آجائے تو پھر اس سے سرتابی اور خواہ مخواہ کا جھگڑا کفر کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر پہلے سے طے کر لیا جائے کہ حقیقت کتنی ہی کھلی ہوئی ہو ہم نہ مانیں گے تو ظاہر ہے کہ ایسا منکر ہٹ دھرم ضدی اور متعصب ہوگا اور اس کے جھگڑے کا مدار اندرونی کفر ہی قرار پائے گا۔

گزشتہ آیت میں وضاحت کردی گئی تھی کہ اللہ ہمہ گیر اقتدار اور عمومی عزت کا مالک ہے اور محیط کل علم بھی رکھتا ہے۔ اس کے اقتدار اور غلبے کی بنا پُرحکمت علم پر ہے۔ تمام تکوینیات و تخلیقات سے یہ بات عیاں ہے کہ ساری کائنات مغلوب مقہور اور مسخر ہے۔ ایسی حالت میں اسی کی الوہیت کو حقِ تشریع بھی ہونا چاہیے۔ اسی لئے اپنی مہربانی سے اس نے قوانین مکتوبہ مفروضہ نازل فرمائے۔ اور انسانی زندگی کے لئے دستور العمل بھیجا۔ یہ حقیقت اتنی کھلی ہوئی تھی جس کا انکار کسی عقلی برہان یا نقلی دلیل سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اگر کوئی خواہ مخواہ جھگڑا کرنا شروع کر دے اور لاجواب ہو کر ادھر اُدھر کی بکواس کرنے لگے۔ کبھی نورِ نبوت کو کثافت کہے۔ کبھی جادو کبھی شاعری۔ کبھی کسی انسان یا جن کی تعلیم کبھی جنون کا مظاہرہ تو اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس شخص نے پہلے سے انکار کرنے کی ٹھان لی ہے اور طے کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو وہ کفر ہی کرے گا اور کسی طرح نہ مانے گا۔ ایسی صورت میں یہ جدال طلبِ حقیقت کے لئے نہ ہوگا بلکہ مظاہرۂ کفر کے لئے۔ آیت کا یہی مطلب ہے۔

ایک وہم کا ازالہ

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا قرآن میں جدال کرنا کفر ہے۔ (رواہ ابو داؤد و عبد بن حمید) دوسری روایت میں ہے کہ قرآن میں مراء (خواہ مخواہ جھگڑا) کفر ہے۔ (رواہ ابو داؤد) حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے۔ ایک روز اول ظہر میں خدمتِ مبارک میں حاضر ہوا۔ حضور نے اس وقت دو آدمیوں کے جھگڑا کرنے کی آواز سنی جو مسجد کے اندر قرآن مجید کی کسی آیت میں اختلاف کر رہے تھے (فوراً) حضورؐ باہر تشریف لے آئے چہرۂ مبارک پر غصہ کے آثار نمودار تھے۔ فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ انھوں نے کتابِ الٰہی میں اختلاف کیا (رواہ مسلم) ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جدال اور اختلاف نہ کرنا چاہیئے لیکن کس قسم کا اختلاف نہ کرنا چاہیئے اس کی طرف موخر الذکر حدیث کے آخری فقرے میں اشارہ ہے جس میں گزشتہ قوموں کا سبب بربادی اختلاف فی کتاب اللہ کو قرار دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گزشتہ قوموں نے اللہ کی کتاب میں کس قسم کا اختلاف کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی بربادی ہوئی تو اس کو آیت قرآنی میں خود واضح فرما دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

وما اختلف الذین اوتوا الکتٰب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم الخ۔ ایک اور آیت میں آیا ہے ان الذین اختلفوا فی الکتٰب لفی شقاق بعید۔ اب حقیقت سامنے آگئی کہ جس اختلاف کی بنیاد نفسانیت دوسرے پر غالب آنے کی خواہش اور جذبۂ بغض و عناد ہو اور جس سے انتہائی پھوٹ اور شیرازۂ اسلام کی پراگندگی پیدا ہوتی ہو۔ ایسا اختلاف موجبِ بربادی اور ممنوع ہے اور طلبِ حق کے لئے تو اختلافِ امت رحمت ہے (کما فی النعیم) مخالفت ممنوع ہے حسد اور بغی ناجائز ہے۔ اختلاف میں کوئی ہرج نہیں۔

فَلَا یَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ۔ خطیب کے قول پر تقلب سے مراد ہے تجارتی سفر مال و دولت اور فوجیں لے کر گھومنا پھرنا اور البلاد سے مراد ہے ملک شام و یمن۔ تخصیص غیر منصوص کی وجہ ہمارے علم سے باہر ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے البلاد کو عموم پر رکھا اور تقلب سے ہر طرح کی سیر د

بظاہر خطاب رسول اللہ کو ہے لیکن رسول اللہ تو کیا اونچے مرتبے والے صحابیوں کی ذات بھی اس
تفریح اور عیش وراحت میں گھومنا پھرنا مراد لیا ہے۔
سے اونچی تھی کہ وہ کافروں کے اس چند روزہ عیش وتنعم اور آزادی وخوش حالی کو دیکھ کر فریب خوردہ ہو جاتے لیکن تمام مسلمانوں کا ایمان تو ایک طرح کا
نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے پاس نور روحانی وجدان اور نورانی عقل نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ کافروں کی ظاہری آن بان دیکھ کر کوئی خیال کرنے لگے کہ اگر یہ
باطل پرست ہوتے اور صداقت اُن کے ساتھ نہ ہوتی تو اللہ کی یہ نعمتیں ان کو کیوں ملتیں اور کس طرح روز افزوں عیش وراحت میں ہوتے اس وہم
کو دور کرنے کے لئے فرما دیا کہ اس عیش وراحت میں آزادی کے ساتھ (ان کا گھومنا پھرنا تم کو فریب نہ دے) یعنی ان کی اس فراخ دستی اور مرفہ الحالی
سے تم کو ان کی حقانیت وصداقت پرستی کا دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ میرے نزدیک سب سے بہتر یہ ہے کہ کوئی خاص مخاطب مراد نہ لیا جائے مومن
ہو کافر ہو نیک ہو بد ہو کیسا ہی ہو ہر ایک کو ندا، عام ہے۔ ندا، عام سے مقصود اگرچہ منادی کو متوجہ کرنا ہوتا ہے لیکن ندا، غیر معین میں کبھی غیر منادی
پر تعریض اور در پردہ اس کو تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے اور ندا کا رُخ عمومی ہوتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہے خطاب عام ہے لیکن در پردہ کافروں کو
تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ تم کو اپنی خوش عیشی اور مال ودولت کو لئے لئے گھومتے پھرنے پر ریجھنا نہ چاہیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں
کو حقیر سمجھ کر دُکھ دینے کے درپے نہ ہونا چاہیے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس میں حضور اقدس کو تسلی دی گئی ہے کہ گزشتہ انبیاء کے ساتھ بھی اُن کی قوم کے کافروں
کا برتاؤ یہی رہا ہے جو اُن کا آپ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ نوح کو ان کی قوم نے بھی جھوٹا قرار دیا۔ میرے نزدیک حضور والا کی تسلی کے علاوہ خیر وشر کے ایک
عام ضابطے کا بھی بیان ہے اور جہاں رسول اللہ کی تسلی ہے وہاں کافروں کو وعید بھی ہے کہ خیر کی طاقت سے ٹکراؤ کا نتیجہ ابتداءً کیسا ہی نظر کش ہو
انجام میں تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ۔ حزب اُس گروہ کو کہتے ہیں جن کا اجتماع کسی امر معین پر ہو۔ حضرت نوح کے بعد مختلف اُمتوں نے اپنے اپنے
پیغمبروں کے خلاف محاذ بنا لیا تھا اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کی ساری قوم نے اس کو مان لیا ہو اور محاذ بندی نہ کی ہو۔

وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ۔ جب حق کے مقابلہ میں آدمی محاذ بندی کر کے
سامنے آتا ہے تو اول اپنی نظر میں دلائل کا مقابلہ دلائل سے کرتا ہے جس کی تہہ میں اس کی نفسانیت، حسد وفریب زوال سیادت کا خوف کبر نفس، کوتاہی
نظر، تقلید اسلاف، سوسائٹی اور سماج کا دستور غرض ہر جہالت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ علمی مناظرہ نہیں ہوتا، حق کی طلب نہیں ہوتی، اہل حق کے
پیام پر غور کرنا مقصود ہی نہیں ہوتا اپنے افکار واعمال کی بُرائی سننی گوارا ہی نہیں ہوتی بلکہ ہر باطل طاقت کو کام میں لا کر حق کو شکست دینا اور
اور صداقت کو مغلوب کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ مدت دراز کی اس کشاکش کے بعد بھی جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور چاند پر خاک ڈالنا کسی طرح
ممکن نہیں ہوتا تو جاہلانہ دھمکیوں پر اُتر آتے ہیں۔ دُکھ پہنچانے مارنے قید کرنے اور آخر قتل کرنے کی کوشش اٹھا نہیں رکھتے۔ ہر امت کا سلوک
اپنے پیغمبر سے ایسا ہی رہا ہے۔

قتادہ اور سدی کا قول ہے کہ پکڑنے سے مراد ہے قتل کرنا عربی زبان میں۔ لِيَأْخُذُوا کا معنی لیهلکوا آتا ہے۔ دیکھو دوسری آیت میں آیا
ہے۔ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ۔ میں کہتا ہوں یہ بات تاریخ کی روشنی میں ثابت نہیں کہ ہر اُمت نے اپنے پیغمبر کو قتل کرنے کا ارادہ
ضرور کیا ہو۔ نہ کسی حدیث رسول آیت قرآن قول صحابی یا صراحت تابعی میں اسی کا بیان آیا ہے۔ نہ کسی مشہور معتبر عالم نے کہیں لکھا ہے اس لئے
تعمیم مناسب ہے یعنی ہر امت نے اپنے پیغمبر کو دُکھ دینے یا قید کرنے یا مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔

آیات کا بیان ترتیبی نہیں نوٹ موخر الوقوع کو بیان اور ذکر میں مقدم کر دیا ہے۔ ترتیب واقعی اس طرح ہے کہ حق کو زیر کرنے اور کمزور بنانے
کے لئے انہوں نے باطل کی طاقتوں کی مدد حاصل کی یا باطل کو حق کے مقابلہ پر لائے اور کامیابی نہ مل سکی تو پیغمبروں کو دکھ دینے یا گرفتار کر دینے کے
درپے ہو گئے۔

فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۔ یہاں اخذ سے مراد ہلاک کر دینا ہے۔ یعنی کافروں کی کوئی تدبیر سودمند نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہر قسم کی

محاذ بازی کی یہاں تک کہ قید و قتل کی کوشش سے بھی نہیں چوکے نتیجہ میں اللہ کی پکڑ میں آ گئے۔ اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس آیت میں لفظ استفہام سوالیہ نہیں بلکہ سزا کی ہولناکی ظاہر کرنے اور زجر و ملامت کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جس نے حق کو زیر اور کمزور کرنے کے لئے باطل کی اطاعت کی اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ اس سے آزاد ہو گیا۔ (رواہ الطبرانی بسند جید)

وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۔ شیخ نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے۔ جس طرح اللہ نے لکھ دیا ہے کہ اس کے رسول غالب رہتے ہیں اور کافر شکست کھا کر برباد ہوتے ہیں اور واقعات ہوئے بھی اسی طرح ہیں۔ یونہی اللہ کا یہ فیصلہ بھی ٹھیک ہے کہ کافر دوزخی ہیں۔ شیخ ابن کثیر نے مطلب کو کسی قدر پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ورنہ طرز بیان بالکل سادہ اور صاف ہے۔ اللہ نے کافروں کے متعلق دو فیصلے فرمائے ہیں۔ ایک دنیا میں اور دوسرا آخرت میں۔ دنیوی فیصلہ یہ ہے کہ انبیاء کے لائے ہوئے دین حق کو کافر نہیں مٹا سکتے اور آخر کار خود تباہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ انبیاء کی امتوں نے ایسا ہی کیا اور ہلاک کر دی گئیں۔ یہ دنیوی زندگی کا فیصلہ تھا۔ اسی کی طرح اخروی فیصلہ بھی ہے کہ کافر اپنے کفر کی وجہ سے دوامی جہنمی ہوں گے۔ یہ بات بھی پوری ہو کر رہی۔

مقصود بیان مایجادل الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم معلوم ہونے کے بعد پھر اس میں جھگڑا کرنا اور حیلے بہانے یا ہٹ دھرمی کر کے اس کو نہ ماننا کفر کی علامت ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ اس پر باطن گروہ کو جو خیر و شر کو جانچنے کی کسوٹی عقل کو قرار دیتے ہیں اور حکم منصوص کے مقابلے میں اپنی خود تراشیدہ روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

فَلَا يَغْرُرْكَ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کا عیش ان کی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ اہل ایمان کو اس سے فریب خوردہ نہیں ہونا چاہیئے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ الخ سے حق و باطل کے مقابلے کا ایک عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے اور رسول پاک کی تسلی کے ساتھ در پردہ کافروں کو تباہی کی دھمکی دی گئی ہے۔ وغیرہ

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ

جو فرشتے کہ عرش (الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان

لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا

والوں کے لئے (اس طرح) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ کی رحمت (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے (شرک و

سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝ رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُم

کفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے راستے پر چلتے رہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے اے ہمارے پروردگار اور ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جن کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے

وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَقِهِمُ

اور ان کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مومن) ہوں ان کو بھی داخل کر دیجئے بلاشک آپ زبردست حکمت والے ہیں اور ان کو

السَّيِّئَاتِ ۚ وَمَن تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ ع

قیامت کے دن ہر طرح کی تکالیف سے بچائیے اور آپ جس کو اس دن کی تکالیف سے بچالیں تو اس پر آپ نے (بہت) مہربانی فرمائی اور یہ بڑی کامیابی ہے

ع ۹/۶

تفسیر

اللہ نے علمی ارادی کائنات کی تخمیر تین طرح سے کی ہے (۱) خالص خیر (۲) خالص شر (۳) خیر و شر کی مخلوط معجون۔

(۱) خالص خیر کی وہ طاقتیں ہیں جن سے کبھی دانستہ یا نادانستہ شر کا صدور ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی پوری زندگیاں اور زندگیوں کے تمام ایام اور ایام کے تمام ساعات و لمحات خالص اطاعت گزاری اور فرمان پذیری میں گزرتے ہیں۔ خالص خیر کی طاقتوں کا نام ملائکہ ہے اور ملائکہ میں بھی مختلف مراتب و مدارج ہیں، متعلقہ خدمات ہیں۔ علوی اور سفلی کی تفریق ہے۔ ساری کائنات کا اندرونی نظم اور فرمانِ خداوندی کے موافق تمام چیزوں کو نوعی صنفی اور شخصی ضروریات کی تقسیم غرض اللہ کی خلاقیت اور ربوبیت کے کل تقاضوں کو پورا کرنا انہی کا کام ہے۔ ملائکہ ہی میں کچھ مخصوص افراد مختلف قسم کی عبادتوں میں غرق رہیں نظم کائنات سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ سب سے اونچے درجات والے وہ ملائکہ ہیں جو عرش اور ماحولِ عرش سے وابستہ ہیں۔ سبوحی، قدوسی اور کروبی ہیں اور ان سب سے اونچی شخصیت کا نام جبرئیل ہے۔ جو رسول کریم ہے امین ہے۔ عرش والے خدا کی بارگاہ میں اس کی بڑی عزت ہے۔

(۲) خالص شر وہ ہے جس سے کبھی دانستہ نادانستہ خیر کا صدور نہیں ہو سکتا۔ شر کی خالص طاقت کا نام شیطان ہے۔ شیطان کے بھی شیطنت کی کمی بیشی اور تنوع کے اعتبار سے مختلف طبقات اور مدارج ہیں اور سب کے سردار کا نام ابلیس ہے۔

(۳) تیسری مخلوق وہ ہے جس کے قوام میں خیر و شر دونوں داخل ہیں۔ کبھی کسی پہلو کو ترجیح اور غلبہ حاصل ہوجاتا ہے اور کبھی کسی کو۔ اس مخلوط قوام کا نام آدمی ہے۔

آدمی کی تقویم میں چونکہ نیکی اور بدی دونوں کو دخل ہے اور دونوں طرح کی طاقتیں اس کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے کسی آدمی میں خیر کا غلبہ ہوجاتا ہے اور کسی میں شر کا۔ کوئی مومن بن جاتا ہے کوئی کافر، کوئی نیک کوئی بد، کوئی فرماں پذیر صالح، کوئی نافرمان طالح، کسی کا عاطفۂ ملکیت قوی ہوتا ہے کسی کا جذبۂ شیطنت۔ غرض اس کے اندر ہر وقت ایک جدال تصادم ٹکراؤ اور کشاکش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور اس تنازع میں جو طاقت غالب آتی ہے اس کی فتح ہوجاتی ہے اور آدمی اسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ کسی پر صبغۃ الخیر چڑھ جاتا ہے اور کسی پر صبغۃ الشر۔ اگر خیر کی طاقت قوی ہوتی ہے تو اس کا جھکاؤ ملکیت کی طرف ہوجاتا ہے اور خالص خیر والی کائنات سے اس کا خالص لگاؤ ہوجاتا ہے۔ خیر کی ہر کائناتی طاقت اس کی مددگار بن جاتی ہے۔ گویا دونوں میں اتحادِ مقصد کی وجہ سے خاص دوستی ہوجاتی ہے اور اندرونی طور پر ملکوتی دنیا اس کے لئے اللہ سے دعا استغفار اور درخواست رحمت بھی کرتی ہے اور ہر مکروہ مصیبت سے اس کو بچانے کی خواہشمند بھی ہوتی ہے۔ لیکن اگر شر کی طاقت بڑھ جاتی ہے تو ایسے آدمی کا میلان شیطنت کی طرف ہوجاتا ہے۔ اس کے افکار و اعمال پر شرارت غالب ہوجاتی ہے اور پھر خالص شر والی کائنات اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ طرح طرح سے شر کی جانب اس کو اُبھارتی ہے، بچوکے دیتی ہے، اُکساتی ہے۔ اس کی رگوں کی خلاؤں میں اور دل کی تجویفوں میں خون کے ساتھ ساتھ دوران کرتی ہے اور ہر طرح سے سبز باغ دکھا کر اس کے دل میں شر کی محبت رچا دیتی ہے لیکن جب انسان شر پر آمادہ ہو کر عملی طور پر کفر کرنے لگتا ہے تو بے ایمان شر پرست اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور بیزاری کا اعلان کر دیتی ہے۔ نتیجہ میں فریب خوردہ انسان تباہ ہوجاتا ہے اور طلبگارِ خیر کامیاب۔

تحلیل اجزاء

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ۔ پچھلی آیات میں بیان فرمایا تھا کہ کافر اپنے کفر کی وجہ سے مسلمانوں سے عداوت رکھتے ہیں اور آیات اللہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور (بے مقدار مال و دولت لئے) ملک میں گھومے پھرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اُن کی اس عارضی راحت و شوکت سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہیئے۔ اس جگہ ظاہر فرمایا ہے ایسی عظیم الشان ہستیاں جو عرشِ الٰہی کی حامل ہیں اور وہ جلیل القدر افراد جو عرش کے گرداگرد ہیں یعنی حاملینِ عرش اور کروبی فرشتے مسلمانوں سے محبت رکھتے ہیں اور اُن کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اللہ سے اُن کے لئے استغفار کرتے ہیں اور نزولِ رحمت کی درخواست کرتے ہیں۔ ایسی مکرم معظم عالی مرتبہ رفیع القدر مقربانِ بارگاہ کی محبت کی موجودگی ان بے مقدور عاجز ذلیل کافروں کی دشمنی ناقابلِ توجہ ہے۔ حاملینِ عرش کیسے ہیں کتنے ہیں کس صورت اور جسامت اور طاقت کے حامل ہیں۔ عرش کیا ہے کیسا ہے۔ کیا خدا عرش پر موجود اور متمکن ہے کیا حاملینِ عرش اللہ کو دیکھتے ہیں۔ یہ تمام مباحث تفسیر آیات کے ذیل میں آئندہ آئیں گے۔ اس جگہ صرف حاملینِ عرش کے متعلق تشریح ہے۔ خطیب نے سراج میں بروایت شہر بن حوشب اور زمخشری نے کشاف میں بغیر صراحت قائل کچھ عجیب صراحتیں کی ہیں اور کسی روایت کا سلسلۂ اسناد کسی نے بیان نہیں کیا اس لئے ہم اُن پر اعتماد نہیں کر سکتے کیونکہ عالمِ ارواح اور فوق الطبیعات کا علم عقلی نہیں محض نقل پر مدار ہے اور نقل بلا سلسلہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ وضع

اور ضعف اور قوت ضابط جرح و تعدیل چونکہ پرکھنے کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا اور جب اسناد کا سلسلہ ہی مفقود یا منقطع ہے تو پرکھنا کس طرح ممکن ہے امام رازی نے کبیر میں کشاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں مگر جرح نہیں کی اور کشاف نے روایت کو مجہول کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بھی ان کی صحت کے قائل نہیں۔ ہاں ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں مسند امام احمد سے ایک حدیث غریب مع اسناد نقل کی ہے ہم بھی اس کو لکھتے ہیں۔ پھر ابو داؤد وابن ماجہ اور ترمذی سے ایک حدیث نقل کریں گے اور دونوں میں جو ظاہری تعارض ہوتا ہے اس کے ازالہ کی کوشش کریں گے۔ باللہ التوفیق احمد ح عبداللہ بن محمد بن ابی شیبۃ ح عبدۃ بن سلیمان عن ابن محمد بن اسحق عن یعقوب بن عتبۃ عن عکرمۃ عن ابن عباس اس روایت کا یہی سلسلہ ہے اور ابن کثیر نے اس روایت کو جید قرار دیا ہے۔ بہر حال ابن عباس نے فرمایا کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا امیہ بن ابی الصلت نے اپنے بعض اشعار میں کچھ سچ کہا ہے ؎

زحل وثور تحت رجل یمینہ — والنسر للاخریٰ ولیث مرصد

یعنی زحل اور ثور اللہ کے دائیں قدم کے نیچے ہیں اور نسر طائر اور لیث مرصد دوسرے قدم کے نیچے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا امیہ نے سچ کہا۔

ابن کثیر نے کہا۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الحال حاملان عرش چار فرشتے ہیں۔ دائیں جانب زحل اور ثور اور بائیں جانب نسر طائر اور لیث رشید اور چاروں حاملان عرش کی شکلیں بھی انہی چار جانوروں کی طرح ہیں جن کا ذکر امیہ نے اپنے شعر میں کیا ہے، لیکن

حضرت عباس بن عبد المطلب کا بیان ہے کہ چند آدمیوں کے ساتھ میں وادی مکہ میں تھا رسول اللہ بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ اچانک بادل کا ایک ٹکڑا سامنے سے گزرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ تم لوگ اس کو کیا کہتے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا سحاب۔ فرمایا اس کو مزن بھی کہتے ہیں لوگوں نے جواب دیا جی ہاں فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے جواب ملا نہیں۔ فرمایا اکہتر یا بہتر یا تہتر (زیادہ) برس کی راہ کا فاصلہ ہے۔ اس کے اوپر آسمان ہے، اسی طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک طویل مسافت ہے۔ آپ نے سات آسمان شمار فرمائے۔ پھر فرمایا ساتویں آسمان سے اوپر ایک بحر زخار ہے جس کے زیریں و بالائی حصوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک۔ پھر اس کے اوپر آٹھ اوعال (وعل کی جمع ہے جس کا معنی ہے پہاڑی بکرا) ہیں اور اوعال کی پشت پر عرش ہے اس کے نچلے اور بالائی حصہ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پھر اس سے بالا تر حق تعالیٰ ہے (رواہ ابو داؤد وابن ماجہ والترمذی وقال حدیث حسن غریب) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش کو اٹھانے والے آٹھ (ملائکہ) ہیں جن کی شکل پہاڑی بکرے کی ہے۔ شہر بن حوشب نے بھی یہی کہا تھا کہ عرش اٹھانے والے آٹھ ملائکہ ہیں جن میں سے چار کہتے ہیں۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ اور چار کہتے ہیں۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ۔

حضرت ابن عباس کی روایت مدنی ہے اور حضرت عباس کی وادی مکہ والی روایت کی ہے۔ اول میں حاملین عرش کی تعداد چار بتائی ہے جن کی شکلیں چار مختلف جانوروں کی ہیں اور دوسری میں تعداد آٹھ ظاہر کی ہے جن کی شکلیں بکروں کی طرح بیان کی ہیں۔ بعض لوگوں نے توفیق کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ فی الحال چار ہیں اور قیامت کے دن آٹھ ہو جائیں گے ابن کثیر کا یہی قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار ملائکہ عرش کے پایوں کو تھامنے پر مامور ہیں اور چار پہاڑی بکروں کی طرح اپنی پشت پر سقف عرش کو روکے ہوئے ہیں۔ میری رائے میں عالم غیب کے حالات کسی کو بھی معلوم نہیں ہیں۔ عقل ان ماورات سے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہے اور کیسا ہے ظن و تخمین کا وہاں دخل نہیں، مشاہدہ اور معاینہ کا امکان نہیں۔ صرف حامل وحی اور اہل کشف ہی کچھ دیکھنے سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن عالم فوق الشعور کا واقعی بیان انبیاء اور اہل مکاشفہ بھی کس طرح کریں۔ ہر زبان کے الفاظ واقعی حقائق کے بیان سے قاصر ہیں صرف تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں اظہار کیا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں عرش جلالی کیا ہے اور کیسا ہے۔ تو پھر اس کو پیمائش کرنے کی اور اس کی حقیقی کیفیت بیان کرنے کا چونکہ امکان ہی نہیں اس لئے کہیں آٹھ سے کیف۔ بے نوں نے شکل اور کے تم نورانی شکلوں کو پہاڑی بکروں سے تشبیہ دی کہیں کہا اور دوسرے جانوروں کے نام لئے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھ کر اپنے جلال حکومت کا اظہار کرتے ہیں۔ تخت کے چار پائے ہوتے ہیں اس کا نام تخت یا اسٹیج بھی ہوتی ہے۔ پایوں کی شکلیں مختلف جانوروں کی ہوتی ہیں یا مختلف اشکال۔ کہ جیسے عرش کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں عرش

تخت شاہی کی یہی شکل ہوتی ہے۔ خدا وسی قسم یا دی جلوہ گاہ الوہیت کو جو محض نورانی ہے۔ جب عرش (تخت) سے تعبیر کیا تو تخت کے تمام لوازم و متاع کا بھی تذکرہ کر دیا تاکہ جلالِ الٰہی کا کچھ پرتو ذہنوں پر پڑ سکے اور عظمت و ہیبت کی کچھ تصویر کشی ہو سکے جو ان الفاظ کے ذریعے سے ہو جائے اس لئے مناسب یہی ہے کہ ایسی حقیقتوں پر زیادہ غور ہی نہ کیا جائے اور عقل کے گھوڑے دوڑا دوڑا کر فلک پیمائی اور عرش نوردی کا دعویٰ ہی ترک کر دیا جائے۔ ان روایت پر زور دینے کی بجائے روایت کی چھان بین اور پرکھ خوب کی جائے اور سنت سے مخرج (کا) کسوٹی پر جانچا جائے اگر سلسلۂ روایت میں کہیں ضعف کہیں اور تدلیس نظر آئے تو فوراً پایۂ اعتبار سے گرا دیا جائے۔ تابعین کے دور سے لے کر چند صدیوں تک بہت سے مسلم نما غیر مسلموں نے (جو عبادت کا جامہ پہن کر) حضور کی ذات گرامی سے سروپا باتیں منسوب کی تھیں جن کو علماء حق نے کاٹ چھانٹ کر کے علیحدہ پھینک دیا ہے اور دودھ میں سے پانی دور کر دیا ہے۔ لہٰذا سلسلۂ روایت کی پرکھ بہت ضروری ہے۔

يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ یعنی حاملین عرش اور حاضرین حول العرش اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں عزت حاصل ہونے کے دو ہی سبب ہیں۔ اوّل اللہ کی عظمت و کبریائی کا اعتراف اور نقائص و عیوب سے تنزیہ کا اقرار۔ دوم اللہ کی فرماں بردار مخلوق سے محبت اور اس سے شفقت۔ بارگاہِ الٰہی کے مقرب سوسی قدوسی اور کروبی فرشتے اللہ کے باعزت بندے ہیں اس لئے سب سے پہلے وہ اللہ کی تسبیح و تحمید کا اقرار کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کے مومن بندوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

فقرۂ مذکورہ کے تین ٹکڑے ہیں تسبیح، تحمید اور رب۔ اللہ کی صفات تین قسم کی ہیں۔

(۱) تنزیہی اور سلبی یعنی اللہ کا تمام نقائص و عیوب سے پاک ہونا۔ اس پر لفظ تسبیح دلالت کر رہا ہے۔ (۲) اللہ کی تمام ثبوتی کمالیہ یعنی تمام اچھے اوصاف کا خدا میں پایا جانا۔ یہ جامعیت ہی ہے جو اللہ کو محمود بنا رہی ہے۔ ہر حمد کا سزاوار خدا ہی ہے اور حمد خالص کے لئے سزاوار ہے اس لئے کہ وہی صفات کمالیہ کا جامع ہے۔ اس مفہوم کا اظہار ملائکہ کے لفظ بحمد سے ہو رہا ہے۔ (۳) اللہ کا ماسوی اللہ سے خصوصی تعلق خواہ اس طور پر ہو کہ اللہ نے سب کو پیدا کیا یا اس طور پر ہو کہ وہی سب کی نگرانی رکھتا ہے، سب پر حکومت کرتا اور سب کو رفتہ رفتہ مدارج ترقی طے کرا کے وقتِ خاص تک باقی رکھتا ہے۔ اس خصوصی وصف کو ربوبیت کہتے ہیں۔ اللہ نے ملائکہ کے متعلق جن احوال و اقوال کا اظہار فرمایا ہے ان میں اللہ کی تسبیح (تنزیہی صفات کا اقرار) تحمید (اللہ کی مثبت صفات کمالیہ کا اقرار) اور ربوبیت (اللہ کی اس انعامی صفت کا اظہار جس کا تعلق خلق سے ہے) شامل ہے اور آیت مذکورہ میں تینوں معانی کو ظاہر کرنے والے تینوں الفاظ موجود ہیں۔

وَيُؤْمِنُونَ بِهِ۔ حاملانِ عرش مقرب بارگاہ ہیں۔ شرف حضوری ان کو حاصل ہے۔ اللہ کے سرگانہ اوصاف کا وہ ہمہ اوقات اقرار کرتے ہیں تو پھر کیا اللہ ان کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ کیا وہ خدا کو دیکھتے ہیں اور دیکھ کر حمد و ثنا کرتے ہیں۔ جی نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان کی قابل مدح صفت ان کا ایمان ہے۔ سورج کو نظروں کے سامنے روشن دیکھ کر روشنی کا اقرار کرنا قابل مدح و منقبت نہیں۔ پھلوں اور کھیتوں کی پختگی اور دوسرے حقیقی آثار دیکھ کر یا دیکھ کر سورج کا اعتراف عقلی کمال اور علمی بحث پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے فرشتوں کی تمام حمد و ثنا، خدا کو عرش پر سامنے بیٹھا دیکھ کر نہیں ہوتی۔ یہ تو کوئی کمال ہی نہیں ہے، قابل تعریف۔ قیامت کے دن بخت مخرین کا فر بھی اس اقرار پر مجبور ہوں گے۔ بلکہ فرشتوں سے تمام حمد و ثنا کا فطری ظہور ایمان بالغیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو ایسے آدمیوں سے بھی محبت ہوتی ہے جو اللہ پر نادیدہ ایمان رکھتے ہیں۔ صاحب کشاف نے لفظ یؤمنون بہ کی یہ لطیف تفسیر کی ہے اور امام رازی نے بھی تفسیر کبیر میں اس کو بہت پسند کیا ہے۔

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا۔ اوپر کی آیت میں اس تسبیح و تحمید کا ذکر تھا جس کا ظہور صدور ملائکہ سے ہوتا رہتا ہے۔ اس آیت میں اس شفقت و محبت کا اظہار ہے جو ملائکہ کو اہل ایمان سے ہے اور جس کا ظہور بارگاہِ الٰہی میں مسلمانوں کے لئے دعائے خیر کرنے سے ہوتا ہے۔ یہاں دو بحث طلب ہیں۔

(۱) آیت میں یہ صراحت تو موجود ہے کہ حاملانِ عرش اہل ایمان کے لئے استغفار کرتے ہیں لیکن خود اپنے لئے استغفار کرنے کا ذکر نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔

(۲) کیا فرشتے گنہگار مسلمانوں کے لئے گناہ معاف کر دینے کی التجا کرتے ہیں یا بے گناہ مسلمانوں کے لئے زیادتی ثواب کی دعا کرتے ہیں اس آیت سے ترشح ہو رہا ہے کہ فرشتوں کو اپنے لئے استغفار کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان سے گناہ سرزد ہونے کا ہی امکان نہیں۔ ایک آیت میں اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا تھا۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ حضرت نوح کی دعا دوسری آیت میں نقل کی ہے۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو اپنے لئے استغفار کی ضرورت ہے کیونکہ ان سے لغزش (خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو اور خواہ دینی معاملات میں نہ ہو صرف دنیوی امور میں ہو) کا صدور ممکن ہے اور فرشتے چونکہ ہر لغزش سے پاک ہیں ان کو شر کی طاقت ہی نہیں دی گئی اس لئے ان کو اپنے لئے استغفار کی ضرورت نہیں۔ ہے گروہ معتزلہ کی خوف سے کعبی نے کہا کہ ملائکہ عام اہل ایمان کے گناہ معاف کرانے کے لئے دعا نہیں کرتے بلکہ زیادتی ثواب کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ان کی دعا کا یہ مطلب نہیں کہ خدا گناہگاروں کے گناہ معاف کر دے بلکہ یہ مراد ہے کہ جن مسلمانوں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے خدا ان کا اجر بڑھا دے کیونکہ اسی آیت کے بعد آتا ہے۔ فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ۔ یعنی اے اللہ تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے۔ کعبی کی یہ تشریح خود تراشیدہ ہے۔ زیادتی ثواب کے لئے دعا کو استغفار کہا ہی نہیں جاتا۔ اس لفظ کا اطلاق صرف استغفار گناہ کی طلب کے لئے ہوتا ہے۔ جو گناہوں سے توبہ کر چکے اور ان کے گناہ (بقول معتزلہ لازماً) معاف ہو گئے ان کے لئے استغفار کے لفظ کا استعمال ہی نہیں ہے۔ آخر بے گناہ کس کے جرم کو مستور اور پوشیدہ کرنے کی خواہش کی جا سکتی ہے۔ زیادتی ثواب کی خواہش میں کونسا جرم مستور کرانا مقصود ہوتا ہے۔ رہی بعد کو آنے والی آیت جو يَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا کی توضیح ہے۔ اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ اے خدا جن لوگوں نے کفر سے توبہ کی اور تیری راہ توحید پر چلنا اختیار کیا ان کے گناہ معاف کر دے۔ اشاعرہ کی وکالت کرتے ہوئے امام رازی نے کبیر میں یہی تشریح کی ہے۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ۔ اہل ایمان کے لئے دعا کرنے سے پہلے ملائکہ نے اللہ کی ثناء کی اور لفظ رب کہہ کر ندا کرتے ہوئے اللہ کی وسعت رحمت اور ہمہ گیری علم کا اظہار کیا۔ تمام انبیاء کی دعاؤں میں اظہار سے مطلب پہلے اللہ کی حمد و ثناء کا التزام کیا گیا ہے۔ دیکھو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے دعا سے پہلے اللہ کے اوصاف کمالیہ کا اعتراف کیا تھا اور کہا تھا: الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ۔ پھر سب کے آخر میں کہا تھا۔ رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ۔ خود سورۂ فاتحہ کو حمد سے شروع کرنے اور اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کہنے سے پہلے اللہ کے اوصاف کو ذکر کرنے میں اسی کی تعلیم دینی مقصود ہے۔ حقیقت میں جوہر روح کی کثافت کو دور کرنے، اس میں قدسی صفائی پیدا کرنے کے لئے عظمت الٰہی کی معرفت اور اس کا اظہار ضروری ہے تاکہ اس طرح اکسیر کا ایک ذرہ تانبے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو سونا بنا دیتا ہے اسی طرح معرفت عظمت کا اکسیری ذرہ لوح روح کو چمکا کر نور خالص میں تبدیل کر دے۔ ملائکہ نے بھی استغفار سے پہلے اللہ کی ثنا اسی لئے کی۔ رہا لفظ رب کہہ کر ندا کرنا تو تمام انبیاء کا عموماً یہی طریقہ رہا ہے کہ دعا سے پہلے لفظ رب کہہ کر پکارتے ہیں اور قرآن کی اکثری تعلیم بھی یہی ہے۔ حضرت آدم نے کہا تھا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا الخ۔ حضرت نوح نے کہا تھا۔ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ الخ۔ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي الخ۔ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ الخ۔ حضرت ابراہیم نے کہا تھا۔ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى الخ۔ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ الخ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ الخ۔ حضرت یوسف نے کہا تھا۔ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ الخ۔ حضرت موسیٰ نے کہا تھا رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ الخ۔ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي الخ۔ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ الخ۔ حضرت داؤد کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ الخ۔ حضرت سلیمان نے کہا تھا رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا الخ۔ حضرت زکریا کے متعلق اللہ نے (فرمایا) إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا الخ۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا۔ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً الخ۔ خود رسول اللہ کو اللہ نے بار بار یہی حکم دیا۔ قُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا الخ۔ وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الخ۔ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ الخ۔ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ۔ ایک جگہ مومن کے قول کو اللہ نے نقل فرمایا ہے جس کی شروعات میں بھی لفظ رب ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔ یہ لفظ اس جگہ پانچ مرتبہ ذکر فرمایا ہے۔ دوسری جگہ مومنوں کے قول کی نقل ان الفاظ میں کی ہے۔ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ۔ الیٰ آخر السورۃ۔ ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے وقت اللہ کو اپنے بندے کے منہ سے لفظ رب سننا بہت پسند ہے۔ بندے کے اس اظہار عجز سے بحر رحمت جوش میں آجاتا ہے۔

میں نیک اور بد سب برابر ہوں گے۔ وہاں جس شخص پر اللہ رحمت فرمائے تو وہ تمام مکروہات سے بچ جائے گا۔ مکروہات اور شدائد سے بچنا بغیر رحمت کے ممکن نہیں ہے جیسا کہ انبیاء، اولیاء، صلحاء اور وہ لوگ جن کو اللہ نیکوں کے ساتھ کر دے شدائد سے محفوظ رہیں گے۔ اُن کے حساب میں مناقشہ اور سختی نہ ہوگی۔ پل صراط سے بھی وہ ہوا یا بجلی کی طرح گزر جائیں گے۔ اللہ کی طرف سے ان کو تسکین آمیز بشارتیں بھی ملیں گی۔ ملائکہ نے مومنوں کو انہی شدائد سے بچانے کی درخواست کی۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس سیئات سے ... گناہ مراد ہیں۔ مگر یہ مراد سیاقِ آیت کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ - یعنی اللہ کی رحمت ہی بڑی کامیابی ہے۔ مطلب یہ کہ مکروہاتِ قیامت اور عذابِ دوزخ سے بچاؤ اور جنت میں اللہ کی رحمت پر موقوف ہے اور اللہ کی رحمت کا حصول ہی بڑی کامیابی ہے۔ اس زندگی کا حاصل بھی یہی ہے کہ کسی طرح اللہ کی رحمت حاصل ہو جائے۔

یہ ذٰلِكَ سے اشارہ مکروہاتِ قیامت اور دوزخ سے بچاؤ اور جنت میں داخل ہونے کی طرف ہے۔

مقصودِ بیان

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر فرشتے بھی اللہ کی تنزیہی اور تجمیلی صفات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ پھر عاجز اور کمزور انسان کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اللہ کے مقرب فرشتوں کا ایمان بھی اللہ پر ظاہر ہے مومن ایک حقیقت واقعہ ہے۔ مفہوم واقعی سے خالی لفظ ہی لفظ نہیں ہے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ الخ سے بالکل واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے فرشتوں کو بھی اللہ کی ربوبیت کے اقرار سے مفر نہیں اور جب عظیم القدر ربوبیت الٰہیہ کا انکار نہیں کر سکتے بلکہ عاجزانہ اقرار کرتے ہیں تو اُن لوگوں کو نصیحت حاصل کر لی چاہیے جو دوسروں کو رب اور کارساز بنائے پھرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ کے علم کا ہمہ گیر اور رحمت کا محیطِ کل ہونا صراحۃً مذکور ہے جس سے مترشح ہوتی ہے یہ ہدایت کہ کوئی شخص اپنی کسی حرکت کو خدا سے پوشیدہ نہ سمجھے اور اللہ کے حاضر ناظر ہونے کا یقین رکھے اور ہر دعا کرنے والا یہ یقین رکھتے ہوئے دعا کرے کہ اللہ کو میری نیت اور حالت اور الفاظ غرض ہر بات کا علم ہے۔ پھر اللہ کی وسعتِ رحمت کو بھی نظر کے سامنے رکھنا چاہیے اور یہ یقین رکھتے ہوئے بھی کہ خدا کو ... میرے سب گناہوں کا علم ہے۔ اس رحمت سے اُمید رکھنی چاہیے ناامید نہ ہونا چاہیے۔ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ کے فرماں بردار وں کو فرماں برداروں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ اس سے یہ نصیحت بھی حاصل کی جا سکتی ہے کہ مومن بندہ کو دوسرے مومن سے محبت ہونی چاہیے اور اس کے لئے اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اگر اہلِ ایمان ہوں خواہ وہ گناہگار ہی ہوں تو اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مومن کو دوسرے مومن کے گناہوں پر نظر نہ کرنی چاہیے اور اس کو فاسق گناہگار سمجھ کر رشتۂ اخوت نہ توڑ لینا چاہیے۔ ایمان اصل ہے گویا ہر مومن دوسرے مومن سے وابستہ ہے خواہ نیک ہو یا بد۔ نیکوکار کافر کے مقابلے میں بدکار مومن قابلِ ترجیح ہے۔

اَلَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر مومن کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ خدا نے کر لیا ہے خواہ وہ کیسے ہی اعمال ہوں لیکن اس وعدہ کے اعتماد پر عذاب سے نڈر نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ بغیر عذاب دیئے جنت میں داخل کرنے کا وعدہ ہر مومن سے نہیں کیا ہے۔

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ دعا کا تکملہ ہے جس سے ہدایت مستفاد ہوتی ہے کہ دوزخ کے عذاب سے بچاؤ کی دعا جس طرح ضروری ہے اسی طرح تمام شدائدِ قیامت سے محفوظ رہنے کی درخواست بھی لازم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ

(اس وقت) اُن کو پکارا جائے گا کہ جیسی تم کو (اس وقت) اپنے سے نفرت ہے اس سے بڑھ کر خدا کو (تم سے) نفرت تھی جبکہ تم (دنیا میں) ایمان کی طرف بلائے

اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا

جاتے تھے پھر تم نہیں مانا کرتے تھے۔ وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم کو دوبار مردہ رکھا اور دوبار زندگی دی سو ہم اپنی خطاؤں کا

بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ۝ ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ

اقرار کرتے ہیں تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی کوئی صورت ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا تو تم

كَفَرْتُمْ ۖ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ۚ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ۝ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ

انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم ان لیتے تھے ۔ (اس پر) یہ فیصلہ اللہ کا ہے جو عالیشان (اور) بڑے رتبہ والا ہے وہی ہے جو تم

آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا ۚ وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ ۝ فَادْعُوا

کو اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے اور (وہی ہے جو) آسمان سے تمہارے لئے رزق بھیجتا ہے اور صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے جو خدا کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ رکھے

اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

سو تم لوگ خدا کو خالص اعتقاد کر کے پکارو گو کافروں کو ناگوار (ہی کیوں نہ ہو)

تفسیر

عالم غیب بہت زیادہ پوشیدہ اور بالکل غیر محسوس ہے ۔ نہ جسم مرئی نہیں کہ آنکھوں سے دکھے پست یا بلند آواز نہیں کہ کانوں سے سنی جائے ۔ ایسی بو بھی نہیں کہ ناک سے سونگھی جائے ۔ ذوق وطعم والی کھٹی میٹھی کڑوی کسیلی چیز نہیں کہ زبان سے اس سے مزہ دریافت ہو ۔ ٹھنڈی گرم تر خشک ہوا نہیں کہ جلد بدن کو لگتی ہوئی معلوم ہو ۔ صورت خارجیہ نہیں ہیئت ذہنیہ نہیں ارنگ نہیں جسامت نہیں پھر کس طرح محسوس ہو ۔ اں افعال آثار شواہد اور نشانات ایسے موجود ہیں کہ بالغ بصیرت والا ان سے اصل کا پتہ لگا لیتا ہے ۔ لیکن نارسا نظر والوں کا حد بصر صرف محسوس ہوتا ہے ۔ محسوس سے پرے ان کو کچھ نظر نہیں آتا ۔ خدا کی ہستی اس کا کلام اس کے وعدے اور وعید جنت دوزخ حساب کتاب اجر عذاب کوئی بھی ان آنکھوں سے دیکھے نہ ان کانوں سے ان کو دریافت کیا جا سکتا ہے ۔ نہ ان محسوس پرست فہم و دانش سے ان کو سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے باوجود آنکھیں ہونے کے کافر نابینا ہیں اور باوجود کان رکھنے کے بہرے ہیں اور باوجود فہم و قلب موجود ہونے کے بے سمجھ ہیں ۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف عذاب آخرت دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نہیں دیکھتے ۔ کان اٹھا اٹھا کر اور لگا لگا کے عذاب کے فرشتوں کی ہولناک آوازیں سننی چاہتے ہیں مگر نہیں سن پاتے پکار پکار کر محسوس نمایاں نشان عذاب مانگتے ہیں مگر نہیں ملتا اس لئے بیگانہ بیٹھا نا محسوس خدا سے منہ موڑ کر اور آخرت کے حساب کتاب عذاب ثواب کے خیال کو چھوڑ کر نظر آنے والی مورتیوں اور حواس میں سمانے والی صورتوں کی طرف جھک جاتے ہیں ۔ اللہ کا منادی ان کو ہر چند پکارتا ہے ڈراتا ہے سمجھاتا ہے پر ان کو یقین نہیں آتا اور محسوس پرستی کی ہر آواز ان کے کانوں میں گونجتی ہے ۔ دماغ میں آ رہتی ہے اور فکر و عمل کی تمام قوتوں پر چھا جاتی ہے لیکن ایک وقت آئے گا جب کہ غیب کے ہزار در ہزار پردے سب کے سب آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جائیں گے اور کانوں کی گرانی دور ہو گی نگاہیں خیرہ اور دماغ متحیر ہو جائیں گے عذاب کی اصل تصویر رنگا رنگ اور گوناگوں مظاہر کے ساتھ ہر کور بصیرت کے سامنے آ جائے گی آنکھوں سے دکھے گی اور ہولناک آواز کانوں سے سنائی دے گی ۔ اس وقت تباہی کا یقین ہو جائے گا بدیقینوں کو اور اپنے جرائم کا اقرار کریں گے انکار کرنے والے اللہ کو ایسے وقت میں رب مانیں گے ۔ رب کہہ کر پکاریں گے اپنے انکار و اعمال کی غلطی کا اعتراف کریں گے ۔ دوزخ کی آگ میں جلنے والی لکڑی تنا کرے گی کہ بھٹی سے نکال کر دوبارہ اس کو شاداب زمین میں بو دیا جائے تاکہ وہ ہدایت کے پانی رشد کی ہوا سے سرسبز اور بار آور ہو جائے اور ٹھنڈا سایہ اور میٹھے پھل پیدا کر سکے لیکن سوختہ اصل کو کونسا پانی شاداب کر سکتا ہے اور کونسی ہوا سرسبز بنا سکتی ہے ۔ کڑوے درخت کی لکڑی جلا کر دوبارہ بونے سے بھی کیا حاصل ۔ پھل تلخ ہی پیدا ہوں گے گیہوں کے کھیت میں گرد بادانہ جم کر بڑا ضرور ہو جائے گا اس میں بالیاں بھی آئیں گی اور بالیوں میں ہزاروں دانے بھی پیدا ہوں گے لیکن کاٹنے کے وقت کڑوے ہی ہوں گے گیہوں کی طرح میٹھے کس طرح بن جائیں گے ۔ زمین کی صلاحیت ہوا کی نمناکی پانی کی شیرینی

اور روانی اور ہمسایہ گیہوں کی خوش ذوقی سے ان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ سچ ہے۔ ولو رُدّوا لعادوا لما نھوا عنہ۔ پس خوش نصیب ہیں وہ دانشمند مفکر اور فکر شعار دانشور جو کائنات میں غیبی دست کاریوں اور مخفی فعال شہنشاہیت کا مشاہدہ کرکے سربسجود ہوجاتے ہیں اور ہر طرف سے رُخ پھیر کر اسی کے سامنے جھک جاتے ہیں اور عالم تکوین کے چھوٹے فرماں رواؤں کے احکام کو ٹھکرا کر ایک ہمہ گیر متصرف کل شہنشاہ کے تمام احکام کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہوجاتے ہیں۔

تحلیل اجزاء

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰہِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَی الْاِیْمَانِ فَتَکْفُرُوْنَ۔

یہاں کافر اپنے عیش کی فراوانی اور راحت کی ارزانی پر نازاں ہیں لیکن اہل ایمان کو ان کی دولت و راحت دیکھ کر فریب خوردہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ مضمون پہلے بیان ہوچکا۔ ان آیات میں کافروں کی اس بدحالی اور بدمآلی کا بیان ہے جس میں قیامت کے دن مبتلا ہوکر وہ اپنے پچھلے کئے پر پچھتائیں گے۔ گویا جہاں مومنوں کو کافروں کی اُخروی حالت بتاکر ایمان پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنی مقصود ہے وہاں کافروں کو اُن کا وبالِ آخرت دکھا کر کفر پر اڑے رہنے پر بازداشت بھی ہے۔

سدی قتادہ مجاہد حسن بصری ذرین عبید ہمدانی عبدالرحمٰن بن زید ابن جریر اور اکثر دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ کافروں کو جب اس دنیا میں ایمان لانے کی ہدایت کی جاتی ہے تو وہ سرتابی کرتے اور اپنے دل کا کہا مانتے ہیں لیکن قیامت کے دن یہی ہوا پرستی ان کی ہلاکت کا باعث ہوگی اس وقت خود ان کو اپنے جی سے نفرت پیدا ہوجائے گی اور وہ خود اپنے آپ کو بُرا کہیں گے۔ پس قہر کے ملائکہ اور جہنم کے نگراں فرشتے پکار اٹھیں گے کہ آج جتنی نفرت تم کو اپنی ذات سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت تھی جب تم کو دنیا میں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی مگر تم سرتابی کرتے اور دعوتِ ایمان کو ٹھکراتے تھے۔

اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ پکارنے والے جہنم کے نگراں ہوں گے اور قیامت کے دن کافر خود اپنے آپ سے مبغض ہوجائے گا۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اپنی ذات سے نفرت کرنے کے معنی ہیں جماعت کا باہم ایک دوسرے سے نفرت کرنا یعنی سرداروں سے اُن کے زیردست نفرت کریں گے اور کہیں گے تم نے ہمیں گمراہ کیا اور سردار اپنے زیردست طبقہ سے نفرت و بیزاری کا اظہار کریں گے اور کہیں گے تم خود مختار تھے۔ ہم کو تمہارے دل و دماغ پر کوئی جبریہ حکومت حاصل نہ تھی۔ تم خود گمراہ ہوئے تھے آج ہم تمہارے کفر سے بیزار ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قیامت کے دن جب کفار عذاب میں مبتلا ہوں گے تو شیطان کو بُرا کہیں گے اور ابلیس اُن سے بیزاری کا اعلان کرے گا۔ آیت میں یہی مراد ہے۔ میری رائے میں آیت کا اجمال تمام تفصیلات کو شامل ہے۔ ہر تعیین کی تائید قرآن مجید کی آیات سے ہوتی ہے مگر حصر بیکار بلکہ خود تراشیدہ ہے۔

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَھَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ۔ جب عذاب میں پھنس جائیں گے اور باہم ملامت کرنا اور پچھتانا کرنا بھی سودمند نہ ہوگا تو اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے دوزخ سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانے کی تمنا کریں گے تاکہ ایمان کے ساتھ فرماں بردار بندے بن جائیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان آیات میں اُس تمنا کا بیان ہے جو دوزخ کے عذاب میں پھنسنے کے بعد کافر کریں گے اس واپسی کی تمنا سے پہلے ایک تمہید بیان کریں گے اور اللہ کو رب کہہ کر پکاریں گے۔ پھر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے بعد دوزخ سے نکلنے اور دنیا کی دارالعمل میں بھیجے جانے کی درخواست کریں گے۔

دنیا میں واپس چلے جانے کی سب سے اول تمنا کا فرائس وقت کریں گے جب اللہ کے سامنے نادم ہوکر سرافگندہ کھڑے ہوں گے۔ اس تمنا کا بیان اللہ نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْا رُءُوْسِھِمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ پھر دوزخ کا عذاب سامنے آئے گا اور اس کا معائنہ کریں گے اور اُس میں گرفتار بھی ہوجائیں گے تو کہیں گے۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ اور رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْھَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ پھر آخر میں جب بالکل ہی پھنس جائیں گے تو درخواست کریں گے اور کہیں گے۔ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَھَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ۔

اس جگہ آیت میں دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی سے کیا مراد ہے۔ اس کی تعیین میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ سفیان ثوری نے حضرت ابن مسعودؓ

کا قول (اپنی) اسناد سے نقل کیا ہے کہ پہلے آدمی نطفہ (بے جان) تھا پھر دنیا میں زندہ ہو کر آیا پھر مر کر قبر میں گیا۔ پھر زندہ کر کے قیامت میں اٹھایا جائے گا۔ یہی دو بار موت اور دو بار زندگی ہوگی۔ اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ ابن عباس ضحاک قتادہ اور ابو مالک سے یہی تشریح مروی ہے۔

سدی کا قول ہے کہ پہلی زندگی دنیوی پھر موت پھر سوال جواب کے لئے قبر میں زندہ ہونا پھر مرجانا پھر قیامت کے دن عذاب ثواب کے لئے زندہ کیا جانا مراد ہے لیکن صورت میں زندگیاں تین اور موتیں دو ہوں گی بلکہ اگر نطفۂ بے جان کو بھی موت کی حالت (آیت كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ کی بنا پر) مانا جائے تو موتیں بھی تین ہو جائیں گی اور اس طرح کل شمار چھ ہو جائے گی۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ سب سے پہلی زندگی وہ تھی جب میثاق ابتدائی کے لئے آدم کی پشت سے نکالا گیا تھا پھر موت آگئی پھر ماں کے پیٹ میں زندگی دے کر دنیا میں بھیجا گیا پھر موت آگئی اور آخر میں قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ اس طرح دو زندگیاں اور دو موتیں ہو گئیں لیکن ابن زید کی یہ تشریح غلط ہے۔ ان کے حساب سے زندگیاں تین اور موتیں دو ہوتی ہیں۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ابن مسعود اور ابن عباس سے جو قول مروی ہے وہ صحیح ہے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ رازی اور ابن کثیر نے اس آیت کو گزشتہ آیت کے جواب کا قائم مقام قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اصل جواب دوسری آیت میں مذکور ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۔ ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کی طرف سے واپسی کی تمنا کے جواب میں ان کو جھڑک اور حکم ہوگا۔ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔ اس جہنم میں خوار پڑے رہو۔ مجھ سے بات بھی نہ کرو۔

آیت عالیہ انہی جوابوں کی قائم مقام ہے اور اس میں واپسی نہ ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمہاری سرشت ہی ایسی ہے کہ حق کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ سچائی کو قبول نہیں کر سکتی ہے۔ دیکھو پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ حق کے منادی نے جب تم کو دعوت دی تو تم نے نہیں مانا اور شرک کی پکار پر سب جمع ہو گئے اور یقین کر لیا۔ دوبارہ کس طرح یقین پا سکتے ہو۔

میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کی دروغ گوئی تو ان کے تمنائی دعوے سے ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی خود رائی خود نمائی اور خود استعدادی کا اظہار کیا ہے اور دنیا میں لوٹ کر جانے کے بعد اپنے مومن بن جانے اور نیک ہو جانے کا دعویٰ کیا ہے اور اس دعوے کو خدا کے حکم پر معلول نہیں کیا اور صاف کہہ دیا کہ اگر تو ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دے گا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور نیک اعمال کر کے صالح بن جائیں گے اور پہلی زندگی کی بداعمالی کی طرح بدکاری نہیں کریں گے۔ یہ کتنا بڑا استعدادی دعویٰ ہے۔ کسی کو کیا معلوم ہے کہ آئندہ ہم کیا کریں گے ہماری حالت کیا ہوگی اور ہم کس قسم کے علم و عمل کے حامل ہوں گے۔ پھر کسی کی طاقت کو اس علم و عمل میں کیا دخل۔ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ سو مرتبہ مر مر کے جئے تب بھی اس میں اللہ کے حکم کے بغیر ذرہ بھر استعدادی طاقت نہیں ہو سکتی۔ پس جب آخری جھٹکے کے بعد خدا کی نہایت اور اپنی بے بسی کا مشاہدہ کر لینے کے بعد بھی دماغوں سے کا نخوت نہیں نکلا تو کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دوبارہ زندگی میں بیکار کاروس بن جائیں گے۔ حاصل یہ کہ آخری فیصلہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ان کے حق میں ہو چکے گا۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا۔ عذاب آخرت دیکھنے کے بعد اقرار بیکار اور دوبارہ دنیا میں لوٹائے جانے کی تمنا لاحاصل ہوگی۔ کیا اسی زندگی میں اللہ کی نشانیاں کچھ کم ہیں۔ کیا آنکھوں کے سامنے قدرت کے مظاہر تو مشکل میں نہیں آتے۔ دور کیوں جاؤ اپنے رزق کی ہی فراہمی کے سوال پر غور کرو کہ کس طرح علوی کائنات کو تمہارے رزق کی فراہمی کے لئے حرکت دی جاتی ہے ہر کرہ یہی ان گنت حرکتوں اور بے شمار گردشوں کے ساتھ فضا کی لہروں کو متاثر کرتا ہے جس سے تبخیر ہو کر بارش ہوتی ہے پھر بارش سے کس طرح روئیدگی پھر پختگی پھر غذا صالح پیدا ہوتی ہے یہ لاکھوں ترتیبی مدارج کس طرح طے ہو کر تم کو جسمانی بقا کا سامان حاصل ہوتا ہے سوچو پھر اس پر بھی غور کرو کہ اللہ کی مقرر کردہ تعداد جو بالکل خیاری ہیں تمہارے جسم و روح کی تربیت کا سامان عالم میں سے لے کر پہنچاتی ہیں اور کائنات کے ہر ذرہ کو اللہ کا پیام پہنچاتی

اور ہر قطرہ کو اس کی خدمت پر لگا دیتی ہیں اور تمہارے بدن کے ہر خورد ترین ریزہ کو اور باغ کے ہر مخفی تصور کو غذا فراہم کرتی ہیں مطالعہ قدرت کے لئے یہ چیزیں کیا کچھ کم ہیں۔ لیکن

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ۔ مطالعہ کے مشاہدہ تک پہنچنے اور مشاہدہ کے بعد آیات قدرت کو یادداشت حیات سمجھنے والے یہی لوگ ہیں جو آیات سے صاحب آیات اور مصنوعات سے صانع اور آثار سے موثر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ورنہ دیکھنے کو سب دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ کائنات کو طبعی رفتار رکھتے ہوئے اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ نارسا آیات کے پردوں کو چاک کر کے صاحب آیات تک نہیں پہنچتی بلکہ جال کے حلقوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے، وہ نظم کائنات کی اس مسلسل زنجیر کے ہر حلقے کو دوسرے حلقے کی حقیقی علت اور مختار کل فاعل قرار دیتے ہیں اور زنجیر کی ہر کڑی کے سامنے سربسجود ہو کر اپنی مدد کے لئے اس کو پکارتے ہیں اور اس طرح ہر ڈیوڑھی کے غلام اور فرمانبردار بن جاتے ہیں۔ مگر اے اہل انابت اور اے رسا نظر رکھنے والو۔

فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ تم اللہ ہی کو اپنی مدد کے لئے پکارو۔ ہر دروازہ کو چھوڑ کر خالص اللہ ہی کی فرمانبرداری کرو اور تمام خود ساختہ فرمانرواؤں کی اطاعت کو ترک کر دو۔ اللہ ہی کی نعمتوں پر جینے کے باوجود اس کا انکار کرنے والے ناگوار سمجھیں تو سمجھتے رہیں تم ان کی ناگواری کی پرواہ نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ حضرت ابن زبیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان الفاظ کو ہر نماز کے بعد بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ (رواہ احمد و مسلم وابوداؤد والنسائی)

مقصود بیان

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا ہوگا اور وہ دوزخ سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانے کی تمنا کریں گے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ وہ وقت بڑا ہولناک ہوگا اس کی کہنی پڑے گی

فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی حاکم کی ظاہری حکومت بھی نہ ہوگی۔ اور اگر اس جملہ کو عام رکھا جائے تو مستفاد ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی واقعی حکم اللہ ہی کا ہے۔ دوسرے حکمران نہیں بلکہ نقال ہیں۔

هُوَ الَّذِي الخ میں مشاہدۂ آیات کا درس ہے اور آیات سے صاحب آیات پر استدلال کرنے کا ضمنی حکم ہے۔ وَمَا يَتَذَكَّرُ کے جملے سے واضح ہو رہا ہے۔ نصیحت پذیری اور حقیقت تک رسائی کے لئے قلب منیب شرط ہے۔

فَادْعُوا اللَّهَ الخ میں اللہ کی خالص اطاعت کرنے کا حکم ہے اور کافروں کی ناگواری کی پرواہ نہ کرنے کی ہدایت ہے یعنی لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ وغیرہ۔

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

وہ رفیع الدرجات ہے وہ عرش کا مالک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ (وہ صاحب وحی لوگوں کو) اجتماع

لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ

کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے موجود ہوں گے (کہ) ان کی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی آج کے روز

الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا

کس کی حکومت ہوگی بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جاوے گا آج (کسی پر)

ظُلۡمَ الۡيَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۝

کچھ ظلم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے

تفسیر رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ - یوں تو اللہ کی تمام صفات کمالیہ ہیں۔ کسی طرح کا کوئی نقص اس کی ذات یا صفات میں نہیں ہے۔ لیکن پانچ اوصاف اس کی عظمت الربیت کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے صفتِ ایجاد کا يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ اور صفتِ ربوبیت کا يُنَزِّلُ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا میں ذکر گزر گیا۔ اس جگہ سے باقی تین صفات کو ظاہر فرمانا مقصود ہے۔

(۱) رفیع الدرجات یعنی بلند درجات۔ رازی اور خطیب نے اس لفظ کی تشریح دو طرح سے کی ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کی ذات سب سے اونچی ہے۔ اتنی کہ کسی انسان کے تصور اور کسی فرشتہ کے علم حضوری کی بھی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی کہ جلیل القدر پیغمبر اور مقرب فرشتہ کو اس کی کنہ ذات کا علم نہیں۔ اور اللہ کے صفات کا درجہ بھی مخلوق کی صفات سے بہت اونچا ہے۔ اس کی صفت وجود کے سامنے مخلوق کی ہستی ہیچ ہے۔ اس کی قدرت کے لاکھوں بلکہ لاتعداد اور غیر محدود چمکاروں میں سے ایک ادنیٰ کرن ساری کائنات پر پڑی ہے جس کا مظاہرہ آسمانوں کی ہولناک ناقابلِ فہم رفعتوں، سمندر کی چڑھتی ہوئی زخار موجوں، ہوا کے برق رفتار طوفانوں، کوہ شگاف بجلیوں، پہاڑوں کی زہرہ گداز بلندیوں، سورج کی جھلستی شعاعوں، آگ کے غراتے ہوئے شعلوں، سائنس کے فلک پیما ہمالیہ شکن تجربوں اور بادشاہوں کی بے دریغ سفاکیوں سے ہوتا ہے۔ اس کی صفت علم و حکمت کی رفعت اس عالم کی تکوینی دقت اور نظمی دقیق استحکام سے عیاں ہے۔ اس قدر کہ اس کے علمی بحر ناپیدا کنار کے سامنے ساری کائنات کا علم صرف اتنی حقیقت رکھتا ہے جتنی سمندر میں غوطہ دے کر نکالی ہوئی سوئی کے ناکے پر باقی رہ جانے والی تری۔ اسی طرح اس کی صفتِ ایجاد ربوبیت اور حکومت و تصرف کے مقابلے میں مخلوق کی صفات کو لانا ایسا ہے جیسا تاریکی کو نور کے مقابلے میں لانا۔ سائے کو دھوپ کا ہم وزن بنانا یا ذرّہ کو آفتاب کی مثل قرار دینا اور یہ بھی صرف تشبیہی الفاظ ہیں حقیقت سے خالی ورنہ وجوب کا امکان سے اور قدم کا حدوث سے مقابلہ ہی کیا اور دونوں کے درجات میں تناسب و توازن ہی کا کیا امکان۔

(۲) رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ کا دوسرا معنی رافع الدرجات یعنی مخلوق کے درجات بلند کرنے والا کہا گیا ہے۔ اس مفہوم کی تفصیل رمز شناس علماء کے لئے تو ہم آخر میں کریں گے۔ پہلے اس سادہ تفسیر کو نقل کر دینا مناسب ہے جو رازی وغیرہ نے لکھی ہے مطلب یہ کہ آخرت میں انبیاء و اولیاء اور صلحاء کے درجات اللہ اونچے کرے گا اور دنیا میں بھی اس نے بعض کا درجہ بعض سے اونچا کیا ہے۔ فرشتوں میں ہر ایک کا مقام مقرر فرمایا ہے۔ آیت میں ارشاد ہے۔ وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ الآیۃ اہل علم کے درجات بھی اونچے بنائے ہیں اور ہر ایک کا درجہ دوسرے سے علیحدہ رکھا ہے۔ وَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ الآیۃ پھر کمالِ ایمانی کے تفاوت کے لحاظ سے ہر مومن کا درجہ الگ الگ ہے۔ اگرچہ مراتب سب کے بلند ہیں۔ اسی طرح اجسام کثیف مکدر مادی سفلی ہیں اور بعض اجسام لطیف شفاف علوی اور بعض نورانی جوہری۔ پھر صورت رنگ قوت سیرت رزق اور عزت و ذلت کے اعتبار سے مراتب متفاوت ہیں۔ ہر نیچے سے اونچا اور اونچے سے نیچا۔ اسی طرح راحت تکلیف دکھ سکھ صحت مرض طاقت ضعف اور سعادت و شقاوت کے لحاظ سے بھی آدمیوں کے درجات میں باہم تفاوت اور درجہ بندی ہے۔ رفیع الدرجات کا لفظ ان تمام معانی کو حاوی ہے۔

رمز شناس اہلِ حقیقت کو مطالعہ کی دعوت

یوں تو دنیا کا ذرّہ ذرّہ پست و بلند ہے۔ جمادی اور وجودی طبقہ کے اوپر نباتی اور نمائی طبقہ ہے اور نباتی مخلوق سے بالا تر شعوری اور ارادی حرکت کرنے والی جاندار کائنات ہے اور اس سے بلند ادراک و عرفان کی حامل انسانی دنیا واقع ہے اور پھر نور محض لطافت بے رنگ کا درجہ ہے لیکن اہل باطن نے شیفتگانِ معرفت کی ضیافت کے لئے کچھ لطیف تشریح کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مختلف انسانوں کی بلندی مختلف صفات کی وجہ سے ہے۔ اہل ارادت کا کمال عزت و کرامت ہے۔ اہل محبت کا کمال مشاہدہ ہے۔ اہل معرفت کا کمال ذات و صفات کا عرفان ہے۔ اہلِ وجد کی رفعت شہود سے ہے اہلِ سلوک کا منتہیٰ عظمت و جلال کا مشاہدہ ہے۔ زاہدوں کی بلندی پرواز جنت تک ہے عقل کی بزرگی آیات و براہین کا مطالعہ ہے۔ ارواح کی عزت

قرب انس سے ہے اور اسرار کی بلندی مرکز قدس تک رسائی ہے۔ اس حد تک کہ خودی سے فنا ہو کر انوار صفات میں بقا بحق حاصل ہو جائے۔ ہم نے تفریع کے لئے حقیقت کی یہ تصویر کشی نہیں کی ہے، بلکہ ہر فکرہ ایک حقیقت ثابت ہے اور اہلِ حقیقت کے لئے درسِ علم اور سبق عرفان۔ واللہ اعلم۔

ذُو الْعَرْشِ عظمتِ الوہیت کو ثابت کرنے والا یہ چوتھا وصف ہے۔ رازی نے لکھا ہے کہ جلالِ الوہیت کے مظہر دو طرح کے ہیں مادی اور غیر مادی۔ مادی مظاہر میں سب سے بڑی جلوہ گاہ صفات عرش ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ عرش ایک یاقوتِ سرخ ہے جس کا درمیانی قطر پچاس ہزار سال کی راہ کے برابر ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ احکامِ الٰہی کے نفاذ کے لئے عرشِ عظیم شاہی تخت کا درجہ رکھتا ہے اور مخلوقات کے لئے عرش مثل سقف کے ہے۔ ابن کثیر کی یہ عبارت مجمل ہے ہم اپنی طرف سے کچھ زیادتی کر کے اس کی توضیح کرتے ہیں۔ عرش چونکہ مظہرِ صفات ہے اور تمام مخلوق پر اللہ کے افعال یہیں سے جاری ہوتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ عرش صفاتِ خداوندی کی سب سے بڑی مادی جلوہ گاہ ہے اور یہیں سے اللہ کے احکام ساری مخلوق پر جاری ہوتے ہیں اور احکامِ الٰہی ساری کائنات کو محیط ہیں۔ پس عرشِ الٰہی بھی ساری کائنات کو محیط ہے۔ یا یوں کہو کہ حصولِ علم کے لئے تمام مخلوق کی نگاہیں صفاتِ خداوندی کی خصوصی جلوہ گاہ کی طرف اٹھتی ہیں۔ پس گویا مخلوقات کے لئے عرش مثل سقف ہے۔ یاد رکھو کہ مقامِ عظمتِ الوہیت میں عرش کا ذکر صرف جسی حدود کے اندر رہنے والوں کے لئے ہے۔ جن کی عقلی سیر بھی مادی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ ورنہ دانشِ سلیم اور عقلِ سادہ رکھنے والے تو افعالِ الٰہی کی سیر کر کے عروج و ترقی کی خواہش کو ترک کر کے نہیں بیٹھ رہتے بلکہ آگے بڑھ کر صفات کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر معرفتِ صفات کو معرفتِ ذات کا آئینہ قرار دیتے ہیں۔ داؤد ظاہری ابن حزم اندلسی اور کچھ دوسرے ظاہر پرست علماء کو آیت استوی علی العرش سے تباہ کن دھوکہ ہو گیا۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ عرش اللہ کا مقام اور مکان ہے اور عرش کی کوئی خاص جہت اور شکل ہے۔ یہ دھوکہ انتہائی خطرناک ہے۔ کہاں عرش اور کہاں اللہ کا مقام الوہیت۔ عرش تو اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی عزت و سلطنت کا مظہر و عاجز بے بس اور اپنی ہستی میں بھی اللہ کا محتاج اور اللہ خالقِ عرش ہے مالکِ عرش ہے حاکمِ عرش ہے۔ اللہ ہی کے پرتوِ ذات اور تجلی ذات نے عرش کو بزرگی عطا فرمائی، پس وہ اللہ کا مقام مکان مسکن فرودگاہ اور محل کس طرح ہو سکتا ہے اس لئے اس جگہ ذو العرش فرمایا تاکہ استوی علی العرش کو پڑھ کر عرش کو مقامِ الٰہی سمجھنے والوں کی خیالی گمراہی دور ہو جائے۔

يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ عظمتِ الوہیت کو واضح کرنے والی یہ پانچویں صفت ہے۔ غیر مادی مظاہر میں سب سے بڑی جلالِ الوہیت کی جلوہ گاہ القاءِ روح ہے۔ عام مفسرین نے لکھا ہے کہ روح سے مراد وحی اور مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ سے مراد انبیاء ہیں۔ بات یہ ہے کہ تمام جاندار اجسام کی زندگی روح سے ہوتی ہے اور روح کی زندگی روح الارواح یعنی وحی سے یا یوں کہو کہ وحی روحِ انسانیت ہے جس طرح معمولی جان روحِ حیوانیت ہے پس انسانوں کو انسانی زندگی بخشنے کے لئے انسانیت کی روح یعنی وحی کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں تو اول زندگی انبیاء کی ہوگی اور ان کے بعد تمام ان لوگوں کی زندگی ہوگی جو وحی کو مانتے ہیں۔ باقی جو وحی کو نہیں مانتے اور اس کے حکم سے سرتابی کرتے ہیں ان کی انسانیت مردہ ہے۔ اگرچہ اُن کی حیوانیت کتنی ہی موٹی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کو مردہ کہا گیا ہے۔ اس تفسیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانی زندگیاں سنوارنے اور ان کو حیاتِ انسانیت عطا کرنے کا کام بھی اللہ ہی کا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس انسان کو انتخاب فرماتا ہے اس کے پاس وحی بھیجتا ہے اور پھر اس پیغمبر کے ذریعے سے تمام انسانوں کو اللہ کا پیام پہنچ جاتا ہے۔

اللہ ہم کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے اور ذہنی افکار کو کجروی سے بچائے ہماری رائے میں عام مفسرین کا خیال صحیح نہیں۔ خطیب امام رازی صاحب خازن و مدارک وغیرہم نے جو روح سے مراد وحی اور مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ سے مراد انبیاء کا ہونا بیان فرمایا ہے وہ معنوی بلاغت سے دور ہے، بلکہ الروح من امرہ سے مراد وہی امرِ الٰہی ہے جو مردہ انسانیت کی حیات کا سبب ہے اور مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ سے وہ تمام انسان مراد ہیں جن کی مردہ انسانیت کو خدا اپنے امر سے زندہ کرنا چاہتا ہے۔ اس روحِ حیات کا ظہور انبیاء، اولیاء اور عام اہلِ ایمان میں مختلف طور پر ہوتا ہے۔ انبیاء میں تو نورِ ذات کا ظہور ہوتا ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور انبیاء کے ساتھیوں میں نورِ صفات پر تو فگن ہوتا ہے۔ اور وہ تمام قضاء و قدر یعنی افعالِ الٰہی کے آئینوں میں نورِ صفات چمکتا جھلکتا دیکھتے ہیں۔ رہے عام اہلِ ایمان ان کی عقلیں نورِ فعلی سے روشن ہوتی ہیں اور وہ آیات و براہین سے استدلال کرتے ہیں۔

پس یہ تینوں مدارج حیاتِ انسانیت کے ہیں اور ہر جگہ امرِ الٰہی کا تعلق مختلف طور سے ہے۔ شاید شیخ ابن عطا کا بھی یہی مطلب ہے۔ جہاں انہوں نے صراحت کی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے۔ مگر جب تک اس کو حقیقی حیات حاصل نہ ہو وہ مردہ ہے۔ دیکھو اللہ نے کافروں کو مردہ فرمایا ہے اور مومنوں سے خطاب کرتے ہوئے حکم دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ الآیۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے جس وحی کی طرف کنے اور اس کو ماننے کی دعوت دی ہے وہی حقیقی حیات ہے۔ پس اللہ جس مومن پر جس روح کا القاء فرماتا ہے وہی اس کے لئے حیات ہے کسی پر روح نبوت ورسالت کا القاء فرماتا ہے۔ کسی پر روحِ صدیقیت کا کسی پر روحِ شہادت کا کسی پر روحِ صلاح کا پھر ان صالح لوگوں میں بھی جدا جدا خصوصیات ہیں۔ کسی پر روحِ عبادت واطاعت کا القاء ہے تو وہ عابد مرتاض ہوتا ہے۔ کسی پر روحِ ہدایت کا القاء ہے تو وہ ہادی مہتدی ہوتا ہے کسی پر تقویٰ کی دوسری شاخوں کا القاء ہوتا ہے اور ہر خصوصیت اس کے لئے حیاتِ حقیقی کا سبب بن جاتی ہے۔

اس دقیق طرزِ کلام کا حاصل یہ ہے کہ شیخ ابن عطاء کے نزدیک آیت مذکورہ میں روح من امرہ سے صرف وحی اور مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ سے مراد صرف انبیاء ہی نہیں ہیں بلکہ روح سے روحِ انسانیت مراد ہے جس کے القاء سے آدمی کو حقیقی انسانیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ زندہ ہو جاتا ہے خواہ وحی ہو، صدیقیت ہو شہادت ہو یا کوئی دوسرا درجۂ تقویٰ اور خصوصیتِ ایمانیہ ہو۔ اسی طرح مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ کے مفہوم میں بھی تعمیم ہے انبیاء ہوں صدیق ہوں شہید ہوں یا دوسری طرح کے متقی اہلِ ایمان ہوں۔ رہے کفار تو ان پر صرف روحِ حیوانی کا القاء ہوتا ہے جس کو جان کہا جاتا ہے اسی لئے اگرچہ وہ ظاہر میں زندہ معلوم ہوتے ہیں مگر باطن میں مردہ ہونے کے سبب وہ مردہ ہیں۔

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ یعنی جس بندہ پر اللہ روح امر القاء فرمانا چاہتا ہے القاء فرماتا ہے تاکہ روزِ قیامت (کے حساب کتاب اور عذاب و ثواب سے لوگوں کو) ڈرائے (اور نیک بندوں کو اُخروی نجات کی بشارت دے) علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یوم التلاق قیامت کا نام ہے اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عباس کا قول ہے اس روز حضرت آدم کی اپنی سب اولاد سے ملاقات ہوگی (ابن جریر) ابن زید نے کہا۔ اس روز لوگوں میں باہم ملاقات ہوگی۔ قتادہ سدی بلال بن سعد اور سفیان بن عیینہ نے کہا آسمان اور زمین والوں میں ملاقات ہوگی۔ قتادہ اور سدی کا ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ اس روز خالق و مخلوق میں ملاقات ہوگی میمون بن مہران نے کہا۔ اس روز ظالم و مظلوم باہم ملیں گے۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ اس روز ہر شخص اپنے عمل کو پائے گا ہر آدمی کا کیا ہوا سامنے آئے گا نیکی ہو یا بدی جیسا کیا ہوگا ویسا پائے گا۔ (ابن کثیر)

خطیب نے لکھا ہے بعض کا خیال ہے کہ اجسام و ارواح کی باہم ملاقات ہوگی۔ بعض نے کہا پجاریوں کی ملاقات اپنے معبودوں سے ہوگی (سراج) چونکہ لفظ میں تخصیص نہیں اس لئے مفہوم میں بھی تقیید نہ کی جائے تو اولیٰ ہے تلاقی کا لفظ ہر ملاقات کو شامل ہے، لیکن اس تعمیم کے باوجود ہر عمل یا ہر عمل کی سزا اور جزا پانے کا دن چونکہ قیامت کا دن ہے اس لئے اگر اس مناسبت سے روزِ قیامت کو یوم التلاق قرار دیا جائے تو زیادہ سہل القبول معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۔ یہ ترکیبی لحاظ سے یوم التلاق سے بدل ہے۔ یعنی قیامت کے دن سب آدمی نکل کر سامنے آجائیں گے کوئی بات بھی کسی کی پوشیدہ نہیں رہے گی یوں تو اس دنیا میں بھی اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور کسی کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہاں آدمی کی آنکھوں پر جہالت و کثافت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں دیکھتا کہ میں ہر وقت ہر لمحے اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ قیامت کے دن یہ پردے ہٹ جائیں گے اور ہر شخص کو یقین ہو جائے گا کہ میں بارگاہِ عدالت میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں اور یہ میرے سامنے میرے اچھے بُرے عمل ہیں۔ ان میں سے اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ وہ وقت بڑا ہیبت ناک ہوگا۔ کسی سے کسی کی دوستی نہ ہوگی۔ کسی کا کسی پر دباؤ نہ ہوگا۔ کوئی کسی کا طرفدار اور پیر وکار نہ ہوگا۔ ہر شخص پر ہول طاری ہوگا۔ اس وقت خدا تعالیٰ فرمائے گا۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۔ آج کس کی حکومت ہے۔ یعنی دنیا میں تو بہت لوگ حکومت کے مدعی تھے۔ آج وہ دعوے کیا ہوئے اور مدعی کہاں گئے حضرت ابن عباس سے مروی ہے قیامت کے قریب ایک منادی ندا کرے گا۔ لوگو قیامت آگئی۔ اس آواز کو زندے اور مُردے سب سنیں گے پھر (فنا) خلق

کے بعد) اللہ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرمائے گا اور فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (رواہ ابن ابی حاتم) اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا سب پر ہیبت چھائی ہوگی، نظریں خیرہ، لب خشک اور حلق بند ہوں گے۔ جب کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا تو خود ہی فرمائے گا۔

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ آج حکومت صرف واحد قہار اللہ کی ہے۔ شیخ ابن عطاء نے نہایت لطیف تفسیر کی ہے لکھا ہے اگر جاہلوں کی جہالت نہ ہوتی تو اللہ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ نہ فرماتا، کیونکہ ازل سے ابد تک ہمیشہ سے ہمیشہ تک حکومت تو اللہ ہی کی ہے اور ملک بھی اسی کا ہے۔ لیکن کافروں کے دماغوں، دلوں اور روحوں پر چونکہ پردے پڑے ہیں اس لئے یہاں ان کو تنہا خدا کی حکومت نہیں دکھائی دیتی۔ قیامت کے دن تمام حجابات اٹھا دیئے جائیں گے وہ خود مشاہدہ کرلیں گے کہ آج حکومت اللہ واحد القہار کی ہے۔ واحد وہ ہے جو شمار سے خارج ہو۔ اور قہار وہ ہے جس نے سب کو اپنی عبودیت میں مسخر کرلیا ہو کہ بے چارہ ناچار اس کی الوہیت کا اقرار کریں اور اس کی مشیت سے انحراف نہ کرسکیں گوارا ہو یا ناگوار۔ پس جب تمام دنیا والوں میں کسی ایک کی حکومت نہ ہوگی تو اس روز خدا کی حکومت ہوگی جو ہر شمار سے بالاتر ہے اور تمام مخلوق اس کی الوہیت و اقتدار کا اقرار کرنے پر مجبور ہے۔ گویا ابن عطاء کے نزدیک لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کافروں کی طرف سے اضطراری غیر اختیاری جواب ہوگا جو ان کی زبانوں سے قیامت کے دن نکلے گا۔ ابن عطاء کا یہ قول عام مفسروں کی تشریح کے خلاف ہے۔

اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے یہ بیچارہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کی طرف سے یہ سوال اور پھر اپنی ہی جانب سے یا کافروں کی زبانوں سے یہ جواب ہوگا۔ اگر کسی روایت میں اس کا ثبوت بھی مل جائے تب بھی اس جگہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے سمجھا جائے کہ قیامت کے دن یہ سوال جواب ہوں گے۔ خواہ مخواہ اپنی طرف سے کسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کچھ الفاظ محذوف ماننا اصول تفسیر کے خلاف ہے۔ آیت بالکل صاف اور مربوط ہے مطلب بالکل سہل اور سادہ ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ وحی نازل کرنے اور پیام بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ حاملانِ وحی لوگوں کو قیامت سے ڈرائیں۔ پھر فرمایا روزِ قیامت وہ ہوگا جب سب لوگ (قبروں سے) نکل آئیں گے برآمد ہو جائیں گے۔ کوئی اللہ سے چھپی نہ ہوگی۔ پھر فرمایا بتاؤ اس روز حکومت کس کی ہوگی۔ پھر خود ہی جواب دیا اس روز حکومت صرف اس خدا کی ہوگی جو یگانہ ہے اور کل کائنات اس کے ہاتھ میں مقہور و مسخر ہے۔ ان تمام الفاظ میں قیامت کے دن اس قسم کے سوال و جواب ہونے کا تو کوئی بیان ہی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ کیا قیامت کے دن یہ سوال جواب ہوگا تو اگر کسی صحیح حدیث سے ثابت ہو جائے تو واجب التسلیم ہے ورنہ قابلِ رد۔ اس آیت میں اس مضمون کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ۔ جب تمام حالات سامنے آجائیں گے اور کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی تو جزا سزا کا وقت آئے گا اور جو کچھ کسی نے نیکی بدی کی ہوگی اس کا بدلہ ملے گا لیکن یاد رکھو کہ نیکی وہ ہے جس کی بنیاد صحیح ہو۔ کافر کی کسی نیکی کی بنیاد صحیح نہیں۔ شرک کی گھنی ہوئی بوسیدہ جڑ سے کوئی ٹہنی اچھی نہیں پھوٹ سکتی۔ پھر پھل اچھا کہاں سے آئے گا۔ اسی لئے کافروں کے تمام اعمال ملیامیٹ کر دیئے جائیں گے كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ میں اگرچہ عموم ہے لیکن آیت فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا اور اسی مضمون کی دوسری آیات سے کافروں کے نیک اعمال کی تخصیص مستفاد ہوتی ہے۔

لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ۔ سزا جزا میں حق تلفی کا احتمال تھا۔ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہی تھا۔ بادشاہوں کے فیصلوں میں انتہائی احتیاط کے باوجود کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔ نہ جرم سے زیادہ سزا ملے گی نہ نیکی سے کم جزا۔ رہے اس کے خلاف دو رُخ، ایک یہ کہ جرم سے کم سزا دی جائے یا بالکل معاف کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ نیکی سے زیادہ ثواب دیا جائے تو یہ دونوں باتیں اللہ کے فضل و رحمت پر موقوف ہیں، آیت میں ان کی نفی نہیں ہے۔ شیخ ابوبکر بن طاہر نے کہا۔ آخرت کے دن کسی کو اپنے اعمال یا اعمال کی سزا جزا میں تردد نہ ہوگا۔ جو اعمال نامہ سامنے آئے گا اس میں کمی بیشی کا اس کو احتمال بھی نہ ہوگا۔ نہ اس کے موافق جزا سزا ہونے میں اس کو شک ہوگا۔ ہر چیز یقینی طور پر سامنے آجائے گی۔ شیخ ابن عطاء نے کہا جس مومن کی نظر اپنے نیک اعمال پر ہے اس کو اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ لیکن جس کی نظر اپنی نیکیوں پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل پر ہے اس پر عوض سے زیادہ اللہ کا فضل و احسان ہوگا۔ آیت میں وارد ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا الآیۃ۔

إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۔ لاتعداد مخلوق کا حساب آسان کام نہیں۔ کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ ذرہ ذرہ کی حساب فہمی ایک دن میں ہو جائیگی خواہ دن کتنا ہی بڑا ہو اس کے لئے تو بے شمار حساب فہمی کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ ایک آدمی کی ساری عمر کی نقل و حرکت نشست و برخاست خواب بیداری بلکہ ہر سانس کا حساب ایک شخص آسانی سے نہیں لے سکتا پھر کتنے حساب لینے والے ہوں گے اور کیسے حساب فہمی کریں گے اور کس طرح بغیر حق تلفی کے سزا جزا دی جائے گی اس کا تصور کسی انسان کا دماغ نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ سریع الحساب ہے۔ وہ بہت جلد حساب فہمی کرے گا۔ دنیا کے آدھے دن کے برابر وقت میں سب کا حساب ہو جائے گا۔ (رواہ الحاکم) مومن کو ایسا معلوم ہوگا کہ ایک نماز کا وقت گزرا۔ (کما فی الصحیح)

مقصودِ بیان عظمتِ الوہیت کو ثابت کرنے والی تین صفات کا اظہار۔ رفیع الدرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا درجہ مخلوق سے بہت اونچا ہے بلکہ مخلوق کے تصور سے بھی بلند ہے۔ یا یوں سمجھو کہ مخلوق کے درجات کو دین و دنیا میں بلند کرنے والا اللہ ہی ہے۔ لوگوں نے جو حسنِ صورت جسمانی طاقت بدنی صحت روشنی حواس نسلی امتیاز صنعتی کمال اور مالی تفاوت کے لحاظ سے نیچ اونچ قائم کر رکھی ہے وہ سب ہیچ ہے۔ کسی کو اس کا حق نہیں ہے۔ ذو العرش سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش بھی خدا کی مخلوق ہے۔ محل الوہیت نہیں۔ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت کو سنوارنے اور سدھارنے کے لئے اللہ منتخب کرنا اور بھیجنا اللہ ہی کا کام ہے یا یوں کہو کہ مردہ انسانیت کو حسب اختلاف مراتب زندہ بنانا اللہ ہی کے حکم پر موقوف ہے۔ وغیرہ

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ

اور آپ اُن لوگوں کو ایک قریب آنے والے مصیبت کے دن سے (کہ روز قیامت ہے) ڈرائیے جس وقت کلیجے منہ کو آجاوینگے اور غم سے گھٹ گھٹ جاویں گے

حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ۝ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِي

(اُس روز) ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہا مانا جائے وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور اُن باتوں کو بھی جو سینوں میں

بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ ع ۲

پوشیدہ ہیں اور اللہ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیگا اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارا کرتے ہیں وہ کسی طرح کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ) اللہ ہی سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے

تفسیر دل سے آنکھوں تک ایک راہ ہے۔ آنکھ دروازہ ہے بیرونی اور دل بادشاہ ہے پردہ نشین۔ جو چیز آنکھ نے دیکھی وہ اس کھڑکی سے دل میں پہنچی لیکن دل بھی مستقل بادشاہ نہیں اس کا کمرہ بھی اندرونی رُخ سے بند نہیں۔ دل نفس کا منظر ہے۔ ایک دریچہ ہے نفس کے جھانکنے کا۔ کوئی چیز آنکھ سے دکھی دل میں پہنچی، دل میں پہنچ کر نفس میں اُتری، نفس کو لذت آئی یا کراہت، اگر نفس لذتوں سے خوگر ہو گیا تو اس پوشیدہ راستے سے وہ حصولِ لذت کی کوشش کرتا ہے۔ سینہ میں چھپی ہوئی خواہش کا ظہور آنکھ کے بیرونی دریچے سے ہی ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت آداب شریعت کا احترام حقیقت کا خوف، سوسائٹی کی لاج، بھلا بندوں کی شرم سب ہی نفس کے منہ میں لگام دیتی ہیں اور لذتوں کی کدورت کو صاف کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتی ہیں، لیکن خواہش پرستی اور لذت کا حصول نفس کی سرشت میں داخل ہے اور سرشت کا بدلنا آسان نہیں۔ اس لئے نفس کی پیچ در پیچ خلاؤں کی تہہ میں اصل سرشت کا تقاضا چھپا رہتا ہے اور صرف چھپا ہی نہیں رہتا بلکہ موقع پاکر اُبھرتا ہے، جوش مارتا ہے اس وقت عقل کی روشنی اور روح کا نور نفس کی کدورتوں کو صاف کرنے اور اس کو جلا دینے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر نفس عقل کے جاسوسوں سے بھی چھپ کر جب موقع پاتا ہے تو آنکھ کے دریچوں سے جھانکتا ہے۔ یہ ہوتی ہے نفس کی خیانت اور چوری اور خفیہ راستوں سے سر اُبھارنے کی کوشش۔ اسی کے متعلق فرمایا تھا الٰہی میں معصیت خواہش سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ نفس کی نیت، اور پھر آنکھ کے راستے سے اس کی خیانت کوئی بیرونی محتسب نہ جان سکے تو نہ جانے شریعت کا پابند

اس کو نہ دیکھ سکے تو نہ دیکھے۔ سوسائٹی کے جاسوسوں کی وہاں تک رسائی نہ ہو تو نہ ہو مگر علام الغیوب تو جانتا ہے۔ وہ اندرونی تہہ نشین خواہشات سے بھی واقف ہے اور چھپا چوری خواہشوں کے حصول کے راستوں سے بھی۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ نفس کی لذت پرستی فطری ہے۔ اگر جمالِ خاطر کو اپنے چہرے کے تہ بر تہ نقابوں کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتا اور روحانی لذت سے محروم ہوتا ہے تو فطری اقتضا کو پورا کرنے کے لئے وہ آنکھ کے دریچوں کو استعمال کرتا ہے۔ اس استعمال کرنے میں کوئی خرابی نہ ہوتی اگر پاسبان عقل کی زیر نگرانی ان دریچوں کو کھولا جاتا اور شرعی دربانوں کی اجازت کے موافق مطالعۂ حسن کیا جاتا مگر نفس کی رندانہ نیت پردے کے اندر کارفرما ہوتی ہے۔ وہ عقل کے پاسبان اور شرع کے نگران دونوں سے چھپ کر لذت اندوزی کی کوشش کرتا ہے۔ یہی تو وہ چوری ہے جس کو خیانتِ نفس بھی کہا جاتا ہے اور خیانتِ چشم بھی۔ کھلی ہوئی نگاہ اتنی خطرناک نہیں کہ جتنی چھپی نظر زہریلی ہوتی ہے۔ دیکھنے کو ان دیکھا ظاہر کرنا بڑی تباہ کن حرکت ہے۔ نفس کی یہ خیانت اور آنکھ کی یہ چوری اسی وقت تک چھپی رہ سکتی ہے جب تک دیکھنے والے نہ دیکھ سکیں، لیکن اگر دیکھنے والے کی آنکھ غلاف در غلاف نقاب پوش تصویروں کو دیکھ سکتی ہے اور اس کی شعاعِ نوری ہر بجلی سے زیادہ تیز ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ آنکھ کی چوری اور نفس کی خفیہ خیانت اس سے چھپی رہ سکتی ہے۔

جب نگراں کو سب کچھ معلوم ہو رہا ہے تو روزِ محاسبہ کے وقت پوری سرگزشت سامنے آئے گی اور سرگزشت کے ذرہ ذرہ کی بازپرس بھی ہوگی۔ اس وقت کوئی دل سوز مددگار حمایت کرنے والا رشتہ دار اور سفارش کرنے والا پیر دکار بھی نہ ہوگا اور فیصلہ بھی انصاف کی روشنی میں ہوگا۔ ایسے وقت میں بری ہونے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ وقت تو اتنا ہولناک ہوگا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگے گا۔ دم گھٹنے لگے گا۔ ہونٹ خشک ہوں گے اور حلق بستہ ہو جائے گا۔

تحلیلِ اجزاء

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ۔ گذشتہ آیات میں ارسالِ وحی اور فرضِ رسالت کی اصل غایت بیان کرنے کے ذیل میں کچھ احوالِ قیامت بیان کئے تھے اور جزا سزا ملنے کی صراحت کی تھی اور حق تلفی کی نفی کا بلند آہنگی سے اعلان کیا تھا۔ لیکن قیامت کب آئے گی۔ کوتاہ بین قیامت کو بہت دور سمجھتے ہیں اور سزا کا بعدِ زمانی یا بعدِ مسافت انسانی توجہ کو فوراً اس کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ آدمی سمجھتا ہے کہ ابھی داروگیر کا وقت بہت دور ہے۔ اس طرح اس میں استغنا اور لاپرواہی کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور باوجود یقینی الوقوع جاننے کے دماغ پر غفلت و ذہول کے پردے چھا جاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اسی لئے آیتِ مذکورہ میں لفظ آزفہ فرمایا یعنی قریب آنے والی قیامت کا دن۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ گذشتہ آیات میں ارسالِ وحی کی عمومی غایت بیان کی تھی جس کا تعلق عموماً تمام انبیاء سے اور تمام امتوں سے برابر تھا۔ اس آیت میں خاص رسول اللہ کو حکم دیا کہ اس امت کو قیامت سے ڈرا دو۔ یعنی فرض انذار سے تم مستثنیٰ نہیں ہو۔ نہ تمہاری امت اس سے مستثنیٰ ہے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ الآیۃ۔ اسی مفہوم کو اس جگہ لفظ آزفہ سے تعبیر کیا ہے۔

اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ۔ ابن جریر نے کہا لوگ روتے ہوں گے۔ بعضوں نے کہا خاموش ہوں گے۔ کاظمین کی یہ دونوں تفسیریں غلط ہیں (ابن کثیر) صحیح مطلب وہ ہے جو قتادہ عکرمہ اور سدی نے بیان کیا کہ خوف کی وجہ سے دل حلق کے پاس آ کر اٹک جائیں گے نہ باہر نکلیں گے کہ مر کر سکون مل جائے) نہ نیچے اتریں گے کہ اطمینان اور قرار آ جائے) یعنی دل منہ کو آ جائیں گے نہ باہر نکل کر موجب سکون بنیں گے نہ اپنے ٹھکانے لگیں گے۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ ظالمین سے مراد ہیں کافرین اور مشرکین۔ آیت میں وارد ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ یوں تو ہر کبیرہ گناہ ظلم ہے بلکہ خالی وقت میں نفل نماز نہ پڑھنا اور وقت کو بیکار کھونا بھی بے جا حرکت ہے۔ لیکن اس جگہ سب سے اونچے درجے کا ظلم یعنی شرک مراد ہے۔ پس مومن گنہگار کے لئے شفاعت کی نفی اس آیت سے نہیں نکلتی اور کعبی وغیرہ اہلِ اعتزال نے نفی شفاعت مومنین کا آیت سے غلط استنباط کیا ہے۔

طاعت کا حقیقی معنی تو باری تعالیٰ کے متعلق ممکن ہی نہیں۔ اللہ نہ کسی کا فرماں مطیع ہے نہ مومن کا اس کا مطاع۔ نہ کوئی جلیل القدر نبی اللہ فرشتہ ہے نہ ابلیس ملعون اس لئے مطاع کے معنی اس جگہ مقبول الشفاعت ہیں لیکن اس سے مطلقاً شفاعت کی نفی نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ کافروں کا کوئی سفارشی ہو مگر اس کی سفارش نہ مانی جائے گی

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۔ اوپر کی آیات میں قیامت کی دہشت اور ہیبت کو بیان کر کے ہر قسم کی دوستی اور سفارش کے نافع ہونے کی نفی کی تھی۔ اس آیت میں اپنے ہمہ گیر علم کی صراحت فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز یہاں تک کہ دزدیدہ نگاہ چشم اور پوشیدہ

سے پوشیدہ بات یہاں تک کہ وہ خیال جو سینوں میں چھپا ہوتا ہے خدا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جو ہم نے بیان کر دیا۔ علمائے تفسیر نے کچھ معانی اور بھی بیان کئے ہیں۔ مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے خائنۃ الاعین اور مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ کو ایک تمثیل میں بیان کیا اور فرمایا یوں سمجھو کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں گیا وہاں ایک عورت موجود تھی۔ لوگوں کی شرم کی وجہ سے اس عورت کو تو نہیں دیکھ سکا مگر کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ یا کوئی کسی مجمع میں بیٹھا تھا اُدھر سے کوئی خوبصورت عورت گزری لوگوں کی شرم سے یہ اس کی طرف نظر تو نہ اُٹھا سکا نگاہ نیچے کو رکھی مگر یہ تاک میں کہ کسی طرح اس کو دیکھ لے۔ حالانکہ اللہ خوب واقف ہے کہ اگر اس کو موقع مل جائے تو اس کی شرم گاہ تک دیکھنے سے دریغ نہ کرے۔ (رواہ ابن ابی حاتم وابن المنذر وابن ابی شیبۃ وسعید بن منصور) دوسری روایت میں آیا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ آنکھوں کی خیانت سے آگاہ ہے کہ نیت بھی خیانت کی ہے یا نہیں۔

خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ کا تشریحی معنی مجاہد و قتادہ سے بھی یہی مروی ہے اور مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ کی تشریح میں ابن عباس نے فرمایا۔ اللہ کو معلوم ہے کہ اگر تجھے اس عورت پر دسترس مل جاتی تو تو زنا کرتا یا نہ کرتا۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط وابو نعیم والبیہقی) حضرت ابن عباس کی یہ تشریح تمثیلی ہے خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ یا مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ کے معنی کی تعیین نہیں ہے ورنہ خیانت چشم اور اخفاء دل کا حصر صرف دزدیدہ دیدار حسن اور نیت زنا میں ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک مرفوع روایت میں موجود ہے کہ حضورؐ نے حکم قتل کو آنکھ کے اشارے سے پورا کرانے کی خواہش کو بھی خیانت چشم فرمایا تھا حضرت سعد سے مروی ہے کہ جب لشکر سمیت رسول اللہ مکہ کو فتح کرنے پہنچے تو تمام غیر جنگی اہل مکہ کو امن دینے کا اعلان کر دیا۔ صرف چار مردوں اور دو عورتوں کے متعلق حکم ہوا کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ خواہ کعبہ کا پردہ ہی پکڑے کھڑے ہوں۔ ان میں سے ایک شخص عبد اللہ بن سعد بن ابی السرح تھا۔ یہ شخص حضرت عثمان کے پاس جا کر چھپ گیا۔ جب حضور نے لوگوں کو بیعت کے لئے بلوایا تو حضرت عثمان عبد اللہ کو لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ عبد اللہ بن سعد حاضر ہے اس کی بیعت قبول فرمائیے حضور نے عبد اللہ کو دیکھا اور سر جھکا لیا تین بار اسی طرح ہوا حضورؐ بیعت لینے سے ہاتھ روکتے رہے آخر بیعت لے لی۔ اس کے بعد حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا۔ تم میں سے کوئی بھی اتنا سمجھدار نہ تھا کہ جب میں بیعت لینے سے ہاتھ روک رہا تھا تو کھڑا ہو کر اس شخص کو قتل کر دیتا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کو حضورؐ کے دل کی بات کیسے معلوم ہوتی، حضورؐ نے آنکھ کا اشارہ کیوں نہ فرما دیا۔ ارشاد فرمایا پیغمبر کے لئے خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ مناسب نہیں۔ (رواہ ابو داؤد والنسائی وابن مردویہ)

وَاللّٰهُ يَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ۔ اوپر کی آیت میں اپنے ہمہ گیر اور غیب رس علم کی صراحت کرنے کے بعد اس آیت میں دو تین باتیں ظاہر فرمائیں۔ ایک اپنا خود اختیاری مگر عادلانہ فیصلہ، دوئم دوسرے جھوٹے معبودوں کی ناچاری بے بسی اور کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے عجز۔ مطلب یہ کہ قیامت کے دن عذاب ثواب اور سزا جزا کا فیصلہ خدا ہی کرے گا اور اس کا فیصلہ انصاف و حق کے ساتھ ظلم و جبر نہ ہوگا۔ رہے کافروں کے دوسرے جھوٹے معبود وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکیں گے ان کو اختیار ہی نہ ہوگا کہ کسی قسم کا فیصلہ کر سکیں۔ خواہ عادلانہ ہو یا ظالمانہ۔ حضرت ابوذر کی مرفوع حدیث میں اللہ کا ایک کلام قدسی آیا ہے۔ اے میرے بندو یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں گن رہا ہوں یہی اعمال تم کو پورے پورے دوں گا۔ پس جو شخص بھلائی پائے وہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے نفس کو ہی ملامت کرے اسی کلام قدسی میں ہے اے بندو میں نے اپنے اوپر ظلم حرام کر لیا ہے اور تمہارے آپس میں بھی ظلم کو حرام کر دیا ہے تم باہم ظلم نہ کرنا۔ (صحیح مسلم)

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ اللہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور دوسرے معبود کسی قسم کا فیصلہ نہیں کریں گے اور اعمال خارجیہ کا علم بغیر سمع و بصر کے نہیں ہوتا۔ اس لئے فرمایا کہ خدا سمیع و بصیر ہے یعنی دیکھنے والا ہے (بغیر آنکھوں کے) اور سننے والا ہے (بغیر کانوں کے) مطلب یہ کہ مخلوق کو سمع و بصر سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے یعنی آواز سن کر اس کی کیفیت کو معلوم کرنا اور صورت دیکھ کر اس کو جان لینا اس قسم کا علم خدا کو بہر حال اور ہر وقت ہے مگر اس کا سننا دیکھنا قید زمان و جہت اور مکان و ہیئت سے آزاد ہے۔ وہ ہر نا قابل سمع آواز کو بھی سنتا ہے یہاں تک کہ قلبی خطرات کی سرسراہٹ کو بھی وہ ہر غیر مرئی صورت کو دیکھتا ہے یہاں تک کہ معقولات اور معانی اور وجدانیت اور ارادوں کی شکلوں کو بھی۔ پس حقیقت میں وہی سمیع و بصیر ہے اس کے علاوہ دوسروں میں سمع و بصر کی طاقت ہی نہیں کیونکہ سننے اور دیکھنے سے کسی نے گوش ہوش اور چشم دید اندرونی حقائق کو کما حقہٗ انکشاف نہیں

سکے۔ ان کا سننا بھی ناقص ہے اور دیکھنا بھی۔ پھر مخلوق کی دید و شنید بھی ناقص اپنی حدود کے اندر مقید ہے۔ زمان، مکان، سمت، جہت، خارجی بیرونی سمع و بصر کی محدود لطافت و کثافت غرض اسی طرح کی چند در چند اور گوناں گوں قیود میں مخلوق کی قوت دید و شنید بندھی ہوتی ہے اور اللہ کا سمیع و بصیر ہونا ان تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے۔ پس حقیقت میں سمیع و بصیر صرف خدا ہی ہے اور کوئی نہیں۔

مقصودِ بیان قیامت کے قرب کی صراحت کر کے غافل اور لاپرواہ دماغ رکھنے والوں کے پردۂ غفلت کو چاک کیا ہے۔ قیامت کے دن حامی کی حمایت سفارشی کی سفارش اور یار و مددگار کے کام نہ آنے کو ظاہر فرما کر تلقین کی ہے۔ ہر محبوب غیر حقیقی کے لیے اور ہر معبود کی پرستش کو بیکار جاننے اور تمام دنیوی شوکت و حکومت کو ہیچ سمجھنے کی۔ یَعْلَمُ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور پوشیدہ سے پوشیدہ تصور بھی خدا سے مخفی نہیں۔ اس سے رد ہوتا ہے اُن بے وقوف اہل دانش کے مسلمات کا جو کہتے ہیں کہ خدا کو جزئیات و ذرات کا تفصیلی تو بتو علم نہیں ہو سکتا۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اُن ظاہر پرست علماء کو جو قوانین شریعت کی ظاہری پابندی کر کے اپنے کو پیشوائے شریعت اور علماء حق کہلاتے ہیں اور صلاح و تقویٰ کا بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ چوری چوری مخفی خباثتیں اور بدکاریاں ان کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہیں اور اندرونی جلن حسد حُبِ جاہ و مال اور اسلام کو تباہ کرنے والے چھپے ہوئے امراض اُن کی روحوں کو چاٹ چکے ہیں۔ اسی طرح نصیحت کرنی لازم ہے اُن سرمائے کے بندوں کو جو معاشرت اور ماحول کی لاج سے بیرونی گناہ تو نہیں کرتے لیکن اندرونی طور پر اللہ کی نافرمانیاں کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس میں تازیانۂ ہدایت ہے اُن ریاکار مکار درویشوں اور پیروں کے لئے جو مریدوں کے حلقے میں بیٹھ کر تو جبریل کے بھائی معلوم ہوتے ہیں اور تنہائی میں ابلیس رہا۔ وَاللّٰهُ يَقْضِي الخ سے اللہ کے عدل کی وضاحت ہوتی ہے یعنی اللہ اگرچہ مختار ہے۔ وہ ظلم کرے تب بھی اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن وہ ظلم کرتا نہیں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ الخ سے دلیل کی روشنی میں آس توڑی اُن تمام باطل پرستوں کی جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرتے اور ان کے سہارے پر جیتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ الخ میں ہے کہ اللہ کے ہی سمیع و بصیر ہونے کی صراحت ہے یعنی اس کے علاوہ کوئی سننے اور دیکھنے والا نہیں بلکہ وہی واقفِ حقیقت ہے کوئی دوسرا حقیقت شناس نہیں وغیرہ۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (کافر) لوگ اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیسا انجام ہوا

كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا

وہ لوگ قوت اور اُن نشانوں میں جو کہ زمین پر چھوڑ گئے ہیں ان سے بہت زیادہ تھے سو اُن کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے ان پر

كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

دار و گیر فرمائی اور ان کا کوئی خدا (کے عذاب) سے بچانے والا نہ ہوا یہ (مواخذہ) اس سبب سے ہوا کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کی واضح دلیلیں

فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

لے کر آتے رہے پھر انہوں نے نہ مانا تو اللہ نے ان پر مواخذہ فرمایا بیشک وہ بڑی قوت والا سخت سزا دینے والا ہے

تفسیر کچھ لوگ ملک در ملک گھومتے پھرتے ہیں۔ شہر در شہر کے چکر لگاتے ہیں۔ تاریخی آثار قدیم عمارات، پرانے کھنڈر، فرسودہ غار، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں و خار دریاؤں کے گمنام سرچشمے سب کچھ دیکھنے اور دشوار ترجگہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن صرف ذہنی عیاشی کے

واسطے سرمایہ فراہم کرنے کے لئے محقق اسکالر اور وسیع العلم سیاح کہلوانے کے لئے اور اس طرح مال و دولت یا عزت و شہرت حاصل کرنے کے لئے اس سے آگے ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ بازاروں میلوں اور تمام انسانی مجمعوں میں کافی روپیہ اور عزیز وقت صرف کر کے پہنچتے ہیں تاکہ اپنی بیمار بے قرار نگاہوں کے لئے مفرح موقعے تلاش کریں۔ پیاسی نظروں کی پیاس بجھائیں اور بھوکے شہوت پرست نفسوں کے لئے لذیذ صنفی غذائیں حاصل کریں۔ یا مختلف آلاتِ موسیقی سُریلے عندلیبی چہچہے سنیں اور زندگی بخش شہوانی نغمے سُن کر اپنے مُردہ نفسوں کو دوبارہ گناہگار زندگی عطا کریں۔ کچھ لوگ مقاماتِ مقدسہ اور مزاراتِ متبرکہ پر جاتے ہیں۔ اونچی خانقاہوں کو دیکھتے ہیں اور عطر میں ڈوبی ہوئی پھولوں سے لدی ہوئی قبروں پر حاضری دیتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ بانجھ عورت کے بیٹا ہو جائے، قاتل عدالت سے بری ہو جائے۔ حتمی موت والا مریض موت کے پنجے سے چھوٹ جائے، حسین نوجوان بیوی کو جو جن یا فرضی آسیب ستا رہا ہے وہ دُور ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ تمام نظریں خیانت کار ہیں۔ تمام سر گناہ بردوش اور معصیت دربغل ہیں۔ یہ سب لوگ عیش پرست غافل یا بے وقوف جاہل ہیں۔ کسی کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ اور قلبِ بیدار نہیں۔ یہ سب مُردے ہیں۔ بے حس اور بے دماغ ہیں مردہ دل۔ حقیقت میں دنیا میں گھوم کر دیکھنے کی چیز تو اقوام کا مدوجزر ہے۔ طاقتوروں کا زوال اور کمزوروں کا عروج جاذبِ نگاہ ہے انقلاباتِ دہر عبرت آفرین ہیں۔ پرانے کھنڈر اور فرسودہ قبریں کیا کیا پیام دے رہی ہیں۔ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فطرت کی دعوت سے رُوگردانی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ انبیاء کی پکار کو ٹھکرانے سے کیسی کیسی بربادیاں آتی ہیں اور اللہ کی ہدایت سے سرکشی کتنی عظیم الہیبت ہلاکتیں لاتی ہے۔ یہ ہیں دیکھنے اور سمجھنے کی چیزیں اور عبرت دلانے والی حقیقتیں۔

تحلیلِ اجزاء

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ تک خیانت کی نظر اور فریب کی نگاہ جرم ہے۔ بڑے منصوبے اور بُری نیت گناہ ہے اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ اس لئے خیانتِ چشم اور خبثِ نیت سے پرہیز لازم ہے۔ یہ مضمون اوپر بیان ہو چکا ہے لیکن کیا چشم بند گوش بند اور ہوش بند کی تعلیم پر عمل کیا جائے اور دیکھتی آنکھ سنتے کان اور سمجھتے ہوش کے ہوتے ہوئے بہرا اندھا اور بے وقوف بن جانا چاہیئے۔ اس طرح کی تعلیم چونکہ احمقانہ بلکہ خوابِ دیوانہ ہے۔ زندہ حواس کو مردہ بنا دینا فطری ہدایت کے خلاف ہے۔ اس لئے حواس و ہوش کا صحیح مصرف آیت مندرجہ میں بیان فرمایا ہے۔ انسان کے اندر علم اور طاقت (مالی ہو جسمانی ہو حکومت کی ہو) ہی ایسی چیزیں ہیں جن پر اس کو گھمنڈ ہوتا ہے۔ علم کی طغیانی اور طاقت کی فراوانی آدمی کو بدخود غلط ناوجی ہے۔ طرح طرح سے وہ اپنے علم و حکمت اور طاقت و شوکت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اونچی اونچی عمارتیں بناتا اور صنعتی آثار قائم کرتا ہے۔ آخر اس کی رعونت اس کو خود فراموش بنا دیتی ہے اور عیش و طرب یا علم نما جہالت میں پھنس کر وہ زندگی کے تمام سیدھے راستوں سے بھٹک جاتا ہے۔ اس کے عقائد و افکار میں کمزوری اور اعمالِ حیات میں غلط روی پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر کار ارحم الراحمین کو اس پر رحم آتا ہے۔ انبیاء شمعِ ہدایت ہاتھ میں لے کر آتے ہیں۔ بھٹکتے کج راہ مسافروں کو زندگی کا سیدھا راستہ بتلاتے ہیں لیکن مالدار خود پسند طاقتور جاہل، انبیاء کو حقیر سمجھتا ہے۔ اُن کا مذاق اُڑاتا اور ہدایت کو ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ رحمتِ الٰہیہ پر بھی بس نہیں کرتی۔ بدکیش مغروروں کی بے جا کوششوں کا اثر نہیں لیتی۔ انبیاء پیہم سمجھاتے ہیں۔ گرمی کی چلچلاتی جھلستی دھوپ اور سردی کی منجمد کن برف باری ان کو پیامِ رحمت پہنچانے اور قومِ گمراہ کے لئے بہبودی کی طلب سے نہیں روکتی لیکن جاہل ہٹی گمراہ اسلاف کے گمراہ پیرو کسی طرح اپنی زندگیوں کو درست کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتے بلکہ اپنے مہربان خیرخواہوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ طرح طرح سے ان کو ستاتے اور دکھ دیتے ہیں۔ پیامِ حق کو مٹانے کے لئے شیطانی تدبیریں کرتے اور پیغامبرانِ حق کو تباہ کرنے کے لئے طاغوتی داخلی اور عفریتی طاقتوں کو کام میں لاتے ہیں۔ جب روئے زمین پر نجاست بڑھ جاتی ہے اور چپہ برابر ٹکڑا پاک نہیں رہتا تو گندگیوں سے پاک کرنے کے لئے غضبِ الٰہی کا سیلاب چڑھ آتا ہے۔ قومِ گمراہ کی شان و شوکت کے تمام نشان مٹا دیتے ہیں۔ فلک بوس کوٹھیاں کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں سرسبز کھیت جل جاتے ہیں۔ شاداب باغ اُجڑ جاتے ہیں۔ مغرور بدکیش قوم تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس کے نشانات صفحۂ ہستی سے محو کر دیئے جاتے ہیں اور روئے زمین کو غلاظتوں سے صاف کر دیا جاتا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے مسکن بنا سکیں اور پچھلوں کی بربادی سے عبرت حاصل کر کے ان کی بدکرتیوں اور بدکیشیوں کو اپنی زندگیوں پر کسی طرح اثر انداز نہ ہونے دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کافر بھی گزشتہ اُمتوں کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ وہی دماغی رعونت وہی پندار وہی اطوار و کردار کی بدعملی اور وہی اعمال کی تباہی۔ حضور والا تشریف لائے۔ فکری و عملی گمراہیوں پر متنبہ کیا۔ غلط روی سے روکا۔ لیکن کافروں کے پندار نے ان کو مدہوش و خود فراموش بنا دیا تھا ان میں جہالت تھی، جتھہ بندی تھی، دولت تھی، آزادی تھی، جسمانی طاقت تھی، علم تو نہ تھا مگر عالم اسلاف کی پیروی کا دعویٰ تھا۔ اس لئے دعوت رحمت اور ندائے شفقت کو انتہائی کور باطنی کے ساتھ رد کر دیا۔ اس پر قرآن نے اُن کو اُن کے غلط پندار پر متنبہ کیا اور بتایا کہ ذرا اپنے کنویں سے نکل کر سمندر کی سیر کرو۔ گزشتہ اقوام کے پرانے بوسیدہ کھنڈرات پر نگاہ عبرت اندوز ڈالو۔ دیکھو وہ تم سے طاقت میں بھی زیادہ تھے اور صنعت میں بھی اُن کے آثارِ صنعت اور مظاہرِ شوکت بہت شاندار تھے لیکن جب انہوں نے اللہ کے احکام سے سرتابی کی اور پیغمبروں کی نصیحت نہ مانی تو کس طرح اس کو تباہ کر دیا گیا اور ان کی طاقت و صنعت ان کو نہ بچا سکی۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ کے زمانے کے کافر ہیں لیکن حکم عبرت اندوزی ہر زمانے کے کافروں کے لئے عام ہے۔ قوت سے مراد شاید جسمانی طاقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قبائلی طاقت یا حکومت مراد ہو۔ آثار سے مراد ہیں صنعتی آثار جو آرٹ کے کمال اور علم و ہنر کی وسعت پر دلالت کرتے ہیں۔

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ۔ اللہ زبردستی کسی کو تباہ نہیں کرتا علم و طاقت کی وسعت و برتری سے مدنیت اور زندگی کا معیار بڑا ہو جاتا ہے، قوم مالدار اور مرفہ الحال بن جاتی ہے۔ پس جب علم و دولت کا رُخ خطاکاریوں اور عیش پرستیوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ لوگ فطری راستوں سے ہٹ جاتے ہیں۔ جفاکشی اور محنت کوشی کو چھوڑ کر راحت پسند آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے منادی ان کو پکارتے ہیں۔ بدکاریوں پر متنبہ کرتے اور الٰہی قانون پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں مگر ان کی سیاہ کاریاں باطنی اور کور دماغی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ علمبردارانِ صداقت کی کسی پکار کی پرواہ نہیں کرتے آخر اپنے جرائم کی پاداش میں ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی گرفت سے اُن کی جسمانی قوت تعداد کی کثرت، علم کی فراوانی، دولت و مال کی طغیانی، حکومت کی ہمہ گیری اور جلال و شکوہ کی فلک رسی کوئی اور کچھ بھی بربادی سے نہیں بچا سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا غفور و رحیم نہیں ہے کیا اس کی مہر قہر پر غالب نہیں نادانوں کا گنہگار ہونا درست مگر اللہ کا ارحم الراحمین ہونا بھی تو بجائے خود ثابت ہے تو پھر جرائم کی گرفت کر کے اُن کو تباہ کیوں کیا۔ اُن کی توضیح کے لئے فرمایا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ۔ مطلب یہ کہ اللہ نے بداطوار زیاں کاروں کو اسی پر آتے کے واقع پر پہنچایئے۔ خواہ مخواہ ان کے جرائم کی پکڑ نہیں کی۔ اُن کی خطاکاری اور معصیت کوشی کے باوجود اللہ نے اُن پر مہربانی کی، رحم کیا، ان کی حالت درست کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھیجے پیغمبروں نے ان کو کھول کھول کر سمجھایا، واضح نشانیاں دکھائیں۔ لوگوں نے اُن کی رسالت کا ثبوت مانگا تو پیغمبروں نے دلائل واضحہ اور نمایاں نشانیاں پیش کیں جب منکرانِ حقیقت نے انبیاء کی صداقت کا انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کو پکڑا اور سزا دی۔

اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ کیونکہ ناقابلِ شک ہے۔ یہ حقیقت کہ اللہ کمزور نہیں کہ سزا نہ دے سکے وہ خود بھی قوی ہے اور اس کی سزا بھی شدید ہے۔

مقصودِ بیان

سیاحت کا دنظر کی بجائے عبرت اندوز نظر رکھنے کی تلقین اور ملک ملک میں سیاحت کرنے کے اصل مغز کا اظہار اگرچہ حصولِ دولت اضافۂ علم وسعتِ تجربہ اور دوسری شخصی قومی اغراض کے لئے سفر کرنا جائز ہے لیکن سیاحت کا اصل گر عبرت اندوزی سے حال کو ماضی پر قیاس کرنا اور مستقبل کو درست کرنے کے لئے ماضی کو پیش نظر رکھنا اور اقوام پارینہ کے احوال اور مدوجزر کو سبق آموز غور سے دیکھنا مقصدِ سیر ہے۔ سیر و تفریح کے شیدا حسن پرستی کے دلدادہ اونچی قبروں پر جا کر مرادیں مانگنے کے شوقین اس سے نصیحت حاصل کریں۔

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ ظالم نہیں۔ کسی کی ترقی کو تباہ کرنے کا اُس کو شوق نہیں بلکہ انسان کی خطاکاریاں اور گمراہیاں خود اُس کی تباہی کے اسباب بن جاتی ہیں اور جرائم کی پاداش میں اللہ اُس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ الخ۔ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ آخری حجت پوری کر دیتا ہے۔ جرائم کی گرفت بھی بغیر آخری ہدایت کے نہیں کرتا۔ بدکاریوں پر آگاہ کرتا ہے۔ پیہم پیغمبر بھیج کر نصیحت کراتا ہے اور اصلاحِ حال کے تمام مواقع فراہم کراتا ہے۔ لیکن جب لوگ پیغمبروں کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں اور حقیقتِ صادقہ کا انکار کرنے لگتے ہیں گویا حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتے ہیں اور اُن کی قوتِ تمیز ختم ہو جاتی ہے تو خدا اُن کو تباہ کر دیتا ہے۔ وغیرہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ

اور ہم نے موسیٰ کو اپنے احکام اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تو اُن لوگوں

فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ

نے کہا کہ یہ جادوگر (اور) جھوٹا ہے پھر (اس کے بعد) جب وہ (عام) لوگوں کے پاس دینِ حق جو ہماری طرف سے تھا لے کر آئے تو اُن (مذکور) لوگوں نے

اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ

(بطور مشورہ کے) کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو اور ان کافروں کی تدبیر محض بے اثر ہی اور فرعون

ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ

نے (اہلِ دربار سے کہا) کہ مجھ کو چھوڑو میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اس کو چاہیے کہ اپنے رب کو (مدد کے لئے) پکارے مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ (کہیں) تمہارا دین (نہ) بدل ڈالے

فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ

یا ملک میں کوئی خرابی (نہ) پھیلا دے اور موسیٰ نے جب (یہ بات سُنی تو کہا) کہ میں اپنے اور تمہارے (یعنی سب کے) پروردگار کی پناہ لیتا ہوں

مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝ ع

ہر خردماغ (کے شر) سے جو روزِ حساب پر یقین نہیں رکھتا

تفسیر حق و باطل کا ٹکراؤ اور طاغوتی طاقتوں کی ریشہ کاریوں سے اہلِ صداقت کی سورج نما دلائل کا تصادم ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ نے پیہم شکستیں کھائی ہیں۔ جاہل باطل پرستوں کا قاعدہ ہے کہ حق کا آفتاب جب چمکتا ہے اور اس کی کرنیں ان کی آنکھوں میں چکاچوند اور دماغوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہیں اور وہ آنکھیں اٹھا کر نگاہ جما کر دیکھنے سے عاجز آجاتے ہیں تو اپنی بیچارگی اور شکست پر مکر کا پردہ ڈالنے کے لئے کہتے ہیں یہ حق نہیں جادو ہے۔ یہ شخص جادو دکھا کر نبوت اور خدارسی کا دعویٰ کر رہا ہے بڑا جھوٹا ہے لیکن نبوت کہاں اور جادو کہاں۔ ایک نفیز لطیف دوسرا نجاست غلیظ، ایک پاکیزگی اور طہارت کا سیال چشمہ، دوسرا گندگی اور پلیدی سے بھرا ہوا متعفن کوڑا گھر۔ انبیاء اپنی شستہ مہکتی ہوئی تعلیم پیش کرتے ہیں جو اخلاق کو سنوارتی، معاشرت کو سدھارتی اور زندگیوں کو پاکیزہ بناتی ہے۔ ساحر کے پاس انسانیت کو درست کرنے کا کوئی دستور العمل نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کے چند عجیب کرشموں کو دیکھ کر لوگ اُس کی برتری مان لیں اور اس کی مغرور بزرگی کے سامنے سر جھکا دیں۔ چنانچہ انبیاء کی روشنی ہدایت کو مان کر جب بعض پاکیزہ فطرت والے اپنی زندگیوں کو مانجھنے اور جلا دینے لگتے ہیں تو کور بصیرت ظالم اُن کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ طرح طرح سے دکھ پہنچاتے اور ستاتے ہیں۔ پھبتیاں اڑانا مذاق بنانا، آوازیں کسنا مالی اور جسمانی اذیتیں دینا ان کا دن رات کا مشغلہ بن جاتا ہے اور جب اس طرح بھی سورج کی شعاعوں کو وہ ماند نہیں کر سکتے تو بعض شقی القلب سنگ دماغ بے رحم دلوں والے اہلِ حق کے معصوم بچوں کو قتل کرنے اور بے داغ بچیوں کو اپنی خدمت کرانے اور نفسانی آگ کو بجھانے کے لئے باقی رکھ چھوڑنے کا وطیرہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ حرکت عمومی نہیں۔ ہر باطل پرست اتنا سنگدل نہیں ہوتا۔ اتنی قساوت کی مثالیں تاریخ میں چند ہی ملیں گی۔ عام جاہلانہ دستور یہ رہا ہے کہ جب ہر طرف سے کامیابی کے راستے بند نظر آئے کوئی فریب کوئی اغوا کوئی تخویف دہشت انگیزی سود مند نہ ہوئی اور طالبانِ حق کو مالی اور جسمانی اذیتیں پہنچانے کا

کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو طاغوتی گروہ فیصلہ کن اقدام پر اتر آیا۔ اس نے باہم مشورے کے بعد طے کر دیا کہ اس مدعی نبوت کو قید کر دو تاکہ جیل خانے کے دکھ اٹھا کر اس کا دماغ صحیح ہو جائے یا قتل ہی کر دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن ہر ظلم کی کوئی وجہ جواز ظالم ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔ ظالمانہ ٹیکسوں سے رعایا کا مال چھین لینا اور ڈاکہ مار کر لوٹ لینا نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ لیکن ایک جگہ ظلم نے قانونی شکل اختیار کر لی ہے کیونکہ ظالم زیادہ مکار ہے۔ دوسری جگہ ظالم کے بے وقوف ہونے کی وجہ سے ظلم آئینی پوزیشن اختیار نہیں کر سکا ہے۔ چنانچہ پیغمبر الٰہی کو جب فرعونی ظالم قتل کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ جواز بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ شخص ملک میں فساد پھیلاتا اور لوگوں کے مذہب کو بگاڑتا ہے۔ امن عالم کو تباہ کرنا اور کسی کے مذہب کو بگاڑنا سنگین جرم ہے جس کی سزا قتل ہے، اس لئے ایسے آدمی کو قتل کر دینا ہی مناسب ہے۔ ظالموں کا یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کمزور ایمان والوں کو لرزا دے مگر جس کی رگ رگ میں اور دل کی خلاؤں کے ہر خانے میں حق رچ چکا ہو جو حق اور حق بھیجنے والے خدا کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہو، جس کا ایمان کسبی اور یقین صرف علمی نہ ہو بلکہ شہود سے ترقی کر کے وہ حق الیقین تک پہنچ چکا ہو وہ باطل کے کسی فیصلے سے نہیں ڈرتا۔ سرکش جاہلوں کے سامنے اس کی گردن نہیں جھکتی۔ اس وقت بھی وہ پکار کر کہتا ہے۔ لوگو رب ایک ہی ہے تم سب کا بھی اور میرا بھی۔ مجھے اسی کی پناہ کی ضرورت ہے۔ یہ مغرور زندگی کو محاسبہ اخروی سے آزاد سمجھنے والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں اپنے رب کی پناہ چاہتا ہوں۔

تحلیل اجزاء

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ اوپر ایک عام تبصرہ فرمایا تھا کہ انبیاء کو جن لوگوں نے جھوٹا قرار دیا اور ان کا حکم نہ مانا ان کو برباد کر دیا گیا چاہے وہ کتنے ہی طاقتور تھے۔ مگر انبیاء کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ان آیات میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ (بطور ثبوت) بیان فرمایا تھا کہ رسول اللہ کو قوم کی سرکشی اور تکذیب سے رنج نہ ہو اور فرعون جیسے بادشاہ کی سرتابی کا نتیجہ دیکھ کر کافروں کو عبرت ہو۔ عاد، ثمود، طسم، جدیس اگرچہ عربی قومیں تھیں لیکن ان کا زمانہ بہت قدیم تھا۔ ان کے تمدن کا کچھ تاریخی پتہ بھی نہیں۔ کچھ فرسودہ کھنڈر سر راہ قوم ثمود وغیرہ کے عربی قافلوں کے سامنے آتے تھے لیکن ان سے اصل شکوہ و جلال کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ دوسری آسمانی کتابوں میں بھی ان کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا اس لئے جاہل ضدی ہٹ دھرم کافر ان کی بربادی کو زیادہ عبرت اندوز نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن فرعون مصر کا تذکرہ لوگوں پر پوشیدہ راز نہ تھا۔ بنی اسرائیل کا مصر کو جانا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں آباد ہونا۔ پھر حضرت موسیٰ سے پہلے ہی قبطیوں کے ہاتھوں ہر طرح کے دکھ اٹھانا اور اچھوت شودر بن کر قبطیوں کی خدمت کرنا پھر حضرت موسیٰ کا مبعوث ہونا۔ فرعون سے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کی خواہش کرنا۔ فرعون کا انکار کرنا۔ موسیٰ کے خلاف ہر قسم کی مکاری اور زور آزمائی کرنا آخر شکست کھا کر دریا میں لشکر سمیت ڈوب مرنا۔ یہ واقعات وہ تھے جن کو یہودی اور عیسائی بھی مانتے تھے اور اہل کتاب کی وساطت سے غیر کتابی عربوں کو بھی ان کا پتہ تھا اس لئے قرآن میں جابجا کہیں طویل کہیں مختصر حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل اور فرعون و ہامان کا ذکر کیا گیا تاکہ نصیحت حاصل کرنے والے نصیحت حاصل کریں۔

آیت مذکورہ میں آیات سے حضرت موسیٰ کے عام معجزات اور سلطان مبین سے مخصوص معجزۂ عصا مراد ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ۔ فرعون شاہ مصر، ہامان اس کا وزیر اور قارون ایک مالدار اسرائیلی تھا۔ قارون کا صرف نام آیا ہے۔ اس کا کوئی مفصل واقعہ اس جگہ مذکور نہیں۔ کیا فرعون و ہامان بھی حضرت موسیٰ کی امت دعوت میں داخل تھے اور اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو ان دونوں کی ہدایت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس صرف اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے اور ترک وطن کر کے موسیٰ کے ساتھ شام کو جانے کی اجازت دیدے۔ اصل غرض فرعون کی ہدایت نہ تھی۔ اکثر علماء کا قول اس کے خلاف ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات بھی اس کی شاہد ہیں اور یہاں کی آیت میں بھی صاف نص ہے کہ موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو صرف فرعون ہامان اور قارون کی ہدایت کا حکم نہیں تھا بلکہ آپ کی دعوت تمام اسرائیلیوں کے لئے عمومی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ قبطیوں کو بھی آپ نے پیام ہدایت دیا ہو لیکن یہ تینوں بڑے آدمی تھے۔ ان کی شخصیتیں مصر میں بہت اونچی تھیں۔ فرعون بادشاہ تھا اور خدائی کا مدعی۔ دوسرا ہامان وزیر تھا فریب میں شیطان کا استاد۔ تیسرا قارون تھا عدیم المثال سرمایہ دار جس کا نام اب تک ضرب المثل ہے۔ گویا حکایت اور سرمایہ پرستی نے مل کر مصر میں غریبوں کو لوٹا تھا۔ ان کے پاس بھیجنے کے معنی صرف یہ تھے کہ اگر یہ مان گئے تو پھر مصر میں دین الٰہی کی اشاعت میں

کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔

فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۔ حضرت موسیٰ نے اللہ کا پیام فرعون کو پہنچایا فرعون کی رعونت نے اجازت نہ دی کہ حق کا اقرار کرے حضرت موسیٰ نے معجزات دکھائے۔ بھرے دربار لاٹھی اژدھا بن گئی ۔ ہامان کے مشورے سے فرعون نے اطراف ملک سے ساحروں کو طلب کیا ۔ اسکندریہ کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ ساحر مغلوب ہوئے اور ایمان لے آئے ۔ فرعون نے ساحروں کو دردناک طریقہ سے قتل کرا دیا ۔ ملک میں شور مچ گیا ۔ حضرت موسیٰ نے عمومی ہدایت کا اعلان کیا ۔ جوق درجوق بنی اسرائیل موسیٰ کی طرف آنے لگے ۔ ممکن ہے کچھ قبطی بھی ایمان لائے ہوں مگر فرعونیوں میں سے کوئی مومن نہ بنا صرف ایک عورت آسیہ فرعون کی بیوی اور ایک مرد جس کا تذکرہ آئندہ آیات میں آتا ہے مسلمان ہوئے ۔ ہامان پر اپنی جگہ لرزہ طاری ہوگیا ۔ موسیٰ کا تو کچھ بگاڑ نہ سکے ۔ مقابلہ میں پیہم شکستیں کھائیں مگر سب نے مل کر ایک شیطانی تدبیر سوچی اور موسیٰ کے زور توڑنے کے لئے ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۔ فیصلہ کیا کہ جو لوگ مومن ہوگئے ہیں یا آئندہ مومن ہوں ان کے نرینہ بچوں کو قتل کردو اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دو ۔ مطلب یہ کہ بچوں کے قتل کے خوف سے کوئی آئندہ موسیٰ کی جماعت میں داخل نہ ہوگا اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ بھی لوٹ جائیں گے ۔ لڑکیوں کی زندگی کی خواہش بھی رحم کے جذبہ کے زیر اثر نہ تھی بلکہ اپنی نفسانی پیاس کو بجھانے اور چھوکریوں باندیوں کا حلقہ وسیع کرنے کے لئے ایسی تدبیر سوچی تھی ۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا ۔

ایک ضروری یادداشت

بچوں کے قتلِ عام کا یہ حکم کیا وہی حکم جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے نجومیوں کے مشورے کے مطابق بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنے کے متعلق فرعون نے دیا تھا یا یہ دوبارہ قتل کا عمومی حکم اس وقت ہوا تھا جب حضرت موسیٰ پیغمبر بن کر فرعون کے دربار میں پہنچے اور ساحروں کو شکست دی اور فرعون مجبور ہوگیا ۔ سیاق قرآنی موخرالذکر شق پر دلالت کر رہا ہے ۔ ترتیب بیان اس کی شاہد ہے ۔ امام رازی کا بھی یہی قول ہے ۔ سورۂ اعراف کی آیات بھی اسی پر دلالت کر رہی ہیں جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ فرعونیوں نے فرعون سے کہا ۔ آپ نے موسیٰ کو اجازت دیدی کہ آپ سے اور آپ کے معبودوں سے قطع تعلق کرے ۔ اس وقت فرعون نے جواب دیا تھا اب ہم اُن کے لڑکوں کو قتل کریں گے ۔

غرض بچوں کے قتل عام کا حکم جاری ہوگیا ۔ مگر طاغوتی تدبیریں اللہ کی تدبیر کے مقابلہ میں ہیچ ہیں ۔

وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۔ منکرینِ خدا کی مکاری منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی ۔ اُس کو کامیابی کا راستہ ہی نہیں ملتا ۔ بچے قتل ہوتے تھے ۔ معصوم ہستیاں بے قصور ذبح کی جاتی تھیں ۔ اہل ایمان دیکھتے تھے اور راہ خدا میں قربانیاں دے رہے تھے مگر کسی کی بس پر میل نہ تھا ۔ حضرت موسیٰ سے ضرور شکایت کرتے تھے اور حضرت ان کو تسلی دے دیتے تھے ۔ آخر یہ تدبیر بھی سودمند ثابت نہ ہوئی تو فرعون نے (جھلا کر) اپنے اہل شوریٰ سے کہا ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۔ اب مجھے تم لوگ اجازت دو میں موسیٰ کا کام ہی تمام کئے ڈالتا ہوں ۔ اس کو قتل کرائے دیتا ہوں ۔ اب وہ اپنے خدا کو (مدد کے لئے) بلائے (دیکھوں اس کا خدا کیا کرتا ہے !)

فرعون کا اہل مشورہ سے موسیٰ کے قتل کی اجازت مانگنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اس وقت تک شاید ملک میں فتنہ و فساد کے خوف سے اُسی کے درباریوں نے موسیٰ کے قتل سے اس کو روکا تھا ۔ حسن بصری اور بعض دوسرے علماء اس کی تائید میں ہیں ۔ اور قتل سے روکنے کی مختلف وجوہ پیش کرتے ہیں ۔ (۱) ممکن ہے فرعون کے درباریوں میں کچھ موسیٰ کے طرفدار بھی ہوں جو فرعون کو موسیٰ کے قتل سے روکتے ہوں ۔ (۲) فرعونیوں نے فرعون سے کہا موسیٰ معمولی ساحر ہے ۔ ایسے آدمی کو قتل کرنے سے رعایا کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو جائے گا کہ فرعون موسیٰ کا مقابلہ نہ کرسکا مجبور ہو کر قتل کرا دیا ۔ (۳) ممکن ہے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو کہ اگر موسیٰ مارا گیا تو اس وقت تک فرعون جس قدر ہماری عزت و توقیر کرتا رہا ہے اس میں کمی آجائے گی ۔ اس لئے ہماری ذاتی اغراض کو موسیٰ کے قتل سے نقصان پہنچے گا ۔

میری رائے میں کسی نے بھی فرعون کو نہیں روکا تھا ۔ حقیقت میں فرعون خود خوف زدہ ہوگیا تھا ۔ موسیٰ کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر اس کو اپنی سلطنت کے خطرہ پڑ جانے کا ڈر ہوگیا تھا ۔ گو موسیٰ کو قتل کراتے بھی ڈرتا تھا ۔ کہیں ملک میں عام بغاوت نہ ہو جائے اور سلطنت تباہ نہ ہو جائے مگر انتہائی مکاری کے

ساتھ اپنے خوف کو چھپا کر ممانعتِ قتل کا مشورہ اہلِ دربار کے سر ڈالا اور پھر اُن سے قتل کی اجازت طلب کی۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ مکار ظالم ظلم کو قانونی شکل میں پیش کرتا ہے اور حقیقت میں ظلم کا آئین بنالیتا ہے۔ فرعون نے اپنے ساتھیوں کے جذبات سے کھیلنا چاہا۔ انسان دو ہی چیزوں کا تحفظ بہت زیادہ ضروری خیال کرتا ہے۔

(۱) مذہب اور آبائی مذہب اُس کو بہت پیارا ہوتا ہے۔ کسی طرح وہ اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ جو شخص اس کے مذہب میں مداخلت کرے، یا مذہبی جذبہ کو ٹھیس لگائے اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ (۲) جان و مال اور آبرو کی حفاظت بھی ہر ایک کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ملک میں تباہی پھیلنے کے معنی یہ ہیں لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں۔ اگرچہ مذہبی تبدیلی ہو یا حکومت کا انقلاب دونوں چیزیں واجب العمل ہی ہیں گرا ہی وقت جبکہ غلط مذہب کی جگہ صحیح مذہب اور ظالم حکومت کی جگہ عادل حکومت کو دی جائے۔ سمجھدار بلند حوصلہ آدمی ایسے انقلاب کو دیتے ہیں۔ مذہب و حکومت کی اصلاح کی صورت ہی یہ ہوتی ہے سڑے ہوئے عضو کو کاٹ کر پھینک دینے سے باقی اعضاء میں صحت برقرار رہتی یا زائل شدہ صحت واپس آجاتی ہے۔ تخریب کے بغیر تعمیر کا امکان ہی نہیں خشکی نہ ہو تو تبخیر کس طرح ہو اور ابر آئے کر پانی کس طرح برسے۔ قانونِ قدرت ہی یہ ہے کہ غیر صالح چیزوں کو بگاڑ کر صالح چیزوں کو اُن کی جگہ دی جائے سوکھ جانے والے درختوں کو کاٹ کر اُن کی جگہ نئے پودے لگائے جاتے ہیں تاکہ ٹھنڈا سایہ اور لذیذ پھل پیدا ہوسکیں۔ لیکن عام طور پر سادہ لوح آدمی انقلاب کے نام سے لرزتا ہے۔ وہ صالح اور غیر صالح میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ موجودہ حالت پر ہی پست حوصلہ بیوقوف آدمی قناعت کرنا اہم خیال کرتا ہے۔ فرعونیوں کو اپنا مذہب پیارا تھا۔ اپنی حکومت محبوب تھی۔ اپنی جان و مال اور عزت سب کچھ ان کو عزیز تھا۔ فرعون مکار ظالم تھا۔ موسیٰ کے قتل کی اجازت طلب کی تو وجہ جواز یہ پیش کی۔ لوگوں کے جذبات سے اپیل کی کہ وہ قتل کی اجازت دیدیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کا مذہب برباد ہو جائے گا۔ امنِ عام میں خلل پڑ جائے گا ملک میں فساد پھیل جائے گا۔ لوٹ مار شروع ہو جائے گی۔ حکومت میں انقلاب آجائے گا۔ مالدار محتاج اور عزت والے ذلیل ہو جائیں گے۔ یہ تھا فرعون کا اندیشہ فاسد جس کو پیش کر کے اُس نے لوگوں کو موسیٰ کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ۔ روشن دماغ اور نورانی روح رکھنے والے دانشور بلند حوصلہ ہوتے ہیں۔ وہ دشمن کے کسی ظلم کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ نہ مخالف کی دھمکیوں سے ڈرتے ہیں اور پھر ان میں انانیت اور مرعوب عقلی بھی نہیں ہوتی ان کو اپنی طاقت کا پندار بھی نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ان تمام ناقص مادی طاقتوں کی کارفرمائیوں سے بہت اونچی ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی ہر بڑی سے بڑی طاقت کو غیبی طاقت کے سامنے ذرہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ وہ ہر مصیبت کے وقت اللہ کے دامنِ پناہ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اُن کو نہ دشمن کی طاقت سے خوف ہوتا ہے نہ اپنی قوت کا نشہ۔ صرف اللہ کی ہمہ گیر طاقت پر اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اللہ کو مہربان اور رب جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس کا رب خدا ہو اور جو خدا کی ربوبیت پر نظر رکھتا ہو اور رب کو خدا باقی رکھنا چاہے اور ترقی دے کر کمال کی حد تک پہنچانا چاہے اُسے کون ہٹا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ صاحب وحی تھے اسرار فطرت سے واقف تھے۔ اللہ کی ہمہ گیر طاقت پر اُن کو یقین تھا۔ اس کی ربوبیت پر ایمان تھا۔ ایمان کیا تھا خود آنکھوں سے اللہ کی مہربانی اور امدادی طاقت کو دیکھ چکے تھے۔ اس لئے بجائے خوفزدہ ہونے اور خود اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے اپنے بچاؤ کا سامان فراہم کرنے کیلئے انہوں نے اللہ کے دامنِ ربوبیت کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اعلان کر دیا کہ ان مغرور ظالموں سے مجھے کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے رب کی اعانت کا یقین ہے۔ میں اسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

تصویرِ بیان

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت بے دلیل نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ کے پاس واضح نشانیاں اور دلائل تھے۔ خصوصاً ایک کھلی سند بھی تھی جس کا مقابلہ فرعون جیسے جابر بادشاہ اور ہامان جیسے شیطان وزیر بھی نہ کرسکتے تھے۔ اِلٰی فِرْعَوْنَ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تھا کیونکہ بھیجا گیا تھا کیا اس کو ایمان کی دعوت دی تھی یا اسرائیلیوں کی رہائی کی اس سے خواہش کی گئی تھی آیت اس تفصیل سے خاموش ہے۔ صرف سیاق بتا رہا ہے کہ فرعون کو ہدایت کرنا بھی موسیٰ کے فرائضِ رسالت میں تھا۔ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے زمانے میں بھی ساحروں کی غیر معمولی عزت تھی گو ساحر بھی ایک ہنر یا ایک فن سمجھا جاتا تھا جس کو جاننے والا ایسی عزت و اقتدار کا مالک نہیں خیال کیا جاتا تھا جو بادشاہوں کا مقابلہ کر سکے۔ کذاب کا لفظ اگر تاکیدی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے زمانے کے لوگ بھی سحر کو جھوٹ سمجھتے تھے حقیقت سے خالی۔ صرف نظر بندی یا کوئی اور کرشمہ سازی۔ تغیری حقائق کی بنا اُن کی نظر میں بھی سحر پر صحیح نہ

تھی۔ قَالُوا اقْتُلُوٓا الخ سے مستنبط ہو رہا ہے کہ باطل پرست شقی القلب رعونت زدہ آدمی اہلِ حق کو شکست دینے کے لئے کبھی سخت ترین اقدام سے بھی نہیں جھجکتا اور ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کرتا ہے جو جانوروں کے لئے باعثِ شرم ہے۔ اِسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی چاہتے تھے کہ اسرائیلی عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت ہو جائے (تاکہ ان کو ترقی کا موقع ہی نہ ملے۔ عزّت و ناموس بھی برباد ہو اور خود اچھوت بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جس قوم میں عورتوں کی کثرت ہوتی ہے اس کی عزّت و ناموس کا تحفظ دشوار ہو جاتا ہے اور مدافعت کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے) اس سے یہ بات بھی مستفاد ہو سکتی ہے کہ فرعون والے نفس پرست مکار اور قوم پرستی کے نشہ سے چُور تھے۔ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ الخ میں صراحت ہے کہ کافروں کا فریب کوئی بھی اللہ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ الخ سے مترشح ہو رہا ہے کہ فرعون بڑا فریبی تھا۔ گویا اس وقت تک موسیٰ کو قتل نہ کرنے کی وجہ اپنے درباریوں کی مخالفت کو قرار دے رہا تھا اور خود موسیٰ پر ہاتھ ڈالنے سے جو اس پر لرزہ طاری تھا اُس کو پُر فریب الفاظ میں چھپا رہا تھا۔ ایک بات یہ بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ فرعون ظالم بھی تھا اور مغرور بھی۔ بے دریغ خون بہانے پر بھی آمادہ تھا اور خدا کی طاقت کو بھی کچھ نہ جانتا تھا اور واقعی بے رحمی غرور نفس کا نتیجہ ہوتی بھی ہے۔ پُر خود غلط انسان دوسروں پر مظالم ڈھانے کی پرواہ نہیں کرتا۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ فرعون درباریوں کو بھڑکا رہا ہے قوم کے جذبات سے کھیل رہا ہے اور اس طرح موسیٰ کے قتل کے بعد جو اندیشۂ فساد تھا اس کے مقابلے میں اپنے ساتھیوں کو محاذ بند بنانا چاہتا تھا۔ وَقَالَ مُوْسٰٓى الخ سے ثابت ہے کہ اہلِ حق باطل کی کسی طاقت اور دھمکی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کو حق کی طرفداری میں اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ ظاہر اسباب سے خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی نظر عالمِ غیب پر ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز میں اللہ کی طاقت کو کارفرما دیکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جس خدا نے ربوبیت کا ذمہ لیا ہے اُس کے وعدۂ ربوبیت کو کوئی شیطانی طاقت شکست نہیں دے سکتی اس لئے وہ سخت مصیبت کے وقت بھی اللہ کے دامنِ پناہ میں چھپنا چاہتے ہیں وغیرہ۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ

اور (اس مجلس مشورہ میں) ایک مومن شخص نے جو کہ فرعون کے خاندان سے تھے اور (ابتک) اپنا ایمان پوشیدہ رکھتے تھے کہا کیا تم ایک شخص کو (محض) اس بات پر قتل

يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ

کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے (اس دعوے پر) دلیلیں (بھی) لیکر آیا ہے اور اگر (بالفرض) وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ

كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

اُسی پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہوا تو وہ جو کچھ پیشین گوئی کر رہا ہے اُس میں سے کچھ تو تم پر (ضرور ہی) پڑے گا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو مقصود تک نہیں

مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ

پہنچاتا جو (اپنی) حد سے گزر جانے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہو اے میرے بھائیو آج تو تمہاری سلطنت ہے کہ اس سرزمین میں تم حاکم ہو

فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى

سو خدا کے عذاب میں ہماری کون مدد کریگا اگر (اُن کے قتل کرنے سے) وہ ہم پر آپڑا فرعون نے (یہ تقریر سُن کر جواب میں) کہا کہ میں تو تم کو وہی رائے دوں گا جو خود سمجھ رہا ہوں

وَمَآ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ ۝

(کہ ان کا قتل ہی مناسب ہے) اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتلاتا ہوں

تفسیر سیاہ پتھروں میں کبھی کوئی ہیرا بھی چھپا ہوتا ہے۔ سڑے ہوئے کوڑے میں کبھی کوئی جوہر آبدار بھی دفن ہوتا ہے۔ اندھیرے کالے بادلوں کے پیچھے کبھی آفتاب بھی ہوتا ہے۔ ظلمت کفر میں کبھی نور ایمان کا کوئی ذرہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ ظلم کی فوج میں کسی رحم دل سپاہی کا ہونا اور باطل پرستوں کے جتھے میں کسی حق پرست کی موجودگی بعید نہیں۔ جب باطل کی طاقت کو شکست دینی اور ظالموں کی جڑ کاٹنی مقصود ہوتی ہے تو سیاہ باطن گروہ میں سے ہی اللہ کسی کے دل کو روشن کر دیتا ہے اور جب تک روشنی کو چھپائے رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کو مخفی رکھا جاتا ہے لیکن جب وقت کے تقاضے کے تحت اس کا ظہور مناسب ہوتا ہے اس کو رونما کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اہل حق اپنی قوم کے طرفدار ہوتے ہیں۔ ان کی سرکشی پر ابھری جابر باطل آخر ہو گر ان کا جذبۂ خیر خواہی ہر وقت قوم کی بہتری کے لئے کام کرتا رہتا ہے لیکن ان کی خیر خواہی دوست نما دشمن کی طرح نہیں ہوتی بلکہ کونین کی آگ کی طرح تلخی کے ساتھ شیریں نتیجہ کی حامل ہوتی ہے وہ قوم کے بہی خواہ ہوتے ہیں اس لئے دانشورانہ بہی خواہی کرتے ہیں۔ حریف کو شکست دینے کے لئے ہٹ دھرم ضدی ظالم جن مظالم سے دریغ نہیں کرتا وہ عاقلانہ دلائل کی روشنی میں اس کو باز داشت کرتے ہیں اور ظلم نہ کرنے کی صورت میں جن تباہ کن نتائج سے تحفظ رہتا ہے اس کو بھی کرتے ہیں۔ حریف اگر حق پر ہے تو اس کی حقانیت کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور قوم کو بھی سچی بات مان لینے پر آمادہ کرتے ہیں مگر لطیف بیان اور پُر مغز طرز کلام کے ساتھ۔ آخر کار کفر کی جبروتی طاقت شکست کھاتی اور لاجواب ہو جاتی ہے۔ اپنے ہی لشکر کے ایک سپاہی کی حق بیانی کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا باطل کی فوج میں انتشار پھیل جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کلام کا طرز حاکمانہ نہیں بلکہ بے جان واعظانہ ہو جاتا ہے۔ رعونت کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور لیڈری کی شکست پیدا ہو جاتی ہے۔ نتیجہ میں سردار کفر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میری نظر میں جو بات صحیح تھی وہ میں نے کہہ دی جو سیدھا راستہ تھا وہ دکھا دیا۔ اب تمہارا کام

تحلیل اجزاء وَقَالَ رَجُلٌ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَكۡتُمُ اِيۡمَانَهٗۤ۔ حضرت موسیٰ کے قتل کے مشورے ہونے تو اتفاقاً ان پتھروں میں اس وقت ایک ہیرا بھی تھا۔ فرعون کے ساتھیوں میں ایک شخص در پردہ مسلمان ہو گیا تھا اس نے (غضب ناک ہو کر قوم کو ڈانٹ بتائی اور کہا) اس شخص کا نام کسی نے حبیب کسی نے شمعون اور ابن عباس نے حزقیل بتایا ہے (مبہمات سیوطی) ابن جریر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ فرعونیوں سے صرف دو آدمی ایمان لائے تھے۔ ایک عورت، ایک مرد۔ عورت فرعون کی بیوی تھی اور مرد یہی شخص تھا۔ اسی نے حضرت موسیٰ کو پہلے یہ اطلاع دی تھی کہ فرعون کے اشراف والے آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ (رواہ ابن ابی حاتم)

اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ يَّقُوۡلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدۡ جَآءَكُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّكُمۡ۔ کیا اللہ کو جو شخص اپنا رب کہتا ہے تم اس کو قتل کر رہے ہو یعنی جو فرعون کی ربوبیت کا قائل نہیں بلکہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے بس یہی اس کا جرم ہے اور اس کا یہ دعویٰ بھی بلا دلیل نہیں۔ وہ رب کے پاس سے اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے کھلے ہوئے نشانات بھی لایا ہے۔

امام رازی نے اس جگہ سے استخراج کیا ہے کہ فرعون کا دعویٰ خالق کائنات ہونے کا نہ تھا بلکہ فلاسفہ جس طرح رب النوع کا نظریہ رکھتے ہیں اسی طرح وہ اپنے کو رب نوع انسانی قرار دیتا تھا یا صرف قبطیوں کا رب اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ قبطیوں کا رزاق ان کی نسل کا نگراں اور ان کا حاجت روا اپنے آپ کو کہا کرتا تھا اور غیبی طاقتوں کو اپنا زیر بار دار بتاتا تھا جن کی ذہنی مورتیاں رعایا کی پوجا کے لئے اس نے رکھوا دی تھیں۔ امام کی اس تشریح کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے اشارتاً بھی مترشح ہو رہا ہو کہ فرعون اپنے آپ کو رب النوع کہتا تھا۔ شاید امام کو فرعون کے انا ربکم الاعلیٰ کے لفظ سے یہ کچھ اشتباہ ہوا ہو لیکن اس لفظ سے رب النوع ہونے کے دعوے کا استنباط غلط ہے۔ فرعون شاید اتنا بے وقوف نہ تھا کہ وہ قبطی جو فرعون کے آباء و اجداد کی پہلی نظر میں آباد چلے آتے تھے ان کا رب النوع اپنے آپ کو قرار دے۔ بات صرف اتنی تھی کہ بددماغ بادشاہ جب رعونت و غرور کی وجہ سے جب دماغ خراب ہو جاتے ہیں وہ بندار و کبر کے نشہ سے سرمست ہو کر خدائی تعمیر کو بھی اپنے دماغ سے نکال دیتے ہیں۔ طاقت کا نشہ آدمی کو بے ہوش کر دیتا ہے۔ افسوس کر دیا

آدمیوں کا ہر وقت اُن داتا اور غریب پرور کہنا دماغی توازن کو خراب کر دیتا ہے اور وہ خدا سے بغاوت کر کے عملاً اپنے کو خدا کہنے لگتا ہے۔ غالباً فرعون کا بھی یہی کیفیت ہوئی۔ وہ بڑا مغرور اور سرکش آدمی تھا۔ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا فِي الْاَرْضِ شمالی افریقہ کے کئی حصوں میں اس کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ تمام پبلک کا نفع نقصان، کھیتی باڑی، تجارت، لین دین یہاں تک کہ موت اور زیست بھی اُس کے اشارۂ ابرو سے وابستہ نظر آتا تھا۔ وہ اس سراب کو آب، فریب کو واقعیت اور مجاز کو حقیقت سمجھنے لگا اور خدا سے بے نیاز بن کر خود مختاری اور استبداد کا دعویٰ کر بیٹھا۔ فلسفے و لسفے کی اصطلاحی گتھیاں اور یونان، ہندوستان اور چین و ایران کی علمی موشگافیاں اس کے پیش نظر نہ تھیں۔ نہ اُس کو ایسے فلسفیانہ دقیق مسائل سے کوئی لگاؤ تھا۔ واللہ اعلم

امام رازی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ربّی کہنے سے اُس مومن نے توحید کا اظہار کیا تھا اور قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ کہہ کر نبوت پر استدلال کیا تھا یا توحید کے ثبوت میں یہ لفظ کہا تھا۔ کیونکہ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ کا یہ قول مذکور ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى الخ اور سورۂ شعراء میں بھی آیا ہے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ الخ میں کہتا ہوں کہ مِنْ رَّبِّكُمْ کہہ کر اس مرد مومن نے یہ بات ظاہر کرنی چاہی تھی کہ فرعون تمہارا رب نہیں۔ اس کی ربوبیت کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں اور اللہ کے رب ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں موسیٰ نے پیش کی ہیں اور یہ نشانیاں موسیٰ کی خود ساختہ اور دماغی تراشیدہ نہیں بلکہ قدرت کی طرف سے اُن کو دی گئی ہیں اور واقعی ہیں۔ نہ طلاقت بیان کو ان میں دخل ہے نہ اختراع ذہنی کو۔

وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ امام رازی نے فرمایا۔ اُس مرد صادق نے آخری پرشوکت دلیل سے ان احمقوں کو قائل کیا اور کہا آخر موسیٰ کے قتل کی تمہیں ضرورت ہی کیا ہے۔ کیونکہ موسیٰ اپنے دعوے میں سچے ہیں یا جھوٹے اگر جھوٹ بول رہے ہیں تو اُن کا جھوٹ پلٹ کر اُن ہی پر پڑے گا تم کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ یعنی خدا پر الزام لگانا آسان نہیں۔ اتنا بڑا جرم تقدیری سزا پانے سے خالی نہیں رہ سکتا اور اگر موسیٰ کا قول سچا ہے اور وہ واقعی نبی ہیں اور اللہ نے ان کو بھیجا ہے تو جس قدرتی سزا کی وہ دھمکی دے رہے ہیں اگر تم نے اُن پر ہاتھ ڈالا تو وہ تم کو ضرور ملے گی۔ حاصل یہ کہ اگر موسیٰ جھوٹ بول رہے ہیں تو وہ مسرف کذاب ہیں یعنی حد سے آگے بڑھ کر جو انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور اگر وہ سچے ہیں تو تم مسرف کذاب ہو یعنی حد سے آگے بڑھ کر زیادتی کرنے والے اور موسیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانے والے۔ بہرحال یہ عام ضابطہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دروغ باف کو خدا کامیاب نہیں کرتا۔ پس یا موسیٰ خود بخود تباہ ہو جائیں گے یا تم موسیٰ کی تکذیب اور اُن کو ایذا رسانی کی پاداش میں يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا۔ آخر میں مرد مومن نے کافروں کے دماغوں سے طاقت کا نشہ اتارنے کے لئے کہا قوم والو دیکھو آج (مصر میں) تمہاری پوری پوری حکومت ہے۔ تم اس سرزمین پر غالب ہو گویا غلبہ اور طاقت دوسری قوموں اور غیر ملکوں کے مقابلہ میں چل سکتا ہے۔ تم اُن سے تصادم کر سکتے ہو اور غالب بھی آ سکتے ہو لیکن) اگر اللہ کا عذاب ہم پر آ جائے تو اس سے ہم کو کون بچائے گا اور کون مدد کرے گا۔ یہ فوج اور پولیس، خزانے اور جتھے کس کام آئیں گے؟

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔ مرد صالح کی تقریر قوم نے غور کر کے سنی اور ایسے واضح بیان کا اُن کے پاس کوئی رد نہ تھا اُدھر فرعون کے بارے خدائی کا نشہ بھی کافور ہو چکا تھا۔ خود اُسی کی قوم کے ایک آدمی نے ایسی تقریر کی تھی جو صداقت و معنویت کی متحرک تصویر تھی اس لئے زمین نذر اور قدرے پیدا ہونے والی رعونت کو بھول گیا اور خدائی کے غرور کو چھوڑ کر لیڈری کے مجز پر اتر آیا اور بولا جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہی تم کو دکھا رہا ہوں۔ میں اپنی دانست میں تم کو سیدھا راستہ ہی دکھا رہا ہوں (اب تم کو اختیار ہے مانو یا نہ مانو) کم بخت نے آخر میں بھی دو باتیں جھوٹ کہیں۔ اُس کو حضرت موسیٰ کی سچائی کا یقین ہو چکا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس سے فرمایا تھا لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ الخ فرعون کے ساتھیوں کو بھی یقین آ چکا تھا اللہ نے فرمایا ہے۔ وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ۔ صرف ظلم اور تکبر کی وجہ سے انکار کر رہے تھے۔ فرعون کی دوسری بات بھی غلط تھی۔ وہ اپنی قوم کو سیدھا راستہ نہیں دکھا رہا تھا وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ۔ خود بھی اپنے نفس کا خائن تھا اور قوم کی بھی خیانت کر رہا تھا سب کو جہنم کی طرف لے جا رہا تھا۔ خود آگے آگے تھا اور قوم پیچھے پیچھے يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ۔ حضرت عروہ بن زبیر کا قول ہے، میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے پوچھا کہ مشرکوں نے حضور والا کے ساتھ مکہ میں جو سب سے زیادہ سلوک کیا ہو وہ مجھے بتائیے۔ عبد اللہ نے فرمایا۔ ایک روز کعبہ کے صحن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط آیا حضور والا کے مونڈھے کو

گلا مبارک میں ایک کپڑا ڈالا اور اینٹھنے لگا۔ حضور کا دم گھٹنے لگا۔ ہم ڈر کے مارے بچا نہیں سکتے تھے اتنے میں ابوبکر صدیق تشریف لائے۔ آپ نے اس کا مونڈھا پکڑ کر الگ ہٹایا اور فرمایا۔ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (بخاری)

ایک روز حضور والا مشرکوں کے ایک مجمع کی طرف سے گزرے۔ مشرکوں نے پوچھا کیا تم ہم کو اُن معبودوں کو پوجنے سے منع کرتے ہو جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں میں منع کرتا ہوں کم بختوں نے آگے بڑھ کر حضور کو پکڑ لیا اور مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں میں نے خود دیکھا کہ ابوبکر صدیق حضور کو پیچھے سے دبوچے ہوئے ہیں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور کہہ رہے ہیں يٰقَوْمِ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ الآیۃ (رواہ النسائی وابن ابی حاتم عن عبداللہ بن عمرو بن العاص)

رازی نے لکھا ہے کہ حضرت جعفر بن محمد نے فرمایا آلِ فرعون کے جس صدیق مومن کی اللہ نے اس آیت میں تعریف فرمائی ہے اُس سے اِس امت کے صدیق حضرت ابوبکر افضل تھے۔ کیونکہ وہ تو ایمان کو چھپاتا تھا اور ابوبکر اپنے ایمان کا اعلان فرماتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک روز خطبہ میں فرمایا لوگو سب سے زیادہ بہادر کون ہے۔ حاضرین نے جواب دیا آپ۔ فرمایا میں نے میدان میں جس شخص سے مقابلہ کیا اس سے انصاف کیا (پھر) بتاؤ سب سے بڑا بہادر کون ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم کو علم نہیں آپ ہی فرمائیے۔ ارشاد فرمایا۔ ابوبکر صدیق۔ میں نے خود دیکھا کہ مشرک رسول اللہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ ایک ایک پہلو میں مارتا تھا اور دوسرا اُدھر سے دوسرے پہلو میں گھونسے رسید کر رہا تھا اور منہ سے کہتے جا رہے تھے تو ہی ہم کو ہمارے معبودوں سے روکتا اور ایک معبود بتاتا ہے۔ واللہ ہم میں سے کسی کو رسول اللہ تک جانے (اور حضور کو چھڑانے) کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہاں ابوبکر ہی تھے جو کبھی ایک مشرک کو اور کبھی دوسرے مشرک کو مارتے اور کہتے جاتے تھے۔ ارے کم بختو تمہارا بُرا ہو اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ چادر کا کونہ منہ پر ڈال کر اتنا روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر فرمایا لوگو میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ مومن آلِ فرعون افضل تھا یا ابوبکر۔ لوگ خاموش تھے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے۔ سنو خدا کی قسم ابوبکر کی (زندگی کی) ایک ساعت مومن آلِ فرعون کی (پوری شخصیت) سے افضل تھی وہ تو اپنا ایمان مخفی رکھتا ہے اور یہ ایمان کا اعلان کرتے تھے (رواہ ابونعیم فی فضائل الصحابۃ) امام رازی نے صراحت کی ہے کہ فرعون موسیٰ کے قتل کے درپے تھا موسیٰ کی اولاد کو مار ڈالنے کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ سب لوگ قتل موسیٰ پر متفق الرائے ہو چکے تھے۔ ظاہر میں حفاظت کی کوئی صورت ہی نہ تھی لیکن موسیٰ نے جب اللہ کی پناہ لی اور اُس سے مدد مانگی تو کسی دشمن کا قابو نہ چلا۔ حقیقت میں اللہ کی پناہ ہر مشکل کا حل اور ہر مصیبت سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

مقصود بیان

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ الخ اس شخص کو اللہ نے مومن فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ وہ اپنا ایمان مخفی رکھتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف وہلاکت کے وقت ایمان کو چھپانا جائز ہے۔ اس مردِ مومن نے جو قوم کو نصیحت کی اور حضرت موسیٰ کے قتل سے روکا اس سے واضح ہوتا ہے کہ ظالموں کو ظلم سے روکنا اور دوستوں کو ضرر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا اہلِ ایمان کا شیوہ ہونا چاہیئے۔ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کے لفظ میں صراحت ہے کہ یہ شخص اسرائیلی نہ تھا فرعون کے خاندان یا کم از کم اس کی قوم سے تھا۔ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ جھوٹے پر اُس کے جھوٹ کا وبال خود پڑتا ہے خصوصاً جب وہ خدا کے معاملے میں جھوٹ بولے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ الخ سے قدرت کا ایک عام ضابطہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جو شخص اپنی حدِ اختیار یا حدِ الہیت سے آگے بڑھ کر اُن کمالات کا مدعی بن بیٹھے جو اس کے اندر نہیں ہیں تو خدا ایسے جھوٹے کو کامیاب نہیں بناتا۔ اس جملہ میں ہدایت بمعنی رہنمائی نہیں ہے بلکہ ایصال الی المنزل مقصود پر پہنچانا مراد ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہانِ حق کے مقابلے میں بڑے سے بڑا جابر بھی سرگرم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ظالم بادشاہوں پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دلیل حق کا مقابلہ فرد سے نہیں کر سکتے اور جبر و قہر کی سطح سے نیچے اتر کر لیڈروں کی طرح سنجیدگی اور عجز اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر بادشاہ جب سنجیدہ لیڈر بن جاتا ہے تو چونکہ اس کا کلام کھوکھلا اور دلیل سے خالی ہوتا ہے اسلئے اس کی کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ وغیرہ

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ

اور اس مومن نے کہا صاحبو مجھ کو تمہاری نسبت اور اُمتوں جیسے روز بد کا اندیشہ ہے جیسا قوم نوح

قَوْمِ نُوحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ وَيَا قَوْمِ

اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والوں (یعنی قوم لوط وغیرہ) کا حال ہوا تھا اور خدا تعالیٰ تو بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا اور صاحبو مجھ کو

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ

تمہاری نسبت اس دن کا اندیشہ ہے جس میں کثرت سے ندائیں ہوں گی جس روز (موقف حساب سے) پشت پھیر کر (دوزخ کی طرف) لوٹو گے (اور اس وقت) تم کو خدا سے

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ

کوئی بچانے والا نہ ہو گا اور جس کو خدا ہی گمراہ کرے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور اس کے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف (علیہ السلام) دلائل (توحید ورسالت کے) لے کر آ چکے

فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ

ہیں سو تم ان امور میں بھی برابر شک ہی میں رہے جو وہ تمہارے پاس لے کر آئے تھے حتیٰ کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم لوگ کہنے لگے کہ بس اب اللہ کسی رسول کو

رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ۝ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ

نہ بھیجے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ آپے سے باہر ہو جانے والوں (اور) شبہات میں گرفتار رہنے والوں کو غلطی میں ڈالے رکھتا ہے جو بلا کسی سند کے کہ ان کے پاس موجود ہو

اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ

خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں اس (کج بحثی) سے خدا تعالیٰ کو بھی بڑی نفرت ہے اور مومنین کی بھی اور اسی طرح اللہ تعالیٰ

اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

ہر مغرور جابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے

تفسیر جن دانشوں اور اصحاب فکر و فہم کا ایمان ہمیشہ بڑی قوی ہوتا ہے۔ وہ کائناتی تغیرات پر غور کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے انسانی عقل کی نارسائی اور بشری فہم کی عاجزی آتی ہے۔ وہ دستور حیات کی تدوین سے تمام عقلاء کے اجتماعی اور انفرادی دماغوں کو عاجز پاتے ہیں اس لئے قانون زندگی جاننے کے لئے وہ پیغمبروں کی تلاش کرتے ہیں اور پیغامبران حق جب اُن کو حقانیت و صداقت کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں تو وہ ہر یہی علامات صدق دیکھ کر بے جھجک پیام حق کو مان لیتے ہیں لیکن جن کی مزاج زنگ خوردہ دماغوں والے آدمی ہر دعوت کو شک کی نظر سے دیکھتے اور حدود بشریت سے آگے قدم بڑھا کر قوانین زندگی کی تصنیف کے لئے اپنی عقلوں کو کافی سمجھتے ہیں اور نہ فقط یہ کہ گزشتہ اور موجودہ پیغمبروں کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ آئندہ کے لئے بھی نہایت صفائی سے ساتھ پرزور اعلان کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی کبھی کوئی خدا کا فرستادہ نہیں آئے گا۔ درحقیقت اسی باطل کوش گروہ میں وہ مذموم اخلاق ایسے رچ جاتے ہیں کہ اُن کے قلب کی بینائی زائل ہو جاتی ہے اور راہ حق ان کو نہیں سوجھتی۔ اول غرور و نخوت اُن کے دماغوں پر چھایا رہتا ہے اور وہ اپنی فکر و فہم کو ہمہ گیر اور تنقید سے بالا سمجھتے ہیں۔ دوسرے خود غرضی، مفاد پرستی اور مخلوق کی حق تلفی کا نشہ اُن کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے جس کی وجہ سے وہ جبار ظالم اور ناحق کوش بن جاتے ہیں۔ ایسا عناد حق پسند اُن کو ہر بڑھائی طور پر ہدایت کرتے ہیں اور جب کوئی دلیل مؤثر نہیں ہوتی تو عذاب آخرت کی وعید سناتے ہیں اور ذوق کے ساتھ اطلاع کرتے ہیں کہ قیامت کے دن کوئی کسی کا مددگار نہ ہو گا اور کوئی بھی اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے گا۔ لیکن قیامت کون دیکھ کر آیا ہے اللہ کا توفیق دے کرے جس

کے پاس چشم بینا اور دل دانا ہو جو گم کردہ راہ ہو اس کو کون راہ راست پر لا سکے۔ بالآخر حق پرست اشخاص باطل کوش افراد کو تمثیلی رنگ میں سمجھاتے ہیں۔ حق سے سرکشی کرنے کی پاداش میں جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کا تذکرہ کر کے دنیوی بربادی سے ڈراتے ہیں اور ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن جھگڑا کرنے سے باز نہیں آتے اور اس طرح بارگاہِ الٰہی سے بھی مردود ہوتے ہیں اور اہلِ ایمان کی نظر میں بھی مبغوض۔

تحلیل اجزاء

جب مردِ مومن کے جواب میں فرعون نے پھر قوم کو اکسایا اور اغوا میں کیا تاثات سے تو وہ مردِ حق شیر کی طرح بپھر گیا۔ اور مدبرانہ پر حکمت جوشِ غضب کے ساتھ اس نے لوگوں کو دنیوی اور آخروی عذاب سے ڈرایا اور صاف کہہ دیا کہ اللہ ظالم نہیں کہ بے وجہ قوموں کے وارث کو تباہ کرتا ہو۔ لوگوں کی بدکرداری خود ان کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ گزشتہ اقوام کی طرح تم بھی تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ غور کرو اب سے پہلے تمہاری ہی قوم کو یوسف نے آکر ہدایت کی روشن دلیلیں اور کھلی ہوئی نشانیاں بھی پیش کیں مگر تم نے اُن کی بات کا یقین نہیں کیا۔ آخر جب اُن کی وفات ہو گئی تو تم نے (جان چھوٹنے کو غنیمت جانا اور) کہا اب آئندہ خدا کسی پیغمبر کو نہیں بھیجے گا مگر خدائی دستور سے تم ناواقف ہو اس سے بات بھی وہی کہی جس سے گمراہی کا ظہور ہوتا تھا۔ جب آدمی کے پاس دلیل نہ ہو نہ عقلی نہ نقلی تو پھر اللہ کے احکام کا انکار کرنا مجادلہ باطل ہے اور باطل مجادلہ کرنے والوں کو قدرتاً راہِ حق نہیں دکھائی جاتی۔ اللہ ان کو گمراہ ہی چھوڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ۙ﴿۳۰﴾ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ

جب مردِ مومن کی بات کاٹ کر فرعون نے پھر حاضرین کو دھوکا دیا تو مردِ مومن غضب ناک ہو گیا لیکن پر حکمت جوش کے ساتھ برائی آمیز طرز بیان کے ادبِ دلنشا اپنا رنگ اختیار کیا اور قوم کو دو قسم کی دھمکیاں دیں۔ ایک دنیوی بربادی کی دوسری عذابِ آخرت کی۔ اول وعید کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا۔ قوم نوح عاد ثمود اور ان سے پیچھے آنے والی اقوام (مثلاً قوم لوط قوم شعیب وغیرہ) کی تباہی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ مجھے تمہارے متعلق بھی اسی تباہی کا اندیشہ ہے جس سے اقوامِ گزشتہ دوچار ہو چکی ہیں۔ یعنی پیغمبروں کی ہدایت سے انہوں نے سرتابی کی اللہ کے احکام کو نہ مانا۔ اپنے افکار و اعمال کی اصلاح نہیں کی جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کو برباد کر دیا۔ ان کا وسیع تمدن ان کی مضبوط عمارتیں، اُن کے بلند آثار، ان کی فوجوں کی کثرت اور دولت کی فراوانی اعمال کی آوردہ ہلاکت سے اُن کو نہ بچا سکے گی۔ بات صرف یہ ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کو خواہ مخواہ برباد نہیں کرتا بلکہ لوگوں کا کردار خود اُن کی تباہی کا سبب ہوتا ہے۔

وَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ یَوۡمَ التَّنَادِ ﴿ۙ۳۲﴾ یَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِیۡنَ ۔ دوسری وعید کے متعلق مردِ مومن نے عذابِ آخرت سے ڈرایا جبکہ ہام پکار مچی ہوگی۔ ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارے گا۔ کمزور طاقتوروں کو، مرید پیروں کو، عابد معبودوں کو، امتیں اپنے اپنے پیغمبروں کو۔ تمام بے سہارے اپنے سہاروں کو پکاریں گے لیکن سب باطل پرست منہ پھیر کر بھاگیں گے۔ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ یَوۡمَ التَّنَادِ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ تسمیہ کی وجوہ مختلف بیان کی گئی ہیں۔ (۱) جنت والے دوزخیوں کو اور دوزخی جنت والوں کو پکاریں گے۔ قرآن میں آیا ہے۔ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ الآیۃ یہ ندا تو اہلِ جنت کی طرف سے ہوگی اور دوزخیوں کی پکار یہ ہوگی۔ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ الآیۃ سورہ اعراف کی ندا کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے (قتادہ) (۲) ہر گروہ کو اس کے لیڈر کے ساتھ پکارا جائے گا (زجاج) (۳) کفار ہائے واویلا کریں گے اور پکاریں گے (۴) قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد لوگوں کو میدانِ حشر میں جمع کرنے کے لئے پکارا جائے گا (۵) اعمالنامے پڑھنے کے لئے پکارا جائے گا (۶) ظالموں پر لعنت کی پکار ہوگی (۷) موت کو سیاہ مینڈھے کی شکل میں لا کر جب ذبح کر دیا جائے گا تو ندا ہوگی اے اہلِ جنت ہمیشہ عیش کرو اب کبھی موت نہیں ہے اور اے اہلِ دوزخ ہمیشہ دوزخ میں پڑے رہو آئندہ کبھی موت نہیں آئے گی۔ امام بغوی نے کہا کسی وجہ کی تعیین اور تخصیص نہیں تمام توجیہات کے مجموعہ کو تسمیہ کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

مَا لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ عَاصِمٍ ۔ یہ کلامِ سابق کا تتمہ ہے۔ اوپر کی آیت میں بیان کیا تھا کہ تم منہ پھیر کر بھاگو گے یعنی کوئی کسی کی مدد نہ کرے گا۔ کہ باہم مدد کرنے کی بنا رحم، خلق اور بے مروتی پر نہ ہوگی بلکہ واقع میں کسی میں بچانے کی طاقت ہی نہ ہوگی اور فقط یہی نہیں کہ ایک کا فرد دوسرے کا ذکر نہ بچا سکے گا بلکہ کافروں کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔ نہ جھوٹے معبود نہ فرضی دیوتا، نہ پیر نہ پیغمبر نہ ملائکہ، نہ کائنات کی کوئی اندرونی اور بیرونی طاقت۔

وَمَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ۔ تخلیقِ ضلال و ہدایت خدا کا کام ہے۔ انسان دوسرے انسان کو نصیحت کرتا ہے لیکن اس کے اندر ہدایت اور
ذوبانی پیدا نہیں کرسکتا جس کے اندر خدا ہدایت کی تخلیق نہ کرے اس کو کون ہدایت یاب بنا سکتا ہے۔ اوپر کے جملے میں اللہ کے عذابِ آخرت کی کامل گرفت کا اظہار
فرمایا تھا۔ اس آیت میں اللہ نے ہمہ گیر احاطۂ تخلیقی کو بیان فرمایا۔ یعنی جس طرح آخرت میں عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اسی طرح اس دنیا میں بھی دائرۂ
الٰہی کو راہِ راست پر لانے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔

نوٹ:۔ انسان قادرِ مطلق ہے یا مجبورِ محض یا ارادتاً مختار اور تخلیقاً مجبور یہ بحث بہت طویل ہے ہم کئی جگہ اس کی تنقیح کر چکے ہیں اس جگہ تفصیل
کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ تکوین و تخلیق انسانی جبر پر دلالت کرتی ہے اور تشریعات کی بنا اختیارِ انسانی پر ہے اس لئے قدر و جبر کا درمیانی
مسلک حق ہے۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِى شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُم بِهِۦ حَتَّىٰٓ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللّٰهُ مِنۢ
بَعْدِهِۦ رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ۔ مردِ مومن نے قوم والوں کو اُن کی پے در پے غلطیوں پر متنبہ کیا اور کہا کہ اب سے پہلے
یوسف (پیغمبر ابھی تم لوگوں کی ہدایت کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے بھی کھول کھول کر احکام بیان کئے تھے (یا معجزات اپنے ساتھ لائے تھے) مگر تم نے ان کا بھی
یقین نہیں کیا اور ان کی ہدایت میں شک کرتے رہے پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اُن کی وفات کے بعد ہر پیغمبر کے مبعوث ہونے اور پیامِ الٰہی لانے سے تم نے
انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ (نہ صرف یوسف ہی پیغمبر نہ تھے بلکہ) آئندہ بھی کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ مراد یہ کہ آسمانی شریعت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم خود اپنی
زندگی کے آئین ساز ہیں ہمارا علم اور ہماری دانش اصلاحِ انسانی کا دستور بنانے کے لئے کافی ہے گویا اس طرح حدودِ انسانیت سے تم نے آگے قدم
بڑھایا اپنے اختیار و قدرت سے زیادہ کے مدعی بن بیٹھے اور شریعتِ الٰہیہ پر یقین نہ کیا۔ ایسی حالت میں خدا تم کو کس طرح ہدایت یاب ہونے کی توفیق
دیتا۔ مسرف مرتاب کو خدا تعالیٰ ہدایت یافتہ بننے کی توفیق نہیں دیا کرتا۔ اس کا یہی دستور ہے۔

ان آیات میں تشریح طلب یہ امر ہے کہ مردِ مومن نے فرعونِ موسیٰ کے زمانہ میں جن لوگوں سے خطاب کیا تھا کیا اُنہی لوگوں کے سامنے حضرت
یوسف بھی پیغمبر تھے یا اُن کے اسلاف کے زمانے میں۔ بعض لوگوں کا میلان اول قول کی طرف ہے۔ علامہ قاری نے صراحت کی ہے کہ فرعونِ موسیٰ کی عمر اتنی لمبی تھی
کہ اس نے حضرت یوسف کا عہد پایا تھا۔ اس کی کل عمر چار سو چالیس سال تھی۔ صاحبِ جمل نے لکھا ہے کہ قولِ اول کو سوائے شیخ جلال محلی و خازن و نسفی کے کسی نے نقل
نہیں کیا۔ سیوطی نے تحبیر میں لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی اور حضرت یوسف و حضرت موسیٰ کے درمیان چار سو برس کا فصل تھا۔
اسی سلسلے میں بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں یوسف سے مراد یوسف بن یعقوب نہیں ہیں بلکہ وہ یوسف مراد ہیں جو افرائیم کے بیٹے اور یوسف بن
یعقوب کے پوتے تھے اور قبطیوں کی ہدایت کے لئے اُن کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔
خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ یوسف سے مراد یوسف بن یعقوب ہی ہیں اور مردِ مومن کے مخاطب اگرچہ اُس کے زمانے کے لوگ تھے مگر مراد ان کے
اسلاف تھے کیونکہ فرعون کے زمانہ کے قبطی اپنے اسلاف کے جامد مقلد تھے اور اُن کے ہر قول و عمل کو برحق جانتے تھے۔ تو گویا وہ خود اپنے بزرگوں کے قول کے
قائل اُن کے عقیدے کے معتقد اور ان کے اعمال کے عامل تھے۔ قومی نظریات و اعمال میں وحدتِ عقیدہ و عمل قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ مکان اور زمان کے
اختلاف میں مکان کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے جس کے مستحق ان کے آباء و اجداد تھے۔

الَّذِينَ يُجَٰدِلُونَ فِىٓ ءَايَٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَٰنٍ أَتَىٰهُمْ۔ انسانی دانش و اختیار کی حدود سے آگے بڑھ کر کچھ لوگ تشریعِ حیات کے دعوے دار
بن بیٹھتے ہیں اور خود تراشیدہ دماغی زاییدہ دستور کو انسان اور انسانیت کو سدھارنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ جب اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر اُن کے سامنے
اللہ کے احکام اور تشریعات لاتے ہیں تو ان کے پاس رد کرنے اور غلط قرار دینے کی کوئی عقلی نقلی وجہ نہیں ہوتی اور نہ وہ حق کے طلبگار ہوتے ہیں اس لئے
کج بحثی اور جاہلانہ جھگڑوں سے کام لے کر مقابلہ کرتے ہیں۔ انسانی حدود سے تجاوز کر کے خدائی اختیار کی تشریع کے تو پہلے ہی سے مدعی ہوتے ہیں اب مرتاب
اور جھگڑالو بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بات
كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللّٰهِ وَعِندَ الَّذِينَ ءَامَنُوا۔ خدا کو بھی اور سچا یقین رکھنے والوں کو بھی بڑی مبغوض ہوتی ہے جس چیز کی عقلی یا نقلی دلیل نہ ہو

پر خدا انسان ہونے ہوئے اختیارات الوہیت کا دعویدار خواہ مخواہ بن بیٹھے اور جب اس کو حقانیت کا راستہ بتایا جائے اور انسانیت کو سنوارنے کی تعلیم دی جائے تو جھگڑا کرنے لگے تو ایسی بے باک جاہل کی یہ ناپسندیدہ حرکات نہ خدا کو پسند ہو سکتی ہیں نہ ان اہل علم و ایقان کو جن کو خدا نے نور ایمانی عطا فرمایا ہے ۔ حقیقت میں ایسی باتیں اسی شخص سے سرزد ہو سکتی ہیں جس کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہو اور نور حق کا کوئی پرتو اس کے دل میں کسی گوشے پر نہ پڑ سکتا ہو۔ اسی لئے فرمایا:۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جبّار سے مراد ہے قاتل ۔ عکرمہ اور شعبی کا قول ہے کہ آدمی اس وقت جبار ہوتا ہے جب ناحق قتل کرے (ابن ابی حاتم) ابو عمران الجونی اور قتادہ نے فرمایا ناحق قتل کرنا جبابرہ کی پہچان ہے ۔ جبّار کا لفظی ترجمہ قاتل نہیں ہے جباریت کو قاتل میں حصر کرنے کی کوئی وجہ ہے ۔ ممکن ہے ان علماء نے جباریت کی تمثیل میں قتل ناحق کو پیش کیا ہو حصر مقصود نہ ہو ۔ مقاتل نے متکبر اور جبار کا فرق ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا کہ توحید الٰہی کو بازِ نخوت سے ٹھکرانے والا متکبر ہے اور ظالمانہ حرکات کو اختیار کرنے والا جبار ہے ۔ اس قول کی توضیح کرتے ہوئے امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ سعادت کا حصول دو باتوں پر موقوف ہے ۔ اللہ کے احکام کی عظمت اور مخلوق پر شفقت جس میں یہ دو باتیں نہ ہوں گی شقی ہے پس جو شخص غرور و نخوت کو کام میں لاکر احکام الٰہیہ کو نہ مانے وہ متکبر ہے اور جو مخلوق پر ظلم کرے اور انصاف سے کام نہ لے وہ جبار ہے ۔

حاصل یہ کہ جس جاہل بر خود غلط بد اندیش کا تعلق نہ خدا سے درست ہو نہ انسانوں سے وہ ہدایت فطری سے محروم ہی ہوتا ہے گویا اس کے دل پر اللہ کی طرف سے مہر لگ جاتی ہے ۔

مقصودِ بیان وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا الخ ۔ اس سے ضابطۂ الٰہیہ کو بیان کرنا اور اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انسان خود اپنی تباہی کا سامان فراہم کرتا ہے اور اسی کی بداعمالی اس کو ہلاک کرتی ہے ۔ خدا کو کسی سے بیر نہیں ہے نہ وہ کسی پر ظلم کرتا ہے ۔ آیت وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ سے اللہ کے اقتدار کامل کا اظہار مقصود ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز یہاں تک کہ انسان کی گمراہی اور ہدایت یابی بھی مشیت الٰہیہ کی تابع ہے ۔ مسرف مرتاب میں تازیانۂ عبرت ہے ان جاہل مریدوں کے لئے جو پیروں فقیروں کو خدائی اختیار کا حامل اور مختل اور معصوم جانتے ہیں ان مغرور علماء و مشائخ کے لئے جو اپنے احکام کو اپنے مقلدوں کے لئے دستورِ زندگی قرار دیتے ہیں خواہ وہ احکام شرعیہ کے خلاف ہی ہوں اور ایسے بے دین فلسفیوں کے لئے جو آدمی کے فہم و اختیار کو انسانی زندگی کی درستگی کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور حیات انسانیت کو قوانینِ الٰہیہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں ۔ لفظ متکبر و جبار میں احکام الٰہیہ کے سامنے سر جھکا دینے اور مخلوق سے انصاف برتنے کی مخفی تلقین ہے وغیرہ ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ

اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں پھر (وہاں جاکر) موسیٰ کے

فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کی (اللہ نے) بدکرداریاں (بھی) اس کو مستحسن معلوم

وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ؏

ہوئی تھیں اور (سیدھے) راستہ سے روک دیا اور فرعون کی (ہر) تدبیر غارت کی گئی

رکوع ۱۰ / ۹

تفسیر طاغوتی جاسوس اور شیطانی نمائندے جب فرستادگانِ حق کے سامنے اپنی علمی بے مائگی اور برہانی تہی دامنی کے سبب رسوائی اور ذلت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کی عزت کے تار مکڑی کے جال کی طرح ٹوٹتے نظر آنے لگتے ہیں تو وہ انتہائی مکاری اور کھوٹی عیاری کو کام میں لاکر وقتی شکست کو

ٹلانے کی کوشش کرتے ہیں اور بھولے بھالے حق پسندوں کے دماغوں کو کچھ دیر کے لئے حقانیت کی طرف سے موڑ دینے کی سعی لاحاصل کے فریب میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ بحروج گفتگو میں اُن کے غرور و نخوت سے سرشار دماغ ندائے حق کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور انا ولا غیری کی صدا بلند کرتے ہوئے صداقت و حقائق کے خفیف تصور کو بھی کسی گوشۂ دماغ میں جگہ دینا پسند نہیں کرتے لیکن آخر میں شکست خوردہ ہو کر اپنی ذہنی شکست کو چھپانے کے لئے دعوت حق پر طنز کرنے کی جرأت گوارا کرتے ہیں مگر نامعقولیت اور کج رفتاری کے ساتھ کسی غیر محسوس خدا کو مبہم شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں مکان سے ماوراء خدا کو انتہائی قریب کے ساتھ مکانی ظاہر کرتے ہوئے لوگوں کے دماغوں کو حق پرستوں کے کلام کے اصل مفہوم اور بنیادی حقیقت سے ہٹا کر غلط مطلب اور جھوٹی خود ساختہ خیال آرائی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حقیقت پر فریب کا پردہ نہیں ڈالا جاسکتا مکار کی مکاری خود اس کے لئے تباہی کا سبب بن جاتی ہے اور ہر فریب کی ملمع کاری بہت جلد دور ہو جاتی ہے۔ فرعون بھی ایسے ہی بدمست اور نخوت پرست طبقہ میں سے تھا۔ اول حضرت موسیٰ کی بات کی طرف توجہ کرنی ہی پسند نہیں کی اور جب ہر طرح حجت اور وعید و تہدید کے ذرائع استعمال کر چکا اور کوئی ہتھیار کارگر ثابت نہ ہو سکا تو مجبور ہو کر جناب موسیٰ کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی اور غیر محسوس بلند از عقل خدا کو محسوس مبصر اور مادی قرار دیتے ہوئے ایک اونچا منارہ یا محل بنانے کا حکم دے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں موسیٰ کے خدا کو آسمان یعنی انتہائی بلندی پر ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرے خیال میں موسیٰ کاذب ہے لیکن پھر بھی مجھے اس کی بات پر غور کرنا ہے۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح لوگوں کے دماغوں کو اغوا کر کے کچھ مدت کے لئے حق کی طرف سے موڑ دے اور جب وقتی توجہ لوگوں کی ہٹ جائے اور سر پر آئی ہوئی بلا ٹل جائے تو آئندہ عوام کے دماغوں کو پھر اپنی طرف مائل کرے مگر اس کی گفتگو کا یہ باغ سرسبز نہ ہو سکا جس کی تفصیل آئندہ آیات میں بیان کی گئی ہے۔

تحلیلِ اجزا

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا۔ فرعون نے ہامان کو ایک اونچا محل تعمیر کرانے کا حکم دیا اور علت یہ بیان کی کہ میں آسمان کے راستوں پر پہنچ کر موسیٰ کے اللہ کو جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ سعید بن جبیر اور ابو صالح نے اس جگہ اسباب کا ترجمہ ابواب یعنی دروازے کیا ہے۔ اکثر اہل علم نے اسباب سے مراد طرق اور راستے لئے ہیں۔ محل غور یہ امر ہے کہ کیا فرعون اس قدر نادان اور کورا جاہل تھا کہ عمارت کا زینہ لگا کر آسمان پر چڑھنا چاہتا تھا اور خدا کو جھانک کر دیکھنا ممکن سمجھتا تھا، تاریخی حقیقت اور ہدایت عقل کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔ خطیب نے سراج میں اسی لئے صراحت کی ہے کہ فرعون کی یہ ایک مکاری تھی۔ جاہل قوم کو اپنی رواداری اور طلب حق کے جذبہ کی کارفرمائی دکھا کر مدت دراز تک غافل رکھنا چاہتا تھا تاکہ سالہا سال بلند ترین محل کی تعمیر میں لگ جائیں اور میدان میں عمارت بنتی دیکھ کر بیوقوف عوام فرعون کے جذبۂ انصاف اور حق پژوہی کی مدح سرائی کرتے رہیں اور اپنے جھوٹے خدا کی عاجزی اور ناتوانی کو سمجھنے اور غور کرنے کا موقع ہی ان کو نہ ملے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ فرعون نے ایک چال چلی موسیٰ کے مقابلے سے عاجز ہوا اور اپنے ہی گروہ کے ایک آدمی کی زبان سے مسکت دلائل حق سنیں اور قوم کے سامنے اپنی خدائی کا چراغ بجھتا نظر آیا تو اپنی خدائی کو برقرار رکھنے کے لئے اور احمق لوگوں کو بہکانے کے لئے تین قسم کی چالیں چلا۔ اول اپنے جذبۂ حق جوئی کا مظاہرہ کیا اور گویا یہ ظاہر کیا کہ موسیٰ کا خدا کہیں زمین پر تو نظر نہیں آتا۔ شاید کہیں بہت اونچا سماوی شاہراہوں پر ہو گا اس لئے میں وہاں پہنچ کر اُس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اطمینان رکھو میں خود اُس کی تلاش میں سرگرم ہوں۔ دوسرے درجہ پر حضرت موسیٰ نے جس الٰہ برحق کی الوہیت و ربوبیت کا اعلان کیا تھا، قوم کو اس کی صحیح صفات اور تنزیہی کیفیات کے تصور سے ہٹانے اور لوگوں کے دماغوں کو اس کی مکانیت اور جسمانیت پیدا کرانے کے لئے اس قسم کا طریقہ بیان اختیار کیا گویا کم بخت نے الٰہ برحق کی دعوت کی طرف سے بیوقوفوں کے ذہنوں کو موڑنے کی کوشش کی اور موسوی تعلیم کو مسخ کر کے ہی پیش کیا۔ تیسرے نمبر پر اپنی جھوٹی خدائی کو مدت العمر محفوظ رکھنے کے لئے وہ تدبیر کی جس کا سرانجام ہی جب صدیاں برس لگ جائیں اور کوئی بھی نہ حق کا مطالبہ کر سکے نہ مطالعہ۔

(جزو ثانی انشاء اللہ جلد ہی پیش کیا جاسکے گا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۲۴

جزو ثانی

فَمَنْ اَظْلَمُ

فاضلِ اجل حضرت علّامہ مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

مالک

عطاء الرحمٰن صدیقی وسیم بک ڈپو دیوبند

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی)

ضروری اعلان

دین کی اشاعت کیلئے عظیم الشان پروگرام

اظہار تشکر

ہم خدائے برتر و توانا اور اپنے مخلص معاونین کے صمیم قلب سے ممنون و مشکور ہیں اور ساتھ ہی مسرت کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ تفسیر بیان السبحان بحمد اللہ تکمیل کو پہونچی جو کہ بائیس ۲۲ جزوں پر مشتمل ہے اگر مخلص معاونین حضرات اپنا تعاون جاری نہ فرماتے تو اس پریشان کن دور میں شاید ہمارے ارادے حوصلہ شکن ہوجاتے کاغذ کی گرانی، بحران کی حد تک بڑھ چکی ہے اور اس پر بھی دستیاب نہیں ہوتا لہٰذا مجبوراً قدرے ہدیہ میں اضافہ کرنا پڑا یعنی فی پارہ پانچ روپے ۵/- امید کہ ہمارے معاونین حضرات ہماری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں درگذر فرمائیں گے (چند گذارشات)

① مکمل سیٹ تفسیر بیان السبحان کا مجلد ۲۳۰/- روپے جو کہ ۴۲ جزوں میں پچاس فیصدی کمیشن کاٹ کر ۱۱۵/- روپے ہے علاوہ محصولڈاک

② مکمل سیٹ تفسیر بیان السبحان غیر مجلد ۲۱۰/- روپے جو کہ ۴۲ جزوں میں ہے لیکن یہ قیمت علاوہ محصولڈاک ہے چار جلدوں میں مکمل ہوا ہے ایک جزو کا ہدیہ یعنی فی جزو ۵/- روپے ہے لیکن ممبران و تاجران کو اس پر پچاس فیصدی کمیشن کاٹ کر دیا جائے گا یعنی فی جزو کمیشن کاٹ کر ۲/۵۰ فی پارہ دیا جائے گا لیکن علاوہ محصولڈاک کے یعنی ایک پارہ کی وی پی جو جائے گی وہ چار روپے میں بھیجی جاوے گی مع محصولڈاک کے دو پاروں کی وی پی ۷/- روپے اور تین پاروں کی وی پی ۱۰/- روپے اور چار پاروں کی وی پی ۱۳/- روپے۔ اور پانچ پاروں کی وی پی ۱۵/- روپے میں بھیجی جائے گی یہ غیر مجلد کی قیمت ہے اور مع محصولڈاک ہے اور اب مجلد کی قیمت یعنی ۱۰ پاروں کی وی پی ۳۱/- روپے مع محصولڈاک کے بھیجی جائے گی۔ مجلد پاروں کی وی پی ۱۷/۵۰ کی ہوگی بیس پاروں تک ایک ایک ہی پارہ ہے اور اکیس سے انتیس ۲۱ ۲۹ پاروں تک ہر پارہ کے دو جزو ہیں اور تیس پاروں کے چار جزو ہیں ۲۶ سے ۳۰ تک ۱۲ جزوں کی جلد بنائی جائے گی آخیر تک جلد کا ہدیہ ۳۷/۵۰ ہے۔

ضروری نوٹ: بحمد اللہ فتاویٰ عالمگیری کے ۲۲ جزو طبع ہو چکے ہیں ان کا ہدیہ بھی حسب بالا ہوگا جو رعایت ممبران و تاجران کو مندرجہ بالا دی گئی ہے وہ پیش کی جائے گی فی جزو فتاویٰ عالمگیری کا ۵/- کمیشن کاٹ کر ممبران و تاجران کو پچاس فیصدی کمیشن کاٹ کر ۲/۵۰ علاوہ محصولڈاک کے دی جائے گی وی پی ۴/- مع محصولڈاک کے جاوے گی دو پاروں کی وی پی ۷/- روپے تین پاروں کی ۱۰/- روپے چار جزوں کی ۱۳/- روپے اور چار جزوں کی ۱۵/- روپے غیر مجلد کی قیمت۔ اور مجلد دس پاروں کی قیمت ۳۱/- روپے مع محصولڈاک کے بھیجی جائے گی۔

منجانب: وسیم بکڈپو۔ دیوبند (یوپی)

دینِ حق کی تبلیغ واشاعت کیلئے عظیم الشان پروگرام

اللہ جل شانہ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ ہمارے ادارہ نے تفسیر بیان السبحان کی قسط وار اشاعت سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جس عظیم تبلیغی خدمت کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ تفسیر بیان السبحان اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے ایک بے مثال تفسیر ہے۔ عام مسلمانوں اور علمی حلقوں میں کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکی ہے اب تک اس کے ۳۰ پارے قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ ان شاء اللہ مستقبل قریب ہی میں پروگرام کے مطابق مکمل ہو جائے گی۔ تفسیر بیان السبحان کی قسط وار اشاعت میں ممبر حضرات اور عام خریداران نے اپنے دینی ذوق و شوق کے زیر اثر اس تفسیر کی پذیرائی میں جو حصہ لیا وہ ہمارے لئے یقیناً حوصلہ افزا ہے اور اس ہمت افزائی اور دوستانہ تعاون کے لئے ہم ان کے بصمیم قلب شکر گزار ہیں،

تفسیر بیان السبحان کی اشاعت کے دوران ہمیں بہت سے محبین ومخلصین نے تحریر کیا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح و فلاح کے لئے اسلامی قوانین کی ایک جامع اور مستند انسائیکلو پیڈیا بھی شائع کی جائے تو بہت بہتر ہے تاکہ عام مسلمان اسلامی زندگی کے تمام مسائل سے واقف ہو جائیں اور ان کے مطابق عمل کر کے خود کو شرافت وانسانیت کا نمونہ بنا سکیں۔ ضرورت اور افادیت کے پیش نظر یہ مشورہ ادارہ کے لئے یقیناً قابل قبول ہے اور تبلیغ واشاعتِ دین کا یہی جذبہ جو تفسیر بیان السبحان کی اشاعت کا محرک ہوا اس کارِ خیر کے لئے بھی محرک بن گیا چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے فقہ اسلامی کی بہترین اور مستند کتاب فتاویٰ عالمگیری کے اصل عربی متن کو سلیس عام فہم اردو ترجمہ اور شرح کے ساتھ اجزاء کی صورت میں قسط وار شائع کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری

بلاشبہ عہدِ عالمگیری کا ایک عدیم المثال کارنامہ ہے جسے اس زمانہ کے سینکڑوں علمائے امت اور مفتیانِ دین نے پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک عرصہ کی شدید کاوش و محنت کے بعد مرتب کیا تھا۔ درحقیقت یہ کتاب اسلامی دینی احکام ومسائل کی ایک عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا ہے اور آج تک مسائلِ دینیہ میں مسلمانوں کے لئے دلیل و حجت اور مشعلِ ہدایت ہے۔ فقہ حنفی اس کتاب پر بجا طور پر فخر و ناز کرتی ہے۔

ضروری گزارش اور اپیل

تمام برادرانِ اسلام سے بالعموم اور اپنے مخلصین ومحبین سے بالخصوص ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ اس اہم ترین دینی اور تبلیغی کام میں اپنے گرانقدر تعاون سے ہماری ہمت افزائی فرمائیں تاکہ یہ عظیم الشان کام بہ احسن وجوہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔

فتاویٰ عالمگیری مروجہ طریقِ کار کے مطابق بصورتِ اجزاء قسط وار شائع کی جائے گی۔ ہر جزو ادسطاً سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ کاغذ سفید رنگین دیدہ زیب ٹائیٹل، سائز بیان السبحان کی طرح $\frac{20 \times 30}{8}$ کتابت وطباعت اعلیٰ اور معیاری ہوگی۔ ان خصوصیات اور خوبیوں کے باوجود ہر جزو کتاب کی قیمت صرف ۵/ روپے رکھی گئی ہے تاکہ ہر مسلمان اس نادر کتاب کو بآسانی خرید سکے۔ محصول ڈاک قیمت کتاب کے علاوہ ہوگا۔ جو حضرات تفسیر بیان السبحان اور فتاویٰ عالمگیری کو ایک ساتھ منگانا چاہیں ان کو وی پی -/۷ روپے میں روانہ کیا جائے گا۔ محصول ڈاک اس میں شامل ہے۔

رعایتی تبلیغی اعلان

جو حضرات فتاویٰ عالمگیری کے مستقل خریدار بن کر اپنا نام ایک روپیہ فیس ممبری داخل کر کے بحیثیت ممبر درج رجسٹر کرائیں گے ان کے ساتھ خاص رعایت کی جائے گی۔ یہ رعایت اس طرح ہوگی کہ ممبران کو کتاب کا ہر جزو مع محصول ڈاک صرف ۵ روپے میں بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا اس صورت میں خریداروں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ہر جزو کا محصول ڈاک جو تقریباً سوا روپیہ ہوتا ہے ادا نہ کریں گے بلکہ یہ محصول ادارہ خود ادا کرے گا۔ ہر ممبر کو فیس ممبری صرف ایک مرتبہ ادا کرنی ہوگی۔ ہم اپنے تمام محبین سے مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک روپیہ فیس ممبری روانہ کر کے اپنا نام رجسٹر ممبران میں درج کرائیں اور اس رعایتی اعلان سے مزید فائدہ اٹھائیں۔ کوپن منی آرڈر میں "نقد فیس ممبری فتاویٰ عالمگیری" ضرور تحریر فرمائیں۔

وسیم بکڈپو دیوبند ضلع سہارنپور - یو - پی

چوبیسواں ۲۴ پارہ (جزو ثانی)

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ۔ انسان شروع میں بُرے کام کرتاہے، لیکن برائی کو برائی سمجھتا ہے اور اس پر پشیمان ہوتا ہے۔ آگے بڑھ کر جب گناہ کی جرأت بڑھ جاتی ہے تو برائی کو برائی نہیں سمجھتا، لیکن اچھا بھی نہیں کہتا۔ نیکی کی طرف سے بے پرواہ ہوجاتا ہے، اسلئے گناہ پر پشیمان بھی نہیں ہوتا اور توبہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جب اس سے آگے بڑھتا ہے تو برائی کو اچھائی، شر کو خیر اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ پہلے درجہ میں اگر توبہ کرلی تو راہِ راست پر آجاتا ہے اور دوسرا نمبر بھی کسی قدر امید کا ہوسکتا ہے کہ خصوصی تنبیہ اس کے لئے مفید ثابت ہوجائے اور اہل دلائل و براہین یا وعید و تہدید اُس کو گناہوں سے روک دے، لیکن تیسرے مرتبے پر پہنچنے کے بعد حق کی طرف لوٹنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی۔ ایسے آدمی کے سامنے ہر بدی نیکی کے لباس میں نمودار ہوتی ہے اور کج راہ ہونے کے باوجود وہ اپنے کو راہِ راست پر سمجھتا اور انتہائی ڈھٹائی سے وہ اہل حق کا مقابلہ کرتا ہے۔ گناہ کے ان تمام مراتب میں تدریجی ترقی آدمی کی خود آوردہ ہوتی ہے، لیکن چونکہ اصل مؤثر اور خالق خدا ہے اور خدا کسی کو نیکی یا بدی پر مجبور نہیں کرتا نہ زبردستی کسی سے گناہ کراتا ہے نہ گناہ سے روکتا ہے صحت تکلیف باقی رکھنے کے لئے ہر آدمی کو فطرتاً مختار بنایا گیا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی خود آوردہ بداعمالی کے سبب اللہ اس کی بداعمالی کو بصورت حسن عمل اس کے سامنے جلوہ گر کرتا ہے اور نتیجہ میں یہ عملی کجراہی فطری کجراہی کا سبب بنتی ہے اور فکری کج راہی سے آئندہ راستی عمل کی اُمید بھی باقی نہیں رہتی اور آدمی ہر سید ھے راستے سے رُک جاتا ہے اور استقامت کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے آدمی کو ایسی طاقت عطا کی ہے کہ وہ ہر نیکی بدی کرسکتا ہے جس راستے کو چاہے اپنے لئے اختیار کرلے، اللہ کی طرف سے جبر نہیں۔ جب آدمی خود ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور گناہ کرنے لگتا ہے تب بھی خدا اس کی قوتِ اختیار کو سلب نہیں کرتا اور آدمی گناہ کرتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ گناہ کے انتہائی درجہ پر پہنچتا ہے اور سوءِ عمل کو حسنِ عمل سمجھنے لگتا ہے۔ تخلیقی طور پر چونکہ ہر خیر و شر کی طاقت خداداد ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کی بداعمالی موجب کج راہی ہے۔ فرعون کی بھی یہی حالت تھی۔ گناہ کا آغاز بصورتِ گناہ تھا۔ اس کے بعد انہماک فی المعاصی ہوا اور اس کے سوءِ عمل کی تزئین اور بدی کو نیکی سمجھنے کا درجہ آیا اور اس طرح فرعون کے لئے حق کے تمام راستے بند کردیئے گئے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ۔ باطل پرست آدمی نفع عاجل کو لازوال فائدہ اور مکاری کو دانشمندی تصور کرتا ہے۔ حالانکہ مآل کار کے لحاظ سے اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے اور مکر کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ فرعون نے بھی کوشش کی کہ اپنی چند روزہ حکومت کو باقی رکھنے کے لئے قوم کے دماغوں سے کھیلتا رہے اور اغوا و اضلال کے ہر گندے ہتھیار کو استعمال کرنے سے دریغ نہ کرے، لیکن نتیجہ میں اس کی ہر چال خود تباہی کو دعوت دیتی اور بربادی کو قریب لاتی رہی اور کچھ ہی مدت بعد خود بھی ڈوبا اور سب قوم کو بھی ڈبویا۔

مقصودِ بیان وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ الخ سے مستنبط ہو رہا ہے کہ فریبی دنیا پرست بھولے بھالے عوام کے دماغوں سے کھیلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا اور حق جوئی کا لبادہ پہن کر باطل پرستی کا خوب خوب مظاہرہ کرتا ہے۔ خصوصاً فرعون کا خطاب ہامان سے تنبیہ کر رہا ہے اس بات پر کہ مکاروں اور عقلی چوروں کا گروہ بیوقوف عوام کو لوٹنے کے لئے کیسے کیسے گٹھ جوڑ کرتا ہے۔ اس سے سمجھ حاصل کرنی چاہیئے سادہ لوح آدمیوں کو کہ ان کے لیڈر اور سردار متفق الرائے اور ہم زبان ہو کر کیسی کیسی مکاریاں کرتے ہیں اور حق پرستی کے اظہار میں اُن کی کس قدر طاغوتی اغراض پنہاں ہوتی ہیں۔ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا سے کتنی فریب آگیں معصومیت ٹپک رہی ہے۔ گویا فریبی دماغ کا آدمی اپنے کو کتنا معصوم طلبگار حق ظاہر کرتا ہے۔ اور انتہائی ڈھٹائی سے حق کا مقابلہ کرتا ہے مگر بڑے معصومانہ انداز میں۔ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ الخ سے استنباط کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کی بداعمالی تمادی فی المعصیۃ اور ترقی گناہ کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن موجب مؤثر اور فاعل حقیقی خدا ہے، مگر خدا کو کسی سے کوئی ذاتی عداوت نہیں بلکہ انسان کی بداعمالی خدائی ڈھیل کا سبب بنتی ہے۔ حقیقت میں یہ آیت جبر و قدر کی حدود متعین کر رہی ہے۔

وما کیدُ فرعون سے یہ بتانا مقصود ہے کہ فرعون کی مکاری اس کو بچانے کی بلکہ مزید ہلاکت کا سبب بن گئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نجات و ہلاکت خدائی قانون کے ہاتھ میں ہے۔ مہلک کو بھی سمجھ لینے سے نجات کا میسر آ جانا ناممکن ہے۔ خواہ ظاہر میں کیسی ہی جبروتی طاقت ساتھ ہو اور کیسے ہی مکر آفرین دماغ کا نمو ظہور کر لیں، مگر ہے بے سُود۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ

اور اُس مومن نے کہا کہ اے بھائیو تم میری راہ پر چلو میں تم کو ٹھیک رستہ بتلاتا ہوں اے بھائیو یہ دنیوی زندگانی محض

الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا

چند روزہ ہے اور (اصل) ٹھہرنے کا مقام تو آخرت ہے (جہاں جزا کا یہ قانون ہے کہ) جو شخص گناہ کرتا ہے اس کو تو برابر سرابر ہی بدلہ ملتا

مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ

ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جاویں گے

الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

(اور) وہاں بے حساب اُن کو رزق ملے گا

تفسیر ساری شیطانی خود غرضی دولت پرستی جاہ پسندی آرام طلبی اور عیش کوشی کا محوری نقطہ اور مرکز صرف یہ خیال ہے کہ زندگی کا حاصل فقط یہی دنیا ہے۔ اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ روزِ آخرت کا تصور سچ ہے۔ جزا سزا کا اُخروی عقیدہ خرافات ہے نہ کوئی اچھائی ہے نہ برائی ہے۔ اگر ہے تو وہی جس کا نتیجہ اسی دنیا میں اچھا یا برا مل جائے، اس لئے خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہر عمل اپنے ساتھ دنیوی نتیجہ رکھتا ہے جس کو سمجھنے کے لئے انسانی بصیرت کافی ہے اور نتائج دنیوی ہی حقیقی نتائج ہیں قانونِ الٰہی کی کیا ضرورت ہے۔ شرائع اور انبیا میں بے سُود ہیں، انسان کا خدا سے کچھ تعلق نہیں، لیکن یہ اور اس قسم کی دوسری بیہودہ خیالیاں تارِ عنکبوت کے برابر اپنے اندر استحکام نہیں رکھتیں یہ ایک پُر فریب جال ہے، مگر لودی ریت کی دیوار ہے۔ بے بنیاد کھوڑے پر چمنے والی سبزی ہے عفونت دلدل۔ جانتے والے مانتے ہیں اور ماننے والے جانتے ہیں کہ یہ دنیا دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ سرائے فانی ہے اس کی ہر چیز آنی جانی ہے یہ فرودگاہ ہے قرارگاہ نہیں دار البوار ہے دار القرار نہیں۔ آخرت حقیقت میں اصل منزل ہے ساحلِ مراد ہے مآلِ زندگی ہے یہاں کا ہر اچھا برا عمل آخرت کی جزا سزا سے خالی نہیں۔ برائی کی سزا ضرور ملے گی برائی کے مطابق ملے گی۔ اور نیکو کاری بشرطیکہ ایمان صحیح پر مبنی ہو اور درست بنیاد پر صحیح عمارت بنائی گئی ہو تو کرنے والا کوئی ہو مرد یا عورت ہر ایک کو دوامی راحت ملے گی۔ ایسی کہ اُس کا گمان اس دنیا میں ہو بھی نہیں سکتا۔

تحلیلِ اجزاء وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔ فرعون نے کہا تھا مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔ جھوٹا آدمی اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لئے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکیدی الفاظ بھی بولتا ہے، قسمیں بھی کھاتا ہے تاکہ اس کی بات کسی طرح قابلِ قبول ہو جائے۔ فرعون نے بھی ایسا ہی کیا تھا کلام کو نفی و اثبات کی شکل میں پیش کیا، لیکن سچے آدمی کو اپنی بات کی صداقت کا یقین ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر اپنے کلام کی مقبولیت کا یقین رکھتا ہے اور عموماً (بعض مخصوص صورتوں کو چھوڑ تے ہوئے) بات سادہ طور پر کہہ دیتا ہے۔ مردِ مومن نے بھی فرعون کی بات کے مقابلے میں وہی بات کہی جو فرعون نے کہی تھی، مگر نہایت سادہ طریقہ سے ایسے الفاظ

میں جن سے پیار اور محبت کا ترشح ہو رہا ہے۔ کہنے لگا اے میری قوم میری راہ پر چلو میں تم کو سیدھا لے چلوں گا۔ مقصد یہ کہ میں تم میں کا ہی ایک فرد ہوں۔ تم میرے بھائی بند ہو میں تمہارا بدخواہ نہیں ہو سکتا سوا ہم قوم ہونے کے مجھے کوئی (حصول حکومت و اقتدار وغیرہ) ذاتی لالچ بھی نہیں۔

یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ۔ دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے۔ آخرت کا انکار یا اس سے بے نیازی ہر خطا کی جڑ ہے۔ جب دنیا کی صحیح تصویر سامنے آجائے اور آخرت پیش نظر ہو تو پھر دنیا کی کوئی حکومت دولت سیادت وجاہت اور شہرت اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی اور نہ گناہ پر جرأت ہو سکتی ہے۔ مرد مومن نے حق و باطل کا فیصلہ اسی ضابطہ کے تحت کیا۔ اوّل دنیا کو متاع حقیر قرار دیا اور پھر آخرت کو اصل قرارگاہ بتایا پھر اس زندگی اور آخرت کی زندگی کا باہم ربط ظاہر کرنے کے لئے کہا۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یعنی یہ زندگی متاع حقیر اور زوال پذیر ضرور ہے، مگر رائیگاں اور لاحاصل نہیں۔ آخرت کے تمام نتائج و ثمرات اسی سے وابستہ ہیں۔ دنیا میں تین طرح کے خیالات رکھنے والے آدمی ہیں۔

(۱) وہ لوگ ہیں جو یہاں کے عیش و راحت کو اصل مقصد جانتے ہیں اُن کا حاصل حیات صرف یہی حیات ہے۔ آخرت پر نہ اُن کا عقیدہ ہے نہ تصور۔ (۲) وہ لوگ ہیں جو آخرت کا تصور رکھتے ہیں، مگر مسخ شدہ شکل میں۔ ہیر پھیر کے مرکز توجہ اسی زندگی کے عیش و طرب کو قرار دیتے ہیں۔ ہر اچھائی برائی کے نتیجہ کا ظہور ان کے نزدیک اسی زندگی میں ہو جاتا ہے جو یہاں سکھ کی حالت میں ہے بڑا عالم ہے اونچا لیڈر ہے عیش کوش دولتمند ہے۔ پھر گر اقتدار رکھنے والا راجہ ہے دلکش حسین ہے دیدہ زیب رعنائی کا حامل ہے۔ بہر حال جو یہاں خوش عیش ہے وہی صالح کامیاب ہے۔ اور جس کی موجودہ زندگی تلخ ہے مصائب و آلام کا شکار ہے نادار ہے بیمار ہے بدرو اور ذلیل ہے واقعی گنہگار ہے جو اسی دنیا کو اپنی گزشتہ زندگی کی بداعمالیوں کی سزا اسی دنیا کی موجودہ زندگی میں بھگت رہا ہے۔

(۳) تیسرا گروہ قائل ہے کہ یہ زندگی متاع حقیر ہے فانی ہے زوال پذیر ہے۔ یہاں کی حکومت امارت وجاہت قیادت طاقت سب ہیچ ہے۔ چند روزہ ہے پل ہے گذرگاہ ہے سرائے ہے فرودگاہ ہے اصل عیش آخرت کا عیش ہے جو لازوال ہے حقیقی زندگی وہی ظلی زندگی ہے جو غیر فانی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ زندگی بے کار نہیں نا قابل توجہ نہیں۔ اگرچہ مقصود اصلی نہیں، لیکن یہاں کا کوئی قول و عمل حرکت و سکون اور خواب و بیداری لاطائل بے حاصل اور رائیگاں نہیں۔ یہ کھیتی ہے جس کا حاصل آخرت میں ملے گا۔ اچھا بیج اچھا حاصل، بُرا بیج بُرا حاصل۔ یہاں کا ہر حرکت و سکون تجارتی ہے جس کا نفع نقصان دوسری لازوال زندگی میں ملے گا۔ یہ نظریہ بہت ٹھوس پُر مغز نظریہ ہے جو بتاتا ہے کہ یہ دنیا بے کار بھی ہے اور با کار بھی۔ فانی بھی ہے اور باقی بھی۔ یہ خود اپنی نیرنگیوں سمیت زوال پذیر ہے، لیکن اس کا نتیجہ لازوال ہے پھر اس فکر کے حامل بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بدی کا نتیجہ بدی بھلائی کا نتیجہ بھلائی۔ گناہ زہر ہے مہلک ہے اور نیکی تریاق ہے موجب حیات اس لئے بدی کو معاف کرنا اور نیکی کی جزا اصل استحقاق سے زیادہ دینا ممکن نہیں۔ اس گروہ نے خدائی اختیار و اقتدار رحمت و عفو کو اپنی فکر سے خارج کر دیا اور رحمت و ظلم میں کوئی فرق نہیں کیا، لیکن دوسرا گروہ قائل ہے کہ برائی کی سزا اصل قصور سے زائد نہیں ہوگی، لیکن معافی ہو سکتی ہے۔ خدا مہربان اور غالب ہے اسی طرح نیکی کی جزا اصل سے کئی گنا زائد ملے گی۔ اللہ رحیم ہے۔ حقیقت میں اہل حق کا یہی مسلک ہے۔ حقیقت شناس اہل ایمان کا یہی عقیدہ ہے۔ قوم فرعون کے مرد مومن نے بھی اسی نظریہ کو اپنی قوم کے سامنے رکھا۔ اور دنیا کا آخرت سے ربط ظاہر کرتے ہوئے بدی کی سزا کو اصل سے زائد نہیں قرار دیا۔ ہاں نیکی کی جزا کو غیر محدود کہا۔ کیونکہ اللہ عزیز غفار ہے بے حساب جزا دیتا اور گناہ معاف کر دینے کی اس میں طاقت اور اختیار ہے۔

اس جگہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی صحیح عمل بغیر صحیح علم کے مفید نہیں۔ کچھ لوگ اس زندگی کو محض عملی مشین جانتے ہیں۔ اُن کی نظر میں مشینری کی تھیوری صحیح ہو یا نہ ہو فنکشنگ درست ہو یا نہ ہو مشین کی اتفاقی درست حرکت ہی اچھا نتیجہ پیدا کرنے کی موجب ہے اس لئے ہر غلط عقیدہ والا بھی حسن عمل کے کامل ترین اعلیٰ نتیجہ سے بے بہرہ نہیں ہو سکتا۔ گویا اس مفکر کی نظر میں یہ دنیا محض دارالعمل ہے۔ معرفت کدہ اور درس گاہ علم نہیں۔ یہاں مقصود صرف کردار ہے تصورات اور تصدیقات کی خالص فکری ترقیاں محض ناکارہ ہیں۔ روحانیت اور وجدانیات ہیچ ہیں بلکہ کردار کی جزا سزا کے لئے کسی صحیح

مادی فکر کی بھی ضرورت نہیں، لیکن حقیقت میں یہ قول بداہتہً غلط ہے۔ بنیاد درست نہ ہو تو عمارت کس طرح سیدھی ہوگی۔ اصل اصلاح فکر کی اصلاح ہے۔ جو کہیں خالص نظری حیثیت رکھتی ہے اور کہیں اس کی غرض عمل کی درستی ہوتی ہے اس لئے اہل حق کہتے ہیں کہ بغیر ایمان کے عمل صالح بیکار ہے بلکہ کسی صلاح عمل کو صلاح کہہ بھی نہیں سکتے۔ جب تک مبدء و معاد روحانی اور جسمانی پیامبر اور جزا سزا وغیرہ ہر چیز جزو ایمانی نہ بن جائے اور اللہ کو آہی سازِ حیات نہ سمجھ لیا جائے اور اس کی تمام صفات الوہیت و ربوبیت کو تسلیم نہ کر لیا جائے اسی لئے مرد مومن نے سے مقید کیا ہے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بعض مذاہب میں عورتوں اور مردوں کی نیکی اور بدی کی جزا سزا میں بھی فرق مراتب ہے۔ عورتوں کا چھوٹا گناہ بھی بڑی سزا کا موجب ہے اور بڑی نیکی بھی قلیل اجر رکھتی ہے۔ گویا صنفی تفاوت اعمال کی جزا سزا پر بھی اثر انداز ہے، مگر اہل حق اس کو انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ نیکی اور بدی مرد کی ہو یا عورت کی دونوں برابر ہیں۔ سزا جزا میں صنفی اختلاف کا اعتبار نہیں۔ اسی لئے مرد مومن نے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا کے بعد مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى کی تعمیم کر دی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے زمانے میں تمام مصری ضوابط شہریت میں مرد اور عورت کے اعمال کی جزا سزا میں تفاوت ہوگا جس کے خلاف مرد مومن نے پرمغز تلمیح کی اور شریعت موسوی میں مساوات صنفی من حیث العمل کی صراحت کر دی۔ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ بعض احادیث میں ہر نیکی کی جزا گو دہ ملنے کی صراحت آئی ہے بلکہ آیت سنبلہ میں تو سات سو اور اس سے بھی چند در چند سزا دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے گویا نیکی کی جزا غیر محدود ہے۔ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے جتنا چاہے عنایت فرمائے۔ صحاح کی حدیث میں آیا ہے کہ جس نے نیک کام کی (صرف) نیت کی تو اللہ اپنے ملائکہ کو حکم دیتا ہے کہ اس کی ایک نیکی لکھو اس کے بعد اگر وہ نیکی کر بھی لے تو دس نیکیاں لکھو اور کسی نے گناہ کی نیت کی تو حکم دیا جاتا ہے کہ ابھی گناہ مت لکھو۔ پھر اگر وہ بُرا عمل کر لیتا ہے تو حکم ہوتا ہے ایک بدی لکھو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کی جزا (کم سے کم) گیارہ نیکیوں کی برابر ملے گی اور بدی کا عوض صرف بدی کے برابر ہوگا۔

مقصود بیان

مرد مومن نے اپنے وعظ میں تین باتوں کا لحاظ رکھا۔ ۱۔ مشاہدات عقلی اور براہین کی روشنی میں قانون جزا اور سزا کی تصویر کشی کی مساوات صنفی کا ذیلی طور پر اظہار کیا عمل صحیح کی ضرورت کی صراحت کی دنیا کو متاع حقیر گر پُر منافع بتایا دنیا اور آخرت کا ربط دکھایا پھر ۲۔ سرکشوں کو خوف دلایا اور ۳۔ فرماں برداروں کو اجر جزیل ملنے کی تصریح کی۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ہر وعظ کے لئے ان ہی تینوں ارکان کا ہونا ضروری ہے۔ پھر یا قوم کا لفظ بتا رہا ہے کہ واعظ کا لہجہ ترحمانہ ہو اور مفاد ذاتی سے بلند۔

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى سے جزا میں صنفی برابری کا اظہار مقصود ہے۔

وَهُوَ مُؤْمِنٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عمل صالح بغیر ایمان کے مقبول نہیں ہو سکتا ہے کہ ایسے اعمال کی جزا دنیا میں دے دی جائے یا آخرت میں کسی قدر عذاب میں کمی ہو جائے لیکن نجات نہیں ہو سکتی۔ مُؤْمِنٌ کے لفظ کا اطلاق بتا رہا ہے کہ جن امور کو شرعاً ماننا ضروری ہے ان سب پر ایمان رکھنا لازم ہے۔ یعنی اللہ ملائکہ، انبیاء، کتب الٰہیہ، قیامت اور خیر و شر وغیرہ۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَى النَّارِ ؕ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ

اور اے میرے بھائیو یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم کو (طریق) نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھ کو دوزخ کی طرف بلاتے ہو (یعنی) تم مجھ کو اس بات کی طرف بلاتے ہو کہ میں خدا تعالیٰ

وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؗ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّمَا

کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا ساجھی بناؤں جس کے ساجھی ہونے کی میرے پاس کوئی بھی دلیل نہیں اور میں تم کو خدائے زبردست خطا بخش کی طرف بلاتا ہوں یقینی بات ہے کہ

تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ

تم جس چیز (کی عبادت) کی طرف مجھ کو بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا ہی میں پکارے جانے کے لائق ہے اور نہ آخرت ہی میں اور یقینی بات ہے کہ ہم سب کو خدا کے پاس جانا ہے اور جو لوگ

هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

دائرۂ (عبودیت) سے نکل رہے ہیں وہ سب دوزخی ہونگے سو آگے چل کر تم میری بات کو یاد کروگے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں خدا تعالیٰ سب بندوں کا نگراں (ع)

بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ

ہے پھر خدا تعالیٰ نے اُسی (مومن) کو ان لوگوں کی مضر تدبیروں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں پر (مع فرعون کے) موذی عذاب نازل ہوا جس کا

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ

آگے بیان ہے کہ وہ لوگ برزخ میں) صبح اور شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت آگ میں داخل کرو

تفسیر

اس حق و باطل کی دنیا میں دو قسم کے خیالات اور افکار رکھنے والے آدمی ہیں۔ خدا پرست اور خدائی پرست یا یوں کہو کہ اللہ کے پرستار اور مخلوق کے پرستار، لیکن کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ کون دانشمند اور صداقت اندیش ہے اور کون سبک عقل اور جہالت کوش۔ اس کا فیصلہ تو یوں بہت دشوار ہے۔ ہر نظریہ کا حامل اپنے فہم کو رسا اپنی فکر کو صحیح اور اپنے عمل کو درست سمجھتا ہے، لیکن تمام مدعیان حق کا اتفاق اگر ہو سکتا ہے اور سب کو اگر تسلیم ہو سکتا ہے تو یہ مسلمہ ضابطہ کہ قابلِ پرستش اسی معبود کی ذات ہو سکتی ہے جو ہمہ گیر طاقت تسخیر کن غلبہ اور بے روک ٹوک مہربانی کا مالک ہو۔ اگر اس کی نافرمانی کی جائے تو اس کی طاقت، عزت، غلبہ اور گرفت سے بچ کر نکل جانا ناممکن ہے۔ وہ اس قدر طاقتور ہو کہ ہر باغی طاغی کو سزا دے سکے اور ایسا مہربان ہو سکے کہ اگر چاہے تو ہر سزا کو معاف بھی کر دے۔ اب محل غور یہ امر ہے کہ سوا ایک ذاتِ الوہیت کے کسی دوسری ہستی میں ان اوصاف کا تحقق بھی ہے یا نہیں۔ جہاں تک تجربہ کی رسائی اور عقل کی پہنائی کا دخل ہے ایک ہستی کے علاوہ کوئی دوسری ہستی ہمارے دائرۂ معلومات میں ایسی نہیں کہ ہم اس کو عزیز غفار یا ہمہ گیر طاقت در غالب کامل اور مہربان با اقتدار خود اختیار رکھ سکیں اور ضرورت کے وقت ہم اس کو پکاریں تو وہ ہماری کارسازی کر سکے جس کی سزا جزا کا قانون اس دنیا میں بھی جاری ہو اور آئندہ زندگی میں بھی۔ جس کے نتیجۂ اقتدار میں رہ کر یہاں بھی ہم مہربانی کے صحیح اُمیدوار ہوں اور آخرت میں بھی ہمارا واسطہ اُسی سے پڑے اور اسی کے پاس ہماری زندگی کی بازگشت ہو۔ جب اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں تو صفاتِ الوہیت میں دوسرے کو اس کا ساجھی قرار دینا اور آئینِ سازِ حیات مالک نفع و ضرر اور قادر خیر و شر ماننا حدودِ صداقت و حقانیت سے آگے قدم بڑھانا ہے۔ جس کا نتیجہ انسان اور انسانیت کی نجات نہیں ہلاکت ہے، لیکن اس زندگی میں موجودہ حالات میں کون غور کرتا ہے۔ جب احوال میں انقلاب آئے گا اور کیفیاتِ حیات کا ورق اُلٹے گا اُس وقت حقیقت معلوم ہوگی۔

تحلیلِ اجزاء

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَى النَّارِ۔ مردِ مومن نے قوم فرعون کو خود پردے کی آڑ میں رہ کر نصیحت کی تھی اور طرزِ کلام ایسا اختیار کیا تھا کہ قوم والوں کو اس کا مومن ہو جانا اور فدائیانِ موسیٰ میں شامل ہونا محسوس نہ ہو سکے تاکہ ان کو یک دم نفرت نہ پیدا نہ ہو جائے اور نصیحت مؤثر ثابت ہو، لیکن جب یہاں تک نوبت پہنچی کہ فرعون اور فرعونی حضرت موسیٰ کی جان لینے کے در پے ہو گئے۔ تو اس وقت مردِ مومن نے واضح غیر مبہم طرزِ خطاب اختیار کیا کہ میں تم کو بچانا چاہتا ہوں تم مجھے جلانا چاہتے ہو۔ تم مجھے اللہ کی الوہیت و ربوبیت میں ایسی چیزوں کو شریک بنانے کی دعوت دیتے ہو جن کی میری نظر میں کوئی حقیقت نہیں یعنی کسی کو میں نے اللہ کا ساجھی نہ دیکھا نہ دیکھنے والے نے بیان کیا نہ کسی عقلی

مشاہدہ نے اس کی شہادت دی اس صورت میں عقیدۂ شرک تو محض جہالت پر مبنی ہوا علم سے اس کا کچھ تعلق نہیں اور میں تم کو اس اللہ کی الوہیت و وحدانیت کی طرف بلا رہا ہوں جو عزیز بھی ہے اور غفار بھی یعنی اس کی عزت کبریائی ہمہ گیر طاقت محیط کل حکمت ادعائی بانت وحمت بڑی ہے پھر جو توبہ کرنے والے کئے قصور بھی معاف کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ ایسے اللہ کی الوہیت کو ماننا بہرحال موجب کامرانی ہے۔ مقصد یہ کہ فرعون اور فرعون کے مقرر کردہ سارے معبود بے بس ہیں، عاجز ہیں، ان میں طاقت نہیں، علم نہیں، رحمت نہیں، کارسازی کی قوت نہیں، کسی کے گناہ معاف کر دینے اور سزا سے بچا لینے کا یارا نہیں اور اللہ بہرحال اللہ ہے، عزیز ہے، غفار ہے، اس لئے تمہاری دعوت کو ماننے کا نتیجہ سوا تباہی ہلاکت اور آگ کے کچھ نہیں اور میری دعوت کو ماننے کا ثمرہ کامرانی اور کامیابی ہے۔

مرد مومن نے یہ بھی کہا کہ جن کی طرف آنے کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو وہ کسی طرح پکارے جانے کے قابل نہیں یعنی ان میں نفع پہنچانے اور ضرر سے بچانے کی طاقت نہیں ہے اور نہ وہ تمہاری پکار سنتے ہیں۔ اس مضمون کو اللہ نے دوسری آیت میں اس طرح بیان کیا ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۔

تکمیل برہان کے لئے مرد مومن نے یہ بھی کہا کہ ہم سب کو لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے یعنی دنیا میں اللہ کے سوا کسی کو دکھ سے بچانے کی طاقت نہیں اور آخرت میں تو بہرحال اسی سے واسطہ پڑے گا۔ یہ ظاہری فریب نظر بھی وہاں نہ رہے گا۔ سب جو لوگ حدود عقل و فطرت اور دائرۂ علم و نظر سے آگے بڑھ کر قدم رکھیں اور جہالت کے میدان میں اندھا دھند دوڑیں اور معبود و الٰہ بھی دو تین کو قرار دیں یا اللہ کے علاوہ کسی کو آئین حاجات سمجھیں یا کسی صفت الوہیت کو مخلوق میں موجود خیال کریں یا خالق کو گرا کر مخلوق کے برابر اور مخلوق کو بڑھا کر خالق کے برابر جا کھڑا کر دیں تو ایسے مسرفوں اور حد انصاف سے تجاوز کرنے والوں کی سزا دوزخ ہے بلکہ وہی دوزخی ہیں۔

یہاں تک مرد مومن کا خطاب خالص برہانی تھا، لیکن باطلوں کا قاعدہ ہے کہ دلائل سے عاجز آ کر جب لاجواب ہوتے ہیں تو تخویف و تہدید پر اتر آتے ہیں۔ مرد مومن کی اس برہانی صاف گوئی سے عاجز آ کر جاہلوں نے اس حق پرست کو ڈرایا دھمکایا اور اس کو ہلاک کرنے کے لئے مکاری کے جال بچھائے، مگر اس مجاہد کے پائے استقلال میں لرزہ نہ آیا، قدم میں لغزش نہ پیدا ہوئی بلکہ گرج کر بولا کہ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ بندوں کا نگران ہے اس کے مشاہدہ اور معائنہ سے بندہ پوشیدہ نہیں۔ یعنی مجھے تمہاری دھمکیوں کی پروا نہیں۔ تم اپنی طاقت سطوت حکومت فوج اور جتھوں کی کثرت سے ڈراتے ہو ان کی میری نظر میں کوئی حقیقت نہیں۔ کارساز اللہ ہے اس کو اپنے بندوں کا ایسا ہی علم ہے جیسا آنکھوں سے دیکھنے والے کو ہوتا ہے پھر مجھے کیا پرواہ وہ جو کچھ چاہے گا کرے گا۔ چنانچہ اللہ نے کافروں کی تمام مکاریوں سے اس مشاہد الایمان کو بچا لیا اور فرعون والوں کو بدترین سزا دی اور نقطہ یہ کہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر سب کے سب پانی میں ڈوب مرے بلکہ مرنے کے بعد بھی صبح و شام آگ کے روبرو ان کی پیشی ہوتی رہتی ہے اور قیامت کے دن تو سخت ترین عذاب میں داخل کرنے کا ان کے متعلق حکم ہو گا ہی۔

ایک ضروری توضیح آیت سے صراحتہً ثابت ہے کہ قیامت تک آل فرعون کو آگ کے سامنے لایا جاتا رہے گا۔ یعنی یہ برزخی عذاب ان پر قیامت تک مسلط رہے گا۔ اس کی تائید حدیث معراج سے بھی ہوتی ہے جس کو ابن کثیر نے بروایت ابو ہارون العبدی عن ابی سعید الخدری بیان کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آل فرعون کو ہر روز اول و آخر وقت آگ کے سامنے لایا جاتا ہے (اس طرح بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ ہر روز اول و آخر وقت آل فرعون کی پیشی آگ پر ہوتی ہے۔ مترجم) اور بالفعل ان کی شکل موٹے تازے اونٹ کی طرح ہے اور وہ پتھروں اور درختوں کو نگلتے ہیں اور کچھ سمجھتے نہیں۔ خطیب نے سراج منیر میں اور بغوی نے معالم میں لکھا ہے کہ آگ پر یہ برزخی پیشی آل فرعون ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر کافر کا برزخی حال یہی ہوتا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ ہر کافر کی روح کو صبح و شام جہنم پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس تعمیم کی تائید صحاح کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور والا نے فرمایا تھا کہ جب کوئی مرتا ہے اور وہ مومن ہوتا ہے تو جنت کا معائنہ اور خوشخبری پاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے یہی تیرا مقام ہے اور کافر ہے تو اس کی پیشی جہنم پر ہوتی ہے اور حکم

ہوتا ہے کہ یہی تیرا مقام ہے مومن اس خوشی میں دعا کرتا ہے کہ الٰہی قیامت جلد برپا ہو اور کافر گڑگڑاتا ہے کہ الٰہی قیامت قائم مت کیجیو۔ اس حدیث سے ہر کافر کے لئے عذابِ قبر ہونا معلوم ہوتا ہے۔

امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تم میں جب کوئی مرتا ہے تو ہر صبح و شام اس کا ٹھکانا اس کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اگر وہ جنتی ہے تو اہلِ جنت کا مقام اور دوزخی ہے تو دوزخیوں کا مقام اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تیرا حشر کرے (وقد رواہ البخاری و مسلم) اس حدیث سے مزید تعمیم معلوم ہوتی ہے۔ یہ تخصیص کافر کی ہی نہیں مومن کو بھی شامل ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عذابِ قبر کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہیں۔ اس جگہ ہم کسی قدر تفصیل کرنی چاہتے ہیں۔

صحاح میں ایک حدیث بروایت ام المومنین حضرت عائشہؓ سے وارد ہے۔ ایک یہودی عورت ام المومنین کی خدمت کرتی تھی۔ ام المومنین جب اس کے ساتھ کوئی بھلائی کرتیں تو وہ دعائیں دیتی اللہ آپ کو عذابِ قبر سے بچائے۔ ام المومنین نے ایک روز حضورؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ کیا قیامت سے پہلے قبر میں عذاب ہوگا فرمایا نہیں۔ تم سے کس نے کہا۔ ام المومنین نے واقعہ بیان کیا ارشاد فرمایا یہودی جھوٹے ہیں اللہ پر بڑی دروغ بافی کرتے ہیں۔ قیامت سے پہلے عذاب نہیں۔ اس کے بعد چند روز کا وقفہ گذرا جب تک خدا نے چاہا۔ ایک روز دوپہر کو حضورؐ کپڑا اوڑھے جب کہ سرکار کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بلند آواز سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے برآمد ہوئے کہ قبر ایسی ہے جیسے شب تاریک کا ایک ٹکڑا لوگو جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو روتے بہت اور ہنستے کم۔ لوگو عذابِ قبر سے پناہ مانگو قبر کا عذاب درست ہے۔ قال ابن کثیر اسنادہ صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ۔

امام احمد نے ایک دوسری صحیح اسناد سے یہی روایت قدرے تغیر الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے جس میں اول حضورؐ نے عذابِ قبر کا انکار فرمایا اور پھر کچھ مدت کے بعد ارشاد فرمایا لوگو میرے پاس وحی آئی ہے کہ قبروں میں تمہاری آزمائش کی جائے گی۔

ایک اور روایت میں امام احمد نے نقل کیا ہے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا حضور والا میرے گھر تشریف لائے اس وقت ایک یہودی عورت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی (کیا) تم واقف ہو کہ قبروں میں عذاب ہو رہا ہے تم لوگوں کی آزمائش کی جائے گی۔ یہ سن کر حضورؐ نے خشمناک ہو کر فرمایا عذاب فتنہ میں تو یہودی ڈالے جائیں گے۔ ام المومنین نے فرمایا اس واقعہ کے چند ہی روز بعد حضورؐ نے فرمایا آگاہ رہو قبروں میں تم لوگوں کی آزمائش کی جائے گی۔ اس دن کے بعد حضورؐ عذابِ قبر سے پناہ مانگا کرتے تھے (رواہ مسلم)

شیخ ابن کثیر نے اس جگہ ایک اعتراض کیا ہے کہ آلِ فرعون پر عذابِ برزخی ہونے کی آیت مکی ہے اور یہودیہ والی تمام روایات مدنی ہیں اور آیت کے ذریعہ سے جب حضورؐ کو عذابِ قبر ہونا مکہ میں معلوم ہو چکا تھا تو پھر ان احادیث میں عذابِ قبر کا کیوں انکار کیا اور وحی کے منتظر رہے تو اقراری کا اعلان فرمایا۔ ابن کثیر نے اس کا جواب دیا جس کو نقل کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ ہماری نظر میں صحیح جواب یہ ہے کہ آیت صرف آلِ فرعون کا تذکرہ ہے عمومی عذابِ قبر کی صراحت نہیں بلکہ اشارہ بھی نہیں، اس لئے آلِ فرعون پر عذابِ قبر ہونا تو یقینی ہو گیا۔ پھر یہود کا یہ واقعہ پیش آیا اور حضورؐ نے عذابِ قبر کا انکار فرمایا۔ رفتارِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امتِ اسلامیہ کے متعلق حضورؐ نے انکار فرمایا۔ یہودیوں کے متعلق تو اقراری صراحت کر دی تھی پھر وحی کے ذریعہ عمومی عذابِ قبر کا علم ہوا تو حضورؐ نے عام مسلمانوں کو خطاب کر کے عذابِ قبر کی حقانیت کا اعلان کیا اور خود بھی پناہ مانگی اور پناہ مانگنے کا حکم بھی دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابن ابی حاتم نے اپنی اسناد سے اور سفیان ثوری نے اپنی اسناد سے بروایت ابو ہذیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں (کی شکل میں) جنت کے اندر جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہیں۔ اور اہلِ ایمان کے بچوں کی روحیں چڑیوں کے پوٹوں یا جوف میں ہو کر جنت میں جہاں چاہتی ہیں پھرتی ہیں پھر سیر کر کے ان قندیلوں میں چلی جاتی ہیں جو عرش سے آویزاں ہیں اور آلِ فرعون کی روحیں سیاہ چڑیوں کے جوف میں صبح شام جہنم کو جاتی ہیں۔ آگ پر ان کی پیشی کا مطلب یہی ہے۔ (اسنادہ حسن) سدی سے بھی یہی منقول ہے۔ قبر کے عذاب ثواب کے متعلق کثیر احادیث کا مطالعہ کرنے کے بعد اہلِ حق اس نتیجہ پر پہنچے کہ قبر کا عذاب ثواب حق ہے اس میں نہ کافر کی تخصیص ہے نہ مومن کی۔ البتہ عذابِ قبر کی نوعیت اور کیفیت میں فرق ہے انتہائی تاریکی ضغطہ (دباؤ) فتنہ (امتحان یعنی محمد رسول اللہ اور دین وغیرہ کے متعلق نکیرین کے سوال) یہ تمام مصائب مومن پر بھی

آ گئے ہیں اور کافر پر بھی، مگر کافر جب امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے تو صبح و شام اس کو جہنم کے سامنے بھی جانا پڑتا ہے اور غالباً جہنم کی لپٹ اس کو ہر صبح شام جلاتی اور دکھ پہنچاتی رہتی ہے اور مومن ان بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے اس کو جنت کا دیدار کرایا جاتا ہے اور شاید کچھ چاشنی بھی چکھائی جاتی ہے جس سے لطف اندوز ہو کر قیامت کے جلد آنے کی دعا کرتا ہے۔

مقصود بیان يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ الخ میں تعجب کا اظہار ہے اور یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ طرزِ کلام کی نرمی اور مبہم نصیحت اگر سودمند ثابت نہ ہو تو پھر کھول کر دو ٹوک گفتگو کرنی چاہیئے۔ اپنے قول کی صداقت اور باطل نظریات کی تباہی آفرینی پر واضح تبصرہ ضروری ہے۔

مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عقائد ہوں یا اعمال کسی میں اندھی جاہلانہ تقلید جائز نہیں۔ علم سرچشمۂ ہدایت ہے فقدانِ علم جہالت ہے اور جہالت پر عمل کرنا نہ فقط حماقت ہے بلکہ تباہ کن بھی۔ مردِ مومن کی یہ برہان آفرینی ہم [illegible] درس دے رہی ہے اس بات کی کہ خطابیات بھی دلائل و براہین سے خالی نہ ہونے چاہئیں۔ اور ہر منطقی دلیل کو عوامی خطابی رنگ میں سہل الفہم اور سریع القبول بنا کر پیش کرنا لازم ہے

وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ سے جہاں اللہ کی ہمہ گیر طاقت کا اظہار ہو رہا ہے وہاں یہ بھی دکھانا مقصود ہے کہ اس دنیا میں آخرت کی زندگی کو پیشِ نظر رکھنا لازم ہے اور یہ سمجھنا ضروری ہے کہ حیاتِ دنیا کی تمام طاقتیں انجام کار کام آنے والی نہیں ہیں۔ نہ آغاز میں ان کا وجود تھا نہ انجام میں ہوگا۔ یہ درمیانی کڑیاں ہیں ان کو مرکزِ توجہ نہ بنانا چاہیئے۔ لوٹ کر اللہ ہی کے پاس یعنی اس کے قوائے اقتدار کے سامنے جانا ہے وہاں دنیوی اقتدار یہ ظاہری شکلیں بھی نہ ہوں گی اور خالص حکم اللہ ہی کا ہوگا۔ اَلْمُسْرِفِيْنَ کے لفظ کا ابہام بہت مراتب کا حامل ہے جو فطری و عقلی شرعی حدود سے ہٹا وہ مسرف ہے۔ نیچے کو اونچا اور اونچے کو نیچا تصور کرنا اسراف ہے یعنی مخلوق کو خالق کے اختیارات تمیزی دینا اور خالق میں مخلوق کی صفات ماننا اسراف ہے۔ اس سے مراد اس جگہ اسراف کا اعلیٰ درجہ یعنی کفر ہے۔ اگر عقیدۃً اسراف نہ ہو تو اگرچہ اس پر لفظ اسراف کا اطلاق ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ اسراف نہیں ہے۔ فَسَتَذْكُرُوْنَ الخ میں تباہی کی دھمکی ہے اور یہ دکھانا غرض ہے کہ جو حق پرست صادق القول ہمدرد کی بات نہیں مانتا وہ انجام میں تباہ ہو جاتا ہے۔ اُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ الخ سے استقامت توکل اور شدتِ مراقبہ کی تعلیم مستفاد ہو رہی ہے اور یہ بھی کہ مادی طاقتیں کتنی ہی ضرر رسانی کے درپے ہوں، لیکن اہلِ حق کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سے حق پرستوں کے ساتھ اللہ کی مدد کا ہونا اور ان کے دشمنوں کا تباہ ہونا مستفاد ہو رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کی نصرت کے مقابلے میں کسی باطل پرست کا مکر نہیں چل سکتا وغیرہ۔

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اور جب کہ کفار دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو ادنیٰ درجے کے لوگ (یعنی تابعین) بڑے درجے کے لوگوں سے کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع

اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ

تھے سو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی جزو ہٹا سکتے ہو وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں اللہ تعالیٰ

قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ

بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا اور (اس کے بعد) جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے موکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے کہ

عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا

تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے فرشتے کہیں گے (یہ بتلاؤ) کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزات لیکر نہیں آتے رہے دوزخی کہیں گے

فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ع

کہاں آتے تو رہے تھے فرشتے کہیں گے کہ پھر تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دعا محض بے اثر ہے

تفسیر ضعیف العقل نچلا طبقہ عموماً بالادست لیڈروں کے کہنے سے گمراہ ہوتا ہے۔ امت کو علماء، مریدوں کو مشائخ، غریبوں کو امیر، غلاموں اور نوکروں کو آقا، اور رعایا کو بادشاہ اور حکام، سپاہیوں کو جرنل غرضیکہ ہر زبردست زیردست کو گمراہ کرتا ہے۔ وہ اگر راستی پر ہے تو اس کی نجات ہو جاتی ہے اور وہ کج راہ ہے تو وہ پہلے تباہ ہوتا ہے پھر جب مصیبت اور بربادی کا وقت آتا ہے تو دنیا میں اتفاقاً ہی ایسا ہوتا ہے کہ بالادست گمراہ کرنے والے گمراہ ساکوئی حق قدامت وا تباع پورا کرنے کے لئے خود سے کسی طرح اس کی مدد کر سکے عموماً تو یہی ہوتا ہے کہ بربادی کے وقت کوئی مقتدا کسی مقتدی کے کام نہیں آتا، لیکن پھر بھی کمزور کو قوی سے اور بے کس و بے بس کو طاقتور سے آس لگی رہتی ہے، لیکن اگر موقع کبھی ایسا ہو کہ اعلیٰ ادنیٰ و نچلے گروہ کی رہائی ہی ممکن نہ ہو اور سب سے پہلے وہ تباہ ہو رہا ہے تو ایسے وقت میں نچلا گروہ برباد ہو جاتا ہے اور کوئی آس باقی نہیں رہتی۔ مجبوراً ڈوبتا سوار کو پکڑتا ہے اور جیل کی تکلیفوں میں پھنسا ہوا قیدی جیل کے نگہبانوں سے ہی امیدوار ہوتا ہے کہ وہی حکام سے سفارش کر دیں کسی طرح قید خانے کی تکلیف تو کم ہو، مگر قید خانے کے امانت دار فرماں بردار محافظ اپنے کو بے بس پاتے ہیں۔ ان کو سفارش اور جنبہ داری کا کوئی حق نہیں پہنچتا وہ ہائی کورٹ کے عادل جج سے کسی قسم کی سفارش نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ فیصلے میں ان کو کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ جرائم محقق سزا مناسب تو وہ الٹے قیدیوں کو ہی قائل معقول کرتے ہیں کہ قانون وقت کا کیا تم کو علم نہ تھا۔ کیا واضع قانون نے تم کو قانون کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کیا تم بغاوت کے جرم اور اس کی سزا سے ناواقف تھے۔ قیدیوں کو اعتراف کرنا پڑتا ہے اور حقیقت واقعہ چھپائے نہیں چھپتی تو اہل سزا ضد سے کہتے ہیں کہ اب تو جج صاحب سے ہی تم التجا کرو انہی کو پکارو شاید وہی تمہاری طرف متوجہ ہوں۔ قیدی جج کو پکارتے ہیں اور اپیلیں کرتے ہیں۔ مگر یہ تمام مرافعات اور استغاثے کس سے متعلق ہوتے ہیں۔ جن میں کہیں جج کے فیصلے کی صحت اور مبنی بر انصاف ہونے کا اقرار نہیں ہوتا اور جرم کا بھی ہے تو اوپرے دل سے۔ حقیقت اور واقعیت سے خالی، ایسے ان بدنصیبوں کی پکار بے کار بھٹکتی پھرتی ہے۔ قیامت کے دن نچلے طبقے کا بھی یہی حال ہوگا۔ بالادست گروہ کے کہنے سے گمراہ ہونے والے گروہ مقلدین جب اپنے کو عذاب میں پھنسا دیکھیں گے تو اپنے لیڈروں اور پیشواؤں سے سخت التجا کریں گے وہ خود عذاب میں غرق ہوں گے کورا جواب دے دیں گے مجبوراً جہنم کے نگرانوں سے مدد کی خواہش کریں گے۔ وہ بیچارے کیا مدد کر سکیں گے خود لاچار ہوں گے۔ کافروں کے کفر اور خدا کے فیصلے کی روئیداد ان کے سامنے ہوگی۔ بالآخر وہ قائل معقول کریں گے اور پوچھیں گے کیا اللہ کے پیغمبر اللہ کے احکام اور ضوابط لے کر تمہارے پاس نہیں پہنچے تھے کیا تم ناواقف تھے۔ دوزخی انکار نہ کر سکیں گے تو فرشتے کہہ دیں گے۔ اب تم ہی اللہ سے دعا کرو۔ خود ہی اس سے فریاد کرو۔ لیکن اس وقت دعاؤں سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ وہ دعا بطور عبادت اور اعتراف الوہیت کے تو ہوگی نہیں اس لئے رائگاں جائے گی اور یونہی بھٹکتی رہے گی۔

تحلیل اجزاء وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ

۱ دنیا میں دو طرح کے آدمی ہیں زوردار اور نادار، مطلوب اور طالب، رعایا اور بادشاہ، مرید اور پیر، چیلے اور گرو، کمزور اور طاقت ور، پیغمبر اور ان کی امت، سرگروہ اور ان کے پیچھے غرضیکہ ایک گروہ نیچا ہے دوسرا اونچا ہے۔ ایک بیوقوف یا سادہ نیک طینت دوسرا عقلمند یا مکار، بد سرشت نچلا طبقہ اونچے طبقہ کا پیرو ہوتا ہے اور بالادست گروہ کی راستی درستی صداقت اور رہبری کا قائل ہو کر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بے چون و چرا اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اب اگر بالا گروہ واقعی حق پرست اور ہادی مہدی ہے تو پیچھے چلنے والا تمام گروہ ہدایت یافتہ بن جاتا ہے اور اگر رہنما لٹیرا یا گمراہ ہے تو سب قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

۲ زردار، حکمران، باوجاہت، عالی نسب، طاقتور، اسی طرح ہر دنیوی سیادت کا حامل اپنی غلطی فکر کی وجہ سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں بہمہ حیثیات کامل ہوں، عقلمند بھی ہوں، بڑا عالم بھی ہوں، اقوام و اشخاص کی ترقی کے اسرار سے کہ بھی جانتا ہوں۔ میرے اندر تنظیم کہ

باطل کو پرکھنے کی قوت بھی سب سے زیادہ ہے۔ میں روحانیات، اخلاقیات، مدنیات، سیاسیات غرض کل انسانیات کا ماہر ہوں۔ میری قوت فیصلہ غلط نہیں ہو سکتی میرا سیاہ فیصلہ سیاہ ہے اور سفید سمجھا ہوا سفید۔ یہاں تک کہ نجات آخرت اور حصول سعادت کے کیا ذرائع ہیں اور انسانی زندگی کو سدھارنے والے قوانین کیا کیا ہیں۔ میں ہی اُن سے واقف ہوں اور میری بصیرت زندگی کی تمام گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے۔ یہی استکبار ہے یعنی اپنے کو بڑا سمجھنا ظاہر ہے کہ دولت حکومت جسمانی طاقت حکمت ہدایت صحت دنیوی اور آخروی سعادت سب جدا جدا چیزیں ہیں۔ ایک چیز میں اگر کسی کو کمال حاصل ہو جائے تو ضروری نہیں کہ دوسری صفات بھی اُس کے اندر بدرجۂ اکمل پائی جائیں۔ ایسا دعوٰی حقیقت سے خالی ہے اور محض جھوٹا ادعا ہے یہی استکبار ہے۔ لیکن عوام کی قوت فیصلہ کمزور رہتی ہے۔ وہ دودھ کو پانی سے الگ نہیں کر سکتے۔ ظاہری وجاہت و سیادت کا مالک ان کی نظر میں ہمہ صفات موصوف ہوتا ہے وہ ہر چمکیلی چیز کو سونا ہی سمجھتے ہیں۔ عیار اور دانشمند کا فرق ان کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے ہر چرواہے کی پکار پر گردنیں جھکائے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ خواہ وہ ان کو پہاڑ کے خندقوں میں دھکیل دے یا کسی سرسبز مرغزار میں لے جائے۔ احمقوں کے سامنے جب تک اُن کی بیوقوفی اور غلط روی کا انجام برہنہ آجائے اُس وقت تک نہ اپنی کج روی کو تسلیم کرتے ہیں نہ اپنے لیڈروں کی بے راہ روی اور گمراہ کنی کو۔

۳ قیامت کے دن حق و باطل کے فیصلے کے بعد جب ان تمام گمراہ لیڈروں اور کھوئی ہوئی بھیڑوں کا اجتماع دوزخ میں ہوگا اُس وقت مکار پیروں کے مریدوں، جھوٹے لیڈروں کے پیروؤں عیار گروؤں کے نادان چیلوں اور خود پرست بادشاہوں کی بہکی ہوئی رعایا کو اپنی غلط روی کا یقین آئے گا اور وہ اپنے پیشواؤں سے مدد کی درخواست کریں گے۔ لیکن بے چاروں کو یہ کہنے کی تو جرأت نہ ہوگی کہ تم دوزخ سے ہم کو بالکل بچالو۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمہارے پیرو یا تابع تھے۔ اب یہاں ہمارے کچھ کام آؤ۔ آتشی عذاب کا کوئی حصہ ہی کم کرو۔ جھوٹے لیڈر اور مکار پیشوا اُس وقت خود بے بس ہوں گے۔ دنیوی وجاہت و اقتدار اُن کے پاس نہ ہوگا۔ استکبار کی قلعی کھل چکی ہوگی وہ خود کہیں گے۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝ اب تو ہم سب آگ میں ہیں۔ اللہ بندوں کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یعنی جب ہم اپنی تکلیف ہی کم نہیں کر سکتے تو تمہارے دکھ میں کیا تخفیف کر سکتے ہیں۔ سب ایک ناؤ پر سوار ہیں۔ جو خدائی فیصلہ ہونا تھا ہو چکا اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ مجبوراً بے کسی کی حالت میں سب اونچے نیچے کمزور قوی راجہ پرجا مرید گرو چیلے غرض۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِنَ الْعَذَابِ۔ تمام دوزخی کافر جہنم کے نگرانوں سے ہی سفارش کی درخواست کریں گے کہ کسی طرح ایک دن کا عذاب ہی ہلکا ہو جائے۔ اس جگہ دن سے مراد قیامت کا دن نہیں نہ دنیا کا دن مراد ہے۔ دوزخ کا سورج کا طلوع و غروب کہاں بلکہ ایک قلیل مدت مراد ہے۔ حکم فیصل کے بعد سفارش کی درخواست بے سود خصوصاً جہنم کے نگرانوں اور عذاب پر مسلط فرشتوں سے، اس لئے جہنم کے دربان ان کو کورا جواب دے دیں گے اور مزید شرمندہ کرنے کے لئے کہیں گے۔

قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ۔ کیا اللہ کے پیغمبر اللہ کے احکام واضحہ لے کر تمہارے پاس نہیں پہنچے تھے یعنی آج تم کو معذرت کا کیا موقع ہے۔ کیا تم اللہ کے احکام اور احکام کی خلاف ورزی کی سزا سے ناواقف تھے۔ کیا ضوابط الٰہیہ کو تم کو علم نہ تھا۔

قَالُوا بَلَىٰ دوزخی انکار نہ کر سکیں گے اور اثبات ہی میں جواب دیں گے۔

قَالُوا فَادْعُوا فرشتے (بطور تشنیع) کہیں گے اب تم خود دعا کرو یعنی ہم نہیں کر سکتے۔ فرشتوں کے اس جواب کا مطلب دو طرح ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ جب تم دنیا میں خود رائی تھے اور احکام خداوندی کو تم نے ٹھکرا دیا تھا تو آج خود ہی بھگتو اور خود ہی تخفیف عذاب کی دعا کرو۔ دوسرے یہ کہ شاید بعض ملائکہ کو افسوس ہو کہ یہ کمبخت اپنے قصور کے معترف ہیں۔ اگر اللہ عذاب میں کمی کردے تو ممکن ہے لیکن خود کوئی سفارش کرتے ڈریں گے یا آگے سفارش نہیں کریں گے کہ ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے حق میں بے سود ہے سفارش فیصلۂ الٰہی ہو چکا۔ اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ سفارش نہ کرنے کی ایک وجہ عدم اذن بھی ہو سکتی ہے۔ بغیر اذن کے شفاعت ناممکن ہے اور شفاعت کی اجازت حاصل نہ ہوگی۔ بہرحال وہ خود پکاریں گے، لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ ان کا اقرار تکلیفوں سے گھبرا کر ہوگا، اس لئے دعا قبول نہ ہوگی۔

وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۔ کافروں کی دعا (راہِ راست پر نہیں پہنچتی) بھٹکتی پھرتی ہے یعنی قبول نہیں کی جاتی ۔ متاخرین علماء کے ایک گروہ کے نزدیک کافروں کی بعض دعا قبول کرلی جاتی ہے ، لیکن امام جمہور سلف کا قول اس کے خلاف ہے ۔ اس کے علاوہ قائلین قبول کرنے کے نزدیک بھی بعض دعائیں قبول کی جاسکتی ہیں ۔ جیسے مظلوم اور بے کس کی دعا ۔ ہر دعا کے قبول ہونے کا کوئی قائل نہیں ۔ پھر اگر قبول و عدم قبول میں کچھ اختلاف ہے تو وہ دنیوی دعاؤں کے متعلق ہے یہاں کافروں کی کوئی نہ کوئی دعا کافر کی بھی قبول کرلی جاتی ہے ۔ آخرت میں کافروں کی پکار سنی جانے کا تو کوئی قائل نہیں ۔ اور آیت مذکورہ میں نفی قبول کی صراحت کا تعلق قیامت کے دن کی دعاؤں سے ہے ۔

ایک ضروری تنبیہ دعا میں دو حیثیات ہیں ۔ ایک بندہ کی عاجزی اور بندگی کا اظہار اور بارگاہِ الوہیت میں اپنی بے کسی کو پیش کرکے التجا ، یہ حیثیت عبادت ہونے کی ہے ، اس لئے حدیث میں الدعاء مخ العبادۃ آیا ہے ۔ چونکہ کافر و مشرک اللہ کی خالص الوہیت کے ہی قائل نہیں ، اس لئے ان سے اس طرح کی دعا کا صدور ہی نہیں ہوسکتا اور نہ مغز و حقیقت سے خالی دعائیہ الفاظ بارگاہِ الٰہی تک پہنچ سکتے ہیں ۔ ان کا عقیدہ غلط ہے ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے کسی کا کوئی معبود ہے کسی کا کوئی مصنوعی کارساز ہے ، اس لئے ان کی دعائیں اور پکاریں بھی خدائی کی طرح بھٹکتی پھرتی ہیں ۔ نہ عقیدہ صحیح نہ دعا قابل قبول ۔ آیت میں یہی مراد ہے ۔ دعا کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ کوئی خاص مطلب حل ہوجائے ، اور مراد مل جائے تو ظاہر ہے کہ ایسی دعا ہر انسان کی مقبول ہوتی ہے یعنی تقدیر الٰہی میں جو کچھ ہے وہ پورا ہوکر رہتا ہے ۔ کوئی خدا سے مانگے یا فرشتوں سے ، دیوتاؤں سے یا درختوں سے اور پتھروں سے ۔ بہرحال دینے والا خدا ہی ہے وہ بغیر مانگے بھی دیتا ہے ، اس لئے کافر کی دعا قبول ہوتی ہے ۔ مومن اور کافر کی دعا میں فرق اول اعتبار سے ہے ۔ اس دوسری جہت سے تو فرق دونوں میں کوئی نہیں ۔ ہاں اگر ہے تو ثواب آخرت کے لحاظ سے ہے ۔ معین مراد دعا کے بعد اگر نہیں دی جاتی تو مومن کو ثوابِ آخرت ملے گا اور کافر محروم رہے گا ۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنفَعُ

ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے (یعنی فرشتے جو کراماً کاتبین ہیں)

الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ

کھڑے ہوں گے جس دن کہ ظالموں (یعنی کافروں) کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس عالم میں خرابی ہوگی اور آپ کے

وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۝ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ فَاصْبِرْ

قبل ، ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ (یعنی توریت) دے چکے ہیں اور (پھر) ہم نے وہ کتاب بنی اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ وہ ہدایت اور نصیحت (کی کتاب) تھی اہل عقل (سلیم) کے لئے

إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۝ إِنَّ

سو آپ صبر کیجئے بیشک اس کا وعدہ سچا ہے اور اپنے (اس) گناہ کی (جس کو مجازاً گناہ کہہ دیا) معافی مانگیے اور شام اور صبح اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے (اور) جو

الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِن فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا

لوگ بلا کسی سند کے کہ ان کے پاس موجود ہو خدائی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں ان کے دلوں میں نری بڑائی (ہی بڑائی) ہے کہ وہ اس تک کبھی

هُم بِبَالِغِيهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝

پہنچنے والے نہیں سو آپ اللہ کی پناہ مانگتے رہیے بیشک وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے

تفسیر قومیں گمراہ ہوتی ہیں تو اللہ اپنے پیغمبر بھیجتا ہے۔ کتابیں نازل فرماتا ہے حق کو باطل سے ممتاز کر کے دکھاتا ہے۔ قوانین حیات کی تفہیم دیتا ہے انفرادی اور اجتماعی تعامل کی اصلاح کرتا ہے پیغمبر عمومی اور خصوصی دعوت حق دیتے ہیں۔ دلیل و حجت کی روشنی میں وہ صداقت کھول دیتے ہیں لیکن برا ہو خود پسنداری اور غرور نفس کا نسبی برتری اور دولت کا نشہ حکومت کی چیرہ دستی کر کی طرح کاری اور جاہلانہ کٹ حجتی لوگوں کو جھگڑوں پر آمادہ کرتی ہے جن کی جستجو مقصود نہیں ہوتی۔ صداقت کی طلب نہیں ہوتی۔ خود ساختہ برتری کا نشہ دماغ کے کسی گوشہ کو اجازت نہیں دیتا کہ اہل حق کی بات سن کر سچائی کا کوئی نقش قبول کر سکے۔ حقیقت میں تباہی اور گمراہی کی جڑ یہی غلط پندار ہے۔ جب طلب حق ہی نہ ہوا اور خود ساختہ علمی نقوش اور عملی حرکت و سکون کو حق سمجھ بیٹھے تو کجی اڑ جاتی ہے اور ندائے صداقت کو پاؤں سے ٹھکرا دے تو رہ یابی کا امکان ہی کیا رہ جاتا ہے نتیجہ یہ کہ غرور و رعونت کا نداء حق سے تصادم ہوتا ہے اس ٹکراؤ کی ابتدائی شکل شور و شغب جاہلانہ طعنے دشنام طرازیاں، آبرو ریزیاں اور جسمانی ایذائیں ہوتی ہیں۔ اہل حق کا پاؤں ان سفیہانہ حرکتوں کے مقابلے میں لغزش نہیں کھاتا غرور اور جڑھ جاتا ہے جہالت کی شکست مسائلات میں مزید تلخی پیدا کر دیتی ہے۔ دست بدست جنگ و جدال و قتال تک نوبت پہنچ جاتی ہے ایک طرف باطل کی شان و شوکت خیل و حشم جاہ و حشم لاؤ لشکر انبوہ اور رعونت ہوتا ہے کثرت تعداد ہوتی ہے توپ سامان ہوتی ہے، مکر ہوتا ہے، داؤں پیچ ہوتے ہیں۔ باطل کوشی اور عدا فراموشی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اہل حق کے ساتھ حق ہوتا ہے۔ بقدر استطاعت سامان ہوتا ہے۔ استقلال ہوتا ہے استقامت ہوتی ہے مصائب و شدائد پر صبر ہوتا ہے۔ بقدر امکان کوشش ہوتی ہے، ایثار ہوتا ہے مخلوق سے بے نیازی ہوتی ہے اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے۔ ہاتھ حرکت میں زبانیں دعاؤں میں اور دل توجہ الی اللہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ طاغوت و لاہوت کی صف آرائی ہوتی ہے۔ اہل حق بھی مرتے ہیں لیکن دوامی زندگی حاصل کر کے۔ باطل کوش بھی مرتے ہیں لیکن ابدی موت کے ساتھ۔ کافروں کے لیڈروں کی طرح ایمانداروں کے پیشوا امام یہاں تک کہ بعض انبیاء بھی کام آتے ہیں۔ لیکن بالآخر فتح اہل حق کی ہوتی ہے۔ اہل حق کے مشن کی ہوتی ہے۔ حق کے نظریات کی ہوتی ہے برہانی غلبہ کے ساتھ آخرکار دنیوی اقتدار بھی ایمانداروں کی جماعت کے ہاتھوں میں آ جاتا ہے گو بعض حق کے افراد شہید ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی فتح حق پرست گروہ کی ہوتی ہے۔ اہل باطل نامراد رہتے ہیں۔ وہ اپنی انتہائی کوشش کے بعد بھی حق کو مغلوب کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اس طرح اللہ کا وعدہ آخر میں پورا ہوتا ہے۔ ان تمام کاوشوں اور کشتوں کے درمیان اہل حق کی توجہ خدا سے نہیں ہٹتی اور اپنی طاقت اور کوشش پر وہ کبھی مغرور نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ بارگاہ الٰہی میں اپنی بے بضاعتی قصور سعی ضعف و عجز اور کوتاہی عمل کا اقرار کرتے اور خطاؤں کی معافی کے طلب گار رہتے ہیں۔

تحلیل اجزاء إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ گزشتہ آیات میں تفصیلی طور پر حضرت موسیٰ کے مخالف فرعون اور آل فرعون کی تباہی حضرت موسیٰ اور مومنوں کی کامرانی اور فتحیابی کو بیان فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک عمومی ضابطہ اور کلیہ مقرر فرما دیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ اپنے پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں کی دنیا میں بھی مدد کرتا ہے اور آخرت میں بھی مدد فرمائے گا اور ان کے دشمنوں کو دنیا میں بھی ذلیل ہونا پڑتا ہے اور قیامت کے دن بھی کوئی عذر معذرت ظالموں کو فائدہ نہیں پہنچائے گی اور ان پر اللہ کی پھٹکار ہوگی۔ مطلب یہ کہ اہل حق کا مقابلہ جب باطل پرستوں سے ہوتا ہے تو اللہ کی مدد اہل حق کو حاصل ہوتی ہے۔ اور بحیثیت جماعت انجام کار کامیابی انہی کو ملتی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

شیخ ابن کثیر نے علامہ طبری کی تفسیر سے نقل کرتے ہوئے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ یہ ہے کہ بعض انبیاء کافروں کے ہاتھوں سے شہید ہوئے مثلاً زکریا، یحییٰ اور شعیا علیہم السلام بعض کو وطن چھوڑنا پڑا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آقائے دوجہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض کو کفار کے نرغہ میں سے غیر معمولی طور پر نکلنا پڑا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ۔ پھر اہل حق بکثرت میدان جنگ میں شہید بھی ہوئے حضرت موسیٰ

اور مختلف پیغمبروں کے ساتھی اور جنگ احد وغیرہ میں صحابہ کرام اور یزیدی فوج کے ہاتھوں امام مظلوم اور آپ کے رفیق حالانکہ نص آیت کے مطابق ہر ایک کو فتحیاب ہونا چاہیئے۔ کسی پیغمبر، امام اور صحابی کی شہادت تو ایک طرف رہی کبھی کسی کو عارضی شکست بھی نہ ہونی چاہیئے تھی۔ ابن جریر نے اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا ہے۔ اول یہ کہ آیت مذکورہ میں کسی جامع کلیہ کا منطقی بیان نہیں، بلکہ خطابی رنگ میں غالب حال اور کثیر الوقوع واقعات کا اظہار مقصود ہے۔ اگر بعض مثالیں اس کے خلاف پائی جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ آیت میں کلیہ ضابطہ نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ اکثریہ واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت میں عمومی ضابطہ کا بیان ہے اور پیغمبروں کو بھی اللہ کی طرف سے نصرت ملتی ہے، لیکن نصرت الٰہی دو طرح سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ پیغمبروں پر کافروں کو غالب نہ کیا جائے بلکہ ان کے دشمنوں اور دکھ پہنچانے والوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ ایسا اکثر ہوا ہے دوم یہ کہ بعض رسولوں کو کافروں کے ہاتھوں سے شہادت ملی یا ترک وطن کرنا پڑا یا کسی اور طرح سے جدا کر دیا گیا پھر اس قوم پر تباہی بھیجی گئی۔ چنانچہ اسرائیلیوں نے جب بعض پیغمبروں کو شہید کر دیا تو بنی اسرائیل کے دشمن (بخت نصر وغیرہ) ان پر چڑھ آئے اور اتنی خونریزی بربادی اور بیخ کنی کی جس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کے بعد نمرود اور اس کے طاقتور ساتھیوں کو حقیر ترین مخلوق کے ذریعے سے برباد کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے کے بعد رومیوں کو یہودیوں پر مسلط کر دیا اور یہودیوں کو تباہ کیا۔ رہا اسلامی دور تو اگرچہ ان آیات کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا لیکن آیت کا عمومی ضابطہ اس دور میں بھی سچا ثابت ہوا۔ حضور کی ہجرت کے بعد مسلمان کو پیہم فتوحات حاصل ہوئیں یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور کفر کی جڑ اکھڑ گئی۔ اسی طرح امام مظلوم کی شہادت کے بعد مختار ثقفی نے قاتلان حسینؓ اور طرفداران یزید کا تختہ تاراج کر دیا اور یزید نہایت ذلت کے ساتھ قریب زمانہ میں مر گیا۔ امام المفسرین کی یہ توجیہ اگرچہ خوب ہے اور شبہ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک آیات کے سیاق اور ماقبل مابعد کا لحاظ کرتے ہوئے بہترین تشریح وہی ہے جو تمہیدی مقالہ میں ہم نے کر دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیات میں نصرت و کامرانی کا وعدہ مخصوص افراد اور معین اشخاص سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ پیغمبروں اور مومنوں کی جماعت سے کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض انبیاء صلحاء ائمہ حق کی ہمدردی میں شہید ہو جائیں لیکن آخر کار صوری اور معنوی کامیابی اہل ایمان کو ہی ملتی ہے اور آخرت کی فلاح کے علاوہ دنیوی اقتدار بھی ان کے قدم چومتا ہے۔ تاریخ عالم میں ایک واقعہ بھی اس کے خلاف نہیں مل سکتا۔ واللہ اعلم

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ جس شخص نے میرے ولی سے عداوت رکھی اس نے مجھ سے لڑنے کا اشتہار دیا (بخاری) دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ نے فرمایا میں اپنے اولیاء کا بدلہ ایسا لیتا ہوں جیسا لڑائی جو شیر بدلہ لیتا ہے۔ سدیؒ نے فرمایا اللہ جب کسی پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کیلئے بھیجتا ہے اور قوم والوں نے پیغمبر کو قتل کیا یا پیغمبر کے ساتھیوں کی جماعت کو اس قرن کے گزرنے سے پہلے اللہ نے کسی شخص کو مسلط کر کے اس قوم سے اپنے نیک بندوں کا انتقام لے لیا۔ پس اگر انبیاء و مومنین شہید بھی ہوئے تب بھی وہ منصور رہے۔ علامہ سدیؒ کی اس تقریر سے مترشح ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک نصرت سے مراد حقیقی کامرانی ہی نہیں بلکہ کسی اجنبی کے ہاتھوں سے قوم سرکش کی تباہی بھی نصرت مومنین کی فہرست داخل ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى۔ اللہ اپنے خاص بندوں کی نصرت اس دنیا میں دو طرح سے کرتا ہے۔ اول دشمنوں پر ان کو غالب کرتا ہے اور اعداء حق ذلیل ہوتے ہیں۔ دوم ان کو انسانیت کی صلاح و فلاح کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ پاکیزہ قوانین حیات سکھاتا ہے اور امن آفریں راحت بخش جوئی صاف ستھری تعلیم دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو فرعون اور فرعونیوں پر غلبہ عطا فرمایا اور اعداء حق کو پانی میں غرق کیا۔ اول قسم کی نصرت پوری ہو گئی پھر موسیٰ کو توراۃ عطا فرمائی تاکہ ان کو بھی زندگی کا سیدھا راستہ معلوم ہو اور

وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ۔ ان کے بعد دوسرے اسرائیل کو بھی احکام الٰہیہ پہنچ جائیں اور ان کے ہاتھوں میں بھی مکمل دستور حیات آ جائے مگر یاد رکھو کہ احکام الٰہیہ اور کتب سماویہ کی رہنمائی اگرچہ عمومی ہوتی ہے، مگر ان سے فائدہ اندوز صرف سمجھدار آدمی ہی ہوتے ہیں۔ توراۃ اور ملفوظات موسیٰ اگرچہ عمومی طور پر ہر اسرائیل کے لئے راہنما تھے، مگر یادداشت کا درجہ صرف اہل عقل کو ہی حاصل تھا۔ قرآن بھی اگرچہ سب لوگوں کے لئے پیام ہدایت ہے مگر نفع اندوز صرف اہل تقویٰ ہوتے ہیں۔ اس لئے ھدی للمتقین خصوصیت

کے ساتھ فرمایا۔ اسی طرح تورات اگرچہ ہر اسرائیل کو شریعتِ الٰہیہ کی تعلیم دیتی تھی، مگر فائدہ اندوزی صرف اہلِ دانش کے حصہ میں آئی تھی، اس لئے اولی الالباب کا لفظ بصورتِ خاص ذکر کیا

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ اس آیت میں قرآن کے اصل مقصد کی طرف توجہ کیا گیا ہے۔ مقدم الذکر آیات میں حضرت موسیٰ کا مفصل تذکرہ تھا، لیکن قرآن داستان کی کتاب نہیں۔ ہدایت نامہ ہے۔ قصص و حکایات کا تذکرہ بھی معنوی طور پر راہنمائی کا حامل ہے۔ موسیٰ بے بس تھے، بے کس تھے، نادار تھے۔ ان کی قوم ذلیل تھی جو بھیڑ بکریاں چراتی تھی۔ فرعون دشمن تھا۔ فرعونی خون کے پیاسے تھے۔ اُن کی سلطنت تھی حکومت تھی، اُن کے پاس دولت تھی، موسیٰ نے حق کی آواز نکالی، اسرائیلیوں نے ساتھ دیا سب نے جیتا بنا یا اور ہر کوشش صرف کی۔ مصائب پر صبر کیا۔ راتوں رات پوری قوم بھاگی۔ آخر فرعون اور فرعون کا جتھا ہوا۔ موسیٰ اور ان کے ساتھی کامیاب ہوئے۔ یہ درس نصیحت ہے حضور اقدس اور ان کے ساتھیوں کے لئے۔ تفصیل یہ ہے کہ ۱ آپ بھی صبر کیجئے۔ یعنی مصائب و شدائد آپ کے پاؤں کو لغزش نہ دے سکیں ارادوں میں تزلزل نہ پیدا ہونے پائے۔ اپنی امکانی کوشش سے دریغ نہ کیا جائے ۲ اللہ کا وعدہ سچا ہے یعنی وہ اپنے دوستوں کی نصرت و مدد کرتا ہے۔ پیغمبروں اور مومنوں کو دنیوی اور دینی فلاح عنایت فرماتا ہے۔ آخرت میں جنت اور دنیا میں اقتدار ان کو ضرور ملتا ہے۔ آپ کو بھی دارین کی نعمتیں ملیں گی۔ ۳ مگر آپ کو اپنے گناہ کی معافی طلب کرنی چاہیئے۔ یعنی اپنی کوشش کی کوتاہی طاقت کی کمی اور اپنے ضعف و عجز کا اعتراف کرنا چاہیے کتنی ہی کوشش کرو جتھا بن جائے سامان جمع ہو جائے، ہتھیار فراہم ہو جائیں مگر پھر بھی سعی میں کوتاہی کی معافی کی طلب کرنا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ پندار نفس پیدا ہو جائے اور ظاہری طاقت کا نشہ دماغوں پر چھا جائے اور توکل کی روحانی رسّی ہاتھ سے چھوٹ جائے چونکہ حضور والا پیغمبر معصوم تھے۔ آپ کا کوئی گناہ موجود ہی نہ تھا پھر استغفار کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، اس لئے شیخ ابن کثیر نے کہا کہ خطاب اگرچہ رسول اللہ کو ہے مگر اس سے مقصود امت کو استغفار کی ترغیب دینی ہے۔ خطیب نے کہا کہ یا مضاف محذوف ہے یعنی اُمت کے گناہوں کے لئے استغفار کیجئے یا استغفار سے مراد ہے اونچے درجوں کی طلب یعنی حضور کو استغفار کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ کو مراتب نبوت کی ترقی عطا فرمائی جائے۔ صحیح مطلب وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں یعنی کوشش کی کمی کا اعتراف اور اس کی معافی کی طلب تاکہ توکل کا رشتہ منقطع نہ ہو۔ ۴ اور اللہ کی تسبیح مع حمد بیان کرنی چاہیئے یعنی اللہ کو ہر نقص و عیب عجز اور برائی سے پاک سمجھنا چاہیئے، پاک کہنا چاہیئے اور عمل سے بھی اس کا مظاہرہ کرنا چاہیئے پھر اس کے ساتھ اللہ کی حمد بھی کرنی چاہیئے۔ ساری کائنات اُس نے بنائی نیست سے ہست کیا۔ ہر قسم کی جسمانی دماغی ادراکی طاقتیں اور روحانی روشنی عنایت کی پھر قوانین حیات کا درس دیا وحی بھیجی پیغام بھیجے قوی دشمنوں کے مقابلے کی ہمت دی اور اپنی نصرت سے سرفراز فرمایا۔ یہ نعمتیں ان گنت ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرنا اور اللہ کی حمد و ثنا کرنی لازم ہے گویا تسبیح سے صفات سلبیہ کی طرف اشارہ ہے اور حمد سے صفات ثبوتیہ کی طرف ۵ شام و صبح یعنی تمام اوقات تسبیح و حمد میں مشغول رہنا چاہیئے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عشی کا وقت دن کے پچھلے حصہ سے رات کے اوّل حصہ تک ہے اور ابکار کا وقت رات کے آخر حصہ سے دن کے اوّل حصہ تک یعنی وقت زوال سے رات کے نصف اوّل تک عشی ہے۔ اس میں چار نمازیں ہیں ظہر عصر مغرب عشاء اور ابکار میں فجر داخل ہے، اس لئے بقول ابن کثیر عموم اوقات مراد ہے۔ ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک صرف عصر و فجر کی نمازیں مراد ہیں۔ خطیب نے اسی کی تائید حسن بصری کی طرف منسوب کی ہے اور دوسری آیت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے فرمایا ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا الخ بعض علماء نے فرض نماز سے علاوہ عشی کی دو رکعت اور ابکار کی دو رکعت مراد لیں۔ اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ پانچوں وقت کی نمازوں کی تفصیلی فرضیت تو مدینہ میں پہنچ کر ہوئی اور آیت مکی ہے پنجگانہ فرائض سے پہلے اس کا نزول ہوا مکہ میں صرف دو نمازیں تھیں۔ دو رکعت فجر کی اور دو رکعت عصر کی، اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا نماز فرض ہوئی تو حضر و سفر میں صرف دو رکعت تھی پھر سفر میں تو ویسی ہی دو رکعت باقی رکھی گئی اور حضر میں بڑھا کر چار رکعت کر دی گئی۔ (کما فی الصحیح)

إِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ آغاز سورت اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ کی تردید فرمائی تھی۔ اس کے بعد دوسرے معارف و مواعظ کا سلسلہ یہاں تک پہنچا اور متصل آیات میں صبر و تسبیح

وتحمید کا حکم دیا، لیکن جھگڑنے والوں کا جھگڑا منقطع نہ ہوا احکام الٰہیہ میں مجادلہ بدستور باقی رہا۔ آخری فیصلہ کرنے کیلئے اس مجادلہ باطلہ کی علت اس جگہ بیان فرما کر اس کا علاج بھی تجویز کر دیا اور پیشین گوئی بھی فرما دی کہ یہ بلا دلیل مجادلہ کرنے والی اپنی مراد کو کبھی نہیں پہنچیں گے۔ ماحاصل ارشاد یہ ہے کہ بلا دلیل مجادلہ کی علت صرف غرور نفس ہے۔ دولت پر غرور ہو حکومت پر ہو سیادت قومی پر ہو۔ طاقت جسمانی پر ہو، ہمہ دانی پر ہو، تخیل کی بلندی اور عقل کی رسائی پر ہو کسی بات پر ہو رعونت نفس پر ہو رعونت زدہ دماغ والا کسی دلیل کو نہیں سنتا اور سن لے تو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ چاہتا ہے کہ بے دلیل مخالف پر غالب آجائے اور اپنا اقتدار جمالے۔ بے چارے کے پاس کوئی برہان عقلی نقلی تو ہوتی نہیں اور غالب آجانے کی ہوس ہوتی ہے اور غرور نفس اجازت نہیں دیتا کہ مخالف کی مدلل حقانیت کو تسلیم کر لے اس لئے خواہ مخواہ جھگڑے کرتا ہے، لیکن اس طریقے سے وہ غالب نہیں آسکتا اور اپنی مراد کو نہیں پاسکتا اور بڑا نہیں بن سکتا ایسے آدمی کی خرافات سے تو اللہ کی پناہ ہی مانگنی چاہیئے۔ بہرحال وہ سنتا بھی ہے دیکھتا بھی ہے حقیقت حال سے پورا واقف ہے۔

مقصود بیان

آیت اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ جماعت اہل حق کی مدد کرتا ہے اور اس کو فتح یاب بنا دیتا ہے۔ لفظ اَوْرَثْنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی اصلاح میں لفظ وراثت سے وراثت مال ہی نہیں ہوتی بلکہ وراثت علمی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو توراۃ وراثت میں ملی۔ لِاُولِی الْاَلْبَابِ کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ توراۃ کی ہدایت اگرچہ سب اسرائیلیوں کے لئے تھی لیکن نصیحت حاصل کرنے والے صرف دانشمند ہی تھے۔ فَاصْبِرْ میں شدائد برداشت کرنے اور استقامت رکھنے کی تلقین ہے اور حکم استغفار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ نبی معصوم بھی حکم استغفار سے بالا نہیں ہیں۔ صبر سے انسانی کوشش اور استغفار سے ہر کوشش کی کوتاہی کا اعتراف اور اس کی معافی کی درخواست پھر تسبیح وتحمید سے توکل کی تعلیم اور رشتہ منقطع نہ کرنے کی ہدایت مترشح ہو رہی ہے۔ شریعت الٰہیہ میں کامیابی کے یہی چار اجزا ہیں اور ان چاروں کی موجودگی میں نصرت الٰہیہ کا نزول یقینی ہے۔ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جھگڑا کرنے کی علت صرف غرور ورعونت ہے۔ حق جو صداقت کوش کبھی برخود غلط نہیں ہوتا، اس لئے خواہ مخواہ جھگڑا نہیں کرتا اور پیام حق کو سنتا ہے، غور کرتا ہے اور سمجھ کر مان لیتا ہے۔ تسلیم حق میں اس کو اپنی شکست نظر نہیں آتی۔ مَا هُمْ بِبَالِغِیْهِ میں صراحت ہے کہ نفسانی غرور والے کبھی بڑائی کو نہیں پہنچتے۔ بے وجہ غرور کا کچھ حاصل نہیں نکلتا۔ فَاسْتَعِذْ سے رعونت زدہ اہل خصومت کے جھگڑوں سے بچنے کیلئے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم ہے تاکہ شر سے بچاؤ ہو جائے یعنی غرور کا جواب غرور سے نہ دینا چاہیئے بلکہ بچاؤ کا راستہ صرف اللہ سے پناہ جوئی ہے اور بس وغیرہ۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَ

بالیقین آسمانوں اور زمین کا (ابتداء) پیدا کرنا آدمیوں کے (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے لیکن اکثر آدمی (اتنی بات) نہیں سمجھتے اور

مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا

بینا نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکار باہم برابر نہیں ہوتے

مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی اس (کے آنے) میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں مگر اکثر لوگ نہیں مانتے

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ

اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کر لوں گا جو لوگ صرف میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب

جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ

(مرتے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہونگے اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (نفع کے) لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو (دیکھنے کے لئے) روشن بنایا

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

بیشک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا ہی فضل ہے لیکن اکثر آدمی (ان نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے یہ اللہ ہے تمہارا

رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ

رب ہے ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو (بعد اثبات توحید کے) تم لوگ (شرک کرکے) کہاں الٹے چلے جا رہے ہو اسی طرح وہ (پہلے)

كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاۗءَ

لوگ بھی الٹے چلا کرتے تھے جو اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے اللہ ہی ہے جس نے زمین کو (مخلوق کا) قرار بنایا اور آسمان کو (مثل) چھت (کے)

بِنَاۗءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ

بنایا اور تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں (پس) یہ اللہ ہے تمہارا رب

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ

سو بڑا عالیشان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے وہی (ازلی ابدی) زندہ (رہنے والا ہے) اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو تم (سب) خالص

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

اعتقاد کرکے اسکو پکارا کرو تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہان کا۔ آپ ان مشرکوں کو سنانے کیلئے کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس سے ممانعت کردی گئی ہے

دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کہ میں ان (شرکاء) کی عبادت کروں جن کو خدا کے علاوہ تم پکارتے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی نشانیاں آچکیں اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں (صرف) رب العالمین کے سامنے گردن

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا

جھکالوں وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر تم کو بچہ کرکے (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے

ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا

پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو پھر تاکہ تم بڈھے ہو جاؤ اور کوئی کوئی تم میں سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور تاکہ تم سب اپنے اپنے

أَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا

وقت مقررہ (مقدر) تک پہنچ جاؤ اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا) تاکہ تم لوگ سمجھو وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے پھر جب وہ کسی کام کا (دفعتہً) پورا کرنا

فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ○ ع أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ ۖ أَنَّىٰ

چاہتا ہے سو بس اس کی نسبت (اتنا) فرما دیتا ہے کہ ہو جاؤ سو وہ ہو جاتا ہے کیا آپ نے ان لوگوں کی حالت کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں (۷)

يُصْرَفُونَ ○ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ○

(حق سے) کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب (یعنی قرآن) کو جھٹلایا اور اس چیز کو بھی جو ہم نے اپنے پیغمبروں کو دے کر بھیجا تھا سو ان کو ابھی (یعنی قیامت میں)

إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ○ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ

جو قریب ہی معلوم ہوا جاتا ہے جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے۔ زنجیریں ان کو گھسیٹتے ہوتے کھولتے پانی میں لے جاویں گے پھر یہ آگ میں جھونک

يُسْجَرُونَ ○ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تُشْرِكُونَ ○ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ

دیئے جائیں گے پھر ان سے پوچھا جاوے گا کہ وہ (معبود) غیر اللہ کہاں گئے جن کو تم شریک (خدائی) ٹھہراتے تھے وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے

قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُو مِن قَبْلُ شَيْئًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ

غائب ہو گئے بلکہ ہم ان کے قبل کسی کو بھی نہیں پوجتے تھے اللہ تعالیٰ کافروں کو اسی طرح غلطی

الْكَافِرِينَ ○ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ

میں پھنسائے رکھتا ہے یہ (سزا) اس کے بدلے میں ہے کہ تم دنیا میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور اس کے بدلے

تَمْرَحُونَ ○ ع ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ○

میں ہے کہ تم اترایا کرتے تھے جہنم کے دروازوں میں گھسو (اور) ہمیشہ (ہمیشہ) اس میں رہو سو متکبرین کا (وہ) برا ٹھکانا ہے

تفسیر کیا قیامت آنی ممکن ہے اور تخلیق ثانی ہو سکتی ہے۔ اس کائنات کا خالق کون ہے۔ انسان کا خدا سے کیا ربط ہے۔ کیا ضرورت و البتہ ہے۔ یہاں حکومت اور تصرفات کس کے ہیں معبود ہونے کا استحقاق کس کو ہے۔ انسان مصیبت کے وقت کس کو پکارے کون اس کی کارسازی کرے۔ کیا خدا کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا درست ہے یہ سوالات عام طور پر اہل دانش کے دماغوں میں آتے ہیں۔ اور بے دانش کم فہم آدمی ان پر غور کرنے کی تکلیف ہی گوارہ نہیں کرتے۔ نابینا دماغوں والے ہر تکر و نظر سے بے نیاز ہو کر انسانیت کبریٰ کی تذلیل کرتے ہیں۔ اور مظاہر قدرت کو سجدہ گاہ و عقیدت قرار دے لیتے ہیں۔ قرآن برہانی طور پر تفکر و نظر کی دعوت دیتا ہے اور عقل کی روشنی میں تفکر و تدبر کا تقاضہ جبر کی طرف بلاتا ہے۔ اس کی نظر میں ہے کہ انسان کی تخلیق ارض و سما کی تخلیق سے آسان ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا تو

اگرچہ خلافِ عقل ہے، لیکن مساوی کو مساوی پر قیاس کرنا جائز ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا تو بالکل بدیہی الجواز ہے یہ صحیح کہ الف بار لکھنے والا بچہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں الف بار لکھ لیتا ہوں اس لئے بہترین خطاطی کر سکتا ہوں، لیکن حروف ہجا کو خوش خطی سے لکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پھر دوبارہ بھی حروف ہجا کو اچھی طرح تحریر کر سکتا ہوں۔ اور چین کا بہترین نقاش اگر معمولی نقش انگنی کا دعویٰ کرے تو اس کے اس دعوے کو کوئی ذی ہوش رد نہیں کر سکتا۔ پس جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی وہ کیا دوبارہ انسان کو نہیں بنا سکتا۔ اس واضح دلیل کا انکار کور دانشی ہے۔ نابینائی ہے۔ اچھا آسمان و زمین کا ذکر بھی جانے دو والا خطا کے سوا کوئی اور ہے۔ رات کو مہد سکون اور دن کو مرکز نور کس نے بنایا۔ بارش کہاں سے آتی ہے کون برساتا ہے۔ رزق کون دیتا ہے۔ کھیتوں کو سر سبز کون کرتا اور کون پاکیزہ پھل پیدا کرتا ہے۔ اچھا ان تمام آفاقی تصرفات سے قطع نظر کرو۔ اپنی ہی حالت پر غور کرو۔ تم کیا تھے قطرۂ بے جان کتنے تغیرات کے بعد آدمی بنے۔ ماں کے پیٹ میں کتنی تبدیلی منزلیں طے کیں۔ اس کو بھی جانے دو۔ لمبا اگرچہ ماں کے پیٹ میں تھے۔ اور تمام مراحل طے کر چکے ہو پھر بھی وہ کالی کوٹھری کا معاملہ تھا اس روشن دنیا میں آنے کے بعد کیا سے کیا ہوتے چلے جا رہے ہو۔ اسی پر غور کرو۔ بے شعور بچہ، باشعور بچہ، جوان بوڑھا کیا یہ تمہاری زندگی کے مراحل نہیں ہیں پھر کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے کوئی پہلے ہی مر جاتا ہے۔ کیا یہ تغیرات بھی تم کو نہیں دکھتے۔ اگر دکھائی دیتے ہیں تو بتاؤ ایسا کون کرتا ہے۔ کس کا حکم ہر آن جاری ساری ہے۔ کون الحی ہے کون ہر تغیر و فنا سے پاک کون رب العالمین ہے۔ سب کے لئے اسباب حیات پیدا کرنے اور فراہم کرنے والا کون الہٰ کارساز ہے۔ مرادیں دینے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا اگر اللہ کے سوا کوئی دوسرا ایسا نہیں تو پھر اسی کو پکارو اسی کے سامنے اپنی عبدیت کا اظہار کرو اسی کو معبود قرار دو۔ اس سے سرتابی نہ کرو۔ یاد رکھو کہ اس کے اس ہمہ گیر نظام کو تم توڑ نہیں سکتے۔ سرکشی کر نہیں سکتے۔ اگر عبدیت اور عجز و بے بسی کے بعد اس سے استکبار کرو گے، منہ موڑ دو گے، رشتۂ عبادت کو توڑو گے تو قیامت بہر حال آئے گی۔ اس روز سخت ذلت اور دکھ اٹھانا ہوگا۔ میں تم کو کہاں تک سمجھاؤں عقل کی آنکھیں کھولو اور دیکھو کیوں اندھے بنے ہوئے ہو۔ اندھا اور آنکھیا لا برابر نہیں ہو سکتا پھر فرماں بردار نیکو کار مومن بدکار کافر کی طرح ہو سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اکثر آدمی سوجھ بوجھ سے بے بہرہ ہیں۔ ان کی ساری معلومات حسی دائرہ کے اندر بند ہیں۔ عقل و برہان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ جو چیز ان کے حسی ادراک سے خارج ہو وہ ان کے لئے ناقابل قبول ہے، اسی لئے وہ قیامت کو حقیقت واقعیہ نہیں جانتے اور دوسری زندگی کے امکان کو اچنبھے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح غیر محسوس خدا کی ہستی کا اقرار ان کو بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ علت العلل واجب الوجود کا تعقل اور تسلیم کرنا ان کے بس کی چیز نہیں، اس لئے قرآن نے جابجا خالص برہانی رنگ کو چھوڑ کر تمثیل اور آثار سے استدلال کیا ہے۔ بے علم اہل جدال کا سرمایۂ جدال آخرت کا انکار ہے۔ اور جب قیامت کا امکان نہیں تو اخروی جزا سزا کا کیا امکان اور جب جزا سزا سے بے نیاز ہو گئے تو خیر و شر اور اچھے برے عمل کی کیا تمیز اور کیا ضرورت اور اعمال صالحہ و فاسدہ کی تمیز ضروری نہیں تو رسالت کتب سماویہ شرائع الٰہیہ اور خدا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ غرض اس طرح کوتاہ فہم والا نابینا آدمی مطلق العنان ہوس ران اور باعثِ فساد جہاں بن جاتا ہے۔ اس تمام خرافات کی تردید ان آیات سے شروع کی گئی ہے۔ خلق کے معنی ہیں ایک اندازۂ مخصوص کے ساتھ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور نیست سے ہست کرنا آدمی کو اللہ نے ایک خاص اندازہ کے ساتھ پیدا کیا اور دوبارہ زندگی بھی اللہ کے اندازہ کے تحت ہوگی۔ لیکن یہ بات بعید از فہم نہیں۔ کیونکہ اتنی بڑی کائنات یعنی آسمان زمین جب کچھ بھی نہ تھے تو اللہ نے ان کو مخصوص قدروں کے ساتھ ہستی کا جامہ پہنا دیا۔ یہ سوال کہاں سے آیا کیسے آیا اس کو کون لایا کس طاقت کے ساتھ لایا۔ ان کا مادہ پہلے کب تھا اور کیا تھا۔ اس کو سوچو پھر انسان کی تخلیق ثانی پر غور کرو جس میں صرف موجود مادہ کے مختلف ذرات کو جمع کرنا جوڑنا اور صورت کا لباس پہنانا پڑے گا جب سوچنے کے بعد ذہن اس نتیجہ پر پہنچے کہ مادہ کو عدم سے وجود میں لا کر صورت کا جامہ پہنا کر ایسی عظیم الشان کائنات کو اللہ نے پیدا کر دیا تو انسان کے موجودہ مادہ کے پراگندہ ذرات کو اکٹھا کر کے جوڑنا اور جیتا جاگتا انسان دوبارہ بنا دینا کیا دشوار ہے۔ امام رازی نے اس جگہ صراحت کی ہے کہ ادنیٰ کا اعلیٰ پر قیاس کرنا بالکل صحیح ہے جو شخص نے پرندہ درندہ یا انسان بنا کر اس میں روح پھونک دی وہ اگر دعویٰ کرے

کہ میں مٹی کا کھلونا بنا سکتا ہوں تو اس بات کا انکار کرنے والا کور دانش ہی ہو سکتا ہے۔ ہاں اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ الف بے لکھنے والے کا یہ دعویٰ کہ میں ابن مقنع اور عماد سے زیادہ اچھی تحریر لکھ سکتا ہوں بے بنیاد قرار پائے گا اور ایسے دعوے کے منکر کو نہیں بلکہ مدعی کو بے علم کہا جائے گا۔ ہاں جو شخص اوّل حقیقت کا انکار کرے گا وہ نابینا کہلائے گا۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ اور ظاہر ہے کہ نابینا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک روشن نظر رکھتا ہے ہر حقیقت کو دیکھتا ہے اچھے برے کی تمیز کرتا ہے پاکیزگی اور گندگی میں فرق کر سکتا ہے۔ خوبصورت خوش رنگ بدرنگ اور ان کیفیات میں امتیاز کر سکتا ہے جن کا تعلق نور بصارت سے ہے۔ رہا نابینا وہ تو بہر حال نابینا ہے۔ پاک ناپاک کی اس کو تمیز نہیں۔ خوبصورتی اور بدصورتی میں وہ فرق نہیں کر سکتا۔ سیدھا اور ٹیڑھا راستہ اس کی نظر بے بصر میں ایک جیسا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی گندی چیز کھا لے یا ٹیڑھے راستے پر چل کر کہیں کھائی خندق میں گر کر ہلاک ہو جائے یا کوئی موذی جانور اس کو کاٹ لے یا کوئی درندہ اس کو لقمہ بنا لے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ۔ صحیح فکر و نظر اور صالح عمل والا آدمی بھی نیکو کار خوش اطوار روشن نگاہ رکھنے والا آدمی ہے جو علمی و عملی صحت کا حامل ہے۔ اس کے نظریات صحیح افکار درست طریق فکر صائب اور اعمال صالح ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاہراہ حیات کو وہ صحیح سوجھ کے ساتھ آنکھوں سے دیکھ کر بخط مستقیم طے کرے گا نتیجہ میں نہ کسی درخت سے ٹکرائے گا نہ پہاڑ سے نہ کسی غار میں گرے گا نہ کنوئیں میں نہ اس کو کوئی گزندہ کاٹے گا نہ درندہ پھاڑے گا اور اس طرح عافیت کے ساتھ قیامت کے دن منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ رہا کافر بدکار تو چونکہ اس کا فہم غلط اندیش ہے اس کی فکر غیر صحیح ہے اس کی نظر روشن نہیں اس کی رفتار زندگی درست نہیں اس کا طریق رفتار بھی کج ہے، اس لئے وہ بصیرت کی روشنی میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے گا۔ کج مج راہوں اور پیچیدہ تنگ ڈنڈیوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ اور آخر کار دوزخ کے غار میں گر پڑے گا اور جہنم کے سانپ بچھو اس کو ڈس لیں گے اور سعیر و سقر کی آگ اس کو جھلسا دے گی۔

بہر حال یہ دونوں گروہ مساوی درجہ نہیں رکھتے۔ ایک یقینی النجات ہے اور دوسرا قطعی تباہ حال۔

قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ قلت، عدم کے معنی میں ہے اور خطاب کافروں کو ہے یعنی اے جدال کرنے والے کافرو تم کچھ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ دوسری قرأت میں يَتَذَكَّرُوْنَ بصیغۂ غائب آیا ہے یعنی اہل جدال نصیحت پذیر نہیں ہوتے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن کثیر کی تشریح اگرچہ عربی محاورہ کے موافق اور صحیح ہے، لیکن اگر قلیلی کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے تب بھی مطلب صحیح رہتا ہے کیونکہ بعض اوقات اہل جدال اپنے جدال کو چھوڑ کر نصیحت پذیر ہو جاتے تھے اور ہو جاتے ہیں یا یوں کہو کہ کبھی کچھ کچھ نصیحت مان لیتے ہیں۔ اگرچہ پوری طرح ہدایت پذیر نہیں ہوتے۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا۔ اوپر کی آیت میں وجود قیامت کی تمہیدی دلیل تھی اور یقینی تھی، اس لئے اس آیت میں اصل مدعا کو تاکیدی رنگ میں بیان فرمایا کہ ساعت معہودہ مقررہ یعنی ساعت قیامت ضرور آئے گی۔ شک کرنے والے شک کرتے رہیں اور اضطرابی حالت میں لوٹتے رہیں۔ ان کو اطمینان نہ ہو تو نہ ہو دلائل و براہین اور واقعہ کی شہادت قیامت کے یقینی الوقوع اور ناقابل شک ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ قیامت کا دن اگرچہ بہت لمبا ہو گا جس میں اعمال کی وزن کشی حساب فہمی اور فیصلے ہوں گے، لیکن حشر یعنی قبروں سے اٹھنا اور زندہ ہو کر نمودار ہونا لمبے وقت کا محتاج نہیں۔ تھوڑے وقت میں ہو جائے گا شاید اسی لئے لفظ ساعت سے تعبیر فرمایا۔ اس کے علاوہ انکار کرنے والوں کو سب سے بڑا شبہ تو حشر اجساد میں ہی تھا اور ہوتا ہے۔ فی الجملہ عذاب ثواب اور حساب کتاب کے تو اہل تناسخ بھی قائل ہیں، اس لئے قوت اور تاکید کے ساتھ حشر کو ہی بیان کرنا چاہیئے تھا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی وجود قیامت براہین کی روشنی میں یقینی ہے اور حشر ضرور ہو گا، مگر اس کے باوجود اکثر آدمی نہیں مانتے اور یقین نہیں رکھتے یعنی صرف عناد اور شرارت سے وجود قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ جب ثابت ہو گیا کہ دوبارہ زندگی ہو گی اور قیامت بپا ہو گی۔ اور جزا سزا بھی ہو گی تو بری زندگی کو ترک

اور اچھی کو اختیار کرنا چاہیئے ۔ لیکن اچھائی برائی اور حق و باطل کا فیصلہ کون کرے اور کون بتائے کہ صحیح عمل کون سا ہے اور غلط کون صالح کیا چیز ہے اور فاسد کیا ۔ تمیز خیر و شر کے لئے ضروری ہے کہ ہم غور کریں اور دیکھیں کہ ہماری یہ زندگی کس کی ممنون کرم ہے ۔ کون ہم کو عدم سے وجود میں لایا اور کس کی عنایت سے ہم کو جسمانی روحانی اور عقلی ترقیوں کے تدریجی اسباب فراہم ہوتے ہیں ۔ اور کس کا دست ربوبیت بغیر ذاتی مفاد کی خواہش کے ہم کو ساری ضروریات زندگی عطا فرماتا ہے ۔ چونکہ رب ایک ہی ہے ۔ کارساز چارہ ساز مخلوق نواز وہی ہے لہٰذا اسی کو حق ہے کہ وہ افکار و اعمال کی صحت و بطلان کی تعلیم دے ۔ پس وہی تمہارا رب ۔ مہربان نواز ندہ ۔ بندہ پرور کارساز حکم دیتا ہے کہ مجھ سے مانگو میں دوں گا ۔ مجھے پکارو میں تمہاری پکار مانوں گا ۔ مگر کیا مانگو اور کس لئے پکارو ظاہر ہے کہ تمہارا رب تمہارا بدخواہ نہیں ، اس لئے اس سے خیر ہی مانگو وہ خیر ہی دے گا ۔ اُس کے سامنے اپنی عبدیت کا قولی اور عملی اظہار کرو وہ نوازے گا ۔ مقصد یہ کہ اپنا تعلق اس سے جوڑو معبودیت اور عبدیت کے رشتہ کو نہ توڑو زندگی کی ہر رفتار کا رُخ اسی کی طرف کر دو عجز و عبادت کا مرکز اسی کو قرار دو ۔ ہر دکھ سکھ میں اسی کی خوشنودی کو پیش نظر رکھو تو بس بیڑا پار ہے ۔ اکثر اہل تفسیر نے اس جگہ دعا سے لفظی دعا مراد لی ہے ، اس لئے ان کو تفصیل کرنی پڑی کہ کیا مسلمان ہی کی دعا قبول کی جاتی ہے یا غیر مسلم کی بھی اور اجابت دعا کے کیا معنی ہیں کیا منہ مانگی ہر مراد مل جاتی ہے یا مصلحت الٰہیہ کی موافقت ضروری ہے اور کیا ہر دعا کا نتیجہ اس دنیا میں ہی ظاہر ہونا ضروری ہے یا بعض دعاؤں کا نتیجہ یہاں نہیں ملتا آخرت کیلئے ذخیرہ رہتا ہے ۔ ہم نے دعا اور اجابت کی جو تشریح کی ہے وہ کسی تفصیل اور استثناء کی محتاج نہیں ہے جس پکار کا آیت میں حکم دیا گیا ہے وہ توحیدی پکار ہے عبدیت کا اظہار ہے عبادت کا شعار ہے ۔ اللہ کی معبودیت اور الوہیت کا اقرار ہے ۔ بندگی کا عجز و انکسار ہے ۔ حکم معبود کے مطابق عبد کی گفتار ہے کردار ہے اور زندگی کی رفتار ہے اور اللہ کی طرف سے جس اجابت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ الٰہی عطوفت ہے ربانی رحمت ہے راہ مستقیم کی ہدایت ہے روحانی نور پاشی ہے عقلی جلوہ افگنی ہے دنیوی کامرانی اور سعادت ہے اُخروی نجات و مغفرت ہے اور بالآخر خطیرۂ قدس میں شامل کر کے عطاء قربت ہے ۔

نعمان بن بشیر راوی ہیں حضور نے فرمایا دعا کرنا عین عبادت ہے پھر حضور نے آیت اُدْعُونِی سے دَاخِرِیْنَ تک پڑھی (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن ابی حاتم وابن جریر وابو داؤد وابن حبان والحاکم وقال الترمذی حسن صحیح) محمد بن سعید کا قول ہے کہ محمد بن سلمہ انصاری کی وفات کے بعد ہم کو ان کی تلوار کی میان میں ایک تحریر ملی لکھا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں نے رسول اللہ سے سنا تھا فرماتے تھے تمہارے ایام زندگی میں تمہارے رب کی رحمت (کی ہواؤں) کے جھونکے (چلتے رہتے) ہیں تم کو چاہیئے کہ ان کے سامنے ٹھہرے رہو ۔ شاید کوئی دعا رحمت کے موافق پڑ جائے جس کے بعد دعا کرنے والے کو وہ سعادت مل جائے کہ اس کے بعد کسی طرح کا خسارہ ہی نہ ہو (رواہ الحافظ الحسن بن عبدالرحمٰن امر اہرمزی) وہیب بن الورد کو سیاحت روم کے درمیان کسی پہاڑ سے ایک ندا سنائی دی کوئی کہہ رہا تھا اے رب مجھے تعجب ہے کہ جس نے تجھے پہچانا وہ کس طرح تجھ سے تیرے سوا کوئی اور چیز مانگتا ہے ۔ اے رب مجھے تعجب ہے کہ جس نے تجھے پہچانا وہ کس طرح سوا تیرے کسی اور سے اپنی حاجات مانگتا ہے ۔ اے رب مجھے تعجب ہے جس نے تجھے پہچانا وہ کس طرح کسی غیر کو خوش کرنے کے لئے ایسا کام کرتا ہے جس میں تیری ناخوشی ہے ۔ وراق اور دوسرے علماء نے قبول دعا کی شرائط میں حلال غذا حلال پاک لباس صدق مقال خلوص قلب ماسوی کے خیال کی نفی اور تضرع وغیرہ کا ذکر کیا ہے ۔ بعض نے ان شرائط کے علاوہ دوسرے آداب دعا بھی ذکر کئے ہیں ۔ میری نظر میں جو چیزیں عبادت کیلئے ضروری ہیں وہ ہی دعا کے لئے بھی لازم ہیں ۔ دعا بھی عبادت ہے بلکہ عبدیت کا مکمل مجموعہ ۔ معبود کی تمام صفات منفی و مثبت کا یقین اسباب ظاہری و باطنی سے قطع اعتماد صرف ذات باری کو مرکز توجہ قرار دینا اپنے عجز کا اقرار گناہ کا اعتراف عفو کی درخواست اور محض ایک کام خدا طاقت کا غیبی مشاہدہ یہ تمام لوازم دعا کی ضروری شرائط ہیں ۔ بے ادبی اور سرکشی عزور اور رعونت کی حالت میں دعا کرنی دعا نہیں استہزاء ہے اور بقول وراق ایسی دعا سے بجائے فائدہ کے ضرر کا اندیشہ ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۔ حکم دعا اُن لوگوں کے لئے تھا جن کو اپنی عبدیت احتیاج عجز اور بیکسی و بے بضاعتی کا اقرار ہے جو معبود کو کارساز قاضی الحاجات متصرف کل اور حاکم مطلق جانتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کو اجابت کی خوشخبری دی گئی ہے

لیکن جن لوگوں کا اعتماد دولت سطوت حکومت روشنی عقل وسعت علم حسنِ تدبر ذاتی قابلیت بھائی بندوں کی کثرت غرض دنیوی اسباب میں سے کسی چیز پر ہے یا وہ کسی موہومی طاقت غیبی ملائکہ فطرت عالم طبائع مادیہ فرضی دیوتا ارواح کواکب اور خبیث شیاطین پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ان سے مدد کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اور انانیت وغرور کے ساتھ کارسازِ حقیقی کی بارگاہ سے منہ موڑتے ہیں۔ ایسے جھوٹے مغروروں کا ٹھکانہ جہنم ہے حکم دعا کے بعد اس آیت میں جو عَنْ عِبَادَتِیْ کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے دعا کرنی عبادت ہے یعنی دوسروں کو پکارنا شرک فی العبادت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کا حشر چیونٹیوں کی طرح ہوگا۔ اُن کی ذلت کیلئے ہر چیز اُن سے اونچی ہوگی۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو جہنم کے ایک قیدخانے میں جس کا نام بولس ہے داخل کیا جائے گا الخ (رواہ احمد والترمذی)

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ استحقاق الوہیت ثابت کرنے کے لئے قرآن جابجا اللہ کے آفاقی وانفسی انعامات کا تذکرہ کرتا ہے۔ ربوبیت عامہ اور عطوفت تامہ کو بیان فرما کر وحدتِ معبودیت پر استدلال کرتا ہے۔ بقول شیخ بوعلی سینا کے واجب الوجود کو ثابت کرنے کے لئے برہان لمی (علت سے معلول پر استدلال) تو ممکن نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آثار سے افعال پر افعال سے صفات پر اور صفات سے ذات پر استدلال کیا جائے۔ قرآن مجید کا استدلال صرف حکماء اور روشن عقل رکھنے والوں کی ہدایت کیلئے ہی نہیں ہوتا ایسے آدمیوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔ وہ دلیل وبرہان کو بیان کرنے میں بھی خطابی طرز اختیار کرتا ہے اور صرف حسی مشاہدات پر قناعت کرنے والوں کے لئے بھی سرمایۂ ہدایت فراہم کرتا ہے چنانچہ اس جگہ جہاں تخلیق زمانہ اور لیل ونہار کے چکر کو عدم سے وجود میں لانے کی صراحت فرمائی ہے اور خالص عقل سے ہر چیز کو ادراک کرنے والوں کو دعوتِ غور دی ہے وہاں فوائد لیل ونہار بھی بیان فرمائے ہیں اور تخلیق قادرانہ کے ساتھ انعام مربیانہ اور ربوبیت متفضلانہ کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ اللہ نے رات اور دن بنائے اس کی کیسی عظیم الشان قدرت اور راتہا طاقت ہے کہ ایسی لاکھوں میل لمبی چوڑی زمین بنائی پھر عظیم الشان سورج بنایا پھر زمین کو سورج کے یا سورج کو زمین کے گرد اگر دچکر دیا اور یہ دور روزانہ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کتنی غیبی طاقتوں کو برسرِ عمل کیا اور عرش سے فرش تک تیس چالیس کروڑ ستاروں کو حرکت دی تب کہیں یہ لیل ونہار نمودار ہوئے۔ تمام کروں کی حرکت کا توازن اور قوت وضعف کا تناسب حجم وثقل اور جذب کا توافق ان تمام چیزوں کو روز وشب کی تخلیق کا باعث قرار دیا، اس سے اس کی غیر محدود خلاقیت اور ہمہ گیر پُرحکمت قوت عمل کا پتہ چلتا ہے، کیا اس کے سوا کوئی اور ایسا خالق ہے روئی زمین کے سارے سائنس کے ماہر اور انجینئر اگرچہ تخلیق سے عاجز ہیں۔ کوئی ایک ذرہ کے مادہ کو بھی عدم سے وجود میں لانے پر قادر نہیں صرف پیدا شدہ اشیاء کا جوڑ توڑ اور تحلیل وترکیب ان کا کام ہے، لیکن کیا آج تک وہ کوئی دوسرا دلیل ونہار بنا سکے یا موجودہ گردش نور وظلمت کو روک سکے یا اس چکر میں ایک سیکنڈ کا تفاوت کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں عبدیت کے دائرہ سے باہر قدم نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کیوں ایسے خلاق کے سامنے سرنیاز نہیں جھکاتے اور کیوں استکبار وغرور کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔

اس خلاقیت کو سمجھنے کے بعد اب ذرا اللہ کی عمومی مہربانی اور شمولی عطوفت وربوبیت کو بھی دیکھو۔ یہ لیل ونہار کا چکر اس نے کیوں بنایا کیا اس سے اس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہے، جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی کو نقصان پہنچانے اور دشمنوں کو تباہ کرنے کے لئے اس نے ایسا کیا ہے۔ بداہۃً یہ دونوں باتیں نہیں نہ جلب نفع مقصود ہے نہ دفع ضرر بلکہ اس سارے چکر کی غرض صرف یہ ہے کہ تم کو فائدہ پہنچے پرسکون خنک رات اور روشن دن کی تخلیق بھی تمہارے فائدہ کے لئے ہے۔ روحانی قلبی اور جسمانی سکون کا گہوارہ رات ہے اور فضائل روحانیہ اخلاقیہ عمرانیہ، معاشیہ کا سرچشمہ دن ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو جسمانی راحت کیسے حاصل ہوتی دل کو چین اور روح کو سکون کس طرح میسر ہوتا بدن دماغ اور حواس دماغیہ کی تھکاوٹ کس طور سے دور ہوتی۔ یکسو ہو کر رب کریم کی بارگاہ تک رسائی کیوں کر نصیب ہوتی۔ یہ تمام کام رات ہی میں تو ہوتے ہیں۔ اور دن نہ ہوتا تو موجودات کائنات کی اچھائی برائی کیسے دکھتی۔ اشیاء کے حسن وقبح میں کس طرح تمیز ہوتی۔ ہزاروں واٹ کے برقی بلب کہاں کہاں

اورکس طور پر کام دیتے یعنی باڑی صنعت وحرفت امارت حکومت نظم ونسق اور تمام معاشی نظام کی سرانجام دہی اس طرح ہو سکتی۔ حقائق لیل و نہار پر غور کرنے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ فطری تقاضوں کو پورا کرتا اور رات و دن کو جن بشری فوائد کے لئے پیدا کیا گیا ہے حدود اطاعت میں رہ کر اُن کے حصول کی بیش از بیش جائز کوشش کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر آدمی ناشکرے ہیں۔ فکری یا عملی شرک میں مبتلا ہیں۔ احسان خدا کے کیا گُن دوسروں کے گاتے ہیں۔ بشریت کی تکمیل کے لئے لیل ونہار کا چکر قائم کیا گیا اور وہ اسی دور کو انسانیت کی تخفیف اور تباہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ راتوں کو تباہی انگیز منصوبے باندھنے اور ظلم وسفاکی کی اسکیمیں بنانے میں بے چینی کے ساتھ گنواتے یا فسق وفجور اور عیش ونشاط کی محفلیں گرم رکھنے میں گذار دیتے ہیں اور دن کی پوری مدت کو معصیت کوشیوں بادۂ تمرد کی سرجوشیوں اور حق فراموشیوں میں بسر کر دیتے ہیں فطرت خاطر کی یہ بڑی ناشکری ہے جس میں اکثر آدمی مبتلا ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ کلام سابق سے ثابت ہو گیا کہ اللہ ہی رب ہے اور وہی ہر چیز کا خالق ہے یعنی مالک منعم متصرف بھی وہی ہے جس نے لیل ونہار کو چکر دے کر آدمی کی ترتیب کا سامان فراہم کیا اور نہ فقط یہ کہ وہ ناظم مدبر اور مربی ہے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے۔ سمک سے سماک تک اور ثریٰ سے ثریا تک ہر شئی اسی کی مخلوق ہے اور ہر چیز کو اندازہ کے مطابق بنانا اور نیست سے ہست کرنا اسی کا کام ہے۔ یہ ساری تربیت تخلیق حکمرانی اور جہانبانی بتا رہی ہے کہ اللہ یعنی مستحق الوہیت وہی ہے۔ تمام صفات کمالیہ اسی کی ذات میں جمع ہیں۔ اور صفات نقص وعیب سے اس کی ہستی پاک ہے۔ پھر اس کی یہ الوہیت یہ مجموعۂ صفت کمال ہوتا اس کی وحدانیت پر دلالت کر رہا ہے۔ کسی میں نہ یہ قدرت تخلیق ہے نہ نظم چلانے اور نہ رب ہونے کی قابلیت۔ اسی لئے لا الٰہ الا ہو اس کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی مالک نہیں۔ کوئی آمر وناہی اور آئین ساز حیات نہیں۔ اُس سے اگر منہ موڑا اور رُخ پھیرا جائے تو کدھر کو اس کو چھوڑ کر جائے تو کس کو ڈھونڈا جائے (اے جدال کرنے والے بے وقوف تمہارے یہ گمراہ کن پیشوا یہ نافہم لیڈر یہ کوتاہ بین سردار اور یہ چالاک مشائخ) تمہاری زندگی کے رُخ کو کس کی طرف گھما رہے ہیں۔ اور کذب تراشی کے ساتھ تم کو کہاں لئے جا رہے ہیں۔ حقیقت میں خدا کو چھوڑنا اس سے منہ موڑنا شواہد فطرت اور آیات قدرت سے انکار پر مبنی ہے جو لوگ براہین ربوبیت اور نشانہائے الوہیت کا انکار کرتے ہیں ان کا رخ موڑ ہی دیا جاتا ہے اور غلط طور پر (خبیث شیطان عیار طاغوت اور فریبی مغوی) اُن کے دماغوں دلوں اور ساری قوتوں کو حق سے ہٹا کر غیر اللہ کی طرف لگا ہی دیتے ہیں یعنی شواہد فطرت کا انکار الوہیت کے انکار کا موجب ہو ہی جاتا ہے۔ گزشتہ اقوام وافراد بھی آیاتِ الٰہیہ کے انکار کرنے سے حق سے روگردان ہو ہی گئے تھے اور اغوا کرنے والوں نے ان کو اللہ کی طرف سے دوسری جانب غلط طور پر موڑ ہی دیا تھا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ۔ سابق آیات میں زمانہ کی تخلیق وگردش سے استدلال کیا تھا۔ اس آیت میں علوی اور سفلی مکان کی تخلیق نفع آفرینی اور بقاء حیات کے وسائل کی فراہمی اور (اندرونی قوتوں کے علاوہ بیرونی) صورتوں کی تحسین کو بطور انعام پیش کر کے اصل مقصد کو ثابت کیا ہے۔ آیت کے تین اجزاء ہیں۔

ا۔ اللہ نے انسانوں کے نفع کے لئے زمین کو قرارگاہ بنایا یہ لفظ اگرچہ مجمل ہے، لیکن معانی کو حاوی ہے۔ زمین میں تزلزل نہیں ظاہری کروٹ نہیں۔ دھنسا دینے والی نرمی نہیں۔ ناقابل قیام سختی نہیں۔ سطح ہی ہموار ہے۔ آرام دہ ہے ہوا مناسب، پانی موافق، فضا موزوں، ماحول اور افق مطابق ریگستانی سرد گرم ہوائیں سمیت کو دور کرنے والی سمندری مانسون خشکی کو دفع کرنے والی سرسبزی اور روئیدگی۔ راحت پہنچانے والی پہاڑوں کی میخیں بھونچال کے جھٹکوں کو روکنے والی دریاؤں کا اتار چڑھاؤ زمین میں صلاحیت کے غذا نے پیدا کرنے والا غرض یہ تمام احوال کیفیات اور کمیات زمین کو انسان کی قرارگاہ بنانے میں پورے پورے مددگار اور وحدانیت الٰہیہ کی برہان قاطع ہیں۔ اگر زمین میں تزلزل ہوتا تو کون اس کے تزلزل کو روکتا۔ ایک بیج بھی بو کر جاتے تو کوئی اس کو لوٹا کر سبز نہیں کر سکتا۔ پھر یہی نہیں بلکہ آسمان کو بطور چھت بنایا جو سائبان کی طرح دکھتا ہے۔ اگر اللہ کا یہ نظامِ حکومت نہ ہوتا آسمان وزمین تہ وبالا ہو جائیں۔ ہم نے وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً کی یہ تشریح دوسرے مفسروں کی تقلید میں کی ہے، لیکن الفاظ بکثرت معنی پر دلالت کر رہے ہیں۔ ہم الفاظ کو ملحوظ رکھتے ہوئے مزید تفصیل کرنی چاہتے ہیں۔ سماء لغت میں ہر بلندی کو کہتے ہیں۔ ارض وسماء تو

وہ تو مشہور ہی ہے۔ ہر کرہ بجائے خود سماء ہے۔ ہر ستارہ کو سماء کہا جا سکتا ہے اور بناء جس طرح چھت اور خیمہ کو کہتے ہیں اسی طرح ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر دوسری چیز بنی ہو یا جو خود بنی ہو۔ ابنیۃ البیوت اور بناء الوسیل کے الفاظ اس مدعا کے شاہد ہیں۔ اس توضیح سے یہ مطلب نکلا کہ اللہ نے ان محسوس بلندیوں کروں اور ستاروں کو موجوداتِ زمین کے لئے بناء بنایا ہے یعنی ان کی گردش حرکت خواص اور تاثیرات سے نظام ارضی وابستہ کیا ہے۔ سورج اور ستاروں کی روشنی اور روشنی کی تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ فصول کا تبادل، موسموں کا تغیر، سردی، گرمی، خریف اور ربیع کا انقلاب اور التطہیر۔ سبزہ کی روئیدگی یا بالیدگی کھیتوں کا جمنا بڑھنا، پھولنا پھلنا اور درختوں کا لباس تبدیل کرنا اور رنگ آفرین ہونا جانوروں کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں مختلف کیفیات اور اثرات کا ظہور ہمتوں میں بلندی یا پستی دماغوں میں تموج اور تصورات میں پرواز غرض زمین کے ہر تغیر کا سرچشمہ علوی تاثیرات ہیں۔ موالید ثلاثہ اور ان کے اجزاء اربعہ کی ہر کیفیت اور کمیت آباء علویہ سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ انسانی تعقلات کی رنگینی بھی منتہی طور پر عالم بالا کی مختلف طاقتوں سے مربوط ہے۔ ایک دانشمند نے سچ کہا ہے کہ درخت کی کوئی پتی ٹوٹ کر گرتی ہے تو اس سے دس کروڑ کروں کے تمام غیر مرئی ذرات میں ارتعاشی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ زنجیری سلسلہ حلقہ در حلقہ یونہی چلا جاتا ہے اور ایک قادر ممتاز حکمران مطلق اللہ برحق کی مشیت کے مطابق سارا سنسار گھوم رہا ہے اور جھوم رہا ہے اور چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔

۲۔ اللہ نے انسان کی شکل دوسرے جانداروں سے حسین بنائی۔ یوں تو کارخانہ قدرت میں کوئی چیز بھی بدصورت نہیں، عارف کی نظر میں فاطر کا حسن ہر چیز سے جھلک رہا ہے۔ جس نوع کا جس قسم کا تقاضہ نظم کائنات کو قائم رکھنے کیلئے تھا وہ پورا کر دیا گیا، قبیح ترین جانور کی شکل بھی اس کی نوعی اقتضائیات کے ماتحت حسین ہی ہے، لیکن انسان کو جو ناک نقشہ چہرہ مہرہ قد قامت اعضاء کا تناسب ہڈی گڈی رگ پٹھے اور گوشت پوست عنایت کیا گیا ہے وہ کسی جانور کو نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جانور کا قد بڑا ہو۔ کوئی ضخامت کے ساتھ طاقت بھی زیادہ رکھتا ہو۔ کوئی بہت چھوٹا اور کوئی بہت زیادہ کمزور ہو، لیکن قوت ضعف کلانی خوردی بلندی پستی فربہی اور لاغری کے اعتبار سے جو اعتدال انسانی اعضاء میں ہے اور جو جاذبیت آدمی کی صورت کو حاصل ہے وہ کسی کو میسر نہیں، مور رنگین ہے، حسین ہے، نظر کش ہے، لیکن انسانی رخسار کی برق پاشی کی ایک کرن بھی اس میں نہیں، شیر کا پنجہ بہت طاقتور ہے، مگر دست انسانی کی رعنائی زیبائی اور ناخن پوشی سے محروم۔ ہاتھی بہت ضخیم الجثہ جانور ہے۔ کالے پہاڑ کے چار آہنی کھمبے لگے ہوئے ہیں۔ لیکن پائے بشری کی ہمواری ایڑی پنجہ کے توازن کف پا اور پشت پا کے تناسب سے وہ یکسر خالی ہے۔ کیا ایسے محسن اور رحمٰن کی یہ مہربانی حکمت آفرینی اور قدر اندازی اس کی وحدانیت کو ثابت نہیں کر رہی ہے۔

۳۔ اللہ نے کھانے پینے اور پہننے کی پاکیزہ چیزیں عنایت فرمائیں۔ رزق طیبات بھی بہت جامع لفظ ہے۔ انسانی صحت حسن اور لطافت کو باقی رکھنے کیلئے مناسب، لذیذ اور صحت بخش مطعومات و مشروبات کی ضرورت تھی اور سردی گرمی سے محفوظ رکھنے، زہریلی ہوا سے بچانے اور موذی جراثیم کو دفع کرنے کے لئے نافع ترین لباس بھی لازم تھا، اللہ نے یہ تمام پاکیزہ چیزیں آدمی کو مرحمت فرمائیں اور ہر طرح کی غیر پاکیزہ مضر صحت تکلیف دہ غیر مناسب طعام و لباس سے روکا۔ یہ تو جسمانی پاکیزگی برقرار رکھنے کا سامان تھا۔ علمی اخلاقی اور عرفانی پاکیزگی پیدا کرنے اور فطرت سادہ کو برقرار رکھنے جو سرمایہ تربیت عنایت فرمایا وہ اس کی روحانی پاکیزگی کی ضمانت بنتی رہا ہے۔ پھر ذکر کے پاکیزہ کلمات فکر کے پاکیزہ نظریات اور فضائل تقویٰ کے لذیذ مزے جو عنایت فرمائے وہ مزید بالا و مزید ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ۔ ایسا جامع صفات کارساز اور مہربان خدا ہی تمہارا مالک ہے۔ رب ہے۔ تم مالک ہے۔ تم مملوک ہو تو اس کے مربوب ہو تو اس کے پھر اصل مالک کو چھوڑ کر دوسروں کو کیوں مالک بناتے ہو اور رب سے منہ موڑ کر غیر کو کیوں رب قرار دیتے ہو۔ کیا تم کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ سارا سنسار اللہ ہی کا مربوب ہے مملوک ہے وہی کل جہان کا مالک اور رب ہے اور مربوب اور مملوک کی ہر مشابہت سے مقدس ہے۔ سب ادنیٰ ہیں وہ اعلیٰ ہے۔ ہر چیز پست ہے وہ بالا ہے۔ مملوک کو مالک قرار دینا اور انہی صفات و خصوصیات کا حامل اس چیز کو ماننا جو اپنی ہستی اور بقاء ہستی میں بھی محتاج ہے حماقت نہیں تو اور کیا ہے یہ تمام سنسار اپنے آغاز و انجام کے لحاظ سے قطعاً فانی اور زندگی سے خالی ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی اور حقیقت میں صاحبِ حیات تو بس وہی ہے یعنی کسی دوسرے کی زندگی حقیقی نہیں۔ ظاہری صورتِ زندگی
ہے۔ فریبِ زندگی ہے۔ جس میں حیات ہو اس پر موت کیسے آسکتی ہے، اور وجود سے پہلے اس کا عدم کس طرح متصور ہو سکتا ہے اور
جو آغاز میں معدوم اور انجام میں مفقود ہو وہ درمیان میں صاحبِ حیات کہاں سے بن سکتا ہے۔ پھر جب کسی میں حیات ہی نہیں تو الوہیت
اور معبودیت کا وصف اس میں کیسے پایا جا سکتا ہے۔ صفاتِ کمال کا تحقق تو اصلِ حیات کا فرع ہے۔ جڑ نہیں تو شاخ کیسی۔ اگر کوئی
آدمی نہیں تو آدمی کے اچھے بُرے اوصاف سے اس کا کیا علاقہ۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں

فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ آیاتِ مندرجۂ بالا میں جب وحدتِ الوہیت کو متعدد دلائل کی روشنی میں ثابت کر دیا تو اس آیت
میں مسئلۂ اطاعت کو متفرع فرمایا۔ یاد رکھو کہ الوہیت اور توحیدِ الوہیت کا اقرار ایک نظری عقیدہ ہے جس کی صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس
نظریہ کو سمجھنے کے بعد مخلوق کا خالق سے تعلق اور انسان کا خدا سے ربط ہو جاتا ہے اور انسانی فکر کو ماسوا سے آزادی مل جاتی ہے، لیکن
باایں ہمہ صرف فکری درستی سے انسان کی زندگی درست نہیں ہو سکتی، انسان میں نظری قوت بھی ہے اور عملی طاقت بھی، روشن فکر رکھنے
کے بعد اگر عمل میں تاریکی ہو تو حیاتِ بشری کس طرح مکمل ہو سکتی ہے۔ دنیا میں عقیدتاً شرک رکھنے والوں کے علاوہ بکثرت آدمی توحیدِ نظری
کے مدعی ہیں۔ اللہ کو خالق، رزاق، مہربان، رحمٰن و رحیم اور الٰہِ برحق جانتے ہیں، لیکن عملی زندگی ان کی دو طرح سے گزرتی ہے۔ یا تو وہ
اپنی، اپنے ساتھیوں کی، اپنے بزرگوں کی، دنیا کے عقلمندوں کی، روشن دماغ فلاسفروں کی، چوٹی کے لیڈروں کی اور خاندانی سرداروں کی
عقل و فہم کو قوانین، اعمال اور ضوابطِ حیات کی ساخت پرداخت اور وضع کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے اُن کی
نظر میں شخصی یا جمہوری آئین سازی کافی ہوتی ہے، ہر روشن ذہن رکھنے والا تنہا یا دوسرے عقلمندوں کے ساتھ مل کر نہ فقط انسانوں
کے لئے دستورِ حیات بنانے کے لئے کافی نظر آتا ہے بلکہ دستور کے بنیادی نظریات بھی تاسیسی طور پر قائم کر سکتا ہے، اس لئے عملی
زندگی کے لئے خدا کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ شخصی اور عمرانی زندگی کی کتاب میں کسی جگہ خدا کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی ضرورت صرف
فطری تکوین و تخلیق کے لئے ہے۔ اس سے آگے جہاں سے ارادی شعوری اور غیر عزمی زندگی شروع ہوتی ہے وہاں سے انسانی دانش
کے تصرفات شروع ہوتے ہیں۔ سادہ سمجھدار انسانوں کی عقل خود رہنمائی کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی سمجھ کا آدمی بڑی سمجھ والے سے زندگی
کے تقاضے دریافت کر سکتا ہے اور نابالغ کو بالغ روش اور روش سکھا سکتا ہے۔ یہ گروہ گویا خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا قائل ہے
مگر فکری اور نظری طور پر عملی زندگی میں وہ انسان کو خدا سے بے نیاز جانتا ہے۔ اس گروہ کے عقلمندوں کی دماغی کھچڑیاں عملی زندگی میں جب
عملی زندگی میں کارفرما ہوتی ہیں تو چونکہ کوئی متفق علیہ مشترک صداقت نہیں ہوتی، اس لئے ایک ہی زمانہ اور ایک ہی مقام پر مختلف اوقات اور
مختلف ممالک میں باہم ٹکراتی ہیں۔ انسان فطرتاً خود رائی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ افلاطون ارسطو کی موافقت ہی کرے اور افلاطون کی ریاست
ارسطو کو بھی تسلیم ہو بلکہ یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ بعض انسان ایک ہی وقت میں ایک نظریۂ عمل کو صحیح سمجھتا ہے اور خود ہی مزید غور و فکر کے بعد دوسرے
وقت میں اس کو غلط قرار دیتا ہے۔ اس لئے تمام انسانوں کا تمام جہات کلی ممالک اور ہر وقت میں کسی ایک نظریۂ حیات پر عمل کرنا اور تصادم
تصادم نہ ہونا ممکن نہیں طاغوتی طاقتیں ضرور ٹکراتی ہیں۔ اور انسان کی بھری بھالی آبادیاں تباہ ہوتی ہیں۔ نسلِ انسانی ہلاک، کھیتیاں اُجاڑ اور
عمارتیں ویران ہو جاتی ہیں۔

مومنین کا دوسرا گروہ قائل ہے کہ قوانینِ زندگی بنانے کے لئے خدا کی ضرورت ہے، لیکن خدا کے کچھ نمائندے اس دنیا میں ہیں اور رہتے۔
وہ واقفِ اسرار ہیں عارفِ رموز ہیں مقربینِ بارگاہ ہیں۔ خدا کے چہیتے اور پیارے ہیں، اس لئے ان کی فرمان پذیری بعینہٖ خدائی فرمان
پذیری ہے۔ وہ شارع ہیں مقنن ہیں مؤسسِ آئین ہیں ماہرِ قوانین ہیں۔ اس لئے جہاں خدا کی اطاعت کی جائے وہاں ان کی خوشنودی حاصل
کرنی اور ہر [illegible] ہے۔ اللہ کے قوانین کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ خدائی زبان کے مطلب تک ہماری فہم کی رسائی نہیں۔
اس لئے [illegible] خداوندی کی [illegible] کے خلاف بھی ہم کو ان واقفانِ اسرار کی تشریحات کی پابندی کرنی چاہیے۔ حقیقت میں شیطان کا یہ ایک بڑا فریب

ہمہ رنگ زرین جال ہے جس میں وہ عوام کو پھنسا رہا ہے۔ دھوکہ دے کر عملی شرک کو توحید کی شکل میں پیش کر رہا ہے گویا وہ کہہ رہا ہے کہ کھاؤ خدا کا اور پکارو اپنے خود رو پیشواؤں کو، خود ساختہ رہنماؤں کو، بر خود غلط مدعیان عرفان کو، نری طاغوتوں کو اور کہیں وہ اس سے بھی زیادہ گہری وسیسہ کاری سے کام لیتا ہے اور کسی سچے عالم اور صادق عارف اور معصوم فرشتے اور معزز ولی مقرب کا نام لے کر کہتا ہے کہ یہ مسلم الثبوت حقائق شناس تھے۔ بجز شریعت کے تبرک تھے۔ اس لئے جہاں خدا کو پکارو ان کو بھی پکارو۔ یہ از خود کارخانۂ قدرت کے مالک نہیں، مگر نائب خدا ہیں، خلیفۃ اللہ ہیں۔ ان کے تصرفات کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ اس لئے ان سے مرادیں مانگو ان کو کارساز جانو اور قاضی الحاجات مانو شیطان کی یہ وسیسہ کاری سب سے زیادہ پُرفریب ہے۔ گویا اس نے بندوں کو خدا سے بے نیاز کر دیا اور سب کو چھٹی کا پیام دے دیا۔ انسانوں یا فرشتوں کو خدا اور بندوں کے درمیان حائل کر دیا۔ مخلوق کو اس کا قائم مقام کر دیا۔ قرآن نے کہا کہ جب تکوین تخلیق ربوبیت اور نظمی تصرفات میں تم خدا کو مالک و مختار بے ہمتا بے مثال اور ہر قسم کی مدد سے بے نیاز جانتے اور سمجھتے ہو تو اس کی اطاعت میں بھی کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اس کو پکارو خالص اطاعت کے ساتھ۔ جس طرح پکار اور دعا میں شرک و حرام ہے۔ اسی طرح اطاعت و فرماں پذیری میں بھی مشارکت ناجائز ہے یعنی اگر اس کی اطاعت سے کتنی ہی بڑی مخلوق روکے تو کسی کا کہنا نہ مانو۔ خالق کی معصیت اور مخلوق کی طاعت یہ صریحی عملی شرک ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ پروردگار عالم کا شکر ہے کہ اس نے زندگی کے بنیادی اصول کی تاسیس اپنے ہاتھ میں رکھی، اگر وہ تاسیس نہ کرتا اور یہ کام انسانوں پر چھوڑ دیتا تو انسان کی یہ آباد بستیاں اب سے بہت پہلے ٹکرا کر تباہ ہو چکی ہوتیں۔ ہر گروہ اپنے پیشوا کے اساسی قوانین کو برحق سمجھتا اور دوسرے کے اصول کو امن سوز قرار دیتا۔ اور امن کوشی کے بہانے سے اللہ کی ساری زمین کو معصوم بچوں، عاجز بیواؤں، ضعیف بوڑھوں اور بے زبان جانوروں کے خون سے رنگین کر دیتا۔ حقیقت میں وہ رب العالمین ہے پھر رب الناس کس طرح نہ ہوتا۔

ابن جریر نے لکھا ہے کہ علماء سلف کی ایک جماعت کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر توحید کا اقرار کرتا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھنے کا بھی اس کو حکم دیتے، ابن جریر نے ابن عباس کا بھی یہی قول مسنداً روایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ جب کوئی شخص آیت فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ پڑھے تو اس کے بعد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بھی کہے اور اس کے متصل ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ بھی پڑھے امام احمد کی روایت ہے کہ عبداللہ بن زبیر ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ الْحَسَنُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ عبداللہ بن زبیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر نماز کے بعد یہی تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے (وقد رواہ مسلم و ابو داؤد)

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ مذکورہ بالا آیات میں اللہ کی الوہیت کو شواہد و براہین کی روشنی میں ثابت کر کے خالص اطاعت اور عملی انقیاد کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آیت میں براہ راست حضور والا کو اور بالواسطہ ہر مومن کو نہی (اور امر کی شکل میں واضح طور پر اٹل فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پہلے توحید علمی و عملی کو سمجھنے کے لئے آفاقی اور انفسی آیات پر غور کرنے کی دعوت دی تھی اور اس آیت میں صاف ارشاد فرما دیا کہ جب اللہ کی طرف سے وحی آ گئی اور شواہد فطرت بھی سامنے آ گئے تو اب صاف کہہ دیجیے کہ تم اللہ کے علاوہ جن معبودوں کو پکارتے ہو مجھے ان کی عبادت (اطاعت اور پکارنے) کی ممانعت کر دی گئی ہے اور صرف رب العالمین کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت میں بینات سے مراد ہیں نقلی اور عقلی شواہد۔ اور عبادت کا لفظ ہر اطاعت کو شامل ہے اور اسلام سے مراد ہے عقیدۂ توحید کا شرعی اقرار اور عملاً احکام خداوندی کی پابندی۔

(نوٹ) اگرچہ تکوینی طور پر ساری کائنات اللہ کی فرماں بردار ہے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی، لیکن آیت میں اسلام سے مراد ہے ارادی شعوری اطاعت۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ الوہیت کے اسباب کا یہاں سے دوسرا طرز اختیار کیا۔ ان

آیات کے مطالعہ سے اللہ کی دقیق حکمت، عجیب صنعت، زبردست قدرت اور انسان کی ہر آن فنا پذیری اور زوال آگین ظاہر ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کتنا ہی بڑا انسان ہو مگر ہر آن فانی ہے۔ عنصری بے جان بے حس جامد حالت سے بدلتے بدلتے حالتِ پیری تک پہنچتا ہے اور بالآخر وقت مقررہ پر مرجاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کا حکم جاری اور ساری ہے۔ انسان کی موت اور زندگی اسی کے قبضہ میں ہے اس کو کسی چیز کی تخلیق اور نظم عالم کو چلانے کے لئے درمیانی مادی ذرائع کی بھی ضرورت نہیں نہ وزیروں اور کارندوں کی احتیاج ہے۔ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس کا ارادی امر ہی کافی ہوتا ہے جب چاہتا ہے فوراً سب کچھ ہو جاتا ہے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ ہر شخص کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔ شاید امام کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ انسانی ساخت میں مختلف عناصر کا دخل ہے، لیکن زیادہ حصہ مٹی کا ہی شامل ہے۔ دوسرے عناصر کا شمول تو صرف ضروری ہے۔ مٹی اور کھاد ہی سے سبزہ پیدا ہوتا ہے۔ سبزہ سے غلہ اور پھل بنتے ہیں۔ جو جانوروں اور انسانوں کی خوراک میں صرف ہوتے ہیں۔ جانوروں کا دودھ اور گوشت اسی خوراک سے بنتا ہے۔ دودھ سے گھی پنیر مکھن اور دہی بنتا ہے اور ان چیزوں کو انسان کھاتا ہے۔ انسانی خوراک سے چوتھے ہضم کے بعد نطفہ بنتا ہے۔

دوسرے اہل تفسیر کہتے ہیں کہ مٹی سے صرف آدم کو پیدا کیا گیا اور آدم کے اندر نطفہ بنا جس سے دوسرے آدمی پیدا ہوئے۔ آیت میں یہی مراد ہے۔ غرض سفید نطفہ پختگی کے بعد رحم مادر میں خون کا لوتھڑا بنا (اس کے بعد مضغہ گوشت کی حالت اور کیفیت پیدا ہوئی اور ترقی کرتے کرتے اندرونی اور بیرونی اعضاء کی جدا جدا تشکیل اور ساخت کی گئی اور ایک ہی مضغہ گوشت سے بنے ہوئے مختلف اجزائے جسم مختلف خصوصیات و فرائض کے حامل قرار دیئے گئے۔ کسی کا مزاج گرم ہوا کسی کا سرد کسی کا خشک کسی کا تر کسی کے ذمہ ہضم کا کام ہوا کسی کے ذمہ حرکت دینے اور حرکت پانے کا کوئی غور و فکر کا فاعل قرار پایا کوئی روح حیوانی یا نفسانی یا طبعی کا مرکز کسی کو شنوائی کی طاقت دی کسی کو دیکھنے کی، کسی کو سننے کی کسی کو چکھنے یا سونگھنے کی، غرض ایک مادہ سے بنے ہوئے اعضاء مختلف الامزجہ مختلف الخصوصیات اور مختلف الفرائض ہوگئے) اس کے بعد اسی مضغۂ بے جان کو خدا تعالیٰ جان دار بنا کر بچے کی شکل میں باہر لاتا ہے۔ (اس وقت بچہ بے شعور ہوتا ہے نہ اس میں نفع نقصان کی تمیز نہ دوست دشمن اور اپنے بیگانے کی شناخت، مجبور محض۔ اللہ اس کو دنیا میں لایا، آگیا، پیدا کیا ہوگیا۔ خورد و نوش کی طرف سے بے فکر، کمائی کی طرف سے غافل، اللہ اس کے لئے لطیف غذا کا انتظام کرتا ہے اس کی پرورش کے لئے دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔ اس کو پینا سکھاتا ہے۔ اس کے معدے اور آنتوں کو ہضم کرنا بتاتا ہے اس کے جسم کو لمبا چوڑا اور موٹا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بیٹھنا پھر کھڑا ہونا پھر چلنا پھرنا دوڑنا سیکھتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ سن شعور تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ پرورش کرتا رہتا ہے)

ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا اَشُدَّكُمْ تاکہ تم بڑے (ہوکر) قوت اور مضبوطی کی حد تک پہنچ جاؤ (ہاتھ پاؤں دل جگر اور دوسرے اعضاء مضبوط ہو جائیں جسمانی اور دماغی طاقتیں بھرپور ہو جائیں۔ پھر اسی طرح پالتے پالتے انحطاط کے دور تک پہنچاتا ہے تاکہ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا تم بوڑھے ہو جاؤ (اور اس تدریجی بلندی پستی اور ترقی و تنزل کا گہری نظر سے معائنہ کرو)

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ اور کچھ لوگ اس سے پہلے وفات پا جاتے ہیں، یعنی بڑھاپے سے پہلے جوانی میں یا جوانی سے بچپن میں مرجاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس تکوینی تغیرات میں تم بالکل عاجز اور مجبور ہو اللہ کا حکم ہر طرح جاری ہے۔ ہر آن وہ تم کو لوٹتا پلٹتا ہے وہ انتہائی کمزوری اور بے بسی کے بعد تم کو طاقت دیتا ہے تاکہ اس کی طاقت کا مطالعہ کرو اور قدرت کو دیکھو۔ اگر جوانی میں ہوش نہ آئے تو انحطاط اور زوال قوت کے زمانہ میں بیدار ہو جاؤ اور آنکھیں کھول کر اپنی مجبوری مقہوری اور عبدیت کو دیکھو اور تم کو کوئی عذر باقی نہ رہے۔

وَلِتَبْلُغُوٓا اَجَلًا مُّسَمًّى اور مقررہ میعاد زندگی تک پہنچ جاؤ۔ یعنی یہ سمجھ لو کہ آدمی کے لئے یوں تو ہر آن موت ہے گذشتہ حالت اور کیفیت کی موت مگر آخری زندگی کی جو مہلت مقرر کر دی گئی ہے، وہ بہر حال آئے گی۔ کتنی ہی طویل عمر ہو جائے موت کے پنجہ سے رہائی ناممکن ہے۔

وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ شاید تم سمجھ سے کام لو اور جان جاؤ (کہ ضعف کے بعد قوت اور قوت کے بعد ضعف خدا کی قوت قاہرہ پر دلالت کر رہا ہے

جس خدا نے عنصری حالت سے ترقی دے کر آدمیت کا لباس پہنایا وہ مرنے کے بعد پھر بھی زندہ کر سکتا ہے۔ (ابن جریج)

هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ غرض وہی زندہ کرتا ہے وہی موت بھیجتا ہے۔ یعنی ظاہری طور پر اگرچہ بچہ ماں کے پیٹ اور باپ کے نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں زندگی عطا کرنے والا خدا ہی ہے۔ یہ تو زندگی عطا کرنے کے راستے ہیں۔ اسی طرح آدمی اگرچہ بیماری سے یا کسی کی ضرب سے یا کسی اور طریقے سے مرتا ہے مگر موت بھیجنے والا اور مقررہ مدت حیات کو ختم کرنے والا خدا ہی ہے پھر زندگی اور موت بھیجنے کے لئے اس کو کسی سامان یا مددگار یا امداد زمانہ یا حالات کی موافقت کی بھی ضرورت نہیں بلکہ فَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ جب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور کسی کام کا فیصلہ کر چکتا ہے تو اس کا کن کہنا یعنی امر مشیت ہی اس امر کی سرانجام دہی کے لئے کافی ہوتا ہے (کوئی روک نہیں سکتا)

سورۃ یٰسین میں آیا ہے اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اور اس جگہ بجائے اَرَادَ کے لفظ قَضٰى استعمال فرمایا ہے۔ ہم نے وہاں لکھا تھا فَيَكُوْنُ، اِذَاۤ اَرَادَ کی جزا ہے اور اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ بدل ہے اور شَيْــًٔا مبدل منہ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے یعنی کسی چیز کے متعلق کُن کہنا چاہتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے، لیکن یہ تاویل اس جگہ نہیں ہو سکتی کیونکہ فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ کو اس جگہ اَمْرًا سے بدل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اِنَّمَا کا لفظ اس سے انکار کر رہا ہے، اس لئے بظاہر یہی مطلب نکلے گا کہ اللہ کن کہتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔ اس مطلب پر مختلف رنگ میں شبہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کیا کسی چیز کی تخلیق کے لئے خدا کو کن کہنے کی ضرورت ہے صرف ارادہ کافی نہیں ہے۔ لفظ کن زمانی ہے۔ اس لفظ کو کہنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے خواہ کتنا ہی قلیل وقت ہو تو کیا تخلیق الٰہی زمانہ کی محتاج ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر چیز کا ظرف زمانہ ہے لیکن زمانہ کی تخلیق کے لئے کوئی دوسرا زمانہ نہیں۔ اگر ہے تو یہ سلسلہ غیر متناہی تک پہنچے گا یا اول زمانہ کی تخلیق کا ظرف زمانہ کو قرار نہیں دیا جائے گا۔ پھر ہر خطاب موجود سے ہوتا ہے معدوم کو حکم دینے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ جب کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو اس کو مخاطب کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام شبہات کے ازالہ کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ شک کلام لفظی پر ہو سکتا ہے۔ اور اللہ کا کلام حقیقت میں کلام نفسی ہے جو قدیم ہے وہاں نہ کوئی ماضی ہے نہ حال نہ استقبال نہ واقع نہ منتظر الوقوع، ارادہ کی ایک لہر اور علمی موجودات کی طرف مشیت کی ایک توجہ ظہور کائنات کے لئے کافی ہے۔ ساری کائنات ازل سے ابد تک علم الٰہی میں مفصل موجود ہے جس چیز کو عالم ظہور میں لانا چاہتا ہے اپنی علمی لوح میں اس کی طرف توجہ فرماتا ہے وہ چیز نمودار ہو جاتی ہے۔ اس چاہنے کی تعبیر سورۂ یٰسین والی آیت میں لفظ اَرَادَ سے اور اس جگہ لفظ قَضٰى سے کی ہے اور علمی لوح کی طرف توجہ کو قول کُن سے تعبیر کیا ہے ورنہ واقع میں نہ وہاں الفاظ ہیں نہ قول نہ زمانہ نہ زمانیات نہ حروف مقطعہ نہ صوت متبدل زوال پذیر۔ اگر ہماری زبان میں دقیق ترین لفظ کوئی مل سکتا ہے تو ہم اس کے فعل کو آنی کہہ سکتے ہیں۔ مگر واقع میں وہ آنی بھی نہیں۔ صرف اپنی معلومات قدیمہ کی طرف توجہ کسی چیز کے ظہور حدوثی کے لئے کافی ہے۔ والعلم عند اللہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ۔ آدمی کے تخلیقی تغیرات فنا پذیری اور مجبوری و عجز کو بیان کرنے اور اپنی قوت قاہرہ اور قدرت باہرہ کی صراحت کرنے کے بعد اب روئے کلام انہیں اہل جدال کی طرف موڑا جو بے دلیل کٹ حجتیاں کرتے اور اللہ کی کھلی ہوئی نشانیوں میں جھگڑا کرتے ہیں (اور ان تغیرات کو کبھی طبعی کبھی دہری کبھی اتفاقی اور کبھی مجہول الحال علتی قرار دیتے ہیں اور تصرفات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں) اَلَمْ تَرَ سے خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اصالۃً اور ہر مخاطب کو نیابۃً ہے اور استفہام تعجبی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھو ان جھگڑا کرنے والوں کی حالت بھی عجیب ہے شواہد الٰہیہ میں جدال کرتے ہیں ان کا رخ کدھر کو ہے کس طرف (حکم ہٗ) ان کے رخ کو موڑا جا رہا ہے یعنی حق و صداقت سے روگرداں اور کذب و باطل کے لئے کوشاں اور رواں دواں۔

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۣ۟ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ۔ گزشتہ آیات پر استدلال کو ختم کر دیا لیکن اہل جدال کا جدال ختم نہ ہوا انہوں نے بصیرت کا مقابلہ نابینائی سے معقول کا وہم سے صداقت کا کذب سے اور حق کا باطل سے کیا اور سمجھ کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی تو (آخر الدواء الکی۔ علاج کا آخری نمبر داغ لگانا) لامحالہ جب تک غلط اندیشی کج روی اور بداعمالی کا نتیجہ عملاً ان کے سامنے نہ آجائے اور اپنی کج رفتاری کی سزا میں گرفتار نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کی سمجھ میں کوئی صداقت آ ہی نہیں سکتی۔ نافہم کج اندیش آدمی جب تک اپنے

کسی کی سزا میں گرفتار نہ ہو جائے اور بدکرداری کے نتیجہ بد کو آنکھوں سے نہ دیکھ لے بلکہ جب تک اُس کا مزہ نہ چکھ لے اُس وقت تک وہ اپنی غلط روی کو تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ جو لوگ اللہ کی کتابوں اور پیغمبروں کی وحی و رسالت کا انکار کرتے ہیں قیامت کے دن جب طوق و زنجیروں میں جکڑے ہوئے دوزخ کی آگ میں جھونکے جائیں گے اور اُبلتے کھولتے پانی میں ان کو گھسیٹا جائے گا اُس وقت ان کو یقین آئے گا اور حقیقت کو سمجھیں گے۔

یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ۔ حمیم سے مراد ہے وہ گرم پانی جس کی گرمی سے حسب صراحت حدیث پینے والے کی آنتیں کٹ کر گریں گی۔ زقوم کی خوراک ملنے کا تذکرہ اس آیت میں نہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ ثم کا مفہوم اس جگہ صرف تراخی اور تعقیب زمانی کے لئے نہیں ہے بلکہ مختلف تکالیف کا اظہار مقصود ہے۔ کبھی شدت بھوک و پیاس میں حمیم و زقوم کی جانب کھینچا جائے گا۔ کبھی آگ میں جھونکا جائے گا۔

ثُمَّ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا۔ دوزخ میں داخل کر دینے اور مختلف عذابوں میں مبتلا کر دینے کے بعد (دوزخ کے فرشتوں کے ذریعہ سے) اُن سے دریافت کیا جائے گا اب وہ چیزیں جن کو خدا کی خدائی میں تم شریک جانتے تھے کہاں ہیں۔ لفظ (ما غیر عقل چیزوں کے لئے عربی میں مستعمل ہے) بتا رہا ہے کہ تانبے پیتل لوہے پتھر اور دوسری چیزوں سے بنائے ہوئے بتوں اور درختوں اور دریاؤں اور ستاروں اور بسیط عنصروں غرض ان تمام بے عقل چیزوں کے متعلق سوال ہوگا جن کو کارساز یا مظہر الوہیت سمجھ کر اہل شرک پوجتے ہیں۔ یا ما کا لفظ عام ہے۔ اس میں وہ تمام ظاہری اور غیبی معبود داخل ہیں جن کی مدد کے بھروسے پر اُن کی پوجا ہوتی ہے۔ حضرت مسیح حضرت عزیر ملائکہ بعض دوسرے انبیاء اور اولیاء۔ جامد اور نامی مخلوق۔ سماوی و ارضی طاقتیں اور ان کے مظاہر وغیرہ۔ ملائکہ انبیاء اور صلحاء کی شفاعت حق ہے اور شفاعت بھی ایک قسم کی مدد ہے، لیکن مشرکوں کے متعلق کوئی بھی شفاعت نہ کرے گا۔ اور آیت میں صرف مشرکوں کی حالت کا بیان ہے، اس لئے ایمان دار گنہگاروں کے متعلق شفاعت کا رد اس آیت سے مستنبط نہیں ہو سکتا فرشتے جب ان کذاب مشرکوں سے ان فرضی کارسازوں کے متعلق دریافت کریں گے جن کی وہ پوجا کرتے تھے تو دوزخی جواب دیں گے وہ کھو گئے۔ اس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ آج ہم کو وہ نظر نہیں آتے معلوم نہیں کہاں گئے۔ دوسرا مطلب یہ کہ آج وہ ہماری مدد نہ کر سکے ہم کو ان سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَیْئًا۔ مندرجہ بالا جواب کے بعد دوزخیوں کو شاید خیال ہوگا کہ ممکن ہے جھوٹ بولنے سے کچھ فائدہ مل جائے اور بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا جائے، اس لئے کلام اول سے اعراض کرتے ہوئے کہیں گے ہم تو اس سے پہلے کسی چیز کو بھی نہیں پکارتے تھے یعنی کسی کی مدد کے خواستگار اور کسی کے پجاری نہ تھے دوسری آیت میں اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا۔ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے حضور نے آیت اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ الخ تلاوت فرمائی پھر فرمایا اگر سر کے برابر رنگ کا ایک گولہ آسمان سے زمین کی طرف پھینکا جائے تو رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا۔ حالانکہ یہ درمیانی مسافت پانچ سو برس کی راہ ہے، لیکن اگر دوزخیوں کی زنجیر کے ایک سرے سے اُس کو (جہنم کے اندر) پھینکا جائے تو قعر جہنم تک پہنچنے میں چالیس برس دن رات اُس کو چلنا پڑے گا۔ (رواہ احمد والحاکم وابن مردویہ والبیہقی والترمذی وقال حدیث حسن)

كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِیْنَ۔ دنیا میں کافر گمراہ تھے۔ آخرت میں بھی اُن کا باطن خبث سے بھرا ہوا ہوگا۔ دنیا میں بھی جھوٹ بولتے تھے اور فرضی خداؤں کو عبادت اور پکار میں اللہ کا شریک بناتے تھے قیامت کے دن بھی جھوٹ بولیں گے اور شرک سے صراحتاً انکار کر دیں گے۔ اللہ ہی کافروں کو گمراہ چھوڑ دیتا ہے یعنی ان کا کفر ان کی منبع ہے۔ جب انہوں نے کفر کیا تو کفر کے سبب اللہ نے بھی ان کو ہدایت نہیں کی۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ۔ یہ سزا دنیا میں اترانے اور اکڑتے پھرنے کی ہوگی یعنی ناحق بے دلیل خود رائی اور غرور کے زیر اثر جو اہل حق کے مقابلے میں کافر اکڑتے اور اپنی حکمت و دانش اور سیادت و وجاہت پر اتراتے تھے اور حق کی طرف توجہ کرنا

بھی گوارا نہیں کرتے تھے ۔ قیامت کے دن اُس کی یہ سزا ہوگی اور ان کو حکم دیا جائے گا کہ
اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔ جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے ۔ تکبر کرنے والوں کا وہی ٹھکانہ ہے اور بُرا ہے ۔ ابواب جہنم کا بیان دوسری آیت میں اس طرح آیا ہے ۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ جہنم کے سات دروازے ہیں ۔ ہر دروازے کے لئے کافروں کی جماعت کا ایک تقسیم شدہ حصہ مقرر ہے ۔
خود رائی اور غرورِ نفس بُری بلا ہے ۔ صداقت کو ٹھکرانے کا زہریلا مادّہ اسی کان سے پیدا ہوتا ہے ۔ متکبر کبھی مومن نہیں بن سکتا ۔ حدیث میں وارد ہے ۔ لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ جب تک تمہاری نفسانی خواہش وحی رسالت کے تابع نہ ہوجائے تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا ۔

تفسیری غلط فہمی

علامہ قرطبی نے کہا آیت قدسیہ میں جدال و عذاب کی صراحت فرقۂ قدریہ کے متعلق ہے ۔ یہ ہی اکثر اہل کا خیال ہے ۔ یہاں تک کہ ابن سیرین نے فرمایا اگر قدریہ کے متعلق یہ آیت نہ ہو پھر مجھے معلوم نہیں کہ کس کے حق میں ہے ۔

ازالہ

حقیقت میں یہ فہم کی غلطی ہے ۔ حضور والا کے زمانے میں جب کہ قرآن مجید نازل ہو رہا تھا خصوصاً مکی زندگی میں جب کہ ان آیات کا نزول ہوا تھا ۔ اس اسلامی فرقۂ قدریہ کا وجود ہی کب تھا ۔ معتزلہ خوارج اور دوسرے اسلامی دورکے قدریہ کا چوتھی خلافت کے عہد سے نمودار ہوئے بلکہ ان میں سے بعض تو دوسری اور تیسری صدی ہجری کے پیداشدہ ہیں ۔ اہلِ تفسیر کو غیر مسلم قدریہ میں جزو مشترک دیکھ کر اشتباہ ہوگیا ۔ عموماً مجوسی اور نصاریٰ کا ایک فرقہ واقعی قدریہ تھا جو قرآن مجید کا منکر تھا خالق شر اہرمن یا شیطان کو جانتا تھا ۔ مانویہ ثنویہ اور بعض دوسرے فرقوں کا یہی خیال تھا ۔ اُن کا ایمان نہ قرآن پر تھا نہ وحی و رسالت پر ۔ معتزلہ کو اسلامی قدریہ صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ افعال عباد کا خالق خود عباد کو قرار دیتا ہے ۔ اُس کی نظر میں جس طرح کسب قبیح قبیح ہے اُسی طرح خلق شر بھی شر ہے ۔ اس فرقہ کا عقیدہ صداقت قرآن اور حقانیت وحی و رسالت کا ہے ۔ یہ تقدیر کا بھی قائل ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ جو آیات اور احادیث قدر خالق کی نفی کر رہی ہیں اُن کی وہ تاویل کرتا ہے ۔ اور اشاعرہ کے خیال میں اُس کی تاویل زائغ اور غیر صحیح ہے ، اسی لئے اس کے اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ کبھی اہل السنۃ والجماعۃ نے نہیں دیا ۔ ہاں چونکہ وہ صحابہ و تابعین کے اجماع کو نہیں مانتا اور احادیث صحیحہ کی غلط تاویلیں کرتا ہے ۔ اس وجہ سے اہلِ سنت اُس کو گمراہ اور بدعتی کہتے ہیں اور فاسق بسبب العقیدہ ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں ۔ غرض جس قدریہ بیان آیاتِ مذکورہ میں ہے اور جن کے متعلق دوامی جہنمی ہونے کی نص ہے وہ وہی ہیں جو نزولِ آیات کے وقت یا اُس سے پہلے سے تھے ۔
علامہ نسفی نے فرمایا اس سورت میں اہل جدال کا تذکرہ تین جگہ کیا گیا ہے ۔ شاید یہ ایک ہی فرقہ ہو جس کا ذکر تین مرتبہ کیا گیا ، لیکن ظاہر یہ ہے کہ کافروں کے یہ الگ الگ تین فرقے تھے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے اعتقاد کے موافق آیاتِ الٰہیہ میں جدال کرتا تھا ۔ غالباً علامہ کی مراد یہ ہے کہ تمام کافروں کے درمیان اگرچہ قدر مشترک شرک و کفر ہے ، مگر نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے ہر فرقہ کا عقیدہ جدا ہے ۔ مثلاً بُت پرست بھی مشرک تھے اور تثلیثی نصاریٰ بھی اور ثنویہ مجوسی بھی اور سب کا شمار اہل جدال میں سے تھا ، لیکن ان کے عقائد میں باہم بھی بڑا فرق تھا ۔ قدر مشترک کے اعتبار سے ایک فرقہ تھا اسلام کے خلاف صف آراء اور امتیازات و خصوصیات کے لحاظ سے تین فرقے تھے ۔ ایک اب ابن اور روح القدس میں الوہیت کو دائر سمجھنے والا دوسرا یزدان اور اہرمن کو جدا جدا خالق قرار دینے والا ۔ اوّل الذکر لاتعداد معبودوں کے سامنے سر جھکانے والا ۔ یہ تینوں فرقے نظریاتِ اسلام کے خلاف عقیدہ رکھتے تھے تو یہ ذاتی و صفاتی کے سب منکر تھے تقدیر کا کوئی قائل نہ تھا ۔ حسب تفصیل قرآن روز قیامت کو کوئی نہ مانتا تھا ۔ بعث جسمانی اعمال کی وزن کشی اور جزئی جزئی حساب فہمی کا عقیدہ سب کے خیال میں غلط تھا تمام یا اکثر انبیاء کی تکذیب ہر ایک گروہ کرتا تھا ۔ خلاق کا تعدد اگرچہ ثنویہ کے علاوہ بُت پرستوں کو تسلیم نہ تھا ، لیکن الوہیت کا عموم اور اشتراک سب مانتے تھے ۔ لہٰذا ان سب کا رد آیات مذکورہ میں کیا گیا ۔

مقصودِ بیان ۔ آیت اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں حکم دعا اور قبول دعا کا وعدہ منصوص ہے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سے دو باتیں مستفاد ہو رہی ہیں۔ ایک یہ کہ دعا بھی عبادت ہے۔ یا یوں کہو کہ قضاءِ حاجات اور امداد کیلئے فریاد کرنی اور پکار مچانی ایک قسم کی پوجا ہے۔ عبدیت اور بندگی کا اظہار ہے۔ اپنے عجز و ضعف اور مغیث و مجیب کی کارسازی کے عقیدے کی تصریح ہے، اسی لئے جہاں اللہ سے دعا کرنی لازم ہے وہاں دوسروں کو پکارنا اور تصورِ عبدیت کے ساتھ استغاثہ کرنا حرام ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تکبر اصل شرک ہے یعنی اللہ کے احکام اور اللہ کے پیغمبروں سے جو مغرورانہ سرکشی کرے ان کو حقیر ناقابلِ توجہ اور داستانِ پارینہ جانے وہ واقعی مشرک ہے۔

لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جسمانی قلبی اور روحانی سکون کے لئے رات بنائی گئی ہے، اس لئے جہاں جسمانی تعب کو دور کرنا ضروری ہے وہاں قلبی سکون روحانی خنکی کو حاصل کرنا بھی لازمی ہے یعنی رات کے تین حصے کئے جائیں۔ ایک آرام کا۔ ایک اہل و عیال سے مشغولیت کا اور ایک مراقبہ اور مشاہدہ کا

وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی کد و کاوش عمرانی فلاح و امن کوشش اور سیاسی تنظیم یہ تمام مشاغل دن کے ہیں۔ غرض روشنی کے محتاج جس قدر فرائضِ حیات ہیں اُن کی سرانجام دہی دن کو کرنی چاہیئے۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ سے در پردہ ایماء اس طرف ہے کہ مختلف مذاہب کے اکثر پیرو صحیح توحید پر قائم نہیں رہے۔ یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ تعداد مدعیانِ مذہب کی ہے اور ہر مذہب والا عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ ظالم نہیں مہربان ہے اور زبان سے وہ خدا کی یاد بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس لئے زیادہ تعداد شکرگزاروں کی ہوئی، لیکن زبانی شکر اور عملی شرک قابلِ اعتبار نہیں۔ توحید کا دعویٰ اور شرک سے بھرا ہوا۔ زبان سے اللہ کی نعمتوں کا اقرار اور صفاتِ الوہیت میں دوسروں کو شریک بنانا یہ شکر نہیں استہزاء ہے، اسی لئے اس آیت میں اکثر لوگوں کے ناشکرے ہونے کی صراحت فرمائی۔

ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس فقرے سے چار بنیادی عقائد سمجھ میں آتے ہیں۔ لفظ اللہ سے الوہیت۔ لفظ رب سے ربوبیت۔ لفظ خالق سے خلاقیت اور لا الٰہ الا ھو سے وحدت معبودیت۔ یہ اتنا جامع جملہ اور پُر جلال استدلال ہے کہ تفصیل کے لئے کئی کتابیں درکار ہیں۔ مجمل خاکہ یہ ہے کہ اللہ کا رب اور خالق ہونا ناقابلِ انکار ہے اور ربوبیت و خلاقیت کا استحقاق اسی کو ہو سکتا ہے جس میں الوہیت ہو اور الوہیت عقلاً شرکت سے انکار کرتی ہے، اس لئے اللہ وحدہٗ لاشریک ہے یا یوں کہو کہ الوہیت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو رب اور خالق ہو۔ اگر ایجاد اور تربیت کا کسی سے رشتہ نہ ہو تو کیوں اس کو الٰہ مانا جائے۔ پس جو رب اور خالق ہے وہی اللہ ہے اور جامع صفاتِ کمالیہ ہونا وحدت کو چاہتا ہے۔ اس مفہوم میں چند شریک نہیں ہو سکتے، اس لئے اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

وَالسَّمَآءَ بِنَآءً کی لطیف توضیح ہم تفسیر کے وقت کر چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علویات کی تاثیرات پر موجوداتِ ارضی کا نظام موقوف ہے کارخانۂ قدرت کو قادر اسی طرح چلا رہا ہے مگر کسی ستارے کی کوئی تاثیر حقیقی نہیں اختیاری نہیں بلکہ خواص اضطراری ہیں، اسی لئے لفظ بناء استعمال کیا۔ یعنی کسی بنانے والے نے علویات کو ایسا بنایا ہے جس طرح باپ اثر آفریں اور ماں اثر اندوز ہوتی ہے اور دونوں کے اتصال سے بچے بقدرتِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین قرارِ مستقر اور محلِ قبول بنائی گئی اور فضاءِ سماوی کو اثر افگن اور مبنی بنایا گیا اور دونوں کے باہم تاثیر و تاثر سے نظامِ ارضی قائم کیا گیا۔ هُوَ الْحَیُّ کے لفظ سے حیاۃ کا حصر اللہ کی ذات میں ثابت ہو رہا ہے۔ اس سے ماسویٰ خدا کی حیات کی نفی مستفاد ہوتی ہے۔ اگر وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والے اس جملہ سے اپنے عقیدہ پر استدلال کریں تو کر سکتے ہیں۔ یعنی اللہ کے علاوہ دوسروں کی زندگی، زندگی نما فریب ہے۔ حقیقۃً عدم ہے۔ ظاہر میں وجود رکھتا ہے۔ جب اللہ کے سوا ساری کائنات کی حیات مجازی ہے تو اس کی جتنی خصوصیات اور احکام ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ غیر حقیقی کے لئے حقیقی احکام کا ثبوت حقیقۃً نہیں ہو سکتا۔

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ سے مترشح ہو رہا ہے کہ سرکشی اور نافرمانی کی حالت میں پکارنا شرعی دعا نہیں۔ اللہ کو پکارنے کے لئے اس کی خالص

اطاعت لازم ہے اطاعت کسی اور کی اور پکارنا خدا کو یہ فریب ہے۔ اس سے یہ امر بھی فی الجملہ مستنبط ہوتا ہے کہ پوری زندگی کو اصول شریعت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے اور حصول مقصد کے جن ذرائع کو استعمال کرنے کا شریعت نے حکم دیا یا اجازت دی ہے ان سب کو بقدر امکان فراہم کرنے کے بعد خدا سے دعا کرنی چاہیئے تاکہ بقدر استطاعت جس قوت کو خدا نے مہیا کرنے کا حکم دیا ہے اس کی بھی تعمیل ہو جائے اور قوت ممکنہ کے موثر ہونے کا عقیدہ بھی نہ پیدا ہو حقیقت میں اخلاص دینی اور خلوص نیت کے ساتھ دعا کرنے سے شرک کے ہر شائبہ کا استیصال ہو جاتا ہے اور بھولا ہوا تعلق خدا سے جڑ جاتا ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیق تربیت اور ارادی زندگی کے بنیادی اصول کی تاسیس اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھی یہ اُس کا کرم ہے اور اس پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کاموں میں کسی دوسرے کی شرکت ہوتی تو خدا جانے نظام کائنات کس قدر درہم برہم ہو جاتا۔ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ سے ثابت ہو رہا ہے کہ قوام بشری تخلیقی مادہ خاک ہی ہے اور خاک ہی (بقدر ضرورت دوسرے عناصر کو ساتھ لے کر) بہت تالیفوں میں سے گزرتی ہوئی اور چند در چند مناظر تکوینی کی سیر کرتی نطفی دور تک پہنچتی ہے۔

وَلِتَبۡلُغُوۡۤا اَجَلًا مُّسَمًّی سے واضح ہو رہا ہے کہ زندگی کی مدت ہر شخص کی مقرر ہے۔ گویا ہر شخص کی مدت حیات کو نشانہ مدار بنا دیا گیا جس میں دواؤں یا دعاؤں سے کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تسمیۂ اجل اس طرح کر دیا گیا ہو کہ اگر یہ شخص فلاں دوائیں یا غذائیں کھائیگا اور فلاں تدابیر صحت جاری رکھے گا اور بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوگا تو اس کی عمر سو سال ہوگی اور ایسا نہیں کرے گا تو ساٹھ سال ہوگی اور یہ خدا کو معلوم ہے کہ وہ شخص ایسا کرے گا یا نہیں، اس لئے اُس کی عمر بھی تسمیۂ الٰہی کے موافق ہی ہوگی۔

فَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔ اس آیت سے چند امور مستفاد ہوتے ہیں ۱؎ قضاء الٰہی امر سے پہلے ہوتی ہے یا سورۂ یٰسین والی آیت کی صراحت کے موافق یوں کہو کہ ارادۂ الٰہی امر سے پہلے ہوتا ہے پھر ۲؎ امر کا ظہور آتا ہے۔ ۳؎ اس کے بعد شئی موجود یا معدوم ہوتی ہے یعنی اقتضاء امر پورا ہو جاتا ہے گویا امر تکوینی قضا کا نتیجہ ہے اور وجود مامور بہ امر کا اثر ہے۔ ۴؎ حکم اور مامور بہ کے درمیان زمانی تاخیر نہیں ہوتی حکم کے بعد فوراً مامور بہ موجود ہو جاتا ہے۔

ذٰلِکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ بر خود غلطی خود پنداری اور غرور نفس شان عبدیت کے خلاف ہیں۔ حق و صداقت کے مقابلے میں جاہلانہ اکڑ تباہی کا موجب ہے اور ایسے آدمی کی سزا دوامی جہنم ہے وغیرہ۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا

اور جب اُن سے اس طرح انتقام لیا جاوے گا تو آپ (چندے) صبر کیجئے بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے پھر جس عذاب کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ تھوڑا سا عذاب

یُرۡجَعُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَیۡکَ وَمِنۡہُمۡ

اگر ہم آپ کو دکھلا دیں یا اس کے نزول کے قبل ہی ہم آپ کو وفات دیدیں سو ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہوگا اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو ایسے ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان کیا اور

مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَیۡکَ ؕ وَمَا کَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ فَاِذَا جَآءَ

ان کا امر سب میں مشترک ہے کہ کسی رسول سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی معجزہ بدون اذنِ الٰہی کے ظاہر کر سکے پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزولِ عذاب

اَمۡرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالۡحَقِّ وَخَسِرَ ہُنَالِکَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ۝ ع ۱۰/۱۳

کے لئے) آوے گا ٹھیک ٹھیک فیصلہ ہو جائے گا اور اس وقت اہلِ باطل خسارہ میں رہ جاویں گے

تفسیر آغاز انسان سے آخری دور نبوت تک بکثرت انبیاء آئے۔ بعض کے نام اور احوال قرآن میں مذکور ہیں۔ اور بعض کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ اقوام عالم کو ہدایت کرنے کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں اللہ کی طرف سے پیغمبر بکثرت پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنا فرض رسالت ادا کیا۔ پیام الٰہی پہنچایا۔ بھلائیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے باز داشت کی۔ غرض عقائد کو صحیح اور اعمال کو درست کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے مانا اور اکثر نے مخالفت کی اور بطور عناد پیہم معجزات طلب کیے۔ معجزہ ظاہر کرنا اور حدود بشریت میں رہتے ہوئے بشری طاقت سے زیادہ اور عجیب کارنامہ از خود دکھانا پیغمبروں کی طاقت سے باہر تھا۔ اللہ نے جب مناسب سمجھا اور جس قدر واقعی ضرورت ہوئی اس وقت اور اسی قدر معجزات کا ظہور اپنے پیغمبروں کے ہاتھوں سے کرا دیا۔ تمام مطالبات کا پورا کرنا چونکہ فضول تھا، اس لیے ہر طلب پر معجزہ نہیں دکھایا گیا۔ رفتہ رفتہ مخالفت بڑھی اپنی قوم دشمن بن گئی۔ بیگانے اور یگانے در پے آزار ہو گئے۔ اللہ نے پیغمبروں اور ان کے ایماندار ساتھیوں سے نصرت کا وعدہ کیا اور حکم دیا کہ وہ شدائد پر صبر اور ایمان صالح پر استقامت رکھیں۔ ایمانداروں نے حکم کی تعمیل کی۔ انبیاء اور صلحاء پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ کبھی دکھ اور سختی نے جھنجوڑ ڈالا۔ نتیجہ میں اکثر پیغمبر اپنی زندگیوں میں ہی کافروں پر غالب آ گئے اور اعداء خدا کا تختہ تاراج کر دیا گیا۔ بعض پیغمبر شہید بھی ہوئے مگر پیغمبروں کے جانشینوں کی قیادت میں ایمانداروں کی جماعت کو ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔ بعینہ یہی حال حضور اقدس کی نبوت کے دور میں بھی ہوا۔ حضور تشریف لائے اعلان توحید کیا۔ اصلاح اعمال کی کوشش کی، ٹھوس روشن دلیلیں پیش کیں۔ آخرت کے ثواب کا امید وار بنایا اور عذاب سے ڈرایا۔ کوئی طریقہ سود مند نہ ہوا۔ کافروں نے عناداً پیہم معجزات طلب کیے۔ اللہ کا فرمان آیا کہ منہ مانگے معجزے نہیں ملا کرتے۔ کوئی پیغمبر از خود معجزہ دکھانے کا مجاز نہیں۔ اللہ کی اذن کے بغیر کوئی پیغمبر کچھ نہیں کر سکتا۔ کفار کا عناد اور بڑھا جدال تک نوبت پہنچی۔ ہر آن ہر قدم پر دکھ دینے لگے۔ حضور کی اور مسلمانوں کی زندگی دوبھر کر دی۔ اللہ کا حکم آیا اپنی کوشش میں کمی نہ کرو اور مصائب پر صبر رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے وہ کامیابی ضرور دے گا۔ تمہارے دشمن ضرور تباہ ہوں گے وہ اقتدار اعلیٰ دنیا میں تمہارے ہاتھ میں آئے گا۔ مخالفت کرنے والے ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی تم سرخرو ہو گے اور کافر ذلیل و خوار طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ تمام کامیابیاں رسول کی زندگی میں ہی حاصل ہو جائیں اور آپ کے سامنے ہی سب کافروں کو تباہ کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وعدۂ خدا کے مطابق کچھ عزت و اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ رسول اللہ کی زندگی میں ہی آجائے اور کچھ باطل پرست تباہ کر دیئے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کی وفات سے پہلے ہو جائے اور مسلمانوں کو دنیوی کامیابی بعد کو ملے۔ اور دشمنوں کی بربادی بھی بعد کو ہی ہو، لیکن مرنے کے بعد قیامت کے دن لوٹ کر سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے وہ موعودہ سزا ضرور دے گا اور دنیا میں بھی جب اللہ کا حکم پورا ہونے کا وقت آئے گا اُس وقت باطل پرست تباہ کر دیئے جائیں گے کوئی اُن کو بچا نہ سکے گا اور اہل ایمان کی جماعت غالب آئے گی کوئی اس کو روک نہ سکے گا۔

تحلیل اجزاء فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ عربی زبان میں وعدہ اور وعید کا مادہ اگرچہ ایک ہے، لیکن استعمال اور محل استعمال کے لحاظ سے فرق ہے۔ مستقبل میں نفع پہنچانے والی ترغیب کو وعدہ کہتے ہیں اور ضرر رساں تخویف کو وعید۔ اللہ نے کچھ وعدے مسلمانوں سے کیے تھے اور کچھ دھمکیاں کافروں کو دی تھیں۔ تسلط و اقتدار اور عرب و عجم کی حکومت عطا کرنے کا اعلان اور آخرت میں فلاح و کامرانی کی بشارت اہل ایمان کے لیے تھی اور دنیا میں ذلت و خواری تباہی محکومی کی تنبیہ اور مرنے کے بعد طرح طرح کے دکھ میں مبتلا کرنے کی تخویف کافروں کو دی تھی، لیکن اس کے لیے شرط یہ تھی کہ مسلمان اپنی امکانی کوشش میں کمی نہ کریں اور دشمنوں کی طرف سے پہنچنے والی کسی مصیبت سے تنگ نہ آجائیں۔ ایمان اور اعمال صالحہ پر استقامت رکھیں۔ آپس کی تنظیم درست رکھیں۔ کافروں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کیسا ہی دکھ پہنچے مگر جمے رہیں۔ استقلال اور برداشت میں کمی نہ آنے پائے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انسانی طاقت محدود ہے۔ کوئی آدمی پہاڑ کیسے سر پر اٹھا سکتا ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں براہ راست رسول پاک کو اور بالواسطہ ہر مومن کو دوبارہ تلقین فرمائی کہ صبر قائم رکھو اللہ کا وعدہ یقیناً سچا اور برحق ہے ضرور پورا ہو گا، لیکن کب ہو گا تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ ۔ یا تو تمہاری زندگی ہی میں ہم کو کافروں کے متعلق دی گئی بعض وعیدیں عملی شکل میں تم کو دکھادی جائیں گی یعنی کافروں کو ذلیل وخوار محکوم غلام اور مسلمانوں کو با اقتدار حکمران اور غالب بنادیں گے ۔

اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ ۔ یا تمہاری وفات ہوجائے گی (اور تمہارے بعد پورا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئے گا ۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ) لوٹ کر ان سب کو ہمارے ہی پاس آنا ہے آخرت کے عذاب سے بچ نہیں سکتے ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ واقعات بھی بیان آیات کے موافق ہوئے جنگ بدر میں سب سے اوّل کافروں کے لیڈر مارے گئے ان کا کچھ زور ٹوٹا بلکہ حق و باطل کا فیصلہ بھی اس معرکہ میں ہوگیا پھر مکہ فتح ہوا اور مسلمان غالب آئے پھر رفتہ رفتہ اکثر قبائل عرب نے اسلام کے سامنے سر جھکا دیا اور کل جزیرۂ عرب پر مسلمان چھا گئے اور ان کی حکومت ہوگئی پھر حضور والا کی وفات کے بعد شام، عراق، مصر اور روم وایران پر اسلامی پرچم لہراگیا ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ یعنی ہمیشہ سے سنت اللہ یہی رہی ہے وہ پیغمبر جن کا خدا نے تذکرہ کردیا ہے مثلاً نوح ابراہیم اسحاق موسیٰ عیسیٰ وغیرہ اور وہ انبیاء جن کا تذکرہ ناموں کے ساتھ نہیں کیا مثلاً حقوق دانیال شعیا وغیرہ ان سب کے متعلق کافروں کا یہی طریقہ رہا ۔ دکھ پہنچاتے رہے ہاتھوں سے بھی اور زبانوں سے بھی اور انہوں نے دکھ کو برداشت کیا ۔ شدائد پر صبر کیا ۔ اللہ پر بھی بھروسہ کیا استقامت قائم رکھی آخر اللہ نے ان کو نصرت یاب کیا کسی کو اس کی زندگی میں اور کسی کی اُمّت کو پیغمبر کی وفات کے بعد ۔ بہرحال اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہا ۔ اسی طرح وہ تم کو کامیاب اور کافروں کو ذلیل کرے گا مگر صبر رکھو ۔ رہا کافروں کا ہر قدم پر یہ مطالبہ کہ معجزہ دکھاؤ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹادو ، سچائی کی شہادت کے لئے فرشتوں کو بلاؤ ، ہم پر فوری عذاب لے آؤ ، دنیا پر ابھی اقتدار جماکے دکھاؤ ۔ اس قسم کی خرافات ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہے لیکن

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ کسی پیغمبر میں یہ طاقت نہ تھی نہ اُس کے لئے یہ مناسب تھا کہ اللہ کی اذن کے بغیر از خود کوئی معجزہ نمودار کردیتا ۔ یعنی یہ تو اللہ کی حکمت اور مصلحت ہے وہ جب چاہتا ہے پیغمبر کے ہاتھ سے معجزہ ظاہر کرا دیتا ہے ۔ خود پیغمبر کو معجزہ نمائی کا اختیار نہیں

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ جب بھی اللہ کا حکم آیا ٹھیک ٹھیک جاری کردیا گیا اور اہل باطل کو گھاٹا اٹھانا پڑا یعنی جب اور جہاں مناسب سمجھا گیا حکم دیا گیا اور نفاذ حکم کے ساتھ ہی کافروں پر تباہی آگئی ۔ آیت میں دو لفظ حل طلب ہیں ۔ ایک یہ کہ اس آیت میں قضا کو مشروط بالامر کیا ہے یعنی امر پہلے آتا ہے اور قضا پیچھے ۔ حالانکہ چند آیات پہلے فرمایا تھا ۔ فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تخلیق مشروط بالقضاء ہے یعنی قضا خداوندی پہلے ہوتی ہے اور امر تخلیق پیچھے ۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ مقدم الذکر آیت میں قضا سے مراد ارادہ اور مشیت ہے اور امر آتا ہے پیچھے یعنی جب اللہ کا ارادہ کسی چیز کی تخلیق وتکوین کا ہوتا ہے تو وہ حکم دیتا ہے اور فوراً وہ چیز پیدا ہوجاتی ہے ۔ اس آیت میں امر اللہ سے مراد ہے حکم اور قضاء سے مراد ہے حکم کا نفاذ یعنی جب اللہ کا حکم آجاتا ہے تو اس کا نفاذ پورا پورا ہوجاتا ہے اور کام تمام کردیا جاتا ہے ۔ دوسرا لفظ هُنَالِكَ ہے ۔ یہ لفظ اصل میں ظرف مکان ہے یعنی اُس موقع پر باطل پرست برباد ہوجاتے ہیں ۔ ظرف زمان بھی مراد لیا جاسکتا ہے یعنی اُس وقت یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ ان حالات میں باطل کوش تباہ ہوجاتے ہیں ۔

مقصود بیان

فَاصْبِرْ کے لفظ سے معلوم ہورہا ہے کہ صبر شرعی لازم ہے یعنی بقدرِ استطاعت کوشش اور پھر معاملات کی اللہ کو تفویض ۔ فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الخ سے ثابت ہورہا ہے کہ نصرت الٰہیہ کے معنی صرف یہی نہیں کہ کسی خاص شخص کی زندگی میں اُس کو کامیابی حاصل ہوجائے بلکہ مشن اور جماعت کی کامیابی بھی نصرتِ الٰہیہ کی ایک صورت ہے ۔ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ سے یہ واضح ہورہا ہے کہ امر اللہ کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور امر کے بعد اس کا نفاذ فوراً ہوجاتا ہے ۔ یعنی اللہ کا ہر امر مبرم ہی ہوتا ہے اگرچہ بظاہر وہ معلق نظر آئے وغیرہ ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِیْهَا

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے مواشی بنائے تاکہ ان میں بعض سے سواری لو اور ان میں بعض (ایسے ہیں کہ) اُن کو کھاتے ہو۔ اور تمہارے لئے ان میں

مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝

اور بھی بہت فائدے ہیں (اور اس لئے بنائے) تاکہ تم اُن پر اپنے مطلب کو پہنچو جو تمہارے دلوں میں ہے اور اُن پر (بھی) اور کشتی پر (بھی) لدے پھرتے

وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ۝

پھرتے ہو اور (ان کے علاوہ) تم کو اپنی اور بھی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے سو تم اللہ کی کون کونسی نشانیوں کا انکار کرو گے

تفسیر

آدمی کی یہ کیسی خود فریبی ہے کہ تکوینی بے بسی کے باوجود اپنی طاقتوں کو مختار فہم و دانش کو مؤثر اور حس و ادراک کو حاکم جانتا ہے۔ نہ فقط اپنی شخصی اور جمہوری تقاضوں کو بلکہ کل کائنات کو اپنے ارادہ کا مسخر اور اپنے شعور و فہم کا تابع خیال کرتا ہے۔ کہتا ہے ہوا میری محکوم ہے، پانی میرا مملوک، زمین میری باندی، پہاڑ میرے غلام، موسمی تغیرات میرے فرمان بردار یہاں تک کہ اس خلاکی بھی اہر پر بھی میرے قابو میں ہوائی پریں اُڑ سکتا ہوں اور ہوا کے رُخ پر کنٹرول کر سکتا ہوں، پانی پر ہزاروں ٹن وزنی جہاز میں لے جا سکتا ہوں۔ کیا مجال کہ جہاز ڈوب جائے اور یہ گھوڑے گدھے خچر بیل گائے بھینس بھیڑ بکری وغیرہ تو یہ بہر حال میرے زیر نگین ہیں جس طرح چاہوں ان کو استعمال کروں۔ ذبح کروں گوشت کھاؤں، کھال کھینچوں، چربی، سینگ، اُون، آنت اور تانت کو کام میں لاؤں۔ دل چاہے تو زندہ رہنے دوں۔ پالوں دودھ نکالوں گھی کھاؤں یا سواری لوں بوجھ لادوں، ہل چلاؤں گاڑی میں جوتوں۔ غرض نطفہ حقیر سے بنا ہوا یہ کس عاجز انسان اپنی جسمانی اور دماغی طاقتوں پر اتنا اتراتا اور اکڑتا ہے کہ وہ کائنات کا حکمران مطلق اپنی ذات کو سمجھ لیتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ اس کے اندر یہ تمام طاقتیں خدا داد ہیں خود آوردہ نہیں تکوینی ہیں اختراعی نہیں۔ انسان مظہر ہے مظہر نہیں مشین ہے ڈرائیور نہیں۔ ان تمام تخیلات اور بلند پروازیوں کے نشہ سے سرشار ہو کر اتنا نہیں سمجھتا کہ چوپایہ کی کھال پر بال کس نے جمائے۔ تھنوں میں دودھ اور دودھ میں مکھن کس نے پیدا کیا۔ گھوڑے گدھے اور خچر بیل اونٹ اور ہاتھی کی تخلیق کس نے کی۔ کیا آدمی نے کوئی جاندار یا بے جان مخلوق پیدا کی ہے۔ پھر ان سب کو آدمی کو فرماں بردار اور تابع کس نے قرار دیا۔ اگر یہ جانور تخلیقاً کام کے ہی نہ ہوتے یا فرماں برداری کا خمیر اُن میں نہ ہوتا تو آدمی کس سے اپنا کام چلاتا اور کیسے چلاتا۔ یہ جانور اور ان کے منافع (بلکہ کل عناصر اور عناصر کے مرکبات) تو قدرت کے نشانات ہیں اصل منزل کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ آخر ان لاتعداد آیات قدرت اور آثار فطرت میں کس کا انکار آدمی کر سکتا ہے اور وہ کون چیز ہے جس کا خالق اور مختار مطلق اپنے کو قرار دے سکتا ہے۔

تحلیل اجزاء

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ ۔ انسانی صنعت کو جن چیزوں کی بناوٹ میں دخل ہے وہاں شیطانی دماغ رکھنے والا انسان اپنی مختاری اور خود اختیاری کا شیفتہ و فریفتہ ہو کر کوس لمن الملک بجانے لگتا ہے۔ قدرتی مرکبات کی تحلیل اور نئے اشکال کی ترکیب یعنی اُس کا محض ساختہ جوڑ توڑ اس کو فریب خوردہ بلکہ خود غلط بنا دیتا ہے اور وہ اپنے کو کارساز سمجھنے لگتا ہے۔ کہتا ہے میں ریل کا موجد ہوں میں نے مشینیں ایجاد کی ہیں۔ ہوائی جہاز میرے اختراع کردہ ہیں اور مادہ کے پوست کندہ احوال میں عدم سے وجود میں لایا ہوں گو اس کا یہ ہرزہ سرائی اپنی جگہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ ایجاد و اختراع الگ چیز ہے اور تحلیل و ترکیب جدا حقیقت ہے۔ پھر بھی انسانی مصنوعات کو اپنی قدرت اور ارادہ کی طرف منسوب کرنے کا اس کو دانش انسان کو ظاہری موقع مل سکتا ہے۔ لیکن جاندار چیزوں کی پیدائش کا دعویٰ تو کوئی غلط طور پر بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے چوپائے بنائے۔ اس لفظ سے جہاں اللہ کی خلاقیت کا اظہار ہو رہا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ

کہ ان کی تخلیق آدمی کے نفع کے لئے کی گئی ہے۔ گویا اللہ چوپایوں کا خالق ہے تو انسانوں کا رب بھی ہے۔

لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۔ کچھ چوپائے آدمی کی سواری کے کام میں آتے ہیں اور کچھ انسانی خوراک کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ گویا (جانوروں کے گوشت چربی دودھ وغیرہ سے انسانی خوراک کا فراہم ہونا فطری ہے)

وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ مویشیوں سے آدمی کے دوسرے منافع بھی وابستہ ہیں۔ چوپایوں کے اجزاء بدن سب ہی کار آمد ہیں۔ غذائی دوائی اور تمدنی ضروریات میں سب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ منافع بے شمار تھے تفصیل دشوار تھی، اس لئے بعض منافع کا ذکر فرما کر مجملاً وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ فرمادیا۔ خطیب کا یہ خیال صحیح ہے۔ کچھ منافع کا ظہور اب تک ہو چکا ہے اور ان گنت فوائد ابھی تک پوشیدہ ہیں۔

وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ بعض جانور سواری اور دوسری اغراض کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً ڈاک پہنچانا نیزہ بازی کرنا پولو کھیلنا شکار کرنا جہاد کرنا وغیرہ۔ غرض دل میں جو مقصد ہو اس کے حصول کی کوشش میں کبھی بعض جانور بھی کام دیتے ہیں۔

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں کہا ہے کہ جانوروں اور کشتیوں پر سامان معیشت لادنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانا مراد ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر اس آیت کو ذاتی سواری پر محمول کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جانوروں اور کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو۔ شیخ ابن کثیر کے نزدیک الانعام سے صرف اونٹ گائے اور بکریاں مراد ہیں۔ گائے بھینس کو بھی شامل ہے اور بکری کے ذیل میں بھیڑ اور دنبہ بھی داخل ہے۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنْكِرُونَ ۔ یہ گزشتہ تمام دلیلوں کا خلاصہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تم کو اپنی قدرت حکمت صنعت ربوبیت الوہیت اور وحدانیت کی محسوس نشانیاں دکھاتا ہے۔ خالص عقلی براہین کا سمجھنا اور غیر معقول کو محسوس کی طرح سمجھنا تمہیں دشوار ہے، لیکن آنکھوں دیکھی حقائق اور مشاہدات کا انکار کون کر سکتا ہے۔

مقصود بیان مشاہدہ اور معائنہ سے کام لینے کی طرف اشارہ یعنی نظر جانوروں اور چیزوں کے منافع کو نظر غور سے دیکھنے اور ان سے اللہ کی ذات و صفات پر استدلال کرنے کی پر لطف تلمیح۔ اس بات پر نازک دلالت کہ انسان فاعل مختار نہیں عاجز ہے۔ اللہ نے اس کے منافع کی چیزوں کی تخلیق ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ ہر چیز سے قدرت کی تخلیقی حدود کے اندر رہتے ہوئے فائدہ اندوز ہو سکے۔

لِتَأْكُلُوا مِنْهَا سے جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت فطری مستنبط کی جاسکتی ہے یعنی گوشت انسان کی فطری غذا ہے جس کو چھوڑنے سے فطری غذا کا ایک حصہ کم ہو جائے گا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَكْثَرَ

کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (مشرک) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا انجام ہوا (حالانکہ) وہ لوگ

مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

ان سے زیادہ تھے اور قوت اور نشانوں میں (بھی) جو کہ زمین پر چھوڑ گئے ہیں بڑھے ہوئے تھے سو ان کی (یہ تمام تر) کمائی ان کے کچھ بھی کام نہ آئی

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ

غرض جب ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (اس) علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا اور ان پر وہ عذاب آپڑا

مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا

جس کے ساتھ وہ تمسخر کرتے تھے پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے (اب) ہم خدائے واحد پر ایمان لائے اور ان سب

بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ

چیزوں سے ہم منکر ہوئے جن کو ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے سو ان کو ان کا ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا اللہ تعالیٰ نے

اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے اور اس وقت کافر خسارے میں رہیں گے۔

تفسیر ملک ملک کی سیر سے نت نئے مشاہدات حاصل ہوتے ہیں اور مشاہدات کی رنگینی سے تجربہ اور بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ آدمی کی طبیعت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ ماضی پر حال کو قیاس کرتا ہے اور مستقبل کو ماضی و حالی دونوں کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔ تاریخ سلف کی تدوین اور مطالعہ کی اصل غرض یہی سبق آموزی ہے۔ گذشتہ قوموں کا جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کا ظہور ان کے چھوڑے ہوئے آثار سے ہوتا ہے۔ مصر کے اہرام، ایلورا کے غار، دہلی کی جامع مسجد، آگرہ کا روضہ، چین کی دیوار، وادی نیل کی نہر اپنے بنانے والوں کی صنعت، لطافت طبع، فنی کمال اور پر شکوہ طاقت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ قابل غور ہے یہ بات کہ ثمود اور عاد کی طاقت کیا ہوئی۔ کلدانیوں اور عمرانیوں کا تمدن کہاں گیا۔ فراعنہ اور زار وہ کا نام لیوا کوئی کیوں نہیں رہا۔ حق سے ٹکرانے کے نتیجہ میں باطل کیوں پاش پاش ہو گیا۔ ان کو بھی اپنی علمی وسعت اور محیط کل دانش پر فخر تھا وہ بھی اپنے زریں تمدن پر اتراتے تھے۔ ان کے پاس بھی لاکھوں آدمیوں کے جتھے تھے۔ نمرود کی سطوت بھی اور جبروتی فوج بھی تھی۔ پھر مظلوم ضعیف بے بضاعت بے یار و مددگار حق پرست منادی کی ایک للکار کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ بنی اسرائیل ،عمالقہ قریش اور دوسرے قبائل عرب میں وہ طاقت کہاں وہ حکومت و حکمت کہاں وہ تمدن و عمرانیت کہاں۔ ذرا کنویں سے نکل کر ادھر ادھر گھوم کر تو دیکھیں۔ جب پیغمبروں کی وہ بینات اور دلائل واضحہ کو اقوام پارینہ نے نہ مانا اور اپنی قبائلی قومی اور ملکی علم آفرینیوں سے ایسے بدمست اور مغرور ہوئے کہ رسل خداوندی کی پیش کردہ صداقتوں اور عذاب و ہلاکت کی پیشین گوئی کا مذاق بنانے لگے تو آخر کار اسی تباہی نے ہر طرف سے آگھیرا جس کا پہلے مذاق اڑاتے تھے اس وقت لگے اضطراری ایمان کا اقرار اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرنے، مگر جب عذاب اور تباہی احاطہ کر لیتی ہے تو بچاؤ ناممکن ہو جاتا ہے۔ سیلاب آنے سے پہلے پل کا باندھنا مفید ہوتا ہے۔ طوفان میں ڈوبنے کے وقت پل بنانے کا ارادہ اور اقرار کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اللہ کا فطری قانون یہی ہے اور عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ سر پر آیا ہوا ہلاکت خیز عذاب کسی قوم کے سر سے نہیں ٹلتا۔

تحلیل اجزاء اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان آیات میں در پردہ وعید و تہدید ہے قرآن کی ہدایات سے سرکشی کرنے والوں اور رسول اللہ کے حکم کا مذاق اڑانے والوں کے لئے اور درس بصیرت ہے، اہل دانش کے لئے اور مستقبل کو ماضی پر قیاس کرنے کی تعلیم ہے سوچنے والوں کے لئے اور سیروا فی الارض کا حکم ہے عبرت اندوزی اور صلاح پذیری کے لئے نہ کہ تفریح کرنے فساد پھیلانے اور بھولے بھالے انسانوں کا شکار کرنے کے لئے۔

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ اقوام پارینہ کی تعداد بھی ان سے زیادہ تھی طاقت بھی بڑی تھی اور ان کی صنعت حکمت شوکت کے آثار بھی ان سے بڑھ کر تھے۔ مطلب یہ کہ جتنے زیادہ جسمانی طاقت قوی اور دانش و صنعت بڑی تھی۔ مثلاً ثمود و عاد اور کلدانی حورابی قبیلی

اقوام جنہوں نے بڑے بڑے پہاڑ کاٹ کر عالی شان محل اور مضبوط قلعے بنائے۔ وسیع اور پختہ تالاب اور کنویں کھودے۔ اونچے اونچے منارے قائم کیے جو ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک جوں کے توں باقی ہیں، لیکن اس

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ساری طاقت شوکت جمعیت صنعت حرفت حکمت اور مدنیت نے ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔ آنے والی ہلاکت آئی تو کوئی علمی وسعت جسمانی طاقت اور مال کی کثرت بچا نہ سکی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ پیغمبروں نے کھلی ہوئی ہدایت اور واضح دلیلیں پیش کیں، مگر وہ احمق اپنے علم و فن پر اترانے نہ حشر نشر کا ان کو یقین آیا۔ نہ سزا جزا کا نہ اللہ کی توحید کا نہ پیغمبر کی رسالت کا نہ کتاب اللہ کی ضرورت انہوں نے محسوس کی نہ قومی جاہلانہ تعامل کو ترک کیا۔ پیغمبر نے اُن کی وعید سنائی اور اعلان کیا کہ اگر اللہ کی ہدایت کو نہ مانو گے تو تباہ کر دیے جاؤ گے تمہارا ستیا ناس ہو جائے گا۔ ان کو اپنا علمی جہالت آفریں غرور کب اجازت دے سکتا تھا کہ اللہ کے پیغمبروں کی باتوں کو سچا سمجھیں اور کان دھریں اُلٹے اور ٹھٹھا کرنے لگے۔ آخر عذاب موعود آگیا جس چیز کا استہزا کرتے تھے اُسی نے آدبوچا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ جب اللہ کے عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیا علمی اخبار یعنی مشاہدہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور خبر نے واقعہ کے لباس میں ظہور کر لیا تو لگے ایمان و توحید کا اعلان کرنے اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرنے لیکن

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا آنکھوں دیکھے عذاب کے بعد ایمان لانے سے ان کو کچھ نفع نہ ہوا اور ہلاک ہو ہی گئے یعنی مشاہدہ اور معائنہ کے بعد اقرار اختیاری نہیں ہوتا اضطراری ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے بھڑکتی آگ کا انکار کون کر سکتا ہے۔ جب یقین کی بنا سوجھ بوجھ پر نہ ہو وہ اختیاری کب ہوتا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے بحوالہ حدیث لکھا ہے کہ بندہ کی توبہ اُس وقت قبول کی جاتی ہے جب اُس کو گھرا نہ لگا ہو گھرا لگ گیا حلق میں روح آگئی فرشتہ کو دیکھ لیا تو ایسے وقت میں توبہ مقبول نہیں ہے۔ بعض علماء قائل ہیں کہ ایسے وقت میں شرک سے توبہ مقبول نہیں ہوتی۔ گناہوں سے استغفار قابلِ قبول ہوتا ہے۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ یا تو یہ مطلب ہے کہ عادۃ اللہ یونہی جاری ہے اور فطرت فاطرا سی طرح ہے کہ حق سے سرکشی کرنے والے کتنے ہی طاقت ور ہوں آخر تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور حق پرست کتنے ہی کمزور ہوں اللہ ان کی نصرت کرتا ہے۔ دوسرا مطلب اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب اللہ کا عذاب سر پر آجاتا ہے تو اس کو کوئی طاقت رفع نہیں کر سکتی۔ ایسے وقت میں توبہ بھی مفید نہیں۔

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ۔ شیخ ابو السعود کے نزدیک لفظ هُنَالِكَ اس جگہ ظرف زمان ہے۔ زجاج کا بھی یہی قول ہے۔ شیخ یاسمین نے صراحت کی ہے کہ ظرف مکان ہی ہے اور حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔

سورۂ حٰمٓ السجدۃ

اس سورۃ کا نام سورۂ فصلت اور سورۃ المصابیح بھی ہے۔ بیضاوی، سراج اور اکثر تفسیروں میں باتفاق علماء اس سورۃ کا مکی ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے۔ قرطبی نے بھی یہی صراحت کی ہے۔ اکثر تفاسیر میں اس سورت کی آیات ۵۴ اور ایک ضعیف قول میں ۵۳ ہیں۔ کلمات کی تعداد ۷۹۹ اور حروف کا شمار ۳۳۵۰ ہے (سراج منیر) شیخ سیوطی نے اتفاق میں آیات کلمات اور حروف کی شمار کو اجتہادی قرار دیا ہے۔

قریشی سردار عتبہ جب حضورؐ کی خدمت میں قریش کا پیام لے کر آیا تھا تو حضورؐ نے اُس کو یہی سورت پڑھ کر سنائی تھی جس کی عظمت و ہیبت سے وہ مبہوت بن کر رہ گیا تھا۔ شیخ ابن کثیر نے اس واقعہ کو حضرت جابر کی روایت سے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ ہم تحلیل اجزاء کے ذیل میں اُس کو نقل کریں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں　اللہ کے نام سے　جو بڑے مہربان　نہایت رحم والے ہیں

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

حٰمٓ　یہ کلام　رحمٰن رحیم کی طرف سے　نازل کیا جاتا ہے　یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان میں)

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا

ہے ایسے لوگوں کے لئے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں بشارت دینے والا ہے اور (نہ ماننے والوں کے لئے) ڈرانے والا ہے سو اکثر لوگوں نے (اس سے) رُوگردانی کی پھر وہ (توجہ) اعراض کے (سنتے ہی

تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝

نہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان میں ایک

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ

حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیے ہم اپنا کام کر رہے ہیں آپ فرما دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں۔ مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو تم (معبود حق)

وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ

کی طرف سیدھے بندھ لو اور اس سے معافی مانگو اور ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے　جو زکوٰۃ نہیں دیتے　اور وہ آخرت کے منکر ہی　رہتے ہیں۔

هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

(اور برخلاف ان کے) جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں

تفسیر آخرت کی جزا سزا کا غم نہیں، حساب کتاب کا ڈر نہیں، غیبی نگران طاقت کا اندیشہ نہیں، خدا سے کوئی واسطہ نہیں، اوّل تو خدا کی ہستی کا اقرار نہیں اور ہے بھی تو اس کی ہمہ گیر سطوت اور ہمہ کامل حکومت تسلیم نہیں ما جز خدا کس کام کا۔ ایسے خدا تو اور بھی بہت ہیں۔ نہ ان میں پوری طاقت نہ خدا کا کامل اقتدار۔ سب کی تھوڑی تھوڑی شرکت۔ پھر خدا اور تنہا خدا ہی کی کیا ضرورت۔ یہ ہیں اہل شرک کے افکار اور خود تراشیدہ نظریات حیات یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگیاں پاک نہیں، دماغ ستھرے نہیں، روحیں پاکیزہ نہیں، دلوں میں نظافت نہیں، گفتار کردار میں طہارت نہیں۔ سب سے بڑی گندگی تعامل اور باہم معاشرے کی گندگی ہے۔ قارون کے خزانے اپنے صندوقوں میں بھر لینا، یتیموں، بے کسوں، بیواؤں اور بھوکے پیٹ برہنہ بدن

سردی رسیدہ گرمی زدہ بیماروں کو اور دکھیاروں کو بے آب و دانہ تڑپانا سب سے بڑا پاپ ہے۔ نفسانی پاپ، روحانی پاپ، دل اور دماغ کا پاپ ساری زندگی کا پاپ ایسے اشخاص اور اقوام کی تباہی لازم ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا ہر قدم ہلاکت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سوچو تو جب خود غرضی خود پرستی مفاد پرستی اور دل و دماغ کی کنجوسی غریبوں کی ہلاکت کا سبب بن جائے بیمار نادار دکھ کے مارے ہوئے مزدور بدن عریاں، شکم بریاں، دماغ لرزاں اور دل تپاں رکھنے والا کسان تباہ ہو جائے تو موٹی توند اور تیس من لاش کی خوراک کہاں سے آئے گی۔ انگلیوں کے سرے گلتے گلتے پہونچا اور پہونچے کے بعد پورا ہاتھ گل جائے گا اور رفتہ رفتہ دل پگھل کر رگوں میں دوڑتا ہوا لال خون جل کر عام زندگی کی تڑپ ہی ختم ہو جائے گی۔ مشرک کو ستھرے اخلاق کی ضرورت نہیں، صالح معاشرے کی تعمیر کا خیال نہیں، نفس کی پاکیزگی اس کی نظر میں بیہودہ چیز ہے۔ قومی بلکہ عام انسانی وسائل حیات کی گندگی دور کرنے کی کوشش ہیچ ہے۔ تو کس طرح اس کی مالی اور نفسانی خود غرضیاں اور شخصی مفاد پرستیاں اس کو تباہی سے بچا سکیں گی۔ فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ہاں جو لوگ خدا کو واحد کارساز جانتے ہیں، آخرت کی جزا سزا کو مانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہم عاجز ہیں خدا عاجز نہیں۔ ہم بادشاہ ہوں تب بھی محکوم ہیں اور خدا حاکم۔ کرۂ مریخ میں بھی پہنچ جائیں تب بھی مجبور ہیں اور خدا مختار۔ ہم اپنی زندگی کے کسی لمحہ اور کسی سانس کے مالک نہیں۔ مالک ایک ہی ہے وہی فاطر ہے اسی نے نظام فطرت بنایا ہے۔ اسی نے انسان، انسانی معاشرہ اور معاشرت کے تمام ضوابط بنائے معاشرہ اور افراد معاشرہ کی صلاح و فلاح خدا کے بنائے ہوئے ضوابط پر چلنے کے بغیر ناممکن ہے۔ غرض جو صالح الاعمال مومن ہیں ان کی قلبی اور بدنی صلاحیتوں کی جزا اور علمی و عملی درستیوں کا ثواب ناقابل انقطاع ہے۔ ان کی انہی صلاحیتوں سے انسانی معاشرہ کی تعمیر ہوگی وہ خود بھی چین سے رہیں گے اور دوسرے بھی چین پائیں گے۔ ہر شخص بے فکر اور سکھ سے ہوگا نہ کسی تباہی کا ڈر نہ ہلاکت کا اندیشہ۔ پھر یہی نہیں کہ یہ اجر اسی زندگی میں ختم ہو جائے اور آخرت میں بداعمالی اور بے ایمانی کے بھڑکتے بھاڑ میں گھسنا پڑے بلکہ مرنے کے بعد بھی راحت ہی راحت ملے گی اور آئندہ زندگی کا سکون بھی کبھی زائل نہ ہوگا۔

دعوت غور دے رہا ہے یہ امر کہ پیغمبر فرشتہ تو نہیں ہوتا جن تو نہیں ہوتا انسان ہوتا ہے۔ انسان کا بچہ ہوتا ہے۔ انسان کا دودھ پیتا ہے۔ انسانوں میں انسانوں کی طرح رہتا ہے اس کا کوئی ذاتی لالچ نہیں ہوتا نہ بادشاہ بننا نہیں چاہتا، مال دار امیر بننے کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ پرلیں کے جھرمٹ اور سنہری روپہلی وردی والے غلاموں کے جھگمٹ کی اس کو تمنا نہیں ہوتی۔ فقط اتنا کہتا ہے اللہ نے مجھے پیام بھیجا ہے کہ مالک مختار پوجا کے قابل بس ایک ہی اللہ ہے۔ اس کو پہچانو اسی کے قانون کو مانو۔ پیچیدہ دماغوں کے یہ پیچ و خم اور ژولیدہ فکروں کی یہ ژولیدگیاں چھوڑ دو۔ فکر و نظر درست رکھو۔ چال ڈھال سیدھی رکھو۔ نادانستگی میں سیدھے راستے سے ادھر ادھر اگر کوئی قدم پڑ جائے تو خدا سے معافی مانگ لو اور آئندہ اپنی چال کی نگرانی اور راست روی کا اہتمام کرلو۔ ایسی سچی باتوں سے منہ موڑنے کی کیا وجہ ہے۔ اچھا یوں سمجھو کہ دنیا کی اس ساری بستی میں ماں کا لال کون ایسا ہے جو سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکے کہ میں غرض سے پاک ہوں اور ساری دنیا کی ماننا مجھے بے لاگ ہے۔ ماں بچے سے محبت بے لاگ نہیں کرتی۔ آئندہ زندگی کا عیش اس کے پیش نظر نہ بھی ہو تب بھی بچے کو دودھ پلا کر دکھ سے بچا کر اور سکھ پہنچا کر اس کے دل کو تسکین تو ہوتی ہے راحت کا چین تو نصیب ہوتا ہے۔ بچے کے ننھے سے بھولے چہرے کو دیکھ کر اور غوں غوں کی آواز سن کر اس کی آنکھوں کو خنکی اور کانوں کو ایک خاص کیف انبساط نصیب ہوتا ہے۔ یہ خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے بیوہ مردہ شوہر پر، ماں مردہ بچے پر، اولاد ماں باپ پر اور بھائی بہن ایک دوسرے پر اپنی بھڑاس نکالنے اور ماتا کو تسکین دینے کیلئے ہی تو روتے پیٹتے ہیں۔ اگر مالی لالچ بھی نہ ہو، جسمانی تمنا بھی نہ ہو، بالادستی اور حکومت بھی مقصود نہ ہو تب بھی روحانی سکون اور قلبی سکون تو سب کے ہی پیش نظر ہوتا ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے اوتار اور انبیاء بھی خودی کی اس فکر سے خالی نہیں۔ یہاں بھی اور یہاں سے بڑھ کر آئندہ زندگی میں بھی۔

لیکن خدا کو کیا لالچ۔ انسانوں بلکہ تمام جانداروں اور بے جانوں سے اس کو کیا فائدہ۔ ہر چیز اسی کی اسی کے پاس موجود، ہر دکھ سے پاک، سکھ سے مبرا، وہ تو رحمٰن و رحیم ہے۔ مہربان بے نیاز ہے۔ اسی کی رحمت کا تقاضا تھا کہ اس نے انسانی زندگی سدھارنے کے لئے ضوابط بھیجے، ہر ضابطہ الگ الگ بیان کر دیا۔ کوئی اخلاقی ضابطہ ہے، کوئی معاشرتی اور سماجی کوئی سیاسی اور تمدنی، کسی کا تعلق

انفرادیت سے ہے کسی کا اجتماعیت سے کسی کا عام انسانیت سے۔ ان ضوابط نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دکھایا، دودھ کو پانی سے جُدا کر دیا، کھوٹے کھرے میں تمیز کر دی۔ اچھے بُرے اور حق و باطل کا فیصلہ کر دیا۔ ضوابط کیا تھے اور ان پر چلنے والوں کو نجات کی خوشخبری سنا دی اور منکروں یا عملی باغیوں کو ہلاکت سے ڈرایا۔ یہ تمام باتیں اور کل تعلیمیں انہیں لوگوں کے لئے سودمند ہیں جو علمی صلاحیتیں رکھتے ہوں جن کی علمی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور دلوں کے کیواڑ وا ہوں اور سنیں سمجھیں توجہ کے ساتھ۔ جانیں اور مانیں جن کی توجہ ہی نہ ہو زندگی سدھارنے کی خواہش ہی نہ ہو وہ سنیں گے کیا اور سمجھیں گے کیا اور فائدہ اٹھائیں گے کس طرح۔ جاننے کے تین ہی طریقے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھنا یا دیکھنے والوں کی زبانی سننا یا چشم بند گوش بند مگر قوتِ فکریہ بیدار اور بصیرت قلب روشن۔ جن غریبوں کو ان تینوں ذرائع میں سے علم کا ایک ذریعہ بھی حاصل نہ ہو۔ نہ آنکھ عبرت اندوز، نہ گوش نصیحت نیوش، نہ دل آزاد، پس تصویرِ حق وہ کس طرح دیکھیں۔ جب آنکھوں کے سامنے ہٹ دھرمی کا پردہ ہو صدائے حق کس طرح سنیں۔ جب نفرت، ضد اور ضد کی ڈاٹ کان میں ٹھکی ہوئی ہو اور نورِ حق کا کس طرح معائنہ کریں، جب دل جہالت انانیت، تعصب اور خواہشاتِ نفس کے تہ بر تہ غلافوں کے اندر بند ہوں اُن کو حق و باطل سے کیا غرض۔ ان کے پیشِ نظر تو زندگی کا گذارنا ہے۔ گذارے جاؤ جیسی گذر رہی ہے گذرنے دو، نہ تو کہہ میری نہ میں کہوں تیری، مگر ان کا یہ کلام رواداری پر مبنی نہیں بلکہ اس سے ان کی ذہنی شکست، عزم کی پستی اور دماغ کی جہالت ٹپکتی ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کے خبثِ نفس اور بدنیتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء حٰمٓ: مختلف علماء نے اس لفظ کی تفسیر میں دو معنوں پر زور دیا ہے اور کچھ تاویلیں بھی کی ہیں۔ مثلاً ح حیات کی م محمدؐ کی یعنی قسم ہے حیاتِ محمدؐ کی۔ شیخ سہل نے کہا ح لوح کی م محفوظ کی یعنی لوحِ محفوظ کی قسم، یہ اور اس قسم کی ہر تاویل محض اختراعی ہے۔ صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ صحیح تفسیر بس یہی ہے کہ اللہ ہی اس کی تفسیر سے واقف ہے۔ ہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو غالباً مرادِ الٰہی معلوم ہوگی۔ اگرچہ حضورؐ نے کچھ اظہار نہیں فرمایا کیونکہ اگر حضور واقف نہ ہوں تو پھر کون واقف ہو سکتا ہے۔
شیخ ابن کثیر نے اس جگہ ابو یعلیٰ موصلی اور حافظ ابوبکر بزاز کے حوالے سے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے ایک قصہ نقل کیا ہے اور محمد ابن اسحاق نے سیر و مغازی میں کچھ تغیر کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے اور بیہقی و ابونعیم نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے بھی (کچھ اختلاف کے ساتھ) تحریر کیا ہے۔ طویل قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے ابو الولید عتبہ نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر مال و دولت سیادت امارت وغیرہ کا لالچ دے کر تبلیغ سے روکنے کی کوشش کی تو حضورؐ نے اس کے جواب میں حٰمٓ سے لے کر مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ تک تلاوت فرمائی۔ عتبہ نے (خوف زدہ ہو کر) دہن مبارک پر ہاتھ رکھ کر خاموش کر دیا اور واپس جاکر قریش سے کہہ دیا کہ میں نے فرض پیامبری ادا کر دیا۔ سب کچھ کہا۔ ترغیب و ترہیب سے کام لیا۔ محمدؐ نے جواب میں ایسا کلام سنایا جو نہ جادو تھا نہ کہانت نہ شاعری۔ مجھے نہیں معلوم کیا تھا میں کچھ نہیں سمجھا بس مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ سمجھا۔ میں جانتا ہوں کہ محمدؐ نے کبھی جھوٹ بات زبان سے نہیں نکالی۔ قوم والو مجھے ڈر پیدا ہو گیا۔ میری بات مانو محمدؐ سے کچھ تعرض نہ کرو جو کرتے ہیں کرنے دو (الخ) ان روایات کا سلسلہ حضرت جابر اور عبداللہ بن عمر پر پہنچتا ہے اور ظاہر ہے کہ جابر انصاری تھے اور قصہ مکہ کا ہے۔ سورت مکی ہے اور عبداللہ بہت چھوٹے تھے۔ ہجرت کے وقت اُن کی عمر صرف دس سال کی تھی، اس لئے ابن کثیر نے یہ توجیہہ کی کہ قصہ بہرحال صحابہ میں معروف تھا، اس لئے اغلب ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اکابر مہاجرین سے سن کر بیان کیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: یعنی یہ قرآن رحمٰن و رحیم کی طرف سے اُتارا گیا۔ مطلب یہ کہ لوحِ محفوظ سے جبرئیل کی معرفت رسول اللہؐ کے قلب پر اس کا نزول ہوا۔ یہ نہ جبرئیل کا خود ساختہ کلام ہے نہ رسول اللہ کا نہ کسی جن کا نہ انسان کا۔ اللہ کی صفات متعدد ہیں۔ غضب و قہر بھی اس کی صفت ہے اور رحمت و کرم بھی۔ ہو سکتا تھا کہ اللہ اپنی صفتِ قہر و غضب صمدیت اور غنا کو کام میں لاتا اور گمراہ انسانوں کے پاس کوئی پیام ہدایت نہ بھیجتا، سب کو نوبتِ ناعلمی کی حالت میں جہنم میں ڈال دیتا، لیکن اُس کی رحمت غضب پر غالب ہے۔ یونہی گمراہ چھوڑ دینا اُس کی رحمت کے تقاضا کے خلاف تھا، اس لئے اس نے اپنی مہربانی سے قرآن مجید نازل فرمایا۔ یہاں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اللہ رحمٰن بھی

ہے رحیم بھی ہے۔ یعنی دونوں جہان میں اُس کی رحمت مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ وہ سب سے بڑا مہربان یعنی رحمٰن ہے۔ کیونکہ مخلوق پر مہربانی میں اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں، اُس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، اس لئے اس کی بھیجی ہوئی ہدایت غرض کی ہر آلودگی سے پاک ہے۔ (کتاب شیخ مکی اور اخفش کا قول ہے کہ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ مبتدا ہے اور کتاب خبر۔ خطیب کے نزدیک کتاب کتب سے مشتق ہے اور کتب کے معنی ہیں جمع اس لئے) کتاب کے معنی ہیں مجموعہ۔ یعنی علوم اوّلین و آخرین کا مجموعہ۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ اس کی صفات مبدء معاد رسالت ملائکہ اور تمام مافوق الطبعیات افکار صحیحہ کا مجموعہ اور انسان کی عملی زندگی کے متعلق تمام ضوابط صادقہ نافعہ کا مکمل دستور العمل۔

فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ یعنی قرآنی آیات الگ الگ مفصل بیان کی گئی ہیں۔ مختلف مطالب و مسائل کی جُدا جُدا توضیح کی گئی ہے۔ کہیں اللہ کی صفات ذاتیہ کا بیان ہے۔ کہیں صفات تنزیہ و تقدیس کا کہیں رحمت، قدرت صنعت اور حکمت کا کسی جگہ اللہ کے افعال اور آثار کو ظاہر فرمایا ہے کسی جگہ کائنات کی آغاز آفرینش کو کسی جگہ تغیرات ارضی و سماوی اور تبدلات فضائی کو کھولا ہے اور کہیں ان سے نصیحت حاصل کرنے کا سبق دیا ہے ترغیب کے لئے اقوام مومنہ ناجیہ کے احوال اور ڈرانے کے لئے اقوام ہالکہ کی کیفیات کی تصویر کشی کی ہے۔ اخلاق کی درستی، اعمال کی راستی، معاملات کی صفائی اور معاشرت کی پاکیزگی کے احکام کا بھی تفصیلی بیان ہے اور ظلم و دراز دستی سے بھی سختی کے ساتھ باز داشت غرض فطری اور عملی اصلاح کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور سعادتِ دارین کے حصول کا کوئی طریقہ پوشیدہ نہیں رکھا (سراج منیر)

یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ قرآنی آیات کو حق و باطل اور صحیح و غلط کی تمیز کے لئے امر فیصل قرار دیا اور کھرے کھوٹے میں فصل کر دیا۔ اس کے مقابلے میں اب کسی کو اپنی رائے سے جائز ناجائز اور حرام حلال کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رہا۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا یعنی اس کی زبان عربی ہے پڑھنے میں عربی کے الفاظ آتے ہیں، مگر معانی اور احکام عام ہیں۔ الفاظ تو عربی جاننے والے ہی جانتے ہیں، مگر مطالب اور حقائق اہل عرب سے سیکھ کر تمام دنیا کے آدمی جان سکتے ہیں۔ یوں تو وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ ہر قوم کے پاس پیام اصلاح اسی زبان میں بھیجا گیا تھا اور وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ ہر قوم کی درستی کے لئے کوئی نہ کوئی پیغمبر بھی بھیجا جا چکا تھا لیکن لِکُلِّ قَوۡمٍ ہَادٍ وہ خصوصی ہدایت تھی اور صرف ایک قوم کی اصلاح کے لئے خاص پیغمبر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ ہمہ گیر ہدایت ہے۔ اس کے احکام مفصل بھی ہیں اور آخری فیصلہ کا بھی حکم رکھتے ہیں۔ اُن کو ظاہر کرنے کے لئے عربی زبان کا انتخاب کیا گیا، مگر معانی کی حیثیت عمومی امر فیصل کی ہے۔

لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ یہ مجموعۂ ہدایت جاننے والے آدمیوں کے لئے ہے جو حق و باطل کو جانتے ہیں اور سمجھ رکھتے ہیں۔ بے سمجھ کیا ہدایت پائیں گے اُن کو کیا فائدہ ہوگا ضحاک نے کہا (عرب ہوں یا عجم جو بھی) اس قرآن کا نزول اللہ کی طرف سے جانتے ہیں اُن کے لئے یہ قرآن نافع ہے۔ مجاہد نے کہا جو لوگ توحید سے واقف ہیں قرآن اُن کے لئے ہے۔

بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا یعنی مومنوں کو بشارت دینے والا اور کافروں کو ڈرانے والا یا فرماں برداروں کے لئے بشارت یا نافرمانوں کے لئے وعید۔ شیخ سہل نے کہا قرآن گناہگاروں کے لئے بھی بشارت ہے شفاعت اور مغفرت کی اور اہلِ اطاعت کیلئے بھی وعید ہے کہ کہیں عدم خلوص نیت اور لحاظ سنت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی اطاعت مردود ہو جائے یا یوں کہو جس نے ایمان صحیح کے ساتھ اللہ کی رحمت پر نظر رکھی اُس کے لئے باعث بشارت ہے اور جس نے اپنی طاعت اور عبادت کو دیکھا اُس کے لئے وعید ہے۔

فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ۔ ہم کی ضمیر قریش کی طرف راجع ہے، مگر حکم میں عموم ہے یعنی اکثر آدمی سنتے ہی نہیں پھر سمجھیں گے کیا اور کیسے نہ سننے سے مراد ہے توجہ نہ کرنا اور سُن کر اثر قبول نہ کرنا سُنی اَن سُنی کر دینا۔

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ۔ اکنہ جمع ہے اس کا مفرد کنانہ ہے۔ کنانہ ترکش کو کہتے ہیں۔ ترکش میں تیر بند ہوتے ہیں۔ ندائے رسول کی طرف توجہ نہ کرنے والوں نے بھی اپنے قلوب کو (جہالت عناد یا) بے توجہی یا علم کے غلافوں میں پیچیدہ ظاہر کیا۔ دوسری آیت میں یہودیوں کا قول اسی کا ہم معنی نقل فرمایا ہے۔ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ مطلب دونوں کا ایک ہے یعنی ہمارے دل تمہاری دعوت کی طرف توجہ کرنے کے لئے تیار نہیں یا ضرور بتسند

نہیں۔ ہمارے دل خود طبعی غلاف ہیں اور وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے۔ ہم تمہاری بات سنتے ہی نہیں۔ تمہاری آواز ہمارے کانوں میں پہنچ ہی نہیں سکتی اور۔

وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِكَ حِجَابٌ ہمارے تمہارے درمیان حجاب حائل ہے پردہ پڑا ہے یعنی نفرت بغض و دشمنی یا اصولی اختلاف کا یا یہ معنی کہ ہم کو تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ ہم تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ بات سننا تو درکنار رہا غرض باطل کوشوں نے تینوں علمی ذرائع کی نفی کر دی۔ حقانیت کو آنکھوں سے دیکھا نہ کانوں کو سننے کے لئے تیار کیا نہ دلوں سے سوچا سمجھا۔

فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ تم اپنے دین پر عمل کرو ہم اپنے مذہب پر عمل کر رہے ہیں۔ مراد یہ کہ ہم سے ہمارے مذہب سے ہمارے معبودوں سے کچھ تعرض نہ کرو۔ خطیب نے لکھا ہے شاید ان کی مراد یہ ہو کہ تم ہمارے خلاف کئے جاؤ ہم تمہارے خلاف کر رہے ہیں۔ تم سے جو کچھ ہو سکے تم کر لو ہم سے جو ہو سکے گا ہم کریں گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کافروں کے مذکورہ بالا قول کے جواب میں رسول اللہ کو حکم دیا کہ تم ان سے کہدو کہ میں تو تمہاری طرح صرف آدمی ہی ہوں یعنی فرشتہ نہیں جن نہیں، کوئی اور مخلوق نہیں۔ آدمی کا بچہ، آدمی سے پیدا، آدمی کی طرح پرورش یافتہ، آدمی کی خو خصلت اور شکل وصورت رکھنے والا خالص آدمی ہوں۔ اور ہر ایک آدمی کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اُس کی باتیں سُنی اور سمجھی جاتی ہیں پھر تم کیوں میری بات نہیں سمجھتے اور اپنے میرے درمیان حجاب حائل خیال کرتے ہو۔

ایک ضروری تنقیح

آیت مذکورہ کی روشنی میں یہ بات سمجھنا غلط ہے کہ رسول اللہؐ ایک معمولی انسان تھے۔ صورت میں بھی سیرت میں بھی حضورؐ کی تمام عملی اور علمی قوتیں دوسرے انسانوں کی طرح تھیں۔ مثلیت اور مشابہت کا یہ مفہوم نہیں نہ تشبیہ کے لئے تمام صفات کا اشتراک ضروری ہے۔ آدمی کو شیر کی طرح کہا جائے تو ضروری نہیں کہ آدمی کی دُم بال کھال ناخن پنجے چہرہ مہرہ شیر کی طرح ہو۔ کھانے پینے چیرنے پھاڑنے چلنے پھرنے میں وہ بھی پورا شیر ہو۔ یہاں تک کہ شیر کی جوہریت کامل طور پر اس میں موجود ہو۔ تشبیہ اور استعارہ کا یہ مفہوم تو بالکل غلط ہے۔ رسول پاکؐ کو دوسرے آدمیوں کی مثل قرار دینے کا یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ مراد ہے کہ پیغمبر اور معمولی کافر ہر وصف میں مشترک ہیں۔ حضور والاؐ کی صورت اور سیرت دونوں چیزیں دوسروں سے ممتاز تھیں۔ ایسے کامل الاعتدال مزاج کا کوئی آدمی آج تک نہیں ہوا۔ نہ ایسی شکل کسی کی ہوئی۔ اپنی جگہ پر یہ امر محقق ہے کہ جوہریت اور صفات کے لحاظ سے ہر پیغمبر دوسرے انسانوں سے جدا ہوتا ہے۔ اس کی عقلی روشنی عقل مستفاد کی روشنی سے بھی بالاتر ہوتی ہے اس کا خمیر اور فطری جوہر ہی الگ ہوتا ہے۔ ہاں آدمی کا بچہ آدمی کی قوتوں کا حامل اور بنی نوع انسان کی سب سے بڑھ کر طاقتوں کا مالک ہوتا ہے۔ جن نہیں ہوتا، فرشتہ نہیں ہوتا، کسی قسم کا جانور نہیں ہوتا، خدا نہیں ہوتا، خدا کا بیٹا نہیں ہوتا، خدا اس میں حلول نہیں کرتا دخول نہیں کرتا۔ وہ انسانیت کی حدود میں رہتے ہوئے مظہر صفات الٰہیہ ہوتا ہے نور خداوندی کا جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ کمالات بشری کا منبع ہوتا ہے۔ قدم وحدوث کی حد فاصل ہوتا ہے اُس کا آئینۂ فطرت سامنے کے رُخ سے نہایت روشن ہوتا ہے اور پشت کی طرف سے مادیت کی مصالح سے آلودہ۔ آفتاب الوہیت کی روشن کرنوں (کلام ووحی) کو روشن رُخ کی طرف سے اپنی روح میں جذب کرتا اور مادی رخ کی کثافت کے سبب ان کو اپنے اندر روکتا ہے اور ترشیح طور پر عام انسانوں کی طرف نور پاشی کرتا ہے۔ یہ اس کی فطری صلاحیت ہوتی ہے جس سے کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا اَللّٰهُ یَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔

پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو گستاخی اور جہالت کے سبب رسول اعظمؐ کو معمولی انسانوں کی طرح قرار دیتے اور حضورؐ کی تمام قوتوں اور اندرونی صلاحیتوں کو معمولی انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کی طرح جانتے ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت پیغمبری معمولی فطرت انسانی سے ہی جدا ہوتی ہے۔ پھر دوسرے اوصاف خصوصی میں اشتراک کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بہکے ہوئے ہیں وہ عالم اور جاہل جو حضور والاؐ کو انسان ہی نہیں جانتے اور حضورؐ کے اندر روح الوہیت کے قائل ہیں اور کل علوم الٰہیہ کا حامل قرار دیتے ہیں آپ کو۔ صحیح تنقیح وہی ہے جو ہم نے لکھ دی اور آیت میں بھی اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ تشبیہ دے کر ایسے عظیم الشان امتیاز کا ذکر کیا ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسرے

ممتاز اوصاف اور خصوصیات کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اسی لئے فرمایا۔

یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی یوں تو صفات نبوت اور جوہر نبوت باوجود بشری اشتراک کے پیغمبر کی خصوصیات ہیں، لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اور وحی کے ذریعہ سے اس کو توحید الوہیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ سب آدمیوں کا معبود ایک ہی ہے۔

فَاسْتَقِیْمُوْۤا اِلَیْهِ پس اسی کی طرف (اپنی پوری زندگی کا) رخ کر کے استقامت رکھو۔ استقامت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رفتار زندگی بالکل سیدھی ہو، زندگی کی کسی حرکت و سکون میں کج روی نہ ہو۔ فرائض شخصی و اجتماعی بخلوص نیت ادا کئے جائیں۔ نہ خدا سے معاملہ کرنے میں فساد ہو نہ انسانوں سے تعلقات میں خرابی اور پوری زندگی کا رخ اللہ ہی کی طرف ہو، اس کی خوشنودی کا حصول اصل مقصد ہو۔ اسی کے احکام کی پابندی شعارِ زندگی ہو۔ غرض اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم سے قدم ادھر ادھر ہٹنے نہ پائے اور گزشتہ زندگی میں کوئی قدم بھٹک گیا ہو تو۔

وَاسْتَغْفِرُوْهُ۔ اللہ سے اس کی معافی مانگو یعنی پچھلے گناہ کی معافی کی درخواست اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرو۔

خلاصہ یہ کہ وہی تین ضروری ارکان ہیں۔ توحید کا اقرار، اوامر و نواہی کی عملی پابندی، گناہوں کی معافی کی درخواست آئندہ نہ کرنے کا عہد

وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ اس آیت میں کافروں کے تین خصوصی احوال کو موجب ہلاکت قرار دیا۔ ۱ مشرک ہونا ۲ زکوٰۃ نہ دینا۔ ۳ آخرت کا انکار کرنا۔ ہم ہر ٹکڑے کی کسی قدر تشریح کرنی چاہتے ہیں۔ ۱ شرک موجب ہلاکت ہے شرک کیا ہے۔ اللہ کی ذات یا خصوصی صفات میں دوسرے کو ساجھی قرار دینا یعنی مخلوق کو خالق کا ہم پلہ قرار دینا یا خالق کو اس کے مرتبہ سے گرا کر مخلوق سے ملا دینا۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ دو خالق ماننا، اللہ کا بیٹا قرار دینا، اللہ کے سوا کسی کو رب یا مالک جاننا، قانون حیات کا مؤسس اللہ کے سوا کسی دوسرے کو سمجھنا۔ خواہ اپنی عقل کو یا کسی حکیم ملی امام پیغمبر اور فرشتے کو یا کسی جمہوریت اور مجلس شوریٰ کو کسی کی ایسی تعظیم کرنا جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان سب صورتوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ کا عجز یا جہل لازم آتا ہے۔ عاجز کو مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناواقف بادشاہ وزیر مقرر کرتا ہے۔ ماتحتوں کی کل ضرورتیں پوری نہ کر سکنے والا دوسرے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ خدا نہ تخلیق سے عاجز نہ تربیت سے نہ تنظیم کائنات سے نہ انسانی زندگی کے لئے تاسیس، ضوابط اور ایجاد نظریات سے اب جو کوئی خدائی خصوصیات کسی مخلوق میں ہونے کا قائل ہوگا، یا خدا کے اندر مخلوق کی خصوصیات موجود سمجھے گا وہ اپنے شیرازۂ زندگی کو بھی منتشر کرے گا اور دوسروں کے نظام حیات کو بھی پراگندہ کرے گا۔ خود بھی تباہ ہوگا، دوسروں کو بھی تباہ کرے گا۔ ایسے مشرک سے زیادہ مستحق ہلاکت اور کون ہو سکتا ہے۔ ۲ مشرک زکوٰۃ نہیں دیتا اور اس کا زکوٰۃ نہ دینا اس کو مستحق ہلاکت بنا دیتا ہے۔ اس نمبر کے یہ جز ہیں۔ زکوٰۃ دینے کا مطلب مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ سے مراد ہے نفس کی زکوٰۃ یعنی صدق دل سے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل نہیں (عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباس کا یہی قول ہے) کیونکہ نفس کی زکوٰۃ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ دوسری جگہ ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى تیسری آیت یوں ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے فرمایا۔ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى اکثر مفسرین کی رائے میں زکوٰۃ سے مال زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ یعنی مشرک زکوٰۃ روکتے ہیں (قتادہ) اطاعتِ الٰہی میں مال خرچ نہیں کرتے اور صدقہ نہیں دیتے (ضحاک و مقاتل کذا فی السراج) حسن بصری نے کہا مراد یہ ہے کہ مشرک زکوٰۃ دینے کو واجب نہیں جانتے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے سے مال کی زکوٰۃ نہ دینا ہی مراد ہے۔ یہی ظاہر مطلب ہے۔ شیخ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

ایک شبہ: زکوٰۃ کا وجوب سنہ ۲ھ میں ہوا اور آیت مکی ہے، اس لئے زکوٰۃ سے مالی زکوٰۃ مراد ہی کس طرح ہو سکتی ہے۔

ازالہ: زکوٰۃ کی مقدار کی تعیین سنہ ۲ھ میں ہوئی مکہ میں مقدار مقرر نہ تھی، لیکن زکوٰۃ یعنی صدقہ کا غیر معین مقدار میں حکم مکہ میں ہی تھا۔ آیت میں وارد ہے۔ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑنے کے دن حق صدقہ ادا کیا کرو۔ اصل یوں ہجرت کے بعد دوسرے

سال حکم زکوٰۃ میں آسانی کر دی گئی اور ڈھائی فی صدی کا حکم دے دیا گیا اور دو سو درہم سے کم پر زکوٰۃ کا حکم باقی نہیں رکھا گیا ورنہ مدینہ میں بھی ابتداء حال میں یہ حکم تھا کہ آدمی جو کچھ کمائے ایک دن کا کھانے کو رکھ لے باقی صدقہ کر دے۔

دوسرا شبہ مشرک صرف توحید کے مکلّف ہیں دوسرے فرائض و واجبات پر مامور ہی کب ہیں پھر زکوٰۃ نہ دینے کو ان کے لئے تباہ کن کیوں قرار دیا۔

ازالہ علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ مشرک اوّلین حیثیت میں توحید کا مکلّف ہے اور ثانوی حیثیت میں دیگر فرائض کا یعنی ایمان نہ لانے پر اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور فرائض ادا نہ کرنے پر عذاب میں زیادتی ہوگی۔

علماء کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ مشرک صرف ایمان کا مکلّف ہے اور جب تک موحد نہ بن جائے دوسرے فرائض پر مامور ہی نہیں۔ نہ ترک فرائض سے۔ اس کے عذاب میں زیادتی ہوگی۔ گویا ظاہر آیت سے اوّل گروہ کے مسلک کی تائید اور مؤخر الذکر کی تردید ہوتی ہے (سراج) میرے نزدیک حقیقت مسئلہ کا کشف ابھی پوری طرح نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ توحید کا حکم تو بہر حال عمومی ہے وہ تو ایمان کی بنیاد ہے اور فقط توحید نہیں بلکہ تمام لوازم توحید یعنی ملائکہ انبیاء آسمانی شرائع قدر وغیرہ پر ایمان لانا مشرک کے لئے ضروری ہے۔ فرائض و واجبات تمام اصول شریعت ہیں، اس لئے ان کو ماننا یعنی ان کی ضرورت کا اقرار کرنا اور اللہ کو تمام شرائع حیات کیلئے ضروری محسوس جاننا لازم ہے۔ اب اگر زکوٰۃ نہ دینے سے مراد ہو زکوٰۃ کو واجب نہ جاننا تو ظاہر ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا منکر کافر ہوتا ہے اور کفر موجب سزا لیکن اگر انکار زکوٰۃ مراد نہ ہو بلکہ زکوٰۃ ادا کرنا مراد ہو تو اس صورت میں شبہ کا ازالہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی ادائیگی صرف مسلمانوں کے ذمہ لازم ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، شراب نہ پینا، حرام گوشت نہ کھانا۔ ظاہر ہے کہ جب مشرک ان احکام کا مکلّف ہی نہیں تو آخرت میں ان کو ادا نہ کرنے سے سزا کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔ اِلَّا بِتَاوِیْلٍ بَعِیْدٍ۔ آیت میں ان علماء کے لئے کوئی دلیل نہیں جو اس قسم کے احکام ادا نہ کرنے والے مشرک کو دوہرے عذاب کا مستحق قرار دیتے ہیں ایسے احکام کو ادا نہ کرنے کا آیت میں بیان ہی نہیں۔

دوسرے قسم کے احکام وہ ہیں جن کا تعلق مومن مشرک دونوں سے ہے۔ مثلاً سچ بولنا، رشوت نہ لینا، چوری نہ کرنا، سود نہ لینا، خیانت نہ کرنا، قول ماپ میں کمی بیشی نہ کرنا۔ زکوٰۃ یعنی مالی امداد کا حکم اسی فہرست میں داخل ہے، سرمایہ پرستی، پیسہ پر پیسہ رکھ کر گننا، مخلوق کو بھوکا مارنا، اپنے صندوق بھرنا، بھوکوں اور ننگوں کو تڑپانا، غریبوں کا خون پینا اور رحم نہ کرنا اس کی اجازت کسی کو بھی نہیں بلکہ اس قسم کے احکام تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والا مستحق مذمت و سزا ہر مذہب میں ہے، اسی لئے آیت میں اس فعل کو اگرچہ مشرک سے صادر ہو موجب ہلاکت اور تباہ کن قرار دیا ہے۔ کیونکہ جس طرح شرک سے اللہ کی خالص حق تلفی ہوتی ہے اسی طرح زکوٰۃ نہ دینے سے اللہ کی حق تلفی کے ساتھ مخلوق کی تباہی بھی ہوتی ہے۔ ۳۔ مشرک آخرت کا انکار کرتا ہے۔ جب آخرت کا یقین نہیں تو حساب کتاب کی بیشی کا کیا ڈر اور جزا سزا کا کیا اندیشہ اور سزا کا خوف نہیں تو نیکی کو نیکی سمجھ کر کون کرے اور ایسا جذبۂ خیر کس میں موجود ہے کہ برائی کو صرف برائی سمجھ کر ترک کرے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دنیا میں خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز نہیں ہو سکتی اور اس مطلق العنانی سے ہر شخص کا نظام زندگی مختل ہو جائیگا اور عمومی تباہی پھیل جائے گی۔ حاصل یہ کہ انکار آخرت موجب تباہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ اس آیت میں اُسی طرح بشارت ہے جس طرح سابق آیت میں وعید تھی۔ شرک انکار آخرت اور حقوق مالی ادا نہ کرنے کو گزشتہ آیت میں ہلاکت انگیز کہا تھا اس آیت میں ایمان و عمل صالح کو موجب اجر قرار دیا ہے۔ ایمان سے مراد ہے تمام ضروری چیزوں کا دل سے ماننا، جس میں اللہ کی ذات صفات کا یقین رکھنا شرک نہ کرنا، رسالت کو ماننا اور آخرت کا انکار نہ کرنا ہر چیز داخل ہے عمل صالح کا لفظ تمام اوامر کے ادا اور نواہی کے ترک کو شامل ہے نہ فقط ادائے زکوٰۃ بلکہ تمام اصولی اور فروعی واجبات و فرائض کی ادائیگی عمل صالح ہی کی شاخ ہے۔

اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کا ترجمہ سدی نے اجر بلا احسان کیا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ اہل ایمان پر تو اللہ کا احسان دوامی ہے۔ اہل ایمان کی نسبت اللہ

نے خود فرمایا ہے۔ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ الخ۔ اہلِ جنت، جنت میں پہنچ کر خود کہیں گے فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۔ مجاہد اور دوسرے اہلِ تفسیر سے مروی ہے کہ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کے معنی ہیں عطاءً غیر مجذوذ یعنی دوامی غیر منقطع ثواب۔ ابن عباس کا یہی قول ہے۔

خطیب نے سدی کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ایسے بیماروں اور اپاہجوں کے حق میں ہوا جو حالتِ تندرستی میں طاعت کرتے رہے اور طاعت کرتے کرتے مجبور ہو گئے۔ ایسے مجبوروں کو ان کے خلوص نیت پر ویسا ہی ثواب ملتا رہے گا جیسا کہ حالتِ تندرستی میں اعمالِ صالحہ پر ملتا۔ اس مضمون کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرو کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ بندہ اگر اچھے طریقے سے عبادت کرتا ہو اور اسی حالت میں وہ بیمار ہو جائے تو موکل فرشتے کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے اعمال ویسے ہی لکھتا رہے جیسے وہ تندرستی کی حالت میں کرتا تھا اس وقت تک کہ اللہ اس کو تندرست کر دے یا اپنی رحمت میں لے لے۔

مقصودِ بیان

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ انسانوں کے لئے قانونِ حیات کی تاسیس کا مدار رحمت موسس پر ہے اور چونکہ خدا سب سے مہربان ہے یعنی رحمان ہے اس سے زیادہ انسانوں کی فلاح کسی کے پیشِ نظر نہیں، اس لئے وہی دستورِ حیات بھیجنے کا حق رکھتا ہے۔

كِتٰبٌ کی تنوین قرآن کی عظمت پر دلالت کر رہی ہے اور فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ میں کوئی خفاء ابہام اور باہم اختلاط واشتباہ نہیں۔ ہر حکم تفصیل وار جدا جدا بیان کر دیا ہے اور حق وباطل کے امتیاز کے لئے قرآن امرِ فیصل ہے۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ عربی ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ صرف اہلِ عرب کے لئے ہے۔ لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ کا مقصود یہ ہے کہ نصیحت قبول کرنے والے صرف جانکار ہی ہوتے ہیں جن کے دماغوں پر جہالت کے پردے پڑے ہوں اور ہدایت پانا ہی نہ چاہیں۔ ان کو قرآن سے کچھ فائدہ نہیں مل سکتا۔ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کی آیاتِ مفصلہ اور اس کی عربیت صرف عبارت آرائی اور مظاہرۂ ادبی کے لئے بلکہ یہ ایک نصیحت عامہ ہے جس میں بشارت بھی ہے اور تخویف بھی یعنی قرآن کی آیات دستورِ زندگی کو پیش کر رہی ہیں جن کی تعمیل مستحق بشارت اور خلاف ورزی مستحق عذاب بنا دیتی ہے۔ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ سے مترشح ہو رہا ہے کہ حق پسند اور حق پرست کم ہیں۔ اکثر ضدی ہیں جو حق کو نہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ سننا، نہ سوچنا اور نہ سمجھنا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ رسول اللہؐ بشر تھے اور بعض صفاتِ بشریت میں دوسروں کی طرح ہی تھے۔ مگر آپ کی بشریت دوسروں کی بشریت سے بہت ہی زیادہ ممتاز اور افضل تھی یعنی حضورؐ کے پاس وحی آتی تھی اور براہِ راست اللہ سے تعلق تھا۔ گویا سرکار والا کو جوہرِ بشریت قدسی تھا۔ اور دوسروں کا جوہرِ بشریت اس قدوسیت سے خالی۔ فَاسْتَقِيْمُوْٓا کا لفظ بکثرت معانی کو حاوی ہے۔ استقامۃ فی القول استقامۃ فی العمل۔ استقامۃ فی الارادہ پھر ان تینوں میں ہر ایک کی بہت شاخیں ہیں۔ اس میں تلقین ہے مسلمانوں کو کہ پوری زندگی کے تمام اطوار میں اللہ کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں اور شرائع کی پابندی کریں۔ اِلَيْهِ کے لفظ سے اس طرف ایما ہے کہ راہِ مستقیم وہی ہے جو خدا تک پہنچانے والی ہو۔ اس جانب بھی لطیف اشارہ ہے کہ شریعت کی ظاہری پابندی کا نہیں بلکہ اوامر ونواہی کی تعمیل خوش نیت کے ساتھ ہو اور مرضیِ الٰہی حاصل کرنا مقصود ہو اور ہر عمل خیر کا رُخ اللہ کی طرف کر دیا جائے۔ اِسْتَغْفِرُوْهُ میں تلقین ہے اس بات کی کہ استقامت کے باوجود استغفار لازم ہے تاکہ دانستگی میں اگر قدم ادھر ادھر پڑ گیا ہو تو معافی ہو جائے، اسی لئے تمام اولیاء انبیاء بھی استغفار کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی زندگیاں مطلقاً نافرمانیوں سے پاک تھیں یا قصداً کسی کبیرہ کا صدور ان سے نہیں ہوتا تھا۔ وَوَيْلٌ کا لفظ ہر قسم کی ہلاکت کو شامل ہے۔ آخرت میں ہو یا دنیا میں صرف شخصی ہو یا متعدی ہو کر دوسروں کو بھی تباہ کرنے والی ہو۔

لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ سے اس طرف اہم اشارہ ہے کہ اہلِ استحقاق کی مالی امداد مسلمان کے لئے بھی بہت اہم ہے۔ کیونکہ جس فعل کا ترک مشرک کے لئے موجب تباہی قرار دیا گیا اس کی اجازت مسلمان کو کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر لفظ زکوٰۃ کا عموم بتا رہا ہے کہ مشرک کے پیشِ نظر کسی قسم کی پاکیزگی نہیں نہ وہ اپنے نفس کو پاک کرنا چاہتا ہے نہ مال کو یعنی مومن کا مقصد ہر طرح کی پاکیزگی ہونی چاہیئے۔

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ میں ضمیر هُم کی تکرار تاکید اور حصر پر دلالت کر رہی ہے یعنی آخرت کا انکار مومن نہیں کرتا کافر ہی کرتا ہے۔
آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں عمل صالح کی قید بتا رہی ہے کہ اجر غیر منقطع کا نہ مومن فاسد الاعمال سے ہے نہ مشرک صالح الاعمال سے (بشرطیکہ کوئی صالح الاعمال ہو سکے) وغیرہ۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ

آپ فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا (کی توحید) کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو (باوجود اتنی بڑی وسعت کے) دو روز میں پیدا کر دیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو

ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ

یہی سارے جہان کا رب ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنا دیئے اور اس زمین میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اس

فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ

میں اس (کے رہنے والوں) کی غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں (یہ ہوا جو شمار میں) پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے پھر آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی

وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ۝

اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی سے دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا

سو دو روز میں اس کے سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا اور ہم نے اس قریب والے

السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝

آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور (استراق شیاطین سے) اس کی حفاظت کی یہ تجویز ہے (خدائے) زبردست واقف الکل کی

تفسیر قدیم مادہ پرستوں کے تخلیق عالم کے متعلق مختلف اقوال تھے۔ مادہ اور مادیات کے علاوہ ہر چیز کی نفی پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن وجہ تکوین اور سلسلہ تکوین کے متعلق بہت ہی اختلاف تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ تمام علوی سفلی کائنات کا وجود محض اتفاقی ہے۔ کوئی قائل تھا کہ تمام اجرام سماویہ اور کرۂ ارض موجودہ ہیئت کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور نباتات و حیوانات کے سلسلہ کی کہیں انتہا نہیں۔ بعض قائل تھے کہ اجرام علویہ اور ان کی ہیئتیں ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں اور حیوانات اپنی انواع کے لحاظ سے تو قدیم ہیں، لیکن جزئیات کے لحاظ سے حادث۔

موجودہ زمانے کے مادہ پرستوں کی اجماعی تحقیقات یہ ہے کہ اس تمام کائنات کی مادی ہو یا ارضی، اصل مادہ اور مادہ کی قوت یعنی حرکت ہے۔ مادہ اور اس کی حرکت دونوں ہمیشہ سے ہیں، مادہ یہی ایتھر ہے جس سے یہ خلا پر ہے۔ اسی کا نام ہیولیٰ ہے اور مادہ کی قوت نام ہے اس کے چھوٹے چھوٹے ذرات کی حرکت کا۔ یہ ذرات یوں تو یک ذات ہیں۔ ان کی اصل جوہریت میں کوئی فرق نہیں، لیکن اشکال اور دوسری حالت میں باہم مختلف ہیں۔ اجزاء مادہ کی حرکت کا کوئی سبب نہیں۔ خود بخود ہمیشہ سے ان میں حرکت ہے۔ اور اس حرکت سے ہی اجرام سماویہ یعنی تمام

ستارے سیارے اور ارضی کائنات جمادی ہو یا نباتی یا حیوانی غرض کل جہان رونما ہوا ہے پھر مادہ اور اس کی حرکت میں نہ کوئی شعور ہے نہ ارادہ یہی اجزا مادہ حرکت کے ذریعہ خود بخود مخصوص کیمیاوں کے ساتھ جمع ہو گئے اور ان کے اجتماع سے مادہ سدیمیہ بن گیا یعنی چھوٹے چھوٹے اجسام بن گئے۔ اور قانون جذب کے زیر اثر ان کا اجتماع ہوا اور ایک کرہ بن گیا جس کو آفتاب کہتے ہیں۔ سورج اپنے محور پر حرکت کرتا رہا۔ اسی کی دورانی حرکت سے کچھ اور ستارے اسی کے جسم سے الگ ہو کر بن گئے اور سب کے سب اپنے اپنے محوروں پر گھومنے لگے۔ زمین بھی ایک ستارہ ہے جو سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی اور اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ ایک مدت تک دورانی حرکت ہوتی رہی تو زمین کا بیرونی چھلکا ٹھنڈا ہوتا گیا اور اس طرح زمین کے طبقات بنے۔ معادن اور حیوانات اور نباتات کا ظہور بھی مادہ کے اجزا کی حرکت سے ہوا۔ حیوان اور نبات کا وجود پہلے سے نہ تھا۔ زمین کی دورانی حرکت ان کی ہستی کا سبب بنی۔ علم جیالوجی (طبقات الارض) نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ حیوانات اور نباتات حادث ہیں۔ اب بھی زمین کا آخری طبقہ ہر قسم کے جاندار اور نبات سے خالی ہے اور ایک وقت تو ایسا گزرا کہ کہیں زمین کے حصہ میں حیوانات و نباتات کا نشان بھی نہ تھا۔ اکتشافات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اجزاء مادہ کی حرکت سے ہی عناصر پیدا ہوئے اور مناسب توازن کے ساتھ بعض عناصر ملے تو ایک زلالی مادہ بنا جو نہ بالکل سیالی تھا نہ جامد۔ اس زلالی مادہ سے خلیات کی ساخت ہوئی اور خلیات سے اجسام عضویہ اور اجسام عضویہ سے حیوانات اور نباتات، فلاسفروں اور مادہ پرستوں کی یہ تمام صراحتیں ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔ قیاس و قرائن بھی اس ساری تنقیح کی بنیاد ہے۔ عقل وفلفین سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی اساسی غلطی مادہ کی خود مختار فعالیت اور بے سبب حرکت ہے۔ مادہ کے اجزاء کیوں حرکت کرتے ہیں۔ جب کہ ان میں شعور و ارادہ نہیں یہ کسی نے آج تک نہیں بتایا۔ تنظیم اور تکوین کی تدریجی ترقی کا تو بطور تخمین اظہار کیا، لیکن فعل کو بغیر فاعل کے قرار دیا اور ناظم و مکوّن کا پتہ تک نہیں دیا۔

قرآن کا حقیقی نظریہ اللہ کی ذات اور صفات کی معرفت ہے۔ اس کی عبادت اور ادائے شکر کی تعلیم ہے اور ان تمام احکام کا علم ہے جن کا تعلق معاشی انتظام اور سعادت آخرت سے ہے۔ تخلیق عالم کی کیفیت بیان کرنا اور سماویات و ارضیات میں جو ضوابط فطرت جاری ہیں براہِ راست ان کی تفصیل سے قرآن کا کوئی تعلق نہیں۔ انواع مخلوق کا تنوع، اختلاف تخلیق سماوی و ارضی اور تنظیم فضائی کا کہیں کہیں اگر تذکرہ آیا بھی ہے تو محض ذیلی طور پر صرف اس غرض سے کہ اللہ کی ہستی، وسعت، حکمت، قدرت اور صنعت کو معلوم کرنے کے لئے عقلی برہان پیش کر دی جائے۔ خصوصیت کے ساتھ تخلیق کائنات اور تنوع موجودات کی مفصل تنقیح مقاصد قرآنی سے خارج ہے، اس لئے فلسفہ مادیت سے اس کا ٹکراؤ ہوتا ہو یا موافقت دونوں چیزیں ناقابلِ اعتنا ہیں تاہم کہیں کہیں قرآن میں عالم تکوین کی آغاز آفرینش کے متعلق جو کچھ صراحت آئی ہے ہم اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں اور جو کچھ علماء اسلام نے ان کا مطلب سمجھا اس کو بھی کسی قدر مجمل الفاظ میں نقل کرنا چاہتے ہیں

۱۔ سماوات وارض اور درمیانی کائنات کو اللہ نے چھ دن میں پیدا کیا۔ یہ چھ دن کیسے تھے اس وقت تو نہ سورج تھا نہ زمین پھر دن کی تعیین کیسے ہوئی۔ علماء نے کہا کہ اس سے مراد چھ دن کی مقدار حقیقی ایام مراد نہیں ہیں اور یہ مقدار بھی ایام دنیا کی برابر تھی کسی نے کہا ایام آخرت کے برابر تھی یعنی چھ ہزار سال (ہکذا روی عن ابن عباس صرح بہ الوراق فی مباحث الفکر) چھ دن میں کائنات کی تخلیق کیوں کی اللہ تو ایک لمحہ بلکہ اس سے بھی کم میں کر سکتا تھا۔ اس کی حکمت اللہ ہی کو معلوم ہے شاید اس سے ہر عمل میں تدریج اختیار کرنے کی تعلیم دینی مقصود ہے۔

سب سے پہلے ایک دخان اللہ نے بنایا تھا یعنی بخارات۔ وہ آپس میں مخلوط تھے۔ زمین کا آسمان سے کوئی امتیاز نہ تھا۔ اللہ نے اس کے کچھ حصہ کو اونچا کر کے آسمان قرار دیا۔ اور کچھ حصہ کو اسی کی جگہ برقرار رکھ کر زمین فرمایا کانتا رتقا ففتقناھما کے یہی معنی ہیں (رواہ عکرمہ عن ابن عباس ومثلہ عن عطاء والضحاک والحسن وہو قول سعید بن جبیر وقتادہ کذا یوخذ من الجمل علی الجلالین والکبیر الرازی) زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے کی گئی، لیکن اس وقت وہ مبسوط نہ تھی اور نہ رہنے کے قابل نہ اس میں پہاڑ تھے نہ درخت نہ حیوان اس کے بعد تخلیق سماء کا قصد کیا اور سات آسمان بنائے پھر زمین کو بچھائی اور کائناتِ ارضی کو پیدا کیا (ہکذا نقل عن ابن عباس نقل الجمل عن الخطیب عن الرازی فی ہذا الموضع) اللہ نے کواکب پیدا کئے اور ان کو سماء دنیا یعنی سب سے نیچے والے آسمان کی زینت بنایا اور ستارے آسمان میں مرکوز یعنی جڑے

ہوئے ہیں (ہو قول الجمہور نقلہ فی مباہج الفکر للوراق) بعض کا قول ہے کہ ستارے آسمان کے نیچے خلا میں ہیں (نقلہ فی کنز الاسرار للعقائد الصنائعی عن مکی فی تفسیر سورۃ التکویر۔ وان صاحب بہجۃ النفس نقلہ عن وہب ونقلہ القرمانی فی مختصر الہیئۃ الیۃ وذکر مثلہ الشیخ مرعی الحنبلی المقدسی فی عجائب المخلوقات۔ ونقل حدیث احادیا یدل علیہ وکذلک نقل ہذا الحدیث محمد بن عبداللہ الکسائی فی کتاب الملکوت ونقل الرازی اثر بعن کعب الاحبار صریحا فی ان الشمس دون السماء الدنیا۔)

بدء آفرینش کے متعلق علماء مادیت کی تنقیح اگرچہ ہمارے لئے ناقابلِ اعتبار ہے کیونکہ ان کا اساس فکر ظن وتخمین ہے برہان ویقین نہیں پھر خود ایک کا تصادم دوسرے سے ہوتا ہے۔ تاہم اجماعی اور جمہوری تحقیقات کو اگر سامنے رکھا جائے اور پھر قرآن کو بعض علماء اسلام کی تفسیری روشنی میں پڑھا جائے تو مادیت کا بیشتر حصہ قرآنی صراحت کے موافق نظر آئے گا۔ مثلاً اللہ نے سارے عالم کا مادّہ ایک بنایا اور اس کا نام دخان رکھا یعنی آبی بخارجس کو فلسفہ کی اصطلاح میں سدیم کہا گیا ہے اور خلا میں اس کا منتشر ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر اللہ نے آسمان وزمین کو جدا جدا کر دیا یعنی سدیم کے کچھ حصہ کو آسمان کا مادّہ قرار دیا اور کچھ حصے سے سورج اور ستارے اور زمین وغیرہ کی ساخت کی (کما مار وی عن ابن عباس ومن معرفی تفسیر الفتق والرتق) پھر آسمان کے مادہ کو اٹھا کر اس سے آسمان بنائے اور سورج کے مادہ سے سورج اور سورج سے تمام ستاروں اور زمین کو توڑ کر علیحدہ کیا، لیکن زمین اس وقت تک مبسوط اور قابلِ سکونت نہ تھی اور آسمانی مادہ موجود تھا مگر تشکیل سماوی نہ ہوئی تھی تو اللہ نے آسمان کی تشکیل کرنی چاہی اور تشکیل دے کر اس کے سات طبقات بنائے اور ہر طبقہ کو ایک آسمان فرمایا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا اور کائنات ارضی کی تخلیق کی۔

یہ ساری تکوین دفعۃً نہیں ہوگئی بلکہ تاثیر وتاثر اور اسباب ومسببات کے ضابطہ کے تحت ایک طویل مدت میں ہوئی۔ اس طویل مدت کو چھ دن فرمایا۔ حالانکہ ضابطہ تدریجی کے بغیر آن کے آن میں بھی تکوین کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

سورج تمام ستارے اور زمین ہر ایک آسمان کے نیچے قانون جذب کے زیر اثر قائم اور متحرک ہیں، لیکن مؤثر حقیقی اللہ ہی ہے اسی نے قانون کشش بنایا ہے۔

تحلیلِ اجزاء آیات مندرجہ میں تکوین کائنات کا بیان کس قدر تفصیل کے ساتھ فرمایا ہے اور آفرینش عالم کی واقعی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے اور آخر میں صراحت فرمائی ہے کہ یہ تمام تخلیق عزیز علیم کے اندازۂ قدرت اور تقدیر حکمت کے موافق ہے یعنی بلا ارادہ غیر شعوری اضطراری غیر منظم بلا فائدہ نہیں ہے ہر ذرہ کائنات کی پیدائش حکمت آگیں اور مصلحت قرین ہے اس سے فاطر کی انتہا طاقت لامحدود حکمت اور قہار قدرت کا ظہور ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی ہستی یا حکمت وقدرت کا انکار یا مقنن حیات نہ سمجھنا بڑی عجیب سی بات ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ نے زمین کو دو دن میں اپنے اندازہ کے موافق بنایا اور وہی سارے جہان کا مالک ہے۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں ضد نہیں پھر اس کا انکار کرنا اور کسی دوسرے کو اس کا ہمسر قرار دے کر معبودیت اور صفاتِ الوہیت میں شریک ماننا بڑا تعجب انگیز ہے۔ مخلوق کو خالق، مملوک کو مالک، مقدور کو قادر اور مربوب کو رب کا ہم پلہ بنانا اور اس سے ٹکرانا تعجب انگیز نہیں تو اور کیا ہے۔

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ۔ اس کلام کا واقعی مرتبہ ثُمَّ اسْتَوٰٓى کے بعد ہے۔ تخلیقی ترتیب میں آسمانوں کی پیدائش پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کی پیدائش سے مقدم ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے ایک دخان یعنی آبی بخار (سدیم) اللہ نے پیدا کیا جو بالکل مخلوط تھا۔ اس کے چھانٹ کر دو حصے علیحدہ علیحدہ کر دیئے۔ نچلے حصے سے زمین وغیرہ بنائی۔ تمام معدن چشمے اور پہاڑ بھی اس کے ساتھ ہی بنے۔ بظاہر آیت مذکورہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن مفسرین نے ان کی تخلیق کو جہاں عرض کے ساتھ قرار دیا ہے، اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ چیزیں زمین کے ساتھ نہیں بنائی گئی تھیں۔ تخلیق ارضی دو دن میں ہوئی یعنی دو دن کی

مقدار کے مساوی وقت میں اوپر والے حصہ سے آسمان بنے اس بالائی حصہ کو بھی سات حصوں میں تقسیم کیا اور ہر طبقہ کو دوسرے سے جدا کر دیا یہ سات آسمان ہوئے۔ ان کی تخلیق بھی دو دن میں ہوئی۔ پھر زمین کو بچھایا، ہموار کیا اور رواسی الارض کو پیدا کیا اس میں بھی دو دن صرف ہوئے۔ کل چھ دن ہوئے۔ تخلیق سماء کے دو دنوں کو چھوڑ کر باقی چار ایام میں سے دو دن میں زمین بنی اور دو دن میں پہاڑ وغیرہ

نافع بن ازرق خارجی نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا تھا کہ آیت اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ سے واضح ہوتا ہے کہ زمین آسمان سے پہلے بنائی گئی اور آیت ثم بعد ذٰلك ..... سے بسط ارض کا مؤخر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دونوں میں توافق کس طرح ممکن ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اللہ نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ پھر آسمان کو درست کیا پھر زمین کو بچھایا۔ سامان کو آراستہ کیا یعنی پانی نکالا۔ نباتات کو پیدا کیا پہاڑ، ریت، جمادات، جھیلیں اور تالاب بنائے (رواہ البخاری عن سعید بن جبیر)

رواسی کا واحد راسیہ ہے اور مادہ رسوّ۔ رسوّ کے معنی ہیں سکون اور استقرار۔ اسرائیلی روایت مشہور ہے کہ پہاڑوں کی میخیں ٹھونک کر اللہ نے زمین کے لرزہ کو روکا۔ علماء اسلام نے اسی قسم کی ایک روایت نقل کی ہے لیکن عقل و مشاہدہ کی شہادت اس کے خلاف ہے اول تو زیادتی وزن کے سبب زمین کا اضطراب قابل تسلیم نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر پہاڑوں نے زمین کا اضطراب روکا تو پہاڑوں کا غیر معمولی وزن کس چیز نے روکا۔ پھر سمندروں کے اندر پہاڑ کیوں ہیں۔ لفظ رواسی سے اہلِ تفسیر کو شاید دھوکہ ہوا ہو حالانکہ راسیہ متعدی نہیں لازم ہے یعنی ساکنہ اور مستقرہ۔ ظاہر ہے کہ پہاڑ ساکن اور مستقر ہیں نہ کہ استقرار بخش اور سکون آفریں۔

زمین میں برکت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کو پیداوار کے قابل بنایا۔ درخت، سبزہ اور کھیتی پیدا ہونے کی صلاحیت اس کو عطا فرمائی۔ طرح طرح کی کانیں پیدا کیں۔ کوئلہ، گندک، ہڑتال، سونا، چاندی، ہیرا اور تمام جواہر، ہر قسم کی جڑی بوٹیاں، دوائیاں۔ غرض غذا، دوا، لباس اور رہائش کا سامان سب زمین کی ہی پیداوار ہے۔

زمین کے اندر اللہ نے روزی کا ذخیرہ بھی پیدا فرمایا۔ ہر قسم کے جانور اور آدمی کی روزی بلکہ درخت اور سبزہ کی بھی روزی کا خزانہ زمین میں ہی ہے اور اللہ کے اندازہ کے مطابق ہے۔ جس جاندار یا جمادات کو جس قسم کی روزی کی جتنی ضرورت ہے ویسی اور اتنی روزی اللہ نے زمین میں پیدا کی۔ ایک ہی تختہ زمین ہے کہ چرند، حشرات، مویشی، انسان اور مختلف انواع کے پودے اپنی اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے کرور در کرور انواع نبات و حیوان ہیں جو زمین سے اندازۂ خداوندی کے موافق اپنا رزق حاصل کرتے رہیں۔

سواء للسائلین۔ یعنی ہر سائل کی ضرورت کے موافق اللہ نے زمین میں رزق پیدا کیا۔ اسی مطلب کو دوسری آیت میں بیان کیا ہے — وآتاکم من کل ما سألتموہ۔ (ابن جریر)

ثم استوٰی الی السماء۔ یعنی زمین کی پیدائش کے بعد آسمان بنانے کا قصد کیا۔ اس وقت آسمان کی موجودہ کیفیت ضخامت اور ہیئت نہیں تھی۔ نہ اس کے طبقات تھے، نہ موجودہ جسم ٹھوس۔

وهی دخان۔ اس وقت وہ دخان یعنی ایتھر یا آبی بخار تھا۔ حدیث میں موج مکفوف کہا گیا ہے۔ یعنی ایک آبی لہر تھی جو سیال نہ تھی بہتی نہ تھی اپنی جگہ رکی ہوئی تھی۔

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ○ اس آیت میں آسمان و زمین کو حکم اور ان کی طرف سے اجابت یہ کل کیفیت تکوینی ہے زمین میں اور آسمان میں تکوین دو طرح سے ہو سکتی تھی۔ ایک تو وہ اجزاء جن میں باہم ربط تو پیدا کرا دیا گیا ہو لیکن بغیر جبری انقلاب کے وہ مفوضہ خدمات انجام نہ دے سکتے ہوں۔ مثلاً زمین کے اجزاء میں کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہو یا گیہوں کی جگہ وہ جو پیدا کر دے یا اس کی ہیئت ترکیبیہ ضعیف ہو۔ دوسری صورت یہ کہ اجزاء کی طبیعت خاصیت ہیئت اور حالت ایسی بنائی گئی ہو کہ تکوین کے بعد فرض مقررہ کو ادا کرنے کے لئے کسی جبر و اکراہ کی ضرورت نہ ہو۔ سورج اور ستاروں کا طلوع و غروب اپنے وقت پر ہو۔ زمین پر موسمی تغیرات، فصلوں کا تبادل اور معدنی تبدلات سب ٹھیک وقت پر ہوں۔ کسی فرض کو ادا کرنے میں کبھی غلطی نہ ہو۔ اس لئے روزانہ فرائض فطرت کو ادا کرنے کے لئے کسی مزید جبری حکم کی حاجت نہ ہو اور اسی نظم و ہمواری سے ادائے فرائض کی وجہ سے بیوقوفوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ مادہ اور صورت کے تاثر و تاثیر کے درمیان تخلیق کے بعد خدائی ارادہ اور صنعت

وقدرت کو دخل دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ کائنات کا یہ زنجیری سلسلہ چل رہا ہے۔ علت معلول اور سبب مسبب کا ناقابل انقطاع تسلسل ہے۔ اللہ نے زمین و آسمان کی تمام طاقتوں کو ایسا متوازن اور منظم بنایا کہ ہر ذرہ کی طاقت ٹھیک ٹھیک اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ کبھی فطرت سے کسی نے سرکشی نہیں کی اور موجودات کا انتظام کبھی مختل نہ ہوا۔ سورج اور ستاروں کی رفتار، تاثیرات، روشنی، حرارت اور مختلف خصوصیات میں نہ کبھی کمی بیشی ہوئی، نہ ادائے فرائض میں کبھی تقدم تاخر۔ اسی طرح زمین اور کائنات زمین کی فطرت کا جو اقتضاء ہے وہ تکوین الٰہی اور تسخیر خداوندی پورا ہو رہا ہے۔ شاید حکم بجیئت اور اقرار اطاعت کا یہی مطلب ہے۔ والعلم عند اللہ۔

ابن عباسؓ نے تشریح آیت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے آسمانوں کو حکم دیا کہ چاند سورج اور ستارے ظاہر کرو اور زمین سے فرمایا دریا اور نہریں جاری کرو اور پھل پھول پیدا کرو۔ دونوں نے برغبت اس حکم کو مانا (اختارہ ابن جریر) حسن بصری نے فرمایا۔ اگر زمین آسمان سرتابی کرتے تو اللہ ان کو ناقابل برداشت عذاب دیتا (رواہ ابن ابی حاتم)

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ غرض جس طرح زمین اور زمین کی کائنات کی تخلیق تدریجی طور پر چار روز کے برابر وقت میں کی تھی اسی طرح دو روز کے برابر وقت میں مادہ سماوی سے بتدریج سات آسمان بنائے۔

وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا اس جگہ وحی سے مراد نقش کرنا لکھنا اور مقرر کرنا ہے۔ قلب میں القاء یا حکم دینا مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اوحینا کے بعد اس جگہ فی ہے الی نہیں ہے۔ یعنی ہر آسمان کو اللہ نے اس کی ڈیوٹی پر لگا دیا، خدمت کی تفویض کر دی اور فرض مقرر کر دیا۔ گویا جس طرح کسی پتھر پر حروف منقوش ہوتے ہیں اور ان کو وحی کہا جاتا ہے اسی طرح ہر آسمان میں اس کا فرض المقرش کر دیا۔ ترتیب تخلیق کے متعلق خطیب نے ابن جوزی کے حوالے سے ابن عباس کا قول لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنوں کے تمام نام اللہ نے مقرر فرمائے۔ زمین اتوار اور پیر کے دن پہاڑوں کو منگل کے دن۔ دریاؤں نہروں درختوں باغوں اور آباد ہونے والے مقاموں کے ناموں کو بدھ کے دن۔ چرندوں پرندوں درندوں وحشی جانوروں کیڑے مکوڑوں اور بلاؤں کو جمعرات کے دن اور آدمی کو جمعہ کے دن پیدا کیا اور سنیچر کے دن فراغت رہی۔ ابن عباس کی یہ روایت ضعیف ہے مسلم اور نسائی کی روایت کے خلاف ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے حضورؐ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اللہ نے خاک کو سنیچر کے دن، پہاڑوں کو اتوار کے دن، درختوں کو پیر کے دن، مکروہات کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن، زمین کے کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کو جمعرات کے دن اور آدم کو جمعہ کے دن عصر کے بعد آخری ساعت میں پیدا کیا۔ (رواہ مسلم والنسائی) ابن کثیر نے لکھا کہ بخاری نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو معلول قرار دیا ہے۔ شیخ ابن حجر نے فتح الباری میں بخاری کے کلام کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ ابو ہریرہ کعب احبار کے پاس بہت اٹھتے بیٹھتے تھے یہ قرینہ ہے کہ کعب احبار سے سنا ہوگا۔ اس کے علاوہ بعض ثقہ راویوں نے صراحتہً کہا ہے کہ ابو ہریرہ نے کعب احبار سے سن کر ہی یہ قصہ بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ توریت کے سفر الخلیقہ میں ترتیب تخلیق جس طرح بیان کی گئی ہے وہ حضرت ابو ہریرہ کی مذکورہ روایت کے خلاف ہے اس لئے کہ مذکورہ بالا روایت کو کعب احبار کا قول قرار دینا مناسب نہیں۔ اگر کعب احبار کا قول ہوتا تو توریت کے موافق ہوتا۔ ابن جریر نے بروایت عکرمہ ابن عباس کا قول اس طرح بیان کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر زمین و آسمان کی پیدائش کے متعلق سوال کیا حضورؐ نے فرمایا اللہ نے اتوار اور پیر کے دن زمین کو، منگل کے دن پہاڑوں کو، بدھ کے دن پانیوں، درختوں اور آبادیوں کے مقاموں کو پیدا کیا۔ یہ چار روز ہو گئے۔ پھر حضورؐ نے آیت ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض الآیات فرمائی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اللہ نے جمعرات کے دن آسمان کو جمعہ کے دن چاند سورج ستاروں اور ملائکہ کو تین ساعت دن باقی رہنے تک پیدا کیا۔ اس کے بعد والی ساعت میں انسان کو فائدہ دینے والی چیزوں پر آفت ڈالی۔ اور اس کے بعد کی ساعت میں آدم کو پیدا کر کے جنت میں بسایا اور ابلیس کو سجدۂ آدم کا حکم دیا اور آخری ساعت میں جنت سے نکالا۔ یہودیوں نے عرض کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ارشاد فرمایا اللہ نے عرش پر استواء فرمایا۔ یہودیوں نے کہا۔ آپ نے بیان ٹھیک کیا۔ لیکن جیسے ہم لوگ پورا بیان کرتے ہیں کاش آپ بھی پورا کر دیتے کہ اللہ نے عرش پر مستوی ہو کر تکان سے راحت حاصل کی۔ حضورؐ والا یہ سن کر غضب ناک ہوئے (اور یہودی اٹھ کر چل دیئے) اس پر آیت ولقد خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب الخ نازل ہوئی۔ ابن کثیر نے

اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ غرابت کی وجہ یہاں یہ ہے کہ مختلف اسنادوں سے مروی نہیں ہے اس کا سلسلۂ سند صرف ہناد بن سری عن ابی بکر بن عیاش عن ابی سعید البقال عن عکرمۃ عن ابن عباس ہے وہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہودیوں کی کتابوں میں ترتیب تخلیق کا یہ طریقہ مذکور نہیں ہے۔ توریت کی صراحت اس کے خلاف ہے پھر وہ کس طرح اس کو درست مان سکتے تھے۔

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ۔ یعنی اس نچلے سماء کو جو زمین سے قریب ہے چراغوں سے سجایا۔ سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ سات آسمانوں میں سے جو آسمان اس زمین سے قریب تھا اس میں اللہ نے کواکب بنائے یا اس کے جوف کے نیچے بنائے۔ بہرحال ان چراغوں سے اس کو سجایا۔ دیکھنے میں چراغوں کی طرح روشن دکھتے ہیں۔ وحفظا اور اللہ نے پوری پوری نگرانی کی۔ کس سے کس چیز کی حفاظت کی۔ اس جگہ اس کی کوئی صراحت نہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے کہ عالم بالا کے رہنے والے ملائکہ کے اسرار معلوم کرنے کے لئے شیاطین جن اوپر چڑھتے ہیں لیکن ڈر کے مارے چڑھ نہیں سکتے اگر کوئی جھپٹ میں کوئی راز معلوم کرکے بھاگتا ہے تو شہاب ثاقب اس کے مارا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اس زیریں آسمان میں کچھ کواکب بطور زینت پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ ٹوٹنے والے تارے بھی ہیں جو انگاروں کی طرح شیطانوں کے مارے جاتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں شہاب ثاقب کو بھی کوکب کہا گیا ہے۔ خدا خود ہی واقف ہے کہ ملائکہ کی گفتگو سننے کے لئے شیاطین کس طرح جاتے ہیں اور کیسے سنتے ہیں اور ملائکہ کیسے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ باتیں خود رموز و اسرار ہیں جن کو لسان نبوت ہی بیان کر سکتی ہے۔ ہم کو تو کچھ ٹوٹ کر گرنے والے اجرام کو نیہ دکھائی دیتے ہیں جن کی سرشت میں انہی عناصر اربعہ میں سے کوئی عنصر داخل ہے۔ واقع میں وہ سماوی اجرام نہیں لیکن بالائی یعنی فضائی اجرام ضرور ہیں۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ کائنات پر غور کرنے اور اس کی تکوین کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد اتنی بات بداہۃً معلوم ہوتی ہے کہ اس کو بنانے والا ہمہ گیر طاقت کا مالک ہے اور سارے سنسار پر غالب ہے۔ اسی لئے تو کسی کو سرتابی کی مجال نہیں اور سب اپنے فرض کی انجام دہی میں مشغول ہیں ادائے خدمت میں کمی بیشی یا تقدم و تاخر نہیں کر سکتے۔ یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ بنانے والی ہمہ گیر طاقت کے ساتھ محیط کل علم بھی رکھتا ہے۔ کائنات کی مشینری کو جن پرزوں کی ضرورت تھی اور جس ذرہ کی جو خصوصیت ہونی چاہیے تھی اس کا علم اس علیم کو تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ تخلیق اور نظم کے لئے کن چیزوں اور کن صفات و حالات کی ضرورت ہے۔ اس کے علمی اندازے سے کوئی چیز خارج نہیں۔

حاصل یہ کہ جو فلسفی تکوین کائنات کو اتفاقی غیر ارادی لاشعوری کہتے ہیں وہ جھوٹے ہیں سبب مسبب کا زنجیری سلسلہ ضرور جاری ہے۔ مگر اندازۂ الٰہیہ کے مطابق چل رہا ہے۔

وہ مشرک بھی جھوٹے ہیں جو عناصر کواکب ملائکہ موالید ثلاثہ یا آسمان و زمین میں کسی مخلوق کو معبود جانتے ہیں۔ کیونکہ سب بے بس مقہور ہیں۔ کوئی کسی کا خالق نہیں۔ اگر علت و معلول کا فطری تسلسل نظر آتا بھی ہے تو اجزاء نظام کا یہ ربط باہمی اضطراری ہے پھر کس طرح کوئی کسی کا خالق ہو سکتا ہے۔

اہل اسرار کے لئے چند باطنی رموز

استقامت کیا ہے ہر نیکی نیکی کیا ہے۔ اپنی نیکی پر بھی بھروسہ نہ کرنا اور اپنی ذات سے بھی الگ ہو جانا حدیث میں آیا ہے واستقیموا ولن تحصوا استقامت اختیار کرو اور نیکیوں کا شمار نہ کرو۔ ارشاد فرمایا شیبتنی ہود مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا کیونکہ اس میں حضور کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ استقامت کے بعد اگر حصول استقامت کا خیال آئے تو فریب نفس سمجھ کر استغفار کرے۔ صوفی کی نظر میں ظاہر باطن کی موافقت کا نام استقامت ہے بشرطیکہ استقامت کو از خود نہ خیال کرے من اللہ سمجھے۔ دو دن میں زمین پیدا کی گئی۔ ایک یوم القدر دوسرا یوم القضاء یا ایک یوم الامر دوسرا یوم الخلق۔ زمین میں حیوان و نبات کی روزی مقرر کر دی گئی لیکن ہر شخص کی روزی جدا جدا ہے۔ عام اجسام کی روزی یہی خورد و نوش اور لباس۔ روحانی بندہ کا رزق مشاہدہ ہے ربانی کا رزق مکاشفہ اور اہل عرفان کا رزق توحید و عرفان

مقصود بیان

ائنکم لتکفرون سے یہ مقصود ہے کہ آسمان زمین اور ان کی تمام موجودات سے تو اللہ کی الوہیت قدرت صنعت حکمت اور ربوبیت نمایاں ہے۔ آغاز آفرینش سے اب تک کل کائنات اللہ کے تصرف اور قبضہ سے خارج نہیں۔ ایسی حالت میں اس کی ذات یا صفات کا انکار کرنا تعجب انگیز ہے خلق الارض فی یومین میں صراحت ہے کہ زمین کی پیدائش دو روز کے برابر وقت میں ہوئی یعنی مادہ

نے رفتہ رفتہ تغیرات قبول کرتے کرتے صورتِ ارضی اختیار کی معلوم نہیں کہ کس قدر تغیرات ہوئے اور کتنے مدارج تعویری سے مادہ کو گزرنا پڑا۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کا امر تو آنی ہے زمانی نہیں پھر دو دوروز میں تخلیق کے کیا معنی۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ امر اور خلق میں فرق ہے۔ الا لہ الخلق والامر سے دونوں کا جدا جدا ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ امر تو کسی زمانہ کا محتاج نہیں۔ ارادہ کی ایک لہر ہے جس کو شاید آنی کہنا بھی بیجا ہے ہاں تخلیق امتداد کو چاہتی ہے۔ اگرچہ اللہ کے ہاں نہ ماضی ہے نہ استقبال لیکن فعل تخلیق بہرحال زمانی ہے تخلیق کا تعلق حوادث سے ہے اور ہر حادث کے حدوث کا ظرف زمانہ ہے اور امر کا تعلق محض ارادۂ الٰہیہ سے ہے جو احاطۂ زمانہ سے خارج ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا سے ثابت ہو رہا ہے کہ ہر جاندار وغیرہ کا رزق مقرر ہے۔ پہلے سے اندازۂ خداوندی میں ہے اور آسمان میں نہیں زمین میں ہے۔ تمام وسائلِ زیست اللہ نے زمین کے اندر مقرر کر دیئے ہیں ثُمَّ اسْتَوَى سے ظاہر ہے کہ آسمان کی پیدائش زمین کے بعد ہوئی۔ وَهِيَ دُخَانٌ سے مترشح ہے کہ آسمان سے پہلے اس کا مادہ موجود کر دیا گیا تھا جس کو دخان سے تعبیر کیا۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ الخ سے تکوینی اور فطری امر و اجابت کی طرف اشارہ ہے۔ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ میں سات آسمانوں کا ہونا مصرح ہے۔ وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا سے فطری نظم و نسق اور فرائضِ تخلیقی کی طرف اشارہ ہے۔

وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا سے واضح ہو رہا ہے کہ چمکتے ستارے چراغوں کی طرح اس قریب والے آسمان میں سجائے گئے ہیں اور ستاروں کے دوسرے منافع کے علاوہ یہ بھی فائدہ ہے کہ وہ اس محفل کی زینت ہیں لیکن ان سے کون سے کواکب مراد ہیں۔ کواکب سیارہ یا ثابتہ یا فضائیہ اس کی کوئی صراحت نہیں۔ بظاہر یہی کواکب مراد ہیں جو ہم کو آنکھوں سے دکھائی دے رہے ہیں اور چراغوں کی طرح ٹمٹمار ہے ہیں وَحِفْظًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ کواکب کا تخلیقی فائدہ حفاظت بھی ہے یعنی حفظ اسرار ملائکہ۔ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (١) اس پوری اونچی نیچی دنیا میں بلا اندازہ کوئی چیز نہیں۔ نہ کسی کی حرکت نہ سکون، نہ کمیت نہ کیفیت نہ ہیئت نہ مقامات نہ وضع (٢) اللہ غالب ہے طاقتور ہے۔ ہر چیز اس کے احاطۂ قدرت میں ہے (٣) اللہ عالم کل ہے۔ اس نے جان کر یہ سب کچھ بنایا ہے بن جانے نہیں۔ اور یہ تمام تخلیق غیر ارادی، لاشعوری اور اضطراری نہیں۔ ایسی نہیں جیسی سورج سے روشنی، آگ سے گرمی اور درخت سے سایہ پیدا ہو رہا ہے۔ وغیرہ۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ۝ إِذْ جَاءَتْهُمُ

پھر اگر (دلائلِ توحید سن کر بھی) یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر (شرک و کفر سے) آئی تھی جبکہ ان کے پاس

الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا

اُن کے آگے سے بھی اور اُن کے پیچھے سے بھی پیغمبر آئے کہ بجز اللہ کے اور کسی کو مت پوجو انھوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے پروردگار کو منظور ہوتا

لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ

(کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے) تو فرشتوں کو بھیجتا سو ہم اس توحید سے بھی منکر ہیں جس کو دے کر (بزعم خود تم) بھیجے گئے ہو پھر وہ جو عاد کے لوگ تھے وہ دنیا میں ناحق کا تکبر کرنے لگے

بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ

اور کہنے لگے وہ کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ ہو (آگے جواب ہے کہ) کیا ان کو یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا وہ اُن سے قوت میں بہت

مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ۝ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ

زیادہ ہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے تاکہ ہم ان کو

نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ

اس دنیوی حیات میں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب اور زیادہ رسوائی کا سبب ہے اور ان کو مدد

لَا يُنصَرُونَ ○ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ فَأَخَذَتْهُمْ

پہنچے گی اور وہ جو ثمود تھے تو ہم نے ان کو (پیغمبر کے ذریعہ سے) رستہ بتلایا سو انہوں نے گمراہی کو بمقابلہ ہدایت کے پسند کیا پس ان کو عذاب

صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (ع)

سراپا ذلت کی آفت نے پکڑ لیا ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے اور ہم نے (اس عذاب سے) ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور (ہم سے) ڈرتے تھے اور

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ○ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ

(ان کو وہ دن بھی یاد دلائیے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کرنے کے لئے (موقف حساب میں) لائے جائیں گے پھر وہ روکے جائیں گے (تاکہ بقیہ بھی آجائیں) یہاں تک کہ

سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ

جب وہ اس کے قریب آجاویں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہوکر) اپنے اعضاء سے کہیں گے

عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ (اعضاء) جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو

وَمَا كُنتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن

اور تم (دنیا میں) اس بات سے تو اپنے آپ کو چھپا ہی نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمہارے خلاف ہی گواہی دیں لیکن تم اس گمان

ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ○ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ

میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر ہی نہیں اور تمہارے اس گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا

أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ ○ فَإِن يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۖ وَإِن يَسْتَعْتِبُوا

تم کو برباد کیا پھر تم (ابدی) خسارہ میں پڑ گئے سو (اس حالت میں) اگر یہ لوگ صبر کریں تب بھی دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ عذر کرنا چاہیں گے

فَمَا هُم مِّنَ الْمُعْتَبِينَ ○ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

تو بھی مقبول نہ ہوگا اور ہم نے (دنیا میں) ان کے لئے کچھ ساتھ رہنے والے (شیاطین) مقرر کر رکھے تھے سو انہوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نظر میں مستحسن کر رکھے تھے اور ان

وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (ع)

کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدۂ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن و انسان (کفار) ہو گزرے ہیں بیشک وہ (سب) بھی خسارہ

میں رہے

تفسیر

سب کے پہلے، تمام پیغمبروں کا مقصد اور نظریہ ایک ہی ہوتا ہے۔ طریق تبلیغ میں بھی اصولی اشتراک ہوتا ہے، اور مختلف اقوام و ملل میں سے سرکش عنصر کا طرز فکر بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ ادھر سے توحید کا پیام آیا اور بصورت نافرمانی وعید و آخرت کے ساتھ دنیوی بربادی سے بھی ڈرایا گیا۔ ادھر سے انانیت اور غرور کا مظاہرہ کیا گیا۔ دولت کی کثرت، جماعت کی زیادتی، علم کی وسعت اور کبھی جسمانی طاقت اور مدنیت و حضریت کی بلندی پر نازش بیجا کی گئی۔ دنیوی تباہی کو موجودہ اسباب کے بل پر ناممکن خیال کیا گیا اور آخرت کی جزا سزا چونکہ حساب اعمال پر موقوف ہے اور اعمال کا حساب کون کر سکتا ہے، کس کو معلوم ہے کہ اندرون خانہ کوئی کیا کر رہا ہے، اس لئے آخرت کے عذاب کو ناممکن الوقوع سمجھ لیا گیا۔ جہالت ملی، مدت ملی، لیکن عدم یقین میں گذر گئی۔ آخر اسباب عادیہ غیبیہ کے زیر اثر بحکم حاکم تباہی آئی تختہ تاراج ہو گیا۔ نام لیوا باقی نہ رہا۔ ایک وعید پوری ہو گئی۔ رہی اعمال کی حساب فہمی، جرائم کا ثبوت اور شہادت تو حرکت کھال کی ہو یا بال کی، ہاتھ کی یا پاؤں کی کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اپنی اصلی حالت میں باقی رہتی ہے۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور آثار الصوت کی خفیف ترین جنبش بھی اسی اثیری لہروں میں بشکل اصلی باقی رہتی ہے۔ اب سے دس ہزار برس پہلے اگر زید نے شراب کا گلاس ہاتھ سے پکڑ کر منہ کو لگایا تھا وہ بعینہٖ اس فضا کی موج مکفوف میں موجود ہے۔ صرف آنکھوں سے پردہ ہٹنے کی دیر ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ نظر کے سامنے سے تمام حجابات دور ہو جائیں گے۔ ہاتھ پاؤں کھال بال ناک کان غرض ہر حصۂ بدن اپنے اچھے برے اعمال میں مشغول دکھائی دیں گے۔ زندہ ثبوت سامنے آ جائے گا۔ تمام اجزاء اعضاء مجسم شہادت بن جائیں گے۔ اس وقت انکار کا کچھ حاصل نہ ہو گا جس مجرم کا رونگٹا رونگٹا جرم کی مجسم شہادت بنا کھڑا ہو اور پکار پکار کر اعلان گناہ کر رہا ہو۔ ایسے مجرم کو مجرم قرار دینے کے لئے مزید ثبوت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سزا سامنے آئے گی تو برے ہم نشین اور گمراہ کن ساتھی تیار ہوں گے جنہوں نے زندگی میں ہر بری چیز کو آراستہ کر کے دکھایا تھا، ہر گناہ کو نیکی کا لبادہ اوڑھایا تھا اور شر کو خیر کا جامہ پہنایا تھا، لیکن اس وقت کیا فائدہ جو خسارہ ہونا تھا ہو چکا۔

تحلیلِ اجزاء

فَإِنْ أَعْرَضُوا: اعراض کے معنی ہیں رُخ موڑنا، رُخ موڑنا بے پروائی اور انکار کی علامت ہے، اس لئے مراد معنی ہوئے انکار کرنا اور نہ ماننا۔

فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ: صاعقہ کڑک کو کہتے ہیں۔ عاد و ثمود پر بجلی نہیں گری پھر صاعقہ سے کیا مراد ہے۔ عبروں نے کہا صاعقہ ہر اگوار مہلک مصیبت کو کہتے ہیں۔ اردو میں بھی بولا جاتا ہے۔ تجھ پر کون سی بجلی ٹوٹی کہ تو نے یہ کام نہیں کیا۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ عاد ہوں یا ثمود، طسم ہوں یا جدیس، قوم فرعون ہو یا اُمت نوح، بنی اسرائیل ہوں یا ہندوستان کے ہندو۔ پیام حق اور تعلیم صداقت کو ٹھکرانے کا نتیجہ تو بربادی سب ہی کیلئے مقرر ہے، لیکن بنی اسرائیل کی تباہی عرب کے صحرائی باشندوں نے کہاں دیکھی تھی۔ قبطیوں، ہندوؤں، چینیوں اور یونانیوں پر جو غیبی عذاب ٹوٹے ان کے آثار دیکھنے عرب کے بدوی کب گئے تھے۔ یہ واقعات تو عرب سے باہر اطراف عالم کے تھے۔ ہاں ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام عرب کی سرزمین کے باشندے تھے۔ عاد ثمود بھی عربی قومیں تھیں۔ حدود عرب میں رہنے والی اُن کہ نافرمانیوں کی جو سزا ملی تھی اس کے آثار اور نشانات عربی زمین پر باقی تھے اور چونکہ نافرمانیاں اختلاف اشکال کے باوجود مشترک عنصر رکھتی ہیں اور اسباب سرکشی بھی کم و بیش مشترک ہی ہوتے ہیں، اس لئے سزا بھی ایک جیسی ملنی قرین عقل ہے، اس لئے آیت میں فرمایا کہ عاد و ثمود جیسی مصیبت سے تم کو ڈراتا ہوں۔ عاد و ثمود نے سرکشی کی مصیبت میں مبتلا ہوئے، قریش نے پیغمبر برحق کی تکذیب کی، اُن کے بڑے بڑے مدبر بدر میں مارے گئے۔ اسی طرح وعید پوری ہوئی۔

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ: یہاں سے تباہی کے سبب کا بیان شروع کیا گیا۔ عاد و ثمود کے آگے پیچھے سے پیغمبر آئے کچھ پہلے گذر گئے کچھ بعد آئے۔ گذرنے والوں میں سے نوح اور ان کے جانشین تھے۔ پیچھے آنے والوں میں ہود اور صالح تھے۔ سب نے بالاتفاق ایک ہی تعلیم دی أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ کہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو، کسی کو معبود مت قرار دو، الٰہ مت جانو، اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی کا حکم مت مانو۔ ہم کو یہی حکم دے کر بھیجا گیا ہے۔ قوم والے کہنے لگے۔

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ ہم تم کو رسول نہیں جانتے تمہارے کہنے کو مانتے اگر (ہمارا طریقہ غلط ہوتا اور) اللہ ہماری اصلاح کرنا چاہتا تو ہدایت کے لئے فرشتوں کو بھیجتا کیونکہ تم ہماری طرح آدمی ہو۔ آدمی کے پاس خدا کا حکم کیسے آسکتا ہے، وہ لطیف یہ کثیف وہ نورانی یہ ظلمانی وہاں تک آدمی کی رسائی کیسے ہوسکتی ہے۔ قریش کو حضورؐ کی رسالت پر اسی قسم کے شبہے تھے۔ وہ بھی ایسی ہی کٹ حجتی کرتے تھے۔ پیغمبروں کی تکذیب اور وجہ تکذیب سب میں مشترک تھی۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۔ قوم عاد کو اپنے قوی ہیکل، دراز قامت اور سخت گیر طاقت پر بے جا غرور تھا۔ وہ کہتے تھے ہم سے زیادہ طاقتور کون (بقول خطیب ان میں بعض آدمیوں کا قد دو سو گز تھا۔ غالباً یہ اسرائیلی روایت ہے) قوم عاد کی حکومت عدن سے بصرے تک تھی۔ پہاڑوں سے بڑے بڑے بھاری پتھر اکھاڑ کر جہاں چاہتے اکھاڑ کر لے جاتے تھے تعداد بھی بہت تھی۔ ایک قوم، ایک نسل دیوقامت اور قوی ہیکل جیسے تاڑ کے درخت جیسے قد تعداد میں کثیر حکومت لمبی چوڑی بجائے اس کے کہ اللہ کا شکر ادا کرتے اترانے لگے۔ حضرت ہود نے ان کو تباہی سے ڈرایا۔ بولے ہم سے بڑھ کر طاقتور کون ہے جو ہم کو تباہ کرسکے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ طاقت ہم کو کس نے دی۔ ایسا قوی کس نے بنایا جس خدا نے یہ طاقت دی اُس کی یہ طاقت بڑی ہونی چاہیئے۔ خالق کا مخلوق سے زیادہ طاقتور ہونا امر بدیہی ہے جس کا مشاہدہ ہر سلیم الحواس آدمی کرسکتا ہے؛ اس لیے کسی عقلی برہان کی ضرورت نہیں کہ روشن دماغ دانشور ہی سمجھیں اور معمولی احساس والا نہ سمجھے۔

وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۔ اصل بات یہ تھی کہ غرور کا پردہ قوم عاد کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا اُن کو اللہ کی طاقت نہیں دکھتی تھی اور قدرتِ خداوندی کی نشانیوں کا اصرار کے ساتھ انکار کرتے تھے وہ فقط کافر رسول ہی نہ تھے بلکہ کافر نعمت بھی تھے اللہ کی بخشی واضح نعمتوں کی ناشکری کرتے تھے نعمتوں کو خداداد مانتے ہی نہ تھے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِىْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ ۔ ملک بہت سرسبز تھا۔ درخت بار آور کھیتی شاداب اور زمین زرخیز تھی۔ پانی اور ہوا بھی صحت بخش اور طاقت آفرین تھی، اس لئے ڈیل ڈول بھی لمبے چوڑے ہوتے تھے۔ قوم عاد کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور مغرور ہوگئے۔ ہود علیہ السلام پیغمبر نے ان کو نصیحت کی، ڈرایا، نہ مانے تو سخت قحط پڑا جس کا تذکرہ سورۂ الاعراف میں گزر چکا ہے۔ اس پر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو اللہ کی بھیجی ہوئی ایک طوفانی آندھی آئی اور چند روز مسلسل رہی۔ بقول مجاہد و قتادہ کے ماہِ شوال کے آخری بدھ سے شروع ہوکر آٹھ دن سات رات پیہم طوفان قائم رہا۔ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ جس قوم پر عذاب آیا بدھ ہی کے دن آیا۔ اس آندھی سے سوا اہلِ ایمان کے تمام قوم تباہ ہوگئی۔ اللہ نے اپنی قدرت سے اہلِ ایمان کو ہر دُکھ سے محفوظ رکھا۔

لِنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْىِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ۖ وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۔ آندھی کے زور نے پوری قوم کا زور ڈھا دیا۔ کھوکھلے درختوں کے تنوں کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ ایسی طاقتور با اقتدار قوم کی یوں خواری ہوئی۔ یہ تو دنیا میں حالت ہوئی آخرت میں اس سے بھی بڑی خواری ہوگی۔ وہاں کا عذاب تو اور بھی تباہ کن ہے کسی طرح کوئی مدد نہ کرسکے گا۔ بات یہ ہے کہ دنیا کا سکھ بھی حقیر اور دکھ بھی۔ آخرت کا ثواب بھی بڑا اور عذاب بھی۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ۔ قوم عاد سے سو برس کے بعد عادِ ثانیہ یعنی ثمود کا زمانہ آیا حضرت صالحؑ نے ان کو نصیحت کی یہ قوم بھی طاقتور تھی۔ پہاڑوں کے پتھروں کو تراش کر مکان بناتی تھی۔ گویا پہاڑوں میں کھود کر مکان تعمیر کئے تھے۔ مدینے سے شام کو جانے والے راستے پر اُن کی آبادیاں تھیں۔ پیغمبر نے ان کو اچھا برا راستہ دکھا دیا۔ حق و باطل میں فرق بتا دیا مگر وہ تھے نابینا اندھی عقل والے۔ انہوں نے حق کو پسند نہیں کیا کج راہی کو اختیار کیا۔ معجزہ طلب کرنے پر حضرت صالح کی دعا سے پہاڑ سے ایک غیبی اونٹنی پیدا ہوئی اور حضرت صالحؑ نے اس سے تعرض نہ کرنے کی ہدایت کردی اور بتا دیا کہ اگر اس سے تعرض کروگے تو تباہ کردیئے جاؤگے۔ یہ تمہارے لئے پیامِ ہلاکت لے کر آئی ہے لیکن وحشی قوم نہ مانی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا سب نے مل کر بسالت قدار کو اس کے قتل پر آمادہ کیا۔ اس بدبخت نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ بیچاری تڑپ

مرگئی ۔ سب نے تکہ بوٹی کر کے بانٹ کھایا ۔ اللہ کا عذاب آیا ۔ زمین میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی ۔ بھونچال نے بستیوں کو الٹ دیا ۔ ایک فضبی چیخ بھی پیدا ہوئی ۔ سب گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے جہاں تھے وہیں رہ گئے ۔ اہل ایمان بچا لیے گئے کافر تباہ ہوگئے ۔ ہو سکتا ہے کہ زلزلہ اسباب عادیہ کے تحت آیا لیکن تمام اہل ایمان کا محفوظ رہنا دوسروں کا ہلاک ہو جانا اپنے اندر درس عبرت رکھتا ہے ۔ کیا ثمود ہدایت یافتہ ہوکر مرتد ہو گئے تھے ۔ یہ ایک سوال ہے جس کا منشا فَهَدَيْنٰهُمْ کا لفظ ہے ۔ واقع میں تو ایسا نہیں ہوا ۔ قوم ثمود نے حضرت صالح کی تصدیق ہی نہیں کی نہ وحید عذاب کو صحیح سمجھا اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اہل تفسیر نے بہت دور از فہم تاویلیں کی ہیں ۔ سیدھی بات کو ٹیڑھا کر دیا ۔ اللہ نے ہر شخص کو دو راستے دکھا دیئے ہیں اَلَمْ نَهْدِهٖ النَّجْدَيْنِ ایمان، کفر، نیکی بدی اور خیر شر ہر راستے پر چلنے کا آدمی کو اختیار دیا ہے ۔ ثمود کو بھی اللہ نے یہی دونوں راستے بتا دیئے تھے کسی راستے پر چلنے سے روکا نہ تھا ۔ فطرت کی طرف سے قائم کیا ہوا سیدھا راستہ بھی ان کے سامنے تھا جس پر چل سکتے تھے ۔ اور ٹیڑھا راستہ بھی سامنے ہی تھا جس کو چھوڑ سکتے تھے، لیکن انہوں نے ٹیڑھے راستے کو سیدھے راستے پر ترجیح دی نابینا بن گئے ۔ منزل مقصود سامنے نظر نہ آئی اندھے غاروں میں جا گرے ۔

فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ سالف قذار اور اس کے ساتھیوں نے جب اونٹنی کو قتل کر دیا تو حضرت صالح آئے ۔ اونٹنی کی حالت دیکھ کر رو دیئے اور بدکاروں سے کہا عذاب آ پہنچا اب صرف تین روز کی تمہیں مہلت ہے ۔ لوگوں نے ہنسی میں اڑا دیا اور لگے ٹھٹھے کرنے ۔ پیغمبری فرمان کے بموجب سب کافروں کے بدن کا رنگ سرخ ہو گیا ۔ دوسرے دن زرد تھا اور تیسرے دن سیاہ ۔ بہت مضطرب ہوئے پیغمبر برحق کو قتل کر دینا چاہا، لیکن بس نہ چلا ۔ چوتھے دن کی صبح ہوئی، بدن کی سیاہی جاتی رہی سب خوش ہوئے ۔ خیال کیا کوئی زہریلی ہوا تھی جو سب کو بیمار کر گئی تھی ۔ اب سب تندرست ہو گئے ۔ انہی سرمستیوں میں تھے کہ زمین میں زلزلہ آیا ۔ گڑگڑاہٹ ہوئی، ہیبت ناک چیخ بھی سنائی دی ۔ دل دہل گئے، کلیجے پھٹ گئے ۔ گھٹنوں کے بل جیسے پڑے تھے ویسے ہی ہلاک ہو کر رہ گئے ۔ بداعمالی کی یہ قدرتی سزا تھی، لیکن متقی اہل ایمان کا کچھ نہ بگڑا ۔ اللہ نے ان کو بچا لیا ۔ کہا جاتا ہے اہل ایمان کی تعداد چار ہزار تھی ۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۔ دنیا میں جو سزا ملی وہ ملی ۔ یاد کرنے کا تو وہ دن ہے کہ اللہ کے دشمنوں کو جہنم میں ہنکا کر لے جایا جائے گا ۔ سب کافر جماعت در جماعت ہر سمت کی خاص خاص ٹولی راہ جہنم پر گامزن ہوگی ۔ دوزخ پر پہنچیں گے اور سب جمع ہو جائیں گے ۔ تو باز پرس کے لئے ان کو روک لیا جائے گا ۔ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۔ پرسش جرائم ہوگی تو وہ انکار کریں گے ۔ (اعمال ناموں کی شہادت تسلیم نہیں کریں گے ۔ پڑوسیوں اور گھر والوں کی گواہی کی بھی تکذیب کریں گے، فرشتوں کی شہادت بھی ان کے لیے قابل پذیرائی نہ ہوگی تو

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کان، آنکھیں اور کھالیں ثبوت بدکاری کی شہادت دیں گی ۔ شہادت کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ یہ اعضاء منہ کی طرح بولیں گے ۔ تحقیقی مطلب وہ ہے جو ہم تفسیری مقالہ میں اوپر لکھ آئے ہیں کہ تمام اعضاء گناہ کرتے ہوئے اصل حالت میں سامنے آ جائیں گے ۔ شراب کا پیالہ ہاتھ میں منہ سے لگا ہوا حرام آوازیں اٹھتی ہوئی اور کان ان کی طرف متوجہ غیر محرم عورتیں سامنے اور آنکھوں کا گھور کر ان کو دیکھنا ۔ غرض بدن کا ہر ننگا گناہ میں مبتلا سامنے آئے گا ۔ یہی ان کی شہادت ہوگی ۔ نطق و شہادت کے الفاظ کنائی ہیں ۔ مراد یہی ہے واللہ اعلم بالصواب ۔

صحاح کی حدیث ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں (ابن کثیر نے نقل کی ہے) کہ ایک روز حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے (کسی کی جرأت نہ ہوتی سبب دریافت کرتا خود ہی) فرمایا تم نے مسکرانے کی وجہ دریافت نہیں کی ۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ حضور کو ہنستا رکھے ۔ سرکار کے مسکرانے کا سبب کیا ہے ۔ فرمایا میں اس بات پر تعجب کر کے مسکرایا کہ قیامت کے دن کافر بندہ اپنے رب سے جھگڑے گا اور کہے گا پروردگار تو نے وعدہ کر لیا ہے کہ ظلم نہ ہوگا ۔ ارشاد ہوگا کیا میری اور میرے ملائکہ کی شہادت کافی نہیں ہے ۔ بندہ بار بار اپنی وہی بات کہے جائے گا ۔ آخر اللہ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا اور اس کان و اعضاء اس کی بداعمالیاں بیان کرنے لگیں گے ۔ جو کچھ اس نے کیا ہوگا ایک ایک کر کے بیان کر دیں گے ۔ پھر جب اس کا منہ کھلے گا تو وہ اپنے اعضاء سے کہے گا دور ہو کمبختو ۔ تم پر خدا کی لعنت تمہاری ہی طرف سے تو میں جھگڑ رہا تھا ۔ (رواہ البزار وابن ابی

حاکم والمسلم والنسائی)

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں مطلب یہی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا میرا خیال ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اُس کی ران بولے گی۔ (رواہ ابن ابی حاتم بسند صحیح)

حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا قیامت کے دن کافر کو آگاہ کیا جائے گا کہ یہ بدکاری تو نے کی تھی وہ انکار کر جائے گا ارشاد ہوگا تیرے پڑوسی اس کے گواہ ہیں۔ وہ کہے گا یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ارشاد ہوگا تیرے گھر اور کنبہ والے بھی گواہ ہیں۔ وہ پھر بھی جھگڑے گا اور کہے گا یہ جھوٹ کہتے ہیں (کم بخت) قسم بھی کھا جائے گا۔ آخر اللہ اس کو خاموش کر دے گا اور اس کے اعضاء اس کے خلاف شہادت دیں گے پھر اللہ اس کو دوزخ میں داخل کر دے گا (رواہ الامام ابو یعلیٰ الموصلی)

نافع بن ازرق خارجی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تھا قیامت کے دن ہولناک موقف ہوں گے۔ ایک وقت ہوگا کہ لوگ خاموش ہوں گے نہ زبان سے بات نکلے گی نہ کچھ عذر کریں گے۔ اس ہیبت کے بعد جب ان کو اجازت دی جائے گی تو کافر جھگڑیں گے یہاں تک کہ مشرک اپنے شرک سے ہی انکار کر جائیں گے اور قسم کھا جائیں گے جیسے یہاں جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ آخر اللہ ان کے منہ بند کر دے گا اور ان کی کھالیں آنکھیں کان ہاتھ پاؤں ان کے اعمال پر شہادت دیں گے پھر جب اللہ ان کا منہ کھول دے گا تو وہ اپنے اعضاء سے لڑنے لگیں گے۔ آخر کار انکار کے بعد اقرار ہوگا (رواہ ابن ابی حاتم)

حضرت جابر بن عبداللہ نے بیان فرمایا مہاجرین حبش جب مدینہ میں واپس آکر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو ایک روز حضورؐ نے فرمایا تم نے حبش میں کوئی انوکھی بات دیکھی ہو تو بیان کرو چند جوانوں نے عرض کیا یارسول اللہ ایک روز ہم بیٹھے تھے اسی قوم کی ایک بڑھیا سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے اُدھر سے گذری۔ بڑھیا راہبہ تھی اور دونوں ہاتھوں سے گھڑے کو تھامے ہوئی تھی۔ اتنے میں اُسی قوم کا ایک نوجوان لڑکا آیا۔ آہستہ آہستہ بڑھیا کے پیچھے چلا اور پیچھے پہنچ کر ہاتھ سے گھڑے کو دھکا دے دیا بڑھیا گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی گھڑا ٹوٹ گیا۔ بیچاری اُٹھی پیچھے پھر کر نوجوان کو دیکھا اور بولی گنڈے عنقریب تجھے معلوم ہو جائے گا جب اللہ اپنی کرسی بچھائے گا۔ اگلوں پچھلوں کو جمع کرے گا سب کو۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں اُن کی بدکاریوں کی گواہی دیں گے تب تجھے بھی معلوم ہو جائے گا کہ میرا تیرا معاملہ کیا ہوگا حضور والا نے فرمایا اُس بڑھیا نے سچ کہا (رواہ ابن ابی حاتم وابن ابی الدنیا)

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ کافر اپنی کھالوں سے پوچھیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کس طرح دی (تم میں بولنے کی طاقت ہی کب تھی) کافروں کا یہ خطاب ہوگا تمام اعضاء سے، لیکن ہاتھ پاؤں کان آنکھ وغیرہ کا بولنا اتنا دور از فہم نہیں جتنا کھال کا نطق دشوار معلوم ہوتا ہے، اس لئے سخت ترین تعجب کھال کے بولنے پر ہوگا ان کو ادھر سے جواب ملے گا جس خدا نے ہر چیز کو ناطق بنایا اسی نے ہم کو گویا کر دیا۔ آغاز بھی وہیں سے ہوا اُسی نے تم سب کو پیدا کیا اور انجام میں بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

کیا اللہ نے ہر چیز کو ناطق بنایا ہے۔ ہر چیز کا نطق کیسے ممکن ہے جبکہ جامد نابت اور حیوان۔ عناصر۔ زمین اور آسمان غرض انسان جن اور ملائکہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں بولتا اور کسی کو نطق کی طاقت نہیں۔ عام متکلمین مفسرین یہاں تک کہ امام رازی نے اس کے جواب میں کہا کہ زبانِ حال سے ہر چیز بولتی ہے۔ مصنوع صانع پر مربوب رب پر اور مخلوق خالق پر دلالت کر رہی ہے۔ یہی ہر چیز کا نطق ہے۔ آیت ان من شیء الا یسبح بحمدہ میں تسبیح سے مراد بھی یہی تسبیح حال ہے۔ میری رائے میں یہ جواب دونوں آیتوں میں کافی نہیں۔ زیر تفسیر آیت کا سیاق اور سباق دونوں بتا رہے ہیں کہ نطق سے مراد بولنا ہے۔ اعضاء جسم کہیں گے کہ جس خدا نے ہر چیز کو ناطق بنایا اسی نے ہم کو ناطق بنایا۔ کیا اعضاء کو ناطق بنانے کا مفہوم بھی نطق حال کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں وجہ تشبیہ کس طرح جامع ہوگی۔ اعضاء کے نطق سے نطق مقال اور اشیاء کے نطق سے نطق حال مراد لینے سے مابہ الاشتراک چیز کوئی پیدا نہیں ہوتی اور اگر نطق اعضاء ایسا ہی ہوگا جیسا متکلمین اور مفسرین نے نطق اشیاء کو بیان کیا ہے تو کافروں کے لئے وجہ تعجب کیا ہوگی۔ اور وہ کہتے سے کیا چیز

دریافت کریں گے۔

اسی طرح آیت تسبیح میں اگر تسبیح سے مراد تسبیح حالی ہو تو تسبیح حالی کو ہر دانشمند سمجھتا ہے پھر لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ سے فہم تسبیح کی نفی کیوں کی گئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ نطق سے مراد نطق مقالی اور تسبیح سے مراد تسبیح قولی ہی ہے لیکن ہر نطق کی کیفیت اور ہر قول کی حیثیت جداجدا ہے۔ انسان کا نطق حلق اور اوتار صوت کے اتار چڑھاؤ پر موقوف ہے۔ دوسرے حیوانوں کے نطق کا طریقہ کوئی اور درختوں کی زبان الگ اور پتھروں کی بولی جدا۔ غرض ہر چیز کے نطق کی نطقی کیفیت، ماہیت اور حالت الگ الگ ہے۔ ہم چونکہ کسی چیز کی کیفیت نطق سے واقف نہیں نہ ماہیت نطق سے نہ احوال نطق سے اسی لئے سب کو غیر ناطق کہتے ہیں۔ اس وقت اعضاء جسم اور ذرات جسم کا نطق کافروں کی کیا کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اسی لئے اعضاء جسم کے نطق پر تعجب ہوگا اور اعضاء کی طرف سے جواب ملے گا وہ یعنی ہر حقیقت ہوگا۔ یہ تو حقیقت نطق کی بحث تھی۔ رہی شہادت نطقیہ اور اس سے مراد تو ہم نے تفسیری مقالہ میں لکھ دیا ہے کہ اس جگہ یہ الفاظ کنائی ہیں۔ اعضاء شہادت مجسم بن کر سامنے آئیں گے۔ والعلم عند اللہ

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ۔ اس آیت کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے (۱) قیامت کے دن اعضاء بدن جو شہادت دیں گے انہی کا یہ مقولہ ہے یعنی اعضاء کہیں گے کہ جو کچھ تم کرتے تھے وہ ہم سے چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ اعضاء کی شہادت دینے کا تم کو اندیشہ ہی نہ تھا۔ بلکہ تمہارا تو خیال تھا کہ اللہ تمہارے کثیر اعمال سے ناواقف ہے۔ یہ تفسیر ابن کثیر نے لکھی ہے۔ (۲) خطیب نے کہا یہ قول اللہ کا ہے اور کلام مستانف ہے۔ اعضاء کا قول وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ پر ختم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جو بداعمالیاں چھپ کر اور پردہ کے اندر کرتے تھے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ تم کو اعضاء کے شہادت دینے کا اندیشہ تھا (اعضاء کی شہادت کا تو تمہیں خیال بھی نہ تھا) بلکہ چھپ کر کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ تمہارے خیال میں پوشیدہ اعمال سے خدا ناواقف رہتا ہے۔ خطیب کی یہ تشریح شان نزول سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ امام احمد نے بسند جید حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا ایک مرتبہ میں کعبہ کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ اتنے میں تین آدمی آئے یہ سب کافر تھے اور باہم قرابت دار تھے۔ ایک قریشی اور دو ثقفی تھے یا ایک ثقفی اور دو قریشی (نسیان از راوی) تینوں خوب موٹے تازے تھے۔ چربی سے پیٹوں پر تہیں پڑی تھیں، لیکن تھے کم سمجھ۔ تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اُن کا ابتدائی بیان میں نے نہیں سنا۔ اتنا حصہ سنا کہ ایک شخص کہہ رہا تھا کیا تمہارے خیال میں اللہ ہماری باتوں کو سنتا ہے۔ دوسرا بولا ہم اونچی آواز سے کہتے ہیں تو سن لیتا ہے آہستہ کہتے ہیں تو نہیں سن سکتا۔ تیسرے نے کہا اگر خدا کچھ سن سکتا ہوگا تو سب کچھ سنتا ہوگا۔ (یعنی وہ کچھ بھی نہیں سنتا) حضرت عبداللہ نے فرمایا میں نے ان کی باتیں سن کر حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی گفتگو عرض کی۔ اس پر اللہ نے آیت وَمَا كُنْتُمْ سے مِنَ الْخَاسِرِينَ تک نازل فرمائی (رواہ الترمذی ومسلم والبخاری) واقعہ نزول سے ثابت ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اعضاء بدن کا مقولہ نہیں نقل فرمایا ہے بلکہ اللہ نے کافروں کی حالت پر خود تبصرہ کیا ہے۔

ظن کے معنی ہیں گمان کبھی یقین کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں دونوں طرح استعمال کیا ہے إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ میں گمان تخمین اور اٹکل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت مندرجہ بالا اور اس سے بعد والی آیت میں ظن کے معنی ہیں یقین یعنی تم کو یقین تھا کہ اللہ تمہاری کثیر بداعمالیوں کو نہیں جانتا۔ قتادہ نے کہا ظن اعتقادی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک نجات دینے والا دوسرا ہلاک کرنے والا۔ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ نجات دہندہ ظن اعتقادی مراد ہے۔ اسی طرح الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ میں نجات دہندہ اعتقاد کا اظہار کیا ہے۔ دوسرا ظن اعتقادی مہلک وہ ہے جس کا بیان آیت وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ میں کیا ہے۔

وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ یعنی اللہ کو لاعلم اور ناواقف سمجھنے ہی نے تم کو ہلاک کیا۔ اللہ کی ناواقفیت کا عقیدہ بجائے خود فکری غلطی ہے اور جو شخص خدا کو بندوں کے اعمال سے ناواقف سمجھتا ہو وہ گناہ پر جسارت بھی زیادہ کرے گا اور یہی بداعمالی اُس کی ہلاکت کا سبب بنے گی۔ اس طرح اللہ کو جاہل اور بے خبر سمجھنے کا اعتقاد براہ راست بھی تباہ کن ہے اور بالواسطہ بھی۔ اس سے اس زندگی میں فکر و عمل دونوں کی تباہی ہوتی ہے اور دوسری زندگی میں بھی ابدی ہلاکت ہوگی

فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ وَإِنْ يَسْتَعْتِبُوا فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ دنیا میں دوبارہ لوٹ کر جانے کی خواہش نہیں کریں گے اور

عذاب پر صبر کریں گے تو بہر حال دوزخ ان کا ٹھکانا ہوگا اور راضی کرنا چاہیں گے تو ان کو رضامندی نہیں دی جائے گی یعنی اگر کچھ عذر معذرت کر کے وہ دنیا میں جانے کے خواستگار ہوں گے تو ان کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی اور دنیا میں لوٹ کر جانے کی اجازت نہیں ملے گی، یا یہ مطلب کہ اگر آگ پر صبر رکھیں گے تو بہر حال ان کا وہی ٹھکانا اور اللہ کو رضامند کر کے وہاں سے نکلنے کے خواستگار ہوں گے تو اللہ کی رضامندی ان کو حاصل نہ ہو سکے گی۔ دونوں صورتوں میں عذاب سے نجات ناممکن ہے۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ

قیض کے معنی ہیں انڈے کا چھلکا جو گودے سے چمٹا ہوتا ہے اور ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ بہکانے والا شیطان بھی ہر وقت ساتھ لگا رہتا ہے۔ آدمی سے جدا نہیں ہوتا۔

مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ سے مراد ہے دنیا اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد ہے آخرت یا اول سے مراد ہے موجودہ حالت اور دوسرے سے مراد ہے آئندہ حالت، اللہ کا ضابطہ یہی ہے کہ آدمی کی جیسی نیت ہوتی ہے اور جس قسم کا عمل جھکاؤ ہوتا ہے اللہ ویسے ہی اس کو اندرونی اور بیرونی ساتھی دے دیتا ہے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز چنانچہ جس کا میلان بداعمالی کی طرف ہوتا ہے اور نیکی سے اس کو نفرت ہوتی ہے تو اللہ اس کے لئے انس وجن میں سے اندرونی اور بیرونی ساتھی فراہم کر دیتا ہے۔ یہ شیاطین اس کے ساتھ ہر وقت لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ بہکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اول تو دنیا کی محبت دل میں رچاتے ہیں طرح طرح سے دنیوی سجاوٹ سامنے لاتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہ دنیا ہے حاصل زندگی یہیں کا عیش ہے حرام حلال کوئی چیز نہیں۔ اخلاقی قدریں فرضی افسانے ہیں۔ خدا کو کس نے دیکھا یہ قوت واہمہ کا خلل ہے۔ رسالت کا مفہوم تخیل کا ذہن سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ شرائع الٰہیہ چند وقتی قوانین کا نام ہیں وہ بھی اختراعی۔ کیسی قیامت اور کہاں کی آخرت، زندگی نام ہے اسی راحت و سرور کا، فارغ البالی اور فراخ حالی کا۔ حاصل کر و جس طرح مل سکے اور مزے اڑاؤ جس طور سے ممکن ہو۔ اور بالفرض اگر آئندہ زندگی ہوئی بھی اور اس کے رنج و راحت کی کوئی حقیقت بھی تو وہ بھی انہیں لوگوں کا حصہ ہے جو یہاں مرفہ الحال ہیں۔ فقر سے دونوں جہان میں منہ کالا ہوتا ہے جس کو یہاں سکھ ہے وہاں بھی سکھ ہے۔ جو اب دکھ میں ہے اب بھی دکھ میں ہوگا۔ نمونہ مشتے از خروارے یہاں کی حالت پیش خیمہ ہے وہاں کی حالت کا۔ گذشتہ ہوئی قومیں ایسی ہی خام خیالی میں مبتلا رہیں زر و جواہر جاہ و جلال، مال و منال ہمہ گیر اقتدار، اونچے مکان مضبوط محل، حشم و خدم کی کثرت، عیش و نشاط کا سرور، سرسبز باغ، شاداب کھیتیاں اور دولت کی ریل پیل ان کا بھی حاصلِ زندگی قرار پائیں۔ وہی حالت اُن کی ہے جو سزا اُن کو ملی ان کو بھی ملے گی۔ نتیجہ میں ان کے ہاتھ بھی خسران کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہ بھی گھاٹے میں رہیں گے۔ اللہ کی تو ایک بات ہے، ایک ضابطہ ہے وہ بہر حال پورا ہوتا ہے۔

مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ میں مِن بیانیہ ہے۔ لفظی قرب کے سبب امم کا بیان ہو سکتا ہے، لیکن معنوی لحاظ سے اس کا ربط قرناء سے ہے، اس لئے قرناء کا ہی بیان ہوگا یہی زیادہ مناسب ہے۔ یعنی آدمی کو بہکانے والے ساتھی آدمی بھی ہوتے ہیں اور جن بھی۔

مقصودِ بیان

اقوام عالم کے افکار ایک جیسے ہیں۔ انسان کا خمیر ہونا سب کو عجیب معلوم ہوتا ہے، اس لئے غلطی کا فکر نتیجہ بھی سب کو ایک ہی طرح بھگتنا پڑتا ہے۔ استکبار اور خود پسندی کی سزا بربادی ہے، خواری ہے جو ہو کر رہتی ہے، لیکن ایمان اور اصلاح عمل رکھنے والے ہر خواری سے محفوظ رہتے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کا یہی ضابطہ ہے۔ نَجَّيْنَا الَّذِينَ سے درسِ نصیحت دینا مقصود ہے ان لوگوں کو ہر حادثہ کو مادیت کے چشمے سے دیکھتے ہیں اور نازل ہونے والی مصیبتوں کو اسباب فطریہ اور نیچرل ذرائع کا اثر ضروری قرار دیتے ہیں۔ بخاراتِ ارضیہ کی وجہ سے زلزلہ آسکتا ہے، لیکن ہلاکت میں اچھے بُرے اور کھرے کھوٹے کا امتیاز بتا رہا ہے کہ تاثیر زلزلہ اللہ کے غیبی ہاتھوں میں ہے اور اسباب عادیہ کی تاثیر مؤثر حقیقی سے بے نیاز نہیں۔ شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ میں اعضاء بدن کی منطوق شہادت کی صراحت ہے۔ أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ سے ثابت ہو رہا ہے کہ ہر چیز ناطق اور با احساس ہے گویا یہ ان بیوقوف فلاسفروں کا رد ہے جو جمادات و نباتات کو عدیم الشعور اور صامت جانتے ہیں۔ قرآن کی صراحت اُن کے اس مفروضہ کے خلاف ہے۔ ذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الخ سے تباہی کا اصل گر بتانا مقصود ہے کہ خدا کو لاعلم قرار دینا اور اس کو ناواقف سمجھنا موجب ہلاکت ہے۔ اس نظریہ کو مان کر آدمی اعمالِ بد پر جرأت کرتا ہے اور نکر نتائج سے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔

اور یہی موجب تباہی ہے۔ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ سے اللہ کے اس مقررہ ضابطہ کی طرف اشارہ ہے کہ بداعمالی کی طرف جھکنے والے آدمی کو بہکانے کے لئے شیاطین جن وانس مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو دنیا کی محبت کو اس کے دل میں رچا دیتے ہیں۔ گویا دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے وغیرہ۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ○

اور یہ کافر (باہم) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس تدبیر سے) تم ہی

فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

غالب رہو سو ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے اور اُن کو اُن کے (ایسے) بُرے بُرے کاموں کی سزا دیں گے

ذَٰلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا

یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی یعنی دوزخ ان کے لئے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا اس بات کے بدلے میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار

يَجْحَدُونَ ○ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذَيْنِ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ

کیا کرتے تھے اور (جب مبتلائے عذاب ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنہوں نے

نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ○ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ

ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں کے تلے ڈال دیں تاکہ وہ خوب ذلیل ہوں جن لوگوں نے (دل سے) اقرار لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے

ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ

پھر (اس پر) مستقیم رہے اُن پر فرشتے اُتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو

الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَكُمْ

جس کا تم سے (پیغمبر کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارے لئے

فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ○ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ (ع)

اُس (جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اس میں جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے (جو لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے

الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

ہوں　اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے ثواب) آپ (مع اتباع) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجیے

فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ

پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے　اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے

صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ

جو بڑے مستقل (مزاج) ہیں اور یہ بات اُسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے　اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے　بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے

تفسیر جاہلوں کا طریقہ ہے کہ جب سچائی کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں دانشمندوں سے ہر عقلی گفتگو میں شکست کھاتے ہیں اور کوئی امید غالب آنے کی باقی نہیں رہتی تو جاہلانہ طرز معاشرت اختیار کرتے ہیں۔ صداقت اور حقانیت کا کوئی توڑ سوا اس کے ان کے پاس نہیں ہوتا۔ کہ جب اہل حق ندائے حق بلند کریں تو وہ سننے والوں کو طرح طرح سے بہکائیں، سیٹیاں بجائیں، آوازے کسیں اور شور مچائیں۔ جس طرح ممکن ہو حق کی آواز لوگوں کے کانوں میں نہ پہنچنے دیں۔ ایسی حالت میں حق کے علمبرداروں کو خواہ مخواہ غصہ آتا ہے وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں، گوشت پوست پٹھے ہڈی کے بنے ہوئے۔ جذبات اُن کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ گھونسے کا جواب گھونسے سے دیتے ہیں۔ جہالت کے مقابلے میں کچھ جہالت پر اتر آتے ہیں، لیکن مقابلہ کا یہ طریقہ ضرور آسان ہوتا ہے۔ لوگوں کی توجہ اصل حقانیت سے ہٹ کر جدال کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ پیام صداقت پر غور کرنے کا موقع فوت ہو جاتا ہے۔ در حقیقت یہ شیطانی ابھار ہوتا ہے جو غصہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جاہلوں کی بیہودگی کا اصل جواب یہ ہے جس سے اُن کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور اسی بیہودہ عداوت پیش کردہ میں سے کچھ لوگ اسی حربہ کی ضرب کھا کر گہرے دوست بھی بن جاتے ہیں کہ کسی بیہودگی کی طرف توجہ نہ کی جائے جاہلوں کی طرف سے پہنچنے والے ہر دکھ کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے۔ اور ہر حالت آفریں غصہ کو تھوک کر اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ دوسری طرف اپنے کام سے کام رکھا جائے۔ اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے اعمال پر استقامت رکھی جائے بدی کا مقابلہ نیکی سے کیا جائے۔ اپنے فرض کو فراموش نہ کیا جائے۔ دینی دعوت برابر جاری رکھی جائے اس میں کمی نہ آنے دی جائے۔ یہ طریقہ مخالفوں کے حوصلہ کو توڑ دیتا ہے۔ دشمنوں میں سے دوست پیدا ہو جاتے ہیں　عداوت والے گہرے یار بن جاتے ہیں۔ اللہ کے علمی کارندے اللہ کے حکم سے کارسازی کرتے ہیں اور اللہ مدد کرتا ہے آخر مشن میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔

تحلیل اجزاء وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ. ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قرآن میں لغو پیدا کرنے سے مراد ہے سیٹیاں اور تالیاں بجانا اور قرآن میں گڑبڑ پیدا کر دینا، ابن عباس کی ایک روایت میں آیا ہے عیب لگانا مراد ہے۔ قتادہ کے نزدیک تکذیب اور انکار مراد ہے۔ شیخ ابن کثیر کی تشریح زیادہ مناسب ہے۔ قشیری نے صراحت کی ہے کہ قرآن سن کر لوگوں کے دل کھنچتے تھے۔ رقیق القلب لطیف الدماغ آدمی تو بہت ہی متاثر ہوتے تھے، اس لیے پورے زنگ خوردہ دل رکھنے والے کافروں نے نوجوانوں کو قرآن سننے ہی سے منع کر دیا اور مشورہ دیا کہ جب رسول اللہ قرآن پڑھا کریں تو اس وقت تم تالیاں اور سیٹیاں بجایا کرو، شور مچایا کرو، شعر گایا کرو۔ ایسا کرنے سے قرآن

کی آواز کسی کے کانوں میں نہیں پہنچے گی اور لوگوں کا میلان اس کی طرف نہ ہوگا۔ اس تدبیر سے تم غالب آجاؤ گے۔

اس کے مقابلہ میں اہل ایمان کو اللہ نے حکم دیا تھا ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ الآیۃ۔ علماء نے لکھا ہے مسلمان کو چاہئے کہ تلاوت قرآن کے وقت غور و فکر کرے، دل کو نرم رکھے۔ اگر کوئی دوسرا پڑھتا ہو تو خاموشی اور ادب کے ساتھ سنے، کان لگائے رکھے۔ ایسی حرکت نہ کرے کہ پڑھنے والے کے پڑھنے میں کوئی خرابی آئے اور اس کی توجہ بٹے۔

﴿فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اس آیت میں عذاب کی وعید ہے۔ دنیوی عذاب یا اُخروی یا دونوں، اس کی کوئی صراحت نہیں۔ غالباً دونوں قسم کے عذاب مراد ہیں۔ بدترین سزا دینے کا یہ مطلب نہیں کہ جرم سے زائد سزا دی جائے گی بلکہ مراد یہ ہے کہ چونکہ ان کا جرم بدترین ہے، اس لئے عذاب بھی بدترین ہوگا، نہ دنیا میں ان کو غلبہ حاصل ہوگا نہ آخرت میں چین۔ بدر کی جنگ میں وعید پوری ہوئی۔ پڑھنے والے لاش ہو کر مارے گئے۔ کفر کی طاقت ٹوٹ گئی۔ غالب آنے کا خواب پورا نہ ہوگا۔ رہی آخرت تو وہاں کے دشمنوں کو آگ کے عذاب میں رہنا ہی پڑے گا اور دوامی طور پر رہنا پڑے گا

﴿ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ﴾ بیضاوی کے نزدیک دار الخلد سے دوامی عذاب مراد ہے۔ ابن عادل نے کہا کہ بعض روایات کے مطابق جہنم میں ایک گھر ہے اس کے ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ اس کا نام دار الخلد ہے۔ کافروں نے جس طرح ہر طرف سے عداوت کی آگ بھڑکائی اسی طرح سزا کی آگ ان کو ہر طرف سے گھیر لے گی۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ﴾ اس آیت میں کافروں کی اس حسرت کا بیان ہے جو قیامت کے دن ان کو ہوگی۔ بہکانے والے یہاں بہکاتے ہیں۔ شیاطین انس و جن دنیا کی متاع حقیر پر پالش چڑھا کر زیدہ زیب اور جاذب نظر بناتے ہیں اور قیامت کے دن جب دنیا کی کوئی دولت کام نہ آئے گی تکیہ والے پتے ہوا دینے لگیں گے تو دوزخیوں کے دلوں میں جلن پیدا ہوگی ان کا جذبۂ انتقام بھڑکے گا اور اپنے گمراہ کرنے والوں کو وہ قدموں سے روندھنا چاہیں گے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف اس قول کی نسبت کی جاتی ہے کہ آیت میں جن سے مراد ہے ابلیس اور انس سے مراد ہے حضرت آدم کا وہ بیٹا جس نے بھائی کو قتل کیا تھا۔ آیت میں اس کی کوئی صراحت نہیں۔ روایت میں بھی قوت نہیں، اس لئے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ جس نے جس کو گمراہ کیا ہے گمراہ ہونے والا اس کو اپنے قدموں تلے روندھنا چاہے گا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ اوپر کی آیت بہکنے اور گمراہ ہونے والوں کے احوال کی تصویر کشی تھی تاکہ کوئی بہکنے نہ پائے۔ اس آیت میں ثابت قدم اہل ایمان کی خوش انجامی کا اظہار ہے تاکہ کمزور ایمان والے بھی استقامت اختیار کریں۔ اجزاء آیت کی تشریح ہے۔

۱۔ استقامت کیا چیز ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضورؐ نے آیت ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ تلاوت فرمائی پھر ارشاد فرمایا یہ کلمہ بہت لوگوں نے کہا پھر کافر ہو گئے (یعنی کافرانہ اعمال اختیار کئے) پس جس شخص نے مرتے دم تک اس کلمے پر ثبات رکھا وہ مستقیم رہا (رواہ النسائی والترمذی والبویعلی والبزار وابن ابی حاتم وابن جریر وغیرہم)

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اسلام میں مجھے ایسی بات بتا دیجئے کہ پھر کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے فرمایا گواہی دے پھر استقامت رکھ (رواہ احمد والنسائی)

سعید بن عمران سے مروی ہے حضرت صدیق اکبرؓ کے سامنے میں نے آیت ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ پڑھی۔ فرمایا یہ وہ بندے ہیں جنہوں نے شرک نہیں کیا (رواہ ابن ابی حاتم) اسود بن ہلال کا قول ہے حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھ کر (حاضرین سے) فرمایا تم جانتے ہو اس کے کیا معنی ہیں۔ حاضرین نے جواب دیا ہم اس کے معنی وحدانیت کا اقرار اور ترک گناہ پر ثبات خیال کرتے ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ اس کی تفسیر ہے غیر اللہ کی طرف التفات

نہ کرنے پر ثابت قدم رہنا (رواہ ابن ابی حاتم)

ابن شہاب زہری نے کہا حضرت فاروقؓ نے منبر پر یہ آیت پڑھی اور فرمایا واللہ یہ لوگ اللہ کی اطاعت پر ثابت قدم رہے اور لومڑیوں کی طرح حیلہ بازی نہیں کی۔

حضرت عثمان نے فرمایا اللہ کے لئے خلوص عمل استقامت ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ادائے فرائض استقامت ہے (سراج منیر) حضرت ابن عباس نے فرمایا طاعت پر قائم رہنا اور معصیت سے پرہیز رکھنا استقامت ہے۔ عکرمہ کی روایت ہے حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا اللہ کی کتاب میں سب سے صاف اور آسان کون سی آیت ہے۔ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه پر ثابت قدم رہے (ابن ابی حاتم) علی بن ابی طلحہ کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول اس طرح ہے۔ فرائض الٰہی کی ادائیگی پر ثابت قدم رہنے کا نام استقامت ہے قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد، سدی اور دوسرے اکابر علماء نے استقامت کے معنی وہی بیان کئے ہیں جو اسود بن ہلال نے مذکورۂ بالا روایت میں صدیق اکبر کی طرف منسوب کئے ہیں۔ سفیان ثوری نے کہا قول و عمل کی مطابقت استقامت ہے۔ فضیل بن عیاض نے کہا دنیا کی رغبت نہ ہونا اور آخرت کی تمنا نہ کرنا استقامت ہے۔ ربیع بن انس نے کہا اللہ کے سوا ہر طرف سے منہ موڑ لینا استقامت ہے۔ اسود کی روایت میں حضرت صدیق کا بھی یہی قول ہے۔

؎ فرشتے اترتے ہیں بے خطر اور بے غم رہنے کی بشارت دیتے اور جنت کی خوش خبری سناتے ہیں۔ دوسری جگہ آیا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا الآیۃ۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ مومن کی روح سے ملائکہ کہتے ہیں اے پاکیزہ روح تیرے سبب سے پاکیزہ بدن کی آبادی تھی اب بدن سے نکل کر راحت و ریحان اور (جوار) رب رحمان میں داخل ہو جا (صحیح) مجاہد، عکرمہ اور زید بن اسلم نے کہا ملائکہ کہتے ہیں جہاں جا رہے ہو وہاں کچھ ڈر نہیں اور جس کو چھوڑ رہے ہو اس کا کچھ غم نہ کرو۔ ہم تمہارے دوست ہیں ہر برائی سے بے خوف رہنے اور ہر خوشی کے حاصل ہونے کی تم کو بشارت دیتے ہیں (ابن کثیر)

؎ فرشتے کہتے ہیں ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے دوست اور ساتھی ہیں یعنی دنیا میں تمہارے ساتھ رہتے ہیں تم کو سیدھا راستہ بتاتے ہیں پھر آخرت کی پہلی منزل یعنی قبر میں تم کو وحشت نہ ہوگی۔ ہم تمہارے مونس رہیں گے۔ نفخۂ صور اور حشر نشر کے وقت بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ یہاں تک کہ صراط مستقیم سے پار لگا کر جنات نعیم میں تم کو پہنچا دیں گے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ پرانے کافروں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا تھا کہ جہاں قرآن سنایا جا رہا ہو تم گڑبڑ کیا کرو تاکہ کوئی سن نہ سکے۔ ایسے اعدائے تبلیغ اور دشمنان قرآن کے مقابلے میں کچھ ایسے آدمی بھی تھے جنہوں نے اپنا سر اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے۔ اپنا رخ اللہ کی طرف پھیر لیا ہے۔ خدا نے جو صلاح اعمال اور درستئ زندگی کے لئے جو قوانین بتائے ہیں ان پر وہ خود بھی کاربند ہیں اور دوسروں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کے مصداق سب سے پہلے حضور اقدسؐ تھے اور حضور کے بعد صحابی ائمہ، اولیاء، تمام صلحائے امت اور علمائے دعوت۔ محمد بن سیرین، سدی اور عبدالرحمٰن بن زید نے یہی تفسیر کی ہے (ابن کثیر)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول موذنوں کے حق میں ہوا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کا یہی قول ہے۔ عکرمہ، قیس بن ابی حازم اور مجاہد کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی جاتی ہے (خطیب) حضرت ابو امامہ باہلی نے کہا کہ عمل صالح (سے مراد) اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز ہے۔ اذان کی فضیلت بکثرت احادیث میں مصرح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے سب سے دراز گردن موذن ہوں گے (صحیح مسلم) امام ضامن ہوتا ہے موذن امانت دار ہوتا ہے۔ الٰہی میری امت کے اماموں کو ہدایت دے اور موذنوں کو بخش دے (السنن) حضرت سعد بن ابی وقاص نے فرمایا قیامت کے دن موذنوں کا درجہ نمازیوں کے برابر ہوگا۔ اذان اور اقامت کے درمیان موذن کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے راہ خدا میں لڑ کر خون میں لوٹ کر شہید ہونے والے کی (ابن ابی حاتم) حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر میں موذن

ہوتا تو مجھے کچھ پرواہ نہ ہوتی کہ میں نے حج عمرہ اور جہاد (نفل) نہیں کیا۔ فاروق اعظم نے فرمایا اگر میں مؤذن ہوتا تو میرا کام پورا ہو جاتا پھر مجھ کو پرواہ نہ ہوتی کہ تہجد کے واسطے اٹھوں یا دن کے روزے رکھوں۔ میں نے خود سنا حضورؐ فرما رہے تھے الٰہی مؤذن کو بخش دے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ حضورؐ ہم کو ایسی حالت میں چھوڑے جا رہے ہیں کہ ہم اذان (دینے) کے لئے تلواروں سے (لڑنے کی) جرأت کریں گے۔ فرمایا عمر ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اذان دینے کی خدمت لوگ اپنے ضعیف لوگوں پر چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ مؤذن کے گوشت کو اللہ نے آگ پر حرام کر دیا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک کا قول ہے کہ اذان واقامت کے درمیان دعا رد نہیں ہوتی (ابوداؤد، ترمذی نسائی) ان تمام احادیث اور آثار سے اذان کی فضیلت ظاہر ہو رہی ہے، لیکن آیت میں مؤذن مراد ہیں۔ اس کی صراحت صحابہ میں صرف ام المومنین کی منسوب ہے، مگر شاید اس نسبت میں ضعف ہے، کیونکہ آیت مبارکہ کی ہے اور اذان کا آغاز مدینہ میں اس وقت ہوا جب حضرت عبداللہؓ بن زید انصاری نے خواب دیکھا تھا، اس لئے صحیح یہی ہے کہ آیت کا حکم عام مؤذن بھی اسی میں داخل ہے۔

حسن بصری نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا تھا یہی حبیب اللہ ہے یہی ولی اللہ ہے یہ صفی اللہ ہے یہی زمین والوں میں اللہ کے نزدیک سب سے بہتر ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے اللہ کی دعوت قبول کی۔ قول کے موافق عمل بھی کئے اور لوگوں کو بھی دعوت دی اور کہا میں فرماں بردار ہوں۔ یہی ہے خلیفۃ اللہ ہے۔ (رواہ عبدالرزاق)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی اور صدیق اکبرؓ نے صدق دل سے لبیک کہا پھر حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعوت دی اور اکابر صحابہ (عثمان طلحہ وغیرہما) نے لبیک کہی۔ اسی طرح تمام صحابہ اس شرف سے ممتاز ہوئے۔ پھر آنے والے لوگوں کو نیابت حاصل ہوئی۔ سچ ہے دعوت مؤذنین اور تمام اصحاب خیر کی دعوت کے ترتیب وار مدارج ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔ نیکی اور بدی نتیجہ کے اعتبار سے برابر نہیں۔ کافروں کی وہ بدی کہ خود بھی بدکار ہیں اور اگر ان کو کوئی سمجھائے تو اس کو بھی روکتے ہیں۔ سچی بات نہ خود سنتے ہیں نہ دوسروں کو سننے دیتے ہیں اور حق پرست گروہ کی یہ نیکی کہ اللہ نے جب اُن کو صراطِ مستقیم کی طرف بلایا تو خود بھی آگئے اور دوسروں کو بھی تباہ ہوتے نہ دیکھا گیا تو ان کو بھی سمجھانے میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ ان دونوں کا نتیجہ اور مآل مرتبہ ایک ہی طرح نہیں ہو سکتا۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ۔ دشمن کی ایذا رسانی طعن تشنیع تحقیر اور استہزا بہت سے صبر و اراں صداقت کے لئے بھی حوصلہ شکن ہوتی ہے۔ اہل حق بھی آخر انسانی حدود کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ بشری خدمات سے وہ پاک نہیں ہوتے۔ بدی کا مقابلہ بدی سے کرنے پر وہ کبھی آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن تبلیغ و دعوت کی جڑ تحمل ہے۔ قوتِ برداشت کی کمزوری اچھا نتیجہ نہیں پیدا ہونے دیتی، اس لئے آیت میں اللہ نے ایک عام سماجی معاشرتی اخلاقی تعلیم دی ہے کہ بدی کا مقابلہ بدی سے نہ کرنا چاہیئے۔ مقابل کی طرف سے نازل کی ہوئی ہر مصیبت کو کشادہ پیشانی سے انگیز کرنا اور بدی کے مقابلے میں نیکی کرنا ضروری ہے۔ اس تدبیر سے دشمن بھی گہرا دوست بن جائے گا۔ حضورؐ کا خلق کریم تو بہر حال اس تعلیم سے پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ اس لئے خصوصی خطاب نہیں بلکہ عام معاشرتی ضابطہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ تمام خانگی سماجی معاملات کی درستی اس ضابطہ پر عمل کر کے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ قانون صرف ملکی اور سماجی ہے۔ جنگی نہیں۔ جنگ میں حدود انصاف کے اندر رہ کر غلظت اور شدت کو استعمال کرنا جائز ہے۔

مقاتل کا قول ہے کہ آیت کا نزول ابو سفیان کے حق میں ہوا۔ حالتِ کفر میں ابو سفیان حضورؐ کے سخت دشمن تھے اور ان گنے ہوئے دشمنوں میں سے تھے جن کو حضورؐ کی تبلیغ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ باوجودیکہ معاویہ اور ام المومنین) ام حبیبہ دونوں کہ ہی میں ہجرت سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے، لیکن باپ کی اسلام دشمنی انتہائی ترقی پر تھی، مگر حضور والا ان کے ساتھ نرمی کا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ آخر ابو سفیان مسلمان ہو ہی گئے۔ شروع میں ضعیف الایمان تھے۔ آخر میں ایمان پختہ ہو گیا۔ مقاتل کی یہ روایت معلوم نہیں اسناداً کیسی ہے، لیکن درآیتہً کمزور ہے۔ ابوسفیان تو فتح کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضور کے اخلاق کو دیکھ کر نہیں بلکہ عام اقتدار اور غلبہ کو دیکھ کر حلقہ بگوش بنے تھے۔ آیت مکی ہے کی زندگی کے دوران میں ابوسفیان حضور والا کے کب دوست تھے کہ ان کو ولی حمیم کہا جا سکے۔ حقیقت میں یہ ایک عمومی تعلیم ہے۔ جس کی نظیر دنیا کے کسی سماج

میں نہیں مل سکتی۔ اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ بھی اس سے کئی درجہ نیچا ہے۔ سچ ہے کہ دشمن کو دوست بنانے کے لئے اس سے زیادہ مفید نسخہ ممکن ہی نہیں
وَمَا یُلَقّٰہَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰہَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔ یعنی بد سلوکی کو برداشت کرنا اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا صرف اہل صبر ہی کا حصہ ہے
مطلب یہ کہ اس صفت کے حامل صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو دبا کر مضمحل کر دیتے ہیں، غصہ پی جاتے ہیں۔ ناگوار باتیں بھی انگیز کر لیتے ہیں۔
اور اپنی ذات کا انتقام نہیں لیتے۔ حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کو کوئی ناگوار بات کہہ دیتا ہے وہ جواب میں کہہ دیتا ہے
اگر تو نے سچ کہا (اور میں ایسا ہی ہوں جیسا تو نے کہا) تو اللہ مجھے بخش دے اور اگر تو نے جھوٹ کہا تو اللہ تجھے معاف فرمائے۔

ابن کثیر کے نزدیک حظ عظیم سے مراد ہے بڑا ثواب۔ قتادہ کے نزدیک جنت مراد ہے۔

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں شیطان اس بات سے تو
مایوس ہو چکا ہے کہ اس کی پوجا کی جائے گی، لیکن وہ تمہارے درمیان تحریش کرے گا یعنی ایک کو دوسرے پر بھڑکائے گا اور فساد ڈلوائے گا

آیت میں شیطان کا لفظ عام جن ہو یا آدمی مراد یہ ہے کہ با قتضاء بشریت اگر کوئی شیطان تم کو ابھار دے اور غصہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگو
غصہ کو پی جاؤ۔ حقیقت میں ابلیس کے علاوہ انسانی شیطانوں کی طرح کاریاں اور فتنہ پردازیاں بھی بہت سخت ہوتی ہیں۔ آدمی کی شرارت آفرینی
بھی کبھی آدمی کو دشمن تو دشمن اپنے بھائی کے خلاف غضب ناک کر ہی دیتی ہے۔ اس لئے اللہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی۔ ابن کثیر کے نزدیک آیت میں جنی
شیطان مراد ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ انسانی شیطان تو اکثر احسان سے دب جاتا ہے۔ اور دوست بن جاتا ہے، لیکن ابلیس اور اس کی ذریات
کو رام کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں۔ وہ اس طرح سے رام نہیں ہوتے تو علاوہ خوش خلقی اختیار کرنے کے اس کے وسوسے سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ بنا بریں
شیخ نے یہ خیال فرمالیا کہ خوش خلقی اختیار کرنے سے شیطان کو رام کرنا مقصود ہے اور چونکہ شیطان اس طریقہ سے مطیع نہیں ہو سکتا، اس لئے استعاذہ
کی ضرورت ہے، مگر شیخ کا یہ خیال غلط ہے۔ آیت مندرجہ بالا کا یہ مفہوم ہی نہیں ہے۔ بدی کو نیکی کر کے دفع کرنے سے بدی کرنے والا نرم پڑ جاتا ہے اور
دوست بن جاتا ہے۔ آیت کا یہی مفہوم ہے۔ رہا بہکانے والا خواہ وہ کوئی آدمی ہو یا جن اُس کا رام کرنا مقصود نہیں نہ اس طریقہ سے وہ خوش ہوتا ہے
بلکہ اپنی فتنہ پردازیوں اور وسوسہ آفرینیوں کو ناکامیاب دیکھ کر تو اس کا غصہ اور تیز ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

شیطان کا وسوسہ تین طرح کا ہوتا ہے (۱) دل میں رعونت پیدا کر کے اس کو خود غلط بنا دینا (۲) خواہشات اور شہوانیات کی طرف مائل کرنا۔
(۳) غضب ناک بنا دینا۔ اوّل کو نفث کہتے ہیں دوسرے کو نفخ اور تیسرے کو ہمز۔ اسی لئے حضورؐ والا جب نماز کو کھڑے ہوتے تو دعا کرتے
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ہَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ (رواہ ابن کثیر فی تفسیرہ)

خطیب نے سلیمان بن صرد کی ایک روایت نقل کی ہے کہ دو آدمیوں میں ایک بار کچھ گالی گلوچ ہو گئی۔ ایک بہت مشتعل ہو گیا منہ میں جھاگ بھر آئے
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت ملاحظہ کی تو فرمایا مجھے ایک بات معلوم ہے اگر یہ شخص وہ الفاظ کہہ دے تو اس کی یہ حالت جاتی رہے گی یعنی
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت تلاوت فرمائی (صحیحین)

مقصودِ بیان

لَا تَسْمَعُوْا الخ سے دو باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔ ۱۔ اہلِ باطل کے پاس حق کو توڑنے والی جب کوئی دلیل باقی نہیں رہتی اور
ان کو اپنی مغلوبیت نظر آتی ہے تو وہ لوگوں کو حق سے روکنے کے لئے حیالانہ تدبیریں کرتے ہیں اور بہر صورت کوشش کرتے
ہیں کہ کوئی حق کی آواز سن ہی نہ سکے، لیکن ان کی ہر کوشش بے سود ہوتی ہے اور حق حق بن کر نمایاں ہوتا ہی ہے۔
۲۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت خاموش رہیں۔ ادب سے سنیں گڑبڑ نہ کریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں قابل
ستائش مومنوں کے اوصاف کے مجموعہ کو قرار دیا۔ ایمان اور استقامت یعنی عقیدہ کی درستی اور اعمال کی صلاح۔ لفظ استقاموا سے اس طرف بھی اشارہ
ہے کہ فقط زبان سے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرنا اور شرائع الٰہیہ کے مطابق اعمال کی درستی نہ کرنا شرعاً قابلِ اعتماد نہیں۔ اقرار توحید کے ساتھ استقامت
لازم ہے یعنی اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف۔ ایسا جھکاؤ کہ اللہ کی ناراضگی کے باوجود اس کی رضا مندی کو حاصلِ زندگی قرار دے لیا جائے
شانِ مومن نہیں

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دعوت ایمانی اور تبلیغ اعمال صالحہ اللہ کی نظر میں بہت پسندیدہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جہاں دوسروں کو دعوت دی جائے وہاں اپنے اعمال کو بھی صالح بنایا۔ شرط کے بغیر شروط اور قید کے بغیر مقید قابل مدح نہیں۔ مبلغ کی تبلیغ اور واعظ کا وعظ اسی وقت مستحق ستائش ہے جب مبلغ اور واعظ کے بھی اعمال درست ہوں۔ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ مسلمان صالح الاعمال ہوتا ہے یعنی تبلیغ نہ کرنی یا اپنے اعمالوں کو درست نہ کرنا مسلم کی شان نہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ الخ میں ایک سماجی ضابطہ کا بیان ہے جو معاشرہ کی تنظیم اور دشمن کو دوست بنانے کے لئے اکسیر ہے۔ اس ضابطہ کی تعلیم دی ہے کہ جہاں حصول برتری کی ہوس اور باہمی رعونت اور سماج میں بہوہ تعلب کی خواہش کی بیخ کنی ہے۔ وہاں عقل و روح کے ایک بہترین جوہر کو بھی نمایاں کیا ہے اور در پردہ تلقین کی ہے کہ مرد مومن کو جذبات کا شکار ہو کر دانشمندی کو مغلوب نہ کر دینا چاہیے۔ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اس جاہل مبلغ کو جو کرسی من الملک بیاکر دوسروں کو جاہل کہتا ہے اور جب کوئی اس کے مقابلے پر آ جائے تو اول تیغ کر غالب آنا چاہتا ہے۔ منہ میں جھاگ بھر لاتا ہے اور جنگ و دفاع کا بگڑ لڑائی کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس طرح ترغیب اسلام کی بجائے لوگوں کو اسلام سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ایسی عبرت پکڑنی چاہیے ان مبلغوں اور مناظرہ کرنے والے مسلمانوں کو بھی جو دنیا میں اسلام کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک دشمن مسلم نہیں بنیں گے وہ دشمنوں کو دوست نہیں بنا سکتے۔

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا سے دشمنوں کی طعن و تشنیع، توہین اور استہزاء پر صبر کرنے اور ماتحت ذات کا انعام ملنے کی اعلیٰ تلقین ہے۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ سے مترشح ہو رہا ہے کہ شیطان جن ہو یا آدمی بہکانے اور ابھار دینے سے باز نہیں رہتا۔ کسی کو ابھار دینا اور بداخلاقی پر آمادہ کرنا شیطانی فعل ہے۔ آدمی کو خود بھی اس سے باز رہنا چاہیے اور کوئی دوسرا بھڑکائے اور دل میں وسوسہ پیدا ہو تو اللہ کی پناہ کا خواستگار رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے پناہ مانگنی نفسانی غصہ کو ہٹا دیتی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ

اور منجملہ اس کی (قدرت و توحید کی) نشانیوں کے رات ہے اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے (پس) تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور صرف خدا

وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا

کو سجدہ کرو جس نے اُن (سب) نشانیوں کو پیدا کیا اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا ہے پھر اگر یہ لوگ تکبر کریں

فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔـمُوْنَ ۝ السجدۃ وَمِنْ

تو جو فرشتے آپ کے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی پاکی کرتے ہیں اور وہ (اس سے ذرا) نہیں اکتاتے اور منجملہ اس کی قدرت و

اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ

توحید کی نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب) تو زمین کو دیکھتا ہے کہ دبی دبائی (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور

اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ

پھولتی ہے (اس سے ثابت ہو گیا) جس نے اس زمین کو زندہ کر دیا وہی مُردوں کو زندہ کرے گا بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں کجروی

فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ

کرتے ہیں وہ لوگ ہم پر مخفی نہیں ہیں سو بھلا جو شخص نار میں ڈالا جاوے، وہ اچھا ہے، یا وہ شخص جو قیامت کے روز امن وامان کے ساتھ جنت میں

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا

آئے جو جی چاہے کرلو وہ تمہارا سب کیا ہوا دیکھ رہا ہے جو لوگ اس قرآن کا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں

جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ

(ان میں خود) اور یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے

خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝ مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ

پیچھے کی طرف سے یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے آپ کو وہی باتیں (تکذیب وایذا کی) کہی جاتی ہیں جو آپ سے پہلے رسولوں کو

قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ ۝

کہی گئی ہیں آپ کا رب بڑی مغفرت والا اور دردناک سزا دینے والا ہے۔

تفسیر رات کی تاریکی کے بعد دن آتا ہے یا دن کے بعد رات آتی ہے۔ زوال ظلمت کا نام نور ہے یا روشنی نہ ہونے کا نام تاریکی یا نور وظلمت دونوں اپنی جگہ وجودی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ بھی کہو تبادل یقینی ہے۔ رات کو چاندنی اور دن کو سورج کی روشنی ہوتی ہے۔ اوپر سے بارش ہوتی ہے۔ مری ہوئی زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ کھیتی ہے ابھرتی ہے سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔ ایسا سب کچھ کیوں ہوتا ہے کون کرتا ہے۔ کوتاہ نظر والا آدمی کہتا ہے چاند سے چاندنی اور سورج سے روشنی ہوتی ہے۔ سردی گرمی پھلوں کی پیدائش اور پختگی، حیوانوں کے جسمانی اور دماغی تغیرات غرض کائنات میں تمام تبدیلیوں کا مدار انہی پر ہے۔ یہی رازق ہیں، دیوتا ہیں، کارساز ہیں، انہی کے قبضہ میں ہماری زندگیوں کے تغیرات ہیں۔ کیا پانی سے کھیتی اور درختوں میں سبزی نہیں آتی کیا اس کے بغیر بھی شادابی ہو سکتی ہے۔ کیا سورج اور چاند کے بغیر عالم میں روشنی ہو سکتی ہے یا سبزہ اور پودا پیدا ہو سکتا ہے یا پھل پک سکتے ہیں یا حیوان کی نسوں میں خون دوڑ سکتا ہے یا تصورات کی لہریں دماغ میں اٹھ سکتی ہیں۔ جب انہی پر مدار ہے تو یہی دیوتا ہیں۔ معبود ہیں، مسجود ہیں، الٰہ ہیں، محتاجوں کی پناہ ہیں، اس اندھے دماغ والے کی بصیرت اندھی ہے۔ اس کو نہیں دکھتا کہ رات دن کا چکر تو غیر اختیاری ہے۔ چاند سورج کی ضیا ریاشیاں اور نور بیزیاں تو اضطراری ہیں۔ ان تاثیرات میں خود ان کو کچھ دخل نہیں۔ یہ خود بے بس ہیں، مجبور ہیں، پانی کا اثر زمین کو زندہ نہیں کرتا۔ خالق اور فاعل حقیقی تو کوئی دوسرا ہے جس نے چاند اور سورج کو روشن کیا۔ رات اور دن کا چکر مقرر کیا، پانی برسایا، پانی میں سبزہ پیدا کرنے کی طاقت پیدا کی۔ ایسا قادر مطلق ہے، الٰہ برحق ہے۔ آیات فطرت کا فاطر سے رخ موڑنا، نشانات قدرت کو قادر سمجھ لینا اور مجبور کو مختار جاننا نادانی ہے، کج فہمی ہے۔ قادر مطلق خدا ہی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے جو رات کو دن کی روشنی سے اور مردہ زمین کو پانی سے زندہ کرتا ہے۔ وہی قیامت کے دن مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔

تحلیل اجزاء

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ ذاتِ الٰہی کا تصور ناممکن ہے۔ صفات میں براہِ راست غور نہیں کیا جا سکتا بجز یہ کہ اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے غور کیا جائے۔ گمراہی اور اغوا سے نجات پانے کا واحد ذریعہ فکر آیات ہے فہم انعامات ہے۔ سب سے نمایاں رات دن کا چکر ہے ایک تاریک دوسرا روشن ایک آرام دہ سکون بخش دوسرا معاش آفرین۔ یہ چکر کیا خود بخود ہے کیا بغیر ارادہ کے ہے۔ نہیں! یہ کسی باشعور اور صاحب ارادہ کا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہے۔ ایک قادرِ مطلق خالق۔ صاحب ارادہ مختار حکیم اور ہمہ گیر حکمران کے زیرِ تصرف سب کچھ ہو رہا ہے۔ تاریکی اور روشنی اسی نے بنائی ہے۔ وہی اس کا تبادلہ کر رہا ہے۔ خیر و شر کو اسی نے پسند کیا۔ اُسی کے اندر ان کی گردش ہے۔ زندگی اور موت بھی اسی کا قبضہ ہے۔ وہی عدم کے بعد وجود لایا۔ وہی وجود کو معدوم کر کے دوبارہ پھر معدوم کو وجود کا لباس پہنائے گا۔

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ چاند سورج اور ان کا دورہ بھی قدرت کی نشانی ہے۔ سورج اور چاند کس نے بنائے کس نے ان کو روشن کیا۔ روشنی خود کیا ہے، اُس کا کیا خمیر ہے۔ کیا مادہ سورج کی روشنی میں حدت و شدت کیوں ہے۔ چاند کی چاندنی سے خنکی اور رطوبت کیوں ٹپکتی ہے۔ ہر ایک کے منازل مقرر کیوں ہیں، جداجدا کیفیت کیوں ہے۔ اس نظام میں یہ لطیف حکمت اور دقیق صنعت کس کی ممنونِ کرم ہے۔ کیا اس کے نظام نظر میں مساوات ہو گئی۔ بہت احمق اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے، غفلت میں پڑے ہیں۔ کچھ ادھوں کو ان کے اندر غیبی ہاتھ کارفرما نہیں دکھتا وہ انہی کو حقیقی مؤثر سمجھتے ہیں۔ معبود قرار دیتے ہیں، مسجود جانتے ہیں اے روشن عقل رکھنے والو۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ اگر تم خدا کو مانتے اس کی عبادت کرنے اور اپنی ہستی کو اس کی قیدِ عبدیت میں جکڑا ہوا پاتے ہو تو شرک نہ کرو۔ سورج چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ جس نے ان کو بنایا ہے اس کو سجدہ کرو۔

تنبیہ هُنَّ جمع کی ضمیر ہے۔ چاند سورج دو ہیں ان کی طرف جمع کی ضمیر راجع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یا تثنیہ کو حکم جمع میں قرار دیا جائے گا یا رات دن اور چاند سورج لے مجموعہ کی طرف ضمیر لوٹائی جائے گی یا یہ کہا جائے گا کہ چاند کا خصوصی ذکر تو اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اس عالم میں ان کے زیرِ اثر نمایاں ہیں۔ ان کے ذیل میں کل ستارے اور سیارے داخل ہیں مگر اُن کی تاثیریں معین نہیں اور ابھی تک یقینی انکشاف نہیں ہوا، اس لئے ان کو معنی مذکور سمجھا جائے گا اور ضمیر سب کی طرف راجع ہو جائے گی۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ انسان چاند سورج اور دن رات کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اللہ نے اس کو حیوانی جسم عطا فرمایا ہے جس کے ہر رُونگٹے پر یہ گردشیں اثر ڈال رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ غرور کرتا ہے۔ فطرت کی قیود میں بندھا ہوا انسان خاطر سے سرکشی کرتا ہے۔ لیکن کچھ مخلوق ایسی بھی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں اس کے مرتبے اونچے ہیں۔ اُن کے منازل قرب حاصل ہیں اللہ نے ان کو خصوصی شرف و اعزاز عنایت کیا ہے۔ وہ شبانہ روز اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتے نہیں تھکتے۔ اُن کی یہ عزت اور اس قدر عبدیت کا کُل اظہار اور انسان اتنا بے بس اور اس کے غرور کی یہ کیفیت۔ امام رازی اور خطیب نے لکھا ہے اس سے مراد ملائکہ کا ایک خاص گروہ ہے جو مقرب بارگاہ ہے اور شبانہ روز اس کا کام ہی تسبیح و تقدیس ہے۔ وہ فرشتے جو مدبرات امر کہلاتے ہیں اور دنیا کے بعض انتظامات ان سے متعلق ہیں مثلاً بدر میں پانچ ہزار ملائکہ مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجے گئے یا احزاب میں حضرت جبرئیل نے تعاقب کیا تھا ایسے ملائکہ چونکہ دوسری خدمات پر مامور ہیں، اس لئے آیت میں ان کا ذکر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان بزرگوں نے شاید غور نہیں فرمایا اور تسبیح و تقدیس سے مراد صرف زبانی تسبیح و تقدیس لی ورنہ اس تخصیص کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل میں سرگرم ہونا اور سرکشی نہ کرنا عین تسبیح ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ البتہ تسبیح کی صورتیں مختلف ہیں۔ کچھ ملائکہ سجدے سے سر نہیں اٹھاتے۔ کچھ رکوع میں کچھ تحلیل و تمجید میں رطب اللسان کچھ ہوا پر مسلط کچھ بارش کی خدمت پر متعین اور کچھ دوسرے نظام کائنات کے کارندے مگر ہے ان میں سے ہر ایک تسبیح میں مشغول۔ دن رات مفوضہ خدمات کی سرانجام دہی میں مشغول ہے پھر بھی نہیں تھکتا

تنبیہ اس آیت میں سجدہ ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ مقام سجدہ میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور امام حسن بصری اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کے قائل ہیں۔ رافعی نے امام اعظم اور امام احمد کا بھی یہی قول نقل کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے لفظ اسجدوا طلب سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اس لئے فوری تعمیل ضروری ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو، سعید بن مسیب، قتادہ اور بعض دوسرے علماء لَا یَسْئَمُوْنَ پر سجدہ کرتے ہیں۔ امام شافعی کا یہی مسلک ہے اور زمخشری نے امام اعظم کی طرف اسی قول کو منسوب کیا ہے اور زمخشری کی حکایت رافعی کی روایت سے زیادہ قوی ہے یا شاید رافعی کی روایت میں امام اعظم نے اول قول کا بیان ہو اور زمخشری نے آخری قول نقل کیا ہو۔ لَا یَسْئَمُوْنَ پر سجدہ کرنے سے فوت سجدہ یا مقام سجدہ سے پہلے سجدہ کر لینے کا احتمال باقی نہیں رہتا، اس لئے یہی اولیٰ ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ چار آیات علویہ ذکر فرمائیں۔ اب آیات ارضیہ کی طرف توجہ فرمائی کچھ لوگ پانی کی پوجا کرتے ہیں۔ دریاؤں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اُن کی اتنی تعظیم کرتے ہیں جیسے خدا کی کچھ آدمی درختوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں عقیدے اور عمل غلط ہیں۔ زمین خشک ہوتی ہے پانی برستا ہے، زمین کی قوت نامیہ میں جوش آجاتا ہے۔ پوشیدہ طاقتوں میں ایک لہر اور جنبش پیدا ہوتی ہے۔ مٹی کی تہہ پھولتی ہے، ابھرتی ہے، پھٹتی ہے، سبزہ نمودار ہو جاتا ہے جس میں پھل اور بیج آتے ہیں جانور چرتے ہیں آدمی کھاتے ہیں۔ یہ قدرت کی کھلی ہوئی نشانی ہے، اللہ کی رحمت ہے۔ اس سے پانی کو دیوتا اور درختوں کو حیات بخش سمجھ لینا غلطی ہے۔ یہ چیزیں تو بے جان بے بس بے اختیار ہیں۔ حکم اور تصرف تو خدا کا جاری ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ بارش سے سبزہ کی زندگی کو دیکھ کر اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کیا جاتا اور یقین کر لیا جاتا کہ

اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کہ جس خدا نے مردہ زمین کو دوبارہ زندگی عطا فرمائی وہ قیامت کے دن مردوں کو ضرور زندہ کرے گا۔ لیکن ایسا نہیں کیا جاتا۔ اُلٹا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے آثار کو مؤثر اور مجبور کو مختار تصور کر لیا جاتا ہے۔

خشوع ارض سے مراد ہے اللہ کی عظمت کے سامنے زمین کی پستی، عاجزی اور بے بسی یا خشک بنجر پڑا ہونا۔ اہتزاز جنبش اور لہر کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد ہے قوتِ نامیہ کی خفیف جنبش اور اس کے اندر نمو کی لہر پیدا ہونا۔ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ مردے کس طرح زندہ ہوں گے۔ ارشاد فرمایا تم اپنی قوم کی وادی میں سے گذرتے ہو صحابی نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا وہ خشک میدان ہوتا ہے۔ عرض کیا جی ہاں فرمایا پھر ایک وقت تم اُدھر سے گذرتے ہو تو وہ ہرا بھرا لہلہاتا نظر آتا ہے۔ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا یہی دلیل (قدرت) ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا اَفَمَنْ یُّلْقٰى فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ الحاد کا لغوی ترجمہ ہے منحرف کرنا موڑنا۔ اگر آیت میں آیات سے مراد قدرتی اور فطری آیات ہیں تو ان کا الحاد یہی ہے جس میں تمام مظاہر پرست اور مخلوق کی پجاری قومیں مبتلا ہیں اور قرآن میں بہت جگہ جو بار اسی کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آثار قدرت کو مؤثر اور علاماتِ فعل کو فاعل سمجھ لینا سب سے بڑا الحاد فی الآیات ہے ساری آیات فطرت کا صحیح رُخ تو فاعل حقیقی کی طرف ہے۔ صانع کی جانب سے ان کے رُخ کو موڑ کر مخلوق کی طرف پھیر دینا اور خالق کی جگہ مخلوق کو دینا ہی گمراہی اور ذہنی الحاد کی علامت ہے۔ لیکن اگر آیات سے مراد قرآنی آیات ہیں جیسا کہ عام اہل تفسیر نے لکھا ہے تو الحاد کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے وضع الکلام فی غیر محلہ بیان فرمائے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ فقرہ بہت معانی کو حاوی ہے ۱۔ کفر و شرک (قتادہ) ۲۔ آیات قرآنیہ کی تکذیب کرنا، تصدیق اُن کی طرف توجہ ہی نہ کرنا گویا ان کو بے ضرورت سمجھنا (مجاہد) ۳۔ تلاوت کے وقت شور و غل مچانا، گڑبڑ پیدا کرنا ۴۔ بعض الفاظ کو بدل ڈالنا، اصل آیات پر طعن کرنا اور تبدیلی کو صحیح سمجھنا ۵۔ الفاظ کو غلط معنی پہنانا اور باطل تاویل کرنا۔ یہ تمام صورتیں الحاد کی ہیں۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ جو کچھ دل چاہے کئے جاؤ۔ اللہ تمہارے کرتوت دیکھ رہا ہے۔ ایسا واقف ہے جس طرح دیکھنے والا واقف ہوتا ہے۔ آیت اَفَمَنْ یُّلْقٰى فِی النَّارِ میں کافروں کے لئے تہدید اور اہل ایمان کے لئے بشارت تھی جس کی مثالیں (بطور تعیین) بعض اہل تفسیر نے بیان کی تھیں مثلاً جہنمی ابوجہل ہے اور جنتی ابوبکر صدیق (ابن عباس)، یا جنتی عمار بن یاسرؓ ہیں (بشیر بن تمیم و عکرمہ) یا فاروق اعظم ہیں یا حضرت حمزہؓ ہیں یا حضرت ابوسلمہؓ مخزومی ہیں۔ یہ سب مثالیں ہیں تعیین اور حصر غلط ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں بقول مجاہد عطاء خراسانی اور ضحاک

کے کافروں کو تہدید ہے (یعنی مسلمانوں کو خطاب نہیں)۔ لیکن حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اہل ایمان کے لئے بشارت ہے (یعنی کافروں سے خطاب نہیں)۔ ابن عباس نے یہاں تک فرمایا کہ یہ آیت صحابہ و در اہل بدر کے لئے خاص ہے شاید اس روایت میں سنداً ضعف ہو کیونکہ آیت مکی ہے اور معرکۂ بدر ہجرت کے بعد ہوا یا ابن عباس کی تفسیر کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کے مصداق تمام صحابہ تھے۔ لیکن خصوصیت کے اہل بدر اس کے مظہر اتم ثابت ہوئے کیونکہ اللہ نے ان کو مغفرت کی بشارت دیدی۔ اور سب کچھ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ میرے خیال میں آیت میں تہدید بھی ہے کافروں کے لئے اور بشارت بھی ہے مومن کے لئے جس طرح آیت فَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ میں وعدہ بھی تھا اور وعید بھی۔ اسی طرح اس آیت میں ترہیب بھی ہے اور ترغیب بھی اور اجمالی طور پر فرمایا کہ جو کچھ جس کا دل چاہے کئے جائے۔ اللہ سب کے اچھے برے عمل دیکھ رہا ہے وہی سزا و جزا دے گا

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالذِّکْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ۔ اس آیت کا مطلب بیان کرنے سے پہلے اجزاء کی تشریح ضروری ہے ؎۱ ذکر یعنی یادداشت۔ ضحاک سدی اور قتادہ کا قول ہے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ قرآن ایک نصیحت نامہ ہے۔ احکام و شرائع کا اس میں تذکرہ ہے۔ حرام و حلال کا بیان ہے۔ آدم و شیطان کی دشمنی کی تصریح ہے۔ اقوام ہالکہ ماضیہ کی تفصیل ہے۔ عہد ازل کی یاد دہانی ہے۔ ہوش کو بیدار رکھنے کی تنبیہ ہے۔ تخلیق کائنات کی ضروری توضیح ہے۔ اللہ کی ذات اور صفات اور ملائکہ کی صحیح توضیح ہے۔ اچھے برے انجام اور جنت و دوزخ کا اظہار ہے۔ غرض مبدء و معاد اور درمیانی زندگی کی مکمل تفسیر ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ذکر کہا جاتا ہے، لیکن قرآن کا مقصد تاریخی واقعات کا بیان نہیں۔ تخلیق کائنات کی ژولیدہ گتھیوں کو سلجھانا نہیں۔ ملائکہ کے احوال سے خواہ مخواہ واقف بنانا نہیں۔ یہ فلسفہ طبعیات، علم ارضیات و فلکیات اور تنقیح ماہیات و کیمیات کی کتاب نہیں۔ اصل مقصد انسان کو درس حیات دینا ہے اخلاقی سماجی اور مدنی اصلاح کرنا ہے، مخلوق کا خالق سے رشتہ جوڑتا ہے اور انسان کو فلاح دارین عطا کرتا ہے یہ سارے کے دوسرے تذکرے بھی ہیں جن کا ذکر برائے ذکر نہیں بلکہ برائے یادداشت و اصلاح ہے، اسی لئے پڑھے لکھے عقلمندوں سے زیادہ جاہلوں اور بیوقوفوں نے اس کا انکار کیا کیونکہ ان کو اپنی زندگیاں سدھارنے اور سنوارنے کا ہوش نہ تھا صرف ظاہری زندگی اُن کے پیش نظر تھی۔ انجام سے بے پرواہ ہو کر وہ کسی یادداشت اور نصیحت نامہ کو کیوں مانتے۔ ؎۲ قرآن مجید زندگی کو سنوارنے والے قوانین کا مجموعہ ہے۔ ایسا کہ عزت و تکریم کا مستحق ہے ٹھکرانے اور ذلت کی نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں۔ کتاب عزیز ہے اور کلام کریم۔ نزول آیت کے وقت اگرچہ پورا قرآن نہیں نازل ہو چکا تھا، اسی لئے نزول آیت کے وقت ہی اس کو کتاب کہا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ قرآنی تعلیم بے ربط تعلیم نہیں اس کا کوئی ضابطہ دوسرے ضابطہ سے نہیں ٹکراتا وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا اس کا کوئی قانون تخریبی نہیں ہر ایک تعمیری ہے۔ مثلاً توحید کا اقرار خود اعتمادی سکھاتا ہے۔ در در سجدہ ریزی کر کے توہین انسانیت سے بچاتا ہے انسان کو صفاتِ الٰہی کا مظہر بناتا اور بناتا ہے۔ نماز کی تعلیم اخلاق فاضلہ سکھاتی ہے۔ غرض ہر ضابطہ بجائے خود صداقت کی مکمل تصویر ہے۔ گویا ہر جزو فرقان بجائے خود حق و باطل میں فرق ظاہر کرنے والا ہے اور ہر جزو کتاب ایک کتاب ہے مجمل۔ طلبگار فکر۔ وضاحت طلب۔

؎۳ قرآن مجید تک باطل کی رسائی نہیں۔ نہ آگے سے نہ پیچھے سے نہ اول سے نہ آخر سے نہ اس میں بشری ملفوظات کا شمول ہے نہ ملائکہ اور جن کے کلام کا دخل۔ نہ اس کی کوئی تعلیم جعلی تعلیم ہے نہ انسانیت کو تباہ کرنے والی۔ غرض قرآن کے الفاظ اور معانی تک کسی باطل اور جھوٹ اور غلطی کی پہنچ نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے برحق ہے، کاشف ہے مبین حق ہے۔

(نوٹ):۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک پیشین گوئی بھی ہو کہ آئندہ قرآن میں کوئی شخص گڑبڑ نہ کر سکے گا نہ الفاظ کی ساخت میں نہ عبارت میں نہ سیاق میں تعلیم میں اور نہ تلقین میں۔ اس سے مراد نہیں کہ قرآنی آیات کی غلط تشریحات نہیں کی جائیں گی یہ تو انسانی ذہن کی تراش خراش ہے۔ جیسے چاہے تشریح کرے کسی کی ذہنی تراشیدہ لیوں کو قرآن میں شامل نہیں کیا جا سکتا جیسے اقوام ماضیہ نے اپنے اختراعیات کو کتب الہیہ میں شامل کر دیا۔ ایسا قرآن میں نہ ہوگا۔ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

؎۴ قرآن کا نزول اللہ علیم حمید کی طرف سے ہے۔ اللہ وہ عالم حقائق ہے جس کا علم ازلی اور ابدی حاوی ہے اور لازوال ہے۔ ایسا

حمید ہے جس کی ربوبیت و رحمت کا ذرہ ذرہ ثنا خوان ہے۔ ایسے حکیم رحیم اور عالم رب العالمین نے قرآن اتارا پھر اس میں غلطی کا امکان ہی کیسے ہو سکتا ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ۔ قرآن مجید اگرچہ زندگی کی یادداشت ہے باعزت کتاب ہے برحق ہے۔ باطل اس کو چھو نہیں سکتا۔ مہربان اور رحمان خدا نے اپنے انعام کو کہ ہم یہاں نے کر اس کو بھیجا ہے، لیکن جاہلانہ انکار کا تو کوئی جواب نہیں۔ اتنی کھلی ہوئی حقیقت کے باوجود نابینا میت الفہم کافر حضور کو شاعر، ساحر، کاہن اور مجنون کہتے ہی رہے اور دل آزار کلمات کہہ کر دکھ پہنچاتے ہی رہے اس لئے حضور کی تسلی کے لئے فرمایا کہ گزشتہ پیغمبروں سے جو (بیہودہ) الفاظ کہے گئے وہی آپ سے کہے جا رہے ہیں اور کہے جائیں گے۔ (ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابن جریر ذکرہ الشیخ ابن کثیر) خطیب نے لکھا ہے شاید یہ معنی ہوں کہ توحید کے اقرار و اعلان کا حکم جس طرح گزشتہ پیغمبروں کو دیا گیا تھا ویسا ہی آپ کو دیا جا رہا ہے۔ یعنی تمام شرائع الٰہیہ توحید میں متحد ہیں محمدی شریعت کا اعلان توحید کوئی نیا نہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ یعنی اللہ نے اپنے احکام پہلے بھی بھیجے اور اب بھی قرآنی صورت میں نازل فرما دیے (ماننا نہ ماننا عمل کرنا نہ کرنا لوگوں کا کام ہے کوئی عمل کرے گا اللہ اس کو بخش دے گا) وہ بخشنے والا ہے (عمل نہیں کرے گا تو اللہ اس کو دردناک عذاب دے گا) اللہ دردناک عذاب بھی دینے والا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب راوی ہیں کہ جب آیت إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اللہ کی طرف سے عفو اور درگزر نہ ہوتا تو کسی کو زندگی گوارا نہ ہوتی اور اس کی طرف سے وعید و عذاب نہ ہوتا تو ہر شخص بھروسہ کر بیٹھتا۔

الحاد کی تفسیر ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، لیکن شیخ نے ریاکاری کو بھی الحاد کی ایک شاخ قرار دیا ہے (استقامت کی جو تشریح حضرت عثمان رضی اللہ

تازیانہ

تعالیٰ عنہ نے فرمائی تھی اس کی ضد یعنی خلوص عمل نہ ہونا الحاد کی ایک شاخ ہے) پھر شیخ نے صراحت کی ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سخت تہدید ہے جو مجلس حال و قال منعقد کر کے عوام کے سامنے جھومتے سر ہلاتے لہرے لگاتے اور کپڑے پھاڑتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر دنیا میں اپنی ریاکاری کا ڈنکا پٹوانے کے لئے گوشہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مشائخ اور اولیاء کی تصانیف پڑھ کر ان کے خیالات کو اپنی خواہشات کے موافق ڈھال کر بناتے ہیں اور عوام کے سامنے ولی بن جاتے ہیں، بلکہ وہ لوگ ہر گوشہ کی آنکھ سے منتظر رہتے ہیں کہ امراء اور رؤساء ان کے پاس آئیں اور اپنے ہدایا اور نذرانوں سے ان کی خدمت کریں۔ یہ لوگ نجوم و رمل اور شیطانی تدبیروں سے مکاشفہ وجد اور حال کا دعویٰ کرتے اور اپنی قطبیت جتلاتے ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ اللہ کے یہاں ان کی کیسی ذلت و خواری ہوگی۔ ایسے ہی مکاروں اور فریبیوں کو تہدید و تحذیر کے لئے اللہ نے فرمایا ہے۔ اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ جو چاہے کئے جاؤ اللہ تمہارے کرتوت دیکھ رہا ہے۔

مقصودِ بیان

آیاتِ فلکیہ و فضائیہ کو پیش کر کے صانع کی قدرت عظیم اور حکمت بالغہ پر استدلال کرنا مقصود ہے۔ شمس و قمر کو سجدہ کرنے کی ممانعت ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی روشنی اور نفع بخشی ذاتی اور اختیاری نہیں، خداداد اور اضطراری ہے اور جس کو نفع و ضرر کا اختیار نہ ہو اس کے ارادہ کو افادیت میں دخل نہ ہو وہ نہ کسی کی کارسازی کر سکتا ہے نہ اپنا نفع روک کر کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ سے استنباط ہوتا ہے کہ توحید اور شرک جمع نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خالق سمجھنا تو شرک ہر حال ہے ہی لیکن عملی سجدہ بھی غیر اللہ کے لئے حرام ہے یہ بھی شرک فی العبادت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سجدہ مطلقاً غیر اللہ کو کرنا ممنوع ہے۔ ہر سجدہ سجدۂ عبادت ہے۔ سجدہ میں سجدۂ تعظیم اور سجدۂ عبادت کا فرق غلط ہے۔ عقیدہ تو کافروں اور مشرکوں کا بھی نہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی خالق ہے وہ سجدۂ تعظیم ہی کیا کرتے تھے پھر یہی سجدۂ تعظیمی مسلمانوں کے لئے کیسے جائز ہو جائے گا۔ فتبصروا۔

آیت يُسَبِّحُونَ لَهُ الخ میں صراحت ہے کہ ملائکہ مقربین شبانہ روز تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں اور اکتاتے نہیں۔ یعنی نفرت، تھکان اور تنگدلی ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس مفہوم کا مخالف پہلو یہ نکلا کہ تنگدلی اور نفرت کی حالت میں عبادت قابل مدح نہیں۔ آیت إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ الخ سے قرآن میں ہر قسم کے الحاد کی ممانعت مستفاد ہوتی ہے۔ لفظی ہو یا معنوی قرآن کے الفاظ کو اپنی طرف سے گھٹانا بڑھانا جس طرح ناجائز ہے اسی طرح

خودساختہ تفسیر بالرای بھی ممنوع ہے۔ جاہل صوفی باطنیہ گروہ خارجی اور معتزلہ غرض ہر بدعتی مفسر کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ جاہل مولویوں اور آزاد واعظوں کو اس سے تنبیہ ہونا چاہیئے جو بغیر تفسیری واقفیت کے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے بات بات پر آیت کی تلاوت کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب ان کو دینی تبلیغ کے لئے کہا جائے اور حکومت وقت کے قانون کی زد پڑتی ہو تو اپنے عزم کی پستی اور ایمان کے ضعف کو چھپانے کیلئے کہہ دیتے ہیں۔ ایسی بات کہو یہ بیٹے گرفتاری، خانہ بربادی اور مال کی تباہی یقینی ہے اور اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے۔ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ خود اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ایسے مفسروں کو آیت کا مطلب ہی نہیں معلوم۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاد و تبلیغ کا ترک ہلاکت آفرین ہے جس سے آیت میں روکا گیا ہے تبلیغ و دعوت تو حیات بخش ہے۔ اگرچہ اس میں مالی تباہی ظاہراً نظر آ رہی ہو۔ حضور اقدس اور صحابہ کی زندگیاں اس آیت کی عملی تفسیر تھیں۔ انہوں نے مالی تباہی خانہ بربادی اور گرفتاری کو خود آور دہ ہلاکت نہیں سمجھا۔ آیت إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ میں قرآن کو لفظ ذکر سے تعبیر کرنا بتا رہا ہے کہ قرآن تعویذ گنڈوں کی کتاب نہیں۔ فال لینے کا صحیفہ نہیں۔ اس کا نزول اس لئے نہیں ہوا کہ خوشبو لگا کر غلاف چڑھا کر طاقچہ پر برکت کیلئے رکھ دیا جائے بلکہ یہ زندگی کی ایک یادداشت ہے۔ اس میں جو کچھ سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ہے وغیرہ۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ

اور اگر ہم اس کو عجمی (زبان کا) بناتے تو یوں کہتے کہ اس کی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں یہ کیا بات کہ عجمی کتاب اور عربی رسول۔ آپ کہہ دیجئے

اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ

کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو رہنما اور شفا ہے　اور جو ایمان نہیں لائے　ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے　اور وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے

اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۟ۚ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ

یہ لوگ (بوجہ عدم انتفاع کے ایسے ہیں کہ گویا) کسی بڑی دور جگہ سے پکارے جا رہے ہیں (کہ آواز سنتے ہوں مگر سمجھتے نہ ہوں) اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی سو اس

فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ

میں بھی اختلاف ہوا اور اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب آخرت میں ملے گا) تو ان کا فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ

مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۟ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا

لوگ اس کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑے گا

رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۟

اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں

تفسیر خوئے بد را بہانہ بسیار۔ دل چاہتا نہیں دماغ مانتا نہیں۔ عقل نابینا بصیرت مردہ اس پر بہانہ یہ کہ عربی تو پیغمبر کی زبان ہے۔ خود ادیب ہیں چوٹی کے کتاب خود لکھ لی اور کہہ دیا خدا نے بھیجی ہے۔ کمال تو جب تھا کہ کسی عجمی زبان میں قرآن بھیجا جاتا تب یقین کے قابل تھا۔ بر خود غلط اتنا نہیں سمجھتے کہ قرآن اگر عجمی زبان میں نازل کیا جاتا تو یہ سمجھتے کیسے اس وقت کہتے کہ عربی پیغمبر اور عجمی کتاب۔ ہم اس کو کیا جانیں کھول کر

احکام کیوں نہیں بیان کئے کہ ہم سمجھ لیتے ۔ مطلب کہ قرآن کا عربی ہونا بھی قابلِ قبول نہیں اور عجمی ہونا بھی غیر مفید ہے ۔ حقیقت میں اپنے اپنے ظرف کا فرق ہے ۔ اگر قلب بنجر اور شور نہیں اور اس میں ایمان کی صلاحیت ہے اُس کے لئے تو قرآن چراغِ ہدایت ہے ۔ دونوں جہان کی سعادت کے حصول کا راستہ اس کو دکھا دیتا ہے ۔ اور تمام نفسانی بیماریاں اس نسخۂ شفا سے دور ہو جاتی ہیں ۔ لیکن جو اندھے بہرے میت القلب ہیں ان کو کیا حاصل ۔ عربی میں قرآن ہوا تو کیا اور عجمی میں ہوا تو کیا ۔ بھٹکنے والے گمراہ بہٹرین دور سے چرواہے کی پکار سنتی ہیں ۔ سمجھتی کچھ نہیں ۔ ان کو کیا فائدہ کہ چرواہا کس زبان میں پکارتا ہے ۔ کچھ راہ بھیڑوں کو عبرانی زبان میں بھی تو حضرت موسیٰ نے پکارا تھا ، لیکن ان میں پھوٹ جب بھی پڑ جاتی کوئی کسی راہ گیا تھا کوئی کسی راہ ۔ حالات کا تو تقاضا تھا کہ کسی بھیڑیے کو سمجھا کر ان کا گلہ بیل کرا دیا جاتا ۔ جو سیدھی راہ پر تھا وہ بچ جاتا جو کج رو تھا وہ تباہی کے غار میں گر جاتا ، مگر خدا نے ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے جس کو توڑنا نہیں چاہتا ۔ اس نے ہر شخص کو اچھائی برائی کا اختیار دے رکھا ہے اور کہہ دیا ہے جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا جیسی کرنی ویسی بھرنی ۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ۔ اس آیت کا حاصل مطلب دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے ۔ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ یعنی اگر کسی عجمی پر قرآن اترا جاتا اور وہ پڑھ کر سناتا تو یہ نہ مانتے ۔ مقصد یہ کہ اگر کسی عجمی زبان میں کتاب ہدایت کا نزول ہوتا تو عرب والے اس کو بھی نہ مانتے اور کہتے کہ ہماری زبان میں تفصیلی احکام کھول کر کیوں نہیں بیان کئے گئے ہم اسے کیا جانیں عجمی زبان میں کتاب ہے اور مخاطب عرب آیا ۔ یہ عجیب بات ہے (کذا فسرہ ابن عباس ومجاہد وعکرمۃ وسعید بن جبیر وسدی وغیرہم)

حسن بصری کی روایت میں ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ہمزۂ استفہام کے ساتھ نہیں ہے بلکہ عجمی وعربی آیا ہے ، اس لئے انہوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ قرآنی آیات کو الگ الگ کیوں نہیں بیان کیا گیا کہ کچھ عجمی ہوتا کچھ عربی ، عرب والے اپنی زبان میں سمجھ لیتے اور عجم والے اپنی زبان میں ۔ یہ مطلب سیاق کے خلاف ہے ۔ عرب والوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ عجمی زبان میں بعض آیات کے نزول کی خواہش کرتے ۔

بعض مفسرین نے تشریحی مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ رسول اللہ عجمی زبان سے ناواقف تھے ۔ آپ کی زبان خالص عربی تھی ، اس لئے اگر قرآن عجمی میں ہوتا تو اعتراض کرنے والے کہتے کہ رسول تو خالص عربی ہے اور کتاب لایا عجمی زبان میں ۔ ہم کیا سمجھیں کتاب میں ضرور گڑبڑ ہوگی ۔

بعض نالائقوں نے کھول کر کہہ دیا تھا کہ کوئی عجمی غلام رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآن سکھلا دیتا ہے ، لیکن قرآن ہے عربی میں ، اس لئے اُن کی اس بات میں وزن نہیں ۔ ہاں اگر عجمی زبان میں قرآن ہوتا تو ان کا یہ خیال بہت وزنی ہو جاتا ۔

کیا رسول اللہ صلعم فارسی زبان جانتے تھے؟

سنن ابن ماجہ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے ایک بار شکمت درد ۔ فرمایا تھا ۔ اس سے لوگوں نے رائے قائم کی کہ حضورؐ فارسی سے واقف تھے ، مگر یہ رائے بہت کھوکھلی ہے ۔ شیخ ابن جوزی ، ملا علی قاری اور دوسرے ناقدین نے تحقیق کے بعد اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے ۔ یہ کسی رافضی کی خود ساختہ روایت ہے ۔ علامہ نسفی نے مدارک میں اس جگہ سے استنباط کیا ہے کہ قرآن صرف معنی کا نام ہے عربی الفاظ میں ہو یا عجمی زبان میں ۔ الفاظ جزءِ قرآن نہیں ہیں ، لیکن یہ شبہ بے جا ہے ۔ آیت میں تو جملہ شرطیہ ہے اور جملہ شرطیہ میں حکم علی التقدیر ہوتا ہے ۔ جزءِ اول کا تحقق ضروری نہیں ، جیسے اگر زید گھوڑا ہوتا تو ضرور ہنہناتا ۔ اس جملہ میں زید کا گھوڑا ہو جانا ضروری نہیں ۔ اس جملہ کو سن کر زید کی فرسیت کا یقین کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح آیت کا مطلب ہے کہ اگر قرآن عجمی زبان میں کسی عجمی پیغمبر پر اتارا جاتا تو یہ لوگ ایمان نہ لاتے ۔ اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کسی عجمی پیغمبر پر یا کسی عجمی زبان میں اُتار دیا گیا ۔

تنبیہ

امام اعظم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کے نزدیک چونکہ قرآن صرف معانی کا نام تھا ، اس لئے آپ نے فارسی میں نماز کو جائز قرار دیا تھا ، مگر امام کی طرف اس قول کا انتساب غلط ہے معتزلہ کی ایجاد ہے اور صحیح بھی ہو تو آخر میں رجوع ثابت ہے اور مجتہد جس قول سے رجوع کرلے وہ کالعدم ہو جاتا ہے ۔ (کذا فی الدر مختار وفتاویٰ عالمگیری)

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۔ آدمی ایک مسافر ہے جو زندگی کا سفر طے کر رہا ہے ۔ راستے پیچ در پیچ ہیں ۔ کسی راستے کی انتہا ہلاکت پر ہے ۔ کوئی راستہ منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے ۔ عقل کی رہنمائی کافی نہیں ۔ تمام راستوں کو دیکھ کر کسی کی عقل نہیں آتی کہ سیدھے ٹیڑھے اور

ہلاکت و نجات کا فیصلہ کر سکے۔ اللہ کو سیدھے ٹیڑھے سب راستے معلوم ہیں۔ کون راستہ تباہی کے غار میں گراتا ہے اور کون عافیت کی منزل پر پہنچاتا ہے اس کا علم اُسی کو ہے۔ زندگی کا صحیح راستہ بتانے کے لئے اُس نے قرآن مجید کو نازل فرمایا۔ اب یہ کام عقل کا ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے کو سمجھ کر اُس پر آدمی کو چلائے۔ جن کے دلوں میں ایمان کا خمیر ہے اُن کی عقلیں قرآنی ہدایات کو سمجھتی اور منزل بہ منزل چلتی ہیں۔ قرآن اُن کیلئے واقعی رہنمائی کرتا ہے یعنی قرآنی رہنمائی کا فائدہ اُن ہی کو پہنچتا ہے۔

ہر آدمی بیمار ہے۔ علمی اور عملی، عقلی اور اخلاقی، شخصی اور اجتماعی امراض میں مبتلا ہے۔ مزاج عناصر کی بیماری ہو تو حکیم ڈاکٹر سے علاج پوچھا جائے نظام بشری کا علاج کون جانے۔ کس کس کے شخصی اور اجتماعی امراض کی پہچان ہے اور اس کے پاس ان امراض کو دور کرنے کے لئے نسخۂ شفا ہے۔ اللہ نے اس روگ کو دور کرنے کے لئے نسخۂ قرآنی تجویز کیا، مگر یقین نہ رکھنے والوں کے لئے وہ سودمند نہیں۔ یقین نہ ہوگا تو دوا کا استعمال کیسے کیا جائیگا اور استعمال نہ ہوگا تو فائدہ کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف اہل ایمان کے لئے قرآن ہدایت نامہ بھی ہے اور نسخۂ شفا بھی۔

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ۔ لیکن جن دلوں میں ایمان کا خمیر ہی نہیں۔ جنھوں نے سچی بات کو نہ ماننا اپنے دلوں میں طے کر لیا ہے وہ بہرے اور اندھے ہیں۔ قرآن ہر مسلمان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتاتا ہے، مگر ان کو دیکھتا ہی نہیں ہر طرح سے صراط مستقیم کے نشانات علامات بتلائے جاتے ہیں، لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کا ایک گلہ ہے بھٹکا ہوا اِدھر اُدھر گھومنے والا۔ چرواہا ان کو دور سے پکارتا ہے للکارتا ہے، درندوں کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ پھاڑنے جانے اور لقمۂ سباع بننے سے ڈراتا ہے۔ سیدھے راستے پر چلنے کو کہتا ہے، مگر وہ کیا سمجھیں ان کو دور سے ایک چیخ صرف سنائی دیتی ہے منہ اٹھا کر حیران ہو کر دیکھتے ہیں پھر جس راستے پر جا رہے تھے اسی پر چلتے رہتے ہیں۔ ایسے گروہ کو قرآن کی رہنمائی سے کیا فائدہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ۔ یعنی قرآن کے متعلق مومنوں اور غیر مومنوں کا جو اختلاف ہے وہ نیا نہیں۔ توریت بھی جب موسیٰ کو دی گئی تو اس میں بھی لوگوں نے یوں ہی اختلاف کیا۔ کسی نے مانا کسی نے نہ مانا۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ۔ اگر اللہ کی طرف سے ایک ضابطہ مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو اس اختلاف کا فیصلہ ہو چکتا۔ نہ ماننے والوں کو آخرت کا عذاب یہیں مل جاتا اور ماننے والوں کو ایمان و اعمال کے عوض اخروی ثواب اسی زندگی میں نصیب ہو جاتا۔

وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ نہ ماننے والے کتاب اللہ کے معاملہ میں ایسی تردد آفریں شک میں مبتلا ہوتے کہ عذاب آخرت آ پہنچتا اور سب کو ہلاک کر دیا جاتا، مگر اللہ کا ازلی حکم جاری ہے۔ اس نے اس دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزاء قرار دیا ہے۔ جزاء آخرت دنیا میں نہیں مل سکتی اور اعمال کی دنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ آخرت دار العمل نہیں، اس لئے مومن و کافر کا عملی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

ہم نے جملۂ مذکورہ کو حالیہ قرار دیا ہے اور جملہ مذکورہ میں بَيْنَهُمْ کی ضمیر کو ذوالحال۔ گویا دونوں جملے مربوط ہیں، لیکن عام اہل تفسیر نے دونوں جملوں کو مستقل قرار دیا ہے۔ اوّل جملہ میں حکم ازلی کا بیان تھا۔ اس جملہ میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کافر جو قرآن کی تکذیب کرتے ہیں وہ کسی بصیرت و یقین کی روشنی میں نہیں کرتے۔ ان کے دلوں کی حالت غیر یقینی ہے، ایک تردد ہے جس میں مارے مارے پھرتے ہیں (ابن کثیر) بعض مفسروں نے اس آیت کو آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ کا فَاخْتُلِفَ فِيْهِ سے متعلق قرار دیا ہے یعنی توریت میں اختلاف کرنے والے بصیرت کی بنا پر اختلاف نہیں کرتے تھے بلکہ نفسانیت و عداوت سے شک کرتے تھے۔ میرے نزدیک یہ تشریح غلط ہے کیونکہ آیت میں فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ہے فَاخْتَلَفُوْا نہیں ہے اور توریت میں اختلاف کرنے والے دو فریق تھے۔ ایک حق جانتا تھا دوسرا باطل۔ ایک کی نظر میں توریت سچی کتاب اللہ تھی۔ دوسرے کی نظر میں خود ساختہ یا غلط اور ظاہر ہے کہ شک مؤخر الذکر گروہ کو ہی تھا۔ اوّل الذکر کو نہ تھا۔ اگرچہ اختلاف دونوں کے درمیان تھا پر اِنَّهُمْ کی ضمیر تمام اختلاف کرنے والوں کی طرف راجع کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے اور اختلاف کا معنی عداوت اور نفسانیت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اللہ نے اس دار العمل میں سب کو مہلت دے رکھی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ کوئی بھلائی کرے گا تب اپنے لئے اور برائی کرے گا تب اپنے لئے

خدا کسی پر جبر نہیں خواہ مخواہ کسی پر عذاب نہ ہوگا۔ کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔۔

مقصودِ بیان قرآن مجید کی عمومی دعوت پر ایک شبہ ہمیشہ پیش کیا جاتا رہا ہے کہ قرآن عربی میں ہے۔ تمام عالم کی ہدایت سے اس کا کیا واسطہ۔ صرف عربوں کی ہدایت کا کتابچہ اس کو کہا جا سکتا ہے۔ دوسری قوموں کو ہدایت مقصود ہوتی تو اُن کی زبانوں میں کی جاتی۔ آیت وَلَوْ جَعَلْنٰهُ اَعْجَمِيًّا سے اس شبہ کا ازالہ ہو جاتا ہے کیونکہ کسی معین زبان میں تو اللہ کے احکام ہی نازل کئے جاتے دوسری زبانوں والے یہی اعتراض کر بیٹھتے عجمی میں کتاب ہوتی تو عرب کہتے ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ عمومی دعوت کیلئے بین الاقوامی زبان کون سی تھی جس میں احکام بھیجے جاتے۔ اس لئے شبہ ہی بیکار ہے۔

هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ میں اصل مقصد کا اظہار مقصود کہ قرآن کی غرض کسی زبان کی پیشکش نہیں کہ دوسری زبانوں والے اپنی بے تعلقی ظاہر کریں۔ اس کا مقصد زندگی کی رہنمائی اور تمام علمی وعملی امراض کی بیخ کنی ہے اور یہ مدعا عربی زبان میں ہونے کے بعد بھی پورا ہوتا ہے پھر شک بے بنیاد ہے

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ الخ سے یہ غرض ہے کہ جو ایمان لانے والے نہیں۔ اُن کے لئے قرآن بے کار ہے۔ آخری آیت میں ایک ضابطۂ عمل بیان فرمایا ہے۔

۲۴
چوبیسواں پارہ ختم ہوا

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحانْ

کا

پارہ نمبر ۲۵

اِلَیْهِ یُرَدُّ

فاضلِ اجل حضرت علّامہ مولانا سید عبدالدّائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط شائع ہو رہی ہے

ن مولوی کے ادارہ

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک نسیم بک ڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند یو پی

پچیسواں (۲۵) پارہ (جزو اوّل)

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى

قیامت کے علم کا حوالہ خدا ہی کی طرف دیا جاسکتا ہے اور کوئی پھل اپنے خول میں سے نہیں نکلتا اور نہ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور نہ وہ بچہ

وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ

جنتی ہے مگر یہ سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے اور جس روز اللہ تعالیٰ اِن (مشرکین) کو پکارے گا (اور کہے گا) کہ میرے شریک (اب) کہاں ہیں وہ کہیں گے کہ (اب تو) ہم

شَهِيْدٍ ۚ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ

آپ سے یہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں (اس عقیدہ کا) کوئی مدعی نہیں اور جن جن کو یہ لوگ پہلے سے (یعنی دنیا میں) پوجا کرتے تھے وہ سب غائب ہوجائیں گے اور یہ لوگ سمجھ لیں گے

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاۗءِ الْخَيْرِ ۡ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ۝ وَلَىِٕنْ

کہ ان کے لئے کہیں بچاؤ کی صورت نہیں آدمی کا ترقی کی خواہش سے جی نہیں بھرتا اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہراساں ہوجاتا ہے اور اگر ہم اس کو کسی

اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّاۗءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ

تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی تھی اپنی مہربانی کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہونا ہی چاہیے تھا اور میں قیامت کو آنے والا نہیں خیال

قَاۗىِٕمَةً ۙ وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کرتا اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا بھی گیا تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے سو ہم اُن منکروں کو اُن کے (یہ) سب کردار ضرور

بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ

بتلادیں گے اور اُن کو سخت عذاب کا مزہ چکھادیں گے اور جب ہم آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو (ہم سے

اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ

اور ہمارے احکام سے) منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے آپ کہیے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ

كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ سَنُرِيْهِمْ

کہ اگر یہ قرآن خدا کے یہاں سے آیا ہو (اور) پھر تم اس کا انکار کرو تو ایسے شخص سے زیادہ کون غلطی میں ہوگا جو (حق سے) ایسی دور دراز مخالفت میں پڑا ہو ہم عنقریب

اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ

ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھادیں اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جاوے گا کہ وہ قرآن حق ہے (تو) کیا آپ کے

اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ

رب کی یہ بات (آپ کی شہادت کے لئے) کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) احاطہ میں...

تفسیر نیکی بدی کا نفع نقصان آدمی کو خود اٹھانا ہوگا۔ کب ہوگا۔ جواب ملتا ہے۔ قیامت کے دن۔ قیامت ہی دارالجزا ہے۔ پاداش کا جو دن مقرر ہے اس کا عذاب کھینچ کر اس دارالعمل میں نہیں آسکتا۔ لیکن قیامت ہوگی کب۔ آخر اس کا کوئی سال، مہینہ، دن مقرر ہے یا یوں ہی وہم ہی وہم ہے۔ پھر ہوگی تو جزا سزا کیسے ملے گی۔ ہمارے چھپے ہوئے اعمال کا کسی کو کیا پتہ۔ جب جرم ظاہر نہ ہو تو سزا کیسی اور کس کی قیامت ویامت۔ محض ڈراوے کی باتیں ہیں تکلیف و راحت جو کچھ ہے بس یہیں ہے۔ ہم مال اعمال حکومت عزت صحت جو کچھ حاصل کرتے ہیں اپنی کوششوں سے کرتے ہیں اور بالفرض اگر قیامت ہوئی بھی تو جس طرح اہلیت کی وجہ سے یہاں راحت حاصل ہے وہاں بھی چین ہی چین میسر ہوگا۔ جس طرح یہاں حمایتی اور مددگار موجود ہیں وہاں بھی ہونگے ہمارا ساتھ وہاں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اس قسم کی خرافات عام طور پر منکر قیامت بکتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اللہ کا علم ہمہ گیر ہے۔ کونپل اور پتی پھوٹتی ہے شگوفہ کے غلاف سے پھل کی نوک نمودار ہوتی ہے۔ ماں کے پیٹ میں نطفہ نرینہ یا مادینہ قرار پکڑتا ہے اور بڑھ کر کس وقت دنیا میں انسانی یا حیوانی بچہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے سب کا علم اللہ کو ہے۔ اس کی واقفیت محیط کل ہے۔ انسان کی کوئی حرکت اچھی یا بری اس سے پوشیدہ نہیں۔ تعین وقت کے ساتھ قیامت کا علم بھی اسی کو ہے۔ پھر یہ خیال کرنا کہ وہاں حمایتی کام آئیں گے بالکل غلط ہے۔ کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔ ساری عمر جن کو شریک خدا سمجھ کر پوجا کی وہ سب غائب ہوں گے۔ رہا یہ گمان کہ جو کچھ راحت و عیش ہم کو یہاں میسر ہے وہ ہماری اہلیت اور کوشش کا نتیجہ ہے خدا کو کیا دخل تو جس وقت دکھ ہوتا ہے اس وقت ہر طرف سے مایوسی کیوں ہو جاتی ہے اور کیوں لمبی چوڑی دعائیں کی جاتی ہیں۔ جس طرح عیش میں منہ پھلائے اور تیوڑائے پھرتے تھے اب بھی ایسا ہی کرو۔ بھلائی کے تے پکار کیوں مچاتے ہو۔ دہائی دینے سے کیوں نہیں تھکتے۔ یاد رکھو قیامت کے دن تکذیب و کفر کا برا مزہ چکھنا پڑے گا اور قیامت ہی کیا دنیا میں ہی دیکھ لو گے کہ قرآن کا فیصلہ اور رسول کا فرمان کس طرح حق ثابت ہو کر رہے گا۔ خود اس معاملے میں بھی تم کو قرآن کی حقانیت تسلیم کرنی پڑے گی اور دوسری گھمنڈ رکھنے والی قوموں کے متعلق بھی۔

تحلیل اجزاء اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ گزشتہ آیات کا حاصل یہ تھا کہ اگر ضابطۂ الٰہی کی شکست نہ ہوتی کہ دنیا میں ہی حق و باطل اور ثواب و عذاب کا فیصلہ ہو چکتا۔ مگر چونکہ فیصلہ کا دن مقرر ہے۔ ہر شخص کی اچھائی برائی کا نتیجہ خود اس کو اس دن ملے گا اس لئے دنیا میں مہلت دیدی گئی ہے۔ اس پر سوال کیا جاسکتا تھا اور کہا جاسکتا تھا کہ قیامت آئے گی کب؟ اس کا جواب اس جملہ میں دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کا (تعینی) علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔ پیغمبر برحق ہو یا فرشتہ مقرب ہر کوئی اس کے علم کو صرف خدا ہی کی طرف منسوب کرتا ہے خود واقف ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

صحاح کی حدیث جبریل میں مذکور ہے کہ سائل کے سوال کے جواب میں حضورؐ نے قیامت کی علامات اور امارات بیان فرمادیں۔ دن تاریخ اور وقت ظاہر نہیں فرمایا اور اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ۔ یہ بھی سوال کیا جاسکتا تھا کہ قیامت کے دن جزا سزا کیسے ہوگی۔ ہمارے پوشیدہ اعمال کا کسی کو کیا علم۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا۔ حاصل معنی یہ ہے کہ ثمر سے جو پھل نکلتا ہے اس کی تعداد کیفیت مزہ رنگ شکل مقدار غرض کوئی حالت خدا سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ کوئی جاندار مادہ جب حاملہ ہوتی ہے تو اس کے پیٹ میں کیا ہے نر یا مادہ کس رنگ، کس شکل، کس کیفیت کس مزاج، کس مقدار اور کس اطوار کا ہے۔ پھر کس وقت اور کب پیدا ہوگا۔ اس سے بھی خدا ہی واقف ہے۔ جب اس کا علم اتنا

وسیع الذیل اور ہمہ گیر ہے تو انسانی اعمال اس سے کس طرح پوشیدہ رہ سکتے ہیں۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوا مَا لَهُمْ مِنْ مَحِيصٍ ۔خیال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کو ہمارے اعمال کا علم مسلم اور یوم الجزاء کا ہونا بھی صحیح ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آسمان و زمین میں کسی کی سفارش مدد اور کوشش سود مند ہو جائے۔ چاند اور تارے سورج اور سیارے مظاہر قدرت ہیں۔ پیر، ولی اور فرشتے مقرب بارگاہ ہیں۔ زندگی بھر ہم نے اُن کی پوجا کی اُن کے اشاروں پر سر جھکائے۔ کیا قیامت کے دن یہ ہمارے کام نہ آئیں گے۔ اس فرضی وہم کی تردید ان آیات میں کی ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ اللہ (کی طرف سے اس کے ملائکہ) مجرموں کو پکاریں گے اور کہیں گے آج وہ (مفروضہ) خدائی کے ساجھی کہاں ہیں ان کو مدد کے لئے بلاؤ۔ مجرم جواب دیں گے وہ سب آج کھو گئے کوئی مدد نہیں کر سکتا ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہمیں ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں رہائی نہ ہونے کا ان کو یقین ہو جائیگا لیکن اب کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۔انسان سے مراد ہے کافرانہ عقیدہ رکھنے والا انسان۔ کافر العقیدہ آدمی کا قیامت پر یقین نہیں ہوتا اور اس کی نظر میں جو کچھ دکھ سکھ ہے وہ اسی دنیا کا ہے اس لئے وہ عیش و آرام کا خواہشمند ہوتا ہے تو صرف دنیا کے۔ پھر اس کی خواہش ہوس کی حد تک ہوتی ہے اور ہوس بھی اُلٹی۔ کبھی دنیوی عروج سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ بالکل نا اُمید ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر چونکہ محدود ہوتی ہے آخرت کا اس کو یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر دنیا میں اس کو کوئی دُکھ آیا تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ میری زندگی برباد ہو گئی۔ یہ مصیبت دور نہیں ہو گی۔ لیکن خدا تو بہرحال رب العالمین ہے مومن غیر مومن سب پر رحم کرتا ہے۔ اپنی رحمت سے جب مصیبت کو دور کر دیتا ہے تو کافر انسان کو غیبی کارسازی تو نظر نہیں آتی، اس کی نگاہ صرف ظاہری اسباب پر ہوتی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی مجھے اپنی کوشش سے ہوئی ہے۔ میری ذاتی اہلیت اور کاوش اسی کی مستحق تھی۔ اب یہ عیش مجھے ملتا ہی رہے گا۔

وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۔ اور اگر بالفرض قیامت ہوئی اور مجھے خدا کے پاس لوٹ کر جانا ہی پڑا تو وہاں بھی مجھے بھلائی ہی بھلائی ملے گی۔ یعنی کوئی دکھ نہ ہو گا کیونکہ اپنی ذاتی قابلیت اور اہلیت کے سبب یہاں بھی مالدار باعزت اور خوش عیش ہوا ہوں وہاں بھی ایسا ہی رہوں گا۔

فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ہے۔ کافروں کو ان کے اعمال کی اطلاع قیامت کے دن ملے گی۔ یہاں تو ان کو اپنے اعمال کی خرابی نظر نہیں آتی اور کفر کا وبال نہیں دیکھتا۔ قیامت کے دن ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا اور ساری رعونت دھری کی دھری رہ جائے گی۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۔ آدمی کی بھی عجب حالت ہے۔ خدا عیش دیتا ہے تو آدمی رُخ پھیرے منہ موڑے گردن نیوڑائے پہلو بچائے الگ بچا بچا پھرتا ہے۔ بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتا۔ گویا سارا عیش اس کا اپنا استحقاق اور خود پیدا کردہ ہے کبھی زائل ہی نہ ہو گا۔ لیکن جب مصیبت آ گئی تو دُکھ چھوتے ہی لمبی چوڑی دعائیں مانگتا ہے۔ اس وقت اس کا اپنا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ اور خدا یاد آتا ہے۔ (ابن کثیر کے نزدیک انسان سے مراد اس جگہ بھی کافر آدمی ہی ہے جو اللہ کی نعمتوں کا ناشکر گزار ہوتا ہے)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۔ قرآن مجید کی صداقت کھلی ہوئی ہے۔ دلائل کو دیکھ کر اس کی حقانیت کا کون انکار کر سکتا ہے لیکن گمراہیوں کو پھر بھی یقین نہیں آتا۔ ایک طرف واضح سچائی ہے، دوسری طرف جہالت کے تہ بہ تہ پردے ذاتی عناد مال نسب طاقت اور وجاہت کا غرور۔ ایسی حالت میں دل میں تردّد اور تذبذب کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ (اگر قرآن پیامِ خداوندی نہیں اور خود ساختہ ہے تو اس پر عمل کرنے والوں کا کچھ بگڑتا نہیں۔ بہرحال اس کی تعلیم زندگی کو سدھارنے والی ہے۔ خدا کی طرف سے نہ سہی۔ انسان کی بنائی ہوئی سہی، لیکن) اگر اللہ کی طرف سے ہے اور اس کو تم نہ مانو اور سچا نہ جانو تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر

اِدھر اُدھر پگڈنڈیوں پر بھٹک کر دور نکل جانے والوں سے زیادہ گم کردہ راہ اور کون ہو سکتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ - اہل تفسیر کے نزدیک اس آیت میں ایک پیشین گوئی کا اظہار ہے اور آیات سے مراد ہیں اسلامی فتوحات۔ آفاقی آیات تو وہ فتوحات ہیں جو مسلمانوں کو اطراف ملک میں حاصل ہوئیں۔ باوجود بے بضاعتی اور قلت تعداد کے تمام عرب مسخر ہو گیا اور روم و ایران کی حکومتیں تباہ ہو گئیں اور اُن کا ملک مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور بڑے بڑے جبّار فرمانبردار بن گئے اور آیات فی الانفس سے بدر کی شکست کی طرف اشارہ ہے اور فتح مکہ مراد ہے۔ مجاہد، حسن بصری اور سدی کا یہی قول ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ - جس وقت اِن آیات کا نزول ہوا، یعنی کی دور میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نہ ظاہر میں کوئی طاقت تھی نہ حکومت تھی، نہ ساز و سامان، اس لئے اگر کافر اس کی سچائی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے تو ظاہری اسباب پر نظر کو محدود رکھنے والوں کا یہی شعار ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اُن کو غیب کا کیا علم۔ لیکن اللہ کو تو سب آئندہ واقعات کا علم ہے۔ ہر چیز اس کے سامنے حاضر ہے۔ اس تے ظاہر پرست کافروں کی طرف سے رُوئے خطاب پھیر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیا اور فرمایا کہ ہر چیز کا ظاہر ہونا یعنی ہر چیز کا اللہ کے سامنے حاضر ہونا اللہ کے قول کی صداقت کے لئے کافی ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ اللہ کے علم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اب کچھ چیزیں اس وقت موجود نہ ہوں اور اُن کا وقوع اللہ کے علم میں ہو تو وہ ضرور واقع ہوں گی۔

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ - خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ کافروں کو قیامت کے دن خدا کے سامنے جانے اور سزا پانے میں شک ہے اور عقائد و اعمال کی درستی کی جڑ یہ ہے کہ خدا کے علم اور قدرت کو ہمہ گیر سمجھا جائے۔ اسی لئے آیت میں دونوں فقروں کو تنبیہی لفظ سے شروع کیا ہے۔

مقصود بیان

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ سے ثابت ہو رہا ہے کہ قیامت کا تعینی علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔ کسی فرشتے اور نبی مرسل نے بھی اس سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وَمَا تَخْرُجُ الخ سے اللہ کے غیر محدود علم کو بیان کرنا مقصود ہے۔ لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ الخ میں انسان کے عموم کی پستی، تنگ دلی اور غرور و انانیت کو بتایا ہے۔ مصیبت کے وقت اتنا تنگ دل کہ مایوس ہو جائے (اس کا خدا کا یقین ہی نہیں تو مایوس کیوں نہ ہو) اور راحت کے وقت ایسا مغرور کہ اپنی کوشش اور اہلیت کا نتیجہ سمجھنے لگے۔ غرض خدا کی کسی حالت میں ضرورت نہیں۔ مصیبت میں یاس ہے آس نہیں اور راحت میں بد خود غلطی ہے خوف زوال نہیں۔ وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي میں ایک مفروضہ کا بیان کیا گیا ہے کہ کافر کو دنیا کی راحت دوامی راحت نظر آتی ہے لازوال۔ سب سے پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ کسی پیغمبر کو بھی قیامت کا دن تاریخ معلوم نہیں۔ دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ باریک سے باریک اور حقیر سے حقیر واقعہ کا علم بھی اللہ کو ہے۔ تیسری آیت سے تنبیہ ہونی چاہیئے اُن ظاہر بینوں کو جو دکھ اور تکلیف میں اگر مبتلا ہوتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں اور عیش ملتا ہے تو اس کو اپنی کوشش کا لازوال نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یعنی نہ آئندہ ان کو امید راحت نہ خوف مصیبت حال پر نظر محدود۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ عقیدہ کی یہ خرابی کفر ہے۔ چوتھی آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ مومن صالح الاعمال کے افلاس اور کافر بدکار کے عیش سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اول سے خدا کی دشمنی ہے اور دوسرے سے دوستی، اس لئے آئندہ زندگی میں بھی ان دونوں کی یہی حالت ہوگی۔ یعنی مفلوک الحال ایماندار کو یہ نہ خیال کر لینا چاہیئے کہ میں خدا کا معتوب ہوں، میری آئندہ بھی یہی حالت رہے گی اور کافر مالدار کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں ہمیشہ یونہی رہوں گا۔ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ الخ میں آدمی کے غلط فیصلہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگر خوش عیش ہونے کی خدا کی یاد ضروری نہیں اور خدا سے بے نیازی ہے تو دُکھ کے وقت خدا کی یاد کیوں ہوتی ہے۔ مغرور انانیت کیوں عاجزانہ انکساری میں تبدیل ہو جاتی ہے وغیرہ۔

سُورَةُ شُورىٰ

اس سورت کا نام سورۃ شوریٰ ہے اور حم عسق ہے، کبھی حمعسق بھی کہا جاتا ہے۔ پوری سورت مکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت جابر، حسن بصری، عکرمہ، عطاء وغیرہم نے یہی صراحت کی ہے۔ حضرت ابن عباس کی ایک روایت اور قتادہ کے قول کے موافق قل لا اسئلکم

علیہ اجرا الا المودۃ فی القربٰی سے چار آیت تک مدنی ہے ہجرت کے بعد ان آیات کا نزول ہوا۔ کل آیات کی تعداد ۵۳ کلمات ۸۶۶ اور الفاظ ۳۵۸۸ ہیں۔ حٰم عسق بعض کے نزدیک حروف ہیں اور ایک آیت ہے۔ بعض نے ان کو دو نعل قرار دیا ہے اور دو آیتیں کہا ہے۔

متشابہات کے متعلق ایک ضروری تنقیح

شیخ محلی اور سیوطی وغیرہم نے صراحت کی ہے کہ متشابہات کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حروف مقطعات میں کلام کرنے کی گنجائش بہت کم ہے اٹکل سے گفت گو کرنے کا راستہ مسدود ہے۔

ہماری نظر میں صحیح یہ ہے کہ مقطعات کی صحیح مراد اور قطعی تاویل سے تو سوائے خدا کے کوئی واقف نہیں۔ بلکن قطعی اور یقینی مراد کے علاوہ ان کے اندر بہت رموز و اسرار ہیں۔ اور علماء راسخین اپنی اپنی استعداد کے موافق اُن کو جانتے ہیں۔ ہاں علمائے خاص کے علاوہ عوام کچھ نہیں سمجھتے۔ البتہ علماء اور عوام دونوں گروہ اس ایمان میں مشترک ہیں کہ ان کی حقیقی مراد سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور ان کا نزول من عنداللہ ہے اور حق ہے۔ یہی تشریح ہے ان دو اقوال کی جو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور بظاہر دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ ایک قول میں ابن عباس نے فرمایا کہ متشابہات کی تاویل سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے قول میں فرمایا میں بھی اُن علماء راسخین میں سے ہوں جو متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قطعی اور آخری تاویل سے تو خدا ہی واقف ہے۔ رہے اسرار اور رموز اُن سے علمائے خاص واقف ہیں اور میں بھی واقف اسرار ہوں۔

منشاء نزاع آیت لا یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا الآیۃ کی تشریح ہے۔ عام قراءتوں میں الا اللہ پر وقف ہے اور والراسخون فی العلم جدا کلام ہے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ متشابہات کی تاویل بس خدا ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور علماء راسخین کہتے ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے لیکن ایک متواتر قراءت میں والراسخون فی العلم پر وقف ہے اور یقولون سے کلام علیحدہ ہے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ اللہ اور راسخ علماء کے علاوہ کوئی اور (معمولی عالم اور عامی شخص) متشابہات کی تاویل سے واقف نہیں اور اصولِ تفسیر میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ایسی دو قراءتیں دو آیتوں کے حکم میں ہوتی ہیں اور دونوں کا مفہوم اپنی اپنی جگہ صحیح ہوتا ہے۔ اصولِ تفسیر کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر قراءت کا مطلب تو یہ ہے کہ متشابہات کی حقیقی تاویل سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ نہ عارف کامل نہ عالم راسخ (اس سے کسی راسخ العلم عارف کے عالم اسرار ہونے کی نفی نہیں نکلتی) اور دوسری قراءت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کے اسرار و رموز اللہ بھی جانتا ہے اور راسخ العلم عارف بھی۔

اس تنقیح کی بنا پر قرآن کے بعض اجزاء کے ناقابلِ فہم اور بے کار ہونے کا شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت میں قرآن مجید کی آیات میں ظاہری احکام قطعیہ کے علاوہ کچھ رموز و اسرار اور دقائق و حقائق بھی ہیں اور خاص خاص علماء ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور استنباط بھی کرتے ہیں۔ علماء متقدمین کے علاوہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اسرارِ حقیقت تک پہنچنے کی بہت کوشش کی ہے۔ ہم نے بھی اپنی اس تفسیر میں بقدرِ امکان کاوش کی ہے کہ علماء عارفین کے عرفانی چشمے سے چند قطرے حاصل کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے، لیکن یہ اسرار بینی اور حقائق رسی قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، اسی لئے ان پر اعتماد کامل نہیں کیا جا سکتا ..... متشابہات کو حل کرنے کی بھی علماء عارفین نے اسی قسم کی کوششیں کی ہیں اور حضرت ابن عباس نے بھی اسی طرح کی تاویل جاننے کا دعویٰ کیا ہے فافہم فانہ اہم۔

حٰم عسق کی جو تشریح بطریق عکرمہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اُس کا خلاصہ ہے کہ ح حلمِ الٰہی م مجدِ الٰہی ع علمِ الٰہی س سناء الٰہی (روشنی) اور ق قدرتِ الٰہی ہے۔

شہر بن حوشب اور عطاء بن ابی رباح کی روایت عن ابن عباس میں ہے کہ (ح) سے مراد حرب قریش ہے یعنی قریش باہم لڑیں گے۔ م سے ملک ہے یعنی ملک ایک قوم سے دوسری قوم کی جانب منتقل ہوگا۔ ع سے مراد عدو ہے یعنی قریش کی سلطنت پر ان کا دشمن چنگیز خاں یا اور کوئی حملہ کرے گا۔ س یعنی سنین قحط آئیں گے۔ ق قدرِ الٰہی ہے جو مخلوق میں نافذ ہے جس کو کوئی تدبیر روک نہیں سکتی (خطیب فی السراج)

ابن جریر نے اس جگہ ایک اثر غریب منکر نقل کیا ہے از احمد بن الازہر (یا احمد بن زہیر) از عبدالوہاب بن نجدۃ الحوطی از عبدالقدوس ابوالمغیرہ بن الحجاج

ازارطاۃ بن المنذر۔ ابن عباس سے ایک شخص نے کہا۔ مجھے حٰم عسق کی تفسیر بتائیے۔ ابن عباس نے سر جھکا کر منہ پھیر لیا۔ سائل نے دوبارہ سوال کیا۔ ابن عباس نے پھر بھی منہ پھیر لیا۔ سہ بارہ سوال کرنے پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت حذیفہ بن الیمان موجود تھے۔ آپ نے فرمایا۔ میں تجھے اس کی تفسیر بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ابن عباس تجھے اس کی تفسیر کیوں نہیں بتاتے۔ بات یہ ہے کہ یہ آیت ابن عباس کے خاندان کے ایک شخص کے متعلق ہے۔ اس خاندان میں عبداللہ نام کا ایک شخص ہوگا (شاید خلیفہ منصور) مشرقی دریاؤں میں سے ایک دریا پر اُس کا پڑاؤ ہوگا۔ دریا کے دونوں جانب دو آبادیاں ہوں گی۔ جب اللہ چاہے گا کہ اس خاندان کی حکومت زائل ہو تو دونوں آبادیوں میں سے ایک آبادی پر آگ (یعنی لڑائی کی آگ) مسلط فرمائے گا۔ صبح کو وہ شہر سوختہ خاکستر نظر آئے گا۔ دوسرے حصہ والے تعجب بھی کریں گے اور خوشی بھی کہ ہماری بستی تو بچ گئی وہ دن یونہی گزر جائے گا۔ رات ہوگی تو قوم کے بڑے بڑے جبار جمع ہونگے اور اللہ اس قطعۂ زمین کو مع اُن سرکشوں کے دھنسا دے گا یعنی تختہ اُلٹ جائے گا (آخری خلیفۂ عباس کے زمانہ میں تاتاری سپہ سالار نے مسلمانوں کے تمام سرداروں اور امراء و علماء کو بہانہ سے ایک خیمہ میں بلوا کر چُن چُن کر قتل کر دیا تھا۔ شاید خسف سے یہی مراد ہو) پس حٰم عسق سے یہی مراد ہے یعنی حٰم عزیمت از جانب حق تعالیٰ۔ (ع) عدلِ الٰہی (س) سکون (ق) قضاءِ الٰہی یعنی عباسی خاندان کی تباہی عزیمتِ الٰہی کے تحت عدل کے موافق بقضاء و قدر عنقریب ہوگی۔ یہ حکم قضاء ظلماً نہ ہوگا عدل کے موافق ہوگا (رواہ ابن ابی حاتم والخطیب) شیخ ابن کثیر نے اس اثر کو غریب منکر قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ نواب صدیق خاں بھوپالی نے تفسیر فتح البیان میں اسی روایت کو موضوع قرار دیا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ ارطاۃ بن المنذر، عبدالقدوس، عبدالوہاب سب ثقہ راوی ہیں۔ ابوداؤد نے سنن میں عبدالوہاب سے چند روایات لی ہیں۔ اسی طرح احمد بن الازہر بھی ثقہ ہے پھر موضوع ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ ہاں اگر بن الازہر کی جگہ بن زہیر ہو تو یہ شخص مستور الحال ہے۔ پھر بھی مستور الحال کی روایت کو موضوع نہیں کہا جا سکتا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ ابن ابی حاتم کسی روایت کو جب تک اُس کی اسناد حسن نہ ہو نقل ہی نہیں کرتے۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں　اللہ کے نام سے　جو نہایت مہربان　بڑے رحم　والے ہیں

حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ یُوْحِیْٓ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ

حٰم　عسق　اسی طرح آپ پر　اور جو (پیغمبر) آپ سے پہلے　ہو چکے ہیں　اُن پر اللہ تعالیٰ جو زبردست حکمت والا ہے

الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

(دوسری صورتوں اور کتابوں کی) وحی بھیجتا رہا ہے　اُسی کا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی سب سے برتر اور عظیم الشان ہے کچھ بعید نہیں کہ

یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی

آسمان اپنے اوپر سے (کہ اُدھر ہی سے بوجھ پڑتا ہے) پھٹ پڑیں　اور (ادھر) فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں　اور اہل زمین کے لئے　معافی مانگتے

الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ

ہیں　خوب سمجھ لو کہ اللہ ہی معاف کرنے والا ہے رحمت کرنے والا ہے　اور جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں

اللّٰهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا

اللہ ان کو دیکھ بھال رہا ہے اور آپ کو ان پر کوئی اختیار نہیں دیا گیا اور ہم نے اسی طرح آپ پر (یہ) قرآن عربی وحی کے

عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ

ذریعہ سے نازل کیا ہے تاکہ آپ (سب سے پہلے) مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے آس پاس ہیں اُن کو ڈرائیں اور جمع ہونے کے دن سے

وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ۝ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي

ڈرائیں جس کے آنے میں ذرا شک نہیں ایک گروہ جنت میں (داخل) ہوگا اور ایک دوزخ میں ہوگا اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے

رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُم مِّن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۖ

اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور ان ظالموں کا (قیامت کے روز) کوئی حامی مددگار نہیں کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں۔

فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ

سو اللہ ہی کارساز ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور جس جس بات میں تم (اہل حق کے ساتھ)

مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ فَاطِرُ

اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے یہ اللہ میرا رب ہے میں اسی پر توکل رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ آسمان

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۖ

و زمین کا پیدا کرنے والا ہے اُس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) مواشی کے جوڑے بنائے (اور) اس کے

يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۚ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ

(جوڑے ملانے کے) ذریعے سے تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے اسی کے اختیار میں ہیں کنجیاں آسمان

وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

اور زمین کی جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور (جس کو چاہے) کم دیتا ہے بے شک وہ ہر چیز کا پورا جاننے والا ہے

تفسیر تمام آسمانی مذاہب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پیغمبر پر منجانب اللہ وحی آتی ہے۔ وحی کی کیفیت نوعیت اور کمیت میں خواہ اختلاف ہو اور تفصیلی احکام جدا جدا ہوں لیکن اصولی اشتراک سب میں ہے اور امور مندرجہ ذیل کی تعلیم سب جگہ ایک ہی طرح ہے۔ (۱) اللہ واحد ہے، خالق ہے، رزاق ہے، عالم محیط ہے، حاکم مطلق ہے اور متصرف کل ہے (۲) اُسی کے تشریعی احکام جاری ہونے چاہئیں۔ حق و باطل اور اچھے برے کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔

اگر انسانی افہام مختلف ہوں، کسی کی عقل ایک بات کو صحیح اور دوسرے کی دانش اُس کو غلط بتاتی ہو تو فیصلہ کرنے کا حق صرف خدا کو ہے۔ کوئی شخص اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کر سکتا (۳) قیامت ضرور آئے گی اور اعمال کی جزا سزا ملے گی۔ کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ میں جائیں گے (۴) اگر اللہ چاہتا تو سب لوگ ہم خیال ہو جاتے اور اختلافِ رائے نہ ہوتا سب صراطِ مستقیم پر ہوتے یا سب گمراہ ہوتے مگر اللہ نے نہ چاہا کہ سب کا ہم خیال ایک گروہ ہو اُس نے اپنی مشیئت کے مطابق بعض کو رحمت سے نوازا جاتا (۵) پیغمبر کا کام تبلیغ وحی ہے۔ گمراہیوں کی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں (۶) قیامت کے دن اللہ کی مشیت کے خلاف کوئی بھی کسی گمراہ کی حمایت نہ کر سکے گا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اصول تمام پیغمبری ادیان میں مشترک ہیں۔ صرف زبان کا اختلاف ہو تو ہو غرض وحی ایک ہی ہے۔

تحلیلِ اجزاء حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ اس کی حقیقی مراد سے اللہ ہی واقف ہے۔ بعض رموز و اسرار ابن عباس کے قول سے اخذ کر کے ہم لکھ چکے ہیں۔
كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یعنی جس طرح اللہ عزیز حکیم محمد رسول اللہ کے پاس قرآن وحی کے ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اسی طرح پہلے انبیاء کے پاس صحیفے اور کتابیں وحی کے ذریعے سے اس نے بھیجی تھیں (ابن کثیر) تشبیہ کس بات میں ہے وجہ شبہ یعنی امر جامع تین چیزوں کو قرار دیا جانے کا احتمال ہے۔ (۱) تمام اصول عقائد، مکارم اخلاق اور تفصیلی احکام میں اشتراک ہو ایسا نہیں ہوا۔ اقوام کے حالات زمان و مکان کا اختلاف اور زبانوں کا تباین اشتراکِ کلی سے مانع ہے۔ اسی لئے سیاسی مدنی اور بعض اخلاقی احکام کی تفصیل میں ادیانِ سماوی باہم مختلف ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ کے طریقے، جہاد کا حکم، مالِ غنیمت کو تصرف میں لانے نہ لانے کا فیصلہ تیمم کی تشریع غرض بکثرت تفصیلی احکام میں اختلاف ہے اس لئے تمام عقائد و اعمال کی تعلیم کو مشترک نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) اصول میں اتحاد خواہ اصول عقائد ہوں یا اصولِ مکارم یہی صحیح ہے۔ امام رازی نے اس جگہ لکھا ہے کہ ہم نے سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ اس میں اول توحید کا بیان ہے۔ دوئم نبوت اور سوئم دارِ آخرت کی تشریح اور آخر میں فرمایا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى یعنی ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں ان ہی تینوں چیزوں کا بیان ہے۔ گویا امام کی تشریح کے موافق آیت كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ میں انہی تینوں مشترک چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور بات بھی یہی ہے۔ اللہ کی توحید کے اندر اس کے تمام خصوصی اوصاف آجاتے ہیں اور قیامت کے اقرار کے اندر قیامت کی تفصیل کا اقرار آجاتا ہے۔ اور نبوت سے دینِ الٰہی کا بندوں تک پہنچنا اور اُس کے بتائے ہوئے احکام پر چلنا ضروری قرار پاتا ہے۔ رہی احکام کی تفصیل اور کمی بیشی تو اس میں اشتراک نہیں ہر شریعت انفرادیت کی حامل ہے۔

(۳) کیفیتِ وحی میں اشتراک۔ کیفیتِ وحی کو وجہ شبہ مشترک قرار دینا غلط ہے کیونکہ بروایت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ۔ حضور کے پاس وحی مختلف طریقوں سے آتی تھی۔ کبھی جرس کی آواز کے ساتھ آتی تھی، کبھی بشری شکل میں فرشتہ آتا تھا اور پیامِ الٰہی پہنچاتا تھا سخت سردی کے زمانے میں انقطاعِ وحی کے بعد پیشانی مبارک سے اتنا پسینہ جاری ہوتا تھا جیسے کسی فصد کھول دی (رواہ البخاری ومسلم قد نقلناہ مع حذف بعض التفاصیل) یہ کیفیت تو حضور کی وحی کی تھی یعنی جرس والی صورت میں وحی اتصالی ہوتی تھی اور فرشتہ کی صورت میں وحی کو ہم معمولی وحی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں۔ دوسرے انبیاء کے پاس وحی کس طرح آتی ہے۔ صرف القائے قلبی ہوتا تھا یا سب کے پاس فرشتہ آتا تھا یا وحی اتصالی ہوتی تھی اور وحی کے وقت پیغمبر تمام بشری صفات سے پاک ہو جاتا تھا۔ اس کی تفصیل معلوم نہیں ہاں حضور کی وحی میں اتنی خصوصیت ضرور ہم کو معلوم ہے کہ قرآن کتابی شکل میں بحیثیت مجموعہ نازل نہیں ہوا۔ دوسرے پیغمبروں پر وحی کا نزول بصورتِ کتابی ہوا اور پورا صحیفہ یا کتاب عطا کی گئی۔ واللہ اعلم۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ یعنی آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اللہ ہی کی مخلوق مملوک مقبوض اور محکوم ہے کوئی دوسرا نہ ان کا خالق ہے نہ مالک نہ قابض نہ حاکم اور متصرف۔ لیکن کیا اُس کو اُن کی مخلوقیت مملوکیت اور محکومیت سے کوئی نفع پہنچتا ہے یا ان میں سے کوئی اُس کے مشابہ اور مساوی ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔ وہ ہر نفع اندوزی غرض مشابہت مماثلت اور مساوات سے بلند اور برتر ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ۔ عظمتِ الٰہی کی ہیبت سے قریب ہے کہ آسمان پارہ پارہ ہو جائیں۔ کذا قال ابن عباس و ضحاک

وسدی وکعب الاحبار (ابن کثیر) یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ کفار جو اللہ کے لئے بیٹا اور بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور بیہودہ بکواس کرتے ہیں۔ اس بیہودگی سے آسمان شگافتہ ہو جائیں تو بعید نہیں۔ بعض مفسرین نے فَوْقِهِنَّ کی ضمیر زمین کی طرف راجع کی ہے جو آیت بالا میں مذکور ہے یا کافروں کی جماعتوں کی طرف ضمیر لوٹتی ہے۔ یعنی خدا کی شان میں کافروں کی یہ بیہودگیاں اس قابل ہیں کہ اگر ان کے اوپر سے آسمان پھٹ پڑیں تو بعید نہیں۔ (سراج)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔ آسمانوں کے شق ہو جانے کا یہ دوسرا سبب بیان کیا۔ ایک تو خدا کی شان میں کافروں کی بیہودہ بکواس۔ دوسرے فرشتوں کی تحمید و تقدیس کی پرجلال ہمہ وقت مشغولیت (ہکذا فی السراج) یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی عظمت کی ہیبت سے آسمانوں کا پارہ پارہ ہو جانا کچھ بعید نہیں اور اس کی ہیبت سے فرشتے بھی اس کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ۔ ملائکہ زمین والوں کے لئے معافی مانگتے ہیں۔ زمین والوں سے صرف اہل ایمان مراد ہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ یا گنہگار اور کفار سب مراد ہیں۔ ان کے گناہوں کے ڈر سے فرشتے بھی لرزتے ہیں کہ کہیں عذاب کی کوئی چھینٹ ہم پر بھی نہ پڑ جائے۔ اس لئے مجرموں کے لئے معافی کی درخواست کرتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ یعنی نادانی کی حالت میں جن سے گناہ ہو جاتے اور وہ پشیمان ہو کر توبہ کر لیں تو اللہ اُن کے لئے غفور رحیم ہے۔ ہم نے اللہ کے غفور رحیم ہونے کی یہ تشریح ایک دوسری آیت کی روشنی میں کی ہے لیکن اگر دونوں آیتوں کو اپنی اپنی جگہ رکھا جائے اور ایک کو دوسری کی تشریح نہ قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ آیت توبہ میں توبہ قبول ہونے کی شرط یہ قرار دی ہے کہ نادانی سے گناہ ہو جائے اور پھر پشیمان ہو کر توبہ کر لی جائے۔ اس آیت میں غفران و رحمت کو مطلق رکھا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت عمومی ہے۔ اگر بندوں کے گناہوں پر گرفت ہوتی اور اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اپنے غفور رحیم ہونے کی نمائش اور فرشتوں کی طرف سے زمین والوں پر شفقت تھی۔ رہا سرکش کافروں کا اللہ کے ساتھ سلوک تو اس کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز اور سرپرست سمجھ رکھا ہے۔ اُن کے بھروسہ پر جیتے ہیں اُن کے ناموں کی رٹ لگاتے ہیں۔ اُن کو پکارتے ہیں اُن سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اُن کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ غرض اللہ کو چھوڑ کر ان کو دوست سمجھ رکھا ہے تو اللہ اُن کے اعمال کا نگراں ہے۔ اُس کو اُن کے کرتوت سب معلوم ہیں۔ اُن سے منوانا اور زبردستی راہ راست پر لانا رسول کا کام نہیں۔ رسول ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ یعنی جس طرح جس مقصد کے لئے اللہ نے گزشتہ پیغمبروں کے پاس صحیفے اور کتابیں اور پیام ہدایت بھیجے تھے۔ اسی طرح آپ کے پاس بھی عربی زبان میں قرآن بھیجا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی الفاظ بھی قرآن کا جزو ہیں اور رسول اللہ کو وحی قرآن عربی زبان میں ہوئی تھی۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ تاکہ مکہ کے باشندوں کو اور مکہ کے چہار اطراف والوں کو اللہ کی نافرمانی سے آپ ڈرائیں۔ مَنْ حَوْلَهَا سے مکہ کے قریب گرد اگرد رہنے والے ہی مراد نہیں ہیں بلکہ چونکہ وسط زمین ہے اس لئے اول نزول وحی مکہ کے باشندوں کے لئے ہوا۔ پھر ہر سمت جہاں تک آبادی ہے سب اسلام کے مکلف ہوئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے پہلے کعبہ کو نمودار فرمایا پھر اس کے گرد تمام زمین بچھائی۔ یعنی مشرق مغرب شمال جنوب ہر سمت زمین پھیلائی۔

وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ یوم الجمع سے مراد ہے قیامت کا دن جس میں اگلے پچھلے سب جمع ہوں گے اور حساب کتاب کے بعد ایک گروہ جنتی اور دوسرا دوزخی ہوگا۔ آیت بالا کی بناء پر بعض مفسرین نے صراحت کی ہے کہ دوزخیوں کا دوزخی ہونا اور جنتیوں کا جنتی ہونا علم الٰہی میں پہلے سے مقرر ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے۔ کل میسر لما خلق لہ۔ یعنی جس غرض کے لئے آدمی کی تخلیق ہوئی آدمی کو اسی کی توفیق ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ ہم لوگوں کے پاس حضور والا دو تحریریں دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا تم جانتے ہو یہ کیسی تحریریں ہیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں نہیں معلوم حضور آگاہ فرمائیں۔ حضور نے دائیں ہاتھ والی تحریر کے متعلق فرمایا۔ یہ رب العالمین کی

طرف سے ایک تحریر ہے جس میں اہلِ جنّت کے اور ان کے باپوں اور قبیلوں کے نام ہیں۔ ان میں زیادتی کمی نہیں ہوسکتی۔ پھر بائیں ہاتھ والی تحریر کے متعلق فرمایا یہ اہلِ دوزخ کی تحریر ہے جس میں ان کے اور ان کے باپوں اور قبیلوں کے نام ہیں جن میں بیشی کمی نہیں ہوسکتی۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ جب معاملہ ختم ہوگیا تو اب ہم عمل کیوں کریں۔ فرمایا اعتدال کا نیک راستہ اختیار کرو۔ قرب کی کوشش کرو۔ جنتی کا خاتمہ جنتی کے کام پر ہوگا۔ خواہ وہ کوئی کام کرتا ہو، اور دوزخی کا خاتمہ دوزخ کے کام پر ہوگا۔ خواہ وہ کوئی کام کرتا ہو۔ پروردگار اپنے بندوں کے کام سے فارغ ہوچکا ہے۔ اس کے بعد حضور نے دائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف اشارہ کیا۔ (وہ غائب ہوگئی) اور فرمایا فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ۔ پھر بائیں ہاتھ والی تحریر کو پیچھے پھینکنے کا اشارہ کیا (اور وہ بھی غائب ہوگئی) اور فرمایا فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ (رواہ احمد والنسائی والترمذی وقال حسن صحیح) حضرت براء بن عازب اور بعض دوسرے صحابیوں سے بھی اسی طرح کی روایات آئی ہیں۔ الفاظ کچھ مختلف ہیں۔

میں کہتا ہوں حدیث اپنی جگہ صحیح ہے۔ اہلِ جنّت اور اہلِ دوزخ کی تعیین تخلیق سے پہلے ہوچکی ہے جس کا علم اللہ کو ہے اور حضور والا کو بھی اس کی اطلاع دے دی گئی تھی لیکن آیتِ مذکورہ میں اس ازلی نوشتہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں بلکہ آیت میں تو قیامت کے ہولناک ہونے کا بیان ہے جبکہ ایک فریق جنتیوں کا ہوگا اور دوسرا دوزخیوں کا۔ وہ وقت بہت خوفناک ہوگا۔ یہ مطلب تو اس آیت کے کسی جزء سے مترشح نہیں ہوتا کہ تخلیق سے پہلے جنتی اور دوزخی ہونے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر اللہ چاہتا تو آدمیوں کے یہ دو فریق نہ ہوتے ایک ہی گروہ ہوتا (خواہ جنتی یا دوزخی) اللہ قادر و مختار ہے جیسا چاہے کرسکتا ہے لیکن

وَلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے (اور اس کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے اور شیطانی مکر سے محفوظ رکھتا ہے) ہاں جو ناحق کوش اور بے جا حرکتیں کرنے والے ہیں یعنی جنھوں نے خدا کے اختیارات مخلوق کو دے رکھے ہیں یا خدا کو عاجز قرار دیتے ہوتے دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے قیامت کے دن ان کا نہ کوئی کارساز ہوگا نہ مددگار۔ خطیب نے تفسیر سراج میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوتے اللہ نے فرمایا تھا کہ آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یعنی آپ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ سب کو مومن بنا دیں۔ ہاں اللہ کو یہ قدرت ہے اگر وہ چاہتا تو سب کو ایمان پر جمع کر دیتا۔ خطیب کی یہ تشریح ہماری تفسیر سے مختلف ہے۔ اول تو خطیب کے نزدیک وکیل اور ذمہ دار نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سب کو ایمان پر جمع کرنے کی قدرت نہیں اور ہم نے ذمہ دار نہ ہونے کی تشریح یہ کی تھی کہ اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اس کی بازپرس آپ سے نہ ہوگی۔ دوسرے ایک امت بنانے کا معنی خطیب کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو مومن بنا دیتا اور ہماری تشریح اس سے عام ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب آدمیوں کو ایک گروہ بنا دیتا خواہ سب کو مومن بنا دیتا یا غیر مومن۔ واللہ اعلم بحقیقۃ مرادہ۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ مدد کرنے کی اولین شرط مددگار کی طاقت ہے۔ مدد کرنے والے میں اگر طاقت نہ ہو تو وہ حاجت مند کی کارسازی کیسے کرسکتا ہے۔ پھر طاقت بھی ہوتی لازم ہے ورنہ مدد کا نتیجہ معلوم۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو کارساز سمجھنے والے یاد رکھیں کہ ان کا کوئی فرضی معبود کارسازی کی طاقت نہیں رکھتا۔ چاہے وہ باطل معبودوں اور طاغوتوں کو اپنا کارساز سمجھ رہے ہوں، مگر کارسازی کسی کے بس کا کام نہیں۔ کوئی ہمہ گیر طاقت نہیں رکھتا۔ کوئی مُردوں کو زندہ نہیں کرسکتا۔ یہ خصوصیت تو صرف اللہ کی ہے۔ وہ بے جان کو جاندار بناتا ہے اور اس میں سب کچھ کرنے کی قدرت ہے۔ اس لئے کارساز وہی ہے کوئی دوسرا نہیں۔ حاصل یہ کہ نہ دنیا میں کوئی دیوی دیوتا پیر فقیر پتھر پانی درخت ستارہ اور سیارہ کچھ نفع پہنچا سکتا ہے نہ آخرت میں عذاب سے بچا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ کی تفسیر میں هُوَ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا ہے۔ اس صورت میں کافر و مومن کی عمومی کارسازی ظاہر کرنی مقصود نہ ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ کافروں نے تو دوسروں کو اپنا ولی اور مددگار بنا رکھا ہے مگر اللہ صرف اہلِ ایمان کا مددگار ہوگا ان کی نصرت کرے گا۔ اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے۔ فرمایا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور کافروں کے متعلق فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّاغُوْتُ گویا کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں اور مسلمانوں کا مولیٰ اللہ ہے۔ جنگِ احد میں جب کافروں کے سردار نے مسلمانوں سے پکار کر کہا۔ اِنَّ لَنَا عُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ۔ عُزّیٰ ہماری دیوی ہے اور تمہارے لئے کوئی عزّیٰ نہیں یعنی

غزنی کی مدد سے ہم غالب آئے تو حضورؐ نے فرمایا۔ اَللّٰہُ مَوْلٰینَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ اللہ ہمارا کارساز ہے مددگار ہے۔ تمہارا کوئی مددگار کوئی کارساز نہیں یعنی عزیٰ تمہاری مدد نہیں کرسکتی مددگار تو صرف خدا ہے اور اس کی مدد ہم کو حاصل ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ۔ انسانوں کے باہمی اختلاف اور کسی چیز کی حقانیت و بطلان کے متعلق قضا و آخری فیصلہ کرنا یعنی اشیاء کی حلت و حرمت کے احکام تجویز کرنا اور جاری فرمانا اللہ کا کام ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خالقِ کل اللہ ہے۔ قادرِ مطلق اللہ ہے کارساز اللہ ہے تو افکار و اعمال کی تصحیح و تغلیط اور احکام کی تحلیل و تحریم بھی اُسی کا کام ہے۔ کسی کا از خود یا دوسروں کے کہنے سے کسی چیز کو صحیح یا غلط یا حلال حرام قرار دینا باطل ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ دینی امور کا فیصلہ کرنا خدا کا کام ہے۔ یعنی آیت مذکورہ میں لفظ من شیءٍ خاص ہے اور اس سے مراد دینی احکام ہیں مگر ابن کثیر اور جلال محلی کے نزدیک من شیءٍ نکرہ ہے۔ اس میں دینی یا دنیوی کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہی تفسیر صحیح ہے کیونکہ مسلمان کے لئے دنیا دین جدا جدا نہیں۔ پوری زندگی دین ہے۔ زندگی کی ہر حرکت دین کے لئے ہے۔ دوسرے مذاہب والوں کی دنیا اور ہے اور مسلمان کی دنیا اور۔ اس لئے زندگی کے ہر معاملے کے صحیح غلط اور جائز ناجائز ہونے کا فیصلہ اللہ کے حکم کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہیئے۔ اللہ شارع احکام ہے۔ قرآن دستورِ شریعت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شارحِ شریعت ہیں۔ یعنی واقفِ اسرار مفسر حضور کا ہر فرمان فیصلۂ الٰہی ہے۔ کسی دوسرے کارساز اور حاکم کی گنجائش نہیں۔ اس لئے دوسروں کو حاجت روا حکمران اور معبود قرار دینا بڑی عجیب بات ہے۔

ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ۔ اس میں رُوئے خطاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ایسا خالق کارساز قادرِ مطلق حاکم برحق خدا میرا رب ہے۔ اسی کا مجھے بھروسہ ہے اور اپنی پوری زندگی کا رُخ میں اُسی کی طرف پھیر رہا ہوں۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وہی فاطر السموات والارض ہے۔ یعنی آسمان زمین اور ان کی درمیانی کائنات کو عدمِ محض سے نکال کر شکلِ ہستی پہنانے والا وہی ہے۔ ہر چیز اس کی مسخر ہے۔ کوئی شے خودمختاری کا سر نہیں اُٹھاسکتی۔ اُسی نے

جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا۔ تمہاری قلبی تسکین جسمانی راحت تعاونِ زندگی اور تناسل کے لئے تمہاری دو صنفیں بنائیں۔ مرد اور عورت تمام عناصر متحد۔ مادہ ایک، صنف جدا جدا اور کیفیت منافع الگ الگ۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا۔ اسی نے تمہاری غذا سواری اور دوسرے منافع کے لئے چوپایوں کو الگ الگ صنف بنایا اور نر مادہ کا جوڑا لگایا۔

یَذْرَؤُکُمْ فِیْهِ۔ اس طریقہ سے تمہاری نسل کو پھیلاتا ہے۔ یعنی اوّل تخلیقِ کائنات کی جس میں انسان کی شخصی بقا کے لئے اسباب پیدا کئے۔ پھر نر و مادہ کو الگ الگ بنایا اور صنفوں کو ملا کر جوڑا لگایا اور اس طرح نسلِ انسانی کو پھیلایا۔ اس پوری تقریر سے واضح ہوگیا کہ اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں۔ نہ جوہرِ ذاتی میں، نہ صورت و کیفیت میں، نہ مقدار اور مرتبہ میں، نہ صفت اور حالت میں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ مثل کا لفظ تمام الفاظ سے زیادہ عام ہے۔ ند اُس کو کہتے ہیں جو ذاتی جوہر میں مشابہ ہو۔ شبیہ مشترک الکیفیت کو کہتے ہیں۔ مساوی مقدار میں برابری رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ مشاکل لمبائی چوڑائی اور ہیئت میں ایک طرح کی چیز کو کہتے ہیں اور لفظ مثل ان سب معانی کو حاوی ہے۔ پس اللہ کا کوئی مثل نہیں۔ یعنی نہ جوہرِ ذاتی میں نہ صفات میں نہ کیفیت صورت اور مرتبہ میں۔ خلاصہ یہ کہ کائنات میں سے اللہ کی طرح کسی کی ذات نہیں، صفت نہیں کیفیت اور حالت نہیں، ہیئت اور خاصیت نہیں، مرتبہ اور طاقت نہیں۔ وہ ہر تمثیل تشبیہ اور تنظیر سے پاک ہے۔ زمان و مکان سے منزہ ہے۔ امکان کی ہر آلائش سے مبرا ہے۔ خارج و ذہن کی قیود سے جدا ہے۔ جو کچھ اُس کے متعلق کہا جائے اس سے وہ ماوراء ہے۔ جو تصور دماغ میں لایا جائے وہ اس سے بلند ہے۔ ہر قول و بیان کی ہمہ گیری اور ہر تصور کی رسائی اور پہنائی بارگاہِ الوہیت کے سامنے سپر انگندہ ہے۔ سچ ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ پھر کسی دوسرے کو کارساز کیوں سمجھا جائے۔ کیوں کسی کے سامنے سرِ بندگی جھکایا جائے اور کیوں کسی سے غلط آس لگائی جائے۔

وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ سمیع و بصیر بھی تو اللہ ہی ہے۔ یعنی اُس کے سوا کوئی سنتا اور دیکھتا بھی تو نہیں۔ گو بظاہر دوسرے بھی دیکھتے سنتے ہیں، لیکن کوئی بھی ایسا نہیں کہ ہر آواز کو سن سکے یا کسی آواز کی ہر کیفیت کو سن سکے۔ اسی طرح کوئی بھی اس موجودات کی ہر چیز کی صورت کو نہیں دیکھ سکتا۔ نہ کسی ایک صورت کو دیکھنے کے بعد اس کی ہر کیفیت اور پوری حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے۔ کون ہے کہ کروڑوں مخلوق کی پکار کو ایک وقت ایک ساعت،

ایک دقیقہ اور ایک ثانیہ میں سُن کر سمجھ لے۔ کون ہے افلاک وکواکب ملائکہ اور ارب درارب یبنی کائنات کی ہر حرکت کی آواز کو سُن سکے۔ کون ہے جو دماغی ہر تصور اور ہر قلبی خطور کی خفیف ترین لہر کی آہٹ پاسکے۔ پتیوں اور کلیوں کی چٹک اور نوکِ خار کی شکست کی کھٹاک کون سماعت کر سکتا ہے۔ ایسا سُننے والا تو اللہ ہی ہے۔ یہ بھی سوچو کہ تاریک غاروں کے اندر رات اندھیری میں چیونٹی کے پاؤں کی حرکت کو کون دیکھتا ہے۔ روئے زمین کے ہر سبزے کے حقیر ترین ہر جزء کی بالیدگی کون ملاحظہ کر رہا ہے۔ ان گنت قطروں کی روانی اور ذراتِ ہوائی کی روانی کس کے زیرِ معائنہ ہے۔ غرض ہر ذرہ کائنات کی ہر آن پیدا ہونے والی تغیراتی موج کا کون مشاہد ہے۔ یہ خصوصیت تو اللہ ہی کی ہے۔ پس وہی سمیع ہے وہی بصیر ہے۔ نہ کوئی دوسرا دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔ پھر کسی دوسرے کو کیوں پکارا جائے، کیوں اپنی حالتِ زار دکھائی جائے اور کیوں مدد کے لئے بلایا جائے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اُسی کے پاس تو زمین آسمان کے خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ (مقالید کے معنی کنجیاں، مقدورات و ممکنات اللہ کا خزانہ ہے جو اُس کے قبضہ میں ہے اور اس کی قدرت نامحدود ہے (امام قشیری) یعنی زمین کے اندر سونا چاندی قیمتی جواہر ہر مفید دھات اور ہر طرح کی روئیدگی اور بالیدگی کی طاقت مخفی ہے جس کی کوئی گنتی نہیں۔ نہ کوئی جان سکتا ہے۔ اور آسمانوں میں بھی طرح طرح کے غیبی خزانے پوشیدہ ہیں۔ سیارے ستارے ملائکہ غیبی طاقتیں اتھاہ توانیں ناقابلِ تصور برقی لہریں اور خدا جانے کیا کیا مخفی صلاحیتوں کے دفینے مدفون ہیں اُن غیبی خزانوں میں سے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔ وہ جس کو چاہتا ہے فراخی کے ساتھ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے رزق کی تنگی دیتا ہے۔

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ وہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے جس کو جتنا جب جہاں سے اور جس طور سے مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی نہیں جس کے پاس زمین آسمان کے خزانے ہوں۔ ان خزانوں کی کنجیاں ہوں۔ کھولنے اور دینے کی طاقت ہو۔ تصرف کرنے کا اختیار ہو۔ دینے اور نہ دینے کی مصلحت کا علم ہو۔ لینے والے کی قابلیت اور مقدارِ قابلیت سے واقفیت ہو۔ جب کسی کے بس میں کچھ نہیں۔ ہر ماسوا ناواقف عاجز تہی دست اور محتاج ہے تو پھر منگتا کو منگتا کیا دے سکے گا۔ نادار سے مانگنا عبث ہے۔ عاجز کے پاس طاقت کہاں کہ وہ کسی کی مدد کر سکے۔ ایسے عاجزوں، جاہلوں، تہی دستوں اور بے بسوں کو اولیاء بنانا اور کارساز تصور کرنا سراسر حماقت ہے۔ خسرانِ مالی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

مقصود بیان

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ الخ سے تمام ادیانِ سماویہ اور مسالک انبیاء کے اصولی اشتراک و وحدت کی طرف اشارہ ہے۔ امہات العقائد اور اصول مکارم اخلاق کی تعلیم ہر پیغمبر کے پیشِ نظر رہی۔ شرک انکار قیامت تکذیب رسالت اور اشاعت فسق و فجور کی ہر پیغمبر نے ممانعت کی۔ حکمِ خداوندی کے مطابق زندگی کی رفتار کو ڈھالنے کی ہر ایک نے ہدایت فرمائی۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ الخ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کی عظمت کی ہیبت اور جلال کے خوف سے آسمان اور ملائکہ یعنی سب سے بڑی مرئی اور غیر مرئی مخلوق بھی لرزاں اور ہراساں ہے۔ اس خوف سے آسمانوں کا پھٹ پڑنا بعید نہیں اور ملائکہ ہر دم تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ یا خدا کے متعلق کافروں کی بیہودگیاں ایسی لرزہ خیز ہیں کہ آسمان باوجود اپنی تہاریت و عظمت کے اور ملائکہ باوجود اپنی کرامت اور منزلت کے لرزاں ترساں ہیں۔

يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ سے واضح ہوتا ہے کہ ملائکہ اہلِ زمین کے لئے استغفار کرتے ہیں یعنی گناہگاروں کی شفاعت کرتے ہیں۔ یہ آیت شفاعتِ ملائکہ پر دلالت کر رہی ہے۔

مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ سے صراحۃً ثابت ہے کہ کسی کی نافرمانی کی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں اور بقول خطیب پیغمبر سب کو ایمان پر جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتے نہ اس پر مکلف ہیں۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کا لفظ بتا رہا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

وَلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ الخ سے یہ امر مترشح ہو رہا ہے کہ اللہ نے اپنی دونوں صفتوں یعنی رحمت و غضب کا اظہار چاہا۔ اس لئے سب آدمیوں کے دو گروہ کر دیئے ایک خیال پر سب کو جمع نہیں کیا۔

مَنْ حَوْلَهَا کے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ رسول پاک کی رسالت تمام اطرافِ عالم کے لئے عمومی تھی۔ يَوْمَ الْجَمْعِ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اگلے پچھلے سب آدمی جمع ہوں گے۔ ایسا نہ ہوگا کہ قبروں سے اٹھتے جائیں حساب ہوتا جائے اور جنت و دوزخ میں داخل ہونے کا تانتا بندھا رہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ میں اظہارِ تعجب ہے اُن لوگوں کی حالت پر جنہوں نے حقیقی قادرِ مطلق عالمِ کل سمیع و بصیر کارساز کو چھوڑ کر

دوسرے چھوٹے کارساز بنا رہے ہیں اس آیت کو پڑھ کر درس بصیرت اور سبق نصیحت لینا چاہیے اُن پجاریوں کو جو اولیاء انبیاء ملائکہ بلکہ ہر چھوٹے پیر فقیر کو کارساز سمجھتے اُن کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مرادیں مانگتے ہیں اللہ کو نہیں سمجھتے کہ اُن کے بس میں خود کچھ نہیں۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ سے ثابت ہو رہا ہے کہ تشریع یعنی اشیاء کی تحلیل و تحریم کا حق صرف خدا کو ہے۔ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ میں کلمہ حصر بتا رہا ہے کہ اللہ کے علاوہ نہ کوئی سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ یعنی پوری کیفیت اور ماہیت کو خواہ کسی ایک چیز ہی کی ہو یا ہر آواز اور ہر صورت کو بیان حقیقت اور مجاز کی تعطیل بے محل ہے۔ کیونکہ واقع میں نہ بطور حقیقت نہ بطور مجاز کوئی شخص بھی نہ سمیع ہے نہ بصیر وغیرہ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم

وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ

اور موسیٰ و عیسیٰ کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امت کو یہ کہا تھا) کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی

إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ

ہے جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔ اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اسکو اپنے تک رسائی دیدیتا ہے اور وہ لوگ بعد اس کے

بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى

کہ ان کے پاس علم پہنچ چکا تھا محض آپس کے ضد اضدی سے باہم متفرق ہو گئے اور اگر آپکے پروردگار کی طرف سے ایک وقت معین تک (کیلئے مہلت دینے کی) ایک بات

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ۝

پہلے قرار نہ پا چکی ہوتی تو (دنیا ہی میں) ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی ہے (مراد اس سے مشرکین عہد نبوی کے ہیں) وہ اسکی طرف سے ایسے

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ

(قوی) شک میں پڑے ہیں جس نے انکو تردد میں ڈال رکھا ہے سو آپ اسی طرف (ان کو برابر) بلاتے جائیے جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے اور (اس پر) مستقیم رہیے اور ان کی فاسد

وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا

خواہشوں پر نہ چلئے اور آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں میں سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ بھی حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان

وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝

میں عدل رکھوں اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور

تمہارے عمل تمہارے لئے ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں اللہ ہم سب کو جمع کریگا اور اسی تک ہم سب کو اسی کے پاس جانا ہے۔

تفسیر حضرت آدم اس زمین پر آئے اور رفتہ رفتہ آپ کی نسل پھیلی۔ مدت تک لوگ سادہ فطرت پر رہے۔ ایک خدا کے بندے۔ سب ایمان دار نہ کوئی مشرک نہ بے ایمان نہ دوسرے کی حق تلفی کرنے والا، اس لئے کسی قانونی مجموعہ کی ضرورت ہی نہ تھی بعض آدمی گناہگار ضرور تھے، لیکن بدعقیدہ نہ تھے نہ ان کا کوئی پیرو نہ طرفدار اللہ کے نیک بندوں کی معمولی تنبیہات ایسے گناہگاروں کی اصلاح کے لئے کافی تھیں۔ اسی لئے حضرت آدم کو رسول نہیں بنایا۔ آپ صرف نبی تھے۔ صاحب وحی نہ الہام۔ رسول نہ تھے صاحب صحیفہ و کتاب۔ صحاح کی مشہور حدیث شفاعت میں آیا ہے کہ جب لوگ جمع ہو کر حضرت آدم سے شفاعت کرنے کی درخواست کریں گے تو آپ لغزش ممنوعہ کو کھانے کا عذر پیش کر کے فرمائیں گے تم نوح کے پاس جاؤ وہ زمین والوں کے لئے اللہ کی طرف سے اوّلین رسول تھے الحدیث۔ یہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ رسالت کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوا اور خاتمۂ رسالت تو بہرحال محمد رسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر ہوا۔ دونوں کے درمیان تین جلیل القدر صاحب صحیفہ صاحبِ شریعت پیغمبر ہوئے۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ۔ حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیم تک جتنے پیغمبر گذرے وہ سب شریعت نوحؑ کے پیرو تھے۔ مثلاً حضرت صالح حضرت ہود۔ جب ابراہیمی دور آیا تو نئی شریعت اور نئی ملت پیدا ہوئی اور آپ کے بعد جتنے انبیاء اور رسول گذرے سب ملتِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔ مثلاً حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیب وغیرہ۔ حضرت موسیٰ کا دور آیا تو توریت سب سے پہلی مدون کتاب نازل ہوئی اور حضرت عیسیٰ کے دور تک اس کے قوانین واجب العمل رہے۔ حضرت یوشع حضرت حزقیل حضرت داؤد حضرت سلیمان اور دوسرے انبیاء شریعت موسوی کے پابند تھے۔ زبور کتاب ضرور نئی تھی، لیکن شریعت نئی نہ تھی۔ توریت کے احکام کے خلاف کوئی حکم زبور میں نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ کا دور آیا تو انجیل نازل ہوئی۔ اور حضور سید المرسلین کی بعثت تک شریعت انجیل نافذ رہی۔ اس کے بعد قرآن مجید کا نزول ہوا۔

اللہ کی ذات وصفات ہر تغیر اور زمان و مکان کی حدود سے پاک ہیں۔ قیامت کا وقوع ہر زمانہ کے ہر آدمی کے محاسبۂ زندگی کیلئے ضروری ہے۔ نظم کائنات کو قائم رکھنا اور پیغمبروں تک اللہ کا پیام پہنچانے کے لئے ملکوتی طاقتوں کو بہرحال ہر زمانہ میں ضرورت ہے۔ اصول خیر و شر اور زندگی کے بنیادی قوانین کی تاسیس سے ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم کا انسانی جتھا عاجز ہے، اس لئے مکارم اخلاق اور راجہات الاعمال نظریات کی تشریع ہر زمانہ میں خدا کی طرف سے ایک ہی جیسی ہونی لازم ہے۔ مثلاً چوری، زنا، دراز دستی، خیانت، رشوت، جھوٹ، بہتان، غیبت، فواحش، مکاری، دغا، دھوکہ دہی وغیرہ ہر زمانہ میں بری حرکات ہیں اور ان کی سزا ضروری ہونی چاہیئے۔ خواہ کسی نوعیت کی ہو۔ غرض مبدء و معاد اللہ ملائکہ کتب سماویہ انبیاء اندازۂ خیر و شر اور اصول فضائل ورذائل کی تعلیم ہر زمانہ میں ایک ہی طرح کی رہی ہے اسی کو دین کہا گیا ہے اور اسی کی اقامت کا حکم ہر پیغمبر کو ایک ہی طرح کا دیا گیا۔ رہا فروعی اختلاف مثلاً جرائم کی سزاؤں کی کمی بیشی بعض اشیاء کی علت و حرمت تو یہ اختلاف زمان ومکان اور اقوام کے قوامی مزاج کے اختلاف کے پیش نظر تمام ادیان سماویہ میں ہوتا رہا ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ہر ایک کا گھاٹ علیحدہ راستہ جدا۔ یہ اختلاف شریعت کا اختلاف ہے۔ دین کا اختلاف نہیں۔

غرض تمام انبیاء نے متحد الفکر ہو کر اپنے دور میں اقامت دین کی کوشش کی اور چونکہ سب کو حکم دیا گیا تھا کہ آپس میں پھوٹ پیدا نہ کرنا۔ دینی تفرقہ نہ کرنا۔ اس لئے ہر آنے والے نے گذشتہ کی تصدیق کی۔ شریعت کے اختلاف کے باوجود گذشتہ شریعت کو گذشتہ دور کیلئے غلط اور غیر مفید نہیں قرار دیا اور اس طرح انبیاء کی تمام جماعت یک دل ہونے کے ساتھ یک زبان بھی ہوگئی۔ اور چونکہ انسانی معاملات میں ان کو عدل کرنے اور صحیح وزن قائم رکھنے کا بھی حکم دیا گیا تھا۔ نسب مودت زوجیت وطنیت والدیت ومولودیت مخدومیت اور خادمیت زبان رنگ کسی تعلق اور رابطہ کو اقامت عدل پر ترجیح دینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، اس لئے تمام انبیاء نے معاملات عبادت نفس اور سلوک باللہ میں میزان عدل کے دونوں پلڑے برابر رکھے۔ ہر نبی زندگی بھر اقامت دین کی کوشش میں سرگرم رہا۔ انتقال کے بعد اس کا صحیح جانشین آیا اور اس کے تزکیہ پیغمبر کے زیر اثر رہ کر تعلیم نبوت کو پھیلانے کی پوری زندگی میں سعی بلیغ کی اور جس طرح ہر پیغمبر ذاتی لالچ اور غرض سے آزاد رہ کر تبلیغ و ہدایت کرتا تھا اسی طرح اس کے صحیح جانشین نے بھی خواہش نفس اور لالچ سے بچ کر اقامت دین کی خدمت کی۔ رفتہ رفتہ ایسے لوگ پیغمبر کے جانشین ہونے لگے جن کا ایمان مردہ اور نور روح افسردہ تھا۔ ہوا و ہوس کا غلبہ اقتدار اور برتری

کی خواہش کا تسلط اور دوسروں کے حقوق پر چھاپہ مارنے کا جذبہ برسرِ عمل تھا اور پیغمبری سے دوری بھی ہوتی گئی تھی۔ تعلیم نبوت لوگوں کو فراموش ہوگئی تھی۔ دلوں پہ زنگ اور روحوں پر کثافت چھاگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود کتاب اللہ کے موجود ہونے اور دین نبوت حاصل کر چکنے کے سب آپس میں لڑ پڑے ایک دوسرے کے خلاف ہوگیا۔ پھوٹ پڑگئی، فرقے بن گئے۔ اختلاف نے مخالفت کی شکل اختیار کرلی۔ تحقیق حق کا جذبہ ذاتی عناد میں تبدیل ہوگیا۔ اور علم کے بعد پھر جہالت کا دور آگیا۔ اور ہر شخص بجائے خدا کے نفس کا بندہ ہوگیا۔ اللہ نے اُمتِ اسلامیہ کو متنبہ کرنے کے لئے گزشتہ انبیاء و اقوام کے احوال بیان کئے اور حضور اقدس کو امرِ الٰہی کا پابند رہنے، استقامت قائم رکھنے اور خواہش نفس کی پیروی کو ترک کرنے کا حکم دیا اور افرادِ ملت کو مامور فرمادیا کہ تم دوسری قوموں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور صاف کہدو کہ ہمارے عمل ہمارے ساتھ، تمہارے عمل تمہارے ساتھ۔ قیامت کے دن ہم سب کو جب اللہ جمع کرے گا تو فیصلہ کردے گا۔

تحلیل اجزاء

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى حضرت نوحؑ سے پہلے کوئی رسول نہ تھا۔ انبیاء ضرور ہوئے تھے۔ اُن کی کوئی شریعت جامع نہ تھی۔ سب سے اوّل رسول حضرت نوح ہوئے تھے، اس لئے نوح سے پہلے پیغمبروں کا تذکرہ آیت میں نہیں کیا۔ آخری پیغمبر محمد رسول اللہؐ تھے۔ اور دونوں کے درمیان ابراہیم اور موسیٰ تین جلیل القدر پیغمبر گذرے تھے، اس لئے ان پانچوں کا دینی اشتراک بتا رہا ہے کہ ان کی شریعتوں پر چلنے والے دوسرے پیغمبر کبھی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے اُن کا دین بھی وہی تھا جو ان پانچوں بزرگ ترین ہستیوں کا تھا۔ دین سے کیا مراد ہے۔ اس کو ہم کئی جگہ لکھ آئے ہیں اور ان آیات کے تفسیری مقالہ میں بھی ذکر کردیا ہے۔ بعض لوگوں کو شریعت کے اختلاف کی وجہ سے دین کے اختلاف کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حالانکہ شریعت سے مراد تحلیل و تحریم کے وہ خصوصی جزئی فرعی احکام ہیں جو اختلاف زمان و مکان اور تفاوت اقوام کے مصالح کے پیشِ نظر بدلتے رہے ہیں لیکن دین ہمیشہ اٹل رہا۔ اللہ کی ذات و صفات کا عقیدہ ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اللہ کا شارع ہونا، قیامت کا آنا، اعمال کا محاسبہ ہونا۔ سماوی و ارضی ملائکہ کا اپنی اپنی خدمت پر مامور رہنا اور اعمال کی دنیا میں مکارم اخلاق محاسن و اقوال و افعال کا ضروری قرار پانا ہر پیغمبر کی تعلیم کی اصلی روح ہے کسی کا دوسرے سے سرمو تفاوت نہیں۔ ہاں شریعت میں اختلاف ضرور ہے۔ مثلاً دو بہنوں کا ایک وقت میں ایک مرد کی زوجیت میں رہنا حضرت یعقوب کے زمانے میں جائز تھا۔ توریت میں اس کی ممانعت کردی گئی۔ شراب پہلے حلال تھی توریت میں حرام کردی گئی۔ جہاد ضروری تھا، مگر مالِ غنیمت حاصل کرنے کی ممانعت تھی اونٹ کا گوشت کھانا ممنوع تھا جزیہ قبول کرنا ناجائز تھا۔ ایمان نہ قبول کرنے والے کافروں کو قتل کردینے کا حکم تھا۔ حضرت عیسیٰ کی شریعت میں شراب، اونٹ بلکہ سور کا گوشت بھی حلال کردیا گیا۔ جہاد بند ہوگیا۔ کافروں کو قتل کرنے کی ممانعت ہوگئی۔ شریعت محمدیہ میں مالِ غنیمت حلال ہوگیا۔ جزیہ جائز ہوگیا، ذمی کافر کو قتل کرنے کی ممانعت ہوگئی اور حربی کو قتل کرنے کا حکم ہوگیا۔ اونٹ کا گوشت حلال، شراب اور سور کا گوشت حرام قرار پایا۔ غرض اس طرح کے اختلاف شریعتوں میں ہوتے رہے، مگر دین اور اقامت دین میں اتحاد رہا۔ کسی نے کسی کی تکذیب نہیں کی۔ مجاہد نے بھی آیت مذکورہ کی تشریح میں اسی وحدتِ دینی کی صراحت کی ہے جو بخاری میں موجود ہے۔

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ تمام انبیاء کو اقامتِ دین کے حکم کے ساتھ تفرقہ فی الدین کی ممانعت کردی گئی تھی یعنی تحلیل و تحریم احکام میں اختلاف کے باوجود دینی تفرقہ کی ممانعت کردی گئی تھی (ہکذا فسرہ قتادہ) قتادہ نے یہ بھی فرمایا اس میں (در پردہ) لوگوں کی مذمت کی گئی ہے کہ تم نے یہ نہ جانا کہ دینی تفرقہ سے بربادی ہوتی ہے اور اقامت جماعت مضبوطی کا سبب ہے۔ جماعت پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور پھوٹ پر عذاب۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ۔ یعنی دین توحید اور ممانعت شرک کی دعوت مشرکوں کو کھلتی ہے۔ قتادہ نے اس فقرہ کی تفسیر میں فرمایا مشرکوں پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی دعوت گراں گذری۔ ابلیس اور اس کی ذریات اس سے دل تنگ ہوئے، لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ دین توحید غالب ہو توحید کا بول بالا ہو اور مخالف دشمن ذلیل و خوار ہوں۔ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ

مَنْ يُّنِيْبُ۔ قتادہ نے کہا جس کو چاہتا ہے اللہ اپنی بندگی کیلئے خالص فرما لیتا ہے۔ اور جو گڑگڑاتا ہے اس کو اپنے پاس تک پہنچنے کا راستہ بتا دیتا ہے۔ ایمان اور صلاح اعمال کی ہدایت کر دیتا ہے۔ اس مطلب پر یَشَآءُ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہو گی۔ اور اگر کی طرف لوٹائی جائے تو معنی میں زیادہ لطافت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی جو شخص خود اللہ کی طرف جانا چاہتا ہو اللہ اس کو چُن لیتا ہے اور بزرگی عطا فرماتا ہے۔ اس مطلب کے موافق آیت میں ارادہ اور نیت کو خالص رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ اس آیت میں اہل کتاب کی مذمت ہے اور مسلمانوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ یعنی اہل کتاب کو جب کتاب مل گئی اور علم شریعت حاصل ہو گیا تو اب لگے دینی اختلاف کرنے اور اس اختلاف کی بنیاد محض آپس کا حسد، بغض، دشمنی اور ایک کی دوسرے پر نفسانی تسلط کی زیادتی تھی۔ چنانچہ اہل کتاب کے بہتر فرقے ہو گئے جو باہم تکفیر کرتے ہیں۔ شریعت ایک دین ایک مگر ذاتی عداوت کے تحت ہر ایک دوسرے سے لپٹ گیا پھوٹ پڑ گئی۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ۔ یعنی اگر اللہ کا ضابطہ میعاد مقرر (تا زندگی) مہلت دینے کا نہ ہوتا (آخرت کو دار الجزاء اور دنیا کو دار العمل نہ بنایا گیا ہوتا تو اسی زندگی میں) ان کا باہمی فیصلہ کر دیا جاتا (حق پرست کو جزا اور باطل پرست کو سزا دے دی جاتی ہے)۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ یعنی یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تحریفات کی تھیں۔ قرآن نے آکر اُن کی تحریفات کو مٹا دیا گیا اور اصل حکم ظاہر کر دیا گیا۔ اب پچھلے لوگوں پر ظاہر تھا کہ اللہ کا شکر کرتے اور قرآن کو سچا جانتے اور اس پر ایمان لاتے مگر وہ شک میں ہی پڑے رہے۔ ایمان نہ لائے، بے اطمینانی کی حالت پر قائم رہے۔

شیخ ابن کثیر نے تفسیری مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اگلے لوگوں نے جو کچھ تحریفات کی تھیں پچھلے لوگوں کے پاس اُن کی صداقت ثابت کرنے کی کوئی یقینی دلیل نہیں یہ تو کورے مقلد ہیں بغیر دلیل و برہان کے اختلافات میں پڑے ہیں۔ جیسا اگلوں نے لکھ دیا، پچھلوں نے متحیر ہو کر ان کی تقلید کر لی اور لگے باہم لڑنے اور نفسانی خواہشوں پر اڑنے۔ شیخ محلی نے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ اہل کتاب رسول اللہ کی رسالت کے معاملہ میں شک میں پڑے ہیں دین اُن کے پاس باقی نہیں رہا۔ توحید کو انہوں نے مٹا دیا اب کیا کریں مضطرب ہیں۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے اس پوری آیت میں دس کلمات ہیں اور ہر کلمہ ایک مستقل حکم ہے۔ آیت الکرسی کے علاوہ کوئی دوسری آیت ایسی نہیں ہے۔ آیت الکرسی میں ضرور دس امور کا ذکر ہے۔ اس فقرہ میں ذٰلک مشارٌ الیہ کیا ہے۔ اس کے متعلق علماء تفسیر کے مختلف اقوال ہیں۔ ہر اہل کتاب کی پھوٹ، کتاب علم حکم توحید بہر حال دعوت کا حکم ہے حکم کی بنیاد علت اور رجحت کچھ بھی ہو۔

وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ یہ آیت بھی مجمل ہے۔ جیسا حکم دیا گیا ہے اُس پر قائم رہو۔ یہ الفاظ مختلف معانی کو حاوی ہیں۔ امام راغب نے کہا کہ راہِ مستقیم کو لازم پکڑ لو۔ قتادہ نے کہا امر الٰہی پر قائم رہو۔ سفیان ثوری نے کہا قرآن پر ٹھیک قائم رہو۔ ضحاک نے کہا فرض رسالت کی ادائگی پر قائم رہو۔ اس تاکید کا مقصد یہ ہے کہ اپنی یا کسی دوسرے کی خواہش کی پیروی مت کرو۔ امر الٰہی کو سامنے رکھو۔ اس کی تشریح آئندہ آیت میں فرمائی ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ یعنی لوگوں کے میلان خاطر اور جھکاؤ کے پیچھے نہ چلو۔ آدمیوں کا کسی طرف میلانِ خاطر چونکہ ہر خرابی کی جڑ ہے اور تنظیم انسانی کو تباہ کرنے والا ہے۔ خواہشات میں تضاد ہے اور حق ایک ہی ہے، اس لئے زندگی کا کوئی دستور العمل بن ہی نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کے رجحانات اور میلانات کا اتباع کیا جائے کسی کا جھکاؤ قومیت کی طرف ہے کوئی وطنیت کا شکار ہے۔ کسی کے خیال میں بیوی بچوں یا ماں باپ بہن بھائی کی محبت ہر چیز پر غالب ہے۔ کوئی دوستی پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ کسی کو ملی مفاد یا شخصی راحت ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ کوئی زبان اور رنگ کے جھگڑوں میں پھنسا ہوا ہے۔ غرض میلانات میں اختلاف تباین کی حد تک پہنچا ہوا ہے اور کسی ایک شخص یا گروہ کے مرغوبات کو دستورِ زندگی میں ترجیح دینا دوسروں کے جذبات کو مجروح بلکہ مردہ کر دینے والا ہے، اس لئے واجب الاتباع صرف امر خداوندی ہے میلان بشری نہیں۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۔ اس جملہ کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے جو قرآن نازل فرمایا ہے ۔ تم کہدو میرا اُس پر ایمان ہے ۔ میں اس کو حق جانتا ہوں ۔ اس کے علاوہ کوئی دستور میرے لئے قابلِ اتباع نہیں یا یہ مطلب کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی سب پر ایمان ۔ وہ سچی کتاب تھی ۔ اُس کے کچھ حصوں کو سچا جانوں اور کچھ حصے میں اپنی طرف سے یا کسی کی رعایت سے تبدیل کرلوں ۔ ایسا نہیں کرسکتا ۔ کسی حکم کو لفظاً یا معنیً بگاڑ دوں یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا ۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آدمیوں کے آپس میں عدل کروں ۔ معاملات بشری کو درست رکھوں کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے درازدستی نہ کرے حق تلفی نہ کرے ۔ انسانی معاشرہ بیجا اونچ نیچ مظلومیت تفاخر عدم مساوات اور تغلب سے تباہ نہ ہو ہر شخص کو اس کا حق پہنچ جائے ۔ سیاست مدنیت سماج اور اخلاق کی درستی ہو جائے اور یہ سب کچھ امر خداوندی کی روشنی میں ہو، نفسانی خواہش اور شخصی جھکاؤ کے زیر اثر نہ ہو ۔ ابوالعالیہ نے اس فقرہ کی تفسیر میں فرمایا کہ مساوات قائم رکھوں، توحید الٰہی پیشِ نظر رکھوں، تمام پیغمبروں اور کتابوں کو سچا جانوں کسی کی تغلیط و تکذیب نہ کروں

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۔ اللہ ہم سب کا رب ہے یعنی وہی خالق اور وہی معبود ہے ۔ اسی کے احکام جاری ہیں ۔

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ اپنے اپنے اعمال ہیں جیسی کرنی ویسی بھرنی ۔ ایک کے عمل کو دوسرے کے عمل میں دخل نہیں ۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۔ ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں یعنی کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ۔ امر حق واضح ہو چکا اب جھگڑا کیسا ۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۔ اللہ کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے وہ ایک دن سب کو یکجا کرے گا اور ہر شخص کے اعمال کی جزا سزا دے گا، جیسا کیا ہوگا سامنے آئے گا ۔ خازن اور بغوی نے صراحت کی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے ۔ ابن کثیر نے سدی کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور جہاد کا حکم ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوا ۔ جہاد سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا ۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ۔ آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ کافروں سے بالکل جدائی کرلی جائے اُن سے کچھ تعرض نہ کیا جائے بلکہ جھگڑا کرنے کی ممانعت ہے ۔ اظہار حق کے لئے دلیل پیش کرنا یا کافروں کے ظلم و سرکشی کو روکنے کے لئے جہاد کرنا اس آیت کی رُو سے ممنوع نہیں پھر منسوخ قرار دینے کی کیا ضرورت ہر مفہوم اپنی جگہ ثابت ہے دونوں میں تضاد نہیں ہے ۔

خطیب نے مدارج میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے امیر المؤمنین حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے ۔ فرمایا ایمان چار ستونوں پر قائم ہے صبر، یقین، عدل اور جہاد ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی چار شاخیں ہیں ۔ صبر کی چار شاخیں ہیں ۔ شوق، خوف، زہد، انتظار ۔ جس شخص کو جنت کا شوق ہوگا وہ خواہشات کو ترک کر دے گا ۔ جس کو جہنم کا ڈر ہوگا وہ محرمات و ممنوعات سے علیحدہ رہے گا جو دنیا سے بے رغبت ہوگا دینی مصیبتوں سے بچ جائے گا جس کو موت کا انتظار ہوگا وہ نیکیاں کرنے میں جلدی کرے گا ۔ یقین کی بھی چار شاخیں ہیں ۔ تبصرۂ فطنت ۔ تاویل الحکمت ۔ موعظۃ العبرت ۔ سنت سابقین ۔ جس نے تبصرۂ فطنت یعنی آئینۂ دانش حاصل کیا وہ تاویل حکمت کو پہچان لے گا اور جس کو فہم حکمت حاصل ہو گیا اُس نے درسِ عبرت کو جان لیا اور درسِ عبرت کو سمجھ لینے کے بعد طریقۂ اولین معلوم ہو جائے گا ۔

عدل کی چار شاخیں یہ ہیں، غور رس فہم، تا رسی علم، گلستان علم، دانش حکمت جس نے غور رس فہم حاصل کر لیا اس نے علم کو جمع کر لیا ۔ وہ راہ حکمت سے نہیں بھٹکتا اور دانش کا راستہ اس کو معلوم ہو جاتا ہے اور حلم سے اس کا کام نہیں بگڑتا ۔ جہاد کی بھی چار شاخیں ہیں نیک باتیں سکھانا بری باتوں سے روکنا، ہر موقع پر سچ بولنا، فاسقوں سے نفرت کرنا جس نے نیک باتوں کا حکم دیا اس نے اپنی کمر مضبوط کرلی، جس نے بری باتوں سے روکا اس نے منافقوں کی کمر توڑ دی ۔ جس نے ہر موقع پر حق کہا اس نے اپنا فرض ادا کیا اور جس نے فاسقوں سے نفرت کی اس کا غصہ محض اللہ کے واسطے ہوگا، اس لئے اللہ تعالیٰ اُس کے دشمنوں کو مقہور کر دے گا ۔ یہ سن کر سائل اٹھا اور سر مبارک کو چومنے کے بعد چلا گیا ۔

مقصودِ بیان :- آیت شرع لکم من الدین سے ثابت ہو رہا ہے کہ سب پیغمبروں کا دین ایک ہی ہے ۔ اسلام بھی کوئی نیا دین نہیں ہے ان اقیموا الدین سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر زمانہ کی موجودہ شریعت کی پابندی کے علاوہ ہر پیغمبر کا فرض تھا کہ وہ اقامت دین کی کوشش کرے ۔ ولا

تتفرقوا فیہ میں کھلی ہوئی نفی ہے کہ دینی امور میں کوئی دوسرے کی مخالفت نہ کرے اور پھوٹ نہ پیدا کرے۔ کبر علی المشرکین سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکوں کو وحدت ادیان کی دعوت ناگوار ہے اور قرآن کے پیش کردہ اصولوں سے ان کو نفرت ہے۔ وما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم میں اگرچہ اہل کتاب کی حالت بد کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن خصوصی طور پر یہ ہے درس نصیحت ہر مسلمان کے لئے کہ قرآن و حدیث کے بعد ذاتی عناد اور نفسانی عداوتوں کی وجہ سے باہم لڑنا اور کسی کو بے دین قرار دینا جائز نہیں۔ نہ حنفی شافعی کو، نہ شافعی مالکی کو، نہ مالکی حنبلی کو بے دین قرار دے نہ خواہ مخواہ جھگڑے کر کے مسلمانوں کے شیرازہ کو پراگندہ کرے۔ لفظ فادع سے تبلیغ دینی کا وجوب ظاہر ہو رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ واستقم یعنی خود بھی استقامت رکھی جائے۔ دیگرے را نصیحت اور خود را فضیحت کا مصداق نہ بن جائے لیکن یاد رکھو کہ خود تراشیدہ عقلی استقامت کافی نہیں۔ امر الٰہی کے زیر ہدایت استقامت زندگی ضروری ہے، اسی لئے کما امرت فرمایا۔ ولا تتبع اھواءھم سے اُن واعظوں، مولویوں اور پیروں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جو عوام کی خواہشات کو رد کرنے کی جرأت نہیں رکھتے اور کوشش کرتے ہیں کہ امر الٰہی میں تراش خراش کر کے اس کو عوام کی مرضی کے سانچے میں ڈھالتے رہا کریں۔ وامرت لاعدل سے ثابت ہو رہا ہے کہ انسانی سماج اور معاشرہ میں عدل قائم رکھنے کا قانون خدا نے بنایا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مامور فرمایا کہ لوگوں کے باہمی حقوق کی حد بندی عدل کے ساتھ کر دیں وغیرہ۔

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے (دین) کے بارے میں (مسلمانوں سے) جھگڑے نکالتے ہیں بعد اس کے کہ وہ مان لیا گیا اُن لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے

عَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ

اور اُن پر غضب (واقع ہونے والا ہے) اور اُن کے لئے (قیامت کو) سخت عذاب (ہونے والا) ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے (اس) کتاب (یعنی قرآن) کو اور انصاف کو نازل فرمایا

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ

اور آپ کو اس کی کیا خبر عجب نہیں کہ قیامت قریب ہو (مگر) جو لوگ اُس کا یقین نہیں رکھتے اس کا تقاضا کرتے ہیں اور جو لوگ یقین رکھنے والے

اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ

ہیں وہ اُس سے ڈرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ برحق ہے یاد رکھو کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں بڑی دور

لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ ع

کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر مہربان ہے جس کو جس قدر چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہ قوت والا اور زبردست ہے

ع ۲

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اُس کو اُس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں)

نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ۝ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ

دیدیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں کیا ان کے کچھ شریک (خدائی) ہیں جنھوں نے اُن کے لئے ایسا دین

الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ

مقرر کردیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی اور اگر (خدا کی طرف سے) ایک قول فیصل (ٹھہرا ہوا) نہ ہوتا تو (دنیا ہی میں) ان کا فیصلہ ہوچکا

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ تَرَى الظّٰلِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

ہوتا اور (آخرت میں) ان ظالموں کو ضرور دردناک عذاب ہوگا (اس روز) آپ ان ظالموں کو دیکھیں گے کہ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہونگے اور وہ (وبال) ان

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ۝

پر لامحالہ پڑ کر رہے گا اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں داخل ہوں گے وہ جس چیز کو چاہیں ان کے رب کے پاس انکو ملے گی یہی بڑا انعام ہے۔

تفسیر قیامت کا واقع ہونا یقینی ہے۔ جن کو یقین ہے وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں کیونکہ اُن کی نظر میں قیامت ضرور آئے گی اور اعمال کی پاداش ضرور ملے گی۔ اس لئے ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ معلوم نہیں ہمارا نتیجہ کیا ہو اور جن کو قیامت کا یقین نہیں وہ بڑی بے فکری کے ساتھ خواہش کرتے ہیں کہ قیامت جلد آجائے مگر یہ بات بڑی گمراہی کی ہے کیونکہ کسی کی عجلت طلبی سے قیامت پہلے تو آ نہیں جائے گی۔ ضابطۂ الٰہیہ موجود ہے عمل کی دنیا کی پاداش کا عالم کھنچ کر آجائے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہاں عمل کی مہلت ہے جس کا دل چاہے کرے، لیکن دینے نہ دینے والا دنیا میں بھی خدا ہی ہے۔ آخرت مانگو آخرت ملے گی دنیا مانگو دنیا ملے گی آخرت نہ ملے گی۔ اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ کفر و ایمان اور عصیان و فرمانبرداری سے رزق میں کمی بیشی نہیں ہوجاتی۔ اللہ کا لطف کو سب ہی کو شامل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ ہاں انسانی زندگی درست کرنے کیلئے اس نے برحق کتاب نازل فرمادی ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے بندوں کا باہم یا خدا اور بندے کے درمیان صحیح توازن قائم کر دیا ہے۔ اللہ کی الوہیت اور بندہ کی عبدیت کی حدود مقرر کر دی ہیں پھر ہر شخص کے حقوق کی بھی حد بندی کر دی ہے۔ کسی کو دوسرے کی حدود میں داخل ہونے کا حق نہیں دیا۔ وزن برابر رکھنے اور اپنے اپنے حق پر قائم رہنے کے قوانین اللہ ہی نے تو بنائے ہیں کسی اور نے تو نہیں بنائے اگر کسی دوسرے نے بنائے ہوں تو بتاؤ وہ کون ہے جس نے شرکت الوہیت کا دعویٰ کیا ہو۔

تحلیلِ اجزاء وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ۔ آیت کے دو اجزا حل طلب ہیں ۱ اللہ کی شان میں جھگڑا کرنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں۔ قتادہ نے فرمایا یہودی اور عیسائی مراد ہیں جو جھگڑتے تھے کہ ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے تھا۔ ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے تھی۔ ہم انبیاء کی اولاد ہیں۔ ہمارے باپ دادا پیغمبر تھے۔ نبوت کا حصہ ہمارے ہی فریق میں (رہا) ہے۔ انہی کے ساتھ ان مشرکوں کا بھی شمول ہے جو خانۂ کعبہ کی تولیت اور اپنی قوت و کثرت پر اتراتے تھے۔ حضرت ابن عباس کے ایک قول میں یہودی مراد ہیں جو مسلمانوں سے جھگڑتے اور ان کو بے پڑھا لکھا سمجھ کر بہکاتے تھے۔ ابن عباس کے دوسرے قول میں آیا ہے کہ انہیں گمراہوں میں منافقوں کی اس جماعت کا بھی شمار تھا جو دورِ جاہلیت اور عہد بت پرستی کے لوٹ آنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

ان تمام تفسیری اقوال سے الَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ کی تعیین مقصود نہیں ہے۔ آیت مکی ہے اور ہجرت سے پہلے نہ یہودیوں اور عیسائیوں سے کوئی مناظرہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوتا تھا۔ نہ مکی دور میں اہل کتاب اہل قرآن کے سامنے کوئی ضعیف قوی حجت پیش کرتے تھے۔ بلکہ ان تمام اقوال میں یہودیوں عیسائیوں مشرکوں اور منافقوں کا تذکرہ بطور تمثیل ہے یعنی حکم آیت اُن لوگوں کو بھی شامل ہے بلکہ اہل کتاب مشرک اور منافق ہی پر کیا موقوف ہے بہت سے وہ کلمہ گو بھی اسی حکم میں داخل ہیں جو حضورؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے یا زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوجی طاقت سے اُن کو شکست دی تھی۔ ان میں سے بہت لوگ ارتدادی حالت میں مارے گئے۔ اُن پر اللہ کا غضب اور عذاب شدید باقی رہا۔ بہت سے لوگ عذاب شدید اٹھا کر دوبارہ تائب ہو گئے اور اللہ کے غضب سے بچ گئے۔
اس لئے سب سے اچھا اور صحیح حضرت مجاہد کا وہ تفسیری قول ہے جس میں آپ نے الَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ کے مصداق کی تعیین نہیں کی اور ان تمام لوگوں کو حکم آیت میں شامل کر رکھا ہے جو دینِ الٰہی میں جھگڑتے ہیں۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ کے یہ معنی ہیں کہ ان کے پاس کوئی قوی مضبوط و پائیدار دلیل نہیں ہر دلیل لغزش کھا رہی ہے کیونکہ ہر حجت کا مدار شرک پر ہے اور شرک خود کوئی پائیدار حقیقت نہیں۔ بے قیام ہے عدیم الثبات خالص توہم اور خیال آفرینی۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ الکتاب سے مراد ہے قرآن مجید۔ ابن کثیر نے کہا ہر آسمانی کتاب مراد ہے۔ میزان سے مراد عدل ہے (مجاہد و قتادہ) واحدی نے اس کو اہلِ تفسیر کا قول کہا ہے۔ میزان اسم آلہ ہے یعنی ترازو اور مصدر بھی ہے۔ آیت میں آیا ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ روزانہ۔ وزن یعنی ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنا۔ ثقل وزن جنس والے پلڑے کا جھکنا خفتِ وزن جنس والے پلڑے کا اوپر اٹھ جانا۔ عدل میں بھی دونوں طرف برابری ہوتی ہے کسی طرف جھکاؤ نہیں ہوتا نہ افراط نہ تفریط۔ اسی وجہ سے میزان کے معنی ہو گئے عدل۔ آیت میں میزان سے مراد میزانِ قیامت نہیں بلکہ وہ عادلانہ ضوابط ہیں جو اللہ نے نازل فرمائے ہیں۔ اللہ کے حقوق کیا ہیں اپنے نفس کا کیا حق ہے۔ بندوں میں ماں باپ بہن بھائی بیوی بچے دوسرے اقارب احباب محلہ والے، شہر والے، دوست دشمن غرض ہر شخص کا حق جدا جدا ہے۔ اور ضوابط الٰہیہ نے اُن کی حدبندی کر دی ہے۔ انہیں قوانین کے مجموعہ کا نام شریعت ہے۔
مطلب یہ نکلا کہ اللہ نے برحق کتاب (قرآن یا ہر آسمانی کتاب) بھی نازل فرمائی اور انسانی تعامل میں عدل قائم رکھنے کے لئے شریعت بھی اتاری۔ کتاب اور شریعت تو آگئی، لیکن اُن کو مان کر عمل کرنے والوں اور نہ ماننے والوں یا مان کر عمل نہ کرنے والوں کو بدلہ کب ملے گا۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ تو کیسے معلوم نہیں کون بتائے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔ اُمید رکھو قیامت دُور نہیں۔ یعنی آنکھ بند ہو جاتے ہی قیامت شروع ہو جائے گی۔ من مات فقد قامت قیامتہ۔ جو مرا اُس کی قیامت آگئی۔ قیامت کا آغاز ہو گیا۔ یوم معہود کا کسی کو علم نہیں، لیکن آنے والی چیز ہر لمحہ قریب ہوتی جاتی ہے اور جانے والی چیز ہر آن دور ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے قیامت کی گھڑی کو قریب فرمایا۔ جب قیامت کی گھڑی سر پر کھڑی ہے تو جلد آنے کی درخواست یا دور سمجھ کر کفر و معصیت میں دونوں باتیں لغو ہیں۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا۔ قیامت کے جلد آنے کی طلب تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اُس کے آنے کا یقین نہیں ہوتا ورنہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ جو لوگ قیامت کو حق جانتے اور ایمان و یقین رکھتے ہیں وہ تو اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اللہ کا یہ فیصلہ یقیناً صحیح ہے۔ مشاہدہ سے اس کا کھلا ثبوت ملتا ہے قیامت کی ہولناکیاں حقیقت میں ایسی ہیں کہ جو لوگ اس کا یقین رکھتے ہیں تصور کرنے ہی سے اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں دل لرز جاتے ہیں اور خون خشک ہو جاتا ہے۔ ہولِ قیامت کا یقین مومن کے بدن کو فربہ نہیں ہونے دیتا۔

اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ۔ قیامت کے وقوع میں جھگڑنے والے یعنی انکار یا شک کرنے والے یقیناً بھٹک کر دور چلے گئے ہیں یوں تو اگر کسی کو قیامت کا یقین ہو، لیکن غفلت کے سبب کچھ تیاری نہ کرے ٹالتا رہے اور کہتا رہے کہ ابھی کیا جلدی

ہے نیکی کرنے کے لئے عمر پڑی ہے۔ یہ بھی گمراہی ہے، لیکن بڑی گمراہی اُن لوگوں کی ہے جو نفس کے فریب میں آکر وقوع قیامت کا یقین ہی نہیں کرتے۔

چونکہ منکرین قیامت حاصل زندگی صرف دولت راحت اور عیش و طرب کو جانتے ہیں اور ان کو یہ چیزیں میسر بھی ہیں تو اُن کے دماغوں میں یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ہم گمراہ ہوتے ہماری زندگی کی رفتار صحیح نہ ہوتی تو ہم کو یہ عیش و آرام کیسے ملتا۔ دولت کی فراوانی، رزق کی کثرت اور اولاد کی بہتات ہمارے پاس کیوں ہوتی، اس قسم کے شبہات بے بنیاد ہیں۔ کہاں قیامت اور اعمالِ زندگی کی اُخروی پاداش کا مسئلہ اور کہاں اس زندگی میں رزق کی کثرت۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ یہ تو اللہ کی دین ہے وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اُس میں دینے کی طاقت بھی ہے وہ سب پر غالب ہے۔ کوئی اُسے روک نہیں سکتا، اس لئے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ کے لطیف ہونے کی تشریح اہلِ تفسیر نے مختلف طور پر کی ہے۔ مقاتل نے کہا کہ بندہ نیک ہو یا بد اللہ اس کو بھوکا نہیں مارتا۔ عکرمہ نے کہا بندوں کے حق میں بھلائی کرتا ہے۔ سدی نے کہا اللہ نرمی کرتا ہے۔ ایک مفسر نے کہا اللہ منافع پہنچاتا اور مصیبتیں دور کرتا ہے۔ امام جعفر صادق نے کہا رزق میں لطف فرماتا ہے۔ اگر ایک بارگی دے دے تو برباد کردیں۔ شیخ جُنید نے کہا اللہ نے (اپنے) اولیاء پر لُطف فرمایا ہے تو اولیاء نے اس کو پہچانا۔ اگر اعداء پر لطف فرماتا تو وہ منکر نہ ہوتے۔ شیخ حسین بن الفضل نے کہا کہ قرآن مجید نازل فرمایا یہ اُس کا لُطف ہے۔ حسب صراحت خطیب ابن عباس کا قول ہے کہ لطیف کے معنی ہیں مہربان۔ ایک عالم نے تشریح کی ہے کہ لطیف وہ ہے جو نافرمان کو سزا دینے میں عجلت نہ کرے اور امیدوار کو محروم نہ چھوڑے، ایک اور عالم کا قول ہے جو لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اللہ ان پر رحم فرماتا ہے۔ امام قشیری نے کہا لطیف وہ ہے جو تمام امور کی باریکیاں اور اسرار جانتا ہو۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ لطف الٰہی ایک مرکب حقیقت ہے علم رحمت اور نرمی سے۔ مومنوں پر اس کا لطف ظاہر ہے کہ کافر بھی اس کے لطف سے محروم نہیں، کمترین لطف یہ ہے کہ دنیا میں ان کو چھوڑ رکھا ہے۔ عذاب نازل نہیں کیا۔ اور آخرت میں جرم سے زیادہ سزا تجویز نہیں فرمائی۔

امام قشیری کی تشریح نازک حقیقت رکھتی ہے۔ دوسری آیت وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ میں بھی اسی مفہوم کو ظاہر کیا ہے۔ اگر ابن عباس اور قشیری کے بیان کردہ مفہوم کا مجموعہ آیت میں مراد لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے یعنی اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اُن کو رزق دیتا ہے کہاں کہاں سے دیتا ہے۔ کیسے دیتا ہے، کتنا کتنا دیتا ہے۔ ان اسرار کو وہ جانتا ہے۔ کمیت کیفیت اور ہر طرح کی اندرونی حالت سے وہ واقف ہے۔ کبھی مومن کو کم اور کافر کو زیادہ دیتا ہے (تاکہ صبر کرنے سے مومن کے مدارج میں ترقی اور غفلت میں رہنے یا ناشکری کرنے کافر کے وبال میں اضافہ ہو) کبھی مومن کو زیادہ اور کافر کو کم دیتا ہے (تاکہ شکر کرنے سے مومن کے رزق و ثواب میں مزید زیادتی اور مایوس ہو کر بے صبر بن جانے سے کافر کے عذاب اُخروی اور رزقِ دنیوی میں تنگی بڑھ جائے)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ جو آخرت کی کمائی کی نیت رکھتا ہے (یعنی ایمان کے ساتھ آخرت کے ثواب کے لئے اعمال صالحہ کرتا ہے) ہم اس کی کمائی میں (دس گنہ سے سات سو گنہ تک) زیادتی کر دیں گے اور جو دنیا کی کمائی کی نیت رکھتا ہے اس کو ہم دنیا میں دیتے ہیں آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ بخاری مسلم وغیرہ کی صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ جیسی جس کی نیت ویسا اُس کا نتیجہ۔ بیہقی کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے اللہ فرماتا ہے اے آدم زاد تو میری عبادت کیلئے فارغ ہو جا (دوسرا کوئی کام نہ کر) میں تیرے سینے کو تونگری سے بھر دوں گا۔ اور بقدر ضرورت تیری حاجت پوری کر دوں گا۔ اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تیرے سینے کو افکار سے بھر دوں گا۔ اور تیری حاجت پوری نہ کروں گا۔ (رواہ الحاکم ایضًا)

امام قشیری نے کہا بظاہر آیت قدسی کافروں کے بارے میں ہے جن کی نیتوں میں ثواب آخرت تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ ساری کوشش

دنیا کے لئے ہوتی ہے اُن کے اعمال کا ثواب اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ دنیوی مال ومتاع میں ترقی کر دی جاتی ہے۔ آخرت میں اُن کی نیکیاں اکارت جائیں گی۔ بعض علما نے آیت کے حکم میں کافر و مسلمان دونوں کو داخل کیا ہے۔ آخرت کی نیت تو صرف مسلمان کی ہوتی ہے۔ اور دنیوی نیت صرف کافر کی۔ ہاں کبھی مسلمان کی نیت میں بھی صرف فلاحِ دنیا ہوتی ہے تو ایسی نیکی آخرت میں قابلِ اعتبار نہیں۔ دنیا میں (کافروں کی طرح) کچھ ثمرہ مل جاتا ہے۔ رہی وہ نیکی جس میں مشترک نیت ہو یعنی دین و دنیا دونوں کی فلاح، تو بعض علماء نے کہا جتنی کوشش میں آخرت کی نیت ہوگی اتنا ثواب آخرت میں ملے گا۔ مؤخر الذکر تفسیر کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت ابی ابن کعب راوی ہیں کہ حضور گرامی نے ارشاد فرمایا اس اُمت کو بشارت دے دی گئی ہے کہ اُن کو شوکت رفعت نصرت اور اقتدار حاصل رہے گا جب تک یہ لوگ آخرت کے کام سے دنیا حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ (یعنی دین کو دنیا کی کمائی کیلئے نہ بیچیں اور اسلامی احکام کی پابندی محض دنیا کے لئے نہ کریں) جب لوگ آخرت کے کام سے دنیا چاہیں گے تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ (رواہ احمد والحاکم وابن حبان وابن مردویہ) اس حدیث میں لفظ اُمت صراحتہً بتا رہا ہے کہ آیت قدسیہ کا جو مفہوم ہے اُس کے مصداق صرف مسلمان ہیں جو مفہوم آیت کا ہے وہی حدیث کا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آیت کو مسلمان اور کافر دونوں کے لئے عام قرار دیا جائے اور حدیث میں تذکرہ صرف مسلمانوں کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا جس نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی اُس کے آخرت میں سوا آگ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اور دنیا میں بھی اس کے اس فعل سے سوا رزق مقسوم مقدر کے کچھ زیادہ نہیں مل سکتا۔ گویا حبر الامتہ کی نظر میں نُؤْتِهٖ مِنْهَا سے مراد ہے رزق مقسوم مقدر اور ارادۂ حدیث دنیا سے مراد ہے دنیا کی دین پر ترجیح۔ خطیب نے اس آیت شریفہ سے استنباط کیا ہے کہ جب دنیا اور آخرت دونوں کو اللہ نے کھیتی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ کھیتی بغیر محنت مشقت برداشت کرنے کے حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کوشش اور محنت لازم ہے پھر جب محنت ہی کرنی ہے تو دنیا فانی کے لئے محنت کرنی فضول ہے۔ لازوال آخرت کیلئے کرنی چاہیئے۔

رازی نے لوامع میں لکھا ہے کہ خواہش اور ارادہ کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) دنیا کے طالب (۲) آخرت کے طالب (۳) مولیٰ کے طالب۔ ان میں سے ہر گروہ کی خصوصیات وعلامات ہیں۔ طالبِ دنیا کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں دین کا نقصان ہو رہا ہو، مگر دنیا میں زیادتی ہوتی ہو وہ اس سودے پر راضی ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ دنیا میں وہ محتاج نہیں ہوتا، مگر دنیا کی بیشی کے لالچ میں دین کا خسارہ برداشت کر لیتا ہے۔ غریب مسلمان میں اُس کو کوئی کشش نظر نہیں آتی وہ غریب مسلمانوں کو در خورِ اعتنا ہی نہیں جانتا۔ ہر کام وکوشش میں دنیوی فائدہ کو ہی نظر کے سامنے رکھتا ہے۔ طالب آخرت کی خصوصیات طالبِ دنیا کی خصوصیات کے برعکس ہیں۔ جس کام میں آخرت کا خسارہ ہو وہ اس کو نہیں کرتا، پوری زندگی میں آخرت کا اہتمام رکھتا ہے۔ غریب مسلمانوں کی طرف سے توجہ کو نہیں ہٹاتا۔ رہا طالبِ مولیٰ جس کا بیان آیت يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ میں آیا ہے تو وہ دونوں جہان سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے مخلوق سے عزلت اختیار کرتا ہے اور ہر وقت نفس کے پنجہ سے رہائی پانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ خطیب نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ مولیٰ اللہ کے اور بندوں کے حقوق ادا کرے اپنے حقوق کا خواہشمند نہ ہو اور ان تمام فرماں برداریوں میں اس کے پیشِ نظر محض رضائے مولیٰ کی طلب ہو نہ جنت کی طمع نہ دوزخ کا ڈر یعنی اطاعت برائے اطاعت کرے طمع اور خوف کے زیرِ اثر نہیں۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ کفار شریعت اسلامیہ کے حلال حرام کو نہیں مانتے اور قرآن کو سچا نہیں جانتے اور محمد الرسول اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر نہیں چلتے بلکہ ان شیطانوں کی راہ پر چلتے ہیں جن کو انہوں نے الوہیت کا درجہ دے رکھا ہے اسی بنا پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے رکھا ہے، مگر اللہ نے اس تحلیل وتحریم کا حکم نہیں دیا۔ نہ اُن کے مفروضہ خداؤں کو اس کا اختیار دیا ہے۔ پھر یہ شریعت کہاں سے لائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں نے عمرو بن لحی قمعہ کو دیکھا کہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھر رہا تھا۔ یہی پہلا شخص تھا جس نے بتوں کے نام پر سانڈھ چھوڑا تھا۔

وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ۔ کلمۃ الفصل سے مراد وہی ضابطۂ الٰہیہ ہے جس کو اس سے پہلے دو جگہ کلمۃ سبقت من ربک فرمایا ہے یعنی دنیا کا دارالعمل ہونا اور آخرت کا دارالجزاء ہونا اور دنیا میں عمل کی مہلت ملنا اور عذابِ آخرت کا دنیا میں کھنچ کر نہ آنا۔

وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ ظالم وہ ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور سعادتِ اُخروی سے اس کو محروم رکھا کم زیادہ سب سے بڑے ظالم مشرک ہیں اور ان سے کم مسلمان گناہگار رہے۔ یہاں بقرینۂ سباق مشرک مراد ہیں۔ مسلمان گناہگار مراد نہیں۔

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ۔ اس آیت میں قیامت کی حالت کا بیان ہے۔ قیامت کے دن مشرکوں کو ابھی بداعمالی کے عذاب کا اندیشہ ہوگا، مگر یہ خوف سود مند نہ ہوگا۔ عذاب تو ان پر آکر رہے گا۔ کوئی بچا نہ سکے گا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ۔ اس جملہ میں مومنین صالحین کی حالت کا بیان ہے اور گزشتہ جملہ میں مشرکوں کی کیفیت بیان کی تھی۔ رہا گناہگار اہلِ ایمان کا بیان تو ان کا انجام براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اُس کی مشیت ہوگی تو مغفرت ہوجائے گی ورنہ سزا برداشت کرنی ہوگی۔

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ جنت میں مکان باغ بیں کھانا پینا لباس خادم حکومت عزت غرض ہر چیز مومنین صالحین کو اُس تفصیل کے ساتھ ملے گی جو قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے، لیکن ان گنت نعمتوں کا ہر الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مجملاً فرمادیا کہ جو کچھ چاہیں گے اللہ کے پاس ملے گا۔ مومن زندہ ہوتا ہے۔ اس کا دل دماغ اور تمام تصورات زندہ ہوتے ہیں اُس کے ہر خیال میں پاکیزگی اور نورانیت ہوتی ہے۔ اُس کے آئینۂ دماغ میں جو صورت پیدا ہوتی ہے وہ زندہ ہوتی ہے اور واقعی اثر رکھتی ہے۔ ہاں عوام الناس کے خیالات نفسانیات سے مرکب ہوتے ہیں، کثیف ہوتے ہیں، تاریک ہوتے ہیں اُن میں نورانیت نہیں ہوتی مردہ ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی نشان اُن کے اندر نہیں ہوتا، اس لئے اُن میں کوئی خارجی اثر بھی نہیں ہوتا۔ یوں سمجھو کہ مومن کے آئینۂ قلب میں جو صورت آتی ہے وہ اتنی نورانی اور پر اثر ہوتی ہے کہ مجسم شکل میں باہر موجود ہوجاتی ہے۔ یہی خرقِ عادت ہے اور عام آدمی کے خیالات میں یہ روشنی نہیں ہوتی وہ خود مردہ ہوتے ہیں۔ پھر زندہ ہوکر خارج میں کیسے نظر آئیں، لیکن بعض مومن خالص النفس نہیں ہوتے۔ اُن کا ایمان روشنی کے انتہائی درجہ تک نہیں پہنچتا بداعمالی یا ضعیف عقیدہ کے سبب نورانیت میں ظلمت شامل ہوجاتی ہے نہ مکمل روشن ہوتے ہیں نہ بالکل تاریک، اس لئے دنیا میں ان کے خیالات کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو خالص الایمان مومن کے خیالات کو حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتفاقاً ہی کبھی ان کے خیالات میں سے کوئی خیال خارجی دنیا میں مجسم شکل میں موجود ہوجاتا ہے ورنہ عموماً دماغی پیداوار دماغ ہی میں ختم ہوجاتی ہے اور بیرونِ دماغ اُن کا کوئی نشان بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے مومن کا قلب معارضۂ نفس میں مبتلا ہوتا ہے کبھی قلب غالب آجاتا ہے کبھی نفس۔ لیکن دارِ آخرت میں نفس کا معاوضہ ختم ہوجائے گا اور روح میں خالص روشنی پیدا ہوجائے گی۔ اس لئے وہاں جو خیال پیدا ہوگا وہ بصورتِ مجسم حسبِ ارادۂ الٰہی نمودار ہوجائے گا۔ اور مومن جو کچھ چاہیگا فوراً مل جائے گا۔ خواہش پیدا ہوتے ہی چیز حاصل ہوجائے گی۔ آیت کا یہی مطلب ہے۔ واللہ اعلم۔

ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ۔ مشرک دنیا کی نعمتوں کو فضلِ کبیر سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ فنا پذیر ہیں لازوال نہیں۔ اس کے علاوہ کسی شہنشاہ کو بھی یہ بات میسر نہیں کہ جونہی جو خواہش دل میں پیدا ہوئی فوراً وہ حاصل ہوگئی۔ پُر جلال ہمہ گیر حکومت رکھنے والوں کو بھی زبان یا قلم یا اشارۂ ابرو اور خطوطِ پیشانی سے حکم دینا پڑتا ہے اور تعمیلِ حکم کا کچھ دیر انتظار کرنا پڑتا ہے خواہ ایک منٹ ہی ہو، لیکن اہلِ جنت کی حالت ایسی نہ ہوگی۔ اُن کو ہر نعمت میسر ہوگی۔ اور زبان سے مانگنے منگوانے کی ضرورت بھی نہ ہوگی نہ حصولِ دعا کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ اُدھر خواہش پیدا ہوئی اِدھر وہ چیز موجود ہوگی حقیقت میں فضلِ کبیر یہی ہے۔

مقصودِ بیان

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ الخ سے یہ بتا دینا مقصود ہے کہ پیامِ ہدایت اور عادلانہ دستورِ حیات نازل کرنا اللہ کا کام ہے۔ اس آیت سے اللہ نے مہرِ یاس ثبت کردی اُن فلاسفروں اور قومی لیڈروں اور اصلاحاتِ انسانی کا دعویٰ کرنے والوں کے دماغوں پر، زبانوں پر اور قلم کی نوکوں پر جو انسانی معاشرہ کے لئے دستورِ حیات تصنیف کرنے کے مدعی تھے یا مدعی ہو

معاد اور مافوق الطبیعیات کی عقل موشگافیوں کو قطعی صحیح سمجھتے تھے اُن کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اللہ وہی ہے جس نے کتاب نازل کی الہیاتی امور کیلئے مبدء ومعاد ملائکہ صفات ذات رسالت وحی ولایت کرامت وغیرہ کی جو جانیں اس کتاب میں ہے وہی آخری فیصلہ کا درجہ رکھتی ہے۔ فلسفہ کی تمام اشیا غیر مفید اور تخمینی ہیں یہ حق اللہ ہی کا ہے پھر اس کتاب میں خصوصیت کے ساتھ انسانی معاشرہ کی تنظیمی تامل کے اصول بیان کئے گئے ہیں جنہیں خالق مخلوق کے اقدار کی صحیح وزن کشی کی گئی ہے۔ حق اللہ اور حقوق العباد کو جانچنے اور صحیح حد بندی کرنے کے ضوابط عامہ بیان کئے گئے ہیں۔ عدل و اعتدال کی یہ ترازو خصوصیت کے ساتھ اللہ نے اتاری ہے۔ پس عبرت حاصل کریں جاہل صوفی مکار پیر غلط رو لیڈر، بے عمل اور خودغرض مولوی، بے وقوف فقیہ، کور دانش مفکر، بہکے ہوئے فلاسفر اور گمراہ جمہوریت کے ناکارہ ممبر جو تشریعی قوانین تصنیف کرنے کے مشّاق ہیں جو خلاف شرع کام کرتے ہیں اور از خود کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں۔ خصوصاً بگڑے ہوئے صوفی تو اپنے شیطانی الہامات کو نہ فقط عقل کی روشنی سے بے نیاز سمجھتے ہیں بلکہ ان کو وحی کے مقابلے پر لا کھڑا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شریعت الگ ہے اور طریقت الگ۔ مولوی کا راستہ جدا ہے اور فقیر کا جُدا۔ گویا فقیر وہ ہے جس نے قرآن اور وحی کے مقابلے میں دوسری الہامات شریعت تصنیف کرنے کا دعوی کیا ہو اور پیغمبر معصوم کے لائے ہوئے قرآن کو غلط یا بے ضرورت قرار دیا ہو۔

آیت وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ سے دو باتیں معلوم ہوئیں ۱۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ قیامت کب اور کس دن کس تاریخ کو آئے گی۔ ۲۔ لفظ لعل سے اس طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کو قیامت کے قریب ہونے کی اُمید رکھنی چاہیئے۔ اللہ کا علم تو بہر حال یقینی ہے اور ہر اُمید سے پاک اُمید کا رُخ انسانوں کی طرف ہے۔ انہیں کو امید رکھنی چاہیئے کہ قیامت قریب ہے۔ قریب ہونے کے دونوں معنی تفسیری مطلب میں لکھ چکے ہیں۔

آیت يَسْتَعْجِلُ بِهَا الخ میں انکار قیامت کو عجلت طلبی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ کیونکہ قیامت کا ہول محاسبہ کا ڈر نجات وہلاکت کے بین بین دماغی تردد جنت کی کشش اور دوزخ کی لپیٹ، فرشتوں کی صف بندی، اربوں انسانوں کی کس مپرسی کی حالت، سفارشی فقدان اور اللہ کا پُر جلال ظہور، یہ تمام باتیں قیامت کا یقین رکھنے والوں کے دلوں کو لرزا دیتی ہیں، لیکن جس کو ان باتوں میں سے کسی بات کا یقین ہی نہ ہو وہ ان تمام یقینی الوقوع واقعات کا مذاق اڑاتا ہے اور فوری قیامت آجانے درخواست کرتا ہے

اَللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ رزق کی کمیت، کیفیت اور حالت کا اختلاف اللہ کی مصلحت بینی پر مبنی ہے۔ اللہ ہی واقف ہے کہ کس کو کتنا کب اور کیسے اور کہاں سے رزق دیا جاتا ہے، اس لئے مومن عارف کا فرض ہے کہ وہ اگر مفلس ہو تو اللہ کے رزق کے خزانوں کو اپنے لئے بند نہ سمجھ لے اور یقین رکھے کہ یہ اللہ کی نازک حکمت ہے۔ انسانی فہم سے بلند۔ وہ جب چاہے گا تنگی کو فراخی سے بدل دے گا۔

آیت مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ الخ سے اہل ایمان کو سبق لینا چاہیئے اور مرکز توجہ صرف آخرت کو قرار دینا چاہیئے اور زندگی کی حرکت کو دینی آخرت کی نیت سے کرنا چاہیئے یعنی دنیا کو دین سمجھنا چاہیئے۔ دین کو حصول دنیا کا ذریعہ نہ بنا لینا چاہیئے۔ لفظ حرث سے لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ بغیر کوشش اور محنت کے محض دعاؤں کی قوت پر دین و دنیا کی تمنا بے سود ہے۔ نتیجۂ کمائی کے حصول کیلئے کمائی کرنی ضروری ہے۔ اس آیت میں لفظ نَزِدْ اور نُؤْتِهٖ سے یقینی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی کوشش رزاق نہیں حصولِ رزق کا ذریعہ ضرور ہے۔ دینے والا خدا ہی ہے، حاکم وہی ہے۔ خزانہ اُسی کا ہے انسان عمل بہانہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں اعمال انسانی موجب اور علت تامہ نہیں۔ اللہ کی مرضی لازم ہے۔ خدا چاہے کوشش بشری کے بعد دے دے نہ چاہے تو ہزاروں کوششوں کے بعد بھی نہ دے وغیرہ۔

ذٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا

یہی ہے جس کی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے آپ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ میں تم ہی سے کچھ مطلب

إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۗ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس میں اور خوبی زیادہ کردیں گے بے شک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا

شَكُورٌ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ

قدردان ہے کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ انھوں نے خدا پر بہتان باندھ رکھا ہے سو خدا اگر چاہے تو آپ کے دل پر بند لگا دے اور اللہ تعالے

الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

باطل کو مٹایا کرتا ہے اور حق کو اپنے احکام سے ثابت کیا کرتا ہے وہ دلوں کی باتیں جانتا ہے

تفسیر آدمی اپنا مال، اہل وعیال یہاں تک کہ عزت وجان کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ ہلاکت سے نہیں ڈرتا، طوفانوں سے مقابلہ کرتا ہے پہاڑوں سے ٹکرا جاتا ہے۔ چڑھتے دریاؤں کی گھومتی اور جکراتی موجوں میں کود پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے۔ شہرت یا دولت یا سیادت یا عزت یا حکومت واقتدار کے حصول کے لئے، زندگی میں عیش کرنے اور مزے اڑانے کے لئے، جذبات کی تسکین اور حیوانی قوتوں کی پیاس بجھانے کے لئے کون مصلح ہے جو ہوس واقتدار سے خالی ہو، کون مدبر ہے جس کو سیادت قومی اور قیادت ملکی کی خواہش نہ ہو، ایسا کون حق پسند حق گو اور حق پرست ہے جو سچائی کا اعلان اشاعتِ تبلیغ صرف سچائی کی خاطر کرتا ہے اور دنیا کی کوئی دوسری خواہش اس پر غالب نہیں ہے۔ لیکن مفاد پرستی اور غرض جوئی کسی حق کو بھی حدودِ حق کے اندر نہیں رہنے دیتی۔ باطل کا تو ذکر ہی کیا ہے صرف ایک گروہ ایسا ہے جو حق پرستی کرتا ہے، حق گوئی اس کا شیوہ ہے، اعلانِ حق اس کا شعار ہے، ساری دنیا کو وہ حق کا پرستار دیکھنا چاہتا ہے۔ باطل پرستی کی آگ میں بھنتے ہوئے لوگوں کو وہ کر پکڑ کر کھینچتا اور آگ سے بچاتا ہے۔ اپنا مال قربان کرتا ہے، سکون برباد کرتا ہے۔ اہل وعیال اور اعزاء واحباب کو ترک کرتا ہے، بھوک پیاس کی شدت اور حدت برداشت کرتا ہے، جسمانی اذیتیں جھیلتا ہے، ذلتیں اٹھاتا ہے اپنے بشری جذبات کو مردہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی انتہائی دکھ اٹھاتے ہوئے اپنی جان بھی دے دیتا ہے، مگر کسی آدمی سے اس کو لالچ نہیں ہوتا۔ اُس کے پیشِ نظر صرف کائناتِ بشری کی سدھار اور سنوار ہوتی ہے نہ وہ بادشاہ بننے کا خواہشمند ہوتا ہے نہ امیر کبیر ہو جانے کا لالچی نہ لیڈر اور سردار کہلائے جانے کا خواستگار نہ جاہ وحشم اور خیل وخدم کا پرستار نہ اپنے ہاتھ پاؤں چوموانے اور فرعون بدمست بن کر عیش کرنے کا متمنی۔ اس کو اپنی محنت کی داد اپنی کوشش کی قدر اپنے ایثار کے صلے کی خواہش ہوتی ہے تو رب العالمین سے نہ کسی چھوٹے بڑے انسان سے۔ یہ مقدس گروہ انبیاء کا ہے جو دنیا کے سامنے انسانی صلاح وفلاح کا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام چھوٹے مراتب ومدارج کا فرق مٹا دیتا ہے اور ایک چیز مابہ الامتیاز پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو شخص میری پیش کردہ تعلیم کو پائے گا وہ میری دوستی کا مستحق ہے اور میرے ساتھیوں کی دوستی کا مستحق ہے جو نہ مانے گا وہ نہ میرا دوست نہ میرے ساتھیوں کا نہ خدا کا۔

تحلیل اجزاء ذٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اللہ کی طرف سے فضلِ کبیر کی بشارت مومنین صالحین کو ہے۔ یہاں دو باتیں جاننے کے قابل ہیں ۱ ایمان سے مراد صرف جان لینا نہیں بلکہ یقین اور تصدیق ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رسول تو بعض کافر بھی جانتے تھے۔ ہرقل عیسائی تھا اور حضور کی رسالت سے واقف بھی تھا۔ بلکہ بعض یہودی تو حضورؐ کی شناخت اتنی بداہت کے ساتھ کرتے تھے جیسے اپنے بچوں کی يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ اس کے باوجود وہ سب کافر کے کافر رہے تصدیق واقرار سے خالی وَإِنَّ فَرِيقًا لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ وانستہ حق کو چھپاتے تھے۔ ۲ بے اختیاری

شبہات ایمان کو ضرر نہیں پہنچاتے۔ دل میں اگر اضطراراً کوئی وسوسہ خلافِ ایمان پیدا ہو تو قابلِ گرفت نہیں۔ صحابہ کے روشن قلوب میں بھی کبھی ایسے شبہات ہوتے تھے اور وہ ان کو دفع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور زبان پر لانا بھی اُن کو گوارا نہ تھا اور حضور والا نے اس کو عین ایمان قرار دیا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اٰمَنُوْا یا یُؤْمِنُوْا یا مُؤْمِنِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ظہر لھم الایمان یا یطلعون علی الایمان اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ استعمال نہیں فرمائے یعنی ایمان کسبی کو قابلِ مدح قرار دیا بے اختیاری ایمان کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا کیونکہ بے اختیاری ایمان کو یقین نہیں کہا جاتا۔ دشمن کی کوئی خوبی آدمی کو معلوم ہوجائے تب بھی اس کی عداوت کبھی دل سے نہیں جاتی۔

تنبیہ آیت مقدسہ میں بشارت عام اہلِ ایمان کو نہیں دی گئی نہ بغیر ایمان کے ظاہری نیکی کرنے والے کو بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے والے کو خوش خبری دی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے لئے عمل صالح ضروری ہے اور عمل صالح کے لئے ایمان لازم ہے۔ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔ اگر واعظ شخصی مفاد کا کچھ خواہش مند ہو اور نصیحت قبول کرنے والوں سے کچھ لالچ رکھتا ہو تو اس کے خلوص اور خیر خواہی میں شبہ کیا جاسکتا ہے۔ پیغمبر کے علاوہ ہر مصلح ذاتی منفعت اندوزی سے خالی نہیں۔ ہاں جو سنتِ پیغمبری پر چلے گا وہ ہر طمع سے آزاد ہوگا۔ تفسیری مطالب پر غور کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ آیت میں استثناء متصل نہیں منقطع ہے۔ یعنی مودت فی القربیٰ کا جو استثناء کیا گیا ہے وہ اجر تبلیغ نہیں اس کو اجر کہا ہی نہیں جاسکتا مثلاً ماجاء فی القوم الاحمار یعنی میرے پاس قوم نہیں آئی، مگر ایک گدھا آیا تھا۔ اس مثال میں ظاہر ہے کہ حمار کا شمار قوم میں نہیں ہے قوم والے سب آدمی ہوتے ہیں۔ گدھے کو آدمی نہیں کہا جاسکتا۔ بالکل یہی صورت آیت میں ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مودت فی القربیٰ پیغمبر کی تبلیغ کی اجرت تھی انبیاء کے سلسلے میں نفی اجرت تو صریحاً منصوص ہے۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا۔ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اسی طرح حضرت ہود و صالح و شعیب علیہم السلام کے ذکر میں بھی صراحت ہے کہ سب نے اپنی اپنی قوموں سے کہدیا تھا کہ ہم کسی اجرت کے خواستگار نہیں ہیں حضورؐ کے متعلق بھی منصوص ہے قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ فرمایا قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ یعنی میں تم سے کچھ اجرت کا طالب نہیں اور بالفرض اگر تم کو شبہ ہو کہ میں تم سے کچھ مانگوں گا تو جو کچھ مانگوں وہ تمہارا ہے تم ہی لے لینا۔ ان آیات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کا اجرت طلب کرنا ممکن نہیں اور اگر طلب ممکن ہو تو کسی چیز کا اجرت قرار پانا ممکن نہیں اور اگر کسی چیز کو اجرت قرار دے بھی لیا جائے تو اُس کا لینا حرام ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مودت فی القربیٰ اجرت نہیں ہے۔ آیت کی تفسیر تین طرح سے کی گئی ہے۔

۱ مودت سے مراد مودتِ رسول ہے اور قربیٰ سے مراد ہے رسول اللہؐ کی رشتہ داری۔ امام بخاری نے صحیح الاسناد روایت کے ساتھ طاؤس کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی۔ ابن عباس جواب دینے نہیں پائے تھے کہ سعید بن جبیر (ابن عباس کے شاگرد) بول اٹھے کہ اقارب آلِ محمد مراد ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا تم نے جلدی کی (بے سمجھے جواب دے دیا) پھر فرمایا قریش کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قرابت نہ ہو۔ ہر شاخ میں حضورؐ کی رشتہ داری موجود تھی۔ پس آیت کے معنی ہیں اَلَا اَنْ تَصِلُوْا مَا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقَرَابَةِ یعنی میری اور تمہاری جو رشتہ داری ہے اس کو ملائے رکھو (رواہ احمد ایضاً) شعبی ضحاک علی بن ابی طلحہ موفی یوسف بن مہران مجاہد عکرمہ قتادہ سدی ابو مالک اور عبدالرحمٰن بن زید سے بھی یہی تفسیر اور ابن عباس کی تشریح اسانید صحیحہ کے ساتھ مروی ہے۔ ابو القاسم طبرانی نے سعید بن جبیر کی وساطت سے حضرت ابن عباس کا تشریحی قول نقل کیا ہے کہ حضور نے قریش سے فرمایا میں تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ سوا اس کے کہ مجھ سے مودت رکھو کیونکہ میری قرابت تم سے موجود ہے۔ آپس کی اس قرابت کا لحاظ رکھو۔ (رواہ احمد)

۲ مودت سے مراد ہے رسول کی مودت یا مودت خدا اور قربیٰ سے مراد ہے حصول قربت الٰہی مطلب یہ کہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مجھ سے مودت رکھو میری اجرت تبلیغ یہی ہے (رواہ ابن ابی حاتم عن مجاہد عن ابن عباس) ظاہر ہے کہ بغیر محبت رسول کے

محبت خدا ناممکن ہے اور بغیر محبت خدا کے محبت رسول حاصل نہیں ہو سکتی اور ان دونوں کے بغیر قربت الٰہی کا حصول ممکن نہیں۔

یہ قربیٰ سے مراد ہیں اقارب رسول اللہ یعنی اقارب رسول اللہؐ سے محبت اور مودت رکھو بس اسی کو تبلیغ رسول اور ہدایت الٰہی کا عوض سمجھ لو۔ سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ کما رواہ البخاری عن طاؤس۔ امام زین العابدین کو جب یزیدی لشکر قید کر کے دمشق میں لایا تو ایک شخص نے امام سے کہا شکر ہے کہ اللہ نے قتل کر کے تم لوگوں کو نابود کر دیا اور فتنہ کے سینگ ٹوٹ گئے۔ امام نے فرمایا ارے تو نے قرآن بھی پڑھا ہے۔ کہنے لگا ہاں۔ فرمایا آل حم سورتیں بھی پڑھی ہیں بولا جب پورا قرآن پڑھا ہے تو آل حم سورتیں کیوں نہیں پڑھی ہیں۔ امام زین العابدینؒ نے آیت لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى تلاوت فرمائی۔ وہ شخص بولا کیا قربیٰ آپ لوگ ہیں۔ فرمایا ہاں (رواہ ابن جریر عن السدی)

ابو اسحاق سلیعی نے کہا میں نے عمرو بن شعیب (تابعی) سے پوچھا الا مودۃ فی القربیٰ قرابتی کون لوگ ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرابتی۔ (رواہ ابن جریر)

حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضورؐ نے فرمایا تھا میں نے تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرے اپنی عترت (اولاد) یہ دونوں مجھ سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر وارد ہوں گے (صحیح البخاری)

حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے کہ تالاب خم غدیر پر حضور اقدسؐ نے ایک خطبہ میں فرمایا تھا میں بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد مجھ تک آ پہنچے اور میں اس کا بلاوا قبول کر لوں۔ میں تم میں ثقلین چھوڑنے والا ہوں۔ اول کتاب اللہ جس سے ہدایت و نور ہے تم اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔ دوم میرے اہل بیت ہیں۔ میں تم کو اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ حضورؐ نے یہ لفظ دو مرتبہ فرمایا۔ حصین بن مرہ نے یہ حدیث سن کر حضرت زید سے پوچھا۔ قربیٰ کون لوگ ہیں۔ کیا حضورؐ کی بیبیاں اہل بیت نہیں ہیں۔ حضرت زید نے فرمایا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیبیاں تو اہل بیت ہیں، لیکن (ان کے علاوہ) اہل بیت وہ لوگ ہیں جن پر حضور کے بعد صدقہ حرام ہے۔ حصین نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں۔ زید نے فرمایا اولادِ علی اور اولادِ عقیل اولادِ جعفر اولاد عباس، حصین نے پوچھا کیا ان پر صدقہ حرام ہے فرمایا ہاں۔ (رواہ مسلم والنسائی وَقَدْ حَذَفْنَا بَعْضَ اَلْفَاظ۔ حصین بن میسرۃ التابعی)

ترمذی نے جید حسن غریب اسانید سے حدیث حجۃ الوداع نقل کی ہے جس میں کتاب اللہ اور اہل بیت کو حضورؐ نے ثقلین فرمایا ہے قرآن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے اور اہل بیت کے ساتھ اچھا سلوک رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری حضرت ابوسعید خدری حضرت حذیفہ بن اسید وغیرہم سے بھی اس بارہ میں مختلف صحیح احادیث مروی ہیں۔

امام احمد نے اپنی اسناد سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ قریش آپس میں تو خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور ہم سے ملتے ہیں تو بے رخی کے ساتھ گویا غیر ہیں۔ یہ سن کر حضور کو غصہ آیا اور فرمایا اس پاک عزوجل کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کسی مرد کے دل میں ایمان داخل نہ ہوگا جب تک کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے واسطے تم سے محبت نہ کرے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں حضرت عباس یا ابن عباس سے انصار کا مکالمہ درج ہے اور حضور کا انصار کو خطاب کر کے ایک مفصل فیصلہ بھی مذکور ہے اور آخر میں ابن عباس کا یہ قول ہے کہ اس پر آیت قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ نازل ہوئی۔ اس روایت میں یزید بن ابی زیاد ضعیف راوی ہے (کذا قال ابن کثیر) پر اس روایت کے بموجب آیت کا مدنی ہونا ثابت ہوتا ہے حالانکہ پوری صورت مکی ہے۔ ہاں اگر ان چار آیات کو مستثنیٰ قرار دیا جائے تو ممکن ہے۔

صحیحین میں یہ روایت دوسری اسناد کے ساتھ مروی ہے مگر اس میں نزول آیت کا تذکرہ نہیں اور غزوۂ ہوازان کے بعد کا واقعہ ظاہر کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آیت میں القربیٰ سے رسول اللہؐ کے اقربا مراد ہیں۔ مذکورۂ بالا بعض روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے، لیکن

صرف نسلِ رسول مراد ہے یا چچا اور چچا کے بیٹے اور ان کی اولاد اور حضورؐ کی بیبیاں۔ اس مسئلہ کی تعیین ثبوت کی محتاج ہے۔ اگر آیت کو مکی قرار دیا جائے تو اس وقت سیدہ زہراء کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، اس لئے امامین اور ان کی نسل پر آیت کو محصور سمجھنا غلط ہے بلکہ وہی حضرت علی حضرت جعفر حضرت عقیل حضرت عباس اور ان کی اولاد مراد ہو گی۔ حضرت فاطمہ اور حضرت رقیہ وغیرہما حضور والا کی اولاد میں جو کوئی زندہ تھا سب کو آیت شامل ہو گی۔ لیکن تخصیص مورد سے چونکہ حکم میں تخصیص نہیں ہو جاتی، اس لئے آئندہ جتنی رسول کی نسل یا حضورؐ کے چچاؤں کی نسل ہوئی سب حکم آیت میں داخل ہو گی۔

صحیح ترین تفسیر وہی ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے جس کو ہم نمبر اوّل میں ذکر کر آئے ہیں اور اگر آخری تفسیر مراد ہو گی تو اقارب رسول کو ایمان اور عمل کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہو گا کیونکہ بغیر عمل صالح کے تو بیٹے کو بھی قرآن نے آل ہونے سے خارج کیا ہے۔ حضرت نوح کے قصہ میں کنعان کے متعلق فرمایا۔ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ۔

وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا۔ بعض مفسرین کے نزدیک حسنہ سے اس جگہ اولادِ رسول کی محبت مراد ہے کیونکہ فی القربیٰ کے ذکر کے بعد اس کا ذکر فرمایا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول غلط ہے حسنہ نکرہ ہے جو عموم چاہتا ہے۔ اگر اولادِ رسول کی مودت مراد ہوتی تو الف لام عہدی لایا جاتا اور الحسنۃ کہا جاتا۔ صحیح مطلب یہ ہے کہ مودت سے مراد اگر مودتِ رسول اور قربیٰ سے قرابت داری کا لحاظ مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ صرف مودت حاصل تبلیغ نہیں ورنہ سارا قرآن لغو قرار پائے گا۔ اگر یہی حاصل نبوت قرار پاتا تو لوگ مخالفت ہی کیوں کرتے اور اگر مودت اقارب رسول مراد ہو تو وہ بھی کافی نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اعمال صالحہ کا اقتران نہ ہو، اس لئے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی کسی قسم کی بھلائی (مع شرط ایمان) کرے گا ہم اس کے لئے خوبی بڑھا دیں گے (دس گونہ سے لے کر سات سو گونہ بلکہ اس سے بھی زائد)

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ۔ اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور اعمال صالحہ کی قدر کرنے والا ہے (کسی کی کوشش رائیگاں نہیں کرتا)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا۔ اس جملہ سے پہلے ایک جملہ سوالیہ مع حرف استفہام کے محذوف ہے یعنی یہ لوگ رسول اللہ کو دیوانہ کہتے ہیں یا خود قرآن بنا کر غلط طور پر اللہ کی طرف منسوب کرنے والا، ظاہر ہے کہ دیوانے کی بات کی تک نہیں ہوتی اور اللہ پر دروغ بافی کرنے والا فروغ نہیں پا سکتا۔

فَإِنْ يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ۔ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو وہ آپ کے دل پر مہر لگا دیتا قرآن بنانے ہی نہ دیتا۔ اور (جو نقوش) باطل دل پر ہوئے ان کو مٹا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دروغ بافی پر تم کو قدرت ہی نہیں ہوتی، لیکن چونکہ آپ کے دل کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور قرآن مجید کا فیضان آپ کے قلب پر ہو رہا ہے، اس لئے یہ باطل اور جھوٹ نہیں ہے۔

وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ۔ اللہ تو اپنی آیات سے حق کو ثابت کرتا ہے۔ تمام صحیح افکار و احکام کو دلائل واضحہ سے بیان فرماتا ہے۔

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ دلوں کے اسرار سے وہ پورا واقف ہے۔ پھر کس طرح ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ پر افترا پردازی کرتے ہیں اور دل سے بنائی ہوئی باتوں کو اللہ کی طرف منسوب کر سکتے۔

مقصودِ بیان

ذَٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ الخ سے صرف مومنین صالحین کو بشارت دینے کی صراحت ہے۔ اس سے نصیحت پکڑیں وہ سرکش بے عمل مسلمان جو اپنے ایمان پر (بشرطیکہ ایمان بھی شرک سے پاک ہو) مغرور اور اعمال کی طرف سے بن کر جنت کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔ گویا باوجود بداعمالی کے جنت حاصل ہونے کا ان کو قطعی یقین ہے۔ اس آیت میں درس فکر ہے ان واعظوں کے لئے جو عوام کے ساتھ چلتے ہیں اور گناہگاروں کو بہشت کی بشارتیں دے کر خوب تھپک کر سلاتے ہیں۔

آیت لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا سے عبرت حاصل کریں وعظ و ارشاد کے عوض نذرانوں کا نام رکھ کر اجرت لینے والے اذان، امامت، نکاح خوانی اور ہر کارِ خیر کی مزدوری کو معاوضہ خدمت اور پاک معاوضہ سمجھنے والے۔ پیری اور ہدایت کی مزدوری سالانہ ٹیکس کی صورت

میں وصول کرنے والے اور دین کو دنیا کی متاعِ حقیر کے عوض فروخت کرنے والے آیت
فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰہُ الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تمام مخلوق سے مستغنی ہے۔ یہاں تک کہ مقدس پیغمبروں سے بھی۔ اگر یہ بھی اس
کی آیات میں خلط ملط کر دیں تو اس غلط کو مع ان کے قلوب اور ذہنی کے مٹادے اور حق و حقیقت کو اپنے کلماتِ قدسیہ سے ثابت فرمادے وغیرہ۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَيَسْتَجِيْبُ

اور وہ ایسا رحیم ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ تمام گناہ (گزشتہ) معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس (سب) کو جانتا ہے اور

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ وَلَوْ

ان لوگوں کی عبادت قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور انکو اپنے فضل سے اور زیادہ ثواب دیتا ہے اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کیلئے سخت عذاب ہے

بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ

اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کیلئے روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے لیکن جتنا رزق چاہتا ہے اندازِ مناسب سے (ہر ایک کیلئے) اتارتا ہے وہ اپنے

بَصِيْرٌ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

بندوں (کے مصالح) کو جاننے والا اور ان کا حال دیکھنے والا اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد پانی برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور وہ (سب کا) کارساز قابلِ حمد ہے

تفسیر انکار کرنے والے انکار کر دیں ملحد دہریہ نہ مانیں کور بصیرت اور مردہ عقل والے نہ سمجھیں، لیکن یہ واقعہ ہے ناقابلِ شک اور حقیقت ہے ناقابلِ تردد کہ پیدائش کے بعد بندہ کے دو قسم کے تعلقات اپنے خالق سے رہتے ہیں۔ بندہ کافر ہو یا مومن، گناہگار اور سرکش ہو یا فرماں بردار اور مطیع۔ ہیں سب پیدا کئے ہوئے خدا کے ہی، اس لئے بندوں کی روحانی تربیت ہو یا درستی یا جسمانی نظم و بقا، ہیں دونوں خدا ہی کے ہاتھ میں۔

۱۔ اللہ بندہ کی ہر آواز کو سنتا اور روز قبول فرماتا ہے۔ اگر بندہ مشرک یا مومن نافرمان ہے تو چونکہ روحانی تربیت اس کی بھی خدا کو منظور ہے، اس لئے اگر وہ پچھلے قصور پر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی سنتا اور توبہ قبول کرتا ہے۔ خواہ کیسا ہی سخت مشرک اور نافرمان ہو اور اگر مومن صالح اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ اس کی بھی سنتا ہے اور اس کے اجر میں اضافہ کرتا ہے۔ گویا طہارت روحانی کے لئے بندے اور خدا کا یہ سلسلہ ہر وقت جڑا رہتا ہے۔ خواہ کاٹنے والے کتنا ہی مخلوق کے تعلق کو خالق سے کاٹنے کی کوشش کریں، مگر ایک طرف سے پکار اور دوسری طرف سے قبول کی یہ مسلسل زنجیر جڑی ہوئی ہے۔ ہلانے والا کنارہ بندہ کے ہاتھ میں ہے اور قبولیت والا سرا اللہ کے ہاتھ میں۔

۲۔ مومن ہو یا مشرک، عاصی ہو یا مطیع، جسمانی پرورش کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں، لیکن کسی کی خواہش یا ایمان و کفر کو اس کی کمی بیشی میں دخل نہیں۔ اللہ اپنے اندازہ کے موافق جتنا موافق سمجھتا ہے دیتا ہے نہ تمام مومن اور اطاعت گذار مالدار ہیں نہ سب مشرک اور گناہگار دولت مند۔ حسب منشاء خداوندی بندوں کے رزق میں تفاوت ہے۔ ہم اس بحث کی کسی قدر توضیح کرنی چاہتے ہیں۔ یہ زمین دن کی روشنی اور چمکتے ہوئے سورج کے باوجود اندھیری کیوں ہے۔ لوگ کیوں چوری، ڈاکہ، خیانت اور رہزنی کرتے ہیں۔ جب کہ معاش کے دوسرے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کیوں غیر عورتوں کو باصرہ نواز اور زینتِ آغوش بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ صنفی خواہشات کو پورا کرنے کے جائز ذرائع موجود ہیں یا موجود ہو سکتے ہیں۔ جھوٹ کیوں بولتے ہیں، غیبت کیوں کرتے ہیں۔ حسد کیوں رکھتے ہیں جبکہ ان میں

کوئی خصوصی لذت نہیں۔ غرض کہ فضائل فاضلہ کو کیوں ترک کرتے اور رذائل قبیحہ کو کیوں اختیار کرتے ہیں جبکہ رذائل میں کوئی فضیلت نہیں اور فضائل میں کوئی رذالت نہیں۔ ذلت نفس خبث دماغ اور کثافت روح کا کیوں اندازہ نہیں: جبکہ ضوابط الٰہیہ قوانین فطرت اور دلائل عقلیہ تمیز دلانے کے لئے موجود ہیں۔ کیا ان خرابیوں کی جڑ افلاس ہے۔ مفلس ہی چوری کرتا ہے۔ خیانت کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے، بدمعاشی کرتا ہے، دوسرے سے جلتا ہے، راستے لوٹتا ہے، جیبیں کترتا ہے، مفلس کا دماغ زنگ آلودہ، عزم مردہ اور روح افسردہ ہوتی ہے۔ افلاس ہی تمام بیماریوں کی اور تباہ کاریوں کی جڑ ہے۔ ہر وقت چہرہ پر موت چھائی رہتی ہے۔ نیت میں بدی اور ارادہ میں میل بھرا رہتا ہے۔ مفلس معاشرۂ انسانی کے جسم کا گلا سڑا عضو ہے کاٹ ڈالنے کے قابل۔ چمنستان سماج کے لئے خاردار زہریلی جھاڑی ہے۔ صاف کر دینے کے لائق سوکھا درخت ہے۔ بھٹیوں اور چولہوں میں جلائے جانے کا مستحق۔ زمین کی گردن کا بار ہے جس کا زمین کے اندر دفن کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے زہر سے دنیا کو بچانا سرمایہ دار کا فرض ہے۔ ناداری ایسا روگ ہے جس کو دور کرنے کے لئے روگی ہی کو فنا کر دینا لازم ہے نہ روگ رہے نہ روگی۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ بے ایمانی مال دار سے زیادہ کون کرتا ہے۔ غیر محسوس طور پر بھولے انسان کی گرہ کون کاٹتا ہے۔ سود در سود کے ہمہ رنگ نے میں خالی میں مفلسوں کو کون پھنساتا ہے۔ شراب خانہ خراب کس نے ایجاد کی۔ مالدار نے اپنی عیش پرستی کی مجلسوں کو گرم رکھنے کے لئے یا مفلس اپنی سوکھی ہڈیوں کو جلانے کے لئے فسق و فجور کی کثرت کس کے دست کرم کی ممنون ہے۔ جندہ خانے قحبہ گھر زناکاریوں کے اڈے کس نے اپنی راتیں جگانے اور دماغوں کو سلانے کے لئے ایجاد کئے۔ مفلس بے ایمان ہے، خائن ہے، چور ہے سب کچھ ہے، لیکن کروڑوں روپے کا دیوالہ کون نکالتا ہے۔ دنیا کی دولت جمع کرنے کے لئے کون بینک فیل کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مفلس قاتل ہے، ضارب ہے بدخو اور جنگ جو ہے، لیکن کروڑوں کی دولت ہتھیار بنانے میں کون صرف کرتا ہے۔ منٹ بھر میں لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مفلس ڈاکہ مارتا ہے۔ دو چار دس بیس مظلوم مارے جاتے ہیں، لیکن ایک دن میں لاکھوں آدمی کس کی جوع الارضی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور لاکھوں ہزاروں کی کون بھرپور آبادیوں کو تہ تیغ اور تہ بم کر دیتا ہے۔ بہتے خون کے بھرے دریا تڑپتی لاشوں کے بے جان انبار، بیواؤں کی آہ، یتیموں کی پکار، سرسبز کھیتوں کی تباہی، پھل دار باغوں کی بربادی اور سر بفلک عمارتوں کی ویرانی کس کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ مفلس کو مفلس بنانے والا خون پی کر اس کی رگوں کو سکھانے والا اور کثیر آبادی کو محتاج بنانے والا، عصمت والیوں کو عصمت فروشی پر مجبور کرنے والا۔ نیک چلن کو بدمعاش اور صالح کو طالح بنانے والا کون ہے۔ یہ تمام جرائم سرمایہ دار ہی کے تو ہیں پھر بھی یہی خواہش ہے کہ مفلسوں کو تباہ کر دو۔ اُن کی جڑیں اکھاڑ دو۔ اگر مفلس نہ ہو تو صنعت و حرفت کی یہ رونق جس سے دنیا کے بازار دُلہن کی طرح سجے ہوئے ہیں، زمین کا یہ مخملی لباس سبز، باعث حیات کھیتیاں، یہ کام و دہن کو لذیذ بنانے والے پھل، یہ اونچی کوٹھیاں، یہ عیش و طرب کا سامان اور یہ رقص و نشاط کے جلسے کہاں سے آئیں گے۔ کیا دنیا تباہ نہ ہو جائے گی، کیا آبادیاں کھنڈر نہ بن جائیں گی، کیا انسان کے سماج کو کالا سانپ نہ سونگھ جائے گا، کیا انسانی معاشرہ کا شیرازہ بکھر نہ جائے گا اور کیا ہر شخص وحشی غیر مانوس نہ بن جائے گا۔ حقیقت میں سرمایہ کی زیادتی تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ ہو یا ناداری، اس دنیا کی آبادی کو برقرار رکھنے کے لئے دونوں کی ضرورت ہے، لیکن معاشرت انسانی کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں کا بقاء ایک خاص انداز کے تحت ہونا چاہیئے اور اندازہ کرنے والا سوا عالم کل اور واقف ہمہ ذات کے اور کون ہو سکتا ہے۔ سچ ہے ہو الولی الحمید۔

تحلیل اجزاء

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ۔ گناہ گار ہے نادانی کی حالت میں گناہ سرزد ہو جائے اور پشیمان ہو کر وہ توبہ کر لے تو اللہ قبول فرما لیتا ہے اور اس کے گزشتہ گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ گناہگار بندہ کا بھی اللہ سے تعلق اور ربط باقی رہتا ہے۔ کتنا ہی بڑا گناہ ہو جب پشیمان ہو کر اس کی معافی چاہتا ہے اور آئندہ کے لئے عہد کرتا ہے تو چونکہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے۔ اگرچہ گناہگار ہے اور گناہ ترک کر چکا ہے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کر لیا ہے اور گزشتہ کی معافی مانگ رہا ہے اس لئے اللہ کی ناراضگی خوشنودی سے بدل جاتی ہے اور گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ توبہ اور استغفار کے لئے ضروری نہیں کہ گناہوں کی فہرست نظر کے سامنے ہو اور ان کو معاف کرنے کی درخواست کی جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا واللہ میں ہر روز ستر بار سے زیادہ استغفار کرتا ہوں، دوسری روایت میں ہے لوگو اپنے رب سے توبہ کرو میں خود روزانہ سو بار توبہ کرتا ہوں۔

جب موت کا غرغرا شروع ہو جائے گناہوں سے توبہ کا وقت ہے۔ حدیث میں آیا ہے اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب تک اُس کو موت کا غرغرہ لگنے لگے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت میں آیا ہے حضور نے فرمایا کہ اللہ ہر رات کو اپنا دستِ رحمت پھیلاتا ہے تاکہ دن بھر کا بدکار توبہ کر لے اور دن میں اپنا دستِ رحمت دراز کرتا ہے تاکہ رات بھر کا بدکار توبہ کر لے۔ یہ سلسلہ یونہی رہے گا۔ یہاں تک کہ آفتاب مغرب سے نمودار ہو۔

حضرت انس بن مالک کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا تم میں سے اگر کسی کا اونٹ ریگستان بیابان میں گم ہو جائے جس پر اُس کا کھانا پانی بھی لدا ہوا اور وہ اُس کی تلاش سے مایوس ہو جائے۔ اور درخت کے نیچے آکر لیٹ جائے۔ اچانک آنکھ کھلے تو وہی لدا ہوا اونٹ سامنے کھڑا ملے اور وہ اس کی مہار پکڑ لے جتنی خوشی اُس شخص کو ہوتی ہے اُس سے زیادہ خوشی اُس وقت ہوتی ہے جب بندہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے (مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت بھی اسی کے قریب ہے (صحیح)

عبدالرزاق کے مصنف میں بحوالہ زہری حضرت ابوہریرہ کی روایت بھی اسی کے ہم معنی مذکور ہے۔ توبہ کی شناخت۔

خطیب نے لکھا ہے کہ کسی نے شیخ ابوالحسن بوسنجی سے توبہ کی کیفیت پوچھی، فرمایا گناہ یاد ہو جائے تو لطف نہ آئے (یعنی گذشتہ گناہ کی یاد تلخی پیدا کردے یہ توبہ کی علامت ہے) عبداللہ تستری نے فرمایا توبہ کی شناخت یہ ہے کہ بُری حالت بدل کر اچھی حالت ہو جائے۔ بعض محققین نے صراحت کی ہے کہ گذشتہ گناہوں پر ندامت، حال میں ترک گناہ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ یہی توبہ کا مفہوم ہے۔

مدینہ کی مسجد مبارک میں ایک بار کوئی اعرابی آیا اور نماز پڑھ کر اُس نے معمول کے موافق کہا الٰہی میں تجھ سے توبہ استغفار کرتا ہوں۔ امیرالمومنین حضرت علیؓ نے فرمایا ارے زبان سے جلدی جلدی استغفار کرنا جھوٹے آدمیوں کی توبہ ہوتی ہے اُس نے عرض کیا امیرالمومنین پھر توبہ کیسی ہوتی ہے؟ فرمایا کہ چھ باتیں ہوں تو توبہ ہوتی ہے ۱۔ گذشتہ گناہوں پر ندامت۔ ۲۔ ترک شدہ فرائض کی دوبارہ ادائیگی۔ ۳۔ اگر کسی بندہ کا حق تائب کے ذمہ ہو تو اس کی واپسی ۴۔ دل نے گناہ کا جو مزہ اٹھایا اُس کے عوض نیکی کی تلخی اُس کو چکھائی جائے۔ ۵۔ جس طرح بدکاری نے اُس کو موٹا کیا تھا اسی طرح نیکی کر کے اس کو گھلایا جائے ۶۔ گناہ میں غافل ہو کر جتنا ہنسا تھا اب اُتنا ہی روئے۔

وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ۔ اس فقرہ میں صرف ہاتھ پاؤں کا عمل ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہاتھ سے پاؤں سے سر، ابرو اور آنکھ کے اشارے سے آدمی جو کرتا ہے، زبان سے جو کچھ کہتا ہے، دل میں جو نیت اراد کرتا ہے غرض زندگی کے تمام حرکات سکنات کو اللہ جانتا ہے۔ اس فقرہ میں گویا تنبیہ ہے اس بات پر کہ کون توبہ کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ آئندہ کون توبہ شکنی کرتا ہے اور کون توبہ پر قائم رہتا ہے۔ توبہ کرنے میں کس کی کیا نیت ہے، دنیوی اغراض کا حصول یا اللہ کا خوف۔ ان سب چیزوں سے اللہ واقف ہے۔ اس لئے خلوص خاطر کے ساتھ توبہ کی جائے تو اللہ قبول فرمائے گا۔

وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ یعنی جن لوگوں نے اللہ کی توحید کو مانا اور فرائض و حدود پر قائم رہے۔ اللہ اُن کی دعا قبول فرماتا ہے (کذا فسر ابن کثیر والخطیب فی السراج وافتادہ ابن جریر من قبل) اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ آیت مندرجہ بالا میں تو گناہگاروں کی توبہ قبول کرنے کا بیان تھا اور اس آیت میں مومنین صالحین کی دعا قبول فرمانے کا وعدہ ہے۔ بعض اہل تفسیر نے پہلی آیت کو مشرکین کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔ یعنی جو مشرک شرک اور زمانۂ شرک میں کئے ہوئے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اللہ اس کو معاف کر دیتا ہے اور شرک کے بعد جب ایمان اور عمل صالح سے اپنے نفس کو آراستہ کر لیتا ہے تو اس کی دعا قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک جو صحیح ترین تفسیر تھی اُس کی توضیح ہم نے تفسیری مقالہ میں کر دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرک بدکار ہو یا مسلمان، گناہگار یا مومن صالح کسی سے رشتہ خدا کا نہیں ٹوٹتا، ہیں سب خدا کے بندے، اس لئے مشرک اور گناہگار مسلمان جب خدا سے توبہ کرتا ہے تو خدا اس کی توبہ قبول فرماتا

ہے اور مومن صالح حبیب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ دعا قبول فرماتا ہے بلکہ

وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ اپنی مہربانی سے ان کو دعا سے بھی زیادہ عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ مومن صالح کو دنیا میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے اور قبر میں بھی منکر نکیر کے سوال کے وقت اور اپنی مہربانی سے اُن کے اعمال سے زیادہ عنایت فرماتا ہے۔

ابوصالح نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا اللہ مومنین صالحین کی شفاعت قبول کرے گا اور بھائیوں کے لئے دوسرے اُن کی عزت بڑھائے گا گویا استجابت سے مراد ہے شفاعت قبول کرنا اور زیادتی فضل سے مراد ہے شفاعت قبول کرکے ان کی عزت افزائی کرنا۔

ابن کثیر نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ کے معنی ہیں یَسْتَجِیْبُ لِلَّذِیْنَ یعنی مومنین صالحین کی دعا اللہ قبول فرماتا ہے۔ ہم نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت ہے کہ حضور والا نے آیت وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ کی تفسیر میں فرمایا مومنوں کو ایسے شخص کی شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی جس کے لئے (شرک یا بدکاری کی سزا میں) دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔ کیونکہ اُس نے ان مومنوں کے ساتھ (دنیا میں) کوئی نیکی کی ہوگی۔ (رواہ ابن ابی حاتم) مقصد یہ کہ مشرک ہو یا مسلمان گناہگار دونوں نے اگر دنیا میں کسی مومن صالح کے ساتھ کوئی نیکی کی ہوگی تو اللہ مومن پر اس کا احسان باقی نہیں چھوڑے گا۔ اور احسان اتارنے کے لئے مومن کی شفاعت اُس کے حق میں قبول فرمائے گا۔ گناہگار مسلمان کے حق میں شفاعت قبول کرنے کے معنی تو ظاہر ہیں کہ اُس کی مغفرت فرما دے گا۔ لیکن مشرک کے متعلق عدم مغفرت کی چونکہ نص وارد ہے، اس لئے اُس کے حق میں شفاعت قبول کرنے کے معنی شاید یہ ہوں کہ عذاب کی شدت میں نسبتاً کچھ کمی کردی جائے گی۔ اور دوزخ کے نچلے طبقہ سے اوپر والے درجہ میں اُس کو منتقل کر دیا جائے۔ ابوطالب کے متعلق جو حدیث آئی ہے اُس سے مفہوم کا ترشح ہوتا ہے۔ رہے وہ وَالْکٰفِرُوْنَ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ کافر جنہوں نے کفر نہیں چھوڑا اور توبہ نہیں کی۔ اُن کے لئے تو عذاب شدید مخصوص ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ عمرو بن حریث کی روایت میں ہے کہ اس آیت کا نزول اصحاب صفہ کے حق میں ہوا۔ کچھ غریب مسلمان جن کے رہنے اور کھانے پینے کا کہیں سہارا نہ ہوتا وہ علم دین سیکھنے کیلئے مسجد کے باہر ایک چبوترے پر آپڑتے ہیں۔ مہاجرین اور انصار میں سے جس کو توفیق ہوتی وہ دو چار دس بیس کو اپنے گھر لے جاتا اور کھانا کھلاتا یا چبوترہ پر ہی کھانا پہنچا دیتا۔ حضور کی خدمت میں جو کھانا یا لباس یا کوئی چیز بطور ہدیہ آتی یا امہات المومنین کی ڈیوڑھیوں میں کچھ ہوتا وہ سب اصحاب صفہ کو بھیج دیا جاتا۔ غرض اس طرح مصیبت سے ان غریبوں کی زندگی گذرتی تھی، مگر وہ دربار نبوت کی حاضری نہیں چھوڑتے تھے۔ اور کاشانۂ وحی کے دروازے پر پڑے رہتے تھے اور اس طرح دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

حضرت خباب بن الارت کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول ہمارے حق میں ہوا۔ بنی قریظہ بنی نضیر اور بنی قینقاع کے مالدار یہودیوں کو دیکھ کر ہم کو تمنا ہوتی تھی کہ کاش ہم بھی مال دار ہوتے۔ ابن حریث کی روایت کو سیوطی نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا۔ حضرت علی کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت خباب کے قول کو امام رازی اور خطیب نے نقل کیا ہے۔ دونوں روایتوں میں تباین نہیں ہے کیونکہ حضرت خباب بھی بہت غریب آدمی تھے اور اصحاب صفہ میں شامل تھے۔

بہرحال شان نزول کچھ بھی ہو آیت کے حکم میں تخصیص نہیں۔ تفسیری مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اپنے بندوں کو ضرورت سے زائد دیتا (اور سب لوگ غنی ہو جاتے) تو لوگ ملک میں فساد برپا کر دیتے اور معاشرۂ انسانی کا نظم قائم نہیں رہتا۔ کیونکہ جب سب مال دار ہوتے تو کوئی کسی کا کام نہ کرتا۔ ضرورت معاش کام کراتی ہے۔ صنعت و حرفت زراعت ملازمت علوم و فنون کی ترقی، تجارت کا فروغ سب کچھ انسانی طبقات کے مختلف المعاش ہونے کی وجہ سے ہے۔ پھر فسق و فجور، اللہ کی نافرمانیاں، عیش پرستیاں، راحت پسندیاں اور طرح طرح سے معصیت کوشیاں بڑھ جاتیں۔ ضرورت معاش سے بالاتر ہو کر باقی دولت کا کوئی نہ کوئی مصرف تو نکالا جاتا ہے۔ عموماً آدمی جذبات

کا محکوم ہوتا ہے۔ سلطان عقل کی حکومت ماننے سے سرکشی کرتا ہے، اس لئے تسکین جذبات کے راستے میں مال کو خرچ کرتا اور تصادم جذبات سے ملک میں فساد پیدا ہوتا ہے، اس لئے اللہ نے سب کو غنی نہیں بنایا اور مومن و کافر کی خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے رزق کی تقسیم کی اور چونکہ ضروریات انسان کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے کوئی انسان اپنی ضرورتوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد کس چیز کی ضرورت ہوگی۔ زندگی میں کتنے بچے پیدا ہوں گے۔ کتنے مریں گے کتنے باقی رہیں گے۔ کون کون بیمار ہوگا۔ کیا کیا بیماری ہوگی۔ غرض کسی کو اپنی حالت کا بھی پورا اندازہ نہیں۔ پھر دوسروں کے متعلق حال و استقبال کی ضرورت اور مصالح کا کسی کو کیا علم ہوسکتا ہے۔ لامحالہ اندازۂ الٰہی کی ضرورت ہے جو ماضی اور مستقبل کی حدود سے آزاد ہے، وہی اپنے اندازہ کے تحت جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ دونوں آیتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص کی زندگی کا باطنی اور علمی اخلاقی رُخ بھی اللہ کی ذات سے وابستہ ہے اور جسمانی رُخ بھی اُسی کی طرف ہے وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا، پکار سنتا اور ایک اندازہ کے تحت سب کو روزی دیتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ اُوپر کی آیت میں تھا کہ اللہ ایک اندازہ کے تحت رزق دیتا ہے۔ رزق کہاں سے آتا ہے، کیسے آتا ہے، کتنا آتا ہے۔ اس آیت میں اس کا بیان ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی خشکی اپنی انتہا کو پہنچ چکتی ہے۔ لوگ ناامید ہوچکتے ہیں تو اللہ بارش نازل فرماتا ہے اور اُس بارش کو پھیلاتا ہے۔ گویا بارش نازل فرمانا ایک عنایت پھر بادلوں کو ہوا کے کاندھوں پر سوار کرکے حسبِ ضرورت ادھر اُدھر پھیلانا اور ہر جگہ مصلحت کے مطابق مینہ برسانا دوہری عنایت ہے۔ اس سے مقصود ہر مخلوق کی کارسازی ضروریات کی فراہمی اور حاجت روائی تو چونکہ اللہ ایسا کارساز اور حاجت روا ہے کہ اس کی کارسازی پر کسی جنبہ داری اور غلطی کا شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے حقیقت میں وہی کارساز ہے اور حقیقی ستائش کا مستحق ہے۔ یوں تو دنیا میں دوسرے بھی کارسازی کارسازی کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگ ان کو کارساز مانتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں، لیکن انسانوں کی کارسازی اوّل تو حقیقی نہیں۔ اسباب امداد کا وہ خالق نہیں، نیست کو ہست بنانے کی اُس کو قدرت نہیں پھر اس کی ظاہری کارسازی بھی آلائش جذبات سے خالی نہیں۔ ایسی کارسازی کارسازی نہیں غرض پرستی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہی کارساز اور مستحق ثنا و حمد ہے۔

مقصود بیان

اللہ ہی بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہ معاف کرتا ہے پھر توبہ کرنے میں تاخیر کیوں اور اللہ کا دروازہ کھٹکھٹانے میں دیر کیا۔ آؤ جلد سے جلد توبہ کرلیں۔ مومن صالح کی اللہ دعا قبول کرتا اور خواہش سے زیادہ اس کو دیتا ہے تو پھر ہم نیک کیوں نہ بنیں۔ ہم نیک بن جائیں گے تو خدا ہماری دعا بھی قبول فرمائے گا۔ خوب سمجھ لو کہ خدا کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں، نہ کافر اور گناہ گار کے لئے نہ مومن اور نیکوکار کے لئے۔ پہلے دروازہ پر دستک دو۔ معافی مانگو معافی ملے گی، پھر حکم پر چلو سب کچھ ملے گا۔

آیت وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ سے مترشح ہو رہا ہے کہ مال کی کثرت بربادی کی جڑ ہے۔ یہ بڑی آزمائش ہے۔ اللہ اپنے اندازہ کے مطابق دیتا ہے۔ ایسا اندازہ کہ انسانی معاشرہ کا نظم قائم رہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں، لیکن حکم کا جاری ہے وغیرہ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ

اور منجملہ اُس کی (قدرت) کی نشانیوں کے پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور اُن جانداروں کا جو اُس نے آسمان و زمین میں پھیلا رکھے ہیں۔

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۠ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا

اور وہ اُن (مخلوق) کے جمع کرلینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے اور تم کو (اے گنہگارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی

كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ

ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے (پہنچتی) اور بہت سی تو درگزر ہی کر دیتا ہے اور تم زمین میں (پناہ دے کر اس کو) ہرا نہیں سکتے

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

اور خدا کے سوا تمہارا کوئی بھی حامی و مددگار نہیں۔

تفسیر ہزاروں قرن گذرنے کے بعد فلکیات کے ماہر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس طرح یہ زمین پہاڑوں دریاؤں درختوں جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے بھری پڑی ہے اور سب کا سرخیل انسان ہے۔ اسی طرح دوسرے کروں میں بھی پہاڑ ہیں دریا ہیں اور جانداروں کی آبادی ہے جن میں شاید آدمی بھی ہیں اور دوسری مخلوق بھی، لیکن قرآن مجید نے اپنی زبان میں ۱۳۷۳ سال پہلے بغیر معمل اور رسدگاہ اور بلا کسی خوردبین اور دوربین کے حشر اجساد اور بعثت جسمانی پر استدلال کرتے ہوئے پکار کر کہا تھا کہ لوگو آیات قدرت کا مطالعہ کرو۔ تمام آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق پر نظر ڈالو۔ یہ سب کیسے بنائے گئے، کس چیز سے بنائے گئے اور کیوں بنائے گئے کب بنائے گئے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ آسمانوں میں بھی اور زمینوں میں بھی اللہ نے کس قدر رینگنے اور چلنے پھرنے والے جاندار پیدا کئے۔ اہل عالم نے زمین پر رینگنے اور چلنے پھرنے والے کچھ جانداروں کو دیکھا، اُن کی حالت دیکھی تخلیق پر غور کیا، کیفیت سمجھی، لیکن ناقص ناتمام۔ اور بیشتر جانداروں کو ابھی تک نہیں دیکھا نہ اُن کی کیفیات اور خصوصیات کا مطالعہ کیا نہ افعال و آثار سمجھے۔ بالائی کروں کے جانداروں کی خبر تو وہاں کسی ایک نے بھی کسی ایک کو وہاں نہیں دیکھا بس اتنا جانا کہ وہاں بھی کچھ جاندار ہیں۔ روح زندگی رکھنے والے۔ کبھی ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ قرآن درس مطالعہ دیتا ہے۔ عامی کو بھی اس کی سمجھ کے لائق اور محقق کو بھی اس کے علم و عقل کے مطابق۔ عام آدمی نیلگوں چھت اور چوڑی چکلی زمین دیکھتا ہے۔ سمجھتا ہے وہ آسمان ہے یہ زمین ہے۔ گھوڑے گدھے اونٹ ہاتھی بکری کتے بلی کو دوڑتا پھرتا دیکھتا ہے اور کہتا ہے یہ جان دار ہیں اور چونکہ البعرة تدل علی البعیر والاثر علی المسیر اس لئے وہ پکار اٹھتا ہے فکیف لاتدل السموٰت والارض علی اللطیف الخبیر لیکن محقق کی نظر اس سے گہری ہوتی ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ طرز فکر اور حد نظر دونوں میں تبدیل کر دے۔ حد نظر کی تبدیل تو اس طرح کہ وہ بقدر رسائی تمام موجودات کی جستجو کرے۔ اس زمین اور اُن آسمانوں میں کیا کیا چیزیں ہیں کون کون جاندار ہیں۔ کہاں کہاں ہیں، اُن کا مادۂ تخلیق کیا ہے۔ فوائد اور خصوصیات کیا ہیں۔ کیا یہ بے کار اور عبث ہیں یا بہ کار آمد ہیں۔ نظم کائنات میں اُن کو دخل ہے۔ اُن کو کس نے بنایا ہے وغیرہ وغیرہ اور طرز فکر میں تبدیل اس طرح کرے کہ جس خدا نے یہ اَن گنت مخلوق نیست سے ہست کی عدم سے وجود میں لا کر زمین و آسمان میں بے شمار جانداروں کو پھیلایا کیا وہ آدمیوں کو قیامت کے دن دوبارہ پیدا کر کے حساب کتاب اور ثواب عقاب کے جمع نہیں کر سکتا۔ بصر و بصیرت کو دعوت مشاہدہ دے رہی ہے کائنات کی تخلیق اور تخلیق کی یہ ترکیب و ترتیب، سمندروں کے لامحدود قطرے، ہوا کے ناقابل استقصار ذرے غرض زمین اور کائنات زمین کے حد حساب سے خارج اجزا غیر منقسم سب کے سب جانداروں میں ہیں۔ حرکت کرنے والے اور رینگنے والے اس طرح بالائی کروں کے وہ اجزا تخلیقی جو انتہائی باریکی کے سبب مبلغ فہم و درجہ وہم سے بھی باہر ہیں۔ وہ کل کے کل سکڑنے پھیلنے ہلنے اور رینگنے کیڑے ہی تو ہیں۔ ان سب کو کس نے جمع کر کے پھیلایا کس نے مختلف اشکال کا لباس پہنا کر نمودار کیا۔ کیا ایسا خالق انسانی قوام کے منتشر ٹکڑوں کو دوبارہ جمع کر کے جوڑ نہیں سکتا۔ جب کائنات کا کوئی ذرہ خدا کے قابو سے باہر نہیں اور کسی میں سرتابی کرنے کی طاقت نہیں تو کتنا بے وقوف ہے یہ انسان جو اللہ کے احکام سے سرتابی کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس نے نافرمانی کے تباہ کن نتیجہ سے بھاگ کر کسی جگہ زمین پر پناہ حاصل کر لے گا اور خدا کی دست رس سے باہر ہو جائے گا اور کوئی مددگار نہ والا خدا کے مقابلے میں صف آرا

ہوکر اس کی مدد کر سکے گا اور اس کو ہلاکت سے بچالے گا۔ یہ خیال خام ہے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے نہ مددگار۔

تحلیلِ اجزاء وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ اس آیت میں توحید خلاقیت کو ظاہر فرما کر حشر جسمانی پر استدلال کیا ہے۔ فِیْہِمَا کی ضمیر زمین و آسمان دونوں کی طرف لوٹتی ہے جس سے صراحتہً یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ جس طرح زمین میں مختلف جانور ہیں آسمانوں میں بھی ہیں۔ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ داب انہی چوپایوں کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتے ہیں پھرتے ہیں۔ آسمانوں میں یہ جانور کہاں ہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے مختلف علماء نے یہ تقریریں کی ہیں۔ بیضاوی نے تو آسمانوں میں جانداروں کے وجود سے ہی انکار کر دیا تھا اور صاف کہہ دیا کہ تثنیہ کی ضمیر کبھی واحد کی طرف راجع ہو جاتی ہے یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں مِنْهُمَا کی ضمیر شیریں سمندر کی طرف راجع ہے کیونکہ شور سمندر میں موتی مونگا پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس آیت میں تثنیہ کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہے۔ ہر قسم کے جانور اور انسان اسی زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

مجاہد نے فرمایا دابہ میں ملائکہ اور انسان بھی داخل ہیں (یعنی ضمیر تثنیہ اپنی حقیقت پر ہے زمین و آسمان دونوں کی طرف راجع ہے۔ آسمان کے دابہ میں انسان داخل ہیں) ابن کثیر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

زمخشری نے کہا ممکن ہے ملائکہ اڑنے کے باوجود بھی زمین پر بھی چل سکتے ہیں، اس لئے دابہ میں ان کا شمار کیا گیا یا آسمانوں میں کوئی ایسی مخلوق ہو اسی طرح وہاں چلتی پھرتی ہو جس طرح زمین پر آدمی چلتے ہیں۔ گویا زمخشری کی اوّل تاویل کے مطابق فیہما کی ضمیر صرف زمین کی طرف راجع ہوئی اور دابہ وہی جاندار قرار پائے جو زمین پر چلتے ہیں، لیکن ملائکہ کا ان میں شمول اس احتمال و امکان پر ہوا کہ شاید وہ زمین پر بھی چل سکتے ہوں اور دوسری تاویل کے بموجب ضمیر دونوں کی طرف راجع ہے۔ آسمانی دابہ میں ملائکہ داخل ہیں۔

ابن عادل نے کہا کچھ بعید نہیں کہ آسمانوں پر اللہ نے چلتے پھرتے جاندار پیدا کئے ہوں جس طرح زمین پر انسان حیوان وغیرہ چلتے ہیں اسی طرح وہ آسمانوں پر چلتے ہوں۔

حقیقت میں یہ علماء کی تمام تاویلیں اس غلط بنیاد پر قائم ہیں کہ اوّل انہوں نے دابہ کے عرفی معنی آیت میں مراد لئے اور پھر لگے تاویلیں کرنے۔ حالانکہ اگر دابہ کے لغوی معنی آیت میں مراد لئے جائیں تو ایک نازک حقیقت اور نئے علمی نظریئے کا انکشاف ہوتا ہے۔ دبیب کے معنی لغت میں ہیں رینگنا۔ دوڑنے بھاگنے چکر لگانے کو دبیب نہیں، بلکہ ایسی خفیف حرکت کو دبیب کہتے ہیں جس پر سکون حس کا شبہ ہوتا ہے، اس لئے دابہ کا ترجمہ ہوا رینگنے والا۔ رینگنے کے لئے جاندار ہونا شرط ہے۔ پاؤں سے حرکت کرنا ضروری نہیں۔ ظاہر نظر سے دیکھنے والے اور قرآنی الفاظ کو سرسری طور پر پڑھنے والے کیڑوں مکوڑوں درندوں چوپایوں اور انسانوں کو دابہ جانتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پرندوں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور کچھ آگے بڑھے تو مختلف تاویلیں کر کے جن اور ملائکہ کو اس میں داخل سمجھ لیتے ہیں، لیکن فلسفۂ یونان کو وحی آسمانی کی طرح یقین کرنے والوں کی دماغی حرکت اس طرف نہیں ہوتی کہ کائنات کی ساری تخلیق جاندار ذرّوں سے ہی ہے۔ آسمان ہو یا زمین یا فضائی موجودات ہر ایک کی ساخت ایسے خلیات اور اجزاء غیر منقسمہ سے ہوئی ہے جن میں سے ہر خلیہ جاندار ہے حرکت کرتا اور رینگتا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ ریت کے ایک ذرہ اور ستارہ کے ایک کرن پارہ کے اندر کروڑوں حیوان ہیں۔ زندہ ہلتے حرکت اور رینگتے سکڑتے سمٹتے اور آگے بڑھتے۔ یہی وہ حقیقی دابہ ہیں جن کی تخلیق پر غور کرنے کی قرآن نے دعوت دی ہے۔ ہمارے قدماء کے زمانے میں یہ تخلیقی انکشاف نہیں ہوا تھا اور اس دور کا علمی حلقہ اس تھیوری کو جانتا ہی نہ تھا، اس لئے ابن عادل کے تفسیری قول اور زمخشری کی تاویل دوم میں احتمال اور امکان کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ کوئی یقینی توضیح نہیں کی گئی۔ اب جب کہ ماہرین طبعیات اور علماء فلکیات نے اس نظریہ کا اقرار کر لیا کہ ہر ذرہ کی تخلیق لامحدود زندہ اجسام سے ہے جو حرکت کرتے اور رینگتے ہیں تو قرآنی صراحت کی حقیقت و صداقت سامنے آئی۔ کاش ہمارے علماء قرآنی منصوصات کو اپنے انکشافات کا سنگِ بنیاد قرار دیں اور بغیر کسی اندیشے کے قرآنی نظریات کو اہل عقل کے سامنے لائیں۔ قرآن علم و عمل کی کتاب ہے۔ داستان اور چیستان نہیں۔ علمی تنقیحات روبہ ترقی کی طرف گامزن ہیں۔ اس وقت اگر علماء کی علمی نگاہ قرآنی نظریات

تک نہ پہنچے تو اس سے قرآن کی صداقت پر حرف نہیں آسکتا۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ اہلِ علم پر قرآن کی سچائی واضح ہو جائے گی جس طرح گزشتہ دور میں قرآن کی چند در چند تصریحات کو مدعیانِ علم نے نہ مانا اور علمائے اسلام بھی اُن کی تسلی نہ کر سکے بلکہ خود بھی اپنی علمی پیاس نہ بجھا سکے۔ حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ محض عقیدہ کی حد تک اپنی لاعلمی اور کوتاہیٔ نظر کا اعتراف کرتے ہوئے مانتے رہے۔ لیکن اب وہی ژولیدہ نا قابلِ فہم نظریات حقائقِ مسلمہ بن گئے اور دنیا کے دانشمند اُن کو صحیح کہنے پر مجبور ہو گئے۔ مثلاً اجسام نامیہ کا جاندار اور ذی شعور ہونا اور اعمالِ انسانی کا فنا نہ ہونا اور مجسم شکل میں سامنے آنا اور ہر قول و فعل کا اپنی جگہ محفوظ رہنا اور رقیب عتید کا اُس پر مسلط ہونا اس قسم کے بہت سے مسائل پہلے محض عقیدہ کی حیثیت میں مانے جاتے تھے اور ان کو نا قابلِ فہم عالم بالا کی باتیں قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اب وہ بولتی حقیقت بن کر سامنے آگئے اور جاہل یا پاگل کے علاوہ دنیا کا کوئی دانشمند ان کا منکر نہیں رہا۔ اسی طرح کچھ قرآنی تصریحات اور بھی ہیں۔ حل طلب ہمارے قدماء اور موجودہ زمانہ کے علمائے اسلام ان کو عقیدۃً مانتے ہیں اور علمی حلقہ کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا اقرار کر کے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ گویا قرآن کی بعض تصریحات (اُن کی نظر میں) گتھیاں ہیں اُلجھی ہوئی ناقابلِ فہم علم و دانش کے خلاف اور مسلمان کا فرض ہے کہ اٰمَنَّا کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا کہہ کر خاموش ہو جائے سمجھے یا نہ سمجھے مان لے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن کا پیش کردہ کوئی عقیدہ اور قائم کردہ نظریہ علم و دانش کے خلاف نہیں۔ قصور اپنی جہالت کا ہے نہ کہ قرآن کے روشن علمی نظریہ کا فَتَدَبَّرُوْا وَتَبَصَّرُوْا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ آدمی کا ہر رونگٹا گناہوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر آن زندگی کی ایک نعمت ہے۔ گوناگوں احسانات کی حامل اور ہر احسان کے عوض شکریہ لازم ہے، لیکن فطرتاً انسان میں اتنی طاقت نہیں کہ ہر احسان کا شکریہ ادا کرے اللہ بندہ کی اس مجبوری کو دیکھتا ہے اور درگزر فرماتا ہے، لیکن جس قدر دل کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے اور روح کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ اس قدر قیود میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عرفاء اولیاء اتقیاء اور انبیاء کی تدریجی قیود میں زیادتی اسی بناء پر ہوتی جاتی ہے۔ یہ تو تخلیقی دشواری کے تحت اللہ کی طرف سے معافی اور درگزر کا سلسلہ جاری ہے، لیکن انسان کے ارادی اور شعوری گناہوں کی فہرست بھی بہت لمبی چوڑی ہے۔ آخرت میں تو بہرحال ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا سزا ملے گی یا معافی، مگر دنیا میں بھی بیشتر گناہوں سے اللہ درگزر فرماتا ہے۔ صرف مخصوص صورتوں میں (جبکہ نظمِ عالم تباہ اور حقوقِ انسانی برباد کئے جا رہے ہوں) بداعمالی کی سزا میں کوئی مصیبت مسلط کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کی دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ الآیۃ اگر اللہ لوگوں کے اعمال کا (دنیا میں پورا) مواخذہ کرتا تو کسی جاندار کو روئے زمین پر نہ چھوڑتا (زمین اُلٹ دیتا یا ایسے طوفان بھیجتا یا عالمگیر قحط نازل کر دیتا یا کوئی اور ایسی بلا مسلط کرتا کہ کوئی جاندار زندہ باقی نہ رہتا) حضرت علی نے فرمایا تھا لوگو میں قرآن مجید کی ایک ایک افضل آیت تم کو بتاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی وہ ہم سے بیان فرمائی تھیں۔ حضور نے آیت وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا تھا علی میں تجھے اس کی تفسیر بتاتا ہوں۔ دنیا میں جو بیماری یا سختی یا بلا تم کو پہنچے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ حلیم ہے (اس بات سے) کہ دوبارہ آخرت میں سزا دے۔ اور جس چیز کو اللہ نے دنیا میں معاف فرما دیا ہے تو وہ بڑا کریم ہے کہ پھر اس کا مواخذہ کرے (رواہ ابن ابی حاتم وابن راہویہ واحمد وابن منیع وعبد بن حمید والحکیم الترمذی وابویعلی الموصلی وابن المنذر وابن مردویہ والحاکم) یعنی جس گناہ کی دنیا میں سزا مل گئی اس کی آخرت میں سزا نہیں ملے گی۔ اور جو گناہ دنیا میں معاف کر دیا گیا وہ آخرت میں بھی معاف کر دیا جائے گا۔ حسن بصری سے مرسل حسن روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ اُتری تو حضور نے فرمایا اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے آدمی کے اگر لکڑی کی پھانس لگتی ہے یا رگ پھڑکتی ہے یا قدم پھسلتا ہے تو صرف اس کے گناہ کے عوض ہوتا ہے اور اللہ جس چیز سے درگزر فرماتا ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے یہ تو گناہگاروں کے گناہ کے پاداش میں جو مصیبت آتی ہے اُس کا بیان تھا، لیکن کیا نیکوں کو جو دکھ پہنچتا ہے وہ بھی اُن کے گناہوں کی سزا ہوتی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ نیکوں پر آئی ہوئی مصیبت اُن کے لئے سزا نہیں کفارہ ہوتی ہے اس سے ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور درجات کی ترقی ملتی ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے حضورؐ نے فرمایا قسم ہے اُس پروردگار کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مومن بندہ کو جو سختی اور تکلیف پہنچتی ہے۔

یا فکر اندوہ آتا ہے اللہ اُس کو مومن کے گناہ کا کفارہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی لگتا ہے تو وہ بھی گناہ کا اُتار ہوتا ہے۔
اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا جب بندہ کے گناہوں کی کثرت ہوتی ہے اور گناہوں کو اتارنے والی اُس کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی تو اللہ اس کو غم واندوہ میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔ حضرت معاویہ سے ایک حدیث مروی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جسمانی دکھ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ صابر بندوں کو صبر کے عوض جو نعمتیں اور مرتبے عنایت ہوں گے اُن کو دیکھ کر عافیت میں زندگی گذارنے والے تمنا کریں گے کہ کاش اللہ کے لئے قینچی سے ہماری بوٹیاں کاٹی جائیں۔

کم عمر بچوں کا ذکر اُن کے گناہوں کی سزا ہے یا کفارہ

یہ سوال ایک شخص نے علماء بن بدر سے کیا۔ علماء نے جواب دیا بچے کے والدین کے گناہوں کا عوض ہوتا ہے (رواہ ابن حاتم عن ابی البلاد)
حضرت عائشہؓ کی روایت کردہ صحیح حدیث میں آیا ہے حضورؐ نے تین دو بلکہ ایک چھوٹے سے بچے کی موت کو بھی ماں کے لئے باعثِ اجر قرار دیا۔ (بخاری)
یہ مسئلہ اپنی جگہ درست ہے کہ بچہ کی موت ماں باپ یا صرف ان کے گناہوں کا بدلہ یا کفارہ ہوتی ہے اور بچہ کے دُکھ سے ماں باپ کو جو دکھ پہنچتا ہے وہ ان کے اپنے گناہوں کی سزا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہر مصیبت خود آورہوتی ہے تو بچہ نے کون سا ایسا جرم کیا تھا کہ اس پر مصیبت آئی۔ وہ تو شرعاً مکلف نہیں۔ اس کا صحیح جواب تو ہم اپنی تفسیری توضیح میں دیں گے، لیکن اس جگہ شبہ کو دور کرنے کیلئے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ شرعاً گناہ کا صدور عاقل وبالغ سے ہی ہوتا ہے۔ وہی مکلف ہے بچہ اور دیوانہ مکلف نہیں۔ اس کا کوئی عمل گناہ نہیں۔ اس لئے آیت مذکورہ میں خطاب بھی اُنہی لوگوں کو ہے جو مخاطب بننے کے اہل ہیں۔ یعنی عاقل بالغ صاحب ارادہ واختیار مرد یا عورت۔ مجبور یا پاگل یا بچہ مخاطب ہی نہیں۔ اُس پر مصیبت کسی گناہ کی پاداش میں نہیں آتی بلکہ اللہ کے ایک عمومی ضابطہ کے تحت آتی ہے جو تخلیقی اور تکوینی ہے۔ ارادۂ انسانی کو اس میں دخل نہیں۔ درخت میں پھول آتے ہیں کچھ خشک ہو جاتے ہیں کچھ پھل بن جاتے ہیں پھر کچھ پھل بھی گر جاتے ہیں۔ کچھ عمر طبعی کو پہنچ جاتے ہیں۔ سبزہ جمتا ہے۔ جم کر کچھ گرم سرد ہواؤں یا زمین کی خشکی کے سبب سوکھ جاتا ہے کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ حیوانوں کے بچوں کی بھی یہی رفتار ہے کچھ بیمار رہتے ہیں کچھ تندرست کچھ مر جاتے ہیں کچھ بچ جاتے ہیں۔ اصلح کی بقاء اور غیر اصلح کی فنا ضرور رہے۔ سوکھی ناکارہ لکڑی بھٹیوں اور چولہوں میں جھونکی جاتی ہے۔ سرسبز بار آور درخت کو باقی رکھا جاتا ہے۔ آدمی کے بچوں کی بھی یہی حالت ہے۔ تمام غیر ارادی غیر مکلف مخلوق کے استمراری قانون کے تحت ان کے بھی حالات بدلتے ہیں۔ عاقل بالغ انسان کے علاوہ تغیرات ایک ضابطۂ فطری کے تحت دوسری مخلوق میں ہوتے ہیں وہی انسانی بچوں میں بھی ہوتے ہیں۔
یہاں تک تشریح اُن علماء کے اقوال کے موافق تھی جو مصیبت کو نتیجۂ عمل یا کفارۂ گناہ قرار دیتے ہیں، لیکن خطیب نے ذکر کیا ہے کہ کچھ علماء دنیوی مصیبت کو پاداشِ عمل نہیں کہتے اور ان کی تین وجوہ بیان کرتے ہیں ۱۔ روز قیامت بالاجماع روزِ جزا ہے آیت میں آیا ہے الیوم تجزیٰ کل نفس بما کسبت ۲۔ دنیا میں اگر گناہ کی سزا دے دی گئی تو دنیا دار الجزیٰ بن جائے گی پھر قیامت کی کیا ضرورت رہے گی۔ ۳۔ مصیبتیں تو مومن کافر نیک اور بد سب پر آتی ہیں بلکہ انبیاء اور صلحاء پہ زیادہ آتی ہیں۔ کیا یہ گناہوں کی پاداش میں آتی ہیں۔ اوّل دونوں شبہوں کا جواب صاف ہے۔ دنیوی سزا تنبیہی ہے تاکہ بندہ متنبہ ہو کر توبہ کر لے۔ یہ آخری سزا نہیں اور قیامت کے دن آخری سزا ملے گی جبکہ توبہ اور عمل کا کوئی وقت نہ ہوگا۔ اسی لئے دنیوی سزا سے گناہ کی تخفیف ہو جاتی ہے۔ تیسرا شبہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مصیبت وہ ہوتی ہے جس سے مصیبت زدہ کو حقیقت میں ضرر پہنچتا ہو۔ انبیاء اور صلحاء تو مصیبت کو مصیبت جانتے ہی نہیں نہ اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے اور جو واقعہ بشکلِ مصیبت دکھائی دیتا ہے اُس میں اُن کو مرضیٔ مولیٰ کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس لئے ہر مصیبت نما واقعہ اُن کے درجات کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ نعمت تو بہر حال نعمت ہوتی ہے۔ مصیبت بھی ان کے لئے نعمت اور راحت رساں ہوتی ہے۔ ایمان میں جتنی قوت ہوگی اتنی ہی مصیبت میں لذت اور مراتب میں ترقی ہوگی۔ رہے مشرک اور گناہگار اُن میں ایمان نہیں ہوتا، اس لئے مصیبت میں اُن کو بے صبری اور عیش میں ناشکری ہوتی ہے۔

اُن کے لئے دُکھ بھی مصیبت اور سُکھ بھی مصیبت۔ ہم نے جو احادیث اوپر نقل کی ہیں اُن میں سے آخری حدیث میں صبر کرنے والوں کے مراتب میں ترقی کو بیان فرمایا ہے۔

میری نظر میں آیت کی توضیح اپنے عموم پر ہے۔ کسب کے معنی ہیں کمائی۔ اچھی یا بُری کمائی کرنے والا نیک ہو یا بد، بالغ ہو یا نابالغ، دانا یا دیوانہ، مومن یا مشرک لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں کسب عمومی معنی پر ہے۔ مراد یہ کہ آدمی کا کوئی عمل نتیجہ سے خالی نہیں رہتا۔ عمل اور نتیجہ میں جو فطری تعلق ہے وہ بہرحال جاری ہے۔ عمل اپنے عامل کو نہیں دیکھتا کہ عاقل ہے یا پاگل، بالغ ہے یا بچہ، نیک ہے یا بد، دیوانہ اور بچہ میں بھی، اگر کنویں میں گرے گا تو ڈوبے گا بلکہ جلد ڈوبے گا کیونکہ اُس میں نکلنے اور بچنے کی سمجھ نہیں۔ زہر اور بچہ اور دیوانہ کو بھی ہلاک کرے گا دنیا میں جو مصیبت کسی پر آتی ہے وہ اس کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ عمل شرعاً گناہ ہے یا نہیں، اُس عمل کو نہ کرنا لازم ہے یا کرنا مباح ہے یہ الگ بات ہے۔ کسی بچہ یا دیوانہ کا خودکشی کرنا شرعاً قابلِ مواخذہ نہیں، لیکن فطرت تو بہرحال اپنا کام کرے گی۔ جو اپنے سینے میں کارگر چھرا مارے گا وہ مرے گا۔ دیوانہ یا بچہ، گناہگار یا نیکوکار جو شخص بھی ایسا کام کرے گا جو قانونِ فطرت کو پسند نہیں تو اس کا نتیجہ بُرا ہوگا دوسری زندگی میں وہ عمل جو اس دنیا میں نتیجہ کو دیکھ کر قبیح نظر آتا ہے سودمند ہو سکتا ہے۔ شہید کو شہادت ملتی ہے اگرچہ اُس کے سینکڑوں زخم لگتے ہیں اور دکھ پہنچتا ہے۔ اگر اپنے کو محفوظ رکھنے کی یقینی طاقت نہ ہو تو دشمن پر حملہ کرنا خلافِ فطرت ہے، اس لئے شہید میدانِ جنگ میں مارا جاتا ہے۔ اُس کے پاس محفوظ رہنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ قانونِ فطرت اپنا کام کرتا ہے، لیکن شریعت اُس کے فعل کو قبیح نہیں کہتی اور اُس کے نتیجہ کو قابلِ رشک قرار دیتی ہے۔

حاصل مطلب یہ نکلا کہ فطری طور پر آدمی پر جو مصیبت آتی ہے وہ اُس کے ہاتھوں کا لایا ہوا نتیجہ ہوتا ہے، اُس کے عمل کا پھل ہوتا ہے۔ یوں تو قدم قدم پر ہلاکت کے سامان انسان اپنے ہاتھوں سے غیر محسوس طور پر پیدا کرتا ہے۔ مگر اللہ آدمی کی بہت حرکتوں کو مٹا دیتا ہے۔ اُن کے نتائج بدبرآمد نہیں ہونے دیتا۔ کوئی ایسی رکاوٹ غیبی طور پر پیدا کر دیتا ہے کہ عمل ناتمام رہے اور نتیجہ بدہٹ جائے، لیکن جب عمل کی تکمیل ہو ہی جاتی ہے تو مصیبت آ ہی جاتی ہے۔ هٰذَا مَا عِنْدِي وَاسْتَغْفِرُ اللهَ إِنْ أَخْطَأْتُ۔ وَاللهُ أَعْلَم۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ جب ہر مصیبت انسانی اعمال کا نتیجہ ٹھہری تو پھر مصیبت کے دور کرنے کے لئے انسانی تدبیر ہی سودمند ہوگی۔ مقامِ ضرر سے بھاگنا یا کسی سے مدد مانگنا اور اُس پر بھروسہ رکھنا مصیبت دور کرنے کی تدبیریں ہیں۔ پھر خدا کی کیا ضرورت رہی۔ یہ ایک وہم ہے جو نقدانِ تدبیر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسبِ انسانی وقوعِ مصیبت کا سبب ہے، لیکن مصیبت اور کسب دونوں پیدا کئے ہوئے خدا کے ہیں اُسی نے اس کا تعلق جوڑا اور سبب کو مسبب سے وابستہ کیا۔ اب اس تعلق کو توڑنے والا اور نئی تخلیق کرکے مصیبت کو دور کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ زمین کے کسی حصہ میں بھاگ کر آدمی چلا جائے، کسی پیر ولی کو پکارے، فرضی دیوتاؤں کے ناموں کی رٹ لگائے جب خدا نہ چاہے تو کون کارسازی کرے اور کسی کی مدد کام آئے۔ اللہ ہی کوئی رکاوٹ اور مخالفت پیدا کرکے بداعمالی سے پیدا ہونے والی مصیبت کو دور کر دے تو ہو سکتا ہے کیونکہ سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔

تنبیہ جبریہ عقیدہ رکھنے والے تو انسان کو مجبورِ محض اور بے ارادہ مشینی پُرزہ جانتے ہیں۔ اُن کی نظر میں جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہی یہاں تک کہ کسی گناہ کا مجرم بھی حقیقت میں بندہ نہیں خدا ہے۔ گویا جب خالقِ کل خدا ہے تو کاسب بھی خدا ہی ہے۔ قدریہ گروہ کہتا ہے کہ انسان کا عمل نتیجہ کا علت ہے۔ گیہوں بو کر گیہوں حاصل کیا جاتا ہے اور جو بو کر جو اور بغیر بوئے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی لئے اس گروہ کے نزدیک انسان اپنے اپنے افعال کا پورا پورا قادر ہے۔ خیر و شر کا مختار ہے۔ اپنی بھلائی بُرائی خود پیدا کرتا ہے۔ گویا اس گروہ کے نزدیک جب کاسب بندہ ہے تو اپنے اعمال کا خالق بھی خود ہی ہے۔ قرآن مجید کی راہ ان دونوں سے الگ ہے۔ پہلے والی اور مندرجہ بالا آیت دونوں مل کر ایک ہی نظریہ پیش کر رہی ہیں۔ پہلی آیت سے انسان کا کاسب ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ ہر مصیبت انسانی عمل کا نتیجہ ہے۔ گویا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے عمل (اور کسب) کا خالق بھی بندہ ہی ہے اور انسان کے عمل اور اس کے نتیجہ میں جو ربط ہے وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

اللہ توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے۔ بہت سے قدرتی نتائج کو غیبی رکاوٹ پیدا کر کے روک دیتا ہے اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہے تو روئے زمین پر کوئی دفع نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی مدد کر سکتا ہے نہ کارسازی۔

مقصود بیان مَابَثَّ فِیْهِمَا سے ایک ایسے عظیم الشان مسئلہ کا انکشاف ہو رہا ہے جو ہزاروں قرنوں تک انسانی حدود علم سے باہر تھا۔ سب سے پہلے اسی آیت نے دنیا کے دانشمندوں کو واقف بنایا کہ آسمانوں میں بھی زمین کی طرح مخلوق پھیلی ہوئی ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ سے انسان کی بداعمالی کو مصیبت آور ہونا اور وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ سے رحمت آمیز قدرت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ گویا اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان خودکشی کرتا ہے اور خدا اکثر اس کی تباہی انگیز ہلاکت آفرین حرکات کو نتیجۂ بد سے معطل کر دیتا ہے یعنی اعمال اور نتائج کا باہم علاقہ مؤثر حقیقی نہیں۔ اگر خدا نتیجہ کو مٹا دیتا ہے

وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ الخ سے اللہ کی محیط کل طاقت اور اللہ کے علاوہ ہر چیز کی بے بسی ظاہر ہو رہی ہے وغیرہ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى

اور منجملہ اس کی نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے

ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ

رہ جاویں بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر (یعنی مومن) کے لئے یا ان جہازوں کو ان کے اعمال بد (کفر وغیرہ) کے سبب تباہ کر دے اور (انہیں) بہت آدمیوں

كَثِيْرٍ ۝ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ۝

(سے) درگذر کر جاوے اور (اس تباہی کے وقت) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں معلوم ہو جاوے کہ (اب) ان کے لئے کہیں بچاؤ نہیں۔

تفسیر پانی کی سطح پر کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ اسٹیمر ہوں یا نمون۔ سوال یہ ہے کہ ہزاروں ٹن لوہا پتھر اور قسم قسم کے بوجھ لے کر یہ کشتیاں پانی پر کیوں رواں دواں ہو جاتی ہیں۔ یہ مانا کہ ان کی خاص شکل ہے۔ ہوا کا دباؤ اور گہراؤ ہے جو ان کو نہیں ڈوبنے دیتا، لیکن لوہے اور خالص پتھر غرض پانی میں ڈوبنے والی چیزوں کی کوئی خاص شکل بنائی جائے۔ ان کا تو خفیف اور حقیر حصہ بھی تہ نشین ہو جاتا ہے، لیکن لکڑی اور دوسری نا ڈوبنے والی چیزوں سے بنی ہوئی ناؤ پانی کی سطح پر ہی تیرتی ہے۔ ہوا کا دباؤ اور گہراؤ تو ہر جگہ ایک ہی طرح کا ہے۔ پھر تفاوت کیوں، اچھا ہوا ہی کشتی کو بہاتی ہے، لیکن یہ طبعی کیفیت ہوا میں کس نے پیدا کی۔ پھر ہوا کا رخ کون موڑتا ہے اور اس میں حرکت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہوا رک جائے تو کشتی کھڑی کی کھڑی رہ جائے۔ اگر ہوا میں حرکت تیز ہو کر طوفان آ جائے تو کشتی کو کون ناخدا بچائے۔ یہ خدا ہی تو ہے کہ غیر معمولی پوشیدہ اسباب کو بر سر عمل بنا کر ہوا کو اعتدال کے ساتھ حرکت دیتا ہے وہ ہلاک کرنا چاہے تو کون حفاظت کر سکتا ہے۔

تحلیل اجزاء وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ۔ قرآن کے استدلال کا خاص طرز ہے۔ پیش نظر چیزوں کو ذکر کر کے دعوت ذہنی دیتا ہے۔ عوام کو ان کی سمجھ کے موافق اور علماء کو ان کے لائق وہ چیزیں جو عمومی نظر سے غائب ہوں، عام طور پر استدلال میں ان کا ذکر نہیں۔ ہاں محسوس اور متبذل چیزوں کو پیش کر کے نتیجہ خالص عقلی نکالتا ہے، ماوراء حس مسائل کو ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ اور آسان مفید طرز ہو بھی نہیں سکتا۔ سمندروں میں بڑے بڑے جہاز پہاڑوں کی طرح عام طور پر ساحلی باشندوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور پانی میں گھومتے دوڑتے ہر شخص ان کو دیکھتا یا دیکھ سکتا ہے، لیکن ان میں خدا کی قدرت حکمت حکومت بہت کم لوگوں کو نظر آتی

ہے، علماء طبعیات بھی پانی، ہوا اور اشیا ثقلیہ کی طبعی کیفیتوں کو بیان کرتے اور انہی فطری حالات کو جہاز رانی اور روانی کی علت قرار دیتے ہیں۔ اس سے اوپر ان کی نگاہ بھی نہیں پہنچتی، لیکن قرآن ہر روشن دانش سے اپیل کرتا ہے کہ اس سے بھی اونچی نظر اٹھاؤ۔ اسباب بجائے خود اسباب ہیں۔ اول الکی سببیت کا مطالعہ کرو اور نتیجہ کا ربط دیکھو پھر یہ سمجھو کہ سبب بجائے خود کوئی مختار کل نہیں۔ کارساز نہیں بلکہ موثر، موجد اور قادر مطلق کا محتاج ہے ہر سبب اول سبب کا نتیجہ ہے اور پچھلے سبب کی علت۔ یہ علت و معلول کا سلسلہ اللہ کی انتہا قدرت ذرہ گیر حکومت، دقیق حکمت اور بے نیاز الوہیت کا پتہ دے رہا ہے۔

جواری جاریہ کی جمع ہے کشتی کو کہتے ہیں۔ چونکہ پہاڑوں سے تشبیہ دی ہے، اس لئے کشتیاں نہیں جہاز مراد ہیں۔ علم پہاڑ کو کہتے ہیں خلیل نے کہا ہر بلند چیز کو علم کہتے ہیں۔ مجاہد نے فرمایا یہاں قصر یعنی بلند محل مراد ہے۔ اگرچہ نزول آیت کے وقت جہازوں کی ہیئت قصر نما نہیں ہوتی تھی لیکن اب تو ہوتی ہے۔ اور اللہ کو معلوم تھا کہ اونچے محلات کی شکل کے جہاز بنائے جائیں گے، اس لئے ایجاد سے پہلے ہی اُس نے جہاز کو قصر نما فرمادیا۔

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ اللہ اگر جہاز کو روک دینا اور رواں کر دینا چاہے تو ہوا کی حرکت بند کر دے۔ جب ہوا نہ چلے تو جہاز کسی قسم کے ہوں دخانی یا اگبوٹ کوئی بھی نہیں چل سکے گا۔ سمندر میں کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا۔ ابن عباس نے رواکد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا، اگر اللہ ہوا کو روک دے تو جہاز سمندر کی لہروں کے تلاطم سے کھڑا ڈگمگاتا رہے اور آگے نہ بڑھ سکے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۔ صبر اور شکر ایمان کی دو ہی نشانیاں ہیں۔ دکھ میں صبر اور سکھ میں شکر مومن ہی کرتا ہے جس کی نظر میں خدا نہیں ہوتا یا اس کی خدائی نہیں ہوتی وہ ہر مصیبت سے بے چین اور مایوس ہو جاتا ہے یا عیش زندگی پر اتراتا اور بدخود غلط بن جاتا ہے۔ جہازی مسافر کا جہاز چلا ہوا موافق رہی ساحل پر پہنچ گیا۔ اللہ کا شکر واجب ہو گیا۔ ہوا ناموافق رہی یا جہاز کے مناسب حرکت نہ کرسکی، جہاز سمندر میں رک گیا۔ لہروں کے ٹکرانے کا خوف جہاز کے چکرانے کا خطرہ ہلاکت کا اندیشہ، لیکن بیقراری کیوں مایوسی کی کیا وجہ۔ خدا کارساز مسبب الاسباب ہے اُس سے عاجزانہ التجا کرنی لازم ہے۔ مومن کا یہی شیوہ ہے۔ اُس کو رنج و راحت دونوں میں خدا نظر آتا ہے۔

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ۔ اگر خدا چاہے تو ہوا کو روک دے اور سمندر میں کھڑے جہاز ڈگمگانے لگیں یا کسی دوسرے طریقہ سے ان کو ہلاک کر دے۔ چٹان سے ٹکرا جائیں مچھلی ٹکر مار دے، گرداب میں پھنس جائیں، طوفان میں گھر جائیں اور مسافر ہلاک ہو جائیں۔ مگر اللہ بڑی درگذر فرماتا ہے۔ انسان کی بداعمالی تو اس قابل تھی کہ بھرے ہوئے جہاز غرق کر دیئے جاتے، مگر اللہ درگذر فرماتا ہے۔

وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ۔ منکر قدرت جھگڑالو کو بھی ایسے وقت میں یقین آجاتا ہے کہ اب چھٹکارا ناممکن ہے۔ یعنی جب جہاز تباہی میں آجاتا ہے تو نشانہائے قدرت میں جھگڑا کرنے والے سب طبعیاتی مادیاتی بحثیں بھول جاتے ہیں اور وہ جان لیتے ہیں کہ اب بچاؤ ممکن نہیں، نافع اور ابن عامر کی قرأت میں وَيَعْلَمُ رفع کے ساتھ ہے۔ اسی قرأت پر آیت کا یہ مطلب ہوگا۔ عام قرأتوں میں يَعْلَمَ زبر کے ساتھ ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آیاتِ الٰہیہ میں جھگڑا کرنے والے جان لیں کہ ان کے لئے بھی چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں۔ (جو حالت تباہی میں گھرے ہوئے جہازیوں کی ہوتی ہے وہی ان کی ہوگی)

مقصود بیان محسوس نشان قدرت سے غیر محسوس نتیجہ کا استنباط۔ اس بات کی طرف ایمار کہ اسباب کی اثر انگیزی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ کوئی سبب تاثیر میں مستقل نہیں۔ یہاں سے رد ہوتا ہے مادیت پرستوں اور اعتزال پسندوں کے اس قول کا (کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ) خدا نے تمام اسباب کو پیدا کیا اور ان کے حلقوں کو باہم جوڑ کر ایک زنجیر بنادی تو اس کے بعد خدا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ زنجیر کی ہر کڑی کی حرکت دوسری کڑی میں حرکت پیدا کر دے گی کسی کے چاہنے نہ چاہنے کو اس میں دخل نہیں۔ اس کائنات کی زنجیر گردش یوں ہی جاری ہے نہ منقطع ہونے والی۔

صَبَّارٍ اور شَكُوْرٍ کے لفظ سے مومن کامل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ صبر و شکر مومن ہی کی خصوصیت ہے جو حوادثات زمانہ اور اتفاقات

کو مؤثر جانتا ہو وہ مصیبت پر نہ صبر کر سکتا ہے نہ راحت میں شکر وغیرہ۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سو جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کیلئے ہے اور (اجر ثواب آخرت میں) جو اللہ کے یہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا

اور زیادہ پائیدار وہ اُن لوگوں کیلئے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور جو کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور

هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جن لوگوں نے کہ اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور اُن کا ہر کام (جس میں بالتعیین نص نہ ہو) آپس کے

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا

مشورہ سے ہوتا ہے۔ اور ہم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ جو ایسے ہیں کہ جب اُن پر ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں اور برائی

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝

کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی پھر (بعد اجازت انتقام کے) جو شخص معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۭ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ

نہیں کرتا اور جو اپنے اوپر ظلم ہو چکنے کے بعد برابر کا بدلہ لے سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم

يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَ

کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر) کرتے ہیں ایسوں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے اور

لَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ۧ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ

ع ۱۳ ۵

جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے یہ البتہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے بعد

وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ

اس شخص کا (دنیا میں بھی) کوئی چارہ ساز نہیں اور آپ (ان) ظالموں کو دیکھیں گے جس وقت کہ ان کو عذاب کا معائنہ ہوگا کہتے ہوں گے کیا (دنیا میں) واپس

سَبِيْلٍ ۚ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ

جانے کی کوئی صورت ہے اور (نیز) اُن کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ وہ دوزخ کے روبرو لائے جاویں گے مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہونگے سست نگاہ سے

خَفِيٍّ ۗ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ

دیکھتے ہوں گے اور (اس وقت) ایمان والے کہیں گے کہ پورے خسارے والے وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے (آج) قیامت کے روز

الْقِيٰمَةِ ۗ أَلَا إِنَّ الظّٰلِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ ۝ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنْ أَوْلِيَاءَ يَنصُرُونَهُم

خسارے میں پڑے یاد رکھو کہ ظالم (یعنی مشرک و کافر) لوگ عذاب دائمی میں رہیں گے اور وہاں ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو خدا سے الگ (ہو کر)

مِّن دُونِ اللّٰهِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِن سَبِيلٍ ۝

ان کی مدد کریں اور جس کو خدا گمراہ کردے اس کی نجات) کے لئے کوئی رستہ ہی نہیں۔

تفسیر آدمی کی زندگی کا مقصود کیا ہے۔ کیا اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہوگی۔ کیا اس زندگی کی استواری اور ناہمواری آئندہ زندگی کے رنج و راحت کا سبب ہے۔ جیسا یہاں بویا جائے گا ویسا ہی وہاں کاٹا جائے گا۔ جو کچھ ہے وہ یہی زندگی ہے۔ تکلیف ہو یا راحت، بیماری ہو یا تندرستی۔ ناتوانی ہو یا توانائی، ناداری ہو یا زرداری، ذلت ہو یا عزت جو کچھ اس زندگی میں حاصل ہو بس یہی ہے آگے کچھ نہیں۔ یہاں کا دکھی دکھی ہے اور سکھی سکھی ہے۔ گویا حاصل زندگی یہی زندگی ہے۔ یہ دونوں فکریئے اس عمرانِ بشری کے ہیں۔ ہر گروہ ایک نظریئے کا قائل ہے۔ اور اپنے عقیدہ کے موافق زندگی گذار رہا ہے۔ دنیا کا پجاری آخرت کا منکر ہے اور ماحصل زیست کو سمجھتا ہے، اس لئے مخفی اخلاقی سماجی قوانین اور سیاسی و مدنی ضوابط کا عمل اس کی نظر میں بے حقیقت حماقت ہے۔ جائز ناجائز حرام حلال کی بحث بے سود بلکہ بیکار قید ہے۔ انسان نام ہے صرف پیٹ کا پیٹ میں روٹی بدن پر بوٹی برق رفتار موٹر اونچی کوٹھی رقص و سرود کی محفلیں عیش و نشاط کے جلسے کپڑوں کی کشش چہرے کی شہابی چمک پریوں کا جھرمٹ اور غلاموں کا جھمگٹ مقصود حیات ہے اور بس جس کے پاس یہ نہیں وہ بدنصیب ہے۔ پھٹکاری ہے، ذلیل ہے، خوار ہے، زمین کی گردن کا بار ہے، قابلِ شمشیر و دار ہے، لیکن اوّل الذکر عقیدہ کا قائل اس دنیا اور اس کی تمام لذت آفرینیوں کو متاعِ حقیر جانتا ہے۔ زوال پذیر فانی ناقابلِ بھروسہ۔ اس کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں۔ آخرت کی زندگی حقیقی زندگی ہے لافانی زندگی اور اس زندگی کے دکھ سکھ کا سبب اس زندگی کی کارگذاری ہے۔ یہ کھیتی ہے وہ حاصل۔ یہ تخم پاشی ہے وہ ثمر یابی، جب اس معترفِ آخرت کی نظر میں آئندہ زندگی کی تعمیر یا تخریب اسی دنیوی زندگی میں ہوتی ہے تو وہ ایسے ضوابط و اعمال کو اختیار کرتا ہے جو اگلی زندگی میں اس کے لئے سود مند ہوں اور ایسے افکار و اطوار سے بچتا ہے جو آگے اس کو تباہ کرنے والے ہوں۔ سب سے پہلے اس کا بھروسہ خدا ہی پر ہوتا ہے۔ وہ خدا کو طاقتور عالم اور رحیم سمجھتا ہے کمزور غافل اور سنگ دل نہیں کرتا، اس لئے اس کو در در پیشانی رگڑنے اور سوال کا ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان بے ہودگیوں کو شرک کہتا اور خلافِ ایمان قرار دیتا ہے۔ اس کا خدا عاجز نہیں دوسرے سب عاجز ہیں، غافل اور بے خبر نہیں۔ دوسرے سب بے خبر اور ناواقف ہیں ظالم اور بے رحم نہیں۔ دوسرا کوئی بھی خود غرضی سے خالی نہیں اس بات کو دیکھ کر اور سمجھ کر وہ اللہ تعالیٰ ہی سے پوچھتا ہے کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ خدا جو حکم دیتا ہے وہ ویسا ہی کرتا ہے۔ خدا سے پوچھ کر وہ زندگی کے میل کچیل کو صاف کرتا ہے۔ قوتِ شہوانیہ کی بندگی فحش پرستی اور اخلاق کو بگاڑنے والی عیش پسندی نفس انسانی کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ غصہ میں آپے سے باہر ہو جانا گالی کے عوض قتل کر دینا دشمن کے خاندان کو تخس نخس کر ڈالنا۔ اس کے مکانوں باغوں اور کھیتوں کو جلا کر خاکستر کر دینا نفس کو دغیلا کر دیتا ہے، اس لئے قوتِ شہوانیہ کی کج روی ہو یا غضبیہ کی بے اعتدالی وہ دونوں کی کدورت رگڑ رگڑ کر اس سے دور کر دیتا ہے پھر نفس کو روشن بنانے اور چمکانے کے لئے خدا کے زیر حکومت رہ کر ربانی ہدایت کو سامنے رکھ کر اخلاقِ فاضلہ اختیار

کرتا ہے۔ کسی سے کوئی قصور ہو جائے اور اُسے غصہ آ جائے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ کسی پر زیادتی کرنا تو بجائے خود رہا وہ برائی کا بدلہ بقدر برائی لینے کو جائز سمجھتے ہوئے بھی معاف کر دینے کو ظالم کے ظلم کا مصلح اور ناحق کوش کو حق کوش بنانے کے لئے اکسیر سمجھتا ہے، اس لئے اگر اُس کی معافی سے جرم میں غرور اور جرم کی مزید جرأت اور انسانی بستی کی بربادی پیدا نہ ہوتی ہو تو وہ معاف ہی کر دیتا ہے۔ سماج اور مدنیت کے تعلق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ جماعتی معاملات میں کبھی اپنی رائے کی انفرادیت کو قابلِ اعتبار نہیں جانتا چونکہ اپنی رائے کو آخری رائے سمجھنے سے دوسروں کے آراء کی توہین اور پندارِ نفس کی تولید ہوتی ہے، اس لئے وہ جمہوری جماعتی اور سماجی معاملات میں دوسروں سے مشورہ ضرور کرتا ہے اور انفرادی اخلاق سے آگے بڑھ کر جب انسانوں کے باہمی معاشرہ کا سوال آتا ہے تو وہ فقط اپنے ہی جواب کو کافی سمجھتا ہے بلکہ دوسروں سے بھی پوچھتا ہے اور آپس میں جو رائے قرار پکڑ جائے اُس پر عمل کرتا ہے۔ ان تمام اخلاقیات اور سماجیات کی پابندی کے ساتھ دو چیزوں سے وہ کبھی چشم پوشی نہیں برتتا۔ اول تو اپنے خالق رازق رحمٰن رحیم خدا کے سامنے پابندیٔ وقت کے ساتھ شرائط الٰہیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے دست بستہ کھڑا ہوتا جھکتا، دوزانو بیٹھتا اور سربسجود ہوتا ہے اور نماز کی یہ حاضری اُس کی انفرادی نہیں اجتماعی ہوتی ہے۔ دکھاوٹ کی نہیں دل سے ہوتی ہے، خود ساختہ نہیں قانونِ الٰہی کے تحت ہوتی ہے اور نماز کے وقت وہ دنیا اور مافیہا یہاں تک کہ اپنے نفس سے غافل ہو جاتا ہے۔ اُس وقت اس کو سوا خدا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ رگ رگ سے خشوع اور رونگٹے رونگٹے سے خضوع ٹپکتا ہے۔ غرض وہ اقامت صلوٰۃ کرتا ہے۔ دوسرے جماعت انسانی کی اجتماعیت کے سنگِ بنیاد کو بھی جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ غریبوں یتیموں بے کسوں بیواؤں اور حاجتمندوں کی مالی مدد نہ کرنی تباہی کی پیامبر ہے۔ اس کنجوسی سے ملک کے ملک تباہ ہو جاتے ہیں، اس لئے اپنی زندگی کے ضروری سامان سے فارغ ہو کر وہ کل مال دوسرے اہلِ حاجت کی حاجت روائی میں صرف کرتا ہے۔ اس طرح دنیا کے انسانوں میں وہ مساوات اور امن پھیلاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اس قانونِ عدل سے بغاوت کرے اور جمعیت انسانیہ کو برباد کرنے کے درپے ہو جائے تو اس کی سرکوبی سے یہ دریغ نہیں کرتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے باغی کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ جماعتی امن اور عدل کو قائم رکھنے کے لئے ظالم کی کج روی کو دور کرتا اور حق کا بول بالا رکھتا ہے یہ ہے مومن اور وہ ہے کافر، دونوں کے درمیان فرق صرف بھروسہ کا ہے۔ کسی کو خدا کا بھروسہ ہے کسی کو خودی یا ساری خدائی کا۔

تحلیل اجزاء

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کافر کا مطمح زندگی صرف دنیا ہوتی ہے۔ اسی مال منال اور عیش و عشرت کا اس کو بھروسہ ہوتا ہے۔ اسی پر اس کو غرور اور تکبر ہوتا ہے۔ اس کی تردید میں فرمایا کہ تم لوگوں کو اس دنیا میں جو حقیر چیزیں دی گئی ہیں وہ اسی قریب الزوال زندگی کا سامان ہے یعنی ناقابلِ اعتماد فناپذیر بے مقدار ہے۔ اس پر بھروسہ رکھنا اور چند روزہ زندگی پر رکھنا حماقت ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اور آخری زندگی کا سروسامان جو تم کو نہیں دیا گیا ہے اور اللہ نے اپنے پاس ہی رکھا ہے وہ مقدار کیفیت اور مرتبہ کے لحاظ سے بہتر بھی ہے اور ناقابلِ زوال بھی۔ اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا کی بھی ہر چیز ہے، لیکن دنیا کی نعمتیں انسانوں کو یہاں دے دی گئی ہیں۔ اور آخرت ابھی نہیں آئی۔ اُس کی کوئی نعمت اس دنیا میں کسی کو نہیں دی گئی فقط اللہ تعالیٰ کے پاس ہی چھپی ہوئی ہے، اسی لئے اس کو ما عند اللّٰہ فرمایا، لیکن کیا آخرت کی نعمتیں بھی دولتمند کافروں کو ہی ملیں گی یا مومن اور غیر مومن دونوں ان میں شریک ہوں گے یا صرف اہلِ ایمان کے لئے وہ مخصوص ہیں۔ اور اہلِ ایمان میں سے بھی کن لوگوں کو دینے کا قطعی وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا گنہگار نافرمان اہلِ ایمان کو عنایت کرنے کا بھی وعدہ ہے یا اُن کے متعلق کوئی یقینی وعدہ نہیں۔ اللہ چاہے تو دے، نہ چاہے نہ دے۔ اس کی تفصیل کے لئے فرمایا۔

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ یہاں سے لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ تک اُن خصائل حسنہ اور صفات فاضلہ کا بیان فرمایا ہے جو مسلمان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ہم تفصیلی تشریح تو اجزاء آیات کے ذیل میں کریں گے، لیکن مجمل طور پر خلاصہ یہ ہے کہ کافر کا بھروسہ دنیا کے مال متاع اور عزت و حکومت پر ہوتا ہے جس میں سے ہر چیز زوال پذیر ہے، لیکن مسلمان ایمان صحیح کے ساتھ صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتا ہے۔ تمام اسباب دنیاوی

اُس کے ہاتھوں میں اور نظر کے سامنے ہوتے ہیں۔ لیکن اُس کو بھروسہ ایک کا بھی نہیں ہوتا۔ نہ کسی بادشاہ اور امیر کبیر کے خزانوں کا وہ لالچ کرتا ہے نہ کسی کی قہار طاقت سے ڈرتا ہے نہ عیش وراحت پر اتراتا ہے نہ مصائب وشدائد سے بے صبر ہو کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ سوا رضائے مولا کے کوئی چیز اُس کی نظر میں نہیں جچتی اور اس کی توجہ کو اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ اُس کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسا حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتا ہے۔ درستی نظر اور فکر صحیح کے بعد وہ حسب الحکم بڑے بڑے گناہوں سے بچتا ہے۔ جن میں سے کچھ گناہ قوت شہوانیہ کی غلط روی سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ قوتِ غضبیہ کی بے اعتدالی سے نہ فحش پرستی کرتا ہے نہ غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے اگرچہ ذاتی انتقام کی اُس کو اجازت ہے اور برائی کے بدلہ میں برائی کر سکتا ہے، لیکن وہ بہت عالی حوصلہ اور وسیع الظرف ہوتا ہے اس کے پیش نظر اپنے نفس کا انتقام نہیں ہوتا بلکہ دشمنوں کی اصلاح ہوتی ہے، اس لئے وہ دشمنوں اور مخالفوں کی ایذا پر صبر کرتا اور باوجود قدرت انتقام کے درگزر کرتا ہے۔

اُس کے پیشِ نظر اہلِ ایمان کی تنظیم بھی ہوتی ہے۔ وہ دوسرے مسلمانوں سے ہٹ کر سب سے الگ اپنی راہ نہیں بنانا چاہتا نہ اپنی ذات کو دوسروں سے برتر جانتا ہے نہ کسی کو ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے۔ اپنی اس وسعتِ اخلاق کا مظاہرہ سب سے پہلے نماز میں کرتا ہے۔ سب کے ساتھ سب کے برابر کھڑے ہو کر اُنہی قیود وشرائط کے ساتھ جو ایک غریب نادار مسلمان کی نماز کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں نماز پڑھتا ہے نہ اُس کو کسی فقیر کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے سے عار آتی ہے نہ اپنی ذات کو اس سے فوق سمجھتا ہے۔ ایک نماز ایک ہیئت ایک امام ایک قبلہ صف بہ صف شانہ بہ شانہ قدم بہ قدم ایک حالت ایک کیفیت بارگاہِ الٰہی میں دست بستہ سرو قد قیام دوزانو قعود خمیدہ کمر رکوع اور مسکنت وعجز کی زمین پر سر بسجود۔ دوسرے درجہ پر اپنی انانیت اور غرور کو فنا کر دینے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ سیاسی سماجی معاشرتی ملکی کوئی معاملہ ہو امن قائم کرنا ہو یا امن پھیلانا جس کام کا تعلق اجتماعی فلاح اہلِ ایمان سے ہو وہ اہل الرائے سے مشورہ لیتا ہے۔ اپنی ذات کو سب سے اونچا اور اپنی بات کو سب سے بالا نہیں جانتا۔ اپنی رائے کی کمزوری کا اس کو اعتراف ہوتا ہے۔ علو نسب شرف حسب عمومی عزت ہمہ گیر شہرت کثرت ودولت ضیاء فکر اور نور فطانت پر اُس کو گھمنڈ نہیں ہوتا۔ اس لئے دوسروں سے مشورہ کرنا وہ ضروری خیال کرتا ہے تیسرے درجہ پر وہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور اللہ پر توکل کا اعلان اس طرح کرتا ہے کہ اُس کے پاس جو خداداد مال ہوتا ہے وہ اسکو خداداد جانتا ہی اور سمجھتا ہے یہ چیز فانی ہے اللہ نے مجھے دی ہے میرا فرض ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی اس سے مدد کروں، اس لئے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی اور اپنے متعلقین کی ضرورت پوری کرنے کے بعد حسب ہدایتِ الٰہی دوسرے مسلمانوں کی ضرورتوں میں اس کو خرچ کرتا ہے۔ کچھ خود کھاتا ہے کچھ دوسروں کو کھلاتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرتا ہے۔ اپنے اخلاق فاضلہ اور خصائل حمیدہ سے اور اپنے مال سے پھر مسلمانوں کے شیرازہ کو پراگندہ کرنے تنظیم کو بگاڑنے یا شخصی واجتماعی ضرر پہنچانے کے لئے اگر کوئی دشمن حملہ کرتا ہے، مسلمانوں پر زیادتی کرتا اور عدالتِ اسلامیہ کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو وہی مسلمان جو ذاتی انتقام سے ہمیشہ دست بردار رہا مسلمانوں کی اس انفرادی اور اجتماعی بربادی کو برداشت نہیں کر سکتا اور انتقام کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی دینی غیرت خاموش بیٹھا رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ ہے مسلمان اور اُس کی زندگی۔ ایسے مسلمان ہی کے لئے وہ نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جو دنیا میں کہیں موجود نہیں اور پورا ذخیرہ آخرت میں ہے۔ رہے نافرمان مسلمان ان کے متعلق اللہ نے یہ نعمتیں دینے کا وعدہ نہیں فرمایا۔ وہ چاہے دے وہ چاہے نہ دے پھر بھی لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ آخرت کی نعمتیں جن لوگوں کے لئے مخصوص ہیں اُن کی صفات یہ ہیں:-

۱ ایمان صحیح ۲ اللہ ہی پر بھروسہ یعنی تمام جائز تدابیر کو حسب ہدایت قرآنی استعمال کرنے کے بعد کسی کو مؤثر اور کارساز نہ سمجھنا نہ مال ومتاع اور عزت وشہرت اور حکومت پر اعتماد کلی رکھنا نہ کسی زبردست طاقت سے ڈرنا۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ... ۳ عموماً بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز رکھنا یعنی جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اُن کو اختیار نہ کرنا اور جن چیزوں کو لازم بتایا ہے اُن کو کرنا۔ یہ فقرہ تمام منہیات اور مامورات کو شامل ہے۔

وَالْفَوَاحِشَ ۔ یعنی خصوصاً فواحش سے بچنا ۔ فحاشی میں زنا بھی داخل ہے اور لواطت بھی اور ان کے تمام دواعی اور لواطت بھی رقص نامحرم۔ لباس عریاں ۔ سرود نسوانی اور رغناء فاسقانہ کو بھی یہ لفظ شامل ہے ۔

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ۔ یعنی کسی کے قصور پر غصہ آجائے تو انتقام نہ لینا اور باوجود قدرت کے معاف کر دینا ۔ اس سے مراد ذاتی معاملات میں درگزر کر دینا ہے ۔ حضور اقدسؐ نے اپنے نفس کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا ۔ لیکن حرماتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی دیکھ کر حضور والا غضبناک ہو جاتے تھے ۔ (صحیح)

جب حضور والا عمرہ کرنے کے ارادہ سے صحابہ کو لے کر مکہ شریف کے ارادہ سے اور مکہ والوں نے بستی کے اندر داخل نہ ہونے دیا تو حضور مقام حدیبیہ میں فروکش ہو گئے کافروں نے ایک سازش کی ۔ اسی آدمیوں کی ایک جماعت کوہ تنعیم میں چھپ گئی اور شبخون مارنے کا ارادہ کیا ۔ کچھ مسلمان بھی تنعیم پر گئے ہوئے تھے ان کو معلوم ہو گیا اور ایک ایک کو گرفتار کر کے خدمتِ گرامی میں پیش کیا ، حضورؐ نے سب کو معاف فرما دیا ۔ ایسے ہی ایک مرتبہ حضور بھی ایک دست جہاد کو تشریف لے گئے ۔ راستہ میں دوپہر کے وقت پڑاؤ کیا ۔ ایک ایک دو دو آدمی مختلف درختوں کے سایہ میں جا کر لیٹ رہے ۔ حضورؐ بھی ایک درخت کے نیچے استراحت فرما ہو گئے ۔ آنکھ لگی تھی کہ ایک کافر نے آکر درخت سے لٹکی تلوار پر قبضہ کیا اور قتل کے درپے ہو گیا ۔ چشم مبارک کھل گئی ۔ کافر سر پر برہنہ تلوار لئے کھڑا تھا ۔ بولا محمدؐ اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا ، فرمایا اللہ ۔ کافر پر اس لفظ کو سن کر لرزہ طاری ہو گیا ۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی ۔ حضورؐ نے اٹھا لی اور فرمایا اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا ۔ وہ خوشامد کرنے لگا ۔ حضورؐ نے معاف فرما دیا ۔

لبید بن اعصم یہودی نے حضورؐ پر سحر کیا تھا ۔ حضورؐ کو معلوم ہو گیا لیکن معاف فرما دیا ۔ مرحب یہودی کی بہن نے کھانے میں زہر ملا کر حضورؐ کو کھلایا حضورؐ کو بقوتِ نبوت معلوم ہو گیا ملزمہ نے اقرار بھی کر لیا ، مگر سرکار نے معاف فرما دیا البتہ بشر بن براء چونکہ اس زہریلے کھانے سے شہید ہو گئے تھے اُن کے انتقام میں یہودیہ کو قتل کیا گیا ۔

ایک شخص نے حضور والاؐ کی خدمت میں صدیق اکبر کی موجودگی میں حضرت ابوبکر کو برا کہنا شروع کیا ۔ حضورؐ سن کر مسکراتے رہے جب اس کی بدگوئی حد سے بڑھ گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی کوئی جواب دیا یہ سنتے ہی حضور غضبناک ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ صدیق اکبر کو بھی اس کا احساس ہوا فوراً قریب پہنچ کر عرض کیا یا رسول اللہ جب تک وہ شخص برا کہتا رہا حضور سماعت فرماتے رہے ۔ جب میں نے اس کی بات لوٹائی تو حضور کو غصہ آگیا ۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے فرمایا (وہاں) میں دیکھ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے اس کی بات اسی پر لوٹا دیتا تھا ، لیکن جب تم نے اُس کی بات لوٹائی تو ایک شیطان وہاں آگیا اور شیطان کے پاس بیٹھنا مجھے پسند نہ تھا (میں اُٹھ کھڑا ہوا) ابوبکر تین باتیں ہیں اور تینوں سچی ہیں ۔ ایک یہ کہ اگر کسی پر کچھ ظلم ہو جائے اور وہ اللہ کیلئے اُس تلخی کو برداشت کر لے تو اللہ تعالیٰ اُس کے عوض اس کی عزت اور نصرت بڑھاتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ جو شخص اپنے قرابت داروں اور دینی بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا دروازہ کھولتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اُسے زیادہ دیتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ جو شخص مال جمع کرنے کی نیت سے بھیک مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نحوست سے اُس کی تنگی بڑھا دیتا ہے ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد)

ابراہیم نخعی (تابعی) نے فرمایا صحابہ کا یہ طریقہ تھا کہ ذلیل ہونے کو برا سمجھتے تھے اور قابو پا لیتے تھے تو معاف فرما دیتے تھے ۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ قصور معاف کر دینے کا حکم اُس وقت ہے جب مجرم اور ظالم کی جرأت اور جرم کرنے کی ہمت میں اضافہ نہ ہو ۔ اپنے کئے پر پشیمان ہو اور معافی پا کر اُس کے اندر غرور نہ بڑھ جائے یعنی تکبر نہ کرنے لگے ۔ اگر معافی کا نتیجہ اس کے خلاف برآمد ہونے کا خطرہ ہو تو آیت میں ایسے عفو کو قابلِ مدح نہیں قرار دیا نہ اس قسم کی معافی سے آیت کے مفہوم کا کچھ تعلق ہے ۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو ماننا یعنی کسی پیشوا لیڈر ، پیر ولی شیطان باپ دادا رسم و رواج شاہی حکم اپنی رائے اور خواہش غرض کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں) اور ہر ایک کے حکم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو ترجیح دینا ۔

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۔ یعنی اقامت الصلوٰۃ کی تشریح ہم بہت جگہ کر چکے ہیں ۔ نماز باجماعت میں فراموش شدہ رشتۂ عبدیت کو جوڑ نا غرور نفس کی

سرکردہ مسلمانوں کی خصوصی تنظیم امیر کی اطاعت، مساوات کا مظاہرہ اور بکثرت دوسرے فوائد ہیں۔ جن کی تفصیل کی یہ جگہ نہیں۔ یہ بھی مسلمان کا ہی شیوہ ہے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ تنظیم کو قائم رکھنے پر خود غلطی میں مبتلا ہو نے اپنی رائے کو صحیح اور دوسروں کی رائے کو غلط نہ سمجھنے کے لئے تمام سماجی سیاسی معاشرتی امور میں اہلِ بصیرت کا مشورہ طلب کرنا اور طے شدہ رائے پر عمل کرنا۔ ضحاک سے مروی ہے کہ جب اہلِ مدینہ کو اطلاع ملی کہ قریش میں ایک نبی نے ظہور کیا ہے تو سرداران قوم ابوایوب انصاری کے مکان میں جمع ہوئے اور مشورہ کے بعد طے کیا کہ ہر پیغمبر مبعوث پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا چاہیئے۔ آیت میں اسی مشورہ کی طرف اشارہ ہے۔ ہم اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔ مدینہ میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک یہودی دوسرے بنو قیلہ جو یمن سے ہجرت کر کے آئے تھے اور مدینہ میں آباد ہو گئے۔ یہودی پڑھے لکھے تھے، مگر کمزور۔ بنو قیلہ یعنی اوس اور خزرج کے خاندانوں والے طاقتور تھے۔ دونوں باہم مخالف تھے۔ یہودی بنو قیلہ سے کہا کرتے تھے کہ پیغمبر آخر الزماں کی بعثت کا زمانہ قریب ہے۔ ہم ان کے ظلِ عاطفت میں رہ کر تم کو تباہ کر دیں گے۔ بنو قیلہ کو یہ باتیں سن کر تعجب ہوتا تھا۔ کچھ ہی زمانے کے بعد اہلِ مدینہ کو بعثتِ مبارک کی اطلاع ملی۔ یہودیوں نے قریش کی معرفت حضورؐ سے تین باتیں دریافت کرائیں جب اُن کو ایسا جواب ملا کہ بغیر وحی کے ملنا ممکن نہ تھا تو ان کو حضورؐ کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ اور ایک وفد خدمتِ گرامی میں بھیجا۔ لیکن قریش کی روک ٹوک کے سبب یہ وفد بارگاہِ نبوت تک نہ پہنچ سکا۔ ادھر حضورؐ کی ناداری کمزوری اور قریش کی قوت و مخالفت کا علم ہوا تو چونکہ سرمایہ دار مصلحت بین اور موقع شناس تھے۔ اس لئے یقین تردد سے بدل گیا۔ اسی دوران میں بنو قیلہ کے دونوں خاندان اوس اور خزرج باہم لڑ پڑے کچھ یہودی ایک طرف کچھ دوسری طرف ہو گئے۔ خون ریز جنگ ہوئی۔ آخر ہوش آیا عقلمندوں نے پنچایت کر کے آپس میں صلح کرا دی۔ تجویز کی گئی کہ دونوں خاندانوں کا ایک ہی سردار ہونا چاہیئے۔ تفریقِ سیادت سے قوم میں پھوٹ پڑتی ہے۔ سب نے متفق الرائے ہو کر عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنانا چاہا۔ ساری قوم کمزور ہو چکی تھی اور ضعیف العقیدہ ہو گئی تھی۔ خیال کیا کہ اوّل مکہ کو جا کر منات دیوی کو راضی کرنا چاہیئے وہ ناراض ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ تباہی آئی ہے۔ دوسرے قریش سے بھی یہ معاہدہ کر لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری اس کمزوری سے عرب کا کوئی قبیلہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے اور چڑھائی کر دے۔ قریش جب ہمارے حلیف ہو جائیں گے تو پھر کسی کو بھی یہ ہمت نہیں پڑے گی کہ ہم پر حملہ کر سکے۔ یہ سوچ کر دونوں گروہوں نے اپنے اپنے نقیب اور نمائندے مکہ کو بھیجے۔ حج کا موسم تھا۔ ان نمائندوں نے میدانِ حج میں حضور والاؐ کو تقریر کرتے دیکھا اور کلامِ مبارک سنا گرویدہ ہو گئے۔ جس غرض سے مکہ آئے تھے وہ تو بھول گئے۔ رات کی تاریکی میں پہاڑ کی گھاٹی کے اندر حضور والاؐ سے تنہا ملاقات کی باتیں سنیں اور کہیں اور واپس آ کر اپنے اپنے خاندانوں والوں سے پوری سرگزشت بیان کی۔ دوسرے سال سب نے متفق الرائے ہو کر ابوایوب کے مکان میں جمع ہو کر مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد کچھ نمائندے منتخب کر کے خدمتِ گرامی میں بھیجے۔ اسی مشورہ کی طرف ضحاک کے قول میں اشارہ ہے۔ اس تقدیر پر اس آیت کا نزول بنو قیلہ کے حق میں قرار پائے گا، لیکن سیاقِ آیات اس کے خلاف ہے۔ آیات میں مومن کی صفات بیان کی ہیں جن میں ایمان اقامتِ صلوٰۃ وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے والوں نے وقتِ مشورہ تک ایمان قبول نہیں کیا تھا۔ چند آدمیوں کے ایمان کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی عموماً بنو قیلہ اُس وقت تک حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے آیت کو اگر عام مومنوں کے لئے متعلق قرار دیا جائے تو زیادہ صحیح ہے اور شانِ نزول کو اگر صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی مراد عمومی ہے۔ ہر مومن با عمل حکمِ آیت میں داخل ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی دستگیری نہ کرنے سے آخر میں پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ طبقات کا اختلاف ہو کر آپس میں پھوٹ پیدا ہوتی ہے اور شیرازۂ اجتماعیت میں پراگندگی آ جاتی ہے، اس لئے مومن بقدرِ امکان دوسروں کی مالی مدد کرتا ہے۔ آیت میں مِنْ تبعیضیہ ہے اس سے کچھ اہلِ علم نے یہ سمجھ لیا کہ مال کا کچھ حصہ غریبوں کی مدد میں صرف کیا جائے کچھ خود صرف میں لایا جائے باقی کو پیش آنے والی ضروریات کیلئے پس انداز کر لیا جائے، مگر تبعیض کا یہ مفہوم آیت میں مراد نہیں ہے۔ آیت مکی ہے اور مکی زندگی مسلمانوں کے لئے بہت سخت تھی۔ کمائی کے دروازے تقریباً بند تھے۔ قوم کی طرف سے ہر طرح کی ترکِ موالات ہو چکی تھی۔ مدت تک تو مسلمان کے ہاتھ کوئی کھانے پینے اور برتنے کی چیز بھی فروخت نہ کرتا تھا، عموماً کمزور طبقہ ہی مسلمان ہوا تھا۔ چند مالدار تھے، اس لئے سب کا قرار پایا تھا کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضرورت سے جو

مال بچے وہ سب کا سب مسلمانوں کی امداد میں خرچ کیا جائے۔ جمع کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ مدینہ کی ابتدائی زندگی میں بھی یہی حکم تھا، جب مسلمان پوری طرح آزاد ہو گیا اور کمائی کے دروازے اس کے لیے کھل گئے تو مقررہ زکوٰۃ کا حکم ہوا، لیکن اسلامی ضرورت اور مسلمانوں کی حاجت کو مقدم سمجھا گیا۔ مقررہ زکوٰۃ تو بہر حال لازم تھی۔ اس سے زائد وقت ضرورت وقت امداد لازم رہی، اس لئے جمع کرنے کی اجازت تو بہر حال ہر وقت میں نہ ہوئی۔ مسلمان کی زندگی اور عزت کی حفاظت کے بعد جو مال بچے اُس کو جمع کرنا جائز ہو سکتا ہے، اس لئے بعض مفسروں نے آیت سے صرف زکوٰۃ مراد لی ہے۔ یا ینفقون کے لفظ سے ہر وقت جمع کرنے کی اجازت کا استفادہ کیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ رَزَقْنٰـهُمْ کا لفظ تو صاف بتا رہا ہے کہ دینے والا خدا ہے۔ کسی کی اپنی کوشش تحصیل مال کا موجب نہیں، اس لئے مالی محبت کو حکم خداوندی پر ترجیح دینی خلاف دانش ہے اور دینے کا احسان رکھنا بھی نظریۂ ایمان کے خلاف ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ۔ اگر کوئی زیادتی کرے تو اس سے انتقام لینا۔ اہل تفسیر نے اس آیت میں لفظ بغی کو عام معنی پر محمول کیا ہے یعنی کوئی مسلمان کسی مسلمان پر زیادتی کرے یا غیر مسلم مسلم پر ظلم کرے دونوں کا انتقام لینا جائز ہے۔ میرے نزدیک یہ مطلب غیر اولیٰ اور سیاق و سباق کے خلاف ہے۔ کیونکہ زیادتی کا انتقام اگرچہ جائز ہے، لیکن قابل ستائش نہیں، عفو اولیٰ ہے۔ گزشتہ آیت میں يَغْفِرُوْنَ اور آئندہ آیت میں فَمَنْ عَفَا کے الفاظ ترغیب عفو دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آئندہ آیت میں انتقام کا جواز مذکور ہے پھر اس جگہ ذکر کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے اگر اس جگہ بغی سے بغاوت مراد لی جائے تو افضل ہے یعنی جب کسی طرف سے بغاوت ہو رہی ہو خواہ غیر مسلم مسلمانوں کی حکومت پر جارحانہ حملہ کر دیں یا کوئی مسلمان اسلامی جمعیت کو تباہ کرنے اور جماعت میں پھوٹ ڈالنے کیلئے ہتھیار اٹھائے تو ایسے وقت میں ہر مومن کا فرض ہو جاتا ہے کہ اسلام کی مدد کرے جتنی کوشش ممکن ہو کرے اور مسلمانوں کی تنظیم و وحدت کو بگڑنے نہ دے یہ فعل ضرور قابل مدح ہے اور واجب العمل ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ برائی کا بدلہ بقدر برائی لینا جائز ہے یہ عام ضابطہ ہے۔ ہر مسلمان اُتنا بدلہ لینے کا حق رکھتا ہے جتنی اُس پر زیادتی ہوئی، لیکن معاف کر دینا بہتر ہے۔ معاف کر دینے کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو جاتا ہے، لیکن عفو کر دینے کی ایک شرط ہے وہ ہے اصلاح۔ بہت آدمی شریف النفس اور راسخ الاسلام ہوتے ہیں۔ نادانی اور اغوا کے زیر اثر ان سے بے ساختہ کسی مسلمان پر زیادتی ہو جاتی ہے، ہو جانے کے بعد ان کو خود پشیمانی ہوتی ہے اور وہ معافی کے طالب ہوتے ہیں اور آئندہ کے لئے عہد کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معاف کر دینے سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں سے بلا ارادہ کسی مسلمان پر زیادتی ہو جاتی ہے جب وہ دماغ کی یکسوئی کے ساتھ سوچتے ہیں تو ان کو اپنے قصور پر ندامت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ قابل معافی ہیں۔ ان کو معاف کر دینا اسلامی شیرازہ کو منتشر نہیں ہونے دیتا، مسلم معاشرہ اور تنظیم جماعت میں رخنہ نہیں پڑتا۔ سلیم الطبع انسان عفو قصور کے بعد مددگار دوست بن جاتا ہے۔ اس طرح مسلم سماج بگاڑ سے بچ جاتا ہے۔ جماعتی تنظیم کو سنوارنے بنانے اور تباہی سے بچانے کا اجر اللہ تعالیٰ دینے والا ہے دنیا میں بھی وہ اس کا اجر عزت مودت حکومت اقتدار اور شوکت و سطوت کی شکل میں دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہی اس کا ثواب عطا فرمائے گا۔ انسان اگر اپنا انتقام اپنے ہاتھوں میں لے لے تو بھڑکتے جذبے کی تسکین کے سوا کچھ نہیں ملتا اور معاف کر دے تو اس کا عظیم الشان اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ انتقام ذاتی کا اثر صرف انتقام لینے والے کی ذات تک محدود رہتا ہے اور درگزر عفو پوری اسلامی جماعت کی تنظیم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پوری جماعت کی شیرازہ بندی جس شخص کے فعل سے ہوگی اس کا کامل ثواب سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کون دے سکتا ہے۔

لیکن یاد رکھو کہ ابتدائی ظلم ہو کہ ظلم کے انتقام میں اصل قصور سے بڑھ کر بدلہ دونوں صورتیں ظلم کی ہیں۔ بیشک بدی کا انتقام لیا جا سکتا ہے اور بدی کا عوض بدی ہو سکتی ہے، لیکن جرم سے زیادہ بدلہ بھی ظلم ہے اور ظلم خدا کو پسند نہیں۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ قانون عدل کا سوسائٹی میں اجراء ضروری ہے اور عدل نام ہے اس بات کا

کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے اور حق تلفی بھی نہ کرے نہ عزت کا نقصان نہ مال کا۔ نہ جسمانی دکھ نہ جان کا ضرر۔ اگر کوئی ایسا کر گزرے اور کسی کے قول و عمل سے کوئی ذاتی ضرر نہ پہنچ جائے تو انتقام بقدر ظلم کے ضابطہ کے زیر اثر وہ بدلہ لے سکتا ہے اور اگر مظلوم اپنا بدلہ بقدر ظلم لے لے تو اس کو ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس سے انسانی معاشرہ تباہ نہیں ہوتا اس کو تخریب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فساد اور بغی فی الارض نہیں نہ یہ ظلم ہے۔

اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور حق تلفیاں کرتے اور معاشرہ کو تباہ کرتے اور ناحق ملک میں زیادتیاں کرتے ہیں۔ سبیل کا معنی ہے راستہ یعنی جرم الزام یا سزا کا راستہ۔

اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ۔ انہی کے لئے عذاب ہے۔ دنیا میں بھی قید بند ہاتھ کٹنے رسوائی اور ذلت اٹھاتے اور سوسائٹی میں بدنام ہو جانے کا اور آخرت میں دوزخ کا۔ مراد یہ کہ انتقام بقدر ظلم لینے والے عذاب کے مستحق نہیں۔ استحقاق عذاب ظالموں کے ساتھ مخصوص ہے۔

وَ لَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ۔ انتقام بقدر ظلم اگرچہ اپنے دکھ کے مقابلے میں جائز ہے اور یہ فعل قابل مذمت بھی نہیں ہے نہ اس سے معاشرہ تباہ ہوتا ہے پھر بھی جوئی کے اخلاق کے خلاف ہے۔ عالی ہمتی اور بلندی حوصلہ تو یہ ہے کہ جو دکھ اذیت نقصان مالیہ اور ضرر پہنچ گیا اس پر صبر کیا جائے۔ قوت غضبیہ کو قابو میں رکھا جائے۔ ذاتی انتقام کی طلب ہی نہ کی جائے اور (اگر ظالم کو معافی مغرور اور مزید سرکش نہ بنا دے تو) اس کو معاف کر دیا جائے۔

مقصود بیان

فَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ سے بطور رسالت ساری دنیا اور متاع دنیا کے حقیر اور رو بزوال ہونے پر تنبیہ اور آیت مَا عِنۡدَ اللّٰہِ میں آخرت کے عیش و تنعم (خواہ وہ عیش کتنا ہی قلیل ہو) کے تمام دنیوی نعمتوں سے اعلیٰ اور ناقابل زوال ہونے کی صراحت ہے اور دونوں جملوں کا مجموعہ بالاشارہ تعلیم دے رہا ہے کہ متاع دنیا اور اقتدار مادی سے وابستگی نہ رکھی جائے۔ اور انہی کو اولین مقصد حیات نہ بنایا جائے بلکہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں پیش آنے والی راحتوں مسرتوں اور نعمتوں کو ہی غایت زندگی قرار دیا جائے، لیکن یہ اخروی عزت راحت اور نعمت صرف ایمان والوں کا حصہ ہے۔ ایمانداروں کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں مندرجۂ آیات اوصاف ہوں۔

۱۔ عقل میں روشنی اور حقیقت رسی کی خصوصیت ہو۔ ان کی نظر اور فکر سطحی نہ ہو۔ یعنی دنیا کی طاقت عزت حکومت نعمت راحت اور صحت پر ان کا فکری بھروسہ نہ ہو۔ ناپائیدار چیزوں کو وہ ناپائیدار ہی سمجھتے ہوں ثبات بقاء اور کارسازی کا اعتماد ان کو کسی چیز پر نہ ہو انکی تہ رس دانش کو اللہ کی محیط کل قدرت مشیت اور ربوبیت تمام کائنات کی حاکم مطلق نظر آتی ہو، اس لئے ان کا حقیقی توکل اللہ ہی کی ذات پر ہو ۲۔ ان کی شہوانی قوت اور نفسانی طاقت ان کے کنٹرول میں ہو اسی لئے وہ فواحش اور دوسرے بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب رکھتے ہوں۔

۳۔ ان کی قوت غضبیہ بھی عقل کی تابع ہو۔ اگر غصہ آ جائے تو معاشرہ کی تباہی کا باعث نہ ہو۔ ذاتی انتقام کو چھوڑ کر وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والوں کے جرم کو معاف کر دیتے ہوں اور ان تمام امور کے ساتھ وہ اللہ کے فرماں بردار، اطاعت گزار اور اہل حاجت کے ہر وقت مددگار رہوں۔ نماز پابندیٔ وقت و شرائط کے ساتھ باقاعدہ ادا کرتے ہوں۔ مقررہ فرض زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور اگر مسلمانوں کو ضرورت پڑ جائے تو صدقہ نافلہ دینے اور غیر واجب مالی امداد کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے ہوں۔ آیت ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ سے انتقام بقدر جرم کا جواز مستفاد ہو رہا ہے مگر عفی و اصلح کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ عفو اور انتقام سے بہتر ہے بشرطیکہ جذبۂ اصلاح کارفرما ہو اور عفو سے ظالم کو مزید ظلم کا حوصلہ نہ پیدا ہو جائے۔

تحلیل اجزاء

وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ وَّلِیٍّ قوت فکریہ کو روشن کرنا اور افکار صحیحہ پیدا کرنا شہوانی اور غضبی طاقتوں کو عقل فطری اور ہدایت خلقی کے تابع بنا دینا اللہ کا کام ہے اس میں کسی محسوس نیم محسوس اور غیر محسوس مخلوق کو دخل نہیں۔ اگر اللہ فکر صحیح نہ پیدا کرے اور دانش و روحانیت کو مادی طاقتوں کا حکمران نہ بنا دے تو پھر کوئی ہستی بھی انسان کو راہ راست نہیں دکھا سکتی۔ دانش اور حق کی راہ گم ہو جاتی ہے وہ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کو تلاش کرتے اور ہر ایک سے ہدایت و اعانت کی آس لگاتے ہیں مگر بے سود۔ کوئی ان کا مددگار

اور کارساز نہیں ہوتا۔ نتیجہ میں زندگی بھر راہِ صداقت سے محروم رہتے ہیں اور یونہی اس دارالایمان اور عالم عمل سے درگزر کر جاتے ہیں۔ جب قیامتِ کبریٰ کا دن ہوگا اور دوبارہ زندگی ملے گی اور اول زندگی کی غلط روی کا نتیجہ ان کی نظروں کے سامنے آئے گا اور محسوس طور پر جان لیں گے کہ دنیا میں ہم غلط راستے پر تھے تو پشیمان ہوں گے اور دارالجزاء سے دارالعمل کی طرف دوبارہ لوٹ کر جانے کی تمنا کریں گے، مگر ماضی کا حال بننا ناممکن ہے۔ خرگاہ نتیجہ سے بنگاہ عمل کی طرف لوٹنا محال ہوگا۔ ان کی دکھ بھری حالت کو دیکھ کر اہلِ ایمان کہیں گے دنیوی زندگی تو گزر گئی۔ دکھ سکھ اور رنج و راحت جو کچھ تھا ختم ہو گیا زندگی کا سرمایہ جس بیوپار میں لگانا تھا لگ گیا۔ اب تو زندگی کے تمام کھاتوں کے حساب کا دن ہے۔ گھٹا و بڑھاؤ جمع منہائی جو کچھ کتابِ زندگی میں درج ہے وہ سامنے آنے کا وقت ہے۔ زندگی کس کے ہاتھ بیچی لمحاتِ زندگی کے عوض کیا حاصل کیا۔ اس وقت سب تفصیل سامنے آئے گی۔ دنیا میں تکلیف سے زندگی گزری یا آرام سے اس کا اعتبار نہیں۔ اصل گھاٹے میں ان کی زندگی ہے جن کو آج گھاٹا اٹھانا ہے جنہوں نے اپنے کو بھی نقصان پہنچایا اور اپنے متعلقین کو خسران مآل بنایا۔ ایسے ظالم جنہوں نے اپنی زندگیوں کو غلط داؤں پر لگایا تھا اور اوقاتِ زندگی کا بیجا استعمال کیا تھا۔ سدا قائم رہنے والے دکھ میں رہیں گے۔ ہمیشہ سزا بھگتتے رہیں گے۔ دنیا میں جن ہستیوں پر ان کا بھروسہ تھا اور جن کو وہ اپنا مددگار سمجھتے تھے۔ کوئی بھی ان میں سے ان کو راہِ حق دکھانے والی نہ تھی۔ ہر ایک موجب گمراہی تھی۔ قیامت کے دن بھی ان کا کوئی حامی نہ ہوگا اور اللہ کے مقابلے میں نجات کا راستہ کوئی بھی نہ بتا سکے گا۔ راہِ سعادت و نجات انسان سے گم کر دے گا جس طرح راہِ صداقت کو دیکھنے اور ان پر چلنے سے اللہ تعالیٰ نے محروم کر دیا تھا۔ اسی طرح جنت کی راہ سے محروم رکھے گا۔

تمام آسمانی کتابوں کے موافق قرآن کا بھی اعلان ہے کہ گمراہی اور ہدایت کو پیدا کرنا اور کسی کو گمراہ یا ہدایت یاب بنا دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ گمراہ ہیں وہ فلسفی جو اپنی فکری قوتِ تخلیق پر مغرور ہو کر اللہ کی غیبی توفیق کا انکار کرتے اور اپنی دانش کو زندگی کی پُر پیچ پگڈنڈیوں کی راستی اور کجی کے فیصلہ کرنے اور شناخت کر لینے کا مختار کل سمجھتے ہیں اور نہایت ہی کوتاہ نظر ہیں۔ اسلام کے جہمیہ اور معتزلہ فرقوں والے جو فرسودہ بوسیدہ فلسفہ کی تقلید میں انسان کو اپنے افعال کا خالق قرار دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جب انسان کا خالق خدا ہے تو اس کے اچھے برے افعال کا خالق اور کون ہو سکتا ہے۔ اکابر معتزلہ نے آخر میں یہی سوچا کہ خیر و شر کا فیصلہ کرنا اور زندگی کے راست یا کج راستہ پر چلنا اگرچہ بظاہر انسان کا اختیاری فعل ہے، مگر افعالِ انسانی کا خالق بھی خدا ہی ہے کیونکہ انسان انسان کی اچھی بری قوتیں اُسی کی مخلوق ہیں، مگر عام معتزلہ نے اپنی ہٹ نہیں چھوڑی۔ سچ ہے جس کو اللہ گمراہ کر دے اور گمراہ چھوڑ دے اس کی کون حمایت کرے اور کون راہِ حق بتائے۔

گزشتہ آیات میں اللہ نے قانونِ عدل بتایا تھا اور عدل حقوق سے آگے بڑھ کر اپنے فطری حق سے دست برداری کو علو ہمت اور بلندی حوصلہ کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ کوتاہ نظر قومیں اور فلسفہ کے علمبردار اس آفتاب جیسی تعلیم کی روشنی نہ دیکھ سکے۔ کوئی افراط میں پڑ گیا کوئی تفریط میں کسی نے عفو و تحمل کو اپنی کتابِ زندگی سے مٹا دیا اور کسی نے حصولِ اقتدار اور لذت کوشی کے سیلاب میں بہہ کر قانونِ تعادل و توازن کو بھی پارہ پارہ کر دیا اور نہیں سمجھے کہ ہر شخص نہ بلند حوصلہ ہے نہ ہو سکتا ہے، اس لئے عفو کا جبری قانون جاری نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح نہ ہر شخص عدل کوش ہے نہ اپنے حق پر قانع رہنے والا۔ معاشرہ میں بکثرت ایسے بدمعاش اور بدقماش بھی ہیں جو معاشرہ کے امن و سکون اور شانتی کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر انتقام اور بقدرِ جرم و سزا ضروری نہ قرار دی جائے تو انسانی سوسائٹی تباہ ہو جائے۔ پس ہدایتِ عمومی کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے بیان کر دیا کہ جرم کی سزا بھی اپنے موقع پر ضروری ہے اور عفو و تحمل بھی بلندی حوصلہ کی نشانی ہے۔ اگر اتنی واضح حقیقت بھی سمجھ میں نہ آئے تو پھر کون ہے کہ ایسے فطری گمراہ کو راہِ حق دکھا سکے۔

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ سے مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ تک۔ ایسے لوگ ظالم ہیں۔ زندگی کی ساری طاقتوں کا غلط استعمال کرنے والے نہ فکر صحیح نہ عمل درست۔ اس زندگی میں وہ اپنے افکار کو روشن اور اعمال کو درست جانتے ہیں۔ غلط روی کا ان کو شعور نہیں ہے، لیکن قیامت کے دن یہی ناحق کوش زندگی کی طاقتوں کا غلط استعمال کرنے والے اور اوقاتِ حیات کو بیجا صرف کرنے والے جب آنکھوں سے اپنے افکار و کردار کی سزا دیکھ لیں گے اور عذاب کو دفع نہ کر سکیں گے تو پھر دنیا کی طرف واپس جانے اور از سرِ نو زندگی کی راہِ مستقیم پر چلنے کی تمنا کریں گے۔ ان کی بے چینی، مایوسی اور اضطراب کی عجیب

حالت ہوگی آگ کے سامنے لائے جائیں گے تو نظر اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہ ہوگی کن آنکھوں سے دیکھیں گے اور ذلت کے مارے منہ اوپر نہ کر سکیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے عَذَابٍ مُّقِيْمٍ تک۔ عذاب کی یقینی تکلیف ذلت نفس اور مایوسی کی حالت کے ساتھ ان ناحق کوشوں کو ایک دکھ یہ ہوگا کہ جن مومنوں کو وہ بیوقوف ذلیل اور بدحال بدآل سمجھے ہوئے تھے وہی) مومن (بطور طعن یا بصورت شماتت) کہیں گے کہ حقیقت میں زندگی کے سودے میں گھاٹا پانے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے خود بھی آج گھاٹا پایا۔ ساری زندگی کا سرمایہ برباد کیا اور اپنے گھر والوں کو بھی نقصان پہنچایا کہ وہ ان کی وجہ سے بدعقیدہ اور گمراہ ہوئے۔ سچ ہے کہ گھر کے سرپرست اور سردار کی گمراہی دوسروں کے لئے گمراہ کن بھی ہوتی ہے۔ وہ خود تو برباد ہوتا ہے اپنے متعلقین کو بھی برباد کرتا ہے۔ ایسے ظالم یعنی بداعمال مشرک ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کبھی نجات نہیں پائیں گے۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ سے مِنْ سَبِيْلٍ تک۔ دنیا میں راہ حق بتانے والا سوا اللہ کے کوئی نہیں۔ آخرت میں بھی راہ نجات و سعادت دکھانے والا اللہ کے سوا کوئی نہ ہوگا اور ظالموں کو دنیا میں اللہ نے جس طرح راہ صداقت سے محروم رکھا تھا اسی طرح آخرت میں ان کو نجات اور جنت کے راستے سے محروم رکھے گا۔ اور جس طرح دنیا میں کوئی شخص اللہ کے مقابلہ میں ہدایت اور رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح آخرت میں بھی اُن کا کوئی حمایتی اور مددگار و کارساز نہ ہوگا۔ تمام دوست احباب باطل معبود گمراہی کے پیشوا کوئی بھی کام نہ آئے گا۔

مقصود بیان

آیت وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ الخ دلالت کر رہی ہے کہ گمراہ کرنے والا حقیقت میں خدا ہے پس غلط خیال ہے مسلمانوں کے ان فرقوں کا جو گمراہی کو انسان کی تخلیق کہتے ہیں۔ اس آیت سے بطور اشارہ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان میں گمراہ کرنے کی حقیقی طاقت نہیں۔ انس ہو یا جن یا نفس امارہ سب گمراہی کے ذرائع اور پرزے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان پرزوں کو معطل کر دیا جائے۔ اور اللہ جس کو گمراہ کرنا نہ چاہے اس کو کوئی گمراہ نہ کر سکے۔ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کو دیکھ کر کافر دنیا میں واپس جانے کی تمنا کریں گے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اہل ایمان کافروں کی بری حالت دیکھیں گے اور طعن یا شماتت کریں گے۔

اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الخ سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ حقیقی واقعی نامرادی آخرت کی نامرادی ہے یعنی دنیا کا گھاٹا ناقابل اعتبار ہے۔ ایک امر یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ گھر کا سرپرست یا کسی قوم کا سردار اگر خود بگڑتا اور گمراہ ہوتا ہے تو وہ سارے متعلقین کو برباد کر دیتا ہے یعنی اس کے نامۂ اعمال میں ساری قوم کی گمراہی لکھی جاتی ہے۔ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ کے لفظ سے کافروں کے عذاب کا عدم انقطاع ثابت ہو رہا ہے۔ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ کافروں کی کوئی حمایت نہیں کرے گا۔ مسلمان گناہگاروں کے لئے صالحین کی شفاعت کی نفی نہیں ہوتی وغیرہ۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ

تم اپنے رب کا حکم مان لو قبل اس کے کہ ایسا دن آپہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا نہ تم کو اس روز پناہ ملے گی اور

يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ

نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے پھر اگر یہ لوگ (دین کو بھی) اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان پر نگران کر کے نہیں بھیجا (جس سے

عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ

آپ کو ان کی باز پرس کا احتمال ہو) آپ کے ذمہ تو صرف (حکم کا) پہنچا دینا ہے اور ہم جب (اس قسم کے) آدمی کو اپنی عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس پر خوش

سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

ہوجاتا ہے اور اگر (ایسے) لوگوں پر ان کے ان اعمال کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے اللہ ہی کی سلطنت ہے

وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝

آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے

اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

یا اُن کو جمع کر دیتا ہے بیٹے اور بیٹیاں بھی اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے بیشک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

تفسیر آسمانی کتابوں اور دین انبیاء کا دعویٰ ہے اور اہلِ دانش نے اس کو تسلیم بھی کیا ہے اور عقلِ سلیم کی روشنی میں اس کو ثابت بھی کیا ہے کہ انسانی زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے والے قوانین انسانی اختراع کے ممنون نہیں ہو سکتے۔ اللہ ہی زندگی کو گذارنے کے ضوابط بنانے اور جاری کرنے کا مالک مختار ہے کیونکہ وہی ساری کائنات کا خالق اور حکمران ہے پس اسی کو حق ہے کہ انسان کے لئے شریعت بنائے اور سب کو اس پر چلنے کی دعوت دے۔ وہی پکار رہا ہے کہ لوگو قیامت آنی یقینی ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور اعمال کی جزا سزا بھی ضرور ملے گی کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ اس لئے اللہ کی پکار کو سنو۔ اس کی دعوت پر چلو اور اس کے بھیجے ہوئے دستور کو زندگی کا دستور مانو۔ اپنا یہ پیام پہنچانے کے لئے اللہ نے پیغمبروں کو بھیج دیا اور لوگوں تک اس پیام کو پہنچا دینا اُن کا فرض قرار دیا کسی کے ماننے نہ ماننے کا پیغمبر کو مکلف نہیں کیا اور صاف فرما دیا کہ تمہارا کام ہمارا پیام پہنچانا ہے تسلیم کرانے اور عامل بنانے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، لیکن عام طور پر انسان بڑا کوتاہ بین اور صرف محسوس پر یقین رکھنے والا واقع ہوا ہے وہ قوتِ فکریہ سے بہت کم کام لیتا ہے۔ فقط جذبات اور نفسانی عواطف کا بندہ ہے۔ اگر اللہ کی دی ہوئی کوئی نعمت (جو باطنی وظاہری نعمتوں کے مقابلے میں ادنیٰ ترین ہوتی ہے) اُس کو مل جاتی ہے تو اتراجاتا ہے۔ اکڑجاتا ہے۔ اپنی سعی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اپنی فکر اور کوشش کو حقیقی کارساز خیال کرنے لگتا ہے، لیکن اگر اسی کی بداعمالی اور ناشکری کی وجہ سے اللہ کی طرف سے اس پر کوئی حقیر ترین دکھ آجاتا ہے بیماری، نقصان مالی تجارت کی تباہی، اولاد کی موت یا اور کوئی ناگوار امر آپڑتا ہے تو خدا کی دی ہوئی ان کثیر نعمتوں کو بھی جو اس کو میسر ہوتی ہیں اور اس کے پاس باقی ہوتی ہیں بھول جاتا ہے اور گذشتہ زمانہ میں اللہ کی جس قدر اس پر نوازش ہو چکی تھی وہ سب کی ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور کہتا ہے مجھے تو کبھی آسائش ملی نہیں۔ مجھ سے زیادہ دکھی کوئی نہیں۔ ہائے میری کمائی ہوئی دولت لٹ گئی۔ میں نے بڑی عقلمندی اور محنت سے پونجی کمائی اور جمع کی تھی وہ سب تباہ ہوگئی۔ میں نے تکلیفیں اٹھا کر اولاد کو پالا تھا وہ خدا نے چھین لی اور مجھے برباد کر دیا اسی طرح کے دوسرے ناشکری اور کفر کے کلمات کہتا ہے۔ اس کور دانش بے بصیرت جانور کو معلوم نہیں کہ رب وہی ہے جو خالقِ کل ہے اس کا علم ہمہ گیر اور قدرت محیطِ کل ہے۔ اسی نے سارا جہان بنایا اور وہی کل سنسار کی حکومت چلاتا ہے۔ انسان کو بھی اسی نے پیدا کیا کسی کو صرف بیٹیاں دیں کسی کو بیٹے اور کسی کو بیٹے بیٹیاں دونوں طرح کی اولاد دی اور کسی کو لاولد بنا دیا۔ کون ہے جو بیٹا بیٹی پیدا کرتا اور بانجھ بناتا ہے، کون ہے جو سارے جہان کی حکومت چلاتا ہے۔ پس جو خالق مطلق اور حاکم کل ہے وہی رب ہے نعمت بھی وہی دیتا ہے اور نکبت بھی وہی بھیجتا ہے، مگر مصیبت خود بخود نہیں آتی۔ بلاوجہ وہ کسی کو دکھی نہیں بناتا۔ ہر انسان کے اپنے کرتوت کی یہ دنیوی پاداش ہوتی ہے۔ زہر میں تریاق کی خاصیت نہیں ہو سکتی۔ بداعمالی اچھا نتیجہ نہیں لا سکتی۔ پس ضروری ہے کہ نگاہ وعبرت سے کام لیا جائے اور روزِ آخر آنے سے پہلے اس کی پکار کو سنا جائے اور اس کے احکام کی پابندی کی جائے۔

تحلیلِ اجزاء

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ۔ آیات سابقہ میں فرمایا تھا کہ کافر دوامی عذاب میں رہیں گے اور اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ مددگار کہ اللہ کے مقابلہ پر عذاب سے نجات دے سکے یا دلا سکے۔ اب اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب قیامت کے دن عذاب سے نجات دینے والا سوا اللہ کے کوئی نہیں اور جب وہ دن آجائے گا تو تم اس کا انکار بھی نہ کر سکو گے، اس لئے اس دن کے آنے سے پہلے اللہ کے احکام کے پابند ہو جاؤ، اُس کی دعوت کو قبول کرو اور ہدایت پر عمل پیرا ہو۔

یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ سے موت کا دن مراد ہے یا قیامت کا دن۔ مؤخر الذکر معنی کا قرینہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں روزِ قیامت ہی کا تذکرہ ہے، اس لئے سیاق اور سباق کا تقاضا ہے کہ روزِ قیامت ہی مراد لیا جائے، لیکن اول معنی کا قرینہ اس آیت کا آخری فقرہ یعنی مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ہے کیونکہ کافر اگرچہ قیامت کے دن قیامت کا انکار نہ کر سکیں گے مگر اس وقت تو انکار کرتے ہیں البتہ موت کا انکار کوئی نہیں کرتا۔ اور موت سے کسی کو پناہ نہیں۔ مؤخر الذکر معنی کو اہلِ تفسیر نے ترجیح دی ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ آیت بالا میں دعوتِ ایمان و عمل دی گئی تھی۔ اس آیت میں روئے خطاب رسول اللہ کی طرف کر کے فرمایا کہ تمہارا کام ہمارے احکام کی تبلیغ ہے۔ حکم پہنچا دینے کے بعد تمہارا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ تم کسی کے ذمہ دار اور نگران نہیں ہو۔ اگر یہ مانتے ہیں مانیں نہیں مانتے ہیں نہ مانیں۔ مطلب یہ کہ ان کے نہ ماننے سے تمہارے اجر میں کمی نہیں آئے گی۔ نہ تم سے اس سے بازپرس ہوگی۔

وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ۔ ان آیات میں انسان کی کوتاہ بینی اور بے بصیرتی کا اظہار کیا ہے کہ انسان کو اگر ہم اپنی (دنیوی) رحمتِ عمومی کا تھوڑا سا مزہ چکھا دیتے ہیں (ادنیٰ حکومت یا قومی سیادت و عزت یا مال کی وسعت یا زیادہ اولاد کی کثرت یا جسمانی طاقت و صحت یا دوسرے اسبابِ راحت عطا فرما دیتے ہیں) تو وہ اترا جاتا ہے (یعنی اپنے کو دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اتنا بڑا کہ کبھی دوسرے انسانوں سے ہٹ کر اپنی شخصیت کو کسی بالائی مخلوق کی نسل سے ماننے لگتا ہے بلکہ کبھی اپنے کو اَن داتا، پروردگار اور ربِ اعلیٰ خیال کرنے لگتا ہے اور اپنی فطری بے بضاعتی کمزوری احتیاج اور بے مقداری کا احساس بھی نہیں کرتا اور سمجھنے لگتا ہے کہ یہ سب دولت طاقت حکومت عزت میری اپنی ہے یہ میرا حق ہے جو مجھ سے کبھی کوئی نہیں چھین سکتا۔ حالانکہ یہ اللہ کی دی ہوئی ادنیٰ نعمت ہوتی ہے جو نعمتیں اللہ کے غیبی خزانہ میں ہیں ان کے مقابلے میں اس نعمت کی کوئی حیثیت نہیں) اور جب بدکرداری کج فکری بے عقلی اور ناشکری کی وجہ سے اللہ اپنی کچھ نعمت چھین لیتا ہے اور کچھ دُکھ پہنچ جاتا ہے (مثلاً تجارت میں گھاٹا، کھیتی اور پھلوں کی بربادی، عزت کی کمی، نوکری سے معزولی حکومت کا زوال و اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا ہے) تو (موجودہ باقی نعمت کی) ناشکری کرنے لگتا ہے اور پھر پچھلی نعمتوں کو بھول کر ناسپاس بن جاتا ہے۔ عام انسان (باستثناء بعض) بڑے ہی ناشکرے ہیں (شکرگذار بندے بہت ہی کم ہیں وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ)

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ۔ یہ آیت سابقہ آیت کے مضمون کی تاکید و تائید ہے۔ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ انسان کا دکھ سکھ اور راحت و رنج کا تغیر من جانب اللہ ہوتا ہے یعنی انسان کے تمام احوال و کیفیات پر پورا اقتدار اللہ کا ہے اب فرماتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں یعنی ساری کائنات کی حکومت کی لگام اللہ کے دستِ قدرت ہی میں ہے۔ انسان بھی کائنات کا پرزہ ہے، اس لئے یہ بھی اللہ کے احاطۂ تصرف سے باہر نہیں ہو سکتا اور حکومت ہی کیا ملکیت سب خدا کی ہے بلکہ مُلک اور ملک ہی نہیں سب کا خالق بھی وہی ہے جس کو (اور جس طرح اور جب) چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے وہی مالک و مختار ہے۔ کسی کو لڑکے کسی کو لڑکیاں اور کسی کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں قسم کی اولاد دیتا ہے اور کسی کو بانجھ بنا دیتا ہے۔ ساری عمر میں ایک بچہ بھی نہیں ملتا۔ پس کس قدر کودن دانش ہے وہ انسان جو اولاد کی کثرت یا مال کی فراوانی یا عزت کی برتری یا

جیسے وسعت یا اقتدار کی سطوت پر غرور کرتا ہے اور کتنا بے بصیرت ہے وہ انسان جو ان نعمتوں کو اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کا نتیجہ سمجھ کر اللہ کو بھول جاتا ہے اور ان نعمتوں کے زوال پر ناشکری کرنے لگتا ہے ۔ نہ راحت میں شکر کرتا ہے نہ رنج پر صبر نہ مصلحت خداوندی پر غور و فکر۔ حالانکہ یہ حقیقت ناقابلِ شک ہے کہ اللہ کا علم محیطِ کل ہے اور اس کا دائرۂ قدرت وقدرت سب کو گھیرے ہوئے ہے نہ اُس کے علم و اندازہ سے کوئی چیز باہر ہے نہ قدرت و قبضہ سے پھر اس کی دعوتِ ایمانی پر لبیک نہ کہنا اور تکوینی و تخلیقی طور پر اس کے علم و قدرت کے احاطہ کے اندر رہتے ہوئے اپنی زندگی اور دستورِ زندگی کو آزاد قرار دینا سراسر ضلالت نہیں ہے تو اور کیا ہے ۔

مقصودِ بیان

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ لفظ رب سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تم کو ہر طرح ترقی دے کر انسانیت کے درجہ کمال پر پہنچانا چاہتا ہے وہ جو حکم دیتا ہے اس میں شانِ ربوبیت جھلکتی ہے نہ اس کا مقصد بے وجہ تم کو مقید رکھنا ہے نہ بے نتیجہ اور مضر ضوابط زندگی پر کاربند بنانا ۔ اسی لفظ سے ایک ایماء اس طرف بھی ہے کہ اللہ کو تمہارے ضوابط زندگی بنانے کا حق بھی ہے کیونکہ وہ تمہارا رب ہے اور ربوبیت کا تقاضا ہے کہ رب کا علم و قدرت ہمہ گیر ہو اور رحمت و عطوفت عام ہو پس اللہ کی ربوبیت موجب ہے تمہارے لیے احکام تشریعیہ مقرر کرنے کی ۔ مفہوم مخالف کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اللہ کے سوا کوئی اور تمہارا رب نہیں" اس لیے کسی کو اپنے احکام تمہاری زندگی کے لیے جاری کرنے کا حق بھی نہیں ہے ۔ آیت فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ الخ نبوت کا فرض ظاہر کر رہی ہے ۔ اس سے بطور دلالت یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا ۔ اُس کی تعلیم و ہدایت اُس کی دماغ کی زائیدہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ کی طرف سے پیام رساں ہوتا ہے اور مضمون تعلیم اللہ کا تجویز کردہ ہوتا ہے ۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نبی کسی کی کایا نہیں پلٹ سکتا ۔ راستہ بتانا اُس کا کام ہوتا ہے ۔ آیت اِذَآ اَذَقْنَا الخ سے انسان کی کور بصیرتی اور ناشکری کی تصویر کھینچی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ انسان کو عیش میں غافل یا مغرور یا دکھ میں بے صبر اور ناشکرا نہ بن جانا چاہیئے وغیرہ۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا

اور کسی بشر کی (حالتِ موجودہ میں) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس سے کلام فرماوے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتے کو

فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ

بھیجدے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے وہ بڑا عالیشان ہے بڑی حکمت والا بھی ہے اور اسی طرح ہم نے آپکے پاس بھی وحی یعنی اپنا حکم

اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ

بھیجا ہے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کا انتہائی کمال) کیا چیز ہے ولیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جس کے

مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ

ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝ ع

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے یاد رکھو سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے

تفسیر:- کیا اللہ متکلم ہے کلام کرتا ہے بعض غیر مسلم فرقوں کی طرح مسلمانوں کا فرقۂ معتزلہ بھی کلام کو اللہ کی صفت نہیں مانتا۔ اور جس کلام کو تمام امتِ اسلامیہ اللہ کا کلام کہتی ہے فرقۂ معتزلہ اُس کو مخلوق اور حادث مانتا ہے۔ اگر کلام کرنا اللہ کی صفت ہے اور یہ صفت ازلی اور قدیم ہے تو کیا وہ کسی انسان سے بات کرسکتا ہے اور کسی کام کا حکم یا ممانعت صادر کرسکتا ہے بکثرت دماغ زدہ [illegible] اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں قدیم کا حادث سے واجب کا ممکن سے نور کا ظلمت سے تجرد کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں میں نفا اور انتہائی دوری ہے۔ کوئی انسان اللہ سے کوئی حکم حاصل نہیں کرسکتا نہ اللہ کسی بندہ سے کلام کرسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور قرآن مجید کو اللہ کا کلام فرمایا تو مشرکوں کو بڑا تعجب ہوا۔ ان کی نظر میں یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اللہ تعالیٰ انسان سے ہم کلام ہو یا اُس پر اپنا کلام نازل فرمائے۔

قرآن کی صراحت ہے کہ اللہ کلام کرتا ہے اور صرف فرشتوں سے نہیں بلکہ انسان سے بھی کرتا ہے وہ بعض چیزوں کے کرنے کا حکم بھی انسان کو دیتا ہے۔ اور بعض امور سے باز داشت بھی کرتا ہے۔ اُس نے اپنی کتاب بھی انسان پر اتاری ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ بندہ حادث ہے۔ اور اللہ قدیم۔ لیکن بندہ سے اس کا کلام رو در رو اور بالمشافہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اس کی شانِ الوہیت کے خلاف ہے۔ ہاں تین طریقوں سے وہ بندہ سے کلام کرتا ہے۔

(۱) یا تو اپنی ازلی صفتِ کلامیہ کا تعلق براہِ راست انسان کے قلب سے کر دیتا ہے یعنی معانی ملفوظہ یا غیر ملفوظہ کو نقوش اور عکس کی طرح بندہ کے دل پر ثبت کر دیتا ہے۔ اس عکس پذیری میں بندہ کے ذہنی عمل اور فکری غور و خوض کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۲) یا نورانی پردوں کی آڑ سے یا کثیف مادی اوٹ سے ایک بے کیف آواز نکلتی ہے اور دوسرے لوگ چاہے اس کو نہ سُن سکیں مگر صاحبِ نبوت اس کو سُنتا اور سمجھتا ہے اور چونکہ بے کیف آواز کسی غیبی شیطان کی نہیں ہوسکتی اور نہ قوتِ واہمہ وجدانِ قلبی پیدا یا اثر ڈال سکتی ہے، اس لئے صاحبِ وحی کو یقین ہوتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے مخلوق کے کلام کی آمیزش سے پاک۔ کلامِ خداوندی اگرچہ صوت اور ترتیب حروف سے بے نیاز ہے، مگر چونکہ بندہ کو کلامِ صوتی سُننا ہوتا ہے، اس لئے بندہ کے قلب پر گوشِ نبوت کے ذریعہ سے الفاظ و معانی دونوں کا مجموعہ نازل ہوتا ہے۔

(۳) کوئی فرشتہ اللہ کے حکم سے تلفف روحانی کرنے کے بعد صاحبِ وحی کے پاس آتا ہے اور اس کے قلب میں القا کرتا ہے یا انسانی شکل میں آتا ہے اور مکالمہ کرتا ہے۔ اُس وقت اس فرشتے کو بشکلِ انسانی دوسرے لوگ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس کا کلام سنتے ہیں، مگر پہچانتا کوئی نہیں کہ یہ کون ہے۔

مزید توضیح کے لئے آیت کے ہر فقرہ کی آئندہ تفسیر پڑھو۔

تحلیلِ اجزاء

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ
انسان سے (خواہ کتنا ہی جلیل القدر پیغمبر ہو) اللہ کا کلام کرنا زیبا نہیں۔ شانِ الوہیت کے خلاف ہے۔ قدم و حدوث وجوب و امکان تجرد و مادیت لطافت و کثافت نور و ظلمت مخلوقیت و خالقیت کا فرق کلام کرنے اور سننے سے مانع ہے۔ دن اور رات بلکہ وجود و عدم کا اجتماع ناممکن ہے ایک حقیقتِ ثابتہ ہے دوسرا سلب محض جو عدم ثابت کے مشابہ ہے۔ ہاں انسانی وجدان و ذہن تک کلامِ الٰہی کے پہنچنے اور آدمی کے قلب و دماغ پر اللہ کی صفتِ کلامیہ کے پرتو افگن ہونے اور کلام اللہ کا عکس ثبت ہونے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) اللہ کی طرف سے مضامین و معانی کے کچھ نقوش انسان کی لوحِ قلب پر ثبت ہو جائیں۔ آئینۂ روح کا کوئی خفی یا اخفی لاسلکی کنکشن اللہ کی صفتِ کلامیہ کے آفتاب سے پیدا ہو جائے اور غور و فکر و ترتیبِ معلومات کے بغیر معانی مربوطہ کا انکشاف ہو جائے اُس انکشاف و انجلاء میں نہ ذہنی فکری عمل کو دخل ہو نہ شیطانی وہمی مداخلت کا کوئی شائبہ نہ بیرونی حسی جاسوسوں کے ذریعہ سے باہر سے لائی ہوئی صورتوں

کی آمیزش نہ استقرار جزئیات سے انتزاع کلیات کر کے علت و معلول اور سبب و مسبب کا تعلق پیدا کر کے برہان قائم کرنے کی ضرورت۔ لفظ وحی سے اسی بے کیف لاسلکی و قلبی وجدانی تعلق اور صفت کلامیہ کی غیبی اثر اندازی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ وجدانی عکس و انعکاس کبھی صرف حقائق و معانی کا ہوتا ہے۔ بغیر انسانی لغت کی ترتیبی و ترکیبی شکلوں کے اور بدوں کسی زبان کے الفاظی ہئیت کے۔ اس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ پھر جب ان معانی کی تعبیر صاحب وحی کرتا ہے تو اپنی زبان میں کرتا ہے اور ہر الفاظ کے ترکیبی جملے اسی کے ساختہ پرداختہ ہوتے ہیں اور کبھی معانی و حقائق کا القا سادہ نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی زبان کے الفاظ کے پیرایہ میں ہوتا ہے۔ الفاظ گو انسانی زبان میں ہوتے ہیں، مگر ترتیب و ترکیب الفاظ اور اسلوب ادا انسان کے طرز ادا اور اس زبان بولنے والوں کی قدرت تعبیری سے بالاتر ہوتی ہے گویا یہ وحی مع الفاظ کے ہوتی ہے، مگر صاحب وحی کی ذہنی ساخت پرداخت کو جس طرح معانی کی ترتیب میں دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح الفاظ کی ترتیب میں بھی اس کے فکری عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی وحی کو وحی متلو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احادیث مقدسہ کا بیشتر حصہ وحی غیر متلو سے تعلق رکھتا ہے اور سارا قرآن وحی متلو ہے۔ یعنی بیشتر احادیث کے معانی القائی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اور قرآن کی الفاظی ترتیب اور ہر مضمون کا طرز ادا بھی القائی ہے۔ اسی لئے گذشتہ آسمانی کتابوں کو اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور قرآن مجید کو اللہ کی کتاب کے ساتھ کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ تورات و انجیل اور تمام الٰہی صحیفوں کا بیشتر حصہ کتاب اللہ تو تھا، مگر کلام اللہ نہیں تھا۔

(۲) انسان مادی کثیف ہے۔ اس کے تمام بیرونی (اور اندرونی) حواس بھی کثیف ہیں، لیکن اللہ کی شکل جسمانی نہیں ہے وہ ہر ہیئت سے پاک ہے۔ اُس کی کوئی صفت بھی مادی نہیں ہے۔ ہر وصف مقداریت کیفیت اور ہر قسم کی عرضیت سے منزہ ہے پھر انسان۔ حادث ہے فانی ہے اور اللہ کی ہر صفت قدیم لازوال ناقابل تغیر، اس لئے اللہ کی صفت کلامیہ کا تعلق براہِ راست کسی انسان سے نہیں ہو سکتا۔ جس طرح نورِ بے شکل و بے رنگ کو آنکھوں سے مادی کثیف آنکھوں سے دیکھنے کا امکان نہیں۔ اسی طرح بے کیف بے آواز اور بے حرف کلام کو جو صوت کی ہر موجی کیفیت سے پاک ہے۔ مادی کانوں کے ان اعصاب سے سُننا جو اپنے عمل میں ہوا کی لہروں کے محتاج ہیں محال ہے، اس لئے صوت سرمدی اگر سنائی دے سکتی ہے تو (فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے ضابطہ کے زیر اثر دو شرطیں ضروری ہیں۔ ۱ سننے والے کے ظاہری کان خواہ بند ہوں، مگر گوش وجدان کھلے ہوں۔ کان کے اندر کی تینوں ہڈیاں مطرقی رکابی اور سندانی خواہ شکستہ ہوں، مگر روحانیت کے کان شنوا ہوں) صوت بے کیف اپنے مقام سے نیچے اتر کر کسی نورانی یا مادی پردے سے چھن کر باہر آئے۔ کبھی درخت اور آگ کے پردے کی آڑ ہو تو کبھی نظر کو خیرہ کر دینے والے ستر ہزار نورانی حجابوں کے اندر سے کلام بے کیف ہر جہتی سنائی دے رہا ہو۔ لفظ من وراء حجاب میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(۳) اللہ کا کلام سننے والا انسان اپنی نورانیت اور روحانی انجلا میں روحانی ملائکہ کی صف میں داخل ہو اور غیر مادی مخلوق کا سرگروہ اس سے ربط رکھتا ہو اور اس کی شرح و قلب پر کلام خداوندی کا روحانی القا کرتا ہو یا کسی انسان کی شکل میں نمودار ہو کر بالمواجہ اُس کو پیام الٰہی پہنچا دے۔ نمبر سوم کی یہ آخری صورت وحی کی ایک شاخ ضرور ہے، مگر قرآن مجید کی کسی آیت کا نزول اس طرح نہیں ہوا۔ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ کا مفہوم یہی ہے۔

اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ اور بالا ہے کسی ممکن کی اُس کی ذات مجرد تک رسائی نہیں، نہ کوئی آنکھ اُس کو دیکھ سکتی ہے نہ حسی کان اُس کی بے کیف آواز کو سُن سکتا ہے نہ کسی وہم و فہم کی وہاں تک پہنچ ہے نہ قوتِ فکریہ اُس کو پا سکتی ہے نہ ذہن کے اندر اس کا نزول ہے۔ ہاں وہ حکمت والا ہے۔ انسان کی ہدایت کے لئے اُس نے اپنی مخلوقِ انس و ملک میں سے جس کو اور جس طرح چاہا اپنے کلام کا وجدان اور روحانی تلقف عطا کر دیا اور جس کے پاس وحی بھیجنی چاہی بھیج دی اور جس کو حامل وحی اور قابلِ نورِ نبوت بنانا چاہا بنا دیا۔

تنبیہ انبیاء کے قلوب پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلامیہ کا جو پرتو پڑتا ہے خواہ وحی القاء روحانی ہو یا حجاب کے اندر سے بے کیف کلام سنائی دے یا فرشتے کے ذریعہ سے الہام ہو۔ بہرحال وحی کی ہر صورت ناقابلِ شک ہوتی ہے۔ شک وہم ظن سب کا تعلق دماغی عمل سے ہے اور وحی کا نزول دماغ پر نہیں قلب پر ہوتا ہے۔ وجدان قلبی ہی حامل وحی اور نورِ قدس سے عکس پذیر ہوتا ہے اس لئے ہر وحی قطعی یقینی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبروں کے قلوب پر جو القاء خواب میں ہوتا ہے وہ بھی یقینی ہوتا ہے۔ البتہ اولیائے کرام اور دوسرے اصحابِ الہام کا انکشافِ روحانی اگرچہ وجدانی ہوتا ہے یعنی ذہن کو اس میں بھی دخل نہیں ہوتا، مگر پھر بھی ظنی اور قابلِ شک ہوتا ہے۔ کبھی قوتِ وہمیہ ان کے الہام میں دخل انداز ہو کر اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے اور اس وجہ سے مطلب اخذ کرنے میں اُن سے غلطی ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ واللہ اَعْلَمُ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ یعنی جیسے انسان کے پاس اللہ کا کلام اُس کی حکمت کے زیرِ عمل آ سکتا ہے جس کی تین صورتیں بیان کر دی گئیں تو انہیں اقسامِ الہام کی طرح اللہ نے اپنا کلام اپنے حکم سے وحی کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔ اور اپنے پیغمبر کو اپنے کلام سے واقف بنا دیا خواہ القائی صورت سے یا من وراء حجاب یا جبرئیل کو بھیج کر۔ روحًا سے مراد حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق قرآن مجید ہے (کیونکہ قرآنی اصطلاح میں روح کلام اللہ کو کہا گیا ہے اور کلام اللہ صرف قرآن مجید ہے احادیثِ مقدسہ کا سرچشمہ بھی وحی ہی ہے، مگر وہ اللہ کا کلام نہیں)

اَمْرِنَا کا سادہ ترجمہ اہلِ تفسیر نے حکم کیا ہے، مگر اس فقیر کی نظر میں یہ لفظ بہت دقیق معنی کا حامل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول پر عالم دو ہیں، عالمِ خلق (یعنی عالمِ اجسام) اور عالمِ امر (یعنی عالمِ مجردات) آیت الا لہ الخلق والامر کے ذیل میں بھی تشریح کی گئی ہے۔ اہلِ فلسفہ مادیات سے اونچا، ایک عالمِ مجردات یا عالمِ انوار یا عالمِ اشباح اور ہے آیت قل الروح من امر ربی میں روح کو اسی عالم کی ایک چیز کہا گیا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ یہ مادی نہیں، ظلمانی نہیں، جسمانی نہیں، مخلوق نہیں صرف نور اور نورانی ہے اسی لئے آئندہ آیت میں اس کو نور کہا گیا ہے۔ یہ حیاتِ ابدیہ کی روح ہے۔ اس کا نزول عالمِ انوار سے ہوتا ہے اور وحی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ تمام کسبی اور فکری علوم دماغی زائیدہ اور ذہن کے روئیدہ ہوتے ہیں۔ سب کا تعلق جزئیاتِ مادیہ یا اُن کلیات سے ہوتا ہے جو جزئیات سے اخذ کی گئی ہوں۔ علوم مجردہ سے باطنی حواس کا قطعاً تعلق نہیں ہوتا۔ نفسِ ناطقہ اپنے تجرد کی حالت میں اگر علومِ مجردہ کو حاصل کرتا ہو تو کرے مگر شرط یہ ہے کہ اس تحصیل میں ترتیبِ فکری کو دخل نہ ہو۔ ترتیبِ فکری سے حاصل کردہ علم ناقابلِ زوال نہیں ہوتا۔ پس نورِ قرآنی سے اولین پرتو اندوز صرف وجدان ہوتا ہے جس کا تعلق براہِ راست عالمِ امر یا کائناتِ انوار سے ہوتا ہے۔ وجدان کو جو کچھ ملتا ہے اسی عالم سے ملتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ قرآن ہم نے اپنے امر یعنی عالمِ امر سے بھیجا۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ یعنی نبوت اور نزولِ قرآن سے پہلے آپ نہ قرآن سے واقف تھے اور نہ ایمان سے۔ چونکہ نبوت سے پہلے ہر پیغمبر کا مومن ہونا اور مشرک نہ ہونا اجماعی عقیدہ ہے، اس لئے قرآن سے پہلے ایمان سے ناواقف ہونا محلِ تأمل ہے اور تاویل کا محتاج۔ بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ ایمان سے مراد ہے نماز یعنی آپ نماز اور اس کے ارکان و شرائط سے ناواقف تھے بعض نے لکھا ہے کہ ایمان سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی آپ اہلِ ایمان سے واقف نہ تھے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ اہلِ ایمان کون ہوتے ہیں اور کس کا ایمان اللہ کے لئے معتبر ہے یا ایمان سے مراد ہے تفصیلی ایمان۔ یعنی آپ (اگرچہ مشرک نہ تھے موحد تھے، مگر) نہیں جانتے تھے کہ تفصیلی ایمان کیا ہوتا ہے اور کن کن امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس فقیر کے نزدیک موخر الذکر توجیہ اگرچہ اچھی ہے اس میں مجاز کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن سب سے عمدہ اور صحیح توجیہ جس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں یہ ہے کہ ایمان سے مراد ہے ایمان شرعی کیونکہ لغت میں ایمان کا معنی ہے تصدیق (یا وثوق یا اعتراف و اقرار) اور تصدیق ایک فکری عمل ہے جو ترتیب مقدمات اور ترکیب مبادی کا محتاج ہے خواہ ان مبادی کو اجزاء تصدیق کہا جائے (جیسا کہ امام رازی کا مسلک ہے) یا ابتدائی شرائط کا درجہ دیا جائے (جیسا کہ اہل

منطق کا قول ہے) اور فکری عمل سے جو تصدیق حاصل ہوتی ہے اس کو ایمان کہا جا سکتا ہے ، مگر وہ کسبی ایمان ہوتا ہے ۔ ایسا ہی جیسا روشن عقل رکھنے والوں کا ہوتا ہے ۔ وجدانی نہیں ہوتا یعنی دلیل فکری کا محتاج ہوتا ہے اور فکر ہی سے حاصل ہوتا ہے یعنی اگر کسی و نتت ترکیب فکری کے دوسرے نتیجہ پر پہنچ ادر پہلی دلیل کے خلاف کوئی دوسری دلیل سمجھ میں آگئی تو پہلی تصدیق زائل ہو جاتی ہے اسی لئے کسبی تصدیق کو اہل شریعت شرعی ایمان نہیں کہتے ۔ شرعی ایمان تو وجدانی ہوتا ہے جس کے خلاف اگر ذہنی دلائل ہوں تب بھی اس کو جنبش نہیں ہوتی ۔ آفتاب کے وجود کے خلاف کتنی ہی عقلی دلیلیں قائم کی جائیں ، لیکن سب پادر ہوا ہوتی ہیں اور وجدان آفتاب پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ ہر شخص اپنی ہستی کا وجدان رکھتا ہے ۔ اگر ارسطو اور افلاطون بھی ثابت کر دیں کہ زید کی ہستی نہیں ہے تب بھی زید کو اپنی ہستی کا یقین ہی رہے گا ۔ کیونکہ یہ یقین وجدانی ہے ، پس انبیا نبوت سے پہلے اگر مشرک نہیں ہوتے ، مگر ان کی توحید عقلی اور کسبی ہوتی ہے شرعی اور وجدانی نہیں ہوتی اور آیت میں اسی وجدانی ایمان کی قبل نبوت نفی کی گئی ہے ۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ قرآن مجید حیاتِ طیبہ ابدیہ عطا کرنے والی روح ہے اور چونکہ عالم انوار کا ایک حصہ ہے ، اس لئے سراسر نور ہے جو عقل کی ظلمت کو روشنی سے بدل دیتا ہے اور وہمی فکری پگ ڈنڈیوں پر چلنے والوں کو راہِ مستقیم بتاتا ہے جو ذہنی کجراہیوں اور گمراہیوں میں پڑے بھٹک رہے ہیں ان کو سیدھا راستہ منزل تک پہنچانے والا بتاتا ہے ، مگر شرط یہ ہے کہ چشم فطرت وا ہو بصیرت کی روشنی بجھ نہ گئی ہو ورنہ آفتاب نصف النہار کی روشنی بھی نابینا کو راستہ نہیں دکھا سکتی اور چشم کور کے لئے دن رات برابر ہوتے ہیں پس اللہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس قرآن کے ذریعہ سے راہِ مستقیم بتا دیتا ہے اور راہِ مستقیم دکھاتا وہ اسی کو چاہتا ہے جس کی بصیرت کی فطری روشنی بجھ نہ گئی ہو ورنہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ قرآن مجید کو تو اللہ تعالیٰ نے نور بنایا ہی ہے جو شمع ہدایت ہے ۔ لیکن حامل شمع ہدایت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے جو منزل سعادت تک پہنچانے والی سیدھی معتدل راہِ شریعت بتاتے ہیں ۔ زندگی کی یہ راہ اللہ کی راہ ہے ۔ اُسی نے قائم کی ہے ۔ آخر سارا جہان اُسی نے بنایا ہے ۔ زمین آسمان اُسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی کی حکومت ساری کائنات میں جاری ہے ۔ یہ کل سنسار اسی کی ملک اور اسی کا مُلک ہے ۔ پس ضوابط زندگی بنانے اور بتانے کا بھی اسی کو حق ہے اُسی نے دستور قرآن کو ضوابطِ حیات مقرر کیا اور ذاتِ رسول کو ہادیٔ برحق بنایا ہے ۔ لہٰذا رسول و قرآن کی بتائی ہوئی راہ اُسی کی راہ ہے ۔

اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۔ یعنی سارا جہان اللہ ہی نے پیدا کیا اور سب کا انتظام اُسی کے زیرِ حکم چل رہا ہے اقتدار اعلیٰ اور حکومت اُسی کے دستِ قدرت میں ہے ۔ اسی نے انسان کی ہدایت کے لئے شمع ہدایت روشن کی اور رسول کو حامل شمع بنایا ، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ بس ہماری یہ زندگی ہی اُسی کے زیرِ حکم ہے جب مر جائیں گے تو معدوم ہو جائیں گے ۔ اللہ سے تعلق ختم ہو جائے گا ہرگز نہیں ۔ ایسا نہیں ہوگا ۔ خوب سمجھ لو کہ (آغاز کی طرح) انجام بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے ۔ سب کو اسی کے پاس جانا ہے اور زندگی کے تمام امور کی واپسی اسی کی طرف ہوگی ۔ وہی فیصلہ کرے گا اور اچھا بُرا بدلہ دے گا ۔

مقصود بیان مَا كَانَ لِبَشَرٍ الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ انسان سے اللہ کلام کرتا ہے ، مگر رو در رو آمنے سامنے ہو کر نہیں بلکہ اس کے کلام کی تین صورتیں ہیں یا براہِ راست فرشتے کی وساطت کے بغیر قلب میں مخصوص معانی الفاظ دونوں کا القاء کر دیتا ہے یا پس پردہ رہ کر اپنا کلام صاحب وحی کو سناتا ہے (یہ پردہ یا تو تہ پر تہ نور کا ہوتا ہے اور انتہائی روشنی ہی نظر کے لئے حجاب ہو جاتی ہے یا ممکنات میں سے کوئی پردہ آڑیں حائل ہے اور پردہ سے چھن کر آواز سنائی دیتی ہے ۔) یا فرشتہ کی معرفت اپنا پیام بھیجتا ہے اور فرشتہ اس پیام کا القاء قلب پر کرتا ہے ۔ لفظ رُوْحًا دلالت کر رہا ہے کہ قرآن بھی حیاتِ ابدیہ کی روح ہے ۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ کو قرآن کا علم نہ تھا آپ تفصیلی یا شرعی ایمان سے واقف تھے جَعَلْنٰهُ نُوْرًا سے ثابت ہے کہ قرآن نور ہے یعنی زندگی کی شمع ہو راہ سیدھی راہ دکھاتی ہے ، مگر راہِ مستقیم اُس کی روشنی میں اُسی کو دکھتی ہے جس کو اللہ دکھانا چاہے ۔ اصل ہادی

اللہ تعالیٰ ہے۔
إِنَّكَ لَتَهْدِي ... سے معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہادی تھے اور آپ کا بتایا ہوا اللہ کا راستہ ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ وَهِيَ مَكِّيَّةٌ تِسْعٌ ثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

یہ سورت باتفاق علماء مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور دوسرے
صحابہ کا یہی قول ہے۔ اس میں سات رکوع اور نواسی آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ وَاِنَّهٗ فِيْٓ

حٰم قسم اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ (اے عرب) تم (آسانی سے) سمجھ لو اور وہ ہمارے

اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۭ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ

پاس لوح محفوظ میں بڑے رتبہ کی اور حکمت بھری کتاب ہے کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد (اطاعت) سے گزرنے والے ہو

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۞ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

اور ہم پہلے لوگوں میں بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں اور ان لوگوں کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو

فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ

پھر ہم نے اُن لوگوں کو جو کہ ان سے زیادہ زور آور تھے غارت کر ڈالا اور پہلے لوگوں کی یہ حالت (ہلاک و غارت کی) ہو چکی ہے

تفسیر انسان اپنے افکار اور قوتِ فکریہ کو قرابت مودت، قربت مکانی، تاثیر زمانی، میلان نفس اور تمام جذبات و عواطف سے بالاتر اور خالص دانش و حکمت کا عامل جانتا ہے، مگر حقیقت میں انسان مادہ اور مادیات کے تقاضوں سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ جبلت اور سرشت سے خالی ہو جانا ناممکن ہے، اسی لئے انسان کے تمام علوم عقلیہ خواہ اخلاق و معاشرت سے تعلق رکھنے والے ہوں یا تمدن و سیاست سے یا مادہ اور طبیعیات سے سب کے سب ناقص ہوتے ہیں اور صحیح سمجھ و دانش حاصل کرنے کیلئے اُس کو اللہ کے مقرر کئے ہوئے ضابطوں کی ضرورت ہے۔ جو حق و باطل کو اور صحیح کو غلط سے الگ الگ کر کے حد بندی کر دیں۔ انہیں ضوابط و حدود کے مجموعہ کو کتاب مبین۔ فرقان، نور اور شریعت کہا جاتا ہے اور سب ضوابط کسی زبان کے تابع نہیں۔ اللہ نے مختلف زبانوں میں زمان و مکان کے زیر اثر ان کو نازل فرمایا ہے۔ آخر میں عرب کو یہ شرف عطا ہوا کہ ان کی زبان میں کتاب مبین کا نزول ہوا تاکہ آسانی کے ساتھ ان کی سمجھ میں آجائے۔ انسانی سوسائٹی کی تنظیم

صحیح کرنے والے قوانین اللہ کے علم غیر متناہی کا ایک پرتو ہیں ۔ وہ تمام انسانی جذبات و عواطف اور ذہنی افکار سے بالاہیں اور محکم لازوال ناقابل تغیر ہیں ۔ اسی کے ساتھ صحیح حقائق کی تعلیم دینے والے اور پر حکمت بھی ہیں ۔ لیکن ہمیشہ سے دستور چلا آیا ہے کہ انبیائے کرام کے ذریعہ سے جو ہدایت نامے نازل فرمائے گئے بیوقوف جاہل اور اپنی خودی پر اعتماد کرنے والے طبقہ نے ان کی مخالفت کی ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی جب یہ کتاب ہدایت پیش کی تو مغرور، خود پسند اور بیوقوف لوگوں نے مخالفت کی اور لگے اپنی حدود فطری سے آگے بڑھ کر باتیں بنانے ، مگر کسی کی انانیت جہالت اور بر خود غلطی سے نوامیس الٰہیہ کے نزول پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے ۔ ان کا نزول بند نہیں ہو سکتا ۔ ان کی اشاعت اور ہمہ گیری رک نہیں سکتی ۔ بلکہ مخالفت کرنے والوں کو انجام کار خود ہی تباہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اقوام سابقہ کی زور آزمائی اور طاقت بھی اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبروں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے خود ہی تباہ ہوئے ۔ صدائے حق کو زیر نہ کر سکے ، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کفار عرب کی عناد پروری اور جہالت نزول کتاب پر اثر انداز ہو سکے ۔

تحلیل اجزاء حٰمٓ ۔ حروف مقطعات کا کوئی صحیح مرادی معنی معلوم نہیں ۔ اللہ جانے اور اللہ کا رسول ۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوق مادی ہو یا غیر مادی عزیز ہے اور قسم اسی چیز کی کھائی جانی چاہیئے جو قسم کھانے والے کی نظر میں عزیز ترین ہو اسی لئے شریعت میں انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانی جائز نہیں ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کسی مخلوق کی عزت انسان کی نظر میں نہ ہونی چاہیئے ورنہ یہ کھلا ہوا شرک ہوگا ۔ اور ساری مخلوق سے زیادہ عزت اللہ کے نزدیک اس کی اپنی ذات و صفات کی ہے ۔ اور کلام اللہ اس کی ایک ازلی صفت ہے ۔ اس لئے قرآن مجید میں جہاں اپنی ذات کی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے ۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ وہاں کئی جگہ قرآن حکیم اور کتاب مبین کی بھی قسم کھائی ہے ۔

الْكِتٰبِ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضوابط کا مجموعہ ۔ الْمُبِيْنِ یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والا ۔ جو خود بھی روشن ہے اور ضوابط انسانی اور عقائد صحیحہ کی وضاحت کرنے والا بھی ۔ الکتاب المبین سے مراد ہے قرآن مجید ۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا یعنی اس کتاب اور کلام مبین کو ہم نے عربی الفاظ اور زبان کا جامہ پہنایا کہ زبان سے پڑھا جا سکے (پس اب یہ کلام بصورت قرآن عربی الفاظ میں مجسم کر دیا گیا ۔)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم (آسانی کے ساتھ) سمجھ سکو ۔ اگرچہ تمام اقوام عالم کے لئے اس کتاب کا نزول ہوا لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ عرب تھے ، اس لئے عربی میں اس کا ہونا ضروری تھا ورنہ عرب نہ سمجھتے اور سب سے پہلے جس قوم میں اس کا نزول ہوا وہی محروم رہتی ۔

ہدایت اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا ۔ صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین ہدایت عربی میں نازل فرمائے اور اس عربی مجموعہ کا نام قرآن ہے اور نماز میں قرآن کی قرأت ضروری ہے ، اس سے معلوم ہو گیا کہ ترجمۂ قرآن کی قرأت نماز میں ناکافی ہے ۔

تنقیح حقیقت ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کتاب اور قرآن کا کلام اللہ پر اطلاق مجازی ہے ۔ حقیقت میں یہ نقوش کتابت جو مجموعہ اوراق کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور وہ الفاظ جو ہم اپنے اوتار الصوت اور حرکت کام و دہن سے ادا کرتے ہیں کلام اللہ نہیں ہیں بلکہ نقوش کتابت الفاظ پر اور الفاظ اللہ کے کلام پر دلالت کرتے ہیں ، اس لئے مجازاً ان کو بھی کلام اللہ کہہ لیا جاتا ہے ورنہ یہ نقوش تو ہمارے ہاتھ سے لکھے ہوئے اور یہ الفاظ ہمارے بولے ہوئے ہیں ۔ لیکن یہ قول غلط ہے ۔ اہل تحقیق (علامہ تفتازانی وغیرہ) نے صراحت کر دی ہے کہ کلام اللہ کا لفظ مشترک ہے اس کے تین معانی ہیں اور تینوں حقیقی ہیں ۔

(۱) اللہ کی صفت ازلیہ (۲) الفاظ جو معانی پر دلالت کرتے ہیں ۔ (۳) نقوش جو الفاظ کو بتاتے ہیں ۔ اول اعتبار سے کلام اللہ ازلی اور قدیم ہے اور باقی دونوں اعتبارات سے حادث ۔ گویا مرتبۂ صفت میں دوسری صفات کی طرح صفت کلامیہ بھی قدیم ہے اور فعلیت و تعلق کے مرتبہ میں حادث ہے ۔ مرتبۂ صفت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو متکلم کہا جاتا ہے اور مرتبۂ کتابت کے لحاظ سے اس کو کتاب اور مرتبۂ قرأت کے اعتبار سے اس کو قرآن کہا جاتا ہے ۔ حقیقت ایک ہے ۔ مظاہر مختلف ہیں ۔ کسی مظہر کے حدوث سے اصل معنی اور

حقیقت کا حدوث لازم نہیں آتا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

وَاِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا ام الکتاب لوح محفوظ۔ اللہ کے علم کی نہ مٹنے والی لوح جس میں تغیر و تبدل نہیں۔ ماضی اور مستقبل کا اس پر کوئی اثر نہیں، نہ نسیان اور ذہول کا اس میں دخل ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ظاہر نہ کرے۔ انسانی اور ملکی جولانی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں وہ ہر عیب و نقص سے محفوظ ہے۔ یہ کتاب مبین اور قرآن مجید لباس عربی اسی کے بعض علمی نقوش کا پرتو ہے اور اس کا سارا مفہوم اسلوب بیان اور طرز ادا اُسی اُم الکتاب کا ایک حصہ ہے۔

لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ام الکتاب تمام ممکنات کی علمی رسائی اور ذہنی تراش خراش سے بلند ہے، اس لئے یہ قرآن بھی انسان کی فکری بلند پروازی اور تخیل بلندیوں سے بھی اونچا ہے۔ نہ کسی فرشتہ کے عمل فکری کا نتیجہ ہے نہ بشری غور و نظر کو اس کی ساخت میں دخل ہے۔ پھر یہ حکیم بھی ہے یعنی پر حکمت۔ غلط اور غیر واقعی نہ اُس کی تعلیم ہے نہ طرز تعلیم نہ طریق ادا نہ الفاظ کی نشست نہ اسلوب بیان۔ نہ مصلحت بشری سے خالی۔ غرض جہالت یا سفسطہ کو اس میں دخل نہیں۔ یا یوں کہو کہ اس کی تعلیم اور بیان محکم ہے نا قابل نسخ و تغیر۔ ہر فلسفہ اور ذہنی فکر کا نتیجہ قابل ترمیم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کوئی فلسفہ دوامی یقین کا حامل نہیں ہوتا، مگر قرآن محکم ہے اس کی نظری و عملی تعلیم کبھی غلط ثابت نہیں ہوسکتی۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ کچھ لوگ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ فکری اور عملی سیاسی اور سماجی درستگی کے لئے دنیا کے مشہور دانشور ناکافی ہیں۔ یہ حدود بشریت سے آگے بڑھ کر دعویٰ کرنے والے ہیں۔ کیونکہ انسان خود عدل کی راہ اختیار نہیں کرسکتا۔ نہ جذبات بشریت اور عواطف انسانیت سے آزاد ہوسکتا ہے نہ اپنی عقل سے انسانیت کو سدھارنے والے ایسے ضوابط بنا سکتا ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر اور ہر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے صداقت و عدل کے حامل ہوں۔ پس کیا انسان کی یہ خودسری اس حد سے بڑھ کر اثابت انسان کی زندگی کو اللہ کی آسمانی تعلیم سے بے نیاز بنا سکتی ہے۔ کیا آدمیوں کے ایسے بیہودہ دعووں سے اللہ تعالیٰ ہدایت نامہ بھیجنا ترک کردے گا اور لوگوں کی مخالفت اُس کی زندگی کے سُدھارنے والے احکام جاری کرنے سے باز رکھ سکی۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ سے مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ تک۔ اس سے پہلے بھی گذشتہ اقوام میں اللہ پیغمبر بھیجتا رہا ہے۔ آج اس پیغمبر کو یہ کتاب دے کر بھیجنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قدماء کے پاس جو پیغمبر بھی آیا وہ اس کا مذاق بناتے رہے، ان کو بھی اپنی دانش اور زیادتی قوت پر ناز تھا اور پیغمبر کی ضرورت وہ بھی محسوس نہیں کرتے تھے، مگر ان کا کچھ زور نہ چل سکا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کردیا۔ ساری سمجھ اور قوت دھری کی دھری رہ گئی یعنی ان منکروں کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔

مقصودِ بیان

اَلْكِتٰبِ کا لفظ تین باتیں ظاہر کر رہا ہے :

(۱) پورا قرآن جس کا کچھ حصہ نازل ہوچکا تھا اور کچھ حصہ اس کے بعد نازل ہوا سب کو ماننا اور دستور پر چلنا فرض ہے۔ یہ تشریح مقصود اُس وقت ہوگی جب کتاب کو کتب بمعنی فرض سے ماخوذ قرار دیا جائے۔

(۲) نزول قرآن اگرچہ مجموعی شکل میں نہ ہوا تھا لیکن یہ لفظ بطور پیشین گوئی اشارہ کر رہا ہے کہ آئندہ اس کا مجموعہ مرتب ہونا ضروری ہے۔ یہ اشارہ اس وقت جب کتاب کو کَتَبَ بمعنی جَمَعَ سے ماخوذ مانا جائے۔

(۳) لفظ کتاب ایک خفی اشارہ کر رہا ہے اس امر کی طرف اس کا لکھوانا جائز ہے۔ یہ اشارہ اس وقت ہوگا جب لفظ کتاب کو کتب بمعنی رَقَمَ و حَرَّرَ سے ماخوذ قرار دیا جائے۔ اَلْمُبِيْنِ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دستور قرآنی خود بھی واضح اور روشن ہے اور حق و صداقت کو ظاہر کرنے والا بھی۔

جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کا لفظ دلالت کر رہا ہے اس امر پر کہ اللہ نے اپنی اس کتاب کو عربی شکل میں نازل کیا ہے۔ یعنی اس کی ساخت پرداخت بیان طرز بیان سب خدا کا بنایا ہوا ہے کسی انسان یا فرشتہ یا جن یا کسی اور مخلوق کا دماغی تراشیدہ نہیں ہے۔ اور اس کے عربی الفاظ کی عبارت بھی اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ پس غلطی پر ہیں وہ لوگ جو قرآن کی عبارت کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا جبرئیل یا کسی

جن کی ساعتنہ کہتے ہیں۔

اِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ کے الفاظ ہیں کہ قرآن مجید لوح محفوظ کی نقل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت کلامیہ کا مظہر ہے۔ عَلِیٌّ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن مجید اونچا ہے یعنی ہر ممکن کی رسائی سے بلند ہے۔ حَکِیْمٌ کا لفظ قرآن کے غیر منسوخ یا پرحکمت ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ اَفَنَضْرِبُ الخ سے صراحتہً ثابت ہو رہا ہے کہ لوگوں کی سرکشی انکار بر خود غلطی غرور نفس غرض ہر علمی او عملی اسراف اور اپنے حدود نکریہ سے تجاوز قانونِ الٰہی اور کتاب خداوندی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی کی علمی جسمانی قومی اور مالی ملکی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی بلکہ منکروں کا انکار اور طاقتوروں کی طاقت کبھی نبوتِ الٰہی کی طاقت پر غالب نہ آسکی۔ جب حق سے باطل نے ٹکراؤ کیا خود تباہ ہو گیا۔ ماضی حال کے لئے عبرت کا آئینہ ہے۔ وغیرہ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ ان کو جاننے والے (خدا) نے پیدا کیا ہے جس نے تمہارے

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(آرام کے) لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے رہو) اور اس میں اس نے تمہارے لئے رستے بنائے تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ وَالَّذِيْ

اور جس نے آسمان سے پانی ایک اندازے سے برسایا پھر ہم نے اس سے خشک زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کیا اسی طرح تم (بھی اپنی قبروں سے) نکالے جاؤ گے

خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى

اور جس نے تمام اقسام بنائیں اور تمہارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو

ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ

پھر جب اس پر بیٹھ چکو تو اپنے رب کی نعمت کو دل سے یاد کرو اور (زبان سے استحباباً) یوں کہو اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے

لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ

بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور ان لوگوں نے خدا کے بندوں میں سے (جو

جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ

مخلوق ہوتے ہیں) خدا کا جزو ٹھہرایا واقعی انسان صریح ناشکرا ہے کیا خدا نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں پسند کیں۔ اور تم کو بیٹوں کے

بِالْبَنِيْنَ ۝ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا

ساتھ مخصوص کیا حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے جس کو خدائے رحمٰن کا نمونہ (یعنی اولاد) بنا رکھا ہے (مراد بیٹی ہے) تو اس کا

وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

ناراض ہوکر) سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور دل ہی دل میں گھٹتا ہے کیا جو کہ (عادۃً) آرائش میں نشو ونما پائے اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے اور انہوں نے

الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ۝

فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں عورت قرار دے رکھا ہے کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جاتا ہے اور (قیامت میں) ان سے بازپرس ہوگی

تفسیر تکوین عالم۔ انسان کے بقاء اور آرام کے اسباب کی فراہمی اور ان اسباب کا باہم ارتباط تقاضہ کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے غلبہ اقتدار، ارادۂ حاکمہ اور ہمہ گیر علم کا اقرار کرے اور اپنی پوری زندگی کو اللہ کا محتاج اور اس کے قبضہ و تصرف میں سمجھے اور اس کے ساتھ یہ بھی یقین کرلے کہ جب اللہ نے ساری کائنات کو اور مجھے پہلی مرتبہ عدم سے پیدا کیا تو موجود کرنے کے بعد معدوم کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا ناممکن نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی طرف سب کا لوٹ کر جانا یقینی ہے۔ مقدمات کی یہ ترکیب اور ہر ترتیب کا حامل نتیجہ ہونا بالکل منطقی ہے، مگر مشرک اللہ کو خالق کل تو مانتے ہیں اور مانتے تھے اُس کی ہمہ گیر قدرت اور کامل علم کے بھی قائل تھے۔ اُن کو اللہ کی آمریت کی ہمہ گیری کا بھی انکار نہ تھا وہ اللہ کی ربوبیت عامہ اور غیبی و ظاہر الغامات کی بارش کو بھی تسلیم کرتے تھے مگر ان مسلمات کے نتیجہ کے عقیدۃً منکر تھے۔ توحید و تمجید کو چھوڑ کر انہوں نے خدا کو عاجز باپ کی طرح اولاد کا محتاج قرار دے رکھا تھا، اس لئے (بعض انسانوں کو اس کے بیٹے اور) فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے تھے اور اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ والدیت بجائے خود احتیاج کی علامت ہے اور خدا محتاج نہیں پھر اولاد بھی مادہ جو کسی طرح باپ کی مدد نہیں کرسکتی۔ سوا آرائشگی اور زیبائش کے شوق کے اس میں نہ دفاع کی طاقت ہوتی ہے نہ باپ کی طرف سے زبانی نمائندگی کی۔ خالق کو باپ اور مخلوق کو اولاد قرار دینا اتنی ہی بڑی کور دانش ہے جیسے بے نیاز قادر مطلق کو محتاج اور عاجز کہنا۔ مشرکوں کی دوسری حماقت دانش یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کو موجد مانتے ہوئے حشر جسمانی اور حیاتِ اُخرویہ کو ناممکن خیال کرتے تھے۔ مادہ سے موجودہ صورت جسمانیہ کا انفصال ان کے نزدیک دوبارہ ناقابلِ اتصال تھا۔ حالانکہ بدیہی مشاہدہ ہے کہ بارش ہونے سے مردہ زمین زندہ ہوجاتی اور خشک کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ جب نباتی موت و حیات کا یہ حال ہے تو حیوانی موت کے بعد حیاتِ جدیدہ آجانے میں کیا استحالہ ہوسکتا ہے۔ حیوان اور نبات نشو و نمو میں تو شریک ہی ہیں۔ ارتقائے کائناتی کا نظریہ مانا جائے یا تباین نوعی کا۔ بہرحال خصوصیات شعوری و ادراکی کو چھوڑ کر حیات نامیہ تو حیوان میں بھی اسی طرح ہے جس طرح نبات میں پھر کیا وجہ کہ ایک کا بربنار مشاہدہ اقرار اور دوسرے کا بر سبیل توہم انکار کیا جائے۔

تحلیلِ اجزاء وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ۔ مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا مسلمان، ہم کی ضمیر عہد نزول کے مشرکوں کی طرف راجع ہے، مگر حکم میں خصوصیت نہیں، ہر زمانہ کے مشرک اسی کے قائل ہیں۔ ہاں منکرین خدا کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ۔ آسمان و زمین یعنی ساری کائنات ایک خاص اندازے اور پلاننگ کے زیر اثر بنائی گئی ہے۔ اس کا بنانے والا یقیناً بہت بڑے علم والا ہے۔ اتفاقاً بغیر علم و ارادہ کے ایسی مربوط کائنات جو ایک نظم میں تخلیقاً بندھی ہوئی نہیں بنائی جاسکتی۔ پھر اس کے بنانے والے کی قوت و قدرت بھی ماننی پڑتی ہے۔ بغیر قوت کے تو ادنیٰ ارادی کام بھی نہیں ہوسکتا۔ اور اس سنسار کو پیدا کرنا تو بہت بڑا کام ہے اس کے لئے تو بنانے والے میں بہت بڑی طاقت ہونی ناگزیر ہے، اس لئے ہر وہ شخص جو خدا کی ہستی کا قائل ہے خواہ نظم عالم اور ربوبیت میں ان گنت شریک مانتا ہو اور قدرت کے ہر خدمت گذار کارندے کو رب جانتا ہو، مگر خالقِ کائنات ایک ہی ذات کو مانتا ہے جب خالق کا واحد ہونا اور اس کا علیم و قدیر ہونا مشرکوں کو بھی تسلیم ہے اور یہ بھی حقیقتِ مسلمہ ہے کہ خالق کو اس تخلیق میں کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ تھی نہ آئندہ کسی کو پیدا کرنے میں کسی کی اعانت کا وہ محتاج ہوگا۔ اور سارا عالم اپنے وجود میں اسی کا محتاج ہے تو اب سوال یہ ہے کہ اس کائنات

کی بقاء اور انتظام کس کے ہاتھ میں ہے۔ کون ایسا فرماں روا اور حاکم مطلق ہے جس کی حکمت و حکومت اس کائنات میں چل رہی ہے ظاہر ہے کہ جو خالق سارے جہان کو بغیر کسی کی مدد سے عدم سے وجود میں لایا۔ ناظم حاکم آمر اور فرماں روا بھی ہے وہی ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا جس نے انسانوں کے رہنے کے لئے زمین کو پرورش گاہ بنایا یا پالنا بنایا یا گہوارہ بنایا نہ زیادہ نرم کہ انسان زمین میں دھنس جائیں نہ اتنا سخت اور مخروطی اور چکنا کہ بیٹھنا، لیٹنا اور کھڑا ہونا ناممکن ہو جائے نہ ایسا گرم کہ تپش سے جلا دے نہ اتنا سرد کہ ٹھٹھرا دے اور جما دے نہ ایسا لرزاں کہ سانس لینا دشوار ہو اور اختلاجِ قلب ہو کر دم نکل جائے نہ ایسا ساکن اور جامد کہ حبس دم ہو جائے۔

وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔ اسی نے زمین میں راستے بنائے کہ انسان راہوں پر چل کر مقصد تک پہنچ جائے۔ اگر ساری زمین ناقابلِ عبور سنگستان ہوتی یا غاروں اور وادیوں سے بھری ہوئی ہوتی یا کل زمین پر ریگ رواں کا سیلاب ہر وقت آتا رہتا یا سمندری موجوں کی طغیانی ہر وقت زمین پر زمین پر دلدلی تہیں چڑھائے رہتی۔ تو انسان اپنی جگہ سے کیسے حرکت کرتا۔ یہ بحری اور بری راستے اور یہ شاہراہیں اور پگ ڈنڈیاں نہ ہوتیں تو چلنا پھرنا آنا جانا اور سفر کرنا ناممکن ہوتا۔

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ اسی نے انسانوں کے لئے کھانے پینے پہننے اور استعمال کرنے کا سامان پیدا کرنے اور فراہم کرنے کا انتظام کیا خشک مردہ زمین پر اوپر سے ایک مخصوص مقدار میں پانی برسایا تاکہ زمین سرسبز ہو جائے۔ غلہ پھل پھول جڑی بوٹیاں، لکڑی روئی، کتان، ریشم، دودھ دہی، مکھن، گھی، پنیر، گوشت اور تمام مشروبات و ماکولات مہیا کرنے کا انتظام کیا۔ پانی اتنا برسایا جتنی زمین کو از سر نو زندگی حاصل کرنے اور انسانوں کے لئے اسبابِ زندگی پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا۔ کہیں کم کہیں زیادہ، کبھی ایک جگہ کم، کبھی دوسری جگہ زیادہ۔ کبھی وہاں کم یہاں زیادہ اوسط اندازہ ایک ہی ہے۔ عملِ تبخیر ایک ہی جاری ہے۔ سمندر سے مون سون اٹھنے کی مقدار ایک ہی ہے۔ سورج کی شعاعیں ایک سی ہی پڑتی ہیں۔ مون سون اٹھتے ہیں دوڑتے ہیں، پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ ٹھنڈے پڑتے ہیں پانی بنتے ہیں، برستے ہیں، پانی زمین میں داخل ہوتا ہے۔ عملِ تبخیر عملِ انقلاب تک پہنچتا ہے۔ عملِ انقلاب کی انتہا عملِ تولید پر ہوتی ہے، زمین شاداب اور سیر ہو جاتی ہے۔ عملِ تولید کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو پانی اس دوری حرکت کے بعد لوٹ کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ یہ ہی قدرِ خداوندی اور اندازۂ خالق ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ اس طریقہ سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ سوکھی زمین میں حیاتِ نامیہ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب عدم سے وجود میں اور وجود سے عدم اور پھر عدم سے وجود کا چکر تمہارے سامنے ہے اور اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہے ہو اور اندازۂ الٰہی کی بے پایانی مسلم ہے تو خوب سمجھ لو کہ

کَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ۔ اسی طرح مرنے کے بعد ایک معین وقت پر تم کو بھی دوبارہ پیدا کر دیا جائے گا۔ بدن اور اعضاء بدن کا لباس روح کو دوبارہ پہنا دیا جائے گا۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا۔ اور اسی نے تو تمام اقسام کی چیزیں پیدا کیں۔ طرح طرح کے پھل پھول اور جڑی بوٹیاں قسم قسم کے چرندے پرندے، درندے اور بری بحری جانور۔ سعید بن جبیر کے نزدیک ازواج سے مراد اصناف ہیں۔ عام طور پر ازواج کا معنی جوڑے ہیں۔ دوسری آیت میں خَلَقَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ زَوْجَیْنِ بھی آیا ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ہم نے مکمل تشریح کر دی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کائنات میں ہر چیز اضافی اور تقابلی ہے۔ حقیقی کوئی شئی نہیں۔ گرمی، سردی، تری، خشکی، تلخی، شیرینی، جھوٹ سچ حق و باطل حسن قبح زمانہ روشنی تاریکی کفر ایمان غرض غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ کائنات حسی ہو یا غیر حسی صوری ہو یا معنوی سب کی تخلیق تقابلی ہے اور ہر مقابل کا دوسرے مقابل کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ اور جھکاؤ احتیاج و حدوث کی علامت ہے۔ اس لئے کوئی چیز قابلِ الوہیت و معبودیت نہیں۔ حقیقت صرف ایک ہے۔ وہ ہے واحدِ حقیقی جو ہر جھکاؤ اور میلان اور اضافت سے پاک ہے، بے مثال ہے اس کی مثال کوئی نہیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ اس جگہ کیونکہ تکوینی نعمتوں کا تذکرہ ہے اور سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنی ہمہ گیر ربوبیت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے سعید بن جبیر کا تشریحی قول مراد لینا مناسب ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ۔ آیاتِ مذکورہ میں پانچ چیزوں کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) تخلیق کائنات جس میں انسان بھی داخل ہے ۔ (۲) زمین کو پیدا کر کے قابلِ سکونت بنانا تاکہ انسان کو رہنے کی مناسب جگہ مل جائے (۳) آمد و رفت کی سہولت کے لئے زمین پر راستے بنا دینا تاکہ چل پھر کر آدمی اپنی ضرورتیں پوری کر سکے (۴) بارش نازل کرنا تاکہ انسان کو بقائے زندگی کا سامان فراہم ہو جائے (۵) بارش سے زمین پر طرح طرح کی چیزوں کو برآمد کرنا تاکہ انسان کو غذا اور لباس مل جائے ۔ اب اس آیت میں پانی اور خشکی میں سفر کرنے کے لئے سواریاں پیدا کرنے اور ان کو انسان کی خدمت پر لگا دینے کا اظہار فرمایا تاکہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے کا ذریعہ انسان کو مل جائے اور جہاں پیادہ نہ جا سکتا ہو وہاں سوار ہو کر چلا جائے ۔ کیا یہ نعمتِ رب نہیں کہ سرکش نافہم بے دانش جانور انسان کے اشاروں پر کام کرتا ہے اور ہزاروں ٹن کے جہاز پانی کی سطح پر تیرتے ہیں ۔ اور انسانوں کو سمندر پار ملکوں تک پہنچاتے ہیں ۔ پانی رقیق اور ہوا خفیف ہونے کے باوجود اپنے دباؤ اور اٹھاؤ سے ایسا توازن قائم رکھتی ہے کہ زمین کا مرکزِ ثقل جہاز کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے ۔ کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ مادی کائنات کی طبعی خاصیت ہے ، لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ یہ خاصیت کس نے بنائی اور کس نے انسان کو جہاز کی ساخت بتائی اور کس نے مادیات کے ان خواص کو آدمی کی خدمت پر لگایا ۔ اگر اللہ ان سواریوں کی تسخیر نہ کرتا ۔ جانوروں کو فرمان پذیری کی صلاحیت اور انسان کو تدریب و ٹریننگ کی دانش و تدبیر نہ دیتا تو کس طرح ایک حقیر انسان اتنی عظیم الشان خارج از مقدور کائنات سے کام لے سکتا ۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو سفرِ حیات طے کرنے کے لئے جب سواریوں پر ٹھیک طرح سے سوار ہوتے ہیں تو انعامِ خداوندی کا شکر ادا کرتے ہیں اور اللہ کی پاکی کا اقرار کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا یہ سفرِ حیات بے مقصد اور آخری نہیں ۔ سفر کی انتہا اور غایت وہی ذات ہے جو ہمارے آغازِ زندگی کا مبدءِ اول ہے وہی ہم کو عدم سے وجود میں لایا اور جب تک چاہا اپنی نعمتوں سے نوازا اور باقی رکھا اور

وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ۔ آخر کار زندگی کی موجودہ مسافت طے کرنے کے بعد ہم کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور اسی کو اس کی ربوبیت و انعامات کا حساب دینا ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سوار ہوتے وقت تین بار تکبیر کہتے پھر سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا سے لَمُنقَلِبُونَ تک پوری آیت پڑھتے تھے رواہ مسلم والبوداؤد والترمذی والنسائی والحاکم فی المستدرک

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ۔ کور دانش مشرک اللہ کے خالق بے نیاز اور قادر عظیم ہونے کے قائل ہوں مگر اسی کی مخلوق اور عاجز بندوں میں سے بعض کو اس کی اولاد قرار دیتے ہیں ۔ (بعض پیغمبروں کو اس کے بیٹے اور) فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے ہیں ۔ یہ تو کھلا ہوا انکار اور ناشکری ہے ۔ خالقیت اور منعمیت کا اقرار تو چاہتا ہے کہ کسی کو اس کا مددگار نہ مانا جائے اور مخلوق کی مدد سے اس کو بے نیاز سمجھا جائے اور اس کو والد قرار دینے کا تقاضا ہے کہ اس کو اولاد کا محتاج قرار دیا جائے اور خالقیت یا منعمیت میں کسی کو اس کا ساجھی کہا جائے یہ کھلا ہوا کفر اور واضح ناشکری نہیں تو اور کیا ہے ۔ بیشک یہ مشرک انسان کھلا ہوا ناسپاس اور منکرِ ربوبیت ہے ۔

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ ۝ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۔ ایک تو خالق کو والد اور مخلوق کو اولاد قرار دینا ہی خالقیت اور تقاضائے خالقیت کے خلاف ہے کفر بھی ہے ۔ اور ناسپاسی بھی پھر اس سے بڑی حماقت اور دماغی بے مائیگی کی علامت یہ ہے کہ مشرک اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہیں اور اگر بیٹی ہونے کی اطلاع ملتی ہے تو منہ فق پڑ جاتا ہے رنج سے چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں ، لیکن جو صنفِ اولاد اپنے لئے رنجدہ اور ناگوار سمجھتے ہیں وہ اللہ کے لئے ثابت کرتے ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر بالفرض محال اللہ اپنے لئے اولاد کو اختیار بھی کرتا تو کیا لڑکیوں کا انتخاب کرتا جو کسی طرح اس کے کام آنے والی نہیں ۔ لڑکیوں میں تو قوتِ وفا نہیں ہوتی کہ باپ کی طرف سے دشمن (ہاتھ سے) یا کم از کم زبان ہی سے دفع کر سکیں ۔ زیور اور بدنی زیب و زینت میں پرورش پانے والی اور بناؤ سنگھار سے شیفتگی رکھنے والی کیا مدد کر سکتی ہے ۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔــلُوْنَ مشرکوں کی دوسری حماقت یہ ہے کہ وہ ملائکہ کو جو اللہ تعالیٰ کے خالص بندے ہیں یعنی نہ نر ہیں نہ مادہ عورتیں قرار دیتے ہیں تو (نہ ان کے پاس وحی آئی نہ اللہ کے کسی پیغمبر نے ان سے کہا) پھر کیا یہ خود کسی فرشتے کی پیدائش کے وقت وہاں موجود تھے کہ عینی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کی (یہ جھوٹی) شہادت ضرور لکھی جائے گی اور قیامت کے دن اس بات کی اُن سے بازپرس ہوگی۔

مقصود بیان

لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مشرکوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے خالق لاشریک لہٗ ہونے کا اقرار تھا اور ان کو اس کا بھی اقرار تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ قادر ہے اور عالم بھی ہے ما سِ ندہ سے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تک توحید خالقیت اور وحدت ربوبیت کو ثابت کرنے کے لئے آسمان زمین اور بعض کائناتِ زمین کی تخلیق اور پرحکمت قانون نظم کو بیان کیا ہے۔ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ میں حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی مخلوق کو انسان کا مطیع بنا دیا ہے اس میں انسانی تدبیر کو دخل کامل نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ قوی کو کمزور کے تابع کر دیا، اس لئے اللہ کو اس نعمت سے فائدہ اٹھاتے وقت اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور احاطہ ربوبیت کا اقرار کرنا اور ہر نقص و عیب سے اس کے پاک ہونے کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ساری کائنات کی تسخیر اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے اسی طرح انسان کی ہستی بھی اس کے دسترس سے باہر نہیں۔ آغاز ہستی کا کنارہ بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور انتہا و جو بھی اُسی کے قبضہ میں۔ پس جس خدا نے نیست سے ہست کیا اور بقاء ہستی کے تمام اسباب کو انسان کے کام پر لگا دیا وہ ہی خواہش کو نیست بنا کر اپنی طرف ضرور لوٹا لے گا۔ وَجَعَلُوْا لَهٗ سے انسان کی حماقت اور کفران نعمت کا اظہار ہے۔ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اُن اولیاء پرستوں اور مزاراتِ مقدسہ کے پجاریوں کو کہ پیدائش سامانِ پیدائش ہستی بقاء ہستی اور مآل ہستی سب کا مالک اللہ کو جانتے ہوئے وہ حکومت کائنات اور الوہیت آمریہ میں اللہ کے بندوں کو اللہ کا ساجھی قرار دیتے ہوئے اور شرک کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے در در کی جبہ سائی کرتے پھرتے ہیں۔ اُن پڑھے لکھے جاہل عالموں اور وظیفچیوں کو بھی اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جو غیبی مؤکلوں اور کارساز ملائکہ کو پکارتے اور ان سے مدد کی خواہش کرتے ہیں۔ اور کارگاہ ہستی کا مختار دوسروں کو قرار دیتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مشرکین عرب ملائکہ (یعنی دیوتاؤں) کو مانتے تھے، مگر ان کو اللہ کی بیٹیاں (یعنی بیبیاں) قرار دیتے تھے وغیرہ۔

وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ⑳

اور وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے ان کو اس کی کچھ تحقیق نہیں محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں کیا ہم نے

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا

ان کو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب دے رکھی ہے کہ یہ اس سے استدلال کرتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک

عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ

طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا

مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ

مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہیں کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ

(تب) اُن کے پیغمبر نے کہا کہ کیا (رسم آبائی ہی کا اتباع کئے جاؤ گے) اگرچہ میں اُس سے اچھا مقصود پر پہنچا دینے والا طریقہ تمہارے پاس لایا ہوں کہ جس پر تم نے اپنے

كٰفِرُوْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿ع﴾

باپ دادا کو پایا ہے (براہِ عناد) وہ کہنے لگے کہ ہم تو اس دین کو مانتے نہیں جس کو دے کر تم کو بھیجا گیا ہے سو ہم نے اُن سے انتقام لیا سو دیکھئے تکذیب کرنے والوں کا...

تفسیر کسی مسئلہ کی صحت و غلطی میں امتیاز کرنے اور حقیقت کو جاننے کے صرف دو ذرائع ہیں۔ (۱) عقل و فکر جو وہم و خیال کی آمیزش و آلائش سے پاک ہو۔ (۲) وحی اور اللہ کی کتاب۔ اوّل طریقۂ علم کے رہرو حکماء اور حاملین عقل سلیم ہوتے ہیں۔ قوانین بدیہیہ کے علاوہ بعض طبعی حقائق تک ان کی عقل نظری کی رسائی ہو جاتی ہے، لیکن الٰہیات اور فوق الطبیعات کے متعلق ان کی قوتِ فکریہ کی نارسائی قابلِ انکار ہے۔ اللہ کی ذات اور صفات کا اس گروہ کو صحیح علم نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ یہ سوچتے سمجھتے اور دلائل عقلیہ قائم کرتے ہیں وہ وہم آلود اور قیاسی اٹکل کے زیرِ اثر ہوتا ہے الٰہیات کے متعلق یقینی علم کا ذریعہ صرف وحیِ نبوت اور کتاب اللہ ہے۔

الوہیت اور ربوبیت میں ملائکہ یا غیبی کارندوں کو شریک بنانے کی شہادت نہ عقل سلیم سے مل سکتی ہے نہ اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب یا وحیِ نبوت سے مشرکوں کی یہ محض قیاسی اٹکل اور وہم آلود فہم ہے جو شرک کو مشیتِ الٰہی پر محول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو ہم شرک نہ کرتے۔ ان کو نہیں معلوم کہ مشیت کا احاطہ اگرچہ ہمہ گیر ہے، مگر رضا کا تعلق ہر چیز سے نہیں۔ اور ہم تخلیقاً اگرچہ دوسری کائنات کی طرح دائرۂ مشیت کے اندر گھرے ہوئے ہیں، مگر مجبور نہیں۔ مشیت کا تعلق رضاءِ خداوندی سے بھی ہے اور نامرضی سے بھی پھر نامرضی کو اختیار کرنے کی علت مشیت جابرہ کو قرار دینا غلط ہے۔ ہم مکلّف ہیں اور صاحبِ ارادہ ہیں اور ارادہ کے تعلق میں ہم آزاد ہیں۔ پس ہم کو مشیتِ خداوندی کے حیلے کو ترک کر کے مرضیٔ الٰہی کی جستجو کرنی چاہیئے اور مرضی کا علم نبوت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے نبی کے فرمان اور کتاب اللہ کی صراحت کے سامنے سر جھکا دینا چاہیئے۔ کتاب اللہ اور فرمانِ رسول کے مقابلے میں عمل آباء کو پیش کرنا اور دستورِ سلف پر چلنا حماقت ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ

مشرکوں کو توحید پر اعتراض تھا اور ملائکہ کی پرستش کے لئے یہ توجیہ کرتے تھے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی مشیت کے دائرہ سے اندر ہے۔ ہماری ملائکہ پرستی بھی اُسی مشیت کے زیرِ اثر ہے۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کا یہ قیاس تخمینی ہے اور اٹکل مفید یقین نہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اللہ ملائکہ پرستی چاہتا ہے یا نہیں۔ مشیت کا پتہ یا عقل سے ہو سکتا ہے یا اللہ کی کسی کتاب کی صراحت سے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا حکم دیتا ہے یا منع کرتا ہے وہی اس کی مشیت یعنی رضا ہونی چاہیئے اور شرک کی اُس نے ممانعت کی ہے لہٰذا توحید ہی اُس کی رضا ہے اور شرک خلافِ رضا۔ رہا مشیت کا عمومی تصور تو بے شک ہر گناہ اور ممنوع فعل بھی اُس کی مشیت کے اندر داخل ہے، لیکن مشیت کا یہ عموم تخلیقی ہے جس سے کسی شخص کے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔ مشیت تخلیقی پر مشیت بمعنی رضا کو قیاس کرنا اٹکل پچو بے بنیاد قیاس نہیں تو اور کیا ہے

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ مشرکوں کے پاس شرک کا جواز کا عقلی ثبوت ہے نہ نقلی نہ فکر ہے نہ علم بلکہ ایک جواب جاہلانہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا اور وہ یقیناً راہِ راست پر تھے لہٰذا ہم بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے، مگر یہ جواب وہی ہے جو ہمیشہ سے عیش پسند آرام کوش راحت طلب طبقہ جو فکر و علم سے خالی ہوتا ہے کہتا

چلا آیا ہے۔ جب بھی اُن کے پاس کوئی پیغمبر اللہ کا پیام ہدایت لے کر پہنچا اور حکم خدا وندی کی مخالفت کے نتیجۂ بد سے ڈرایا اور توحید و عمل صالح کی تعلیم دی اُس کور دانش طبقہ نے اپنے عقیدہ اور عمل کے جواز میں یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو اسی طریقہ پر پایا اور انہیں کے نقشِ قدم پر ہم چل رہے ہیں۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ پیغمبر وقت نے سمجھایا کہ تمہارے باپ دادا کا جو طریقۂ زندگی تھا جس پر تم نے ان کو پایا تھا وہ غلط تھا میں تو تمہارے پاس الٰہی صحیح تعلیم لے کر آیا ہوں اور وہ ضوابطِ حیات بتا رہا ہوں جو تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے کہیں زیادہ منزل پر پہنچانے والے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں بھی تم باپ دادا کے طریقہ پر چلتے رہو گے۔ اور میری ہدایت کو نہیں مانو گے۔ مشرکوں نے جواب دیا تم سب لوگ جس پیام ہدایت کے حامل بنا کر بھیجے گئے ہو ہم کو اس سے انکار ہے یعنی نہ ہم کو اس کا یقین ہے کہ اللہ نے تم کو یہ پیام پہنچا لے اور اس طرح ہدایت کرنے پر مقرر کیا ہے نہ اس تعلیم کو ہم باپ دادا کے طریقہ کے مقابلے میں صحیح اور مفید سمجھتے ہیں۔

قٰلَ کا فاعل رسول ہے اور اُرْسِلْتُمْ کے مخاطب رسول اور رسول کے تمام ساتھی ہیں۔

اس سرکشی غلط روی اور خطا کوشی کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور پوری قوم کا تختہ تاراج کر دیا۔ اہلِ دانش اور آنکھوں والے اُن تکذیب کرنے والوں کے آثار دیکھ سکتے ہیں جو دیکھنا چاہے دیکھ لے کہ ان میں کوئی فرد نہیں بچا (اُن کی ساری طاقت، صنعت، مدنیت، اکثریت، حکومت اور ہر چیز تباہ ہو کر رہ گئی۔)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ

اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جبکہ ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں اُن چیزوں (کی عبادت) سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ

سَيَهْدِيْنِ ۝ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ

کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے اور وہ اس (عقیدہ) کو اپنی اولاد میں (بھی) ایک قائم رہنے والی بات کر گئے تاکہ (ہر زمانہ میں مشرک) لوگ (شرک سے) باز آکر توحید میں لگ رہیں بلکہ میں نے

وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

انکو اور انکے باپ دادوں کو (دنیا کا) خوب سامان دیا ہے یہاں تک کہ اُن کے پاس سچا قرآن اور صاف صاف بتانے والا رسول آیا اور جب اُن کے پاس یہ سچا قرآن پہنچا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اسے نہیں مانتے

تفسیر جب کفر کی طاقت انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ باوجود غلطیِ عقیدہ طغیانِ عمل اور اسراف زندگی کے ان کا اقتدار ہمہ گیر ہوتا جاتا ہے۔ دولت بڑھتی جاتی ہے۔ دنیوی علوم میں ترقی اور صنعت میں فراوانی ہوتی جاتی ہے تو ایسی قوم غلط روی اور خطاء عقیدہ سے آگے بڑھ کر کج فکری میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر (امتحانی) عنایت و نعمت اپنی فکر و کوشش کا نتیجہ قرار دے کر مزید گمراہی میں پڑ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں انہیں کے اندر سے کوئی صحیح الفطرت صالح الفکر انسان پیدا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقاضائے دانش کے زیر اثر قوم کے افکار و اطوار سے بیزاری کا اظہار کرتا اور ساری گمراہ قوم کو صداقت و حقانیت کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے قول کے ثبوت میں کھلے ہوئے نشان اور واضح معجزات کو پیش کرتا ہے، مگر وہ لوگ اپنی نسبی اور موروثی آبائی عزت حکومت دولت صنعت اور طاقت پر اتنے مغرور ہوتے ہیں کہ رسولِ امین اور ہادیٔ برحق کے پیام ہدایت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں اور ہادیٔ صادق کے کھلے معجزات اور آیات بینات کو جادو سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ اُن کی باطنی آنکھ میں تو روشنی ہوتی نہیں اور ظاہری آنکھ سے چمک دمکتی

ہے جس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہیرے اور شیشے کی چمک میں فرق نہیں کر سکتے اور غیبی قوتِ قدسیہ کے حامل کو شعبدہ باز اور شیطانی طاقت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی قصہ ہوا۔ آپ بھی ایک طاقتور متمدن حکمران پُرجبروت باطل پرست مشرک قوم میں پیدا ہوئے اور قوم کے افکار و اعمال سے بیزاری کا اعلان کرنے کے ساتھ سب کو راہِ حق دکھائی، مگر کسی نے راہِ حق کا ساتھ نہیں دیا۔

تحلیلِ اجزاء

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ بَلْ مَتَّعْتُ هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ حضرت ابراہیم کا قصہ قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے کیونکہ اولادِ اسمٰعیلؑ (عرب) اور بنی اسرائیل آپ ہی کی نسل میں سے تھے اور سب اپنے مسلک کو مسلکِ ابراہیمی کہتے تھے۔ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آذر تھا بعض اہلِ تاریخ نے باپ کا نام تارخ اور چچا کا نام آذر قرار دیا ہے اور چونکہ چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور آذر نے ہی حضرت ابراہیمؑ کی پرورش کی تھی، اس لئے قرآن مجید نے آذر کو پدرِ ابراہیمؑ قرار دیا ہے۔

قومِ ابراہیمؑ سے مراد تمام اہلِ بابل ہیں۔ نسل یا وطن کے اتحاد کی وجہ سے ان کو قومِ ابراہیم فرمایا۔ انسان کے افراد و اجتماع کی تقویمِ ساخت نسل اور قرابت سے بھی ہوتی ہے اور وطنی اشتراک سے بھی اور دستورِ زندگی کی یگانگت سے بھی اور وحدتِ فکر و نظر سے بھی، اس لئے کنبہ اور قبیلہ کو بھی قوم کہا جاتا ہے اور اہلِ وطن کو بھی اور ایک رسم و رواج پر عمل کرنے والوں کو بھی اور کفر یا ایمان میں شرکت کرنے والوں کو بھی۔ دستورِ زندگی میں یگانگت اور فکر و نظر میں اتحاد رکھنے والوں کو ایک ملت کے افراد کہا جاتا ہے۔ علاوہ ایک قوم ہوتے کے وہ متحد الملت بھی ہوتے ہیں، اسی لئے مومن کو مومن کا اور کافر کو کافر کا ہم ملت کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی کافروں سے شرکت قرابت کی بھی تھی اور وطن کی بھی، اس لئے وہ آپ کے برادرانِ وطن و قرابت تھے، مگر ہم ملت نہ تھے اسی لئے آپ نے اُن کے شرک سے بیزاری کا اعلان کیا اور بلند آہنگی سے فرمادیا کہ جب عدم سے وجود میں لانے والا ایک ہے تو وہی راہِ زندگی بتانے والا بھی ہوگا۔ جو خالق ہے اُسی کو شارعِ حیات بھی ہونا چاہیئے۔ جب عدم سے حیات کی طرف اُس نے راہنمائی کی تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی میں وہ صحیح فکر و عمل کی راہ نمائی نہ کرے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی توحیدِ الوہیت و ربوبیت کی تلقین اپنی اولاد کو بھی کی اور ساری نسل کے لئے اسی کلمۂ تنزیہ و توحید کو باقی چھوڑ گئے تاکہ لوگ سوچ سمجھ کر تمام پیچ در پیچ پگ ڈنڈیوں کو چھوڑ کر اسی صراطِ مستقیم کی طرف لوٹیں اور اسی پر گامزن رہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کے قوم والوں نے آپ کی ہدایت کو نہ مانا اور اپنی اور اپنے باپ دادا کی حکومت، دولت، طاقت، مدنیت اور ہمہ گیر سطوت کو اپنے مسلک کے صحت کے ثبوت میں پیش کیا اور کہنے لگے اگر ہم حق کی راہ پر گامزن نہ ہوتے اور ہمارے باپ دادا کج راہ ہوتے تو ہم کو یہ نعمتیں کیسے ملتیں۔ بیوقوف اتنا نہ سمجھے کہ یہ نعمت تو خداداد ہے خود آوردہ نہیں۔ یہ تو خدا کی ایک عنایت ہے۔ وہ بندوں کو ہر طرح نوازتا ہے۔ لیکن جب بندے اس کی بتائی ہوئی راہ پر نہیں چلتے اور خدا پرست ہونے کی بجائے خود پرست ہو جاتے ہیں تو ان کی تنبیہ کے لئے پیامِ حق و صداقت بھیجتا اور کسی پیغمبر کو مقرر کرتا ہے تاکہ پیغمبر کھول کھول کر اچھے بُرے خیر و شر اور خطا صواب کو الگ الگ بیان کر دے۔ جب پیغمبر آکر اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچاتا اور دلائل و معجزات سے اپنے قول کی صداقت ثابت کرتا ہے تو جاہلوں کے پاس سوا اس کے کوئی جواب نہیں ہوتا کہ تم جادوگر ہو کچھ شیطانی طاقتیں تمہاری مددگار ہیں۔ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے اور ہرگز تسلیم نہیں کریں گے کہ اللہ نے تم کو ہدایت کرنے کے لئے بھیجا ہے اور تمہارا یہ پیام حاملِ حق و صداقت ہے۔

(اسرائیلی اہلِ کتاب اور) اسماعیلی عربوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ انہوں نے مسلکِ ابراہیمی اور وہ مشربِ زندگی چھوڑ دیا تھا جو حضرت ابراہیم اپنی نسل کے لئے چھوڑ کر گئے تھے۔ توحید کی جگہ شرک کو ان لوگوں نے اختیار کر لیا تھا اور اپنی کثرت، طاقت اور فراوانیٔ مال و حریت کو اپنے مسلک کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حق نازل فرمایا اور رسولِ امین کو مبعوث فرمایا جنہوں نے

ہے جس کا انکار نہیں کر سکتے، اس لئے ہیرے اور شیشے کی چمک میں فرق نہیں کر سکتے اور علمی قوت قدسیہ کے حامل کو شعبدہ باز اور بطالی قوت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی قصہ ہوا۔ آپ بھی ایک طاقتور متمدن حکمران پر جبروت باطل پرست مشرک قوم میں پیدا ہوئے اور قوم کے افکار و اعمال سے بیزاری کا اعلان کرنے کے ساتھ سب کو راہ حق دکھائی، مگر کسی نے راہ حق کا ساتھ نہیں دیا۔

تحلیل اجزاء

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ بَلْ مَتَّعْتُ هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ۔ حضرت ابراہیم کا قصہ قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے کیونکہ اولاد اسمٰعیلؑ (عرب) اور بنی اسرائیل آپ ہی کی نسل میں سے تھے اور سب اپنے مسلک کو مسلک ابراہیمی کہتے تھے۔ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آذر تھا بعض اہل تاریخ نے باپ کا نام تارخ اور چچا کا نام آذر قرار دیا ہے اور چونکہ چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے اور آذر نے ہی حضرت ابراہیمؑ کی پرورش کی تھی، اس لئے قرآن مجید نے آذر کو پدر ابراہیمؑ قرار دیا ہے۔

قوم ابراہیمؑ سے مراد تمام اہل بابل ہیں۔ نسل یا وطن کے اتحاد کی وجہ سے ان کو قوم ابراہیم فرمایا۔ انسان کے افراد و اجتماع کی تقویم ساخت نسل اور قرابت سے بھی ہوتی ہے اور وطنی اشتراک سے بھی اور دستور زندگی کی یگانگت سے بھی اور وحدت فکر و نظر سے بھی، اس لئے کنبہ اور قبیلہ کو بھی قوم کہا جاتا ہے اور اہل وطن کو بھی اور ایک رسم و رواج پر عمل کرنے والوں کو بھی اور کفر یا ایمان میں شرکت کرنے والوں کو بھی۔ دستور زندگی میں یگانگت اور فکر و نظر میں اتحاد رکھنے والوں کو ایک ملت کے افراد کہا جاتا ہے۔ علاوہ ایک قوم ہونے کے وہ متحد الملت بھی ہوتے ہیں، اسی لئے مومن کو مومن کا اور کافر کو کافر کا ہم ملت کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی کافروں سے شرکت قرابت کی بھی تھی اور وطن کی بھی، اس لئے وہ آپ کے برادران وطن و قرابت تھے، مگر ہم ملت نہ تھے اسی لئے آپ نے اُن کے شرک سے بیزاری کا اعلان کیا اور بلند آہنگی سے فرمایا کہ جب عدم سے وجود میں لانے والا ایک ہے تو وہی راہ زندگی بتانے والا بھی ہوگا۔ جو خالق ہے اُسی کو شارع حیات بھی ہونا چاہیئے۔ جب عدم سے حیات کی طرف اُس نے راہنمائی کی تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی میں وہ صحیح فکر و عمل کی راہ نمائی نہ کرے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی توحید الوہیت و ربوبیت کی تلقین اپنی اولاد کو بھی کی اور ساری نسل کے لئے اسی کلمۂ تنزیہ و توحید کو باقی چھوڑ گئے تاکہ لوگ سوچ سمجھ کر تمام پیچ در پیچ پگ ڈنڈیوں کو چھوڑ کر اسی صراط مستقیم کی طرف لوٹیں اور اسی پر گامزن رہیں، لیکن حضرت ابراہیمؑ کے قوم والوں نے آپ کی ہدایت کو نہ مانا اور اپنی اور اپنے باپ دادا کی حکومت، دولت، طاقت، مدنیت اور ہمہ گیر سطوت کو اپنے مسلک کے صحت کے ثبوت میں پیش کیا اور کہنے لگے اگر ہم حق کی راہ پر گامزن نہ ہوتے اور ہمارے باپ دادا کج راہ ہوتے تو ہم کو یہ نعمتیں کیسے ملتیں۔ بیوقوف اتنا نہ سمجھے کہ یہ نعمت تو خداداد ہے خود آوردہ نہیں۔ یہ تو خدا کی ایک عنایت ہے۔ وہ بندوں کو ہر طرح نوازتا ہے۔ لیکن جب بندے اس کی بتائی ہوئی راہ پر نہیں چلتے اور خدا پرست ہونے کی بجائے خود پرست ہو جاتے ہیں تو ان کی تنبیہ کے لئے پیام حق و صداقت بھیجتا اور کسی پیغمبر کو مقرر کرتا ہے تاکہ پیغمبر کھول کھول کر اچھے بُرے، خیر و شر اور خطا و صواب کو الگ الگ بیان کر دے۔ جب پیغمبر آ کر اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچاتا اور دلائل و معجزات سے اپنے قول کی صداقت ثابت کرتا ہے تو جاہلوں کے پاس سوا اس کے کوئی جواب نہیں ہوتا کہ تم جادوگر ہو کچھ شیطانی طاقتیں تمہاری مددگار ہیں۔ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے اور ہرگز تسلیم نہیں کریں گے کہ اللہ نے تم کو ہدایت کرنے کے لئے بھیجا ہے اور تمہارا یہ پیام حامل حق و صداقت ہے۔

(اسرائیلی اہل کتاب اور) اسماعیلی عربوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ انہوں نے مسلک ابراہیمی اور وہ مشرب زندگی چھوڑ دیا تھا جو حضرت ابراہیم اپنی نسل کے لئے چھوڑ کر گئے تھے۔ توحید کی جگہ شرک کو ان لوگوں نے اختیار کر لیا تھا اور اپنی کثرت، طاقت اور فراوانی مال و حریت کو اپنے مسلک کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے قرآن حق نازل فرمایا اور رسول امین کو مبعوث فرمایا جنہوں نے

واضح دلیل اور معجزات پیش کر کے راہِ حق دکھائی۔ مگر کم بختوں نے اللہ کے رسول کو جادوگر قرار دیا اور کہنے لگے ہم تمہاری بات کی حقانیت اور تمہارا دعوئ رسالت تسلیم نہیں کر سکتے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ

اور کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الٰہی ہے تو) ان دونوں بستیوں (مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ کیا یہ لوگ آپ کے

رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ

رب کی رحمت (خاص یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں دنیوی زندگی میں تو ان کی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تا کہ

فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا

ایک دوسرے سے کام لیتا ہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور آپ کے رب کی رحمت بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع) سے بہتر ہے جس کو

يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ

یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں اور اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں

سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـــُٔوْنَ

اُن کے لئے اُن کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور (زینے) زینے بھی جن پر سے چڑھا (اترا) کرتے اور اُن کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں

وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ

اور یہ چیزیں سونے کی بھی اور یہ سب ساز و سامان، کچھ بھی نہیں صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (یعنی زخرفا) اور آخرت آپ کے رب کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔

ع ۱۰ ۹

تفسیر جن لوگوں کی روحانی آنکھ نابینا اور نورِ بصیرت بجھا ہوا ہوتا ہے اُن کا خود ساختہ معیارِ برتری، مال کی فراوانی، قومی سیادت و حکومت، دنیوی وجاہت، جسمانی طاقت، جتھہ کی کثرت اور ہمہ گیر سطوت ہوتی ہے اور اسی معیار پر وہ روحانی روشنی، اخلاق و کردار کی پاکیزگی، فطرت کی سلامتی اور استحقاقِ نبوت کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ جتھہ دار دولت مند اور پُر جبروت سردار ہی ان کی نظر میں روحانی روشنی کا حامل اور مستحق نبوت بھی ہوتا ہے۔ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایجابی ہو یا استحقاقی خود اُس کے انتخابی موقع پر نازل ہوتی ہے۔ اُس کی رحمت کبھی مادی ہوتی ہے کبھی روحانی اور عقلی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی مشیت کے مطابق دنیا کی معاش اور دولت کی تقسیم کی ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ دی ہے تاکہ انسانی مادی اجتماعیت میں تضاد نہ پیدا ہو کسی کو خادم بنایا کسی کو مخدوم۔ کسی کو حاکم کسی کو محکوم۔ اگر کمی بیشی کے ساتھ تقسیمِ دولت نہ ہوتی تو تنظیمِ اجتماعیت کیسے ہوتی اور کون کسی کا محتاج اور دستِ نگر ہوتا اور یہ سوسائٹی کیسے درست رہتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی روحانی رحمت سے بھی جس کو چاہا سرفراز کیا۔ روحانی رحمت مادی رحمت سے کہیں زیادہ جلیل القدر اور بلند مرتبہ ہے اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو اگر تنظیمِ اجتماعیت کا پاس نہ ہوتا تو کافروں کے مکان سونے اور چاندی کے بنا دیتا۔ اور ہر طرح کی راحت و دولت ہر کافر کو عطا کر دیتا، مگر یہ چیزیں تو صرف مایۂ دنیا ہیں، آخرت پر ان کو

رقیاس کرنا غلطی ہے۔ وہاں تو وہی لوگ کامران اور فلاح یاب ہوں گے جو شرک سے بیزار، گناہوں سے پاک اور دنیا کی ہر آلائش سے پرہیز رکھنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تقسیم رحمت ہے۔ کسی کو دنیوی دولت و راحت دی اور کسی کو نبوت اور آخرت کی کامیابی سے سرفراز فرمایا۔

تحلیلِ اجزاء

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قریتین سے مراد دو شہر مکہ اور طائف ہیں۔ مکہ والوں میں ولید بن مغیرہ کو اہل طائف میں عروہ بن مسعود ثقفی کو بڑا آدمی کہا جاتا تھا۔ کافروں نے پہلے تو نبوت کی ضرورت ہی تسلیم نہ کی تھی۔ قومی رسم و رواج اور اجتماعی دستور ہی اُن کے لئے کافی تھا۔ آباؤ اجداد کی تقلید اور طریقۂ زندگی کی قدامت اُن کی نظر میں معیارِ صداقت تھی، لیکن بادلِ ناخواستہ اور ناگواری خاطر کے ساتھ اگر وہ ضرورت نبوت کو تسلیم بھی کر لیتے تھے تو استحقاق نبوت اور اہل نبوت ہونے کا معیار اُن کے نزدیک صرف مال کی کثرت، قوم کی سیادت، دنیوی وجاہت (اور شاید عمر کی بیشی بھی) تھی۔ کسی ایسے نادار کم عمر آدمی کو جو قوم اور جتھے کا سردار بھی نہ ہو نبی بننے اور بنائے جانے کا کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا حامل اُسی شخص کو ہونا چاہئے جس کے اقتدار کے سامنے لوگوں کے سر جھکتے ہوں اور دنیوی حیثیت میں ممتاز ہو، اسی لئے مکہ کے کافر کہتے تھے کہ طائف یا مکہ کے کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن نازل کیوں نہ ہوا اور دونوں بستیوں کے سرداروں میں سے کسی کو پیغمبر کیوں نہیں بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ کہ کیا اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تقسیم ان کے قبضہ میں اور ان کے قائم کردہ معیار پر ہے کیا یہ لوگ خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تقسیم کرتے ہیں۔ دنیوی مادی رحمت کی تقسیم جس طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے اسی طرح باطنی روحانی اور اُخروی رحمت کی تقسیم بھی اُسی کا عمل اختیاری ہے جس طرح سوسائٹی اور اجتماعیت کی معاشی تنظیم اور سیاسی درستگی قائم کرنے اور باقی رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے کسی کو زیردست بنایا کسی کو بالادست کسی کو نادار کسی کو زردار کسی کو حاکم اور کسی کو فرماں پذیر۔ اسی طرح باطنی نعمت (نبوت) اور آخرت کی رحمت بھی وہی تقسیم کرتا ہے۔ دنیوی دولت کی فراوانی نبوت کا مستحق نہیں بنا دیتی پھر طائف یا مکہ کے کسی بڑے مالدار آدمی پر قرآن کیوں اتارا جاتا۔ لوگ مال کی کثرت اور قوم کی سیادت پر اکڑتے ہیں اور اس کو معیارِ برتری قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جس مال و متاع اور زر و جواہر کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی باطنی رحمت (اخلاق کی درستگی افکار کی صحت اعمال کی حقانیت نبوت ولایت اور جنت) اُس سے کہیں برتر ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت مل جائے حقیقت میں بڑا آدمی وہ ہے۔ زردار سردار بڑا آدمی نہیں۔ یہ زرداری اور ناداری تو محض تنظیم معاشی کے لئے ہے نہ کہ برتری کا معیار قائم کرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تو اس مال کی اتنی بھی عزت نہیں جتنی مچھر کے پر کی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں دنیا کی قدر مچھر کے پر برابر بھی ہوتی تو کافر کو سرد پانی بھی نہ دیتا (ترمذی) فرمایا اللہ تعالیٰ مومن کو دنیا سے اس طرح روکتا ہے جیسے کوئی شخص بیمار کو پانی سے روکتا ہے۔ (ترمذی)

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـــُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیوی مال کی بے قدری کی یہ حالت ہے کہ اگر سب لوگوں کے ایک جیسا ہو جانے کا پاس نہ ہوتا (اور یہ بات بھی نہ ہوتی کہ سب لوگ مال دار ہو جائیں گے اور کوئی مال کا ضرورت مند نہ رہے گا اور اس سے معاشرہ کی تنظیم تباہ ہو جائے گی نہ کوئی خادم رہے گا نہ مخدوم نہ کاشت کار نہ صنعت کار۔ نہ حاکم نہ محکوم نہ حکمران نہ فرماں پذیر کوئی کسی حاجت مند ہی نہیں رہے گا پھر کون کسی کا دست نگر ہوگا اور سوسائٹی کی ہیئت تنظیمی کیسے بنے گی) تو اللہ تعالیٰ کافروں کے پاس سونے چاندی کے انبار لگا دیتا اُن کے مکان کی چھتیں چھتوں پر چڑھنے کے زینے گھروں کے دروازے اور لیٹنے کے تخت سونے چاندی کے بنا دیتا، مگر اس مال و زر کی تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ وقعت و قدر تو آخرت کی نعمتوں کی ہے اور اُخروی نعمت کے حصول کا ذریعہ کفر و معصیت نہیں بلکہ کفر و معصیت سے اجتناب اور ایمان و اعمال صالحہ ہیں۔ جنت کافروں کا حق نہیں پرہیزگاروں کا حق ہے۔ اسی لئے کافر اس سے محروم رہیں گے۔

مقصودِ بیان

هُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت اللہ تعالیٰ مخصوص رحمت۔ الفاظ کا عمومی حکم یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ رحمتِ رب (یعنی روحانی اور جسمانی ہر طرح کی نعمت) میں انسان کی مشیت و انتخاب کو دخل نہیں۔

نَحْنُ قَسَمْنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اجتماعیت کی درستگی اور تنظیم معاش کی کمی بیشی اور مال کی کثرت و قلت پر موقوف ہے۔ بالادستی اور زیردستی فقر و غنا اور حاکمیت و محکومیت صرف اسی تنظیم کو قائم رکھنے کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کی ہوئی ہے یعنی اٰل ہے۔ بس اوقات معاشی یا مساوات حکمرانی کا تصور ہی اجتماعیت کی تنظیم کے خلاف ہے۔

وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ سے آخرت کی نعمت کی ترغیب اور دنیوی مال و منال سے نفرت دلانے کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ سے یہ بتانا غرض ہے کہ سونا چاندی اور دولت و مال کی اللہ تعالیٰ کی نظر میں کوئی قدر نہیں ورنہ کافروں کو نہ دی جاتی۔ ایک بات یہ بھی بتانی مقصود ہے کہ سب لوگوں کا ایک طریقہ پر ہو جانا اور ہر ایک کا مال دار بن جانا چونکہ اجتماعی تنظیم میں خلل انداز ہے اس لئے ہر شخص کو مال دار نہیں بنایا گیا۔

وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ میں صراحت کی گئی ہے کہ شرک سے بچنے والے نیکوکاروں کا ہی جنت میں داخلے کا حق ہے، اس لئے ترغیب توحید و تقویٰ دنیا بھی فی الجملہ مقصود ہے۔ وغیرہ۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ○ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ

اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن) سے اندھا بن جائے ہم اُس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ (ہر وقت) اُس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ انکو راہ (حق)

عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ ○ حَتّٰى إِذَا جَاءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِي وَ

سے روکتے رہتے ہیں اور یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ راست پر ہیں یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آوے گا تو (اس شیطان سے) کہے گا کاش

بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ ○ وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ

میرے اور تیرے درمیان میں (دنیا میں) مشرق و مغرب کی برابر فاصلہ ہوتا کہ (تو تو) بُرا ساتھی تھا اور (اُن سے کہا جاوے گا کہ) جبکہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو آج

فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ○ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلٰلٍ مُبِينٍ ○

یہ بات تمہارے کام نہ آوے گی کہ تم (اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو سو کیا آپ (ایسے) بہروں کو سنا سکتے ہیں یا (ایسے) اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو کہ صریح گمراہی میں ہیں راہ پر لا سکتے ہیں

تفسیر

انسان کو فطری طور پر شر کی طاقتیں بھی عطا کی گئی ہیں یعنی علمی اور عملی ایسی قوتیں دی گئی ہیں جن کو ایک طرف موڑنے سے شر اور دوسرے رُخ پر موڑنے سے خیر نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ہی قوتِ فکریہ ہے جو فریب کاری دھوکہ بازی اور مکاری کے ہمہ رس جال بھی بُنتی ہے جس میں گرفتار ہو کر لوگ تباہ ہوتے ہیں اور یہی قوت فکریہ اللہ تعالیٰ کی ذات صفات نبوت اور دنیوی و دینی ضوابط کا صحیح علم بھی رکھتی ہے اور درست عقائد و افکار کی حامل بھی ہوتی ہے۔ اوّل رُخ شر کا ہے جس سے شر کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرا رُخ خیر کا ہے جس سے خیر رونما ہوتی ہے یہی حال صنفی اور بطنی خواہشات کی طاقت اور ضرر رساں چیزوں کو دفع کرنے والی قوت کا بھی ہے۔ ان کا رُخ بھلائی کی طرف بھی موڑا جا سکتا ہے اور برائی کی طرف بھی۔ ان کے عمل سے تباہی عالم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور تعمیر عالم کا بھی۔ خیر و شر کی طرف نظری اور تخلیقی طاقتوں کا رُخ موڑنا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں کر دیا ہے۔ نتیجہ اچھا یا بُرا اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور تخلیق پر موقوف ہے۔ انسان کے مقصد میں نہیں مگر اندرونی قوتوں کو

اپنے ارادہ کے زیر اثر کسی طرف کو موڑنا بندہ کے اختیار میں ہے پس جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوتا ہے اور زندگی ہمہ گیر قدرت کو دیکھنے سے اس کی نگاہ ہٹ جاتی ہے تو پھر بیرونی شیطانوں کا بھی اُس پر قابو چل جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی مخفی شیطان اُس کے ساتھ لگ جاتا ہے (جیسے راہِ مستقیم سے ہٹ کر کسی پگ ڈنڈی کی طرف مڑ جانے والی بھیڑ ہوتی ہے کہ جب شاہراہ سے ہٹی تو کسی بھیڑیے کا لقمہ بنی۔ یہی حال انسان کا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا اور اللہ کی طرف سے توجہ کو ہٹا لیتا ہے تو کوئی شیطان اُس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ہر وقت اس کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ گھر ہو یا بازار، شہر ہو یا جنگل، خلوت ہو یا جلوت کسی حال میں شیطان پیچھا نہیں چھوڑتا، مگر شیطان کی اس دست رس کی اصل علت انسان کی خود آوردہ غلط اندیشی اور غلط روی ہوتی ہے) پھر شیطان کا یہ تسلط بھی اللہ کے حکم سے اور مسلط کرنے سے ہوتا ہے۔ ورنہ شیطان میں یہ قدرت کہاں کہ اللہ کے نیک بندوں کو بہکا سکے اور شیطان کو ضلال آفرینی پر اللہ کی طرف سے مسلط کرنا اس امر پر مبنی ہوتا ہے کہ آدمی خود اپنی طاقتوں کے رُخ کو شر کی طرف موڑتا ہے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت کرنے والے کا پیچھا مرتے دم تک شیطان نہیں چھوڑتا۔ غافل انسان زندگی بھر شیطانوں کی ابد فریبیوں میں پھنسا رہتا ہے۔ شیطان اُس کو راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں اور وہ سمجھتا رہتا ہے میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں۔ بالآخر اسی حالت میں موت آجاتی ہے اور شیطان سے پیچھا چھوٹ جاتا ہے، لیکن جب قیامت کا دن ہوگا اور انسان اپنی گمراہی اور کج روی کو شیطان کی طرف منسوب کرے گا اور زندگی کا کیا کرایا دوزخ کی شکل میں سامنے آجائے گا اور یہ شخص اپنے شیطان کے ساتھ دوزخ میں گرفتارِ عذاب ہوگا تو تمنا کرے گا اور شیطان سے کہے گا کہ کاش زندگی کے دور میں میرے اور تیرے درمیان مغرب مشرق کا فاصلہ ہوتا کہ تیری رسائی ہی نہ ہوتی اور تو میری شکل ہی نہ دیکھتا، لیکن اُس روز اس قسم کی تمنا بے سود ہوگی۔ دونوں عذاب میں مبتلا ہوں گے اس تمنا سے عذاب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

حقیقت میں جو لوگ شیطانی اغوا میں پھنس جاتے ہیں ان کے کان حق کو سننے سے بہرے اور آنکھیں صداقت کی تصویر دیکھنے سے اندھی اور دماغ راہِ راست کی تمیز کرنے سے معطل ہو جاتے ہیں اور جن کے حواس ہی حق کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے سے معطل ہو جائیں اُن کو ہدایت یاب کرنا انسان کی قدرت سے خارج ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ یعش کا مادہ عَشْوٌ ہے فراء اور زجاج کے نزدیک عَشْوٌ کا معنی ہے اعراض اور مڑ جانا۔ خلیل نے اس کا ترجمہ کمزور نظر کیا ہے۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے اعشی وہ شخص جس کو رات کے وقت کچھ نہ دکھتا ہو اس کا مؤنث عشویٰ ہے اور عَشا مصدر ہے۔ چونکہ اس کے بعد عن آیا ہے، اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ غافل ہونا اور روگرداں ہونا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہمہ وقت دل کے تعلق کی استواری اور لو لگائے رکھنا ذکر الرحمٰن ہے۔ یہی قلبی تعلق جب دوسری مادی جسمانی قوتوں پر غالب آکر اپنا تسلط جمالیتا ہے تو پھر ساری جسمانی قوتیں اسی نورِ باطن کے پرتو سے روشن ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں اپنی حرکت و سکون میں رحمٰن کی رحمت کو یاد رکھتے اور یاد کا مختلف طور پر اظہار کرتے ہیں۔ کبھی عباداتی شکل میں اور کبھی پابندی شرع کے ساتھ معاملاتی شکل میں زبان پر ہر وقت سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا ذکر رواں ہوتا ہے۔ کبھی تسبیح تقدیس تکبیر تہلیل اور تحمید و تمجید کے الفاظ کے ساتھ اور کبھی رشد و ہدایت اور صدق و نصیحت کے کلمات کے ساتھ کبھی تلاوتِ قرآن و حدیث کے ساتھ اور کبھی تجارت، سیاست و حکومت میں پابند شریعت کلام کے ساتھ۔ کان بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور معاملات میں سچی باتیں سنتا ہے اور آنکھ بھی ہر وقت جلوۂ حق دیکھتی ہے اور تصویرِ صداقت پر نفسانی میلان سے پاک ہو کر دیکھتی ہے، لیکن اگر انسان ذکر رحمٰن سے غافل ہوا اور روح پر زنگ اور دل میں کثافت پیدا ہوئی تو پھر اس غافل دل پر شیطان آکودتا ہے اور ہر وقت ساتھ لگ جاتا ہے اور خون کے ساتھ ساتھ رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور دل کے ہر خانہ میں گھس جاتا ہے اور دماغ کے ہر گوشہ کو اپنا مسکن بنالیتا ہے اور ارادہ کے تاروں کو ہر وقت جھنجھناتا رہتا ہے اور ہر راہِ نجات و طریق رشد سے روکتا اور کفر و معصیت کے راستوں پر چلاتا ہے، مگر اس وقت آدمی چونکہ اپنی قوتوں کا خود مالک نہیں رہتا شیطان کے پنجہ میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے ہر شر کو خیر اور گمراہی کو ہدایت سمجھتا ہے

گویا خیر و شر میں تمیز کرنے کی فطری طاقت مردہ ہوجاتی ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ ۝ وَ لَنْ یَّنْفَعَكُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۔ آخر اسی حالت میں موت آجاتی ہے اور اعمال اپنی شکل میں اجمالی طور پر سامنے آجاتے ہیں یا قیامت کے دن تفصیلی حقیقت کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ اور عقائد باطلہ اور اعمال شنیعہ عذاب بن کر ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اس وقت انسان شیطان سے بیزار ہوگا اور ساری عمر کے ہر وقت ساتھ رہنے والے دوست نما دشمن سے اظہار نفرت کرے گا، لیکن اس روز یہ تمنا خام مفید نہ ہوگی چونکہ ابتدائی جرم کا سرچشمہ انسان ہی ہوگا۔ شروع میں اُس نے ہی جرم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوا تھا اور اس غفلت کی وجہ سے ابلیس کو اس کے حدود قلب میں داخل ہونے اور پھر دماغ و ارادے اور فکر و عمل کی طاقتوں پر چھا جانے کا موقع ملا تھا۔ اس کے بعد شیطان نے ہر طرف اور ہر راہ سے آکر آدمی کے ذہن کو اغوا اور سفر زندگی کو گمراہ بنایا تھا، اس لئے مجرم دونوں ہوئے اور عذاب میں شرکت بھی دونوں کی ہوگی۔ انسان کی شیطان سے بیزاری اور شیطان کی گمراہی سے ندامت غرض کسی کی نفرت کام نہ آئے گی۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ مَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے اور اس کے پیش نظر اپنی ہستی کا خالق اور تربیت کرنے والا رب اور عقل و نقل کی روشنی دکھانے والا غیبی ہادی نہیں رہتا اور پھر باطل کی ساری پوشیدہ اور ظاہر طاقتیں اُس پر اپنا تسلط جمالیتی ہیں تو پھر اس کے ظاہری اور باطنی حواس اور نظر و فکر کی طاقتیں گمراہ ہوجاتی ہیں۔ اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتیں ہیں تصویر حق میں اس کو باطل کے نقوش اور مجسمۂ کذب میں صداقت کے خد و خال دکھنے لگتے ہیں۔ سچائی کی دعوت کی آواز میں اس کو صدائے گمراہی اور صوت ضلالت میں پیام ہدایت سنائی دینے لگتا ہے۔ غرض وہ آنکھوں والا نابینا اور کانوں والا بہرہ اور عقل والا جاہل ہوجاتا ہے۔ ایسے شخص کو راہ حق دکھانا انسانی قدرت سے خارج ہوتا ہے۔ بہرے کو گوش شنوا اندھے کو چشم بینا اور فاقد الفکر کو فہم رسا کون بخش سکتا ہے۔

مقصود بیان

وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ الخ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت ہر طرح کی گمراہی کا اصلی سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی شیطان کو اسی وقت انسان پر دست رس دیتا ہے جب انسان کا دل غافل روح زنگ آلود اور قوت فکریہ کثیف ہوجاتی ہے گویا اصل مجرم انسان ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو شیطان کو مسلط کرنا نتیجہ ہوتا ہے آدمی کی کور باطنی کا اور کور باطنی پیدا ہوتی ہے یاد الٰہی سے غافل ہوجانے سے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ جب خدا ہی گمراہ کرتا ہے تو انسان بے قصور ہے اس کو عذاب کیوں دیا جائے گا اُن کے اس وہم کا ازالہ آیت کی اس صراحت سے ہوجانا چاہیئے کہ اصل گمراہی کا سرچشمہ خود انسان کے اندر ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی گمراہ کرنے والی طاقتوں کو اسی پر مسلط کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے۔

یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ جب آدمی کی اپنی قوت فکریہ تاریک ہوجاتی ہے تو پھر شیطان بھی اُس کو ہر قدم پر گمراہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ جب تک آدمی گناہ کو گناہ سمجھتا رہتا ہے اُس وقت تک اس کی ہدایت یابی کی امید رہتی ہے اور جب معصیت کو ثواب سمجھنے لگا تو پھر ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم ہوگیا۔ غِطَاء، غِشَاء، دین، ختم۔ وغیرہ الفاظ جو قرآن میں محروم القسمت کافروں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اُن سے مراد یہی درجہ ہے جس میں پہنچ کر آدمی اغوائے شیطانی کو ہدایت سمجھنے لگتا ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الخ سے مراد بطور استعارہ وہ کافر ہیں جن کی آنکھیں حق کی صورت نہیں دیکھتیں اور جن کے کان حق کی آواز نہیں سنتے۔ جو باوجود بینا ہونے کے نابینا اور باوجود شنوا ہونے کے بہرے ہوں گے وغیرہ۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۙ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ

پھر اگر ہم (دنیا سے) آپ کو اٹھائیں تو بھی ہم اُن سے بدلہ لینے والے ہیں یا اگر ہم اُن سے جو ہم نے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے وہ آپ کو (بھی)

فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ○ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی

دکھلادیں تب بھی (کچھ بعید نہیں کیونکہ) ہم کو ان پر ہر طرح کی قدرت ہے تو آپ اس قرآن پر قائم رہیے جو آپ پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے آپ بیشک

صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ○ وَسْـَٔلْ

سیدھے راستہ پر ہیں اور یہ قرآن آپ کے لئے ہے اور آپ کی قوم کے لئے بے شک بڑے شرف کی چیز ہے اور عنقریب تم سب

مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ○

پوچھے جاؤ گے اور آپ اُن سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا دوسرے معبود ٹھہرا دیئے تھے کہ انکی عبادت کی جائے

تفسیر

توحید و شرک دو عقیدے ہیں جن کی بنا پر مذہبی لوگ ہمیشہ سے دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اصل عقیدہ توحید ہے اللہ تعالیٰ کے ہر پیام کا سنگ بنیاد توحید ہی ہے جو پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا اُس نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی خالقیت، حاکمیت، ربوبیت، شارعیت اور الوہیت کی یکتائی کا اعلان کیا اور اللہ کے سوا کسی کی پرستش کی اجازت نہیں دی۔ شرک کا عقیدہ انسان کا دماغی زائیدہ اور اختراع کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فوق البشریت یا غیبی کارندوں یا اُن ہستیوں کو جن کو صرف توہم پرستی اور غیر یقینی قیاس آرائی ہے یا اُن مظاہر قدرت کو جو مختار نما بے اختیار ہیں مگر حسی نظر سے قدرت کی مظہر اکمل دکھائی دیتے ہیں۔ مختار کل اور قادر سمجھ کر رب والٰہ ماننا شرک ہے اور اس کی اجازت کسی آسمانی کتاب میں نہیں ہے، مگر ہے یہ عقیدہ بھی توحید کا ہمزاد۔ فرق یہ ہے کہ توحید کو عقل سلیم نے قبول کیا ہے اور شرک محسوس اور نیم محسوس پرست واہمہ کی تخلیق ہے، توحید سیدھی شاہراہ حیات ہے اور شرک وہ کج مج پگڈنڈی ہے جس کی انتہا کسی آتشیں غار اور تباہ کن گڑھے پر ہے۔ وحی ایک شرف ہے جو نہ صرف صاحب وحی کو عطا کیا جاتا ہے بلکہ اُس خاندان، قبیلے، قوم اور گروہ کو بھی جو صاحب وحی کی وحی کو ماننے والا اور پیام وحی پر چلنے والا ہوتا ہے، عنایت ہوتا ہے۔ اور شرک کا نتیجہ ہے دنیا میں جان مال کی تباہی ذلت، نکبت اور شکستہ حالی اور آخرت میں عذاب الیم اور خسران مآل۔ چونکہ شرک کا عقیدہ بذاتِ خود تباہی آفرین ہے اور پیام وحی بذاتِ خود سچا ہے، اس لئے وحی مشرکوں کی بستی میں رہے یا بستی سے نکل جائے۔ بلکہ زندہ رہے یا دائرہ ہستی سے باہر ہو جائے۔ بہرحال اہل شرک تو برباد ہونا ہے اور شرک کی دنیوی اور دینی سزا ملنی ہے۔ توحیدی عقیدہ کی حقانیت اور شرک کی تباہی انگیزی کا صاحب وحی کی زندگی اور موت یا حضور و غیبوبت پر مدار نہیں ہے

تحلیل اجزاء فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ۔ مشرک کی شرک پرستی اور برحق پیغمبری کی مخالفت بجائے خود تباہ کن ہے خصوصاً اُس صورت میں جب کہ پیغمبر صادق سے مخالفوں اور سرکشوں کو تباہ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا گیا ہو۔ پھر ایسی حالت میں پیغمبر کا اپنی کامیابی اور مخالفوں کی بربادی کی امید رکھنا بھی یقینی ہے اور تقاضائے فطرت ہے کہ جب بار بار نمونۂ عذاب دیکھنے کے بعد سرکشوں کی سرکشی میں کمی نہ آئی ہو بلکہ تمرد اور ظلم بڑھنے ہی لگا ہو تو ان کو بالکل برباد ہو جانا ہی چاہیئے اور پیغمبر کو یقین کے ساتھ منتظر رہنا چاہیئے کہ اب یہ قوم برباد ہونے ہی والی ہے، مگر ادھر اللہ تعالیٰ کا وعدۂ غلبہ اُدھر قوم کا ظلم واستبداد اور شوکت وجبروت باوجود یقینِ غلبہ پیغمبر کو پریشانی میں ڈال سکتا ہے کہ نزول عذاب کا وقت کب آئے گا، مگر عذاب کی کوئی ساعت یا دن مقرر نہیں، اس لئے فرمایا کہ ہم آپ کو اس بستی سے کہیں اور لے جائیں یا دنیا ہی سے لے جائیں بہرحال ان سرکشوں سے انتقام ضرور لیں گے یا آپ کی موجودگی میں آپ کی نظروں کے سامنے اگر ان لوگوں کو عذاب دنیوی (قتل، قید، غلامی، محکومی وغیرہ) میں مبتلا کر دیں تو یہ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں (آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں نہ آپ اس کے مکلف ہیں۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ آپ تو اسی حکم ہدایت کو مضبوطی کے ساتھ کپڑے رہیں جو آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے اور آپ راہِ راست پر ہیں۔ (اسی کے مکلف آپ ہیں)

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ۔ اور یہ وحی آپ کے اور آپ کی قوم (یعنی اہلِ ایمان یا اُمتِ دعوت) کے لئے ایک یادداشت دستورِ زندگی کی دستاویز اور مآلِ زندگی کا تبصرہ ہے۔ آپ اور آپ کی قوم اس کی مکلف ہے۔ اسی کو ماننے نہ ماننے اور عمل کرنے نہ کرنے کی بازپرس سب سے ہوگی (نہ ماننے والے تباہ ہوں گے تو کب ہوں گے۔ کیسے ہوں گے اس کو جاننا آپ کے لئے ضروری نہیں۔) وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ پیامِ توحید نئی انوکھی چیز اور شرک کی ریت قدیمی ہے اور دیوتاؤں کی پوجا کا ہمیشہ کا دستور چلا آیا ہے تو یہ اُس کی خام خیالی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے تو کبھی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی تعلیم نہیں دی نہ کسی کو قابلِ معبودیت بنایا۔ اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو پیغمبروں کی پیروی اور علمِ نبوت کے حامل ہونے کا دعویٰ کرنے والوں سے پوچھ لیں (یہودیوں عیسائیوں سے دریافت کرلیں جو اہلِ علم ہیں وہ بتادیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو شرک کی اجازت نہیں دی اور نہ کسی کو اپنے علاوہ معبود قرار دیا)

آیت میں پیغمبروں سے دریافت کرنے سے مراد ہے پیغمبروں کی کتابوں اور ان کی کتابوں کے عالموں سے دریافت کرنا۔

مقصودِ بیان

ہدایتِ الٰہی کی خلاف ورزی بجائے خود تباہ کن ہے۔ پیغمبر کی موجودگی یا غیر موجودگی اور موت وحیات پر اس کا انحصار نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت کے مخالفوں اور سرکشوں سے ضرور انتقام لیتا یعنی ان کو آل کار تباہ کرتا ہے۔ اِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ الخ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ استمسک سے اس امر کی طرف ایماء ہے کہ جس کے پاس اللہ کا پیامِ ہدایت بھیج جائے وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ کاربند رہنے کا مکلف ہے یعنی دوسروں سے اس کو کوئی غرض نہیں۔

اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ بتا رہا ہے کہ اللہ کی طرف بھیجا ہوا دستورِ زندگی ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یعنی عقل سے اختراع کئے ہوئے ضابطے سب کے سب قابلِ شک ہیں اور ملاخلتِ وہم سے پاک نہیں ہیں۔

لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اور آپ کے قبیلہ کے شرف کو ظاہر کیا گیا ہے، لیکن قبیلہ سے مراد اہلِ ایمان ہیں فقط رشتہ دار اور برادر ہونا شرف کے لئے کافی نہیں ہے۔ اگر ذکر کا ترجمہ شرف نہ کیا جائے بلکہ یادداشت کیا جائے تو اس امر کی صراحت ہو جائے گی کہ قرآن ایمان کے لئے دستورِ حیات ہے۔ اس کو دستورِ زندگی بنانے نہ بنانے کی بازپرس ان سے ہوگی یعنی دوسروں نے کیوں نہ مانا اُن پر عذاب کب آئے گا۔ اس کا سوال ان سے نہیں کیا جائے گا۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا الخ سے عام تعلیمِ الٰہی کا اظہار ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رسول پر جو پیامِ ہدایت نازل ہوا وہ دوسرے پیغمبروں کی وحی سے الگ اور کوئی نرالا نہیں ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اور ہم نے موسیٰ کو اپنے دلائل دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس بھیجا تھا سو انھوں نے (اُن لوگوں کے پاس آکر) فرمایا کہ میں رب العٰلمین کی طرف سے پیغمبر

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ

(ہو کر آیا ہوں پھر جب موسیٰ اُن کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آئے تو وہ یکایک اُن پر لگے ہنسنے اور ہم اُن کو جو نشانی دکھلاتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی

اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا

تھی اور ہم نے ان لوگوں کو عذاب میں پکڑا تھا تاکہ وہ (اپنے کفر سے) باز آجائیں اور انھوں نے کہا کہ اے جادوگر ہمارے لئے آپ اپنے رب سے اس بات کی

عَهِدَ عِندَكَ ۚ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ○ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ○ وَنَادَىٰ

دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد رکھا ہے ہم ضرور راہ پر آجائیں گے پھر جب ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹایا تب ہی انہوں نے (اپنا) عہد توڑ دیا اور فرعون نے

فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ أَفَلَا

اپنی قوم میں منادی کرائی یہ بات کہی کہ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے (محل کے) پائیں میں بہہ رہی ہیں کیا تم دیکھتے

تُبْصِرُونَ ○ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۙ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ ○ فَلَوْلَا

نہیں ہو بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے جو کہ کم قدر ہے اور قوتِ بیانیہ بھی نہیں رکھتا تو اس کے

أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ○ فَاسْتَخَفَّ

سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے غرض اس نے (ایسی باتیں کر کے) اپنی قوم کو مغلوب کر دیا

قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ○ فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ

اور وہ اس کے کہنے میں آگئے وہ لوگ شرارت کے بھرے تھے پھر جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو ڈبو دیا اور ہم نے ان کو آئندہ

فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ○ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ○ ع

آنے والوں کے لئے خاص طور کے متقدمین اور نمونہ (عبرت) بنا دیا

ع ۱۱ ۵ ۱۱

تفسیر پیغمبروں کی دعوت کی غرض کسی فردِ مخصوص کی ہدایت نہیں ہوتی بلکہ پوری قوم یا پورے ملک کی رہنمائی اور ہدایت یابی اُن کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ مگر گمراہی کا سرچشمہ چونکہ گمراہوں کے لیڈر اکابر اور امراء ہوتے ہیں۔ وہی ساری قوم پر اپنا اثر قائم کرنے اور عزت و دولت کی حکومت کی تحصیل کے لئے سارے عوام کو آلۂ کار بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی ہدایت یابی یا شکست پوری قوم کی حالت میں انقلاب لاسکتی ہے، اس لئے سب سے پہلے پیغمبروں کا نقطۂ تبلیغ بالا دست طبقہ ہی ہوتا ہے پیغمبر جب بادشاہوں، وزیروں اور ان کے مصاحبوں کے سامنے رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ ہنسی بناتے اور پیغمبروں کی تضحیک کرتے ہیں۔ لیکن علمبردارانِ ہدایت جب غیر معمولی معجزات اور اپنی قوتِ قدسیہ کے نشانات پیش کرتے ہیں اور مغرور سرکشوں کے پاس جب ان کا کوئی توڑ نہیں ہوتا اور نشانات عذاب ان کو گھیر لیتے ہیں۔ مبتلائے عذاب ہوجانے کا یقین یا گمان غالب ہوجاتا ہے اور ان کو محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ ضرور کسی غیبی طاقت کے مالک ہیں جو ہمارے اندر نہیں ہے، اس لئے پیغمبروں کو جادوگر کہنے لگتے ہیں۔ غیبی طاقت کا تو ان کو اقرار ہوجاتا ہے مگر غیبی قوت کے قدسی اور خبیث ہونے میں ان کو امتیاز نہیں ہوتا ملکی اور ابلیسی طاقتوں میں وہ فرق نہیں کر سکتے، اس لئے عذاب کو ٹالنے کی پیغمبروں سے ہی درخواست کرتے ہیں، مگر جادوگر کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ اور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ غیبی مصیبت ٹل گئی تو ہم تمہاری سچائی کو مانیں گے۔ پھر پیغمبروں کی دعا سے جب عذاب ٹل جاتا ہے تو جھوٹے عہد شکن وعدہ پورا نہیں کرتے بلکہ مقابلے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اپنی علمی، دماغی عیاریوں اور جسمانی مادی طاقتوں کو ساتھ لے کر پیغمبروں کے مقابل صف آراء ہوجاتے اور علمی مناظرہ کے طور پر کہتے ہیں تم حقیر ہو، نادار ہو، قوم میں گمنام

رہے ہو۔ ہم طاقتور ہیں، مال دار ہیں۔ باعزت ہیں، حکمران ہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں کون سے سونے کے کنگن پڑے ہوئے ہیں کہ ہم تمہاری برتری مان لیں۔ تم کو ملکی طاقت اور خیر و صلاح کی قوت کے ساتھ ہونے کا دعویٰ ہے تو وہ غیر کی غیبی طاقتیں کہاں ہیں۔ تمہارے ساتھ کیوں نہیں۔ اس قسم کی باتیں بنانے اور حق و باطل کے لباس میں نمودار کرنے سے عام بدکار لوگ احمق بن کر ان باطل پرست لیڈروں کے بہکاوے میں قائم رہتے اور ان کے اطاعت گذار بنے رہتے۔ جب آدمی کے اندر خود ہی فسق و فجور اور ہوا و ہوس کی طرف جھکاؤ ہو تو وہ عیار مکار لیڈروں اور عالموں کے جال میں بڑی آسانی سے پھنس جاتا ہے۔ غرض عوام خواص کے پھندے میں پھنسے رہتے ہیں، اور یہ مناظرہ بازی اور جعلی بحث طرازی زیادہ فائدہ رساں نہیں ہوتی اور رفتہ رفتہ ابلیسی دسیسہ کاریوں کا تار و پود بکھرتا نظر آتا ہے تو سرکش بالادست طبقہ پوری پوری مادی طاقت لے کر مقابلے پر اُتر آتا ہے۔ آخر شکست پاتا اور صفحۂ ہستی سے برباد ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سب سے بڑے اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ بحکم خداوندی سب سے پہلے فرعون کے پاس تشریف لے گئے۔ اور رسالت الٰہی کا دعویٰ کیا۔ فرعون اور اس کے درباری ہنس دیئے اور مذاق بنانے لگے۔ حضرت موسیٰ نے پے در پے معجزات کا اظہار کیا۔ ید بیضا کا سورج چمکایا۔ لاٹھی کو اژدہا بنا کر دکھایا۔ ملک مصر میں مینڈکوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ کوئی برتن مینڈک سے خالی نہیں رہا۔ جوں خون اور دوسرے مسلسل معجزات سامنے آئے۔ کافروں نے ہر معجزہ سے مجبور ہو کر ڈر کے مارے آپ سے درخواست کی کہ یہ بلا لائے ہو تو خود ہی اسے ٹالو۔ ہم تمہاری سچائی کو مان لیں گے۔ حضرت موسیٰ کی دعا سے عذاب ٹلتے رہے، مگر بدعہد شکست عہدی کرتے رہے۔ جب فرعون عاجز ہو گیا تو مناظرہ بازی کرنے لگا۔ قوم سے خطاب کر کے کہا موسیٰ ذلیل نادار حقیر ہے۔ اسے تو بولنا بھی نہیں آتا زبان لکنت کرتی ہے اور میرے پاس مصر کی حکومت ہے، امارت ہے جس میں دریا اور نہریں رواں ہیں۔ جو ملک کو سیراب کرتی ہیں ان پر میری حکومت ہے۔ موسیٰ بے چارہ کیا ہے (نہ حکومت نہ دولت نہ تخت نہ تاج) اس کے ہاتھوں میں کون سے سونے کے کنگن ہیں اور غیر کی غیبی طاقتیں اس کے ساتھ کہاں ہیں۔ اس طریقے سے اُس نے قوم کو احمق بنائے رکھا اور چونکہ قوم خود ہی بدکار تھی، اس لئے اس کے بہکاوے میں آ گئی (اور گمراہی پر جمی رہی) بالآخر فرعون نے مادی طاقت سے کام لے کر حضرت موسیٰ پر غلبہ حاصل کرنا چاہا (اور) پوری قوم نے اللہ کو ناراض کر دیا تو اللہ کا عذاب بھی ان کو سزا دینے کے لئے آ گیا اور تمام فرعونی مع فرعون کے غرق ہو گئے تذکرہ کتابوں میں رہ گیا جو آنے والوں کے لئے ذخیرۂ عبرت ہے۔

(پارہ ۲۵ کا جزء ثانی جلد ہی پیش کیا جائیگا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۲۵

اِلَيْهِ يُرَدُّ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

جزء ۲

ناشر

مکتبہ دار الفرقان

۱۵۶۵ - سوئیوالان نئی دہلی ۲

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّىْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ آپ کا اعلان توحید اور ایک جابر و اہر طاقت کے سامنے اظہار حق کا تذکرہ چند آیات پہلے ذکر کیا گیا تھا وہاں جعلہا کلمۃً باقیۃ فی عقبہٖ بھی فرمایا تھا اور صراحت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کلمۂ توحید کو ابراہیم کی نسل میں نا زوال اور غیر قابل نسخ ورثہ بنا دیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسرائیلی نسل میں سب سے اولین جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ ہوئے جن پر توریت نازل فرمائی۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ آئے گا۔ آپ اسرائیلی پیغمبروں میں سب سے آخر عالی مرتبہ پیغمبر تھے۔ حضرت ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی اسماعیلی نسل میں ہمارے آقا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سید الانبیاء بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس طرح نسلِ ابراہیمی میں کلمہ توحید جاری اور باقی رکھنے کا سامان کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رسالت کا دعویٰ اور توحید کا اعلان کیا تو قریش کنانہ اور قبائل عرب کو اچنبھا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر احمد عبد اللہ کا بیٹا جس کے پاس نہ کھانے کو نہ پینے کو نہ پہننے کو نہ لمبا تاجر نہ قومی قائد و سائد نہ حکمران نہ شیخ قبیلہ، نہ جنگجو نہ اکھڑ درشت خو، یہ کیسا پیغمبر ہے۔ اسی طرح آپ ہنسی اڑاتے اور مذاق بناتے رہے پھر قرآن سنا اور مقابلے سے عاجز ہوئے تو بولے جادوگر ہے یا کاہن یا کوئی بڑا شاعر۔ رہا اس کے کلام کا مطلب تو کسی نے کہا یہ تو پہلوں کی داستانیں ہیں۔ کسی نے کہا ہم نے یہ بات تو اپنے بزرگوں سے کبھی نہیں سنی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعجب کو دور کرنے کے لئے گزشتہ آیات میں فرق فرمایا تھا۔ ذرا علماء کتاب سے تو پوچھو کہ ہم نے جس پیغمبر کو بھی بھیجا کسی نے بھی شرک کی تعلیم نہیں دی۔ ان آیات میں بزرگ ترین اسرائیلی پیغمبر کا ذکر منجملہ انبیاء کے بطور نمونہ کیا ہے پھر حضرت عیسیٰ کا ذکر بھی اسی غرض سے کیا ہے۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سب سے اونچے پیغمبر تھے اور صاحب تورات تھے اور حضرت عیسیٰ بھی سب سے بزرگ پیغمبر تھے اور صاحب انجیل تھے۔ ان دونوں کا تفصیلی مختصر حال طریق دعوت اور پیام دعوت ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ سب ہی پیغمبروں نے توحید کی تعلیم دی تھی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم بھی تمام انبیاء کی تعلیم کی مؤید ہے۔

حضرت موسیٰ فرعون اور اس کے درباریوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے مگر آپ کی دعوت صرف فرعون اور اس کے مصاحبوں تک محدود نہ تھی۔ بادشاہ اور ارکانِ حکومت کے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ پوری قوم ان کی گرفت میں تھی۔ خصوصاً بنی اسرائیل کو نسل و اصل کے اختلاف کی وجہ سے انہوں نے غلام بنا رکھا تھا اور ان کے پنجہ سے بنی اسرائیل کو آزاد کرانا تھا، اس لئے فرعون اور اس کے وزراء امراء کا ابتدائی دعوت کیلئے انتخاب کیا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِىَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ حضرت موسیٰ اللہ کا پیام لے کر پہنچے اور تبلیغ دعوت کی، مگر انہوں نے آپ کو اور آپ کی دعوت کو حقیر سمجھا اور ہنسی اڑانے لگے۔ آپ نے مختلف معجزات دکھائے اور ہر نشانی ایسی تھی جو دوسری سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ تنبیہ کے لئے مختلف غیبی دکھ بھی ان پر مسلط کئے گئے۔ اس جگہ عذاب کی تعیین نہیں کی گئی مگر دوسری جگہ کچھ تفصیل آئی ہے۔ بہرحال عذاب اور دکھ میں مبتلا کرنے کی غرض تباہ کرنا نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرانا مقصود تھا۔ قبطی قوم حکومت دولت علم حکمت دقیق صنعت اور بلند مدنیت پر مغرور تھی اور نشہ میں چور تھی۔ عیش کوش اور حق فراموش تھی اُن کا بادشاہ ان کا دیوتا تھا اور سب اس کے پجاری تھے۔ بادشاہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ البتہ رب العالمین کی طرف سے قطعی غافل تھے۔ کبھی دماغ کے کسی گوشہ میں بھی توحید الوہیت کے تصور کو جگہ نہ دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ کی بددعا سے جو غیبی عذاب آئے تو فرعون کی فرعونیت کا سر کچھ جھکا۔ اپنی عاجزی دیکھی اور موسیٰ کا اقتدار۔ مجبور ہو کر درخواست کی کہ عذاب کو آپ ہی لائے ہیں۔ آپ ہی اس کو ہمارے سروں سے ٹالیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر لوگ سیدھے راستہ پر آجائیں گے تو ہم عذاب ٹال دیں گے۔

توہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ عذاب مل گیا توہم آپ کو مان جائیں گے۔ اور راہِ راست پر آجائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی عذاب مل گیا، مگر وعدہ فراموشوں نے شکستِ عہد کی ایمان نہ لائے۔ ہر عذاب میں مبتلا ہونے کے وقت ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور جب عذاب دور ہو جاتا تھا تو عہد توڑ دیتے تھے اور ایمان نہ لاتے تھے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ اب فرعون مجبور ہو گیا تو قوم کو گمراہی پر قائم رکھنے کے لئے کچھ اس طرح کی مناظرہ بازی کرنے لگا جس کی بنا کچھ رسم و رواج پر تھی۔ کچھ لوگوں کی نفسیات پر اور کچھ ذاتی جذبات پر۔ عقلی دلیل اور یقینی برہان سے اس کے کلام کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی اور اس کی بیوقوف قوم کی نظر میں دنیوی امارت و ثروت حکومت وجاہ و حشمت ہر قسم کی جسمانی و روحانی سیادت حاصل کرنے کا استحقاق پیدا کر دینے کی علتِ لازمہ تھی۔ روحانی طاقتوں اور غیر طبعی قوتوں کا اس کو انکار تھا، اس لئے کہنے لگا موسیٰ ایک حقیر آدمی ہے صاف بات بھی نہیں کر سکتا۔ نہ خطیب قوم ہے نہ اس کے اندر کوئی سرداری کی علامت ہے۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن بھی نہیں (دنیا کے اکثر حصوں میں بادشاہوں اور سرداروں اور فوجی افسروں کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہننے کا رواج تھا اب بھی ایشیا کے بعض حصوں میں یہ رواج موجود ہے) یعنی سیادت اور عزت کا کوئی نشان نہیں نہ اس کے ساتھ ساتھ کوئی روحانی مخلوق رہتی ہے (کم بخت کتنا بے وقوف بنانے والا چالاک تھا کہ روحانی مخلوق کے مجسم مادی ہو کر موسیٰ کے ساتھ ساتھ رہنے کا خواستگار تھا۔ غیبی روحانی نورانی قوتیں اس کے نزدیک موجود ہی نہ تھیں۔ آج بھی مادہ کے پرستار ہر طاقت کو مادہ کی پیداوار جانتے ہیں اور مادہ پر روحانیت کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے) اور میں مصر کا بادشاہ ہوں اور دریاؤں کا مالک ہوں جو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ میرے محلات کے اردگرد نہریں بہتی ہیں یعنی ہر طرح کی ثروت و حکومت مجھے حاصل ہے۔ اس تقریر سے اس نے اپنی قوم کو خوب بیوقوف بنایا، قوم والوں نے اس کی بات مانی وجہ یہ تھی قبطیوں کی قوم حق پرست ہی نہ تھی کہ موسیٰ کی صداقت کو سمجھتی اُن کی عادت اور خمیر میں بداعتقادی اور بدکاری رچی ہوئی تھی۔ فرعون کی سطحی باتیں اُن پر اثر انداز ہو گئیں اور سب نے فرعون کا ساتھ دیا۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝ غرض جب ساری قوم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا تو سب کو سزا دینی ضروری ہو گئی اور زمین کو ان کی گندگی سے پاک کر دینا لازم ہو گیا (اس کے بعد کا قصہ اس جگہ مذکور نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ جب فرعون کی طرف سے مایوس ہو گئے تو راتوں رات تمام اسرائیلی قوم کو لے کر مصر سے باہر نکل گئے۔ صبح کو فرعون کو اطلاع ہوئی تو وہ اپنا سارا لاؤ لشکر لے کر تعاقب میں نکلا۔ حضرت موسیٰ دریا پر پہنچے اور باعجاز موسیٰ حسب حکم خدا دریا خشک ہو گیا۔ بنی اسرائیل خشکی سے نکل گئے۔ فرعون کنارہ پر پہنچا اور اس نے دریا کو خشک پایا اسے دکھا تو اس نے بھی اپنی فوجیں دریا میں ڈال دیں۔ اور خود بھی گھس گیا۔ فوراً دریا میں طغیانی آگئی اور) اللہ تعالیٰ نے سب کو غرق کر دیا۔ سب گئے گذرے ہو گئے۔ کوئی بھی نہ بچا۔ آئندہ آنے والی قوموں کے لئے ذخیرۂ عبرت اللہ تعالیٰ نے ان کو بنا دیا (فرعون کی لاش کو دریا نے بھی قبول نہیں کیا نکال باہر پھینکا اور لوگوں نے اس کو اٹھا کر ممیا کر رکھ لیا۔)

مقصودِ بیان مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ میں۔ ھا۔ ضمیر کا رجوع آیات کی جانب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے رسالت کا دعویٰ کیا اور معجزات دکھائے تو شروع شروع میں فرعون اور اس کے درباریوں نے معجزات کا مذاق بنایا۔ سب نے اُن کو دل لگی سمجھا۔ شاید موسیٰ کی شعبدہ بازی خیال کیا اور شعبدہ بازی ہے بھی ہنسی کی چیز۔

وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو معجزات حضرت موسیٰ نے پیش کئے وہ عبرت دلانے اور دلوں میں ایمان کو بٹھانے کے لئے دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ بذاتِ خود تو سب ہی بڑے تھے۔ تمام قوم تھا کسی ایک معجزہ کی مثل پیش کرنے سے عاجز

لیکن مگر افادۂ ایمانی عبرت آفرینی اور سبق آگینی میں ایک کو دوسرے پر فوقیت تھی۔ شاید کوئی ایسا ہو کہ لوگ اس کو محض اتفاق قرار دیں اور کوئی ایسا ہو کہ جس کی کچھ تاویل کر دیں اور کچھ ایسے ہوں جو محسوس طور پر دلالت کرتے ہوں کہ موسیٰ کے ساتھ کوئی غیبی قوت قدسیہ ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ معجزات افادۂ ایمانی اور کفر سے توبہ کرانے کے لئے تھے۔ ہلاک کرنے کے لئے نہ تھے یٰاَیُّہَ السّٰحِرُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ لوگ حضرت موسیٰ کے پیش کردہ معجزات کو جادو قرار دیتے تھے جب مقابلہ نہ بن پڑا اور روحانیت و ملکیت کا عقیدہ نہ تھا تو مجبور ہو کر انھوں نے معجزاتِ نبوت کو شیطانی غیبی طاقتوں کی کرشمہ سازی یعنی جادو قرار دیا۔

وَلَا يَكَادُ يُبِينُ میں صراحت ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان صاف نہ تھی کچھ لکنت سے بولتے تھے۔

جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ فرعون ملائکہ کا قائل نہ تھا لیکن حضرت موسیٰ کو روحانی مخلوق کے برسر امداد ہونے کا دعویٰ تھا۔ مگر فرعون کا فہم خالص روحانیت تک پہنچ نہ سکتا تھا، اس لئے اس نے روحانی مخلوق کے انکار کو ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ اگر ملائکہ ہوتے اور موسیٰ کے مددگار ہوتے تو اس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور چونکہ ایسا نہیں ہے، اس لئے ملائکہ کا وجود ہی نہیں ہے اور نہ موسیٰ کا دعویٰ صحیح ہے۔

كَانُوا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ بتا رہا ہے کہ قبطی قوم عادتاً اور طبیعتاً بدکار اور بدافکار تھی۔ اس لئے فرعون کی محض سطحی گفتگو سن کر ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ سے اشارہ ہے کہ ماضی حال و مستقبل کا آئینہ ہے یعنی ضابطۂ قدرت ایک ہی ہے جو ماضی و مستقبل کے چکر سے بالاتر ہے۔ پس عبرت اندوز ہونا چاہیئے پچھلوں کو اگلوں کے حالات اور اچھے برے نتائج سے اور نصیحت حاصل کرنی چاہیئے سرکشوں کو گزشتہ سرکشوں کے انجام کو دیکھ کر اور یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ پیغمبر برحق کی مخالفت اور ہدایت خداوندی سے سرتابی موجب تباہی ہے۔ بڑی سے بڑی ملوکیت اور اونچے سے اونچا تمدن اس سلسلۂ اسباب و مسببات کی باہم وابستگی کو توڑ نہیں سکتا وغیرہ۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ○ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا

اور جب عیسیٰ ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو یکایک آپ کی قوم کے لوگ اس سے (مارے خوشی کے) چلانے لگے اور (اس

خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ○ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا

معترض کے ساتھ ہو کر) کہنے لگے کہ ہمارے معبود زیادہ بہتر ہیں یا عیسیٰ ان لوگوں نے جو یہ (مضمون عجیب) بیان کیا ہے تو محض جھگڑنے کی غرض سے بلکہ یہ لوگ

عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِى

ہیں ہی جھگڑالو عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے فضل کیا تھا اور انکو بنی اسرائیل کے لئے ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا اور اگر ہم چاہتے تو ہم تم

الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ○ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ

میں سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین پر یکے بعد دیگرے رہا کرتے۔ اور وہ (یعنی عیسیٰ) قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو اور تم لوگ

مُّسْتَقِيْمٌ ○ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى

میرا اتباع کرو یہ سیدھا راستہ ہے اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پائے وہ بیشک تمہارا صریح دشمن ہے اور جب عیسیٰ معجزے لیکر آئے تو انہوں نے

بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

(لوگوں سے) کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت کی باتیں لے کر آیا ہوں اور تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کردوں تو تم لوگ اللہ سے ڈرو اور

وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ

میرا کہنا مانو بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو اسی کی عبادت کرو یہی (توحید) سیدھا رستہ ہے سو مختلف گروہوں

الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝

نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال دیا سو ان ظالموں کے لئے ایک بڑے درد دل کے عذاب سے بڑی خرابی ہے

تفسیر اگر اہل حق کے کلام میں کوئی لفظ ایسا آجائے کہ باطل پرست اس کا رخ موڑ کر اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال سکتے ہوں تو وہ پورے کلام حق سے غلط طور پر فائدہ اندوز ہوتے اور جھگڑے کی اونچی عمارت بنا ڈالتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کی پرستش کے سوا کسی کی پرستش کی اجازت نہیں دی اور نہ کسی دیوی دیوتا کو معبود قرار دیا۔ یہ بات ان لوگوں سے پوچھ دیکھو جو کسی پیغمبر کے پیرو ہیں تو ان الفاظ کو غلط مطلب پہنانے کا بعض کافروں کو موقع مل گیا۔ کہنے لگے دیکھو یہ نصاریٰ عیسیٰ کی امت ہیں۔ انجیل کے حامل ہیں اور عیسیٰ کو ابن اللہ یعنی اللہ کا بیٹا قرار دے کر پوجتے بھی ہیں۔ پھر ہمارے دیوتا اور معبود تو عیسیٰؑ سے بڑھ کر ہیں۔ ہم اُن کی پوجا کرتے ہیں تو کیا جرم ہے۔ ان بیوقوفوں کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے دریافت کرنے کا حکم آیت مذکورہ میں دیا ہے اور پیغمبروں سے پوچھنے کی مراد ہے اُن کے فرمانوں اور کتابوں کو پڑھنا اور سمجھنا اور پیغمبروں کے جو صحیح پیرو ہیں یعنی کتاب اللہ اور فرمان پیغمبر پر چلتے ہیں ان سے دریافت کرنا اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی پرستش کی اجازت دی نہ انجیل میں اس کی کہیں اجازت ہے۔ عام عیسائیوں کی باتوں کا کچھ اعتبار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بے شک عیسیٰؑ کو اپنی قدرت کا ایک عظیم الشان نمونہ بنایا تھا۔ کہ بن باپ کے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تو یہ بھی تھا کہ بغیر ماں باپ کے اور بغیر توالد تناسل کے پیدا ہونے والے ملائکہ کو انسانوں کی جگہ بسا دیتا یا تمام ہی انسانوں کو ملائکہ کی طرح بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیتا اور ایک کے پیچھے دوسرا یوں ہی آتا چلا جاتا۔ پھر اس کی قدرت سے کیا یہ بات باہر تھی کہ ایک شخص کو بغیر باپ کے پیدا کر دیا۔ یہ تو قدرت کی ہمہ گیری کا ایک نمونہ تھا ورنہ عیسیٰ صرف ایک انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تھا اُس کا پیدا ہونا قیامت کی ایک نشانی تھی کہ قیامت کا آنا اور مُردوں کا دوبارہ قبروں سے اٹھنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہے جس خدا تعالیٰ نے عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا وہ مردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ عیسیٰ نے اپنے دعویٰ رسالت کی تصدیق کے لئے کھلے کھلے معجزات ظاہر کئے تھے (مادرزاد اندھے کو بینا کیا، مریضوں کو تندرست کیا اور بے جان پتلے میں روح پھونک کر زندہ پرندہ بنا کر اڑا دیا۔ عیسیٰ کا زندہ پتلے کو زندگی عطا کرنا عظیم الشان ثبوت ہے قیامت کا جب کہ بے جان مُردے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے) عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ توریت اور دین یہودیت میں جو تم اختلاف کر رہے ہو اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہو میں تمہارے پاس دانش کی باتیں لے کر آیا ہوں اور میرے آنے کی غرض یہ ہے کہ تمہارے اختلافی مسائل کا فیصلہ کر دوں۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ ہی میرا خالق و مالک اور حاکم ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔ کج کج راہیں چھوڑ دو یہی سیدھا رستہ ہے اسی پر چلو۔ عیسیٰ کا یہی پیام توحید تھا۔ لیکن عیسیٰ کے بعد بنی اسرائیل اور اتباع عیسیٰ کا دعویٰ کرنے والے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔

کسی نے مسیح کو خدا کا بیٹا اور کسی نے تین میں کا تیسرا قرار دے دیا اور توحید عیسیٰ شرک سے بدل گئی۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝ وَقَالُوا ءَأَٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کا ذکر کرنے سے پہلے فرمایا تھا کہ جن لوگوں کو ہم نے پیغمبر بنایا تھا اُن سے دریافت کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو قابلِ پرستش بنایا ہے۔ مراد یہ تھی کہ پیغمبروں کے اقوال کو اور ان کتابوں اور صحیفوں کو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں پڑھو اور ادیانِ سماوی کا صحیح علم رکھنے والوں سے پوچھو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی کو معبود نہیں بنایا اور شرک کی کہیں اجازت نہیں۔ مشرک اس کلام کو سن کر مناظرہ اور بحث کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور خوشی کے مارے چلا اٹھے اور غل مچالیا اور حضرت عیسیٰ کی ہستی کو شرک کے ثبوت میں پیش کیا۔ عبداللہ بن زبعری (جو اس وقت مشرک تھا اور کچھ مدت کے بعد مسلمان ہو گیا تھا) بولا دیکھو عیسائی مسیح کو پوجتے ہیں تو کیا ہمارے معبود جو کائنات کے دیوتا ہیں عیسیٰ سے بھی گئے گذرے ہوئے جن کی ہم پوجا کرتے ہیں وہ عیسیٰ سے بہتر نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جھگڑالو تھے حق طلب نہ تھے، اس لئے جھگڑے کے طور پر ایسی بات کہی جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ محض جہالت کا مظاہرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کب فرمایا تھا کہ جو لوگ کسی پیغمبر کے صرف نام لیوا ہیں اور ہیں مشرک اور غیر اللہ کے پجاری اُن سے پوچھو یا اُن کے طرزِ عمل کو دلیل میں پیش کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تو انبیاء سے پوچھنے کا حکم دیا یعنی انبیاء کی کتابوں اور حدیثوں کا مطالعہ کرو۔ اور جو لوگ صحیح طور پر انبیاء کی تعلیم پر چلنے والے ہیں ان سے شہادت لو اور ظاہر ہے کہ اہلِ حق عیسیٰ کی پرستش نہیں کرتے نہ اس کی اجازت دیتے ہیں پھر مشرک جن دیوتاؤں اور موہومی معبودوں کی پوجا کرتے ہیں اُن کی ہستی ہی موہوم ہے نہ اُن کے وجود کی کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی ثبوت۔ اور ثبوت بھی ہو تو عیسیٰ سے ان کا افضل ہونا ثابت نہیں۔ اس صورت میں عیسیٰ کی معبودیت کے عقیدہ کو پیش کرنا اور اپنے دیوتاؤں کو عیسیٰ سے افضل قرار دے کر ان کی معبودیت کی وجہِ جواز نکالنا جھوٹ پر جھوٹ کی تعمیر کے سوا اور کچھ نہیں، اسی لئے اس کو جدل اور ایسا کرنے والوں کو قوم فرمایا۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ یہ مسیح کی اصل حالت کا بیان ہے کہ عیسیٰ محض ایک بندہ تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا تھا (شیرخوارگی کی حالت میں اس کو قوتِ کلام عطا فرمائی کہ اس نے اپنی ماں کی پاک دامنی کی شہادت دی اور آئندہ ملنے والی نبوت کا اظہار کیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبری سے سرفراز فرمایا اور عظیم الشان معجزے عنایت کئے جن میں ایک مُردوں کو زندہ کرنا بھی تھا۔)

وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی ہمہ گیر قدرت و حکمت کا ایک شاندار نمونہ بنایا (اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات کوئی بعید نہیں تھی)

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا جو ایک کی جگہ دوسرا آتا رہتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو ملائکہ بنا دیتا جو بغیر ماں باپ کے فرشتوں کی طرح پیدا ہوتے اور زمین پر ایک کے بعد ایک آباد ہوتا اور آتا رہتا۔

وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ مسیح تو قیامت کی علامت اور نشانی تھے یعنی قیامت کے قریب اتریں گے۔ اور ان کے بعد قیامت آجائے گی یا یہ مطلب ہے کہ مسیح کی پیدائش قیامت کے ثبوت کی نشانی ہے کہ جس خدا نے مسیح کو بغیر باپ کے نطفہ کے پیدا کر دیا اُس کی قدرت سے بعید نہیں کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دے یا یہ مطلب ہے کہ مسیح کی نبوت قیامت کا ثبوت ہے۔ مسیح کو منجملہ دیگر معجزات کے ایک معجزہ یہ بھی دیا گیا تھا کہ آپ مردوں کو زندہ کرتے اور مٹی کا پتلا بنا کر اُس میں پھونک مار کر جان ڈال دیتے تھے۔ پس جو خدا مسیح کو یہ طاقت دے سکتا ہے کیا وہ خود مُردوں کو زندہ کر کے نہیں اُٹھا سکتا۔

فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ لہٰذا تم قیامت میں شک نہ کرو (اعمال و اقوال کو سزا جزا سے معطل سمجھنا یا انکارِ قیامت کرنا یا اسی دنیا میں سزا جزا کو بصورتِ آواگون ماننا کج راہی ہے اور)

قیامت کا ایک دن آنا ہی (صحیح عقیدہ اور) راہ مستقیم ہے تم کو شیطان کے بہکاوے میں نہ آنا چاہیئے تم شیطان کے سنگ راہ بن جانے سے صراطِ مستقیم سے روگرداں نہ ہو اور اُس کے کہے میں نہ آؤ وہ تمہارا کھُلا دشمن ہے

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ اوپر کی آیات میں حضرت عیسیٰ کا اصل مقام بتایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے تھے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل فرمایا تھا۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے اُن کی تعلیم اور غرض بعثت کو بیان کیا ہے۔ جب عیسیٰ کھُلی ہوئی علمی وعملی دلیلوں اور واضح معجزات کے ساتھ قوم کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا میں تم کو دانش کی سچی سچی درست باتیں سکھانے اور ان مباحث ومسائل کا فیصلہ کرنے آیا ہوں جو تمہارے اندر نزاعی ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اُس کے سچے احکام میں خرد برد اور تغیر نہ کرو اس کی ہدایت پر عمل کرو) اور میرے قول کو صحیح مانو اور اُس پر چلو خوب کان کھول کر سمجھ لو کہ میرا خالق، مالک اور حاکم ایک اللہ ہے اور وہی تمہارا خالق، مالک اور حاکم ہے یہی (عقیدہ صحیح اور) سیدھا راستہ ہے حضرت عیسیٰ کا کلام ختم ہو گیا۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ۔ حضرت عیسیٰ سے کچھ ہی مدت کے بعد عیسائیوں نے اپنی طرف سے اختلافات کرنے شروع کر دیئے۔ مختلف مباحث یہاں تک کہ خود عیسیٰ کے مقام وذات کے متعلق بھی ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ مسیح کو کسی نے خدا کا بیٹا اور کسی نے تین اقانیم الوہیت میں سے تیسرا کہنا شروع کر دیا۔ بعض نے کہا اس کو صلیب دے دی گئی۔ بعض نے اس کا انکار کیا۔ فرقہ صدوقی نے قیامت کا انکار کر دیا اور فقیہوں اور فریسیوں نے بہت غلط اختراعات کو جزو مذہب بنا لیا۔ رومن کیتھولک عیسائیوں نے مسیح، صلیب اور کنواری مریم کی عبادت ہی شروع کر دی۔ غرض ان بدنصیبوں نے عقائد وافکار اور اعمال وگفتار سب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور عیسیٰ کی تعلیم کے خلاف کیا اور ہر فرقہ گمراہ ہو گیا۔ اُن کی یہی پھوٹ تعلیم عیسوی کو برباد او گُم کر دینے کا باعث بنی۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ایسے حق فراموش ناحق کوش غلط فکر وعمل والوں کے لئے قیامت کے دن عذاب الیم سے تباہی وہلاکت ہو گی۔

مقصود بیان

إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ میں اگرچہ مشرکوں کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگوں نے شرک کی قدامت اور جواز کو ثابت کرنے کے لئے عیسائیوں کی مسیح پرستی اور صلیب کی پوجا کو پیش کیا تھا۔ اور عیسیٰ کا نام جو بطور تمثیل اُن کے سامنے لیا گیا تھا اُس سے انہوں نے غلط استدلال قائم کیا تھا، لیکن اس سے عام باطل پرستوں اور جاہلوں کے طرزِ مکالمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چالاک، ہٹ دھرم باطل پرستوں کو اگر اہلِ حق کے کلام میں اپنے مطلب کا کوئی ذرہ بھر اشارہ مل جاتا ہے تو وہ اس کو غلط طور پر اپنے مقصد کی طرف موڑ تے ہیں اور اپنے مفروضہ کو مسلمہ قرار دے کر جھوٹ پر جھوٹ کی عمارت چُن دیتے ہیں۔

مَثَلًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تخلیق اور نبوت اور نبوت کے خاص معجزات قدرتِ خداوندی کی ہمہ گیری کا ایک خاص نشان ونمونہ تھے۔

لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً سے مراد یہ ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کو فرشتوں کی طرح توالد وتناسل کے سلسلے سے بے نیاز کر دیتا اور بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیتا۔ قدرتِ خداوندی کے لئے یہ عمل دشوار نہ تھا۔

لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ قیامت کی نشانی ہیں یعنی دوبارہ نازل ہوں گے اور ان کے بعد قیامت آجائے گی یا یہ مراد ہے کہ حضرت عیسیٰ کو حیات بخشی کی طاقت عطا کرنا وجود قیامت کو ثابت کر رہا ہے۔ جس خدا نے دوسرے کو حیات بخش بنا دیا وہ خود کس طرح اعادۂ اموات سے عاجز ہو گا۔

وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہودیوں کے اندر افکار وعقائد اور مباحث دینیہ کے متعلق باہم بہت اختلافات تھے اور حضرت عیسیٰؑ ان اختلافی مباحث کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَیْنِہِمْ سے ثابت ہو رہا ہے کہ عیسائیوں کے گروہوں میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ اُن کے خود پیدا کردہ تھے۔ ذاتی اختلافات تھے۔ صداقت وحقانیت اور تحقیقِ حق سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا وغیرہ۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ

یہ لوگ بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ اُن پر دفعتہً آپڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو تمام (دنیوی) دوست اُس روز ایک

بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ○ يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ

ع ۶ / ۱۲

دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے بجز خدا کے ڈرنے والوں کے (اور مومنین کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوگی کہ) اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ

تَحْزَنُونَ ○ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ○ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ

تم غمگین ہوگے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور (ہمارے) فرمانبردار تھے تم اور تمہاری (ایماندار) بیبیاں خوش بخوش جنت میں داخل

تُحْبَرُونَ ○ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ

ہو جاؤ ان کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لائے جاویں گے (یعنی غلمان لاویں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن

وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ لَكُمْ

سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور تم یہاں ہمیشہ رہو گے اور اُن سے کہا جاوے گا کہ یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دیئے گئے ہو اپنے (نیک) اعمال کے

فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ ○ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ○

عوض میں (اور) تمہارے لئے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے کھا رہے ہو بیشک نافرمان (یعنی کافر) لوگ عذاب دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ○ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ○ وَنَادَوْا

وہ (عذاب) اُن سے ہلکا نہ کیا جاوے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے اور ہم نے ان پر (ذرا) ظلم نہیں کیا لیکن یہ خود ہی ظالم تھے اور پکاریں گے

يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ ○ لَقَدْ جِئْنَاكُم بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ○

کہ اے مالک تمہارا پروردگار (ہم کو موت دے کر) ہمارا کام ہی تمام کر دے وہ (فرشتہ) جواب دیگا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہو گے ہم نے سچا دین تمہارے پاس پہنچایا لیکن تم میں اکثر آدمی سچے

تفسیر جولانگاہ عمل کا نقطۂ آغاز تو ہر شخص جانتا ہے کہ آغازِ شعور ہے۔ لیکن یہ میدان ختم کہاں ہوگا۔ اس کا آخری کنارہ کہاں ہے انفرادی طور پر ہر آدمی کے عمل وسعی کا خاتمہ اُس کی موت پر ہو جاتا ہے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا

اختیاری کردار ختم ہو جاتا ہے ، لیکن اس دار التکلیف کی بحیثیت مجموعی آخری حد کہاں ہے اور کہاں دار العمل اور دار الجزا کے ڈانڈے ملتے ہیں اور کب جزا سزا کی مقررہ ساعت آئے گی ۔ یہ بات پردۂ غیب میں ہے کسی کو معلوم نہیں ۔ علامات و نشانات کا ظہور گو ہزاروں برس پہلے سے ہو رہا ہو ، لیکن ساعت معین تمام نشانات کے بعد یک دم آئے گی اور یکایک صورِ قیامت پھونک دیا جائے گا ۔ اب اس انتظار میں بیٹھا رہنا کہ قیامت ابھی کہاں آرہی ہے ۔ ابھی تو یہ دنیا ہزاروں برس رہے گی اور اس انتظار میں ہر نیکی سے دست کش رہنا سراسر حماقت ہے ۔ یہ گیا یہ گمان کہ حکومت یا جتھے کی کثرت یا بھائی برادروں کی جماعت یا ہزاروں جان چھڑکنے والوں کی حمایت اعمال کی سزا سے بچا لے گی ۔ قیامت آئے تو آجائے عذاب اور مصیبت سے بچانے والے اہل قرابت و مودت ، اور فداکار اہل محبت ہر دکھ سے حفاظت کر لیں گے تو یہ خیال خام ہے ۔ یہ رشتے ناطے اور دوستی یاری کچھ کام نہ آئے گی ۔ وطنیت ، محبت ، صلاحیت ، زوجیت خون کی قرابت و قومیت قیامت کے دن کوئی چیز باقی نہیں رہے گی ۔ وہاں بدکار نیک سے اور کافر مومن سے کوئی تعلق نہیں رہے گا وہاں ایمان ، اسلام اور پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا رشتہ قائم ہوگا ایک مومن دوسرے مومن کا اور ایک متقی دوسرے متقی کا ساتھی ہوگا اور اسی گروہ سے خطاب ہوگا کہ میرے بندو آج تم کو عذاب کا ڈر نہیں نہ گذشتہ دنیوی مصائب و آلام کا کوئی حزن باقی ہے جاؤ جنت میں چلے جاؤ وہاں اپنی جنتی بیبیوں کے ساتھ ہر طرح کے ناقابلِ ذکر راحت و عیش کے ساتھ رہو وہاں تم کو ہر مرغوبِ خاطر اور جاذبِ نظر نعمت ملے گی ۔ اور یہ عیش دوامی اور لازوال ہوگی نہ کمی کا اندیشہ نہ فنا کا خوف ۔ متقیوں اور مومنوں کے اس گروہ کے مقابل مجرموں اور کافروں کا گروہ ہوگا جو عذابِ جہنم میں گرفتار ہوگا اور ہمیشہ گرفتار رہے گا ۔ رہائی یا تخفیف عذاب کی کوئی امید نہ ہوگی اور یہ سب کچھ ظلم نہ ہوگا اُن کے غلط انکار اور ناسزا اعمال کا بدلہ ہوگا ، اُس وقت وہ موت کی تمنا کریں گے ۔ مگر بے سود ۔ موت نہ آئے گی اور اسی موت و حیات کی کشاکش میں ہمیشہ پڑے رہیں گے

تعجیل اجزاء

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ پہلے کی آیت میں فرمایا تھا کہ حق فراموش ناحق کوش لوگوں کے لئے قیامت کے دن ہلاکت و تباہی ہوگی ، لیکن منکروں کو تو قیامت آنے کا اقرار ہی نہ تھا اُن کے سامنے تو اپنی زندگی اور زندگی کے بعد موت تھی ۔ سزا جزا کے دن کا تصور ہی ان کے دماغوں میں نہ تھا اُن کو تنبیہ کرنے اور ڈرانے کے لئے فرماتا ہے کہ قیامت کی گھڑی تو اچانک آجائے گی ۔ پتہ بھی نہیں ہوگا کہ صور پھونک دیا جائے گا ۔ تو کیا یہ لوگ اسی انتظار میں ہیں کہ قیامت آئے تو ایمان لائیں اور اعمال کو درست کریں یعنی ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا ۔ قیامت یک دم آئے گی ایمان و عمل کا موقع ہی نہیں رہے گا ۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ دنیوی رشتے سب کٹ جائیں گے جو لوگ دوستی کا دم بھرتے ہیں اور جان چھڑکتے ہیں یا فرزندوں اور عزیزوں کے وہ بھی دشمن ہو جائیں گے ۔ کوئی کسی کا دوست نہ ہوگا ۔ یعنی یہاں ایک بدکار کا اور ایک شیطان دوسرے شیطان کا دوست ہے ۔ ایک بہکاتا ہے دوسرا بہک جاتا ہے ۔ ایک غلط راستہ دکھاتا ہے دوسرا اس پر چل پڑتا ہے ۔ مگر قیامت کے دن ہر شیطان اپنے پیرو سے اور ہر گمراہ ہونے والا اپنے گمراہ کرنے والے سے بیزار ہوگا اور خواہش مند ہوگا کہ اس کو مجھ سے دوگنا عذاب دیا جائے گا ۔

اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۔ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۔ ہاں وہ پرہیزگار لوگ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو سچا مانتے اور ان پر چلتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا رُخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کر لیا ہے ان کا باہمی تعلق منقطع نہ ہوگا وہ باہم دشمن نہ ہوں گے ہر ایک دوسرے کا دوست ہوگا ۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوگا کہ میرے بندو (ڈر اور رنج کی زندگی ختم ہوگئی) آج تم کو نہ خوف ہے نہ غم (نہ پچھلی زندگی کا غم نہ آئندہ دکھ کا اندیشہ)

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۔ تم خوش خوش اپنی (جنتی) بیبیوں کے ساتھ جنت میں چلے جاؤ ۔ ازواج سے مراد یا مومنہ نیکوکار بیبیاں ہیں جو مومن نیکوکاروں کے ساتھ جنت میں جائیں گی یا جنت کی حوریں مراد ہیں اور چونکہ حوروں سے بھی مومنوں کا رشتہ

زوجیت ہوگا، اس لئے ان کو ازواج فرمایا

یُطَافُ عَلَیۡهِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَهَبٍ وَّاَکۡوَابٍ یہ مومنوں کی جنتی حالت کا بیان ہے یا خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے۔ اصل میں عَلَیۡکُمۡ ہونا چاہیئے لیکن کلام میں حسن پیدا کرنے کے لئے حاضر کی جگہ غائب کی ضمیر استعمال کی۔ اول مطلب اس صورت میں ہوگا جب کلام کا کچھ حصہ محذوف قرار دیا جائے گا۔ گویا پورا کلام اس طرح تھا کہ جب وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ان کے سامنے کھانے پینے کے برتنوں کا دور ہوگا۔ قرطبی کے نزدیک برتنوں کے دور سے مراد ہے کھانے پینے کی چیزوں کا دور جو سونے کے پیالوں اور رکابیوں میں ہوں گی۔ صحاف صحفۃ کی جمع ہے جس کا معنی ہے بڑا پیالہ یا قاب۔ خطیب نے کسائی کا قول لکھا ہے کہ کھانے کا سب سے بڑا برتن جفنہ ہوتا ہے جس کی جمع جفان ہے۔ اس سے چھوٹا جس میں دس آدمیوں کا کھانا آ جائے قصعہ کہلاتا ہے۔ قصعہ کے بعد صحفہ کا نمبر ہے صحفہ میں پانچ آدمیوں کے کھانے کی سمائی ہوتی ہے۔ صحفہ کے بعد میکلہ ہے جس میں دو تین آدمیوں کا کھانا آ جاتا ہے۔ اکواب کوب کی جمع ہے۔ کوب وہ کوزہ یا گلاس جس میں پکڑنے کا دستہ اور ٹونٹی نہ ہو۔

وَفِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡهِ الۡاَنۡفُسُ وَتَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ اور ان برتنوں میں یا جنت میں وہ نعمتیں ہوں گی جو مرغوب خاطر خواہش کے مطابق اور آنکھوں کے لئے سرور بخش اور کیف آور ہوں گی۔ اگر فیہا کی ضمیر صحاف و اکواب کی طرف راجع کی جائے تو قرطبی کے قول کی ضرورت نہیں رہتی کہ برتنوں سے مراد کھانے پینے کی چیزیں ہیں بلکہ یہ مطلب غلط ہوگا۔

وَاَنۡتُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ اور تم جنت میں ہمیشہ رہو گے۔ نعمت کتنی ہی بڑی ہو اگر کسی وقت اس کے ختم ہو جانے کا اندیشہ لگا رہے تو دانش مندوں کے لئے موجودہ راحت بھی کدورت آمیز اور رنج آگیں ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کو دور کرنے کے لئے جنت کے لازوال ہونے کی صراحت فرما دی۔ خلود سے مراد اس جگہ باتفاق مفسرین مدت غیر منقطعہ ہے زمان طویل مراد نہیں ہے۔

وَتِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۔ لَكُمۡ فِیۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِیۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ جنت کا داخلہ اور اس کی ہر نعمت و راحت اگرچہ بلا استحقاق ہے کسی پیغمبر کو بھی وجوبی حق حاصل نہیں کہ اس کو جنت میں ضرور ہی داخل کر دیا جائے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوگا۔ صحابہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا حضور بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے) جنت میں داخل نہ ہوں گے فرمایا نہیں ہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مجھے ڈھانک لے گی، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی جنت میں داخل ہونے کا ایک ضابطہ بنا دیا ہے اور وعدہ فرما لیا ہے کہ نیکوکار اہل ایمان کو جنت میں داخل کر دوں گا اور اعمال کے بدلے میں جنت عطا کروں گا، اس لئے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ جنت میں داخلہ (اور جنت کا عطیہ زیر رحمت خدا) نیک اعمال کی وجہ سے ہوگا۔ اور جنت میں بکثرت لذت بخش پھل ہوں گے جن میں سے (جو شخص جتنا چاہے گا) کھائے گا۔ چونکہ سب پھلوں کا کھانا تو ناممکن ہوگا اس لئے مِنۡهَا فرمایا۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ۔ لَا یُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِیۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ نیکوکار اہل ایمان کی جزا بیان کرنے کے بعد اس آیت میں بدکار کافروں کی سزا کی تصویر کشی کی ہے۔ تاکہ ترغیب کے ساتھ ترہیب بھی شامل ہو کر دعوت و تبلیغ کی پوری تکمیل کر دے۔ المجرمین سے مراد کافر ہیں۔ کیونکہ اس جگہ یہ لفظ الۡمُتَّقِیۡنَ کے مقابل آیا ہے اور المتقین کی تشریح ایمان دار نیکوکار فرما دی ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت آیات و احادیث دلالت کر رہی ہیں کہ گناہگار مومن اگر بغیر توبہ کے بھی مر جائیں اور ان کے گناہوں کی مغفرت بھی نہ ہو تب بھی وہ گناہوں کی سزا پانے کے بعد کبھی جنت میں چلے ہی جائیں گے اور اس جگہ دوامی عذاب میں مبتلا ہونے اور رہائی بلکہ تخفیف عذاب سے بھی نا امید ہو جانے کی صراحت کی ہے اس لئے صرف کفار ہی مراد ہیں۔ مبلسون کا ترجمہ ہے نا امید ہو کر چپ ہو جانے والے۔

وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡا هُمُ الظّٰلِمِیۡنَ یعنی یہ دوامی جہنم کی سزا کافروں کو بطور ظلم نہ ملے گی۔ اللہ ان پر ظلم نہیں کرے گا۔ اُن کو ضابطۂ خداوندی کے موافق جنت کا یا تخفیف عذاب کا یا عذاب غیر دائمی کا استحقاق ہو اور اللہ تعالیٰ ان کی حق تلفی کر کے ہمیشہ

کے لیے سخت عذاب میں ڈال دے۔ ایسا نہ ہوگا بلکہ ظالم اور حق تلفی کرنے والے وہ خود تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے فائدہ اٹھانے کے بعد اس کو معبود یکتا نہ مانا اور اس کے احکام کی تعمیل نہ کی۔ پھر انہوں نے خود اپنے حق کو اپنے ہاتھوں سے برباد کیا۔ خدا داد قوتوں کا غلط استعمال کیا ہو علمی اور عملی طاقت کا بے محل استعمال کیا۔ فکر و اعتقاد کو غلط رو بنایا اور عملی رفتار کو ناہموار رکھا۔ یہی زندگی کا غلط استعمال اور بے راہ روی دوامی جہنم کی شکل میں ان کے سامنے آئے گی

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ۔ جب کوئی دوست کام نہیں آئے گا۔ ہر شیطان اور گمراہ کرنے والا دوست دوزخ کے اندر شریک عذاب اور اپنے دوست پر مزید عذاب ہونے کا خواستگار ہوگا تو عذاب دینے والے فرشتوں اور کارندوں کے سرگروہ کو بھی پکاریں گے اور مایوس ہو کر درخواست کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخری موت ہی دے دے کام تمام ہو جائے کارندگان دوزخ کے اس سرگروہ کا نام مالک ہے۔

قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (بقول بعض اہل تفسیر کے ہزار برس کے بعد) مالک جواب دے گا کہ تم کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے (یعنی کبھی نہیں مرو گے کہ عذاب سے نجات مل جائے) مکث سے مراد اس جگہ باجماع علماء دوام ہے

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۔ کارہون بعض اہل تفسیر نے اس کلام کا مخاطب اہل جہنم کو قرار دیا ہے یعنی اللہ (مالک کی زبانی) دوزخیوں کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ دنیا میں پیغمبروں کی معرفت ہم نے تم کو ہدایت کر دی تھی جو سراسر حق تھی، لیکن تم نے حق سے نفرت کی اور باطل کو پسند کیا۔ اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ دوزخیوں کی حالت کا بیان ماکثون پر ختم ہو گیا۔ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ سے اہل مکہ کو خطاب ہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے متعلق جو حق بات تھی اور جنت و دوزخ میں کون کون گروہ جائے گا اور تم کو کیا جاننا، کیا ماننا اور کیا کرنا چاہیئے۔ یہ سب کچھ ہم نے پیغمبر کی زبانی تم کو بتا دیا، مگر تم میں سے اکثر اس پیام حق سے نفرت کرنے والے ہیں۔ اول مطلب شیخ حقانی نے پسند کیا ہے، مگر اس فقیر کی نظر میں یہ مطلب غلط ہے۔ کیونکہ اگر دوزخیوں کو خطاب ہوتا تو اکثرکم کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ دوزخی تو سب ہی حق سے نفرت کرنے والے ہوں گے۔ کیا بعض کافر دوزخی ایسے بھی ہوں گے جو حق پسند ہوں اور پھر ہمیشہ دوزخ میں رہیں، اس لئے مؤخر الذکر مطلب ہی صحیح ہے۔ ہاں اس صورت میں اتنی بات زیادہ کہی جا سکتی ہے کہ روئے خطاب براہ راست اگرچہ اہل مکہ کی طرف ہے، مگر مخاطب بالواسطہ تمام انسان ہیں۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان

هَلْ يَنْظُرُوْنَ الخ۔ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ جب قیامت آجائے گی تو ایمان و عمل کا وقت ختم ہو جائے گا جو کچھ کرنا ہے ابھی موقع ہے کر لو۔

بَغْتَةً اور لَا يَشْعُرُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ قیامت اچانک آجائے گی پہلے سے اُس کے آنے کی معین ساعت بھی کسی کو نہ معلوم ہوگی۔

اَلْاَخِلَّاۗءُ الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ مجرموں کی دنیا میں جو دوستی ناطے اور فدائی ہیں وہ قیامت کے دن دشمن ہو جائیں گے یعنی اگر رشتہ دار اہل ایمان ہیں تو ان کا قیامت کے دن دشمن بن جانا تو ظاہر ہی ہے وہ تو اس زندگی میں بھی کافروں سے حقیقی دوستی نہیں رکھتے اور وہ اگر بہکانے والے یا بہکنے والے کافر ہیں تو وہ بھی دشمن بن جائیں گے بہکنے والا بہکانے والے سے بیزار ہوگا اور گمراہ کرنے والا گمراہ ہونے والے سے اظہار نفرت کرے گا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ میں صراحت ہے کہ متقی صرف وہی لوگ ہیں جو ایمان دار اور فرماں بردار ہوں۔

بِاٰيٰتِنَا کے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اور پورے کلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔

مِنْ ذَهَبٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ ظروف جنت سونے کے ہوں گے۔ بعض آیات میں بعض ظروف کی ساخت چاندی کی ہونے کی بھی صراحت آئی ہے۔ مقصد اس سب کا یہ ہے کہ ظروف جنت جس چیز کے بنے ہوئے ہوں گے وہ ایسی نایاب ہوگی کہ اس دنیا میں اُس کی

حقیقت نہیں بیان کی جا سکتی صرف سمجھانے کے لیے ہم اس کو سونا چاندی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں یہی چیزیں اعلیٰ اور عمدہ مانی گئی ہیں۔
مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ کے الفاظ کا عموم بتا رہا ہے کہ ظروف جنت میں ہر دل پسند اور نظر نواز اشیاء ہوں گی۔ کوئی خاص نوع مخصوص نہیں، لیکن دل پسندی اور نظر نوازی اہل جنت کی حقیقت کے اندر معتبر ہے۔ اس دنیا میں بعض اشیاء کا مرغوب خاطر اور جاذب نظر ہونا قابل اعتبار نہیں نہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو آدمی یہاں پسند کرتا ہے آخرت میں بھی اُسی چیز کو پسند کرے۔
خٰلِدُوْنَ کا لفظ دونوں جگہ بتا رہا ہے کہ نہ ثواب جنت کا کبھی انقطاع ہوگا نہ عذاب دوزخ کا۔
بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے اعمال کی جزا جنت کو بنایا ہے یعنی بداعمال بداعمالی کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گا۔
مَا ظَلَمْنٰهُمْ الخ میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرے گا بلکہ دوزخیوں پر عذاب خود ان کے بدقوت کی بناء پر ہوگا اور اعمال کے مطابق ہوگا سزا میں عمل سے بیشی نہ ہوگی۔
إِنَّكُم مَّاكِثُونَ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخیوں کو کبھی موت نہیں آئے گی وغیرہ۔

أَمْ أَبْرَمُوا أَمْرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ۝ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا

ہاں کیا انھوں نے کوئی انتظام درست کیا ہے سو ہم نے بھی ایک انتظام درست کیا ہے ہاں کیا ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی چپکی چپکی باتوں کو اور انکے مشوروں

لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ۝ قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ۝ سُبْحَانَ رَبِّ

کو نہیں سنتے ہم ضرور سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں آپ کہیے کہ اگر خدائے رحمن کے اولاد ہو تو سب سے اول اُسکی عبادت کرنیوالا میں ہوں آسمان اور زمین

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا

کا مالک جو کہ عرش کا بھی مالک ہے ان باتوں سے منزہ ہے جو یہ مشرک لوگ بیان کر رہے ہیں تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجیے یہاں تک کہ

يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝

ان کو اپنے اُس دن سے سابقہ واقع ہو جس دن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اور وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے اور وہی

وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ

بڑا حکمت والا بڑا علم والا ہے اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کیلئے آسمان اور زمین کی اور جو مخلوق انکے درمیان ہے اسکی سلطنت ثابت ہے اور اسکو قیامت کی بھی خبر ہے اور

تُرْجَعُونَ ۝ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ

تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے اور خدا کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش (تک) کا اختیار نہ رکھیں گے ہاں جن لوگوں نے حق بات (یعنی کلمہ ایمان) کا اقرار

هُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ وَقِيلِهِ

کیا تھا اور وہ تصدیق بھی کیا کرتے تھے اور اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے سو یہ لوگ کدھر اُلٹے جا رہے ہیں اور اس کو

يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

ع ۲۲ / ۱۲

رسول کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے تو آپ ان سے بے رخ رہیے اور یوں کہہ دیجیے کہ تم کو سلام کرتا ہوں سو ان کو ابھی معلوم ہو جاوے گا

تفسیر ہر مشرک کو اقرار ہے اور نزول قرآن کے زمانے میں بھی اقرار تھا کہ تمام انسانوں کو پیدا کرنے والا اور عدم سے وجود میں اپنے علم و ارادہ کے مطابق لانے والا اللہ ہی ہے۔ اس تخلیق میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ نہ کوئی اس کا مددگار ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ صاف ہے کہ اللہ والد نہیں اُس کی کوئی اولاد نہیں۔ والد خالق نہیں ہوتا علم و ارادہ کے مطابق عدم سے وجود میں لانے والا اور نیست سے ہست کرنے والا نہیں ہوتا اور جب وہ خالق ہے والد نہیں تو لامحالہ اس کو بیوی کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ بات اتنی صاف ہے کہ اس میں کسی سوچ وچار اور غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ لیکن مشرک اتنی کھلی حقیقت کو بھی نہیں مانتے بلکہ کبھی الوہیت کے اقانیم ثلثہ قرار دیتے اور مجموعہ کو اللہ کہتے ہیں۔ کبھی انسان اور ملائکہ کو خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ کبھی انسان کے اندر اللہ کے حلول کر جانے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ سب خرافات ہے اس قابل بھی نہیں کہ اس کی طرف توجہ بھی کی جائے۔ جب اللہ ہی خالق اللہ ہی مالک اللہ ہی حاکم اور اللہ ہی ساری کائنات پر اقتدار رکھنے والا ہے تو اُس کے سوا معبود و مسجود کون ہو سکتا ہے اور کس کی اتنی عظیم الشان ہستی ہے کہ اُس کے سامنے سرِ نیاز جھکایا جائے اور اس کو معبود قرار دیا جائے۔ معبود ہونے کی اصل علت خالقیت ربوبیت اور حاکمیت ہے۔ جب ان اوصاف کمالیہ کا حصر اللہ ہی میں ہے تو وہی معبود ہونے کا مستحق بھی ہے بس وہی ایک معبود ہے آسمانوں پر رہنے والوں کا بھی اور زمین پر بسنے والوں کا بھی۔ اُسی کی خدائی ساری کائنات میں اور تمام سنسار پر ہے۔ تمام عالم ہستی اسی کی الوہیت کا مُظہر اور مَظہر ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جیسے حسی دنیا میں کوئی ٹھوس جامد اور تاریک ہے اور کوئی روشن براق اور لامع اول مظہر صنعت ہے مگر دقیق بالفہم مشکل سے سمجھ میں آنے والا اور دوسرا واضح اور عیاں ہے آسانی سے سمجھا جانے والا۔ مؤخر الذکر کا مظہر نور ہوتا اکمل ہے اور اوّل الذکر میں کچھ خفا ہے۔ اسی طرح عالم مجردات و روحانیات میں کوئی مخلوق مظہر اتم و اکمل ہے اور کوئی ناقص ملائکہ انبیاء اور اولیاء کامل ترین مظہر الوہیت ہیں باقی انسان و حیوان مظہر ناقص اور جو ملائکہ یا انسان مظہر اکمل ہیں انہیں کی معرفت اللہ کی طرف سے پیام ہدایت عام انسانوں تک پہنچتا ہے۔ جس طرح ملائکہ اور غیبی کارندوں کے ذریعہ سے نظامِ تکوینی کو قائم رکھا گیا ہے اسی طرح انبیاء کے ذریعہ سے نظامِ تشریعی کو چلایا گیا اور عام انسانوں تک پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ نظامِ تکوینی و تشریعی چلانے اور قائم رکھنے کا ملائکہ اور انبیاء کو اختیار کامل اور اقتدار مطلق العنان حاصل ہے۔ یہ تو غیبی کارندے ہیں۔ کارگزار اپنی اپنی مفوضہ خدمت کو سرانجام دینے پر مکلف نہ یہ خود مختار کل ہیں نہ اللہ سبحان کا جزئیت اور ولدیت کا تعلق ہے کہ معبودیت میں شریک بن جائیں نہ اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کو قربِ الٰہی تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں نہ ان کو سرکشوں کی سفارش کرنے کا اختیار ہے۔ اگر یہ شفاعت کر بھی سکتے ہیں تو باذنِ الٰہی صرف اہلِ ایمان کی جن سے کوئی عملی لغزش ہو گئی ہو۔ لیکن باطل پرست ان کھلی ہوئی واجب التسلیم حقیقتوں کو نہیں مانتے وہ انبیاء برحق کو زیر کر لینے اور ان پر غالب آنے کے لئے کھلم کھلا اور چپکے چپکے ہر طرح تدبیریں کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے فیصلے کے مقابلے میں اپنی عقل نارسا کے فیصلوں کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی تدبیریں اور مکاریاں ناقص ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محکم اور قطعی۔ اُن کی کوئی سرگوشی اور خفیہ سے خفیہ حرکت اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں وہ بذاتِ خود بہت بڑا الحکیم والعلیم ہے۔ پھر اس نے اپنے غیبی کارندے بھی مقرر کر رکھے ہیں جو انسان کی ہر خاموش قوتوں کو سنتے اور ہر پوشیدہ حرکت کو دیکھتے اور چھپے ہوئے ارادوں کی ہر لہر کو جانتے ہیں اور جو کچھ یہ لوگ کہتے کرتے اور سوچتے ہیں اس کو لکھ لیتے ہیں۔ عالم ناسوت میں جو کچھ نمودار ہونے والا ہوتا ہے اس کا اوّل ترین نقش عالم ملکوت میں تیار کیا جاتا ہے اور پھر جو کچھ عالم ناسوت میں ظاہر

ہوتا ہے یا سوچا جاتا ہے اس کی بعینہٖ کاپی (جس کو اگر اصل کہا جائے تو بیجا نہیں) عالم ملکوت میں چھپ جاتی ہے سرمو فرق نہیں ہوتا، اس لیے پست سے پست، آواز اور ضعیف سے ضعیف حرکت اور پوشیدہ سے پوشیدہ ارادہ کی چھاپ کراماً کاتبین کی قدرتی کاغذ پر پڑجاتی ہے جو کبھی نہیں مٹتی۔ پس اللہ اور اعداء اللہ کے برحق پیغمبر کے برحق پیام کے خلاف خفیہ تدبیریں اور چپکے چپکے سرگوشیاں کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں وغیرہ۔

تحلیلِ اجزاء

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ابرام امر سے مراد ہے مضبوط تدبیر کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے نفرت کرنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا انہوں نے حق اور اہل حق کے خلاف کوئی کام طے کر رکھا ہے کوئی ایسی تدبیر بنا رکھی ہے کہ وہ حق پر غالب آجائیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر امر کو طے کرنے والے تو ہم ہیں ہمارا ہی حکم نافذ ہوتا ہے۔ ہماری ہی خفیہ تدبیر سب پر غالب آنے والی ہے۔ یہ قضاء و قدر میں دخیل نہیں ہوسکتے۔

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ۔ یا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کے چھپے ہوئے اور علانیہ باہمی مشوروں کو ہم نہیں سنتے ہیں۔ (بغوی) زمخشری نے کہا کہ سر سے مراد ہے دل کا پوشیدہ خیال جو دوسرے پر ظاہر نہ کیا گیا ہو اور نجویٰ سے مراد ہے سرگوشیاں اور کانوں کان مشورے۔

بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ۔ حالانکہ (ہمارے ذاتی ہمہ گیر علم کے علاوہ) ہمارے فرشتے اُن کے پاس (ہر وقت) رہتے ہیں اور (جو کچھ وہ سوچتے کہتے اور کرتے ہیں سب کو) لکھ لیتے ہیں (جو اُمیٹ رہے) یعنی ایسی صورت میں کوئی خفیہ تدبیر ہم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ بیٹا باپ کا جزء ہوتا ہے اور باپ کے نسلی اوصاف بیٹے میں منتقل ہوتے ہیں۔ پس بالفرض محال اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس میں بھی باپ کی الوہیت منتقل ہو کر آتی۔ اور اس انتقال الوہیت کا تقاضا ہوتا کہ اس کو بھی معبود قرار دیا جائے اور اس کی بھی عبادت کی جائے تاکہ باپ ناراض نہ ہوجائے لیکن اللہ تعالیٰ کی تو کوئی اولاد نہیں وہ تو آسمان و زمین کا مالک اور حاکم اور خالق ہے۔ ساری کائنات کے عرش اقتدار کا مالک ہے۔ اُسی کا حکم جاری و ساری ہے وہ تخلیق کائنات اور حکومتِ کائنات میں کسی سہارے کا محتاج نہیں پھر اس کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ لوگ جو طرح طرح سے عاہمہ کے زیر اثر اس کے ذاتی اور صفاتی احوال بیان کرتے ہیں۔ کبھی کائنات میں سے بعض مخلوق کے اندر اس کا حلول مانتے ہیں۔ کبھی صفات ثلٰثہ کے مجموعہ کو ذاتِ الوہیت قرار دیتے ہیں۔ غرض مخلوق کو کبھی خالق کا ہم پایہ بنا دیتے ہیں اور کبھی خالق کے اندر مخلوق کی خصوصی صفات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ سب خرافات ہیں اللہ تعالیٰ اس تمام خرافات سے پاک ہے۔ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ اگر رحمان کا کوئی بیٹا بیٹی ہوتا تو سب سے پہلے میں اُس کی عبادت کرتا یعنی مسیح ہو یا عزیر یا ملائکہ یا کوئی غیبی طاقت سب اس کی مخلوق ہے کوئی بھی اس کی اولاد نہیں۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ۔ اگر یہ لوگ نہیں مانتے اور تشبیہ و شرک پر اڑے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے اندر اٹکل پچو خیالات و توہمات کے گھوڑے دوڑاتے ہیں تو ان کو پرواہ نہیں کرتے وہ دانیوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو کھیل بنا رکھا ہے کہ جس طرح چاہا توڑا مروڑا گھٹایا بڑھایا) آپ ان کو کھیلنے دیجیے۔ کھیل میں لگا رہنے دیجیے۔ آخر قیامت آئے گی مقررہ سزا قیامت کے دن ان کو ملے گی۔ اگر اس دنیا میں یہ باز نہیں آتے تو قیامت کے دن اس کی سزا پائیں گے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ جب ساری کائنات کا رب اور خالق اور مالک اللہ ہی ہے اور کل جہان کا عرش اقتدار بھی وہی متمکن ہے

اور اسی کا حکم جاری ہے تو پھر آسمان ہو یا زمین بلند ہو یا پست سارے عالم بالا و زیریں میں اسی کی الوہیت ہونی چاہیئے اور ہے ۔ پورے سنسار کا معبود اسی کو ہونا چاہیئے اور وہی معبود کل ہے ۔ جب سارے جہان کی تکوین اسی کی الوہیت کو مانتی ہے اور تنہا دعوت دیتی ہے تو اگر یہ مشرک اس کی وحدت و الوہیت کو نہیں مانتے اور شرک کرتے ہیں تو اس کا کیا بگڑتا ہے آپ بھی اس کو یونہی رہنے دیجئے ۔ اس کی الوہیت اور تنہا الوہیت کو یہ بات بھی ثابت کر رہی ہے کہ وہی تمام جہان کے نظم اور تدبیر بقا سے واقف ہے اور کل مخلوق کے ذرے ذرے کا علم اس کو ہے اور رہتا ہے ۔ اسی کی حکومت آسمانوں اور زمین پر اور درمیانی فضا پر اور آسمانی و زمینی موجودات پر چلتی ہے ۔ ہر چیز اسی ملک ہے ۔ وہی سب کا مالک ہے اسی نے سب کو بنایا ہے وہی نقطۂ آغاز ہے اور مرنے کے بعد اسی کے پاس سب کو پہنچنا ہے وہی مرکز انجام ہے تو جب ابتدا و انتہا اور ان دونوں کے درمیان ہستی و بقا کا مرکز اسی کی ذات ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی حکومت و علم سے کوئی چیز خارج نہیں ۔ اور جب سب کو اسی کے پاس لوٹنا ہے تو وہی سزا جزا کا بھی مختار ہے ۔ یہی یہ بات کہ سزا جزا کب ہو گی تو اس کا ایک وقت مقرر ہے (تھوڑی تھوڑی سزا جزا اگرچہ اس دنیا میں دنیوی دکھ سکھ اور نعمت و مصیبت کی شکل میں ملتی رہتی ہوں ، مگر پورے بدلے کی ایک ساعت معین ہے ۔ جب یہ عمل گاہ حیات اور نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا) اور اس ساعت کا قطعی تعیینی علم صرف اسی کو ہے (علامات و نشانات اگرچہ اس نے اپنے پیغمبروں کی زبانی بتا دیئے ہیں ، مگر مقرر وقت کا علم اپنے لئے مخصوص رکھا ہے)

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ مشرک جو بعض پیغمبروں کی یا ملائکہ کی یا خاص خاص دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے کچھ بے وقوف تو ان کو محل الوہیت قرار دیتے تھے اور معبود حقیقی سمجھتے تھے ان کی حماقت کا اظہار تو گذشتہ آیات میں پرزور دلائل کے ساتھ کر دیا گیا ، لیکن عام طور پر مشرک معبود حقیقی تو ایک ہی خدا کو مانتے ہیں ، مگر پرستش سیکڑوں کی کرتے ہیں ۔ کچھ ان کے معبود روحانیات میں سے کچھ جسمانیات میں سے ۔ جسمانیات میں سے کچھ علویات ہیں ۔ جیسے سورج چاند ستارے اور کچھ عناصر ہیں جیسے آگ ، پانی ، مٹی اور کچھ خالص عناصر کے مرکبات ہیں جیسے پتھر ، سونا ، چاندی ، پیتل ، درخت وغیرہ ۔ اور کچھ روح و جسم کے مجموعے ہیں جیسے بعض انبیاء و اولیاء ، علویات اور سفلیات کو وہ الوہیت کا نمونہ اور مظہر اتم قرار دیتے ہیں ، اس لئے سب کی پوجا کرتے ہیں ، مگر کسی کو خدا سمجھ کر نہیں پوجتے بلکہ ان کو خوش کرنے کے لئے پوجتے ہیں تاکہ خدائی دربار میں وہ ان کی سفارش کر دیں اور خدا سے ان کا سلسلہ ملا کر مقام قرب تک پہنچا دیں ان کی تردید اس آیت میں فرما دی کہ جب تم کو تسلیم ہے کہ اللہ ہی تنہا تمہارا خالق ہے ۔ بغیر کسی کی مدد اور سہارے کے اس نے تم کو پیدا کیا تو پھر یہ بہکا ہوا طرز زندگی کیوں اختیار کرتے ہو ۔ تنہا اللہ تعالیٰ کی معبودیت سے منہ موڑ کر دوسروں کی معبودیت کی طرف اپنا رخ کیوں کرتے ہو ، اس لئے دوسروں کی پوجا کرتے ہو کہ وہ خدا سے تمہاری سفارش کر دیں گے حالانکہ ان کو سفارش کرنے کی طاقت اور شفاعت کا از خود اختیار نہیں ۔ عام طور پر تو بے جان سفلیات بسائط اور مرکبات اور بے اختیار علویات ہیں ۔ جنہیں شفاعت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے وہ کسی کی شفاعت کر ہی نہیں سکتے اور جو شفاعت کرنے کی صلاحیت اور اختیار رکھتے ہیں وہ وہی ہیں جو توحید کے قائل اور معبود کو ایک ماننے والے ہیں ۔ اور ان کو یقین ہے کہ اللہ ایک ہے ۔ اس کی معبودیت میں کوئی شریک نہیں ۔ جب خود وحدت الوہیت کے قائل ہیں اور ایک معبود پر یقین رکھتے ہیں تو پھر اپنی پوجا ہونے سے کیوں خوش ہو سکتے ہیں کیا اپنے پجاریوں سے ان کا کوئی تعلق پیدا ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ سفارش کر سکیں ۔ اگر وہ سفارش کریں گے تو وہ اہل توحید اور ایمانداروں کی کریں گے جو اللہ کی معبودیت میں کسی کو شریک نہیں بناتے مشرکوں سے ان کا کیا واسطہ ۔

وَقِيلِهِ يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ قیلہ زیر کے ساتھ مشہور قرأت ہے اس کا عطف الساعۃ پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو قیامت کا علم ہے کہ کب اور کیسے آئے گی اور اپنے رسول کے اس قول کا بھی علم

ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مطلب یہ رسول کو ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی ہوگئی اور انہوں نے کہدیا کہ یہ ایمان لانے والے نہیں۔ پس ان کو عذاب میں مبتلا ہونا ہے اور عذاب قیامت کے دن ہوگا جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کب آئے گا عنقریب ان کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ مریں گے تو قیامت کے عذاب کا نمونہ اُن کو مرتے ہی دکھ جائے گا۔

بعض نے واو کو قسمیہ اور جواب قسم کو محذوف مانا ہے۔ اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ قسم ہے رسول کے اُس قول کی کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ یقیناً یہ سرکش عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

پھر رسول کو خطاب کرکے فرماتا ہے کہ آپ اب ان سے درگذر کیجئے (ان کی ہدایت کے پیچھے نہ پڑیئے) اور ان سے کہدیجئے کہ مجھے تم سے عذر بچائے (میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ ایمان تم نہیں لاتے شرک سے میں بیزار ہوں) عنقریب ان کو شرک و معصیت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا (یعنی مرنے کے بعد ہی عذاب قیامت کا نمونہ دکھ جائے گا اور مبتلائے عذاب ہو جائیں گے)

مقصودِ بیان

اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر پوشیدہ ہے اور تدبیر اُس کی غالب رہتی ہے۔ قضا و قدر پر کسی کی مکاری اور اسکیم غالب نہیں آسکتی۔

اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ میں اللہ کے ہمہ گیر علم کی صراحت ہے۔ لفظ نَسۡمَعُ سے یا تو وہ علم مراد ہے جو بندوں کو سننے سے حاصل ہوتا ہے یعنی مسموعات کا علم۔ یا سمع کا حقیقی معنی مراد ہے جس کی حقیقت اور کیفیت مجہول ہے اور مخلوق کی سماعت کی مشابہت سے پاک ہے اول معتزلہ کا قول ہے اور دوسرا اہل سنت کا۔

وَرُسُلُنَا سے دو باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ اللہ کے کچھ غیبی فرستادے کارندے موجود ہیں جن کو رسول کہا گیا ہے۔ تو گویا جس طرح انسانوں میں رسول مقرر کیے گئے اسی طرح فرشتوں میں بھی رسول ہیں اور وہ رسول ارضی ہیں۔ دوئم یہ کہ فرشتے انسان کے سارے اعمال لکھنے پر مامور ہیں بلکہ اگر کوئی چپکے چپکے سرگوشیاں بھی کرے یہاں تک کہ اپنا راز اور ارادہ دل میں بھی چھپا کر رکھے اور کسی سے نہ کہے سب کو فرشتے لکھ لیتے ہیں

رَبِّ الۡعَرۡشِ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سارے جہان کے تخت حکومت پر متمکن ہے۔ وہی اقتدار کل کا مالک ہے۔

فَذَرۡهُمۡ سے جہاں رسول کو آئندہ تعرض نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں مشرکوں سے بیزاری کا مفہوم بھی اس سے مترشح ہو رہا ہے۔

یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا سے زیر پردہ ذات و صفات کے مسائل میں وہمی گھوڑے دوڑانے اور اپنی طرف سے اٹکل پچو ان میں دخل دینے کی ممانعت مستنبط ہو رہی ہے اور یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات ایسی چیز نہیں جو بازیچۂ اوہام ہو۔

فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی الوہیت کو سارا جہان تکوینی طور پر مانتا ہے، اُس کی معبودیت ہر جگہ تسلیم شدہ ہے پھر کیا وجہ کہ شعور و عقل رکھنے والا انسان سارے جہان کے خلاف وحدت الوہیت کو شرک سے آلودہ کرے۔

لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ الخ سے تخلیق ملکیت اور ملوکیت کو ظاہر کیا ہے۔ اس کے آغاز کا سرا اپنے ہاتھ میں رکھنے اور کائنات کی مدت حیات پر اپنا قابو دکھانے کی طرف اشارہ ہے

اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ یہ بتانا مقصود ہے کہ مآل کار مرنے کے بعد بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے پاس ہی جانا ہے۔ گویا ابتدائی اور انتہائی دونوں کنارے اُسی کے قبضہ میں ہیں اور وسطی درمیانی اُسی کے دست قدرت میں ہے۔

وَلَا یَمۡلِكُ الخ سے مشرکوں کے لئے نفی شفاعت کی صراحت ہے اور یہ بات بھی ظاہر کی گئی ہے کہ صرف سچے موحد اور

شہادت دینے والے ہی شفاعت کریں گے ۔ یعنی کوئی بت ، درخت ، پتھر، پانی ، آگ ، ستارے اور گمراہ شیطان شفاعت نہیں کرسکیں گے اور جب اہل حق ہی شفاعت کریں گے تو وہ مشرکوں کی شفاعت نہیں کرسکتے ۔

لَئِن سَالۡتَهُم سے مشرکوں کی حماقت کا اظہار کیا ہے کہ اللہ کا خالق واحد ہونا تو ان کو تسلیم ہے ، مگر معبود واحد ہونا تسلیم نہیں ۔ یہ کیسی حماقت ہے وغیرہ ۔

سُورَۃ دخان

حضرت ابن عباس اور حضرت زبیر کے اقوال میں اس سورت کو مکی کہا گیا ہے ۔ قرطبی نے یہی لکھا ہے ۔ بعض اہل روایت نے آیت انا کاشفوا العذاب قلیلا کو مکی ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے ، مگر یہ روایت کچھ زیادہ قوی نہیں ہے

اس سورت میں ۵۶ یا ۵۷ یا ۵۹ آیات ہیں ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

حٰمٓ ۚ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۙ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ○

حم قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے ہم آگاہ کرنے والے تھے

فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۙ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِيۡنَ ۚ

اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے ہم بوجہ رحمت کے جو آپ کے رب کی طرف سے ہوتی ہے

رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۙ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ

آپ کو پیغمبر بنانے والے تھے بے شک وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے جو کہ مالک ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو (مخلوق) ان

وَمَا بَيۡنَهُمَا ۘ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ○ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ؕ رَبُّكُمۡ وَ

دونوں کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم یقین لانا چاہو اس کے سوا کوئی لائق عبادت کے نہیں وہی جان ڈالتا ہے اور وہی جان نکالتا ہے وہ تمہارا پروردگار ہے

رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ○ بَلۡ هُمۡ فِىۡ شَكٍّ يَّلۡعَبُوۡنَ ○

اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا بھی پروردگار ہے بلکہ وہ شک میں ہیں کھیل میں مصروف ہیں

تفسیر ریاضی اور طبیعیات کے کچھ اولین اصول ایسے ہیں جن کی صداقت زمان و مکان کی قید سے باہر ہے ۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں دانشوروں کو ان کی صحت پر اتفاق ہے بالکل اسی طرح انسان کی روحانی اور زندگی کے کچھ واقعی اصول ہیں جن سے انسان کی دنیوی اخروی زندگی کی فلاح و بہبود وابستہ ہے اور جن کی صحت ہر زمانہ اور ہر مقام پر واجب التسلیم ہے ، لیکن ان ضوابطِ فلاح

کو دنیا کی گوشوں اور زاویوں کا استقرا کرنے کے بعد مرتب اور منظم کر کے باہر نکالنا اور انسانی سوسائٹی کے سامنے لانا کسی زمانہ میں بھی عقل بشر کے بس کی بات نہ رہی کیونکہ انسانی معاشرہ کی بہبود کامل کا تعلق علم کامل سے اور علم کامل کا حصول عقل ماندہ پا کی رسائی سے خارج ہے۔ ساری کائنات کے ذرہ ذرہ سے واقفیت اور واقفیت بھی ایسی جو زمانی و مکانی حدود سے بالاتر ہو انفرادی اور اجتماعی فکر کے بس کی بات نہیں۔ پھر مبدء و معاد اور آغاز و انجام کے ابتدائی مباحث کے غور کرنے کے راستہ میں ارسطو اور سقراط دیمقراطیس اور افلاطون کو بھی ایسی لاتعداد ٹھوکریں لگی ہیں اور جہاں کے ان فلاسفروں کی نافہم قوت فاہمہ ایسے تاریک غاروں میں ڈوبی ہے جہاں سے نجات ناممکن ہے۔ ضوابط حیات وضع کرنے اور مبدء و معاد کا علم روشن عطا کرنے کے لئے تو علام الغیوب کی روشن کتاب کی ہی ضرورت ہے جو انسانی نسل کی کوہی سلامتی کو کھول کھول کر بیان کرے اور شر کو خیر سے اور خطا کو صواب سے جدا کر کے دکھا دے۔ اللہ نے گم کردہ راہ اور گمراہ انسان کی ہدایت کے لئے جو جہالت کی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا تھا ہمیشہ صحیفے اور کتابیں اپنے اُن بندوں پر نازل کیں جن کا علم ہر غلطی سے پاک اور جن پر معارف وہبیہ کا فیضان ہر کسب عقلی کی آلائش سے منزہ تھا۔ اُن مقدس کتابوں میں سے ایک روشن اور روشنی بخش کتاب اللہ نے نازل کی جس کا نام قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کا نزول بارگاہ قدس سے عالم ملکوت میں ایک مبارک قدر والی رات میں ہوا وہ رات تاریک رات تھی، مادیت کی رات جس پر آفتاب یا زمین کے چکر کا کوئی اثر نہ تھا۔ آفتاب ماہتاب کا غروب و طلوع اس رات کے پیدا ہونے کا سبب نہ تھے سا ایسی رات تو زمین پر رہنے والوں کی رات ہوتی ہے ملکوتی دنیا میں ایسی رات نہیں ہوتی۔ وہ رات تو ملکوتی رات تھی۔ گو ساکنان ارضی کے لحاظ سے ہم اس کو آفتابی یا مہتابی رات کہہ سکتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ رات مادیت کی تھی اور مادیت بھی فلسفی اصلاح والوں کی نہیں بلکہ ملکوتی مادیت جس پر گردش لیل و نہار اثر انداز نہیں۔

غرض ایک قدر والی رات میں ایک پُرحکمت کتاب نازل ہوئی جس کے اندر اندازۂ الٰہی کے مطابق انسان کے فکری و عملی تمام نجات بخش و ہلاکت ریز ضوابط کو جدا جدا امتیازی شکل میں بیان کر دیا گیا تھا۔ انسانی بہبود و نامرادی سے تعلق رکھنے والا کوئی علمی و عملی ضابطہ ایسا نہ تھا جو چھانٹ کر الگ نہ بیان کر دیا گیا ہو اور کوئی پُرحکمت کلیہ ایسا نہ تھا جس کو بچا کر رکھا گیا ہو اور یہ سب کچھ اللہ رحمت و ربوبیت کے نتیجہ میں ہوا ورنہ سرکش نافرمان باغی انسان کو کب حق پہنچتا تھا کہ اس کی ہدایت و بہبود کے لئے اللہ اپنی کتاب نازل فرمائے، مگر وہ چونکہ انسانی ضرورتوں کی آواز کو سُنتا اور بشری مصالح و مفاسد کو جانتا ہے۔ وہی بلند و پست اور خلا و ملا کا خالق مالک مدبر اور حکم ہے اُسی کا حکم سارے جہان میں رواں ہے اور اسی کے قبضہ میں افراد و اقوام اور بلاد و قری کی موت و حیات ہے اور وہی موجودہ اور گزشتہ سارے انسانوں کا رب ہے، اس لئے اس نے اپنی رحمت سے کتاب مبارک نازل کی تاکہ لوگ خبردار اور ہوشیار ہو جائیں اور اس کی دی ہوئی ہدایت کی مخالفت سے ڈریں۔

تحلیل اجزاء

حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ قسم ہے کتاب مبین کی مبین روشن اور کھول کر بیان کرنے والی۔ قرآن مجید میں دونوں اوصاف ہیں۔ خود سراسر نور ہے، اس لئے اس کو نور بھی کہا گیا اور انسانی زندگی کو درست کرنے والے دنیوی و دینی ضوابط بھی بیان کرنے والا ہے۔ اس کی تعلیم میں فلاح دارین مضمر ہے۔ ذات، صفات، مبدء و معاد اور عالم مجردات و نبوات کے اُن مباحث کو اس نے نہایت صاف بیان کیا ہے جو بڑے بڑے فلاسفروں کی عقل کی نارسائی سے ماوراء تھے، اس میں اخلاقیات مدنیات سیاسیات غرض تمام شخصی اور اجتماعی کلیات و قوانین کی تعلیم کامل بغیر کسی ژولیدگی کے اس طرح دی گئی ہے کہ ہدایت کا ضلالت سے اور اچھائی کا برائی سے اور تعمیر کا تخریب سے کامل امتیاز ہو جاتا ہے۔

کتاب بمعنی مکتوب ہے یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی یا آئندہ اوراق میں لکھی جانے والی۔ یا کتاب کا معنی ہے مثبت اور مفروض یعنی قوانین و ضوابط کا وہ مجموعہ جس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اللہ کی طرف سے فرض کر دیا گیا ہے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ہم نے ہی کتاب نازل کی یعنی عالم لاہوت سے عالم ملکوت میں اتاری یا لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارہ یا پردۂ وجوب و قدم سے دائرۂ امکان کی طرف بھیجا۔ اور اپنے بندہ کے دل پر کسی خاص فرشتے کے ذریعہ بلاواسطہ مجموعۂ معانی مرتب عربی عبارت کے اندر القا کیا۔ نہ اس میں جن وانس اور فرشتے کی ذہنی اختراع اور ساخت پرداخت کو دخل ہے نہ توثِ واہمہ اور شیطانی آمیزش کی وہاں تک رسائی ہے۔ برکت والی رات سے مراد عکرمہ اور ایک جماعت علماء کے نزدیک شعبان کی پندرھویں شب ہے۔ نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں باب صوم التطوع کے اندر اس تفسیر کو غلط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اس قول کی تغلیط کی ہے اور صراحت کی ہے کہ جو شخص شب قدر نصف شعبان کی رات کو قرار دیتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ بہ نص قرآن لیلۃ القدر رمضان ہی میں ہے یعنی شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن میں ماہِ رمضان میں نزول قرآن کی صراحت کی گئی ہے اور اِنّا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ میں لیلۂ مبارکہ میں نزول قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لیلۂ مبارکہ یعنی شب قدر جس میں قرآن نازل ہوا رمضان ہی میں ہے شیخ ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شعبان سے دو شعبان تک کے کل امور کے فیصلے نصف شعبان کی رات کو کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جس شخص کا نام مُردوں کی فہرست میں داخل ہو چکتا ہے اس کا نکاح بھی ہوتا ہے اور اس کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے جو نصوص کے مقابل لائے جانے کے قابل نہیں۔ کذا فی المواہب۔

حسن، مجاہد اور قتادہ نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ سال بھر کے تمام امور رزق، پیدائش، موت وغیرہ کا فیصلہ شب قدر میں کر دیا جاتا ہے، لیکن شب قدر کو نصف شعبان والی رات ان بزرگوں نے نہیں قرار دیا۔ شب قدر کی تعیین کے متعلق مختلف اقوال و روایات ہم سورت قدر میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اکثر اہل تفسیر کے نزدیک لیلۂ مبارکہ سے شب قدر ہی ہے اور شب قدر رمضان میں ہی ہوتی ہے یا کم از کم جس شب قدر میں قرآن مجید نازل ہوا وہ رمضان میں ہی تھی اور غالباً وہ ۲۷ ستائیسویں تاریخ تھی۔ تمام قرآن مجید لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر شب قدر میں نازل ہوا اور ۲۳ تیئیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا آسمان دنیا سے اترتا رہا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ سورۂ اقرء شوال میں نازل ہوئی اور بالاتفاق علماء سورۂ اقرء کی اول چند آیات کا نزول سب سے اوّل ہوا۔ اس روایت کی صحت کی تقدیر پر یہ تاویل کی جائے گی کہ آغاز نزول تو شب رمضان ہی میں ہوا لیکن حضور نے لوگوں پر اس کا اظہار ماہِ شوال کے شروع میں کیا۔ شیخ ابن جریر نے اسی کی صراحت کی ہے۔

نزول کے وقت کو شب مبارک کے لفظ سے تعبیر کرنا ساکنانِ مکہ کے لحاظ سے ہے۔ بھیجنے والے کے نزدیک اور جہاں سے قرآن بھیجا گیا اُس مقام پر تو ہماری نہ رات ہے نہ دن۔ نہ آیت میں وقت ارسال یا آن روانگی کی طرف کوئی اشارہ کیا بلکہ نزول کا وقت بتایا ہے اور حقیقتاً مکہ میں رات ہی کا وقت تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی زمین پر دوسری جگہ دن کا وقت ہو۔

اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ یعنی قرآن بھیجنے اور ضوابط حیات کا مجموعہ نازل کرنے سے ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں بلکہ لوگوں کو ہوشیار کرنا اور اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا اور اس کو نہ مانے گا وہ دنیا میں تباہ اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوگا۔

فِیۡهَا یُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِیۡمٍۙ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا امر حکیم یعنی ایسا امر جو محکم ہوتا ہے جس میں تغیر تبدل نہیں ہو سکتا یا ہر حکمت اور مصلحت آگیں امر یعنی جس میں نظم کائنات کی درستی ہوتی ہے اگر وہ پر حکمت امر نہ ہو تو نظام عالم میں تباہی یا خرابی پیدا ہو جائے۔

فیہا کی ضمیر لیلۃ مبارکۃ کی طرف راجع ہے اور یفرق کا ترجمہ عموماً اہل تفسیر نے تقسیم کیا جانا، ہر کام کا بانٹا جانا، جدا جدا کیا جانا ہی کیا ہے یعنی اس مبارک رات میں سال بھر کے اندر حادث ہونے والے تمام امور کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ پیدائش، موت، رزق، اولاد اور دوسرے تمام امور طے کر دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت میں طے تو ازل ہی میں کر دیے گئے ہیں، مگر وہ

فیصلہ اور قضاء مبرم تو صرف اللہ کے علم ہی سے اور لوح محفوظ میں ثبت ہے۔ شب قدر میں آئندہ سال ہونے والے واقعات کے متعلق فرشتوں کو ہدایت دی جاتی ہے اور ہر ایک کی ڈیوٹی مقرر کر دی جاتی ہے کہ یہ کام فلاں ساعت فلاں منٹ میں فلاں مقام پر کرنا ہے، لیکن اس فقیر کی نظر میں سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یفرق سے ایک واقعہ کی حکایت کرنا مقصود ہے یعنی نزول قرآن کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن مجید کے اندر ہر خیر و شر اور صحیح غلط کو الگ الگ کر کے بیان کر دیا گیا ہے اور قرآن کے اندر بیان کیا ہوا ہر امر پُر حکمت بھی ہے اور قطعی بھی جس کی افادیت پر نہ مرورِ زمانہ اثر انداز ہوتا ہے نہ تغیر مکانی اس صورت میں امر حکیم سے مراد ہوں گے وہ تمام امور اور ضوابط اور تعلیمات و ہدایات جو قرآن کے اندر موجود ہیں اور ترجمہ اس طرح ہوگا کہ مبارک رات میں ہم نے قرآن نازل کیا اُس رات میں انسانوں کے متعلق تمام ضوابط و قوانین طے کئے جا رہے تھے اور نافع مضر اچھے برے اور حلال حرام میں تفریق کی جا رہی تھی گویا قرآن کا نزول ہی اوامر و نواہی اور خیر و شر کی تفصیل و تفریق تھی واللہ اعلم۔ اسی ترجمہ کی روشنی میں ان آیات سے متعلق ابتدائی تمہید اس فقیر نے قالم کی ہے۔

إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ بلاشبہ ہم ہی بھیجنے والے ہیں۔ انسان کے دل میں القاء دو طرح سے ہوتا ہے۔ القاء رحمانی اور القاء شیطانی اول القاء ملکوتی اور خالص وہبی ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے قلب پر بغیر عمل ذہنی اور فکر ترتیبی کے ہوتا ہے اور صرف انبیاء و اولیاء کو ہوتا ہے۔ دوسرا القاء عمل ذہنی اور دخل واہمہ یا وسوسہ شیطانی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے آیت میں فرمایا کہ بلاشبہ قرآن کو بھیجنے والے ہم ہی ہیں۔

رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ یعنی قرآن مجید نازل فرمانا اللہ کی رحمت کے زیر اثر ہے۔ اللہ نے دیکھنے سننے سونگھنے چھونے چکھنے کے لئے بیرونی آلات عطا فرما دیئے ہیں۔ جزئیات کا علم حاصل کرنے کے لئے دماغ میں مختلف طاقتیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ ترتیب و ترکیب جزئیات کے بعد نتیجہ اخذ کرنے کے لئے قوت فکر بھی عطا کر دی ہے۔ غرض عقل اور اس کی خادم قوتیں اچھے برے کو پہچاننے اور جاننے کے لئے مرحمت کر دی ہیں۔ ایسی حالت میں کسی شخص کا خدا پر حق نہیں رہتا کہ وہ پیغمبروں کو بھیجتا اور اپنے احکام ان پر نازل فرماتا۔ اب جو قرآن مجید اس نے نازل فرمایا وہ محض اس کی رحمت کا تقاضا تھا۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ کتاب نازل کرنے اور احکام بھیجنے کا اُسی کو حق اس لئے ہے کہ وہی (انسان کی فردی اور جماعتی ضرورتوں کی خاموش آواز کو) سننے والا اور (بشری مفاسد و مصالح کو کامل طور پر) جاننے والا ہے۔ مخلوق میں کوئی ہستی ضرورتِ بشری کی خاموش آواز کو سننے والی اور ماضی و مستقبل کے تمام مصالح و مفاسد کو جاننے والی نہیں ہے۔

رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا۔ وہ تمام کائنات پست و بلند کا خالق مالک اور ناظم مقتدر ہے۔ اسی کا حکم سارے جہان میں جاری ہے۔ پس ہر چیز کو تکوینی طور پر درجۂ کمال تک پہنچانا جب اسی کا کام ہے تو تشریعی طور پر انسان کی فلاح کے لئے قوانین بنانے کا بھی اسی کو حق ہے۔

إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ (اے اہل مکہ یا اے انسانو) اگر تم یقین رکھنے والے ہو تو اس کا یقین رکھو (اور یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص فطری طور پر قوت یقین تو رکھتا ہے لہٰذا اللہ کے کلام پر ایمان لانا ہر ایک کا فرض ہے)۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ۔ اُس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں کیونکہ

يُحْيِي وَيُمِيتُ۔ وہی (افراد و اقوام کو) زندہ کرتا اور موت دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے اُسی کو معبودیت کا استحقاق ہے یعنی جس نے زندگی عنایت کی اور جب چاہے زندگی لے لے اور لے لیتا ہے تو پھر انسان کو اپنی زندگی صرف اسی کی عبادت میں لگانا چاہیئے۔ زندگی دی ہوئی خدا کی اور لگائی جائے کسی دوسرے کی عبودیت و عبادت میں۔ یہ باطل ہے

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ۔ وہی تمہارا اور تمہارے اسلاف کا رب اور خالق ہے مالک اور حاکم ہے (اور ظاہر

ہے کہ جو حیات بخش مالک جان وجسم اور آمر و متصرف ہے اسی کو معبود ہونے کا حق ہے)

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۔ مگر مشرکوں کے پاس شرک وکفر کی کوئی دلیل نہیں بلکہ محض شک میں پڑے لہو ولعب میں مبتلا ہیں یعنی عقیدہ میں غیر یقینیت ہے اور اطوار وگفتار حقیقت سے خالی ہے۔

مقصودِ بیان اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ کے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ قرآن عبارت اور معنی کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ مجموعہ ہی اللہ نے اتارا ہے۔ کیونکہ ہٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب صرف معانی کا نام نہیں ہوتا الفاظ کو بھی کتاب کے کتاب ہونے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو معانی کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ اور الفاظ و عبارت کو رسول اللہ ﷺ کی ساختہ قرار دیتے ہیں۔

فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی متبرک واقعہ کی وجہ سے تو کسی مکان و زمان میں خصوصی برکت پیدا ہو جاتی ہی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات کو فی نفسہٖ بھی اللہ نے دوسرے اوقات پر افضلیت و برکت عطا فرمائی ہے۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ماہ رمضان اور عشرہ محرم اور ایام حج اور بعض دوسرے ایام کا متبرک ہونا اور ان کو متبرک ماننا خلافِ شرع نہیں ہے۔ اَمْرٍ حَكِيْمٍ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کا ہر امر پُر حکمت اور مبنی بر مصلحت اور نظام کائنات کو چلانے اور قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ پورا قرآن خدا کا بھیجا ہوا ہے وہی اس کو بھیجنے والا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں انسان یا فرشتہ کی طرف سے کی ہوئی کوئی زیادتی نہیں ہے۔ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ میں صراحت ہے کہ قرآن رحمتِ پروردگار کا نتیجہ ہے یعنی اللہ پر کسی کا حق نہیں تھا کہ اُس کی ہدایت کے لئے اللہ اپنی کتاب نازل فرماتا۔ باقی آیات میں ربوبیت عامہ اور ربوبیت انسانیہ اور مالک موت و حیات ہونے کا اظہار کیا گیا اور اس سب کی غرض توحید الوہیت کا اثبات ہے۔ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ سے کافروں کے علم وعمل کا رد مقصود ہے۔ جس سے در پردہ یہ تعلیم بھی مستفاد ہوتی ہے کہ علم نام ایمان و یقین کا ہے اسی کو حاصل کرنا ضروری ہے اور اعمال زندگی لہو ولعب نہیں اور حقیقت سے خالی نہ ہونا چاہیئے وغیرہ

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

سو آپ (ان کیلئے) اُس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو اُن سب لوگوں پر عام ہو جائے یہ بھی ایک دردناک سزا ہے اے ہمارے

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ

رب ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آئیں گے ان کو (اس سے) کب نصیحت ہوتی ہے حالانکہ (اس کے قبل) اُن کے پاس ظاہر شان کا پیغمبر

رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ

آیا پھر بھی لوگ اس سے اور یہی کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھایا ہوا ہے دیوانہ ہے ہم چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے تم پھر اپنی اسی حالت

قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝

پر آ جاؤ گے۔ جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے (اُس روز) ہم (پورا) بدلہ لے لیں گے۔

تفسیر انکارِ حق اور عملی سرکشی اور علمی و عملی بغاوت کی وجہ سے جب اللہ کی طرف سے بطور تنبیہ کوئی مصیبت آتی ہے اور اُس سے

نجات ممکن نہیں ہوتی تو بڑے بڑے مشرک مجبوراً اللہ ہی کی طرف لوٹتے اور تمام نفسانی معبودوں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ لیکن جب اللہ اس مصیبت کو دفع کر دیتا ہے تو نافرمان پھر شرک و معصیت کی طرف لوٹ پڑتا ہے اور رسولِ برحق کی بھی پرواہ نہیں کرتا بلکہ وہ رسول جس کی نافرمانی کی وجہ سے سابق مصیبت میں پھنسا تھا اُس کو بجائے رسولِ خدا کہنے اور پیغمبر صادق ماننے کے سرپھرا، دیوانہ اور دوسرال کا سکھایا پڑھایا سازشی قرار دینے لگتا ہے اور نہیں جانتا کہ جو مصیبت ٹل گئی وہ ہلاک کرنے کے لئے آئی ہی نہ تھی اُس کا مقصود صرف تنبیہ کرنی اور اتباعِ حق پر آمادہ کرنا تھا۔ آئندہ واقعی ہلاکت آفریں مصیبت آئے گی جس سے مفر نا ممکن ہوگا اور حقیقت میں بدبختی اور بداندیشی کا انتقام ہوگا۔ مکّہ کے کافروں کو بیدار کرنے کے لئے جب ہفت سالہ قحط میں اللہ نے مبتلا کر دیا تو لگے رسول اللہ کے سامنے عجز و زاری کرنے اور رشتہ داری کا واسطہ دلانے اور مصیبت کے دفع ہونے کے بعد ایمان لانے کا وعدہ کرنے، لیکن پیٹ میں روٹی پڑی اور فاقوں کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے جو دھواں سا آنے لگا تھا جب دفع ہو گیا تو مکر گئے اور سابق سرکشی پر اتر آئے اور ہادیٔ برحق کو کسی عجمی غلام یا کسی جن کا سکھایا پڑھایا بلکہ دیوانہ سرپھرا کہنے لگے۔ آخر بدر کی لڑائی میں ایسی مصیبت پڑی کہ ساری نخوت دھری رہ گئی۔ کافروں کے بڑے بڑے قتل مارے بھی گئے اور گرفتار بھی ہوئے۔ یہ تھا اللہ کا قطعی انتقام اور ہلاکت ریز سزا۔

تحلیلِ اجزاء فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ يَغْشَى النَّاسَ هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ اوپر کی آیت میں تھا کہ یہ لوگ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں یعنی ان کو اللہ کی توحید، پیغمبر کی حقانیت اور قرآن کی صداقت کا یقین ہی نہیں آتا اور زندگی کو انہوں نے بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے کہ اس کے اعمال واقعہ کی کوئی بازپرس ہی ان کے نزدیک نہیں ہوگی۔ اب فرماتا ہے جب یہ بات ہے تو آپ ان پر عذابِ الیم آنے کا انتظار کیجئے۔ وہ زمانہ آنے والا ہے کہ آسمان سے ایک دھواں نمودار ہوگا اور ان لوگوں پر چھا جائے گا اس سے نجات پانے کے لئے لوگ درخواست کریں گے اور کہیں گے:

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ اے ہمارے مالک اس عذاب کو ہم سے دور کر دے ہم ایمان لاتے ہیں، لیکن أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ اب ان کو نصیحت کہاں ہو سکتی ہے یہ کہاں سمجھتے ہیں۔ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ .... حالانکہ ان کے پاس ہمارا رسول آ گیا جو (فرماں برداری اور نافرمانی کے نتائج) کھول کھول کر بیان کرتا ہے مگر یہ نہیں مانتے اس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں تجھے کسی نے سکھا دیا ہے دوسروں کے سکھانے میں آ گیا ہے تیرا تو دماغ چل گیا ہے (یا کسی جن کے اثر سے ماؤف ہو گیا ہے)

إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ۔ اچھا ہم کچھ مدت کے لئے عذاب ہٹا دیں گے، مگر تم پھر وہی سابق سرکشی کرو گے۔ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ آخر ایک روز ہم سخت پکڑ کریں گے اس روز نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری ان سرکشیوں کی ضرور سزا دیں گے۔

ان آیات میں ایک واقعہ کے متعلق پیشین گوئی ہے۔ وہ حادثہ کون سا ہے اس کی تعیین میں صحابہ ہی کے اقوال مختلف آئے ہیں۔ عام اہلِ تفسیر نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کی بددعا سے مکّہ میں ہفت سالہ قحط پڑا۔ لوگ ہڈیاں اور مردار کا چمڑا تک کھا گئے۔ آدمی آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو ضعفِ نگاہ کی وجہ سے اس کو آسمان پر دھواں سا نظر آتا تھا۔ جب تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی تو ابوسفیان نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور آپ کی قوم بھوک کی وجہ سے مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ بلا دفع ہو۔ آپ نے دعا کی اور وہ بلا ٹل گئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا قوی قول یہی ہے مقاتل، مجاہد، فراء اور زجاج نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی یہی فرمایا تھا بلکہ آپ نے تو یہاں تک فرمایا تھا کہ جو شخص اس دخان کے علاوہ جو انتہائی بھوک کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی شکل میں محسوس ہوتا تھا۔ دخان سے مراد کوئی اور

دخان لینا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ اس صورت میں البطشۃ الکبریٰ سے مراد بدر کی جنگ ہوگی۔ گویا مراد یہ ہے کہ اوّل قحط کا عذاب آئے گا پھر وہ ٹل جائے گا تو بدر میں تباہی ہوگی اور بدر کا عذاب نہیں ٹلے گا۔ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو یہ اُس وقت کا واقعہ ہوگا جب حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تھے اور ابو سفیان نے مدینہ پہنچ کر دعا کی درخواست کی تھی اور یہ اُسی وقت تسلیم کرنا ممکن ہے جب آیت إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ الخ کو مدنی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے اور فارتقب کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ ابو سفیان کے آنے بلکہ قحط پڑنے سے بھی پہلے اس آیت کا نزول ہوا ہے۔ ہی تو انتظار کا حکم دیا۔ ایسی حالت میں یہ آیت مدنی کیسے ہو سکتی ہے۔ پوری سورت کی طرح اس کا بھی مکی ہونا ضروری ہے۔ حاصل یہ کہ اگر دخان سے مراد ہفت سالہ کال ہے اور بر قول امام رازی (فی الکبیر) کسی ہولناک واقعہ کو دخان سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ تو اس تفسیری مراد اور لفظ فارتقب میں تعارض ہوگا جس کو دور کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ ابو سفیان کی حاضری کو مکہ کی سکونت ہی کے زمانے کا واقعہ قرار دیا جائے اور واقعہ بدر سے کم سے کم سات سال پہلے آغاز قحط قرار دیا جائے یعنی بعثت سے چند سال بعد ہی یہ پیشین گوئی کی گئی کہ سخت کال پڑے گا اور وہ کال پڑا۔ پھر حضورؐ کی دعا سے کال دفع ہوا اور پھر جنگ بدر ہوئی جس میں کافروں کے سردار مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ آیات اور واقعات میں یہ خواہ مخواہ کی توڑ مروڑ کرنی پڑے گی پھر بھی آیت کو مدنی نہیں کہا جا سکتا بلکہ مکی ہونا لازم ہے پیشین گوئی کا یہی تقاضا ہے۔ دوسرا قول جو حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت زید بن علی اور حسن بصری کا ہے اور حضرت ابن عباس کا بھی دوسری روایت میں قول آیا ہے کہ دخان سے مراد ہے وہ دھواں جو آخر زمانہ میں نمودار ہوگا اور قرب قیامت کا نشان ہوگا۔ آسمان سے زمین تک سارے جہان پر چھا جائے گا۔ مومن پر تو اس دھوئیں کا اثر بس ایک زکام کی طرح ہوگا (جیسے ناک کے اندر کچھ کھجلی ہو جاتی ہے) اور کافر اس کے اثر سے نیم مدہوشی کی حالت میں ہو جائے گا۔ دھواں اُس کے پیٹ میں بھر کر ناک کان اور منہ سے خارج ہوتا رہے گا۔ کل زمین اس گھر کی طرح ہو جائے گی جس کے اندر آگ دھونکی گئی ہو اور سارے گھر میں دھواں بھر گیا ہو۔ یہ کیفیت چالیس روز تک رہے گی۔ اس قول پر آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ کلام میں کوئی تعارض نہیں اور آیت کے مکی ہونے سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں البتہ البطشۃ الکبریٰ سے روز قیامت مراد لینا ہوگا۔ بدر کی جنگ مراد نہ ہوگی۔

تیسرا قول عبدالرحمٰن بن اعرج کا ہے۔ فتح کے دن مسلمانوں کا لشکر جب مکہ میں داخل ہوا تو ان کے قدموں سے اتنا غبار اٹھا کہ فضا میں چھا گیا۔ آسمان نظر نہ آتا تھا اسی کو دخان فرمایا۔ یہ قول پوری آیت کے سیاق سباق کے خلاف اور بالکل غلط ہے واللہ اعلم۔

مقصود بیان

پوری آیات میں دو پیشین گوئیاں ہیں ایک عذاب دخان کی جو ایمان لانے یا وعدۂ ایمان پر دفع ہو جائے گا۔ دوسرا البطش الکبریٰ جس کے بعد رہائی ممکن نہ ہوگی۔ اس بیان سے یہ امر مستنبط ہوا کہ سرکشی اور نافرمانی کی سزا ضرور ملتی ہے۔ غیبی ہولناک حوادث جن سے مخلوق پر کچھ نہ کچھ تباہی آتی ہے، سرکشوں کو تنبیہ کرنے اور نافرمانوں کو ہوشیار کرنے کے لئے آتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح لوگ توبہ کر لیں اور راہِ راست پر آ جائیں۔ واقعات کی ہولناکی بڑے بڑے سرکشوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے اور وقتی طور پر وہ بھی اپنے لاتعداد معبودوں اور فرضی مددگاروں کو چھوڑ کر معبود حقیقی کو پکارنے لگتے ہیں۔ اور اللہ با وجود یکہ ان کی بے ایمانی اور طینت کی بدی سے واقف ہوتا ہے۔ پھر بھی رحم کرتا اور تنبیہ عذاب کو دفع کر دیتا ہے، لیکن مصیبت دور ہوتے ہی جب بدکار اپنی سابق نافرمانیوں پر آ جاتے ہیں اور کوئی تنبیہی سزا مفید نہیں ہوتی تو اللہ کا ارادۂ انتقام حرکت میں آ جاتا ہے اور ایسا عذاب آتا ہے کہ اُس سے نجات ناممکن ہوتی ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے عموماً سارے عالم کے مسلمانوں کو اور خصوصاً ہندوستان کے مدعیانِ اسلام کو اور ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حکومتوں کی جبرہ دستیاں ابنائے وطن کی ستم رانیاں، سیلابوں کی تباہ کاریاں، خشک سالیوں کی بربادیاں اور پیہم امراض و افلاس کی ایذا رسانیاں اللہ کی نافرمانی کے نتائج ہیں اور ان کا علاج سوا سچی توبہ اور پابندی شریعت کے اور کچھ نہیں۔ ورنہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ سخت تاراج ہو جائے گا اور صفحۂ ہستی سے نام

بھی مٹا دیا جائے گا وغیرہ۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ

اور ہم نے　ان سے پہلے قوم فرعون کو　آزمایا تھا　اور (وہ آزمائش یہ تھی) کہ اُن کے پاس ایک معزز پیغمبر آئے تھے کہ اللہ کے بندوں (یعنی بنی

عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ

اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو میں تمہاری طرف (خدا کا) فرستادہ (ہو کر آیا) ہوں دیانتدار ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ تم خدا سے سرکشی مت کرو میں تمہارے سامنے ایک واضح

مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ

دلیل (اپنی نبوت کی) پیش کرتا ہوں اور میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم لوگ مجھ کو پتھر (یا غیر پتھر) سے قتل کرو اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ

مجھ سے الگ ہی رہو تب موسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں تو اب میرے بندوں کو تم رات ہی رات میں لیکر چلے جاؤ تم لوگوں کا تعاقب ہوگا اور تم اس

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ

دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا ان کا سارا لشکر ڈبو دیا جائیگا وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے (یعنی نہریں) اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات　اور آرام کے سامان

كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ

جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے (یہ قصہ) اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا مالک بنا دیا تو ان پر آسمان و زمین کو رونا آیا　اور

وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

نہ اُن کو　مہلت دی گئی　اور ہم نے　بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب یعنی فرعون کے ظلم و ستم سے　نجات دی　واقعی وہ بڑا سرکش (اور) حد عبودیت

عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ۝

سے نکل جانے والوں میں سے تھا اور (اسکے علاوہ) ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رو سے (بعض امور میں تمام) دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے انکو ایسی نشانیاں دیں جنمیں صریح انعام تھا

تفسیر　اللہ تعالیٰ کا ضابطہ رہا ہے کہ جس کسی ملک میں کفر و ظلم کی طاقتیں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ کفر ایمان کے اور ظلم قانون عدل کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے اور ان ظالموں اور حق فراموشوں سے اس زمین کی تطہیر ضروری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر ان کے پاس بھیجتا ہے۔ معزز پیغمبر جا کر ان کو ہدایت کرتا ہے۔ جب لوگ کسی طرح ہدایت کو قبول نہیں کرتے تو پیغمبر کہتا ہے کہ تم اگر نہیں مانتے تو نہ مانو۔ مگر ایمان لانے والوں کو تو ایذا مت دو۔ ان کو میرے پاس آنے جانے دو اور میری حمایت سے مت روکو۔ کم سے کم ان کو اس ملک سے ہی ہجرت کر جانے دو۔ کفر کے معزز و علمبردار جب اس درخواست کو بھی ٹھکرا دیتے اور

پیغمبر کو قتل کر دینے کے درپے ہو جاتے ہیں تو پیغمبر اُن سے کہتا ہے کہ تم میرے قتل کے درپے کیوں ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میرا راستہ الگ تمہارا الگ۔ مجھ سے الگ ہی رہو۔ میرے کام میں روڑے نہ اٹکاؤ۔ سرکش ظالم جب یہ بات بھی نہیں مانتے تو پیغمبر اُن کے لئے بد دعا کرتا ہے جس پر اللہ حکم دے دیتا ہے کہ تم اہل حق کو لے کر اس ناپاک ملک سے باہر چلے جاؤ۔ ہم اس کو غارت کر دیں گے۔ پیغمبر حکم کی تعمیل میں وطن اور گھر بار چھوڑ کر اہل ایمان کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ کافر پیچھا کرتے ہیں۔ تعاقب میں دوڑتے ہیں آخر ناکام ہوتے ہیں۔ اُس وقت اللہ یک دم اُن کو تباہ کر دیتا ہے۔ زمین ان کے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی ہے اور ان کے سرسبز باغات، لہلہاتی کھیتیاں، اُونچی عمارتیں، شاندار محلات، رواں دریا اور سامان بے پروریٔ زیبائش مقامات اہل حق کو دے دیئے جاتے ہیں مگر یہ عطیۂ گرامی بھی بطور آزمائش کے ہوتا ہے۔ پہلے دُکھ سے آزمائش تھی اب سکھ دے کر امتحان لیا جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت فرعون و موسیٰ کی ہوئی، قبطیوں اور اسرائیلیوں کا یہی معاملہ ہوا۔ حضرت موسیٰ نے نصیحت کی، فرعون انتہائی سرکش تھا اُس نے نہ مانا۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو محفوظ رہنے کی درخواست کی فرعون نے اس درخواست کو بھی ٹھکرا دیا اور آپ کے قتل کے درپے ہو گیا، آپ نے پھر فرمایا میرے قتل کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر ایمان نہیں لاتے تو نہ لاؤ۔ مجھ سے الگ رہو۔ تمہارا راستہ الگ میرا الگ۔ فرعون اور فرعونیوں نے یہ بات بھی نہ مانی۔ آخر حضرت نے بد دعا کی حکم ہوا اس سرزمین سے چلے جاؤ وطن کو چھوڑ دو۔ میرے حق پرست بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ یہ لوگ تمہارا پیچھا کریں گے۔ تم کو دریا خشک ملے گا تم نکل جانا پیچھے سے یہ کافر پہنچیں گے دریا خشک پائیں گے۔ اندر گھس پڑیں گے فوراً سب کو غرق کر دیا جائے گا۔ یہ حکم دیا گیا ہے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر نکل گئے۔ دریا خشک پا کر گزر گئے۔ پیچھے فرعون قبطیوں سمیت آیا۔ دریا خشک دیکھ کر گھس پڑا۔ پانی کی ایک لہر آئی سب ڈوب گئے۔ ساری سرسبز کھیتیاں شاداب باغ، اُچھلتے چشمے، رواں دریا، سرفلک کوٹھیاں، اونچے محلات اور ہر عمدہ آسائش بخش مقام چھوڑ گئے۔ اللہ نے اسی طرح کل نعمتوں کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا، فرعونیوں کا بیج مار گیا جو قبطی بچے وہ ذلت کی حالت میں رہے اور بنی اسرائیل کو بھی اللہ نے جو دولت، عزت، راحت اور حکومت شام میں عطا فرمائی وہ بھی آزمائشی تھی کہ کون شکر کرتا اور کون فرماں برداری کرتا ہے، کون ناشکر اور نافرمان بن جاتا ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات بھی حضرت موسیٰ ؑ کے احوال کی طرح ہوئے۔ اسی لئے اس جگہ یہ قصہ نقل کیا ہے فرق صرف زمان مکان قوم اور طریق عذاب کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی شروع میں مکہ والوں کو توحید کا پیغام سنایا۔ جب نہ مانے تو فرمایا کہ ماننے والوں کو تو نہ ستاؤ۔ اہل حق کو میرے پاس آنے سے نہ روکو۔ قریش نے یہ بات بھی نہ مانی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا تو اپنے راستہ پر تم چلتے رہو۔ میرے کام میں رکاوٹ نہ ڈالو۔ قریش نے یہ بات بھی تسلیم نہ کی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ آخر مسلمانوں کو ہجرت کا حکم ہو گیا۔ کچھ لوگ چھپ کر حبش کو چلے گئے۔ اور کچھ مدینہ کو اور حضورؐ کو بھی بہ نفس نفیس ترک وطن کا حکم دے دیا گیا۔ حسب الحکم آپ نے بھی ایک رات کو گھر بار اور وطن چھوڑ دیا۔ کافروں نے پیچھا کیا، لیکن ناکام رہے حضور مدینے میں پہنچ گئے وہاں بھی کافروں نے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ سازشوں کے جال بچھا دیئے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے بدر میں اُن کی کمر توڑ دی اور فتح مکہ کے بعد اُن کی ہستی کو مٹا دیا اور چند ہی روز میں جزیرۂ عرب سے ان کی تطہیر ہو گئی اور بطور آزمائش پورا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور جس طرح بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں آ کر نہیں بسے اسی طرح مہاجر مسلمانوں نے بھی مکہ کی سکونت دوبارہ اختیار نہیں کی۔ اہل مکہ کو سبق دینے اور عبرت دلانے اور ڈرانے کے لئے اس جگہ حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

تحلیل اجزاء

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ۔ حق و باطل کا مقابلہ اور حق کی فتح تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور بکثرت پیغمبروں کے واقعات اس کے شاہد ہیں، لیکن سب سے آخر واقعہ جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مشرکین کے حال سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت موسیٰ اور فرعون کا ہے۔

اس واسطے اس جگہ اس کو بیان فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اہل مکہ یا اس زمانہ کے مشرکوں سے پہلے ہم نے (فرعون اور) فرعونیوں کی بھی آزمائش کی تھی، ان کو بھی طاقت، حکومت، اور دولت دی تھی۔

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ۔ اور ان کے پاس بھی ایک باعزت پیغمبر پہنچا تھا یعنی قوم فرعون کی نظر میں اگرچہ اس کی عزت نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی بڑی عزت تھی۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ۔ اور یہ کہنے کے لئے بھیجا تھا کہ اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کا معاملہ میرے سپرد کر دو یعنی ان پر ظلم نہ کرو۔ میں بغیر کسی ذاتی یا قومی جذبہ داری کے انتہائی امانت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچانے والا ہوں۔ اس مطلب پر عباد اللہ سے مراد بنی اسرائیل ہوں گے اور یہ لفظ اَدُّوْٓا کا مفعول ہوگا یا اَدُّوْٓا کا مفعول محذوف ہے اور عِبَادَ اللّٰهِ منادیٰ ہے اور حرف ندا محذوف ہے یعنی اے اللہ کے بندو، ایمان اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا حق ادا کرو۔ اس مطلب پر عباد اللہ سے مراد فرعون کی قوم والے ہوں گے۔

وَاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰهِ ۚ اِنِّیْٓ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ۔ اور مجھ پر چیرہ دستی نہ کرو مجھ پر اپنی بڑائی نہ جتاؤ (میں تم سے کمزور نہیں ہوں اور بے ثبوت رسالت کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں میں) تمہارے پاس واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ یہ سن کر فرعونیوں نے حضرت موسیٰ کو قتل کر دینے کی دھمکی دی تو آپ نے فرمایا۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ۔ میں اپنے اور تمہارے دونوں کے مالک کی تمہارے رجم (کی دھمکیوں) سے پناہ چاہتا ہوں یعنی میرا پناہ دہندہ وہ ہے جو میرا اور تمہارا مالک ہے مجھے تمہاری دھمکیوں کا کوئی خوف نہیں۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ۔ اور اگر تم میری ہدایت و رسالت پر یقین نہیں رکھتے تو مجھ سے الگ رہو یعنی مجھ سے کچھ سروکار نہ رکھو۔ میرے راستہ میں رکاوٹ ڈالو نہ تمہاری راہ میں مجھے کچھ دخل ہے۔ تم الگ ہو، الگ دونوں کے مقصد الگ الگ۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ۔ کافروں نے جب حضرت کا آخری پیام مصالحت بھی نہ مانا اور قتل کرنے کے در پے ہو گئے تو آپ نے اپنے مالک سے دعا کی کہ یہ سب مجرم قوم ہے یعنی ہدایت پر نہیں آئے گی تو ہی ان سے حفاظت کا کوئی راستہ بتا حکم ہوا۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا۔ تم میرے بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) رات کو (مصر سے باہر) لے جاؤ۔ یعنی یہاں سے تم سب ہجرت کر جاؤ۔ اور رات کو نکلنا تاکہ فرعون کو اگر اطلاع بھی ہو تو صبح کو ہو۔

اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ۔ بلاشبہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ یعنی تم لوگوں کو پکڑنے فرعون کے آدمی تمہارے پیچھے دوڑیں گے تو جتنی زیادہ دیر میں اطلاع ہو اُتنا ہی اچھا ہے۔ حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ قلزم کی جانب بنی اسرائیل کو لے چلے۔ قلزم کے کنارے پر پہنچے اور سمندر کو موجزن پایا تو حسب وحی خداوندی پانی میں لاٹھی ماری۔ فوراً پانی رُک گیا۔ چلتا دریا تھم گیا اور جُدا جُدا بارہ راستے خشک بن گئے۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کو لے کر پار ہو گئے۔ پیچھے فرعون اپنے لشکر کو لے کر پہنچا اور سمندر کو خشک پا کر سمجھا یہ جزر کا وقت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پار ہونے کے بعد اندیشہ ہوا کہ اگر راستے یونہی خشک رہے تو فرعون کا لشکر بھی پار آ جائے گا۔ یہ سوچ کر (بروایت قتادہ) آپ نے پانی میں لاٹھی مارنی چاہی تاکہ قلزم اپنی حالت پر آ جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا۔ اور سمندر کو یونہی ساکن اور کشادہ راہ چھوڑ دو یعنی لاٹھی مار کر ہموار نہ کرو تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اندر گھس پڑے۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ۔ بلاشبہ یہ ڈبوئے جانے والا لشکر ہے یعنی اس کا ڈوبنا مقدر ہو چکا ہے۔ اس کو ڈوبنا ہی ہے۔ موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی۔ سمندر کو خشک چھوڑ دیا۔ فرعون اور فرعونی سب سمندر میں گھس پڑے اور پانی نے آ کر سب کو ڈبو دیا۔

اللہ فرماتا ہے۔

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۙ كَذٰلِكَ انہوں نے (بلاد مصر میں) بکثرت باغ اور رواں چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ قیام گاہیں اور سامان راحت و آسائش جس میں وہ مزے اڑاتے اور عیش کرتے تھے چھوڑا۔ یہ واقعہ یونہی ہونا تھا ہو گیا یعنی اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ اور ایسی جیسی نعمتیں مکانات باغات محلات اور سامان آسائش (شام میں) ہم نے دوسری قوم یعنی بنی اسرائیل کو دے دیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ قبطیوں اور فرعونیوں کی چھوڑی ہوئی چیزیں ہم نے ایک اور قوم کو دے دیں۔ جس کا اقتدار ملک مصر پر ہوا۔ اول صورت میں ھا کی ضمیر مذکورہ بالا نعمتوں کی اجناس پر راجع ہے۔ شدت مشابہت کی وجہ سے ایک کو بعینہٖ دوسری چیز کہہ لیا جاتا ہے۔ جیسے هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا یعنی جنتیوں کو جب دوبارہ پہلی شکل کے پھل دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہیں جو ہم کو پہلے دیے گئے تھے یعنی ان کی ان سے اتنی مشابہت ہے کہ گویا یہ وہی ہیں۔ ملک شام میں بنی اسرائیل کو اللہ نے جو نعمتیں عطا کی تھیں وہ مصر کی قبطیوں کی نعمتوں سے اتنی مشابہ تھیں کہ گویا وہی تھیں۔ دوسری صورت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ ہم نے اول صورت میں اس لئے مذکورہ بالا تاویل کی کہ اگر قَوْمًا اٰخَرِيْنَ سے بنی اسرائیل مراد لئے جائیں اور ھا کی ضمیر قبطیوں کی متروکہ چیزوں کی طرف راجع کی جائے جیسا کہ بعض مفسرین نے کیا ہے تو یہ کہنا درست پڑے گا کہ بنی اسرائیل لوٹ کر ملک مصر میں گئے اور قبطیوں کی متروکہ اشیاء پر قابض ہوئے حالانکہ باجماع مورخین بنی اسرائیل مصر سے نکل کر عراق کے میدان تیہ میں چالیس برس تک پھنسے رہے۔ حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کی وفات تیہ میں ہی ہوئی۔ جب حضرت یوشع پیغمبر ہوئے تو تیہ سے رہائی ملی اور شام کی حکومت عنایت کی گئی۔ مصر میں تو لوٹ کر گئے ہی نہیں۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ قوم فرعون کے برباد و ہلاک ہونے پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ان کو ایمان کی یا عذاب سے بچنے کی مہلت ہی نہیں دی گئی۔ مومن کے مرنے پر اس کی جائے نماز، زمین پر اعمال خیر پہنچنے کا مقام آسمان پر روتا ہے، مگر مشرک کے برباد ہونے پر کوئی نہیں روتا۔ یا یوں کہا جائے کہ آسمان و زمین کا کسی پر رونا ایک محاورہ ہے کسی نیک آدمی کے مرنے پر آسمان و زمین روتا ہے یعنی سارے جہان کو اس کا غم ہوتا ہے اور بدوں کے مرنے سے کسی کو رنج نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۙ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ۔ فرعون بنی اسرائیل کو ذلت آمیز عذاب دیتا تھا۔ لڑکے پیدا ہوتے تو ان کو قتل کرا دیتا تھا اور لڑکیاں پیدا ہوتیں تو قبطیوں کی خدمت کے لئے ان کو زندہ رہنے دیتا۔ حاملہ عورتوں سے سخت ترین مشقت کے کام لیتا اور مردوں سے بلا مزدوری کام کراتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ فرعون مغرور سرکش اور حد سے آگے بڑھ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم نے اس کے عذاب سے بنی اسرائیل کو نجات دے دی۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۚ اور اس زمانے کے سب لوگوں پر (اور ان کے حالات کو) جان کر ہم نے بنی اسرائیل کو ترجیح (دی) (اور نبوت کیلئے ان کی قوم کا انتخاب کیا) یعنی ہم سے بنی اسرائیل کی کوئی بات تو چھپی تھی کہ سارے جہان میں نبوت کے لئے ان کو چنا۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ۔ اور ہم نے ان کو (دکھ سکھ اور ذلت و عزت کی) وہ نشانیاں دی تھیں جن کے اندر کھلی ہوئی جانچ تھی (مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات۔ فرعون کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی ذلت پھر حضرت موسیٰ کی وجہ سے نجات۔ فرعون کی غرقابی اور بنی اسرائیل کے گزرنے کے لئے دریا کا خشک ہو جانا پھر میدان تیہ میں چالیس برس تک ان کی سرگردانی پھر عمالقہ جیسی طاقتور قوم پر ان کی فتح اور شام کی حکومت ملنا اور پے در پے بنی اسرائیل میں اسرائیلی پیغمبروں کا مبعوث ہونا وغیرہ)

مقصودِ بیان پوری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر کسی سے لڑنے اور دنیوی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں آتے جہاں تک ممکن ہوتا ہے نرمی سے نصیحت کرتے ہیں۔ آخر میں اسی بات پر ہی قناعت کرتے ہیں کہ اہل حق

کو ان کے پاس آنے سے مجبور کیا جائے اور ان سے کچھ تعرض نہ کیا جائے گویا ابتدائی حقوق انسانی کو دلاتے اور قائم رکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ افکار و عقائد اور ان اعمال شخصی اور قومی آزادی کے خواہش مند ہوتے ہیں جن سے دوسروں کو جانی مالی نقصان اور کسی کا ضرر نہ ہوتا ہو، لیکن اقتدار پرست باطل اندیش طاقتیں کسی طرح باز نہیں آتیں تو جمال تبلیغ کی جگہ جلال پیغمبری نمودار ہو جاتا ہے اور پیغمبروں کو ذلیل و کمزور سمجھنے والی پر جبروت مغرور طاقتیں اہل حق سے ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جاتی ہیں اور دنیوی حکومت بھی اہل حق کے قبضہ میں آجاتی ہے، مگر یہ بطور آزمائش آتی ہے جس طرح مصائب و آلام کا اہل حق پر نزول بطور امتحان ہوتا ہے اسی طرح دنیا کی دولت، عزت، حکومت اور ہر نعمت بھی ان کو جانچنے کیلئے دی جاتی ہے

ان آیات میں کافروں کو دھمکی اور تباہی کی پیشین گوئی اور مسلمانوں کو تسلی اور آئندہ غلبہ پانے اور اقتدار حاصل ہونے کی در پردہ بشارت ہے وغیرہ۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ○ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ○ فَأْتُوا

یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخیر حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ ہوں گے سوائے مسلمانو اگر

بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ

تم سچے ہو تو ہمارے باپ داداؤں کو (زندہ کرا کے) لا موجود کرو۔ یہ لوگ (قوت و شوکت میں) زیادہ بڑھے ہوئے ہیں یا تبع (شاہ یمن) کی قوم اور جو قومیں ان سے

إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ○ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ○ مَا خَلَقْنَاهُمَا

پہلے ہو گزری ہیں ہم نے انکو (بھی) ہلاک کر ڈالا وہ نافرمان تھے اور ہم نے آسمانوں و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسکو اس طرح نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہیں

إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ○ يَوْمَ لَا

(بلکہ) ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے بے شک فیصلہ کا دن (یعنی قیامت کا دن) ان سب کا وقت مقرر ہے جس دن

يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ○ إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (ع)

کوئی علاقہ والا کسی علاقہ والے کے ذرا کام نہ آوے گا اور نہ ان کی کچھ حمایت کی جاوے گی ہاں مگر جس پر اللہ رحم فرمائے وہ (اللہ) زبردست ہے مہربان ہے

تفسیر عموماً مشرک اور کافر جو توحید الوہیت و ربوبیت سے منکر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اس کی بنیادی اور اصلی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو آئندہ دوسری زندگی کا اقرار نہیں ہوتا۔ وہ اس زندگی کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے اور پہلی زندگی کے اعمال کی جزا سزا پانے کے قائل ہی نہیں ہوتے اور جب آئندہ دوسری زندگی ہی نہیں نہ سزا کا اندیشہ نہ جزا کی امید تو پھر جہاں تک ممکن اور جتنا بھی ممکن ہو اسی زندگی کا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کر لینی چاہیئے خواہ کسی کی حق تلفی ہو یا عدل۔ شخصی اور ذاتی فائدہ حاصل ہونا ضروری ہے۔ پھر شخصی فائدہ سے آگے بڑھ کر اہل قرابت، خاندان، قوم، زبان، اہل وطن، اہل ملک، اور پھر مشرق مغرب اور شمال جنوب کی حدود تک اسی فائدہ طلبی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور ان سب کا تعلق بھی بالواسطہ مفاد شخصی سے ہوتا یا سمجھا جاتا ہے۔ گویا منکرین جزا سزا کی نظر میں یہ سارا سلسلہ بازیچۂ اطفال اور جولان گاہ لہو و لعب ہے جس کی کوئی غرض ہی نہیں، یہاں آنے آسمان کے جگمگاتے

ستاروں اور زمین کے لہلہاتے گلزاروں کی سیر کی سورج کی خیرہ کن چمک اور چاند کی سکون بخش روشنی سے فائدہ اندوز ہوئے۔ کھایا پیا مزے اڑائے آرام اٹھائے اور چل دیئے۔ یہ کویکبارگی زندگی ہوئی۔ دوسری زندگی کے انکار کی کافروں کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دیکھو ہزاروں لاکھوں برس سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے مرتا ہے لوٹ کر نہیں آتا۔ ہمارے تمام باپ دادا یونہی آئے یونہی چلے گئے۔ اگر تم کو دوبارہ زندہ ہونے کا دعویٰ ہے تو ہمارے باپ دادا کو ہی ذرا دوبارہ جلا دو۔ ان جاہلوں اور بیوقوفوں کو معلوم نہیں کہ روز روز دوسری زندگی نہیں ہوتی کہ برسوں پہلے آئے پھر مر گئے اور اب ان کو دوبارہ زندہ کر کے دکھایا جائے۔ دوسری زندگی اعمال کی سزا جزا کے لئے ہوگی۔ اب ہر ایک کے لئے جدا جدا سزا دینے کا دن تو ہو نہیں سکتا۔ جب تک کل انسانوں کے ایام عمل ختم نہ ہو جائیں اور مجموعی طور پر یہ دار العمل اور یہ عملی کارگاہ بند نہ کر دی جائے اُس وقت تک دار الجزا کا آنا ناممکن ہے۔ فیصلۂ اعمال اور نتائج کا سب کے لئے ایک دن مقرر ہے۔ یہاں بظاہر تعاون امداد سفارش اور ادا معاوضہ کا قانون جاری ہے۔ قرابت دار اپنے قرابت دار کی اور دوست اپنے دوست کی مدد کر دیتا ہے کیونکہ یہ پورے طور پر دار الجزا نہیں ہے۔ یہاں اعمال زندگی کا پورا بدلہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن مکمل جزا سزا کے دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ ہاں جس پر اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمادے تو اس کے جرائم معاف ہو سکتے ہیں اور اس کی شفاعت بھی ممکن ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ مسلمانوں کو تسلی و بشارت دینے کے لئے اور کافروں کو نتائج بد سے آگاہ کرنے کے لئے بیان کیا گیا تھا۔ اب کافروں کی اُس کٹ حجتی کو بیان فرماتا ہے جو بطور معارضہ وہ مسلمانوں کے سامنے کرتے تھے اور کہتے تھے (فرعون و موسیٰ کا جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ راحت و رنج اور زیست و موت تمام ہیں فرعون بادشاہ تھا مر گیا اُس کی قوم حکمران تھی چلی گئی۔ کسی بہانے سب کو موت آ گئی۔ موسیٰ بھی مر گئے اور وہ اسرائیلی بھی چل دیئے جو شام کے حکمران بنے تھے۔ اب نہ فرعون اور قوم فرعون کو دوبارہ جینا ہے نہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو) بس اتنی بات ہے کہ اس زندگی کے بعد سب کو مرنا ہے۔ اس کے بعد کسی کو دوبارہ زندہ ہونا نہیں (تو فکر کس بات کی تم بھی مرو گے ہم بھی مریں گے) بعض اہل تفسیر کے نزدیک مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى سے مراد ہے پیدا ہونے سے پہلے وہ وقت جب انسان نطفہ تھا اور مجسم ہو کر دنیا میں نہیں آیا تھا۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ ایسی موت جس کے بعد زندگی آتی ہے وہ موت تو گذر گئی۔ اب جو موت آئے گی وہ ایسی نہ ہوگی کہ اس کے بعد پھر دوبارہ زندہ کیا جائے۔ یہ مطلب پیچ در پیچ تاویل کا محتاج ہے، اس لئے ہم نے سادہ مطلب کو جو عام مفسرین کا قول ہے ترجیح دی ہے۔

فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یہ جملہ کافروں کے قول کا تتمہ ہے۔ کافروں نے کہا کہ اگر تم کہتے ہو کہ آدمی مر کر دوبارہ زندہ ہوگا اور تم اس دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کرا کے بلواؤ (اور چونکہ لاکھوں برس گذر گئے اور کوئی بھی مر کر واپس نہیں آیا، اس لئے دوبارہ زندگی ممکن ہی نہیں ہے)

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۔ تبع سے مراد تبع اوّل ہے جو قبائل حمیر کا بادشاہ تھا اور یمن پر اس کی حکومت تھی۔ یہ شخص مرد صالح اور موحد تھا۔ بیہقی، حاکم، ابن المبارک، امام احمد طبرانی اور ابن ماجہ کی روایات میں یہی آیا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کیا تبع پیغمبر تھا؟ فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ پیغمبر تھا یا صرف مرد صالح (او کما قال) تبع کے جانشین بھی تبع کے لقب سے مشہور ہوئے۔ تبع حقیقت میں شہنشاہ کے معنی مستعمل تھا یعنی وہ بادشاہ کہ دوسرے چھوٹے بادشاہ اور راجے اس کے تابع ہوں تبع کہلاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذوالقرنین تبع اوّل کے بیٹے کا نام تھا۔ شاہانِ حمیر کے نام عموماً ذو سے شروع ہوتے تھے جیسے ذویزن، ذوجدن، ذوالقرنین اور سب سے آخر میں ذونواس۔ یہ لوگ یہودی المذہب تھے۔ ممکن ہے تبع اوّل ہی کوئی اسرائیلی پیغمبر ہو، مگر قوم کافر تھی۔ تبع نے ہر چند توحید کی تعلیم دی، مگر قوم انکار و سرکشی سے باز نہ آئی۔ دنیوی شان و شوکت عزت و جاہ اور حکومت و اقتدار پر اُن کا قبضہ تھا۔ سرسبز کھیتیاں، شاداب باغ، سیکڑوں میل لمبی سڑکیں

پر دو رویہ پھلدار درخت رواں چشمے غرض ہر دنیوی نعمت کے مالک تھے ۔ اونچا تمدن تھا ۔ رفاہیت کی ساری زندگیاں تھیں ۔ اُن چیزوں نے ان کو مغرور اور خدا سے باغی بنا دیا تھا ۔ آخر قدرتی سزا کا وقت آگیا ۔ وہ پراجیکٹ جو ملک کو سیراب کرنے کے لئے انہوں نے پہاڑوں کے درمیان قائم کیا تھا ، راتوں رات پھٹ پڑا ۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر ہمسایہ ممالک میں بھاگے اور بیشتر غرق ہو گئے ۔ ان کے قصہ کی طرف اشارہ کر کے اللہ نے فرمایا (یہ اہلِ مکہ جو اتنے مغرور ہیں اور اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مقابلے میں معارضے کر رہے ہیں) کیا یہ زیادہ طاقت ور ، بلند مرتبہ ، باعزت اور صاحب اقتدار غرض تمام حالات و الزامات میں بہتر اور برتر ہیں یا قوم تبع ان سے بالا اور اعلیٰ تھی (ظاہر ہے کہ تبع کی قوم ہی ہر دنیوی حیثیت میں اُن سے اونچی تھی) اور تبع کی قوم سے پہلے (ثمود و عاد اولیٰ وغیرہ) جو قومیں گذر گئیں وہ بھی ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں ، مگر (نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں) اللہ نے ان کو غارت کر دیا ۔ (اُن کی حکومت ، دولت ، مدنیت اور سطوت و حشمت کام نہ آئی) کیونکہ حقیقت میں وہ مجرم تھے (پھر یہ کس گنتی میں ہیں ۔ ان کا بھی وہی نتیجہ ہوگا ۔ یہ بھی سرکشی کی پاداش میں تباہ کر دیئے جائیں گے)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ یہ کائنات بلند و پست یعنی آسمان و زمین اور خلائی موجودات بازیچہ نہیں کہ یونہی کھیل تماشہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے ۔ بلکہ ان کی تخلیق حامل حقانیت و حکمت ہے ۔ (کیا سارا سنسار جس کا سنگِ محراب انسان ہے یونہی بے کار بنایا گیا ہے ۔ اگر اس کی تخلیق بے کار نہیں تو انسان جو اس ہار کا سب سے بڑا موتی ہے کس طرح افکار و اطوار میں بے کار اور آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور کس طرح اس کی زندگی سزا جزا سے مستغنی رہے گی) مگر اکثر لوگ نادان ہیں ان کو سزا جزا کا یقین نہیں ۔ (دنیا کی اس زندگی کو ہی یہ آخری زندگی سمجھے ہوئے ہیں)

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (مجرم کو فرماں بردار سے ثواب کو عذاب سے اچھے اعمال و افکار برے اطوار و عقائد اور سزا کو جزا سے) جدا کرنے کا ایک وقت مقرر ہے اور سب کا وقتِ فیصلہ ایک ہی ہے ۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اُس مقررہ ساعت اور معین دن میں کوئی قرابتدار کسی قرابتدار کا اور کوئی دوست کسی دوست کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکے گا (نہ مجرم کا عوض اور تاوان دے سکے گا نہ اس کی سزا اپنے اوپر لے کر بٹا سکے گا نہ سفارش کر کے اس کو بچا سکے گا) اور نہ حمایت کر کے زور اور قوت کے ساتھ اس کو محفوظ رکھے گا (غرض عذاب سے بچانے کی کوئی صورت نہ ہوگی ۔ دنیا کا یہ جتھہ یہ لاؤ لشکر یہ لوکر چاکر یہ رشتہ داریاں اور دوستیاں جو یہاں کام آجاتی ہیں فیصلہ کے دن کام نہیں آئیں گی)

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ مگر جس پر اللہ ہی رحم کرے تو وہ عذاب سے بچ جائے گا (اور قیامت کے دن اللہ کی رحمت صرف مومنوں پر ہوگی کیونکہ اُس نے اسی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے اور کافروں پر رحم نہ ہوگا کیونکہ اللہ نے اس کی صراحت کر دی ہے اور اللہ کی اطلاع میں جھوٹ کی آمیزش محال ہے ۔ دنیا میں اللہ کی رحمتِ عام ہر مومن اور کافر مقر اور منکر سب اُس سے بہرہ اندوز ہیں ۔ یہ رحمت ایجابی نہیں ۔ رحمت وجوبی قیامت کے دن ہوگی جو اہلِ ایمان کے لئے مخصوص ہے ۔ پس گنہگار مومن کے لئے انبیاء ملائکہ صالحین شیر خوار اولاد اور جس کو خدا چاہے گا وہ شفاعت کر سکے گا اور شفاعت قبول کی جائے گی یا اللہ خود معاف فرما دے گا یا عذاب دے گا تو دوامی نہ دے گا ، مگر کافر کا عذاب دوامی ہوگا کیونکہ دائرۂ رحمت سے خارج ہوگا ۔)

اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ بے شک اللہ ہی غالب اور رحمت والا ہے یعنی اُس کا ہی رحم و اقتدار ہمہ گیر ہے ۔ ساری کائنات اسی کی رحمت و قدرت کے زیر اثر قائم ہے اور رواں دواں ہے ۔ اگر وہ رحم نہ کرے تو کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا ۔

مقصودِ بیان

اِنْ هِيَ اِلَّا الخ سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ مشرک صرف ایک موت کے قائل تھے یعنی دوسری موت کے قائل نہ تھے ، مگر حقیقت میں اس کلام سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بس یہی موت زندگی کو ختم کر دیتی ہے بالکل معدوم کر دیتی ہے اس کے بعد کوئی زندگی نہ ہوگی ۔ اسی مطلب کی وضاحت وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ میں کر دی ۔

فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ میں مشرکوں کے انکارِ حشر کی ایک ضعیف دلیل کا بیان ہے کہ اُس وقت تک کسی چیز کے واقع نہ ہونے کو دوامی اُس

شے کے غیر ممکن ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے۔ باپ دادا دوبارہ نہیں آسکے اور اس وقت ان کو زندہ کر کے لایا بھی نہیں جا سکتا اس لئے دوبارہ آئندہ حشر بھی محال ہے۔ اس کلام کے سیاق سے یہ بات بھی مترشح ہو رہی ہے کہ کسی چیز کے ماضی اور حال میں نہ ہونے سے عدم مستقبل پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ وجود ماضی وجود مستقبل کا آئینہ ہوتا ہے، لیکن کسی چیز کا عدم وقوع عدم امکان کی دلیل نہیں۔

إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ دنیوی تباہی جرم کی پاداش میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ظلم سے کسی کو برباد نہیں کرتا۔ یہ آیت دنیا کے سارے انسانوں خصوصاً مسلموں کے لئے درس نصیحت و عبرت رکھتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ضابطہ کے بموجب تباہی جرم سے وابستہ ہے تو مجرموں کو تباہ ہونے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آیت وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ میں اس کائنات کے بازیچۂ اطفال نہ ہونے کی صراحت کی گئی ہے یعنی یہ صرف سیرگاہ نہیں، لہو ولعب کا میدان نہیں، سبق اندوزی اور حکمت آفرینی کا مقام ہے۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو اس جہان کے احوال کو حقیقت بینی اور عبرت اندوزی کا آئینہ جانتے ہیں اور نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو وقتی تفریح کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ سے معلوم ہو رہا ہے کہ بالکل فیصلہ کا دن، ورتمام اعمالِ زندگی کی سزا جزا اور عذاب ثواب کا وقت اور انسانوں کو جنتی و دوزخی دو گروہوں میں بانٹ دینے کی ساعت معین ہے اور سب کا آخری فیصلہ ایک ہی دن ہوگا۔

إِلَّا مَنْ رَّحِمَ کے لفظ سے فرقۂ خوارج و معتزلہ کی تردید ہوتی ہے جو مطلقاً شفاعت کے منکر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان آپس میں کام ضرور آئیں گے یعنی سفارش کر سکیں گے، مگر انہی کی سفارش کریں گے جن پر اللہ رحم کرنا چاہے گا۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝

بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (کہ بہ صورت) تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا (اور) وہ پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے

خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۝ ذُقْ

(اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر کے اوپر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو (اور اس سے استہزاءً

إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِ تَمْتَرُونَ ۝ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ

کہا جائیگا) لے چکھ تو بڑا معزز مکرم ہے　　یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے　　بیشک خدا سے ڈرنے والے امن (وچین) کی جگہ

أَمِينٍ ۝ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ يَلْبَسُونَ مِن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝

میں ہوں گے　باغوں میں اور نہروں میں (اور) وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا　آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے　(اور) یہ بات

كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ۝ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ۝

اسی طرح ہے　اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کر دیں گے (اور) وہ وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہوں گے (اور

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝

وہاں) بجز اس موت کے جو دنیا میں آ چکی تھی　اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے (یعنی مریں گے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ سے بچائے گا اور

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ

سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا بڑی کامیابی یہی ہے سو ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ

يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝ ع

نصیحت قبول کریں تو (اگر یہ لوگ نہ مانیں تو) آپ منتظر رہیے یہ لوگ بھی منتظر ہیں

تفسیر

آخرت کے عذاب ثواب کی شکلیں اور ذرائع اور ڈیوٹی پر مقرر کارندے اس وقت سب پردۂ غیب میں ہیں اور انسانی فکر کی بلند پروازی سے بھی بہت بلند۔ اس لئے ان کی اصلی اور صحیح حقیقت تصور سے ماوراء ہے۔ کھانے کے لئے تھوہر کا درخت یا کوئی زہریلی بدمزہ کسیلی غذا ہو یا پینے کے لئے لہو زرداب پیپ، گرم تیل کھولتا ہوا پانی پگھلا ہوا سیال تانبہ سیسہ جلانے کے لئے بھڑکتی آگ، لپکتے لپکتے شعلے قید و بند کے لئے گردن موٹی آتشیں زنجیریں، گوشت نوچنے اور قیمہ بنانے کے لئے آنکڑے، سر کچلنے کیلئے آگ کے ہتھوڑے اور اسی طرح کے دوسرے انواع عذاب اور اشیاء ایذا رساں۔ یا۔ کھانے کے لئے خوشبو دار خوبصورت خوش مزہ پر کیف سرور آگیں فرحت بخش غذائیں پہننے کے لئے ریشم اور کم خواب کے دبیز اور مہین کپڑے، پینے کے لئے دودھ، شہد اور کیف آفریں خوش ذائقہ شربت، رہنے کے لئے سونے چاندی موتی مونگے کے مکان خدمت و راحت اندوزی کے لئے حور و غلمان، حکومت کے لئے لمبا چوڑا ملک ہر طرح کا چین، موت مرض اور ہر طرح کی مصیبت نہ آنے کا اطمینان وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں صرف سمجھانے اور آخرت کے دکھ سکھ کو تصور میں لانے کے لئے ذکر کی جاتی ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ آخرت کا ثواب ہو یا عذاب صرف تخیلی اور روحانی یکسر جسمانی نہ ہوگا۔ مادی مجسم اور متشکل ہوگا، لیکن اس کی حقیقت کیا ہوگی یہ سمجھنے اور سمجھانے اور بتانے کی چیزیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین عربی زبان میں اسی لئے نازل فرمائی ہے کہ عربوں کو براہِ راست سمجھنے میں سہولت ہو اور سمجھنے کے بعد اس کے مقصد تک پہنچ کر نصیحت اندوز ہو سکیں، کوئی نہ کوئی انسانی زبان تو ہدایت کرنے کے لئے اختیار کرنا ضروری تھا اور سب زبانوں میں ہدایت نامہ کا نزول بھی بعید از فہم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ عربی تھے اور آپ کی قوم بھی عربی تھی، اس لئے کتاب کی زبان کو بھی عربی ہی بنایا اور عذاب و ثواب کو سمجھانے کے لئے عربی الفاظ ہی استعمال کئے اور عربوں کے اسلوب زندگی اور طرزِ فہم و عمل کو سامنے رکھ کر ہدایات نازل فرمائیں، لیکن بیان اور اسلوب بیان کی خصوصیت ہدایت کے عموم سے مانع نہیں، ہدایت کا تعلق معانی اور مضامین سے ہے۔ ضوابط حیات کسی زبان میں ترجمہ کر کے سمجھائے جائیں اور افکار و اعمال کی صحت کے قوانین کو سمجھنے کے لئے کوئی زبان استعمال کی جائے بہر حال مقصدیت فوت نہ ہوگی۔ فرق صرف براہِ راست اور بالواسطہ تعلیم کا ہوگا اور یہ فرق زیادہ قابلِ توجہ نہیں۔

تحلیلِ اجزاء

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ ۔ اثیم بڑا گناہگار۔ مراد ابوجہل اور اس کے ساتھی اور کفار۔ مُہل تیل کی تلچھٹ، پگھلا ہوا تانبہ، پیپ کچلہو۔ خطیب نے لکھا ہے کہ آگ میں تپانے اور پگھلانے سے جو چیز پگھل جائے اُس پگھلی ہوئی چیز کو مُہل کہتے ہیں۔ جیسے پگھلا ہوا تانبہ، پیتل، لوہا، سونا، رانگ، سیسہ وغیرہ۔

زقوم۔ تھوہر کا درخت جو دوزخ کی تہ میں ہوگا۔ زقوم کا مزہ کڑوا کسیلا اور ناگوار ہوتا ہے۔ خشک ریگستان میں پیدا ہوتا ہے۔ ناگ پھنی بھی اس سے ملتی جلتی چیز ہے۔ سخت گناہگار یعنی کافروں کو دوزخ کے اندر کھانے کے لئے دیا جائے گا۔ آیت کا نزول اگرچہ ابوجہل کے سلسلے میں ہوا۔ مگر ابوجہل کی طرح کے تمام کافر اس حکم میں داخل ہیں۔ پہلا جملہ الاثیم پر ختم ہوگیا۔ کالمہل دوسرا جملہ ہے اور آئندہ یغلی سے تیسرا جملہ ہے۔ یغلی نہ حال کی صفت ہے نہ حال ہے۔ کیونکہ پگھلے ہوئے تانبے وغیرہ میں جوش نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ. سخت گرم اُبلتے پانی کی طرح تھوہر کی غذا پیٹ میں پہنچ کر اُبال کھائے گی۔ دوزخ کے فرشتوں کو حکم ہوگا۔

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ اس کو پکڑو (باندھو) اور زور سے دھکے دیتے ہوئے جاکر وسط جہنم میں جاگراؤ۔ پھر گرم پانی کا عذاب اس کے سر کے اُوپر سے برساؤ۔

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ. ابوجہل کہا کرتا تھا کہ مکہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان مجھ سے زیادہ عزت دار اور شرافت والا اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو بڑا باعزت شریف بنتا تھا، اب اُس دھوکے کا مزہ چکھ۔ اس کے بعد فرماتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ. اہل تفسیر نے اس جملہ کو کلام سابق کا تتمہ اور مخاطب دوزخیوں کو ہی قرار دیا ہے۔ اس تفسیر پر یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دوزخیوں سے فرمائے گا کہ یہ عذاب جو تمہاری نظروں کے سامنے ہے اور جس میں تم مبتلا ہو یہ وہی ہے جس کے واقع ہونے اور آنے میں تم شک کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ کلام سابق سے جدا ہو اور مخاطب مشرکین ہوں یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس عذاب کی کیفیت اور تفصیل بیان کی گئی یہ وہی ہوگا جس کے متعلق تم شک میں پڑے ہوئے ہو۔ مجرموں کے عذاب کی تفصیل کے بعد آگے مومنوں کے ثواب کی وضاحت فرماتا ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ. متقی (یعنی مومن) امن کی جگہ میں ہوں گے یعنی سرسبز باغات اور بہتے اُبلتے چشموں میں ہوں گے۔ امین یعنی نہ بیماری کا اندیشہ نہ کسی قسم کے رنج والم کا خوف نہ موت کی فکر نہ ذلت کا غم ہر چیز سے امن کی جگہ

یَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ. اُن کا لباس باریک ریشمین اور دبیز ریشمین ہوگا۔ اوّل مکان کا بیان تھا یہ لباس کا بیان ہوگیا۔ متقابلین یعنی بیٹھنے کی ہیئت ایسی ہوگی کہ ایک کا منہ دوسرے کے منہ کی طرف ہوگا۔ کسی کے منہ کی طرف کسی کی پشت نہ ہوگی گویا سب کا محل نشست گول دائرہ کی شکل کا ہوگا

كَذٰلِكَ ایسا ہی ہوگا۔ یہ مستقل جملہ تاکید سابق کے لئے ہے۔

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ. حور جمع حوراء، مفرد عین جمع عیناء مفرد۔ واحدی نے حور کا ترجمہ گوری عورتیں کیا ہے کیونکہ حور کا معنی ہے سفیدی۔ اور عین کا معنی ہے بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں۔ یعنی اہل جنت کا جوڑا بنا کر حبالۂ ازدواجی سلسلہ حوروں سے کردیا جائے گا۔ یہ تقاضائے صنفی کی تکمیل کا بیان ہوگیا۔

یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ. یدعون مانگیں گے، طلب کریں گے۔ آمنین بےغمی کی حالت میں خاطر جمع ہوکر یہ غذا کا بیان ہے۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى. جنت کے اندر ان کو موت کا مزہ کبھی نہ چکھنا پڑے گا۔ البتہ جو موت ہوچکی جس سے دنیوی زندگی کا خاتمہ ہوا بس وہی موت ان کے لئے ہوگی۔ زجاج اور فراء نے اس آیت میں استثناء کو منقطع قرار دیا ہے اور بقول کرخی طبری کے نزدیک اِلّا استثنائیہ نہیں بلکہ بعد کے معنی میں ہے۔ یعنی پہلی موت کے بعد پھر ان کو موت نہیں آئے گی۔

اس آیت میں زوال نعمت اور انقطاع جنت کے اندیشہ کی نفی ہے۔ مکان، لباس، غذا، خدمت، ازدواجی تقاضا اور انقطاع نعمت کے اندیشہ کی نفی، ان سب چیزوں کا بیان ہوگیا۔ لیکن پھر بھی اتنا ابہام رہا کہ کیا یہ نعمتیں سزا کی مدت ختم ہوجانے اور عذاب دوزخ برداشت کرنے کے بعد ملیں گی یا عذاب دوزخ سے واسطہ ہی نہ پڑے گا۔ اس لئے فرمایا۔

وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ. اللہ تعالیٰ بھڑکتی آگ کے عذاب سے ان کو محفوظ رکھے گا۔ لیکن لپٹ سے اور سرزنش سے اور معمولی سزا سے محفوظ رکھنے کی صراحت نہیں فرمائی، اس لئے یہ امور ابتدائی طور پر بطور تطہیر ہو سکتے ہیں۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ. یعنی یہ جنت میں داخلہ اور مذکورہ بالا نعمتوں کی عطا کسی ذاتی یا صفاتی استحقاق کی بنا پر نہ ہوگی۔ کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ پر اپنے اعمال کی وجہ سے واجب الاداحق نہیں رکھتا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وفضل سے ہی نیک اعمال

مومنوں کے لئے جنت کا وعدہ فرمایا ہے

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۔ دنیا کی کوئی کامیابی ہو، قارون کی دولت ہو یا شداد کی جنت، یا نمرود و فرعون کی حکومت چند روزہ ہے اور وہ بھی ہزاروں افکار، امراض و موت کے اندیشہ کے ساتھ۔ اس لئے اس کو نعمت والی کامل بڑی کامیابی نہیں کہہ سکتے۔ ان فوز عظیم اور دنیا کی ہر کامرانی سے بڑی آخرت کی کامیابی ہے جس کا ذکر اوپر کردیا گیا ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۔ اس آیت کے مضمون کی تشریح ہم إِنَّ الْمُتَّقِينَ الخ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔ اعادہ موجب طوالت ہے

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ ۔ (جب یہ لوگ نصیحت نہیں مانتے اور) آپ کے مرنے کے منتظر ہیں تو آپ بھی ان پر عذاب نازل ہونے کا انتظار کیجئے یعنی جب کوئی نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر تلے ہوئے ہیں کہ آپ کے ہلاک ہونے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان پر عذاب آنا ضروری ہے، لیکن عذاب کب آئے گا اس کا انتظار لازم ہے

مقصود بیان زقوم کا درخت جو بدمزہ اور ناقابل غذا ہے دوزخیوں کو کھلایا جائے گا۔ جنت میں قیام طعام لباس الغرض تمام اغراض ہر خواہش کے پورا ہونے کا انتظام اور اعلیٰ ترین انتظام ہوگا نہ وہاں بیماری نہ ہوگی دکھ نہ مرنے کا ڈر نہ نعمت کے زائل ہونے کا اندیشہ۔

وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں پر دوزخ کا عذاب ہی نہ ہوگا۔

فَضْلًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ آخرت کی نعمت بطور واجب نہیں ملے گی بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملے گی۔

يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن مجید کی عربی زبان بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی عربوں کو سمجھنے کی سہولت کے لئے اپنے پیام کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ وغیرہ۔

سُورَةُ جَاثِيَة

اس سورۃ کا نام بقول مفسر خازن کے شریعۃ بھی ہے، اس میں ۳۶ یا ۳۷ آیات اور چار رکوع ہیں۔ یہ سورۃ بھی مکہ میں نازل ہوئی بعض اہل روایت کے نزدیک آیت قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا الخ مکی نہیں ہے، مدنی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بہت رحم والے ہیں

حٰمٓ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ

حٰم یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (ماننے) کے

لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيٰتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ

بہت سے دلائل ہیں اور (اسی طرح) خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا رکھا ہے دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے

وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ

میں اور (اسی طرح) ایک کے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس (مادہ) رزق میں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے

اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ

خشک ہونے کے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں دلائل ہیں اُن لوگوں کیلئے جو عقل سلیم رکھتے ہیں یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں تو پھر اللہ کی

يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ

(آیتوں) کے بعد اور کونسی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لاویں گے بڑی خرابی ہوگی ایسے شخص کیلئے جو جھوٹا ہو نافرمان ہو جو اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جبکہ وہ اس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں پھر بھی وہ تکبر

لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ

کرتا ہوا اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اس نے اُن کو سنا ہی نہیں ایسے شخص کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اس کی ہنسی

لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا

اڑاتا ہے ایسے لوگوں کیلئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب ہے ان کے آگے جہنم (آرہا) ہے اور (اس وقت) نہ تو ان کی دنیا کی کمائی ذرا کام آوے گی اور نہ وہ جن کو اللہ کے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

سوا کارساز (معبود) بنا رکھا تھا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا یہ قرآن سراسر ہدایت ہے اور جو لوگ اپنے رب کی (ان) آیتوں کو نہیں

لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ

مانتے ان کے لئے سختی کا عذاب ہوگا اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے دریا کو مسخر بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اور تاکہ تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو اور اسی طرح جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں

جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا

ہیں اُن سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا بیشک ان باتوں میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو غور کرتے ہیں آپ ایمان والوں سے فرما دیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر

لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

کریں جو خدا کے معاملات کا یقین نہیں رکھتے تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو (یعنی مسلمانوں کو) ان کے عمل کا صلہ دے جو شخص نیک کام کرتا ہے سو اپنے

فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ○

لفع کے لئے اور جو شخص بُرا کام کرتا ہے اُس کا وبال اُسی پر پڑتا ہے پھر تم کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے

تفسیر کیا اللہ کا وجود ہے۔ اگر ہے تو اُس کے امتیازی اوصاف کیا ہیں اور ان صفات خصوصی کا ثبوت کیا ہے۔ اگر صفات کا بھی ثبوت ہے تو ہماری زندگی اور زندگی کے احوال سے اُس کا کیا تعلق کہ وہ ہمارے لئے ہدایت نامے ضروری بھیجے۔ ہمارا اُس سے کون سا کام اٹکا ہوا ہے، ہماری کون سی غرض اُس سے وابستہ ہے کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس سے تعلق پیدا کریں اور اس کی ذات و صفات کو ماننا ہماری زندگی کی بنیادی غرض ہو جائے اور اس کی ہدایات پر چلنا ہمارے لئے لازمی قرار پائے۔ اگر کوئی اس کا انکار کرے تو کیا خرابی ہے اور اقرار کرنے والوں کا انکار کرنے والوں سے کیا سلوک ہونا چاہئے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات منکر عموماً کیا کرتے ہیں۔ ان تمام امور کی توضیح ان آیات میں کی ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور سب پر غالب محیط کل اقتدار کا مالک اور کائنات کی حقائق خواص و لوازم آپس کے ارتباط اور وجوہ ارتباط اور شخصی و جماعتی ضرورتوں سے سب سے زیادہ واقف ہے نہ اُس کی قوت و قدرت کی نظیر ہے۔ نہ علم و حکمت کی مثال۔ آسمان و زمین یعنی کائنات بلند و پست کی تخلیق و تقویم۔ ایجاد و بقاء۔ انتظام و تصادم۔ ان کی نوعی صورتوں اور خاصیتوں کا تنوع۔ رنگ۔ وزن مقدار حجم کا اختلاف پھر سب کا مل کر اس عالم کی مشین کو یکساں چلانا اور مفوضہ خدمت کی سر انجام دہی میں آغاز آفرینش سے اب تک سر مو فرق نہ ہونا کسی کا کسی سے نہ ٹکرانا باوجود طبائع اور لوازم طبائع کے اختلاف کے اپنی اپنی رفتار پر سب کا متحد العمل ہو کر چلنا۔ انسان کی تخلیق اس کی علمی و عملی طاقتوں کا توازن اُس کی ظاہری و باطنی خوبیاں اُس کے جسمانی و عقلی اور مادی و روحانی کمالات اس کا اسفل السافلین یا اعلیٰ علیین میں پہنچنا، زمین پر لاکھوں انواع کے جانور۔ ان کا رینگنا، پھدکنا کودنا دوڑنا سانس لینا اور اپنی اپنی بدنی و نوعی تکمیل میں اس طرح لگا رہنا کہ ہزار در ہزار وجوہ اختلاف کے باوجود نظم کائنات کو چلانے میں بالاتفاق مددگار رہیں۔ رات دن کا چکر اور اس چکر میں کبھی ایک پل کے لاکھویں حصے کے برابر فرق نہ آنا۔ آسمان اور بالائی فضا سے بارش کا نازل ہونا اور اس کے ذریعہ سے خشک زمین کو سرسبزی مل جانا۔ ہواؤں کا چلنا اور ایک نظم کے ساتھ چلنا یہ اُسی طرح کی بڑی بڑی نشانیاں اللہ کے غالب مقتدر اور علیم و حکیم ہونے پر دلالت کر رہی ہیں اور اس کی توحید کے ترانے اپنی اپنی نوعی زبان میں گا رہی ہیں۔ سمجھنے والے دل ہوں تو جان لو۔ سننے والے کان ہوں تو کائنات کی آواز سن لو۔ دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو آیاتِ الوہیت کو دیکھ لو۔ پوری کائنات اور آیاتِ کائنات کی ترجمان زبانِ قرآن ہے۔ اسی کو پڑھ لو اور سن کر مان لو۔ اس پر بھی ایمان نہ ہوگا تو اس سے بڑھ کر کس کلام کو مانو گے۔ کس پر ایمان لاؤ گے۔ گناہگار دل اور جھوٹی زبان رکھنے والے کلامِ قدرت اور نشانِ الوہیت کا مذاق بناتے اور ہنسی اڑاتے ہیں۔ آیاتِ الٰہیہ کو سنتے ہیں اور ان سنی کر دیتے ہیں۔ پیامِ توحید کو بانے استکبار و استہزاء سے ٹھکراتے ہیں اور ان گنت لاتعداد فرضی معبودوں کی چوکھٹ پر پیشانیاں رگڑتے پھرتے ہیں۔ ایسے گناہگاروں، منکروں، صداقت و حقانیت کی ہنسی اڑانے والوں اور جھوٹے مغروروں کی سزا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ عَذَابٌ عَظِيْمٌ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، ان کے افکار باطلہ اعمال شنیعہ اور افعال کاذبہ کی سزا ان کو ضرور ملنی ہے۔ اس وقت کوئی فرضی دیوتا اور بنایا ہوا معبود کام نہ آئے گا اور کوئی بات نہ چلے گی۔ کہنے کو کہہ لو کہ اگر کوئی کائنات کا خالق اور با اختیار تنہا حاکم ہے بھی تو ہمارا اس سے کیا تعلق اور وہ ہمارے واسطے کیوں ہدایت نامہ بھیجنے لگا۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اور خارجی موجودات کو فقط پیدا ہی نہیں کیا ہے کہ پیدا کر کے بے تعلق بن کر بیٹھ جائے بلکہ اُس نے سب کا انتظام ہر آن اپنے ہاتھ میں رکھا ہے سمندروں کو تمہارے کام پر لگا دیا ہے۔ میلوں گہرا سمندر خشکی کی طرح تمہارے جہازوں اور کشتیوں کو اپنے سینہ پر چلاتا پھراتا ہے اور باوجود پانی کی رقت اور جہازوں کے ثقل کے جہاز سطح آبی پر رواں دواں رہتے اور تم کو

ایک ملک سے دوسرے ملک کو اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو پہنچاتے ہیں۔ اس طرح تم کو تجارتی منافع، ور شہر کے رہنے والوں کو دوسرے شہر کی چیزیں مل جاتی ہیں، تم سمندروں کے اندر سے موتی مونگے نکالتے، طرح طرح کے جواہر نفیسہ برآمد کرتے اور کروڑوں من مچھلیوں کا شکار کرتے ہو۔ خشکی پر رہنے والوں کے لئے سمندر کی مچھلیاں غذا بنتی ہیں۔ سمندروں سے بخارات! اٹھتے ہیں بادل بن جاتے ہیں پانی بن کر برستے ہیں۔ انسانوں کو میٹھا پانی، غلہ، پھل پھول ترکاری اور سبزہ حاصل ہوتا ہے۔ تمہاری یہ سب خدمت سمندر انجام دے رہا ہے۔ سمندر ہی پہ انحصار نہیں۔ درخشاں سورج، چمکتا چاند، جگمگاتے ستارے اور تمام معدنیات دھاتیں، جڑی بوٹیاں، آگ، ہوا، مٹی، پانی اور کل عناصر تمہارے ہی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ فکر کو کام میں لاؤ۔ غور کرو کفر نہ کرو شکر ادا کرو۔ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی اس ربوبیت کے ساتھ ملا کر شرک نہ کرو۔ اس پر بھی اگر کوئی نہیں مانتا تو نہ مانے اپنا کرنا اپنا بھرنا اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے کئے کرائے کا بدلہ دے گا اچھا یا بُرا جیسا بھی ہو گا عمل کا پھل مل جائے گا۔ اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ ان منکروں سے خواہ مخواہ کا جھگڑا نہ کریں۔ اگر یہ زیادتی بھی کریں تو درگزر کریں۔ کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ آخر سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے وہی سب کا حساب چکا دے گا۔

تحلیلِ اجزاء

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ اس سورت میں بھی گزشتہ سورت کی طرح توحید۔ الوہیت۔ نبوت اور قرآن کی صداقت پر زور دیا ہے اور معاد۔ اور نیکوں بدوں کی اچھی بری جزا سزا کو بھی بیان کیا ہے۔ مکی سورتوں میں عموماً فکری صحت پر ہی زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اعمال کی درستی عقیدہ کی صحت پر ہی موقوف ہے اکثر عبادات اور معاملات کے احکام مدینہ میں نازل ہوئے۔ عقیدہ کی سنگِ بنیاد یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اقتدارِ عام اور حکمت تام کو مانا جائے پھر یہ بتایا جائے کہ سارا عالم جس میں انسان بھی داخل ہے اپنی ہستی اور بقائے ہستی میں خالق مقتدر حکیم کا محتاج ہے۔ اور جب وجود و بقاء وجود میں انسان خدا کا محتاج ہے تو زندگی کو صحیح بنانے والی ہر تعلیم میں بھی اُسی کا ضرورت مند ہے۔ تشریعات حیات کی ساخت پرداخت کے لئے عقلِ بشری نہ کافی ہے نہ بے احتیاج۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نامہ آنا ضروری ہے۔ اور نزولِ کتاب لامحالہ کسی ایک منتخب انسان پر ہی ہونا چاہیئے، ہر شخص اس کا اہل نہیں ہے کہ عالم مجردات اور خطیرۂ قدس سے براہ راست اس کا تعلق ہو سکے، اس لئے کسی برتر انسان کا نبی ہونا لازم ہے۔ پھر انسان اپنے اعمال زندگی میں خیر و شر اور صحیح غلط میں امتیاز پیدا کرنے خیر کو اختیار کرنے اور شر سے اجتناب کرنے کا مکلف ہے، اس لئے اس کے اعمال کا اچھا بُرا بدلہ بھی ہونا چاہیئے۔ اور سزا جزا اس دنیا کی چونکہ ناکافی اور بعض لمحاتِ حیات کے اعمال کی ناممکن ہے، اس لئے جزا کا دن مستقل طور پر اس جولان گاہ عمل کے بعد آنا چاہیئے۔ پس فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکیم کی طرف سے اس کتاب یعنی قرآن کا نزول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی قدرت تامہ اور حکمت عامہ کی وجہ سے انسانوں کو زندگی کا سیدھا راستہ بتانے کے لئے یہ کتاب نازل فرمائی۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ اہلِ ایمان اور اصحابِ علم کے لئے زمین آسمان کی بناوٹ سجاوٹ وزن جذب تنگ مسافت حجم طبیعت اور خواص ولوازم کی تخلیق اور رفتار میں بکثرت عظیم الشان نشانیاں ہیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی وحدت ہستی قدرت کی ہمہ گیری حکمت کے احاطۂ کلی اور مالک مقتدر ہونے کو جان سکتے ہیں۔

وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ اور اربابِ یقین کے لئے انسان کی پیدائش اور زمین پر رینگنے چلنے پھرنے اور زندگی کا سانس لینے والے جانوروں کی ساخت و آفرینش میں بھی اللہ تعالیٰ کی عجوبہ انگیزی، ربوبیت اور الوہیت و کبریائی کی بڑی بڑی دلائل موجود ہیں۔ یعنی شک و ارتیاب اور جہالت و انانیت میں مبتلا رہنے والے لوگوں کے لئے تو کوئی دلیل بصیرت مفید نہیں ہو سکتی، لیکن جو لوگ سلیم الیقین ہیں ان کے لئے آدمیوں اور جانوروں کی ساخت و حالات کا مطالعہ اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، مالکیت، الوہیت اور وحدت کا یقین پیدا کر دیتا ہے۔

وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

—— اور رات دن کے بدلنے، شب و روز کی گردش (جو اپنے اندر ان گنت حکمتیں پوشیدہ رکھتی ہے) اور اوپر سے پانی کا برسنا جو (ہر چیز کی زندگی اور) ہر جاندار کے رزق کا ذریعہ ہے جو مردہ زمین کو زندہ کر دینے کا سبب ہے اور ہواؤں کا الٹ پھیر اور ادل بدل کر چلنا (اور اپنی اپنی تاثیرات سے کائنات عنصری کو متاثر بنانا) اللہ تعالیٰ کی حکمت، صنعت اور ربوبیت و الوہیت کی بکثرت آیات کا حامل ہے۔ (اور قیامت کو ثابت کرنے کے لیے اس سلسلۂ اسباب کی نتیجہ آفرینی اور کسی حرکت و سکون کا رائیگاں نہ ہونا کافی ہے۔ نیستی سے ہستی اور ہستی سے نیستی کی آفرینش و افزائش بتا رہی ہے کہ جب مادہ بے شعور کی کوئی حرکت بے نتیجہ نہیں اور نتیجہ اپنے مقررہ وقت پر نکلتا ہے تو انسان کے افکار و اعمال کس طرح بے نتیجہ ہو سکتے ہیں، ان کی جزا سزا بھی اپنے وقت پر ضرور ملے گی۔)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی آیات ہیں جو اے پیغمبر ہم تم کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں (اور تم پر نازل کر رہے ہیں) اگر لوگ ان آیات کا بھی یقین نہیں کرتے تو پھر اللہ تعالیٰ کے کلام کے بعد کون سا کلام ان کے لئے موجب ایمان اور یقین بخش ہوگا۔

بیان توحید کے بعد اس آیت میں جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کو ظاہر فرمایا، اور تلاوت بالحق فرما کر بتا دیا کہ تم جو کلام گوش ہوش اور سماعت حق نیوش سے سنتے ہو وہ ہمارا ہی نازل کردہ ہے نہ قوت واہمہ کا اس میں دخل ہے نہ کسی انسان یا جن یا فرشتے کی دماغی اختراع کا۔ تلاوت جبرئیل کو اپنی تلاوت فرمایا کیونکہ حضرت جبرئیل کی حیثیت ذریعہ سے زیادہ نہ تھی۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ جو بڑا گنہگار جھوٹا ان آیات الٰہیہ کو سنتا اور پھر ان سنی کر دیتا ہے اور غرور کے ساتھ اپنی ہٹ پر جما رہتا ہے (اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو سچا نہیں جانتا، جھوٹی باتیں بناتا ہے، کبھی اس کو جادو کبھی دیوانہ کی بڑ اور کبھی کہانت کے بے تکے الفاظ اور کبھی کسی انسان یا جن کا ساختہ پرداختہ کہتا ہے) ان کے لئے تباہی اور ویل ہے، آپ اس کو عذاب الیم کی بشارت دے دیں (اس کے لئے دوزخ کا عذاب ہی بشارت ہے۔)

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ اور اگر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کوئی آیت اس کو معلوم ہو جاتی ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے، ٹھٹھول بناتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب مقرر ہے اور ان کے آگے جہنم آ رہا ہے۔ جس میں ان کو ڈالا جائے گا۔

وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اور جو کچھ انہوں نے کمایا تھا (مال و دولت عزت و جاہ اولاد وغیرہ) وہ ان کے کچھ کام نہ آ سکے گا اور نہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں وہ بنائے ہوئے معبود کام آئیں گے جن کو انہوں نے اپنا کارساز و حامی قرار دے رکھا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جن لوگوں کو انہوں نے اپنا دوست اور حامی و مددگار بنا رکھا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کام نہیں آئیں گے۔ (نہ خادم مخدوم کے، نہ پیشوا اپنے متبعین کے، نہ دوست دوست کے، نہ بھائی بھائی کے، غرض جتھہ قوم لشکر حلیف معاہد دوست کوئی مدد نہ کر سکے گا) ان پر بڑا عذاب ہوگا۔

تین آیات میں عذاب کی تین صفات بیان فرمائیں۔ الیم، مہین، عظیم۔ دردناک، ذلیل کن، بہت بڑا۔ چونکہ عذاب جہنم انتہائی دکھ دینے والا ہوگا، اس لئے بطور مبالغہ الیم فرمایا اور چونکہ گناہوں سے پاک کرنے اور انجام کار عزت عطا کرنے کے لیے وہ عذاب نہ ہوگا اس لئے اس کو مہین فرمایا اور چونکہ اس میں واقعی کثرت و شدت ہوگی، اس لیے عظیم کی صفت ذکر فرمائی۔ اس آیت کا نزول اگرچہ ابوجہل کے حق میں ہوا۔ مگر ہر کافر جو مذکورہ اوصاف شنیعہ کا حامل ہو عذاب کے اس حکم میں داخل ہے حکم محدود نہیں ہے۔

هٰذَا هُدًى ۚ یہ قرآن نور مجسم اور مجسم ہدایت ہے (ماننے نہ ماننے کا ہر شخص کو اختیار ہے۔ اس کی راہنمائی کو سچا جان کر اس کی بتائی راہ پر چلے گا کامیاب ہوگا)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ اور جو اللہ تعالیٰ کے کلام کو جھوٹا کہیں گے یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام ہی نہ مانیں گے

(یا اللہ تعالیٰ کا کلام جانتے ہوئے اس کو غلط قرار دیں گے) اُن کے لئے سخت دردناک عذاب مقرر ہے۔

رجز کا معنی ہے سخت ترین عذاب۔ اس صورت میں عذاب سے مراد ہوگا عذاب کا ایک حصہ یعنی سخت دردناک عذاب مقرر ہے۔

اللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ اس سورت میں سب سے پہلے ایجادِ عالم اور تخلیقِ انسانی کو پیش کر کے توحید کو ثابت کیا اور اسی سلسلہ میں نبوت، نزولِ کتاب اور معاد کو متفرع کر کے منکرین متکبرین کے عذاب کا ذکر فرمایا۔ اب ربوبیتِ خصوصی کا ذکر فرما کر انسان پر اپنے احسان کا اظہار فرماتا ہے تاکہ لوگ اس کے احسان کا شکر ادا کریں اور ہر نعمت کو عطیۂ خداوندی یقین کر کے دوسروں کو رزاق اور قاضی الحاجات نہ قرار دیں۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو انسان کی خدمت پر مامور کر دیا۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے حکم سے جہاز اور کشتیاں سمندر پر رواں دواں ہوتی ہیں۔ پانی کا مرکزِ ثقل نیچے کی طرف ہے اور ہر چیز اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جہاز بنانے سکھائے اور ہوا کو حکم دیا کہ جہاز کو ہر طرف سے اُٹھائے رکھے اور سمندر کو حکم دیا کہ لاکھوں ٹن وزن سے لدے ہوئے بڑے جہازوں کو اپنی تہ کی طرف نہ کھینچے۔ یہ سمندر کا طبعی تقاضا نہیں اور طبعی تقاضا ہو تب بھی طبیعت اور لوازمِ طبیعت پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۲) جہازوں اور کشتیوں میں سوار ہو کر انسان سفر کرتے ہیں۔ ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملک والوں تک پہنچ جاتی ہے، سوداگروں کو نفع ہوتا ہے۔ کچھ لوگ سمندر کے اندر سے موتی مونگے اور طرح طرح کی چیزیں نکال لیتے ہیں جو دوا اور زینت اور دوسرے کاموں میں آتی ہیں۔ کروڑوں مچھلیاں انسان کی غذا بنتی ہیں اور اس طرح آدمیوں کے بقاءِ زندگی کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

(۳) جب اللہ تعالیٰ اتنا بڑا مہربان ہے کہ اُس نے اپنی غیبی کارسازی سے انسان کے زندہ رہنے کا ایسا عظیم الشان انتظام کر رکھا ہے تو ظاہر ہے کہ کسی وقت بھی آدمی اُس کے خوانِ نعمت سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کا تقاضا ہے کہ اُسی کو اپنا معبود واحد سمجھے اور اُسی کا شکر گزار رہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔ اور سمندر ہی پر کچھ منحصر نہیں بلکہ اُس نے ساری علوی اور سفلی کائنات کو انسان کے کام پر لگا دیا ہے۔ آدمی کی علمی رسائی بہت کم ہے اور اس کو معلوم بھی نہیں کہ کیا کیا چیزیں کس کس طرح اُس کی خدمت میں مشغول ہیں۔ آسمان پر چاند سورج ستارے اور سیارے علاوہ ہیں شہاب ثاقب کہربائی لائن اور ساری فضائی کائنات اپنے رنگ، تاثیر، وزن، خصوصیات اور حرکات کو آدمی کی خدمت کے لئے وقف کئے ہوئے ہے۔ زمین کی ساری قوت روئیدگی اور سبزہ کی بالیدگی اور معدنیات [illegible] کی پوشیدگی اور کل دوائیں پھل غذائیں اور تمام حیوانات بحری، دریا اور آبشاریں انسان ہی کی خدمت پر کمربستہ ہیں، مگر جس طرح آدمی کسان کا ئناتی طاقتوں کے اکثر حصے پر قابو نہیں بلکہ علم بھی نہیں کہ کیا کیا قوتیں اس کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرح یہ مخلوق بھی اپنے ارادہ اور اختیار سے نہیں بلکہ خالق قاضی الحاجات اور رب کارساز کے حکم سے انسان کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اصحابِ فکر اگر فکر سے کام لیں تو "ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار" ہر حرکت و سکون اور ظہور و خفا میں اُن کو اللہ تعالیٰ کی وحدتِ حکمرانی اور بے پایاں رحمت و کارسازی کی لاکھوں نشانیاں نظر آئیں گی۔

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ رجاء کا حقیقی معنی ہے امید [illegible] لیکن بطورِ مجاز اس جگہ خوف کا معنی مراد ہے یعنی جو لوگ اُن حوادث سے نہیں ڈرتے جو اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں پر نازل کرتا ہے یا اُن اوقات سے نہیں ڈرتے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کو تباہ اور مسلمانوں کو فتحیاب کرنے کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔ (بیضاوی)

مکہ میں اہلِ شرک مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ پہنچاتے اور سخت ترین ایذائیں دیتے تھے اور مسلمانوں میں انتقام و جنگ کی طاقت نہ تھی، اس لئے حکم دیا کہ اُن کافروں سے جو اللہ تعالیٰ کے اوقاتِ انتقام اور وقائعِ غضب سے نہیں ڈرتے (بالفعل) درگزر کریں تاکہ اللہ تعالیٰ خود ان کافروں کو سزا دے (مطلب یہ کہ اپنا انتقام خود نہ لیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور ظاہر ہے کہ انسان کا انتقام ناقص اور بعض

وقت ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کا انتقام ہر وقت کامل طور پر ممکن ہے ، لیکن اُس نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے ۔ ایام اللہ یعنی دشمنوں کو تباہ کرنے کے اوقات یا وہ اسباب ہلاکت جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے مقرر کر دیئے ہیں وہ ضرور آئیں گے)

جہاد کا حکم مدینہ میں نازل ہوا اور یہ آیت مکی ہے ، اس لئے اکثر اہل تفسیر نے آیت قتال سے حکم مغفرت کو منسوخ قرار دیا ہے بعض نے کہا جہاد ذاتی انتقام کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے کفر کی طاقت توڑی جاتی ہے ، اس لئے وہ اپنی جگہ حکم ہے اور اس آیت میں ذاتی انتقام سے درگذر کرنے کا حکم دیا ہے ۔ یہ بھی اپنی جگہ غیر منسوخ ہے ، مگر یہ قول ضعیف ہے ۔ ذاتی انتقام اگر عدل کے ساتھ ہو تو اس کی شرعاً اب بھی اجازت ہے ، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مکی زندگی میں مسلمان کمزور تھے ، اس لئے درگذر کا حکم دیا اور اب بھی جہاں مسلمان مکی زندگی کی حالت میں ہوں تو درگذر ہی مناسب ہے ، اس لئے مغفرت اور درگذر کا حکم زمان ومکان کے ساتھ مشروط ہے ۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۔ اس آیت کا مضمون سابق آیت کے مضمون سے معنوی ربط رکھتا ہے اور مستقل ضابطہ بھی ہے ۔ مطلب کہ جو نیکی کرے گا اپنے لئے کرے گا اور جو بدی کرے گا اپنے لئے کرے گا ۔ (یعنی نیکی بدی کرنے والے کو اپنے کئے کی جزا سزا تو ضرور ملے گی ، لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض نیکیاں اور بدیاں متعدی ہوں اور دوسروں کو اُن کے کرنے نہ کرنے کا عذاب یا ثواب پہنچ جائے ۔ متعدی نیکی کرنے والے کو اپنے کرنے کے علاوہ دوسروں کے کرنے کا ثواب اور متعدی بدی کرنے والے کو اپنے کئے کے علاوہ دوسروں کے اس راہ پر چلنے کا عذاب ہو ، مگر کرنے والے کے ثواب عذاب میں اس سے کمی نہیں آئے گی) اور سب کو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (اس لئے یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ کیا کرایا مٹ جائے گا یا مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہی نہ ہوگی تو جزا سزا کیسے ملے گی)

مقصود بیان آغاز سورت سے تُرْجَعُوْنَ تک مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑ رہی ہے (۱) آیات کائنات پر غور کی نظر ڈالنا اور طبیعیات وتغیرات کا فہم آنکھیں عبرت اندوز مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ مسائل طبعیہ سے فوق الطبیعیات پر استدلال کرنا ضروری ہے ۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی وصفاتی کا انکشاف ہو اس سے معلوم ہوا کہ خالص الٰہیاتی بحث اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی چگونگی کا تجزیہ کرنا درست نہیں بلکہ ذات وصفات کو سمجھنے کے لئے کائنات مادیہ کا مطالعہ ضروری ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحقیقات سائنس اور طبعی ریسرچ دہریت کی طرف نہیں اقرار خدا اور توحید الوہیت کی طرف لے جاتی ہے ۔ بشرطیکہ عقل توہم آمیز نہ ہو بلکہ عقل کے ساتھ ایقان اور ایقان کے ساتھ جذبۂ ایمان بھی ہو ۔

(۲) اگر خمیر میں گناہ گاری رچ گئی ہو تو گوش ہوش بند ہو جاتے ہیں اور آدمی آیات الٰہیہ کو سن کر بھی ان سُنی کر دیتا ہے ۔ پیام حق کی تکذیب کرتا ہے اور غرور کے ساتھ اپنے نقشۂ زندگی پر جما رہتا ہے ۔

(۳) قرآن کریم اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور سراسر ہدایت ہے

(۴) بر و بحر اور ساری کائنات پست وبلند کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی (روحانی جسمانی) خدمت پر لگا دیا ہے

(۵) طلب معاش اور تحصیل منافع کے لئے بحری سفر جائز ہے ۔

(۶) مال ومعاش اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کی طلب وتحصیل ضروری ہے

(۷) اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا تقاضا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے ۔

(۸) اگر کفار کا غلبہ ہو اور مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں دکھ پہنچ رہا ہے اور مقابلے کی طاقت نہ ہو تو انتقام سے درگذر کرنا چاہیئے ۔

(۹) جو شخص جیسا کرے گا ویسا بھرے گا وغیرہ ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (یعنی علم اور احکام) اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

اور ہم نے انکو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ

الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

آپس کی ضد اضدی کے آپ کا رب اُن کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں (عملی) فیصلہ کرے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیے یہ لوگ

لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ

خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے اور ظالم ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا یہ قرآن عام لوگوں کے

الْمُتَّقِيْنَ ۝ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین (یعنی ایمان) لانے والوں کے لئے بڑی رحمت (کا سبب) ہے

تفسیر حضرت ابراہیمؑ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اقوام عالم میں سے ایک زمانہ تک اسرائیلی نسل کو اپنی دینی اور دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرماتا رہا۔ بنی اسرائیل میں سے اپنے سینکڑوں منتخب بندوں کو نبوت بھی عطا فرمائی۔ متعدد صحیفے اور کتابیں بھی ان پر نازل کیں، سب سے بڑی ام الکتاب اور فرقان یعنی توریت حضرت موسیٰؑ پر اتاری جس کو شریعت اسرائیلی کی جڑ بنایا اور اپنے احکام کھول کھول کر اس میں بیان کیے۔ دنیوی اقتدار بھی عنایت کیا کہ طالوت حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور بہت پیغمبروں کو قوت حاکمہ بھی مرحمت کی اور بہتوں کو بادشاہ بنایا، لیکن بندگان حرص و ہوا اور شیفتگان آزوریا جاہ پسندی یا اقتدار پرستی کے زیر اثر آپس ہی میں لڑنے لگے۔ دین کی طلب صادق نے ذاتی عناد کی شکل اختیار کر لی۔ ایک گروہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گیا اور ہر گروہ کا پیشوا اپنی اور اپنے گروہ کی نفسانی خواہشات کے سانچے میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کو ڈھالنے لگا۔ حق گم ہو گیا۔ صداقت کھو گئی۔ دینداری کا نام رہ گیا۔ مغز معدوم ہو گیا۔ حق کا راستہ دکھانے اور روح شریعت سے واقف بنانے اور اخلاقی رہنمائی کا صحیح فیصلہ کرنے کے لئے متعدد پیغمبر آئے، مگر شیفتگان سیادت و امارت نے سب کو ٹھکرا دیا کسی کی تکذیب کی اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں سے اپنی نعمت ہمیشہ کے لئے چھین لی نہ سیادت رہی نہ حکومت نہ عزت نہ نبوت۔ اسرائیلی دور ختم ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنا اعلیٰ قدر عظیم الشان پیغمبر مبعوث فرمایا جو سید الانبیاء کہلانا اور اس پر وہ آخری کتاب نازل فرمائی جو تمام سابق کتابوں کی ناسخ تھی (یعنی افکار و عقائد کی درستی اور اصول اعمال کی اصلاح

ضابطے تو اس کے اندر وہی تھے جو اسرائیلی کتابوں کے تھے ۔ مگر زمان و مکان کے تغیر کے زیر اثر جزئیات احکام و عبادات میں سب سے الگ تھی اور کتب سابقہ کی تعلیم ماضی کی ہی اصلاحی شکل تھی) اور حکم دیا کہ اس شریعت پر سب کو چلنا چاہیے ۔ اس اعلان کی زد دو گروہوں پر پڑ رہی تھی ۔ ایک گروہ کفر و شرک کا جس نے فرضی دیوتا اور معبود رکھے تھے جس کے پاس نہ اللہ تعالیٰ کی کتاب تھی نہ دلیل و فہم ۔ دوسرا گروہ اسرائیلی اہل کتاب کا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنی خواہشات کا تابع بنا لیا تھا ۔ دونوں گروہوں کے شخصی اور گروہی مفاد کو چونکہ قرآن مجید کی تعلیم سے نقصان پہنچنے کا یقین تھا ، اس لئے دونوں متفق الرائے ہو کر مخالف ہو گئے اور ہر ناحق کوشش دوسرے حق فراموش کا دوست اور ساتھی بن گیا ۔ کسی کی مخالفت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی ۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا پیغمبر تھا اور اس کا متقی گروہ تھا جس کا حامی اور ناصر اللہ تعالیٰ تھا ۔ دوسری طرف ظلم پسند طاقتوں کی جمعیت تھی جن کے ساتھ ہوا و ہوس اور نفس پرستی کا لشکر تھا ۔ قرآن نے صراط مستقیم سارے انسانوں کو بتا دی ، مگر زیادہ گروہ اس راستے پر چلنے کیلئے تیار نہ ہوا ۔ ہاں کچھ اہل یقین ایسے بھی ہوئے جو قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو گئے اور قرآن ان کے لئے دنیوی اور دینی مفاد کا ضامن بن گیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہو گئی ۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی کتابیں عطا فرمائی تھیں اور حکومت یا حکمت بھی عنایت کی تھی اور ان میں بکثرت پیغمبر بھی مبعوث فرماتے تھے اور پاکیزہ چیزیں یعنی عمدہ نعمتیں بھی مرحمت کی تھیں اور اس زمانے کے سارے انسانوں پر برتری بھی دے کر سرفراز فرمایا تھا ۔

کلام کا سیاق بتا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کی صداقت کو مدلل طور پر بیان کر کے کافروں کو خاموش کرنا اور مسلمانوں کو بشارت دینا مقصود ہے کہ نبوت اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔ بنی اسرائیل کو بھی اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت کتاب اور حکومت عطا فرمائی تھی ، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عطا ان سے چھین لی اور اسماعیلیوں میں پیغمبر بھیجا اور کتاب نازل کی

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ ہم نے ان کو معجزات و کرامات بھی عطا کی تھیں (کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرماں بردار بندے صاحب کشف و کرامات بھی ہوتے تھے اور لوگوں کو ہدایت کرتے تھے) یا بینات سے مراد ہے دین کے واضح احکام اور ضابطے یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق بشارتیں ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کتابیں اور حکومت اور مال و دولت ملنے کے بعد ہوا پرستی ان پر مسلط ہو گئی اور محض عناد و فساد کے زیر اثر ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی ۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے لگے ۔ ہر عالم شریعت گر بن گیا اور گروہ در گروہ ہو گئے اور پھوٹ پڑی جو قیامت تک ان کو ایک محکم فیصلے پر جمع نہ ہونے دے گی اور ان اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی کرے گا

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔ یعنی حسب ضابطہ مشیت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اپنی نعمت چھین لی اور آپ کو نبی بنایا اور دین کا راستہ دکھایا ۔ اب آپ اس راستہ پر چلیں (اور جو لوگ آپ کے ساتھ اس راستہ پر چلنا چاہیں وہ بھی چلیں) ان (مشرکوں اور اہل کتاب) نادانوں کے میلان طبع اور خواہشات کی پرواہ نہ کریں ۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کی کچھ نہیں چلے گی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ سارا حق کش گروہ متحد ہے ، ایک دوسرے کا حامی ہے ، مگر نفس پرستی ، شرک اور نافرمانی سے بچنے والوں کا اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہے ۔ اس کی حمایت و مدد کے مقابلے میں ان کی اجتماعی طاقت کچھ کام نہ دے گی ۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى تمام لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی یہ کتاب مجموعۂ بصیرت و ہدایت ہے سب کو فکری و عملی راہ نجات بتانے والی ہے۔

وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ مگر رحمت انہی لوگوں کے لئے ہے جو اس کی ہدایتوں کو مانتے ہیں اور حقانیت کا یقین رکھتے ہیں (کافروں کی گندگی تو آفتاب کی اس روشنی اور اس رحمت کی بارش سے اور بڑھے گی۔ ان بیچاروں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا)

مقصودِ بیان بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت حکومت اور اپنی کتابیں، صحیفے اور واضح ضابطے اور احکام عنایت کئے مگر انہوں نے نعمت کی قدر نہ کی اور علماء نے محض عناد اور دنیا طلبی کے جذبہ کے زیر اثر آپس میں پھوٹ پیدا کر لی۔ اس واقعہ کو نقل کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے کتاب عنایت کی اور نبوت سے سرفراز کیا۔ اور واضح احکام اور محکم ضابطے بنا دیئے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر نہ چلیں۔ آپس میں پھوٹ پیدا نہ کریں۔ قرآن کو اپنی ضد ہٹ اور عناد کے سانچے میں نہ ڈھالیں ورنہ یہ اختلاف پھر قیامت تک نہیں مٹے گا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اس پُر مغز اشارہ کے مفہوم کو بھلا دیا آخر جو نتیجہ بنی اسرائیل کا نکلا اسی سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ علماء کے درمیان تکفیر و تفسیق کی مشین چل گئی۔ فرقے فرقے بن گئے۔ ہر ایک نے دوسرے کو کافر و فاسق کہا، حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر جزیرہ میں ایک امیرالمومنین اور خلیفۂ رسول اللہ بننے کا مدعی بن بیٹھا۔ علماء نے امیروں کی خواہشات بلکہ اپنی سیادت طلبی کے سانچے میں قرآن وحدیث کو ڈھالنے کی کوشش کی حالانکہ فَاتَّبِعْهَا فرما کر حکم دیا گیا تھا کہ اس دین کے راستے پر چلنا، مگر علماء و امراء بھٹک گئے۔ خدا پرست ہونے کی جگہ نفس پرست بن گئے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر انہوں نے دوسرے غیر مسلم نادانوں کی پیروی کی، ان کی تہذیب، رسم و رواج بلکہ افکار اور طرز انکار کو اختیار کیا۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وہ تو باہم متحد اور مددگار تھے۔ سب ظالم اور حق شناس تھے۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلے پر متحد ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمایت کے بھروسے پر ثابت قدم رہنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ خود ان کے دوست بن گئے اور اپنوں کے مخالف ہو گئے۔ نتیجہ میں اسرائیلیوں کی طرح تباہ ہوئے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى سے ثابت ہو رہا ہے کہ دعوت قرآنی عام ہے اور اس کی تبلیغ عمومی ہے، مگر رحمت صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ بشرطیکہ وہ اہل ایمان ہوں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

یہ لوگ جو بُرے بُرے کام کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور صالح عمل اختیار کیا

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ع وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

ع ۱۰ / ۱۸

کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے یہ بُرا حکم لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت

بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ

کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور اُن پر ذرا ظلم نہ کیا جائے گا سو کیا آپ نے اُس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے

هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً

اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے اور خدا نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی

فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ

آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے، کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے اور دلبث کے منکر یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس

وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ وَاِذَا

دنیوی حیات کے اور کوئی حیات نہیں ہے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ (کی گردش) سے موت آجاتی ہے اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل

تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

نہیں ہے محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں اور جس وقت (اس بارہ میں) ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کا (اس پر) بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع ۳ ۱۹

کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کو زندہ کر کے سامنے لے آؤ اگر تم سچے ہو آپ یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو زندہ رکھتا ہے پھر تم کو موت دیگا پھر قیامت کے دن جس کے آنے میں ذرا شک

تفسیر سارے جہان کی زندگی کا یہ کارخانہ اللہ تعالیٰ نے عدل پر قائم کیا ہے۔ زمین اور موجودات زمین آسمان اور کائنات آسمان فضا اور مخلوقات فضائیہ سب عدل کے ساتھ اپنے اپنے مرتبہ اور مقام پر قائم ہیں۔ آگ کے اندر پانی کی خاصیت نہیں۔ ہوا کے اندر زمین کا سا جمود نہیں۔ سیب کے درخت سے انار نہیں پیدا ہوتا اور گل لالہ سے گلاب کی خوشبو نہیں آتی۔ ہر نوع کا پرندہ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور ہر چرندہ اپنے امتیازات۔ سورج کے اندر چاند کی خنکی اور سرور آگیں نہیں اور چاند کے اندر سورج کی تمازت اور خیرگی آفریں چمک دمک نہیں۔ ہر سیارے کی راہ جدا ہے اور ہر ستارہ کی خصوصیت الگ۔ کوئی بھی دوسرے کی خصوصیات آثار اور کیفیات اور نتائج سر اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا۔ بس اسی طرح نیکی بدی، ایمان کفر اور خیر و شر جدا جدا اپنی خصوصیات کی حامل ہیں۔ زندگی ہو یا موت، ہر خیر و شر کا ہر دور حیات و ممات میں نتیجہ جدا جدا ہے۔ دونوں ایک نتیجہ کی حامل ہوں تو توازن بگڑ جائے، نظم عالم تباہ ہو جائے۔ حرکت ارادی ہو یا اضطراری بہر حال اپنے مخصوص نتائج اپنے ساتھ لاتی ہے اس میں طبعی اور ارادی نوعیت کا اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا۔ پس ہر شخص کو اپنے عمل و فکر کے نتیجہ کا سامنا کرنا ہے۔ زندگی یا موت میں مومن و کافر ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ جس کے گوش ہوش بند ہوں۔ چشم بصیرت پر پردہ پڑا ہو اور عقل سلیم زنگ آلود ہو اور وہ صرف اپنے حیوانی جذبات اور نفسانی خواہشات کا پرستار ہو وہ بیدار دل رکھنے والے بصیرت مند اور نصیحت پذیر اہل ایمان کی طرح کس طرح ہو سکتا ہے جس کو ہدایت کی تصویر دیکھنے کی چشم بینا اور صدائے حق سننے والے گوش شنوا اور حق کو سمجھنے والی عقل روشن نہ ملی ہو اس کو ہدایت کی صورت کون دکھائے اور حق کی آواز کون سنائے اور حقیقت صداقت کون سمجھائے۔ اس کے یقینی نظر تو یہی حسی زندگی ہے۔ وہ کہتا ہے جب تک اس چراغ میں تیل رہے گا چراغ روشن رہے گا تیل ختم ہو جائے گا چراغ اپنی طبعی موت مر جائے گا۔ زمانہ کی یہی رفتار ہے آدمی آتا ہے بڑھتا ہے گھٹتا ہے مر جاتا ہے ہو گیا۔ گیا۔ پھر لوٹ کر آتا نہیں۔ سیال میں سر

کی طرف نہیں لوٹتی۔ یہ نادان صرف تشبیہات اور تمثیلات سے کام لے کر برہان عقلی کی ترتیب دینا چاہتا ہے اور گمان کو یقین کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کہتا ہے لاکھوں اسلاف گذر گئے۔ تمام باپ، دادا مر گئے۔ وہ کہاں ہیں اگر دوبارہ آنے والے ہوتے تو آ جاتے۔ دوبارہ جی جاتے۔ مردوں کو بلا کر لاؤ اور زندہ کر کے لا کھڑا کر دو تو جانیں۔ یہ ظن نہیں تو کیا ہے غیر موجود کو ناممکن الوجود قرار دینا توہم نہیں تو کیا تعقل ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ دار العمل کمل دار الجزاء نہیں کہ مردے دوبارہ آ جائیں۔ ہاں ایک دن ضرور آئے گا کہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور دوبارہ زندہ کر دیئے جائیں گے۔ لاریب فیہ وھو الحق۔

تحلیلِ اجزاء

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ سابق آیت پر مسئلہ نبوت کا مدلل بیان ختم ہو گیا اور نبوت کی ضرورت ثابت ہو گئی اور یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ قرآن کریم کی ہدایت اگرچہ عمومی ہے لیکن رحمت صرف اہل یقین کیلئے ہے اس پر بعض نادان کہنے لگے کہ بدکاری اور نیکو کاری چیز ہی کیا ہے نہ کسی کی سزا ہے نہ جزا۔ بس زندگی ہی ہے جو چل رہی ہے۔ آئندہ کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔ پیدائش اور موت زمانے کی رفتار کا ایک سلسلہ ہے۔ باپ کے بعد بیٹا آتا ہے، اسلاف جاتے ہیں اخلاف ان کے جانشین ہوتے ہیں۔ اگر آباء و اجداد لاکھوں برس گذرنے کے بعد بھی اب تک دوبارہ زندہ نہ ہوئے تو اخلاف بھی مرنے کے بعد کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ ماضی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس پورے مسئلہ کی مدلل توضیح یہاں آخر رکوع تک فرمائی ہے فرماتا ہے

کیا ان بدکاروں اور گناہ کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ ہم نیکو کار اہل ایمان کے ہم پلہ رہیں گے کہ مومن و کافر اور نیک و بد کی زندگی اور موت برابر ہو جائے گی۔ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نیکوں کی زندگی بھی صاف ستھری ہوتی ہے اور موت بھی اعلیٰ بحالت اطمینان۔ (ابن عباس) کہ مرنے کے وقت رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور بدوں کی زندگی بھی بری (غیر مطمئن و طبع بے چین روح، گندے اعمال، ضرر رساں اقوال و اطوار) اور موت بھی بری (کہ عذاب کے فرشتے چوروں کی طرح ان کو گرفتار کرتے اور طرح طرح کے دکھ دیتے ہیں) ان کا یہ فیصلہ برا ہے (خلاف عدل ہے)

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور اللہ تعالیٰ نے تو تمام آسمان زمین یعنی سارا جہان عدل کے ساتھ بنایا اور قائم رکھا ہے (اگر عدل و توازن نہ ہو تو سارا عالم تباہ ہو جائے) اور اس لئے بھی بنایا ہے کہ (انسان کو اچھے برے کی پہچان ہو اچھائی کو اختیار کرے اور برائی سے بچے اور) ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا کسی کی حق تلفی نہ کی جائے گی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ نیک و بد اور مومن و کافر برابر ہو جائیں یہ تو خلاف عدل ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ بھلا دیکھو تو جس شخص نے اپنا معبود اپنی خواہش نفس کو بنا لیا۔ یعنی اپنے نفس کا پرستار ہے۔ حیوانی خواہشات کی تکمیل اس کا مقصد زندگی ہے۔ جائز ناجائز اور ظلم و انصاف سے اس کا تعلق نہیں۔

وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جان کر گمراہ کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس کی روح میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس کی سرشت ہی حیوانی ہے۔ فطری طور پر اس کی روح ہی زنگ آلود ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اس کو سمجھ دی تھی کہ اچھے برے اور خیر و شر کو پہچان لے، مگر اس نے اپنی فطری صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہ کر دیا۔

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ حق و باطل میں امتیاز کرنے اور صحیح علم حاصل کرنے کے تین ہی ذرائع ہیں اگر دماغ میں سمجھنے کی متوسط استعداد ہے تو آدمی محسوسات کو دیکھ کر خیر و شر کا امتیاز کر سکتا ہے۔ واقعات حاضرہ اپنے اندر درس نصیحت رکھتے ہیں۔ آنکھوں میں بصارت اور بصارت کے پیچ میں بصیرت

ہونی چاہیئے تاکہ دیکھی ہوئی چیزوں کو ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔ اگر دماغی صلاحیت اور قلب کی روشنی بہت ہی اعلیٰ ہے تو بیرونی صورتوں اور آفاقی دلیلوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ عقلِ سلیم اور فطرت سادہ راہنمائی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اگر عقلی جوہر خود کی راہنمائی کے لئے کافی نہ ہو اور استقرائی آفاقی دلائل کو سمجھنا اور ان سے نتیجہ اخذ کرنے کی بھی استعداد نہ ہو تو پھر اہلِ حق کا کلام اور خیر خواہ اہلِ دانش کی نصیحت سن کر اور ذہن میں اُس کا اثر لے کر راہِ راست اختیار کی جا سکتی ہے، لیکن علم کے اگر یہ تینوں ذرائع معدوم ہوں تو پھر حق و باطل میں امتیاز کرنے اور راہِ راست پانے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے فرمایا کہ جس نے اپنی حیوانیت کو معبود بنا لیا ہو (انسانیت سے اس کا تعلق نہ رہا ہو) کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہو کہ حق بات ہی نہ سُنے اور سنی ان سنی کر دے اور دل پر قفل لگا دیا ہو کہ خود اپنی دانش و فہم سے کام لے کر اچھے بُرے کا امتیاز ہی نہ کر سکتا ہو اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو کہ تصویرِ حق ہی اس کو نظر نہ آئے۔

فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو اب اللہ کے گمراہ کرنے اور گمراہ چھوڑ دینے کے بعد اس کو کون ہدایت دے سکتا ہے کون راہِ راست پر چلا سکتا ہے (نہ اُس کو قرآن اور پیغمبر سے فائدہ نہ خود چشمِ بینا نہ عقلِ رسا تو ہدایت یابی کا امکان ہی کیا ہے)

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس زندگی تو یہی ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ ہم مرتے ہیں پیدا ہوتے ہیں (یہ تو طبعی چکر ہے نیچرل رفتار ہے) زمانہ ہی ہم کو ہلاک کرتا ہے (یعنی زمانہ کی رفتار ہی یوں ہے کہ اسلاف جاتے ہیں اخلاف آتے ہیں۔ آباء و اجداد کی جگہ ان کی اولاد لیتی ہے) ان لوگوں کو زمانے کا علم ہی نہیں فقط تخمینی گھوڑے دوڑاتے ہیں (اٹکل چلاتے ہیں۔ زمانہ کیا ہے باشعور اور خود مختار ہے یا ایک موہومی چیز موجود نہیں ہے یہ ماضی اور حال اور مستقبل کا چکر کیا ہے۔ اس کے اندر کون طاقت حکمراں ہے۔ اس نظام کا ناظم کون ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ زمانے کا ردّ و بدل کرنے والا اور رات دن کا چکر چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے ورنہ زمانہ بجائے خود کوئی چیز نہیں ہے)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں (اور سزا سے ڈرایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ایک دن تم کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو) کہتے ہیں اگر تم سچے ہو اور سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لا کھڑا کرو (اور جب اسلاف لاکھوں برس گزرنے کے بعد بھی اب تک دوبارہ پیدا نہیں ہوئے اور نہ تم ان کو زندہ کر کے لا سکتے ہو تو پھر دوبارہ زندگی ملنے کا قول ہی غلط ہے۔ مشاہدہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ماضی اور حال مستقبل کا آئینہ ہے۔)

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ روز روز مردے زندہ نہیں کئے جاتے نہ اُس دار العمل کو کامل دار الجزاء بنایا جا سکتا ہے زمانہ وانہ کچھ نہیں، (نہ وہ پیدا کرتا ہے نہ مارتا ہے بلکہ) اللہ تعالیٰ ہی تم کو پیدا کرتا اور مارتا ہے پھر وہی قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا اور سب کو جمع کر دے گا، جس اٹھنے کا ایک دن مقرر ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نادان ہیں (وہ یقین نہیں رکھتے کہ دوسری زندگی بھی کبھی ملے گی اور وہ ضرور آئے گی اور اعمال کی جزا سزا بھی برداشت کرنی ہوگی۔)

مقصودِ بیان نیکوں کو بدوں کے برابر کر دینا خلافِ عدل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد جو امتیاز ہوگا وہ تو ہونا ہی چاہیئے ضرور ہوگا۔ دنیاوی زندگی میں بھی فرق ہے۔ مومن کی زندگی مطمئن ہے کیونکہ اس کی نظر اسباب پر نہیں مسبب پر ہے۔ پردۂ غیب کے اندر تار گھمانے والا ہاتھ اس کو دکھتا ہے اور کافر کی زندگی روحانی سکون سے بے بہرہ ہے دولت مال صحت جسمانی آل و عیال کی کثرت دنیوی وجاہت و سیادت اور ملکی حکومت اس کی روحانی پیاس کو نہیں بجھا سکتی۔ لہٰذا مسلمان کتنا ہی نادار اور مصائب کا شکار ہو اس کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا اور دل کو مطمئن رکھنا چاہیئے۔ اطمینانِ قلب کے بعد ہر مصیبت پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ رکھے گی۔

بالحق کا لفظ بتا رہا ہے کہ کائنات کی تخلیق عدل و توازن پر مبنی ہے اگر توازن بگڑ جائے تو تباہی آ جائے۔
اضلہ اللہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ گمراہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے یعنی اسباب گمراہی اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کئے ہیں۔ بیرونی اور اندرونی ہدایت و دواعی اللہ تعالیٰ ہی نے بنائے ہیں، مگر گمراہی کو اختیار بندہ کرتا ہے اور اپنی خواہش کی پوجا آدمی خود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فعل تکوینی ہے اور انسان کا عمل کسبی و اختیاری۔
فمن یہدیہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت یاب نہ کرے تو پھر کسی کی راہنمائی ہدایت یاب نہیں کر سکتی۔ دل کو پلٹ دینا سوائے اللہ کے کسی کا کام نہیں۔
وما یہلکنا الا الدھر میں نادان کافروں کی غلطی کو تباہی کا اظہار ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے ان مسلمانوں کو جو اپنے ہر دکھ سکھ کی نسبت زمانہ کی طرف کرتے ہیں اور نصیحت حاصل کرنا چاہیئے ان مادہ پرستوں کو جو سلسلہ اسباب پر اپنی نظر محدود رکھتے اور خیر و شر کے توارد کو اسباب کا نیچرل نتیجہ قرار دیتے ہیں۔
قل اللہ یحییکم میں اللہ تعالیٰ کے فاعل حقیقی ہونے کی صراحت ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیوی زندگی اور موت ہو یا قیامت کے دن کی دوسری زندگی سب کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ زمانہ کا چکر نہیں۔
لاریب فیہ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں ہی نیکی بدی کا کامل نتیجہ نہیں ملتا۔ یعنی تناسخی چکر کا عقیدہ غلط ہے نہ صرف روحانی دکھ سکھ کافی ہے بلکہ سب کے جی اٹھنے کا ایک مقرر دن ضرور آئے گا اور اصل جزا سزا اس دن ملے گی۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

اور اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ

(اس روز) آپ ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ (مارے خوف کے) زانو کے بل گر پڑیں گے ہر فرقہ اپنے نامۂ اعمال (کے حساب) کی طرف بلایا جائے گا آج تم کو تمہارے

تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

کئے کا بدلہ ملے گا (اور کہا جائے گا کہ) یہ (نامۂ اعمال) ہمارا دفتر ہے جو تمہارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہے اور ہم (دنیا میں) تمہارے اعمال کو

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝

فرشتوں سے لکھواتے جاتے تھے سو جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا

اور جو لوگ کافر تھے (ان سے کہا جائے گا) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے (ان کو قبول کرنے سے) تکبر کیا تھا اور تم (اس وجہ

مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا

سے) بڑے مجرم تھے اور جب (تم سے) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے

نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ○ وَبَدَا لَهُمْ

قیامت کیا چیز ہے محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں اور (اس وقت) ان کو اپنے

سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ

تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آ گھیرے گا اور (ان سے) کہا جائے گا کہ آج

كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ

ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور (آج) تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں یہ (سزا) اس وجہ

اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا

سے ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیوی زندگانی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا سو آج نہ تو یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے

هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ

اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا سو تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا پروردگار

الْعٰلَمِيْنَ ○ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

تمام عالم کا اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے

تفسیر سارے سنسار پر حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ ہر آن اور ہر سیکنڈ کا نظم اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر لحظہ تکوینی تغیرات اس عالم میں ہو رہے ہیں، لیکن ایسا انقلاب جس سے یہ نظام کلی یکسر بدل جائے ابھی تک نہیں آیا، مگر ظاہر ہے کہ جو سارے جہان کا حکمران مطلق اور ناظم و مالک ہے اور ہر وقت ہر چیز میں تغیر پیدا کر رہا ہے وہ بالکل الٹ پلٹ بھی کر سکتا ہے۔ انسانی کردار بھی عدم سے وجود میں آنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو لوحِ کائنات پر ثبت کر دیتا ہے اور قلمِ قدرت سے لکھ دیتا ہے کہ کچھ اعمال کے نتائج بسلسلۂ اسباب نمودار بھی کر دیتا ہے، مگر چونکہ انقلاب کلی کا ابھی وقت نہیں آیا، اس لئے لوحِ ثابت ابھی سامنے نہیں لائی جاتی اور کل اعمال کی حساب فہمی مؤخر رکھی جاتی ہے پس قیامت عالم کا ایک دن ضرور آنا ہے جو لوگ باطل پرست ہیں ان کو خسران کامل اٹھانا پڑے گا اور جو لوگ حق پرست ہیں وہ کامیاب ہوں گے۔ پس لائق ستائش ہے وہ اللہ جس نے حکمت اور مصلحت کے ساتھ اس نظم تکوینی کو قائم رکھا ہے (اور انسانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ دنیوی زندگی میں اپنی فکری اور عملی درستی کر لے)۔

تحلیلِ اجزاء وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یہ کلام سابق کا ثبوت ہے۔ یعنی اللہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کر لے گا۔ کیونکہ سارے جہان کی حکومت اسی کی ہے۔ اسی کے قبضہ میں آسمان زمین کی تخلیق اور انتظام ہے قیامت کے دن سب آدمیوں کو زندہ کر کے جمع کرنا اس کی قدرت سے خارج نہیں۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ۔ قیامت بپا ہو گی تو اس روز اہلِ باطل اور تکذیب کرنے والے سراسر گھاٹے میں

رہیں گے۔ دنیا میں زندگی کے انکار و اعمال کی جس طرح خرید و فروخت کی تھی اس کا خسران اور وبال الیہ ین قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گا دنیا ختم ہو چکی ہو گی اور آخرت کی راحت میں اُن کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ نفع تو بجائے خود اصل مال بھی کھو بیٹھیں گے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ۚ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ جاثیۃ کا مادہ جثو ہے۔ جثو کا معنی ہے دو زانو بیٹھنا جیسے حاکموں کے سامنے بیٹھتے ہیں (لیث) یا حسب محاورہ قریش ادب سے بیٹھنا۔ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں تخت جلال کے سامنے ہر گروہ با ادب بیٹھا ہو گا اور ہر گروہ کو ان کے اعمال نامے دینے کیلئے بلایا جائے گا۔ اور بارگاہ خداوندی سے حکم صادر ہو گا آج تم (سب) کو تمہارے کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔ ہماری یہ کتاب یعنی فرشتوں کی لکھی ہوئی تحریر اعمال سچی سچی سرگذشت بیان کر دے گی ــــــ ہم تمہارے اعمال اس میں ثبت کرلیا کرتے تھے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۔ یہاں سے نیک و بد کی حساب فہمی کا اچھا برا نتیجہ بیان فرمایا یعنی نیکو کار مومنوں کو اللہ اپنی رحمت میں لے گا۔ جنت مقام قرب رضوان الٰہی سب ہی کا حصول رحمت پر موقوف ہے، اس لئے فرمادیا کہ نیکو کار مومنوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں لے گا۔ اور یہ ہی کھلی ہوئی کامیابی ہے (عذاب و لعنت سے بچ کر رحمت میں داخل ہوجانے سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۔ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ اور کافروں سے کہا جائے گا کہ میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی گئی تھیں، مگر تم نے نہ مانا اور غرور سے انکار کر دیا۔ تم مجرم لوگ تھے اور جب تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں تو تم نے کہا تھا کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا بلا ہے۔ ہم کو یقین نہیں ایک وہم سا ہے عموماً کفار تو قیامت کا قطعی انکار ہی کرتے تھے اور زندگی صرف دنیوی زندگی کو کہتے تھے لیکن بعض کو کچھ شبہ سا پیدا بھی ہو گیا تھا کہ شاید یہ عالم بھی فنا ہو جائے۔ غرض کافروں کے اعمال بد کی برائیاں بصورت عذاب ان کے سامنے آجائیں گی اور جس عذاب کی وہ ہنسی اڑاتے تھے وہ ہی ان پر آپڑے گا۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ اور ان کی قطعی آس اور امید (رہائی) توڑنے کے لئے) کہا جائے گا۔ جس طرح تم نے (دنیا میں) آج کے دن کی پیشی کو فراموش کر دیا تھا (یعنی ذہن سے آج کی پیشی کا تصور ہی نکال دیا تھا) اسی طرح آج ہم تم کو (عذاب میں ڈال کر) لاپرواہ ہو جائیں گے۔ تم کو بھلا بسرا کر دیں گے۔ تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور آج تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

نسیان کا معنی ہے بھولنا اور کسی چیز کو بھول جانے کے لئے اُس چیز کو ترک کر دینا لازم ہے۔ اس لئے اس جگہ نسیان سے مراد ہے ترک کر دینا اور بے پرواہ ہونا کیونکہ بھول جانا اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم دنیوی زندگی پر ریجھے ہوئے تھے۔ (آخرت کی زندگی کا انکار ہی کر دیا تھا) اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی (توہین کرتے اور) ہنسی بناتے تھے۔ لہٰذا اُس روز ان منکروں اور کافروں کو دوزخ سے نہیں نکالا جائے گا اور نہ اُن کو معافی کی درخواست کا موقع دیا جائے گا کہ توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دور کر سکیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور سارے جہان کا بھی یعنی وہی سب کا مالک اور حاکم ہے اور وہی سارے عالم کا انتظام اور تکمیل کرتا ہے اور عدل و توازن کے ساتھ سب کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بس وہی ستائش کا مستحق ہے اور ہر حمد اسی کو زیبا ہے۔ تمام عالم بالا و پست میں اسی کو عزت حاصل ہے اور عظمت ذات و صفات اسی کے لئے ہے۔

کیونکہ وہی سب پر غالب و مقتدر ہے اور حقائق کونیہ کا صحیح علم محیط اسی کو حاصل ہے۔ اس کی ہر تخلیق و صنعت پر حکمت ہے۔
سورت کے شروع میں تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ فرمایا تھا اور ختم سورت بھی هُوَ الْحَكِيْمُ پر کیا۔ آغاز میں الحکیم کے بعد اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ فرمایا تھا۔ یہاں هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ سے پہلے فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ فرمایا۔ گویا آغاز میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار و حکمت کی دلیل میں تخلیق کائنات کو پیش کیا تھا اور اس جگہ ربوبیت عالم سے اللہ تعالیٰ کے حکیم و عزیز ہونے پر استدلال کیا۔ پس وہ خدا جس کے دست قدرت و حکمت کا سارا جہاں محتاج ہے۔ اپنے وجود کے لئے بھی اور بقاء وجود کے لئے بھی اسی کا محتاج انسان بھی ہے۔ اپنی ہستی کے لئے بھی اور کمال زندگی حاصل کرنے کے لئے بھی۔ لہٰذا اسی خدا عزیز و حکیم نے اپنی کتاب نازل فرمائی اور انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتایا تاکہ صراط مستقیم پر چل کر انسان دنیا میں درجۂ کمال تک اور آخرت میں منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ پس اُسی خدا کی ربوبیت عمومی و خصوصی کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی ہر طرح کی حقیقی ثنا کریں اور اُسی کی الوہیت کا اقرار کریں۔

مقصودِ بیان وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ (یعنی سارے جہان بالا و پست میں حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ طبعی قوتیں نیچرل طاقتیں شعوری ارادے اور غیبی کارندے سب مامور ہیں۔ مختار مطلق نہیں حقیقی حکمرانی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سارا ملک بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ یعنی انسانوں کی ملکیت حقیقی نہیں عارضی اور تابع حکم خداوندی ہے۔ اسی لئے کسی کو اپنی جان اور اپنے زر و زمین میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف تصرف کرنے کا اختیار نہیں۔

كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً کا لفظ بتا رہا ہے کہ ہر گروہ کی خواہ کافر ہو یا مومن قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں باادب پیشی ہوگی۔
هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ بِالْحَقِّ میں صراحت ہے کہ اعمال نامے مکتوب منقش ہوں گے ان میں نقوش ثبت ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال ان میں درج کر دیے ہوں گے۔ مگر اس آیت میں یہ صراحت نہیں کہ کسی زبان کے الفاظ بصورت حروف منقوش ہوں گے یا ان کے اندراج ثبت ہونے کی کوئی دوسری صورت ہوگی۔ واللہ اعلم۔
اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا سے معلوم ہو رہا ہے کہ کچھ کافروں اور منکروں کو قیامت ہونے اور جزا سزا پانے کا کچھ گمان اور وہم سا ہو جاتا ہے۔ مگر یقین کی حد تک نہیں پہنچتا۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اُن مسلمانوں کو جو زبان سے تو قیامت ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر دل میں روز حساب کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ امر کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اُن کو قیامت کا یقین نہیں کیونکہ یقین قلبی کیفیت ایمانیہ کا نام ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی صرف زبانی اقرار کا نام یقین نہیں ہے۔ اگر دل سے یقین نہ ہو تو صرف زبانی اقرار اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں اور باوجود دعویٰ مسلمانی کے ایسے لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اندراج کافروں کی فہرست میں ہوگا۔
وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ میں صراحت ہے کہ کافروں کی توبہ قیامت کے دن قبول نہیں ہوگی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور کرنے کے لئے کیسی ہی معافی کی درخواست کریں، مگر رہائی نہیں ملے گی۔
فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ الخ حقیقی ستائش ربوبیت عزت اور اقتدار کا حصر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا ہے جو توحید و الوہیت کی دلیل ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبحَانُ

کا

پارہ نمبر ۲۶

حٰم

فاضلِ اجل حضرت علّامہ مولانا سید عبداللّٰہ ائمہ جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے باقساط شائع ہوتی رہی ہے

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

آستانہ بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۲۰۶ اسوٹ والان نمبر ۵۱۹۹ دہلی

ہدیہ فی پارہ چھ روپے

۲۶

چھبیسواں پارہ

سورۂ احقاف

سُوْرَةُ الاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

باتفاق اہل تفسیر یہ سورت مکی ہے۔ اس میں چار رکوع اور پینتیس آیات ہیں۔ احقاف حقف کی جمع ہے۔ حقف کا معنی ہے ریت کا ٹیلہ۔ یمن کی ایک وادی کا نام احقاف تھا۔ اس وادی کے میدان میں ریت کے ٹیلے بہت تھے۔ یہی قوم عاد کا مسکن تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی قوم میں سے تھے۔ اس قوم کا شمار عرب کی بائدہ (ہلاک شدہ) اقوام میں کیا جاتا ہے۔ طسم جدیس جرہم اولیٰ اور بعض دوسری اقوام کی طرح عاد اول بھی فنا ہو گئی۔ اس کا نشان بھی مٹ گیا۔ نسل بھی ختم ہو گئی۔ تاریخ میں بھی اس کے احوال نہیں ملتے صرف توریت میں اس کا کچھ نام ونشان اور نسب ملتا ہے یا قرآن میں اس کے کچھ حالات مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○

حٰمٓ ۔ یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

ہم نے آسمان وزمین اور اُن چیزوں کو جو اُن کے درمیان میں ہیں حکمت کے ساتھ ایک میعاد معین کے لئے پیدا کیا ہے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ

اور جو لوگ کافر ہیں ان کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے وہ اس سے بے رُخی کرتے ہیں آپ کہیئے کہ یہ تو بتاؤ جن چیزوں کی تم خدا کو چھوڑ کر

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي

عبادت کرتے ہو مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ انھوں نے کونسی زمین پیدا کی ہے یا اُن کا آسمان میں کچھ

السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمَنْ

سا بجھا ہے میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہو یا کوئی اور مضمون منقول لاؤ اگر تم سچے ہو [illegible]

اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ

زیادہ گمراہ کون ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے گا جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے

غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝

کی بھی خبر نہ ہو اور جب سب آدمی جمع کئے جائیں تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں اور ان کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں

تفسیر کتنی ہی عبارتوں میں یہ مضمون بیان ہو چکا ہے اور عقلِ سلیم بھی اس کی شاہد ہے کہ انسانوں کی شخصی معاشرتی اور سماجی زندگی کیلئے ایک ضابطۂ عدل ہونا چاہیئے تاکہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کر سکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہو اور یہ ضابطہ ہر طرح کی نسلی، قومی، ملکی، وطنی اور جبنی جنبہ داری سے آزاد ہو۔ جذباتیت کو اس میں دخل نہ ہو۔ خالص افادیت اور علم کی روشنی میں اس کو بنایا گیا ہو۔ بنانے والا ایک شخص ہو یا چند۔ بہرحال واضع قانون کا علم ہمہ گیر ہو۔ قوتِ ارادہ محیطِ کل ہو اور اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج نہ ہو اور ہر انسان کی پوری زندگی اس کے سامنے ہو۔ زندگی کے تمام تقاضوں سے اس کو کامل واقفیت ہو۔ پس یہ بات مسلم ہے اور ان گنت شہادتوں سے ثابت ہے کہ ایک ذات ہی ساری کائنات پر غالب ہے۔ غیر مغلوب تاند ہے۔ غیر مقدور ارادۂ مطلق اور ہمہ گیر علم کی حامل ہے۔ اس کی قدرت میں عجز کو دخل نہیں۔ اس کے علم میں جہالت کا شائبہ نہیں وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس کو انسانوں کے لئے دستور وضع کرنے اور آئین جاری کرنے کا حق ہے۔ اس نے اپنے ساختہ پرداختہ قوانین و ضوابط انسانوں کے فلاح و صلاح کے لئے عالم قدس و لاہوت سے اس مادی دنیا میں نازل کئے۔ غیب کو شہود کے دائرہ میں اتارا۔ پس یہ قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ کا ثبت کردہ اور مقرر کردہ دستور ہے اسی کے بھیجے ہوئے قوانین و آئین کا مجموعہ ہے۔ اس کے کامل علم اور آفاق سیاروں میں کوئی علاوت ہے۔ کیا کائنات بلند و پست اپنی ہزار در ہزار رنگینیوں کے باوجود ایک ربط ایک بندھن اور ایک کشش کے اندر جکڑی ہوئی نہیں ہے۔ کیا ریگ زار، مرغزاروں، کہساروں اور سمندروں میں باہم عدم ارتباط اور پراگندگی ہے۔ کیا ٹوٹنے والے ستاروں کا کہکشانی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا ہوا پانی مٹی اور آگ اختلاف طبائع کے باوجود یکساں اور یکجان نہیں ہیں۔ کیا رات کی چھا جانے والی تاریکی اور دن کی ہر جہتی ہمہ گیر خیرہ کن روشنی میں کوئی باہم وابستگی نہیں۔ اگر یہ سارا سنسار ایک اسراری حقیقت اور اتحادی طاقت کا حامل ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو برحق پیدا کیا ہے۔ اس میں کسی چیز کی بنیاد باطل پر نہیں، لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ یہ کائنات ازلی نہیں۔ ان کی آفرینش کا ایک نقطۂ آغاز ہے۔ ان کی ہر جگہ کی تغیر پذیریاں، حدوث آگینیاں اور محتاجیاں بتا رہی ہیں کہ یہ نیست سے ہست ہوئی ہیں، عدم سے وجود میں آئی ہیں اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کا ایک چکر ہے۔ ہر چیز جس طرح عدم سے وجود میں آئی اسی طرح وجود سے عدم کی طرف جا رہی ہے ہر آن رواں دواں ہے۔ کیفیات کمیات وضع ہیئت رنگ اور مختلف احوال کا ہر آنی تغیر فنا بداماں اور ہلاکت بکنار ہے۔ ہر چیز کی زندگی ایک خاص مدت ہے، ایک خاص حد ہے، ایک خاص دائرہ ہے یعنی ایک مقررہ اجل ہے جس سے اللہ تعالیٰ واقف ہے وہی ہر چیز کی اندرونی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی چگونگی سے واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ ہر چیز کو کتنا اور کس طرح رہنا اور عالم ہست میں رکھنا ہے۔ پس پوری کائنات کی عمر طبعی کیا ہے اس کا علم بھی اسی کو ہے۔ آسمان و زمین کا نقطۂ آغاز ہمارے زمانے سے کتنا

ہی دور ہو، مگر ہے ضرور، اسی طرح ان کی حد انتہا خواہ کہیں ہو، مگر ہے مقرر اور محدود حاصل یہ کہ ہر چیز بالک الاصل اور بیچائے خود فانی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل علم اور علی الاطلاق قدرت کے زیر اثر ایک خاص اندازہ کے اندر اپنے ارادہ کے مطابق پیدا کیا ہے، اسی لئے اس خلاق علام اور قادر مطلق کو خیر و شر اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے کا حق ہے اور اسی نے یہ قرآن مجید نازل فرمایا اور اس پر عمل لازم قرار دیا ہے۔ پس کتنی بڑی سبک سری اور حماقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں یا اس کے ساتھ ملا کر ایسی چیزوں کی پوجا کی جائے جو کوری جاہل ناواقف اور اتنی عاجز ہیں کہ کسی چیز کو انہوں نے پیدا نہیں کیا نہ ان میں پجاری کی دعا سننے کی طاقت ہے نہ جواب دینے کی قوت نہ قبول کرنے کا یارا اس شرک کی اجازت اس سے پہلے بھی کسی آسمانی کتاب نے نہیں دی نہ کسی دانشور عالم اور حکیم یا پیغمبر نے بلکہ سنسار کے فنا ہونے کے بعد جب دوبارہ زندگی ہوگی اور انسان دوبارہ جی اٹھے گا تو جن انسانوں یا جنوں یا فرشتوں کو معبود قرار دیا جاتا تھا وہ خود ان کافروں کی پوجا اور اپنی معبودیت کا انکار کریں گے۔ اور صاف صاف کہدیں گے کہ ہم مستحق معبودیت نہیں تم کو ہم نے اپنی پوجا کرنے کا حکم نہیں دیا تم ہماری پوجا ہمارے حکم سے نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے دماغی اختراعی معبودوں کی پوجا اپنے میلان خاطر اور ذہنی جھکاؤ کے زیر اثر کرتے تھے۔

تحلیلِ اجزا

حٰمٓ۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ۔ اَلْکِتٰب۔ یعنی قرآن مجید جو لوح محفوظ میں مکتوب ہے اور انسانوں کی تعلیم و عمل کیلئے اس کو نازل کر دیا گیا ہے۔

مِنَ اللّٰہِ۔ یہ نازل کردہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے نہ کسی انسان کی تصنیف ہے نہ جن کا الہام نہ سحر نہ کہانت نہ کلام جبرئیل بلکہ یہ پوری کتاب اپنے الفاظ اور ترتیب عبارت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہے۔

اَلْعَزِیْزِ۔ غلبہ والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اللہ کی پہلی صفت ہے۔

اَلْحَکِیْمِ۔ حکمت اور حقیقی علم والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت ہے۔ قرآن مجید یا دستور زندگی بھیجنا یا بنانا چاہتا ہے کہ واضع دستور کے اندر دو ضروری اوصاف ہوں۔ ایک یہ کہ وہ قادر مطلق ہو، سب پر غالب ہو، اس کا ارادہ محیط کو اس کی طاقت سے کوئی چیز باہر نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ ہمہ وقت ہمہ دان ہو۔ اس کا علم کامل و حاضر ہو اور زمان و مکان کے قید سے آزاد ہو اور جہالت کے شائبہ سے پاک ہو۔ پس اللہ ہی چونکہ عزیز و حکیم ہے، اس لئے دستوری کتاب بھیجنے کا اسی کو حق ہے۔ العزیز اور الحکیم اگرچہ اللہ تعالیٰ کے دو وصف ہیں، لیکن امام المعانی والنحو شیخ عبدالقاہر جرجانی نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی حکم کسی وصف پر مرتب ہو تو اس ترتیب سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ شرط یا قید اس حکم کی علت ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تنزیل کے حکم کو اللہ تعالیٰ کے اوصاف علم کے ساتھ مشروط کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی عزیز و حکیم ہے، اس لئے اس نے کتاب نازل فرمائی۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی کتاب نازل کی گئی ہو اس کا نبی صادق ہونا یقینی ہے نہ وہ جھوٹا کاہن ہو سکتا ہے نہ جھوٹا نبی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سچا پیغمبر ہونا لازم ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کے عزیز و حکیم ہونے کی کیا دلیل ہے تو اس کا ثبوت آئندہ آیت میں تخلیق کائنات کا ذکر کر کے پیش کیا ہے فرماتے ہیں۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ ہم نے کائنات بلند و پست کو بے حقیقت غلط طور پر باہم غیر موزوں و غیر متناسب نہیں بنایا یعنی اس سنسار کو تمام اجزاء ترکیبی و ترتیبی غیر موزوں اور باہم نامناسب نہیں ہیں۔ بظاہر تمام اجزاء الگ الگ معلوم ہوتے ہیں، ہر مادی عنصر کا مرکز و محور جدا جدا ہے۔ ہر پست و بلند کرہ اپنی جگہ مستقل ہے، لیکن کوئی بھی غیر موزوں اور بے تناسب نہیں سب کے اندر ایک مقناطیسی کشش ہے جو ایک کو دوسرے کی طرف کھینچ رہی ہے پھر اس کشش میں تناسب و توازن ہے، اسی لئے کوئی کرہ دوسرے کرے سے نہیں ٹکراتا اور اسی طرح نظام عالم کا چکر چل رہا ہے پھر کسی کرہ کے باہمی اجزاء میں بھی عدم توازن نہیں۔ پھر اندرونی اور بیرونی طاقتوں میں بھی باہمی توازن ہے۔ اگر کسی آواز رنگ شکل مقدار نرمی سختی بلندی پستی یا کسی کیفیت کو قطعاً معدوم کر دیا جائے یا فرض کر لیا جائے کہ اس کا وجود مفقود ہے تو عالم میں ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جو کسی طرح پر نہ ہو گا اور نتیجہ

میں غیر معمولی تناؤ اور کھچاؤ اور تاثیر و تاثر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کا ثمرہ سوائے عالم کی تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہواؤں کی رگیز اندل میں سن سناہٹ آبشاروں کے نیچے گرنے سے پٹ پٹ یا دھڑ دھڑ کی آوازیں۔ ہوا کی حرکت سے درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ، پرندوں کا چہچہانا، اونٹوں کا بلبلانا، ہاتھیوں کا چنگھاڑنا بادلوں کا گرجنا، بجلیوں کا تڑکنا، طوفان کا اُمڈنا اور آدمیوں کا چیخنا چلانا یا بلند و پست آوازوں سے باتیں کرنا غرض ساری کائنات کی تمام آوازیں مل کر ایک خاص کیفیت صوتیہ پیدا کر رہی ہیں اگر ان تمام آوازوں میں سے کسی ایک آواز کو بالفرض نکال دیا جائے یا معدوم مان لیا جائے تو توازن صوتی قائم نہیں رہے گا اور اس صوتی بگاڑ سے تاثیر و تاثر کا اختلاف نمودار ہو جائے گا۔ باہم تصادم شروع ہو جائے گا اور تصادم کے نتیجہ میں سب کا اپنی جگہ چھوڑنا ایک کا دوسرے پر حملہ کرنا اور غالب یا مغلوب ہو جانا لازم ہو گا۔ اسی طرح اس نظام کی تباہی ضروری ہو جائے گی۔ یہی حال سارے بے شمار رنگ لاتعداد رنگوں کا ہے جن کا اجتماع اور باہمی تاثیر و تاثر اور کسر و انکسار ایک متوازن کیفیت رنگیہ پیدا کر رہا ہے۔ ہزار در ہزار مرکب رنگ ہیں اور سب کے ملنے سے عالم ہمہ یک رنگ ہے۔ اختلاف الوان کے باوجود یہ یک رنگی ان گنت رنگوں کے اتحادی رابطہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جس پر نظم موجودات کا مدار ہے۔ اسی پر وضع ہیئت شکل بو مقدار اور ہر کیفیت و کمیت کے اختلاف کو قیاس کر لینا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ان کی باہم موزونیت اور مناسبت نہ ہوتی تو کائنات تباہ ہو جاتی۔ ان کا باہمی توازن ہی ان کی حقیقت و حقانیت کی غمازی کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان کو پیدا کرنے والے نے ان کو پیدا کرنے کا پہلے سے اندازہ کر لیا تھا اور ان کی تخلیق اسی علمی اندازہ کے مطابق کی ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب یہ کائنات ہالک الاصل ہے معدوم الحقیقت ہے آغازی نقطہ کی طرف سے محدود ہے۔ ان کی آفرینش کبھی کسی نقطہ سے شروع ہوئی ہے تو کیا اس نظام کی رواں دوانی یونہی ہمیشہ رہے گی۔ ان کی انتہا کبھی نہ ہو گی۔ ماضی کی طرف سے محدود ہونے کے باوجود مستقبل کی جانب ان کی کوئی حد نہیں ہے اور آئندہ ان کی بقاء زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس میں کبھی فرسودگی اور بوسیدگی نہیں آئے گی۔ ایسا نہیں ہے جو چیز ہالک الاصل اور معدوم الحقیقت ہے وہ قدیم الاصل اور واجب الحقیقت کیسے بن جائے گی۔ حادث قدیم اور ممکن واجب کیسے ہو جائے گا۔ جس چیز کا قوام حقیقت تباہی بربادی اور عدم سے ہوا ہو وہ اپنی حقیقت کو کیسے چھوڑ دے گی۔ محدود الماضی محدود الابتداء والی چیز لا محدود المدت اور لا انتہا کس طرح ہو جائے گی۔ اس کی ہمہ وقت نیرنگی، تغیر پذیری اور عدم و وجود کے سلسلے کے اندر وابستگی بتا رہی ہے کہ سب کے سب ایک خاص مدت بقاء کے حامل ہیں اور خالق نے ان کو موجودہ حالت و کیفیت میں باقی رہنے کی ایک خاص مدت عطا فرمائی ہے۔ پس تخلیق کائنات کا بالحق اور باجلٍ مسمّٰی ہونا پکار کر اللہ تعالیٰ کے غلبۂ اقتدار اور علم محیط کی شہادت دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے باہر اور علمی مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ لہٰذا ہر چیز کا زوال یقینی ہے۔ اور آخرت ضرور ہو گی (اس وقت منکروں اور ناشکروں کو عذاب اور اعتراف کرنے والے نیکوکار شکرگزاروں کو اپنا اپنا کردار کی نتیجہ ملنا ضروری ہے) مگر

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ــــ کافر لوگ غافل ہیں ان کو نتیجۂ آخرت اور عذاب قیامت اور ہلاکت دنیوی و اُخروی کی پرواہ نہیں اور سارے جہان کے عزیز و علیم خالق کو یا تو چھوڑ دیتے ہیں یا اس کے ساتھ دوسروں کو ملا کر ان کی پوجا کرتے ان سے مرادیں مانگتے اور ان کو اپنا کارساز قرار دیتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ط۔ مقام غور ہے اور ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کے معبودوں نے اس زمین کی کیا چیز پیدا کی اور آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کیا حصہ ہے۔ جب اس کائنات کے جزو و کل کا خالق ایک ہی ہے اور کوئی تخلیق میں شریک نہیں تو معبودیت الوہیت انتظام۔ کارسازی اور ربوبیت میں کیسے شریک ہو جائے گا۔

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ شرک کے جواز کی کوئی نقلی عقلی شہادت نہیں، نہ کوئی پچھلی آسمانی کتاب اس کی تعلیم دیتی ہے نہ علمی عقلی تجربہ۔

امام احمد نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اوْ اَثَارَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ سے مراد ہے تحریر مجاہد اور عکرمہ کے نزدیک اثارۃ کا معنی ہے روایت و نقل (یعنی آسمانی کتاب کی نقل) قتادہ کے نزدیک خصوصیت اور علامت یعنی علم کی کوئی خاص نشانی پیش کرو۔ کلبی نے اثارۃ کا ترجمہ کیا ہے بقیہ قاموس میں ہے الاثر البقیۃ من الشئ کسی چیز کے باقی حصے کو اثر کہتے ہیں۔ حاصل سب کا تقریباً ایک ہی طرح ہے یعنی گزشتہ انبیاء کے پاس اللہ تعالیٰ نے جو وحی بھیجی اور جو صحیفہ یا کتاب نازل فرمائی کسی میں شرک کے جواز پر دلالت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ کسی آسمانی کتاب میں شرک کا جواب ہے نہ کسی صاحب وحی پیغمبر کے کلام میں نہ صائب الفہم صحیح العقل دانشور کے ملفوظات میں۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ۔ جب یہ بات نقل و عقل کی رو سے ثابت ہے کہ معبود و کارساز وہی ہو سکتا ہے جو علم کل اور قدرت تامہ رکھتا ہو تو اب بے علم عاجز مخلوق کو پکارنا اور ایسی ناکارہ ہیچ پوچ اور بے خبر چیز کی عبادت کی دعوت دینا جو عبادت اور پکار سے بھی بے خبر ہے اور کبھی قیامت تک جواب بھی نہیں دے سکتی سراسر حماقت و گمراہی ہے۔ اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ بے مقدرت بے علم اور بے خبر محض عاجز و جاہل مخلوق کی عبادت کی دعوت دی جائے جو نہ سنتی نہ دیکھتی ہے نہ اُس کے پاس علم ہے، نہ قدرت اور اگر برائے نام ان باطل معبودوں میں سے کوئی علم و قدرت کا حامل بھی ہے تو اس کو خود اپنا معبود قرار دیا جانا پسند نہیں۔ قیامت کے دن جب لوگوں کا حشر ہوگا اور جب ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پوجا کرتے تھے تو وہ صاف انکار کر دیں گے اور کہیں گے تبرأنا الیک ماکانوا ایانا یعبدون۔ ہم ان سے اور ان کے شرک سے بری ہیں بیزاری کا اظہار کرتے ہیں (بلکہ اپنے دماغی تراشیدہ بتوں اور خیالی معبودوں کی پوجا کرتے تھے۔ ہم نے ان کو اپنی عبادت کا حکم دیا تھا نہ اظہار رضا مندی کیا تھا۔) اس مطلب پر کانوا کی ضمیر معبودوں کی طرف راجع ہے۔ بعض علمائے تفسیر نے کانوا کی ضمیر مشرکوں کی طرف راجع کی ہے یعنی دنیا میں تو یہ دوسروں کی پوجا کرتے ہیں، لیکن جب قیامت کے دن ان سے بازپرس ہوگی اور عذاب میں گرفتار رہیں گے تو بالکل مکر جائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ ہم بخدا مشرک نہ تھے۔

مقصودِ بیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کے نزول کی صراحت جس سے درپردہ نبوت کا اثبات مقصود ہے۔ اس بات کی تصریح کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہمہ گیر قدرت اور علم کامل کا حامل ہے، اس لئے اسی کو کتاب بھیجنے کا اور انسانوں کے لئے دستورِ حیات بنانے کا حق ہے۔

بالحق۔ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات یونہی بے جوڑ، غیر ضروری اور ناموزوں نہیں ہے۔ اس کی ترتیب اور ترتیب کا ہر پرزہ ضروری توازن و تناسب رکھتا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اس کائنات کو فریب نظر و ہم اور بے حقیقت سمجھتے ہیں۔

(۲) اس کائنات کے تمام اجزاء کی ترتیب ایک توازن رکھتی ہے۔ موجودات بالاولیت باہم اتنی وابستگی، پیوستگی اور ہم آہنگی رکھتے ہیں کہ کوئی نہ کسی سے مستغنی ہے نہ دوسرے کے لئے غیر ضروری اور غیر مفید۔ اجل مسمی کے لفظ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر چیز زمان و مکان اور مدت بقاء کی حدود کے اندر ہے۔ فطری طور پر ہر ایک کی زندگی اور بقاء کی مدت مقرر کر دی گئی ہے کوئی لازوال اور دوامی نہیں اجل مسمی کا لفظ جس طرح مستقبل کی ایک خاص حد مقرر ہونے کی صراحت کر رہا ہے ماضی کی جانب نقطۂ آغاز کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کیونکہ تعیین اجل جب ہی ہو سکتی ہے جب ابتدا اور انتہا دونوں کے کنارے محدود ہوں گے۔ اگر ایک جانب بھی حد بندی نہ ہوگی تو اسی جانب تعیین اجل نہ ہو سکے گی۔ قل ارایتم الخ سے ساری مخلوق کا عاجز اور بے علم ہونا ظاہر کیا گیا ہے جس پر الوہیت اور معبودیت کا فقدان مبنی ہے گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ جو خالق نہیں ہو سکتا وہ معبود اور کارساز کیسے ہو سکتا ہے۔

اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ الخ سے شرک کی نقلی و عقلی دلیل کی نفی کی گئی ہے اور امر تعجیزی کا صیغہ استعمال کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نہ کوئی

آسمانی کتاب شرک کی اجازت دیتی ہے نہ کسی پیغمبر اور صحت مند عقل کا حامل اس کا قائل ہے۔
ومن اضل الخ سے کافروں کی حماقت پر آخری مہر ثبت کر دی ہے کہ جو معبود اتنا عاجز و بے خبر ہو کہ اس کو اپنے پجاری کی پوجا کی خبر ہو نہ وہ جواب دے سکے۔ اس کی عبادت سراسر گمراہی ہے۔ آخری آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جن ملائکہ، انبیاء، اولیاء، جنات اور ارواح غیبیہ کی پوجا کی جاتی ہے۔ قیامت کے دن وہ خود اس شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے وغیرہ۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ منکر لوگ اس سچی بات کی نسبت جبکہ وہ ان تک پہنچتی ہے یوں کہتے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ

ہیں کہ یہ صریح جادو ہے کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اسکو اپنی طرف سے بنایا ہوگا تو تم

بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

لوگ مجھ کو خدا سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے وہ خوب جانتا ہے تم قرآن میں جو جو باتیں بنا رہے ہو میرے اور تمہارے درمیان میں وہ کافی گواہ ہے اور وہ بڑی مغفرت والا رحمت والا ہے۔

تفسیر کتاب الٰہی کا نزول اگرچہ تسلیم کر لیا جائے تو تمام مضامین کتاب کا حق ہونا واجب التسلیم ہے۔ پھر جس پر کتاب نازل ہوئی اس کو نبی برحق بھی ماننا بھی ضروری قرار پاجاتا ہے۔ اس طرح توحید نبوت اور حشر جسمانی کا عقیدہ محکم ہو جاتا ہے اور تمام دینی فرائض کا التزام کرنا پڑتا ہے۔ پھر نبی کی تصدیق کے بعد اس کی ہر وحی خفی اور تعلیم نبوت کو تسلیم کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے اور مکہ کے مشرکوں کو ان میں سے کوئی چیز گوارا نہ تھی۔ نہ اپنے قدیم اسلاف کے عقائد و عبادات کو ترک کرنا وہ پسند کرتے تھے نہ بے قید زندگی کو چھوڑ کر خواہشات کو ترک کر کے خواہ مخواہ کسی دوسری کتاب یا نبوت کے زیر ہدایت زندگی کو مقید کرنا ان کو گوارا تھا، مگر قرآن کے اعجاز کے اور منہ بولتی صداقت کا جواب بھی کیا تھا۔ قدرت بشری سے بلند و خارج ہونا ان کو دکھ رہا تھا اور دماغ تھے محسوس پرستی اور محض توہمات کے پنجے میں گرفتار جاہلوں اور وحشیوں کے ذہن توہمات کے جال میں گرفتار ہوتے ہی ہیں۔ خالص عقل اور سلیم فطرت سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں توہم کو تعقل اور تخیل کو شعور سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی ذہنی پرواز صرف اپنے تخیل کی حدود تک ہوتی ہے اور وہ قدرت بشری سے فوق اگر کسی چیز کو قرار دیتے ہیں تو اس کو جادو ہی کہتے ہیں سحر ایک شعبدہ کاری ہوتی ہے۔ حقیقت نما ایک حقیقت ہوتی ہے محض تخیلی جس کی رسائی صرف اسی کرۂ ارضی تک محدود ہوتی ہے اور دماغی جولانی سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی سب بے حقیقت نفع و ضرر اس سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اشیاء اذہان اور انواع کا انقلاب بھی اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو حقیقی نہیں ہوتا ہنگامی ہوتا ہے عارضی ہوتا ہے، مگر نور و نار میں فرق کرنا اور حقیقی و تخیلی میں امتیاز کرنا تو توہم پرستوں کا کام نہیں، اس لئے جو چیز کسی سے معمولات بشری سے صادر ہوئی اور ان کی سمجھ میں اس کی حقیقت نہ آئی تو اس کو جادو کہہ دیتے ہیں، اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جادوگر کا مقصد سوا شعبدہ کاری کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اصلاح بشری سے اس کا کیا تعلق قیادت انسانی سے اس کو کیا لگاؤ۔ سحر کو نبوت قرار دینا اور اپنے کلام کو وحی کہنا اس کے لئے کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ جادو کو جادو ہی کہے تب بھی اس کو سیادت و برتری جاہلوں کی نظر میں حاصل ہو جائے گی پھر جھوٹا دعویٰ کرنا اور خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے کلام کو منسوب کرنا ضرر آگیں نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ کفار مکہ کا ذہن بھی توہم پرستی کے زنگ سے آلودہ تھا۔ ان کے تخیل کی پرواز بھی محسوس پرستی کی حدود سے اونچی نہ تھی۔ قرآن کو جب انسانی کلام سے انہوں نے اونچا پایا اور منظومات بشری کی حدود سے باہر ان کو

کلام اللہ کی واضح آیات نظر آئیں جن کے اندر کھول کھول کر انسان کی فلاح و صلاح کے قوانین بیان کیے گئے ہیں اور وہ مفہوم نبوت کو سمجھنے سے عاری تھے تو اپنی فکر رسائی کے مطابق انہوں نے قرآن کو سحر کہنا شروع کر دیا، لیکن محکم طور پر سحر بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں سحر کے لئے غیبی ارواح و قویٰ سے تعلق ضروری تھا پھر جادوگروں کے کچھ خصوصی احوال بھی ہوتے ان کی زندگی مخصوص سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی ان کے سامنے تھی۔ صداقت و امانت کی حامل نہ تھی، اس لئے قرآن کو جادو کہنے کے بعد پھر اس قول سے گریز کرتے اور کہتے تھے اگر یہ جادو نہیں تو تمہارا دماغی زائیدہ ہے جس کو تم اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہو یعنی اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں جس کو ہم قدرت بشری کے باہر قرار دے سکیں۔ ہم کو ایسا بنانے کی قدرت نہیں تم کو ہے۔ ہم کو یہ کمال حاصل نہیں تم کو حاصل ہے رہا اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا انتساب تو یہ غلط ہے۔ اس نسبت کرنے میں تم جھوٹے ہو۔ ایسے ضدی، کج باطن، ہٹ دھرم لوگوں کو کسی عقلی برہان اور معقول دلیل سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کار ان سے بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تم کسی عقلی شہادت اور علمی استدلال کو نہیں مانتے تو اب ہمارا تمہارا فیصلہ اللہ ہی کر دے گا اسی کی شہادت حق و باطل میں تمیز کر دے گی۔

تحلیل اجزاء

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ہماری آیات یعنی قرآن کی آیات کھلی کھلی یعنی جن کا من جانب اللہ ہونا واضح ہے ناقابل شک روشن ہے بلا ریب۔ ان کے اصلاحی مضامین بھی واضح ہیں۔ اعجاز کے حامل اور عبارت بھی واضح معجزہ ہے۔

لِلْحَقِّ یعنی جب کلام حق اور قرآن کافروں کے سامنے آجاتا ہے اور ان کی کفر آگیں ذہنیت اس کو حق ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو اس کو کھلا ہوا جادو کہہ دیتے ہیں۔ یعنی حقیقت نما بے حقیقت چیز۔ غیبی ارواح اور قویٰ سے اندرونی تعلق کا ناپاک نتیجہ خبث روحانی کا گندہ ثمرہ۔ گویا اتنا مان لیتے ہیں کہ تمہارے اندر معمولی انسانوں سے بڑھ کر کوئی اندرونی طاقت ضرور ہے، جس کا تعلق غیبی قوتوں سے ہے مگر وہ طاقت خبیث ہے۔ جادو خبث روحانی پر دلالت کرتا ہے۔ دوسروں کو وقتی طور پر عاجز بنا دیتا ہے، مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ پھر ساحر اور سحر قرار دینے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ ان کو قرآن کے مضامین کی پختگی اور انقلابی قوانین کی تعلیم نظر آتی ہے اور اصلاح بشری کی دعوت عامہ سنائی دیتی ہے اور جادو انقلابی تعلیم اور اصلاح بشری کے قوانین سے خالی ہوتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہارا ساختہ پرداختہ زائیدہ تراشیدہ ہے جس کی نسبت تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی ہے لوگوں کو اپنی دماغی تعلیم کی طرف چلانا چاہتے ہو اور کہتے ہو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ یعنی اگر میں نے از خود اس کو بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی غلط نسبت کر دی ہے تو اس کا وبال مجھ پر پڑنا ضروری ہے۔ تم اگر میرے پیرو بن بھی جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے مجھے نہیں بچا سکتے۔

هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ یعنی جن بیہودہ خیال آرائیوں اور دروغ بافیوں میں تم پڑے ہو۔ کبھی قرآن کو جادو کہتے ہو کبھی رسول اللہ کا از خود تراشیدہ۔ تمہاری ان باتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ ان ظاہری غلط بیانیوں سے تم سزا سے نہیں بچ سکتے۔ میری اس صداقت اور تمہارے اس جھوٹ کا اللہ تعالیٰ شاہد ہے اور اسی کی شہادت آخری شہادت ہے۔ اس کے بعد کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔

مقصود بیان

قرآن کا آیات بینات ہونا اور کافروں کا اس کا انکار کرنا اور اس کو کبھی کھلا ہوا جادو اور کبھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ساختہ پرداختہ قرار دینا اس جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِذَا تُتْلٰى بتا رہا ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ترتیب الفاظ اور عبارت بھی اسی کی ہے کیونکہ تلاوت کا تعلق براہ راست الفاظ سے ہے اور الفاظ کی وساطت سے معانی سے۔ پس اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے کا معنی ہوا اللہ تعالیٰ

کی لکھی ہوئی عبارت کا پڑھا جانا جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم کا اظہار کیا گیا ہے۔

اِنِ افْتَرَيْتُهٗ الخ ـــ اس سے در پردہ ثابت ہو رہا ہے کہ جھوٹا مدعی نبوت اور کسی خود ساختہ چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ مسیلمہ اور دوسرے مدعیان نبوت کا تاریخ و سیر کی کتابوں میں نتیجہ بد مذکور ہے۔ بہاء اللہ و غلام احمد قادیانی کی موت اور قادیانی کا خبیث ترین مرض الموت میں گرفتار ہونا مشہور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ الخ سے مراد عذاب قیامت ہو۔ دنیوی مواخذہ کی طرف اشارہ نہ ہو اور یہ مقصود ہو کہ جھوٹے مدعی نبوت کا جتھا اگرچہ دنیا میں کتنا ہی بڑا ہو جائے، مگر مرنے کے بعد یہ بھی ہوئی جماعت اللہ کے عذاب سے اس جھوٹے مدعی نبوت کو نہیں بچا سکتی۔ واللہ اعلم۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ

آپ کہہ دیجئے کوئی میں انوکھا رسول تو ہوں نہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ معلوم کہ) تمہارے ساتھ (کیا کیا

اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

جائے گا) میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعہ آتا ہے اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں

تفسیر رسالت کے معاملے میں کافروں اور مومنوں کے دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ تو نبوت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لئے انسان کے معاشرہ کی انفرادی یا اجتماعی سوجھ بوجھ کو کافی سمجھتا ہے۔ اس کی تردید اور ذہنی کج روی کی اصلاح تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ سے غٰفِلُوْنَ تک کر دی گئی۔ اسی گروہ میں سے ایک شاخ ایسی ہے جو پیغمبر اور قانون سماوی کی ضرورت تو محسوس کرتی ہے، مگر انسان کا پیغمبر ہونا اس کو عجیب معلوم ہوتا ہے یا نبوت بشری کے اقرار کے بعد جب حامل صداقت پیغمبر ان کے سامنے آجاتا ہے تو باوجود یکہ وہ (انسان) کے پیغمبر ہونے کے قائل ہوتے ہیں، مگر اپنے زمانے کے سچے پیغمبر کی تکذیب کرتے ہیں اور طرح طرح سے اس کو دھمکیاں دیتے یا اس پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔ دوسرا اہل ایمان کا گروہ پیغمبر وقت کو سچا نبی مانتا ہے، مگر ان میں سے کچھ لوگ افراط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ پیغمبر کو شارح دستور ہونے کی بجائے خود شارع ماننے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ خیر و شر کا مالک اور حاجت روا کارساز قرار دینے لگتے ہیں۔ کچھ علم غیب کا کلی طور پر حامل سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کے زمانے کا پیغمبر (تفاوت مرتبہ رکھنے کے باوجود) کوئی انوکھا نبی نہیں ہوتا نہ کامل غیب داں ہوتا ہے البتہ جس قدر وحی کے ذریعہ سے اس کو علم دیا گیا ہو اتنا ہی جانتا اور اس پر چلتا ہے۔ اس سے آگے ایک فاضل انسان ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ پیغمبر انسان ہی ہوتا ہے۔ دوسرے پیغمبروں سے الگ کوئی انوکھی بات پیغمبر میں نہیں ہوتی۔ ہر پیغمبر کے پاس وحی آتی ہے اور وہ وحی پر چلتا ہے اس کو وحی کے علاوہ کوئی علم غیب نہیں ہوتا۔ دنیا اور آخرت میں اس کا علم محدود ہوتا ہے۔ اس کو دنیوی اور اخروی زندگی کی تفصیل جزئیات کا کامل علم نہیں ہوتا۔ اگرچہ اپنی صداقت اور منکروں کی تکذیب اور صداقت و تکذیب کے اچھے برے نتیجہ کا اس کو مجمل علم ہوتا ہے، مگر اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اس کو بتا دیا گیا ہو وہ اس احاطہ جزئیات کا حامل یا مکلف نہیں ہوتا۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ واضح طور پر کھول کھول کر غیر مبہم الفاظ میں لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچا دے۔

تحلیل اجزاء قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ یعنی میں انوکھا پیغمبر نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی پیغمبر ہوئے ہیں جیسے وہ پیغمبر تھے میں بھی اسی طرح پیغمبر ہوں۔ وہ بھی فرشتہ یا جن نہ تھے انسان ہی تھے میں بھی انسان ہی ہوں ان کو بھی تمام غیبی قوتوں کا مالک نہیں بنایا گیا تھا نہ میرے قبضہ میں ساری کائنات کے تصرفات ہیں نہ وہ کارساز مطلق اور کامل غیب دان تھے نہ میں دنیا اور آخرت کے تمام جزئیات کا علم رکھتا ہوں۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ دنیا و آخرت میں تمہارے تفصیلی حالات کیا ہوں گے اور میرے کیا ہوں گے۔ آئندہ تم میں سے کون مومن ہوگا کون کافر کون جنتی اور جنت کے مختلف درجات پر فائز اور کون جہنمی اور جہنم کے مختلف عذاب میں مبتلا۔ کون کب مرے گا اور تفصیلی طور پر کیا کیا کرے گا اور اس کے عمل کا تفصیلی نتیجہ دنیا اور آخرت میں کیا نکلے گا۔ کس کو بیماری، صحت، رزق، بھوک، سرمایہ داری اور ناداری، علم وجہالت غرض مختلف احوال سے کیا کیا اور کتنا کتنا حصہ ملے گا وما تدری نفس بای ارض تموت وما تدری نفس ماذا تکسب غدا۔

بعض علماء کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ آخرت میں میرا اور تمہارا کیا نتیجہ ہوگا۔ یہ سن کر مشرک بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، لات وعزی کی قسم ہمارا اور محمد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ہی طرح کا ہے۔ ان کو ہم پر کوئی برتری نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ از خود قرآن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر خدا کی طرف سے ہوتا تو ان کا رب ان کو نتیجہ سے ضرور واقف کر دیتا۔ کافروں کے اس قول کے ازالہ کے لئے آیت لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ نازل ہوئی۔ صحابہ نے عرض کیا یا نبی اللہ جو کچھ آپ کے ساتھ کیا جائے گا وہ تو ہم کو معلوم ہو گیا، لیکن ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا اس پر لیدخل المومنین والمومنات جنت الخ اور بشر المؤمنین بان لھم من اللہ فضلا کبیرا نازل ہوا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قتادہ حسن اور عکرمہ نے یہی تشریح کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول شروع میں ہوا تھا جب کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت کی بشارت نہیں دی گئی تھی، لیکن حدیبیہ کے سال جب لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تأخر نازل ہوئی تو مذکورہ بالا آیت منسوخ ہو گئی۔

میرے نزدیک یہ تشریح غلط ہے روایۃً بھی، بغوی کی روایت کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ پھر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن کی کوئی سورت ہو مکی ہو یا مدنی ہر سورت میں کافروں سے وعید اور مومنوں سے وعدۂ جنت مذکور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کی غایت بھی بشارت و انذار تھی۔ آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہی گیا تھا۔ سب سے پہلے یہی پیام آیا تھا۔ انذر عشیرتک الاقربین پھر اسی صورت میں آگے آیا ہے۔ وھذا کتب مصدق لسانا عربیا لینذر الذین ظلموا وبشری للمحسنین۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون اولئک اصحب الجنۃ الخ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایمان وکفر کے نتیجہ سے پیغمبر بے خبر ہو اور باوجود غیر یقینی علم کے ایمان کی دعوت دے اور کفر کی مذمت کرے اس کے علاوہ آیت لیغفرلک اللہ اور لیدخل المومنین والمومنت جنات کا نزول ہوا تو نبوت کے گیارہ سال بعد ہوا اگر اس کو بیان حکم قرار دیا جائے گا تو وقت ضرورت سے بیان کی تاخیر لازم آئے گی جو نا ممکن ہے۔ غرض ایمان وکفر کے نتیجہ سے پیغمبر کا ناواقف ہونا مقصد دعوت کو فوت کر دیتا ہے جس کو خود اپنے پیام کے نتیجہ کا یقینی علم نہ ہو اور نافرمانوں کی غلط روی کا مآل اس کو معلوم نہ ہو وہ حق و باطل کا فیصلہ ہی کیا کر سکتا ہے اور اپنی تعلیم کے حق ہونے کا دعویٰ ہی کس طرح کر سکتا ہے۔

ایک شبہ بغوی نے خارجہ بن زید کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ام العلاء انصاریہ نے فرمایا انصار نے مہاجرین کو اپنے پاس رکھنے کے سلسلے میں قرعہ اندازی کی۔ ہمارے پاس قیام کے لئے عثمان بن مظعون کا نام نکلا۔ حضرت عثمان کا قیام ہمارے گھر ہو گیا۔ اتفاق سے آپ بیمار ہو گئے۔ ہم نے خدمت کی، لیکن ان کی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی اور آپ کی وفات ہو گئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے۔ میں نے عثمان کو خطاب کر کے کہا، ابو السائب آپ پر اللہ کی رحمت ہو، میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ عزت پا گئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میری یہ بات سن کر فرمایا تجھے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس نے عزت پائی۔ میں نے عرض کیا بخدا مجھے کچھ معلوم نہیں، فرمایا اس کا یقینی وقت آ گیا، مجھے امید ہے کہ اس کو بھلائی ملے گی۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، لیکن خدا کی قسم مجھے پھر بھی معلوم نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ آئندہ کبھی خدا کی قسم میں کسی کا تزکیہ نہیں کروں گی (یعنی کسی کے متعلق یہ نہیں کہوں گی کہ یہ گناہوں سے پاک ہے) اس کے بعد میں نے

خواب میں دیکھا کہ عثمان کا ایک چشمہ جاری ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہ خواب بیان کیا۔ فرمایا یہ (چشمہ) اس کے اعمال ہیں۔ اس حدیث مقدس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی کا کیا نتیجہ ہوگا اور خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ناواقف تھے اور آیت مذکورہ کا یہی مطلب ہے۔

جواب اس حدیث شریف سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کے سلسلے میں کسی کی شخصی تعیین نہ کی جائے کسی معین شخص کا تزکیہ نہ کیا جائے (کیونکہ اعتبار انجام کا ہے معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ کس حالت پر ہوا اور ایمان پر خاتمہ ہوا بھی ہو تو یہ نہیں معلوم کہ اللہ نے اس کے (زندگی بھر کے گناہ معاف کر دیئے یا نہیں) یہ دعویٰ نہ کیا جائے کہ اس کی مغفرت ہو ہی گئی یہ علم غیب کا دعویٰ ہے جو کسی کے لئے درست نہیں؛ اللہ تعالیٰ کے سوا غیب سے کوئی واقف نہیں، ہاں آدمی کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے لئے خیر کی امید کی جا سکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ امید ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی ہوگی۔ رہا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان کہ باوجود اللہ کا رسول ہونے کے مجھے معلوم نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے باوجود یکہ اولین و آخرین کے علوم عطا کر دیئے گئے ہیں، لیکن تفصیلاً کسی کے ہر عمل کی مخصوص جزا مجھے بھی معلوم نہیں کہ کسی کا کیا ہوگا اور ثواب و عذاب کا کتنا حصہ اس کو ملے گا۔

بعض علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ آخرت کے معاملات سے آیت کو متعلق کرنا سیاق کے خلاف ہے۔ بات یہ تھی کہ کفار جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو طرح طرح سے دنیوی لالچ بھی دیتے تھے اور ڈراتے بھی تھے، سیاق بتا رہا ہے کہ اسی کے جواب میں اس آیت کا نزول ہوا اور جواب دے دیا گیا کہ آپ کہہ دیں کہ مجھے معلوم نہیں میرا تمہارا کیا نتیجہ ہوگا۔ میں کامیاب رہوں گا یا تم، مجھے کفر پر غلبہ حاصل ہو جائے گا یا کافر غالب رہیں گے۔ کچھ بھی ہو میں تمہارا اتباع نہیں کر سکتا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک آیت کا تعلق صرف دنیوی امور ہی سے ہے۔ مومنوں کے لئے جنت اور کافروں کے لئے دوزخ کا ہونا، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہی تھا۔ ہاں دنیوی امور کا آئندہ کے سلسلے میں علم نہ تھا جو لوگ دنیوی امور سے اس آیت کو متعلق قرار دیتے ہیں ان کے درمیان بھی مصداق کی تعیین میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ مکہ میں جب صحابہ حد سے زیادہ شدائد میں مبتلا ہو گئے تو ایک روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ایک زمین شور ہے جہاں نخلستان ہیں۔ اس زمین کی طرف جانے کے لئے آپ ترک وطن کر رہے ہیں۔ صحابہ کو یہ خواب معلوم ہوا تو انہوں نے دریافت کیا آپ ہجرت کب کریں گے۔ حضور نے کوئی جواب نہیں دیا اور آیت مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ نازل ہوئی۔ یعنی مجھے معلوم نہیں کہ مجھے تمہیں یہیں رہنا ہے یا اس زمین کی طرف ہجرت کر کے جانا ہے جو مجھے دکھائی گئی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے مجھے معلوم نہیں کہ جس طرح بعض گزشتہ انبیاء کو ترک وطن کرنا پڑا مجھے بھی اسی طرح ترک وطن کرنا پڑے گا یا جس طرح بعض انبیاء کو شہید کر دیا گیا مجھے بھی قتل کر دیا جائے گا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اہل ایمان کی کیا حالت ہوگی ان کو بھی میرے ساتھ ترک وطن کرنا پڑے گا یا یہیں رہنا ہوگا یا کیا ہوگا نہ یہ معلوم ہے کہ کافروں کا کیا ہوگا۔ کیا ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں گے جیسے قوم لوط پر برسائے گئے یا ان کو زمین میں دھنسایا جائے گا جیسے قارون کو دھنسایا گیا یا ان کے ساتھ کوئی اور سلوک کیا جائے گا اس کے بعد مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے واقف بنا دیا اور فرما دیا۔ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ اور فرمایا۔ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ وَمَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَھُمْ وَھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔ یہ تفسیر مؤخر الذکر سدی نے کی ہے۔

ہمارے نزدیک تفسیری مطلب وہی ہے جس میں آخرت اور دنیا کی تخصیص نہیں بلکہ دنیوی امور ہوں یا دینی سزا جمہور ایک کے تفصیلی اور جزئی علم کی نفی کی گئی ہے جن لوگوں کو صراحت کے ساتھ حضور نے جنت یا دوزخ کی بشارت دے دی تھی۔ ان کی تفصیلی عذاب و ثواب کی کیفیت بھی حضور نے نہیں بتائی جو کچھ بتایا وہ اجمالی تصویر کشی کی حد تک تھا نہ دنیوی امور میں غیب دانی کا آپ نے دعویٰ کیا جو پیشین گوئیاں آپ نے کیں وہ وحی کی روشنی میں تھیں اور خاص خاص حالات سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام انکشافات اور علمی

موہبات مخصوص تھے اور مخصوص چیزوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس تفسیر پر کوئی جرح و قدح نہیں ہو سکتی نہ کوئی آیت اس کے خلاف تعلیم دے رہی ہے نہ حدیث میں اس کے خلاف کچھ آیا ہے۔ وَالعلمُ عندَ اللہ۔ اور اسی کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے اور سیاق کلام بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ یعنی میں اپنی پوری زندگی اور تمام امور میں وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ جتنا علم مجھے وحی کے ذریعہ سے ہو گیا ہے اتنا جانتا ہوں اور جو مجھے تعلیم دی گئی ہے اس پر چلتا ہوں۔ اپنی طرف سے نہ دعوت دیتا ہوں نہ کچھ بتاتا ہوں، نہ کچھ بنا کر پیش کرتا ہوں۔ مجھ سے غیب کی خبریں دریافت کرنا بے کار ہیں نہ مجھے ڈرانے دھمکانے کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے نہ طمع دلانے کا میں تعلیم وحی کو ترک نہیں کر سکتا۔ میرا کام کلام اللہ تعالیٰ کے دنیوی اور اخروی عذاب الٰہ لاکت سے ڈرانا ہے۔

وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ سو میں ڈراتا ہوں ڈراتا رہوں گا۔ ڈرانے والا ہوں۔ کھول کھول کر واضح طور پر تبلیغ کرتا ہوں کوئی مانے یا نہ مانے۔

مقصود بیان

مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ سے معلوم ہو رہا ہے کہ دستور رسالت ہمیشہ سے ایک ہی طرح چلا آ رہا ہے۔ اختلاف مراتب کے باوجود ہر پیغمبر کی حالت ایک ہی جیسی رہی ہے نہ کوئی جن ہوا نہ فرشتہ نہ آدمیت سے برتر کوئی اور مخلوق۔ اور انسان ہی پیغمبر ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم غیب کی کلی نفی کر رہی ہے اور اس کا ناسخ کوئی آیت منقول ہے، لیکن اس سے علم اجمالی کی نفی مستفاد نہیں کی جا سکتی۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ سے معلوم ہو رہا ہے کہ وحی کے سوا خطرات نفس اور اجتہادات فکریہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بھی یقینی نہ تھے۔ جس طرح اتباع وحی کا حکم صراحتاً اس آیت میں دیا گیا ہے اسی طرح غیر وحی کی اتباع کی ممانعت بھی اس سے مستفاد ہو رہی ہے۔ لیکن جو تشریح یا قیاس وحی کے ضابطہ کے تحت ہو اور منافی نہ ہو اس کے اتباع کی حرمت آیت سے نہیں نکلتی بلکہ جس طرح جزئیات کا اندراج کلی کے تحت ہوتا ہے اور ہر جزئی پر حقیقت کلیہ کا صدق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر قیاسی جزئی جو ضابطۂ وحی کے تحت آتی ہے وحی کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَہِدَ شَاہِدٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ

آپ کہہ دیجیے کہ تم مجھ کو یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن منجانب اللہ اور تم اس کے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے کوئی گواہ اس جیسی

اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ع

کتاب پر گواہی دے کر ایمان لے آوے اور تم تکبری میں رہو بے شک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا

تفسیر

قرآن مجید بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اسی نے بھیجا ہے۔ توریت میں اس کی شہادت موجود ہے۔ حضرت موسیٰ پہلے سے اس کی تصدیق کر چکے ہیں۔ توریت سفر استثنار کے اٹھارہویں باب میں ہے اور خداوند تعالیٰ نے مجھ سے کہا۔ ۱۸۔ میں ان (بنی اسرائیل) کے لئے ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تجھ سا ایک نبی پیدا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مونہہ میں ڈالوں گا۔ یعنی مکمل کتاب نازل نہیں کی جائے گی بلکہ تھوڑا تھوڑا کلام اس کو القا کیا جائے گا اور وہ اپنے مونہہ سے بیان کریگا اور بنی اسرائیل میں سے بعض بڑے عالموں اور دانشمندوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی جیسے حضرت عبداللہ بن سلام نے شہادت دیدی۔ اب اگر کوئی اس کی تصدیق نہ کرے اور اللہ کے کلام کو اور اللہ کے پیغمبر کے علم کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا دے تو ایسے شخص سے زیادہ بدنصیب

اور گمراہ کون ہو سکتا ہے۔ انبیاء اور بڑے بڑے اہلِ دانش کی شہادت کے خلاف جو فرد دانکار کے راستہ پر گامزن ہوگا اس کی گمراہی اور ہلاکت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ کلام بطور الزام ہے۔ مشرکوں کے پاس اس کی کوئی دلیل تو نہیں تھی کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہی ہو بلکہ اسماعیلی عربوں کے مقابل جو بنی اسرائیل تھے وہ اہلِ کتاب ہی تھے اور اسماعیلیوں کی نظر میں اہلِ علم بھی مانے جاتے تھے ایسے مسلم الثبوت علماء میں سے اگر کوئی جلیل القدر عالم قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی شہادت دے دے تو پھر جاہل اسماعیلیوں کے انکار کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور اس کو سوائے گمراہی کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ پس اے مشرکو بتاؤ کہ اگر بنی اسرائیل میں سے ایک عظیم الشان شاہد شہادت دے دے اور کلام اللہ ہونے کی تصدیق کرے اور تم ماننے سے انکار کرو اور غرور کرو تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ۔ مثلہ میں مثل کا لفظ زائد ہے یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد نے قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر شہادت دی۔ یا یہی مثل کی ضمیر مَا قُلْتُ کی طرف راجع ہے یعنی جس طرح میں قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہہ رہا ہوں میرے قول ہی کی طرح بنی اسرائیل میں سے اگر کوئی شاہد شہادت دے دے اور ایمان لے آئے۔

شاہد سے مراد جمہور کے نزدیک حضرت عبد اللہ بن سلام ہیں حسن قتادہ مجاہد اور اکثر تابعین کا بھی قول ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے بخاری و مسلم نے صحیحین میں یہی نقل کیا ہے۔ ترمذی، ابن جریر اور ابن مردویہ کی بھی یہی روایات ہیں اور اس کو حضرت عبد اللہ بن سلام کا مقولہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ اور ضحاک کا بیان ہے کہ شاہد ابو یوسف عبد اللہ بن سلام بن حارث ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ بخاری اور بیہقی نے حضرت انس کی روایت سے اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبد اللہ بن سلام کی اولاد میں سے کسی شخص کی روایت سے اور امام احمد نے یعقوب سفیان سے خود حضرت عبد اللہ بن سلام کی زبانی نیز بیہقی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب زہری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام نے فرمایا جب میں نے رسول اللہ صلعم کا تذکرہ سنا اور آپ کے صفات نام اور شکل کا علم ہوا، میں سمجھ گیا کہ یہ وہی ہیں جن کے ہم امیدوار تھے تو میں خاموش رہا اور اپنے خیالات کو چھپائے رکھا۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے اور بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں فروکش ہوئے تو ایک شخص نے آکر حضور کی تشریف آوری کی اطلاع دی اس وقت میں کھجور کے ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا اور میری پھوپی درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے خبر سنتے ہی اللہ اکبر کہا، پھوپی بولی اگر موسیٰ بن عمران کے آنے کی اطلاع بھی تجھے پہنچتی تو اس سے زیادہ (اظہارِ مسرت) تو کیا کرتا۔ میں نے کہا پھوپی خدا کی قسم یہ موسیٰ بن عمران کے بھائی ہیں ان ہی کے دین پر ہیں اور جو پیام دے کر موسیٰ کو بھیجا گیا تھا وہی پیام لے کر یہ مبعوث ہوئے ہیں۔ پھوپی نے کہا (اچھی تو) یہ سنی ہوئی باتیں ہیں آئندہ دیکھا جائے گا) پھر میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف آیا اور چہرۂ مبارک دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا سب سے پہلے حضور سے جو فرمان میں نے سنا وہ یہ تھا لوگو (ضرور تمندوں کو) کھانا کھلاؤ۔ سلام کو آپس میں پھیلاؤ۔ قرابت داروں کی قرابت جوڑے رکھو۔ رات کو جب لوگ سو رہے ہوں تم نماز پڑھو۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا محمد میں آپ سے تین باتیں پوچھتا ہوں جن کو سوائے پیغمبر کے اور کوئی نہیں جانتا۔ قیامت کی اول ترین علامت اور کیا ہوگی۔ اہلِ جنت کا سب سے پہلا کھانا کیا ہوگا اور بچہ اپنے ماں یا باپ کے مشابہ کیوں ہوتا ہے اور چاند میں یہ سیاہی کا دھبہ کیسا ہے۔

(شاید راوی سے نقل کرنے میں کچھ سہو ہو گیا۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ نے تین باتیں دریافت کرنے کا اظہار آغاز کلام میں کیا تھا اور تفصیل میں چار باتیں دریافت کیں، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اَرْبَعٌ کی جگہ راوی نے ثَلَاثٌ کا لفظ سہواً ذکر کر دیا۔ واللہ اعلم (مؤلف)

حضور نے ارشاد فرمایا مجھے جبرئیل نے ابھی اطلاع دی ہے ۔ میں نے کہا جبرئیل نے؟ فرمایا ہاں! میں نے کہا وہ تو یہودیوں کا دشمن ہے ۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کی اوّل ترین نشانی یہ ہوگی کہ ایک آگ مشرق سے برآمد ہوگی اور مغرب کی جانب لوگوں کو ہنکا کر لے) جائے گی ۔ اہلِ جنت کی اوّل ترین کھانا مچھلی کے جگر کا ابھار ہوگا ۔ اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ کو اپنی (صورت کی طرف کھینچ لیتا ہے اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آتا ہے تو بچہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور چاند میں سیاہی کی وجہ یہ ہے کہ پہلے دونوں روشن تھے ۔ سیاہی کا یہ دھبہ روشنی کے مٹنے سے پیدا ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ ۔ یہ سن کر میں فوراً بول اٹھا ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا اور گھر والوں کو مسلمان ہونے کا مشورہ دیا سب مسلمان ہو گئے، مگر میں نے اسلام کو چھپائے رکھا ۔ اس کے کچھ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرا خیال ہے کہ یہودی مجھے اپنا سردار اور سردار زادہ اور سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا کہتے ہیں، مگر یہ لوگ ہیں بڑے جھوٹے ، پہلے آپ ان سے میرے متعلق دریافت کریں ۔ اگر آپ کے دریافت کرنے اور ان کے بیان کرنے سے پہلے ان کو میرے مسلمان ہوجانے کی اطلاع ہوجائے گی تو وہ مجھ پر دروغ بندی اور تہمت تراشی کریں گے اور ایسے عیوب میرے اندر نکالیں گے جو میرے اندر نہیں ہیں ۔ لہٰذا آپ مجھے اپنے گھروں میں سے کسی گھر کے اندر داخل کردیجئے (تاکہ میں وہاں چھپ جاؤں) چنانچہ آپ نے مجھے اپنے ایک گھر میں داخل کر دیا پھر یہودیوں کو بلوایا جب وہ آگئے تو حضورؐ نے ان سے فرمایا ۔ اے گروہ یہود اللہ تعالیٰ سے ڈرو ۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم لوگ یقین کے ساتھ جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہارے پاس حق پیام لے کر آیا ہوں لہٰذا اسلام لے آؤ ۔ یہودی بولے ۔ ہم تو آپ کے رسول ہونے سے واقف نہیں ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اچھا بتاؤ عبداللہ تم میں کیسا آدمی ہے ۔ یہودیوں نے جواب دیا ہم سب سے برگزیدہ ہے اور سب سے اچھے آدمی کا بیٹا ہے ۔ ہمارا بزرگ اور بزرگ زادہ ہے ۔ ہم سب سے بڑا عالم اور بزرگ ترین عالم کا بیٹا ہے ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اچھا اگر وہ مسلمان ہوجائے گا تو تم بتاؤ (کیا مسلمان ہوجاؤ گے) کہنے لگے اللہ اس کو مسلمان ہونے سے بچائے ۔ حضورؐ نے مجھے باہر نکل آنے کا حکم دیا میں فوراً اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتا ہوا نکل آیا اور یہودیوں سے کہا اے جماعت یہود اللہ سے ڈرو اور اللہ کے رسول کچھ تمہارے پاس) لے کر آئیں اس کو قبول کرلو ۔ خدا کی قسم تم لوگ یقین کے ساتھ جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں ۔ میں تو ان پر ایمان رکھتا ہوں، ان کی تصدیق کرتا ہوں اور ان کو پہچانتا ہوں ۔ یہودی بولے تو جھوٹ کہتا ہے ۔ تو سب سے بڑا شریر اور شریر کا بیٹا ہے ۔ یہودیوں نے میری تنقیص کی ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسی کا مجھے اندیشہ تھا ۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تہمت تراش جھوٹے اور بدزبان لوگ ہیں ۔ غرض میں نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا اسلام ظاہر کر دیا اور میری پھوپی بنت حارث بھی مسلمان ہوگئی اور اس کا اسلام اچھا رہا ۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عوف بن اشجعی کا بیان نقل کیا ہے ۔ حضرت عوف نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم روانہ ہوئے میں بھی حضورؐ کے ساتھ تھا ۔ ہم یہودیوں کے عبادت خانہ میں جا پہنچے ۔ یہودیوں کے تہوار کا دن تھا ان کو ہمارا عبادت خانہ میں پہنچنا ناگوار ہوا ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا ۔ اے گروہ یہود تم اپنے میں سے بارہ آدمی ایسے دکھا دو جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں (اگر ایسا ہو گیا) تو اللہ کا وہ غضب جو ہر یہودی پر ہے اس آسمان کے نیچے رہنے والے ہر یہودی کے سر سے اللہ دور کر دے گا ۔ یہودی خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ حضورؐ واپس چلے آئے اور واپسی کے وقت ایک آدمی پیچھے سے آیا اور کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ محمدؐ ہیں ، پھر یہودیوں سے جا کر کہا تم اپنے اندر مجھے کیسا آدمی سمجھتے ہو ۔ یہودیوں نے کہا ۔ تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جاننے والا ہم کسی کو سمجھتے ہیں ، نہ تمہارے باپ سے نہ تمہارے دادا سے ۔ اس شخص نے کہا تو میں شہادت باللہ دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم کو توریت میں ملتا ہے ۔ یہودیوں نے کہا تو جھوٹا ہے ۔ انہوں نے اس شخص

کی بات پلٹ دی اور کچھ برا کہا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت سعید بن ابی وقاص کا قول نقل کیا ہے۔

حضرت سعید کا بیان ہے کہ زمین پر چلنے پھرنے والے آدمیوں والے آدمیوں میں سے کسی کے متعلق میں نے نہیں سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو جنتی فرمایا ہو سوائے عبداللہ بن سلام کے (کہ حضورؐ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ یہ اہلِ جنت میں سے ہے) عبداللہ ہی کے بارے میں آیت وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ نازل ہوئی۔ عبداللہ بن یوسف جو شیخ بخاری ہیں اس حدیث کے راوی ہیں ان سے امام مالک نے یہ حدیث بیان کی۔ عبداللہ کا قول ہے مجھے نہیں معلوم کہ آخری جملہ۔ عبداللہ ہی کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مالک کا قول ہے یا حدیث کا جزء ہے (اور حضرت سعید بن ابی وقاص کا قول ہے)

ابن جریر نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا میرے ہی بارہ میں آیت وشھد شاھد من بنی اسرائیل نازل ہوئی — مؤخر الذکر صورت میں یہ آیت مدنی ہوگی۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ میں تھے۔

شعبی اور مسروق حضرت عبداللہ بن سلام کے بارہ میں اس آیت کے نزول کا انکار کرتے تھے۔ مسروق نے تو یہاں تک کہا تھا خدا کی قسم یہ آیت عبداللہ بن سلام کے متعلق نازل نہیں ہوئی کیونکہ سورت حٰم مکّی ہے اور عبداللہ بن سلام مدینہ میں ایمان لائے تھے بلکہ اس آیت میں لفظ شاہد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات میں بعثت محمدیہ کی خبر دی تھی یہی ان کی شہادت تھی۔ عَلٰی مِثْلِہٖ سے مراد ہے۔ علیٰ مثل القرآن یعنی تورات کے وہ مضامین جن کے اندر قرآن کی تصدیق کی گئی ہے۔ مسروق کے اعتراض کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ سورت اگرچہ مکّی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔ بعض روایات میں ایسا بھی آیا ہے بالفرض اگر اس آیت کو بھی مکّی مان لیا جائے تب بھی کوئی قباحت نہیں، مکّی آیات میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کا تعلق مدنی احوال سے ہے جن کو بطور پیشین گوئی پہلے سے نازل کر دیا گیا ہے۔ وقت ضرورت سے نزول کی تاخیر تو جائز نہیں لیکن ضرورت پر نزول کی تقدیم تو کوئی قباحت نہیں رکھتی۔ اس آیت میں تمام صیغے ماضی کے ہیں۔ کان۔ شھد۔ آمن۔ کفرتم۔ استکبر ماضی کے صیغے ہیں اور ایک دوسرے پر عطف ہے اور سب پر حرف شرط داخل ہوا ہے جس نے سب کو مستقبل کے معنیٰ میں کر دیا ہے۔ گویا مطلب اس طرح ہے کہ اگر قرآن من جانب اللہ ہوا اور تم اس کا انکار کر دو اور آئندہ کوئی شاہد اس کی تصدیق کر دے اور اس پر ایمان لائے اور تم غرور سے اس کو ٹھکرا دو تو بتاؤ تمہاری گمراہی میں کیا شک ہوگا۔ آئندہ ایک عظیم الشان اسرائیلی عالم اس کی تصدیق کرے گا اور اس پر ایمان لائے گا اور تم محروم رہو گے تو عذاب سے کس طرح بچو گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ

اور یہ کافر ایمان والوں کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے اور جب ان لوگوں کو قرآن سے

فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا

ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہ کہیں گے کہ یہ قدیمی جھوٹ ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ہے جو رہنما اور رحمت تھی اور یہ ایک کتاب ⓒ

كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ

ہے جو اس کو سچا کرتی ہے۔ عربی زبان میں ظالموں کے ڈرانے کے لئے اور نیک لوگوں کو بشارت دینے کے لئے۔

تفسیر جو لوگ نسب، مال، جسمانی قوت، جمال صورت سے دنیوی عزت و شوکت اور ظاہری سیادت و جاہ پر جاہلانہ فخر کرتے ہیں وہ علم ہدایت استقامت، صحت عقیدہ اور صلاح اعمال کو اپنا ہی حصہ سمجھتے ہیں کہ مفلسوں، ناداروں اور کمزوروں کو ہدایت و علم اور استقامت و صلاح اعمال میں بھی آگے بڑھنے کا استحقاق نہیں ان کو ہر چیز میں پیچھے رہنا چاہیے۔ دولت صحت جسمانی دنیوی عیش پرستی، شرافت نسبی اور عزت و حکومت میں ہم سب سے آگے اور اونچے ہیں۔ اور دنیوی عقل و علم میں بھی ہم کو برتری حاصل ہے، اس لئے مذہبی دانش علم ہدایت اور ذہنی کردار و اطوار میں بھی ہم کو اعلیٰ اور بالا رہنے کا حق ہے۔ بس جس عقیدہ و عمل کو ہم نہ اختیار کریں اور نچلا طبقہ اس کو اپنائے تو وہ فکر و عمل صحت سے خالی ہوگا، بے جان ہوگا، ویسا ہی غلط ہوگا جیسا پرانے زمانے سے چلا آیا ہے پہلے لوگ بھی ایسی ہرزہ سرائی اور بیہودہ افسانوں کا شکار رہتے چلے آئے ہیں۔ انہی کی نقل اور ریس یہ ہے کہ بعض سلف نے بھی پچھلے زمانے میں ایسی ہی جھوٹی باتیں بنا کر اور پھیلا کر شہرت حاصل کی تھی۔ یہ بھی اس کی کاپی ہے۔ یہ بیوقوف گروہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کا پیام اول سے آخر تک ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے۔ دستور حیات ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور سلف و خلف میں ایک ہی جیسا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی تھی جو دستور حیات تھی اور انسانوں کے لئے رحمت تھی۔ کیا وہ ہرزہ سرائی یا ضلالت آگیں افسانوں کا مجموعہ تھی۔ اگر بالاتفاق اہل کتاب و ارباب علم تورات مجموعۂ ہدایت تھی اور قرآن اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ تورات کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ مانتا ہے صرف زبان کا فرق ہے وہ عبرانی زبان میں تھی اور یہ عربی زبان میں ہے۔ وہ بھی فرماں برداروں کو نجات و جنت کی خوشخبری دینے والی اور نافرمانوں کو اور منکروں کو ہلاکت دوزخ سے ڈرانے والی تھی اور یہ قرآن بھی وعدہ وعید اور انذار و بشارت کا مجموعہ ہے پھر اس کو اِفْكٌ قَدِيْمٌ اور پرانی دروغ بافی کہنا کس طرح صحیح ہے۔

تحلیل اجزاء وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور مشرکوں نے اہل ایمان کے متعلق کہا۔

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ کہ اگر محمد کا دین اچھا ہوتا تو اس کی طرف یہ لوگ ہم سے آگے نہیں بڑھتے یعنی ہم عقل و دانش وجاہت سیادت اور روشنی دماغ میں ان سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اگر اسلام بہتر مذہب ہوتا تو ہم ان بیوقوف کور دانش ذلیل لوگوں سے پہلے اس کو قبول کر لیتے۔

وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ اور اب چونکہ یہ اسلام سے اہل ایمان کی طرح ہدایت نہ پا سکے تو ان کا عناد ظاہر ہو گیا۔ اسی عناد کا نتیجہ ہے کہ قرآن کو قدیمی جھوٹ کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گزشتہ لوگوں نے خود ساختہ جھوٹ پھیلا دیا اور اس کو الٰہی مذہب کہا تھا۔ اسی طرح محمد نے بھی از خود کتاب گڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کر دی۔

ابن جریر نے قتادہ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ مشرک کہتے تھے ہم بڑی عزت والے ہیں۔ اگر دین اسلام میں خوبی ہوتی تو فلاں فلاں لوگ ہم سے آگے نہ بڑھ سکتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن المنذر نے عون بن شداد کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عمر کی ایک باندی تھی جس کا نام زنیرہ تھا۔ حضرت عمر سے پہلے وہ مسلمان ہو گئی تھی مسلمان ہونے کی وجہ سے آپ اس کو خوب مارتے تھے اور کفار قریش اس پر کہتے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو زنیرہ ہم سے آگے اسلام کی طرف نہ بڑھتی۔ ابن سعد نے ضحاک اور حسن بصری کا بھی بیان اسی طرح نقل کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سابق آیت چونکہ حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق نازل ہوئی تھی، اس لئے اس آیت کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہودی بھی اسی قول کے قائل تھے یعنی یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام جیسے مومنین اہل کتاب کے متعلق کہا اگر دین اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو یہ شخص اور اس کے دوسرے مومن ساتھی ہم سے پہلے اسلام کی طرف نہ بڑھتے۔

وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ۔ یعنی ان مشرکوں یا یہودیوں نے ایمان لانے والے مسلمانوں کو ذلیل نظر سے دیکھا اور خود ہدایت نہ پائی

اسلام قبول نہ کیا تو اسلام کی حقانیت پر حملہ کرتے ہوئے اور خود مسلمان نہ ہونے کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے۔ یہ ایک قدیم جھوٹ ہے پہلے لوگوں نے باتیں (توحید قیامت اور نبوت کی) من گھڑت افسانے بنا رکھے تھے۔ محمد نے بھی ایسا ہی جھوٹ کا مجموعہ بنا لیا جس کا نام اسلام بنا لیا۔ ہم اس کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آچکی تھی جو انسانوں کے لئے دستور حیات تھی اور مجسم رحمت الٰہی تھی۔ افکار و عقائد اور اعمال کی اصلاح اور بشری فلاح کا مجموعہ تھی۔ جھوٹ کا پلندہ نہ تھی۔ اہل علم نے اس کو امام مانا تھا اور انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت تسلیم کیا تھا اور تورات کی پیروی کرنے والوں کو یہ مشرک اور یہودی بھی اہل علم و ہدایت مانتے ہیں پھر اس قرآن کو اِفْكٌ قَدِيْمٌ کیوں کہتے ہیں۔ یہ بھی تو توریت کو سچا بتاتا اور آسمانی کتاب کہتا ہے فقط زبان کا فرق ہے۔ یہ عربی میں ہے اور وہ کسی اور زبان میں تھی۔ مقصد و اصول تبلیغ اور روح دعوت میں دونوں ایک جیسے ہیں۔ یہ بھی مشرکوں اور نافرمانوں کو تباہی اور آخرت سے ڈراتا ہے اور اہل ایمان اطاعت گذار نیکوکار لوگوں کو نجات و سعادت کی بشارت دیتا ہے اور توریت بھی ایسی ہی تھی۔

مقصود بیان وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ سے مترشح ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی شہادت تھی اور تورات میں بھی آنحضرت کی تصدیق موجود تھی اور بنی اسرائیل کی یہ تصدیق دوسروں کے لئے بھی واجب القبول ہونی چاہیے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے سرداران کفر کے غلط پندار کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دولتمندی اور دنیوی سیادت انسان کو اتنا بر خود غلط کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ہر عقیدہ و عمل کو صحیح سمجھتا اور دوسروں کے ہر فکر و طریقہ کے ہر عمل کو غلط قرار دیتا ہے اور اپنی عقل کو حق و باطل کا معیار قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ ہم اس فکر و عقیدہ اور عمل کو صحیح نہیں جانتے اس لئے یہ غلط ہے۔ اگر صحیح ہوتا تو ہم ضرور اس کو اپنا لیتے۔ ہمارا اس کی طرف سب سے پہلے نہ بڑھنا ہی اس کے باطل ہونے کی علامت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے اُن لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یہ لوگ اہل جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے بعوض اُن کاموں کے جو کہ وہ کرتے تھے

تفسیر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تین صفات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ علم قدرت ارادہ تربیت خلق کے لئے ضرورت ہے کہ اول تخلیق کی قدرت کاملہ ہو پھر تخلیق کے بعد مدارج کمال تک (خواہ مدارج کمال جسمانی ہوں یا روحانی یا دماغی شخصی ہوں یا قومی) پہنچانے کیلئے قدرت ضروری ہے اور قدرت اضطراری چیز نہیں جہاں اضطرار ہو وہاں تو علت معلول کا ذاتی ارتباط ہوتا ہے جیسے سورج میں روشنی اور آگ میں گرمی ذاتی ہے بغیر اختیاری ایک علت ہے دوسرا معلول اس کو قدرت نہیں کہہ سکتے سورج اور روشنی کے درمیان قادر اور مقدور کا تعلق نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ جب چاہے گرمی عطا کرے اور نہ چاہے تو گرمی نہ پہنچائے۔ سورج چاہے تو روشنی پھیلائے نہ چاہے تو تاریکی کو چھوڑ کر روشنی کو سمیٹ لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قدرت کی بنا ارادہ پر ہے، لیکن قدرت و ارادہ کا مدار علم پر ہے۔ علم ہی نہ ہو تو قدرت کیسی اور ارادہ کس چیز کا۔ علم جزئیات کا کیسا ہوتا ہے

اور کلیات کا بھی علم اپنے اندر سمع بصر کا بھی حامل ہے اور غیر محسوس انکشاف کا بھی۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ ربوبیت کا اقرار حقیقت میں تمام اصول صفات اقرار ہے۔ پھر ربوبیت کے اعتراف کا تقاضا اعتراف الوہیت بھی ہے۔ رب تسلیم کرنے کے بعد الله واحد کا انکار ممکن نہیں، اس لئے رَبُّنَا اللهُ کہنے سے تمام افکار و عقائد کی درستی کا اظہار ہو جاتا ہے، لیکن اقرار الوہیت و ربوبیت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے خود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ ہر عمل میں اعتدال افراط و تفریط کے درمیان توسط اور مادی و روحانی قوتوں کی یک جہتی و یک رنگی استقامت کا مفہوم ہے اور یہ اعتدال و یک رنگی بھی عارضی نہیں بلکہ دوامی ہنگامی اور وقتی نہیں بلکہ پائیدار اور راسخ ہونا ضروری ہے۔ ہر رفتار گفتار اطوار ہر سکون و حرکت ہر خواب و بیداری غرضکہ زندگی کا ہر رخ اور ہر پہلو مستقلاً اگر اعتدال و یک جہتی میں پختہ طور پر رنگ جائے تو اس کو استقامت کہا جائے گا۔ حاصل یہ کہ جن کا عقیدہ اور فکر ہر طرح کے شرک و تشبیہ سے پاک ہو اور جن کے اعمال حیات معتدل اور مستقیم ہوں وہ دوامی سعادت و عیش پائیں گے ان کو کوئی رنج و حزن نہ ہو گا یہی وہ لوگ ہیں جن کو اہل احسان اور صالح الایمان مومن کہا جاتا ہے۔ انہی کے لئے دخول جنت حصول قرب اور علو درجات کی بشارت ہے اور ان کے مقابل وہ لوگ جن کے نہ افکار درست ہیں نہ اعمال۔ حق ناشناس ہیں ناحق کوش ایسے ظالموں کے لئے تخویف عذاب ہے اور انذار عقاب۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا یہ جملہ گویا سابق جملہ کی تشریح اور تفصیل ہے۔ کلام سابق میں قرآن کو محسنین کے لئے بشارت فرمایا۔ بشارت کا لفظ مجمل تھا اور محسنین کی بھی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی۔ اس جملہ میں محسنین کا توضیحی مفہوم بھی بیان کر دیا اور بشارت کی تفصیل بھی کر دی کہ ان کو نہ دکھ کا ڈر ہے نہ سکھ کے زوال کا اندیشہ نہ دنیا میں تکلیف کے ساتھ زندگی گذرنے کا ملال نہ آئندہ تکلیف میں مبتلا ہونے کا خوف۔ وہ جنتی ہوں گے اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے احسان کیا ہے اس کے مفہوم پر کچھ روشنی حدیث صحیح اعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (او کما قال) میں ڈال دی گئی ہے۔ یہاں اس کو استقامت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر عمل میں اخلاص کے ساتھ خوبی اور پائیداری اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار۔ یہی وہ صفات ہیں جو مرتبہ احسان پر فائز کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں لفظ جزآءً بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے اعمال کی یہ جزا مقرر کر دی ہے یعنی اعمال اگرچہ بذاتِ خود موجب جنت نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو استحقاق ثواب کا موجب بنا دیا ہے۔

یَعْمَلُوْنَ سے مراد ہے یَکْتَسِبُوْنَ یعنی جو کچھ وہ حاصل کرتے تھے خواہ وہ علمی فضائل ہوں یا اندرونی مکارم یا بیرونی محاسن۔

مقصودِ بیان ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں لفظ ثُمَّ اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ استقامت اعمال اسی وقت معتبر ہے جب بنیادی عقیدہ صحیح ہو۔ بغیر اقرار ربوبیت و توحید کے اعمال کی درستگی کافی نہیں۔ لفظ ثُمَّ اس جگہ تعقیب زمانہ کیلئے نہیں بلکہ ترقی مرتبہ کیلئے ہے یعنی اقرار توحید کرنے والے جب آگے بڑھ کر اعمال میں استقامت پیدا کر لیتے ہیں تو ان کے مراتب بہت اونچے ہو جاتے ہیں۔ مطلب کہ اقرار توحید اگرچہ بجائے خود بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بغیر صلاح اعمال نتیجہ خیز نہیں، مگر اصلاح اعمال بھی موحد کے مرتبہ کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ

اللہ ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اُس کی ماں نے اُس کو بڑی مشقت کے

كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ

ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اُس کو جنا اور اُس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ چھوڑنا تیس مہینے (میں پورا ہوتا ہے) یہاں تک کہ

أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ

جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ اے پروردگار مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر

عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي

کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے لئے صلاحیت

إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ

پیدا کر دیجئے میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرماں بردار ہوں یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم اُن کے

عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ

کاموں کو قبول کر لیں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے اس طور پر کہ یہ

الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

اہل جنت میں سے ہوں گے اس وعدۂ صادقہ کی وجہ سے جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا تھا

تفسیر حقیقت میں خالق اور رب تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر یہ عالم اسباب ہے۔ زنجیرِ حیات کی ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے۔ سچا دوست ملی سرپرست ظالموں اور چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کرنے والا حاکم، امنِ عام کو برقرار رکھنے والا بادشاہ، علمی زندگی بخشنے والی تعلیم سے دماغ کو روشن کرنے والا اُستاد، ہمدردی اور امداد کرنے والے قرابت دار، نو ماہ تک پیٹ میں اٹھائے پھرنے والی اور ڈیڑھ دو برس دودھ کی شکل میں اپنا خون پلا کر پرورش کرنے والی ماں اور پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ہر آن ترقی اولاد کی کوشش کرنے والا اور غلط راستوں سے بچا کر صحیح تربیت کرنے والا اور روشن تعلیم دلوانے والا باپ یہ سب ہی انسان کے لئے محسن و مربی ہیں اور ان سب کے احسان کا تقاضا ہے کہ ان کی خدمت کی جائے ہر محسن سے حسن سلوک کیا جائے اور مربی کی جائز فرماں برداری کی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے بعد ان تمام محسنوں میں سب سے اونچا درجہ ماں باپ کا ہے۔ انسان تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور تولید میں ماں باپ کا، پھر تربیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے بعد تمام انسانوں سے زیادہ دخل ماں باپ کا ہے۔ تولید کے بعد سن شعور کو پہنچنے تک انسان کے قدرتی مربی ماں باپ ہی ہیں۔ اسی لئے اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت نہ ہو تو ماں باپ کی اطاعت سب سے زیادہ ضروری ہے بلکہ دنیوی رشتہ کو تو اسلام بھی نہیں توڑتا اور کافر ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اولاد ماں باپ ہی کے بدن کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ماں اور باپ کے ہر بن مو نہ سے رطوبت کھنچ کر آتی ہے اور اس سے اولاد کا خمیر تیار ہوتا ہے اور خمیر بھی ایسا کہ ماں باپ کی اکثر طبعی اور شکلی خصوصیات اور مزاجی امتیازات کا حامل ہوتا ہے۔ بیٹا باپ کا سربستہ راز ہوتا ہے۔ ساخت

اور اندرونی احساسات کا نمونہ ہوتا ہے پس حقیقت میں والدین کی خدمت اپنی ہی خدمت ہے۔ ماں باپ سے اچھا معاملہ کرنا اپنی ذات سے حسن معاملہ کا مظہر ہے، ماں باپ کا نفع و نقصان اپنا فائدہ و ضرر ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو ماں باپ کا احسان مانتے اور ان کی خدمت کرتے ہیں۔ خصوصاً ماں کو خدمت خصوصی کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں جو ایک مدت تک اس کو پیٹ میں لئے لئے پھرتی اور مشقت اٹھاتی رہی۔ پھر تکلیف اور مشقت اٹھا کر اس کو جنم دیا پھر دو ڈیڑھ برس اس کو اپنا خون پلا کر پالا۔ پس واجب الشکر ہے وہ ربِ حقیقی جس نے اپنی نعمتوں سے آدمی کو سرفراز کیا اور قابلِ تبریک ہے وہ شخص جو دعا کرتا ہے کہ الٰہی مجھے اپنا شکر ادا کرنے کی توفیق دے کہ تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو اپنے احسانات سے نوازا۔ اے اللہ مجھے نیک اعمال کرنے کی توفیق عنایت کر اور میری نسل و اولاد کو صالح الاعمال بنا کر میری صلاح و فلاح کا سامان فراہم فرما دے۔ میں سارے عالم سے منہ موڑ کر تیری طرف رخ کرتا ہوں اور تیری اطاعت گذاری کا اقرار کرتا ہوں۔

تحلیلِ اجزاء وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا وصیت وہ آخری فرمائش جو مرتے وقت انسان کرتا ہے چونکہ یہ آخری فرمائش نہایت مضبوط ہوتی ہے جس کو منسوخ کرنے کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا، اس لئے ہر تاکیدی ناقابلِ نسخ حکم کو وصیت کہدیا جاتا ہے۔ احسان سے مراد حسن سلوک اچھا معاملہ کرنا خدمت کرنا، مالی امداد دینا، اطاعت کرنا بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہو اگر خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو تو ایسا حسن سلوک کسی مخلوق سے جائز نہیں خواہ وہ والدین ہی ہوں۔

الانسان میں الف لام عہدی ہیں اس سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا یہ حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق نازل ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا اس آیت کا نزول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماں باپ دونوں مسلمان ہو گئے تھے۔ مہاجرین میں سے آپ کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہوا کہ اس کے ماں باپ دونوں مسلمان ہو گئے ہوں۔

سدی اور ضحاک کے نزدیک اس آیت کا نزول حضرت سعد بن ابی وقاص کے متعلق ہوا۔

بعض علماء کے نزدیک الانسان میں الف لام جنسی ہے خواہ اس کا نزول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ہوا ہو یا حضرت سعد کے حق میں، مگر یہ قول سیاقِ آیت کے خلاف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو (یا ابوبکر یا سعد کو) تاکیدی حکم دے دیا کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام ابو قحافہ عثمان بن عمر تھا اور ماں کا نام ام الخیر بنت الخیر بن صخر بن عمر۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حمل سے مراد ہے پیٹ میں اٹھائے رکھنا اور وضع سے مراد ہے جنم دینا اور فصال سے مراد ہے دودھ پلانا یہ پہلے کلام کی گویا علت ہے اور ماں کی طرف زیادہ توجہ دلانے کے لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ مشقت اور تکلیف کے ساتھ وہ اپنے پیٹ کے اندر بچہ کو اٹھائے رہتی ہے اور اٹھائے پھرتی ہے۔ پھر دکھ کے ساتھ اس کو جنم دیتی ہے پھر (اپنا خون) دودھ کی (شکل میں) پلاتی ہے اور تیس ماہ کی مدت اس میں صرف ہو جاتی ہے۔ ڈھائی برس اسی تکلیف میں گزر جاتے ہیں۔

مدتِ حمل کم سے کم مدتِ حمل چھ ماہ ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا وَفِصٰلُهُ فِيْ عَامَيْنِ اور دودھ پلانا دو سال میں ہوتا ہے اور اس جگہ حمل و رضاعت کی مدت ڈھائی سال بیان کی گئی ہے تو مدتِ رضاعت یعنی دو سال منہا کرنے کے بعد مدتِ حمل چھ ماہ رہ جاتی ہے تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے۔ قتادہ نے ابوالحرب بن ابی الاسود دؤلی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک عورت کے چھ ماہ میں بچہ پیدا ہوا اس کی پیشی حضرت عمر کے سامنے ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ

سے مشورہ لیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس پر رجم (سنگ ساری کی سزا) نہیں ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اور دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ وَفِصَالُهٗ فِیْ عَامَیْنِ لہٰذا حمل کے چھ ماہ باقی رہے۔ حضرت عمرؓ نے عورت کو چھوڑ دیا۔ ہم کو اطلاع ملی ہے کہ پھر اس عورت کے چھ ماہ میں اور بچہ پیدا ہوا۔

نافع بن جبیر کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا ایک عورت کے چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوا اس کی پیشی ہوئی۔ لوگوں نے اس فعل کو منکر قرار دیا (یعنی سزا دلوانی چاہی) میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا آپ کس طرح ظلم کر رہے ہیں فرمایا ظلم کیا۔ میں نے کہا پڑھیے آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اور دوسری آیت پڑھیے وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ حَوْل کس کو کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا سال کو۔ میں نے عرض کیا سال کتنے دنوں کا ہوتا ہے فرمایا بارہ مہینے کا۔ میں نے عرض کیا چوبیس مہینے کے دو سال ہو گئے۔ (باقی مدت ہے چھ ماہ وہ حمل کے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ حمل میں جتنی تاخیر چاہتا ہے کرتا ہے اور جتنی تقدیم چاہتا ہے کرتا ہے) حضرت عمرؓ کو یہ سن کر اطمینان ہو گیا۔

حضرت عبدالرحمٰن کے آزاد کردہ غلام ابوعبیدہ کی روایت ہے کہ ایک عورت کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس کے چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا یہ بچہ میرے خیال میں گناہ کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب مدت رضاعت پوری ہو جائے تو حمل کے چھ ماہ ہی رہ جاتے ہیں۔ پڑھیے وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ حضرت عثمانؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔

عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اگر حمل نو ماہ تک رہے تو رضاعت کے اکیس ماہ ہوں گے اور اگر حمل چھ ماہ رہے تو رضاعت کے چوبیس ماہ ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ مدت حمل کم سے کم چھ ماہ ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ مدت کتنی ہے اس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حمل کی طویل ترین مدت دو سال مدت ہے۔ امام مالک کے تین قول مختلف روایات میں آئے ہیں۔ ایک قول میں چار سال دوسرے میں پانچ سال اور تیسرے میں سات سال کی مدت آئی ہے۔ امام شافعی چار سال کے قائل ہیں۔ امام احمد کے ایک قول میں دو سال اور دوسرے میں چار سال کی مذکور ہے۔ مؤخر الذکر قول زیادہ مشہور ہے۔

امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا بچہ ماں کے پیٹ کے اندر دو سال سے زائد نہیں رہتا خواہ تکلے کے دور کے برابر ہی ہو۔

مدت حمل کی یہ تعین اس وقت ہوگی جب الانسان کے الف لام کو جنسی قرار دیا جائے۔ گویا اس میں عام انسانوں کی حالت کا بیان کیا گیا اور حمل و رضاعت کی مدت معین کی گئی ہے۔ لیکن آیت کو اگر حضرت ابوبکر یا حضرت سعد کے متعلق کہا جائے تو اور الف لام عہدی قرار دیا جائے تو صرف ایک واقعہ کا اظہار ہوگا اور حضرت ابوبکر صدیق کی پیدائش اور بچپن اور جوانی سے تعلق رکھنے والا ایک واقعاتی بیان ہوگا اس سے آگے عام ضابطہ کی طرف رہنمائی نہ ہوگی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حملت اور وضعت سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک پیٹ میں رکھنا اور جنم دینا مراد نہیں ہے بلکہ گود میں اٹھانا اور نیچے اتارنا مراد ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً۔ امام شافعی نے اشد کی تفسیر بلوغ سے کی ہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر مراد ہے۔ حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ سال کی عمر سے رہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ۲۰ سال کی اور حضرت ابوبکر کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ دونوں تجارت کیلئے ملک شام کو ساتھ گئے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبوت کا اظہار کیا تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق فوراً مسلمان ہو گئے آپ کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے دعا کی جس کا ذکر آئندہ

آیت میں کیا گیا ہے ۔ دعا میں تین باتوں کا ذکر کیا ۔
قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ ۔ اور کہا اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ان کا تیری بارگاہ میں شکر ادا کروں ۔ منعم کی نعمت کا شکر ادا کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کے انعام میں دوسرے کی شرکت نہ کی جائے اس کا احسان مانا جائے اور اس انعام کا محسن دوسرے کو نہ قرار دیا جائے گویا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں کسی کو شریک نہ سمجھنا ، اس لئے دعا کرنے کے وقت لفظ رب (میرے پروردگار) سب سے پہلے کہا اور چونکہ توحید ربوبیت کے بعد توحید الوہیت اس کا لازمی نتیجہ ہے ، اس لئے توفیق شکر کی درخواست اپنے اندر اقرار الوہیت کی بھی حامل ہے اور اقرار ربوبیت کے اندر اقرار الوہیت پوشیدہ دوسری درخواست یہ کی کہ مجھے ایسے نیک اعمال کی توفیق دے جو تجھے پسند ہوں ۔ صلاح اعمال کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ دنیا میں ہر گروہ اپنے لیڈر مصلح گرو استاد اور دوسرے پیشواؤں کی ہدایت کو عمل کا ذریعہ ہی جانتا ہے ۔ فلاسفر اپنے خود ساختہ عقلی نظریات کو مصلح اعمال جانتا ہے اور پارلیمنٹری حکومتیں اپنے شورائی قانون کو صلاح عمل کا سانچہ اور معیار سمجھتی ہیں ۔ اگر ہر شخص مخلص ہے تو اس کا عمل خواہ کتنا ہی برا ہو ، مگر وہ اس کو درست ہی جانتا ہے ، لیکن حقیقت میں خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار کیا ہے یہ عقلی تکیں لڑنے والے نہیں جانتے ۔ یہ تو اپنے دانش نما توہمات کے جال میں گرفتار ہیں کوئی سراب کو آب سمجھتا ہے اور کوئی شراب خراب کو خیر آب ۔ ظاہر ہے کہ واقع میں جو چیز حق اور صواب ہے اس میں تعدد نہیں ہو سکتا ، پھر اختلاف عقول کی اس انتہاء اور ان گنت دنیا میں کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ کون عمل صحیح ہے اور کون غلط اس کا معیار وا حد اگر ہو سکتا ہے تو یہ کہ رب کا پسندیدہ کون سا عمل ہے اور نا پسند کون سا ۔ اس صورت میں حق ایک ہی ہوگا اور تعدد و تکثر مٹ جائے گا ، لیکن اچھے عمل کی تعلیم کون دے اور کون رب سے معلوم کرے کہ تیری مرضی کیا ہے اور کس عمل کو تو پسند کرتا ہے ۔ اس تعلیم اور آگاہی کے لئے بھی اسی سے درخواست کرنی لازم ہے تاکہ وہ ہی اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے آگاہی عطا فرما دے کہ پسندیدہ اعمال فلاں فلاں ہیں اور ناپسندیدہ فلاں فلاں ۔ گویا نیک اعمال کی خداوند تعالیٰ سے درخواست کرنا اپنے اندر اقرار نبوت کو اٹھائے ہوئے ہے ۔ پہلا جملہ اعتراف توحید کو متضمن تھا اور یہ اعتراف نبوت کو پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ عمل صالح معلوم ہونے کے بعد بھی ضروری نہیں کہ آدمی اس کو اختیار کرے ۔ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی چٹکی میں ہے وہ جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے ۔ آدمی حق کو حق جانتا ہے مگر عمل نہیں کرتا ۔ تصور و ارادہ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ۔ اعصاب و عضلات میں طاقت پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے حس و شعور میں بیداری پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے ۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو ارادہ اور تصور کا رخ خیر کی طرف نہ ہو ، حس و شعور پر غفلت طاری رہے اور اعصاب و عضلات خیر کی جانب حرکت نہ کریں ، اس لئے اعمال پسندیدہ اختیار کرنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق کی درخواست بھی اللہ تعالیٰ ہی سے کی ۔

ماں باپ اگر روحانی اور جسمانی نعمتوں سے سرفراز ہوں ۔ دنیوی عزت اور راحت کے مالک ہوں اور دینی فکر و عمل کی صحت ان کو حاصل ہو تو اولاد کی ذاتی صلاحیت کو ماں باپ کی صحیح تربیت سے چار چاند لگ جاتے ہیں ، ماں باپ کو خوش حال اعمال خوش اقوال اور خوش افکار دیکھ کر آدمی اپنی جگہ خوش ہوتا ہے اور ماں باپ پر اللہ تعالیٰ کا جو احسان ہوتا ہے اس کو اپنی ہی ذات پر احسان خداوندی سمجھتا ہے اور صرف سمجھتا ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ماں باپ کی صلاح و فلاح میں اولاد کا حصہ ہوتا بھی ہے ، اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے براہ راست خود بہرہ یاب ہونے کا وہ شکر ادا کرتا ہے ماں باپ کی دنیوی و دینی بہبودی کا بھی جو بالواسطہ اس کی اپنی ہی بہبودی ہوتی ہے شکر ادا کرتا ہے ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی لئے دوہرا شکر ادا کرنے کی توفیق کی درخواست کی ۔ اُن نعمتوں کا بھی جن سے وہ خود بہرہ یاب تھے اور ان نعمتوں کا بھی جو اُن کے ماں باپ کے شامل حال تھیں اور مندرجہ بالا مقصد ہی کے زیر اثر توفیق شکر کی التجا

کے ساتھ عمل صالح میسّر آنے کی بھی درخواست کی اور عرض کیا

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ تیسرا خوش کن انعام آدمی کی اولاد کی صلاح و فلاح کی شکل میں سامنے آتا ہے - صالح اولاد نہ فقط زندگی کا شیریں ثمر ہوتی ہے بلکہ اس حیاتِ مستعار اور آئندہ حیاتِ دوامی کو خوش گوار بنانے کا ذریعہ بھی ہوتی ہے، جو اولاد خوش اطوار صالح الاعمال، فرماں بردار اور مومن صادق ہو وہ انسان کے لئے مدت العمر بلکہ قیامت تک کے لئے خیر جاری کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے نیک کردار کا پھل انسان کو نہ صرف اس زندگی میں ملتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیشہ ملتا رہے گا، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اصلاح ذریت کرد ے تو بالواسطہ اس کا اچھا اثر خود انسان کی اپنی ذات پر پڑتا ہے - یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی دعا میں اولاد کی اصلاح کو بھی شریک کر لیا اور عرض کیا۔

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ صرف اَصْلِحْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ نہیں کہا بلکہ لِيْ کا لفظ بڑھا دیا کہ میرے فائدے کیلئے میری اولاد کو صالح بنا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ دعا قبول ہوئی - بقول حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوبکرؓ نے تو ایسے مومن غلام اور باندی آزاد کئے جن کو مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی جاتی تھیں (اور سارا مال تبلیغ اسلام اور حضور کی اعانت میں صرف کر دیا) اور ماں باپ کے اسلام کے ساتھ اُن کی ساری اولاد بھی مومن ہوئی - کذا قال ابن عباس - ابو قحافہ (والد) ام الخیر (والدہ) عبدالرحمٰن (حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے) ابو عتیق ابن عبدالرحمٰن (حضرت ابوبکر کے پوتے) سب ہی مسلمان اور صحابی ہوئے - اصل و نسل کی یہ مجموعی نعمتیں کسی اور صحابی کو میسّر نہیں آئیں -

ایک شبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اڑتیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی پھر حضرت ابوبکر صدیق کی چالیس سال کی عمر میں یہ دعا کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے - کیا مسلمان ہونے کے دو سال بعد تک دعا کرنے سے غافل رہے - یہ بات ہدایتِ عقل کے خلاف ہے اور اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ چالیس سال سے ٹھیک چالیس سال مراد نہیں جو چالیس کے قریب ہو وہ بھی تقریباً چالیس سال کا ہی کہلاتا ہے - اڑتیس اور چالیس سال میں کچھ زیادہ فرق نہیں یا یہ کہا جائے کہ ماں باپ کیلئے خصوصی دعا کو اپنی دعا میں شامل چالیس سال کی عمر کیا - اس سے پہلے ماں باپ کیلئے دعا نہیں کی تب بھی یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابو قحافہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی چالیس سال کی نہ تھی اور اس آیت کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا ہے کیونکہ سورت مکی ہے جب حضرت ابوبکر چالیس برس کے تھے اس وقت حضرت ابو قحافہ تو اسلام سے بیس سال پیچھے تھے - اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے -

ازالہ بعض روایات میں آیا ہے کہ مسلمان ہونے کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اڑتیس سال کی تھی اور دو سال کے بعد آپ کے والدین بھی مسلمان ہو گئے تھے (اگرچہ ابو قحافہ کے اسلام کا اظہار فتح مکہ کے دن ہوا) اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی عمر یقیناً چالیس سال تھی اور اگر فتح مکہ کے وقت ابو قحافہ کا مسلمان ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی بیس سال پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا کافر والدین کے حق میں یہ کہنا کہ تو نے میرے ماں باپ کو نعمتوں سے سرفراز کیا ہے کوئی خلاف واقعہ یا غلط بات نہیں ہے کیونکہ دنیوی نعمتیں تو ماں باپ کو میسّر ہی تھیں اور کافر باپ کی دنیوی نعمتوں کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ دنیوی معاملات میں حسن سلوک رکھنے کا بھی حکم ہے البتہ دینی معاملات میں ان کے اتباع کی ممانعت فرما دی ہے - سورۂ عنکبوت میں آیا ہے - وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا - ان تاویلات کی اس صورت میں ضرورت پڑے گی جب الانسان میں الف لام عہدی مان کر حضرت ابوبکرؓ کے حق میں آیات کا نزول قرار دیا جائے اور دوسرے اہل ایمان جو ان صفات کے حامل ہوں ان کو ذیلی طور پر آیت کے حکم میں شامل کر لیا جائے، لیکن اگر الانسان کے الف لام کو جنسی کہا جائے اور اشد سے مراد بلوغ یا

اٹھارہ سال کی عمر یا اٹھارہ سے تیس سال تک کی عمر یا بھرپور جوانی اور طاقت کی عمر مراد لی جائے اور چالیس سے کمال شعور وعقل کے زمانہ کا آغاز مراد ہو تو جو انسان بھی ان صفات کا حامل ہو وہ آیت کا مصداق ہوگا اور چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، اس لئے آپ اس آیت کے مصداق اعلیٰ قرار دیئے گئے اور روایات میں آپ کو مورد آیات کہا گیا۔

اُولٰٓئِكَ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسی صفات کے حامل یا وہ تمام لوگ جو صفات مذکورہ کے ساتھ موصوف ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ بھی شامل ہیں۔

اَلَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا یعنی ایسے لوگ ہی ہیں جن کے بہترین اعمال ہم قبول کر لیتے ہیں اور چونکہ ان کا ہر نیک عمل دوسرے کم درجہ کے مومنوں کے عمل سے اچھا ہوتا ہی ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کا ہر نیک عمل دوسرے کے اعمال سے احسن ہوتا ہے رہے وہ بُرے اعمال جو باقتضائے بشریت ان سے کبھی نہ کبھی سرزد ہو جاتے ہیں اور کبھی دانستہ نادانستہ ان سے چھوٹا موٹا گناہ ہو جاتا ہے تو

وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ ہم ان کی برائیوں کی پکڑ نہیں کرتے درگزر کرتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ نیکیاں کرنے والا آہستہ آہستہ گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ نماز کی خلوص کے ساتھ پابندی برے کاموں سے اور بے حیائی کی باتوں سے روک دیتی ہے۔ سچائی جھوٹ پر غالب آجاتی ہے۔ حلال کمائی کی پیہم کوشش حرام خوری کو ترک کرا دیتی ہے۔ دوسرا معنی بھی ہے جو اس آیت کا ظاہر مطلب ہے کہ مذکورۂ بالا صفات رکھنے والوں کے گناہوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا گرفت نہیں کرے گا۔

فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ۔ یعنی مذکورۂ بالا اوصاف والے اصحاب جنت میں شامل ہوں گے۔

لفظ اصحاب عدم انفکاک پر دلالت کر رہا ہے یعنی دوزخ اور دوزخ کی آنچ سے بھی آزاد ہیں گے ایسا نہ ہوگا کہ کچھ عذاب پانے کے بعد معافی پاکر جنت میں جائیں گے بلکہ جنت والے ہوں گے۔

وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان سے غلطیاں معاف کرنے اور خالص جنتی بنانے کا وعدہ کر رکھا ہے یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے سچا کیا ہے اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔

مقصودِ بیان

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا تاکیدی حکم۔ خصوصاً ماں کی خدمت کرنے کی مدلل تلقین۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا سے معلوم ہو رہا ہے کہ حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت ڈھائی سال ہے ادنیٰ حمل چھ ماہ اور انتہائی رضاعت دو سال اس تقسیم کی طرف آیت میں کوئی اشارہ نہیں۔ مفسرین نے حولین کاملین والی آیت اور بعض احادیث کی روشنی میں استنباط ضرور کیا ہے، لیکن اس آیت سے ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں اور بالفرض اگر اس آیت میں حمل کی ادنیٰ مدت چھ ماہ قرار دی جائے تو ادنیٰ مدت رضاعت بھی دو سال کہنی پڑے گی۔ یہ تفصیل اور تعزیق نہیں کی جا سکتی کہ حمل کی مدت تو کم سے کم اور رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ بیان کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس سے ایک روایت میں منقول ہے کہ اگر حمل نوماہ تک رہے تو رضاعت کی مدت کے اکیس ماہ رہ جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حمل کی کوئی مدت اس آیت میں نہ بیان کی گئی ہے اور دوسری آیت میں دو سال کامل اس شخص کیلئے قرار دی گئی ہو جو اپنی مطلقہ بیوی سے اجرت پر دودھ پلوانا چاہتا ہو کیونکہ وہاں لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ آیا ہے یعنی دو سال کی مدت اس شخص کیلئے ہو رضاعت پوری کرانی چاہتا ہو۔ واللہ اعلم۔

بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً لفظ اربعین محض اتفاقاً مذکور نہیں ہے بلکہ اس طرف اشارہ ہے کہ عقل وشعور اور فہم ودانش کی تکمیل چالیس سال کی عمر میں ہو جاتی ہے یعنی قوت عقل وفہم اپنے تخلیقی عروج پر چالیس سال میں پہنچ جاتی ہے۔ اب اس کے بعد تخلیقی ترقی کا وقت نہیں رہتا بلکہ تجربات ومشاہدات اور صحیح ترتیب افکار کی ترقی سے فہم میں ترقی ہو جاتی ہے۔

اَوْزِعْنِیْٓ سے یہ تعلیم مستفاد ہوتی ہے کہ مومن پر لازم ہے کہ اللہ نے جو نعمتیں اس کو عطا کی ہیں ان کا بھی شکر ادا کرے اور جو نعمتیں اس کے ماں باپ کو دی ہیں ان کا بھی شکر کرے اور اللہ تعالیٰ سے توفیق شکر کی دعا بھی کرے اور اپنے اور اپنی اولاد کے صالح ہونے کی بھی دعا کرے اور صلاح اولاد کو اپنی ہی صلاح تصور کرے ۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان زاہدوں، عابدوں اور تعلیمی خدمات میں غرق رہنے والوں کو جو اولاد کی تربیت و تعلیم اور سعی اصلاح سے غافل رہتے ہیں ۔

نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ میں صراحت ہے کہ نیکو کار پرہیز گار مومنوں سے اگر کوئی قصور ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے قصور کو معاف فرمادے گا اور نیکیاں گناہوں کو بھی بہا لے جائیں گی وغیرہ۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ

اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تُف ہے تم پر کیا تم مجھ کو یہ وعدہ یعنی خبر دیتے ہو کہ میں (قیامت میں دوبارہ زندہ ہوکر)

مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۖ فَیَقُوْلُ

قبر سے نکالا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی امتیں گزر گئیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کر رہے ہیں ارے تیرا ناس ہو ایمان لا بیشک اللہ کا وعدہ سچا

مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ

ہے تو یہ کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آرہی ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کے حق میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول پورا ہوکر

اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۸﴾

رہا جو ان سے پہلے جن و انسان ہو گزرے ہیں بے شک یہ خسارے میں رہے۔

تفسیر اس دنیا میں خیر کے ساتھ شر اور نیک کے ساتھ بد ہمزاد ہیں ۔ نیک ماں باپ کی اولاد صالح بھی ہوتی ہے اور طالح بھی اور یہ بدیہی مشاہدہ اور عقلی مسلمہ اور فطری تقاضا ہے کہ اولاد نیک ہو یا بد ۔ ماں باپ کو فطری طور پر اس سے محبت ہوتی ہے البتہ محبت کی نوعیت میں اختلاف ہوتا ہے ۔ کچھ ماں باپ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اولاد اللہ کی نافرمان ہو یا فرماں بردار کافر ہو یا مومن ۔ بہرحال اس کے لئے صرف دنیوی بہبودی کے خواستگار ہوتے ہیں ۔ ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ مرنے کے بعد یہ دکھ میں رہے گا یا سکھ میں ۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اگر اولاد کے لئے دعا بھی کرتے ہیں تو صرف دنیوی مقاصد میں کامیابی کے لئے ۔ اس سے آگے ان کے تصور کی رسائی بھی نہیں ، لیکن کچھ ماں باپ ایسے ہوتے ہیں کہ اولاد سے ان کی محبت کا اوّل ترین اور بنیادی تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کی نافرمان ہو تو وہ اولاد کو راہ راست پر چلنے کی ہدایت کرتے ہیں ۔ اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی فریاد کرتے ہیں کہ اے بارالٰہا اس کو ہدایت فرمادے ۔ نافرمان اولاد ان کو سٹھیا ہوا کہتی ہے اور ان کی ہدایت کو داستان پارینہ قرار دیتی ہے ۔ مگر وہ برابر فہمائش کرتے ، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے استغاثہ کرتے رہتے ہیں ۔ ایسے نافرمانوں کا مآل وہی ہوتا ہے اور وہی ہوگا جو ان سے پہلے بد عقیدہ بدکاروں کا ہوا ۔

تحلیلِ اجزاء وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ یعنی جب ماں باپ نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے ، اس کی اطاعت کرنے اور حشر و نشر عذاب و ثواب کا عقیدہ رکھنے

کی دعوت دی تو اس نے ماں باپ کو جھڑک دیا اور بولا کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ مرنے کے بعد مجھے دوبارہ قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور دوسری زندگی میں جزا سزا ملے گی ۔ حالانکہ مجھ سے پہلے ان گنت لوگ گذر گئے اور کوئی بھی زندہ ہو کر واپس نہیں آیا ۔ اگر کوئی بھی اب تک زندہ ہو کر لوٹا ہوتا تو میں تمہاری بات کو مانتا ۔ جب تمہاری بات خود تمہارے اور میرے مشاہدے کے خلاف ہے تو کس طرح تسلیم کی جائے ۔

وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ مگر ماں باپ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں اور توفیقِ ایمان عطا ہونے کی دعا کرتے رہیں ۔ یعنی ان کی محبت اندھی نہیں بلینا ہے ، نارسا نہیں حقیقت شناس ہے ، صرف مادی اور دنیوی نہیں بلکہ مآل اندیش ہے ۔ وہ اللہ سے اس کے ہدایت یاب ہونے کی دعا کرتے ہیں اور بیٹے سے کہتے ہیں ارے کم بخت مان جا ۔ آخرت پر ایمان لے آ ۔ اللہ تعالیٰ نے حشر و نشر کا وعدہ فرمایا ہے جو پورا ہو کر رہے گا یعنی اگر اب تک قیامت نہیں آئی اور کوئی دوبارہ زندہ ہو کر نہیں آیا تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کبھی قیامت نہ ہوگی ۔ یہ کسی انسان کی کہی ہوئی بات نہیں جس میں غلطی کا احتمال ہو سکے اللہ کا وعدہ ہے جس میں غلطی نہیں ہو سکتی ۔ وہ پورا ہو کر رہے گا ، مگر کافر بیٹا نہیں مانتا اور کہتا ہے یہ وعدۂ قیامت تو پچھلے لوگوں کی بنائی ہوئی داستان ہے ۔ متقدمین نے یہ جھوٹ بنایا تھا جو پھیل گیا ۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ۔

کیا آیت کی خاص شانِ نزول ہے

بخاری نے یوسف بن مالک کی سند سے لکھا ہے کہ معاویہ کی طرف سے مروان حجاز کا گورنر تھا ۔ ایک روز مروان نے خطبہ دیا اور معاویہ کے بعد یزید کی خلافت کے لئے لوگوں سے کہا یعنی یزید کے ولی عہد ہونے کی لوگوں سے بیعت لینی چاہی اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو کچھ کہہ دیا ۔ مروان نے کہا اس کو پکڑ لو ۔ حضرت عبدالرحمٰن ام المومنین حضرت عائشہ کے گھر میں چلے گئے اور لوگ آپ پر قابو نہ پا سکے ۔ مروان کہنے لگا یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آیت والذی قال لاویہ اف لکما اتعدانني نازل فرمائی تھی ۔ حضرت عائشہ رضی نے پردہ کے پیچھے سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملے میں جو قرآن نازل فرمایا اس میں میری معذرت (یعنی پاک دامنی) ظاہر فرمائی ہے ۔ (یعنی منقصت اور مذمت کی کوئی آیت ہمارے متعلق نازل نہیں کی) روایت میں آیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن مروان کے قول سے غضب ناک ہو گئے تھے اور فرمایا تھا یہ تو ہرقلوں کا دستور ہے کہ بیٹے باپ (کی حکومت) کے وارث ہوتے ہیں ۔۔ ابن ابی حاتم نے سدی اور ابن عباس کا قول بھی یہی نقل کیا ہے جو مروان نے کہا تھا اور بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے متعلق اس وقت نازل ہوئی تھی جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے ۔ پھر مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام اچھا رہا ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس سدی اور مجاہد کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عبداللہ کے متعلق ہوا ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ، عبدالرحمٰن کے والدین ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے ، مگر وہ نہیں مانتے تھے اور کہتے تھے عبداللہ بن جدعان ۔ عامر بن کعب اور دوسرے قریش مشائخ کو میرے سامنے زندہ کر کے لاؤ میں ان سے تمہاری بات کے متعلق دریافت کروں گا ۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے متعلق اس آیت کے نزول کا قول سب سے پہلا مروان کا تھا ۔ مروان ہی کے قول پر بعد کے اقوال کا مدار ہے اور ظاہر ہے کہ مروان کے اس قول کا باعث اس کا عناد تھا ۔ سچائی کو اس میں دخل نہیں ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے متعلق اس آیت کے نزول کا حضرت عائشہ رض نے انکار کیا تھا اور ایک اور شخص کا نام لے کر فرمایا تھا یہ آیت تو اس کے متعلق نازل ہوئی تھی ۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ کے انکار والی روایت نہایت صحیح اور بہت زیادہ قابلِ قبول ہے ۔ بغوی نے حسن اور قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ایک نافرمان کافر کے حق میں ہوا تھا ۔ جس کے ماں باپ مسلمان تھے ۔ زجاج نے کیسی اچھی بات کہی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن کے متعلق اس آیت کا نزول ممکن نہیں کیونکہ اس سے

آگے آتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ کا نزول ایسے شخص کے متعلق ہوا جو ہمیشہ کافر رہا اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے کافروں کے ساتھ اس کو جہنمی بنا دیا۔ اور قیامت کے دن جس طرح دوسرے کافر خسران مآل ہوں گے وہ بھی زبوں حال ہوگا اور حضرت عبدالرحمٰن ایسے نہ تھے آپ بزرگ صحابہ میں سے تھے۔ کفر کے بعد جب دائرۂ اسلام میں آئے تو خلوص کے ساتھ آئے اور بزرگ ترین صحابہ میں آپ کا شمار کیا گیا۔

پس حق یہ ہے کہ آیت میں اگر مخصوص کافر مراد ہو تو اس کا نام کسی حدیث میں نہیں آیا پھر لعین اسم پر آیت کا مفہوم موقوف بھی نہیں ہے اگر کوئی مخصوص شکل مورد نزول ہوتا تب بھی حکم اور ضابطہ عام ہوتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ۔ یعنی مذکور بالا کافر اور اس جیسے دوسرے لوگ ایسے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی بات پوری ہوکر رہے گی ۔ بات سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ گمراہ رہیں گے۔ اور جہنمی ہوں گے۔

فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ۔ ایسے لوگوں کو جن وانس کی ان اقوام کے ساتھ فیصلے اور عذاب میں جو ان سے پہلے گذر گئیں اور انہیں کی طرح تھیں یہ سب لوگ زبوں حال ہوئے ان کا کفران کو فائدہ نہ پہنچا سکا۔

مقصودِ بیان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واحد ماننا اور رسول کو سچا رسول جاننا تنہا نجات کیلئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ قیامت اور حشر جسمانی ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پس جو شخص اسلام کا دعویٰ کرے اور قیامت کا انکار کرے یا مذاق اڑائے یا صرف روحانی سزا جزا کا اقرار کرے اور حشر جسمانی کا منکر ہو وہ کافر ہے اس کے کفر کو ثابت کرنے کیلئے یہ آیت کافی ہے وغیرہ۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يُعْرَضُ

اور ہر ایک کے لئے اُن کے اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے ملیں گے اور تاکہ اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال پورے کر دے اور اُن پر ظلم نہ ہوگا اور جس روز کفار آگ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا

کے سامنے لائے جائیں گے (اور ان سے کہا جاوے گا) کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝ ع

اور اُن کو خوب برت چکے سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائیگی اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔

تفسیر مسلمانوں اور منکروں کی جدا جدا جماعتیں ہوں یا ہر جماعت کے الگ الگ افراد بہرحال اسلام و کفر کے درجہ اور خصوصیات میں امتیاز ہے پھر ہر اسلام اور ہر کفر کے احوال بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ اسلام کے اندرونی مدارج بلندی اور پستی کے اعتبار سے بہترین اور کفر کے مراتب بھی ادنیٰ اور اعلیٰ ہونے کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ پس عمل قلبی یعنی عقیدہ ہو یا عمل اعضاء یعنی افعال اور حرکات و سکنات سب کے درجے الگ الگ ہیں۔ اور ان درجات ہی کے مطابق ان پر سزا جزا اور عذاب ثواب کا ترتب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمایز و تفرقہ جزا سزا میں اس لئے رکھا ہے کہ ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلا مل جائے گا اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ لیکن کیا کافروں کو کفر کے باوجود اُن کے اچھے اعمال کی جزا ملے گی۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ کافروں کے اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اُن کو

دیا جائے، لیکن چونکہ ان کے اچھے اعمال بے بنیاد ہوتے ہیں لوجہ اللہ خلوص خاطر کے ساتھ نہیں ہوتے، ان کا بنیادی عقیدہ درست نہیں ہوتا، اس لئے ان کو پائیدار اور لازوال جزا نہیں مل سکتی اور آخرت کا تو ہر ثواب لازوال ہے۔ خواہ کم ہو یا زیادہ مگر غیر منقطع ہے، اس لئے آخرت میں تو وہ اچھے اعمال کے ثواب سے محروم رہیں گے، مگر دنیا میں باختلاف مراتب ان کو آرام، عیش، صحت، دولت، حکومت اور طرح طرح کی نعمتیں عطا فرمائی جاتی رہیں گی اور قیامت کے دن ان سے کہہ دیا جائے گا کہ تمہارے لئے سوائے اہانت آگیں عذاب کے اور کچھ نہیں۔ تم اچھے کاموں کی جزا دنیا میں لے چکے۔

تحلیلِ اجزاء

لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ لکل سے مراد یا تو مسلمانوں کی جماعت کا ہر فرد ہے یعنی ہر مسلمان کے ثواب کا درجہ اس کے عمل کے مطابق جدا جدا ہے۔ سب مسلمانوں کے مراتب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مراتب میں مطابق اعمال کمی بیشی اور بلندی و پستی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا۔ مراد یہ ہے کہ اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے والا پیچھے آنے والے (مسلمان) سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ تقدم تاخر ایک گھنٹہ کا ہی ہو۔ مقاتل نے کہا ہر ایک کے فضائل اعمال کے مطابق ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال کا پورا ثواب دے گا۔

یا مومنوں اور کافروں کی دونوں جماعتوں کا ہر فرد مراد ہے۔ ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ دوزخیوں کے درجات (عذاب) میں اضافہ پستی کی طرف بڑھتے جانے سے ہوگا اور جنتیوں کے مراتب (ثواب) میں ترقی بلندی مدارج سے ہوگی۔

مِمَّا عَمِلُوْا کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کی وجہ سے ان کے درجات ثواب و عذاب مختلف ہوں گے یا یہ مراد ہے کہ ہر ایک کے اعمال کے درجات مختلف ہیں، اس لئے جزا، اعمال کے مراتب بھی جدا جدا ہیں۔

وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ درجات کا تمایز رکھا ہے اور اس لئے رکھا ہے کہ سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ نہ ثواب میں کمی کی جائے گی نہ عذاب میں زیادتی، لیکن شبہ کیا جا سکتا تھا کہ جو کافر کفر کی حالت میں اچھے اعمال کرتے ہیں ان کے اعمال کو حبط کرنا اور اچھا بدلہ نہ دینا تو خلاف عدل ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کیلئے صراحت فرما دی کہ آخرت کے ثواب سے محروم ہوں گے۔ بے شک وہاں ان کو عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا اور عذاب بھی وہ جس سے اصلاح حال مقصود نہ ہوگی بلکہ اہانت آگیں عذاب ہوگا، لیکن دنیا میں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اچھے اعمال کی مقررہ جزا ان کو ضرور ملے گی۔ فرمایا:-

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ۔ یعنی جس روز کافروں کی دوزخ پر پیشی ہوگی تو ان سے کہہ دیا جائے گا کہ آج تم کو اپنے پندارِ علمی اور معصیت عملی کی وجہ سے عذاب ذلت بطور سزا ملے گا، رہے تمہارے اچھے اعمال تو ان کی اچھی جزا اور لذتیں تم دنیا میں حاصل کر چکے۔ اب تمہارا کوئی حق نہیں رہا۔

بغوی نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کافروں کو ان کی دنیوی عیش پرستی اور آرام کوشی پر سرزنش فرمائی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اور صحابۂ کرام نے دنیوی لذت اندوزیوں اور عیش پرستیوں سے اجتناب کیا اور ہمیشہ آخرت پر نظر رکھی۔ بخاری اور مسلم نے حضرت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ بدن مبارک اور چٹائی کے درمیان کوئی بستر نہ تھا۔ چٹائی کی بٹیوں کے نشان پہلو پر پڑ گئے تھے۔ چمڑے کا ایک تکیہ جس کے اندر درخت خرما کے ریشے بھرے ہوئے تھے سر کے نیچے رکھا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، اللہ سے دعا فرمایئے کہ آپ کی امت کو اللہ فراخ حالی عطا فرمائے۔ روم اور ایران کے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے مالی فراخی عطا فرمائی ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کی پرستش بھی نہیں کرتے۔ فرمایا ابن خطاب کیا تم اس خیال میں پڑے ہو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی لذتیں دنیوی زندگی ہی میں

جلد عنایت کر دی ہیں۔ ایک روایت میں اتنا زائد آیا ہے کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت (صحیحین)

صحیحین میں حضرت عائشہ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے گھر والے جو کی روٹی سے بھی دو دن متواتر سیر نہ ہوئے۔ بخاری نے ابو سعید مقبری کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا گذر کچھ لوگوں کی طرف سے ہوا جن کے سامنے ایک بھنی ہوئی بکری رکھی تھی۔ ان لوگوں نے آپ کو دعوت دی۔ آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی پیٹ بھر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی۔

بخاری نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے۔ کبھی ہم پر پورا مہینہ ہو جاتا اور سوائے پانی اور چھواروں کے کچھ اور نہیں ملتا تھا۔ خدا بھلا کرے انصار کی عورتوں کا وہ تو کچھ دودھ بطور ہدیہ کبھی ہم کو بھیجدیتی تھیں۔ امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم متواتر راتیں بھوکی گزار دیتے تھے۔ گھر والوں کو شام کا کھانا بھی نہیں ملتا اور حضور کے گھر والوں کی بیشتر خوراک جو کی روٹی تھی۔ ترمذی شریف نے حضرت انس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جس زمانے میں کسی کو بھی خوفزدہ نہیں کیا جاتا تھا مجھے ڈرایا (دھمکایا) جاتا تھا اور جب کسی کو بھی اذیت نہیں دی جاتی تھی مجھے دکھ دیا جاتا تھا۔ مجھ پر تیس شبانہ روز ایسے بھی گزرے کہ میرے اور بلال کیلئے کوئی ایسا کھانا نہیں ملا جس کو کوئی جگر والا (یعنی زندہ آدمی) کھا سکے۔ ہاں بلال رض کچھ بغل میں چھپا لیا کرتا تھا۔ ترمذی شریف نے اس حدیث شریف کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضور بلال کو ساتھ لے کر جب مکہ سے پوشیدہ طور پر نکل گئے تو بلال کے پاس بس اتنا کھانا تھا کہ انہوں نے بغل میں لے لیا تھا اور کچھ نہیں تھا۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایسے ستر اصحاب صُفّہ (چبوترہ والے مساکین جو دین کی طلب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ایک چبوترہ پر پڑے رہتے تھے) دیکھے جن میں سے کسی کے بدن پر چادر نہ تھی صرف ایک لنگی یا کملی تھی جس کو انہوں نے گردن سے باندھ رکھا تھا کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتی تھی کسی کے ٹخنوں تک اور ستر کھلنے کے ڈر سے وہ اس کو ہاتھ سے سمیٹے رہتے تھے۔ بخاری نے حضرت انس کا قول نقل کیا ہے کہ میں حضور کی خدمت میں جو کی روٹی لے گیا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زرہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھ دی تھی اور اس سے گھر والوں کے لئے جو لئے تھے یہ بھی حضرت انس کا ہی قول ہے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس رات کو کبھی نہ ایک صاع گیہوں رہے نہ ایک صاع (کوئی اور) دانے اور آپ کی نو بیبیاں تھیں۔ ترمذی شریف نے حضرت ابو طلحہ رض کا بیان نقل کیا ہے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر ایک ایک پتھر بندھا دکھایا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شکم مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے تھے۔

ترمذی شریف نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ مسلم نے عبدالرحمٰن کی روایت سے لکھا ہے کہ تین آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے۔ میں بھی موجود تھا اور انہوں نے کہا ابو محمد خدا کی قسم ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے نہ خرچ ہے نہ سواری ہے نہ سامان ہے حضرت عبداللہ نے فرمایا تو تم کیا چاہتے ہو۔ اگر مرضی ہو تو ہمارے پاس لوٹ کر آجانا اللہ تعالیٰ نے جو توفیق دی ہم پیش کر دیں گے اور چاہو تو حاکم سے ہم تذکرہ کر دیں۔ اگر چاہو تو صبر کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرما رہے تھے کہ قیامت کے دن فقراء مہاجرین دولتمندوں سے ستر سال پہلے جنت میں جائیں گے (جنت کا سال کتنا ہوگا یہ اللہ ہی جانے) ان حضرات نے کہا تو ہم صبر کریں گے کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔

امام احمد نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب مجھے یمن کو (حاکم بنا کر) بھیجا تو فرمایا عیش پرستی سے اجتناب رکھنا۔ اللہ کے بندے عیش پرست نہیں ہوتے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی

کرم اللہ وجہٗ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے تھوڑے رزق پر راضی رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل سے راضی ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کی خدمت میں کچھ کھانا پیش کیا گیا۔ آپ کا روزہ تھا فرمایا مصعب بن عمیر جو مجھ سے بہتر تھے جب شہید ہو گئے تو ان کو صرف ایک چادر کا کفن دیا گیا۔ سر ڈھانکا جاتا تھا تو پاؤں کھلتے تھے اور پاؤں چھپائے جاتے تھے تو سر کھلتا تھا اور یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے اور حضرت حمزہ بھی شہید ہو گئے جو مجھ سے بہتر تھے (اس وقت بھی ناداری کی یہی حالت تھی) پھر ہمارے لئے دنیا پھیلا دی گئی یا یہ فرمایا کہ ہم کو دنیا دے دی گئی۔ ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری نیکیاں (یعنی نیکیوں کا بدلہ) ہم کو جلد (اسی دنیا میں) نہ دے دی گئی ہوں (اور آخرت میں ہمارے لئے کچھ نہ رہا ہو) پھر آپ رونے لگے۔ یہاں تک کہ کھانا اٹھوا دیا (کیونکہ روزہ دار تھے)۔

حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے میرے ہاتھ میں کچھ گوشت دیکھ لیا جو میں (خرید کر) لٹکائے ہوئے لا رہا تھا۔ فرمایا جابر یہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ میرا دل چاہا تھا میں نے گوشت خرید لیا فرمایا تو کیا جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا تم خرید لاؤ گے۔ کیا تم کو اس آیت کا کوئی ڈر نہیں کہ (قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (رواہ البغوی)

حضرت جابر کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا) کیا تم میں سے کوئی اپنے ہمسائے اور چچا کے بیٹے کیلئے خود بھوکا رہنا پسند نہیں کرتا۔

زرین نے زید بن اسلم کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پانی مانگا۔ شہد ملا ہوا پانی (یعنی شہد کا شربت) پیش کیا گیا۔ فرمایا یہ عمدہ ہے، لیکن میں سن رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی خواہشات کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری نیکیاں بھی جلد (اسی دنیا میں) ہم کو نہ دے دی جائیں۔ اس کے بعد آپ نے وہ شربت نہیں پیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے سالم کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے۔ ہم لذت عیش کے طلبگار نہیں کہ حلوان کا گوشت بھنوائیں اور گیہوں کی مینگ (یعنی میدے) کی روٹیاں پکوائیں اور کشمش کا نبیذ بٹیر کی آنکھ کی طرح سرخ تیار کرائیں اور پھر اس کو کھائیں پئیں اور مزے اڑائیں۔ ہم اپنی لذتیں (آخرت کے لئے) باقی رکھنی چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ قتادہ کا بیان ہے ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا تو تم سب سے زیادہ لطیف ترین کھانے اور نرم لباس والا ہوتا، مگر میں اپنی لذتیں (آخرت کیلئے) باقی رکھنا چاہتا ہوں۔ قتادہ نے کہا ہم سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب شام کو تشریف لے گئے تو وہاں آپ کے لئے کھانا تیار کیا گیا جو پہلے آپ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا ان غریب مسلمانوں کے لئے کیا تھا جو مرتے مر گئے اور پیٹ بھر جَو کی روٹی نہ کھا پائے۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا (ان کے لئے) جنت تھی۔ یہ جواب سن کر حضرت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فرمایا اگر ہمارے حصے میں دنیا کا یہی حقیر سامان آیا اور وہ جنت لے گئے تو ہم سے بہت دور نکل گئے۔ (ہم ان کو نہیں پہنچ سکتے) حمید بن بلال کا بیان ہے کہ حفص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں بہت زیادہ حاضری دیتے تھے۔ جب آپ امیر المومنین کی خدمت میں پہنچتے اور امیر المومنین کھانا پیش کرتے تو آپ اٹھ جاتے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تم ہمارا کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ حفص نے جواب دیا۔ امیر المومنین میرے گھر والے جو کھانا تیار کرتے ہیں وہ آپ کے کھانے سے زیادہ مزیدار ہوتا ہے، اس لئے آپ کا کھانا چھوڑ کر میں ان کے کھانے کو پسند کرتا ہوں۔ فرمایا تیری ماں تجھے روئے کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر میں چاہتا تو ایک نوجوان موٹی بکری کے بال چھلوا کر اس کو بھنوا لیتا۔ پھر آٹے کو کسی کپڑے میں چھنوا کر اس کی پتلی چپاتیاں بنوا لیتا پھر چار سیر کشمش لے کر اس کا نبیذ بدن کے خون کی طرح (سرخ) تیار کرا لیتا۔ حفص نے کہا معلوم ہوتا ہے امیر المومنین آپ عمدہ کھانے کو پہچانتے ہیں۔ فرمایا تیری ماں تجھے روئے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں قیامت کے دن اپنی نیکیاں کم کرانی نہیں

چاہتا ۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم کو عمدہ کھانوں میں شریک کر لیتا (یعنی خود بھی کھاتا اور تم کو بھی کھلاتا)

مقصودِ بیان لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا سے ثابت ہو رہا ہے کہ نہ تمام مسلمانوں کے مراتب ایک جیسے ہوں گے نہ تمام کافروں کے مدارج بلکہ ہر ایک کا درجہ اس کے عمل کے مطابق ہوگا ۔ ثواب کا بھی اور عذاب کا بھی ۔

لِيُوَفِّيَهُمْ الخ میں صراحت ہے کہ اعمال کی سزا جزا بغیر کمی بیشی کے پوری پوری دی جائے گی ۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو کسی سے ذاتی عناد نہیں ۔ کفر اور فسق اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا ۔ مگر ناپسندیدگی کے باوجود انتقامی عنادی جذبہ نہیں رکھتا کہ کسی کو اس کے قصور سے زائد سزا دے نہ کسی مسلمان سے اس کا ذاتی تعلق ہے کہ زیادہ عمل کا کم ثواب دے ۔ رہ گیا قانونِ معافی اور کم عمل کی زیادہ جزا کا اختیار تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ مجبور نہیں کہ سزا ضرور دے یا زیادہ ثواب کسی کو نہ دے ۔ کیونکہ یہ چیز حق تلفی اور ظلم کے ذیل میں نہیں آتی استحقاق سے کم ثواب دینا ظلم ہے زیادہ دینا ظلم نہیں ۔ استحقاق سے زیادہ عذاب دینا ظلم ہے کم دینا ظلم نہیں ۔ اوّل مرحمت ہے ۔ دوسری مغفرت ۔ مرحمت و مغفرت سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی ۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا میں اس طرف اشارہ ہے کہ باوجود کفر کے تم نے جو نیکیاں کی تھیں ان کا بدلہ دنیا میں تم کو مل گیا اور چونکہ وہ نیکیاں ناپائیدار اور بے بنیاد تھیں ، اس لئے آخرت میں ان کی کوئی جزا باقی نہیں رہی ۔ یعنی کافروں کی نیکیوں کا آخرت میں اجر نہ ملنا ظلم نہیں کیونکہ دنیا میں مل چکا وغیرہ ۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا

اور آپ قوم عاد کے بھائی کا ذکر کیجئے جبکہ انھوں نے اپنی قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ریگ کے مستطیل بلند تودے تھے اس پر ڈرایا کہ تم خدا کے سوا

تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ

کسی کی عبادت مت کرو اور ان سے پہلے اور ان سے پیچھے بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر اب تک) گزر چکے ہیں مجھ کو تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے ۔ وہ کہنے لگے کیا تم

اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ

ہمارے پاس اس ارادہ سے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو سو اگر تم سچے ہو تو جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اس کو ہم پر واقع کر دو ہود نے کہا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے اور مجھ کو تو

مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ

جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نری جہالت کی باتیں کرتے ہو سو ان لوگوں نے جب اس بادل کو اپنی وادیوں کے مقابل

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ تُدَمِّرُ

آتا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا نہیں بلکہ یہ وہی ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے ۔ وہ ہر

كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

چیز کو اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دے گی چنانچہ وہ ایسے ہو گئے کہ بجز ان کے مکانات کے اور کچھ نہ دکھلائی دیتا تھا ہم مجرموں کو یونہی سزا دیا کرتے تھے

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ

اور ہم نے اُن لوگوں کو اُن باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو اُن باتوں میں قدرت نہیں دی اور ہم نے اُن کو کان اور آنکھ اور دل دیئے تھے سو چونکہ وہ

اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ

لوگ آیاتِ الٰہیہ کا انکار کرتے تھے اس لئے نہ اُن کے کان اُن کے ذرا کام آئے اور نہ آنکھیں اور نہ اُن کے دل اور جس

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۧ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ

کی وہ ہنسی کیا کرتے تھے اُسی نے اُن کو آگھیرا اور ہم نے تمہارے آس پاس کی اور بستیاں بھی

الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ

غارت کی ہیں اور ہم نے بار بار اپنی نشانیاں بتلادی تھیں تاکہ وہ باز آئیں سو خدا کے سوا جن چیزوں کو انھوں نے خدا تعالیٰ کا

دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

تقرب حاصل کرنے کو اپنا معبود بنا رکھا ہے انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی بلکہ وہ سب اُن سے غائب ہوگئے اور وہ محض انکی تراشی ہوئی اور گھڑی ہوئی بات ہے

تفسیر دنیا میں دو طرح کے لوگ ہمیشہ سے چلے آئے ہیں۔ وجود خدا کا انکار کرنے والے اور اقرار کرنے والے۔ منکر خدا پہلے کم تھے اور اب بظاہر بہت ہیں۔ خصوصاً ایشیا ان سے بھرا ہوا ہے اور یورپ میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو انکارِ خدا کا اعلان کرنے والے بھی کسی نہ کسی حد تک خدا تعالیٰ کا اقرار کرنے پر مجبور رہیں۔ ان کی عقل اور انسانی فطرت ان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر قدرتِ قاہرہ کا اقرار کریں۔ خواہ وہ اس کو خدا نہ کہیں نیچر کہیں، طبیعت کہیں، قوتِ جاذبہ کہیں یا کچھ اور نام رکھیں۔ خواہ اس میں علم محیط اور ارادۂ کلی کی طاقت نہ مانیں مگر ایک عظیم الشان مجبور کن طاقت کا ان کو انکار نہیں۔ اگرچہ وہ اپنے کو بھی مختار کل جانتے اور اپنے علم و ارادہ کو بھی ایک حد تک رسا اور محیط کہتے ہیں۔ اس طرح یہ گروہ بھی اقرار کرنے والے گروہ میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اقرار خدا کرنے والا گروہ مذہباً اور عقلاً خدا کو ایزد کو نور کو گاڈ کو پرماتما اور بھگوان و ایشور کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کا اقرار شرک میں غرق ہے۔ باوجود خدا، پرماتما، ایشور اور گاڈ کو ماننے کے کثرت کی دوسری موجودات میں وہ عموماً صفات خداوندی مانتا ہے۔ غیبی دیوتاؤں اور ملائکہ کو بزرگوں کی ارواح کو، آگ کو، سورج کو، دوسرے ستاروں کو، انبیاء و اوتار کو اور فرضی معبودوں کو اپنا کارساز، قاضی الحاجات سمجھتا ہے اگر مختارِ مطلق اور آزاد کارساز نہیں بھی جانتا تو کم از کم اتنا ضرور ہی مانتا ہے کہ یہ فرضی دیوتا بارگاہِ خداوندی میں مقرب ہیں، محبوب ہیں۔ ان کی سفارش رد نہیں ہو سکتی۔ اور ہم خدا تعالیٰ سے بہت دور ہیں۔ ہماری اس بارگاہ تک رسائی نہیں، اس لئے ہم ان دیوتاؤں، انبیاء صلحاء اوتار سے شفاعت کے خواہش مند ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی پوجا کرتے ہیں ان سے عجز و نیاز کرتے ہیں ان کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ ان کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں تاکہ یہ ہم سے خوش رہیں، ناراض ہو کر ہم کو ضرر نہ پہنچادیں اور خوش ہو کر ہماری سفارش کردیں۔ مشرکوں کا گروہ عموماً آخرت کا ایک مقررہ دن نہیں مانتا تو اس زندگی کے بعد کسی زندگی کا قائل ہی نہیں یا آئندہ زندگی کا اقرار کرتا ہے، مگر اسی دنیا میں۔ وہ کہتا ہے کہ اعمال کی جزا و سزا ضرور ہونی چاہیئے۔ مگر اسی دنیا میں یا آئندہ زندگی میں جو اسی دنیا میں ہو۔ یہ مؤخر الذکر گروہ

جکہ اور تناسخ کا عقیدہ رکھنے والوں کا ہے۔ بہرحال اس دنیا کی موجودہ زندگی کا بالکل تباہ ہو جانا اور میدانِ عمل کا بالکل خاتمہ ہو جانا اور نئے سرے سے انسانوں کا مجسم زندگی پانا اور جزا سزا کا ایک نیا عالم پیدا ہونا اس کو تسلیم نہیں ہوتا۔ ہر طرح کے مشرک ہر زمانے میں رہے ہیں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہودؑ، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بکثرت شامی حجازی عراقی مصری انبیاء کے مختلف زمانوں میں ادھر مشرق میں مختلف براہمہ کے دوروں اور براہمہ سے بھی پہلے ایسے لوگ بہت تھے، مغرب میں یونان اور قاف وادی اور بحر اسود کا ساحل ایسے مشرکوں کا مرکز تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنا پیغام اپنے کسی پیغمبر کی زبانی یا تحریری شکل میں بھیجا تو مختلف عملی ہدایات کے ساتھ اساسی تعلیم یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو واحد جانو۔ وہی رب خالق قادر مطلق اور قاضی الحاجات ہے۔ اسی کی پوجا اور عبادت کرو۔ اس کی صفات کسی اور میں نہ مانو۔ اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو۔ قیامت کا ایک دن مقرر ہے۔ اچھے عمل کی اچھی جزا اور برے عمل کی بری سزا ضرور ملے گی۔ حشر جسمانی ضرور ہوگا۔ زندہ کر کے ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ اگر ان باتوں کو نہ مانو گے اور پیغمبر کو سچا نہ مانو گے اور دستورِ خدا تعالیٰ کی مخالفت جاری رکھو گے تو کسی نہ کسی دن تم پر عذاب عظیم ضرور آ جائے گا۔ غیبی اسباب ہلاکت حرکت میں آ جائیں گے اور بحکم خدا تم کو تباہ کر دیں گے۔ مشرکوں نے ہمیشہ اس تعلیم کی مخالفت کی، اس کا مذاق اڑایا۔ ایسا پیغام لانے والے کو ستایا، اس کی ہنسی بنائی اور ہنس ہنس کے عذاب موعود کے طلب گار ہوئے۔ آخر اللہ تعالیٰ کا غضب مختلف مادی شکلوں میں نمودار ہوا، مشرکوں کو تباہ کر دیا گیا، ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ کہیں کہیں فرسودہ کھنڈرات ان پر لعنت کا اعلان کرنے کے لئے موجود رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی حسب دستور انبیاء، توحید، حشر و نشر اور احیاء ثانی کی تعلیم دی، قرآن پیش کیا جس کے اندر ان دونوں عقیدوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ مشرکوں نے عناداً نہ مانا، اپنے فرضی معبودوں کو نہ چھوڑا۔ سب کی پوجا چھوڑ کر اللہ واحد کی طرف اپنا رخ نہ موڑا، اس لئے جگہ جگہ ان کو اقوام پارینہ کی مختصر داستانیں اور مخالفت انبیاء کی پاداش میں ان کی تباہیاں سنائی اور بتائی گئی ہیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے کے مشرکوں کو ہدایت ملے اور آنے والے مشرک بھی اگر عبرت اندوز ہوں اور حقیقت رس نظر رکھتے ہیں تو ان کے لئے درس موعظت ہو جائے۔

تحلیلِ اجزاء

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ۔ اخاعاد۔ عاد کا بھائی۔ یعنی حضرت ہود علیہ السلام عاد سے مراد عادِ اولیٰ قوم عاد قبیلۂ ارم کی ایک شاخ تھی۔ جس طرح اردو میں پورے قبیلہ کو ایک برادری اور قبیلہ کے ہر فرد کو بھائی کہا جاتا ہے اسی طرح عربی میں بھی قبیلہ کی طرف لفظ اخ کی اضافت کر دی جاتی ہے اور قبیلہ کا ایک فرد مراد ہوتا ہے۔ اس لئے اخاعاد کا مطلب ہوا قوم عاد کا ایک فرد۔

بِالْأَحْقَافِ۔ احقاف جمع۔ حقف مفرد۔ ابن زید نے کہا احقاف ریت کے ٹیلوں کا وہ طویل سلسلہ جو پہاڑیوں کی طرح چلا جائے، مگر بلندی میں پہاڑ کی برابر نہ ہو۔ کسائی نے کہا احقاف جگہ جگہ سے کٹتا ہوا ریگستان۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے۔ احقاف کی بستیاں عمان اور مہرہ کے درمیان واقع تھیں۔ مقاتل نے کہا عاد کی بستیاں مہرہ کے مقام حضرموت علاقہ یمن میں تھیں۔ مہرہ مقام کی طرف مہری اونٹوں کی نسبت کی جاتی ہے۔ یہ لوگ بہار کے زمانے میں سفر کی حالت میں (خانہ بدوش) رہتے تھے، لیکن جب لو کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں تو گھروں کو لوٹ آتے تھے۔ قتادہ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ عاد کا قبیلہ ریگستان میں شحر کے مقام پر سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ طسم جدیس جرہم اولیٰ ثمود اور عاد وغیرہ عرب کے وہ پرانے قبائل تھے جن کا تمدن کسی زمانے میں برسر عروج رہا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے سرکشی کرنے کی وجہ سے ان کا تختہ تاراج ہو گیا، سب تباہ ہو گئے۔ ان کی نسل بھی تباہ ہو گئی۔ کہیں کہیں ان کی بستیوں کے کچھ کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی مفصل حالت کہیں تاریخ میں مذکور نہیں۔ توریت اور قرآن مجید میں ان کا مختصر تذکرہ موجود ہے جو قابلِ اعتماد ہے۔ باقی احوال نسبی ہوں یا ملکی اور تمدنی اگر تاریخ عرب قدیم میں ملتے ہیں تو وہ اتنے غیر معتبر ہیں کہ ان کو داستان سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ عاد ثمود قوم لوط یعنی بنی سدوم کا ذکر قرآن میں محض عبرت آفرینی کیلئے کیا گیا ہے تاکہ

اگلوں کے احوال سن کر پچھلوں کو عبرت حاصل ہو، اسی لئے ان کے تذکروں میں نہ ان کا مفصل تمدن مذکور ہے نہ حکومت نہ سیاست نہ نسب نہ زمانہ۔ صرف ان کی کفر توزیوں اور معصیت کاریوں کا کچھ مجمل تذکرہ اور ان کی تباہی پر تبصرہ ہے۔ غالباً حضرت نوح علیہ السلام سے پانچ پشت نیچے ارم کا بیٹا عاد ہوا۔ جس کی نسل اور بھائی برادروں کو قوم عاد کہا جاتا ہے۔ یہ قوم بڑی قد آور اور قوی الجثہ تھی۔ عرب کے جنوب میں وسیع ملک پر ان کا اقتدار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تمدن بھی تھا اور اچھا تمدن تھا۔ بہر حال ان کا جتھا مضبوط افراد قوی اور عموماً مرفہ الحال تھے۔ قریش کو عرب میں وہ عظمت و قوت اور سطوت حاصل نہ تھی جو یمن میں عاد کو حاصل تھی۔ جسمانی طاقت میں تو قریش کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ یہ لوگ حشر نشر کے منکر تھے اور بت پرست تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر ان کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا۔ آپ ہی اول ترین عرب پیغمبر تھے جو یمنی عربوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے۔ قوم عاد کو آپ نے توحید اور اقرار قیامت اور اصلاح اعمال کی دعوت دی۔ چند لوگوں کے علاوہ سب نے ماننے سے انکار کر دیا۔ حضرت نے اللہ تعالیٰ کا عذاب آجانے سے ڈرایا دھمکایا کسی پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا اور کہنے لگے اگر سچے ہو تو عذاب لے آؤ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا عذاب لانا تو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کب عذاب آئے گا۔ میرا کام تو اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچا دینا ہے۔ میں تم کو اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچا رہا ہوں اور تم بڑے نادان ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے منکر ہو۔ خود ساختہ اسباب پر تم کو اتنا اعتماد ہے کہ جو چیز تمہاری نظروں سے غائب ہے اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی آنکھیں ضرور تھیں، مگر حق سبحانہ' و تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں کر سکتی تھیں، کان بھی تھے، مگر صدائے حق کو سننے والے نہ تھے، دل بھی تھے مگر فہم سلامت سے خالی، اس لئے کوئی قابل دید یا لائق شنید یا واجب الفہم نشانی بھی ان کو فائدہ نہ پہنچا سکی۔ آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب بصورت طوفان آیا۔ دو سال سے بارش نہیں ہوئی تھی، یہ تنبیہی نشانی تھی کہ متنبہ ہو کر دعوتِ الٰہیہ کو مان لیں۔ مگر مادی اسباب کے پرستاروں کو اللہ تعالیٰ کی غیبی کار فرمائی نظر نہ آئی۔ آخر ایک ابر اٹھا، اٹھ کر سامنے سے آیا ان کو امید پڑی کہ اب بارش ہوگی۔ مان سون کو بارش کی علت تامہ اور پانی برسانے پر قادر مطلق سمجھنے والوں کو اٹھتی ہوئی بھوری گھٹا دیکھ کر یقین کر ہی لینا چاہیئے تھا کہ بارش ضرور ہوگی، مگر ہوا نے طوفانی صورت اختیار کرلی۔ جنگل میں چرنے والے جانور، چلتے راہ مسافر اور ان کی سواریاں اور ہوا میں اڑنے والے پرندے غرض ہر چرندے پرندے درندے اور مویشی کو طوفان اوپر اڑا کر لے گیا اور پھر زمین پر دے پٹکا۔ لوگوں نے یہ ہولناک منظر دیکھ کر گھروں میں پناہ لینی چاہی، کمروں اور حجروں میں بند ہو گئے۔ کواڑ بند کر لئے، مگر عذابی طوفان کمروں کے اندر بھی گھس گیا، دیواریں گریں، چھتیں اڑیں، بیتاب اور مجبور ہو کر نکلے۔ طوفان نے سب پر ریت لا ڈالا، ریت کے پہاڑ کے نیچے دب گئے۔ کئی روز دبے رہے پھر طوفان کی ریت اڑ گئی اور سب لاشوں کو اڑا کر سمندر میں لا پھینکا۔ قوم عاد پر یہ طوفانی عذاب سات شبانہ روز رہا العیاذ باللہ۔

وادی قریٰ میں حضرت صالح کی قوم ثمود یعنی عاد ثانی پر بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تھا کہ سب اپنے گھروں میں مرے پڑے رہے۔ زلزلے نے سب کو تباہ کر دیا۔ بحیرۂ مردار کے کنارے سدوم کی بستیاں بھی حضرت لوط علیہ السلام سے سرکشی کرنے کی پاداش میں زلزلے میں مبتلا ہوئیں۔ زمین کچھ دھنس گئی، کچھ الٹ گئی اوپر سے کنکریلے پتھروں کی بارش ہوئی گویا جوالا مکھی پھوٹ پڑا اور پتھر پگھل کر کنکر بن کر اور اڑ کر کافروں پر گرے۔ یہ عذاب عرب کی بستیوں پر یا ان کے گرد اگرد نازل ہوئے جو براہ راست اہل مکہ کی عبرت اندوزی اور بالواسطہ دوسرے لوگوں کی سبق آموزی کے لئے کافی ہیں، مگر باطل معبودوں کے پجاری نصیحت پذیر نہیں ہوتے۔ اپنے خود ساختہ معبودوں کو کم سے کم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا مقرب مان کر ان سے سفارش کی تمنا رکھتے ہیں اور ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں، اسی لئے ان کے سامنے سر افگن اور سجدہ ریز رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ دنیا میں جب عذاب سے بچا نہ سکے تو آخرت کی تباہی سے کیا بچا سکیں گے۔ اگر ان میں کارسازی کی طاقت ہوتی یا یہ اپنے پجاریوں کی شفاعت کر سکتے تو دنیوی عذاب سے ہی بچا لیتے۔

وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ اور حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر گذر چکے تھے۔ جیسے حضرت نوحؑ، حضرت شیثؑ وغیرہ اور حضرت ہود علیہ السلام کے بعد بھی پیغمبر ہوئے جیسے حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط

علیہ السلام ۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو، کسی کو معبود نہ مانو ۔ اگر شرک کرتے رہو گے اور دوسروں کی پوجا جاری رکھو گے اور تنہا اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دن تم پر عذاب آ جائے گا ۔ جس کی تباہی اور مصیبت بڑی عظیم الشان اور ہولناک ہوگی ۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۔ قوم والوں نے جواب دیا تم اسی لئے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو ۔ لیکن دو ان کو ہم سے چھڑا دو ۔ ہم تمہاری یہ بات نہیں مان سکتے ۔ رہا عذاب جس کی خبر تم ہم کو دے رہے ہو، تو اگر سچے ہو تو وہ ہم پر لے آؤ ۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ عذاب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کب آئے گا کس دن آئے گا کیسے آئے گا اس کی تاریخ اور وقت کو جاننے سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ کبھی نہیں آئے گا یا میں جھوٹا ہوں ۔

وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ ۔ جو کچھ حکم مجھے دیا گیا ہے میں وہ تم کو پہنچا رہا ہوں ۔ اس سے آگے میرا کوئی بس نہیں نہ مجھے اس سے زیادہ علم ۔

وَلٰكِنِّیْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۔ بلکہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ نادان ہو، اتنا بھی نہیں جانتے کہ علم و قدرت والا تو اللہ تعالیٰ ہے پیغمبر تو نافرمانی کے عذاب سے ڈرانے والے اور اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچانے والے ہوتے ہیں ۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا ۔ جب قوم عاد نے عذاب کو بادل کی شکل میں دیکھا جو آسمان پر پھیلا ہوا سامنے سے آ رہا تھا ۔

مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ ۔ جس کا رُخ ان کی وادیوں کی جانب تھا سامنے سے چلا آ رہا تھا ۔

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۔ اور انھوں نے کہا یہ ابر سامنے سے آ رہا ہے ۔ ہم پر بارش کرے گا ۔ یعنی ابر اٹھا ہوا دیکھا تو یقین کر لیا کہ بارش ضرور ہوگی ۔ بادل کو وہ بارش کی یقینی علت سمجھتے تھے ۔ ابر کو دیکھا تو بارش کا یقین کر لیا ۔ ظاہری مادہ پرست ایسے ہی ہوتے ہیں ۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یا ہود علیہ السلام نے فرمایا یہ ابر باراں نہیں بلکہ وہ عذاب ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے ۔ یہ ایک طوفانی ہوا ہے جس کے اندر دردناک عذاب ہے ۔ اپنے مالک و حاکم کے حکم سے یہ ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گی کوئی کافر اور مال مویشی نہیں بچے گا ۔ چنانچہ یہی واقعہ بھی ہوا عظیم الشان آندھی آئی ۔ ڈیرے خیمے اور سواریاں لدی لدائی ٹڈیوں کی طرح اڑ گئیں ۔ درخت اکھڑ کر کہیں کے کہیں جا پڑے ، کھیتیاں برباد ہو گئیں ، بستیوں کے اندر لوگ گھروں میں گھس گئے اور کوٹھریوں کمروں کے کواڑ بند کر لئے ، مگر طوفان کی شدت سے چھتیں اڑ گئیں ۔ دیواریں گر گئیں ، ریت کے تودے اڑتے آئے جن کے اندر زندہ آدمی دب گئے ۔ سات دن اور آٹھ رات یہ طوفان رہا ۔ آخر ہوا نے ہی ریت اڑا دی اور لاشوں کو سمندر میں جا پھینکا ۔ کھنڈر ہی کھنڈر رہ گئے ۔ کسی زندہ کافر کا نشان باقی نہ رہا ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے مومنوں کی جماعت کے گرد اگرد ایک باڑہ بنا دیا تھا جو احاطہ کی طرح ہو گیا تھا ۔ سب مسلمانوں کو ساتھ لے کر آپ اس کے اندر چلے گئے ۔ طوفان سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔

كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۔ یعنی پیغمبر کی مخالفت کرنے والوں اور نبی برحق سے مقابلہ کرنے والوں کو ہم دنیا میں قوم عاد کی طرح برباد کرتے ہیں ۔ خواہ طوفان کے ذریعہ سے یا زلزلے سے یا کڑک سے یا کسی اور مادی ذریعہ سے ۔ بہر حال پیغمبر کے دشمنوں کی تباہی قوم عاد کی طرح ضرور ہوتی ہے اور یہ تباہی ان کے کرتوت کی سزا کے طور پر ہوتی ہے بغیر جرم کے نہیں ہوتی ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھرپور منہ سے اس طرح ہنستے ہوئے کہ حلق کا کوا نظر آ جائے کبھی نہیں دیکھا ۔ آپ صرف مسکرا دیتے تھے اور جب (آسمان پر) ابر یا (تیز) ہوا دیکھتے تو چہرۂ مبارک پر اس کا اثر نمودار ہو جاتا تھا (بخاری و مسلم)

بغوی کی روایت میں اتنا اور بھی آیا ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ لوگ تو ابر کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی اور آپ کے چہرے پر ابر

دیکھ کر ناگواری کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ فرمایا عائشہ مجھے (بادل کے اندر عذاب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے) کیا اطمینان کہ اس کے اندر عذاب ہو (اور رنگ بارش کا یقین کئے بیٹھے ہوں) ایک قوم پر طوفان بشکلِ طوفان آچکا ہے اور ایک قوم نے عذاب کو (بشکلِ بادل) دیکھ کر کہا تھا کہ یہ بادل ہے اور سے ہم پر بارش ہوگی (اور واقع میں ان پر عذاب آگیا)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ تیز ہوا چلتی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دعا کرتے اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی بھلائی اور اس چیز جو کچھ ہے اس میں مجھے بھلائی عطا کر اور جس چیز کا حامل بنا کر اس (ہوا) کو تو نے بھیجا ہے اس میں مجھ کو خیریت عنایت کر اور تیری پناہ کا خواستگار ہوں اس کی خرابی سے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کی برائی سے اور جس چیز کا حامل بنا کر تو نے اس کو بھیجا ہے اس کے شر سے، جب آسمان پر بادل چھایا تا تو آپ کا رنگ بدل جاتا۔ باہر جاتے اندر آتے بے چین ہوجاتے۔ پھر جب بارش ہونے لگتی تو وہ بے چینی دور ہوجاتی (ایک بار) میں نے محسوس کرلیا اور وجہ دریافت کی تو فرمایا ممکن ہے عائشہ یہ ویسا ہی عذاب (بشکلِ بادل) ہو جیسا کہ عاد نے کہا تھا فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ بارش کو دیکھ کر حضور سرکار دو عالم ارشاد فرماتے تھے (اے اللہ) اس کو رحمت بنا دے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ابوداؤد و نسائی ابن ماجہ اور شافعی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب آسمان پر کوئی بادل اٹھتا ہوا دیکھتے تو کام چھوڑ دیتے اور بادل کی طرف منہ کرکے فرماتے اے اللہ میں اس کے اندر کی چیز کی خرابی سے تیری پناہ مانگتا ہوں (الیٰ آخرہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ جب کبھی تیز ہوا چلتی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو زانو بیٹھ کر دعا کرتے، اے اللہ اس کو رحمت بنانا عذاب نہ بنانا۔ الحدیث۔ رواہ الشافعی والبیہقی

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ اور ہم نے قوم عاد کو وہ مقدور دیا تھا جو (اے اہلِ مکہ) تم کو نہیں دیا۔ دولت عمر جسمانی قوت عزت کثرت، حکومت، اقتدار، سطوت، رعب، آسائش، نعمت ہر چیز ان کو تم سے زیادہ دی اور ان کا اس زمین پر جماؤ تم سے زیادہ تھا وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔۔۔۔۔۔ اور ہم نے ان کو کان بھی دیئے تھے (سننے کیلئے) اور آنکھیں بھی دی تھیں (دیکھنے کے لئے) اور دل بھی دیئے تھے (سمجھنے اور سوچنے کے لئے) مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی آیات (اور نشانات توحید) کے منکر تھے، اس لئے ان کے یہ ظاہری و باطنی ادراک و فہم کی طاقتیں کچھ کام نہ آئیں اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے عذاب کو دفع نہ کرسکیں اور جس آنے والی بلا و آفت کا وہ مذاق بنایا کرتے تھے وہی ان پر آپڑی۔ حاصل یہ کہ ان کو مادی نعمتیں بھی حاصل تھیں، ان کی علمی قوتیں اور ان کے کان بھی تھے جن سے وہ گزشتہ قوموں کے عبرت آفریں اور نصیحت آگیں واقعات سنتے تھے اور آنکھیں بھی تھیں جن سے ہر وقت وہ قدرت خداوندی کے عجائبات اور توحید کی محسوس نشانیاں دیکھتے تھے اور دل بھی رکھتے تھے جن سے ہر اچھے برے اور مفید و مضر کو سمجھتے تھے، مگر نہ کانوں سے سچ کو انہوں نے اثر قبول کیا نہ آنکھوں سے نقوش وحدانیت کا مشاہدہ کیا، نہ دلوں سے پیام صداقت کو سمجھا۔ دنیوی امور میں ان کے حواس اور عقلیں بہت تیز تھیں، مگر پیغمبر برحق اور آیات قدرت کو سمجھنے اور اثر قبول کرنے سے ان کے کان بھی بہرے تھے اور آنکھیں بھی نابینا، اور دل بھی زنگ آلود نافہم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے انکار پر اڑے رہے اور جس عذاب و بلا سے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا اس کا مذاق بناتے رہے تو وہ عذاب ان پر آگیا اور ان کی کوئی مادی طاقت، دنیوی بصیرت اور سننے دیکھنے اور سمجھنے کی قوت کام نہ آئی۔ پس اے اہلِ مکہ تم تو ان کی برابر مادی اور علمی طاقتیں بھی نہیں رکھتے نہ تمہارے پاس مال کی اتنی کثرت ہے نہ اتنی جسمانی طاقت نہ اتنی مستحکم حکومت نہ ویسی جابرانہ سطوت۔ پھر کس طرح پیغمبر برحق کی تکذیب کے بعد تباہی سے بچ سکتے ہو۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ اور ہم تمہارے گرد و پیش کی بستیاں تباہ کرچکے ہیں

اور ان بستیوں والوں کو طرح طرح سے اپنی قدرت کی نشانیاں بھی دکھا دی تھیں کہ وہ توبہ کرلیں (اور شرک و نافرمانی سے توبہ کرلیں، مگر انہوں نے توبہ نہ کی اور اپنی ہٹ سے باز نہ آئے، اس لئے ہم نے ان کو تباہ کر دیا) یعنی اے اہلِ مکّہ تمہارے جنوب میں قوم عاد کی بستیاں اور مغرب و شمال میں قوم ثمود کی آبادیاں اور قوم لوط کی نگریاں ویران پڑی ہیں۔ ہم نے ان کو الٹ دیا، ڈھا دیا، کھنڈر بنا دیا۔ یہ ویرانے تمہاری نظروں کے سامنے ہیں اور ہم نے بغیر تنبیہ و اطلاع کے اچانک ان کو غائب نہیں کیا بلکہ ادل بدل کر بار بار طرح طرح سے متنبہ کرنے کے لئے اپنی قدرت کی نشانیاں ان کو دکھائیں تاکہ وہ اپنی غلطی فکر اور زشتی عمل سے باز آجائیں اور ہماری طرف رجوع کریں اور توبہ کرلیں، مگر ان کو اپنے باطل معبودوں اور فرضی دیوتاؤں سے عقیدت تھی۔ وہ ان کو اپنا کارساز جانتے تھے اور معبود مانتے تھے اور وسیلہ سمجھتے تھے، اس لئے ہماری تنبیہات کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۔ پھر ان بتوں نے ان کی کیوں مدد نہیں کی جن کو تقرب حاصل کرنے کیلئے انہوں نے معبود بنا رکھا تھا۔ (وہ بُت ان کے کام نہ آئے) بلکہ ان سے گُم ہو گئے۔ مطلب یہ کہ وہ لوگ بھی بتوں کے پجاری تھے۔ بُت پرستی کرتے تھے اور اس امید پر کرتے تھے کہ آڑے وقت یہ معبود ہمارے کام آئیں گے، ان کو خوش رکھنے سے بڑے معبود کا قرب ملے گا اور دنیا میں کامیابی ہوگی۔ یہی عقیدہ اہلِ مکّہ کا بھی تھا وہ بھی کہا کرتے تھے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی اور پیغمبر سے نافرمانی کی وجہ سے ان پر عذاب آیا تو سارے معبود غائب ہو گئے۔ کوئی بھی کام نہ آیا کوئی بھی مدد نہ کر سکا۔

وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔ اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور وہ چیز تھی جس کو وہ از خود بناتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نسبت کرتے تھے یعنی بتوں کے معبود ہونے اور مصیبت کے وقت ان کے کام آنے کا عقیدہ قطعاً غلط اور خود تراشیدہ تھا اور یہ بات من جملہ ان خرافات کے تھی جن کو وہ از خود بناتے تھے اور پھر بطور تہمت اللہ تعالیٰ کی طرف ان کی نسبت کر دیا کرتے تھے یعنی ان کی افتراء پردازیاں اور بھی تھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ بُت ان کے مددگار رہیں اور ان کی پوجا کا ان کو حکم دیا گیا ہے۔

مقصودِ بیان (گزرے ہوئے لوگوں کی نیکی بدی اور کامیابی اور بربادی کا تذکرہ اپنے اندر آئندہ قوموں کے لئے درسِ عبرت رکھتا ہے۔ سلف کے احوال میں خلف کے لئے نصیحت ہے۔ تاریخ کا یہی فائدہ اور یہی ضرورت ہے) قوم عاد کا تذکرہ اسی مقصد سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی نصیحت کو نہ ماننا دنیوی تباہی کا بھی موجب ہے۔ پیغمبر اپنی امت پر بڑا مہربان ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو عذابِ خداوندی سے بچانا چاہتا ہے، مگر دماغ جب نابینا اور نافہم اور جاہل ہو جاتے ہیں تو انسان ڈھیٹ بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے جلد آجانے کا خواستگار ہو جاتا ہے، مگر عذاب آجانے کا وقت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کسی کے ٹالنے یا جلدی طلب کرنے کو اس میں دخل نہیں۔ پیغمبر کا کام تو اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچا دینا ہے۔ عذاب طلب عذاب لانا نہیں۔ قوم عاد ایسی ہی سرکش قوم تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام کی تنبیہات کا مذاق اڑایا۔ عذابِ الٰہی کے جلد آجانے کی خواہش کی۔ حضرت ہود علیہ السلام نے وقتِ عذاب سے اپنی لاعلمی ظاہر کی، لیکن عذاب کے یقینی آجانے پر تنبیہ بھی کی۔ آخر عذاب آگیا اور طوفانی شکل میں آگیا۔ سب تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ کے عذاب سے علمی، جسمانی، مالی اور جماعتی طاقت بچا نہیں سکتی۔ قوم عاد کو بھی ان کی شنوائی، بینائی اور دانائی کی طاقتیں اور جسمانی قوت اور جتھوں کی کثرت اور مال کی فراوانی اور حکومت و اقتدار کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہ بچا سکا اور جن معبودوں کے مددگار ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے اور اسی عقیدہ کی بنا پر ان کی پوجا کرتے تھے وہ بھی کام نہ آئے۔ اور قوم عاد ہی پر منحصر نہیں عرب کے گرداگرد (بلکہ سارے جہان میں) بکثرت ویرانے کھنڈر ہیں۔ بستیاں اجڑی پڑی ہیں جن کو نافرمانیوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے غارت کر دیا۔ طرح طرح سے ان کو تنبیہات کرنے کے بعد جب وہ باز نہ آئے تو ان کو تباہ کر دیا وغیرہ۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا

اور جب کہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آ پہنچے کہنے لگے کہ خاموش رہو پھر جب

قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ○ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ

قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے کہنے لگا کہ اے بھائیو ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا

جو اپنی سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے　حق اور راہِ راست کی طرف　رہنمائی کرتی ہے　اے بھائیو　اللہ کی طرف بلانے والے کا

دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ○ وَمَن لَّا يُجِبْ

کہنا مانو　اور اس پر ایمان لے آؤ　اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا　اور جو شخص

دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○

اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا نہ مانے گا　تو وہ زمین میں ہرا نہیں سکتا اور خدا کے سوا کوئی اس کا حامی بھی نہ ہوگا ایسے لوگ صریح گمراہی　میں　ہیں۔

تفسیر کچھ اجسام ایسے ہیں جن کو تنہا مادی حواس سے ہم دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں یا تحلیل کیمیاوی کے بعد مادی عقل سے ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے اجسام وہی ہیں جو پیش نظر مادی عناصر سے مرکب ہیں۔ جن کو عام طور پر عوام یا خصوصیت کے ساتھ اجسام طبعیہ کے علماء جانتے ہیں۔ جیسے آسمان، زمین، چاند، ستارے، سورج، آگ، پانی، ہوا، مٹی اور ان سے بنے ہوئے مرکبات پتھر، نبات، حیوان، انسان، بجلی اور اس کی لہریں اور تمام مادی ذرات۔ کچھ اجسام ایسے ہیں جو ہیں تو مادی، تمام مادی خصوصیات ان کے اندر موجود ہیں، لیکن ان کا مادہ یہ نہیں جس کو ہم مادہ کہتے ہیں۔ ان کے مادے میں ہمارے مادی اجسام سے زیادہ لطافت ہے۔ حرکت وزن مکان اور دوسری خصوصیات ان کے اندر بھی ہیں۔ ان میں افزائش نسل بھی ہے اور تغیرات شخصی بھی، مگر جب تک ہم اپنے ان مادی حواس کو فوق المادیت روحانیت کی مدد سے لطیف نہ بنالیں اور اپنی تمام قوتوں میں روحانیت کے زیر اثر لطافت نہ پیدا کرلیں ان کو تنہا ان مادی حواس یا مادی عقل سے نہ محسوس کر سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں ان کے آثار، علامات اور پیدا کئے ہوئے ثمرات کبھی کبھی عوام اور خواص اپنی آنکھوں، کانوں، ہاتھوں، پاؤں اور دوسری قوتوں سے محسوس کر سکتے ہیں۔ یہی وہ غیبی مخلوق ہے جس کو جن کہا جاتا ہے۔ ان کے اجسام میں تغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔ توالد و تناسل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ یہ مذکر مؤنث خوبصورت اور بدصورت بھی ہوتے ہیں۔ تغذیہ تنمیہ موت و حیات اور دوسرے مادی خواص بھی ان کے اندر ہیں۔ یہ جگہ کے بھی محتاج ہیں اور حرکت و سکون کے بھی، یہ وزن بھی رکھتے ہیں اور جسمانی لمبائی چوڑائی اور موٹائی بھی، مگر ان تمام کیفیات و احوال کے باوجود ان کے آثار ہم دیکھ سکتے ہیں، علامات محسوس کر سکتے ہیں، کبھی آوازیں بھی سن سکتے ہیں، کبھی ان کی بدلی ہوئی شکلیں بھی دیکھ سکتے ہیں، مگر ان کی اصلی اشکال اور ان کے پورے نوعی تقاضے بغیر لطیف اور روحانیت کی مدد کے ہم میں سے کوئی شخص تنہا اپنی اس چشم سر اور گوش شنوا سے نہیں محسوس کر سکتا نہ ان کو پکڑ سکتا ہے نہ روک سکتا ہے نہ قید مکانی میں لا سکتا ہے، نہ احاطۂ اقتدار میں داخل کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعض صحابۂ کرام اور کچھ اہل روحانیت نے لطیف روحانیت کی مدد سے ہی ان کو اصلی شکل میں دیکھا۔ اصلی آوازیں سنیں، اصلی حالت و ہیئت دریافت کی، ان کو گرفت میں لائے، قید مکانی میں داخل کیا، ان پر حکم چلایا اور اب بھی اگر لوگوں کے دماغ سفسطہ زدہ نہ ہوں اور دلوں میں کچھ روحانیت کی چمک ہو تو اس مادہ سے بالاتر نظر اٹھا کر اس سے زیادہ لطیف مادہ والی مخلوق کو انہی چہرہ والی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ بہم واقعات شنیدہ اور دیدہ

اس کے شاہد ہیں۔

کچھ اجسام ایسے ہیں جن کا مادہ ہمارے پیش نظر مادہ سے قطعاً جدا ہے۔ ہمارے اس مادے کے تمام خواص سے وہ معرّیٰ و مبرا ہیں۔ یہ زمان یہ مکان یہ مقدار یہ حرکت و سکون یہ وزن جو ہمارے مادہ کی خصوصیات ہیں ان میں یہ خصوصیات بالکل نہیں نہ ان کے شخصی اجسام میں یہ تغیرات عرضی ہیں نہ تسلسلِ نوعی نہ توالد و تناسل نہ تذکیر و تانیث۔ ان کے اجسام خالص نور یا نورانی ہیں۔ نور ہی ان کا مادہ اور خمیر ہے۔ ان کے اندر جو تغیرات تشکلات اور تشخصات ہوتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جو ان کے مادۂ نور کے مناسب ہیں۔ پس اس مادی دنیا کے لئے ان کو دیکھنا ان کو پانا ان سے ربط و علاقہ پیدا کرنا اس وقت تک بالکل ناممکن ہے جب تک یہ مادی حواس اور مادی عقل کارفرما ہے ان مادی حواس کا تعطل اور سب سے تجرد، ان سے ملنے دیکھنے اور ان کی آواز کو سننے اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے خواہ تجرد اور تخلیہ مستقل نہ ہو وقتی ہی ہو، مگر تجرد کامل کے بغیر ان کو اصلی صورت حالت اور جسم میں نہیں دیکھا جا سکتا نہ ان کی دنیا میں سوائے مجرد روحانیت کی قدرت رکھنے والوں کے کسی اور کی رسائی ممکن ہے۔ یہ اجسام نوری ملائکہ ہیں اور ان سے وقتی ربط و تعلق رکھنے والے انبیاء اور بعض اہلِ عرفان ہیں کثیف لطافت آمیز یا لطیف کثافت آمیز مادی جسم رکھنے والی متوسط المقام مخلوق یعنی جنات کے بعض افراد کے حاضر ہونے قرآن سے واقف ہوتے اور اپنی قوم کے پاس پہنچ کر اس کی خبر دینے اور تبلیغ رسالت کرنے کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ اسلام اور صداقت کی تبلیغ صرف انسانی نوع تک محدود نہیں۔ یوں تو فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے حق پرست بندے اور اوامرِ الٰہیہ کے پابند ہیں، مگر ان کی فرماں پذیری غیر اختیاری ہے۔ ان کی سرشت میں ہی شر کا عنصر شامل نہیں۔ وہ اس کثیف مادہ کی آلائشوں اور نفسانی خواہشات کی آمیزشوں سے فطرتاً پاک ہیں، اس لئے وہ حدِ اطاعت سے ہٹ نہیں سکتے۔ ہاں با اختیار اور صاحبِ ارادہ اہلِ دانش و بصیرت مخلوق یا انسان ہے یا جنات دونوں کے خمیر میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ علمی اور روحانی تسلط بھی ان پر کبھی ہو جاتا ہے اور کبھی وہ نفسانی خواہشات کے دست برد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے جولان گاہ عقل اور افکار صحیح بھی ہیں اور باطل بھی اور میدان عمل میں ان کی تگ و دو کبھی راہِ مستقیم پر ہوتی ہے کبھی کج مج پگڈنڈیوں پر۔ ان کے اندر ملکوتی طاقت بھی ہے اور شیطانی قوت بھی۔ الغرض الٰہی اطاعت کی حاجت دونوں کو ہے تاکہ سیدھی راہ چل کر منزلِ سعادت و نجات تک پہنچ جائیں۔ ممکن ہے کہ انسانوں کی طرح جنات کی ہدایت کیلئے انہی کی نوع میں سے اللہ تعالیٰ نے کچھ جنات کو مبعوث فرمایا ہو اور وہ اپنی قوم کی ہدایت پر مامور ہوں اگر ایسا ہو گا تو جنات کے پیغمبروں کی نبوت ذیلی اور ظلی ہو گی۔ کوئی صاحبِ شریعت اور حاملِ کتاب پیغمبر جنات کی ہدایت کے لئے خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو اس کا ثبوت کسی قرآنی صراحت یا حدیث میں نہیں آیا۔ ہاں بعض آیات سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ توریت جنات نے سنی اور اس پر ایمان لائے اور توریت کے بعد قرآن مجید بھی انہوں نے سنا اور سیکھا اور اپنی قوم سے جا کر یہ بات کہی اور تبلیغ قرآن کی مندرجہ بالا آیات میں اسی کا تذکرہ ہے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بطن نخلہ میں (نماز کے اندر) قرآن پڑھ رہے تھے تو جن ادھر سے گزرے جن میں سے ایک کا نام زوبعہ تھا (نفر کا معنی ہے جماعت جس کے افراد کی تعداد دس سے کم ہو) جب قرآن کی آواز ان کے کان میں پڑی تو دلکش مضامین (اور روح پرور آواز) سن کر چونک پڑے اور متحیر ہو کر رک گئے اور کان لگا کر سننے لگے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت ختم کر دی جب تلاوت ختم ہو گئی تو جن چلے گئے اور جا کر اپنی قوم سے کہا۔ قوم والو ہم نے حضرت موسیٰ کے بعد ایک (عجیب) کتاب (کی آیات) سنی ہیں جو گذشتہ کتابوں کے اصول میں ان کے مطابق ہے اور ان کو سچ بتاتی ہے اور راہِ حق دکھاتی ہے، اے قوم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہا مانو، اس کو سچا (پیغمبر) جانو تاکہ نجات پاؤ اور جو نہ مانے گا وہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے باہر تو نکل نہ جائے گا۔ پھر کوئی حمایتی اس کو سزا سے نہ بچا سکے گا۔ جو لوگ ماننے والے نہیں وہ صریح گمراہی میں ہیں۔

قرآن کی کسی عبارت میں نہ صراحت ہے نہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جنات جو بطن نخلہ کی طرف سے نکلے تھے ان کا ادھر سے گذر محض اتفاقی

نکلا یا کسی تلاش میں نکلے تھے، لیکن مختلف صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے جس طرح طلوع کی علامات نمودار ہو جاتی ہیں اور کچھ کچھ فجر کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کچھ خصوصی نشانات ظاہر ہوئے تھے جن سے گروہِ جنات کو معلوم ہو گیا تھا کہ عنقریب اس دنیا میں کوئی عظیم اصلاحی انقلاب آنے والا ہے اور کسی جلیل القدر پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہے جس کی تلاش میں وہ گروہ جنات جو ہدایت کا طلب گار اور حق کا خواستگار تھا نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تورات میں جس پیغمبر کی بشارتیں مذکور ہیں اور انجیل میں جس نبی کا نام نشان اور خصوصی اوصاف کا بیان ہے اور فاران سے جس آفتاب کے طلوع ہونے کی صراحت ہے اس کی تلاش میں آسمانی کتابوں کو پڑھنے والے جنات نکلے ہوں جس طرح یہودیوں کو قرائن سے معلوم ہوا تھا۔ اور اپنی مذہبی کتاب کی روشنی میں وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں پیدا ہونے والے ہیں۔ اسی لئے اوس و خزرج کے قبائل سے جنگ کے وقت وہ نبی آخر الزماں کے طفیل اور وسیلہ سے فتح پانے کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اہلِ کتاب جنات بھی کتابی صراحت اور کائناتی قرائن سے سمجھ چکے ہوں گے کہ ہادیِ موعود کی بعثت کا وقت قریب ہے۔ اسی بنیاد پر وہ جدید معلومات کرنے کے لئے نکلے ہوں گے اور بطن نخلہ کی طرف سے گذر رہے ہوں گے۔

امام احمد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے، مگر بیہقی نے دلائل النبوۃ میں فجر کی نماز کا ذکر کیا ہے۔ جنات کے قرآن سننے اور بعثتِ نبوی کی اطلاع پانے کا یہ پہلا واقعہ تھا، اس کے بعد تو کتنی ہی مرتبہ جنات حاضرِ خدمت ہوتے رہے اور تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایک بار حضرت ابن مسعود جنگل میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور حضور آپ کو ایک جگہ چھوڑ کر ایک طرف کو چلے گئے تھے اور وہاں جنات حاضر ہوئے تھے اور مسائلِ دین سیکھ کر واپس گئے تھے۔

بعض مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ جنگل میں کوئی بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گیا اور جنات رات کو حاضر ہوئے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ جنات جن کی تعداد دس سے کم تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف موڑ دیا۔ یہ جنات قرآن سننا چاہتے تھے۔

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا۔ جب قرآن پڑھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے (اور قراءتِ قرآن سنی) تو کہنے لگے چپ ہو کر کان لگا کر سنو۔ چنانچہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پڑھتے رہے وہ کان لگا کر خاموش سنتے رہے۔

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ۔ جب قراءت ختم ہوئی اور سب سن چکے تو لوٹ کر اپنی قوم کے پاس چلے گئے تاکہ ان کو اسلام کی تبلیغ کریں اور نافرمانی سے ڈرائیں۔

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى کہنے لگے قوم والو ہم نے ایک عجیب کتاب (کی کچھ آیات) سنیں۔ یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے۔ اگرچہ تورات کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور اور حضرت عیسیٰ پر انجیل بھی نازل ہو چکی تھی، لیکن یہ دونوں کتابیں اصلاحی تھیں۔ یہودی علماء نے تورات کے الفاظ و معانی میں جو تحریفیں کر لی تھیں اور غلط تاویلیں گھڑ لی تھیں اور احکامِ خداوندی کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے لگے تھے اور اپنی من گھڑت خواہشات کے سانچے میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو ڈھال لینے کی کوشش کی تھی، ان باتوں کی اصلاح اور تورات کے حقیقی مفہوم سے لوگوں کو شناسا بنانے کے لئے انجیل و زبور کا نزول ہوا گو یہ کتابیں مستقل تھیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعض محرمات و ممنوعات کو حلال بنانے کے لئے آئے تھے بھی، مگر یہ نسخ جزئی تھا۔ چند جزئی احکام کو آپ نے نسخ کیا تھا جیسے قرآنی آیات بعض بعض کو نسخ کرتی ہیں یعنی وقتی اور ہنگامی احکام کی مدت کو واضح کرتی ہیں اور بتاتے ہیں یہ احکام دوامی نہیں ایک خاص وقت کے لئے تھے آئندہ ان پر عمل نہ کیا جائے۔ اسی طرح انجیل نے علاوہ اصلاحِ تحریفات کے بعض احکام کو منسوخ کر دیا، مگر مستقل جدید شریعت نہیں پیش کی۔ قرآن مجید کے نزول تک مستقل حیثیت شریعتِ تورات ہی کی رہی، اس لئے جنات کا یہ کہنا صحیح تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بعد ہم نے ایک عجیب کتاب سنی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ یہ کتاب کے اوصاف کی تفصیل ہے۔

۱۔ گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کو سچا بتاتی ہے وہ تصدیق کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی کتابیں نازل ہوئیں اور مختلف انبیاء پر صحیفے اترے سب حق تھے، سچے تھے اور اپنے اپنے زمانے کے لئے ضروری تھے۔

۲۔ وہ گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ خود حق کا راستہ بتاتی ہے۔ موجودہ اور آئندہ انسانوں کی زندگیاں سنوارنے کیلئے جن ضوابط کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور آخرت میں نجات پانے کیلئے جو احکام واجب العمل ہیں ان کی تعلیم دیتی ہے۔ گویا گزشتہ کتب الٰہیہ سے اصولی اتحاد و مطابقت رکھنے کے باوجود پچھلی شریعتوں کو منسوخ کرتی اور جدید شریعت جو اب اور آئندہ انسانیت کے سدھار و سنوار کیلئے ضروری ہے اس کو پیش کرتی ہے۔

۳۔ سیدھا راستہ بتاتی ہے۔ افراط و تفریط سختی و نرمی ناقابل برداشت دشواری اور بے لگام مساہلت کے درمیان اس راستہ پر چلنے کی تعلیم دیتی ہے جو منزل سعادت و نجات تک پہنچنے کا سب سے معتدل راستہ ہے جس پر چلنے کیلئے نہ مادی قوتوں اور جسمانی طاقتوں کو بے لگام چھوڑا جاسکتا ہے کہ ہوا و ہوس کے خارزاروں میں انسان الجھ کر رہ جائے یا اندھا دُھند چلنے کی وجہ سے صرف دنیوی لذت کوشیوں کے کھائی خندقوں میں گر کر ہلاک ہو جائے نہ منزل پر پہنچنے سے پہلے راستہ میں ہی جسمانی طاقتوں کے گھوڑے کو قتل کرنے کی اجازت ہے کہ سہر روستہ سبک رفتار سے محروم ہو کر راستہ طے کرنے سے عاجز ہو جائے اور خود انسانی عمرانی زندگی اور تہذیب و مدنیت کو تباہ کر کے شخصی اور قومی خودکشی کا مرتکب ہو۔ یہ تینوں اوصاف کتاب اللہ کے ہیں۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ اے ہماری قوم والو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی جانب جو بلانے والا آیا ہے اس کے احکام کو مانو اور اس کو سچا جانو (کیونکہ اس کے احکام خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں وہ تو صرف داعی اور ہادی ہیں) اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانے گا اور ان پر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کے گزشتہ گناہ اور تمام لغزشوں کو معاف کر دے گا) لہٰذا اگر تم بھی رسول اور داعی کا کہنا مانو گے اور اس کی ہدایت پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے قصور بھی معاف کر دے گا اور آخرت کے دردناک عذاب سے تم کو محفوظ رکھے گا۔

اس آیت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے اور آپ پر ایمان لانے کو گناہوں کی مغفرت اور عذاب سے حفاظت کا ذریعہ قرار دیا ہے تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے داعی کی مخالفت اور اس کی تکذیب موجب تباہی ہے۔

وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے ہادی کی ہدایت کو نہ مانے گا وہ کھلی گمراہی میں ہوگا کیونکہ عقل شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رہنمائی گمراہ کن نہیں۔ اس کے خلاف جو راستہ اختیار کرے گا وہ گمراہ ہوگا یا کج راہ۔ دونوں صورتوں میں شکست میسر ہوگا اور پھر اس کا کوئی دستگیر نہ ہوگا نہ کوئی دنیوی دوست کام آئے گا نہ جھوٹا مذہبی پیشوا اور کسی طرح اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے وہ باہر نہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی غیبی طاقت ہوتی ہے۔ اس لئے رسول خدا سے سرتابی اللہ تعالیٰ سے سرتابی ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرنے والے کو روئے زمین پر کہیں بچاؤ کا مقام اور حفاظت کی طاقت میسر نہیں آسکتی۔

مقصود بیان وجود جن کی صراحت اور دس سے کم جنات کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تلاوت کے وقت حاضر ہونا اور قرآن مجید کو کان لگا کر سننا اور پھر اپنی قوم کو جا کر تبلیغ کرنا ان سب امور کا عبارت میں ذکر۔ آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ کچھ جن مومن اطاعت گذار ہوتے ہیں اور کچھ کافر بداطوار۔ کافر جنات کو مومن جنات ہدایت کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ثابت ہو رہی ہے کہ ہدایات دقرآن یعنی پیغمبروں کی ہدایات اور اللہ کی کتابوں کی تعلیم کو ماننا جنات پر بھی آدمیوں کی طرح فرض ہے۔
قرآن مجید کے تین اوصاف کا ذکر کتب سابقہ کی تصدیق حق کی ہدایت اور معتدل راہ پر چلنے کی تعلیم۔ وغیرہ

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى

کیا ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے میں ذرا نہیں تھکا وہ اس پر قدرت

أَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ

رکھتا ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے کیوں نہ ہو بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس روز کافر لوگ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ فَاصْبِرْ

کیا یہ دوزخ امر واقعی نہیں ہے وہ کہیں گے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی قسم ضرور امر واقعی ہے ارشاد ہوگا تو اپنے کفر کے بدلے میں اس کا عذاب چکھو تو آپ صبر

كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا

کیجئے جیسے اور ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور ان لوگوں کے لئے (انتقام الٰہی کی) جلدی نہ کیجئے اور جس روز یہ لوگ اس چیز کو

يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ع

دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو گویا یہ لوگ دن بھر میں ایک گھڑی رہے ہیں یہ پہنچا دینا ہے سو وہی برباد ہوں گے جو نافرمانی کریں گے

تفسیر

ہم کثرت آیات کی تشریح میں کتنی ہی بار لکھ چکے ہیں کہ انسان کا علم ناقص ہے اور جتنا ہے وہ بھی غلطی سے پاک نہیں ہے۔ ماضی اور مستقبل اس کے سامنے حاضر نہیں اور قیاس عقلی کو توہم کی دخل اندازی سے پاک رکھنا انسان کے بس میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے سُدھارنے کے لئے خیر و شر کا قانون بنانا اور مفید و صالح کو مضر و فاسد سے کامل طور پر ممتاز کر دینا انسانی جولانگاہِ فکر سے خارج ہے۔ اسی لئے ہر انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی داخلی اور خارجی زندگی کو درست کرنے کے لئے اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کے دستور کا محتاج ہے جس کا علم محیط اور قدرت ہمہ گیر ہے۔ لیکن قانون خداوندی کا ہر شخص کے پاس براہِ راست آنا ناممکن ہے۔ نورِ خالص کا مادی تاریک کثافت سے بغیر کسی درمیانی ذریعہ کے کیسے تعلق ہو سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ نورِ قدس کی پرتو فگنی ایسے آئینۂ نبوت پر ہو جس کا ایک رخ خالص نورانی ہو اور دوسرا مادیت کے کثیف مصالحہ سے آلودہ تاکہ روشن رخ کی وجہ سے آفتاب الوہیت کی پرتو اندازی کو قبول کر سکے۔ اور تاریک رُخ کی وجہ سے نور کو پار نہ جانے دے بلکہ اندر جذب کر کے دوسرے انسانوں کی طرف عکس ریزی کر سکے۔ یہ تو ہوئی ہدایت خداوندی حاصل کرنے کے لئے واسطۂ نبوت کی ضرورت، لیکن سوال یہ ہے کہ خیر کو شر سے اور صحیح فکر و عمل کو غلط عقیدہ و فعل سے امتیاز کرنے اور ممتاز بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر بھلائی اور نیکی کا نتیجہ نیک اور بدی کا ثمرہ بد نہ ہو۔ اگر جزا سزا اور مآل کی اچھائی برائی نہ ہو تو بدی سے بچنے اور نیکی کو اختیار کرنے کا کیا باعث اور کیا حاصل۔ عالم انسانیت بگاڑ سے محفوظ رہے اور زندہ اور نامی زندگی میں فساد و تباہی ہی نہ آئے، قانون عادل جاری ہو، حقوق و فرائض کی وضاحت کر دی جائے، جور و تعدی کی بیخ کنی ہو جائے۔ کیوں۔ اس لئے کہ عدل اور جہد عدل بجائے خود اچھی چیز ہے اور اس کا پھل اچھا ہے ظلم و جور غارت گر حقوق و امن ہے اور اس کا نتیجہ برا ہے۔ مآل کار کی اچھائی برائی اگرچہ اس دورِ حیات میں ہی کسی قدر سامنے آتی ہے اور نوعِ انسانی کو بحیثیت نسل و نوع اچھا برا نتیجہ اچھے برے شخصی اعمال و افکار کا مل جاتا ہے، لیکن ناقص ہے وہ نتیجہ جو کوشش کرنے والوں کو کم اور اس کے نسلی جانشینوں کو زیادہ ملے۔ اشخاص کی جدوجہد سے دوسرے اشخاص تو فائدہ اٹھائیں اور سعی مسلسل میں

اپنی زندگیاں تج دینے والی ہستیاں عموماً محروم رہیں، اس لئے اس جولانگاہ عمل میں سبک رفتاری یا لغزش اقدام کا کامل نتیجہ ہر شخص کو انفرادی طور پر ملنا ناممکن ہے اور جہد پیہم ہر دوڑنے والے کو منزل راحت والم تک پہنچا دے۔ ایسا ہونا تصور سے خارج ہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ میدانِ عمل ہے، جولانگاہ حیات ہے، کامل دار الجزاء نہیں۔ پوری جزا سزا اور کامل کامل سعی کا ظہور آنے والی دوسری زندگی میں ہوگا۔ اگر دوسری زندگی ضروری نہیں تو اس زندگی کی خیر و شر انفرادی اور شخصی طور پر لاحاصل قرار پائے گی، اور شخصی کوششوں کا اچھا برا نتیجہ خواہ نسلِ انسانی کو مل جائے مگر جولانگاہِ حیات میں دوڑنے والے افراد منزلِ مقصود پر پہنچنے سے بیشتر محروم رہیں گے اور یہ چیز قانونِ تعادل کے خلاف ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس دورِ زندگی کی شخصی اور انفرادی کوششوں کا شخصی نتیجہ دوسری زندگی میں برآمد ہو اور یہ ظاہر ہے کہ جس قادرِ مطلق نے یہ کارگاہِ وجود بنائی اور آسمان زمین کی تخلیق کی اور عالمِ بالا و پست کو بغیر سابقہ نمونہ کے نیست سے ہست کیا۔ اس کے لئے انسان کو دوسری مرتبہ پیدا کر دینا کیا دشوار ہے۔ اس زندگی کے شیداؤں کو آئندہ زندگی کا ظہور عجیب نظر آتا ہے۔ اور فریفتگانِ حیات دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے ہیں، لیکن جب آنے والی زندگی سامنے آجائے گی اور فکر و عمل کی خرابی مجسم اشکال میں دکھائی دے گی تو اس وقت انکار کی مجال نہ ہوگی، مگر وہ ساعت صرف ساعتِ ندامت ہوگی فرصتِ تلافی نہ ہوگی۔ ندامت سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وبال مآل لامحالہ برداشت کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ضوابط اصلاحی ہوتے ہیں۔ ہوا و ہوس ذاتی خواہشات قرابت مودت زوجیت و قومیت شہریت و وطنیت کے تمام عواطف سے زیادہ ہمہ گیر اور سارے جذبات نفس و قوم سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ قانونِ الٰہی سے تصادم کے وقت تمام علائق کو توڑنا اور کل رشتوں کو کاٹنا پڑتا ہے اور یہ کام بندگانِ تعلقات اور غلامانِ ہوا کیلئے بہت دشوار ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے پیامبروں کی تبلیغی راہ میں بندگانِ قومیت و قدامت اور شیفتگانِ نسل و اصل بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور ہر قدم پر سنگِ راہ بن جاتے ہیں۔ معصوم انسانوں کو طرح طرح سے ستاتے اور جسمانی و مالی نقصان پہنچاتے اور ان کے ساتھیوں کو گوناگوں چند در چند ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں، مگر عالی ہمت اور صاحبانِ عزم ہیں وہ بزرگ معصوم ہستیاں جو ظالموں کے ہر ظلم کو جھیلتی اور ہر اذیت کو برداشت کرتی ہیں، مگر فریضۂ انسانیت کو ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں اور ہر چند کہ ان کو ذلیل کرنے اور ان کا مذاق اڑانے کیلئے منکرینِ حق کہتے ہیں کہ جس سزا کی تم دھمکی دے رہے ہو تاخیر کیوں کرتے ہو فوراً لے آؤ۔ لیکن عذاب اور سزا کا ایک وقت مقرر ہے۔ کسی کی طلب و خواہش پر نزولِ عذاب نہیں ہو سکتا، جب وہ دن اور وقت آجائے گا تو کسی منکر معاند کے ٹالے سے آیا ہوا عذاب نہ ٹلے گا اور بدکار کافروں کی رہائی اس روز ناممکن ہوگی، جو صحیح افکار و عقائد رکھتے ہیں اور قانونِ الٰہی کے سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھالنے والے ہیں۔ سزا جزا کے دن ان کو تو کوئی غم نہ ہوگا اور جو تباہ کار کفر شعار ہیں وہی غارت ہوں گے۔

تحلیلِ اجزاء

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰىؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ گزشتہ آیات میں دلائل توحید کا بیان اور قادرِ مطلق ہونے کا مشاہدات و مسلمات سے اثبات کیا تھا پھر قرآن مجید کی تبلیغ عمومی کا ذکر تھا اور قرآن کریم کے تینوں اوصافِ خصوصی کا اظہار کر کے یہ بتایا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے داعی اور رسول ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے اور ان کے اوامر و نواہی کی پابندی لازم ہے۔ نبوت کے بعد اب روزِ قیامت اور بعثِ جسمانی کو عقل کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خدا نے اپنی قدرتِ تامہ کاملہ سے آسمان و زمین یعنی کائنات بالا و پست کو بنایا اور عدم سے وجود میں لایا اور اتنی بڑی عجیب مخلوق کو پیدا کرنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا کسی قسم کی تھکاوٹ اور ضعف قوت اس میں پیدا نہ ہوا کیا وہ مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ مردہ انسانوں کو تو از سرِ نو بنانا نہیں فقط زندہ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیقِ کائنات یعنی سارے سنسار کو عدم سے وجود میں لانا انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے سے کہیں دشوار ہے۔ پھر اس کی قدرتِ عامہ سے کیا بعید ہے۔ کہ وہ سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھا دے

آیت میں دیکھنے سے مراد ہے جاننا یعنی عقل کی آنکھوں سے دیکھنا۔ حقیقتِ مسلمہ یہ تھی کہ مشرکین بھی آسمان و زمین یعنی سارے جہان کا خالق اللہ ہی کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود حیاتِ ثانیہ اور روزِ قیامت کے منکر تھے۔ پس ان کا یہ انکار عقلی شہادت کا انکار تھا۔ جب اللہ تعالیٰ

کو خلاقِ جہاں مان لیا اور اس کی قدرت کو جہانگیر تسلیم کر لیا تو پھر تخریبِ عالم اور تجدیدِ حیات پر خداوند تعالیٰ کی قدرت کا انکار اور بوسیدہ گلی سڑی ریزہ ریزہ ہڈیوں میں از سرِ نو زندگی کی خصوصیات پیدا ہونے پر تعجب عقلی بے مائیگی کی علامت تھی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۔ اور قابلِ یاد ہے وہ دن جب دوزخ کے کنارے کافروں اور قیامت کے منکروں کو لے جا کر دریافت کیا جائے گا کیا یہ واقعی نہیں کیا اس میں کچھ شک ہے۔ اس وقت وہ کہیں گے بے شک یہ حق ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے سابق انکار کی سزا میں (پہلے انکار کرتے تھے، اب اقرار کر رہے ہو، مگر اس اقرار کا اس وقت کچھ فائدہ نہیں سزا بھگتنی ہوگی۔ دنیا میں منکرین قیامت عقلی شہادت اور کتبِ الٰہیہ کی صراحت کے خلاف محض آبائی تقلید، جہالت، غلبۂ توہم اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے قیامت کا انکار کرتے اور مُردوں کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہونے کو انکار آمیز و استہزاء انگیز تعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسے زنگ آلود عقل والوں کے لئے مشاہدہ اور معائنہ کے بغیر یقین کی کوئی راہ نہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن جب دوزخ نگاہ کے سامنے آ جائے گی اور آگ کے کنارے پہنچ کر خود ناقابلِ تردید مشاہدہ کر لیں گے تو عذاب کا یقین آئے گا مگر وہ دار العمل نہ ہوگا اس وقت یقین موجبِ نجات اور سودمند نہ ہوگا حکم ہوگا پہلے انکار کرتے تھے (اب اقرار سے کیا فائدہ) عذاب اور انکار کی سزا بھگتو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ پس (اے رسول مصائب پر) آپ ثابت قدم رہیں جیسے عالی ہمت پیغمبر ثابت قدم رہے اور کافروں کے لئے (عذاب نازل ہونے کی) جلدی نہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب اعلانِ حق کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف آنے کی دعوت دی تو جن لوگوں کے آبائی رسم و رواج قومی تقلید اور مفروضہ مذہبی فکر و عمل پر آپ کے اعلان کی زد پڑتی تھی اور جن کو باطل معبودوں کی پرستش کو چھوڑ کر توحید کی طرف بلایا گیا تھا وہ مخالف ہو گئے اور جس طرح اہلِ باطل اہلِ حق کو ہر طرح کی اذیت پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں، اسی طرح مشرکین مکہ بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جانی مالی نقصان پہنچانے آپ کی دعوت کا مذاق اڑانے اور ٹھٹول کرنے میں مشغول ہو گئے۔ طرح طرح سے آپ کو ستانے لگے اور آپ کے ساتھیوں کو ہر ممکن ایذاء دینے لگے۔ بلکہ ان کی جرأت معاندانہ اس حد تک پہنچ گئی کہ عذاب نازل ہونے کی جلدی مچانے لگے، مگر حق کا راستہ بہت دشوار گذار ہوتا ہے۔ تمام بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء سے بھی ان کی امت کے کافروں نے یہی سلوک کیا اور بعض پیغمبروں کو سینکڑوں برس ستاتے رہے، مگر وہ صاحبانِ عزم تھے، بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھے۔ باطل پرستوں کی طرف سے پیش کی ہوئی کسی رکاوٹ نے ان کو پست حوصلہ نہیں بنایا، شدائد و مصائب پر ثابت قدم رہنا اور مصیبت سے تنگ آ کر کبھی انہوں نے کافروں کو جلد از جلد غارت کر دینے کی دعا نہیں کی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جلیل القدر عالی حوصلہ پیغمبروں نے جس طرح ہر دکھ اور کافروں کی ایذاء رسانی پر صبر کیا۔ آپ بھی صبر کریں اور تنگ دل ہو کر ان کے لئے بددعا اور فوری نزولِ عذاب کی استدعا نہ کریں۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ۔ جب وہ اس قیامت کو دیکھیں گے جس کی دھمکیاں دی جا رہی ہے اور قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں آئیں گے) تو ان کو اپنی دنیوی زندگی ایسی معلوم ہوگی کہ بس ایک گھڑی دنیا میں رہے۔ آپ کا کام اس بات کو پہنچا دینا اور اعلان کر دینا ہے (کوئی مانے نہ مانے اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں) آخر وہی لوگ غارت ہو کر رہیں گے جو بدکار (یعنی کافر) ہیں، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام صرف اعلانِ حق سنانا اور پیامِ صداقت پہنچانا ہے نہ ماننے والوں کے جلد غارت ہونے کی بددعا کرنا نہیں جو مانتا ہے مانے نہیں مانتا ہے نہ مانے، (اس وقت یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں) قیامت کے دن قبروں سے اٹھنے کے بعد ان کو گزشتہ دنیاوی زندگی بہت حقیر معلوم ہوگی۔ ایسا محسوس ہوگا کہ بس گھڑی بھر دنیا میں رہے تھے اس وقت ان پر عذاب آئے گا اور تباہ کئے جائیں گے (دنیا میں ان کو کچھ مدت کے لئے چھوٹ ہے)

مقصودِ بیان ۔ امکانِ حشر اور وجودِ قیامت کا عقلی دلیل سے اثبات۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خلاقیت کے ہمہ گیر ہونے کی

صراحت۔ اس بات کا وضاحت کے ساتھ ذکر کہ یہ لوگ صرف مشاہدے کے بعد قیامت کے وجود اور عذاب دوزخ کو مانیں گے یعنی ان کی نظر محسوس پرست ہے۔ مشاہدے کے بغیر عقل کو اپیل کرنے والی دلیلیں ان کے لئے سودمند نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ثابت قدم رہنے اور مصائب پر صبر رکھنے کی تعلیم اور دوسرے جلیل القدر انبیاء کے صابر رہنے کا ذکر کرکے اس امر کی طرف اشارہ کہ جس طرح سابق عالی ہمت انبیاء معاند کافروں پر غالب آئے اور حق کا باطل پر تسلط ہو گیا اسی طرح اگر آپ بھی ثابت قدم رہیں گے تو ان مشرکوں پر غالب آئیں گے اور یہ آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔ میں کافروں پر فوری عذاب نازل ہونے کے لئے دعا کرنے سے باز رکھنے کا حکم۔

كَأَنَّهُمْ میں اس بات کی صراحت کہ قیامت کے دن کافروں کو دنیاوی زندگی ایک گھڑی ٹھہراؤ سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔

الحمد للہ والمنۃ سورۃ احقاف کی تفسیر ختم ہوئی

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ

جمہور صحابہ کے نزدیک یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ اس میں چار رکوع اور اڑتیس آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکا خدا نے اُن کے عمل کالعدم کر دیئے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں

الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

نے اچھے کام کئے اور وہ اُس سب پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا ہے اور وہ اُن کے رب کے پاس سے امر واقعی ہے اللہ تعالیٰ اُن کے گناہ اُن پر سے

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

اُتار دیگا اور اُنکی حالت درست رکھے گا یہ اسی وجہ سے کہ کافر تو غلط راستے پر چلے اور اہل ایمان صحیح راستے پر چلے جو

اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ○

اُن کے رب کی طرف سے ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کے لئے ان کے حالات بیان فرماتا ہے

تفسیر

کچھ لوگ بعض کام ایسے کرتے ہیں، جو شکلاً ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ مہمان نوازی مسافروں سے حسن سلوک، کنبہ پروری، اہل وعیال کی نگہداشت اور تربیت وغیرہ یہ کام بجائے خود اچھے ہوتے ہیں، لیکن جن جذبات اور عواطف کے زیر اثر ان کو کیا جاتا ہے وہ جذبات خود غرضی یا قومی نسلی عصبیت یا وطنی لسانی حمیت پر مبنی ہوتے ہیں، اس لئے اعمال خواہ کتنے ہی جاذب نظر وقلب ہوں، لیکن انسانیت عامہ کی فلاح اور عمومی امن وصلاح کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ انسانیت عامہ کو سنوارنے میں وہ رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ نسلی اور قومی تعصب جذبہ مفاخرت طلب شہرت۔ دوسری اقوام وافراد پر استیلاء کی خواہش عمومی انسانیت کو تباہ کرنے کے محسن نما بُرے ذرائع ہیں جو دوسرے اشخاص اقوام پر چیرہ دستی اور ظلم کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس طرح افراد انسانی میں تصادم ہو کر عمومی امن وآشتی اور سلم وشانتی تباہ ہو جاتی ہے۔ آپس کی تنظیم قومی اور وطنی ہمدردی قبائلی امداد اور ہم خیال ہم معاشرت ہم پیالہ وہم نوالہ لوگوں کی خیر خواہی بظاہر اچھی چیزیں ہیں جو جذبات رحم واخوت کے نتائج معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کی بنیاد، عقیدۂ آخرت اور تعمیل امر خداوندی پر قائم نہ ہو تو یہی وہ مقاصد بن جاتے ہیں جن سے افراد و اقوام ٹکرا جاتی ہیں۔ جتھہ بندیاں ہو کر بین الافرادی فساد سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی اور بین البلادی تباہیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہری بھری کھیتیاں سرسبز پھلوں سے لدے ہوئے لہلہاتے باغ، دودھ کی نہریں، لہلہاتے والے جانور، معصوم نوجوان، قابل رحم ضعیف بوڑھے اللہ تعالیٰ کی یاد کے عبادت خانے اور بھری پُری آبادیاں برباد اور تباہ ہو جاتی ہیں اور اگر جذبہ صحیح ہو، اساسی عقیدہ درست ہو، آخرت کا تصور پیش نظر ہو، نظریۂ توحید کارفرما ہو تو پھر نسلی قومی وطنی لسانی لونی اور کسی قسم کے شیطانی تعصب کی گنجائش ہی نہیں رہتی جو کچھ کیا جاتا ہے لوجہ اللہ کیا جاتا ہے اپنی نفسانیت کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا صلح ہو یا جنگ، امداد قومی ہو یا بین الاقوامی تعاون سب کی روح ایک ہوتی ہے یعنی حکم خداوندی کے مطابق سلامتی کا قیام۔

پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت کا انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی راہ حق پر گامزن ہونے سے روکتے ہیں ان کے بیرونی اعمال کیسے ہی خوش آئند اور دلکش ہوں، مگر چونکہ ان کی بنیاد انسانی نفسانیت پر ہوتی ہے، اس لئے ثمر آفریں نہیں ہو سکتے وہ انسانی صلاح کی درستگی اور نتیجۂ آخرت دونوں سے بے بہرہ ہوں گے۔ ہاں جو اپنی پوری قولی وعملی زندگی کا سنگ بنیاد ایمان باللہ اور عقیدۂ آخرت کو بنائے ہوئے ہے اور اللہ کی تمام کتابوں اور پیغمبروں خصوصاً قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر اس کے بعد نیک اعمال بھی کرتے ہیں ان کا شجر زندگی بار آور رہوگا اور اغوائے شیطانی کے قدرتی جھکڑوں سے ان کے بعض عملی اوراق خشک بھی ہو جائیں گے تب بھی ان کے سرسبز درخت زندگانی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکے گا، سوکھے پتے گر جائیں گے ان کی جگہ شاداب پتیاں پھوٹیں گی اور عمومی احوال زیست پُر صلاح ہوں گے۔

تحلیل اجزاء

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِن رَّبِّهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد ہے اسلام۔ اسلام کے تمام احکام و عقائد اور اسلام کی بتائی ہوئی تمام نیکیاں۔ سورۂ احقاف کی آخری آیت میں فرمایا ہے کہ صرف فاسقوں یعنی کافروں کی تباہی ہوگی۔ ایسا کیوں ہوگا۔ غیر مسلم بھی بعض اچھے کام کرتے ہیں اور اچھے کاموں کا بدلہ اچھا ہونا چاہیئے۔

اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ تمام اعمال کا مدار عقیدہ پر ہے۔ کافروں کا اساسی اعتقاد باطل ہوتا ہے۔ وہ باطل کے متبع ہوتے ہیں اور اپنے کو اور دوسروں کو راہ حق سے روکتے ہیں۔ یعنی ان کی نیکیاں بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی بنیاد نفسانیت پر ہوتی ہے، حق پرستی پر نہیں ہوتی، اس لئے ان کا نتیجہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ کافروں کے تمام امور خیر دنیا میں فساد وہلاکت پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ کسی شخص تعلق کے حصول یا قوم یا وطن کی متعدی جنبہ داری یا لسانی لونی اور جغرافیائی عصبیت یا اسی طرح کے کسی اور شیطانی جذبہ کے زیر اثر کافروں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں رفاہ عام، غریبوں کی ہمدردی اور محتاجوں کی پرورش محسوس ہوتی ہے، مگر باطن میں ان تمام ہمدردیوں کے اندر نفسانیت شخصی و قومی اور جذبۂ

وطنی وملکی اور داعیۂ اقتدار پسندی کے علاوہ کوئی عمومی عاطفۂ خیر کارفرما نہیں ہوتا ۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان ضوابط خیر کی تصنیف انسان خود کرتا ہے ۔ خدا کی ہستی کا انکار کرتا ہے یا خدا تعالیٰ سے اپنے کو بے نیاز سمجھتے ہوئے خدائی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے ۔ وہ آسمانی کتابوں کو نہیں جانتا ۔ نہ پیغمبروں کی اس کی نظر میں کوئی ضرورت ہوتی ہے خود ہی بادہ نوش ہوتا ہے خود ہی بادہ فروش ۔ اور خود ہی بادہ گر ساغر بکف مینا بدوش ۔ ایسا خود اپنے خود نگام کب نفسانی جذبات سے آزاد ہو سکتا ہے ۔ جس کی عقل بے لغامی اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ خدائی کو مخلوق میں بانٹ دے اور شریعت ساز مختار مطلق خالق کی ہستی کا انکار کر دے یا مخلوق کو خالق سے جا ٹکرائے ۔ پس ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کی توحید مطلق اور مختار کل فرماں روائی کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے احکام سے اپنے کو بے نیاز قرار دیتے ہوئے آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کو ضروری خیال نہیں کیا اور خدا تعالیٰ کی قائم کی ہوئی راہ سعادت سے اپنے کو اور دوسروں کو روکا ۔ ان کی تمام کوششیں دنیا میں بھی راحت آفرین اور امن آگیں نہیں ہو سکتیں اور آخرت میں بھی تمام نیکیاں برباد ہو جائیں گی ۔ ان کی یہ خوش آئند کارگذاریاں ٹھیک نشانہ پر نہ پہنچ سکیں گی ۔ منزل مراد سے بھٹک جائیں گی اور جن لوگوں کی علمی و عملی عمارت اللہ تعالیٰ کی کتابوں خصوصاً قرآن کی اساس پر مبنی ہے ان سے گو کوئی لغزش یا فروگذاشت ہو جائے مگر اس لغزش کو ان کے پورے اعمال پر اللہ تعالیٰ اثر انداز نہیں ہونے دے گا جو پتی شجر زندگی کی خشک ہو گئی ہوگی اس کو گرا دے گا اور باقی اوراقِ حیات کو درست رکھے گا ۔

کَفَرُوْا یعنی اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور بقدرت مشیت اور مختار کل ہونے کا اور انسان کی زندگی کی اصلاح کے لئے قوانین خیر و شر نازل کرنے اور حدود و اعمال مقرر کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کی غیبی انتظامی طاقتوں کا اور کچھ انسانوں کے رسول و پیغامبر ہونے کا اور اس تفصیل کے ساتھ جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں موجود ہے جزا و سزا کو ماننے کا انکار کیا ۔

وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہِ مستقیم (شریعت اسلامیہ) سے اپنے نفس کو یا دوسروں کو روکا ۔

اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے (تمام اچھے برے) اعمال برباد کر دیئے ۔ بے نتیجہ اور بے سود بنا دیئے ۔ کیونکہ دیکھنے میں بظاہر ان کے اعمال کیسے ہی اچھے ہوں ، مگر ان کی بنیاد شخصی ہوس اور قومی نفسانیت پر ہوتی ہے ، اس لئے نتیجہ میں دنیا کے اندر تصادم اور یا افرادی یا اقوامی ٹکراؤ ہونا لازم ہے جس سے انسان کو امن نصیب نہیں ہو سکتا اور آخرت میں بے نتیجہ ہونا اور منزل نجات سے محروم رہنا تو کھلا ہوا ہے جو عمل دنیوی نتیجہ کے اعتبار سے ناکارہ ہو وہ آخرت میں کیسے سود مند ہوگا ۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور جو لوگ ایمان لائے اس میں اللہ اور اللہ کے تمام پیغمبروں اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتابوں پر ایمان لانا مراد ہے ۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ اور خصوصیت کے ساتھ اس وحی اور کتاب پر ایمان لائے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب یقین کیا اور نبی کی تصدیق کی ۔

وَھُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ۔ اور وہ کتاب (اور وحی) برحق ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاشبہ آتاری گئی ہے ۔ اس فقرہ میں لفظ رب سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ اللہ رب ہے ۔ عدم سے وجود میں لا کر رفتہ رفتہ کمال نوعی تک انسان کے بدنی اور اس کی صفات کو پہنچانے والا ہے عملی اور علمی طاقتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانا اسی کا کام ہے اس کے سوا انسان کی کوئی جسمانی اور عملی تربیت کر سکتا ہے نہ علمی اور روحانی تکمیل ، اس لئے انسان کی شخصی اور سماجی درستی کے ضوابط و احکام نازل کرنا بھی اسی کا کام ہے اور جس طرح آدمی تخلیق و تربیت جسمانی میں خود مکتفی نہیں ہے اسی طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صالح بنانے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے ۔

کَفَّرَ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ ۔ تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو مٹا دے گا ۔ زندگی کے فلیان میں لغزش ہر غیر معصوم انسان سے لازم ہے نسیان یا دانستہ عصیان آدمی کی سرشت اول کا جزو ہے ، اس لئے ہر نیکوکار مومن سے اگر وہ معصوم نہ ہو چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کا صدور اور لغزشوں کا وقوع فطرت کے خلاف نہیں ہے ، لیکن اگر زندگی کے اعمال کی بنا صحیح ایمان پر ہو تو یہ سہل انگاریاں اور لغزشیں ، غلط راہ روی کا مظہر ہونے کے باوجود زندگانی کی عمومی استقامت پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں ۔ اللہ تعالیٰ ان سے درگذر فرمائے گا اور حسناتِ باقیات پر اثر انداز

نہ ہونے دے گا۔ برائیوں کو مٹا دینے کے یہی معنی ہیں۔
درخت حیات کی اگر چند پتیاں خشک ہو جائیں تو وہ درخت کی
وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ اور ان کے حال کو دونوں جہان میں درست کر دے گا۔
عام سر سبزی کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں بلکہ خشک پتیوں کی جگہ نئی شاداب پتیاں نمودار ہو جائیں گی اور درخت کی سر سبزی بحال رہے گی۔
ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔۔۔ کافروں کے تمام اعمال کے بے سود ہونے
اور نیکو کار اہل ایمان کی برائیوں کے قابل سقوط ہونے کی وجہ اس آیت میں بیان کی گئی ہے چونکہ کفار باطل پرست اور باطل کے پیرو ہیں۔
اور مومن حق پرست اور حق پژوہ۔ اس لئے باطل اساس رکھنے والوں کی امارت بھی باطل ہوگی اور پرستاران حق کا ہر عمل حق پر ہوگا، وہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حق کے پیروی کرنے والے ہیں۔
انکارِ حق کرنے اور دوسروں کو راہ حق سے روکنے کی مذمت اور اس امر کی صراحت کہ اساس کفر پر جو اعمال (خواہ

مقصودِ بیان کیسے ہی اچھے ہوں) مبنی ہوں گے ان سے اچھے نتائج اور ثمرات حاصل نہیں ہو سکتے۔

مِنْ رَّبِّهِمْ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کے شریعت ساز ہونے کے استحقاق کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔
كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ میں صراحت کی گئی ہے کہ نیکو کار خوش اعمال صادق الایمان شخص سے اگر کچھ عملی لغزشیں بھی ہو جائیں تو
قابلِ درگذر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔
اَصْلَحَ بَالَهُمْ میں اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ ان کی لغزشیں عام احوالِ زندگی کو نہیں بگاڑیں گی۔ ان سے شخصی یا جمہوری مفاسد
پیدا نہ ہوں گے، تباہیوں اور بربادیوں کی تخم کاری نہیں ہو گی۔ صاحب لغزش کی لغزشیں اپنی جگہ سوکھ کر گر جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو متعدی
بیماری اور آکلۃ الانسانیت نہ بننے دے گا۔
اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ اور اتَّبَعُوا الْحَقَّ کے الفاظ سے کافروں اور مومنوں کے احوال و اعمال کا فرق بتایا ہے اور اساسی اختلاف و افتراق
کو ظاہر کر کے اعمال کے سود مند یا ناکارہ ہونے کی وجہ کی طرف دقیق اشارہ فرمایا ہے۔
كَذٰلِكَ يَضْرِبُ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانوں کے احوال خیر و شر کی بنیاد ایمان و کفر پر ہے۔ دونوں کے اعمال باہم
کتنے ہی ہم شکل ہیں، لیکن روح دونوں کی الگ الگ ہے اور روح کے اختلاف کی وجہ سے دونوں کے نتائج بھی مختلف ہیں۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ

سو تمہارا جب کفار سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو خوب مضبوط باندھ لو

فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۟ ذٰلِكَ ؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ

پھر اس کے بعد یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا جب تک کہ لڑنے والے اپنے ہتھیار نہ رکھ دیں یہ حکم (جہاد کا جو مذکور ہوا) بجا لانا اور

لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ

اگر اللہ چاہتا تو ان سے انتقام لے لیتا لیکن (تم کو جہاد کا حکم اس لئے دیا) تاکہ تم میں ایک کا دوسرے کے ذریعے سے امتحان کرے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے

يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ۚ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝

جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کریگا اور اللہ تعالیٰ ان کو مقصود تک پہنچا دیگا اور ان کی حالت درست رکھے گا اور ان کو جنت میں داخل کریگا جسکی ان کو پہچان

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدم جمادے گا اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے لئے تباہی ہے اور ان کے

فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝

اعمال کو خدا تعالیٰ کالعدم کر دے گا یہ اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اُتارے ہوئے احکام کو ناپسند کیا سو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعمال کو اکارت کر دیا۔

تفسیر حق کے راستے پر خود گامزن ہونے کے بجائے اعدائے حق، حق کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ اپنی ساری خداداد طاقتیں راہِ حق سے لوگوں کو روکنے اور شجرۂ حق کو سطحِ زمین سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کرتے ہیں، اس لئے حق پرستوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حق کی حمایت کریں اور اپنی کل مالی جسمانی دماغی طاقتیں کام میں لا کر حملہ کرنے والے کافروں اور استیصالِ حق کرنے والے ظالموں کو ان کی حرکتوں اور چیرہ دستیوں کی سزا دیں، یوں تو اللہ تبارک و تعالیٰ قادر ہے اس کی قدرت ہمہ گیر ہے وہ عاجز نہ محتاج نہیں۔ اپنے دین کی حفاظت و حمایت خود کر سکتا ہے اور کافروں کو خود ہی تباہ کر سکتا ہے، لیکن حمایتِ دین کی غرض کافروں کی تباہی نہیں بلکہ امن و سلامتی پھیلانا اور پرستارانِ حق کو مستحقِ اجر قرار دینا اور منزلِ سعادت تک پہنچانا ہے، پھر حق پرست افراد کے درمیان فرقِ مراتب بھی قائم کرنا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حق کی طرف سے دفاع اور کفر پر مدافعانہ یلغار اہلِ حق خود کریں، مگر یہ مدافعت بھی نفسانیت اور جذباتِ شیطانی کے زیرِ اثر نہ ہونی چاہیئے بلکہ خداوند تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے اندر ہونی چاہیئے۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں کہ دفاع کی آڑ لے کر بے قصور کمزور مجبور انسانوں کا خون بہایا جائے۔ ہرے بھرے باغوں اور کھیتیوں کو برباد کیا جائے اور زمین پر بناؤ کے نام سے بگاڑ پیدا کیا جائے بلکہ ایک ضابطۂ الٰہی کے تحت حق کی حمایت اور کفر کی مدافعت لازم ہے اور ضابطہ یہ ہے کہ صرف حملہ آور کافروں سے جنگ کی جائے سختی سے مقابلہ کیا جائے جب تک ہنگامۂ کارزار گرم رہے لڑنے مارنے اور قتل کرنے سے دریغ نہ کیا جائے اور جب لڑائی ہو چکے تو کافروں کی طاقت کو پوری طرح سے توڑنے اور آئندہ کے خطرات سے بقدرِ امکان محفوظ رہنے کیلئے ان کو گرفتار کر لیا جائے، مگر گرفتاری کا یہ مطلب نہیں کہ گرفتار کر کے انتقامی جذبہ کے زیرِ اثر ان کو قتل کر دیا جائے بلکہ اس گرفتاری کا مقصد یہ ہو کہ قیدی مسلمانوں کے حسنِ سلوک سے متاثر ہوں اور فاتح کے قابو میں آجانے کے بعد ان کے اندر جذبۂ نفرت و عداوت جذبۂ محبت سے بدل جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو احسان رکھ کے مفت چھوڑ دیا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حق پرستوں کا مقصد صرف حق کا بچاؤ اور پھیلاؤ ہے۔ کسی کی جان لینا اور ملک فتح کرنا نہیں۔ اگر قیدیوں کے دلوں میں کسی گوشہ میں بھی انسانیت اور شرفِ نفس کی ادنیٰ چمک ہوگی تو وہ اس احسان کے بدلے میں کفر کے دائرہ سے نکل کر حق پرستوں کے گروہ میں آجائیں گے یا کم سے کم آئندہ کفر کی طرف سے حق پر یلغار نہیں کریں گے۔ اگر قیدیوں کو آزاد کرنے سے یہ بلند ترین غرض سامنے نہ ہو تو کم سے کم اہلِ حق کی تنظیم اور حق کی حفاظت و استحکام کے لئے قیدیوں سے کچھ مال لیا جائے اور تاوان لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ وصولِ تاوان سے حق پرستوں کی مالی تنظیم حق کی حفاظت اور کافروں کی آئندہ حوصلہ شکنی ہوگی۔ حق کی حمایت سے غرض چونکہ ذاتی نفع اندوزی نہیں ہوتی بلکہ استحکامِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اصل مقصد ہوتا ہے، اس لئے کافروں کے مقابلے میں اگر کسی کی جان بھی جاتی رہے تو بے مقصد نہیں جائے گی، قربانی رائیگاں نہیں ہوگی۔ اعمال اکارت نہ ہوں گے۔ دنیوی غلبہ خواہ نہ ملے اور تسلط و اقتدار حاصل نہ ہو، لیکن اصل غایت کا فقدان نہ ہوگا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل دین کا استحکام اور اشاعتِ حق ہو جائے گی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، رحمت اور جنت حاصل ہو جائے گی اور کافر خائب ہوں یا مغلوب بہرحال ان کے اعمال بے ثمر رہیں گے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور کلام کو پسند نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت ان کو گوارہ نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی تمام اچھی کارگزاریاں نابود و بے سود اور مردہ ہوں گی اور اہلِ ایمان اگر اللہ کے دین کی حمایت اور حق کو پھیلانے جمانے

اور قائم رکھنے میں مدد کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرے گا اور کافروں کے مقابلے میں ان کے پاؤں جمائے رکھے گا (اور دلوں میں ثبات پیدا کردے گا)۔

تحلیلِ اجزاء

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا باطل پرست کافر حق پرست مسلمانوں کو تباہ کردینے کے درپے تھے اور ان کی چیرہ دستیاں اور ستم شعاریاں روکنے کے لئے مدافعانہ جنگ ضروری تھی اور یہ فطری امر ہے کہ باطل حق کا دشمن ہوتا ہے اور اہلِ حق پر حق کی حفاظت لازم ہوتی ہے اور حفاظت و حمایت بغیر مدافعت اور جنگ کے ممکن نہیں، اس لئے اس آیت میں مقابلہ اور مقاتلہ کی ترغیب دی ہے بلکہ وجوبی حکم نازل فرمایا ہے، مگر جنگ دفاع اور پھر امن اور گرفتاری رہائی کا ضابطہ بھی بتایا ہے۔ اول لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فرمایا گویا اس طرف اشارہ کیا کہ اگر تمہارا مقابلہ ہو ہی جائے یعنی کفار خود ہی لڑنے آہی جائیں اور تم کو ان کا مقابلہ کرنا پڑ جائے تو پھر قتال کرو، گردنیں اڑا دو۔ اس میں کوئی تخصیص و استثناء نہیں کہ کون کافر کسی مسلمان کا قرابت دار یا دوست ہے۔ بغیر رو رعایت اور بلالحاظ تعلق و رشتہ کافروں کی گردنیں مارو اور جب ہنگامۂ کارزار گرم کرچکو تو (اور نوبت غلبہ کی آجائے) کافروں کو گرفتار کرلو۔ اس کے بعد بغیر معاوضہ اور تاوان لئے جنگی قیدیوں کو چھوڑ دو یا تاوان لے کر رہا کردو، دونوں صورتیں جائز ہیں اور یہ سلسلۂ قتل و بند اس وقت تک رہنا چاہیئے کہ لڑائی موقوف ہوجائے اور ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہ رہے۔ قیدیوں کو قتل کرنے کی کوئی اجازت اس آیت میں نہیں ہے۔ نہ جنگی کافروں کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنے اور تباہ کردینے کی اجازت ہے۔ نہ کھیتوں، باغوں، عبادت خانوں اور عمارتوں کو تباہ کرنے یا مال لوٹنے اور بے گناہوں کو قید کرنے کے جواز کی کوئی صراحت ہے۔

اس آیت میں تین الفاظ تحقیق طلب ہیں۔ ضَرْبَ الرِّقَابِ، اِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً۔ مجاہد کا قول ہے کہ گردن مارنے کا حکم ایک خاص جنگ میں ہوا تھا۔ شاید مجاہد کی مراد یہ ہے کہ امن کی حالت میں بغیر شرعی جرم کے گردن مارنے کی اجازت نہیں اور جنگ کی حالت میں بھی ہر وقت اور ہر جنگ میں یہ حکم نہیں بلکہ گردن مارنے کی اجازت خاص حالات میں ہے اور خاص افراد کو قتل کرنے کا حکم ہے یعنی مقابلے کا وقت ہو، جنگ ہو رہی ہو (مدافعانہ جنگ ہو) تو لڑنے والے مردوں کو قتل کرنا چاہیئے۔ ہر کافر کو ہر حالت میں قتل کی اجازت نہیں۔

اِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً یعنی بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ جنگی قیدیوں کو رہا کیا جائے یہ بھی اختلافی مسئلہ ہے۔ قتادہ، ضحاک، سدی، ابن جریج، اوزاعی، امام ابوحنیفہ اور ایک جماعت علماء کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہے۔ آیت اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم اور آیت فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم اس کی ناسخ ہے۔ اب جنگی قیدیوں کو کسی طرح رہا کرنا جائز نہیں۔ یا ان کو قتل کیا جائے گا یا غلام بنایا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ قیدیوں کو کسی قسم کا معاوضہ لے کر نہ چھوڑا جائے (اور بلا معاوضہ چھوڑنے کی اجازت تو بدرجۂ اولیٰ منسوخ ہے) البتہ امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام شافعی کافر قیدیوں سے مسلمان قیدیوں کا تبادلہ جائز قرار دیتے ہیں یعنی قیدیوں سے قیدیوں کا تبادلہ اور معاوضہ درست ہے۔ مال لے کر کافر قیدیوں کو چھوڑنا جائز نہیں، لیکن سیر کبیر میں ہے کہ اگر مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہو تو مال لے کر اس کے معاوضہ میں قیدیوں کو چھوڑنا بھی جائز ہے۔ اکثر صحابہ جن میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی شامل ہیں اس آیت کو محکمہ، غیر منسوخ کہتے ہیں۔ اب بھی امام کو اختیار ہے کہ جنگی قیدیوں کو رہا کردے خواہ کسی قسم کا مالی غیر مالی معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ قیدیوں کے تبادلے کی شکل ہو یا کسی اور شرط پر آزادی یا بلا شرط آزادی۔ بہرحال قیدیوں کو چھوڑ دینا جائز ہے اور چونکہ غلام بنا لینے یا قتل کر ڈالنے کی (خاص خاص صورتوں میں) اجازت صحیح احادیث میں آگئی ہے، اس لئے قتل کردینے یا غلام بنانے کا اختیار بھی امام المسلمین کے ہاتھ میں ہے۔ حاصل یہ کہ اپنی اپنی جگہ ہر حکم محکم ہے کوئی منسوخ نہیں۔ بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ رہا کرنا بھی درست ہے اور قتل کردینا بھی اور غلام بنا لینا بھی۔ حسن بصری، عطاء خراسانی، سفیان ثوری، امام احمد اور ایک روایت میں امام شافعی کا بھی قول یہی ہے۔

بعض اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ قتل کرنے یا غلام بنانے کا ذکر احادیث میں ضرور ہے، لیکن وہ احادیث آحاد ہیں پھر اس آیت کے نزول سے

پہلے کی ہیں۔ اور جن آیات (اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ اور اِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ الخ) کو ناسخ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا نزول بھی اس آیت کے نزول سے پہلے ہوا۔ اور اس آیت میں نہ قتل کی اجازت ہے نہ غلام بنانے کا ذکر۔ گرفتار کرنے کے بعد صرف دو باتوں میں حکم کو محدود کر دیا گیا ہے۔ بلا معاوضہ رہائی اور یہ آیت جنگ بدر اور غزوۂ بنی المصطلق دونوں کے بعد نازل ہوئی۔ لہٰذا یہ آیت اباحت قتل و غلامی کی ناسخ ہے۔ اب جنگی قیدیوں کو نہ قتل کرنا درست ہو سکتا ہے نہ ان کو غلام بنانا۔ واللّٰہ اعلم وعلمہ اکمل واتم۔

حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ضَرْبَ الرِّقَابِ اور شُدُّوا الْوَثَاقَ دونوں حکموں کی غایت زمانی ہے یعنی کافروں کو قید یا قتل کرنے کا حکم اُس وقت تک ہے جب تک جنگی حالت ہو۔ جب جنگی حالت ختم ہو جائے تو پھر نہ اجازت قتل کرنے کی ہے نہ قید کرنے اور باندھنے کی۔ دشمن جب ہتھیار ڈال دیں اور امن ہو جائے یا طرفین سے لڑائی بند کرنے کا معاہدہ ہو جائے تو ایسی حالت میں نہ کسی کو قتل کرنا درست ہے نہ قید کرنا۔

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا مقصد صرف یہی ہو تا کہ کافروں کو شکست ہو جائے ان کا زور ٹوٹ جائے۔ وہ تباہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی غیبی طاقت سے یہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کو ضرورت نہ تھی کہ تم کو جہاد و قتال کا حکم دیتا اور تم سے دین کی حمایت کراتا۔ (بلکہ اس کو تو کسی مخلوق کی طاقت استعمال کرانے اور کسی سے مدد لینے کی حاجت ہی نہیں ہے) مگر اس کا مقصد صرف کافروں کی شکست ہی نہیں تمہاری آزمائش کرنی بھی ہے کہ کون جانی اور مالی قربانی دیتا ہے اور کون تکالیف سے گریز کرتا ہے پھر فرق مراتب بھی قائم کرنا ضروری تھا اور یہ امتیاز رتبہ تمہاری کوششوں اور قربانیوں پر موقوف ہے۔ اب اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت اپنے عمل سے کرو گے اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرو گے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ بھی اپنی غیبی طاقت سے تمہاری مدد کرے گا۔ تمہاری جدوجہد اور قربانی کے بعد اللہ تعالیٰ تم کو نصرت عطا فرمائے گا (یعنی فتح و نصرت تمہاری کوشش سے نہ ہو گی، اللہ تعالیٰ کی مدد کی بہر حال ضرورت رہے گی، مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت کا نزول تمہاری جدوجہد کے بعد ہو گا) اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔ (غیبی طاقت سے تمہارے دلوں میں اطمینان، تمہارے ایمانوں میں ثبات اور استحکام پیدا کر دے گا اور غیبی حمایت سے) تم کو میدانِ جنگ میں قائم رکھے گا اور اس کوشش اور جدوجہد میں اگر تم مارے جاؤ گے تو (جماعت اہل اسلام اور اسلام کے استحکام کے لئے تمہارا مرجانا تو مفید ہو گا ہی) تمہارے اپنے لئے بھی یہ قربانی بیکار نہ جائے گی آخرت میں لازوال راحت تم کو ملے گی۔ بلا تردد جنت میں تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ (یعنی سارے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے اور تمہاری یہ قربانی تمام پچھلے گناہوں کو دھو ڈالے گی) اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی تم کو راہِ راست پر قائم رکھے گا اور آخرت میں جنت کا راستہ بھی دکھائے گا اور راہ سعادت و نجات پر چلا کر دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جائے گا۔

فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ الخ۔ یعنی کافر چونکہ قرآن اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت سے نفرت کرتے اور عداوت رکھتے ہیں (اور اگر کچھ نیکیاں کرتے ہیں تو وہ ان کی خود مفروضہ نیکیاں ہوتی ہیں جو واقع میں نیکیاں نہیں ہوتیں۔ انسانیت عامہ کی بہبودی ان سے وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ عام انسانیت کے لئے نتیجۃً ضرر رساں ہوتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو دنیا میں ناکارہ کر دیتا ہے وہ ثمر آفریں نتیجہ خیز اور فلاح آفریں نہیں ہونے پاتیں اور آخرت میں ان نیکیوں کا کوئی ثواب ان کو نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمالِ خیر اکارت کر دے گا۔ پس ان کو بد اعتقادی اور انکارِ حق کی وجہ سے دنیا اور دین میں سوائے پھٹکار کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

مقصودِ بیان

اِذَا لَقِيْتُمُ الخ۔ اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی جنگ جارحانہ نہ ہو دفاعی ہو۔ اگر کافر اقدام جنگ کریں اور لڑائی پر تل جائیں تو (صرف) جنگی لوگوں کو قتل کیا جائے پھر خوں ریزی جاری ہی نہ رکھی جائے بلکہ خون بہانے کے بعد اگر کفار جنگ سے باز آجائیں اور اقدام جنگ ختم کر دیں اور دفاع کی ضرورت نہ رہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ جو لوگ لڑنے کیلئے آئے ہیں ان کو گرفتار کر لیں تاکہ دوبارہ یلغار اور یورش کا فوری خطرہ نہ رہے۔ مگر گرفتاری کا یہ مطلب نہیں کہ گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔ خوں ریزی کا دور تو ختم ہو گیا، قتال کی انتہا گرفتاری پر ہو گئی۔ اب گرفتار کر لینے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک منفی دوسری مثبت۔ منفی غرض تو یہ کہ کفار کے

لشکر کی پوری طاقت ٹوٹ جائے اور مسلم فوجوں پر دوبارہ فوری حملہ کرنے اور پلٹ پڑنے کا خطرہ ٹل جائے اور مثبت غرض کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ وہ ہے جس سے قیدیوں کو اگر ان میں شرافت نفس اور دانش مندی کا کوئی بھی شائبہ ہے۔ براہ راست کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یعنی بلا معاوضہ اور بغیر کسی تاوان وصول کئے اور تبادلہ کی شرط کے بغیر مسلمان اپنے گرفتار کردہ کافر قیدیوں کو رہا کر دیں۔ اس سے بصیرت مند کافروں کی چشم بصیرت کھلنے کی امید ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا مقصد خوں ریزی اور ملک گیری اور زر اندوزی نہیں نہ مسلمان جبراً کسی کو مسلمان بنانا چاہتے ہیں بلکہ یہ گروہ سلامتی کوش ہے۔ قابو پانے کے بعد بھی آشتی اور سلامتی کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ دوسرا رخ یہ کہ مسلمانوں کی جماعت کی تنظیم اور اسلام کے تحفظ کا مالی استحکام ہو جائے۔ مسلمانوں کی مالی ضرورتیں پوری ہونے میں کچھ نہ کچھ مدد مل جائے اس کی صورت یہ کہ فدیہ معاوضہ اور تاوان لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ آزاد شدہ قیدی جو معاوضہ دے کر آزاد ہوا ہو اگرچہ کامل طور پر احسان مند نہ ہوگا پھر بھی اپنی جان بچ جانے سے خوش ہوگا اور مسلمانوں کے لئے اس کے دل میں کچھ جذبہ محبت بیدار ہو جائے گا اور آئندہ مسلمانوں کے خلاف عسکری کوشش میں حصہ دار نہ ہوگا۔

حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قتال کا دور گرفتاری پر ختم ہو گیا اور گرفتاری و آزادی کا دور جنگی حالات کے خاتمہ تک باقی رہے گا۔ جب کفار ہتھیار ڈال دیں گے اور امن ہو جائے گا تو یہ دور بھی ختم ہو جائے گا۔ امن کے اعلان کے بعد گرفتاری بھی جائز نہیں۔

وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ سے دو باتوں کا اظہار مقصود ہے۔ ایک تو اس وہم کو دور کرنا غرض ہے جو شاید ضعیف الایمان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے کہ ہماری کوشش قربانی استقامت جرأت جفاکشی اور ثبات و تنظیم کافروں کی شکست کا حقیقی سبب اور کامل مؤثر ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی انسان کی طاقت کی حاجت نہیں۔ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی جہادی کوششوں کے بغیر بھی کافروں کو شکست دے سکتا ہے۔ اپنی طاقت پر کامل اعتماد خام خیال ہے۔

دوسری غرض یہ بتانا ہے کہ اصل میں جہاد کا منشاء تو تمہارے خلوص کی جانچ اور عملی کوشش کا امتحان ہے یعنی فرق مراتب کے ساتھ تمہارے درجات کو اونچا اٹھانا مقصود ہے۔ اس جہاد کا فائدہ تم کو ہی پہنچتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا الخ سے اس وہم کو دفع کرنا مقصود ہے کہ جنگ میں بعض مسلمانوں کا مارا جانا یقینی ہے اور جو مقتول ہو گیا اس کا تو سراسر نقصان ہی ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے والدین بچے بیوی بھائی بند اور اقربا و احباب چھوٹے، مال گیا دنیا گئی یہاں تک کہ جان بھی گئی، اس کو جہاد سے کیا فائدہ۔ اس شبہ کو اس طرح دور کر دیا کہ شہیدوں کی مغفرت اور جنت میں داخلہ یقینی ہے یعنی ساری کامیابی دنیوی کامیابی ہی نہیں بلکہ آخرت کی نجات و مغفرت اور جنت کا داخلہ اصل مدعا ہے۔ شہیدوں کی کوششیں رائیگاں نہیں جا سکتیں۔ وغیرہ۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ

کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں اور انہوں نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا انجام کیا ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ان پر کیسی تباہی

عَلَیْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ

ڈالی اور ان کافروں کے لئے بھی اسی قسم کے حالات ہونے کو ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ مسلمانوں کا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی

لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ۧ اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا

کارساز نہیں بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے

ع ۱ / ۱۱ / ۵

الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝

سے نہریں بہتی ہونگی اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان لوگوں کا

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝

ٹھکانا ہے اور بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپکو گھر سے بے گھر کر دیا ہم نے انکو ہلاک کر دیا سو

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝ مَثَلُ

ان کا کوئی مددگار نہ ہوا تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر ہوں کیا وہ ان شخصوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو مستحسن معلوم ہوتی ہے اور جو اپنی

الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ

نفسانی خواہشوں پر چلتے ہوں جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے اسکی کیفیت یہ ہے کہ اسمیں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جسمیں ذرا تغیر نہ ہوگا۔

وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں شراب کی ہیں جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہونگی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی

وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝

جو بالکل صاف ہوگا اور اُن کیلئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کیطرف سے بخشش ہوگی کیا ایسے لوگ اُن جیسے جو ہمیشہ دوزخ میں رہینگے اور کھولتا ہوا پانی ان

تفسیر

جس طرح فطرت تکوینیہ ایک ہے۔ ستاروں کا طلوع غروب تمام کُروں کی دوری حرکت فصول کا تبادل، بہار و خزاں اور گرما و سرما کا تعاقب اور شب و روز کی رفتار پیہم ابتداء آفرینش سے اب تک ایک ہی کیفیت و کمیت اور ایک ہی حالت پر جاری ہے۔ اسی طرح فطرتِ انسانیہ ایک ہے۔ آغازِ انسانیت سے خیر و شر کی طاقتیں ٹکرا رہی ہیں حق و باطل کا تصادم ہو رہا ہے۔ دکھ سکھ، رنج راحت مال داری ناداری آبادی بربادی اور موت و حیات کی کشمکش جاری ہے۔ حال ماضی کا عکس اور مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ ماضی اپنے اندر خزانۂ عبرت رکھتا ہے مستقبل کے لئے ضابطۂ انسانیت لازوال ہے۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد۔ فطرت انسان غیر متغیر ہے۔ گزشتہ سے پیوستہ اور آئندہ اوقات کے خصوصی تغیرات مشرق اور مغرب کا بعد مکانی اور تہذیب و بربریت کا تفاوت انسانی فطرت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے۔ اساسی فطرت ہر وقت اور ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ افراد کی موت و حیات اور اقوام کا عروج و زوال استمراری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے سرتابی کرنے والوں اور حق سے بغاوت کرنے والوں کی تباہیاں اپنے زندہ آثار کے ساتھ صفحۂ گیتی پر موجود ہیں۔ ناحق کوش حق فراموش طبقات و ملل کی قہار طاقتیں حق کے مقابلے میں چکنا چور ہو گئیں۔ بڑی بڑی متمدن طاقتور قومیں جن کی کثرتِ مال افزونی طاقت اور جبروتی ملوکیت کے مقابلے میں قریش کی طاقت و فرعونیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی، صفحۂ ہستی سے نابود کر دی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ حق پرست بھی ہمیشہ نہیں رہے۔ ضابطۂ موت و زیست ان پر بھی لاگو رہا۔ عروج کے بعد زوال سے ان کو بھی ہمکنار ہونا پڑا۔ لیکن زندگانی اسی ناپائیدار زندگانی ہی کا تو نام ہے۔ حقیقی اور سچی زندگی وہ ہے جو اس زندگی کے بعد آنے والی ہے۔ لازوال مآل کا سکہ

دکھ معیارِ حق وباطل ہے ۔ کافروں کی مادی زندگی چونکہ مصائب شدائد تباہی اور دکھ سے بھری ہوئی ہے اور اہلِ حق کی آئندہ زندگی راحت آگیں اور سرور آفریں ہے، اس لئے اہلِ حق وباطل کا یہ تقابلی ہنگامی عروج وزوال اور پستی وبلندی ہی حقیقی معیار نہیں پھر بھی عبرت انگیز حقیقت میں نظر رکھنے والوں کے لئے اس کے اندر ایک بصیرت آفریں درس ہے ۔ پس کیوں نہیں دیکھتے یہ حق سے بغاوت اور پیامِ الٰہی سے سرتابی کرنے والے گزشتہ کافروں کا انجامِ بد ۔ اور کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے ماضی کے واقعاتِ بربادی سے ۔ فرسودہ کھنڈرات اور بوسیدہ آثار کیا ان کی سبق آموزی کے لئے کافی نہیں ہیں ۔

تحلیلِ اجزاء

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ۔ یسروا کی ضمیر کفارِ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف راجع ہے اور الارض سے مراد ہے یمن اور شام کے علاقے اور ان کے راستہ میں پڑنے والی ویران بستیاں، شام کو جاتے ہوئے قوم ثمود کی ویران بستیاں اور ان کے کھنڈرات اور یمن کو جاتے ہوئے قوم عاد کے فرسودہ بوسیدہ آثار سرِ راہ پڑتے تھے ۔ ہر راہگیر ان کو دیکھتا تھا ۔ عبرت اندوز نظر رکھنے والوں کو دکھائی دیتا تھا کہ انبیاءِ حق سے مخالفت کرنے والی کتنی ہی بڑی طاقتیں اور طاقتور قومیں ہوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔

دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا ۔ ان کی طاغوتی جبروتی طاقتیں حق کے مقابلے میں چکنا چور ہو گئیں ۔ پھر فقط یہی نہیں کہ عاد ثمود اور طسم وغیرہ کا ہی یہ انجامِ بد ہوا یا اسی زمانے کے ساتھ کافروں کی یہ ہلاکت مخصوص تھی ۔ آئندہ حق کے دشمن تباہ نہیں ہوں گے نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ۔

وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُہَا ۔ کافروں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے ۔ ہر جگہ ہوتا رہا ہے اور ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے ۔ حق وصداقت سے باطل و کذب کا تصادم اور تصادم کے بعد تباہی نہ عاد وثمود کے ساتھ مخصوص ہے نہ یمن وشام کے لئے ۔ دریائے نیل ہو یا کنعان قبطی اور عمالقہ ہوں یا نمرودی اور بابلی سب کافروں کا نتیجہ ایک ہی طرح رہا ہے اور رہے گا یعنی قریش اور ان کے ساتھی جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مخالفت وعداوت پر کمربستہ ہیں ۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اور پیغمبرِ برحق کے تمام دشمنوں کو ملک میں چل پھر کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے ۔ ماضی سے حال کیلئے اور دوسروں سے اپنے لئے سبق لینا چاہیئے ۔ کافروں کی اس تباہی اور اہلِ ایمان کی اس کامیابی کی وجہ مادی طاقت کی برتری وکمتری یا افراد کی کثرت وقلت نہیں ۔ بلکہ

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَہُمْ ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مومنوں کی حمایت حفاظت اور مدد کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور کافروں کو بچانے والا کوئی نہیں نہ ہو سکتا ہے (نہ مزعومی دیوتا نہ غیبی ارواح نہ مورتیاں نہ اقارب واولاد نہ کوئی دنیوی طاقت) یہ تو کفر وایمان کے دنیوی نتائج تھے ۔ ممکن تھا کہ کور باطن کج دماغ یہ کہنے لگتا ہے کہ دنیا میں بربادی اور ہلاکت تو اہلِ حق کی بھی ہوئی ہے وہ بھی زمانے کی دست برد سے کب نکل سکے ۔ رات دن کا ادل بدل اور عروج وزوال کا چکر فطری ہے ۔ اس میں ایمان و کفر کو کوئی دخل نہیں ، گو اس کا جواب بہت آسان تھا کہ اپنے وقت پر سورج کا طلوع وغروب تو ہوتا ہی ہے ۔ قوموں کے چڑھاؤ اتار کا دور بھی فطری ہے ، لیکن حوادث وواقعات کی تہ میں کچھ پوشیدہ اسباب ضرور ہوتے ہیں ، کچھ ظاہری موجبات ضرور ہوتے ہیں جو نتائج کو پیدا کرتے ہیں ، کفر وایمان کے مقابلے میں کبھی بھی کفر کی طاقت انجام کے اعتبار سے غالب نہیں رہی مآل کار حق مغلوب نہیں ہوا دورانِ مقابلہ میں کبھی عارضی نشیب وفراز اور زیر وزبر کا ظہور ہوتا رہا ، مگر نتیجہ میں اہلِ ایمان ہی کو نصرت نصیب ہوئی اور کفر کو شکست سے دوچار ہونا پڑا ۔ پھر اہلِ ایمان وصداقت کو جو کبھی شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ اہلِ ایمان نے کامل طور پر قوانینِ حق کی پابندی نہیں کی یا فہمِ صداقت میں ان سے غلطی ہو گئی ۔ حاصل یہ کہ اہلِ حق اگر قوانینِ حقانیت کے پابند ہوئے اور پابند رہے تو کبھی ان کو بربادی سے ہمکنار ہونا نہ پڑا اور کفر کی طاغوتی طاقتیں ہمیشہ اہلِ حق کے مقابلے میں تباہ ہوئیں ۔ صفحۂ گیتی پر اہلِ حق کا کوئی نشان ایسا نہیں ملتا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ان کو اہلِ باطل کے مقابلے میں تباہ ہونا پڑا تھا ۔ ہاں خود ہی انہوں نے حق کو چھوڑ دیا یا حق کو سمجھنے میں غلطی کی تو ضرور برباد ہو گئے ۔ بہر حال اقوام

پارینہ کے چھوڑے ہوئے آثار اس امر کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اللہ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی نافرمانی کرنے والے بری طرح تباہ ہوئے۔ پھر یہ تو حق و باطل کو جاننے اور سمجھنے کا دنیوی معیار ہے جو حقیقی نہیں۔ حقیقی کسوٹی تو آخرت کے نتیجہ کی کسوٹی ہے کہ کہ

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ مومنین صالحین کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا۔ اٰمَنُوْا کے بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کہنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صرف ایمان اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا مستحق نہیں بنا دیتا کیونکہ آیت کی رفتار بظاہر بتا رہی ہے کہ جنت میں داخل کرنے سے مراد بغیر عذاب دیئے براہِ راست داخل کرنا ہے اور بغیر سزا کے داخلے کا وعدہ صرف انہیں لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو ایمان دار بھی ہوں اور ان کے اعمال بھی درست ہوں، بداعمال ایمان داروں کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر کے جنت میں براہِ راست بلا سزا داخل فرما دے اور ہو سکتا ہے کہ سزا دینے کے بعد پاک کر کے جنت میں لے جائے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اور خصوصیت سے آخرت کی جزا سزا کے منکر ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف دنیوی آسائش اور عیش پرستی ہوتی ہے۔ پاک ناپاک اور حرام حلال کے کسی دائرہ میں وہ نہیں رہتے ان میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں۔ جانور بھی اچھا کھانے پینے اور آرام و آسائش حاصل کرنے کا گرویدہ ہوتا ہے۔ حق و باطل میں تمیز کرنے والی قوتِ فکریہ اس کے پاس نہیں ہوتی۔ ان دنیا پرست کافروں کے دماغ بھی آخرت کے نفع نقصان اور عذاب ثواب کے تصور و ادراک سے خالی ہوتے ہیں، مگر حقیقت کے انکار سے حقیقت نہیں ٹلتی۔ حق نہیں بدلتا۔ قیامت تو بہرحال آکر رہے گی اور کافروں کا ٹھکانا جہنم ہوگا (کافر کیسے ہی خوش خصال اور خوش رفتار ہوں کتنے ہی خوش مقال اور خوش اطوار ہوں، مگر منکرِ حق ہیں اور انکارِ حق کے بعد ہر نیکی نما کردار و گفتار بے ثمر ہے، بے اساس ہے، اس لئے کافر کا مآلِ زندگی سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ۔ کفارِ قریش کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے بل بوتے پر گھمنڈ تھا۔ جہالت کا تقاضہ ہے کہ جسمانی طاقت، دولت کی فراوانی اور قومی جتھے کی مضبوطی پر غرور پیدا ہو جائے۔ اگرچہ ایران روم اور دنیا کی بڑی حکومتوں یہاں تک کہ یمن و شام کے گورنروں اور نوابوں سے بھی ٹکر لینے کی طاقت اہلِ مکہ کیا سارے عرب میں نہ تھی، مگر محدود نظر رکھنے والوں کے حوصلے (غلط طور پر) نامحدود ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی طاقت سے بڑھ کر کسی طاقت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ روئے زمین کی سلطنتوں کی طاقتوں کا اندازہ ان کو نہیں ہوتا پھر اللہ تعالیٰ کی غیبی قدرتِ عامہ اور ہمہ گیر محیطِ کل طاقت کو تو ان کی چشمِ تصور دیکھ ہی نہیں سکتی۔ جہالت کی تاریکی ان کو بے بصیرت اور عدیم البصر بنا دیتی ہے۔ قریش بھی جہالت کے اس عام ضابطہ سے الگ نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پشت پر جو الٰہی طاقت تھی وہ ان کو نظر نہ آتی تھی۔ اپنے اونٹوں کی کثرت، چاندی سونے کی فراوانی، جسمانی اکڑ اور قبائل کی بہتات پر ان کو گھمنڈ تھا۔ اسی غرور کی وجہ سے انہوں نے ایسے اسباب فراہم کئے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور مسلمانوں کا گروہ جلا وطن ہو جائے۔ گو اس دیس نکالے میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت اور اسلام کی ناقابلِ تصور منفعت تھی۔ اسلام کی اشاعت اور پھیلاؤ کا بڑا حصہ اسی ہجرت کا ممنون ہے، لیکن کافروں کا مقصد تو اسلام کو تباہ کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو بے یار و مددگار بنا کر نکالنا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو بے بس اور بے کس سمجھ کر وہ ایسا کر گزرے اور مکہ سے نکالنے کے بعد طنز و طعن کے تیر چلانے لگے۔ کہنے لگے محمد کا خدا کہاں گیا۔ اس نے محمد کی حمایت کیوں نہیں کی۔ ہم نے اس کو مکہ سے نکال دیا جلا وطن کر دیا وہ جان بچا کر اور منہ چھپا کر بھاگا اور اس کے خدا نے ہمارے مقابلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خرافات کے جواب میں فرمایا۔ بہت سی بستیاں یعنی قومیں اور بستیوں میں رہنے والے ان مکہ والوں سے ہر طرح زیادہ طاقتور گزرے ہیں (لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کی اور مقابلہ کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔ آخر کار انبیاء یا ان کے جانشین غالب آئے) اُن کی مدد کسی نے بھی نہیں کی کوئی ایسا مددگار ان کو مل ہی نہ سکا جو اپنی طاقت سے ان کی مدد کرتا اور ان کو بچا لیتا۔ (شدادی فرعونی نمرودی عملیقی عادی اور ثمودی طاقتیں کیسی بڑھی چڑھی ہوئی تھیں۔ قوم لوط قوم شعیب اور سب سے پرانے زمانے میں قوم نوح کیسی طاقتور تھی پر ان کی بستیاں کہاں گئیں۔ کوئی الٹ گئی، کوئی زمین میں دھنس گئی، کسی پر پتھر برسائے گئے اور کوئی طوفان میں ڈو

گئی) حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہمہ گیر ہے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز اور کوئی طاقت باہر نہیں۔ قریش کو یہ گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے کہ ہم نے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا اور ان کا کوئی حامی ان کو نہ بچا سکا۔ ان کافروں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ضرور تباہ کرے گا اور کوئی حمایت کرنے والا ان کو اللہ تعالیٰ کے عتاب و عذاب سے نہ بچا سکے گا۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے ہی سال بدر کے مقام پر اللہ تعالیٰ نے کفر کی طاقت توڑ دی۔ قریش کے بڑے بڑے سرغنہ مارے گئے نہ ابوجہل بچا نہ عتبہ نہ ولید۔ پھر آٹھ دس برس میں تو کافروں کا تختہ ہی الٹ گیا جس مکہ سے مسلمانوں کو بے یار و مددگار اور بے کس و بے بس سمجھ کر نکالا تھا اسی مکہ پر مسلمانوں کا اقتدار ہو گیا۔ اور اسی جگہ کافروں کو اپنی دوامی شکست پر مہر قبول لگانی پڑی۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ۔ آیاتِ مذکورہ بالا میں کافر اور مومن کا فرق اخروی اور دنیوی محسوس نتیجہ کے اعتبار سے بیان فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ جس راہ زندگی پر چلنے کا دنیوی اور اخروی نتیجہ اچھا ہے وہ راہ اچھی ہے اور اسی پر چلنا بھی اچھا ہے اور جس راہ کو اختیار کرنے کا ثمرہ برا ہے وہ راہ بھی بری ہے اور اس کو اختیار کرنا بھی برا ہے۔ درخت حیات کی اچھائی برائی پھلوں کی اچھائی برائی سے جانی جا سکتی ہے۔ اب اس آیت میں مومن و کافر کا فرق عقلی دلیل کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ انسانی زندگی نام ہے فکر و عمل کا اور ان دونوں کی اصلاح کے دو ہی ذریعے ہیں۔ وحی یا عقلی فلسفہ، نبوت و رسالت مظہر وحی ہوتی ہے اور فلسفہ عقل کی آزاد جولانی کا نتیجہ۔ وحی میں غلطی کا امکان نہیں، اس میں دماغ کی اختراعیات اور ذہنی مفروضات کو دخل نہیں ہوتا۔ فلسفہ میں جذبات کی آمیزش ہوتی ہے، فہم کے حدود میں وہم داخل ہو جاتا ہے عقل کی سلامتی خواہشات و عواطف کے جارحانہ حملوں سے مجروح و مخدوش ہو جاتی ہے پھر عقل کی جولانگاہ طبعیات سے خارج نہیں ہوتی اور طبعیات کے میدان میں گردش تکمیل نفس کی رکاوٹوں سے آزاد نہیں ہوتی۔ پس جو شخص حامل وحی ہو اس کا علم وہی ہو گا جو علام الغیوب نے اسے سکھا دیا ہو، اس کا موازنہ اس شخص سے کیسے کیا جا سکتا ہے۔ جو محض دماغی افسانوں کا بندہ اور خواہشات کا متبع ہو۔ لہٰذا جس شخص کو رب کی طرف سے روشن راہ حیات (وحی اور تعلیم خداوندی) مل گئی ہو وہ اس شخص کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتا جو بداعمالی کو پسند کرتا ہو اعمال سیئہ کو اعمال حسنہ سمجھنے لگا ہو اور اپنی خواہشات کا پیرو ہو اول کا حق پر ہونا اور دوسرے کا باطل پر ہونا بالکل ظاہر ہے کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۥ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ۔ مومن و کافر کا مآلی اور عقلی فرق اوپر کی آیات میں بیان کر دیا گیا۔ مآلی ذکر اوپر بھی آیا تھا، مگر مجمل تھا۔ جنت اور اس کی نہروں کا ذکر کیا گیا تھا اور دوزخ کی آگ کا بھی، لیکن تفصیل نہ جنت کی نہروں کی کی گئی تھی نہ نعمتوں کی نہ دوزخ کی آگ کی۔ اس آیت میں دونوں کی تفصیل کی گئی ہے۔

جنت میں نہریں ہوں گی: پانی کی، دودھ کی، شراب کی شہد کی اور کھانے کیلئے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور سب سے بڑھ کر رب کی مغفرت ہوگی۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ جنت کی عظیم الشان عجیب حالت۔ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ یعنی متقیوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ متقی ہر مومن بھی ہوتا ہے۔ خواہ کیسا ہی فاسق ہو۔ کیونکہ شرک سے تو وہ بہرحال بچتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ متقی ہوتا ہے جو کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور ان چیزوں سے بچتا ہے جن کی حرمت قطعی ہے۔ شراب خواری، قمار بازی، قتل ناحق، چوری، ترک صلوٰۃ، بندش زکوٰۃ، ترک صوم اور تمام فرائض کے ترک اور ممنوعات کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ مومن ہے جو شرک اور کبیرہ گناہوں کو تو ترک کرتا ہی ہے صغیرہ گناہوں سے بھی باز رہتا ہے۔ اور سب سے اونچا وہ مومن ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو اپنے دل سے نکال پھینکتا ہے۔ حلال لذت گو وہ حاصل کرتا ہے، مگر تعلق خاطر اور دل کی وابستگی حلال نعمت اور جائز آسائش سے بھی اس کی نہیں ہوتی۔ جنت کے اندر سب کے درجات جدا جدا ہیں، مگر داخلۂ جنت کے لئے استحقاق ابتدائی درجہ کے متقی یعنی مومن غیر مشرک کے لئے ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی جنت کا وعدہ کر لیا ہے اس کو جنت ضرور ملے گی۔ یہ بات الگ ہے کہ سزا دیئے جانے کے بعد ملے گی یا گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا اور بغیر سزا دیئے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

مِنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ۔ نہروں کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں :

(۱) کچھ نہریں پانی کی ہوں گی ۔ سڑے ہوئے بودار بگڑے ہوئے رنگ کے پانی کی گندی نہریں نہ ہوں گی بلکہ نتھرے ہوئے پاکیزہ پانی کی ہوں گی

(۲) کچھ نہریں دودھ کی ہوں گی ۔ دودھ بھی ایسا نہ ہوگا جس کا مزہ بگڑ گیا ہو اور امتدادِ زمانہ نے اس کے مزہ کو خراب کر دیا ہو ۔

(۳) کچھ نہریں شراب کی ہوں گی ۔ شراب بھی وہ جو تلخ بدمزہ نہ ہوگی دنیا کی شرابوں کی طرح اس کے مزے میں کڑواہٹ اور تیزی نہ ہوگی

(۴) کچھ نہریں شہد کی ہوں گی ۔ شہد وہ نہیں جس میں خاک یا کوڑا کرکٹ پڑا ہو یا کسی اور چیز کی آمیزش کر دی گئی ہو بلکہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہوگا۔ پینے کی یہ چار چیزیں جنت کے اندر نہروں کی شکل میں رواں ہوں گی ، ظاہر آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے ، لیکن ہو سکتا ہے کہ نہریں بہنے سے مراد کثرت اور حسبِ پسند ہر جگہ دستیابی ہو ۔ کلام کو حقیقت پر محمول کرنا تاویل کرنے سے بہتر ہے ، بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو ۔ نارسا فہم والوں کی نظر میں شراب ، دودھ اور شہد کی نہریں نہیں آتیں ، اس لئے وہ تاویل کر کے ان چیزوں کی کثرت مراد لیتے ہیں ، مگر آخرت کی کس نعمت کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہروں پر ہی کیا منحصر ہے حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی نعمتیں نہ کسی نے آنکھوں سے دیکھیں اور نہ کانوں سے سنیں نہ دل میں ان کا تصور کیا پھر سمجھ میں پوری کیفیت کیسے آ سکتی ہے ۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۔جنت کے اندر اہلِ جنت کے لئے ہر طرح کے پھل ہوں گے یعنی جنتیوں کے کھانے کے لئے وہ تمام پھل ہوں گے جو دنیا میں کھائے جاتے ہیں مگر ان کی حقیقت جسامت لذت اور افادیت دنیوی پھلوں سے بالکل الگ ہوگی ، مگر رنگ اور شکل کو دیکھ کر کہا جا سکے گا کہ یہ سیب ہے یہ انار ہے یہ انگور ہے ان کے نام بھی یہی ہوں گے ۔ اشتراکِ نام و رنگ اور اختلافِ لذت و طعم سے دنیوی پھلوں پر ان کی ترجیح ظاہر ہوگی اور اہلِ جنت کی طبائع کا ان کی طرف میلان ہو سکے گا ۔ نامعلوم چیز کیسی ہی لذت آگیں ہو ، مگر اجنبی اور ناواقف شخص کو اس کی خوبی اسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اسی نام و نوع کی کم درجہ چیز کو بھی اس نے کھایا یا چکھا ہو ، اعلیٰ کی برتری اسی وقت نمایاں ہوتی ہے جب ادنیٰ سے واقفیت ہو اور دونوں کا تفاوت محسوس ہو ، اس لئے جنت کے اندر انہی دنیوی ناموں اور شکلوں اور رنگوں کے ہر قسم کے پھل ہوں گے ۔

وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۔ لذت کام و دہن فطری مرغوب جسمانی ہے ۔ تربیتِ جسمانی کے لئے مرغوب مفید ماکول و مشروب ضروری ہے اور رغبتِ خاطر نظر کے علاوہ کیفیت ذائقہ پر موقوف ہے ۔ اس کی تفصیل اور ترغیب کی تکمیل مذکورہ بالا آیات سے ہو گئی ، لیکن کون شخص ہے جو گناہ گار اور قصوروار نہ ہو ، فرائضِ الٰہی کو کمال کی حد تک کون ادا کر سکتا ہے ۔ انبیاء اپنی جگہ اپنے قصور کے معترف ہیں اور فاسق و بدکار انسان اپنے دائرہ میں مجرم اور جرم کا مقر ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نعمت ہو اگر اس کے ساتھ باز پرس اور سزا کا اندیشہ لگا رہے اور سکھ کے ساتھ دکھ کی آمیزش قائم رہے تو ایسی راحت و نعمت اہلِ دانش کے لئے موجبِ کشش نہیں ہو سکتی ، اس لئے مادی اشکال کی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فروگذاشتوں کی مغفرت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملے گی چونکہ اللہ تعالیٰ رب ہے اور اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ اگر کسی کو نوازنا چاہے تو نوازش کو ادھورا نہ چھوڑے ، اس لئے رب کی طرف سے قصوروں کی معافی اہلِ جنت کو مل جائے گی ، حاصل یہ کہ نہ کسی قسم کا قلبی اندیشہ اور روحانی کوفت باقی رہے گی نہ تقاضائے جسمانیت پورا کرنے میں کمی ہوگی ۔

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۔ وہ جنتی جن کو مندرجہ بالا دوامی نعمتیں حاصل ہوں گی ، کیا ان لوگوں کی طرح ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ۔ یعنی نہ کبھی مریں گے نہ آگ سے نکلیں گے نہ عذاب سے چھوٹیں گے اور جن کو دوسری نعمتوں اور راحتوں کا میسر آنا تو درکنار پینے کا پانی بھی نہیں ملے گا ، اور جبراً پلایا جائے گا تو ایسا کھولتا ہوا پانی جو ان کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا

آیاتِ بالا میں ترغیب کامل تھی اور اس آیت میں تخویف تام ہے ۔ دونوں پر غور کرتے اور دونوں بیانوں سے اثر انداز ہونے کے بعد کوئی دانش مند بلکہ کوئی معمولی ہوش مند بھی ایمان سے نفرت کر کے کفر کو اختیار نہیں کر سکتا ۔

مقصودِ بیان

ماضی میں درسِ عبرت ہے حال و استقبال کے لئے، انسان کی فطرت اور خیر و شر کی طاقتیں اختلافِ زمان و مکان کے باوجود یکسانیت رکھتی ہیں۔ اہلِ کفر کے آثارِ فرسودہ اور دیارِ بوسیدہ مقاماتِ تفریح نہیں، علمی تاریخ مرتب کرنے کے عنوان نہیں بلکہ ان کو عبرت اندوز نظر سے دیکھنے اور سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا میں صراحت ہے اس امر کی کہ کفر کا نتیجہ حق کے مقابلے میں تباہی صرف دورِ ماضی کی داستان نہیں بلکہ اہلِ حق اس زمانے میں بھی اگر حق پرست ہو جائیں اور ساتھ ہی اسباب و شرائط پر کاربند ہو جائیں جو تعلیمِ الٰہی کا منشا ہیں تو آج بھی ان کے مقابلے میں کفر کی مغلوبیت اور تباہی فطرتِ حق و باطل کے موافق ہوگی۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق و باطل کا معیار تعلیمِ ربانی اور وحی ہے۔ روشن دلیل اور قطعی برہان وہ قانون ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ خود ساختہ ضوابط کو دستورِ زندگی قرار دینا ہوا پرستی کی نشانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغی تراشیدہ خواہ کتنے ہی بڑے فلاسفر کا ہو اور کیسا ہی پُرحکمت ہو، مگر میلانِ نفس کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتا، وطن زبان قوم خاندان اور دوسرے مادی علائق کی آسائش کا شائبہ اس کے اندر ضرور ہوتا ہے اور یہی آلائش عدلِ حقوق اور صحتِ فکر سے اس کو ہٹا دیتی ہے۔

آیات میں جنت کی نعمتوں کی تفصیل بتا رہی ہے کہ وہاں ہر طرح کی لذت فرحت اور انبساطِ خاطر کے اسباب حاصل ہوں گے۔ تقاضائے جسمانیت بھی اور لوازمِ قلب و روحانیت بھی۔

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ سے معلوم ہو رہا ہے کہ عذابِ آتش کے علاوہ دوزخیوں کو دوسرے طرح کے عذاب بھی ہوں گے۔ بیرونی ایذاؤں کے بھی اور تباہ کن ماکولات و مشروبات کی شکل میں بھی جنت و دوزخ کی کیفیات کے بیان کا اصل مقصد ترغیب و ترہیب ہے۔

اور اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ کا مقصد دعوتِ فکر و غور ہے اور گزشتہ کافروں کے احوال و آثار کے مطالعہ کی غرض بصیرت کوشی اور عبرت اندوزی کی تعلیم ہے۔ وغیرہ۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپؐ کی طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپؐ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو وہ دوسرے اہلِ علم سے کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے

قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا

ابھی کیا بات فرمائی تھی یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور یہ اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ

زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ

اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور اُنکو اُن کے تقوے کی توفیق دیتا ہے سو یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر دفعتہً آپڑے تو

فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ۝ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

اس کی علامتیں تو آچکی ہیں تو جب قیامت ان کے سامنے آکھڑی ہوئی اس وقت اُن کو سمجھنا کہاں میسر ہوگا تو آپؐ اس کا یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابلِ

اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝ ع

عبادت نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیئے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی اور تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی خبر رکھتا ہے

تفسیر جو لوگ مخلص الایمان نہیں ہوتے جن کے دل میں پورا ہوتا ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول کی رسالت اور نظریۂ قیامت کے قائل نہیں ہوتے وہ ظاہری اعمال کے اعتبار سے کیسے ہی مومن نظر آتے ہوں، لیکن ان کا دل نفاق سے خالی نہیں ہوتا اور کسی وقت شیطنت آمیز فریب اور دسیسہ کاری سے ان کا کوئی اقدام بھی پاک نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ دکھاوے کے لئے جب وہ مرشدِ اعظم کی مجلسِ وعظ میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بجائے نصیحت پذیر ہونے اور پیامِ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے دکھاوے کے طور پر کان دھر کر ہادیٔ برحق کی تقریر تو سنتے ہیں (مگر محض اس غرض سے کہ کہیں ان کی منافقت کا اظہار تو نہیں ہو گیا اور ہادیٔ دین نے ان کی خفیہ چالوں کو کچھ سن گن تو نہیں پائی) پھر جب مجلس سے اٹھ کر کسی وجہ سے باہر آتے ہیں تب (یہی دل میں اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہمارے خلاف کوئی بات ناصحِ امت کی زبان سے نہ نکلی ہو، اس لئے) دوسرے اہلِ مجلس جب باہر آتے ہیں تو ان سے دریافت کرتے ہیں کہ ہادیٔ اسلام نے ہمارے باہر آجانے کے بعد کیا کیا فرمایا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر ہی ان کا عقیدہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ رسول کی صداقت کو مانتے ہیں نہ قیامت کی حقانیت کے، بلکہ اپنی خواہشات کے پرستار ہوتے ہیں، اس لئے نفسانی ہوا و ہوس پر چلتے ہیں۔ البتہ جو خالص مومن ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں اللہ (پیغمبر کے وعظ اور نزولِ آیات سے) ان کی ہدایات میں مزید اضافہ کر دیتا ہے اور ہر طرح کی نافرمانی سے بچنے کی ان کو توفیق عطا فرماتا ہے (گویا خلوص کے ساتھ ابتدائی ایمان اور راہِ ہدایت پر گامزن ہونا مزید توفیقِ الٰہی حاصل ہونے کا سبب ہوتا ہے) جب ایسے بد باطن منافقوں کے دل سے نفاق دور کرنے کے لئے قرآن مجید کی آیات رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات اور ہر طرح کی راہنمائی کافی نہیں ہوئی اور ان کو روزِ آخرت کا یقین نہیں آیا تو کیا اس وقت یقین ہو گا جب ناگہاں قیامت آ پہنچے گی۔ اگر علامات و آثار سے کسی چیز کی حقانیت اور یقینی الوقوع کو مانا جا سکتا ہے تو پھر قیامت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، قیامت کی نشانیاں تو ظاہر ہو گئیں (نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ آخری ہدایت نامہ آ گیا جس کی تعلیم تمام گزشتہ آسمانی کتابوں کا نچوڑ ہے) جس وقت قیامت آ پہنچے گی اس وقت نصیحت پذیر ہونے اور ماننے سے کیا فائدہ۔ عقل کی روشنی میں عذاب و ثواب اور حساب کتاب کو ماننا قابلِ اعتبار ہے۔ مشاہدے کے بعد تو بے اختیار ماننا ہی پڑ گیا، آنکھوں دیکھی چیز کو ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ پس کوئی مانے یا نہ مانے امت کا خصوصیت کے ساتھ اور آپ کے متبعین کا عموماً اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی و صفاتی پر کامل ایمان ہونا ہی چاہیئے۔ (اور پھر ایمان ہی نہیں بلکہ اپنے گروہ کی مالی عملی اور فکری تنظیم بھی ضروری ہے) اور اگر کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو خواہ پیشوا سے یا امت کے کسی فرد سے (اس کے عفو کی دعا بھی لازم ہے (افرادِ امت سے تو فروگذاشت کیا گناہ اور بڑے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا اگرچہ گناہ نہیں مگر تقاضائے ایمان کے خلاف کسی گناہ کا سرزد ہونا عدمِ عصمت کی دلیل ضرور ہے۔ ہاں معصوم من اللہ سے گناہ کا صدور ناممکن ہے، مگر اجتہادی غلطی یا فروگذاشت تو ہو سکتی ہے اور وہ ذات جو اقرب المقربین اور معصوم من رب العالمین ہو اس کی فروگذاشت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ نیکوں کی بھلائیاں اہلِ قرب کے لئے گناہ ہوتی ہیں، اس لئے افرادِ امت کے گناہ ہوں یا پیشوائے برحق کی فروگذاشت سب کے لئے استغفار ضروری ہے)

تحلیلِ اجزاء وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ۔ ان کافروں یا منافقوں میں سے کچھ آپ کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں یعنی متوجہ ہو کر سنتے ہیں۔ کان لگا کر سننے کی غرض شاید یہ ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مخلص مسلمان ان کو سچا مسلمان سمجھیں یا شاید یہ مقصود ہو کہ کہیں ہمارے نفاق کی کچھ سن گن تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہیں مل گئی۔ مؤخر الذکر تفسیر کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے فرمایا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا۔ جب مجلسِ نبوی سے اٹھ کر باہر آتے ہیں تو جاننے والوں سے پوچھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا۔ اس کا مطلب حصولِ علم کی کوشش اور عمل کیلئے ہدایتِ نبوی سے واقفیت تو بہر حال نہیں ہے۔ شاید اپنے اخلاص کو دکھانا اور طلبِ علم کا مظاہرہ کرنا مقصود ہو یا یہ غرض ہو کر ان کی غیر حاضری میں کہیں کوئی ایسی بات نہ فرما دی ہو جس سے ان منافقوں کا بھانڈا پھوٹ جائے۔ اور ان کے باطنی نفاق کا پردہ چاک ہو جائے۔ یہی قول اولیٰ ہے۔ حضرت

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا بعض اہل علم سے وہ دریافت کرتے تھے ان میں سے میں بھی تھا۔ (باوجودیکہ) میں اس زمانے میں لڑکا تھا۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ۔ ان لوگوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے۔ یہ حق کے طلبگار ہی نہیں ہیں اپنی خواہشات کے پرستار ہیں۔ مجلس ہدایت میں شریک ہونے کے بعد بھی طریق حق پر گامزن ہونا ان کا مقصد نہیں۔ انسان چھپ کر گناہ کرتا ہے۔ گناہ کو گناہ کہتا ہے ایسی حالت میں لوٹ آنے کی توی امید ہوتی ہے۔ آگے بڑھ کر علانیہ گناہ کرتا ہے اور گناہ کی پرواہ نہیں کرتا، مگر گناہ کو پھر بھی گناہ جانتا ہے ایسی حالت میں بھی توبہ کی امید ہوتی ہے، مگر ضعیف۔ اس سے آگے بڑھتا ہے تو گناہ کو ثواب اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک شر کیا ہے اور شر کیا۔ اس کے پیش نظر محض اپنی مرغوبات اور خواہشات کا حصول ہوتا ہے۔ یہ اتباع ہوا کا درجہ ہوتا ہے اس مرتبہ پر پہنچ کر دل پر کفر کی مہر لگ جاتی ہے اور ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں رہتی۔ یہی وہ مقام ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھپہ لگ جانا کہا جاتا ہے۔

منافقوں کی بھی یہی حالت تھی، اُن کے دل حق سے نفرت کرتے تھے۔ دنیوی اغراض کے حصول کے لئے وہ بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے، مگر حق جوئی اور ہدایت یابی ان کی غرض نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھتے ضرور تھے اور کان لگا کر حضورؐ کے فرمان بھی سنتے تھے۔ مگر اتباع ہوا کے زیر اثر یہ سب کچھ کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اپنا اخلاص دکھانا، ان کو غافل بنائے رکھنا جاسوسی کرنا اور اپنے نفاق کے حالات پر پردہ ڈالے رکھنا ان کا مقصود ہوتا تھا۔ ٹوہ میں لگے رہتے تھے جب تک بیٹھے رہتے تھے کان کھڑے رکھتے تھے۔ اٹھ کر باہر آجاتے تھے تب بھی ہوشیار رہتے تھے کہیں ان کے نفاق کی پردہ دری نہ ہوگئی ہو، کہیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کی کوئی سن گن نہ معلوم ہوگئی ہو، اس لئے فیض یافتگان صحبت سے دریافت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا۔

حاصل یہ کہ صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں ان کا بیٹھنا، فرمان نبوی کو کان لگا کر سننا، پھر وہاں سے اٹھ کر آنا اور دوسرے اہل علم سے فرمانِ ہدایت کو دریافت کرنا یہ حرکات اتباع ہوا اور خواہشات پرستی کے زیر اثر ہوتی تھیں۔

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۔ منافقوں کے برعکس جو لوگ فرمانِ رسالت اور کلام ہدایت سن کر اسلام قبول کر لیتے اور ہدایت کا ابتدائی درجہ پالیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت یابی میں مزید ترقی عنایت فرماتا ہے۔ ان کے ایمان کو استحکام وثبات اور عمل میں استقامت عطا فرماتا ہے۔ وہ بتوفیق خداوندی ادائے فرائض کرتے اور ممنوعات سے اجتناب رکھتے ہیں اور رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ ان کو تقویٰ کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے، غیر اللہ کے خیال کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے۔ نفس اور نفسانیات کے اتباع سے ان کو محفوظ رکھتا ہے ہوا پرستی کا ان کے اندر شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔

فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰی لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ۔ ہر آن موت انسان کی نظر کے سامنے ہے علامات موت موجود ہیں۔ اگر یقینی علامات سے وقوع شے پر استدلال کرنا صحیح ہے، اگر نشانات و آثار دیکھ کر آنے والے واقعہ کو سمجھ لینا اہل دانش کا شیوہ ہے تو مستقبل قریب میں دنیوی زندگی اور اس کے تمام لوازم کا ختم ہو جانا بھی ناقابل شک ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کب رشتۂ حیات کٹ جائے۔ علامات و آثار دیکھنے کے بعد بھی اچانک موت کے آنے کا انتظار کرنا اور تغیرات حیات سے سبق اندوز نہ ہونا دلیل ابلہی یا ثبوت عناد ہے۔ موت آنے کے بعد ٹلتی نہیں اور موت کے وقت ایمان کا موقع نہیں۔ مشاہدہ کے بعد یقین بے سود ہے۔
بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ السَّاعَة سے مراد روز قیامت ہے۔ مشرک قیامت کے قائل ہی نہیں تھے اور اہل کتاب گو جنت دوزخ اور ثواب و عذاب کے قائل تھے، مگر انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کا انکار کیا، اس لئے کافر ہو گئے۔

بعض علمائے تفسیر نے آیات مذکورہ کی تشریح حسب ذیل کی ہے۔ شیخ ابن کثیر نے بھی اسی کی صراحت کی ہے کہ آیات میں منافقوں کی بیوقوفی اور ناسمجھی کو ظاہر فرمایا گیا ہے۔ بعض اہل نفاق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس میں شریک ہونے کے باوجود اور رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلام سننے کے بعد بھی کچھ نہیں سمجھتے۔ مجلس کے ختم ہو لے کے بعد دوسرے مخلص صحابہ سے پوچھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت کیا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔ یہ اپنی من مانی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں۔ نہ ان میں دینی سمجھ ہے نہ ہدایت کا فہم۔ ان کا ارادہ ہی حق کا طلب کا نہیں۔ یہ ہدایت کے خواستگار ہی نہیں۔ جو لوگ ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی انہیں ہدایت یابی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور ہدایت پر جم جانے کی ہمت بھی دے دیتا ہے اور ان کی ہدایت میں ترقی بھی عنایت کرتا ہے اور رشد و صداقت کا انوار بھی ان کے دلوں میں کر دیتا ہے۔ منافق اور کافر تو اس انتظار میں ہیں کہ اچانک قیامت آجائے اور اپنی آنکھوں سے وہ حقانیت کا مشاہدہ کرلیں۔ لیکن جب قیامت آجائے گی تو اس وقت نصیحت کیا سود مند ہوگی۔ نصیحت پذیری اور عمل کا موقع ہی کہاں ہوگا۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى۔ اس روز انسان نصیحت اندوز ہوگا، لیکن نصیحت پذیری کا اس وقت موقع ہی کہاں ہوگا۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ۔ اس وقت وہ کہیں گے ہم قرآن پر ایمان لائے۔ حالانکہ اب انہیں ایسے دور کے مکان پر دست رس کہاں ہوسکتی ہے۔ ہاں اگر ان کو قیامت کی علامات اور قرائن کی تلاش ہے تو قرب قیامت کے نشانات ظاہر ہوچکے ہیں دوسری آیت میں آیا ہے۔ هَذَا نَذِيرٌ مِنَ النُّذُرِ الْأُولَى۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ لوگوں کا حساب قریب آگیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا بھی قیامت کے قرب کی نشانی ہے۔ آپ خاتم المرسلین تھے، آخری پیغمبر تھے۔ آپ کے پیدا ہونے سے حجت الٰہیہ پوری ہوگئی۔ لوگوں کو اب عذر کرنے کا موقع باقی نہیں رہا۔ آپ کا پیدا ہونا بقول حسن بصریؒ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ آپ کا لقب نبی التوبہ، نبی المرحمۃ اور نبی الرحمۃ تھا۔ آپ ہی حاشر تھے یعنی لوگوں کا حشر آپ ہی کے قدموں پر ہوگا۔ (قیامت کے اور آپ کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہوگا) آپ کو ہی عاقب کہا گیا ہے یعنی آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ حسب روایت بخاری آپ اور روز قیامت دو متصل انگلیوں کی طرح تھے، کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی کہ ان دونوں کے درمیان جس طرح تیسری انگلی نہیں ہے، اسی طرح آپ کے اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہوگا۔ پھر آپ نے ہی قیامت کی اتنی نشانیاں بتائی ہیں کہ کسی دوسرے پیغمبر نے اتنی نشانیاں بیان نہیں کیں ــــ وحشی، جاہل اور نچلے طبقہ کا اوپر اٹھنا اور سردار بن جانا اور حکومتوں پر قابض ہو جانا، اونچے اونچے طبقاتی مکانوں کو بنانا اور مکانوں کی بلندی پر فخر کرنا، خادمہ کا مخدومہ اور مخدومہ کا خادمہ ہو جانا، مشرق کی طرف سے ایک ہولناک آگ کا ظاہر ہونا اور سب کو سمیٹ کر مغرب کی طرف دھکیلنا، یاجوج ماجوج کا روئے زمین پر چھا جانا، دجال کا نمودار ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا اور ملک شام میں منارۂ بیضاء پر اترنا وغیرہ وغیرہ بکثرت علامات قیامت کا بیان جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جن میں سے بہت سی ظاہر ہوچکیں اور ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ سے مَثْوَاكُمْ تک۔ شیخ ابن منیر نے لکھا ہے کہ فَاعْلَمْ گو امر کا صیغہ ہے، لیکن جاننے کا حکم دینا مقصود نہیں بلکہ یہ امر بمعنی خبر ہے یعنی توحید الوہیت و ربوبیت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ شاید شیخ کے اس قول کی وجہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ اللہ واحد ہے کوئی دوسری ہستی لائق عبادت نہیں۔ اب مزید حکم دینے کا کیا معنی۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ امر کا مقصود جس طرح انشاء فعل کی طلب ہوتی ہے اسی طرح کسی فعل پر استحکام اور ثبات بھی کبھی امر کی غرض ہوتی ہے۔ جیسے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ میں بیان کیا جاچکا ہے۔ پس اس جگہ بھی لفظِ توحید پر قائم اور مستحکم رہنے کا حکم دینا مقصود ہے۔ اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو استغفر سے طلب مغفرت کا حکم دیا گیا ہے۔ حضورؐ تو شروع نبوت سے ہی استغفار اور توبہ کرتے رہتے تھے۔ مزید استغفار کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس لفظ کا مقصد یہی ہے کہ استغفار کرتے رہو، استغفار پہ قائم رہو، استغفار کے سلسلے کو ترک نہ کرو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گناہ کا صدور اگرچہ ممکن نہ تھا، لیکن وحی سے پہلے کسی مسئلہ میں کبھی اجتہاد فکر سے بھی حضورؐ نے

فیصلہ کیا ہے۔ جیسے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دینا کبھی اپنی رائے کے خلاف ہونے کے باوجود دوسروں کے مشورہ پر آپ نے عمل کر لیا ہے جو واقع میں غلط تھا۔ جیسے غزوۂ احد کے موقع پر آپ کی رائے مدینہ شریف کے اندر رہ کر لڑنے کی تھی، مگر جوشیلے نوجوانوں کا مشورہ یہ تھا کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ آخر اسی مشورہ پر آپ نے عمل کیا اور نتیجۂ جنگ ناموافق نکلا۔ کبھی آپ سے لغزش بشری بھی ہوئی ہے گو دینی تقاضا اس کا باعث تھا۔ جیسے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے رخی اور سرداران قریش کی طرف یہ سوچ کر توجہ کہ اگر یہ مسلمان ہو گئے تو ان کے زیر اثر جتنے لوگ ہیں سب مسلمان ہو جائیں گے یا جیسے عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ پڑھنی اور یہ فرمانا کہ میں ستر بار سے زیادہ اس کے لئے استغفار کروں گا۔ غرض یہ امور اگرچہ گناہ نہیں قرار پاتے معمولی لغزش فکری و عملی ہیں۔ مگر مقرب ترین رسول اعظم کی شانِ قرب کے منافی ہیں، اس لئے ان کو ذَنْب فرمایا اور طلب مغفرت کا حکم دیا اور اسی کے ساتھ مومن مردوں اور عورتوں کے لئے بھی استغفار کرنے پر مامور فرمایا۔ کیونکہ تمام امتِ اسلامیہ کی نجات کی وابستگی آپ کے دامن سے ہے۔ قیامت کے دن جو مقامِ شفاعت آپ کو حاصل ہوگا اس سے قطع نظر مومنوں کیلئے مغفرت کی سفارش اہلِ ایمان کے دلوں کا سہارا اور روحوں کے لئے طمانیت ہے۔ حضرت عبداللہ بن سرجس رضی کا بیان ہے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور آپ کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں حضور کے لئے استغفار کروں؟ ارشاد فرمایا "ہاں اور اپنے لئے بھی"۔ (مسند احمد ۔ ترمذی ۔ نسائی)

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا — لوگو! اپنے رب کی طرف رجوع کرو یعنی گناہوں سے توبہ کرو، میں روز ستر بار سے بھی زیادہ اپنے رب کے سامنے توبہ استغفار کرتا ہوں۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس طرح دعا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَآ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ هَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطِیْئَتِیْ وَعَمْدِیْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ اے اللہ معاف فرما دے میری خطا کو، میری نادانی کو اور میرے حد سے آگے بڑھ جانے کو جو اپنے معاملے میں مجھ سے ہو گئی ہو اور ہر اس چیز کو جس کو تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اے اللہ بخش دے میرے بے قصد اور با قصد گناہوں کو اور مزاح اور سنجیدگی میں صادر ہونے والی غلطیوں کو اور یہ تمام (قصور) میرے پاس ہیں (ان سب کو بخش دے)

نماز کے آخر میں آپ ارشاد فرماتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَآ اَخَّرْتُ وَمَآ اَسْرَرْتُ وَمَآ اَعْلَنْتُ وَمَآ اَسْرَفْتُ وَمَآ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ اِلٰهِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ۔

اے اللہ میرے اگلے پچھلے پوشیدہ ظاہر گناہ اور میری زیادتیاں اور وہ تمام گناہ جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے معاف فرما دے تو ہی میرا معبود ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

مسند ابو یعلیٰ میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور اَسْتَغْفِرُ اللّٰه کا التزام رکھو اور اس کو بکثرت کہا کرو۔ کیونکہ ابلیس کہتا ہے میں نے گناہ (کرا کے) لوگوں کو گناہوں سے تباہ کیا اور انہوں نے دو کلمے کہہ کر مجھے غارت کر دیا۔ میں نے جب یہ دیکھا تو ان کو خواہشوں کے پیچھے لگا دیا۔ وہ خواہشات کے اتباع کرنے کے باوجود سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔

گناہ کا تعلق انسانی حرکت سے ہے یا سکون سے قرار سے یا فرار سے عمل سے یا ترک عمل سے مثبت سے یا منفی سے اور چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے ہر سکون و حرکت اور جولان و ثبات سے واقف ہے اور اس سے انسان کی کوئی حالت پوشیدہ نہیں، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ اپنی اختیاری و اتفاقیت گناہ یا اضطراری ناواقفیت دونوں کی معافی کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کرے۔

متقلب سے مراد ہے دن کو گھومنا پھرنا اور مثویٰ سے مراد ہے رات کو کسی جگہ قرار پکڑنا، ابن جریج اور شیخ ابن جریر کا یہی قول ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس کے نزدیک مثویٰ سے مراد ہے آخرت کا ٹھکانا۔ سدی کے نزدیک قبر کی جگہ مراد ہے۔ اول قول پر متقلب اور مثویٰ دونوں کا مصدری معنی مراد ہے اور آخری دونوں قولوں پر اول لفظ مصدر ہے اور دوسرا اسم ظرف۔

مقصودِ بیان

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبی کی صحبت اور مواعظ کا اثر حاضرین پر صرف اسی وقت پڑتا ہے جب وہ نصیحت پذیر ہوتا اور سمجھنا چاہیں ورنہ فیضانِ رحمت سے محروم رہتے ہیں۔

وَاتَّبَعُوْا اَهْوَآءَهُمْ اور وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا کے جملے بتا رہے ہیں کہ جو نفس و نفسانیات کا پرستار ہو اور ہدایت کا طالب نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نہیں کرتا اور جو ہدایت کا طلب گار ہوتا ہے اس کو ہدایت یاب ہونے کی توفیق عنایت کرتا ہے اور مراتب پر فائز کرتا چلا جاتا ہے۔

جَآءَ اَشْرَاطُهَا میں صراحت ہے علاماتِ قیامت کے ظہور پذیر ہونے کی۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی لغزش کا صدور ہونا تھا جس کی معافی طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہ نازل ہوئی، سو جس وقت کوئی صاف صاف (مضمون کی) سورت نازل ہوتی ہے اور اس

رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْ

(اتفاق سے) جہاد کا بھی ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری (نفاق) ہے آپ اُن لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی

لٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝

بیہوشی طاری ہو۔ سو (اصل یہ ہے کہ) عنقریب ان کی کمبختی آنے والی ہے انکی اطاعت اور بات چیت معلوم ہے پس جب سارا کام تیار ہی ہو جاتا ہے تو اگر یہ لوگ

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

اللہ سے سچے رہتے تو ان کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا، سو اگر تم کنارہ کش رہو تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے کہ تم دنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع قرابت کر دو یہ وہ لوگ ہیں

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ

جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں

اَقْفَالُهَا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ

جو لوگ پشت پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا رستہ ان کو صاف معلوم ہو گیا شیطان نے ان کو چکمہ دیا ہے اور ان کو دور دور

سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ

کی سوجھائی ہے یہ اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اتارے ہوئے احکام کو ناپسند کرتے ہیں یہ کہا کہ بعضی

بَعْضِ الْاَمْرِ ښ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ

الامور میں ہم تمہارا کہنا مان لیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے خفیہ باتیں کرنے کو خوب جانتا ہے سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ فرشتے انکی جان قبض کرتے ہوں گے اور ان کے منہوں پر اور پشتوں

وَ اَدْبَارِهِمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝

پر مارتے جاتے ہوں گے یہ اس سبب سے کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اسی پر چلے اور اس کی رضا سے نفرت کیا کئے اسلئے اللہ نے انکے سب اعمال کالعدم کر دیئے

تفسیر

اس روئے زمین پر انسان دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہمیشہ سے دو گروہ قائم ہیں۔ اوّل خدا پرست دوسرا ہوا پرست۔ ہوا پرستی کا مظاہرہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے ــــ (۱) اہل حق اور خدا پرستوں کا بلکہ خدا پرستی کا علی الاعلان مقابلہ کرنے والے بالکل علانیہ توحید حقیقی کا اعلان کرتے ہیں اور افکار حق کو غلط قرار دیتے ہیں۔

(۲) کچھ لوگ خدا پرستی کے دعوے دار ہوتے ہیں، بعض پیغمبروں اور ان پر اتری ہوئی کتابوں کو بھی برائے نام مان لیتے ہیں، مگر ان کا دین دنیا کمانے کا آلہ ہوتا ہے وہ دنیا کو حصول دین کا ذریعہ نہیں بناتے۔ بلکہ دین سے دنیا حاصل کرتے ہیں۔ اپنی مذہبی کتاب کو بھی اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ان کے پیشوا بھی ہوا و ہوس کے بندے ہو کر سرداران قوم کے لئے دینی مسائل میں خود دیر و کر دیتے ہیں۔ جیسے یہودی تھے .... یہ گروہ بھی خالص خدا پرستوں کا دشمن ہوتا ہے اور سچی توحید کے علمبرداروں کو ایک آنکھ نہیں بھاتے بلکہ منکرین خدا سے ساز باز کر سکتا ہے۔ مگر توحید اور خالص خدا پرستی کے علمبرداروں کا دوست نہیں بن سکتا۔

(۳) تیسرا گروہ ان باطل پرستوں کا ہوتا ہے جو حقیقت میں تو غیر اللہ کے پرستار اپنی خواہشات کی پوجا کرنے والے اور اہل حق کے بدترین دشمن ہوتے ہیں، مگر دنیوی مصالح کے پیش نظر حق پرستوں کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں، کلمہ حق بظاہر زبان پر جاری کر لیتے ہیں بظاہری اعمال بھی اہل حق کے ساتھ مل کر انہی جیسے کرنے لگتے ہیں، مگر دلوں میں صداقت شعار گروہ کے بدترین دشمن ہوتے ہیں اور اہل حق کے مقابل اول اور دوسرے گروہ سے پوشیدہ طور پر ساز باز بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ مگر اہل حق کو کوئی حکم ملتا ہے کہ باطل پرستوں کے خلاف جہاد کرو اور ان کی جڑیں اکھاڑنے کی کوشش کرو تو اہل حق چونکہ پرستار حق ہوتے ہیں ان کی تو من مانی مراد مل جاتی ہے، لیکن باطل پرستوں کے آخری فرقہ پر اس حکم کو سنتے ہی موت چھا جاتی ہے۔ عافیت اور نفع اندوزی کے دور میں تو وہ اہل حق کے بظاہر ساتھی ہوتے ہیں، لیکن مالی اور جانی قربانی کا موقع آنے پر ان کے حواس بجا نہیں رہتے۔ پھر کوشش اور جہاد اصول اور ضابطہ کے تحت ہونا ضروری ہے۔ جس طرح امن و عافیت کا دور ضابطہ کا پابند ہے، باہم جدال و قتال لوٹ مار چوری غبن اور دوسرے معاشرہ کو برباد کر دینے والے اعمال قانون امن میں ناجائز ہیں۔ اسی طرح ضابطہ جہاد بھی فساد فی الارض کی اجازت نہیں دیتا، مگر منافقوں کے پیش نظر تو محض حصول دنیا ہوتا ہے، اس لئے اصول جہاد کے حکم سے ان کی جان نکل جاتی ہے۔ ان کے کان ناشنوا اور آنکھیں نابینا ہوتی ہیں۔ نہ قرآن پر غور کرتے ہیں نہ حق کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر کراہت خاطر کے ساتھ جہاد کو جاتے بھی ہیں تو کسی بہانے سے اُلٹے قدموں پلٹ آتے ہیں۔ شیطان ان کو فریب دیتا ہے۔ یہ اچھے کو برا اور برے کو اچھا غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھنے لگتے ہیں اور سب گٹھ جوڑ کر کے آپس میں کہنے لگتے ہیں کہ گو طریق زندگی ہمارا آپس میں جدا جدا ہے۔ کوئی بت پرست منکر توحید ہے۔ کوئی برائے نام موحد اور مقر خدا لیکن ایک بات پر ہم سب متفق ہیں۔ یہ گروہ جو اپنے کو خالص توحید کا علمبردار کہتا ہے اور اس نے تمام عبادتوں کے ڈھنگ بدل دیئے ہیں اور زندگی گزارنے کے راستے پلٹ دیئے ہیں۔ ہم سب کے لئے یکساں ضرر رساں ہے، اس لئے اس کا مقابلہ سب کو مل کر کرنا چاہیئے۔ ہم اندرونی طور پر ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو ان سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی اندرونی سازشیں اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ واقف ہے کہ ان کی ظاہری خوش کرداری اور مسلمانوں سے موافقت نفاق آگیں ہے، ان نیک نما اعمال کی عمارت خالص توحید پر قائم نہیں ہے۔ حقیقت میں ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب ہی نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو قیامت کے دن بے ثمر بنا دے گا۔ سب ظاہری نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔

تحلیلِ اجزاء وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں مومنوں کی تین قسمیں ہیں ۔

(۱) وہ لوگ جو راسخ الایمان اور حامئ دین تھے انہوں نے اپنی ساری زندگیاں اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھیں ، اسلام کی راہ کے کانٹے ان کے لئے پھول تھے اور اقامتِ دین میں پیش آنے والی شدائد ان کے ایمانوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر دیتی تھیں ، ان کی دلی تمنا ہوتی تھی کہ کوئی جدید سورت نازل ہو اور وہ اس کے احکام پر عمل کر کے اپنے ایمانوں کو تازہ کریں ۔

(۲) وہ مومن تھے جن کے ایمان اگرچہ خالص تھے ان میں نفاق کی آمیزش نہ تھی پھر بھی فریقِ اول کی طرح ان کا ایمان محکم البنیان اور راسخ الاصل نہ تھے ضعیف تھے ۔ ایسے ہی لوگوں کی حالت کی تصویر کشی ایک اور آیت میں اس طرح کی ہے ۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ الخ (ترجمہ) کیا تم نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جب ان سے کہا گیا اپنے ہاتھوں کو روکو ، ٹھیک ٹھیک نمازیں پڑھو ، زکوٰۃ ادا کرتے رہو ، (تو ان بے ضرر احکام کی کچھ تعمیل کرتے رہے) پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے کچھ لوگ ، لوگوں سے ایسا ڈرنے لگے جیسا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے تھا ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے بھی زیادہ ان کو انسانوں کا ڈر لگنے لگا ۔ کہنے لگے اے ہمارے رب تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا ۔ تو نے ہم کو مستقبل قریب تک مہلت کیوں نہیں دی ۔ الخ

(۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو بظاہر ایمان کے مدعی تھے ، بیرونی اعمال کے لحاظ سے مومن نظر آتے تھے اور شمار بھی ان کا مومنوں کے گروہ میں ہی ہوتا تھا ، لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں تھا ، ان کو اسلامی افکار کا یقین نہ تھا ، انکار یا تذبذب تھا ، دلوں کے اندر چور چھپا ہوا تھا ، مرضِ نفاق تھا یہ بھی (محض دکھاوٹ اور دھوکہ دینے کے لئے) مومنوں کی طرح نو بنو احکام نازل ہونے کی تمنا کا اظہار کرتے تھے مگر جب کوئی سورت جہاد کا حکم لے کر نازل ہوتی اور کھول کر واضح طور پر ناقابلِ منسوخی جہاد کا حکم آجاتا تو آیات کو سن کر بوکھلا جاتے ، اور گھبراہٹ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف دیکھتے ۔ معلوم ہوتا کہ ان پر موت کا ہول سوار ہے ۔ موت کی ایسی غشی ان پر چھا جاتی ۔

فَأَوْلَىٰ لَهُمْ سے أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا تک مناسب تو یہ تھا کہ وہ حکم جہاد کو بدل وجاں قبول کرتے ۔ سنتے ، مانتے عملی اطاعت کرتے ، بری بات زبان سے نہ نکالتے ، معرکہ کارزار گرم ہونے کے بعد نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اس میں شریک ہوتے ، یہی ان کے حق میں بہتر تھا ، لیکن یہ بدباطن منافق جہاد سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے کرتے تھے ۔ شاید ان کے گریز کا ایک حیلہ یہ بھی ہو کہ ہم عرب سے کیوں کر لڑیں ! یہ سب ہمارے بھائی برادر ہیں ۔ ہم سب ایک نسل اور ایک ملک کے ہیں ، ہماری ان سے قرابت ہے ، رشتہ داریاں ہیں ، ان سے لڑنا تباہی اور فساد ہے ۔ اس فرضی حیلہ کے ازالہ کے لئے فرمایا (کہ جہاد فساد و تباہی کو دعوت نہیں دیتا بلکہ) جہاد سے اگر تم گریز کرو گے تو بعید نہیں کہ (تمہاری تنظیم ختم ہو جائے اور) تم ملک میں تباہ کاریاں اور فساد پھیلانے لگو اور باہمی قرابت و رشتہ داری کو کاٹ دو نہ خونی رشتہ کا لحاظ رکھو نہ عزیز داری اور خاندان کے تعلقات کا ، جیسا کہ دورِ جاہلیت میں عرب کا شیوہ تھا کہ بغیر کسی خاص اور اہم مقصد کے آپس میں لڑتے اور بے دریغ محض ضد اور عناد کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ، جہاد تو ایک بلند مقصد رکھتا ہے ، اصول کا حامل ہے ، نظامِ عدل قائم کرنا چاہتا ہے ، غیر جنگی لوگوں کو ستانے ، سرسبز کھیتوں اور باغوں کو جلانے اور اجاڑنے سے منع کرتا ہے ، ملک میں امن پھیلاتا ہے ۔ ایسی مفید مقصد رکھنے والی دفاعی جنگ سے گریز سراسر لعنت ہے ۔ اگر منافق اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ احکام کے مصالح کو نہیں سمجھتے تو اللہ تعالیٰ کی پھٹکار میں مبتلا ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اندھا بہرا کر دیا ہے نہ ان کو پیامِ صداقت سنائی دیتا ہے ، نہ صورتِ حق دکھائی دیتی ہے ، صحیح احساس کے بیرونی ذرائع ہی ان کے ماؤف ہو چکے ہیں ۔ ان کے دلوں پر جہالت اور ضلالت کے قفل لگا دیئے گئے ہیں ، مضمونِ حق ان کے دلوں کے اندر پہنچتا ہی نہیں ۔ فہمِ قرآنی سے ان کے دماغ مایوسی کی حد تک محروم ہو چکے ہیں ۔

زمین پر فساد مچانے تباہی پھیلانے اور رشتہ داری منقطع کرنے کی ممانعت بہت شدت کے ساتھ احادیث میں آئی ہے ۔ زمین پر فساد کرنے سے مراد ہے ، بے مقصد یا غیر اہم مقصد کے لئے یا نظامِ ظلم کو قائم رکھنے یا باقی رکھنے کے لئے قتال کرنا ، دوسرے کے مال پر ناحق قبضہ کرنا دنیا کو مصائب و آلام میں مبتلا کرنا ، لیکن اگر مقصد بلند ہو ، امن و صلاح کو پھیلانا مقصود ہو ، ظلم کو مٹانا اور عدل کو قائم کرنا مطلوب ہو تو یہ فساد نہیں صلاح ہے ، بربادی نہیں آبادی کی کوشش ہے ، اسی کو جہاد کہتے ہیں ۔ جہاد میں فساد کا شائبہ نہیں ہوتا بلکہ نفسانیت اور شخصی جذبات کو بھی اس میں دخل نہیں ہوتا ۔

صلۂ رحمی کا معنی ہے کلام ، سلام ، معاشرت اور آپس کے تعلقات میں رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا ، جہاں تک ممکن ہو قرابت داروں کی مالی و جسمانی مدد کرنا بشرطیکہ اس امداد سے نظامِ عدل کی شکست نہ ہوتی ہو اور اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے قانون تعامل میں شگاف نہ پڑتا ہو ۔ اور کسی انسان کی حق تلفی نہ ہوتی ہو نہ حق اللہ کی ادائیگی میں کوئی ضعف آتا ہو ۔

حدیث بخاری میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحم سے فرمایا تجھے جوڑنے والے کو میں اپنے سے ملاؤں گا اور تجھے توڑنے والے کو اپنے سے کاٹ دوں گا ۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ، سرکشی ، بغاوت اور قطع رشتہ داری سے بڑا اور برا کوئی اور گناہ ایسا نہیں کہ جس کی سزا دنیا میں بہت جلد اور آخرت میں بہت بڑی ملنے والی ہو ۔

مسند احمد میں ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص چاہے کہ اس کی عمر بڑی اور روزی کشادہ ہو تو وہ صلۂ رحمی کرے ۔

ایک شخص نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ! میرے قریبی رشتہ دار مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں (اور میں ان کو ملائے رکھنے کی کوشش رکھتا ہوں) وہ میری حق تلفی کرتے ہیں میں انہیں معاف کرتا ہوں ۔ وہ میرے ساتھ برائیاں کرتے ہیں ۔ میں ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہوں تو کیا مجھے ان سے بدلا لینے کی اجازت ہے ۔ فرمایا نہیں ۔ اگر ایسا کرو گے تو سب کے سب بے مدد چھوڑ دیئے جاؤ گے ۔ تم صلۂ رحمی سے پیش آتے رہو اور یاد رکھو کہ جب تک تم اس پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر وقت تمہاری مدد ہوتی رہے گی ۔

بخاری وغیرہ راوی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حقیقۃً صلۂ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو بھلائی کے بدلے میں بھلائی کرے بلکہ صحیح معنی میں قرابت داری کی حفاظت کرنے والا وہ ہے کہ تو اس سے تعلق توڑے اور وہ تجھ سے تعلق جوڑے ۔

مسند احمد میں ہے رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے ۔ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا ۔ رحم (کا علاقہ) رحمٰن کی طرف سے (قائم کردہ) ہے ۔ اس کو جوڑنے والے کو اللہ تعالیٰ ملائے رکھتا ہے اور اس کو توڑنے والے کو اللہ تعالیٰ (اپنے سے) الگ کرتا ہے ۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا روحیں مخلوط ہیں روزِ ازل میں جن میں میل ملاپ تھا ۔ یہاں بھی وہ آپس میں میل محبت رکھتی ہیں اور جن میں وہاں دوری تھی یہاں بھی ان میں نفرت ہوتی ہے ۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب زبانی دعوے بڑھ جائیں عملی (ثبوت) کم ہو زبانی میل جول ہو دلوں میں بغض و عداوت ہو رشتہ داروں سے بدسلوکی کرے اس وقت ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت نازل ہوتی ہے اور ان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی کر دی جاتی ہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚۖ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت نامہ آگیا جس میں حق کو باطل سے الگ کر کے دکھایا گیا ۔ سچ اور جھوٹ میں کوئی اشتباہ نہ رہا ۔ تشریح اور توضیح کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی مبعوث

فرمایا اور آپ کی ذات کو معیارِ ہدایت بنا دیا ۔ جن لوگوں نے مفادِ ہدایت نامے کو مان لیا اور پیغمبری نبوت کی تصدیق کر دی انہوں نے نجات پائی اور جن لوگوں نے وضوحِ حق کے بعد بھی انکار کیا وہ شقی قرار پائے ۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو زبانوں سے تو قرآن پر ایمان لا چکے تھے اور ظاہری حالت اہلِ ایمان کی طرح انہوں نے بنالی تھی ، مگر باطن میں وہ مومن نہیں تھے ۔ در پردہ وہ منکرین حق سے ساز باز رکھتے تھے اور پوشیدہ طور پر انہوں نے کافروں سے بعض ایسے امور میں جو مسلمانوں کو ضرر پہنچانے والے تھے اشتراک کا وعدہ کر لیا تھا ۔ شیطان نے ان کو بہکا رکھا تھا ۔ ان کو یقین دلا رکھا تھا کہ منکرینِ اسلام سے درپردہ سازش کر لو اور مسلمانوں کے لئے مار آستین بنے رہو ۔ اس طرح مسلمان بیرونی دفاع اور اندرونی تنظیم پر قادر نہ ہو سکیں گے ۔ مگر اللہ تعالیٰ سے ان کی یہ خفیہ سازشیں چھپ نہیں سکتیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کے باطن اور باطنی احوال سے واقف تھا ، اس لئے ان کی کوئی دسیسہ کاری نتیجہ خیز اور سود مند نہ ہو سکی ۔

قرآن کا نزول کن لوگوں کو ناگوار تھا اور وہ کون دشمن قرآن تھے جن سے منافقوں نے اشتراک کا وعدہ کر رکھا تھا اور وہ سازش کیا تھی جس پر دونوں فریق متحد تھے ۔ بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک قرآن کے دشمن عرب کے مشرک اور کفار تھے ۔ مدینہ کے منافقوں نے ان سے خفیہ ساز باز کر لیا تھا اور کہلا بھیجا تھا کہ صرف ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے ہیں حقیقت میں ہم تمہارے ہم مذہب ہیں ۔ اگر تم مسلمانوں پر حملہ کرو گے اور غالب آجاؤ گے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں ، مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سازش ابن ابی یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے کی ہو ۔ لیکن تفسیر قرآن بالقرآن بہرحال قابلِ ترجیح ہے ۔ اس جگہ جو چیز مجمل طور پر بیان کی ہے اس کی تشریح اور تفصیل دوسری آیت میں خود فرما دی ہے ۔ فرمایا ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۔ (منافق لوگ اپنے اہلِ کتاب برادرانِ کفر سے کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہی نکل چلیں گے اور تمہارے معاملے میں کبھی کسی کا کہنا نہیں مانیں گے اور اگر تم سے مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے)

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والے منافق تھے اور منافقوں نے جن دشمنوں سے سازش کی تھی وہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے یہودی تھے اور خفیہ امر جس پر متفق ہوتے کا انہوں نے وعدہ کیا تھا وہ یہودیوں کی حمایت کا اقرار تھا اور ساتھ میں یہ بھی وعدہ تھا کہ اگر تم کو نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل چلیں گے اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیں گے ۔ اس اشتراک و اتحاد کا باعث وہی تھا جس کی طرف ہم نے ان آیات کی ابتدائی اجمالی تفسیر میں اشارہ کر دیا ہے کہ یہودی اگرچہ اہلِ کتاب تھے اور منافق زیادہ وہی لوگ تھے جو مشرک تھے جن کو اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ بھی نہیں تھا ۔ لیکن ایک نقطہ پر دونوں متفق تھے کہ اسلام کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے پنپنے کا موقع نہ دیا جائے ۔ وجہ صرف یہ تھی کہ دونوں گروہ ہوا پرست اور بندگانِ نفس تھے ۔ نام کے لئے تو یہودی توریت کو مانتے تھے اور مشرک بتوں کی پوجا کرتے تھے ، مگر حقیقت میں یہ دونوں گروہ خواہشاتِ نفس کے پرستار تھے ۔ خدا پرستی اور خود پرستی میں تضاد ہے ، اس لئے یہودی اور مشرک منافق باہمی اختلافات کے باوجود اہلِ توحید کو مغلوب کرنے میں ہر طور کوشاں تھے ۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۔ اسلام اور قرآن کے خلاف اہلِ کتاب کے ساتھ منافقوں کی خفیہ سازش کا انتہائے دنیا اور ابتدائے آخرت کے وقت جو نتیجہ ہوگا اور منزلِ آخرت میں قدم رکھنے کے وقت منافقوں کا جو حال ہوگا اس آیت میں اس کا اجمالی اظہار کیا ہے اور فرمایا ہے ان کا کیا حال ہوگا یعنی بہت برا حال ہوگا ۔ اس وقت جب فرشتے ان کی جانیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پشت پر (نا معلوم اصلحہ سے) ضربیں لگائیں گے ۔ منہ پشت پر ضرب یہ سب چیزیں عالمِ برزخ کی ہیں ۔ آخرت کا تفصیلی عذاب کیا ہوگا اور برزخ میں ان کو کیا کیا سزائیں دی جائیں گی اس کی تشریح اس جگہ نہیں بلکہ عذاب کی عظمت اور ہولناکی کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۔ اہلِ کتاب اور منافقوں کے متفق العمل اور مسلمانوں کے

خلاف متحد ہونے کا سبب بھی اس آیت میں بیان کیا ہے اور عذاب میں مبتلا ہونے کی وجہ بھی۔ حاصل آیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کی پرواہ نہیں کی وہ امور اختیار کئے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے موجب تھے اور ان باتوں کو ترک کیا جن سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی، اس لئے (مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو کر اور مدعی ایمان بن کر ظاہری طور پر) جو اعمال انہوں نے کئے وہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اکارت کر دیا۔

مقصد آیات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے اسباب کو بُرا جاننا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اسباب کو اچھا سمجھ کر اختیار کرنا چونکہ موجب کفر ہے اور کفر سے تمام نیک اعمال کی صلاحیت زائل ہوتی ہے۔ لذیذ ترین طاقت بخش غذا و دوا بھی زہر کی ادنیٰ آمیزش سے اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔ کفر بھی اخلاقی و روحانی زہر ہے جو اخلاقی اور روحانی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ انکار خدا کے بعد خیر و شر میں امتیاز کرنے کا ذریعہ صرف عقل کا رہ جاتا ہے اور کوئی عقل کامل نہیں ہے اس کے علاوہ عقلی خیر و شر کا فیصلہ انسانی جذبات باطلہ کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے کفر کی موجودگی میں کوئی نیکی خالص نیکی ہی نہیں رہتی۔ ہر نیکی میں خوشنودی خدا تعالیٰ کے حصول کی جگہ نفسانی اغراض شامل ہو جاتی ہیں۔ خواہ ان اغراض کا تعلق قرابت و دوستی سے ہو یا وطنیت اور جنسیت سے یا قومیت یا مذہبی جنبہ داری سے۔ بہر حال ایسی نیکیوں کا محرک نفسانی رغبت و نفرت کا ہوتا ہے اور مآل کار کے اعتبار سے دنیا میں ان کی افادیت باقی نہیں رہتی بلکہ یہ صلاح نما نیکی انسانیت عامہ کے بگاڑ کی طرف لے جاتی ہے اور جب دنیا میں ہی یہ نیکی مبنی بر صلاح نہیں رہتی تو آخرت میں اس کے اجر کا استحقاق بھی نہیں رہتا۔ اکارت جانے کا یہی معنی ہے۔

تنبیہ یہاں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حکم خدا کے خلاف اگر کوئی عمل کر لیا جائے تو وہ نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے اور شراب پینے یا جُوا کھیلنے سے روزہ نماز کا ثواب بھی مفقود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آیت میں کرھوا رضوانہ کا لفظ آیا ہے یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے (کے اسباب) کو برا سمجھا اور ناراضگی پیدا کرنے والے اسباب کو (اچھا سمجھ کر) اختیار کیا اور ظاہر ہے کہ اللہ کی نافرمانی کو پسند کرنا اور رضامندی کو برا سمجھنا کفر ہے اور کفر حبط اعمال کا موجب ہے۔ ہر گناہ کبیرہ سے حبط اعمال نہیں ہو جاتا۔

مقصودِ بیان جہاد اسلامی خالص ایمان اور نفاق آمیز ایمان کی کسوٹی ہے۔ کمزور ایمان والے حکم جہاد سن کر حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ جانی مالی قربانی کا حکم گویا ان کے لئے پیام موت ہوتا ہے۔ حالانکہ جہاد پیام زندگی ہے۔ اس سے انسانیت عامہ تمام فسادات اور تباہیوں سے محفوظ ہو جاتی ہے جو لوگ جہاد کی افادیت کو نہیں دیکھتے اور مصلحت جہاد کو نہیں سمجھتے اور حکم جہاد کو گوش صداقت نیوش سے نہیں سنتے وہ حقیقت میں انسانیت عامہ کی صلاح و فلاح کے پیام کی طرف سے غافل ہیں، بہرے ہیں نابینا ہیں، کور دانش ہیں، اللہ تعالیٰ کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ ملک میں فساد بپا کرنے اور انسانوں کے ابتدائی خاندانی معاشرہ کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ تنظیم قبائل کے ابتدائی اصول کی بھی شکست کے حامی ہیں۔ جب تنظیم قبائل کے عادلانہ ضوابط کی بندش ٹوٹ جائے گی اور صلۂ رحم مفقود ہو جائے گا تو انسانیت عامہ کی مساویانہ عادلانہ تنظیم کیسے ہو سکے گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا الخ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب انسان خود حق سے روگردانی کرتا ہے تو شیطان بھی اس کو اغوا کرنے لگتا ہے پھر وہ شخص شیطانی وسوسہ آفرینی سے حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔ وغیرہ۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ ۝ وَلَوۡ نَشَآءُ

جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا		اور اگر ہم چاہتے تو آپ کو

لَأَرَيْنَٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَٰهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِى لَحْنِ ٱلْقَوْلِ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ

اُن کا پورا پتہ بتلا دیتے سو آپ ان کو حلیے سے پہچان لیتے اور آپ اُن کو طرزِ کلام سے ضرور پہچان لیں گے اور اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال

أَعْمَٰلَكُمْ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ ٱلْمُجَٰهِدِينَ مِنكُمْ وَٱلصَّٰبِرِينَ وَنَبْلُوَا۟ أَخْبَارَكُمْ ۝

کو جانتا ہے اور ہم ضرور تم سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم اُن لوگوں کو معلوم کرلیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کریں

تفسیر نفاق یعنی ظاہر و باطن کی ناموافقت دو طرح کی ہوتی ہے (۱) باطن صحیح ہو، عقیدہ درست ہو، ایمان مضبوط ہو، مگر اعمال تقاضائے ایمان کے خلاف ہوں۔ مومن ہونے کے باوجود آدمی عملی فسق میں مبتلا ہو ایسے شخص کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ مومنانہ ہے، مگر بعض اعمال کافروں ایسے ہیں۔ اگر اس کے اعمال اس حد تک بگڑے نہ ہوں کہ کفر کی حد و دمیں اس کو داخل کر دیں تو اس کو گناہگار مومن کہا جائے گا۔ اکثر اعمال کا تعلق چونکہ ظاہر حال سے ہے، اس لئے عملی نفاق کو پہچاننا بھی آسان ہے۔

(۲) ظاہری اعمال مسلمانوں کی طرح ہوں۔ مگر عقیدہ کا فرانہ ہو، دل میں ایمان نہ ہو انکارِ حق ہو یا تردد و تذبذب۔ بہرحال شرعی اصطلاح میں ایسے شخص کو منافق کہا جاتا ہے، جو دل میں اہلِ حق سے کینہ رکھتا ہے اور ہر موقع پر ایمانداروں کو نقصان پہنچانے کی خفیہ تدبیریں کرتا ہے۔ اور چونکہ اپنی بدباطنی کو چھپائے رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر اس کا عقیدہ نہیں ہوتا، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ میری یہ قلبی حالت کسی کو نہیں معلوم، مگر اللہ تو عالم الغیب ہے وہ دلوں کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔ دلوں کے اندر کی باتیں وہ ظاہر بھی کرسکتا ہے اور ایک ایک منافق کا پردہ فاش بھی کرسکتا ہے اور ایسا علم بھی دے سکتا ہے کہ صورت دیکھتے ہی منافق کی شناخت ہوجائے، مگر بتقاضائے مصلحت اس نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو بندوں کی عملی آزمائش مقصود ہے۔ وہ سب کچھ پہلے سے جانتے ہوئے بھی عملی امتیاز قائم کرنا چاہتا ہے۔ اپنے ازلی علم کو سزا اور جزا کا معیار اس نے نہیں بنایا بلکہ عملی ظہور کو کسوٹی قرار دیا۔ اعمال و افعال کے بعد ہی ظاہر ہوگا کہ کون اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کے لئے کوشش کرنے والا اور مصائب و شدائد پر ثابت قدم رہنے والا ہے اور کون پیش آمدہ شدائد سے ڈر کر مسلمانوں کے راستہ سے کترا کر جانے والا اہلِ حق کا ساتھ چھوڑ دینے والا ہے۔

تحلیلِ اجزاء أَمْ حَسِبَ ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَن لَّن يُخْرِجَ ٱللَّهُ أَضْغَٰنَهُمْ۔ منافق اپنے اندرونی احوال کو مسلمانوں سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ کہیں مسلمانوں کو ان کی حالت معلوم ہوجائے تو مسلمانوں کو ملنے والے منافع میں وہ شریک ہونے سے محروم ہوجائیں۔ اور ان کی تدبیریں ناکام ہوجائیں اور پھر ان کو مسلمانوں کے راز نہ معلوم ہوسکیں اور اپنے کافر بھائی بندوں کی کوئی خدمت وہ انجام نہ دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا جن لوگوں کے دلوں میں روگ یعنی نفاق ہے وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کی دلی ہوئی اندرونی قلبی عداوتوں کو اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں کرے گا۔ یعنی کیا اللہ تعالیٰ کو ان کی باطنی خباثت کا علم نہیں کہ مسلمانوں پر اس کا اظہار کرسکے۔ منافقوں کے تفصیلی احوال سورۂ برأت میں بیان کئے گئے ہیں، اسی لئے سورۂ برأت کا نام فاضحہ بھی رکھا گیا ہے۔ اس کے آگے فرماتا ہے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَأَرَيْنَٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَٰهُمْ۔ اے نبی! اگر ہم چاہتے تو تم کو تعین کے ساتھ منافقوں کی شخصیتیں دکھا دیتے کہ تم خاص نشانیوں سے ان کو پہچان جاتے (لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا اور ہر منافق سے جدا جدا آگاہ نہیں کیا تاکہ ہر ایک کی نگاہ میں وہ نہ آسکیں اور پردہ پڑا رہے اور ہر شخص کے سامنے ہر منافق کی رسوائی نہ ہو)

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِى لَحْنِ ٱلْقَوْلِ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَٰلَكُمْ۔ ہاں تم ان کو ان کی بات چیت کے ڈھنگ اور طرزِ کلام سے صاف پہچان لو گے۔

اور اللہ تعالیٰ تم سب کے (اندرونی و بیرونی) اعمال کو جانتا ہے۔ (یہ اس کی مصلحت اور عنایت ہے کہ مخلوق کی پردہ دری نہیں کرتا اور منافقوں کے دلی نفاق کو عام لوگوں پر ظاہر نہیں کرتا۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو آئندہ مختلف اوقات میں منافقوں کی ہستیاں نام بنام تعین کے ساتھ بتا دی تھیں، گو عام مسلمان بہتوں سے ناواقف تھے، مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے اس کا علم ہو چکا تھا۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک روز خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا تم میں بعض لوگ منافق ہیں۔ میں جس کا نام لوں وہ اٹھ کھڑا ہو (یعنی یہاں سے چلا جائے) پھر آپ نے نام بنام کہنا شروع کیا، اے فلاں! اٹھ جا، اے فلاں کھڑا ہو جا۔ اس طرح حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چھتیس [۳۶] اشخاص کے نام لئے پھر (مسلمانوں سے) فرمایا تم میں کچھ منافق ہیں۔ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ (اور احتیاط کرو)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو پردہ کشائی نہیں کی اور ظاہری حالت پر حکم اسلامی کا مدار رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری جانچ کرنی چاہتا ہے اور تمہارے حالات کا عملی امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں اور کون راہِ حق میں پیش آنے والی سختیاں پامردی اور ہمت کے ساتھ برداشت کرنے والے ہیں۔ (اور کون جہاد سے گریز کرنے والے اور شدائد کو دیکھ کر پست حوصلہ ہونے والے اور قربانی سے اعراض کرنے والے ہیں۔) امتحان اور جانچ کی اللہ کو ضرورت نہیں وہ علّامُ الغیوب ہے اور ہر چیز کے ظہور وجودی سے پہلے اس کے تمام احوال سے واقف ہے، مگر جزا سزا اور عذاب ثواب کا مدار وہ علم خداوندی ہے جو اعمال کے وقوع و ظہور کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی صفت کمالیہ نہیں۔ کیونکہ اس کا مدار عملی ظہور پر ہے۔ ہم اس علم کو رویت سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے لِنَعْلَمَ (ہم جان لیں) کی تفسیر لِنَرٰی (کہ ہم دیکھ لیں) کی ہے۔ اسی عملی ظہور امتحان اور جانچ فرمایا ہے۔ اس امتحان خداوندی کے بعد لوگوں کے سامنے حق کا باطل سے اور خیر کا شر سے امتیاز ہو جاتا ہے۔

مقصودِ بیان اللہ تعالیٰ دلوں کے اسرار سے پورے طور پر واقف ہے۔ اگر وہ چاہے تو دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کا اظہار کر دے اور ایسا واقف بنا دے کہ خصوصی نشانیاں اور علامات دیکھ کر اصحاب اسرار کو دیکھنے والا پہچان جائے۔ (مگر اس کی مصلحت اور رحمت ہے کہ اس نے دشمنوں کی دشمنی کا راز بھی فاش نہیں کیا) گو کلام کے طرز ادا اور اسلوب سے دشمنِ اسلام پہچانے جاتے ہیں (مگر اللہ تعالیٰ ان کا راز افشا نہیں کرتا) اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو منافقوں کی شخصیتوں سے یقینی طور پر واقف نہیں کیا تھا۔ ہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرائن اور طرزِ کلام سے منافقوں کو پہچانتے تھے۔

مومن اور منافق کو الگ الگ ممتاز نہ کر دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں گروہوں کی عملی جانچ کرنی مقصود تھی تاکہ استحقاق ثواب و عذاب پیدا ہو جائے۔ وغیرہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ

بے شک جو لوگ کافر ہوگئے اور انہوں نے اللہ کے راستے سے روکا اور رسول کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان کو رستہ نظر آچکا

الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ

تھا یہ لوگ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو مٹا دے گا اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

اور رسول کی اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ اور رسول کی مخالفت کرکے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے

اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ

اللہ کے رستے سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے خدا تعالیٰ ان کو بھی نہ بخشے گا سو تم ہمت مت ہارو اور صلح کی طرف مت بلاؤ

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۝

اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال میں ہرگز کمی نہ کرے گا

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ

دنیوی زندگانی تو محض ایک لہو و لعب ہے اور اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارے مال

لَا يَسْـَٔــلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝ اِنْ يَّسْـَٔــلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ

طلب نہ کرے گا اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری

اَضْغَانَكُمْ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ

ظاہر کر دے ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے سو بعض تم میں سے وہ ہیں جو بخل

مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ

کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو اور اگر

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ع

رکوع ۸

تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

تفسیر انسانی فکر و دانش حق و باطل میں یقینی امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔ بالفرض اگر عقل بسیط کو حق شناس اور حقیقت رس مان بھی لیا جائے تو ایسی سادہ عقل ہے کہاں جو بشری جذبات رغبت و نفرت سے آزاد ہو۔ خصوصاً ما فوق الطبعیات اور آغاز و انجام کے تصورات میں فہم کا وہم سے امتیاز ناممکن ہے۔ پس وجدان رسالت اور وحی ہی ایسی فیصلہ کن طاقت ہے جو حق کو باطل سے.... چھانٹ دیتی ہے اور حق و حقیقت کو کھول کر سامنے لے آتی ہے۔ یہی حقیقت و صداقت وہ ہدایت ہوتی ہے جو رسول کی وساطت سے لوگوں کے سامنے واضح طور پر آجاتی ہے اور اسی کو راہ خدا کہنا صحیح ہے، لیکن اس روئے زمین پر اکثر آدمی نابینا ہیں، سورج کی کھلی ہوئی روشنی

کو دیکھنے سے محروم ہیں۔ ان کو رات دن کا امتیاز ہی نہیں۔ کچھ لوگ دوسروں کے کہنے سے اگر مان بھی لیتے ہیں تب بھی ان کو قلبی یقین حاصل نہیں ہوتا اور وہ تذبذب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف آنکھوں کی نابینائی ان کو انکار حقیقت پر آمادہ کرتی ہے تو دوسری طرف آنکھوں والوں کی یقین دہانی ان کو انکی صداقت کی جانب مائل کرتی ہے، اس لئے بظاہر وہ نور آفتاب کا اقرار کر لیتے ہیں، مگر دل سے منکر ہی ہوتے ہیں۔ پس انسانی زندگی کی جو شاہراہ پیام رسالت اور قرآن نے واضح کر دی اور جو راہ سعادت کھل کر سامنے آگئی اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن کی بصیرت دانش اور فہم قلبی پر جہالت، ضد، عناد اور ہوا و ہوس کے تاریک پردے پڑے ہیں۔ ان کو صراط مستقیم دکھتی ہی نہیں۔ خود ساختہ کج راہوں کو وہ استقامت راہ سمجھتے ہیں اور جہاں خود راہ عذاب پر نہیں چلتے وہاں دوسروں کو بھی اس واضح صراط مستقیم پر چلنے سے روکتے ہیں اور جادۂ برحق کی شق سے کٹ کر دوسری شق پر خود بھی چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی چلاتے ہیں، لیکن سیدھے راستے کو چھوڑ کر وادئ گمراہی میں بھٹکتے پھرنے سے ان کا خود ضرر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نقصان ہوتا نہیں وہ خود ہی کسی غار خندق میں گر کر اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ اگر ابتداءً چند قدم ان کے سیدھی راہ پر پڑتے بھی ہیں تب بھی زندگی کی بنیادی کج روی آخر کار ان کو تباہ کر دیتی ہے اور چند عقلی یا رواجی نیکیاں جو ان سے سرزد ہو جاتی ہیں کوئی اچھا پھل نہیں پیدا کرتیں۔ ٹیڑھی بنیاد پر ٹیڑھی دیوار چننے سے وہ ساری محنت و مشقت برباد ہو جاتی ہے جو تعمیر دیوار میں اٹھاتے ہیں۔ مآل کار اسی حالت پر مر جانے سے دوسری زندگی کی نجات و سعادت سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تاریک غاروں میں اندھا دھند گھس کر ٹاپک ٹوئیاں مارنے والے اس گلزار سعادت تک کیسے پہنچ سکتے ہیں جس پر پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی معرفت سب کو دعوت دی ہے اور اس شاہراہ کی حد بندی بھی کر دی ہے۔ پس جو لوگ اس زندگی کے لئے وحی و رسالت کے فیصلے کو حق اور اٹل سمجھتے ہیں اور جن کو یقین ہے کہ خدا تعالیٰ کی قائم کردہ شاہراہ ہی صراط مستقیم ہے، ان پر لازم ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں۔ اگر اللہ و رسولؐ کے رسول کی اطاعت و فرماں پذیری سے منہ موڑیں گے اور دوسری راہ پر چلیں گے تو گزشتہ استقامت رفتار کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ سیدھے راستہ پر چل کر درمیان راہ یا مال سیر میں صراط مستقیم سے کترا جانا تباہ کن ہوگا۔ پچھلی زندگی کی صحیح رفتار منزل مقصود تک نہیں پہنچائے گی۔ اور ساری اچھی سبک سیریں اور سبک ساریاں برباد ہو جائیں گی۔ اہل ایمان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک طرف اللہ اور رسول اللہ کے رسولؐ کا بتایا ہوا راستہ ہے جو سیدھا ہے، حق ہے، ہموار ہے، کشادہ ہے جس میں کوئی غار نہیں، خندق نہیں، موڑ نہیں۔ دوسری طرف قعر ضلالت ہے، گمراہی یا کج راہی ہے، باطل ہی باطل ہے اور ان دونوں راستوں پر چلنے والوں کا تصادم ہونا ضروری ہے۔ نور اور تاریکی کا توافق ناممکن ہے۔ خیر و شر کا اجتماع محال ہے۔ اس تصادم میں حق کا غلبہ یقینی ہے۔ حق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہوتی ہے۔ حق کی طاقت بڑی ہوتی ہے، اس لئے اہل حق کو اہل باطل سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے، دب کر صلح نہ کرنا چاہیئے، ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ کمزوری ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔ اہل حق مقابلے میں ہمیشہ ہی سربلند رہیں گے۔ فتح پائیں گے تو اقتدار ہاتھ آجائے گا، شکست کھائیں گے تو شہادت ملے گی قربانی رائیگاں نہ جائے گی۔ ہاں اگر امام اہل حق اور زعماء اسلام کی مصلحت ہو اور اسلام کا فائدہ صلح میں نظر آ رہا ہو تو دب کر صلح کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ دبنا بھی بے مصلحت نہ ہوگا۔ نتیجہ کے اعتبار سے برتری اور غلبہ حاصل ہونے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ اگر اہل حق نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت سے انحراف کیا تو ان کی پچھلی خدمات اور کارگزاریاں برباد جائیں گی۔ اور وہ خود اپنے اچھے اعمال کو اکارت بنائیں گے۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ۔ الہدیٰ سے مراد ہے قرآن اور ہدایت اسلام۔ اسلام کے بدیہی احکام و عقائد کی تصدیق قلبی نہ کرنے کا نام کفر ہے جس کا مظاہرہ کبھی زبان سے بصورت انکار کیا جاتا ہے اور کبھی عمل سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کی مخالفت کر کے اور لوگوں کو دین اسلام سے باز داشت کر کے کفر کی موجودگی میں کوئی نیکی مقبول نہیں۔ بلکہ کافر کی کوئی نیکی (چونکہ لوجہ اللہ نہیں ہوتی اور کوئی نہ کوئی شخصی قومی وطنی نسلی غرض اس کا باعث ہوتی ہے، اس لئے وہ) نیکی ہی نہیں ہوتی۔ کفر ساری نیکیوں کو کھا لیتا ہے۔ منکر اسلام اور اللہ و رسول کا مخالف اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ مریض اگر نسخۂ شفا استعمال نہ کرے تو خود ہلاک ہوگا طبیب کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ حاصل آیت یہ ہے کہ جو لوگ رسول اللہ کی بعثت اور اسلام کی صداقت کی تصدیق نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور رسول اللہ کی دینی مخالفت کرتے ہیں جس رخ پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چلنے کا حکم دیتے ہیں۔ اُس پر نہیں چلتے۔ اس کے خلاف رُخ کو اختیار کرتے ہیں اور یہ تمام حرکات اس کے باوجود کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولؐ کی معرفت ہدایت نامہ آگیا اور ہدایت کا گمراہی سے امتیاز ہو گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں۔ کل قیامت کے دن یہ خالی ہاتھ ہوں گے۔ ایک نیکی بھی ان کے پاس نہ ہوگی۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ۔ مسلمانو! تم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم پر چلو (کافروں جیسے عقائد و اعمال اختیار کر کے) اپنی نیکیوں کو ضائع نہ کرو۔

محمد بن نصر مروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں بیان کیا ہے کہ بعض صحابہؓ کا خیال تھا جس طرح شرک کے ساتھ کوئی نیکی سودمند نہیں۔ اسی طرح لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے اقرار کے بعد کوئی گناہ ضرر رساں نہیں۔ اس پر آیت اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہؓ کو خوف ہو گیا کہ کہیں ہمارے گناہ ہماری نیکیوں کو برباد نہ کر دیں۔ اس وقت آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ الخ نازل ہوئی اور صراحت کر دی گئی کہ شرک ناقابلِ مغفرت ہے۔ باقی گناہ اللہ چاہے گا تو معاف کر دے گا، چاہے گا عذاب اور سزا دے گا (بہرحال بغیر کفر کے نیکیاں برباد نہ جائیں گی) دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ ہر نیکی کو یقینی طور پر مقبول سمجھتے تھے تو آیت اَطِیْعُوا اللّٰهَ نازل ہوئی۔ اس پر صحابہؓ کا خیال ہوا کہ کبیرہ گناہ اور برے اعمال نیکیوں کو برباد کر دینے والی چیزیں ہیں۔ اس پر آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ الخ نازل ہوئی (اس آیت میں ناقابلِ مغفرت صرف شرک کو قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ سے نیکیاں برباد نہیں ہوتیں یا یوں کہا جائے کہ گناہوں سے نیکیوں کی بربادی یقینی نہیں) اس کے بعد صحابہ کی حالت بیم و رجا کے درمیان ہو گئی۔ کبائر کے مرتکب کیلئے عذاب کا ڈر رہتا ہے اور کبائر سے بچنے والے کے لئے امیدِ رحمت۔ کفر اور مخالفت رسولؐ پر عذاب کی وعید کے بعد اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ گویا اعمالِ کفر کے ارتکاب اور ارتداد سے روکا ہے تاکہ اعمالِ مومن غارت نہ ہو جائیں نفی و نہی کے بعد اثبات اور امر بلیغ ترین اسلوب ادا ہے۔

ایک شبہ اطاعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعینہٖ اطاعتِ خداوند تعالیٰ ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ پھر اطیعوا اللہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اطاعت اللہ کے اندر اطاعت رسولؐ داخل ہے۔ پھر اطیعوا اللہ اطیعوا الرسول کیوں فرمایا۔

ازالہ اطاعت اللہ کا دعویٰ بغیر اطاعتِ رسولؐ کے قابلِ قبول نہیں۔ یوں تو تمام اہلِ کتاب جو رسالتِ محمدیہ کے منکر ہیں اطاعتِ خداوند تعالیٰ کے مدعی ہیں۔ مگر ان کا یہ دعویٰ قابلِ قبول نہیں، اس لئے اطاعتِ خداوند تعالیٰ کا دعویٰ کرنے والوں کو آگاہ کرنا ضروری تھا کہ اطاعتِ رسولؐ ہی معیارِ اطاعت ہے۔ رسول کا منکر اللہ کا مطیع نہیں، بہت سے نافہم یا کج دانش اصحابِ طریقت بھی اتباعِ رسول کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اگرچہ انکارِ رسالت بھی نہیں کرتے، مگر اتباعِ رسالت کی اہمیت بھی نہیں سمجھتے۔ محبتِ خدا تعالیٰ کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور فرمانِ رسول کے خلاف راہبانہ ترکِ دنیا کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ مخلوق سے ربطِ قلبی اور دلی وابستگی کو ترک کرنے کی جگہ علائق انسانی منقطع کر دیتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ رسالت کی اہمیت کو سمجھیں، اطاعت اللہ کی ضرورت تو تمام اہلِ مذاہب کا اجماعی

عقیدۃً اور ضروریہ ہے۔ مگر مدنی اسلام کے لئے مستقل طور پر اطاعتِ رسول کی ضرورت ہے، اسی لئے دوبارہ لفظ اطیعوا فرمایا — اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ نہیں فرمایا بلکہ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فرمایا۔ کچھ محبتِ رسولؐ کا دعویٰ کرنے والے حُبِّ رسولؐ میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ انکی توحید میں شائبۂ شرک پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے کلام سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ رسالت میں احکام الوہیت کے ظہور کی جگہ کہیں پیغمبر میں الوہیت کا حلول اور اللہ کی عبدیت میں اللہ کی الوہیت کا ادغام تو نہیں سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے حدِ فاصل قائم کرنا اور اطاعتِ اللہ اور اطاعتِ رسولؐ کا بجائے خود مستقلاً حکم دینا ضروری تھا تاکہ دونوں فریقوں کے عقیدہ میں شرک کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ کہیں رسالت کے اندر الوہیت کا حلول یا الوہیت کے اندر رسالت کا ادغام و انضمام نہ سمجھ لیا جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ اوپر کی آیت میں اعمال کے غارت ہوجانے کا ذکر تھا، جس سے خیال ہوسکتا تھا کہ حبطِ اعمال کے بعد مغفرت کی کوئی صورت نہیں۔ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے فرمایا کہ مغفرت نہ ہونے کی صورت صرف یہ ہے کہ کفر کرنے والے اللہ یا اللہ کے رسول کو نہ ماننے والے اور دین حذا یعنی شریعتِ رسول سے انحراف کرنے والے کفر کی حالت پر مرجائیں ایسے کافروں کی ہرگز مغفرت نہیں ہوگی۔ دوسری آیت میں بھی: لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ آیا ہے یعنی مغفرت کا دروازہ بند نہیں ہے۔ جب تک بندہ خود مغفرتِ الٰہیہ کا دروازہ بند نہ کردے اگر کفر و شرک کے بعد توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ زندگی پر سکراتِ موت طاری ہونے سے پہلے پہلے بابِ مغفرت کھلا ہوا رہتا ہے جو چاہے کفر سے توبہ کرلے۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ۔ یہ سورۃ، سورۂ قتال ہے۔ اوپر ذکر کیا گیا تھا کہ آیتِ قتال سننے کے بعد منافق مدہوش ہوجاتے ہیں یعنی حواس درست نہیں رہتے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں گویا ان پر موت کی غشی چھا جاتی ہے۔ ان کے لئے حکم کی تعمیل کرنی ضروری تھی۔ پھر اس کے بعد فرمایا تھا ہم مجاہدوں کی کوشش اور صابروں کے صبر کی آزمائش کریں گے۔ ادھر یہ سخت احکام تھے ادھر مسلم جماعت کی مادی کمزوری تھی، عددی کمی تھی، اسلحہ کی قلت تھی، دشمنوں کی کثرت تھی، ان کو قوت و تعداد میں اتنی برتری حاصل تھی کہ کوئی تناسب ہی نہ تھا، مسلمانوں کے دلوں میں کمزوری کا خیال آنا فطری تقاضا تھا۔ اس ضعفِ خیال کو دور کرنے اور جری بنانے کے لئے اس جگہ مدلل طور پر فرمایا بودے نہ بنو اپنے کو کمزور نہ سمجھو اور دب کر صلح کی طرف نہ جھکو، دشمن کی اطاعت کی طرف مائل نہ ہو۔ کیونکہ بول بالا تمہارا ہی رہیگا اونچے تم ہی رہو گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ صداقت و حقانیت کی مددگار غیبی طاقت تمہارے ساتھ ہے۔ حق و صداقت کی حمایت میں تمہاری کوششیں اللہ تعالیٰ ہرگز رائیگاں نہ کرے گا۔

ایک اور آیت میں آیا ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اور اگر تم پورے پورے پختہ مومن ہو گے تو تم ہی سب پر غالب رہو گے۔

ایک شبہ

جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب چودہ یا پندرہ یا سولہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ کو تشریف لے گئے اور کافروں نے مکہ میں داخل نہ ہونے دیا تو آپ نے بمقام حدیبیہ ہی پڑاؤ ڈال دیا اور قریش سے مراسلت کی آخری ایسی شرائط پر صلح کرلی، جو مسلمانوں کے لئے ذلت آمیز تھیں۔ من جملہ دیگر شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ سے کوئی بھاگ کر مسلمانوں کے پاس جا پہنچے گا یعنی مسلمان ہو جائے گا تو اس کو قریش ہی کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ مسلمان اس کو اپنے پاس پناہ نہیں دیں گے۔ اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر کافروں میں جا ملے گا تو کفار اس کو واپس نہیں کریں گے۔

ایک ضد قریش کے نمائندہ کی یہ بھی پوری کی گئی کہ دستخط کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نہیں لکھا گیا۔ بلکہ قریش کے نمائندہ کی ضد کی وجہ سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا لفظ مٹا دیا گیا۔ یہ مصالحت عام صحابہؓ کو بھی ناگوار گزری خصوصاً

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بہت شاق گزری، آپ نے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت ہی کر بیٹھے کہ کیا ہم حق پر اور کافر باطل پر نہیں ہیں۔ اگر ہم اہل حق ہیں تو ایسی ذلت آمیز صلح کیوں کی جا رہی ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا یہ فتح ہے بظاہر یہ مصالحت آیت فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا اِلَى السَّلْمِ کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

ازالہ علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ صلح حدیبیہ کی کوئی شرط ذلت آمیز نہیں تھی، جو مسلمان مرتد ہو گیا وہ مسلمانوں کے کسی کام کا نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے اندر اس کا رہنا مصلحت قومی کے خلاف اور ضرر رساں تھا اور پکا مسلمان اگر کافروں میں بھی رہے، مومن ہی رہے گا اور کافروں میں رہ کر تو شاید مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہو، جسمانی ضرر پہنچنے کا اس کو ضرور اندیشہ ہے، مگر کسی کافر کو حقیقت اسلام ذہن نشین کرا لینے کے بعد مومن بنا لینے کی بھی توی امید ہے، برداشت خود موجب اجر ہے اور کسی نئے کافر کا مومن بن جانا جماعت مسلمین کے لئے مفید۔ یہ جواب اگرچہ صحیح ہے، لیکن شمس الائمہ سرخسی حنفی متوفی سنہ ۴۸۳ھ نے شرح السیر الکبیر میں جس رنگ میں صلح حدیبیہ کی افادیت ظاہر کی ہے وہ عجیب ہے لکھتے ہیں۔ لانہ کان فیہ نظر للمسلمین لما کان بین اھل مکۃ واھل خیبر من المواطاۃ علی ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا توجہ الی احد الفریقین اغار الفریق الآخر علی المدینۃ فوادع اھل مکۃ حتی یامن من جانبہم اذا توجہ الی خیبر۔ یعنی مدینہ کا محل وقوع مکہ اور خیبر کے وسط میں ہے۔ اہل خیبر اور اہل مکہ دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے اور دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ اگر مسلمان کسی ایک فریق پر حملہ کر دیں تو دوسرا فریق مدینہ پر چڑھائی کر دے ایسی حالت میں سیاسی فتح اسی میں تھی کہ ہر شرط پر مکہ والوں سے صلح کر لی جائے تاکہ اہل خیبر سے جو سمجھوتہ قریش نے کر رکھا تھا وہ ٹوٹ جائے یا کم از کم مسلمانوں کو ضرر نہ پہنچا سکیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے سیاسی مبصر کی بصیرت بھی اتنی دور رس اور گہری نہیں تھی کہ اس سیاسی فتح کو سمجھ سکتے۔ اس کی تفصیل آگے سورۂ فتح کی تفسیر میں آ رہی ہے۔

استدراک آیت کے اطلاق سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کو صلح کی طرف کسی حالت میں جھکنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ بصیرت کشی ہے اور اسلامی صلح پسندی کے خلاف ہے۔ دوسری آیت ہے وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا اگر کافر صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔ یعنی مصالحت کر لو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر سیاسی بصیرت کے زیر اثر اگر صلح ضروری ہو تو صلح کر لو۔ طاقت کے توازن پر نظر ضرور رکھو۔ چاہے ایک کا مقابلہ دس سے ہو یا دو سے یا ایک کا ایک سے۔ بہرحال بزدلی کو راہ نہ دو۔ ہمت نہ ہارو، حوصلے پست کر کے بغیر کسی سیاسی فائدے کے اطاعت و صلح پر نہ جھک پڑو۔ کافروں کی ظاہری طاقت سے مرعوب نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طاقت و مدد کو اپنے ساتھ سمجھو اور (حق و صداقت کی حمایت کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری کسی محنت اور کوشش کو برباد نہ ہونے دے گا یعنی فتحیاب ہو گے تو دنیوی شوکت، اقتدار میں اضافہ ہو گا، دولت اور عزت بڑھے گی، مارے جاؤ گے تو اعمال کا پورا پورا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ مجاہدین و شہداء کے مراتب پر فائز ہو گے۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ۔ دنیوی زندگی تو بس کھیل کود ہے۔ اس سے دل کو وابستہ رکھنا بے کار ہے۔ اگر مان لو گے اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کو اور رسول کی ہدایت کو، اور ممنوعات سے بچے رہو گے تو تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا پورا پورا المقررہ اجر دے گا اور اس میں کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا کہ کوئی ڈرے۔ اللہ تعالیٰ تم سے (پورا مال) نہیں طلب کرتا۔ اللہ کی طرف سے مدعیان اسلام کا امتحان لیا گیا تھا۔ یوں تو منافق بھی اسلام کے دعوے دار تھے، مگر وہ امتحان میں پورے نہ اترے۔ اللہ تعالیٰ نے جانی جہاد کا حکم دیا تھا جس کو سن کر بھی ان پر موت کی ایسی غشی چھا گئی، شدت حیرت میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد مالی کا بھی حکم دیا اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی طلب کی، لیکن یہ ایسی طلب نہ تھی کہ آدمی کنگال ہو جائے۔ اگر بالکل نادار بن جانے کا حکم دیا جاتا اور سب

مال دے دینے کو لازم کر دیا جاتا تو منافق کا نفاق ظاہر ہو جاتا، مگر اللہ تعالیٰ نے سارا مال نہیں مانگا اور اتنا مال طلب نہیں کیا کہ منافق بالکل کنگال ہو جاتے فرماتا ہے

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ تم لوگوں کو (جہاد جسمانی کے علاوہ) راہ خدا میں (یعنی دین کو مضبوط رکھنے کے لئے) مال خرچ کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے (اور یہ خرچ مال کی دعوت قابل برداشت حد تک ہے اتنی نہیں کہ محتاج ہو جاؤ) اس پر کچھ لوگ (یعنی منافق) کنجوسی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو کسی کے مال (وجان) کی ضرورت نہیں وہ تو غنی ہے محتاج تو تم ہو ضرورتیں تو تمہاری ہیں، تمہاری باہمی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے مال داروں کو حکم دیا ہے کہ کچھ مال غریبوں کو دیں اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کریں (تاکہ یہ مال دار اگر کسی وقت غریب ہو جائیں تو دوسرے مال داران کی حاجت روائی کریں) یہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا ہے۔ اب جو کوئی بخیلی کرے گا تو حقیقت میں وہ خدا تعالیٰ سے بخیلی نہیں کرے گا خود اپنی ذات سے بخیلی کرے گا۔ اگر اس کو کسی وقت ضرورت پڑی تو دوسرے دولتمند اس کو کچھ نہیں دیں گے تو درحقیقت دوسرے سے بخیلی کرنے کا وبال خود اسی کی ذات پر پڑے گا پھر آخرت میں بھی اس کو کچھ نہیں ملے گا جب دنیوی زندگی میں اس نے آخرت کیلئے کچھ نہیں جمع کیا تو وہاں کیا ملے گا۔ یہ بخیلی آخرت میں بھی محرومی کا سبب بن جائے گی۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۠ یعنی جہاد جانی ومالی اور احکام اسلامی کی پابندی کی تعلیم تو تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا وہ تمہارے جانشین ہو جائیں گے اور تمہاری طرح نہ ہوں گے یعنی مخلص مومن اور پکے دین دار ہوں گے۔ ترمذی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر وغیرہ کی روایت ہے جس کو ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضورؐ وہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہماری جگہ لے آئے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ اور اس کی قوم اگر دین ثریا کے پاس بھی چلا جاتا تو فارس کے لوگ دین کو وہاں سے بھی لے آتے۔

اس روایت کے ایک راوی مسلم بن خالد زنگی ہیں جن کی ثقاہت میں علماء روایت نے کلام کیا ہے۔ بعض کے نزدیک قَوْمًا سے مراد انصار ہیں بعض کے نزدیک فارس و روم والے ہیں۔ بعض کے نزدیک اہل یمن مراد ہیں۔ مجاہد نے کہا کوئی خاص ملک ونسل مراد نہیں۔ اللہ جس کو چاہے دین کا حامی بنا دے۔ یہ قول تمام اقوال میں زیادہ اچھا ہے۔

مقصودِ بیان دین کے خلاف ہر کوشش نیکیوں کو برباد کر دیتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا دعویٰ کافی نہیں۔ اطاعت رسولؐ لازم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا منکر خدا تعالیٰ کا منکر ہے۔ کفر بالرسول بھی کفر باللہ کی طرح ہے لیکن کفر کے بعد توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور موت تک کھلا رہے گا۔ جو شخص کفر پر مر گیا اس کی مغفرت کبھی نہیں ہوگی۔ اللہ کی راہ میں جہاد جسمانی و مالی لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا مال دینے کا حکم نہیں دیا جو بالکل کنگال کر دے۔

آیت میں درپردہ پیشین گوئی ہے اس بات کی کہ مستقبل میں راسخ الایمان صالح الاعمال مجاہد فی سبیل اللہ لوگ پیدا ہوں گے جو (ظاہری) مدعیان ایمان وصحابیت (یعنی منافقوں) کی طرح نہیں ہوں گے، اس سے مخلص الایمان صحابہ پر آنے والے اہل ایمان کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ وغیرہ۔

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ الفتح مدنی ہے اس میں ۵۶۸ کلمات اور ۲۵۵۵ حروف ہیں

یہ سورت مدنی ہے اس میں چار رکوع اور انتیس آیات ہیں۔ ابن جریر نے اس سورت کو مدنی لکھا ہے اور کسی مفسر نے اختلاف نہیں کیا۔ اس سے بعض اہل تفسیر سمجھ بیٹھے کہ یہ سورت مدینہ شریف میں اتری ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے مکہ سے جب مدینہ شریف کو واپسی ہوئی تو راستہ میں یہ سورت نازل ہوئی۔ تفصیل ذیل میں آرہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہجرت کے بعد جو آیت یا سورۃ جہاں کہیں نازل ہوئی علماء اس کو مدنی قرار دیتے ہیں اور ہجرت سے پہلے قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا اس کو مکی کہتے ہیں اسی بنا پر سورہ الفتح کو مدنی کہا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝

بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی

ہم نے آپ ہی کو یقینی کھلی ہوئی عظیم الشان فتح عنایت کی۔ اگر کسی چیز کا آئندہ واقع ہونا یقینی اور قطعی ہو تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے گویا یہ چیز واقع ہو گی، اس لئے یقینی لوقوع مستقبل کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ حدیبیہ کی صلح سے بھی مسلمانوں کے لئے فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ اور صلح حدیبیہ سے چند ماہ کے بعد ہی خیبر فتح ہو گیا اور مختلف سرکش قبائل نے اطاعت قبول کر لی۔ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں مسجدیں بن گئیں، امام مقرر ہو گئے باجماعت نمازیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے لئے کوئی بندش نہیں رہی، ہر طرح سے دینی راستہ کھل گیا، مدینہ اور اطراف مدینہ سے یہودیوں کا بیج مارا گیا۔ پورے مدینہ میں اسلامی ریاست بن گئی۔ خیبر میں یہودی ذمی رعایا بن کر رہنے لگے مسلمانوں کا دستور تقریباً مکمل ہو گیا، تہذیب اسلامی مستقل ہو گئی، اسی لئے اس صلح کو باعتبار نتیجہ فتح کہا گیا۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ ذی قعدہ ۶ھ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمرہ ادا کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کو چلے، لیکن راہ میں مشرکین مکہ نے روک دیا اور مسجد حرام کی زیارت سے روک دیا۔ تاریخ حرم میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مسلمانوں کو مکہ والوں نے کعبہ کی زیارت سے روکا اور وہ بھی ماہ ذی قعدہ میں۔ یہ دستور جاہلیت کی بھی شکست تھی۔ اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی دعا و ہدایت کی خلاف ورزی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہو گئے اور قریش سے کہلا بھیجا کہ ہم لڑنے کے ارادہ سے نہیں آئے عمرہ کرنے آئے ہیں۔ یہ پیام حضرت عثمانؓ کی معرفت بھجوایا تھا۔ قریش نے حضرت عثمان کو روک لیا۔ قاصد امین کو قید کر لینا اس زمانے میں بھی بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا، مگر قریش نے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی اس کے فوراً بعد ایک افواہ مشہور ہو گئی کہ کافروں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ سنتے ہی حضورؐ نے حدیبیہ میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تمام ساتھیوں سے بیعت جاں نثاری لی اور سب نے میدان سے نہ بھاگنے کی شرط پر بیعت کی، قریش نے جب خطرہ محسوس کر لیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جنگ ضرور ہو کر رہے گی تو انہوں نے اپنا قاصد بھیجا اور درخواست کی کہ اس سال آپ لوگ چلے جائیں اور آئندہ سال آ کر عمرہ ادا کریں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس بات کو مان لیا اور معاہدہ لکھا گیا جس کے اندر ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ چلا آئے گا تو مسلمان اس کو واپس کر دیں گے اور اگر کوئی مسلمان مدینہ سے قریش کے پاس چلا آئے گا تو قریش اس کو واپس نہیں دیں گے۔ اور اگر مکہ کا کوئی کافر مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو مسلمان اس کو پناہ نہیں دیں گے جب حضرت علیؓ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکھا تو قریش نے کہا کہ ہم آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے تو معاہدہ میں یہ لفظ ہم برداشت نہیں کریں گے۔ رسول اللہؐ کی جگہ محمد

ابن عبداللہ لکھو۔ حضور اس پر بھی رضامند ہو گئے۔ صحابہ کو یہ معاہدہ سخت شاق گزرا۔ بظاہر معاہدہ قریش کے لئے مفید اور مسلمانوں کے لئے ضرر رساں محسوس ہو رہا تھا۔ معاہدہ کیا تھا قریش کے مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا تھا، مگر اللہ کے رسولؐ کو اس کی مصلحت و حکمت معلوم تھی۔ اس معاہدہ کی رو سے اہل مکہ اہل خیبر سے کٹ گئے تھے قبائل عرب کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمان غارت گر جنگ جو اور خواہ مخواہ کے فسادی نہیں ہیں۔ ادھر مسلمانوں کو بھی مواقع مل گئے کہ وہ امن کے ساتھ اندرون ملک مختلف قبائل میں اور حوالی عرب کے چھوٹے بڑے شیوخ اور شام و روم و ایران کے بادشاہوں تک امن و فراغت کے ساتھ اپنا انقلابی پیام پہنچا سکیں اور حکم خداوندی کی تبلیغ کر سکیں۔ مستقبل قریب میں حاصل ہونے والے منافع صحابہؓ کی نظر سے اوجھل تھے، اس لئے عموماً اس معاہدہ کو پسند نہیں کیا گیا اور حضرت عمرؓ نے بیتابی کے ساتھ عرض کر ہی دیا کہ حضورؐ کیا ہم حق پر اور قریش باطل پر نہیں ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا پھر ایسا معاہدہ کیوں کیا گیا۔ حضورؐ نے کچھ مبہم سا جواب دیا جس سے حضرت عمرؓ کی تسلی نہیں ہوئی اور کوئی قربانی کرنے اور احرام کھول دینے پر راضی نہیں ہوا۔ آخر حضرت ام سلمہؓ کے مشورہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنی قربانی کا جانور اسی جگہ حرم سے باہر ذبح کر دیا اور احرام کھول دیا۔ یہ دیکھ کر صحابہؓ نے بھی مجبوراً احرام کھول دیئے اور اپنے اپنے قربانی کے جانور ذبح کر دیئے۔ اس کے بعد لوٹ آئے اور راستہ میں یہ سورت نازل ہوئی جس کو اِنَّا فَتَحْنَا سے شروع کیا گیا اور حدیبیہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی۔ اس سورت کو سن کر مسلمانوں کو یقین تو ہو گیا کہ یہ مصالحت یقیناً کوئی بڑی فتح ہے، لیکن متحیر تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی فتح ہے لیکن اس کے فوراً بعد خیبر کی فتح اور دوسری کامیابی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بلا شبہ یہ عظیم الشان فتح تھی۔

میں کہتا ہوں کہ عربی زبان میں فتح کا معنی ہے کھول دینا کسی بستی یا شہر یا ملک پر تسلط پانے کو فتح اسی مناسبت سے کہتے ہیں کہ فاتح قوم کے وہاں غلبے کے ساتھ داخل ہونے اور اپنا حکم جاری کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ کوئی روک ٹوک اور بندش نہیں رہتی۔ عربی کی اس لغوی تنقیح کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ فَتَحْنَا کے معنی صرف ملکی تسلط ہی نہیں بلکہ دین کی اشاعت کے راستے میں جو بندشیں تھیں ان سب کو دور کر دینا بھی اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ فتح خیبر ہوئی، یہودیوں کی بیخ کنی ہوئی، مسلمانوں کا افلاس دور ہوا، اسلحہ اور سامان جنگ کی فراہمی کیلئے روپیہ کا انتظام ہو گیا، ملک میں تبلیغ کی راہ کھل گئی، امن عام ہو گیا، اسلامی اسٹیٹ ہو گئی، بیشتر دستور اسلامی کا نفاذ ہو گیا، مسلمان سکھ سے ہو گئے کافر اور مسلم باہم ملنے اور تبادلۂ خیال کرتے لگے اور ان تمام امور نے فتح مکہ و حنین کا راستہ کھول دیا بلکہ بیرون عرب بھی دین اسلام پہنچ گیا۔ اور صلح یا جنگ کے ساتھ اسلامی مقبوضات میں توسیع ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش بہت ہو گئے۔ اسی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ اور دوسرے صحابہ فرمایا کرتے تھے کہ تم تو فتح مکہ کو فتح کہتے ہو۔ یہ بھی صحیح ہے، لیکن ہم صلح حدیبیہ کو فتح جانتے ہیں۔ حضرت جابرؓ کا قول بھی یہی مروی ہے

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے تھے تم تو فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو اور ہم بیعت رضوان (حدیبیہ کے مقام پر جو تمام مسلمانوں نے بیعت کی تھی) کے واقعہ کو فتح گنتے ہیں۔ ہم چودہ سو آدمی رسول اللہؐ کے ساتھ اس موقع پر تھے، حدیبیہ ایک کنویں کا نام تھا (حرم سے سات میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے) ہم نے ضرورت کیلئے اس میں سے پانی لینا شروع کیا (پانی کم تھا) تھوڑی دیر میں پانی ختم ہو گیا ایک قطرہ بھی کنویں میں نہیں رہا۔ پانی نہ ہونے کی شکایت حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کانوں تک پہنچی۔ آپؐ کنویں پر تشریف لائے اور اس کی من پر بیٹھ گئے اور ایک برتن میں (تھوڑا سا) پانی منگوا کر برتن میں وضو کیا اور اسی میں کلی بھی کی۔ پھر کچھ دعا کی اور وہ پانی کنویں میں ڈلوا دیا تھوڑی ہی دیر گذری کہ کنواں پانی سے لبالب بھر گیا۔ ہم نے پیا جانوروں کو پلایا۔ تمام ضرورتیں پوری کیں اور سارے برتن بھر لئے۔

(باقی پارہ ۲۶ دوسری قسط میں ملاحظہ فرمایئے)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَيَانُ السُّبْحَانْ

کا

پارہ نمبر ۲٦

جزو ثانی

حٰمٓ

از

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵٦ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی تھی

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

بصورتِ پارہ

شائع کی جا رہی ہے

آستانہ بک ڈپو، پوسٹ بکس ۱۲۰٦ سوئیوالان ۱۵٤۹ نئی دہلی

ہدیہ چھ روپے فی پارہ

پارہ چھبیسواں (۲۶)

جزو ثانی

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا ایک سفر میں (یعنی حدیبیہ سے واپسی میں) میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھا، اثناء راہ میں میں نے حضورؐ سے تین بار ایک بات دریافت کی، آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے سخت ندامت اور افسوس ہوا کہ میں خواہ مخواہ آپ کے سر ہوتا رہا۔ جب کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جواب دینا منظور نہیں تو میں نے کیوں اصرار کیا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ ہوا کہ میری اس بے ادبی پر کوئی آسمانی حکم میرے خلاف ضرور نازل ہوگا۔ اس اندیشہ سے میں اپنی سواری تیز کر کے آگے نکل گیا۔ جونہی میں آگے بڑھا کسی نے میرا نام لے کر آواز دی اور کہا چلو بارگاہِ نبوت میں تمہاری یاد ہوئی ہے، میں یہ سن کر سناٹے میں آگیا کہ ہو نہ ہو کوئی وحی میرے خلاف نازل ہوئی ہے۔ اب میں تباہ ہوگیا جلدی جلدی حاضر خدمت ہوا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا گزشتہ شب مجھ پر ایک سورت اتری ہے جو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ مجھے عزیز ہے۔ پھر آپؐ نے اِنَّا فَتَحْنَا تلاوت فرمائی۔ یہ حدیث صحیح بخاری ترمذی اور نسائی میں بھی (الفاظ کے کچھ تغیر کے ساتھ) آئی ہے۔

حضرت مجمع بن حارثہ انصاریؓ کا بیان ہے کہ ہم حدیبیہ سے واپس آرہے تھے کہ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لوگ اونٹوں پر سوار بہت تیز دوڑاتے ہوئے ایک طرف کو جارہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کوئی تازہ وحی نازل ہوئی ہے۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ہولیا اور اونٹ دوڑاتا ہوا لوگوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقام کراع الغمیم میں فروکش تھے۔ ہم سب خدمت گرامی میں پہنچ گئے تو حضور سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ سورت سنائی۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کیا یہ فتح ہے۔ فرمایا "ہاں۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے بلاشبہ یہ فتح ہے۔" (چنانچہ یہ فرمان) حرف بحرف سچا ثابت ہوا جس کے بعد ہی خیبر فتح ہوگیا اور وہاں بہت زیادہ زرخیز زمین پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، خیبر کے مال کا حصہ دار صرف انہی لوگوں کو قرار دیا گیا جو حدیبیہ میں موجود تھے۔ خیبر کی فتح میں شریک پندرہ سو مسلمان تھے (حضرت براء بن عازبؓ کی روایت میں شرکاء کی تعداد چودہ سو تھی، ہم صحیح بخاری کی یہ روایت اوپر نقل کر چکے ہیں) ہوسکتا ہے کہ پندرہ اور چودہ سو کے درمیان تعداد ہو اور دونوں جگہ تعداد کی تقریباً صحت ہو) کل مال کے اٹھارہ حصے کیے گئے۔ تین سو اسپ سوار تھے، سوار کو دوہرا حصہ ملا اور پیدل کو اکہرا (رواہ ابوداؤد) فائدہ ابوداؤد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان منقول ہے۔ آپ نے بیان کیا حدیبیہ سے واپسی میں ہم ایک جگہ رات کو فروکش ہوئے اور سو گئے پھر جب ہم جاگے تو سورج نکل آیا تھا، آپؐ نے فرمایا معمول کے مطابق کام کرو (یعنی قضا نماز پڑھو) جو سو جائے یا بھول جائے (تو جب بیدار ہو یا اس کو یاد ہو جائے) وہ ایسا ہی کرلیا کرے (یعنی قضا نماز پڑھ لیا کرے) اسی سفر میں آپ کی اونٹنی جنگل میں گم ہوگئی۔ ہم ڈھونڈنے نکلے تو دیکھا کہ اس کی نکیل ایک درخت کی شاخ سے الجھ گئی ہے اور وہ رکی کھڑی ہے۔ ہم پکڑ کر لے آئے۔ اثناء راہ میں ہی آپ پر ایک تازہ وحی آنے لگی، نزول وحی کے وقت آپ پر بہت بار پڑتا تھا۔ بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر حالت جاتی رہی تو فرمایا مجھ پر سورۃ اِنَّا فَتَحْنَا نازل ہوئی ہے

حضرت انسؓ کا بیان ہے حدیبیہ سے واپسی میں لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا مجھ پر ایک آیت اتری ہے۔ جو مجھے روئے زمین (کی ہر چیز) سے زیادہ عزیز ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی صحابہ آپ کو مبارکباد دینے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آیت تو حضورؐ کے لئے ہوگئی۔ ہمارے لئے کیا ہے (ہمارا تو اس میں کوئی ذکر نہیں ہے) اس پر آیت لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ سے عَظِيمًا تک نازل ہوئی۔ (صحیحین)

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کردے اور آپ کو

صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝

سیدھے راستے پر لے چلے اور اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو

تفسیر ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر کافروں سے ایک سال کیلئے صلح ہوگئی ۔ صلح کیا تھی بظاہر کھلی ہوئی شکست تھی۔ جب حضور کی اونٹنی خود بخود اس جگہ بیٹھ گئی تو آپ نے فرمایا ہاتھیوں (اصحاب الفیل ابرہہ اور اس کا لشکر) کو روکنے والے نے اس کو روک دیا ہے ۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آج یہ کفار مجھ سے جو کچھ مانگیں گے (یعنی جو شرطیں پیش کریں گے) میں دے دوں گا ۔ بشرطیکہ حرمتِ الٰہی کی ہتک نہ ہو ۔ اس فرمان کا صاف مطلب یہ ہے کہ قریش سے ان کی منہ بولی شرطوں پر مصالحت کی گئی تھی ۔ اور حضور نے نافہمی یا غلطی سے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ وحی کے ذریعہ سے پوشیدہ اشارہ ہی مصالحت کو اختیار کرنے کی طرف کیا گیا تھا۔ شکست کی یہ شکل تو ظاہری تھی ، لیکن واقع میں قریش کی لگائی ہوئی شرطان ہی کے خلاف پڑتی تھی اس صلح سے مسلمانوں کو ملک میں تبلیغ کرنے کا پُر امن راستہ مل گیا ۔ غیر مسلموں کے پاس جانے ان سے ملنے اور ان کو سمجھانے کا موقع گیا ، عناد اور ضد کی جو خلیج حائل تھی وہ عارضی طور پر ہٹ گئی اور غیر مسلم قبائل مسلمانوں کے پاس آنے لگے ۔ یہودیوں سے نمٹنے کیلئے مسلمانوں کو یکسوئی حاصل ہوگئی ۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فتح مکہ سے پہلے خیبر فتح ہوگیا اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن ایک حد تک مضبوط ہوگئی ۔ اطراف ملک کے سرکش قبائل نے بھی سرکشی میں کچھ کمی کر دی ۔ اس کے بعد فتح مکہ کا راستہ کھل گیا جو جدید الاسلام مسلمان معاہدہ کے مطابق مکہ میں رہ گئے انہوں نے اسلام کی تبلیغی اور مسلمانوں کی امدادی اور تقویتی خدمت کافی انجام دی اور جو اسلامی دائرہ میں داخل ہونے کے باوجود مفقود الایمان اور منافق تھے ان کی قلعی کھل گئی یہ ایسی فتح مبین اور ایسی کھلی ہوئی در پردہ نصرتِ الٰہی ہوئی جو فتح بدر کا تکمیلی تجزیہ تھی ۔ جنگ بدر میں قریش کے سرکش سرداروں کا زور ٹوٹا تھا پھر بھی انہیں البتہ دوانیوں وسیسہ کاریوں اور قبائلی لشکر کشی کی طاقت باقی تھی جس کا ظہور احد کی لڑائی میں ہوا ، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد جب مکہ بھی فتح ہوگیا تو کفر کی بیخ کنی ہوگئی ۔ علاوہ قریش اور باشندگانِ مکہ کے ہر طرف سے جوق در جوق افراد قبائل شوق کے ساتھ آ آکر اسلام کے حلقہ بگوش ہونے لگے ۔ اہلسنت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ کسی پیغمبر سے پیغمبر ہونے کے بعد گناہ کبیرہ کا صدور نہیں ہوسکتا ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو خصوصیت کے ساتھ بنصِ قرآنی معصوم بنا دیئے گئے تھے ، لیکن رائے اور اجتہاد کی غلطی تو ہوسکتی ہے اور ہوئی بھی تھی ۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دینا سیاسی لغزش تھی جس میں آیت میں تنبیہ بھی کر دی گئی ہے اور پھر معاف کر دیا گیا ۔ احد میں مدینہ سے باہر نکل کر نوجوان جوشیلے مسلمانوں کے مشورہ کے مطابق صف بندی کرنا اور مدینہ کو خالی چھوڑ دینا بھی جنگی فرو گذاشت تھی جس کا نتیجہ شکست کی شکل میں نکلا ۔ اسی طرح کی دوسری سیاسی جنگی اور اسلوب کی تبلیغ کی اجتہادی اور فکری لغزشوں کا صدور ممکن تھا اور بعض کا وقوع ہوا بھی تھا۔ مگر حدیبیہ کی مصالحت اور مکہ کے بعد ان تمام لغزشوں کا دروازہ بند ہوگیا ۔ اب کافروں کی طرف سے نہ ایسی زہریلی ریشہ دوانیاں رہیں جن کا مقابلہ کرنے کیلئے فکری اور تدبیری لغزش کا امکان ہوتا نہ حریفوں کی کوئی ایسی خطرناک طاقت باقی رہی جس کے دفاع کے لئے زیادہ توڑ پھوڑ کی ضرورت ہوتی ، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی پچھلی یقینی اور اگلی احتمالی لغزشیں معاف کر دیں اور دنیوی و دینی نعمت آپ کو کامل طور پر عطا فرمادی ۔ جزیرۃ العرب کے لاکھوں انسانوں پر حکومت ، پورے ملک کا اقتدار اور آزادی کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے دین کی

اشاعت اور شرعِ کامل و دینِ قیم کی طرف آپ کی رہنمائی و رہبری اور تمام اعداءِ اسلام پر آپ کو غلبہ و نصرت عنایت کردی۔ ان تمام امور کی تکمیل فتح حدیبیہ کے نتیجہ میں ہوئی اسی لئے اس کو فتح مبین فرمایا۔

تحلیلِ اجزاء

فَتْحًا مُّبِيْنًا فتح کا معنی کھول دینا۔ فتح ملکی کو فتح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ملک فتح ہونے کے بعد ہر طرح کے اقتدار و عزت حکومت اور اس مفتوحہ ملک سے منفعت اندوزی کا راستہ کھل جاتا ہے شہر کی فصیلوں اور حصار و حصن کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ فتح مبین سے مصالحت حدیبیہ مراد ہے۔ اس سے اسلام کی تبلیغ اور دین کی اشاعت کے دروازے کھل گئے تھے اور حصن کفر مفتوح ہو گیا تھا۔ اس فتح کے چار نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ جو فکری تدبیری لغزشیں اور عملی فروگذاشتیں گزشتہ اوقات میں ہو گئی تھیں۔ ان کو معاف کر دیا گیا اور جو آئندہ عمر میں احتمالی سہل انگاریاں باقتضاءِ بشریت ممکن تھیں۔ ان کو بھی وقوع سے پہلے ہی معاف کر دیا گیا۔ ایسی فروگذاشتیں اگرچہ عوام کے لئے گناہ نہیں ہوتیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرتبہ کی رفعت کا تقاضا تھا کہ باقتضائے بشریت پیدا ہونے والی ادنیٰ فروگذاشت کو بھی جرم قرار دیا جائے، اسی لئے حضورؐ کی ادنیٰ لغزش فکر و عمل کو بھی اس جگہ ذنب قرار دیا۔

۲۔ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تخلیق اور فطری صلاحیتیں دوسرے انسانوں سے ممتاز تھیں عطائے نعمت کا آغاز تو شروع آفرینش سے ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طبیعت کو ہی سلیم اور فکر کو مستقیم بنایا تھا، اس لئے امتیازی انعام فطری آپ کے شاملِ حال رہا تھا پھر اس کا پورا ظہور غارِ حرا میں ہوا۔ جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ تبلیغ و اشاعتِ دین کے راستے ہموار کئے۔ رکاوٹیں دور کیں، دینی پیشوائی کے علاوہ دنیوی سیادت بخشی پھر آہستہ آہستہ ترقی دے کر علمی روحانی اور دنیوی و اخروی نعمتوں کا کمال درجہ عنایت کیا۔

۳۔ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ شرعِ عظیم اور دینِ قیم کا سیدھا راستہ، معرفت کا راستہ مقامِ قرب تک پہنچنے کا راستہ تمام مخلوق میں تمام مراتب سے اونچا مرتبہ حاصل کرنے کا راستہ۔

۴۔ وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ عزیز، غالب جو مغلوب نہ ہو دنیوی اقتدار کے ساتھ ایسی نصرت عطا کی جو ہمیشہ غالب رہنے والی اور کبھی مغلوب نہ ہونے والی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو نصرت غالبہ عطا کی گئی اور آپ کے بعد نصرت میں مزید توسیع کی گئی۔ یہاں تک کہ سارے روئے زمین پر دین پھیل گیا اور مسلمانوں کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور تاقیامِ قیامت ایک گروہ حق پر قائم اور غالب رہے گا۔

مقصودِ بیان

کشائش کار اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ بظاہر بعض چیزوں کا ظہور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اور مآل کے لحاظ سے ان کا ظہور ایک غیبی امداد کی شکل ہوتی ہے، صلح حدیبیہ فتح مبین تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف فرما دی تھیں وغیرہ۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا ہے تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو اور آسمان

جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

و زمین کا سب لشکر اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کا) بڑا جاننے والا حکمت والا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ یُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ

ایسی بہشتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ کو رہیں گے اور تاکہ اُن کے گناہ دُور کر دے اور یہ اللہ کے

عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّ یُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِیْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ

نزدیک بڑی کامیابی ہے اور تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو

الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ

عذاب دے جو کہ اللہ کے ساتھ بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں اُن پر بُرا وقت پڑنے والا ہے اور (آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن پر غضبناک ہوگا اور

اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۶﴾ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۷﴾

انکو رحمت سے دور کر دیگا اور ان کے لئے اس نے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے اور آسمان و زمین کا سب لشکر اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے

تفسیر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے صلح حدیبیہ کا فتح مبین ہونا منکشف ہو گیا اور اس مصالحت سے جو کامیابیاں حاصل ہونے والی تھیں ان کا ذکر بھی آیات مذکورہ بالا میں کر دیا گیا لیکن صحابہ کرام باقتضائے بشریت متردد تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمانے کے بعد انہوں نے اس مصالحت کو فتح مان لیا اور یقین بھی کر لیا کہ یہ فتح ہے۔ لیکن خارجی شواہد و یقینی ثبوت ان کو نہیں ملتا تھا۔ ظاہر حال کی شہادت مصالحت کو فتح قرار دینے کے خلاف تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس تردد سے ان کے ایمان کو داغ دار نہیں ہونے دیا اور غیبی اطمینان ان کے دلوں میں پیدا کر دیا۔ اب اُن کا ایمان اور زیادہ قوی ہو گیا اور علم الیقین شہود کے درجہ میں داخل ہو گیا۔ ایمان کی اس قوت اور یقین کی طمانیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ سب کے سب بلا استثنا سعد الخیال متفق العقیدہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہم رکاب پوری نشاط جسمی اور طمانیت کے ساتھ خیبر کی طرف متوجہ ہو گئے اور کوئی بھی دل شکستہ نہیں رہا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کا غیبی لشکر ان گنت اور ناقابل تصور طاقت کا حامل ہے وہ کائنات سماوی اور موجودات ارضی سے ہر کام لے سکتا ہے، لیکن اس عالم تکلیف میں انسان کو سعی و عمل کا مکلف کیا گیا ہے۔ تاکہ کوشش پر مرتب ہونے والے نتائج سامنے آ جائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی قدرت غالب ہے لیکن قدرت کا استعمال اس کی مصلحت و حکمت کا تابع ہے اور حکمت یہی ہے کہ کچھ لوگوں کے دلوں میں ایمانی سکون اور اطمینان الیقین پیدا ہو جائے اور کچھ لوگ شک و تردد کی وادی میں سرگرداں رہیں اور غیبی کارسازی کے متعلق ان کو طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہونے اور پیدا کرنے کا موقع ملتا رہے اور مآل کار اوّل فریق کی نادانستہ غلطیوں کو معاف کر کے اس کو دائمی جنت عطا کر دی جائے اور دوسرے فریق پر اللہ کی نعمت اور غضب نازل ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ کو بنا دیا جائے۔

پس مصالحت حدیبیہ کو فتح قرار دینا بھی مسلمان اور نامسلمان کے ایمان و تردد کو جانچنے کی جانچنے کی کسوٹی تھی۔ مخلص پختہ مومنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص طمانیت پیدا کر دی جس سے ان کے ایمان میں قوت پیدا ہو گئی اور وہ علم الیقین ایمانی سے آگے بڑھ کر شہود و ایمان کے درجہ میں داخل ہو گئے۔ گو ان کی مادی مدد کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہ تھی۔ اس کا کائناتی لشکر ان گنت اور لا محدود طاقت کا حامل تھا۔ وہ اپنی ہر قسم کی مخلوق سے کام لے سکتا تھا، لیکن اس کا علم و حکمت مقتضی تھا کہ اہل ایمان کو مزید اطمینان عطا فرما کر جنت کا مستحق بنا دیا جائے اور ان کی گزشتہ لغزشوں کو معاف کر کے فوز عظیم مرحمت فرما دی جائے اور منافقوں نیز مشرکوں کو بدگمانی کا موقع ملے اور وہ خیال کر لیں کہ ...

مسلمانوں کی بربادی اور اسلام کی تباہی ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ اب برائیوں کی گردش مسلمانوں پر آنے والی ہے۔ اس بدگمانی اور ایمان شکن شکوک کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت و غضب میں گرفتار ہوں اور جہنم کے مستحق قرار پائیں۔

تحلیلِ اجزاء

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ۔ فتح حدیبیہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ترقی درجات کا سبب بنی، لیکن صحابہؓ کو باقتضائے بشریت اس کے فتح ہونے کا اطمینان نہیں ہوا گو ان کا ایمان تھا اور ناقابلِ شک ایمان تھا، مگر یہ ایمان تو ایمان کلی تھا۔ ہر فرمانِ خداوندی اور حکم رسالت کو وہ صحیح مانتے تھے، مگر جزئیاتی ایمان جو دلوں کے اندر سکون پیدا کردے حاصل نہ تھا۔ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ایسے جلیل القدر صحابہ گومگو میں مبتلا تھے، فرمانِ رسالت کو حق مانتے ہوئے واقعاتی شہادت ان کے دلوں میں اطمینان پیدا ہونے سے روکتی تھی۔ لیکن علیم کارساز اللہ ہی ہے اسی کی مدد سے ڈگمگاتے اور لغزش کھاتے ایمان سکون پاتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے ملائکۂ الہام کے ذریعہ سے طمانیت نازل فرمادی اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان مشاہدۂ قدرت سے مرتبۂ اطمینان پر فائز ہوگیا تھا، اسی طرح صحابہ کے ایمان کلی میں اس واقعۂ جزئی پر ایمان رکھنے سے مزید قوت پیدا ہوگئی۔ سکینہ سے مراد ہے طمانیت' دل کا ٹھہراؤ۔ بے چینی کا ازالہ۔ اندرونی روحانی سکون۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۔ اللہ تعالیٰ کی کائناتی سماوی اور ارضی فوج ناقابلِ شمار ہے۔ وہ ادنیٰ کیڑوں اور کمزور ترین شہابوں سے بھی جس خطۂ ارضی کو چاہے ہلاک کرا سکتا ہے۔ انسانوں کی مدد کی اس کو ضرورت نہیں، لیکن اس کا علم محیط کل اور حکمت ہمہ گیر ہے۔ اس کا ہر عمل حکمت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس نے انسانوں کو سعی و عمل کا مکلف بنایا۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کی جانچ کی جائے اور مومن و غیر مومن کے دو گروہ الگ الگ کر دیئے جائیں۔ چنانچہ مومنوں کے ایمان میں مزید قوت پیدا کرنے کی غرض یہ تھی کہ

لِیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَیُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ مومن مردوں اور عورتوں کے قصور معاف کردیئے جائیں توبہ اور نیکی کی کوشش گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ پس گزشتہ گناہوں کا معاف کرنا اور دوامی جنت میں داخل کیا جانا نتیجہ ہے مومنوں کے پختہ ایمان اور سعی و عمل کا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بڑی عظمت والی کامیابی ہے۔ دنیوی کامرانیاں فانی اور ناقص ہیں۔ آخرت کی کامیابی لازوال اور کامل ہے، اس لئے آخرت کی کامیابی بڑی کامیابی ہے۔ صحابہ کو اللہ تعالیٰ نے قلبی سکون عطا فرمایا اور وہ چست ہوکر پلا تردد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمرکاب لوٹ آئے اور حسب ہدایت حضورؐ کے ساتھ خیبر کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور اس اجتماعی طاقت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چند ہی مہینوں میں خیبر کی فتح عنایت کردی۔

وَّیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا۔ اور منافق و مشرک مردوں اور عورتوں کو مزید بدگمانی میں مبتلا کردیا جائے۔ یوں بھی ان کو اسلام کی صداقت و غلبہ کا یقین نہ تھا۔ اس شکست نما واقعہ سے تو ان کی بدگمانیاں اور بڑھ گئیں۔ مشرک اس کو اپنے گروہ کی فتح خیال کرنے لگے اور منافقوں کو اسلام کی جڑ اکھڑتی نظر آنے لگی اور وہ پہلے سے زیادہ مسلمانوں کے مخالف ہوئے اور گمان کرنے لگے کہ مسلمانوں میں لڑنے کی سکت نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ اس جرم کی پاداش میں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑگئی اور غضب خداوندی میں گرفتار ہوگئے اور مرنے کے بعد ان کا ٹھکانہ اور برا ٹھکانہ جہنم قرار دے دیا گیا۔ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح مسلمانوں کی لشکرکشی اور امداد کی اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کی بقا اور استحکام اور کافروں کو مغلوب و ہلاک کرنے کے لئے ضرورت نہیں اسی طرح مشرکوں اور منافقوں کی اسلام دشمنی اور مسلم آزاری سرکشی سے بھی اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ آسمان و زمین کی تمام ظاہری اور باطنی طاقتیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جیسا جس سے چاہے کام لے سکتا ہے، لیکن اس کی ہمہ گیر قدرت

کا ظہور حکمت کے زیر اثر ہے ۔

مقصودِ بیان دلوں میں سکون ایمانی اور طمانیت پیدا کرنا اللہ کا کام ہے ۔ اسی نے صحابہ کرام کے ایمان کو (بالقائے غیبی) مزید قوت عطا فرمائی ۔ تمام بالا و پست اور آسمان و زمین کی ظاہری اور باطنی طاقتیں اللہ کے ہاتھوں میں ہیں وہ جیسا جس سے چاہے کام لے سکتا ہے ، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ انسان کو ایمان و عمل کا مکلف کیا تاکہ اپنے افکار و اعمال کے لحاظ سے اچھے برے مآل کار یا ان کا استحقاق ہو جائے اور اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے لے یا عذاب میں گرفتار کر دے ۔ مسلمانوں کی ظاہری کمزوری کو دیکھ کر یہ خیال قائم کرنا کہ اللہ ان کی مدد نہیں کرے گا اور اسلام کو کفر کی طاقتیں تباہ کر دیں گی ، مشرکانہ خیال اور منافقانہ تمنا ہے ۔ مشرک اور منافق اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب میں گرفتار ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور حکمت کے زیر اثر ہوتا ہے ۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ شَـٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ

ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان

وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝

لاؤ اور اس کے دین کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور صبح و شام اسکی تسبیح میں لگے رہو

تفسیر اعمال و افکار کی جزا سزا کے لئے حق و باطل اور خیر و شر کا فیصلہ ضروری ہے ۔ اچھائی برائی کا امتیاز نہ ہو تو نتیجہ کا اختلاف ناممکن ہے نہ کوئی عقیدہ و عمل اچھا کہلائے گا نہ برا ، اس لئے ثواب و عذاب بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا ۔ عقل نارسا ہے ۔ فکر و تجربہ کی صداقت مشکوک ہے ۔ علوم کسبیہ کی تنگ دامنی ناقابل انکار ہے ۔ ضرورت علمی وجدان کی ہے جو وحی سے حاصل ہوتا ہے عقلی فیصلہ و شہادت ناقص بھی ہے و نارسا بھی ۔ حال بھی کامل طور پر عقل کے احاطہ میں نہیں آتا ۔ مستقبل تو تو بر تو پردوں کے اندر چھپا ہوا ہے ۔ اس کو کون سی عقل دوربین کما حقہ جان سکتی ہے ۔ ہاں عالم الغیب والشہادۃ کسی خاص بندہ کو غیبی طاقتوں کے ذریعہ سے علم عطا فرمادے تو وہ علم فیصلہ کن ہو گا ۔ پس حق کو باطل سے اور خیر کو شر سے ممتاز کرنے والی شہادت اگر ہو سکتی ہے تو پیغمبر کی ہو سکتی ہے ۔ ہر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کا فیصلہ کرنے اور خیر و شر کی شہادت دینے پر مامور ہوتا ہے اور وحی کے ذریعہ سے رسول ہی کو حق و باطل کا امتیاز عطا کیا جاتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی اچھائی کو برائی سے چھانٹنے والے اور فیصلہ کن شہادت دینے والے اللہ کی طرف سے مقرر ہو کر آئے تھے ۔ شہادت حق و باطل اور فیصلہ غلط و صواب کے علاوہ (دوسرے پیغمبروں کی طرح) آپ کا یہ کام بھی تھا جو لوگ آپ کی ہدایت کو مان لیں اور آپ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں ان کو نجات و سعادت کی بشارت دیں اور جو انکار یا خلاف ورزی کریں ان کو برے انجام سے ڈرائیں ۔ پس آپ شاہد ہونے کے ساتھ بشیر و نذیر بھی تھے اور چونکہ رسالت کا اصل مقصد عوام و خواص کو سیدھے راستے پر چلانا اور ٹیڑھے راستے سے بچانا تھا ، اس لئے اللہ اور اس کے رسول کو ماننا اور ان کی ہدایات پر عمل کرنا تمام لوگوں کا فرض ہے اور رسول کی معرفت جب ایسا علم حاصل ہوا ہے جس پر سعادت و شقاوت اور ابدی نجات و ہلاکت کا مدار ہے تو ایسے محسن کی تعظیم و توقیر اور تکریم کے ساتھ اس کی فرماں برداری بھی ہر شخص پر لازم ہے اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدوسیت اور تنزیہ کا اقرار بھی ضروری ہے جس نے اپنی رحمت سے رسول کی معرفت سعادت و نجات کے راستے سے واقف بنایا اور عقل کے ناقص علم کی تکمیل علم نبوت سے کی ۔ پس صبح و شام یعنی عموماً تمام اوقات میں اور خصوصاً رات و دن کے آغاز و اختتام پر اس کی پاکی کا اعتراف اور قولی و عملی اظہار لازم قرار پایا ۔

تحلیلِ اجزاء

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ اس آیت کی مکمل تشریح سورۂ احزاب میں کر دی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شہادت اور قضا کا مفہوم تقریباً ایک جیسا ہے۔ دونوں کو استحقاق نفاذ ہے۔ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دینا اور صواب و خطا میں امتیاز کر دینا قضا کی بھی خصوصیت ہے اور شہادت کی بھی۔ اس لئے شاہد کا معنی اس جگہ ہے حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا اور صحیح فکر و عمل کو غلط عقیدہ و فعل سے ممتاز کر دینے والا اور یہ خصوصیت صرف رسول کی ہی تھی۔ بلکہ ہر پیغمبر کو اسی لئے بھیجا گیا تھا۔ حکیم و فلاسفر اور دوسرے دانش مند شاہد نہیں ہو سکتے۔ پھر شہادت حق کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت اس لئے بھی تھی کہ نظریۂ سعادت و شقاوت کا عمومی اعلان کر دیں۔ ماننے والے فرماں برداروں کو جنت کی بشارت دے دیں اور نافرمانوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں۔ یہ فریضہ بھی سب پیغمبروں کا تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کا بھی یہی مقصود تھا۔

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ رسالت کے خصوصی اوصاف بیان کرنے کے بعد رسالت کی اصل غرض اور اُمت کے ہر فرد کا فریضہ اس فقرہ میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور اسی کو قانون ساز اور شارع ماننا اور اس کے رسولوں کی رسالت کو سچا اور اس کی ہدایات کو صحیح تسلیم کرنا تم پر لازم ہے، لیکن اس کے ساتھ تین امور اور بھی واجب ہیں۔

وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ۔ (۱) تم ان کی تائید کرو، خود بھی تصدیق اور تعمیل کرو اور دوسروں تک بھی پہنچاؤ اور تبلیغ میں ان کی مدد کرو۔ (اور چونکہ سعادت و شقاوت کا الگ الگ راستہ تم کو بتا دیا ہے اور ابدی نجات کی راہ متعین کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ان کی ذاتی صلاحیت اتنی معزز ہے کہ اس نے ان کو اپنا رسول بنایا ہے اور ان کی شہادت کو فیصلہ کن شہادت قرار دیا ہے، اس لئے) تمہارا فرض ہے کہ تم ان کی توقیر و تعظیم کرو (اور کسی طرح ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت میں ان کی توہین نہ کرو۔ محسن اعظم کی توہین بدترین جرم ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ رسالت کا اعزاز عطا فرما دے اس کی عزت نہ کرنا بدترین گناہ ہے۔)

وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ (۲) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کی معرفت شریعت بھیجی ہے اور اسی نے حق کو باطل سے الگ کیا ہے اور خیر و شر کا قانون بنایا ہے، اس لئے اس کے بنائے ہوئے قانون میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ پس اس کی ذات و صفات اور اس کا بنایا ہوا دستورِ زندگی ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ تم اس کی پاکی کا دل سے اعتراف اور زبان سے اقرار، و عمل سے اظہار صبح و شام کرو۔ صبح شام کی خصوصیت صرف اس وجہ سے ہے کہ دن اور رات کے یہ دونوں کنارے ہیں ورنہ تمام اوقاتِ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے اور اس کے قانون کے ہر غلطی سے منزہ ہونے کا اعتراف دل اور زبان اور اعضاء جسم سے لازم ہے۔

تُعَزِّرُوْهُ اور تُوَقِّرُوْهُ کی ضمیریں رسول کی طرف لوٹ رہی ہیں اور تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ ایمان باللہ اصل ہے اور ایمان بالرسول اس پر مبنی ہے۔ ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ ہر عیب سے اس کی تنزیہ مانی جائے اور زبان سے اقرار بھی کیا جائے اور عمل سے اظہار بھی اور ایمان بالرسول چاہتا ہے کہ حق پر وہ رسول کی تائید اور تعظیم کی جائے۔ حق کی توہین بڑا جرم ہے۔ برحق محسن اعظم کی تحقیر خلافِ عقل ہے۔

مقصودِ بیان

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کا برحق ہونا اور آپ کی ہر شہادت کا فیصلہ کن شہادت ہونا منصوص ہے۔ اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حکم دیں یا جس سے روکیں اس کی تعمیل واجب ہے۔ شہادت برحق کا تقاضا ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اور مانا جائے۔

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا لفظ صراحۃً دلالت کر رہا ہے اس بات پر کہ تنہا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور رسولؐ کو نہ ماننا کافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جیسا اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے خود ساختہ یا دوسرے علماء الٰہیات کے تعلیم کردہ اوصاف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف ماننا غیر مقبول ہے۔ ایمان باللہ کا اقتضاء ہے کہ اللہ کو ہر عیب و نقصان سے پاک سمجھا جائے اور اس کی پاکی کا اقرار کیا جائے، یعنی رسولؐ کی بیان کردہ صفاتِ کمالیہ کی مخالف صفات سے اس کی تنزیہ کی جائے اور رسولؐ پر ایمان لانے کے دو جز ہیں، ایک یہ

کہ آپ کی تصدیق اور زبانی و عملی تائید کی جائے۔ دوسرا یہ کہ آپ کی تعظیم و تکریم کی جائے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوا کہ جس طرح انکارِ رسول کفر ہے اسی طرح توہینِ رسول بھی کفر ہے۔ یہ دونوں جزء ایمان بالرسول کے لئے ضروری ہیں وغیرہ۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ

جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے پھر (بعد بیعت کے) جو

فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

شخص عہد توڑے گا سو اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا اس کو بڑا اجر دے گا

تفسیر رسول اللہ کا مخصوص ایسا ہوتا ہے۔ ایک ایسا انسان ہوتا ہے کہ حقیقت بشریہ کا ایک فرد ہونے کے باوجود تمام انسانوں سے جُدا اور ممتاز قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ادھر بشری صفات و حقیقت کے اتحاد کی وجہ سے وہ انسان کی طرح انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے اور ادھر بارگاہِ الوہیت سے قرب رکھنے اور تجرد جیسی نورانیت سے روشن ہونے کی وجہ سے وہ اللہ رب العزت کا خاص نمائندہ اور مرضی الٰہی کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ اس کی خوشنودی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے۔ گویا اس کا کلام بمنزلت اللہ تعالیٰ کا کلام اس کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اور اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ خدا نہیں ہوتا خدا اس کے اندر حلول نہیں کرتا، مگر کسی آن خدا سے جُدا بھی نہیں ہوتا، نارسا فہم والوں کو اس پر الوہیت کا وہم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے تصرفات پہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات کا پرتو ہوتا ہے۔ پس مجازاً ہم اس کے افعال کو خدائی افعال کہہ سکتے ہیں، اس سے بیعت کرنے کو خدا سے بیعت کرنا قرار دے سکتے ہیں اور اس سے کئے ہوئے وعدہ کی شکست کو خدا سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی مان سکتے ہیں۔ وہ ایک زنجیر ہوتا ہے جس کا ایک کنارہ بارگاہِ قدس سے جُڑا ہوتا ہے اور دوسرا کنارہ انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جو شخص اس زنجیر کے تحتانی کنارے کو پکڑے رہتا ہے وہ بارگاہِ قدس تک پہنچ جاتا ہے اور جو اس کنارے کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے وہ حقیقت میں اپنے ہاتھ کا تعلق اللہ کے ہاتھ سے توڑ دیتا ہے اور اس کی رسولؐ سے جدائی اللہ تعالیٰ سے جدائی ہو جاتی ہے۔ یہی معنی ہیں يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اللہ کے رسول کا ہاتھ لوگوں کے ہاتھ پر تھا لیکن رسول کے ہاتھوں میں اللہ کے ہاتھ کا ظہور تھا، اس لئے رسول کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ کہنا صحیح ہے۔ یہ مقام شرک و اتحاد کا نہیں مقام توحید و تجرید ہے۔ یہ ایک ایسا وجدان و عرفان ہے جو حسی برہان سے ماوراء اور عقلی برہان کے ہم آغوش ہے۔ ظاہر پرست اس جملہ کو مجاز بالحذف پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں رسولؐ کا لفظ اللہ سے پہلے محذوف ہے۔ يَدُ اللَّهِ یعنی يَدُ رسولِ اللہ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ان نافہموں کی رسائی اسنادِ مجازی تک نہیں اور مجازی اسناد کو حقیقی نسبت سمجھ کر شرک قرار دیتے ہیں اور اس سے بچنے کے لئے مجاز بالمحذوف کی طرف مڑتے ہیں۔ کچھ تاریک ذہن والے ید اللہ کے لفظ سے خدا کے مجسم ہو جانے کا دھوکہ کھاتے ہیں اور پھر ید اللہ کو مجہول الکیف قرار دیتے ہیں گویا وہ متردد ہیں کہ کیا کہیں حقیقی عرفی ہاتھ تو خدا کا ہو نہیں ہے اور عربی میں اسی گوشت پوست کے ہاتھ کو "ید" کہا جاتا ہے، جو خدا کا ہو نہیں سکتا، پھر ید کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کی گئی تو بجائے اس کے نسبت کو مجازی کہیں۔ ید کے لفظ کو مجہول الکیف قرار دیتے ہیں، یا یوں کہو کہ ید اللہ کا معنی مرادی کیا ہے۔ اس سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔

تحلیلِ اجزاء إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ۔ اے پیغمبر جو لوگ آپ سے بیعت (یعنی میدان سے فرار نہ ہونے کا عہد) کرتے ہیں۔ وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

ایک اور آیت میں آیا ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ رسول بجائے خود شرلیعہ تصنیف کرنے والے نہیں، شریعت خدا کی ہے۔ یہ نازل کیا ہوا خدا کا ہے۔ شریعت پر چلنے، جہاد کرنے، تقوی رکھنے اور میدان سے فرار نہ ہونے کا جو عہد رسول سے کیا گیا وہ حقیقت میں رسول کی وساطت سے اللہ نے کیا گیا۔

ایک دوسری آیت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں، لڑتے ہیں، مرتے ہیں اور مارتے ہیں۔

اس آیت میں بھی صراحت ہے کہ مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کا خریدار اللہ ہے اور اللہ ہی کی راہ میں اہل ایمان جہاد کرتے ہیں۔ رسول نے مومنوں کی جانوں اور مالوں کو نہیں خریدا، نہ رسول کی بادشاہت قائم کرنے کے لئے مسلمان جہاد کرتے ہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں یہی بات آتی ہے کہ معاہدہ رسول سے کیا ہے اور رسول ہی کی حمایت میں مسلمان لڑے اور جہاد کیا، مگر حقیقت میں آپ واسطہ اور درمیانی ذریعہ تھے۔

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں تلوار سونت لی اس نے اللہ سے بیعت کرلی۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حجر اسود کو کھڑا کرے گا۔ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا، اس کی زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا اور جس شخص نے حق کے ساتھ اس کو بوسہ دیا ہوگا اس کے لئے گواہی دے گا۔ اس کو بوسہ دینے والا دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کرنے والا ہے، پھر حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس آیت میں بیعت رضوان کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو کیکر کے درخت کے نیچے حدیبیہ کے مقام حرم کی سرحد کے قریب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ سے لی تھی۔ بیعت کرنے والوں کی تعداد تیرہ یا چودہ یا پندرہ یا سوا پندرہ سو تھی، روایات مختلف ہیں۔

بخاری کی روایت میں ہے ہم اس روز چودہ سو تھے۔ یہ حضرت جابر کا قول ہے۔ بخاری و مسلم کی اتفاقی روایت میں حضرت جابر کا بیان آیا ہے کہ اس روز پانی وہاں موجود نہ تھا۔ صحابہ سخت پیاس میں مبتلا تھے۔ حضورؐ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر دیا کہ جاکر حدیبیہ کے چشمہ میں گاڑ دو۔ تیر کا گاڑنا تھا کہ پانی جوش کے ساتھ ابلنے لگا اور سب کے لئے کافی ہوگیا۔ راوی سے پوچھا گیا اس روز آپ لوگ کتنے تھے۔ فرمایا چودہ سو، لیکن اگر ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی اس قدر تھا کہ سب کے لئے کافی ہوجاتا۔

بخاری کی اور روایت میں حضرت جابر ہی کے حوالے سے شرکاء حدیبیہ کی تعداد پندرہ سو آئی ہے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ واقع میں تعداد پندرہ سو تھی، پھر حضرت جابر کو کچھ وہم سا ہوگیا تو احتیاطاً آپ نے تعداد چودہ سو بیان کی۔ اکثر راویوں نے چودہ سو تعداد بیان کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں پندرہ سو اور ایک روایت میں آیا ہے کہ اصحاب شجرہ کی تعداد چودہ سو تھی جن میں آٹھواں حصہ مسلم مہاجرین کا تھا۔ صحیحین میں جو محفوظ روایت باوثوق طور پر آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: کہ ایک ہزار اور کئی سو تھے۔ سیرت کی بعض روایتوں میں سات سو صحابہ کرام کی تعداد آئی ہے، مگر یہ غلط ہے۔ سیرت ابن اسحاق میں واقعہ بیعت کی تفصیل حسب ذیل مذکور ہے۔ پھر حضورؐ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلب فرما کر اہل مکہ کے پاس یہ کہنے کے لئے جانے کا حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمرہ کے لئے آئے ہیں لڑنے کے لئے نہیں آئے۔ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اس کام کے لئے تو عثمان زیادہ مناسب رہیں گے۔ مکہ کے اندر میرے خاندان بنو عدی میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے جو میری حمایت کرسکے اور قریش سے میری دشمنی آپ کو معلوم ہی ہے وہ مجھ سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے (میرے جانے کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا) حضورؐ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان کو ابو سفیان اور دوسرے سرداران قریش کے پاس جانے کا حکم دے دیا۔ آپ روانہ ہوگئے، راستہ میں ہی تھے یا مکہ میں داخل ہوچکے تھے کہ ابان بن سعید بن عاص (اموی) مل گئے اور انہوں نے آپ کو اپنی امان میں لے لیا اور اپنے آگے اپنی سواری پر بٹھا کر لے چلے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریش کے سرداروں کے پاس گئے اور حضورؐ کا پیام پہنچا دیا۔ کعبہ کے قریب پہنچے تو لوگوں نے کہا "آپ طواف تو کرلیجئے"۔ فرمایا "رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے میں طواف کرلوں یہ ناممکن ہے"۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کو روک لیا اور مسلمانوں میں ایک افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ اس افواہ کو سن کر مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سخت صدمہ پہنچا اور آپ نے فرمایا کہ اب تو بغیر فیصلہ کئے ہم یہاں سے ہٹنے کے نہیں۔

حضرت عثمانؓ کا پیام سننے کے بعد قریش نے سہیل بن عمرو حویطب بن عبدالعزیٰ اور عکرمہ بن حفص کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ یہ قاصد ابھی اسلامی لشکر میں ہی تھے کہ کچھ مسلمانوں اور مشرکوں کے مابین سخت کلامی شروع ہوگئی اور کسی قدر سنگ باری بھی ہوئی اور تیر بھی طرفین سے پھینکے گئے مسلمانوں نے ان قاصدوں کو روک لیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں ندا کر دی کہ جبرئیلؑ آئے تھے اور مسلمانوں سے بیعت لینے کا پیام اللہ کی طرف سے لائے تھے۔ آپ اس وقت درخت کے نیچے تھے اور بیعت کا حکم جاری کر دیا۔ سب صحابہ نے آپ سے بیعت کی۔ سوائے جد بن قیس کے کہ وہ اپنی اونٹنی کی آڑ میں چھپ رہا اور بیعت نہیں کی۔ بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ ہرگز ہرگز میدانِ جنگ سے مونہہ نہیں موڑیں گے۔ اس بیعت کی اطلاع پاکر قریش خوف زدہ ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کو چھوڑ دیا (مسلمانوں نے بھی قیدیوں کو رہا کر دیا اور صلح کی درخواست کی)

بیہقی کا بیان ہے کہ بیعت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ! عثمان تیرے اور تیرے رسول کے کام کو گئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے خود اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہے۔ اس بیعت میں سب سے سبقت کرنے والے ابوسنان بن وہب اسدی تھے۔ بیعت کا حکم سن کر آپ لے سب سے اوّل آگے بڑھ کر عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) دستِ مبارک بڑھایئے میں بیعت کروں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کس بات پر بیعت کرتے ہو' ابوسنان نے جواب دیا جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارادہ ہو' اسی پر بیعت کرتا ہوں۔

صحیح بخاری میں نافع کا بیان منقول ہے کہ لوگ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے اسلام قبول کیا۔ یہ بات غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لڑکے عبداللہ کو کسی انصاری کے پاس گھوڑا لانے کے لئے بھیجا۔ عبداللہ گھوڑا لینے چلے گئے۔ راستہ میں عبداللہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسلمانوں سے بیعت لے رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا علم نہ تھا، آپ بطور خود لڑائی کی تیاری کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ نے لوگوں کو بیعت کرتے دیکھ کر گھوڑے کے لئے جانے سے پہلے حاضر خدمت ہو کر بیعت کر لی اور پھر گھوڑا لینے گئے اور گھوڑا لاکر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیا اور بیعت کی اطلاع دی' اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حاضر ہو کر بیعت کر لی۔ اس سے لوگوں کو دھوکہ ہو گیا کہ حضرت عبداللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے اسلام قبول کیا (یہ بیعتِ اسلام نہ تھی بیعتِ جہاد تھی، اس لئے بیٹے کا باپ سے پہلے اسلام لانا اس سے ثابت نہیں ہوسکتا)

بخاری کی دوسری روایت ہے کہ لوگ الگ الگ درختوں کے نیچے فروکش تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ سب کی نگاہیں حضورؐ پر ہیں اور لوگ آپؐ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ فرمایا عبداللہ جاؤ ذرا دیکھو کیا ہو رہا ہے، حضرت عبداللہ نے جاکر دیکھا تو مسلمانوں سے بیعت لی جارہی تھی۔ آپ نے بھی بیعت کر لی اور واپس آکر باپ کو اطلاع دی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اطلاع پاتے ہی فوراً جاکر بیعت کر لی۔

حضرت معقل بن یسار کا بیان ہے کہ درخت کی ایک شاخ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سر پر جھکی ہوئی تھی' میں نے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کو اٹھا لیا۔ ہم نے اس وقت موت (یعنی لڑنے) پر بیعت نہیں کی بلکہ میدان سے بھاگ نہ جانے پر کی تھی، لیکن حضرت سلمہ بن اکوعؓ کا بیان ہے کہ ہم نے مرنے پر بیعت کی تھی۔ آپ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بیعت کر کے میں ہٹ کر کھڑا ہو گیا، حضورؐ نے کچھ دیر کے بعد ارشاد فرمایا کہ سلمہ بیعت نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا حضور میں تو ابھی بیعت کر چکا' فرمایا خیر (پھر) آکر بیعت کرلو' میں نے قریب جاکر پھر بیعت کر لی۔ حضورؐ نے میرے پاس ڈھال نہ دیکھی تو ایک سپر عنایت فرما دی پھر لوگوں سے بیعت لیتے رہے۔ پھر آخری بار میری طرف دیکھ کر فرمایا تم بیعت نہیں کرتے' میں نے عرض کیا پہلے لوگوں کے ساتھ میں نے بیعت کر لی تھی۔ پھر بیچ میں دوبارہ بیعت کر چکا۔ فرمایا اور سہی

چنانچہ آخری جماعت کے ساتھ بھی میں نے تیسری مرتبہ بیعت کی ۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا ۔ سلمہ وہ ڈھال جو میں نے دی تھی وہ کیا ہوئی ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! عامر سے میری ملاقات ہوئی تو ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں تھی ۔ دشمن کے حملہ کو روکنے کا کوئی سامان ان کے پاس نہیں تھا ، میں نے ڈھال ان کو دے دی ۔ حضور یہ بات سُن کر ہنس دیئے اور فرمایا تمہاری مثال بھی اس شخص کی سی ہے جس نے دعا کی کہ الٰہی ایسے شخص کو میرے پاس بھیج جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو ۔ پھر اہل مکہ نے صلح کی تحریک کی ، صلح ہو گئی اور آمد و رفت شروع ہو گئی ۔ میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ کا خادم تھا ان کی اور ان کے گھوڑے کی خدمت کیا کرتا تھا ۔ وہ مجھے کھانا دیتے تھے ۔ گھر بار ، مال و دولت سب چھوڑ کر راہِ خدا میں ہجرت کر کے نکل آیا تھا جب مصالحت ہو گئی اور طرفین سے آمد و رفت ہونے لگی تو میں ایک درخت کے نیچے صفائی کر کے جڑ سے لگ کر سو گیا ۔ اتفاقاً مشرکین مکہ میں سے چار شخص وہاں آگئے اور حضور کے متعلق آپس میں گستاخانہ کچھ کلمات کہنے لگے ۔ مجھے بُرا معلوم ہوا ۔ میں وہاں سے ہٹ کر دوسرے درخت کے نیچے چلا گیا ۔ وہ لوگ اپنے ہتھیار درخت سے لٹکا کر لیٹ گئے ۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ کسی نے وادی کے نشیبی حصہ سے آواز دے کر کہا ۔ مہاجر بھائیو ، ابن زنیم قتل کر دیئے گئے ۔ میں نے یہ بات سنتے ہی تلوار سونت لی اور اس درخت کے نیچے آیا جہاں وہ چاروں سو رہے تھے ۔ جاتے ہی ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کیا ۔ ایک ہاتھ میں وہ ہتھیار دبائے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار پکڑ کر ان لوگوں سے کہا خوب سنو قسم ہے اس خدا کی جس نے محمد کو عزت دی ہے تم میں سے اگر کسی نے سر اٹھایا تو اس کا سر قلم کر دوں گا ۔ خیریت اسی میں ہے کہ میرے آگے چلو ۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی ۔ میں ان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا ۔ ادھر میرے چچا عامر بھی عبلات کے ایک شخص مکرز کو گرفتار کر کے لائے تھے ۔ اسی طرح ستر مشرک اور بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں گرفتار کر کے حاضر کئے گئے ، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا ان کو چھوڑ دو ، برائی کی ابتدا بھی انہی کے سر ہے اور برائی کے اعادہ کا جرم بھی انہی پر عائد ہو جائے ۔ چنانچہ سب کو رہا کر دیا گیا ۔ اس کا بیان آیت هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ میں کیا گیا ہے ۔

اس موقع پر حضرت سعید بن مسیب کے والد (حضرت مسیب) بھی حاضر تھے ۔ ان کا بیان ہے کہ اگلے سال جب ہم حج کو گئے تو اس درخت کی جگہ ہم کو نہیں ملی ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس درخت کے نیچے ہم نے حضور سے بیعت کی تھی ۔ حضرت جابر نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (اس وقت) فرمایا روئے زمین پر آج جتنے لوگ ہیں ان سب سے تم لوگ افضل ہو ۔ یہ بھی حضرت جابر نے فرمایا کہ اگر آج میری آنکھیں ہوتیں تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ دکھا دیتا ۔

سفیان کا بیان ہے کہ اس درخت کی جگہ کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے ۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس بیعت میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا (صحیحین)

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے میرے ہاتھ پر بیعت کی وہ سب جنت میں جائیں گے ۔ سوائے سرخ اونٹ والے کے ، ہم دوڑ کر اس شخص کی تلاش میں گئے ۔ جا کر دیکھا تو ایک شخص اپنے کھوئے ہوئے اونٹ کی تلاش میں نظر آیا ۔ ہم نے اس سے کہا چل کر بیعت تو کر لے ۔ اس نے جواب دیا بیعت سے زیادہ مفید تو میرے لئے یہ ہے کہ مجھے گمشدہ اونٹ مل جائے ۔

مسند احمد میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو ثنیۃ المرار پر چڑھ جائے گا اس سے وہ بات دور ہو جائے گی جو بنی اسرائیل سے دور ہوئی تھی ۔ یہ سنتے ہی قبیلۂ خزرج کا ایک شخص سب سے پہلے اس پر چڑھ گیا پھر اور لوگ بھی پہنچ گئے ۔ آپ نے فرمایا تم سب بخشے جاؤ گے سوائے سرخ اونٹ والے کے ۔ ہم اس شخص کے پاس گئے اور کہا کہ تو ہمارے ساتھ چل اور معافی کا طلبگار ہو تاکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تیرے لئے مغفرت کی دعا فرما دیں ، وہ کہنے لگا خدا کی قسم اگر میرا گمشدہ اونٹ مجھے مل جائے تو میرے لئے زیادہ مسرت کن ہوگا بہ نسبت اس کے کہ تمہارا ساتھی میرے لئے دعائے مغفرت کرے

ام المومنین حضرت حفصہؓ نے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانی یہ بات سُنی کہ اس بیعت والے دوزخ میں نہیں جائیں گے تو بولیں (کیوں نہیں جائیں گے) ضرور جائیں گے ۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا ۔ ام المومنین نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے :

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۔ تم میں سے ہر ایک دوزخ پر اترے گا ۔ فرمایا اس کے بعد ہی یہ بھی تو فرما دیا ہے ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ہم تقویٰ والوں کو بچا لیں گے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل اس میں گرا دیں گے ۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے متعلق حضورؐ سے شکایت کی گئی اور عرض کیا وہ ضرور جہنم میں جائیں گے ، فرمایا تو غلط کہتا ہے ، وہ جہنمی نہیں وہ بدر اور حدیبیہ میں موجود رہا تھا (ملخص از تفسیر ابن کثیر و ابن جریر)

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ الخ جب اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت حقیقت میں اللہ کی بیعت ہے اور رسول اللہؐ سے کیا ہوا وعدہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ ہے تو پھر جو اللہ کے رسولؐ سے کی ہوئی بیعت کو توڑے گا وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت توڑے گا ۔ اور رسولؐ سے کئے ہوئے عہد کی شکست اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کی شکست ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے بیعت کو توڑنے اور عہد کو خلاف کرنے کا نقصان خود عہد شکن کو ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ کا تو کچھ ضرور ہوگا نہیں ، بیعت شکنی کا وبال بیعت شکن کو ہی اٹھانا پڑے گا اور جو وعدہ کو وفا کرے گا ، جس بات کا عہد کیا ہے اس کو پورا کرے گا ، اپنی جان اور اپنے مال سے راہ خدا میں دریغ نہ کرے گا اور اطاعت رسول پر قائم رہے گا تو اللہ اس کو (آخرت میں) اجر عظیم عطا فرمائے گا ۔ جس اجر کو اللہ تعالیٰ نے عظیم فرمایا ہے اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے ۔ دنیا کا سارا زر و مال اور جاہ و اقتدار تو وہ اجر عظیم نہیں ہو سکتا جس کو اللہ تعالیٰ نے عظیم فرمایا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دنیا تو پر کاہ اور ریشۂ بیعقدار سے زیادہ حقیر ہے ۔ لامحالہ اجر عظیم آخرت ہی میں ملے گا ۔

مقصود بیان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیعت اللہ کی بیعت ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بجائے خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شریعت ساز نہیں ، مگر آپ کا پیش کیا ہوا دین حقیقت میں اللہ کا ہی دین ہے ۔ مفہوم مخالف کے طور پر اس سے یہ بات مترشح ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہدایت کے خلاف کوئی شریعت اور قانون قابل قبول نہیں ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیعت کو توڑنا اللہ تعالیٰ سے سرکشی ہے جو خدا تعالیٰ تک کسی طرح نہیں پہنچ سکتی ، افراط محبت رسول کا دعویٰ کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ رسولؐ کا ہاتھ بعینہٖ خدا کا ہاتھ ہے اور خدا کا رسول میں حلول ہو گیا ہے ۔ نہ ظاہر پرستوں کو اس سے سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھی مجسم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے مراد ہے چند اصول کی تصدیق اور جان و مال کی سپردگی کا اقرار اور بیعت سے مراد ہے ۔ سعادت و جنت کا حصول جان و مال اور عملی جد و جہد کے بعد اصل خرید و فروخت مراد نہیں ہے کیونکہ ہماری ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے ۔ اسی کی چیز اسی کے ہاتھ فروخت کرنا بے معنی ہے جس طرح مبایعت کا مجازی معنیٰ مراد ہے اسی طرح دست رسولؐ کو دست خدا قرار دینا بھی مجازی ہے نہ حقیقت میں ہماری کوئی ملک ہے کہ ہم وہ خدا کو دے کر اس سے جنت خریدیں نہ رسولؐ کا جسمانی ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تو مخلوق کی مشابہت اور جسمانیت و مکانیت سے اور حاجت سے بالکل پاک ہے واللہ اعلم ۔

اَجْرًا عَظِیْمًا سے ثواب آخرت کی طرف اشارہ ہے اور سَیُؤْتِیْهِ میں سین بتا رہا ہے کہ اجر آخرت قریب ہے اور اس کا ملنا یقینی ہے

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا

جو دیہاتی پیچھے رہ گئے　وہ عنقریب آپ سے　کہیں گے　کہ ہم کو　ہمارے مال و عیال نے فرصت نہ لینے دی　سو ہمارے لئے (اس کوتاہی کی)

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ

معافی کی دعا کر دیجئے　یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں آپ کہہ دیجئے کہ سو وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لئے کسی

ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ

چیز کا (کچھ بھی) اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال پر مطلع ہے بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور (ہمراہی)

الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ښ

مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آویں گے اور یہ بات تمہارے دلوں میں اچھی بھی معلوم ہوتی تھی اور تم نے برے برے گمان کئے اور تم برباد ہونے والے

وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝ وَلِلّٰهِ

لوگ ہو گئے اور جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لاوے گا سو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور تمام

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

آسمان و زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے اور اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے

تفسیر صادق ہیں وہ لوگ جو دنیوی نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر صداقت کو قبول کرتے ہیں اور حق پرست ہیں وہ لوگ جو مادی خواہشات سے قطع نظر کر کے حقانیت کے طلبگار ہوتے ہیں ۔ کوتاہ نظر ہیں وہ کافران صداقت جو اہل صداقت کی ظاہری بے بضاعتی اور ان کے دشمنوں کی قوت و شوکت کو دیکھ کر یقین کر لیتے ہیں کہ ان چند بے مایہ ضعیف القوت بے یار و مددگار لوگوں کی شکست و تباہی یقینی ہے پھر ان کا کیوں ساتھ دیا جائے ۔ ان کا ساتھ دینے سے سوائے جان و مال کی تباہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا، لیکن جب مالک کائنات اپنے کمزور نادار بے مایہ پرستاروں کی غیب سے مدد کرتا اور ان کو کامیاب بنا دیتا ہے تو طلبگاران دنیا اور دنیوی جاہ و مال کو معیار برتری کامرانی قرار دینے والے پھر اہل حق کے سامنے اپنی مجبوریاں بیان کرتے اور اہل صداقت کا ساتھ نہ دینے کی جھوٹی عذر تراشیاں کرنے لگتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بندوں سے اگر وہ کوئی بات چھپا بھی لیں اللہ عالم الغیب سے اپنی بدنظری اور دروغ بافی کو کیسے پوشیدہ رکھ سکتے ہیں ۔ ان کو نفع و نقصان پہنچانا کسی بیرونی مدد کے وجدان یا فقدان پر موقوف نہیں ۔ نفع و ضرر کا تعلق تو براہ راست اللہ سے ہے ۔ اگر اس کو ضرر پہنچانا ہی ہے تو اہل حق کی حمایت سے دست کش ہونے اور اپنے گھروں میں بیٹھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں صحرائی منافق الایمان ضعیف الفکر دیہاتی جو بظاہر کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے کلمہ گو ہو گئے تھے ان کی بھی یہی حالت ہوئی جو ہم نے سطور بالا میں بیان کر دی ۔ اسی کی تفصیل ان آیات میں بطور پیش گوئی بیان کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں جس واقعہ کا اظہار قبل از وقوع کر دیا تھا ایسا ہی واقع بھی ہوا ۔

تحلیلِ اجزاء سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۔ مجاہد اور بعض دوسرے مفسروں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر عمرہ کرنے کے لئے مکہ کو روانہ ہوئے تو روانگی سے پہلے آپ نے اعلان عام کرا دیا تھا کہ سب قیاس سانحہ چلیں قریش اور ان کے ساتھی قبائل کی طرف سے قوی اندیشہ تھا، اس لئے مسلمانوں کو ساتھ چلنے کا عمومی حکم دے دیا گیا تھا ۔ اعلان عام کے باوجود عرب کے چند قبائل غفار، مزینہ، جہینہ، اشجع و اسلم جو مدینہ کے اطراف میں رہتے تھے، اپنے گھروں میں بیٹھ رہے ۔ کیونکہ یہ قبائل بظاہر اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے اور اطاعت کا اظہار بھی کیا، مگر باطن میں مسلمانوں کے دشمن یا کم سے کم مسلمانوں کے ضرر کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے فائدہ کے خواستگار تھے کسی کے دل میں اگر

ایمان تھا بھی تو وہ بہت کمزور خواہشات سے دبا ہوا ۔ ان کو اندیشہ تھا کہ مسلمان اہل مکہ کے ہاتھ سے بچ کر نہ آئیں گے۔ اور ساتھ جانے کی وجہ سے ہم تباہ ہو جائیں گے ۔ ان کی اس بات کا اظہار راستہ ہی میں مدینہ پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کر دیا اور جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو حسب صراحت قرآن ان قبائل نے حاضر ہو کر جھوٹی عذر تراشیاں کیں ۔ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ کافروں کی زبردست طاقت مسلمانوں کو تباہ کر دے گی ۔ یہ عظیم الشان طاقت رکھنے والی قوم کے گھروں پر جا رہے ہیں وہاں کاٹ کر رکھ دیں گے ۔ اس خوف سے ساتھ نہیں گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ فتحیاب ہو کر پوری جماعت کو ساتھ لئے واپس آ رہے ہیں اور کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تو ان کو خوف ہوا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمان ہم کو اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور ہمارا کیا بنے گا اور ہم کیا جواب دیں گے ۔ یہ اندیشہ کر کے انہوں نے جھوٹے عذر تراش لئے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے سے خبردار کر دیا کہ یہ بدباطن لوگ اپنے ضمیر کے خلاف جھوٹا بیان دیں گے اور عذر پیش کریں گے کہ ہم تو ہر طرح سے فرماں بردار اور مطیع حکم ہیں ، مگر بال بچوں اور باغوں کے انتظام سے مجبور تھے ۔ انہیں مشاغل نے ہم کو ہم رکاب جانے سے روک دیا ۔ پھر اپنی مزید پختہ ایمانی کو کہیں گے کہ ہم سے جو قصور ہوا اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے آپ دعا فرما دیجئے ۔

يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۔ وہ زبانوں سے جو کچھ کہیں گے وہ ان کے ضمیر کے موافق نہ ہوگا ۔ گویا دوہرے جرم کے مرتکب ہوں گے ۔ دلوں میں ایمان نہیں اور زبان سے دروغ بافی ۔

قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد ہے وہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے اسی کے ہاتھ میں تمہارا نفع و ضرر ہے ۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کون اس کو دفع کر سکتا ہے اور نفع پہنچانا چاہے تو کون اس کو روک سکتا ہے ۔ تمہاری ایمانداری اور نفاق سے وہ بخوبی آگاہ ہے اور تمہارے ہر عمل سے بخوبی واقف ہے ، تم آدمیوں سے اپنے دلوں کے نفاق کو چھپا لو گے اور جھوٹے عذر پیش کر دو گے ، مگر اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتے ۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ۔

بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا ۔ دراصل تمہارا پیچھے رہ جانا کسی صحیح معذوری کی وجہ سے نہ تھا بلکہ نافرمانی کی وجہ سے تھا ، تمہارا دلی نفاق اس کا باعث تھا ، تمہارے دل ایمان سے خالی ہیں ، خدا تعالیٰ پر بھروسہ نہیں ، تم کو یقین تھا کہ رسول اور اہل ایمان زندہ صحیح سلامت لوٹ کر نہیں آئیں گے ، تمہارے دلوں میں یہ بات مندرج گئی تھی کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے ۔ ان کے ساتھ جانا موجب ہلاکت ہے ، تم بدگمانی کا شکار رہے ۔ اللہ ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے متعلق تمہارے خیالات برے تھے ، اس لئے ہلاکت سے بچنے کے لئے تم نے ایسا کیا ۔ انہی بدگمانیوں نے رسول کا ساتھ دینے سے تم کو روکا ۔ دراصل تم تباہ حال اور برباد شدنی لوگ ہو ، ہلاکت سے اپنے بچانے کی تم نے تدبیر کی ، مگر ہلاک ہوئے (جس کو تم نے ہلاکت سمجھا وہ زندگی تھی اور جس کو سلامتی اور نجات سمجھا وہی ہلاکت و تباہی تھی)

بُورًا ۔ ہلاکت میں پڑنے والے ، ہلاک ہونے والے بعض علماء لغت نے اس کو عمان کی زبان کا لفظ قرار دیا ہے ۔

وَمَن لَّمْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر پختہ یقین نہ رکھے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو سچا رسول دل سے نہ مانے (اور دل میں ایمان نہ رکھتے ہوئے ظاہری طور پر مسلمان ہو جائے اور بے دلی سے اطاعت کا اظہار کرے ۔ ایسا شخص حقیقت میں کافر ہے اور کافروں کے لیے اللہ نے دوزخ کی بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ، مطلب یہ کہ ایمان کا مدار تو دل پر ہے ، ظاہر تو ایک علامت ہے جب دل میں یقین نہ ہو تو بظاہر گو وہ مسلم ہونے کا دعویٰ کر رہا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کو مسلمان مانتے بھی ہوں ، مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کافر ہے اور اس عذاب کا مستحق ہے جس عذاب کے مستحق دوسرے کافر ہیں ۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۔ یعنی اہل حق کی ظاہری کمزوری اور کافروں کی طاقت معیار فتح و شکست نہیں ۔ سارے جہان کی حکومت تو اللہ تعالیٰ کی ہے ۔ عالم بالا و پست میں اقتدار اسی کا ہے وہی جیسا چاہتا ہے کرتا ہے جس کو چاہتا ہے کامیاب بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا

ہے تباہ کرتا ہے

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ بخشنا اور عذاب دینا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ وہ بڑا غفور رحیم ہے کہ بندوں کی خطاؤں کو اپنی مہربانی سے بغیر کسی استحقاق کے (توبہ کے بعد) معاف کر دیتا ہے (اور کبھی بغیر توبہ کے بھی ان گناہوں کو معاف کر دیتا ہے جو ایمان کی حالت میں کئے گئے ہیں) اس آیت سے درحقیقت بدویوں اور صحرائی قبائل کو توبہ کی ترغیب اور ان کی مایوسی کو دور کیا گیا ہے کہ اب بھی توبہ کرلو اور پچھلی خطا کی معافی کی اللہ تعالیٰ سے بھی درخواست کرو وہ معاف کرے گا۔

یادداشت اگرچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عمومی اختیار کا اظہار کیا ہے۔ اور مغفرت و عذاب کو ایمان و عمل پر موقوف نہیں رکھا ہے جس سے بظاہر خیال ہوسکتا ہے کہ جب بخشنا نہ بخشنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، ایمان و عمل کو اس میں دخل نہیں بلکہ اس کے غفور رحیم ہونے کا پہلو قوی ہے تو پھر وہ کافروں اور مشرکوں کی بھی مغفرت کرسکتا ہے۔ ایمان لانے کی ضرورت ہی کیا ہے، لیکن آیت کا یہ مطلب سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنی مغفرت کو محدود کر دیا ہے اور فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ کو اختیار تو ہے جس کو چاہے بخش دے مشرک کو بھی وہ بخش سکتا ہے، مگر وہ مشرک کو معاف نہیں کرے گا اور باوجود اختیار کامل کے مشرکوں کی مغفرت نہیں کرے گا اور مشرکوں کے علاوہ دوسروں کی مغفرت کرے گا، مگر اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مومن گناہگار کے گناہ ضرور ہی معاف کئے جائیں گے۔ مومنوں کے گناہوں کو بخشنا نہ بخشنا اس کے اختیار میں ہے جس کو چاہے گا بخش دے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور بخشے گا تو اپنے ذاتی رحم کی وجہ سے بخشے گا کسی کا حق اس پر نہیں کہ استحقاق کی وجہ سے اس کو بخشا جائے۔ واللہ اعلم

مقصود بیان ایک پیشین گوئی جس سے اعجاز قرآن اور صداقت رسول ثابت ہو رہی ہے۔ راہِ خدا میں نکل کر جہاد نہ کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عمومی حکم ہوتے ہوئے مال، اولاد اور دنیوی مشاغل کو ستر راہ بنانے کی پرملال سافت اور مذمت۔ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ سنہ ھ میں بھی کچھ قبائل ایسے موجود تھے جو بظاہر مسلمان یا مطیع ہوگئے تھے، مگر ان کے دلوں میں ایمان نہیں جما تھا۔ آیات سے مخفی ہدایت مل رہی ہے اس امر کی کہ اہلِ حق کی کمزوری اور باطل کی قوت و شوکت دیکھ کر یہ نہ خیال کر لینا چاہیئے کہ اہلِ حق تباہ ہوجائیں گے۔ کفر میں کتنی ہی ظاہری مادی طاقت ہو، مگر حق کی طاقت پر اس کا غالب آنا اور اہلِ صداقت کو نابود کر دینا اس کے بس میں نہیں۔ مادی ضعف و قوت مدار شکست و فتح نہیں، ساری طاقت و حکومت اور سارا اقتدار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔ آخری آیات میں خطاروں کو توبہ و اخلاص کی پُرتلمیح پوشیدہ ترغیب ہے اور اہلِ ایمان کے لئے بشارت بھی کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے وغیرہ۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ

جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں وہ لوگ

اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ

یوں چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو بدل ڈالیں آپ کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے خدا تعالیٰ نے پہلے سے یونہی فرما دیا ہے تو وہ لوگ کہیں گے بلکہ

تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ

تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (۱۵) آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ

إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِن تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا

عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہوں گے کہ یا تو مسلسل لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جائیں سو اگر تم اطاعت

حَسَنًا ۖ وَإِن تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُم مِّن قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

کرو گے تو تم کو اللہ تعالیٰ ایک عوض (یعنی جنت) دے گا اور اگر تم (اس وقت بھی) روگردانی کرو گے جیسا اس سے قبل روگردانی کر چکے ہو تو وہ دردناک عذاب کی سزا دیگا

تفسیر

جن لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوتا وہ روا روی اور سطحی یقین نما گمان کے ہاتھوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان کا ایمان قولی ہوتا ہے اور کسی قدر عملی بھی، مگر ضمیری اور عزمی نہیں ہوتا، اسی لئے وہ جذبۂ خوف یا عاطفۂ طمع سے مغلوب رہتے ہیں۔ داعیۂ خوف ان کو بزدل اور پست ہمت بنا دیتا ہے اور جوشِ طمع مال و منال اور اہل و عیال کے نامناسب تحفظ یا غنیمت باردہ کے حصول پر ان کو آمادہ کرتا ہے۔ راہِ حق پر گامزن ہونے میں اگر ان کو جان و مال کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو خطرۂ موہومہ کا اندیشہ اور اہل و عیال اور زر و مال کی محبت ان کو راہِ حق پر چلنے سے روک دیتی ہے اور وہ اہلِ حق کا ساتھ نہیں دیتے، لیکن اگر خود جسمانی و جانی اور مالی نقصان کا ان کو اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ قطرۂ خون بہانے اور ضرر جسمانی اٹھانے کے بغیر ان کو غنیمت باردہ حاصل ہو جانے کا یقین ہوتا ہے تو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ اپنے حق پرست ہونے، حق پرستوں کا ساتھ دینے اور حق و صداقت کی پیروی کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بغیر تکلیف پائے مالِ مغنم کے حصول کا ان کو حق نہیں ہوتا۔ منفعت اندوزی کا استحقاق تو انہیں کو ہوتا ہے جو راہِ حق میں تحمل مشقت و مضرت کر چکے ہیں، اور آئندہ بھی حمایت حق میں برداشت مصائب کے لئے تیار ہوں۔ پر ہول حوصلہ شکن وادی اور با جلال پر شکوہ پہاڑ بھی راہِ حق پر چلنے سے ان کو نہ روک سکیں۔ پھولوں تک پہنچنا نوکیلے کانٹوں کے زخم کھائے بغیر ناممکن ہے۔ آب دار درِ شاہوار پانے کا حق انہیں کو ہوتا ہے جو سمندر کے اتھاہ قعر اور تلاطم خیز موجوں سے خوف نہ کھاتے ہوں۔ مشکوک الایمان، متردد یقین رکھنے والوں کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ حق کی حمایت و حفاظت کیلئے شدائد کی وادی پُرخار اور صحرائے پُرخار میں قدم رکھ سکیں۔ زمین دوز اور فلک پیما عزم رکھنے والے ہی حفاظت حق کر سکتے ہیں اور انہیں کو کامران و فلاح یاب کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدل دینا ناممکن ہے۔ وہ تھے منافق، پست ہمت، بزدل، لالچی لوگ۔ اگر ایمان کی پختگی اور عزم کی مضبوطی کے مدعی ہوں تو ان کے امتحان کی کسوٹی یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی گزشتہ بے عملی سے قطع نظر کر لیا جائے اور آئندہ کے لئے ان سے کہدیا جائے کہ گزشتہ شدائد و خطرات کو برداشت کرنے سے تم نے گریز کیا تھا، اس سے پیش نظر ثمرہ تر تو تمہارے حلق نہیں جا سکتا۔ یہ بے خطر غنیمت خنک تو انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے حق کی حفاظت و حمایت میں اپنی جانوں اور مالوں کو خطرات میں ڈالا تھا۔ خواہ اس معاملہ میں تم حاسد کہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حسد نہیں وعدہ الٰہی کی وفا اور ضابطۂ فطرت ہے، تم نافہم اور خوش وہم ہو کہ اس کو حسد قرار دیتے ہو۔ تمہارے قول اور دعوے کی سچائی کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ گزشتہ خطرات سے بڑھ چڑھ کر کچھ پُرہول واقعات آئندہ سامنے آنے والے ہیں۔ طاقتور باطل پرستوں اور پہلے سے زیادہ قوی دشمنوں سے دین کی حفاظت کرنی ہے۔ ایسے حالات میں تم ہمارا ساتھ دو، اہلِ باطل کا مقابلہ کرو، ان کی طاقت کو توڑ دو۔ اس کے نتیجہ میں جو منافع حاصل ہوں گے ان میں تم شریک ہو گے اور تم پر ظاہر ہو جائے گا کہ ہم تم سے حسد نہیں کرتے، لیکن اگر آئندہ امتحانی مواقع پر تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے اور سابق کی طرح کرو گے تو ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، ضرر تمہارا ہی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ تم کو فکر کی مار دے گا اور دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔

تحلیلِ اجزاء سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ ـــ یہ پہلی مذکورہ پیشین گوئی کا تتمہ اور جزو تکمیلی ہے

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے راستہ میں ہی مدینہ پہنچنے سے پہلے یہ بھی بتا دیا کہ حدیبیہ کو ساتھ نہ آنے والے قبائل اپنے ساتھ نہ آنے کی عذر تراشی کریں گے اور یہ بھی کہیں گے ..... الخ قرآن مجید کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی، حدیبیہ کو حضورؐ کے ساتھ نہ جانے والے قبائل نے یہ بات بھی کہی جس کا اظہار اس آیت میں کیا گیا ہے

حدیبیہ سے لوٹتے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے راستہ میں مسلمانوں کو ایک خوشخبری دی تھی کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ایک فتح اور مال غنیمت عنایت فرمائے گا، اس میں وہی لوگ شریک ہوں جو حدیبیہ میں ساتھ تھے۔ چنانچہ ذی الحج سنہ ۶ھ میں جب آپ مدینہ میں پہنچے تو شروع محرم سنہ ۷ھ میں خیبر پر چڑھائی کر دی۔ یہ سن کر حدیبیہ کو ساتھ نہ جانے والے قبائل غفار، مزینہ، اشجع وغیرہ حاضر ہوئے اور پچھلی غیر حاضری کو جھوٹی معذرت کرنے کے بعد خیبر کو ساتھ جانے کے خواستگار ہوئے۔ خیبر مدینہ سے شمال کی جانب چار منزل پر ہے۔ خیبر سے تیماء اور حجر بھی چار چار منزل ہے۔ خیبر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں یہودیوں کی ایک گڑھی تھی۔ باغ اور سرسبز کھیت بکثرت تھے، زمین شاداب تھی۔ عموماً آبادی یہودیوں کی تھی، یہودی مسلمانوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مشغول رہتے تھے اور مدینہ کے یہودیوں سے ان کی ساز باز تھی اور قریش سے بھی انہوں نے اندرونی معاہدہ کر چھوڑا تھا کہ اگر مسلمان آپ لوگوں پر چڑھائی کریں گے تو ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور اگر مسلمان ہم پر حملہ کریں تو تم مدینہ پر حملہ کر دینا۔ جب مسلمانوں کی قریش سے مصالحت ہو گئی اور نہ لڑنے کا تحریری معاہدہ ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی خیبر پر چڑھائی کر دی تاکہ وہ کانٹا نکل جائے جو مسلمانوں کے دلوں میں ہر وقت چبھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہودیوں میں مقابلے کی طاقت نہ تھی وہ تو سازشوں کے مرد تھے مرد نبرد نہ تھے۔

آیات کے مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن اعرابی قبائل نے حدیبیہ کو جانے میں اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور صحابہؓ کا ساتھ نہیں دیا وہ جب آپ کو اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کو خیبر کی جانب مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جاتے دیکھیں گے تو درخواست کریں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔ ہم (حدیبیہ کی جگہ) اس فوج کشی میں آپ کا ساتھ دیں گے (مصیبت کو دیکھ کر تو پیچھے ہٹ گئے اور مفت بے خطر مال دیکھ کر ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے) ان کا مقصد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے (اپنے رسولؐ کی زبانی) جو شرکاءِ حدیبیہ سے وعدہ کر لیا ہے کہ تم کو عنقریب فتح حاصل ہو گی اور مال غنیمت ملے گا تو وہ مال غنیمت میں شریک ہو کر اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو بدل ڈالیں اور اس میں ترمیم کر دیں، آپ ان کو ہرگز ساتھ نہ لینا اور ان سے کہہ دینا کہ (کٹھن وقت میں شریک ہونے سے تم نے گریز کیا اور اب ساتھ جانے کو تیار ہو گئے) ہم ہرگز تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتے (مال غنیمت کا وعدۂ الٰہی تو حدیبیہ والوں سے ہے، تم کو شریک ہونے کی اجازت نہیں) تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰهِ سے مراد عموماً علماء تفسیر کے نزدیک وہ وعدۂ غنیمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی معرفت شرکاءِ حدیبیہ سے کیا تھا اور اس میں تبدیلی کی خواہش کا یہ مطلب ہے کہ وہ چیز جو حسب کلام الٰہی صرف حدیبیہ والوں کے لئے مخصوص کی تھی۔ دوسرے قبائل بھی اس میں شریک ہو جائیں اور وعدۂ الٰہی کی خصوصیت ختم ہو جائے۔ ابن زید کے نزدیک کلام اللہ سے یہ آیت مراد ہے۔ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ الخ یعنی اے نبیؐ جب اللہ تعالیٰ آپ کو ان ساتھ نہ آنے والوں کے کسی گروہ کی طرف واپس لے جائے اور وہ جہاد کے لئے نکلنے کی تم سے اجازت مانگیں تو تم ان سے کہہ دینا تم میرے ساتھ ہرگز نہ چلنا اور میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے نہ لڑنا۔ تم وہی ہو کہ پہلی بار ہم سے پھڑ گئے رہے۔ ہمارے ساتھ نہیں گئے اور پیچھے رہ جانے میں ہی خوش رہے۔ ایسے ہمیشہ بیٹھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہو (کسی جہاد میں شریک ہونے کی تمہاری ضرورت نہیں۔

ابن زید کا یہ قول بقول شیخ ابن کثیر غلط ہے کیونکہ یہ آیت سورۂ براءت کی ہے جو غزوۂ تبوک کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے اور غزوۂ تبوک غزوۂ حدیبیہ سے بہت بعد کا ہے۔ مؤخر النزول آیات کی طرف مقدم النزول کلام میں اشارہ کیسے ہو سکتا ہے اور مقدم النزول بھی وہ جو برسوں پہلے نازل ہوا ہو۔

ابن جریج کا قول ہے کہ یہ منافق مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا کر جہاد سے باز رکھنا چاہتے تھے (یعنی خود تو جاتے ہی نہ تھے مسلمانوں کو بھی روک

لینا چاہتے تھے) ابن جریج کا یہ قول سیاقِ آیت کے خلاف ہے۔ صحیح تشریح وہی ہے جو عام علماء تفسیر نے کی ہے کہ وہ منافق مالِ غنیمت میں شرکت کے خواستگار تھے اور چونکہ کوئی خطرہ نہ تھا، اس لئے خود بھی ساتھ جانے کو تیار تھے۔

آپ ان سے کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ تم ہماری پیروی نہیں کرو گے اور ہمارا ساتھ نہیں دو گے، اس لئے ہم تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتے یا یہ مطلب کہ اللہ تعالیٰ حدیبیہ والوں سے پہلے وعدہ کر چکا ہے، اس لئے تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ اس پر وہ جواب دیں گے آپ لوگوں کو ہم سے حسد ہے (آپ کو یہ خیال ہو گیا کہ مالِ غنیمت میں یہ لوگ ہمارے شریک ہو جائیں گے، مگر تم اس جواب کی کچھ پرواہ نہ کرنا ان کا ایمان اور ارادہ جہاد کچھ نہیں) بلکہ یہ ناسمجھ ہیں (حقیقتِ ایمان و جہاد کو سمجھتے نہیں۔ ان کے نزدیک جہاد نام صرف مال لوٹنے کھسوٹنے اور مالدار بن جانے کا ہے۔ اشاعتِ دین اور رضائے الٰہی کے داعیہ سے ناواقف ہیں)

آپ ان سے کہہ دیں کہ تم کو جب ہمارے ہمراہ جانے اور جہاد کرنے کی دل سے خواہش ہے تو عنقریب تم کو ایک بڑی جنگجو طاقتور قوم سے جہاد کرنے کی دعوت دی جائے گی تم کو ان سے اس وقت تک لڑنا ہے کہ وہ اسلام لے آئیں (یا اطاعت گذار ہو جائیں) اگر تم ہمارا کہنا مانو گے اور ہمارے ساتھ مل کر لڑو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بہت اچھا اجر (دونوں جہان میں) عطا فرمائے گا اور اگر پہلے کی طرح کترا جاؤ گے اور رخ موڑ لو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک عذاب دے گا۔

وہ کون سی قوم ہے جس کو طاقتور اور جنگجو اس آیت میں فرمایا ہے اور ان سے لڑنے کی دعوت کی پیشین گوئی کی ہے۔ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی کے نزدیک قبیلۂ ہوازن، کسی کے نزدیک قبیلۂ ثقیف اور کسی کے نزدیک قبیلۂ بنی حنیفہ ساکن یمامہ یعنی مدعیٔ نبوت مسیلمہ کے ساتھی مراد ہیں، کسی نے رومی مراد لئے ہیں، کسی نے اہلِ فارس، کسی نے مشرک بت پرست۔ بعض کے نزدیک کوئی خاص جنگجو قوم مراد نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کرد مراد ہیں۔ کیونکہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم کو ایک ایسی قوم سے جہاد کرنا پڑے گا جس کی جوتیاں بالوں کی ہوں گی اور ایسی جوتیاں کرد ہی کی ہوتی ہیں۔ حضرت سفیان کے نزدیک ترک مراد ہیں۔ کیونکہ ایک مرفوع حدیث ہے کہ قیامت قائم نہ ہو گی جب تک تمہاری جنگ ایک ایسی قوم سے نہیں ہو گی جن کی آنکھیں چھوٹی، ناکیں بیٹھی ہوئی اور چہرے ڈھال کی طرح چپٹے ہوں گے اور یہ حلیہ ترکوں (یعنی چینیوں) کا ہوتا ہے۔ پانچواں قول مجاہد، عطاء خراسانی اور ابن ابی لیلیٰ کا ہے۔ چوتھا قول کعب الاحبار حسن بصری کا ہے۔ اول اور دوم قول سعید بن جبیر کا ہے۔ تیسرا قول زہری اور مقاتل کا ہے اور حضرت ابن عباس بھی اسی کے قائل تھے۔

ایک کمزور روایت میں آیا ہے کہ ابن عباس کے نزدیک اہلِ فارس و روم مراد ہیں، جن لوگوں کے نزدیک قبائل ثقیف و ہوازن مراد ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے طاقتور اور قدر انداز تھے اور عرب کے باشندے تھے اور عرب کے کافروں ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ ان سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یا جنگ یا اسلام دو ہی چیزیں ان کے لئے رکھی گئی ہیں اور اس جگہ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فرمایا ہے۔ لہٰذا غیر عرب مراد نہیں ہو سکتے اور عربوں میں بھی صرف ہوازن و ثقیف مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد انہی قبائل پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لشکر کشی کی تھی۔ فتح مکہ سے فراغت کے بعد انہی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

جن لوگوں کے نزدیک اہلِ یمامہ مراد ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ عرب میں مسلمانوں کے سب سے زیادہ طاقتور دشمن مسیلمہ کے ساتھی تھے۔ ان کی تعداد بھی بہت تھی اور ان کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اور اسلام کو خطرہ بھی بہت بڑا تھا۔ آخر ان میں ایک جھوٹا مدعیٔ نبوت موجود تھا جس نے لاکھوں مریدوں کا حلقہ بنا رکھا تھا۔ اس کے خلاف جہاد کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کی تھی، مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ اس وقت قبائل عرب سے فوجی مدد لینے کی ضرورت بھی تھی اور آپ نے مسلمانوں کو شرکتِ جہاد کی دعوت بھی دی تھی۔

اہلِ فارس و روم مراد لینے کی طرف اکثر علماء کا میلان ہے۔ آیت کا رخ عرب دشمنوں کی طرف نہیں ہے اور ان دشمنوں سے مراد

اسلام لانا نہیں ہے بلکہ اطاعت گزار ہو جانا مراد ہے۔ یعنی اس وقت تک ان سے لڑنا کہ وہ اطاعت گزار اور مغلوب ہو جائیں۔
کرد اور ترک تو بہر حال مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ ان سے جنگ بہت مدت کے بعد ہوئی ان کے جہاد میں شریک ہونے کی دعوت ان عرب قبائل کو نہیں دی جا سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ ہاں رومیوں اور ایرانیوں سے جنگ خلیفۂ اول و دوم کے زمانہ میں بہت پر زور ہوئی اور عام مسلمانوں نے ان جہادوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا اور ہر قبیلہ شریک ہوا۔ رہے بنی ثقیف و ہوازن تو گو وہ بہادر تھے اور تیر انداز بھی تھے، مگر ایسے نہیں تھے کہ ان کو قرآنی زبان میں بڑی جنگجو اور طاقتور قوم کہا جاتا۔ یہ قوم تو یقیناً کوئی ایسی ہونی چاہیے جو بڑی طاقتور، کثیر التعداد اور سامانِ جنگ سے آراستہ ہو، اس لئے یا مسیلمہ کے کثیر التعداد ساتھی مراد ہیں یا رومی یا ایرانی۔ رومی اور ایرانی مراد لینا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم بمرادہٖ۔

مقصودِ بیان ایک پیشین گوئی کے اندر دوسری پیشین گوئی۔ پہلے فرمایا تھا کہ تم لوگ مدینہ پہنچ گے تو اعرابی قبائل والے جھوٹی معذرتیں پیش کرنے کے لئے آئیں گے اور اہل مال کے مشاغل کو جہاد میں شریک نہ ہونے کا سبب قرار دیں گے۔ وہ جھوٹے ہوں گے تم ان کی بات کا اعتبار نہ کرنا اور ان سے کہہ دینا کہ تم کو ہماری شکست کا یقین تھا اور اپنی جانوں کا خطرہ تھا، اس لئے تم شریک نہ ہوئے پھر یہاں ایک پیشین گوئی اور کی اور فرمایا کہ آئندہ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے خیبر کو جاؤ گے تو وہ شریک ہونے اور ساتھ جانے کی تمنا کریں گے۔ تم ان کو ساتھ نہ لے جانا۔ اسی پیشین گوئی کے اندر ایک مزید پیشین گوئی یہ کی کہ ایک سخت جنگجو طاقتور قوم سے تمہارا مقابلہ ہو گا تم ان قبائل کو اس جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دینا وہ مان لیں گے تو ان کے لئے بہتر ہو گا ورنہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ یہ سخت مقابلہ بھی ہوا۔ یمامہ یا روم یا فارس والوں کے ساتھ یہ لڑائی ہوئی اور قبائل کو اس میں شریک کیا گیا اور ان کو اخروی منافع کے ساتھ دنیوی منافع بھی ملے۔ ان آیات میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ایمان کی کسوٹی راہِ حق میں مصائب کو برداشت کرنا ہے یعنی جو مصائب برداشت نہیں کر سکتا اس کا ایمانی دعویٰ غلط ہے وغیرہ۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ

نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور جو شخص اللہ اور

وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ

رسول کا کہنا مانے گا اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو شخص (حکم سے) روگردانی کرے گا اس کو دردناک عذاب کی سزا ہو گا۔

تفسیر گو عقلاً درست ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ناقابل برداشت احکام کی تعمیل کا حکم دیدے، لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے صرف انہیں احکام کا پابند بنایا ہے جو قابلِ برداشت ہوں۔ اضطرار اور مجبوری کے وقت کوئی حکم باقی نہیں رہتا، لیکن یاد رکھو کہ مجبوری ہر حیلہ بہانہ کا نام نہیں۔ شدت اور سختی سے ڈر کر آسانی کی طرف دوڑنا اور معمولی دشواری کو اضطراری کا درجہ دینا جائز نہیں۔ کمائی کے کم ہونے کا اندیشہ اور اہل و عیال کی محبت فریضہ مذہب ادا کرنے سے مانع نہیں ہو سکتی۔ بیوی بچوں کی محبت اور تجارت زراعت میں مشغولیت کو عدم ادائے فرض کا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ معمولی زکام کھانسی کی وجہ سے نہ روزہ چھوڑا جا سکتا ہے نہ نماز ترک کی جا سکتی ہے، انسان سہولت طلب اور حیلہ جو ہے معمولی حادثہ کو بھی ترک فرائض کا بہانہ بنا لیتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ترک کرنے کے لئے بہت سے حیلہ تراشیاں کرتا رہتا ہے جو عقلاً صحیح ہیں نہ شرعاً۔ ہاں اگر کوئی واقعی معذور ہے مجبور ہے، ادائے فرض کر ہی نہیں سکتا۔ اس میں استطاعت ہی نہیں کہ فرض ادا کرے۔ پاؤں نہیں کٹڑا ہو کر نماز کیسے ادا کرے، بول نہیں سکتا یا گونگا ہے، نابینا

قرات کیسے کرے، اگر تختہ ہو گئی ٹھیک نہیں سکتی تو رکوع و سجود کیسے کرے، مال نہیں تو زکوٰۃ کس کی دے اور غریبوں کی پرورش کیسے کرے راستہ خطرناک ہے یا سواری دستیاب نہیں ہوتی تو ہزاروں میل کا سفر کر کے حج کیسے کرے، نابینا، لنگڑا، لولا، مدقوق، اپاہج اور اسی طرح کے دوسرے مجبور مریض بعض قسم کے فرائض کو ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پہ کوئی تنگی نہیں، جبر نہیں کہ نہ کر سکتے ہو پھر بھی کرو۔ یہ تکلیف مالایطاق ہے جو اللہ نے کسی پر نہیں ڈالی۔

لیکن بایں ہمہ کوئی شخص بھی خواہ وہ کتنا ہی معذور ہو جذبۂ اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ بقدر توفیق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ضروری ہے۔ اصل بنیاد اور مقصد تو جذبۂ اطاعت اور امکانی اطاعت ہے ناممکن عمل مقصود نہیں۔ پس جو شخص جذبۂ اطاعت کے زیر اثر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ جنت یاب ہوگا اور جو اطاعت سے کترائے گا اور منہ پھیرے گا جہنم میں جائے گا اور دردناک سزا پائے گا۔ حاصل کلام یہ کہ لنگڑا، اپاہج، اندھا اور دوسری قسم کا مجبور بیمار اگر جہاد میں شرکت نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔ وہ صاحب استطاعت ہی نہیں اور ہٹے کٹے بھلے چنگے غیر معذور نامجبور لوگ بیوی بچوں اور تجارت کو جہاد سے غیر حاضری کا بہانہ نہیں بنا سکتے۔

تحلیلِ اجزاء لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ — اللہ تعالیٰ کسی پر تکلیف مالایطاق نہیں ڈالتا اور نہ ناقابل برداشت فریضہ کسی پہ عائد کرتا ہے، اس لئے جہاں اس نے جھوٹی عذر تراشیوں اور بہانہ سازیوں کو قابل قبول قرار نہیں دیا وہاں فطری معذوریوں اور مجبورکن حالتوں کی موجودگی میں ادائے فرض کا حکم بھی نہیں دیا۔ گزشتہ آیات میں سفر حدیبیہ میں ساتھ نہ دینے والوں کی جھوٹی معذرت کوشیوں کو رد فرما دیا اور قبول نہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس آیت میں قابل قبول مجبوریوں کا ذکر فرما دیا اور جہاد سے پیدائشی یا عارضی اندھے اور لنگڑے یعنی نہ چل سکنے والے لنگڑے کو معذور قرار دیا اور فرما دیا کہ نہ اندھے پر کوئی تنگی ہے نہ لنگڑے پہ کہ جانہ سکیں کام نہ کر سکیں پھر بھی جہاد پر جائیں۔ یہ مستقل عذر ہیں جن کا زوال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس کے بعد بیمار کو بھی غیر مکلف قرار دیا یہ عذر عارضی ہے صحت و طاقت حاصل ہونے کے بعد بیمار بیمار نہیں رہتا۔ بیماری عارضی چیز ہے۔ بیماری سے وہ بیماری مراد ہے جو ادائے فرض سے مانع ہو۔ ہر بیماری مراد نہیں کہ زکام ہوا چھینک آئی اور بیماری کا عذر کر کے ادائے فرض سے منہ موڑ لیا۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ غرض کلام یہ ہے کہ اصل جذبۂ اطاعت ہے جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی (امکانی) اطاعت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا یعنی اگر عملی اطاعت ممکن ہو تو عملی اطاعت لیسے اور عمل کا امکان نہ ہو، مجبور اور معذور رہو جیسے لنگڑا، اندھا، لولا، بیمار وغیرہ تو قلبی اور ذہنی اطاعت لازم ہے۔ اطاعت سے انکار اور سرکشی جائز نہیں اور نہ عملی اطاعت کی طاقت رکھتے ہوئے ترک اطاعت درست ہے ورنہ اللہ تعالیٰ دردناک عذاب دے گا۔ یعنی آخرت میں سخت اذیت رساں سزا دے گا۔

مقصودِ بیان لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی میں فطری، قدرتی یا خود آوردہ مستقل اور عارضی مجبوریوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تکلیف مالایطاق نہیں دیتا۔ اسی کی تائید آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا سے ہوتی ہے۔ پھر مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ غیر مجبور انسان عمل کا مکلف ہے۔ جذبۂ اطاعت اور امکانی اطاعت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ اسی کی تائید آیت لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی سے ہو رہی ہے وغیرہ۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَ

بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت (سمرہ) کے نیچے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا

السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ

پس اللہ تعالیٰ نے اُن میں اطمینان پیدا کر دیا اور انکو ایک لگتے ہاتھ فتح دیدی اور (اُن فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور

عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ

اللہ تعالیٰ بڑا زبردست بڑا حکمت والا ہے اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے سو سردست تم کو یہ دیدی ہے اور لوگوں کے ہاتھ تم

النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَ

سے روک دیئے اور تاکہ یہ (واقعہ) اہل ایمان کے لئے ایک نمونہ ہو جائے اور تاکہ تم کو ایک سیدھی سڑک پر ڈال دے اور ایک

أُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

فتح اور بھی ہے جو تمہارے قابو میں نہیں آئی خدا تعالیٰ اس کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے

تفسیر جن لوگوں کی نیتیں خالص ہوں، ارادوں میں اخلاص ہو، زبانی اعتراف حق کے اندر حمایت حق و اہل حق کے لئے جانی اور مالی قربانی کا جذبہ جھلک رہا ہو، ایمان کی روشنی فکر و عمل کی طاقتوں کو روشن کر رہی ہو ایسے لوگوں کو اگر جان اور مال کی قربانی پیش کرنے کا موقع ملا بھی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان کی جانوں اور مالوں کو محفوظ رکھا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص ایمان اور صفائی نیات کا قدردان ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں اطمینان اور روحوں میں سکون پیدا کر دیتا ہے اور عملی امتحان کے بغیر ہی دنیوی نعمتوں سے نواز دیتا ہے۔ اگر ضابطۂ حکومت نے نتائج کو جد و جہد سے وابستہ کیا ہے۔ اور محنت ثمرات پیدا کرتی ہے، لیکن یہ بھی فطرت ہی کا تقاضہ ہے کہ عالی حوصلہ بلند ہمت اللہ پر کامل بھروسہ کرنے والے اور حمایت حق کے لئے جان و مال کی قربانی کا عزم راسخ رکھنے والے اگر عمل کا آغاز ہی کریں اور حد اختتام تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئے تب بھی کامران و فائز المرام ہو جاتے ہیں۔ جیسے مخلص النیۃ صحابہ جو راسخ الایمان اور جانی و مالی قربانی دینے کا محکم عزم رکھتے تھے اور بدر و احد کے تجربوں نے ان کے اخلاص و جذبۂ صادق کا ثبوت اور ناقابل انکار ثبوت پیش کر دیا تھا، جب حدیبیہ کی بیعت جہاد میں شریک ہوئے اور انہوں نے آخری فیصلہ کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست حق نما پر معاہدہ کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے امتحان قتال میں مبتلا کئے بغیر ان کو فتح سے ہم آغوش کر دیا اور حدیبیہ کا معاہدۂ صلح ہو گیا جو حقیقت میں ہر ایک کی فتح کی دوسری فتوحات کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد اللہ تعالیٰ نے خیبر کی فتح عنایت کی، مسلمانوں کو بڑی بڑی شاداب اور سرسبز زمینیں اور پُر ثمر باغ ہاتھ آئے۔ مال غنیمت بغیر لڑے بھڑے اور بغیر قطرۂ خون بہائے اتنا اللہ تعالیٰ نے عطا کیا کہ نادار زردار بن گئے اور نان شعبینہ کو محتاج غنی ہو گئے اور مسلمانوں کے لئے آئندہ کے واسطے کسی قدر مستقل معاشی انتظام ہو گیا اور یہ ہی نہیں بلکہ فتح خیبر پیش خیمہ اور تمہید بن گئی آئندہ فتوح کی۔ مختلف قبائل کا اسلام کا حلقہ بگوش ہو جانا مکہ حنین و ثقیف اور یمن و یمامہ کی فتوحات اسی حدیبیہ کی صلح اور خیبر کی فتح و غنائم کے خوشگوار پھل تھے۔

تحلیل اجزاء لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ۔ ابن جریر اور بعض دوسرے اصحاب روایت کا مفصل بیان جس کا تعلق حدیبیہ کے واقعہ سے ہے، ہم نے اوپر ذکر کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پیام صلح دے کر ملہ مکہ کو بھیجا تھا اور یہ کہلوایا تھا کہ ہمارا مقصود

صرف عمرہ کرنا ہے - لڑائی کے لئے ہم نہیں آئے، قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روک لیا جس کی وجہ سے افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید کر دیئے گئے ۔ یہ خبر سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا "اب تو قریش سے آخری فیصلہ ہی کرنا ہوگا" اس کے بعد آپؐ نے تمام مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے اور ساتھ چھوڑ کر منہ موڑ کر بھاگ نہ کھڑے ہونے کا وعدہ لیا اور ہر ایک نے آکر اپنا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر رکھا اور زبان سے اقرار کیا - (ہاتھ پر ہاتھ رکھنا وعدہ کے استحکام کی علامت تھی - آج کل تو ہاتھ ملانے کی ایک رسم ہوگئی ہے - ذرا ذرا سے معاملے میں نوجوان باہم ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے ، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ایسی بیعت کسی اہم کام ہی کے سلسلے میں کی جاتی تھی) - تیرہ چودہ سو آدمیوں نے بیعت کرلی ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا - اور ارشاد فرمایا " یہ عثمانؓ کی بیعت ہے " اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی فقط افواہ ہی تھی ، حضورؐ کو اس خبر پر یقین نہ تھا ، بلکہ خیال غالب یہی تھا کہ آپ زندہ ہیں - جب ہی تو حضرت عثمانؓ کی طرف سے خود حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر اس کو بیعتِ عثمانؓ قرار دیا ، شہید سے بیعت لینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں - بات یہ تھی کہ قاصد کو قید کرلینا قریش کی جنگ کی نیت کی غمازی کر رہا تھا - اندازہ ہو رہا تھا کہ قریش لڑنا ہی چاہتے ہیں ، اسی لئے بنظر احتیاط حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے وعدہ جدید لیا - پہلے تو عمرہ کے ارادے سے آئے تھے لڑائی کا احتمال ہی نہ تھا - اب چونکہ جنگ کا احتمال قوی ہو گیا تھا اس لئے مسلمانوں سے جہاد کی بیعت لینی تھی تاکہ جو شخص ساتھ چھوڑ کر جانا چاہے وہ الگ ہو جائے اور مخلص مومن حق کے حامی اور حق پرستوں کے مددگار اور جان و مال کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرنے والے صادق الایمان لوگ چھٹ کر سامنے آجائیں - وقت بڑا سخت اور معاملہ بڑا اہم تھا لڑنے کا سامان اتنا کم تھا کہ گویا کچھ بھی نہ تھا - مدینہ سے لڑائی کا ارادہ کرکے تو آئے ہی نہ تھے نہ روانگی کے وقت سامانِ جنگ ساتھ لیا تھا - اب بے دریغ قربانی کا وقت آگیا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق جوق در جوق اہلِ صداقت ، بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے اور ایک شخص کے علاوہ سب نے ہی جان کی قربانی دینے کا پختہ عزم کرلیا - بدر کے بعد مسلمانوں پر ایسا کوئی خطرناک وقت اور خوفناک موقع نہیں آیا تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے لئے جانوں کی بازی لگا دینی پڑی ہو - قریشؓ کا زور ان کی عددی اور عُددی (تیاری اور سامانِ جنگ) کثرت و قوت ہر طرف سے کمک ملنے کا یقین ادھر وطن سے سینکڑوں میل دور مسلمانوں کی نہتی جماعت جس کو کسی طرف سے امداد ملنے کا احتمال بھی نہ ہو ایسی حالت میں تو اچھے اچھوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں ، مگر اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر طاقت اور محیطِ کل قدرت پر ہر فرد مومن کو کامل یقین تھا اور رسالت کے رسولؐ کو مسلمان واقعی اللہ تعالیٰ کا نمائندہ مانتے تھے ، اس لئے ان کے ثباتِ قدم میں لغزش نہیں آئی اور بڑی جرأتِ ایمانی کے ساتھ سب نے جانیں لڑا دینے کا وعدہ کرلیا ، گو یہ بیعت میدانِ جنگ سے فرار نہ ہونے کے لئے لی گئی تھی ، لیکن میدان سے فرار نہ ہونے کے کوئی معنی سوا اس کے نہ تھے کہ دفاعی جہاد کریں گے اور لڑتے لڑتے مارے جائیں گے ، مگر میدان سے منہ نہیں موڑیں گے ۔ (اپنی طرف سے لڑنے کا ارادہ نہ کرے چونکہ آئے ہی تھے صرف عمرہ کرنا مقصود تھا ، اس لئے اقدام جنگ کی کسی کی نیت نہ تھی ۔ یہ حرمِ آمنہ کی تھی کہ اقدام اور جارحانہ پیش قدمی نہ کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین کو جس کو حرم بنا دیا گیا ہے خود بھی نہ قرار دے لیا جائے - ابتدا قریش کی طرف سے ہو اور پھر وہ ہی حملہ بھی کریں تب بھی کوشش یہی کی جائے کہ حرم میں خون نہ بہایا جائے - چنانچہ ابتدائی چھیڑ چھاڑ میں جب ایک مسلمان کو قریش کے ایک دستہ نے شہید کر دیا اور تیس چالیس قریشی گرفتار ہو کر پیش ہوئے تب بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انتقام نہ لیا اور حسبِ ہدایت رسولؐ مسلمان بھی مشتعل نہیں ہوئے اور آپؐ نے سب کو رہا کر دیا ، ایسی جنگ کہ خود موت کے مونہہ میں ہوں اور خود اقدام قتل سے بقدر امکان پرہیز رکھیں بہت کڑی بیعت تھی ، مگر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ایمان پر قائم اور حکم رسولؐ کی تعمیل پر ثابت قدم رکھا - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کو غزوۂ بدر کی طرح اہمیت دی - باوجود یکہ اس میں جنگ نہیں ہوئی اور بدر میں عظیم الشان رن پڑا ، ملائکہ بھی غیب سے امداد کے لئے مامور کئے گئے - یہاں پر یہ آزمائش بھی تھی صرف قولی حد تک محدود رہی اس عملی اور فعلی امتحان سے علم نہیں قرار دی گئی اور اہلِ بدر کو جس مرتبہ پر فائز کیا گیا اور صراحت کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی ان کے مرحوم و مغفور ہونے کی بشارت دے دی اور بار بار دی ۔

چاہو کرو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری مغفرت کر دی ہے۔ اسی طرح بیعت حدیبیہ میں شریک ہونے والوں کے متعلق بھی اپنی خوشنودی کی بشارت سنادی اور فرمادیا اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہوگیا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

الشجرۃ کوئی خاص درخت تھا۔ یہ وہی کیکر کا درخت تھا جو حل و حرم کی سرحد پر تھا جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فروکش تھے۔ حسب روایت بخاری وہ درخت بھلادیا۔ لوگ متبرک سمجھ کر وہاں آنے لگے تھے۔ ہوتے ہوتے اس کی پرستش ہونے لگتی، اسلئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ذہنوں سے اس کی یاد ہی بھلا دی۔ حضرت سعیدؓ کے والد حضرت مسیبؓ کو بھی وہ درخت نہیں ملا۔ حضرت جابرؓ نے نابینائی کی حالت میں لوگوں سے کہا تھا۔ اگر میں بینا ہوتا تو وہ جگہ بتا دیتا جہاں شجرۂ رضوان تھا، لیکن یہ آپ کا صرف ذہنی استحضار تھا۔ اور اسی حضور ذہنی کی وجہ سے آپ نے یہ الفاظ فرمائے ورنہ واقع میں کسی کو بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ درخت کون سا تھا۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے تو یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ درخت کٹوادیا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ آغاز سورۃ کی دوسری آیت میں فرمایا تھا۔ هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ۔ اسی مضمون کو اس آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو مومنوں کے دلوں کی حالت معلوم تھی وہ ان کے پختہ ایمان اور لازوال اخلاص سے واقف تھا اور ان کے ایمان میں مزید استحکام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ان کا علمی ایمان وجدانی یقین تک تو پہنچ ہی چکا تھا، لیکن حق الیقین کے درجہ پیمان کو پہنچا تھا، اس لئے اس نے بیعت رضوان کا حکم دیا اور مادی اسباب کے بھروسے سے ان کو بالکل بے نیاز کر کے وہ اعتماد اور اطمینان دلوں میں بفیضان غیبی نازل فرمادیا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے ہر بیرونی مدد سے یہاں تک کہ اپنی جانوں سے بھی مونہہ موڑ لیا اور اللہ تعالیٰ کا امدادی ہاتھ ان کو دست رسول کی شکل میں نظر آنے لگا اور بے تامل و بے دریغ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مخفی ہاتھ کو پکڑ لیا اور ایسا پکڑا کہ کوئی طاقت پھر ان کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کو جدا کرنے والی نہ تھی۔ اسی گرفت اور نزول اطمینان کا یہ نتیجہ نکلا کہ باوجود انتہائی بے بضاعتی اور مادی اسباب کے فقدان کے اللہ تعالیٰ نے اس بیعت رضوان کے وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا عوض میں فتح قریب عطا کردی یا عطا کر دیئے کا حکم جاری کر دیا۔ اس جگہ وَأَثَابَهُمْ اور آئندہ آیت میں فَعَجَّلَ لَكُمْ دونوں جگہ فتح قریب عطا کرنے کا اظہار بصیغۂ ماضی فرمایا تھا اور آغاز سورت میں بھی إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ بصیغۂ ماضی فرمایا تھا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ آغاز والی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فتح عنایت کرنے کی صراحت کی اور أَثَابَهُمْ، فَعَجَّلَ میں مسلمانوں کو فتح سے سرفراز فرمانے کا ذکر کیا۔ ظاہری صیغوں کو پیش نظر رکھ کر کچھ علماء نے کہا ان تینوں آیات میں فتح سے مراد ہے صلح حدیبیہ اور صلح حدیبیہ ظاہر میں اگرچہ مصالحت کی مغلوبانہ شکل نظر آرہی تھی، لیکن وہ پیش خیمہ تھی فتح خیبر کی اور دوسری فتوحات کی اور کافروں کے باہم معاہدگروہوں میں اس سے تفریق ہوگئی تھی، خیبر کے یہودی قریش مکہ سے کٹ گئے تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ایک سال کے لئے قریش مسلمانوں کے ہم معاہدہ ہوگئے تھے، اس لئے اس کو فتح مبین فرمایا، لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ ماضی کے صیغے ایسے موقع پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں جہاں مستقبل میں آنے والی چیز یقینی الوقوع ہو۔ فتح خیبر چونکہ عنقریب یقینی طور پر حاصل ہونے والی تھی، اس لئے ہونے والی فتح کو عطا شدہ فتح فرمایا اس بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان آیات کا نزول تو مدینہ کو پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں ہوگیا اور فتح خیبر تو چند ماہ بعد ہوئی، اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ اس جگہ مستقبل کو بصیغۂ ماضی (یقینی الوقوع ہونے کی وجہ سے) بیان کیا گیا ہے۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہر چیز حاضر ہے۔ نہ وہاں کوئی ماضی ہے نہ مستقبل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم جب نافذ ہوگیا تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ہزار برس بعد کو آنے والا واقعہ بھی ہوگیا۔ قیامت آئندہ ہوگی ابھی نہیں ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم جاری ہو چکا ہے، اس لئے قیامت آگئی اور اس کے وقوع کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا صحیح ہوگیا۔ پس أَثَابَهُمْ فَتْحًا اور فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ دونوں سے مراد حدیبیہ کی صلح کے علاوہ خیبر کی فتح ہے اور یہ استعمال کلام الٰہی ہونے کے اعتبار سے غیر حقیقی نہ ہوگا۔ اگرچہ ہم اس کو مجازی استعمال اپنے محاورات کے لحاظ سے کہیں گے۔

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا۔ اس سے خیبر کی کھیتیاں، باغ، جانور اور نقد وجنس مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو جو حدیبیہ میں شریک تھے مفت بلا جنگ کے عطا فرمایا تھا اور کوئی جدید مسلمان اس میں شریک نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ کثرت غنائم شرکاء حدیبیہ ہی کو دیئے جائیں اور کوئی دوسرا ان کا شریک نہ ہو، چونکہ سلسلۂ کلام صرف شرکاء حدیبیہ سے تعلق رکھتا ہے عام مومنوں کی حالت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جو لوگ اس سفر میں شریک نہ ہوئے اعراب اپنے گھروں میں رہ گئے تھے ان کی سرزنش اور تنبیہ اور خیبر میں شامل ہونے کی یادداشت اور یہ آیات بیان ہو چکی ہے، اس لئے شرکاء حدیبیہ کے علاوہ ان مغانم کثیرہ میں شرکت کرنے کا حق نہیں تھا جن کے عطا ہونے کا ذکر اس مذکورہ فقرہ میں ہے۔ يُبَايِعُوْنَكَ۔ قُلُوْبِهِمْ۔ عَلَيْهِمْ۔ يَاْخُذُوْنَهَا سب غائب کی ضمیریں شرکاء حدیبیہ کے لئے ہی استعمال کی گئی ہیں۔ اس لئے بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فقرہ میں مغانم کثیرہ سے مراد خیبر کا مال غنیمت ہی ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ عطا فرمایا تھا۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ آغاز سورت میں دوسری آیت کے خاتمہ پر فرمایا تھا۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اور اس جگہ بجائے عَلِيْمًا کے عَزِيْزًا فرمایا باقی الفاظ وہی ہیں۔

اس اسلوب بیان کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی آیت میں آسمان اور زمین کے تمام غیبی لشکروں کو اپنے علم اور تصرف میں ظاہر کیا گیا تھا لیکن غیبی علم و تصرف کا آئندہ ہونے والا ظہور اس وقت ظاہر نہیں ہوا تھا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں اس کی ہر حکمت و مصلحت تھی اور اب جبکہ خیبر کی فتح عطا کر دی اور مال غنیمت عنایت کر دیا تو اس غیبی لشکر پر باری تعالیٰ کے تصرف کا ظہور ہو گیا کہ مسلمانوں کے لڑنے کے بغیر اس نے اس بیش بہا اور ان گنت نعمت سے سرفراز فرما دیا، اس لئے وہاں عَلِيْمًا فرمانا مناسب تھا اور یہاں عَزِيْزًا فرمانا اور چونکہ غیبی لشکروں پر قبضہ و تصرف ہو یا اس تصرف کا عملی ظہور دونوں حکمت کے زیر اثر ہیں، اس لئے حَكِيْمًا دونوں جگہ ذکر کر دیا۔ واللہ اعلم۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ یہ خطاب تمام صحابہ کو ہے جن کے اندر شرکاء حدیبیہ بھی داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اہل ایمان سے وعدہ کیا تھا کہ جب تم ایمان پر قائم اور اللہ و رسول کے احکام کے پابند رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو فتوحات عطا فرماتے گا اور بکثرت مال غنیمت تمہارے ہاتھ آئے گا، ان غنائم سے مراد ہیں ملک عرب کی داخلی فتوحات جن میں خیبر، فدک، حنین، ثقیف، مکہ مکرمہ، یمامہ، یمن سب ہی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب ممالک کے فتح ہونے اور ان سے مال غنیمت حاصل ہونے کا وعدہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مصالحت حدیبیہ کے بعد چند ماہ کے اندر ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیبر کا مال عطا فرما دیا۔ وہاں کی سب زمینیں کھیتیاں اور باغات مسلمانوں کے ہو گئے۔

فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ سے فتح خیبر کی طرف اشارہ ہے جو فوراً اللہ تعالیٰ نے عنایت کر دی۔ خیبر کا مال غنیمت اگرچہ صرف شرکاء حدیبیہ کو ملا تھا، لیکن بحیثیت قوم مسلمانوں کی عام جماعت کو اس سے سیاسی، معاشی اور مذہبی استحکام ملا تھا۔ اس لئے پوری جماعت کو خطاب کر کے ممنون کرم بنایا۔

وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ اور لوگوں کے ہاتھ تمہاری طرف سے باز رکھے۔ ان کے ہاتھوں کو روک دیا کہ وہ تم پر حملہ نہ کر سکے۔ بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ لوگوں کے ہاتھ روک دینے سے مراد یہ ہے کہ خیبر کے یہودیوں کے ہاتھ روک دیئے کہ وہ تم سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ بعض علماء نے کہا کہ قریش کے ہاتھ روک دینے سے مراد یہ ہے کہ قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

صحیح یہ ہے کہ بظاہر حدیبیہ کے درمیان مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ نہ ہونے دینے کا بیان تو آئندہ آیت وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ موجود ہے، اس لئے صرف اس کی طرف تو اس جگہ اشارہ ہو نہیں سکتا۔ ہاں خیبر کے یہودیوں کے ہاتھ باندھنے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ سے مراد چونکہ فتح خیبر ہے، اس لئے قرینہ کا تقاضہ ہے کہ اسی فتح کی تکمیلی شکل بتائی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو مال غنیمت بطور غنیمت عطا کیا اور وہاں کے رہنے والوں کے ہاتھوں کو لڑنے سے روک دیا۔ وہ لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔

اس فقیر کی نظر میں وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ کے مفہوم کو آزاد ہی رکھا جائے تو الفاظ کے اطلاق کے موافق ہوگا۔ صاف مطلب

یہ ہے کہ کافروں کے بد ارادوں کو اللہ تعالیٰ نے پورا نہ ہونے دیا۔ نہ مکہ کے کافروں کے نہ خیبر کے یہودیوں کے کہ مسلمان جب اہل مکہ سے لڑیں گے تو یہودی مدینہ منورہ کے اندر مسلمانوں کے بال بچوں پر حملہ کر دیں گے اور خیبر پر مسلمان چڑھائی کریں گے تو قریش آکر مدینہ پر حملہ کر دیں گے کسی کا بھی اللہ تعالیٰ نے بُرا ارادہ پورا نہ ہونے دیا بلکہ مدینہ منورہ کے ان منافقوں کے بھی ارادے پورے نہ ہوئے جو حدیبیہ کے موقع پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ اُدھر مسلمانوں کو شکست ہوگی اِدھر ہم مدینہ منورہ کے اندر ان کے بال بچوں پر حملہ کر دیں گے۔ کسی گروہ کی تمنا پوری نہ ہوئی اللہ تعالیٰ نے سب کے ہاتھ باندھ دیئے اور حوصلے پست کر دیئے۔

وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کافروں کے ہاتھوں کو مسلمانوں کی طرف سے روکا اور مسلمانوں کو غنیمت اور فتح ارزانی فرمائی اس سے وعدہ الٰہی تو پورا ہو ہی گیا اور مسلمانوں کو مالی معاشی سیاسی اور مذہبی طاقت حاصل ہو ہی گئی۔ اس کے ساتھ یہ مقصد بھی تھا کہ مسلمانوں کے لیے غیبی قدرت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صداقت کی ایک واضح نشانی ہو جائے کہ باوجود قلت تعداد اور بے سرو سامانی کے اور باوجود دشمنوں کی طاقت کی فراوانی اور عددی کثرت کے اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ رسول برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا کرم ہے اور اللہ کی غیبی قدرت ظاہری اسباب مادیہ کی مدد سے بے نیاز ہے اور سارے جہان کی پوشیدہ طاقتیں اسی کے دست قدرت میں ہیں۔ وہ جیسا چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ شروع سورۃ میں وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا فرمایا تھا اور اس جگہ فرمایا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا۔ حدیبیہ اور خیبر کی فتح اور دشمنوں کے ہاتھوں کی بندش، یہاں مسلمانوں پر احسان عظیم تھا اللہ تعالیٰ کا وہاں تکمیل نعمت اور غالب نصرت بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے اور یہاں قدرت کی غیبی کارسازی کا ظہور ہوا، اہل ایمان کے لیے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی توحید قدرت تامہ اور حکمت عامہ پر ایمان بالمشاہدہ کا راستہ ملا۔ وہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی قرب خداوندی تک رسائی کی صراط مستقیم نظر آگئی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہؓ دونوں کو اپنے اپنے درجہ کے مطابق صراط مستقیم کی ہدایت مل گئی اور دونوں کو نصرت و کامرانی من جانب اللہ حاصل ہوگئی۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔ اور کچھ دوسری نعمتیں اور فتحمندیاں بھی اللہ تعالیٰ تم کو عطا فرمانے کو ہے جو تمہارے بس کی نہیں نہ تم کو ان کا علم ہے وہ اللہ رب العزت ہی کے احاطۂ علم و قدرت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے واقف ہے اور عطا فرمانے کی قدرت رکھتا ہے۔ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے بس میں ہیں۔

غالباً ان فتوحات و غنائم سے مراد روم فارس اور دوسرے غیر عربی ممالک کی فتوحات ہیں۔ جن کا تصور بھی مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی پورا کیا اور ناقابل اندازہ مال عطا کیا اور بڑی بڑی جابر جہانگیر بادشاہتوں کی راجدھانیاں بھی مسلمانوں کے زیر حکم آگئیں اور ان کے تمام مقبوضات پر مسلمان قابض ہو گئے جن کے آثار پارینہ آج بھی موجود ہیں۔

مقصودِ بیان بیعت رضوان میں شریک ہونے والے تمام صحابہؓ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہونے کی صراحت۔ ان صحابہؓ میں تمام جلیل القدر حضرات اس وقت بیعت میں شریک تھے۔ حضرت عثمانؓ گو موجود نہ تھے مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر حضرت عثمانؓ کو بیعت میں شریک قرار دیدیا تھا۔ تیرہ چودہ سو یا اس سے کچھ کم و بیش بہرحال ایک ہزار سے زیادہ صحابہ کرام کا پسندیدۂ خدا اور محبوب الٰہ ہونے کے لیے نص قطعی موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں شیعی فرقہ کی تراشیدہ روایات ناقابل اعتبار ہیں۔ آیات کے مقابلے میں مشکوکات بلکہ موہومات کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ تعجب ہے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت کا یہ لوگ کس طرح انکار کرتے ہیں۔

فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ان صحابہ کرام کو مرتبۂ اطمینان و سکون حاصل تھا اور ان کا یہ شہود وہیں عطا کر دیا گیا تھا۔

وَاَثَابَهُمْ کے لفظ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ صحابہ کرام کو اللہ رب العزت نے جو فتوحات عطا فرمائیں وہ ان کے اخلاص ایمانی اور جذبہ قربانی کے ثمرات تھے۔ وعدہ فتوحات و غنائم کثیرہ اللہ نے صحابہ کرام سے کیا تھا جس سے کچھ فتوحات فوراً عطا فرما دیں اور زیادہ کی آئندہ کیلئے بشارت دے دی۔

ایک بات مجموعہ آیات سے یہ بھی ثابت ہو رہی ہے اور اس کی طرف تمام اہل ایمان کی توجہ مبذول کرانی ہی مقصود ہے کہ تعداد کی کثرت و قلت اور سامان جنگ کی فراوانی اور کمی حق و باطل کا فیصلہ نہیں کرتی۔ یہ تمام اسباب سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ حق کی حمایت کرنے والے حق پرستوں کی اللہ تعالیٰ غیب سے مدد کرتا ہے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ

اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا اور نہ مددگار۔ اللہ تعالیٰ نے

الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ

(کفار کے لئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور آپ خدا کے دستور میں رد و بدل نہ پاویں گے اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ

اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَ

تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ ان (کے قتل) سے عین مکہ (کے قرب) میں روک دیئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا اور

كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ

اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور (تیرا) قربانی کے

مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ

جانور کو جو رکا ہوا رہ گیا اس کے موقع میں پہنچنے سے روکا اور اگر (مکہ میں اس وقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں

تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ

جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی یعنی ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ضرر پہنچتا تو سب قصہ طے کر دیا جاتا لیکن ایسا اس لئے نہیں

تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ

کیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر دے اور اگر یہ ٹل گئے ہوتے تو ان میں جو کافر تھے ہم ان کو دردناک سزا دیتے جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو

الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا کیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو

ع وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾

تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ اس کے اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر ابراہیم و نمرود، فرعون و موسیٰ، عاد و ہود، ثمود و صالح غرض ہر حق و باطل کے تصادم کے وقت اللہ تعالیٰ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرتا ہے۔ ضابطۂ حکمت و قدرت یہی ہے، سنت اللہ یہی ہے، لیکن حق کا غلبہ کب ہوتا ہے اور باطل کی شکست کس وقت ہوتی ہے، اس کا کوئی وقت ہم کو معلوم نہیں۔ کبھی اہل حق کے ایمان و عمل کا امتحان مقصود ہوتا ہے، ان کی کوششیں دیکھی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے باطل کی ہلاکت میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے۔ کبھی اہل باطل کو ڈھیل دی جاتی ہے اور ان کے ہدایت یاب ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے ہوتے ہیں۔ کبھی باطل پرستوں میں سے یا ان کی آئندہ نسل سے بعض افراد کا ہدایت یاب ہونا مقدر ہوتا ہے، اس لئے ان کو فوراً ہلاک نہیں کیا جاتا۔ کبھی اہل باطل کے گروہ میں کچھ کمزور افراد ایسے ہوتے ہیں جو پوشیدہ طور پر دلوں میں ایمان رکھتے ہیں اور دل سے حق کی طرف دار ہوتے ہیں۔ لیکن بے دلی اور تبسلی کمزوری کی وجہ سے ایمان کا اعلان نہیں کر پاتے یا اعلان کر بھی دیتے ہیں، مگر اہل باطل کی قید میں ہوتے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور اپنا مقام نہیں چھوڑ سکتے۔ بہرحال حق کی فوری فتح اور باطل کی شکست میں یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے موانع اور مصالح ہوتے ہیں، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ حق کا مآل اور فیصلہ کن کے وقت فتح حق کی ہوتی ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ضابطۂ الٰہی کی رو سے اگرچہ حق و صداقت کا غلبہ اور فتح لازم ہے، لیکن پیام حق و صداقت اس لئے نہیں آتا کہ مخالفوں کو خواہ مخواہ کچل کر رکھ دے۔ اہل باطل کے دلوں میں جاہلیت کی آگ ضرور بھڑکتی ہے قرابت، قومیت، وطنیت اور دوسرے باطل جذبات کے شعلے اٹھتے اور لپکتے ہیں، لیکن اہل حق کو ضبط و تحمل پر مامور رکھا جاتا ہے۔ جاہلوں کے جذبات جاہلیت کا اشتعال اہل حق کے مادی غضبی جذبات کو نہیں بھڑکاتا۔ ان کو حکم ہوتا ہے کہ تم اپنے جذبات میں تلاطم نہ پیدا ہونے دو اور سکون کے ساتھ کلمۂ توحید و تقویٰ پر قائم رہو۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کے دلوں میں بھی کافروں کی حمیت جاہلیت کے مقابلے میں کچھ نفسانی جوش پیدا ہو جائے گا، لیکن حق کے پرستار اندرونی کشمکش کے بعد بالآخر جذبات جاہلیت کی تحریب الاشتعال آگ کو بجھا دیتے ہیں، ... جاہلیت کو لے لیتا ہے۔

خیبر کی فتح ... کے وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ خیبر میں تو یہودی مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ ان کے ہاتھ بندھ گئے اور بغیر کسی تصادم کے حق کی فتح ہوگئی۔ البتہ حدیبیہ میں حالات نے چند روز ... پلٹے۔ مسلمان عمرہ کرنے گئے تھے لڑنا مقصود نہ تھا۔ قریش نے روک دیا۔ قربانی کے جانوروں کو بھی حرم کے اندر داخل نہ ہونے دیا۔ جاہلیت کی ... شرک کی عصبیت نے گوارا نہ کیا کہ مسلمان بغیر کسی کو تکلیف پہنچائے کے بھی کعبہ کا طواف کرلیں۔ اور جانوروں کی قربانی کریں، سنگ راہ بن گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خون بہانا مقصود نہ تھا۔ مصالحت کیلئے تحریک کی اور سخت ترین شرائط پر بھی صلح کرلی۔ صلح نامہ کی شرائط سے کافروں کا دباؤ اور غلبہ اور مسلمانوں کی کمزوری ظاہر ہو رہی تھی گو حقیقت میں ایسا نہ تھا، مگر ظاہری الفاظ تو کافروں کے حق میں جا رہے تھے۔ الفاظ پر سطحی نظر ڈالنے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے فہیم و زیرک انسان کو بھی غصہ ہو گیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تسکین دہی کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خودی ٹوٹ گئی اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے سکون پیدا کر دیا، بے چینی دور کر دی۔ اور عزیمت کی بات جبھی ہو رہی تھی کہ عصبیت جاہلیت نے تو کلام و مصالحت کو بھی خون آلود کر دینا چاہا۔ ایک ٹولی خفیہ طور پر مسلمانوں کے چاروں طرف چڑھ آئی تاکہ موقع پر کچھ کر ڈالے۔ آخر گرفتار کر لئے گئے اور کچھ عذر پیش نہ کر سکنے کے باوجود رہا کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کو غصہ تو بہت آیا، مگر کیا کرتے ان کو کلمۂ تقویٰ کا پابند بنا دیا گیا تھا۔ جبکہ اس وقت کچھ کمزور مسلمان جن کے دلوں میں نمائیاں ایمان پوشیدہ تھا اور مسلمانوں کو ان کے مومن ہونے کا علم نہ تھا مجبوراً قریش کے ساتھ تھے، ان کا لحاظ بھی ضروری تھا، اس لئے مسلمانوں نے اپنے غصہ کو دبا دیا، بھڑکنے والی آگ کو خاموش کر دیا۔ اگر قریش کے اندر رہنے والے کمزور مسلمان بھی ہجرت کر کے نکل آئے ہوتے اور اپنے مقام سے ہٹ گئے ہوتے تو ضرور قریش کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا اور مسلمانوں کے ہاتھوں

وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہو جاتے ۔ بہرحال کافروں کی طرف سے ہر شر انگیزی سے درگزر کر لی گئی اور ایک سال کے بعد معاہدہ ہو گیا۔ اور مسلمان لوٹ گئے اور دوسرے سال حسب معاہدہ واپس آکر انہوں نے عمرہ کر لیا ۔ معاہدہ حدیبیہ میں ایک دفعہ دس سالہ معاہدہ کی بھی تھی اور طے کر لیا گیا تھا کہ دس سال تک کوئی فریق کسی پر حملہ نہیں کرے گا ، لیکن وقت آچکا تھا کہ حق ہمیشہ کے لئے باطل پر غالب آجائے اور باطل شکست کھا کر ملیا میٹ ہو جائے ، اس لئے معاہدے سے دو سال کے اندر قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور نقض عہد کر دیا ۔ آخر مسلمانوں کو بھی لشکر کشی کا حکم مل گیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکہ پہنچ کر فتح حاصل کر لی ، مکہ کے باشندوں کو مقابلے کی جرأت بھی نہیں ہوئی ۔ اور سب نے طوعاً یا کرہاً رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قیادت مان لی ۔ اس طرح سنت اللہ کا تقاضا پورا ہو گیا ۔

تحلیل اجزاء

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ اور اگر کفار مقابلے پر آجاتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مسلمانوں کی مدد ضرور کرتا اور ان بے ایمانوں کو شکست فاش دیتا ۔ یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور کوئی والی و مددگار بھی ان کو نہیں ملتا ۔ یہ خیبر کے یہودیوں کے متعلق بیان ہے ۔ صیغے ماضی کے استعمال کئے گئے ہیں ، لیکن خیبر کی فتح سے پہلے ان آیات کا نزول ہوا تھا اور بطور پیشین گوئی آئندہ واقعہ کا اظہار کیا گیا جو یقینی ہونے والا تھا ۔ وقت نزول کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے بھی ترجمہ اور تفسیر کا مطلب میں ماضی کے صیغے استعمال کئے ہیں ۔

ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قریش مسلمانوں کے مقابلے پر چڑھ کر گئے تھے اور اُحد میں ان کو فاش شکست دی تھی اور پھر حدیبیہ میں حرم کے باہر ہی مسلمانوں کو روک دیا تھا اس وقت مسلمانوں کی کیوں مدد نہیں کی گئی ، خیبر میں ایک اتفاقی بات ہو گئی ۔ یہودی تیار نہ تھے ، طاقت منتشر تھی جمع نہ ہو سکے تھے ، اس لئے لڑ نہ سکے ۔ اگر سب جمع ہو کر لڑتے تو مسلمانوں کو شکست دے دیتے ۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اگر وہ اجتماعی طاقت سے بھی مسلمانوں کا مقابلہ کرتے تو شکست ہی کھانی پڑتی ، منہ پھیر کر ہی بھاگنا پڑتا ۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت اور معمول یہی ہے ، ضابطۂ حکمت و قدرت یہی ہے کہ اہل حق کو حمایت حق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فتح مند کرتا ہے ۔ اس سے پہلے گذشتہ اقوام و ملل میں بھی ایسا ہی ہوا ہے ۔ ہر پیغمبر کی امت نے پیغمبر سے ٹکراؤ کیا اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی مدد کی اور کفر کی بڑی سے بڑی طاقت نے آخر شکست کھائی) بدر کے معرکہ میں بھی ایسا ہی ہوا ، کفر کی طاقت بہت زیادہ تھی ، مسلمان گنے چنے اور نہتے تھے ، لیکن فتح مسلمانوں کو ہی حاصل ہوئی ۔ ایسا نہیں کہ جو سنت اللہ اور ضابطۂ قدرت ہزاروں سال سے اس امر کے حق و باطل میں قائم ہے وہ اب اس پیغمبر کے وقت میں ان کافروں کی قوت سے ٹوٹ جائے ۔

سنت اللہ (یا ضابطۂ خداوندی) بہرحال اس قانون کا نام ہے جو ازلی ابدی اور لازوال ہے ۔ بہت سے لوگ اکثری واقعات و تجربات یا کثیر الوقوع مشاہدات کو نیچرل قوانین کہتے ہیں ، لیکن حقیقت میں یہ ضوابط الٰہیہ نہیں ہوتے ۔ ان کو سنت اللہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ عوامی ضوابط ہوتے ہیں ۔ خاص خاص مثالیں ہمیشہ ان سے مستثنیٰ ہوتی ہیں ۔ علم کی نارسائی یا نبوت و ولایت کی روحانی اجتماعی اور کرامتی طاقت کا انکار انسان کو نیچرل کہنے پر آمادہ کر دیتا ہے ۔ اگر کسی پیغمبر یا اولیاء امت کا اثر کسی ہیرو یا مادی طاقت کے کسی زبردست قوت پر فتح حاصل ہو جائے تو یہ سنت اللہ کے موافق ہوگا ۔ اگرچہ مادہ پرست کوتاہ نظر اور نارسا فہم رکھنے والے اس کو نیچرل قوانین کے خلاف قرار دیں یا اتفاق پر محمول کریں ۔ حقیقت میں مادہ کے بندوں نے مادہ کی چند خصوصیات اور ان کے چند قانونوں کو ہی ضابطۂ طبعی قرار دے رکھا ہے اور جہاں ان کے مفروضہ مادی قانونوں کے خلاف ان کو کوئی مثال ملتی ہے اور تعلیل ممکن نہیں ہوتی تو وہ اس کو اتفاقی یا نامعلوم اسباب مادیہ کی کارفرمائی کہہ دیتے ہیں ، مگر واقع میں وہ سنت اللہ ہوتی ہے جو بغیر مادی اسباب کے ثمرات و نتائج غیب سے پیدا کر دیتی ہے جس کی ایک مثال فتح خیبر کی شکل میں نمودار ہوئی اور دوسری مثال حدیبیہ کے موقع پر کہ باوجود تمام اسباب موجودہ کے جنگ نہ ہو سکی اور کفر و مسلمانوں کی مصالحت کی شکل میں ایسی نصرت و ظفر حاصل ہوئی جو بدر کے بعد ہر فتح سے بڑھ چڑھ کر تھی اور جو عظیم آغاز تھی تمام آئندہ فتوحات کا ۔ [illegible] اگرچہ بظاہر [illegible] کثرت و سطوت بھی طاقت اور [illegible] حمایت بھی اور [illegible] حالت میں انہوں نے اپنے لئے ذلت آمیز معاہدہ کیا ، مگر نتیجہ [illegible] شکست حاصل ہوئی [illegible] ۔ اسی کے متعلق

فرماتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۔ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۔ اللہ تعالیٰ نے وادی مکہ میں ان کے ہاتھ تمہاری طرف سے اور تمہارے ہاتھ ان کی طرف سے روک دیے یعنی لڑائی نہ ہونے دی اور جنگ سے طرفین کی باز داشت تمہاری فتح کے بعد ہوئی۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے معاہدہ کی شکل میں تم کو کامیابی عطا کر دی تو اس کے بعد ایسا واقعہ ہوا کہ باوجود شدید اشتعال اور جنگ آفریں اسباب کی فراہمی کے اللہ تعالیٰ نے فریقین میں جنگ نہ ہونے دی) اور تمہارے حق میں جنگ سے باز داشت میں ایک فتح دی۔ کافر وہی ہیں جنہوں نے ہی تم کو مسجد حرام تک پہنچنے سے روک دیا تھا اور انہوں نے قربانی کے جانوروں کو قربان گاہ تک پہنچنے سے محبوس کر دیا تھا۔ قربان گاہ حرم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ ستر قربانیاں تھیں جو مجبوراً حدیبیہ میں ذبح کی گئیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر کعبہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو منیٰ میں قربانی کو ذبح کر دیا جائے اور قربان گاہ سے حرم مراد ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اسی مقام پر ذبح کیا جائے جہاں روکا گیا ہو وہ مقام حل ہو یا حرم۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمہؓ بن اکوع والی حدیث مذکور ہے۔ ہم بھی اس کو ذکر کر چکے ہیں کہ ستر کافروں کو گرفتار کر کے خدمت گرامی میں پیش کیا گیا تو حضورؐ نے فرمایا ان کو جانے دو کہ انہی کی طرف سے ابتدا ہو اور ان ہی کی طرف سے دوبارہ شروع ہو (یعنی حرم کے اندر جنگ کی ابتدا نہیں کریں گے) اسی سلسلے میں آیت وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ الخ نازل ہوئی۔ مسند احمد میں ہے کہ تنعیم کی طرف سے اسی مسلح کافر چھپتے چھپاتے اتر آئے لیکن حضورؐ غافل نہ تھے فوراً آپ نے کچھ مسلمانوں کو بھیج کر گرفتار کرالیا پھر آپ نے ان سے درگذر فرمائی اور سب کو چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کا بیان اس آیت میں ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں بھی آئی ہے۔ نسائی نے حضرت عبداللہ بن مغفل مزنیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جس درخت کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے نیچے تشریف فرما تھے۔ ہم لوگ بھی بارگاہ میں موجود تھے حضرت علیؓ اور سہیل بن عمرو (قریش کا نمائندہ) بھی سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ سن کر سہیل نے حضورؐ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا ہم رحمٰن و رحیم کو نہیں جانتے صلح نامہ پر وہی لکھو جس کا دستور ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اچھا لکھو باسمک اللّٰھم یہ (شرائط نامہ) وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے مصالحت کی۔ سہیل بولا اگر آپ رسول ہیں تو پھر (ہمارا انکار) بڑی زیادتی ہے۔ وہی لکھواؤ جو ہم میں مشہور ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اچھا لکھو یہ (شرائط نامہ) وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے مکہ والوں سے صلح کی۔ اتنے میں تیس نوجوان کافر آن پڑے۔ آپؐ نے ان کے حق میں بددعا کی وہ بہرے (اندھے) ہو گئے اور ہم کا اٹھ کر سب کو گرفتار کر لیا حضورؐ نے ان سے فرمایا کیا تم کو کسی نے امان دی ہے یا تم کسی کی ذمہ داری پر آئے ہو؟ انہوں نے انکار کیا، اس کے باوجود آپؐ نے ان سے درگزر کی اور چھوڑ دیا۔ اس پر آیت وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ الخ نازل ہوئی۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام عکرمہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قریش نے چالیس پچاس آدمی اس غرض سے بھیجے کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کے گرد چکر لگاتے رہیں اور موقع پاکر کچھ نقصان پہنچائیں یا کسی کو پکڑ کر لے جائیں۔ لیکن سب کے سب گرفتار کر لئے گئے۔ پھر حضورؐ نے ان کو معاف کر دیا اور چھوڑ دیا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے کچھ تیر بھی چلائے جس کی وجہ سے ایک صحابی جن کا نام ابن زنیم بتایا گیا ہے شہید بھی ہو گئے۔ حضورؐ نے کچھ سواران کے تعاقب میں بھیجے سب گرفتار کر کے پیش کر دیئے گئے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا "تمہارے پاس میری طرف سے کوئی (عہد و امان) امن ہے؟" انہوں نے کہا نہیں۔ "پھر کوئی عہد و پیمان ہے (یعنی کسی نے تم کو امن دیا ہے یا ذمہ لیا ہے)"۔ بولے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود حضورؐ نے ان کو چھوڑ دیا اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے آیت وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ نازل فرمائی۔

ابن جریر نے ایک طویل روایت بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عکرمہ بن ابوجہل پانچسو کا لشکر لے کر حدیبیہ آیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت خالدؓ نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس وقت حضورؐ کا پڑاؤ حدیبیہ میں تھا۔ حضرت خالدؓ نے عکرمہ کو تین بار مکہ کی گلیوں تک دھکیلا۔

اسی کے متعلق آیت وَهُوَ الَّذِي كَفَّ نازل ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مزید چڑھائی کرنے سے روک دیا تاکہ جو مسلمان ضعیف اور مجبور مکہ میں ہیں ان کو اسلامی لشکر کے ہاتھوں سے نادانستگی میں گزند نہ پہنچ جائے ۔

یہ روایت قابل تسلیم نہیں کیونکہ حدیبیہ کی صلح کے زمانے تک تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے ہی نہ تھے اور آئندہ سال عمرۃ القضا کے موقع پر کافروں نے کوئی روک ٹوک اور مقاومت نہیں کی تھی اس لئے نہ عکرمہ و خالد کا مقابلہ حدیبیہ کے موقع پر ہونا ممکن تھا نہ عمرۃ القضا کے موقع پر۔ اور اگر یہ فتح مکہ کے وقت کا واقعہ قرار دیا جائے تب بھی صحت میں کلام ہے کیونکہ جب مسلمان مکہ فتح کرنے کے ارادے سے گئے تھے تو ان کے ساتھ قربانی کے جانور نہ تھے ۔وہ حج یا عمرے کے ارادے سے ہی نہیں گئے تھے ۔ حالانکہ صاف صراحت موجود ہے کہ انہی کافروں نے تم کو کعبہ سے روکا طواف کرنے کی اجازت نہیں دی ۔حالانکہ مسجد حرام کے زیادہ حقدار اور لائق تم ہی لوگ تھے (یہ ابراہیمؑ کا بنایا ہوا مکان ہے جس کی تاسیس توحید اور تقویٰ پر ہوئی تھی ۔جو لوگ اہل توحید اور متقی ہیں وہی اس کے اندر عبادت کرنے اور اس کے نگراں ہونے کے مستحق ہیں ۔مشرک تو مشرک ہیں ۔ انھوں نے مرکزِ توحید کو بت کدہ بنا رکھا ہے ۔یہ صنم خانہ نہیں خانۂ خدا ہے ۔خدا پرست ہی اس کے مستحق ہو سکتے ہیں ۔اس سے آگے مسلمانوں کو لڑائی سے روک دینے کی مصلحت بیان فرمائی گئی ہے ۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۔کہ ابھی مکہ کے اندر چند کمزور مسلمان مرد و عورت ایسے ہیں جو ان کافروں کے خوف سے اپنے ایمان کا اظہار نہیں کر سکتے ہیں، نہ ہجرت کر کے وہاں سے نکل سکتے ہیں اور تم اُن سے واقف نہیں ہو ۔اگر کہ والوں پر حملہ کرنے کی تم کو اجازت دیدی جاتی تو وہ بیچے مومن بھی تمہارے ہاتھوں شہید ہو جاتے اور تم ان کو نادانستگی میں پامال کر دیتے اور اس طرح گنہگار ہو جاتے پس ان مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اللہ نے کافروں سے لڑنے کی تم کو اجازت نہیں دی ۔اگر یہ کمزور مسلمان وہاں نہ ہوتے کافروں سے الگ ہو گئے ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان مشرکوں کو سخت سزا دیتا اور دردناک عذاب (قتل و غارت) میں مبتلا کر دیتا ۔اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ تھا کہ اللہ تم کو اس جرم نادانستہ سے بچائے اور مکہ کے مسلمانوں کو محفوظ رکھے اور اہل مکہ میں جو لوگ مسلمان ہونے والے ہیں ان کو نعمت ایمانی حاصل ہو جائے ۔غرض اس جنگ بندی کا مقصد یہ تھا کہ جس کو چاہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نوازے ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ مومن ان کافروں میں ملے جلے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اسی وقت مسلمانوں کے ہاتھوں ان کافروں کو سخت سزا دیتا اور یہ قتل کر دیئے جاتے ۔

حضرت جنید بن سُبیع نے فرمایا صبح کو میں کافروں کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل تھا اور شام کو اللہ تعالیٰ نے مجھے ایمان کی توفیق دی تو میں حضورؐ کے ساتھ ہو کر کافروں کے خلاف نبرد آزما ہو گیا ۔ہمارے ہی متعلق آیت وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ الخ نازل ہوئی ہم کل نو شخص تھے ،سات مرد اور دو عورتیں ۔بعض روایات میں آیا ہے کہ تین مرد تھے اور نو عورتیں ۔ (طبرانی)

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۔وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں جاہلی حمیت و جوش اور عصبیت جما دی تھی (مسلمان ان کے شہر پر چڑھ کر گئے تھے ۔ان کو جوش آیا اور حمیت جاہلیت تڑپ اٹھی کہ کل احد میں مسلمانوں کے گھروں پر ہم چڑھ کر گئے تھے اور وہاں پہنچ کر ان کو شکست دی تھی ۔آج ان میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ ہمارے وطن پر چڑھ کر آگئے اور زبردستی ہمارے شہر میں گھس آنے کا ارادہ کیا ۔ان کو سمجھا کر مار کر بھگا دو ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو تسکین و تحمل عطا فرمایا جاہلیت کے مقابلہ میں ان کے جوش کو ابھرنے نہ دیا اور کلمۂ تقویٰ کا ان کو پابند رکھا توحید پر ان کو مضبوط رکھا اور لشکر کشی سے روک دیا ۔(حرم میں خونریزی تقاضۂ توحید کے خلاف تھی ۔حرمت حرم کی ہتک سے کلمۂ تقویٰ مانع تھا) اور کلمۂ تقویٰ کی پابندی مسلمانوں پر لازم تھی ۔وہ اسی کے مستحق تھے (کافروں کی جاہلی حمیت کی وجہ سے جوش میں بھر جانا اور مآل نہ سوچنا تقویٰ کے خلاف تھا)

مسند احمد میں مرفوعاً حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ کلمۂ تقویٰ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ مجاہد نے کہا اخلاص مراد ہے۔ قتادہ کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مراد ہے۔ عطا کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ مراد ہے۔ حضرت مسور کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اور حضرت علیؓ و حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اور سعید بن جبیر کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور جہاد فی سبیل اللہ مراد ہے اور زہری کے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مراد ہے۔ ایک اور روایت میں عطا کا قول آیا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ محمد رسول اللہ کلمۂ تقویٰ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ توحید کی شہادت مراد ہے جو ہر تقویٰ کی جڑ ہے۔

حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ کے بعد اور فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سے پہلے یہ جملہ مزید مروی ہے۔ وَلَوْ حَمِيْتُمْ كَمَا حَمُوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ یعنی جس طرح کافروں کو جوش آگیا تھا۔ اسی طرح تم کو بھی جوش اگر آجاتا اور جس طرح وہ گرم ہوگئے تھے، اسی طرح تم میں بھی گرمی آجاتی تو مسجد حرام برباد ہوجاتی۔ حضرت عمرؓ اس قرأت کو سن کر بہت تیز ہوئے۔ حضرت ابیؓ نے فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں حضورؐ کی خدمت میں آتا جاتا رہتا تھا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ آپؐ کو سکھاتا تھا حضورؐ اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ ذی علم اور قرآن داں ہیں جس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ نے آپ کو سکھایا ہے۔ آپ اسی طرح پڑھیئے اور سکھایئے۔ (نسائی)

حدیبیہ کے سلسلہ کی احادیث کا اختصار

مسند احمد میں حضرت مسور کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ زیارت بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ قربانی کے ستر اونٹ ساتھ تھے۔ مقام عسفان میں پہنچے تو بشر بن سفیان کعبی نے آپؐ کو اطلاع دی کہ قریش آپؐ کی آمد کی خبر پاکر مقابلہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اونٹوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی انہوں نے ساتھ لے لئے ہیں اور چیتے کی کھالیں اوڑھ لی ہیں اور باہم عہد و پیمان کر لیا ہے کہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ خالد بن ولید کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ انہوں نے کراع غمیم پر مامور بھی کر دیا ہے۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا "افسوس! قریش کو لڑائیوں نے کھا لیا، کتنی اچھی بات ہوتی اگر وہ مجھ سے تعرض کرتے نہ دوسرے لوگوں سے۔ اگر دوسرے لوگ مجھ پر غالب آجاتے تو قریش کی مراد پوری ہوجاتی اور اگر دوسرے لوگوں پر اللہ مجھے غالب کر دیتا تو پھر یہ بھی اسلام قبول کر لیتے اور اگر اس وقت بھی مسلمان ہونا نہ چاہتے تو مجھ سے پوری طاقت کے ساتھ لڑ لیتے۔ قریش نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ خدا کی قسم میں اس دین پر اُن سے جہاد کرتا رہوں گا اور اُن سے اس وقت تک مقابلہ جاری رکھوں گا کہ اللہ یا تو مجھے ان پر کھلم کھلا غلبہ عطا فرمادے یا میری گردن جاتے سر قلم ہو جائے۔" اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کے لشکر کو دائیں طرف حمص کے پیچھے سے اس راستہ پر جانے کا حکم دیا جو ثنیۃ المرار کو جاتا ہے۔ اور حدیبیہ مکہ کے نشیبی حصہ میں واقع ہے۔ خالد نے دیکھا کہ مسلمانوں نے راستہ بدل دیا ہے تو انہوں نے دوڑ کر قریش کو اس کی اطلاع دیدی۔ حضورؐ ثنیۃ المرار پہنچے تو اونٹنی تو خود بخود بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا۔ یہ تھک گئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ یہ نہ تھکی ہے نہ بیٹھنے کی اس کی عادت ہے بلکہ اس کو یہاں اسی نے روک دیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ آج قریش صلہ رحمی سے تعلق رکھنے والی جو بات مجھ سے طلب کریں گے میں دوں گا۔ (یعنی میں لڑائی کرنا نہیں چاہتا میل ملاپ کی جو بات جس شرط کے ساتھ وہ مجھ سے کہیں گے میں اس کو مان لوں گا) چونکہ اس وادی میں کہیں پانی نہ تھا اور آپؐ کے پاس پانی نہ ملنے کی شکایت پہنچی اس لئے آپؐ نے ترکش سے ایک تیر نکال کر حکم دیا کہ اس کو جاکر چشمہ میں گاڑ دو۔ لوگوں نے جونہی تیر چشمہ کے اندر گاڑا پانی فوراً جوش کے ساتھ اُبل پڑا۔ سب لشکر نے پانی پی لیا اور پانی پھر بھی بڑھتا ہی رہا۔ حسب الحکم مسلمانوں نے وہیں پڑاؤ کر دیا۔ یہاں بدیل بن ورقاء قبیلۂ خزاعہ کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر پیامبر کی حیثیت سے آیا۔ حضورؐ نے اس سے بھی اپنے آنے کی غرض وہی بیان کر دی جو بشر بن سفیان سے بیان کی تھی۔ بدیل نے واپس جاکر قریش سے کہا تم لوگوں نے محمدؐ کے متعلق فیصلہ کرنے میں جلدی کی۔ وہ تم سے لڑنے تو نہیں آئے۔ بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ تم اپنے فیصلہ پر دوبارہ غور کرو۔ حقیقت میں قبیلۂ خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا طرفدار تھا۔ مکہ والوں کی خبریں انہیں کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پہنچتی تھیں۔ قریش نے جواب دیا کہ گو وہ لڑائی کے ارادہ سے نہ آئے ہوں لیکن بغیر اطلاع یوں اچانک تو ہم ان کو مکہ میں گھسنے نہ دیں گے، ورنہ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ زبردستی مکہ میں داخل ہوگئے اور کوئی اُن کو روک نہ

کی ہمت نہ کرسکا۔ قریش نے اس کے بعد قبیلہ بنی عامر بن لوئی کے ایک شخص مکرز بن حفص کو سفیر بنا کر بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر
فرمایا "یہ عہد شکن شخص ہے"۔ پھر اس سے بھی وہی بات فرمائی جو پہلے آنے والے دونوں شخصوں سے فرمائی تھی۔ اس نے بھی واپس جا کر قریش سے حضورؐ کی
گفتگو نقل کردی۔ قریش نے پھر حلیس بن علقمہ کو بھیجا۔ اس کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کے کاموں کی عظمت کرتا ہے: قربانی کے جانوروں کو سامنے
کھڑا کر دو (تاکہ اس کی نظر قربانی کے جانوروں پر پڑے) حلیس نے جو قربانی کے جانوروں کو ادھر ادھر جاتے دیکھا اور ان کے بال اڑے ہوئے دیکھے تو وہیں
سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ گیا اور قریش سے جا کر کہا، بخدا تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم ان کو بیت اللہ سے روکو۔ وہ
خدا کے نام کے جانور قربان گاہ سے رک کے کھڑے ہیں، یہ سخت ظلم ہے۔ اتنے دن کے رہنے سے جانوروں کے بال بھی اڑ گئے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر
آرہا ہوں۔ قریش نے کہا تو بڑا بدو ہے جا چپ ہو کر بیٹھ جا۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی کو بھیجا۔ عروہ نے روانگی سے پہلے ایک تقریر کی اور کہا کہ اے گروہ قریش
جن جن لوگوں کو تم نے وہاں بھیجا جب وہ واپس آئے تو تم نے ان سے کیا سلوک کیا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں ———— کہ تم
نے انہیں برا کہا، ان کی بے عزتی کی، ان کو متہم کیا، ان سے بدگمانی کی، میری حالت تم کو معلوم ہے میں تم کو اپنے باپ کی طرح سمجھتا ہوں۔ تم خوب واقف
ہو کہ جب تم نے ہائے وائے کی تو میں نے اپنی قوم کو جمع کیا اور جس نے میری بات مانی اس کو اپنے ساتھ لیا اور سب کو لے کر تمہاری مدد کو پہنچا، قریش
بولے تم نے سچ کہا تم سے ہم کو کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہے تم جاؤ۔ عروہ اس کے بعد روانہ ہو گیا اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچ کر سامنے بیٹھ کر کہنے لگا "آپ نے
ادھر ادھر کے کچھ لوگوں کو جمع کر لیا ہے اور اپنی قوم کی شان و شوکت کو توڑنے آئے ہیں۔ یہ قریشی ہیں، آج یہ مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ چھوٹے بچے بھی ان کے
ساتھ ہیں جنہوں نے چیتے کی کھالیں پہن لی ہیں۔ وہ خدا کی قسمیں کھا کر باہم عہد کر چکے ہیں کہ ہرگز ہرگز آپؐ کو اس طرح زبردستی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے
خدا کی قسم مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ یہ لوگ جو اس وقت بھیڑ لگائے آپ کے اردگرد کھڑے ہیں لڑائی کے وقت ان میں سے ایک بھی ڈھونڈے نہیں
ملے گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ رہا گیا۔ آپ اس وقت حضورؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے وہیں سے بول اٹھے "جا، لات
(دیوی) کے اندام کو چوس۔ ہم اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں ایسا ممکن ہی نہیں ہے" عروہ نے رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا "یہ کون ہے" حضورؐ نے فرمایا "ابو قحافہ کا بیٹا" عروہ نے کہا "اگر مجھ پر تیرا ایک عظیم احسان نہ ہوتا تو میں تجھے اس کا مزہ
چکھاتا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کرنے کے لئے حضورؐ کی داڑھی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی بے ادبی کو حضرت مغیرہ بن شعبہ نہ سہہ
سکے۔ آپ حضورؐ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور ہاتھ میں لوہے کی کوئی چیز تھی وہی چیز عروہ کے ہاتھ پر مار کر فرمایا "اپنا ہاتھ دور رکھ تو اللہ کے رسول کے
بدن کو چھو نہیں سکتا" عروہ نے پوچھا "یہ کون ہے؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تمہارا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ" عروہ بولا "اے بے ایمان تو کل تک طہارت
کرنا بھی نہیں جانتا تھا (آج یہ باتیں کر رہا ہے) غرض عروہ کو بھی حضورؐ نے حسب سابق جواب دیا اور فرمایا "ہم لڑنے نہیں آئے" عروہ واپس چلا گیا۔
اور جو نقشہ (رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا) دیکھا تھا وہ قریش سے بیان کر دیا۔ اور کہا اے گروہ قریش میں کسریٰ کے دربار میں بھی
گیا ہوں اور قیصر و نجاشی کے درباروں میں بھی۔ خدا کی قسم میں نے ان بادشاہوں کے لئے بھی وہ عظمت و احترام نہیں پایا جو محمدؐ کا (اس کے ساتھیوں کی
نظر میں) دیکھا۔ محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی وہ عزت کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ تم خوب سمجھ لو اور یقین رکھو کہ محمدؐ کے ساتھی ایسے نہیں کہ اپنے
نبیؐ کو تمہارے ہاتھوں میں دے دیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو سفارت پر مامور کر کے قریش کے پاس بھیجنا چاہا لیکن
حضرت عمرؓ کے معقول عذر کو سن کر ان کی جگہ حضرت عثمانؓ کو یہ کہنے کے لئے قریش کے پاس بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، صرف بیت اللہ کی زیارت
اور تعظیم کے لئے آئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے مکہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ ابان بن سعید بن عاص مل گیا اور ابان آپ کو اپنی پناہ میں لے کر اپنے گھوڑے پر اپنے آگے
بٹھا کر لے گیا۔ حضرت عثمانؓ نے قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیا۔ قریش بولے تم تو آ ہی گئے ہو اگر چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہو۔
حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے میں طواف کر لوں ایسا ممکن نہیں۔ قریشیوں نے حضرت عثمانؓ کو روک لیا۔ واپس جانے کر
نہ جانے دیا۔ ادھر اسلامی کیمپ میں یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ (اس خبر سے اشتعال اور بے چینی پھیل گئی) زہری کا بیان ہے۔ پھر قریش
نے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصالحت کا پیغام دے کر بھیجا، لیکن شرط یہ رکھی کہ اس سال آپؐ مکہ میں نہیں آسکتے تاکہ عرب ہم کو یہ طعنہ

نہ دے سکیں کہ وہ آ گئے اور ہم روک نہ سکے (ہاں آئندہ سال بغیر سامانِ جنگ کے تم مکہ میں آ سکتے ہو) سہیل پیامِ مصالحت لے کر چل دیا۔ حضورؐ نے اس کو دیکھ کر پہلے ہی فرما دیا کہ معلوم ہوتا ہے قریش کا ارادہ صلح کا ہو گیا ہے جو اس کو بھیجا ہے۔ غرض سہیل آ پہنچا، گفتگو ہوئی، شرائط صلح طے ہو گئیں ابھی معاہدہ لکھنا باقی تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور بولے کیا ہم مومن اور یہ لوگ مشرک نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہیں کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دینی معاملات میں اتنی کمزوری دکھائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ عمرؓ! اللہ کے رسولؐ کی رکاب تھامے رہو۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ تو مجھے بھی کامل یقین ہے کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ سے صبر نہ ہو سکا اور سیدھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور وہی بات عرض کی جو حضرت ابوبکرؓ سے کہی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا عمرؓ! میں اللہ تعالیٰ کا رسول اور اس کا بندہ ہوں۔ اللہ کے فرمان کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے میں کہنے کو تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ بات کہہ گزرا لیکن پھر مجھے بڑا پچھتاوا ہوا اور ڈرتا رہا کہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم میری سزا کا نہ آ جائے، اس لئے اس گستاخی کے بدلے میں میں نے بہت سی نمازیں پڑھیں، روزے رکھے اور غلام آزاد کیے۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحنامہ لکھنے کے لئے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا اور حکم دیا۔ لکھو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سہیل بولا میں اس (رحمٰن و رحیم) کو نہیں جانتا۔ باسمک اللّٰھم لکھو۔ حضورؐ نے فرمایا ایسا ہی لکھ دو، پھر فرمایا۔ لکھو۔ یہ وہ صلحنامہ ہے جو رسول اللہ نے کیا۔ سہیل کہنے لگا اگر میں آپ کو اللہ کا رسولؐ جانتا تو آپؐ سے لڑتا ہی کیوں۔ اس طرح لکھو۔ یہ وہ صلحنامہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے کیا۔ ان امور پر ہمارا معاہدہ ہو گیا۔ دس سال تک ہمارے اندر لڑائی نہ ہو گی۔ لوگ امن و امان سے رہیں گے، ایک دوسرے سے محفوظ رہے گا۔ جو شخص محمدؐ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ آئے گا محمدؐ اس کو واپس کر دیں گے، اور محمدؐ کا جو ساتھی قریش کے پاس بھاگ کر چلا جائے گا قریش اس کو واپس نہ دیں گے۔ ہم دونوں فریقوں میں لڑائیاں بند رہیں گی، صلح قائم رہے گی، کسی کو طوق و زنجیر اور قید و بند بھی نہ ہو گی۔ جو شخص (یا جماعت) محمدؐ اور ان کی جماعت کے ساتھ عہد و پیمان کرنا چاہے اور ان کا حلیف بننا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور جو قریش کی طرف معاہدہ میں آنا چاہے وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ دفعہ سن کر بنی خزاعہ بول اٹھے ہم رسول اللہؐ کی طرف معاہدہ میں آنا چاہتے ہیں، ہم محمدؐ کے ہم معاہدہ ہو گئے۔ بنی بکر نے کہا ہم قریش کے ساتھ ان کے معاہدہ میں شریک ہوتے ہیں۔ صلحنامہ میں یہ بھی تھا کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں، مکہ میں داخل نہ ہوں، اگلے سال آئیں۔ اس وقت ہم باہر نکل جائیں گے اور محمدؐ اپنے ساتھیوں سمیت آ کر تین روز مکہ میں ٹھہر سکیں گے۔ ان کے پاس ہتھیار اتنے ہوں گے جتنے ایک سوار کے پاس ہوتے ہیں۔ تلواریں نیاموں کے اندر ہوں گی۔

صلحنامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل کا لڑکا ابوجندل (جو مسلمان ہو گیا تھا اور مشرکوں نے اسے قید کر رکھا تھا) لوہے کی بھاری زنجیروں سے جکڑا ہوا مکہ سے چھپ چھپا کر نکلا اور بھاگ کر رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سہیل نے اٹھ کر اس کو پکڑ کر طمانچے مارنے شروع کر دیئے اور کہنے لگا "محمدؐ! میرے اور آپ کے درمیان تصفیہ ہو چکا ہے اور یہ تصفیہ کے بعد آیا، لہٰذا شرط کے مطابق میں اس کو واپس لے جاؤں گا" حضورؐ نے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے" سہیل ابوجندل کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے چلا اور ابوجندل نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا "مسلمانو! مجھے مشرکوں کی طرف لوٹا رہے ہو۔ افسوس یہ میرا دین مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔" اس واقعہ نے صحابہؓ کو بہت زیادہ برافروختہ کر دیا، لیکن حضورؐ نے فرمایا۔ ابوجندلؓ! صبر کرو، نیک نیت رہو، ثواب کی امید پر قائم رہو، نہ صرف تمہارے لئے بلکہ تم جیسے جتنے کمزور مسلمان ہیں سب کے لئے اللہ تعالیٰ راستہ نکالنے والا ہے اور اس درد و الم اور رنج و غم اور ظلم و ستم سے رہائی دینے والا ہے۔ ہم معاہدہ کر چکے ہیں، شرطیں طے ہو چکی ہیں اس لئے بر دست ہم نے تم کو واپس کر دیا ہے۔ ہم غدار نہیں۔ شرائط کی خلاف ورزی اور عہد شکنی کرنا نہیں چاہتے۔ حضرت عمرؓ اور ساتھ ابوجندلؓ کے ساتھ ساتھ ان کے پہلو بہ پہلو چلنے لگے اور کہنے لگے۔ ابوجندلؓ! صبر کرو۔ ان میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ لوگ مشرک ہیں۔ ان کا خون کتے کی طرح ہے۔" حضرت عمرؓ دورانِ راہ میں اپنی تلوار کا قبضہ ابوجندلؓ کی طرف کر رہے تھے تاکہ ابوجندلؓ قبضہ پکڑ کر تلوار کھینچ لیں اور ایک ہی وار میں باپ کا کام تمام کر دیں۔ لیکن ابوجندلؓ ایسا نہ کر سکے۔ آپؓ کا ہاتھ باپ پر نہ اٹھا۔ غرض کہ صلحنامہ مکمل ہو گیا، تصفیہ ہو گیا۔ حضورؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اٹھو اٹھ کر اپنی اپنی یہیں قربانیاں کر لو اور سر منڈوا دو لیکن کوئی بھی کھڑا نہ ہوا۔ صحابہؓ کو شوق تھا کہ کعبہ کی زیارت کریں گے، طواف کریں گے، اور قربان گاہ میں قربانیاں کریں گے، لیکن یہاں نقشہ ہی کچھ اور نظر آیا۔ سب اس مصالحت پر غمگین تھے اور اتنے پریشان تھے کہ گم صم بیٹھے تھے۔ حضورؐ کے حکم کی

بھی کسی نے تعمیل نہیں کی۔ آپ نے دوسری بار اور پھر تیسری بار قربانی کرنے اور سر منڈوانے کا حکم دیا، مگر کسی نے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ رسول اللہ پریشان خاطر ہو کر حضرت اُم سلمہؓ کے پاس پہنچے اور فرمایا۔ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے (کوئی بھی میرے حکم کو نہیں مانتا) ام المومنینؓ نے جواب دیا: "یارسول اللہ! اس وقت لوگ جس قدر صدمہ میں ہیں وہ آپ جانتے ہیں۔ آپ اُن سے کچھ نہ کہیئے، سیدھے اپنے قربانی کے جانور کے پاس جائیے اور جہاں وہ ہو وہاں اس کی قربانی کر دیجئے۔ اور خود سر منڈوا لیجئے۔ آپ ایسا کریں گے تو ناممکن ہے کہ پھر یہ لوگ بھی ایسا نہ کریں" آپؐ نے اسی مشورے پر عمل کیا۔ اپنے جانور کی قربانی کر دی اور سر منڈوا دیا۔ پھر تو سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے قربانیاں کیں اور سر منڈوا دیئے۔ اس کام سے فراغت کے بعد آپ مدینہ کو لوٹ آئے۔ آدھے راستے میں پہنچے ہوں گے کہ سورہ الفتح نازل ہوئی۔

صحیح بخاری میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے جس کی تصریحات حسب ذیل ہیں۔ اس سفر میں حضورؐ کے ساتھ ایک ہزار سے زائد صحابی تھے۔ ذوالحلیفہ میں آپ نے اونٹوں کو نشان زد کیا اور عمرہ کا احرام باندھا اور قبیلۂ خزاعہ کے ایک شخص کو بطور جاسوس روانہ کیا۔ غدیر الاشطاط تک پہنچے تو جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ قریش نے پوری جمعیت تیار کر لی ہے۔ چاروں طرف لوگوں کو بھی جمع کر لیا ہے۔ ان کا ارادہ آپؐ کو کعبہ سے روک دینے کا اور جنگ کرنے کا ہے۔ حضور نے صحابہ سے فرمایا۔ کیا اس صورت میں ہم ان کے اہل و عیال پر حملہ کر دیں۔ اگر وہ آئیں گے تو اللہ ان کی گردنیں اڑا دے گا ورنہ ہم ان کو (شکست خوردہ) غمگین چھوڑ کر جائیں گے۔ پھر اگر وہ بیٹھ رہیں گے تو غم کی حالت میں بیٹھ رہیں گے اور اگر بچ کر (ہم پر حملہ کریں گے تو) اللہ تعالیٰ اُن کی گردنیں کاٹ دے گا۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ہم کسی سے لڑنے کو آئے نہ کسی غیر ارادے سے صرف خدا کے گھر کی زیارت کے لئے آئے ہیں اور وہ ہمیں روک رہے ہیں۔ جائز ہم اُن سے کیوں نہ لڑیں؟" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ: آپ بیت اللہ کی زیارت کو نکلے ہیں، آپ چلے چلئے، ہمارا ارادہ جنگ و جدال کا نہیں، لیکن جو ہم کو اللہ کے گھر سے روکے گا ہم اس سے ضرور لڑیں گے خواہ کوئی ہو" فرمایا "تو بس اب اللہ تعالیٰ کا نام لو اور آگے چلو" کچھ اور آگے بڑھ کر حضور نے فرمایا "خالد بن ولید ہراول دستہ کے ساتھ آ رہا ہے تم دائیں طرف کو ہولو" (تاکہ جہاں تک ممکن ہو تصادم نہ ہو) بخاری کی روایت میں ہے کہ حضورؐ جس اونٹنی پر سوار تھے اور جو خود بخود ثنیۃ المرار کے مقام پر رک گئی تھی اس کا نام قصواء تھا۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا "وہ جو کچھ مجھ سے طلب کریں گے میں دے دوں گا بشرطیکہ اس میں حرمتِ خداوندی کی اہانت نہ ہوتی ہو"

عروہ بن مسعود جب قریش کی طرف سے رسول اللہ کی خدمت میں پہنچا تو اس نے کہا "سنئے، دو ہی باتیں ہیں یا آپؐ غالب قریش مغلوب یا وہ غالب آپ مغلوب۔ اگر اول بات بھی ہوگئی تب بھی کونسی اچھی بات ہوگی وہ آپ ہی کی قوم ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی نے اپنی ہی قوم کو غارت کیا ہو اور اگر دوسری بات ہوگئی تو یہ جتنے آپ کے پاس ہیں مجھے دکھائی دیتا ہے کہ یہ سب آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

حضرت مغیرہ کے متعلق اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ اس وقت حضرت مغیرہ کے ہاتھ میں تلوار اور سر پر خود تھا اور ان کے ٹھوکا دینے پر عروہ نے کہا تھا۔ او غدار میں نے تو تیری غداری میں تیرا ساتھ دیا تھا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ کفر کی حالت میں مغیرہ کافروں کے ساتھ تھے۔ لیکن موقع پا کر انھوں نے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور ان کا مال لے کر بھاگ کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "تمہارا اسلام تو میں قبول کرتا ہوں لیکن اس مال سے میرا کوئی تعلق نہیں"

اس مقام پر عروہ نے دربارِ نبوت کا یہ منظر بھی دیکھا تھا کہ جب حضورؐ تھوکتے تھے تو کوئی نہ کوئی صحابی لپک کر اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا تھا اور اپنے چہرہ اور جسم پر (فرطِ عقیدت و محبت سے حصولِ برکت کے لئے) مل لیتا تھا اور لب مبارک کی جنبش دیکھتے ہی تعمیل کے لئے ایک سے ایک آگے بڑھتا تھا جب آپ وضو کرتے تھے تو وضو سے گرے ہوئے پانی کی طرف صحابہ مسابقت کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں جنگ ہو جائے گی۔ جب حضورؐ بات کرتے تھے تو مجلس میں ایک سناٹا چھا جاتا تھا۔ کسی طرف سے چوں کی آواز بھی نہیں آتی تھی مجلس مبارک میں کوئی شخص چہرۂ مبارک کی طرف نظر نہ اٹھاتا تھا ہر شخص نگاہ نیچی رکھتا اور با ادب رہتا تھا۔ عروہ یہ حال دیکھ کر گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ محمدؐ جو انصاف کی بات کر رہے ہیں اس کو مان لو۔

اس روایت میں بعض دوسرے الفاظی تغیرات کے ساتھ اتنی بات زائد بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حاضر ہو کر کلام مذکور کے ساتھ یہ بھی عرض کیا۔ کیا آپ نے ہم سے یہ نہ فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ پہنچیں گے اور اس کا طواف کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں میں نے یہ ضرور کہا تھا مگر یہ تو نہیں کہا تھا

کہ اسی سال ایسا کرو گے؟" حضرت عمرؓ نے عرض کیا "جی ہاں یہ تو نہیں فرمایا تھا" فرمایا "تو پھر تم بیت اللہ ضرور جاؤ گے اور طواف بھی ضرور کرو گے۔"

حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت سے لوٹ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور جو گزارش رسول اللہؐ سے کی تھی وہی بات حضرت ابوبکرؓ سے کہی اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی وہی جواب دیا جو رسول اللہؐ نے دیا تھا۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جب قربانیاں کر چکے اور سر منڈوا لئے تو کچھ مسلمان عورتیں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں جن کے بارے میں آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ الخ نازل ہوئی اور حضرت عمرؓ نے اس حکم کے ماتحت اپنی دو مشرک بیویوں کو اسی روز طلاق دے دی جن میں سے ایک نے معاویہ بن ابی سفیان سے اور دوسری نے صفوان بن امیہ سے نکاح کر لیا۔

جب حضورؐ لوٹ کر مدینہ پہنچ گئے تو آپؐ کے بعد ایک قریشی جس کا نام ابوبصیر تھا اور جو مسلمان ہو گیا تھا مکہ سے بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں مدینہ پہنچا اور پیچھے سے دو کافر بھی پہنچ گئے جنہوں نے گزارش کی ہم قریش کے قاصد ہیں اور ابوبصیر کو واپس لینے آئے ہیں معاہدہ کے مطابق آپ پر ابوبصیر کو واپس کرنا ضروری تھا حضورؐ نے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے میں واپس کرتا ہوں" چنانچہ آپ نے ابوبصیر کو ان کے سپرد کر دیا۔ یہ دونوں جب ابوبصیر کو لے کر ذوالحلیفہ پہنچے اور بے فکری سے وہاں کھجوریں کھانے لگے تو موقع پا کر ابوبصیر نے ایک شخص سے کہا۔ تمہاری تلوار تو بہت اچھی ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں واقعی بہت ہی اچھی ہے، فولاد کی ہے۔ میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔ عجیب کاٹ کی تلوار ہے۔ یہ کہہ کر اس نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور ابوبصیر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور کہا ذرا میں دیکھوں۔ اس نے بے تامل ابوبصیر کے ہاتھ میں دے دی۔ ابوبصیر نے ہاتھ میں لے کر ذرا اس کو تولا اور اس شخص کے ایک ایسی ضرب لگائی کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔ دوسرے نے جو یہ رنگ دیکھا تو مٹھیاں بند کر کے ایسا بھاگا کہ مدینہ پہنچ کر ہی دم لیا اور جاتے ہی دہائی دی اور کہا کہ میرا ساتھی مارا گیا اور میں بھی تھوڑی دیر کا مہمان ہوں دیکھئے وہ آیا۔ اتنے میں ابوبصیر بھی پہنچ گئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی اپنے وعدہ کے مطابق آپ نے مجھے ان کی سپردگی میں دے دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے رہائی دلوا دی" حضورؐ نے فرمایا "افسوس! یہ کیسا شخص ہے یہ لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ کاش کوئی اسے سمجھا دیتا" ابوبصیر حضورؐ کے کلام سے تاڑ گئے کہ آپ مجھے دوبارہ مشرکوں کے حوالے کر دیں گے، اس لئے فوراً مجلس نبوی سے نکل آئے اور مدینہ کو چھوڑ کر سیف البحر نامی سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ یہ واقعہ مشہور ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد ابوجندلؓ بھی موقع پا کر مکہ سے دور بھاگ کھڑے ہوئے اور براہ راست ابوبصیر کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے بعد تو یہ بات عام ہو گئی کہ مشرکین قریش میں سے جو شخص مسلمان ہو جاتا وہ بھاگ کر ابوبصیر کے پاس پہنچ جاتا۔ اس طرح ایک اچھی خاصی جماعت سمندر کے کنارے جمع ہو گئی۔ اب انہوں نے یہ حرکت شروع کر دی کہ قریش کے جو قافلے مکہ سے شام کو جاتے ہوئے راستہ سے گزرتے مسلمانوں کی یہ جماعت ان پر حملہ کر دیتی۔ کسی کو قتل کر دیتی اور کسی کا مال لوٹ لیتی۔ قریش کا راستہ رک گیا اور وہ بہت تنگ آ گئے۔ آخر انہوں نے رسول اللہؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو وہاں بلا لیجئے ہم اس شرط سے دست بردار ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو بھی آپؐ کے پاس پہنچ جائے گا اس کی سپردگی کا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ ہم آپ کو اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں کو واپس بلوا لیجئے۔ حضورؐ نے سب کو بلوا لیا اور آیت وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ الخ نازل ہوئی مشرکوں کی حمیت جاہلیت تو یہ تھی کہ انہوں نے بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ نہ لکھنے دیا اور رسول اللہؐ کا لفظ لکھنے سے روک دیا اور بیت اللہ کی زیارت سے مانع آئے۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ کو بلوا کر آپؐ نے یہ سورۃ ان کو سنائی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس وقت یہ شرط ہوئی کہ مکہ والوں میں سے جو شخص مسلمان ہو کر آجائے گا تو اس کو واپس کیا جائے گا اور مسلمانوں کی جماعت کا کوئی شخص اگر بھاگ کر مکہ پہنچ جائے گا تو وہ واپس نہیں کریں گے تو صحابہ نے دریافت کیا کیا ہم یہ بھی مان لیں۔ فرمایا۔ ہاں ہم میں سے اگر کوئی ان کے پاس چلا جائے تو اللہ ہم سے اس سے دور ہی رکھے (وہ مرتد ہو جائے گا ہم کس کام کا رہے گا)

مقصودِ بیان

آل کار حق باطل پر غالب آتا ہے۔ سنت الٰہی اور ضابطۂ خداوندی یہی ہے کہ (ابتدائی دور جزر مد اور اتار چڑھاؤ کے بعد بالآخر) باطل کو شکست ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی حامی و مددگار نہیں رہتا۔ وادیٔ مکہ میں (حدیبیہ کے موقع پر مسلمان کو ابتداً بہ ظاہر (اور معاہدہ کی دفعات کو بنا بر کافروں کی بالادستی کو نمایاں کر رہی تھیں لیکن) حقیقت میں وہ مسلمانوں کی فتح تھی (اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ انسانوں میں باہم کشت و خون ہو اس لئے) اللہ نے مسلمانوں کو حدیبیہ کے موقع پر لڑنے کی اجازت نہیں دی اور کافروں کے بھی ہاتھ باندھ دیئے۔ ان میں بھی لڑائی کی

جرأت نہ ہوتی۔ یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم الشان احسان تھا کہ اس نے بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کو فتح مند کر دیا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ کافروں کو جنگ اور مقابلہ سے روک دینا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے۔ (شیطان مسلمانوں سے کافروں کا تصادم چاہتا ہے لیکن اللہ کافروں کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے۔

آیت هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ الخ میں کفار کا سہ گونہ جرم بیان کیا ہے۔ کفر، مسجد حرام کا طواف نہ کرنے دینا اور قربانی کے جانوروں کو قربان گاہ تک نہ پہنچنے دینا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاجیوں کو حج سے اور عمرہ کرنے والوں کو عمرہ سے اور قربانی کے جانوروں کو قربان گاہ سے روک دینا بہت بڑا جرم ہے بدور کافروں کی خصوصیت ہے۔

الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ نسلی، قومی، قبائلی اور وطنی حمایت اور جذبۂ حق کے مقابلہ میں ان تعصبات سے اثر پذیر ہونا حمیت جاہلیت ہے۔

أَنْزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ کا لفظ بتا رہا ہے کہ رسول اللہ کے فیصلے سے اتفاق کرنا اور اس کو حق سمجھنا گو وہ کتنا ہی خود ی شکن نظر آتا ہو نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ سکون قلب اور اطمینان ایمانی کا۔

أَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اپنی رائے کے خلاف ہو یا موافق، مفید نظر آتا ہو یا مضر بہر حال توحید و رسالت کی شہادت یعنی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو حق سمجھنا لازم ہے۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ الخ سے دو باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ ایک صراحتہً دوسری ضمناً۔ صراحت تو اس امر کی ہے کہ مکہ کے اندر کچھ کمزور مسلمان کافروں کے ساتھ رہنے سہنے مجبوری کی وجہ سے رہ گئے تھے جن سے مہاجرین بھی واقف نہ تھے اور ضمناً یہ بات معلوم ہوتی کہ مومن خواہ کتنے ہی کمزور حالت میں ہوں مگر اللہ ان کی پاسداری کرتا ہے چنانچہ انہی ضعیف بے بس مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو حدیبیہ میں جنگ کرنے سے روک دیا۔ ایک امر یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ کبھی کافروں کو تباہ نہ کرنے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے اندر کچھ پوشیدہ حق پرست بھی ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت مقصود ہوتی ہے یا کافروں میں سے کچھ لوگ آئندہ مسلمان ہونے والے ہوتے ہیں اور ان کو توفیق ایمان ملنے والی ہوتی ہے وغیرہ۔

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو سچا خواب دکھلایا جو مطابق واقع کے ہے کہ تم لوگ مسجد حرام (یعنی مکہ) میں انشاء اللہ ضرور

اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا

جاؤ گے امن و امان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا اور کوئی بال کترتا ہوگا تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں معلوم

فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ

ہیں جو تم کو معلوم نہیں پھر اس سے پہلے ایک فتح دے دی وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت دی اور سچا دین (یعنی اسلام)

دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝

دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی گواہ ہے۔

تفسیر انبیاء کے خواب ہمیشہ سچے ہوتے ہیں تحت الشعور دفینات کی آمیزش اور اوہام کے دخل و معقولات سے پاک ہوتے ہیں خواب کی حقیقت

کی تفصیل ہم حضرت یوسفؑ کے خواب کی بحث میں کر چکے ہیں۔ انبیاء کے خواب بلکہ عموماً منامات صادقہ کبھی تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں جیسے حضرت یوسفؑ کا خواب تھا کہ ماں باپ اور بھائیوں کو آپ نے چاند سورج اور ستاروں کی شکل میں دیکھا تھا یا جیسے شاہ مصر کا خواب تھا کہ پیداوار اور قحط کے سالوں کو اس نے موٹی دبلی گایوں اور سبز و خشک بالوں کی صورت میں دیکھا تھا۔ اور اگر خواب کا ثبوت سے بہت ہی گہرا لگاؤ ہو تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ہونے والے واقعات بالقصد ملکوتی خواب میں اصلی ہیئت و حقیقت کے ساتھ دماغ کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ صورت کشف منامی کی ہوتی ہے، الہامی خواب کی ہوتی ہے یعنی بجائے وحی نبوت کے یہ انکشاف رُوحانی ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کے خواب دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ تلوار کی دھار کو کچھ شکستہ دیکھا اس کی تعبیر کا ظہور احد کی شکست کی شکل میں ہوا۔ کنوئیں میں پانی بھرنا پوری طاقت کے ساتھ یا ضعف کے ساتھ یہ بھی اسی قسم کا خواب تھا جو تعبیر کا محتاج تھا اور حضورؐ نے انتظام دینی کے استحکام یا ضعف سے اس کی تعبیر دی۔ یہ خواب جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے محتاج تعبیر نہ تھا۔ کعبہ میں داخل ہونا، طواف کرنا اور بال منڈانا اور کتروانا اصلی صورت میں دیکھا۔ لیکن ایسا کب اور کس طرح ہوگا، اس کی تعیین اور تفصیل کیفیت نہیں بتائی گئی تھی۔ نہ حضورؐ کو خود معلوم تھا نہ صحابہ سے آپ نے اس کا اظہار کیا لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کا وقت بھی مقرر تھا اور اسباب، کیفیات اور ذرائع بھی۔ اس قسم کے خواب دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی فتح بتدریج ہوگی کہ مکہ پران کا قبضہ ہوگا اگر ترتیبی طور پر۔ چنانچہ پہلے مصالحت حدیبیہ ہوئی جو فتح کا پہلا زینہ تھا جس سے آئندہ فتوحات کا دروازہ کھل گیا، پھر خیبر کی فتح ہوئی اور مسلمانوں کو معاشی سیاسی اور مذہبی استحکام حاصل ہوا۔ پھر ٧ھ میں امن کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ میں داخل ہوئے اور پھر ٨ھ میں جب قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور بنی کنانہ کو بنی خزاعہ کے مقابلہ میں مدد دی تو مسلمانوں کا مکہ میں فاتحانہ داخلہ ہو گیا۔ حقیقت میں رسولؐ کو بھیجنے کی غرض نہ مال کو ایک گروہ کے پاس جمع کرانا تھا۔ نہ حکومت نہ سلطنت دینا بلکہ تمام مذاہب باطلہ کو نابود کرنا اور دین حق کو سب پر غالب بنانا اور تمام گمراہیوں سے لوگوں کو بچا کر راہ مستقیم پر چلانا مقصود تھا۔ پیغمبروں کی بعثت کی اصل غرض یہی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کے ذریعہ سے ہدایت کی اشاعت اسی طریقہ سے کرائی گئی ہے اور دین کا غلبہ سیاسی اور فکری و عملی شکل میں عطا کیا گیا۔

تحلیلِ اجزاء

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ط اوپر کی آیت وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا میں اس طرف اشارہ تھا کہ ہر بات کی مصلحت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ بندوں کے جلدی کرنے سے وہ جلدی نہیں کرتا۔ ہر کام اس کے موقع پر پورا کرتا ہے۔ اس آیت میں اسی اجمال کی کسی قدر تفصیل ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہؐ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ہم کعبہ میں امن سے گئے ہیں۔ ارکان حج و عمرہ باطمینان بجا لائے ہیں۔ سر بھی منڈوا رہے ہیں، بال بھی کتروا رہے ہیں اور کسی کا کچھ خوف و خطر نہیں ہے۔ نبی کا خواب جھوٹا ہونا ناممکن ہے یوں بھی سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزو ہے اور کھلا ہوا خواب اور خصوصاً پیغمبر برحق کا خواب تعبیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ تو صبح کے تڑکے کی طرح سامنے آتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ فوراً اس کی تعبیر ظاہر ہو جائے۔ حضورؐ نے یہ خواب بعض لوگوں سے بیان کر دیا تھا۔ پھر کچھ ہی مدت کے بعد حضورؐ نے عمرہ کرنے کا قصد کیا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ مخالفین سمجھے کہ آپ اسی خواب کی تعبیر کی طلب میں عمرہ کرنے چلے ہیں، مگر رسول اللہؐ نے ظہور تعبیر کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ نہ خود یہ سمجھے تھے کہ اسی سال تعبیر ظاہر ہو جائے گی۔ غرض حدیبیہ پہنچے اور وہاں حرم میں داخلہ نہ ملا اور آئندہ سال کے وعدہ پر مصالحت ہو گئی اور مصالحت کے بعد واپس آگئے۔ اب منافقوں کو تکذیب کا موقع ہاتھ آگیا کہ وہ یہ تو کہتے تھے کہ مجھے خواب میں کعبہ کا طواف کرنے اور دوسرے ارکان ادا کرنے کی بشارت دی گئی ہے۔ اب وہ بشارت کہاں گئی کہ مکہ میں داخل بھی نہ ہو سکے۔ منافقوں نے اس بات کو بہت شہرت دی اور مسلمانوں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا، بلکہ حضرت عمرؓ نے تو صلح نامہ لکھتے وقت ہی عرض کیا تھا کہ آپ نے تو ہم سے فرمایا تھا کہ ہم کعبہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ بات ٹھیک ہے، لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال ایسا ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ جی ہاں یہ تو نہیں فرمایا تھا پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے بھی یہی سوال کیا اور جواب رسول اللہؐ نے دیا تھا وہی حضرت صدیق اکبرؓ نے دیا۔ خلاصہ یہ کہ بعض مسلمان بھی سمجھ چکے تھے کہ خواب کی تعبیر اسی سال سامنے آجائے گی مگر یہ ان کے فہم کی غلطی اور علم کی نارسائی تھی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے رسولؐ کو خواب میں دکھایا تھا کہ تم لوگ مسجد حرام یعنی کعبہ میں امن کے ساتھ ضرور داخل ہو گے۔ یہ راست اور

کوئی خطرہ ہوگا نہ مکہ پہنچ کر طواف کرنے میں کوئی خوف۔ احرام کھولنے کے وقت سر بھی منڈواؤ گے اور بال بھی کترواؤ گے۔ یہ خواب اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا (یعنی اس کی تعبیر ضرور نکلے گی خواہ ایک سال بعد نکلے یا کبھی نکلے)۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو سر منڈانے والوں پر" صحابہ نے عرض کیا اور حضورؐ کتروانے والوں پر بھی پھر حضورؐ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے اور صحابہ نے بھی وہی درخواست کی تیسری یا چوتھی بار میں حضورؐ نے بال کتروانے والوں کے لئے بھی رحمت کی دعا کی پھر فرمایا بے خوف ہو کر یعنی راستہ میں بھی امن وامان سے ہوگے اور مکہ میں قیام بھی بے خوفی کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ عمرۂ قضا میں یہی ہوا۔

عمرۂ قضا ذی قعدہ ۷ھ میں ہوا۔ ماہ صفر ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ خیبر کا علاقہ بہت بڑا تھا۔ کھجوروں کے باغ اور بکثرت کھیتیاں تھیں سارا علاقہ فتح کرنے کے بعد باغ اور زمینیں پیداوار کی نصف بٹائی کی شرط پر یہودیوں ہی کے پاس باقی رکھی گئیں۔ اموال خیبر میں حصہ صرف شرکائے اُحد کا مقرر کیا گیا۔ البتہ ایک شخص جس کا نام ابودجانہ سماک بن خرشہ تھا، حدیبیہ میں ضرور موجود تھا۔ مگر بیعت رضوان سے چھپ گیا تھا اس کا حصہ خیبر میں نہیں لگایا تھا اور بقول ابن کثیر حبشہ کے مہاجرین جو واپس آئے تھے جن میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری بھی تھے، غنائم خیبر میں حصہ دار بنائے گئے۔ خیبر کی فتح کے بعد ماہ ذی قعدہ ۷ھ میں عمرہ کے ارادہ سے روانگی ہوئی۔ ساتھ میں وہی لوگ تھے جو گزشتہ سال حدیبیہ تک گئے تھے اور عمرہ نہ کر سکے تھے ذوالحلیفہ میں پہنچ کر احرام باندھا، قربانی کے ساٹھ اونٹ ساتھ لئے۔ ظہران کے قریب پہنچ کر محمد بن مسلمہ کو سواروں کا ایک دستہ دے کر آگے روانہ کر دیا۔ دستہ مسلح تھا۔ مسلح دستہ دیکھ کر مشرک خوفزدہ ہوگئے اور انہوں نے خیال کیا کہ مسلمان پورے ساز وسامان کے ساتھ آئے ہیں ضرور انہوں نے معاہدہ شکنی کی ہے۔ اور لڑنے کے ارادے سے آئے ہیں یہ سوچ کر دور ڈرے سہمے ہوئے مکہ کو گئے اور اہل مکہ کو مسلمانوں کے مسلح ہونے کی اطلاع دے دی۔ حضورؐ ظہران پہنچے تو آپ نے تمام مسلمانوں کے نیزے بھالے تیر کمان وادی یاجج میں بھیج دیں اور شرط کے مطابق صرف تلواریں اور وہ بھی نیاموں میں رکھ کر اپنے پاس رکھیں۔ اُدھر قریش نے مکرز بن حفص کو آپؐ کے پاس بھیجا۔ مکرز نے آکر کہا۔ آپ کی عادت عہد شکنی کی تو نہ تھی پھر ایسا کیوں کیا۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا بات ہوئی۔ مکرز نے کہا آپ تیر کمان اور برچھے بھالے ساتھ لے کر آئے ہیں، حضورؐ نے فرمایا ہم نے تو یہ سب اسلحہ بطن یاجج میں بھیج دیئے ہیں۔ مکرز نے کہا ہم کو آپ سے یہی اُمید تھی آپ ہمیشہ بھلائی اور وفائے عہد کرنے والے ہیں۔

مکہ میں جو بڑے بڑے سردارانِ کفر تھے ان کو رسول اللہؐ اور صحابہ کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ تھی، مسلمانوں کے داخلہ سے پہلے ہی شہر سے نکل گئے۔ باقی سب عورتیں بچے راستوں، ناکوں اور کوٹھوں پر کھڑے ہو کر اس مخلص پاکباز گروہ کا نظارہ کرنے لگے حضورؐ نے قربانی کے جانور ذی طویٰ میں بھیج دیئے۔ حضورؐ خود قصواء اونٹنی پر سوار تھے اور آگے آگے صحابہ لبیک پکار رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ آپؐ کی اونٹنی کی مہار پکڑے یہ اشعار پڑھ رہے تھے

بِسْمِ الَّذِیْ لَا دِیْنَ اِلَّا دِیْنُهٗ　　بِسْمِ الَّذِیْ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُهٗ

اس خدا کے نام سے جس کے دین کے سوا کوئی دین نہیں۔ اُس خدا کے نام سے جس کے رسول محمدؐ ہیں

فَکُّوْا بَنِی الْکُفَّارِ عَنْ سَبِیْلِهٖ　　اَلْیَوْمَ نَضْرِبُکُمْ عَلٰی تَاوِیْلِهٖ

اے کافرو حضورؐ کے راستہ سے ہٹ جاؤ آج حضورؐ کے لوٹنے پر بھی ہم تم کو اسی طرح ماریں گے

کَمَا ضَرَبْنَاکُمْ عَلٰی تَنْزِیْلِهٖ　　ضَرْبًا یُزِیْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِیْلِهٖ

جس طرح آپ کے آنے پر تم کو مارا تھا ایسی مار ماریں گے جو دماغ کو اس کے ٹھکانے سے ہٹا دے

وَیُذْهِلُ الْخَلِیْلَ عَنْ خَلِیْلِهٖ　　قَدْ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ فِیْ تَنْزِیْلِهٖ

اور دوست کو دوست سے غافل کر دے۔ اللہ رحمٰن نے اپنی وحی میں نازل فرمایا ہے:

فِیْ صُحُفٍ تُتْلٰی عَلٰی رَسُوْلِهٖ　　بِاَنَّ خَیْرَ الْقَتْلِ فِیْ سَبِیْلِهٖ

ان صحیفوں میں جو اللہ تعالیٰ کے رسولؐ پر تلاوت کئے جاتے ہیں کہ سب سے بہتر موت وہ موت ہے جو راہ خدا میں ہو۔

یٰرَبِّ اِنِّیْ مُؤْمِنٌ بِقِیْلِہٖ

اے میرے رب میں ان کی بات پر ایمان رکھتا ہوں

مسند احمد میں ہے کہ جب آپ اور صحابہ مرالظہران میں پہنچے تو اہلِ مکہ کہنے لگے یہ لوگ تو کمزوری اور لاغری کی وجہ سے اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتے صحابہ نے یہ بات سُن کر رسول اللہ سے عرض کیا۔ اگر حضورؐ اجازت دیں تو ہم اپنی سواریوں کے چند جانور یہیں ذبح کرلیں اور ان کا گوشت کھاکر اور شوربہ پی کر چاق و چست ہوکر مکہ میں جائیں۔ فرمایا نہیں، ایسا نہ کرو بلکہ تمہارے پاس جو کھانے کی چیزیں ہوں ان کو جمع کرلو چنانچہ ایک دسترخوان بچھایا گیا اور سب چیزیں اس پر جمع کردی گئیں اور سب کھانے بیٹھے تو حضورؐ کی دعا سے کھانے میں اتنی برکت ہوگئی کہ سب نے کھا بھی لیا اور توشہ دان بھی بھر لئے یہاں سے آپ سیدھے مکہ میں آئے قریش حطیم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے چادر کے پلّے دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر گھما کر بائیں کندھے پر ڈال لئے۔ اور فرمایا یہ لوگ تم میں سستی اور کمزوری محسوس نہ کریں (یعنی ذرا تیز چال سے طواف کرنا) پھر آپؐ نے رکن کو بوسہ دے کر لپک کر طواف کرنا شروع کیا جب رکن یمانی کے پاس پہنچے جہاں قریش کی نظریں نہیں پڑتی تھیں، وہاں سے آہستہ آہستہ چل کر حجر اسود تک پہنچے تو قریش کہنے لگے۔ تم لوگ تو ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہے ہو۔ حضورؐ نے تین پھیرے اسی طرح کئے اور اوّل تین پھیروں میں اسی طرح طواف کرنا مسنون ہوگیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں بھی اول تین پھیروں میں اسی طرح عمل کیا تھا (یعنی لپک کر طواف کیا تھا) صحیحین کی روایت سے بھی اس عمرہ میں اوّل تین پھیروں میں رمل کرنا آیا ہے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جب مشرکوں نے صحابہ کو چستی اور پھرتی کے ساتھ طواف کرتے دیکھا تو کہنے لگے انہی لوگوں کے متعلق تم نے یہ بات کہی تھی کہ مدینے کے بخار نے ان کو سست اور دُبلا کردیا ہے یہ فلاں فلاں شخص سے بھی زیادہ چست چالاک ہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ذیقعدہ کی چوتھی تاریخ کو مکہ پہنچ گئے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرک اس وقت قعیقعان کی طرف چلے گئے تھے حضورؐ کا صفا و مروہ کے درمیان (قوت کے ساتھ) سعی کرنا بھی مشرکوں پر اثر ڈالنے کے لئے تھا۔

حضرت ابن ابی اوفیٰ کا قول ہے۔ اس روز ہم حضورؐ کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے تاکہ کوئی مشرک یا کوئی بیوقوف آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچائے۔ غرض جب مقررہ مدت ختم ہوگئی تو مشرکین نے حضرت علی رضؓ سے کہا۔ آپ ان سے کہئے کہ اب وقت گزر چکا ہے۔ آپؐ واپس چلے جائیں۔ حضرت علیؓ نے اطلاع دے دی۔ اور حضورؐ نے کوچ کردیا۔ حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی چچا چچا کہہ کر آپ کے پیچھے ہولیں۔ حضرت علی رضؓ نے ان کو اٹھالیا اور حضرت فاطمہؓ کے پاس لے گئے اور فرمایا اپنے چچا کی لڑکی کو اچھی طرح رکھو۔ حضرت سیدہ نے بچی کو خوشی خوشی اپنے پاس بٹھالیا۔ بچی کے متعلق حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان نزاع پیدا ہوگیا۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے میں اس کا مستحق ہوں۔ حضرت جعفر رضؓ نے کہا۔ یہ میرے بھی چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں بھی ہے۔ حضرت زیدؓ نے کہا یہ میرے بھائی کی لڑکی ہے۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا لڑکی خالہ کے سپرد کردی جائے۔ خالہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے۔ حضرت علی رضؓ سے فرمایا۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ حضرت جعفرؓ سے فرمایا۔ تم جسمانی ساخت اور اخلاق میں مجھ سے پوری مشابہت رکھتے ہو حضرت زیدؓ سے فرمایا۔ تم میرے بھائی اور مولیٰ (آزاد کردہ) ہو۔

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۔ پس اللہ تعالیٰ کو وہ مصلحت معلوم تھی جو تم کو معلوم نہ تھی۔ اس کی حکمت تھی کہ جو لوگ پوشیدہ طور پر مومن ہیں اور مکہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے رہنے پر مجبور ہیں۔ ان کو گزند نہ پہنچے اور خونریزی نہ ہو اور مسلمانوں کے لئے فتوحات کا دروازہ کھل جائے اور ان کا مالی معاشی اور سیاسی استحکام ہو جائے اور بیرونِ عرب تبلیغ کا راستہ کھل آئے اور یہودیوں کا سودی جال ٹوٹ جائے اور قبائل یہران کا سیاسی معاشی دباؤ کم ہو جائے اور ان کا مذہبی وعلمی غرور ٹوٹ جائے۔ اور ان کے علاوہ اللہ کی دوسری مصلحتیں تھیں کہ عمرہ کرنے میں ایک سال کی تاخیر ہوگئی لیکن اس نے آئندہ پُرحکمت فوائد کے حصول کی تمہید کے طور پر فتحِ قریب یعنی مصالحت حدیبیہ اور خیبر کی فتح عطا فرما دی۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ایک شبہ ہوسکتا ہے اور تاریک دانش والے مستشرق یہ شبہ کرتے ہیں اور انتہائی بلند آہنگی سے کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اسلام ایک ایسی تحریک ہے جس کا مقصد حصولِ اقتدار اور زمین پر قبضہ ہے (نعوذ باللہ) رسول اللہ کا مقصد یہی تھا کہ ان کو قبائل عرب اور پھر اطراف عرب پر تسلط حاصل ہو جائے جب ہی تو ادھر اُدھر کی بغیر جنگ

کرکے خیبر پر چڑھائی کردی اور حدیبیہ کے موقع پر جب اہل مکہ صف بند ہو گئے اور مقابلہ کی طاقت مسلمانوں کے قائدنے اپنے اندر نہ دیکھی تو صلح کرلی اور دوسرے سال جب عمرہ کیا اور اہلِ مکہ کی طاقت کا اندازہ کرلیا تو ۸ ہجری میں مکہ پر چڑھ دوڑے اور بستی پر قبضہ کرکے مکہ والوں پر تسلط جمالیا۔ اس قسم کی خرافات کو دور کرنے اور تاریک دماغوں میں روشنی پیدا کرنے کے لئے آیتِ مذکورہ نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد رسول اللہ کا ملک پر تسلط قائم کرانا نہیں ہے۔ نہ پیغمبروں کو بھیجنے کی یہ غرض ہوتی ہے۔ وہ تو ہدایتِ خلق پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کا دین حق ہوتا ہے۔ یعنی ایسے افکار و عقائد جو دنیا و آخرت میں مفید ہوں اور ایسے اعمالِ صالحہ جو دنیا سے فساد کو مٹائیں اور آخرت میں نجات و سعادت کے کفیل ہوں۔ دونوں کا مجموعہ اُن کا دین ہوتا ہے اور اسی دین کو تمام باطل مذاہب پر غالب کرنے کی کوشش ان کا فریضہ ہوتا ہے۔ دین کا یہ غلبہ اخلاقی و روحانی بھی ہوتا ہے اور سماجی و سیاسی بھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت آگیں ہدایت آفریں دستورِ حیات اور حق و صداقت کا حامل دین دے کر بھیجا اور یہ دین اس لئے بھیجا کہ تمام باطل مذاہب و مسالک کو چھوڑ کر لوگ اس کو اپنالیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے تمام بطالت آگیں قواعد مٹ جائیں اور دینِ خالص یعنی اللہ کا بنایا ہوا اللہ کا بھیجا ہوا دینِ خالص سب پر غالب آجائے۔ پس دینِ الٰہی کے غلبہ آنے کی صورت جس طرح اخلاقی اور روحانی اور فکری برتری تھی اسی طرح سماجی اور سیاسی رفعتِ شان بھی۔ سیاسی رفعت کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا دین آیا ہی اس غرض کے لئے ہے کہ اس کو سیاسی برتری اور حاکمانہ تسلط ہو جائے اور اس دین کے ماننے والوں کو صرف دنیوی اقتدارِ اعلیٰ مل جائے۔ سیاسی برتری تو دینی غلبہ کی ایک شاخ ہے۔ اصل مقصد تو لوگوں کی زندگی کو سیدھا راستہ دکھانا ہے اور ایسے ضابطۂ زندگی پر چلانا غرض ہے جو سراسر حق اور صحیح ہے۔ کجروی سے بچانا اور صراطِ مستقیم پر گامزن کرانا اصل غایتِ رسالت ہے۔

وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا۔ لیکن کون سا دین حق ہے اور کونسا باطل اس کا فیصلہ کوئی انسان خود نہیں کرسکتا کوئی عقل نارسائی اور جذبات کی آمیزش اور عجز سے خالی نہیں، اس لئے کہ کوئی بھی از خود نہیں بتاسکتا کہ انسان کسی دستورِ حیات کی پابندی کرے۔ اس فیصلہ کا اختیار تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے جو نظامِ زندگی بنائے اور بتائے کہ اس پر عمل کرو اور یہ عقیدہ رکھو۔ حق و باطل میں تمیز دینے والی تو بس اللہ ہی کی شہادت ہے اور اسی کی شہادت بس فیصلہ کن شہادت ہے اور اسی کا بھیجا ہوا دین دینِ حق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بنائے تشریعات انسانوں کے ہاتھوں میں کیسے پہنچیں اور لوگوں کو اللہ کے دین کا علم کیسے ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے ہیں جو قومی اور ملکی پیغام رساں تھے۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام لائے تھے۔ لوگوں تک پہنچایا تھا۔ پس دوسرے پیغمبروں کی طرح اللہ نے موجودہ اور آنے والے انسانوں کے لئے بھی ایک رسول مبعوث فرمایا اور ان کے لائے ہوئے دین کو غالب کرنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ان کے دینی غلبہ کی ایک صورت فتح کی شکل میں سامنے ہی آگئی اسی مضمون کو آئندہ آیت میں بیان فرمایا ہے۔

مقصودِ بیان لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ الخ۔ یہ آیت صراحت کے بتارہی ہے کہ واقعہ حدیبیہ سے پہلے رسول اللہ کو خواب میں دکھادیا گیا کہ آپ کے رفیق مزور کعبہ کا طواف کریں گے اور پھر سر منڈائیں گے اور بال کتروائیں گے اور نہ خطرہ راہ اُن کو ہوگا نہ طواف کرتے وقت کوئی خوف۔ نہایت امن و امان اور بے خوفی کی حالت میں یہ ارکان ادا کریں گے۔ لیکن اس بشارتِ منامی میں وقت کی تعیین نہ تھی، نہ کوئی خاص کیفیت یا ذرائع کی تفصیل تھی۔ ظاہر ہے کہ عرب میں اس وقت اقتدار مشرکین کا تھا۔ مکہ تو قریش کی طاقت کا مرکز ہی تھا۔ قریش کا اثر مدینہ اور خیبر کے یہودیوں بلکہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے رہنے والے منافقوں اور مشرکوں پر بھی تھا سب طرف ملک کی سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں کوئی بھی از خود نہیں کہہ سکتا تھا کہ مسلمان امن کے ساتھ مکہ جائیں گے اور وہاں عمرہ یا حج بے خوفی کے ساتھ کرسکیں گے۔ حالات شہادت دے رہے ہیں کہ یہ خواب، خوابِ نبوت تھا اور خواب کی یہ بشارت من جانب اللہ تھی۔ چنانچہ یہ خواب آئندہ کچھ ہی مدت میں سچا ثابت بھی ہوگیا اور دوسرے سال سب لوگوں نے امن کے ساتھ عمرۃ القضا بھی کیا، در پردہ لَقَدْ صَدَقَ میں اس طرف اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ مکہ پر مسلمانوں کا اقتدار ہو جائے گا۔ کیونکہ فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا سے معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی فتح بعید بھی ہونے والی ہے۔ جب فتح قریب فتح خیبر ہوگی تو فتح بعید فتح مکہ ہی قرار پائے گی۔ تو گویا خواب میں دو باتوں کی بشارت دی گئی۔ ایک کی صراحۃً کہ مکہ میں امن سے داخل ہوگے اور دوسری کی اشارۃً یا ضمناً کہ مکہ پر تمہارا تسلط ہو جائے گا۔

۲- فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا سے معلوم ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظہور خواب کا وقت اور تاخیر ظہور کی حکمت و مصلحت نہیں ظاہر فرمائی تھی کیا مصلحت تھی اس تدریجی فتح کہ کی اور کیا حکمت تھی حدیبیہ کو بھیجنا اور پھر وہاں حرم کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دینا اور بظاہر مغلوبانہ مصالحت کرانا اور پھر دوسرے سال عمرہ کرانا غرض اس قسم کے واقعات کا تسلسل اور آہستہ آہستہ بر سر ظہور ہونا اپنے اندر کیا حکمت رکھتا تھا۔ اس سے واقف صرف اللہ تعالیٰ تھا مگر وہ مصلحت تھی تو کوئی عظیم الشان اور اہم ترین بات جس کی قبل از وقت مسلمانوں کو بھی اطلاع نہیں دی۔

آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ الآیۃ سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے:-

۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔

۲- آپ کو اللہ ہی نے پیام ہدایت دیا تھا۔ آپ کے ذہنی اختراع اور دماغی تراش خراش کو اس میں دخل نہ تھا۔

۳- مقصد رسالت عمومی ہدایت اور لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا تھا۔

۴- اسلام دین حق ہے اور یہی دین اللہ کا دین ہے جو رسول اللہ لے کر آئے تھے۔

۵- اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ دین اسلام تمام مذاہب پر غالب آجائے (چنانچہ اس کی تکمیل رسول اللہ اور آپ کے خلفاء کے زمانہ میں بدرجۂ اتم ہو گئی اور دنیائے کفر مغلوب ہو گئی)

۶- حق و باطل کی شہادت دینی اور فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اور اس کی شہادت کے بعد کسی کے عقلی فیصلے اور ذہنی شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک درس حقیقت ہے، ان نارسیدہ مدعیان علم دین کے لئے جو اپنی نارسا دانش کو معیار حق و باطل قرار دیتے ہیں اور اگر شہادت قرآنی کا ان کے نابالغ فہم سے کہیں تصادم ہوتا ہے تو اپنی سمجھ کو تابع قرآن بنانے کی بجائے نص قرآنی کی تاویلات بلا نفع کرنے لگتے ہیں تاکہ ان کے عقلی مفروضے کی تغلیط لازم نہ آئے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب الرائے فقہاء اسلام کے قیاس کا اگر ٹکراؤ کسی نص سے ہو سکا ہو تو قیاس کو ترک کر دینا ضروری ہے۔ وغیرہ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی

سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ

یہ ان کے اوصاف تورات میں ہیں اور انجیل میں ان کا یہ وصف ہے کہ جیسے کھیتی اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ

قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تاکہ ان سے کافروں کو جلا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۧ ع

سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت کا اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

ع ۴ ۱۲

تفسیر کوئی جماعت علمبردارِ حق ہو یا باطل پرست، اصحاب توحید ہوں یا اہل شرک، تعمیر انسانی کے متمنی ہوں یا تخریب کار مفسد انسانی سوسائٹی کے لئے پیامِ موت لانے والے بہرحال کسی تحریک اور نظریئے کی کامیابی دو امور کی خواستگار ہے۔

(۱) تحریک چلانے والے اور اپنا دستور زندگی پھیلانے والے باہم ہمدرد ہوں، ایک دوسرے کا مونس و غم خوار ہو ہر شخص اپنی جماعت کے دوسرے لوگوں پر مہربان ہو، مددگار ہو، جسمانی ارکانی مالی معاشی اور افکاری امداد کرنے والا ہو، ایسا کرنے سے داخلی تنظیم میں استواری پیدا ہوگی، جماعتی شیرازہ پراگندہ ہونے سے محفوظ رہے گا۔ افراد کا ربط اساسِ اجتماعیت ہے اور باہم ارتباط پیدا کرنے والا مادہ عاطفۂ اخوت اور داعیہ محبت ہے جو ایک کے دل کو دوسرے کی طرف جھکاتا ہے۔ اسی قلبی میلان اور جھکاؤ کا نام دل کی نرمی اور جذبۂ رحم ہے جو ارتباطِ افراد کی جڑ ہے۔ جماعتی قوت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

(۲) جو لوگ اس جماعت کے مخالف ہوں، اس سے تصادم پیدا کرنے والے ہوں، اس کی بیخ کنی کرنے والے ہوں۔ اس کے فکری نظریہ اور عملی دستور کے دشمن ہوں ان کا مکمل جرأت، قوت اور شدت کے ساتھ اجتماعی مقابلہ کیا جائے۔ ذہنوں میں شکست نہ ہو، حوصلوں میں پستی نہ ہو، عزم میں ضعف نہ ہو۔ انفرادی عداوت اور شخصی جذبۂ بغض سے آزاد رہ کر اجتماعی اور اتحادی مرکزیت کے زیر اثر نظریہ و دستور کے دشمنوں سے شدت اور شجاعت کے ساتھ ٹکراؤ کیا جائے۔ مقابلہ کے وقت کسی قوم کی کامیابی اور غلبہ پانے کے لئے یہ دونوں باتیں سنگِ بنیاد ہیں لیکن یاد رکھو کہ غلبہ پانے کے لئے ہی نہیں بلکہ اقتدار و غلبہ کی بقا کے لئے بھی یہی دونوں بنیادی ضابطے ہیں جو برسرِ اقتدار غالب جماعت دشمنوں کے مقابلے میں سست پڑ جاتی ہے اور اس کے افراد میں باہمی قلبی جھکاؤ باقی نہیں رہتا اور عاطفۂ محبت سرد پڑ جاتا ہے اور ایک کا دوسرے کی طرف میلانِ خاطر مفقود یا کمزور ہو جاتا ہے تو ایسی حالت میں یہ جماعت ضعیف البنیان ہو جاتی ہے۔ مدت قریب یا بعید کے بعد دشمن اس کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیتے ہیں اور اس پر غالب آجاتے ہیں۔ پس یہی دونوں امور جس طرح حصولِ غلبہ و کامیابی کا سنگِ اساس ہیں اسی طرح بقائے غلبہ و اقتدار بھی انہی پر موقوف ہے۔ یہ فطری اصول ہیں جن سے نہ کوئی حق پرست علمبردارِ صداقت جماعت بے نیاز رہ سکتی ہے نہ کسی باطل تحریک کے حامی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک اللہ کے رسول تھے فکر و عمل میں انقلاب پیدا کر دینے والا پیام دے کر اللہ نے آپ کو بھیجا تھا لیکن کیا اس انقلابی پیام اور رسالت کا مقصد صرف حصولِ اقتدار و غلبہ تھا۔ اپنی اور اپنی جماعت کی برتری اور مخالفین کی ذلت و محکومی ہی پیشِ نظر تھی یا کوئی اور مقصد تھا اور مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ حصولِ اقتدار بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ اول شق رسالت کی اصل غرض نہ تھی۔ یہ غرض تو ہر سیاسی دنیوی تحریک کی ہوتی ہے۔ دنیوی عروج و فوقیت جذبۂ نفسانی اور عاطفۂ شیطانی کا مقتضا ہے اور رسالت فکر و عمل کی اصلاح کرنے والا ایک ضابطۂ الٰہی ہے۔ رسالت کی اصل غرض یہ ہے کہ بھٹکی ہوئی سوسائٹی کو سیدھا راستہ دکھایا جائے، جو مخلوق اپنے خالق سے کٹ کر بیٹھ کر اپنی جیسی دوسری مخلوق کی خوشنودی کے حصول کو حاصلِ زندگی سمجھ بیٹھی ہو اس کو خالق سے جوڑ دیا جائے۔ ٹیڑھے دلوں کو مخلوق کی طرف سے موڑ کر خالق کی مرضی و خوشنودی کا طلبگار بنا دیا جائے۔ پیغمبر کے آنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی اللہ کے بندوں میں نافذ کیا جائے۔ ضابطۂ شریعت کی پابندی اور اس پابندی سے رضائے مولیٰ کی طلب اور اس کے فضل کی جستجو اصل مقصدِ رسالت ہے۔ پتھر ہوں یا درخت، پانی ہو یا آگ سورج ہو یا چاند، ستارے ہوں یا سیارے، غیبی ارواح ہوں یا طبعی قوتیں، موہومی دیوتا ہوں یا موکل ملائکہ، کسی کے سامنے سرِ نیاز نہ جھکایا جائے۔ کسی کو مسجود و معبود نہ قرار دیا جائے۔ دوستوں کی دوستی اور دشمنوں سے عداوت رکھنے کی غایت سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو کہ اللہ ہی سے اس کے فضل کی طلب اور اس کی خوشنودی کی خواستگاری کی جائے۔ اسی کے سامنے پشتِ عبدیت خمیدہ کی جائے اور سرِ عبدیت جھکایا جائے۔ اسی سے روح کی پاکیزگی اور دل کی صفائی وابستہ ہے۔ بدن کی جلد کالی ہو یا گوری، خدوخال اور ناک نقشہ جاذبِ نظر ہو یا بھونڈا بہرحال بارگاہِ معبودیت میں پشت بر کوع اور سر بسجدہ ہونے سے نورِ تجلی چہروں پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک روحانی نورانی چمک ہوتی ہے جس کا ظہور اہلِ نظر کے لئے مقدس چہروں سے بھی ہوتا ہے۔ ہاں روحانی نابیناؤں کو وہ نور دکھائی نہیں دیتا۔ بینا آنکھوں والے ہی اس کو دیکھتے ہیں۔ رسالتِ محمدیہ جس اصلاح و انقلاب کی حامل ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہی پیام تو تورات و انجیل بھی لائی تھی۔ ان جگمگاتے نورانی چہروں

کے جمالِ صوری و معنوی کا اظہار تو تورات و انجیل میں بھی کیا گیا ہے۔ (دس ہزار قدسیوں کا تعداد کے ساتھ کوہ سعیر یعنی مدینہ اور کوہ فاران یعنی کہ سے ظہور تو تورات میں مذکور ہے) خوب سمجھ لو کہ مزرعۂ حیات میں تخم اصلاح و انقلاب آغاز نشو میں دو پارہ ہو کر اس طرح نکلتا ہے جیسے ہر تخم سے ابتدا میں ایک سوئی جیسی کونپل نکلتی ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ اس کو طاقت عطا فرماتا ہے اور توقیف نمو کے ساتھ موٹی ہو کر سیدھی ہو جاتی ہے پھر مضبوطی کے ساتھ سیدھی اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے پھر اس کا لہلہاتا سبزہ بن جاتا ہے (جس میں پھل اور خوشے آتے ہیں) جس سے کاشتکار کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ہر تخم حقانیت کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ شروع میں روپوش ہوتا ہے پھر اس کا ضعیف شکل میں ظہور ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ پھر استقلال کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاتا پھر لہلہاتا اور بار آور ہوتا ہے۔ اس کی ترقی سر سبزی اور ثمر آگینی کو دیکھ کر باطل پرست جل اُٹھتے ہیں۔ ان کے دل حسد اور شدتِ غضب کی آگ سے سوختہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ اس نے صداقت کا جھنڈا بلند کرنے والوں اور نیکو کار اہلِ ایمان سے وعدہ کر لیا ہے کہ پہلے کی ہوئی فکری اور عملی غلطیوں کا ان سے مواخذہ نہیں کرے گا اور کفر سے رشتہ توڑ کر ایمان اختیار کرنے اور بد چلنی کو ترک کر کے اعمال و اقوال کو درست کر لینے کا اجر عظیم دنیا اور آخرت میں ان کو عطا کرے گا۔ سو یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گی۔

تحلیلِ اجزاء

محمد رسول اللہ۔ حدیبیہ کے صلحنامہ کی تحریر پر قریش کے نمائندے نے اعتراض کیا تھا کہ ہم آپؐ کو اللہ کا رسول جانتے تو جھگڑا ہی کیا رہتا، اس لئے دستخط کی جگہ آپ محمد رسول اللہ نہ لکھیں۔ محمد بن عبداللہ لکھیں حضورؐ نے حضرت علیؓ کو جو کاتبِ تحریر تھے لفظ رسول اللہ مٹا دینے کا مشورہ دیا مگر حضرت علیؓ نے عرض کیا مجھ سے یہ ممکن کہ میں آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا لکھا ہوا لفظ مٹا دوں۔ آخر رسول اللہ کا لفظ حضورؐ نے خود مٹا دیا۔ اس سے حضرت علیؓ کے دل میں فطرتاً کچھ ملال پیدا ہوا ہوگا۔ اور مسلمانوں کو بھی کچھ رنج ہوا ہوگا۔ پس رنج و ملال کو دور کرنے کے لئے فرمایا محمد رسول اللہ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اوپر کی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کا حامل بنا کر اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کا دین تمام مذاہب پر غالب آجائے لیکن حدیبیہ کے صلحنامہ سے تو بظاہر دینِ حق کی مغلوبیت مترشح ہو رہی ہے اسی لئے صحابہؓ کو یہ صلحنامہ ناگوار ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو حاضرِ خدمت ہو کر صاف طور پر عرض کر دیا تھا۔ یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر اور کافر باطل پر نہیں ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا بیشک ایسا ہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا پھر ایسا مغلوبانہ معاہدہ کس طرح زیبا ہے۔ انہی شبہات کو دور کرنے اور دین کے غالب ہونے اور رفتہ رفتہ ہمہ گیر بننے کی طرف اشارہ آئندہ آیات میں کیا گیا ہے اور اس جگہ سے اس کی تمہید قائم کر کے آخر میں اجر عظیم دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ اس آیت میں صحابۂ کرام کے چار خصوصی اوصاف کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) دشمنوں کے مقابلے میں سخت ہیں نشارت سے یہ مراد نہیں کہ وہ بے رحم ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جذبۂ رحم کا اظہار بے محل نہیں کرتے۔ اللہ کے دین کے دشمن جب دین کی بیخ کنی کے درپے ہیں تو دین کے علمبرداروں کی طرف سے کسی رحم کے مستحق نہیں۔ دین کے معاملے میں دین کے حامیوں کے دلوں میں دین کے دشمنوں کے لئے کوئی رافت اور نرمی نہ ہونی چاہیئے ورنہ دین میں ضعف پیدا ہونا یقینی ہے۔ جب انصاف کی حمایت میں سرگرمی کا اظہار نہ کیا جائے گا اور ظالموں کی قرابت دوستی وطنیت یا کسی اور نفسانی جاذبہ کے زیر اثر لحاظ کیا جائے گا تو دینی پہلو کمزور ہو جائے گا۔ جج مجرموں کے ساتھ نرمی کرے گا تو انصاف کا خون ہوگا اور ظلم کو ترقی ہوگی۔ پس صحابہؓ کا ایک خصوصی وصف یہ تھا کہ دشمنِ دین ان کا باپ ہو یا بھائی، کوئی رشتہ دار ہو یا دوست کسی دنیوی رشتہ کی اُن کو پرواہ نہ تھی۔ ہر دشمنِ دین کے معاملہ میں وہ سختی کے ساتھ اسلام کے حامی تھے اور دشمنانِ دین کے مقابلہ میں وہ جری بہادر اور سخت تھے۔

(۲) صحابہ کا دوسرا امتیازِ خصوصی یہ تھا کہ وہ آپس میں مہربان تھے۔ باہمی مہربانی اور رحم ہر تنظیم و اجتماعیت کی جڑ ہے۔

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ سے دینی معاملات میں نرمی مراد نہیں کہ زانی، چور، ڈاکو اور تارکِ الفرائض کے معاملات میں بھی وہ نرمی کریں بلکہ باہمی حقوق

اور آپس کے سلوک و معاشرت میں رحم دل ہیں (مثلاً نادار قرضدار پر ادائے قرض کا تقاضا نہیں کرتے۔ غریبوں اور ناداروں کی مالی مدد کرتے ہیں یتیموں کی سرپرستی اور بیواؤں کی خبرگیری کرتے ہیں۔ بیماروں کی دوا اور تیمارداری اور بے کس بے بس کمزور لوگوں کی ہر طرح سے جسمانی اور مالی خدمت کرتے وغیرہ وغیرہ) لفظ بَیۡنَہُمۡ اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں ضابطے تو تمام نظریاتی تنظیموں کے قیام و بقا کے ضروری اجزا ہیں۔ کوئی تنظیم مذہبی ہو یا سیاسی، فکری ہو یا عملی، ان دونوں فطری ارکان سے بے نیاز ہو کر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر تحریک خواہ حق ہو یا باطل اپنے قیام بقا اور قابلِ قبول بننے کے لئے انہی دونوں اجزا پر موقوف ہے۔ ربطِ باہم اور دفاعِ محکم کے بغیر کوئی نظریہ یا عملیہ عالم وجود میں نہیں آسکتا اور موجود بھی ہو جائے تو فروغ نہیں پا سکتا اور مقبول بھی ہو جائے تو زیادہ مدت تک باقی نہیں رہ سکتا۔ تعلیمِ قرآنی اور صحبتِ نبوت نے صحابہ کو بھی اسلامی زندگی کے وجود و بقا کا یہ گر سمجھا دیا تھا اور روحِ اجتماعیت اس مقدس جماعت کے رگ و پے میں پھونک دی تھی۔

(۳) صحابۂ کرام کو اپنی داخلی تنظیم کی استواری اور دفاعِ محکم پر ہی بھروسہ نہ تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ اپنی اجتماعیت کو مضبوط کرنے اور دشمن پر غالب آنے کے بعد زمین پر دوسری قوموں کی طرح اپنا اقتدار قائم کر لیں اور دولت و حکومت پر قبضہ جما لیں بلکہ ان کی ساری تنظیم کی اصل غایت یہ تھی کہ اپنے خالق و معبود سے اپنا رشتۂ عبدیت و عبادت مضبوط کریں۔ بیشتر اوقاتِ زندگی کو مظاہرۂ عبدیت کے لئے وقف کر دیں۔ دنیا کے سامنے سربلند رکھیں اور اپنے معبود کے سامنے سرافگندہ ہو جائیں۔ بڑے سے بڑے پُرجبروت دیوتاؤں، پُرجلال ملائکہ اور پُرہیبت بادشاہوں کے سامنے نہ جھکیں۔ مگر خالقِ کائنات کے دربار میں پشت خمیدہ بن جائیں۔ کوئی دنیوی لالچ دولت، سیادت، قیادت، حکومت ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ وہ کسی سے کسی دنیوی مفاد کے خواستگار نہ ہوں بلکہ جو کچھ مانگیں اپنے رب سے مانگیں۔ اسی کے فضل کے طلبگار ہوں اور اسی کی خوشنودی کے جویا۔ ان کا مرکزِ توجہ اپنے رب کی مرضی ہو اور یہی ان کی زندگی کا حاصل۔

(۴) ان کا چوتھا امتیازی وصف یہ ہے کہ سجدوں کے خصوصی نشانات و علامات ان کے چہروں پر ہیں۔ سِیۡمَا علامت، نشان۔ اس سے مراد حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اچھے اخلاق اور مجاہد کے نزدیک خشوع و تواضع ہے۔ مجاہد سے منصور نے کہا۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ اس سے مراد سجدہ کا وہ نشان ہے جو ماتھے پر پڑ جاتا ہے۔

مجاہد نے فرمایا یہ تو ان لوگوں کی پیشانیوں پر بھی پڑ جاتا ہے جن کے دل فرعون سے بھی سخت ہوتے ہیں۔

سدی نے کہا نماز چہروں میں (کچھ باطنی) حسن پیدا کر دیتی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت جابرؓ کی مرفوع روایت اسی مضمون کی بیان کی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا قول ہے۔ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے۔ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ نیکی کی وجہ سے دل میں نور چہرے پر روشنی روزی میں کشادگی اور لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا جو شخص اپنے اندرونی حالات کی اصلاح کرے اور مخلوق سے چھپ کر نیکیاں کرے اس کا اثر چہرے کی سلوٹوں پر اور اس کی زبان کے کناروں پر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتا ہے۔ غرض چہرہ دل کا آئینہ ہے۔ باطن کا اثر چہرے پر آجاتا ہے۔ مومن جب اپنے دل کی اصلاح کر لیتا ہے اور باطن کو سنوار لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں سنوار دیتا ہے۔

مسند میں امام احمد نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص کسی ٹھوس چٹان کے اندر گھس کر کوئی عمل کرے گا اور چٹان میں کوئی بھی سوراخ نہ ہوگا تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے گا بھلائی ہو یا برائی۔

خلاصہ یہ کہ صحابۂ کرام کی نیتیں اچھی تھیں، اعمال اچھے تھے جس کی نگاہ ان کے پاک چہروں پر پڑتی تھی اسے ان کی پاکبازی جچ جاتی تھی اور ان کے چال چلن راست بازی، اخلاق کی بلندی اور اعمال کی پاکی کو سمجھ جاتا تھا۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا جن صحابہؓ نے شام کا ملک فتح کیا جب وہاں کے عیسائی ان کے چہرے دیکھتے تو بے ساختہ پکار اٹھتے۔ خدا کی قسم یہ عیسیٰ کے حواریوں سے بہت افضل اور بہتر ہیں۔

اس فقیر کی نظر میں سِیۡمَا کی تشریح کسی خاص علامت سے نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ اسلاف کی روایات میں اگر کسی علامت کا خصوصی ذکر ہے تو وہ بطور تمثیل ہے تعین مراد نہیں۔ بات یہ ہے کہ چہروں کی سیاہی اور سفیدی خاکستری بدرونق ہونا یا جھلکتا چمکتا جغرافیائی اور نسلی اور غذائی اور آبی اور

ہوائی اختلاف و تنوع کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بیماری اور صحت بھی اس کا سبب ہوتی ہے۔ رنج و راحت اور غم و مسرت سے چہرے کی شگفتگی اور افسردگی نمایاں ہوتی ہے، اس لئے سِیْمَاھُمْ سے مراد نہ صرف حسنِ اعمال اور خلوصِ نیت ہے۔ نہ محض عبادت و ریاضت نہ خالص ایمان و یقین بلکہ چہرہ کالا ہو یا گورا سرخ ہو یا زرد شگفتہ ہو یا افسردہ بہر حال ایمان و حسنِ عمل چہرے پر ایک خاص رونق اور نور پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ ہر کجرو باطن کو نظر نہیں آتا۔ اس کو دیکھنے کے لئے چشمِ بینا کی ضرورت ہے۔ مومن کی آنکھ اس کو دیکھتی ہے خواہ نگاہ کتنی ہی کمزور ہو۔ اور کافر کی چشمِ بصارت کو وہ نظر نہیں آتا خواہ کیسی ہی ژرف نگاہ اور خوردبین ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ۔ ذالک مثلہم فی التوراۃ مستقل جملہ ہے اور مثلہم فی الانجیل کا تعلق بعد والے کلام سے ہے۔ یعنی صحابہ کے یہ احوال تورات میں مذکور ہیں۔ کس تورات میں، تورات تو اصلی نہیں اس میں تحریف و تبدیلی کر دی گئی۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ علماء نے ثابت کیا ہے اس لئے موجودہ تورات میں اگر یہ ذکر نہ ہو تو اس سے تکذیبِ قرآن نہیں ہوتی۔ پھر بھی ہم کو اس بگڑی ہوئی ترمیم شدہ تورات میں کچھ نہ کچھ نشانات ایسے ملتے ہیں جن سے احوالِ صحابہ کے تذکرہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ تورات سفر استثناء باب ۳۳ کے شروع میں یہ الفاظ مذکور ہیں۔ خداوند سیناء سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ ہی سے وہ جلوہ گر ہوا۔ وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔

یہ درست ہے کہ سینا سے مراد کوہ سینا ہے اور یہی کوہ طور ہے۔ اسی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت اور کتاب عطا کی گئی۔ خداوند کے سینا سے آنے کی مراد حضرت موسیٰؑ کا نبوت اور تورات لے کر کوہ طور سے آنا ہے لیکن کوہ شعیر اور کوہِ فاران تو عرب میں ہیں جن کا سلسلہ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک ہے۔ ان میں سے کوہستانِ فاران مکہ کے متصل ہے اور شعیر کا پہاڑ مدینہ ہے۔ مکہ اور مدینے کے پہاڑوں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ظہور نہیں ہوا۔ نہ ان بزرگوں کے ساتھ دس ہزار پاکباز مقدس لوگ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ تو چند حواریوں کے سوا اور کوئی تھا ہی نہیں، اور آپ کا ساتھ دینے والے چند حامی اگر تھے تو منافق تھے۔ نہ آپ کے دائیں ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بے شک بنی اسرائیل کی بہت بڑی جماعت تھی مگر وہ پاکباز نہ تھے۔ مقدس ہونا تو درکنار وہ تو مضبوط ایمان والے بھی نہ تھے۔ گوسالہ پرستی، جہاد سے انکار، قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کے احکام سے سرتابی ان کی خصوصیت تھی۔ انہی نافرمانیوں کی پاداش میں چالیس برس دشتِ تیہ میں ان کو قید رہنا اور سرگرداں پھرنا پڑا۔ ہاں رسول اللہؐ کے مخلص صحابہ ضرور مقدس اور پاکباز تھے۔ حضورؐ نے قیام مکہ کے زمانے میں فاران سے ہی اللہ کی توحید کا پیام سنایا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں آپ ہی کا ظہور ہوا تھا۔ فتح مکہ کے وقت آپ ہی کے ساتھ دس ہزار صحابہ کی فوج تھی۔ آپ ہی کے ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی۔ جو دوستوں اور ایمانداروں کی نگاہوں کو روشن کرنے والی اور دشمنوں کو جلانے والی تھی۔ اسی آتشیں شریعت نے کافروں کو جلا کر خاکستر کر دیا گناہوں کے لہلہاتے کھیتوں اور بداعمالی کے باغوں کو بھسم کر دیا۔ تورات کے مذکورہ بالا جملوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر تورات اور شریعت عطا کی گئی اور شریعتِ تورات کے بعد رسول اللہؐ کو دوسری شریعت دی گئی۔ خداوند کا سینا سے آنا حضرت موسیٰؑ کا طور سے آنا ہے اور فاران و شعیر سے خداوند کا آنا رسول اللہؐ کا مکہ اور مدینہ میں ظاہر ہونا ہے اور خداوند کے ساتھ دس ہزار قدوسیوں سے مراد ہیں۔ مکہ کو فتح کرنے والے اور کعبہ پر قبضہ کرنے والے صحابہ کرام جو باہم بڑے نرم اور کافروں کے لئے بڑے گرم تھے۔ (از تفسیر حقانی مع زوائد)

اگر وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ کو بھی پہلے کلام سے مربوط مانا جائے جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے (اس فقیر کی نظر میں یہ قول ضعیف ہے اس بات کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ قراء کے نزدیک فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف ہے۔ گویا یہ جملہ پورا ہو گیا) تو مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کے مذکورہ احوال انجیل میں بھی مذکور ہیں۔ موجودہ انجیل اہلِ تحقیق کے نزدیک تغیرات سے پُر ہے۔ اس میں صحابہ کے مذکورہ احوال صراحت کے ساتھ ہم کو نہیں ملتے مگر سیرت صحابہ اور مغازی کی بعض صراحتوں میں آیا ہے کہ بعض عیسائی راہبوں اور نصرانی علماء نے بعض اسلامی فتوحات کے موقع پر صحابہ کو پہچان لیا اور اقرار کیا کہ آپ وہی لوگ ہیں جن کا تذکرہ مسیح نے کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

اگر مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ کا تعلق بعد والے کلام سے جوڑا جائے جو روایۃً بھی زیادہ صحیح ہے تو مطلب اس طرح ہوگا کہ صحابہ کی مثال

اور صفت انجیل میں اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ وہ (آغاز ترقی منفعت بخشی وغیرہ میں) کھیتی کی طرح ہوں گے۔
اس توضیح حسب ذیل ہے۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ زمین میں تخم بویا، بیج سے شروع میں ایک کونپل پھوٹی۔ اللہ نے اس کونپل کو قوت عطا کی (اور پودے کی شکل بنی) پھر پودا کچھ موٹا ہو گیا اور اپنی ڈنڈی پر کھڑا ہو گیا۔ بونے والوں نے اپنی محنت کے پھل کو لہلہاتا دیکھا تو پھولے نہ سمائے۔ انجیل متی میں کھیتی کی مثال دو جگہ بیان کی گئی ہے۔ آٹھویں جملہ میں ہے اور کچھ تخم اچھی زمین میں گرا اور پھل لایا کچھ سو گنا کچھ بیس گنا پھر ۳۱ و ۳۲ جملہ میں ہے۔ وہ اچھی زمین عرب ہے جہاں تخم ہدایت بویا گیا ہے۔ یہی حالات مختلف صحابہ کے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مومنوں کے ایمان کی سخت آزمائش ہوئی۔ ادھر مسیلمہ اور سجاح وغیرہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے لاکھوں فوج اپنے پاس جمع کر لی۔ دوسری طرف حوالی مدینہ اور قبائل میں فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان خطرناک حالات میں جو حضرات ایمان پر ثابت قدم اور اسلام کے حامی رہے ان کا تخم ایمان سو گنا پھل لایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام پہلے سے مضبوط ہو چکا تھا مگر سرحدی استحکام کی مزید ضرورت تھی۔ خلافت سابق کے زمانہ کی طرح خطرناک حالات نہ تھے۔ پھر بھی عرب سے باہر کے خطرات ہر طرف سے محیط تھے۔ آخر فتوحات کی کثرت ہوئی اور درخت اسلام میں پھل ساٹھ گنا آیا۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت فتنہ سے بھرا ہوا تھا بغاوت اور آخر خلیفہ راشد کا قتل۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور بھی اندرونی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں سے بھرا ہوا تھا۔ آخرکار آپ بھی شہید کر دیے گئے۔ ان دونوں زمانوں میں شجر اسلام میں پھل تیس گنا آیا۔ اس کے بعد چھ ماہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت رہی۔ اس کا حکم بھی تیسری اور چوتھی خلافت کا سا ہے۔ پھر خلافت راشدہ ختم ہو گئی۔ رسول اللہ نے پہلے سے فرما دیا تھا خلافت میرے بعد تیس برس رہے گی۔ یہ تیس برس پورے ہو گئے اور تیس گنا پھل بھی پورا ہو گیا۔

صحابہ کرام کی روز افزوں ترقی اور اسلام کا ہر دم عروج دیکھ کر حاسدوں کو حسد کرنا اور کافروں کو جلنا چاہیے ہی تھا۔ مقصد بھی یہی تھا کہ کافر اپنے حسد کی آگ میں جلیں۔ ہمیشہ کاشتکاروں کی لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر محنت سے انکار کرنے والے اور جان چرانے والے جلتے ہی ہیں اور کاہلی اور اہمال علمی کی نیند کو ہی باعث آرام سمجھتے ہیں لیکن روز بروز نادار اور فقیر ہوتے جاتے ہیں اور ان کی مفلسی ان کو زیادہ حاسد بنا دیتی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ اس آیت میں نیکوکار اہل ایمان سے گزشتہ جرائم کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ یعنی دنیا میں جو کامرانی اور ترقی اہل ایمان کو ملنی ہے ملے گی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آخرت میں مغفرت اور اجر عظیم نصیب ہو گا۔ کیونکہ اللہ نے اس کا وعدہ کر لیا ہے اور وعدہ خداوندی پورا نہ ہونا ناممکن ہے۔

مقصودِ بیان آیت وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ میں صحابہ کے امتیازی اوصاف کا بیان ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں گرم اور آپس میں نرم اور رکوع و سجود کی کثرت۔ وہ باوجود ان تمام اوصاف کے اپنی نیکیوں پر مغرور نہ ہو جانا بلکہ اللہ کے فضل اور رضامندی کا طلبگار رہنا یہ ہیں صحابہ کرام کے امتیازی اوصاف۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ صحابہ کرام کی کشیدگیاں حسد و عداوت میں داخل نہ تھیں۔ سب باہم انس اور محبت رکھتے تھے، البتہ اعدائے دین کے مقابلہ میں سب متفق اور جری تھے۔ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے ان لوگوں کو جو صحابہ کرام کو دوسرے لوگوں کی طرح باہم دشمن خیال کرتے ہیں اور بنیاد عداوت کبھی رسول اللہ کی میراث کی تقسیم کو قرار دیتے ہیں اور کبھی استحقاق خلافت کو۔ آیت میں تلقین ہے اخوت اسلامی کی اور باہم مربوط رہنے کی اور دشمنان دین سے متحد مقابلہ بلا خوف و خطر کرنے کی اور احکام دینی کی مخالفت کرنے والوں کی رعایت نہ کرنے کی۔

فِي التَّوْرٰىةِ۔ لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے خصوصی احوال کا اظہار تورات میں بھی کر دیا تھا۔ کھیتی سے صحابہ کرام کی حالت یا اسلام کو تشبیہ دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ آغاز اگرچہ کمزور حالت میں ہوا لیکن تخم فاسد نہیں رفتہ رفتہ بارآور اور ثمر آفریں درخت بن جائیگا۔ اور مخالف اس کی ترقی کو نہ روک سکیں گے ان کو حسد اور جلن کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا گویا اس تمثیل میں دو پہلو ہیں۔ مشتبہین کو فتح کی بشارت اور

مومنوں کے لئے وعدہ بھی اور کافروں کے لئے وعید بھی وغیرہ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے اَجْرًا عَظِيْمًا تک سابقہ تمثیل میں ترقی کی چوٹی پر پہنچانے کا مسلمانوں سے درپردہ وعدہ تھا اور صحابۂ کرام کے امتیازات کو صراحۃً ذکر کرنے کے بعد تمثیل دی گئی تھی جس سے وعدہ ترقی کی خصوصیت بظاہر صحابۂ کرام کے ہی ساتھ معلوم ہوتی تھی۔ اس آیت میں تمام نیکوکار مومنوں سے وعدہ مغفرت بھی کیا گیا ہے اور اجرِ عظیم عطا کرنے کی صراحت بھی کی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا اچھا پھل صرف صحابہ کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ جو بھی ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اللہ کے انعام سے سرفراز ہوگا۔ اس حکم میں نہ کسی زمانے کی خصوصیت ہے نہ مقام کی نہ نسل و رنگ کی وغیرہ۔

سُوْرَةُ الْحُجُرَاتِ

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی اس میں اٹھارہ آیات اور دو رکوع ہیں۔

ثمان مدینۃ وھی سُوْرَةُ الْحُجُرَاتِ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — رکوعان وفیھا عشرة ایۃ

کلمات ۳۵۰ — شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں — حروف ۱۵۷۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

اے ایمان والو اللہ اور رسول (کی اجازت) سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ (تمہارے سب اقوال کا) سننے والا

عَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا

(اور تمہارے سب افعال کا) جاننے والا ہے اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو

لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ

بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ

قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ

نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے ان لوگوں کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان

وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ

میں اکثروں کو عقل نہیں ہے ... یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آ جاتے

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ ادب کی بات تھی) اور اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر انسانی معمورہ میں کچھ مطلق العنان بغاوت پسند دماغ رکھنے والے انسانوں کے درمیان فرقِ مراتب کے قائل نہیں تھے۔ ان کی نظر میں نہ صرف نسبی امتیاز نہیں بلکہ علم و عمل کا فرق بھی ادنیٰ و اعلیٰ کے مدارج نہیں قائم کرسکتا۔ ایسا مطلق العنان گروہ انسانیت کا باغی ہے۔ ہر سوسائٹی اور ہر تنظیم کا باغی ہے۔ اس گروہ میں مرکزی نقطۂ مساوات پر متحد ہونے کے باوجود کچھ لوگ مدعیانِ علم و دانش میں اور تہذیب کے علمبردار ہونے کے دعویدار ہیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ انسانیت کی تخلیقی فطری مساوات تمام جسمانی توازن کی یکسانگت اور سب انسانوں کا متحد النسب ہونا اور اس قسم کے دوسرے سطحی ثبوت۔ ان کو فرقِ مراتب کے منکر بنا دیتے ہیں۔ کچھ بے علم اور بے شعور ہیں، نہ ان کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے نہ فلسفہ۔ صرف جہالت ہے اور غرورِ بے جا سبب ہے اس بات کا کہ وہ کسی کو اپنے سے برتر نہ سمجھیں۔ اول الذکر کا فلسفہ سوائے بغاوت و وہم کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ وہم کو فہم سمجھے ہوئے ہیں۔ نسب سب انسانوں کا بیشک ایک ہے۔ جغرافیائی حدود اور جہات بھی وجہ امتیاز نہیں ہیں نہ ہوسکتی ہیں لیکن باایں ہمہ انسانی افراد میں ذہنی قوت کی روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ ہوش و خرد اور حماقت و بلادت کا فطری امتیاز ہے۔ جسمانی تخلیقی قوتیں بھی سب کی ایک جیسی نہیں ہیں۔ کوئی پیدائشی طاقتور ہے، کوئی ضعیف و نحیف۔ پھر کسبی علوم بھی مابہ الامتیاز ہیں اور عملی فساد و صلاح اور خیر و شر کا فرق بھی ظاہر ہے۔ ان تمام فطری امتیازات کے ہونے کے باوجود صرف نسبی اشتراک اور انسانیتِ عامہ کا ایک فرد ہونا کس طرح فرقِ مدارج کو مٹا سکتا ہے۔ ذہنی جسمانی علمی اور عملی تفاوت تو انسانوں میں اتنا زیادہ ہے کہ گویا اشتراکِ انسانیت ان امتیازی وجوہ میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر انسان کو انسان تو بیشک کہہ سکتے ہیں، لیکن کیا ہر آدمی میں آدمیت کی فطری اور کسبی فضائل و ترجیحات ایک جیسے بھی ہیں اس کا قائل سوائے دشمنِ انسانیت کے اور کون ہوسکتا ہے۔ رہ گیا مغرور جاہل خود پسند طبقہ تو اس کی خود پسندی ہی اس کو ہدایت اور فطرت کا باغی بنائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے عالم خداشناس یہاں تک کہ پیغمبرِ اعظم کی بھی معاشرتی برتری کا قائل نہیں اور خطابات میں بھی ہر تہذیب کلامی کو نا واقف ہونے کی بنا پر ناقابلِ ترجیح سمجھتا ہے۔ ان دونوں کے گروہوں کے نزدیک انسانوں کا فرقِ مراتب اگرچہ ہیچ ہے مگر اول گروہ چونکہ اہلِ علم کہلاتا ہے اور دانش و فلسفہ کا مدعی ہے اس لئے وہ اپنے نظریہ کو برحق جانتا ہے اور دوسرا گروہ بے چارا معذور ہے نادان ہے، اصلاح طلب اور نابینا ہے۔ راہنمائی کا محتاج۔ انسانیت کے باغی دونوں ہیں۔ ایک تیسرا گروہ ہے جس کی نظر دوربیں اور فکر عمیق ہے اور علم و عمل کی ہر صلاح اس کو حاصل ہے۔ یہ طبقہ انبیاء، اولیاء اور عارفین کا ہے۔ یہ اگرچہ سب انسانوں کو آدم کی اولاد کہتا ہے اور آدم کو مٹی سے بنا ہوا بھی مانتا ہے لیکن اولادِ آدم میں اس کے نزدیک فطری اور خلقی تفاوت کے علاوہ کسبی اور علمی اور خلقی فرق بھی ہے۔ اس کی نظر میں تمام انسان ایک درجہ کے نہیں بڑا فرق ہے۔ جاہل اور عالم میں کھلا امتیاز ہے۔ مومن صالح اور کافر بد اعمال میں علم و تقویٰ تفاوت انسانوں کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ اس لحاظ سے کوئی ادنیٰ ہے کوئی اعلیٰ، کوئی افضل کوئی احسن۔ کم درجے والے انسان کا فرض ہے کہ اعلیٰ مرتبہ والے انسان کو اپنا جیسا نہ سمجھے۔ حق طلب دماغ کے لئے لازم ہے کہ افضل و اعلیٰ کی عزت کرے معاشرت میں اس کا احترام ملحوظ رکھے۔ یہاں تک کہ اس سے گفتگو میں بھی وہ الفاظ اور لہجہ استعمال نہ کرے جو باہم مکالمات میں استعمال کرتا ہو ورنہ یاد رکھو کہ انسانیت کی تنظیم ناممکن ہو جائے گی معاشرہ اور مدنیتِ صالحہ کی ساخت نہ ہو پائے گی اور سوا اچھے اعمال بھی تنظیمِ معاشرہ نہ کرسکیں گے۔ جب حاکم محکوم اور بڑے چھوٹے کا فرق ختم ہو گیا تو تنظیم انسانی کس طرح ممکن ہوگا۔ تہذیبِ انسانیت کا مدار ہے فرقِ مراتب پر۔ افکار و معاشرہ کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب اصلاح طلب دماغ خود پسند اور مغرور نہ ہوں اور اپنے کو محتاجِ اصلاح سمجھتے ہوں اور مصلح کو اپنے سے اونچا جانتے ہوں اور اس کا احترام کرتے ہوں جذبۂ پندار تو ہر صلاح سے محروم کر دیتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ الآیۃ۔ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یہ بات قطعی متحقق ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے اور سنتا ہے۔

ایمان والو اپنی آوازیں ہمارے نبیؐ کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو اور نہ رسولؐ سے اس طرح چلّا کر بات کیا کرو۔ جیسا کہ تم باہم کیا کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

آغازِ اسلام میں اکثر دیہاتی مسلمان آدابِ اسلامی سے واقف نہ تھے۔ زمانۂ جاہلیت کو گزرے زیادہ مدت نہیں گذری تھی عقائد و افکار بدل جانے کے باوجود معاشرت کے طریقے جاہلیت آمیز تھے۔ باہم گفتگو کا لہجہ آواز اور طرزِ خطاب نو مسلموں کا بھی جاہلانہ تھا رسول اللہؐ کو خطاب کرتے وقت بھی آدابِ نبوت کا لحاظ نہ رکھتے تھے چیخ چیخ کر حضورؐ سے کلام کرتے تھے کاشانۂ نبوت کے قریب آکر زور سے چلّا کر آواز دیتے تھے۔ "محمدؐ! باہر آؤ، ہمارا یہ کام کر دو، یہ بات بتا دو"۔ جاہلیت کے اکثر آثار اگرچہ مٹ چکے تھے لیکن دیہاتیوں کے اندر کچھ نشانات ہائے سابقہ باقی تھے عمر کے لحاظ سے بڑے چھوٹے کا فرق معدوم تھا۔ بڑوں کا احترام اور بزرگوں کے سامنے باادب گفتگو کرنی نہیں جانتے تھے۔ نہ ان کو اس قسم کے آداب سکھائے گئے تھے۔ اس سورت کے شروع میں سوسائٹی کی تہذیب اور معاشرت و مدنیت کے ابواب اور اصول اجتماعیت اللہ تعالیٰ نے ترتیب دیئے ہیں تاکہ مسلمانوں کی مہذب اجتماعی تنظیم اور صالح معاشرہ اور پاکیزہ مدنیت پیدا ہو جائے۔ آیات مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے اور تین باتوں کی ممانعت فرمائی ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے پیش قدمی نہ کرو۔

(۲) اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے اونچا نہ اٹھاؤ۔

(۳) نبیؐ سے اس طرح چلّا کر چیخ کر بات نہ کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ (بلکہ ادب سے آہستہ آواز سے احترام کو ملحوظ رکھ کر نبیؐ سے گفتگو کرو۔)

اللہ اور رسولؐ کے سامنے پیش قدمی کرنے سے کیا مراد ہے۔ علمائے تفسیر نے اس کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔ کتاب و سنّت کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ (حضرت ابن عباسؓ)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کلام کرتے وقت نہ بولو۔ (عوفی)

جب تک کسی امر کی بابت اللہ تعالیٰ کا رسولؐ کچھ نہ فرمائے، تم خاموش رہو۔ (مجاہد)

امر دین اور احکامِ شرعی میں بجز خدا تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسولؐ کی حدیثِ مقدسہ کی اور کسی (کے قول و فعل) سے فیصلہ نہ کرو (یعنی قرآن و حدیث سے ہر حکم اخذ کرو۔ اس کے مقابلہ پر کسی کی رائے اور قول کو نہ مانو۔ (ضحاک)

کسی قول و فعل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سبقت نہ کرو۔ (سفیان ثوری)

امام سے پہلے دعا نہ کرو۔ (حسن بصری)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول کے تابع ہو حضرتؐ سے پہلے کسی کام میں عجلت نہ کرو آپؐ کے سامنے کسی امر میں سبقت نہ کرو۔ چلنے میں، بیٹھنے میں، بات کرنے میں، حکم دینے میں، کھانے میں، نماز کی امامت میں، کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے میں، کوئی حکم دینے میں، کسی سوال کا جواب دینے میں، آگے چلنے اور آگے بڑھ کر بیٹھنے میں، کسی بات میں بھی پیش قدمی نہ کرو۔

(۱) اللہ کے رسول کی آواز سے آوازیں اونچی نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ سے گفتگو کے وقت یا رسولؐ کے سامنے آوازیں اونچی نہ کیا کرو اور آپؐ سے یا آپ کے سامنے گستاخانہ طرزِ گفتگو نہ اختیار کرو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے نبیؐ سے ایسی بلند آواز سے بات نہ کیا کرو جیسی باہم کرتے ہو، یعنی آپ کو چیخ کر آواز نہ دو، چلّا کر نہ پکارو، کلام خطاب یا

ہر ایک وقت آواز میں چلاہٹ یا حرز پیدا ہونے دو مطلب یہ ہے کہ ادب احترام ملحوظ رکھو اور تہذیب کا لحاظ رکھو، نہ رسول اللہ سے گستاخی کرو نہ آپ کے سامنے خلاف احترام کوئی طرز کلام اختیار کرو۔

روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے متعلق ہوا صحیح بخاری میں حضرت ابن ابی ملیکہ کی روایت سے مذکور ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں۔ قریب تھا کہ دو بزرگ ترین ہستیاں تباہ ہو جائیں۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کیونکہ ان دونوں کے درمیان رسول اللہ کے سامنے گفتگو میں رد و بدل ہو گیا اور دونوں کی آوازیں اونچی ہو گئیں واقعہ یہ تھا کہ بنی تمیم کا وفد رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ و حضرت ابوبکرؓ کے درمیان وفد کا سردار بنانے کے متعلق اختلاف رائے ہو گیا۔ ایک نے اقرع بن حابس مجاشعی کے متعلق کہا اور دوسرے نے کسی دوسرے کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم تو میرے خلاف ہی کیا کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا نہیں نہیں آپ ایسا خیال نہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ رسول اللہ سے اتنی پست آواز سے بات کرتے تھے کہ حضور کو دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا ایک تفصیلی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ قعقاع بن معبد کو اور حضرت عمرؓ اقرع بن حابس کو بنی تمیم کے وفد کا سردار بنانا چاہتے تھے گفتگو کے رد و بدل میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں جس پر آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا الخ نازل ہوئی۔

مسند بزار میں آیا ہے کہ آیت لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ الخ کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ سے عرض کیا یا رسول اللہ! قسم خدا کی آئندہ میں حضور سے اس طرح باتیں کروں گا جس طرح کوئی سرگوشی کرتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آیت کے نزول کے بعد کئی روز تک حضرت ثابتؓ بن قیس رسول اللہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور میں اس غیر حاضری کی وجہ عرض کروں گا چنانچہ یہ صاحب حضرت ثابتؓ کے گھر پہنچے اور انھیں سر جھکائے بیٹھا پایا پوچھا کیا حال ہے۔ ثابتؓ نے جواب دیا برا حال ہے۔ میں رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز اونچی کر لیا کرتا تھا میرے اعمال برباد ہو جاتے تھے اور میں دوزخی ہو گیا۔ یہ صاحب لوٹ کر گئے اور سارا واقعہ عرض کر دیا حضورؐ نے ثابتؓ کے پاس اسی شخص کو ان کے جنتی ہونے کی بشارت دینے کے لئے واپس بھیجا۔ اس شخص نے حضرت ثابتؓ سے جا کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم دوزخی نہیں ہو جنتی ہو۔

مسند احمد میں یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے دریافت فرمایا۔ ثابتؓ کہاں ہے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضرت انسؓ نے ارشاد فرمایا ہم ثابتؓ کو چلتا پھرتا زندہ جنتی کہتے تھے۔ یمامہ کے جہاد میں مسیلمہ کی فوج سے لڑتے لڑتے آپ شہید ہو گئے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ نے ثابتؓ کو غیر حاضر پایا تو ان کے ہمسائے یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ سے دریافت فرمایا کیا ثابت بیمار ہیں۔ یہ روایت غیر معتبر ہے کیونکہ ثابتؓ کا واقعہ ۹ھ کا ہے اور حضرت سعدؓ کی وفات ۵ھ میں ہو گئی تھی۔

ابن جریر نے لکھا ہے کہ آیت کے نزول کے بعد حضرت ثابت بن قیس راستہ میں بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ حضرت عاصمؓ بن عدی کا ادھر سے گزر ہوا اور ثابت کو روتے دیکھا تو رونے کا سبب دریافت کیا۔ ثابتؓ نے جواب دیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ آیت میرے ہی متعلق نازل ہوئی ہو۔ میری آواز بلند ہے۔ حضرت عاصمؓ یہ سن کر چلے گئے اور حضرت ثابتؓ کی ہچکی بندھ گئی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور گھر جا کر بیوی سے کہا کہ میں گھوڑوں کے طویلے میں جا رہا ہوں تم باہر سے اس کا دروازہ بند کر دینا اور دروازے میں لوہے کی کیل جڑ دینا خدا کی قسم میں طویلے کے اندر سے نہیں نکلوں گا اور یونہی مر جاؤں گا۔ یا اللہ اپنے رسولؐ کو مجھ سے رضامند کر دے۔ حضرت عاصمؓ حضرت ثابتؓ کو چھوڑ کر بارگاہ رسالت میں پہنچے اور ثابتؓ کی حالت بیان کی حضور سرور کائنات نے حکم دیا تم جا کر ثابت کو میرے پاس بلا لاؤ۔ عاصم واپس آئے اور ثابت کو راستہ میں نہ پایا تو ان کے گھر پہنچے اور ثابت کو دریافت کیا۔ جواب ملا وہ تو گھوڑوں کے اصطبل میں بند ہیں۔ فوراً وہ اصطبل تک گئے اور رسول اللہ کا پیام طلبی سنایا۔ حضرت ثابت نے کہا۔ بہت خوب چلتا ہوں۔ آپ نے باہر سے دروازہ کی کیل نکال کر دروازہ کھول دیا۔ ثابت باہر آ گئے اور عاصم کے ساتھ دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ سرکار عالی نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ ثابتؓ نے اصل سبب صحیح صحیح بیان کر دیا۔

حضور سرورِ کائنات ؐ نے ارشاد فرمایا یہ تمہارے لئے یہ امر باعثِ مسرت نہیں ہے کہ قابلِ تعریف اعلیٰ زندگی گزارو گے پھر شہید ہو جاؤ گے اور جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ یہ سنتے ہی ثابت کا سارا رنج وغم جاتا رہا۔ ہنس پڑے باچھیں کھل گئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! حضورؐ کی بشارت میرے لئے ذہنی مسرت کا سبب ہے۔ آئندہ آپ کی آواز سے میری آواز اونچی نہیں ہوگی۔

روضۂ پاک کے پاس بلند آواز نکالنا

علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ رسول اللہؐ کے مزارِ مبارک کے پاس بھی بلند آواز سے بولنا ناجائز ہے جو مزارِ مبارک بھی واجب الاحترام ہے۔ رسول اللہ کے سامنے جس طرح چلّا کر بلند آواز سے بولنا ناجائز تھا اسی طرح مزارِ مبارک کے قریب بھی بلند آواز سے کلام کرنا ممنوع ہے۔

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مسجدِ نبوی میں دو آدمی بلند آوازوں سے باہم گفتگو کر رہے ہیں اور آوازیں دونوں کی اونچی نکل رہی ہیں۔ فرمایا تم کو معلوم بھی ہے کہ تم کہاں باتیں کر رہے ہو؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ ان دونوں نے جواب دیا۔ طائف کے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تم مدینہ کے باشندے ہوتے تو میں تم کو پوری سزا دیتا۔

اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ۔ یعنی اگر اس حکم کے خلاف کرو گے تو تمہارے سارے اچھے اعمال اکارت جائیں گے اور تم کو احساس بھی نہ ہوگا کہ ہماری ساری نیکیاں برباد ہو گئیں۔ اللہ کے رسولؐ کی دانستہ توہین کا تو ذکر ہی کیا ہے مجلسِ رسولؐ میں ادب و احترام کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہو جانا یہاں تک کہ باہم بیٹھنے والوں میں جھگڑا رگڑا اور آوازوں کا تیز ہو جانا یا اللہ تعالیٰ کے نبیؐ سے چلّا کر کوئی گفتگو کرنا بھی اعمال کو تباہ کر دینے کا موجب ہے۔ یہ اسلامی ادبِ مجلس ہے شاہی دربار کے آداب نہیں۔ ایک طرف رسول اللہؐ کی یہ کیفیت تھی کہ مجلسِ اصحاب میں بھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے کسی کو اپنی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنے بیٹھنے کے لئے کوئی ممتاز جگہ مقرر نہیں فرمائی تھی۔ صحابہ کو پیچھے پیچھے لے کر خود آگے آگے نہیں چلتے تھے چیخ کر کسی سے بات نہیں کرتے تھے اور کسی سے گفتگو میں جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف صحابہؓ کو اللہ تعالیٰ نے محفلِ رسولؐ میں چیخنے چلّانے شور مچانے اور بلند آواز سے گفتگو کرنے کی ممانعت فرما دی تھی۔ سکون و وقار اور ادب و احترام کا ہر آن تمام صحابہ لحاظ رکھتے تھے سب کے سب سروں کو جھکائے اس طرح بیٹھے ہوتے تھے کہ گویا اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں کہ ذرا سر اوپر کو اٹھائیں گے تو اُڑ جائیں گی

حضورؐ کی وفات کے بعد مزارِ مبارک کا بھی احترام صحابۂ کرام اسی طرح کرتے تھے جس طرح زندگی میں حضورؐ کا کرتے تھے۔ مزارِ مبارک کے پاس بھی اونچی آواز نہیں نکالتے تھے، بلکہ منبر شریف کے پاس بھی چیخنے چلّانے اور جھگڑا کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔

نا دانستہ توہینِ رسول اللہ کرنی یا ہو جانی اور ادب و احترام کو ملحوظ نہ رکھنا، اعمالِ خیر کو برباد کرنے والا ہے۔ سیاقِ کلام اور آیت کی رفتار کا یہی تقاضا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰى‌ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ۔ رسولِ خدا کے سامنے پست آواز سے بات کرنے والوں کی اس آیت میں تعریف کی گئی ہے اور مغفرت و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

غَضُّ الطَّرۡفِ نگاہ نیچی رکھنا غَضُّ الصَّوۡتِ آواز نیچی رکھنا۔ جس کی آواز پست اور دھیمی ہے وہ فطرتاً بات کرتے وقت آواز نیچی ہی رکھے گا یہ شخص مقامِ ادب و احترام میں اگر نیچی آواز سے بولے تو قابلِ ستائش نہیں لیکن جس کی آواز بلند ہو اور وہ ادباً پست آواز سے بات کرے تو زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ اس آیت کے حکم میں اگرچہ دونوں گروہ داخل ہیں وہ بھی جو فطری پستیٔ آواز کی وجہ سے حضورؐ کے سامنے دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں اور وہ بھی جو باوجود فطری بلند آہنگی کے دربارِ رسالت میں پہنچتے ہیں تو حضورؐ سے بھی اور آپس میں بھی آہستہ آہستہ پست آواز سے بولتے ہیں۔ دوسرا گروہ بہت زیادہ قابلِ ستائش اور مستحقِ مغفرت اور مستوجبِ اجرِ عظیم ہے۔ اس نے اپنی ذاتی خواہش بلکہ خلقی مجبوری پر بھی جذبۂ ادب و احترام کو غالب بنانے کی کوشش کی اور بالآخر غالب آگیا۔

امام احمد نے کتاب الزہد میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ سے کسی نے تحریری سوال کیا۔ امیر المومنین ایک شخص وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ اس کے دل میں نافرمانی کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی اور ایک دوسرا آدمی ہے جس کو گناہ کی خواہش تو ہوئی مگر وہ خواہش کو دباتا اور گناہ سے

پرہیز رکھتا تھا، دونوں میں افضل کون ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا۔ وہ شخص افضل ہے جس کے دل میں گناہ کی خواہش تو ہوتی ہے مگر وہ نافرمانی نہیں کرتا اور خواہش پر غالب آتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاری کے لئے انتخاب کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ثابت بن قیس اور تمام صحابہ کرام کی اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ الخ میں مدح فرمائی ہے اور جن لوگوں کی آوازیں بلند تھیں اور وہ حضورؐ کے سامنے بھی چلا کر کلام کرتے تھے لیکن انہوں نے تعمیلِ حکم میں اپنی عادت ترک کر دی اور طبعی بے ہودگی کو چھوڑ کر خلقی احترام کے پابند ہو گئے۔ پہلے قصور کی معافی کی ان کو بشارت ہے اور اسلامی انبیہ معاشرت اور احترامِ رسولؐ اختیار کرنے کی وجہ سے اُن کے لئے آخرت میں اجرِ عظیم ہے۔

مقصودِ بیان لَا تُقَدِّمُوْا کا لفظ بتا رہا ہے کہ رسول اللہ سے ہر طرح کی پیش قدمی کرنا حرام ہے قولی ہو یا فعلی، کھانے میں سبقت، بیٹھنے میں سبقت، چلنے میں سبقت، کلام میں سبقت، دربارِ رسالت میں کسی کے سوال کا جواب دینے میں سبقت، ہر سبقت ناجائز ہے۔

رسول اللہ سے پہلے اللہ کا لفظ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ کی تعظیم درحقیقت اللہ کی تعظیم ہے۔ اس سے یہ بات بھی مستفاد ہوتی ہے کہ رسول اللہ سے بے ادبی اور گستاخی اللہ تعالیٰ کی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ میں رسول اللہ کے سامنے چلا کر بات کرنے باہم شور و غل کرنے، بدتمیز اور بے ادب جاہلوں کی طرح چیخنے کی ممانعت کی گئی ہے اور نافرمانوں کی صورت میں تمام اعمالِ صالحہ (خواہ ادائے فرائض کی قسم سے تعلق رکھتے ہوں یا عباداتِ نافلہ اور مستحبات کی شکل میں ہوں) سب کے اکارت ہو جانے اور بے ثمر ہونے کی سخت وعید سنائی گئی ہے اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے انتہائی ادب کے زیادتیہ یہاں تک ہدایت فرمائی کہ رسول اللہؐ کے منبر کے سامنے بھی چیخنا چلانا ناجائز ہے۔ اس سے یہ امر بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر جانشینِ رسول اور عالم متقی اور خاندانی بزرگوں کے سامنے بے ادبی کا اظہار جائز نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ الخ میں ستائش ہے ان لوگوں کی جو رسول اللہ کے سامنے پست آواز سے ادب کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ ایسے باادب لوگوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس سے استنباط کی جا سکتی ہے یہ بات کہ تمام صحابہ کرام خصوصاً مقربینِ بارگاہِ رسالت کی مغفرت اللہ نے کر دی اور ان کے لئے اجرِ عظیم مقرر فرما دیا۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد اونچی آواز سے باتیں کرنے والے صحابہ کرام نے بھی اپنی آوازوں کو اونچا اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے جہیر الصوت اشخاص بھی دربارِ رسالت میں پہنچ کر گویا زیرِ لب بات کرنے لگے تھے۔ وغیرہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

تفسیر جانوروں کی طرح چیخنا پکارنا انسانی تہذیب کے خلاف ہے۔ کسی کو چیخ چیخ کر پکارنا اور گھر کے اندر سے بلانا نہ فقط آدابِ انسانیت کے خلاف ہے بلکہ عقلِ سلیم اور شرفِ نفس کی حدود سے بھی تجاوز ہے۔ خصوصاً اس شخص کو جو شرفِ انسانی اور عادات عزت کی چوٹی پر پہنچا ہوا ہو جانوروں کی طرح پکار کر گھر سے باہر بلانا اور اس کے ساتھ ایسا سلوکِ معاشرت کرنا جو ہم مرتبہ انسانوں کے لئے بھی جائز نہیں ہے کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ فرقِ مراتب کا لحاظ تقاضائے فطرت ہے۔ بڑے چھوٹے اور اعلیٰ ادنیٰ کا امتیاز انسانیت کا ضروری جزو ہے۔ اس سے بغاوت کرنا انسانیت کشی ہے۔ اسی لئے آیاتِ مذکورہ میں حجروں کے باہر سے رسول اللہ کو آواز دے کر بلانا اور آپ کے از خود برآمد ہونے کا انتظار نہ کرنا غیر مستحسن قرار دیا گیا ہے لیکن قوانینِ انسانیت سے لاعلمی کی بنا پر اگر کوئی عمل آدابِ انسانی کے خلاف ہو جائے بشرطیکہ علم کے بعد اس سے رجوع کر لیا جائے اور آئندہ جرم نہ کیا جائے تو قابلِ معافی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ قوانینِ تہذیب وضع کرنے والا مہربان بھی ہو اور اس نے اپنی مہربانی سے آدابِ انسانی کی تعلیم دی ہو۔ بے علم پشیمان مجرمِ انسانیت کو وہ ضرور معاف کر دے گا۔ اس کی مہربانی کا یہی تقاضہ ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ جو لوگ حجروں کے پیچھے یعنی باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں سے اکثر آپ کی عظمت و وقار سے ناواقف ہیں آداب نبوت کو نہیں سمجھ

حجرات سے مراد ہیں امہات المومنین کے حجرے۔ حجرے کا معنی ہے زمین کا ایک محدود ٹکڑا جس کے چاروں طرف دیواریں بھی ہوں (گویا ایوانکان مراد ہے) بعض روایات میں آیا ہے کہ متعدد مرتبہ اعرابیوں نے رسول اللہ کو مختلف اوقات میں باہر سے پکارا تھا اور حضور کے باہر تشریف لانے کی درخواست چلا کر کی تھی پس حجروں کے باہر سے پکارنے کا یہ مطلب ہوگا کہ کبھی ایک حجرے کے باہر سے کبھی دوسرے حجرے سے باہر سے۔ بعض روایات میں آیا ہے پکارنے کا واقعہ ایک ہی بار ہوا تھا تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور کی تلاش میں جو جماعت آئی تھی اس میں سے کسی نے کسی حجرے کے باہر سے اور کسی نے کسی حجرے کے باہر سے آواز دی تھی۔

امام احمد ابن جریر طبرانی بغوی، ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اقرع بن حابس نے آکر پکارا تھا۔ یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ (محمد باہر آؤ)
ابو یعلیٰ و مسدد و ابن راہویہ و ابن مردویہ و طبرانی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ چند دیہاتی بدوی آئے تھے اور انہوں نے یا محمد یا محمد کہہ کر پکارا تھا ان اقوال و روایات کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

حضرت زید بن ارقم نے بیان کیا کہ چند عرب جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ چلو اس شخص کے پاس چلیں۔ اگر وہ سچا نبی ہے تو اس سے سب سے زیادہ سعادت حاصل کرنے کے مستحق ہم ہیں۔ اور اگر وہ بادشاہ ہے تو ہم اس کے زیر سایہ پرورش پائیں گے۔ میں نے یہ خبر حضور کو پہنچا دی پھر وہ لوگ بھی آگئے اور حجرہ کے باہر سے آپ کا نام لے کر پکارنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور والا نے میرا کان پکڑ کر ارشاد فرمایا۔ اللہ رب العزت نے تیری بات سچ کر دی، اللہ نے تیری بات سچی کر دی۔ (ابن جریر)

ثعلبی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حجرے کے باہر سے پکارنے والے عینیہ بن حصین اور اقرع بن حابس تھے۔ یہ دونوں شخص اپنے ساتھ ستر آدمیوں کا وفد لے کر دوپہر کے وقت پہنچے تھے۔ حضور والا اس وقت کسی بی بی کے گھر استراحت فرما تھے۔ دونوں نے جا کر مکان کے باہر سے آواز دی۔ یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ اِلَیْنَا (محمد ہمارے پاس باہر آؤ)

عبد الرزاق نے بوساطت معمر قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ کسی آدمی نے آکر کہا تھا۔ محمدؐ میں جس کی تعریف کر دوں میری تعریف اس کے لئے باعث زینت ہو جاتی ہے اور جس کی مذمت کر دوں تو میری مذمت اس کے لئے عیب بن جاتی ہے۔ حضور والا نے فرمایا۔ یہ کام تو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ قتادہ نے کسی صحابی کا نام نہیں لیا۔ لیکن حضرت براءؓ کی مرفوع حدیث اس کی تائید کر رہی ہے، اس لئے قتادہ کی مرسل روایت بھی مرفوع کی طرح ہوگئی۔ ابن جریج نے حسن بصری کی طرف بھی اس روایت کی نسبت کی ہے۔ بغوی نے قتادہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ بنی تمیم قبیلہ کے کچھ اعرابی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انھوں نے دروازے پر حضور کو پکارا تھا۔ محمد باہر آؤ۔ جس کی ہم تعریف کر دیں تو ہماری مدح اس کے لئے زینت ہو جاتی ہے اور جس کی ہم مذمت کر دیں تو ہماری مذمت اس کے لئے عیب بن جاتی ہے۔ فوراً حضور یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لے آئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کی وہ تعریف کر دے تو اس کے لئے زینت ہو جاتی ہے اور جس کو برا فرما دے تو اس کی مذمت اس شخص کے لئے عیب بن جاتی ہے۔ اعرابی کہنے لگے ہم بنی تمیم ہیں۔ ہمارا شاعر اور ہمارا خطیب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ حضرت ثابت بن قیس بن شماس حضورؐ کے خطیب تھے۔ آپ نے حضرت ثابتؓ کو حکم دیا تم اٹھ کر اس کا جواب دو۔ حضرت ثابتؓ اٹھے اور جواب دیا پھر بنی تمیم کا شاعر اٹھا اور اس نے چند شعر پڑھے۔

رسول اللہ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ تم اٹھ کر اس کو جواب دو۔
حضرت حسان بن ثابت نے اٹھ کر (اشعار میں) جواب دیا۔ یہ دیکھ کر اقرع بن حابس نے (ساتھ والوں سے) کہا۔ محمدؐ کے پاس تو ہر بھلائی موجود ہے۔ ہمارے خطیب نے کلام کیا تو ان کے خطیب نے جواب دیا اور ہمارا شاعر اٹھا تو ان کے شاعر نے جواب دیا۔ پھر رسول اللہ کے قریب آیا اور بولا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ حضور سرور کائنات نے ارشاد فرمایا اس سے پہلے جو کچھ ہوا وہ تمہارے لئے مضر نہ

نہیں ہے۔ پھر سرکارِ والا نے ان لوگوں کو کچھ عطایا عنایت فرمائے اور کپڑے بھی دیئے۔ ان کا ایک ساتھی عمرو بن اہتم بھی تھا جن کو کم عمر ہونے کی وجہ سے سواریوں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ حضورِ والا نے دوسروں کے برابر اُن کو بھی (سب کچھ) دیا۔ بعض لوگوں نے اس کی تحقیر کی اور حضورؐ کے سامنے پھر ان کے درمیان کچھ کلام بڑھ گیا۔ انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ سے غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے عیینہ بن حصین فزاری کی قیادت میں ایک فوجی دستہ بنی العنبر کی جانب بھیجا۔ اُن کو عیینہ کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو وہ اہل و عیال کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ عیینہ نے سب بال بچوں کو گرفتار کر کے رسول اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر بنی العنبر کے مرد آئے ہوئے کہ اہل و عیال کو رہا کرانے کے لئے دوپہر کے وقت مدینہ میں آئے۔ اس وقت رسولِ اکرم مکان کے اندر قیلولہ (دوپہر کا آرام) فرما رہے تھے۔ بچوں نے جو اپنے باپوں کو دیکھا تو چیخنے اور چلا چلا کر رونے لگے۔ رسول اللہ کی ہر بی بی کا (الگ الگ) مکان تھا حضورؐ کسی بی بی کے مکان میں استراحت فرما تھے۔ ان لوگوں نے حضورؐ کے برآمد ہونے کا انتظار نہیں کیا اور (دروازہ پر پہنچ کر) پکارنے لگے۔ محمدؐ! ہمارے پاس باہر نکل کر آؤ۔ آخر حضورؐ بیدار ہو گئے اور باہر تشریف لے آئے۔ اُن لوگوں نے کہا۔ محمدؐ! ہمارے اہل و عیال کا ہم سے معاوضہ لے لو اور ان کو آزاد کر دو۔ اتنے میں جبریلؑ آ گئے اور کہا۔ اللہ آپؐ کو حکم دیتا ہے کہ "اپنے اور ان لوگوں کے درمیان کسی کو ثالث مقرر کر دو۔" حضورؐ نے ان لوگوں سے ارشاد فرمایا سبرہ بن عمرو تمہارا ہم مذہب ہے کیا تم اپنے اور میرے درمیان اس کو ثالث مقرر کرنے پر راضی ہو۔ وہ راضی ہو گئے۔ سبرہ نے کہا۔ جب تک میرے ساتھ میرا چچا اعور بن بشامہ شاہد نہ ہوا میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ وہ لوگ اس پر بھی راضی ہو گئے۔ اعور نے کہا آدھے لوگوں کا فدیہ لے لو اور آدھے لوگوں کو بلا معاوضہ آزاد کر دو۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ میں اس پر راضی ہوں۔ چنانچہ نصف آدمیوں کا فدیہ لے لیا اور نصف کو (یونہی) آزاد کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ۔ یعنی اگر وہ صبر رکھتے، اپنے کو روکے رہتے۔ رسول اللہ کے برآمد ہونے کی جلدی نہ کرتے اور تقاضائے عقل و تہذیب کے خلاف نہ کرتے اور اس حد تک رُکے رہتے کہ آپ خود برآمد ہو کر اُن کے پاس پہنچ جاتے۔

لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ۔ تو ان کے لئے یہ صبر عجلت پسندی سے اچھا ہوتا۔ اس میں ادب و تہذیب کی پابندی تھی۔ رسول اللہ کی عظمت شناسی تھی۔ یہ عمل قابلِ ستائش بھی ہوتا اور موجب ثواب بھی اور مقصد کو پورا کرنے والا بھی۔ مقاتل نے کہا۔ صبر ان کے لئے بہتر ہوتا۔ آپ بلا معاوضہ سب کو آزاد کر دیتے۔ ان کو فدیہ دینا نہ پڑتا۔

وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ یعنی جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے جو بے ادبی اُن سے ہوئی ہے اگر وہ توبہ کر لیں گے تو اللہ معاف کر دے گا۔ اللہ بڑا مہربان ہے۔ وہ نادان بیہودہ حرکت بندوں کو معاف کر ہی دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ سچے دل سے توبہ کر لیں۔ اس تنبیہ کے بعد صحابہ کرام خواہ شہری ہوں یا صحرائی، متمدن یا اعرابی کسی سے ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی اور وہ ایسی شائستہ تہذیب و ادب کا نمونہ بن گئے جو کسی بادشاہ کے مقرب ترین مصاحبوں کو بھی نصیب نہ ہوا۔

مقصودِ بیان

ادبِ نبوت کا درس تہذیب انسانیت کا سبق۔ آیت سے مترشح ہو رہا ہے کہ رسول اللہ کا مرتبہ دوسرے انسانوں سے بہت بالا ہے۔ حجرات کے باہر پکارنے والے اگرچہ چند افراد تھے مگر حکم میں عموم ہے۔ پس کسی عظیم الشان جلیل القدر شہنشاہ کے لئے بھی جائز نہیں قرار دیا گیا کہ وہ رسول اللہ کو آواز دے کر کاشانۂ نبوت سے باہر طلب کر سکے۔

لَا یَعْقِلُوْنَ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ آدابِ نبوت کی خلاف ورزی اور اللہ کے رسولؐ کو بھی اپنا ہم مرتبہ جاننا اور حضورؐ کی شان میں تہذیبِ انسانی کے خلاف کوئی حرکت کرنا بے عقلی کی علامت ہے یعنی عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ بارگاہِ نبوت میں کسی قسم کی قولی و عملی گستاخی نہ کی جائے۔ وغیرہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَھَالَۃٍ

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے ضرر پہنچا دو

فَتُصْبِحُوا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ

ضرر نہ پہنچادو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ ہیں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اگر

كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

وہ اُن میں تمہارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کردیا

وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ فَضْلًا

اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دی ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہِ راست پر

مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

تفسیر معاشرت اور آپس کی سوسائٹی ہو یا عام انسانی سماج یا سیاست و حکومت کا مضبوط نظام غرض ہر جماعتی انتظام صالح کے لئے ضروری ہے کہ بغیر کسی بد دلی یا نفاق کے سوسائٹی کا ہر فرد اس نظام سے وابستہ ہو اور کوئی شخص بھی اندرونی یا بیرونی طور پر سوسائٹی کے اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر قانون شکنی نہ کرے، لیکن انسانی افتادِ طبع فطری طور پر یک ذات نہیں ہے۔ قبائلی قومی مفادِ شخصی کے لئے غیر ایماندارانہ طور پر یا ایمانداری کے ساتھ اختلافِ رائے اور اختلافِ رائے کے ساتھ نفاذِ عمل اور کیفیتِ عمل جدا جدا ہونا لازم ہے۔ کسی ایک حق بات پر بھی مکمل طور پر اتفاقِ خیال ہونا ممکن نہیں۔ لامحالہ سوسائٹی اور سماج کو درست رکھنے کے لئے ایسے لوگوں کے خیالات اور اعمال سے اصحاب سیاست و مدنیت کو باخبر رہنا لازم ہے جو فاسد رائے رکھتے ہیں، قانونِ امن و صلاح کے خلاف ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام اس وقت تک تکمیل نہیں پاسکتا جب تک کچھ لوگ احتسابی ذمہ داری اور تفتیشِ احوال کے بعد خبر رسانی کی خدمت دیانت کے ساتھ انجام نہ دیں۔ لیکن ہر خبر پر بازپرس اور ہر اطلاع پر مواخذہ معاشرت و مدنیت بلکہ سیاست اور حکومت کو بگاڑ سکتا ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ خبر دینے والا جھوٹا ہو، کسی ذاتی کاوش و کدورت کے زیرِ اثر کسی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ اس لئے ضرورت ہے کہ خبر دہندہ خود امین ہو قابلِ اعتماد ہو اور کوئی شخص معتمد اور قابلِ بھروسہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب خود صالح اور عادل ہو، شرعی اور قانونی معیار پر پورا اُترتا ہو۔ جو شخص خود قانون شکن اور شریعت کی خلاف ورزی کرنے والا ہو۔ اس کی خبر غلط ہوسکتی ہے۔ اس کی اطلاع پر اعتماد کرنے سے ممکن ہے کہ کسی شخص یا قوم کو ناواقفیت کی بنا پر حاکم اور سوسائٹی کی طرف سے کوئی ضرر پہنچ جائے اور پھر جب حقیقت کھل کر سامنے آئے تو پشیمانی ہو، اس لئے لازم ہے کہ سب سے پہلے اطلاع دینے والا معیارِ قانونی کے اعتبار سے فاسق اور قانون شکن نہ ہو۔ اگر کوئی فاسق کسی قسم کی اطلاع دے تو انکوائری ضروری ہے وغیرہ۔

تحلیلِ اجزاء محمد بن یوسف صالحی نے بیان کیا کہ عیینہ بن حصین فزاری کو کمان ﷺ ایک فوجی دستہ بنی تمیم کی طرف ماہ محرم ۹ھ میں بھیجا گیا تھا کیونکہ بنی تمیم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس دستہ نے جاکر بنی تمیم کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا اور مرد بھاگ گئے۔ محمد بن عمر کا بیان ہے کہ قیدیوں میں گیارہ عورتیں اور تیس بچے تھے۔

امام احمد وغیرہ نے عمدہ سند سے بیان کیا ہے کہ حارث بن ضرار خزاعی نے کہا میں رسولِ مقبول کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے مجھے اسلام کی دعوت دی میں نے اقرار کرلیا اور مسلمان ہوگیا۔ آپؐ نے مجھے زکوٰۃ ادا کرنے کی بھی دعوت دی میں نے اس کو بھی قبول کرلیا۔ اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! میں اپنی قوم کے پاس جارہا ہوں۔ ان کو اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی دعوت دوں گا۔ جو مان لے گا اس کی زکوٰۃ کا مال جمع کروں گا آپؐ ایاں کو یہ بات کہلوا بھیجیں اور ہمارے پاس

کسی قاصد کو بھیج دیں کہ وہ وصول شدہ مال پر قبضہ کرلے۔ اس کے بعد حارث نے جاکر زکوٰۃ کا مال اپنی قوم سے وصول کرلیا، لیکن رسول اللہ کا کوئی قاصد نہیں پہنچا۔ حارث نے خیال کیا کہ یقیناً کوئی حادثہ ہوگیا ہے اور رسول اللہ کچھ ناراض ہوگئے ہیں۔ یہ سوچ کر اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کرکے کہا رسول اللہ نے مقررہ وقت پر اپنا قاصد مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجنے کا وعدہ کرلیا تھا اور رسول اللہ وعدہ خلافی کر نہیں سکتے لامحالہ کچھ ناخوشی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آپؐ نے قاصد نہیں بھیجا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود رسول اللہ کی خدمت میں پہنچیں۔ اُدھر واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ نے ولید بن عقبہ کو حارث کے پاس مال پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجدیا تھا لیکن ولید کو کچھ حارث کی قوم سے خوف تھا، وہ ڈر کر راستہ سے ہی لوٹ گیا اور رسول اللہ سے جاکر کہہ دیا کہ حارث نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور میرے قتل کے درپے ہوگئے۔ حضورؐ نے ایک مجاہد دستہ حارث کے پاس بھیجا۔ حارث تو اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنی جگہ سے چل ہی دیئے تھے، راستہ میں اس دستہ سے حارث کی ملاقات ہوگئی حارث نے پوچھا تم لوگوں کو کس طرف بھیجا گیا ہے۔ مجاہدین نے کہا۔ تم لوگوں کی طرف۔ حارث نے پوچھا۔ کیوں۔ مجاہدین نے کہا اس لئے کہ اللہ کے رسولؐ نے ولید بن عقبہ کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔ ولید نے جاکر اطلاع دی کہ تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور ولید کو قتل کردینے کا ارادہ کیا۔ حارث نے کہا قسم ہے اس خدا کی جس نے محمدؐ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، ولید کو تو میں نے دیکھا بھی نہیں۔ نہ وہ میرے پاس آیا۔ غرض حارث رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضورؐ نے اس سے فرمایا تم نے زکوٰۃ روک لی اور میرے قاصد کو مار ڈالنے کے درپے ہوگئے۔ حارث نے کہا قسم ہے اُس کی جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس پر آیت:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ سے عَلِيمٌ حَكِيمٌ تک نازل ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت علقمہ بن ناجیہ اور حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے بھی واقعہ مذکورہ طبرانی نے اسی طرح بیان کیا ہے اور شیخ ابن جریر نے بوساطت عوفی حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس بیان کی نسبت کی ہے۔ طبرانی اور بغوی نے حضرت ام سلمہؓ کی طرف نسبت کرتے ہوئے یہ بیان ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ولیدؓ بن عقبہ بن ابی معیط کے حق میں ہوا۔ ولید کو رسول اللہ نے قبیلہ بنی مصطلق کے پاس مالِ زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جاہلیت کے دور میں ولید اور بنی مصطلق کے درمیان کچھ دشمنی تھی۔ بنی مصطلق نے جب ولید کی آمد کی خبر سنی تو فرمانِ رسولؐ کی تعظیم کے لئے ولید کا استقبال کیا۔ ولید کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈالا اور وہ سمجھے کہ یہ لوگ مجھے قتل کرنے نکلے ہیں، یہ خیال آتے ہی خوف زدہ ہوگئے اور راستہ ہی سے لوٹ کر رسول اللہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ بنی مصطلق نے مالِ زکوٰۃ نہیں دیا بلکہ مجھے ہی قتل کرنے کے درپے ہوگئے۔ حضورؐ کو یہ بات سن کر غصہ آگیا اور بنی مصطلق سے لڑنے کا ارادہ کرلیا۔ بنی مصطلق کو جب ولید کی واپسی کی اطلاع ملی تو وہ خود رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ: حضورؐ کے فرستادہ شخص کی آمد کی جب ہم کو خبر ملی تو ہم ان کے استقبال کے لئے نکلے ہم اُن کی تعظیم کرنا اور مقررہ مالِ زکوٰۃ ادا کرنا چاہتے تھے، مگر ان کے دل میں واپسی کا خیال پیدا ہوگیا اور وہ لوٹ پڑے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ راستہ ہی سے ان کی واپسی صرف اسی وجہ سے ہوئی ہوگی کہ حضورؐ کا کوئی خط ان کو مل گیا ہوگا جس میں حضورؐ نے ہم پر کسی ناخوشی کا اظہار فرمایا ہوگا، ورنہ ہم اللہ کے اور رسول اللہ کے غضب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

بغوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ کو بنی مصطلق کی بات کا اعتبار نہیں ہوا اور حضرت خالد بن ولید کو کچھ فوج دے کر خفیہ طور پر حضورؐ نے بنی مصطلق کی طرف روانہ کردیا اور حکم دیا کہ جاکر خفیہ خفیہ تحقیقات کریں اور اگر ایسی چیزیں دیکھیں جن سے ان کے ایمان کا ثبوت ظاہر ہو تو ان سے ان کے مال کی زکوٰۃ لے لیں اور اگر ثبوتِ ایمان کی علامت نہ ملے تو پھر ان سے وہی سلوک کریں جو کافروں سے کیا جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ نے حکم کی تعمیل کی اور بنی مصطلق کے پاس پہنچ گئے۔ پہنچے ہی تھے کہ ان کی آبادی سے مغرب اور عشاء کی نمازوں کی اذان کی آواز سنائی دی۔ آپ نے اُن سے مالِ زکوٰۃ وصول کرلیا اور سب نے بخوشی دے دیا اور سوائے طاعت و بھلائی کے آپ نے اُن کی طرف اور کوئی بات نہیں دیکھی اور واپس آکر حضور کو اطلاع کردی جتادیا۔ اس پر آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ نازل ہوئی۔ فاسق سے مراد ولید ہیں۔ نباء سے مراد ہے مرتد ہونے کی خبر۔ فَاسِقٌ اور نباء کی تنوین عمومِ حکم کو ظاہر کررہی ہے، کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے۔

فَتَبَيَّنُوا تو دیکھ لیا کرو۔ دیکھ بھال کرلیا کرو۔ فاسق کی خبر کی تفتیش کرنے کا حکم ظاہر کررہا ہے کہ اگر کوئی شخص عادل ہو خواہ ایک ہی ہو تو اس

کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر اعتماد کر لینا جائز ہے۔

فسق کا لغوی معنی ہے خروج۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا۔ کھجور اپنے پوست سے باہر نکل آئی۔ عرف شریعت میں فاسق کا اطلاق کافر پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر فاسق کا اطلاق کافر پر کیا گیا ہے۔ کبھی گناہ کبیرہ کے مرتکب یا صغیرہ گناہ پر جم جانے والے کو بھی فاسق کہا جاتا ہے جب تک توبہ نہ کرلے۔ اس آیت میں باجماع اہل علم فاسق ہی مراد ہے۔

ایک شبہ: ولید بن عقبہ بن ابی معیط رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔ منافق بھی نہ تھے۔ اس واقعہ سے پہلے کبھی کوئی اور جھوٹ اُن سے ظاہر بھی نہیں ہوا۔ اور اس کو بھی جھوٹ قرار دینا قطعی اور یقینی امر نہیں، صرف غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں بنی مصطلق ان کے دشمن تھے۔ ان کے دل میں خیال آگیا کہ اب بھی پہلے کی طرح یہ دشمن ہی ہیں اور مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو یقینی طور پر فاسق کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ازالہ: فاسق سے مراد ایسا شخص ہے جس کی حالت پوشیدہ ہو نہ اس کا فسق ظاہر ہو نہ صلاح اور قرینہ اس کے فاسق و کاذب ہونے کا موجود ہو (انجام کار حقیقت ظاہر ہونے کے وقت اس کا جھوٹا ہونا ثابت بھی ہو جائے) بنی مصطلق دوسرے قبائل و اشخاص کی طرح ایمان لا چکے تھے۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کی پابندی کا اقرار کر چکے تھے اور جب انھوں نے حضورؐ سے درخواست کی تھی کہ کسی شخص کو مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنے کے لئے حضورؐ بھیجدیں۔ اُس وقت اُن کو معلوم بھی نہ تھا کہ حضورؐ کس کو بھیجیں گے۔ اگر وہ حضرت ولید کو نامزد کر کے درخواست کرتے تو احتمال فریب ہو نا ممکن تھا۔ پس قرینہ حضرت ولید کے کاذب ہونے پر دلالت کر رہا تھا۔ اسی بنا پر ولید کو فاسق فرمایا۔ پھر شان نزول کا لحاظ قطعی اور یقینی بھی نہیں ہے۔ حکم عام ہے جھوٹے اور فاسق کی خبر پر بلا تحقیق یقین کر لینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ فاسق کوئی ہو کسی قسم کی تعیین نہیں۔ خبر بھی کوئی ہو ولید کی دی ہوئی خبر ہو یا کوئی اور۔ نہ ولید کی تعیین ہے، نہ ولید کی خبر کی۔

نزولِ آیات کے زمانہ میں ولید کا واقعہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اہلِ تفسیر و حدیث نے مصداق حکم ولید کو قرار دیدیا اور آخر میں چونکہ ولید کا جھوٹ بھی ثابت ہو گیا تھا، اُس لئے ان کو فاسق کہنا بھی صحیح ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے پہلے ولید مستور الحال تھے اور جس طرح بنی مصطلق کا مسلمان ہو جانا ان کے عدم ارتداد کا قرینہ تھا، اسی طرح حضرت ولید کا صحابی (اور مخلص صحابی) ہونا ان کی سچائی کا قرینہ تھا۔ پس یقینی طور پر ولید کو مصداق فسق نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ واللہ اعلم۔

اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ یعنی وہ لوگ جو نافرمان نہ ہوں، مخلص اور بے داغ ہوں۔ کہیں تم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ان کو ضرر نہ پہنچا دو تمہارے ہاتھوں سے نادانستگی میں ان کو دُکھ نہ پہنچ جائے جس کی تلافی نہ ہو سکے اور انجام کار سوائے پشیمانی کے کوئی حاصل نہ ہو۔

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مسلمان حضرت ولید کے ساتھی ہو گئے تھے اور رسول اللہ کو بنی مصطلق پر حملہ کر دینے کی ترغیب دے رہے تھے۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی جس کی تائید رسول اللہؐ سے کرانا چاہتے تھے مگر حضورؐ نے ان کی طبیعتوں کے میلان کی تائید نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بطور آزمائش تحقیق حال کے لئے حضرت خالدؓ کی زیرِ قیادت فوجی دستہ بھیجا۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ۔ رسولؐ کے علاوہ ہر شخص کی اپنی ذہنی فکر اور رائے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی شخص صاحبِ کشف و الہام ہو اور کشف میں رائے کو دخل نہیں ہوتا لیکن کشف میں بھی غلطی یا التباس کا احتمال ہے۔ کشفِ رحمانی و شیطانی کا فرق دشوار ہے۔ اس کو بھی معیارِ شریعت پر جانچنا پڑتا ہے۔ ہاں رسول صاحبِ وحی ہوتا ہے۔ اور وحی میں تغیر و تعیت محال ہے۔ بعض صحابہ کی ایک رائے تھی۔ وہ ولید بن عقبہ کو سچا جانتے تھے۔ ولید کی زندگی ان کے سامنے تھی۔ ولید کے غلط فہم ہونے کا ان کو احتمال بھی نہ تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حضرت ولید کو غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے غلط سوچا اور غلط سمجھا اور صحابہ نے جو اُن کی تائید کی وہ بھی حق نہ تھی صرف رائے پر مبنی تھی اور رسول کسی کی رائے کا تابع نہیں ہوتا۔ وحی کا تابع ہوتا ہے۔ اگر ساتھیوں کی رائے کا تابع ہو جاتے تو ساتھیوں کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑ جاتے۔ لوگ دشواری میں مبتلا ہو جاتیں۔ رائے خواہ کیسی ہی جذبہ حقانیت کا نتیجہ ہو پھر بھی رائے ہے۔ غلطی سے غیر معصوم اور غیر معصوم

ذہنی رائے معاشرے کو تباہ کرسکتی ہے۔ اگر پیغمبر لوگوں کے کہنے پر چلنے لگیں تو خود لوگوں کے لئے دشواری ہوجائے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ پس ماے رفقائے رسول۔ اللہ تعالیٰ تم کو دشواری میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۔

بلکہ اس نے تو ایمان کو تمہارے لئے محبوب اور دل پسند بنا دیا ہے اور ہر قسم کے عملی گناہ، بدعقیدگی اور کفر سے تمہارے دل میں نفرت اور کراہت پیدا کردی ہے اور جو لوگ ایسے ہوں جن کو ایمان سے قلبی محبت اور معصیت و بداعتقادی و کفر سے نفرت ہو۔ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ اور راہِ حق پر چلنے والے ہیں۔ (پس اے اصحاب رسول تم ہی راہِ حق پر چلنے والے اور ہدایت یافتہ ہو تم نے جو طرفداری کی وہ حمیت کے زیر اثر کی۔ مگر اس کی بنا غلط اطلاع پر تھی۔ تمہاری نفسانیت کو اس میں دخل نہ تھا۔ آئندہ تم غیر معتبر لوگوں کی اطلاعوں کی تنقیح کرکے فیصلہ کیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ غلط فہمی کے سبب کسی کو تمہارے ہاتھوں سے دکھ پہنچ جائے۔ اور پھر سوائے پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہ ہو)

زینت کا معنی ہے آرائش سجاوٹ اور جو چیز دل میں سج جاتی وہ رچ جاتی ہے پس زینت دینے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو رچا دیا ہے۔ تمہارا ایمان سے قلبی لگاؤ اور تعلق پیدا ہوگیا ہے جس کو کسی قسم کی گروہی اور قومی جنبہ داری توڑ نہیں سکتی۔

آیت میں اول لفظ کفر کا پھر فسوق اور پھر عصیان کا لفظ آیا ہے۔ رفتارِ کلام بتا رہا ہے کہ یہ ذکر ترتیبی ہے۔ بدترین درجہ کفر کا ہے اور دوسرا نمبر فسق کا ہے یعنی اعتقادی بدعت کا جو حدِ کفر تک نہ لے جائے اور تیسرا مرتبہ عصیان یعنی عملی گناہ کا ہے۔ یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری جیسی صفات کے جو لوگ بھی حامل ہوں وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ وہ کسی زمانہ میں ہوں اور کہیں کے رہنے والے ہوں لیکن تمہارا ہدایت یافتہ ہونا تو بہرحال یقینی ہے۔

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۔ یعنی ایمان کو تمہارے دلوں کا محبوب اور کفر و معصیت کو مبغوض بنا دینا تمہارے کسی ذاتی استحقاق و قابلیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ اس کی توفیق و مہربانی ہے جو اللہ رب العزت نے تمہارے شاملِ حال کردی ہے۔ محبتِ ایمان اور نفرتِ کفر کے تم خود ذاتی استحقاق نہیں رکھتے ہو۔ یہ چیز تمہاری خود آوردہ نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کوئی چھین نہیں سکتا۔ پس ایمان کی محبت اور کفر سے نفرت [illegible] زائل نہیں ہوسکتی۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر شخص اور ہر قوم کے ظاہر و باطن کو خوب جانتا ہے۔ ہر فرد و گروہ کی صلاحیت و استعداد کا اس کو پورا پورا علم ہے۔ پس جو کچھ دیتا ہے یا نہیں دیتا ہے سب کچھ علم کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ حکیم بھی ہے اور اس کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی نعمت سے بھی مصلحت کے مطابق جس کو چاہتا ہے سرفراز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم رکھتا ہے۔

مقصودِ بیان

غیر معتبر آدمی کی خبر پر اعتماد نہ کرنے اور انکوائری کرنے کا حکم دے کر ایک عظیم الشان اخلاقی اور سماجی ضابطہ کا اظہار فرمایا ہے جس پر صالح معاشرہ اور صحیح سماج کا مدار ہے۔

فَاسِقٌ کہنا بتا رہا ہے کہ اگر کوئی عادل آدمی اطلاع دے اور کوئی اس کے بیان کی تائید کرنے والا نہ ہو تب بھی اس کی اطلاع کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ لفظ فاسق سے صراحتاً یہی ظاہر ہو رہی ہے کہ بیان کے قابلِ قبول اور سچا قرار پانے کا شرعی معیار مخبر کا عدل و تقویٰ ہے۔ دنیوی وجاہت اور شخصیت کو صداقتِ خبر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اگرچہ امام ابو یوسف رحمہ شاہد کی دنیوی وجاہت کو قبولِ شہادت کے لئے کافی سمجھتے ہیں مگر لفظ فاسق سے ان کے اجتہاد کی جو محض تجربہ اور رائے پر مبنی ہے تردید ہو رہی ہے۔ اگر فاسق کی خبر پر اعتماد کرنے سے حاکم یا سوسائٹی کی طرف سے کچھ ضرر پہنچ جائے تو اس پر ندامت تو بہرحال ضروری ہے۔ باقی ضرر پانے والی قوم کو معاوضہ دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ آیت اس مسئلہ میں خاموش ہے مگر رفتارِ کلام سے ایک پوشیدہ اشارہ ضرور نکلتا ہے کہ کچھ معاوضہ دیا جائے۔ کیونکہ ندامت کا لفظ عام ہے۔ اپنی غلط حرکت پر ہو جس کی وجہ سے کسی قوم کو ضرر پہنچا ہو یا اداء معاوضہ اور خود نقصان برداشت کرنے پر ہو۔ واللہ اعلم۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے

عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا

پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے

بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو بے شک اللہ انصاف کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

کے درمیان اصلاح کر دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

تفسیر

اس معمورہ میں ہزاروں حکومتیں بصورتِ ملوکیت یا بشکل جمہوریت گزری ہیں جو اپنی انفرادیت کی مدعی تھیں، لیکن ان کی انفرادیت یا قومیت نسل کے زیرِ اثر تھی یا جغرافیائی حدود سے وابستہ۔ پورے تعلقاتِ حکومت کا تفصیلی قانون ایک مدون ہوتا تھا جو پورے ملک پر لاگو ہوتا تھا، مگر سوائے راعی و رعایا کے رشتہ کے اور کوئی نظریہ نہ رعایا کو باہم متحد بنانے والا تھا۔ نہ حاکم کو محکوم سے وابستہ کرنے والا۔ ایک ملک میں رہنے والے سب کے سب اس ملک کو اپنا وطن کہتے تھے اور کچھ بڑی بڑی قومیں انفرادی جذبۂ قومیت کی بھی حامل ہوتی تھیں، مگر ظاہر ہے کہ سب کا ایک عام نظریۂ حیاتِ انسانی نہ تھا۔ ایسی کوئی جامع تھیوری نہ تھی جس پر لوگ کالے گورے اعلیٰ ادنیٰ امیر و فقیر راعی رعایا شریف رذیل اونچے نیچے غرض سارا ملک اپنے اخلاق، تمدن، معاشرت اور سیاست کی بنیاد قائم کر سکتا۔ تمام آسمانی مذاہب بلکہ وہ عقلی اور فلسفی مذاہب بھی جو اصلاحِ معاشرہ و ملک کے دعویدار تھے قومیت یا وطنیت کے بندھن سے بندھے ہوئے تھے۔ یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفہ، یہودیت، نصرانیت، بدھ ازم، جین ازم، زرتشتی قانون اور ابراہام لنکن کا بنایا ہوا مساواتی طرزِ حکومت۔ غرض ماضی بعید ماضی قریب اور حال کا کوئی ضابطہ ایسا نہ تھا اور نہ اب ہے جو بیک وقت تمام شعبہ ہائے زندگی کی درستگی کے لئے ایک نظریہ بن سکتا اور کوئی ایسا کلمہ جامع نہ تھا جو ہر انسان کی پوری زندگی کی کفالت کر سکتا اور تمام فطری اور غیر فطری میلانات کو قائم رکھتے ہوئے بھی ہر آدمی کا مطمح زندگی بن جاتا اور ہر شخص کو دوسرے شخص سے ایک رشتۂ برادری میں باندھ دیتا ہے اور آپس کے جملہ جنگ اختلافات اور نزاعات کا فیصلہ اسی ایک نظریۂ زندگی کی روشنی میں کیا جا سکتا اور ملک یا حکومت یا قوم کے باغی کو باغی نہ کہا جاتا بلکہ اس نظریہ کے باغی کو باغی قرار دیا جاتا اور اس نظریہ کے علمبرداروں کی پوری طاقت کو ان باغیوں کے خلاف استعمال کی اجازت ہوتی جو مسلمہ نظریہ سے بغاوت کرنے والے قرار پاتے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ایک فکری اور عملی ضابطۂ زندگی پیش کیا۔ حقیقت میں یہ ضابطہ تو نظری اور اعتقادی ہے لیکن نظریہ کے زیرِ اثر چونکہ تمام عملی زندگی خود بخود آجاتی ہے اس لئے ہم اس کو نظریۂ حیات کہتے ہیں۔ اور اس نظریۂ حیات کو صحیح ماننے والوں کو مومن کہا جاتا ہے۔ مومن کسی جغرافیائی حد یا نسل یا قوم یا زبان یا اعلیٰ و ادنیٰ طبقات کے ساتھ مخصوص نہیں۔ نہ یہ کسی وطن کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے۔ نہ کسی نسل، قوم اور رنگ کے ساتھ، بلکہ کل حیاتِ انسانی کا ایک نظریہ ہے اور اس نظریہ کو ماننے والے اور اس پر چلنے والے بھائی بھائی کہلاتے ہیں۔ ایمان کی یہ برادری اور اخوت اپنے اندر تمام رشتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ اس نے خاص خاص حدود میں رہتے ہوئے وطنی قبائلی قومی اور خونی رشتوں کی نہ صرف یہ کہ تردید نہیں کی بلکہ تائید کی ہے لیکن تمام وطنی قومی اور خونی رشتوں کے نزاعات اور جھگڑوں کا فیصلہ اسلامی ضابطہ کی روشنی میں کرنے کا حکم دیا ہے۔ کسی خاص حکومت یا خاص وطن یا خاص قوم کے مخالف کو اس نے باغی قرار نہیں دیا اور نہ حقوقِ شخصی و قومی کے لئے جنگ کرنے کو خلافِ انسانیت اور ظلم بتایا بلکہ یہ حکم دیا

کہ جب مومن برادری میں باہم کوئی نزاع جدال یہاں تک کہ قتال بھی ہونے لگے تو اسلامی ضابطہ کی طرف رجوع کرو اور حیات انسانی کا وہ نظریہ جس کو ایمانی تقاضہ کہا جاتا ہے اپنے اوپر لاگو اور حاکم سمجھو اور اسی سے اپنے اختلافات کا فیصلہ کراؤ۔ اب اگر کوئی فریق قرآن وسنّت کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو اس کو انسانیت اور امنِ عالم کا باغی سمجھو اور اس سے اس حد تک لڑو کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور اپنی ہٹ سے باز آجائے اور سچے دل سے توبہ کرکے قرآن وسنّت کی طرف آجائے۔ اگر وہ ایسا کرلے تو پھر وہ سابق حالت کی طرح اسلامی برادری کا رکنِ صالح مان لیا جائے گا اور اگر واپس نہ آئے تو اس کو تباہ کردو۔ اسلام و ایمان کا دعویٰ کرنے والے دو شخصوں یا دو گروہوں میں اعلیٰ وادنیٰ بادشاہ فقیر طاقتور کمزور اور وطنی وغیر وطنی کی ترجیحات کو حاکم نہ بناؤ۔ جو فیصلہ کرو نظامِ اسلام کے زیرِ حکم کرو اور دونوں فریقوں کو باہم بھائی بھائی قرار دیتے ہوئے فاسد کو صالح بنانے کی کوشش کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر رحمت کی بارش ہو۔ معاشرہ صالح ہوجائے۔ عدل کے ساتھ امنِ عام پیدا ہوجائے اور ہر فرد حیاتِ انسانی سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہوجائے۔

تحلیلِ اجزاء

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان مصالحت کرادو۔ یعنی جو باطل پر ہو اور اس کو کچھ غلط فہمی ہوجائے تو اس کی غلط فہمی کو دور کردو اور زیادتی کرنے سے اس کو روک دو اور دونوں کو قرآن اور فرمانِ رسول کو ماننے کی دعوت دو اور دونوں کو مشورہ دو کہ آپس کی خصومت ختم کردیں۔ کوئی فریق دوسرے سے بغض نہ رکھے اور کوئی کسی کو دکھ پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔

صحیح مسلم وصحیح بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک بار حضورؐ (انصار کی ایک جماعت کی طرف) سواری پر سوار ہوکر تشریف لے گئے (اس جماعت میں مخلص مومن بھی تھے اور عبداللہ بن ابی منافق اور اس کے ساتھی بھی) عبداللہ بن ابی بولا مجھے آپؐ کی سواری کی بدبو سے تکلیف ہوتی ہے مجھ سے دور ہی رہیے۔ یہ سن کر ایک انصاری (کو غصہ آگیا اور انہوں) نے کہا۔ خدا کی قسم رسول اللہؐ کی سواری میں تجھ سے زیادہ خوشبو آتی ہے۔ عبداللہ کے گروہ میں سے ایک آدمی غضبناک ہوگیا اور ان دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگی۔ پھر ہر ایک کے طرفدار گروہ کے لوگ بھڑک اٹھے اور کھجور کی چھڑیوں اور ہاتھوں اور جوتوں سے آپس میں خوب مارپیٹ ہوئی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے لوگوں کو پڑھ کر سنائی، سنتے ہی لوگ رک گئے اور آپس میں صلح کرلی۔

سعید بن منصور اور ابن جریر نے حضرت ابو مالک کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دو مسلمانوں کے درمیان کچھ گالی گلوچ ہوگئی۔ جماعت میں سے کچھ لوگ ایک کی طرفداری اور کچھ دوسرے کی طرفداری میں بھڑک اٹھے اور ہاتھا پائی اور جوتہ بازی ہونے لگی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ قصہ بھی وہی ہے جو بخاری ومسلم نے صحیحین میں بیان کیا ہے۔

ابن جریر ابن ابی حاتم اور بغوی نے سدی کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کے نکاح میں ایک عورت تھی۔ انصاری کا نام عمران تھا۔ اور عورت کو ام زید کہا جاتا تھا۔ عورت اپنے میکے کو جانا چاہتی تھی اور شوہر نے اس کو روک دیا تھا اور ایک بالاخانہ پر رکھا تھا۔ عورت نے اپنے میکے والوں کو بلوایا۔ اس کے خاندان والے آگئے اور عورت کو ساتھ لے جانا چاہا۔ مرد گھر پہ نہ تھا۔ اس کے رشتہ دار جمع ہوگئے اور انہوں نے عورت کو روکنا چاہا۔ غرض آپس میں دھکم دھکا اور جوتہ بازی ہونے لگی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول خداؐ نے ان لوگوں کے پاس کسی کو بھیج کر باہم صلح کرادی اور سب نے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو قبول کرلیا۔

ابن جریر اور بغوی نے قتادہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول دو شخصوں کے متعلق کیا گیا ہے جن کے درمیان کسی حق کے سلسلہ میں گفتگو کا کچھ ردوبدل ہوگیا تھا۔ ایک کے خاندانی افراد زیادہ تھے۔ اس نے اپنے کنبہ کی کثرت پر غرور کرتے ہوئے کہا۔ میں زبردستی اپنا حق لے لوں گا۔ دوسرے نے رسول اللہؐ سے فیصلہ کرانے کی خواہش کی۔ آخر معاملہ بڑھ گیا۔ دونوں کے طرفداروں میں دھکم دھکا اور ہاتھوں اور جوتوں سے مارپیٹ ہونے لگی مگر تلوار نہیں چلی۔

ابن جریر نے حسن کا قول نقل کیا ہے کہ دو خاندانوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ کسی نے پنچایت کرنے کی دعوت دی مگر جھگڑنے والوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ شاید حسن کا یہ بیان کردہ واقعہ بعینہ وہی قصہ ہے جو قتادہ نے بیان کیا ہے۔

بغوی نے بروایت سالم حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہ کرے نہ اس کو گالی دے۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت (پوری کرنے) میں لگا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت (پوری کرنے) کی طرف متوجہ ہوگا۔ جو شخص کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کی سختیوں میں کوئی سختی اس کی دور فرما دے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہ کرے۔ اس کو بے مدد نہ چھوڑے اور اس کی توہین نہ کرے۔ اپنے سینہ کی طرف اشارہ کر کے تین بار فرمایا۔ تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ اپنے مسلمان بھائی کی بے عزتی کرنا بہت بڑا شر ہے ہر مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔

(نوٹ) دونوں آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ بغاوت کرنے کے بعد بھی باغی پر مومن کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

بغوی نے حارث اعور کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ سے ان لوگوں کا مسئلہ پوچھا گیا جو حضرت علی کے خلاف جنگ جمل و صفین میں اٹھے تھے۔ سائل نے دریافت کیا تھا۔ کیا وہ لوگ مشرک ہو گئے۔

حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا۔ نہیں، شرک سے تو وہ بھاگے تھے۔ سائل نے دریافت کیا۔ تو کیا وہ منافق تھے؟ فرمایا نہیں۔ منافق تو اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں (اور وہ تو بہت ذاکر و شاغل تھے) سائل نے پوچھا تو پھر ان کی کیا حالت تھی؟ حضرت علیؓ نے فرمایا وہ ہمارے بھائی تھے جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

فَإِنۢ بَغَتْ إِحْدَىٰهُمَا عَلَى ٱلْأُخْرَىٰ فَقَـٰتِلُوا۟ ٱلَّتِى تَبْغِى حَتَّىٰ تَفِىٓءَ إِلَىٰٓ أَمْرِ ٱللَّهِ ۚ پھر اگر دونوں میں سے کوئی گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ یعنی اگر زیادتی کرنے والے گروہ کے ظلم کو فہمائش کے ذریعے سے روکنا ممکن نہ ہو وہ باغی گروہ طاقتور ہو، اس کے پاس ایک کثیر جتھا اور اسلحہ ہو تو ایسی صورت میں اس سے مقابلہ کرو اور اس وقت تک لڑو کہ وہ توبہ کرے ہتھیار ڈال دے اور اللہ کے فیصلہ کو قبول کر لے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ نے ارشاد فرمایا۔ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو میں کروں (یہ بات سمجھ میں آتی ہے) لیکن ظالم کی مدد کیسے کروں؟ فرمایا اس کو ظلم سے باز رکھو۔ یہی اس کے لئے تمہاری مدد ہے متفق علیہ۔

فَإِن فَآءَتْ فَأَصْلِحُوا۟ بَيْنَهُمَا بِٱلْعَدْلِ وَأَقْسِطُوٓا۟ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُقْسِطِينَ۔ پھر (لڑائی کے بعد) وہ باغی گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اور اللہ و رسول کا حکم ماننے کے لئے تیار ہو جائے تو انصاف کے ساتھ دونوں کے درمیان مصالحت کرو۔ کسی کی طرف اپنا جھکاؤ نہ کرو۔ عدل اختیار کرو۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

آیات کے مناسب چند مسائل

(۱) مسئلہ۔ اگر باغیوں کی ایک جماعت بن جائے اور لوٹ مار یا کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کرے کہ حاکم اسلام اس سے لڑنے پر مجبور ہو جائے بغیر اس کے اس گروہ کی بغاوت ختم نہ ہوتی ہو تو جنگ ضروری ہے۔ اور اگر خود آغاز قتل و غارت گری باغی جماعت کی طرف سے نہ ہو، مگر وہ لڑنے کے لئے تیار ہو تب بھی حاکم اسلام اس سے جنگ کر سکتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں امام شافعی امام احمد اور امام مالک کے نزدیک حکومت کی طرف سے آغاز قتال کرنا جائز نہیں گرفتاری کی جا سکتی ہے گرفتاری ممکن نہ ہو تب بھی حکومت کی طرف سے جنگ کی ابتدا نہیں کی جا سکتی۔ مسئلہ اختلافی ہے طرفین کے دلائل کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۲) مسئلہ۔ اگر باغی شخص مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہو اور اس کا کوئی گروہ یا مرکز نہ ہو کہ اس سے جا کر ملنا چاہتا ہو تو اس کا پیچھا کرنا اور تعاقب کر کے قتل کرنا جائز نہیں۔ لیکن اگر اس کا جتھا اور مرکز ہو اور بھاگ کر وہ اپنے سینٹر میں پہنچنا اور پہنچ کر طاقت بہم پہنچانا چاہتا ہو تو اس کا پیچھا کیا جائے گا اور تعاقب کرنے میں اس کو قتل بھی کیا جائے گا۔ مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک کسی صورت میں بھاگے ہوئے کا تعاقب کرنا اور تعاقب کر کے قتل کرنا جائز نہیں۔

(۳) مسئلہ۔ باغیوں کے بیوی بچوں کو قید نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کا مال لوٹ کر مسلمانوں کو تقسیم کیا جائے گا۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ بلکہ ان کے مال کو رکھا جائے گا جب وہ توبہ کرلیں گے تو ان کو دے دیا جائے گا۔

ابن ابی شیبہ نے لکھا ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلے میں حضرت طلحہؓ اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہوگئی تو حضرت علیؓ نے اعلان عام کرادیا کہ کسی آنے جانے والے کو قتل نہ کیا جائے، نہ کسی کا دروازہ کھلوایا جائے، نہ کسی کی عورت یا مال کو حلال سمجھا جائے۔ عبدالرزاق کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت علیؓ مقتول کا مال نہیں لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص مال کی شناخت کرلے وہ اپنا مال لے لے۔

تاریخ واسطی میں ہے کہ حضرت علیؓ نے بروز جمل فرمایا تھا۔ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرو، کسی قیدی کو قتل نہ کرو اور عورتوں سے کچھ تعرض نہ کرو خواہ وہ تم کو اور تمہارے سرداروں کو گالیاں دیں۔

(۴) مسئلہ۔ دورانِ جنگ میں باغیوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو جو جانی مالی نقصان ہوجائے اس کا تاوان اور معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے لیکن شافعی کا ایک قول ایک روایت میں آیا ہے کہ ضمان دیا جائے گا۔ بغوی نے زہری کا قول نقل کیا ہے کہ اسی زمانہ میں دورانِ جنگ مسلمانوں کو جو جانی مالی نقصان ہوا تھا اور قاتل یا مال کا نقصان کرنے والا معلوم تھا تو لڑائی کے فوراً بعد کسی سے نہ قصاص لیا گیا نہ مالی تاوان۔

(۵) مسئلہ۔ اگر کوئی باغی حق سمجھتے ہوئے کسی مسلمان کو دورانِ جنگ قتل کردے گا اور وہ مسلمان قاتل کا قرابت دار ہوگا تو باغی اس کا وارث ہوگا۔ اور اگر اس کو خود اقرار ہو کہ میں نے یہ کام غلط کیا ہے تو وارث نہ ہوگا۔ امام شافعی کے نزدیک کسی طرح پر باغی قاتل مسلمان مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا۔ مسلمان قاتل اور باغی مقتول ہو تو قاتل مقتول کا وارث باجماع علماء ہوگا۔

(۶) مسئلہ۔ اگر باغیوں کے پاس بغاوت کی کوئی شرعی وجہ نہ ہو اور وہ بغاوت کا کوئی شرعی ثبوت نہ پیش کریں اور ان کے پاس طاقت اور جتھا ہو اور انہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو یا ان کا مال لوٹا ہو تو ان کا حکم رہزنوں اور لٹیروں کا ہے جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا صلیب پر لٹکایا جائے یا ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور شہر سے نکال دیا جائے۔ اور اگر باغی جتھے بند اور طاقتور اور لشکر کشی نہ ہو تو اس کو گرفتار کیا جائے گا قید کیا جائے گا۔ اور جب تک اس کے ہاتھ سے قتل کا ثبوت نہ ہو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ مسجد کے ایک گوشہ میں کسی (خارجی) شخص نے پکار کر کہا لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ حکم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا نہیں۔ حضرت علیؓ نے یہ کلام سن پایا اور ارشاد فرمایا۔ بات تو حق ہے مگر اس سے جو مطلب نکالا جارہا ہے وہ (استدلال) غلط ہے (اے خارجیو) تمہارے لئے ہمارے ذمہ تین باتیں ہیں۔ ہم تم کو مسجدوں میں نماز پڑھنے سے نہیں روکیں گے۔ جب تک تم ہمارے ساتھ مل کر کافروں سے لڑو گے ہم مال غنیمت میں تم کو شریک رکھیں گے اور ہم اپنی طرف سے تم سے مقاتلہ شروع نہیں کریں گے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ پس سب مسلمان بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں میں اصلاح حالات (یعنی شریعت کے مطابق مصالحت) کرادو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ مقصد یہ کہ سب مسلمانوں کی ایک ہی جڑ اور ایک اصل ہے۔ سب ایک نظریہ کو مانتے ہیں۔ ایمان سب کی بنیاد ہے، ایمان ہی کی مختلف شاخیں ہیں۔ شاخوں میں کتنا ہی اختلاف شکل و رنگ ہو مگر جڑ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا سب بھائی بھائی ہیں۔ دینی ایمان و اسلام ہیں اور ایمان کا مرکز حضورؐ کی ذات بابرکت ہے پس حضورؐ اقدس سب کے باپ ہیں اور آپ کی بیبیاں سب کی مائیں ہیں، لہٰذا بھائیوں میں اختلاف کے باوجود یگانگت کا رشتہ قائم رہتا ہے اور اسی کے پیش نظر حکم خدا کے مطابق مصالحت ضروری ہے۔ کسی کی جنبہ داری نہ کرنی چاہیئے۔ اس مصالحت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ منتشر نہ ہوگا اجتماعی سلسلہ قائم رہے گی۔ دنیا میں ان کی طاقت کافروں کے مقابلہ میں کمزور نہ ہوگی۔ اللہ کی مدد ان کی شامل حال رہے گی اور قیامت کے روز بھی اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا کسی کا حق کسی کے ذمہ نہ ہوگا۔ حقوق العباد دنیا میں ہی معاف ہو چکیں گے کہ یہاں کے نزاعات کا فیصلہ یہیں ہو جائے گا۔

جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا دنیا میں جو لوگ عدل و انصاف کرتے رہے (قیامت کے دن) وہ موتیوں کے منبروں پر رحمن کے سامنے بیٹھے ہوں گے اور یہ بدلہ ہوگا ان کے عدل و انصاف کرنے کا (نسائی) مسلم کی حدیث میں ہے یہ لوگ ان منبروں پر خدا کے دائیں جانب ہوں گے یہ بھی حضورؐ کا

ارشادِ گرامی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اُس کو اس پر ظلم وستم نہ کرنا چاہیئے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی مسلمان اپنے غیر حاضر بھائی کے لئے اس کے پسِ پشت اللہ تعالے سے دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے آمین! تجھے بھی خدا ایسا ہی کردے۔ یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ حضور کریم نے ارشاد فرمایا مسلمان سارے کے سارے باہمی محبت، رحمدلی اور میل جول میں ایک جسم کی طرح ہیں، جب کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔ کبھی بخار چڑھ آتا ہے، کبھی رات بھر نیند نہیں آتی۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے دیوار کے ان اجزاء (اینٹوں) کی طرح ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔ ایک سے دوسرے کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ آپؐ نے اس فرمان کے وقت اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر (پیوستگی اور وابستگی کا) اظہار فرمایا۔

مسند احمد کی ایک اور صحیح حدیث ہے۔ مومن کا تعلق دوسرے اہلِ ایمان سے ایسا ہی ہے جیسے سر سے باقی جسم کا مومن اہلِ ایمان کے ساتھ دردمندی کرتا ہے جو دردمندی جسم کو سر کے ساتھ ہے۔

مقصودِ بیان

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ باہم قتل و قتال کے بعد بھی مومن دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کرتا۔ اس سے معتزلہ اور خوارج کا قول رد ہو جاتا ہے جو مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج کہتے ہیں خواہ کافر قرار دیں یا نہ قرار دیں۔

اَصْلِحُوْا کے لفظ سے مسلمانوں میں مصالحت کرانے کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔

حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ اور اَقْسِطُوْا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ باغیوں سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کے دائرہ میں نہ آجائیں اور حکومتِ اسلامیہ کے فرمانبردار نہ ہو جائیں، لیکن مصالحت کے مقصد اصلاح حال ہونا چاہیئے اور عمل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جذبۂ انتقام کی کارفرمائی کو اس مصالحت میں دخیل نہ بنانا چاہیئے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ میں ایک عظیم الشان ضابطۂ زندگی اور اتحادِ نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باوجود گوناگوں اختلافات و نزاعات کے ہر مومن پر لازم ہے کہ دوسرے مومن سے بھائی جیسا سلوک کرے اور تعلق برادری کو منقطع نہ ہونے دے، نہ جذبۂ اخوت کے خلاف کوئی حرکت کرے۔ آیت کا مقصود تو مسلمانوں میں مصالحت کرانے اور کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مگر اس سے اس حدیث کا مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو چیز اپنے لئے ناپسند کرو وہ چیز اپنے بھائی کے لئے ناپسند کرو جو چیز خود اپنے لئے پسند ہو وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔ اس بات سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ باوجود قومیت نسب وطن زبان رنگ اور دولت و فقر کے اختلاف و تنوع کے اسلام کے نزدیک رشتۂ ایمان کا اتحاد سب پر حاوی ہے، جو عاطفہ اور میلان اور جذبہ اس جذبۂ اتحاد اور وحدتِ نظریہ کے تقاضوں کے خلاف ہوگا اس کو کاٹ دیا جائے گا۔

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ میں لفظ عام ہے۔ آخرت میں رحم کا استحقاق ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی ان مسلمانوں کو یقینی امید رحمت رکھنی چاہیئے جو شیرازۂ اسلام کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی جماعتی طاقت کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ وغیرہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ ان (ہنسنے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر

مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ

ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقاب سے پکارو

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا (ہی) بُرا ہے اور جو ان سرکشیوں سے) باز نہ آویں گے تو وہ ظلم کرنے والے ہیں

تفسیر

دوسروں کو بددل بنانے دشمنی پیدا کرنے نفرت و بغض کا بیج بونے اور جماعت کی شیرازہ بندی کو تباہ کرنے میں بہت بڑا دخل غرور کا ہے۔ اگر سوسائٹی کے اندر معاشرے کا کوئی رکن اپنی ذات کو اعلیٰ و بالا اور دوسروں کو ادنیٰ اور حقیر سمجھنے لگے تو یقیناً دوسرے لوگوں کے دلوں میں اس سے نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے گی اور وہ ہر وقت اس مغرور و متکبر کی تباہی و بربادی اور ذلت کے خواہاں اور جویاں رہیں گے اور اس کو گرانے کی ہر ممکن کوشش سے دریغ نہیں کریں گے اور شخصی اور فردی غرور کا سرچشمہ یا نتیجہ وہ تفوق اور تکبر ہوتا ہے جو ایک فرقہ یا قوم کے دماغوں میں جم جاتا ہے۔ نسبی فخر قومی شرافت وطنی تفوق۔ اور مال و دولت یا عقل و علم کی برتری کی وجہ سے بعض گروہوں اور جماعتوں کے دلوں میں اپنی سیادت اور جھوٹی دنیوی وجاہت کا خیال ایسا چھا جاتا ہے کہ دوسری قومیں اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہیں۔ ذات پات کی بیماری کی بھی یہی علت ہے اور اسرائیلی یا آرین جذبۂ غرور کا سبب بھی یہی ہے۔ اسی غرور نے بے جانے اسرائیل کو دنیا کی قوموں میں مبغوض بنا دیا اور اسی باعث غیر آرین ہندوستانی قوموں کو آریوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اب بھی ہندوستان کی قدیم قوموں کی نظر میں برہمنوں، کھتریوں اور بنیوں کا یہی جذبۂ تفریق اور ذات کی تقسیم تمام آریہ نسل والوں کو متعدی بیماری کی طرح ناقابل اختلاط بنائے ہوئے ہے۔ ہندو بہرحال ہریجنوں کو اچھوت جانتے ہی ہیں جس کے لئے ان کا تفریقِ ذات کا جذبہ یا نظریہ مجرم ہے مگر ہریجن بھی ہندوؤں کو اچھوت سے کم نہیں سمجھتے اور اس کا باعث ہریجنوں کا جذبۂ انتقام ہے جس کی تخم پاشی ان کے دلوں میں ہندوؤں نے کی ہے۔ غرور شخصی ہو یا جماعتی اور قومی، بہرحال اجتماعیت اور باہم پیوستگی کو فنا کرنے والا ہے۔ غرور و تکبر کے مظاہر گوناگوں ہیں۔ شخصی غرور بھی طرح طرح کا ہوتا ہے اور جماعتی تکبر کی بھی بہت صورتیں ہیں۔ منجملہ دوسری صورتوں کے یہ صورت ہمہ گیر ہے کہ ایک اہل قوم دوسری قوم سے اپنے کو اعلیٰ اور بہتر سمجھ کر اس کی بیوقوفی یا کمزوری یا ناداری کا مذاق اڑاتی ہے۔ ناداری یا سادہ لوحی یا کمزوری کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھتی ہے۔ طرح طرح سے اس پر آوازے کستی اور اس سے تمسخر کرتی ہے۔ نکتہ چینی، عیب گیری اور طعن کرتی ہے۔ اگر کوئی فطری کمزوری یا اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے کوئی نازیبا حرکت کر گزرے تو اس کی چڑ بنا لیتی ہے۔ پوری قوم میں وہ نازیبا لفظ اس کا لقب ہی بن جاتا ہے اور ان تمام بیہودگیوں اور جاہلانہ مظاہروں کا سرچشمہ یہی پندارِ شخصی یا غرور قومی ہوتا ہے جو طرح طرح سے دوسروں کی توہین و تحقیر پر آمادہ کرتا ہے۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیوی وجاہت و سیادت، دولت و ثروت، طاقت و عزت کسی کے لئے معیارِ برتری نہیں، برتری کا مدار ایمان کی مضبوطی، کردار کا حسن، گفتار کی صحت اور اطوار کی پاکیزگی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس کی توہین کی جا رہی ہے اور جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہو وہ اللہ رب العزت کے نزدیک اُن مذاق اُڑانے والوں سے بہتر ہو۔ بلالؓ ابوجہل سے، سلمان فارسیؓ ابولہب سے اور عمار ابن یاسرؓ بڑے بڑے سردارانِ کفر سے اللہ کے نزدیک افضل تھے اور کافروں سے برتری پہنچی منحصر نہیں، بہت سے نکتہ چینوں، خردہ گیروں اور استہزاء کرنے والے مسلمانوں سے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر تھے جن کا مذاق اُڑایا جاتا اور بُرے القاب سے ذکر کیا جاتا تھا۔ ایسے مغرور لوگوں کو ضرور اپنی تباہ کن حرکتوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر ان بیہودگیوں کو ترک نہیں کریں گے تو وہی ظالم قرار پائیں گے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ظلم کے ابتدائی اور وسطی درجے میں چاہے ظالم کو مومن کہا جاتا ہو اور وہ دائرہ ایمان سے خارج نہ ہو لیکن ظلم کی آخری چوٹی کفر کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تحلیلِ اجزاء

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ مسلمانو! مرد مردوں کا مذاق نہ اُڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو وہ ان مذاق اُڑانے والوں سے (اللہ کے نزدیک) بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق بنائیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن کا مذاق بنایا جا رہا ہو وہ ان مذاق بنانے والیوں سے (اللہ کے نزدیک) بہتر ہوں۔

[1] صاحبِ قاموس نے لکھا ہے کہ قوم کے معنی ہیں مردوں اور عورتوں کی مخلوط جماعت یا صرف مردوں کی جماعت پر لفظ قوم کا اطلاق حقیقی ہے اور

بھی (بالتبع) ضمنی طور پر داخل ہیں۔ جوہری نے لکھا ہے کہ قوم کا لفظ اصل میں صرف مردوں کی جماعت کے لئے وضع کیا گیا ہے جوہری نے اس لغوی تحقیق پر اسی آیت سے استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں قوم پر نساء کا عطف کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ معطوف علیہ سے معطوف مغایر ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا قول ہے۔

وما ادری ولست اخال ادری ۔ اقوم آل حصن ام نساء

ترجمہ: میں نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ میں جانوں گا بھی نہیں کہ قبیلہ حصن والے مرد ہیں یا عورتیں۔ اس شعر میں بھی مردوں کے لئے لفظ قوم استعمال کیا گیا ہے۔ اس آیت کے علاوہ قرآن میں عام طور پر لفظ قوم کا اطلاق مردوں اور عورتوں کے مجموعہ پر کیا گیا ہے۔

صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ قومیت کا مفہوم حقیقت میں مردوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ فرمایا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ لفظ قوم مصدر ہے بطور مجازی معنی میں مستعمل ہے اور جماعت پر اس کا اطلاق عام ہو گیا یا قَائِمٌ کی جمع ہے جیسے زَائِرٌ کی جمع زَوْرٌ ہے۔

کسی کا مذاق اڑانا اس کی بے عزتی ہے اور کسی کو بے عزت کرنا غرور نفس کی علامت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا بلا وجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی بات کی وجہ سے ہنسے گا ممکن ہے خود اسی میں مبتلا ہو جائے۔ اگر کسی کی کانی آنکھ پر ہنسے گا تو خوف کرے کہیں خود کانا نہ ہو جائے یا اس سے زیادہ سخت بلا میں گرفتار ہو جائے، کیونکہ خدا قادر ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔

بغوی نے حضرت انسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ کی بیبیوں کے متعلق نازل ہوئی جو حضرت ام سلمہؓ کی پستی قامت کا مذاق بناتی تھیں۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اس آیت کا نزول ام المومنین حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب کے سلسلہ میں ہوا (چونکہ آپ پہلے یہودی مذہب رکھتی تھیں اور ماں باپ بھی یہودی تھے۔ خیبر کی جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں اور اسلام قبول کر لیا تو جناب رسول اللہ نے آپ سے عقد کر لیا بعض بیبیوں نے آپ کو یہودن اور یہودی ماں باپ کی بچی کہا تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ (حضرت صفیہؓ نے حضورؐ سے اس کی شکایت کی تو) آپؐ نے فرمایا تم نے کیوں نہیں کہا کہ میرے باپ (حضرت) ہارونؑ تھے اور میرے چچا (حضرت) موسیٰ تھے اور میرے شوہر محمدؐ ہیں۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور باہم طعنہ زنی نہ کرو۔ ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اپنے نفسوں کو طعن نہ دو کا مطلب ہے کہ آپس میں کوئی کسی کو طعن نہ دے جیسے

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا مطلب ہے تم میں سے کوئی کسی کو قتل نہ کرے۔ لمز کے معنی ہیں عیب گیری، نکتہ چینی۔ لمز زبان سے نکتہ چینی کا نام ہے اور ہمز فعل سے طعن و طنز کو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت میں فرمایا ہے۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ ہر طعنہ باز عیب جو کے لئے خرابی ہے۔ ایک دوسری آیت ہے۔ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ۔ جو لوگوں کو حقیر جان کر ان پر طعن کرتا اور لگائی بجھائی کرتا پھرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ مجاہد سعید بن جبیر قتادہ اور مقاتل بن حیان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر طعنہ زنی نہ کرے۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ اور کوئی کسی کی چڑ نہ بنائے۔ تنابزو (باب تفاعل کا مصدر) نبز سے بنایا گیا ہے۔ نبز کا معنی ہے لقب بیضاوی نے کہا نبز خصوصیت کے ساتھ برے لقب کو کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ تنابز باہم عار دلانا (برے) الفاظ سے ایک کا دوسرے کو پکارنا یعنی کوئی کسی کو برے لقب سے نہ پکارے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہ نے کہا تنابز کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی کو فاسق یا منافق یا کافر کہہ کر پکارے۔ حسن نے کہا بعض یہودی یا عیسائی سب مسلمان ہو چکے تھے پھر بھی بعض لوگ ان کو یا یہودی یا نصرانی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس کی ممانعت اس آیت میں کر دی گئی۔ عطاء نے کہا اپنے بھائی (مسلمان کو گدھا یا سور کہہ کر پکارنے کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں آیا ہے۔ تنابز کا یہ معنی ہے کہ (اگر کسی شخص نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہو تب بھی گزشتہ گناہوں کی اس کو عار دلائی جائے (اس گناہ کی طرف نسبت کر کے اس کو پکارا جائے)

اصحاب سنن نے حضرت ابو جبیرہ بن ضحاک کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (جب رسول اللہ مدینہ میں تشریف لائے تو اس زمانہ میں ہمارے قبیلہ میں) ہر

شخص کے دو تین نام ہوتے تھے اور اس کو کسی (بُرے) نام سے پکارا جاتا تھا جو اس کو بُرا لگتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابو جبیرہؓ نے یہ آیت خاص طور پر ہمارے بنی سلمہ کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ جب مدینہ تشریف لائے تو اس زمانے میں مدینہ کے اندر ہر شخص کے دو تین نام ہوتے تھے۔ جب کوئی کسی کو کوئی (بُرا) نام لے کر پکارتا تھا تو لوگ کہتے تھے یا رسول اللہ یہ اس نام سے چڑتا ہے۔ اس پر یہ آیت مکمل نازل ہوئی۔

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام (لگانا) برا ہے۔ یعنی توبہ کرنے کے بعد کسی کو یہودی یا عیسائی یا فاسق یا شرابی کہنا برا ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو کسی کو فسق یا کفر کی طرف منسوب کرے گا، اگر وہ ایسا نہ ہوگا تو یہ قول خود کہنے والے پر لوٹ پڑے گا (یعنی اگر وہ شخص فاسق یا کافر نہ ہوگا تو کہنے والا گناہگار ہوگا اور کافر ہو جائے گا)۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جو کوئی اپنے بھائی کو کافر کہے گا تو لامحالہ اس قول کا مصداق دونوں میں سے کوئی ایک ہو جائے گا (اگر وہ شخص جس کو کافر کہا گیا ہے کافر ہوگا تو خیر، ورنہ کہنے والا کافر ہو جائے گا۔ دونوں میں سے کوئی تو کفر کا مصداق ہوگا) متفق علیہ۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی کو کافر کہہ کر پکارا یا دشمن خدا کہا اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ لفظ کہنے والے پر لوٹ پڑے گا۔ (متفق علیہ)

بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ کسی کا مذاق بنانا، عیب بینی اور طعنہ زنی کرنا اور چڑ بنانا گناہ ہے اور ایمان لانے کے بعد فسق کا نام بُرا ہے۔ یعنی ایسی حرکت نہ کرو اگر تم کو فاسق کہا جائے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق (کبیرہ گناہ) ہے۔ اور اس کو (ناحق) قتل کرنا کفر ہے۔ (متفق علیہ) ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت سعدؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مغفل اور حضرت عمر بن نعمان بن مقرن کی روایت سے اور دار قطنی نے حضرت جابر کی روایت سے، طبرانی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے اتنا زائد بیان کیا ہے کہ مسلمان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ اور جو ان حرکتوں سے باز نہیں آئے تو وہ (اپنے اوپر اور دوسروں پر) ظلم کرنے والے ہیں۔ یعنی استہزاء، دوسروں پر طعنہ زنی اور چڑ بنانے سے اس ممانعت کے بعد بھی جو لوگ توبہ نہ کریں گے اور اس حرکت کو ترک نہ کریں گے تو ایسے لوگ ظالم ہوں گے۔ اپنے نفسوں اور دوسرے مسلمانوں پر ظلم کرنے والے۔ اگر کسی پاک دامن کو زنا کے ساتھ متہم کیا تو قذف کی سزا باجماع علماء اس کو دی جائے گی۔ اگر کوئی شخص محصن نہیں ہے مثلاً کافر ہے تو حدِ قذف تہمتِ زنا لگانے والے پر جاری نہ ہوگی اگر حسب صوابدید حاکم اس کو سزا ضرور دی جائے گی۔ اگر محصن پاک دامن شخص پر زنا کے علاوہ کسی اور گناہ کی تہمت لگائی تو حدِ قذف جاری نہ ہوگی۔ تعزیراً کوئی اور سزا دی جائے گی بشرطیکہ وہ فعل حرام اور اختیاری ہو اور عرفاً اس کو معیوب سمجھا جاتا ہو مثلاً چوری، ڈاکہ، بے ایمانی وغیرہ یا کسی مسلمان کی اس سے توہین ہوتی ہو جیسے کسی مسلمان کو فاسق خبیث فاجر مخنث خائن دیوث سود خوار ملحد بے دین کہنا، یا شرابی بدمعاش اوباش قرار دینا ان سب صورتوں میں تعزیری سزا دی جائے گی۔ حدِ قذف جاری نہ ہوگی۔ اگر کسی کو گدھا بیل اور کتا، بکرا، نائی اور جولاہا وغیرہ کہہ دیا تو امام ہمام کی صراحت کے بموجب تعزیری سزا بھی نہ ہوگی۔ بعض نے کہا ان الفاظ پر بھی تعزیری سزا دی جائے گی بشرطیکہ کسی عالم باعمل اور صالح مردِ مسلم کے حق میں ان کا استعمال کیا گیا ہو۔ اگر کسی کو شطرنج باز (یا نجومی وغیرہ) کہہ دیا تو تعزیر نہ ہوگی کیونکہ اس طرح کے افعال اگرچہ شرعاً جائز نہیں مگر عرفاً ان کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

مقصودِ بیان معاشرت اور سماج کو درست رکھنے کے بعض اصول کا اظہار، کسی مرد یا عورت کا مذاق بنانا، حقیر سمجھنا، کسی پر طعن، عیب جوئی اور نکتہ چینی کرنا، کسی کی پردہ دری کرنا، برے ناگوار القاظ سے کسی کو پکارنا، خطاب کرنا ان تمام امور کی ممانعت صراحت کے ساتھ کر دی گئی ہے۔

عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا اور عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ سے اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیوی معیار تفاضل و برتری کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کمزور سادہ لوح مظلوم گمنام لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں طاقتور دانشمند زردار مشہور لوگوں سے برگزیدہ ہو سکتے ہیں۔

لَا تَلْمِزُوْۤا اور لَا تَنَابَزُوْا سے بہ اشارہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمان یک ذات اور ایک جسم کی طرح ہیں۔ دوسرے پر طعن کرنا اور کسی کو برے لقب سے یاد کرنا خود اپنے اوپر حرف گیری اور اپنی تحقیر ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ دوسرے کے نفس کو اپنے نفس کی طرح سمجھے۔

بِئْسَ الِاسْمُ سے ایما ہے اس امر کی طرف کہ ایمان سے پہلے کے تمام عیوب اور نقائص جو کفر کا نتیجہ تھے ایمان لانے کے بعد معدوم ہو گئے۔ اب کسی کو ان سے نامزد کرنا بھی برا ہے۔

مَنْ لَّمْ يَتُبْ میں وعید ہے اس بات پر کہ پچھلی غلطیوں پر جب آگاہی حاصل ہو گئی تو اب ان کا اعادہ نہ کرنا چاہیے۔ جو شخص رجوع نہیں کرے گا وہ ظالم ہے۔ دوسرے کی حق تلفی کرنے والا بھی ہے، اور خود اپنے اوپر ظلم کرنے والا بھی، کیونکہ دوسرے پاک صاف لوگوں کے لئے جن برے لفظوں کا استعمال کرے گا وہ خود اس پر لوٹ آئیں گے۔ وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا

اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغ مت لگایا کرو اور کوئی

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ

کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس کو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ○

تم ناگوار سمجھتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

تفسیر انسانوں کی پرامن سوسائٹی کو برباد اور معاشرتی و سماجی تنظیم کو تباہ کرنے والے امور میں جہاں ظلم اور دوسرے کے حقوق پر دراز دستی اور بے جا حرص مال و جاہ وغیرہ ہے وہاں آپس کی بدگمانیاں دوسروں کے پوشیدہ احوال کی جستجو اور اندرونی عیوب کی تلاش اور پس پشت برائی کے ساتھ دوسروں کا تذکرہ یعنی لگائی بجھائی کرنی اور جھوٹ سچ باتیں ملا کر کسی کا ذکر کسی سے کرنا اور بغرض توہین و استہزا پیٹھ پیچھے کسی کی خرابیاں بیان کرنا تاکہ زبانی لذت اندوزی کے علاوہ نفس کی کینگی کا تقاضا بھی پورا ہو اور جذبہ حسد کی تسکین بھی ہو جائے۔ یہ تمام امور بھی باہمی الفتوں کو نفرتوں میں اور دوستیوں کو عداوتوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اچھے خاصے دل بگڑ جاتے ہیں۔ منظم سوسائٹی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ صلاح کی جگہ فساد لے لیتا ہے اور امن عام فقدان [illegible] کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ پھر اس کی آبرو کی پاسداری بھائی پر لازم ہے۔ تلف حقوق صرف جسمانی مار دھاڑ یا مالی خیانت و غصب وغیرہ ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ قابل احترام آبرو سے کھیلنا اور کسی کی عزت کی توہین کرنا بھی بڑا ظلم ہے۔ بڑا فتنہ ہے۔ ایک زہریلا سانپ ہے جو پرامن معاشرے کو ڈسنے والا ہے۔ اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کچھ مالی فائدہ نہیں ہوتا صرف نفس شیطانی کی خوراک مل جاتی ہے۔ مردہ بھائی کے گوشت کو کھانا کون پسند کرتا ہے۔ پھر غیبت اور تمامی بھی اس مردہ خوری سے کم نہیں ہے۔ اس کو کیسے پسند کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ معاشرتی عیوب اور سماجی نقائص دورِ جاہلیت کی زینت تھے۔ اللہ نے مسلمانوں کو اس سے روک دیا اور بشرط توبہ پچھلے جرائم کی معافی کا وعدہ فرمایا اور اعلان کر دیا کہ اللہ تواب ورحیم ہے۔ جو کچھ ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دے گا۔ آئندہ احتیاط رکھو۔

تحلیلِ اجزاء يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ۔ اے اہلِ ایمان بہت سے گمانوں سے پرہیز رکھو۔ بغوی نے لکھا ہے۔ حضورؐ کا قاعدہ تھا جب حضورؐ کسی جہاد پر جاتے یا معمولی سفر ہوتا تو دو مالدار آدمیوں کے کام کاج کے لئے ایک تیسرے غریب آدمی کو لگا دیا کرتے تھے۔ یہ تیسرا آدمی سفر میں ان کی ضروریات فراہم کرتا۔ پہلے سے فرودگاہ پر پہنچ کر ان کے ٹھہرنے کا ٹھکانا کرتا کھانا تیار کرتا اور دوسری ضرورتیں مہیا کر دیتا اور منزل پر پہنچ کر ان دونوں کو ہر چیز تیار ملتی کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ ایک سفر میں حضرت سلمان فارسیؓ کو دو آدمیوں کی خدمت پر مامور فرما دیا۔ آپ دونوں کے ساتھ لگ گئے۔ منزل پر پہلے سے جا پہنچے۔ لیکن نیند سے مغلوب ہو کر سو گئے۔ کوئی چیز فراہم نہ کر سکے نہ کھانا بنا سکے، نہ دوسری ضروریات کی فراہمی کر سکے۔ جب وہ دونوں حضرات بھی منزل پر پہنچے اور حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا تو آپ نے جواب دیا مجھے نیند آ گئی، بیتابی کے ساتھ سو گیا، میں نے تو کھانا تیار نہیں کیا۔ ان دونوں بزرگوں نے کہا۔ اچھا تو اب آپ رسول اللہؐ کی خدمت میں جائیے اور ہمارے لئے کچھ کھانے پینے کو حضورؐ سے لے آئیے۔ حضرت سلمانؓ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور کھانے کی درخواست کی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہ کے مہتمم مطبخ تھے۔ حضورؐ نے فرمایا اسامہؓ کے پاس چلے جاؤ اور اُن سے کہہ دو کہ اگر کچھ روٹی سالن بچا ہوا ہو تو دیدیں۔ حضرت سلمانؓ، حضرت اسامہؓ کے پاس گئے اور حضورؐ کا فرمان بیان کیا۔ اسامہ نے کہا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ حضرت سلمانؓ لوٹ آئے اور اسامہؓ کا قول ساتھیوں سے نقل کر دیا۔ ان دونوں بزرگوں نے کہا۔ اسامہؓ کے پاس کھانا ضرور تھا مگر انھوں نے بخل سے کام لیا۔ (دینا نہ چاہا) پھر حضرت سلمانؓ کو مختلف صحابہ کے پاس کھانے کی تلاش میں بھیجا مگر کہیں سے کچھ نہ لا۔ کہنے لگے اگر ہم کنوئیں پر بھی تم کو بھیجیں گے تو اس کا پانی بھی سوکھ جائے گا۔ اس کے بعد یہ دونوں حضرات حضرت اسامہؓ کی ٹوہ لگانے کے لئے نکلے کہ ان کے پاس کھانا تھا (اور نہیں دیا) یا واقعی موجود نہ تھا۔ اس کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا وجہ کہ مجھے تم دونوں کے منہ سے گوشت کی بو آ رہی ہے۔ دونوں نے جواب دیا۔ حضورؐ بخدا ہم نے آج دن بھر گوشت کھایا ہی نہیں۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ تم بےشک سلمانؓ اور اسامہؓ کا گوشت تم دونوں (دن میں) کھاتے رہے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ ثعلبی نے یہ قصہ بغیر سند کے بیان کیا ہے اور اسی کے ہم معنی (دوسرے الفاظ میں) اصبہانی نے ترغیب میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی روایت سے بیان کیا ہے لیکن ابن المنذر نے ابن جریج کے حوالے سے بیان کیا کہ آیت کا نزول حضرت سلمان فارسیؓ کے سلسلہ میں ہوا تھا آپ کھانا کھا کر سو گئے تھے اور ایسے سوئے کہ خراٹے لینے لگے۔ یہ دیکھ کر آپ کے دونوں ساتھیوں نے آپ کے کھانے اور سونے کا ذکر کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۔ بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں۔ اثم وہ گناہ جو موجب سزا ہو۔ إِثْمٌ اصل میں وثم تھا۔ واؤ ہمزہ سے بدل گیا۔ وثم کا معنی ہے توڑ دینا۔ گناہ نیک اعمال کو توڑ دیتا ہے۔ ظن سے مراد ہے غیر یقینی علم خواہ اس طرح ہو کہ کسی چیز کے ہونے کا غالب گمان ہو یا اس طرح ہو کر نہ ہونے کا گمان غالب اور ہونے کا گمان کمزور ہو یا ہونے نہ ہونے کے دونوں رخ برابر ہوں۔ یعنی تردد اور شک ہو۔ بہرحال اس جگہ ظن سے مراد ہے وہ علم جس پر یقین نہ ہو۔ ظن کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وہ ظن جو قائم رکھنا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظن، مسلمان مردوں، اور عورتوں کی طرف سے خوش گمان رہنا، یا وہ ظن جو دلیل شرعی سے تو حاصل ہو مگر دلیل قطعی اور یقینی نہ ہو۔ خواہ اس کا تعلق عمل سے ہو یا علم سے، مبدء سے یا معاد سے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی قطعی دلیل شرعی اس کے خلاف موجود نہ ہو۔ ان تمام صورتوں میں حسنِ ظن واجب ہے اور ترکِ ظن ممنوع۔

(۲) وہ ظن جس کا ترک ضروری ہے اور قائم رکھنا حرام ہے جیسے مسلمان مردوں اور عورتوں کے متعلق بدگمانی، خصوصاً نیک لوگوں کے متعلق بدخیال رکھنا یا نبوت و وحی سے تعلق رکھنے والے امور میں یقین نہ ہونے اور صرف غالب گمان رکھنا، ان تمام امور میں ظن واجب الترک ہے۔

(۳) تیسری قسم ظن کی وہ ہے جس کو نہ چھوڑنا ضروری ہے نہ قائم رکھنا لازم ہے جیسی مصلحت ہو ویسا ہی کرنے کی اجازت ہے۔ معاشی اور دنیوی امور میں سمجھ بوجھ کا جیسا تقاضا ہو ویسا ہی کرنا چاہئے۔ ان میں نہ حسنِ ظن ممنوع ہے نہ سوءِ ظن۔ نہ امید کا وجود ناجائز ہے، نہ اندیشہ قوت حرام۔

آیت میں بعض ظن سے مراد ہے ظن کی دوسری قسم اس سے اجتناب لازم ہے۔ بدگمانی مسلمانوں کے متعلق ناجائز ہے اور اللہ کے متعلق بھی

سوءِ ظنی حرام ہے اور وحی و نبوت کے مسائل پر بھی یقین نہ رکھنا ممنوع ہے۔

كَثِيرًا کا لفظ تنبیہ کر رہا ہے کہ بدگمانیاں اور ان سے مشابہت رکھنے والے خیالات بھی واجب الترک ہیں، ایک صحیح حدیث مبارک ہے حضورؐ نے فرمایا۔ حرام واضح ہے اور حلال بھی کھلا ہوا ہے اور دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں (ان کی کچھ مشابہت حلال سے اور کچھ مشابہت حرام سے معلوم ہوتی ہے) الی آخر الحدیث۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا (بُرے) گمان سے بچو، گمان بہت ہی غلط بات ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوا اور کسی کی ٹوہ لگانے کے درپے نہ ہو۔ لوگوں کے پوشیدہ احوال کی جستجو نہ کرو۔ کسی کے مخفی عیوب کی تلاش مت کرو۔ اللہ نے پردہ پوشی کی ہے تم بھی پردہ برقرار رہنے دو۔

جَسٌّ ہاتھ سے چھونے کو کہتے ہیں اور تجسس کا معنی ہے خبروں کی ٹوہ لگانا، لوگوں کے احوال کی جستجو میں رہنا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورۂ بالا حدیث میں ہے، لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں نہ لگے رہو، آپس میں نفرت اور حسد و بغض نہ رکھو۔ ایک دوسرے کی طرف سے منہ موڑے پشت پھیرے نہ بیٹھے رہو۔ بلکہ سب اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بنے رہو۔ رواہ مالک و احمد و ابن ماجہ و ابو داؤد اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ [illegible] اے وہ گروہ جو زبانوں سے تو ایمان کا اقرار کرتا ہے مگر اس کے دلوں تک ابھی ایمان نہیں پہنچا، مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور ان کے عیوب کی ٹوہ میں نہ پڑ جاؤ۔ جو شخص مسلمانوں کے پوشیدہ عیوب معلوم کرنے کے درپے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کو فاش کر دے گا اور اس کو رسوا کر دے گا خواہ وہ اپنی فرودگاہ کے وسط میں ہی (چھپ کر عیب کرے) ترمذی اور ابن حبان نے یہ حدیث نقل کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔

زید بن وہب کا بیان ہے کہ حضرت ابن مسعود سے کہا گیا ولید بن عقبہ کی گرفت آپ نہیں کرتے (باوجودیکہ) اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے (یعنی وہ شراب خور ہے شراب اتنی پیتا ہے کہ اس کی داڑھی پر شراب بہتی ہے) فرمایا ہم کو عیب جوئی سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی چیز ہمارے سامنے آجائے گی تو ہم اس کی گرفت کریں گے۔

وَلَا يَغْتَبْ [illegible] بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے یعنی کسی کی غیر موجودگی میں اس کا برائی کے ساتھ ذکر نہ کرے اہل علم کے نزدیک غیبت کی یہی تعریف ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ استہزاء یا توہین کی نیت بھی ہو۔ اگر مسلمانوں کو محتاط رکھنا یا کسی حدیث کی تنقیح کرنا مقصود ہو تو عیوب و نقائص کا ذکر غیبت کے حکم میں نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی خوب واقف ہے۔ فرمایا اپنے (مسلم) بھائی کا ایسا تذکرہ کرنا جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو (غیبت ہے) عرض کیا گیا۔ اگر میرے بھائی میں وہ عیب ہوں جو میں کہہ رہا ہوں (تب بھی ان کا ذکر غیبت کہلائے گا) فرمایا جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ عیب اس کے اندر ہوں گے تو یہ غیبت ہوگی اور اگر نہ ہوں گے تو یہ اس پر تمہاری طرف سے تہمت ہوگی۔ متفق علیہ۔

حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت ہے کہ رسول اللہ کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا کہ جب تک اس کو کھلایا نہ جائے وہ کھاتا نہیں اور جب تک اس کو سوار نہ کیا جائے سفر نہیں کرتا۔ فرمایا تم نے اس کی غیبت کی۔ صحابہ نے عرض کیا ہم نے وہی بات کہی جو اس کے اندر ہے۔ فرمایا اگر تم اپنے بھائی کا ذکر ان اوصاف (یعنی عیوب) کے ساتھ کرو جو اس کے اندر ہیں تو یہ غیبت کے لئے کافی ہے۔ (رواہ البغوی)

أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ - یہ کلام بطور تمثیل ہے۔ غیبت کو مُردہ بھائی کے گوشت کو کھانے سے تمثیل دی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کو یہ فعل ناپسند ہے پھر غیبت مزے لے کر کرنی کس طرح گوارا کی جاتی ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا (معراج میں) جب مجھے لے جایا گیا تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں کو اور گوشت کو کھرچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے کہا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے اور ان کی عزتوں کو نوچتے تھے۔ (رواہ البغوی)

میمون کا بیان ہے میں نے خواب میں دیکھا ایک مردار حبشی دیکھا (یعنی ایک لاش دیکھی جو سڑ گل گئی تھی) اور کسی نے مجھ سے کہا کہ اس کو کھا۔ میں نے کہا بندۂ خدا میں اس کو کیوں کھاؤں۔ اس نے جواب دیا اس لئے کہ تو نے فلاں شخص کی غیبت کی۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں نے تو اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، نہ اچھا، نہ برے کا۔ اس شخص نے کہا مگر تو نے کان دھر کر اس کی غیبت سنی تو اور اس کو پسند بھی کیا۔ حضرت میمون نہ کسی کی غیبت کرتے تھے اور نہ اپنے سامنے کسی کی غیبت کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ سے عرض کیا صفیہؓ کی فلاں فلاں بات ہی (بدصورتی اور عیب دار ہونے کے لئے) کافی ہے۔ یعنی حضرت صفیہؓ کا قد بہت ٹھگنا ہے۔ فرمایا تو نے ایسی بات زبان سے نکالی ہے کہ اگر اس کو (تیری) سمندر میں ملا دیا جائے تو اس پر بھی غالب آجائے (یعنی اس کو بھی تلخ و شور بنا دے)۔ رواہ احمد والترمذی

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا۔ غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! زنا سے زیادہ غیبت کیسے ہو سکتی ہے؟ فرمایا اس لئے کہ زانی اگر زنا کرنے کے بعد توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہی شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی ہے۔

کفّارۂ غیبت

غیبت کا تدارک بس اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے لئے اور اپنے لئے دعائے مغفرت کی جائے حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے لئے دعائے مغفرت کرے اور یوں کہے۔ اے اللہ تو ہم کو بھی بخشش دے اور اس کو بھی۔ رواہ البیہقی

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ یعنی جو جرم تم سے ہو گیا ہو اس پر دل سے پشیمان ہو اور آئندہ ایسا نہ کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ جو گنہگار گناہ سے توبہ کرے اس کو بے گناہ کی طرح کر دیتا ہے اور وہ بندوں پر مہربان بھی ہے۔ اس کو پسند نہیں کہ کوئی کسی کی آبرو ریزی یا عزت پر حملہ کرے۔

مقصودِ بیان

بدگمانی رکھنے کی ممانعت، بعض بدگمانیوں کے گناہ ہونے کی صراحت ہے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ زبان سے بری بات کہنے آنکھ سے ناجائز چیز کو دیکھنے، کان سے ممنوع بات سننے اور ہاتھ پاؤں سے غلط حرکات کرنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بدگمانی (جس کا تعلق صرف دل سے ہوتا ہے) بھی گناہ ہے۔

لَا تَجَسَّسُوْا سے مسلمانوں کے اندرونی رازوں کی جستجو کرنے کی ممانعت ثابت ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ غیر مسلم دشمنوں کی اندرونی اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کی توہ لگانا اور جماعت کفر کی حالت خفیہ طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرنا بھی ممنوع ہے۔ آیت میں صرف مسلمانوں کی باہمی معاشرت اور سوسائٹی کو درست رکھنے کے ایک ضابطہ کا بیان ہے، جہادی احکام کا اظہار نہیں ہے، دین الاقوامی تعلقات کا بیان ہے۔

لَا يَغْتَبْ سے ہر غیبت کی ممانعت فرما دی۔ یاد رکھو کہ کبھی غیبت زبان سے ہوتی ہے اور کبھی اشاروں میں اور کبھی کنایہ میں۔ آیت میں نقطۂ عام سے ہر طرح کی غیبت کی ممانعت ہے۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ الخ سے غیبت کی مکروہ ترین تصویر پیش کی گئی ہے۔ جس بتایا گیا ہے کہ کسی کے عیب کا پس پشت بغرض توہین واستہزاء بیان ایسا ہی برا اور قابل نفرت ہے جیسے مسلمان کی مردہ لاش کو نوچ نوچ کر کھانا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الخ میں توبہ کی بلیغ ہدایت ہے اور تنبیہ ہے کہ توبہ کا اعلان نہیں بلکہ توبہ اسی وقت مقبول ہے کہ گزشتہ پر ندامت اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو۔ وغیرہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا

اے لوگو ہم نے تم کو پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ○

شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے۔

تفسیر اپنے اپنے قبائل قوم اور خاندانوں کو سب سے اعلیٰ اور بالا سمجھنا اور دوسری تمام قوموں، نسلوں اور قبیلوں کو اپنی قوم قبیلے کے مقابلہ میں ذلیل خیال کرنا ہمیشہ سے اس انسانی معاشرے کا دستور چلا آیا ہے۔ اس نسلی تفاخر نے یہاں تک ترقی کی کہ بعض دوسری قوموں کو کچھ لوگ اپنی قوم و نسل کا غلام و خادم سمجھنے لگے اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی نسل کے علاوہ دوسری نسلوں کو ملیچھ ناپاک اور اچھوت قرار دے دیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے آرام و آسائش حکومت و عزت اور دولت اور علم و عمل کی ترقی کے دروازے اچھوتوں پر بند کر دیئے۔ گویا کچھ نسلوں نے سمجھ لیا کہ ہمارے علاوہ دوسرے لوگ انسان ہی نہیں۔ اُن کے اول ترین ماں باپ انسان نہ تھے۔ ذات پات کے اس جھگڑے اور نسلی برتری کے اس جذبہ نے انسانی معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ شریف و رذیل اور پیدائشی مخدوم و خادم اس تباہی میں مبتلا عرب بھی تھے اور غیر عرب بھی، ہندی بھی ایرانی بھی، مشرقی بھی اور مغربی بھی، اہل کتاب بھی اور ناخواندہ اُمّی بھی۔ دماغ یہاں تک خراب ہوئے کہ ہندوستان کا پنڈت اپنا نسب سورج اور چاند سے ملانے لگا اور اپنے کو سورج بنسی کہنے لگا عرب کے کچھ لوگ اپنے قبائل کو بنو ماء السماء (آسمانی پانی کی اولاد) اور نَحْنُ بَنَاتُ طَارِق ہم ہیں ستاروں کی بیٹیاں قرار دینے لگے۔ یہودی پکار اٹھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ ہم ہیں خدا زادے۔ عیسائیوں نے بھی کمی نہیں کی۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خدا زادے ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا، مگر اتنا ضرور کیا کہ اپنے ہادی کو خدا کا بیٹا قرار دے لیا۔ افلاطون اور نیٹشے (اور بعض دوسرے چوٹی کے یونانی رومی اور ہندی و مصری) دانشمند بھی اسی رنگ کے روگی رہے۔ ان تاریک دل زنگ خوردہ دماغ والوں نے یہ نہ سوچا کہ آخر سب انسان انسان ہیں، حیوانِ ناطق ہیں، ایک نوع کے افراد ہیں، ایک حقیقت کے حامل ہیں۔ بادشاہ ہوں یا فقیر، فلاسفر ہوں یا کندۂ ناتراش جاہل، جین مانس یا جنگلی ہوں یا متمدن مہذب و درباری سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اصناف مختلف ہیں۔ ان کا قبائلی اختلاف اور شعبی یا فرعی امتیاز محض شناخت کے لئے ہے۔ ہر بچہ کا نام اس لئے رکھا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا امتیاز ہو جائے۔ ہر قبیلہ کا دائرہ اسی لئے محدود کر دیا گیا ہے کہ پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ پس جس طرح نام کا اختلاف موجب فخر و فضیلت نہیں اسی طرح قبائل کی تفریق بھی سببِ تفاخر نہیں۔ اصل برتری اور عزت اعمال سے وابستہ ہے۔ نسب موجبِ فضیلت نہیں، کسب ضرور سببِ عزت ہے۔ انسان کے پرامن فائدہ بخش سماج کا مدار اچھے اعمال و کردار پر ہے۔ اور تباہ کن مظالم و حق تلفیاں اور جنگ و جدال معاشرے کو برباد کرنے والے اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضوابط کا پابند اور حدود معینہ سے نہ ہٹنے والا انسان ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا معزز ہے۔ وہ نسل کے اعتبار سے کچھ بھی ہو، دراوڑ ہو یا آرین، سامی ہو یا حامی، یافث کی اولاد ہو یا ارج کی، ادنیٰ فقیر ہو یا شہنشاہ و عالم، بحر العلوم ہو یا ناخواندہ اُمّی کوئی کسی سے اللہ کے نزدیک بڑا نہیں۔ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔

تحلیلِ اجزاء

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ۔ بغوی نے مقاتل کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کے حکم کے مطابق فتح مکہ کے دن حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ عتاب بن اسید بولا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے باپ کو پہلے سے ہی بلا لیا اس کو یہ (برا) دن دیکھنا نہ پڑا۔ حارث بن ہشام کہنے لگا۔ کیا محمدؐ کو اس کالے کوے کے سوا کوئی اور آدمی مؤذن بنانے کے لئے ملا ہی نہیں۔

سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس حالت کو (بھی) بدل دے گا (ہمارا غلبہ نہ رہا تو ان مسلمانوں کا بھی نہیں رہے گا)۔

ابو سفیان نے کہا میں کچھ نہیں کہوں گا، مجھے اندیشہ ہے کہ آسمان والا رب اس کو خبر دے دے گا۔ یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ جبریلؑ نے آکر رسول اللہؐ کو اس گفتگو کی اطلاع دیدی۔ آپ نے ان لوگوں کو طلب فرمایا اور دریافت کیا۔ سب نے اقرار کر لیا۔ اس پر یہ آیت یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے ابو ملیکہ کی روایت سے بھی یہی شانِ نزول مختصر طور پر نقل کی ہے۔

لیکن ابن عساکر نے مبہمات میں ابن بشکوال کی تحریر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو بکر بن ابو داؤد نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے بنی بیاضہ سے فرمایا تھا۔ اپنے قبیلہ کی کسی عورت کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! ہماری لڑکیاں تو اپنے ہی بھائی برادری میں بیاہی جاتی ہیں (قبیلہ سے باہر کوئی لڑکی نہیں جاتی) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ رسول اللہؐ کی ایک مجلس میں کسی (گران گوش بہرے) آدمی کو ایک شخص نے بیٹھنے یا آگے بڑھنے کی جگہ نہیں دی (کہ وہ شخص رسول اللہؐ سے مل کر بیٹھ سکتا اور حضورؐ کا فرمان سننے میں اس کو آسانی ہوتی۔ خود رسول اللہؐ سے متصل بیٹھا رہا) حضرت ثابت بن قیس نے فرمایا "اے فلاں عورت کے بیٹے اس کو جگہ دیدے"؟ (حضرت ثابت نے اس کی ماں کا تذکرہ بطور تحقیر کیا تھا) حضورؐ نے فرمایا یہ ابن فلانہ کہنے والا کون ہے؟ حضرت ثابت نے عرض کیا۔ یہ فقرہ میں نے کہا تھا فرمایا ثابت سب لوگوں کے چہرے دیکھو۔ ثابت نے حکم کی تعمیل کی (فرمایا ثابت کیا نظر آیا؟ ثابت نے کہا کچھ گورے ہیں کچھ کالے ہیں کچھ سرخ فرمایا تم کو ان پر کوئی برتری حاصل نہیں (ہاں دین اور تقویٰ کی وجہ سے برتری ہو سکتی ہے) اس پر یہ آیت حضرت ثابتؓ کے متعلق نازل ہوئی اور جس شخص نے جگہ نہیں دی تھی اس کے متعلق آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا اتری۔

اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى۔ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ یعنی آدم و حوا سے سب کو پیدا کیا ہے۔ کسی کو کسی پر نسبی یا جماتی یا لونی یا تخلیقی شرف حاصل نہیں ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اور ہم نے ہی تمہاری قومیں اور قبیلے تمہاری شناخت کے لئے بنا دیئے ہیں۔ یعنی ایک نوع بشری کے تحت مختلف اصناف اور ایک صنف کے تحت مختلف جماعتیں صرف شناخت اور باہم تعاون کے لئے بنائی ہیں۔ اس سے مقصد نسبی برتری نہیں سب کی نسبی جڑ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، پس جس طرح کسی شاخ کو دوسری شاخ پر اصل کے اعتبار سے فضیلت حاصل نہیں اسی طرح تم کو بھی نسبی لحاظ سے باہم برتری حاصل نہیں۔ لیکن ایک شاخ میں پھل آتے ہیں دوسری میں نہیں آتے۔ کوئی ٹیڑھی ہوتی ہے کوئی سیدھی کوئی کمزور کوئی مضبوط، کوئی لمبی کوئی چھوٹی۔ اور ظاہر ہے کہ سرسبز پھل دار طاقتور خوبصورت شاخ ایسی اپنی خصوصیات رکھتی ہے جن سے خشک بے ثمر کمزور بدصورت ٹیڑھی شاخ محروم ہے۔ اسی طرح انسانوں میں اگر ایک کو دوسرے پر برتری اور عزت حاصل ہے تو وہ صرف پرہیزگاری عبادت بازی اعمال کردار اور احکام الٰہی کی پابندی کی وجہ سے ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو اس کے احکام کا سب سے زیادہ پابند اور سب سے بڑا پرہیزگار ہے۔

شعوب۔ شعب کی جمع ہے۔ شعب وہ پہلی شاخ جو کسی جڑ سے دوسری شاخ کے مقابلے میں نکلتی ہے یعنی جہاں سے قومیت بنتی ہے اس کے بعد قبیلہ کا درجہ ہے۔ ایک شعب میں متعدد قبائل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد عمارہ کا مرتبہ ہے۔ ایک قبیلہ کے ذیل میں مختلف عمائر ہوتی ہیں پھر عمارہ سے مختلف بطون اور ہر بطن سے مختلف فخذ اور ہر فخذ سے متعدد فصائل اور ہر فصیلہ کے نیچے متعدد عشائر ہوتے ہیں۔ عشیرہ کے ماتحت کسی جماعت کا درجہ نہیں صرف افراد کا اندراج ہوتا ہے۔

حضرت سمرہ بن جندب راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ حسب مال ہے اور کرم (عزت) تقویٰ۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دنیا کی عزت تو دولت ہے اور آخرت کی عزت تقویٰ ہے۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہؐ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں طواف کیا۔ جب باہر تشریف لے آئے اونٹنی کو بٹھانے کی گنجائش نہ پائی تو لوگوں کے ہاتھوں پر اتر سکے اور ایک تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے تم سے جاہلیت کی نخوت و تکبر کو دور کر دیا آدمی دو طرح کے ہیں۔ نیکوکار، پرہیزگار، اللہ تعالیٰ کی نظر میں معزز اور بدکار، بدبخت، اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل۔ پھر آپؐ نے آیت یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى الخ تلاوت کی اور فرمایا میں اپنی یہ بات کہہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلبگار ہوں اپنے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی۔ رواہ الترمذی والبغوی۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی اللہ کے حکم سے ندا دے گا۔

خوب سُن لو! میں نے (قابلِ عزت) ایک نسبت قرار دی تھی اور تم نے (قابلِ عزت) دوسری نسبت کو قرار دیا تھا۔ میں نے قرار دیا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے پرہیزگار ہو مگر تم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے فلاں بن فلاں افضل ہے فلاں بن فلاں سے (یعنی نسبی تفاخر پیدا کر لیا) آج میں اپنے قائم کئے ہوتے نسب کو اونچا کروں گا اور تمہارے قائم کئے ہوئے نسب کو نیچے گرا دوں گا۔ متقی کہاں ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ سے دریافت کیا گیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا کون ہے۔ فرمایا جو سب سے بڑا متقی ہے وہی سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ عرض کیا گیا ہماری یہ مراد نہیں ہے۔ فرمایا سب سے زیادہ عزت والے یوسفؑ تھے جو اللہ کے نبی تھے نبی زادے تھے نبیؑ کے پوتے تھے اور ان کے پردادا بھی اللہ کے نزدیک نبی خلیل تھے۔ عرض کیا گیا ہمارا سوال یہ بھی نہیں ہے فرمایا تو کیا عرب کے خاندانوں کے متعلق تم دریافت کر رہے ہو۔ عرض کیا گیا۔ جی ہاں فرمایا تو جو جاہلیت میں اعلیٰ تھے وہ اسلام (کے زمانہ) میں بہترین ہیں بشرطیکہ وہ (دینی) فقاہت رکھتے ہوں۔

رواہ البخاری وغیرہ

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں پر نظر نہیں رکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

رواہ مسلم وابن ماجہ

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ بلاشک اللہ تعالیٰ تمہاری اندرونی حالت اور فضائل کو خوب جانتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ کون افضل ہے اور کیوں افضل ہے اس کو سب کچھ معلوم ہے۔

مقصودِ بیان

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ میں خطاب عمومی ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، اعلیٰ نسب کا مدعی ہو یا نچلے طبقہ کا کوئی فرد مسلمان ہو یا کافر، سب ہی مخاطب ہیں۔

اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى میں ایک عظیم ضرب ہے ان لوگوں کے دماغوں پر جو نسبی، نسلی، وطنی، قبائلی اور لسانی برتری کے قائل ہیں، جنہوں نے امیر و غریب کی طبقاتی تقسیم کر رکھی ہے۔ یا ذات پات اور چھوت اچھوت کے معیار قائم کر رکھے ہیں۔ یہ آیت اتنی دلیل ہے کہ تمام دنیا کے نسلی تفاخر والے بھی اس کو نہیں توڑ سکتے۔

مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تمام انسانوں کا سرچشمہ ایک مرد اور ایک عورت ہی ہے یعنی نوعِ حیوانی سے ترقی کرکے مختلف اور متعدد انسان نہیں آئے ہیں۔ اصل میں صرف ایک مرد اور ایک عورت کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس امر پر بھی تنبیہ کہ سب باپ کے حقیر نطفہ سے بنے اور رحمِ مادر میں گندی غذا کھا کر سب کی تدریجی ترقی ہوئی ہے۔ اس مادۂ تخلیق اور ذریعہ تخلیق میں سب برابر ہیں۔ نہ کوئی اعلیٰ اس سے مستثنیٰ ہے نہ ادنیٰ۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ

یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے　آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم (مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے　اور ابھی تک ایمان تمہارے

فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

دلوں میں داخل نہیں ہوا　اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مان　لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں سے ذرا بھی کمی نہ کرے گا　بے شک اللہ غفور

رَّحِيْمٌ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا

رحیم ہے　پورے مومن وہ ہیں　جو اللہ پر اور اس کے　رسول پر ایمان لائے پھر شک نہیں کیا　اور اپنے مال اور

بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ○ قُلْ أَتُعَلِّمُونَ

جان سے خدا کے رستے میں محنت اٹھائی یہ لوگ ہیں سچے آپ فرما دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ

اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

کو اپنے دین کی خبر دیتے ہو حالانکہ اللہ کو تو سب آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کی خبر ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو

عَلِيمٌ ○ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّهُ

جانتا ہے یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ

يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ

تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم سچے ہو بے شک اللہ تعالیٰ آسمانوں اور

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

زمین کی مخفی باتوں کو جانتا ہے اور تمہارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے

ع ۲ ۵

تفسیر (باستثناء بعض) عام افرادِ انسانی کے اندر لالچ اور خوف کی قوتیں غالب ہیں اور دانش و فہم کی طاقت مغلوب۔ مادی منافع کے حصول کی رغبت اور مادی ضرر و نقصان سے حفاظت عامی ذہن کا منتہائے سیر ہے۔ عقل اور سمجھ کی کوئی بات اگر رغبت و خوف کے جذبات سے ٹکراتی ہو تو عوام کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوتی، لیکن اگر حقائقِ صادقہ کو ماننا اپنے ساتھ جذباتِ نفسانیہ کی تسکین کا بھی کچھ سامان لئے ہوئے رہا ہو تو حقائق کی تصدیق کر ماننے سے گو ان کے نظریاتِ تقلیدیہ کی بیخ کنی ہو رہی ہے اور ان کی دانشِ نارسا کی رسائی سے خواہ سطحِ حقیقت کتنی ہی ارفع ہو مگر وہ بھی مادہ طلب لوگ بظاہر اس کو زبانی طور پر مان لیتے ہیں۔ گو ان کے دلوں میں حقیقتِ صادقہ کی سچائی نہ اترے مگر دکھاوٹ سے تو اقرار کر ہی لیتے ہیں اور پھر وہ تمام کیفیات اپنے اعضاء و جوارح پر طاری کر لیتے ہیں جو سچی حقیقت کو ماننے کے مقتضیات ہوتے ہیں یعنی ظاہری اطاعت و فرماں پذیری اور ظاہری احکام کی کچھ تعمیل و پابندی اور چونکہ ان کی یہ اطاعت جذبۂ تصدیق کے زیرِ اثر نہیں ہوتی اور دل کے اندر داعیۂ یقین نہیں ہوتا صرف لالچ یا خوف ان کو اطاعت پر مجبور کرتا ہے اس لئے ان کے اندر دو خصوصی اوصاف کا فقدان ہوتا ہے۔

(۱) اگر جان و مال کی قربانی کا موقع آ جائے تو وہ گریز کرتے ہیں۔ حق و صداقت کے لئے قربانی کو وہ خودکشی اور تاوان سمجھتے ہیں۔ (۲) ظاہری اطاعت کو وہ اپنا احسان قرار دیتے ہیں اور جس کی اطاعت کرتے ہیں اس کو اپنا ممنون بنانا چاہتے ہیں اور اطاعت کا بدلہ مالی شکل میں فوراً چاہتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے تمہاری اطاعت کی ہے آپ کے گروہ میں شامل ہو گئے ہیں اس لئے دوسروں کی طرح ہم کو بھی مساویانہ حقوق دیجئے۔ حالانکہ ظاہری اسلام و اطاعتِ رسولؐ پر احسان رکھنا انتہائی لغو حرکت ہے۔ اس میں تو خود انہی کا فائدہ ہوتا ہے اور نافرمانی میں انہی کا ضرر ہوتا ہے۔ ان کا نہیں بلکہ اللہ کا ان پر احسان ہوتا ہے کہ اس نے راہِ حق ان کو دکھائی اور زندگی کے پیچ پیچ پیچیدہ راستوں میں سے سیدھی راہ پہچان کر بتا دی اور سچے دل سے اس راہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی پس ایسے لوگوں کو ہم ظاہری مسلم اور مطیع کہہ سکتے ہیں۔ مومن اور سچے دل سے صداقتِ اسلام کا ماننے والا نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے ابھی قربانی نہیں دی اور اللہ کے دین کے مقابلہ میں جان و مال کو عزیز رکھا۔ اہلِ صداقت کو ماننے والا اور حق پر ایمان لانے والا اس کو کہہ سکتے ہیں جس نے دین کے لئے اپنی جان اور مال کی قربانی پیش کی۔ دین کو قائم رکھنے کے لئے نہ اپنی جان کی پرواہ کی نہ مال کی۔ ایسے ہی لوگ سچے مومن ہیں۔

تسھیلِ ابتزاء

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ دیہاتیوں نے کہا ہم ایمان لے آئے ہیں۔ سدی کا قول ہے کہ الاعراب سے مراد وہ مخلص بدوی ہیں جن کا ذکر سورۂ فتح میں آیا ہے یعنی قبائل جُہَینہ، مُزَینہ، اسلم، اشجع اور غفار کے بدوی گنوار انھوں نے یہ دعویٰ اس لئے کیا تھا کہ ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں لیکن حدیبیہ کے موقع پر جب رسول اللہ نے مجاہدین کے ساتھ ان کو حدیبیہ کی جانب چلنے کا حکم دیا تو یہ نہیں گئے اور پیچھے رہ گئے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بغوی کا بیان ہے کہ ایک بار خشک سالی کی وجہ سے جب بہت بدحالی آئی اور معاشی تنگی ہوئی تو بنی اسد کے کچھ لوگ مدینہ میں آ گئے اور اسلام ہونے کا اظہار کیا مگر دل میں یہ مومن نہ تھے۔ گنوار ہونے کی وجہ سے مدینہ کے سارے راستے انہوں نے گندگی سے بھر دیئے جہاں جا رفع حاجت کے لئے بیٹھ گئے۔ مدینہ میں پہلے سے ہی کچھ معاشی تنگی تھی۔ ان کے آنے کی وجہ سے غذائی اشیاء کی گرانی بہت بڑھ گئی۔ صبح و شام یہ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں جاتے اور کہتے تھے دیکھئے اور لوگ تو تنہا آئے ہیں اونٹوں پر سوار ہوئے اور آ گئے اور ہم تمام بال بچوں کو ساتھ لے کر آئے (ہم کو کھانے پینے کی زیادہ ضرورت ہے) فلاں فلاں قبیلے والے تو آپ سے اظہار ایمان کرنے کے بعد مسلمان ہوئے اور ہم نے تو کبھی آپ سے جنگ نہیں کی، کبھی آپ کا مقابلہ نہیں کیا (اس لئے ہم زیادہ معاشی استحقاق رکھتے ہیں) اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ آپ کہہ دیجئے تم لوگ ایمان نہیں لائے ابھی ایمان تمہارے دلوں میں نہیں داخل ہوا۔ ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اطاعت گزار ہو گئے، فرمان پذیر ہو گئے۔ ایمان تو دل کے ماننے اور تصدیق کرنے کا نام ہے۔ زبانی اقرار اور اعضائے ظاہری سے تعمیلِ احکام صرف علامات ہیں۔ حدیثِ جبرئیل میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ تم مان لو اللہ کو اس کے فرشتوں کو اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں کو اور روزِ آخرت کو اور اچھی بری تقدیر کو (صحیحین) چونکہ ان اعراب کے دلوں میں اس وقت تک ایمان نہیں پہنچا تھا صرف ظاہری طور پر اطاعت گزار اور مدعی اسلام ہو گئے تھے۔ اس لئے اللہ نے فرما دیا کہ ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اترا اس لئے ایماندار ابھی نہیں ہوئے بلکہ صرف اطاعت گزار ہوئے ہو۔

وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر چلو گے تو اللہ تمہارے (اچھے) اعمال کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یعنی اپنے اعمال کی استقامت اور اللہ و رسول کی کامل اطاعت سے اپنا تسلیم ایمان ثابت کرو۔ قلبی ایمان کا تقاضا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کے کامل فرمان بردار ہو جاؤ۔ لالچ چھوڑ دو سادہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر چلو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ مومن تو حقیقت میں صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کو یقینی طور پر مان لیا پھر کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوئے اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے کوشش کی۔ یہی لوگ ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔

اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کو انہوں نے تمام خصوصی صفات کے ساتھ مانا۔ اس کے کلام کو سچا جانا اور اس کے احکام کی تعمیل کی۔ رسول پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ رسول نے فرمایا سب کو انھوں نے سچا تسلیم کر لیا اور رسول اللہ کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھ لیا۔ لَمْ يَرْتَابُوْا کا یہ معنی ہے کہ زندگی بھر انھوں نے اپنے ایمان و عقیدہ کو شک اور تردد سے بچائے رکھا۔ کبھی ان کے اعتقاد لغزش نہ پائی۔ اللہ کی راہ میں جان مال سے جہاد کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کے دین کو مضبوط اور محفوظ کرنے میں انھوں نے جان اور مال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن سے ہمیشہ لڑتے رہے شیطان ناجائز خواہشاتِ نفس اور کفار و فساق سب کا مقابلہ کیا۔ کبھی باطل کے سامنے سر نہ جھکایا خواہ راہِ حق میں ان کا مال تباہ ہو گیا یا جان جاتی رہی یا جسمانی اذیتیں اٹھانی پڑیں یا خداداد مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر طور انھوں نے راہِ حق کو پکڑا اور حق کی حفاظت سے منہ موڑا۔ مجاہدہ بالمال والنفس کا لفظ تمام کھی اور بدنی عبادات مالی زکوٰۃ و صدقات اور کل اداء مامورات و ترکِ منہیات کو شامل ہے۔ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ یعنی مجاہدین نے جو ایمان کا دعویٰ کیا تھا ہر طرح کی عملی تعمیل کر کے اس کا ثبوت بھی پیش کر دیا۔ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ۔ اعراب نے اپنے مومن ہونے کا اظہار کیا تھا اور اٰمَنَّا کہا تھا۔ رسول اللہ سے جب انہوں نے بیعت کر لی تھی تو حضور کو معلوم ہی تھا کہ یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں

داخل ہو گئے ہیں پر ایمان کے اظہار کا معنی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنا مومن ہونا جتلا کر رسول اللہ ﷺ اور اللہ پر اپنا احسان رکھنا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے کہا کہ اور لوگ تو آپ سے لڑے اور لڑائی میں مارے تو مسلمان ہوئے اور ہم نے آپ سے کبھی جنگ نہیں کی ویسے ہی مسلمان ہو گئے لہٰذا ہمارے اس ایمان کا خصوصی بدلہ ملنا چاہیے۔ ہم کو کچھ دنیوی مال و متاع عطا کیجئے۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ اللہ آسمان و زمین کی ہر چیز سے واقف ہے کیا تم اللہ کو ظاہر و باطن کو خوب جانتا ہے۔ اس کو اپنا مومن ہونا کیا جتلاتے ہو۔ کیا اس پر اپنے ایمان کا احسان رکھتے ہو۔ یمنون علیک الخ اس پر تمہارے مسلمان ہونے کا کوئی احسان نہیں۔ احسان تو اس کا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کا راستہ دکھایا۔ اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو تو سمجھو کہ اللہ نے جو تم کو مومن ہونے کی توفیق دی یہ اس کا کرم ہے

ابن سعد نے محمد بن کعب قرظی کی روایت سے اور سعید بن منصور نے سنن میں سعید بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ سنہ ۹ھ میں (بقول بعض فتح مکہ کے بعد) بنی اسد کے دس آدمی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ ان میں طلحہ بن خویلد بھی تھا اور حاضر ہو کر سلام کیا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور آپ اس کے رسول ہیں۔ یا رسول اللہ آپ نے ہمارے پاس کوئی تبلیغی وفد نہیں بھیجا تھا ہم خود آ کر مسلمان ہوئے ہیں اور اپنے قبیلہ کی طرف سے پیام اسلام لائے ہیں۔ اس پر اللہ نے آیت یمنون علیک ان اسلموا الخ نازل فرمائی۔

مقصودِ بیان

قولوا اسلمنا کے الفاظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جو شخص مسلمان ہونے کا اظہار کرے اس کو مسلمان مان لیا جائے خواہ اس کے دل میں ایمان پیوست نہ ہوا ہو۔ ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ قلبی یقین کا نام ایمان ہے اور اسلام کا تعلق ظاہری اقرار و اعمال سے ہے۔ اگرچہ حقیقی اسلام بغیر ایمان کے غیر معتبر ہوتا ہے۔ بنائے اسلام ہی پانچ ارکان پر ہے جن میں رکن اول شہادت توحید و رسالت ہے لیکن ظاہری اسلام کا حکم تو صرف اقرار زبانی سے ہو جاتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الخ میں مومن کے حقیقی اوصاف بیان کئے ہیں۔ نفس ایمان کا مدار غیر مشکوک یقین پر ہے اور کمال ایمان کا ظہور جانی و مالی قربانی پیش کرنے سے ہوتا ہے۔ پس جو شخص ایمان اور اسلام کے مقابلے میں جان و مال کو عزیز رکھتا ہو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اور دعوائے ایمان کی سچائی کا ثبوت مالی اور جانی قربانی ہے۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ مصلحت بین اہل الوقت جو جان و مال کی محبت میں گرفتار ہیں اور استحکام اسلام کے لئے قربانی دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں ان کا ایمان دعوٰی صداقت سے خالی ہے۔

بل اللہ یمن علیکم سے ثابت ہو رہا ہے کہ مومن ہونا اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ کسی کو زیبا نہیں کہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان رسول اللہ پر رکھے یا کسی دوسرے مسلمان پر بلکہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی۔ وغیرہ

سورۃ ق

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اس میں تین رکوع اور ۴۵ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ

ق قسم ہے قرآن مجید کی بلکہ ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی (کی جنس) میں سے (کہ بشر ہیں) ایک ڈرانے والا (پیغمبر) آیا سو کافر لوگ کہنے لگے

هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ○ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ

کہ یہ (ایک) عجیب بات ہے جب ہم مرگئے اور مٹی ہوگئے تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے یہ دوبارہ زندہ ہونا (امکان سے) بہت ہی بعید بات ہے ہم انکے ان اجزا کو

الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ○ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْ

جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی اور) کم کرتی ہے اور ہمارے پاس (وہ) کتاب (یعنی لوح) محفوظ (موجود) ہے بلکہ سچی بات کو جبکہ وہ انکو پہنچتی ہے جھٹلاتے ہیں غرضکہ وہ ایک

اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ○ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ

متزلزل حالت میں ہیں کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا (اونچا اور بڑا) بنایا اور (ستاروں سے) اس کو سجایا اور اس میں

فُرُوْجٍ ○ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ

کوئی رخنہ تک نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی

بَهِيْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا

کا ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے اور ہم نے آسمان سے برکت (یعنی نفع) والا پانی برسایا پھر

فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ○ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ○

اس سے بہت سے باغ اگائے اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجوروں کے درخت جن کے گچھے خوب گوندھے ہوئے ہوتے ہیں

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ○ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ

بندوں کے رزق دینے کے لئے اور ہم نے اس (بارش) کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کیا (بس) اسیطرح زمین سے نکلنا ہوگا ان سے پہلے قوم نوح اور

نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ○ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ○ وَّاَصْحٰبُ

اصحاب الرس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور قوم لوط اور اصحب الایکہ اور

الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ○ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ

قوم تبع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا سو میری وعید (ان پر) محقق ہوگئی کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ○ ع ۱ ۱۵

بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) مشتبہ ہیں۔

تفسیر جن مغرور کوتاہ نظر کور دانش لوگوں کی نگاہ پردہ ممکنات سے آگے نہیں بڑھتی وہ بر خود غلط اور خود بین اور بھی ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ

اپنی دانش و فہم کو انسانی دستورِ حیات کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور عالمِ کل خدا سے اپنی ہستی کو بالکل بے نیاز قرار دیتے ہیں اور انسانی عقل و دانش کے تفاوت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن وجدانِ نبوت اور تعلیم وجدانی ان کی سمجھ سے بالاتر چیز ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی انسان نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے اس پر وجدانی فیضِ ہدایت ورود ہوتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے ہی کوئی انسان اتنا اونچا اٹھ جائے کہ تمام ممکنات کے پردے پھاڑ کر مقربِ خدا بن جائے اور براہِ راست شرائعِ زندگی کا اکتساب کر کے نیچے آ کر دوسروں کو سنائے۔ یہ بات بعید از فہم معلوم ہوتی ہے۔ پھر اگر انسانوں میں سے ہی کسی کو نبی بنایا جانا ضروری تھا اور عقل و دانش کا فیصلہ کافی نہ تھا اور خدائی ہدایت ہی کی ضرورت تھی تو تعلیم ایسی ہونی چاہئے تھی جو قابلِ فہم اور لائقِ قبول ہوتی۔ آدمی مرجاتا ہے۔ اچھا یا برا نتیجہ اس کو اسی زندگی میں مل چکتا ہے۔ جیسا کیا ہوتا ہے ویسا پھل اس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ فیصلہ زمین بالائے زمین درست ضابطہ ہے۔ مرنے کے بعد زندگی کے اعمال کا فیصلہ یہ بیہودہ فرقی نہیں تو اور کیا ہے۔ جو مرگیا گیا لوٹ کر نہیں آئے گا کہ اس کو کئے دھرے کی سزا جزا اٹھانی پڑے تا آئندہ دوبارہ زندگی ہی نہیں اور بالفرض دوبارہ زندگی ہو بھی تو اسی دنیا میں ہونی چاہئے۔ بری بھلی تکلیف کی یا راحت کی زندگی اسی زمین پر ہو جہاں پچھلی زندگی میں اچھا برا کام کیا ہے۔ سزا جزا کا اگر بھی اسی کو ہونا چاہئے۔ مشاہدہ بتا رہا ہے کہ مرنے کے بعد جسم کے اجزا جب خاک کے ذرات بن کر ہوا میں اڑ کر نابود ہو گئے تو ان کو دوبارہ جمع کرنا اور سب کو جوڑ کر دوسرا جسم بنانا ناممکن ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پریشان ذرات کو یکجا سمیٹ کر سابق جسم تیار کیا گیا ہو۔ یہ ایک خوابِ پریشان ہے۔ دیوانے کی بڑ ہے۔ کیا معلوم وہ ذرے کہاں کہاں چلے گئے۔ کون ان کو جمع کر سکتا ہے۔ نہ کسی کو ان کا علم نہ یکجا کرنے کی قدرت۔ یہ اور اسی قسم کے مکڑی کا جالا بننے والے پا در ہوا ضعیف البنیان شبہات کرتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ پیامِ حق سنانے والا اگر انہی میں سے نہ ہوگا اور انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہوگا تو اس کے کلام و پیام کو یہ کس طرح سمجھیں گے اور کس طرح اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ مرنے کا معنی معدوم ہو جانا نہیں۔ کوئی جسمانی تغیر ہو یا عملی حرکت و سکون کچھ بھی فنا نہیں ہو جاتا یعنی عدمِ محض اس پر مسلط نہیں ہو جاتا۔ جسمِ خاکی کے ذرات خاک میں مل جاتے ہیں، پراگندہ ہو جاتے ہیں، مگر زمین میں باقی رہتے ہیں اور وہ کہاں کہاں جاتے ہیں اس کا اندراج ایک کتاب میں ہوتا ہے جو مٹ نہیں سکتا۔ کسی قسم کی خورد برد اس میں نہیں ہو سکتی۔ ایک وقت آئے گا اور اللہ اپنی علمی کتاب کے مطابق تمام ذرات کو جمع کر کے جسم بنا دے گا۔ اس تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ یہ اونچا لمبا چوڑا لامحدود آسمان اللہ نے نہیں بنایا ہے۔ کیسے بنایا ہے۔ اس کے ترکیبی ذرات کہاں سے آئے؟ کیسے جوڑے گئے۔ پھر وہ ذراتِ منتشرہ کس چیز سے بنائے گئے۔ ان کا مادہ تخلیق کیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو آسمان موجود ہے۔ نہ اس میں شگاف ہے نہ دراڑ۔ کروڑ در کروڑ ستاروں اور سیاروں سے سجا ہوا جگمگاتا ہوا ریت کے ذرات سے زیادہ ستاروں کا زیور پہنے کیسے بن گیا۔ کس نے بنا دیا۔ یہ لمبی چوڑی موٹی زمین کس نے بنائی ہے۔ اس کے ترکیبی خاکی ذرات کس مادہ سے بنے ہوئے ہیں، کیسے بنے ہوئے ہیں، پھر کیسے جڑے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں کی میخیں زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔ زمین کو لرزنے اور کروٹ لینے سے روکے ہوئے ہیں۔ زمین میں طرح طرح کا سبزہ لہلہاتا ہے۔ بارآور درخت اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں پھولتے ہیں اور پھلتے ہیں۔ پانی سے پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں۔ پانی کہاں سے آتا ہے۔ سمندروں اور دریاؤں سے پانی ہزاروں میل کیسے پہنچ جاتا ہے۔ پانی ہوا بنتا ہے، مانسون اٹھتے ہیں، اس طرح پانی نیچے سے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ اوپر پہنچ کر بادل کی شکل میں ہو کر ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے۔ پھر نیچے پانی کی شکل میں ہو کر گرتا ہے جس سے زمین شاداب ہوتی اور سبزہ اگاتی ہے۔ یہ کس کی حکمت ہے، کس کی قدرت ہے اور کس کا علم ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ روزانہ اجزاء کی پراگندگی اور ذرات کا انتشار اور ذرات کا پھیلاؤ ناقابلِ انکار ہے۔ پھر انہی اجزائے پریشاں کا اجتماع اور شکل نوعی مساحتی اور وزنی تغیر بدیہی حقیقت ہے۔ پھر انسان کی دوبارہ زندگی کیوں ناممکن ہے جسمِ انسانی کے پراگندہ ذرات کہاں کہاں ہیں یہ اللہ کو معلوم ہے۔ اس کی علمی کتاب میں سب کچھ درج ہے۔ وہ ان کو سمیٹ کر یکجا بھی کر سکتا ہے اور زندہ کر کے اٹھا بھی سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت اور بعث و حشر کا انکار ایک ایسی بدیہی حقیقت کا انکار ہے جو لاکھوں مرتبہ اس زندگی ہی میں سامنے آئی ہے اور آ رہی ہے اور آتی رہے گی اور چونکہ ضابطۂ قدرت ایک ہے۔ نہ وہاں ماضی ہے نہ مستقبل، وہاں ہر چیز حال ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کھلی حقیقت کا جس قوم نے انکار کیا اور پیغمبروں کی تکذیب کی اس پر غیبی عذاب آیا اور بغیر ظاہری سبب کے سوا تختہ تاراج ہو کر دیا گیا۔ قومِ نوح کہاں گئی۔ ثمود عاد نے کس طرح تباہ ہو کر دے مارا اول کا کیا حشر ہوا۔ فرعون اور اس کی قوم اور قومِ لوط اور قومِ تبع وغیرہ [illegible] پیغمبر کی تکذیب کی وجہ سے تباہ کر ڈالیں جس [illegible]

کو جھوڑا جاتا اور ضابطۂ الٰہیہ کو نہ مانا اللہ نے ان کو غارت کر دیا۔ وغیرہ

تحلیلِ اجزاء

ق والقرآن المجید مفصّل سورتوں کی ابتدا سورۂ قاف سے ہوتی ہے۔ کچھ لوگ سورہ الحجرات سے اور بعض سورۂ عم سے مفصّل سورتوں کا آغاز قرار دیتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ ایک طویل حدیث باب تحزیب القرآن میں ابوداؤد نے نقل کی ہے جس کے راوی اوس ہیں۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ میں نے صحابہ سے پوچھا آپ حضرات قرآن کے حصے کس طرح کرتے تھے انہوں نے جواب دیا پہلی تین سورتوں کی ایک منزل اس کے بعد پانچ سورتوں کی دوسری منزل پھر سات سورتوں کی تیسری منزل اس کے بعد نو سورتوں کی چوتھی منزل، اس کے بعد گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل پھر تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل اور پھر مفصّل سورتوں کی ساتویں منزل یہ حدیث ابن ماجہ میں بھی آئی ہے۔اس حساب سے اڑتالیس سورتوں کی چھ منزلیں ہوتی ہیں اور ساتویں منزل انچاسویں سورت سے آخر تک قرار پاتی ہے اور انچاسویں سورت سورۂ ق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سورۂ ق سے مفصلات کا آغاز ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت ابو واقد لیثی سے پوچھا۔ رسول اللہ عید کی نماز میں کیا پڑھتے تھے۔ حضرت ابو واقد نے جواب دیا۔ سورت ق اور سورت اقتربت الساعۃ۔ یہ بھی مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ام ہشام بنت حارثہ نے کہا۔ دو سال یا ایک سال اور چند ماہ ہمارا اور رسولؐ اللہ کا چولہا ایک ہی رہا۔ میں نے سورہ ق والقرآن المجید حضور کی زبان سے ہی سُن کر یاد کی تھی، کیونکہ ہر جمعہ کے دن جب آپ خطبہ دینے منبر پر تشریف فرما ہوتے تو اس سورت کو پڑھتے تھے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ عید اور جمعہ کے موقع پر حضور اس سورت کی تلاوت کرتے تھے۔ عید کے دن نماز میں اور جمعہ کے دن خطبہ میں۔

ق حروف مقطعات میں سے ہے۔ یہ امر باتفاق مفسرین ثابت ہے۔ مزید تشریح میں علماء کے اقوال میں اختلاف ہے۔ کسی نے سورت کا نام اور کسی نے قرآن کا نام قرار دیا ہے۔ قرطبی نے کہا۔ اللہ کے ان ناموں کی طرف اشارہ ہے جو ق سے شروع ہوتے ہیں۔ قدیر، قادر، قاہر، قریب، قابض۔ کسی نے کہا کہ لفظ قضاء یا قُضِیَ الْاَمْرُ کی طرف ایماء ہے۔ حق بات یہ ہے کہ تمام حروف مقطعات سر اور رمز ہیں جن سے صرف اللہ واقف ہے یا اس کا رسول۔ کوئی تیسرا واقف نہیں (یا یوں کہا جائے کہ پختہ علم وجدانی رکھنے والوں پر بھی ان کے معانی کا انکشاف ہو جاتا ہے) سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ والقرآن میں واؤ قسمیہ ہے یعنی قسم ہے قرآن مجید کی کہ یہ پیغمبر سچے ہیں اور جس عذاب سے یہ ڈراتے ہیں وہ بھی حق ہے قیامت اور حشر جسمانی ضرور ہوگا۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ۔ یقیناً ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ انہیں میں سے (یعنی انسانوں میں سے یا انہیں جیسے آدمیوں میں سے یا ان ہی کے قبیلے اور کنبے میں سے) ایک پیغمبر ان کے پاس آیا ہے جو ان کو شرک اللہ کی نافرمانی اور قیامت کے عذاب سے ڈرا رہا ہے اور ان کو اللہ کی وحدانیت پیغمبر کی صداقت اور قیامت کی حقانیت سے انکار ہے اس لئے ان کو پیغمبر کی پیغمبری اور قیامت کے وقوع کی خبر عجیب معلوم ہوتی ہے حالانکہ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ مکہ والوں کو کسی آدمی کے نبی ہونے پر تعجب تھا۔ ایک ایسے آدمی کے پاس اللہ کا براہ راست پیام آنا ان کو عجیب معلوم ہوتا تھا جو انسانیت لوازم انسانیت اور تقاضائے انسانیت میں انہی کی طرح تھا۔ آدمی کے نطفہ سے بنا آدمی کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ دوسرے بچوں کی طرح پرورش پائی۔ چالیس سال کی عمر تک دوسرے آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا پھرتا سوتا جاگتا رہا۔ نکاح بھی کیا بچے بھی ہوئے۔ پھر دنیوی دولت اور قبائل کی سیادت بھی اس کے پاس نہ تھی۔ ایسا آدمی پیغمبر بنا دیا جائے۔ عالم بالا کی خبریں دے تمام انسانوں کے ہادی بننے کا دعویٰ کرے۔ اور انہونی بات کہے اور پکار کر کہے کہ ایک دن یہ سارا جہان ٹوٹ پھوٹ جائے گا کل دنیا الٹ پلٹ جائے گی، انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ جو لوگ موجود ہونگے غیبی صور کی آواز سُن کر سب مر جائیں گے پھر ایک آواز سارے جہان میں گونجے گی اور آدم کے وقت سے اول صور کی آواز تک جو انسان پیدا ہوئے اور مر چکے ہونگے اور معلوم نہیں ان کے جسم کے ذرات کہاں کہاں ہوں گے سب کو چھانٹ کر سمیٹ کر دوبارہ مجسّم کر کے زندہ بنا کر سامنے لایا جائے گا۔ آدمی کا نبی ہونا بھی عجیب، پھر اندر کے ایک معمولی انسان کا پیغمبر خدا ہونا تو اور بھی عجیب۔ پھر اس کا پیام کلام اور غیبی اطلاعات تو انتہائی عجیب ہیں جو تجربہ کاروں کے تجربے اور دانشوروں کی دانش کے قطعی خلاف اور ناقابل فہم ہے۔

ان بیوقوفوں اور وہم زدہ لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ اگر آدمیوں کے لئے آدمی پیغمبر نہ ہو تو آدمیوں کو اس کا کلام کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے، کس طرح ان کو ہدایت ہو سکتی ہے۔ اس دنیا میں ہدایت کے لئے اللہ کی طرف سے انسانوں کو ہی پیغمبر بنا کر ہمیشہ بھیجا گیا یہ کوئی انہونی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ دولت اور دنیوی وجاہت کو نفس کی شستگی روح کی روشنی، دماغ کی نظافت، اخلاق کی پاکیزگی اور فکر و قول و عمل کی سچائی میں کیا دخل ہے۔ محل نبوت تو وہی شخص ہوگا جس کا باطن پاک صاف، روح روشن، دماغ لطیف اور زیرک، اور اخلاق شستہ رفتہ، تکبر سے ستھرے ہوں۔ کثیف گندہ روح اور مردہ اخلاق والے دولت مندوں اور دنیوی سرداروں میں نبوت کی اہلیت کہاں ہو سکتی ہے۔ جس شخص کی پاکبازی اور صداقت قول و عمل تمام قوم میں آغاز طفولیت سے انتہائے کہولت تک تسلیم شدہ ہو جو کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور کسی شخص پر ہنسی دل لگی کے طور پر اس نے دروغ بندی اور تہمت تراشی نہ کی ہو وہ اللہ پر افترا بندی کیسے کر سکتا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک بار رسول اللہ نے قریش کے تمام بطون (شاخوں) کو پہاڑ پر جمع کر کے ایک خطاب کیا، جس میں فرمایا۔ لوگو! میں اس اونچی جگہ پر کھڑا ہوں اور تم نشیب میں ہو اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کی وادی میں (پہاڑ سے پار) کچھ سوار نکل آئے ہیں اور تم پر حملہ کرنا اور غارت کرنا چاہتے ہیں تو کیا تم مجھے سچا جانو گے۔ حاضرین نے کہا بیشک کیونکہ ہمارا (ساری عمر کا) تجربہ ہے کہ آپ نے کبھی جھوٹی بات نہیں کہی۔ حضورؐ نے فرمایا تو میں سامنے آنے والے سخت عذاب سے تم کو ڈراتا ہوں تم اس کو سچ مانو۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ۔ کیا جب ہم مر گئے اور خاک ہو گئے (تو پھر بھی ہماری خاک کے ذرات کو چھانٹ کر، یکجا کر کے جمع کر کے بدن کی ساخت تیار کر کے جان ڈال کے دوبارہ اٹھایا جائے گا) زندگی کی طرف یہ دوبارہ واپسی تو بعید (از عقل بعید از تجربہ اور بعید از امکان) ہے یعنی ہمارے خاکی ذرات جب پراگندہ ہو جائیں گے تو کون جانے کہاں گئے۔ اور کون ان کو یکجا کرنے اور حسب سابق جوڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ایسا ہونا نہ قابل فہم ہے نہ تجربہ کے موافق نہ ممکن الوقوع۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ زمین جو کچھ ان کے اجزاء میں کمی کرتی ہے یعنی ان کے گوشت ہڈیاں کھال اور بال جو کچھ زمین کھا جاتی ہے ہمارے علم میں ہے۔

سدی نے کہا نقص سے مراد اس جگہ موت ہے یعنی جس قدر لوگ مرتے ہیں وہ ہم کو معلوم ہیں ہمارے علم سے باہر نہیں۔ ہمارے پاس ایک دفتر ہے جس میں ہر بات درج ہے۔ وہ ہر بات کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے یا کمی بیشی اور تبدیل و تغیر سے وہ کتاب محفوظ ہے نہ اس کو مٹایا جا سکتا ہے، نہ غلط ملط اور تغیر ہو سکتا ہے۔ کتاب سے کون سی کتاب مراد ہے بظاہر لوح محفوظ کا مراد ہونا معلوم ہو رہا ہے۔ پھر لوح محفوظ کیا ہے، یہ مسئلہ بھی تشریح طلب ہے ہر حال اللہ کا علمی استحضار مراد ہے خواہ اس کی کوئی صورت ہو۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ حق سے مراد ہے نبوت جو معجزات سے ثابت ہے۔ میرے نزدیک تعیین مناسب نہیں لفظ عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت مطلقہ اور وقوع قیامت اور قرآن مجید کا کلام اللہ ہونا اور رسول اللہ کا نبی برحق ہونا سب ہی حق ہے۔ اور کافروں نے ان تمام امور کی تکذیب کی تھی۔ بات یہ ہے کہ قیامت کی جزا سزا کا عقیدہ ہو یا رسول اللہ کی نبوت کا انکار ہو یا اللہ ہی کو نہ مانا جائے یا اس کی ربوبیت میں دوسرے کو شریک قرار دیا جائے یا قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم نہ کیا جائے یہ تمام امور باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی تکذیب دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے۔ جو لوگ اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت تامہ کو نہیں مانتے وہ در در کاسہ گدائی لئے مانگتے پھرتے ہیں، کبھی دھرتی کی پوجا کرتے ہیں، کبھی سورج اور ستاروں کو دیوتا کہتے ہیں، کبھی آگ کے سامنے سر نیاز جھکاتے ہیں، کبھی ارباب اقتدار سے دعائیں کرتے ہیں، کبھی فرشتوں کو کارساز اور قاضی الحاجات سمجھ کر پکارتے ہیں، کبھی مسیح کو قربانی کا بکرا کہتے ہیں اور اغراض و مقاصد کا مرکزی نقطہ ان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ غیر یقینی ہوتا ہے۔ کروڑوں دیوتاؤں کی طرف بڑھتے گھٹتے اور نیت کو ڈانوا ڈول کرتے رہتے ہیں کسی ایک ہستی پر ان کو قرار نہیں ہوتا۔ اگر قرآن کو کلام اللہ نہ قرار دیا جائے اور اللہ کی اس کتاب کو خیر و شر اور صحیح و غلط کے امتیاز کا مرکز نہ مانا جائے تو گویا اللہ کی تمام کتابوں کا انکار ہو جاتا ہے اور پھر انسان خود رائی اور خود فراموشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خیالات مختلف ہیں آثار و افکار پراگندہ ہیں زمان و مکان کا اختلاف حق کو

باطل اور باطل کو حق بنا دیتا ہے اور انسانی دماغ غیر یقینی میں رہ کر اضطراب زندگی کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر نبوت (یعنی اللہ کی طرف سے براہِ راست بغیر توسط حواس کے علم کے فیضان اور ضوابطِ الٰہیہ کی اطلاع) کو تسلیم نہ کیا جائے اور عقل و دانش کے کسبی ساختہ پرداختہ علوم کو ہی معیارِ حق و باطل قرار دے لیا جائے تو ایمان و یقین کس طرح حاصل ہوگا۔ دماغی عمل اور فکر و غور کے نتائج میں اختلاف اور اختلاط و تضاد ضرور ہوگا پھر یقین کو کس سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ اسی طرح وقوعِ قیامت اور آخری جزاء و سزا کا انکار بھی زندگی کو مطلق العنان اور بے قید بنا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کافر چونکہ تکذیبِ حقانیت و قیامت و انکارِ نبوت و توحید کرتے ہیں، اس لئے تردد و بے یقینی اور پراگندگی احوال میں مبتلا ہیں۔

قتادہ اور حسن بصری نے فرمایا جو حق کو ترک کر دیتا ہے اس کے امور غیر یقینی ہو جاتے ہیں اور اس کا دین (اوہام کے) دھندلکے میں چھپ جاتا ہے۔ زجاج کے کافروں کی حالت غیر یقینی اور گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کبھی وہ رسول اللہ کو جادوگر، کبھی معلم، کبھی جن رسیدہ دیوانہ اور کبھی مفتری دروغ بند کہتے تھے۔ کسی ایک قول پر قرار نہ تھا، متضاد اقوال تھے، کوئی قطعی رائے نہ تھی اور یہ بے یقینی تکذیبِ حق کا نتیجہ تھی۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ۔ کافروں نے کہا جب ہم مر گئے اور خاک ہو گئے تو پھر دوبارہ زندگی بعید از عقل ہے۔ کس کو علم ہے کہ خاکی ذرات کہاں گئے اور کس میں طاقت ہے کہ دوبارہ ان کو جمع کر کے جسمانی ساخت تیار کر کے زندہ کر دے۔ اس کی تردید میں اللہ نے اس آیت سے كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ تک ایسی اٹل حقیقت بیان فرمائی ہے جو یقینی برہان ہونے کے علاوہ اللہ کے علم محیط اور قدرتِ تامہ کو مشاہدات سے ثابت کر رہی ہے اور اس پر غور کرنے کے بعد جس طرح بڑے بڑے دانشور فلاسفروں کو اللہ کے ہمہ گیر علم اور محیط کل قدرت کا اقرار کرنا پڑتا ہے اس طرح عام لوگ بھی اپنے اپنے مبلغ فہم کے موافق اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے اس عالم بالا کو جس کو ہم آسمان کہتے ہیں دیکھو اس کی تخلیق پر غور کرو کس طرح اللہ نے ہمارے اوپر چھت کی طرح اس کو بنا رکھا ہے۔ نہ کوئی محسوس ستون ہے نہ ٹیک۔ کس چیز سے بنا ہے کیسے بنا ہے، اس کے اجزاء اور تقویمی مادہ کہاں سے آیا، کیسے اجزاء جڑ گئے، کس طرح اوپر اٹھ گیا، کتنی ترکیب سے بن کر تیار ہو گیا یہ دعوتِ نظر ہے علماء کے لئے بھی اور عوام کے لئے بھی۔ پھر آسمان پر جگمگاتے تاروں کو بھی دیکھو، کیسے روشن ہیں، کیوں روشن ہیں، کس مادہ سے روشن ہیں، ان کی روشنی کا مادہ کیا ہے، اجزائے نور کیا ہیں، آسمان پر سورج چاند سیارے اور ستارے کیسے پہنچے، کہاں تھے اور کیوں پہنچے، آسمان کا یہ زیور اور اس زیور کی خیرہ کن روشنی پر غور کرتے جاؤ، دیکھو اور دیکھتے جاؤ۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ آسمان میں نہ کوئی شگاف ہے نہ سوراخ نہ شکست و ریخت ہے، نہ دراڑ اور رخنہ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ایک عالم قدیر کے حکم کے زیر اثر ہوا ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ۔ یہ بھی دیکھو اور سوچو کہ یہ لمبی چوڑی زمین کیا ہے، خاک اور مٹی کیا ہے اور پھیلاؤ اس کا کیسے ہوا، تمہارے رہنے کے لئے یہ کس نے بچھائی، پھیلائی، معلق زمین کس کے سہارے پر قائم ہے، تین طرف پانی ہے، پھر پانی کے دباؤ اور لہروں سے اس میں لرزہ کیوں نہیں آتا، اللہ نے یہ پہاڑ کیسے اور کہاں سے پیدا کر دیئے اور پہاڑوں کی میخیں زمین میں کیوں ٹھونک دیں اور ان میخوں سے زمین کا لرزہ کیسا بند ہو گیا، کس طرح توازن قائم ہو گیا۔ تین طرف سے پانی نے اس کو جکڑ رکھا ہے اور زمین کے اندر میخیں ٹھوکی ہوئی ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ۔ زمین میں ہر طرح کا سبزہ اللہ تعالیٰ نے لگایا ہے، کیسا پُر رونق، نظر نواز، بہجت آفریں لہلہاتا سبزہ ہے، کیسا خوشنما، طاقت بخش، غذا آفریں ہے، خاک اور جامد خاک میں فرحت آگیں شاداب نمو پذیر سبزہ کیسا عجوبہ ہے قدرت قادر کا اور کیسی حیرت آفریں ہے صنعتِ صانع کی۔ غور نہ کرو یوں ہی چوپایوں کی طرح دیکھتے جاؤ تو یہ کچھ نہیں۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ۔ لیکن مصنوع سے صانع پر اور مخلوق کی پر حکمت تخلیق پر اور درستی نظم سے ناظم سے علم و قدرت کی ہمہ گیری پر جو لوگ استدلال کرتے ہیں اور رب تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے لئے تو یہ دعوتِ بصیرت اور درسِ عبرت ہے۔ مشاہدہ سے ترقی کر کے یقینِ عقلی تک اور کسبی یقین سے وجدانی ایمان تک پہنچنے کا یہ زینہ ہے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ

یہ مشاہدہ بھی غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان یا بادل سے پانی برساتا ہے۔ کیا اوپر کہیں پانی رکھا ہے، اگر ہے تو کہاں ہے؟ نہیں ہے تو نیچے سے کیسے چڑھتا ہے، کس طرح پانی کا بادل بنتا ہے اور چڑھ جاتا ہے۔ پھر بادل پانی بن جاتا ہے اور نیچے اُتر آتا ہے۔ طبعیاتی وجوہ کچھ بھی ہوں، ہر حال ہے یہ عروج و نزول پُرحکمت۔ یہ بھی مقامِ فکر ہے کہ گندہ اور شور پانی جب بادل بن کر اوپر سے گرا تو میٹھا گرا۔ شور پانی تو سبزے اور درختوں کو جلا ڈالتا مگر بارش کا پانی برکت والا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے گھنے باغ پیدا ہوتے ہیں۔ کھیتی کا غلہ اُگتا ہے، خصوصاً کھجور کے لمبے لمبے درخت زمین کے اندر سے نکل پڑتے ہیں جن میں کھجوروں کے گچھے آتے ہیں۔ تہ بہ تہ قطار در قطار چنی ہوئی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں اور یہ سارا غلہ اور باغوں کے پھل بندگانِ خدا کا رزق بنتے ہیں۔

مبارک پانی سے مراد ہے بڑا فائدہ رساں۔ حصید وہ کھیتی جو کاٹی جاتی ہے۔ حب الحصید کھیتی کا غلہ جیسے گیہوں، چنا، جو، چاول۔

نَخْلَ۔ کھجور کے درخت۔ بَاسِقَاتٍ۔ لمبے یا باردار۔ بَسَقَتِ الشَّاةُ۔ بکری گابھن ہو گئی۔ کھجور کے درخت میں بھی گابھا ہوتا ہے۔ یہ نر بھی ہوتے ہیں اور مادہ بھی۔ حدیث میں کھجور کے درخت سے مومن کو تشبیہ دی گئی ہے۔

ایک روز حضور سرکارِ دو عالم نے ارشاد فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کا پت جھاڑ کبھی نہیں ہوتا اور اس کی عجیب حالت مسلمان کی طرح ہوتی ہے۔ بتاؤ وہ کونسا درخت ہے؟

صحابہ نے جنگلی درختوں کی طرف خیالات دوڑائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔ رواہ البخاری۔ من حدیث ابن عمر۔ ابن ابی حاتم۔ ابو یعلی۔ ابن عدی۔ عقیلی۔ ابن السنی۔ ابو نعیم اور ابن مردویہ نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ کھجور کے درخت کی عزت کرو۔ یہ تمہاری پھوپھی ہے۔ تمہارے باپ آدم کے پتلے سے بچی ہوئی مٹی سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور اس درخت سے زیادہ کوئی درخت اللہ کے نزدیک عزتمند نہیں ہے جس کے نیچے مریم بنتِ عمران پیدا ہوئی تھیں، لہٰذا تم اپنے بچوں کو (جو نوزائیدہ ہوں) کھجور کھلایا کرو۔ اگر کھجور نہ ملے تو چھوارا ہی۔ طَلْعٌ سے مراد ہیں پھل، نضید تہ بہ تہ قطار در قطار۔

وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا پانی سے غلہ اور پھل تو پیدا ہوتے ہی ہیں مردہ زمین میں بھی جان آجاتی ہے۔

بَلْدَةً مَّيْتًا سے مراد ہے وہ قابلِ زراعت زمین جو خشک پڑی ہو، خاک اُڑتی ہو اور زندہ کرنے سے مراد ہے خشک زمین کو سرسبز کر دینا۔ حقیقت یہ ہے کہ موت و حیات عناصر کی ترتیب کی خرابی اور درستی کا نام نہیں بلکہ نوعی فرائض کو ادا نہ کرنا یا ادا کرنا موت و زندگی ہے۔ مثلاً جو زمین ناقابلِ زراعت ہے۔ کُرہ کی زمین ہو یا ریگستان، یہ زمین نہ مردہ ہے نہ زندہ اور جو زمین قابلِ زراعت ہو لیکن اس میں سبزی نہ ہو خشک بنجر پڑی ہو۔ تو ایسی زمین مُردہ کہلائے گی۔ کیونکہ قابلِ زراعت زمین کا نوعی فریضہ ہے سرسبز اور شاداب ہونا اور خشک قابلِ زراعت زمین اس فرض کو ادا نہیں کر رہی ہے تو اس کو مُردہ کہا جائے گا۔ لیکن اگر قابلِ زراعت اور لائقِ روئیدگی زمین سرسبز ہو، گھاس یا کھیتی اس میں اُگی ہوئی ہو تو اس کو زندہ زمین کہا جائے گا۔ روئیدگی اور بالیدگی زمین کی زندگی ہے۔

اسی طرح جو گھاس ہری ہو، جو پودا سبز ہو، جو درخت سبز پوش اور بارآور ہو وہ زندہ ہے۔ مقصودِ فطرت اور فرضِ نوعی کو ادا کرنے والا اور جو سبزہ یا درخت سوکھ جائے نہ مثمر ہو نہ جانوروں کے لئے روزی کا سامان فراہم کرتا ہو نہ انسان کے لئے خوراک، نہ غذا بخش ہو نہ تخم آفرین نامردہ ہے اور اسی طرح جو جانور بے حس و حرکت ہو جائے، خصوصیاتِ حیوانی سے محروم بن جائے تو اس کو مُردہ کہا جاتا ہے اور جب تک حساس و حرکت ہو اس کو زندہ کہتے ہیں)۔

اس مختصر تقریر کا حاصل یہ ہے کہ وہ زمین جو روئیدگی کی صلاحیت تو رکھتی ہے مگر خشک اور بنجر ہو جائے تو وہ مُردہ ہے اور بَلْدَةً مَّيْتًا سے یہی مراد ہے۔

كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ۔ یعنی خشک ہو جانے کے بعد بنجر زمین سے سبزہ اُگ آتا ہے اسی طرح مُردے قبروں سے زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ دونوں مرتبہ صور پھونکے جانے میں چالیس کا فصل ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا۔

ابوہریرہؓ کیا چالیس دن مراد ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا مجھے اس (تعین) سے انکار ہے۔ لوگوں نے کہا تو چالیس مہینے مراد ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ مجھے اس سے بھی انکار ہے۔ لوگوں نے کہا تو کیا چالیس برس کا فصل ہوگا۔ ابوہریرہؓ نے کہا: میں اس کا بھی اقرار نہیں کرتا (یعنی مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا مراد ہے)۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش کرے گا جس سے لوگ (قبروں سے) ایسے اُگیں گے جیسے سبزی اُگتی ہے۔ انسان (کے جسم) کی ہر چیز گل جائے گی، صرف ایک ہڈی نہیں گلے گی اور وہ دُم گزے کی ہڈی ہے۔ اسی سے جسم کی بناوٹ جوڑی جائے گی۔

ابن ابی داؤد کی روایت میں چالیس سال کا لفظ تعین کے ساتھ آیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں صوروں کی آوازوں کے درمیان چالیس سال کا فصل ہوگا اور اس درمیانی مدت میں عرش کے نیچے سے پانی کا ایک نالہ بہہ کر نیچے گرے گا جس سے ہر گلا شدہ مخلوق انسان ہوں یا پرندے یا چوپائے اس طرح اُگ آئیں گے کہ اگر پہلے سے کوئی شخص ان کو پہچانتا بھی ہوگا تو اُگ آنے کے بعد نہ پہچانے گا۔ پھر روحوں کو چھوڑا جائے گا اور وہ اپنے اپنے جسموں سے آکر جڑ جائیں گی۔ آیت وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ کا یہی مطلب ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ ۔ پارینہ قوموں کے ذکر میں درسِ نصیحت ہے، خزانۂ عبرت ہے، پند و حکمت ہے اور وعدہ و وعید ہے اور تنبیہ و تہدید ہے۔ اسی لئے قرآنی دستور اور اسلوبِ بیان یہ ہے کہ عقلی اور نقلی دلائل کے بعد گزشتہ اقوام کی کچھ مختصر داستان بیان کی جاتی ہے تاکہ پیغمبر کے احکام سے سرتابی کا نتیجہ بد نظروں کے سامنے آجائے۔ یوں تو اس روئے زمین پر واقع ہونے والی پارینہ داستانیں بہت ہیں۔ جن گزشتہ اقوام نے جہاں بھی انبیاء کی تکذیب اور مخالفت کی اللہ تعالیٰ کے انتقامی عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ ہو گئیں۔ مغرب، مشرق، شمال، جنوب ہر طرف اقوام و اشخاص کی تباہی کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں اور آثارِ قدیمہ اب بھی اُبھرے ہوئے ہیں جو خاموش دعوتِ عبرت دے رہے ہیں لیکن قرآن کریم عربی میں نازل ہوا۔ اول مخاطب اس کے عرب ہی تھے، اور عرب صرف اپنے پس و پیش سے واقف تھے۔ عراق، وادئ قریٰ، یمن، شام، اردن یہی ممالک ان کی جولانگاہ تھے اور نزولِ قرآن کے زمانہ تک ان ممالک و بلاد میں کہیں کہیں گزشتہ تباہیوں کے آثار باقی تھے اس لئے متقدمین میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم اور قوم لوط کی تباہ کاریوں اور فساد آفرینیوں کے مٹے ہوئے نشانات کا ذکر قرآن میں ملتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد قوم شعیب، اصحاب الرس، تبابعہ، اصحاب (الایکہ)، اصحابِ خندق، قوم موسیٰؑ اور بعض دوسری اقوام کے فرسودہ آثار کو بیان کیا گیا ہے۔ قوم نوحؑ نے حضرت نوحؑ کی تکذیب و مخالفت کی۔ نو سو پچاس برس آپ نے نصیحت کی اور دعوتِ توحید دی اتنی طویل مدت تک۔ قوم والے نسل در نسل آپ کو طرح طرح سے تکلیفیں اور جسمانی دُکھ دیتے رہے۔ انہیں بیاسی آدمیوں کے سوا اور کسی نے آپ کو سچا نہ جانا۔ آخر پانی کا طوفان آیا اور سارے جہان کو اس نے غرق کر دیا صرف وہ لوگ بچے جنہوں نے حضرت نوحؑ کی کشتی میں آپ کے دامنِ عافیت میں پناہ لی تھی۔

وَأَصْحَابُ الرَّسِّ ۔ اور رس والوں نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی۔ صاحبِ قاموس نے رس کے متعدد معانی لکھے ہیں۔ کسی چیز کی ابتدا۔ وہ کنواں جس کے گرداگرد پتھروں کی من بنادی گئی ہو۔ قوم ثمود کا وہ کنواں جو ثمود کی تباہی کے بعد باقی رہ گیا تھا۔ گڑھا، میت کو دفن کرنا۔ بغوی نے رس کا معنی لکھا ہے۔ کنواں، وہ کنواں جس کے گرداگرد پتھروں اور اینٹوں کی من نہ بنائی گئی ہو۔ بعض کے نزدیک رس (معدن) کو کہتے ہیں۔

اصحاب الرس کون تھے؟

بعض لوگوں نے کہا جو لوگ ثمود کی تباہی کے بعد ان کی نسل کے باقی رہ گئے تھے وہی اصحاب الرس تھے۔ بغوی نے ابو روق کی روایت سے ضحاک کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت صالحؑ چار ہزار اہل ایمان کو لے کر عذابِ الٰہی سے بچ کر حضر موت (یمن) میں آکر ایک کنویں کے گرداگرد آباد ہو گئے تھے۔ اس بستی کا نام حاضوراء ہو گیا۔ حاضوراء ہی میں حضرت صالحؑ کی وفات ہوئی۔ اس علاقہ کو حضرموت اسی مناسبت سے کہا جانے لگا کہ یہاں حضرت صالحؑ کی موت حاضر ہوئی۔ یعنی آپ نے وفات پائی۔ مدت تک یہ لوگ اسی جگہ آباد رہے۔ نسل در نسل ہو کر ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ آخر کار یہ بھی بُت پرست ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جن کا نام حنظلہ بن صفوان تھا، حنظلہ پیشے کے اعتبار سے قلی تھے۔ قوم والوں نے بازار میں ان کو شہید کر دیا۔ نتیجہ میں اللہ نے سب کو تباہ کر دیا۔ اور

اونچے محل کھنڈر بن گئے اور کنوؤں سے پانی بھرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔

آیت وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ میں اسی کنویں کا اظہار فرمایا ہے۔ جس کے گرداگرد قوم صالحؑ آباد ہوتی تھی۔ سعید بن جبیر کا قول بھی ہے کہ اصحاب الرس کے ایک پیغمبر تھے جن کا نام حنظلہ بن صفوان تھا۔ حضرت حنظلہ کو اصحاب الرس نے شہید کر دیا تھا۔

وہب بن منبہ نے کہا اصحاب الرس کا ایک کنواں تھا اور بہت مویشی تھے (یعنی یہ لوگ جانور پالتے تھے) جب انھوں نے بت پرستی اختیار کرلی تو اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے حضرت شعیبؑ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے ان کو نصیحت فرمائی، اللہ کے عذاب سے ڈرایا، لیکن جب قوم والوں نے زیادہ سرکشی کی تو اللہ نے ان کا کنواں مع ان کی آبادی کے زمین میں دھنسا دیا۔

قتادہ اور کلبی نے کہا، رس یمامہ میں ایک کنواں تھا، انھوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا جس کی پاداش میں اللہ نے ان سب کو تباہ کر دیا۔

کعب، مقاتل اور سدی کے نزدیک انطاکیہ میں ایک کنواں تھا جس کو رس کہا گیا ہے۔ حضرت حبیب نجار جن کا ذکر سورۂ یٰسین میں آیا ہے اسی پر شہید کیے گئے تھے۔ بعض علماء کے نزدیک اصحاب الرس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں۔

عکرمہ کا قول ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کو کنویں میں گرا کر اوپر سے کنویں کو پتھروں سے پاٹ دیا تھا۔

وَثَمُوْدُ۔ اور ثمود کی قوم نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی۔ اس قوم کے پیغمبر حضرت صالحؑ تھے، اس قوم کے متعلق اللہ نے مختصر قصہ نقل کیا ہے اور فرمایا ہے:۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۔ قوم ثمود حضرت صالحؑ سے معجزہ کے طلبگار ہوئے تو ایک پتھر کے اندر سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی برآمد ہوگئی، پھر اس کے بچہ پیدا ہوا۔ چونکہ اونٹنی عظیم الجثہ تھی۔ اس کو دیکھ کر تمام اونٹ بھاگ جایا کرتے تھے اور چشمہ کا سب پانی پی جاتی تھی۔ دوسرے جانور پیاسے رہتے تھے اس لیے حضرت صالحؑ نے یہ طے کر دیا کہ ایک دن اونٹنی اور اس کا بچہ پانی پئیں اور ایک دن لوگوں کے جانور۔ یہ طریقہ کچھ دنوں چلتا رہا۔ حضرت صالحؑ نے یہ بھی فرما دیا تھا۔ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ اس اونٹنی کے حصہ کا پانی ایک دن اور تم لوگوں کے جانوروں کے حصہ کا پانی دوسرے دن ہے۔ یہ باری مقرر ہے اس کو دکھ نہ پہنچانا ورنہ تم پر سخت عذاب آجائے گا۔ لوگوں نے اس حکم سے سرتابی کی اور اونٹنی کو قتل کر کے دلیر ہوگئے۔ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ۔ آخر قتل کر دیا اور پھر (عذاب کو دیکھ کر) پشیمان بھی ہوئے۔ فَقَالَ لَهُمْ صٰلِحٌ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا تین روز تک اپنے گھروں میں مزے اڑا لو (چوتھے روز عذاب آئیگا) یہ وعدہ غلط نہیں ہے چنانچہ عذاب حسب وعدہ آیا۔ فَاَنْجَی اللّٰهُ صٰلِحًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ اور اللہ نے صالحؑ کو اور ان کے ساتھی مومنوں کو تو محفوظ رکھا اور ظالموں کو ایک چیخ نے آپکڑا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے (مردہ) رہ گئے۔

وَعَادٌ اور عاد نے اپنے پیغمبر یعنی ہودؑ کی تکذیب کی۔ قوم عاد اور ان پر عذاب آنے کا تذکرہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ فرمایا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ یعنی حضرت ہودؑ کی نصیحت جب ان کی قوم نے نہ مانی تو اللہ نے ایک طوفان بھیج کر سب کو تباہ کر دیا۔ سات رات اور آٹھ روز مسلسل عظیم الشان آندھی ان پر مسلط کر دی گئی جس کی وجہ سے سب ہلاک ہو کر گر پڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کھجور کے درختوں کے تنے زمین پر پڑے ہیں۔

وَفِرْعَوْنُ۔ فرعون اور اس کی قوم نے بھی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جھوٹا جانا تصدیق نہ کی۔ فرعون کی قوم عمالقہ تھی۔ اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو ان کی ہدایت پر مامور کیا اور فرمایا۔ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی وَاَهْدِیَكَ

إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ۔ أَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا حَيَّةٌ تَسْعَىٰ وَأَدْخَلَ يَدَهُ فِي جَيْبِهِ خَرَجَتْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ فَكَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۔ وَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا وَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ۔ غرض حسب الحکم خداوندی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے فرعون کے پاس جاکر پیام خداوندی پہنچایا فرعون مغرور تھا اس نے نہ مانا۔ جادوگروں کو مقابلہ کے لئے جمع کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے ید بیضا اور لاٹھی کے معجزات دکھائے۔ فرعون نے پھر بھی تکذیب کی بنی اسرائیل پر مزید تشدد اور ظلم کیا۔ آخر حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے سمندر آیا آپ نے پانی میں اپنی لاٹھی ماری پانی پھٹ گیا خشک راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل پار نکل گئے۔ پیچھے سے فرعون لشکر کو لئے آپہنچا۔ راستہ کو خشک دیکھ کر گھس پڑا ایک موج آئی فرعون ڈوبنے لگا تو اس وقت پکارا۔ آمَنْتُ بِرَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۔ میں موسیٰ و ہارون پر ایمان لایا۔ جس رب پر اسرائیل ایمان لائے ہیں میں نے بھی اس کو مان لیا لیکن وقت موت کا ایمان قبول نہ ہوا اور عبرت کے لئے اللہ نے اس کی لاش پانی کے اندر سے کھینچ کر کنارے پر ڈالدی اس سے لوگوں کو فرعون کے مرنے کا یقین ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر قہار قدرت کا یقین مضبوط ہوگیا۔

وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۔ اور لوط کے بھائی برادری یعنی وطن والوں نے بھی حضرت لوط کی تکذیب کی۔ دوسری آیت میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۔ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ۔ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ وَأَمْطَرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ۔ یعنی لوطؑ نے ان کو امرد پرستی سے منع کیا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کے جواب میں قوم نے لوطؑ کو دھمکیاں دینی شروع کیں اور بستی سے نکال باہر کردینے کا ڈراوا دیا۔ حضرت لوطؑ نے ان کے عمل سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے لوطؑ کو اور ان کے ساتھی مسلمانوں کو تو بچالیا اور چونکہ ان کی بیوی کافر تھی اس نے اس کو اور سارے کافروں کو غارت کردیا۔ آسمان سے کنکر یلے پتھروں کی بارش کی، زمین کو الٹ دیا۔ اس طرح سب تباہ ہوگئے۔

یہ واقعہ بحیرۂ مردار کے کنارے کا ہے سدوم اور دوسری چار بستیاں وہاں آباد تھیں۔ انہیں کی ہدایت کے لئے حضرت لوطؑ کو بھیجا گیا تھا۔

وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ اور بن والوں نے بھی حضرت شعیبؑ کی تکذیب کی۔ یہ لوگ بن کے اندر بحر احمر کے قریب آباد تھے۔ یہی لوگ اصحاب مدین کہلاتے ہیں یا اصحاب الایکہ اصحاب المدین کے علاوہ کچھ لوگ تھے مگر آبادی سب کی بحر احمر کے قریب تھی اور ان سب کی ہدایت کے لئے اللہ نے حضرت شعیب کو مبعوث فرمایا تھا۔ حضرت شعیبؑ حضرت موسیٰؑ کے خسر تھے اور خطیب الانبیاء کے لقب سے مشہور ہیں۔ بڑی سلجھی ہوئی بلیغ تقریر کرتے تھے۔ ان کی قوم والے بے ایمان تھے۔ خرید و فروخت اور لین دین کے وقت ناپ تول میں کمی کرتے تھے اور رہزنی بھی کرتے تھے۔ یہ قصہ دوسری جگہ آیات میں اس طرح آیا ہے:-

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ یعنی حضرت شعیب نے قوم کو صحیح ناپ تول رکھنے کی ہدایت کی، رہزنی سے روکا لوگوں نے آپکو جادو زدہ کہا اور آسمان سے نزول عذاب کے خواستگار ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب [illegible] مسلط کردیا [illegible] کی سخت گرمی پڑی، لوگ جھلس گئے چیخ اٹھے، تنگ آکر جنگل کو نکل کھڑے ہوئے۔ وہاں ایک ابر آسمان پر آیا، وہ سب کے اوپر چھا گیا۔ لوگ گرمی سے [illegible] سب ابر کے [illegible] میں جمع ہوگئے جب سب جمع ہوگئے تو اس بادل میں سے آگ برسنی شروع [illegible] قوم کو جلا کر خاک [illegible]

بغوی نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تبع سے مراد تبع حِمیَر مراد ہے جو یمن کا بادشاہ تھا اور اس کا تسلط عراق اور ترکستان تک تھا شاہانِ یمن کا ایک خاندان تبع کہلاتا تھا کیونکہ ہر بادشاہ کے بعد اسی کے خاندان کا دوسرا بادشاہ اس کا جانشین ہوتا تھا۔ قبیلہ حمیر کا یہ تبع پہلے آتش پرست تھا پھر مسلمان ہوگیا اور قوم کو اسلام کی دعوت دی، لیکن قوم والوں نے اس کی تکذیب کی۔ محمد بن اسحٰق وغیرہ نے عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ آخری تبع اسعد بن ابو کرب تھا، مشرق کی طرف سے گھومتا ہوا جب مدینہ کے قریب پہنچا تو کسی نے مخفی طور پر اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اس نے خیال کیا کہ مدینہ ہی کا کوئی شخص قاتل ہوگا، اس لئے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ مدینہ میں اس زمانہ میں انصار کے مورث اعلیٰ رہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ ناگہانی بلا آتی دیکھی تو وہ بھی جتھے بند ہو کر باہر نکل آئے۔ اہلِ مدینہ اور اسعد کے ساتھیوں میں خوب قتال ہوا۔ شام ہوگئی، لڑائی ختم ہوگئی تو مدینہ والوں نے اسعد اور اس کی فوج کے لئے کھانا بھیجا اور کہا دن میں ہماری تمہاری جنگ جاری رہے گی اور شام کو تم ہمارے مہمان ہوگے۔ اسعد نے کہا یہ تو بڑے شریف لوگ ہیں۔ اسی اثناء میں اسعد کے پاس دو یہودی عالم آئے۔ ایک کا نام کعب اور دوسرے کا نام اسعد تھا۔ یہ دونوں عالم قبیلہ بنی قریظہ کے تھے۔ انہوں نے اسعد سے کہا بادشاہ اب آپ اپنا ارادہ ترک کر دیں ورنہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ جائے گا۔ یہ شہر ایک نبی کی ہجرت گاہ ہے وہ نبی قریشی ہوگا اور اس کا نام محمد ہوگا۔ مکہ اس کا وطن ہوگا اور اپنا وطن چھوڑ کر وہ یہاں آ بسے گا اور یہاں کے باشندے اس کے حامی ہوں گے۔ اسعد نے یہودیوں کے سمجھانے سے لڑائی کا خیال چھوڑ دیا اور یہودیوں کی دعوت پر اس نے دینِ موسوی اختیار بھی کر لیا اور مدینہ سے چلا گیا کچھ یہودی علماء اس کے ساتھ ہو لئے۔ راستہ میں قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگ اس کو ملے اور کہا۔ یہاں ایک مکان ہے جس کے اندر موتی مونگا، ہیرے، چاندی سونا بکثرت موجود ہے۔ اگر آپ اس مکان پر قبضہ کر لیں گے تو بڑی دولت ہاتھ آئے گی۔ اسعد نے پوچھا وہ مکان کہاں ہے؟ ہذیل والوں نے کہا مکہ میں ہے یعنی کعبہ۔ بنی ہذیل کا خیال تھا کہ اسعد تباہ ہو جائے کیونکہ کعبہ پر جس کسی نے چڑھائی کی وہ تباہ ہوگیا بادشاہ نے علماءِ یہود سے پوچھا۔ یہودیوں نے کہا سوائے کعبہ کے اور کوئی مکان ایسا نہیں ہے، لیکن آپ لوٹنے اور کعبہ کو ڈھانے کا خیال ترک کر دیں، وہ عبادت گاہ ہے، مسجد ہے، آپ وہاں آ کر ارکانِ عبادت ادا کریں، قربانی کریں اور سر منڈوائیں، حسبِ مشورہ اسعد مکہ میں فروکش ہوگیا۔ سینکڑوں اونٹوں کی قربانی کی، مناسکِ حج ادا کئے اور کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ ابن اسحٰق کا خیال ہے کہ سب سے پہلے کعبہ پر غلاف چڑھانے والا اسعد ہی تھا یہاں سے فارغ ہو کر یمن کے ارادہ سے اسعد روانہ ہوگیا۔ لیکن قبیلہ حمیر کے سرداروں نے کہا۔ ہم آپ کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ آپ نے ہمارا دین چھوڑ دیا۔ اسعد نے کہا۔ میں نے جو مذہب اختیار کیا ہے وہ تمہارے مذہب سے بہتر ہے۔ حمیر والوں نے کہا۔ اچھا تو اس کا فیصلہ آگ کر دے گی۔ اس زمانہ میں یمن کے ایک پہاڑ کے نشیب میں کسی غار کے اندر ایک آگ تھی۔ ظالم اور مظلوم دونوں فیصلہ کرانے غار پر جاتے تھے۔ آگ غار کے اندر سے نکل کر ظالم کو جلا دیتی تھی۔ اس دستور کے مطابق اسعد اپنے ساتھ دونوں یہودی عالموں کو لے کر نکلا۔ دوسری طرف سے قبیلہ والے اپنی مورتیوں سمیت نکلے۔ یہودی علماء کے گلے میں توراۃ پڑی تھی۔ دونوں آگ کے پاس پہنچے۔ آگ ایکدم نکلی اور دونوں فریقوں کو گھیر لیا۔ مورتیوں اور بتوں کو تو کھا گئی اور توراۃ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ دیکھ کر تمام حمیر والے یہودی ہوگئے۔ یمن میں یہودیت اس طرح قائم ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے رقاشی کا قول نقل کیا ہے کہ اسعد حمیری تبا لعہ میں سے تھا۔ یہ جناب رسول اللہؐ سے سات سو برس پہلے تھا اور غائبانہ حضورؐ پر ایمان لے آیا تھا۔

کعب کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تبع کی مذمت نہیں کی، تبع کی قوم کی مذمت کی ہے۔

حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں تبع کو بُرا نہ کہو وہ مسلمان ہو گئے تھے

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا، مجھے نہیں معلوم کہ تبع نبی تھے یا نہ تھے۔ تبع کے متعلق مذکورہ بالا تمام قصہ اور روایات کا تذکرہ بغوی نے سورۃ "الدخان" میں کیا ہے۔

کُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ۔ یعنی اقوام مذکورہ بالا میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے کیونکہ ہر پیغمبر نے دوسرے پیغمبر کی تصدیق کی ہے۔ اب کسی ایک پیغمبر کی تکذیب کرنے سے ان تمام پیغمبروں کی تکذیب لازم آتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کسی ایک پیغمبر کی تکذیب سارے پیغمبروں

کی تکذیب ہے۔

تکذیب پیغمبر کے بعد وہ مستحق عذاب قرار پا گئے۔ پس اللہ کا عذاب ان پر نازل ہو گیا۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ آسمانوں کو، زمینوں کو، بادو باراں اور ابر ریزاں کو، رات اور دن کو، پہاڑوں اور درختوں کو، صحرا اور لہلہاتے باغوں اور ہرے کھیتوں کو اللہ نے پیدا کیا۔ کچھ نہ تھا اس نے سب کچھ کر دیا تو کیا یہ سب کچھ پیدا کرنے کے بعد تھک گیا عاجز ہو گیا۔ دوسری بار پیدا کرنے کی اس میں قدرت نہیں رہی ایسا نہیں ہے۔ قدرت کاملہ میں کسی کو کلام نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ نارسا فہم رکھنے والے انسان، کا ذہن توہم کا شکار ہے، معاملہ پوشیدہ ہے۔ دماغ کی روشنی پر پردے پڑ گئے ہیں۔ صداقت کا نور جگمگاتا نظر نہیں آتا، دلوں میں یقین کی روشنی نہیں شک اور تردد کی تاریکی چھائی ہوئی ہے، غیر یقینی حالت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صاحب قاموس نے عَيِيَ بِالْاَمْرِ کا معنی لکھا ہے۔ مقصد تک پہنچنے کا اس نے راستہ نہیں پایا یا عاجز آ گیا۔ صحیح بخاری میں حضرت۔۔۔ عباسؓ و حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ جناب رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم نے میری تکذیب کی اور اس کے لئے یہ جائز نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی اور اس کے لئے یہ درست نہ تھا تکذیب تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے جس طرح مجھے ایک بار پیدا کر دیا پھر دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ ابتدائی تخلیق تا نوی تخلیق سے آسان نہیں ہے۔ اور گالی یہ دی کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے اپنی اولاد اختیار کی ہے، حالانکہ میں ایک اللہ ہوں (اولاد سے) بے نیاز ہوں، نہ میں کسی کا باپ ہوں نہ کسی کا بیٹا، میرا ہمسر کوئی بھی نہیں ہے۔

مقصودِ بیان پیغمبر کا انسان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، قرآن مجید کی قسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے تعجب کا اظہار بصورت انکار کیا ہے۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے اس امر کی طرف کہ جس انسان پر یہ قرآن اتارا گیا ہے وہ یقیناً پیغمبر ہی ہوگا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ پھر پیغمبر نے جو قیامت کا عقیدہ پیش کیا یہ بھی کوئی انکار کی بات نہیں سارے جہان کو جس نے بنایا وہی اس کو توڑ مروڑ کر دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ مختلف و متعدد انبیاء کا ذکر کر کے اس کو فطرت انبیاء کیا ہے، کہ انبیاء ہمیشہ انسان ہی ہوتے ہیں۔ آدمی کا نبی ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پھر انبیاء کی تکذیب کرنے والوں کی تباہی کا ذکر مجمل طریقہ پر کر کے در پردہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ تم لوگ اگر اپنے پیغمبر کی تکذیب کرو گے تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو گزشتہ منکرین انبیاء کا ہوا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی

حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ

رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں جب دو اخذ کرنے والے فرشتے اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں وہ کوئی لفظ منہ سے

مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا

نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے اور موت کی سختی (قریب) آ پہنچی یہ (موت) وہ چیز

كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ

ہے جس سے تو بدکتا تھا اور (قیامت کے دن دوبارہ) صور پھونکا جائیگا یہی دن ہوگا وعید کا اور ہر شخص اس طرح (میدان قیامت میں)

مَعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ○ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ

آوے گا کہ اس کے ساتھ (دو فرشتے ہوں گے) ایک اسکو اپنے ہمراہ لائیگا اور ایک (اس کے اعمال کا) گواہ ہوگا تو اس دن سے بیخبر تھا سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت کا)

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ○ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ○ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ

ہٹا دیا آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے اور (اس کے بعد) فرشتہ جو اس کے ساتھ رہتا تھا عرض کریگا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے جو میرے پاس تیار ہے ایسے شخص کو جہنم

كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ○ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ○ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

میں ڈال دو جو کفر کرنیوالا ہو اور (حق سے) عناد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبدیت سے) باہر ہو جانیوالا ہو اور (دین میں) شبہ پیدا کرنیوالا ہو جس نے خدا کے ساتھ

فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ○ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ

دوسرا معبود تجویز کیا ہو سو ایسے شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا تھا کہے گا کہ اے ہمارے رب میں نے اسکو جبراً گمراہ نہیں کیا تھا لیکن

ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ○ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ○ مَا

خود (دور دراز) کی گمراہی میں تھا ارشاد ہوگا کہ میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے سود ہیں) اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا میرے ہاں وہ

يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ع

ع ۲ ۱۶

بات (وعید مذکور کی) نہیں بدلی جاویگی اور میں (اس تجویز میں) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔

تفسیر انسان کہاں سے آیا، کس مادہ اور کن ذرات سے بنایا گیا۔ اس کے تخلیقی قوام کے کیا احوال ہیں اور کیا تھے۔ یہ کیوں یہاں آیا اور کہاں جاتا ہے۔ ذہن کی تصوراتی لہریں اور دل کے ارادے اور نیتیں کس طرح ہر آن بدلتی رہتی ہیں اور ان کا اثر کیا پڑتا ہے۔ کیا پیدا ہونے والے ارادے، اٹھنے والے تصورات اور نو بنو ظاہر ہونے والے اعمال و افکار رائیگاں اور بے مآل ہیں یا ان کا کوئی مقصد ہے۔ کیا یہ تمام اور جسمانی حرکات و سکنات رونما ہونے کے بعد فنا ہو جاتے ہیں جو کبھی دوبارہ سامنے نہیں آئیں گے یا روپوش ہو جاتے ہیں اور دوبارہ جب پردہ اٹھے گا تو تمام افکار و اعمال کی مرتب فہرست سامنے آئے گی۔ انسانوں کا ایک کثیر گروہ منکر قیامت ہے۔ وہ اس زندگی کے تمام خیالات و تصورات اور کردار و اطوار اور گفتار کو معدوم ہو جانے والا قرار دیتا ہے۔ جو زندگی گئی اپنے ساتھ ساری حقیقتوں کو لے گئی۔ دوبارہ نہ وہ زندگی لوٹے گی نہ اس کی گزشتہ خصوصیات۔ یہ زندگی برائے زندگی ہے۔ آخرت میں کاٹی جانے والی کھیتی نہیں۔ یہ خود اسی دنیا میں یا قیدخانہ ہے دکھ سے بھرا ہوا یا گلستان ہے سکھ اور چین کے پھول بکھیرنے والا، آخرت کوئی چیز نہیں، اعمال زندگی کی آخری حساب فہمی محض جاہلانہ توہم ہے، کون کیا سوچتا ہے، کیا کرتا ہے، کون جانتا؟ خود بھی آدمی کو پورے طور پر معلوم نہیں کہ میں بلا ارادہ کیا کر رہا ہوں اور ارادہ کے ساتھ کیا کر چکا ہوں، زندگی کی گوناگوں کیفیات کی کوئی فہرست نہیں جو انمٹ ہو کر کوئی مرتب اور منظم لا کر عمل نامہ اس کو پڑھوا دیا جائے۔ بہت سی وہ حقیقتیں ہیں جو گزشتہ زندگی میں سامنے آئی تھیں اور اب ان کے نقوش بھی دماغ سے مٹ چکے۔ ماضی کے اعمال کا ہزارواں حصہ بھی انسان کو خود یاد نہیں، پھر کیسی قیامت اور کیسی اس کی جزا سزا۔ اس قسم کے خیالات زنگ آلودہ دماغوں اور کرم خوردہ حواس والوں کی تصوراتی لہروں میں بکثرت پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ حقیقت کیا واجب الیقین نہیں کہ انسان عدم سے آیا ہے اور اللہ نے اپنے علمی اندازے کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ نے اپنے علمی اندازہ کے مطابق انسان کو ہستی کا جامہ پہنایا۔ وہ ہستی، اجزاء ہستی، قوام ہستی اور لوازم و خصوصیات

متوسّطہ یقیناً واقف ہوگا۔ انسان خود تو بنا نہیں، کوئی اپنا خالق خود نہیں، اس لئے اپنے قلبی واردات اور وجود کے معاورات کا بھی اس کو پورا علم نہیں ہو سکتا۔ ہاں انسان کا خالق ہی اس کی دماغی خلاؤں اور ان خلاؤں میں پیدا ہونے والی غیر شعوری یا تحت الشعوری لہروں سے واقف ہوگا کیونکہ اسی نے تمام خلایوں اور خلیات بنائے ہیں۔ پس جس خالق کا اتنا ہمہ گیر علم ہے اس سے انسان کے اعضاء کی کوئی حرکت یا ذہنی لہر کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے وہ تو رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یہ سائنس کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کا انسانی جسم سے کیا تعلق ہے اور یہ تعلق کیسے پیدا ہوا کیسے قائم ہے۔ انسان خود اس سے ناواقف ہے مگر اس کا خالق تو واقف ہے وہ سانس کے دورے کو اور جسم سے اس کے تعلق کو اور تعلق کی کیفیت کو جانتا ہے کیونکہ وہ خالق ہے۔ رہ گئی انسان کی رفتارِ زندگی، اطوارِ زندگی اور گفتار و کردار کا علم تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ جب اس نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے ان تمام لوازم و خصوصیات کو بھی اپنے منصوبہ کے تحت پیدا کیا اور پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے انسان کی کوئی حرکت بھی خواہ کیسی ہی مخفی ہو خالق کے دائرۂ علم سے خارج نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کی غیبی طاقت کے دو مظہر جن کو فرشتے کہا جاتا ہے ہر انسان پر ہر پل مسلط ہیں۔ زبان سے جو لفظ نکلتا ہے مقرر فرشتے اس کو لکھ لیتے ہیں۔ کوئی بات بغیر اندراج کے نہیں رہتی۔ دائیں بائیں دو فرشتے برابر لگے رہتے ہیں۔ ایک اچھی باتیں لکھتا ہے اور دوسرا بُری حرکتیں اور یہ سلسلہ موت تک قائم رہتا ہے۔ آدمی مرنے سے بہت بھاگتا ہے لیکن آخر موت آ دبوچتی ہے۔ موت کے نشہ سے ہر ایک کو سرشار ہونا پڑتا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ سارے انسانوں کی اجتماعی موت ہو جائے گی، تولید و تناسل کی مدت ختم ہو جائے گی اور صعق کی ایک آواز سے تمام زندہ انسان مر جائیں گے اس کے بعد صور کی آواز سے سب مردے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہر شخص کے ساتھ اس کو ہنکا کر لانے والا ایک فرشتہ بھی ہوگا اور شہادت دینے والا فرشتہ بھی اور اس کے اعمال بھی۔ اس وقت آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ جس چیز کا دنیوی زندگی میں انکار کیا تھا وہ آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔ جو فرشتہ تحریرِ اعمال پر مقرر تھا وہ شہادت دے گا کہ اس کے اعمال کی یہ فہرست میرے پاس موجود ہے۔ آخر حساب کتاب کے بعد حکم ہوگا اس کو لے جا کر جہنم میں ڈال دو یہ منکر تھا، حق کا دشمن تھا، صحیح افکار و اعمال سے دوسروں کو بھی روکتا تھا، حدِ انسانیت سے تجاوز کرنے والا تھا۔ اس نے عملی اور علمی زندگی کا حاکم مطلق اپنی کور دانشی کو قرار دے رکھا تھا۔ اللہ کی ذات صفات حشر نشر نبوت وحی اور کتاب اللہ کے احکام کی صحت کا معیار اس نے اپنی عقل کو بنا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید میں، ربوبیت میں، اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق اور عالم کل ہونے میں، اور قیامت کے واقع ہونے میں اس کو شک تھا۔ یہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی اپنا معبود سمجھتا تھا، اس لئے اس کو سخت عذاب میں جھونک دو۔ عذاب کو یقینی طور پر دیکھنے کے بعد اپنے آپ کو جرم سے پاک رکھنے کے لئے وہ کافر جھوٹے عذر پیش کرے گا۔ کبھی تو کہے گا کہ لکھنے والے فرشتے نے میرے اعمال کا صحیح اندراج نہیں کیا۔ فرشتہ کہے گا میں نے لکھنے میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ ایسا نہیں کیا کہ اس نے کفر اور گناہ نہ کیا ہو اور میں نے اندراج کر لیا ہو۔ کافر دوسرا عذر یہ تراشے گا کہ مجھ کو دوسرے لوگوں نے گمراہ کیا میں تو ان کے کہنے پر چلا تھا۔ وہ گمراہ کرنے والے انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے اس کو سرکش نہیں بنایا۔ یہ تو خود ہی پرلے درجہ کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ آخر اللہ فرمائے گا آج میرے پاس جھگڑا نہ کرو۔ میں نے پہلے سے اس عذاب کی آگاہی دیدی تھی (تم لوگوں نے اس پر یقین نہیں کیا) میں کسی پر ظلم نہیں کرتا (بغیر ہدایت بھیجے اور بغیر انبیا کو مبعوث کئے میں آج کسی کی پکڑ نہیں کرتا۔ میں حجت تمام کر چکا اب کسی عذر کا موقع نہیں)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

تحلیلِ اجزاء

وسوسہ بہت مخفی آواز۔ توسوس بہ نفسہ۔ وہ دل ہی میں جو کچھ کہتا ہے ہم اس کو جانتے ہیں۔ حبل ڈوری ورید رگ حَبْلِ الْوَرِيْدِ رگِ جان۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے علمی اندازہ کے ساتھ پیدا کیا۔ تخلیق اور بقائے تخلیق کے تمام لوازم اور خصوصیات کا اس کو علم ہے کیونکہ تخلیقی اسباب و اجزاء اور صفات و احوال بھی اسی نے بنائے ہیں۔

اللہ کا قرب بندے سے کس طرح ہے اور اقرب ہونے سے کیا مراد ہے؟

علماء کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں۔ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کے قرب سے مراد محاورہ میں انتہائی قرب مراد ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں موت میری حبل الورید سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ظاہر ہے یہ قرب مکانی نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ

ہم بھی کسی سے قرب مکانی ذاتی نہیں بلکہ قرب علمی مراد ہے یہ قول علماء ظاہر کا ہے۔

بیضاوی نے تفسیر میں لکھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمہاری حبل الورید سے بھی زیادہ قریب اگر کوئی شخص ہو تو جس قدر علم اس کو تمہارا ہوگا اس سے زیادہ ہم کو علم ہے، یہ تفسیر بھی علماء ظاہر کے قول کے قریب ہے۔

بغوی نے مطلب کی تشریح اس طرح کی ہے۔ آدمی جتنا اپنے حال کو جانتا ہے ہم اس کے احوال کو اس سے زیادہ جانتے ہیں، کیونکہ جسم کے مختلف اعضاء اور حصے آدمی کے سامنے نہیں ہیں بلکن اس تشریح میں تو طبیب کو ہم مریض سے اس کی ذات سے بھی زیادہ قریب قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا کہ مریض اپنی حالت مرض اتنی نہیں جانتا جتنی طبیب جانتا ہے، بلکہ جو چیزیں بے عقل اور عدیم الفہم ہیں ان کو اپنی ذات کا بالکل علم ہی نہیں ہوتا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جتنا قرب پتھر کو یا زمین کو یا آسمان کو یا پانی کے قطرات اور ریت کے ذرات کو اپنی اپنی ذات سے ہے اس سے زیادہ قرب ہم کو ان کی ذات سے ہے، کیونکہ بہر حال ہم ان کے احوال سے کچھ زیادہ واقف ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قرب و بعد کا مدار علم کو قرار دینا غلط ہے۔

صوفیاء کرام کہتے ہیں مخلوق سے اللہ کا قرب ذاتی ہے، زمان و مکان کی حدود و قیود سے خارج اور کیفیت سے منزہ اور عبر احساس اور استدلال سے اس قرب کو دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ نور فراست اور کشف روحانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کچھ اس قرب کا تصویر کشی الفاظ میں کی جا سکتی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہر مخلوق ممکن ہے اور ہر ممکن اپنے وجود اور بقاء وجود میں واجب کا محتاج ہے۔ وجود واجب اصل ہے اور وجود ممکن اس کا سایہ۔ سائے کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں جو وجود ہے وہ اصل کا ہے اصل کو سائے سے وہ قرب ذاتی حاصل ہے جو سائے کو خود اپنی ذات سے نہیں۔ کیونکہ اس کی ذات بجائے خود کچھ بھی نہیں۔ اصل کی نسبت سے سائے کا وجود مانا جاتا ہے۔ ذات ممکن وجود سے خالی ہے۔ ذات ممکن کا اپنے نفس پر حمل اول بھی نہیں۔ مرتبۂ ذات میں ہر ممکن مسلوب الوجود ہے۔ ہر ممکن کے لئے وصف وجود اس وقت ثابت ہوگا جب وہ موجود ہو جائے پس وجود ممکن ذات ممکن سے بھی زیادہ اقرب ہے اور چونکہ یہ وجود بجائے خود کچھ نہیں اضافی ہے اصل وجود واجب کا ہے۔ پس واجب کا وجود ذات ممکن سے جتنا قریب ہے اتنا قرب ممکن کو بھی اپنی ذات سے نہیں ہے۔

صوفیاء تمام عالم کی نسبت دائرۂ ظلال کی طرف کرتے ہیں اور ظلال کی نسبت صفات کی طرف اور صفات کی ذات کی طرف اور ظلال کے مراتب بہت زیادہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ اللہ کے لئے نور و ظلمت کے ستر ہزار حجاب ہیں۔ اگر وہ کھول دیئے جائیں تو جہاں تک ان کی نظر پہنچے سب کو اس کے چہرے کے چمکارے جلا ڈالیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بھی غیر محدود ہیں۔ آیت وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ الخ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کل روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر روشنائی ہو جائیں اور ان سمندروں کی روشنائی ختم ہونے میں سات سمندر اور بھی ان کی مدد کریں اور اللہ تعالیٰ کے کلمات (صفات) لکھی جائیں تو اللہ کی صفات ختم نہ ہوں گی۔

دوسری آیت میں ہے جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لازوال اور غیر فانی ہے۔

تتمہ اللہ تعالیٰ کا قرب تو ہر مخلوق سے ہے۔ کافر ہو یا مؤمن، عارف ہو یا جاہل سب ہی سے اس کا قرب ذاتی ہے لیکن خاص بندوں سے جو خصوصی قرب ہے وہ دوسروں سے نہیں ہے۔ صحیح فراست سے ہی اس کا ادراک ہوتا ہے۔ نور باطن ہی سے اس کو دیکھا جا سکتا ہے اور کتاب و سنت سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ دوسری آیت ہے۔ اَللّٰهُ مَعَنَا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ۔ ایک اور جگہ آیا ہے۔ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ۔ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ اللہ تعالیٰ کے رسول نے اللہ کا قول نقل فرمایا ہے۔ لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ۔ اس خصوصی قرب ہی کا نام ولایت ہے جس کے مدارج غیر محدود ہیں اور اسی قرب سے محرومی کا نام دوری ہے جو کافروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ۔ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ اَلَا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ جب دو لینے والے

(اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے) آکر ایسی ہی ملتے ہیں۔ ایک دائیں طرف سے آتا ہے، دوسرا بائیں طرف سے، اور آکر بیٹھ جاتے ہیں اور آدمی جو بات زبان سے نکالتا نگران (فرشتہ) تیار بیٹھا ہوتا ہے (اس کو لکھ لیتا ہے) مطلب یہ کہ دل کے خیالات اور وسوسوں سے تو اللہ واقف ہے۔ ان کو کوئی نہیں جانتا وہ نہیں لکھے جاتے البتہ زبان سے کہی ہوئی ہر بات اور اعضائے بدن سے کیا ہوا ہر فعل (خواہ ہاتھ سے کیا ہو یا پاؤں سے یا چشم و ابرو کے اشارہ سے) فرشتے لکھ لیتے ہیں۔ اچھا کام اور قول ہو یا برا قابلِ عذاب ہو یا قابلِ ثواب۔ دائیں طرف والا فرشتہ نیکیاں اور بائیں طرف والا فرشتہ بدیاں لکھتا ہے۔ حسن نے کہا دو حالتوں میں فرشتے انسان سے جدا ہو جاتے ہیں۔ فعل صنفی کے وقت اور قضائے حاجت کے وقت۔ مجاہد نے کہا ہر حال میں، یہاں تک کہ بیماری میں بھی ساتھ رہتے ہیں۔ عکرمہ نے کہا صرف ان اقوال و اعمال کو لکھتے ہیں جو قابلِ ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ بیکار اور مباح کاموں کو نہیں لکھتے۔ حضرت ابن عباس کی طرف بھی ایک روایت میں اس قول کی نسبت کی گئی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں عموم ہے۔ پھر یہ مسئلہ بجائے خود غور طلب ہے کہ مباحات کا ارتکاب قابلِ ثواب ہے یا نہیں۔ فہم سلیم کا تقاضا ہے کہ عمل مباح بذاتِ خود گو موجبِ اجر نہیں، لیکن عمل غیر مباح سے روک دیتا ہے، اس لئے بالواسطہ موجبِ ثواب ہے، بیکار کوئی عمل نہیں۔

بغوی نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور نے فرمایا نیکیاں لکھنے والا آدمی کے دائیں جانب اور بدیاں لکھنے والا بائیں جانب ہوتا ہے۔ دائیں طرف والا بائیں طرف والے پر حاکم ہوتا ہے۔ آدمی اگر کوئی گناہ کرتا ہے اور بائیں طرف والا لکھ لینا چاہتا ہے تو دائیں طرف والا کہتا ہے سات گھنٹے ٹھہر شاید یہ توبہ کر لے اور معافی کا طلبگار ہو جائے اور اگر آدمی کوئی نیکی کرتا ہے تو کاتب حسنات فوراً (بجائے ایک نیکی کے) دس نیکیاں لکھ لیتا ہے۔

ابن راہویہ نے مسند میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

صحیحین کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے دلی خیالات معاف کر دیئے تاوقتیکہ وہ زبان سے نہ نکالے یا عمل نہ کرے۔

تنبیہ اور مختصر تنقیح کراماً کاتبین کون ہیں؟ کیسے اور کس کاغذ اور کس قلم و روشنائی سے لکھتے ہیں۔ یہ تمام امور حقیقت میں ناقابلِ بیان ہیں۔ بہرحال یہ عنصری مادی متداول کاغذ، مال ہے نہ روشنائی نہ قلم۔ ممکن ہے کتابت سے مراد محفوظ رکھنا یا ثبت کر لینا یا نقش کر لینا ہو۔ تحقیقاتِ جدیدہ سے ثابت ہے کہ دماغ کی کوئی تصوری لہر، خیال، ارادہ، نیت، اور اعضاء جسم کی کوئی حرکت یا سکون فنا نہیں ہو جاتا، اس کائنات کی فضائی لہروں میں بعینہ موجود رہتا ہے۔ ہر ساعت اور ہر لمحہ کا قول اور عمل یہاں تک کہ ذہنی تصور بھی گو اعضاء سے نکل چکا ہو اور ذہن سے فنا ہو گیا ہو مگر فضائی لہروں سے زائل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ پر بولے ہوئے الفاظ یا ہاتھوں پاؤں سے کئے ہوئے اعمال اور چشم و ابرو کے اشارات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت کو گرفت میں لے کر ٹیلی ویژن پر سنایا اور دکھایا جاتا ہے۔ حقیقت میں اس فضا میں ہر انسان کی زندگی کی اصل فلم تیار کی جاتی ہے ہر واقعہ لہروں میں ثبت ہو کر پچھلے واقعہ سے وابستہ ہوتا رہتا ہے۔ شاید انہی لہروں کے اندر ثبت کر لینے والی غیبی طاقتوں کو کراماً کاتبین کے لفظ سے تعبیر کیا ہو اور فضائی لہروں میں ثبت کرنے کو کتابت فرمایا ہو۔ اعمالناموں کو قرآن مجید میں لفظ طائر اور کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ۔

كُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا۔

کتاب کا مادہ کتبٌ ہے لکھنا، جمع کرنا، نقش کرنا، ثبت کرنا، کتبٌ کے متعدد معانی ہیں اور سب قریب قریب ہیں۔

طائر اڑنے والا، کیا اعمالنامے کہیں ثبت اور نقش اور جمع اور مرقوم ہوتے ہیں اور کیا اعمالنامے اڑتے ہیں۔ کیا واقعی اعمالنامے گلے سے بندھے ہوئے ہیں جو قیامت کے دن بصورتِ تحریر سامنے آئیں گے۔ بے شک یہ سب باتیں صحیح ہیں اور مادہ پرستوں کو اس کے انکار کی مجال نہیں فضائی لہریں اور برقی کرنیں فضائے بسیط میں لہرا رہی ہیں۔ ہر تصور، ارادہ، نیت، خیال، قول، عمل ان لہروں میں منقوش، مکتوب، مثبت، جمع ہو رہا ہے اور ہر انسان کے افکار و اعمال کا جدا جدا نامہ شعاعی فضا میں تیر رہا ہے اور ہر شخص کی ذات اور شخصیت کے ساتھ اس کے اعمال و افکار و اقوال کی اڑتی ہوئی لہروں اور منتشر کرنوں کا غیر محسوس خصوصی رابطہ ہے کسی کا فکری یا عملی نقش شعاعی دوسرے کے فکری و عملی نقشِ فضائی سے مخلوط نہیں ہو سکتا۔ گویا اسی کے گلے سے بندھا ہوا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو اڑ رہی ہے اور ایسی فلم ہے جس کی ہر تصویر دوسری تصویروں سے جڑی ہوئی ہے اور چونکہ فضائی لہریں ہر شخص کو دائیں بائیں یعنی ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور صندوق کے اندر بند ہو کر بھی کوئی ان برقیات سے باہر نہیں ہو سکتا، اس لئے تنہائی میں دائیں بائیں جانب کی لہریں ہم پیوستہ ہوتی اور اس کو گھیرے رہتی ہیں۔ قیامت کے دن یہ دستاویز کھولی جائے گی جس کے اندر ہر چھوٹی بڑی حرکت بعینہ موجود ہے۔ ما هذا الكتاب لا

یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا یہی مطلب ہے۔ واللہ اعلم۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔ سکرۃ الموت، موت کی مدہوشی، نشہ۔ بالحق۔ الحق واقعی امر، یعنی امر جو متحقق ہوا اور اپنی ایک حقیقت واقعیہ رکھتا ہو، اس جگہ انقطاع حیات مراد ہے۔ موت کی حقیقت انقطاع منکشف کرکے لاتی ہے۔ دنیا اور دنیا کی زندگی ایک سراب ہے بے حقیقت۔ جب موت کی مدہوشی آتی ہے تو اسی سراب اور فریب ہستی کو ختم کردیتی ہے یا وعدۂ حق مراد ہے، یعنی ایسا وعدہ جس کا خلاف ورزی ممکن نہیں یا سزا جزا مراد ہے کیونکہ موت اپنے ساتھ جزا سزا کرکے کراتی ہے۔ عمل کی جزا کا ختم ہوجاتا ہے۔ نتیجہ اور ثواب عذاب کے پیدا ہونے کی جگہ شروع ہوجاتی ہے۔ کافر اور سرکش گناہگار ضعیف الایمان مسلمان بھی موت سے نفرت کرتا ہے، زندگی سے محبت رکھتا ہے، جہاں ایک چھوٹ ملتی ہے اس کو پسند کرتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جو زندگی کو ختم کردیتا ہے جس سے آدمی بھاگتا ہے وہ سامنے آجاتی ہے، دنیا چھوٹ جاتی ہے، عالم برزخ شروع ہوجاتا ہے، زندگی میں جو عقائد و افکار اور اعمال و افعال جمع کئے گئے تھے وہ سب ظاہر ہوجاتے ہیں اور علامات سزا جزا کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ حال تو شخصی زندگی کا ہوتا ہے لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ پوری کائنات انسانی کی یہ عملی زندگی ختم کردی جائے گی اور ایسا کوئی ہمہ گیر حادثہ ہوگا کہ کوئی آدمی زندہ نہ بچے گا۔ پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے کے وقت ہوگا۔ ایک دم ایک لمبی گونج ہلکی ہلکی سنائی دے گی اور رفتہ رفتہ اتنی اونچی ہوگی کہ ہر جاندار بے ہوش ہوجائیگا اور بے ہوشی بھی ایسی کہ زندگی کو ختم کردے گی۔ پہاڑوں کے پتھر روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے، سمندر زمین پر چڑھ آئیں گے، اور دھکتی آگ کی طرح ہوجائیں گے۔

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔ میں عام انسان کو خطاب ہے۔ اور ما موصولہ ہے۔ یعنی اے انسان یہ وہی موت ہے جس سے تو کتراتا گھبراتا اور نفرت کرتا تھا یا ما نافیہ ہے یعنی یہ چیز ایسی ہے جس سے بچنے کی تو قدرت نہیں رکھتا تو اس سے ہٹ نہیں سکتا۔

طبرانی نے معجم کبیر میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص موت سے بھاگتا ہے اس کی حالت اس لومڑی جیسی ہے جس سے زمین نے اپنا قرض طلب کیا اور وہ زمین سے بھاگ پڑی۔ بھاگتے بھاگتے جب تھک گئی اور بالکل چکنا چور ہوگئی تو اپنے بھٹ میں جا گھسی۔ زمین چونکہ وہاں بھی موجود تھی۔ اس نے وہاں بھی لومڑی سے اپنا قرضہ مانگا۔ لومڑی وہاں سے نکل کر پھر بھاگی۔ سانس پھولا ہوا تھا، حال برا ہورہا تھا، آخر بھاگتے بھاگتے بے دم ہوکر گر پڑی، جس طرح لومڑی کے لئے زمین سے بھاگنے کا راستہ بند تھا اسی طرح ہر انسان کے لئے موت سے بچنے کی تمام راہیں بند ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی نے فرمایا میں اپنے والد کی وفات کے وقت آپ کے سرہانے بیٹھی تھی آپ پر غشی طاری ہوئی تو میں نے یہ شعر پڑھا۔

مَنْ لَا يَزَالُ دَمْعُهُ مُقَنَّعًا　　　فَاِنَّهُ لَابُدَّ مَرَّةً مَدْفُوْقٌ

جس کے آنسو ہمیشہ بند رہے وہ بھی یقیناً ایک بار چھلک پڑیں گے۔ صدیق اکبرؓ نے سر اٹھا کر فرمایا۔ بیٹا یوں نہیں بلکہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ۔ اس جگہ نفخ صور سے دوسری مرتبہ صور پھونکا جانا مراد ہے۔ پہلے صور کے متعلق رسول اللہ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا۔ مجھے کیسے قرار و اطمینان ہوسکتا ہے حالانکہ صور پھونکنے والا فرشتہ صور منہ میں لئے گردن جھکائے حکم خداوندی کا منتظر ہے کہ کب حکم ہو اور کب وہ پھونک دے۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ پھر ہم کیا کہیں! ارشاد فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ اس کے بعد جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور میدان محشر میں کھدیڑ کر لائے جائیں گے اور کہا جائے گا یہی وہ دن ہے جس کے عذاب کی وعید تم کو دنیا میں سنائی گئی تھی۔

ابو النعیم نے حلیہ میں عکرمہ کا قول نقل کیا ہے۔ اگر کچھ لوگ سمندر میں ڈوب جائیں اور ان کا گوشت مچھلیاں کھالیں سوائے ہڈیوں کے کچھ باقی نہ رہے اور سمندر کی موجیں ان ہڈیوں کو ساحل پر پھینک دیں اور وہاں وہ بوسیدہ فرسودہ ہوکر ریزہ ریزہ ہوکر خاک بن جائیں پھر اس خاک میں جو دب کر رہ جائے اور اونٹ اس کو چر کر مینگنیاں کردیں اور مینگنیوں کو بھی جلا کر خاک کردیا جائے اور ہوا اس خاک کو اڑا کر کہیں سے کہیں بکھیر دے پھر بھی جب دوسرا

مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب سمٹ کر اصلی حالت پر ہو کر اپنے اپنے مقام پر زندہ ہو کر برآمد ہو جائیں گے۔

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيدٌ۔ ہر شخص کے ساتھ ایک چلانے والا اور ایک گواہ ہوگا۔ سعید بن منصور عبدالرزاق ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفاسیر میں حضرت عثمان بن عفان کا قول نقل کیا ہے کہ چلانے والا (فرشتہ) تو اللہ کے حکم کی طرف ہنکا کر لے جائے گا اور گواہی دینے والا (فرشتہ) اعمال کی گواہی دے گا۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چلانے والا فرشتہ ہوگا اور گواہ اس کا خود عمل ہوگا۔ سیوطی نے کتاب البرزخ میں حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جب قیامت بپا ہو جائے گی تو نیکیوں اور بدیوں کے دونوں فرشتے تیزی کے ساتھ آدمی کی طرف بڑھ کر اس کی گردن سے کھول لیں گے پھر دونوں اس کے ساتھ آئیں گے۔ ایک ہنکا کر لائے گا اور دوسرا گواہ ہوگا۔ ابونعیم ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

بغوی نے کہا ضحاک کے نزدیک سائق فرشتہ ہوگا اور گواہ خود آدمی کے ہاتھ پاؤں ہوں گے۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

شیخ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ دائیں طرف بیٹھنے والے سے مراد ہے آدمی کی وہ قوت خیر جو اس کو نیک اعمال پر اُبھارتی ہے اور بائیں طرف والے سے مراد ہے جذبۂ شر جو بداعمالی کی ترغیب دیتا ہے۔ شیخ کے اسی قول کی بنا پر بعض اہل باطن نے کہا ہے کہ سائق دو قسم کے ہوں گے۔ اگر آدمی نیک ہے تو اس کا سائق شوق و جذبہ ہوگا جو بارگاہِ کبریائی میں اس کو لے جائے گا اور اگر آدمی بداعمال ہے تو اس کا سائق وہ غفلت و نحوست ہوگی جو مقامِ عذاب میں اس کو ہنکا کر لے جائے گی۔ اور شہید سے مراد ہے انسان کی حالت۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ۔ تو دنیا میں اس (معاد اور حشر اور حیاتِ ثانویہ) کی طرف سے غافل تھا۔ تیرے دل و دماغ پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ محسوسات کا خوگر تھا۔ انہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ محسوسات سے آگے تیری عقل کی نظر اٹھتی ہی نہ تھی۔ دل کالا اور زنگ خوردہ ہو گیا تھا۔ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ اور آیت بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ میں اسی غطاء کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

مطلب یہ کہ دنیا میں تیری آنکھوں پر پردے پڑے تھے۔ معاد اور معاد کی کیفیات کا تجھے یقین ہی نہ تھا۔ اب ہم نے وہ پردے ہٹا دیئے اور معاد اپنی تمام کیفیات کے ساتھ تیرے سامنے آ گیا۔

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ۔ اب تیری نظر تیز ہے آنکھوں سے پردے اٹھ گئے ہیں۔ جس چیز کا دنیا میں انکار کرتا تھا آج وہی چیز آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

وَقَالَ قَرِينُهُ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ۔ اور اس کا ساتھی کہے گا۔ یہ تیرا اعمالنامہ میرے پاس موجود ہے۔ اس جگہ قرین سے مراد وہ فرشتہ جس کے پاس آدمی کا اعمالنامہ ہوگا یا خیر و شر کا لکھنے والا فرشتہ مراد ہے۔ وہ کہے گا یہ تیرے اعمال کی فہرست ہے۔ اس میں تیرے جرائم درج ہیں۔

اَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۝ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا جہنم میں پھینک دو ایسے شخص کو جو کفر کرنے والا ہو اور حق سے ضد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبودیت) سے باہر جانے والا ہو اور (دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو جس نے خدا تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کر لیا ہو۔ ایسے شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو۔

اَلْقِيَا سے دو فرشتوں کو خطاب ہے۔ ایک ہنکا کر لانے والا دوسرا شہادت دینے والا یا دوزخ کے دو فرشتوں کو خطاب ہے یا اَلْقِيَا اصل میں اَلْقِيَنْ تھا۔ القین میں نون خفیفہ کو الف سے بدل دیا گیا ہے یا تثنیہ کا صیغہ ہے لیکن مراد واحد ہے جیسے قِفَا بمعنی قف کے ایک شاعر کے قول میں آیا ہے۔ عَنِيدٍ حق کا سخت دشمن۔ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ زکوٰۃ مفروضہ کی ادائیگی سے یا ہر نیکی اور خیر سے روکنے والا۔ مُعْتَدٍ حد سے آگے بڑھنے والا، ظالم

منکر توحید۔ مریب اللہ تعالیٰ کی ہستی یا توحید یا اس کے دین میں شک کرنے والا۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ جس نے خدائی میں دوسروں کو شریک سمجھ رکھا ہے۔

کفار (سخت کافر) کے پانچ اوصاف بیان فرمائے۔ اول تو وہ معاند حق ہوتا ہے پیام حق پر غور نہیں کرتا ہے۔ وہ حق جو نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں حق دشمنی پیوستہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی دلیل بیان کی جائے وہ توجہ سے سنتا ہی نہیں۔ گمراہی اور باطل پرستی پر اڑ جاتا ہے منجمد ہوتا ہے۔ پھر دوسروں کو بھی قبول حق سے روکتا ہے۔ خود تو گمراہ ہوتا ہی ہے دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر نیکی کا دشمن اور ہر خیر کا مخالف ہوتا ہے۔ حد انسانیت سے آگے بڑھتا ہے حدودِ فطرت سے باہر نکل جاتا ہے۔ ذاتی میلاناتِ تقلید اسلاف قومی رسم و رواج شیطانوں کا افساد اور وطنیت قومیت نسل و رنگ، زبان، مال، حکومت، شہرت اور سیادت و وجاہت کی پوجا کرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو اللہ کے قانون کے برابر بلکہ اس سے برتر سمجھتا ہے۔ آئینِ حیات کی تعلیم رب کی خصوصیت ہے۔ کارسازی اور حکومت مطلقہ رب قادر کی صفت ہے مگر وہ اتنا ناحق کوش بر خود غلط ظالم ہوتا ہے کہ سر حد بشریت کو پار کر کے سرحدِ الوہیت میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ ہر وقت تردد میں پڑا رہتا ہے۔ کبھی اس کو اللہ کی ہستی میں شک ہونے لگتا ہے یعنی باری تعالیٰ کی یقینی ہستی کا منکر ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کو اللہ کی صفات میں شک ہوتا ہے۔ اللہ کا عالم الغیب قادرِ مطلق رب حقیقی اور مرسلِ انبیاء و شارع قوانین ہونا اس کو موہوم نظر آتا ہے۔ غرض ہر وقت اس کے دل و دماغ میں بے چینی رہتی ہے۔ اگر وہ خدا کو مانتا بھی ہے تو اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے خالق کو مخلوق کا جامہ پہنا دیتا ہے اور شکل و رنگ۔ اور دوسری خصوصیاتِ مخلوق کو خدا کے لئے ثابت کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو درجۂ الوہیت سے نیچے لانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخلوق کو خالقیت کی پستی سے اُٹھا کر وہ اللہ کا ہم پلہ بنا دیتا ہے اور اللہ کی الوہیت، عبادت اور ربوبیت میں دوسروں کو بھی ساجھی ماننے لگتا ہے۔ کفر کے نتیجہ میں ابتدا ہوئی تھی جاہلانہ عنادِ حق سے اور اختتام ہوا محسوس پرستی اور شرک پر۔ پس ایسا ہر شخص مستحقِ جہنم ہے۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ اس کا ساتھی (یعنی وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا ہے) کہے گا۔

اے رب ہمارے مالک! میں نے اس کو (جبراً) گمراہ نہیں کیا تھا لیکن یہ خود ہی دور کی (یعنی لمبی چوڑی) گمراہی میں تھا۔

حضرت ابن عباس مقاتل اور سعید بن جبیر کے نزدیک اس جگہ بھی قرین سے مراد نامۂ اعمال لکھنے والا فرشتہ ہی مراد ہے اور عربی زبان کے قواعد کا تقاضا بھی یہی ہے۔ بلاغتِ زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی معرفہ کو دوبارہ بصورتِ معرفہ ذکر کیا جاتا ہے تو دوسرے سے مراد بھی وہی معنیٰ ہوتا ہے جو پہلے لفظ سے مراد ہوتا ہے۔ پس اس جگہ پہلی مرتبہ قَرِيْنُهٗ بصورتِ معرفہ مذکور ہے اور دوسری بار بھی قرینہ بصورتِ معرفہ ہے لہٰذا جو مراد پہلے قرین سے ہے وہی مراد دوسرے قرین سے بھی ہونا چاہیئے۔

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ جب کافر کے اعمال کی شہادت اعمال نامہ لکھنے والا فرشتہ دے گا اور نامۂ اعمال پیش کرے گا تو وہ شخص کہے گا اس نے میرے گناہ لکھنے میں کچھ کمی بیشی کی ہے۔ میں نے یہ کام نہیں کئے تھے۔ اس پر فرشتہ کہے گا۔ پروردگار میں نے اس شخص کی طرف طغیان کی نسبت غلط نہیں کی میں نے اس کو طاغی لکھنے میں زیادتی نہیں کی، یہ شخص تھا ہی بڑا گمراہ۔

اہل تفسیر کے نزدیک اس جگہ قَرِيْنُهٗ سے مراد وہ شیطان ہے جو آدمی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔

کافر کہے گا اس شیطان نے مجھے بہکایا اور گمراہ کیا تھا میں اس کے بہکاوے میں آ گیا شیطان کہے گا مالک میں نے اس کو (زبردستی) گمراہ اور کج راہ نہیں کیا یہ تو خود ہی بڑی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔

بات یہ ہے کہ شیطانی اغوا کے جال میں بھی وہی شخص پھنستا ہے جو بدعقیدہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف مائل ہو اسی لئے شیطان کہے گا میرا تجھ پر جبر نہ تھا میں نے تجھے صرف دعوتِ گناہ دی تھی۔ تو نے میری دعوت اپنی مرضی سے قبول کی۔ آج تم لوگ مجھے ملامت نہ کرو، اپنے کو خود ملامت کرو کہ تم نے میری ترغیب کو کیوں قبول کیا۔

بعض مفسروں کا قول ہے کہ دونوں جگہ قرین سے مراد شیطان ہی ہے، گویا شیطان کہے گا کہ یہ شخص موجود ہے، میرے پاس حاضر ہے۔ جہنم کے لئے میں نے اس کو تیار کیا ہے مگر میں نے اس پر زبردستی نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے اختیار اور مرضی سے میرا کہا مانا اور میرے پیچھے چلا اور تیرے پیغمبروں کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔

اس نیچر کی نظر میں یہ تفسیر بہت کمزور ہے اور جمہور کا بیان کیا ہوا مطلب بہتر ہے۔

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْكُمْ بِالْوَعِیْدِ ۔ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میرے سامنے جھگڑا مت کرو میں پہلے ہی تمہارے پاس عذاب کی وعید (پیغمبروں کی زبانی) بھیج چکا تھا۔ میرے پاس بات تبدیل نہیں کی جا سکتی اور میں بندوں کی حق تلفی کرنے والا بھی نہیں ہوں (جیسی کرنی ویسی بھرنی)

میرے سامنے سے مراد ہے مقام حساب۔ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں کو نہ بخشنے کی بات جو میں کہہ چکا ہوں وہ بدلی نہیں جائے گی یا یہ مطلب ہے کہ میرے سامنے جھوٹی باتیں نہیں بنائی جا سکتیں۔ نہ کافر کا عذر قبول کیا جا سکتا ہے نہ شیطان کی بات مانی جا سکتی ہے جتنا جس کا جرم ہے اتنی اس کو سزا دی جائے گی ظلم کسی پر نہیں ہوگا۔

آیت میں ظَلَّام سے مراد بڑا ظالم نہیں بلکہ ظالم مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ میں بڑا ظالم نہیں ہوں چھوٹا ظالم ہوں۔

مقصود بیان

آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے۔ وہ آدمی کے ریشے ریشے اور جسمانی ساخت کے ذرے ذرے سے واقف ہے اور اس کے دل اور دماغ کے اندر جو پوشیدہ خیال پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو جتنا قرب اپنی ذات سے ہے خالق کو اپنی مخلوق سے اس سے بھی زیادہ قرب ذاتی حاصل ہے (جو قید زمان و مکان سے پاک ہے)

اِذْ یَتَلَقَّی الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ انسان کے دائیں بائیں سے دو ہستیاں آکر باہم ملتی ہیں اور دونوں دائیں بائیں موجود ہیں اور جو بات انسان زبان سے نکالتا ہے غیبی غیر محسوس لکھنے والا اس کو اپنی نگہداشت اور نگرانی میں لے لیتا ہے یعنی معدوم اور فنا نہیں ہونے دیتا۔

نُفِخَ فِی الصُّوْرِ سے معلوم ہو رہا ہے کہ نفخ صور حق ہے۔ اس کے بعد مقررہ دن آجائے گا یعنی قیامت بپا ہو جائے گی۔

جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ الخ سے صراحت ثابت ہے کہ ہر شخص پر دو کارندے مسلط ہوں گے۔ ایک ہنکا کر لائے گا، دوسرا اعمال کی شہادت دے گا یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک ہنکا کر لانے والا بھی ہوگا اور شہادت دینے والا بھی یعنی دونوں گھیر کر لائیں گے اور اعمال کی گواہی دیں گے

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مادی زندگی ایک پردہ ہے جو ہماری چشم بصیرت دل بصر پر پڑا ہوا ہے۔ مرنے کے بعد جب یہ مادی خول فنا ہو جائے گا تو آخرت کا منظر سامنے آجائے گا۔ اس وقت آدمی کی نظر تیز ہو جائے گی اور اور ماورائے زندگی کی تمام چیزیں دکھائی دیں گی۔

لفظ قَرِیْنُهٗ بتا رہا ہے کہ آدمی کے ساتھ ہر وقت ایک غیبی ساتھی رہتا ہے جو فہرست اعمال اپنے ساتھ رکھتا ہے اور پیشی کے وقت وہ پوری فہرست پیش کر دے گا لیکن ایک اور ساتھی بھی ہمہ وقت موجود رہتا ہے جو اغوا اور ترغیب کرتا ہے لیکن قیامت کے دن خود گمراہ کرنے کا انکار کر دے گا اور سارا الزام گمراہ ہونے والے انسان پر ڈال دے گا۔

آیت مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھوٹی باتیں نہیں چلیں گی جو بات واقع میں جیسی ہے ویسی ہی رہے گی وہ عدالت بکنے والی نہیں ہے کسی پر ظلم نہ ہوگا وغیرہ۔

یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ ۝ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ

جس دن کہ ہم دوزخ سے کہیں گے کہ تو بھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے اور جنت متقیوں کے قریب

لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ ۝ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ

لائی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لیے ہے جو رجوع کرنے والا پابندی کرنے والا ہو جو شخص خدا سے

بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ۝ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۝ لَهُم

ڈرتا ہے اور رجوع ہونے والا دل لے کر آوے گا اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا اُن کو

مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ۝

بہشت میں سب کچھ ملیگا جو چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی زیادہ (نعمت) ہے

تفسیر ہمارے یہ مادّی کان اسی آواز کو سنتے ہیں جو اسی کثیف مادّے سے تعلق رکھتی ہے۔ ماورائے طبعیات کی تو کوئی صدا یہ گوش سن ہی نہیں سکتے، بلکہ ان اجرام طبعیہ کی وہ آوازیں جو اُن کے خصوصی دہن نوعی اور زبانِ شخصی سے نکلتی ہیں ہمارے گوشِ مادہ بردوش نہیں سنتے لیکن گوش بصیرت و حقیقت سے وہ آوازیں بھی سنی جاسکتی ہیں جو اجسام طبعیہ کے نوعی حلقوم سے نکل رہی ہیں اور وہ غیر مادی ماوراء الطبعیاتی صدائیں بھی سنی اور سمجھی جاسکتی ہیں جو اگرچہ مادی ہیں اور مادی اجسام سے خارج ہو رہی ہیں لیکن وہ مادہ کثیف نہیں لطیف ہے۔ اس میں نورانیت ہے اور نزہت ہے۔ اس کی شکل بھی ہے، رنگ بھی ہے، ذبیبی ہے مقدار بھی، عرض و طول بھی ہے۔ لیکن یہ تمام امور وہ نہیں جن کو محسوس کرنے کے ہم خوگر ہیں۔ اس طبعیاتی ماحول کے لحاظ سے وہ تمام عوارض و لوازم گویا غیر مادی ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد جب مادّی کثیف پردہ اٹھ جائے گا اور موجودہ طبعیاتی حجابات دور ہو جائیں گے اس وقت ماوراء الطبعیات اجسام کی شکلیں بھی سب کو نظر آئیں گی اور لطیف آوازیں بھی سنائی دیں گی۔ پس جہنم اور جنت کی شکلیں دیکھنے اور ان کی آوازیں سننے اور اُن کے قرب و بعد کو محسوس کرنے سے کوئی امر مانع نہ ہوگا۔ آغاز آفرینش سے لمحۂ قیامت تک کے سارے مشرک اور کافر جب دوزخ میں بھر جائیں گے اور پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوزخ سے دریافت کیا جائے گا کیا تیرا پیٹ بھر گیا؟ تو وہ جواب دے گی کیا اور بھی کچھ ہے (کہ مجھے کھانے کے لئے دیدیا جائے) اس وقت اللہ تعالیٰ اپنا قدم بے کیف اس پر رکھدے گا، فوراً دوزخ بول اٹھے گی بس بس (میں بھر گئی) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مستحق ہوں گے اُن کے سامنے جنت لائی جائے گی۔ ان کو اپنے قریب ہی جنت نظر آئے گی۔ اللہ کی طرف سے حکم ہوگا یہ وہی جنت ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اس کے اندر تمہاری سکونت دوامی ہوگی، ہمیشہ یہاں رہو گے کبھی نکالے نہ جاؤ گے۔ لیکن یہاں داخلہ انہی لوگوں کو ملے گا جو واقعی اپنے دلوں میں اللہ کا خوف رکھتے تھے۔ خلوت میں بھی اللہ کے عذاب سے ڈرتے تھے، سچے دل سے خلوص کے ساتھ طاعت بجالاتے اور دربار الٰہی میں حاضر ہوتے تھے اور سارے تعلقات سے منہ موڑ کر اللہ سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے۔ ایسے لوگ جو کچھ جنت کے اندر چاہیں گے وہ سب ان کو ملے گا بلکہ تمنا اور خواہش سے زائد بھی اللہ ان کو عنایت فرمائے گا۔

تحلیل اجزاء يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ۔ یاد کرو اس منظر کو جب ہم (کافر) اور مشرکوں کو جہنم کے اندر داخل کرنے کے بعد) جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی اور دوزخ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔

عطاء مجاہد اور مقاتل بن سلیمان نے هَلْ مِن مَّزِيدٍ کو استفہام انکاری قرار دیا ہے۔ یعنی دوزخ کہے گی۔ اب میرے اندر کوئی گنجائش نہیں میں بالکل پُر ہو گئی۔ عام اہل تفسیر نے لکھا ہے اور یہی ہے کہ اس سوال کا مقصد مزید طلب ہے یعنی میری خوراک۔ اگر اور بھی ہو تو میرے اندر داخل کر دی جائے۔ میرا پیٹ ابھی نہیں بھرا۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جہنم کے اندر برابر مخلوق ڈالی جاتی رہے گی اور جہنم برابر هَلْ مِن مَّزِيدٍ کا نعرہ لگاتی رہے گی۔ آخر رب العزت خود اپنا قدم اس میں رکھ دے گا اس دوزخ کے بعض اجزا بعض کی طرف سمٹ جائیں گے یعنی دوزخ میں وسعت نہ رہے گی۔ تنگی آجائے گی) اور وہ کہے گی بس بس تیری عزت و کرم کا واسطہ (رحم فرما) اور جنت کا کچھ حصہ (سب مومنوں کے داخلہ کے بعد بھی) باقی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو آباد کرنے کے لئے کسی اور مخلوق کو پیدا کرے گا۔

حضرت ابی بن کعب راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جہنم مزید (خوراک) کی طلبگار رہے گی۔ آخر جبار اس کے اندر اپنا قدم رکھ دے گا [illegible]

کر اُٹھے گی اور اس کے بعض حصے بعض کی طرف سمٹ جائیں گے (اور وہ تنگ ہو جائیگی)۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (اس لئے) اللہ کے دشمنوں کو جب دوزخ میں ڈالا جائے گا اور ہر گروہ اس کے اندر گھستا چلا جائے گا (اور اس کا پیٹ نہ بھرے گا) اور کسی حیثیت سے اس کی پُری نہ ہوگی تو وہ کہے گی تو نے کیا قسم نہیں کھائی تھی کہ مجھے بھر دے گا۔ (اب میری پوری خوراک عطا کر) اس وقت اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم رکھ دے گا اور فرمائے گا اب تو بھر گئی۔ دوزخ کہے گی۔ بس بس اب مزید گنجائش نہیں۔

بیضاوی نے اس سارے سوال جواب کو حامی قرار دیا ہے اور مجاز پر محمول کر کے مختلف توجیہات کی ہیں، مثلاً دوزخ کی وسعت کی تصویر مقصود ہے کہ کسی چیز سے نہیں بھرے گی۔ دوزخ کی شدت حدت اور لپٹ اور گناہگاروں کو اپنی گرفت میں لینا اور پھر بھی شور کرنا گویا مزید خوراک طلب ہوگی لیکن اس فقیر کی نظر میں ان بے کیف اور بے مغز توجیہات کی ضرورت نہیں۔ سوال جواب یقیناً قولی ہوگا اور آیت کا حقیقی مفہوم ہی مراد ہے جس کی تشریح میں نے تمہیدی مقالہ میں کر دی ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں قولی شہادت دیں گے۔ دوزخ بھی اپنی زبان سے بولے گی۔ ہر ذرّہ اس وقت بھی شعور و احساس کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہے، لیکن ہمارے پاس اس وقت گوشِ حقیقت نیوش نہیں کہ سن سکیں۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ۔ اور جنّت تقوے والوں کے بالکل قریب لے آئی جائے گی۔ یعنی شرک و کفر سے بچنے والوں کے سامنے لے آئی جائے گی۔ اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ مومنوں کو جنت کے قریب پہنچا دیا جائے گا اور جنّت ان کے قریب ہی نظر آئے گی یا واقعی بُعدِ مسافت کو ختم کر دیا جائے گا اور وہ دوری جو اس دنیا میں اہلِ ایمان اور جنّت کے درمیان ہے اٹھا دی جائے گی جب یہ دنیوی مادّی کثیف پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو جنّت نظر کے سامنے آہی جائے گی۔

جنّت اللہ کی مجسّم رحمت ہے اور رحمتِ خداوندی یہاں بھی نیکوکاروں کے قریب ہی ہے لیکن ضعفِ بصیرت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ قیامت کے دن جب ہر مومن کی بصیرت تیز ہو جائے گی تو جنّت سامنے نظر آنے لگے گی۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ۔ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ۔ یہ ہے وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو رجوع ہونے والا پابندی کرنے والا ہو۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے بے دیکھے ڈرتا ہو اور رجوع ہونے والا دل لیکر آئیگا۔

اَوَّاب یعنی ہر چیز سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا یا معاصی کو چھوڑ کر طاعت کی طرف لوٹنے والا۔ سعید بن مسیب نے کہا۔ اس سے مراد وہ گناہگار ہے جو گناہ کے بعد توبہ کر لیتا ہے شعبی اور مجاہد نے کہا وہ گناہگار مراد ہے جو تنہائی میں گناہوں کو یاد رکھتا ہے اور ان سے استغفار کرتا ہے۔ ضحاک نے کہا آوّاب بمعنی توّاب ہے۔ بہت زیادہ توبہ کرنے والا۔ حضرت ابن عباس اور عطاء کے نزدیک آوّاب سے مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے والا (تادیب کا معنی ہے سبحان اللہ پڑھنا)

ایک اور آیت میں آیا ہے۔ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ۔ اے پہاڑو اور پرندو! داؤد کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ قتادہ نے کہا۔ نماز پڑھنے والا مراد ہے۔

حَفِيْظٍ۔ حاضر القلب لمحہ بھر اللہ تعالیٰ سے غفلت نہ کرنے والا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اللہ کے احکام کا پابند۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے۔ حفیظ وہ جو اپنے گناہوں کو یاد رکھتا ہے کہ ان سے توبہ کرے بمقصد یہ کہ وہ گناہوں کو سہل سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتا۔ قتادہ نے کہا حفیظ وہ شخص ہے جو اللہ کے حقوق کی نگہداشت کرے کسی حق کو ضائع نہ ہونے دے۔ ضحاک نے کہا اپنے نفس کی نگرانی رکھنے والا (کہ اس سے گناہ کا صدور نہ ہو جائے) سہیل بن عبداللہ نے کہا طاعت کی حفاظت رکھنے والا حفیظ ہے شعبی نے حفیظ کا مرادی ترجمہ کیا ہے مراقب۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ اللہ یا اللہ کا عذاب اس کی نظر کے سامنے نہیں مطلب یہ کہ دنیوی زندگی میں اللہ سے یا اس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

ضحاک، سدی اور حسن کے نزدیک الغیب سے مراد ہے خلوت یعنی (دکھاوٹ کے لئے نہیں بلکہ) خلوت میں اللہ سے ڈرتا ہے۔

وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ - منیب اخلاص والا۔ خلوص کے ساتھ طاعت کی طرف متوجہ ہونے والا۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ - یعنی اُن سے کہا جائے گا کہ سلامتی و عافیت اور عذاب و افکار سے آزاد ہو کر اور زوالِ عیش کے خطرہ سے بے غم رہ کر جنت میں داخل ہو۔ آئندہ نہ تم کو زوالِ نعمت و راحت کا غم ہو گا، نہ عذاب کا خوف۔

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ - یعنی جس وقت ان کا جنت میں داخلہ ہو گا وہ وقت وہی ہو گا جس میں ہمیشہ جنت میں رہنے کا حکم اُن کو مل جائے گا۔

شیخین نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جنتی دوزخ میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ایک منادی دونوں گروہوں کے بیچ میں کھڑا ہو کر منادی کرے گا۔ اے دوزخ والو! (آئندہ) موت نہیں اے اہلِ جنت (آئندہ) مرنا نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ رہے گا۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے اے جنت والو! (تمہارے لئے جنت کے اندر) ہمیشگی ہے، موت نہیں۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ - جو کچھ وہ چاہیں گے جنت کے اندر وہ سب اُن کو ملے گا اور اللہ کے ہاں بھی اور نعمت بھی حاصل ہو گی۔

یعنی ایسی نعمتیں ملیں گی جو کسی آنکھ نے کبھی دیکھی ہوں گی، نہ کسی کان نے سنی ہوں گی نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہو گا۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو ادنیٰ ترین خواہش جنت رکھتا ہے اس سے اللہ فرمائے گا اپنی تمنا دل میں پیدا کر وہ اپنی خواہش دل میں پیدا کرے گا اور اللہ فرمائے گا کیا تو نے (دل میں) تمنا پیدا کر لی۔ بندہ عرض کرے گا جی ہاں، اللہ فرمائے گا جو تو نے (دل میں) تمنا کی ہے وہ تجھے دیدی گئی اور اتنا ہی اور بھی دے دیا گیا۔

حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول کریم نے ایک طویل حدیث کے ذیل میں فرمایا اللہ فرمائے گا میں اپنے بندوں کو وعدہ دے چکا ہوں کہ جس شخص کو جنت میں داخل کروں گا اس کو جنت کے اندر وہ تمام نعمتیں دیدوں گا جن کی ان کو خواہش ہو گی۔ اب تم کو وہ تمام چیزیں دے دی گئیں جو تم مانگو اور اتنی ہی اور بھی۔

حضرت جابر اور حضرت انس کا قول ہے کہ مزید سے مراد ہے دیدارِ خداوندی۔

مسلم اور ابن ماجہ نے حضرت صہیب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ ان سے فرمائے گا۔ کیا تم کچھ اور چاہتے ہو۔ جنتی عرض کریں گے تو نے ہمارے چہروں کو نورانی کر دیا جنت میں داخل فرما دیا اور دوزخ سے بچا لیا۔ اب ہم اور کیا درخواست کریں۔ فوراً اللہ (اپنے چہرہ سے) حجاب اُٹھا دے گا۔ یہ نعمت ایسی ہو گی کہ اس سے زیادہ محبوب اور کوئی نعمت ان کو نہیں دی گئی ہو گی۔ ایک نظر اپنے رب کی طرف اٹھانا ان کو ہر نعمت سے زیادہ محبوب ہو گا۔ یہ فرمانے کے بعد حضورؐ نے آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ تلاوت فرمائی۔

ابن خزیمہ اور ابن مردویہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت کعب بن عجرہ اور حضرت ابی کعب کی روایت سے نیز ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے حضرت انسؓ کی روایت سے اور ابوالشیخ نے حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت حذیفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے صحابہؓ کرام کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ ایک منادی مقرر فرما دے گا۔ منادی کی آواز تمام لوگ اول سے آخر تک سنیں گے وہ ندا دے گا۔ اے اہلِ جنت اللہ نے تم سے اچھی جزا کا اور (اس سے) زیادہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اچھی جزا تو جنت ہے اور مزید نعمت رحمٰن کا دیدار ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان قیامت کے دن اللہ دوزخ سے خطاب فرمائے گا اور دوزخ جواب دے گی۔ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دوزخ کا پیٹ کسی چیز کے داخل ہونے سے نہیں بھرے گا وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مزید خوراک کی طلبگار ہو گی۔

لفظ اُزْلِفَتْ بتا رہا ہے کہ جنت متقیوں کے بالکل قریب لے آئی جائے گی۔ اب جو مخلص مومنوں کا جنت سے غیر محدود فاصلہ ہے وہ قرب سے بدل جائے گا۔

لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ... مُّنِيْبٍ تک اہلِ جنت کے اوصاف کا ذکر کیا ہے جو جنت کے اندر داخلہ کے اسباب ہیں، ہر چیز سے تعلقِ خاطر توڑ کر اللہ سے رشتہ

جوڑنا گناہوں سے منہ موڑنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا لمحہ بھر یاد خدا سے غفلت نہ کرنا، ہر وقت اللہ سے لو لگائے رکھنا خلوت میں بھی اللہ کا خوف دل میں جائے رکھنا اور خلوص قلب کے ساتھ طاعت الٰہی کی طرف توجہ کرنا یہ اوصاف جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں اور انہی اوصاف والوں سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ۔ بتا رہا ہے کہ اہل جنت کا جنت میں اور دوزخیوں کا دوزخ میں داخلہ عارضی نہ ہوگا لازوال ہوگا داخل ہونے کے بعد باہر نہیں نکالا جائیگا۔ اس سارے بیان میں مومنوں کو اوصاف مذکورہ حاصل کرنے کی ترغیب ہے۔ اور کافروں کو دوزخ سے ترہیب ہے۔ ایک کے لئے وعدہ ہے دوسرے کے لئے وعید ہے۔

مَزِيْدٌ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ جنت کے اندر آدمی جو خواہش کرے گا وہ تو پوری کی ہی جائے گی اس کے علاوہ کچھ نعمتیں ایسی بھی ہوں گی جو بغیر استحقاق کے اور بلا تصور و خیال کے محض اللہ کی طرف سے ملیں گی۔ وغیرہ

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ

اور ہم ان (اہل مکہ) سے پہلے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو قوت میں ان سے (کہیں) زیادہ تھے تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (لیکن) جب ہمارا عذاب نازل

مَّحِيْصٍ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۝

ہوا تو (انکو) کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہ ملی اس میں اس شخص کیلئے بڑا عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو۔

تفسیر

زمانہ ایک ہے مستقبل ماضی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ماضی مستقبل کا ایلچی ہے۔ آغاز آفرینش سے مستقبل کے آخری کنارے تک قانون خیر و شر ضابطۂ قدرت اور انسانی فطرت ایک ہے مظاہر مختلف ہیں۔ حقیقت میں کوئی فرق نہیں، خزاں، بہار، سردی، گرمی، خشکی، تری، گرد و غبار سورج کا طلوع و غروب، شب و روز کا توارد روشنی اور تاریکی کا تبادل اور انسان کی سعادت و شقاوت کا معیار غیر متغیر ہے۔ نتائج کے اعتبار سے زندگی اور زہر تریاق کی جدا جدا اثر آفرینی ابتدائے عہد انسانیت سے آخری دور ہستی تک ایک جیسی ہے جو افکار و اعمال ماضی میں تباہی انگیز تھے۔ وہ ماضی کی طرح اب بھی برباد کن ہے اور آئندہ بھی ہلاکت آگیں رہیں گے اور جن عقائد و اطوار سے بیتے ہوئے زمانے میں فلاح انسانیت وابستہ رہی ہے وہی اب بھی موجب کامرانی ہیں اور مستقبل میں بھی انہی کے دامن سے انسانیت کی بہبودی آویختہ رہے گی۔ ماضی حال کا آئینہ ہے اور مستقبل ماضی کا پرتو لیکن اس کو سمجھنے کے لئے نورانی دماغ، روشن روح اور دانشمند دل کی ضرورت ہے۔ عبرت اندوز فہم رکھنے والے اس سے نصیحت پذیر ہو سکتے ہیں، اقوام گزشتہ کے عروج یا زوال آبادی یا بربادی کو دیکھ کر پڑھ کر سمجھ کر زندگی کا سبق پڑھنا اور نتیجہ اخذ کرنا انہی عقلمندوں کا کام ہے جو فہیم عمیق اور ذہن رسا رکھتے ہیں اور مبادی معلومہ کو ترتیب دیکر کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں یا خود فہم رسا اور عمیق تفکر کے مالک نہیں تو کم از کم اہل علم و دانش کی نہائش کو دل کی توجہ سے سنتے ہیں اور گوش ہوش وا کر دیتے ہیں، لیکن اگر روشن فکر کی جگہ دل میں تاریکی ہو اور گوشِ نصیحت نیوش بھی وا نہ ہو تو پھر سبق آموزی کی کوئی صورت نہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ۔ اور ہم ان (اہل مکہ) سے پہلے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں، جو قوت میں اُن سے کہیں زیادہ تھے اور تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (لیکن جب ہمارا عذاب نازل ہوا تو ان کو کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہیں ملی۔

اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً۔ ہر خود غلط مغرور جاہل آدمی اپنی جسمانی طاقت جتھے اور اعوان و انصار کی کثرت مال و دولت کی فراوانی اور عزت و اقتدار کی ہمہ گیری پر پھولا نہیں سماتا وہ خیال کرتا ہے کہ قوت جو مجھے حاصل ہے وہ کسی کو نہ اب حاصل ہے نہ کبھی میسر ہوئی۔ ہر جاہل قوم اسی زعم باطل میں مبتلا ہوتی ہے رسول اللہ کے زمانے کے اہل مکہ بھی اسی روگ کے روگی تھے۔ حضور کی دعوت کو ماننے سے ان کا کبر نفس اور قومی غرور مانع ہوا۔ قریش کعبہ کے متولی تھے مشرکین عرب

کی مذہبی سیادت ان کو حاصل تھی، قبائلِ عرب ان کا مذہبی احترام کرتے تھے۔ ان کی تجارت بھی آزاد تھی۔ ان کے تجارتی قافلوں سے کسی زمانے میں کسی جگہ کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ یمن اور شام کے درمیان تجارتی دَورے کرتے رہتے تھے۔ ہر قافلہ کا سفر ایامِ حرم کے علاوہ دوسرے ایام میں بھی پُرخطر تھا مگر قریش کی تجارت ہر جگہ ہر زمانہ میں مامون تھی، اسی لئے بعض قریشی کروڑپتی تھے۔ بیس بیس تیس تیس لاکھ درہموں کے مالک تھے۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی کسی سے کم نہ تھے اور حرم کے اندر اطمینان کو مزدوری کثرت بھی حاصل تھی۔ ان چیزوں نے ان کے سروں کو پندار کے نشہ میں بدمست کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وادیٔ قریٰ یمن اور مصر و شام میں کیسے پُرشکوہ باسطوت طاقتور سردار گزر گئے، کیسی پُرجلال باکمال تمدن کی چوٹی پر پہنچنے والی قومیں بیت گئیں جن کی تہذیب، مدنیت، تجارت، دولت، جسمانی عظمت و شوکت، بدنی طاقت اور جبروتی اقتدار و حکومت کے مقابلہ میں اہلِ مکہ تو کیا پورے عرب کی قبائلی قوت بھی ہیچ ہے۔ لیکن جب عاد نے ہودؑ کی، ثمود نے صالحؑ کی، سدوم والوں نے لوطؑ کی، اہلِ بابل نے ابراہیمؑ کی، اصحابِ مدین نے شعیبؑ کی اور قبطیوں نے موسیٰؑ کی ہدایت کی ہدایت سے روگردانی کی اور پیغمبرانِ وقت کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئے تو ان کا تختہ تاراج کر دیا گیا۔ روئے زمین پر سوائے فرسودہ بوسیدہ کھنڈروں کے نہ ان کے مضبوط قلعے باقی رہے نہ اونچے محل، نہ صنعت نہ تہذیب نہ حکومت نہ اقتدار۔ غیبی عذاب آیا سب کو مٹا گیا۔ کسی کو موقع قرار بھی نہ ملا۔ عاد و ثمود اور قومِ لوط و شعیب کے مٹے مٹے نقوش ہیں، جس کے پاس دلِ ہوشمند ہو پڑھ لے یا گوشِ ہوش ہوں تو ان کھنڈروں سے اُٹھتی ہوئی آوازوں کو سُن لے۔

نَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ۔ وہ ملکوں میں پھیل گئے تھے۔ تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے لیکن کہیں ان کو راہِ فرار نہ ملی، یا یہ مطلب ہے کہ گزشتہ اقوام کے پارینہ کھنڈروں میں قریش گھومتے پھرتے ہیں اُن کے آثار دیکھتے ہیں تو کیا ان کو ہلاک ہونے والی قوموں کے لئے عذابِ خداوندی سے بھاگنے کا کوئی مقام نظر آیا۔ پھر کیا وجہ کہ گزشتہ کافروں کی راہ پر چل کر یہ لوگ عذاب سے بچ سکیں گے۔

لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک قلب سے مراد عقل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک قلب سے مراد ہے بیدار دل حقائق پر غور کرنے والا۔ اہلِ تصوف کے نزدیک ایسا دل مراد ہے جو تمام کدورتوں سے صاف ہو۔ تجلیاتِ صفات کے عکس پذیری کی اس میں صلاحیت ہو، اللہ کے سوا کسی اور کا تصور اس میں جاگزین نہ ہو۔ ایک حدیث قدسی ہے۔ اللہ نے فرمایا میری سمائی نہ میرے آسمان میں ہے نہ میری زمین میں۔ ہاں مومن بندہ کے دل کے اندر میری سمائی ہے۔ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔ یا حضورِ قلب کے ساتھ کانوں کو سننے کے لئے متوجہ کیا یعنی یہ سورت یا بیان اس شخص کے لئے پیامِ نصیحت و درسِ عبرت ہے جو قلبِ سلیم رکھتا ہے۔ یا حضورِ قلب اور دل کی توجہ سے قرآن کو سنتا ہے۔ یا شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جو قرآن سنتا ہے اور اس کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔

مقصودِ بیان اقوامِ پارینہ کے نتائجِ اعمال ان لوگوں کے لئے سرمایۂ عبرت ہیں جن کا دل بیدار ہو، عقلِ سلیم ہو، باخلوصِ خاطر اور حضورِ قلب کے ساتھ پیامِ قرآنی کو سنتے ہوں یعنی دلِ بینا اور گوشِ شنوا نہ ہوں تو ہدایتِ قرآنی بھی سودمند نہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ

اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک

لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ

نہیں۔ سو اُن کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے (اور اسمیں نماز بھی داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً فجر کی نماز) اور

الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ

چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر و عصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (اس میں مغرب و عشاء آگئی) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی اور سن رکھو کہ جس دن ایک پکارنے والا پاس ہی

مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ۝ إِنَّا نَحْنُ

پکارے گا جس روز اس چیخنے کو بالیقین سب سن لیں گے یہ دن ہو گا (قبروں سے) نکلنے کا ہم ہی (اب بھی) جلاتے ہیں

نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ۝ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا

اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف پھر لوٹ کر آنا ہے جس روز زمین ان (مردوں) پر سے کھل جائیگی جبکہ وہ دوڑتے ہوں گے یہ ہمارے نزدیک ایک آسان

يَسِيرٌ ۝ نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ ۖ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝

جمع کرلینا ہے جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں ہم خوب جانتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنیوالے نہیں ہیں تو آپ قرآن کے ذریعہ سے ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہئیے جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔

ع ۳ / ۱۶ / ۱۷

تفسیر

یہ سارا جہان کس نے بنایا عالم بالا و پست کو نیستی سے ہستی میں کون لایا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کون ہے جس نے یہ آن گنت کرّے جو دیکھنے میں ہر جگہ ہمارے اوپر ہیں اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور اس نشیب و فراز کی درمیانی کائنات پیدا کی اور اپنے علمی اندازہ کے مطابق پیدا کی۔ اس سارے سنسار کی تخلیق اضطراری اور بے اختیاری نہیں جہالت پر مبنی نہیں، بلا منصوبہ نہیں، حقیقتِ امکانیہ اور اعیانِ کونیہ اس ظہورِ فعلی سے پہلے اگرچہ حدودِ زمان و مکان سے خارج تھے۔ نہ ان کا ثبوتِ زمانی تھا نہ آنی بلکہ مشیت اور ارادۂ خداوندی کا دوسرا نام ثبوت دایمان حقائق تھا لیکن عملی ظہور ترتیبی ہے، تدریجی ہے۔ علت و معلول کے ضابطہ کے تحت ہے۔ اسباب اور نتائج کی وابستگی کے زیر اثر ہے۔ پس اللہ کا امر و ارادہ اگرچہ غیر زمانی ہے بلکہ زمانہ کا وجود خود اس کا ممنونِ کرم ہے لیکن حسبِ مشیت اس دنیا کا فعلی ظہور تقدیم و تاخیر کے قانون کے زیر اثر ہے۔ چھ دن کے امتداد کے بقدر مدت اس کائنات کے اظہارِ وجودی میں صرف ہوئی ہے۔ حاصل یہ کہ اس جہان کی کونیت اور ثبوت آنی بھی نہیں صرف ارادۂ الٰہیہ کا نام ہی ثبوتِ ممکنات ہے لیکن عالمِ وجود میں یہ دنیا ترتیب زمانی۔ محدود وقت کی کسی آن میں آسمان بنائے گئے اور کسی آن میں زمین اور کسی میں سمندر، درخت، جانور، جنی ملائکہ اور خیر و شر اور۔ اور۔۔۔

اب قابلِ غور امر ہے کہ یہ مخلوق جس مادّہ سے بنائی گئی کیا اس مادّہ کی تخلیق میں کوئی نقص ہے یا جس نوع کی مخلوق کو جو جسمانی اور نوعی صورت دی گئی ہے اس میں کچھ عیب ہے کیا ہر نوع کی صورت نوعی فرائض کامل طور پر ادا نہیں کر رہی ہے۔ یا ہر نوع کا مادہ نوعی صورت کے عمل و اثر کو قبول کرنے سے قاصر رہتا ہے یا کوئی مخلوق اپنی تشخصی اور کائناتی غایت و غرض کو پورا کرنے میں رخنہ اندازی کر رہی ہے یا بنانے والے نے اس مخلوق کو بے جانے ناپ شناپ بے ضابطہ بنا دیا ہے اور اس کائنات کے درمیان کوئی ربط ضبط اور وابستگی نہیں کیا سب ایک ہی ضابطہ کے بندھن سے بندھی ہوئی نہیں، کیا اس کا مجموعی نظم اختلال پذیر ہے یا اس کا کوئی پرزہ بیکار ہے نافرمان اور سرکش ہے، نظمِ کائنات کے ضابطہ سے منہ موڑ رہا ہے۔ اگر ایسا کچھ بھی نہیں ہے تو اقرار کرو کہ عالم کو پیدا کرنے والا ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ اس کی پاکی کا اعتراف کرو۔ اس کو بے عیب جانو اور مانو۔

یوں تو مادہ کا ہر ذرّہ ہر آن تغیر پذیر ہے۔ شکل، رنگ، وضع، کیفیت، کمیت اور دوسرے عوارض کا ورود ہر آن ہر ذرّہ پر ہو رہا ہے لیکن اس زمین کے رہنے والوں پر دو نمایاں تغیر اس وقت آتے ہیں جب سورج دن بھر کی تمازت کے بعد بے نور ہو کر چھپنے لگتا ہے اور زمین کے مختلف قطعات پر تاریکی کا لشکر حملہ آور ہو جاتا ہے اور بالآخر اندھیرا آفتاب عالمتاب کو اپنی تاریک آغوش میں لے کر مختلف حصصِ ارضی کے رہنے والوں کی نظر سے چھپا لیتا ہے اور آدھی زمین پہ ظلمت کا پردہ پڑ جاتا ہے یا ہمہ گیر محیط گھپ تاریکی کو پھاڑ کر مشرق سے سورج کی جھلکتی چمکتی کرنیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ دنیا والوں کے لئے موت کے بعد زندگی کا پیام آجاتا ہے۔ یہ دو انقلاب نمایاں شکل میں سارے روئے زمین پہ آتے ہیں لیکن کیا ممکن کہ ذرّہ برابر اس طلوع و غروب کے نظام میں فرق آجائے اور ضابطۂ ربوبیت میں کہیں ادنیٰ انکشاف پیدا ہو جائے۔ قبل طلوع و غروب کے اوقات کے علاوہ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی سے بھی نورشانِ خلاقیت و ربوبیت جھلکتی ہے اور فنائے عالم کا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے اس لئے ان تمام اوقات میں حضورِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سبوحیت اور بے عیب ہونے کا اعتراف ضروری ہے۔

جب یہ سارا جہان ہر وقت تغیر پذیر ہے۔ تو ڈ پھوڑ کا عمل اس کے ہر ذرہ میں جاری اور ساری ہے اور ساری تخریب و تعمیر اللہ کر رہا ہے تو پھر کوئی ہونی سے منو دہ آواز جو سارے زندوں کو یکدم مردہ اور تمام مردوں کو آن کی آن میں زندہ کر دے گی۔ وہ آواز کہیں دُور سے نہیں آئے گی بلکہ ہر شخص کو اپنے پاس سے نکلتی ہوئی محسوس ہوگی۔ وہ آوازہ صور کی ہوگی جس کو سب سنیں گے۔ مُردے بھی سنیں گے اور جلد جلد دوڑے دوڑے زمین کا پردہ چاک کر کے باہر نکل کر پھیل جائیں گے۔ کیا یہ حشر اللہ کے لئے کچھ دشوار ہوگا کیا دنیا میں اللہ ہر آن ہر زندہ کو موت وحیات کا پیام نہیں دے رہا ہے۔ پھر یکدم تخریب و تعمیر اس کے لئے کونسی مشکل بات ہے۔ ابتدا ہی سے دستِ قدرت نے سب کو پیدا کیا اور وہی سب کو موت کی آغوش میں پہنچا رہا ہے اور اپنے پاس واپس بلا رہا ہے اور وہی سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اب جو وقوعِ قیامت کے منکر ہیں اور ظہورِ قیامت اُن کو نا ممکن نظر آتا ہے ان کو زبردستی ہدایت نہیں کر سکتے جبری ہدایت کرنا اختیارِ انسانی سے باہر ہے۔ ہاں قرآنی تذکیر سے نصیحت پذیر وہی ہوگا جو اللہ کے عذاب پر یقین رکھتا اور ڈرتا ہے وغیرہ۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ اور ہم نے آسمان کو زمین کو اور ان دونوں کی درمیانی کائنات کو چھ روز میں پیدا کیا اور ہم کو کسی طرح کی تکان چھو بھی نہیں گئی۔

حاکم نے بروایت صحیح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ یہودیوں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر آسمان و زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا۔ حضور نے فرمایا اللہ نے زمین کو اتوار کے دن پیدا کیا۔ سمندروں کو پیر کے دن، پہاڑوں کو منگل کے دن اور اسی دن پہاڑوں کی تمام معدنی چیزوں کو اور بدھ کے دن درختوں کو، پانی کو، آبادیوں کو اور ویرانوں کو، جمعرات کے دن آسمانوں کو اور جمعہ کے دن ستاروں کو، سورج چاند اور ملائکہ کو تین ساعت رہے تک۔ باقی تین پچھلی ساعتوں میں سے پہلی ساعت میں ہر مرنے والے کی موت کو اور دوسری ساعت میں انسان کو فائدہ پہنچانے والی چیزوں کو اور تیسری ساعت میں آدم کو پیدا کیا اور جنت میں رکھا اور ابلیس کو سجدۂ آدم کا حکم دیا اور آخر میں آدم کو جنت سے نکال دیا۔ یہودیوں نے کہا۔ محمدؐ پھر کیا ہوا؟ حضور نے ارشاد فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ عرش (اقتدار) پر متمکن ہو گیا۔ یہودی بولے آپ نے بیان تو ٹھیک کیا لیکن ناقص بیان کیا) پورا بیان کرتے تو اچھا ہوتا پھر خود ہی بولے۔ اس کے بعد اللہ نے آرام کیا[1] (یعنی کائنات کو پیدا کرنے سے اس کو تکان ہو گئی تھی آرام کر کے اس کو دور کیا) حضور یہودیوں کی اس گستاخی پر سخت غصہ آیا اور آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آسمان و زمین کی تخلیق والی پوری حدیث بالفاظ ذیل نقل کی ہے۔ اس میں نہ ہی یہودیوں کے سوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ نہ آیت مذکورہ کے نزول کا سبب اس واقعہ کو قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے رسول اللہؐ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے سنیچر کے دن خاک (زمین) کو پیدا کیا اور اتوار کے دن پہاڑوں کو۔ اور پیر کے دن درختوں کو اور منگل کے دن مصائب کو اور بدھ کے دن نور کو اور جمعرات کے دن جانوروں کو زمین پر پھیلایا اور جمعہ کے دن عصر کے بعد دن کی آخری گھڑی میں رات تک آدم کو پیدا کیا۔ اس حدیث میں سنیچر کے دن کو آغازِ تخلیق کا دن قرار دیا گیا ہے اور یہ کسی راوی کی چوک ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش اتوار کے دن سے ہوئی اور جمعہ کے دن تخلیقِ کائنات ختم ہو گئی۔ آیت میں سِتَّةِ اَيَّامٍ کا لفظ مدتِ تخلیق چھ دن کو قرار دے رہا ہے۔ ساتواں دن سنیچر کا ہے جو ہر تخلیق سے خالی ہے۔

لیکن خالی ہونے کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس جہان کو پیدا کرنے کی وجہ سے تھک گیا تھا اور اس نے ساتویں دن آرام کیا۔

مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ اور آیت لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ میں صاف صراحت کر دی گئی کہ اللہ رب العزت تھک نہیں گیا تھا اس کو تکان نے مس بھی نہیں کیا تھا۔

بعض دوسری صحیح احادیث میں آیا ہے کہ زمین و آسمان اور جن و ملائکہ کی پیدائش سے بہت مدت بعد آدم کو پیدا کیا گیا پہلے اس زمین پر جنات آباد تھے اور ابلیس کی رسائی دنیوی آسمان اور جنت میں تھی۔ وہ کبھی اللہ کی عبادت زمین پر کرتا تھا کبھی آسمان پر کبھی جنت کے اندر پھر آیت هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح پھونکنے سے پہلے مٹی سے بنا ہوا آدم

---

[1] یہودیوں کا یہ عقیدہ توریت کی کتاب الخروج باب نمبر ۲۰ درس نمبر ۱۱ میں مذکور ہے۔

اِسْتَمِعْ ۔ سنو گرش ہوش سے سنو۔ یہ ہر شخص کو خطاب ہے۔ اگرچہ مخاطب اول رسول اللہ تھے۔ اس دن کی کیفیت کا تذکرہ سنو۔

يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ جس روز کہ ایک منادی (ندا کرنے والا عجیب شان کے ساتھ) ندا دیگا جو ہر شخص کو اپنے پاس سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوگی۔ یہ منقول ہے کہ پکارنے والے اسرافیل ہوں گے۔ اسرافیل پکاریں گے۔ اے بوسیدہ ہڈیو! اے وہ جوڑو جو الگ الگ ہو گئے ہو، اے پارہ پارہ گوشت! اے پراگندہ بالو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ فیصلۂ خداوندی کے لئے سب باہم جڑ جاؤ۔

ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ اسرافیل بیت المقدس کے صخرہ پر کھڑے ہو کر پکاریں گے۔ اے ریزہ ریزہ بوسیدہ ہڈیو! اے پارہ پارہ کھالو! اے ٹوٹے ہوئے بالو! تم کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ فیصلۂ خداوندی کے لئے باہم مل جاؤ۔

يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۔ اس چیز کو سب مردے سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذرے میں ایک خاص قسم کی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ہر چیز باشعور، حساس اور اپنے خالق کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اگرچہ اس کی زندگی کو ہم نہیں سمجھتے ہیں، اس کی آواز کو نہیں سنتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ مادی ہر ذرہ کی ایک خاص نوعی زندگی ہے، سمجھ ہے، زبان ہے، کان ہیں۔ پس اللہ کے منادی کی آواز ہر ذرۂ خاکی، قطرۂ آبی، شعاعِ ناری اور دم ہوائی اپنے قریب ہی سن لے گا اور سب دوڑ کر جمع ہو کر جسم بن کر اصلی ساخت اور ہیئت پر آجائیں گے اور ہر مردہ زندہ ہو کر قبر سے نکل آئے گا۔

قرطبی نے بیان کیا ہے کہ زندہ کرنے والی صور کی یہ آواز لمبی ہوگی۔ اس میں امتداد ہوگا (آنی اور لمحاتی نہ ہوگی) آواز کا ابتدائی حصہ تو (ہر ذرہ جسم کو اور پھر ہر مردہ کو زندگی عطا کرنے کے لئے ہوگا جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے اور آواز کا آخری حصہ زندوں کو قبروں سے باہر نکل آنے کے حکم کے لئے ہوگا۔ پس آواز کے ابتدائی حصہ کو تو مردہ اجسام (اور اجسام کے بے جان ذرات) نہیں سنیں گے اور جب زندہ ہو جائیں گے تو قبروں سے باہر نکلنے کے حکم کو سن لیں گے۔ علامہ سیوطی نے کہا کہ صور کے اندر تمام ارواح بھری ہوں گی اس لئے ابتدائی آواز کو ہی وہ سن لیں گی۔

قرطبی کا قول اس فقیر کی نظر میں غلط ہے۔ اس قول کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قرطبی حکماء یونان کی تقلید میں شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ زندگی نام ہے روح کے بدن کے ساتھ تعلق کا اور ذرات خاکی مردہ ہیں ان میں روح نہیں ہے، ان میں شعور و احساس ہے نہ حرکت ارادی نہ قوت سماعت۔ پھر اسرافیل کی آواز کو کون سنے گا۔ سننے کے لئے زندہ ہونا ضروری ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی اسی نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے ایک ضعیف ترین تاویل کی اور سننے والا قرار دیا۔

مقامِ غور ہے کہ اگر خاکی ذرات، آبی قطرات، ناری لمعات اور ہوائی امواج میں شعور و حیات نہیں تو کون سنے گا اور مشرق و مغرب بلکہ ہر جہت سے جسم کے منتشر عنصری اجزا کس طرح دوڑ کر جمع ہوں گے۔ اسلامی اور قرآنی نظریہ کے لحاظ سے ہر ذرۂ کائنات ذی شعور ہے، زندہ ہے، حرکت ارادیہ رکھتا ہے۔ طبعی یعنی غیر ارادی حرکت کا (سوائے ارسطو کی خرافات کے) کہیں وجود نہیں۔ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ ۔ ہر چیز اللہ کی تسبیح اور حمد و ثنا (اپنی نوعی زبان سے) کرتی ہے لیکن ہم ان کی نوعی زبان سے واقف نہیں اس لئے اس کی حمد و ثنا کی آواز کو نہ سنتے ہیں اور نہ کچھ سمجھتے ہیں۔ ہر ذرہ کی نوعی حیات اور لوازم و کیفیات حیات جدا جدا ہیں۔

لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ کا اور معنی ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اگر تسبیح مقالی مراد نہ ہو اور تسبیح حالی مراد ہو جیسے ہمارے اکثر علماء نے بیان کیا ہے امام رازی نے بھی لکھا ہے اور صراحت کی ہے کہ ہر چیز مصنوع اور مخلوق ہے اور اپنے صانع و خالق کا بے عیب و بے نقص ہونا ظاہر کر رہی ہے۔ ہر چیز کی تسبیح سے تو ظاہر ہے کہ مصنوع کی صانع پر، مخلوق کی خالق پر اور اثر کی مؤثر پر دلالت تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ پھر لفظی تفقہ کا کیا معنی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس تسبیحِ کائنات کا ہم کو علم نہیں وہ ہر فتنہ کی زبان نوعی سے ادا ہو رہی ہے اور اس زبان کے الفاظ و اصطلاحات سے ہم ناواقف ہیں پس قیامت کے دن جب اسرافیل صور پھونکیں گے تو یقیناً اس کی آواز اور حکم ہر ذرہ سنے گا کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

علامہ بیضاوی بھی اسی دور میں تھے جب یونانی بلکہ ارسطو کا فلسفہ مسلمان علماء کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے صورِ اسرافیل سے نکلنے والی آواز کو امر تکوینی کے مشابہ قرار دیا جس کو سننا ضروری نہیں، (یعنی مامور کے اختیار کی ضرورت نہیں، بے اختیار ذرات کو بھی تکوینی حکم دیا جا سکتا ہے جیسے اللہ نے معدوم کو لفظ کُن کہہ کر یعنی حکم دے کر موجود کر دیا) بیضاوی نے اسی آیت کے آخری فقرہ پر غور نہیں کیا۔ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ سے تو یقیناً ثابت ہو رہا ہے کہ جو تکوینی حکم دیا جائے گا وہ آواز کو یقیناً سنیں گے۔ واللہ اعلم

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ۔ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۔ ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی (لوٹ کر) آنا ہے (اللہ ہم ہی سب کو اٹھائیں گے) جس روز کہ زمین پھٹ جائے گی اور اس سے سب آدمی جلدی جلدی نکل آئیں گے۔

زندہ کرنا روح و حیات جسم عنصری کو عطا کرنا اور مضغہ بے جان کو جاندار بنا دینا اللہ کا کام ہے۔ پھر وقت مقررہ تک زندہ رکھنا بھی اور اس کے بعد جسم سے روح کا تعلق کاٹ دینا اور سبب زندگی کو واپس لے لینا بھی اسی کے اختیار میں ہے گویا زندگی کی پیدائش، بقا، سلب حیات اور روح کو جسم سے منتقل کرکے اپنی طرف بلا لینا سب اسی کے کام ہیں تو زمین کو پھاڑ کر ذرات کو جمع کرکے دوبارہ زندگی عطا کرنا اور قبروں سے برآمد کرنا اس کے لئے کیا دشوار ہے۔

ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ۔ یہ تو (فقط) قبروں سے اٹھانا ہے (عدم سے وجود میں لانا اور خالص نیستی سے ہستی کرنا نہیں ہے) جو اللہ رب العزت کیلئے آسان ہے بوجہ اس کے کمال قدرت اور احاطۂ علم کا عملی ثبوت ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہے تو حشر و قیامت کا انکار محض جہالت اور کج فہمی ہے۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔ تم سب کو پیدا کرنا اور پھر قیامت کے دن اٹھانا بس ایک شخص کے زندہ کرنے اور اٹھانے کی طرح ہے اللہ کے نزدیک اس میں نہ کچھ دشواری ہے نہ طول عمل۔ ایک شخص کو زندگی بخش دینا اور قبر سے اٹھنے کا حکم دینا اور سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور قبروں سے اٹھنے کا حکم دینا برابر ہے۔ طول عمل کسی میں نہیں۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ۔ جو کچھ (مکہ کے مشرک قرآن کی اور آپ کی تکذیب کے سلسلہ میں) کہتے ہیں ہم اس کو خوب جانتے ہیں (یعنی آپ کو اس سے دل شکستہ اور کبیدہ خاطر اور ناامید نہ ہونا چاہیے) آپ کا کام جبر کرنا نہیں (دلوں کو پلٹ دینا اور زبردستی قرآن کی صداقت اور نبوت کی حقانیت کو ذہنوں اور دماغوں میں بٹھا دینا اور دلوں میں جما دینا آپ کا کام نہیں) آپ کا کام قرآن پڑھ کر سنانا اور نصیحت کرنا ہے جس کا فائدہ صرف ان لوگوں کو پہنچے گا جو اللہ کی طرف سے عذاب تباہی کی وعید سے ڈرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ نہ ماننے اور نافرمان ہونے کی سزا اللہ کی طرف سے ضرور ملے گی۔ جو ایمان ہی نہیں رکھتا جس کو آخرت کا یقین ہی نہیں اس کیلئے ہر نصیحت بیکار ہے۔

مقصودِ بیان

تخلیق کائنات کو پیش کرکے حیات بعد الموت اور وجود قیامت کے محال نہ ہونے پر استدلال۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ میں نفی عجز و ضعف کی صراحت اور یہود کے عقیدۂ استراحت کی تردید اور مزید اس بات کی طرف اشارہ کہ اللہ کا فعل طول مدت کا محتاج نہیں۔ نہ اس کے فعل میں مادیت کے افعال کی خصوصیات ہیں۔ کفار کی زبان درازی اور دلکو اس پر صبر کرنے کی تلقین اور سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ سے فَسَبِّحْهُ تک بقول حضرت ابن عباس پانچوں وقت کی نماز کا حکم اور بقول مجاہد فَسَبِّحْهُ سے نوافل مستحب ادا کرنے کا اور سبحان اللہ کو تخصیصی حکم اور ادبار السجود کے لفظ سے ہر فرض نماز کے بعد سبحان اللہ پڑھنے کا مستحب حکم۔

مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ ہر شخص کو ندائے اسرافیل اور صدائے صور اپنے پاس ہی محسوس ہوگی یعنی آواز نہ آسمان کی طرف سے آئے گی نہ زمین کے اندر سے بلکہ ہر جہتی ہوگی۔ یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ باوجود بے جان ہونے کے مردے بھی صور کی آواز کو سنیں گے۔ یعنی ادراکی شعور ہر شخص میں ہونا چاہیے ان لوگوں کو سننے کے لئے حیات حیوانی کی شرط لگاتے ہیں ان کو آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ صور کی آواز مردوں کو سنائے گا۔

حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ۔ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کا فعل زمانی نہیں۔ زمانہ اور قدرت کا محتاج نہیں کہ دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اس کو لاکھوں، ہزاروں برس درکار ہوں گے بلکہ اس کے لئے سب کو زندہ کرکے اٹھا دینا آسان ہے ایکدم اٹھا دیگا۔ وغیرہ

سُوْرَةُ الذّٰرِیٰتِ مَكِّیَّةٌ وَهِیَ سِتُّوْنَ اٰیَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

یہ سورت بھی حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کے قول کے مطابق مکی ہے اس میں ساٹھ آیات اور تین رکوع ہیں۔ ۳۶۰ کلمات اور ۱۵۵۹ حروف ہیں۔

ابوموسیٰ کے پاس آیا اور سچی قسمیں کھاکر کہا کہ اب میرے خیالات کی پوری اصلاح ہوچکی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ نے بارگاہِ خلافت کو اس کی اطلاع دی اور یہ بھی ظاہر کیا میرے خیال میں اب اس کا عقیدہ درست ہوگیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی اور سابق حکم منسوخ کردیا۔ کچھ لوگ اس حدیث کو مرفوع کہتے ہیں مگر بزار کے نزدیک مرفوع ہونے کا قول غلط ہے بلکہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

شیخ ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، مجاہد، قتادہ، سری، حسن بصری اور سعید بن جبیر نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسم گرما کی تپتی اور جھلساتی ہوئی دھوپ سے جب ہر سبزہ اور پودا خشک ہوجاتا ہے سطح زمین پر نمی نام کو بھی باقی نہیں رہتی۔ ساری زمین تپنے لگتی ہے اس وقت (کبھی) ہوائیں خاک اڑاتی ہیں۔ اس کے بعد خشک ہواؤں کا زمانہ ختم ہوتے ہی سمندروں اور دریاؤں سے بخارات اٹھتے ہیں اور کچھ بلندی پر پہنچ کر گھٹا کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں بادل اور بوجھل دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ان کے اندر پانی کا بوجھ ہوتا ہے پھر یہ پانی کے قطرات کی شکل میں نیچے گرتے ہیں۔ ندی نالے بھر پور ہوجاتے ہیں، دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے، سیلاب چڑھ آتے ہیں، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دریاؤں میں کشتیاں اور سمندروں میں جہاز ہواؤں کی تندی اور پانی کے اچھال وابال کی وجہ سے تیز رفتاری چھوڑ کر سبک خرام ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف عالم بالا میں غیبی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اندرونی ڈیوٹیوں پر مامور فرشتے ہر حصۂ زمین کو قطراتِ بارش کی تقسیم کرتے ہیں، بادلوں کو ہنکاتے ہواؤں کو چلاتے گھماتے اور برق و رعد کو چمکاتے گرجاتے ہیں۔ پس قسم ہے خاک اڑاتی ہواؤں کی پانی سے بھرے بادلوں کی، سبک خرام کشتیوں اور جہازوں کی، بارش پر مامور تقسیم کرنیوالے غیبی فرشتوں کی کہ قیامت ضرور آئیگی۔ جو خدا مردہ زمین کو زندہ کرسکتا ہے، خاک اڑاتی ہواؤں کو سحاب آفریں اور بارش آگیں بناتا ہے اور خشک دریاؤں کو پانی سے لبریز کرتا اور ساکن سمندروں کو پُرشور کرکے دیو پیکر جہازوں اور پری تمثال کشتیوں کو نازک خرام ہوجانے پر مجبور کردیتا ہے اور غیبی ملائکہ کو اس عالم ہست و بود کو سطحِ وجود پر لانے اور پردۂ عدم کو چاک کرکے زندگی کو رونما کرنے کی خدمت سپرد کرتا ہے وہی خدا مُردوں کو قبروں سے زندہ کرکے اٹھائے گا اور باطن زمین سے معدوم کو نکال کر میدان میں موجود کردے گا۔

بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک چاروں الفاظ سے بحیثیت اوصاف کے لحاظ سے ہوائیں ہی مراد ہیں، ہوائیں ہی خاک اور دوسرے ارضی اجزاء کو اڑاتی پھر مانسون کو اٹھاکر پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کی شکل میں نمودار کرتی، پھر نرم نرم خوشگوار جھونکوں کا جامہ پہن کر ہلکے پھلکے طریقہ سے چلتی، پھر حکم کے مطابق بادلوں کو بانٹتی چھانٹتی اور بانٹ دیتی ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک چاروں سے ملائکہ مراد ہیں اور یہ اوصاف ملائکہ کے ہیں، یہ تمام تصرفات ملائکہ ہی کرتے ہیں یہاں تک کہ تقسیم بارش اور رزق بھی فرشتوں ہی سے وابستہ ہے۔ کسی نے کہا عورتیں مراد ہیں۔ عورتوں سے بچے پیدا ہوکر منتشر ہوتے ہیں۔ نطفے اور حمل کا بوجھ وہ اٹھاتی ہیں پھر تیز رفتار اور نرم چال آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ پھر بچوں کو دودھ پلانا اور حسبِ ضرورت و خواہش انکو غذا تقسیم کرنا بھی عورتوں کی ہی صفت ہے۔

کسی نے کہا سارے غیبی اسبابِ کائنات اور تمام ذرائع ظاہری مراد ہیں، جن کے وجود و عدم سے اللہ تعالیٰ نے نتائج کے ہونے یا نہ ہونے کو وابستہ کردیا ہے۔ اسباب و ذرائع میں ہوائیں بھی داخل ہیں اور سورج کی شعاعیں بھی، پانی کی رطوبت انگیزی بھی شامل ہے اور زمین کی نمو آفرینی بھی، ستاروں کا طلوع و غروب کا شعار بھی انہی میں ہے اور ملائکہ کا اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر لگا رہنا بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔

غرض قسم ہے سارے سلسلۂ اسباب و مسببات اور علل و نتائج کی یعنی اس کائنات کے سارے تصرفات گواہ ہیں۔ ضابطۂ عروج اور زوال اور قانونِ بقا و فنا گواہ ہے کہ کوئی نتیجہ بے سبب اور کوئی عمل بے نتیجہ نہیں اور کسی چیز کا عدم یا وجود محال نہیں۔ پس انسانی زندگی کے لمحات اور لمحاتِ زندگی کے افکار و اعمال کس طرح بے نتیجہ ہوسکتے ہیں اور کیونکر بے ثمر رہ سکتے ہیں۔ یقیناً جس حشر نشر اور انقلاب کامل کا تم کو پیام دیا جارہا ہے وہ ضرور ہوکر رہے گا اور جس سزا جزا اور اچھے برے کی تم کو اطلاع دی جارہی ہے وہ ضرور پیش آئے گی۔ اس میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے (لیکن مکمل ناگہانی انقلاب اور افکار و اطوار کے اچھے برے بدلے کا ایک دن اور ایک وقت مقرر ہے) مختلف جانداروں کی مدتِ زندگی مقرر ہے۔ نباتات و عنصریات کے اسبابِ آفرینش و بقا محدود ہیں۔ اسی طرح ان اسبابِ حیات و بقا کے کمزور ہونے کے اور مکمل فنا ہوجانے کا بھی ایک لمحہ متعین ہے۔ جب اسبابِ بقا کمزور ہوتے جاتے ہیں فنا کی طرف ہر موجود بڑھتا جاتا ہے۔ آخر ایک دن سارا وجود عدم سے بدل جائیگا۔ قطرۂ آب ہو یا ذرۂ ریگ یا درخت کی حقیر پتی ہو یا تھاہ سمندر یا ہزاروں میل اونچا کوہ ہمالیہ سب ہی فنا در آغوش اور عدم بردوش ہیں۔ یہاں تک کہ یہ محکم ترین، ہر چیز سے زیادہ مضبوط اور حسین آسمان گواہ ہیں۔ ان کے اندر روشن ستاروں کی گذرگاہیں گواہ ہیں۔ انکی غیبی طاقتوں کی قرارگاہیں اور سیرگاہیں گواہ ہیں، ان کے اندر سے پھیلی مارتی ہوئی شعاعیں گواہ ہیں اور انکی فضائے بسیط میں کہربائی موجیں گواہ ہیں کہ اے منکرین قیامت!

تم طرح اعتقادی پھوٹ میں پڑے ہوئے ہو۔ (کوئی کہتا ہے دوبارہ زندگی ناممکن ہے، کوئی کہتا ہے دوبارہ زندگی ہوگی یہ جسم بدل جائے گا روح ایک ہی ہوگی، کوئی کہتا ہے دوسری زندگی صرف روحانی ہوگی جسمانی زندگی لوٹ کر نہیں آئے گی، کوئی کہتا ہے کہاں کی جزا سزا اور مرنے کے بعد کیا دکھ سکھ یہ محض افسانے اور ڈراوے ہیں جو گیا وہ گیا معدوم ہوگیا کوئی کہتا ہے دکھ سکھ مرنے کے بعد ضرور ہوتا ہے علت العلل کا قرب سکھ ہے اور اس سے دوری عذاب ہے، کوئی بے مغز کہتا ہے روح مختلف چولے بدلتی اور بھٹکتی رہتی ہے اور یونہی نئے نئے لباسوں میں ہمیشہ نمودار ہوتی رہے گی۔ لباس کی تبدیلی ہی سکھ ہے اور یہی دکھ ہے۔)

اور اے منکرین نبوت تم بھی فکری اور قولی تفرقہ کا شکار ہو (جو پیغمبر برحق توحید کی طرف بلاتا ہے اور قیامت کو حق بتاتا ہے تم میں سے کوئی اس کو جادوگر کہتا ہے کوئی دیوانہ کوئی جن رسیدہ کوئی کاہن کوئی شاعر کوئی جھوٹا مفتری۔ رسول اللہ کے اندر عام انسانوں سے آگے بڑھ کر کسی معجز طاقت کا ظہور تو ناقابل انکار تھا کوئی بھی اس کے انکار کی مجال نہیں رکھتا تھا اس لئے حیران تھے کہ کہیں تو کیا کہیں، ذہنوں میں سلامت روی نہیں تھی، روحوں میں نظافت نہ تھی، عقلیں نورانیت سے محروم تھیں، روحانی اور ملکوتی طاقت کا مظاہرہ وہ بھی ایک انسان کی زبان سے اُن کے لئے ناقابل فہم تھا، نظر الجھی تھی تو صرف جہالت آگیں گردوپیش کی طرف اور ماحول میں غیر معمولی طاقت کے حامل یا شاعر نظر آتے تھے یا کاہن یا جن رسیدہ جاہل یا فرضی جادوگر، غرض خالص مادیت یا توہم کی حدود سے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا، اس لئے وہ حضور کو کوئی اسی قسم کا موہومی طاقت کا حامل اور شیطانی قوتوں کا مرکب سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ کوئی یقینی شہادت اُن کے پاس نہ تھی اور یقینی علم حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا، اس لئے کوئی قول متفق علیہ نہ تھا، کوئی جادوگر کہتا تھا تو کوئی کاہن، کوئی شاعر کہتا تھا تو کوئی جن رسیدہ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں، کسی قول پر قرار نہ تھا) تقدیر ازلی کے خلاف کون حرکت کر سکتا ہے، سورج کی شعاعوں کو پیدائشی نابینا کیسے دیکھ سکتا ہے جو ازل میں حق و ایمان سے رُخ گرداں بنا دیا گیا ہو۔ وہ اس دنیا میں آکر بھی اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر سے رُخ گرداں ہی رہے گا۔ ازلی اندھے اندھیرے میں اٹکل کے تیر چلاتے ہیں لیکن یہ اٹکلیں ان کو حق کا راستہ نہیں دکھا سکتیں۔ قیامت اور تفصیل قیامت کا علم وہم، شک، اور ظن سے حاصل نہیں ہو سکتا، نبوت، وحی اور کتاب الٰہی کی حقیقت کو باطن توہم پرست اٹکل بازوں کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ حقیقت میں یہ لوگ حقیقت کی طرف سے غافل ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ سچائی تک ان کے تاریک دماغوں کی رسائی نہیں۔ قیامت کے وقوع اور جزا سزا کی ضرورت کا ان کو یقین نہیں۔ بطور استہزا پوچھتے ہیں کہ اچھا قیامت کب آئے گی؟ سزا جزا کا دن کب ہوگا؟ ان بیوقوفوں کو اتنا ہوش نہیں کہ اس سوال کو حل کرنے سے فائدہ کیا۔ جب بھی قیامت بپا ہوگی ان کو تو ان کی بدفکری اور بداعمالی کی سزا ملنی ہی ہے۔ قریب مدت میں آجائے یا لاکھوں کروڑوں برسوں کے بعد مدت کے طول و قصر سے سزا میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر سزا جزا جلدی نہ ملی تو کیا کبھی نہ ملے گی۔ بہر حال ایک دن تو آئیگا کہ منکرین قیامت کو آگ کی بھٹی میں جھونکا جائے گا اور جس عذاب کے وہ فوری طلبگار تھے اسی عذاب میں مبتلا ہونا پڑیگا۔

تحلیلِ اجزاء

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا۔ چاروں الفاظ کی مکمل تشریح و تفسیر ہم نے تفسیری مقالہ میں کردی ہے۔ ان چاروں الفاظ سے کچھ بھی مراد ہو۔ حاصل یہ ہے کہ نیستی کے بطن سے ہستی اور ہستی کے بطن سے نیستی کا نمودار ہونا فطری قانون ہے۔ بگاڑ بناؤ، تغیر تبدل، اسباب و نتائج کی باہم وابستگی اور تسلسل ضابطۂ فطرت ہے۔ اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ دن رات کا یہ مشاہدہ ہے اور اس کی سچائی مبنی بر مشاہدہ ہے اور مشاہدہ مبنی بر صداقت۔ یہ تغیرات ہم کو راستہ دکھا رہے ہیں اس امر کی طرف کہ عالم کی کوئی حرکت نہ بے سبب ہے نہ بلا نتیجہ۔ پس انسانی عمل کی بھی ایک علت ہے اور اس کا کوئی نتیجہ ہے اس نتیجہ سے ہم آغوش ہونے کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے کیونکہ کسی بگاڑ کے بعد بناؤ ہونا اور عمل کے بعد ثمرہ پیدا ہونا ایک بدیہی امر ہے پس روز قیامت اور بدلہ کے دن کا آنا بھی لازم ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔ حُبُكٌ حَبِيكَةٌ یا حِبَاكٌ کی جمع ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے، مضبوط محکم بناوٹ والے، حبک الرمل، رمل کے حروف حبک السماء ستاروں کی رہگزر۔ بغوی نے حضرت ابن عباس، قتادہ اور عکرمہ کا قول نقل کیا ہے۔ ذات الحبک کا معنی ہے خوبصورت ہموار بناوٹ والا اگر بننے والے نے ٹھیک عمدہ کپڑا بنا ہو تو عرب بولتے ہیں۔ مَا اَحْسَنَ حُبُكَهٗ۔ اس کی بناوٹ کیسی خوبصورت ہے۔ سعید بن جبیر نے ترجمہ کیا ہے سجاوٹ والا۔ حسن نے کہا ستاروں سے آراستہ۔ مجاہد کا قول ہے مضبوط ساخت والا۔ مقاتل ضحاک اور کلبی نے کہا راستوں والا (ستاروں کی راہگزر اور ملائکہ کے نزول و عروج کا راستہ اس میں ہے) بیضاوی نے اسی قول کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راستوں سے مراد محسوس راستے ہیں یعنی ستاروں کی گزرگاہیں یا وہ عرفانی راستے مراد ہیں جن کو دیکھ کر اہل نظر کو عرفان حاصل ہوتا ہے یا خود ستارے مراد ہیں۔

إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ۔ خطاب کافروں کو ہے یا صرف کفارِ مکہ کو اور اختلاف سے مراد ہے حضورؐ کے متعلق ان کے اقوال کا اختلاف۔ کوئی ساحر، کوئی شاعر کوئی کاہن، کوئی سِن رسیدہ، کوئی کسی عجمی لوہار کا سکھایا ہوا کہتا تھا یا قرآن کریم کے بارے میں ان کا اختلاف مراد ہے کہ قرآن جادو ہے یا شاعری کا نتیجہ یا کہانت یا افسانہائے پارینہ کا مجموعہ، یا روزِ قیامت اور جزا سزا کی بابت ان کا اختلاف مراد ہے کوئی قیامت اور جزا سزا کا سرے سے منکر تھا۔ کوئی دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کرتا تھا کوئی کہتا تھا اگر قیامت کا دن بالفرض ہوا بھی تو جس طرح ہم یہاں عزت مند طاقتور مالدار اور سردار ہیں اس روز بھی ایسے ہی ہوں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ اختلاف سے مراد ہے رسول اللہ اور قرآن کے متعلق اختلاف۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف کافروں کو خطاب نہ ہو عام اہل مکہ کو خطاب ہو کیونکہ ان میں مومن بھی رہتے تھے اور کافر بھی، مومن تصدیق کرتے تھے اور کافر تکذیب، دونوں کے قول مختلف تھے۔

يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ یعنی اللہ کے علم ازلی میں جس کو رسولؐ اور قرآن پر ایمان لانے سے پھیر دیا گیا ہے وہی (خود یا کسی کے بہکانے سے) ایمان کی طرف سے پھرتا ہے۔

قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ يَسْأَلُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ۔ بے یقین اور بد یقین لوگ جہالت اور غفلت کے نشہ سے سرشار اور بطر نادانی اور انانیت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں حقانیت و صداقت کا ان کو یقین تو ہوتا ہی نہیں ہے حق کے مقابل وہ اپنے توہمات شک اور ظنی گمانوں کو لاتے اور محض اپنی اٹکل اور دماغ کے اختراع کردہ تخمین پر چلتے ہیں ایسے اٹکل والوں کو کبھی اللہ کی طرف سے ہدایت نہیں ملتی اور خود بھی راہِ راست ان کو سجھائی نہیں دیتی سو لامحالہ رحمت خداوندی سے دور رہتے ہیں۔ یہ بے یقین گروہ اہلِ حق کے اعلانِ حقانیت کا مذاق بناتا اور ٹھٹول کے طور پر کہتا ہے۔ اچھا بتاؤ یوم جزا سزا کب آئے گا۔ اس کے آنے میں کتنی مدت باقی ہے۔ ظاہر ہے یہ سوال استہزائیہ ہوتا ہے حق جوئی پر مبنی نہیں ہوتا کیونکہ ایسا سوال کرنے والے یوم جزا کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے۔ پھر ان کو کب اور کیسے کہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ (ابن الانباری کا قول ہے کہ اللہ کے کلام میں جب قُتِلَ آتا ہے تو اس سے مراد بددعا نہیں ہوتی بلکہ اظہارِ لعنت ہوتا ہے اور رحمت سے خارج ہو جانے کی اطلاع ہوتی ہے)

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ۔ یعنی جزا سزا کا دن وہ ہوگا جس روز آگ میں اُن کو جلایا اور عذاب دیا جائے گا اور اُن سے کہا جائے گا اب اس عذاب کا مزہ چکھو جس کو دنیا میں تم بطور استہزاء فی الفور طلب کیا کرتے تھے۔

نضر بن حارث نے کہا تھا۔ اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ۔ اے اللہ! اگر یہ جو محمدؐ پیش کر رہے ہیں تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے۔ نضر کا یہ کلام بطور استہزاء و تکذیب کے تھا۔

آیت میں سوال کا جواب نہیں دیا گیا اور یوم جزا سزا کی تعیینِ مدت نہیں کی گئی، کیونکہ سوال کا باعث جذبۂ حق طلبی نہ تھا بلکہ عذاب قیامت سے ڈرایا گیا اور تنبیہ کی گئی کہ قیامت جب بھی ہوگی تمہارے لئے عذاب ہی لائے گی۔ تم کو اپنی فکر کرنی چاہئے۔ قیامت کے جلد یا دیر میں آنے سے تمہارے عذاب میں فرق نہ آئے گا۔

مقصودِ بیان اسبابِ کائنات اور ان کے نتائج کی باہم وابستگی دکھا کر اور محسوس تغیراتِ عدم و وجود کی تصویر کشی کر کے وقوعِ قیامت اور جزا سزا کی صداقت پر استدلال۔ إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفارِ مکہ کا بھی کسی قول پر باہم اتفاق نہ تھا کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔

مَنْ أُفِكَ کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان سے اعراض وہی محرومانِ ازلی کرتے ہیں جن کا بے ایمان رہنا علم الٰہی میں پہلے سے مقدر ہو چکا ہے۔

قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ میں قیامت یا رسول اللہ کی ذات اقدس کے سلسلہ میں اٹکل چلانے والوں پر لعنت کی گئی ہے اس سے تنبیہ حاصل کرنی چاہئے۔ ان مدعیانِ علم و عقل کو جو اپنی ہمہ دانی کے دعوے میں اتنے غرق ہیں کہ روزِ قیامت، نبوت و رسالت اور وحی کے سلسلہ میں بھی اپنی تاریک عقلوں کے تیر چلاتے ہیں اور مافوق الطبیعت کو اپنے توہمات کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں ان کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ ؎ عنقا را بلند است آشیانہ

اٹکل بازیوں سے الٰہیاتی علوم حاصل نہیں ہوتے۔ حال پر مستقبل کو اور مرئی پر غیر مرئی کو قیاس کرنا بس قیاس ہی ہے غیر مفید، بے یقینی پیدا کرنے والا۔

أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ سے بطور استہزاء تعیینِ قیامت کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس فقرے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سوال کیا مبنی بر غفلت ہے جو لوگ بادۂ غفلت سے سرشار ہیں وہی ایسا سوال کرتے ہیں۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ

بے شک متقی لوگ بہشتوں میں اور چشموں میں ہوں گے (اللہ) ان کے رب نے ان کو جو (ثواب) عطا کیا ہوگا اس کو (خوشی خوشی) لے رہے

ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۝ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ

ہوں گے (اور کیوں نہ ہو) وہ لوگ اس کے قبل (دنیا میں) نیکوکار تھے وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور آخر شب میں استغفار

يَسْتَغْفِرُونَ ۝ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝

کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی کا حق تھا۔

تفسیر روزِ قیامت صرف سزا اور عذاب ہی کا دن نہیں بلکہ جزا اور ثواب کا بھی دن ہے۔ کافروں اور کافرانہ اعمال رکھنے والوں کو دُکھ ہوگا تو دوسری اور تقویٰ والوں کو سُکھ بھی ہوگا اور یہ جزا ہوگی ان کی صحت افکار و اطوار کی تعلق باللہ اور تعلق بالخلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کی جسمانی اور مالی عبادت کی روحانی جلا پیدا کرنے اور ضرورتمندوں کی معاشی مدد کرنے کی۔

اللہ تعالیٰ سے بندہ کا تعلق عبدیت کا ہے اور عبدیت کا اظہار کامل عابدیت سے ہوتا ہے جو بندہ اقرار بندگی کرنے کے باوجود معبود حقیقی کا پرستار کامل نہ ہو وہ بندہ فرمود ہے مگر نافرمان سرکش باغی پرستار ہے اور عابدیت کی شاخیں یوں تو چند در چند اور گوناگوں ہیں مگر نماز سے جو کامل عبدیت و پرستش کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ کسی اور شکل یا عبادت سے نہیں ہوتا اور نماز بھی وہ جو تخیل کی کامل یکسوئی کے ساتھ ہو۔ حضور سے پایۂ شہود تک پہنچانے والی ہو جو اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت اور تجلیات ربوبیت کو نظروں سے دکھا دینے والی ہو، جو ماسوا سے غافل کر کے مطالعۂ جمال قدسی میں غرق کر دینے والی ہو۔ جو استدلال و علم کسبی سے عین الیقین کے مرتبہ تک پہنچا دینے والی ہو۔ ایسی نماز کا وقت صرف رات کو ہی آسانی سے مل سکتا ہے جب سناٹا طاری ہوتا ہے اور اللہ کا پرستار سجدوں میں پڑا روتا ہے۔ چرند پرند درندے پرسکون نیندیں غرق ہوتے ہیں۔ اور زمین کے لئے انسان بھی آغوشِ خواب میں جا چکے ہیں جب بازاروں اور گلیوں میں ہنگامہ آبادی موت نما سکون سے بدل جاتی ہے اور ساری ہما ہمی تھک کر مردہ ہو جاتی ہے اس وقت اللہ کا بندہ میٹھی نیند اور راحت آفریں بستر کو چھوڑ کر اپنے معبود کے سامنے قیام پیرا ہوتا ہے۔ جھکتا ہے ایسا کہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کی کمر خمیدہ ہو گئی اور گرتا ہے محبت کے خیال چرنوں میں۔ ایسا کہ دیکھنے والا اگر دیکھ پائے تو سمجھے کہ یہ محبوب کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑ کر مر جائے گا اور سر نہیں اٹھائے گا۔ اس کا دل تڑپتا ہے روح پھڑکتی ہے، آنسو رواں ہوتے ہیں تنفس میں تپش ہوتی ہے۔ فراق کا ستایا ہوا محبوب کے دروازے پہ پڑا اور پکارا ہوتا ہے۔ زبان پہ تسبیح و تقدیس کے زمزمے ہوتے ہیں اور ہر سانس سے اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے رات کے بیشتر حصہ میں اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس ساری استغراقی کیفیت میں رات کا بڑا حصہ گزارنے کے بعد بھی اس میں غرور کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ عظمت و کبریائی اس کے محبوب کی چادر ہے وہ اس شب گزاری و اطاعت شعاری کو محبوب کا کرم و احسان سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اب بھی پورے طور پر مجھ سے حقِ عبدیت ادا نہیں ہوا کوئی نہ کوئی کوتاہی ضرور رہ گئی ہے اس لئے جونہی آسمان کے کنارے پہ پو پھٹتی ہے اور بطنِ شب سے نورِ فجر نمودار ہوتا ہے وہ شبینہ قصور کی معافی کا طلبگار ہوتا ہے۔ یہ تو تھی اس کے تعلق باللہ کی کیفیت اور عبدیت کی حقیقت۔ لیکن معبود سے اتنی والہانہ شیفتگی کے باوجود جب دن نکلتا ہے تب بھی وہ نشۂ اطاعت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے معبود نے اپنی جس جس مخلوق کے اس کے متعلق حقوق لگا دیئے ہیں، ان کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کے عاشقوں کا جتھہ بڑھتا رہے۔ کوئی شیطان کسی بندۂ خدا کو مال کا لالچ دے کر کہیں اپنی طرف نہ جھکا لے اس لئے وہ لوگوں کے احوال کی جستجو رکھتا ہے کہ کون حاجتمند بے نوا ہے اور کون بے کس نادار ضرورتمند پھر کوئی مانگے یا نہ مانگے وہ ہر ایک کی اپنے معبود کے حکم کے مطابق معاشی مدد کرتا ہے۔

تحلیل اجزاء ۔ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۔ عیون سے مراد ہیں جاری نہریں بہتے دریا۔

آیات مذکورۂ بالا میں منکرین قرآن و قیامت کے عذاب کو بیان کیا تھا۔ اس آیت میں مومنوں کے ثواب کو ظاہر فرمایا۔ تبلیغ کے دو اہم جز ہیں۔ نافرمانی کے برے نتیجہ سے خوف دلانا اور فرماں پذیری کے خوش آئند نتیجہ کا امیدوار کرنا، ترہیب و ترغیب سے جذبات میں خوف یا شوق پیدا ہوتا ہے۔ سادہ عقل والے کم ہیں۔ ان کے لئے دعوتِ فہم و غور متعدد آیات میں دی گئی ہے۔ آئندہ آیات وَفِي الْأَرْضِ اور وَفِيٓ أَنفُسِكُمْ اور وَفِي السَّمَآءِ اور گزشتہ آیات وَالذّٰرِيٰتِ الخ میں اہل بصیرت و دانش کے لئے مطالعہ و نظر کی دعوت ہے اور عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ اور فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ میں عام دماغوں کے لئے وعید و وعدہ ہے۔

اٰخِذِينَ مَآ اٰتٰىهُمْ سے یہ مراد ہے کہ جو عزت و نعمت جنت کے اندر ان کو عطا کی جائے گی وہ ایسی ہوگی کہ اہل جنت اس کو خوشی سے لیں گے کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو ان کی ناخوشی کا باعث ہو۔

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِينَ۔ یعنی دنیا میں ان کا ہر عمل خیر ایک حسن رکھتا تھا، لوجہ اللہ ہوتا تھا، اخلاص قلب کے ساتھ ہوتا تھا۔

احسان کیا ہے؟ ہر عمل خیر کی روح محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے نیک کام کرنا اللہ کو حاضر ناظر جانتے ہوئے کرنا احسان فی العمل کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) عبادت میں احسان (۲) مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں احسان، عبادات کی چوٹی نماز ہے اور معاملات میں سب سے اہم مالی امداد۔ دونوں کا ذکر آئندہ آیات میں کیا گیا۔

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ۔ وہ رات کو کم سویا کرتے تھے۔ ہجوع کا معنی ہے رات کو سونا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک مَا يَهْجَعُونَ میں (ما) نفی کے لئے ہے یہی قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ ان پر کوئی رات ایسی نہیں گزرتی جس کا کچھ حصہ یادِ خدا میں نہ گزارتے ہوں خواہ اول ہی کچھ نوافل پڑھ لیں، خواہ درمیان میں خواہ آخر میں یعنی کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی وقت ہر رات میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ ساری رات سوتے سوتے نہیں گزارتے۔ ابوالعالیہ نے کہا وہ لوگ مغرب و عشاء کے درمیان کچھ نوافل پڑھ لیا کرتے تھے۔ امام باقرؒ نے فرمایا۔ وہ لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ یہ توجیہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ اگر ما کو موصولہ مانا جائے گا۔ یہ مطلب ہوگا کہ رات کے کچھ تھوڑے حصہ میں وہ سوتے ہیں یعنی رات کے زیادہ حصہ میں نماز پڑھتے اور ذکر خدا کرتے ہیں۔ اس مطلب کا اس حدیث صحیح سے تضاد ہوگا جس کو مسلم اور بعض اہل سنن نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا رات کا ایک تہائی حصہ تمہارے (آرام) کے لئے ہے۔ اور ایک تہائی تمہارے اہل کے لئے اور ایک تہائی اللہ رب العزت (کی عبادت) کے لئے تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی اور اللہ تعالیٰ کا بھی۔ (او کما قال)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی رات میں آرام بھی کیا اور نماز بھی پڑھی اور متعلقین کے ساتھ بھی رہے، صحابہ کا بھی یہی دستور تھا بلکہ صحابہؓ نے پوری رات عبادت کرنی چاہی تو حضورؐ نے روک دیا، اس لئے مناسب اور محفوظ صورت یہ ہے کہ مَا يَهْجَعُونَ کے (ما) کو نافیہ مانا جائے اور مطلب قرار دیا جائے جو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے۔

وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ اور آخری راتوں میں وہ استغفار کرتے ہیں۔ یعنی رات کی عبادت میں قصور وار جانے اور کوتاہی ہو جانے کا ان کو خیال رہتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکا، اس لئے قصور طاعت کی تلافی کے سحر کے وقت خواستگار ہوتے ہیں۔

سحر رات کے آخری چھٹے حصہ کو کہتے ہیں، قاموس میں ہے کہ سحر صبح سے کچھ پہلے کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ہر رات کو جب رات کا تہائی حصہ رہ جاتا ہے حق تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے میں ہی بادشاہ ہوں کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں۔ کون ہے جو مجھ سے مانگے پھر میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے معافی طلب کرے اور میں اس کو معاف کر دوں۔ متفق علیہ۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے تو استغفار کرتے اور کہتے:۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَآؤُكَ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ اَنْتَ رَبُّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا

اِلٰهَ غَیْرُكَ۔ متفق علیہ من حدیث ابنِ عباسؓ۔

اے اللہ! تیرے ہی لئے تعریف ہے آسمانوں کو زمین کو اور جو کوئی بھی ان کے اندر ہے سب کو تو ہی تھامنے والا ہے۔ تیرے ہی لئے حمد ہے آسمانوں کا زمین کا اور ان کے اندر کی کائنات کا تو ہی بادشاہ ہے۔ تیرے ہی لئے ستائش ہے تو ہی حق ہے، تیرا وعدہ ہی حق ہے، تیری بقا حق ہے، تیرا قول حق ہے، دوزخ حق ہے، سب پیغمبر حق ہیں محمد حق ہیں قیامت حق ہے۔

اے اللہ! میں تیرا فرمانبردار ہوں، تجھ پر ہی ایمان لایا ہوں، تیرے اوپر ہی میرا بھروسہ ہے۔ تیری ہی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ تیری ہی مدد سے میں (دشمنوں سے) لڑتا جھگڑتا ہوں اور تیری ہی طرف میں فیصلہ کے لئے آتا ہوں۔ تو ہمارا رب ہے۔ تیری ہی طرف (آخر) جانا ہے۔ میرے اگلے پچھلے گناہ اور وہ قصور جو میں نے پوشیدہ اور ظاہر کئے ہیں اور میری وہ خطائیں جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، سب معاف کر دے۔ تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہی معبود ہے۔ (بخاری و مسلم بروایت حضرت ابن عباسؓ)

حضرت عبادہؓ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص رات سے اٹھ کر (یعنی تہجد کو اٹھ کر) کہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ اس کے بعد کہے رَبِّ اغْفِرْ لِیْ پھر دعا کرے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے بعد وضو کر کے نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز مقبول ہوتی ہے۔ (رواہ البخاری)

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ رات سے بیدار ہو کر فرماتے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِیْ وَاَسْئَلُكَ رَحْمَتَكَ اللّٰهُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنِیْ وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ یہ محسنین کی دوسری صفت کا بیان ہے۔ اس صفت کا تعلق معاشرے سے ہے یعنی محسنین نہ فقط شب بیدار تہجد گزار ہوتے ہیں بلکہ اپنے مال میں حاجتمندوں کا حق سمجھ کر کوئی ان سے سوال کرے یا نہ کرے بہرحال محتاجوں کو دیتے ہیں۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک محروم سے مراد وہ محتاج ہیں جو باوجود احتیاج کے کسی سے سوال نہیں کرتے۔

بخاری و مسلم کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا مسکین صرف وہی لوگ نہیں جو گھومتے پھرتے ہیں اور جن کو تم دو ایک لقمے یا دو ایک کھجوریں دے دیتے ہو بلکہ وہ لوگ بھی درحقیقت مسکین ہیں کہ بقدر حاجت ان کو ملتا نہیں اور حال تو ایسا رکھتے ہیں کہ کسی پر ان کی حاجت و افلاس ظاہر نہ ہو اور کوئی ان کو خیرات دے سکے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا محروم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کمائی کا کوئی ذریعہ اختیار تو کر لیا ہو کماتے ہوں لیکن اتنا نہیں پاتے کہ انہیں کافی ہو جائے۔ ضحاک نے کہا محروم سے مراد وہ شخص ہے جو پہلے مالدار تھا پھر تباہ حال ہو گیا چنانچہ یمامہ میں جب سیلاب آیا اور ایک شخص کا سارا اثاثہ کھو گیا تو ایک صحابی نے فرمایا یہ محروم ہے۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا سائل کا حق ہے گو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ محروم وہ ہے جس کا کوئی حصہ بیت المال میں نہ ہو اور خود اس کے پاس کوئی کام کاج نہ ہو۔ نہ کوئی پیشہ آتا ہو نہ حرفہ کہ روزی کما سکے۔

شعبی نے کہا میں تو عاجز آ گیا لیکن محروم کے معنی معلوم نہ کر سکا۔ ابن جریر کا قول ہے کہ محروم وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ رہا ہو خواہ کوئی وجہ ہو (مال تباہ ہو گیا ہو یا کمائی نہ کر سکتا ہو یا کام نہ چلتا ہو۔)

مقصود بیان تقویٰ والوں کی جزا کا اظہار، محسنین کے لفظ سے فنا فی اللہ ہونے کی طرف اشارہ۔

قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ میں بقول ابن عباسؓ اس بات کی طرف ایماء ہے کہ رات کے کچھ حصہ میں بیدار رہ کر نماز پڑھنا محسنین کا خصوصی وصف ہے (یعنی رات کے بیشتر حصہ میں وہ حق نفس و اہل ادا کرتے ہیں اور کچھ حصہ میں اللہ کے سامنے دست بستہ حاضر رہتے ہیں)

بِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ میں ان لوگوں کی مدح جو باوجود شب بیدار تہجد گزار ہونے کے حق خداوندی کو ادا کرنے سے اپنے کو عاجز سمجھتے ہیں

اور معافی کے خواستگار رہتے ہیں۔ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ میں حق کا لفظ بتا رہا ہے کہ مالداروں کا کوئی احسان نہیں کہ وہ غریبوں کو دیتے ہیں بلکہ ان کا حق ہے دولتمندوں پر۔ اگر مالدار طبقہ ان کی امداد نہ کرے گا تو حق تلفی کرے گا۔ یہ لفظ بہت پرمعنی ہے اور معاشرہ کی درستی کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مالداروں کو چاہئے کہ وہ غریبوں کا اپنے مال میں حق ضروری سمجھیں اور ادا کرنے کی کوشش کریں اور فقط ادائے زکوٰۃ کو کافی نہ سمجھیں۔ وغیرہ

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ وَفِي السَّمَاءِ

اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی پس کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا اور تمہارا رزق اور جو تم سے اعمال

رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ۝ ع

ع ۱۸

کے متعلق وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب (کا معین وقت) آسمان میں ہے تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے جیسا تم باتیں کر رہے ہو

تفسیر: اہل احسان ہی اہل یقین ہوتے ہیں بلکہ یقین کی آخری چوٹی پر پہنچنے کا نام ہی احسان ہے۔ ان کو سارے عالم میں روح اور قلب کی آنکھوں سے ایک ہی ہستی نظر آتی ہے۔ اسی کی حکمت، صنعت، قدرت اور رحمت کے پرتو کا ظہور سارے جہان کا وجود، انتظام، ترتیب اور تغیر سے ہو رہا ہے وہ تشریعی احکام کو جاہلانہ اور احمقانہ طریقہ سے نہیں مانتے۔ اور عادتاً ایمان نہیں لے آتے بلکہ سوچنے میں غور کرتے ہیں ترتیب ذہنی سے کام لیتے ہیں اور بہت سوچ و بچار کے بعد اس حقیقت تک پہنچتے ہیں، زینہ بزینہ ترقی کر کے عرفان کا مدارج حاصل کرتے ہیں۔ یہ زمین کا فرش ہے کہیں نشیب ہے کہیں فراز، میدان ہیں، کوہستان ہیں، بیابان ہیں اور سبزہ زار، گلستان ہیں، زمین ایک جگہ ٹھہری ہوئی ہے، پانی تین طرف سے گھیرا ہے۔ اپنے دباؤ میں جکڑے ہوئے ہے، ایک طرف سے زمین ابھری ہوئی ہے۔ خشکی ہے تاہم حرکت ہے۔ پہاڑوں کی میخیں گڑی ہوئی ہیں۔ زمین کے لرزنے کو روکے ہوئے ہیں۔ اس زمین پر لاکھوں اقسام کے لاتعداد ان گنت جانور ہیں، درخت اور بیلیں ہیں، طرح طرح کے پتھر اور معدنیات ہیں، مختلف خواص کے چشمے اور دریا ہیں، کروڑوں شکلوں رنگوں اور جسامتوں کی کائنات ہے۔ لاکھوں طبیعتوں، مزاجوں، ذائقوں اور طبعی میلانوں کی مخلوق ہے، موجودات ارضی کی ہر شان نرالی، ہر آن عالم کچھ اور ہی حالت و کیفیت عجیب ہے۔ سورج اور ستاروں کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں، راتوں کی تاریکی اس پر چھاتی ہے۔ سورج کی گرمی اس پر آتی ہے۔ اس کی کائنات میں سے کوئی ہلکی ہے کوئی بھاری، کوئی بڑھتی ہے، کوئی سمٹتی ہے، کوئی گرتی ہے، کوئی ابھرتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ لاکھوں کروڑوں قسم کی تبدیلیاں ہیں، اختلافات، تغیرات اور انقلابات ہیں، لیکن موجودات کے یہ سارے اختلافات ایک نظم اور ایک ضابطہ کے زیر اثر ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ شیشم کے تخم سے آم کا درخت پیدا ہو جائے یا کدو کی بیل کو وہ مالیہ کے برابر ہو جاتی ہے یا چیونٹی شیر بن جائے۔ حقیقت میں ایک ترتیب ہے، ایک تنظیم ہے ایک فطری ضابطہ ہے۔ ضابطہ فطرت سے سرتابی کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ کوئی شخص یا فرد اپنی نوع اور خاص نوع کی حدود سے تجاوز نہیں کرتا نوعی حدود سے تجاوز نہیں کرتا اس کے لئے پیام فنا ہے عارف کے لئے ہر ورق دفتر لیست معرفت کردگار۔ وہ آیات ارضی کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ ان سب مختلف الوجوہ کائنات کو ایک زبردست قادر، عالم کا علم اور قدرت اور ارادہ محیط ہے۔ اسی کی رحمت سے ان سب کی ہستی اور بقاء ہستی ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ یہ تو ہے بیرونی منظر اور قریب ترین آیات آفاقی کا مطالعہ اور اس کا نتیجہ لیکن اس سے بھی زیادہ قریب اور سہل اپنی حالت کا مشاہدہ ہے جو پکار پکار کر اللہ تعالیٰ کی توحید، الوہیت، ربوبیت، علم کی ہمہ گیری اور قدرت کے کمال کو ظاہر کر رہا ہے۔ اگر بصیرت و دانش سے کام لیا جائے اور چشم باطن سے دیکھا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان عالم صغیر ہے اس سارے عالم میں جو کچھ ہے وہ سب انسان کے اندر ہے۔ یہ عالم کبیر کا مجموعہ ہے۔ اس کے اندر عنصری اجزاء ہیں۔ جسمانیت ہے لوازم جسمانیت ہیں۔ اجزاء کو جوڑے رکھنے والی اور پراگندگی سے محفوظ رکھنے والی طاقت ہے۔ اس کے اندر نمو ہے یہ موٹا دبلا ہوتا ہے۔ جسمانی بڑھوتری اکائی ہوتی ہے پھر تھوڑا ہوتا ہے پھر گھٹتا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ظاہری اور باطنی حس ہے شعور ہے ارادہ ہے اچھے برے کی تمیز ہے، حق ناحق کی پرکھ ہے۔ استقراء کے بعد جزئیات سے نتائج کلیہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے اندر عقل مجرد بھی ہے جو ما فوق الطبیعات مسائل کو سمجھتی ہے اور حل کرتی ہے۔

غور طلب ہے یہ تغیرات کا تواتر کہ عنصری حالت سے کس طرح درجہ بدرجہ ترقی کر کے نطفہ بنا، پھر خون بستہ اور جونک نما کپڑا ہوا، پھر لوتھڑا اور بوٹی بنا، پھر ہڈیاں بنیں، پھر ہڈیوں کو عضلات سے اعصاب اور تار اور کھال کا لباس پہنایا گیا، نقشہ بنایا گیا، ناک کان آنکھ اور ہر ضروری شکل دی گئی، پھر جو قوت اس کے پیٹ کے اندر پال رہی تھی اسی نے دھکے دے کر اس کو باہر نکال دیا اور اللہ نے اس کے نکلنے کا راستہ آسان کر دیا۔ پھر روزی حاصل کرنا سکھایا، دودھ پینا بتایا، پھر دودھ چھوٹا، مختلف قسم کی خوراک لینے لگا اور کھائی ہوئی چیز کے ناکارہ اجزاء کو بول و براز اور پسینہ کی شکل میں باہر پھینکنے لگا۔ پھر نوع کو باقی رکھنے کی تڑپ اس کے دل میں ڈالی اور سلسلۂ نوعی باقی رکھا۔ پھر ان تمام آیاتِ قدرت کے باوجود رنگ، شکل، طبیعت، عادت، میلان، جذبات، مزاج، صحت، حسن، طاقت کا آنکھوں سے دیکھنے والا اختلاف و تفاوت اور وسعت، قرب و عرفان کی کمی بیشی اور تجلیات ذاتیہ صفاتیہ اور ظلالیہ کی نظرِ باطن سے دیکھنے والی جلوہ پاشی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بے اختیار ہو کر ایک سانس میں بول اٹھے۔ تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ اور دوسری سانس میں ہی فوراً پکارے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۔ پس (اے کوتاہ نظر کور باطن لوگو) کیا تم کو آیاتِ الٰہیہ اور نشانہائے عدبانیہ دکھائی دیتے ہیں، نہ چشمِ بصیرت سے تم کو بلندیوں سے چڑھتے بادل اور بادلوں سے اترتی بارش بھی دکھائی نہیں دیتی جس سے تمہارا رزق وابستہ ہے۔ زمین کا چہرہ، سبزہ کا نمو، سایہ دار درخت، درختوں کی بار آوری، تمام کھیتی اور کھیتی کی غلہ آفرینی سماوی بارش پر ہی موقوف ہے۔ پانی کس طرح بھاپ بن کر اٹھتا ہے، پانی میں ہوا کس طرح اوپر کھینچ کر لے جاتی ہے اور پھر کہاں کہاں بادل کھینچ کر لے جاتے ہیں اور کس حیرت آفریں طریقہ سے خلیج بنگال کا پانی ہمالہ پر اور اس کی گھاٹی دور کر کے ہزاروں میل دور خشک زمینوں پر بہایا جاتا ہے۔ کیا یہ قدرتِ خداوندی اور حکمتِ الٰہی کے کھلے نشان نہیں ہیں۔ کیا یہ فیضی ربوبیت انسانی فکر کو سرِ حد الوہیت تک پہنچا کر سجدہ ریز کر دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور سوچو زمین ہی کے تو کچھ لطیف اجزاء ہیں جو آگ کی گرمی سے مغلوب ہو کر دھوئیں کی شکل میں اوپر کو پہنچتے ہیں اور بادلوں سے جا گھر بناتے ہیں، کبھی بادلوں کے اندر بند ہو کر گھومتے ہیں، چھپتے گڑگڑاتے پھرتے ہیں، کبھی ابر کو پھاڑ کر کڑکناک آواز اور گرجناک تڑخ کے ساتھ نیچے کو گرتے ہیں اور جس چیز پر گرتے ہیں اس کو جلا کر کوئلہ اور خاکستر کر دیتے ہیں۔ یہ تغیرات یہ انقلابی کیفیات یہ سماوی فضائی خلائی کون و فساد اور ہستی و نیستی کا یہ تواتر و تبادل اور ہست و بود کا یہ تسلسل اور نتائج و اسباب کا یہ ارتباط پوری ہم آہنگی سے پکار رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ آسمان و زمین کو منصوبہ بند انداز کے ساتھ پیدا کرنے والے کی قسم کہ قیامت ضرور آئے گی اور جس طرح تم بولتے اور کلام کرتے ہو اسی طرح تمہاری ساری زندگی ایک روز ضرور سامنے آجائے گی۔

تحلیلِ اجزاء

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ زمین میں بڑی بڑی عظیم الشان کھلی ہوئی عجیب آیاتِ قدرت و حکمت ہیں۔ نشانہائے صنعت و ربوبیت ہیں، دلائلِ الوہیت ہیں اور شواہدِ وحدانیت ہیں۔ زمین، زمین کی معدنی جمادی بحری موجودات نباتی اور حیوانی کائنات غرض زمین کے اندر کے بخارات، اندرونی حرارت، بیرونی برودت، کانیں، مختلف جواہرات اور فلزات، پھر زمین کے بالائی حصہ کی نباتات، اشجار، خرمار، تمام جاندار خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے ننھے کیڑوں سے لے کر انسان تک سب ہی کے اندر اللہ کا نشانِ ربوبیت و قدرت جھلک رہا ہے اور وحدتِ الوہیت اور توحید کو ثابت کر رہا ہے، نیز ان تمام موجودات کی یک رنگی، ترتیبی تسلسل، ضابطۂ فطرت کے تحت باہم آویزی اور اسباب و نتائج کے تعاون سے وابستگی امکانِ قیامت کی برہانِ قاطع ہے، لیکن لِّلْمُوْقِنِیْنَ یہ ساری نشانیاں انہی لوگوں کے لئے سنگِ میل اور رہنما ہیں جو اصحابِ یقین ہیں اور یقین بھی وہ جو کامل ہو اور مشاہدہ کے درجہ پر فائز ہو مرتبہ احسان پہنچانے والا ہو۔

وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ خصوصاً اے انسانو تمہارے اندر خود تمہاری شخصیتوں میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت، وحدانیت اور وقوعِ قیامت کے شواہد و آیات موجود ہیں۔ انسان ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو جمادات سے لے کر ملائکہ تک تمام موجودات کو عطا ہوئی ہیں۔ اس میں تمام جمادی طاقتیں بھی ہیں اور نباتی توالد و تناسل اور حیوانی شعورِ بیرونی اور احساس اندرونی بھی اور ہر طرح کا علم جزئی و کلی بھی اور عرفانِ شہودی اور وجدانِ قلبی اور لسانِ ملکوتی بھی۔ سماء اعلیٰ سے زمین کے اندرونی وسطی نقطہ تک سارا جہان اس کے اندر سمٹ آیا ہے۔ حسن ظاہر و باطن کا یہ مجموعہ نمونۂ عالم ہے اور قدرت کی صناعی کا شاہکار ہے۔ آنکھیں درکار ہیں دیکھنے کے لئے اور بصیرت ضروری ہے سمجھنے اور سوچنے کے لئے۔ کیا تم کو چہرے کی آنکھوں سے اس کا بیرونی جمال صورتِ انسانی میں نظر نہیں آتا اور دل کی بینائی سے اپنی اندرونی طاقتوں میں اس کی وحدانیت کا جگمگاتا نور دکھائی نہیں دیتا۔ بصارت ہو تو اس کو آنکھوں سے اپنی شکل میں دیکھ لو۔ ہستی کائنات کا مرکزی مجموعہ ہے اور بصیرت رکھتے ہو تو جھانک لو اپنے شعور و قلب کے دریچوں سے اپنے اندر وجودِ حقیقی کے جمالِ نور کی طرف۔

ضروری تنقیح عموماً اہلِ تفسیر کے نزدیک وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ کا عطف فی الارض پر ہے۔ یعنی فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اٰیٰتٌ مطلب صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت حکمت صنعت ربوبیت الوہیت اور وحدانیت کی نشانیاں زمین میں موجود ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں بھی موجود ہیں لیکن شیخ ابن عربی، ابن سبعین، ابن فارض اور ان جیسے دوسرے وحدت الوجود کے علمبردار کہتے ہیں کہ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ مبتدا کلام ہے یعنی ھُوَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اللہ تمہارے نفسوں کے اندر موجود ہے۔ اس کی تائید ھُوَ الظَّاھِرُ وَھُوَ الۡبَاطِنُ کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، اللہ ہی ظاہر ہے اور اللہ ہی باطن، اللہ ہی باہر اور اللہ ہی اندر۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کی تنقیح اس جگہ مقصود نہیں ہے مجمل طور پر اتنا جان لینا کافی ہے کہ محققین وحدت الوجود کے نزدیک اللہ کے سوا کسی چیز کا وجود حقیقی نہیں ہے وجود کلی مشکک نہیں کہ بعض افراد پر کم صادق آئے اور بعض افراد پر زیادہ نہ یہ کہ یہ لفظ ممکن و واجب کے درمیان مشترک ہے بلکہ ممکن کا وجود مجازی ہے اور واجب کا حقیقی اصل وجود واجب کا ہے اور ممکن کا وجود اس کا پرتو ہے۔ شکل اعتباری کا نام ممکن ہے اور وجود مطلق بے شکل کا نام واجب۔ واجب ایک لطیف ترین حقیقت ہے۔ برق البرق ہے، روح الارواح ہے۔ اس کا ظہور ان کثیف اشکال میں ہوتا ہے۔ پس! باطن وہی ہے تمہارے نفسوں کے اندر وہی ہے ظاہری اشکال کا جامہ پہن کر وہ سامنے آتا ہے اس لئے انتہائی ظہور بھی اسی کا ہے۔ مگر یہ ظاہری اشکال عالم بعینہ واجب نہیں مظہر واجب ہیں۔ جلوہ گاہ و حقیقت میں فانی ہیں باقی نہیں شکل اور رنگ کا نام ممکن ہے۔ واجب ان صورتوں کے اندر جاری ساری اور حلول کئے ہوئے نہیں ہے، بلکہ نمودار تجلی اور پرتو افگن ہے۔ یہ پرتو یہ شکل و صورت یہ الوان جو محسوس ہوتے ہیں بجائے خود بے حقیقت ہیں۔ حقیقت ایک ہی ہے آفتاب قدم، ممکنات کے دریچوں سے جھانک رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس مطلب پر ھُوَ ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور موجودٌ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ خبر۔ مقام نازک ہے۔ اتحاد الوجود میں شرک ہے۔ وحدت وجود حق ہے۔ دونوں میں فرق کی راہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے جس پر چلنا صرف اہلِ حقیقت کو زیبا ہے بمبر نتواں گفت۔

وَفِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ حضرت ابن عباس اور مقاتل کے نزدیک اس جگہ رزق سے مراد بارش ہے جو سبب رزق ہے۔ بیضاوی نے کہا السَّمَآءِ (بلندی) سے مراد ابر ہے اور رزق سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی اسباب رِزۡقِکُمۡ یا تَقۡدِیۡرُ رِزۡقِکُمۡ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ لفظ رزق سے مراد حصہ اور نصیب ہو (لغت میں رزق کا معنی حصہ اور نصیب ہے۔ اس جگہ لغوی معنی بھی مراد ہو سکتا ہے) آیت وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَکُمۡ اَنَّکُمۡ تُکَذِّبُوۡنَ میں بھی رزق سے مراد حصہ ہی ہے (جب رزق سے مراد حصہ اور نصیب ہوگا تو آسمان اور آسمانی موجودات کو مطالعہ کرنے کے بعد جو علم انسان کو ہوگا وہ رزق ہی ہوگا) پس اس صورت میں آیت کے اندر رزق سے مراد وہ سماوی آیات ہیں جو اللہ کی صفات و ذات پر دلالت کر رہی ہیں۔ چاند سورج ستارے ان کا طلوع و غروب ان کی حرکات اور ان کی حرکات سے پیدا ہونے والے آثار موسموں کا تبادل رات دن کا چکر وغیرہ۔ یہ سب نشانہائے حکمت و قدرت ہیں اور اہلِ احسان و یقین انہی کائنات سماوی سے اللہ کی ذات و صفات کو غور و فکر کرنے کے بعد پہچانتے ہیں پھر اس تفکر و غور کے بعد رحمت و برکت کا ان پر جو فیضان ہوتا ہے اور تجلیاتِ الٰہیہ کی جو عرفان پاشی ہوتی ہے سب تمہارا رزق سے مراد ہوگی کیونکہ یہ عارف کا نصیب علمی و عرفانی ہے۔ اہلِ احسان کے علاوہ کسی کو یہ روزی نہیں ملتی۔ عارف رومی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر نخواہد بے بدن جانِ تو زیست   فی السماء رزقکم روزی کیست

یا رزق سے مراد صرف کھانا پینا ہے اس صورت میں آسمان میں رزق ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان پر لوح محفوظ میں تمہارا رزق لکھا ہوا ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ پس اسی اللہ تعالیٰ کی جس نے تمہارا رزق لکھ رکھا ہے، خالص طور پر عبادت و اطاعت کرو اور اللہ کے لکھے ہوئے رزق پر شاکر رہو۔

وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ عطاء کے نزدیک وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ سے مراد ہے ثواب عذاب اور مجاہد کے نزدیک خیر و شر اور ضحاک کے نزدیک جنت و دوزخ یعنی آسمان میں اللہ کے پاس ہر شخص کا ثواب عذاب ہر خیر و شر اور جنت و دوزخ لکھا ہوا ہے۔ اس فقیر کے نزدیک اگر عام لفظ کو اس کے عموم پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یعنی لوح محفوظ یا علم الٰہی میں نہ صرف تمہارا رزق مرقوم اور موجود ہے بلکہ ہر وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے مرقوم و موجود ہے۔ دنیاوی زندگی سے متعلق ہو یا آخرت کی زندگی سے ہر چیز علم الٰہی یا لوح محفوظ میں ثابت ہے جو ظاہر ہو کر رہے گی۔ پس قیامت اور قیامت کے تمام احوال بھی ضرور پیش آکر رہیں گے۔ اسی مضمون کے متعلق آئندہ آیت میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ۔ قسم ہے مالک جہان کی کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے (یعنی قیامت

کا بپا ہونا، مُردوں کا زندہ ہو کر اُٹھنا، حساب کتاب، اور عذاب و ثواب ہونا اور ہر وعدہ وعید بلا شک و شبہ بالکل ایسا ہی حق سچ اور واقعی ہے، جیسے تمہارا گفتگو کرنا یعنی محسوسات کی طرح ہے۔

مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) خطاب منکرین کو ہے اور مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ سے مراد ہے خاص قول یعنی جس طرح تم کلام کرتے ہو اور لا الٰہ الا اللہ کہتے ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔

(۲) یا خطاب عام انسانوں کو ہے اور نطق سے مراد بھی عام نطق ہے۔ تفسیر مدارک میں آیا ہے کہ اصمعی نے کہا میں بصرہ کی جامع مسجد سے آرہا تھا، سامنے سے ایک اعرابی آتا دکھائی دیا۔ اعرابی نے پوچھا آپ کس قبیلے سے ہیں۔ میں نے کہا بنی اصمع سے۔ اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہیں، میں نے کہا۔ ایسی جگہ سے آرہا ہوں جہاں اللہ رحمٰن کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ اعرابی نے کہا۔ کچھ سنا دیجیے میں نے وَالذّٰرِيٰتِ پڑھ کر سنائی جب آیت فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ پر پہنچا تو اعرابی بولا بس کیجیے۔ اور یہ کہہ کر فوراً اپنی اونٹنی کی طرف بڑھا۔ اس کو ذبح کیا اور پارہ پارہ کر کے اس کا گوشت آنے جانے والوں کو تقسیم کر دیا۔ پھر اپنی کمان اور تلوار کو توڑ کر پشت موڑ کر چل دیا۔ اس واقعہ سے کچھ مدت کے بعد جب مجھے حج کرجانے کا اتفاق ہوا اور میں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اس وقت کسی نے مجھے کمزور پست آواز سے پکارا میں نے منہ پھیر کر دیکھا تو وہی اعرابی نظر آیا۔ اعرابی نے مجھے سلام کیا اور سورہ وَالذّٰرِيٰتِ سنانے کی فرمائش کی میں نے پڑھ کر سنائی جب آیت فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ تک میں پہنچا تو اعرابی نے ایک چیخ ماری اور کہا ہم سے جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو حق پایا۔ پھر مجھ سے کہا آگے پڑھیے میں نے آیت فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ پڑھی۔ اعرابی نے فوراً ایک چیخ ماری اور کہا سُبْحَانَ اللّٰہ کس نے رب جلیل کو غضبناک کر دیا اور اس کے کلام کی تصدیق نہیں کی کہ وہ (اپنے کلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے) قسم کھانے پر مجبور ہوا۔ یہ الفاظ اس نے تین مرتبہ کہے اور (خوف سے) اس کی جان نکل گئی۔

مقصود بیان فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ میں صراحت ہے اس بات کی کہ اگر نظر یقین و ایمان سے دیکھا جائے تو زمین میں ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی وحدانیت الوہیت حکمت علم اور ربوبیت کے بکثرت دلائل موجود ہیں۔ نتائج اسباب سے وابستہ ہیں اور اسباب ایک خدا بالکے ہاتھ مسبب کل کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور بجائے خود کوئی سبب بھی مسبب سے مستغنی نہیں ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ سے تنبیہ ہے اس امر پر کہ انسان کی خود ذات کے اندر باری تعالیٰ کی ہستی جلوہ پاش ہے۔ اور اس کی جلوہ نمائی اتنی ظاہر ہے کہ آنکھوں والا ہر آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ نظر ظاہر میں باطنی نور کی جھلک ہو۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ انسان کا رزق نصیب ذلت شکر موت حیات صحت مرض غرض ہر وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا ہے آسمان پر موجود ہے یعنی اس کا حکم اور فیصلہ مقدر سے نازل ہے۔ آیت میں در پردہ تلقین ایمان و یقین ہے۔ مومنوں کے لیے اور وعید عذاب ہے کافروں کے لیے وغیرہ۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ

کیا ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت آپ تک پہنچی ہے (اور یہ قصہ اس وقت میں ہوا) جبکہ وہ (مہمان) ان کے پاس آئے پھر

فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ

ان کو سلام کیا اور ابراہیم نے بھی (جواب میں) کہا سلام (اور کہنے لگے کہ) انجان لوگ (معلوم ہوتے ہیں) پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک فربہ بچھڑا

سَمِيْنٍ ۙ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ

(تلا ہوا) لائے اور اس کو اُن کے پاس (یعنی سامنے) لاکر کہا کہنے لگے آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں تو اُن سے دل میں خوف زدہ ہوئے

قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ

انہوں نے کہا تم ڈرو مت اور ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم ہوگا اتنے میں ان کی بی بی بولتی پکارتی آئیں پھر

فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ

ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ (اول تو) بڑھیا (پھر) بانجھ فرشتے کہنے لگے کہ تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے

اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝

کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا بڑا جاننے والا ہے

تفسیر مہمان کوئی ہو شناسا ہو یا اجنبی، وطنی ہو یا غیر وطنی، دوست ہو یا دشمن، سنتِ انبیاء ہے، آدابِ مرسلین ہے کہ اس کی تجلیل کی جائے، اس کی عزت کی جائے، خوش اخلاق کا برتاؤ کیا جائے۔ معزز مہمان کا بھی اول ترین فرض ہے کہ آتے ہی ہر بات سے پہلے اپنے میزبان کو سلامتی کی دعا دے۔ دنیوی مصائب و مکارہ اور آخرت کے عذاب و دکھ سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لئے التجا کی جائے۔ اس کے جواب میں کریم میزبان کا بھی فرض ہے کہ مہمان کے لئے سلامتی کی دعا کرے۔ اس کے بعد جو کچھ میسر ہو خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کردے اور مہمان اس کو بطیبِ خاطر قبول کرے کیونکہ اگر ناک بھوں چڑھائے گا اور پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردے گا تو میزبان کی دل شکنی ہوگی اور ممکن ہے کہ وہ مہمان کو دشمن سمجھنے لگے گا کیونکہ دوست کا کھانا قبول کیا جاتا ہے اور دشمن کی طرف سے کی ہوئی دعوت رد کردی جاتی ہے۔ یہ عرف عام ہے۔ لیکن یاد رکھو یہ قانونِ میزبانی و مہمانی تو انسانی معاشرہ کے لئے ہے۔ انبیاء کے پاس خصوصیت کے ساتھ کچھ مہمان ایسے بھی بشکلِ انسانی آتے ہیں جن کو ابتدائی ملاقات میں غیر آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ ان کو پہچانتے نہیں۔ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہوتے کوئی اور نورانی غیبی مخلوق ہوتی ہے جس کو شریعتِ الٰہیہ کی زبان میں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ ملائکہ گو نورِ مجسم ہیں لیکن وہ ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ ہر شکل قبول کرسکتے ہیں۔ آدمی کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بشری تمام خصوصیات ان کے اندر پیدا ہوسکتی ہیں۔ کھانا پینا مادی زندہ اجسام کی خصوصیت ہے۔ بقائے جسم اور بقائے نوع کی کوشش تغیر الجسم مخلوق کا خاصہ ہے، فرشتے نہ کھانے کی خواہش رکھتے ہیں نہ پینے کی، نہ کھا پی سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس بھی فرشتے بصورتِ بشری آئے تھے۔ حضرت پہلے نہ پہچان سکے جب طعامِ مہمانی کی طرف ملائکہ نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو کچھ خوف باقتضائے بشری آپ کے دل میں پیدا ہوا لیکن فرشتوں نے فوراً اصل حقیقت ظاہر کردی اور بشارتِ اولاد کا مژدہ سنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو اس بشارت پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ آپ اسرارِ قدرت کے شناسا تھے، جانتے تھے کہ قدرتِ الٰہیہ اپنے بنائے ہوئے ضابطہ کی پابند نہیں ہے۔ مگر عمومی ضابطۂ فطرت ہے کہ بوڑھے والدین میں افزائشِ نسل اور تولید کی طاقت مفقود ہوجاتی ہے لیکن اس ضابطہ کی شکست خود قدرت کے نزدیک ناممکن نہیں ہے۔ جس نے ضابطہ بنایا وہ بمصلحت اس کو توڑ بھی سکتا ہے۔ لیکن حضرت سارہ گو مومنہ تھیں پر ان کی عرفانی سیر کو وہ رسائی حاصل نہ تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نگاہِ نبوت کو حاصل تھی اس لئے تعجب کیا اور فرشتوں نے ان کے تعجب کو صرف یہ کہہ کر دور کردیا کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی مشیت مختارِ مطلق ہے۔

یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ اس مادی دنیا سے اوپر اللہ تعالیٰ کی ایک غیبی مخلوق ہے جو خالص نورانی اور مجردانہ مادہ عنصریہ ہے بلکہ ہر شکل کے باوجود مادی اشکال کو قبول کرلینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس مخلوق میں سے کچھ افراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی کارندے ہیں جو اس مادی کائنات کو چلا رہے ہیں مگر

اثر ڈالنے کی خدمت پر مامور ہیں۔ یہ غیبی کارندے اگرچہ ایک قدرتی ضابطہ کے ماتحت منظم طور پر تقسیم کار کی روشنی میں مفوضہ خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ ایسی ملکوتی طاقت رکھنے والی ہستیاں بھی ہیں جو کبھی کبھی غیر معمولی اور غیر مادی خدمات بھی بجا لاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ملائکہ کا امرد نوجوان انسانوں کی شکل میں بشارتِ پسر کے لئے آنا اور پھر یہاں سے قومِ لوط کو تباہ کرنے کے لئے جانا انہی غیر عادی فرائض کی بجا آوری کی ایک شان ہے۔

تحلیلِ اجزاء

حدیث ضیفِ ابراہیم بغوی نے لکھا ہے یہ فرشتے جو بصورتِ مہمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے گئے تھے۔ اس کی تعیین میں مختلف اقوال آئے۔

حضرت ابن عباس اور عطاء کا قول ہے کہ تین تھے۔ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل۔ محمد بن کعب نے کہا۔ جبرئیل اور ان کے ساتھ سات فرشتے تھے۔ ضحاک کے قول پر نو تھے۔ مقاتل نے بارہ بیان کئے ہیں۔ سدی نے گیارہ کہا ہے۔

اَلْمُکْرَمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز، فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ۔

یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ بغیر پہچانے حضرت ابراہیمؑ نے ان مہمانوں کی عزت کی تھی۔ ان کا فرشتہ ہونا تو بعد کو معلوم ہوا۔

انبیاءؑ کی یہ خصوصی سیرت ہے کہ مہمان کوئی ہو اس کی عزت کرتے ہیں۔ خود اس کی خدمت کرتے اور جو کچھ مقدور ہو فوراً پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے ہمسائے سے اچھا سلوک کرے، دوسری روایت میں ہے اپنے ہمسایہ کو دکھ نہ دے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ کلمۂ خیر زبان سے نکالے یا خاموش رہے۔

(رواہ احمد والشیخان فی الصحیحین والترمذی وابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے دریافت کیا حضور سب سے اچھا اسلام کون سا ہے (یعنی اسلام کے نزدیک سب اچھی خصلت کونسی ہے) فرمایا (سب سے اچھا اسلام یہ ہے کہ) تم کھانا کھلاؤ جان پہچان کا آدمی ہو یا اجنبی سب کو سلام کرو۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْہِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ۔ اس سارے کلام کا تعلق لفظِ حدیث سے ہے یعنی ابراہیم کے معزز مہمانوں کی یہ بات اس وقت کی تھی جب مہمان نما فرشتے ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے الخ

فرشتوں نے شریعتِ ابراہیمی کے موافق اور اس زمانہ کے دوسرے لوگوں کے رواج کے خلاف سلام کیا اور جملہ فعلیہ بولا اور جملہ فعلیہ میں وقوعِ فعل کسی معین زمانہ میں ہوتا ہے۔ ماضی ہو یا حال یا استقبال بہر حال استمرارِ فعل نہیں ہوتا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کا سلام ناقص تھا اور حضرت ابراہیمؑ نے بجائے جملہ فعلیہ کے جواب میں جملہ اسمیہ بولا جس سے سلام کا استمرار ظاہر ہوا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا جواب زیادہ کامل تھا۔ شریعت اسلامیہ میں سلام کا جواب اعلیٰ طور پر دینا افضل ہے اگرچہ مساوی درجہ کا جواب دینا بھی جائز ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا۔ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا الخ۔

قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ یعنی ابراہیمؑ نے یہ بھی کہا کہ تم لوگ اجنبی ہو ہم تم سے واقف نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا۔ ابراہیمؑ نے یہ بات کہی تھی اپنے دل میں۔ ابوالعالیہ نے کہا حضرت ابراہیم نے فرشتوں کے سلام کرنے سے جان لیا کہ یہ لوگ اجنبی ہیں، کیونکہ اس بستی میں سلام کا دستور اور رواج یہ نہ تھا۔

فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ۔ اس سلام کلام کے بعد ابراہیم نے اپنے گھر والوں کی طرف رخ کیا اور جا کر ایک موٹا بچھڑا بھنا ہوا لے آئے اور مہمانوں کے سامنے کھانے کے لئے رکھا لیکن وہ حقیقت میں آدمی تو نہ تھے کہ کھانا شروع کر دیتے اس لئے کھانے کے لئے کسی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں کہ فرشتے مختلف اشکال میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ گو وہ اصلاً نوری قوام رکھتے ہیں لیکن عنصری جامہ بھی پہن سکتے ہیں مگر عنصری خواص و لوازم ان کے اندر نہیں پیدا ہو سکتے۔ نر مادہ ہونا تو الد و تناسل کا سلسلہ قائم ہونا صنفی یا شکمی خواہشات ہونا یا لاغری کی بات بھی

ان کو چھو نہیں سکتی اس لئے انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مہمانوں کی یہ حرکت بہت کھلی۔ آپ کو معلوم تھا کہ ان دنوں میں لوگ اگر دشمنی کے ارادے سے کہیں آتے ہیں اور کسی کو ضرر پہنچانا چاہتے ہیں تو اس کے گھر کا نان نمک نہیں چکھتے۔ ممکن ہے یہ بھی دشمنی کے ارادے سے آئے ہوں۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام گو عارف کامل اور خداشناس تھے اور پیغمبر برحق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے لیکن آپ پیغمبر ہونے کے ساتھ انسان بھی تھے اور تمام انسانی فطری تقاضوں کے حامل تھے۔ جرأت و حیا کی تو نتیجہ ایمان و شہود تھی مگر فطرتِ انسانی کے اندر تو رغبت و خوف کو چھپا کر مدفون کیا گیا ہے۔ اس کا ظہور تو فطرتاً ہوتا ہی ہے گو آنی ہو۔ ایک لمحہ کے لئے ہو پر ہوتا ضرور ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں خطورِ نفس کے طور پر ایک خوف کا پوشیدہ ظہور ہو گیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تشریح فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو (اپنے جانی مالی ضرر کا کوئی) اندیشہ نہ ہوا۔ نہ وہ مہمانوں کی دشمنی سے خوف زدہ ہوئے بلکہ آپ پہچان گئے کہ یہ ملائکہ ہیں لیکن چند ملائکہ کا اجتماعی شکل میں آنا تو عذاب کے لئے ہوتا ہے، اس لئے آپ کو) اندیشہ ہوا کہ شاید ان کو عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

قَالُوا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۔ فرشتوں نے کہا آپ کچھ اندیشہ نہ کریں (ہم ملائکہ ہیں اس لئے کچھ کھا نہیں سکتے) پھر آپ کو فرشتوں نے بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دی جو ذی علم ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو علم عطا کیا جائے گا۔ وہ علم نبی کا حامل ہوگا۔ غلام یعنی بیٹے سے مراد حضرت اسحٰق ہیں۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ کی بی بی سارہ اپنے منھ کو پیٹنے لگیں اور کہنے لگیں کیا بانجھ بڑھیا اب بچہ جنے گی۔ حضرت سارہ کی عمر اس وقت نوے سال کی تھی اور آپ بانجھ تھیں۔

قَالُوا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۔ فرشتوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ وہ حکمت و علم والا ہے۔ یہ قصہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بھی آیا ہے۔ الفاظ میں کچھ کمی بیشی ہے۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت مہمانوں کے سامنے رکھا تو نہایت تواضع سے فرمایا۔ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ کھانے کا حکم نہیں دیا بلکہ نہایت اخلاق سے کھانے کی ترغیب دی لیکن جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں تو دہشت زدہ ہو گئے اور دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ اس پر فرشتوں نے کہا۔ ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں ہم کو قومِ لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور ان کی بی بی کو فرشتوں نے ایک دانشمند لڑکا پیدا ہونے کی بشارت بھی دی یعنی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری سنائی اور یہ بھی کہا کہ اسحٰقؑ کے بعد ان کا بیٹا یعقوبؑ بھی ہوگا۔ یعنی اسحٰقؑ کی بھی نسل جاری رہے گی سلسلہ منقطع نہ ہوگا (یا یہ مطلب کہ تمہاری زندگی میں ہی پوتا بھی ہو جائے گا اور تم پوتے کو بھی دیکھ لوگے۔ یا یعقوبؑ کی بشارت دینے سے یہ مطلب تھا کہ لڑکا تو دانشمند یعنی پیغمبر ہوگا ہی، اس کا بیٹا بھی ایسا ہوگا جو قابلِ بشارت ہے یعنی وہ بھی پیغمبر ہوگا۔ واللہ اعلم)

بیوی کو یہ بشارت سن کر تعجب ہوا اور انہوں نے منھ پیٹ لیا کہ میرا شوہر انتہائی بوڑھا اور میں کھوسٹ بانجھ بڑھیا پھر اولاد کیسے ہوگی۔ فرشتوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یونہی ہے کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو۔ اے ابراہیم کے گھر والو! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ اس کی رحمت سے کوئی چیز دور نہیں خوب سمجھ لو کہ اللہ رب العزت قابلِ ستائش ہے۔ بڑی عظمت والا حکمت و علم رکھنے والا اور اعلیٰ شان والا ہے یعنی اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

مقصودِ بیان

الْمُكْرَمِينَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ ابراہیمؑ نے بغیر پہچانے مہمانوں کی عزت کی۔ گویا اشارہ اس طرف ہے کہ مہمان خواہ اجنبی ہو اور بغیر بلائے آیا ہو لیکن اس کی عزت کرنی سنتِ ابراہیمی ہے۔

الْمُكْرَمِينَ سے اس بات سے بھی تنبیہ ہو سکتی ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عزت یافتہ ہوتے ہیں۔

فَجَآءَ بِعِجْلٍ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ابراہیمؑ نے رسمی طور پر مہمانوں سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو، کہاں جاؤ گے، کس غرض سے آئے ہو

کھانا کھاؤ گے یا نہیں بلکہ فوراً جو کچھ گھر میں اچھی چیز موجود تھی وہ پیش کر دی اور کھانے کا حکم بھی نہیں دیا لیکن جب کھانے کی طرف ان کے ہاتھ بڑھتے نہ دیکھے تو پھر نہایت ادب سے کھانے کی ترغیب دی اور فرمایا آپ لوگ کچھ کھاتے نہیں اس کی کیا وجہ۔ اس سے بھی مہمانوں کے ساتھ مہذب اور متواضع سلوک کی ہم کو تعلیم مل رہی ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً سے ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں سے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا شاید یہ دشمن ہیں۔ ہم تفسیر میں لکھ چکے ہیں کہ یہ خوف آنی تھا، فطری تھا باقتضاء بشری تھا، خلافِ ایمان نہ تھا۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ الخ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کتنا ہی بڑا عارف یہاں تک کہ ہر وقت پیغمبر برحق کے ساتھ رہنے والا مومن کامل ہو لیکن نتائج کے ظاہری اسباب پر اس کی نظر ضرور رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ضابطۂ الٰہیہ سے واقف ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب کے ساتھ نتائج کو وابستہ کیا ہے، یہ اس کا قانون ہے۔ جب اسباب خارجی خداوند کریم کی طرف سے موجود نہیں ہیں تو پھر نتائج کا ظہور کس طرح ہو سکتا ہے۔

حضرت سارہ بھی عارفہ تھیں۔ بشارت سن کر ان کی نظر بھی ضابطۂ الٰہیہ پر پڑی اور بوڑھے والدین کے ہاں بچہ کی پیدائش ان کو قانونِ قدرت کے خلاف نظر آئی اس لئے تعجب کیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظر بہت اونچی تھی۔ آپ ضابطۂ عام جاری کرنے والے کی قدرت کو پہچانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس ضابطہ کی بعض اوقات شکست بھی ضابطہ کے اندر داخل ہے اور قدرتِ الٰہی کبھی اس عام ضابطہ کو توڑ کر غیب سے کوئی پوشیدہ سبب پیدا کر کے نتیجہ ظاہر کر دیتی ہے اس لئے آپ کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ کہہ کر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی غیبی قدرت اور پرحکمت ظہورِ قدرت کی طرف اشارہ کر دیا وغیرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْحَمِيْدِ کہ چھبیسویں جز کی تفسیر اس کی توفیق سے ختم ہوئی۔

فارجو اللّٰه اَنْ ينفعني به وَاِيَّاكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ يتقبله مني بفضله وكرمه۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَيَانُ السُّبْحَانُ

کا

پارہ نمبر ۲۷

قَالَ فَمَا

فاضلِ اجل حضرت مولانا عبد الدائم جلالی

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند۔ یو، پی

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو،پی) سے شائع کیا

ستائیسواں پارہ

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ○ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ

ابراہیم کہنے لگے (کہ) اچھا تو (بتلاؤ کہ) تم کو تمہاری مہم کیا درپیش ہے اے فرشتو فرشتوں نے کہ ہم ایک مجرم قوم (یعنی قوم لوط) کی طرف

مُّجْرِمِينَ ○ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ○

بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر کنکر کے پتھر برسائیں جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالم غیب میں) خاص نشان ہیں

فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ

حد سے گزرنے والوں کے لئے اور ہم نے جتنے ایماندار تھے سب کو وہاں سے نکال کر علیحدہ کر دیا سو بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کوئی گھر (مسلمانوں کا) ہم نے

الْمُسْلِمِينَ ○ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ○

نہیں پایا اور ہم نے اس واقعہ میں (ہمیشہ کے واسطے) ایسے لوگوں کے لئے ایک عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

تفسیر تعلیم من جانب اللہ اور خبر صادق سے وہ جذبۂ رغبت و خوف جو وقتی طور پر اپنی حد سے آگے بڑھ کر ابھر آتا ہے زائل ہو جاتا ہے۔ اچانک خوف و رغبت جو کسی ناگہانی واقعہ کے ظہور کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے حقیقتِ حال کے علم کے بعد ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوف مہمانوں کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد جاتا رہا، لیکن ایک کانٹا دل میں نیا کھٹکا، آخر ان کے آنے کی وجہ کیا ہے، کیوں یہ اجتماعی شکل میں آئے ہیں۔ بشارت ایک فرشتہ کی معرفت بھی مل سکتی تھی اور براہِ راست وحی سے بھی۔ شاید ان کے آنے کی کوئی اور غرض ہے، آپ واقفِ اسرارِ معرفت تھے، ادا شناسِ الوہیت تھے۔ سوچ میں پڑ گئے کہ جماعتِ ملائکہ کیوں اتری ہے، اس لئے دریافت کیا کہ آپ بارگاہِ الٰہی کے فرستادہ ہیں، لیکن کون سا عظیم الشان کام ہے جس کے لئے آپ کو بھیجا گیا ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا ہمارا آنا قوم لوط کو عذاب دینے کے لئے ہوا، ہم ان پر کنکر یلے پتھر برسائیں گے ہر پتھر نامزد ہے جس شخص کو اس سے مرنا ہے اس کا نام اس پتھر پر لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر پتھر کو جدا جدا ہر شخص کے لئے نامزد کر دیا ہے۔ افرادِ قوم لوط حد سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ ان کی سرکشی حد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ ہاں (اگر آپ کو مومنوں کی طرف سے اندیشہ ہو تو آپ ان کی ہلاکت کا اندیشہ نہ کریں) جو مومن وہاں ہوں گے ہم ان کو پہلے ہی وہاں سے نکال لیں گے، لیکن وہاں تو ایک گھر یعنی خانۂ لوط کے علاوہ کوئی مومن ہے ہی نہیں (اور خانۂ لوط میں بھی ان کی بیوی مومن نہیں ہے وہ اپنی قوم کی ساتھی ہے، اس لئے اس کو بھی ہلاک کر دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ قوم لوط کی بستیاں تباہ کر دی گئیں۔ ان پر کنکریلے پتھر بھی برسائے گئے اور نام و نشان مٹا دیا اور آنے والوں کے لئے ان کی تباہی اور آثارِ باقیہ سرمایۂ عبرت بن کر رہ گئے۔ یہ عبرت انہی لوگوں کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ جو بے باک منکرِ عذاب ہیں ان کو ان فرسودہ کھنڈروں سے کوئی سبق نہیں مل سکتا۔

تحلیل اجزاء: قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ — الْمُرْسَلُونَ بھیجے ہوئے فرستادگان جو شخص لوگوں کو دامن

کرنے کے لئے بذریعہ وحی مامور ہو وہ مرسل یا رسول کہلاتا ہے اور جو فرشتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم پہنچانے یا عذاب نازل کرنے یا کسی اور کام کے لئے بھیجا گیا ہو وہ بھی مرسل ہے۔ اصطلاحی معنی کی لغوی معنی سے مناسبت ظاہر ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ۔ حضرت ابراہیم ہجرت کرکے ملک شام میں آ بسے۔ آپ کے بھتیجے لوط بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابراہیم کی زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور بحیرۂ مردار کے کنارہ پر بسی ہوئی قوم کی ہدایت پر مقرر فرمایا۔ اس قوم کی پانچ بستیاں تھیں۔ سدوم اور عمورہ بڑی آبادیاں تھیں۔ یوں تو لوگ رہزن اور ڈاکو بھی تھے اور سرِ راہ فسق و فجور کے خوگر بھی تھے۔ لیکن شرک کے بعد ایک جرم ان کا سب سے بڑا تھا اور ایسا تھا کہ ان سے پہلے کسی نے بھی یہ جرم نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کہ عورتوں کو چھوڑ کر وہ لڑکوں سے بدکاری کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام مامور ہوکر ان بستیوں میں گئے اور ہر چند نصیحت کی، لیکن کسی نے بھی نہیں مانا۔ یہاں تک کہ آپ کی بیوی بھی ایمان نہیں لائی اور شرک و معصیت میں اپنی قوم کی ساتھی رہی۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ ساحل مردار پر جو قوم آباد تھی وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام ان کے لئے غیر تھے۔ بہرحال کسی قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ حضرت لوط نے ہر چند عذاب خداوندی سے ڈرایا۔ آخر عذاب کا وقت آیا اور فرشتے عذاب پر مامور ہو کر آگئے۔ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند اور پوتے کی بشارت دی۔ پھر ظاہر کیا کہ ہم قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم نے کہا وہاں تو لوط بھی رہتے ہیں پوری بستی کیسے غارت کی جاسکتی ہے۔ فرشتوں نے کہا اس کا علم ہمیں بھی ہے۔ ہمیں حکم مل چکا ہے کہ ہم ان کو اور ان کے ساتھ دوسرے مومنوں کو اور ان کے گھر والوں کو بچالیں۔ ہاں ان کی بیوی نہیں بچ سکتی۔ وہ بھی دوسرے مجرموں کے ساتھ اپنے کرتوت کی پاداش میں ہلاک کر دی جائے گی۔

(یہ تفصیل سورۂ عنکبوت میں آچکی ہے)

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ۔ تاکہ ہم (اوپر سے) ان پر مٹی کے پتھر یعنی کنکر چھوڑیں۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ۔ جو آپ کے رب کے نزدیک ان لوگوں کے لئے نام بنام مقرر کردیے گئے ہیں جو فسق و بدکاری میں حد (انسانیت) سے آگے بڑھ چکے ہیں۔

حضرت ابن عباس کے نزدیک مُسْرِفِيْنَ سے مشرک مراد ہیں۔ شرک سب سے بڑا اور بڑھ کر گناہ ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ سو لوط کی بستیوں میں جو مومن تھے ان کو ہم نے (عذاب نازل کرنے سے پہلے) باہر نکال لیا یعنی جب حضرت لوط علیہ السلام قوم والوں کی یورش سے بہت پریشان ہوئے اور آپ کو اپنی آبرو ریزی کا مخمصہ ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا لوط ہم آپ کے رب کے فرستادہ ہیں۔ ان لوگوں کی رسائی آپ تک نہ ہو سکے گی، یہ دست درازی نہ کرسکیں گے۔ آپ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر کچھ رات رہے یہاں سے باہر نکل جائیں اور کوئی منہ پھیر کر نہ دیکھے سوائے آپ کی بی بی کے (وہ باہر نہیں جائے گی اور) اس پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قوم پر آئے گا۔ حضرت لوط علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر پچھلی رات سے نکل گئے۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (پھر) ہم کو ان بستیوں میں مسلمانوں (یعنی مومنوں) کے ایک گھر کے علاوہ کوئی دوسرا گھر نہیں ملا (اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کی بیٹیاں ان کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ بیوی تو ان کے ساتھ شامل بھی نہ ہوئی۔)

او پہلی آیت میں اَلْمُؤْمِنِيْنَ آیا ہے اور اس جگہ اَلْمُسْلِمِيْنَ کچھ لوگ اس سے یہ سمجھ گئے کہ ایمان اور اسلام مترادف الفاظ ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے (یہ مسئلہ بجائے خود ثابت ہے) ہاں ہر مومن کا مسلم ہونا چونکہ ضروری ہے اور لوط کے گھر والے مومن تھے، اس لئے ان کو المسلمین بھی فرمایا۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔ اور ہم نے ان بستیوں میں نشان عبرت چھوڑ دیئے لیکن یہ عبرت انہیں لوگوں کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور عبرت حاصل کرنا چاہتے ہیں ورنہ یوں تو سینکڑوں نشان قدرت و عبرت لوگوں کی نظر کے سامنے آتے ہیں اور غفلت پوش دماغ رکھنے والے دیکھے چلے جاتے ہیں اور کوئی نافرمانی و سرکشی سے باز نہیں آتا۔

نشانہائے عبرت کیا ہیں۔ کسی نے کہا پانی سیاہ اور بدبودار ہے۔ کسی نے کہا تہ بہ تہ چٹانیں ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ یہاں کھنڈر ہیں جن کے

کچھ کچھ نشان باقی ہیں ۔ باقی ان مقامات پر بستیوں والوں کی نسل سے بھی کوئی موجود نہیں ۔

مقصودِ بیان اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرکش اشخاص و اقوام پر تباہ کن عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے یعنی غیبی فرشتوں کا انسانوں کو ہلاک کرنا ، بستیاں اُلٹنا اور ملک کے ملک کو غارت کر دینا ممکن ہے بلکہ متعدد بار واقع ہو چکا ہے ۔ تباہی اور ہلاکت صرف ظاہری اسباب اور محسوس مصائب سے ہی نہیں ہوتی بلکہ غیبی تصرفات کے ہاتھوں سے بکثرت ہوتی ہے ، اس لئے آیت کو اگر ہم آیت وبشرو کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کی نہ کسی سے ذاتی دوستی ہوتی ہے نہ دشمنی ۔ وہ مامور من اللہ ہیں ۔ نیکوکار مومنوں کی نامرادی اور مایوسی کے زمانہ میں جب کہ ظاہری اسباب و وسائل منقطع ہو چکے ہوتے ہیں ، کامرانی و مراد برآری کی جہاں بشارتیں دیتے ہیں وہیں بدکار نافرمان خسران مآل کافروں کو آن کی آن میں بحکم رب تہس نہس بھی کر دیتے ہیں ۔

آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ فرشتوں کی طاقت بڑی ہمہ گیر ہے ۔ چند فرشتے زمین کو الٹ سکتے ہیں ۔ پتھروں کنکروں کی بارش کر سکتے ہیں اور سارے ملک کو غارت ایک لمحہ میں کر سکتے ہیں ۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب لوگ مدہوش خواب غفلت میں پڑے ہوتے ہیں ۔ اس وقت غفلت کی حالت میں غیبی عذاب آتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ

اور موسیٰ کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ہم نے ان کو فرعون کے پاس ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی معجزہ) دے کر بھیجا سو اس نے مع اپنے ارکان سلطنت

قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ

کے سرتابی کی اور کہنے لگا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون سو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) اور اس نے کام ہی ملامت

مُلِيْمٌ ۝ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ

کا کیا تھا اور عاد کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ہم نے ان پر نامبارک آندھی بھیجی جس چیز پر گزرتی تھی (یعنی ان اشیاء میں سے کہ جن کے ہلاک

شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى

کا حکم تھا) اس کو ایسا کر چھوڑتی تھی جیسے کوئی چیز گل کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور ثمود کے قصہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ان سے کہا گیا اور تھوڑے

حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ

دنوں چین کر لو (سو اس ڈرانے پر بھی) ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی سو اُن کو عذاب نے آ لیا اور وہ (اس عذاب کے آثار کو) دیکھ رہے تھے سو نہ تو

قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

کھڑے ہی ہو سکے اور نہ (ہم سے) بدلہ لے سکے اور ان سے پہلے قوم نوح کا یہی حال ہو چکا تھا (یعنی اس سبب سے کہ) وہ بڑے نافرمان لوگ تھے

تفسیر حق و باطل کے مقابلے میں انجام کار حق غالب رہتا ہے ۔ باطل کی برتری وقتی ہوتی ہے اور حق کا غلبہ آخری ۔ اس تصادم اور ٹکراؤ میں ممکن ہے کہ باطل کا انجام اس دنیا میں ہولناک نہ ہو اور باطل پرست شکست کھانے کے بعد بھی ذلت کے ساتھ زندہ رہیں ۔

اور کسی وقت پر سوا تھا میں سا توام کے عروج وزوال اور زوال وعروج کا یہ چکر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لیکن جب پیغمبر برحق زندہ ہو اور کفر کی طاقت برسر عناد آکر مقابلے پر ڈٹ جائے تو نا ممکن ہے کہ پیغمبر کو شکست ہوجائے۔ پیغمبر کی مشن ضرور کامیاب ہوکر رہتا ہے اور پھر کفر کی طاقت ایسی ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے کہ کافروں کا تختہ تاراج ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ تباہی انہی کافروں پر ٹوٹتی ہے جو جذبۂ عناد کے زیر اثر نبی برحق سے آکر ٹکراتے ہیں۔ اقوام قدیمہ کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اطراف عالم میں بے گنتی ایسے واقعات ہوئے ہیں، چین ہو یا ہندوستان، ترک ہو یا تاتار، مشرق ہو یا مغرب، ہر جگہ اور ہر قوم وملت کو ان واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن عرب کے سامنے تو عرب اور عرب سے متصل سرزمین حجاز، تہامہ، سنجد، شام، یمن، عراق، مصر وغیرہ میں جن پیغمبروں کو بھیجا گیا اور کافروں نے ان سے تصادم کیا تو ایسے تباہ وبرباد ہوئے اور ان کا ایسا ستیاناس ہوا کہ نام ونشان بھی باقی نہیں۔ نوح کی قوم کس سمندر میں ڈوب گئی کہ ان کی نسل کا نشان بھی نہیں رہا۔ سدوم اور عمورہ کی آبادیاں کہاں الٹ گئیں کہ ان کا پتہ بتانے والا بھی کوئی باقی نہیں۔ عاد کی قوم کو کون سی طوفانی ہوا اڑا کر لے گئی کہ کہیں ان میں سے کسی ایک کی نسل بھی نہیں ملتی۔ ثمود کی قوم کے جگر کس زلزلے اور غیبی آواز سے شق ہوگئے کہ سب مرے کے مرے رہ گئے۔ فرعون اور اس کی قبطی فوج کس دریا میں ڈوب مری اور کن مچھلیوں کی خوراک بن گئی کہ فرعون کی لاش کے علاوہ کسی کا نشان بھی دکھائی نہیں دیکھتا۔ یہ ساری تباہ کاریاں پیغمبروں پر عناد، خصومت اور جنگ وقتال کے نتیجہ میں سامنے آئیں۔ رہی آخرت کی تباہی اور سزا اس سے تو کوئی کافر محفوظ نہیں رہے گا۔

تحلیلِ اجزاء وَفِىْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ یعنی جس طرح قوم لوط کا انجام ما ننا کرہم نے خوفِ عذاب رکھنے والوں کے لئے عبرت اور درس نصیحت بنایا ہے۔ اسی طرح موسیٰ کے واقعہ میں بھی ہم نے اہل فکر کے لئے عبرت آموزی کا سبق قائم کیا ہے جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو روشن دلیلیں اور واضح معجزات دے کر فرعون اور فرعون والوں کے پاس ہدایت کے لئے بھیجا، لیکن فرعون مغرور تھا۔ اس کے تکبر نے اس کو حق کا اقرار نہ کرنے دیا اس نے حق سے عناد کیا۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ اور ہمارے فرمان کو اپنی طاقت وقوت کے گھمنڈ اور لاؤ لشکر کے بل بوتے پر رد کردیا۔ حق کی طرف سے منہ پھیر لیا (اخفش) اور اپنے ساتھیوں کو حمایت پر لے کر موسیٰ علیہ السلام پر تہمت تراشی کرنے لگا اور دو کوسنے پر اتر آیا۔

وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ۔ اور کہنے لگا موسیٰ یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ۔ آخر اس طاغی کافر معاند متکبر کو ہم نے اس کے لشکر سمیت دریا برد کردیا، سب کو غرق کردیا۔

اس جگہ ایک طویل واقعہ کا خلاصہ صرف عبرت دلانے بعد مکہ کے کافروں کو ڈرانے کے لئے بیان فرمایا ہے۔ پورا واقعہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً سورۂ طٰہٰ میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، قصر فرعون میں پرورش، قتل قبطی، مدین کو فرار، مدین سے مدت دراز کے بعد واپسی، واپسی میں کوہ طور پر نبوت سے سرفرازی وعطاء معجزات، پھر فرعون کے پاس جانے کا حکم، پھر موسیٰ اور ہارون کا دربار فرعون میں پہنچ کر فرض رسالت کو ادا کرنا، فرعون کا انکار، مقابلہ کے لئے جادوگروں کی سارے ملک سے طلبی، پھر جادوگروں سے مقابلہ، ان کو شکست، ان کا ایمان لانا، فرعون کا غضبناک ہوکر ان کو صلیب پر چڑھانا، آخر موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا اور فرعون کا اپنی فوج اور رفقاء کو ساتھ لے کر تعاقب کرنا، بنی اسرائیل کا دریا سے پار ہوجانا اور فرعون کا مع لشکر اور اپنے رفقاء کے ڈوب جانا بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہاں اس واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کردیا ہے۔

وَفِىْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ۔ مَا تَذَرُ مِنْ شَىْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ اسی طرح قوم عاد کے واقعات میں بھی ہم نے اہل یا ان کے لئے عبرت کی نشانیاں رکھی ہیں (جب حضرت ہود علیہ السلام کی نصیحت کو انہوں نے پائے استحقار سے ٹھکرایا اور کسی پیغمبر برحق کی نصیحت کو نہ مانا اور شرک سے باز نہ آئے تو) ہم نے ایک طوفانی ہوا جو بے برکت تھی اس میں رحمت کی بارش نہ تھی ان پر سات شبانہ روز مسلط کردی۔ اس طوفان نے قوم عاد اور ان کے سروسامان کو تہ وبالا کردیا، وہ ایک لپیٹ میں جس کو لگ گئی اس کو بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈی کی طرح چورا کردیا۔ یہ طوفانی ہوائیں جنوبی تھیں یا پچھمی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میری مدد پُروا ہوا سے کی گئی تھی۔ عاد والے

بھی ہواؤں کے طوفان سے ہلاک کیے گئے ۔
قوم عاد کا واقعہ بھی قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے اور ہم نے اس کی مفصل تشریح کر دی ہے ۔ اس جگہ اجمالی طور پر اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ پیغمبروں سے سرکشی اور عناد، آخر میں تباہی کو دعوت دیتا ہے اسی سرکشی اور عداوت کی وجہ سے قوم عاد تباہ ہوئی ۔ باوجودیکہ بڑی طاقتور، دراز قامت اور شان و شوکت والی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے ایک ادنیٰ اشارہ سے غیبی اسباب ہلاکت سے ایسے غارت ہوئے کہ نام نشان بھی باقی نہیں رہا۔

وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝ اسی طرح قوم (صالح علیہ السلام یعنی) ثمود کے واقعات کو بھی ہم نے عبرت انگیز بنایا ہے (جب انہوں نے حضرت صالحؑ کی نصیحت کو نہ مانا اور بت پرستی سے باز نہ آئے اور اپنا فرمائشی معجزہ دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائے بلکہ وہ اونٹنی جو حضرت صالحؑ کی دعا سے معجزہ کے طور پر پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی ۔ اس کو بھی بدکاروں نے قتل کر دیا تو اس وقت حضرت صالح علیہ السلام کی زبانی) ان سے کہہ دیا گیا کہ اب عذاب کا آنا یقینی ہے ایک مقررہ وقت تک چھوٹ ہے (تین دن کے اندر عذاب آجائے گا) انہوں نے امر رب سے سرتابی کی اس لئے عذاب الٰہی آگیا (تین روز گزرنے کے بعد چوتھے روز صبح ہی صبح) زمین کے اندر سے یا آسمان کی طرف سے ایک ایسی ہولناک چیخ لپٹ پڑی کہ ہوش باختہ ہوگئے ۔ جہاں تھے وہیں دوزانو ہو کر زمین سے چمٹ گئے ۔ کھڑا ہونا تو درکنار کھڑے ہونے کی بھی تاب نہ رہی اور کسی طرح اپنے کو بچا نہ سکے ۔ سب کے سب مرے کے مرے رہ گئے ۔ ثمود کا قصہ بھی کلام پاک میں بہت جگہ آیا ہے ۔ یہ قوم عاد کی نسل سے تھے ۔ اسی لئے ان کو عاد ثانیہ کہا جاتا ہے ۔ اقوام قدیمہ میں عاد طسم جدیس وغیرہ کی طرح ان کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ دولت و ثروت میں ان کی بہت بڑی طاقت تھی ۔ پتھروں کو تراش کر پہاڑوں کے غاروں کے اندر انہوں نے مضبوط مکان بنائے تھے، لیکن آن کی آن میں غیبی چیخ یا کڑک سے ساری قوم ہلاک ہو گئی ۔ حضرت صالح علیہ السلام تو اپنے ساتھ مومنوں کو لے کر وہاں سے نکل ہی آئے تھے ۔ ان کی تباہی کے اندر بھی خزانۂ عبرت ہے ۔ مگر انہی لوگوں کے لیے جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں ۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ اور ان سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کو تباہ کیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے نافرمان تھے، نافرمانی اور بدکاری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر پانی کا طوفان مسلط کر دیا جس نے سب کو غرق کر دیا ۔ حضرت نوحؑ قدیم نبی تھے ۔ کچھ کم ہزار برس کافروں کو نصیحت کرتے رہے پر کافروں نے بت پرستی نہ چھوڑی اور حضرت نوح علیہ السلام کو ستاتے رہے ۔ آخر ایسا طوفان آیا کہ سب ڈوب گئے ۔ یہ واقعہ بھی قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے ۔

مقصودِ بیان

متعدد انبیاء اور ان کی قوموں کے عبرت انگیز واقعات کو بیان کر کے کفار مکہ کو یہ سبق دینا ہے کہ حال ماضی کا آئینہ ہے ۔ ماضی کی تصویر حال کے آئینہ میں دیکھو اور غور کرو کہ انبیاء سے عداوت و عناد اور ان کی ہدایت سے سرکشی موجب تباہی ہے ۔ پس تم بھی عبرت حاصل کرو اور رسول برحق کی مخالفت ترک کر دو ورنہ آخر کار تم بھی تباہ کر دیے جاؤ گے ۔

نَبَذْنٰهُمْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ فرعون کا لشکر بھی فرعون کے ساتھ دریا میں غرق ہوگیا ۔ قوم عاد کو طوفان ہوا سے اور قوم ثمود کو عذاب صاعقہ سے ہلاک کرنا آیات میں صراحۃً مذکور ہے ۔ ان آیات کا مطالعہ ہم کو سبق دے رہا ہے کہ اقوام گذشتہ کی تباہی گو پیغمبروں سے عناد و عداوت رکھنے اور ان کی ہدایت سے سرتابی کرنے کی وجہ سے ہوئی، مگر ہوئی اسباب مادیہ ہی کے ذریعہ سے ۔ اگرچہ وہ مادی اسباب ظاہری نہ تھے غیبی تھے ۔ ان میں حرکت کسی غیبی ہاتھ کے قوی ہاتھ سے ہوئی تھی ۔ پس مادی اسباب کی حرکت نہ اتفاقی ہے نہ ارادہ و اختیار کے ساتھ بلکہ غیبی ارادہ و مشیت و قدرت کے زیر اثر ہوتی ہے ۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ ۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ۝ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ

اور ہم نے آسمانوں کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو ہم (کیسے)

الْمَاهِدُونَ ○ وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

اچھے بچھانے والے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم بنایا تاکہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو

فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ○

تو تم اللہ ہی کی (توحید کی) طرف دوڑو میں تمہارے سمجھانے کے واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہو کر آیا ہوں

تفسیر قرآن مجید کا اسلوب تبلیغ اپنے اندر ایک خاص ندرت رکھتا ہے۔ یہ ضابطۂ اشباہ نظائر کے زیر اثر اقوام ماضیہ کے احوال و نتائج کی تصویر کشی کرتا ہے۔ افراد و امم کے اطوار و اعمال اور کردار و افکار کا نقشہ پیش کرتا ہے اور افراد و امم کے نام بدل کر حال و مستقبل کے اشخاص و طوائف امم کے نام اس نقشہ میں بھر دیتا ہے۔ پڑھنے اور مطالعہ کرنے والے ماضی کے آئینے میں اپنی تصویریں دیکھنے لگتے ہیں اور اپنی تصویروں کے ساتھ افکار و گفتار اور کردار و اطوار وہی لکھے پاتے ہیں جو ماضی کی عبرت آفریں داستانوں میں انہوں نے پڑھی تھیں۔ اور جن کے نتیجہ میں بہبود و نابود سعادت و شقاوت اور فلاح و ہلاکت سے دوچار ہو کر افراد و ملل زیب داستان بن گئی تھیں۔ اس طرز تبلیغ سے پڑھنے اور سننے والے کے جذبۂ رغبت و خوف میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وہ حصول فلاح یا دفع ہلاکت کیلئے فکر و عمل کی غلطی سے جھجکنے لگتا ہے اور اپنے عقائد و اعمال کو درست کرنے یا صحیح رکھنے کی کوشش میں مشغول ہو جاتا ہے، لیکن یہ طرزِ تبلیغ گو کتنا ہی بلیغ مؤثر اور گہرے نقوش ثبت کرنے والا ہو پھر بھی جذبات سے آزاد اور ہر خوف و لالچ سے بے نیاز فکر و نظر رکھنے والوں کے دماغوں پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ وہ پوچھتے ہیں ظلم بُرا ہے کیوں اور انصاف اچھا ہے کس وجہ سے۔ نادر و چنگیز ظالم تھے، فرعون و نمرود ظالم تھے اور سب تباہ ہو گئے۔ ان کا نشان بھی مٹ گیا صرف اس وجہ سے ظلم برا ہے۔ نوشیرواں عادل تھا، صلاح الدین عادل تھا، جہانگیر عادل تھا۔ تاریخ میں ان کے کارنامے روشن حروف کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگیاں خوش گوار اور مطمئن تھیں صرف اس سبب سے انصاف اچھا ہے۔ راون بُرا تھا، ظالم اور ہوس پرست تھا ہلاک ہو گیا۔ رام اچھا تھا، عادل، غیرت مند اور صفا کیش تھا کامیاب ہوا اور بقائے دوام حاصل کی، اس لئے ظلم بُرا ہے اور انصاف اچھا۔

یہ طریق استدلال صرف نورانی اور روحانی فہم و دانش والوں کو مطمئن نہیں بنا تا وہ نتائج کو اسباب سے وابستہ ضرور جانتے ہیں، لیکن نتائج کی روشنی میں اسباب کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ طریقہ تمثیلی یا استقرائی ہے جو مفید علم ضرور ہے، لیکن مفید یقین نہیں۔ وہ سادہ بے جذبہ عقل رکھنے والوں کو یقین دلانے کیلئے نفس خیر و شر اور صحت و غلطی کی جانچ پڑتال کرنے اور عقلی دلائل و براہین سے کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ نور علم اور وجود کو اچھا کہتے ہیں، اس لئے کہ عقلی شہادت ان کو اچھا کہتی ہے اور تاریکی جہالت اور عدم کو یہ برا کہتے ہیں، اس لئے کہ سادہ غیر مادی فکر ان کو برا کہتی ہے۔ جذبات سے آزاد رہنے والوں کی دعوے کی یہ طلب صحیح ہے یا غلط یہ بات اپنی جگہ رہی، لیکن اس قسم کی طلب بے ضرور اور علم و حکمت کے بعض دعوی کرنے والوں کے اندر اس طرح کی پیاس ہے لازمی۔ قرآن کریم نے تقریباً تین سو آیات میں اس طرح کے اہل دانش کو مختلف پیرایۂ بیان میں ایک ہی حقیقت کو رونما کرکے دعوت غور و فکر دی ہے اور آفاق و انفس کے مطالعہ کرنے اور بصیرت مندانہ نظر ڈالنے کی طرف مائل کیا ہے۔ ہر دس پندرہ آیات کے بعد کائنات اندرونی یا بیرونی کی صنعت حکمت اور یگانگت یا حدوث تغیر اور فنا یا کمال اتقان اور افادیت غرض مختلف اسرار و رموز کو پیش کیا ہے تاکہ مدعیانِ عقل ترہیب و ترغیب اور جذبات نفور و محبت سے آزاد ہو کر غور کریں اور سوچیں۔ خالق کی ہمہ جہات وحدت پر استدلال کو سمجھیں۔ ربوبیت تشریعیہ و تکوینیہ کا یقین کریں۔ اور وجود بعد العدم سے عدم بعد الوجود اور پھر وجود بعد العدم کو قابلِ شک نہ قرار دیں۔ تکوینی قانونِ خیر و شر کی خوب سوچ بچار

کے بعد اس کے بنانے والے کی جستجو کریں وغیرہ وغیرہ۔
آیات زیر تفسیر میں بھی آسمان کی ساخت کا استحکام زمین کی پہنائی اور دنیا کی ہر چیز کا تقابلی وجود اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدت وعلم وقدرت کے ثبوت کے لئے بطور استدلال پیش کیا گیا ہے اور پھر ہر قسم کے شرک سے بھاگ کر اور ہر متغیر فنا پذیر ہستی سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے پناہ جوئی اور اسی کے احکام شرعی اور امداد تکوینی کے سایہ میں آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اللہ و رسول کی مخالفت سے بلسان رسالت ڈرایا گیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ ایدٍ۔ طاقت۔ قدرت (حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، سفیان ثوری وغیرہ)، لَمُوْسِعُوْنَ۔ ہم بلاشبہ بڑی طاقت والے ہیں۔ ہماری قدرت وسیع ہے۔ وُسْعٌ طاقت (حضرت ابن عباس)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔ ضحاک نے مُوْسِعُوْن کا ترجمہ اغنیاء کیا ہے۔ ہم بے نیاز اور بے احتیاج ہیں۔ آیت میں آیا ہے۔ علی الموسع قدرہٗ یعنی غنی پر اس کے اندازہ کے مطابق لازم ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول اِنَّا لموسعون کے متعلق یہ آیا ہے کہ ہم مخلوق کا رزق وسیع کرنے والے ہیں۔ ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم ہی آسمان کو وسیع بنانے والے ہیں یا آسمان و زمین کے درمیان بڑی وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ اور زمین کو ہم نے فرش بنایا اور بچھایا ہے تاکہ مخلوق اس پر رہے قرار پکڑے (اور استراحت حاصل کرے)، خلاصہ یہ ہے کہ آسمان کی یہ مضبوط وسیع چھت اور زمین کا عریض بسیط ہموار فرش اللہ نے ہی بنایا ہے۔ پس سارے جہان نشیب و فراز کا بنانے والا نیست سے ہست کرنے والا اور عدم محض سے برآمد کرنے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں اور اس عالم بالا و پست میں سے کوئی چیز اپنے وجود اپنی ذات اور بقائے ذات و ہستی میں اس کی محتاج ہے وہ ان میں سے کسی چیز کی محتاج نہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کوئی چیز نہ ہوتی اور اس کا کوئی شریک اور تخلیق میں ساجھی ہوتا تو اس کو اس جہان پر قدرت تامہ حاصل نہ ہوتی اور تنہا اس کا قانون ایجاد و بقا ان پر لاگو نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کوئی غیبی طاقت جو ہمہ گیر قدرت رکھتی ہے موجود ہے اور وہ تنہا اس کی خالق، موجد اور قابض ہے۔ کوئی مخلوق اس کے مشابہ نہیں۔ کیوں۔ اس وجہ سے کہ۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ اسی نے ہر چیز کا جوڑا جوڑا یا دو دو قسمیں پیدا کی ہیں۔ مخلوق میں سے کوئی چیز بھی حقیقی نہیں اضافی ہے۔ ہر ایک کا مقابل موجود ہے۔ کوئی طاقت ضعف سے خالی نہیں۔ کوئی بلندی بغیر پستی کے نہیں۔ کوئی روشنی بغیر تاریکی کے نہیں، کوئی علم بغیر جہالت کے نہیں، کوئی قدرت بغیر عجز کے نہیں۔ کسی کی زندگی نہ بغیر موت کے اور کسی کا وجود بغیر عدم کے نہیں، رات اور دن ہم زاد ہیں۔ پستی اور بلندی توام ہیں، نیستی کے ساتھ ہستی ہم کنار ہے۔ یا کسی میں ایسی ہمہ گیر طاقت و قدرت ہے کہ ضعف و عجز بالکل نہ ہو۔ کیا کوئی علم ایسا کامل ہے جس میں کسی چیز سے ناواقفیت نہ ہو۔ کیا کوئی ایسا وجود ہے جس کا ابتدائی کنارہ عدم سے ملا ہوا نہ ہو، یا کوئی ایسی ہستی ہے جو فنا اور نیستی کے توارد سے خالی ہو، یا کوئی ایسی زندگی ہے جس پر موت طاری نہ ہو سکے۔ پس ہر چیز جوڑا جوڑا ہے تو کس میں صلاحیت و قابلیت ہے کہ واحد حقیقی کو شریک وجود و بقا یا شریک ایجاد و تخلیق یا شریک ربوبیت و الوہیت ہو سکے۔ وہ واحد ہے، بہمہ جہات واحد، بہمہ صفات واحد، بہمہ اعتبارات واحد کہ اس میں اضافیت نام کو نہیں۔ وہ عالم کل ہے۔ بغیر ادنیٰ جہالت کے وہ قادر مطلق ہے۔ بغیر کسی عجز و ضعف کے، وہ نور بہ کامل ہے بغیر کسی ظلمت کے، وہ باقی ہے بغیر کسی احتمال فنا کے، وہ حاکم اعلیٰ ہے بغیر محکومیت کے، وہ متصرف اور ہمہ رس متصرف ہے بغیر کسی رکاوٹ کے۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ پس سوچو سمجھو اور نصیحت حاصل کرو۔ تمہارے اور سارے جہان کی تخلیق کا تقاضا ہے اور تمہارا ذی عقل ہونا اس کو دعوت دے رہا ہے کہ تم غور کر کے سمجھو گے کہ سارے عالم میں تعدد اور اثنینیت ہے اور واحد حقیقی صرف ایک ذات بے ہمتا ہے۔ وہی عالم کل ہے وہی قادر کل وہی منتظم اور رب۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ پس ساری مخلوق سے منہ موڑ لو۔ کسی کو کارساز نہ سمجھو۔ کسی کے قانون و آئین کی طرف مائل نہ ہو۔ کسی کو معبود نہ بناؤ

سب سے ہٹ کر بس اللہ ہی کی طرف دوڑو ۔ اسی کے دامنِ عافیت میں پناہ لو ۔ اسی کے بھیجے ہوئے دستور کی پابندی کرو ۔ اسی کو اپنا معبود مانو ۔ اسی کے سامنے سرِ اطاعت خم کرو اور اسی کے قرب کی تلاش کرو (اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ میں اسی کا پیغام سناتا ہوں ۔)

اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اس کی نافرمانی کے عذاب سے واضح طور پر ڈراتا ہوں ۔ اگر اس آئینہ کو جو میری معرفت اس نے بھیجا ہے نہ مانو گے اور اس کو غلط جانو گے اور میری تکذیب کرو گے تو دنیا میں بھی تباہ ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا ہو گے ۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت ماننے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی ذات کو مع تمام ثبوتی وسبی صفات کاملہ کے مانا جائے ۔ اثبات الصفات جو آٹھ ہیں کتب عقائد میں ان کی توضیح مفصل طور پر کر دی گئی ہے ۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان صفات کا حامل صرف اسی کی ذات کو قرار دیا جائے ۔ جس طرح مخلوق کی صفات سے اس کی ذات پاک ہے ۔ اسی طرح اس کی مخصوص صفات میں سے کوئی صفت بھی مخلوق میں نہیں پائی جاتی اور پائی جانا ممکن ہی نہیں ہے ۔ پس کوئی بھی اس کی الوہیت میں شریک نہیں ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ اگر کسی دوسرے کو الوہیت اور معبودیت میں اللہ کا شریک قرار دیا جائے اور کوئی سہارا ڈھونڈا جائے تو یہ عقیدہ غلط کل گمراہ اور خیال خام ہوگا ۔ کوئی بھی اس عذاب سے بچا نہیں سکتا ۔

قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ یا تو محض تاکید ہے یا یہ کہ اول مرتبہ خواص کو ڈرایا گیا تھا کہ وہ کسی کی طرف توجہ نہ کریں مرکزِ محبت صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیں اور دوسری مرتبہ عوام کو ڈرانا مقصود ہے کہ اگر وہ استغراقِ محبت کے درجہ پر فائز نہیں اور اپنی توجہ کامل طور پر مخلوق سے ہٹانے پر قادر نہیں تو کم از کم شرک سے تو پرہیز کریں ۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے ایسی محبت نہ کریں کہ اس کی الوہیت میں کسی اور کو ساجھی بنا دیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی پوجنے لگیں ۔

اس فقیر کی نظر میں آیت تخویف کی تکرار کی جو وجہ تھی وہ تشریحی سطور میں ظاہر کر دی گئی ۔ بات یہ ہے کہ اس مجموعۂ ہستی میں فکر و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے تین طبقات رہے ہیں ۔ اور اب بھی ہیں ۔

(۱) ایک طبقہ خود رای خود آراء پر خود غلط خود پرست وہ ہے جو اس ساری کائنات کو خود نائیدہ اور خود رو سمجھتا ہے ۔ مادی نیرنگیوں کی اس کے نزدیک سوا اس کے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مادے کے طبعی تقاضے ہیں ، اتفاقات ہیں ، اس جہان کا نہ کوئی خالق ہے نہ منتظم اور رب ۔ سارے جہان کی نمود اور آرائش بغیر جہاں آرا خلاق کے ہے ۔ انسان ایک مادی حیوان ہے ۔ دوسرے جانوروں سے ممتاز ۔ اپنی عقل و فکر کی وجہ سے ہر بیرونی آئین ساز سے بے نیاز انسان کی عقل بدنی طاقتوں اور شعوری قوتوں کی رب ہے ۔ انسانی معاشرہ اور سماج کی درستگی کیلئے انسانی عقل خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی کافی ہے ۔ اس گروہ کے خیال کی بیخ کنی وَالسَّمَآءَ سے خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ تک کر دی گئی ۔

(۲) ایک طبقہ ان ضعیف العقیدہ مذبذب الفکر توہم پرستوں کا ہے جو ہر اس چیز کے سامنے عبدیت اور عبودیت کا سر جھکا دیتا ہے ۔ جس سے بظاہر اس کو فائدہ پہنچ رہا ہو یا فائدہ پہنچنے کی امید ہو ۔ اس کی نظر میں ساری علوی اور سفلی مخلوق اس کی معبود ہے ۔ یہ سورج کے سامنے بھی سر جھکاتا ہے اور سانپ کے سامنے بھی اور بے جان معدنیات اور پتھروں کے سامنے بھی ۔ ہر وہ چیز جس کو کچھ بھی انسانی مشین کو بنانے یا چلانے میں بظاہر دخل ہے اس طبقہ کیلئے مسجود و معبود ہے ۔ اس کی تردید بھی آیاتِ مذکورہ سے ہو گئی ۔ جب خالق اللہ ہے ہر چیز کو بنانے والا اللہ ہے تو معبودِ مطلق ہونے کا بھی اسی کو حق ہے ۔ وہ رب حقیقی ہے ۔ سب کل پرزے اسی نے بنائے ۔ کوئی پرزہ باختیار خود نہ انسان کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان ۔ کسی کے قبضہ و اختیار میں بات خود کچھ نہیں ، اس لئے کوئی بھی الوہیت یعنی خلاقیت ربوبیت اور ایجاد و بقاء وجود میں اس کا شریک نہیں ۔ خدا کی خاص ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب اس سنسار کی ہر چیز پر خدا ہی کا قبضہ و اقتدار مان جائے ۔ در در کا منہ گدائی لے کر پھرنے والوں کو کیا ضرورت کہ وہ صرف ایک خدا کو اپنا معبود مانیں ۔ ایسی خدائی کا اقرار خود ساختہ دماغی زائیدہ اور خود تراشیدہ عقیدہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اعتراف بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس کو واحد لاشریک اور بے نیاز و غیر محتاج سمجھا جائے ۔ جو خدا مخلوق کا محتاج ہو وہ الٰہ بننے کا حق نہیں رکھتا ۔

(۳) تیسرا طبقہ ان مومن موحد خدا پرست لوگوں کا ہے جو اللہ کو بہمہ حیثیات بہمہ حیثیات ، بہمہ اعتبارات ، وحدہٗ لاشریک لہٗ مانتے ہیں اسی کو

بہبودی اور سدھار تفصیلی دستور اور دستور کے مطابق آئین کی خواستگار ہے اور چونکہ عقلِ بشری اپنی بے بصری۔ دائرہ کی تنگی اور نارسائی کی وجہ سے معاشرہ کی درستی کے لئے دستور و آئین کو جنم نہیں دے سکتی۔ اس لئے عقلِ اعظم علم اکبر اور فوق الکائنات محیطِ کل۔ دقیقہ رس طاقت کی ضرورت سے بے سنسار بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کی راہنمائی اور فیصلۂ خیر و شر کی اطلاع ہر شخص کو کیسے ہو۔ ممکن حادث معدوم الاصل بے حقیقت مخلوق کا واجب قدیم الوجود موجودِ حقیقی سے کیا ربط۔ تکوین جس میں مخلوق کے ارادہ کی آمیزش نہیں۔ دوسری چیز ہے جو ہو گئی۔ بقائے ہستی بھی غیر اختیاری ہے جو ہو رہی ہے۔ لیکن ارادہ افعال و اعمال کی درستگی کے لئے تفصیلی کسبی آئین کا علم تو بغیر ارادی صلاحیت اور اختیاری استعداد کے ناممکن ہے۔ پس ضرورت ہے ایک درمیانی قاصد کی جو معدوم الاصل اور ممکن و حادث ہونے کے باوجود محیط کائنات واجب الوجود ہستی سے کچھ عرفانی نورانی تعلق رکھتا ہو جو بشری تقاضوں کی تاریکی کے باوجود نورانی جگمگاتی روح اور روشن جوہرِ قلب کا حامل ہو۔ ایسی ہی ہستی کو رسول اور نبی کہا جاتا ہے۔ جو شخصی اور سماجی دستور کی روشنی آفتابِ قدم سے حاصل کرتا اور دوسرے انسانوں پر اس کا پرتو ڈالتا ہے۔ پس توحیدِ الٰہ کے عقیدہ کے ساتھ دستورِ الٰہی سے واقفیت کے لئے رسول کو ماننا ضروری ہے۔

رسول کی روح اور قلب میں غیر معمولی نورانیت اور دوسرے انسانوں سے ماوراء ایک خلقی استعداد و صلاحیت ہوتی ہے ایسی جس کا پرتو رسول کے تمام اعضاء و حواس پر بھی پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے خارقِ عادت اور غیر معمولی معجزات کا ظہور ہونے لگتا ہے اور سفلی سطحی نظر رکھنے والے رسول کی صلاحیت اور فیضانِ قدسی سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے حقیقتِ نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ اور معجزات کو کبھی جادو اور کبھی جن رسیدگی، القاء شیطانی یا جنون سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ گو جادو اور القاء شیطانی کی حقیقت سے بھی وہ ناواقف ہوتے ہیں، لیکن انسانوں کے معاشرہ میں چونکہ جادو اور جن رسیدگی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس لئے باوجود نارسیدہ مجہول ہونے کے ان چیزوں کی حقیقت ان کو تسلیم ہوتی ہے اور وہم انسانوں کے فکر کی رسائی ان مجہول الحقیقت یا بے حقیقت چیزوں تک ہو جاتی ہے۔ پس وہ نبوت کو بھی جادو سمجھنے لگتے ہیں اور جادوگر چونکہ مصلح نہیں ہوتا۔ اصلاحِ بشر کے قوانین کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس کو راہنما ماننا اور اس کی بنائی لکیر پر چلنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی تباہی انگیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے جب نبوت کا تصادم کور دانش بے بصیرت انسان کے فہم نارسا سے ہوا تو انہوں نے پیغمبر کو جادوگر یا جن رسیدہ یا دیوانہ کہا اور یہ دستور ایسا استمراری رہا کہ معلوم ہوتا تھا شاید پچھلے لوگ آنے والوں کو وصیت کر کے مرتے ہیں کہ تم بھی مدعیانِ نبوت صادقہ کو جادوگر اور جن رسیدہ ہی کہنا۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا بلکہ عام انسانوں کی تاریک فطرت کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ نورِ نبوت ان کو نظر نہ آئے اور بھٹکنے والے تاریک عقائد و نظریات کی وادی میں وہ سرگرداں رہیں۔ حق و صداقت سے طغیان اور معرفتِ حقیقت کی حدود سے تجاوز تخلیقی اور عادی طور پر سب میں مشترک ہوتا ہے۔ پیغمبر کی ہدایت کی روشنی تو صرف روشن چشم، بصیرت مند فہم رکھنے والوں کو ہی نظر آتی ہے۔ ایقان اور ایمان کی جن میں صلاحیت ہے وہی رسولِ برحق کی نصیحت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جن و انس جس حقیقت کو ماننے اور احکامِ الٰہی کے پابند رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس کو سمجھنا صرف مومن کا کام ہے۔ اصل غرضِ تخلیق تو عرفانِ توحید اور تعمیلِ احکام ہے اور اس سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں بلکہ تحصیلِ معیشت کی ناجائز کوششوں کے راستہ میں آئینِ الٰہی کی پابندی کو رکاوٹ جانتے ہیں۔ باوجودیکہ تخلیقِ رزق جس نے کی اسی نے اپنے ہاتھ تقسیمِ معیشت بھی رکھی ہے۔ اور تقسیمِ ربانی میں احکامِ ربانی کی پابندی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مگر ناحق کوش احسان فراموش انسان کو تاہ نظر ہوتا ہے وہ توحیدِ الوہیت ربوبیت سے منہ موڑ کر اپنے کو آئین ساز اور تحصیلِ علم کا مختارِ مطلق خیال کرتا ہے لامحالہ اس زہر خوری کا نتیجہ ہلاکت انگیز عذاب کی شکل میں اس کے سامنے آئے گا۔ لیکن کب آئے گا اس کا ایک وقت موعود ہے۔ وقت سے پہلے نہیں آسکتا۔ قیامت کا دن سب کا فیصلہ کر دے گا۔

تحلیلِ اجزاء

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تسلی اور ایذاء منکرین پر ثابت قدم اور صابر رہنے کے لئے فرمایا کہ آپ سے پہلے بھی جو پیغمبر آئے ان کو بھی کافروں نے جادوگر یا مجنون کہا تھا۔ یہ مخالفت اور گالی کافروں کی طرف سے صرف آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ کافروں کا یہ قول سلسلہ بسلسلہ یونہی چلا آیا ہے۔ جیسے ایک دوسرے کو وصیت کر جاتا ہو۔ اسلاف اپنے اخلاف سے کہہ جاتے ہوں

کہ تمہارے زمانے میں جو نبی آئے اس کو جادوگر اور مجنون قرار دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکشی اور سرتابی میں یہ سب یکساں ہیں۔ زمانہ اور مقام کا اختلاف ہے ورنہ جو بات پہلے والوں کے منہ سے نکلی وہی ان کی زبانوں سے نکلتی ہے کیونکہ سخت دلی میں سب ایک سے ہیں۔ نارسا فہم رکھنے والے افراد حقیقت رسالت کو نہیں جانتے۔ آدمی کا خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر ہونا ان کو بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر کے معجزات دیکھ لو کوئی جواب سمجھ میں نہیں پڑتا۔ روحانیت کی اتنی روشنی اور نورانیت جو کائنات مادی پر چھا جائے۔ اور اس میں تغیر اور غیر معمولی تبدیلی کو ظاہر کردے۔ ان کیلئے ناقابل فہم ہوتی ہے۔ وہ تاریک روح اور زنگ آلود دماغ رکھنے والے دائرۂ معبودیت کے اندر محبوس ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر خوارق اور معجزات کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں آتی ہے تو وہ بھی روحانی نورانی نہیں ہوتی۔ بلکہ حسی آتشیں شعلہ ہوتی ہے۔ جو بظاہر چمکتا جھلکتا اور حقیقت میں دود سیاہ کے علاوہ اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ جادو کیا ہے محض حسی ملمع کاری ہے۔ تخیل کی یکسوئی اور قوت خیالیہ کی مشق سے کچھ دُخانی آمیز چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے والے اس کو نور خالص سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ نور نبوت و کرامت اور اشتعال سحر میں بصیرت مند لوگوں کو کھلا ہوا فرق نظر آتا ہے۔ ایک طبع ہوتا ہے دوسرا کندن۔ ایک کا تعلق حقیقت سے کچھ نہیں ہوتا محض عارضی نظر بندی اور دیکھنے والوں کے خیال پر اثر اندازی ہوتی اور دوسرے کا اثر انقلابی ہوتا ہے۔ حقائق کو بدلنے والا ہوتا ہے اور واقعی طور پر کائنات پر اثر ڈالنے والا۔ ہنگامی معجزہ ہو یا دوامی دونوں نفس الامری اور حقیقی ہوتے ہیں۔ کیمیاوی تحلیل و ترکیب اور شیطانی خیال آفرینی سے پاک، مگر کور بصیرت والوں کو یہ فرق سجھائی نہیں دیتا وہ توہم پرست ہوتے ہیں۔ فہم کو وہم سے اور نور کو نار سے الگ کرنا اور الگ سمجھنا ان کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ ان کی ذہنی قوتیں تاریک ہوتی ہیں یا فہم نما تاریکی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے خوشبو اور بدبو اخلاق طیبہ اور عادات خبیثہ پاکیزہ روح اور کثیف باطن میں وہ امتیاز نہیں کرسکتے اور معجزات نبوت کو جادو یا دماغی عدم توازن یا تاثیر جن کہنے لگتے ہیں۔ اور چونکہ طبیعت خیر ہو یا طبیعت شر ہر زمانہ اور ہر مقام میں فطری طور پر یکساں رہی ہے۔ انسانی عادات اپنی فطرت پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں قائم ہے، اس لئے نبوت و سحر میں امتیاز نہ کرنا ہر کور بصیرت انسان کا ہر زمانے میں شعار رہا ہے۔ اس نابینائی میں اختلاف افراد و اقوام اور تغیر زمانہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ ارباب حق ہر طرح ہر زمانہ میں ارباب حق ہی رہے ہیں اور منکرین حق ہر دور میں منکرین حق ہی ہوئے ہیں اور حق کا مقابلہ جن باطل پرستی کے اسلحہ سے پہلوں نے کیا انہی اسلحہ سے پچھلے لوگ بھی حق پر حملہ کرتے ہیں۔ گویا یہ مقابلہ اور قدیم اسلحہ کا استعمال بطور توارث چلا آیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے ہر کافر اپنے جانشین سے کہہ کر مرتا ہے کہ نبی کو ساحر اور پاگل قرار دینا کسی نبی برحق کو نبی نہ ماننا۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ وَّ ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ پس آپ ان کی طرف سے چشم پوشی کریں۔ آپ کو یہ جادوگر کہیں یا مجنون آپ پرواہ نہ کیجئے صبر سے کام لیجئے۔ اور نصیحت کرتے رہیئے، تبلیغ نہ چھوڑیئے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے رہیئے۔ آپ کی تبلیغ و نصیحت سے خواہ ایسے کافروں کو فائدہ نہ پہنچے، لیکن جن میں ایمان کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے ان کو ضرور فائدہ ہوگا۔ آپ کی نصیحت مومنوں کو ضرور نفع پہنچائے گی۔ وہ مانیں گے اور دونوں جہاں میں فائدہ اٹھائیں گے۔

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ۔ میں نے جن اور انس کی تخلیق صرف اس لئے کی ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یعنی جن و انس کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض اور منفعت وابستہ نہیں ہے بلکہ جن و انس کا ہی اطاعت خداوندی میں فائدہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ کی تشریح میں فرمایا اِلَّا لِاٰمُرَهُمۡ بِعِبَادَتِیۡ وَاَدۡعُوۡهُمۡ اِلَیۡهِ۔ یعنی عبادت کا حکم دینے اور اپنی اطاعت کی خبر دینے کے لئے میں نے جن وانس کو پیدا کیا۔ مجاہد نے اس جگہ عبادت کو بمعنی معرفت کہا ہے۔ یعنی میں نے اپنی ہستی کی معرفت دلانے کے لئے جن و انس کو پیدا کیا اور وجود خداوندی کا اقرار مشرک بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ بعض علماء نے کہا، عبادت کا اس جگہ معنی ہے تذلل انقیاد۔ چارو ناچار۔ برغبت ہو یا بکراہت۔ اللہ تعالیٰ کے دائرۂ حکم میں رہنا اور تکوینی و تخلیقی طور پر ضابطۂ تکوین کے اندر بند ھا رہنا، قانون فطرت کو نہ توڑ سکنا۔

صاحب مدارک نے لکھا ہے تمام کفار اقرار توحید پر مجبور ہیں۔ اگر دنیا میں کسی وجہ سے شرک میں مبتلا بھی ہیں تب بھی قیامت کے دن

وہ مشرک نہیں رہیں گے بلکہ قیامت کے دن تو یہ بھی کہیں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ بخدا ہم مشرک نہ تھے۔ گویا عبادت سے مراد ہے اقرار توحید۔

کلبی ضحاک اور سفیان ثوری کے نزدیک جن و انس سے مراد مسلمان جن و انس ہیں۔ کچھ جن و انس کو تو اللہ تعالیٰ نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی قرأت سے ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی قرأت اس طرح ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

قاضی ثناء اللہ مؤلف تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک آیت کا تفسیری مطلب اس طرح ہے کہ میں نے تمام جن و انس کو عبادت کے قابل اور قوت اطاعت رکھنے والا پیدا کیا ہے کسی کو ناقابل عبادت پیدا نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ فطرت (اسلام) پر ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی۔ جیسے چوپائے کا جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے اعضاء مکمل ہوتے ہیں۔ کیا تم کسی بچہ کو (پیدائشی) کن کٹا پاتے ہو۔ اس کے بعد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔۔۔ (متفق علیہ من حدیث ابی ہریرہؓ) مراد یہ ہے کہ ہر شخص فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ فطرت صالحہ کو کفار برباد کرتے ہیں۔

میرے نزدیک تیسرا اور آخری قول زیادہ ترجیحی ہے۔ ہر شخص فطرتاً سادہ دل اور بسیط دماغ کا پیدا ہوتا ہے۔ اسی فطرت بے داغ کا نتیجہ ہوتا ہے اپنے خالق کے احکام کی تعمیل اور اس کی اطاعت اور ہر آدمی کے اندر تکوینی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ قبول حق سے کوئی اور فطری مانع نہیں ہوتا۔ پس ہر شخص کی تخلیق اسی سادہ فطرت پر رہنے کے لئے ہوتی ہے، لیکن کفر کے دائرہ کے اندر نشو و نما اس کو داغ دار بنا دیتی ہے اور سادہ دل مومن کافر بن جاتا ہے۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ٥ میں ان سے رزق کا طالب نہیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تعلق اپنے بندوں سے ایسا نہیں جیسے آقاؤں کا غلاموں کے ساتھ ہوتا ہے کہ غلاموں سے کمائی کرانے کے آقا طلب گار ہوتے ہیں اور غلاموں کی کمائی میں سے خود بھی کھاتے ہیں اور غلاموں کو بھی کھلاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ وہ فرماں بردار اطاعت شعار رہیں۔ اسی کے احکام کی تعمیل کریں۔ اطاعت و عبادت کی ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دے دی ہیں۔ تخلیقی طور پر اس نے ہر شخص کو قابل عبادت بنایا ہے۔ فطری معذوری کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ وہ کسی بندہ سے رزق کا طلب گار نہیں۔ اس کی شان ایسی طلب سے بہت بالا اور اعلیٰ ہے۔ وہ خود کسی سے کھانا طلب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ رزاق ہے۔ رزق دینے کی مستحکم قوت رکھتا ہے۔ سب کو رزق دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں۔ ساری مخلوق ہر حالت میں ہر وقت اس کی محتاج ہے۔ اور صرف حاجت مند ہی نہیں بلکہ بالکل نادار اور سراسر فقیر ہے۔ خالق رازق اکیلا اللہ ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث قدسی آئی ہے۔ فرمایا ہے اے ابن آدم میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا۔ میں تیرا سینہ تونگری اور بے نیازی سے پُر کر دوں گا۔ اور تیری فقیری روک دوں گا۔ اور اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو میں تیرے سینے کو مشاغل دنیوی سے بھر دوں گا اور تیری فقیری کو ہرگز بند نہیں کروں گا (رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی ہٰذا حسن غریب)

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سواء سے فرمایا۔ سر ہلنے کے وقت تک روزی سے مایوس نہ ہونا۔ دیکھو جب انسان پیدا ہوتا ہے تو ایک سرخ بوٹی ہوتا ہے (بالکل ننگا) بدن پر ایک چھلکا بھی نہیں ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے سب کچھ دیتا ہے (مسند احمد)

بعض آسمانی کتابوں میں آیا ہے۔ اے ابن آدم میں نے تجھے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس تو اس سے غفلت نہ کر۔ تیرے رزق کا ضامن میں ہوں۔ تو اس کے لئے بے جا تکلیف نہ اٹھا۔ مجھے ڈھونڈ تاکہ مجھے پالے جب تو نے مجھے پالیا تو یقین مان کر تو نے سب کچھ پالیا اور اگر میں تجھے نہ ملا تو سمجھ لے کہ تمام بھلائیاں تو کھو چکا۔ سُن تمام چیزوں سے زیادہ تیرے دل میں میری محبت ہونی چاہیے۔

بعض اہل تفسیر نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میری کسی مخلوق کو رزق دیں یا کھلائیں جو خود اپنے آپ کو رزق دیں۔ کیونکہ رزاق اور رزق پہنچانے پر زبردست قدرت رکھنے والا تنہا میں خود ہوں اور چونکہ کسی محتاج کو کھانا دینا بطور مجاز خدا تعالیٰ ہی کو دینا ہے، تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے، اس لئے اَنْ يُّطْعِمُوْا اَحَدًا مِّنْ خَلْقِيْ کی بجائے اَنْ يُّطْعِمُوْنِ فرمایا۔ یعنی نہیں چاہتا کہ وہ مجھے یا میری مخلوق کو کھانا دیں۔

ایک حدیث قدسی میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے گا۔ اے

میرے رب تو تو رب العالمین ہے۔ میں تجھے کھانا کیسے دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا اور تو نے اس کو نہیں دیا۔ اگر تو اس کو کھانا دے دیتا تو (آج) میرے پاس اس کو پاتا۔ (رواہ مسلم)

اللہ تعالیٰ کو کھانا دینا مجازی ہے۔ حقیقت میں محتاجوں کو کھانا بامر خدا دیا جاتا ہے تو گویا خدا کو دیا جاتا ہے۔

ایک شبہ اللہ تعالیٰ نے فقراء کی پرورش اور امداد رزق ہی کے لئے مسلمانوں کو ادائے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ میں ان میں سے کسی مخلوق کو رزق پہنچوانا نہیں چاہتا۔

ازالہ زکوٰۃ واجب کرنے کا مقصد صرف تعمیل حکم اور ادائے زکوٰۃ ہے، رزق پہنچوانا اصل مقصد نہیں ہے (اگرچہ ادائے زکوٰۃ سے فقراء کو رزق پہنچ جاتا ہے۔) اسی لئے امام اعظم کے نزدیک بچہ اور مجنون پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ یہ جواب ناقص ہے۔ بعض صورتوں میں صرف تعمیل حکم ہی اصل مقصد نہیں ہوتا بلکہ رزق پہنچانا اور پہنچوانا مقصد ہوتا ہے۔ ماں باپ اور اہل و عیال کے مصارف کا مقصد ان کو رزق دلانا ہی ہوتا ہے۔ عشر اور خراج کا بھی یہی مقصد ہے، اسی لئے ماں باپ اور بیوی کے مصارف ادا کرنے میں نیابت جاری ہوتی ہے اور بچہ کا ولی ادا کردے تو ادائیگی صحیح مانی جائے گی۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ یعنی اللہ ہی سب کا رزاق ہے اور رزق سے بے نیاز ہے۔ رزق دینے پر ہر طرح قابو رکھتا ہے۔ اور اس کی قدرت کامل ہے محکم ہے۔

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ سے پہلے لفظ قل محذوف ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلام ہے۔ یعنی اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے کسی رزق کا طالب نہیں نہ اس کا خواستگار ہوں کہ لوگ مجھے کھانا کھلائیں۔ رزاق تو میرا اللہ ہے۔ اسی قسم کا مضمون دوسری آیت میں بھی آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ الخ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں اس تبلیغ اور اسلام کی تم سے اجرت کسی طرح کی نہیں مانگتا۔ میرا ثواب تو میرے رب کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی مجھے اجر عطا فرمائے گا۔

فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنُوبًا مِثْلَ ذَنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونِ ۝ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ۔

کافر (کفران نعمت کرنے والا ناشکرا) ظالم ہے۔ فطرت سلیمہ پر اس کو پیدا کیا گیا جس کا تقاضا تنہا اللہ تعالیٰ کی عبدیت کا اعتراف اور عبادت خداوندی میں بغیر شرک کے سرگرمی، تمام اسباب عبادت اس کو دے دیئے گئے۔ کوئی فطری رکاوٹ نہیں کی گئی، بے داغ بنایا گیا۔ لیکن اس نے فطرت سلیمہ کے خلاف عمل کیا، سن شعور کو پہنچا تو شکر نعمت الٰہی کی جگہ کفران نعمت کیا۔ دوسروں کو منعم سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں کی پوجا کی۔ اپنی فطرت کا بے محل استعمال کیا یہی تو ظلم ہے پس شرک حقیقت میں سب سے بڑا ظلم ہے اور اس کفر میں ہر کافر ایک جیسا ہے۔ کمی بیشی کا فرق ضرور ہے حقیقت کفر ہر کافر میں ایک ہی ہے۔ زمان و مکان کا اختلاف اس حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔ جس طرح گذشتہ انبیاء کی مختلف امتیں کفران نعمت میں مبتلا اور کفر و انکار توحید میں سرگرم تھیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو شرک کے ساتھ آلودہ ہونے کا عقیدہ رکھنے والے بھی گزشتہ کافروں کی طرح تھے اور آئندہ کافر بھی اسی مرکز کفر کے گرد اگرد چکر کاٹتے رہیں گے اور ظاہر ہے کہ جو نتیجہ گزشتہ کافروں کے کفر کا ہوا وہی موجودہ اور آئندہ کافروں کا بھی ہوگا۔ جو حصہ عذاب سابقین کو ملا وہ حصہ لاحقین کو بھی پہنچے گا۔ لیکن کب پہنچے گا بے بصیرت کور دانش کافر چونکہ ایمان و دانش سے محروم ہوتا ہے، اس لئے بطور استہزاء یا بطور تکذیب جلدی مچاتا ہے اور کہتا ہے۔ عذاب کیوں نہیں آتا۔ ڈرانا کیا۔ عذاب لے آؤ۔ مگر عذاب آنے کا تو ایک وقت ہے جس کا علم کسی کو نہیں، تاخیر عذاب کی مصلحت ہے کوئی واقف نہیں۔ انہیں کافروں میں سے ابھی بعض لوگ آئندہ کفر سے توبہ کریں۔ یا ان کافروں کی آنے والی نسل مومن ہو جائے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ زہر خوری پر اصرار کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ اور ایک زہر اپنا ہلاکت آفریں اثر دکھلائے گا۔ اسی لئے آیت میں فرمایا کہ ان ظالموں کو بھی ویسا ہی حصۂ عذاب پہنچے گا جو ان کے ساتھیوں کو یعنی گذشتہ امتوں کے کافروں کو پہنچا۔ اب ان کو طلب عذاب میں جلدی نہ کرنی چاہیئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ جس دن کے آنے کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ اس روز ان کی ہلاکت ہوگی اور عظیم الشان ہلاکت ہوگی۔

ذَنُوبًا ایک حصہ عذاب۔ اَصْحٰبِهِمْ ان کے ساتھی یعنی گذشتہ کافر جو کفر میں ان کے ساتھی تھے۔
يَوْمِهِمُ سے مراد ہے روزِ قیامت، یا روزِ بدر۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

سُوْرَةُ الطُّوْرِ

یہ سورت باتفاق اہلِ روایت مکی ہے۔ اس میں دو رکوع اور ۴۹ آیات ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو عموماً مغرب کی نماز میں سورۃ والطور پڑھتے سنا اور آپؐ سے زیادہ اچھی قرأت والا کسی کو نہیں سنا۔ (ابن کثیر بحوالہ موطا مالکؒ)

حضرت ام سلمہؓ راوی ہیں زمانہ حج میں میں بیمار ہو گئی اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حالت بیان کی۔ فرمایا تم سواری ہی پر سوار ہو کر لوگوں کے پیچھے پیچھے طواف کر لو۔ میں نے سوار ہو کر طواف کیا اور اس وقت حضور والا بیت اللہ کے ایک کونے میں نماز پڑھ رہے تھے اور وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ کی قرأت فرما رہے تھے۔ (بخاری)

مکیۃ ۷۶	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	رکوعاتہا ۲ وآیاتہا ۴۹
سورۃ الطور		
کلمات ۳۱۹	شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں	حروف ۱۳۴۴

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ وَالسَّقْفِ

قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے اور (قسم ہے) بیت المعمور کی اور (قسم ہے) اونچی چھت کی (مراد

الْمَرْفُوْعِ ۙ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ يَّوْمَ تَمُوْرُ

آسمان ہے) اور (قسم ہے) دریائے شور کی جو (پانی سے) بھرا ہے کہ بیشک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا (البتہ یہ اس روز واقع ہوگا)

السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۭ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ

جس روز آسمان تھرتھرانے لگے گا اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹ جائیں گے تو جو لوگ جھٹلانے والے ہیں (اور) جو (تکذیب کے) مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگے ہیں

فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۭ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ

ان کی اس روز کم بختی آئے گی جس روز کہ ان کو آتش دوزخ کی طرف دھکے دے کر لائیں گے یہ وہی دوزخ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے

كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا

تھے تو کیا یہ (بھی) سحر ہے (دیکھ کر) بتلاؤ یا یہ کہ تم کو (اب بھی) نظر نہیں آتا اس میں داخل ہو پھر خواہ (اس کی)

أَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ

صبر کرنا یا بے صبری کرنا تمہارے حق میں دونوں برابر ہیں جیسا تم کرتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جاوے گا متقی لوگ بلاشبہ (بہشت کے) باغوں اور

وَّنَعِيْمٍ ○ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ○ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

سامان عیش میں ہوں گے (اور) ان کو جو چیزیں ان کے پروردگار نے دی ہونگی اس سے خوش دل ہوں گے اور ان کا پروردگار ان کو عذاب دوزخ سے محفوظ رکھے گا خوب کھاؤ

هَنِيْٓئًا ۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ○

پیو مزے کے ساتھ اپنے عملوں کے بدلے میں تکیہ لگائے ہوئے تختوں پر جو برابر بچھائے ہوئے ہیں اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں (یعنی حوروں) سے بیاہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ أَلَتْنٰهُمْ

کر دینگے اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی

مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ ۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ○ وَأَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ

چیز کم نہیں کریں گے ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (فی النار) رہے گا اور ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا ان کو مرغوب

مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ○ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَأْثِيْمٌ ○ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ

ہو روزافزوں دیتے رہیں گے اور وہاں آپس میں (بطور خوش طبعی کے) جام شراب میں چھینا جھپٹی کریں گے اس میں نہ بک بک لگے گی اور نہ کوئی بیہودہ بات

غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ○ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○

ان کے پاس ایسے لڑکے آویں جاویں گے جو خاص انہی کے لئے ہونگے گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے

قَالُوْٓا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ أَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ

یعنی کہیں گے کہ بھائی ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا میں انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچالیا

السَّمُوْمِ ○ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۖ إِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ○ ع

ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے

تفسیر انسان کسی بات کی سچائی دوسرے کے ذہن نشین کرنے کے لئے ایسی چیز کی قسم کھاتا ہے جو قسم کھانے والے کی نظر میں سب سے زیادہ بزرگ واجب التعظیم ہوتی ہے۔ یا عزیز ترین محبوب۔ اللہ یا دوسرے معبودوں کی قسم بقصد تعظیم ہوتی ہے۔ اپنی جان یا اولاد کی قسم شدت محبت کو ظاہر کرتی ہے اور ماں باپ وغیرہ کی قسم میں تعظیم بھی جھلکتی ہے اور محبت قلب کا بھی ظہور ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑا کوئی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی عظمت کی قسم کھائے ، اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں جو اس کی نظر میں محبوب تھیں۔ لعمرک میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی ہے کیونکہ حضور کی زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین تھی۔ قرآن کی قسم کھائی کیونکہ قرآن کلام الٰہی ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بیشتر قسموں میں ہم بغیر تاویل کے یہی نہیں کہہ سکتے کہ اس نے جن جن چیزوں کی قسمیں کھائیں سب ہی اس کو پیاری اور محبوب تھیں۔ رات دن چاشت کا وقت شفع وتر فجر پہاڑ سمندر مذکر مؤنث چاند سورج ستارے اور دوسری علوی اور سفلی کائنات اللہ تعالیٰ کی نظر میں کوئی ایسی ہستی نہیں رکھتی جس سے اللہ تعالیٰ کو شدید محبت ہو۔ اس لئے یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔

(۱) وہ جو خدا تعالیٰ کو بہت زیادہ پیاری ہیں۔ جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک۔ خود اللہ کی ذاتِ اقدس۔ کعبہ۔ قرآن مجید وغیرہ۔

(۲) وہ جن کی ساخت پرداخت پر حکمت ہے ، اللہ کی حکمتِ کاملہ اور ربوبیت تامہ کا ان سے ظہور ہو رہا ہے جو بجائے خود ایسی عجیب ہیں کہ ان کی حقیقت اور حالت پر غور کر لے کے بعد آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے آسمان اور آسمانی کائنات۔ زمین اور زمین کی موجودات زمانہ اور زمانہ کے مختلف اوقات وغیرہ۔

اس سورت میں بھی ایسی ہی عجیب چیزوں کی قسم کھائی ہے جو ساخت اور فطرت کے اعتبار سے تعجب آفریں اور حیرت انگیز ہے اور بعض اللہ کی نظر میں محبوب بھی ہیں۔

لیکن یاد رکھو کہ قسم کا مقصد اور مفہوم صرف یہی نہیں کہ جس کی قسم کھائی جائے اس کی تعظیم یا اس سے اپنی محبت یا اس کی عجیب صنعت پر غور کرنے کی دعوت کا محض اظہار کر دیا جائے بلکہ قسم حقیقت میں اپنے اندر گواہ بنانے کا مفہوم رکھتی ہے۔ گویا قسم کھانے والا ان چیزوں کو اپنی سچائی کا گواہ بناتا ہے جن کی کھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسموں میں یہی مقصد اور مفہوم زیادہ جھلکتا ہے۔ گویا موجوداتِ ارضی اور کائناتِ سماوی و فضائی کے تغیرات و انقلابات کو اپنے قول کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے بطور شاہد پیش کر رہا ہے۔ یہ مفہوم اکثر قسموں سے نمایاں ہو رہا ہے۔ اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت کے وقوع اور عذاب و ثواب کو ثابت کرنے کے لئے طور کی کتاب مرقوم کی اور بیتِ معمور کی قسم کھائی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی قسم اپنے اندر ندرت رکھتی ہے۔ یہ سب قدرتِ الٰہی کی عظیم الشان نشانیاں ہیں۔ اس کی تفصیل ہم تحلیل اجزاء کے ذیل میں کریں گے۔

تحلیلِ اجزاء

وَالطُّوْرِ۔ قسم ہے طور کی۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ طور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر درخت ہوں۔ جیسے وہ پہاڑ تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اور جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ اگر پہاڑ خشک ہو اور اس پر درخت نہ ہوں تو اس کو "جبل" کہتے ہیں۔ طور نہیں کہتے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب مؤلف تفسیر مظہری نے لکھا ہے سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ (قاضی صاحب نے سرسبزی کی شرط نہیں لگائی) اس طور سے مراد وہ سینا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا اور جہاں آپ کو تورات عطا کی گئی تھی۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ اور قسم ہے اس تحریر کی جو کھلے ہوئے ورق پر لکھی گئی ہے۔ (اس ترکیب پر منشور رق کی صفت ہوگی۔

دوسرا ترجمہ قاضی ثناء اللہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ جھلی پر لکھی ہوئی تحریر کی قسم (تلاوت کے لئے) کھولی جاتی ہے۔ (اس ترجمہ پر منشور رق یا کتاب کی صفت ہوگی۔)

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس جگہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے، لیکن لوح محفوظ جھلی پر لکھی ہوئی نہیں۔ لفظ دلالت کر رہا ہے کہ لوح محفوظ مراد نہیں ہے۔

پھر اس سے یا قرآن مجید مراد ہے یا تمام آسمانی کتابیں جو اوراق پر لکھی گئی تھیں اور جن کو لوگ پڑھتے ہیں۔ کلبی نے کہا اس سے وہ تورات مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قلمِ قدرت کے چلنے کی آواز بھی سُنی تھی۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ۔ اور بیت معمور (آباد گھر) کی قسم بیتِ معمور سے مراد کون سا مکان ہے۔ اس کی تشریح کے لئے ہم مندرجہ ذیل روایات شیخ ابن کثیر کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے حدیث معراج میں رسول اللہؐ نے فرمایا ساتویں آسمان سے آگے بڑھنے کے بعد مجھے بیت معمور دکھایا گیا۔ جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادتِ خدا کے لئے جاتے ہیں اور ان کی واپسی کے بعد دوسرے دن اور آتے ہیں۔ لیکن جو ایک بار اس کے اندر چلے گئے پھر قیامت تک ان کی باری نہیں آتی جس طرح زمین پر کعبۃ اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ اسی طرح اہلِ آسمان کی عبادت اور طواف کی جگہ وہ ہے۔ اسی حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابراہیم کو بیت المعمور سے کمر لگائے بیٹھے دیکھا۔ شاید اس میں یہ نکتہ ہے کہ چونکہ خلیل اللہ بانیٔ بیت اللہ تھے آپ نے ہی کعبہ کو قدیم بنیادوں پر تعمیر کیا۔ بس وہاں بھی آپ کعبۂ سماوی سے لگے بیٹھے ہیں۔ گویا تعمیر کعبہ کی جزا اللہ نے اپنے خلیل کو انہی کی پسند کے مطابق عطا فرمائی۔ یہ بیت معمور ٹھیک خانہ کعبہ کے اوپر ہے اور ساتویں آسمان پر ہے۔ یوں تو ہر آسمان پر اس آسمان پر رہنے والے فرشتوں کی مقرر عبادت گاہ ہے جہاں فرشتے عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلے آسمان پر جو عبادت گاہ ہے اس کا نام بیت العزت بتایا گیا ہے۔ حضرت علیؓ سے (غالباً) ابن کوا نے پوچھا بیت المعمور کیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ آسمان میں ہے اسے صراح کہا جاتا ہے۔ کعبہ کے ٹھیک اوپر ہے جس طرح زمین پر کعبہ کی حرمت کی جاتی ہے اسی طرح بیت المعمور آسمانوں پر محترم عبادت گاہ ہے۔ ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جو آج داخل ہو گئے واپسی کے بعد ان کی قیامت تک باری نہیں آئے گی۔ فرشتوں کی تعداد ہی اتنی کثرت سے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بیت معمور عرش کے محاذ میں ہے۔

ایک حدیث مرفوع میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے صحابہ سے فرمایا بیت المعمور کو جانتے ہو۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے۔ فرمایا وہ آسمانی کعبہ ہے۔ زمین کے کعبہ کے بالکل اوپر ہے۔ ایسا کہ اگر وہ گرے تو اسی کعبہ پر ہی گرے۔ اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں۔ جن کی باری دوبارہ قیامت تک نہیں آئے گی۔ محقق مفسر بیضاوی نے لکھا ہے کہ بیت معمور سے مراد کعبہ ہے جو حاجیوں اور عبادت گزاروں سے آباد رہتا ہے۔ اس لئے اس کو معمور فرمایا۔ یا مومن کا دل مراد ہے جس کی آبادی معرفت و اخلاص سے ہوتی ہے۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ۔ اور اونچی اُٹھائی ہوئی چھت کی قسم۔ جمہور اہلِ تفسیر کے نزدیک اس سے آسمان مراد ہے صرف ربیع بن انس کا قول ہے کہ اس سے مراد عرش ہے۔ عرش تمام مخلوق کی چھت ہے۔ جمہور کا قول زیادہ صحیح ہے۔ اللہ نے فرمایا وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ۔ اور بھڑکتے سمندر کی قسم۔ محمد بن سیرین اور ضحاک نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ بھڑکتے ہوئے تنور کی طرح سمندر کو کر دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول منقول ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ اللہ قیامت کے دن ان سمندروں کو آگ بنا دے گا جن کی وجہ سے جہنم کی آگ اور بھڑک جائے گی۔ بیہقی نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سوا مجاہد یا حاجی یا عمرہ کرنے والے کے اور کوئی سمندر میں سوار نہ ہو کیونکہ سمندر کے نیچے آگ ہے یا یہ فرمایا آگ کے نیچے سمندر ہے۔ یعلی بن امیہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا سمندر جہنم ہے۔ ابوالشیخ نے العظمۃ میں اور بیہقی نے بروایت سعید بن مسیب بیان کیا کہ حضرت علی نے فرمایا میں نے فلاں (یہودی) سے زیادہ کسی یہودی کو سچا نہیں پایا فلاں (یہودی) نے کہا تھا اللہ کی بڑی آگ سمندر ہے۔ قیامت کے دن اللہ اس کے اندر سورج، چاند اور ستاروں کو جھونک دے گا پھر مغربی ہوا کو بھیجے گا اور وہ سمندر کو بھڑکا دے گی۔ ابوالشیخ نے کعب کا قول البحر المسجور کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ سمندر کو بھڑکایا جائے گا

اور وہ جہنم بن جائے گا۔ بہر حال جمہور اہلِ تفسیر کے نزدیک مسجور کا ترجمہ بھڑکتا ہوا اور سمندر سے یہی سمندر مراد ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے۔

علاء بن بدر نے کہا بحر کو مسجور اس لئے کہا کہ اس کا پانی نہ پینے کے کام آتا ہے نہ کھیتی سینچنے کے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ بحر مسجور سے وہ سمندر مراد ہے جو عرش کے نیچے ہے۔ مقاتل کا یہی قول ہے۔ ضحاک نے نزال بن سبرہ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت علی نے بحر مسجور کے متعلق فرمایا وہ ایک سمندر ہے عرش کے نیچے۔ اس کی گہرائی اتنی ہے جیسے ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کا فاصلہ۔ اس کا پانی گاڑھا ہے۔ اس سمندر کو بحر حیات کہا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے کے بعد بحر حیوان سے بارش ہوگی جو چالیس روز ہوتی رہے گی۔ اس بارش سے مُردے اپنی اپنی قبروں سے اُگیں گے۔ (یعنی زندہ ہو کر اوپر کو ابھریں گے جیسے درخت زمین سے اُگتے ہیں)

مجاہد اور کلبی نے مسجور کا ترجمہ کیا بھرا ہوا۔ عرب کہتے ہیں سَجَرْتُ الْإِنَاءَ میں نے برتن کو لبریز کر دیا۔

حسن، قتادہ اور ابو العالیہ نے ترجمہ کیا۔ خالی خشک۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ اگر کسی خادمہ کو پانی لینے کسی حوض پر بھیجا جائے اور اس کو پانی نہ ملے تو وہ آکر کہتی ہے حوض مسجور ہے۔

مسجور کا ترجمہ ممنوع و محبوس بھی کیا گیا ہے یعنی ایسا سمندر جس کو روک دیا گیا ہو۔ یعنی اللہ نے سمندر کو اس کے مقام پر روک دیا ہے وہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ورنہ ساری زمین اور اس کی کائنات ڈوب جاتی۔ مسند احمد کی ایک مرفوع روایت میں ہے کہ ہر رات تین بار سمندر اللہ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو سب کو غرق کر دوں، لیکن اللہ اس کو روک دیتا ہے

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهُ مِن دَافِعٍ بلاشبہ آپ کے رب کا عذاب (قیامت کے دن کفار پر ضرور پڑے گا جس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ یہاں سے ان واقعات کا بیان ہے جن کو ثابت کرنے کے لئے طور۔ کتاب۔ بیت معمور۔ آسمان اور سمندر کی قسم کھائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قیامت کا دن ضرور آئے گا۔ جو یکسر انقلاب عالم اور بناؤ بگاڑ کا دن ہوگا۔ یہ جہاں اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ عمل کا میدان ختم ہو جائے گا اور عمومی جزا سزا کا وقت آجائے گا۔ کافروں کو یقیناً عذاب ہوگا اور اہلِ ایمان کو ثواب۔

حضرت جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ میں بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ پہنچا۔ میں جس وقت خدمت گرامی میں حاضر ہوا اس وقت آپ اپنے ساتھیوں کو نماز مغرب پڑھا رہے تھے۔ اور قرأت کی آواز مسجد سے باہر آرہی تھی۔ آپ والطور پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے ان ربک لواقع مالہ من دافع پڑھا تو سنتے ہی میرا دل پھٹنے لگا۔ میں اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ یہ آیت سنتے ہی عذاب سے ڈر کر فوراً مسلمان ہو گیا اور ایسا خوف طاری ہوا کہ میں سمجھا کہ یہاں سے اٹھنے بھی نہ پاؤں گا کہ عذاب آجائے گا۔

ابن ابی الدنیا کا بیان ہے کہ ایک رات حسب معمول حضرت دیکھ بھال کے لئے مدینہ کی گلیوں میں گشت کرنے نکلے۔ دورانِ گشت میں ایک مسلمان کی قرأت کی آواز ایک مکان سے آئی۔ کوئی شخص والطور پڑھ رہا تھا۔ آپ نے سواری روک لی اور ٹھہر کر قرآن سننے لگے۔ جب قاری آیت ان عذاب ربک لواقع مالہ من دافع۔ پر پہنچا تو آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ رب کعبہ کی قسم یہ بات سچی ہے۔ پھر اپنے گدھے سے اتر پڑے اور کسی دیوار سے سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ چلنے کی طاقت نہ رہی۔ دیر تک بیٹھے رہے۔ دیر کے بعد جب حواس ٹھکانے سے آئے تو اپنے گھر پہنچے، لیکن آیت کے اثر سے دل میں اتنی کمزوری پیدا ہو گئی کہ مہینہ بھر تک بیمار پڑے رہے۔ لوگ بیمار پرسی کو آتے تھے، لیکن کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیماری کیا ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آپ کی تلاوت کے دوران یہ آیت آگئی اسی وقت ہچکی بندھ گئی اور دل پر ایسا اثر پڑا کہ بیمار ہو گئے اور بیس روز تک بیمار رہے۔

يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا۔ جس روز کہ آسمان تھرتھرائے گا، لرز اٹھے گا، لپٹ جائے گا، چکر کھانے لگے گا۔

مَور الیسا چکر انا گھومنا کہ الٹ پلٹ ہوجائے جیسے کشتی اگر چکرا جائے تو مسافروں کو اپنے ساتھ الٹ دیتی ہے۔ قتادہ نے مَور کا ترجمہ کیا ہے حرکت کرنا۔ بعض نے ترجمہ کیا لرزنا، تھرتھرانا۔ لغت میں مَور کے یہ سب معانی آئے ہیں۔ آنا جانا گھومنا چکرانا، لرزنا (قاموس)

وَتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا۔ اور پہاڑ چل پڑیں گے یعنی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ اِدھر سے اُدھر چلے جائیں گے۔ کانپ کانپ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ پھر ریزہ ریزہ ہوکر روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ بے نام و نشان ہوجائیں گے۔

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ۔ اس دن ان لوگوں کے لئے تباہی اور ہلاکت ہوگی جو اس دن کے ہونے کو جھوٹ قرار دیتے تھے۔ دنیا ہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور دین کو ایک کھیل تماشہ سمجھے ہوئے تھے۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ۔ یہ وہ دن ہوگا جب کافروں کو جہنم کی طرف دھکے دے کر کھدیڑ کر لے جایا جائے گا۔ دوزخ کے کارندے ان کے ہاتھوں کو گردنوں سے باندھ کر اور پیشانیوں کو قدموں کی طرف جھکا کر دھکے دے کر سختی کے ساتھ نکالتے ہوئے جہنم کی آگ کی طرف لے جائیں گے اور جب آگ کے قریب پہنچیں گے تو ان سے کہیں گے۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ یہی وہ آگ ہے جس کو تم نہیں مانتے تھے۔ پھر مزید ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر کہیں گے دیکھو۔

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ۔ کیا یہ (بے حقیقت) جادو ہے یا تم اندھے ہو۔ تم کو دکھائی نہیں دیتا (تمہاری نظر بندی کردی گئی ہے) یعنی دنیا میں تم اللہ کے کلام کو اور معجزات کو جادو کہتے تھے، لیکن اللہ کے اور پیغمبر کے کلام میں جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا وہ تمہاری نظروں کے سامنے آج آگیا۔ اگر وہ جادو تھا تو اس کو بھی جادو ہونا چاہیئے۔ (محض بے حقیقت) اور اگر وہ نظر بندی تھی تو یہ بھی نظر بندی ہونی چاہیئے (پر فریب) تم دنیا میں کہتے تھے۔ انما سکرت ابصارنا۔ ہماری نظر بندی کردی گئی ہے۔ پس کیا آج بھی تم اندھے ہو تم کو عذاب سجھائی نہیں دیتا۔ جاؤ۔

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ۔ اس میں گھس جاؤ۔ اس میں ڈوب جاؤ۔ تمہیں سہار ہو یا نہ ہو۔ یہ آگ تمہیں ہر طرف سے گھیرے گی۔ واویلا کرو، شور مچاؤ یا خاموش رہو۔ دونوں برابر ہیں۔ اسی میں پڑے جلتے رہو گے۔ کوئی صورت رہائی کی نہیں نکلے گی۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ یہ خدا کی طرف سے ظلم نہیں ہے بلکہ تمہارے اعمال کی سزا ہے جو تم کو دی جارہی ہے۔ یہاں تک اس عذاب کا بیان ہے جو قیامت کے کافروں کو دیا جائے گا۔ اس سے آگے اہل ایمان کے ثواب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ۔ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔ اس روز مومن متقی عذاب جحیم سے بحکم خدا محفوظ رہیں گے۔ اللہ ان کو دہکتی آگ سے بچا کر جنتوں اور نعمتوں میں داخل فرمادے گا اور وہ خداداد راحتوں اور نعمتوں میں خوشحال اور خوش دل رہیں گے۔ قسم قسم کے کھانے، طرح طرح کے شربت، رنگارنگ آرام دہ حسین لباس، عمدہ عمدہ سواریاں، بلند جاذب نظر اعلیٰ مکانات اور ہر طرح کی بکثرت نعمتیں ان کے لئے مہیا ہوں گی۔ کسی قسم کا ذرا رنج و غم نہ ہوگا۔ دکھ سے دور سکھ سے مسرور اور ہر راحت و لذت میں مخمور رہیں گے۔ جو چیز سامنے آئے گی وہ ایسی ہوگی جو کبھی کسی نے نہ دیکھی ہوگی نہ سنی ہوگی۔ نہ کسی کا خیال وہاں تک پہنچا ہوگا۔ پھر خدا کی طرف سے بار بار مہمان نوازی کے طور پر ان سے کہا جائے گا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ کھاتے پیتے رہو۔ خوش گوار، خوش ذائقہ، بے تکلف مزیدار مرغوب چیزیں تمہارے لئے مہیا ہیں۔ پھر مزید دل خوش کرنے حوصلہ بڑھانے اور طبیعتوں میں امنگ پیدا کرنے کے لئے کہا جائے گا۔ یہ تمہارے ان اعمال کا بدلا ہے جو دنیا میں تم کرتے تھے۔

مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ۔ مرصع جڑاؤ شاہانہ تختوں پر بڑی بے فکری اور فارغ البالی کے ساتھ تکیے

لگائے بیٹھے ہوں گے۔ دستر ستر سال گزر جائیں گے انہیں ضرورت نہ ہوگی کہ اٹھیں یا کسی کام کو جائیں۔ بیشمار سلیقہ شعار ادب دان خدام ہر طرح کی خدمت کے لئے کمربستہ۔ جس چیز کو دل چاہے آن کی آن میں موجود۔ آنکھوں کا نور دل کا سرور وا فر موفور سامنے۔ بے انتہا خوبصورت، خوب سیرت گورے گورے چاندی جیسے چمکیلے بدلنوں والی بڑی بڑی رسیلی کٹیلی آنکھوں والی بکثرت حوریں، پاک باز، پاک دل دل بہلانے کے لئے ہر وقت کمربستہ موجود ہوں گی۔ ہر نعمت جو طرف بکھری ہوئی ہوگی۔ ستر ستر سال کے بعد جب دوسری جانب رُخ پھیریں گے تو وہاں عجیب ہی منظر سامنے آئے گا۔ ہر چیز نئی، ہر نعمت اعجوبہ، ہر طرف نور کی بارش اور خیرگی وحیرت پیدا کرنے والی نظر فریب روشنی، شرمیلی نظروں والی بھولی بھالی شکلوں والی دوشیزائیں پرکشش حسن کا مجسمہ، مقناطیسی اثر والی نگاہ، شیریں کلام خوش طراز لطیف اندام رعنا سحر انداز عورت نما جنتی حوریں ادنیٰ التفاتِ نظر کی منتظر دکھائی دیں گی۔ اللہ ان جنتیوں کا ان حوروں سے جوڑا لگا دے گا (ابن کثیر)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔ یعنی جن مومنوں کی اولادیں بھی ایمان میں اپنے بزرگوں کی راہ پر لگ جائیں، لیکن اعمالِ صالحہ میں اپنے بزرگوں سے کم ہوں۔ مراد یہ کہ مومن تو ہوں مگر اعمال میں کمزوری ہو۔ اللہ ان کے کم اعمال کا بدلہ بڑھا بڑھا کر ان کو بڑوں کے درجہ میں پہنچا دے گا۔ اور ناقص اعمال کے باوجود جنت میں وہ اپنے بزرگوں سے جا ملیں گے۔ تاکہ بڑوں کی آنکھیں چھوٹوں کو اپنے پاس دیکھ کر بڑوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور چھوٹے بھی اپنے بڑوں کے پاس ہشاش بشاش رہیں۔ ان کے اعمال کے ثواب کی زیادتی ان کے بزرگوں کے اعمال کو کاٹ کر نہیں کی جائے گی بلکہ اللہ ان کو... اپنے خزانوں سے اپنی رحمت سے عطا فرمائے گا۔ (کذا قال ابن عباس)

ایک روایت میں آیا ہے کہ جب جنتی شخص جنت میں داخل ہو جائے گا اور وہاں اس کو اپنے ماں باپ اور بیوی بچے نظر نہ آئیں گے تو وہ دریافت کرے گا کہ میرے والدین واولاد کہاں ہیں۔ جواب ملے گا وہ تیرے مرتبہ تک نہیں پہنچے۔ جنتی کہے گا میں نے تو اپنے لئے اور ان سب کے لئے اچھے عمل کئے تھے۔ حکم ہوگا ان کو بھی اس کے پاس اسی کے درجے میں لے آؤ۔

حضرت ابن عباس شعبی سعید بن جبیر، ابراہیم، قتادہ، ابوصالح، ضحاک، ربیع النس اور بکثرت اہل تفسیر کا قول ہے کہ جنتیوں کی جس اولاد نے ایمان قبول کر لیا اور نیک اعمال بھی کئے۔ وہ تو بہرحال جنتیوں کے ساتھ ہوں گے۔ باقی ان کے وہ چھوٹے بچے جو بچپن میں مر گئے ان کو بھی اہلِ جنت کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔

مشرکوں کے نابالغ بچے بھی جنتی ہوتے ہیں

عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں بیان کیا ہے کہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضا نے رسول اللہ سے اپنے ان دونوں بچوں کے متعلق دریافت کیا جن کا انتقال بچپن میں زمانۂ جاہلیت میں ہو گیا تھا۔ حضور نے فرمایا وہ دونوں دوزخ میں ہیں (یہ بات سُن کر ام المومنین کو کچھ رنج ہوا۔ حضرت خدیجہ کے چہرے پر ملال کے آثار دیکھ کر حضور نے فرمایا اگر تم ان دونوں کو (اس وقت) دیکھ لو تو تم کو ان سے نفرت ہو جائے گی۔ حضرت خدیجہ رضا نے عرض کیا پھر میرا وہ بچہ جو حضور سے تھا وہ کہاں ہے۔ فرمایا وہ جنت میں ہے۔ مومن اور ان کی اولاد جنتی ہے۔ اور مشرک اور ان کی اولاد دوزخ میں۔ اس کے بعد حضور والا نے آیت والذین آمنوا واتبعتہم ذریتہم بایمان الحقنا بہم ذریتہم۔ تلاوت فرمائی۔

یہ روایت مجہول ہے اور اس میں انقطاع بھی ہے۔ امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضا نے مشرکوں کے بچوں کے متعلق حضور اقدس سے دریافت کیا۔ فرمایا۔ اگر تم چاہو تو میں دوزخ کے اندر ان کی چیخ پکار تم کو سنا دوں۔ اس حدیث کی سند بھی ضعیف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ روایات منسوخ ہیں۔ شروع میں حضور نے یہی فرمایا تھا پھر اطفال کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ گویا توقف کیا پھر جب اسلام میں استحکام پیدا ہو گیا تو آیت وَلا تزر وازرۃ وزر اخری

نازل ہوئی۔ ابن عبداللہ نے حضرت عائشہ رضؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے مشرکوں کے بچوں کے متعلق رسول اللہ ؐ سے دریافت کیا۔ فرمایا وہ اپنے باپوں سے (متعلق) ہیں۔ پھر کچھ مدت کے بعد دریافت کیا تو فرمایا اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ (زندہ رہتے تو) کیا کرنے والے ہوتے۔ پھر استحکام اسلام کے بعد حضرت خدیجہ نے دریافت کیا تو آیت ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ نازل ہوئی۔

اور حضور نے فرمایا ہم فطرت پر ہیں یا فرمایا وہ جنتی ہیں۔ اس حدیث کی سند میں ضعف ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے اولاد آدم میں سے ان (بچوں) کے متعلق درخواست کی جو کھیلنے والے ہیں۔ (اور بچپن میں ہی مر جائیں) اللہ نے مجھے وہ عطا فرما دیئے (یعنی ان کے جنتی ہونے کا حکم دے دیا) ابن عبداللہ نے کہا کھیلنے والوں سے مراد ہیں وہ بچے جن میں سمجھ ہوتی ہے نہ عزم ان کے تمام اعمال کھیل ہی ہوتے ہیں۔

ابن جریر نے حضرت سمرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ؐ سے ہم نے مشرکوں کے بچوں کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا۔ وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے۔ (اور ظاہر ہے کہ جنت کے اندر ہی اہل جنت کی خدمت کریں گے لامحالہ وہ جنتی ہوں گے۔) حضرت ابن مسعود سے موقوف روایت اسی طرح کی منقول ہے۔ ابوداؤد طیالسی نے اسی مضمون کی مرفوع حدیث بھی حضرت انس کی روایت سے نقل کی ہے۔

صحیح یہ ہے کہ مشرکوں کے بچے جنتی ہیں۔ علماء کا اسی پر اجماع ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ میری امت کے تین آدمیوں سے قلم (یعنی احکام تکلیفی) اٹھا لئے گئے ہیں۔ بچے سے جب تک کہ وہ بڑا (یعنی بالغ) ہو۔ سوتے ہوئے آدمی سے اس وقت تک جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے۔ اور دیوانے سے جب تک جب تک وہ اچھا نہ ہو جائے۔ (باہوش نہ ہو جائے) ظاہر ہے کہ بچے مکلف ہی نہیں ہیں۔ تکلیف کے لئے عقل و بلوغ ضروری ہے۔ جب وہ شرعاً مامور ہی نہیں تو کچھ بھی کریں سب معاف ہے پھر وہ دوزخی کیسے ہو سکتے ہیں۔

مومنوں کی نابالغ اولاد کو جنت کے اندر ان کے پاس پہنچا دیا جائے گا تاکہ ان کو خنکی چشم اور سرور قلب حاصل ہو، لیکن کیا مومن اولاد بھی اپنے ماں باپ کے کام آسکتی ہے اور والدین کو نیک اولاد سے بھی کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔

مسند احمد میں ایک روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا اللہ اپنے نیک بندے کا درجہ جنت کے اندر دفعتہً بڑھا دیتا ہے۔ بندہ دریافت کرتا ہے یا اللہ میرا یہ درجہ کیسے بڑھ گیا۔ اللہ فرماتا ہے تیری اولاد نے تیرے لئے استغفار کیا۔ اس وجہ سے میں نے تیرا درجہ بڑھا دیا۔ اس وجہ سے میں نے تیرا درجہ بڑھا دیا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں ایک روایت آئی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا۔ آدمی کے مرتے ہی اعمال موقوف ہو جاتے ہیں، لیکن تین (موقوف نہیں ہوتے) مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچاتے رہتے ہیں۔ (۱) صدقۂ جاریہ (یعنی وقف وغیرہ) (۲) علم دین جس سے نفع پہنچتا رہے۔ (۳) نیک اولاد جو مرنے والے کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ شیرخوار یا چھوٹے بچے اپنے مومن ماں باپ کو جنت میں لے جائیں گے۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ یعنی ہر شخص اپنے اعمال سے وابستہ رہے گا۔ مقاتل نے کہا امرء سے مراد ہے کافر۔ یعنی ہر کافر و مشرک دوزخ میں بند رہے گا۔ اس کے اعمال کی سزا دوسروں تک نہیں پہنچے گی۔ مطلب یہ کہ کافر یا فاسق کے ساتھ اس کی چھوٹی نابالغ اولاد کو عذاب میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت آیت میں قانون عدل کا اظہار ہے اور اوپر کی آیت میں باری تعالیٰ

کے فضل و رحمت کا ذکر تھا کہ مومن نیکو کار والدین کے ساتھ ثواب میں تو ان کے بچوں کو اللہ اپنے فضل سے شریک کر دے گا، لیکن کافر یا فاسق کے گناہ کی سزا صرف مجرم ہی کو ملے گی۔ اس کے بچے سزا میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ہر شخص اپنے عمل میں گرفتار رہے گا۔ ہاں جن کے دائیں ہاتھوں میں اعمال نامے دیئے جائیں گے وہ جنت کے اندر بیٹھے ہوئے گناہگاروں سے دریافت کریں گے الخ۔

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۔ جنتیوں کو طرح طرح کے پھل اور قسم قسم کے گوشت حسب پسند اور مطابق خواہش بہم دیئے جائیں گے اور عطا کا یہ سلسلہ منقطع نہ ہوگا، تسلسل کے ساتھ ہر چیز ہر وقت ملتی رہے گی۔

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا۔ شرابِ طہور کے چھلکتے ہوئے جام باہم پیتے اور پلاتے رہیں گے۔ اور خوش طبعی و تفریح کے لئے چھینا جھپٹی کریں گے۔

کاس پیالہ۔ وہ چیز جو پیالے میں بھری ہوئی ہو۔ بھرا ہوا چھلکتا جام۔ اس جگہ آخری معنی مراد ہے۔

لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ۔ جس کے پینے کے بعد نہ بیہودہ گوئی، بکواس اور جھک ہوگی نہ کوئی گناہ۔ دنیا میں شرابیوں کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ پینے کے بعد سر میں چکر، پیٹ میں مروڑ، بے ہوشی، بدحواسی، بے ہودہ بکواس، فحش گالیاں، بہکی بہکی باتیں، بدن کے اعصاب بے قابو اور پینے کے وقت مزہ کڑوا، عفونت آگیں بو، لیکن جنت کی شراب تمام گندگیوں سے پاک ہوگی۔ خوش رنگ، خوش ذائقہ، پُر سرور، نشاط آگیں، کیف آفریں، بے ضرر، نہ پینے سے سر میں درد نہ بہکی بہکی باتیں نہ بکواس نہ کسی گناہ کی حرکت کا صدور نہ اعصاب مفلوج نہ حواس میں تعطل نہ مدہوشی۔

لغو کا ترجمہ قتادہ نے کیا ہے باطل اور مقاتل نے بیہودگی۔ سعید بن مسیب نے کہا فحش کلام اور ابنِ زید نے کہا گالی گلوچ اور جھگڑا فساد اس میں نہ ہوگا۔ عتبی نے کہا زوال عقل نہ ہوگا کہ فحش بکیں۔

لَا تَاْثِيْمٌ کا مطلب زجاج نے کہا کہ جنت کی شراب پینے کے بعد کسی گناہ کا صدور نہ ہوگا۔ بعض نے کہا۔ لا تاثیم کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پینے سے جنت والے گناہگار نہ ہوں گے۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ۔ ان کے خادم نو عمر نوخیز امرد جو حسن و خوبی میں ایسے ہوں گے جیسے مروارید اور مروارید بھی وہ جو ڈبوں میں بند کر کے رکھے گئے ہوں۔ گرد آلود نہ ہوا اور کسی کا ہاتھ بھی ان کو نہ لگا ہو۔ ابھی ابھی تازہ نکالے گئے ہوں۔ جنت کی شراب ناب کے جام اور میووں کی کشتیاں اور طرح طرح کے گوشت کی پلیٹیں لئے اہل جنت کی خدمت میں گھومتے ہوں گے۔ اور ہر خدمت کے لئے کمربستہ ہوں گے۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا سب سے نچلے درجے والی جنت کے جنتیوں کے سرہانے دس ہزار خادم (کمربستہ) کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت میں ہے کہ سب سے نچلے درجہ والے جنتی کے پاس صبح شام پانچ ہزار موجود ہوں گے اور ہر خادم کے پاس (کھانے پینے اور طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوا) وہ برتن ہوگا جو دوسرے کے پاس نہ ہوگا۔ بغوی نے بروایت حسن بیان کیا ہے کہ جب حضورؐ نے یہ آیت پڑھی تو صحابہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ جب خادم مروارید کی طرح (آب و تاب رکھنے والے) ہونگے تو مخدوم کا کیا ٹھکانا۔ (وہ کس حسن و جمال کا ہوگا۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۔ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ۔ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۔ دورِ شراب و کباب کے وقت گھل مل کر باتیں کریں گے۔ دنیا کے احوال یاد آئیں گے تو کہیں گے ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے گھر والوں میں تھے تو آج کے دن کے عذاب سے ہر وقت لرزاں ترساں رہتے تھے۔ اللہ کا ہم پر کرم و احسان ہوا اس نے گرم لو کے عذاب سے (بھی) محفوظ رکھا۔ عذاب السموم اس آگ کا عذاب جو مسامات کے اندر گھس جائے گی جیسے گرم لو گھس جاتی ہے۔ حسن نے کہا سموم بھی دوسرے ناموں کی طرح جہنم کا نام ہے۔

إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ۔ ہم اس سے پہلے دنیا میں اسی سے دعائیں کرتے ہیں۔ اُس نے ہماری دعائیں قبول فرمالیں۔ یقیناً وہ احسان کرنے والا بڑا مہربان ہے

اَلْبَرُّ۔ محسن۔ اچھا سلوک کرنے والا۔ حضرت ابن عباس نے اس کا ترجمہ کیا لطیف۔ ضحاک نے کہا۔ سچ وعدہ والا۔ (نماز کے اندر) اُم المومنین حضرت عائشہ نے جب یہ آیت پڑھی تو دعا کی۔ اَللّٰھُمَّ مُنَّ عَلَیْنَا وَقِنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ اِنَّکَ اَنْتَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ۔

مقصودِ بیان

والطور سے والبحر المسجور تک ساری قسموں سے درپردہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر عجیب حکمت اور پرجلال شانِ صنعت اور افادہ آگیں ظہورِ ربوبیت رکھتی ہیں۔ جو دعوتِ مطالعہ دے رہی ہیں۔ اور ثبوت پیش کر رہی ہیں وقوعِ قیامت اور اُخروی سزا و جزا کا۔ تمور السماء میں صراحت ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے بالائی گنبد تھرتھرائیں گے ان میں تھرتھری پیدا ہوجائے گی۔ یہ لرزیں گے اور اپنی جگہ سے اضطرابی اور اضطراری حرکت کریں گے۔ تسییر الجبال سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے روز پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ لپٹ جائیں گے، اُلٹ جائیں گے، پلٹ جائیں گے۔ ان کا جماؤ ختم ہوجائے گا۔ بعض دوسری آیات کو اگر اس آیت کے مضمون میں ملایا جائے۔ اور ان کی روشنی میں اس آیت کے مضمون کو دیکھا جائے گا تو مطلب یہ ہوجائے گا کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح زمین سے اٹھا کر ریزہ ریزہ کر کے اُڑا دیئے جائیں گے۔ فویل کا لفظ بتا رہا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کی کامل تباہی ہوگی۔ کوئی صورت نجات کی نہ ہوگی۔ فی خوض یلعبون سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے ان جھوٹے مدعیانِ فکر و نظر کو جو انبیاء کی وحی اور اللہ کے بیان کردہ عقائد و احکام کی صحت کو بزعم غلط عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور دماغی فریب کاریوں کے کھیل میں منہمک ہیں۔ وحی و رسالت فکر کی دراندازی اور غور و خوض کے کھیل سے پاک ہیں۔ خرق الطبعیات اور الہیات اور مبدء و معاد کے متعلق عقلی دوڑ ایک کھیل ہے۔ بے حقیقت اور لہو ہے۔ صداقت و واقعیت سے غافل بنانے والا۔ افسحر ہذا ام انتم لاتبصرون سے ثابت ہو رہا ہے کہ واقعاتِ قیامت سحر نہیں نہ نظر بندی ہوں گے۔ اس سے مترشح ہو رہی ہے یہ بات کہ سحر بے حقیقت چیز ہے اور نظر بندی محض تخیل کی کارفرمائی۔ جس کی کوئی واقعیت نہیں ہوتی اور قیامت ایک واقعی حقیقت ہے۔ ماکنتم تعملون کے دو معنی ہیں۔ ۱؎ جو کچھ تم کرتے تھے اس کا بدلہ تم کو دیا جا رہا ہے۔ ۲؎ جو کچھ تم کرتے تھے وہی چیز بدلہ میں تم کو دی جا رہی ہے۔ دوسرے معنی کی تقدیر پر یہ بات بر سبیل ترشح معلوم ہوگی کہ جو عمل کافر دنیا میں کرتے ہیں وہ دوزخ کے عذاب کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گے۔ یعنی وہ گناہ اور عمل جس کی یہاں کوئی شکل نہیں ہے قیامت کے دن ناگوار آگ اور تکلیف دہ عذاب کی شکل اختیار کرلے گا۔

وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ الخ۔ میں لفظ ایمان بتا رہا ہے کہ اہلِ جنت کے ساتھ الحاق ان کی اسی اولاد کا ہوگا جو ایمان دار ہو خواہ اس کے اعمال کمزور ہوں یعنی کافر اولاد مومن والدین کے ساتھ جنت میں نہ جاسکے گی۔

وَمَا أَلَتْنَاهُمْ میں اس بات کی صراحت ہے کہ والدین کی نیکیوں کا بدلہ کاٹ کر مومن اولاد کو نہیں دیا جائے گا بلکہ اللہ اپنی رحمت سے ان کے ناقص عمل کی جزا کامل طور پر عطا فرما دے گا اور کم کو بیش کردے گا۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ صالح ماں باپ کی نیکی گنہگار مومن اولاد کو فائدہ پہنچائے گی۔ كُلُّ امْرِئٍ الخ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی کافر کا کفر یا گنہگار کا گناہ ان لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوگا جو مجرم نہیں ہیں۔ جرم کی سزا مجرم ہی تک محدود رہے گی۔

لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جنت کی شراب دنیوی شراب کے عوارض و نتائج سے پاک ہوگی۔

يَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ جنتیوں کے پیش خدمت انتہا کے حسین امرد ہوں گے، لیکن زوجیت کا تعلق حوروں سے ہوگا۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ الخ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اہلِ جنت کو اپنی دنیوی عملی سرگذشت یاد ہوگی جس کا تذکرہ وہ اپنے ساتھیوں سے کریں گے۔ وغیرہ۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ

تو آپ سمجھاتے رہیے کیونکہ آپ بفضلہ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں (جیسا یہ مشرکین کہتے ہیں) ہاں کیا یہ لوگ یوں (بھی) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں (اور) ہم ان کے

نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝

بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں آپ فرما دیجئے کہ (بہتر) تم منتظر رہو سو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں کیا

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ

ان کی عقلیں ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں ہاں کیا یہ (بھی) کہتے ہیں کہ انہوں نے اس (قرآن)

لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝

کو خود گھڑ لیا ہے بلکہ یہ لوگ تصدیق نہیں کرتے تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعوے میں) سچے ہیں۔

تفسیر نبوت کیا ہے۔ وحی کی کیا حقیقت ہے۔ ایک انسان کے پاس اللہ کے احکام کیسے آتے ہیں۔ ملائکہ کون ہیں۔ فرشتوں کو پیامِ خداوندی کیسے معلوم ہوتا ہے فرشتے آدمی کے پاس کس طرح آتے اور کس طرح تعلیم دیتے ہیں۔ وجدان کیا ہے مجردات سے مادی انسان کا تعلق کیونکر ہوتا ہے۔ یہ تمام امور مجہول ہیں۔ ہر شخص کے لئے ناقابلِ فہم خصوصاً اس قوم کے لئے تو سراسر واجب الانکار تھے۔ جو کسبی علوم کی ایک جھلک سے بھی عام طور پر محروم تھی۔ تاریک روح، تاریک دل، تاریک دماغ رکھتی تھی۔ توہمات میں غرق تھی وہم کو فہم خیال کرتی تھی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت اور واقعہ ہے کہ غیر معمولی غیبی طاقت کی کارفرمائی ان کے سامنے تھی۔ ایک غیبی محیطِ کل ہستی کے اثر فعلی کا ظہور ناقابلِ انکار تھا۔ ہدایات اندرون پردہ کا عربی زبان میں اظہار قرآن کی شکل میں پیش نظر آچکا تھا۔ جو کانوں کے راستے دماغ میں گھس کر روح کو متاثر کر رہا تھا۔ جو کانوں کے راستے دماغ میں گھس کر روح کو متاثر کر رہا تھا۔ اور جس کا جواب ممکن نہ تھا۔ متحیر تھے کہ نبوت کے مدعی کو دعویٔ نبوت کا کیا جواب دیں اور قرآن کی اعجاز نمائی کو کیا کہیں۔ تمام جاہل قومیں قوتِ واہمہ کے تسلط کا شکار ہوتی ہیں۔ روحانیت سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔ توہمات کے غلبہ کو ہی وہ وجدان روحی سمجھتی ہیں۔ امی توہم اور بے حقیقت تخیل کی کارفرمائی کی وجہ سے وہ بشری طاقت سے بالاتر وہ اس گروہ اور افراد کو قرار دیتی ہیں جو مظاہر کونیہ کو جاننے کے مدعی ہوتے ہیں اور تُک بندی کی شکل میں کچھ پیش گوئیاں کرتے اور تخیل کی قوت سے امور غیبیہ کے چہروں سے پردہ کشائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کاہن، عریف، نجومی عامل روحانیات وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ خیالی بلند پروازی کے شیفتہ ہوتے ہیں۔ تخیلی قیاسات کو برہان و حقیقت کا موزوں جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس گروہ کو شاعر کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا روحانی تعلق غیبی مخلوق سے ہے غیبی مخلوق کا نام وہ جن یا فرشتہ قرار دیتے ہیں۔ اور جن و ملک کو مستقبل کا عالم سمجھتے ہیں۔ جنات کے اس تعلق سے وہ مدعی روحانیت بن بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگ جن رسیدہ کہلاتے ہیں۔ شاعروں کا ایک گروہ بھی اپنا علاقہ ملائکہ یا جنات سے کہتا ہے اور الہام ملکوتی یا القاء جناتی

کا دعویٰ کرتا ہے ۔ ان سب کے علاوہ کچھ غیر متوازن حواس کے حامل ہوتے ہیں ۔ ترتیب ذہنی سے محروم ۔ اختلاط افکار کا شکار ۔ سنجیدگی سے کوسوں دور ۔ عرب کے سامنے یہی مدعیان روحانیت تھے ۔ نبوت کی حقیقت کو سمجھنے سے وہ لوگ قاصر تھے ۔ ان کی نظر فکر کی رسائی کچھ تھی تو انہی مدعیان غیب تک تھی ۔ اس لئے رسول اللہ کو کبھی کاہن کبھی شاعر کبھی جن رسیدہ اور کبھی دیوانہ کہتے تھے ۔ اور ظاہر ہے کہ کاہن ہو یا شاعر جن رسیدہ ہو یا کوئی اور مدعی غیب سب کی طاقت اور غیب دانی کا جھوٹا دعویٰ وقتی ہوتا ہے ۔ بے شک لوگ ان کو غیر معمولی طاقت کا حامل سمجھ کر ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں ، لیکن خوب سمجھتے ہیں کہ یہ اقتدار اور مجبوری تسلط روحانیت ہنگامی ہے ۔ گردش زمانہ کا ایک طمانچہ اس کو ڈھا دے گا ۔ حوادث دہر کا مقابلہ یہ شخص کر نہیں سکتا ۔ آئی ہوئی موت کو ٹال نہیں سکتا ۔ اس کے مرنے کے بعد اس روحانیت اور طاقت کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اس کا تار پود بکھر جائے گا ۔ پس مدعی غیب کے وقت موت کا وہ انتظار کرتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے نزدیک اسی طرح کے مدعی غیب دانی اور روحانی رابطہ و تعلق کے ہنگامی دعوے دار تھے ، اس لئے وہ منتظر تھے کہ ان پر کب موت کا حملہ ہوتا ہے اور کب ان کے دعویٰ نبوت کا شیرازہ بکھرتا ہے ۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ نبوت ایک ابدی حقیقت ہے جس پر زوال کبھی نہیں آسکتا ۔ پیام حقیقت اٹل اور دوامی ہے ۔ نبی کی موت کے بعد بھی نبوت کی حقیقت اور صداقت مردہ نہیں ہوتی باطل کا بول کبھی بالا نہیں ہو سکتا ۔ انکار صداقت سے ہمیشہ باطل پرستوں کا ہی ضرر ہوتا ہے ۔ اس زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ مشرکین مکہ میں کچھ لوگ اہل دانش بھی تھے ۔ ظاہر ہے کہ انکار نبوت و صداقت جواز عقلی کے دائرہ میں نہیں آتا ۔ ان کی عقلیں بھی اگرچہ جذبات سے آزاد اور بے لوث ہوں تو ان کا فیصلہ بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ بلا دلیل توحید و نبوت کا انکار کر دیا جائے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نعرہ بھی جذباتی تھا اور ابدی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کا باعث ان کی شرارت نفس اور جاہلی سرکشی تھی ۔ کچھ بات نہ بن پڑی تو شاعر کہہ دیا ، کاہن کہہ دیا ، مجنون کہہ دیا لیکن یہ سب باتیں تو بے سر و پا تھیں ۔ کسی ایک قول پر ان کو خود قرار نہ تھا ان کو اپنے جواب پر خود یقین نہ تھا ، اس لئے آخر میں ہوشمندوں اور دانشوروں کی ایسی باتیں کہنے لگے اور بولے انسان کے ذہن کی رسائی نامحدود ہے ۔ آدمی کا غور و فکر بہت کچھ تراش سکتا ہے محمد عقلمند آدمی ہیں انہوں نے بھی اپنے عقیدہ و فکر کو عربی کی بلیغ عبارت میں ڈھال لیا اور غلط طور پر اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی اور وحی ربانی کا دعویٰ کر بیٹھے ۔ یہ بات لگتی تھی جو شاید پہلی باتوں سے بہتر تھی ، لیکن اس کا کیا جواب تھا کہ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر اور بلند پایہ خطیب و ادیب عرب میں موجود تھے ۔ رسول اللہ ﷺ تو نہ کہنہ مشق خطیب تھے نہ شاعر نہ عکاظ و ذی المجنہ کے بازاروں میں بلند بانگ مقرر تھے ان کو اور ان کے سربلند شعراء و خطباء کو چاہیئے تھا کہ وہ بھی کوشش کر کے کوئی ایسا ہی بلیغ ہدایت نامہ جو قرآن کی طرح ہوتا پیش کر دیتے ۔ پورا نہیں تو دو چار جملے ایسے جوڑ دیتے ، لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکے ۔

تحلیلِ اجزاء

فَذَكِّرْ ، یعنی قریش کے مشرک آپ کو جو کچھ کہتے ہیں کہنے دیجئے ۔ اور آپ کی نصیحت نہیں مانتے ہیں تو پرواہ نہ کیجئے ۔ آپ نصیحت کرتے رہیں ۔ میثاق فطری کی یاد دہانی کرتے رہیں ۔ قیامت کے عذاب سے ڈراتے رہیں ۔ اللہ کی وحدانیت ربوبیت اور الوہیت کا بیان کرتے رہیں ۔ فَمَا أَنْتَ الخ اللہ کے فضل سے نہ آپ کاہن ہیں نہ مجنون نہ جن زدہ نہ جنون زدہ ۔ کاہن وہ شخص ہوتا تھا کہ کچھ شیطان جن اس کے دوست ہوتے تھے ۔ عالم بالا کے فرشتوں میں اللہ کے احکام اور آئندہ واقعات کے متعلق جو کچھ گفتگو ہوتی تھی اس کا کچھ حصہ سن کر لے بھاگتے تھے اوپر سے فرشتے انگارے برساتے تھے ۔ کچھ شیطان جل جاتے تھے ۔ کوئی بچ کر نکل آتا تھا ۔ اور اپنے دوست کاہن کو وہ بات آ کر بتا دیتا تھا ۔ کاہن اس ایک بات میں دس باتیں اپنی طرف سے ملا کر جذب کی حالت بنا کر لوگوں سے کہہ دیتا تھا اور لوگ تمام باتوں کا یقین کر لیتے تھے ۔ پیغمبر کی دوستی کسی شیطان سے نہیں ہوتی ۔ نہ وہ جن رسیدہ ہوتا ہے نہ دیوانوں کی طرح بڑبڑ کرتا ہے ۔ اس کے پاس تو فرشتہ خود آتا ہے ۔ اللہ کی طرف سے وحی لاتا ہے ۔ پس پیغمبر کاہن اور مجنون نہیں ہو سکتا ۔ وحی ہی استغراقی حالت میں آتی ہے ۔ یا یوں کہو کہ وحی آنے کے وقت

استغراقی حالت ہو جاتی ہے۔ اور کاہن پر جن کا نزول بھی جذب کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ بھی پیام جن سننے کے وقت مجذوب کی ایسی حالت رکھتا ہے، لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک پر فرشتۂ وحی کا نزول ہوتا ہے اور دوسرے کے دل پر شیطان القاء کرتا ہے اور اس بات کا القاء کرتا ہے جو فرشتوں کی گفتگو سن کر وہ لے بھاگتا ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ الخ۔ دار الندوہ (چوپال یا شورہ گھر) میں قریش کے لوگ جمع ہوئے اور رسول اللہ کے متعلق مشورہ کیا۔ گفتگو میں رد و بدل ہو کر آخری رائے یہ قرار پائی کہ یہ ایک شاعر ہے کسی مکان میں اس کو بند کر دو۔ اس سے کوئی ملنے نہ پائے۔ اپنی قید میں رکھو۔ نابغہ۔ زہیر۔ امرء القیس وغیرہ کی طرح یہ بھی آخر مر جائے گا۔ اس کے بعد وہیں یہ آیت نازل ہوئی۔ یوں بھی مشرکوں کو اپنی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔ کبھی کاہن کہتے تھے کبھی ساحر، کبھی مجنون کبھی شاعر۔ بہر حال بیتابی کے ساتھ حضورؐ کے بڑھتے ہوئے اثر سے ڈر رہے تھے اور آپ کی وفات کے منتظر تھے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات سے مشرکوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اسلام کا پیام بہر حال باقی رہتا اور شرک کی بیخ کنی پیام توحید سے ہوتی ہے نہ کہ رسول اللہؐ کی ذات سے، اس لئے آگے فرمایا۔ قُلۡ تَرَبَّصُوۡا تم لوگ میری وفات کے منتظر رہو اور دیکھو تم کو میری وفات سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ہم بھی منتظر ہیں کہ تمہارا کیا انجام ہوتا ہے اور قرآن کی مخالفت تم کو کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ۝۔ یہ صراحت کر دی گئی کہ یہ باتیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ ان کی عقلیں بھی اس بات کی شہادت نہیں دے رہی ہیں۔ یعنی محض جذباتی باتیں ہیں۔ ان کی عقل کی روشنی میں ان جذباتی باتوں کی غلطی کو ظاہر کر رہی ہیں۔ نہ رسول اللہؐ کو کاہن قرار دینے کو ان کی دانش تسلیم کرتی ہے نہ مجنون یا شاعر ہونے کو۔ محض عناد و عداوت کا جذبہ جاہلیت کی حمیت اور آباؤ اجداد کے رسم و رواج کی عصبیت ان کو سرکش بنائے ہوئے ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ۔ رسول اللہ کے جادوگر یا کاہن ہونے کا ثبوت نہ تھا۔ آپ شاعر بھی نہ تھے۔ چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک شعر بھی نہیں کہا۔ چالیس سال کی عمر کے بعد جو کچھ کہا وہ تخیل کی بے حقیقت بلند پروازی کا نتیجہ نہ تھا۔ خیالی آفرینی سے وہ کلام پاک تھا نہ وزن کی پابندی نہ ردیف کی نہ کسی بحر کی۔ پھر آپ نہ کسی سالانہ مشاعرہ میں شریک ہوئے نہ شاعری کا دعویٰ کیا نہ لوگوں میں شاعر کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔ پھر کیا وہ کلام جو وہ پیش کر رہے تھے اللہ کا کلام تھا۔ اس بات کو تسلیم کرنے کی اجازت مشرکوں کا جذبۂ عناد و عداوت نہیں دیتا تھا، اس لئے وہ کہنے لگے شاعر نہ سہی کاہن نہ سہی جادوگر بھی نہ سہی۔ اتنا ضرور ہے کہ ایک بلیغ الکلام فصیح البیان آدمی ہے۔ اس نے خود یہ کلام بنا لیا ہے اور اللہ کی طرف غلط نسبت کر دی ہے۔ بات یہ ہے کہ مشرکوں کے یہ سب حیلے بہانے ہیں۔ حقیقت میں ان کو ایمان لانا ہی نہ تھا وہ مومن ہونا ہی نہ چاہتے تھے کیونکہ اگر محمد رسول اللہ نے خود ساختہ کلام پیش کیا ہے اور خود تراشا ہے تو دوسرے چوٹی کے ادیب و زبان داں بھی اس زمانے میں موجود تھے۔ ان کو اس کی طرح کوئی مختصر کلام بنا لینا چاہیئے تھا۔ جو اسلوب بیان اور درستی مضمون اور ہدایت آگیں معانی کے لحاظ سے قرآن کی طرح ہوتا۔

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ؕ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا

کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا انہوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ یہ لوگ (بوجہ جہل توحید کا) یقین

یُوۡقِنُوۡنَ ؕ۝ اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ ؕ۝ اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ یَّسۡتَمِعُوۡنَ

نہیں لاتے کیا ان لوگوں کے پاس تمہارے رب کے خزانے ہیں یا یہ لوگ (اس محکمۂ نبوت کے) حاکم ہیں کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر (چڑھ کر آسمان کی)

فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ تَسْأَلُهُمْ

باتیں سن لیا کرتے ہیں تو ان میں جو (وہاں کی) باتیں سن آتا ہو وہ (اس دعوے پر) کوئی صاف دلیل پیش کرے۔ کیا خدا کے لئے بیٹیاں اور تمہارے لئے بیٹے (تجویز ہوں) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ

أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ۝ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ۝ أَمْ يُرِيدُونَ

(تبلیغ احکام کا) مانگتے ہیں کہ وہ تاوان ان لوگوں کو گراں معلوم ہوتا ہے کیا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ لکھ لیا کرتے ہیں کیا یہ لوگ کچھ برائی کرنے کا

كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ۝ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

ارادہ رکھتے ہیں سو یہ کافر خود ہی (اس) برائی میں گرفتار ہوں گے کیا اُن کا اللہ کے سوا کوئی معبود ہے اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔

تفسیر کیا انسان کا کوئی خالق نہیں یا وہ خود اپنا خالق ہے۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ آسمان وزمین یعنی سارا جہان کیا خود بن گیا۔ ان کا کوئی خالق ہی نہیں ہے۔ یا انسان نے ان کو تخلیق کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بے جان مادہ بغیر بیرونی صورتیں بغیر کسی نظم وضبط کے با ضابطہ ایک قانون کے تحت خود بخود ہو جائیں یہ بات بداہتِ عقل کے خلاف ہے۔ اس لئے انسان کا بھی بغیر کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو جانا اور ایک نظم وضبط کے تحت پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اور چونکہ آسمان وزمین نہ خود اپنے خالق ہیں نہ انسان نے ان کو تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا انسان اپنا بھی خالق نہیں سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ پھر آسمان وزمین کی تخلیق بے فائدہ نہیں بے ضابطہ نہیں بے نتیجہ اور بے نظم نہیں تو کیا انسان کی پیدائش بلا فائدہ ہے اس کی تخلیق بے کار ہے۔ ایسا بھی ناممکن ہے۔ معلوم ہوا کہ جو سارے جہان کا خالق ہے وہی انسان کا بھی خالق ہے۔ اور جس طرح ہر چیز کی پیدائش کا ایک فائدہ اور مقصد ہے اسی طرح انسان کی تخلیق بھی با مقصد ہے۔ اور جس طرح سارا جہان خالق کے احکام تکوینیہ کا پابند ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی خالق کے احکام تکوینیہ وتشریعیہ کی ضرورت ہے۔ اور انسان کو ان احکام کی اضطراری واختیاری پابندی ضروری ہے۔

۲۔ اللہ سارے جہان کا رازق ہے۔ بقائے حیات کے لئے جس رزق کی جس مقدار میں جس چیز کی ضرورت ہے اللہ اتنا رزق اس کو عطا کرتا ہے۔ اور اللہ ہی ہر شخص کی صلاحیت واستعداد سے واقف ہے۔ سارا علمی خزانہ اسی کے پاس ہے۔ پس وہ ہی نبوت تا کمان جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ انسان نہ خزانۂ رزق کا مالک ہے کہ جس کو چاہے دے نہ چاہے نہ دے۔ نہ غیبی علوم کا خزانہ انسان کے پاس ہے کہ جس کو مناسب سمجھے نبی بنا دے۔

۳۔ اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے۔ وہی سب پر غالب ہے۔ وہی حاکم کل ہے۔ انسان جس طرح علم کامل کا مالک نہیں اسی طرح اس کی قدرت بھی عجز سے خالی نہیں۔ پس انسان نہ آمر حقیقی ہو سکتا ہے نہ ناہی۔

۴۔ سوائے مخصوص افراد کے دوسرے کسی آدمی کو صف ملائکہ میں داخل ہونے یا ملائکہ کی گفتگو سننے یا کسی فرشتے سے گفتگو کرنے کی طاقت نہیں۔ اس لئے کوئی بھی (سوا ان افراد کے لئے جن کا انتخاب اللہ خود فرمالے) حامل وحی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایسے لوگوں کو سوا نبی کے اتباع کے اور کوئی ذریعہ حاصل نہیں کہ پیام خداوندی اور احکام شرعی کا ان کو علم ہو جائے۔

۵۔ کسی کی روح میں اتنی روشنی نہیں کہ وہ لوح محفوظ کا مطالعہ کر سکے اور وہاں سے غیبی علوم اخذ کر سکے۔

۶۔ نبی کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اللہ پیغمبر کا حامی اور اپنے دین کو غالب کرنے والا ہے۔ اللہ کی مخفی تدبیریں کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا مقابلہ کیا... جا سکے۔ اس لئے اللہ کے پیغام جاننے کے لئے ہر پیغمبر کی پیروی لازم ہے

۷۔ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہی حاکم اعلیٰ ہے۔ آئین ساز اور دستور جاری کرنے والا ہے۔ اس کے سوا، کوئی اس قابل نہیں کہ اس کے ساختہ پر داختہ قوانین کو مانا جائے اور ان کی تعمیل لازمی قرار دی جائیں۔

تحلیلِ اجزاء

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ الخ۔ رسول اللہ ﷺ نے جن امور کی تبلیغ کی اور قرآن نے جو تعلیم دی اس کا سرچشمہ افکار و عقائد کی درستگی ہے اور عقائد کی اصلاح کا سنگِ بنیاد ہے اللہ ہی کو معبود ماننا اور الوہیت کی وحدت کے چند ضروری اجزاء و عناصر ہیں۔ ۱۔ اللہ ہی خالق ہے کسی اور نے خود نہ اپنی تخلیق کی نہ کسی دوسرے کی یعنی اللہ اپنے علمی اندازہ کے مطابق اس سارے جہان کو عدم محض اور نیستی سے عالمِ وجود و ہستی میں لایا۔ ۲۔ اللہ رب بھی اپنی مرضی و ارادہ کے مطابق وجودِ کائنات کو تھامے اور باقی رکھے ہوئے ہے۔ اسی کا تکوینی انتظام جاری و ساری ہے۔ ۳۔ ہر چیز کو پیدا کرنے اور مدتِ مقررہ تک باقی رکھنے کی ایک غرض ہے ایک مقصد ہے۔ انسان کی پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے۔ مقصد کی تعین اور حصولِ مقصد کے ضروری طریقے بتانا اللہ کا کام ہے۔ پس انسان جس طرح اپنی تخلیق میں اللہ کا محتاج ہے خود نہ اپنا خالق ہے نہ کسی دوسری چیز کا۔ اسی طرح زندگی گذارنے اور مدتِ مقررہ تک جینے کے ضابطے اور دستور سیکھنے میں بھی وہ محتاج خدا ہے۔ یہ سب عناصر الوہیت ہیں۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو خدا کا انکار کرتے یا دوسروں کو اس کی عبادت و اطاعت میں ساجھی قرار دیتے ہیں کیا بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے۔ (حضرت ابن عباسؓ) یا بلا وجہ بغیر کسی مقصد کے پیدا ہو گئے۔ اچھے برے اعمال کا کوئی فرق نہیں۔ جزا سزا وہم ہے۔ انسان کی تخلیق یونہی ہو گئی۔ نہ اللہ نے اس کے لئے کوئی دستورِ زندگی بنایا نہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا (عام اہلِ تفسیر) ظاہر ہے کہ انسان کی تخلیق بے کار نہیں۔ عقل و شعور کا تقاضہ ہے کہ اس کے اعمال میں کچھ اچھے برے ہونے چاہئیں اور سزا جزا ملنی چاہیئے۔ پس جب انسان کو پیدا کرنے کے لئے کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے اور تخلیق کا کوئی مقصد بھی ہونا لازم ہے۔ تو بتاؤ کہ کافروں نے کیا خود اپنے کو اور دوسری چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اندازۂ خیر و شر میں وہ کسی کے محتاج نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو کسی عقلی نقلی قطعی دلیل پر یقین ہی نہیں۔ تردد اور تشکیک کی وادی میں سرگرداں ہیں نہ ان کے دلوں میں ایمان جاگزیں ہو سکتا ہے نہ دماغوں میں تصدیق و یقین۔

اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ۔ اللہ کے پاس بے انتہا علمی خزانے ہیں۔ وہ ذرہ ذرہ کا علم رکھتا ہے۔ اس کی لوحِ علمی میں نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ ہر چیز حاضر ہے وہی کائنات کی ہر چیز کی صلاحیت و استعداد اور ظہور پذیر حرکات و سکنات سے کامل طور پر واقف ہے اسی کو ہر شخص کی فطری ازلی قابلیت معلوم ہے۔ پھر اسی کے پاس سارے جہان کی ہنگامی بقا خصوصاً انسانوں کی روحانی و جسمانی تربیت کے انتھا خزانے بھی ہیں۔ اس کے سوا کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ رزق یا ہدایت و علم کے کامل خزانے کسی کے پاس ہیں۔ جب یہ بات مسلمہ ہے تو پھر وہ جس طرح اپنی مشیت کے مطابق روزی کی تقسیم کرتا ہے اور کسی دوسرے کو اپنی مرضی کے مطابق تقسیم رزق کا حق نہیں ہے اور نہ کوئی اس تقسیم میں دخیل ہے۔ اسی طرح علمی خزانے کی تقسیم اور عطا نبوت و ہدایت میں وہ مختار مطلق ہے۔ کسی اور کو عطا نبوت میں کوئی دخل نہیں۔

اَمْ ھُمُ الْمُصَۜیْطِرُوْنَ۔ اللہ قادر مطلق ہے اسی کی طاقت ہمہ گیر اور ہمہ رس ہے۔ اس کے سوا کسی کو عمومی تسلط حاصل نہیں۔ کسی کے اندر ہمہ گیر قوت نہیں۔ کوئی حقیقی طاقت کا مالک نہیں۔ پس کیا یہ مشرک۔ اس عالم کے انتظام کو اپنی قوتِ قاہرہ کے زیرِ حکم چلانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور اس سنسار کو اقتدارِ الٰہی اور حکمِ خداوندی سے خارج کر کے اپنے حکم کے تحت لا سکتے ہیں۔

اَمْ لَھُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ الخ۔ یا ان کے پاس کوئی ایسا زینہ اور عالمِ غیب تک چڑھنے کا ذریعہ ہے کہ عالمِ ملکوت ولاہوت

تک پہنچ کر ان کو اللہ کے غیبی کارندوں کی گفتگو سننے کا موقع مل سکے اور واقعہ جو اصلی ابدی حکومت چلا رہا ہے اور زندہ تحریفات احکام صادر فرماتا ہے اور ملائکہ اس کے احکام کا علم نفاذ ظاہری سے پہلے ہو جاتا ہے۔ اس کی اطلاع ان مشرکوں کو ہو جانے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ پھر وہ حق کو قبول کر لیں۔ اس پر چلیں اور اتباع پیغمبر کی ان کو ضرورت نہ ہو۔

اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ۔ اے انسانو تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہو۔ تمہاری یہ حماقت و سفاہت اس مرتبہ پر پہنچ گئی کہ تم کو اہل عقل کے گروہ میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ پھر کس منہ سے دعویٰ کر سکتے ہو کہ تمہاری روحانیت اور علمی روشنی تم کو عالم ملکوت کی سیر کرا سکتی ہے اور غیب کی باتوں کی تم کو براہ راست اطلاع ہو سکتی ہے۔

اَمۡ تَسۡـَٔـلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ۔ انسانوں کی دنیوی بہبودی اور اخروی سعادت و نجات نبوت کی اصل غرض ہے اور اس کا باعث محض رحمتِ خداوندی اور پیغمبروں کا جذبۂ خیر خواہی ہے۔ پیغمبر بادشاہ نہیں ہوتا کہ رعایا کی تعلیم و تربیت، حفظانِ صحت، دشمنوں سے حفاظت اور امن قائم رکھنے کے بدلے میں رعایا سے لگان، ٹیکس اور تاوان وصول کر کے اپنے خزانے بھرتا ہے۔ نبی کی تعلیم و ہدایت اپنا معاوضہ طلب نہیں کرتی۔ پیغمبر لوگوں سے چندہ لے کر اپنے صندوق کو آباد نہیں کرتا اور کسی سے اپنی خدمت و راہنمائی کی کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ رسول اللہ ﷺ بھی کسی سے اپنی تبلیغ و اصلاح کی اجرت کے طلب گار نہیں تھے۔ اگر ہدایت و اصلاح کے معاملے میں کچھ طلب کرتے تو شاید لوگوں کو شبہ کرنے کا موقع ملتا کہ یہ روپیہ وصول کر کے مالدار بننا چاہتے ہیں۔ جب اجرت ایمان و اسلام کی کوئی طلب نہیں، سیادت و امارت کی طمع نہیں تو پھر سوائے جذبۂ خیر خواہی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا الغیب سے مراد ہے لوحِ محفوظ جس میں تمام غیبی امور کا اندراج ہے۔ اور یکتبون کے بعد منہ کا لفظ محذوف ہے۔ یعنی کیا ان کے پاس لوحِ محفوظ ہے جس میں تمام غیبی امور درج ہیں۔ اور یہ اس لوحِ محفوظ سے اخذ کر کے لکھتے ہیں (اور لوحِ محفوظ کو پڑھ کر یقین کر لیتے کہ ہمارا عقیدہ اور ہماری قوم کا رسم و رواج حق ہے اور یہ شخص جو رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے اور توحید کا سبق پڑھ رہا ہے جھوٹا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا کہ کیا ان کو غیب کا علم ہے کہ محمد جو کچھ قیامت حشر نشر اور عذاب ثواب کی خبر دے رہے ہیں وہ جھوٹی ہے۔ قتادہ نے کہا یہ آیت نتربص بہ ریب المنون کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ان کو یہ غیبی بات معلوم ہے کہ محمد ان سے پہلے مر جائیں گے اور ان کا تعلیمی نشان بھی مٹ جائے گا۔ اس صورت میں یکتبون کا ترجمہ ہوگا یحکمون یعنی وہ حکم لگا رہے ہیں کہ محمد کی وفات ہم سے پہلے ہو جائے گی اور اسلام مٹ جائے گا۔ قتیبی نے کتاب کا ترجمہ حکم ہی کیا ہے

اَمۡ يُرِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا الخ۔ کید سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کا مشورہ جو قریش نے دار الندوہ میں بیٹھ کر کیا تھا۔ دوسری آیت میں آیا ہے: وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ یعنی یاد کرو کہ کافر مشورہ کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں وہ سازشیں کر رہے تھے اور اللہ بھی مخفی تدبیر کر رہا تھا الخ۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ میں سے جب کوئی ایسی وجہ نہیں جو اسلام سے نفرت اور عداوت کا باعث ہو تو پھر کیا وہ آپ کے خلاف ضرر رسانی کی سازشیں کر رہے ہیں۔ کہ آپ کو قید یا قتل کر دیں۔ یا وطن سے نکال کر باہر کر دیں، لیکن ان کی سازشوں سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا، ہر سازش ناکام پڑے گی۔ یہ اپنی سازشوں کو کامیاب سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں یہ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ ان کی سازشوں کا برا نتیجہ خود ان کو اٹھانا پڑے گا۔

اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۔۔۔ جب ان کو علم غیب بھی نہیں صف ملائکہ میں داخل ہو کر غیب کا

معلومات حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن ہے اور ان کے پاس قوتِ قاہرہ بھی ایسی نہیں کہ ان کی مرضی سے انتظام عالم ہو رہا ہے اور خود ان کی عقلیں بھی شہادت نہیں دیتیں کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اور رسول اللہ کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے تو پھر کس بل بوتے پر یہ اللہ کے رسول کے پیام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے جو ان کی حمایت اللہ کے مقابل کر سکتا ہو۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ ہر طرح کے مشرکانہ بیان اور صفات سے اللہ پاک ہے۔ اس کا الوہیت اور صفاتِ الوہیت میں کوئی بھی شریک نہیں۔

مقصودِ بیان

مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ سے اشارا ہے اس امر کی طرف کہ ہر مخلوق کا کوئی خالق اور غرضِ تخلیق ضرور ہونی چاہیئے۔ اور کوئی مخلوق اپنی خالق خود نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ تخلیق ایک فعل ہے اور فعل نتیجۂ فعل کا ظہور چار چیزوں کے بغیر ناممکن ہے۔ فعل کا کوئی کرنے والا ہو۔ فاعل پہلے سے غرضِ فعل یعنی نتیجہ کا علمی اندازہ کرے کہ مجھے یہ کرنا ہے۔ کوئی میٹر یا مادہ ہو جس پر فعل کیا جائے فعل سے مادہ کی کوئی صورت ظاہر ہو جائے۔ کسی برتن کو دیکھ کر ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہوگا اور اس نے جب بنانے کا ارادہ کیا ہوگا تو پہلے ہی یہ خیال کر لیا ہوگا کہ مجھے کیا بنانا ہے۔ پھر تانبہ، پیتل، ٹین، مٹی یا اور کچھ غرض کوئی میٹر بنانے والے کے پاس ہوگا۔ پھر بنانے کے بعد برتن اپنی خاص شکل کے ساتھ بن گیا ہوگا۔ تخلیق نام ہے ایک اندازہ کے ساتھ کسی چیز کو بنانا۔ بہرحال بنانے والے کی اور اس کے علمی اندازہ کی تخلیق کے لئے ضرورت ہے اور تخلیق کے بعد مخلوق کا وجود بھی لازمی ہے۔ لیکن تخلیق کے لئے کیا کسی میٹر اور مادہ کی بھی ضرورت ہے جو پہلے سے موجود ہو، جیسے ہر صنعت کے لئے پہلے سے میٹر موجود ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تخلیق کو دوسری انسانی صنعت پر قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ تخلیق کا تعلق اس کائنات کے مادہ سے ہی ہے۔ مادہ بھی تو مخلوق ہے۔ پس تخلیق نام ہے عدم محض سے وجود میں لانے کا۔ نیست سے ہست کرنے کا، نہ کہ موجود کی صرف صورت بدلنے کا۔ مادہ قدیم نہیں، غیر مخلوق نہیں۔ گویا اللہ کا علم و ارادہ ہی اس کائنات کا میٹر ہے۔ کسی دوسرے مادہ کی ضرورت نہیں۔ یہی مطلب ہے اس قول کا کہ اللہ کے علم ہی کا نام حقائقِ امکانیہ یا اعیانِ ثابتہ ہے یعنی اللہ کا علمی اندازہ تقدیر یا تقرر وجود کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد ظہور وجود ہوتا ہے۔ پس غور طلب یہ امر ہے کہ کوئی شخص بھی اپنا خالق نہیں اور بغیر خالق کے بھی اس کی تخلیق نہیں ہوئی تو پھر خالق کون ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی اور چیز خالق ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ خالقِ انسان وہی ہوگا جو ساری کائنات کا خالق ہو۔ آسمان و زمین یعنی کائناتِ بالا و پست کو جس نے پیدا کیا اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اس جگہ تک توحیدِ تخلیقی کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس سے آگے توحید تربیت کے دونوں اجزاء کا بیان ہے یعنی خزانۂ علم و رزق کا تنہا مالک ہونا اور قدرتِ کاملہ کا حامل ہونا ان دونوں خزانوں کا جو مالک و مختار ہوگا اسی کو الٰہ و اکمل ہونے کا استحقاق ہوگا۔ اس سے یہ امر بھی مترشح ہوا کہ تقسیم رزق جس کے قبضہ میں ہے اسی کے قبضہ میں تقسیم علم و نبوت بھی ہے کسی مخلوق کی مرضی کو نہ تقسیم رزق میں دخل ہے نہ علم و نبوت عطا کرنے میں۔ المصیطرون کا لفظ بتا رہا ہے کہ کارخانہ قدرت پر کسی کو تسلط حاصل نہیں تو پھر کسی کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ محمد جیسے بے بضاعت نوجوان کو نبی کیوں بنایا گیا۔ کسی اور قریشی معمر سردار کو کیوں نہیں بنایا گیا۔

أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مشرکین قریش بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ عالم ملائکہ اوپر موجود ہے اور انسانوں کے متعلق انتظام کے سلسلہ میں ان کی باہم گفتگو ہوتی ہے۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا سے معلوم ہو رہا ہے کہ پیغمبر دینی تبلیغ کے کسی مالی معاوضہ کے طلبگار نہ تھے۔ اس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ ان فتوی والوں اور ملاؤں اور خطیبوں اور واعظوں کو جو اپنے علم اور وعظ کو مالی معاوضہ لے کر فروخت کر رہے ہیں یہاں تک کہ کلمہ کا مطلب بیان کرنے کی بھی قیمت وصول کرتے ہیں۔ عبرت حاصل کرنا چاہیئے ان قاریوں کو جو اپنی تلاوت کے معاوضہ کے طلبگار رہتے ہیں اور کان کھولنا چاہیئے ان مشائخ طریقت کو جو مریدوں سے ہدایت کا معاوضہ نذر اور ہدیہ کے جھوٹے ناموں سے حاصل کرتے ہیں۔ فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ سے یہ بات بھی مترشح ہو رہی ہے کہ اگر مذہب اور دین کی تبلیغ بالمعاوضہ کی جائے گی تو کامیابی نہ ہوگی۔ لوگ اس کو تاوان سمجھیں گے اور مانگنے والے کو لالچی۔ زکوٰۃ کوئی تاوان نہیں یہ امدادِ باہمی اور فقراء و مساکین کی مالی ہمدردی کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ رسول اللہ اور آپ کے جانشین خود اپنے لئے طلب نہیں کرتے تھے بلکہ عشر زکوٰۃ وغیرہ کا مصرف اہلِ احتیاج ہیں۔ اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ رسول اللہ کے قریبی رشتہ دار نہ ہوں۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ○ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ

اور اگر وہ آسمان کے ٹکڑے کو دیکھ لیں کہ گرتا ہوا آرہا ہے　تو یوں کہہ دیں کہ یہ تو تہ بہ تہ جما ہوا بادل ہے　تو ان کو رہنے دیجئے یہاں تک کہ انکو اپنے اُس دن سے

الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ○ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ

سابقہ ہو جس میں ان کے ہوش اُڑ جائیں گے　جس دن ان کی تدبیریں ان کے کچھ بھی کام نہ آویں گی　اور نہ (کہیں سے) اُن کو　مدد ملے گی　اور ان ظالموں کے لئے قبل اس

ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا

(عذاب) کے بھی عذاب ہونیوالا ہے (جیسے قحط و قتل بدر) لیکن ان میں اکثر کو معلوم نہیں　اور آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئیے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ○ ع

اور اُٹھتے وقت (مجلس سے یا سونے سے) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے　اور رات میں بھی اسکی تسبیح کیا کیجئے (مثلاً عشا)　اور ستاروں سے پیچھے بھی

تفسیر جب آدمی کے ذہنِ نارسا پر جہالت کے تہ بہ تہ پردے چھا جاتے ہیں اور پندار و نادانی کی کثیف چادر اس کے اندرونی حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو پھر بیرونی حواس بھی اس کے غلط ہی ہو جاتے ہیں۔ غلط اندیشی غلط بینی تک پہنچا دیتی ہے اور غلط بینی غلط اندیشی کا باعث بن جاتی ہے۔ دونوں طرف سے اس کے لئے ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر غیبی عذاب کی کوئی محسوس شکل بھی اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اپنی غلط بینی اور کج اندیشی کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور نازل ہونے والے عذاب سے خوف کرنے کی بجائے نابود وار فلاح بن جاتا ہے اور اپنی گمراہی پر اور اڑ جاتا ہے لیکن موعودہ مقررہ مصیبت کو کوئی طاقت اور سازش ٹال نہیں سکتی۔ نہ اس منکرِ حقیقت مستحقِ عذاب شخص کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔ نہ ایسے کج اندیش بدباطن سازشی ذہن رکھنے والے لوگ ملہم برنارِ صداقت کو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ اللہ اپنے نمائندے کا خود ہر وقت محافظ ہوتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ۔ اور اگر وہ آسمان سے (عذاب کا) کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں، یعنی اگر اوپر سے ان پر عذاب کا ایک ٹکڑا بصورتِ ابر گرتا ہوا نظر آئے تو چونکہ ان کی نظر حقیقت بیں نہیں اور اپنی سیاہ کاریوں کا ان کو یقین نہیں اور نبی برحق کے کلام پر ایمان نہیں اور اللہ کی محیط کل غیبی طاقت ان کے لئے قابلِ شک ہے اور امیدوں کا ان کے ذہنوں پر تسلط ہے اور عافیت و فلاح کا ان کو یقین ہے اس لئے اس غیبی عذاب کو جو بھوری یا کالی گھٹا کی شکل میں ان کی نگاہوں کے سامنے آئے گا اس کو تہ بر تہ گھٹا ٹوپ ابر باراں ہی سمجھیں گے اور کفر و شرک سے ہرگز باز نہیں آئیں گے جس طرح اقوامِ پارینہ میں قوم عاد کا واقعہ ہوا اور ثمود و جدیس و طسم وغیرہ دوسری اقوام بھی اسی قسم کے عذابوں سے ہمکنار ہوئیں۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہ کافر اپنی سرکشی، ضد اور ہٹ میں اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اللہ کے عذاب کو محسوس شکل میں دیکھنے کے بعد بھی ان کو ایمان کی توفیق نہیں ہوگی۔ اگر آسمان سے کوئی ٹکڑا عذاب بن کر ان کے سروں پر گر رہا ہوگا تو بھی ان کو یقین نہیں آئے گا بلکہ صاف کہیں گے کہ یہ ابر غلیظ ہے جو پانی برسانے آیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ولو فتحنا علیہم باباً من السماء الخ اگر ہم ان کے لئے آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور یہ وہاں چڑھ بھی جائیں تب بھی یہی کہیں گے کہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ سے وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ تک۔ یعنی اے نبی آپ ان کو چھوڑ دیجئے (نہ ان پر عذاب نازل ہونے کی دعا کیجئے ان

ان سے کسی قسم کا خوف کیجئے) یہ خود ایک مقرر دن عذاب سے دوچار ہوں گے۔ اس روز ان کی ساری فریب کاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ کوئی مکاری اس روز کام نہ آسکے گی اور کوئی بھی اُن کی مدد نہ کرسکے گا۔

یَوْمَهُمُ سے مراد شیخ ابن کثیر کے نزدیک روز قیامت ہے۔ اور بیضاوی کے نزدیک پہلی بار نفخ صور کا دن۔ لیکن یہ دونوں قول کمزور ہیں کیونکہ آیت میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ جس روز یہ بیہوش کر دیئے جائیں گے اس روز تک ان کو چھوڑے رکھئے اور ظاہر ہے کہ یہ چھوڑے رکھنا صرف یوم موت تک ہوسکتا ہے۔ نفخ صور یا روز قیامت تک چھوڑے رکھنے کا کوئی معنی نہیں۔ مرنے کے بعد تو ان کی گرفتاری ہو جائے گی۔ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے مولانا قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں یومھم سے یوم الموت مراد لیا ہے یعنی تا زندگی ان کو چھوڑے رکھئے مرنے کے بعد ان کو خود اللہ کا عذاب گھیرے گا۔ نہ کوئی شخص ان کو عذاب سے بچا سکے گا نہ ان کی کوئی فریب کاری کام آئے گی۔

وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۔ یعنی ان کافروں کے لئے مرنے سے پہلے ایک عذاب اور بھی مقرر ہے لیکن اکثر لوگ اس عذاب سے واقف نہیں۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ سے مراد ہے بدر کے دن کی شکست مجاہد نے کہا ہفت سالہ قحط مراد ہے جو اہل مکہ پر پڑا تھا۔ حضرت براء بن عازب کا ایک قول مروی ہے کہ اس سے عذاب قبر مراد ہے۔ اس قول سے بیضاوی کے مذکورہ بالا تفسیری قول کی تائید ہو جائے گی۔ دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ ہم بڑے عذاب سے پہلے (چھوٹے اور) قریب والے عذاب کا (دنیا میں ہی) ان کو مزہ ضرور چکھائیں گے۔ شاید یہ توبہ کرلیں۔ اکثرھم لا یعلمون کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ ان کی سرکشیاں اور سیاہ کاریاں ہی ان پر نزول عذاب کا موجب ہیں اس لئے گناہ پر گناہ اور ظلم پر ظلم کئے جاتے ہیں۔ جہاں معصیت ہٹی اور پھر ویسے کے ویسے ہی ہو گئے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ منافق کی حالت اونٹ کی طرح ہے جس طرح اونٹ نہیں جانتا کہ اس کو کس غرض سے کھولا اور کس غرض سے باندھا جاتا ہے اسی طرح منافق بھی نہیں جانتا کہ اُسے کیوں بیمار ڈالا گیا اور کیوں تندرست کر دیا گیا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۔ اور اپنے رب کے حکم پر صبر رکھو۔ یعنی اللہ نے جو ان کافروں کو مہلت دی ہے اور آپ کو ان کی ایذا رسانیوں کے نرغے میں رکھا ہے۔ اس پر صبر رکھئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے جو ان کے لئے عذاب مقرر کر رکھا ہے اس وقت آپ صبر رکھئے اور اُن کی ایذاؤں کا کوئی خطرہ نہ کیجئے۔

فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۔ کیونکہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ آپ کی نگہبانی کے ذمہ دار ہم ہیں (زجاج)

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۔ سعید بن جبیر اور عطاء نے کہا مجلس سے اُٹھتے وقت سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ پڑھنا مراد ہے مجلس اگر خیر کی ہوگی تو اس کی بھلائی بڑھ جائے گی اور شر کی مجلس ہوگی تو گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا ہو اور وہاں بیہودگیاں زیادہ ہوں اور یہ شخص اُٹھنے سے پہلے سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ پڑھ لے تو اس کے لئے (مجلس) کے گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ رواہ البغوی۔ وروی الترمذی والبیہقی فی الدعوات الکبیر بلفظ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا كَانَ فِي مَجْلِسِهِ ۔

حضرت رافع بن خدیج راوی ہیں کہ رسول اللہ کا آخری عمر میں یہ طریقہ تھا کہ جب صحابہ کی مجلس سے اُٹھنے کا ارادہ کرتے تو فرماتے سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ عَمِلْتُ سُوءًا (یا عملت سوءًا کی جگہ فرمایا ظَلَمْتُ نَفْسِي) فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ عَمِلْتُ سُوءًا ۔ میں اللہ کے بے عیب ہونے کا اعتراف کرتا ہوں اور ہر ستائش کا تجھے مستحق جانتا ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں میں نے گناہ کئے ہیں (یا اس کی جگہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے) تو مجھے معاف فرما دے۔ تیرے سوا کوئی گناہ معاف کرنے والا نہیں۔ میں تجھ سے معافی کی درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں نے گناہ کئے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ حضور نے تو یہ الفاظ نئے فرمائے ہیں (اس سے پہلے تو ایسا نہیں فرماتے تھے) فرمایا

ہاں میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا محمد یہ (الفاظ) مجلس (کے گناہوں) کا کفارہ ہیں۔ رواہ النسائی حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ اس کو مختصر طور پر معاجم ثلثہ میں نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے فرمایا۔ چند کلمات ہیں جو کوئی کسی خیر کی مجلس یا ذکر الٰہی کی محفل میں کہے گا۔ ان کلمات کی مہر اس کے لئے لگادی جائے گی جیسے کسی کاغذ پر مہر لگادی جاتی ہے۔ کلمات یہ ہیں۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ۔ رواہ ابوداؤد وابن حبان فی صحیحہ۔ حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھے ہوں اور اللہ کا ذکر اس مجلس میں نہ کریں اور اپنے نبی پر درود نہ بھیجیں تو اللہ کی ان پر خفگی ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو ان کو عذاب دے اور چاہے معاف فرمادے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والبیہقی وابن ابی الدنیا۔ ابوداؤد کی روایت میں آیا ہے کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھے ہوں اور اللہ کا ذکر نہ کریں تو اللہ کی طرف سے ان پر خفگی ہوتی ہے اور جو شخص بستر پر لیٹ جائے اور خواب گاہ میں اللہ کی یاد نہ کرے اس پر اللہ کی خفگی ہوتی ہے اور جو شخص راستہ میں چلے اور اللہ کی یاد راستہ میں نہ کرے اللہ کی خفگی اس پر ہوتی ہے۔

مجاہد کا بھی یہی قول ہے کہ آیت میں قیام سے مراد مجلس سے قیام ہے۔ ابوالاحوص کا بھی قول ہے کہ مجلس سے اٹھتے وقت سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ پڑھو۔ جامع عبدالرزاق میں حضرت سعر کی روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ کو تعلیم دی کہ مجلس سے اٹھنے لگو تو کہو سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ۔ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کی تائید دوسری مسند احادیث سے ہوتی ہے چنانچہ ترمذی کی حسن صحیح روایت ہے کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور وہاں کچھ لیک جھک (لغویت) ہو اور کھڑا ہونے سے پہلے یہ کلمات کہہ لے تو اس مجلس میں جو کچھ ہوا ہے اس کا کفارہ ان کلمات سے ہو جاتا ہے۔ اس روایت کی سند بر شرط مسلم ہے۔ حاکم نے بھی مستدرک میں اس کو بیان کیا ہے لیکن امام بخاری کے نزدیک یہ روایت ابن جریج کے سلسلہ سے آئی ہے اس لئے معلل ہے۔ امام احمد ابوحاتم ابوزرعہ اور دارقطنی وغیرہ نے بھی اس کو معلل قرار دیا ہے لیکن ابوداؤد کی روایت جس سند سے آئی ہے اس میں ابن جریج کی وساطت نہیں ہے اس لئے بسند ابوداؤد روایت مذکورہ غیر مجروح ہے۔

بعض کے نزدیک آیت میں قیام سے مراد نماز کو اٹھنا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ نماز شروع کرتے ہی رسول اللہ سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا إله غيرك پڑھتے تھے۔ (صحیح مسلم)۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سو کر اٹھنے کے بعد تسبیح و تحمید مراد ہے۔ ضحاک اور ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ بعض نے کہا تہجد کے وقت سو کر اٹھنے کے بعد تسبیح و تحمید کرنی مراد ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ جب رات سے اٹھتے تھے تو دس بار تکبیر، دس بار تحمید، دس بار تسبیح اور دس بار استغفار کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضِيْقِ الْمَقَامِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (البغوی) ابوداؤد نے شریق ہذلی کی وساطت سے بروایت حضرت عائشہؓ بیان کیا کہ رسول اللہ رات سے اٹھتے تو دس بار تکبیر، دس بار تحمید اور دس بار سبحان اللہ وبحمدہ اور دس بار سبحان الملک القدوس اور دس بار استغفار اور دس بار لا إله إلا الله پڑھتے اور دس بار فرماتے۔ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

مسند احمد، سنن اور صحیح بخاری میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو شخص رات کو اٹھے اور کہے۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ پھر دعائے مغفرت کرے یا کچھ اور جو چاہے دعا کرے تو اللہ اس کی دعا قبول فرمالیتا ہے۔ پھر اگر عزم کے ساتھ اس نے وضو کرکے نماز بھی پڑھ لی تو وہ نماز قبول کرلی جاتی ہے۔

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ۔ اور رات کے کچھ حصہ میں اللہ کی پاکی بیان کرو۔ تسبیح سے مراد ہے نماز پڑھنا۔ مقاتل نے کہا مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے۔ شیخ ابن کثیر نے کہا تہجد کی نماز مراد ہے۔ مولانا قاضی ثناء اللہ کے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

وَإِدْبَارَ النُّجُوْمِ۔ اور ستاروں کے پشت پھیرنے کے وقت یعنی طلوع صبح کی وجہ سے ستارے جس وقت چھپ رہے ہوں اس وقت بھی نماز پڑھ

ضحاک کے نزدیک اس سے فجر کی نماز مراد ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر کے نزدیک فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ فجر کی دو رکعتیں (یعنی دو سنتیں) دنیا اور ساری موجودات دنیا سے بہتر ہیں۔ (رواہ مسلم) یہ بھی حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ فجر کی دو رکعتوں کی نگہداشت اور پابندی بہت ہی زیادہ کرتے تھے۔ (متفق علیہ)

ایک مرفوع حدیث ہے ان سنتوں کو نہ چھوڑو خواہ تم کو گھوڑے کچل ڈالیں۔ اسی حدیث کو نظر میں رکھ کر امام احمد نے فجر کی سنتوں کو واجب کہا ہے لیکن سنتوں کے وجوب کا قول سہو ہے غلط کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں (فرض) ہیں سننے والے نے عرض کیا کیا مجھ پر اس کے سوا اور کچھ (نماز) بھی (فرض) ہے۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفل پڑھے۔

مقصودِ بیان وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ باطل کے پرستاروں کی بے یقینی اس حد تک پہنچ گئی ہے۔ اور ان کی دانش ایسی کور ہو گئی ہے کہ اگر عذاب الٰہی بھی محسوس شکل میں ان کے سامنے آجائے تو بے دانشی اور کج فہمی کی وجہ سے اس کو اپنے لئے رحمت خیال کریں گے اور تسلط غفلت کی وجہ سے ابر کی طرح اڑ کر آنے والے قہر خداوندی کو ابر باراں سمجھیں گے۔

فَذَرْهُمْ سے مراد ہے کہ ان کی پرواہ نہ کرو یعنی ان کو سمجھانا بیکار ہے۔ ان للذین ظلموا عذابا میں اسی زندگی میں آنے والے عذاب کی بطور پیشین گوئی صراحت ہے۔ فانک باعیننا کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ رسول اللہ کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لے لی تھی اور آپ امان خدا میں تھے۔ کوئی شخص آپ کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ وغیرہ۔

سُوْرَۃُ النَّجْمِ

یہ سورۃ مکی ہے۔ قرینہ کا تقاضا ہے کہ ہجرت سے کچھ پہلے اس کا نزول ہوا۔ اس میں تین رکوع اور ۶۲ آیات ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ کا قول مروی ہے کہ سب سے پہلی سورت جس میں سجدہ نازل ہوا وہ سورت والنجم تھی۔ رسول اللہ نے اور آپ کے پیچھے سارے نمازیوں نے (اور سب حاضرین نے) سجدہ کیا لیکن ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ اس نے (زمین پر سجدہ نہیں کیا اور غرور کی وجہ سے یا مذاق کے طور پر) مٹھی میں مٹی لے کر پیشانی سے لگالی میں نے دیکھا کہ یہ شخص کفر کی حالت میں مرا۔ یہ امیہ بن خلف تھا۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ یہ شخص عتبہ بن ربیعہ تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کلمات ۳۶۵ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے حروف ۱۴۵۰

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ

قسم ہے مطلق ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ کے رہنے والے نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہوئے اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں ان کا

هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ

ارشاد تو نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقتور ہے پھر وہ فرشتہ (اپنی) اصلی صورت پر (آپ کے روبرو) نمودار ہوا ایسی حالت

الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝

میں کہ وہ آسمان کے بلند کنارہ پر تھا پھر وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم پھر اللہ نے اپنے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانی تھی

تفسیر ابن ابی حاتم نے شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ خالق کو اختیار ہے اپنی مخلوق میں جس کی چاہے قسم کھائے لیکن مخلوق کو سوائے اپنے خالق کے کسی اور کی قسم کھانا جائز نہیں ۔ قرآن مجید میں مختلف متعدد کائنات کی جو قسمیں مذکور ہیں ان کی تشریح اور غایت ہم سورہ والطور کے شروع کے مقالہ میں لکھ کئے ہیں۔

ستارہ کے جھکنے سے مراد ہے فجر کے وقت ثریا ستارہ کا غروب ہونا ۔ بعض کے نزدیک النجم سے مراد زہرہ ہے ۔ ضحاک کے نزدیک وہ ٹوٹنے والے ستارے مراد ہیں جو انگاروں کی شکل میں آسمان کی طرف چڑھنے والے شیطانوں کے مارے جاتے ہیں ۔ مجاہد نے کہا النجم سے مراد ہے قرآن (یعنی قرآن کے مختلف حصے) اور ھوی کا معنی ہے نزل ۔ اسی طرح دوسری آیت میں آیا ہے ۔ فرمایا ہے فلا اقسم بمواقع النجوم (یعنی بمنازل نجوم القرآن) ڈوبتے ہوئے زہرہ یا ثریا یا اترتے ہوئے قرآن کی قسم کھا کر فرمایا کہ تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہے نہ کجرو یعنی صاحب رشد و ہدایت اور تابع حق ہے ۔ بے علمی کی وجہ سے گم کردہ راہ نہیں کہ اس کو حق و باطل کی راہوں میں امتیاز نہ ہوا اور وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھرے ۔ نہ علم اور حق و باطل میں امتیاز حاصل کرنے کے بعد وہ دانستہ ٹیڑھے راستے پر چلنے والا ہے ۔ گمراہ عیسائیوں اور جان بوجھ کر خلاف حق کرنے والے یہودیوں کی طرح آپ نہیں ہیں ۔ آپ کا علم کامل اور سچا ہے اور آپ کا علم عمل کے مطابق ہے ۔ آپ پگڈنڈیوں پر بھٹکنے والے نہیں اور نہ راہ حق سے منہ موڑنے والے ہیں ۔ آپ عظیم الشان شریعت کے شارع اور اعتدال والی راہ حق پر قائم ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ آپ کا کوئی قول کوئی فرمان اپنے نفس کے جھکاؤ اور ذاتی غرض کے لئے نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کی تبلیغ کا آپ کو حکم خداوندی ہوتا ہے آپ وہی زبان سے نکالتے ہیں ۔ سعادت بشری سے تعلق رکھنے والے کسی دینی معاملے کا فیصلہ آپ اپنی رائے سے نہیں کرتے بلکہ اللہ بذریعہ وحی جو کلام آپ کی زبان پر جاری کر دیتا ہے وہی فرماتے ہیں ۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ایک شخص کی شفاعت سے جو نبی نہ ہوگا دو قبیلوں کے یا (فرمایا) ایک قبیلہ کے شمار کی برابر لوگ جنت میں داخل ہوں گے ۔ یعنی قبیلۂ ربیعہ اور قبیلہ مضر کی گنتی کے برابر ۔ ایک شخص بولا کیا قبیلۂ ربیعہ مضر میں سے نہیں ہے ۔ فرمایا ۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے میں حضور سے جو کچھ سنتا یاد کرنے کے لئے اس کو لکھ لیتا تھا ۔ بعض قریشیوں نے مجھے اس سے روکا اور کہا رسول اللہ ایک انسان ہیں کبھی کبھی غصہ اور غضب کی حالت میں کچھ فرما دیا کرتے تھے ۔ میں قریش کے کہنے سے رک گیا اور رسول اللہ سے اس کا ذکر کر دیا فرمایا تم لکھ لیا کرو ۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری زبان سے (کسی حالت میں) سوائے حق کے اور کوئی کلمہ نہیں نکلتا ۔ (مسند احمد ، ابو داؤد ۔ نیز ابن ابی شیبہ فی المصنف)

بزار کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میں جس امر کی اطلاع اللہ کی طرف سے دوں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میں بجز حق کے اور کچھ نہیں کہتا ۔ بعض صحابہ نے عرض کیا ۔ حضور ہم سے کبھی خوش طبعی بھی کرتے ہیں ۔ فرمایا اس وقت بھی میری زبان سے ناحق کلمہ نہیں نکلتا۔

تنقیح مسئلہ دینی معاملات میں رسول اللہ کا ہر قول اور ہر حکم کا مدار وحی پر تھا ۔ ذاتی میلان ، جذبات اور اقتضاء مزاج کو اس میں دخل نہیں تھا ۔ آپ نے مزید بعض مسائل میں اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے لیکن آپ کے اجتہاد فکری کی بنیاد بھی وحی پر قائم تھی اس لئے آپ کا دینی ارشاد ہر غلطی سے پاک تھا ۔ رہے دنیوی معاملات جیسے زراعت ، تجارت ، صنعت ، حرفت اور دوسرے فنون معاشی اور مشاغل زندگی ان کا تعلق وحی سے عام طور پر نہ تھا اس لئے ان میں کبھی خلاف امید نتیجہ بھی نکلا ۔ کھجور کے درختوں کی پیوندکاری سے آپ نے انصار کو روکا ۔ انصار رک گئے ۔ اس سے کھجور کی فصل اچھی نہیں ہوئی ۔ سبب دریافت فرمایا ۔ صحابہ نے پیوندکاری ترک کر دینے اور حکم کی تعمیل کرنے کا اظہار کر دیا ۔ فرمایا تم اپنی دنیا کے معاملات کو خوب جانتے ہو ۔ دینی معاملات میں تم پر میرے حکم کو ماننا لازم ہے ۔ (دنیوی معاملات تم جانو ۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے جو ہم نے بیان کیا)

ہوٰی اور وحی کا فرق انسان کو فطرتاً تین قوتیں عطا فرمائی گئیں ۔ دو جذباتی ہیں جن کا مدار حس پر ہے ۔ منفعت کے حصول کی خواہش خواہ جائز ہو یا ناجائز اور دفع مضرت کی طاقت ۔ دونوں طاقتوں کی کچھ اعتدالی حدود ہیں اور کچھ ادھر ادھر جھکاؤ

کی شکلیں ۔ اگر اپنے حقوق کے حصول اور تحفظ کے لئے ان قوتوں کا استعمال جائز حدود میں کیا جائے تو مستحسن ہے ۔ اور نیچے اوپر یا دائیں بائیں کی طرف ان کا رُخ اگر موڑ دیا جائے تو اس سے تباہی اور بربادی پیدا ہوتی ہے ۔ ۳۔ سوچنے اور غور کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی طاقت خواہ حواس کے ذریعہ سے جو معلومات حاصل ہوں ان پر غور کر کے ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کیا جائے یا کلی امور اور عام غیر مادی حقائق پر غور کر کے نتیجہ اور مقصد حاصل کیا جائے۔ مزید وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ زر، زن، زمین یا عزت، شہرت، حکومت، اقتدار وغیرہ کے حصول کی طاقت کو اگر دوسروں کی حق تلفی کے لئے استعمال نہ کیا جائے صرف اپنے حقوق کی طلب میں اس سے کام لیا جائے اور تعمیری فکری طاقت کے زیر اثر اس سے خدمت لی جائے تو سماج اور معاشرہ کی درستگی اور شخصی بہبودی کی یہ تعمیری کوشش ہوگی لیکن اگر اس قوت کو فکری طاقت سے باغی بنا دیا جائے اور عقل کی رہنمائی سے آزاد کر کے اس کو تخریب کار کر دیا جائے اور اپنے حصولِ منفعت کے لئے دوسروں کی حق تلفی کی پرواہ نہ کی جائے یا جذبۂ خواہش کو بالکل مُردہ کر دیا جائے، یہاں تک کہ اہل و عیال اور والدین و اقارب اور دوستوں سے فطری محبت کو بھی ختم کر دیا جائے اور بقاءِ زندگی کے لئے جس مادی غذا کی ضرورت ہر شخص کو ہے اس سے بھی دست کشی اختیار کر لی جائے اور باوجود زندہ ہونے کے موت کے کمل آثار اپنے اوپر طاری کر لئے جائیں تو افراط و تفریط کے یہ دونوں رُخ ناجائز جھکاؤ کے ہیں اور قبیح ہیں ۔ سفر میں گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دینا ہلاکت کے غار میں گرا سکتا ہے اور منزل پر پہنچنے سے پہلے راستہ ہی میں گھوڑے کو قتل کر دینا بھی موجبِ ہلاکت ہے لیکن اعتدال کے ساتھ بقدر ضرورت بدنی حقوق ادا کرنا باعثِ کامیابی ہے ۔ اسی طرح دفع مضرت کی طاقت ۔ کا بے محل استعمال یا برمحل استعمال کا ترک بھی تباہ کن اور افراط و تفریط کے دو تخریبی رُخ ہیں ۔ غیرت و حمیت کے موقع پر اور حفاظتِ شخصی و سماجی کی ضرورت سے بھی اس کا استعمال نہ کرنا بجھاؤ ہے اور موت کی جانب جھکاؤ ہے ۔ یہ یقیناً تقاضائے سیاست و دانش کے خلاف ہے لیکن حد سے بڑھ کر غضب و غصہ کے غلبہ سے پاگل بن جانا اور ہوش حواس کھو بیٹھنا بھی ہلاکت آفرین ہے ۔ خلاصہ یہ کہ قوتِ فکریہ اور دانش و غور کی حکومت سے دونوں جذباتی قوتوں کو آزاد کر دینا اور ان کا آزادانہ استعمال نفسانی جھکاؤ ہے جو یقیناً تخریبی ہے تعمیری نہیں ہے اور عقل کے زیرِ حکم انکا استعمال تعمیری نہیں ہے ۔ اور عقل کے زیرِ حکم ان کا استعمال تعمیری ہے جو انفرادی اور اجتماعی بہبودی کا حامل ہے ۔ اس تقریر سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ تیسری غیر مادی قوت یعنی فکری طاقت کا استعمال بھی دو طرح سے کیا جاتا ہے ۔ ایک جذبات و عواطفِ نفس کے زیرِ حکم اور میلانات سے متاثر ہو کر دوسرے جذبات کو قابو میں رکھ کر اور ذاتی عواطف سے آزاد ہو کر خالص فکر سے کام لینا ۔ اول صورت انتہائی بُری ہے ۔ ایسی دانش کو عقلِ سلیم نہیں کہا جاسکتا بلکہ عقلِ شیطانی کہنا بے جا نہ ہوگا اور دوسری صورت قابلِ ستائش اور لائقِ پسندیدگی ہے ۔ اس صورت میں عقل جذبات کے تابع نہیں ہوتی اور مادی قوتوں کی آمیزش سے پاک ہوتی ہے ۔ جذبات پر قابو رکھتی ہے اور ان کو اعتدال پر قائم رکھتی ہے ۔ اس کو یقیناً عقلِ سلیم اور دانشِ مستقیم کہنا زیبا ہے ۔ لیکن عقلِ سلیم کا وجود عنقا ہے ۔ افلاطون یا ارسطو ہوں یا کوردہ کا رہنے والا کوئی وحشی انسان ، جذبات کے جھکاؤ سے کسی کی عقل آزاد نہیں ۔ زوجیت ، دوستی ، قرابت ، وطنیت ، ولادت اور دوسرے بندھن ہیں جو ہر شخص کو باندھے ہوئے ہیں ۔ کوئی بھی ان رشتوں کے تقاضوں سے آزاد نہیں جو شخصیت یا جماعت جذبِ منفعت یا دفعِ مضرت کا ضابطہ انسانیت عامہ کے لئے بنائے گی اس کی عمومی افادیت اور مساوی فیض بخشی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کی ساخت ہر جذبہ سے آزاد ہو لیکن جذبات سے آزاد فکر کہاں سے آتے ۔ یقیناً اہلِ وطن اور وطن کو فکر کے نزدیک غیر وطنی اور غیر وطن پر ترجیح ہے ۔ ماحول سے متاثر ہونا فطری تقاضا ہے ۔ اپنوں سے اتصال اور غیروں سے انفصال مزاجِ بشری کا خاصہ ہے ۔ جب عمل اور قول میں ملکی ، قومی ، وطنی ، تولیدی ، جواری اور ازدواجی تعصبات سے کوئی شخص آزاد نہیں اور کسی کی فکر ان میلانات سے پاک نہیں تو وضع آئین اور قانون کی ساخت عقل کی روشنی میں کس طرح ہر جذباتی کدورت سے صاف ہو سکتی ہے ۔ حاصل یہ کہ اگر جذبات کا استعمال عقلی حکمرانی کے ماتحت بھی ہو تب بھی عقل کا اِدھر اُدھر جھکاؤ اور بالجملہ جذبات سے متاثر ہو کر کج راہ بن جانا یقینی ہے ۔ فکر گو جذبات کی حکمراں ہے پھر بھی جذبہ سے متاثر اور ماحول کی کسی قدر محکوم ضرور ہے اور عقل کی بھی کج روی شر انگیز اور عواطف کے اِدھر اُدھر جھکاؤ کا باعث ہوتی ہے ۔ ہاں اس ہوا اور نفسانی جھکاؤ سے آزادی عقل کو اسی وقت میسر آسکتی ہے جب وحی ربانی اور وجدانِ تعلیمی کی روشنی میں اور علم وہبی کی رہنمائی میں عقل جذبات پر حکومت کرے ، چونکہ وحی الٰہی اور غیبی وجدان میں غلطی ناممکن ہے اور کسی رشتۂ انسانیت اور رابطۂ بشریت کا اس پر ترجیحی اثر نہیں پڑ سکتا ، اس لئے جو عقل جذبات

کام لینے میں وحی کی رہنمائی قبول کرے گی۔ وہ کبھی غلط رو یا گمراہ نہیں ہو سکتی۔

حکماء اور فلاسفر چونکہ فطری تقاضوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے اس لئے ان کی عقلیں اگرچہ جذبات کی حاکم ہوتی ہیں لیکن فطری تقصور علم کے باوجود جذبات انسانی کی اثر پذیری سے کامل طور پر آزاد نہیں رہ سکتیں اس لئے جذبات قومیت وطنیت قرابت اور دوسرے روابط انسانیت ان کی عقلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتے اور انبیاء کی عقلیں وحی ربانی کی فیض یافتہ ہوتی ہیں اور تعلیم رحمانی کو اپنا رہنما بنا کر جذبات سے کام لیتی ہیں اس لئے جذبات سے پاک ہوتی ہیں اور فطرت بشریہ کو اعتدال پر لا کر ان سے کام لیتی ہیں۔ پس رسول اللہ بھی چونکہ اللہ کے صاحب وحی سچے نورانی عقل رکھنے والے رسول تھے اس لئے اگر ہدایت انسانی سے تعلق رکھنے والا کوئی لفظ بھی بولتے تھے تو وحی کے سہارے پر بولتے تھے۔ آپ کی عقل کا تکیہ وحی پر تھا۔ عواطف و جذبات کے جھکاؤ سے پاک جو پیام وحی سے ملتا آپ وہی لوگوں تک پہنچا دیتے۔ ذاتی منفعت علاقہ زوجیت، رشتہ قرابت، رابطہ والدیت و مولودیت اور بندش صداقت و محبت کے ہر افراطی و تفریطی جھکاؤ سے آپ کی تعلیم آزاد تھی۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ سے مَآ اَوْحٰى تک۔ اللہ نے تخلیقی طور پر ایک ضابطہ کے تحت اس کائنات کے مدارج کی حد بندی کر دی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس عالم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ۱۔ مادی ۲۔ غیر مادی۔ مادی عالم کے پھر دو حصے کر دیئے ہیں۔ علوی یعنی افلاک اور فلکیات۔ سفلی اور زیر یعنی عالم عناصر۔ عالم افلاک کی کائنات میں سارے سیارے اور ستارے داخل ہیں جن کی لاتعداد ان گنت قسمیں ہیں۔ بے گنتی نظام ہیں اور ہر نظام کے اندر بے شمار ستارے اور سیارے اپنی انفرادیت کو لئے ہوئے داخل ہیں۔ ایک نظام کہکشانی ہی ہے جو ہمارے سامنے ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ کتنے ستارے اور کرّے اس کے اندر اپنے فرائض نوعی و شخصی کی ادائیگی میں مشغول ہیں۔ نظام سفلی میں کچھ بسائط ہیں جن کی تعداد سو سے زیادہ اب تک معلوم ہو چکی ہے اور نہیں معلوم کہ آئندہ کتنے بسائط کے وجود کا انکشاف ہوگا۔ مرکبات سفلیہ کے پانچ مدارج ہیں۔ ۱۔ بھاپ یا دھواں جن کی ساخت میں صرف دو دو عنصر شامل ہیں۔ ان کا کوئی مزاج نہیں۔ کوئی محفوظ قوام نہیں۔ جسم و جسمانیت ضرور ہے لیکن سمٹی ہوئی کوئی مجتمع الجسم مقدار نہیں۔ ۲۔ بھاپ اور دھوئیں سے ذرا ادھر ہم کو ایسا مرکب نظر آتا ہے جس کو ہم مرکب کامل کہہ سکتے ہیں۔ اس مرکب کے اندر ایک ایسی قوت ہے جو اجزاء کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی مقدار محدود اور محفوظ ہے۔ پتھر اور تمام معدنی چیزیں بلکہ تمام اجسام بریہ و بحریہ، جامدہ اور نامیہ اس میں داخل ہیں۔ جامدہ اجسام میں جو قوت اجزاء کو سمیٹے رکھے ہوئے ہے اس کے درجات لاکھوں ہیں کوئی بہت ہی زیادہ کمزور ہے۔ جیسے نوشادر کہ ذرا گرمی پائی اور پگھل گیا۔ اجزاء کا تماسک ختم ہوگیا، کافور ہوا پا کر اڑ گیا بعض میں سمیٹے رکھنے والی قوت اس سے قوی ہے۔ رانگ، ہڑتال، گندھک، تانبا، چاندی، سونا، لوہا، پتھر۔ پھر پتھروں کے ترتیبی اقسام ان سب میں قوت حافظۃ الاجزاء کی کمی بیشی ہے۔ بڑا تفاوت ہے۔ سب سے اونچی قسم یاقوت یا ہیرا یا انہی جیسی کوئی سخت چیز ہے جو سینکڑوں مرتبہ تپانے کے بعد بھی نہیں پگھلتی۔ اس کے پیسنے میں سخت دشواری اٹھانی پڑتی ہے۔ شدید ترین ضرب کے بعد بھی دبتی اور پھیلتی نہیں بلکہ ٹوٹ جاتی ہے کٹ جاتی ہے۔ ۳۔ جمادی کائنات کی ایک اعلیٰ حد ہے۔ اس حد سے ذرا اوپر اٹھ کر نباتی دنیا شروع ہو جاتی ہے جو مزاج اور قوت جامعۃ الاجزاء بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور اس سے آگے نمو اور بڑھاؤ کی طاقت اور اس طاقت کے تمام مددگار بھی اس میں موجود ہوتے ہیں۔ باہر سے ہوا، پانی، مٹی سے غذا حاصل کر کے جزو بدن بنا کر رگ، سوتے، ریشے، تنے، ڈالی، ٹہنی، پھول اور پھل کی شکل دی جاتی ہے۔ غذا کے کچھ حصے سے مختلف متعدد تبدیلیوں کے بعد بیج اور تولید نسل کا مادہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح لاکھوں اقسام کے نباتات بیل بوٹے اور درخت موجود ہو جاتے ہیں۔ عالم نباتات کا بھی ایک سب سے نچلا درجہ ہے اور ایک سب سے اونچی حد۔ نچلے درجے کے سبزہ کو دیکھ کر نمایاں طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے شاید ابھی جمادی سطح کو چیر کر سر ابھارا ہے۔ بہت سے ابتدائی پودے اور بیلیں جماد سے کامل مشابہت رکھتی ہیں اور سب سے اونچی حد میں شعور اور ارادی حرکت ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ کدو کی بیل، چھوئی موئی کا پھول، حیوان خور بلکہ آدم خور درخت اپنے اندر شعوری فریب رکھتے ہیں۔ ۴۔ ذرا آگے اور اوپر اٹھ کر یہی شعوری فریب حقیقت کا لباس پہن لیتا ہے۔ نبات ایک قدم آگے بڑھ کر انتقال مکانی کرنے لگتی ہے۔ نبات کے اندر پہلے بھی تبدل کیفیت و کمیت اور حرکت وضعی تھی لیکن ایک زینہ اوپر چڑھ کر حرکت مکانی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور واضح طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ نباتی

کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے خراطین اور مختلف اقسام کے دودی حرکت کرنے والے کیڑے۔ حیوان کے ابتدائی شعور اور ارادی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ چھونے سے تاثر تو بعض نباتات میں بھی ہوتا ہے اور شاید نامناسب، ناگوار چیز کو اپنے اندر جذب نہ کرنا جہاں قوتِ غذائی کے کمالِ اثر پذیری پر کسی قدر دلالت کرتا ہے وہاں شاید ابتدائی درجہ کی ذوقی طاقت کا بھی اس سے اظہار ہوتا ہے لیکن دوسرے بیرونی حواس انتہائی نباتات سے اونچی مخلوق میں ہی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ پھر بیرونی حواس کے اختلاف کے ساتھ اندرونی شعور و احساس کی کمی بیشی کے ان گنت مراتب ہیں اور حیوانی جسمانیت، ہیئت، شکل اور حس ترقی کرتے کرتے بن مانس اور بندر تک جا پہنچتی ہے۔ حیوانیت اسفل السافلین (مثلاً خراطینی سطح) سے اٹھ کر اعلیٰ علیین (مثلاً بندر یا بجو یا کسی اور ذکی الحس حیوان) کی حد تک ترقی کرتی ہے۔ جب حیوانیت اپنے محیط تک پہنچ جاتی ہے تو اس سے آگے اس پر علمی ادراکی اور فہمی طاقت کا ابتدائی فیضان ہوتا ہے۔ سوچ و چار کرنے، معلومات کو ترتیب دینے اور نتیجہ اخذ کرنے کی فکری قوت کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ حیوانیت اٹھتی ہے، ابھرتی ہے، چڑھتی ہے اور آخری حد پر پہنچ کر ایک دم رک جاتی ہے اور اس جگہ غیبی فیضان کی ایک نئی روشنی اس پر پڑتی ہے جس سے حیوانی شعوری دماغ فکری ذہن بن جاتا ہے۔ یہ ہے ذہنِ انسانی کی ابتدا اور نقطۂ آغاز۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیوان کی ہی کوئی اونچی سطح ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ حیوانیت کی اعلیٰ چوٹی نہیں ہوتی بلکہ اس سے پہلے حیوانیت کی سب سے اونچی چوٹی تو سر ہو چکی ہے۔ یہاں سے تو وجود مادی ایک اور ہی وادی کی سیر شروع کرتا ہے جو بہت ہی گہری ہے اور جس پہاڑ کی یہ وادی ہے اس کی چوٹی علویات سے بھی اوپر غیر مادی مخلوق کی بلند ترین سطح سے بھی ماوراء ہے۔ یہ درجہ ابتدائی وحشی جنگلی انسانیت کا ہے جس پر ابھی حیوانیت کا دھوکہ ہوتا ہے حقیقت سے عاری۔

انسانیت کے مدارج اور مراتب گوناگوں اور ان گنت ہیں۔ نوع ایک ہی ہے جس کو مادی سفلی مخلوق کی انتہا قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس نوع کا جہاں نقطۂ آغاز وحشی اور جنگلی انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور جس پر ترقی یافتہ حیوان ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کے دائرہ کا محیطی کنارہ اتنا اونچا ہے کہ مادی علویات تو درکنار غیر مادی مجردات کی بلند ترین چوٹی بھی اس محیط الدائرہ کے افقِ اعلیٰ سے نیچے ہی رہ جاتی ہے۔ امکان، حدوث، جہت اور مکانیت کی یہ افقِ اعلیٰ ہوتی ہے جس کے ڈانڈے وجوب و قدم کی سرحد سے ملتے ہیں۔ اس کی بلندی کی یہ انتہا ہوتی ہے کہ ناقص نظر رکھنے والوں کو امکان و وجوب اور حدوث و قدم کا انضمام و ادغام معلوم ہونے لگتا ہے۔ گو یہ نظر کا قصور ہوتا ہے۔ خیرگی نظر فریب نگاہ بن جاتی ہے لیکن یہ فریب نگاہ بالکل ہی بے اصل اور محض اختراعی نہیں ہوتا کیونکہ جو انسان امکان اور مخلوقیت کے افقِ اعلیٰ پر پہنچ جاتا ہے تو لامکان میں رہنے والا واجب الوجود قدیم مطلق، عالم کل قادرِ محیط اپنے دائرۂ الوہیت کی نچلی سطح پر آکر افقِ اعلیٰ پر پہنچے ہوئے انسان کے بالکل ہی قریب آجاتا ہے۔ اتنا قریب کہ دونوں کا اتصال دکھائی دینے لگتا ہے۔ حاجبین کا حقیقت میں اتصال نہیں دونوں ابروؤں کے درمیان ایک لکیر حدِ فاصل ضرور ہوتی ہے۔ لیکن یہ حدِ فاصل بہت زیادہ روشن نظر رکھنے والوں کو ہی دکھائی دیتی ہے۔ بس اس قرب بے کیف اور نزولِ بے جہت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اعلیٰ اگرچہ الٰہ مطلق کی اصل شکل دیکھ نہیں پاتا لیکن اس کی قلبی فضا الٰہی نور پاشیوں سے جگمگانے لگتی ہے۔ یہ نور بیزیاں اور جلوہ ریزیاں ذاتی بھی ہوتی ہیں اور صفاتی بھی۔ ان ہی شعاعوں کے ستر ہزار پردوں کے اندر سے ایک بے صوت آواز اور بے جہت غیر ملفوظ ندا نکل کر گونجتی ہے۔ کون جانے کہ بے صوت آواز کیسی ہوتی ہے اور بے جہت بے مکان بے تلفظ کلام کیسے سنا جاتا ہے اور اس کا القا انسانِ کامل کے قلب پر کس طرح ہوتا ہے اور کن آنکھوں سے قلبِ عرفانی الوہیت کی نور پاشیاں اور جلوہ بیزیاں دیکھتا ہے اور پھر ان کی تصدیق کرتا ہے اور تخیل و توہم کی دخل اندازیوں سے انوارِ غیبی کی پردہ کشائی کو محفوظ رکھتا ہے۔ حقیقت میں یہ وحی و القاء وجدانی ہوتا ہے۔ کوئی بیان اس کو کسی اسلوبِ کلام کے احاطہ میں نہیں لا سکتا۔ معبود اپنے عبد کو جو کچھ سنانا بتانا سکھانا اور سمجھانا چاہتا ہے بے کیف و کم سنا سکھا تا اور سمجھا دیتا ہے۔

(۲) غیر مادی کائنات یا عالمِ ملائکہ نورانی ہے اور اس کی نورانیت کثافت آمیز نہیں، ہر نور غیر مجسم اور بے شکل ہوتا ہے لیکن کائنات ملکی جسم نوری رکھتی ہے اور اس کی مخصوص شکلیں بھی ہیں۔ گویا یوں کہو کہ افلاطون اور اس کے گروہ اشراقیہ نے لفظ مکان کی جو حقیقت بیان کی ہے کہ مکان نام ہے ایک امتداد کا۔ لیکن یہ امتداد مادہ سے خالی ہوتی ہے۔ یہ تعریف مکان کی صحیح ہے یا غلط اس کی تنقیح کا یہ مقام نہیں لیکن اتنی بات ضرور صحیح ہے کہ کائنات ملکوتی ایک امتداد اور مقدار رکھتی ہے اور یہ امتداد خالص نورانی ہے غیر مادی۔ مادہ اور مادی کی خصوصیت امتداد اور تشکل کو قرار دیا جاتا ہے لیکن

یہ مادی خصوصیت اس کائناتِ ملکوتی میں بھی پائی جاتی ہے باوجودیکہ وہ مادی نہیں ہے۔ گویا عالمِ ملائکہ ایک متوسط عالم ہے۔ اوپر وجود واجب قدیم ہے جو خالص نور اور غیر متشکل ہے۔ ہر کیف و کم سے آزاد، ہر عرض و جوہر سے پاک، ہر وضع و مکان سے مبرا اور نچلے رُخ پر مادی کائنات ہے جس کی نورانیت پر مادیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ قیدِ زمان و مکان اور عوارضِ کیفیت و کمیت میں گرفتار ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک عالم نورانیت ہے، غیر مادی یعنی اس کا مادہ ہر کثافت سے پاک ہے۔ نور اور نورانیت اس کا مادہ ہے۔ جب نور اس کا مادہ ہے تو اسی کے مناسب اس کی شکل بھی نورانی ہے اور اس کی مقدار و خطوط ہیئت بھی خالص نور کے ہی ہیں جن کو ان کثیف مادی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ عالم مادی کی سرحد سے اس کی حد ملی ہوئی ہے اور مادی عالمِ سفلی کا سرگروہ انسان ہے اور عام انسانوں کے سرتاج اولیاء و انبیاء۔ پھر انبیاء میں بھی فرقِ مراتب ہے۔ کوئی نچلے درجے کا نبی ہے۔ کوئی نبوت کی اعلیٰ چوٹی پر پہنچا ہوا ہے۔ نقطۂ اشتراک یہ ہے کہ تمام انبیاء کے قلوب پر نورانیت غالب ہوتی ہے اور باوجود مادی ہونے کے مادی کثافت مغلوب ہوتی ہے۔ اسی گروہِ انبیاء کا بعض وقت عالم ملائکہ سے اتصال ہو جاتا ہے۔ بیرونی حواس باوجود صحیح ہونے کے تھوڑی دیر کے لئے اپنا عمل چھوڑ دیتے ہیں۔ کان سنتے نہیں آنکھیں دیکھتی نہیں، زبان بولتی نہیں۔ ہوش درست ہوتے ہوئے بھی بے ہوشی کی یا استغراق اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی استغراقی کیفیت میں وہ مختلف شکلیں دیکھتے ہیں لیکن یہ شکلیں نورانی ہونے کے باوجود مجسم ہوتی ہیں اور بصورت مادیت نظر آتی ہیں اور اسی مقام پر پہنچ کر وہ بے کیف اور بے صوت آوازیں اور بے تلفظ کلام بھی سنتے ہیں جو عالم ملکوت پر بارگاہِ الوہیت سے القاء کیا جاتا ہے اور عالمِ ملائکہ سے ان انبیاء پر اس کا القاء ہوتا ہے جو استغراقی حالت میں مادیت سے منقطع ہو کر عالمِ ملائکہ میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسی کو وحی کہتے ہیں لیکن سید الانبیاء کو دو بار ایسا بھی اتفاق ہوا کہ سید الملائکہ کی اصلی شکل استغراقی حالت میں آپ نے دیکھ لی۔ ممکن ہے کسی اور نبی نے بھی دیکھی ہو۔ ہم نے عالم ملائکہ کی یہ تشریح اور وجوب و امکان کی کسی قدر تنقیح اس لئے افتتاحیہ مقالہ میں کی ہے کہ آیات زیرِ بحث کے تفسیری مطلب میں اختلاف ہے۔ تحلیلِ اجزاء کے ذیل میں ہم نے اس اختلاف پر روشنی ڈالی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى۔ شدید القویٰ اور ذو مرہ سے مراد ہے اللہ۔ استویٰ کا فاعل بھی اللہ ہے اور عَلَّمَهٗ کی مفعولی ضمیر رسول اللہ کی طرف راجع ہے۔ اس سے آگے وَهُوَ ضمیر بھی رسول اللہ ہی کی طرف لوٹتی ہے اور دنیٰ اور تدلّٰی کا فاعل اللہ ہے۔ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن محض وحی الٰہی ہے۔ اللہ نے ہی اپنے پیغمبر کو یہ قرآن یاد کرا دیا ہے۔ اللہ بڑی قوت اور طاقت والا ہے۔

مِرَّة قوت مضبوطی اصالت استحکام (کذا فی القاموس) استویٰ کا مرادی ترجمہ اردو میں نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کا مستوی ہونا متشابہات میں سے ہے۔ سلفِ صالحین نے الرحمٰن علی العرش استویٰ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ استواء (لغوی اعتبار سے) معلوم ہے لیکن استوائے الٰہی بے کیف ہے (قیدِ زمان و مکان وضع مقدار ہیئت، جہت کیفیت وغیرہ سے ماوراء) سہیل بن عبد اللہ تستری نے کہا استواء خالق کی کیفیت دریافت کرنا مومن کے لئے جائز نہیں۔ رضا و تسلیم ہمارا مقام ہے۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا کیفیت استواء معلوم نہیں اور استواء مجہول نہیں اور استواء کی کیفیت دریافت کرنا بدعت ہے۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى اور جس وقت نزولِ وحی ہو رہا تھا اس وقت محمد رسول اللہ اپنی استعداد و قابلیت کے آخری کنارے پر تھے یعنی دائرۂ امکان کی چوٹی پر فائز تھے جہاں سے سرحدِ وجوب شروع ہو جاتی ہے۔ اس حد سے آگے امکان کی رسائی نہیں۔ (کذا قال مولانا القاضی ثناء اللہ فی التفسیر المظہری)

ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى پھر اللہ (اپنے رسول کے) قریب ہوا اور اس نے نزولِ اجلال فرمایا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ واقعۂ معراج کے بیان میں امام شریک بن عبد اللہ بن انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جبار رب العزت قریب ہوا اور اس نے نزول فرمایا یہاں تک کہ رسول اللہ سے اللہ کی دوری دو کمانوں کے فاصلہ کے برابر رہ گئی یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا اور دوری اس سے بھی کم رہ گئی۔ شیخ محمد حیات سندی نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے۔ حدیث غریب ہے۔ ایسی ہی ایک حدیث حضرت ابن عباس پر محمول کرتے ہوئے ابو سلمہ نے بیان کی ہے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۔ قاب اور رقیبۃ بمعنی مقدار ۔ یہی معنی قاد اور قید کا ہے ۔ قوسین دو کمانیں ۔ عرب کا دستور تھا کہ جب دو آدمی باہم دوستی اور تعاون کا معاہدہ کرتے تھے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں لاکر دونوں کو جوڑکر چسپاں کر دیتے تھے ۔ اس سے مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا تھا کہ ہم دونوں کی طاقت ایک ہوگئی ۔ اور ضرورت کے وقت ہر ایک دوسرے کی مدد کرے گا ۔ آیت میں قاب قوسین سے مراد ہے انتہائی قرب ۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ دو کمانوں سے مراد ہے قوس امکان اور قوس وجوب ۔ جب عارف مرتبۂ دنیٰ میں ہوتا ہے تو اس کی نظر میں وجوب و امکان کا فرق باقی رہتا ہے اور ادنیٰ کے مرتبہ میں پہنچ کر قوس امکان اس کی نظر سے غائب ہوجاتی ۔ اس کی اپنی ہستی اور ہستی کا کوئی نشان ہی نظر نہیں آتا ۔

ضحاک نے دنیٰ اور تدلّیٰ کی ضمیریں رسول اللہؐ کی طرف راجع کی ہیں یعنی رسول اللہؐ اپنے رب کے قریب ہوگئے اور سجدہ کرنے کیلئے جھکے

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۔ پس اللہ نے اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنی تھی کر دی ۔ وحی سے مراد نہ صرف قرآن ہے بلکہ وحی غیر متلو بھی اس میں داخل ہے ۔

مقصودِ بیان

مذکورہ بالا تفسیر حضرت ابن عباس حضرت انس اور دوسرے جلیل القدر صحابہ و تابعین کی تشریح کی روشنی میں کی گئی ہے لیکن حضرت عائشہؓ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ شدید القویٰ اور ذومرّہ سے مراد حضرت جبرئیل امین ہیں اور استویٰ کی ضمیر بھی حضرت جبرئیلؑ کی طرف راجع ہے اور ھو بالافق الاعلیٰ میں ھُوَ کی ضمیر کا مرجع بھی جبرئیل ہی ہیں اور افق الاعلیٰ سے مراد ہے زمین کا افق یعنی شرقی افق ۔ عام طور پر حضرت جبرئیلؑ بشکل انسانی آیا کرتے تھے لیکن حضورؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیلؑ کو اصلی شکل میں بھی دیکھا تھا ۔ ایک مرتبہ آسمان پر اور دوسری مرتبہ زمین پر ۔ رسول اللہ غارِ حرا میں تھے کہ حضرت جبرئیل شرقی جانب اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوئے اور مشرق سے مغرب تک چھا گئے حضورؐ دیکھتے ہی بیہوش ہوگئے ۔ فوراً جبرئیل انسانی شکل میں ہوکر قریب ہوگئے اور رسول اللہ کو چمٹا لیا ۔ دوسری مرتبہ رسول اللہؐ نے حضرت جبرئیل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس شب معراج میں دیکھا تھا ۔ رسول اللہ کے علاوہ اور کسی نبی نے حضرت جبرئیلؑ کو ان کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا ۔ اس قول پر ذومرّہ کا ترجمہ ہوگا خوبصورت (حضرت ابن عباس) یا خوبصورت عظیم الجثہ (قتادہ) مطلب اس طرح ہوگا کہ جبرئیل پہلے تو سارے مشرق پر (مغرب تک) چھا گئے، برابر ہوگئے، پھر جب رسول اللہ بے ہوش ہوگئے تو وہ آپ کے قریب آئے اور نیچے اُترے اور قوسین کے فاصلہ کے بقدر آپ کے پاس پہنچ گئے ۔ قوسین سے مراد یہی متعارف کمانیں ۔ یہ قول بروایت عطاء حضرت ابن عباسؓ کا منقول ہے ۔ مجاہد اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے ۔ یعنی رسول اللہ اور جبرئیلؑ کے درمیان دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ۔ یعنی اتنا فاصلہ جتنا تانت سے کمان تک ہوتا ہے (اس سے دوگنا) حضرت ابن مسعود نے فرمایا اور یہی قول سعید بن جبیر اور شقیق بن سلمہ کا بھی ہے کہ قوس سے مراد ہے ذراع (شرعی گز) قوس سے ہر چیز ناپی جاتی تھی ۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے ۔ بغوی کی صراحت کے بموجب حضرت (ابن عباس اور حسن و قتادہ بھی اسی کے قائل تھے ۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝

قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی تو کیا ان پیغمبر سے انکی دیکھی ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو اور انہوں نے (پیغمبر نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی (صورت اصلیہ میں) دیکھا ہے

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝

سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کے قریب جنت الماویٰ ہے جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

لپٹ رہی تھیں نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی انہوں نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى ۔ یعنی اللہ کے رسولؐ نے جو کچھ دیکھا ان کے دل نے اس میں غلطی نہیں کی۔

تفسیر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا رسول اللہؐ نے حضرت جبرئیل کو دیکھا کہ ان کے چھ سو پر (بازو) تھے۔ یہ قول حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے حضرت عائشہؓ تسلیم نہیں کرتی تھیں کہ رسول اللہؐ نے اپنے رب کو دیکھا۔ حسب روایت بخاری مسروق کا بیان ہے میں نے کہا اماں کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا حضرت عائشہؓ نے فرمایا تمہاری اس بات کو سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تین باتیں ایسی ہیں کہ جو شخص بھی تم سے بیان کرے تو وہ جھوٹا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے جس شخص نے یہ کہا کہ محمدؐ نے اپنے رب کو دیکھا اس نے جھوٹ کہا۔ اللہ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرتا ہے۔ (نگاہوں کو دیکھ لیتا ہے) اور وہ لطیف خبیر ہے۔ (دوسری آیت ہے) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ۔ اور کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر بطور وحی کے یا پردہ کی آڑ سے۔ اور جو شخص تم سے کہے کہ محمدؐ کل کو آنے والی بات جانتے ہیں تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کل کو کیا کرے گا۔ اور جو شخص تم سے بیان کرے کہ آپ نے وحی کا کوئی حصہ چھپا رکھا تھا تو وہ بھی غلط کہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے — يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الخ۔ اے رسول جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو (دوسروں کو) پہنچا دو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جبرئیل کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔

حضرت ابن عباس نے آیت ما کذب الفؤاد ما رأی ولقد رآہ نزلۃ اخری کی تشریح میں فرمایا کہ محمد صلعم نے اپنے رب کو دو مرتبہ چشم دل سے دیکھا۔ (رواہ مسلم)

ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا محمد صلعم نے اپنے رب کو دیکھا۔ عکرمہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا کیا اللہ نے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار نہیں فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ارے یہ (عدم رویت بصر) تو اس وقت ہے جب اللہ اپنے اصلی نور سے جلوہ انداز ہو۔ محمدؐ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا (یعنی اس کا جلوہ دیکھا احاطۂ نور خالص نہیں کیا۔ واللہ اعلم) ابن جریر نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا گیا۔ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا۔ فرمایا میں نے (چشم) دل سے دیکھا۔

حضرت انس، حسن بصری اور عکرمہ کا خیال ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے رب کو دیکھا یعنی آنکھوں سے دیکھا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنی خلت کے لئے منتخب فرمایا اور حضرت موسیٰ کو اپنے کلام کے لئے اور رسول اللہ صلعم کو اپنے دیدار کے لئے۔ ترمذی نے بروایت شعبی بیان کیا کہ کعب احبار نے حضرت ابن عباس سے کہا اللہ نے اپنے دیدار اور کلام کو محمدؐ و موسیٰ کے درمیان تقسیم کر دیا۔ موسیٰ سے دو بار کلام کیا اور محمدؐ کو دوبارہ دیدار کرایا۔

محاکمہ عام اہل السنت رویت چشم کے قائل ہیں۔ رویت قلبی تو بعض اولیاء کو بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ رویت چشم کا جو دعویٰ کرے وہ خلاف اجماع ہے محض اشتباہ ہے۔ بعض عارف بیداری کی حالت میں قلب کی آنکھ سے اپنے رب کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ چہرے کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اس لئے وہ دیدار بصری سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ دیدار کے وقت ظاہری حواس معطل ہو چکتے ہیں آنکھ کھلی رہنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھتی۔ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کے اقوال نفی کی شہادت دے رہے ہیں لیکن ثبوت کی شہادت نفی کی شہادت پر ترجیح رکھتی ہے۔ ام المومنین کا استشہاد بھی اجتہادی ہے۔ عدم ادراک بصر کا معنی ہے عدم احاطۂ بصر اور یہ صحیح ہی ہے۔ کوئی آنکھ رب کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ مسلم نے حضرت ابوذر کی روایت سے جو حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ نور انی اراہ وہ نور ہے اس کو میں کیسے دیکھتا۔ اس حدیث سے بھی عمومی نفی رویت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ نفی رویت سے مراد ہو نفی احاطۂ رویت۔

امورِ قدسیہ کا ادراک اول دل کرتا ہے۔ پھر وہ صورت آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ اب اگر قلبی ادراک کے موافق آنکھوں کے یا دل کے سامنے صورت نمودار ہوتی ہے تو دل اس کی تصدیق کرتا ہے اور ادراک میں غلطی نہیں کرتا۔ لیکن اگر آنکھوں کا مشاہدہ یا ذہن کا معائنہ ادراک قلبی کے خلاف ہوتا ہے تو دل اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ علومِ رحمانی اور خیالاتِ شیطانی میں یہی فرق ہے۔ فہم قلبی اور وہم حسی میں یہی امتیاز ہے۔ الہاماتِ رحمانی کبھی الہاماتِ شیطانی کے ساتھ مخلوط ہو جاتے ہیں۔ توہمات تخیلات کبھی یقینیات کا جامہ پہن لیتے ہیں اور عارف کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔ وہ وہم کو فہم اور تخیل شیطانی کو الہامِ رحمانی سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ اپنے دماغ کو دل کا تابع بنائے اور دل سے فتویٰ طلب کرے۔ اگر دل مطمئن ہو تو سمجھ لے کہ میرا دماغی اور حسی علم غلط نہیں اور اگر ثباتِ قلب نہ ہو تو سمجھ لے یہ امنیۃ الشیطان اور ذہنی تراشہ ہے حقیقت اور صداقت سے خالی۔ رسول اللہ نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا یا چشمِ بصیرت سے معائنہ کیا تھا وہ دل کے لئے اطمینان بخش تھا مفتیِ قلب کا فتویٰ اس کے موافق تھا اس لئے یہ مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا۔

أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ۔ کیا ان کی آنکھوں دیکھی چیز یا قلبی مشاہدۂ حق کا تم لوگ انکار کرتے اور ان سے جھگڑا کر رہے ہو یعنی ان کا تو چشمِ بصر سے دیکھا ہوا یا چشمِ قلب سے مشاہدہ کیا ہوا حال ہے اور تمہارے انکار کی بنیاد محض جھگڑا کرنا اور جاہلانہ مقابلہ کرنا ہے۔

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ۔ اور محمدؐ نے تو اپنے رب کو ایک بار اور بھی دیکھا تھا۔ جب ربِ متعال اتر کر سرحدِ خلق کے قریب آ گیا تھا یا محمدؐ نے جبرئیل کو ایک بار اور اس کی اصلی شکل میں دیکھا تھا جب کہ وہ اتر کر محمدؐ کے قریب آ گیا تھا۔

عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ۔ سدرۃ المنتہی کے پاس یہ واقعہ شبِ معراج کا تھا۔ سدرۃ المنتہیٰ وہ مقام جو امکان و وجوب اور عبدیت و الوہیت کی آخری سرحد ہے۔ اعمالِ خلق بالواسطہ اسی مقام تک پہنچتے ہیں۔ اس سے اوپر نہیں جاتے اور احکامِ الٰہی بلا واسطہ اسی جگہ تک اترتے ہیں اس سے نیچے براہِ راست بلا واسطہ نہیں پہنچتے۔ علم خلائق کی یہ آخری چوٹی ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان کی نظر متحیر ہو جاتی ہے اور چشمِ قلب میں چکاچوند پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کے جمال و جلال کا پرتو اس مقام پر ایسا پڑتا ہے کہ سوائے خیرگی اور تحیر کے چشمِ علم کو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سچ ہے آخر العلم الحیرۃ علم کا آخری درجہ حیرت ہے۔ رسول اللہؐ کو بھی سیرِ کائنات کرائی اور اس مقام پر پہنچایا گیا۔ سیرِ آثار و افعال اور معائنہ صفات کے بعد جب یہ مقام آیا تو عروجِ عبدیت کی چوٹی آ گئی اور حدودِ عبدیت سے آگے بڑھ کر دائرۂ الوہیت میں داخل ہونا ممکن نہ ہوا۔ حضرت ابن عباس اور کعب احبار کے قول میں جو آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا۔ اس سے مراد غالباً سدرۃ المنتہیٰ تک رسائی ہی ہے۔ سدرہ لغت میں بیر کے درخت کو کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بطور استعارہ اس مقام کو بیری کا درخت قرار دیا گیا ہو لیکن سِدَرٌ کا معنی تحیر ہے اور رسول اللہؐ نے اسی مقام پر جلوہائے الوہیت کو سنہری پتنگوں کی شکل میں بکھرا ہوا دیکھا تھا جو ہر طرف اڑ رہے تھے۔ جھلکنے اور جگمگانے کی وجہ سے ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی، نگاہ میں خیرگی پیدا ہو گئی تھی۔

معراج کا واقعہ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں بوساطت حضرت انس بن مالک بروایت حضرت مالک بن صعصعہ بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے آ کر اس جگہ سے اس جگہ تک یعنی حلق کے گڑھے سے ناف تک (میرا سینہ) چاک کیا۔ پھر ایمان سے بھرا ہوا ایک سنہری طشت لایا گیا اور دل نکال کر اس میں دھویا گیا۔ اس کے بعد دوبارہ دل کو اس کی جگہ رکھ کر بند کر دیا گیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ پیٹ کو آبِ زمزم سے دھویا گیا۔ پھر ایمان و دانش کو اس کے اندر بھر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک چوپایہ لایا گیا جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ اس کو براق کہا جاتا تھا اور اس کا ایک قدم بقدر مدِ نظر (رسائی چشم) پڑتا تھا۔ مجھے اس پر سوار کیا گیا۔ جبرئیل مجھے لے کر آسمانِ دنیا تک پہنچے اور دروازہ کھلوانا چاہا۔ آواز آئی کون ہے۔ جبرئیل نے کہا۔ جبرئیل۔ دریافت کیا گیا۔ آپ کے ساتھ اور کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد۔ دریافت کیا گیا کیا ان کے پاس آپ کو بھیجا گیا تھا۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ آواز آئی خوش آمدید۔ مرحبا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ میں اندر پہنچ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں وہاں آدم موجود ہیں۔ جبرئیل نے کہا۔ یہ تمہارے باپ آدم ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے سلام کیا۔ آدم نے جواب دے کر کہا۔ اچھے بیٹے خوش آمدید۔ اس کے بعد جبرئیل مجھے دوسرے آسمان تک چڑھا لے گئے اور دروازہ کھلوانا چاہا۔ حضورؐ نے اس کے بعد بھی

بیان کیا جو پہلے آسمان کا دروازہ کھلوانے کے سلسلے میں بیان کیا تھا اور ہر آسمان کے متعلق بھی (آسمان کا یہ دروازہ) کھلوانے کے سلسلے میں وہی بات بیان کی جو پہلے بیان کی تھی۔ یہاں پہنچ کر یحییٰ اور عیسیٰ سے ملاقات ہوئی جو باہم خالہ زاد تھے۔ جبرئیل نے کہا۔ یہ یحییٰ ہیں اور یہ عیسیٰ۔ ان کو سلام کرو۔ میں نے دونوں کو سلام کیا۔ دونوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ اچھے بھائی اور اچھے نبی مرحبا۔ حضورؐ نے تیسرے آسمان پر یوسفؑ سے چوتھے آسمان پر ادریس سے پانچویں آسمان پر ہارون سے، چھٹے آسمان پر موسیٰ سے ملاقات کا ذکر کیا اور ہر ایک نے کہا۔ اچھے بھائی اور اچھے نبی مرحبا۔ حضورؐ نے فرمایا جب میں آگے بڑھا تو وہ (یعنی حضرت موسیٰ) رو دیئے۔ دریافت کیا گیا۔ آپ کس وجہ سے رو دیئے۔ حضرت موسیٰ نے کہا میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک لڑکا میرے بعد پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور اس کی امت میری امت سے زیادہ جنت میں جائے گی۔ پھر مجھے ساتویں آسمان کی طرف چڑھا لے جایا گیا۔ حضورؐ نے ساتویں آسمان کا دروازہ کھلوانے اور اوپر جانے کا اسی طرح ذکر کیا جس طرح پہلے آسمان کا ذکر کیا تھا اور فرمایا وہاں ابراہیمؑ موجود تھے۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ ہیں ان کو سلام کرو۔ میں نے سلام کیا۔ ابراہیمؑ نے جواب دے کر کہا۔ اچھے بیٹے مرحبا۔ پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ سدرۃ المنتہیٰ (بیری کے آخری درخت) کے بیر ہجر کے مٹکوں کے برابر اور پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے چار دریا نکل رہے تھے۔ دو پوشیدہ دو ظاہر۔ میں نے پوچھا یہ کیسے دریا ہیں۔ جبرئیل نے کہا پوشیدہ دریا تو جنت میں رواں ہیں اور ظاہری دریا نیل و فرات ہیں۔ اس کے بعد مجھے بیت المعمور تک لے جایا گیا اور وہاں ایک برتن میں شراب، ایک میں دودھ اور ایک میں شہد میرے سامنے لایا گیا میں نے دودھ لے لیا۔ جبرئیل نے کہا یہی (دین) فطرت ہے جس پر تم اور تمہاری امت قائم ہو۔ اس کے بعد ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر میں واپس آیا اور موسیٰ کی طرف سے میرا گزر ہوا تو انہوں نے پوچھا تم کو کیا حکم دیا گیا۔ میں نے کہا روزانہ پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا۔ موسیٰ نے کہا تمہاری امت روزانہ پچاس نمازیں نہیں ادا کر سکتی۔ بخدا تم سے پہلے میں لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنی اسرائیل سے میرا واسطہ رہا ہے تم واپس جاؤ اور اپنی امت کے لئے اپنے رب سے تخفیف کی درخواست کرو۔ میں لوٹ کر گیا۔ اللہ نے دس نمازوں کی تخفیف کر دی۔ میں لوٹ کر موسیٰ کے پاس آیا انہوں نے وہی پہلی بات پھر کہی۔ میں واپس گیا (اور تخفیف کی درخواست کی) اللہ نے دس نمازوں کی اور معافی دے دی میں لوٹ کر موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پھر وہی پہلی بات کہی۔ آخر مجھے روزانہ دس نمازوں کا حکم دے دیا گیا۔ میں واپس موسیٰ کے پاس آیا تو انہوں نے وہی پہلے کی طرح بات کہی میں پھر واپس گیا (اور مزید تخفیف کی درخواست کی) بالآخر روزانہ پانچ نمازوں کا مجھے حکم دے دیا گیا میں موسیٰ کی طرف لوٹا۔ انہوں نے پوچھا اب کیا حکم ملا۔ میں نے کہا روزانہ پانچ نمازوں کا۔ انہوں نے کہا تمہاری امت روزانہ پانچ نمازیں بھی ادا نہ کر سکے گی میں لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔ بنی اسرائیل کو پورے طور پر آزما چکا ہوں۔ تم پھر لوٹ کر جاؤ اور اپنی امت کے لئے اپنے رب سے تخفیف کی درخواست کرو۔ میں نے کہا میں اپنے رب سے (اتنا) مانگ چکا کہ اب (مزید سوال کرتے) مجھے شرم آتی ہے۔ اب میں اسی پر خوش ہوں اور اسی کو مانتا ہوں۔ اس کے بعد میں موسیٰ کو چھوڑ کر آگے آگیا آگے آیا ہی ہوں کہ کسی منادی نے ندا دی میں نے اپنا فرض جاری کر دیا اور اپنے بندوں کے لئے تخفیف کر دی۔

مسلم نے بوساطت ثابت بنانی حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ مجھے براق پیش کیا گیا۔ براق ایک سفید رنگ کا طویل القامت چوپایہ تھا جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ اپنا سم وہاں رکھتا تھا جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی میں اس پر سوار ہو گیا اور بیت المقدس پہنچا (اور نیچے) اتر کر براق کو اس حلقہ (زنجیر) سے باندھ دیا جس سے انبیاء اپنی سواریوں کو باندھا کرتے تھے۔ ابن جریر نے حضرت بریدہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہم بیت المقدس پہنچے تو جبرئیل نے اپنی انگلی کے اشارے سے پتھر میں شگاف کر دیا اور براق کو اس سے باندھ دیا۔ پھر میں مسجد کے اندر گیا اور وہاں دو رکعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد باہر نکلا تو جبرئیل دو برتن سامنے لائے۔ ایک میں شراب بھری ہوئی تھی دوسرے میں دودھ۔ میں نے دودھ پسند کر لیا۔ جبرئیلؑ نے کہا تم نے فطرت کو اختیار کیا۔ پھر ہم کو آسمان کی طرف چڑھا کر لے جایا گیا۔ اس سے آگے (آسمانوں کا) وہی ذکر ہے جس کی تفصیل پہلی روایت میں آ چکی ہے۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم سے ملاقات ہوئی۔ آدم نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ تیسرے آسمان کے ذکر میں حضورؐ نے فرمایا وہاں یوسف سے میری ملاقات ہوئی۔

یوسف کو (پورے انسانی) حسن کا آدھا حصہ عطا فرمایا گیا تھا۔انہوں نے بھی مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔اس روایت میں حضرت موسیٰ کے رو پڑنے کا ذکر نہیں ہے۔ساتویں آسمان کے سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔وہاں میری ملاقات حضرت ابراہیم سے ہوئی۔آپ بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہو کر نماز پڑھتے ہیں اور جب نماز پڑھ کر نکل جاتے ہیں تو دوبارہ اس کے اندر (کبھی) نہیں آتے۔(فرشتوں کی نئی جماعت ستر ہزار کی تعداد میں روزانہ بیت المعمور کے اندر نماز پڑھنے آتی ہے) پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا۔میں نے دیکھا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پتے ہاتھیوں کے کانوں کی طرح ہیں اور بیل مٹکوں کے برابر۔جب اس پر جو کچھ چھانا تھا چھا گیا (یعنی امر الٰہی چھا گیا (شاید اس سے مراد پرتو، جلوہ یا نور یا عکسِ جمال ہے) تو اس کی حالت میں (عجیب) تغیر آ گیا۔مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے حسن کو بیان نہیں کر سکتا اور جو کچھ وحی کرنی تھی اللہ نے (مجھے) کر دی۔ہر شبانہ روز میں پچاس نمازیں مجھ پر فرض کر دیں۔اس کے بعد میں اتر کر موسیٰ کی طرف آیا۔انہوں نے پوچھا۔تمہارے رب نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا۔میں نے کہا ہر رات دن میں پچاس نمازیں۔موسیٰ نے کہا اپنے رب کے پاس لوٹ کر جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو۔تمہاری امت اس کی طاقت نہیں رکھے گی۔میں بنی اسرائیل کا تجربہ اور جانچ کر چکا ہوں۔میں اپنے رب کے پاس واپس گیا اور عرض کیا اے میرے رب میری امت کے لئے تخفیف فرما دے۔اللہ نے پانچ نمازیں کم کر دیں میں موسیٰ کے پاس واپس آیا اور اُن سے کہا۔اللہ نے پانچ نمازیں ساقط کر دیں۔موسیٰ نے کہا تمہاری امت اس کو بھی برداشت نہ کر سکے گی۔اپنے رب کے پاس واپس جا کر پھر تخفیف کی درخواست کرو۔حضورؐ نے فرمایا۔میں برابر اپنے رب اور موسیٰ کے درمیان آتا جاتا رہا۔(اور تخفیف کی درخواست کرتا رہا اور اللہ تخفیف فرماتا رہا۔آخر اللہ نے پانچ نمازیں) کر دیں۔اور فرمایا محمد ہر رات اور دن میں یہ پانچ نمازیں (طے کر دی گئیں) ہیں۔ہر نماز کا ثواب دس گنا ہے۔اس طرح یہ پچاس ہو گئیں۔جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے گا اور کر نہ سکے گا میں اس کے لئے ایک نیکی کا ثواب لکھ دوں گا اور اگر نیکی کر بھی لے گا تو میں اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دوں گا اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے گا اور عمل نہ کرے گا تو اس کا کوئی گناہ نہیں لکھا جائے گا۔اور اگر اس نے وہ گناہ کر لیا تو اس کا ایک ہی گناہ لکھا جائے گا۔حضورؐ نے فرمایا اس کے بعد میں اتر کر موسیٰ کے پاس آیا اور سرگزشت بیان کی موسیٰ نے کہا۔پھر واپس جا کر مزید تخفیف کی درخواست کرو۔میں نے کہا میں اپنے رب کے پاس (بار بار اتنی مرتبہ) لوٹ کر گیا کہ اب مجھے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

صحیحین میں بوساطت حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوذرؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔میں اس وقت مکہ میں تھا اور میرے گھر کی چھت میں شگاف کر دیا گیا تھا۔اس روایت میں شق صدر کا حسب سابق ذکر ہے لیکن براق کا تذکرہ نہیں ہے۔حضورؐ نے فرمایا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف چڑھا لے گئے آسمانِ دنیا تک پہنچ کر جبرئیل نے بابِ سماوی کے دربان سے کہا۔دروازہ کھول دو۔جب دروازہ کھول دیا گیا تو ہم آسمانِ دنیا کے اوپر پہنچ گئے۔وہاں ایک آدمی کو بیٹھا پایا جس کے دائیں جانب بھی کچھ پرچھائیاں تھیں اور بائیں جانب بھی کچھ پرچھائیاں جب وہ دائیں جانب دیکھتا تھا تو ہنس دیتا تھا اور بائیں جانب دیکھتا تھا تو رونے لگتا تھا۔اس شخص نے کہا اچھے نبی اور اچھے بیٹے مرحبا۔میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا۔یہ کون ہے۔جبرئیلؑ نے کہا یہ آدم ہیں۔اور ان کے دائیں بائیں یہ پرچھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔دائیں جانب والے جنتی ہیں اور بائیں جانب والی پرچھائیاں دوزخی ہیں۔اسی لئے دائیں طرف کو دیکھ کر یہ ہنس دیتے ہیں اور بائیں طرف کو دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔

اس روایت کے اعتبار سے رسول اللہ نے آسمانوں میں آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم سے ملاقات کا تذکرہ کیا۔آدم کی موجودگی پہلے آسمان میں اور ابراہیم کی موجودگی چھٹے آسمان میں بیان فرمائی۔ان کے علاوہ دوسرے انبیاء کے مقامات کی تعین نہیں فرمائی۔

ابن شہاب زہری نے بروایت ابن حزم حضرت ابن عباس اور حضرت ابو حبہ انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا پھر مجھے چڑھایا گیا۔یہاں تک کہ میں اس سطح پر پہنچ گیا جہاں قلموں کے چلنے کی آواز مجھے سنائی دینے لگی۔پھر اللہ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کیں۔واپسی میں میرا گزر موسیٰ کی طرف سے ہوا۔انہوں نے پوچھا اللہ نے تم پر کیا فرض کیا۔میں نے کہا پچاس نمازیں۔موسیٰ نے کہا واپس جاؤ تمہاری امت ایسا نہ کر سکے گی۔میں لوٹ کر گیا (اور تخفیف کی درخواست کی۔اللہ نے ایک حصہ ساقط کر دیا۔میں لوٹ کر موسیٰ کے پاس آیا اور ان سے کہا۔اللہ نے

نمازوں کا کچھ حصہ ساقط فرما دیا۔ موسیٰ نے کہا لوٹ کر پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ تمہاری امت اس کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ میں لوٹ کر بارگاہِ الٰہی میں پہنچا اور تخفیف کی درخواست کی۔ آخر اللہ نے فرمایا یہ پانچ ہیں اور (حقیقت میں) یہ پچاس ہیں۔ میری بارگاہ میں بات نہیں بدلی جاتی۔ میں لوٹ کر موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پھر یہی کہا کہ لوٹ کر جاؤ (اور تخفیف کی درخواست کرو) میں نے کہا اب تو مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا پھر جبرئیل مجھے لے کر سدرہ تک پہنچے۔ اس پر مختلف رنگ چھائے ہوئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم (ان کی کیا حقیقت تھی) وہ کیا تھے۔ پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا۔ وہاں کی مٹی مشک کی تھی۔

قتادہ نے حضرت انس کا بیان نقل کیا ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ کے سامنے براق لایا گیا جو (کسا کسایا) زین پوش اور لگام دیا ہوا تھا سامنے آکر وہ شوخی کرنے لگا۔ جبرئیلؑ نے کہا کیا محمدؐ سے تو ایسی حرکت کر رہا ہے۔ تیرے اوپر کوئی بھی اس سے زیادہ عزت والا سوار نہیں ہوا۔ براق یہ بات سُن کر پسینے پسینے ہو گیا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہؐ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان میں ہے۔ زمین سے جو کچھ اوپر چڑھتا ہے وہ یہیں تک پہنچتا ہے۔ یہیں سے لے لیا جاتا ہے اور جو کچھ اوپر سے اُترتا ہے یہاں تک اُترتا ہے اور یہیں سے لے لیا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ہلال بن یسار نے کہا۔ میں موجود تھا۔ میرے سامنے حضرت ابن عباس نے کعب احبار سے سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق دریافت کیا۔ کعب نے کہا۔ وہ ایک بیر کا درخت ہے جو عرش کی جڑ میں ہے۔ یہیں تک علمِ خلائق پہنچتا ہے۔ اس کی مخلوق کیسی ہے۔ یہ غیب ہے جس سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ علامہ قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ یہیں تک علمِ خلائق پہنچتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ مخلوق مثلاً فرشتے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس سے پرے کیا ہے یہ بالکل پوشیدہ ہے جس سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ اگرچہ انسانوں کی علمی نظر سے مخفی ہے لیکن فرشتوں کے لئے وہ غیب نہیں ہے۔

بغوی نے حضرت اسماء کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سدرۃ المنتہیٰ (اتنا بڑا درخت ہے کہ اس کی) ایک شاخ کے سائے میں سو برس تک گھوڑا سوار چل سکتا ہے اور ایک ٹہنی کے سائے میں ایک لاکھ سوار آ سکتے ہیں۔ اس پر سونے کے پتنگے (ہر طرف اُڑتے) ہیں۔ اس کے پھل مٹکوں کے برابر ہیں۔ مقاتل نے کہا۔ یہی درخت طوبیٰ ہے جس کا ذکر سورۂ رعد میں آیا ہے۔

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى۔ اور سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ حضرت ابن عباس نے جنتِ ماویٰ کی تشریح میں فرمایا۔ یہ ایسی جنت ہے جہاں جبرئیل اور دوسرے ملائکہ قیام پذیر ہوتے ہیں۔ مقاتل اور کلبی نے کہا۔ شہداء کی روحیں یہاں رہتی ہیں۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى۔ جب چھا رہا تھا سدرہ پر، جو کچھ چھا رہا تھا سدرہ پر کیا چیز چھائی ہوئی تھی۔ اس کا حُسن کیسا تھا۔ اس کی حقیقی کیفیت کیا تھی کوئی نہیں جانتا۔ حضرت انس کی روایت میں آ چکا ہے کہ سدرہ پر جب جو کچھ چھانا تھا چھا گیا تو سدرہ میں (عجیب) تبدیلی آ گئی کوئی مخلوق اس کے حسن کو بیان نہیں کر سکتی۔ مسلم نے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ سدرہ پر سونے کے پتنگے چھائے ہوئے تھے۔ حسن نے کہا رب العزت کا نور چھا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جگمگانے لگا تھا۔ مقاتل نے کہا۔ اس پر ملائکہ کووں کی طرح (ہر طرف سے) چھائے ہوئے تھے۔ سدی نے کہا پرندے اس پر چھائے ہوئے تھے۔ ابو العالیہ نے حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ نور خلائق اس پر چھایا ہوا تھا اور محبتِ الٰہی میں ملائکہ کووں کی طرح اس پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ حقیقت میں جلوۂ خداوندی اس پر پرتو انداز تھا۔ خواہ پتنگوں کی شکل میں ہو یا ملائکہ کووں کی طرح اس پر اُڑ رہے ہوں یا پرندے اس کے گرداگرد اور اوپر اُڑ رہے ہوں۔ یہ سب ربانی تجلیات تھیں۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ نگاہ نہ تو ہٹی نہ بڑھی۔ یعنی رسول اللہ کی نظر نہ اِدھر اُدھر مڑی نہ چوکی، نہ محبوب سے ہٹی بلکہ جلوہائے محبوب کے نظاروں میں ڈوب گئی، محو ہو گئی۔ بعض اہلِ تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جن عجائبات کو دیکھنے اور سیر کرنے کا حکم تھا انہی کو دیکھا اُن سے نظر اِدھر اُدھر نہیں ہٹی۔

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں یا کچھ بڑی نشانیاں دیکھیں۔ آیات سے مراد ہیں،

براق، رفرف، آسمانوں کی حالت، انبیاء، ملائکہ، سدرۃ المنتہیٰ، جنت، دوزخ، غیبی مشاہدات، جلوہائے قدرت و حکمت، تجلیاتِ ذات اور انوارِ صفات۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا۔ جبرئیل کے چھ سو طیرانی بازو تھے۔ یوں تو ہر ممکن اور ممکن کی ہر حالت اللہ کی قدرت حکمت اور وحدت کی مظہر اور عظیم الشان مظہر ہے۔ لیکن جن آیات کو آیت مذکورہ میں کبریٰ فرمایا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ فرودگاہِ رحمت و برکت اور جلوہ گاہِ نور و معرفت تھیں۔ ایسی نشانیاں اور سیرگاہیں تھیں جو کسی انسان نے کبھی نہیں دیکھیں۔ یہ سارے مظاہر جمالِ صفات و ذات کے آئینہ تھے۔ ان آیات کے اندر آفتابِ قدس کا نور جلوہ ریز تھا۔ نگاہِ نبوت جمالِ الوہیت کا ان آیاتِ کبریٰ میں مشاہدہ کرنے میں غرق تھی۔ نہ کسی اور طرف ہٹتی تھی نہ مڑتی تھی نہ چوکتی تھی۔

ایک اہم تنقیح

اہل السنت والجماعت کا اجماعی قول ہے کہ معراج بیداری کی حالت میں ہوئی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ مسجدِ حرام (کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک رات کو جانا قطعی ناقابلِ انکار ہے۔ آیت سبحان الذی اسریٰ بعبدہ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الّذی الخ میں اس کی ناقابلِ انکار صراحت ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ باقی سیرِ سماوی قرآن سے ثابت نہیں۔ صحیح احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لئے اس کا منکر کافر نہیں فاسق ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنا سورۃ النجم کی آیت سے قطعی ثابت ہے اس لئے تفصیلی احادیث کا منکر گو کافر نہ ہو لیکن سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کا منکر یقیناً کافر ہوگا۔

ایک شبہ کیا جاسکتا ہے کہ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں حضرت شریک بن عبداللہ کے حوالہ سے حضرت انس بن مالک کی روایت سے معراج کی ایک طویل حدیث بیان کی ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے۔ جس رات کو رسول اللہؐ کو مسجد کعبہ میں لے جایا گیا (اس کی صورت یہ ہوئی کہ) آپ مسجدِ حرام میں سو رہے تھے (اس وقت تک وحی آنی شروع نہیں ہوئی تھی) وحی آنے سے پہلے (خواب میں) تین شخص آئے۔ اس سے آگے ایک طویل حدیث بیان کی گئی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ پھر آپ بیدار ہو گئے۔ اس وقت آپ مسجد حرام میں تھے۔ مسلم نے جو حدیث منفرداً مختصر طور پر بیان کی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علمائے حدیث نے بخاری و مسلم کی اس روایت پر طعن کیا ہے۔ اور قبل ان یوحی الیہ کے لفظ کو شریک بن عبداللہ کا قول قرار دیا ہے۔ اسی طرح حدیث کے آخری لفظ کو بھی شریک بن عبداللہ ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باتفاق علمائے معراج کا واقعہ آغازِ نبوت سے بارہ سال کے بعد ہجرت سے ایک برس پہلے کا ہے۔ بعثت اور نزولِ وحی سے پہلے کا نہیں۔

صحیح فیصلہ یہ ہے کہ معراج دو مرتبہ ہوئی تھی۔ ایک بار نبوت سے پہلے خواب میں جبکہ آپ مسجدِ حرام میں سو رہے تھے۔ پھر بعثت سے بارہ سال بعد بیداری کی حالت میں۔ جس طرح ۶ھ میں حدیبیہ کے سال آپ کو خواب میں مکہ کی فتح دکھائی گئی تھی اور آپ اسی خیال سے مکہ کی جانب بہ نیتِ عمرہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ بھی ہو گئے تھے لیکن یہ فتح خوابی تھی جس کا ظہور عالمِ خارجی میں دو سال بعد ۸ھ میں ہوا اور اللہ نے فرمایا۔ لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق الخ اللہ نے اپنے نبی کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یعنی دو سال بعد فتح مکہ عنایت فرما دی۔

مقصودِ بیان

سدرۃ المنتہیٰ تک رسول اللہؐ کا پہنچنا یقینی ہے۔ آیت میں اس کی صراحت ہے۔ باقی آسمانوں کی جنت دوزخ کی اور ملائکہ کی سیر اور انبیاء سے ملاقات قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ تفصیلِ سیر احادیث میں موجود ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھنا محض خیال اور توہم کا کرشمہ نہ تھا بلکہ واقعی رویت تھی اور یہ نگاہِ چشم تھی۔ بصر کے لفظ سے یہی مترشح ہو رہا ہے۔ مازاغ کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ دیکھنے میں غلطی اور کجی بھی نہ تھی کہ حقیقت کچھ اور ہو اور دیکھنے میں کچھ اور آئی ہو۔ ماطغیٰ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دیکھنا محدود تھا احاطہ کامل نہ تھا۔ مقررہ حد سے آگے نگاہ نہیں بڑھی تھی۔ وغیرہ۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّـٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ

بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے کیا تمہارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا

الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ

کے لئے بیٹیاں اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی یہ (معبودات مذکورہ) نرے نام ہی نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ٹھہرا لیا

وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى

ہے خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل بھیجی نہیں (بلکہ) یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں

الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ۭ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝ۡۖ فَلِلّٰهِ

حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (بواسطہ رسول) ہدایت آ چکی ہے کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے سو خدا ہی کے اختیار

الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝ۧ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا

میں ہے آخرت اور دنیا اور بہت سے فرشتے آسمان میں موجود ہیں ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر بعد اس کے

اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دیدیں اور (اس کے لئے شفاعت کرنے سے) راضی ہوں جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں

بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ

کو (خدا کی) بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۝ۚ

خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے

تفسیر انسان نہ فقط محسوس پرست واقع ہوا بلکہ موہوم پرستی کا بھی شکار ہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ موہوم پرستی ہی محسوس پرستی کی بنیاد ہے۔ آجکل تو عموماً اہلِ سائنس کی نظر مادہ سے اونچی نہیں اٹھتی۔ بڑے بڑے سائنٹسٹ مادہ پرستی میں مبتلا ہیں اور مادی طاقتوں کو کارساز مطلق اور فعالِ اصلی سمجھتے ہیں۔ ماوراء مادہ کسی طاقت کے قائل ہی نہیں ہیں لیکن عوام آج بھی مادی طاقتوں کی پرستش کے قائل نہیں۔ ان کی علمی رسائی مادی انکشافات تک نہیں۔ وہ اس سنسار کا انتظام کچھ غیبی طاقتوں کے ہاتھوں میں جانتے ہیں اور ان غیبی طاقتوں کو قادرِ مطلق اور خود مختار خیال کرتے ہیں۔ دولت، افلاس، بیماری، صحت، اولاد کی پیدائش یا اولاد سے محرومی یہاں تک کہ خوش نصیبی اور بدبختی بلکہ زندگی اور موت کو بھی غیبی موہومی طاقتوں ہی کے ہاتھوں میں سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی موہومی طاقت کا کوئی معین اور مقرر تصور ان کے ذہنوں میں نہیں۔ کبھی وہ ان کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں کبھی ارواحِ نجوم کبھی ملائکہ۔ پھر اس عالم محسوسات میں انہوں نے خود ساختہ مظاہر بنا رکھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کی بیٹیوں اور دیویوں و دیوتاؤں اور ستاروں کی روحوں نے اپنے لئے الگ الگ مظاہر اور جلوہ گاہیں قرار دے رکھی ہیں۔ طرح طرح کی مورتیاں تراش کر انہوں نے اعتقاد جما لیا ہے کہ ان کے اندر دیویاں اور دیوتا اور ارواحِ نجوم و ملائکہ حلول کئے ہوئے ہیں۔ پس ان کو راضی کرنے کے لئے ان بتوں کی پوجا کرنی ضروری ہے

جو حقیقت میں ان دیوتاؤں کی پوجا ہے جو ان بتوں کے اندر حلول کئے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ بعض درختوں اور دریاؤں کو مظاہر الوہیت اور جلوہ گاہِ ارواحِ نجوم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے دریاؤں اور مخصوص درختوں سے مرادیں مانگتے، اُن کو پکارتے اور ان کی نذریں ماننے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

عرب کے جاہلوں میں بھی یہ مذہبی توہم پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ لات، منات، عزیٰ نام کے کچھ بت یا درخت یا مکان تھے جن کے اندر جنات یا ملائکہ کی روحیں اثر انداز اور دخیل سمجھی جاتی تھیں۔ ملائکہ یعنی غیبی موہوم طاقتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور بتوں یا درختوں میں خدا کی ان بیٹیوں کا حلول مانتے تھے اس لئے بعض بتوں اور بتنیوں یا درختوں کی پوجا کرتے تھے تاکہ خدا کی بیٹیاں اُن سے خوش ہو کر خدا سے ان کی سفارش کر دیں اور اس طرح دربارِ خدا میں ان کی رسائی ہو جائے اور ساری مرادیں پوری ہو جائیں۔ عجیب احمق تھے کہ خدا کو مخلوق کی طرح محتاج اور صاحبِ اولاد سمجھتے تھے اور اولاد کی بھی وہ صنف جو کمزور ہے۔ خالق کی اولاد مخلوق کیسے ہو سکتی ہے۔ خالق بے نیاز مخلوق محتاج۔ پھر دربارِ الٰہی میں سفارش کس کی مجال ہے جو بغیر اجازت کے کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی معبود صرف ان کی خواہشات تھیں۔ وہ اپنے ہوا و ہوس کی پوجا کرتے تھے۔ خود ہی انہوں نے کچھ نام تراش رکھے تھے اور خود ہی ان کے اندر کچھ صفاتِ کارسازی فرض کر لی تھیں۔ ورنہ واقع میں ان کے دماغوں میں اپنے معبودوں کا کوئی مفہوم معین ہی نہ تھا۔ ان کا آخرت پر تو یقین ہی نہ تھا۔ صرف دنیوی زندگی اور اس کی ضرورتیں پیشِ نظر تھیں۔ انہیں کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے خیالی معبود گھڑ لئے تھے لیکن اللہ کی الوہیت اس کا اقتدارِ محیط اور اس کا ہمہ گیر علم و ارادہ اور کامل اختیار تو مخلوق کا محتاج نہیں۔ ملائکہ بھی بغیر اجازت کے اس کے دربار میں سفارش کرنے کی مجال نہیں رکھتے۔ ملائکہ بھی اگر سفارش کریں گے تو اسی کی جس کے حق میں سفارش کو اللہ پسند کرے گا اور اجازت دیدے گا۔

تحلیلِ اجزاء

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی۔ عام اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ لات و عزّیٰ بتوں کے نام تھے۔ مشرکینِ عرب جن کی پوجا کرتے تھے۔ اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ بت ملائکہ کی محسوس شکلیں ہیں جن کے اندر ملائکہ کی طاقتیں حلول کئے ہوئے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ نے تفسیرِ مظہری میں لکھا ہے کہ مشرکینِ عرب نے اللہ کے ناموں سے بتوں کے نام مشتق کر لئے تھے۔ چنانچہ اللہ سے اللات اور عزیز سے عُزّیٰ بنا لیا تھا۔ بعض اہلِ علم کا یہ بھی قول ہے کہ اللات کی اصل لویۃ بروزن فعلۃ تھی (مادہ لَوْیٌ۔ لَیٌّ ہے) لَیٌّ کا معنی ہے موڑنا۔ وہ لوگ بھی اس بت کے گرداگرد طواف کرتے اور گھومتے تھے اس لئے اس بت کا نام ہی اللات ہو گیا۔

ابن عباس، مجاہد، رویس اور ابو صالح کی قرأت میں اَللّاتّ بتشدید تَ آیا ہے۔ لاتّ اسم فاعل کا صیغہ ہے لَتٌّ مادہ ہے۔ ایک شخص تھا جو گھی میں ستو ملا کر حاجیوں کو حج کے زمانہ میں کھلایا کرتا تھا۔ اس کا نام اللاتّ ہو گیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کی قبر پر لوگ بیٹھ گئے اور مجاور بن گئے پھر رفتہ رفتہ اس کی پوجا کرنے لگے۔

قتادہ کا قول ہے کہ اللات طائف میں بنی ثقیف کا ایک بت تھا۔ ابن زید نے کہا مقام نخلہ میں ایک مکان نام اللات تھا۔ قریش اس مکان کی پوجا کرتے تھے۔ عُزّیٰ بر قول مجاہد بنی غطفان کی آبادی میں ایک درخت تھا جس کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ نخلہ میں ایک مکان کا نام عُزّیٰ تھا۔ بنی شیبان اس کے مجاور تھے۔ بنی شیبان سے بنی ہاشم کی گہری دوستی اور معاہدہ تھا تمام بنی کنانہ اور قریش کا یہ سب سے بڑا معبود تھا۔ عمرو بن لحی (جو عرب میں بت پرستی کا موجد تھا) نے کہا تھا کہ رب موسم سرما میں طائف میں لات کے پاس رہتا ہے اور موسم گرما میں عُزّیٰ کے پاس۔ اسی کے قول کے مطابق قریش اور بنی کنانہ نے ان دونوں جگہ مکان بنا دیئے اور ان مکانوں کی پوجا کرنے لگے اور کعبہ کی طرح ہدیئے اور رفتہ رفتہ ان دونوں پوجا گھروں میں بھی پیش کرنے لگے۔

بیہقی نے حضرت ابو الطفیل کی روایت سے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہؐ نے خالد بن ولید کو عُزّیٰ کو ڈھا دینے کے لئے بھیجا حسب الحکم خالد نے جا کر کیکر کے درخت کاٹ دیئے اور عُزّیٰ کو ڈھا کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دیدی۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تم کو وہاں کچھ نظر آیا۔

حضرت خالد نے عرض کیا نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا تم نے عزّیٰ کو نہیں ڈھایا۔ خالد بڑی ہوشیاری کے ساتھ دوبارہ لوٹ کر گئے۔ مجاور خالد کو دیکھ کر پہاڑوں میں پھیل گئے۔ اور کہنے لگے عزّیٰ اس کے پاس اکیلی آجا۔ عزّیٰ اس کے سامنے ننگی ہو کر آجا ورنہ ذلت کے ساتھ مر جا۔ چنانچہ ایک کالی عورت ننگی، سر بکھیرے ہوئے، چہرے اور سر پر خاک ڈالتی خالد کے سامنے نمودار ہوگئی۔ خالد نے تلوار سونت لی اور کہنے لگے کہ ہم تجھے نہیں مانتے تو پاک نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس پر تلوار ماری۔ پھر واپس آکر، رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ گرامی نے فرمایا ہاں وہ عزّیٰ تھی۔ اب اس کو امید نہیں رہی کہ تمہارے شہر میں کبھی اس کی پوجا ہو سکے گی۔ ضحاک کا قول ہے کہ عزّیٰ بنی غطفان کا ایک بُت تھا۔ سعد بن ظالم غطفانی نے اس کو قائم کیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ سعد جب مکہ گیا تو اس نے صفا و مروہ کے درمیان مکہ والوں کو طواف کرتے دیکھا۔ جب وہ لوٹ کر وادیٔ نخلہ میں آیا تو اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ مکہ والوں کے طواف کرنے کے لئے تو صفا و مروہ ہے تمہارے طواف کے لئے کوئی چیز نہیں۔ پھر ان کا ایک معبود بھی ہے جس کی وہ پوجا کرتے ہیں اور تمہارا کوئی معبود بھی نہیں۔ لوگوں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو۔ کہنے لگا میں بھی تمہاری پوجا کے لئے ایسا ہی ایک معبود بناؤں گا۔ اس کے بعد یہ شخص کچھ پتھر صفا کے اور کچھ پتھر مروہ کے جا کر لایا۔ جو پتھر صفا سے لایا تھا ان کے متعلق کہنے لگا۔ یہ تمہارے لئے صفا ہے اور مروہ والے پتھروں کو کہنے لگا یہ تمہارا مروہ ہے۔ پھر تین پتھر لے کر ایک درخت کے سہارے سے ان کو کھڑا کر دیا اور کہنے لگا۔ یہ تمہارا رب ہے۔ اس کے بعد لوگ دونوں پتھروں (یعنی صفا اور مروہ کے پتھروں) کے درمیان طواف کرنے لگے اور پتھروں کو پوجنے لگے۔ آخر فتح مکہ کے زمانے میں رسول اللہ نے وہ پتھر اٹھوا دیئے اور حضرت خالد کو بھیج کر عزّیٰ کو کٹوا دیا۔

وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۔ اور تیسری اور منات کو۔ قتادہؓ نے کہا منات مقام قدید میں بنی خزاعہ کا بت تھا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا انصار (دورِ جاہلیت میں) منات کے نام کا احرام باندھتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ منات کا مقام قدید کے بالمقابل تھا۔ ابن زید نے کہا منات مشلل میں ایک گھر تھا۔ بنی کعب اس کو پوجتے تھے۔ ضحاک نے کہا۔ منات بنی ہذیل اور بنی خزاعہ کا ایک بُت تھا جس کو مکے والے پوجتے تھے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لات، عزّیٰ اور منات کعبہ کے اندر تین بت تھے۔ لوگ ان کی پوجا کرتے تھے۔

محمد بن یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے زمانہ میں ۲۴؍ رمضان کو رسول اللہ نے سعد بن زید اشہلی کو منات (کے توڑنے کے لئے) مشلل کی طرف بھیجا۔ مشلل ایک پہاڑ تھا جس کی نشیبی وادی میں قدید کا مقام تھا۔ منات اوس، خزرج اور غسان کا بت تھا۔ سعد بیس سواروں کو ساتھ لے کر جا پہنچے۔ منات کا ایک مجاور تھا۔ اس نے پوچھا۔ تم کیا چاہتے ہو۔ سعد نے کہا۔ منات کو توڑ دینا چاہتا ہوں۔ مجاور نے کہا۔ کیا تم وہی ہو (یعنی کیا تم منات کو توڑنے کی طاقت رکھتے ہو) سعد (سواری سے اتر کر) پیدل منات کی طرف چلے۔ اچانک ایک ننگی کالی کلوٹی عورت بال بکھیرے سینہ پیٹتی ہوئی ہائے وائے کرتی نمودار ہوئی۔ مجاور کہنے لگا۔ منات اپنے دشمن کو پکڑ۔ سعد نے اس کو اتنا مارا کہ وہ قتل ہوگئی۔ پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر بُت کی طرف گئے اور اس کو ڈھا دیا۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ کیا تمہارے لئے نر (بیٹے) ہیں اور خدا کے لئے بیٹیاں ہوں۔ یہ تو تمہاری طرف سے بے انصافی کی تقسیم ہے۔ یعنی تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بیٹیوں سے افضل و اعلیٰ ہوتے ہیں اور خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہو جو تمہارے خیال میں بیٹوں کے مقابلہ میں ادنیٰ اور کمزور ہوتی ہیں۔ یہ تو تمہارے قانون اور رواج کے اعتبار سے بھی ناانصافی کی تقسیم ہے۔ خدا کا مرتبہ تو تمہاری نظر میں بھی انسان سے زیادہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ادنیٰ کو تم خود پسند نہیں کرتے اور خدا کے سر منڈھتے ہو۔ کلبی نے کہا کہ مکہ کے مشرک بُت پرست تھے اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بات حقیقت میں یہ تھی کہ عام طور پر بُت پرست اپنے اپنے معبودوں کو ذاتِ خدا کا محل یا صفاتِ الٰہی کی جلوہ گاہ کہتے تھے۔ کچھ ستارہ پرست ستاروں کی پوجا کرتے تھے، کیونکہ ان کی نظر میں انسان کی سعادت و نحوست اور صحت و مرض اور موت و زندگی اور ساری کامیابی و ناکامی ستاروں کی رفتار اور تاثیر سے وابستہ تھی وہ ستاروں کو اپنا کارساز مانتے تھے اس لئے ستاروں کے نام کے مندر بناتے اور ستاروں کی خیالی تصویر کے بُت تراش کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ عرب کے مشرک ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں بھی مانتے تھے اور ان کو کارخانۂ قدرت کا خود مختار کارندہ جانتے تھے۔ انہوں نے بھی ان بنات اللہ کو خوش کرنے اور پوجنے کے لئے کچھ مادہ شکل کی مورتیاں

گھڑلی تھیں۔ ہندوستان کے مشرک دیوتاؤں کے بھی پجاری ہیں اور دیویوں کے بھی۔ دیویوں کی پوجا ان کے مذہب میں بھی زائد ہے۔ عیسائیوں اور بعض یہودیوں نے انسان کو خدا کا بیٹا قرار دے لیا ہے مگر انہوں نے خدا کے بیٹوں کے بت نہیں بنائے۔ آیت میں عرب کے مشرکوں کی حماقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر تم خدا کو صاحبِ اولاد ماننا صحیح خیال کرتے تھے تو اس کی نرینہ مانتے۔ یہ کیسی نادانی ہے کہ اول تو خدا کو صاحبِ اولاد مانا (جو بنیادی طور پر ناممکن ہے) پھر اولاد کو مؤنث قرار دو۔ گویا تمہاری نظر میں خدا کا مرتبہ تمہارے مقابلے میں بھی گھٹا ہوا ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ الخ یعنی یہ بت کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کو معبود قرار دینے کے لئے خود نام تراش رکھے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں آئی۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم جو ان کے اندر حقیقتِ ملائکہ کا ظہور سمجھتے ہو اور ان کو اپنا سفارشی قرار دیتے ہو اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں مانتے ہو۔ یہ صرف تمہارے خیالات ہیں۔ واقعی ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم نے اور تمہارے اسلاف نے ان بتوں کے نام خود گھڑ لئے ہیں۔ کسی کو تم عزت والی (عزّیٰ) کہتے ہو، کسی کو مادہ الٰہ (لات) اور کسی کے نام پر قربانیاں کرنے اور بھینٹ چڑھانے کے لحاظ سے منات کہتے ہو واقع میں نہ عزّیٰ عزت والی ہے، نہ لات مادہ خدا اور نہ منات قربانیاں قبول کرنے والی اور اپنا تقرب بخشنے والی۔ فضول نام ہیں حقیقتِ معنی سے خالی۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ۔ کچھ لوگ مادہ پرست ہیں۔ ان کی انتہائے مقصد مادہ پرستی ہی ہے۔ کچھ لوگ مادہ پرستی سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں اور ماوراءِ مادہ روحانیت کے قائل ہیں۔ لیکن یہ بیچارے کم فہم وہم کا حقیقت سے امتیاز نہیں کر پاتے۔ عقلیت کو جذبات کے اور روحانی حقائق کو توہمات کے تابع بنا لیتے ہیں۔ بت پرستی ہو یا ستارہ پرستی یا ملائکہ پرستی، کائنات کی کوئی پرستش ہو حقیقت روحانیت سے خالی ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ خواہش پرستی اور عبدیتِ جذبات ہوتی ہے۔ اپنے گمان کی پوجا ہوتی ہے۔ اپنے میلانِ طبع کو صداقت قرار دے کر اس کا اتباع ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔ فہم کو وہم سے، حقیقت کو جذبات سے اور واقعیت و صداقت کو من گھڑت خیالات سے امتیاز دینے والا اور راہِ حق بتانے اور دکھانے والا قرآن آگیا اور رب کی طرف سے آگیا۔ رب کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ جس نے مخلوق کے لئے تکوینی ضابطۂ زندگی بنایا اور سب کو اس ضابطہ کے اندر جکڑ دیا۔ وہی انسان کی علمی و عملی درستی کے لئے ضابطۂ تشریعی بنانے اور اتارنے کا اختیار رکھتا ہے۔ پس اسی نے رسول کو بھیجا اور دستورِ حیات نازل فرمایا۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى۔ اب کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے جذبات کی پرستش کرتا رہے اور خود تراشیدہ قوانین پر چلے اور جس چیز کی اس کو خواہش ہے وہ اس کو حاصل ہو جائے اور اس کی آرزو کے مطابق بت اس کی شفاعت کر سکیں۔

فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى۔ کیونکہ ابتدائی تخلیق سے آخری انجام تک سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو اختیار نہیں کہ خود بلا اجازت شفاعت کر سکے اور اپنے پرستاروں کی حاجت روائی اور امداد کر سکے۔ الآخرۃ سے مراد قیامت اور الاولیٰ سے مراد دنیا بھی ہو سکتا ہے یعنی آخرت اور دنیا دونوں کا اختیار اللہ ہی کو ہے جس طرح دنیا کی تخلیق اور انتظام میں کسی مخلوق کو دخل نہیں۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی کوئی کسی کے متعلق کچھ اختیار کا مالک نہ ہوگا اور اللہ کے عذاب سے آڑے نہ آسکے گا۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى۔
یہ صحیح ہے کہ آسمان و زمین کے ملائکہ کارخانۂ قدرت کے کارندے یا پرزے ہیں۔ ہر ایک ڈیوٹی ہے جو وہ انجام دے رہا ہے، لیکن کوئی بھی مختارِ عام نہیں کسی کو خود بغیر اللہ کے حکم کے کچھ کرنے کا اختیار نہیں۔ ہر قطرۂ آب جو زمین پر گرتا ہے اس کو ایک فرشتہ ہی لاتا ہے۔ ہواؤں، بادلوں اور تمام فضائی حوادث پر ملائکہ مامور ہیں۔ زمین سے ہر دانہ کی روئیدگی و بالیدگی فرشتہ ہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ درختوں کا تناور اور بارآور ہونا حیوانوں کی پیدائش نمو، پرورش رزق رسانی بیماری صحت یہاں تک کہ موت پر بھی ملائکہ ہی مامور ہیں۔ آسمانوں پر بھی ملائکہ اپنی اپنی خدمت پر مقرر ہیں۔ سیاروں اور ستاروں کی فوقانیت رفتار گردش اور نظم ملائکہ ہی سے وابستہ ہے۔ فلاسفہ جس کو قانونِ کشش کہتے ہیں۔ وہ غیر اختیاری اور طبعی نہیں بلکہ بحکم خدا فرشتوں کے فرضِ منصبی کا

الہام ہے۔ پھر تسبیح و تقدیس میں ہر وقت غرق رہنے والے ملائکہ ان سب ملائکہ سے الگ ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ کی عبادت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تسبیح و تقدیس میں مشغول رہنے والے فرشتوں کے علاوہ دنیوی نظم کو قائم رکھنے والے ملائکہ کو اسی لئے ملائکہ کہا جاتا ہے کہ ان پر انتظامِ عالم کا دار و مدار ہے (ملائکہ یا ملک سے مشتق ہے اور ملک کا معنی ہے دار و مدار) یا وہ اللہ کا حکم ہر ذرہ کائنات کو پہنچاتے ہیں (ملائکہ کا لفظ اَلوکۃ کا معنی ہے پیام رسانی۔ تفسیر بیضاوی) تمام اہلِ مذاہب جو وجودِ خدا کے قائل ہیں وہ اس کارخانہ کو چلانے والی کچھ غیبی طاقتوں کو بھی مانتے ہیں۔ توہم پرست ہوں یا دانشور قائل روحانیت ہی انتظامِ عالم کی ہر شاخ کو کسی غیبی طاقت سے وابستہ جانتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ کوتاہ نظر ہیں اور ان غیبی طاقتوں کو خود مختار اور کارساز مطلق مانتے ہیں۔ اسی لئے ان کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ناموں پر بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ مصیبتوں میں ان کو پکارتے ہیں ان کو قاضی الحاجات اور دافع البلیات سمجھ کر پوجتے ہیں کچھ لوگ ان غیبی طاقتوں کو مختارِ مطلق نہیں جانتے بلکہ بارگاہِ الٰہی کے مقرب سمجھتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ کہنے والا اگرچہ خدا ہے لیکن ان مقربانِ بارگاہ کو اللہ کی مرضی میں اتنا دخل ہے کہ خدا سے سفارش کر کے جس کو چاہیں مصیبت سے بچالیں جس کو چاہیں کامیاب و کامران بنا دیں۔ ان کی شفاعت واجب القبول ہے اور اور شفاعت کرنے میں یہ آزاد ہیں۔ اسی عقیدہ کے زیرِ اثر یہ لوگ غیبی طاقتوں کی عبادت کرتے، ان کے نام کی منتیں مانتے اور ان کی دہائی دیتے ہیں۔ اس گروہ کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو غیبی ملائکہ کو پوجتا ہے اور خود ساختہ ان کی شکلیں بنا کر ان صورتوں اور مجسموں ہی کی تعظیم و عبادت کرتا ہے۔ یہ گروہ بُت پرستوں کا ہے۔ پوشیدہ طاقتوں کی کوئی واقعی شکل اس گروہ کے دماغ میں نہیں آتی اور محسوس پرستی یا زیادہ سے زیادہ نیم محسوس پرستی کے دائرہ کے اندر اس کی ساری ذہنی قوتیں بند ہوتی ہیں اس لئے فرضی طور پر پوشیدہ طاقتوں کی وہ کچھ صورتیں اور مورتیں بنا لیتا ہے اور انہی کو اپنا مددگار جانتا ہے۔ دوسری شاخ ملائکہ کے ساتھ انبیاء اور اولیاء کی پاک روحوں کو بھی شامل کر لیتی ہے اور جس طرح انبیاء اور اولیاء کا وجود اس عالمِ ظاہر میں مرنے سے پہلے تھا اسی طرح مرنے کے بعد وہ ان کو حاضر ناظر اور اسی عالم میں موجود خیال کرتا ہے۔ اتنی بات ضرور کہتا ہے کہ وہ ہماری نظروں سے ہٹ گئے ہیں۔ پردہ پوش ہو گئے ہیں مگر ہیں زندہ۔ اور اسی طرح زندہ جس طرح وہ ہمارے سامنے تھے یہی وجہ ہے کہ یہ گروہ انبیاء اولیاء کی نذریں مانتا اور جانوروں کو ان کے نام ذکر کرتا اور قربانی و نیاز کی شکل میں ان کے ناموں پر بھینٹ چڑھاتا ہے کیونکہ اس کے عقیدہ میں دنیا اور آخرت کی فلاح انہی بزرگوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اس دنیا کی ہر مصیبت کو دور کر سکتے ہیں اور ہر قسم کا فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور قیامت کے دن بھی جس کو چاہیں گے دوزخ سے بچا لیں گے، جس کی چاہیں گے سفارش کر دیں گے اور ان کی شفاعت کا رد ہو جانا ممکن نہیں پس یہ گروہ بھی ملائکہ پرستوں کی طرح انبیاء اور اولیاء کا پرستار بن گیا اور ملائکہ پرستوں نے جس طرح غیبی طاقتوں کی محسوس صورتیں اور مجسمے بنا رکھے تھے اس گروہ نے انبیاء و اولیاء کے ایسے مجسمے تو نہیں بنائے لیکن ان کی قبروں اور چھوٹے ہوئے آثار و نشانات کو عملی معبود قرار دے لیا اور مزاروں کی پوجا اور طواف اسی طرح کرنا شروع کر دیا جس طرح بُت پرستوں نے مورتیوں کی پوجا کی۔

ایک تیسرا گروہ ان دانشوروں کا ہے جو مادہ پرست نہیں ہر تغیر کو نیچرل اور طبعی قرار دے کر بے جان مادہ کا پرستار نہیں بنتا بلکہ اس عالمِ ظاہر میں غیبی پوشیدہ طاقتوں کی ارادی کارفرمائی کو دخیل سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عالمِ ظاہر ایک پوشیدہ عالم کا پرتو ہے۔ مادہ بے جان ہے بے شعور ہے بے ارادہ ہے۔ مادیات میں توازن قائم رکھنا بے شعور مادہ کا کام نہیں۔ تمام نوعی صورتیں بے شعور ہیں۔ حرکت و سکون کا ہر مصدر جس کو طبیعت کہا جاتا ہے شعور و ارادہ سے اگرچہ محروم ہے لیکن کچھ با ارادہ باشعور غیر محسوس پوشیدہ طاقتیں ہیں جو سارے مادیات سماوی و خلائی و ارضی کا انتظام کر رہی ہیں لیکن یہ پوشیدہ طاقتیں بھی با ارادہ اور باشعور ہونے کے باوجود خود مختار نہیں۔ خود کچھ نہیں کر سکتیں، کسی کی تمنا اور آرزو پوری نہیں کر سکتیں۔ نہ اُن کو آغازِ آفرینش پر قابو ہے، نہ انجامِ تخلیق پہ۔ آغاز بھی اللہ ہی کے قبضہ میں ہے اور انجام بھی۔ کسی معاملہ میں بے جان بت اور انسانی روحیں تو بجائے خود رہیں وہ چوٹی کی غیبی طاقتیں جن کو ملائکۂ آسمانی کہا جاتا ہے اور جن کو اس کارخانۂ قدرت کا کارندہ بنایا گیا ہے وہ بھی اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے بغیر خود کارسازی تو کیا کر سکیں گی خدا سے سفارش بھی نہیں کر سکتیں۔ اللہ ہی جس شخص کے متعلق ان کو سفارش کرنے کا حکم دیتا ہے وہ سفارش کرتی ہیں اس لئے ملائکہ کو مختارِ مطلق سمجھ کر پوجنا انتہائی لغو حرکت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ

اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا۔ حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ قیامت اور دوسری زندگی کو نہ ماننے والے (چونکہ اسی دنیا میں سُکھ دُکھ اور نفع وضرر کے قائل ہیں اور آخرت کی زندگی اور اس کی جزا سزا کو نہیں مانتے اور فہم کو چھوڑ کر محض توہم پرستی کے حدود دائرہ میں بند ہیں، اس لئے ملائکہ اور غیبی قوتوں کی مادہ صورتیں انہوں نے گھڑلی ہیں اور ملائکہ کو نسوانی اسماء کے ساتھ نامزد کرتے ہیں۔ (اور پھر نسوانی نام کے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں) یہ ان کی خود تراشیدہ حرکت محض غلط توہمات اور بے بنیاد خیالات پر مبنی ہے۔ فرشتوں کو انہوں نے کبھی دیکھا نہیں چھوا نہیں۔ کانوں سے ان کی آواز کو سُنا نہیں۔ فرشتوں سے ملاقات کرنے والوں نے انہیں بتایا نہیں۔ اللہ نے کسی پیغمبر کی وساطت سے یا بالغیر وساطت کے ان کو اطلاع دی نہیں۔ ان کے پاس عقلی ثبوت نہیں۔ غرض نہ حسی علم ہے نہ عقلی نہ نقلی۔ محض وہمی اختراع ہے۔ فرشتوں کا غیر مادّی اور لطیف ہونا تولید و تناسل اور خورونوش سے پاک ہونا اللہ کے پیغمبروں کے کلام سے ثابت ہے اور عقل بھی اس کی شاہد ہے اس لئے ان کی جھوٹی قیاس آرائی اور توہم پرستی صحیح نقل و روایت کے مقابل ہیچ ہے۔

مقصودِ بیان عرب خصوصاً اہلِ مکہ (دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کے علاوہ) تین بتوں کی پوجا کرتے تھے جن کے نام مؤنث رکھ چھوڑے تھے۔ منات، لات، عزّٰی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ملائکہ مؤنث ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ توہم پرستی پر مبنی تھا۔ محض قیاس کاذب تھا کوئی عقلی نقلی دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ خود ہی انہوں نے اور ان کے اسلاف نے اسم بلا مسمّٰی رکھ چھوڑے تھے۔ یہ محض ان کی نفسانی خواہش تھی جس نے ان کو بت پرستی اور فرضی دیوتا گھڑ لینے پر آمادہ کیا تھا۔ ورنہ نزولِ قرآن کے بعد جب راہِ حق یقینی طور پر سامنے آگئی اور سچائی کا مشاہدہ ہوگیا تو پھر کسی تخمین اٹکل اور توہم کی گنجائش باقی نہیں رہی، کیونکہ آغاز و انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے تو ظاہر ہے کہ آغاز و انجام کے درمیان انتظامی دور بھی اسی کے قبضہ میں ہے اور اسی کو حق ہے کہ اس متوسط دور یعنی زندگی کو درست رکھنے کے لئے قانون بنائے۔ اگر انسان کے ہاتھ میں وضع قانون کا اختیار دیدیا جائے تو وہ وضع قانون کو اپنی تمناؤں کا تابع بنائے گا اور اس کی کل آرزوئیں پوری نہیں ہوسکتیں جس کی ذات سے تمناؤں کو وابستہ کیا جائے۔ اس کے قبضہ میں فائدہ رسانی کی طاقت بھی ہونی چاہیئے۔ فرضی معبود تو قاضی الحاجات نہیں ہوسکتے۔

اور یہ امید رکھنا کہ جن ملائکہ کی پوجا کی جاتی ہے وہ ہمارے کارساز ہیں خود نہیں کرسکیں گے تو خدا سے ہماری ضرورتیں پوری کرادیں گے سراسر حماقت ہے۔ ملائکہ کی سفارش بھی اذنِ خداوندی کی محتاج ہے۔ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہنا اور عورتوں کے ایسے نام ان کے رکھنا محض بے بنیاد خیال ہے۔

تنقیحِ مبحث تفسیر مندرجہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیات میں ظن سے مراد ہے توہم اور گمان۔ لیکن اگر ظن سے مراد غالب گمان ہو تو اس صورت میں آیت کی تشریح کے لئے اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ علم (یعنی جاننے) کے مختلف مدارج ہیں۔ ۱ کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا ایک کمزور خیال۔ اس کو وہم یا توہم کہتے ہیں۔ ۲ کسی چیز کے ہونے اور نہ ہونے کے دونوں رُخ برابر ہوں۔ ہونا یا نہ ہونا دونوں متحمل ہوں۔ نہ ہونے کا گمان غالب ہو نہ نہ ہونے کا۔ اس کو شک کہتے ہیں ۳ ہونے یا نہ ہونے کا گمان غالب ہو اور اس کے مقابل دوسرا رخ کمزور اس غالب گمان کو ظن کہا جاتا ہے ۴ کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین ہو لیکن اس پر جزم اور قطعیت حاصل نہ ہو، کسی قطعی ناقابلِ شک دلیل پر اس کی بنا نہ ہو اس کو تقلید کہتے ہیں ۵ علم یا حق اس قطعی عقیدہ کو کہتے ہیں جو ناقابلِ شک و شکست ہو، واقع کے مطابق ہو، راسخ اور انتہائی مضبوط ہو، قطعی دلیل سے حاصل ہوا ہو۔

ظن کا مقابلہ حق سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس عقیدہ کی بنا قطعی دلیل پر ہو۔ عقلِ سلیم اس کی شاہد ہو یا ناقابلِ شک قطعی روایت میں اس کی صراحت ہو اس کے مقابلہ میں صرف تخمین اور اتباعِ رسوم اور تقلیدِ اسلاف کی کوئی حیثیت نہیں، شرک کا مدار محض تقلیدِ اسلاف اور نفسانی جھکاؤ پر ہے اور توحید کا قطعی ثبوت عقل و نقل سے ملتا ہے۔ پس ملائکہ کو مؤنث قرار دینا اور خدا کی بیٹیاں کہنا اور مؤنث شکل کی مورتیاں بنا کر ان کو مظہرِ معبودیت جاننا محض تقلیدی بات ہے، حقانیت و صداقت سے خالی۔

ایک شبہ شریعتِ اسلامیہ میں عملیات میں تو ظن سے کام لیا ہی جاتا ہے۔ علمِ ظنی کے موافق عمل واجب ہوتا ہے۔ اکثر فقہی مسائل کا استنباط ظنی دلائل ہی سے کیا جاتا ہے۔ اقوامِ ماضیہ کی مختلف قصے اور مختلف قرآنی قصوں کی تفصیل اور جنت و دوزخ کی مکمل تشریح اور روزِ قیامت کے واقعات کا تفصیلی ذکر سب کچھ آحاد احادیث میں ہی آیا ہے اور حدیثِ آحاد ظنی ہوتی ہے۔ اگر ظن مفید علم نہیں تو اس پر عمل کرنا اور اس کے مطابق عمل کو واجب قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے۔

ازالہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب ظنیات کا علومِ یقینیہ سے ٹکراؤ ہو رہا ہو اس صورت میں ظن مفید علم نہیں ہوتا۔ اگر ظن کا مقابل کوئی علم قطعی نہ ہو تو بلاشبہ ظنی پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جو عقائد محکم آیاتِ متواترہ احادیث اور اجماع سلف صالحین سے ثابت ہیں اُن کو تسلیم کرنا لازم ہے۔ اگر ان کے مقابلہ میں ظنیات ہوں تو واجب الترک ہیں اور جس مسئلہ کی کوئی قطعی دلیل نہ ہو تو عقلِ سلیم اس کا فیصلہ کرے گی اور گو دلیل ظنی ہو مگر عمل واجب ہوگا۔ مثلاً دلیلِ ظنی سے ثابت ہے کہ وتر واجب ہیں۔ چاشت کی نماز سنت ہے۔ بھنگ حرام ہے۔ اگر خرید و فروخت میں کوئی شرط فاسد لگا دی جائے تو ایسی بیع شرعاً ممنوع ہے۔ یہ تمام مسائل ظنی ہیں۔ ظنی دلائل سے ان کا ثبوت ہوتا ہے اور ان کے نہ ماننے والی کوئی قطعی دلیل ان مباحث کے خلاف موجود نہیں ہے۔ اس لئے عقل کا فیصلہ ہے کہ وتر کو ترک نہ کیا جائے اور بھنگ نہ پی جائے۔ اور بامید ثواب چاشت کی نماز پڑھی جائے اور شروطِ فاسدہ لگا کر بیع نہ کی جائے کیونکہ قطعی دلیل موجود نہ ہونے کی صورت میں ظنیات پر عمل مفید ہی ہے مضر نہیں۔ دیکھو ایک بچہ بھی اگر تم کو اطلاع دے کہ اس سوراخ میں ابھی سانپ داخل ہوا ہے تو اطلاع اگرچہ قطعی نہیں لیکن تم اس سوراخ پر ہاتھ نہیں رکھو گے۔ احادیث متواترۃ المعنی۔ اجماع امت۔ اور آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہے کہ اگر قطعی دلائل جانب مخالف میں موجود نہ ہوں تو اخبارِ احاد اور قیاسِ فقہی پر عمل واجب ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ دوسری آیت میں آیا ہے فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا۔ مسائلِ فقہیہ میں ظنیت حقیقت میں طریقِ ثبوت کی ظنیت ہے لیکن اگر یہ ظنیت ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا قطعی دلیل سے ثابت ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۭ ذٰلِكَ

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اسکو کوئی (اخروی مطلب) مقصود نہ ہو ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی

مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى

حد بس یہی دنیوی زندگی ہے تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستے سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اسکو بھی خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہے

تفسیر کم ہیں، پست حوصلہ، کوتاہ عقل والے آدمی کا مقصدِ زندگی صرف منافعِ دنیوی کا حصول ہوتا ہے۔ اس کی عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ نہیں ہوتی۔ دونوں میں جذباتیت کی رنگینی آجاتی ہے۔ قومی، نسلی، لسانی، لونی، وطنی اور گروہی عصبیت کی اونچی عمارتیں اسی جذباتیت کی بنیاد پر بنائی جاتی ہیں اور اسی میں انسان نما حیوان کو اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ خالقِ کل کا تصور اور اس کے بنائے ہوئے قانون کی افادیتِ عامہ اور آخرت کی زندگی اور آئندہ زندگی کی بھلائی اس کے دماغ کے کسی گوشہ میں نہیں ہوتی۔ وہ اللہ، اللہ کے احکام اور قیامت کی جزا سزا کے ذکر سے رُوگرداں ہوتا ہے۔ نہ اس کو کلامِ خداوندی کی پرواہ ہوتی ہے نہ رسول اللہ کے فرمان کی۔ وہ تو بس اپنے ظن و تخمین، تنگ قیاس اور ذہنی تاریکی کی دلدل میں پھنسا رہتا ہے۔ پس ایسے لوگوں سے جن کا مقصدِ زندگی ہی بدلا ہوا ہے اور جو دنیوی منافع سے آگے کچھ سوچ ہی نہ سکتے ہوں۔ اُن نا لڑنا اور جھگڑے کرنا بے سود ہے۔ اُن سے ہدایت یافتہ ہو جانے کی اُمید رکھنی ہی بیکار ہے۔ جو ہدایت پانے والے ہیں اور جو صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ جن کے خمیر میں قبولِ صداقت ہے اور جو کج راہ ہیں سب سے اللہ واقف ہے

پس ایسے لوگوں کی طرف توجہ ہی نہ کرو جو اول ترین مقصد حیات اسی دنیوی زندگی کو سمجھے ہوئے ہیں اور اللہ کی یاد سے رُوگرداں ہیں۔

تحلیلِ اجزاء فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی۔ وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا۔ یعنی جب ان منکرینِ حق کی جہالت سبک سری اور عقل و فہم کی کوری آپ پر واضح ہوگئی اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ یہ محض توہم پرست یا پرستارانِ ظن ہیں اور نازل شدہ صداقت و ہدایت کی طرف ان کا رُخ بھی نہیں ہے اور پتھروں کی پوجا کو ذکرِ الٰہی پر ترجیح دیتے ہیں۔ بت پرستی کے شیفتہ ہیں اور ذکرِ خداوندی سے لاپرواہ۔ اس لئے آپ کی دعوت سے یہ کسی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ گویا یہ چوپائے ہیں اور گم کردہ چوپائے جن کو کوئی پکار کج راہی سے نہیں روک سکتی۔ ان کے پیشِ نظر صرف فوائد دنیا ہیں۔ انہی کو حاصل کرنے کے لئے یہ تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں۔ اس سے آگے ان کی علمی رسائی ہی نہیں۔ یہ معاشی سطح سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتے کہ معاد پر غور کریں۔ یہی ان کا منتہائے علم ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اھْتَدٰی۔ یعنی آپ ان کی پرواہ نہ کریں۔ کیونکہ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ کون راہِ حق سے بھٹکنے والا ہے اور کون صحیح راستہ پر چلنے والا۔ پس وہ ہر ایک کو سزا جزا اس کی ضلالت اور ہدایت کے مطابق دے گا۔ مقصد یہ کہ جس کا گمراہ ہونا اللہ کے علم میں ہے وہ کبھی راہ یاب نہ ہوگا۔ پس اس کے لئے آپ کا کڑھنا اور ہدایت کے درپے ہونا بیسود ہے۔

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ

اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے انجام کار یہ ہے کہ برا کام کرنے والوں کو اُن کے (برے) کام کے

الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۚ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا

عوض میں (خاص طور کی) جزا دیگا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے عوض میں جزا دیگا وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص)

اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ ؕ ھُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ

(بازہ) بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب تم کو زمین سے پیدا کیا تھا اور جب تم

اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ ۚ فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ؕ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ۝ ع ۶

اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے تم تو اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (بس) تقوے والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔

تفسیر ازل سے ابد تک آغازِ آفرینش سے انتہائی انجام تک سارا جہان اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور کل عالم بالا و پست کا وہی مالک بھی ہے اور اسی کے زیرِ حکومت ہر ذرہ کائنات اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ پس جب خالقِ کل مالکِ کل، حاکمِ کل اور ناظمِ کل وہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عالمِ کل نہ ہو۔ یقیناً اس کے سامنے عرشِ اعلیٰ سے لے کر ذرہ ادنیٰ تک ہر چیز حاضر ہے اور وہ ہر شے کی مقدار کیفیت حالت اسکی رفتار اور حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے اور جب سارے سنسار کی کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہیں تو انسان اول کا مٹی (کے عنصر غالب) سے پیدا کیا جانا اور پھر نوعی سلسلہ کو تناسلی شکل میں جاری رکھنا اور ماں کے پیٹ کے اندر نطفہ کی حالت کیفیت اور مقداروں پے درپے تغیرات پیدا کرکے جیتا جاگتا انسان نمودار کردینا کیونکر اس کے علمی دائرے سے باہر نہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کس کا خمیر کیسا ہے اور فطری سعادت و شقاوت کس کس کو حاصل ہوچکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی سرشت میں خیر کے ساتھ شر بھی داخل ہے۔ کوئی بشر بے شر نہیں پیدا کیا گیا۔ ہر آدمی میں قوتِ خیر بھی ہے اور قوتِ شر بھی۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی ذات یا گروہ کو شر اور گناہ سے پاک قرار دے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ عملی دنیا میں کوئی کبائر، صغائر سے

بچنے والا (اور کون مرتکب معاصی) ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کے آخری لمحات کا پتہ نہیں۔

اللہ نے دستورِ زندگی خیر و شر کے فیصلہ کے لئے نازل فرمایا ہے۔ بدکاروں اور گناہگاروں کو ان کے کئے کی پاداش ملے گی اور نیکوں کو ان کے اچھے اعمال کی جزا۔ اور اللہ چونکہ بڑا رحیم و مہربان ہے اس لئے وہ ان گناہگاروں اور بداطواروں کو بھی معاف فرما دے گا جن سے کوئی بڑا گناہ اور کھلی ہوئی خطا اتفاقاً سرزد ہوگئی ہو۔ گاہے گاہے تصور ہو جانا اور پھر اس سے توبہ کر لینا اللہ کے نزدیک جرم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ ہاں کبائر پر اصرار اور جہادؔ ضرور قابلِ گرفت ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ سموات (بلندیاں) سے مراد ہیں اجرام علویہ عالم بالا اور الارض (زمین) سے مراد ہے عالم زیریں۔ یعنی کائنات بالا و پست زمینی ہو یا فضائی و خلائی یا فلکی اور سماوی سب کا خالق اللہ ہے۔ سب کا مالک اللہ ہے، سب کا حاکم اور ناظم اللہ ہے اور ہر چیز کی حقیقت کیفیت حالت ابتداء آغاز و انجام سے واقف اللہ ہے۔ غرض ہر چیز اللہ ہی کی ہے، اس لئے ہر ایک کو اسی کی بندگی کرنی چاہیئے۔ وہی مختارِ کل ہے۔ انسان کی زندگی کو سُدھارنے کے لئے قانون نازل کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہے جو تخلیقات و تکوینات کا مالک ہے۔ وہی معبود ہونے اور تشریعات نازل کرنے کا بھی حق رکھتا ہے اس نے دستورِ حیات اس لئے نازل کیا اور اپنے احکام اس لئے بھیجے کہ

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا ... بِالْحُسْنٰى۔ جو لوگ بدکار ہیں اور اوامر و نواہی کو تھکراتے ہیں اور ان کی صداقت کا انکار کرتے ہیں یا اقرار کے باوجود اُن پر عمل نہیں کرتے قیامت کے دن ان کو سزا دے اور جو لوگ نیکوکار ہیں ان کی نیکیاں ضائع نہ جائیں۔ ان کی نیکیوں کے مطابق ان کو جزا عطا فرمائے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ یہ الذین احسنوا بالحسنیٰ کی صفت کا شفہ ہے۔ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک باللہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے کبائر کا درجہ ہے۔ کبائر ذنوب کی تفصیل سورت النساء کی آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

الفواحش سے مراد یا عام کبائر ہیں یا حد سے بڑھے ہوئے چوٹی کے کبائر۔ بعض کے نزدیک فواحش وہ گناہ ہیں جن کی سزا شریعت میں مقرر کر دی گئی ہے (زنا، چوری وغیرہ) لَمَم سے مراد جوہری کے خیال میں وہ گناہ کبیرہ ہیں جو اتفاقاً کبھی کبھی صادر ہو جاتے ہوں ان گناہوں کی عادت نہ بن گئی ہو۔ جب اتفاقاً گناہ ہو جائے تو اس سے توبہ کر لی جائے۔ بقول بغوی یہی قول حضرت ابو ہریرہ، حسن بصری اور مجاہد کا ہے۔ حضرت ابن کے متعدد اقوال میں سے عطا کی روایت میں آپ کا یہی قول منقول ہے۔ لیکن سدی کا بیان ہے کہ ابو صالح نے کہا مجھ سے اِلَّا اللَّمَمَ کی تفسیر دریافت کی گئی تو میں نے کہا اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ پر (ایک بار) اتر گیا ہو پھر دوبارہ نہ کرے (لمم کا لغوی معنی ہے اُترنا۔ حضرت ابن عباس نے یہ تفسیر سُن کر فرمایا۔ اس تفسیر میں معزز فرشتے نے تیری مدد کی (یعنی یہ تفسیر الہامی اور ملکوتی ہے فرشتہ نے تیرے دل میں ڈالی ہے) بغوی نے عطا ہی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس سے الا اللمم کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا۔ رسول اللہ نے فرمایا تھا

اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا   وَاَیُّ عَبْدٍ لَّكَ لَا اَلَمَّ

اے اللہ اگر تو بخش دے گا تو بہت گناہ بخش دے گا تیرا کونسا بندہ ہے جو (گناہ پر) اترا نہ ہو۔

ان سب اقوال پر الا اللمم میں استثناء منصل قرار پائے گا لیکن بعض علماء کا قول ہے کہ لمم سے مراد ہیں چھوٹے گناہ۔ صاحب قاموس نے بھی لمم کا یہی معنی بیان کیا ہے۔ بروایت بغوی یہ قول حضرت ابن مسعود (نیز) حضرت ابو ہریرہ، مسروق اور شعبی کا ہے۔ طاؤس کی روایت میں اس تفسیر کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف بھی کی گئی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے، ابن عباس نے فرمایا لمم کے سلسلہ میں ابو ہریرہ کی اس روایت سے زیادہ اشبہ

(اور اصح) قول میں نے نہیں) پایا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ ابن آدم کے نصیب میں اللہ نے زنا کا جو حصہ لکھ دیا ہے وہ مل کر رہے گا آنکھ کا زنا (ناجائز) نظر ہے۔ زبان کا زنا (ناجائز شہوانی) کلام ہے۔ نفس تمنا کرتا ہے خواہشمند ہوتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے (زنا حقیقت میں شرمگاہ کا کام ہے باقی دواعی اور مبادی ہیں شرم گاہ سے زنا کا صدور ہو گیا تو گویا تمام مبادی زنا پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی اور سارے دواعی حکم زنا میں داخل ہو گئے اور شرم گاہ محفوظ رہی تو دواعی زنا کی تکذیب ہو گئی) ابو صالح نے بھی حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ آنکھوں کا زنا (ناجائز) نظر ہے۔ کانوں کا زنا (ناجائز شہوانی) کلام کو سننا ہے۔ زبان کا زنا (ناجائز شہوانی) بات کرنا ہے۔ ہاتھ کا زنا (ناجائز طور پر نامحرم کی) گرفت ہے اور پاؤں کا زنا (مقام زنا کی طرف بارادۂ زنا) جانا ہے۔

حسن بن فضل نے کہا لمم بلا ارادہ (نامحرم پر) نظر پڑ جانا ہے اور یہ معاف ہے۔ اگر دوبارہ نظر ڈالے گا تو وہ لمم نہ ہوگا۔ اس قول پر لمم ایک خاص قسم کا صغیرہ گناہ ہوتا ہے۔

سعید بن مسیب نے کہا۔ دل میں جو (گناہ کا) خیال پیدا ہو وہ لمم ہے (المام کا معنی ہے اترنا) یہ قول جوہری کے قول کے قریب ہے۔ ان تمام اقوال پر اَلَّا اللَّمَمَ میں استثناء منقطع ہوگا (یعنی ان تمام اقوال پر لمم سے مراد ہوں گے صغیرہ گناہ اور صغیرہ گناہ کبائر و فواحش میں داخل نہیں ہیں اس لئے استثناء متصل نہ ہوگا)

کلبی نے کہا لمم کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) وہ گناہ جن کی کوئی دنیوی سزا یا عذاب آخرت کا ذکر اللہ نے نہیں کیا نماز ایسے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ کبائر اور فواحش کی حدود میں داخل نہ ہو گئے ہوں۔ (۲) وہ بڑا گناہ جو کسی وقت مسلمان سے صادر ہو جائے اور وہ فوراً توبہ کرے۔

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ۔ یعنی اللہ کی طرف سے مغفرت میں بڑی وسعت اور سمائی ہے۔ صغیرہ کبیرہ توبہ کے بعد اور بغیر توبہ کے ہر طرح جس شخص کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے (مشرکوں کے علاوہ) اس کی مغفرت کسی کے لئے بند نہیں، صرف اس کی مشیت پر موقوف ہے عذاب دینا اس پر لازم نہیں۔ ہر طرح کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو اگر وہ چاہے گا تو معاف بھی کر دے گا۔ پس گنہگاروں کو اس کی مغفرت سے ناامید نہ ہونا چاہئے۔ نہ کسی کو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک سمجھ کر نجات کا یقین کر لینا چاہئے۔

ابو نعیم نے حضرت علی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے پاس اللہ نے وحی بھیجی۔ اپنی امت کے گناہگاروں سے کہو کہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (اور رحمت سے مایوس نہ ہوں) میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں اور اس کی مجھے پرواہ بھی نہیں ہوتی۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ یعنی جب اللہ نے آدم کو مٹی کے (غالب عنصر) سے پیدا کیا تھا اسی وقت وہ تمہاری خوش نصیبی و بدبختی نجات ہلاکت اور انجام کار اور اعمال زندگی سے واقف تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوق کی تقدیریں لکھ دی تھیں۔ اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ (رواہ مسلم)

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور فرمایا لکھ قلم نے عرض کیا کیا لکھوں۔ اللہ نے فرمایا تقدیر کو لکھ۔ حسب الحکم قلم نے وہ تمام چیزیں جو ہو چکیں اور ابد تک ہونے والی ہیں لکھ دیں۔ رواہ الترمذی۔ ترمذی نے کہا اس حدیث کی سند غریب ہے۔

امام مالک۔ ترمذی اور ابو داؤد نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ اللہ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت پر پھیرا اور اس کی (کچھ) نسل کو برآمد کر کے فرمایا۔ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ جنتیوں کے عمل کریں گے۔ پھر آدم کی پشت پر ہاتھ پھیر کر (کچھ) نسل کو برآمد کیا اور فرمایا۔ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے یہ دوزخیوں کے عمل کریں گے۔ ایک شخص نے یہ فرمان سن کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ پھر عمل کس لئے ہیں۔ فرمایا (اللہ نے جب کسی بندہ کو جنت کے لئے پیدا کیا ہوتا) تو اس سے جنتیوں کے عمل کراتا ہے

تک کہ وہ اہلِ جنت کے عمل کرنے کی حالت میں ہی مرجاتا ہے۔ اللہ اس کو جنت میں داخل فرما دیتا ہے اور جس بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہوتا ہے اس کو دوزخیوں کے عمل کا عامل بناتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخیوں کے عمل پر ہی مرجاتا ہے۔ پھر اللہ دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔

وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ۔ اور اللہ تمہاری اس حالت سے بھی بخوبی واقف ہے جب تم جنینی حالت میں ماؤں کے پیٹوں میں ہوتے ہو۔ حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا تمہاری بناوٹ (یعنی مادہ) بصورتِ قطرہ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک ہوتی رہتی ہے۔ پھر وہ اتنی ہی مدت تک بستہ خون (کی شکل میں) رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت میں وہ بوٹی (بے جان لوتھڑا) ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھ دینے پر مامور فرماتا ہے۔ عمل، میعادِ زندگی اور رزق اور شقی یا سعید ہونا۔ اس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ آدمی (ساری عمر) جنتیوں کے کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔ آخر کتاب کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کے عمل کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں چلا جاتا ہے اور کوئی (ساری عمر) دوزخیوں کے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔ آخر کتاب کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ جنتیوں کے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں چلا جاتا ہے۔ رواہ البخاری و مسلم فی صحیحیہما۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ پس تم پر لازم ہے کہ اپنے اعمال کی پاکیزگی اور نیکیوں کی کثرت کی تعریف نہ کرو یا یہ مطلب ہے کہ اپنے نفسوں کو گناہوں سے اور بری خصلتوں سے پاک نہ قرار دو کیونکہ انجام کا تم کو علم نہیں۔

حسن بصری نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کوئی کیا کرے گا اور اس کا انجام کیسا ہوگا اس لئے اپنے نفسوں کو گناہوں سے پاک نہ قرار دو اور اچھے اعمال پر اپنی ستائش نہ کرو۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہی قول مروی ہے۔

کلبی اور مقاتل کا بیان ہے لوگ اچھے اعمال کرتے تھے اور نیک عمل کرنے کے بعد کہتے تھے۔ ہماری نماز، ہمارے روزے، ہمارا حج۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

واحدی طبرانی ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ثابت بن حارث انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی چھوٹا بچہ مرجاتا تھا تو کہتے تھے کہ یہ تو صدیق ہے (یعنی ولی کامل، معصوم مغفور) رسول اللہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو حضور نے فرمایا۔ یہودی جھوٹے ہیں۔ جس جان کو اللہ ماں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے (اسی وقت لکھ دیتا ہے کہ) وہ خوش نصیب ہے یا بدنصیب۔ اس پر آیت وَهُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ الخ نازل ہوئی۔

هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ یعنی آدم کی پشت سے باہر لانے سے پہلے ہی اللہ جانتا تھا کہ تقویٰ اور خلوصِ عمل پر کس کا خاتمہ ہوگا۔

مقصودِ بیان

ساری مخلوق کا خالق مالک اور حاکم اللہ ہے۔ اللہ نے دستورِ زندگی اس لئے نازل کیا کہ نیکوں اور بروں کو جزا سزا مل سکے۔ کبیرہ گناہوں سے بچنے والے ہی نیک ہیں۔ ارتکابِ کبائر سے بچنا نیکی ہے اس سے اشارہ ملتا ہے اس بات کی طرف کہ تنہا معاملات کی ادائیگی ہی نیکی نہیں ہے۔ کبائر سے پرہیز بھی نیک ہونے کے لئے ضروری ہے۔ الا اللمم کا لفظ بتا رہا ہے کہ اگر کبھی کوئی گناہ بے ارادہ ہو جائے تو وہ قابلِ گرفت نہیں۔ یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ کبائر سے بچتے رہنے کے بعد صغائر قابلِ مواخذہ نہیں رہتے۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ تخلیقِ آدم کے وقت ہی اللہ کو ساری نسلِ آدم کے کل احوال کا تفصیلی علم تھا اور اللہ کا تفصیلی علم جزئیاتِ حادثہ کے ظہور پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا علم فعلی زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہے۔ نہ اس کے علم میں کوئی ماضی ہے، نہ مستقبل بلکہ سب کچھ حاضر ہے۔ ایک بات یہ بھی بصراحت ثابت ہو رہی ہے کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ یعنی آدم کا بدن مٹی سے بنایا گیا اور مٹی کو گوشت پوست کی شکل دی گئی۔ اگرچہ آبی ہوائی اور آتشی اجزاء کو بدنِ آدم کی تخلیق میں دخل تھا لیکن غالب عنصر مٹی کا ہی تھا۔ دوسرے اجزاء تو مٹی کے خمیر کرنے گوندھنے اور خشک کرنے کے لئے تھوڑی تھوڑی مقدار میں شامل کئے گئے تھے۔ قوام، بدن کا طول و عرض عمق اور تمام اندرونی و بیرونی اجزاء و اعضاء کی ساخت مٹی ہی پر موقوف تھی) اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ایک آدمی بنایا گیا پیدا نہیں کیا گیا۔ نوعی ارتقاء نہیں ہوا۔

بلکہ بسائط کو ترکیب دے کر مرکب تیار کیا گیا اور پھر اس سے روح کو متعلق کیا گیا)
فَلَا تُزَكُّوْٓا سے اشارہ ہے اس طرف کہ انسان ضعیف البنیان ہے اور تخلیقی طور پر معصوم نہیں ہے۔ اس کے اندر شر کی طاقت ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے اندر فطری شر کب سر اٹھائے اور اس کا کیا انجام ہو۔ وغیرہ

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ۙ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ

تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے (دین حق سے) روگردانی کی اور تھوڑا مال دیا اور (پھر) بند کر دیا کیا اس شخص کے پاس (کسی صحیح ذریعے سے) علم غیب ہے

يَرٰى ۝ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ ۙ اَلَّا

کہ اس کو دیکھ رہا ہے کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور نیز ابراہیم کے جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی (اور وہ مضمون یہ ہے)

تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ

کہ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا اور یہ کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی اور یہ کہ انسان کی سعی بہت

سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى

جلد دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا بدلا دیا جاوے گا اور یہ کہ (سب کو) آپ کے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے

تفسیر

اللہ نے ہر انسان کو عقلی و عملی طاقتیں مرحمت فرمائی ہیں اور ان طاقتوں کو استعمال کرنے کا اس کو اختیار دیا ہے۔ اپنی طاقتوں سے کام لینے پر ہر آدمی کو قدرت حاصل ہے اور طاقتوں کے اس استعمال کے نتیجہ کا بھی وہ خود ہی ذمہ دار ہو۔ اگر یہ خیر و شر کی فطری طاقتیں حد شعور میں داخل ہو گئی ہیں اور اچھے برے میں محسوس طور پر امتیاز کرنے کی سمجھ پیدا ہو گئی اور شعور و احساس دائرۂ جنون میں داخل نہیں ہو گیا ہے اور توازن حواس قائم ہے تو ایسا انسان جو کچھ کرے گا اس کا ذمہ دار وہ خود ہو گا۔ دوسرے کو اس کے عمل پر نہیں پکڑا جائے گا اور ایسا بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی کسی کا بار اس کے سر سے اتار کر اپنے اوپر اٹھائے قدرت کا یہ قانون اٹل ہے۔ تمام آسمانی کتابوں میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے اور تقاضائے عدل بھی یہی ہے۔ ہاں ان لوگوں کی شفاعت و سفارش کرنا جن کے متعلق سفارش کرنے کی اللہ نے اجازت دیدی ہو نہ خلاف نقل ہے نہ عدل شکن۔ کسی کا گناہ اپنے اوپر اوڑھ لینا اور بجائے مجرم کے اپنے کو قابل مواخذہ قرار دینا فطرت، عقل اور نقل کے خلاف ہے۔ اللہ سے دعا کر کے قصور کو معاف کرا دینا اللہ کی صفت رحیمی کے دائرہ کے اندر آتا ہے۔ پس نا ممکن ہے کہ کچھ مال لے کر دولتمندوں سے کوئی معاہدہ کرے کہ تمہارے گناہ میں اپنے اوپر لے لوں گا اور اگر سزا ملی تو تمہاری جگہ ہر سزا کو میں برداشت کر لوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کرنی اپنی دھرانی اپنی بھگتنی ہے۔ اپنے کرم کا پھل خود ہی سب کو کھانا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے (ایمان سے) پشت پھیر لی پھر (اپنے ساتھی کو) کچھ تھوڑا سا (مال) دیا اور (پھر) بخل کیا۔

ابن جریر نے بحوالۂ ابن زید بیان کیا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ اس کے ساتھی نے اس کو سخت و سست کہا اور شرم دلائی کہ تو نے باپ دادا کا مذہب چھوڑ دیا اور بزرگوں سے منہ موڑ لیا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ سارے آباؤ اجداد آگ میں جائیں گے۔ مسلمان نے کہا۔ بھائی مجھے اللہ کے عذاب سے ڈر لگا اس لئے مسلمان ہو گیا۔ ساتھی بولا مجھے کچھ مالی معاوضہ دیدو۔ میں تمہارے اوپر آنے والا سارا عذاب اپنے اوپر اٹھا لوں گا۔

مسلمان نے اس کو دے دیا اور کچھ دینے کا وعدہ کر لیا اور ایک میعادی تحریر بھی لکھ دی جس پر گواہی بھی ثبت کر دی اور مرتد ہو گیا (جب ختم میعاد کا وقت آگیا تو وعدے سے مکر گیا اور کچھ مزید نہیں دیا) اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

بغوی نے اس مسلمان ہونے والے کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے اور اس کو اسلام سے مرتد بنانے والا کسی اور مشرک کو قرار دیا ہے۔ گویا صاحب تفسیر بغوی افرأیت میں استفہام تعجبی ہے اور الذی تولی سے مراد ولید ہے اور اعطی واکدی کا فاعل بھی ولید ہے اور پشت پھیرنے سے مراد ہے ایمان واسلام پر قائم نہ رہنا اور اکدی کا معنی ہے بخل کیا۔ مطلب یہ کہ اپنے ساتھی کو کچھ مال تو دے دیا اور باقی کو (حسب وعدہ) ادا کرنے میں کنجوسی کر گیا۔ مقاتل نے کہا اعطی قلیلا سے یہ مراد ہے کہ زبانی طور پر کچھ دے دیا تھا لیکن زبان بیکار نہیں رہا اور کچھ دیا نہیں۔

سدی نے کہا کہ اس آیت کا نزول عاص بن وائل کے حق میں ہوا جو بعض باتوں میں رسول اللہ صلعم کی موافقت کرتا تھا۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا کچھ دینے سے مراد ہے کسی قدر اقرار حق کرنا اور اکدی سے مراد یہ ہے کہ ایمان نہیں لایا۔ یہ آیت ابوجہل کی بابت نازل ہوئی تھی، کیونکہ ابوجہل اتنا تو کہتا تھا کہ محمد کچھ اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ اتنا تو اس کو اقرار تھا لیکن ایمان نہیں لایا۔

اکدی کا لغوی معنی ہے کاٹ دیا (یعنی ولید یا عاص یا ابوجہل نے اپنے اقرار کو کاٹ دیا ایمان نہ لایا) کدیہ اس سخت چٹان کو کہتے ہیں جو کنواں کھودتے وقت نکل آتی ہے اور کھودنے والوں کو کھودنے سے روک دیتی ہے۔ کھدائی کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے۔ یا یہ مطلب کہ اس نے جو مال دینے کا وعدہ کیا تھا اس کو کاٹ دیا اور باقی کچھ نہیں دیا۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى - کیا وہ غیب داں ہے۔ کیا اس کو آئندہ کا علم ہے کہ یہ شخص مجھ پر آنے والا عذاب اپنے اوپر اٹھائے گا۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى ۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى - یعنی توریت کی تحریروں میں اور ابراہیم کے صحیفوں میں (اور قرآن میں بھی یعنی تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں ایک ضابطہ لکھ دیا گیا ہے تمام صحیفوں میں) مذکور ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بار اپنے اوپر قیامت کے دن نہیں اٹھائے گا۔ کیا ان لوگوں کو اس کی خبر نہیں دی گئی۔ مطلب یہ کہ ان کو نہ تو قیامت کا علم ہے جس کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکیں کہ ایک کا بار گناہ دوسرا اپنے سر اٹھائے گا اور اصل مجرم آزاد ہو جائے گا۔ نہ آسمانی کتابوں میں کہیں اس کی صراحت ہے کہ مجرم کا بوجھ غیر مجرم برداشت کرے گا۔

وَفّٰى پورا کیا یعنی اللہ نے جو ان کو حکم دیا تھا اس کی تعمیل مکمل طور پر انھوں نے کی تبلیغ رسالت میں کمی نہیں کی۔ بیٹے کی قربانی دینے کا حکم ملا تو اس کی بھی تعمیل کی۔ مخلوق کے ہاتھوں سے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں۔ نمرود نے آگ میں ڈالا۔ قوم نے خانہ بدر کیا۔ مال ومنال، اعزا اقربا سب کو چھوڑنا پڑا۔ یہاں تک کہ شہر اور ملک سے بھی نکالے گئے لیکن توحید سے منہ نہیں موڑا۔ ثبات وصبر میں لغزش نہ آئی۔ اللہ نے چند کلمات واحکام کا پابند بنایا۔ انھوں نے ان کلمات کا حق ادا کیا۔

بغوی نے حضرت ابوامامہ باہلی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے آیت وابراہیم الذی وفّٰی پڑھی اور فرمایا ابراہیم نے شروع دن ہی چار رکعتیں پڑھیں (اور ان کی پابندی کی)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت معاذ بن انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا، کیا میں تم کو بتاؤں کہ ابراہیم خلیل اللہ کو الذی وفی (کی صفت) کے ساتھ کیوں ذکر کیا۔ جب بھی صبح اور شام ہوتی ابراہیم پڑھتے تھے فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون (الی آخر الآیۃ) ترمذی نے حضرت ابودرداء اور حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا، اللہ نے ارشاد فرمایا۔ اے ابن آدم شروع دن میں میرے لئے چار رکعتیں پڑھ لیا کر آخر دن (تک) کے تیرے کام میں پورے کر دوں گا ابوداؤد اور دارمی نے یہ حدیث حضرت نعیم غطفانی کی روایت سے بیان کی ہے۔ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں کیا تھا اس کے متعلق فرمایا۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کہ کوئی کسی کا بار عذاب اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا۔ بغوی نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے عام دستور تھا کہ مجرم کے

جرم کی پاداش میں غیر مجرموں کو پکڑ لیا جاتا تھا قاتل کے قتل کا بدلا اس کے باپ اولاد اور بھائی برادروں سے لیا جاتا تھا یہاں تک کہ قاتل کی عورتوں اور غلاموں کو قتل کر کے بدلے میں قتل کر دیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اس حرکت سے ان کو منع کیا اور فرمایا اللہ کا ارشاد ہے کہ غیر مجرم پر مجرم کا جرم نہ ڈالا جائے۔ حقیقت بھی یہ دستور جاہلیت کے دور میں عام تھا۔ رسول اللہ کی ہجرت سے قبائل اوس و خزرج میں باہم جنگ ٹھنی رہتی تھی۔ ایک قبیلہ کمزور تھا۔ دوسرا طاقتور۔ طاقتور قبیلہ کی کوئی عورت ماری جاتی تو اس کے عوض کمزور قبیلہ کے مرد کو قتل کرتے تھے اور غلام مارا جاتا تو ضعیف قبیلہ کے کسی آزاد مرد کو قصاص میں قتل کیا جاتا تھا لیکن اس کے برعکس معاملہ ہوتا تھا تو انتقام اور قصاص کا یہ دستور بدل جاتا تھا۔ اس پر آیت الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ الخ نازل ہوئی جس کی تشریح سورت بقرہ میں کر دی گئی ہے

ایک شبہ (۱) ایک آیت ہے وَكَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ اس آیت میں صاف صراحت ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اگر کسی نے کسی کو ناحق قتل کیا، مقتول نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو، نہ ملک میں لوٹ مچائی ہو اور اس کو کوئی قتل کر دے تو گویا اس قاتل نے سب آدمیوں کو قتل کر دیا۔ حل طلب یہ سوال ہے کہ قاتل نے قتل تو ایک کو کیا اور عذاب وہ سب اٹھانا پڑتا جو تمام انسانوں کے قاتل کا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ مفہوم آیت ان لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کے خلاف نہیں۔

(۲) ایک صحیح حدیث ہے جو مسلم اور امام احمد نے حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے کوئی برا طریقہ قائم کیا اس کو اپنے عمل کا بھی گناہ ہوگا اور قیامت تک جو لوگ اس طریقہ پر عمل کریں گے ان کا بھی بار گناہ ہوگا (مگر اس طریقہ پر چلنے والوں کا عذاب اس سے کم نہ ہوگا یعنی انتقالِ گناہ نہیں ہوگا۔ اصل گناہگار پر تو گناہ ہوگا ہی اور برا طریقہ ایجاد کرنے والے پر بھی گناہ ہوگا) یہ حدیث بتا رہی ہے کہ ناکردہ گناہ کا بار بھی اٹھانا پڑے گا۔

ازالہ گناہ کا طریقہ ایجاد کرنا بجائے خود گناہ ہے۔ ایجادِ گناہ کے بعد جو لوگ طریقۂ گناہ پر چلتے ہیں اول گناہ دوسرے گناہ کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اسی لئے حدیث مذکور کے آخر میں یہ فقرہ ہے کہ گناہ کرنے والوں کا عذاب کم نہ ہوگا یعنی ان کا عذاب موجد گناہ پر منتقل نہ ہوگا بلکہ موجدِ گناہ پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک خود کرنے کا دوسرا ایسا ذریعہ پیدا کرنے کا کہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگ گناہ کرنے لگے۔ اسی طرح ایک کا قتل دوسروں کے قتل کا سبب اور ذریعہ ہے۔ یہی توضیح آیت کی بھی کی جا سکتی ہے۔

شبہ اللہ نے فرمایا ہے وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً۔ ایسے فتنہ سے ڈرو جو ظالموں پر ہی خصوصیت کے ساتھ نہیں پڑے گا (بلکہ غیر مجرموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیگا) حضرت ابن عمر کی روایت سے ایک متفق علیہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جب اللہ کسی قوم پر عذاب نازل فرماتا ہے تو جو لوگ بھی اس قوم کے اندر ہوتے ہیں سب پر عذاب آجاتا ہے لیکن جب ان کا حشر ہوگا تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق ہوگا (جو بے قصور ہوں گے وہ عذاب آخرت میں مبتلا نہیں ہوں گے) اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ مجرموں پر آنے والا عذاب غیر مجرموں پر بھی آجاتا ہے اور ظالموں کے ظلم کی سزا میں وہ لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں جو ظالم نہیں ہوتے۔

ازالہ آیت اور حدیث میں غیر مجرموں پر جس عذاب کے نازل ہونے کا بیان ہے وہ بھی ایسا عذاب نہیں جو مجرموں سے منتقل ہو کر غیر مجرموں پر آجاتا ہے بلکہ بجائے خود ان لوگوں کا بھی جرم ہوگا کہ انھوں نے امر بالمعروف کیوں نہیں کیا اور ممنوعات سے کیوں نہیں روکا اور بصورت ناکامی اس معاشرہ میں کیوں رہے۔ بدکار قوم سے الگ کیوں نہ ہو گئے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے، جو حضرت ابوبکر صدیق کی روایت سے سنن اربعہ میں موجود ہے کہ حضور نے فرمایا۔ جب لوگ ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو ہو سکتا ہے کہ سب پر اللہ کا عمومی عذاب آجائے۔

تنقیح مسئلہ کیا پسماندگان اگر میت پر روئیں تو اس کا عذاب میت پر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔

صحیحین میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ملیکہ نے بیان کیا کہ مکہ میں حضرت عثمان بن عفان کی ایک صاحبزادی کا انتقال ہوگیا میں جنازہ میں شریک تھا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر بھی موجود تھے۔ حضرت ابن عمر نے عمرو بن عثمان سے کہا آپ (لوگ) رونا دھونا ختم کیوں نہیں کرتے باوجودیکہ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ گھر والوں کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا (ہاں) کچھ ایسا ہی فرمایا تھا۔ اس کے بعد تفصیل بیان کی اور فرمایا جب حضرت عمر زخمی ہو گئے تو صہیب روتے پیٹتے آئے اور کہنے لگے ہائے بھائی ہائے ساتھی۔ حضرت عمر نے فرمایا صہیب کیا تم مجھ پر رو رہے ہو باوجودیکہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ میت پر گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ جب حضرت عمر کی وفات ہوگئی اور اس حدیث کا تذکرہ حضرت عائشہ کے سامنے کیا گیا تو ام المومنین نے فرمایا اللہ عمر پر رحمت نازل فرمائے بخدا رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ (ہر) میت پر گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ گھر والوں کے رونے کی وجہ سے اللہ کافر کے عذاب میں زیادتی کر دیتا ہے۔ اور (اس حدیث کے خلاف) تمہارے لئے آیت قرآنی کافی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ ہی ہنساتا اور رُلاتا ہے (یعنی غم کی وجہ سے رونا اضطراری امر ہے) حضرت ابن عمر نے یہ سارا واقعہ سُنا اور کچھ نہیں فرمایا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ نے جو حضرت عمر کے (مطلب نہی) کی تردید کی وہ بجائے خود مناسب نہیں۔ حضرت عمر دینی فہم حضرت عائشہ سے زیادہ رکھتے تھے۔ پھر آپ کی گواہی شہادت ثبوت ہے (اور حضرت عائشہ کا بیان نفی پر دلالت کرتا ہے اور شہادت ثبوت شہادت نفی پر ترجیح رکھتا ہے) اس کے علاوہ حضرت عمر کی حدیث دوسری متعدد احادیث سے بھی ہوتی ہے (۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے میں نے خود سُنا رسول اللہ فرما رہے تھے جس پر نوحہ گریہ کیا جائے اس کو اس نوحہ (کی پاداش) میں عذاب دیا جاتا ہے۔ (۲) ابو یعلی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث بیان کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا زندہ کے رونے سے میت کو گرم پانی سے غسل دیا جاتا ہے (۳) ابن حبان نے صحیح میں حضرت انس اور حضرت عمران بن حصین کی روایت سے اور طبرانی نے الکبیر میں حضرت سمرہ بن جندب کے حوالہ سے اور ابو یعلی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر کی بیان کردہ حدیث صحیح ہے (اور حضرت عمر حدیث کا مطلب بھی صحیح سمجھے) رہا حدیث اور آیت مذکورہ کا تعارض تو اس کو دور کرنے کے لئے۔ بعض اہل علم نے یہ توجیہ کی ہے کہ حدیث میں جو زندہ کے رونے سے مردہ کو عذاب دیا جانا مذکور ہے۔ اس سے مراد یا تو کافر ہے (جیسا کہ حضرت عائشہ نے فرمایا تھا کہ کافر میت کے عذاب میں پسماندگان کے رونے سے اضافہ ہو جاتا ہے) یا وہ شخص مراد ہے جس نے اپنے مرنے کے بعد پسماندگان کو نوحہ کرنے کی وصیت کی ہو جیسے عرب کے بعض مغرور شیوخ قبائل اور سر برآوردہ جاہلوں کا دورِ جاہلیت میں دستور تھا۔ مگر یہ دونوں تاویلیں غیر مفید ہیں۔ ان سے حدیث اور قرآن کا تعارض دُور نہیں ہوتا۔ آیت کے الفاظ میں عموم ہے۔ مومن اور کافر دونوں کو حکم آیت شامل ہے۔

بعض علماء نے کہا۔ مردہ پر عذاب ہونے سے مراد یہ ہے کہ جس مردہ پر اس کے متعلقین روتے ہیں فرشتے اس کو ڈانٹتے اور زجر و توبیخ کرتے ہیں اس کی صراحت ترمذی حاکم اور ابن ماجہ کی مرفوع حدیث میں آئی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا جو مردہ مر جائے اور رونے والی اس پر کھڑی ہو کر ہائے (استقلال کے) پہاڑ ہائے میرے آقا اور اسی کی طرح دوسرے الفاظ (پیٹ پیٹ کر) کہے تو اس کی وجہ سے میت پر دو فرشتے مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو اس کو جھڑکتے ہیں۔ اس توجیہ سے بھی تعارض دور نہیں ہوتا۔ آیت کا عموم دوسرے کے عمل کی وجہ سے میت کو زجر و توبیخ کے بھی خلاف ہے۔ بعض اہل علم نے کہا میت پر نوحہ و بکا کرنے سے خود میت کو تکلیف ہوتی ہے۔ حدیث میں عذاب دیئے جانے سے یہی مراد ہے کہ پسماندگان کے نوحہ سے میت دُکھ پاتی ہے۔ طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے کہ قیلہ بنت مخرمہ نے اپنے مرے بچہ کا تذکرہ رسول اللہ سے کیا پھر رونے لگی۔ حضور نے فرمایا کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو چیخنے والی کو خاموش کر دے۔ پھر فرمایا اللہ کے بندو اپنے مُردوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ابن جریر نے اسی قول کو پسند کیا ہے اور ائمہ اُمّت کے نزدیک یہ تاویل اچھی ہے۔ ابن تیمیہ کا بھی یہی خیال ہے۔

لیکن تعارض کو دور کرنے کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ حدیث میں جس میت پر عذاب ہونے کی صراحت ہے اس سے مراد وہ میت ہے جس کا اپنی زندگی میں میت پر رونے کا دستور تھا یا اس نے وصیت کردی ہو کہ مجھ پر نوحہ کرنا یا کم از کم یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ پر متعلقین نوحہ کریں گے پسماندگان کو گریہ نہ کرنے کی نصیحت نہ کی ہو۔ ایسے مردہ پر عذاب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے خود گناہ کیا۔ دوسری میتوں پر نوحہ گری کی یا متعلقین کو نوحہ کرنے کی وصیت کی یا جانتے ہوئے بھی نوحہ کرنے کی ممانعت نہیں کی۔ پس یہ جرائم اس کے خود تھے جن پر اس کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ تاویل قاضی ثناء اللہؒ نے تفسیر مظہری میں کی ہے۔ لیکن اس فقیر کی نظر میں ان تاویلات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نہ حدیث کا آیت سے تعارض ہے۔ آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا (اپنے اوپر) دوسرے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یعنی یہ امر ممکن نہیں کہ کوئی غیر مجرم دوسرے مجرم کے گناہ کی سزا میں پکڑا جائے اور مجرم کو چھوڑ دیا جائے اور اس مضمون کی نفی حدیث سے نہیں ہوتی۔ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رونے والے نوحہ کرنے کے گناہ سے آزاد کر دیئے جائیں گے اور میت پر ان کا گناہ ڈال دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ اور یہ بھی موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں اللہ نے لکھ دیا تھا کہ انسان کو وہی ملے گا جس کی اور جتنی اس نے کوشش کی ہوگی۔ یعنی دوسرے کی نیکی سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اپنا کیا کام آئے گا۔ نہ دوسرے کے گناہ میں پکڑا جائے گا۔ نہ دوسرے کی نیکی سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ کوئی کسی کے گناہ کا بار اپنے اوپر نہیں اٹھا سکے گا اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہوگی۔

اسی آیت سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے کہ میت کو نہ مالی صدقات کا ثواب پہنچتا ہے نہ قرآن خوانی کا۔ میت کے لئے صرف دعا کی جا سکتی ہے اور پسماندگان کی دعاؤں کا فائدہ اس کو پہنچ سکتا ہے۔ احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ نیک مومن میت کے لئے تمام جانور اور ملائکہ بھی دعا کرتے ہیں۔

مندرجہ ذیل احادیث میت کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے جواز کو ثابت کر رہی ہیں (۱) حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ کو فرماتے سُنا کہ جب اللہ اپنے کسی مومن بندہ کی روح قبض کر لیتا ہے تو (اعمالنامے لکھنے والے) دونوں فرشتے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں بار الٰہا تو نے اپنے مومن بندہ کے اعمال لکھنے کی خدمت ہمارے سُپرد کی تھی ہم اعمال لکھتے تھے۔ اب تو نے اُس کو اپنے پاس بلا لیا اس لئے (اب) تو ہم کو اجازت دے کہ ہم (واپس جاکر) زمین میں رہیں۔ اللہ فرماتا ہے۔ میری زمین میری مخلوق سے بھری ہوئی ہے جو میری پاکی بیان کرتی ہے۔ ہاں تم جا کر اس (مومن) کی قبر پر کھڑے ہو کر قیامت تک میری تسبیح تہلیل اور تکبیر میں مشغول ہو جاؤ اور اس (تسبیح تہلیل و تکبیر) کو میرے بندہ کے لئے لکھ لو۔ اخرجہ ابونعیم۔

(۲) مسلم نے حضرت ابوہریرہ کی اور امام احمد نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں۔ تین قسم کے عمل کا (ثواب) ملتا رہتا ہے۔ جاری رہنے والی خیرات (یعنی وقف فی سبیل اللہ اگر مردہ نے اپنی زندگی میں کر دیا ہو) اور قابلِ انتفاع علم (یعنی مفید تالیف تصنیف تحریر و سلسلۂ درس) اور نیک اولاد جو میت کے لئے دعا کرے۔ اس حدیث میں اول الذکر دونوں چیزیں انسان کے اپنے عمل سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں اور تیسری بات غیر اختیاری ہے۔ یعنی نیک اولاد کی دعا اولاد کا عمل ہے میت کے سابق عمل کو اس میں دخل نہیں۔

(۳) طبرانی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے نیز حضرت ابوسعید کے حوالہ سے مرفوع حدیث ذکر کی ہے کہ اللہ نیک بندہ کا درجہ جنت میں اونچا کر دے گا بندہ عرض کرے گا کہ مجھے یہ کہاں سے ملا۔ اللہ فرمائے گا تیری اولاد نے تیرے لئے دعائے مغفرت کی تھی اس سے یہ درجہ اونچا کر دیا گیا۔

(۴) حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا قبر کے اندر میت کی حالت اس ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح ہوتی ہے جس سے سب کچھ چھوٹ گیا ہو۔ مردہ اپنے ماں باپ یا اولاد یا قابلِ اعتماد دوست کی دعا کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جب دعا اس کو پہنچ جاتی ہے تو دنیا اور دنیا

کی ہر چیز سے زیادہ وہ دعا اس کو عزیز ہوتی ہے۔ اللہ قبروں پر زمین والوں کی پہاڑوں جیسی دعائیں پہنچا دیتا ہے۔ زندوں کی طرف سے مُردوں کو ہدیہ ان کے لئے دعائے مغفرت ہے۔ رواہ البیہقی والدیلمی

(۵) مرفوع حدیث ہے حضورؐ نے فرمایا میری اُمت اُمتِ مرحومہ ہے۔ قبروں میں داخل ہوتے ہیں تو گناہ لئے ہوئے اور قبروں سے نکلیں گے تو بے گناہ ہو کر۔ مومنوں کے استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو چکے ہوں گے۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔ ان تمام احادیث سے مردہ کے لئے زندوں کی دعائے مغفرت کی افادیت ثابت ہو رہی ہے۔

سیوطی اور متعدد علماء نے لکھا ہے کہ مردہ کے لئے زندوں کی دعا کا مفید ہونا با جماعِ اُمت ثابت شدہ ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔ اور وہ لوگ جو ان کے بعد ایمان لائے کہتے ہیں کہ ہمارے رب ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے۔

حضرت نوح نے دعا کی تھی۔ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ۔ اے میرے رب مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

یہ آیات بتا رہی ہیں کہ میت کے لئے دعائے مغفرت جائز ہے۔ رہا تلاوتِ قرآن اور صدقاتِ مالیہ کا میت کو ثواب پہنچانا اور ان چیزوں کا ایصالِ ثواب کرنا سو کسی آیت اور حدیث سے ثابت نہیں بلکہ آیات واحادیث کی دلالت اس کے خلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ دعا کے علاوہ میت کو ایصالِ ثواب کے مختلف طریقوں سے جواز کے قائل ہیں۔ میت کے لئے دعا کا جواز تو بنصِ قرآنی بصراحتِ حدیث اور با جماعِ اُمت ثابت ہی ہے لیکن عبادتِ نافلہ اور صدقہ خیرات وغیرہ کا ثواب مندرجہ ذیل احادیث سے ثابت ہو رہا ہے۔ بخاری ومسلم نے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ وصیت بھی نہ کر سکی۔ میرا قوی خیال ہے کہ اگر اس کو بولنے کا موقع ملتا تو وہ (کچھ) خیرات کرتی اب اگر میں اس کی طرف سے خیرات دوں تو کیا اس کو کچھ ثواب ملے گا۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔

بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ سعد اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ آپ نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں کا انتقال ہو گیا میں موجود نہ تھا۔ اب اگر میں اس کی طرف سے کچھ خیرات کروں تو کیا اس کو فائدہ پہنچے گا۔ حضور نے فرمایا ہاں۔ سعد نے کہا تو میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ میری ماں کی طرف سے خیرات ہے۔

امام احمد اور اصحابِ سنن نے بیان کیا کہ حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اس کے لئے میری طرف سے کونسی خیرات زیادہ اچھی ہوگی۔ فرمایا پانی (یعنی کنواں) چنانچہ حضرت سعد نے کنواں کھدوا دیا اور کہا کہ یہ سعد کی ماں کے لئے ہے۔ طبرانی نے صحیح حدیث کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا تم میں سے اگر کوئی کچھ نفل خیرات کرنی چاہے تو اپنے ماں باپ کے لئے کرے۔ اس کا ثواب والدین کو بھی ملے گا اور اس کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ دیلمی نے حضرت معاویہ بن جندہ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

حضرت انس کا بیان ہے۔ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ فرما رہے تھے جو شخص مر جاتا ہے اور اس کے گھر والے اس کے لئے کچھ خیرات کرتے ہیں تو جبرئیل اُس کو نور کے طباق میں رکھ کر اس کی قبر کے کنارے جا کھڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں اے گہری قبر والے یہ ہدیہ ہے جو تیرے گھر والوں نے تجھے بھیجا ہے تو اس کو لے لے۔ قبر والا جبرئیل کے پاس آ جاتا ہے اور وہ ہدیہ خوب خوش وخرم ہوتا ہے لیکن (دوسری) آس پاس کی قبروں والے جن کو کچھ ہدیہ نہیں ملتا رنجیدہ ہوتے ہیں۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کی طرف سے حج کرتا ہے اللہ ان دونوں کے لئے دوزخ سے آزادی لکھ دیتا ہے۔ حج کرنے والے کو پورے حج کا ثواب مل جاتا ہے اور والدین کے ثواب میں بھی کمی نہیں کی جاتی۔ یہ بھی رسول اللہ نے

فرمایا کہ قرابتدار جو اپنے اہلِ قرابت سے اچھے سلوک کرتے ہیں ان سب میں افضل سلوک اس شخص کا ہے جو (کسی میت کے لئے) حج کرتا ہے اور اس کی قبر میں حج (کا ثواب) پہنچاتا ہے۔ یہ روایت بیہقی اور اصبہانی کی ہے لیکن اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں۔

حضرت زید بن ارقم راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جس کے ماں باپ نے حج نہ کیا ہو (اور بغیر حج کئے مرجائیں) اور وہ ماں باپ کی طرف سے حج کرے تو ماں باپ کے حج سے بری الذمہ ہوجاتا ہے اور ان دونوں کی روحوں کو آسمان میں خوشخبری دی جاتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کو (ماں باپ کا) فرماں بردار لکھا جاتا ہے۔ یہ روایت ابو عبداللہ ثقفی کی ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث ہے کہ ایک عورت نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہوکر دریافت کیا۔ میری ماں کا انتقال ہوگیا کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں۔ فرمایا بتا تو اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو ادا کرتی (یا نہیں) عورت نے عرض کیا جی ہاں (ضرور ادا کرتی) راوی کا بیان ہے حضورؐ نے اس کو حکم دیا کہ اپنی ماں کی طرف سے حج کرے۔ رواہ الطبرانی۔

حضرت انس کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور میرے باپ نے حج اسلام (یعنی فرض حج) ادا نہیں کیا (کیا میں اس کی طرف سے کرسکتا ہوں) فرمایا بھلا دیکھ تو اگر تیرے باپ پر کچھ قرض ہوتا تو کیا تو ادا کرتا۔ اس شخص نے جواب دیا جی ہاں۔ فرمایا تو یہ بھی اس پر قرض ہے تو ادا کردے۔ رواہ البزار والطبرانی بسند حسن۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جس نے مردہ کی طرف سے حج کیا تو حج کرنے والے کو بھی اتنا ہی ثواب ہے جتنا مردہ کو ملے گا۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط

عطا اور زید بن اسلم کی مرسل روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ مرچکا ہے کیا میں اس کی طرف سے (باندی غلام) آزاد کرسکتا ہوں۔ فرمایا ہاں۔ رواہ ابن ابی شیبہ

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ نے سنا ایک شخص کہہ رہا ہے لَبَّیْکَ عَنْ شُبْرُمَۃَ۔ فرمایا شبرمہ کون۔ اس شخص نے جواب دیا۔ میرا بھائی یا کہا میرا قرابتدار۔ فرمایا کیا تو نے اپنا (فرض) حج کرلیا ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا تو پہلے اپنا حج کرلے پھر شبرمہ کی طرف سے۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارقطنی والبیہقی۔ بیہقی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

حضرت حجاج بن دینار کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا نیکی بالائے نیکی ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ ان دونوں (ماں باپ) کی طرف سے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزے کے ساتھ ان کی طرف سے بھی روزہ رکھے اور اپنے لئے صدقہ دینے کے ساتھ ان کی طرف سے بھی خیرات کرے۔

رواہ ابن ابی شیبۃ

حضرت بریدہ کی حدیث ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ میری ماں پر دو ماہ کے روزے تھے۔ اگر میں اس کی طرف سے روزے رکھوں تو کیا اس کے لئے کافی ہوجائیں گے۔ فرمایا ہاں۔ عورت نے عرض کیا میری ماں نے کبھی حج بھی نہیں کیا تھا۔ کیا میں اگر اس کی طرف سے حج کروں تو کافی ہوجائے گا۔ فرمایا ہاں۔ رواہ مسلم

حضرت عائشہ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص مرجائے اور اس پر روزے (قرض) ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے متفق علیہ

حضرت علی کی مرفوع روایت ہے کہ جو شخص قبرستان کی طرف سے گذرے اور گیارہ مرتبہ قل ہو اللہ احد پڑھ کر مردوں کو بخش دے تو اس کا ثواب تمام مردوں کو ان کی گنتی کے مطابق پہنچ جائے گا۔ رواہ ابو محمد السمرقندی۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں جائے اور سورت الحمد اور قل ہو اللہ احد اور الھٰکم التکاثر پڑھ کر کہے کہ میں نے اس پڑھنے کا ثواب ان قبروں کے مومن مردوں اور عورتوں کو بخشا تو وہ قبروں والے اللہ کے ہاں اس کی شفاعت کریں گے

رواہ ابوالقاسم سعد بن علی

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں جاکر سورۂ یٰسین پڑھے گا اللہ مردوں کے عذاب میں تخفیف کردے گا اور اس کو بھی سب مردوں کی تعداد کے مطابق نیکیاں ملیں گی۔ اخرجہ عبدالعزیز صاحب الخلال

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر کی مرفوع حدیث میں دفن کے وقت قبر کے سرہانے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور بائیں جانب سورۂ بقرہ کی آخری آیات کا پڑھنا آیا ہے اور علاء بن الجلاح کی مرفوع حدیث میں سورہ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات کی قرأت آئی ہے۔

ایک حدیث ہے۔ اِقْرَءُوْا عَلٰی مَوْتٰکُمْ یٰسٓ (اپنے مردوں پر یٰسین پڑھو) قرطبی نے لکھا ہے۔ اس حدیث کا مطلب جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ کسی کے مرنے کے وقت یٰسین پڑھو۔ لیکن ابن عبدالواحد مقدسی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ قبرستان میں جاکر یٰسین پڑھو۔ محب طبری نے کہا دونوں حالتوں میں پڑھو۔

ابن ابی شیبہ نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد (اس کی طرف سے دوسروں کا) غلام آزاد کرنا حج کرنا اور صدقہ دینا اس (مردہ) کو پہنچتا ہے۔ ابو جعفر کی روایت ہے کہ سیدنا حسین و سیدنا حسن حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد آپ کے لئے باندی غلام آزاد کرتے تھے۔

ابن سعد نے قاسم بن محمد کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے (متوفی) بھائی عبدالرحمٰن کے واسطے ایک غلام آزاد کیا تھا اور آپ کو امید تھی کہ بھائی کو اس کا ثواب ملے گا۔ حافظ شمس الدین بن عبدالواحد نے کہا مسلمان ہمیشہ سے ہر شہر میں جمع ہو کر اپنے مردوں کے لئے قرآن خوانی کرتے چلے آئے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس (قرآن خوانی) پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ خلال نے شعبی کا بیان نقل کیا ہے کہ انصار میں جب کوئی مرجاتا تھا تو اس کی قبر پر آمد و رفت رکھتے اور قرآن پڑھتے تھے۔ احیاء العلوم میں امام احمد بن حنبل کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ جب تم قبرستان میں جاؤ تو سورت فاتحہ اور معوذتین (سورت فلق اور سورت الناس) اور قل ہو اللہ احد پڑھا کرو اور اس کا ثواب قبر والوں کو بخشد یا کرو وہ ثواب ان کو پہنچے گا۔ واللہ اعلم

وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی۔ اور اس کی کوشش آئندہ دیکھی جائے گی۔ یعنی قیامت کے دن مومن کے عمل تولے جائیں گے اور کافروں کے اعمال یوں ہی اکارت جائیں گے۔ کیونکہ اعمال کی بنیاد ایمان ہے اور کافر ایمان سے خالی ہیں یا یوں کہا جائے کہ کافروں کے اچھے اعمال کا بدلا دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے اس لئے وہ زیر غور ہی نہ آئیں گے اور آخرت میں اکارت جائیں گے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے سعیٰ قصد کیا۔ عمل کیا چلا دوڑا پورا ہو گیا اور کمائی کی۔ بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ سعی کے معنی میں تیز چلنا اور عملی کوشش کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اس لغوی تحقیق کی روشنی میں اگر آیت میں سعی کا معنی نیت اور قصد کے لئے جائیں تو احادیث سے آیت کا تعارض نہیں رہے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ آدمی جس نیت سے عمل کرے گا وہی اس کے سامنے آئے گا اور وہی اس کو ملے گا۔ یہی مضمون اس مشہور حدیث کا ہے جو حضرت عمر کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے جس میں فرمایا ہے۔ انما الاعمال بالنیات وان لکل امرء ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبہا او امرأۃ ینکحہا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔ اعمال فقط نیتوں سے وابستہ ہیں۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی وہ نیت کرے گا۔ جس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہوگی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہوگی اور جس کی ہجرت مال حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کے لئے ہوگی اس کی ہجرت اسی مقصد کے لئے مانی جائے گی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہوگی۔ اس تفسیر پر آیت کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ ایک کے اچھے عمل سے دوسرے کو فائدہ نہ ہوگا۔ جنازہ کی نماز کا فائدہ میت ہی کو پہنچتا ہے۔ رسول اللہ پر درود پڑھنا واجب ہے اور اس کا فائدہ حضورؐ کے مراتب کی ترقی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک کے عمل سے دوسرے زندہ یا مردہ کو فائدہ نہیں پہنچتا ہاں میت کو یا زندہ کو اسی وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے جب وہ خود ایماندار ہو۔ کافر کو آخرت میں فائدہ نہیں پہنچتا نہ اپنے کئے ہوئے عمل کا نہ دوسروں کے کار خیر کا۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ فائدہ اندوزی کی بنیاد خود انسان کی اپنی فکری کاوش کی درستی اور عقیدہ کی صلاحیت ہے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى پھر اس کو پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔ یعنی مومن کو یا ہر انسان کو اس کی نیت کا یا سعی عمل کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۔ منتہی مصدر ہے بمعنی انتہا۔ اللہ تک انتہا ہونے کا کیا مطلب ہے۔ بغوی نے حضرت ابی بن کعب کی روایت سے بیان کیا کہ آیت وان الی ربك المنتهى کی تشریح میں رسول اللہ نے فرمایا۔ رب میں کوئی غور (جائز) نہیں۔ یعنی اللہ تک پہنچ کر ہر غور ختم ہوجاتا ہے (ذات الٰہی فکر انسانی سے باہر ہے) بغوی نے کہا یہ حدیث اسی مضمون کی طرح ہے جو حضرت ابوہریرہ کی روایت سے مرفوعاً آئی ہے کہ مخلوق میں غور کرو خالق (کی ذات و صفات میں) سوچ وچار نہ کرو کیونکہ تمہارا فکر اس کو محیط نہیں ہوسکتا۔ بقول البغوی ابوالشیخ نے العظمۃ میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا تم ہر چیز میں غور کرو اللہ کی ذات میں غور نہ کرو کیونکہ ساتویں آسمان سے اللہ کی کرسی تک سات ہزار نور (حجاب) ہیں اور اللہ کی ذات ان سب سے بالا ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے۔ خلوق میں غور کرو خالق میں غور نہ کرو۔ تم (اس کی ذات وصفات) کا اندازہ کرنے سے قاصر ہو۔ ابوالشیخ نے حضرت ابوذر کا قول نقل کیا ہے اللہ کی مخلوق میں غور فکر کرو اللہ (ذات وصفات) میں غور نہ کرو۔

تنبیہ خوب سمجھ لو کہ اللہ کی ذات و صفات میں غور ممنوع ہے۔ آثار ذات اور نشانہائے صفات کی سیر ممنوع نہیں بلکہ بصیرت مند ہیں وہ دانشور اہل ایمان جو آثار قدرت وحکمت کو دیکھ کر اپنے ایمان کو پختہ کرتے اور مقام اطمینان تک پہنچتے ہیں۔ یہ بھی خوب سمجھ لو کہ اللہ کی ذات و صفات میں غور کرنے کی ممانعت کا یہ معنی نہیں کہ اللہ کی ذات و صفات تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ عارف کی نظر عرفان کی بلا کیف وکم رسائی صفات تک بلکہ ذات تک ہوتی ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ اہل معرفت بلا کیف صفات اور شیونات اور اعتبارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ سیر ذات خالص پر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔ ذات بلا تعین کی سیر ممکن نہیں۔ اکثر اہل تفسیر نے آیت کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ہر چیز کا رجوع اللہ کی طرف ہے۔ ہر شے کو اسی کی طرف جانا ہے۔ بعض اہل علم نے کہا ہر اُمید و آرزو کا آغاز اللہ ہی سے ہوتا ہے اور ہر اُمید و آرزو کا منتہی بھی اسی کی ذات ہے۔

مقصودِ بیان حضرت ابراہیم وحضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اللہ نے لکھ دیا تھا۔ یہ لفظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیم پر بھی صحیفے نازل ہوئے تھے اور توریت کے علاوہ حضرت موسیٰ پر بھی کچھ صحیفے اتارے گئے تھے۔ الذی وفّٰی حضرت ابراہیم کی صفت بیان کی گئی ہے۔ یوں تو ہر پیغمبر اللہ سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرتا ہی ہے۔ کوئی بھی احکام خداوندی کی تعمیل میں سستی نہیں کرتا لیکن حضرت ابراہیم کو اس خصوصی اعزاز سے نوازنا اور خاص طور پر آپ کی اس صفت کو بیان کرنا بتا رہا ہے کہ آپ نے کچھ خاص بڑے بڑے وعدے اللہ سے کئے تھے جن کو آپ نے پورا کیا۔ وہ وعدے کیا تھے۔ شاید اکلوتے اسمٰعیل کی قربانی۔ آگ میں ڈالے جانے پر بھی کسی فرشتہ کی مدد نہ لینا۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر تبلیغ کے لئے حضرت اسمٰعیل کو حجاز میں چھوڑ دینا اور اُن کا مرکز تبلیغ جزیرہ عرب کو قرار دینا اور حضرت اسحٰق کو شام و اطراف شام میں تبلیغ کی خدمت پر مقرر کرنا اور تیسرے بیٹے کو بحر احمر کے کنارے آباد قبائل کی اصلاح پر مامور کرنا اور اردن کا شرقی غربی علاقہ ان کے سپرد کرکے اور اس طرح تمام اولاد کو اللہ کے واسطے اپنے پاس سے جاکر دینا اور اپنے بھتیجے کو بحر شام کی بستیوں (سدوم وغیرہ) میں بھیجدینا اور سخت بدکیش ظالموں کے نرغہ میں چھوڑ دینے میں تامل نہ کرنا اور اس کے علاوہ دوسری خدمات کو پورا کرنا سب ہی کو یہ لفظ شامل ہے۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ یہ آیت صراحتہً بتا رہی ہے کہ قیامت کے دن کوئی گناہگار دوسرے کا کیا ہوا گناہ اٹھا نہ سکے گا یعنی اس کا گناہ اتار نہ سکے گا۔ حضرت عائشہ نے آیت کو ظاہری مطلق معنی پر ہی محمول کیا ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا تھا کہ مردہ پر جو لوگ روتے ہیں ان کے رونے سے مردے پر عذاب نہیں ہوتا لیکن دوسرے اکابر نے اس آیت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا گناہ اپنے اوپر نہ اٹھا سکے گا یعنی مجرم کے جرم کو اپنے اوپر اٹھائے اور مجرم کو آزاد کرادے یا اس کا بار کم کردے ایسا نہ ہوگا۔ اس آیت سے ماغشٰی تک صحف ابراہیم وموسیٰ کے اندراجات کا اظہار ہے توحید الٰہی اس کا احاطہ علمی اس کی قدرت کی ہمہ گیری۔ وجود قیامت

کا بر حق ہونا انبیاء کے احکام سے سرتابی کرنے والوں کی تباہی عرض مختلف مضامین کا بیان گزشتہ صحیفوں میں کیا گیا تھا۔ اس آیت سے شفاعت کی نفی مستفاد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کوئی سفارش کرنے والا اپنے اوپر مجرم کے گناہ کا برداشت کرنے کا خواہشمند نہ ہوگا بلکہ ہر شفیع مجرم کے گناہ کو معاف کر دینے کی درخواست کرے گا۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى۔ اس آیت سے روشنی پڑتی ہے صرف اس امر پر کہ کسی کی سعی عمل اکارت نہیں جائیگی جو کیا ہے وہ سامنے آئے گا۔ ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل ملے گا۔ اس سے اور اس سے پہلی والی آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ صلوٰۃ جنازہ مغفرت میت دعا ایصال ثواب قرآن خوانی شفاعت صالحین سب کچھ بیکار ہے۔ اس کی تفصیل ہم اوپر کر چکے ہیں۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ یہ آیت بظاہر بتا رہی ہے کہ ہر نفس کی واپسی اللہ کی طرف ہوگی۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس کو خدا کے سامنے نہ جانا پڑے۔ اہل تصوف کی نظر سے آیت کے مقصد پر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ہر فکر کی رسائی حدود امکان سے آگے نہیں۔ ممکن واجب کی حدود میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اللہ کی ذات و صفات پر غور کرنا نہ صرف بے سود ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ وغیرہ

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۙ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ

اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رُلاتا ہے اور یہ کہ وہی مارتا اور جلاتا ہے اور یہ کہ وہی دونوں قسم یعنی نر اور مادہ

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۙ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۪ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ

کو نطفہ سے بناتا ہے جب (رحم میں) ڈالا جاتا ہے اور یہ کہ دوبارہ پیدا کرنا (بعد موت) اس کے ذمہ ہے اور

الْاُخْرٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ۙ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۙ وَاَنَّهٗ

یہ کہ وہی غنی کرتا ہے اور سرمایہ دے کر محفوظ اور باقی رکھتا ہے اور یہ کہ وہی مالک ہے ستارہ شعریٰ کا بھی اور یہ کہ اُسی نے قدیم قوم عاد کو

اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۙ وَثَمُوْدَا فَمَا اَبْقٰى ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ

ہلاک کیا اور ثمود کو بھی کہ (ان میں سے) کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح کو (ہلاک کیا) بے شک وہ سب (اُن کے کفر کی وجہ سے)

كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۭ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۚ

سے بڑھ کر ظالم اور سرکش تھے اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک مارا تھا پھر اُن بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ

سو تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت میں شک (و انکار) کرتا رہے گا یہ (پیغمبر) بھی پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں (ان کو مان لو کیونکہ) وہ جلد آنے والی چیز قریب

الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۭ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ

آ پہنچی ہے کوئی غیر اللہ اس کا ہٹانے والا نہیں سو کیا (ایسے خوف کی باتیں سن کر بھی) تم لوگ اس

تَعْجَبُوْنَ ۙ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۙ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ۝ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝ ع ۳ السجدۃ ۷

کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں ہو اور تم تکبر کرتے ہو سو اللہ کی اطاعت کرو اور (اسکی بلاشرکت) عبادت کرو

تفسیر پیامِ الٰہی نیا نہیں۔ رسولِ الٰہی نیا نہیں۔ کتابِ الٰہی نئی نہیں جو تعلیم قرآن میں دی جارہی ہے وہ نئی نہیں جو قرآن کہتا ہے وہی سابق انبیاء کے صحیفوں کی تعلیم ہے جو رسول اللہ خدا کا پیام سنا رہے ہیں وہی گزشتہ انبیاء نے بتایا عذابِ خدا سے سب پیغمبروں نے ڈرایا محمد رسول اللہ اللہ کی طرف سے نذیر مقرر ہو کر آئے ہیں۔ وہ بھی منکروں اور بدکیش نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں اور کتابوں میں بتایا گیا تھا کہ نطفۂ بےجان سے اللہ کے اندازۂ علمی کے مطابق نر مادہ پیدا کئے گئے۔ پھر خاص مدت تک زندہ رکھنے والا اور اپنے مقرر وقت پر اس زندگی کو منقطع کرنے والا وہی ہے۔ وہی سامانِ راحت و عیش اور اسبابِ عزت و جاہ عطا کر کے ہنساتا ہے۔ وہی ان چیزوں سے محروم رکھ کر یا چھین کر رلاتا ہے دکھ سکھ بیماری تندرستی دولت افلاس سب اسی کی دین ہے جس کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے۔ ایجاد و اسبابِ ایجاد، بقائے وجود اور اسبابِ بقا اسی کے قبضہ میں ہیں۔ پس نقشِ اول کی طرح دوبارہ نقش آفرینی اور پہلی زندگی کی طرح دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا اس کے لئے دشوار نہیں۔ اسی نظریہ کی تبلیغ کے لئے اس نے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں پیغمبر بھی آدمی ہی ہوتے اور صحیفے بھی آدمیوں پر ہی نازل کئے گئے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کسی انسان کو دوسرے انسانوں تک احکامِ خداوندی پہنچانے کے لئے مقرر کرنا ناممکن نہیں بلکہ گزشتہ اقوام میں ان گنت ایسے واقعات ہو چکے ہیں پیغمبر آچکے ہیں۔ اللہ کا پیام سنا چکے ہیں اور نہ ماننے والوں کو اللہ تباہ کر چکا ہے۔ قومِ عاد، قومِ ثمود اور قومِ نوح کا تختہ تاراج کر چکا ہے۔ نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کی نافرمانی اور انکار کا نتیجہ تباہی کی شکل میں نکل چکا ہے۔ پیامِ حق کا مذاق اڑانے والے ہلاک کئے جا چکے ہیں۔ وقت قریب آچکا ہے۔ ابھی موقع ہے غفلت کو چھوڑو اپنے دل اللہ ہی کے سامنے جھکا دو اور اسی کی عبادت کرو۔

تحلیلِ اجزاء وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ یہ بھی سابقہ صحیفوں میں بیان کر دیا گیا تھا کہ اللہ ہی ہنساتا اور اللہ ہی رلاتا ہے عطاء بن ابی مسلم نے تفسیری ترجمہ کیا۔ وہی خوش اور وہی غمگین کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا کہ جنت کے اندر اہلِ جنت کو ہنسائے گا اور دوزخ کے اندر دوزخیوں کو رلائے گا۔ ضحاک نے کہا کہ سبزہ پیدا کر کے وہی زمین کو ہنساتا ہے اور بارش کر کے (گویا) بادل کو رلاتا ہے۔

بغوی نے حضرت جابر بن سمرہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ کے صحابی جب کسی فرودگاہ پر اترتے تھے تو واقعاتِ جاہلیت کا کچھ تذکرہ کرتے اور شعر گا گا کر ہنستے تھے۔ حضور بھی ان کے ساتھ مسکراتے تھے۔ ترمذی کی روایت میں بھی شعر گا کر پڑھنے کا ذکر ہے لیکن مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ باتیں کرتے اور واقعاتِ جاہلیت کا کچھ تذکرہ کرتے اور ہنستے تھے اور حضور بھی مسکرا دیتے تھے۔ شرح السنہ میں بغوی نے قتادہ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر سے دریافت کیا گیا۔ کیا حضور کے صحابی ہنستے تھے۔ فرمایا ہاں۔ اور ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ سے بھی بڑا تھا۔ بخاری نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے۔ ام المومنین نے فرمایا میں نے حضور کو ایسا بھرپور ہنستے نہیں دیکھا کہ حلق کا کوا نظر آجاتا۔ آپ صرف مسکرا دیتے تھے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء کا قول نقل کیا ہے۔ عبداللہ نے فرمایا۔ میں نے کسی کو رسول اللہ سے زیادہ مسکراتے نہیں دیکھا۔

وَاَنَّهٗ اَمَاتَ وَاَحْيَا۔ اور یہ بھی (صحفِ انبیاء میں درج تھا) کہ اللہ ہی مردہ کرتا ہے اور وہی زندگی دیتا ہے۔ لفظ عام ہے بظاہر مراد بھی عام ہے۔ زمین کو مردہ کر دیتا ہے یعنی بے آب و گیاہ بنا دیتا ہے۔ پھر اس کو سرسبزی عطا کر کے زندہ کر دیتا ہے۔ تخم بے جان سے بارآور سرسبز درخت پیدا کر دیتا ہے۔ بے جان نطفہ سے چوپایوں اور انسانوں کو پیدا کرتا اور انڈے سے زندہ بچے نکالتا ہے۔ یا یہ مطلب کہ گمراہ کر کے کافروں کے دلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور مومنوں کو ایمان عطا فرما کر ان کے دلوں کو زندہ بنا دیتا ہے۔

وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى۔ جب نطفہ رحم میں ڈالا جاتا ہے تو وہی نر مادہ دو صنفیں

بنانا اور پیدا کرنا ہے (ضحاک و عطاء بن ابی رباح) یا یہ مطلب ہے کہ حسب اندازہ نطفہ سے نر و مادہ کو بنایا اور پیدا کیا جاتا ہے۔ اَمْنَی الرَّجُلُ۔ رحم میں مرد نے نطفہ ڈالا۔ مَنَیْتُ الشَّیْءَ میں نے اس چیز کا اندازہ کر لیا۔ عربی کے دونوں محاورے ہیں۔ موخر الذکر تشریح زیادہ مناسب ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ الی آخرہ کیا انسان سمجھتا ہے کہ اس کو یونہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ منی کا قطرہ نہ تھا جو (رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے۔ پھر وہ بستہ خون بنا پھر اللہ نے اسے اندازے کے مطابق بنایا اور ٹھیک کیا اور اس سے جوڑے یعنی نر و مادہ پیدا کئے کیا ایسی قدرت والا خدا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَۃَ الْاُخْرٰی۔ اور (حسب وعدہ) اسی کے ذمہ دوبارہ زندہ کرنا ہے (یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا اسی کا کام ہے۔ جیسے اس نے پہلے پیدا کیا ایسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی۔ اور یہ کہ اسی نے مالدار اور نادار کیا۔ اس آیت کے تراجم مختلف اہل تفسیر نے مختلف طور پر کئے ہیں۔ ابن زید نے کہا وہی زیادہ دیتا ہے اور وہی کم دیتا ہے۔ فراء نے کہا۔ وہی رزق کو فراخ اور تنگ کرتا ہے۔ اخفش نے کہا وہی غنی اور فقیر کرتا ہے ضحاک نے کہا اغنی یعنی سونا چاندی اور طرح طرح کا مال دیا اور اقنی یعنی اونٹ گائے بھینس بھیڑ بکریاں عطا کیں۔ مطلب یہ کہ اغنی اور اقنی دونوں کے معنی مال دینے کے ہیں خواہ نقد کی شکل میں ہو، خواہ جنس کی صورت میں، خواہ مویشیوں کی ہیئت میں۔ اول دونوں قسمیں اغناء کی ہیں اور آخری صورت اقناء کی۔

قتادہ اور حسن نے اقنی کا ترجمہ کیا۔ اس نے خادم اور نوکر چاکر دیئے۔ مجاہد اور مقاتل نے اقنی کا ترجمہ کیا۔ اس نے راضی کیا کہ قانع بنا دیا حضرت ابن عباس کا تفسیری قول ایک روایت میں آیا ہے۔ اس نے دیا اور دینے کا حکم دیا۔ واضح ترجمہ جو اکثر مفسرین نے لکھا ہے وہی ہے جو ہم نے کیا ہے اخفش، فراء اور ابن زید کے تراجم کا بھی وہی خلاصہ ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی۔ اور یہ کہ وہی ہے رب شعری کا۔ جوزا کے پیچھے دو ستارے ہیں۔ دونوں کو شعری کہا جاتا ہے ایک کا نام عبور اور دوسرے کا نام غمیصا ہے اور دونوں کے درمیان ایک تیسرا ستارہ ہے جس کو مجرہ کہا جاتا ہے۔ اس جگہ عبور مراد ہے (قاضی ثناء اللہ مؤلف تفسیر مظہری) عرب کا قبیلہ خزاعہ اسی کی پوجا کیا کرتا تھا۔ قبیلۂ خزاعہ کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا جس کو ابو کبشہ کہا جاتا تھا اس شخص نے قریش کی بت پرستی کی مخالفت کی اور عبور کو پوجنے کی رسم جاری کی۔ رسول اللہ صلعم نے جب بت پرستی کی مخالفت کی تو (بت پرستی کو ترک کرنے کی وجہ سے) ابو کبشہ کہنا شروع کر دیا۔ بعض اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے والد عبداللہ کو ابو کبشہ کہا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے مکہ والے رسول اللہ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ شعری خود کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ خود پیدا ہوا۔ نہ اپنی بقا کا مالک ہے۔ نہ خود کسی پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے۔ نہ نفع نقصان اور موت و زندگی اس کے قبضہ میں ہے۔ وہ لات عزیٰ اور منات کی طرح بے بس ہے۔ اللہ ہی نے اس کو بنایا ہے۔ وہی اس کو باقی رکھے ہوئے ہے اور اس کی ہر تاثیر (نور اور حرارت وغیرہ) کا مالک و حاکم ہے پس مستحق معبودیت شعری نہیں بلکہ اللہ ہے۔ وانہ ھو رب الشعری کا عطف چونکہ الا تزر پر ہے اور مذکورہ بالا تمام امور حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں بھی لکھے ہوئے تھے اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ غالباً شعری کی پرستش حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کے زمانہ میں بھی ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم کا عہد تو خصوصیت کے ساتھ ستارہ پرستی کا عہد تھا۔ اسی لئے آپ نے (قوم کے دکھانے کو) ایک نظر ستاروں پر ڈال کر فرمایا تھا۔ انی سقیم۔ واللہ اعلم۔

وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰی۔ اور یہ بھی (صحف سابقہ میں تھا) کہ اللہ نے ہی قوم عاد اولیٰ کو غارت کیا تھا حضرت نوح کی قوم کو غرق کرنے کے بعد عاد اولیٰ کے قبائل کی اصلاح افکار و اعمال کے لئے اللہ نے حضرت ہود کو مبعوث فرمایا۔ قوم نے سرکشی کی حضرت ہود کو اور آپ کے پیام کو ٹھکرا دیا۔ اللہ نے ہوائی طوفان بھیج کر ساری قوم کو تباہ کر دیا۔ سات روز تک بے انتہا آندھی کا زور رہا۔ سب آدمی اور جانور اور سامان ہست و بود فنا ہو گیا۔ بڑے قد آور تھے بڑے طاقتور اور پر جلال تھے۔ دولت بھی فراواں تھی۔ بڑے تمدن اور لوازم تمدن

کے مالک تھے۔ لیکن کوئی نہ بچا۔ حضرت ہود نے ایک لکیر کا حصار اپنے اور اپنے مومن ساتھیوں کے گرد کھینچ لیا تھا۔ طوفانی ہوا اس دائرہ کے پاس نرم اور سست ہو جاتی تھی۔ حضرت کے انہی ساتھیوں کی نسل چلی جو آگے بڑھ کر عادِ ثانیہ یعنی ثمود کہلائی۔

وَثَمُوْدَ فَمَآ اَبْقٰى ۔ اور ثمود کو ہلاک کیا۔ قومِ ثمود بھی بڑی طاقتور اور قوی الجثہ تھی۔ پہاڑوں کے پتھر تراش کر اندر مکان اور کمرے بنا کر رہتی تھی۔ بڑے صنعت کار اور سنگتراش تھے۔ جب حضرت ہود کی تعلیم کو بھلا دیا اور توحید کی جگہ شرک نے لی اور بت پرستی پھیل گئی تو اللہ نے حضرت صالح کو ان کی اصلاح کے لئے بھیجا اور نبوت کا یقین دلانے کے لئے پتھر سے ایک بہت لمبی چوڑی عجیب الخلقت اونٹنی کو بمع بچہ کے نمودار کر دیا۔ قوم نے پھر بھی تکذیب کی اور قیدار نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔ آخر عذاب الٰہی آیا۔ آسمان سے ایک چیخ آئی۔ سب مرے کے مرے رہ گئے۔ جو جہاں تھا وہیں اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ حضرت صالح اپنے مومن ساتھیوں کو لیکر پہلے ہی یمن کی طرف جا چکے اور اور مقام حضرموت میں ان لوگوں نے اپنا بسیرا کر لیا تھا۔

فَمَآ اَبْقٰى کا یہ مطلب ہے کہ ثمودی کافروں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔ یہ مطلب نہیں کہ قومِ ثمود میں سے کوئی باقی نہیں رہا کیونکہ حضرت صالح اور آپ کے ساتھی بھی قومِ ثمود میں سے ہی تھے، جو باقی رہے تھے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۔ اور عاد سے پہلے اللہ نے قومِ نوح کو غارت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قومِ عاد و ثمود سے بھی زیادہ ناحق کوش، بے جا حرکات کرنے والے ظالم اور حد سے بڑھ کر اللہ کے باغی تھے۔ یہ نینوا (عراق) کے رہنے والے تھے۔ ساڑھے نو سو برس حضرت نوح نے ان کو نصیحت کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور روزانہ ہی وہ حضرت کو ایذائیں دیتے اور پتھر مارتے رہے۔ آخر اللہ نے ایک طوفانِ آبی ایسا زمین سے برآمد کیا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں۔ سب ڈوب گئے۔ نام نشان بھی مٹ گیا۔ صرف حضرت نوح اپنے بیاسی ساتھیوں سمیت کشتی میں محفوظ رہے۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ ۔ اور اُلٹی ہوئی بستیوں میں رہنے والوں کو بھی اللہ نے غارت کیا۔ ان سے مراد حضرت لوط کی قوم کی بستیاں ہیں جو بحیرۂ مردار کے کنارے واقع تھیں۔ ان لوگوں کی تعداد چار لاکھ تھی اور پانچ بڑے شہر تھے۔ سب سے بڑی آبادی سدوم کی تھی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے بھتیجے لوط بن ہاران کو بحکمِ الٰہی ان کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ اللہ نے لوط کو پیغمبر بنا دیا۔ قوم والے علاوہ مشرک ہونے کے رہزن بھی تھے اور امرد پرست بھی۔ چند لوگوں کے علاوہ کسی نے حضرت لوط کی نصیحت نہ مانی۔ آخر عذاب کے فرشتے آ گئے اور ساری آبادیوں کو اُلٹ دیا اور اُلٹی ہوئی بستیوں پر اتنے کنکر برسائے کہ ساری زمین کنکروں سے چھپ گئی۔

اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (اوپر اٹھا کر اُلٹ کر) نیچے کو گرا دیا اور پھر نشان زدہ پتھروں کی اتنی بارش کی کہ پتھروں نے زمین کو ڈھانک لیا۔ بڑا عظیم الہیبت عذاب تھا یکدم ساری آبادیوں کا اس طرح اُلٹ جانا کہ پہلے اس قطعۂ زمین کو مع موجوداتِ زمین کے اوپر کو اٹھایا اور پھر اُلٹ کر نیچے کو پھینک دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اوپر سے لاتعداد کنکروں کی بارش بھی کر دی تاکہ جو لوگ ادھر اُدھر رہنے کی وجہ سے بچے رہے ہوں وہ بھی ہلاک ہو جائیں۔ پتھر نشان زدہ تھے۔ اللہ کی طرف سے نشان مقرر کر دیا گیا تھا۔ حضرت لوط اپنے ساتھیوں کو لے کر راتوں رات صبح ہونے سے پہلے ان آبادی سے باہر ہو چکے تھے۔ حضرت قتادہ کا قول ہے جو غریب سند سے ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ ساری آبادیاں تیل، گندھک اور آگ بن کر بھڑک اٹھی تھیں۔ اس قول کی سند خواہ کمزور ہو لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ ساحلِ شام پر اندرونِ زمین تیل ہوگا، گندھک ہوگی، آتش گیر مادہ ہوگا جس میں بحکمِ الٰہی آگ لگ گئی اور ایسی آگ لگی کہ اندرونِ زمین کا لاوا بھڑک کر میلوں اوپر پہنچ گیا اور کنکروں کی شکل میں ہو کر اوپر سے گرا۔ آتش فشاں جوالا مکھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ان ہلاکت آفریں مادی اسباب کے حرکت میں آنے کی وجہ کیا تھی۔ کیا یہ خودرو اور خود مختار مادہ تھا کہ جب چاہا حرکت میں آ گیا۔ ایسا تو نہ تھا۔ مادہ تو بے شعور اور ناقابلِ حس ہے۔ یقیناً یہ غیبی مختارِ کل باعلم و ارادہ طاقت کی کارفرمائی تھی جس نے انسانوں کی بداطواری اور بدکرداری کے سبب بطورِ سزا یہ عذاب نازل کیا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۔ پس (اے انسان) تو اپنے رب کی کس کس نعمت میں شک کرے گا اور کونسی نعمت میں جھگڑا کرے گا۔

بعض کے نزدیک یہ خطاب رسول اللہ کو ہے مگر یہ غلط ہے رسول اللہ کو اپنے رب کی نعمت میں نہ کبھی شک تھا۔ نہ آپ نے اللہ کی طرف سے نعمت حاصل ہونے میں کوئی جھگڑا کیا نہ ایسا ممکن تھا بعض نے کہا۔ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی اور وہی مخاطب بھی ہے لیکن یہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ پس صحیح یہی ہے کہ عام انسان کو خطاب ہے۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے تماری کا ترجمہ کیا تُکَذِّبُ۔ یعنی اپنے رب کی کس کس نعمت کی تکذیب کرے گا۔ سابق امتوں کو بدکیشی اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے ہلاک کر دیا اور اے انسان تمہیں ان کا جانشین بنایا اور علاوہ جسمانی عقلی اور مالی نعمتوں کے اور علاوہ انفسی و آفاقی رحمتوں کے اپنا پیغمبر تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا اور اپنی کتاب نازل کی۔ پھر کیا وجہ کہ تو شک میں نبوت کی صداقت اور کتاب کی حقانیت میں جھگڑے کرتا اور رب کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ۔ (ناقابل شک ہے یہ حقیقت کہ) پہلے پیغمبروں یا پہلی کتابوں کی طرح یہ پیغمبر یا یہ کتاب بھی اللہ کی طرف سے ایک نذیر ہے۔ نافرمانی اور تکذیب کے خسران دنیوی اور عذاب اخروی سے ڈراتی ہے کوئی نئی چیز نہیں۔ یعنی رسول اللہ کی رسالت اور اللہ کی کتاب بھی گزشتہ پیغمبروں کی رسالت اور پچھلی کتابوں کی طرح ہے۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاری جا چکی ہیں۔ دوسری آیت ہے۔ قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول تو ہوں نہیں۔ رسالت مجھ سے شروع نہیں ہوئی۔ دنیا میں مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں۔

أَزِفَتِ الْآزِفَةُ قیامت قریب آگئی۔ اور دوسری آیت ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اگر کسی قوم یا قبیلہ یا آبادی پہ کوئی بلائے ناگہانی آنے والی ہو یا دشمن حملہ کرنے کے لئے قریب آپہنچا ہو اور کوئی شخص دیکھ پائے اور یقینی علم کے بعد قوم والوں کو بروقت آگاہ کر دے اور آنے والی مصیبت سے واقف کر دے تو ایسے شخص کو عربی میں نذیر کہتے ہیں۔ نذیر اپنی سچائی کو ظاہر کرنے کے لئے ننگا بھی ہو جاتا تھا اور ننگا ہو کر قبائل میں گھومتا اور لوگوں کو بیدار کرتا تھا۔ اسی لئے نذیر عریاں اس نذیر کو کہتے تھے جو خود پیش آنے والی مصیبت کو دیکھ کر لوگوں کو وقوعِ مصیبت سے آگاہ کر دیتا تھا۔ ہر پیغمبر آنے والے یقینی عذاب سے اپنی قوم کو ڈراتا رہا ہے اور وقوعِ ہلاکت سے پہلے آگاہی دیتا رہا ہے اس لئے ہر پیغمبر کو نذیر کہا گیا ہے۔ ایک آیت میں آیا ہے۔ إِنِّي نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ میں سامنے آنے والے سخت عذاب سے تم کو ڈرانے والا ہوں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ کلمہ کی اور درمیان کی انگلی ملا کر اشارہ کرتے ہوئے ایک بار رسول اللہ نے فرمایا۔ میری اور قیامت کی مثال ایسی ہے (یعنی میں آخری رسول ہوں جس کی مدتِ رسالت قیامت سے متصل ہے) میری اور قیامت کے دن کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسے کسی قوم نے دیدبانی اور نگرانی کے لئے کسی شخص کو بطور طلایہ بھیجا۔ اس شخص نے دشمن کے لشکر کو بالکل نزدیک کسی کمینگاہ میں پوشیدہ اور چھاپہ مارنے کے لئے تیار دیکھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے پہنچنے اور اطلاع دینے سے پہلے ہی یہ فوج میری قوم پہ حملہ نہ کر دے یہ سوچ کر وہ فوراً ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور وہیں سے کپڑا ہلا ہلا کر قوم والوں کو متنبہ کیا کہ خبردار ہو جاؤ دشمن سر پہ آگیا ہے عنقریب حملہ کرنے والا ہے۔ میں بھی تم کو ایسا ہی ڈرانے والا ہوں۔ اس حدیث کی موید اور بھی متعدد صحیح حدیثیں آئی ہیں۔

لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ۔ اللہ کے سوا اس ساعت کو اور کوئی کھولنے والا نہیں۔ ابن کثیر نے اس آیت کا ترجمہ دو طرح سے کیا ہے۔ (۱) اس کو اللہ کے سوا کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ کوئی اس کو سوائے خدا کے دفع نہیں کر سکتا۔ (۲) اس کے صحیح وقت کی کوئی خبر دینے والا نہیں۔ کسی کو اس کا معین وقت معلوم نہیں۔ عطاء، ضحاک اور قتادہ نے اس کی ہولناکیاں اور شدائد اللہ کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں اللہ ہی اہل ایمان سے شدائدِ قیامت کو دور کرنے والا ہے۔ عام اہل تفسیر نے کاشفہ کا ترجمہ کیا ہے۔ کھولنے والا۔ ظاہر کرنے والا۔ بیان کرنے والا۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ۔ اللہ ہی قیامت کو اس کے مقرر وقت پہ ظاہر کرے گا۔ کوئی اور ظاہر نہیں کر سکتا۔ حدیث جبرئیل میں آیا ہے کہ حضرت جبرئیل نے رسول اللہ سے قیامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا جس سے سوال کیا جاتا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ اس کو نہیں جانتا۔ ہاں میں اس کی کچھ علامات بتاتا ہوں۔ پھر آپ نے علاماتِ قیامت بیان فرمائیں۔ کَاشِفَةٌ۔ اسم فاعل مؤنث ہے نفسٌ موصوف محذوف ہے یا اس میں تاء مبالغہ کی ہے یا عافیت کی طرح یہ مصدر ہے۔

أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ - تو کیا تم اس کلام (یعنی قرآن یا تذکرۂ قیامت) پر تعجب کرتے ہو اور اس کا مذاق بناتے ہو اور (اپنی بداعمالی اور حماقت پر) روتے نہیں یعنی تم بڑے جاہل اور نادان ہو اتنا نہیں سمجھتے کہ اللہ کی طرف سے پیغمبروں اور کتابوں کا آنا کوئی نئی بات نہیں اور اللہ کی توحید الوہیت و ربوبیت بالکل بدیہی ہے جو کسی طرح قابلِ انکار نہیں اور قیامت کا آنا برحق ہے۔ عنقریب اس کا ظہور ہو جائے گا۔ اگرچہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے ظہور کا معین وقت کونسا ہے بلکہ ان باتوں کو سنکر انتہائی نادانی کی وجہ سے تعجب ہوتا ہے اور تم اپنے ظاہری احوال کو دیکھ کر سزا سے غافل رہ کر ہنستے اور رسالت و قرآن کا مذاق اُڑاتے ہو اور اپنے مآل کو سوچ کر آنے والے عذاب پر یقین کر کے روتے نہیں۔

وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ - اور غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ سمود کے معنی ہیں غفلت۔ عرب بولتے ہیں دَعْ مِنَّا سَمُوْدَكَ ۔ ہماری طرف سے اپنی غفلت چھوڑ دو۔ والبی اور عوفی نے حضرت ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا یمنی محاورہ میں سمود کا معنی ہے گانا۔ مشرکوں کا قاعدہ تھا کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ گانے لگتے اور کھیل میں مشغول ہو جاتے۔ ضحاک نے سامدون کا ترجمہ کیا مغرور متکبر اترانے والے۔ مجاہد نے ترجمہ کیا غضبناک ناراض اور اعراض کرنے والے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کی طرف نسبت کرتے ہوئے بیان کیا کہ سامدون کا معنی ہے اپنی بڑائی کا مظاہرہ کرنے والے۔ عرب کہتے ہیں۔ سَمَدَ الْبَعِيْرُ فِيْ مَسِيْرِهٖ اونٹ اپنی چال میں مست ہو کر سر اُٹھائے چل دیا جب رسول اللہ نماز میں مشغول ہوتے تو کفار سر اُٹھائے ناک چڑھائے نکل جاتے۔ اس پر آیت وانتم سامدون نازل ہوئی۔

صاحب نہایہ نے سامدون کا معنی لکھا ہے ناک چڑھانے والے یعنی غرور کا اظہار کرنے والے۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا - پس (جب قیامت قریب ہے اور سزا جزا کا دن سامنے ہے تو پھر) اللہ کے سامنے عاجزی اور خشوع کے ساتھ سجدہ میں گر جاؤ اور اسی کی عبادت کرو (بتوں کی عبادت چھوڑ دو کسی کو سجدہ نہ کرو) یہ آیت سجدہ ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے النجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ (تمام) مسلمانوں نے اور مشرکوں نے اور جن و انس نے سجدہ کیا۔

حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ نے النجم کی تلاوت کی پھر اس میں سجدہ کیا اور جو لوگ بھی اس وقت موجود تھے سب نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ سوائے ایک قریشی بوڑھے کے (کہ اس نے سجدہ نہیں کیا) اس نے ایک مٹھی میں کنکریاں یا خاک لے کر اپنی پیشانی سے لگا لی اور کہا میرے لئے یہی کافی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا میں نے دیکھا کہ آئندہ زمانہ میں وہ کفر کی حالت میں مارا گیا۔ بخاری کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ وہ بوڑھا قریشی امیہ بن خلف تھا۔ بخاری کی تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ سب سے پہلے جو سجدہ والی سورت نازل ہوئی وہ النجم ہے۔ اس میں رسول اللہ صلعم نے سجدہ کیا۔ (الحدیث)

اس کے خلاف حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے میں نے حضور کے سامنے (سورہ) النجم پڑھی اور آپ نے سجدہ نہیں کیا۔ متفق علیہ۔ بعض اہلِ علم نے اس کے جواب میں کہا ہے۔ شاید اس وقت حضور کا وضو نہ ہوگا یا سجدہ سے کوئی امر مانع ہوگا اور حدیث سے مطلق سجدہ کی نفی نہیں ظاہر ہوتی۔ واللہ اعلم

مقصودِ بیان

حضرت ابراہیم و حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں جن عقائد کی تعلیم دی گئی تھی وہ سب مشترک تھے۔ مثلاً اللہ کی وحدانیت کا اظہار یعنی ایک خالقِ کل ایک رب کل اور ایک حاکم کل ہونے کا عقیدہ۔ وجود قیامت کا دلیل ثبوت یعنی معلول یعنی ممکنات و مخلوقات سے علت یعنی خالق کے واحد ہونے کا ثبوت اس بات کی صراحت کہ مالدار و نادار بنانا خدا کے حکم پر موقوف ہے۔ اور موت و زندگی پر بھی اس کے سوا کسی کو اختیار نہیں اور اختیارات و قدرت کی یہ غیر محدودیت دلیل ہے اس امر کی کہ اللہ اس عالم کو تباہ کر کے دوسرا عالم سزا و جزا پیدا کر سکتا ہے۔ ان لا تزر وازرۃ وزر اخری اور یجزی کہنے سے اس بات کا مظاہرہ کہ اعمالِ انسانی غیر فانی ہیں اور بے نتیجہ نہیں ہیں۔ ان کی جزا سزا ضرور ملنی ہے۔ اس لئے قیامت کا آنا ضروری ہے اور ہر ایک کو اس کے کئے کا بدلا ملنا

ہے۔ اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ میں صراحت ہے کہ ساعتِ موعود قریب آگئی ہے لیکن اس کا مقرر وقت کب آئے گا۔ لَیْسَ لَہَا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کَاشِفَۃٌ کہہ کر صراحت کردی کہ اس کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں۔

آخر میں سجدہ اور عبادت کا حکم دے کر اصل عبدیت کے مظاہرہ کی تلقین فرمائی وغیرہ۔

سُوْرَۃُ الْقَمَر

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں تین رکوع اور پچپن آیات ہیں۔ اس سورت میں قربِ قیامت کی نص ہے۔ چاند کے پھٹ جانے کی صراحت ہے۔ گزشتہ اُمتوں کی بربادی اور تباہی کا اجمالی تذکرہ ہے۔ عذابِ آخرت کی ہولناکی کا بیان ہے اور تقریرو تحریر کا پرشوکت اعلان ہے۔ تفسیر آیات کے وقت ہم ہر ایک کی توضیح کریں گے۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کل سورتیں عموماً چھوٹی ہیں جن کے اندر توحید الٰہ اور قیامِ قیامت کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے اور رسول اللہ کی نبوت کو بھی مختلف طور سے ثابت کیا گیا ہے۔ یہی تین بنیادی انقلابی عقائد ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔ ایمان بالنبوت کے ذیل میں ایمان بالکتب آہی جاتا ہے اور رسول اللہ کی رسالت کو مان لینے سے دوسرے تمام انبیاء کی نبوت کو تسلیم کر لینا لازم ہو جاتا ہے۔ اب رہا عقیدۂ قضا و قدر تو ہر مکی سورت میں اس کو نہیں بیان کیا گیا۔ کیونکہ اس کو سمجھنا وقتِ نظر پر موقوف ہے۔ البتہ اس سورت میں علم الٰہی کی ہمہ گیری اور قبل از تخلیقِ عالم ہر چھوٹی بڑی بات کا علمِ الٰہی میں موجود ہونا محکم طور پر بیان کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس جہان کی پیدائش محض اتفاقی اور اضطراری اور خودرو نہیں ہے بلکہ ہر چیز کی تخلیق کا اندازہ پہلے سے اللہ کے علم میں تھا۔ ہر شے بارادۂ الٰہیہ اور باندازۂ خداوندی پیدا ہوئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا

قیامت نزدیک آپہنچی اور چاند شق ہوگیا اور یہ لوگ اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں

وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝

کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے

تفسیر حضرت انس بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ سے اہلِ مکہ نے درخواست کی تھی کہ کوئی بڑی نشانی دکھائیے۔ حضورؐ نے ان کو چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیا (ایک پہاڑ کے اس طرف دوسرا اس طرف) کہ کوہِ حرا دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں دکھائی دینے لگا (اخرجہ الشیخان فی الصحیحین والبغوی)

شیبان نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ حضور نے ان کو دو مرتبہ چاند کا پھٹ جانا دکھایا (بغوی) ترمذی کے الفاظ یہ ہیں۔ مکہ میں چاند دو مرتبہ پھٹا۔ اس پر آیت۔ اس پر آیت اقتربت الساعۃ سے سحر مستمر تک نازل ہوئی۔ شیخین اور حاکم نے حضرت ابن مسعود کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ میں نے مکہ میں دیکھا کہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا اور یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اس پر کافروں نے کہا۔ چاند پر جادو

کردیا گیا۔ اس وقت آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ نازل ہوئی۔ بغوی نے بطریق بخاری بیان کیا کہ رسول اللہ کے زمانے میں چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ایک پہاڑ کے اوپر اور دوسرا پہاڑ کے نیچے۔ رسول اللہ نے (کافروں سے) فرمایا گواہ رہو۔ بغوی نے حضرت عبداللہ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے۔ مکہ میں چاند پھٹ گیا۔ یہ بھی فرمایا چاند پھٹ گیا۔ پھر دونوں ٹکڑے مل کر جڑ گئے۔ (رواہ ابوالضحیٰ عن مسروق)

مسند احمد میں مختلف روایات آئی ہیں جن میں چاند کے پھٹنے کا ذکر ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ سے معجزہ طلب کیا جس پر دو مرتبہ چاند شق ہوگیا جس کا ذکر ان دونوں آیتوں میں ہے۔ بخاری میں ہے انہیں چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھائیے۔ ایک ٹکڑا ایک پہاڑ (ابوقبیس) پر دوسرا دوسرے پہاڑ (قیقعان) پر۔ یہ دیکھنے کے بعد بھی جن کے نصیب میں ایمان نہ تھا۔ وہ کہنے لگے محمد نے ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے۔

مسلم و ترمذی میں بھی اسی مضمون کی متعدد صحیح روایات آئی ہیں۔ ابوداؤد طیالسی نے لکھا ہے کہ چاند کو دو ٹکڑے دیکھ کر مشرکوں نے کہا۔ یہ ابن ابی کبشہ (محمد صلعم) کا جادو ہے لیکن سمجھدار لوگوں نے کہا۔ ان لو ہماری نظر بندی کردی گئی ہے۔ ساری دنیا پر تو جادو نہیں ہوسکتا۔ اب جو لوگ سفر سے آئیں ان سے دریافت کرنا کہ انھوں نے بھی چاند کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھے یا نہیں۔ چنانچہ جب کچھ باہر سے آئے اور ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی چاند پھٹنے کی تصدیق کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے شق قمر کی روایات بیان کی ہیں جن کا کچھ ذکر بیان مذکور بالا میں کر دیا گیا ہے۔ لیکن آپ اس وقت کہاں تھے۔ اس کے متعلق دو روایات آئی ہیں۔ ایک تو یہی کہ آپ نے مکہ میں یہ واقعہ دیکھا تھا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ رسول اللہ اور ہم منا میں تھے کہ یہ واقعہ ہوا۔ حضرت عتبہ بن غزوان نے اپنے خطبہ میں فرمایا (اور بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عتبہ نے اس قول کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی اور فرمایا میں نے رسول اللہ سے سُنا) دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہوچکا۔ یہ پیٹھ پھیرے بھاگی جا رہی ہے جس طرح برتن کے اندر کا کھانا کھا لیا جائے اور کناروں پر کچھ لگا لپٹا رہ جائے۔ اسی طرح دنیا کی عمر کا کل حصہ مکمل ہو چکا برائے نام باقی رہ گیا ہے الخ (مسلم)

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے بیان کیا میں اپنے باپ کے ساتھ مدائن گیا اور شہر سے تین میل کے فاصلہ پر ٹھہرا۔ جمعہ کا دن آیا تو والد کے ساتھ جمعہ کی نماز کو گیا۔ حضرت حذیفہ خطیب تھے اور خطبہ میں آپ نے فرمایا تھا۔ لوگو سنو اللہ کا فرمان ہے قیامت قریب آگئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ بیشک قیامت قریب آچکی ہے۔ بیشک چاند پھٹ گیا۔ بیشک دنیا جدائی کا الارم بجا چکی ہے۔ الخ

قرب قیامت پر دلالت کرنے والی احادیث بکثرت کتب صحاح میں مذکور ہیں۔ بزار نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ سورج کے غروب ہونے کے قریب رسول اللہ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے دنیا کے گزرے ہوئے حصہ اور باقیماندہ حصہ میں وہی نسبت ہے جو اس دن کے گزرے ہوئے وقت اور باقی وقت میں ہے۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے ذکر کیا گیا ہے کہ عصر کے بعد جب سورج بالکل ڈوبنے کے قریب تھا رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا تمہاری عمریں گزشتہ لوگوں کی عمروں کے مقابلہ میں (یعنی تم سب موجود اور آئندہ والے انسانوں کی زندگی کی مجموعی مدت گزشتہ لوگوں کی مجموعی مدتِ حیات کے مقابلہ میں) اتنی ہے جتنا یہ دن کا باقی حصہ گزشتہ حصہ کے مقابلہ میں ہے۔ وغیرہ

احادیث مذکورہ کی روشنی میں آیت کی تفسیر باتفاق مفسرین یہی ہے کہ قیامت قریب ہے اور رسول اللہ کے زمانہ میں آپ کے معجزہ کے ظہور کی صورت میں چاند شق ہوگیا۔ گزشتہ سورت کی آخری آیات میں ازفت الآزفۃ فرمایا اور اس جگہ اقتربت الساعۃ فرمایا۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے

بعض اہل علم معجزۂ شق القمر کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مستقبل میں ہونے والی چیز جب قریب الوقوع اور یقینی ہوتی ہے تو مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کرلیا جاتا ہے۔ پس قیامت کا آنا اور چاند کا پھٹنا بھی چونکہ یقینی اور قریب الوقوع تھا اس لئے انشق القمر فرمادیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو امر ظاہر اور ناقابلِ شک ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے انشق القمر یعنی چاند کی طرح یہ امر واضح ظاہر اور ناقابلِ شک ہے۔ یہ دونوں تاویلیں طبع زاد ہیں اور ایسے لوگوں نے کی ہیں جن کو مادیات میں غیر معمولی معجزانہ انقلاب قابلِ تسلیم نہیں ہوتا اس لئے معجزوں کو اسباب مادیہ کے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی بدنصیبی عقل وحی و نبوت کو مافوق العقل ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتے کہ نفسِ ناطقہ کی ایک حالت وہ بھی ہوتی ہے جبکہ وہ سوتے میں بھی جاگتا ہے اور جاگتے میں بھی کائنات اور انوار و تجلیات کے مشاہدہ میں اتنا غرق ہوتا ہے اور اس کو وہ

ماوراء المادیات طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ جو عقل نارسا کی حدود سے خارج ہوتی ہے اور فلاسفروں کے تاریک فہم کو وہاں تک اڑان کرنے کی کوشش سے سوائے خسران کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

تنقیح مبحث

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ نفسِ نباتی میں شعور و احساس کی طاقت نہیں ہوتی۔ اگر شعور و احساس کی کوئی جھلک کسی نبات میں دیکھی بھی جاسکے تو وہ نبات وہی ہوگا جو سطحِ حیوانیت کے قریب آپہنچا ہوگا۔ گویا نفسِ نباتی کے بھی زینہ بزینہ اَن گنت درجات ہیں۔ ادنیٰ نبات وہ ہے جو جمادی پستی سے ذرا ہی اونچا ہوتا ہے جیسے پتھر کا کوئلہ۔ کوک (بشرطیکہ کوک کو نامی مان لیا جائے) اس پست ترین درجہ سے اونچا دوسرا درجہ ہے اور پھر تیسرا پھر چوتھا پھر پانچواں۔ غرض نبات کی ہر نوع اپنی نباتی خصوصیات طبقہ بالا سے تو کم رہتی ہے اور طبقہ زیریں سے زیادہ اور آخری چوٹی وہ ہوتی ہے جہاں پہنچ کر نبات میں کچھ آثارِ حس و شعور نمودار ہونے لگتے ہیں جیسے درخت کدو یا چھوئی موئی یا مونگا۔ جب نفسِ نباتی اپنی آخری معراج پر پہنچ جاتا ہے تو نفسِ حیوانی کی سرحد شروع ہوتی ہے اور سب سے نچلا حیوان جو قریبِ نبات ہوتا ہے نمودار ہو جاتا ہے۔ خراطین اور دوسرے سمٹنے پھیلنے والے کیڑوں کا شمار اسفل ترین حیوانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس سے اوپر نفسِ حیوانی کا دوسرا درجہ آتا ہے جس کا احساسِ شعور اور حرکتِ ارادی کی قوت نچلے طبقہ سے زیادہ ہوتی ہے اور بتدریج حس، شعور اور ارادی حرکت کی طاقتوں میں ترقی ہوتی ہے نفسِ حیوانی ابھرتا جاتا ہے۔ یہاں تک حیوانیت ترقی کرتی ہے کہ انسانیت کی اونچی سطح کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس کے احساس و شعور پر فہم و دانش کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ وہ اگرچہ مادیات کی جزئی حس سے آگے نہیں بڑھتی مگر یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرواز ماورائے مادیات تک ہے۔ حیوانی شعور کی رسائی حدودِ کلیات میں نہیں ہوتی لیکن عملی طور پر دھوکا ضرور ہوتا ہے کہ اس میں فکر و نظر اور سوچ وچار کی طاقت برسرِ ظہور ہے۔ اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ نبات کی طرح نفسِ حیوانی کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ اور سب سے اونچا وہ نفسِ حیوانی ہے جو سطحِ انسانیت کے قریب پہنچ چکا ہو اور جس کے شعور کی جولانی اور عملی حرکت پر انسانی فکر و نظر کا دھوکہ ہونے لگا ہو۔

نفسِ حیوانی کی چھت پر نفسِ ناطقہ انسانی کا تخت بچھا ہوا ہے۔ ادنیٰ وحشی غیر مہذب جنگلی انسان کا نفسِ ناطقہ سقفِ حیوانیت کے اوپر مسند نشین ہوتا ہے۔ اس کے اندر تنہا حیوانی شعور و احساس اور اندرونی جذبات ہی نہیں ہوتے۔ وہ کسی حد فہمِ عمومی اور ادراکِ کلیات سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے۔ اس میں غور و فکر اور سوچ وچار کی فطری جبلی طاقت ہوتی ہے۔ یہ انسانیت کی نچلی سطح پر ہوتا ہے مگر حیوانیت کی بالائی سطح سے اونچا پھر یہ حیوان نما انسان اوپر اٹھتا ہے۔ نوعِ انسانی ترقی پذیر ہے۔ افراد و اقوام میں نفسِ ناطقہ کی ترقی کے سبب اونچائی کے مرحلے طے کرتی جاتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر نہ فقط اپنی فطری ضروریات کی فراہمی ہوتی ہے بلکہ نوع کی بہبودی کی تلاش بھی اور یونہی اس کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک درجہ ایسا آتا ہے کہ نفسِ ناطقہ وہاں پہنچ کر اپنی جسمانی تربیتِ شخصی اور سوسائٹی کی تنظیم سے تھوڑی دیر کے لئے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ تنظیمِ شخصی و نوعی سے کچھ دیر کے لئے قطع تعلق کر لیتا ہے یا نچلے درجات والے انسانوں کی طرف توجہ کم کرنے لگتا ہے۔ وہ خالص طور پر جزئیاتِ مادیہ سے اپنی توجہ ہٹا کر حقائقِ کلیہ اور غیر مادی کائنات کی طرف رُخ کر لیتا ہے۔ اس وقت عالمِ تجرد کی طرف سے اس پر فیضانِ علمی بھی ہوتا ہے اور کائناتِ مادیہ میں تصرف کرنے کی غیر معمولی طاقت بھی عطا کی جاتی ہے۔ گویا انسانی نفسِ ناطقہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو ہر وقت حیوانیت اور تقاضائے حیوانیت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ کھانا پینا اور صنفی تقاضے پورے کرنا اس کا مقصدِ اصلی ہوتا ہے۔ یہ دوسرے جانوروں کی طرح غذا اور صنفی حاجت روائی کی طرف متوجہ رہنا اور اسی کے حصول کا ہمہ وقت تصور رکھتا ہے۔ اس کے اندر قوتِ فہم ہوتی ہے مگر زنگ آلود چشمِ عقل ہوتی ہے مگر کور۔

دوسری قسم وہ ہے جو مرغوباتِ مادی کا خواہشمند ضرور ہوتا ہے مگر بندۂ ہوس نہیں ہوتا۔ اس کی عقل بہت روشن ہوتی ہے۔ زمین دوز اور فلک سیر ہوتی ہے۔ بحرِ مادیت کی شناور اور تہ نشین غوطہ خور ہوتی ہے۔ مادی تحقیقات کے چمکدار جگمگاتے آبدار موتی انتہائی گہرائی سے نکال کر لاتی ہے۔ بڑے بڑے علمی خزانوں کی مالک ہوتی ہے۔ اسفارِ پارینہ کی حافظ ہوتی ہے لیکن بایں ہمہ علم و حکمت اس کی پروازِ حدود مادیت سے

پار ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اڑتی ہے بہت اونچی اڑتی ہے مگر مادی جزئیات سے کلی حقائق کے استنباط کے اندر محصور رہتی ہے جہاں مجرد از مادہ کائنات کی حد شروع ہوتی ہے وہاں اس کے پر پرواز گر جاتے ہیں وہ مرغ بسمل کی طرح بے قرار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا نور بصیرت کثافت آگیں ہوتا ہے۔ وہ مادی حواس کے اندر بے کیف مجردات کی مرقع کشی کرنی چاہتی ہے اس لئے ان دیکھی بے سمجھی غیر مادی صورتوں کی تصویر کشی اس کو گمراہی کے غار میں پھینک دیتی ہے۔ وجدان قلبی تک اس کا دماغی فہم نہیں پہنچتا اس لئے وجدان روحی کا ہی انکار کر دیتی ہے۔ پھر بھی مادی حقائق کی شکست وریخت اور تحلیل و ترکیب میں اس کو ایک حد تک دخل ہوتا ہے۔ یہ گروہ دانشور فلاسفروں سائنس کے ماہروں اور کامل طبیبوں کا ہوتا ہے جو بال کی کھال اتارتے ہیں۔ ایٹم اولی کا بھی پوست کھینچ لیتے ہیں۔ کائنات کی مخفی مادی طاقتوں کے خزانوں کو بازارِ علم میں لے آتے ہیں۔ لیکن ان تمام علمی پہنائیوں اور فہمی وسعتوں کے وہ کائنات کا فطرت کی طرف سے رُخ نہیں موڑ سکتے۔ سمندروں کا رُخ پھیر سکتے ہیں لیکن ان کی ہستی کو صفحۂ وجود سے مٹا نہیں سکتے۔ زمین کی انتہائی گہرائیوں تک گھس سکتے ہیں لیکن زمین کو حرکت سے روک نہیں سکتے۔ آسمانوں پر چڑھتے ہیں ستاروں اور سیاروں پر گھومتے ہیں، خلاء فضا اور مافوق فضا کی سیر کر سکتے ہیں لیکن کسی سیارے یا ستارے کو اس کی فطری گردش کی ممانعت نہیں کر سکتے۔ اس کی پرتو اندازی اور فضائی اثر اندازی کو نہ بند کر سکتے ہیں، نہ اس میں کمی کر سکتے ہیں۔ اس سنسار کا ذرہ ذرہ جو اپنی مادی تغیرات سے بھرپور زندگی کے ساتھ تنظیم کائنات کا ایک پرزہ بنا ہوا ہے کسی فلاسفر اور سائنسٹ میں ایسی علمی طاقت نہیں کہ اس کو فطری ادائے فرض سے غافل بنا سکے یا سست رو کر سکے۔

تیسرا طبقہ ان حقائق شناس انسانوں کا ہے جن کا اصل مقصد سیر مادی نہیں ہوتا۔ وہ آثار کے مطالعہ پر اپنی علمی نظر کو محصور نہیں رکھتے۔ بلکہ آثار کے اندر اصل مؤثر کو تلاش کرتے ہیں۔ مادہ کی انقباطی کڑیاں اور اسباب و نتائج کی مسلسل وابستگی ان کی رفعت نظر کو بلند پروازی سے نہیں روکتی۔ وہ بے بصر نہیں ہوتے لیکن ان کا مقصد علمی بصر کے جال میں پھنس کر پھڑپھڑانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ بصر کے میدان سے نکل کر بصیرت کی وادی میں دوڑتے ہیں ان کو ہر مادہ اور مادی کے اندر بے کیف تجرد نظر آتا ہے۔ وہ کثیف مادہ کو لطیف بنا کر مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ آثار کو دیکھ کر افعال کی سیر کرتے ہیں اور افعال سے آگے بڑھ کر خطیرۂ صفات میں داخل ہو کر اپنی روحی تشنگی کو بجھانا چاہتے ہیں ان کا علمی سرمایہ محض دماغ نہیں ہوتا بلکہ ان کا بڑا علمی ذخیرہ قلبی اور وجدانی ہوتا ہے۔ دائرہ قدس کے باشندے ان کے پاس آتے ہیں ملاقاتیں کرتے ہیں اور کائنات کے حقائق وانکشاف کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو تخلیقی دائرہ کے اندر بند ہے اور سرگرم عمل ہے قدرِ الٰہی سے باہر نہیں اور تمام مادی اور مجرد مخلوق کی ساری کیفیات اور حالات ایک محیطِ کل غیبی طاقت کی لوح علمی میں ہمیشہ سے منقوش ہیں اور حقائق امکانیہ سوائے علمِ خداوندی کے اور کچھ نہیں۔ انسانوں کا یہ طبقہ عالم ملکوت میں داخل ہوتا ہے اور وہاں کی سیر کرتا ہے مادی کائنات کے اجزا کی تحلیل و ترکیب اس کی علمی نظر میں طفلانہ کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کیونکہ سیر صفات کے وقت کبھی کبھی اس کو مادی کائنات اور مجرد مخلوقات کی فطری رفتار کو روکنے اور بدل لینے پر قدرت عطا کر دی جاتی ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ وہ پرندوں چرندوں اور کنکروں کی آوازوں کو سنتا اور ان کا مطلب سمجھتا ہے۔ کثرت کو قلت اور قلت کو کثرت میں بدل لینے کا کسی وقت اس کو اختیار مل جاتا ہے۔ وہ تنگ بند اور قیاس آرا نہیں ہوتا کہ مادی حدود کے اندر بند ہو کر رہ جائے۔ وہ صاحب مشاہدہ و مقدرت ہوتا ہے کہ کائنات کے کل پرزوں میں باذنِ الٰہی تصرف کر سکتا ہے۔ وہ سورج کو رفتار سے روک سکتا ہے۔ چاند کو دو ٹکڑے کر سکتا ہے آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں کو ماند کر سکتا ہے۔ وہ آن کی آن میں تمام مادی حجابوں کو پھاڑ سکتا ہے اور سارے پردوں کو اٹھا کر عرش قدرت کے گرد گھوم سکتا ہے۔ اور نظر میں خیرگی پیدا کر دینے والے منتہائے امکان کے آس پاس اڑنے والے فدائیانِ نور کو اڑتا دیکھ سکتا ہے۔ وہ قید زمان و مکان سے باہر ہو سکتا ہے۔ اسی مقام کا نام مقام وحی و نبوت ہے۔ اسی کو معجزہ یا کرامت کہا جاتا ہے۔ کور دانش یا بے بصیرت ہے وہ دوسرا طبقہ کا انسان جو اپنی علمی نارسائی اور فہمی تنگ پہنائی کی وجہ سے اپنی عقل سے بالاتر علمی حقیقتوں کا انکار کر دیتا ہے اور عام طور پر چلنے والے ضوابط مادی کو اٹل اور لازوال سمجھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ مادی فطری ضوابط کو بعض اوقات توڑ دینا بھی ... ضابطۂ فطرت ہے۔ بیشک اسباب و نتائج کی باہم وابستگی ایک حقیقت رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسی حقیقت نہیں جس کو بدلا نہ جا سکے۔ اولیاء اور انبیاء کا گروہ

باذنِ الٰہی بعض اوقات اس وابستگی کو کھول سکتا ہے۔ آخر ایک دن ایسا آنا ہے اور عنقریب آنا ہے کہ یہ سارا مادی تسلسل اور ربط مادیات بالکل ٹوٹ جائیگا توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا حملہ اور کامیاب حملہ ہر چیز پر ہوگا سارے کُرے ٹکرا جائیں گے۔ سورج بے نور اور چاند تاریک ہو جائے گا۔ ستاروں اور سیاروں سے ان کی روشنی چھین لی جائے گی۔ پانی آگ بن جائے گا۔ زمین بدل جائے گی۔ آسمان بدل جائے گا۔ ہر چیز کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ پھر کیا استحالہ ہے معجزہ میں جو کسی اعلیٰ طبقہ کے کسی فرد کے ہاتھ سے نمودار ہو جائے۔ یہ گروہ تو ذرہ ذرہ کی آواز سنتا اور سمجھتا ہے ہمیشہ نہیں۔ کبھی کبھی وجدانی حالت میں روحی سیر کے وقت۔ درمیانی طبقہ اجزائے کائنات کی تحلیل ترکیب کر سکتا تھا اور احوال و کیفیاتِ مادیہ کو جان سکتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ تغییر خلقت کرنے پر کسی وقت قدرت رکھتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ اسباب و نتائج کے ربط کی تحلیل اور علت و معلول کے اندر شگاف دوامی اور ابدی نہیں ہوتا۔ اس طرح کے معجزات ہنگامی اور وقتی ہوتے ہیں۔ نہ ہر وقت ان کا ظہور رہتا ہے۔ نہ ان کے اثرات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ قانون سبب و مسبب کی دوامی شکست کا تو آئندہ ایک وقت مقرر ہے جب کہ یہ زنجیر بالکل ہی کھل جائے گی اور ہر کڑی دوسری کڑی سے جدا ہو کر خود بھی پگھل جائے گی اور پھر کبھی یہ زنجیر موجودہ ہیئت کے ساتھ سامنے نہ آئے گی۔ مادیات میں معجزہ کا تصرف آنی ہوتا ہے یا زمانی بھی ہوتا ہے تو ایک مدت خاص تک اس کا اثر رہتا ہے اور زوال اثر کے بعد پھر اسباب و نتائج کی زنجیر کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ حضرت صالح کی اونٹنی کا ظہور ہو یا حضرت نوح کا لایا ہوا طوفان یا حضرت ابراہیم کے لئے آگ کا اپنی تمازت و حرارت کو چھوڑ کر خنک بن جانا یا حضرت داؤد کے ساتھ پہاڑوں کا تسبیح پڑھنا یا حضرت موسیٰ کے عصا کا اژدہا بن جانا یا حضرت عیسیٰ کا لاعلاج بیماروں کو تندرست بنا دینا اور مُردوں کو زندہ کر دینا یا رسول اللہ کے لاتعداد معجزات چاند کا شق کر دینا، کنکریوں کا دستِ مبارک میں تسبیح پڑھنا، درختوں کا بولنا اور معراج برزخی حاصل ہونا یہ سب ہنگامی چیزیں تھیں۔ نہ ہر وقت معراجِ برزخی ہوتی تھی۔ نہ کنکریاں دست مبارک میں ہمیشہ ایسی تسبیح پڑھتی تھیں کہ ان کی آواز سنائی دیتی ہو۔ نہ ستون حنانہ ہر دم گریہ میں مشغول تھا۔ نہ چاند کا شگاف ہمیشہ باقی رہنے والی چیز تھا۔ پھٹا ضرور، پھر جُڑ گیا۔ اور ضابطۂ تخلیق و ربوبیت اپنی رفتار پر پھر چلنے لگا۔ بعض لڑائیوں میں ملکوتی طاقتیں مجسم ہو کر مدد کو آئیں لیکن ہر جنگ میں نہیں۔ جہاد و قتال تو ہمیشہ کے لئے انسانوں کی سعی پیہم سے وابستہ رہا۔

تحلیل اجزاء

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ وہ ساعت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔

گزشتہ رکوع کے آخر میں فرمایا تھا۔ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ۔ قریب آنے والی (ساعت) قریب آگئی۔ ایک اور آیت ہے۔ اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ اللہ کا حکم (یعنی روزِ قیامت) آچکا۔ اس کی طلب میں جلدی کرو۔ دوسری آیت ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ لوگوں کا حساب (یعنی وقت حساب فہمی) قریب آگیا۔ اس کے علاوہ اور متعدد آیات ہیں جن میں قیامت کا قریب آنا بیان کیا گیا ہے۔ بکثرت احادیث میں بھی قربِ قیامت کی صراحت فرمائی ہے۔

بزار نے حضرت انس کا بیان نقل کیا ہے۔ غروب آفتاب کے قریب جب کہ تھوڑا سا سورج ڈوبنے سے باقی تھا۔ حضور اقدس نے صحابہ سے خطاب کیا اور فرمایا اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ دنیا کے گزرے ہوئے حصہ میں اور باقی ماندہ حصہ میں وہی نسبت ہے جو اس دن کے گزرے ہوئے حصہ میں اور باقی ماندہ حصہ میں وہی نسبت ہے جو اس دن کے گزرے ہوئے اور باقی ماندہ حصہ میں ہے۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ عصر کے بعد جب سورج بالکل ڈوبنے کے قریب تھا۔ رسول صلعم نے فرمایا تمہاری (بقاء) زندگی (یعنی اس دنیا کی عمر) گزشتہ لوگوں کی عمروں کے مقابلہ میں اتنی ہی باقی ہے، جتنا دن کے گزرے ہوئے حصہ کے مقابلہ میں دن کا باقی حصہ۔

مسند کی حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور نے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی جوڑ کر (دکھائی اور) فرمایا میں قیامت کے ساتھ اس طرح (متصل) بھیجا گیا ہوں۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں حضورؐ نے فرمایا تم اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہو۔

حضرت عتبہ بن غزوان نے ایک روز اپنے خطبہ میں فرمایا۔ دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہو چکا۔ پیٹھ پھیرے بھاگی جا رہی ہے جس طرح برتن کا کھانا کھایا جائے اور کناروں پر کچھ لگا لپٹا رہ جائے۔ اسی طرح دنیا کی کل عمر کا حصہ نکل چکا۔ صرف برائے نام باقی رہ گیا ہے۔

ابو عبدالرحمٰن سلمی کی روایت ہے کہ مدائن میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت حذیفہ بن یمان نے فرمایا۔ لوگو سنو اللہ کا فرمان ہے کہ قیامت قریب آگئی بیشک

چاند پھٹ گیا، دنیا میدانی کا الارم بجا چکی آج کا دن کوشش اور تیاری کا ہے اور کل تو اپنے اعمال کی وجہ سے) دوڑ بھاگ کر کے آگے بڑھ جانے کا دن ہوگا۔

کچھ عقل زدہ لوگ پہلے بھی کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں کہ چاند کا پھٹنا معتبر روایات سے ثابت نہیں بسماع سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ رہی آیت تو یہ قیامت کے احوال سے متعلق ہے۔ آئندہ یقینی الوقوع امور کی تعبیر صیغۂ ماضی سے کر لی جاتی ہے۔ ازفت الازفة اور اقتربت الساعة میں بھی قرب وقوع کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح انشق القمر میں بھی ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ کیونکہ قیامت کا آنا، ستاروں کا ٹوٹ کر گرنا، چاند کا پھٹنا اور اس سارے عالم میں انقلاب برپا ہونا یقینی ہے اور اتنا یقینی ہے کہ گویا ہو چکا۔

حقیقت میں اس قسم کی تاویلات کا سرچشمہ یہ خیال ہے کہ کائنات سماویہ میں بطور معجزہ بھی کوئی تغیر نہیں ہو سکتا اور ارسطو کے ریزہ چینوں نے آسمانوں اور آسمانی موجودات میں شگاف پڑنے اور پھر جڑ جانے کو بعید از عقل خیال کر لیا۔ حالانکہ یہ سب وہم ہے فہم نہیں، جہل ہے عقل نہیں اول نہ خرق نہ التیام کی جو دلائل قائم کی جاتی ہیں وہ انتہائی کمزور ہیں اور ان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان سے آسمانوں میں خرق و التیام (توڑ جوڑ) کا استحالہ صرف عادی ہے۔ عقلی استحالہ کا ثبوت نہیں اور ظاہر ہے کہ معجزہ نام ہی ایسی عملی اور علمی طاقت کا ہے جو ضابطۂ رواں کو توڑنے والی اور خلاف عادت قدرتِ الٰہیہ کا مظاہرہ کرنے والی ہو۔ اس کے علاوہ وہ نفس جو اپنے بدن کا مدبر ہے اور عناصر مادیہ اور ان کے غذائی مرکبات میں تصرف و تحلیل و تالیف کرتا ہے اور اس کا بدن کے اندر (بر قول فلاسفہ) کوئی مقام نہیں بلکہ ظہور ہے اور مبدء عقل (مبدء فیاض) سے اس کا بالائی تعلق ہے پس اگر اس نفس میں زیادہ تجرد و تقدس ہو جائے تو عقل جائز قرار دیتی ہے کہ عالم بالا میں بھی اس کا تصرف ہو سکے۔ اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں۔

رہا آیت میں ماضی کا مجازی معنی مراد لینا تو گو مستقبل کو قطعی الوقوع یا انتہائی قریب الوقوع ہونے کی وجہ سے بصیغۂ ماضی تعبیر کر لیا جاتا ہے لیکن اس آیت میں ایسا ممکن ہے کیونکہ سیاق آیت بتا رہا ہے کہ کافروں کے سامنے کوئی غیر معمولی خلاف ضابطۂ جاریہ نشانی لائی گئی تھی۔ اور کوئی تعجب آفریں حیرت انگیز معجزہ پیش کیا گیا تھا تب ہی تو انھوں نے اس کو چلتا جادو کہا اور جس طرح حضور کے عام معجزات کو انھوں نے سحر کہا اسی طرح شق قمر کو بھی جادو قرار دیا ورنہ اس جگہ سحر مستمر کہنا بے جا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ انشقاق قمر کی تائید کسی صحیح حدیث سے نہیں ہوتی یہ بھی غلط ہے بسلم، ترمذی اور ابوداؤد طیالسی کی روایت کردہ صحیح احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ احادیث ناقابل انکار ہیں۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ اور اگر کافر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا جادو ہے۔ لفظ مستمر کے ترجمہ میں علمائے تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ مجاہد و قتادہ نے اس کا ترجمہ کیا چلا جانے والا، زائل ہو جانے والا یعنی پائیدار چیز نہیں جادو ہے عنقریب جاتا رہے گا۔ مَرَّ اور اِسْتَمَرَّ کا معنی ہے جاتا رہا چلا گیا۔ ابوالعالیہ اور ضحاک نے ترجمہ کیا۔ قوی سخت یعنی یہ ایسا جادو ہے جو ہر جادو پر غالب ہے۔ مَرَّ الْحَبْلُ رسی مضبوط اور قوی ہو گئی۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ۔ میں نے رسی کو مضبوط بٹ دیا۔ اِسْتَمَرَّ الشَّيْءُ فلاں چیز قوی اور مضبوط ہو گئی۔ بعض نے ترجمہ کیا مسلسل پے در پے پایا جانے والا یعنی چلتا جادو۔ بعض نے ترجمہ کیا ناگوار تلخ۔ اِسْتَمَرَّ الشَّيْءُ وہ چیز سخت کڑوی ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ کافروں کی نظر کوتاہ تھی۔ محسوسات سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اگر کسی انجانی ان دیکھی قوت کے وہ قائل تھے تو کہانت کے یا جادو کے۔ کہانت تو صرف غیبی خبریں بتانے والی یا آئندہ کے متعلق کچھ پیشین گوئیاں کرنے والی طاقت کا نام تھا کسی مؤثر طاقت کا نام نہ تھا اور جادو کو وہ مؤثر اور انقلاب صورت و ماہیت کرنے والی طاقت جانتے تھے اور معجزہ کی طاقت سے وہ واقف نہ تھے نبوت الٰہیہ کا تو ان کو تصور بھی نہ تھا۔ معجزہ کو مؤثر ہونے اور انقلابی شکل دینے اور خارق عادت ہونے کے لحاظ سے جادو سے بظاہر مشابہت تھی اس لئے وہ ہر نشانِ قدرت اور معجزہ کو جادو کہتے تھے اور مؤثر چلتا ہوا قوی شدید جادو کہتے تھے۔

وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ ○ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ

اور ان لوگوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر بات کو قرار آجاتا ہے اور ان لوگوں کے پاس (اقوام ماضیہ کی بھی) خبریں اتنی پہنچ چکی

مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ○ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ○ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ

ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت ہو یعنی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی حاصل ہو سکتی ہے سو (انکی کیفیت یہ ہے کہ) خوف دلانے والی چیزیں انکو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں تو آپ

تفسیر وَكَذَّبُوا اور انھوں نے رسول اللہ اور قرآن اور معجزات کو سچا نہ مانا اور تکذیب کی اور اللہ کے بھیجے ہوئے دستور حیات اور آئین زندگی کو صحیح ماننے اور اس کے مطابق چلنے کی بجائے ۔

وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ - اپنی خواہشات اور میلانِ نفس کے پیچھے پڑ گئے ۔ صرف مرغوباتِ نفس اور خود تراشیدہ رسوم کی پیروی کی اور وحی ربانی سے گریز کیا ۔

وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ - اور ہر امر ٹھہرا ہوا ہے ۔ اپنے وقت پر ہوگا ۔ دنیا کی کامیابی ناکامی ہو یا آخرت کی سعادت و شقاوت بہر حال ہر چیز مقرر ہے یا یہ مطلب ہے کہ ہر چیز مقدر ہے لامحالہ ہو کر رہے گی جس کام کے ہونے کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے وہ ضرور ہو گی ۔ اول معنیٰ کی تائید مقاتل کے اس قول سے ہوتی ہے کہ ہر بات کی ایک انتہا ہے ۔

کلبی نے کہا ہر امر ایک حقیقت ہے ۔ دنیا میں کافروں کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر ہو جائے گا اور آخرت میں اللہ کی طرف سے جو کچھ ہوگا وہ معلوم ہو جائے گا ۔ قتادہ نے کہا ہر امر مستقر ہے خیر یعنی جنت اہلِ خیر کے لئے اور شر یعنی دوزخ اہلِ شر کے لئے طے شدہ ہیں ۔ یا یہ مطلب کہ قیامت کے دن ہر امر واقع ہونے والا ہے ۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تصدیق اور تکذیب کرنے والوں کے اقوال برقرار رہیں گے ۔ یہاں تک کہ وہ ثواب یا عذاب کی شکل میں ان کی حقیقت سامنے آئے گی ۔

وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ - گزشتہ لوگوں کے ان واقعات کا تذکرہ جو دل کو ہلا دینے والے ہیں اور جن کے اندر درسِ عبرت اور تنبیہات موجود ہیں اُن کے پاس آ پہنچا ہے ۔

یعنی قرآن میں کفارِ مکہ کے لئے گزشتہ اقوام یا آخرت کے واقعات کا ایسا تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ جس کے اندر گناہوں اور نافرمانیوں سے بازداشت کا عبرت انگیز پیام ہے ۔ سابق نافرمان امتوں کی تباہی اور ہلاکت اپنے اندر آنے والوں کے لئے درسِ عبرت رکھتی ہے ۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ - اقوامِ ماضیہ پر نافرمانیوں اور پیغمبروں کی مخالفتوں کی وجہ سے جو جو بلائیں نازل ہوئیں اور تباہیاں آئیں ان کے ہدایت آفریں عبرت آگیں تذکرہ میں حکمتِ بالغہ اور موعظتِ کاملہ موجود ہے لیکن ان سرکش کافروں کو فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۔ ان تمام تذکروں اور ڈراووں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی کی بیان کردہ دلیلیں کامل ہیں (فَلِلّٰہِ الحجۃ البالغۃ) اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت یاب کر دیتا لیکن بے ایمانوں کو کسی معجزے کسی نشانِ قدرت کسی خوفناک واقعہ کے ذکر اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے کی نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا (فما تغنی الایات والنذر عن قوم لا یؤمنون)

زمانہ گزرا ہوا ہو یا آنے والا اقوام و ملل اور افراد و اشخاص گزشتہ ہوں یا آئندہ بحیثیت مجموعی ایک مزاج اور ایک بشری طبیعت اور ایک میلان و رجحان رکھتے ہیں ۔ رات بہر حال رات ہی ہے اپنے اندر خصوصی آثار و احوال رکھتی ہے ۔ اب سے دس ہزار برس پہلے کی رات ہو یا دس ہزار برس بعد کی ۔ دن ہر زمانہ میں دن ہی ہے اور ہر دن اپنے اندر دن کی وہی خصوصیات رکھتا ہے جو دوسرا کوئی دن رکھتا ہے ۔ گردشِ لیل و نہار، تبادلۂ فصول اور اختلافِ بہار و خزاں روزِ اول سے یونہی چلا آیا ہے اور اپنی کیفیات کو ساتھ لے کر آ رہا ہے ۔ انسان بھی اپنی فطری طبیعت و سرشت کے زیرِ اثر

خیر پسند واقع ہوا ہے یا شر پسند جو یائے حق یا طلبگارِ باطل، عقل و دانش اور صلاح و عاقبت کا حامل یا وہم و رسم اور رشد و بردباری کی طرف مائل، اختلافِ زمانہ، تفریقِ نسل و وطن اور تفاوتِ رنگ و لسان اس فطری میلان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ہر زمانہ میں ایک گروہ حق کے طلبگاروں کا رہا ہے جو حق پرست تھا۔ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی آواز کو گوشِ ہوش میں جگہ دیتا اور طاعت و قبول کی زبان سے اس پر لبیک کہتا اور اعتقاد و ایمان کے ساتھ اس کی طرف جھکتا رہا ہے اور ایک گروہ اہلِ شر کا تھا جو خود رائے، خود پرست، توہمات کا قیدی، رسوم کے جال میں پھنسا ہوا اور ہر خود غلطی میں مبتلا رہا ہے۔ یہ گروہ باطل کا پجاری، محسوسات کا فدائی اور خواہشاتِ نفسانیہ کا شیفتہ تھا۔

اقوامِ ماضیہ کی کامیابی اور فلاح کے تذکرے ہوں یا ہلاکت و تباہی کے واقعات کا عبرت آگیں بیان دونوں آنے والی قوموں کے دماغوں پر بس اتنا ہی اثر انداز ہوتے ہیں جتنا ان کا فطری میلان ہو۔ خیر پسند لوگوں کا میلان ان واقعات کو سُن کر خیر کی طرف بڑھ جاتا ہے اور شر پسند بہر حال غافل رہتے ہیں۔ ان کا جذبۂ نفرت و عناد اور بیدار ہو جاتا ہے اور سوئی ہوئی شریر طاقتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ ان کو ان عبرت آفریں تذکروں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ہر چند کہ حال ماضی کا آئینہ ہے اور آنے والوں کے لئے گزشتہ اقوام کے حالات کے اندر ایک سبق ہے لیکن طبیعت کی شرارت مانع آتی ہے۔ حجتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے لوگوں کا غم کرنا اور ان سے ہمدردی کرنی بیکار ہے لہٰذا۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۔ آپ ان سے اپنا رُخ پھیر لیجئے۔ اور ان کی سرکشی کی کچھ پرواہ نہ کیجئے۔ ان کو تو عذاب و شقاوت سے ہمکنار ہونا ہی ہے۔ ان کے حق میں اللہ کی یہی حکمتِ بالغہ ہے۔ ان کو کوئی ہدایت پر نہیں لا سکتا۔

مقصودِ بیان (رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں بطور معجزہ) چاند پھٹ چکا۔ (لیکن کوئی محسوس معجزہ دائمی نہیں ہوتا، اس لئے چاند پر اب شگاف کا نشان ہونا ضروری نہیں) کوتاہ بیں لوگ جو حقیقتِ نبوت سے ناواقف ہوتے ہیں معجزہ کو جادو کہتے ہیں۔ شقِ قمر کو بھی انھوں نے جادو کہا۔ منکرینِ نبوت و قرآن خواہشات اور اپنے نفسانی میلانات کے تابع تھے۔ سعادت ہو یا شقاوت، زندگی ہو یا موت، ہدایت ہو یا گمراہی، غرض کوئی حادثہ واقعہ ہو سب کا وقت، مقام، حالات وغیرہ مقرر اور مقدر ہے۔ ہر چیز جو ہونے والی ہے ہو کر رہے گی۔ گزشتہ امم و اقوام کے واقعات کا تذکرہ ضرور نصیحت آفریں اور سبق آموز ہے۔ اس کے اندر بلیغ حکمت اور کامل مصلحت بھی ہے لیکن (جو ازلی کافر اور باطل پرست ہیں اور) حق کی خلاف ورزی جن کی سرشت میں ہے ان کو ان تذکروں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وغیرہ

يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ ۙ خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ

جس روز ایک بُلانے والا فرشتہ (ان کو) ایک ناگوار چیز کی طرف بُلائے گا ان کی آنکھیں (مارے ذلت کے) جھکی ہوئی ہوں گی (اور) قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے

كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۙ مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ

جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے (اور پھر نکل کر) بُلانے والے کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہوں گے کافر کہتے ہوں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

تفسیر اِن آیات میں ابتدائے قیامت کے چند احوال کا مختصر ذکر کیا ہے۔ دوسری زندگی کا آغاز کیسے ہو گا اس کو بیان کیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان کی آمد اور یہاں سے روانگی تو تدریجی اور ترتیبی ہوتی ہے۔ باپ کے بعد بیٹا اس دنیا میں آتا ہے اور بیٹے کے بعد اس کا بیٹا ہوتا ہے۔ یکدم سب انسان اس زمین پر نہیں آتے۔ اسی طرح موت بھی ایک کے بعد دوسرے کو آتی ہے۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ توالد و تناسل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور پھر رفتہ رفتہ نہیں یکدم اللہ کی طرف سے ایک آواز دینے والے کی گونج دار آواز جس کو صور کی آواز کہا جاتا ہے لوگوں کے کانوں میں آئے گی اور سب یکدم مر جائیں گے۔ سارا عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ کل کائناتِ سماوی و ارضی مع ارض و سما کے تباہ ہو جائے گی اور پھر از سر نو اس کی تشکیل و تخلیق ہو گی۔ اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک منادی ندا دے گا۔ اے انسانو! اے تمام وہ لوگو جو مر چکے ہو اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر اٹھو

کھڑے ہو جاؤ۔ مرنے کے بعد ہر آدمی عالم برزخ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کی روح برزخی جسم و شکل میں موجود رہتی ہے۔ اللہ کے منادی کی آواز عالم برزخ میں پہنچ جائے گی اور سارے انسان کافر ہو یا مومن آواز کو سن کر فوراً دوڑ پڑیں گے۔ اللہ ان کو پھر مادی جسمانی لباس عطا کرے گا اور وہ فوراً قبروں سے یعنی عالم برزخ سے باہر آ جائیں گے۔ وہ دن بڑا ہولناک اور ناخوشگوار ہوگا۔ کسی کو مخالفتِ حکم کی مجال نہ ہوگی۔ نہ کوئی تعمیلِ حکم میں دیر کر سکے گا۔ اس ہیبت ناک سخت دشوار دن کو دیکھ کر کافر چیخ پڑیں گے اور کہیں گے یہ بے حد سخت دن ہے۔

تحلیلِ اجزاء

يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ۔ جس روز بلانے والا بلائے گا۔ بلانے والے سے مراد ہے اسرافیل۔ ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ اسرافیل صخرہ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر کہیں گے۔ اے بوسیدہ ہڈیوں اور پارہ پارہ کھالو اور شکستہ بالو اللہ تم کو آخری فیصلہ کے لئے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے۔ (اس روایت سے معلوم ہوا کہ پکارنے والا ہڈیوں، کھالوں اور بالوں کو پکارے گا اور اس کے پکارنے پر سب منتشر اجزاءِ بدن جمع ہو کر جڑ کر کمل جسم بن کر بحکم خداوندی جی اٹھیں گے) لیکن اس پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اسرافیل تو صور پھونکیں گے اور صور کی آواز (ظاہر ہے کہ بلا کلام ہوگی اس میں کسی کو خطاب نہ ہوگا) سے ہی سب جی اٹھیں گے۔ مگر آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ کوئی بلانے والا بلائے گا اس لئے اس دعوت سے نفخۂ بعث مراد نہیں ہو سکتا بلکہ بقول ابن کثیر اس سے مراد ہے حساب کے لئے موقف کی طرف بلانا۔ اللہ کا کوئی منادی سب کو موقفِ حساب میں جمع ہونے کے لئے پکارے گا۔ لیکن اسی جگہ یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر بھی فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پکارنے والے کی پکار سنتے ہی لوگ زندہ ہو کر قبروں سے نکل پڑیں گے اور پراگندہ ٹڈی دل کی طرح تیز تیز دوڑتے یا لپکتے ہوئے پکارنے والے کی آواز کی طرف چل دیں گے قبروں سے نکل پڑنے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ دعوت سے مراد نفخۂ بعث ہی ہے اور شَیْءٍ نُکُرٍ سے مراد ہے قیامت۔

میرے نزدیک شیخ ابن کثیر کے قول میں اور اس قول میں تضاد نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صور کی آواز میں دعوتِ اجتماع بھی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خُشَّعًا سے کلام علیحدہ ہو اور دعوت داعی کے علاوہ قبروں سے نکلنے کی حالت کا بیان کیا گیا ہو۔ یعنی نفخۂ بعث سے لوگ جی اٹھیں گے اور قبروں سے نکل پڑیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ منتشر ٹڈی دل لہریں مارتا چلا آ رہا ہے۔ سب کی نظریں جھکی ہوئی خوفزدہ ہوں گی اور ایک پکارنے والا پکارے گا جس کی آواز سن کر سب تیزی کے ساتھ اس کی طرف دوڑتے لپکتے چلے آئیں گے۔ واللہ اعلم

شَیْءٍ نُکُرٍ۔ غیر معمولی سخت اور دشوار چیز۔ جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں دیکھی ہوگی اور تمام لوگوں کے لئے وہ غیر معروف انجانی ہوگی۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ۔ ان کی نظریں نیچی ہوں گی، ڈر رہے ہوں گے۔ یخرجون کے فاعل مضمر سے یہ حال ہے۔ یعنی قبروں سے وہ ایسی حالت میں نکلیں گے کہ ان کی نظریں نیچی ہوں گی۔

اَلْاَجْدَاثِ۔ جمع۔ مراد قبریں۔

كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ۔ کثرت۔ انتشار اور لہریں مارنے میں وہ ٹڈی دل کی طرح ہوں گے۔

یَوْمٌ عَسِرٌ۔ سخت دشوار دن۔

مقصودِ بیان

قیامت کے دن اللہ کی طرف سے کوئی منادی پکارے گا۔ خواہ زندہ ہو جانے اور اٹھنے کی دعوت دے گا یا موقفِ حساب میں جمع ہو جانے کی۔ بہر حال وہ چیز جس کی طرف داعی بلائے گا وہ ہوگی غیر معمولی غیر معروف اور بہت ناگوار۔ پوری آیت بتا رہی ہے کہ بعثِ جسمانی ہوگا اور ایک مقرر دن ہوگا۔ لوگ اجداث (قبور) یعنی عالم برزخ سے نکل کر زندہ مجسم ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ٹڈی دل کی طرح ان کی تعداد بھی ناقابلِ شمار ہوگی اور منتشر بھی ہوں گے۔ بقول الکافرون۔ در پردہ اس سے یہ مضمون مترشح ہو رہا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے وہ دن دشوار نہ ہوگا۔ مومن کے لئے کوئی سختی نہ ہوگی۔ وغیرہ

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا

ان لوگوں سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندے (خاص نوح) کی تکذیب کی اور کہا کہ یہ مجنون ہے اور نوح کو دھمکی دی گئی تو نوح نے اپنے رب سے

رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ ۝ وَفَجَّرْنَا

دعا کی کہ میں درماندہ ہوں سو آپ (ان سے) انتقام لے لیجئے پس ہم نے کثرت سے برسنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین سے چشمے جاری

الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ

کردیئے پھر (آسمان اور زمین کا) پانی اس کام کے (پورا ہونے کے) لئے مل گیا جو (علم الٰہی میں) تجویز ہو چکا تھا اور ہم نے نوح کو تختوں اور میخوں والی کشتی پر

وَدُسُرٍ ۝ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً

جو کہ ہماری نگرانی میں رواں تھی (مع مومنین کے) سوار کیا یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا جس کی بیقدری کی گئی تھی اور ہم نے اس واقعہ کو عبرت کیواسطے

فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا

رہنے دیا کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا ہوا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے

الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝

کے لئے آسان کردیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے

تفسیر حسب دستور قرآنی چند سرکش تباہ شدہ گزشتہ اقوام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قوم نوح، قوم ثمود، قوم لوط، قوم عاد، قوم فرعون کی اپنے پیغمبروں کے حکم سے سرتابی، ان کی عبرت آفریں تباہی کا موجب ہوئی۔ یوں تو کوئی قوم بھی اس روئے زمین پر مرنے اور تباہ ہونے سے محفوظ نہیں رہی۔ قانونِ فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا ناپید ہوگا اور ہر زندہ قوم اپنی مدتِ بقا پوری کرنے کے بعد موت سے ہم آغوش ہوگی۔ لیکن پیغمبروں کی سرکش امتوں کی ہلاکت اگرچہ ضابطۂ فطرت کے زیر اثر ہوئی مگر ایسے اسبابِ غیبی کے باعث ہوئی جن کا ظہور اور وقوع غیر معمولی تھا۔ ہمہ گیر سیلاب کا بے وجہ آنا اور چند مومنوں کو چھوڑ کر سب کافروں کو ہی غرق کر دینا اور مومنوں کا پیغمبر کے فرمان کے مطابق اپنے بچاؤ کا سامان پہلے سے فراہم کر لینا۔

سات روز تک مسلسل ہوا کا طوفان آنا اور اس سے مومنوں کا محفوظ رہنا اور منکرین پیغمبر کا ہلاک ہو جانا۔ غیبی غیر معمولی اونٹنی کا پہاڑ سے برآمد ہونا کافروں کا اس کو قتل کر دینا اور پیغمبر کی ممانعت کی پرواہ نہ کرنا، پھر آسمان و زمین سے ایک چیخ آنا سب کے دل پھٹ جانا اور جہاں تھے وہیں سب کافروں کا مر جانا اور مومنوں کا وقوعِ عذاب سے پہلے ہی بستی کو چھوڑ کر باہر نکل آنا اور اس طرح محفوظ رہنا۔ زمین میں غیر معمولی زلزلہ آنا، زمین کا الٹ جانا، پھر سنگبار ہواؤں کا ان پر کنکر برسانا اور سارے کافروں کا مر جانا اور چند مومنوں کا راتوں رات پہلے ہی سے وہاں سے نکل آنا اور محفوظ ہو جانا۔

ایک عظیم الشان موج کا دریائے نیل میں غرق ہو جانا اور چند مومنوں کا دریا میں گھس پڑنا اور کپڑے بھی تر نہ ہونا اور ان کے لئے پانی کا بارہ خشک

بنا دیا اور مومنوں کا ان راستوں کو طے کرکے پار ہو جانا۔ یہ سب عبرت آفریں سبق آموز واقعات تاریخی ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہلاکت اور غیر معمولی حوادث و اسباب کے ماتحت صرف کافروں کی ہلاکت پھر انہی حوادث و مہلکات سے مومنوں کی حفاظت اور اس طرح حفاظت کہ کوئی ایک مومن بھی اس عمومی ہلاکت کا شکار نہ ہوا اور پہلے سے ہی سب نے پیغمبر کے حکم کے مطابق بچاؤ کا سامان کر لیا اور سب بچ گئے۔ اگر حق و باطل کے تصادم میں حق کا کھلا ہوا غلبہ اور توحید و شرک کے ٹکراؤ کے وقت توحید کا شرک کو تباہ کر دینا اور پیغمبروں کے فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے مقابلے میں فرمانبرداروں کا فتح یاب ہونا اور ہر بلا سے محفوظ رہنا موعظت آفریں سبق آموز پیام خداوندی نہیں تو اور کیا ہے۔ ضابطۂ الٰہی ایک ہے۔ قانونِ فطرت میں زمانی و مکانی اختلاف سے کوئی تفاوت و تغیر نہیں ہوتا۔ انسانی طبیعت اور رفتارِ حیات ایک ہے۔ خیر و شر کی طرف انسانی طبیعت کا ہر زمانہ میں جھکاؤ ایک جیسا ہے۔ پس ماضی کے آئینہ میں حال کا مطالعہ کرنا اور موجود حاضر کے لئے بھی اسی قانون و ضابطہ کا برسرِ عمل آنا جو ماضی کے لئے ظاہر ہو چکا تھا قرینِ قیاس تقاضائے دانش کے موافق اور واجب الیقین ہے۔ مال کی کثرت، افراد کی بہتات، سطوتِ حکومت، اقتدار کی پہنائی اور وسعت ضابطۂ الٰہیہ کو نہیں توڑ سکتی اور کبھی باطل کا حق پر غلبہ نہیں ہو سکتا۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا۔ مکہ کے کافروں سے (بہت پہلے ہزاروں برس) پہلے نوح کی قوم نے نوح کی نبوت اور پیامِ توحید کو جھوٹا سمجھا۔ نوح ہمارے خاص بندے تھے قوم والوں نے ان کی تکذیب کی۔

ساڑھے نو سو برس تکذیب کرتے حضرت نوح بھی برابر اتنی طویل مدت تک ان کو نصیحت کرتے رہے۔ قوم والوں نے کہا نوح اگر تو اپنی ان حرکتوں سے باز نہیں آیا تو پتھر مار مار کر ہم تجھے مار ڈالیں گے اللہ کے خاص بندے نوح پیغمبر نے اللہ کو پکارا اور دعا کی۔ پروردگار میں ان کے مقابلہ میں محض ناتواں اور ضعیف ہوں میں کسی طرح اپنی ہستی کو نہیں سنبھال سکتا۔ نہ تیرے دین کی حفاظت کر سکتا ہوں تو ہی میری مدد فرما۔ اور مجھے ان پر غلبہ عنایت کر۔ نوح کی یہ دعا قبول ہوئی۔ تاریخی بے مثال طوفان بھیج دیا گیا۔ موسلا دھار بارش اوپر سے ایسی مسلسل ہونے لگی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے دروازے کھل گیا اور زمین سے پانی کے چشمے اُبل پڑے۔ زمین کا ہر سوت پھوٹ نکلا۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ درخت ڈوب گئے۔ اونچے محل اور ٹیلے ڈوب گئے۔ یہاں تک کہ بلند ترین پہاڑ ڈوب گئے۔ نہ چرندہ بچا نہ درندہ بچا، نہ مال و اسباب نہ آدمی آدم زاد۔ یہ اللہ کا عذاب تھا۔ طوفان نہ تھا۔ طوفان کی شکل ضرور تھی اور شکل بھی ایسی جس کی مثال نہ کبھی پہلے پیدا ہوئی نہ آئندہ پیدا ہو گی۔ سارا ملک عراق غرق ہو گیا۔ حضرت علی نے فرمایا آسمان کے دہانے کھول دئیے گئے اور پانی موسلا دھار گرنے لگا۔ لیکن اللہ نے اپنے بندے نوح کو (اور ان کے ساتھیوں کو) کشتی پر سوار ہونے کا حکم دے دیا۔ نوح اپنے ساتھیوں سمیت کشتی پر سوار ہو گئے۔ کشتی اللہ کی نگرانی میں تیرنے لگی۔ ہر طرف سے لہروں کے طمانچے اس پر پڑتے تھے مگر وہ اللہ کی حفاظت میں رواں دواں تھی۔ غرض کشتی کو مع سواریوں کے اللہ نے بچا لیا۔ باقی سارا ملک تہ آب ہو گیا۔ اس واقعہ میں اللہ کی قدرت اور نصرتِ حق کی عظیم الشان نشانی موجود ہے۔ قرآن مجید نے یہ قصہ صرف نصیحت اندوزی کے لئے بیان کیا ہے۔ اگر کسی کے پاس گوشِ نصیحت نیوش اور چشمِ عبرت نگاہ اور عقل سبق آموز ہو تو وہ سنے اور عبرت حاصل کرے۔

وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ۔ نوح کو قوم والوں نے پاگل کہا اور اس کو (طرح طرح سے بُرا کہا گیا اور) جھڑکا گیا۔ مجنون جنون رسیدہ یا جن رسیدہ۔ اُزْدُجِرَ کا معنی ہے جھڑکا گیا۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ قوم والوں نے کہا نوح پر کسی جن کی جھڑکی پڑی ہے۔ اسی وجہ سے یہ پاگل ہو گیا ہے۔ جنات کی جھڑکی نے اس کو اوسان باختہ بنا دیا ہے۔ اس مطلب پر وَازْدُجِرَ کا عطف مَجْنُونٌ پر ہو گا۔ اور قوم نوح کا یہ بھی مقولہ ہو گا۔ عام اہلِ تفسیر نے سادہ مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قوم کی طرف سے نوح پر جھڑکیاں پڑتی تھیں اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچا کر وہ لوگ تبلیغ و وعظ سے روکتے اور کہتے تھے۔ اگر تو اپنی اس حرکت سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے عبد بن حمید نے بروایت مجاہد بیان کیا ہے کہ قوم والے نوح کو راستہ میں پکڑ کر آپ کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ آپ بے ہوش ہو کر گر جاتے پھر

جب ہوش آتا تو دعا کرتے اور فرماتے۔ اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے وہ نادان ہے۔ امام احمد نے کتاب الزہد میں بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ۔ اللہ نے نوح کے پاس وحی بھیجی کہ تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ آئندہ قوم کی طرف سے کسی کے ایمان لانے کی امید نہ رکھو۔ آئندہ کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ جو کوئی ایمان لا چکا، لا چکا۔ جب آپ مایوس ہو گئے تو آپ نے دعا کی۔ اے میرے رب میں ضعیف ناتوان ہوں۔ یہ لوگ مجھ پر غالب ہیں تو میری طرف سے انتقام لے اور مجھے غلبہ عنایت فرما۔ اے میرے رب ان کافروں میں تو کسی کو زمین پر بستہ چھوڑ۔ کوئی گھر اور گھر والا زندہ نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو زندہ چھوڑ دے گا تو نہ فقط یہی نہیں بلکہ ان کی نسل جو پیدا ہوگی وہ بھی بدکار کافر ہی ہوگی اور یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہیں گے۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ۔ اللہ نے نوح کی دعا قبول فرمائی۔ آسمان کے دریچے کھول دیئے اور موسلادھار بارش ہونے لگی۔ منہمر کا معنی ہے شدت کے ساتھ برسنے والا۔ روایت میں آیا ہے کہ چالیس روز تک مسلسل شدید بارش ہوتی رہی۔

وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا۔ اور زمین کو پھاڑ کر چشمے ہی چشمے جاری کر دیئے۔ مبالغہ معنی کے لئے اسلوب ادا کو اُلٹ دیا ہے۔ اصل کلام تھا فجرنا عیون الارض۔ ترتیب بدلنے سے یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ ساری زمین کو چشمہائے رواں بنا دیا گیا۔

فَالْتَقَى الْمَاءُ۔ اب آسمان و زمین کا مل ہو گیا۔

عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔ اس حکم کے مطابق جو اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے پانی کی مقدار کا جتنا اندازہ کر لیا تھا کہ زمین سے نکلنے والا پانی اتنا ہوگا اور آسمان سے برسنے والا اتنا۔ اس اندازہ کے مطابق اوپر اور نیچے کا پانی باہم مل گیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس امر کو اللہ نے مقدر کر دیا تھا یعنی قوم نوح کی ہلاکت جو مقدر ہو چکی تھی اس کی بنا پر پانی مل گیا۔

وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا۔ اور نوح کو (مع ان کے ساتھیوں کے) ایک کشتی پر سوار کر دیا جو ہماری حفاظت میں چل رہی تھی اور جس میں جوڑے تختے اور کیلیں لگی ہوئی تھیں۔

جَزَاءً لِمَنْ كَانَ كُفِرَ۔ ان لوگوں کو اللہ نے نوح (کی مخالفت کرنے) کی وجہ سے جن کی ناشکری کی گئی تھی یہ سزا دی یعنی نوح کی ذات اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت تھی جس کی قوم نوح نے ناشکری کی تو اللہ نے اس کو سزا دی یا مطلب ہے کہ نوح کو اچھا بدلہ اور ثواب دینے کے لئے ہم نے کافروں کو غرق کر دیا اور نوح کو ساتھیوں سمیت بچا لیا۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً۔ اس حادثہ کو اللہ نے اپنی قدرت اور انبیاء کی صداقت کا ایک عظیم الشان نشان بنا کر چھوڑ دیا تاکہ آنے والی قومیں اس سے عبرت حاصل کریں۔

قتادہ کے نزدیک تَرَكْنَاهَا میں ھا ضمیر کشتی کی طرف راجع ہے یعنی اس کشتی کو اللہ نے اپنی قدرت کی ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا تاکہ آنے والی قومیں اس کو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ کشتی الجزیرہ کی زمین میں محفوظ کر دی گئی۔ بعض اہل تاریخ نے کہا جودی پہاڑ پر ایک طویل مدت تک وہ باقی رہی یہاں تک کہ امت اسلامیہ میں سے ابتدائی دور کے بعض آدمیوں نے خود اس کو دیکھا۔

فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے۔ مُدَّكِرٍ کا مادہ ذکر ہے۔ اصل میں یہ لفظ (باب افتعال سے) مذتکر تھا۔ حضرت ابن مسعود کی روایت میں مذکر دال کے ساتھ ہی آیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ۔ اوپر کی آیت میں استفہامی رنگ میں نصیحت پذیری کا حکم دیا تھا۔ اس آیت میں استفہامی رنگ میں عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ عذاب اور ڈراوے کی عظمت کو ظاہر کر کے نافرمانوں کے لئے در پردہ وعید عذاب ہے۔ نُذُر فراء کے نزدیک انذار کی طرح مصدر ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کی صفت کلامیہ کا نتیجہ ہے اور تمام صفات خداوندی کی طرح قدیم ہے اور ظاہر ہے کہ ممکن و واجب میں تضاد ہے۔ حادث و قدیم میں منافات ہے۔ انسانوں کی کوئی زبان کسی ملک اور کسی قوم کی ہو اللہ

کی زبان نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ انسانوں کا بنایا ہوا کلام حادث ہے اور اللہ کا کلام قدیم۔ پھر اللہ کے کلام تک انسانی ادراک کی رسائی کیسے ہوسکتی ہے اور اللہ کا کلام انسان کیسے سمجھ سکتا ہے۔ وہ قدیم یہ حادث، وہ واجب یہ ممکن، وہ غیر فانی یہ تغیر پذیر۔ اور جب دونوں کلاموں میں انتہائی منافات ہے تو پھر انسان کی زبان پر اللہ کا کلام کیسے آسکتا ہے اور آدمی خدا کے کلام کو کیسے پڑھ سکتا ہے۔ اس لئے بعض علماء اشتباہ میں پڑ گئے اور کہنے لگے یہ قرآن کی عبارت اگر قدیم ہوتی اور اللہ کی زبان ہوتی تو اس میں واقعات ماضیہ کو ماضی سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ ایک حرف کے بعد دوسرا حرف اور دوسرے کے بعد تیسرا حرف ترتیب وار آدمی کی زبان سے نکلتا ہے۔ یہ علامت تو حدوث کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کلام اور عبادت خدا کی نہیں بلکہ رسول اللہ کی ہے۔ ہاں اس کے معانی الہامی اور خالص وحی ربانی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء کا یہ اشتباہ وہم کی تاریکی کا ظہور ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی حکمت صنعت قدرت اور دوسری صفات کا ظہور اس کائنات انفسی و آفاقی سے ہو رہا ہے۔ اللہ کی صفات قدیم ہیں لازوال ہیں غیر فانی ہیں لیکن ممکنات حادثہ کی شکل میں ان کی نمائش ہو رہی ہے۔ کیا ایسا کہنا ممکن ہے کہ آسمان یا زمین یا کائنات سماوی و ارضی میں سے کوئی چیز یا ہمارے اجسام اور اجسام کی ساری بیرونی اور اندرونی قوتیں اور افعال اختیاری و غیر اختیاری میں سے کوئی بھی اللہ کی مخلوق نہیں کسی مخلوق کی بنائی ہوئی ہے۔ ایسی جرأت تو صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منکر اور انسان کو اپنے افعال کا خالق جانتے ہیں۔ پس جب ہر عمل و قوت اور اندرونی و بیرونی چیزیں اللہ کی صفات کا مظہر ہیں تو اللہ کی صفت کلامیہ قدیم کا بھی ظہور الفاظ و عبارت اور حروف و کلام کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔ قرآن اور دوسری آسمانی کتابیں (خواہ ان کی عبارت معجز ہو یا نہ ہو) اللہ کی صفت کلامیہ کی مظہر ہیں۔ اللہ نے بندوں کی زبان پر اپنا قانون رواں کرنے اور یاد کرنے کے لئے اپنے وصف کلام کو انسانی حروف و مرکبات کے روپ میں ظاہر فرما دیا۔ کلام نفسی کلام لفظی کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ وہ کلام جو کیفیت صوتیہ سے خالی اور ماضی و مستقبل کی بندشوں سے آزاد تھا اس نے انسانوں کے سمجھنے سمجھانے اور نصیحت پذیر ہونے کے لئے صوتی اور لفظی کیفیت اختیار کرلی اور ماضی و مستقبل کے صیغوں کے روپ میں سامنے آگیا۔ پس بلاشبہ یہ قرآن کلام اللہ ہے اس کی عبارت بھی خدا کی ساختہ پرداختہ ہے۔ ہاں کلام اللہ ذکر کی سہولت اور قرأت و تذکر کی غرض سے مقروء (یعنی قرآن) بن گیا ہے۔ اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ قرآن چونکہ اللہ کا کلام نفسی ہے اس لئے قدیم ہے اللہ کی ہر صفت کے قدیم ہونے کی طرح اس کی صفت کلامیہ اور کلام نفسی بھی قدیم ہے لیکن جو ہماری زبانوں پر جاری ہے۔ وہ ترتیب حروف، کیفیت صوتی اور متغیر تلفظات کا محتاج ہے اس لئے کلام اللہ کی ہماری زبانوں پر روانی حادث ہے سوا فرقہ ظاہریہ اور امام احمد کے علماء اہل سنت میں سے کوئی بھی اس مقروء صوتی اور ملفوظ بشری کو قدیم نہیں کہتا۔

تنبیہ ۲ گزشتہ بیان کا حاصل یہ تھا کہ اللہ نے اپنے کلام یعنی قرآن کو بندوں کی یاد کرنے پڑھنے اور سمجھ کر نصیحت پذیر ہونے کی سہولت کے لئے عربی سہل عبارت و الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اصل قرآن یعنی قدیم کلام اللہ تو ناقابل ذکر و تذکر اور ہر انسانی زبان کے حروف و عبارت سے خالی اور تلفظات لسانی سے آزاد تھا لیکن اصل قرآن کو موجودہ معجز عبارت کا لباس پہنا کر نازل کیا گیا تاکہ ذکر و تلفظ اور فہم و تذکر میں آسانی ہو جائے۔

اہل تفسیر نے اس آیت کا مطلب بالکل سادہ اور آسان اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن کے اندر مواعظ ہیں عبرتیں عذاب کی دعیدیں ہیں گزشتہ اقوام و امم کی فرمانبرداری و نافرمانی اور کامیابی و بربادی کے تذکرے ہیں اور یہ سب کچھ آسان عبارت میں نصیحت پذیر بنانے کے لئے اللہ نے کیا ہے۔ تاریخی افسانے بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اصلاح بشری سے تعلق رکھنے والی ہر قسم کی فکری و عملی تعلیم اللہ نے قرآن میں صاف صاف انداز میں بغیر ابہام و ژولیدہ بیانی کے اللہ نے دیدی ہے۔ نہ اس کے اندر رموز و اسرار کی طرف مخفی اشارات ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آسکیں نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اور نہ کاہنوں کی طرح ژولیدہ بیانیاں نہ شاعروں کی طرح خیالی بلند پردازیاں بلکہ یہ ایک موعظت نامہ صاف اور واضح سہل الفہم الفاظ میں ہے، جس کا مقصد ہے پڑھنا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔

لیکن یاد رکھو کہ ارضی فہم رکھنے والے کو وہ قصۂ دانش نہیں ملا جو زمین سے عرش تک چڑھنے والے کو ملا ہے فہم و دانش کا عظیم فرق ہے۔

علمائے صرف و نحو اور واقفانِ معانی و بلاغت جاہلوں کی طرح نہیں ہو سکتے چمکدار منجھے ہوئے صیقل شدہ قلوب اور نورانی روحوں کے فطری الک
ان لوگوں سے بہت زیادہ انکشافاتِ رموز کے حامل ہوتے ہیں جو یا تو بالکل تاریک دل اور ظلمانی روح رکھتے ہیں یا دوسروں سے کرائے پر یا بطور عاریت
لی ہوئی شمعِ علمی کو اپنے دل میں روشن کر لیتے ہیں اور ایک ٹمٹماتا دیا ان کی روحانی تاریکی کو کسی قدر زائل کر دیتا ہے۔ فرمانِ رسالت کس قدر صحیح ہے
کہ قرآن کا ظہر و بطن ہے اس کے عجائبات کی انتہا نہیں، یہ بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس سے ہر شخص کو اس کے فہم کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ ایک وہ
شخص ہے کہ جو صرف قرآنی ترجمہ جانتا ہے اور سادہ مطلب سمجھتا ہے۔ بیشک اس کی نصیحت پذیری اور ابتدائی اصلاح فکری و عملی کے لئے
اتنا کافی ہے اور سادہ مطلب سمجھنے کی اس کو سہولت حاصل ہے لیکن اجتہاد و استنباط فراست اور تعلیل و قیاس کی بارگاہ میں اس کی رسائی
نہیں، بلاغتِ کلام سے وہ واقف نہیں، معارفِ ربانی اور انکشافاتِ روحانی کی حدود میں اس کا داخلہ نہیں۔ وہ صرف سطح بین ہے جو اس کی نجات
کے لئے کافی ہے حقیقت شناس نہیں ہے۔ جہادِ قلبی اور تامل و فور سے بے بہرہ ہے۔ خطیرۃ القدس تک اس کی پرواز نہیں تفقہ اور تدبر
فی القرآن اس کو حاصل نہیں، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں اور ناقابلِ شک الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن فہمی کے مدارج بے انتہا ہیں اور فہمِ قرآنی
ایک زنجیری تسلسل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے۔ قاریِ قرآن جتنا پڑھتا اور سمجھتا ہے اوپر چڑھتا چلا
جاتا ہے یہاں تک کہ ملیک مقتدر کی بارگاہِ قدس تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن خوب سمجھ لو کہ بالائی سطح تک رسائی طفرہ کے ساتھ کود کر نہیں
ہو جاتی بلکہ زینہ بزینہ تدریجی فہم کی ترقی ہوتی ہے۔ ابتدائی زینہ پر قدم رکھنے اور دوسرے زینہ پر چڑھنے سے جو محروم ہے وہ چوٹی پر نہیں
پہنچ سکتا۔ ظاہرِ قرآن اور باطنِ قرآن میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ ظہرِ قرآن ہی بطنِ قرآن تک پہنچاتا ہے۔ فہمِ قرآن میں ترقی کرنے والے کے لئے
نہ ابتدائی زینہ پر قدم رکھنا دشوار ہے نہ زینہ بزینہ مسافتِ راہ طے کرنے کے بعد آخری چوٹی پر پہنچنا دشوار ہے۔ قرآن سب کے لئے سہل
ہے جیسا جس کا فہمی مرتبہ ہے اتنا ہی فہمِ قرآن اس کے لئے آسان ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو اللہ
کی راہ میں کوشش کرتا ہے اللہ خود اس کو اپنی بارگاہ تک پہنچنے کے راستے بتاتا چلا جاتا ہے۔ پس جاہل مومن اس سے اپنا علمی اور
ذکری حصہ لے لیتا ہے اور مومن عارف اپنا حصہ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

تنبیہ ۳ یہاں پر فرمایا کہ نصیحت حاصل کرنے اور یاد رکھنے کے لئے ہم نے قرآن کو آسان کر دیا۔ دوسری آیت میں آیا ہے ہم نے یہ مبارک
کتاب اس لئے نازل کی کہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور عقلمند اس کو یاد رکھیں۔ تیسری آیت ہے۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ
بِلِسَانِكَ الخ ہم نے آپ کی زبان میں اس کو آسان کر دیا۔ ایک اور آیت ہے بلاشبہ یہ ایک یادداشت (نصیحت نامہ) ہے جو چاہے
اس کو یاد رکھے (اور اس سے نصیحت حاصل کرے)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر اللہ اس میں آسانی نہ رکھتا تو مخلوق میں طاقت نہ تھی کہ اللہ
کے کلام کو پڑھ سکے۔ مجاہد نے فرمایا اس کی قرأت و تلاوت اللہ نے آسان کر دی ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے منجملہ دوسری سہولتوں کے
ایک سہولت یہ بھی ہے کہ اس کو سات قرأتوں پر نازل کیا گیا ہے۔

مقصود بیان عَبْدَنَا اضافت اعزاز مضاف کے لئے ہے۔ یعنی ہمارا معزز مقرب بندہ۔ قوم نوح کا لفظ عام ہے۔ قرابت
نسب رکھنے والے بھی اس میں شامل ہیں اور تمام اہل وطن بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں لفظ قوم مختلف
معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ صرف مردوں کو بھی قوم کہا گیا ہے۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ مرد مردوں کا مذاق نہ بنائیں۔ جو لوگ
ایک زبان بولتے ہیں ان کو بھی قوم کہا گیا ہے اور ایک وطن میں رہنے والوں کو بھی اور اس تمام گروہ کو بھی قوم کہا گیا ہے جو کسی پیغمبر کی تبلیغ
کی مخاطب ہو جیسے قوم لوط اور ایک نسل کی مختلف شاخوں کو بھی قوم کہا گیا ہے۔ جیسے قوم عاد قوم ثمود اور ایک مذہب رکھنے والے
اہل ملت پر بھی قوم کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس جگہ شاید نینوا یا کوفہ یا عام عراق کے باشندے مراد ہیں۔
وَقَالُوْا الخ جاہلوں کی خاصیت ہے کہ جب کلام کی حقانیت نہیں سمجھتے اور وہ بات ان کے قومی رسم و رواج اور آبائی تقلید کے خلاف
ہوتی ہے تو اس کے قائل کو پاگل و دیوانہ کہتے ہیں، اور مبلغ حق کو تبلیغ حق سے سختی کے ساتھ روکتے ہیں۔ حضرت نوح کا اپنے رب کو پکارنا اور

مدد کی درخواست کرنا تعلیم رہا ہے کہ اصل کارساز اور حق کا مددگار اللہ ہے۔ سبب ظاہری کوئی بھی نہ ہو پھر بھی اہل معرفت اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور مدد کے طلبگار ہوتے ہیں۔ پس محسوس اسباب موجود نہ ہوں تب بھی اپنے رب کو حق کا مددگار یقین کرکے پکارنا چاہیئے۔ اللہ اپنے نیک متوکل بندوں کی مدد کرتا ہی ہے اور محرک غیبی تباہ کن اسباب ظاہری پیدا کرکے مغرور مادہ پرست طاقتوروں کو تباہ کر دیتا ہے۔

ابواب السّماء۔ آسمان کے دریچے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آسمان میں ایسے دریچے بنے ہوئے ہیں کہ ان سے پانی باہر پھینکا جاتا ہے یہ لفظ بطور مجاز یا بطرز کنایہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سماء سے مراد فلک اصطلاحی بھی نہیں ہے۔ مختلف افلاک سے پانی نہیں برستا بلکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ بادل بصورت آبی نیچے برستا ہے اور چونکہ بادل اوپر ہوتا ہے اور سماء کا معنی بھی بلندی ہے اس لئے سحاب کو سماء کہا جاتا ہے۔

عَلٰٓی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ۔ اس لفظ سے مترشح ہو رہا ہے کہ ہر کام جو دنیا میں ہوتا ہے وہ اللہ کے علمی اندازہ کے مطابق ہوتا ہے۔ تقدیر الٰہی کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔

وَحَمَلْنٰهُ الخ۔ حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو نوح کی بنائی ہوئی کشتی پر سوار کرانا بتا رہا ہے کہ یہ عالم اسباب مسبب ساز اور مدبر اسباب اللہ ہی ہے۔ وہی بندہ کو اسباب کی ساخت اور ان کا استعمال سکھاتا اور پھر سبب سے کام لینے کا حکم دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسباب سازی اور نیز ان اسباب کو استعمال کرنا حکم الٰہی کی تعمیل اور امر خداوندی کے مطابق ہے۔ پس عبرت حاصل کریں۔ وہ نابینا متوکل جو لنگر کو توڑ کر ناخدا سے منہ موڑ کر زندگی کی کشتی چلانا چاہتے ہیں۔ اندھا توکل نابینائی ہے۔ غلط فہمی ہے۔ اسباب دنیاوی سے کام نہ لینا گمراہی ہے۔ نوح جیسے پیغمبر بھی بحکم خدا کشتی سازی اور طوفان سے نجات کے لئے کشتی پر سوار ہونے کے محتاج تھے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً الخ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہلاکت ہو یا نجات باطل کا اقتدار ہو یا حق کا تسلط بہرحال وہ نشان قدرت ہے اور اس کی غرض ہے عبرت اندوزی اور سبق آموزی۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الخ سے معلوم ہو رہا ہے کہ یاد کرنے یا درکھنے، نصیحت قبول کرنے اور اللہ کی الوہیت، ربوبیت کا ذکر کرنے کے لئے ہر شخص کے لئے قرآن آسان ہے۔ ابتدائی درجہ کا فہم تو ہر جاہل کے لئے بھی سہل ہے اور پھر درجہ بدرجہ ترقی حسب فرق مراتب اہل زمان کے لئے آسان ہے۔ ایک درجہ پر فائز ہو جانا خود دوسرے درجہ کی طرف چڑھنا آسان کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِیْ

عاد نے (بھی اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی سو (اس کا قصہ سنو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا ہم نے ان پر ایک تند ہوا بھیجی ایک دائمی نحوست

يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ

کے دن میں وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں سو (دیکھو) کیسا ہوا

عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ع

عذاب اور ڈرانا کیسا (خوفناک) ہوا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

تفسیر حضرت نوح کی قوم کی تباہی کے بعد بہت طویل مدت گزر گئی۔ دور کی رہنمائی کے زمانہ سے جتنی دوری ہوتی جاتی ہے انسانی خواہشات تمام گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت نوح کی کشتی کے ساتھ جو ایماندار لوگ تھے کشتی سے اترنے کے بعد ایک کے بعد ایک مرتا چلا گیا تا آنکہ صرف نسل نوح باقی رہ گئی۔ کچھ وقت کے بعد نسل نوح کی مختلف شاخیں بٹ گئیں۔ پیغام نوح تاریکی میں گم ہو گیا اور یہی گم کردہ راہوں میں سے ایک قوم عاد

کے نام سے مشہور ہوئی جو مشرک ہوئی اور بداعمال بھی۔ اس قوم کو راستہ دکھانے کے لئے اللہ نے اسی قوم کے ایک فرد یعنی حضرت ہود کو مبعوث فرمایا۔ قوم عاد بڑی دراز قامت طاقتور اور طویل العمر تھی۔ تمدن، تجارت اور تعمیر میں فائق تھی۔ حضرت ہود کی نصیحت کو انھوں نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ نتیجہ عذابِ غیبی کے آثار نمودار ہوگئے۔ اللہ کا عذاب ابتدائی طور پر قحط اور خشک سالی کی شکل میں سامنے آیا۔ کچھ لوگ اللہ کو پکارنے کعبہ کو گئے مشرک تھے پھر بھی اللہ کو مانتے تھے۔ دعا کا بظاہر اثر یہ نکلا کہ بادل کا ایک ٹکڑا آسمان پر نمودار ہوا۔ پھر پھیلا بڑھا اور قوم عاد بستیوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ بادل آتا دیکھ کر قومِ عاد کے لوگ بہت خوش ہوئے لیکن وہ بادل ان کے لئے پیامِ ہلاکت تھا۔ ایک ہوائی طوفان اس سے نکلا سات شبانہ روز جاری رہا۔ جو لوگ کعبہ کو دعا کرنے گئے تھے شاید وہ تو بچ گئے باقی ساری قوم مع اہل و عیال اور مویشی و مال کے ہلاک ہوگئی۔ جانور اور آدمی اڑ کر پہاڑوں سے جا ٹکرائے اور پاش پاش ہوگئے۔ حضرت ہود نے اپنے ساتھیوں کو بچا کر کے گرداگرد ایک لکیر کھینچ دی تھی۔ گویا وہ حصن حصین اور فولادی قلعہ تھی۔ کہ اس کے اندر جو ہوا آتی تھی وہ خراماں خراماں نسیم جاں فزا بن کر آتی تھی اور حصار سے باہر طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ اس میں بھی پیغمبر کی نافرمانی اور فرمانبرداری کے اچھے برے نتیجہ اور نجات و ہلاکت کے غیر معمولی ضابطہ شکن قدرت کی کارفرمائی کا اظہار ہے۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ۔ عاد کا نسب کیا تھا۔ یہ قوم کہاں رہتی تھی۔ ان کے پیغمبر کا نام ہود تھا۔ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی جگہ آچکا ہے۔ تکرار بے سود ہے۔ یہاں تو صرف عبرت انگیز نتیجہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا۔ ہم نے ان پر (تکذیب پیغمبر کی سزا کے طور پر) سخت آندھی بھیجی۔ بیشک ہوائیں بھیجنا اور نرم یا تیز کرنا اللہ ہی کا کام ہے جب ہی تو آندھی بھیجنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔

فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ۔ ایک مسلسل نامبارک وقت میں صرصر ٹھنڈی تیز گرجیلی آندھی۔ یوم سے مراد ایک دن نہیں ہے بلکہ وقت مراد ہے۔ کیونکہ سورۃ السجدہ میں فی ایامٍ نحسات آیا ہے چند نامبارک دنوں میں۔ اور سورۃ الحاقہ میں آیا ہے سبع لیال وثمانیۃ ایام۔ سات راتیں اور آٹھ دن۔ مستمر کا معنی ہے مسلسل جاری یا قوی یا تلخ۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آندھی مہینہ کے آخری چارشنبہ کو شروع ہوئی تھی۔ (رواہ البغوی) اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔

نحس یوم کی صفت نہیں۔ کوئی دن نہ فی نفسہٖ نحس ہوتا ہے نہ مبارک۔ اللہ کی نافرمانی اور فرمانبرداری کے اثر سے دن کو منحوس یا مبارک کہا جاتا ہے۔ اللہ کی عبادت کے خصوصی ایام کو مبارک قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عبادت کی وجہ سے ان دونوں کو برکت حاصل ہو جاتی ہے ستاروں کی رفتار اور تعین کو انسان کی شقاوت، وسعادت میں کوئی دخل نہیں اس لئے دنوں کی نحوست کوئی معنی نہیں رکھتی۔

تَنزِعُ النَّاسَ۔ جو لوگوں کو اکھاڑ پھینک رہی تھی۔ مطلب یہ کہ گھروں سے نکال کر باہر لاتی پھر سروں کے بل گراتی اور گردنیں توڑ دیتی تھی۔ بیضاوی نے لکھا ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ لوگ گھاٹیوں اور غاروں میں گھس کر ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے بھی آندھی نے اُن کو نکال باہر کیا۔ بغوی نے لکھا ہے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ قبروں کے اندر سے بھی آندھی نے باہر نکال پھینکا تھا۔

كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ۔ ان کی لاشیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ۔ آیت کی تشریح پہلے گزر چکی۔ قابلِ غور امر اس جگہ یہ ہے کہ قوم نوح کے قصہ میں تو یہ آیت تہدید ایک بار ذکر کی اور قوم عاد کے ذکر میں اس جگہ دو بار اس کا ذکر کیا۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ باعثِ ذکر جدا جدا ہے۔ اول انکار وکفر کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور دوبارہ سزا کے ذکر کے موقع پر۔ یا یوں کہا جائے کہ پہلی بار ذکر کرنے میں دنیاوی بربادی و ہلاکت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری بار ذکر کرنے سے عذابِ آخرت کی وعید دی گئی کیونکہ عاد ہی کے قصہ میں دوسری جگہ دونوں عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔ لِّنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ الخ۔ قوم عاد کی تباہی کا قصہ بھی اپنے اندر درس عبرت مستقل رکھتا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ تباہی صرف نافرمان

قوم نوح ہی کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ نوح کی نسل ہی سے قوم عاد نافرمانی کی وجہ سے اسی ہلاکت سے دوچار ہوئی جس میں قوم نوح مبتلا ہوئی تھی نہ فرق صرف ان اسباب کا تھا جو اللہ نے ہلاکت کے لئے مقرر فرمائے تھے۔ ایک قوم کو پانی میں غرق کیا تو دوسری قوم کو طوفانِ باد سے برباد کیا۔ غرض جسٹر دونوں کی اکھڑ گئی۔ ہر ایک کی تفصیل بجائے خود عبرت آفریں ہے۔

مقصودِ بیان تباہی کسی خاص نافرمان سرکش قوم کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ جو بھی نابکار بدکار قوم ہو وہ اللہ کے غضب کی مستحق ہے۔ نوح کی قوم کی تباہی کے ذکر کے بعد قوم عاد کی ہلاکت کا تذکرہ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئیے برائے نام مسلمانوں کو جن کے اندر حقیقت اسلام کا شائبہ بھی نہیں۔ کیا تعلیم رسول سے سرکشی کرنے والی امت کو زندگی کی بہبودی اور شادابی کا حق ہے۔ کیا اللہ نے ان سے کوئی خاص تعلق کر رکھا ہے جس کی وجہ سے باوجود انتہائی سرکشی اور نافرمانی کے وہ دنیا میں کامران اور آخرت میں فلاح یاب رہے گی۔ قوم نوح کی غرقابی اور قوم عاد کی آندھی سے بربادی ظاہر کر رہی ہے کہ اللہ جس چیز کو ہلاکت کا ذریعہ بنائے بنا سکتا ہے۔ اندر ہر نامزہ رسانی بحکم خداوندی تباہ کن ہو جاتی ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ہلاکت اگرچہ مشیت خداوندی اور حکم الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اللہ کی مشیت انہی فطری اور مصنوعی اسباب سے کام لیتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو بغیر کسی مادی سبب کی استعمال کئے سب کو یکدم فنا کر دے مگر وہ ایسا چاہتا نہیں۔ وغیرہ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ

ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی اور کہنے لگے کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے اور اکیلا ہے اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور

وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا

(بلکہ) جنون میں پڑ جاویں گے کیا ہم سب میں سے (منتخب ہو کر) اسی پر وحی نازل ہوئی ہے (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا اور شیخی باز ہے انکو عنقریب (مرتے ہی) معلوم ہو جاویگا

مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝

کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا ہم اونٹنی کو نکالنے والے ہیں ان کی آزمائش کے لئے سو انکو دیکھتے بھالتے رہنا اور صبر سے بیٹھے رہنا

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ

اور ان لوگوں کو یہ بتلا دینا کہ پانی (کنویں کا) ان میں بانٹ دیا گیا ہے ہر ایک باری پر باری والا حاضر ہوا کرے گا سو انہوں نے اپنے رفیق (قدار) کو بلایا

فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً

سو اس نے (اونٹنی پر) وار کیا اور مار ڈالا سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا ہم نے ان پر ایک ہی نعرہ (فرشتہ کا) مسلط کیا سو وہ (ایسے)

فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے کی باڑ کا چورا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے

تفسیر (۱) توہم پرست نادان ہمیشہ اس ذہنی گمراہی میں مبتلا رہے کہ کوئی انسان اتنا اونچا اٹھ جائے کہ اس کا براہِ راست خدا سے تعلق پیدا

ہو جائے ایسا ہو نہیں سکتا۔ خدا تک انسانوں کے پہنچنے اور انسانوں تک خدا کا پیام پہنچنے کے لئے کتنے ہی ترقی اور تنزل کے زینے طے کرنے ضروری ہیں۔ اول تو انسان کے فطری حواس اور روشن عقل قوانین اصلاحی بنانے کے لئے بہت کافی ہے۔ مشعلِ عقل کی روشنی میں زندگی کی یہ تاریک راہ طے کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر خیر و شر میں امتیاز پیدا کرنے اور صحیح کو غلط سے الگ کرنے کے لئے نوامیسِ الٰہیہ کی ضرورت مان بھی لی جائے تب بھی کسی نورانی مخلوق کو اس کا حامل ہونا چاہیے اور اصلاح بشری کی کفالت کسی فرشتے کو کرنی چاہیے۔ ان کور دانش والوں کو نہیں معلوم کہ خالص نور مجرد سے مادی انسان کو فائدہ کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اگر بالفرض فرشتہ کو رسول بنایا بھی جانا تسلیم کر لیا جائے تو وہ انسانی شکل ہی میں آکر ہدایت کرے گا اور جب وہ انسانی جامہ میں سب کے سامنے نمودار ہوگا تو انسانوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ وہ فرشتہ ہے۔ وہ خود کتنا ہی کہتا رہے کہ میں مَلکِ مقرب ہوں لیکن اس کے دعوے کو کون تسلیم کرے گا۔ عام لوگ بلکہ بیشتر خواص بھی اس کو انسان ہی قرار دیں گے۔

(۲) بدفہم لوگ کہتے ہیں کہ ہدایتِ انسانی کے لئے کسی انسان کو ہی رسول تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کو ہم ہی میں سے، ہماری جنس، قوم میں سے نہ ہونا، آخر دوسرے ہم قرابت یا ہم وطن لوگوں کو کیا برتری حاصل ہے کہ اس کو رسول مان لیا جائے۔ اس کو یقیناً کسی دوسرے ملک کا دوسرے خاندان کا فرد کامل ہونا چاہیے۔ ہم اپنے بھائی برادر کو جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا اور جس کے باپ دادا سے ہم واقف ہیں اور جو کل تک ہمارے ساتھ کھاتا پیتا اٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا رہا جس کے بشری تقاضوں سے ہم واقف ہیں۔ کوئی بشری تقاضا ایسا نہیں کہ ہم میں ہو اور اس کے اندر نہ ہو۔ ہاں کہیں دور کا کوئی کامل، فاضل، خارق العادت آدمی آجائے جس سے ہم واقف نہ ہوں تو ممکن ہے کہ ہم اس کے کمال ذاتی کو دیکھ کر رسول مان لیں اور اپنا پیشوا بنالیں۔ برابر کے دوست کو کیسے اللہ کا رسول مان لیں۔

(۳) اچھا اگر کوئی ہم میں سے رسول ہو سکتا ہو تو اس کو جتھہ دار ہونا چاہیے جس کے پاس بڑے بڑے قبائل کی طاقت ہو، مال ہو، بڑی عزت ہو، اونچی آبرو ہو، اکیلا بے یار و مددگار نادار نہ ہو۔ یہ ہمارا ساتھی تو تنہا بے یار نادار ہے۔ نہ اس کے پاس مال کی کثرت ہے، نہ جاہ و حشم اور لاؤ لشکر، پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے۔ ہم کو کیوں رسول نہیں بنایا گیا اور اس کو کیوں بنا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے مغرور و خود پسند ہے۔

(۴) ہم صورت جسم میں تو مثلِ دولت شہرت عزت اور وجاہت میں اس سے برتر ہیں۔ ہم میں سے یہ نہیں ہو جائے اور ہم باوجود تمام فضائلِ دنیوی رکھنے کے پیغمبر نہ ہوں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم اس کا اتباع کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے اور پاگل قرار پائیں گے۔ یہ کس قدر دیوانگی کی بات ہے کہ ایک ادنیٰ آدمی کی جو ہم سے کہیں کم درجہ ہے ہم پیروی کرنے لگیں۔

پیغمبر برحق اپنے دعوئے نبوت کو ثابت کرنے اور تسلیم کرانے کے لئے خدا داد معجزوں کا سہارا لیتا ہے۔ کچھ لوگ مرعوب ہو کر اس کو بیدلی سے مان لیتے ہیں لیکن خالص ایمان کم لوگوں کے دلوں میں جگہ پکڑتا ہے اور وہ باوجود لاجواب اور بے بس ہونے کے پیغمبر کے اور پیغمبر کے پیش کئے ہوئے معجزوں کے دشمن ہو جائیں گے یہاں تک کہ قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہی حال عادِ ثانیہ یعنی قوم ثمود کا ہوا جب حضرت صالح نے بحیثیت پیغمبر ان کو اللہ کا پیام سنایا اور نصیحت کی تو قوم والوں نے آپ کی تکذیب کی اور کہنے لگے کیا انسان پیغمبر خدا ہو سکتا ہے اور وہ انسان بھی وہ جو ہم میں سے ہے۔ ہمارا برادر ہے۔ کسی دوسری جگہ سے آیا ہوا نہیں ہے۔ ہمارا ہمیشہ کا ساتھی ہے پھر مزید یہ کہ نادار ہے اکیلا ہے نہ کوئی اس کا ساتھی ہے نہ اس کے پاس متاع اور نوکروں چاکروں کا جتھا ہے اور ہم میں کا بھی ایک معمولی فرد ہے۔ نہ ہمارا سردار ہے، نہ کسی قبیلہ کا سرگروہ، نہ آبرودار نہ مالدار۔

حضرت صالح نے مجبور ہو کر قوم کے مطالبہ پر معجزہ پیش کیا۔ پہاڑ کی چٹان سے ایک عظیم الجثہ اونٹنی برآمد ہو گئی۔ قوم کے سارے مویشی اس کو دیکھ کر ڈر کر بھاگنے لگے۔ پھر پانی بھی بستی میں فراوانی کے ساتھ نہ تھا اور اونٹنی تھی بڑی پرخور۔ سارے مویشیوں کا پانی پی جاتی تھی۔ قوم نے فریاد کی۔ آخر حضرت صالح نے فیصلہ کر دیا کہ ایک دن اونٹنی پانی پئے گی اور ایک دن مویشیوں کو پلایا جائے۔ قوم مجبور تھی۔ خود ہی مطالبہ کیا تھا اور مطالبہ پر اونٹنی پہاڑ سے برآمد ہوئی تھی کچھ کہہ نہ سکتے تھے مگر دلوں میں عداوت اور جلن کی آگ بھڑک رہی تھی آخر

چند آدمیوں نے مشورہ کر کے مل کر اونٹنی کو قتل کر دیا اور قوم والے چونکہ اس فعل پر راضی تھے اس لئے ساری قوم مجرم قرار پائی اور اللہ کا عذاب ایک چیخ کی شکل میں نمودار ہوا۔ آسمان سے ایک دل پھاڑنے والی چیخ آئی اور زمین کے اندر سے بھی دلوں کو دہلانے والی گرج پیدا ہوئی۔ آخر سب مر گئے اور بھوسہ کی طرح ریزہ ریزہ ہو گئے۔ حضرت صالح اپنے مومن ساتھیوں کو لے کر وادی قری سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اور یمن کے ملک حضر موت کے مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ یہ عذاب خدا کی تیسری شکل تھی۔ پہلا عذاب آبی تھا۔ دوسرا ہوائی اور یہ بصورت صیحہ۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ۔ قوم ثمود نے حضرت صالح کے سارے دھمکاووں اور عذاب کی وعیدوں کو جھوٹ سمجھا اور جھوٹا قرار دیا۔ نذر، انذار کی طرح بقول فراء اگرچہ مصدر ہے لیکن عام اہل لغت اس کو نذیر کی جمع بھی کہتے ہیں۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ قوم ثمود نے سارے ڈرانے والے یعنی پیغمبروں کی تکذیب کی اور کسی کو نہیں مانا۔ دنیا کے عقلیت پسندوں میں چند طبعیاتی اصول میں بھی اتفاق رائے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تہذیب اخلاق کے بنیادی امور میں بھی اختلاف ہے۔ وعدہ کی سچائی، کمزوروں کی دستگیری غریب ہمسایوں کی امداد مظلوموں کی فریاد رسی جو اصولی طور پر اچھی سمجھی جاتی ہے۔ لاکھوں دانش زدہ انسان اس استحسان کے بھی مخالف ہیں۔ غرض ابوالطیب متنبی کے لوگوں کا کسی بات پر (عقل کی روشنی میں) اتفاق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ موت پر بھی اتفاق نہیں ہے۔ کچھ لوگ موت کا ہدف صرف جسمانی قوتوں کو کہتے ہیں اور روح کو موت کی زد سے باہر سمجھتے ہیں اور بعض لوگ روح مادی طاقتوں کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں جانتے اور روح کو بھی موت کا شکار قرار دیتے ہیں۔ یہ حال تو عقلیت کے پرستاروں کا ہے لیکن اصحاب وحی نبوت سب کے سب اعتراف توحید ذات وصفات اقرار روز قیامت جنت و دوزخ کی واقعیت وجود ملائکہ پر یقین اور نبوت ورسالت کو تسلیم کرنے پر پوری وضاحت وتفصیل کے ساتھ متفق ہیں۔ ہر ایک تمام جماعت انبیاء کی صداقت کو مانتا ہے۔ اگر اب کوئی شخص یا قوم ایک پیغمبر کو نہ مانے، اس کے لائے ہوئے پیغام رسالت اور پیش کردہ تعلیم کو غلط اور جھوٹا قرار دے تو حقیقت میں وہ سارے پیغمبروں کا مخالف اور تکذیب کنندہ ہو جائے گا۔ قوم ثمود یعنی عاد ثانیہ نے جو بقیہ قوم عاد کی نسل سے تھی حضرت صالح کو جھوٹا قرار دیا۔ اول تو ضرورت نبوت کا ہی انکار کیا پھر خصوصیت کے ساتھ حضرت صالح کی نبوت کا انکار کیا اور آپ کی تکذیب کی۔ غرض یہ کہ سارے انبیاء کے مکذب قرار پائے۔ ایک پیغمبر صادق کی تکذیب کی وجہ سے حقیقت میں تمام انبیاء کے منکر ہو گئے۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۙ۔ قوم ثمود نے قوم صالح کی نبوت کا انکار تین طرح سے کیا۔ (۱) کیا ہم ایک حقیر آدمی کا اتباع کریں یعنی کیا آدمی خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ ہر زمانہ کے کافروں کو آدمی کا رسول ہونا عجیب معلوم ہوتا رہا ہے جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ثمود کو بشر کے پیغمبر ہونے کا انکار تھا اور بشر بھی وہ جس کی کوئی غیر معمولی شخصیت قوم میں نہیں تھی۔ معمولی انسانوں کی طرح چلتا پھرتا کھاتا پیتا اور اٹھتا بیٹھتا تھا۔ (۲) پھر وہ آدمی میں بھی ہم میں سے کوئی اجنبی غیر ملکی فاضل یا بادشاہ نہیں۔ ہمارے ساتھ رہنے والا جس نے ہمارے اندر پرورش پائی اور بڑھ کر جوان ہوا اور اب لگا شیخی مارنے اور ہم پر برتری جتلانے اور خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرنے ہم اس کو کیسے مان لیں۔ (۳) پھر یہ اکیلا ہے نہ اس کے پاس ہمدردوں کا جتھا ہے نہ مریدوں کا جمگھٹ نہ نوکر چاکر ہیں، نہ جاہ وحشم، نہ لاؤ لشکر، یہ کیسا بے کس بے بس نبی ہے۔ ہم اس کو کس طرح سچا مانیں اور کیوں اس کا اتباع کریں۔

اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ۔ ایسی حالت میں اگر ہم اس کے پیچھے چلیں گے اور اس کا اتباع کریں گے تو گمراہی اور پاگل پن میں مبتلا ہو جائیں گے یعنی یہ خود بھی گم کردہ راہ اور پاگل ہے۔ ہم بھی اس کا اتباع کر کے ایسے ہی ہو جائیں گے۔

وہب کے نزدیک سُعُر کا معنی ہے حق سے دُور ہو جانا۔ فراء نے جنون ترجمہ کیا ہے۔ نَاقَةٌ مَّسْعُوْرَةٌ سرگرداں اونٹنی جو سبک سر اور پاگل ہو۔ قتادہ نے ترجمہ کیا دکھ تکلیف۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اس کا معنی ہے عذاب۔ حسن نے کہا شدت عذاب کو سعر کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سُعُر سَعِیر کی جگہ ہے۔ سعیر بھڑکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں۔ گویا ثمود نے حضرت صالح کے قول کی تردید میں یہ بات کہی۔ حضرت صالح نے فرمایا تھا۔ اگر میرا اتباع نہ کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے اور دوزخ کی بھڑکتی آگ میں جا پڑو گے۔ کافروں نے اس کے جواب میں کہا۔ اگر ہم صالح کا اتباع کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے اور آگ میں جا پڑیں گے۔

ءَ اُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا۔ کافروں کا یہ جو تھا اعتراض تھا۔ کہنے لگے۔ ہم میں کیا کوئی بھی نبوت کے قابل نہ تھا۔ اگر ہماری قوم میں سے ہی کسی کو نبی بنایا جانا تھا اور وحی آنی ضروری تھی تو ہم میں سردار بھی ہیں، مالدار بھی ہیں، عزت و جاہ والے بھی ہیں، باوجاہت بھی ہیں، اثر دار بھی ہیں تو کیا سب کو چھوڑ کر اس حقیر فقیر کیلئے نادار انسان کو ہی نبوت کے لئے چھانٹا گیا۔

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ۔ ہرگز نہیں۔ یہ پیغمبر نہیں۔ پکا جھوٹا ہے۔ دروغ تراش اور شیخی خورا ہے۔ یونہی نبی ہونے کی شیخی مارتا ہے۔ ہم پر اپنی برتری قائم کرنے کے لئے مدعی نبوت بن بیٹھا ہے۔

سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ۔ اللہ نے فرمایا۔ عنقریب جب ان پر عذاب نازل ہوگا ان کو معلوم ہو جائے گا کہ پکا دروغ گو اور شیخی خورا کون ہے۔ کیا صالح ایسا ہے۔ یا یہ مغرور اپنی کثرت دولت اور قوت پر اترانے والے، جب کہ ان کا جتھا اور قومی کثرت اور مال کی فراوانی ان کو نازل ہونے والے عذاب سے نہ بچا سکے گی اور صالح اپنی جماعت کے ساتھ محفوظ رہیں گے۔ کلبی کے نزدیک غَدًا سے مراد ہے قیامت کا دن۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ۔ جب قوم والے حضرت نوح سے معجزے کے طلبگار ہوئے اور فرمائش کی کہ اگر تم اس چٹان کے اندر سے سرخ رنگ کی دس ماہہ حاملہ اونٹنی برآمد کر دو گے تو ہم تم کو سچا جان لیں گے اور تمہاری نبوت کو مان لیں گے تو حضرت صالح نے دعا کی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ارشاد فرمایا ہم ان کی مطلوبہ اونٹنی عنقریب بھیجیں گے یعنی چٹان سے برآمد کر دیں گے مگر وہ ان کے لئے ایک امتحان اور آزمائش ہوگی کہ تم دیکھ لو کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا۔

فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ۔ تم انتظار کرو دیکھتے رہو کہ اونٹنی کے ساتھ یہ کیا معاملہ کرتے ہیں اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر رکھو۔ حقیقت میں حق کے راستہ میں پہنچنے والے دکھوں اور اذیتوں پر صبر رکھنا اور راہ حق پر برابر گامزن رہنا اور پائے استقلال میں جنبش نہ آنے دینا ایمان کی پختگی کی علامت ہے اور اصحاب عزیمت کا خصوصی وصف ہے۔ اسی لئے حدیث میں ایمان کے دو حصے بتائے گئے ہیں۔ صبر اور شکر۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ۔ جب اونٹنی چٹان سے برآمد ہوگئی تو وہ بہت لمبی چوڑی ہولناک قامت والی تھی۔ ثمود کے جانور اس کو دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ پھر پانی کا ایک چشمہ تھا۔ سارا پانی اونٹنی پی جاتی تھی قوم کے جانوروں کے لئے کچھ نہیں بچتا تھا۔ لوگ تنگ آگئے۔ اپنی درخواست پر پچھتائے۔ حضرت صالح سے شکایت کی۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ ایک روز اونٹنی پانی پیا کرے گی اور ایک دن تمہارے جانور پئیں۔ لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ۔ اونٹنی اور قوم کے جانوروں کے درمیان حضرت صالح یہ تقسیم کر دی۔

كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ۔ ہر ایک اپنی اپنی باری پر اپنے حصۂ آبی پر جا پہنچے۔ اونٹنی کی باری ہو تو وہ پانی پر جا پہنچے اور جانوروں کی باری ہو تو قوم والے اپنے جانوروں کو لے کر پانی پر حاضر ہو جائیں۔ مجاہد نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ لوگ پانی پر جائیں تو وہ اونٹنی وہاں سے غائب ہو جائے۔ اس طرح لوگ اس روز اس اونٹنی کے دودھ سے محروم ہو جائیں۔ پانی تو مل جائے دودھ نہ ملے اور اونٹنی وہاں آجائے تو دودھ مل جائے پانی نہ ملے بہر حال پینے کی ایک چیز مل جائے۔ آخر لوگ بے انتہا تنگ آگئے اور

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ۔ مشورہ کرنے کے بعد اونٹنی کو مار ڈالنے کے درپے ہوگئے اور اپنے ایک ساتھی یعنی قذار بن سالف کو اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے بلوایا۔ وہ آیا اور اس جرم کا ارتکاب کیا اونٹنی پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ اسی قاتل کو دوسری آیت میں ساری قوم سے زیادہ بدبخت اور شقی فرمایا ہے۔ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْیٰهَا فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ادھر قوم نے مشورہ کرکے ایک بدبخت انسان کو اونٹنی کے قتل پر آمادہ کیا اور وہ قتل پر تیار ہوگیا ادھر پیغمبر برحق نے فرمایا۔ اونٹنی سے تعرض نہ کرنا۔ اس کی باری کے دن اس کو پانی پینے دینا ورنہ عذاب الٰہی آجائے گا۔ قوم والوں نے یقین نہیں کیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اس کو قتل کر دیا۔ آخر اللہ کا عذاب آگیا۔

پوری تفصیل سورۃ ہود میں گزر چکی ہے۔

فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ۔ اب دیکھو میری طرف سے جو نافرمانی کی سزا کی وعیدیں دی گئی تھیں وہ کیسی سچی ثابت ہوئیں اور اس قوم پر کیسا

عذاب آیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً ۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ ہم نے آسمان کی طرف سے ایک چیخ اور زوردار آواز بھیجی اور زمین میں زوردار زلزلہ آیا اور اس سے گڑگڑاہٹ ہوئی۔ ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ پس وہی تمام مادی اسباب کو پیدا کرتا اور پھر حسب مشیت ان کو رواں دواں کرتا ہے۔ اس لئے چیخ کو بھیجنے والا بھی وہی تھا۔

فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ۔ نتیجہ میں وہ سب چورا چور ہو گئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ محتظر باڑ بنانے والا یعنی درندوں سے جانوروں کی حفاظت کے لئے (یا چرندوں سے کھیت کی حفاظت کے لئے) جو شخص کانٹوں کا یا لکڑیوں کا باڑھ لگاتا ہے۔ اس کو محتظر (حظیرہ باڑھ بنانے والا) کہا جاتا ہے اس کے جو ریزے گر پڑتے ہیں اور بکریاں اس کو روند دیتی ہیں وہ ہشیم ہے۔ بعض کے نزدیک ہشیم اس سوکھی گھاس کو کہتے ہیں جو جانور پالنے والے سردی کے موسم میں جانوروں کو کھلانے کے لئے جمع کر رکھتے تھے (یعنی بھوسہ یا پیار) قتادہ نے کہا۔ ہشیم المحتظر سے مراد ہیں بوسیدہ سوختہ ہڈیاں۔ سعید بن جبیر نے کہا۔ کچی دیوار سے جو مٹی (نرنی) جھڑ جاتی ہے وہ ہشیم ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ الخ ۔ قوم ثمود کی تباہی کے قصہ کا مقطع بھی اس آیت کو قرار دیا اور وجہ وہی ہے جو ہم نے قوم عاد کے قصہ کے خاتمے کے موقع پر لکھ دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے یہ قصے بطور افسانہ تفریح کے لئے نہیں بیان کئے۔ نہ پورا قصہ کسی ایک جگہ بطور تاریخ نقل کیا کیونکہ قرآن کے پیش نظر نہ افسانہ گوئی ہے نہ بیان تاریخ بلکہ نصیحت آفرینی اور عبرت دلانی مقصود ہے اسی لئے سادہ الفاظ میں حسب ضرورت خطابی مختصر قصہ بیان کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے سبق حاصل کریں۔

مقصودِ بیان

ایک پیغمبر کی تکذیب سب انبیاء کی تکذیب ہے۔ جاہل ہر زمانہ میں توہم پرست ہوتا ہے اور انسان کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کرتا ہے۔ نادانوں کے نزدیک معیار حق کسی مدعی ہدایت کے مریدوں کی کثرت ہوتی ہے۔ جاہل کی نظر میں آدمی کی صرف جسمانیت اور شکل کی یکسانیت مرتبہ کی مساوات کے لئے کافی ہوتی ہے۔ وہ روح کی روشنی، دل کی جلا، نفس کی پاکیزگی، اخلاق کی شستگی افکار کی صحت اور اعمال کی راستی کو نہیں جانتا۔ نہ یہ چیزیں اس کے لئے کوئی اہمیت رکھتی ہیں اور چونکہ پیغمبر بھی آدمی کی ہی صورت وقامت کے ہوتے ہیں اس لئے وہ پیغمبروں کو بھی اپنا ہی جیسا آدمی سمجھتے اور ان کے فضائل و محاسن ذاتیہ کا کوئی لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ قوم ثمود کے لئے بطور معجزہ ایک اونٹنی پتھر سے اللہ نے پیدا کر دی تھی اور جب وہ اپنی درخواست پوری ہونے کے بعد اونٹنی سے تنگ آ گئے تو اللہ کے حکم سے حضرت صالح نے پانی کی تقسیم کر دی لیکن قوم نے عہد شکنی کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا۔ فَنَادَوْا کا لفظ بتا رہا ہے کہ ساری قوم یا بیشتر افراد قتل ناقہ کے مشورے میں شریک تھے اسی لئے سب پر عذاب آیا۔ قوم ثمود پر غضب خداوندی ایک غیبی چیخ کی صورت میں ٹوٹ پڑا جس کی وجہ سے قوم کے ٹکڑے اڑ گئے اور سب لوگ ریزہ ریزہ ہو گئے۔ وغیرہ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ

قوم لوط نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی ہم نے ان پر پتھر (وں) کا مینہ برسایا بجز متعلقین لوط کے (یعنی مومنین) ان کو آخر شب بچا لیا

بِسَحَرٍ ۝ نِعْمَةً مِنْ عِنْدِنَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝ وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا

اپنی جانب سے فضل کر کے جو شکر کرتا ہے ہم اسے ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں اور (قبل عذاب آنے کے) لوط نے ان کو ہمارے دارو گیر سے ڈرایا

فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝ وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا

تھا انہوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کئے اور ان لوگوں نے لوط سے ان کے مہمانوں کو بارادۂ بد لینا چاہا سو ہم نے ان کی آنکھیں چوپٹ کر دیں کہ لو میرے عذاب اور

عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝

ڈرانے کا مزہ چکھو (یہ تو اس وقت واقع ہوا) اور (پھر) صبح سویرے ان پر عذاب دائمی آپہنچا (اور ارشاد ہوا) کہ لو میرے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ع ۲ ۱۸ ۹

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

تفسیر ان آیات میں قوم لوط کی تباہی کا عبرت انگیز اسلوب کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ لوط ابن ہاران حضرت ابراہیم کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ بحیرۂ مردار کی ساحلی بستیوں میں رہنے والوں کی اصلاح کے لئے پیغمبر بنا کر آپ کو بھیجا گیا۔ قوم لوط حضرت لوط کے لئے امتِ دعوت تھی۔ ان سے نہ آپ کا کوئی نسبی رشتہ تھا، نہ وطنی اشتراک، نہ مذہبی اتحاد۔ آپ حضرت ابراہیم کے حکم سے ان بستیوں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ابراہیم نے جس طرح تبلیغ و اصلاح کے لئے اپنے بالوں کو خاص خاص حصۂ ملک میں مامور کیا تھا۔ مثلاً حضرت اسحاق کو شام و فلسطین کی اصلاح کے لئے حضرت اسماعیل کو حجاز نجد تہامہ کی اصلاح کے لئے اسی طرح حضرت لوط کو بحر لیت کی ساحلی پانچ بستیوں میں تبلیغ کے لئے مقرر فرما دیا تھا۔

وہاں کے باشندے مختلف گناہوں میں آلودہ تھے۔ شرک، رہزنی اور سب سے بڑھ کر امرد پرستی ان کا خصوصی شیوہ تھی۔ حضرت لوط نے ہر چند نصیحت کی۔ وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ آخر غضب الٰہی لڑکوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے لڑکوں کی شکل میں ظاہر ہوئے اور حضرت لوط کے گھر مہمان بن کر آئے۔ قوم والوں کو اطلاع ملی۔ وہ شکار کی تلاش میں دوڑے ہوتے آئے۔ حضرت لوط میں لڑنے کی طاقت نہ تھی۔ قوت کے ساتھ دفاع کیسے کرتے مجبوراً خوشامد کرنے لگے لیکن خوشامد بھی نصیحت آمیز۔ کیونکہ اس وقت تک آپ کو معلوم نہ تھا کہ یہ لڑکے حقیقت میں ملائکہ ہیں۔ لوط کو زیادہ پریشان دیکھ کر لڑکوں نے کہا۔ آپ پریشان نہ ہوں دروازہ کھول دیں۔ ان لوگوں کو اندر آنے دیں ہم فرشتے ہیں اللہ نے ہم کو اس قوم کی تباہی کے لئے بھیجا ہے۔ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر صبح ہونے سے پہلے اس بستی سے دور نکل جائیں۔ ہم ان بستیوں کی زمین الٹ دیں گے۔ پھر ایک فرشتہ نے اپنے پروں کا جھپٹا مارا جس سے سارے لوگ جو آئے تھے نابینا ہو گئے اور جادوگر ہیں جادوگر ہیں کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔ حضرت لوط گھر والوں کو لے کر صبح سے پہلے بستی سے نکل گئے اللہ کے حکم سے فرشتوں نے زمین الٹ دی اور اوپر سے نام زد کنکر برسائے۔ ہر کافر کا نام لے کر کنکر اللہ کی طرف سے مقرر کر دیا گیا تھا۔ ساری بستیاں تباہ ہو گئیں۔

اس قصہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ کے غیبی فرشتے اس زمین پر خدائی کارندے ہیں لیکن مختار مطلق نہیں بلکہ حکم خدا کی تعمیل کرنے والے کارگزار ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو رحمت و بشارت کے فرشتے ہیں اللہ ان سے تباہی پھیلانے اور ہلاکت کا کام بھی لے لیتا ہے جیسا کہ یہ عذاب کے فرشتے قوم لوط کے لئے تھے، لیکن یہی فرشتے حضرت ابراہیم کے گھر حضرت سارہ کو فرزند کی بشارت دینے گئے تھے۔ مایوسی کی عمر میں حضرت سارہ کو اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ خلاصہ یہ کہ اسباب ظاہری کے تغیرات غیبی پوشیدہ قوتوں کے تصرفات کے تابع ہیں اور غیبی ملائکہ کی ساری کارگزاریاں حکم الٰہی پر موقوف ہیں۔ پس جھوٹے ہیں وہ لوگ جو ارباب انواع یا موکلوں یا دیوتاؤں کو کارخانۂ قدرت کا مختار کل اور مستقل متصرف سمجھ کر ہر وقت ان کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان کو مرادیں پوری کرنے والا اور مصائب کو دفع کرنے والا جانتے ہیں اور ان کے نام کی نذر نیاز کرتے بھینٹ چڑھاتے اور قربانیاں کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیم کی دعا بھی قوم لوط کو تباہی سے نہ بچا سکی کیونکہ وہ قوم خدا کی دشمن تھی اور حضرت لوط بھی باوجود مقرب بارگاہ ہونے کے کفار کو خود غارت کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے تھے۔ ہر پیغمبر و عارف دعا کر سکتا ہے بارگاہ الٰہی میں درخواست کر سکتا ہے۔ قبول کرنا نہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ کسی پیغمبر کا کام کارخانۂ قدرت کو چلانا نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط کو بستی سے نکل جانے کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ ان کے مکان میں رہنے کی حالت میں ہی ان کی غیبی حفاظت کا انتظام کر دیا جاتا۔

جیسے حضرت ہود کے ساتھ کیا تھا لیکن بتانا یہ تھا کہ قدرت خداوندی کے ظہور میں تنوع ہے۔ وہ ہر طرح سے اپنے بندے کی حفاظت کرسکتی ہے۔ لوط کی حفاظت کا یہی طریقہ مناسب تھا کہ ان کو بستی سے الگ کر دیا گیا اور پھر فرشتوں نے زمین کو اُلٹ دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ساحلی علاقوں میں خصوصاً جاپان اور بحر مردار کے کنارے کی آبادیاں ہر وقت زلزلہ کی زد میں رہتی ہیں اس لئے قوم لوط کی تباہی کوئی نئی بات نہیں پھر آتش فشاں پہاڑوں سے اُڑتے ہوئے پتھر پگھل کر کنکر کی شکل میں نیچے گرتے ہی ہیں۔ یہ سنگباری بھی اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ یہی تاویل حضرت ہود کی قوم کے ہلاک ہونے کی کرتے ہیں کہ طوفان آنا بعید از عقل نہیں اور طوفان سے لوگوں کا ہلاک ہوجانا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ طوفانِ نوح کی بھی اسی طرح توجیہ کی جاسکتی ہے کہ آسمان سے مہینوں پانی برسنا اور زمین کے مسامات کھُل کر پانی کا پھوٹ نکلنا پھر لوگوں کا ڈوب جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

ان کور دانش لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اسباب مادیہ اپنی جگہ ضرور بر سر عمل ہیں۔ سیلاب، طوفان اور زلزلوں سے لوگ ہلاک ہوتے رہتے ہیں لیکن حضرت نوح نے برسوں پہلے کشتی بنانا کس مادی سبب کا علم حاصل کرنے کے بعد شروع کر دیا تھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سارا ملک بیس سال کے بعد ڈوب جائے گا جیسے اپنے۔ بچاؤ کا ذریعہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ پھر کیا وجہ کہ حضرت نوح کے مومن ساتھی تو محفوظ رہے اور گن گن کر ایک ایک کافر لقمۂ اجل بن گیا۔

حضرت ہود نے عذاب کی پیشین گوئی کس بنیاد پر کی تھی۔ ان کو برسوں مہینوں یا ہفتوں پہلے کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس قوم کو چند روز کے بعد غارت ہونا ہے۔ پھر جو طوفان ساری کافر قوم کے لئے پیغامِ اجل ثابت ہوا وہ حضرت ہود اور آپ کے ساتھیوں کے لئے کیوں نسیم روح آفریں بن گیا۔ آپ اور آپ کے مومن ساتھی بھی تو اسی آبادی کے اندر تھے جو پوری کی پوری غارت ہوگئی اور آپ ساتھیوں سمیت اسی جگہ محفوظ رہے۔ اسی طرح حضرت لوط کے پاس لڑکے آئے۔ کیا وہ فرشتے نہ تھے جو اطلاع دینے کے لئے قبل از وقت بھیجے گئے تھے۔ حضرت لوط کون سے طبقات الارض کے ماہر تھے کہ زمین اُلٹنے یا زلزلہ آنے سے پہلے ہی بستی سے نکل گئے۔ واللہ اعلم۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ۔ حسن بصری سے کسی نے پوچھا قوم نوح نے نوح کی، قوم ہود نے ہود کی، اسی طرح دوسری قوموں نے صرف اپنے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی تھی۔ تمام رسولوں کی تو تکذیب نہیں کی تھی۔ پھر کذبت قوم نوح المرسلین یا کذبت قوم لوط المرسلین وغیرہ کہنا کس طرح صحیح ہے۔ حسن بصری نے جواب دیا کہ ہر پیغمبر نے وہی تعلیم دی جو دوسرے پیغمبروں نے دی۔ سب کی تعلیم کا اصولی اشتراک تھا۔ پس جب کسی قوم نے ایک پیغمبر کی تعلیم کو صحیح نہیں جانا تو یقیناً اس نے سب ہی پیغمبروں کی تعلیم کا انکار کیا، اس لئے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہوگئی۔ حضرت لوط کا قصہ ہم نے متعدد مقامات پر تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اس جگہ بھی سطور بالا میں مختصر طور پر نقل کر دیا گیا ہے۔ اس کی تائید؛ تصدیق تورات کے سفر الخلیقۃ باب ۱۹ سے بھی ہوتی ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

دو فرشتے جو حضرت ابراہیم سے مل کر آئے تھے لڑکوں کی شکل میں شام کے وقت لوط کو جو سدوم کے پھاٹک پر بیٹھے تھے نظر آئے۔ لوط مہمانوں کو گھر لے گئے۔ سدوم کے مردوں نے جوانوں سے لے کر بوڑھوں تک سب ہی نے لوط کے گھر کو گھیر لیا اور کہا جو لوگ آج رات تیرے گھر مہمان آئے ہیں کہاں ہیں ان کو باہر ہمارے پاس لا۔ لوط دروازہ سے باہر آئے اور اپنے پیچھے کواڑ بند کر دیا اور کہا۔ بھائیو بُرا کام نہ کرو۔ قوم والوں نے کہا۔ ہٹ جا تو یہاں گزران کرنے آیا ہے یا ہم پر حکومت جتلانے ورنہ ہم تیرے ساتھ پہلے سے زیادہ بُرا سلوک کریں گے۔ پھر وہ لوگ لوط پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے اور دروازہ توڑنے لگے۔ فرشتوں نے ہاتھ بڑھا کر لوط کو گھر کے اندر کھینچ لیا اور (لوگوں کو اندر آنے دیا پھر) دروازہ بند کر دیا اور جو لوگ اندر گھس آئے تھے خواہ بڑے خواہ چھوٹے سب کو اندھا کر دیا وہ لوگ دروازے کی طرف دوڑے مگر تلاش کرتے کرتے تھک گئے دروازہ دکھائی نہ دیا۔ فرشتوں نے لوط سے کہا تم اپنے ساتھیوں کو لے کر اس مقام سے نکل جاؤ ہم اس بستی کو غارت کریں گے۔ صبح کو لوط اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو لے کر نکل گئے اور سورج کی روشنی زمین پر پھیلنے کے وقت شہر صُغر میں پہنچ گئے۔ تب خداوند تعالیٰ نے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور ان شہروں کو غارت کر دیا مگر لوط کی بیوی نے باوجود منع کر دینے کے پیچھے پھر کے دیکھا سو وہ نمک کا کھمبا بن گئی اور ابراہیم نے فجر کو اُٹھ کے ان غارت شدہ بستیوں کے

میدان کی طرف دیکھا۔ آپ کو زمین سے بھٹی کا سا دھواں اٹھتا نظر آیا۔ (سفر الخلیقۃ باب 19)

توریت کے بیان میں اسلامی تاریخوں سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ توریت میں لوط کی بیوی کا نمک کے کھمبے میں تبدیل ہو جانا بیان کیا گیا ہے اور اسلامی تاریخوں میں ایک پتھر لگنے سے اس کا ہلاک ہو جانا مذکور ہے۔ توریت میں گندھک اور آگ کا برسنا ظاہر کیا گیا ہے۔ اور قرآن میں سنگ بار ہوا کا بھیجنا اور نامزد کنکروں کا برسانا بیان کیا گیا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جبرئیل نے ان کی بستیوں کو اٹھا کر آسمان تک لے جا کر الٹ دیا اور اوپر سے پتھر برسائے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا۔ ہم نے ان پر سنگبار ہوا مسلط کر دی۔ حصبار سنگریزے چھوٹی پتھریاں۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے حصبار اتنے چھوٹے پتھروں کو کہتے ہیں جو مٹھی بھر لینے کے قابل نہ ہوں۔ حاصب سنگریزے برسانے والا۔ اہل فلسفہ کہتے ہیں کہ اجزا تے دخانیہ جو زمین سے اٹھتے ہیں کرۂ نار کے اندر یا اس کے قریب پہنچ کر سوختہ ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کے اندر ارضی اجزا ہوتے ہیں اس لئے وہ جل کر کنکر بن جاتے ہیں۔ اور نیچے گرتے ہیں۔ فلسفۂ یونانی کی یہ خرافات صحیح ہو تب بھی نافرمان قوم پر عذاب الٰہی واقع ہو جانے کا انکار اس سے لازم نہیں آتا۔ یہاں تو قوم مجرم تھا اور لوط پیغمبر ہیں۔ ان کی بیٹیاں بنات صالحات ہیں۔ ایماندار گروہ سنگباری سے پہلے ہی بستی چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ کیوں؟ کیا اس کو طبقات الارض اور کرۂ نار کی کیفیت کا علم پہلے سے ہو گیا تھا۔ ایسا تو نہیں تھا۔ پھر مادی سبب کوئی بھی ہو سبب مہلک ضرور تھا۔ اس سے چند نفوس قدسیہ کا ہی بچ جانا محض اتفاق نہیں ہو سکتا جبکہ قبل از وقت اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ عذاب آنے والا ہے۔ مہلک اسباب کی تعیین اس کو حرکت میں لانا اور خصوصیت کے ساتھ پیغمبر کے مخالفوں کو ہلاک کرنا یقیناً اندھے بہرے مادہ کے خود مختار یا اتفاقی تغیر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیچھے ضرور با علم مالک اختیار مشیت کی کارفرمائی کا ہونا لازم ہے۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ۔ مگر لوط کی آل پر ہم نے سنگبار آندھی نہیں بھیجی۔ آل سے مراد ہیں بیٹیاں۔ بیوی مراد نہیں ہے۔ وہ کافرہ تھی۔ اسی نے حضرت لوط کے گھر میں نو وارد حسین لڑکوں کے مہمان ہونے کی اطلاع قوم کو جا کر دی تھی۔ وہ مومنہ نہیں تھی۔ (ابن کثیر) لیکن رشتۂ زوجیت کی وجہ سے حضرت لوط کے ساتھ بستی سے نکل ضرور تھی اور پیچھے پیچھے کراہت خاطر کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کا دل قوم والوں کی محبت میں گرفتار تھا۔ حضرت لوط نے ساتھ والوں کو منہ موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی ممانعت کر دی تھی مگر وہ عورت نہیں مانی پیچھے مڑ کر دیکھا اور قوم کی حالت تباہ ہوتے دیکھ کر بے اختیار ہو کر اظہار حسرت بھی کیا اس لئے وہ بھی ماری گئی۔

نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ۔ ہم نے لوط اور ان کی آل کو سحر میں یعنی رات کے آخری حصہ میں وہاں سے بچا لیا۔

نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ۔ ہم نے لوط اور آل لوط کو اس عذاب و ہلاکت سے بچا لیا اور یہ سب ہمارا فضل و انعام تھا (اور یہ انعام صرف لوط اور ان کی آل اولاد کے لئے ہی مخصوص نہ تھا بلکہ) جو کوئی بھی اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے یعنی شرک نہیں کرتا اور احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کو اللہ اپنے انعام سے اسی طرح نوازتا ہے۔ مقاتل نے اس آیت کی تفسیر میں کہا جو کوئی اللہ کو واحد سمجھتا اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔ اللہ اس کو ایسی ہی جزا دیتا ہے جیسے آل لوط کو دی کہ مشرکوں کے ساتھ ان کو عذاب میں مبتلا نہ کر دیا۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ۔ لوط نے ہماری پکڑ سے قوم والوں کو ڈرایا تھا اور کہا تھا کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ کی پکڑ میں گرفتار ہو جاؤ گے لیکن ان کو اس وعید کا یقین نہیں آیا۔ اس دھمکی کے واقع ہونے میں شک کرنے لگے اور لوط کو سچا نہ جانا۔

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ۔ اور مہمانوں کی طرف سے لوط کو انہوں نے حکم دیا یعنی لوط سے کہا کہ وہ مہمانوں کی حمایت نہ کریں اور ہمارے مطلب میں سنگ راہ نہ بنیں۔

بغوی نے بروایت ابن اسحاق و ابن عساکر بطریق جویبر و مقاتل از ضحاک حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ مہمانوں کو اندر رکھ کر لوط نے دروازہ بند کر لیا اور کواڑ کی آڑ سے باہر والوں سے گفتگو کرنے لگے۔ قوم والوں نے یہ دیکھا تو دیوار کود کر اندر آ گئے۔ فرشتوں نے لوط کو زیادہ پریشان دیکھا تو کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کے رب کے فرستادے ہیں۔ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پھر جبرئیل نے بحکم خدا اپنے ایک بازو کو ان کی آنکھوں

پر پھیرا جس سے سب نابینا ہو گئے اور اندھوں کی طرح حیران ہو کر گھر کے اندر گھومنے لگے کہ دروازہ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آخر اسی حالت میں لوطنے ان کو نکال باہر کیا۔ آیت فَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِهِمْ کا یہی مطلب ہے۔ اکثر اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ طمس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے چہرے کو سپاٹ کر دیا۔ آنکھ کا کوئی شگاف ہی باقی نہ رہا۔ مقاتل نے کہا: مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کی آنکھوں کو بے نور کر دیا۔ وہ ملائکہ کو نہ دیکھ سکے۔ کہنے لگے جب لڑکے آئے تھے تو اندر آتے ہم نے ان کو دیکھا تھا لیکن اب کہاں گئے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ غرض ناکام ہو کر لوٹ گئے۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ۔ اللہ نے فرمایا اچھا اب میرے عذاب اور دھمکی کا مزہ چکھو۔ یعنی جس عذاب سے لوط کی زبانی میں نے تم کو وعید دی تھی اس کا مزہ چکھو۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ۔ اور صبح تڑکے ہی ان پر اٹل عذاب آ گیا۔ شیخ ابن کثیر نے عذاب مستقر کا ترجمہ کیا ایسا عذاب جس سے نہ وہ بھاگ سکتے تھے نہ عذاب ان کا پیچھا چھوڑنے والا تھا۔ بعض اہلِ تفسیر نے مستقر کا مطلب یہ بیان کیا کہ دنیا میں ہلاکت اور ہلاکت کے بعد عذابِ قبر اور قبروں سے اٹھنے کے بعد دوامی دوزخ کا عذاب۔ گویا مستقر کا ترجمہ ہوا۔ لازوال۔ ابدی۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ۔ اس قصہ میں اس آیت کی تکرار عذاب کی ہولناکی اور ڈراوے کے استحکام کو ظاہر کر رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت کا خطاب عذاب کے واقع ہونے سے پہلے ہو اور دوسری آیت کے مخاطب وہ مردے ہوں جو عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے نتیجہ کو پہنچے۔ کیونکہ اللہ کے سامنے وہ حاضر تھے۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ اس آیت کو مقطع میں ذکر کرنے کا فائدہ ہم سطورِ بالا میں لکھ چکے ہیں۔

مقصودِ بیان

ارسلنا کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس عالم کے تصرفات یہاں تک کہ اسبابِ مادیہ کے زیرِ اثر کسی قوم کی تباہی یا میت اور ہلاکت سے بچاؤ سب کا فاعلِ مختار اور مسببِ حقیقی اللہ ہی ہے۔ کوتاہ نظر مادہ پرستوں کی نگاہِ دانش بے جان بے شعور مادہ سے آگے نہیں اٹھتی مادہ کی بے شعور طاقتوں ہی کا وہ ان تغیرات کو نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حاصبًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ قوم لوط پر کوئی سنگ بار آندھی آئی تھی۔ آلِ لوط کا اطلاق بنات پر کیا گیا ہے۔ اگرچہ لفظ آل کا اطلاق تمام متبعین پر آتا ہے جیسے آلِ فرعون۔ لیکن حضرت لوط پر ایمان لانے والا کوئی بھی شخص نہ تھا۔ اہلِ تفسیر کا یہی قول ہے۔ اس لئے اس جگہ آل سے مراد صرف لڑکیاں ہیں۔ نعمۃ من عندنا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ بندہ کو جو عافیت اور خیر عطا فرماتا ہے، وہ اس کی طرف سے بطور نعمت و احسان کے ہوتی ہے۔ بندہ کو اس کا ذاتی استحقاق نہیں۔ ہاں بندہ کی اطاعت و فرماں پذیری کی اللہ قدر کرتا ہے اور اس نے جزا دینے کا وعدہ فرما لیا ہے۔ کذالک نجزی من شکر میں عمومی ضابطہ کا اظہار ہے۔ اللہ شکر گزار بندوں کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہی ہے اور آخر حق کا بول بالا ہوتا ہی ہے۔ عن ضیفه سے اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت لوط اس وقت تک اپنے مہمانوں کو آدمی ہی جانتے تھے حقیقت سے واقف نہ تھے۔ پس صحیح ہے یہ بات کہ جب اللہ مطلع نہ فرمائے کوئی پیغمبر بھی حقائقِ غیبیہ سے واقف نہیں ہو سکتا۔ طمسنا علیٰ اعینهم سے عذاب کی تمہید بیان کی گئی ہے اور قدرتِ تامہ کا اظہار مبہم پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ اصل عذاب کا بیان آیت لقد صبحهم الخ میں کیا ہے۔ وغیرہ۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝

اور (فرعون اور) فرعون والوں کے پاس بھی ڈرانے کی بہت سی چیزیں پہنچیں ان لوگوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا سو ہم نے ان کو زبردست قدرت کا پکڑنا پکڑا

تفسیر

حضرت موسیٰ اور فرعون کا تفصیلی قصہ گزشتہ سورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ قوم نوح قوم عاد قوم ثمود قوم لوط سب ہی اپنے زمانے میں کم و بیش اقتدار، مال، تہذیبِ قومی اور بلند تمدن کے حامل تھے اور ان کی رعونت و فطری گمراہی نے ان کو ایمان نہ لانے دیا اور اللہ کے سچے رسول کی نصیحت انھوں نے نہ مانی۔ آخر اسی دنیا میں وعیدِ پیغمبر اسبابِ سماویہ و ارضیہ کے زیرِ اثر ہلاک ہوئے۔ لیکن ان میں کوئی ایسا

خود پسند مغرور سردار اور رعونت مجسم بادشاہ نہ تھا کہ اپنے آپ کو ربّ اعلیٰ کہلائے اور رعایا کا پروردگار ہونے کا دعویٰ کرے کے فرعون کا ملک وسیع ہو نہ ہو مال اس کے پاس دوسروں سے افزوں ہو یا نہ ہو لیکن فرعون کی طرح مغرور اور پرسطوت سخت گیر بادشاہ کوئی نہیں ہوا۔ اس کی فوجی طاقت بھی بہت تھی اور ایک پیغمبر کی نسل یعنی بنی اسرائیل پر اس نے وہ ظلم توڑ رکھے تھے کہ کوئی حاکم اپنی رعایا پر صرف اختلاف نسل کی بنیاد پر ایسے ستم نہیں ڈھاتا۔ اس نے تو بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ بلکہ غلام سے بھی بدتر۔ اس کے مقابلہ میں موسیٰ جیسے پرجلال پیغمبر کو بھیجا گیا تھا اور سب سے پہلے ایک جامع شریعت توریت کی شکل میں عطا کی گئی جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی۔ فرعون نے باوجودیکہ مقابلہ میں عاجز ہو گیا پھر بھی اس نے موسیٰ کا متبع بننا تو درکنار روادار دوست بننا بھی گوارا نہ کیا۔ آخر اللہ نے اس کو پکڑ دھرا اور لاؤ لشکر سمیت نیل میں غرق کر دیا۔ اللہ ہی ہر چیز پر غالب اور اپنے دشمنوں کو تباہ کر دینے پر قادر ہے۔

تحلیل اجزاء

وَلَقَدۡ جَآءَ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ النُّذُرُ۔ (فرعون اور) اس کے ساتھیوں کے پاس پیغمبر (یعنی موسیٰ اور ہارون) پہنچے۔ النذر سے مراد یا تو حضرت موسیٰ حضرت ہارون اور دوسرے متبعین ہیں۔ اس صورت میں نُذُر نذیر کی جمع ہوگی۔ یا معجزاتِ موسیٰ مراد ہوں گے۔

كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا۔ ہماری ساری آیات کی انھوں نے تکذیب کی۔ آیات سے مراد ہیں نو احکام شریعت جو حضرت موسیٰ نے بیان کئے اور جن کا ذکر ترمذی ابوداؤد اور نسائی نے حضرت صفوان بن عسال کی روایت سے کیا ہے۔ حضرت صفوان کا بیان حسب ذیل ہے۔

ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا چلو اس نبی کے پاس چلیں۔ ساتھی نے کہا ارے اس کو نبی نہ کہو اگر اس نے سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ غرض دونوں رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور (حضرت موسیٰ کی) تِسۡعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (نو کھلی ہوئی آیات) کے متعلق دریافت کیا۔ (کہ وہ کونسی تھیں) حضور نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دو۔ فضول خرچی نہ کرو، زنا نہ کرو، جس شخص کو قتل کرنے کی ممانعت ہے اس کو قتل نہ کرو (یعنی ناحق خون نہ بہاؤ) کسی بے قصور کو (مجرم ٹھہرا کر) حاکم کے پاس اس غرض سے نہ لے جاؤ کہ حاکم اس کو قتل کر دے۔ سود نہ کھاؤ کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت نہ لگاؤ۔ جہاد کے وقت بھاگنے کی غرض سے پشت نہ پھراؤ۔ اور اے یہودیو تمہارے لئے خاص طور پر یہ حکم ہے کہ سنیچر کے دن میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ یہودیوں نے یہ سنتے ہی حضور کے ہاتھ پاؤں چومے اور کہنے لگے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور نے فرمایا پھر میرا اتباع کرنے سے تم کو کون چیز مانع ہے۔ بولے داؤد نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ انھی کی نسل میں (آخری) نبی پیدا ہو اور ہم کو یہ بھی خوف ہے کہ اگر ہم آپ کا اتباع کریں گے تو یہودی ہم کو قتل کر دیں گے۔

اگر اس آیت میں آیات سے مراد حضرت موسیٰ کی عطا کی ہوئی تسع آیات (نو آیات) ہوں تو تسع آیات سے حدیث مذکور کی روشنی میں نو احکام مراد لئے جائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے نو خصوصی معجزات (ید بیضا، عصا، دریائے نیل کا پایاب ہو جانا اور بنی اسرائیل کا پار ہو جانا، قبطیوں پر جوؤں کی بلا مسلط ہو جانا، قبطی کے ہر ظرف ہر طعام ہر پینے کے پانی غرض ہر چیز میں مینڈک ہی مینڈک بھر جانا، قبطی کی ہر چیز خون آلود ہو جانا، وادی تیہ میں من و سلویٰ کا نزول، حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا وادی تیہ میں مشعل کا کام دینا اور محافظ چوکیدار کی طرح لشکر کے گرد گھومنا، پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلنا، فرعون کا مع لشکر کے غرق ہو جانا یا اس غرقابی کی بجائے نواں معجزہ لاٹھی کا جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل جانا قرار دیدیا جائے۔ کیونکہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہو جانے کے بعد تو کوئی حضرت موسیٰ کے معجزات کی تکذیب کرنے والا باقی ہی نہیں رہا تھا۔ زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر نو آیات سے معجزات مراد ہوں تو مصر سے نکل آنے کے بعد کے معجزات کو اس میں شمار نہ کیا جائے کیونکہ ان معجزات کا ظہور فرعون کے غرق ہونے کے بعد ہوا تھا اور اس وقت فرعون یا اس کے ساتھی تکذیب کرنے کے لئے زندہ ہی نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نو معجزات وہی تھے جو فرعون کی زندگی میں حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ظہور پذیر ہوئے تھے۔

آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ اس جگہ آیات سے مراد احکام ہیں۔ اس کی تائید مذکورہ بالا حدیث سے بھی ہو رہی ہے

عَزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ۔ عزیز ایسا غالب جو کبھی مغلوب نہ ہو۔ مقتدر ایسی قدرت و طاقت والا کہ جو چاہے کرے۔ کوئی اس کو اس کے ارادہ سے

روک نہ سکے اور کوئی اس کی برابر قدرت والا نہ ہو۔

مقصودِ بیان حضرت موسیٰ کی بعثت اگرچہ بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے تھی لیکن سنگِ راہ فرعون اور اس کے ساتھی تھے، اس لئے فرعون اور فرعونیوں کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پہنچے (اس صورت میں نذر سے مراد ہوں گے نذیر۔ ڈرانے والے۔ یعنی موسیٰ، ہارون اور آپ کے ساتھی) فرعون اور فرعونیوں نے موسیٰ کے معجزات (یا احکام) کی تکذیب کی۔ ان کو جادو قرار دیا۔ فرعون کے ساتھ لفظ آل کا اس جگہ استعمال دلالت کر رہا ہے کہ آل کا اطلاق تمام متبعین اور پیروی کرنے والوں پر ہوتا ہے۔ فاخذنٰھم سے اس طرف اشارہ ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کا ڈوبنا خدائی پکڑ کی ایک صورت تھی۔ فرعون کی غرقابی بتا رہی ہے کہ کوئی عظیم الشان بادشاہ بھی خدا کے اقتدار اور قبضہ سے باہر نہیں ہے۔ وغیرہ

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ○ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ

کیا تم میں جو کافر ہیں، اُن ہی اُن (مذکور) لوگوں سے کچھ فضیلت ہے یا تمہارے لئے (آسمانی) کتابوں میں کوئی معافی ہے　یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری ایسی جماعت ہے

مُّنتَصِرٌ ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ○ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ

جو غالب ہی رہیں گے　عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھاوے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے　بلکہ قیامت ان کا (اصل)　وعدہ ہے　اور قیامت

وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ○ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ○ يَوْمَ يُسْحَبُونَ

بڑی سخت　اور ناگوار　چیز ہے　یہ مجرمین (یعنی کفار)　بڑی غلطی　اور بے عقلی میں ہیں　جس روز یہ لوگ اپنے منہوں کے

فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ○

بل جہنم میں گھسیٹے جاویں گے تو ان سے کہا جاویگا کہ دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا　مزہ چکھو

تفسیر اگر یہ امر صحیح ہے کہ نوعی اور وصفی اشتراک کے بعد زمانہ کا اختلاف اور مقام کا فرق اور زبان و نسل کی تفریق اور تہذیب و قوم کا تفاوت کوئی اخراج انداز معنی نہیں رکھتا تو پھر نظیر کو نظیر پر قیاس کرنا اور ماضی کے آئینہ میں حال کی خوبصورت یا بدصورت شکل دیکھنا صحیح ہے۔ جو حالت گزشتہ اقوام کی تھی اگر وہی خو خصلت حال کے لوگوں کا ہو تو پیغمبران برحق سے سرتابی کا جو نتیجہ بد اُن کو ملا تھا وہی اِن کو ملنا لازم ہے۔ حکومت، اقتدار، جسمانی طاقت، مال کی کثرت اور قبائل و شباب کی عددی افزونی ان کو بھی حاصل تھی، لیکن جب پیغمبر برحق سے تصادم ہوا تو باوجود ہر قسم کی مادّی طاقت کے اعدائے حق کو شکست ہوئی۔ پھر زمانہ حال کے کافروں کا کون سا ایسا تعلق باللہ اور خدا سے لگاؤ ہے کہ وہ کچھ بھی کریں خدا ہمیشہ ان کی مدد کرے گا اور پیغمبر برحق کو یوں ہی نامراد شکستہ حال چھوڑ دے گا۔ ایسا خیال لغو اور خلافِ عقل ہے۔ جب گزشتہ قوموں سے زمانہ حاضر کی قوموں کو کوئی برتری اور امتیاز حاصل نہیں تو اُن کی طرح اِن کو بھی حق کے مقابلہ میں شکست کھا کر بھاگنا پڑے گا۔ یہ تو دنیا میں حق و باطل اور ایمان و کفر کا فیصلہ ہوگا۔ رہی آخرت تو اس کا آنا جس طرح یقینی ہے اسی طرح ان مجرموں کے لئے اس کی مصائب اور شدائد بھی سخت ہوں گی۔ دنیا میں ان کو راہِ حق نہیں ملی ہمیشہ بھٹکتے رہے۔ آخرت میں بھی سعادت و نجات کا راستہ نہیں ملے گا اور کھینچ کر اوندھے منہ دوزخ میں پھینک دیا جائے گا اور دنیا میں ان کے انکار و اعمال کے اندر جو روح کو جلانے والی آگ پوشیدہ تھی وہ قیامت کے دن ظاہر ہو جائیگی۔ اور حکم ہوگا کہ آپ۔ اس بھڑکتی دہکتی آگ کا (جو تمہارے ہی انکار و اعمال کی آگ ہے) مزہ چکھو۔

تحلیلِ اجزاء

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ. خطاب قریش کو یا عام اہلِ مکہ کو ہے۔ یعنی تم میں سے جو کافر ہیں اور اللہ کی توحید الوہیت اور رسول اللہ صلعم کی نبوت کے منکر ہیں کیا ان کو قومِ نوح قومِ عاد قومِ ثمود قومِ لوط قومِ فرعون پر دولت مال کی فراوانی اعداد کی کثرت جسمانی طاقت صورت سیرت کسی چیز میں برتری حاصل ہے یا ان کا مذہب گزشتہ کافروں کے مذہب سے بہتر ہے۔ ان میں سے تو کوئی بات بھی نہیں ہے۔

اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ. یا ان کے لئے آسمانی کتابوں میں ہر جرم کی سزا سے برأت لکھ دی گئی ہے کہ وہ کچھ بھی کریں عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ. کیا ان کو اپنی کثرتِ تعداد اور اجتماعی جتھوں پر غرور ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہماری جماعت بڑی ہے ہم سب متفق ہیں۔ ہم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ہم سب باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ کفارِ مکہ نے یہ جملہ جنگِ بدر کے دن کہا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ. ان کی جماعت کو تو عنقریب شکست ہو جائیگی، یہ پیٹھ دے کے بھاگ جائیں گے یعنی ان کی کثرت اور جتھہ بندی کام نہیں آئے گی۔ بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم بدر کے دن ایک خیمہ کے اندر تھے اور فرما رہے تھے میں تجھے تیرے عہد اور وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں اے اللہ اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہیں کی جائے۔ حضرت ابوبکر نے حضور کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا اے اللہ کے رسول بس کافی ہے آپ اپنے رب سے انتہا زاری کر چکے۔ اس کے بعد حضور یہ آیت پڑھتے ہوئے خیمہ سے باہر آگئے۔ سیہزم الجمع و یولون الدبر۔ میں اس وقت تک سمجھا بھی نہ تھا کہ کونسی جماعت شکست کھا کر بھاگے گی۔ جب بدر کا معرکہ ہوا تو آپ زرہ پہنے یہ آیت پڑھنے لگے (یعنی اس وقت میں نے دیکھا کہ کافر شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے) بغوی نے یہ قول سعید بن مسیب کی روایت سے حضرت عمر کی طرف منسوب کیا ہے اور عبدالرزاق ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں مرسلاً عکرمہ کی روایت سے بیان کیا ہے طبرانی نے الاوسط میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ. یعنی یہ تو دنیوی عذاب تھا جو حقیقت میں اصلی عذاب نہیں ہے بلکہ آنے والے عذاب کی تمہید اور عنوان تھا۔ اصل عذاب تو قیامت کے دن آئے گا۔ وہ بڑا سخت اور تلخ ہوگا۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ. (اور کفارِ مکہ کی ہی تخصیص نہیں ہے عام) کافر مجرم دنیا کے اندر گمراہی میں سرگرداں ہیں اور آخرت میں بھڑکتی آگ میں پڑے ہوں گے۔ یعنی اللہ کا یہ ضابطۂ سزا عام ہے کسی مجرم کی خصوصیت نہیں ہے۔ حسن بن فضل نے کہا ضلال سے مراد ہے جنت کا راستہ کھو جانا نہ ملنا۔ قتادہ نے ترجمہ کیا۔ دکھ اور عذاب۔

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ. جس روز کہ ان کو منہ کے بل کھینچ کر دہکتی آگ میں ڈالا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی گرمی اور تکلیف کا مزہ چکھو۔

مقصودِ بیان

کفارِ مکہ کو سخت سرزنش اور اس طرف اشارہ کہ کفارِ مکہ کی مذہبی اور دنیاوی پوزیشن سابق امتوں کے کافروں سے اچھی نہیں ہے۔ ام لکم الخ میں اسلوب لطیف ایما ہے۔ تمام کتبِ سماویہ کافروں کی مذہبی حمایت سے خالی ہیں۔ نہ آسمانی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ کافروں کے کیسے ہی غلط عقائد و اعمال ہوں انکو نجات ملنا لازم ہے۔ سیہزم الجمع الخ میں ایک عظیم الشان، اسبابِ ظاہری کے خلاف پیشگوئی جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ○ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ○

ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا اور ہمارا حکم یکبارگی ایسا ہو جاوے گا جیسے آنکھوں کا جھپکانا

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

اور ہم تمہارے ہم طریقہ لوگوں کو ہلاک کر چکے ہیں　سو کیا کوئی نصیحت کرنے والا ہے

تفسیر اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ہم نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا اندازے کے ساتھ پیدا کیا۔ تقدیر اشیاء و اعمال کا مسئلہ ایمان کا اہم جزء ہے۔ قدر خیر و شر کو مانے بغیر ایمان کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔

تقدیرِ کائنات پر روشنی ڈالنے والی احادیث و آثار حسن نے کہا اللہ نے اپنی مصلحت و حکمت کے مطابق اپنی مخلوق میں سے ہر چیز کی ایک قدر مقرر کر دی ہے جو اس کے لئے مناسب تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ صلعم فرما رہے تھے اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوق کی تقدیریں لکھ دی تھیں۔ اس وقت اس کا عرش (اقتدار) پانی پر تھا۔ (رواہ مسلم) طاؤس بن مسلم یمانی کا بیان ہے کہ میں نے بہت صحابہ کرام کو یہ کہتے پایا کہ ہر چیز (اللہ کے) اندازہ کے ساتھ ہے یہاں تک کہ بیوقوفی اور ہوشیاری بھی۔ (رواہ البغوی) حضرت علی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک چار چیزوں پر ایمان نہ رکھتا ہو اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس بات کی بھی شہادت دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اسی نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے۔ مرنے کے بعد (دوبارہ) جی اٹھنے پر بھی اس کا ایمان ہو۔ تقدیر پر بھی ایمان رکھتا ہو (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ صلعم فرما رہے تھے۔ میری امت میں خسف و مسخ (کا عذاب) ہوگا (یعنی کچھ لوگوں کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور کچھ لوگوں کی صورتیں بگاڑ دی جائیں گی) اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہوں گے (رواہ ابوداؤد والترمذی) یہ بھی حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا قدریہ (یعنی وہ گروہ جو اپنے افعال و اعمال کا خالق انسان کو قرار دیتا ہے) اس امت کے مجوسی ہیں۔ (مجوسی دو خالقوں کے قائل ہیں۔ خیر کے خالق کو یزداں کہتے ہیں اور شر کے خالق کو اہرمن) اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت مت کرو اگر مر جائیں تو ان کی میت میں شریک مت ہو۔ (رواہ احمد و ابوداؤد) ابو خزامہ کے والد کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ فرمائیے ہم افسوں منتر پڑھتے ہیں اور دواؤں سے علاج کرتے ہیں اور پرہیز (یعنی ضرر رساں چیزوں سے پرہیز) کرتے ہیں کیا ان میں سے کوئی چیز تقدیرِ خداوندی کو کچھ بھی لوٹا سکتی ہے۔ فرمایا یہ بھی تقدیرِ الٰہی کا ایک حصہ ہے۔ (رواہ احمد والترمذی و ابن ماجۃ) تقدیر کے متعلق احادیث بہت آئی ہیں۔ عقیدۂ تقدیر پر تمام صحابہ کا اجماع ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کا بالاتفاق عقیدہ ہے۔

تقدیر کیا ہے؟ قدر اندازہ کرنا کیفی ہو یا مقداری۔ کسی چیز کا خاص اندازہ مقرر کرنا قدر بنانا تقدیر کا مفہوم ہے۔

تقدیر تکوینی و تشریعی دونوں میں فرق ہے لیکن دونوں کا عمل ایجاد سے پہلے ہے ہم اس کو اگر تقدیر اشیاء کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ تخلیق کا درجہ تقدیر کے بعد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقدیر کا ظہور فعلی تخلیق کے بعد ہوتا ہے لیکن تقدیر ذہنی وجودِ خارجی سے پہلے ہوتا ہے۔

(۱) ترقی یافتہ حکومتیں اور دانشمند حکمراں سیاسی سماجی عمرانی زرعی اور صناعی انتظامات میں پلاننگ اور ترتیبی نصب العین سے کام لیتے ہیں۔ اس پلاننگ کا اثر دوررس ہوتا ہے۔ بڑے بڑے کاموں اور طویل الذیل امور کی تکمیل کے لئے پلاننگ ضروری چیز ہے۔ اگر بے سوچے اور بغیر ذہنی خاکہ بنائے اور بدون ترتیبِ علمی و ذہنی کے کسی کام کو اچانک شروع کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ نہ فقط ناکامی ہوتا ہے بلکہ عباد و بلاد کی تباہی و بربادی کو سامنے لے کر آتا ہے۔

تقدیر تکوینی و تخلیقی اور حسبانِ نظمی سنتِ الٰہیہ ہے جو ساری کائنات کی تخلیق اور ابداع و نظم کا ایک فطری الٰہی ضابطہ ہے۔ خالق کل اور رب کائنات نے نظامِ ہستی کو اسی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ یہی سنگِ بنیاد ہے تعمیرِ عالم کا اور تنظیمِ سنسار کا۔ اگر ضابطۂ تقدیری نہ ہوتا تو وجودِ کائنات

کی عمارت عالمِ ظہور میں نہ آتی نہ آسکتی اور سارا نظامِ خلق و بقا درہم برہم ہو جاتا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسی ضابطۂ کونی کو صراحت عبارت اور اشارت کے پیرائے میں ظاہر کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ سارا جہان اپنی ہستی اور بقائے ہستی میں اسی نظامِ خداوندی کا تابع ہے۔ اس ضابطہ کا تسلط جس طرح چاند سورج اور ستاروں پر ہے اسی طرح بادلوں، بارشوں، ہواؤں، سمندروں اور نامی و جامد عنصری مخلوق پر بھی ہے۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔

کتاب عزیز کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ رب قدیر اور خالق مبدع جو ہر مشیر و مددگار سے بے نیاز ہے اہلِ دانش و بینش کو دعوتِ غور دے رہا ہے اور آیات کونی کو شہادت میں پیش کر رہا ہے کہ یہ سارا جہان نتیجہ ہے تقدیرِ ازلی کا اور کوئی چیز بغیر قدرِ سابق کے نہ جیتی ہے نہ منازلِ ہستی کو طے کر رہی ہے۔

ایک جگہ فرمایا ہے۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ۔

چاند سورج ایک حساب کے زیرِ اثر گردش کر رہے ہیں۔ رات اور دن کا تعاقب ایک ترتیب سابق کے ماتحت ہو رہا ہے۔ نہ سورج چاند سے آگے بڑھ سکتا ہے نہ دن رات سے پیش قدمی کر سکتی ہے۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ پانی جو ہر زوی حیات کی زندگی کی بنیاد ہے وہ بھی ایک اندازہ کے موافق نازل ہوتا ہے۔ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ۔ نباتات کی روئیدگی بالیدگی اور سرسبزی و شادابی باوجود اختلافِ انواع و اصناف اور تباینِ اشکال و صور کے اندازۂ غیبی کے زیرِ حکمت ہے۔ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا۔ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ۔

(۲) کیا انسان خود اپنی انفرادی دانش یا اجتماعی فہم و شعور سے زندگی کی کوئی صحیح شاہراہ متعین کر سکتا ہے جب کہ اس کی قدرت بھی ہمہ گیر نہیں اور عقل بھی محیطِ کل نہیں۔ قدرت کا عجز، فہم کا نقص اور بصیرت و دانش کی نارسائی اس کو روک رہی ہے نظامِ تشریعی کی تکوین سے اور زندگی کے صحیح دستور بنانے سے۔ ارسطو ہو یا افلاطون، سلیمان حکیم ہوں یا عیسیٰ روح اللہ کلمۃ اللہ اپنی عقلی کوتاہی کے سب معترف ہیں۔ کون ہے ایسا جو مستقبل کے حوادث و وقائع ضروریات اور گردشوں کو مکمل طور پر دیکھتا، مشاہدہ کرتا اور جانتا ہو عالم الغیب کا کوئی نہیں۔ عالم الشہادۃ بھی کامل طور پر نہیں۔ بجز سوائے اس ذات کے جو عالم الغیب کامل اور عالم الشہادۃ مکمل ہے جس کی قدرت و تصرف سے کوئی چیز خارج نہیں اور جس کے علم حالی و مآلی سے کوئی شے باہر نہیں۔ کون تکوین ضوابطِ حیات کر سکتا ہے۔ تکوین عقیدہ، تکوین قانونِ اخلاق و معاشرت، تغذیۂ مشاعر و حواس اور وجدان کی ترقی و نمو کس انسان کے بس میں ہے۔ پس جو مکوّن و خالق اور مدبر رزق و حیات ہے وہی مکوّن قانونِ حیات ہے۔ انسانی اعمال کا وہی خالق ہے۔ قدرِ اعمال کو معین کرنے والا ہے اور تقدیرِ تشریعات بھی اسی نے کی ہے اور وہی کرتا ہے۔

طبعی فلسفہ کیا کہتا ہے

سارے علوی سماوی کروں سے نظریں پھیر لو۔ سورج چاند اور ستاروں کی شعاعوں کو مت گنو۔ نہ ان کی ترتیب توازن اور تقابل و توافق کو دیکھو۔ اربوں کھربوں تکوینی گیندوں کو نظر انداز کر دو۔ ان کی تعلیق اور خصوصیات کا بھی مشاہدہ مت کرو۔ صرف اسی عنصری پارۂ وجود کو جس کو ہم ارضی دنیا کہتے ہیں ذرا غور کی نگاہ سے دیکھو۔ غور نہ کر سکو تو گوشۂ چشم ہی سے اس پر نظر التفات ڈال لو۔ تم کو نظر آئے گا کہ یہاں کی ہر چیز اپنی مادی طاقت مادی حجم اور مادی اجزاء کی ایک خاص قدر و اندازہ کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں جو قدرِ فطری سے سرتابی کر سکے۔ پانی پر نباتی زندگی کا مدار ہے۔ حیوان بھی نباتی زندگی کے حامل ہوتے بغیر عالمِ وجود میں نہیں آتا اور نباتی ہستی کی طرح لمبائی چوڑائی موٹائی اور اجزاء کو پراگندہ ہونے سے محفوظ رکھنے کی طاقت پتھروں میں بھی ہے پانی کے اجزاء

کیا ہیں اور خواص و آثار کیا ہیں۔ پھر ان اجزاء و خواص کی مقدار کتنی کتنی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ پانی کے دو توانائی عنصر ہیں اور ہر عنصر کی ایک خاص مقدار ہے اور خاص مقدار کے موافق ہر جز جب دوسرے جز سے مخلوط ہو جاتا ہے تو اس کو پانی کہتے ہیں۔ اور اس مجموعہ میں پانی کے خواص، آثار اور کیفیات و احوال پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ مقدارِ اجزاء فطری ہے۔ پانی بننے سے پہلے ان اجزاء کو ایک خاص اندازہ کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ہم ان اجزاء کے خالق نہیں۔ پیدا شدہ اجزاء کو قدرِ فطری کے ساتھ ملا کر تو پانی بنا سکتے ہیں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد ہر جزء کی مقررہ مقدار الگ نکال بھی سکتے ہیں لیکن مقدارِ اجزاء میں کمی بیشی کرنے کا ہم کو اختیار نہیں ہے۔ اگر قدرِ فطرت سے سرتابی کریں گے اور اجزاء کو کمی بیشی کے ساتھ ملائیں گے یا اجزاء کا اختلاط فطری طریقہ سے نہ کریں گے تو پانی نہیں بنے گا۔ جو سیال چیز تیار ہو گی اس کو پانی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے اندر پانی کی کیفیات و خصوصیات نہیں ہوں گی۔ اجزاء کی مقدار کی کمی بیشی یا فطری اختلاط کی قدر سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ پانی کی طرح ہوا مٹی اور مٹی کی موجودات، جواہر، فلزات، معدنیات، کوئلہ، پتھر، ہر پھول، ہر پھل، ہر جڑی بوٹی، ہر پتہ، ہر ٹہنی، ہر جاندار حیوان اور بے جان جماد اسی اختلاطِ مقداری و کیفی کا مظہر ہے۔ یہ تقدیرِ خداوندی ہے۔ منکرینِ تقدیر زبان سے کچھ بھی کہیں لیکن قدرِ فطرت سے ہٹ نہیں سکتے۔ خواصِ اشیاء جو فطرت کی طرف سے ایک اندازہ کے تحت عطا کئے گئے ہیں ان میں کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ فطری خاصیات کا انکشاف بقدرِ امکان کر سکتے ہیں لیکن خواصِ لازمہ کو اشیاء سے جدا نہیں کر سکتے۔ نہ تصرف کر سکتے ہیں۔ اگر کریں گے تو وہ اشیاء، اشیاء نہیں رہیں گی کچھ اور چیزیں ہو جائیں گی۔ ترقی نوعی جو عالم عناصر میں جاری و ساری ہے وہ بھی اپنی حدِ تقدیری پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اپنی نوعی حدود سے باہر کسی نوع کا کوئی فرد نہیں آ سکتا۔ بندر بندر رہتے ہوئے آدمی نہیں بن سکتا۔ اور آدمی آدمی ہوتے ہوئے بندر نہیں بن سکتا۔ کیا کوئی پتھر حجری حدود میں رہ کر نباتِ نامی ہو سکتا ہے یا کوئی پودا یا بوٹا حدِ نباتی کے اندر رہ کر حساس ذی شعور حیوان بن سکتا ہے۔ نوعی انقلاب ممکن ہو یا محال اس سے نوعی حد بندی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی نوع کا کوئی فرد اپنے نوعی دائرے میں رہتے ہوئے دوسری نوع کا فرد نہیں ہو سکتا۔ نہ دوسری نوع کی خصوصیاتِ لازمہ کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ ہے تقدیرِ خداوندی جس کی خلاف ورزی محال ہے۔ انسان کتنا ہی دانشور حاملِ عقل و خرد ہو جائے غیر مادی روحِ مجرد نہیں بن سکتا۔ انسانی تقاضوں کے دائرے سے نہیں نکل سکتا۔ زندہ رہتے ہوئے نہ پتھر بن سکتا ہے نہ فرشتہ۔ حدودِ نوعی مقرر ہیں۔ حدودِ افراد مقرر ہیں، اجسامِ افراد اور اصنافِ افراد محدود ہیں۔ اجزائے جسم محدود الفرائض ہیں۔ بدن کے سارے عضلات، اعصاب، شرائین اور وریدیں اپنے اپنے خاص فرائض کی ادائگی میں مشغول ہیں۔ حساس حساس ہیں اور بے حس بے حس۔ قویٰ طبعیہ حیوانیہ اور نفسانیہ اپنے اپنے مرکز سے وابستہ ہیں اور اپنے مقررہ عمل کو پورا کرنے میں سرگرم۔ دماغ سوچتا ہے۔ دل دورانِ خون کی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ امعاء، معدہ اور جگر مددگار غذا رسانی ہیں۔ جگر سوچتا نہیں۔ دماغ تغذیۂ بدن کا کام انجام نہیں دیتا۔ زبان بولتی ہے، کان سنتا ہے، آنکھ دیکھتی ہے، ناک سونگھتی ہے۔ ایک عضو کے اعصاب دوسرے عضو کے اعصابی ریشوں کا کام نہیں کرتے۔ یہ ہے تقدیرِ الٰہی جو تخلیق سے پہلے ذہنِ خالق میں اپنا خاکہ بنا چکی تھی۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ۔ اللہ کا حکم نہ زمانی ہے کہ وقت کا محتاج ہو۔ نہ کوئی وقت اس کو اپنے اندر سما سکتا ہے۔ نہ امرِ خدا مکانی ہے کہ کوئی مقام اس کو اپنے اندر سما سکے۔ زمان و مکان تو خود امرِ الٰہی کے نتائج ہیں۔ اللہ کے امر سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ہاں اللہ کے امر کا نتیجہ زمانی و مکانی ہے۔ اللہ کے حکم سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ اوقات کے اندر بھی محدود ہے اور مقام و مکان کے اندر بھی۔ پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کا امر کسی لفظ کا محتاج نہیں۔ ہم سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کہتے ہیں کہ صرف لفظ کُن سے اللہ نے سب کو پیدا کر دیا۔ یعنی اس کو کسی مادی یا غیر مادی مددگار کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا ارادہ ہی تخلیقِ کائنات کے لئے کافی ہے۔ اللہ کا امر یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کے متعلق لفظ کن کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔

آیتِ مذکورہ میں امرِ خدا کو سمجھانے کے لئے فرمایا ہے کہ اللہ کا امر بس ایک کلمہ یا ایک لفظ کُن یا لاتکن ہے جس کی تاثیر پلک جھپکنے کی ایسی تیزی کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہے۔ عوام میں آج بھی اور نزولِ قرآن کے زمانے میں عوام و خواص سب ہی پلک جھپکنے کو کسی چیز کی سرعت اور

انتہائی تیزی کی مثال سمجھا جاتا تھا۔ آیت میں لمح البصر اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیا گیا ہے اور سرعت ظہور و تاثیر میں امر الٰہی کو پلک جھپکنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے امر خدا کو حقیقت میں لمح البصر کی طرح سمجھ لینا غلط ہے سرعت رفتار کی اعلیٰ مثالیں جو لمح البصر سے کہیں زیادہ سریع الظہور ہیں اب اہلِ علم کو معلوم ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ انکشافاتِ جدیدہ ہیں جو عامی محاورہ کا مقام نہیں لے سکتے ہیں نہ لے سکتے ہیں۔ اور قرآن میں حقیقت کو اس پیرایۂ عبارت میں بیان کیا گیا ہے جس کو عام لوگ سمجھ جائیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ اور ہم تمہارے جیسے (گزشتہ امتوں کے) کافروں کو تباہ کر چکے ہیں تو کیا کوئی (ان کے احوال سن کر اور نشانات دیکھ کر) عبرت اندوز ہونے والا ہے۔ یعنی گزشتہ امتوں میں تمہاری طرح کافر اور پیغمبروں کی تکذیب کرنے والے طاقتور، مالدار، سرکش لوگ گزر چکے ہیں۔ اللہ نے ان کے کفر اور بدکرداری کی سزا میں سب کو تباہ کر دیا۔ ان کی کثرت تعداد اور مال کی فراوانی اور طاقت کی شدت ان کو نہ بچا سکی پس تمہارے کفر اور نبی کو جھوٹا قرار دینے کا بھی یہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرنا عقلمندوں کا کام ہے تو کیا تم میں کوئی ایسا عقلمند ہے جو سابق کفار کے عبرتناک انجام کو سن کر اور ان کے کھنڈرات کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے اشیاع شیع کی جمع ہے اور شیع کا معنی ہے مثل۔ اس لئے اشیاعکم کا ترجمہ ہوا امثالکم واشباہکم حقیقت یہ ہے کہ ضابطۂ فطرت ایک ہے۔ زمانہ اور مقام کے فرق سے اس میں فرق نہیں پڑتا۔ اصول خیر و شر ہر زمانہ اور ہر مقام میں ایک ہی ہیں نتائج کی اسباب کی وابستگی اور ہر قسم کے درخت سے اسی قسم کا پھل پیدا ہونا ہر زمانہ میں ایک ہی طرح ہوتا ہے۔ یہ فطری امر ہے جس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ پس جس کفر اور بد اعمالی اور تکذیب انبیاء کی وجہ سے امم سابقہ کو تباہ کیا گیا۔ اگر مکہ والوں نے بھی سابق کافروں کی بد اطواریاں اختیار کیں تو ان کو بھی ان کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور یہ بھی انہیں سے جا ملیں گے۔ عبرت اندوزی اور نصیحت پذیری کے لئے یہ درس فطرت کافی ہے کاش کوئی اس کو سمجھنے والا اور اس سے سبق لینے والا ہو۔

مقصودِ بیان ہر چیز اور ہر عمل کا خالق اللہ ہے اور اللہ نے تخلیق کائنات سے پہلے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے جس کے خلاف نہ کسی چیز کا وجود ہو سکتا ہے۔ نہ کسی عمل کا ظہور۔ اللہ کا امر انتہائی سریع النفاذ ہے جس کو پلک جھپکنے کی طرح سمجھو۔ بصیرت مند ہیں وہ لوگ جو حال کے آئینہ میں ماضی کی تصویر دیکھ کر گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝

اور جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں سب اعمالناموں میں (یہی مندرج) ہے اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے

تفسیر انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا اندراج اس کے اعمالنامے میں ہوتا ہے۔ چھوٹی بڑی کوئی حرکت ہو اگر عاقل بالغ سے سرزد ہو تو اس کو اللہ کے مقرر کردہ ملائکہ لکھ لیتے ہیں۔ ایسا کوئی چھوٹا سا چھوٹا عمل بھی بغیر اندراج کے نہیں رہتا۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد گرامی ہے۔ کسی چھوٹے گناہ کو بھی ہلکا نہ سمجھو۔ خدا کی طرف سے اس کا بھی مطالبہ ہونے والا ہے۔ (نسائی و ابن ماجہ وغیرہ) سلیمان بن مغیرہ کا بیان ہے مجھ سے ایک گناہ ہو گیا اور میں نے اس کو حقیر سمجھا۔ سوتے میں کسی آنے والے نے کہا سلیمان سن۔ لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ صَغِيْرًا اِنَّ الصَّغِيْرَ غَدًا يَعُوْدُ كَبِيْرًا۔ کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھ۔ چھوٹا گناہ کل کو (قیامت کے دن) بڑا ہو جائے گا۔

اِنَّ الصَّغِيْرَ وَلَوْ تَقَادَمَ عَهْدُهٗ عِنْدَ الْاِلٰهِ مُسَطَّرٌ تَسْطِيْرًا۔ چھوٹے گناہ کا زمانہ خواہ کتنا ہی پرانا ہو جائے مگر

اللہ کے پاس وہ کامل طور پر لکھا ہوا ہے۔

فَازْجُرْ هَوَاكَ مِنَ الْبَطَالَةِ لَا تَكُنْ ۔ صَعْبَ الْقِيَادِ وَشَمِّرَنْ تَشْمِيرًا ۔ بدی سے اپنے نفس کی خواہش کو روکے رکھ اور ایسا نہ ہو جا کہ مشکل سے نیکی کی طرف آئے بلکہ بھلائی کی طرف دامن باندھ کر تیار ہو کر آ۔

إِنَّ الْمُحِبَّ إِذَا أَحَبَّ إِلٰهَهُ طَارَ الْفُؤَادُ وَأُلْهِمَ التَّفْكِيرًا ۔ جب اللہ کا دوست سچے دل سے اپنے معبود کی محبت کرتا ہے تو اُس کا دل اُڑنے لگتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کو غور و فکر کرنے کا الہام ہوتا ہے۔

فَاسْأَلْ هُدَى آيَاتِ الْإِلٰهِ فَتَتَّئِدْ فَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ۔ اور اپنے رب سے ہدایت طلب کر اور نرمی کر تیرا رب ہدایت اور مدد کرنے کے لئے کافی ہے۔

تمام انسانی اعمال کا ملائکہ کے صحیفوں میں روزانہ لکھا جانا اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے لیکن ان صحیفوں کی حقیقت کیا ہے۔ کونسا کاغذ استعمال کیا جاتا ہے اور کون سی روشنائی اور قلم فرشتوں کے پاس ہے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ کاغذ یا جھلی یا ہڈی یا درختوں کے پتے یا کسی دھات کے پترے تو اس قابل نہیں کہ ان میں اعمالِ خلائق کا اندراج ہو۔ نہ بانس یا کسی لکڑی یا کسی دھات کا قلم اور کسی قسم کی لال نیلی ہری روشنائی فرشتے استعمال کرتے ہیں۔ پھر کیا یہ اساسی عقیدہ محض مسلّمہ مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ خیر و شر اور اچھے بُرے عمل کی سزا جزا جب عقلاً ضروری ہے تو اعمال کی فہرست بھی ہونی ضروری ہے تاکہ اعمال کی یادداشت اور نشان دہی ہو سکے۔ پھر فہرست اعمال بھی ایسی ہو کہ مجرم کو اس کا انکار نہ بن پڑے۔ ایسی نشان دہی ہو کہ اس کی شہادت رد نہ کی جا سکے۔ یادداشت اور ثبوتِ جرم کے لئے صرف تاریخ وار حوالہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایسا اندراج مسلسل ہو جیسا کہ کسی واقعہ کی عکسی فلم ہوتی ہے۔ ترتیب اور تفصیل کے ساتھ فاعل، فعل، ہیئتِ فعل، مقامِ فعل، زمانِ فعل، مقدارِ عمل، غرض ہر ثبوت یعنی محسوس اور ناقابلِ انکار ہو۔ اعمالناموں کی تفصیل ہم نے کئی جگہ مختلف آیات کے ذیل میں کردی ہے۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ صحیفۂ اعمال نام ہے۔ ایسے عکس اور فوٹو کا جس میں کرنے والے کے عضوِ فاعل کا مکمل فوٹو ہو جو کٹ نہ سکے مٹ نہ سکے جس میں کمی بیشی ممکن نہ ہو۔ اگر اس کو اصل مجرم کے سامنے لایا جائے تو اس کو اقرار کرنا پڑے کہ ہاں یہ میرا ہاتھ ہے، میرا پاؤں ہے، میری کھال ہے، میرا بال ہے، میرے ہی اعضاء یہ کام کر رہے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے اس زمانے کے علمی رنگ میں اس طرح سمجھو کہ آج بڑے بڑے سائنٹسٹ کہتے ہیں کہ انسان کی کوئی نقل و حرکت، قول فعل آواز فنا نہیں ہو جاتی بلکہ فضا کی ان لہروں میں موجود رہتی ہے۔ سانس کی رفتار کی آواز اور سانس کا اُتار چڑھاؤ بلکہ ذہنی تصور کی ہر لہر اس فضا میں باقی رہتی ہے آدمی کا کوئی عمل خواہ سات پردوں کے اندر ہو اس فضا میں اپنی پوری شکل، کیفیت اور ثقل و خفت کے ساتھ برقی لہروں کے اندر نہ فقط ثبت ہو جاتا ہے اور اپنا نقش چھوڑ دیتا ہے بلکہ بعینہٖ موجود رہتا ہے۔ ٹیلی ویژن اس بات کا زندہ ثبوت موجود ہے۔ ٹیلی ویژن ان ساری کیفیات کو دکھا دیتا ہے جو کسی واقعہ یا شخص سے تعلق رکھتی ہیں اور اس طرح دکھاتا ہے کہ ہر فعل کا فاعل بعینہٖ اپنے فعل کے ساتھ سامنے آکر موجود ہو جاتا ہے اور اس کا ہر عضو عملی شہادت دیتا ہے کہ ہاں یہ عمل میں ہی کر رہا ہوں۔ ان برقی لہروں کی یہی فطری خاصیت ہے۔ اللہ نے ان کی قوتِ طبیعت میں یہی خصوصیت رکھی ہے لیکن ان لہروں کی عکس اندازی اور عکس پاشی میں اتنا نقص بھی ہے کہ ان کے اندر ہر انسان بلکہ کسی چیز کے فوٹو کی فلم بنی ہوئی علیحدہ علیحدہ نہیں ہے کہ انسان جو عمل کرے وہ اس کے پچھلے اعمال کے ساتھ مربوط اور پیوستہ ہوتا چلا جائے نہ ابھی انسان کی اتنی علمی رسائی ہوئی کہ وہ ماضی کے واقعات کو لہروں میں سے چن کر لے آئے اور سامنے لا کر دکھا دے۔ ممکن ہے کسی وقت ایسا بھی ہو جائے کہ ہم فرعون اور اس کے لشکر کو بعینہٖ پانی میں ڈوبتے اور بنی اسرائیل کو دریا کے پار نکلتے دیکھ لیں اور اقوام ماضیہ کو ٹیلی ویژن پر کھینچ بلائیں۔ لیکن ابھی ہماری علمی نارسائی ایسا کرنے سے مانع ہے۔ صحیفۂ اعمال جس کو اللہ کی مقرر کردہ غیبی طاقتیں لکھ رہی ہیں ممکن ہے انہی فضائی لہروں کی طرح ہوں جن کے اندر ہمارے اعمال اُتر رہے ہوں اور عمل کا ہر پرندہ عمل کرنے والے کی گردن یعنی شخصیت سے وابستہ ہو رہا ہے۔ وہ غیبی طاقتیں جن پر ہمارے اعمال کے اندراج کا ملاک اور مدار ہے۔ یعنی وہ ملائکہ ہیں ہمارے اعمال کو ہماری گزشتہ

زندگی کی فلم سے عکسی شکل میں جوڑتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح ہماری زندگی کی ہر حرکت و سکون بلکہ دماغی تصورات تخیلات اور دلوں کے ارادوں کے پورے عکس باہم مل کر ہماری ایک فلم بنا رہے ہوں اور اسی فلم کو اسلامی اصطلاح میں صحیفۂ اعمال کہا جاتا ہو اور ایک روز ایسا ہو جائے کہ ہماری زندگی کی پوری فلم ملائکہ قدرت ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جس کے انکار کی ہم کو مجال نہ ہو اور اس کے اندر کل صغیر و کبیر مُستَطَرٌ ہو مرقوم ہو، منقوش ہو، معکوس ہو، بعینہٖ موجود ہو۔

اس تفسیر پر فی الزبر اور مستطر کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ یعنی ہر چھوٹے بڑے عمل کا اعمالناموں میں اندراج۔ لیکن بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہر کام کا زبر میں ہونے یا مرقوم ہونے کا مطلب ہے لوح محفوظ میں اندراج ہونا۔ اس تفسیر پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ لوگ جو کام بھی کرتے ہیں اچھا یا بُرا، چھوٹا یا بڑا سب لوحِ محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ اسی کے مطابق اس دنیا میں عملی ظہور ہوتا ہے۔ لوح محفوظ کیا ہے کیسی تختی ہے جو ہر تغیر اور خرد برد سے محفوظ ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی اس جگہ ضرورت نہیں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ نے اس مخلوق کو اور اس کے سارے افکار خیالات میلانات اور اعمال و ارادوں کو اپنے علمی اندازہ کے مطابق بنایا ہے۔ قدرِ الٰہی تخلیق پر مقدم ہے۔ پس آدمی جو اچھا بُرا، چھوٹا بڑا عمل کرتا ہے وہ اللہ کی لوح علمی اور قدرِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ ہم نے تقدیر تکوینی کی جو تشریح اوپر کر دی ہے اس کی شہادت اس قول کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ واللہ اعلم

مقصودِ بیان تمام اعمال کا اعمالناموں میں اندراج حق ہے۔ انسان کا ہر قول و عمل اللہ کی لوحِ علمی میں پہلے سے موجود ہے اور انسان ویسا ہی کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے صحیفۂ اعمال میں اسی طرح اندراج ہوتا چلا جاتا ہے۔ پس کسی مجرم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ چھپ کر جرم کرنے سے اللہ اور اس کے فرشتوں سے وہ جرم پوشیدہ رہ سکے گا۔ وغیرہ

ع ۱۵ ۱۰

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۝ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ع

بہ تحقیق پرہیزگار لوگ باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس

تفسیر اوپر کی آیات میں بدکاروں کے احوال کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ ترہیب و تخویف تھی ان کے مقابل نیکوکار، پرہیزگار لوگوں کا گروہ ہے جن کا ثواب اور اچھا نتیجہ ترغیب کے طور پر اس آیت میں بیان کیا گیا ہے تاکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب مل کر درسِ نصیحت کو مکمل کر سکے۔

یعنی پرہیزگار اللہ کے فرمانبردار لوگ آخرت میں جنتوں کے اندر خوشگوار صاف شفاف چشموں کے مالک ہوں گے۔ عزت و رضوان احسان و فضل النعمت و رحمت اور آسائش و راحت کے مقام میں خوش خوش رہیں گے۔ مالک حاکم اور با اقتدار خالق کے مقام قرب میں ان کو جگہ دی جائے گی۔ ساری جنت مقام قرب ہے۔ درجات کا تفاوت ہے۔ جس طرح پوری دوزخ ملعون یعنی مقام دوری ہے جو اس کے اندر رہنے والے جن اور انسان ہیں وہ بھی ملعون اور رحمتِ خدا سے دور ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا عدل و انصاف کرنے والے نیک کردار لوگ اللہ کے پاس نور کے ممبروں پر رحمٰن کے دائیں جانب ہوں گے اور خدا کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ یہ عادل لوگ وہیں جو اپنے احکام میں اپنی اہل و عیال میں اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں اللہ کے فرمان کے خلاف نہیں کرتے۔ یہ حدیث صحیح مسلم اور نسائی میں بھی موجود ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَنَهَرٍ یعنی جنت کے اندر پانی شراب شہد اور دودھ کی نہریں۔ نہر اسم جنس ہے۔ اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے یہاں نہریں مراد ہیں۔
ضحاک نے نہر کا ترجمہ کیا روشنی اور وسعت۔ نہار کو نہار (دن) بھی روشنی ہی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

مَقْعَدِ صِدْقٍ - سچائی کا مقام یعنی جہاں کوئی لغو بات اور گناہ کا کام نہ ہوگا۔ یا مقعد صدق سے پسندیدہ مقام مراد ہے۔ بہرحال اس سے جنت مراد ہے۔ جوہری نے لکھا ہے جو فعل باطنی طور پر بھی اچھا ہو اور ظاہری طور پر بھی اس کو صدق کہا جاتا ہے۔ آیات فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ - لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ - أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ - میں لفظ صدق اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بغوی نے حضرت امام جعفر صادق کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے جگہ کی صفت صدق بیان کی ہے اس لئے وہاں اہلِ صدق ہی بیٹھیں گے۔

عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ - ملیک مقتدر سے مراد ہے اللہ - اللہ ہی ساری کائنات کا مالک بھی ہے اور حاکم بھی اور احاطہ قدرت بھی اسی کا ہے۔ اس کے دائرہ قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں۔ یاد رکھو کہ قرب خدا مکانی نہیں۔ اللہ جسم جسمانیات اور تقاضائے جسم سے پاک ہے اس کا قرب بے کیف اور مقدار و مسافت سے پاک ہے۔ کسی عقل کی پرواز وہاں تک نہیں ہوسکتی۔ اور کسی قوت فہم کے اندر اس کی حقیقت نہیں آسکتی۔ اس کے قرب سے مراد ہے عزت افزائی۔ جس طرح بادشاہوں کا قرب اہل قرب کے لئے باعث عزت ہوتا ہے اور بادشاہوں کی طرف سے بڑی عزت بخشی بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی کو اپنا مقرب بنالیں۔ اسی طرح جب اللہ کے لئے لفظ ملیک استعمال کیا تو عزت افزائی کے لئے لفظ عِنْدَ ذکر کیا۔ واللہ اعلم

مقصودِ بیان اللہ کا قرب خالص مقامِ صدق ہے۔ انہیں لوگوں کو نصیب ہوگا جو عقائد اعمال اور اقوال میں سچے ہوں گے بدعقیدہ، بدکار اور لغو گو قرب سے محروم رہیں گے۔ متقی کامل وہی ہوتا ہے جس کا عقیدہ شرک سے محفوظ ہو کیونکہ شرک عقیدہ کا جھوٹ ہے۔ اور جس کے اعمال اللہ کے احکام کی ادنیٰ مخالفت سے بھی محفوظ ہوں۔ ورنہ عمل سے تکذیب عقیدہ لازم آئے گی اور جس کی ہر بات سچی ہو، جھوٹ، لغویت اور بیہودگی سے محفوظ ہو۔ ایسے ہی اہلِ اتقاء کو قرب خدا کی نعمت نصیب ہوگی۔

ملیک اور مقتدر کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ تمام اختیار کا مالک بھی اللہ، ملک بھی اللہ ہر چیز اسی کی ملک ہے اور اسی کے زیر حکومت ہے اور صاحب اقتدار بھی وہی ہے۔ وہ کسی ایک ہی چیز پر قادر نہیں بلکہ ہر شے پر قادر ہے۔ وغیرہ۔

(باقی پارہ جزو ثانی میں ملاحظہ فرمائیے جو جلد پیش کیا جائیگا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَيَانُ السُّبْحَانُ

کا

پارہ نمبر ۲۷

(جزو ثانی)

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ

از

فاضل اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

مالک

عطاء الرحمٰن صدیقی وسیم بک ڈپو دیوبند

مطبوعہ: محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

ستائیسواں ۲۷ پارہ (جزو ثانی)

سورۃ رحمٰن

یہ سورت مکی ہے۔ اس میں ۷۸ آیات اور تین رکوع ہیں!۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی

تفسیر آیت مندرجہ کے اندر چار فقرے ہیں۔ الرحمٰن ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۔ ہم ان کی تشریح کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرنی چاہتے ہیں۔

کیا اللہ رحمٰن ہے اللہ نے یہ عالم پیدا کیا۔ پہلے کچھ نہ تھا۔ نہ مادہ نہ صورت، نہ زمان نہ مکان، نہ حرکت، کچھ بھی نہ تھا۔ عدم محض تھا، صرف اللہ تھا۔ اس نے عدم محض کے پردے کو پھاڑا اور عدم سے وجود کو ظاہر کیا۔ نیستی کے پیٹ سے ہستی کو پیدا کیا۔ تو کیا ایسا کرنا اس پر لازم تھا۔ پیدا ہونے والی کسی مخلوق کا اللہ پر واجبی حق تھا کہ اللہ اس کو ضرور ہی پیدا کرے۔ رحمٰن کا لفظ بتا رہا ہے کہ ایسا نہ تھا۔ اللہ مخلوق کا مقروض نہیں کہ حق وجود اس نے ادا کر دیا ہو۔ اچھا تو کیا خدا نے اس کائنات کو اپنے ارادہ اور اختیار سے پیدا کیا ہے یا ساری مخلوق کا اس سے ظہور اس طرح ہو گیا ہے جیسے سورج سے شعاعوں اور روشنی اور حرارت کا ظہور ہوتا ہے جس کا اظہار میں سورج کے ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں۔ یا جیسے آگ کے اندر جلانے اور گرمی پہنچانے کی طاقت کا ظہور یا پانی کے اندر سیلان اور زمین کے اندر کثافت وجمود اور ہوا میں تموج اضطراب، پھیلاؤ اور سمٹاؤ (انبساط و انقباض) ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اللہ سے اس مخلوق کا ظہور اضطراری نہیں اختیاری ہے۔ غیر ارادی نہیں ارادی ہے۔ بے شعوری نہیں منصوبہ بند ہے اور منصوبہ بھی ارادی یعنی اللہ رحمٰن ہے اس کی رحمت ارادی ہے اختیاری ہے۔ وجوبی نہیں ایجابی ہے۔ اس کا محض احسان و فضل ہے کہ اس نے عدم کو پھاڑ کر اس کے اندر سے وجود کو نکالا۔ تاریکی کے پردوں سے روشنی کو نمودار کیا۔ وجود اور ہستی کمال ہے عدم و ظلمت نقصان۔ کمال کو نمودار کرنا بتقاضائے رحمت ہے۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا وجودِ کائنات بجائے خود اللہ کی عمومی رحمت ہے اور تخلیق انسان خصوصی رحمت ہے۔ آسمان اور آسمانی کائنات کا مادۂ اول پھر اس مادے کی مختلف اشکال اور اجزائے اصلیہ کو جوڑ کر مفوضہ خدمات کی سرانجام دہی کے لئے رواں دواں کرنا بڑی رحمت ہے۔ پھر سفلیات کے مادے کی تخلیق اور اس مادے کو امکانی اصلیہ اور عناصر کی شکلیں پہنانا بھی بڑی رحمت ہے۔ پھر مختلف عناصر میں مختلف خواص ودیعت رکھنا اور مختلف خواص کے زیر اثر مختلف خدمات انفرادی طور پر ادا کرنے کی صلاحیت عطا کرنا بھی بڑی رحمت ہے۔ پھر ان عناصر و اجزاء کو مختلف مقدار و کیفیت کے ساتھ جوڑ کر مجموعہ بنانا اور مجموعہ کو ایسی طاقت عطا کرنا جو اجزائے اولیہ و ثانویہ کو پراگندگی و انتشار سے محفوظ رکھ سکے اور جمادی معدنی یا حجری جسامت قائم رکھ سکے یہ بھی بڑی رحمت ہے پھر

تجری جبلت کو کھانے پینے ہضم کرنے اور جسم کو پرورش کرنے اور اس سے آگے اپنی طرح کی کوئی چیز پیدا کرنے کے لئے تخم بنانے کی طاقت عطا فرمائی جس کو آپ قوت غاذیہ و نامیہ اور مولدہ و مصورہ کے نام دیتے ہیں اور ان قوتوں والے جسم کو آپ جسم نباتی کہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی بڑی رحمت ہے اور اس کا درجہ حجری و جمادی نعمت سے اونچا ہے۔ پھر اسی جسم نباتی میں جزئیات کا شعور پیدا کرنا اور اس کو حرکت کی قوت عطا کر دینا کہ اپنے ارادہ اور شعور سے اڑتا کودتا چلتا رینگتا اور پھدکتا پھرے اور اپنی روزی کہیں سے گھوم پھر کر حاصل کرے۔ یہ بھی بڑی رحمت ہے۔ اسی کو تو آپ حیاتِ حیوانی کہتے ہیں۔ یہ تو سب مادی نعمتیں اور رحمتیں ہیں جن کے فیضان کا ظہور علوی اور سفلی کائنات کے روپ میں ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اللہ کی لاتعداد غیبی رحمتیں بھی ہیں جو مادہ اور مادیات سے ماوراء ہیں۔ وہ مجسم نور اور نورانی ہیں۔ ان کی بھی مختلف شکلیں اور مختلف طاقتیں ہیں لیکن سب نورانی وہ سراسر منور عرفان ہیں علم و ادراک ہیں۔ اس مادی کثافت اور جسمانی آلائش سے پاک ہیں۔ نہ وہ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں، نہ ان میں نمو و ذبول اور فربہی ولاغری ہوتی ہے۔ نہ نسل کشی اور نسل کشی کی آلودگی ان سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ وہ نر ہیں، نہ مادہ، نہ اختلاطِ مذکر و مؤنث سے ان کو واقفیت۔ وہ پاک حسبم مادہ ملکوتی طاقتیں ہیں جن کو آپ ملائکہ اور فرشتے کہتے ہیں۔ کائناتِ مادیہ کے نظم و نسق کا تعلق ان میں سے بعض کے ساتھ ہے اور بعض اس مادی کثافت انسکام سے بھی علیحدہ ہیں۔ یہ بھی اللہ کی عظیم الشان رحمت ہے۔ اگر یہ رحمت و نعمت نہ ہوتی تو مادی قوتیں عنصری نزاعیں کیسے ادا کرسکتیں اور یہ نظم سفلی دعوی کیسے قائم رہتا۔

رحمتِ تخلیقی لیکن ان سب سے اعلیٰ و بالا اللہ کی وہ رحمت ہے جس کو انسان کے روپ میں اللہ نے نمودار کیا ہے۔ تخلیق انسانی درحقیقت ایک برزخی تخلیق ہے۔ یہ مجمل مجموعۂ کائنات ہے۔ تمام کائناتی رحمتوں اور نعمتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے قواسم میں بڑی سے بڑی ملکوتی علمی طاقت بھی مضمر ہے اور مادی، علوی اور سفلی قوت بھی۔ تمام حجری، نباتی اور حیوانی اجزاء و خواص بھی یہ اپنے اندر رکھتا ہے اور آسمانوں کی رفعت و بلندی بھی اور ملکوتی علم و عرفان اور نور و برہان بھی۔ اس کے اندر نمو و ذبول بھی ہے، حس و حرکت بھی ہے۔ غضب و خواہش بھی ہے، عقل کی نورانیت بھی ہے اور روح کی خالص چمک بھی ہے۔

یہ جسمانی قویٰ کی سطح سے اونچا اٹھ کر کنگرۂ عرش تک پرواز کرتا ہے اور اتنی بلندی تک پہنچ جاتا ہے، جس کو سدرۃ المنتہیٰ کہا جاتا ہے جہاں ملائکہ کے پر پرواز کے بھی جلنے کا خطرہ ہے۔ اللہ نے اس کو قوتِ نطق و بیان بھی ایسی عنایت فرمائی جو کسی علوی و سفلی مخلوق کو عطا نہیں فرمائی۔ بیشک نباتات کی بھی اپنی زبان ہے جس سے وہ غذائی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں اور خواہش و لذت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ جانوروں کے اندر بھی اپنے مدعا کے لئے قوتِ لسانیہ ہے۔ اشتہا و غضب اور رنج و دکھ کو ظاہر کرنے کے لئے علامتی گونگے الفاظ بھی ہے۔ ان کی نوعی زبان کو افراد خوب سمجھ لیتے ہیں لیکن اظہارِ مقصد کی یہ تمام زبانیں محدود جزئیات کو سمجھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی چیزیں جو حس و شعورِ حیوانی کے دائرہ میں آسکتی ہیں وہ انہیں کو سمجھنا سمجھانا حیوانی زبانوں سے ہوتا ہے۔ فہم و تفہیم کا دائرہ بہت تنگ ہے جس کے اندر ہر قسم کے جزئیات کی بھی پوری پوری سمائی نہیں۔ حیوانات کا علم محدود ہے، اس لئے اس کی صوتی ادائیگی بھی بہت ہی محدود ہے۔ انسان کے اندر حس و شعور کی چمک کے ساتھ عقل کی پہنائی بھی ہے اور عقلیات و افکار کی لامحدود وسعت بھی اور روح کی حیرت انگیز جلوہ آفرینی بھی۔ یہ افکارِ عامہ کا بھی ادراک کرتا ہے اور نظریات وکلیات کا علم بھی رکھتا ہے۔ اس کی زبان افکارِ عقلیہ کی بھی ترجمان ہے اور وحی و الہام کی تعبیر کا آلہ بھی۔ اس کے پاس ایک ہی جیسے مخارج سے نکلے ہوئے اتنے الفاظ کا ذخیرہ ہے کہ اگر ہزاروں بولیوں میں ان کو گِنا جائے تو کروڑ دو کروڑ تک ان کی گنتی پہنچ جائے گی۔ اگر انسان کو یہ قدرتِ بیان نہ دی گئی ہوتی تو اس کی معاشرت، مدنیت، سیاست، تعلم، تعلیم، تبلیغِ دین بلکہ انسانیت ناقص رہتی ہے۔ ہر قسم کی صناعی، ایجاد، تعمیر اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اسی تقریر و تحریر کی مرہونِ منت ہے۔ اگر نطق لسانی و کتابی نہ ہوتا تو وحی، الہام اور واردات عقل کا اظہار کیسے ہوتا۔ عدل و ظلم، خیر و شر، حسن و قبح اور ہدایت و ضلالت میں امتیاز ممکن نہ ہوتا۔ حیاتِ انسانی حیاتِ حیوانی کی طرح ناقص البیان ہو کر رہ جاتی۔ عقلی امتیازی درجہ رکھنے کے باوجود انسان سطحِ حیوانیت سے اونچا نہ اٹھ سکتا۔ گونگی تعبیر اور اشارات کی گفتگو خالص غیر مادی اور نورانی خیالات کا اظہار کیسے کر سکتے۔ پس تخلیقِ انسانی کے بعد قوتِ بیانیہ کی عطا اللہ کی ایسی عظیم الشان رحمت ہے جس کے فوائد انسان کے لئے ان گنت ہیں۔ یہ تو اللہ کی تخلیقی و تکوینی

رحمتوں کا مختصر بیان تھا لیکن کیا یہ تمام تخلیقی نعمتیں انسانی فلاح و کامرانی کے لئے دنیا و آخرت میں خود مکتفی ہیں۔ کیا انسان کے احساس و شعور کی طاقتیں اور دور رس و دقیقہ سنج عقل انسان کو سعادت و بہبودی کا صحیح راستہ بتانے کے لئے کافی ہے یا خیر و شر اور صحیح راہِ علم و عمل کو غلط راہ زندگی سے ممتاز کرنے کے لئے انسان کے فہم و دانش کی ساری قوتیں مددگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بالکل کامل طور پر بے نیاز بنا دینے والی نہیں ہیں۔ اگر اول شق تسلیم کر لی جائے تو اصولِ خیر و شر اور دستورِ زندگی کی تعیین میں ایک دانشور کا دوسرے دانشور سے، ہوشمندوں کی ایک جماعت کا عقل والوں کی دوسری جماعت سے ایک سمجھدار قوم کا دوسری سمجھدار قوم سے اختلاف کیوں ہے۔ انسانیت ایک ہے، تقاضائے انسانیت ایک ہے۔ سلامتِ عقل اور درستی ہوش میں وحدت ہے۔ پھر بنیادی نظریاتِ حیات میں اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ زمان و مکان کے اختلاف سے فروعی مسائلِ انسانی میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اصول فکری و عملی بدل نہیں سکتے۔ اگر اصولِ انسانیت بدل جائیں تو انسانیت کی وحدتِ نوعی ختم ہو جائیگی افراد کا تعدد اور شخصی تقاضوں کی کثرت وحدتِ نوعی کو کھا جائے گی۔ بات صرف یہ ہے کہ انسان کا علم ناقص ہے۔ زمانہ کا تسلسل جو زنجیری شکل میں سامنے سے آکر پیچھے کو جا رہا ہے اور مستقبل حال کی منزل سے گزر کر ماضی بن رہا ہے۔ یہ اپنے ساتھ نئے نئے زندگی کے تقاضے لئے ہوئے ہے اور لے جا رہا ہے۔ پس کوئی انسان یا فرشتہ ایسا نہیں کہ مستقبل اور ماضی کو مکمل طور پر اپنے علمی دائرے میں گھیرے ہوئے ہو۔ انسانی عقل نارسا ہے، ناقص العلم ہے، لامحدود جزئیات اس کے سامنے نہیں۔ پھر ان کا انکشاف کیسے ہو اور جب ان کا علم نہیں تو ان کے تقاضوں کو کیسے جانے اور جزئیاتی تقاضوں کو پورے کرنے والے اصول زندگی کیسے بنائے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا دستورِ انسانیت کس طرح وضع کرے اور ہر زمانہ اور ہر قوم کے جزئی احوال و افکار کو درست کرنے کے لئے صراطِ مستقیم کا کج رو راہوں سے انتخاب کس صورت سے کرے۔

پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ہر شخص جہول ہونے کے ساتھ ظلوم بھی ہے شخصی میلانات قومی عواطف اور زوجیت و قرابت کے رجحانات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا علاقۂ زوجیت و قرابت، میلانِ قومیت و وطنیت، ارتباطِ صداقت و جوار اور خود اپنی شخصی فائدہ اندوزی کے جذبہ سے کیسے رہائی پا کر انسانیتِ عامہ سے اپنا تعلق ایسا پیدا کرے جو سارے جذبات پر غالب ہو اور سارے عواطفِ طبعی کو مردہ کر کے خالص انسانیت کی سطح پر پہنچ کر تمام افرادِ انسانی کو یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی ایک ہی عام نظر سے دیکھنے لگے۔ یہ بات تجربۂ قدیم و تازہ کی روشنی میں غلط ہے فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے اور عقلِ سلیم بھی اس کو محال جانتی ہے۔ اسی لئے اللہ کی

رحمتِ تشریعی

نے رہنمائی اور رہبری کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اللہ کے سامنے ماضی و مستقبل کی تمام ضروریاتِ انسانی حاضر ہیں۔ اس کا سارا علم حضوری ہے حصولی نہیں۔ اس کے حضوری علم میں نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ ہر چیز کا حضور ہے۔ وہ جس طرح عالم غیب کامل طور پر ہے اسی طرح عالم الشہادت بھی بدرجۂ اتم ہے کیونکہ اس سے کوئی چیز اور کسی چیز کی کوئی ادنیٰ حالت غائب نہیں۔ پس افکار و احوال کی درستی اور اصولِ حق و باطل بتانے کے لئے اس نے مختلف کتابیں اور صحیفے مختلف پیغمبروں پر نازل فرمائے اور یہ بات کہنے میں کسی پیغمبر یا کتاب اللہ کی تنقیص نہیں کہ مختلف پیغمبروں کو ایسی کتابیں اور صحیفے دیئے گئے تھے جو اگرچہ تمام جذبات و عواطف سے پاک اصولِ انسانیت کی تعلیم دیتے تھے اور یہی اصولِ دین یا انسانیتِ عامہ کے اصلاحی ضوابط ان کے اندر بتائے گئے تھے لیکن جزئیاتی اور فروعی مسائل کے لحاظ سے وہ ایک قوم یا ایک بستی یا ایک ملک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قواعد تھے۔ جب وہ زمانہ گیا وہ قوم گئی وہ ضرورتیں گئیں تو انسانیتِ عامہ سے تعلق رکھنے والے اصولِ دین تو باقی رہے اور جزوی مسائل ہٹا کر دوسرے فروعی فیصلے اور ضابطے نازل کر دیئے گئے اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ قومیں آئیں، پیغمبر آئے، کتابیں آئیں، صحیفے آئے پھر کچھ مدت کے بعد سب چلے گئے صرف اصول استمراری دوامی باقی رہ گئے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا جب انسانی عقل چوٹی پر پہنچ گئی۔ وحشت و بربریت کے دور سے انتہائی دوری ہو گئی تو اصولِ دین کو حسبِ سابق لے کر ایک کتاب آئی جو نئی نہ تھی قدیم بھی تھی یعنی اصولِ قدیمہ مشترکہ کی اس نے تعلیم دی لیکن اصولِ انسانیت کی تعلیم کے ساتھ اس نے ایسے آئین بھی بنائے جو عام انسان کی معاشرتی، مدنی، سیاسی اور فکری اصلاح کے کفیل تھے اس لئے ہم اس کو جدید کتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں اور پہلی کتابوں میں فرق یہ تھا کہ گزشتہ کتابوں کی طرح اصولِ دین کے علاوہ ماحول کو درست کرنے کی تعلیم بھی اس کتاب میں دی گئی تھی لیکن ہر زمانے کے انسان کی معاشرت، معیشت، مدنیت شہریت، سیاست اور خود

شخصیت کو سدھارنے اور سنوارنے کے آئین بھی مقرر کردیئے گئے تھے جو ہر زمانہ اور ہر قوم کی بہبودی کے لئے واحد ذمہ دار ہیں۔ اس کتاب کا نام قرآن ہے۔ قرآن ہی اللہ کی وہ رحمت تنزیلی ہے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو انسان کی ساری تخلیقی برتری ناکارہ ہو جاتی بلکہ شاید انسان اسفل السافلین میں جا گرتا کیونکہ آزاد وہم اپنی قوت کی وجہ سے فہم پر چھا جاتا اور انسان کی مادی قوتیں روحانیت پر مسلط ہو جاتیں اور سیدھا راستہ دکھانے والی کوئی شمع بھی نہ ملتی۔ انسان حیرت کی وادی میں سرگرداں آوارہ گھومتا پھرتا۔ خواہش و غضب کے نوکیلے پتھر انسانیت کی سنگلاخ زمین میں اس کی عقل و ورع کے قدموں کو زخمی کر دیتے جن کا کوئی مداوا نصیب نہ ہوتا۔

قرآن کیا ہے؟

قرآن کا نام فرقان بھی ہے۔ حق و باطل میں تفریق کر دینے والا، صحیح فکر و عمل کو غلط رسم و رسم سے جدا کر دینے والا۔ اس کا نام نور بھی ہے جہالت کی تاریک وادی میں علم و معرفت کی روشنی پیدا کرنے والا اور کفر، کفران، اور بد اعمالی کی تاریکیوں کو پھاڑ کر آفتاب عرفان کو نمودار کرنے والا۔ اس کو ہدایت بھی کہا گیا ہے۔ کج مج پگڈنڈیوں سے بچا کر گم گشتہ انسانوں کو سعادت دارین کی راہ بتانے والا۔ یہ ذکر، ذکریٰ اور تذکرہ بھی ہے۔ اس بھولے ہوئے پیام فطرت کو یاد دلانے والا جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے سُنا جا سکتا ہے بشرطیکہ گوش ہوش وا ہوں اور ان میں سننے کی صلاحیت ہو مگر غافل انسان اس کو بھولا ہوا ہے۔

یہ قرآن، قرآن بھی ہے اس لئے کہ فطرت کائنات آفاقی ہو یا انفسی، ظاہری ہو یا باطنی اللہ کی توحید ذات وصفات کا خاموش پیام سنا رہی ہے مگر ہر شخص اس پیام فطرت کو نہ سُن سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ یہ قرآن وہی پیام ہے لیکن قابل خواندگی جس کو پڑھا جا سکتا ہے جو کائنات کی سُنی جانے والی آواز ہے اور کلام منطوق ہے۔

قرآن کیا کہتا اور کیا تعلیم دیتا ہے۔ اس کا جواب بہت تفصیل طلب ہے ہم اس جگہ بطور اختصار اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس کی کتاب (مطالعہ قرآن کا رہنما) سے کچھ تغیر اور کمی بیشی کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

(۱) عقائد اور بنیادی تصورات :- حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا۔ باطل اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔ (۱۷ - ۸۱) قرآن کی غایت حقیقت الٰہیہ کو پیش کرنا ہے۔ قرآن حقیقت میں مجسم سچائی اور قانون ہے۔ وہ تذبذب اور شک یعنی باطل اور گناہ کو نیست نابود کر دیتا ہے۔ باطل سے مراد یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ ذات مطلق کا وجود ہی نہیں ہے یا یہ کہ اس کی ایک اضافی حیثیت ہے یا یہ کہ ذات مطلق میں تعدد ہو سکتا ہے یا یہ کہ خود اضافی ہستی ہی ذات مطلق ہے۔ خدا یعنی ذات مطلق کے متعلق جو عقیدہ صحیح ہے وہ کلمہ طیبہ کے دو اجزاء ہیں۔ اول اقرار توحید معبودیت، دوسرا اقرار رسالت پورا قرآن اسی فرق و امتیاز کی تشریح جو کلمہ شہادت میں واضح کیا گیا ہے کوئی الوہیت (یا حقیقت الٰہی یا ذات مطلق) توحید باری (یعنی حقیقت الحقائق یا ذات مطلق) کے سوا نہیں ہے۔ اور محمد اللہ کے رسول اور بندے ہیں۔

خُدا کی وحدانیت

قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا کے وجود کا یقین کرنا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ انسان کو جو پہلی بصیرت عطا ہوئی وہ وجود باری کی بصیرت تھی۔ اس کو تخلیق کی غرض سے بھی واقف کرایا گیا اور حقیقت الاشیاء کا بھی علم دیا گیا یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ کائنات کے عمل پر غور و فکر کرنے کے بعد بھی خالق کائنات کے وجود کا انکار کر سکے۔ قرآن فطرت انسانی سے سوال کر کے اس کی گہرائیوں سے جواب کا طالب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

بتلاؤ، وہ کون ہے جو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے۔ وہ کون ہے جو تمہاری آنکھوں اور کانوں پر اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے پیدا کرتا ہے اور وہ کون ہے جو تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے۔ ان باتوں کا جواب کافروں کی

طرف سے (بھی) یہی ہوگا کہ یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے۔ (سورۂ یونس ۳۲ و ۳۳) اگر انسان جہالت یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے وجود باری کا انکار کرتا ہے تو کرے خود اس کی فطرت اس کے خلاف شہادت دے رہی ہے بلکہ انسان خود اپنے آپ پر گواہ ہے وہ خواہ کتنے ہی حیلے کرے۔ (القیامۃ ۱۴ و ۱۵)

نظام کائنات اور اس کے طبیعاتی قوانین وتقاضوں میں جو ہم آہنگی، ارتباط اور توازن قائم کیا گیا ہے اور برقرار رکھا گیا ہے وہ اہل بصیرت کو خالق کائنات کے وجود اور اس کی وحدانیت کی ندا دے رہا ہے۔ وہ وجود جو زبردست قدرت اور ہمہ گیر حکومت والا ہے۔

بیشک آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات و دن کے آگے پیچھے آتے رہنے میں اور کشتیوں (کی روانی) میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لے کر رواں ہوتی ہیں اور بارش میں جس کو اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کردیتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو زمین پر اللہ نے پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں (کے چھا جانے) میں جن کو اللہ نے آسمان و زمین کے درمیان گھیر رکھا ہے (غرض ان سب چیزوں میں اللہ کی ہستی قدرت علم اور صنعت و حکمت کی) بہت نشانیاں ہیں (لیکن یہ نشانیاں) انہی لوگوں کے لئے ہیں جو بصیرت و فہم رکھتے ہیں۔ (سورت ۵۱۔ آیت ۲۰۔۲۱)

قرآن کہتا ہے یہ ایقان فطرتِ انسانی کو گھیرے ہوئے ہے کہ ایک ہی ہستی کائنات کی خالق اور مدبر ہے (مفہوم ۔ ۹ ۔ ۴۳)۔ قرآن سوال کرتا ہے کہ جب تخلیق اور ربوبیت صرف ایک ہی ذات کی صفتیں ہیں تو پھر کس طرح مخلوق خالق کے برابر ہوسکتی ہے۔ کیا یہ قرین فہم ہے کہ جس ہستی کے لئے کسی بھی چیز کا پیدا کرنا محال ہو وہ اس ہستی کے برابر ہوجائے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے (۴۶ ۔ ۵) کیا یہ ناشکری نہیں ہے کہ ہم خدائے واحد کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دیں جو بھلا یا برا کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہیں (۱۶ ۔ ۵۳ ۔ ۵۴) اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو ساری خلقت ہی تباہ ہوجاتی (۲۱ ۔ ۲۱) جن مشرکوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی انسان یا کوئی دوسری ہستی خدائے غالب و قادر کی قدرت میں مداخلت کرنے کی طاقت رکھتی ہے تو ان کو اس دعویٰ کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔ (۲۔۲۲۵ ' ۱۳۔۳۳ ' ۳۹ ۔۳)

قرآن نہ صرف اللہ کی توحیدِ ذاتی پر زور دیتا ہے بلکہ اس کا بہت زیادہ زور توحیدِ صفاتی پر ہے۔ انسان کی عقل و حواس محدود ہیں۔ اس لئے وہ ذاتِ مطلق کا بغیر صفات کے ادراک نہیں کر سکتا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کے تصور پر سے وہ تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے اور خدا اور اس کی صفات کا جلوہ اس طرح ذہن کو روشن کردیتا ہے کہ اس میں تجسم و تحیز اور تشکل کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔

خدا کا اقتدارِ اعلیٰ

قرآن کہتا ہے کہ انتظام کائنات کا ایک قطعی قانون ہے۔ اس کو محیط کل حکومتِ الٰہیہ کہیے یا مشیت ایزدی یا سنت اللہ بہرحال ساری کائنات اسی قانون کی تابع ہے۔ سارے سنسار کے ذرے ذرے میں مشیتِ خداوندی کے مطابق انتظام، ہم آہنگی، ترتیب تالیف اور توازن برقرار ہے۔ کہیں کسی جگہ اس میں شگاف نہیں، رخنہ نہیں، تفاوت نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ساری کائنات بغیر توازن و حساب کے بے مقصد اندھا دھند چل رہی ہو۔ بڑی برکت والا ہے۔ وہ اللہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی بادشاہی ہے، جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا۔ (۶۷ ۔ ۱ و ۲)

قرآن کی غرض و غایت انسان کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ خدا ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ وہ انتہائی پاک اور منزہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کی ذات تک رسائی ممکن ہے۔ وہ ایک دھندلی دور از کار محض خیالی ہستی یا ایک منطقی تصور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ (۵۰ ۔ ۵۱)

کہیں تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی کہ ان کا چوتھا اللہ (ان کے ساتھ) نہ ہو۔ نہ پانچ آدمیوں کی سرگوشی ہوتی ہے کہ ان کا چھٹا اللہ

نہ ہوا نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ (اجتماع ہوتا ہے کہ) اللہ ان کے ساتھ نہ ہو خواہ یہ (اجتماع) کہیں ہو۔ (۸-۵۸)

اس کا ادنیٰ ترین بندہ بھی اس کی بارگاہ میں اپنی خواہشات کی تکمیل، اپنے اطمینانِ قلب اور اپنی حفاظت کے لئے بغیر کسی سفارشی اور میانجی کے عرض رساں اور رحم و کرم کا طالب ہو سکتا ہے۔

جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں قریب ہی ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں۔ (۲-۱۸۶)

قرآن چاہتا ہے کہ انسان زندگی کو خدا کا عطیہ اور مقدس امانت سمجھے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر زندگی بسر کرے۔ چونکہ اخلاقی اقدار کو سمجھنے اور بھلائی برائی میں تمیز کرنے کی طاقت و صلاحیت انسان میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ اپنے ہر کام میں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہمیشہ اپنی اخلاقی ذمہ داری کو محسوس کرے توحید خدا کا محض خالی خولی تصور بے نتیجہ ہے۔ جب تک عملاً زندگی کو منافت الٰہی کے تابع نہ بنا دے۔ ڈاکٹر اقبال نے خوب کہا تھا کہ قرآن کا اصل مقصد انسان میں ان گوناگوں رشتوں کا اعلیٰ شعور پیدا کرتا ہے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ اور کائنات کے درمیان موجود ہیں۔

نبوّت و وحی

انسان کو قوتِ ارادہ دی گئی۔ یہ اپنے اختیار سے اچھا یا برا عمل کر سکتا ہے، صحیح غلط عقیدے میں امتیاز کر سکتا ہے۔ لیکن اُس کے اختیار و تمیز کی طاقت محدود ہے۔ عقل طبعی یکساں حالت پہ نہیں رہتی، اس لئے اس کو عقلِ طبعی پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ وحی کو اس کا مددگار بنا دیا گیا عقل و وحی باہم تعاون کرتی ہیں۔ وحی عقل کو سیدھے راستے پر لگاتی ہے۔ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اسی بنیاد پر ہے کہ وہ زندگی کے راز سے واقف ہوتا ہے اور زندگی کے راز سے واقفیت شمع ہدایت کے بغیر ممکن نہیں اور اس شمع کی روشنی عقل کی روشنی سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے۔ عقل زندگی کا نامکمل جائزہ لیتی ہے اور صاحب وحی کا دل زندگی کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔ حاملانِ وحی، وحی کی روشنی میں ایک نئی دنیا دکھاتے ہیں اور جو افراد اس شمع وحی سے نور چینی کرتے ہیں وہ دنیا کی حقیقت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ وحی لفظاً لفظاً اللہ کا پیغام ہوتی ہے۔ محض الہام معنوی کا نام وحی نہیں ہے۔

مختلف زمانوں اور مقاموں میں وحی کے ذریعے سے مختلف افراد پر جو مختلف احکام آئے سب کی اسپرٹ ایک تھی۔ بنیادی عقیدہ اور روحِ احکام سب کی ایک ہی رہی، اس لئے قرآن نے تمام آسمانی کتابوں اور تمام پیغمبروں پر ایمان لانے اور سب کو سچا اور برحق جاننے کو ہر مسلم کا فرض قرار دیا۔ قرآن کہتا ہے جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ کفر و ایمان کے درمیان ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ منکر ہیں (۴-۱۵۰-۱۵۱) اے پیغمبرو تم سب ایک ہی جماعت ہو۔ (۲۳-۵۴)

قرآن کی پُرزور تعلیم ہے کہ انبیاء نہ خدا تھے، نہ انسان کے روپ میں خدا۔ نہ اوتار، نہ خدا کے بیٹے۔

اے محمد کہہ دو میں تمہاری طرح محض انسان ہوں (خدا یا خدا زادہ یا خدا کا اوتار نہیں ہوں) ہاں میرے پاس وحی آتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک ہی ہے۔ (اس لئے میں پیغام رساں ہوں)

ایمان کے معاملہ میں قرآن کسی لچک کو قبول نہیں کرتا، نہ کسی قسم کی رواداری کو برداشت کرتا ہے۔ بلاشبہ قرآن دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ آشتی اور صلح کا حکم دیتا ہے لیکن واضح طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اللہ کی بارگاہ میں قابلِ قبول ہے۔ بیشک دین اللہ کی نظر میں اسلام ہی ہے۔ (۳-۱۹)

جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب چاہے گا تو وہ مذہب ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۳-۸۵)

مرنے کے بعد دوسری زندگی

قرآن کی نظر میں اس دنیا کی ایک عمر ہے۔ جب یہ میعادِ عمر ختم ہو جائے گی تو سارا جہان الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ ہر سیارہ اور ہر ستارہ اپنا نظم اپنی رفتار اور اپنی حرکت چھوڑ دے گا۔ سب ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔ سارے آسمان پھٹ پڑیں گے اور کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ زمین تہ و بالا ہو جائے گی۔ سمندر آگ بن جائیں گے۔ زمین کی اندرونی حرارت باہر نکل کر پانی کو آگ بنا دے گی۔ ممکن ہے دوسروں کی گرمی بھی اس کرہ پر آجائے۔ مردہ انسان دوبارہ اصلی زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے اور جو کچھ پہلی زندگی میں کیا ہوگا وہ دوسری زندگی میں سامنے آئے گا اور پاداشِ عمل کے قانون کے زیرِ حکم اپنے کئے کا بدلا پائے گا۔ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کی کنجی ہے۔ یہ زندگی آنے والی زندگی کے لئے کھیتی ہے جس کا پھل آئندہ کھانا ہوگا۔ آخرت میں اس زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ ہر شخص کے اعمال کا ردِ عمل اس کی روح پر نقش ہو جاتا ہے جو عقبیٰ میں اس کے ساتھ جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کی گردن سے باندھ دیا ہے اور قیامت کے دن ہر شخص کا اعمالنامہ اس کو دیا جائے گا جس کو وہ اپنے سامنے کھلا ہوا دیکھے گا۔ پھر حکم ہوگا اپنی کتاب کو پڑھ۔ آج تو ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ (۱۷-۱۴-۱۵) اگر تم کو دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہو۔

جو لوگ قیامت یا روزِ جزا کے آنے میں شک کرتے ہیں ان سے قرآن کہتا ہے۔

اگر تم کو دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہو تو (غور کرو کہ) بلاشبہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے۔ پھر گوشت کے لوتھڑے (جس کی بناوٹ کبھی) کامل ہوتی ہے (اور کبھی) ناقص ناتمام۔ یہ اس لئے کہ ہم تم کو اپنی قدرت ظاہر کریں اور جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحم میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر بچہ بنا کر تم کو نکالتے ہیں (پھر تمہاری پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ تم میں سے کوئی (بڑھاپا آنے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو نکمی عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ بہت کچھ جاننے کے بعد بے علم ہو جائے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہوتی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ پھولنے اور لہلہانے لگتی ہے اور ہم ہر قسم کی جڑی بوٹیاں اگاتے ہیں۔ یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت ضرور آنے والی ہے۔ یہ بات ناقابلِ شک ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قبر والے مردوں کو اللہ ضرور زندہ کرکے اٹھائے گا۔

(۲۲-۵-۷)

اس دنیا کی زندگی آخری زندگی نہیں۔ یہ مقصدِ حیات کا منتہا نہیں ہے بلکہ ابدی زندگی کا ایک زینہ ہے جو آخرت کی سطح پر پہنچانے والا ہے۔ منتہائے حیات آخرت ہے۔ تم کو درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔ (۸۴-۱۹)

وحدتِ انسانی

اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے ہم نے تم کو ایک ہی اکائی سے پیدا کیا۔ اسی وحدت سے کثرت پیدا ہوئی۔ ایک انسان سے بے گنتی انسان پیدا ہو گئے۔ اس لئے انسانوں کو چاہیئے کہ وہ پھر اپنے نقطۂ وحدت کی طرف آئیں اور اس کو تلاش کریں۔ وحدتِ انسانی کی بنیاد وحدتِ الٰہی کے تصور پر ہے اور اسی سے وہ زندگی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ قرآن رنگ، نسل، وطنیت، دولت، حسن صورت اور قوت کے سارے مفروضہ امتیازات کو ختم کر دیتا ہے۔ مشیخت، سیادت اور سیاسی و معاشرتی برتری بھی اس کی نظر میں ہیچ ہے ایک انسان پر دوسرے انسان کی فوقیت و برتری کے جس معیار کو قرآن نے پیش کیا ہے وہ صحتِ عقیدہ و فکر کے ساتھ اعمالِ صالحہ ہیں۔ قرآن واحد نظامِ عالم اور عالمی برادری کا درس دیتا ہے۔

بلاشبہ یہ تمہارا سب کا ایک ہی دین ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ (٢١-٩٢)

اللہ نے اپنے رسول کی زبان سے کہلوایا۔ ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے (یعنی اللہ ہی کی مخلوق ہے) اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ (بیہقی کتاب الایمان)

ضابطۂ حیات

اسلام نہ صرف پاکیزہ عقائد کی تعلیم دیتا ہے بلکہ ثقافتی اور معاشرتی اصول کے ایک جامع نظام کا بھی حامل ہے۔ قرآن نے خدا اور بندہ کے درمیان روحانی رشتے کی تشریح کرنے کے ساتھ شخصی کردار اور معاشرتی سلوک کے قواعد بھی مدون کئے ہیں۔ بغیر عملی قوانین کے ایمان ایک بنیاد تہ سپرد زمین ہے جس پر سردی گرمی سے بچانے والی کوئی عمارت نہ بنائی گئی ہو۔ قرآن نے جو تصورِ حیات پیش کیا ہے اس میں مادی خوشحالی کی مخالفت نہیں۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا کی مخالفت ہے۔ وہ تزکیۂ نفس کے لئے پیہم فاقہ کشی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس نے اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا ہے کہ اپنے رب سے اس طرح دعا کرو۔

اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں بھی بہبودی عطا کر اور آخرت میں بھلائی عنایت فرما۔ (٢-٢٠١)

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن صرف مادی رجحانات کی طرف مائل کرتا ہے۔ نہیں وہ روحانی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا بھی شعور پیدا کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی شعوری جدوجہد ایسی نہیں جو اسلامی اخلاق کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کی نظر میں ہر دنیوی عمل روحانی مرتبہ اختیار کر لیتا ہے بلکہ عبادت کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ وہ حکمِ خدا اور اخلاقی دستور کے مطابق ہو۔ قرآن انسانی زندگی میں توازن قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ نفس کی شوریدہ سری اور وساوس و شکوک سے آزادی حاصل ہو اور جمعیتِ خاطر نصیب ہو۔ قرآن انسان پر دو قسم کی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔ دوسری وہ جو خارجی دنیا سے متعلق ہے۔ اول کو وہ حقوق اللہ اور دوسری کو وہ حقوق العباد کہتا ہے۔ حقوق اللہ درحقیقت اپنے ہی نفس کے حقوق ہیں۔ انسان کی اول ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کو پکارے اور انسانی سرشت میں رکھے ہوئے توازن کو مناسب طریقہ پر استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اے اہلِ ایمان اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (اس کی قائم کی ہوئی سنت پر عمل کرو گے) تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ (سورت محمد۔ آیت ٧)

دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ انسان اپنے معاشرتی شعور کو ترقی دے۔ یعنی دوسروں کی فلاح و بہبود کے احساس کو فروغ دے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقوق اللہ نام ہے واجباتِ نفس کا اور حقوق العباد سے مراد ہیں واجباتِ خلق۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ زندگی کے کردار کے دو رخ ہیں اور دونوں مل کر اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان کو کس قسم کا ذہن پیدا کرنا ہے۔

ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بعض مخصوص اعمال مددگار ہوتے ہیں اور ان مخصوص اعمال کی دو قسمیں ہیں:۔

(١) مشروعہ اعمال (٢) اختیاری اعمال

اول قسم کے اعمال ارکانِ اسلام پر مشتمل ہیں اور قسم دوم میں ضبطِ نفس کے وہ اعمال داخل ہیں جن کا تعلق ضابطۂ اخلاق سے ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ نظم و ضبط کے ان اصولوں کی پابندی کئے بغیر روحانی مدارج میں ترقی کر کے اپنی شخصیت کو بلند کر سکتا ہے تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اس دوگونہ ذمہ داری کی تکمیل ہی خیر اور بھلائی ہے اور اس کی تکمیل سے قاصر رہنا شر یا برائی ہے۔ اس فرق کو زندگی کے ہر قدم پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ خواہ وہ جسمانی ہو، دماغی ہو، روحانی ہو، معاشی ہو یا معاشرتی ہو۔ عفت، عصمت، الفت، محبت، صداقت، وفائے عہد، تحمل، درگزر، انصاف، رحم اور دوسری اچھی صفات انسان کو محض وقتی نمائش کے لئے نہیں دی گئی ہیں بلکہ ایک صالح زندگی کے ضروری اجزا ہیں۔ ان صفات کے اضداد جیسے درشتی، نفرت، شہوت پرستی، حرام خوری، بد دیانتی، جھوٹ،

فریب، منافقت، عداوت، بغض، کینہ، کمزوری، بے رحمی، استحصال بالجبر وغیرہ قرآن کی نظر میں نہ صرف معمولی برائیاں ہیں بلکہ ایسی سخت خرابیاں اور فساد کی شکلیں ہیں جو معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہیں اور ان سے پرہیز بہت ضروری ہے۔

اسلامی ثقافت ایک مکمل ثقافت ہے جس کی بنیادیں ایک ابدی اور روحانی قانونِ زندگی پر قائم ہیں۔ اسی طرح اسلامی تمدن انسانی فکر اور شخصیت کی بلندی و عروج کو ظاہر کرتا ہے جو منظم شہری زندگی کو حقیقی انسانیت سے نوازتا ہے اور بقائے باہم کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔

اے مسلمانو! ہم نے تم کو ایک بہترین (اور متوازن) قوم بنایا تاکہ تمام لوگوں کے لئے تم ایک نمونہ بن سکو۔ (۲ - ۱۴۳)

قرآن انسان کو پیہم صدا دے رہا ہے کہ وہ نظامِ کائنات میں غور اور قوانینِ قدرت کا مطالعہ کرے لیکن شاعرانہ حظِ نفس یا حصولِ آفرین کے لئے نہیں بلکہ قدرت کے قائم کردہ نظامِ اسباب سے فائدہ اٹھانے اور انسانیت کو فائدہ بہم پہنچانے کے لئے۔ مطالعۂ کائنات سے ہی آدمی اپنے رب کی کرم گستری ربوبیتِ عامہ اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کا اندازہ کر سکتا ہے اور انسانیت کے فائدہ کے لئے کائنات سے کام لے سکتا ہے لیکن یہی مطالعہ اگر انسانیت کی تباہی و ہلاکت کا آلہ بن جائے تو یہ خالص مادہ پرستی اور الحاد و بے دینی ہے۔

قرآن روحانی و مادی زندگی کا پاک صاف امتزاج چاہتا ہے۔ قرآن نے جس طرزِ زندگی کی تلقین کی ہے وہ نہ صرف روحانی اور بے ماؤ زندگی ہے نہ سراسر مادی بے روح زندگی اور اس میں مایوسی و احساسِ شکست خوردگی کا نام بھی نہیں ہے بلکہ زندگی پیہم سعی کو قرار دیا ہے۔ دنیوی زندگی میں نشیب و فراز آیا ہی کرتے ہیں۔ اس لئے کسی کوشش میں ناکامی کے باعث زندگی کو تاریک بنا لینا تعلیمِ قرآنی کے خلاف ہے۔ ناکامی کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کر کے اس کو اخلاقی فتح میں تبدیل کرنا مقتضائے قرآن ہے۔

قسم ہے زمانہ کی یقیناً انسان (نقصان اور زندگی کی تجارت میں) خسارہ میں ہے۔ ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور (راہِ حق میں پیش آنے والی مصائب پر) صبر کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ وہ ضرور گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔

تحلیلِ اجزاء

اَلرَّحْمٰنُ۔ وہ سب سے زیادہ اور سب سے بڑی رحمتوں والا ہے۔ دنیا میں چھوٹی بڑی چیزیں کافروں اور مومنوں کو اسی نے دی ہیں اور آخرت کی نعمتیں سب بڑی ہی ہوں گی اور صرف مومنوں کو وہ عنایت فرمائیگا۔

کافروں نے کہا تھا تا الرحمٰن۔ رحمٰن کیا چیز ہے۔ ہم تو رحمٰن یمامہ (مسیلمۂ کذاب) کے علاوہ کسی اور کو نہیں جانتے۔ اس کے جواب میں فرمایا۔ وہ اللہ ہی تو رحمٰن ہے۔ ساری نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں۔ کچھ تخلیقی نعمتیں ہیں جن میں روحانی نعمتیں بھی داخل ہیں اور مادی بھی اور کچھ تزئینی نعمتیں ہیں جن کی فراہمی کے سارے اسباب اللہ نے بنائے۔ جن میں سے سب سے بڑی نعمت دستورِ زندگی کی تعلیم یعنی قرآن مجید کا نزول ہے۔ عرب کے مشرک ذاتِ خدا کے منکر نہ تھے۔ نہ خدا کی ذات و شخصیت میں شرک کرتے تھے۔ ان کو انکار تھا تو توحیدِ ربوبیت کا۔ وہ اس عالم کا حکمران دوسروں کو بھی جانتے تھے۔ ان میں سورج کو دیوتا قرار دینے والے بھی تھے اور درختوں کے پجاری بھی۔ اور غیبی طاقتوں اور جنوں کو کارساز و مددگار جاننے والے بھی اور بتوں کو شفیع ماننے والے بھی۔ غرض ان کا سارا شرک ربوبیتِ خداوندی میں تھا اسی لئے وہ دوسروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ گویا ان کو تنہا اللہ کے منعم ہونے کا انکار تھا۔ اسی لئے سورت کو شروع بھی لفظ رحمٰن سے کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ ساری مادی اور روحانی نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں۔ کوئی اور دینے والا نہیں ہے۔ پھر ۳۱ آیات میں بار بار عطائے نعمت کا تذکرہ کیا تاکہ خوابیدہ سمجھ والے بیدار ہو جائیں اور مردہ حواس زندہ ہو کر اللہ کی ربوبیت کے مختلف مظاہر پر غور کریں۔ اظہارِ نعمت کی اس تکرار سے کہیں تو نعمتوں کے تنوع کو بیان کرنا مقصود ہے، کہیں کفر و شرک سے باز داشت اور عذاب سے تخویف اور کہیں ثواب و جنت کی ترغیب۔

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ یوں تو سب نعمتیں اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں لیکن سب سے بڑی رحمت و نعمت قرآن مجید ہے جو انسان کے لئے دستورِ حیات ہے، اصلاحِ بشری کا کفیل ہے۔ اگر قرآن نازل نہ ہوتا تو تمام اربابِ دانش بے وقوف جاہلوں کو اپنے ساتھ لے کر وادئ حیات میں سرگرداں پھرتے رہتے اور راہِ حق ان کو سجھائی نہ دیتی اور دنیاوی زندگی کے علاوہ آخرت کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ۔ عطائے قرآن تو عظیم الشان روحانی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور ساجی نعمت ہے۔ لیکن انسانی تخلیق بجائے خود مادی اور جسمانی نعمت ہے۔ کائنات بالا و پست سب ہی اللہ نے پیدا کی ہے۔ ہر انسان کو جو احسن تقویم کا جامہ پہنا کر بھیجا گیا ہے وہ اپنے اندر علمی اور عملی، باطنی اور ظاہری، معنوی اور صوری کمالات کو سمائے ہوئے اور سارے عالم کی قوتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ گویا انسان اپنی بناوٹ اور استعدادی و فعلی قوتوں کے ساتھ ایسا مجمل مجموعہ ہے کہ اگر اس کی تحلیل کی جائے تو اس کے اندر سے اس کائنات سماویہ و ارضیہ جیسے ہزاروں عالم نکل آئیں گے۔ تخلیقِ انسانی کی مفصل تشریح ہم نے سورت والتین کی آیت لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی تفسیر کے ذیل میں کر دی ہے۔

حضرت ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک الانسان سے مراد ہیں حضرت آدم علیہ السلام جن کو اللہ نے بیان یعنی تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے تھے اور تمام زبانوں کی تعلیم دیدی تھی۔ آپ سات لاکھ زبانیں جانتے تھے۔

ابو العالیہ اور حسن نے کہا کہ جنس انسان مراد ہے۔ جنس انسان کو اللہ نے پیدا کیا اور الفاظ میں اظہارِ مدعا کرنا سکھایا ہے۔

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ اللہ نے انسان کو بیان کی تعلیم دی۔ زبان سے ہو یا تحریر سے بہر حال اظہارِ مدعا واضح الفاظ میں کرنے اور سمجھانے کی قوت عطا فرمائی۔ دوسرے حیوانات اور نباتات بھی اپنا مدعا اپنے ابنائے نوع کو کسی نہ کسی طرح سمجھاتے ہی ہیں۔ ہر ایک کو اللہ نے نوعی زبان عطا فرمائی ہے۔ لیکن جو صوتی مخارج اللہ نے انسان کو مرحمت کئے ہیں وہ کسی کو نہیں دیئے۔ حروف ہجا کا تلفظ، پھر ان کی ترتیب و ترکیب سے پُر معنی الفاظ کی ساخت اور تالیفِ الفاظ سے واضح عبارت کی تعلیم اللہ نے انسان ہی کو دی ہے۔ پھر ہزار ہا مختلف زبانیں اور لغات ہیں۔ انسانوں کی ایک جماعت انہی الفاظ اور الفاظ سے بنائے ہوئے جملے بولتی اور اپنے مدعا کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے اور دوسرا گروہ دوسری زبان بولتا ہے اور تیسرا گروہ تیسری زبان۔ اس طرح ہر ملک اور ہر خطہ کی زبان جدا اور ما فی الضمیر کو ظاہر کرنے کا طرزِ کلام الگ الگ ہے۔

مادی نعمتوں میں اللہ کی یہ اتنی عظیم الشان نعمت ہے جس کی قدر حیوانی اور نباتی دنیا میں آکر ہی کی جاسکتی ہے۔ انسان کا ذہن عام حقائق کو براہِ راست جانتا ہے اور جزئیات کا علم حواس کی وساطت سے حاصل کرتا ہے۔ بیرونی شخصی تصویریں، بیرونی حواس کے ذریعہ سے دماغ کی ایک اندرونی قوتِ حس میں، جس کو حسِ مشترک کہتے ہیں، جاتی ہیں۔ اور یہ شخصی صورتیں اپنے ساتھ معانی جزئیہ کو بھی لے جاتی ہیں۔ صورتوں کو ہٹا کر معانی جزئیہ کا ادراک کرنا قوتِ واہمہ کا کام ہے۔ پھر ان تمام صورتوں اور معانی کے تشخصات کو دور کر کے سب سے ایک عام کلی معنی کو اخذ کر لینا عقل کا کام ہے۔ ذہنی معانی خواہ عام اور کلی ہوں یا جزئی اور شخصی بہر حال مادی نہیں ہوتے، جسمانی نہیں ہوتے۔ پس ان معانی کو ذہن سے باہر لانا، خصوصاً غیر مادی عام حقائق کو دماغ سے نکال کر مادی الفاظ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے۔ معانی کلیہ کو الفاظ کا مادی جامہ پہنا کر دوسروں کے ذہن میں اتارنا قوتِ بیانیہ ہی کا خاصہ ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے قوتِ بیانیہ عطا نہ کی گئی ہوتی تو عام حقائقِ کائنات کا طبیعیاتی علم اور دستورِ زندگی یعنی زندگی کے عام اصول و ضوابط کا علم انسان کو نہ ہوتا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے بدن اور بدنی قوتوں کی تخلیق اللہ کی مادی نعمت ہے اور روحانی علمی طاقتوں کی عطا، غیر مادی نعمت ہے اور قوتِ بیانیہ کی بخشش غیر مادی نعمتوں کی مادیت کا جامہ پہنا کر ایک انسان سے دوسرے انسانوں تک غیر مادی نعمت کو پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

اللہ کی سب سے بڑی رحمت تشریعی ہے یعنی قرآن مجید نازل فرما کر اصولِ زندگی کی تعلیم۔ دوسری نعمت تکوینی اور تخلیقی ہے یعنی بدن اور بدنی قوتوں کی پیدائش اور ساری علمی و عملی طاقتوں کی تخلیق۔

تیسری اہم نعمت ہے قوتِ بیانیہ عطا فرمانا جس پر تمام غیر مادی حقائق و ضوابط کو الفاظ و عبارت کا مادی جامہ پہنا کر سمجھنا سمجھانا موقوف ہے۔ وغیرہ۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَ

سورج اور چاند حساب کے ساتھ (چلتے) ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت دونوں (اللہ کے) مطیع ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا

وَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا

اور اسی نے (دنیا میں) ترازو رکھدی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کر

الْمِيزَانَ ۝ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَالنَّخْلُ ذَاتُ

کم دو مت اور اسی نے خلقت کے واسطے زمین کو (اس کی جگہ) رکھ دیا کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن

الْأَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

(کے پھل) پر غلاف ہوتا ہے اور (اس میں) غلہ ہے جس میں بھوسا (بھی) ہوتا ہے اور (اس میں) غذائی چیز (بھی) ہے سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر تخلیق انسان تعلیم قرآن اور عطائے بیان تینوں کا تعلق ایجاد سے ہے یعنی اللہ نے انسان کو وجود عطا کیا۔ اصول زندگی عطا کئے اور اظہار مدعا کی قوت عطا کی لیکن نظم وجود اور ترتیب وجود اور بقائے وجود کا تعلق کس سے ہے۔ کس نے ایسے اسباب پیدا کئے، قائم رکھے اور رواں دواں بنائے جن سے انسان کے وجود کی تربیت اور اس کا بقا ہو اور انسان اپنی حد کمال تک پہنچ سکے۔ کون اس کی پرورش اور حفاظت کر رہا ہے اور کس نے اس کے لئے غذا دوا اور بقائے زندگی کے اسباب ایجاد کئے اور کون ان اسباب اور اجزائے کائنات کے توازن کو برقرار رکھے ہوئے اور انتظام کو تھامے ہوئے ہے۔ ان تمام امور کی تشریح اس جگہ سے آخر سورت تک فرمائی ہے۔

اللہ نے کائنات بالا و پست پیدا کی۔ ہر بلند و زیریں مخلوق کا فریضہ مقرر کیا جس کو ادا کرنے میں وہ سرگرم ہے اور حکم الٰہی سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتی۔ آسمان کو اونچا اور زمین کو نیچا بنایا۔ سورج اور چاند کو ایک مقررہ رفتار سے اپنے اپنے مقام پر رواں دواں کیا۔ زمین میں طرح طرح کے پھل پیدا کئے۔ سورج اور چاند کو روشن کیا۔ زمین کو کثیف اور جامد بنایا۔ پھر ان سب میں ایک خاص توازن قائم کیا کہ کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں۔ دوسرے کی حد میں مداخلت نہیں کرتا۔ باوجود اپنی لامحدود اور ناقابل بیان قوت کے حدودِ توازن میں محدود ہے۔ کوئی غالب یا مغلوب نہیں۔ کسی پر کوئی غیر متوازن چیرہ دستی نہیں کر سکتا اور یہ تمام انتظام انسان کے وجود کو پرورش کرنے اور مقررہ مدت تک زندہ رکھنے کے لئے کیا گیا۔ پس اللہ ہی رحمٰن ہے۔ اسی نے اپنی رحمت سے ایسا کیا اور کر رہا ہے۔ اسی کی قدرت کے ہاتھوں اس اونچی نیچی مخلوق کا نظم ہے۔ پھر اس کائنات کا توازن اور قانونِ توازن انسان کو تعلیم دے رہا ہے کہ وہ بھی شخصی معاشرتی اور سیاسی توازن کو قائم رکھے۔ حقوق و فرائض کی تفصیل لئے ہوئے جو ضابطۂ زندگی اللہ نے انسان کے لئے نازل فرمایا ہے اس کی پابندی رکھے آسمان و زمین کی بقا عدل پر موقوف ہے۔ اگر فطری ضابطۂ تعادل سے کوئی سرمو ہٹ جائے تو عالم درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسان اگر اللہ کی نازل کردہ میزان کے کسی پلڑے کو بھاری یا ہلکا کرے گا اور تعادل میزانی کو قائم نہ رکھے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ نازل کردہ دستورِ حیات اور پیدا کردہ دستورِ کائنات عدل خداوندی کی دو قسمیں ہیں۔ جس طرح سارا جہان اضطراراً دستورِ کائنات کا پابند ہے اسی طرح انسان کو اختیاراً اللہ کے بھیجے ہوئے دستورِ حیات کا پابند ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ طغیان کا نتیجہ بہر حال تباہی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ انسان کی بقائے حیات کے لئے جہاں پانی، ہوا اور غذا وغیرہ ضروری ہیں وہاں روشنی، تاریکی، گرمی، سردی، صبح، دوپہر، شام غرض تبدیلیِ کیفیات و احوال بھی ضروری ہے۔

کائناتِ علویہ میں سب سیارے ستارے عام طور پر روشنی دے رہے ہیں اور شاید حیاتِ نباتی و حیوانی پر بھی اثر انداز ہیں۔ خصوصاً چاند اور سورج کا دوران اور طلوع و غروب ہر جسمِ نامی کے نشو و ترقی اور حدِ کمال تک پہنچانے کے موثر ترین واضح اسباب ہیں۔ سمندروں کا مدوجزر اور درختوں وغیرہ کی بالیدگی پر چاند کا اثر نمایاں ہے اور سبزہ کی رنگ بھرنگی اور نمو اور پھلوں کا پختہ ہونا آفتاب کی روشنی اور گرمی سے وابستہ ہے پس اللہ نے چاند اور سورج کی رفتار ایک مقرر حساب سے کر دی ہے تاکہ ہر نامی کی روئیدگی بالیدگی اوقات کی تعیین احوال، اوقات اور فصلوں کا تبادلہ، بارشوں کا انتظام اور ہر ذی حیات کے تنفس اور دورانِ خون کا نظم خاص ترتیب اور حساب سے ہو سکے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ۔ اور زمین پر پھیلنے والی بیلیں اور تنے والے پودے اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ کائناتِ علویہ میں انسانی بقائے حیات اور فراہمی غذا کے لئے چاند اور سورج کے دوران اور روشنی و گرمی کی اہمیت ہے۔ اتنی ہی زندگی کو باقی رکھنے اور تحلیل شدہ اجزائے جسم کی جگہ نئے اجزاء اور قوتیں کو پیدا کرنے کے لئے فراہمی غذا کی ضرورت ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ نباتات سے حاصل ہوتی ہے انسان دو طرح کی غذا استعمال کرتا ہے حیوانی اور نباتی۔ حیوانی غذا کی اصل بھی نباتات ہی کی پیداوار ہے۔ گوشت، دودھ، دہی، گھی، پنیر، مکھن سب ہی غذائے نباتی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر قسم کا غلہ اناج اور پھل پھول تو براہِ راست نباتات سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ آدمی کی زندگی کو خاص وقت تک باقی رکھنے کے لئے اللہ نے کائناتِ علویہ و سفلیہ سے اس کی روزی پیدا کرنے کا انتظام کر دیا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی خود رزاق یا رب نہیں ہے۔ سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ اللہ نے آسمان کو اونچا بنایا اور وزن (یعنی ترازو) قائم کیا تاکہ تم بھی ناپ تول میں حد سے اِدھر اُدھر نہ ہٹو اور صحیح ناپ تول قائم کرو۔ اور وزن میں کمی نہ کرو۔ اللہ نے آسمان یعنی بالائی مخلوق کو اونچا بنایا اور ایک توازن کے ساتھ رکھا۔ مجاہد نے کہا۔ اس جگہ میزان سے مراد ہے عدل۔ وضعِ میزان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے عدل کرنے کا حکم دیا اور انسان کو عدل کا مکلف بنایا یہاں تک کہ سارے جہان کا انتظام قائم رکھنے میں عدل سے کام لیا۔ توازن برقرار رکھا۔ حسن، قتادہ اور ضحاک کے نزدیک میزان سے مراد ہے صحیح مقدار معلوم کرنے کا آلہ، خواہ پیمائش کا آلہ ہو یا وزن کشی کا یا کوئی اور ذریعہ جس سے صحیح مقادیر کا علم ہو سکے۔ وزن کا لغوی معنی ہے اندازہ کرنا۔

اس فقیر کے نزدیک وضعِ میزان کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) اللہ نے آسمان سے کتابیں نازل کیں جن میں حقوق و فرائض کو تفصیل سے بیان کیا۔ اللہ کی بھیجی ہوئی ہر کتاب میزانِ عدل ہے۔ اس میزان سے تول کر حقوق العباد اور حقوق اللہ کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ آسمان سے نازل شدہ قانون عدل میں زیادتی کرنی بھی طغیان ہے اور کمی بھی طغیان۔ اسی کے متعلق اللہ نے دوسری آیت میں أَنْزَلَ الْمِيزَانَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(۲) وضعِ میزان کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آسمان کو اونچا بنایا اور اس کی وضع، ساخت، بقا اور غرض وجود میں توازن و اعتدال کو قائم رکھا۔ آسمانوں کو قانونِ کشش کے ساتھ تھامے رکھا۔ کشش میں غالبیت اور مغلوبیت نہ ہونے دی۔ بغیر محسوس ستونوں کے اتنا وسعت کے یہ گنبد محض توازنِ جاذبیت اور اعتدالِ کشش کی بنیاد پر بنا دیئے۔ الوان، اشکال، اصوات (آواز)، مقادیر، قوتیں، دوران، بعد یعنی دوری اور قرب، حسابی پیمائش غرض ہر کیفیت، کمیت اور حالت میں توازن اور اعتدالِ کشش کو ملحوظ رکھا اور اسی تعادلِ وضعی پر آسمان قائم ہے۔ یہی فطری ضابطۂ تجاذب و عدل انسان کو دعوت دے رہا ہے کہ وہ اپنے شخصی، قومی، ملکی غرض پوری سوسائٹی میں حقوق و فرائض کا اعتدال قائم رکھے اور ضوابطِ قرآنی سے سرِ مُو تجاوز نہ کرے اور ہر ناپ تول اور اخذ و عطا میں انصاف کو پیشِ نظر رکھے۔ آیتِ مذکورہ میں تین بار لفظ میزان ذکر کیا گیا ہے۔ شاید پہلے لفظ سے مراد ہے میزانِ تخلیقی اور جاذبیت کا اعتدال اور دوسرے لفظ سے میزانِ عدل یعنی قرآن۔ مطلب یہ کہ ضوابطِ قرآن سے تجاوز نہ کرو اور تیسرے میزان سے مراد ناپ، تول اور مقادیر کے جانچ کرنے کے آلات یعنی ناپ، تول اور پیمائش میں کمی نہ

کرو۔ پورا ناپو، پورا تولو۔ واللہ اعلم۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝ بقائے زندگی کے لئے رہنے کے مقام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس غرض کے لئے اللہ نے زمین کو بچھا دیا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ انام مخلوق یا جن وانس یا روئے زمین کی ہر چیز۔ بیضاوی نے لکھا ہے۔ انام سے مراد ہے ہر جاندار۔ اس فقیر کی نظر میں اس جگہ جن وانس مراد ہیں۔ کیونکہ اللہ نے اپنی نعمتیں کی انہی دونوں کو یاد دہانی کی ہے۔

فِيْهَا فَاكِهَةٌ۔ اس زمین میں طرح طرح کے لذت بخش کثیر پھل ہیں۔ ابن کیسان نے کہا فاکہہ ہر وہ نعمت ہے جس سے لذت حاصل کی جائے اور ایسی نعمتیں ان گنت ہیں۔

وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ۔ اکمام کِم کی جمع ہے۔ وہ غلاف ہے جس کے پھٹنے کے بعد پھل اندر سے نکلتا ہے۔ عرب کے لئے خصوصیت کے ساتھ کھجور اور چھوارہ کام کی چیز تھی۔ عرب کھجوروں اور چھواروں کا استعمال نہ فقط لذت کام ودہن حاصل کرنے کے لئے کرتے تھے بلکہ ان کی آدھی غذائی ضرورتیں اس سے پوری ہوتی تھیں۔ غلہ کی پیداوار تو کم تھی۔ اونٹنی کا دودھ یا گوشت، یا چھوارہ اور پانی ان کی عمومی غذا تھی۔ یوں بھی کھجور اور چھوارے کے اندر غذائی فائدہ عرب کے دوسرے پھلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ۔ اور غلہ اناج جیسے گندم، جو وغیرہ جس کے ساتھ بھوسہ بھی ہوتا ہے، دانہ اندر رہتا ہے۔ دانے کے اوپر چھلکے کی طرح بالی ہوتی ہے جیسے چاول کے اوپر دھان کا چھلکا یا جو کے اوپر نوکیلے چھلکے۔ عصف سے اس جگہ یہی چھلکے مراد ہیں۔

وَالرَّيْحَانُ۔ اور غذائیت کی چیز (یعنی دانہ) بھی۔

اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ریحان سے اس جگہ مراد ہے غذائی چیز یعنی دانہ۔ ریحان بمعنی رزق عربی میں مستعمل ہے۔ عرب کہتے ہیں خرجت اطلب ریحان اللہ میں اللہ کا پیدا کیا ہوا رزق تلاش کرنے کے لئے نکلا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ قرآن مجید میں ہر جگہ ریحان سے مراد رزق ہی ہے۔ حسن اور ابن زید کے نزدیک ریحان سے خوشبو کی چیزیں مراد ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تخلیق علویات کے بعد اللہ نے زمین کو انسان کے رہنے کے لئے بچھایا اور زمین میں تمام غذائی اجناس پیدا کر دیئے تاکہ ایک خاص وقت تک آدمی زندہ رہ سکے۔ بقائے وجود کے لئے چند ضروری نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جن وانس کو خطاب کرکے فرمایا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ کہ مذکورہ بالا نعمتیں عطا کرنے والا تو ایک رب ہے جو ہر چیز کی پرورش کرنے والا اور آہستہ آہستہ کمال نوعی وشخصی تک پہنچانے والا ہے۔ وہی انسان کو عدم سے وجود میں لانے والا، وہی انسانیت کو سنوارنے اور سدھارنے کے لئے دستور زندگی بنانے والا اور وہی علوی وسفلی اسباب کو حرکت میں لاکر انسان کی بقائے شخصی ونوعی کا انتظام کرنے والا ہے پھر اس کی کس نعمت کا انکار کر سکتے ہو اور کونسی نعمت ایسی ہے جس کو پیدا کرنے والا اور دینے والا کسی دوسرے کو قرار دے سکتے ہو۔

جمادات، نباتات اور سوائے انسان کے سارے حیوانات اور کل مادی عناصر اور تمام افلاک اور فلکی کائنات یہاں تک کہ سارے ملائکہ ایک تکوینی، غیر اختیاری ضابطہ میں بندھے ہوئے چل رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو انتقاد و ترجیح اور انتخاب وارادہ کی آزاد طاقت نہیں دی گئی اسی لئے اختیاری اعمال کا ان کو مکلف بھی نہیں بنایا گیا۔ سارے جہان میں صرف انسان اور جن ایسی مخلوق ہے جو با اختیار اور صاحب ارادہ ہے اسی وجہ سے ان کو اعمالِ اختیاریہ کا مکلف بنایا گیا۔ انہی انس وجن میں کچھ اپنے اختیار سے توحید الوہیت وربوبیت کے قائل ہیں اور کچھ کافر کفرانِ نعمت کرنے والے اسی لئے انہی دونوں کو اس صورت میں بار بار اپنی نعمتوں کو یاد دلاکر دریافت کیا گیا ہے کہ اللہ کی کس نعمت کا تم دونوں انکار کرو گے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ صیغہ تثنیہ مخاطب کا ہے لیکن مراد ایک ہی گروہ ہے۔ عربی محاورہ میں ایسا آتا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ۔ یہ بھی تثنیہ کا صیغہ ہے اور مراد ایک ہی ہے۔

استفہام کا مقصد مجہول کو دریافت کرنا نہیں ہے۔ اللہ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ بلکہ سوال کی غرض ہے نعمتوں کا اقرار کرانا اور تکذیب نعمت کا لغو اور بے بنیاد ثابت کرنا گویا استفہام تقریری بھی ہے اور انکاری بھی تقریر نعمت اور انکار تکذیب۔

حاکم نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے پوری سورت رحمٰن ہمارے سامنے پڑھی۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ خاموش کیوں رہے۔ تم سے تو جنات ہی اچھے رہے جب میں نے ان کے سامنے آیت فبای آلاء ربکما تکذبان پڑھی۔ ہر بار انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم تیری کسی نعمت کی تکذیب نہیں کرتے۔ تیرے ہی لئے ہر تعریف سزاوار ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آیت میں خطاب جنات کو بھی ہے اور انسانوں کو بھی۔

مقصودِ بیان سورج اور چاند کی رفتار بے حساب نہیں ہے۔ سب کو ایک ضابطۂ الٰہی اپنے اندر باندھے ہوئے ہے۔ اللہ نے سارے جہان کو ایک فطری ضابطہ کے اندر باندھ دیا ہے۔ ایک فطری توازن قائم کر دیا ہے۔ اس توازن اور اعتدال سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی۔ اسی توازن کے اندر انسان بھی تکوینی اور تخلیقی طور پر شامل ہے۔ لیکن اللہ کو مقصود ہے کہ انسان توازنِ تشریعی سے بھی سرتابی نہ کرے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس نے قرآن کو نازل کیا اور انسان کو قوتِ ارادہ و اختیار عطا کی تاکہ حقوق و فرائض میں وہ عدل سے کام لے اور حد مقرر سے طغیان نہ کرے۔

اس دنیا میں انسان کے حقوق و واجبات کا توازن ناپ تول اور دوسرے اسباب و آلات سے ہوتا ہے۔ اسی توازن کو قائم رکھنے کا نام عدل ہے۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی یا دوسرے انسانوں کے یا اپنے نفس کے سب ہی کے اندر توازن کو قائم رکھنا اور کمی بیشی نہ کرنا ضروری ہے تعلیم قرآن کا مغز ہی یہی عدل ہے۔ اس توازنِ شرعی سے نکل جانے کو فسق یا کفر یا کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔

زمین کو پیدا کر کے اسی توازن کے ساتھ اللہ نے رہنے کے لئے بچھایا اور طرح طرح کے پھل پیدا کئے تاکہ انسان اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر زندہ رہے اور تعادلِ فطرت کو دیکھ کر سبق حاصل کرے اور اعتدالِ قانونی کو قائم رکھے۔ وغیرہ

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ۝

اسی نے انسان (کی اصل اول یعنی آدم) کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا سوائے جن و انس

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر اس آیت میں انسان اور جن کے تخلیقی مادہ کو بیان فرمایا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا بسیط ہوں جیسا کہ یونان کے قدیم فلاسفہ خصوصاً ارسطو اور اس کے متبعین فارابی و ابن سینا وغیرہ کا قول ہے یا مختلف طبیعت و خاصیت رکھنے والے اجزاء سے مرکب ہوں جیسا کہ موجودہ طبیعیاتی علماء کہتے ہیں۔ بہر حال ثنائی کائنات (بخار و دخان) کو چھوڑ کر باقی عنصری کائنات کا تخمیری مادہ یہی عناصر ہیں۔ جمادی نباتی اور حیوانی دنیا انہی سے بنی ہے۔ اسلام نے ایک عنصری مخلوق اور بھی مانی ہے جو لطیف مادی ہے جس کی تخمیر کا غالب عنصر آگ ہے۔ اس کو جن کہا جاتا ہے مع سرخ، زرد اور سبز بھڑکتے شعلوں کا مجموعہ (بقول مجاہد) جن کا خمیری مادہ ہے۔ بہر حال جمادی دنیا میں مادی کثافت زیادہ ہے کیونکہ اس کی سرشت میں مٹی کا بیشتر حصہ ہے اور دوسرے عناصر بہت کم ہیں۔ نبات میں بھی مٹی کا حصہ زیادہ ہے لیکن جماد سے کم۔ اور حیوان کی تخلیق میں بھی تراب کا عنصر غالب ہے لیکن خواہش و غضب کی طاقتوں اور آلاتِ شعور کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس میں ہوائی آبی اور آتشی جزو کافی شامل ہے۔ رہا انسان تو بہر حال یہ بھی حامل خواہشات و غضبیات ہے مگر اس میں کچھ لطافتِ عقل اور نورانیتِ اندرم بھی ہے اس نے

اس کی سرشت میں دوسرے حیوانوں کے مقابلہ میں خاکیت کم ہے مگر ہے پھر بھی غالب۔ انسان جس خاک سے بنایا گیا ہے شروع میں وہ محض تراب خاک ہی تھی پھر اس کے اندر دوسرے عناصر کسی قدر شامل کرکے گوندھا گیا تو خاک طین لازب (چپ چپا اور لیس دار کیچڑ) بن گئی۔ پھر مدت تک اسی کا خمیر اٹھتا رہا تو حما مسنون (سڑی ہوئی کالی دلدل) بن گئی۔ پھر اس کو حرارت پہنچا کر خشک کیا گیا کہ وہ کھن کھن بجنے لگی اور ٹھیکرے کی طرح ہوگئی جس کو صلصال کہا گیا ہے۔ یہ چاروں الفاظ قرآن مجید کی مختلف آیات میں آئے ہیں۔

(۲) نوع جن تو ان کی تخلیق کا عنصر غالب آگ ہے۔ ممکن ہے کہ خالص آگ ان کا مادۂ تخلیق ہو لیکن زیادہ مجھ کو قول یہ ہے کہ ان کی تخمیر میں بھی خاکی اور بخاری اجزا شامل ہیں۔ آگ اور مٹی کے مرکب مزاج کا نام دخان ہے اور پانی و ہوا کے مخلوط قوام کو بخار کہتے ہیں لیکن عنصر اغلب آگ ہی ہے۔ اسی کو مارج کہا گیا ہے۔ مجاہد نے مارج کا معنی کیا ہے مخلوط یعنی ایسی آگ جس کے بعض شعلے بعض کے ساتھ مخلوط ہوں۔ کچھ سرخ کچھ زرد کچھ سبز۔ یہ لفظ مَرَجَ القومُ سے ماخوذ ہے۔ مرج القوم کا معنی ہے قوم آپس میں مخلوط ہوگئی۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ سرخ شعلے خالص آگ کی علامت ہیں۔ زرد شعلے آگ کی تیزی کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں اور کسی دوسرے عنصر کے شامل ہونے کو۔ اور سبزی یا سیاہی کا پیش خیمہ ہے اور کثافت ارضی کا ابتدائی تقاضا سبزی ہے۔ اس لئے مجاہد کی تشریح کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن خالص آگ سے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کا قوام بھی مرکب ہے لیکن آتشی عنصر اغلب ہے۔ بیضاوی نے بعض ملائکہ کے ساتھ جن کا اتحاد ذاتی اور اختلاف صفاتی ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ ملائکہ کی تخلیق نور سے اور جن کی تخلیق آگ کے شعلوں سے ہوئی۔ نور اور نار دونوں روشن اور چمکدار عنصر ہیں لیکن ایک خالص غیر مکدر روشنی ہے اور دوسری ایسی روشنی ہے جس میں گدلاپن اور دخانیت ہے۔ جب آگ صاف ہوجاتی ہے یعنی اس میں دخانیت نہیں رہتی (یعنی آگ آگ ہی نہیں رہتی) تو وہ نور ہوجاتی ہے اور اگر نور میں دخانیت اور کدورت آجائے تو رفتہ رفتہ نور بجھ جاتا ہے اور دخان رہ جاتا ہے۔ اس عبارت کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کہ جس مادے سے جن کی تخمیر کی گئی وہ دخان آمیز نور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جنات کی فطرت میں تمرد اور سرکشی ودیعت کردی گئی ہے۔ کیونکہ آگ کی خاصیت عدم اطاعت ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان انسان اور جن کا تخلیقی مادہ اور اس مادہ کے مختلف احوال اور تنوعات کو دیکھ کر اللہ کا خالق کامل الاقتدار اور عالم کل ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نعمت وجود اللہ کی وہ عظیم الشان عطا کردہ نعمت ہے جس کی تکذیب نہ جن کرسکتے ہیں نہ انسان۔ وغیرہ

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک ہے سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر یوں تو زمین کے چکر کی وجہ سے روزانہ ہی سورج کے طلوع اور غروب کا مقام بدلتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ تغیر سردی اور گرمی کے موسم میں بہت زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے جس کو ہر شخص دیکھتا اور جانتا ہے۔ گرمی میں سورج جس جگہ سے طلوع کرتا اور جس جگہ غروب ہوتا ہے اس سے ہزاروں میل دور سردی کے زمانہ میں اہل افق کو اس کا طلوع و غروب نظر آتا ہے۔

اس معلوم ہوا کہ سورج کے گرد زمین حرکت کر رہی یا سورج زمین کے گرد بہرحال یہ چکر دینا غیبی قاہرہ طاقت کا کرشمہ ہے۔ اس تبادل مشرق و مغرب کا کائنات پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی تفصیل کا یہاں مقام نہیں۔ اہل علم اس سے واقف ہیں۔ صرف اتنا جان لینا کہ سورج کے طلوع و غروب کا تغیر اپنے ساتھ ہواؤں، بارشوں، زمین کی پیداواروں حیوانی مزاجوں اور فصول و موسمیات کے اختلاف کو لاتا ہے اور سارا مرئی محسوس عالم تغیر اور بگاڑ بناؤ کی ایک منہ بولتی تصویر دکھائی دیتا ہے جس کے پیچھے غیبی قوت کا زبردست ہاتھ نظر آتا ہے اور انسان و حیوان و نبات کے بقاء وجود اور ترقی وجود کے لئے اسباب کی فراہمی ہوجاتی ہے۔ اس کھلی ہوئی حقیقت کا کون انکار کرسکتا ہے اور جن و انس میں سے

کس کی مجال ہے کہ اس سچائی کو جھٹلا سکے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں (اور حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان میں ایک حجاب (آڑ) ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے سوائے جن و انس .....

تفسیر اللہ کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ اس نے دو سمندر ملے ہوئے چھوڑے ہیں اور قدرتِ الٰہی نے دونوں کو مخلوط ہونے سے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ شامل ہو جانے سے روک رکھا ہے۔ ایک شیریں (یعنی کچھ کم نمکین) اور دوسرا بالکل نمکین بنایا ہے اور کوئی بھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتا باوجودیکہ دونوں آبِ رقیق سیال سے بھرے ہوئے ہیں اور نہ کوئی کسی کے احوال و خصوصیات میں دخل دے سکتا ہے۔

حسن نے کہا بحرین سے مراد ہیں بحرِ روم اور بحرِ ہند۔ قتادہ نے کہا بحرِ فارس اور بحرِ روم جن کے درمیان الجزائر حائل ہے۔ مجاہد اور ضحاک کے نزدیک بحرِ سما اور بحرِ ارض مراد ہیں جو ہر سال باہم ملتے ہیں۔

اہلِ نظر کہتے ہیں کہ اللہ نے عالمِ وجود میں دو سمندر دوش بدوش چلائے ہیں۔ ایک مادی دوسرا غیر مادی۔ یا ایک عالمِ اوامر و نواہی یعنی دنیا، دوسرا عالمِ آخرت اور دونوں کے درمیان عالمِ برزخ حائل ہے۔ جب تک عالمِ عمل کی مدتِ بقا چل رہی ہے عالمِ آخرت نہیں آسکتا۔ ہر مرنے والا شخص عالمِ برزخ میں چلا جاتا ہے۔ عالمِ آخرت کھینچ کر پہلے نہیں آسکتا اور یہ عالمِ تکلیفات وقت سے پہلے عالمِ آخرت تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ سب تاویلات یا اشارات ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ بحرین سے مراد دو سمندر آبی ہی ہیں جو روئے زمین کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور باہم ملے ہوئے ہیں۔ ان سمندروں کے فوائد جامد اور نامی مخلوق کے لئے کیا کیا ہیں، یہ مسئلہ بڑا تفصیل طلب ہے۔ مختصر یہ کہ پانی سے ہر نبات کی پیدائش اور بقا کا سبب ہے اور پانی سحابی شکل میں سمندروں سے اٹھتا اور جس زمین کو سرسبز کرنا اللہ کو منظور ہوتا ہے وہاں برستا ہے۔ اسی سے انسانی حیوانی اور نباتی غذا کی روئیدگی اور بالیدگی ہوتی ہے۔ خصوصاً انسان کے لئے حیوانی و نباتی غذا کی فراہمی ہر دو قسم کے سمندروں کی ممنون ہے اور یہ سب کارگزاری اور نعمت بخشی اللہ کی ہے۔ کوئی بھی ایسا قادرِ مطلق اور منعمِ حقیقی سوائے اللہ کے نہیں کہ ہزاروں میل دور رہنے والوں کی روزی کی فراہمی کا انتظام نامعلوم اور غیر مرئی اسباب سے کام لے کر کر رہا ہو یا کر سکتا ہو۔ پس اللہ کی اس نعمت کا انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا نہ جن نہ انس۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر دونوں یعنی شیریں اور شور سمندر سے موتی مونگے نکلتے ہیں۔ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ موتی مونگے تو صرف شور سمندر سے نکلتے ہیں۔ دونوں سے نہیں نکلتے۔ اس کا جواب چند طریقوں سے ہو سکتا ہے (۱) شور اور شیریں سمندر جدا جدا نہیں ہیں دونوں بالکل متصل ہیں کوئی پہاڑ وغیرہ بیچ میں حائل نہیں اس لئے ایک سے نکلنے کو دونوں کے مجموعہ سے نکلنا کہا جا سکتا ہے (۲) عرب کے محاورہ میں دو چیزوں کا ذکر کر کے پھر ایسا حکم ذکر کیا جاتا ہے جو صرف ایک کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے یا معشر الجن والانس الم یاتکم رسل منکم پیغمبر صرف انسانوں میں سے ہوئے لیکن مخاطب جن و انس دونوں ہیں (۳) اگر دو سمندروں سے مراد آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ جب بادل سے پانی برستا ہے تو موتی پیدا کرنے والی سیپ اپنا منہ کھول دیتی ہے اور ایک بوند جس سے موتی پیدا ہوتا ہے اس کے منہ

میں آجاتی ہے۔ کذا قال ابن جریر۔ یعنی موتی پیدا کرنے میں دونوں سمندروں کا دخل ہے۔
لولو سے مراد ہیں بڑے موتی اور مرجان چھوٹے موتی۔ کذا فی القاموس۔ مقاتل اور مجاہد کا قول اس کے برعکس ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرجان سے مراد مونگا ہے جو نباتات کے بھی مشابہ ہوتا ہے اور پتھر کے بھی۔ عطاء خراسانی نے کہا مرجان لبد کو کہتے ہیں۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

اسی کے (اختیار اور ملک میں) ہیں جہاز جو پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (نظر آتے) ہیں سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

تفسیر سمندروں اور دریاؤں میں جہاز رواں دواں ہوتے ہیں اور پانی کے اوپر ابھرے ہوتے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے پہاڑ۔ اس سے اللہ کی قدرت حکمت اور انعام و فضل کا ظہور ہوتا ہے۔ رقیق پانی کی سطح پر ہزاروں ٹن وزن کے ثقیل اجسام کو روکنا اور چلانا اللہ نے انسان کو سکھایا اور زمین کی کشش پر غالب آنے کی تعلیم دی اور ہوا کے دباؤ کو سمندر کے اندر جہاز کے نہ ڈوب جانے میں دخیل بنایا اور اس طرح انسانی زندگی کی ضروریات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچوایا۔ یہ اللہ کا عظیم کرم اور احسان ہے۔ اگر جہاز نہ ہوتے تو ضرورت اور آسائش کی چیزوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔ مقام غور ہے کہ پانی ہوا اور سورج کی روشنی یا رات کی تاریکی سب ہی کو جہاز کے تھامنے اور نہ ڈوب جانے کا مددگار بنایا تاکہ آدمی کو اپنی زندگی قائم رکھنے میں مدد مل سکے۔ ایسا سوائے اللہ کے اور کون کرتا ہے۔ اس کا انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ فَبِاَيِّ

جتنے (جن و انس) روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور صرف آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت (والی) اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی سو اے جن و انس

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر روئے زمین پر جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے (صرف) آپ کے عظمت و احسان والے رب کی ذات رہ جائے گی۔ زمین پر جو بے جان جمادات نباتات اور جاندار حیوانات ہیں ان کی بے بہرگی، بے کسی اور تخلیقی اعتبار سے بے مائیگی یا کم مائیگی تو ظاہر ہے اس کے ذکر کی تو ضرورت ہی نہیں۔ ان کا عجز اور بے بسی ناقابل تردید ہے۔ ہاں انسان اور جنات نیز ملائکہ ارضی کو دیکھ کر نادان کو کچھ قدرت اور انعام و اکرام کا شبہ ہو سکتا ہے کیونکہ ملائکہ ارضی غیبی طاقتیں ہیں جو اس ظاہری کائنات کی ناظم ہیں اور جن و انس کا صاحب ارادہ و اختیار ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن جب غور کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو یہ اعضائے ثلاثہ بھی شل اور اپاہج دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تخلیقی کنارہ عدم سے ملا ہوا ہے۔ کوئی بھی پیدائش سے پہلے نہ تھا نیستی سے ہستی میں آیا ہے اپنی ہستی میں خود محتاج ہے۔ اس کا اپنا وجود مانگا ہوا ہے۔ لہٰذا ذاتی نہیں ہے اور جو خود ہی نہیں ہے وہ دوسروں کو کیا اور کیسے دے سکتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر مخلوق حوادث کی شکار ہے۔ تغیرات آنی و مکانی اور زمانی سے کبھی کسی کو بھی محفوظ نہیں۔ اور جو خود اپنے لئے ہر خوبی اور کمال کو جمع نہ کر سکتا ہو وہ دوسروں کو اپنی ایجاد کردہ خوبیاں اور کمال ظاہری و باطنی کیسے بخش سکتا ہے۔ جب اس کی اپنی ہستی اور تغیر ہستی خود ساختہ اور خود پروردہ نہیں تو دوسروں پر اس کو قدرت کاملہ اور اکرام و عطا کی طاقت کلی کیسے مل سکتی ہے۔ پس اللہ ہی کی ذات تنہا عظمت قدرت رکھنے والی اور ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتیں عطا کرنے والی

ہے ۔ اس کی ان نوازشوں میں کسی نوازش و عطا کی تکذیب نہ کوئی جن کر سکتا ہے، نہ انسان ۔

تحلیلِ اجزاء

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ مَن سے مراد ہیں جن و انس و ملائکہ یا تمام موجوداتِ ارضی جاندار اور بے جان، ذی عقل اور بے عقل ۔ تغلیباً مَن کا لفظ استعمال کیا جو صرف اہلِ عقل کے لئے آتا ہے ۔ فانی ہے یعنی قیامت کے دن فنا ہو جائیگا زندہ نہیں رہے گا ۔ ہر ایک مرنے والا ہے ۔ اور سلسلۂ موت ہر زندہ کے لئے جاری ہے ۔ یا فانی سے یہ مراد ہے کہ ہر ایک کا وجود عارضی ہے قدیمی نہیں ہے ۔ اللہ کا عطا کردہ ہے، ذاتی نہیں ۔ اس کی ہستی کا ابتدائی کنارہ عدم سے ملا ہوا ہے اور آخری کنارہ بھی عدم میں ڈوب جائے گا ۔

وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اللہ کے لئے وجہ کا استعمال متشابہات میں سے ہے نا قابلِ غور ۔ بعض کے نزدیک ذات مراد ہے ۔ بعض اہلِ تصوف کے نزدیک وجہ سے مراد ہے جہت ۔ یعنی ہر شخص بذاتِ خود فی نفسہٖ فانی ہے ۔ ہاں اس کا جو رخ رب کی طرف ہو وہی باقی رہنے والا ہے ۔ مطلب یہ کہ ہر چیز یا ہر شخص بے قدر ہے نا قابلِ التفات ہے، فنا پذیر ہے، لیکن اس کی زندگی کا جو رخ خالق کی طرف ہو وہ بے قدر اور فنا پذیر نہیں ہے ۔ یہ تاویل حسین ہے، دقیق ہے، لطیف ہے لیکن جمہور اہلِ تفسیر کی تشریح کے خلاف ہے ۔

الجلال ۔ عظمت، غلبہ، بزرگی اور ساری مخلوق سے استغناء اور بے نیازی ۔ الاکرام عطائے کرم ۔

حصنِ حصین میں آیا ہے کہ ایک شخص یا ذوالجلال والاکرام کہہ رہا تھا ۔ رسول اللہ صلعم کا ادھر سے گزر ہوا ۔ فرمایا تیری دعا قبول کر لی گئی جو مانگتا ہے مانگ ۔

يَسْـَٔلُهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِى شَأْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٠﴾

اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان اور زمین والے مانگتے ہیں ۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤگے

تفسیر

انسان ہو یا جن یا فرشتہ ہر ایک منگتا ہے بھکاری ہے اللہ کے سامنے ۔ مغفرت، عافیت، توفیقِ عبادت، فیضان برکات، عکس یا تجلیات رزق، صحت اور حسنِ انجام کا اللہ ہی سے خواستگار ہے ۔ بلکہ کائنات کی ہر چیز اپنے وجود، لوازمِ وجود، تربیت اور سارے احوال میں اللہ کی دست نگر اور سوالی ہے ۔ جو لوگ خدا کو اپنی ذہنی کج رفتاریوں کی وجہ سے نہیں مانتے یا وجودِ خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس کی وحدانیت کے قائل نہیں یا وحدانیتِ ذاتی کے تو قائل ہیں مگر وحدتِ صفاتی کا اقرار نہیں کرتے اور اس کی صفات میں دوسروں کو ساجھی مانتے ہیں ۔ وہ دل سے کچھ بھی سمجھیں اور زبان سے کچھ بھی کہیں لیکن ان کی ساری ہستی اور ہستی کے کل احوال اللہ ہی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور اسی سے مانگتے ہیں ۔ ان کی فطرت پکار پکار کر خدا ہی سے ہر چیز مانگ رہی ہے ۔ کیونکہ کوئی دوسرا حقیقت میں دینے والا نہیں کسی اور کو واقع میں دینے کی قدرت نہیں ۔ عطائے الٰہی کے ذرائع اور وسائط ضرور ہیں خود قدرتِ عطا نہیں رکھتے ۔ سورج ہو یا چاند یا ستارے یا آگ کسی کی بھی روشنی اپنی نہیں، اپنے قبضہ کی نہیں ۔ بادل خود پانی نہیں برساتا ۔ بھاپ خود اٹھ کر بادل کی شکل میں سامنے نہیں آتی ۔ زمین خود سبزہ نہیں اگاتی ۔ سورج کی گرمی خود غلہ اور پھل نہیں پکاتی ۔ یہ سب اللہ کے مقرر کردہ خدمتی کارندے ہیں ۔ کسی کی بھی تو حرکت طبعی ذاتی یا حقیقی ارادی نہیں ۔ سب جبری اور قسری طور پر رواں دواں ہیں ۔ اللہ ہی ہے جو ہر آن، ہر پل نئی شانِ تکوینی کے ساتھ ہویدا ہے ۔ کسی کو پیدا کرتا ہے، کسی کی زندگی ختم کر دیتا ہے، کسی کا رزق فراخ کر دیتا ہے، کسی کو تنگ حال بنا دیتا ہے ۔ وہی عزت و ذلت دیتا ہے ۔ بیمار کو تندرست اور تندرست کو بیمار بنا دیتا ہے ۔ مصائب نازل کرتا اور دور کرتا ہے ۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے اور کسی کے سوال کو رد کر دیتا ہے ۔ مومنوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور کافروں کو جہنم میں داخل کرتا ہے ۔ آسمان سے زمین تک اور زمین سے آسمان تک جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے ۔ کوئی اس کو روک نہیں سکتا ۔ کوئی اس کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا ۔ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ۔ اس کی ہی یہ شان ہے کہ گناہ معاف کرتا ہے ۔ مصائب کو دفع کرتا ہے ۔ کسی قوم کو اوپر اٹھاتا ہے اور کسی قوم کو پستی میں گراتا ہے ۔ (رواہ ابن ماجۃ و ابن حبان من حدیث ابی الدرداء) ابن جریر نے حضرت

عبداللہ بن منیب کی روایت سے اور بزار حضرت ابن عمر کی روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح بیان کی ہے۔ حسین بن فضل نے کہا۔ اللہ کی یہ شان ہے کہ ہر مقدر چیز کو اس کے مقررہ وقت پر پیدا کرتا ہے۔ ابوسلیمان دارانی نے اس آیت کے ذیل میں کہا۔ اسی کی یہ شان ہے کہ ہر آن بندوں کو اپنے احسان وانعام سے نوازتا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا۔ اللہ کے نزدیک دو دن ہیں۔ ایک دن دنیا ہے، دوسرا دن آخرت۔ دنیا میں اس کی شان ہے کہ امر و نواہی نازل کرتا ہے، زندگی اور موت دیتا ہے، اور رزق دیتا ہے یا روکتا ہے اور آخرت میں اس کی یہ شان ہوگی کہ وہ بندوں سے حساب نہیں کرے گا اور سزا جزا دے گا۔ بعض نے کہا۔ اللہ کی یہ شان ہے کہ وہ روزانہ ایک جماعت انسانی کو باپوں کی پشت سے ماؤں کے ارحام میں پہنچاتا ہے اور ایک جماعت کو ماؤں کے ارحام سے میدانِ دنیا میں لاتا ہے اور ایک جماعت کو دنیا سے نکال کر قبروں میں داخل کرتا ہے۔ اس طرح سارے انسان اسی کی طرف جا رہے ہیں۔

شان سے مراد شانِ ظہور بھی ہو سکتی ہے۔ شانِ تکوینی و انتظامی تو بہرحال نمایاں ہے لیکن گہری نظر رکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وجودِ حقیقی صرف ایک ہے۔ یہ ساری کائنات اسی کے ظہور کی تصویریں اور شکلیں ہیں۔ ایک بحرِ قدیم ازل سے ابد تک موجزن ہے۔ اس سمندر کی ارادی لہریں ہر پل اسی سمندر میں اٹھ رہی ہیں۔ کوئی بڑی ہے کوئی چھوٹی، کوئی اونچی، کوئی نیچی۔ ہر لہر اٹھتی ہے، چڑھتی ہے آگے بڑھتی ہے اور پچھلی لہر کے لئے جگہ خالی کر کے خود فنا ہو جاتی ہے۔ یہ لہریں خود سمندر نہیں ہیں لیکن سمندر اور دریا سے باہر بھی ان کا وجود نہیں ہے۔ سمندر اور دریا کا پانی کسی نے نہیں دیکھا، نہ وہ دیکھا جا سکتا ہے۔ صرف لہریں دکھائی دیتی ہیں جن کو پیدا کرنے والا سمندر ہے۔ یہ ساری موجیں بلبلے ہیں، اٹھتے ہیں گرتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں۔ انہی بلبلوں اور لہروں کی شکل میں سمندر کا ظہور ہو رہا ہے۔ لہروں کو سمندر مت کہو اور سمندر کو لہریں مت جانو یہ شرک ہے، لیکن لہروں کا مستقل ذاتی وجود بھی نہ مانو یہ بھی شرک ہے۔ اصل وجود سمندر کا ہے۔ وہی موجودِ حقیقی ہے اور ساری کائنات امواجِ حادثہ ہیں، نوخیز اعتبارات ہیں، نو بہ نو تخلیقات ہیں۔ اللہ ہر آن نئی شانِ ظہور میں جلوہ گر ہے۔ ساری کائنات نشیب و فراز اور علویات و سفلیات کا وجود مستعار اور تازہ بتازہ احوال اللہ ہی کی ذات کے مظاہر ہیں۔ اللہ کی ذات ہر تجسیم، تشکل، تمکن اور تشخص سے پاک ہے۔ ہاں اس کی قدرت و تخلیق کی آئینہ دار ساری خلق ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ کو سورج سے اور ممکنات کو شعاعوں سے تشبیہ مت دو۔ شعاعیں تو جرمِ آفتاب کے لوازم غیر منفک ہیں۔ حادث اور فنا پذیر نہیں ہیں۔

اللہ کو تخمِ کائنات بھی مت کہو جس کے اندر پودا درخت اپنے تنے، شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کے ساتھ مبہم مجمل طور پر موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ جب پودا تخم سے نکلتا ہے تو بیج پھٹ جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔ خدا جڑ بھی نہیں کہ اس کے اندر سے شاخیں پھوٹ کر نکلی ہوں بلکہ قدم اور دوام کا ایک اتھاہ ناپیدا کنار بحرِ ہستی ہے جس سے ارادہ کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ انہی لہروں کو ہم کائنات و ممکنات کہتے ہیں۔ ہر نوخیز لہر پہلے ننھی پھر بڑی ہو گئی اور آگے بڑھ کر باقی نہیں رہے گی لیکن سمندر اپنی جگہ بذاتِ خود بغیر کسی تغیر احوال کے باقی ہے۔ لہروں کے ٹوٹنے پھوٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ واللہ اعلم۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

اے جن و انس ہم عنقریب تمہارے (حساب و کتاب کے) لئے خالی ہو جاتے ہیں سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر اس کائنات ارضی میں بڑی عزت اور وزن کی مالک ہیں دو نوعیں جن و انس۔ ان کا جتنا وزن اللہ کی نظر میں بڑا ہے۔ اتنا ہی اوامر و نواہی کا ثقیل بار بھی ان پر آپڑا ہے بار امانت کو اٹھانے سے ساری کائنات نے انکار کر دیا۔ کسی میں اس بوجھ کو اٹھانے کی تخلیقی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ صرف انسان نے اور اس کے اتباع میں آتشیں مخلوق یعنی جنات نے اس بار کو اپنے اوپر اٹھانے کا اقرار کیا اور اٹھا لیا۔ کیونکہ ان

دونوں میں بارِ امانت کو اٹھانے کی تخلیقی صلاحیت تھی۔

اللہ نے یہ سارا جہان بنایا اور ہر آن بنا رہا ہے۔ انسان اور جن بھی اس جہان کے اہم اجزا ہیں۔ ان کی تخلیق بھی اللہ کر رہا ہے اور ان پر اپنے احکام کے بوجھ ڈال رہا ہے لیکن اس کے کرم ذاتی کا تقاضا ہے کہ تخلیق اور تکلیف کا دروازہ کبھی بند کر دیا جائے۔ ایک وقت آئے گا کہ بابِ تخلیق عمل بند ہو جائے گا۔ تخلیق اور تعمیل اوامر و نواہی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اللہ سزا و جزا کا دروازہ کھول دے گا اور وقت آ جائے گا کہ مومنین صالحین کو ان کے اعمال کا ثواب دیا جائے۔ تخلیق کو ختم کر دینا ہی اللہ کا فارغ ہونا ہے ورنہ اللہ کسی کام میں مشغول نہیں ہوتا کہ دوسری طرف توجہ کرنے سے اس کے لئے رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ سَنَفْرُغُ لَكُمْ کہنے سے مقصود دھمکی دینا ہے۔ حسن اور مقاتل نے کہا سنفرغ سے مراد یہ ہے کہ ہم تمہارا محاسبہ عنقریب کریں گے اور تم سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا کریں گے۔

بعض اہلِ معرفت نے کہا کہ سنفرغ سے مراد یہ ہے کہ ہم تم سے خلوت میں ملیں گے، ہم تمہارے سامنے ہوں گے اور تم ہم کو دیکھ سکو گے۔ حضرت ابوذر نے عرض کیا۔ ہم سب الگ الگ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت ابوذر نے عرض کیا۔ دنیا میں اس کی کیا نشانی ہے۔ فرمایا کیا چودھویں رات کے چاند کو تم الگ الگ (ایک ہی وقت میں) نہیں دیکھتے اور یہ تو اللہ کی ایک مخلوق ہے (جو ایک وقت میں سب کو دکھائی دیتی ہے) اللہ تو سب سے بڑا اور بڑی عظمت والا ہے۔ (رواہ ابوداؤد)

کتنی بڑی نعمت ہے کہ اللہ مستقبل قریب میں دنیا کے خاتمہ کے بعد مومن کو اپنی طرف سے ثواب عنایت فرما دے۔ کیا یہ نعمت مشتبہ اور قابلِ انکار ہے۔ انسان و جن کو ساری کائنات ارضی سے زیادہ عزت عطا کرنا اور دوسرے جانداروں اور بے جانوں کو چھوڑ کر صرف انس و جن کو مستحقِ ثواب و جزا قرار دے کر آخرت میں دوامی راحت و عزت عطا کرنا اللہ کی ناقابلِ انکار رحمت ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اے گروہ جن　اور انسان کے　اگر تم کو یہ قدرت ہے　کہ آسمان اور زمین کی　حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں) نکل جاؤ مگر

فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

بدون زور کے نہیں نکل سکتے (اور زور ہے نہیں پس نکلنے کا وقوع بھی ممکن نہیں) سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

تفسیر اے گروہِ انس و جن اگر تم میں خود (اللہ کے) آسمانوں و زمین میں سے باہر نکلنے کی طاقت ہو تو باہر نکل جاؤ (اور خدا کی خدائی سے باہر ہو جاؤ) تم بغیر غالب آنے کے باہر نہیں نکل سکتے (اور غالب آنا ممکن نہیں) ساری زمین اور آسمانوں کے پار ہو کر اللہ کے ملک سے نکل جانا ممکن نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی ایک کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں پہنچ جائے۔ زمین کی کشش سے نکل کر چاند یا مریخ یا کسی اور کرۂ سماوی میں داخل ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کائناتِ سماوی و ارضی سے نکل کر اللہ کے مقابلہ میں اپنا جھنڈا بلند کر سکے۔ ایسا تو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک خدائی طاقت پر جن و انس کی طاقت غالب نہ آ جائے اور ایسا ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اللہ کی حکومت سے نکل نہیں سکتے۔ پس اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اللہ نے تم کو اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے مرکز کشش میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اگر اپنی حدود سلطنت سے نکلنے کا حکم دے دیتا تو سب تباہ ہو جاتے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جن و انس کو یہ خطاب قیامت کے دن کیا جائے گا۔ ابن جریر اور ابن مبارک نے ضحاک کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے حکم سے یہ نچلا آسمان پھٹ جائے گا اور اس کے اطراف سے فرشتے اتر کر زمین کا محاصرہ کر لیں گے پھر دوسرا آسمان پھٹے گا اور اس کے فرشتے پہلے آسمان کے فرشتوں کا محاصرہ کر لیں گے۔ اسی طرح تیسرا چوتھا پانچواں چھٹا اور ساتواں آسمان پھٹ جائے گا اور ہر آسمان کے فرشتے قطار در قطار حصار کرتے چلے جائیں گے۔ اس طرح سات حصار ہو جائیں گے۔ پھر اللہ نزولِ اجلال فرمائے گا۔ اور

جہنم اس کے بائیں جانب ہوگی۔ جہنم کو دیکھ کر لوگ بھاگیں گے اور اطراف زمین کی طرف فرار کریں گے لیکن ہر طرف سے فرشتوں کا حصار دیکھ کر وہیں لوٹ آئیں گے جہاں سے چلے ہوں گے۔ اسی مضمون کو آیات ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:۔

إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ ...... وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا - وَجِيٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ...... يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ...... وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ وَّالْمَلَكُ عَلٰى أَرْجَآئِهَا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا۔ اے گروہ انس و جن اگر تم آسمانوں کی اور زمین کی موجودات کو جان سکتے ہو تو جان لو۔ مگر اللہ کی قائم کردہ عقلی و نقلی دلائل کے بغیر تم جان نہیں سکتے۔ یعنی کائنات سماوی و ارضی کے علم تک پہنچنے کا ذریعہ عقل و نقل ہے اور یہ نعمت اللہ ہی نے تم کو عطا کی ہے۔ تم اس کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ گویا حضرت ابن عباس کے اس قول پر نفوذ سے مراد ہوگا۔ نفوذ علمی اور سلطان سے مراد ہوگی عقل و وحی۔ جس کے بغیر نفوذ علمی ممکن نہیں۔ اور یہ نعمت خداداد ہے جو ناقابل انکار ہے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۚ فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

تم دونوں پر (قیامت کے روز) آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا پھر تم (اس کو) ہٹا نہ سکو گے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر اس آیت نے قیامت کے بعض احوال بیان کر کے ڈرایا گیا ہے تاکہ انس و جن خواب غفلت و جہالت سے بیدار ہو جائیں اور ان افکار و اعمال سے پرہیز کریں جو موجب عذاب ہیں۔ یہ آیت اور آئندہ آیات تہدید کی ہیں جو اپنے اندر درس عبرت و نصیحت رکھتی ہیں اور یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے اس دنیا میں آخرت کی ہولناکیاں ہم کو بتا دیں تاکہ ہم غفلت سے بیدار ہو جائیں۔ تہدید و تخویف کو جو نعمتوں میں سے شمار کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب بجائے خود کوئی نعمت ہے بلکہ بیان عذاب و خوف ایک نعمت ہے تاکہ اس کے موجبات سے پرہیز کیا جائے جیسے بیان جنت و ثواب ایک نعمت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہم حصول جنت کے اسباب کو اختیار کریں۔ غرض اسی دنیا میں آخرت کی جزا و سزا دونوں کی اطلاع دینا اللہ کا بڑا کرم ہے جو ناقابل انکار ہے۔ شواظ خالص بھڑکتے شعلے۔ اکثر اہل تفسیر نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ اور نحاس کے معنی ہے دھواں۔ مجاہد کا قول ہے کہ سبز شعلے جو آگ سے الگ ہو جائیں ان کو شواظ کہا جاتا ہے۔ مجاہد اور قتادہ کے قول پر نحاس سے مراد ہے پگھلا ہوا پیتل یا تانبا جو دوزخیوں کے سر پر ڈالا جائے گا۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ نحاس سے مراد ہے دوزخیوں کا کھولتا ہوا پیپ (یعنی صدید یا زرد آب) یا پگھلا ہوا تانبا۔

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

غرض جب (قیامت آئیگی جس میں) آسمان پھٹ جاویگا اور ایسا سرخ ہو جاویگا جیسے سرخ نری (یا چمڑا) سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

تفسیر آسمان پھٹ کر ملکوتی سماوی طاقتیں مجسم شکلوں میں نیچے آجائیں گی کیونکہ اس وقت ایمان بالغیب اور اعمال کا دور ختم ہو چکا ہوگا اور ہر مخفی طاقت پر ایمان شہودی ہو جائے گا۔ تمام برزخی موجودات کا اصلی مادی جسمانی لباس پہن کر حساب فہمی کے لئے تیار ہو جانا ضروری ہوگا۔ آسمان کا رنگ سرخ گلاب کی طرح یا نیلیا گھوڑے کی طرح ہو جائے گا۔

وردۃ، سرخ گلاب اور کمیت و سرخ کے درمیانی رنگ کا گھوڑا (کذا فی القاموس) بغوی نے لکھا ہے۔ وردہ وہ سفید جو مائل بسرخی یا مائل بزردی ہو۔ قتادہ نے کہا آج آسمان نیلا ہے اس روز مائل بسرخی ہو جائے گا۔ بعض علماء نے کہا کہ اس روز آسمان کے رنگ بدلتے

جائیں گے جیسے وردی گھوڑا موسم بہار میں زرد، شروع موسم سرما میں سرخ اور سخت سردی میں خاکی ہو جاتا ہے۔ بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آسمان رنگ بدلے گا کبھی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا کبھی نیلیا۔

دہان دہن کی جمع ہے۔ دہن تیل۔ یعنی آسمان اس گھوڑے کی طرح ہو جائے گا جو تیل کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ضحاک، مجاہد، قتادہ اور ربیع نے یہی تفسیر کی ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کالدہان کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آسمان کے رنگ نچوڑے ہوئے تیل کی طرح نو بہ نو ہوں گے۔

ابن جریج نے کہا جہنم کی گرمی سے آسمان اڑنے لگے گا جیسے آگ کی گرمی سے تیل اڑ جاتا ہے۔ کلبی نے دہان کا ترجمہ کیا ہے۔ سرخ چمڑا (نری کا چمڑا)۔

خلاصۂ کلام تہدید اور قیامت کی ہولناکیوں کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ یہ دکھانا ہے کہ اللہ کی بڑی عنایت ہے کہ اس وقت دنیا میں یہ واقعات نہیں ہیں۔ آسمان اپنی جگہ اصلی حالت پر موجود ہے۔ ابھی ایمان و عمل کا وقت ہے۔ آسمان کے پھٹنے اور فرشتوں کے نازل ہونے کے بعد نہ ایمان قبول ہوگا نہ کوئی نیک عمل۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

تو اس روز (اللہ کے معلوم کرنے کیلئے) کسی انسان اور جن سے اس کے جرم کے متعلق نہ پوچھا جائیگا سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر اس آیت میں بھی قیامت کی ایک خاص حالت کی وضاحت فرمائی ہے۔ اللہ کو معلوم ہی ہے اور اللہ کے فرشتوں نے اعمالنامہ میں ہر عمل کا اندراج کر ہی لیا ہے۔ اس لئے کسی آدمی یا جن سے یہ سوال نہ ہوگا کہ تو نے کیا کیا گناہ کئے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ یہ جرائم تو نے کئے یا نہیں بلکہ یہ سوال ہوگا کہ ایسا کیوں کیا۔ یہ سوال توبیخی اور زجری ہوگا طلب علم کے لئے نہ ہوگا۔ دوسری آیت میں آیا ہے کہ فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ گناہ کرنے کی وجہ سب سے پوچھی جائے گی اور یہ سوال زجری ہوں گے۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ دونوں آیتوں کے اختلاف کو دور کرنے کی یہی توجیہ حضرت ابن عباس نے بیان فرمائی۔ لیکن عکرمہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ قیامت کے دن ٹھہراؤ کے مقامات (یعنی مواقف) مختلف ہوں گے۔ کہیں مجرموں سے گناہوں کی باز پرس ہوگی۔ کہیں کوئی سوال نہ ہوگا۔

ابوالعالیہ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بے قصور شخص سے مجرم کے جرم کی باز پرس نہ ہوگی۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ۝

مجرم لوگ اپنے حلیہ سے (کہ سیاہی چہرہ و نیلگونی چشم ہے) پہچانے جائیں گے سو (ان کے) سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جائیں گے۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝

سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر مجرموں کو ان کے چہروں کی علامات سے پہچان لیا جائے گا۔ عذاب کے فرشتے مجرموں کو چہروں سے پہچان لیں گے۔ ان کے منہ کالے اور آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اللہ نے فرمایا۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ۔ کچھ چہرے اس روز گورے ہوں گے اور

کچھ کالے۔

الدیباج میں اور تحقیقی میں حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجھے جبرئیل نے اطلاع دی ہے کہ مسلمان کے لئے لا الٰہ الا اللہ مرنے کے وقت بھی موجب انس (یعنی گھبراہٹ کو دور کرنے والا) ہوگا اور قبر میں بھی اور اس وقت بھی جب قبر سے اس کو نکالا جائیگا۔ اے محمد اگر آپ ان کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ قبروں سے اٹھ کر سروں سے خاک جھاڑتے ہوں گے۔ ایک کہتا ہوا اٹھے گا لا الٰہ الا اللہ اس کا چہرہ گورا ہوگا اور دوسرا کہے گا ہائے افسوس میں نے اللہ کے معاملہ میں قصور کیا۔ اس کا چہرہ سیاہ ہوگا۔ (تو آپ کو تعجب ہوگا)

ابو یعلی نے آیت الذین یاکلون الربوا الخ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ وہ (سود خوار) قیامت کے دن کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ ایسے ہو جائیں گے جیسے جن زدہ آدمی بد حواس ہو جاتا ہے۔ (ابن ابی حاتم)

ابن ابی شیبہ اور ابو یعلی نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ کچھ لوگ قبروں سے ایسے حال میں برآمد ہوں گے کہ ان کے منہ سے بھڑکتی آگ نکلتی ہوگی۔ عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا اللہ کا ارشاد ہے

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں بس آگ بھرتے ہیں۔

بزار نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (رسول اللہ صلعم نے فرمایا) قیامت کے دن غرور کرنے والوں کو سرخ چیونٹیوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا۔ (یعنی انتہائی ذلت کی شکل دے کر)

اصحاب سنن اور حاکم نے حضرت ابن مسعود کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جو شخص باوجود غنی ہونے کے مانگے گا قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں اور کھرونچیں ہوں گی۔ صحیحین میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جس نے مومن کے قتل پر آدھی بات کہہ کر بھی اعانت کی جب وہ اللہ کے سامنے جائے گا تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا۔ اللہ کی رحمت سے مایوس۔ ابو نعیم نے حضرت عمر کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے۔ جو شخص (نماز میں) قبلہ کی طرف کو ناک سنکے گا قیامت کے دن وہ ریزش اسی کے چہرے پر ہوگی۔

طبرانی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت انس کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ دنیا میں جو شخص دو زبان والا ہوگا قیامت کے دن اس کے لئے آگ کی دو زبانیں بنا دی جائیں گی۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت سعد بن وقاص کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ دنیا میں دو رخا آدمی قیامت کے دن جب آئے گا تو آگ کے دو چہرے اس کے کر دیئے جائیں گے۔

اصحاب سنن اربعہ حاکم اور ابن حبان حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ دو بیبیوں والا اگر دونوں بیبیوں میں برابری نہیں کرے گا تو قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو ٹیڑھا ہوگا۔ اس امت کی ایک جماعت قیامت کے دن بندروں کی شکل پر اٹھائی جائے گی۔ مفہوم الحدیث۔

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ جو لوگ ناحق کچھ (مال جائیداد وغیرہ) لیں گے قیامت کے دن وہ اپنی گردنوں پر وہ چیز اٹھائے ہوئے آئیں گے۔

فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ۔ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔ مجرمین کے سروں کو (موڑ کر) قدموں کو ملا کر (دوہرا کر دیا جائے گا) پھر لکڑی کی طرح توڑ دیا جائے گا (بیہقی)۔ ہناد نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ پیشانی کو قدموں سے ملا کر پیچھے سے زنجیر کے ایک حلقہ میں باندھ دیا جائے گا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ پھر اپنے رب کی کس کس نشانی کی تکذیب کرو گے (یا کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے۔ بعض اہل تفسیر نے بشہادت لغت آلاء کا ترجمہ علامات کیا ہے اور نعمت تو عام اہل تفسیر نے ترجمہ کیا ہی ہے۔ مترجم) کیونکہ (اللہ کی نعمتوں کی تکذیب

مندرجہ بالا عذاب کا مستحق بنا دے گی

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ

یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے وہ لوگ دوزخ کے اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان

حَمِیْمٍ اٰنٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

دورہ کرتے پھریں گے سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

تفسیر هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ - یہی وہ جہنم ہے جس کی تکذیب مجرم (یعنی مشرک دنیا میں) کرتے تھے۔ یعنی قیامت کے دن جب مشرک مبتلائے عذاب ہوں گے تو ان سے یہ بات کہی جائے گی۔

یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ - جہنم اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان وہ چکر لگائیں گے۔ بیہقی اور ترمذی نے حضرت ابو درداء کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ کے اندر جب بھوک لگے گی اور وہ کھانا مانگیں گے تو کھانے کے لئے ان کو تھوہر دیا جائے گا جس کے اندر نہ غذائیت ہوگی نہ اس سے بھوک رفع ہوگی (بلکہ) وہ حلق میں پھنس جائے گا۔ دوزخی کہیں گے کہ دنیا میں ہم پھنسے ہوئے لقمہ کو پانی پی کر نیچے اتار لیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ پانی طلب کریں گے تو ان کو ابلتا گرم پانی دیا جائے گا۔ پانی جب ان کے چہروں کے قریب پہنچے گا تو چہروں کو بھون ڈالے گا (الحدیث)

امام احمد، ترمذی، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے آیت وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ کی تشریح میں حضرت ابو سعید خدری کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ (المہل سے مراد ہے) تیل کی تلچھٹ جب دوزخی کے (چہرے) کے قریب لائی جائے گی تو چہرے کی کھال گر پڑے گی۔

کعب احبار کا قول ہے کہ آن جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس کے اندر دوزخیوں کا کچ لہو جمع ہوگا۔ طوق وسلاسل میں جکڑ کر دوزخیوں کو لے جا کر اس میں غوطہ دیا جائے گا کہ ان کے جوڑ جوڑ اکھڑ جائیں گے۔ پھر اس میں سے نکال کر از سر نو تخلیق درست کر کے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یہی مطلب ہے یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ - کا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ - پھر اللہ کی کس کس نشانی کا انکار کرو گے۔ اللہ کی نعمتوں کی تکذیب موجب تعذیب ہے۔

تنقیح مبحث

مختلف آیات میں نوعیت عذاب بیان کرنے کے بعد فبای الاء ربکما تکذبان فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ کسی قسم کا عذاب ہو وہ نعمت نہیں بلکہ اس غیر مناسب تکرار کا کیا فائدہ۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب بعض علماء نے اس طرح دیا ہے کہ کل من علیہا فان سے اس مقام تک تمام آیات میں عذاب سے خوف دلایا ہے باز داشت کی ہے اور موعظت و نصیحت کو پیش نظر رکھا ہے۔ سب کا حاصل نصیحت ہے اور ہر نصیحت خواہ کسی پیرائے میں ہو اللہ کی ایک نعمت ہے گناہوں سے باز داشت بھی یقیناً نعمت ہی ہے اس لئے آیت فبای آلاء ربکما تکذبان غیر مربوط نہیں ہے۔

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تفسیر مظہری میں اس تاویل کو پسند نہیں کیا اور یہ ہے بھی سراسر تکلف۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ اس سورت میں ۳۱ بار آیت فبای آلاء کی تکرار کی گئی ہے۔ اللہ کی آٹھ صفات ہیں۔ (علم قدرت، تخلیق، مشیت، سمع، بصر، ارادہ وغیرہ) جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور دوزخ کے سات دروازے ہیں۔ تمام مقامات میں اس آیت کا ذکر محض توبیخ اور زجر کے لئے کیا گیا ہے۔

شروع سے کل یوم ہو فی شان تک آٹھ مرتبہ اللہ کی صفاتِ ثمانیہ کا لحاظ کرتے ہوئے کسی جگہ نعمتِ ایجاد کے بعد، کسی جگہ نعمتِ ابقاء کے بعد کسی جگہ نعمتِ رزق کے بعد اور کسی جگہ نعمتِ ہدایت کے بعد محض اس امر پر تنبیہ کرنے کے لئے ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ جس کے اتنے بڑے بڑے احسان ہیں اس کی نعمت کی تکذیب کسی طرح مناسب نہیں۔ پھر سنفرغ لکم سے حمیم آن تک سات جگہ جہنم کے دروازوں کی تعداد کے لحاظ سے آیت مذکورہ کا ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ صرف منعم اور محسن ہی نہیں بلکہ منتقم بھی ہے اس لئے اس [illegible] کا جو انتقام پر بھی قادر ہے انکار کرنا موجب عذاب ہے (اور دوزخ کے ہر دروازے میں داخل کر دینا اس کے اختیار میں ہے) اس کے بعد [illegible] جنتوں کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اور آٹھ مرتبہ ایک خاص جنت کے تذکرے کے بعد آیتِ مذکورہ کا ذکر کیا گیا کہ ایسے قادر مطلق منعم کی نعمتوں کی ناشکری کسی طرح مناسب نہیں۔

میرے نزدیک آلاء سے مراد ہے اللہ کی قدرت تخلیق ربوبیت وغیرہ کی نشانیاں اور علامات۔ اب کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۙ ذَوَاتَاۤ

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے (ہر وقت) ڈرتا رہتا ہو اس کے لئے دو جنتیں ہیں) وہ باغ ہوں گے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (دونوں جنتیں)

اَفْنَانٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۚ فَبِاَيِّ

باغ کثیر شاخوں والے ہونگے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ بہتے چلے جائیں گے سوائے جن و انس

اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں ہر میوے کی دو دو قسمیں ہوں گی سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون

تُكَذِّبٰنِ ۚ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَاۤىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ

کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے وہ لوگ تکیہ لگائے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے

تفسیر وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ اور جو اپنے رب کے سامنے (قیامت کے دن حساب فہمی کے لئے) کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو جنتیں ہوں گی۔

ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے عطا کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک روز حضرت ابو بکر قیامت، میزان، جنت اور دوزخ کے معاملے پر غور کرنے لگے اور سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے کاش میں گھاس ہوتا کہ چوپائے مجھے کھا لیتے مجھے آدمی بنا کر پیدا نہ کیا گیا ہوتا۔ اس پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ ابن سوذب کی روایت پر بھی آیتِ مذکورہ کا نزول حضرت ابو بکر صدیق ہی کے حق میں ہوا۔ مقام اسم ظرف ہے یعنی موقف حساب جہاں آدمیوں کو ٹھہرا کر اعمالِ زندگی کی حساب فہمی کی جائے گی قتادہ کے قول سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ یا مقام مصدر ہے بمعنی قیام۔ اس صورت میں قیام سے مراد ہوگا حساب فہمی کے لئے اللہ کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہونا۔ یا قیام بمعنی نگرانی ہے یعنی جو شخص اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ اللہ اس کے اعمال کا نگراں ہے۔ آیت هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ میں یہی معنی مراد ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لفظ مقام کو زائد قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص اپنے رب سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

ضحاک نے کہا۔ دو جنتوں کا انعام ان لوگوں کے لئے ہوگا جو ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔ حرام کو چھوڑتے ہیں اور ہر اس عمل کو

اختیار کرتے ہیں جو اللہ تک رسائی کا ذریعہ ہو۔

کیا ہر ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہوں گی۔ یا اللہ سے ڈرنے والے تمام انسانوں کے مجموعہ کے لئے دو جنتیں ہوں گی۔ موخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے۔

جنّتٰنِ کی تشریح میں مقاتل نے کہا جنت عدن اور جنت نعیم۔ بعض علماء نے کہا ایک جنت انسانوں کے لئے اور ایک جنت متقی جنات کے لئے۔

اول الذکر اگرچہ کمزور ہے لیکن بعض علماء نے اس کو اختیار کیا ہے۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا۔ ایک جنت خوف رب رکھنے کی جزا میں اور دوسری جنت ناجائز خواہشات کو ترک کرنے کے معاوضہ میں ہوگی۔ کسی نے کہا کہ ایک جنت عقیدہ کی صحت کے عوض اور دوسری جنت اعمال کی صلاح کے سبب ملے گی۔ اس تفسیر پر جنتیں لاکھوں بلکہ ان گنت ماننا پڑیں گی۔ ہر خائف کو دو جنتوں کے حساب سے جنتوں کی تعداد غیر محدود شمار پائے گی۔ حالانکہ متعدد احادیث میں جنتوں کی تعداد (نوعیت کے لحاظ سے) چار بتائی گئی۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا دو جنتیں چاندی کی ہیں جن کے سارے ظروف اور سامان چاندی ہی کا ہے اور دو جنتیں سونے کی ہیں جن کے سارے ظروف اور سامان سونے کا ہے۔ جنت عدن کے اندر اہل جنت اور رویت خداوندی کے درمیان صرف ردائے کبریائی حائل ہوگی جو رب کے چہرہ پر ہوگی۔ بغوی نے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن قیس کی روایت سے بیان کی ہے۔

امام احمد، ابو داؤد اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جنات فردوس چار ہیں۔ دو سونے کی جس کے ظروف سامانِ آرائش اور ہر چیز سونے کی ہوگی اور دو چاندی کی جس کے ظروف سامانِ آرائش اور ہر چیز چاندی کی ہوگی۔

بغوی نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابو درداء کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ولمن خاف مقام ربہ جنتان۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ خواہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو (تب بھی اس کے لئے دو جنتیں ہوں گی) حضور نے فرمایا ولمن خاف مقام ربہ جنتان۔ میں نے تیسری بار جب یہی عرض کیا تو حضور نے فرمایا۔ خواہ ابو درداء کی ناک خاک پر رگڑ دے۔ (کہ اس کو جنتیں نہ ملیں تب بھی اس کو جنتیں ملیں گی)۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ پھر کس کس نشانِ رب کی تکذیب کرو گے۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ۔ اور وہ دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے۔ ذوات کی اصل ذواتا۔ گویا ذوات مفرد بھی ہے اور تثنیہ مونث بھی۔ افنان فن کی جمع ہے۔ فن سے مراد ہے وہ پتلی نرم شاخ جو کسی ٹہنی کے بالائی سرے پر پھوٹتی ہے۔ درخت کی سرسبزی بار آوری اور سایہ داری انہی پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لئے جنتان کی صفت میں ذواتا افنان فرمایا۔ مجاہد اور کلبی نے یہی ترجمہ کیا ہے کہ فن اس سایہ کو جو شاخوں کا درخت کے احاطہ پر پڑتا ہے۔ اسی لئے حسن نے ذواتا افنان کا ترجمہ سایہ دار کیا ہے سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا فن سے مراد طرح طرح کے پھل اور درخت۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ۔ ان دونوں جنتوں کے اندر دو بہتے چشمے ہوں گے۔ اہل جنت جس طرف کو بہانا چاہیں گے وہ چشمے رواں ہو جائیں گے بالائی جانب کو بھی اور نشیبی جانب کو بھی۔ اللہ نے انہار جنت کی مختلف نوعیں بیان فرمائی ہیں۔ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ۔ کچھ نہریں نہ سڑنے والے پانی کی ہوں گی۔ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ۔ کچھ نہریں ایسے خالص دودھ کی ہوں گی جن کا مزہ متغیر نہ ہوگا۔ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ۔ کچھ نہریں شراب کی ہوں گی اور شراب بھی وہ جو بدمزہ تلخ نہ ہوگی بلکہ) پینے والوں کے لئے لذت بخش ہوگی۔ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی اور کچھ نہریں صاف شہد کی ہوں گی۔ اس تفصیل سے مستفاد ہوتا ہے کہ چاروں قسم کی نہروں میں سے ہر ایک نوع کی بیشمار شاخیں ہوں گی اور ہر شاخ رواں ہوگی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ۔ ہر جنت کے اندر ہر نوع کے پھلوں میں سے دو دو طرح کے ہوں گے (۱) نادر اور (۲) پہچانے ہوئے یا تر اور خشک۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو میٹھے کڑوے پھل ہوتے ہیں وہ سب جنت میں ہوں گے اور جو پھل یہاں کڑوا ہے وہ جنت میں میٹھا ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت کا حنظل بھی شیریں ہوگا۔ ابن ابی حاتم اور ابن منذر کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ہناد اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ جنت میں جو کچھ ہوگا دنیا میں صرف اس کے نام ہی ہیں۔ (حقیقت نہیں ہے)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۢ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ۔ وہ تکیہ لگائے ایسے بستروں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے۔

استبرق موٹا دبیز ریشمی کپڑا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی ناقل ہیں کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا (آیت میں) استر کی کیفیت تم کو بتا دی گئی، اُبرا کیسا ہوگا (اس کو کون جانے) بغوی نے یہی قول حضرت ابو ہریرہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔

ابو نعیم نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ ابرا جامد نور کا ہوگا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ کسی نے سعید بن جبیر سے پوچھا جب جنتی فرشوں کا استر ایسا ہوگا تو ابرا کیسا ہوگا۔ سعید نے جواب دیا۔ ابرا تو ایسا ہی ہوگا جیسا اللہ نے فرمایا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ کسی کو نہیں معلوم کہ کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک اہل جنت کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت (ابن) عباس نے فرمایا۔ ان فرشتوں کے ابرے کو روئے زمین پر کوئی نہیں جانتا اس لئے صرف استر کا ذکر کیا۔

وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ

اور ان دونوں باغوں کا پھل بہت نزدیک ہوگا سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان میں نیچی نگاہ والیاں (حوریں)

الطَّرْفِ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

ہوں گی کہ ان جنتی لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی

تُکَذِّبٰنِ ۝ کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی

تُکَذِّبٰنِ ۝ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی

تُکَذِّبٰنِ ۝ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ مُدْهَآمَّتٰنِ ۝

نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے اور ان دونوں باغوں سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں سو اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے

تفسیر وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۔ اور ان دونوں باغوں کا پھل بہت نزدیک ہوگا ۔ جنا بمعنی مجنی ۔ درخت سے توڑے جانے والے پھل ۔ یعنی درختوں کے پھل توڑنا اور چننا اہلِ جنت کے لئے آسان ہوگا ۔ ہاتھ بڑھایا اور جو پھل چاہا توڑ لیا ۔ سعید بن منصور، ہناد اور بیہقی نے آیت وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا کی تشریح میں حضرت براء بن عازب کا قول نقل کیا ہے کہ اہلِ جنت کھڑے، بیٹھے لیٹے جس طرح چاہیں گے جنت کے پھل (درخت سے توڑ کر) کھائیں گے ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا درخت اتنا قریب آجائے گا کہ اللہ کا دوست کھڑے بیٹھے جس طرح چاہے گا اس کے پھل خود توڑ لے گا ۔ قتادہ نے جنت کے درخت کے پھلوں سے مومن کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں روکے گی نہ دوری نہ کانٹے ۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ ۔ جنت کی نعمتوں میں کچھ عورتیں ہوں گی جن کی نگاہیں اپنے اپنے جنتی شوہروں کے علاوہ کسی اور پر نہیں پڑیں گی ۔ (بیہقی از مجاہد)

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۔ اہلِ جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے اُن سے جماع کیا ہوگا نہ جن نے ۔

یہ عورتیں کون ہوں گی ۔ کیا نسلِ آدم سے ہوں گی یا نسلِ جنات سے یا جنت ہی کی مخلوق ہوں گی جن کو حوریں کہا جاتا ہے ۔ موخر الذکر قول مقاتل کے نزدیک پسندیدہ ہے لیکن سعید بن منصور اور بیہقی نے شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ دنیا کی عورتیں مراد ہیں ۔ جنت میں دوبارہ جب اُن کی تخلیق ہوگی تو ان کی ہر حالت بدلی ہوئی ہوگی ۔ اللہ نے فرمایا ہے ۔ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا عُرُبًا أَتْرَابًا ۔ اس دوسری تخلیق کے بعد کسی آدمی یا جن نے اُن سے قربت نہیں کی ہوگی ۔ (کذا رواہ البغوی عن الکلبی) ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ عورتیں کچھ انسانی نسل سے ہوں گی جن سے جنت کے اندر قربت کسی جن نے نہیں کی ہوگی ۔ زجاج وغیرہ نے اسی سے استنباط کیا ہے کہ انسانوں کی طرح جن بھی جماع کرتے ہیں ۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۔ یعنی صافی میں یاقوت اور سفیدی میں موتی کی طرح ہوں گی ۔

(بغوی عن قتادہ)

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جنت کے اندر جو پہلا گروہ داخل ہوگا اس کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے جنت کے اندر نہ وہ تھوکیں گے نہ ناک سنکیں گے ، نہ بول و براز کے ضرورت مند ہوں گے ۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ان کے ظروف (یہاں تک کہ) کنگھیاں بھی سونے اور چاندی کی ہوں گی ۔ ان کا پسینہ مشک (کی طرح) ہوگا ۔ ہر ایک کی دو دو بیبیاں ہوں گی ایسی حسین کہ پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا گوشت کے اوپر چمکے گا ۔ اہلِ جنت کے درمیان کوئی اختلاف اور دشمنی نہ ہوگی ۔ سب یکدل ہوں گے ۔ صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کریں گے ۔

(متفق علیہ)

ترمذی کی صحیح روایت ہے جو بیہقی نے بھی نقل کی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں حضور اقدس صلعم نے فرمایا پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا اس کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے اور دوسرے گروہ کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے آسمان میں چمکدار ستارے ۔ ہر شخص کی دو بیبیاں ہوں گی ۔ ہر بیبی کے بدن پر ستر لباس (تہ بر تہ) ہوں گے ۔ پھر بھی پنڈلیوں کی ہڈی کی مینگ باہر سے چمکے گی ۔

طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک ایک حور کی پنڈلی کی ہڈی کی مینگ گوشت ہڈی کے پار ستر لباسوں کے نیچے سے دکھائی دے گی جیسے سرخ شراب شیشہ کے اندر سے دکھائی دیتی ہے ۔ حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ آیت مذکورہ (کی تشریح) کے سلسلہ میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ۔ جب وہ اپنے پردہ کے اندر ہوگی تو اُس کا چہرہ آئینہ کی طرح دکھائی دے گا ۔ جو موتی وہ پہنے ہوگی اس میں کا ادنیٰ موتی (اتنا چمکیلا اور روشن ہوگا) مشرق سے مغرب تک کو روشن کر دے گا ۔ اس کے جسم پر ستر لباس ہوں گے لیکن نظر سب کو پار کر کے پنڈلی کی ہڈی کی مینگ تک پہنچ جائے گی ۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن مسعود کی روایت سے رسول اللہ صلعم کا ارشادِ گرامی نقل کیا ہے کہ جنت کی عورت کی پنڈلی اور پنڈلی کی ہڈی کی مینگ ستر ریشمی لباسوں کے اندر سے دکھائی دے گی ۔ اللہ فرماتا ہے ۔ کانہن الیاقوت والمرجان ۔ یاقوت ایک ایسا پتھر ہوتا ہے کہ اگر اس میں (سوراخ کر کے) ڈورا پرو دیا جائے تو ڈورا چمکتا دکھائی دیتا ہے ۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۔ دنیا میں بھلائی کرنے کا نتیجہ آخرت کی بھلائی ہے ۔ بغوی نے

حضرت انس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے آیت ھل جزاء الاحسان الا الاحسان تلاوت فرمائی پھر ارشاد فرمایا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کو بخوبی علم ہے۔ فرمایا اللہ یہ فرما رہا ہے کہ جس کو میں نے توحید کی نعمت عطا کی اس کے عوض میں اس کے لئے بس جنت ہی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور رسول اللہ جو (شریعت) لے کر آئے ہیں اس پر عمل کیا اس کے لئے جنت (ضرور) ہی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ وَمِنْ دُوْنِہِمَا جَنَّتٰنِ۔ اور ان دونوں سے نیچے دو جنتیں اور ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا درجہ (یعنی ترتیب) میں نیچے۔ ابن زید نے کہا فضیلت میں نیچے۔ حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا۔ اول دونوں جنتیں سونے کی ہوں گی اور موخر الذکر دونوں جنتیں چاندی کی ہوں گی تابعین کے لئے۔ بیہقی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ سونے کی دو جنتیں سابقین (اگلوں) کے لئے ہوں گی۔ اور چاندی کی دو جنتیں تابعین (یعنی سابقین کے پیچھے آنے والوں) کے لئے ہوں گی۔ حضرت ابوموسیٰ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ چاندی کی دو جنتیں اصحاب الیمین (دائیں طرف والوں) کے لئے ہوں گی۔ بغوی نے ابن جریج کی روایت بھی اسی طرح نقل کی ہے۔

کسائی نے بقول بغوی من دونہما کا ترجمہ کیا۔ اول الذکر دونوں جنتوں کے سامنے۔ ضحاک کا قول بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ ضحاک نے کہا دو جنتیں سونے کی ہوں گی اور دوسری جنتیں یاقوت کی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ مُدْہَآمَّتٰنِ۔ دونوں جنتیں گہری سبز کالی ہوں گی۔ اول الذکر دونوں جنتوں کے متعلق کثرت اشجار و فواکہ کا ذکر کیا اور موخر الذکر جنتوں کی صفت مدھامتان ذکر کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فواکہ کی کثرت ہوگی اور ان میں سبزے اور پھولوں کی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ فِیْہِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ جوش مارتے ہونگے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون

تُکَذِّبٰنِ ۝ فِیْہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں

تُکَذِّبٰنِ ۝ فِیْہِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

کے منکر ہو جاؤ گے ان میں خوب سیرت خوبصورت عورتیں ہوں گی (یعنی حوریں) سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ۝

وہ عورتیں گوری رنگت کی ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی۔

تفسیر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ فِیْہِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ۔ ان دونوں میں دو اُبلتے چشمے ہوں گے۔

پہلے دو چشموں کی صفت تجریان ذکر کی کیونکہ وہ دونوں چشمے عرش سے جاری ہوں گے اور اس جگہ چشموں کی صفت نضاختان فرمائی۔ کیونکہ یہ دونوں نیچے سے اچھل کر نکلیں گے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ فِیۡهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ۔ ان دونوں جنتوں میں بکثرت میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔ چونکہ نخل اور رمان کا عطف فاکہۃ پر کیا گیا ہے اور معطوف و معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہیے۔ اس لئے بعض علماء کا قول ہے کہ کھجوریں اور انار فواکہ میں داخل نہیں ہیں۔ فاکہہ صرف وہی پھل ہوتا ہے جس کو کھانے کی غرض صرف لذت اندوزی اور زبان و دہان کا چٹخارا ہوتی ہے۔ کھجور غذا ہے اور انار دوا ہے (ان دونوں کی غرض صرف کام و دہان کی چاشنی ہی نہیں ہے) اسی لئے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر کسی نے فاکہہ نہ کھانے کی قسم کھائی اور پھر کھجوریں یا انار کھائے تو قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اکثر علماء قائل ہیں کہ کھجور و رمان فاکہہ کی ہی ایک قسم ہے۔ ان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے فاکہہ پر عطف کر دیا گیا ہے۔ عام طور پر خاص کا عطف اظہار اہمیت کے لئے کر دیا جاتا ہے۔ جیسے ملائکہ پر جبرئیل و میکائیل کا عطف دوسری آیات میں آیا ہے۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ جنت کے درخت ہائے کھجور کے تنے زمرد سبز کے اور پتے کندن سونے کے ہوں گے۔ درختوں کی چھال سے اہل جنت کا لباس تیار کیا گیا ہوگا۔ درختوں کے پھل مٹکوں اور ڈولوں کے برابر ہوں گے اور دودھ سے زیادہ سفید شہد سے زیادہ شیریں اور مکھن سے زیادہ ملائم ہوں گے۔ ان میں گٹھلی بالکل نہیں ہوگی۔

ابن ابی الدنیا کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ چھوارے جنت کے پھل ہیں۔ جنت کا ایک ایک چھوارہ لمبائی میں بارہ ہاتھ (شرعی گز) کا ہوگا جس میں گٹھلی نہ ہوگی۔ یہ بھی حضرت ابن عباس ہی کا قول مروی ہے کہ جنت کا ایک ایک انار اتنا بڑا ہوگا کہ اس کے گرداگرد بہت سے آدمی بیٹھ کر اس کو کھائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا (شب معراج میں) میں نے جنت کے اندر (اتنے بڑے بڑے انار) دیکھے کہ ایک ایک انار پالان پوش اونٹ کے برابر تھا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ فِیۡهِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ۔ جنت کے محلات میں خوب سیرت حسین عورتیں (یعنی حوریں) ہوں گی۔ حضرت ام سلمہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول خیرات حسان کا (کیا مطلب ہے) مجھ سے فرما دیجئے۔ ارشاد فرمایا بہترین اخلاق والی خوبصورت (البغوی)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ۔ وہ عورتیں گوری ہوں گی خیموں کے اندر محفوظ ہوں گی۔ حور حوراء کی جمع ہے جس عورت کی آنکھ کی سفیدی بجائے خود مکمل ہو اور سیاہی بھی اپنی جگہ گہری ہو اس کو حوراء کہتے ہیں۔ حضرت ابوامامہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا حور عین کی بناوٹ زعفران سے ہوگی (طبرانی)۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً حضرت انس کی روایت سے بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا بھی یہی قول بیہقی نے نقل کیا ہے۔ زید بن اسلم نے کہا۔ اللہ نے حور عین کو مٹی سے نہیں بنایا بلکہ مشک کافور اور زعفران سے بنایا ہے (عبداللہ بن مبارک) حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اگر کوئی حور (نمکین) سمندر میں تھوک دے تو اس کے لعاب دہن کی شیرینی سے سمندر میٹھا ہو جائے (ابن ابی الدنیا) حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ جنت کی عورتوں میں سے اگر کوئی عورت سات سمندروں میں تھوک دے تو سارے سمندر شہد سے زیادہ میٹھے ہو جائیں۔

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر جنت کی عورتوں میں سے کوئی عورت زمین کی طرف جھانک لے تو ساری زمین کی چیزیں چمک اٹھیں اور ساری فضا خوشبو سے بھر جائے۔ حور کے سر کی اوڑھنی دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے بہتر ہے۔ (بخاری)

مقصورات فی الخیام سے مراد ہیں۔ مسہری کے پردوں کے اندر پوشیدہ۔ بغوی نے کہا۔ مقصورات سے مراد یہ ہے کہ ان عورتوں کی نگاہ پسندیدگی اپنے شوہروں کے علاوہ کسی اور پر نہیں پڑی ہوگی۔ وہ اپنے جنتی شوہروں کے سوا کسی دوسرے کی طلبگار نہ ہوں گی۔ مجاہد نے کہا وہ اپنے خیمہ میں بند ہوں گی اور خیمہ موتی اور چاندی کا ہوگا۔ (بیہقی)

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو جنت کے اندر میں ایک مقام پر پہنچا جس کو بیدخ کہا جاتا ہے۔ اس جگہ موتی، سبز زبرجد اور یاقوت سرخ کے خیمے تھے (خیموں کے اندر سے حوروں نے) کہا السلام علیکم یا رسول اللہ۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ آواز کیسی ہے۔ جبرئیل نے کہا یہ مقصورات فی الخیام کی آواز ہے جنہوں نے آپ کو سلام کرنے کی اپنے رب سے اجازت کی

درخواست کی تھی۔ اللہ نے ان کو اجازت فرما دی۔ اس کے بعد وہ مقصورات کہنے لگیں ہم راضی رہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی۔ ہم (یہاں) ہمیشہ رہنے والیاں ہیں کبھی یہاں سے کوچ نہیں کریں گی۔ اس کے بعد رسول اللہ نے (آیت) حور مقصورات فی الخیام تلاوت فرمائی۔

حضرت عبد اللہ بن قیس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا جنت میں ایک خیمہ کھوکھلے موتی کا ہے جس کا عرض ساٹھ میل کا ہے جس کے ہر گوشہ میں رہنے والے رہتے ہیں الخ۔ (البغوی)

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے بھی اسی طرح کی مرفوع حدیث آئی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا ایک کھوکھلے موتی کا خیمہ ہے جو ایک فرسخ چوڑا ایک فرسخ لمبا ہے۔ اس کے چار ہزار کیواڑ سونے کے ہیں۔ [illegible] (ابن ابی الدنیا و بیہقی)

حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا خیمہ کھوکھلے موتی کے ہیں (ابن جریر و ابن ابی حاتم) حضرت عمر کا موقوف قول بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن جریر نے ابو مجلز کی مرسل روایت بھی ایسی ہی نقل کی ہے۔

حضرت ابو درداء کا قول ہے خیمہ ایک موتی کا ہے جس کے ستر دروازے موتی کے ہیں۔ عمرو بن میمون کا قول ہے۔ خیمہ ایک کھوکھلا موتی ہے (ابن ابی حاتم) مجاہد اور ابن احوص کا بھی یہی قول ہے۔ (ابن ابی حاتم)

ہر مسلم کے لئے ایک خوش خلق حور ہوگی اور ہر حور کا ایک خیمہ ہوگا اور ہر خیمہ کے چار دروازے ہوں گے۔ ہر دروازے سے ایک جدید تحفہ اور ہدیہ روزانہ داخل کیا جائے گا جو اس سے پہلے نہیں لایا گیا۔ حوریں اترانے والیاں نہ ہوں گی، مغرور و سرکش نہ ہوں گی، گندہ دہن اور گندہ بغل نہ ہوں گی۔ فراخ چشم ہوں گی۔ الخ (ابن ابی الدنیا از ابن مسعود)

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝

سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان (حوروں) کو ان (جنتیوں) سے پہلے نہ کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ

سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے وہ لوگ سبز مسہری اور عجیب خوبصورت کپڑوں (کے فرشوں) پر تکیہ لگائے بیٹھے

حِسَانٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي

ہوں گے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے بڑا با برکت نام ہے آپ کے رب کا جو

ع ۳ ۱۲

الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

عظمت والا اور احسان والا ہے

تفسیر فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ۔
اس آیت کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

کیا مومن عورتیں جنت کی حوروں سے افضل ہیں مومن عورتوں کو حوروں سے افضل و اعلیٰ قرار دیا گیا ہے حضرت ام سلمہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ کیا دنیا کی

عورتیں حوروں سے بہتر ہیں۔ فرمایا (ہاں) دنیاوی عورتیں فراخ چشم حوروں سے بہتر ہیں جیسے ابرا استر سے بہتر ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کا کیا سبب ہے۔ فرمایا عورتیں اپنی نمازوں اور روزوں کی وجہ سے (قیامت کے دن جنت کے اندر) حوروں سے افضل ہوں گی۔ اللہ ان کے چہروں کو لباس نور سے اور جسموں کو ریشم کے لباس سے آراستہ کرے گا۔ وہ خود گوری ہوں گی۔ ان کے لباس سبز ہوں گے۔ ان کے زیور زرد ہوں گے۔ ان کی خوشبو سلگانے کی انگیٹھیاں موتی کی اور ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ وہ کہیں گی ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں ہم کبھی نہیں مریں گی۔ ہم عیش پروردہ نازک بدن ہیں۔ کبھی ہماری جلد پر درشتی نہیں آئے گی۔ ہم یہاں ہمیشہ رہیں گی۔ یہاں سے کبھی کوچ نہیں کریں گی ہم (اپنے شوہروں سے اور اللہ کی نعمتوں سے) راضی ہیں کبھی ناراض نہیں ہوں گی۔ خوشی ہو اس کے لئے جس کے لئے ہم ہیں اور وہ ہمارے لئے ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جن عورتوں نے دنیا میں دو یا تین یا چار شوہر کئے ہوں پھر مر کر جنت میں چلی جائیں اور ان کے دنیوی شوہر بھی سب کے سب ان کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائیں تو جنت میں وہ کن شوہروں کی بیبیاں ہوں گی۔ فرمایا ایسی عورتوں کو اختیار ہوگا۔ دنیا میں جو شوہر سب سے زیادہ ان عورتوں کے لئے خوش اخلاق ہوں گے انہی کو وہ جنت میں انتخاب کر لیں گی۔

حضرت ام سلمہ نے فرمایا خوش اخلاقی (بھی عجیب چیز ہے اس) سے دنیا کی خیر بھی حاصل ہوتی ہے اور آخرت کی خیر بھی (بیہقی) حبان بن جبلہ کا قول ہے کہ اہل جنت کی عورتیں جب جنت میں داخل ہو جائیں گی تو وہ حورعین سے اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے افضل ہو جائیں گی۔

مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ۔ سبز مشجر پر تکیہ لگائے ہوئے۔ رفرف سبز کپڑے جن سے نشست گاہیں اور فرش بنائے جاتے ہیں اور مسند و لوازم مسند جیسے تکیے (قاموس) جوہری نے صحاح میں لکھا ہے۔ ایک خاص قسم کے کپڑے جو چمن کے ہم شکل ہوتے ہیں رفرف کہلاتے ہیں۔

حضرت ابن عباس نے رفرف کا ترجمہ کیا نشست گاہیں (بیہقی بطریق ابو طلحہ) سعید بن جبیر نے ترجمہ کیا جنت کے باغ (ہناد و بیہقی) بغوی نے ترجمہ کیا بساط، حسن، مقاتل اور قرطبی کا بھی یہی قول ہے۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ رفرف بستر اور نشست گاہوں کے لوازم کو کہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا فرش کے اوپر جو سبز نشست گاہیں بچھائی جاتی ہیں ان کو رفرف کہتے ہیں۔ ابن کیسان نے کہا۔ کہنی ٹیکنے کا سہارا رفرف ہے۔ ابن عیینہ نے اس کا ترجمہ مسند کیا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ہر لمبے چوڑے کپڑے کو عرب رفرف کہتے ہیں۔

وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ اور عجیب نفیس خوبصورت کپڑوں کے فرشوں پر۔ عبقر ایک مقام کا نام ہے جہاں بکثرت جنات تھے وہاں کے کپڑے نہایت خوبصورت ہوتے تھے (عبقری اس مقام کی طرف نسبت ہے) عبقری ہر کامل چیز جس میں کوئی نقص نہ ہو اور سب سے اونچا شخص اور سردار اور قوی اور ایک خاص قسم کا فرش (قاموس) بیضاوی نے لکھا ہے۔ عبقری عبقر کی طرف منسوب ہے۔ عرب کا خیال تھا کہ عبقر جنات کی ایک بستی کا نام ہے۔ ہر عجیب نادر چیز کو عرب عبقر کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

حضرت ابن عباس نے عبقری حسان کا معنی بیان کیا مسندیں۔ قتیبی نے کہا ہر وہ کپڑا جس پر کڑھائی یا چھپائی ہو عرب اس کو عبقری کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا عبقری اس بستی کی طرف منسوب ہے جہاں کپڑے کی چھپائی اور کڑھائی ہوتی تھی۔ خلیل نے کہا۔ ہر اعلیٰ نفیس بزرگ عمدہ چیز یا آدمی کو عرب عبقری کہتے ہیں۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے۔

اسم، نام، صفت، دونوں معنی اس جگہ مناسب ہیں۔ اللہ کی ذات کا بابرکت اور کثیر الخیر ہونا تو ناقابل شک حقیقت ہے۔ اس کا نام اور اس کی ہر صفت بھی بہت ہی بابرکت ہے۔ بسم اللہ میں باسم ربک میں اور تبارک اسم ربک میں اور اسی طرح بکثرت آیات میں لفظ اسم بڑھانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی ذات حقیقت اور شخصیت کا تصور نہ کوئی انسان کر سکتا ہے نہ فرشتہ نہ جن، حقیقت خداوندی نہ فقط ورائے ذہنی ہے بلکہ وراء الوراء ہے۔ البتہ اس کی صفات کے آثار بصر و بصیرت کے سامنے آتے ہیں۔ ہم آثار سے اس کی صفات کا کسی قدر من وجہ تصور کر لیتے ہیں اور انہی صفات کے ذریعہ سے ہم نے ذات کا نام اپنی زبانوں پر جاری کر رکھا ہے۔ پس ہمارے محدود ذہن کے اندر اللہ کی غیر محدود صفات بھی نہیں آ سکتیں صرف ان کے نام آتے ہیں۔ پس اللہ کو اس کے اسم ذات اور اسمائے صفات سے ہی پہچانتے ہیں۔ حقیقت

ذات وصفات کا ذہن میں محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ قرآن میں اسمائے ذات وصفات کا ذکر ہے۔ حقیقت الوہیت کی طرف کسی جگہ اشارہ بھی نہیں ہے۔ تفصیل بحث آئندہ آئے گی۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نماز کا سلام پھیرنے کے بعد صرف اتنی دیر بیٹھتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (ایک بار) پڑھ لیتے تھے۔ (رواہ البغوی ومسلم)

سورۃ الواقعۃ

حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حسن، عکرمہ، جابر اور عطا کا قول ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ قتادہ نے کہا۔ آیت وتجعلون رزقکم الخ مدینہ میں نازل ہوئی۔ باقی سورت مکی ہے۔ کلبی کا قول ہے کہ افبھٰذا الحدیث سے چار آیات تک سفر مکہ میں نازل ہوئیں۔ باقی سورت مدینہ میں۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اور حارث بن اسامہ اور ابویعلی اور ابن مردویہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو کوئی ہر شب سورۂ واقعہ پڑھے گا اس کو کبھی فاقہ کشی کی نوبت نہیں آئے گی۔ ابن عساکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا سورۂ واقعہ غنی کردینے والی سورت ہے اس کو پڑھو اور اپنی اولاد کو سکھاؤ۔

ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے واقعات میں بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابن مسعود مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے تو حضرت عثمان رضؓ عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور دریافت کیا کہ آپ کو کیا دکھ ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ گناہوں کا۔ دریافت کیا کس چیز کی خواہش ہے۔ جواب دیا۔ اپنے رب کی رحمت کی۔ حضرت عثمان نے فرمایا کسی طبیب کو بھیج دوں۔ حضرت ابن مسعود نے جواب دیا۔ طبیب نے ہی تو مجھے بیمار ڈالا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کچھ مال بھیج دوں۔ حضرت ابن مسعود نے جواب دیا مجھے مال کی ضرورت نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا۔ آپ کی بچیوں کے کام آئے گا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ کیا میری بچیوں کے نادار ہوجانے کا آپ کو اندیشہ ہے۔ سنئے میں نے سب لڑکیوں سے کہہ دیا ہے کہ ہر رات کو سورہ واقعہ پڑھ لیا کریں۔ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ کو پڑھے گا اس کو ہرگز ہرگز فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس اثر کے راوی حضرت ابوظبیہ بھی اس سورت کو بلا ناغہ روز پڑھا کرتے تھے۔

یہ اور اس قسم کی بکثرت احادیث جو سورتوں اور آیتوں کے فضائل میں مذکور ہیں ان میں سے بیشتر علمار روایت والسانید کے نزدیک قوی نہیں ہیں بلکہ بعض صحت کے درجہ کو بھی نہیں پہنچیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر کلام اپنے خاص مقصد اور افادیتِ معنی کے علاوہ ایک خاص اثر اور بھی رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے تو سننے والے کے دل میں نفرت یا رغبت کا جذبہ برسرِ ظہور آجاتا ہے۔ اسی کو تاثیر کلام کہا جاتا ہے۔ پس اللہ کا کلام تو علاوہ افادیتِ مضمون کے عظیم الشان تاثیر کا حامل ہے جس کا تجربہ بزرگانِ ملت اور سلفِ صالحین بلکہ اس زمانہ کے بھی پختہ متقی اہلِ ایمان نے ہزاروں بار کیا ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ گو توہم پرست فلسفی اور سائینٹسٹ اس کا انکار کریں گے مگر مشاہدہ اور تجربہ کے مقابلہ میں ان کے انکار کی کوئی وقعت نہیں، اس لئے غیر قوی بلکہ بعض غیر صحیح روایات میں جو سورتوں اور آیتوں کی تاثیرات کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ روایتہً کتنا ہی مجروح اور سقیم ہو مگر تجربہ شاہد عادل ہے اور ان تاثیرات کا مؤید و مصدق ہے۔

ایک بار حضرت ابوبکر صدیق نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ فرمایا مجھے سورۂ ہود، سورہ واقعہ، سورہ والمرسلات، سورۂ عم یتساءلون اور سورۂ اذالشمس کورت نے بوڑھا کردیا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کرنے کے بعد حسن غریب کہا ہے۔

امام احمد نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا۔ رسول اللہ صلعم نماز اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح تم آج کل پڑھتے ہو لیکن حضورؐ کی نماز

ہلکی ہلکی ہوتی تھی آپ فجر کی نماز میں سورۂ واقعہ اور اسی جیسی سورتیں پڑھتے تھے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا کَاذِبَةٌ ۘ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ اِذَا

جب قیامت واقع ہوگی۔ جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں ہے تو وہ (بعض کو) پست کردیگی (اور بعض کو) بلند کردیگی جبکہ

رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَکَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ وَّ کُنْتُمْ

زمین کو سخت زلزلہ آوے گا اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے پھر وہ پراگندہ غبار ہو جائیں گے اور تم

اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ؕ فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ۬ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ؕ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ

تین قسم کے ہو جاؤ گے سو جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں

مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ؕ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۚۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ

وہ بائیں والے کیسے برے ہیں اور جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ ہی درجہ کے ہیں (اور) وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں

فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۞ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙ وَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ؕ عَلٰی سُرُرٍ

یہ (مقرب) لوگ آرام کے باغوں میں ہونگے ان کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے وہ لوگ سونے کے

مَّوْضُوْنَةٍ ۙ مُّتَّكِـِٕیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ ۞ یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ

تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ان کے آس پاس ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے یہ چیزیں لے کر

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِیْقَ ۙ۬ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ۙ لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا

آمد و رفت کیا کریں گے آبخورے اور آفتابے اور ایسا جام شراب جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائیگا نہ اس سے ان کو درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور

یُنْزِفُوْنَ ۙ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ ۙ وَ لَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ ؕ

آئے گا اور میوے جن کو وہ پسند کریں گے اور پرندوں کا گوشت جو ان کو مرغوب ہو

وَ حُوْرٌ عِیْنٌ ۙ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۞

اور ان کے لئے گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی (مراد حوریں ہیں) جیسے (حفاظت سے) پوشیدہ رکھا ہوا موتی یہ ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گا۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا ۝ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝ وَاَصْحٰبُ

(اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ الزام کوئی بیہودہ بات بس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی۔ اور جو داہنے والے

الْیَمِیْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۝ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۝ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۝

ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں وہاں باغوں میں ہوں گے جہاں بے خار بیریاں ہونگی اور تہ بہ تہ کیلے ہوں گے

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۝ وَّفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ

اور لمبا لمبا سایہ ہوگا اور چلتا ہوا پانی ہوگا اور کثرت سے میوے ہوں گے جو نہ ختم ہوں گے اور نہ

لَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۝ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝ فَجَعَلْنٰهُنَّ

ان کی روک ٹوک ہوگی اور اونچے اونچے فرش ہوں گے ہم نے (وہاں کی) ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے یعنی ہم نے ان کو ایسا

اَبْكَارًا ۝ عُرُبًا اَتْرَابًا ۝ لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ۝ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝

بنا کہ وہ کنواریاں ہیں محبوبہ ہیں ہم عمر ہیں یہ سب چیزیں داہنے والوں کے لئے ہیں ان (اصحاب الیمین) کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں کا ہوگا

وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ۝

اور ایک بڑا گروہ پچھلے لوگوں میں ہوگا

ع ۲۸ / ۱۴

قیامت کیا ہے اور اس کا آغاز کیسے ہوگا

کائنات عنصری میں ہر جامد اور نامی کی ایک مقرر عمر اور مدتِ بقا ہے۔ ہر چیز میں تدریجی تغیر ہو رہا ہے۔ کہیں مقدار میں کمی بیشی ہو رہی ہے، کہیں رنگ، شکل، بو، حسن اور مکان کا تبادلہ اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر آن عالم عنصری کا ہر ذرہ متحرک متغیر اور ہالک ہے۔ دانشِ سلیم کا تقاضا ہے کہ ایک وقت ایسا آنا چاہئے جس میں مجموعۂ کائنات کی ہیئتِ ترکیبی بدل جائے۔ ہیئتِ تالیفی کی بقا (اجزاء کی شکل، مقدار، رنگ اور وزن کے تغیر و تبدل کے ہوتے ہوئے) ناممکن ہے۔ پس چھوٹے چھوٹے زلزلے جو اس کائناتِ ارضی و سماوی میں آتے ہیں اور اپنے ساتھ محسوس و نیم محسوس تغیرات و تاثرات لا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ ایک روز بڑے زلزلے میں تبدیل ہو جائیں اور جس زمین پر انسانوں کی آبادی ہے اس میں عظیم الشان بھر بھری آجائے اور زمین کا اندرونی لاوا اور گیس یکدم سطح زمین کو پھاڑ کر ابل پڑے اور ساری زمین تہ و بالا ہو جائے اور سمندروں کا پانی آگ بن جائے اور سارا پانی دھواں اور بھاپ بن کر اڑ جائے اور پھر دنیا پر چھا جائے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور غبار بن کر ہوا میں اڑتے پھریں اور روئی کے گالوں کی طرح فضائے کائنات میں منتشر ہو جائیں اور اس توڑ پھوڑ کے بعد زمین کی شکل از سر نو دوسری بنا دی جائے بلکہ ایسا ہوگا کیوں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ زمین کے اندر کے مردے سب زندہ کر کے کھڑے کر دیئے جائیں۔ جو انسان مر کر بالائی سطح سے زمین کے اندر پہنچ چکا وہ پھر اپنی بگڑی یا سنواری ہوئی شکل کے ساتھ اوپر آجائے گا، لیکن کیوں آئے گا، کس غرض

آئے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی میدانِ عمل ہے۔ عمل تکمیلِ فعل کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنا اچھا برا اثر اور بری اچھی شکل چھوڑ جاتا ہے۔ دوسری دنیا میں اعمالِ فانیہ کے نتائجِ باقیہ سامنے آئیں گے کوئی عمل بے نتیجہ نہیں، بے اثر نہیں پس تجدیدِ کائنات کے بعد نتائج جو بر سرِ ظہور میں ظاہر ہوں گے اصحابِ فکر و عمل تین قسم کے ہیں۔

(۱) صحیح عقائد و اعمال کے رکھنے والے (۲) غلط افکار و اعمال کے حامل (۳) میدانِ معرفت کے شہسوار، سب سے آگے بڑھنے والے۔

دنیوی زندگی میں بھی سارے انسان ہر زمانہ میں انہی تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور آنے والی زندگی میں بھی یہ گروہی تقسیم ضروری ہے۔ یہ تقسیم فکر و عمل کے لحاظ سے ہے معاشی تقسیم نہیں ملکی تقسیم نہیں، نسبی اور خاندانی تقسیم نہیں۔ درجاتِ آخرت کے لحاظ سے تقسیم ہے۔ ایک گروہ مومنین صالحین کا بڑا بابرکت گروہ ہے جو پشتِ آدم سے نکلنے کے بعد دائیں طرف کا گروہ تھا اور دربارِ الٰہی میں بھی قیامت کے دن دائیں جانب اس کا مقام ہوگا۔ دوسرا گروہ بدبخت کافروں کا ہے جو پشتِ آدم سے خارج ہونے کے وقت دائیں جانب تھا اور قیامت کے دن بھی بائیں جانب ہوگا۔ اول گروہ اہلِ جنت کا اور دوسرا گروہ دوزخیوں کا ہوگا۔ تیسرا گروہ ان صادقین کا ہوگا جو میدانِ معرفت کے شہسوار ہیں۔ یہ گروہ بارگاہِ الٰہی میں مقامِ قرب پر فائز ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ۔ جب قیامت برپا ہوگی۔ قیامت ایک واقعی حقیقت ہے اس لئے اس کو الواقعة فرمایا اور چونکہ مستقبل میں قیامت کا تحقق اتنا یقینی ہے جیسے کسی گزری ہوئی چیز کا اس لئے وَقَعَتْ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ۔ وقوعِ قیامت میں کوئی جھوٹ نہیں یا جب قیامت کا وقوع ہوگا تو کوئی بھی اس کی تکذیب کرنے والا نہیں ہوگا۔ (اول ترجمہ پر کاذبة بمعنی مصدری ہوگا)

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ۔ قیامت کچھ لوگوں کو نیچا اور کچھ کو اونچا کردے گی۔ کافروں اور نافرمانوں کو نیچے گرا دے گی اور نیکوکار مومنوں کو سربلند کردے گی۔

یا یہ مطلب ہے کہ کائنات میں انقلاب لے آئے گی۔ دنیا الٹ پلٹ ہو جائے گی۔ ستارے ٹوٹ کر نیچے آجائیں گے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑتے پھریں گے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ۔ قیامت اس وقت ہوگی جب زمین کو سخت جھنجھوڑی دی جائے گی زمین عظیم الشان زلزلہ آئے گا۔ روئے زمین کے سارے قلعے، اونچی مضبوط عمارتیں، بلند و بالا درخت اور سر بفلک پہاڑ ڈھہ جائیں گے، سب منہدم ہو جائیں گے۔ زمین کا چپہ چپہ کپکپا جائے گا۔ ساری زمین میں بھونچال آجائے گا۔ ایک اور آیت میں آیا ہے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا جب زمین کو جھنجھوڑی ایسی دی جائے گی جو اسی کے مناسب ہوگی (یعنی تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے عجب جھنجھوڑی ہوگی) ایک تیسری آیت میں ہے۔ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ قیامت کا زلزلہ عظیم الشان چیز ہوگا۔

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا۔ اور پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے اکھاڑ کر) چلایا جائے گا (یعنی پہاڑوں کی استقامت اور ایک جگہ پائیداری نہیں رہے گی)، کذا قال الکلبی والحسن وابن کیسان۔ یا یہ مطلب ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیا جائے گا۔ کذا قال عطاء ومقاتل بسّ۔ منتشر کردینا۔

فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا۔ پھر وہ پراگندہ غبار ہو جائیں گے۔ دوسری آیت میں كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (ریگِ رواں) کا لفظ آیا ہے، مشبہ بہ میں اختلاف ہے۔ مقصد ایک ہے کہ پہاڑ باریک باریک ریت کے ذرات اور اڑتے ہوئے شعاعی پھنگوں کی طرح ہیچ ہو جائیں گے۔

ہباء وہ شرارے جو آگ جلاتے وقت پتنگوں کی طرح اڑتے ہیں اور نیچے گرنے پر کچھ نہیں رہتے۔ (ابن کثیر) نیز ہباء ان شعاعی ذرات کو بھی کہتے ہیں جو کمرے کے دروازہ کی جھریوں اور دروازوں سے اس وقت اندر آتے ہوئے نظر آتے ہیں جب باہر سامنے کی طرف دھوپ یا روشنی ہو۔ منبث، وہ ریزہ ریزہ چیز جس کو ہوا اڑا کر پتوں کے چورے کی طرح فضا میں لے جاتی پراگندہ اور نابود کردیتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ پہاڑ غبار ی ذرات بن کر اڑ جائیں گے اور نابود ہو جائیں گے۔

وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً الخ۔ اور اے انسانو! تمہاری (اعمال کی ونتیجہ کے لحاظ سے) تین قسمیں ہو جائیں گی۔ ایک جماعت عرش الٰہی (یعنی جلوہ گاہِ الوہیت) کے دائیں طرف ہوگی۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو حضرت آدم کی دائیں کروٹ سے نکلے تھے اور دائیں جانب ان کا مستقر تھا۔ ان کے دائیں ہاتھوں میں اعمال نامے دیئے جائیں گے اور دائیں جانب جنت کی طرف ان کو بھیجا جائے گا (میمنۃ کا معنی ہے یمین یعنی دائیں جانب) یہ لوگ اصحاب خیر و برکت ہوں گے۔ (میمنۃ بمعنی یُمن ہے یعنی برکت) یہ وہی لوگ ہوں گے جن کے متعلق ازل ہی اللہ نے فرمایا تھا ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ دوسرا گروہ عرشِ الٰہی کے بائیں جانب ہوگا جو حضرت آدم کے بائیں پہلو سے برآمد کئے گئے تھے۔ اور ازل میں ان کے متعلق فرمان ہو چکا تھا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھوں میں دیئے جائیں گے اور بائیں طرف کو ان کو روانہ کر دیا جائے گا۔ یعنی دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ (مشئمۃ بمعنی یسرہ یعنی بائیں جانب) یہ لوگ بڑے منحوس ہوں گے (مشئمۃ بمعنی شوم یعنی نحوست)

تیسری جماعت ان اہلِ عرفان کی ہوگی جو مدارجِ قرب پہ فائز ہوگی۔ یہ جماعت اصحاب الیمین سے بھی زیادہ باوقعت اور عام اہل جنت سے بڑھ کر باعزت ہوگی۔ یہ خاص الخاص طبقہ ہوگا جو مقرب بارگاہِ الٰہی ہوگا۔ عام اہلِ جنت سے ممتاز ہوگا۔ اسی سورت کے آخر میں بھی ان تینوں طبقات کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ فاطر میں فرمایا ہے۔ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ۔ پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث اپنے چیدہ بندوں کو بنایا۔ جن میں سے کچھ تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں (یعنی ان کے گناہ نیکیوں پہ غالب ہیں) اور کچھ میانہ رو ہیں، درمیانی چال رکھتے ہیں اور کچھ اللہ کے حکم سے بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔ اس آیت میں بھی مذکورہ بالا تینوں قسموں کو بیان کیا گیا ہے۔ (ظالم لنفسہ کی تفسیر اہلِ جہنم سے اس جگہ کی گئی ہے۔ دوسرا تفسیری قول وہ ہے جو پہلے گزر چکا کہ ظالم لنفسہ سے وہ گناہگار مومن مراد ہیں جن کے گناہ نیکیوں سے زائد ہیں)

حضرت ابن عباس نے فرمایا دو گروہ جنتی ہیں اور ایک گروہ جہنمی۔

سابقین سے کون لوگ مراد ہیں؟

اس کے متعلق علماء تفسیر کے مختلف اقوال ہیں (۱) انبیاء مرسلین (۲) اہل علیین (۳) حضرت یوشع بن نون جو سب سے پہلے حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے (۴) آلِ فرعون میں سے وہ مومن جو حضرت موسیٰ پر تمام فراعنہ اور ان کے اتباع کو چھوڑ کر ایمان لایا تھا جس کا ذکر سورۂ یٰسین میں آیا ہے (۵) حضرت علی جو سب سے پہلے رسول اللہ صلعم پر ایمان لائے تھے (۶) وہ حواری جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے تھے (۷) وہ مسلمان جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی (۸) ہر امت کے وہ لوگ جو اپنے اپنے انبیاء پر سب سے پہلے ایمان لائے تھے (۹) وہ مسلمان جو نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں سب سے پہلے داخل ہوتے ہیں (۱۰) وہ مجاہدین جو اہلِ جہاد کی اگلی قطار میں ہوتے ہیں اور میدان میں سب سے پہلے نکلتے ہیں۔ (۱۱) تمام اولیاء انبیاء اور صحابہ یہی تشریح زیادہ بہتر ہے۔ سبقت کسی خاص وصف کی بناء پہ نہیں بلکہ مجموعۂ اوصاف اسلامیہ اور مقتضیاتِ ایمانیہ کے حامل ہونے کی بناء پر ہوگی۔ مزید توضیح اگلی آیات میں آ رہی ہے۔ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ سَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ الخ اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف پیش قدمی کرو جس کی (لمبائی) چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے۔ پس ہر وہ شخص جو نیکیوں کی طرف سب سے آگے بڑھتا ہے اس کا شمار سابقین میں کیا جائے گا۔ انہی کو اللہ نے اپنی بارگاہ کا مقرب قرار دیا ہے۔

مسند احمد میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک روز فرمایا۔ جانتے ہو کہ قیامت کے دن اللہ کے سایہ (عاطفت و رحمت) کی طرف کون لوگ جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی کو بخوبی علم ہے۔ فرمایا وہ لوگ کہ جب ان کا حق ان کو دیا جائے تو قبول کر لیں۔ اور

لوگوں کا جو حق ان پر ہو اس کو عند الطلب ادا کر دیں۔ لوگوں کے لئے وہی حکم دیں جو اپنے اوپر لاگو کریں۔

ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ ایک (بڑی) جماعت پہلوں میں سے اور تھوڑے سے پچھلے لوگوں میں سے اولین و آخرین (یعنی پہلے آنے والے اور پیچھے آنے والے) کون لوگ ہیں ان سے کیا مراد ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔

(۱) گزشتہ امتوں میں سے بہت اور اس امت میں سے کم (اولین گزشتہ امتیں اور آخرین یہ امت اسلامیہ)

(۲) امت اسلامیہ کے پہلے دور کے لوگ اور ان کے پیچھے آنے والے قیامت تک سارے مسلمان (یعنی صحابہ اولین ہیں اور آخرین صحابہ کے بعد قیامت تک آنے والے سب مومن ہیں)

(۳) ہر نبی کی امت کے صحابی اولین ہیں اور صحابیوں کے بعد آنے والے لوگ آخرین۔

شیخ ابن جریر نے اول معنی کو پسند کیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے ہم (دنیا میں) پچھلے ہیں (سب امتوں کے بعد آئے) اور قیامت میں پہلے ہوں گے (سب سے پہلے جنت میں جائیں گے) ابن ابی حاتم کی روایت بھی اسی تفسیر کی مؤید ہے۔ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ جب آیت ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ نازل ہوئی تو صحابہ پر بڑی شاق گزری تو (کچھ مدت کے بعد آیت) ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ اللہ نے نازل فرمائی (یعنی اس دوسری آیت میں صراحت فرما دی کہ مقام قرب پر فائز ہونے والا پچھلی امتوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ ہوگا اور تم میں سے بھی ایک بڑا گروہ اس درجہ پر پہنچے گا۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجھے امید ہے کہ کل اہل جنت کا ایک چوتھائی حصہ تم ہو گے بلکہ ایک تہائی ہو گے بلکہ کل اہل جنت کے آدھے ہو گے۔ تم آدھی جنت کے مالک ہو گے اور باقی آدھی تمام امتوں کو ملے گی۔ (رواہ احمد)

ابن عساکر راوی ہیں کہ آیت مذکورہ سننے کے بعد حضرت عمر نے حضور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ کیا اگلی امتوں میں سے بہت لوگوں کا شمار سابقین میں ہوگا اور ہم میں سے کم لوگ سابقین میں شامل ہوں گے (یہ سوال اظہار تعجب کے طور پر تھا) اس سے ایک سال کے بعد اللہ نے آیت ثلۃ من الاولین و ثلۃ من الآخرین نازل فرمائی۔ حضور نے حضرت عمر کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ سنو آدم سے لے کر مجھ تک (یعنی میری بعثت تک) ایک ثلہ ہے (یہ ثلۃ من الاولین ہے) اور میری امت تنہا ایک ثلہ (بڑا گروہ) ہے جس کا شمار سابقین میں ہوگا اس روایت کی سند میں کسی قدر ضعف ہے۔ ہاں دوسری بہت سندوں کے ساتھ روایات آئی ہیں کہ حضور نے فرمایا۔ تم اہل جنت کے چوتھائی حصہ ہو (بلکہ ایک تہائی بلکہ آدھے)

دوسرا قول زیادہ صحیح ہے۔ صحابہ میں یقیناً اہل قرب کی تعداد زیادہ تھی پھر دور صحابہ کے بعد تدریجاً اہل قرب کم ہونے لگے اور قیامت تک کم ہی ہوتے جائیں گے۔ روایت میں آیا ہے کہ حسن بصری نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا سابقین تو گزر چکے۔ اللہ ہمیں اصحاب یمین (دائیں جانب والوں) میں سے کر دے۔ دوسری روایت میں حسن بصری کا قول آیا ہے۔ اس امت میں سے جو لوگ گزر گئے ان میں مقربین بہت تھے۔ ابن سیرین نے فرمایا۔ ہر امت میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ شروع میں پیغمبر کی صحبت میں رہ کر فائدہ اٹھانے والے اور ہمہ گیر کفر کے مقابلہ میں توحید کے علمبردار زیادہ ہوتے رہے ہیں اور یہی سابق الایمان سابق الاطاعت سابق الجہاد تھے اس لئے ان میں سے زیادہ تعداد مقام قرب میں پہنچنے والوں کی ہوتی اور پیغمبر سے جتنی دوری ہوتی گئی مقربین کی تعداد گھٹتی گئی) ابن سیرین کے قول کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ سابقین سے مراد تمام انبیاء کے مخلص صحابی ہیں۔ انہیں میں سے اہل قرب کی تعداد بہت ہوئی اور ان کے بعد آنے والوں میں بھی اہل قرب ضرور پیدا ہوئے مگر تھوڑے۔

صحاح ستہ کی حدیث ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اس کے بعد والا۔ پھر اس سے متصل الخ۔ یہ حدیث صحیح ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سابقون سے مراد صحابہ کرام ہیں اور ان ہی کا بڑا گروہ مقرب بارگاہ ہے۔ اس کے بعد انحطاط کا زمانہ ہے۔ لیکن انحطاط بھی تدریجی ہے یعنی تدریجی تنزل کے باوجود خواہ کتنی ہی کم تعداد ہے مگر اہل خیر (ہر زمانہ میں خصوصاً) تابعین اور تبع تابعین میں ضرور موجود ہیں البتہ ایک حدیث اور آئی ہے جس میں حضور نے فرمایا ہے کہ میری امت ایسی ہے جیسے بارش نہ معلوم ابتدائی بارش اچھی ہو یا آخری یہ حدیث مضطرب

اعتبار سے صحیح ہے۔ اختلاف روایت سے الفاظ میں اختلاف ضرور ہے۔ حدیث کا مطلب تو صحیح ہے کہ شروع میں دین کو جاری کرنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت تھی جب استحکام ہوگیا تو پھر اگلے زمانہ میں اس کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسے مسلمانوں کی ضرورت قیامت تک رہے گی جو لوگوں کو اصل دین اور سنتِ رسول اللہ صلعم پر جمائے رکھیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اول گروہ کی دین کو ضرورت زائد ہے۔ اگر شروع میں ماننے والے اور عمل کرنے والے ہی نہ ہوتے تو دین مٹ جاتا۔ کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔ جس طرح کھیت کو شروع بارش اور آخر بارش دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخری بارش کھیت کو سوکھنے سے محفوظ رکھتی ہے اور ابتدائی بارش سے دانہ جمتا پھوٹتا پھٹتا اور نمو پذیر ہوتا ہے۔ اگر ابتدا میں بارش نہ ہو کوئی دانہ نہیں اُگے گا اور کسی دانہ کی جڑ نہیں جمے گی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بارش کا اول حصہ زیادہ مفید ہے۔ پس اس امت کا ابتدائی حصہ بھی دین کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ سب سابقین اولین اور مقربین ہیں۔ اور ان کے بعد والے کم تعداد میں اور صاف صحابہ کے ساتھ ہیں اس لئے ان میں مقربین کی تعداد بھی کم ہے۔

بعض احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے کہ جنت میں جتنے لوگوں کو داخل کیا جائے گا ان میں زیادہ تعداد اس امت والوں کی ہوگی۔ اس مضمون کی بعض احادیث کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ یہ حدیث بھی ناقابلِ شک ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اس امت میں سے ستر ہزار لوگ بلاحساب جنت میں جاویں گے اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے۔ اس حدیث سے بھی اہلِ جنت کی بیشتر تعداد اسی امت کے افراد کی ہونا مترشح ہے۔

طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم میں سے ایک بہت بڑی جماعت قیامت کے دن کھڑی کی جائے گی جو اتنی بڑی ہوگی اور گنتی میں اتنی زائد ہوگی کہ گویا رات سارے روئے زمین پر چھا گئی۔ فرشتے کہیں گے۔ سب انبیاء کے ساتھ جتنے لوگ آئے ہیں ان سے بہت ہی زیادہ محمدؐ کے ساتھ ہیں۔ اس حدیث سے بھی تمام امتوں سے زیادہ امتِ محمدیہ کا داخلہ جنت ثابت ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کو اس طرح کی احادیث پڑھ کر دھوکہ ہوگیا اور انہوں نے عام اہلِ جنت اور سابقین المقربین میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ حالانکہ ایسی احادیث سے مقربین سابقین کا اس امت میں سب امتوں سے زیادہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ تمام امتوں سے زیادہ اس امت والوں کا جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حافظ ابوبکر بیہقی نے دلائلِ نبوت میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نمازِ فجر سے فارغ ہو کر زانو موڑے ہی ہوئے ستر مرتبہ پڑھتے — سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا۔ پھر فرماتے ستر کے بدلے سات سو ہیں جس کے ایک دن کے گناہ سات سو سے بھی بڑھ جائیں وہ بے خیر ہے۔ یہ بات دو مرتبہ فرماتے پھر لوگوں کی طرف رُخ پھیر کر بیٹھ جاتے۔ پھر دریافت فرماتے کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے چنانچہ

ابوزمل کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلعم حسبِ معمول جب اس طرح بیٹھے اور لوگوں سے خواب دریافت کئے تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ فرمایا۔ اللہ خیر سے ملائے۔ شر سے بچائے۔ ہمارے لئے بہتر بنائے اور ہمارے دشمنوں کو بُرائی دکھائے ہر طرح کی حمد کا مستحق وہ اللہ ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اپنا خواب بیان کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کشادہ بڑا آسان اور صاف راستہ ہے۔ بیشمار لوگ اس راستہ میں چلے جا رہے ہیں۔ یہ راستہ جاتے جاتے ایک سرسبز باغ تک جا پہنچتا ہے۔ باغ اتنا سرسبز ہے کہ ایسا لہلہاتا ہرا بھرا باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہر طرف نہریں جاری تھیں۔ ہر سمت ہریالی اٹھی ہوئی تھی طرح طرح کے خوبصورت درخت پھلوں سے لدے ہوئے پھیلے ہوئے کھڑے تھے۔ راستہ چلنے والوں کی جو ایک جماعت اس باغ پر پہنچی تو اس نے اپنی سواریاں تیز کر دیں۔ دائیں بائیں کسی طرف کو نہیں دیکھا اور تیزی کے ساتھ باغ سے گزر گئے۔ پھر دوسری جماعت راہروں کی آئی۔ یہ جماعت بہت بڑی تھی۔ جب وہ لوگ باغ تک پہنچے تو انہوں نے اپنے جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے باغ سے کچھ لیا اور آگے کو چل دیئے۔ آگے

بڑھ گئے ان کے جانے کے بعد بہت زیادہ تعداد میں مسافر یہاں تک پہنچے۔ یہ بہت ہی بڑی جماعت تھی۔ جب ان لوگوں نے ایسا کر کے پھر یہاں دیکھا تو پھر گئے۔ اور کہنے لگے یہ تو (قیام کی) بڑی اچھی جگہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ (راستہ کو چھوڑ کر) وہ ادھر ادھر جھک گئے (پھیل گئے اور باغ میں ہی اتر پہنچے) لیکن میں چلتا ہی رہا۔ جب دور نکل گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ سات درجوں کا ایک منبر رکھا ہوا ہے اور حضور اس کے سب سے اونچے درجے پر رونق افروز ہیں اور آپ کے دائیں جانب ایک اور صاحب ہیں جن کا رنگ گندمی اور انگلیاں رنگ بھری (یعنی سرخ اور قدرے تکلدار) ہیں۔ دراز قامت ہیں۔ جب وہ کچھ کلام کرتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ سب سنتے ہیں اور گردنیں اٹھا کر ان کی باتیں سننے کے لئے ان کی طرف متوجہ ہیں اور آپ کے بائیں جانب ایک اور صاحب موجود تھے، میانہ قامت، چہرے پر بکثرت تل تروتازہ (یعنی چمکدار) بالوں والے ان کے احترام میں سب لوگ جھکے جاتے تھے۔ پھر سامنے کے رخ پر ایک اور صاحب دکھائی دیئے جو اخلاق عادات چہرے اور نقشہ میں بالکل آپ کے مشابہ تھے سب لوگ ان کی طرف پورے طور پر متوجہ تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان سے آگے ایک دبلی پتلی نحیف بوڑھی اونٹنی ہے جس کو آپ اٹھا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضور ﷺ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب آپ کی حالت ٹھیک ہو گئی تو فرمایا۔ سیدھے کشادہ پکے صحیح راستہ سے مراد دین ہے جس کو اللہ کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں۔ یہی وہ راہ ہدایت ہے جس پر تم ہو۔ ہرا بھرا سرسبز باغ جو تم نے دیکھا وہ دنیا اور اس کا حیرت زیب دلوں کو خوش کرنے والا سامان عیش و عشرت ہے۔ میں اپنے صحابہ کو لے کر تو اس سے (صاف) گزر جاؤں گا۔ نہ اس سے دل لگائیں گے نہ وہ ہم کو چمٹے گی۔ نہ ہمارا اس سے تعلق ہو گا نہ اس کا ہم سے، نہ ہم کو اس سے محبت ہو گی، نہ وہ ہم سے لپٹے گی۔ ہمارے بعد دوسرا گروہ آئے گا جو تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہو گا ان میں سے بعض تو اس دنیا (کے باغ) میں پھنس کر رہ جائیں گے اور بعض بقدر حاجت لے کر چل دیں گے اور نجات پا جائیں گے پھر ان کے بعد بہت ہی بڑی جماعت آئے گی جو اس دنیا میں ڈوب جائے گی اور دائیں بائیں بھٹک جائے گی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور تم اپنی سیدھی راہ پر چلتے رہو گے یہاں تک کہ مجھ سے آکر مل جاؤ گے۔ منبر پر میرے دائیں جانب جس گندمی رنگ اور گداز ہتھیلی والے شخص کو تم نے دیکھا ہے وہ موسیٰ تھے۔ اللہ نے ان کو شرف ہم کلامی عطا فرمایا تھا اس لئے لوگ بھی ان کے احترام میں ان کے کلام کو گردنیں اٹھا کر توجہ کے ساتھ سنتے تھے اور بائیں طرف جس شخص کو دیکھا تھا وہ عیسیٰ بن مریم تھے۔ اللہ نے ان کو مکرم بنایا تھا اس لئے ہم بھی ان کی عزت کرتے ہیں اور جس شیخ کو تم نے میرے مشابہ دیکھا تھا وہ ہمارے باپ ابراہیم تھے۔ ہم سب ان کی اقتدا اور تابعداری کرتے ہیں۔ وہ ہمارا نشانہ ارادت ہیں اور جس دبلی اونٹنی کو تم نے دیکھا کہ میں اس کو کھڑا کر رہا ہوں تو وہ قیامت ہے جو میری امت (کے خاتمہ) پر قائم ہو گی۔ نہ میرے بعد کوئی نبی ہو گا نہ میری امت کے بعد کوئی امت۔

اس اثر سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہ بیشتر اہل قرب تھے اور ان کے بعد آنے والے کچھ اچھے کچھ برے ہوئے اور ہوتے رہیں گے خلطوا عملا صالحا اشخاص ان میں اہل خیر فرد ہیں اور اکثریت ابھی تک ہے لیکن عہد صحابہ کے مقابلہ میں مقربین کی تعداد ان میں کم ہے۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ - یہ لوگ (سونے کے) تاروں سے بنی ہوئی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ یعنی کوئی کسی کی طرف پشت کئے ہوئے نہیں بیٹھا ہو گا۔

مَّوْضُوْنَةٍ - جواہرات (اور سونے کے تاروں سے) بنی ہوئی۔ وضین کا بھی یہی معنی ہے۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ - وہ لڑکے جن کا لڑکپن سدا رہے گا آبخورے اور آفتابے اور صاف نتھری ہوئی شراب کے جام لے کر ان کے سامنے دور کر رہے ہوں گے۔

مُّخَلَّدُوْنَ - یعنی وہ لڑکے ہمیشہ اسی حسن و جمال کے ساتھ رہیں گے جو ان کو حاصل ہو گا۔ امتداد زمانہ ان کو جوان نہیں کرے گا۔ نہ ان کے حسن طفلانہ میں کبھی تغیر و زوال ہو گا۔

فراء کا قول ہے کہ مخلد اس شخص کو کہتے ہیں کہ باوجود بڑی عمر ہونے کے اس کی (طفلانہ) صورت میں تغیر نہ آئے۔

سعید بن جبیر کا قول ہے کہ مخلد کا معنی ہے کانوں میں بالا پہنے ہوئے (مخلد بالا) یعنی وہ غلام کانوں میں بالے پہنے ہوں گے۔ بعض اہل علم کا کہنا

ہے کہ یہ غلمان مشرکین و کفار کے وہ لڑکے ہوں گے جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے ہوں گے۔ حسن بصری کا قول ہے کہ غلمان وہ لڑکے ہوں گے جن کی نہ ایسی نیکیاں ہوں گی کہ ان کو ثواب دیا جائے نہ ایسے گناہ ہوں گے کہ ان کو سزا دی جائے۔ پس ان کو اہل جنت کا خادم بنا دیا جائے گا۔

ابن مبارک، ہناد اور بیہقی نے حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا ہے کہ سب سے ادنیٰ درجہ جنتی کے ایک ایک کام پر ہزار ہزار خادم مقرر ہوں گے۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انس کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جنتیوں میں سب سے نچلے درجہ کا جنتی وہ ہوگا جس کے سر کے پیچھے (تعمیل حکم اور تعظیم کے لئے) پانچ ہزار خادم کھڑے ہوں گے اور ہر خادم کے پاس اس قسم کا برتن ہوگا جو دوسرے کے پاس نہ ہوگا (کثرتِ ظروف سے اشارہ ہے انواع ماکولات کی کثرت کی طرف)

اکثر علمائے تفسیر کا قول ہے اور تقریباً یہی صحیح ہے کہ جس طرح حوریں انسان نہیں بلکہ جنت کی کوئی مخلوق ہیں، اسی طرح غلمان بھی جنت ہی کی مخلوق ہیں، بنی آدم میں سے نہیں ہیں۔

اکواب۔ کوب کی جمع ہے۔ کوزے جن قبضہ اور دستہ نہ ہو۔ یہ لفظ پیالوں، آبخوروں، طشتریوں اور رکابیوں کو بھی شامل ہے۔

اباریق ابریق کی جمع ہے۔ چمکدار جھلکتے ہوئے آفتابے جن میں قبضہ اور ٹونٹی ہوتی ہے۔ ہناد نے مجاہد کا یہی قول نقل کیا ہے لیکن ابن جریر نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ اکواب سے مراد ہیں چاندی کے گھڑے۔

کاس وہ جام جس میں شراب موجود ہو۔ اگر شراب موجود نہ ہو تو اس کو کاس نہیں کہا جاتا۔

معین بہتی ہوئی شراب یعنی صاف شراب کی نہر جس کا بہاؤ کبھی ختم نہ ہوگا۔ گویا وہاں شراب شفاف کا چشمہ جاری ہوگا۔ شراب بھی اپنی نوعیت و خصوصیت میں نرالی ہوگی۔

لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ۔ نہ اس کے پینے کے بعد اہلِ جنت کے سر میں درد اور چکر ہوگا، نہ وہ بےہوش ہوں گے کہ بکواس کرنے لگیں۔ نہ شراب کا بہاؤ کبھی ختم ہوگا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے نُزِفَ یعنی اس کی عقل جاتی رہی یا بیہوش ہوگیا۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ اَنْزَفَ کے معنی ہیں کنوئیں کا سارا پانی کھینچ لیا۔

لَا يُنْزِفُوْنَ کی قرأت دو طرح سے آئی ہے۔ لَایُنْزِفُوْن (باب افعال سے) یعنی کبھی شراب کا سلسلہ منقطع نہ ہوگا۔ لَایُنْزَفُوْن یعنی وہ مدہوش نہ ہوں گے۔ دنیا کی شراب پینے سے دورانِ سر بھی ہوتا ہے، خمار بھی ہوتا ہے، حواس بھی زائل ہو جاتے ہیں۔ شرابی مدہوش اور بے خود ہو جاتا ہے۔ جنت کی شراب ان عیوب سے پاک ہوگی۔ غلمان جنت جھلکتے ہوئے طلائی جاموں میں جنت کی شراب پیش کرتے رہیں گے۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ اور جنتیوں کی پسند کے مطابق طرح طرح کے فواکہ بھی ظروفِ جنت میں پیش کریں گے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۔ اور حسب رغبت پرندوں کا گوشت بھی پیش کریں گے۔

وَحُوْرٌ عِيْنٌ۔ اور جنت میں گوری گوری کشادہ چشم حوریں ہوں گی۔ مجاہد نے عینٌ کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی مجاہد کا قول ہے کہ حور کی پنڈلیوں کی میخ (جلد اور گوشت کے شفاف ہونے کی وجہ سے) کپڑوں کے اوپر سے نظر آئے گی۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمیٰ نے فرمایا میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اللہ نے فرمایا ہے حُوْرٌ عِیْن اس کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا گورے رنگ لمبی پلکوں والی۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا سیپ میں چھپے ہوئے اچھوتے موتیوں کی طرح صاف شفاف۔ بغوی نے لکھا ہے جنت میں ایک نور کوندے گا۔ اہل جنت کہیں گے۔ یہ کسی حور کے دانتوں کی چمک ہے جو اپنے شوہر کے سامنے ہنسی ہے۔

كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ (سیپ میں چھپے ہوئے موتی کی طرح (صاف شفاف) طبرانی میں ہے کہ جنتی جس میوہ کو توڑے گا وہیں اس جیسا اور لگ جائے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ جنتی پرندوں بختی اونٹ کے برابر ہیں جو جنت میں چرتے رہتے ہیں۔ یہ بات سن کر حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر تو وہ نہایت مزے کے ہوں گے فرمایا ان کو کھانے والے ان سے بھی زیادہ پروردہ نعمت ہوں گے۔ تین مرتبہ یہی فرمایا۔ پھر فرمایا مجھے امید ہے کہ تم ان میں سے ہوگے جو ان پرندوں کا گوشت کھائیں گے۔ حافظ ابو عبد اللہ مصری نے کتاب

صفت الجنت میں لکھا ہے کہ رسول اللہ کے سامنے طوبیٰ کا ذکر ہوا۔ حضورؐ نے صدیق اکبر سے فرمایا۔ جانتے ہو طوبیٰ کی کیا کیفیت ہے۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا۔ اللہ اور اس کے رسول ہی کو پورا علم ہے۔ فرمایا طوبیٰ جنت کا ایک درخت ہے جس کی پہنائی کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں اس کی ایک شاخ کی پہنائی اتنی ہے کہ اس کے نیچے تیز سوار ستر سال تک چلا جائے پھر بھی اس کا سایہ ختم نہ ہو۔ اس کے پتے بڑے بڑے چوڑے ہیں۔ ان پر بختی اونٹ کے برابر پرندے آکر بیٹھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ پھر تو وہ پرندے بہت ہی نعمت پروردہ ہوں گے۔ فرمایا ان کو کھانے والے ان سے بھی زیادہ پروردۂ نعمت ہوں گے اور انشاء اللہ تم بھی انہیں میں سے ہوگے۔

ابن ابی الدنیا کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے کوثر کے متعلق فرمایا۔ اس کے کناروں پر بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے پرندے ہوں گے۔ حضرت عمر نے عرض کیا۔ پھر تو وہ پرندے بڑے عیش میں ہوں گے۔ حضور نے فرمایا ان کو کھانے والے ان سے زیادہ عیش پروردہ ہوں گے رواہ الترمذی ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا جنت کے اندر جس پرندہ کا گوشت تجھے مطلوب ہوگا وہ خود تیرے سامنے آجائے گا

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۔ جو عمل وہ کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں۔

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِيۡمًا۔ اِلَّا قِيۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔ اور وہاں کسی قسم کی بیہودہ بات نہیں سنیں گے اور نہ جھوٹی بات بلکہ ہر طرف سے) سلام سلام کی آواز سنیں گے۔

لغو بیکار بیہودہ بات۔ بیہقی نے حضرت ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے لیکن ہناد نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے لغو کا ترجمہ ہزل کیا (یعنی ٹھٹول)

تاثیم کسی کی طرف گناہ اور خطا کی نسبت کرنا کسی کو غلط کار کہنا۔ بیہقی نے حضرت ابن عباس کا اور ہناد نے ضحاک کا قول بیان کیا کہ تاثیم سے مراد ہے جھوٹ۔

اِلَّا قِيۡلًا استثنا منقطع ہے۔ سلٰما سلٰما سے مراد یہ ہے کہ ہر طرف سے سلامتی ہی کی آواز سنائی دے گی۔

احمد بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جنت کے اندر نادار مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی حفاظت ہوتی ہے اور تمام حوادث کو ان کے واسطے سے دور کیا جاتا ہے لیکن (ان کی ناداری کی یہ حالت ہے) کہ وہ مرتے دم اپنی حاجت اپنے سینوں میں چھپائے رہتے ہیں کسی طرح پوری نہیں کر پاتے۔ اللہ جن فرشتوں کو چاہے گا حکم دے گا کہ ان کے پاس جا کر سلام کرو۔ ملائکہ عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم تیرے آسمان کے رہنے والے ہیں اور ساری مخلوق میں تو نے ہم کو برگزیدہ بنایا ہے۔ کیا ہم کو تو حکم دے رہا ہے کہ ہم جا کر ان کو سلام کریں۔ اللہ فرمائے گا۔ یہ ایسے بندے ہیں جو میری پرستش کرتے تھے۔ کسی چیز کو میرا شریک نہیں مانتے تھے۔ انہیں کے ذریعے سے سرحدوں کی حفاظت ہوتی تھی اور انہیں کی وساطت سے مصائب دور کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود مرتے دم تک ان کی خواہش ان کے سینوں میں ہی رہی کوئی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ حسب الحکم فرشتے ان کے پاس جائیں گے اور ہر دروازے سے آوازیں آئیں گی۔ تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا (تمہارے لئے) آخرت کا گھر بہت اچھا ہے۔ سعید بن منصور نے سنن میں اور بیہقی نے البعث میں عطاء اور مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل طائف کی درخواست پر رسول اللہ صلعم نے وادی کا شہوان کے لئے مخصوص کر دیا اور ایک عجیب نادی ان کو مل گئی تو (ایک روز) انہوں نے لوگوں کو کہتے سنا کہ جنت میں ایسی ایسی نعمتیں ہوں گی (جو خواہش ہوگی وہ پوری کی جائے گی، طائف والے کہنے لگے۔ کاش جنت میں ہم کو اس وادی کی طرح (کوئی نادی) مل جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ۔ اور دائیں طرف والے بھی کیسی عظمت و شان والے ہوں گے۔

بیہقی نے مجاہد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ طائف والوں کی وادی میں بڑے سایہ دار درخت تھے کیلے کے بھی اور بیری کے بھی اس وادی پر وہ پھولے نہ سماتے تھے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

فِيۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ۔ سدر بیری، مخضود بے خار۔ جس کے کانٹے توڑ دیئے گئے ہوں۔ یا وہ درخت جس کی شاخیں

پھلوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہوں۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک بدوی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ جنت میں کوئی تکلیف دینے والا درخت نہ ہوگا لیکن قرآن میں ایک تکلیف دہ درخت کا ذکر کیا گیا ہے (جو جنت میں ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا وہ کونسا درخت ہے۔ بدوی نے کہا سدر۔ سدر کے تو کانٹے ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کیا اللہ نے مخضود (بے خار) نہیں فرمایا۔ سدر کے کانٹے نہیں ہوں گے۔ کانٹوں کی جگہ پھل ہوں گے)

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ سدر سے مراد بیری کا درخت نہیں بلکہ سدر ایک اور اعلیٰ قسم کا درخت ہوتا ہے جو بیری سے مشابہ ہوتا ہے۔ طلح کا ترجمہ اکثر مفسرین نے کیلا کیا گیا ہے منضود تہ برتہ اوپر تلے قطار در قطار۔

وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ اور پھیلا ہوا سایہ۔

وَمَاۗءٍ مَّسْكُوْبٍ اور جا بجا پانی اوپر نیچے گرتا ہوا

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ اور بکثرت طرح طرح کے پھل

لَّا مَقْطُوْعَةٍ جو کبھی منقطع نہ ہوں گے ہمیشہ ہر خواہش کے وقت ملتے رہیں گے۔ دنیا کے پھلوں کی طرح موسمی اور فصلی نہ ہوں گے کہ موسم گزرنے کے بعد نہ ملیں۔

وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ اور بے روک ٹوک ہوں گے۔ آزادی ہوگی کہ جہاں چاہیں گے پھل مل جائیں گے کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ۔ اور بلند فرش ہوں گے یعنی اونچے تختوں پر بچھے ہوں گے۔ یا مرفوعۃ سے مراد ہے عالی قدر۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک فرشوں سے مراد عورتیں ہیں۔ عرب بطور استعارہ عورت کو فراش کہہ لیتے ہیں۔ اس صورت میں اونچے بستر ہونے سے استعارۃً عالی قدر عورتیں یا اونچے تختوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں مراد ہوں گی۔ سورۂ یٰسین میں آیا ہے۔ وَاَزْوَاجُهُمْ عَلَى الْاَرَائِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاۗءً ہم نے جنت کی حوروں کو ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہے یعنی ان کا اٹھان عجیب ہے۔

فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ہم نے ان کو اچھوتی کیا ہے۔ کسی نے ان سے قربت نہیں کی۔

عُرُبًا اَتْرَابًا۔ وہ دل بہلانے والیاں ہوں گی۔ ہم سن ہوں گی۔ یعنی اہل جنت سے نہ بڑی ہوں گی کہ طبیعتوں کو نفرت ہو۔ نہ زیادہ چھوٹی ہوں گی کہ طبائع کو میلان و رغبت نہ ہو۔

لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۔ یہ سب نعمتیں دائیں جانب والوں کے لئے ہوں گی جو برکتوں والے ہوں گے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ اصحب الیمین کی ایک جماعت اگلوں میں سے ہوگی اور ایک جماعت پچھلوں میں سے آیات کے الفاظ کی لغوی تشریح ہم نے کردی۔ روایات کی روشنی میں تفسیر حسب ذیل ہے۔

منضود۔ ابن مبارک، ہناد اور بیہقی نے مسروق کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے درختوں پر جڑ سے لے کر چوٹی تک پھل ہی پھل تہ برتہ لگے ہوں گے اور پھل مٹکوں کے برابر ہوں گے۔ جو پھل درخت سے توڑا جائے گا اس کی جگہ فوراً دوسرا پیدا ہو جائے گا اور انگور کا ایک خوشہ بارہ ہاتھ کا ہوگا۔ صاحب قاموس نے نضید کا ترجمہ لکھا ہے وہ سامان جو تہ برتہ چنا ہوا ہو۔ صاحب صحاح نے لکھا ہے نضید وہ تخت ہے جس پر تہ برتہ سامان چنا ہوا ہو۔

ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔ پھیلا ہوا سایہ جیسے طلوع آفتاب سے پہلے صبح کے وقت ہوتا ہے۔ یا ظل ممدود سے مراد ہے دوامی سایہ جو دھوپ سے کبھی زائل نہ ہو۔ جو شے غیر منقطع ہو عرب اس کو ممدود کہتے ہیں۔ بغوی نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جو ساق عرش پر قائم ہے بہتی لوگ اس کی جڑ کے پاس جائیں گے اور دنیوی موسیقی سننے کے خواہشگار ہوں گے۔ درخت حرکت کرے گا اور اس سے دنیا کی ہر موسیقی کی آواز نکلے گی۔

لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس کی تشریح میں فرمایا۔ پھل منقطع نہ ہوں گے۔ جب ایک پھل توڑا

جائے گا۔ اس کی جگہ دوسرا فوراً نمودار ہو جائے گا۔

حضرت ثوبان راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ کوئی جنتی جب بھی کوئی پھل وہاں اٹھائے گا اس کی جگہ ویسا ہی دوبارہ پیدا کر دیا جائے گا رواہ البزار والطبرانی بغوی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اس کی جگہ دوگونے پیدا ہو جائیں گے۔

لامقطوعۃ ولاممنوعۃ کا ایک مطلب وہ ہے جو ہم نے تشریح بغوی کے ذیل میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی لامقطوعۃ بالازمان ولاممنوعۃ بالاثمان وہ دنیوی پھلوں کی طرح نہ ہوں گے جو موسم ختم ہونے پر ختم ہو جائیں اور بغیر قیمت کے نہ ملیں۔

فرش مرفوعۃ۔ حضرت علی نے فرمایا اونچے تختوں پر بچھے ہوئے فرش (بغوی) عام اہل تفسیر نے کہا عالی قدر فرش۔

امام احمد ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دو فرشوں کے درمیان (فاصلہ) ایسا ہوگا جیسے آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ان کی بلندی اتنی ہوگی جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ اور آسمان کی اونچائی زمین سے پانچ سو برس کی راہ ہے۔ بغوی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ ترمذی نے کہا۔ بعض اہل علم نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ دو فرشوں کے درجات کا اتنا تفاوت ہوگا جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابی امامہ باہلی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اگر سب سے اونچا فرش سب سے نچلے فرش پر گرے تو چالیس سال میں نہ پہنچ سکے۔ طبرانی نے حضرت ابو امامہ کی مرفوع روایت بھی اسی مضمون کی نقل کی ہے۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً۔ حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا۔ ان بوڑھی سفید سیاہ بالوں والی انسانی نسل کی عورتوں کو ہم نئی تخلیق عطا کریں گے۔

فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ پھر ان کو دوشیزہ بنا دیں گے۔ شوہر جب ان سے قربت کریں گے تو ان کو دوشیزہ پائیں گے۔

سعید بن منصور اور بیہقی نے بحوالہ شعبی نیز ترمذی اور بیہقی نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے آیت اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً پڑھی اور فرمایا (ان سے مراد ہیں وہ) دنیا کی بوڑھی سیاہ و سفید بالوں والی چیپڑ بہتی آنکھوں والی عورتیں (ان کی از سر نو اللہ تخلیق کرے گا اور ان کو کنواری بنا دے گا)

ابن جریر اور بیہقی کا بیان ہے کہ حضرت سلمہ بن یزید نے فرمایا۔ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا انشانٰھن انشاء یعنی بوڑھی اور دوشیزہ دنیا والی عورتیں۔

بیہقی اور ابن المنذر نے حسن کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ جنت میں کوئی بڑھیا نہیں داخل ہوگی۔ یہ سن کر ایک بڑھیا رونے لگی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اس کو اطلاع دے دو کہ وہ اس روز بڑھیا نہیں ہوگی۔ جوان ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً۔

بیہقی نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ ام المومنین نے فرمایا۔ رسول اللہ صلعم میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت میرے پاس ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ فرمایا۔ یہ کون ہے۔ میں نے عرض کیا۔ میری ایک خالہ ہے۔ فرمایا خوب سمجھ لو کوئی بڑھیا جنت میں نہیں داخل ہوگی۔ بڑھیا کو اس کلام سے کچھ دکھ ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ نے فرمایا ہے انا انشانا خلقا آخر۔

طبرانی نے اوسط میں دوسری سند سے حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں ایک بڑھیا آئی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلعم دعا فرما دیجئے کہ اللہ مجھے جنت میں داخل فرما دے۔ فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی۔ یہ فرمانے کے بعد آپ تشریف لے گئے اور نماز پڑھنے کے بعد واپس آئے۔ میں نے عرض کیا۔ اس کو آپ کے کلام سے بڑا دکھ اور رنج ہوا۔ فرمایا۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اللہ جب عورتوں کو جنت میں داخل فرمائے گا تو دوشیزہ بنا کر داخل فرمائے گا۔

مقاتل وغیرہ کے نزدیک انشانٰھن میں (دنیوی عورتیں مراد نہیں ہیں بلکہ) جنت کی حوریں مراد ہیں۔ اللہ نے ان کو دوشیزہ بنایا ہے کبھی ان کے اولاد نہیں ہوئی۔ نہ کسی درد، مرض میں مبتلا ہوئیں۔

عُرُبًا۔ اس لفظ کا ترجمہ لبھانے والیاں اوپر کیا جا چکا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے امام جعفر کے سلسلۂ روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ ان کا کلام عربی ہوگا۔

اَتۡرَابًا۔ ہم سن۔ بیہقی نے حضرت ام سلمہ کی روایت بیان کی۔ ام المؤمنین نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ عُرُبًا۔ فرمایا۔ اترابًا۔ یہ وہ دنیا کی عورتیں ہوں گی جو بڑھی سفید سیاہ بالوں والی اور بہتے چیپڑوں والی ہوکر مری تھیں۔ اللہ ان کو کنواری بنا کر پیدا کرے گا۔ وہ سب ہم سن ہوں گی سب ۳۳ برس کی ہوں گی اور ان کے شوہر بھی اسی عمر کے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اہل جنت، جنت میں داخلہ کے وقت بے ریش و بروت گورے رنگ اور گھونگریلے بالوں والے ہوں گے۔ سب کا قد حضرت آدم کے قد کے برابر ساٹھ گز لمبا اور سات گز چوڑا ہوگا۔ (رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط وابن ابی الدنیا والبغوی بسند حسن)

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دنیا والوں میں جو لوگ بوڑھے ہوکر یا بچپن میں مرگئے ہوں گے اللہ جنت کے اندر ان کو ۳۳ برس کا کردے گا۔ (یعنی ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کی عمر ۳۳ برس ہے) اس سے زیادہ بالکل نہیں (معلوم) ہوں گے اور دوزخی بھی ایسے ہی ہوں گے۔ (رواہ الترمذی وابو یعلی وابن ابی الدنیا)

حضرت معاذ بن جبل راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جنتی جنت میں داخلہ کے وقت بے ریش و بروت سرگمیں چشم ۳۳ سال کی عمر کے ہوں گے۔

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ جنتی جنت میں داخلہ کے وقت ساٹھ گز کے حسب قامت آدم ہوں گے۔ یوسف جیسا حسن ہوگا۔ عیسیٰ جیسی ۳۳ سال عمر ہوگی۔ (حضرت عیسیٰؑ جب آسمان پر تشریف لے گئے تو آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ جب واپس دنیا میں لوٹیں گے تب بھی یہی ہوگی۔ درمیانی مدت عمر میں شمار نہیں کی جائے گی) ان کی زبان محمد صلعم کی زبان (عربی) ہوگی بے ریش و بروت سرگمیں چشم ہوں گے۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط بسند جید)

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ یعنی اس امت کے اگلے لوگوں میں سے بھی بہت سے اور پچھلے لوگوں میں سے بھی بہت سے اصحاب الیمین ہوں گے۔ ابو العالیہ، مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک نے یہی تفسیری مطلب بیان کیا۔ بغوی نے بوساطت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ آیت ثلۃ من الاولین وثلۃ من الآخرین کے متعلق رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ یہ دونوں (اولین و آخرین) سب میری امت سے ہوں گے۔

مسدد نے مسند میں اور طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت ابو بکرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ یہ دونوں میری امت میں سے ہوں گے لیکن دار قطنی نے علل میں بیان کیا ہے کہ ابو بکرہ کی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ اس صورت میں آیت کا مقتضا یہ ہوگا کہ امت محمدیہ اصحاب الیمین سے خالی نہیں ہے۔ اسی کی تائید حضرت معاویہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جو شیخین نے صحیحین میں بیان کی ہے۔ حضرت معاویہ نے کہا۔ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا کہ میری امت میں سے برابر ایک جماعت رہے گی۔ جو امر خدا کو قائم رکھے گی۔ کسی مدد نہ کرنے والے کا ترک اعانت اور کسی مخالف کی مخالفت اس کو ضرر نہیں پہنچائے گی۔ اسی حالت میں امر خدا آجائے گا (یعنی قیامت برپا ہوجائے گی)۔

ایک شبہ

بغوی نے بحوالۂ عروہ بن رویم مرسلاً بیان کیا ہے کہ جب آیت ثلۃ من الاولین وقلیل من الآخرین، رسول اللہ صلعم پر نازل ہوئی تو حضرت عمر

اس کو سن کر رو دیئے اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ہم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور تصدیق کی پھر بھی ہم میں سے نجات پانے والے قلیل ہی ہوں گے۔ اس پر آیت ثلۃ من الاولین وثلۃ من الآخرین اللہ نے نازل فرمائی۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت عمر کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا تم نے جو بات کہی تھی اس کے متعلق اللہ نے یہ آیت نازل فرما دی (جس میں قلیل من الآخرین کی جگہ ثلۃ من الآخرین ہے) حضرت عمر نے عرض کیا۔ ہم اپنے رب سے اور اپنے نبی پر ایمان لانے سے راضی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا آدم سے ہم تک (اول) ثلۃ ہے اور مجھ سے قیامت تک (دوسرا) ثلۃ ہے اور اس ثلہ کو ختم کرنے والے وہ حبشی چرواہے ہوں گے جو لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہوں گے۔ ابن ابی حاتم نے بھی یہ مرسل روایت عروہ بن رویم کی روایت سے نقل کی ہے۔

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بوساطت عروہ بن رویم حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

نیز امام احمد ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بسند مجہول الراوی حضرت ابو ہریرہ کی طرف اس روایت کی نسبت کی ہے کہ جب آیت ثلۃ من الاولین وقلیل من الآخرین نازل ہوئی تو مسلمانوں پر یہ آیت بڑی شاق گزری (کیونکہ اس میں قلیل من الآخرین فرمایا گیا ہے) اس پر آیت ثلۃ من الاولین و ثلۃ من الآخرین نازل ہوئی۔

حدیث مذکور میں صراحت ہے کہ اولین سے مراد ہیں آدم علیہ السلام سے لے کر آغاز دورِ محمدی تک کے مومن۔

ازالہ میں کہتا ہوں کہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ مذکورۃ الصدر حدیث میں فرمایا۔ دونوں (ثلۃ من الاولین وثلۃ من الآخرین) میری امت میں سے ہوں گے اور آخر الذکر حدیث میں فرمایا ہے ثلۃ من الاولین آدم سے ہم تک اور ثلۃ من الآخرین مجھ سے قیامت تک ہوگی۔ بظاہر تو دونوں میں تعارض محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ جو ثلۃ دورِ محمدیؐ سے شروع ہو کر قیامت پر ختم ہوگا اس کے دو حصے ہوں۔ ایک حصہ دورِ صحابہ کا اور دوسرا حصہ متصل قیامت اور یہ دونوں حصے ثلۃ من الآخرین کے ہوں (یعنی امت محمدی کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ بہت سے اصحاب الیمین قدمائے امتِ محمدیہ میں اور بہت سے متاخرین امت میں سے ہوں گے)

مزید شبہ

اگر ثلۃ من الاولین بھی (از روئے حدیث) امتِ محمدیہ ہی میں سے ہوں گے تو آیت ثلۃ من الاولین وقلیل من الآخرین کو سن کر حضرت عمر کیوں روئے۔ اور مسلمانوں پر اس آیت کا مطلب کیوں شاق گزرا۔

ازالہ حضرت عمر کے رونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس امت کے آخری دور کے مسلمانوں پر آپ کو رحم آیا ہو اور آپ نے خیال کیا ہو کہ آخری دور کے مسلمانوں میں سے قلیل حصہ نجات یافتہ ہوگا (اور کثیر حصہ نجات سے محروم ہو جائے گا) اسی لئے جب آیت ثلۃ من الاولین و ثلۃ من الآخرین نازل ہوئی تو آپ کو تسلی ہوگئی یعنی اس امت میں اگرچہ مقربین کی تعداد کم ہوگی لیکن اصحاب الیمین کی تعداد بہت ہوگی اور ہر گروہ سے (خواہ وہ مقربین ہوں یا اصحاب الیمین) اللہ نے جنت کا وعدہ فرما لیا ہے۔

کیا ثلۃ من الآخرین کا جملہ قلیل من الآخرین کا ناسخ ہے

نہیں ایسا نہیں ہے یہ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوتی۔ نسخ کے لئے اتحادِ محل کی ضرورت ہے اور یہاں پہلی آیت مقربین کے متعلق ہے اور دوسری آیت اصحاب الیمین کے متعلق اس لئے محل ایک نہیں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ثلۃ من الاولین سے مراد ہوں۔ تمام انبیاء کے صحابہ اور رسول اللہ کے ساتھی اور تابعینِ عظام جو آثارِ صحابہ پر چلنے والے تھے۔ یہ سب سابقین اولین تھے۔ اللہ نے ان کے متعلق فرمایا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ اور الآخرین سے مراد ہوں اس امت کے پچھلے لوگ قربِ قیامت تک۔ پچھلے لوگوں میں مقربین کی تعداد کم ہوگی۔ البتہ اصحاب الیمین

بکثرت ہوں گے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا مجھے امید ہے کہ تم لوگ کل اہل جنت کے آدھے ہو گے۔ دوسری حدیث ہے کہ (جنت والوں میں) اس امت کی اسی قطاریں ہوں گی اور دوسری (باقی) امتوں کی چالیس قطاریں۔

بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ ایک روز رسول اللہ صلعم (کاشانۂ نبوت سے) برآمد ہو کر ہماری طرف تشریف لائے اور فرمایا (آج رات) انبیاء کی امتوں کو میرے سامنے لایا گیا۔ کوئی نبی ایک آدمی کو ساتھ لئے گزرا کسی نبی کے ساتھ دو آدمی تھے، کسی نبی کے ساتھ ایک جماعت تھی اور کسی کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک اتنی کثیر التعداد جماعت کو دیکھا جس نے افق کو بند کر دیا۔ کسی کہنے والے نے کہا کہ یہ تمہاری امت ہے اور ان کے ساتھ ستر ہزار (اور بھی) جنت میں بلا حساب کے داخل ہوں گے۔ پھر حضور نے فرمایا (یہ وہ لوگ ہوں گے) جو شگون نہیں لیتے، افسوں دم نہیں کراتے، داغ نہیں لگواتے اور اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عکاشہ بن محصن آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں بھی ان میں شامل ہوں گا۔ فرمایا ہاں۔ ایک اور شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں بھی انہیں میں ہوں گا۔ فرمایا عکاشہ تم سے آگے بڑھ گئے۔

بغوی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا آج رات انبیاء اپنے اپنے تابعین کے ساتھ میرے سامنے لائے گئے۔ چنانچہ موسیٰ بھی بنی اسرائیل کی ایک بھیڑ کے جلو میں میرے سامنے آئے۔ مجھے ان کو دیکھ کر تعجب ہوا اور میں نے کہا۔ اے میرے رب یہ کون ہیں کسی نے کہا یہ تمہارے بھائی موسیٰ اور ان کے ساتھی بنی اسرائیل ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ اے میرے رب میری امت کہاں ہے۔ کہا گیا اپنے دائیں جانب دیکھو میں نے دائیں طرف دیکھا تو نظر آیا کہ مکہ کی ساری پہاڑیاں آدمیوں کے چہروں سے پٹی پڑی ہیں۔ کہا گیا یہ تمہاری اُمت ہے۔ کیا تم خوش ہو گئے۔ میں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میں راضی ہوں۔ کہا گیا اپنے بائیں طرف دیکھو۔ میں نے بائیں جانب نظر کی تو دیکھا کہ سارا افق آدمیوں کے چہروں سے پٹا پڑا ہے۔ کہا گیا یہ تمہاری اُمت ہے کیا تم خوش ہو۔ میں نے عرض کیا (ہاں) میرے رب میں خوش ہوں میں راضی ہوں۔ کہا گیا ان کے ساتھ ستر ہزار اور بھی بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اگر تم سے ہو سکے تو ان ستر ہزار میں شامل ہو جاؤ اور اگر تم ان میں شامل ہونے سے قاصر و عاجز ہو تو ٹیلوں (پہاڑیوں) والوں میں شامل ہو جاؤ اور یہ بھی تم سے نہ ہو سکے تو افق والوں میں ہی داخل ہو جاؤ کیونکہ وہاں میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ گھل مل گئے ہوں (یعنی ان میں سے تو نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ مخلوط ہو کر ان میں شامل ہو گئے ہیں)

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ (۴۱)

اور جو بائیں والے ہیں　وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں　وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں　اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں

لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى

جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا　وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) بڑی خوشحالی میں رہتے تھے　اور بڑے بھاری گناہ (یعنی شرک و کفر) پر

الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا

اصرار کیا کرتے تھے　اور یوں کہا کرتے تھے　کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں (ہو کر) رہ گئے تو کیا (اس کے بعد) ہم دوبارہ زندہ کئے

لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝

جائیں گے　اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ کئے جائیں گے)　آپ کہہ دیجئے　کہ سب　اگلے　اور　پچھلے

لَمَبْعُوثُوْنَ ﴿٤٩﴾ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ﴿٥١﴾

جمع کئے جائیں گے — ایک معین تاریخ کے وقت پر — پھر (جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو

لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٥٣﴾ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ

درخت زقوم سے کھانا ہوگا — پھر اُس سے پیٹ بھرنا ہوگا۔ پھر اُس پر کھولتا ہوا پانی پینا

الْحَمِيمِ ﴿٥٤﴾ فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ ﴿٥٥﴾ هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ﴿٥٦﴾

ہوگا — پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا — (غرض) ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ دعوت ہوگی

تفسیر وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ وَظِلٍّ مِّن يَحْمُومٍ لَّا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ۔ اور بائیں طرف والے کیسے دکھیں ہوں گے۔ بائیں طرف والے آگ کی لپٹ میں ہوں گے اور سخت گرم پانی میں اور گہرے سخت سیاہ دھوئیں کے سائے میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ فرحت بخش۔ اصحاب الیمین یعنی اہلِ جنت کے دلکش احوال کو بیان کرنے کے بعد اصحاب الشمال یعنی دوزخیوں کے ہولناک حالات کا بیان ان آیات میں کیا ہے۔ سموم سخت گرم لو جو مساموں میں گھس جائے اور آگ۔ حمیم انتہائی گرم پانی۔ یحموم گہرا کالا دھواں۔ گہرے سیاہ کو عرب اسود یحموم کہتے ہیں۔ ضحاک نے کہا یحموم وہ سیاہ آگ جس کے اندر کی ہر چیز سیاہ ہو۔ ابن کیسان نے کہا۔ یحموم دوزخ کا ایک نام ہے۔ لا کریم یعنی کسی قسم کا فائدہ رساں نہ ہوگا۔ یہ کرمہ المنظر قرار ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ ۔ اس ہولناک اذیت رساں ناقابلِ برداشت مصائب میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس سے پہلے یعنی دنیا میں وہ آرام پسند تھے اور عیش کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے۔

عیش پرستی اور آرام طلبی کا عموم اس دنیا میں بھی ہلاکت و تباہی کا پیغامبر ہے۔ نفس پرور غافل قومیں اور افراد اسباب تجمل میں پھنس کر دنیوی اور اخروی نتائج سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ محنت اور کوشش ترک کرنے کی وجہ سے دنیوی عزت دولت اور اقتدار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور پستی میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ آخر اسفل السافلین میں پہنچ کر گمنام بن جاتے ہیں اور ان کی زندگی کے افسانے بیدار قوموں کے لئے باعث عبرت ہو جاتے ہیں اور آخرت کی طرف سے غفلت ان کو ہر بدی اور بدکاری کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور ہر بُرائی ان کو بھلائی معلوم ہونے لگتی ہے تو ہم پرستی بد اعتقادی اور بدکیشی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ

وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ۔ بڑے گناہ یعنی شرک و کفر اور شرک کے مظاہر پر اَڑ جاتے ہیں۔ الحنث العظیم (بڑے گناہ) سے مراد شرک ہے۔ واحدی، ضحاک۔ حسن اور ابن زید وغیرہ کا یہی قول ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ حنث عظیم سے جھوٹی قسمیں مراد ہیں۔ یعنی وہ قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ قیامت نہیں آئے گی۔ ہم اور ہمارے باپ دادا دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھائے جائیں گے۔ جزا سزا نہیں ہوگی۔ جنت دوزخ کا قول افسانہ اور دماغ اسلاف کا خیال ہی ہے۔

وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۔ وہ لوگ دنیا میں کفر و شرک پر اَڑے بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر گئے اور خاک ہو گئے اور ہڈیاں رہ گئیں تو کیا ہم یا ہمارے باپ دادا دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ آج تک ہمارے اسلاف قدیم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کئے گئے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور ہمارے اسلاف دوبارہ زندہ کئے جائیں۔

اگر نورِ فطرت بجھ گیا ہو۔ دل مُردہ ہو گئے ہوں، عقلیں تاریک اور روحیں کثیف ہو گئی ہوں تو ایسے سیاہ باطن لوگ آنے والی دوسری زندگی کو موجود محسوس زندگی پر قیاس کرتے ہیں اور چونکہ دعقیدہ شعورِ حسی کے خلاف ہو اس کو نہیں مانتے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مرنے کے بعد انسانی جسم کے اجزاء پراگندہ ہو جاتے ہیں، خاک کے ساتھ جسمِ انسانی خاک ہو جاتا ہے اور کوئی جسم گلنے سڑنے اور معدوم الہیت ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اس مادّی حسّی زندگی کا لباس پہن کر سامنے نہیں آیا اس لئے کور باطن لوگ خیال کرنے لگے کہ جب اس دنیا میں ایک بات کبھی نہیں ہوئی تو آئندہ کیسے ہو سکتی ہے، لیکن یہ محض خالی خیال ہے، غائب کا حاضر پر قیاس ہے۔ وقوعِ ماضی کی نفی سے عدمِ امکان پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ اے پیغمبر آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگلے پچھلے یعنی جو انسان آدم کے وقت سے ابتک ہو چکے اور جو اب سے قیامت تک ہوں گے سب کو ایک مقرر دن اور مقرر ساعت میں زندہ کر کے (ایک میدان میں ان کا اعمال کی حساب فہمی کرنے اور اعمال کے مطابق سزا جزا دینے کے لئے) جمع کیا جائے گا۔ یعنی سب اگلوں پچھلوں کے زندہ ہو کر اٹھنے اور ایک میدان میں حساب فہمی کے لئے جمع کئے جانے کا ایک دن مقرر ہے۔ ایک وقت مقرر ہے ایسا نہیں کہ جو مرتا جائے اس کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں بھیج دیا جائے۔ پس تم کو اور تمہارے باپ دادا کو ایک دن ضرور زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور سب کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ سے يَوْمَ الدِّيْنِ تک۔ اس روز اے کافرانِ گمراہ اور اے مکذبینِ انبیاء دوزخ کے اندر تم کو تھوہر کے درخت (کی غذا) کھانی پڑے گی اور اس سے پیٹ بھرنے پڑیں گے۔ پھر اس کے اوپر سے گرم کھولتا پانی پینا ہوگا اور اس طرح پینا ہوگا جیسے پیاس کے مارے اونٹ پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دوزخ کے اندر جزا سزا کے دن یہ دوزخیوں کی میزبانی ہوگی۔ یہ طعامِ مہمانی ہوگا۔

ہیم اَہیَم کی جمع ہے۔ سخت پیاسے اونٹ کو اہیم اور ہائم کہا جاتا ہے۔ جو اونٹ پیاس کا مارا ہو، پیاس کا بیمار ہو کتنا ہی پانی پیئے پیاس نہ بجھے اس کو بھی ہائم اور اہیم الد ہیما اور ہائمہ کہا جاتا ہے۔ پیاس کی بیماری سے اونٹ جانبر نہیں ہوتا۔ (ابن کثیر)

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ

ہم نے تم کو (اول بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی

اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ عَلٰٓى

بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں ہم ہی نے تمہارے درمیان موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ

اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ

اور تم جیسے (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں اور تم کو اول پیدائش کا علم حاصل ہے

الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

پھر تم کیوں نہیں سمجھتے

تفسیر عدم سے وجود میں لانا پھر رفتہ رفتہ اسباب و وسائل ترقی سے کام لے کر حدِ مستقر تک پہنچانا اور معین مدت تک باقی رکھنا پھر موجود کو معدوم کر دینا اور باقی پر فنا کی کیفیت طاری کر دینا اللہ ہی کا کام ہے کسی دوسرے کے قبضہ میں نہ ایجاد ہے نہ اعدام، نہ بقا نہ فنا پھر خدا تعالیٰ کے سامنے پہلے کوئی نمونہ نہ تھا کہ اس کی نقل کر لی ہو۔ ہر چیز لاشئ کے مرتبہ میں تھی اور اللہ ہی نے اس کو اپنے اندازے کے مطابق نیست سے ہست کیا۔

یہاں تک کہ اسباب وجود و بقا بھی اسی نے بنائے۔ اسی طرح موجود کرنے کے بعد اپنے اندازہ کے مطابق مدت بقا مقرر کی، پھر فنا سے ہم کنار کر دیا۔ اس سارے مدارج وجود و بقا اور مراتب عدم و تسلط کرانے سے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ کوئی مانع نہیں آسکتا۔ پس جو خدا معدوم کو ایک بار موجود کر چکا اور موجود کو ایک حد مخصوص تک باقی رکھ کے لباس وجود ہر چیز سے اتار رہا ہے کیا وہ دوبارہ پہلی مرتبہ کی طرح پیدا نہیں کر سکتا۔ کیا معدوم خالص کو موجود کرنا اور موجود کو معدوم کرنا ناپید کو پیدا کرنے سے آسان ہے۔ اگر تخلیق ثانی تخلیق اول سے زیادہ دشوار نہیں اور اللہ کو فعل تخلیق سے کوئی روکنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو قیامت آنے میں کیوں شک کیا جاتا ہے۔ یہی مفصل استدلال آیات مذکورہ میں قائم کیا گیا ہے۔ اول ارشاد فرمایا ہم نے ہی تم کو اندازہ کے موافق پیدا کیا۔ یعنی نیست سے ہست کیا۔ یہ حقیقت ناقابل شک ہے، پھر کیوں اس کو صحیح نہیں مانتے اگر (اس کو صحیح تسلیم کرتے ہو تو پھر کیوں دوسروں کو معبود جانتے اور کارساز مانتے ہو اور کیوں تخلیق ثانی کا انکار کرتے ہو اور دوبارہ حشر جسمانی کو ناممکن قرار دیتے ہو) اگر اللہ کے خالق ہونے کا ثبوت مطلوب ہے تو اپنی پیدائش سے لے کر اول ترین عنصر تک غور کرو اور دیکھو (۱) کہ تم عورت کے رحم میں (چند قطرے) ٹپکا دیتے ہو (بس تمہارا عمل صرف اتنا ہوتا ہے لیکن) ان ٹپکنے والے قطروں کو پیدا کرنا اور ان کو مجسم شکل انسان بنا کر پیدا کرنا کیا تمہارا کام ہے یا اللہ کا۔ نطفہ ایک ٹپکا ہوا قطرہ ہوتا ہے۔ گو پورے طور پر انسان اس کا بھی مختار نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اس کے عمل کو اس ٹپکانے میں اختیاری شکل حاصل ہے لیکن اس کے بعد نطفہ کی پرورش اور اس قابل بنا دینا کہ رحم کی دیواروں سے چمٹ جائے اور علقہ بن جائے اور اس سے آگے تربیت پا کر ایک بوٹی یعنی ایک گوشت نما ٹکڑا ہو جائے اور پھر ہر ماہ اس میں تغیر ہوتا ہے۔ کبھی اعضاء کے نشانات بنیں پھر یہ نشانات ابھریں پھر اعضاء کی شکل اختیار کریں۔ پھر رفتہ رفتہ تکمیل اعضا ہو جائے اور مجسم انسان ہو کر تمام عملی اور ذہنی قوتوں کا حامل بن کر برآمد ہو جائے۔ یہ کام سوائے اللہ کے اور کس کا ہے۔ کسی سائنٹیفک طریقہ سے انسان نطفہ کی تربیت نہیں کر سکتا۔ نہ تدریجاً مدارج کمال پر فائز کر سکتا ہے ہاں قدرتی عمل میں مدد ضرور کر سکتا ہے۔ فطرت الٰہیہ میں دخل نہیں ہو سکتا۔ (۲) جس طرح تخلیق انسانی اللہ کی قدرت کا مظہر ہے اسی طرح پیدائش کے بعد زندہ رکھنا اور ایک مقررہ مدت تک اسباب حیات فراہم کر کے ان سے کام لینا پھر ساری قوتوں کو مضمحل اور معطل کر کے زندگی کا لباس چھین لینا بھی اللہ ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ کون ہے جو مقررہ موت سے بچا سکے اور زندگی کو موت کے پنجہ سے آزاد کر دے یا وقت سے پہلے موت کو بلا سکے یا مدت بقا کے بعد زندہ رکھ سکے۔

تو کیا اتنی عظیم الشان قدرتوں کا مالک یہ نہیں کر سکتا کہ تم جیسے اور پیدا کر دے اور تمہیں نئے سرے سے اس عالم میں پیدا کر دے جس سے تم بے خبر ہو (یا یہ مطلب ہے کہ اتنا بڑا قادر مطلق کیا ایسا نہیں کر سکتا کہ قیامت کے دن تمہاری پیدائش میں تبدیلی کر کے جس صفت اور جس حالت میں چاہے تمہیں از سر نو پیدا کر دے) ابن کثیر

تم اپنی پہلی پیدائش کو تو جانتے اور مانتے ہی ہو کہ اللہ نے جو عظیم الشان قدرت والا ہے تم کو پیدا کیا ہے تو پھر دوسری زندگی کے متعلق اس سے کیوں نصیحت نہیں پکڑتے۔

تقریباً اسی مضمون کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا ہے۔ هُوَ الَّذِي يَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ وہی ابتدائی تخلیق کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ دوبارہ پیدا کرنا تو اس کے لئے بہت ہی آسان ہے۔

سورۃ یٰسین میں فرمایا۔ يُحْيِيهَا الَّذِي اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔ بوسیدہ ہڈیوں کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا تھا

سورۃ قیامت میں بیان کیا ہے۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى۔ کیا وہ غلیظ پانی کا ایک قطرہ نہ تھا۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً پھر علقہ ہو گیا۔ فَسَوّٰى پھر اللہ نے اس کے اعضاء ہموار کئے۔ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى پھر اس سے دو صنفیں بنائیں مرد اور عورت۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى تو کیا ایسا خالق اس بات پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو۔ اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار)

حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿٦٥﴾ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٦٧﴾

کو چورا چورا کر دیں پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ گے (اب کے تو) ہم پر تاوان ہی پڑ گیا بلکہ بالکل ہی محروم رہ گئے (یعنی سارا ہی سرمایہ گیا گزرا)

تفسیر انسان کے وجود تخلیقی کا مبدء نطفہ ہے۔ ایک بے جان قطرۂ آب سے ہوش و خرد اور طاقت و فہم رکھنے والا جیتا جاگتا انسان پیدا ہو جاتا ہے اس سے قادرِ مطلق کی قدرتِ قاہرہ کا ظہور اور امکانِ قیامت کا ثبوت ہو رہا ہے لیکن ہر پل انسانی بدن برسرِ تحلیل ہے۔ بدن کے سارے اعضا اور ساری جسمانی قوتیں فنا کی گود میں جا رہی ہیں۔ اگر تحلیل شدہ اجزاء اور فنا پذیر قوتوں کا بدل انسان کو نہ ملے تو چند روز میں وجودِ انسانی کی یہ عمارت منہدم ہو جائے۔ وجودِ انسانی کو تحلیل شدہ اجزاء کا بدل عنایت کر کے باقی رکھنا اور فنا شدہ طاقتوں کا عوض عطا کرتے رہنا اللہ کی قدرت کی کھلی نشانی ہے جو نصیحت پذیری اور عبرت اندوزی کے لئے کافی ہے۔

انسان کی بقاءِ شخصی اور قیامِ ہستی دو مادی چیزوں پر موقوف ہے۔ غذا اور پانی، مناسب غذا اور صاف شیریں پانی اگر نہ ملے تو صحت بیماری سے اور قوت ضعف سے بدل کر بہت جلد زندگی کا شیرازہ بکھر جائے۔ انسان ایک خاص قسم کا حیوان ہے۔ اس کے لئے اللہ نے غذا بھی دو قسم کی بنائی ہے حیوانی اور نباتی۔ حیوانی غذا بھی حقیقت میں نباتی غذا ہی ہے۔ گھی، مکھن، پنیر، دودھ، گوشت نباتی غذا کی ہی پیداوار ہے پرندے اور چرندے دانہ گھاس اور پھلوں کی غذا کھا کر ہی اپنا گوشت قائم رکھتے اور دودھ گھی وغیرہ مہیا کرتے ہیں۔ نبات کی صورت نوعیہ بدل کر غذا کے حیوانی کی صورت قبول کر لیتی ہے۔ غرض انسان کی غذائی ضرورت صرف نبات سے پوری ہوتی ہے۔ نباتات کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ خودرو اور براہِ راست اسباب فطرت کے ہاتھوں میں رہین ہیں انسان کے عمل کو ان کی پیدائش میں کوئی دخل نہیں۔ جنگلی خودرو پھل اور جڑی بوٹیاں اسی قسم میں داخل ہیں انسانی دستکاری اور دست رنجی سے ہر خودرو نبات بے نیاز ہے۔ نبات کی دوسری قسم کی پیداوار میں انسان کی محنت اور کوشش و حکمت کا کچھ دخل ہے۔ آدمی زمین جوتتا ہے بیج بکھیرتا ہے ہل چلاتا ہے۔ خودرو زمین کو زمین سے اکھاڑ کر پھینکتا ہے۔ چشموں، کنوؤں، نہروں اور دریاؤں سے سینچائی کرتا ہے لیکن سورج کی گرمی ہواؤں کی رفتار، زمین کی قوتِ روئیدگی و بالیدگی دریاؤں، نہروں اور کنوؤں چشموں میں پانی کی پیدائش انسان کی قوتِ تخلیق سے باہر ہے بے شک انسان جوتتا بوتا ہے لیکن اس سے آگے اس کی دسترس نہیں۔ دانہ کو بڑھانا پھلانا پھاڑ کر ناسوئی برآمد کرنا اور تمام فطری طاقتوں کو بروئے عمل لانا اور ان سے کام لے کر سبزہ برآمد کرنا پھر پودے میں پھل پھول دانہ پیدا کرنا اللہ ہی کا کام ہے اگر اللہ چاہے تو سبزہ پیدا ہی نہ ہو اور پیدا ہو جائے تو سوکھ جائے، اس کا بھوسہ بن جائے، ریزہ ریزہ ہو جائے، پھر انسانی غذا کہاں سے حاصل ہو اور کس طرح بقائے ہستی کے لئے تحلیل شدہ تمام بدن کا عوض فراہم ہو۔ یہ اللہ ہی تو ہے کہ اس نے نطفہ سے تخلیق کرنے کے بعد انسانی زندگی کو وقت مقرر تک قائم رکھنے کے لئے غذا اور پھل پیدا کئے اور انسانی وجود کی اہم ترین ضرورت کو پورا کیا۔

آدمی کو اپنی جسمانی ساخت کو باقی رکھنے کے لئے کم و بیش پانی کی ضرورت ہے۔ ہر دم اندرونی و بیرونی حرکات کی وجہ سے جسم کی رطوبتیں فنا ہو رہی ہیں، تحلیل ہو رہی ہیں اور رطوبتوں کا تحلیل ہونا ضروری بھی ہے۔ اگر رطوبتیں تحلیل نہ ہوں تو ان میں سمیت پیدا ہو جائے اور آدمی مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر تباہ ہو جائے۔ کھائی ہوئی غذا کا کیلوس و کیموس بنانے کے لئے خلاصۂ غذا کو جسم کے اندر پھیلانے اور فضلات کو باہر پھینکنے کے لئے کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو غذا کو سیال بنا سکے۔ اعصاب عروق اور عضلات وا قدام میں نرمی پیدا کر سکے، مفاصل کے درمیان لعابیت اور پھسلن پیدا کر کے حرکت کو آسان بنا سکے۔ یہ کام صرف پانی کا ہے۔ ہر حیوان کے اندرونی و بیرونی اعضا جب تشنہ ہو جاتے ہیں ان کی رطوبت کم ہو جاتی ہے تو پانی

کی اضطراری خواہش اُن کو ہوتی ہے لیکن ہر پانی تو فنا شدہ رطوبت کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تلخ اور زیادہ نمکین پانی تو مزید خشکی پیدا کرتا ہے الا زیادہ تلخ ہو تو زبان پر رکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتا بلکہ درختوں اور کھیتوں کو اس سے سینچا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ ہر جاندار کو کم یا زیادہ میٹھے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اللہ نے اوپر سے پانی برسا کر انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ شور سمندروں اور گندہ مقاموں سے شوریلی نمکین بھاپ اٹھتی ہے بادل کی شکل میں نمودار ہوتی ہے پھر برس پڑتی ہے تو نمکینی غائب ہو جاتی ہے۔ صاف نتھرا ہوا شیریں پانی برستا ہے۔ آدمی اور جانور اس سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور تحلیل شدہ رطوبتوں کا صحت بخش بدل حاصل کرتے ہیں۔ درختوں میں پہنچ کر وہ ان کے نمو میں مددگار ہو جاتا ہے۔ تری اور تازگی پیدا کرتا ہے پھلوں میں پھیلاؤ اور بڑھاؤ پیدا کرنے میں مدد کرتا ہے۔

اگر اللہ چاہتا تو بارش کے سارے پانی کو تلخ اور شوریلا بنا دیتا۔ کنوؤں کا اور دریاؤں کا پانی جو بجز کت دوری بارش سحابی کا ہی منت کش ہے، نمکین ہو جاتا اور سارے انسان حیوان اور درخت کھیت سوکھ کر مُردہ ہو جاتے۔ عبرت اندوز نظر رکھنے والوں کے لئے اس کے اندر کتنا قیمتی درس ہے کہ اللہ ایک شیریں پانی بنانے کے لئے کتنے نوعی اور صنفی انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ کیسی حیات و موت کی کشمکش ہے کہ پہلے شیریں پانی سمندر میں پہنچ کر شور بنتا ہے پھر بھاپ بن کر شیریں پانی ہو جاتا ہے۔ کیا ثبوتِ قیامت کے لئے اللہ کی قدرتِ قاہرہ کا یہ دوری عمل کافی نہیں ہے۔ اللہ کی اتنی عظیم الشان نعمت جو بغیر محنت کے مل رہی ہے کیا واجب الشکر نہیں ہے۔

مَا تَحْرُثُوْنَ جو تم کھیتی کرتے ہو بوتے ہو۔ حَرْثٌ کا معنی اُگانا نہیں ہے۔ زرعٌ کا ترجمہ اُگانا ہے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا زَرَعْتُ (میں نے اُگایا) نہ کہا کرو بلکہ حَرَثْتُ (میں نے بویا) کہا کرو۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث سنا کر پھر اسی آیت کی تلاوت کی۔ یعنی مضمون حدیث کے ثبوت میں اس آیت کو پیش کیا۔

فظلتم تفکھون۔ پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ یعنی افسوس کے ساتھ یہ کہنے لگو ہائے آسمان سے آفت ٹوٹ پڑی، کیسی لہلہاتی کھیتی برباد ہو گئی۔ اگر طوفان نہ آتا، اگر سیلاب نہ آتا اگر ژالہ باری نہ ہوتی، اگر بے تحاشا بارش نہ ہوتی تو کیسی اچھی پیداوار ہوتی، ہم کیسے فارغ البال ہو جاتے مگر افسوس اب تو اصل لاگت بھی گئی ہم مفلس نادار ہو کر رہ گئے۔ تَفَکُّہٌ منہ کے مزے لینا۔ اس لفظ کا استعمال راحت لذت اور عیش کے موقع پر بھی ہوتا ہے اور رنج کے موقع پر بھی۔ (ابن کثیر)

ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ۔ کیا تم نے بادلوں سے پانی برسایا۔ بادلوں کو تحلیل کر کے اوپر سے کون بارش اُتارتا ہے۔ کوئی انسان ایسا کر سکتا ہے یا کوئی ایسا کرتا ہے۔ یہ کام تو صرف اللہ ہی کا ہے۔ پھر پانی کو میٹھا بنانا اور نمکینی دور کر کے صاف شیریں پانی برسانا بھی تو اللہ ہی کا کام ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو بارش کے پانی کو شوریلا بنا دیتا۔ اتنا نمکین کر دیتا کہ وہ تلخ ہو جاتا پھر تم کیا پیتے (تمام چشموں اور کنوؤں اور دریاؤں کا پانی بھی تلخ ہو جاتا ان کے پانی کی شیرینی بھی تو بارش کے پانی کی مٹھاس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بارش کا پانی ہی چشموں کی شکل میں پھوٹتا اور دریاؤں کی شکل میں بہتا ہے۔) رسول اللہ صلعم کا طریقہ تھا کہ پانی پی کر فرماتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو میٹھا نتھرا ہوا پیاس کو بجھانے والا پانی پلایا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اس کو نمکین تلخ نہیں بنا دیا۔ (ابن کثیر)

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے

الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰہُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ

ہیں اگر ہم چاہیں اُس کو کڑوا کر ڈالیں سو تم شکر کیوں نہیں کرتے اچھا پھر یہ بتلاؤ

الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ؕ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا

جس آگ کو تم سلگاتے ہو　اُس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے　یا ہم پیدا کرنے والے ہیں　ہم نے اُس کو یاد دہانی کی

تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ۝

چیز　اور مسافروں کے فائدہ کی چیز بنایا ہے　سو آپ عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے

ع ۱۵

تفسیر آگ بے شک جلانے والی خاکستر بنا دینے والی چیز ہے جس طرح پانی ڈبو دینے، تباہی پھیلانے، کھیتوں کو اجاڑنے اور آبادیوں کو بہا کرلے جانے والا ایک عنصر ہے لیکن جس طرح پانی دوسرے رخ کے لحاظ سے حیات بخش اور مدارِ زندگی ہے اسی طرح آگ کے بغیر بھی کسی زندہ حیوان بلکہ درخت کی بھی زندگی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پتھروں درختوں جانوروں اور انسانوں کے اندر آگ چھپی ہوئی ہے اور رگڑ سے اس کا ظہور ہوجاتا ہے۔ پتھر سے پتھر لوہے سے لوہا، لوہے سے پتھر اور درخت سے درخت رگڑ کر آگ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یوں بظاہر دیکھنے میں ہر سبز درخت تروتازہ محسوس ہوتا ہے لیکن بنوں اور جنگلوں میں مختلف قسم کے درخت جب باہم رگڑتے ہیں تو کبھی آگ برآمد ہوجاتی ہے۔ جس سے جنگل کے جنگل جل کر راکھ ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان میں بانسوں کا جنگل اور نیستان اکثر اسی وجہ سے آتشگیر ہوجاتا ہے۔ عرب میں بھی دو قسم کے درخت عفار اور مرخ تھے۔ ان کی رگڑ سے خاص طور پر آگ کا شعلہ نکلتا تھا اور آگ بھڑک جاتی تھی جنگلوں، بیابانوں کے رہنے والوں اور راہگیر مسافروں کے لئے یہ بڑی عجیب نعمت تھی ماچس وغیرہ کی ایجاد تو زیادہ زمانہ کی بات نہیں ہے۔ ضرورت مند پتھر کو پتھر پر مار کر خصوصاً چقماق پتھر سے آگ نکال کر اس کے شعلہ میں روئی وغیرہ جلا کر آگ سلگاتے تھے۔ ایسا بھی زیادہ تر شہروں اور مستقل بستیوں میں ہوتا تھا صحرائے عرب کے مسافروں کے لئے تو آتش آفرینی کا سامان لے کر چلنا بہت دشوار تھا ان کی سہولت کے لئے اللہ نے سبز درختوں کی لکڑی سے آگ پیدا کردی۔

یوں تو انسان اور ہر جانور کے اندر آگ چھپی ہوئی ہے۔ خصوصاً پرندوں میں حرارتِ آتشیں کا حصہ بہت زیادہ ہے اور آہن و پتھر کے اندر آگ بھی پوشیدہ ہے جو خاص تدبیروں سے برآمد بھی ہوجاتی ہے، لیکن لوہا اور پتھر خشک چیزیں ہیں۔ ان کے مزاج میں یبوست غالب ہے۔ ان کے اندر سے رگڑنے کے بعد شعلہ برآمد ہونا زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔ بڑا حیرت آفریں تو مرطوب شاداب، تروتازہ درخت سے آگ نکلنا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سبز درختوں سے اہلِ ضرورت کے لئے آگ برآمد ہوتی ہے۔ یہ انقلابِ عنصری یا تبدیل کیفی کون کرتا ہے اور کس افادیت کے لئے کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی یہ کارفرمائی نہیں ہے۔ یہ نعمتِ عظیمہ واجب الشکر بھی ہے۔ قدرت کی ہمہ گیری کو ظاہر بھی کر رہی ہے اور امکانِ قیامت کو بھی ثابت کر رہی ہے۔

مُقْوِیْنَ کا ترجمہ بعض علماء نے مسافر کیا ہے۔ بعض نے جنگل میں رہنے والے لوگ۔ بعض کے نزدیک ہر بھوکا مراد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہر وہ شخص مراد ہے جس کو آگ کی ضرورت ہو اور وہ آگ سے فائدہ اٹھانے والا ہو۔ ہر امیر، فقیر، شہری، دیہاتی، مسافر، مقیم (عورت مرد) سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ کیوں کہ آگ کی ضرورت کسی کو تاپنے، کسی کو روشنی حاصل کرنے اور کسی کو کھانا پکانے کی ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

ذیلی مبحث

آیات مذکورہ میں تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ نباتات کا، پانی کا، آگ کا۔ یوں تو سیاروں کی روشنی کی افادیت اور ہوا کی ضرورت بھی لازم ہے اور انسانی زندگی ان دونوں چیزوں کے بغیر بھی ممکن نہیں لیکن یہ دونوں چیزیں انسان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان دونوں نعمتوں کو کوئی بھی کسی سے نہیں روک سکتا۔ البتہ مذکورہ بالا تینوں نعمتیں اگرچہ عام ہیں لیکن انسان ان میں سے ہر ایک میں ناجائز تصرف کرسکتا ہے۔ اسی ناجائز تصرف کو شریعت نے روکا ہے۔

ابوداؤد وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تین چیزوں میں تمام مسلمانوں کا برابر کا حق ہے۔ آگ چراگاہ اور پانی۔ ابن ماجہ کی روایت میں ہے یہ تینوں چیزیں روک رکھنے کا کسی کو حق نہیں۔

شَجَرَتَهَا یعنی آگ کا درخت۔ مراد ہے وہ درخت جس کی رگڑ سے آگ برآمد ہو جاتی ہے۔ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً ہم نے اس درخت کو یاد دہانیٔ قدرت اور سبب نصیحت بنایا ہے۔ وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ اور اہلِ ضرورت کے فائدہ کی چیز بھی بنایا ہے۔ مطلب یہ کہ اس سے اہلِ حاجت کی مادّی ضرورتیں بھی وابستہ ہیں اور عبرت اندوز نظر رکھنے والوں کے لئے درسِ نصیحت بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مادّی چیز عبرت آفرین اور نصیحت آگیں بھی ہے اور فائدہ بخش بھی لیکن کور دماغ تاریک بصیرت رکھنے والے چونکہ عبرت اندوز نظر سے محروم ہوتے ہیں اس لئے ان کی نگاہ صرف ظاہری فوائد پر پہنچ کر رک جاتی ہے اور باطن تک پہنچنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے معرفتِ الٰہیہ سے بیگانہ رہتے ہیں ورنہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ۔ پس تم اپنے عظمت والے رب کے نام کی پاکیزگی کا زبان سے اظہار اور دل سے اعتراف کرو۔ اس کو ہر عیب اور خرابی سے پاک جانو مانو اور زبان سے بھی اقرار کرو کہ اس کی ساری صفات کامل اور اعلیٰ ہیں۔ وہ ہر عجز و نقص سے پاک ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے کہ یہ ایک مکرم

كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ

قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں درج ہے کہ اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا یہ رب العالمین کی طرف

رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ

سے بھیجا ہوا ہے سو کیا تم لوگ اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو اور تکذیب کو

رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

اپنی غذا بنا رہے ہو

تفسیر ضحاک کا قول ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ قسمیں محض آغاز کے لئے ہوتی ہیں۔ جمہور کے نزدیک ضحاک کا یہ قول کمزور ہے۔ حقیقت میں یہ قسمیں قسم ہی کا مفہوم اپنے اندر رکھتی ہیں اور ان سے اُن چیزوں کی عظمتِ شان کا اظہار ہوتا ہے جن کی قسمیں کھائی گئی ہوں۔

بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک اس جگہ لا زائد ہے اور اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ قسم کا جواب ہے۔ کچھ اہلِ تفسیر نے اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔ عربی کلام کا دستور یہی ہے۔ لا شروعِ قسم میں اس وقت لایا جاتا ہے جب وہ چیز منفی ہو جس پر قسم کھائی گئی ہو۔ جیسے حضرت عائشہ رضہ کا قول احادیث میں آیا ہے۔ لا واللہِ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ يَدَ امْرَاَةٍ قَطُّ۔ یعنی خدا کی قسم (بیعت لینے کے وقت) رسول اللہ صلعم کا دستِ مبارک (کسی بیعت کرنے والی) عورت کے ہاتھ سے کبھی نہیں لگا۔ اسی طرح یہاں لا شروع میں آیا ہے اور زائد نہیں ہے۔ قسم اس بات پر ذکر کی گئی

کہ قرآن کے متعلق جو تمہارے خیالات ہیں کہ یہ جادو ہے یا شاعری ہے یا کہانت ہے ان میں سے کوئی خیال صحیح نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بعض اہل علم نے کہا لا سے مشرکین عرب کے خیال کی پہلے نفی کرنا مقصود ہے پھر قسم سے مثبت کلام کی بقسم ابتدا ہے۔ (ابن کثیر)

اس بے علم ظلوم وجہول انسان کے خیال میں مذکورۂ بالا تاویلات میں سے کوئی تاویل دل آویز نہیں۔ اعجازی بلاغت کا اس سے تقاضا پورا ہوتا ہے۔ قسم حقیقت میں انہیں چیزوں کی کھائی جاتی ہے کہ یا تو متکلم سے ان کی عظمت زیادہ ہو یا کم سے کم متکلم ان چیزوں کی عظمت اپنے نفس سے زیادہ سمجھتا ہو یا متکلم کو ان چیزوں سے بہت زیادہ محبت ہو۔ جیسے کوئی اپنی جوانی یا اپنی جان یا محبوب کے سر یا اس کی جان یا اپنی یا دوسرے کی عمر کی قسم کھاتا ہے قسم کی اول شق تو کلام الٰہی کی قسموں میں ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ سے زیادہ عظمت والی نہ کوئی مخلوق ہے، نہ اللہ کا یہ مقصد ہے کہ کسی مخلوق کو اپنی ذات سے زیادہ عظمت والی ظاہر کرے۔ رہی دوسری شق وہ کچھ کچھ قابل قبول ہو سکتی ہے لیکن ساری کائنات سے زیادہ اللہ کو اپنے فرمان بردار بندوں سے محبت ہونا ناقابل انکار ہے، ملائکہ، انبیاء، اولیاء اور عباد صالحین اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ اللہ ان سے محبت کرے۔ آیت اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کا مضمون اور اللہ کی طرف سے بندوں کی محبت کو اتباع رسول یعنی اللہ کی فرماں برداری سے وابستہ کرنا اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ فرماں بردار بندے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ نے رسول اللہ صلعم کے علاوہ نہ کسی نبی کی قسم کھائی نہ کسی ولی کی اور حضورؐ کی زندگی کی قسم بھی صرف ایک جگہ ذکر کی، وہ بھی صرف کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے، اس لئے

قابل غور یہ امر ہے کہ قرآن مجید میں اللہ نے کس بات کو پختہ طور پر ظاہر کرنے کے لئے قسمیں کھائی ہیں اور اس بات کا مرتبہ کیا ہے۔ تصفح قرآن کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی توحید پیغمبر صلعم کی رسالت قرآن کی صداقت و طہارت، اس کے کلام اللہ اور وحی من اللہ ہونے اور قیامت و حشر کو ثابت کرنے اور دوسری زندگی پر خدا کے قادر ہونے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے ثبوت کو مدلل کرنے کے لئے قسمیں کھائی ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ کالی رات، روشن دن، پھوٹتی فجر، چھاتی تاریکی، انجیر، زیتون، طور سینا، چمکدار جگمگاتے ستاروں نکلتے ڈوبتے سیاروں اور گزرتے زمانہ کی قسمیں کھائی ہیں۔ ان میں بعض بے حس مخلوق کے غیر اختیاری حالات ہیں یا اضطراری حرکات کرنے والی چیزوں کی رفتار اور سیر گاہیں ہیں یا ان کے نتائج ہیں یا جامد نمو پذیر چیزیں ہیں۔ بہر حال کسی روح مجرد یا ملک مقرب یا نبی مرسل یا فکر وحس رکھنے والے انسان یا بالارادہ متحرک حساس حیوان کی قسم نہیں کھائی۔ یہ واقعہ ہے کہ محض نظریات کو ثابت کرنے کے لئے شہادت عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناقابل فہم و دقیق افکار کو مدلل کرنے کے لئے استشہاد علمی سے کام لیا جاتا ہے لیکن جن واقعات کا ثبوت اتنا بدیہی یقینی اور ظاہر ہو کہ اس کو جاننے اور ماننے کے لئے کسی نظر و فکر اور سوچ وچار کی ضرورت نہ ہو وہاں استشہاد عقلی بیکار ہوتا ہے بلکہ دیکھی جانے والی موجودات کی تشکلیں اور ان کے تغیرات اور ہر شخص کی آنکھوں میں آکر ذہن میں اتر جانے والے واقعات ایمان و تسلیم کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اللہ کی ہستی، اس کی وحدانیت، قرآن کا کلام اللہ ہونا اس کی تعلیم کی صداقت، نافادیت، رسالت کی ضرورت، اللہ کی تکوینی اور تشریعی حکومت، قیامت کا امکان بلکہ سزا جزا کے لئے ایک مقررہ ساعت کا آنا ایسی بدیہی واضح حقیقتیں ہیں کہ ان کو ثابت کرنے کے لئے کسی عقلی برہان کی ضرورت تو کیا استقراء کی بھی حاجت نہیں۔ ارباب عقل و علم تو رہے ایک طرف جامد نامی، بے حس، بے اختیار، کائنات پست و بلند بھی اس کی شہادت دے رہی ہے۔ زمانہ گواہ ہے اندھیری راتیں گواہ ہیں، گھٹاٹوپ تاریکی گواہ ہے، چھٹتی ظلمت اور پھوٹتی فجر گواہ ہے، سورج اور اس کا عروج گواہ ہے، چاند کا سورج کے پیچھے پیچھے آنا گواہ ہے۔ غرض ساری بے حس عاری از فکر مخلوق گواہ ہے کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی قدرت محیط کل اور اس کا علم ہمہ گیر ہے، وہی عدم سے وجود میں لانے والا ہے اور وہی حاکم و منتظم ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے بھکاری ہیں۔ انسان کو اس نے بیکار نہیں پیدا کیا آدمی کے اعمال بے نتیجہ نہیں ہیں۔ خیر و شر میں امتیاز ضروری ہے اور اس تمیز قائم کرنے کے لئے انسان کی انفرادی سمجھ اور اجتماعی فکر ناکافی ہے۔ کوئی شخص یا عقلاء کی کوئی جماعت دستور حیات اور شریعت زندگی انسان کے لئے نہیں بنا سکتی دستور تشریعی عطا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے۔ ساری کائنات اسی کی مخلوق ہے، اسی کی تخلیقی طور پر محکوم ہے اس لئے خیر و شر میں تمیز کرنے اور صحیح کو غلط سے چھانٹنے کے لئے انسان اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ ہی کو ایسا ضابطۂ حیات بنانے کی قدرت ہے جو ماضی میں غلط نہ ہو، حال کے لئے غیر مفید نہ ہو اور مستقبل میں قابل فسخ نہ ہو اور اس ضابطہ کو

جلدی کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ بعض خصوصی صلاحیت رکھنے والے آدمیوں کا انتخاب کیا جائے۔ تاکہ ان کا آئینہ قلب آفتاب قدس و قدم سے شعاعیں لے کر دوسرے انسانوں پر عکس پاشی کرسکے اور پھر دوسرے عالم کے سامنے آنے کے بعد فرماں برداروں کو نافرمانوں سے مستحق ثواب و عذاب قرار دیا جائے۔

یہ سب ایسی لطیف اور واضح النبوت باتیں ہیں جن کی صداقت کی شہادت آسمان اور آسمان کے ستارے دے رہے ہیں۔ زمین اور اس کی موجودات دے رہی ہیں حوادث وانقلابات دے رہے ہیں، زمانہ دے رہا ہے، ہر جماد شہادت دے رہا ہے۔ والفجر۔ واللیل۔ والشمس وضحاھا والقمر اذا تلاھا والنھار اذا جلاھا۔ واللیل اذا یغشاھا۔ والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین والسماء وما بناھا والارض وما طحاھا ونفس وما سواھا والضحی واللیل اذا سجی۔ والعادیات ضبحا والعصر۔ والشفع والوتر ان سب جملوں اور فقروں کو کائنات سماوی وارضی وفضائی کو اور گردش لیل ونہار کو گواہ بنایا ہے اور مظاہر کائنات کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ ناقابل چیزوں سے استشہاد کرنے سطحی نظر والوں کے لئے خواہ کتنا ہی عجیب آفریں ہو لیکن نکات بلاغت کے ماہر اس کو اعجازی بلاغت سمجھتے ہیں۔ والعلم عند اللہ

مواقع النجوم سے مراد ہے نجوم قرآن کا بتدریج اترنا۔ شب قدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر پورا قرآن یکدم اتار دیا گیا پھر حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا نیچے اترتا رہا۔ (ابن کثیر) کذا قال ابن عباس اس قول پر مواقع سے مراد ہوں گے اوقات نزول۔ (مظہری)

مجاہد کے نزدیک منازل کواکب یعنی آسمان پر ستاروں کے طلوع ہونے کے مقامات مراد ہیں۔

بعض نے کہا قیامت کے دن ستاروں کا منتشر ہوجانا مراد ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ نجوم سے وہ ستارے مراد ہیں جن کے متعلق مشرکوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے طلوع سے بارش ہوتی ہے۔

عطاء نے کہا کہ ستاروں کی سیرگاہیں مراد ہیں۔ بہر حال کچھ بھی مراد ہو محسوس آسمانی ستاروں کا طلوع و غروب ہو یا قیامت کے دن کا انتشار یا منازل اور سیرگاہیں یا نجوم قرآن کا نزول، غرض ستاروں کے تمام احوال سے قدرت عظیمہ کا عظیم الشان تعلق ہے۔ عظیم الشان مخلوق کا ظہور قدرت کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اس لئے ستاروں کے مواقع کی قسم کھا کر بیان توحید کے بعد مسئلہ نبوت کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کی صراحت ہے۔

وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ۔ مواقع نجوم کی قسم حقیقت میں بہت بڑی قسم ہے۔ ستاروں کی جگمگاتی روشنی، ان کی رفتار اور میدان رفتار، ان کا طلوع و غروب، ان کی افادیت اور تاثیرات، ان کا حجم، ان کی شکل سب ہی چیزیں ان کی عظمت پر دلالت کر رہی ہیں ایسی عظیم الشان مگر جامد بے حس، غیر متحرک، بے ارادہ مخلوق کو نزول قرآن اور طہارت قرآن کا گواہ بنایا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ استشہاد عظیم ہے۔ مگر اس استشہاد کی عظمت کو سمجھنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔

اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ۔ بےشک یہ (جو پڑھا جا رہا ہے اور ثبوت نبوت میں اس کو پیش کیا جا رہا ہے یہ) عزت والا قرآن ہے۔ بڑی بزرگی اور عزت کا مالک ہے۔ کوئی شخص اس کی عزت کرے یا نہ کرے واقع میں اللہ کے نزدیک یہ بڑا مکرم معظم ہے۔ اس کا شرف ذاتی بھی ہے، صفاتی بھی، معنوی بھی اور لفظی بھی۔

فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ۔ ایک محفوظ پوشیدہ کتاب میں اس کا اندراج ہے۔ اللہ کی نورانیت میں جس کو لوح محفوظ کہا جاتا ہے قلم قدرت سے بغیر انسانی نقوش کتابت کے لکھا ہوا حفاظت سے موجود ہے۔ اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا کمی بیشی نہیں کرسکتا کسی قسم کا تغیر نہیں کرسکتا۔ انسان خواہ اس کو دنیا سے مٹانے فنا کرنے اور بگاڑنے کی کتنی ہی کوشش کریں لیکن لوح محفوظ میں لکھا ہوا نہ مٹ سکتا ہے نہ بگڑ سکتا ہے۔

لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ۔ اس کو سوائے پاک (فرشتوں) کے اور کوئی نہیں چھوتا۔ اس کو صرف پاک ہاتھ ہی لگتے ہیں۔

ابو العالیہ نے کہا اس سے مراد انسان نہیں ہیں۔ انسان تو گناہگار ہیں مطہر کہاں ہیں۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنابت اور حدث سے پاک ہوں۔ یہ جملہ اگرچہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں ہے لیکن کلام الٰہی میں خبر سے مراد انشاء ہوتی ہے اس لئے حکم دینا مقصود ہے کہ پاک لوگ ہی اس کو ہاتھ لگائیں ناپاک ہاتھ نہ چھوئیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآن ساتھ لیکر دارالحرب میں جانے سے مسلمانوں کو رسول اللہ صلعم نے منع فرمایا ہے تاکہ کافر قرآن کے ساتھ کوئی گستاخی نہ کرنے پائیں۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت عمرو بن حزم کو جو فرمان لکھوا کر دیا تھا اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ قرآن کو نہ چھوئے مگر پاک آدمی (موطا، امام مالک)

یہ مسئلہ اپنی جگہ صحیح ہے کہ ناپاک آدمی قرآن کو ہاتھ نہ لگائے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن مجید میں جملۂ خبریہ سے کبھی انشاء حکم مراد ہوتا ہے لیکن انشائی مطلب اس جگہ لینا رفتار آیات اور ربط کلام کے خلاف ہے۔ اس جگہ قرآن کے اوصاف اربعہ کا اظہار ہے۔ اوپر کے جملہ میں لوح محفوظ میں قرآنِ کریم کے اندراج کی صراحت کی اور آئندہ جملہ میں اس کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ فرمایا اس لئے لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ لوح محفوظ سے یہ قرآن کریم کیسے اس دنیا میں آیا اور کون لایا۔ یہ بات ظاہر کرنے کے لئے فرمایا کہ صرف ملائکہ اس کو چھو سکتے ہیں۔ کسی شیطان نجس کا ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ اور ملائکہ بھی خود لے کر نہیں آتے بلکہ اللہ کی طرف سے جتنا اور جس طرح اتارا جاتا ہے اتنا ہی لے کر اترتے ہیں۔ واللہ اعلم

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے اُتارا ہوا ہے۔ یعنی شاعری یا جادو کا کرشمہ نہیں، کہانت نہیں، الہام شیطانی نہیں۔ القاءِ جن نہیں، دماغی تراشیدہ نہیں، تعلیم بشری نہیں۔

اللہ رب العالمین ہے

بصارت اور بصیرت کی شہادت ہے۔ ہوش و خرد کی تائید ہے۔ ناقابلِ انکار حقیقت ثابتہ ہے کہ اللہ ہی خالق کائنات ہے اور تمام جہان کو وہی تھامے ہوئے ہے۔ اسی کا ضابطۂ تکوین و نظم سب کو اپنے بندھن میں باندھے ہوئے ہے۔ وہی ہر چیز کا رب ہے۔ ہر فرد کو اس کے کمال نوعی تک رفتہ رفتہ پہنچانے والا ہے۔ بے جان جامد غذا سے نطفہ، پھر نطفہ سے علقہ پھر علقہ سے مضغہ بنا کر روحِ زندگی پھونکنے والا وہی ہے۔ ایک حقیر قطرۂ مردہ کو پانچ چھ فٹ کا انسان بلکہ سینکڑوں فٹ لمبی اور سینکڑوں من وزنی مچھلی بنا دینا اسی کا کام ہے۔ تربیتِ عمومی کے لئے اسی نے روشنی اور تاریکی کو تناسب کے ساتھ قائم کیا۔ مقادیر اشکال اور آوازوں میں توازن پیدا کیا۔ قانون تجاذب کو محیطِ کل کیا۔ کائنات جوہری و عرضی کے ہر ہر ذرہ کو اس کی جگہ اسی نے بٹھایا جمایا اور پیوست کیا اس خلائی فضا میں اس نے جو کچھ بھرا، جس چیز کو رواں دواں کیا یا ساکن و صامت کیا سب ہی اس کی ہمہ گیر ربوبیت کا مظاہرہ اور مظہر ہیں۔ پس جب اس کا کائناتی تکوینی ضابطہ اتنا مضبوط ہے کہ کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا اور دائرۂ فطرت سے باہر نہیں نکل سکتا تو کیا کوئی دانش و خرد تسلیم کر سکتی ہے کہ اس نے انسان کو عمل خیر و شر کی طاقت عطا کی اور اس کے بعد یونہی بے لگام چھوڑ دیا اور اس کو قانونِ خطاء و صواب اور منہاجِ خیر و شر عطا نہیں فرمایا۔ محدود زمانی و مکانی علم رکھنے والے انسانوں کو کیسے اختیار دیا جا سکتا تھا کہ وہ ایسی تشریعات خود تصنیف کر لیں جو مستقبل بعید و قریب اور حالِ موجود میں اتنی ہی مفید ہوں جتنی ماضی میں۔ کون آدمی عواطف و جذبات بشری سے آزاد ہے اور کون فرد ایسا ہے کہ اس کی عاجز عقل ہر طرح کے قومی، ازدواجی، صنفی، وطنی اور تولیدی علائق پر غالب ہو۔ پس اللہ کی ربوبیت کا عین تقاضا ہے کہ تکوینیات کی طرح انسان کے اعمال سے تعلق رکھنے والے سارے ضوابط بھی اسی کے دستِ کرم کے محتاج ہوں اور اس طرح ہم اس کو رب العالمین مان سکیں۔

قرآن کو چھونا اور پڑھنا کیا بے وضو اور جنب وغیرہ کے لئے جائز ہے

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ جملہ لا یمسہ الا المطھرون اگرچہ خبریہ ہے لیکن انشائیہ کے حکم میں ہے اور المطھرون سے مراد اگرچہ ملائکہ ہیں لیکن لفظ کے عموم کے پیشِ نظر اہل تحقیق کے نزدیک انسان بھی اس میں داخل ہیں بلکہ خبریہ کو جب انشائیہ قرار دیا جائے گا تو اس حکم کا تعلق انسانوں سے ہی ہوگا۔ حضرت ابن عمر کی روایت سے بخاری و مسلم نے جو حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قرآن کو ساتھ لے کر دشمن کے ملک یعنی دارالحرب میں نہ جاؤ۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ قرآن سے مراد اس جگہ کلام نفسی نہیں ہے بلکہ مصحف مراد ہے یعنی الفاظ قرآنی کے وہ نقوش مراد ہیں جو کاغذ وغیرہ پر مختلف طریقوں سے

لکھے جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ہر زمانہ کے علماء کا بالاتفاق قول ہے اور اس امر پر اجماع ہے کہ جنب، حائضہ، نفساء اور بے وضو آدمی کو مصحف کا چھونا جائز نہیں۔ صرف داؤد ظاہری کا قول اس کے خلاف ہے۔ داؤد نے ابوسفیان کی اس روایت کو اپنے قول کے ثبوت میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہرقل کو ایک خط لکھوایا جس میں آیت یا اھل الکتٰب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الخ بھی لکھی تھی اور کافروں کا نجس ہونا ناقابلِ انکار ہے۔ لیکن داؤد کا یہ استدلال غلطی فہم پر مبنی ہے۔ رسول اللہ صلعم نے یہ آیت اس حیثیت سے نہیں لکھی تھی کہ قرآن سے اس کو نقل کیا ہو اور مکتوب الیہ کو لکھا ہو کہ یہ آیت اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ اپنے کلام کا آیت کو جزو بنا کر لکھا تھا اسی لئے لفظ قُلْ جو آیت کا ابتدائی جزو ہے نقل نہیں کیا۔ کلام اللہ کا جزو ہونے کی حیثیت سے اگر آیت کو لکھتے تو پوری آیت کو نقل کرتے۔ ایسی حالت میں لفظ قل کو حذف کر دینا جائز ہی نہ تھا جیسے نماز کے اندر اور تلاوت کے وقت آغاز آیت سے لفظ قل کو حذف کر دینا ناجائز ہے۔

دارقطنی نے نیز المعرفت میں حاکم نے اور خلافیات میں بیہقی نے عمرو بن حزم کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اہل یمن کو ایک خط لکھوایا جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ قرآن کو پاک آدمی کے سوا اور کوئی نہ چھوئے۔

طبرانی نے لکھا ہے کہ حکیم بن حزام نے فرمایا رسول اللہ صلعم نے جب مجھے یمن کو بھیجا تو فرمایا جب تک تم پاک نہ ہو قرآن کو نہ چھونا۔ اگرچہ اس حدیث کی سند میں سوید بن حاتم ضعیف راوی ہے۔ لیکن حضرت ابن عمر کی روایت کردہ اسی مضمون کی مرفوع حدیث قابلِ قبول سند سے دارقطنی اور طبرانی نے بیان کی ہے جو سوید بن حاتم کی روایت کے مضمون کی مؤید ہے۔

مسئلہ: اگر غلاف جلد قرآن سے الگ ہو تو ممنوع لوگوں کو بھی غلاف کے اوپر سے قرآن کو چھونا اور پکڑنا جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی اس کو بھی ناجائز کہتے ہیں کیونکہ اللہ نے اس کو لقرآن کریم اور فی صحف مکرمۃ فرمایا ہے اور عزت قرآنی کا تقاضا ہے کہ بغیر طہارت کے غلاف کے اوپر سے نجس آدمی اس کو نہ چھوئے۔ حنفیہ کہتے ہیں بیشک عزت و تکریم چاہتی ہے کہ قرآن کو ناپاک ہاتھ نہ لگیں لیکن غلاف کے اوپر سے ہاتھ لگانے کو مس قرآن نہیں کہا جاسکتا۔ جدا غلاف کے بغیر چھونے کو قرآن کو چھونا کہا جاتا ہے۔ شرعی طریقہ تکریم سے زائد خود ساختہ اعزاز و تکریم محض تکلف ہے۔

مسئلہ: آستین اور دامن وغیرہ کے ساتھ نجس آدمی کا قرآن کو چھونا پکڑنا بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ آستین ہو یا دامن یا پہنے ہوئے لباس کا اور کوئی حصہ وہ ہاتھ دو ہاتھ سے الگ نہیں مانا جائے گا جس سکہ یا کسی اور چیز پر قرآن کی صورت لکھی ہو وہ بھی مصحف کے حکم میں ہے۔ اس کو بھی بغیر طہارت کے چھونا ناجائز ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے بہ دلالت نص بطریق اولیٰ ثابت ہو رہا ہے کہ جنب کے لئے قرآن زبان سے پڑھنا ناجائز ہے کیونکہ نقوش حروف کو تو قرآن کہنا صرف اس وجہ سے ہے کہ نقوش الفاظ قرآن پر دلالت کرتے ہیں اور نقوش قرآنی مکتوب مصحف کو ہاتھ لگانا ممنوع ہے۔ لہٰذا اصل الفاظ قرآن کو زبان سے ادا کرنا جنب کے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اسی پر اجماع اُمت ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک حائضہ اور نفاس والی عورت کا حکم بھی جنب کی طرح ہے۔ امام مالک کے دو قول مروی ہیں ایک قول آیا ہے کہ تھوڑی آیات حیض نفاس والی عورت پڑھ سکتی ہے۔ لیکن اکثر اہل روایت نے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حیض نفاس والی عورت قرآن جتنا چاہے پڑھ سکتی ہے۔ داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے، لیکن اس قول کے خلاف حضرت ابن عمر کی روایت ہے، یہ حدیث آئی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ نہ حائض قرآن کا کوئی حصہ پڑھے نہ جنب۔ رواہ الدارقطنی والترمذی وابن ماجہ

مسئلہ: مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں قیاس کا تقاضا ہے کہ بے وضو آدمی کے لئے بھی قرآن پڑھنا ناجائز ہو لیکن استحساناً بے وضو کے لئے قرآن زبان سے پڑھنا جائز قرار دیا گیا۔ کیونکہ بے وضو ہونے کا اثر منہ کے اندر نہیں پہنچتا اسی لئے وضو میں کلی کرنا واجب نہیں ہے اور جنابت کا اثر منہ کے اندر پہنچتا ہے اسی لئے جنابت کو دور کرنے کے لئے غسل کے ساتھ کلی واجب ہے۔

حضرت ابن عباس کی روایت سے بھی بے وضو آدمی کا قرآن پڑھنا جائز قرار پاتا ہے۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ ایک رات میں اپنی خالہ ام المومنین حضرت میمونہ کے گھر رہا میں تو بستر کے عرض میں لیٹ گیا اور رسول اللہ صلعم اور حضرت میمونہ بستر کے طول میں استراحت فرما رہے تھے۔

رسول اللہ صلعم سو گئے۔ پھر کم و بیش آدھی رات کو بیدار ہو گئے۔ اٹھ کر نیند دور کرنے کے لئے چہرے کو ملنے لگے۔ پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں پھر اٹھ کر اس مشکیزہ کے پاس جو معلق تھا پہنچ کر وضو کیا (متفق علیہ)

حضرت علی نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ کو قرآن پڑھنے سے سوائے جنابت کے اور کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی۔ رواہ احمد وابن حزیمۃ واصحاب السنن وابن حبان وابن الجارود والترمذی وابن السکن وعبدالحق الدہلوی۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ بغوی نے بھی شرح السنۃ میں اس کو نقل کیا ہے۔

کلبی کے نزدیک آیت میں المطہرون سے مراد موحد ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک موحد ہی ہوتا ہے جس کا مقصود صرف خوشنودی خدا کا حصول ہو۔ شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو تیرا مقصود ہے وہی تیرا معبود ہے۔ اس تفسیر پر یہ مطلب ہوگا کہ مشرک اس کو نہ چھوئیں صرف موحد ہاتھ لگائیں۔

عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس یہودیوں اور عیسائیوں کو قرآن پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔

آیت کا تفسیری مطلب مختلف طور پر علماء نے بیان کیا ہے۔ لیکن اس فقیر کے نزدیک جو صحیح یا اولیٰ التشریح تھی وہ اوپر کردی گئی۔ واللہ اعلم۔

قرآن مجید کی یہ چاروں صفات بیان کر کے رسالت کی حاجت اور ثبوت انتہائی بلیغ اسلوب ادا کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ۔ کیا اس کلام کو تم سرسری اور معمولی سمجھ رہے ہو اور جھوٹا کلام کہہ رہے ہو۔ مداہنت اور ادہان چکنا کرنا مراد جھٹلانا۔

الحدیث سے مراد قرآن ہے۔ یعنی وہ قرآن جو روح زندگانی ہے، نجات ابدی کا راستہ دکھا رہا ہے، تباہی اور ہلاکت سے محفوظ رہنے کا طریقہ سکھا رہا ہے جو عرش سے رب العالمین نے بھیجا جس کو مقرب ملائکہ کے پاک ہاتھ لگتے ہیں جو کسی ابلیس کی تعلیم کا نتیجہ نہیں جنون ذہنی کا کرشمہ نہیں، اختراع دماغی کا نتیجہ نہیں، ساری مخلوق کی دسترس دست برد اور وہمی تماش خراش سے آزاد ہے، جس کی رہنمائی کے بغیر کوئی انسان فلاح ابدی حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسے قرآن کو جھوٹا قرار دینا کتنا بڑا جرم ہے۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ تم تکذیب قرآن و رسول کو اپنا کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا بنا رہے ہو۔ لغت میں رزق کا معنی ہے نصیب حصہ (خواہ خوردنی ہو یا نوشیدنی یا پوشیدنی یا صحت و بیماری یا دکھ سکھ)۔ اس ہیچ مدان کی نظر میں یہ ہی مطلب لغت اور محاورہ کے مطابق ہے۔ اسی مطلب کا مؤید ہے حسن بصری کا اس آیت کے ذیل میں یہ قول کہ خسارہ پایا اس بندہ نے جس کو قرآن سے سوائے تکذیب قرآن کے اور کچھ نصیب نہ ہوا۔ سیاق کلام بھی اسی کا مقتضی ہے کہ تکذیب سے مراد تکذیب قرآن ہے۔

اہل تفسیر کی ایک جماعت کے نزدیک رزق کا معنی ہے شکر۔ یعنی (آیات قرآنی کا تمہاری نظر میں) شکر ہے قرآن کو جھٹلانا۔ تجعلون رزقکم کی تفسیر تجعلون شکرکم رسول اللہ صلعم کی حدیث میں آئی ہے جو حضرت علی کی روایت سے امام احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے۔ ہیثم بن عدی کا قول ہے کہ قبیلۂ ازد شنوءہ کے محاورہ میں رزق بمعنی شکر مستعمل ہے۔ بعض اہل علم نے کہا۔ اس جگہ رزق سے بارش مراد ہے اور لفظ شکر رزق سے پہلے محذوف ہے۔ مشرکین عرب بارش کو بچھڑ ستاروں کا اثر قرار دیتے تھے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ بارش کا شکر اس بات کو قرار دیتے ہو کہ خدا کی تکذیب کرتے ہو اور بارش کو ستاروں کا نتیجہ مانتے ہو۔ یعنی شکر کی جگہ کفر کرتے ہو۔ حضرت زید بن خالد جہنی راوی ہیں کہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلعم نے ہم کو فجر کی نماز پڑھائی۔ رات کو بارش ہو چکی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ اللہ اور اس کا رسول ہی بخوبی واقف ہیں ارشاد فرمایا۔ اللہ نے فرمایا کہ میرے، کچھ بندے مومن ہیں اور کچھ کافر، جن بندوں نے کہا ہم پر اللہ کے فضل و رحمت سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں، ستاروں کے منکر ہیں اور جنہوں نے کہا ہم پر فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے بارش ہوئی وہ میرے منکر ہیں ان کا ایمان ستاروں پر ہے (یعنی ستاروں کو فاعل مختار قرار دیتے ہیں اور تصرف کائنات میں حقیقی دخیل مانتے ہیں)

مسلم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں (ایک رات کو) بارش ہوئی۔ صبح کو کچھ لوگ شکر گزار ہوئے اور کچھ لوگ کافر۔ بعض لوگوں نے کہا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے جو اللہ نے بندوں کو عنایت فرمائی ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا فلاں

ستارہ کی تاثیر سے ہی نکلی ۔ اس پر آیت فلا اقسم بمواقع النجوم سے وتجعلون رزقکم انکم تکذبون تک نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ان آیات کا نزول غزوۂ تبوک کے راستہ میں ایک انصاری کے سلسلہ میں ہوا۔ تبوک کو جاتے ہوئے لوگ (مقام) حجر میں اترے ۔ رسول اللہ صلعم نے حکم دیا یہاں سے پانی ساتھ نہ لانا (صحابہ نے حکم دیا) رسول اللہ نے کوچ کر دیا ۔ آگے ایک اور منزل پر اترے ۔ پانی صحابہ کے پاس نہ تھا ۔ لوگوں نے پانی نہ ہونے کی شکایت رسول اللہ صلعم سے کی ۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھی ، پھر دعا کی فوراً بارش ہونے لگی ۔ سب لوگ سیراب ہو گئے ۔ انصاری قبیلہ میں ایک شخص متہم بالنفاق تھا ۔ اس کے ساتھی مخلص انصاری نے اس سے کہا تم نے دیکھا کہ جونہی رسول اللہ صلعم نے دعا کی اللہ نے بارش کر دی منافق کہنے لگا بارش تو فلاں فلاں ستاروں کے اثر سے ہوئی ہے ۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی ۔ محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حجر میں ہوا تھا۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جب بھی اللہ آسمان سے برکت (بارش) نازل فرماتا ہے لوگوں کا ایک گروہ اس کی وجہ سے صبح کو کافر ہو جاتا ہے ۔ اللہ تو بارش نازل فرماتا ہے اور یہ گروہ کہتا ہے ہم پر فلاں فلاں ستاروں کے اثر سے بارش ہوئی۔

اہل تفسیر نے جو رزق کا معنی اس جگہ بارش لیا ہے اس فقیر کی نظر میں سیاقِ آیت کے خلاف ہے ۔ اگرچہ رزق کا معنی بارش قرار دینا صحیح ہے اور احادیث منقولہ بھی صحیح ہیں لیکن اس جگہ رفتارِ کلام اس کا انکار کر رہی ہے بلکہ ظاہر عبارت پکار رہی ہے کہ تکذیب سے مراد تکذیب قرآن اور تکذیب رسول اور تکذیب قیامت ہے ۔ ان ہی تینوں امور کی سابق ولاحق آیات میں صراحت ہے ۔ واللہ اعلم ۔ ہاں اس جگہ ایک ضعیف توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب سے کافروں کو اور کچھ نصیب نہیں ہوتا ۔ ان کا قرآن میں بس اتنا حصہ ہے کہ یہ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں ۔ چنانچہ بارش ہونے کی قرآنی صراحت کو یہ نہیں مانتے اور اللہ کے حکم سے بارش ہونے کا اقرار نہیں کرتے بلکہ ستاروں کو بارش ہونے کا اصل سبب اور علت قرار دیتے ہیں۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۙ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۙ وَنَحْنُ اَقْرَبُ

سو جس وقت روح حلق تک آ پہنچتی ہے　اور تم　اس وقت　تکا کرتے ہو　اور ہم (اس وقت) اس (مرنے والے)

اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۞ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۙ

شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں　لیکن تم سمجھتے نہیں ہو　تو (فی الواقع) اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞

تو تم اس روح کو (بدن کی طرف) پھر کیوں نہیں لوٹا لاتے ہو اگر تم سچے ہو

تفسیر زندگی میں تو یہ لوگ قرآن اور رسول کو جھٹلاتے ہو اور تصرفاتِ عالم میں اپنے جھوٹے دیوتاؤں غیبی روحوں اور فوق المادیات ملائکہ کو دخیل و شریک مانتے ہیں لیکن بے چارگی کے وقت ان کی کیا حالت ہوتی اس کی تصویر کشی ان آیات میں کی ہے ۔ سورۂ قیامت میں بھی اس مضمون کی آیات آئی ہیں ۔ حاصلِ آیات یہ ہے کہ جب کسی کا آخری وقت ہوتا ہے ، نزع کا عالم ہوتا ہے ، سانس اکھڑ جاتا اور روح پرواز کے لئے تیار ہوتی ہے جان حلق میں آجاتی ہے سب لوگ پاس بیٹھے دیکھتے ہوتے ہیں مگر کوئی کچھ کر نہیں سکتا ۔ ہم یعنی ہمارے فرشتے مرنے والے سے تمہاری بہ نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو دکھائی نہیں دیتے۔

ھو القاھر فوق عبادہ ویرسل علیکم حفظۃ اللہ ہی اپنے بندوں پر غالب ہے وہ تم پر اپنے پاس سے نگراں (فرشتے) بھیجتا ہے جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے فرشتے ٹھیک ٹھیک اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔ سب کے سب اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو حاکم ہے اور جلد حساب لینے والا ہے۔

اس جگہ فرماتا ہے اگر سچ مچ تم اللہ کے زیر فرمان نہیں ہو اور دوبارہ جینے اور میدانِ قیامت میں جمع ہونے کا تم کو یقین نہیں ہے اور اپنے دیوتاؤں کو تم اس کائنات میں دخیل اور شریکِ انتظام جانتے ہو تو مرنے کے وقت روح کو جانے کیوں دیتے ہو۔ اگر کر سکتے ہو تو حلق میں آئی ہوئی روح کو اس کی جگہ جسم کے اندر لوٹا دو۔ کیوں اکڑی ہوئی جان اور حلق تک پہنچی ہوئی روح کو بدن میں نہیں پہنچا دیتے۔

آیاتِ توحید کے آغاز میں فرمایا تھا۔ أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اور کسی مشرک کو اس کا انکار بھی نہیں تھا کہ خالق خدا ہی ہے اور موت بھی وہی بھیجتا ہے اور موت مقررہ مدتِ حیات کے بعد آنی ضروری ہے پس جسم میں روح ڈالنے والا جب اللہ ہے اور بدن سے روح کو نکالنے والا بھی وہی ہے۔ پس بدن کے اجزاء کو یکجا کر کے اس میں دوبارہ روح ڈالنے پر بھی وہ قدرت رکھتا ہے اور جزا سزا کے لئے وہ ضرور سارے انسانوں کو زندہ کرے گا۔ اس روز عقائد و اعمال کے لحاظ سے انسانوں کے تین گروہ ہوں گے۔ (۱) مقربین بارگاہِ الٰہی (۲) اصحاب الیمین یعنی عام اہلِ ایمان (۳) اصحاب الشمال یعنی کافروں کا گروہ۔ موت کے وقت ہی سے انسانوں کی یہ گروہی تقسیم ہو جاتی ہے۔

فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۙ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝ وَأَمَّا

پھر (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں اور آرام کی جنت ہے اور جو شخص

إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ الْيَمِينِ ۝ فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ الْيَمِينِ ۝ وَأَمَّا إِن

داہنے والوں میں سے ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے امن و امان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے اور جو شخص

كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّآلِّينَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝ وَتَصْلِيَةُ

جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں میں سے ہوگا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہوگی اور دوزخ میں داخل

جَحِيمٍ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝

ہونا ہوگا بیشک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) تحقیقی یقینی بات ہے سو اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے۔

۳ / ع ۲۲ / ۱۶

تفسیر فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ۔ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ۔ پھر جو شخص (بارگاہ خداوندی کے) مقربین میں سے ہوگا اس کے لئے تو راحت اور (فراغت کی) غذائیں اور آرام کی جنت ہوگی۔ شروع سورت میں تین قسموں کے لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا ان میں سب سے افضل گروہ سابقین کا تھا۔ مقربین سے سابقین ہی مراد ہیں (مظہری) رَوح کا معنی ہے خوشی، راحت (مجاہد، سعید بن جبیر) یا مغفرت اور رحمت (ضحاک) ریحان پاکیزہ رزق (مجاہد، سعید بن جبیر، مقاتل) مقاتل نے کہا حمیری محاورہ میں ریحان کا یہی معنی ہے۔

بعض علماء نے کہا ریحان اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو سونگھا جاتا ہے (مراد خوشبو یا خوشبو کی چیز۔ مؤلف) ابو العالیہ نے کہا اہلِ قرب کے پاس جنت کی کوئی ہری بھری شاخ لائی جاتی ہے۔ جب وہ اس کو سونگھتا ہے تو اس کی روح قبض ہو جاتی ہے۔

محمد بن کعب قرظی کا قول ہے کہ ہر مرنے والے کو مرنے کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی۔

ابوبکر وراق نے کہا کہ روح سے مراد ہے دوزخ سے نجات اور ریحان سے مراد ہے دارالقرار میں داخلہ۔

سورۂ ابراہیم کی آیت یثبت اللہ الخ کی تفسیر کے ذیل میں سکرات کی حالت سے تعلق رکھنے والی کچھ احادیث بیان کر دی گئی ہیں، لیکن بعض احادیثِ متعلقہ کا تذکرہ اس جگہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ ملک الموت سے فرماتا ہے۔ میرے فلاں بندہ کے پاس جا اور اس کو میری بارگاہ میں لا۔ میں نے اسے دکھ سکھ، راحت رنج، آرام تکلیف اور خوشی ناخوشی غرض ہر طرح آزمایا اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق پایا۔ اب اسے ابدی راحت دینا چاہتا ہوں۔ جا اس کو میری خاص بارگاہ میں پیش کر۔ حسب الحکم موت کا فرشتہ پانچ سو رحمت کے فرشتوں کو اور جنت کے کفن اور خوشبوؤں کو ساتھ لے کر جاتا ہے۔ گو ریحان ایک ہی ہوتی ہے مگر خوشبوئیں بیسیوں قسم کی ہوتی ہیں۔ ہر ایک کی مہک جدا جدا ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ سفید ریشم کا ایک کپڑا بھی ہوتا ہے جس سے مشک کی لپٹیں آتی ہیں۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ہے کہ حضرت ام ہانی نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا۔ کیا مرنے کے بعد ہم آپس میں ایک دوسرے سے ملیں گے؟ حضورؐ نے فرمایا۔ روح ایک پرند ہو جائے گی۔ قیامت تک (جنت کے) درختوں کے پھل چگتی رہے گی۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو پھر اپنے اصلی جسم میں چلی جائے گی۔ امام احمد نے اچھی سند سے ایک اور حدیث نقل کی ہے جس سے حدیث مذکور کی تائید ہوتی ہے اور صحیح روایت میں آیا ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہوتی ہیں اور ساری جنت میں جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں سیر کرتی ہیں اور کھاتی پیتی رہتی ہیں پھر ان قندیلوں میں آ بیٹھتی ہیں جو عرش سے آویزاں ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ عبدالرحمن بن ابو یعلی نے بیان کیا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا جو اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو اللہ سے ملنا پسند نہیں کرتا اللہ بھی اس سے ملاقات کرنی پسند نہیں کرتا (بظاہر اللہ سے ملنے کا معنی مرنا ہے) یہ بات سن کر صحابہ سر جھکا کر رونے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا کیوں، روتے کیوں ہو؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بھلا اپنے مرنے کی خواہش کس کو ہوتی ہے۔ فرمایا سنو سنو، میرے اس کلام کا تعلق سکرات کے وقت سے ہے۔ سکرات کے وقت تو نیک مقرب بندے کو راحت، رحمت اور آرام وہ جنت کی بشارت سنائی جاتی ہے۔ وہ یہ خوش خبری سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اللہ سے مل جائے۔ اللہ بھی ایسے مشتاق بندہ سے ملنا پسند فرماتا ہے اور اگر بندہ بد رفتار ہے تو مرنے کے وقت کھولتے ابلتے پانی اور جہنم کی مہمانی کی اس کو خبر دی جاتی ہے، جس کو سن کر وہ مرنا نہیں چاہتا۔ اس کی روح رونگٹے رونگٹے میں چھپی پھرتی ہے۔ اور یہ بندہ چاہتا ہے کہ کسی طرح حضورِ الٰہی میں حاضر نہ ہو۔ ایسے بندے سے اللہ بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔

وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۔ لیکن جو شخص دائیں جانب والوں میں سے ہوگا تو اس سے کہا جائے گا تیرے لئے امن و امان ہے کہ تو دائیں طرف والوں میں ہے)

یہ دوسرا نجات یافتہ جنتی گروہ ہے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔ دائیں جانب والے گروہ سے موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں۔ تجھ پر سلامتی ہو تو اصحاب الیمین میں سے ہے یا اصحاب الیمین کی طرف سے تجھ کو سلام ہو۔ خود فرشتے بھی اس کو سلام کرتے ہیں جیسا آیت ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا الخ۔ میں آیا ہے کہ سچے پکے ایمان والوں کے پاس ان کے انتقال کے وقت رحمت کے فرشتے آتے ہیں انہیں بشارت دیتے ہیں اور کہتے ہیں، اب تمہارے لئے کوئی ڈرنے کی بات نہیں کچھ غم نہ کرو، حسب وعدہ جنت تمہارے لئے تیار ہے جو چیز تم چاہو گے وہ ملے گی۔ تم غفور و رحیم خدا کے عزت والے مہمان ہو۔

وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۔ اور اگر وہ حق کی تکذیب کرنے والوں اور راہِ حق سے) بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہوگا تو اس کی مہمانی سخت گرم حمیم سے ہوگی اور دوزخ میں جانا ہوگا۔ یہ تیسرا گروہ دوزخیوں کا ہوگا انتقال کے

وقت جو کافر مرے گا قرآن مجید اور رسول اللہ صلعم کی تکذیب کرنے والا اور راہ ہدایت سے گم ہوگا۔ اس کو دوزخ کی آگ ہر طرف سے محیط ہوگی اور اس کی مہمانی حمیم سے ہوگی۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ۔ بلاشبہ یہ یقینی باتیں ہیں جن کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

یقین کے تین درجات ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ دلائل علمی کی روشنی میں اور استدلال کے زور سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ علم الیقین کا درجہ ہے۔ یہ یقین ناقابلِ ازالہ نہیں ہوتا۔ اگر دلائل کی قوت کسی وقت اس حاصل شدہ یقین کے خلاف موجود ہو جائے تو مثبت یقین منفی سے بدل جاتا ہے۔ فلسفی نظریات میں تغیر و تبدیل اسی وجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ یقین کا دوسرا درجہ پہلے درجہ سے قوی ہوتا ہے۔ پہلا یقین حاصل کرنے کے لئے تو عقل کی ہنگامی شہادت، یا کسی معتبر عالم کا کہنا کافی ہوتا ہے لیکن دوسرے درجہ پر پہنچنے کے لئے مشاہدے اور معائنے کی ضرورت ہوتی ہے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ جو چیز آنکھوں سے دیکھ لی جاتی ہے اس کا یقین استدلالی یقین سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی معتبر شخص یا کثیر جماعت نے تم سے کہا کہ تمہارے گھر کے اندر ایک ایسا چشمہ زمین سے پھوٹ کر نکلا ہے جس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے اور دودھ سے زیادہ سفید ہے اور جلدی امراض کو اس میں غسل کرنا فوراً دور کر دیتا ہے۔ معتبر ترین شخص مثلاً بیوی ماں باپ اور دوسرے صحیح الدماغ افراد خانہ کے کہنے سے تم یقین کر لیتے ہو کہ ضرور گھر میں ایسا چشمہ نکلا ہے لیکن قوتِ واہمہ کی کارفرمائی یا دوسرے معتبر لوگوں کی طرف سے اس خبر کی تردید کی وجہ سے تم شک میں پڑ سکتے ہو اور وہ یقین زائل ہو سکتا ہے، پھر تم لوٹ کر اپنے گھر آ جاتے ہو اور اپنی آنکھوں سے چشمہ کو بہتا دیکھ لیتے ہو اور اس کے پانی کا رنگ بھی دودھ سے زیادہ سفید تم کو نظر آ جاتا ہے تو اب کیسا ہی ثقہ معتبر آدمی تم سے کہے کہ چشمہ رواں نہیں ہے یا پانی دودھ سے زیادہ سفید نہیں ہے۔ تم اپنی آنکھوں کی تکذیب نہیں کر سکتے لیکن ایک وہم پھر بھی دماغ میں آ سکتا ہے کہ شاید کسی نے میری نظر بندی کر دی ہو یا میری نظر میں کچھ خرابی آ گئی ہو، یا یہ میری قوتِ خیالیہ کی کرشمہ سازی ہو۔ بیرونی خبروں سے میرا دماغ اتنا متاثر ہو گیا ہو کہ غیر موجود چیز اس کو نظر کے سامنے دکھائی دینے لگی ہو۔ اس قسم کے شک کے پیدا ہونے کا اگرچہ ضعیف ترین احتمال ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے لیکن ایسی بات ہو جانا واقعات کے خلاف نہیں ہے نظر بندی کے واقعات اس کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ چشمہ میں اتر جائیں اور برف سے زیادہ پانی کی ٹھنڈک محسوس ہو جائے اور اگر آپ کی جلد پر پھنسیاں اور دانے ہوں یا خارشت ہو اور غسل کرتے ہی ہر پھنسی اور دانہ ٹھیک ہو جائے اور بدن پر بیماری کی کوئی علامت باقی نہ رہے تو یہ یقین حق الیقین ہے۔ نہ کسی دلیل کی طاقت اس کو زائل کر سکتی ہے، نہ معتبر اشخاص کی مخالفت، نہ قوتِ واہمہ کا تسلط۔

پس رسول کی صداقت، قیامت کی حقانیت اور مرنے کے وقت انسانوں کا تینوں قسموں میں بٹ جانا اور ہر گروہ کا اپنے عقیدہ و عمل کے مطابق فرشتوں سے خبر سننا اور سزا یا جزا پانا حق الیقین ہے صرف استدلالی اور اخباری چیز نہیں بلکہ وجدانی اور حقیقی چیز ہے جس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ۔ پس پاکی بیان کرو اپنے رب عظیم کے نام کی۔ یعنی ربِ عظیم کی عظمت شان کے خلاف جو صفات ہیں، ان سے اپنے رب کو پاک سمجھو اور اس کی پاکی کا اقرار کرو۔ اسم سے مراد اسم وصفی ہے یا لفظ اسم زائد ہے۔ ذاتِ رب مراد ہے اور چونکہ ذات کی حقیقت نامعلوم ہے اس لئے اسم کی پاکی بیان کرنے کا حکم دیا۔ یہ دونوں آیتیں سورۃ الحاقہ کے آخر میں بھی آئی ہیں جن کی مزید تشریح اس مقام پر کی جائیگی۔

مسند احمد میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلعم نے فرمایا اس کو رکوع میں پڑھا کرو اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا کرو۔ حضورؐ نے فرمایا جس نے سبحان اللہ العظیم و بحمدہ پڑھا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے (ترمذی)

صحیح بخاری کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا دو بول ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں۔ میزان (عدل) میں (قیامت کے دن وزنِ اعمال کے وقت) بھاری ہوں گے اور اللہ کو بہت پیارے ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

ایک ضروری نوٹ سورۂ واقعہ میں جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کا بکثرت ذکر کیا گیا ہے اور انہیں ناموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو متعارف ہیں۔ جنت کی نعمت اور دوزخ کے عذاب کی حقیقت کا انسانی الفاظ میں اظہار ناممکن ہے جس کی

حقیقی کیفیت کسی کان نے نہیں سنی جس کی اصل صورت کسی آنکھ نے نہیں دیکھی اور جس کی حقیقت و خصوصیت کا تصور کسی کے دماغ میں نہیں آیا اور نہ آنا ممکن ہے۔ اس کی تصویر کشی عربی یا کسی دوسری انسانی زبان میں ممکن نہیں۔ اس لئے کھانا پینا رہنا بسنا اور دکھ یا سکھ کی زندگی گزارنا جس طرح انسان کی سمجھ میں آنا ممکن تھا اس کو بیان کر دیا۔ حوروں کو انسانی عورتیں غلمان کو لڑکے، شراب کو انگور یا کسی دوسرے پھل کا سڑا ہوا عرق انار، سیب، انگور، زیتون اور دوسرے مذکورہ پھلوں کو گندہ زمین اور متعفن رطوبت کا نتیجہ قرار دینا اور لولو و مرجان کو بحری پیداوار کہنا یا جنت کے زمین آسمان کو اس محسوس عالم کے زمین آسمان سمجھنا غلط ہے۔ دوزخ کے اندر نہ ایسی آگ ہوگی۔ نہ یہ جلا دینے والی برف، نہ ایسے ڈسنے والے سانپ اور بچھو نہ اس لوہے کے آنکڑے اور ہتھوڑے، نہ حیوانی جسم سے بہنے والے لہو اور زخموں سے برآمد ہونے والی پیپ کے حوض، بلکہ یہ تمام نام ہر طرح کی راحت و لذت اور شدید ترین الم و اذیت کی تصویر ذہن نشین کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں تاکہ بشری جذبۂ رغبت و خوف میں ابھار پیدا ہو اور باطل کو چھوڑ کر آدمی حق پرست بن جائے۔ واللہ اعلم۔

سُورَۃُ الحدید

یہ سورت مدنی ہے۔ اس میں چار رکوع اور ۲۹ آیات ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلعم سونے وقت ان سورتوں کو پڑھتے تھے جن کے شروع میں سَبَّحَ یا یُسَبِّحُ آیا ہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ ان کے اندر ایک آیت ایسی ہے جو ایک ہزار آیات سے (ثواب میں) افضل ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے۔ شاید وہ آیت ھوالاول والآخرۃ والظاھر والباطن ہو۔ آئندہ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے اسی کی سلطنت ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَ

اور زمین کی وہی حیات دیتا ہے اور (وہی) موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (سب مخلوق سے) وہی پہلے ہے وہی پیچھے اور

الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے

تفسیر سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔ اس جگہ اور سورہ حشر و سورہ صف میں سَبَّحَ بصیغہ ماضی اور سورہ جمعہ و سورہ تغابن میں یُسَبِّحُ بصیغہ مضارع اور بنی اسرائیل میں بصیغہ مصادر ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے اللہ کی پاکی کا اظہار کسی حالت اور کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ساری مخلوق نے پہلے بھی ہر وقت اس کی تسبیح پڑھی اور آئندہ بھی ہمیشہ پڑھتی رہے گی اور اس وقت بھی اسی کی پاکی ساری کائنات بیان کر رہی ہے اور مصدری معنی چونکہ کسی زمانہ کے ساتھ

مقید نہیں ہوتا اس لئے بنی اسرائیل میں جو مصدری صورت اختیار کی گئی ہے وہ زیادہ واضح ہے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ سمجھتے نہیں۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد ہے عالمِ بالا و پست۔ ساری کائنات، ستارے، سیارے، ملائکہ اور غیبی کائنات سماوی تمام حیوانات چرندے پرندے درندے اور رینگنے والے کیڑے اور سارے جمادات اور ان کے عناصر ترکیبی سب ہی اللہ کی پاکی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی اپنی زبان سے خالق بے چون و چرا اور حاکمِ اعلیٰ کو بے عیب اور ہر نقص سے پاک مانتے ہیں اور پاکی بیان کرتے ہیں۔

عام مفسرین یہاں تک کہ امام رازی نے بھی غیر ناطق مخلوق کی تسبیح کو تسبیح حالی کہا ہے تسبیح مقالی نہیں کہا کیونکہ ارسطو اور اس کے خوشہ چین صرف انسان کو صاحب فکر و ناطق قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقلید میں اکثر متکلمین بھی اسی کے قائل ہو گئے لیکن قرآن کی آواز اس کے خلاف ہے۔ تعجب ہے ایسے اکابر پر کہ انہوں نے قرآنی بیان کو فلسفہ کی خرافات سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور صراحتِ قرآنی کو تاویل کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے کائنات کے ہر ذرے کو اس کی نوعی زبان عطا فرمائی ہے جو انسان کی آواز و تکلم کی طرح اوتار الصوت کے کھلنے بند ہونے اور مخارج تلفظ میں ڈھلنے سے بالکل مبرا ہے۔ اگر تسبیح حال مراد ہوتی تو اس کا یہی معنی ہو سکتا ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق، ہر مربوب اپنے رب اور ہر مصنوع اپنے صانع کی وحدانیت پر فطرتًا دلالت کر رہا ہے۔ اسی کو تسبیح حالی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر قرآن کی آیات کا یہی مطلب ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس قسم کے استدلال کو ہم سمجھتے ہیں۔ برہان اِنّی کا مدار ہی اس استدلال پر ہے۔ پھر قرآن نے اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ فرمانے کے بعد وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ کیوں فرمایا۔ قرآن کی صراحت تو صاف بتا رہی ہے کہ ہم تسبیحِ کائنات کو عام حالات میں (باستثناء بعض انبیاء و اولیاء) نہیں سمجھتے ہیں۔

اس لئے اس فقیر مؤلف کی نظر میں یہی قول زیادہ صحیح ہے کہ ہر چیز اپنی اپنی نوعی زبان میں اللہ کو پکار پکار کر بے عیب اور پاک ظاہر کر رہی ہے۔ ہاں اس کا اظہار تسبیح انسان کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کی طرح اس کے اوتار صوت اور مخارج نہیں ہیں۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اور وہی (سب پر) غالب (اور) حکمت والا ہے۔ اللہ کی صفاتِ کمالیہ میں دو صفتیں بہت اہم ہیں اور تمام اوصافِ کمالی کا جامع مجموعہ ہیں۔ (۱) قدرتِ کاملہ جو ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے کسی طرح کے ضعف و عجز کا اس میں شائبہ بھی نہیں ہے۔ سارے جہان ارضی و سماوی کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اللہ کے غلبۂ قدرت اور ہمہ گیر تسلط سے باہر ہو (۲) علمِ محیط، اللہ کا علم ہمہ گیر ہے۔ مخلوق کی کوئی کیفیت، مقدار، رنگ، شکل بلکہ کوئی حالت خواہ گزشتہ ہو یا حالی یا استقبالی، ایسی نہیں جو اللہ کے حضورِ علمی سے غائب ہو۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کہ اس کا اپنی ذات کا ملاحظہ ہی ساری موجودات اور ممکن الوجود اشیاء کو جان لینے کے لئے کافی ہے اس کا علم ماضی و مستقبل کی قید سے آزاد ہے اور تصور و عکس سے پاک ہے۔ ہر چیز کا مبدءِ وجود اس کی ذات ہے۔ اس لئے ذات کا مشاہدہ ہی مشاہدۂ کائنات ہے۔ بس اسی کا علم ایسا ہے جس میں کسی قسم کی جہالت کی آلائش و آمیزش نہیں۔

قدرت کی ہمہ گیری اور علم کا احاطۂ کلی یہ دو اوصاف اس کو مستحقِ الوہیت اور واجب الاطاعت بنا رہے ہیں اور کائنات کا ہر عجز و نیاز اس کے سامنے جھکا رہے ہیں اور مجبور کر رہے ہیں کہ سارا سنسار اس کی پاکی (یعنی عجز و جہالت سے پاک ہونے) کا اقرار کرے اور اس کو عالمِ کل اور قادرِ مطلق جاننے اور ماننے۔ پس وہ عزیز اور غالب ہے۔ ایسا کہ وہی غالب و عزیز ہے اور ساری مخلوق مغلوب و عاجز ہے اور حکمت والا ہے ایسا کہ سارا جہان نادان ہے اور وہی عالم ہے۔ خلاصۂ تفسیر یہ ہے کہ سارا جہان ہر طرح کی کمزوری عجز اور جہالت و نادانی سے اللہ کے پاک ہونے کا اقرار کر رہا ہے اور کر تا رہے اور سرِ عجز و تسلیم اس کے سامنے جھکا رہا ہے اور جھکا تا رہا ہے اس لئے کہ وہی سب پر غالب ہے اور عالمِ کل ہے اور اسی کا علم صحیح ہے اور وہی سب کا مالک ہے، لہٰذا وہی مستحقِ الوہیت ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانوں میں اور زمین میں اسی کی حکومت ہے۔ یعنی ستاروں اور سیاروں کا طلوع، غروب، نکلنا اور چھپنا، جگمگانا اور بجھنا، شعاعیں پھیلانا اور سمیٹ لینا ضابطۂ کشش یا کسی اور قانونِ اقتدار کے زیرِ اثر سب کا رواں دواں ہونا اور اپنی

سیرگاہ و منزل کو نہ چھوڑنا، نہ اُس سے اِدھر اُدھر کترانا، اپنی کرنوں کی نورانی بارش کروڑوں میل دور زمین پر بکھیرنا اور مرکباتِ عنصری پر اثر انداز ہونا اور علوی کا امہاتِ سفلیہ سے اختلاط و امتزاج ہو کر نباتی اور حیوانی زندگی کا پروردہ، شاداب اور حسین بن جانا، تمام خلائی فضائی اور سماوی موجودات کا انتظام طبعی قوتوں، نوعی صورتوں اور انسان سے بالا تر غیبی نفسی طاقتوں کے زبردست ہاتھوں میں ہونا یہ ساری حکمرانی اللہ ہی کی ہے۔ وہی حاکمِ اعلیٰ ہے، ناہی اور آمر ہے، جہانِ سماوی کے نظم کو تھامے ہوئے ہے کوئی سیارہ دوسرے سیارہ کی رفتار، مقدارِ رفتار، کیفیتِ رفتار اور میدانِ رفتار میں دخل انداز نہیں ہوتا، کوئی کسی سے راستے میں نہیں ٹکراتا اور سب مل کر خوشی خوشی یا جبری طاقت کے زیرِ اثر باہم تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا مددگار ہوتا ہے۔ اگر توڑ پھوڑ بھی ہوتی ہے اور کسی کا کسی سے تصادم بھی ہوتا ہے تو اللہ کے جاری کئے ہوئے قانونِ بقا کے تحت۔ اسی طرح زمین کی اندر زمین میں بھی اللہ ہی کی حکومت ہے۔ زمین کی زرخیزی، بالیدگی، زلزلہ آفرینی اور طوفان خیزی، زمین کی اندرونی کائنات کی ساری تخریب و تعمیر، تبدیلیٔ حالات و کیفیات، توڑ جوڑ، بناؤ بگاڑ اللہ ہی کی حکمرانی کا مظہر ہے۔ زمین کے پیٹ کے اندر موتی، یاقوت، ہیرے، پنے اور طرح طرح کے سنگ و جواہر کا ہزاروں سال کی تپائی اور شعاعی تاثیر کے بعد پیدا ہونا اور زمین کے اوپر لاکھوں اقسام و اصناف کے بیل بوٹوں کا نمو تام ہونا اور پھر ان کا حیوانی زندگی کی بقا میں مددگار بننا اور باوجود وحدتِ غذا کے لاکھوں شکلوں، رنگوں، مقداروں اور تاثیروں کے پھول پھل پیدا ہونا اور باوجود اختلاف کے تمام اشکال، الوان، مقادیر اور آثار کا باہم ارتباط، توازن اور تناسب کے رشتہ میں منسلک ہونا اللہ ہی کے اقتدارِ کامل اور حکومتِ غالبہ کا نتیجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ مالک الملک بھی اللہ ہی ہے اور ملک الملک بھی وہی ہے، نہ کوئی مخلوق کسی کی حقیقی مالک ہے، نہ مختارِ مطلق حکمران۔

یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۔ وہی زندگی اور موت دیتا ہے۔ زندگی اور موت کیا ہے۔ کیا عناصر کے ظہورِ ترتیب کا نام زندگی ہے۔ یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے حقیقت سے خالی یا نامی حساس متحرک بالارادہ اور صاحبِ فکر و نظر ہونا حیوۃ ہے۔ یہ فلسفیانہ نکتہ نظری ہے۔ یہ ساری چیزیں نشانہائے زندگی ہیں زندگی کی علامات ہیں۔ اصل زندگی تو کسی اور چیز کا نام ہے۔ سورج کی کرنیں سورج نہیں ہوتیں بلکہ سورج کے آثار ہوتے ہیں۔ نہ شعاعوں کی عکس ریزی کو شعاعیں قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تو شعاعوں کے طلوع کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب سورج کی شعاعیں براہِ راست یا بالواسطہ کسی چیز پر پڑتی ہیں تو وہ چیز روشن ہو جاتی ہے اور کبھی اتنی روشن ہو جاتی ہے کہ عکس پاش اور نور افشاں بن جاتی ہے۔ مگر یہ سارا اثر اور نتیجہ سورج کی شعاعوں کی عکس ریزی کا ہوتا ہے، اور شعاعوں کی عکس ریزی ممنونِ کرم ہے آفتاب کی۔ پس آفتاب کی نور افشانی سے حقیقت میں عالمِ بالا و پست روشن ہو جاتا ہے۔ زندگی بھی نام ہے نورِ الٰہی کی ایک اداءِ تپاک کا، آفتابِ حیات کے ایک پرتوِ تابندگی کا اور موت نام ہے ارادۂ الٰہی کی نور بخشی سے محرومی کا۔ ارادۂ الٰہی کا جب کسی چیز سے تعلق ہو جاتا ہے تو وہ چیز نامی بھی ہو جاتی ہے اور حساس بھی اور متحرک باشعور بھی اور صاحبِ فکر و نظر بھی اور ترکیبِ عنصری کے اعتدال کی مالک بھی اور اگر اللہ کے ارادۂ حیات بخشی کے تعلق سے محروم ہو گئی تو یہی اس کی موت ہو گئی نہ نامی رہا نہ حساس نہ متحرک، نہ متفکر و ناظر۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ ہی زندگی عطا کرتا اور موت بھیجتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یعنی اللہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ زندگی عطا کرنے پر بھی اور زندگی چھین لینے پر بھی۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ جس طرح اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں اسی طرح اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ اللہ کے احاطۂ علمی اور ہمہ گیری قدرت اور وحدتِ ذاتی و صفاتی ثابت کرنے کے لئے اس آیت میں چار صفاتِ الٰہیہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) وہی اول (۲) وہی آخر ہے (۳) وہی ظاہر ہے (۴) وہی باطن ہے یعنی اس سے پہلے یا اس کے ساتھ کسی مخلوق کا وجود نہیں۔ اس کی ذات و صفات کو حقیقی اولیت حاصل ہے اور اس کے بعد بھی کوئی نہیں وہی باقی ہے سب فانی ہیں۔ اس میں کوئی تغیر ذاتی و صفاتی نہیں۔ اس کے علاوہ ہر چیز متغیر، حادث اور زوال پذیر ہے۔ وجودِ خدا ذاتی ہے۔ اس کی صفات بھی اصلی ہیں، نہ وجود مستعار ہے نہ صفات کسی کی دی ہوئی۔ اصل وجود اسی کا ہے اور اصل صفات بھی اسی کی ہیں۔ باقی جہان جو موجود ہے موجود نہیں۔ ان کا وجود وجودِ الٰہی کا پرتو اور سایہ ہے اور جب اس کا ہی وجود ذاتی ہے اور باقی دنیا کی ہستی مستعار ہے تو کل جہان موجودہ صفات کے ساتھ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا۔ صرف باری تعالیٰ کی ہستی ازلی اور ابدی ہے۔ پس وہی اول ہے اور وہی آخر ہے اور چونکہ ساری کائنات مخلوق ہے اور اللہ سب کا خالق۔ ہر چیز مصنوع اور اللہ اس کا صانع۔ اس لئے اسی کی صفات علم و

پوری کائنات سے اتنی جھلک رہی ہیں کہ ہر ذرّہ اس کی صفات کا مظہر بنا ہوا ہے۔

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پس وہی ظاہر ہے اپنی صفات کے لحاظ سے اور وہی پوشیدہ ہے اپنی ذات اور وجود کے اعتبار سے کسی چیز کی شدت ظہور اس چیز کو آنکھوں سے پوشیدہ کر دیتی ہے۔ انتہائی روشنی آنکھوں میں خیرگی بلکہ نابینائی پیدا کر دیتی ہے۔ نقطۂ عروج پر پہنچے ہوئے سورج کو کس آنکھ کی نگاہ دیکھ سکتی ہے۔ پہاڑی برف کے تودے جو پہاڑ کی چوٹی پر سینکڑوں فٹ اونچے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ میں ظلمت پیدا کر دیتے ہیں۔ پس شدت ظہور ہی اللہ کی دید میں مانع ہے اور وہ سب سے پوشیدہ ہے۔

مسلم ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابوہریرہ اور ابویعلی موصلی کی وساطت سے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلعم جب (بستر پر) لیٹتے تھے (اور سونے کا ارادہ ہوتا تھا) تو فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی وَمُنَزِّلَ التَّوْرَاتِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْءٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ اِقْضِ عَنَّا الدَّیْنَ وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ۔ اے اللہ اے آسمانوں اور زمین کے مالک۔ اے عرش عظیم کے مالک، اے ہمارے مالک اور ہر چیز کے مالک، اے دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والے (یعنی پھاڑ کر سبزے کی کونپل نکالنے والے) اے توریت انجیل اور قرآن کو نازل کرنے والے میں تیری پناہ لیتا ہوں ہر اس چیز کی شر سے جو تیرے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ اور اے اللہ تو ہی اول ہے، تجھ سے پہلے کچھ نہ تھا اور تو ہی آخر ہے، تیرے بعد کچھ نہیں، تو ہی ظاہر ہے (یعنی غالب ہے) تیرے اوپر کوئی چیز نہیں۔ تو ہی باطن ہے، تجھ سے نیچے اور ورے کوئی شے نہیں، ہمارا قرض تو ادا کر دے اور مفلسی دور کر کے ہم کو غنی بنا دے۔ اس حدیث میں ظاہر و باطن کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ظاہر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ سے اعلیٰ بالا اور غالب کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح الباطن کی جو تشریح کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے زیادہ پوشیدہ اور نیچے اور مخلوق کے قریب کوئی دوسری چیز نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت عمرؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا اللہ کو اول کا علم ویسا ہی ہے جیسا آخر کا اور ظاہر کا علم ویسا ہی ہے جیسے باطن کا۔ یعنی اللہ کا علم محیط کل ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ اگلی آیت وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ سے اسی کی تائید ہو رہی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیت وھو علی کل شیء قدیر سے اللہ کی قدرت تامہ کاملہ کی ہمہ گیری کو ظاہر کیا گیا تھا جس کا ثبوت ہو الاول والآخر والظاہر والباطن فرما کر دیا گیا اور اس سے آگے وھو بکل شیء علیم فرما کر اللہ کے علم محیط کی صراحت کر دی اور اس دعوے کو آیات ہو الذی خلق سے علیم بذات الصدور تک پورے طور پر ثابت کر دیا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۭ یَعْلَمُ

وہ ایسا ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر تخت پر قائم ہوا وہ سب کچھ

مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ۭ وَهُوَ

جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً نباتات) اور جو چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمہارے

مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو اور وہ تمہارے سب اعمال کو بھی دیکھتا ہے

تفسیر هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ آسمان و زمین کو چھ روز میں پیدا کرنے اور عرش اقتدار پر متمکن ہونے کی تشریح کئی بار مختلف مقامات پر کردی گئی ہے۔ اس جگہ مزید تفسیر کی ضرورت نہیں ہے آیت مذکورہ پر اس جگہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اللہ نے ساری کائنات پیدا کی ہے تو بغیر سابق و ارادہ کے نہیں پیدا کی۔ خلق کا معنی ہے ایک اندازہ کے ساتھ بنانا عرب کہتے ہیں خلق الاسکاف۔ موچی نے اندازہ کر کے چمڑے کو کاٹا۔ پس اس نے یہ سارا سنسار اپنے سابق علمی منصوبہ اور ارادہ کے ذریعہ تو بنایا اور ہمات و دن کے اندر تمام زمین آسمان اور عرش عدم سے وجود میں آگیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہ جہان بغیر بنائے خود بن گیا ہو، یا جس طرح سورج سے اس کی شعاعیں سورج کے ارادہ کے بغیر نکلتی ہیں اسی طرح اس عالم کا ظہور بھی خالق کل کے ارادہ کے بغیر ہو گیا ہو اور ہو رہا ہو، بلکہ ہر چیز اللہ نے اپنے علمی منصوبے اور ارادہ کے ماتحت بنائی ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے۔ ہر درخت اور غلہ کا بیج اور گٹھلی، بارش کے قطرے، سورج کی کرنیں، مختلف دفینے، باریک کیڑے کوڑے اور انسانوں کی لاشیں عموماً زمین کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ اللہ کو ہر ایک کی تعداد، مقام، کیفیت، نتائج، حرکت سکون، تبدل اور تغیر معلوم ہے اور جو کچھ زمین سے برآمد ہوتا ہے یا برآمد ہوگا اس سے وہ واقف ہے۔ تخم و گٹھلی پھٹ کر سبزہ برآمد ہوتا ہے، پانی کی بھاپ اٹھتی اور باہر آتی ہے، کہیں آگ اگلتی اور لاوا ابلتا ہے، طرح طرح کے قیمتی پتھر کوئلہ اور پانی کے چشمے نکلتے ہیں، کیڑے کوڑے پیدا ہوتے ہیں اور قیامت کے دن انسانوں کے مردے زندہ کر کے باہر لائے جائیں گے۔ اللہ کو سب کا علم ہے۔

وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا۔ اسی طرح جو کچھ آسمان سے اترتا یا اوپر کو چڑھتا ہے اللہ اس سے بھی واقف ہے۔ بارش اترتی ہے کتنے قطرے اترتے ہیں، کیسے اترتے ہیں، کہاں اترتے ہیں، ایک ایک فرشتہ ایک ایک قطرہ لے کر آتا ہے اور جہاں حکم ہوتا ہے وہاں پہنچاتا ہے۔ فرشتے احکام لے کر آتے ہیں، برکات اور مصائب کا نزول ہوتا ہے، اسی طرح انسانوں کے اچھے اعمال فرشتے لے کر اوپر چڑھتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک لوگوں کی روحیں اوپر جاتی ہیں۔ ہر روز دنیا میں کروڑوں شہابوں کا اوپر سے نزول ہوتا ہے اور بخارات و دخان کا اوپر کو صعود ہوتا رہتا ہے۔ ستاروں اور سیاروں کی شعاعیں اور روشنیاں اس فضا میں آتی رہتی اور پھر پلٹ کر جاتی رہتی ہیں۔ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ تم جہاں ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے، ان کی جزا سزا ضرور دے گا۔ اللہ کی معیت بے کیف ناقابل بیان ہے کیونکہ اللہ معیت مکانی سے پاک ہے۔ کوئی مکان اس کو اپنے اندر نہیں سما سکتا یا معیت سے مراد ہے استحضار علمی۔

ملا سالدوا سمنانی، شیخ ابن عربی اور ان کے ہم خیال لوگ جو وحدت الوجود کے قائل ہیں آیت ہو الاول والآخر الخ سے اپنے قول پر استدلال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہو الاول وغیرہ کی ضمیریں اللہ کی طرف راجع ہیں۔ اللہ کی کسی خاص صفت کی طرف راجع نہیں ہیں۔ پھر معیت سے مراد استحضار علمی لینا بھی ضعیف تاویل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ ناقابل انکار مسلمہ ہے اللہ تھا اور اس کے ساتھ کچھ نہ تھا۔ وجود ایک ہی تھا اور اب بھی حقیقی وجود ایک ہی ہے۔ جس طرح وحدت کا کثرت میں ظہور ہوتا ہے۔ کثرت نام بار بار اکائی کو زبان پر لانے کا ہے۔ کثرت کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ ایک ایک دو، ایک ایک ایک تین۔ اسی طرح کروڑوں کی گنتی کا مبدء اکائی ہی ہے۔ یہی وحدت کبھی دو کا جامہ پہن لیتی ہے کبھی تین کا، کبھی اس سے زیادہ کا، غیر متناہی حد تک اسی طرح سلسلہ چلا جاتا ہے اور تمام کثرتوں کے باوجود وحدت اصلیہ باقی رہتی ہے اس میں کوئی تغیر نہیں آتا، پس اللہ واحد حقیقی ہے۔ اسی کی ذات عین وجود ہے۔ وجود واحد کے مظاہر بلاشبہ کثیر ہیں لیکن اس سے حلول کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ گمراہ ہیں وہ لوگ جو ممکن و واجب کے دو وجود مان کر پھر اتحاد الوجودین کے قائل ہیں یہ تو شرک ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ بھی جو وجود کو کلی مشکک کہتے ہیں اور اس کا فرد اکمل واجب کو اور فرد اضعف ممکن کو قرار دیتے ہیں اور گمراہ ہیں وہ لوگ بھی جو وحدت کا کثرت میں حلول مانتے ہیں اور خالق کا حلول مخلوق میں قرار دیتے ہیں۔ یہ افکار قطعاً مشرکانہ ہیں۔ وحدت وجود کا صرف یہی معنی ہے کہ وحدت خداوندی اپنی جگہ لازوال ہے لاکن

اعتباری کثرتیں ہو جائیں لیکن اللہ کی وحدت سب میں اپنے رنگ میں جھلک رہی ہے۔ ممکنات کے وجود کو مجازاً وجود کہتے ہیں۔ کل کائنات کا وجود مجازی ہے اور مجاز کے معنی ہی بے حقیقت ہونے کے ہیں۔ بس حقیقت ایک ہے۔ وہی حق ہے باقی سراب بے حقیقت ہے۔ اسی کی ذات کا جلوہ اور ظہور ہے جو نمودار ہے اور اسی کی حقیقت مستور ہے جہاں تک باوپائے عقل کی بھی رسائی نہیں۔ کوئی گنتی ہو اکائی سے شروع ہوتی ہے اور اکائی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اکائی ازلی ہے ابدی ہے سرمدی ہے۔ بس ہو الاول ہو الآخر ہی صحیح ہے۔ ایک بے شکل بے رنگ، بے کیف، بے کم لطیف ہستی جو اپنی انتہائی لطافت کی وجہ سے بطون کے پردے میں مستور ہے۔ نہ اس کا رنگ ہے نہ شکل نہ مقام نہ مقدار۔ وہ جوہریت اور عرضیت سے پاک ہے اور خصوصیتِ مادّہ سے منزہ۔ اس کے چہرے پر نور کے ستر ہزار حجاب پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ایک حجاب اٹھا دے تو اس کے لمعاتِ چہرہ سارے جہان کو سوختہ کر دیں۔ ظہورِ نور کی شدت ہی اس کے چہرے کے لئے نقابِ خفاء اور حجابِ بطون ہے۔ اس کو آسمانوں پر ڈھونڈو۔ پانسو برس کی مسافتِ نورانی طے کرو پھر بھی وہاں تک رسائی نہ ہوگی۔ پھر اسی طرح پانسو برس کی نورانی سیر چودہ مرتبہ کرتے جاؤ تب بھی اس کو سب پر حاوی اور سب سے مستور پاؤ گے۔ اگر زمین کے قعر میں ایک رسی لٹکاؤ اور طبقاتِ ہفت گانہ کو پھاڑ کر لٹکاتے رہو۔ تب بھی ایک مستور حقیقت پر وہ رسی پہنچے گی جس کو تم پکڑ نہ سکو گے۔ ہاں اس کو پانا ہو تو کثیف مادی شکلوں میں دیکھو۔ وہ لطافت محض جب مادی کثافت کا جامہ پہنے گی تو نمودار ہو جائے گی اس لئے ہمارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہو الظاہر ہو الباطن۔ جمہور مفسرین جو وحدتِ وجود کے منکر اور وحدتِ شہودی کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ ان آیات میں اللہ نے اپنے علم کی لامتناہی وسعت اور قدرت کی غیر محدود پہنائی کا ذکر کیا ہے۔ شروع سورت سے ہر لفظ پر غور کرو یہی حقیقت سامنے آئے گی۔ العزیز کا لفظ غلبۂ قدرت پر اور الحکیم کا لفظ علم صحیح پر دلالت کر رہا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ سے عَلَى الْعَرْشِ تک۔ پھر هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ سے عَلَى الْعَرْشِ تک۔ پھر لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ سے یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ تک۔ یہ تمام جملے اللہ کے کمالِ قدرت اور احاطۂ تخلیق و ربوبیت پر دلالت کر رہے ہیں۔ پھر آیت هُوَ الْاَوَّلُ کے بعد وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کا جملہ اور یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ سے دوسرے سبب کا۔ سورج کی شعاعوں کی گرمی سمندروں کے پانی کو بھاپ میں تبدیل کر دینے کا سبب ہے اور بھاپ کا چڑھنا سبب ہے تخلیقِ ابر کا اور ابر سبب ہے نزولِ بارش کا اور بارش کا پانی موجب ہے زمین کے اندر ہر قسم کے سبزے کی روئیدگی اور بالیدگی اور انہار و بحار کی روانی کا جتنا پانی بصورتِ تبخیر اوپر چڑھتا اور بادل بن کر برستا ہے۔ وہ سب کھیتوں باغوں، بنجر زمینوں اور ریگستانوں میں سما جاتا ہے۔ پھر یہی پانی زمین کے اندر پہنچ کر چشموں کی شکل میں اُبل کر اور آبشاروں کی صورت میں پھل کر دریاؤں میں جاتا اور بہہ کر سمندروں میں پہنچ جاتا ہے۔ سورج کی شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں، کائناتِ ارضی کو چمکاتی اور گرمی عطا کرتی ہیں دور کے کروں میں بھی پہنچتی ہیں۔ ان پر بھی مختلف قسم کے آثار پیدا کرتی پھر اس روشنی اور حرارت سے پھل پیدا ہوتے اور پختہ یا خام شکل میں جانوروں اور انسانوں کی غذا بنتے ہیں اور یہ نباتی غذا حیوانی جسم کو تحلیل شدہ اجزاء کا بدل فراہم کر کے بقائے جسم کا سبب بنتی ہے۔ غرض کوئی سبب ایسا نہیں جو کسی نتیجہ کا موجب نہ ہو اور کوئی نتیجہ ایسا نہیں جو سبب سے بے نیاز ہو لیکن اہلِ نظر کے مطالعہ کے لئے یہی تسلسلِ اسباب و نتائج کافی نہیں۔ وہ دیکھتے اور جانتے ہیں کہ اسباب و نتائج یہ باہم وابستگی خود نہیں بلکہ ایک ضابطۂ عامہ ہے جو سب کو باندھے ہوئے ہے۔ ان تمام اسباب کے پیچھے ایک مسبب ہے جو تخلیقِ اسباب و نتائج کر رہا ہے۔ اس دوری زنجیر کا ابتدائی اور آخری کنارہ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ تک ساری عبارت پھر آخر میں وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ فرمانا اللہ کے علم کی غیر محدود وسعت کو ثابت کر رہا ہے۔ اس تمام سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ہو الاول الخ میں بھی اللہ کے علم ازلی ابدی اور قدرت و حکمت کا ظہور و بطون ہی مراد ہے اور کلام حقیقت پر محمول نہیں ہے واللہ اعلم۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی

اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف سب امور لوٹ جائیں گے وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے (جس سے دن بڑا ہو جاتا ہے)

الْنَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

اور وہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے (جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے) اور وہ دل کی باتوں (تک) کو جانتا ہے۔

تفسیر لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ - اللہ ہی کی حکومت ہے تمام عالم بالا و پست پر وہی مالک اور سب اور حکمراں ہے کل کائنات کا اور اسی کی طرف سارے جہان کے تکوینی اور انتظامی امور کا رجوع ہے۔ شروع سورت میں اللہ کی حکومت عامہ کی انہی الفاظ کے ساتھ صراحت کی تھی۔ اس کے بعد ہو الذی خلق السموات الخ سے اللہ کا خالق کل ہونا ظاہر کیا۔ اب پھر ربوبیت کا اظہار اور تنزیہ کا اختتام کے بعد صورت میں ہو رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ خالق جہان بھی وہی ہے اور مالک بھی وہی ہے اور منتظم عالم بھی ہے سارے آسمانی یعنی عالم بالا ستارے سیارے اور خلا و فضا جو کچھ ہے سب پر اسی کی حکومت ہے اور زمین بھی اسی کے زیر اقتدار ہے۔ کل سنسار میں جو کچھ ہوتا ہے سب کی لگام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

یہ دنیا اور اس کے واقعات اسباب سے وابستہ ہیں۔ اسباب و نتائج کا سلسلہ منظم طور پر چل رہا ہے۔ ہر واقعہ نتیجہ ہے کسی سبب کا اور وہ سبب بھی نتیجہ ہے کسی کا۔ سب اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پس تمام مخلوق کا آغاز و انجام اسی کی طرف لوٹتا ہے اور سارے امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ - وہی رات کو گھٹا کر اس کا کچھ وقت دن میں داخل کر کے دن کو بڑھاتا ہے اور وہی دن کا کچھ حصہ گھٹا کر رات میں داخل کر دیتا ہے اور رات کو لمبا کر دیتا ہے۔ کبھی کے دن لمبے ہوتے ہیں کبھی کی راتیں۔ اسی طرح کہیں کے دن طویل ہوتے ہیں اور کہیں کی راتیں۔ پس جب یہ تمام تغیرات بے نتیجہ اور بے سبب نہیں ہیں اور ہر سبب نتیجہ کا حامل ہے تو انسانوں کے اعمال بے نتیجہ کیسے ہو سکتے ہیں

وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ - اور وہی دلوں کی باتیں جانتا ہے جو باتیں اور خیالات عالم ظہور میں نہیں آئے اور دلوں میں چھپے ہوئے ہیں اُن سے بھی وہ واقف ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ

تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور (ایمان لا کر) جس مال میں تم کو اس نے قائم مقام بنایا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو سو جو لوگ تم میں سے

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ

ایمان لے آئیں اور خرچ کریں اُن کو بڑا ثواب ہوگا اور تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے

وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

حالانکہ رسول تم کو اس بات کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور خود خدا نے تم سے عہد لیا تھا اگر تم کو ایمان

مُّؤْمِنِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰي عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ

لانا ہو وہ (رحیم) ایسا ہے کہ اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے تاکہ وہ تم کو

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا

(کفر و جہل کی) تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے اور بے شک اللہ تعالٰی تمہارے حال پر بڑا شفیق مہربان ہے　　اور تمہارے لئے اس کا کوئی سبب ہے کہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

تم اللہ کی راہ　میں خرچ نہیں کرتے　　حالاں کہ　　سب　آسمان　و　زمین -

تفسیر یوں تو اللہ نے جب دانش و خرد اور حواس باشعور عطا فرما دیئے تو انسان اللہ کو ماننے اور ایک سمجھنے کا مکلف ہو گیا یعنی ایک ایسی طاقت یا خالق کو ماننا جو سارے جہان کو ایک ضابطہ میں باندھے ہوئے ہے۔ فطرت انسانی کا تقاضہ ہے لیکن تفصیلی ایمان میں انسانی دانش قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور گمراہی کی وادی میں سرگرداں رہتی ہے، اس لئے رسول کی اور رسول کی رسالت سے اللہ کی طرف سے نازل شدہ واضح عقائد اور کھلے ہوئے مفید احکام کی ہر آدمی کو ضرورت ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے اور رسول کے بیان کئے ہوئے دستوری احکام کو پھیلانے اور مضبوط کرنے کے لئے مال صرف کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ان آیات میں انہی تینوں امور کو ایک عجیب دل نشین ثبوت کے ساتھ بیان فرمایا۔ سب سے پہلے حکم ہے ایمان لاؤ یعنی اللہ کی ذات اور تمام خصوصی صفات کو مانو مگر اللہ پر صحیح ایمان بغیر رسول پر ایمان لانے کے نہیں ہو سکتا اس لئے رسول کو بھی سچا مانو۔ پھر ایمان کے بعد (نظریۂ ایمان کو پھیلانے اور مضبوط رکھنے کے لئے) راہ ایمان میں بقدر ضرورت مال بھی خرچ کرو۔ نماز روزہ، حج اور دوسرے فرائض بھی ضروری ہیں، لیکن ایمان کی اشاعت و استحکام و حفاظت مالی صرف پر موقوف ہے۔ اس لئے ایمان لاؤ اور راہ خدا میں مال بھی صرف کرو اور یہ سمجھ لو کہ اس مال کے نہ تم خالق ہو، نہ حقیقی مالک۔ اللہ نے تمہارے قبضہ میں اس لئے دے دیا ہے کہ تم اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کو صرف کرو۔ حقیقت میں یہ مال خدا کا ہے پھر ہمیشہ سے نہ تم تھے نہ تمہارا یہ مال بلکہ جس طرح اپنے باپ دادا پر دادا کے ان کے جانشین بنے اسی طرح باپ دادا کی میراث پھر یا کسب کے ذریعہ سے دوسروں کے ہاتھوں سے تم کو اللہ نے یہ مال دیا ہے اور دوسروں کی جگہ تم کو اس پر قبضہ عطا فرمایا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایمان کے بعد تم اس کو اللہ کے جاتے ہوئے راستوں میں خرچ نہ کرو۔ جو لوگ ایمان دار ہیں اور پھر راہ مولیٰ میں ضروری مال خرچ کرتے ہیں ان کو بڑا معاوضہ ملے گا۔ دنیا میں بھی (بحیثیت قوم) اور آخرت میں بھی (بحیثیت فرد) جب رسول آگئے اور انہوں نے اللہ کی طرف اور رب کو ماننے کی دعوت دی اور اللہ کے نازل کردہ ایسے احکام تم کو بتا دیئے جن کی سچائی اور افادیت کھلی ہوئی ہے۔ اور اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جن تاریکیوں اور غلطی افکار و اعمال کی اندھیریوں میں تم پھنسے ہوئے ہو۔ ان سے نکال کر صحیح علم و عمل کی روشن فضا میں تم کو پہنچا دیا جائے اور یہی وہ تعلیم ہے جس کا عہد تم نے ازل کے دن بھی کیا تھا جب اللہ نے تم سے پوچھا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تو تم نے کہا تھا اور انسان کی فطرت بلکہ کل کائنات کی متحرک و ساکن ہستی بھی اس تعلیم کی صداقت کی گواہی دے رہی ہے اور فطری طور پر تم بھی اس تکوینی عہد کے پابند ہو تو پھر کیا وجہ کہ تم رسول پر ایمان نہ لاؤ۔ اگر تم کو اللہ پر ایمان کا دعویٰ اور اقرار ہے تو رسول کو بھی سچا مانو۔ یہ تو اللہ کی بڑی مہربانی اور رحمت ہے کہ اس نے تم کو تاریکیوں سے نکال کر سطح نور تک پہنچانے کے لئے کھلے ہوئے مفید عقائد و احکام دے کر رسول کو بھیج دیا۔ یہ بھی سمجھ لو کہ کسی کا مال باقی رہنے والا نہیں ہے۔ آسمان و زمین کی وراثت و ملکیت اللہ ہی کی ہے۔ سب لوگ آتے ہیں اور دنیا پر قبضہ جماتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، اس لئے مال کو اس طرح صرف کرنا کہ صرف کے بعد اس کا معاوضہ تم کو مل جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ مال دوسروں کے لئے چھوڑ جاؤ اور مرنے کے بعد اس کا کچھ بدل تمہارے ہاتھ نہ لگے۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ لوگوں نے ایک بکری ذبح کی (اور اس کا گوشت لوگوں کو کھلا دیا) رسول اللہ صلعم نے فرمایا کیا دینے کے بعد کچھ گوشت باقی بچا ہے۔ ہم نے عرض کیا صرف ایک شانہ بچا ہے۔ فرمایا (یوں کہو کہ) ایک شانہ کے علاوہ سب گوشت وغیرہ بچ گیا۔ (رواہ الترمذی و صححہ)

حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ تم میں سے کون ایسا ہے جس کو وارث کا مال اپنے مال دار ہونے سے زیادہ پسند ہو۔

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے تو ہر ایک کو اپنا مالدار ہونا وارث کے مالدار ہونے سے زیادہ پسند ہے۔ فرمایا تو اپنا وہی مال ہے جو اپنی زندگی میں مرنے سے) پہلے بھیجدیا اور وارث کا مال وہ ہے جس کو چھوڑ گیا۔ (رواہ البخاری والنسائی)

لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً

آخر میں اللہ ہی کا رہ جاوے گا جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے

مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا

ہیں جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ

سب اعمال کی پوری خبر ہے کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض کے طور پر دے پھر خدا تعالیٰ اس (دیئے ہوئے ثواب) کو اس شخص کے لئے بڑھاتا چلا جائے

وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

اور اس کے لئے اجر پسندیدہ ہے۔

تفسیر فتح مکہ سے پہلے مسلمان بہت تنگ حالی، ناداری، اعداء کی کثرت اور قدم قدم پر شدت و مصیبت کے دور سے گزر رہے تھے۔ نہ ملکی تجارت ان کے ہاتھوں میں تھی، نہ مالِ غنیمت کا حصول، یہودی بغلی گھونسا بنے ہوئے تھے اور منافق مارِ آستین تھے۔ فتح مکہ کے بعد یہ حالات بہت کچھ بدل گئے۔ یہودیوں کی ہمت بھی پست ہو گئی، اعراب کا خطرہ بھی نہیں رہا، قبائل کا زور بھی ایک حد تک ٹوٹ گیا۔ مسلمان کسی قدر فارغ البال بھی ہو گئے اس لئے فتح مکہ سے پہلے مومن مجاہدوں کے مرتبہ کو بعد کو ایمان لانے اور جہاد کرنے والے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ اگرچہ ہر مومن مجاہد سے (خواہ فتح مکہ کے بعد وہ ایمان لایا ہو اور جہاد میں شریک ہوا ہو) اللہ نے ثواب آخرت کا وعدہ کیا ہے (اور جو شخص بھی ایمان کے ساتھ بہ امید اجر اللہ کی راہ میں خرچ کرے اللہ اس کا بدلہ دینا اپنے اوپر قرض قرار دے گا اور قرض بھی ایسا کہ کتنے ہی گنا اس کو اجر عطا فرمائے گا۔ پھر بھی فتح مکہ سے ایمان لانے والے مجاہدوں جنہوں نے راہِ خدا میں اپنا مال صرف کیا درجہ بہت بڑا ہے۔ اجر کریم سب کو ملے گا۔ لیکن عظمت مرتبہ صرف قبل از فتح مکہ مسلمانوں کو مضبوط بنانے اور قوتِ جہاد کو مستحکم کرنے والوں کو حاصل ہوگی۔

اکثر مفسرین کے نزدیک الفتح سے مراد فتح مکہ ہے شعبی کے نزدیک صلح حدیبیہ مراد ہے کیونکہ آیت انا فتحنا لک فتحا مبینا میں صلح حدیبیہ کو ہی فتح مبین قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسند احمد کی بعض روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ بغوی نے کلبی کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق ہوا۔ آپ ہی سب سے پہلے ایمان لائے اور آپ ہی نے سب سے پہلے اپنا مال راہِ خدا میں صرف کیا۔

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ قدس سرہٗ نے لکھا ہے کہ آیت کی صریحی عبارت دلالت کر رہی ہے کہ وہ انصار و مہاجرین جو فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور راہِ خدا میں اپنا مال صرف کیا۔ ان کا درجہ فتح مکہ سے بعد کو ایمان لانے والے مسلمانوں سے بہت بڑا ہے اور آیت کے مفہوم و رفتار سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق تمام صحابہ سے اور باقی صحابہ دورِ صحابیت سے بعد والے مسلمانوں سے افضل ہیں کیونکہ آیت کی عبارت کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت اور برتری کا معیار سبقت اسلام، راہِ خدا میں انفاق اور جہاد ہے اور یہ اوصاف صحابہ کو بعد والے لوگوں سے زیادہ حاصل تھے اور حضرت ابوبکر تمام صحابہ سے پہلے ان اوصاف کے حامل ہوئے۔ آپ سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام کی مدد

کے لئے مال صرف کیا۔ حضرت زبیر بن عوام کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر جس وقت مسلمان ہوئے اس وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے جو آپ نے سب کے سب رسول اللہ صلعم کی مدد کے لئے راہ خدا میں (سب سے پہلے) صرف کر دیئے۔ آپ کی تبلیغ سے قریش کے متعدد بڑے بڑے سردار مسلمان ہو گئے۔ بنی عبد الشمس کے سردار حضرت عثمان بن عفان بنی اسد کے سردار حضرت زبیر بن عوام، بنی زہرہ کے دو سردار حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمن بن عوف، بنی تیم کے سردار حضرت طلحہ بن عبیداللہ یہ سب حضرات وہ تھے جن کو زندگی ہی میں نام بنام رسول اللہؐ نے جنتی ہونے کی بشارت دیدی تھی۔ ایسے جلیل القدر صحابہ حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغ سے ہی دائرۂ اسلام میں آئے تھے۔ ابوالحسن اشعری نے کہا۔ تمام صحابہ پر حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت قطعی ہے۔ مفسر مظہری نے لکھا ہے سلف کا اس پر اجماع ہے۔ صرف ابن عبدالبر نے لکھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی کے درمیان، فضیلت کے مسئلہ میں سلف کا اختلاف ہے لیکن یہ قول تنہا ابن عبدالبر کا ہے۔

حضرت ابوبکر کے فضائل و مناقب احادیث صحیحہ میں بکثرت مذکور ہیں۔ یقرض اللہ۔ اللہ کو قرض دینے کا معنی ہے اللہ کے بندوں کو باخلاص نیت دینا اور خلوص دل سے راہ خدا میں صرف کرنا۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم

جس دن آپ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا آج تم کو

بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ

بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا

ہے (اور یہ وہ دن ہوگا) جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے (اہل صراط پر) کہیں گے کہ (ذرا) ہمارا انتظار

نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُم

کرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کریں ان کو جواب دیا جائے گا تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر (وہاں سے) روشنی تلاش کرو پھر ان (فریقین) کے درمیان میں

بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ

ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ (بھی) ہوگا (جس کی کیفیت یہ ہے کہ) اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب کی طرف عذاب ہوگا یہ منافقین ان کو

أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ

پکاریں گے کہ کیا (دنیا میں) ہم تمہارے ساتھ نہ تھے وہ مسلمان کہیں گے کہ ہاں تھے تو سہی لیکن تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور تم منتظر رہا کرتے تھے اور اسلام کے حق

الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ

ہونے میں تم شک رکھتے تھے اور تم کو تمہاری بیہودہ تمناؤں نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آ پہنچا اور تم کو دھوکہ دینے والے (یعنی شیطان) نے اللہ کے ساتھ دھوکہ میں ڈال رکھا

فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

(قبول) کیا جائے گا غرض یہ کہ نہ تم سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کافروں سے تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمہارا رفیق ہے اور وہ (واقعی) برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر مومن مردوں اور مومن عورتوں کے سامنے قیامت کے دن پل صراط اور تمام تاریک مقامات پر ایمان اور طاعات کا نور چمکتا ہوگا اور اس نور کے ساتھ ساتھ اہل ایمان جنت تک پہنچ جائیں گے۔ اہل جنت کی یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ رہے کافر اور منافق تو وہ سخت تر برترین اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہوں گے۔ دنیا میں ایمان و طاعت کی راہ پر چلنا ان کو نصیب نہ تھا۔ قیامت کے دن راہ جنت ان سے گم ہوگی اور تاریک راہ ان کو جہنم میں پہنچا دے گی۔ مومنوں سے وہ درخواست کریں گے کہ اپنے نور کا کچھ حصہ ہم کو بھی دے دو۔ مومن کہیں گے جس جگہ نور کی تقسیم ہو رہی ہے وہاں لوٹ کر جاؤ اور وہاں نور کی تلاش کرو۔ اس گفتگو کے درمیان مومنوں اور غیر مومنوں کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ دروازہ کے اندر سراسر رحمت اور باہر عذاب ہوگا۔ منافق کہیں گے کیا دنیا میں ہم تمہارے ساتھی نہیں تھے (کیا تمہارے ساتھ مل کر نمازیں نہیں پڑھتے تھے، جہاد میں شریک نہیں ہوتے تھے) مومن جواب دیں گے بیشک تم ہمارے ساتھ تھے لیکن (نفاق کی وجہ سے) تم نے خود اپنے کو ہلاک کر دیا اور مسلمانوں پر مصائب کے چکر پڑنے کے منتظر رہے۔ اور (دین کے معاملے میں) شک میں پڑ گئے۔ تم کو انہی تمناؤں اور مسلمانوں کی تباہی کی آرزو نے مرتے دم تک فریب میں رکھا اور شیطان نے تم کو دھوکا دیا۔ آج تم کو اور کافروں کو کوئی رہائی نہیں دلا سکتا اور عذاب سے چھوٹنے کے لئے تم سب کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا جا سکتا تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ یعنی ان کے ایمان اور طاعتیں نور بن کر پل صراط اور تاریک مقامات پر مومنوں کی قائد ہوں گی اور جنت تک لے جائیں گی۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آگے آگے اور دائیں جانب نور کے دوڑنے سے مراد ہے۔ ہر طرف سے نور کا احاطہ کر لینا۔ رسول اللہ صلعم جب نماز کے لئے برآمد ہوتے تھے تو فرماتے تھے اے اللہ میرے دل میں نور کر دے، میری آنکھوں میں نور کر دے، میرے کانوں میں نور کر دے، میرے دائیں نور کر دے، میرے بائیں نور کر دے، میرے اخلاق کو نور کر دے اور مجھے (سراسر) نور بنا دے۔ رواہ الشیخان وابوداؤد والنسائی۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ اس سے آگے حضور نے فرمایا۔ میری زبان میں نور کر دے، میرے پیچھے نور کر دے، میرے آگے سے نور کر دے، میرے اوپر سے نور کر دے اور میرے نیچے سے نور کر دے، مجھے نور عطا فرما۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن مومن کے لئے ہر طرف سے نور ہی نور ہوگا۔ آیت میں دو سمتوں کی تخصیص غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ خوش نصیب لوگوں کو ان کے اعمالنامے سامنے سے اور دائیں جانب سے ہی دیئے جائیں گے اور بدنصیب لوگوں کو پیچھے سے اور بائیں جانب سے دے دیئے جائیں گے۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا۔ نور تو آگے آگے رواں دواں ہوگا اور اعمالنامے دائیں ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مومنوں کا نور بقدر اعمال ہوگا۔ بعض لوگ پل صراط سے ایسی حالت میں گزریں گے کہ ان کا نور پہاڑ کے برابر ہوگا۔ بعض کا نور درخت کھجور کے برابر اور کم سے کم نور والا وہ شخص ہوگا جس کے صرف انگوٹھے میں نور چمکتا ہوگا کبھی چمکے گا کبھی بجھے گا۔

اسباب نور و ظلمت

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت بریدہ کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو لوگ تاریکیوں میں پیدل چل کر مسجدوں کو جاتے ہیں۔ ان کو قیامت کے دن پورا نور ملنے کی بشارت دے دو۔ اسی کی ہم معنی حدیث حضرات سہل بن سعد، زید بن حارثہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، حارثہ بن وہب، ابو امامہ، ابوالدرداء، ابوسعید، ابوموسیٰ، ابوہریرہ اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم

سے بھی مروی ہے۔

امام احمد اور طبرانی نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس نے نمازوں کی پابندی کی قیامت کے دن یہ نمازیں اس کے لئے نور اور برہان اور نجات ہو جائیں گی اور جس نے نمازوں کی پابندی نہیں کی اس کے لئے قیامت کے دن نہ نور ہوگا، نہ برہان نہ نجات اور وہ بروز قیامت قارون فرعون اور ہامان کے ساتھ ہوگا۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جمعہ کے روز جو شخص سورۂ کہف پڑھے گا قیامت کے دن اس کے قدموں کے نیچے سے ایک نور چمک کر بادلوں تک پہنچ جائے گا۔ دیلمی نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجھ پر درود پل صراط پر نور ہوگی۔

طبرانی نے حضرت ابو امامہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ حالت اسلام میں جس کے بال سفید ہو گئے (بوڑھا ہو گیا) یہ سفیدی قیامت کے دن اس کے لئے نور ہوگی۔

شیخین نے حضرت ابن عمر کی روایت سے مسلم نے حضرت جابر کی روایت سے، حاکم نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر کی روایت سے اور طبرانی نے ابن زیاد کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ظلم کرنے سے بچتے رہو۔ قیامت کے دن ظلم تاریکیاں ہو جائے گا۔

بُشْرٰىكُمُ یعنی استقبال کرنے والے فرشتے کہیں گے تمہارے لئے جنتوں کی بشارت ہو۔

انْظُرُوْنَا ہمارا انتظار کرو، ذرا ٹھہرو۔ قاموس میں ہے نَظَرَ اور اِنْتَظَرَ اور تَنَظَّرَ (تینوں کا معنی ہے) ذرا ٹھہرا۔

نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ یعنی تمہاری وجہ سے ہم بھی روشنی میں آجائیں اور تمہارے نور میں ہم بھی چلیں۔ اللہ نے کافروں اور منافقوں کو نور ایمان عطا نہیں فرمایا۔ قیامت کے دن بھی ان کے لئے نور نہ ہوگا۔ اللہ نے فرمایا ہے ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔

حضرت ابو امامہ باہلی کی ایک طویل حدیث میں آیا ہے کہ ایک شدید ظلمت لوگوں پر چھا جائے گی۔ پھر مومن کو نور عطا فرما دیا اور کافر و منافق کو (تاریکی میں) چھوڑ دیا جائے گا (ابن ابی حاتم)

بعض احادیث اور حضرت ابن عباس وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کو بھی شروع میں دھوکہ دینے کے لئے کچھ نور دیا جائے گا۔ پھر جب وہ اس نور میں چلیں گے تو نور کو بجھا دیا جائے گا۔ اس قسم کی ساری روایات مخدوش و مجروح ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ کافروں اور منافقوں کو قیامت کے دن نور دیا ہی نہ جائے گا اور وہ مومنوں سے کچھ نور چھیننا چاہیں گے مگر مومنوں کی طرف سے انکار کر دیا جائے گا۔

بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ. بغوی نے حضرت عبد اللہ بن عمر کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جس سور کا قرآن میں ذکر ہے وہ بیت المقدس کی شرقی دیوار ہے۔ کعب نے کہا۔ باب سے مراد بیت المقدس کا باب رحمت ہے۔ یہ سب اسرائیلی خیالات ہیں۔ حقیقت میں سور سے مراد ہے مومنوں اور غیر مومنوں کے درمیان کی حد فاصل جس کے اندرونی جانب رحمت اور بیرونی جانب عذاب ہوگا۔

وَتَرَبَّصْتُمْ اور تم منتظر تھے کہ مسلمان مصائب کے چکر میں آجائیں اور آرزومند تھے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات جلد ہو جائے اور تمہاری گلو خلاصی ہو جائے۔

وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ اور تمہاری انہی خام خیالیوں نے تم کو فریب دے رکھا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں اللہ کا حکم یعنی مرنے کا وقت آ گیا۔

وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ اور اللہ کے متعلق تم کو فریبی یعنی شیطان نے فریب دیا تھا کہ اللہ تم کو عذاب نہیں دیگا اور یہ بھی کہا تھا کہ نہ قیامت ہوگی نہ اعمال کا محاسبہ

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور

يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) ان پر زمانہ دراز گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر ان کے دل خوب

وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فٰسِقُونَ ○ اِعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ

سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت آدمی ان میں کے (آج) کافر ہیں۔ یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے خشک ہونے کے پیچھے زندہ کر دیتا ہے ہم نے تم سے اس کے نظائر

بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

بیان کر دیئے تاکہ تم سمجھو

تفسیر حضرت ابن مسعود کا مقولہ ہے کہ ہمارے اسلام کو چار سال نہیں گزرے تھے کہ یہ عتاب آگیں آیت نازل ہوئی (اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت مکی ہے) حضرت ابن عباس نے فرمایا نزولِ قرآن سے تیرہویں سال کے ختم پر اس آیت عتاب کا نزول ہوا جبکہ مسلمانوں کے دلوں میں کچھ سستی پیدا ہو گئی تھی۔ ابن مبارک نے الزہد میں بوساطت سفیان، اعمش کی روایت بیان کی ہے کہ مسلمان جب مدینہ میں ہجرت کے بعد پہنچے تو ان کو خوش عیشی حاصل ہوئی۔ پہلے مشقت اور تکلیف کی زندگی گزار رہے تھے اب کچھ سکھ ملا تو اپنے بعض گزشتہ فرائض سے سست پڑ گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے بروایت سدی قاسم کا بیان نقل کیا ہے کہ صحابہ نے (اپنے دلوں میں) کچھ بے چینی یا اکتاہٹ محسوس کی تو رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کوئی حدیث بیان فرمائیے۔ اس پر آیت اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ نازل ہوئی۔ پھر کچھ مدت کے بعد کچھ تنگیٔ دل محسوس کی اور رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث بیان کرنے کی درخواست کی تو آیت اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ الخ نازل ہوئی۔ بغوی نے کلبی اور مقاتل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت منافقوں کے حق میں نازل ہوئی۔ ہجرت سے سال بھر کے بعد ایک روز منافقوں نے حضرت سلمان فارسی سے درخواست کی کہ توریت کی کوئی بات بیان کیجئے۔ توریت کے اندر تو عجیب واقعات بھرے ہوئے ہیں۔ اس پر آیت نحن نقص علیك احسن القصص نازل ہوئی۔ حضرت سلمان نے بتا دیا کہ قرآنی بیان میں جو حسن ہے وہ اور کسی میں نہیں۔ منافق چپ ہو گئے۔ کچھ مدت کے بعد پھر حضرت سلمان سے حسبِ سابق سوال کیا تو اللہ نے آیت اللّٰہ نزل احسن الحدیث الخ نازل فرمائی۔ یہ آیت سن کر منافقوں نے کچھ مدت تک کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک مدت کے بعد پھر وہی درخواست کی جو پہلے کی تھی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ کلبی اور مقاتل کے اس بیان پر الذین آمنوا سے مراد وہ مسلمان ہوں گے جو زبان سے بظاہر تو اسلام لے آئے لیکن ان کے دلوں میں نرمی نہیں پیدا ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ مومنوں کے لئے کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ذکرِ خدا اور نازل شدہ قرآن سے ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جائے اور احکامِ خداوندی کی پابندی خشوعِ قلب سے کریں اور گزشتہ امتوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کے دل اس وجہ سے سخت پڑ گئے کہ زمان کے (اور انبیاء کے درمیان کی) مدت طویل ہو گئی اور ان میں بہت لوگ بدکار نافرمان ہو گئے۔ یہ جان رکھو کہ زمین جب (موسم بارش کے دور ہو جانے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے) مردہ خشک بنجر ہو جاتی ہے تو اللہ پھر (پانی برسا کر) اس کو زندہ یعنی سرسبز کر دیتا ہے (پس اسی طرح ذکر، تلاوت اور وعظ و نصیحت سے مردہ دلوں کو زندگی بخش دیتا ہے) آیات کو کھول کھول کر ہم نے اسی لئے بیان کیا ہے کہ تم ان کو سمجھو (اور تمہارے دلوں کی سختی دور ہو)

ذکر اللہ سے مراد ہے وعظ و نصیحت (ابن کثیر) یا ذکرِ خداوندی۔ اور حق سے مراد ہے قرآن مجید (مظہری)

اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ سے یہودی اور عیسائی مراد ہیں۔ (تفسیر مظہری)

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ

بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور یہ (صدقہ دینے والے) اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں وہ صدقہ (باعتبار ثواب کے) ان کیلئے

أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ

بڑھا دیا جائیگا اور ان کیلئے اجر پسندیدہ ہے اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق

عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

اور شہید ہیں ان کے لئے (جنت میں) ان کا اجر (خاص) اور (صراط پر) ان کا نور خاص ہوگا اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

ع ۹ ۱۸

یہی لوگ دوزخی ہیں

تفسیر جو لوگ محتاجوں مسکینوں اور ضرورت مندوں کو اپنی حلال کمائی میں سے نیک نیتی کے ساتھ راہِ خدا میں بطور خیرات دیتے ہیں اور اللہ کے مستحق بندوں کو دے کر یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم نے یہ مال اللہ کے پاس جمع کر دیا گویا خدا کو قرضہ حسنہ دے دیا اور قرض کی ادائیگی ہر صاحب استطاعت مقروض پر لازم ہوتی ہے خصوصاً جس کو اللہ اپنے ذمہ اس کو قرض قرار دے۔ پس اللہ قیامت کے دن بہت بڑھا چڑھا کر اس کا عوض عطا فرمائے گا اور اجر کریم عنایت فرمائے گا۔ دس گنا سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زائد جتنا اللہ چاہے گا اپنی مہربانی سے مرحمت فرمائے گا۔ لیکن بغیر ایمان کے کوئی خیرات اور صدقہ قبول نہیں۔ پس جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں اللہ کی کتاب اور پیغمبر کی رسالت کو سچا جانتے اور دونوں کے احکام کی پیروی و پابندی کرتے ہیں اور اس تصدیق کی زبانی اور کانی شہادت دیتے ہیں وہی صدیق اور شہید ہیں۔ قیامت کے دن میدان حشر اور پل صراط پر اللہ ان کو راہ نجات اور سبیل جنت دکھانے کیلئے ایک خاص نور عطا فرمائے گا اور ان کی کوششوں اور محنتوں کا اجر عظیم عنایت کرے گا۔ رہے منکر خدا و رسول اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے وہ ہمیشہ بھڑکتی آگ میں رہیں گے کبھی دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔

تنقیح مبحث

صدیق و شہید کا اطلاق تین قسم کے آدمیوں پر ہوتا ہے۔ (۱) وہ شخص جن کا اللہ اور رسول اور ان کے احکام پر ایمان ہو اور وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت خلوص قلب کے ساتھ دیتے ہوں۔ وہ صدیق بھی ہیں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے والے اور شہید بھی ہیں توحید و رسالت کی شہادت دینے والے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر مجاہد اور عمرو بن میمون نے کہا کہ جو شخص کی وجہ سے ایک نویں آدمی کو بھی ان کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ یعنی حضرت عمر جو نبوت کے چھٹے سال ایمان لائے تھے۔

تعجب ہے کہ مجاہد نے عبدالرحمن بن عوف کا ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ بھی سابقین فی الاسلام میں داخل تھے۔ اس کے علاوہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تمام فرقہ ہائے اسلام کے نزدیک مسلمہ صدیقہ تھیں اور اول ترین مؤمنہ تھیں۔ سب سے پہلے رسول اللہ صلعم نے آپ کو ہی اپنی نبوت کی (جو اس وقت ایک حادثہ کی شکل میں نمودار ہوئی تھی) اطلاع دی تھی اور اپنی وفات کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے حضور کو تسلی دی تھی۔ پھر ورقہ بن نوفل کے پاس

لے کر گئی تھیں اور ورقہ نے ناموس اکبر کے آنے کی تصدیق کی تھی اور حضور کی نبوت کو سچا جانا اور مانا تھا لیکن مجاہد نے حضرت ورقہ کو بھی سابقین فی الاسلام میں شمار نہیں کیا۔ پھر قرآن نے سابقین فی الاسلام میں جس طرح بعض مہاجرین کو داخل کیا ہے اسی طرح بعض انصار کو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا ہے جس کے مصداق وہ انصار ہیں جو مخفی طور پر عکاظ کے میلہ میں شریک ہونے کے زمانہ میں ایمان لائے تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والے حضرت ابو عبیدہ بن جراح بھی تھے اور ان کو بھی عشرۂ مبشرہ میں باجماع امت فرمانِ نبوی کی زیر صراحت شمار کیا گیا ہے۔ آپ کو بھی سبقتِ اسلامی حاصل تھی، اس لئے اگر سبقتِ اسلامی کو معیارِ صدیقیت اور مراد شہادت قرار دیا جائے تو ان سب حضرات کے نام صدیقین و شہداء کی فہرست میں نمبر اول پر ہونا چاہیئے۔

وَالشُّهَدَآءُ ۔ شہداء شہید کی جمع ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول کی شہادت دینے والے، یا وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی امتوں پر خدا کے سامنے قیامت کے دن شہادت دیں گے۔ حضرت ابن عباس مسروق اور علماء کی ایک جماعت کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ اس صورت میں شہداء سے مراد صرف انبیاء ہوں گے۔ اللہ نے انبیاء کے متعلق ہی فرمایا ہے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا مقاتل بن سلیمان کے نزدیک راہِ خدا میں شہید ہونے والے مراد ہیں۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ تمام اہلِ ایمان مسلمان بھی مراد ہونے کا احتمال ہے، کیونکہ ساری امتِ اسلامیہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں

الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ

ایک کا دوسرے سے زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو

مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ

زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے

اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ

مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکے کا اسباب ہے تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کی برابر ہے وہ ان لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس

بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں اور اللہ بڑے فضل والا ہے

تفسیر دنیوی مال و متاع کی ناپائیداری بے مقداری اور فنا پذیری کو ظاہر کرنے اور بخل سے نفرت دلانے اور صدقہ و خیرات کی ترغیب دینے کے لئے فرمایا۔ خوب جان لو کہ وہ سامان و مال دنیا جو آخرت میں کام نہ آئے محض کھیل ہے۔ ناکارہ بے فائدہ اور آخرت کی طرف سے غافل بنانے والا ہے اور صرف دکھاوٹ کی سجاوٹ ہے۔ خوبصورت لباس حسین اور پرشوکت فرنیچر اور دیدہ زیب و دلکش استعمال کا سامان اور حسین و جمیل نسبت کی ہوتی زمین دوز اور فلک فرسا عمارتیں اور آپس کا نسبی و قومی تفاخر اور مال و اولاد کی کثرت میں باہمی مقابلہ غرض وہ تمام سامان جو آخرت میں کام آنے والا نہیں ہے محض متاعِ فریب ہے۔ ناپائیدار فنا ہو جانے والا جیسے بارش سے زمین سرسبز ہو جاتی اور لہلہانے لگتی ہے کاشتکار بڑے خوش ہوتے ہیں کہ کیسی اچھی ہری ہری فصل ہے پھر ایک گرم لو کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں، ہری کھیتی خشک ہو جاتی ہے اور لہلہاتے پودے سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے اور بھوسہ بن جاتے ہیں اور نتیجہ میں خسرانِ دنیا اور آخرت کے عذاب شدید کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ جس کھیتی پر غرور کیا تھا وہ بادِ سمیم کی نذر ہو جاتی ہے اور جس غرور کی وجہ سے آخرت کا انکار کیا تھا اس کا وبال سر پر سوار رہتا ہے۔

لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ دنیا کا یہی ساز و سامان اور مال و دولت اللہ کی خوشنودی اور گناہوں کی مغفرت حاصل ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اگر اس کو راہِ خدا میں حکمِ خداوندی کے موافق خرچ کیا جائے اور کنجوسی کے ساتھ جوڑ جوڑ کر نہ رکھا جائے۔ پس اللہ کے نافرمانوں کے لئے یہ عذابِ شدید کا موجب ہے اور اللہ کے دوستوں کے لئے رضوانِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا تم اے اہلِ ایمان اللہ کی طرف دوڑو، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش اور مغفرت و جنت تک پہنچنے میں باہم مسابقت سے کام لو جنت کسی معمولی باغ کا نام ہے بلکہ اس کی وسعت آسمان و زمین کی درمیانی کشائش کی طرح اور اس کی چوڑائی (لمبائی کا تو ذکر ہی کیا ہے) آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے اور یہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس اے اہلِ ایمان اپنے رب کی طرف گناہوں کی مغفرت اور جنت کے حصول کے لئے تیزی کے ساتھ دوڑو اور یہ سمجھ لو کہ مغفرت اور جنت محض اللہ کی مہربانی ہے۔ وہ جس کو چاہے گا اپنے فضل سے نوازے گا۔ یعنی تمہارا کوئی لازمی حق نہیں ہے کہ جنت میں تم کو داخل کرنا خدا پر واجب ہو بلکہ اس کی یہ عنایت و رحمت ہے۔ اس مضمون کی تائید بخاری و مسلم کی ان احادیث سے ہوتی ہے جو صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ کی روایتوں سے اور صرف مسلم نے حضرت جابر کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت ابو سعید کی روایت سے اور بزار نے حضرت ابو موسیٰ اور حضرت شریک بن طارق کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت اسامہ بن شریک اور حضرت اسد بن کرز کی روایت سے بیان کی ہے۔ مذکورہ تمام احادیث قریب المعنیٰ ہیں۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے بل پر جنت میں نہیں جائے گا بلکہ اللہ اپنی مہربانی سے نیک اعمال کے بدلے میں جنت عنایت فرمائے گا۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوحِ محفوظ میں) لکھی ہے قبل اس کے کہ ہم

اَنۡ نَّبۡـرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰ لِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۖ ۚ ۝ لِّـكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا

ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (یہ بات ہم نے اس واسطے دی ہے) تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ

تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ ۝ اۨلَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ

کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا جو ایسے ہیں کہ (حب دنیا کی وجہ سے) خود

وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۗ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

بخل کیا کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہیں اور جو شخص اعراض کرے گا (دین حق سے) تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں سزاوار حمد ہیں۔

تفسیر انسان کو مال و منال مل جاتا ہے تو اتنا خوش ہوتا ہے کہ اکڑ جاتا ہے، اترانے لگتا ہے، چال ڈھال سے غرور و فخر ٹپکنے لگتا ہے اور اگر کوئی آفت آ جاتی ہے کھیتی خشک ہو جاتی ہے، باغ سوکھ جاتے ہیں، کال پڑ جاتا ہے یا سیلاب سے حرث و نسل تباہ ہو جاتی ہے، بیماری آ جاتی ہے تو علاج کے لئے پیسہ نہیں ہوتا، بلا پیسہ نہ کوئی علاج کرتا ہے نہ دوا ملتی ہے نہ غذا، نہ خدمت، کوتاہ نظر انسان کی نگاہ صرف ظاہری اسباب پر ہوتی ہے اس لئے وہ مال کو جان کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ اس کا جذبۂ ہمدردی مردہ ہو جاتا ہے۔ کنجوسی اس پر مسلط ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر دکھ سکھ اور صحت و بیماری اور مالداری و ناداری اور موت و زندگی ہر چیز موجود ہونے سے پہلے اللہ کی ازلی لوحِ علمی میں لکھی ہوئی ہے جو کچھ تخلیقِ عالم سے پہلے لکھ دیا گیا ہے۔ وہ تو بہرحال ہونا ہے اس لئے ناداری کے خوف سے ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں بخل سے کام لینا حماقت ہے۔ زمین پر جو مصیبت آتی ہے خشک سالی ہو یا سیلاب یا عمومی وبا ہو یا زلزلے یا برق و باراں کی تباہ کاری سب کچھ تحریرِ ازلی کے موافق ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان جن جسمانی حوادث کا شکار ہوتا ہے یا اس پر امراض و موت کا تواردہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اللہ ہی کی کتاب میں مندرجات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے فوت شدہ عزت و مال اور زائل شدہ صحت و راحت کا رنج اور حاصل شدہ دولت و عزت و صحت پر فخر خدا کو ناپسندیدہ ہے۔ خود محبتِ مال کے جذبہ کے زیرِ اثر مال خرچ کرنے میں کنجوسی کرنا اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دینا اللہ کی ناراضگی کا موجب ہے۔ اگر اس بات کو کوئی مانتا ہے تو اسی کا فائدہ ہے (آخرت میں اسی کو ہزار ہا گنا ثواب ملے گا) اور نہیں مانتا روگردانی کرتا ہے تو اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا خود اسی کا نقصان ہے۔ اللہ کو تو کسی کے مال کی ضرورت نہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ

ہم نے (اسی اصلاحِ آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے (کے حکم) کو نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ

بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ

اور حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم [illegible] (اور اس کے علاوہ) لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ

مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

ع ۱۹

(ظاہری طور پر بھی) جان لے کہ بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی دین کی) کون مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ قوی اور زبردست ہے۔

تفسیر کتابِ الٰہی یعنی لوحِ محفوظ میں ہر بات کا اندراج ہے ناداری بھی اور مالداری بھی، دکھ بھی اور سکھ بھی۔ پھر مالی بربادی کا اندیشہ کر کے راہِ خدا میں صرف نہ کرنا اور بخل سے کام لینا بے سود ہے لیکن مصارف کی حدود کیا ہیں، کتنا اور کیا صرف کیا جائے اور کتنا روکا جائے، معیارِ صرف و بخل کیا ہے، میزانِ اعتدال کونسا ہے اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کو صواب و خطا اور خیر و شر کا علم ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے ہوئے احکام دے کر اور ثبوتِ رسالت کے لئے معجزاتِ واضحہ دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ اپنی کتاب یا صحیفے بھی اتارے تاکہ حق کا باطل سے امتیاز اور صحیح کی غلط سے شناخت اور حلال کی حرام سے تفریق ہو جائے) اور میزانِ عدل پر سب لوگوں کے فرائض و حقوق کی صحیح وزن کشی ہو جائے۔ کوئی دوسرے کی حق تلفی نہ

کرے کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ ہر شخص اپنے صحیح حقوق و فرائض کو پہچان کر لینے دینے کا پابند ہو جائے۔ لیکن اگر کوئی روشن کتاب اور میزانِ عدل کو نہ مانے یا اس سے سرتابی کرے، خدا کے بھیجے ہوئے قانون کو توڑ دے تو اس کو سیدھی راہ پر چلانے اور سزا دینے کے لئے اللہ نے لوہا بھی پیدا کیا ہے۔ تلوار بندوق اور دوسرے فولادی اسلحہ کا بڑا دبدبہ ہوتا ہے۔ حقوق شخصی و قومی کا تحفظ قانون عدل کا استحکام و بقا اور دوسرے انسانی منافع انہی اسلحہ سے وابستہ ہیں۔ ضمیر و اخلاق کی درستی کے لئے کتاب اللہ اور میزان شرعی ہے اور نظم و ضبط قائم رکھنے اور قانون کی حفاظت کرنے کے لئے لوہا ہے۔ ان آلات و اسلحہ کا استعمال اللہ کے دین اور پیغمبروں کی شریعت کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اعدائے خدا و رسول کو دفع کرنے کے لئے ہونا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہیں دیکھا اور ان کے دلوں کی حالت بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ شریعت الٰہیہ اور آلاتِ دفاعیہ عطا کرنے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کو عملی ظہور کے بعد معلوم ہو جائے کہ کون ایمان بالغیب رکھتا ہے اور دل سے اللہ کے دین اور اس کے رسول کی مدد کرتا ہے اور کون ان ہتھیاروں کو دینِ خدا اور اس کے رسول کے خلاف اٹھاتا ہے۔ اسلحہ کی طاقت صرف انسانوں کی آزمائش کے لئے ہے۔ ورنہ دین و شریعت کے تحفظ کے لئے خدا ان اسلحہ کا محتاج نہیں۔ نہ انسانوں کے جہاد اور قوتِ مدافعت کے استعمال کی اس کو ضرورت ہے وہ خود بڑی قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی

فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ

سو ان لوگوں میں بعضے تو ہدایت یافتہ ہوئے اور بہت سے ان میں نافرمان تھے پھر ان کے بعد اور رسولوں کو (جو کہ صاحب شریعت مستقلہ نہ تھے)

بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۥ وَجَعَلْنَا

یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل دی اور جن لوگوں نے

فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا

ان کا اتباع کیا تھا ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم پیدا کر دیا اور انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا

مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ

ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انہوں نے اس (رہبانیت) کی پوری

رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ

رعایت نہ کی سو ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا (اجر) موعود دیا اور زیادہ ان میں

فٰسِقُوْنَ ۝

نافرمان ہیں

تفسیر حضرت نوح آدم ثانی تھے۔ آپ سے پہلے کی انسانی نسل ہلاک ہو چکی تھی اس کی ہلاکت طوفان سے ہوئی تھی۔ پھر آپ ہی کی نسل دنیا میں پھیلی۔ حضرت نوح کی ساری نسل ایک زمانہ میں گمراہ ہو گئی اس روئے زمین پر کوئی شخص شریعتِ الٰہیہ سے واقف نہیں رہا تو ایسے وقت میں عراق کے اندر حضرت ابراہیم کی پیدائش ہوئی اور آپ ہی نے توحید کی آواز بلند کی۔ آپ ہی کی نسل میں نبوت اور آسمانی صحائف و کتب کے حامل پیدا ہوئے۔ آپ کی نسلِ اسرائیلی میں نبوت و کتاب کے سلسلہ کا خاتمہ حضرت عیسیٰ بن مریم پر ہوا اور نسلِ اسماعیلی میں حضور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلعم پیدا ہوئے۔ حضرت نوح و حضرت ابراہیم کی نسل میں سے کچھ لوگ تو ہدایت یافتہ ہوتے اور بیشتر لوگ فاسق نافرمان کافر ہو گئے۔ اسی کے متعلق فرمایا وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ۔

حضرت ابراہیم کی نسل اسحاق کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم ہوئے۔ آپ کو اللہ نے انجیل عطا فرمائی جن کی تابع فرمان امت کو رحمدل اور نرم مزاج بنایا۔ ان کے دلوں میں رحم نرمی اور خوف خدا پیدا کر دیا۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ الخ۔ اس عبارت کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے یہ مطلب بیان کیا کہ ان لوگوں نے رہبانیت اپنی طرف سے اپنے اوپر عائد کر لی تھی۔ ہم نے رہبانیت کو ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر ان کی نیت نیک تھی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے رہبانیت اختیار کر لی۔ ہم نے ان کو رہبانیت اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ ان پر صرف اللہ کی رضا جوئی کو واجب کیا تھا لیکن وہ اس کو بھی نباہ نہ سکے۔ سخت ریاضت، مجاہدۂ نفس، ترک تعلقات، جائز خواہشات کا بھی ترک، صیام دوامی اور قیام شبینہ یہ سب باتیں بنی اسرائیل نے از خود اپنے اوپر لازم کر لی تھیں لیکن نباہ نہ سکے۔ رہبانیت کے تقاضے پورے نہ کر سکے۔ ترکِ دنیا کامل طور پر نہ کر سکے۔ شہرت نیک نام ہونے کی خواہش اور قومی سیادت و برتری کے حصول کا جذبہ ان پر مسلط ہو گیا اور اپنے عہد پر پورے نہ اترے۔

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے فرمایا۔ اے ابن ام عبد۔ ابن مسعود نے جواب دیا لبیک یارسول اللہ۔ فرمایا سنو۔ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہو گئے جن میں سے تین نے نجات پائی۔ پہلے فرقہ نے بنی اسرائیل کی گمراہی دیکھ کر ان کی ہدایت کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر بڑے بڑے سرداروں کو نصیحت کرنی شروع کی۔ ان کی یہ گستاخی امراء و حکام کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے ان سب نصیحت کرنے والوں کو جنگ کے بعد قتل کرا دیا۔ ان کے قتل کے بعد ایک اور گروہ مبلغوں کا اٹھ کھڑا ہوا۔ ان میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ پہلا گروہ تو مقابلہ کر کے مجبوراً شہید ہوا تھا۔ اس گروہ میں تاب مقاومت نہیں تھی۔ اس نے بادشاہوں اور حاکموں کے درباروں میں جا جا کر اظہارِ حق کیا اور صحیح دینِ عیسوی کی طرف آنے کی دعوت دی۔ لیکن ظالموں نے بجائے نصیحت پذیر ہونے کے ان حق پرستوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے۔ کسی کو آگ میں جلوا دیا، کسی کو آرے سے چروا دیا۔ اہل حق نے صبر کیا۔ راہِ حق میں شہید ہو گئے۔ مگر حق سے منہ نہیں موڑا۔ پرستارانِ حق کا تیسرا گروہ اٹھا۔ اس گروہ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ ظالموں کے سامنے جا کر اعلانِ حق کریں مگر ان باطل پرست نافرمانوں کے ساتھ اپنے دین کو چھوڑ کر رہنا بھی پسند نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنے دین کا بچاؤ اسی میں دیکھا کہ آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بسیں۔ چنانچہ یہ شہروں کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے اور بیابانوں میں گھس گئے اور سب سے الگ تھلگ ہو کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح یہ فرقہ بھی نجات یافتہ ہو گیا۔ یہی وہ گروہ تھا جس نے رہبانیت اختیار کی تھی۔ انہی کا ذکر رہبانیت والی آیت میں آیا ہے۔

یہ روایت دوسری سند سے بھی آئی ہے۔ اس میں بہتر کی جگہ تہتر فرقوں کا ذکر ہے اور آخر میں ہے کہ اجر انہیں کو ملے گا جو مجھ پر ایمان لائے۔ اور میری تصدیق کی اور اکثر جن کو فاسق کہا گیا ہے وہ ہیں جنہوں نے میری تکذیب کی۔ (ابن کثیر)

ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا ایک طویل بیان آیا ہے، جس کے آخر میں ہے کہ جو لوگ اپنے دین کے تحفظ کی خاطر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گئے اور وہیں بس گئے ان کے پیچھے پیچھے کچھ ایسے لوگ بھی لگ گئے جن کے دلوں میں (پختہ) ایمان نہیں بلکہ بغیر کسی پختہ عقیدہ کے ساتھ ہو لئے تھے۔ یہ لوگ رہبانیت کو نباہ نہ سکے اور ان ہی کا ذکر آیت وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا میں آیا ہے۔ پھر جب رسول اللہ صلعم کی بعثت تو ان صحرا

نشینوں میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔

حضور کی بعثت کی خبر سن کر یہ لوگ اپنی خانقاہوں، غاروں اور جنگلوں سے نکل کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ اور انہیں کے متعلق دوہرے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ایک حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کا اور دوسرا رسول اللہ پر ایمان لانے کا۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ

اے (پہلے پر) ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے

رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ

(ثواب کے) دو حصے دے گا اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے چلتے پھرتے رہو گے اور تم کو بخش دیگا اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى

غفور رحیم ہے (اور یہ دولتیں تم کو اس لئے عنایت کرے گا) تاکہ اہلِ کتاب کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ ان لوگوں کو اللہ کے

شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ

فضل کے کسی جزو پر بھی دسترس نہیں اور یہ کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے دے دے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ع ۴ / ۲۰

تفسیر حضرت ابن عباس کے نزدیک یاایھا الذین آمنوا سے خطاب ان مسلمانوں کو ہے جو پہلے صحیح عیسائی یا یہودی تھے۔ پھر رسول اللہ پر ایمان لے آئے۔ انہیں کو دوہرا ملنے کی صراحت فرمائی ہے۔

حدیث میں تین شخصوں کو دوہرا اجر ملنے کی صراحت آئی ہے۔ ان تینوں میں ایک اس شخص کو بتایا گیا ہے جو پہلے اپنے پیغمبر (حضرت عیسیٰ) پر ایمان صحیح لایا اور پھر رسول اللہ صلعم پر بھی ایمان لایا۔ مفہوم (صحیحین)

انہی کے متعلق آیت اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا میں دوہرا اجر ملنے کی صراحت کی گئی ہے۔ بغوی اور اکثر اہل تفسیر نے بھی یہی کہا ہے کہ اس آیت میں مومنین اہل کتاب کو خطاب ہے۔

لیکن الاوسط میں طبرانی نے مجہول سند سے حضرت ابن عباس کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ نجاشی کے رفقاء میں سے چالیس آدمی مسلمان ہوکر اس وقت مدینہ میں آئے جب مسلمان غزوہ احد میں مشغول تھے۔ یہ بھی معرکہ میں شریک ہوگئے۔ ان میں سے کچھ لوگ زخمی بھی ہوگئے پر شہید کوئی نہیں ہوا مسلمانوں کی عسرت اور تنگی حال کو دیکھ کر انہوں نے عرض کیا۔ ہم مالدار فراغ حال لوگ ہیں اگر حضور کی اجازت ہو تو ہم وطن جاکر کچھ مال لے آئیں اور مسلمانوں کی کچھ مالی مدد کریں۔ انہیں کے متعلق آیت الذین اتینا ھم الکتب من قبلہ ھم بہ یومنون الخ نازل ہوئی تو دوسرے صحابہ پر یہ حضرات اپنی برتری کا اظہار کرنے لگے اور کہنے لگے اے گروہ اہل ایمان ہم میں سے جو کوئی تمہاری کتاب پر ایمان لے آیا

اس کو دوہرا اجر ملے گا اور جس نے صرف اپنی کتاب کو مانا تو وہ تمہاری طرح ہو گیا۔ تمہارا ایمان بھی صرف اپنی کتاب پر ہے۔ اس پر آیت یاایہاالذین آمنوا نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل کا بیان بھی اسی سے ملتا جلتا نقل کیا ہے۔ اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف ہوگا اور آمنوا کہنے کے بعد پھر ایمان لانے کا حکم دینا اور آمنوا فرمانا مفید تاکید ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! تم ان تمام احکام کو مانو جو رسول لائے ہیں اور ان پر پختہ ایمان رکھو۔ اللہ تم کو اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا۔

ویجعل لکم نورا تمشون بہ۔ اور تمہارے لئے نور کر دے گا جس میں تم چلو گے۔ اس نور سے مراد وہی ہے جس کا ذکر آیت یسعیٰ نورہم بین ایدیہم وبایمانہم میں گزر چکا ہے۔

حضرت ابن عباس اور مقاتل نے کہا یہ نور پل صراط پر گزرنے کے وقت ہوگا۔ لیکن ایک اور روایت میں ابن عباس کا قول منقول ہے کہ نور سے مراد قرآن ہے۔ مجاہد نے کہا۔ نور سے مراد ہدایت ہے۔ یعنی تمہارے لئے دین کا واضح راستہ ایسا بنا دے گا جس پر چل کر تم بارگاہ قدس تک پہنچ جاؤ گے اور اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔

ابن جریر نے قتادہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب آیت یؤتکم کفلین من رحمتہ نازل ہوئی تو اہل کتاب کو اس سے جلن پیدا ہو گئی۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لئلا یعلم اہل الکتب۔ الخ۔ دوہرا اجر اور رحمت و مغفرت اس لئے ہے کہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل کے کسی حصہ پر ان کا اختیار نہیں ہے۔ سارا فضل بلاشبہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے وہ عطا فرماتا ہے۔ وہ بڑے فضل والا ہے۔ اس تشریح میں لئلا یعلم میں لا زائد قرار پائے گا۔ (کذا قال قتادہ)

بعض اہل علم نے کہا کہ لئلا یعلم میں لا زائد نہیں ہے اور لا یقدرون کی ضمیر رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ کی طرف راجع ہے۔ اس تشریح پر مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب یہ جان لیں کہ مومنوں کو اللہ کے فضل پر کوئی قدرت حاصل نہیں اور سارا فضل خاص اہل کتاب ہی کے حصہ میں آ گیا ہے۔ فضل خدا خدا کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے عطا فرماتے۔

الحمد للہ حمدا کثیرا

کہ سورۂ حدید کی تفسیر اللہ کی مدد اور توفیق سے ختم ہوئی اور اسی پر ستائیسواں پارہ بھی تمام ہو گیا۔ فالشکر للہ اولاً و آخراً۔

(نوٹ)

آئندہ پارہ عم (تیسواں پارہ) جز اول شائع کیا جائے گا۔ پارہ عم مکمل ہونے پر اٹھائیسواں اور انتیسواں پارہ شائع کیا جائے گا

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۲۸

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ

فاضلِ اجل حضرت مولانا عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے اصرار پر

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک ماہنامہ "مولوی" دہلی

نے برائے اشاعت معارف القرآن

وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند (یو-پی)

سے شائع کیا

اٹھائیسواں پارہ ۲۸

سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃِ

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی ۔ اس میں ۲۲ آیات اور تین رکوع ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ

بیشک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملہ میں جھگڑتی تھی اور (اپنے رنج وغم کی) اللہ سے شکایت کرتی تھی

وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝

اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا (اور) اللہ (تو) سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے

تفسیر

اللہ نے اس عورت کی بات سنی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملہ پر جھگڑا کر رہی تھی اور اللہ کے سامنے اپنا شکوہ کر رہی تھی ۔ اللہ آپ دونوں کی گفتگو سن رہا تھا ۔ بلاشبہ اللہ بخوبی سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول خولہ بنت ثعلبہ زوجۂ اوس بن صامت (برادر عبادہ بن صامت) کے حق میں ہوا ۔ خولہ نہایت حسین متناسب الاعضاء عورت تھی اور اوس بن صامت کے دماغ میں کچھ خلل تھا ۔ ایک بار اس نے اس سے قربت کرنی چاہی خولہ نے انکار کر دیا اس نے (اس سے اظہار کر لیا اور) کہہ دیا تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت ۔ دورِ جاہلیت میں ظہار اور ایلاء کو طلاق سمجھا جاتا ہے ۔ اسی بنیاد پر اس نے خولہ سے کہا کہ میرے خیال میں تو میرے لئے حرام ہو گئی ۔ خولہ نے کہا واللہ یہ طلاق نہیں ہے (اس نے اصرار کیا تو) خولہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی ۔ حضرت عائشہؓ اس وقت رسول اللہ صلعم کا سر دھلوا رہی تھیں ۔ خولہ نے کہا یا رسول اللہ جب میرا نکاح اوس بن صامت سے ہوا تو میں جوان اور بڑی مال دار تھی اس نے میرا مال بھی کھا لیا ۔ اور میری جوانی بھی غارت کر دی اور میرے گھر والے بھی منتشر ہو گئے (یعنی میرا گھر تباہ ہو گیا) اب جب کہ میں عمر رسیدہ ہو گئی (اور بچوں کی تولید کے قابل نہ رہی) تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا اب کئے پر پشیمان ہے ۔ کیا کوئی صورت ہے کہ ہم دونوں پھر مل کر رہ سکیں ۔ حضورؐ نے فرمایا تو اس کے لئے حرام ہو گئی ۔ خولہ نے کہا میں اپنی محتاجی اور تنہائی کا اللہ ہی سے شکوہ کرتی ہوں ۔ میں ایک مدت تک اس کے ساتھ رہی اور اپنا پیٹ اس کے لئے جھاڑ دیا (یعنی اس کے بچے میرے پیٹ سے پیدا ہوئے) رسول اللہ صلعم نے فرمایا میرے خیال میں تو تو اس کے لئے حرام ہی ہو گئی ۔ تیرے معاملے میں مجھے (کوئی خاص) حکم نہیں دیا گیا ۔ خولہ بار بار حضورؐ سے گفتگو میں الٹ پلٹ کرتی رہی ۔ جب حضورؐ فرماتے تو اس کے لئے حرام ہو گئی تو وہ انکار کرتی اور کہتی تھی میں اپنی محتاجی اور بدحالی کا شکوہ اللہ سے کرتی ہوں ۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اگر ان کو اپنے پاس رکھوں گی تو بھوکے رہیں گے ۔ اگر اس کے پاس چھوڑ دوں گی تو تباہ ہو جائیں گے ۔ خولہ اپنا سر اللہ کی (یعنی آسمان کی) طرف اٹھا کر کہہ رہی تھی ۔ اے اللہ میں تجھ سے شکوہ کرتی ہوں ۔ بار خدایا اپنے نبی کی زبان پر (میرے لئے خاص حکم) نازل فرما دے ۔ اسلام میں ظہار کا یہ پہلا واقعہ تھا ۔ حضرت عائشہؓ نے ایک طرف سے اٹھ کر دوسری طرف جا کر سر کا دوسرا حصہ دھونا شروع کیا ۔ خولہ نے کہا اے اللہ کے نبی اللہ مجھے آپ پر قربان کرے ۔ میرے معاملے میں کچھ غور فرمائیے ۔ حضرت عائشہ رضؓ نے کہا اپنی بات اور جھگڑا کو تاہ کر ۔ کیا تجھے رسول اللہ صلعم کا چہرہ دکھ نہیں رہا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت کچھ اونگھ سی طاری ہو جاتی تھی ۔ (خولہ کے زیادہ اصرار و گفتگو کے وقت بھی یہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وحی نازل ہونے لگی تھی) جب وحی کی کیفیت ختم ہو گئی تو فرمایا اپنے شوہر کو بلا لے ۔ حسب الحکم شوہر آ گیا ۔ حضور نے اس کے سامنے قد سمع اللہ قول التی الخ آیات تلاوت فرمائیں ۔ آیات مذکورہ کے نزول کا یہی سبب ہوا ۔ اس واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ اہل روایت نے ذکر کیا جس کو حاکم امام احمد اور نسائی کے علاوہ دوسرے اصحاب السنن نے نقل کیا ہے ، لیکن شیخ عبد الحق نے اس روایت کو منقطع کہا ہے ۔ شیخ ابن کثیر اور بخاری سے (بروایت ترمذی) یہی منقول ہے ۔ یہ واقعہ سلیمان بن یسار نے بیان کیا کہ حضرت سلمہ بن صخر نے کہا میرے اندر جماع کی طاقت بہت زیادہ تھی ، اس لئے جب رمضان آیا تو رمضان بھر کے لئے میں نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا ۔ تاکہ کہیں مجھ سے کسی رات کو کوئی حرکت سرزد نہ ہو جائے ۔ ایک روز میری بیوی میرا کوئی کام کر رہی تھی کہ اس کا کوئی (قابل ستر) حصہ مجھے دکھ گیا اور تاب نہ رہی ۔ جماع کر بیٹھا صبح ہوئی تو میں نے اپنے قبیلہ والوں کو یہ واقعہ بتایا اور ان سے درخواست کی کہ میرے ساتھ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں چل کر میرا یہ واقعہ بیان کر دو ۔ قبیلہ والوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا ۔ خدا کی قسم ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے ۔ ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کے ہمارے بارے میں کوئی آیت نازل ہو جائے ۔ یا رسول اللہ صلعم کوئی ایسی بات فرما دیں جس سے ہماری ذلت ہمیشہ باقی رہے ۔ تم خود جاؤ اور جو تمہارے دل میں آئے کرو ۔ مجبوراً میں خود رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا ۔ حضور نے فرمایا کیا تو نے ایسا کیا ۔ میں نے عرض کیا جی ہاں میں نے ایسا کیا ۔ فرمایا کیا تو نے ایسا کیا میں نے عرض کیا جی ہاں میں نے ایسا فعل کیا ۔ فرمایا کیا تو نے ایسا کیا ۔ میں نے عرض کیا جی ہاں مجھ سے ایسا ہو گیا ۔ فرمایا کیا تو نے ایسا کیا عرض کیا جی ہاں میں نے ایسا کیا ۔ فرمایا تو اللہ کے حکم پر چل ۔ میں نے عرض کیا میں اللہ کے حکم پہ پابند ہوں ۔ فرمایا ایک بردہ آزاد کر دے ۔ میں نے اپنی گردن پہ ہاتھ مار کر عرض کیا ۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے ۔ میں تو اپنی اس گردن کے سوا کسی اور بردے کا مالک نہیں ہوں ۔ فرمایا تو دو ماہ کے روزے رکھ ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ روزے میں ہی تو مجھ پر یہ مصیبت پڑی ہے ۔ فرمایا تو خیرات کر ۔ میں نے عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ کو پیغمبر برحق بنا کر بھیجا ہے ہم نے آج رات بغیر کھانا کھائے گزاری ہے ۔ ہمارے پاس رات کو کھانے کے لئے کچھ نہیں تھا فرمایا تو بنی زریق کی زکوٰۃ وصول کرنے والے کے پاس جا اس سے جا کر کہدے کہ وہ (زکوٰۃ کا مال) تجھے دیدے ۔ اس میں سے ایک وسق (تقریباً چھ من) کھجوریں تقریباً ساٹھ مسکینوں کو دیدے اور باقی خود اپنے اور اپنے بال بچوں کے صرف میں لے آ ۔ میں لوٹ کر اپنے قبیلہ کے پاس آیا اور ان سے کہا ۔ تمہارے پاس تو مجھے اور بدحالی ہی ملی ، لیکن رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے رزق کی فراخی اور برکت حاصل ہوئی ۔ حضور نے مجھے تم لوگوں کی زکوٰۃ لینے کا حکم دیا ہے ۔ اب تم مجھے اپنی زکوٰۃ کا مال دو ۔

تنقیح

ظہار کا لفظ ظہر سے مشتق ہے ۔ شریعت میں ظہار کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میری ماں کی پشت کی طرح ہے ۔ جاہلیت کے زمانے میں اس لفظ کو دوامی طلاق مانا جاتا تھا ۔ لیکن شریعت میں اس لفظ کے کہنے سے نکاح زائل نہیں ہوتا ۔ دوامی حرمت نہیں ہو جاتی بلکہ کفارہ ادا کرنے کے وقت تک حرمت رہتی ہے ۔ پھر کفارہ ادا کرنے کے بعد حلت ہو جاتی ہے ۔ حرمت ختم ہو جاتی ہے ۔

فقہاء احناف نے کہا ہے کہ اگر بیوی کو ماں کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دے گا جس کو دیکھنا بیٹے کے لئے جائز نہیں تب بھی ظہار ہو جائے گا مثلاً یوں کہدیا کہ تو میرے لئے میری ماں کی ران کی طرح ہے یا ماں کے سرین کی طرح ہے ۔

امام شافعی کے نزدیک ماں کے کسی عضو کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دینے سے ظہار کا حکم ہو جاتا ہے ۔ خواہ بیٹے کے لئے ماں کے اس عضو کا دیکھنا جائز ہو جیسے چہرہ ہاتھ پاؤں یا اس عضو کو دیکھنا حرام ہو جیسے سرین ران وغیرہ ۔

اسی طرح اگر دادی ، نانی ، بیٹی بہن کے ساتھ تشبیہ دی یا کسی ایسی عورت کے ساتھ جس کے ساتھ اس کا نکاح حرام ہے جیسے ساس یا دودھ پلانے والی تب بھی ظہار ہو جائے گا ۔ امام شافعی کے نزدیک ایسی عورت سے تشبیہ دی جس سے نسبی محرمیت ہے ، ظہار کے حکم میں ہے ۔ اور غیر نسبی محرم عورات ہے ۔ (جیسے مرضعہ اور ساس) کے ساتھ تشبیہ دینے سے ظہار نہیں ہوتا ۔

اگر اپنی بیوی کے کسی غیر معین حصہ کو یا بیوی کے ایسے عضو کو جس کو بول کر کل شخصیت مراد لی جا سکتی ہے ۔ اپنی ماں کی پشت سے تشبیہ دی مثلاً

یوں کہا جائے کہ تیرا سر یا تیرا چہرہ یا تیرا بدن یا تیری گردن یا تیرا جسم یا تیری روح یا تیرا نفس یا تیرا آدھا یا تہائی حصہ میری ماں کی پشت کی طرح ہے تو ظہار ہو جائے گا۔ ہاں اگر بیوی کے ہاتھ یا پاؤں کو ماں کی پشت کی طرح کہا تو ظہار نہ ہوگا۔ شافعی کا ظاہر ترین قول اس کے خلاف ہے۔ اگر یوں کہا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے تو اس جملہ سے ظہار اس وقت ہوگا جب ظہار کی نیت ہو، ظہار ہوگا اور اعزاز و احترام کی نیت ہو تو ظاہر نہ ہوگا اور اگر ان الفاظ سے طلاق بائن کی نیت ہو تو طلاق بائن پڑ جائے گی اور اگر کوئی نیت نہ ہو تب بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔

مسئلہ اگر بیوی سے یوں کہا جائے تو میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔ ایک ماہ تک تو امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ ظہار نہ ہوگا اور دوسرا قول ہے کہ ظہار کا حکم ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ اگر مدت مقررہ کے اندر جماع کا عزم کیا تو کفارہ ادا کرنا لازم ہو جائے گا۔ اگر مدتِ مقررہ بغیر عزم جماع کے گزر گئی تو کفارہ لازم نہ ہوگا۔ مسائل ظہار کی مکمل تشریح و تفصیل کتب فقہ میں پڑھی جائے۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْؕ وَ اِنَّهُمْ

تم میں جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں (مثلاً یوں کہدیتے ہیں انت علی کظہر امی) وہ ان کی مائیں نہیں ہیں ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے انکو جنا ہے اور

لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًاؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ۝ وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ

وہ لوگ بلاشبہ ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں (اسلئے گناہ ضرور ہوگا) اور یقیناً اللہ معاف کرنے اور بخشنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں

نِّسَآىٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّاؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖؕ

پھر اپنا کہی ہوئی بات کی تلافی کرنی چاہتے ہیں تو انکے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے۔ قبل اسکے کہ دونوں (میاں بیوی) باہم اختلاط کریں اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۝ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّاۚ فَمَنْ لَّمْ

اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے پھر جسکو (غلام لونڈی) میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں قبل اسکے دونوں باہم اختلاط کریں پھر

یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًاؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

جس سے یہ بھی نہ ہو سکیں تو اسکے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یہ حکم اسلئے ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے

تفسیر جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔ مثلاً اس طرح کہدیتے ہیں کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح حرام ہے تو ایسا کہدینے سے وہ بیویاں ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے، اس لئے جب وہ مائیں نہیں ہوتیں تو ابدی حرمت بھی مثل ماں کے ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں وقتی طور پر حرمت آجاتی ہے سو اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بیویوں کو ماں کہدیتے ہیں وہ غلط اور نامعقول بات کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے گناہ ضرور ہوگا اور اگر اسی گناہ کا تدارک کر دیا جائے تو یہ معاف ہو جائے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دینے والے اور بخشنے والے ہیں۔

اس گناہ کا تدارک جس کی وجہ سے وقتی حرمت عائد ہو جاتی ہے یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو ظہار کر کے اپنی کہی ہوئی بات کے مقتضا (یعنی حرمت زوجہ) کی تلافی کر کے پھر ان سے تمتع اور ازدواجی تعلقات کی بحالی کا حلال موقع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تدارک کی صورت یہ ہے کہ وہ آپس کے خاص تعلق سے پہلے ایک غلام یا باندی آزاد کریں۔

اس کفارہ کا منشاء نہ نقصان لوگوں کی تعمیت ہے کہ ایک طرف اس سے تکفیر سیئات بھی ہوگی اور دوسرے دوبارہ اس طرح غلط اور نامعقول بات نہ کہنے کے لئے تنبیہ بھی ہو جائے گی۔ اور یہ بھی خیال رہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے سب اعمال سے باخبر ہیں، اس لئے وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہوسکتا کہ کفارہ کے سلسلہ میں احکام کی تعمیل کیا آوری ہو رہی ہے یا نہیں؟

جن لوگوں کو غلام یا باندی میسر نہ ہو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھیں۔ یہ روزے بھی خاص ازدواجی تعلق اور اختلاط سے پہلے رکھنے ہوں گے اور جو روزے بھی نہ رکھ سکے وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

یہ حکم اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ احکام کی بجا آوری میں اللہ و رسول پر ایمان لے آئیں۔

یعنی معالح متعلقہ بالعمل کے علاوہ معالح متعلقہ بالایمان بھی حاصل ہو جائیں۔

اس طرح کے احکام کا وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں یعنی خداوندی ضابطے ہیں، اس لئے بربنائے عقیدہ ان حدوں کی خلاف ورزی کرنے والوں یعنی کفار کے لئے سخت دردناک عذاب ہوگا اور محض عملاً خلاف ورزی بھی عذاب کا مستوجب ہو سکتی ہے۔

تحلیل اجزاء

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ (جو لوگ ظہار کرتے ہیں) - ظہار ظہر سے مشتق ہے - ظہر عربی میں پشت کو کہتے ہیں۔ اصطلاح فقہ میں ظہار کے معنے یہ ہیں کہ اپنی بیوی کو کسی ایسی عورت کے جو اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو۔ ماں، بہن، بیٹی، دادی، نانی وغیرہ ایسے حصۂ بدن سے تشبیہ دینا جس کی طرف عام حالات میں یعنی بلاضرورت نظر کرنا حرام ہے۔ جیسے پشت، پیٹ اور ران وغیرہ۔ چونکہ عرب میں ایسے موقع پر عام طور پر پشت سے ہی تشبیہ دی جاتی تھی - اور اس طرح کہا جاتا تھا انت علی کظھر امی اور ممکن ہے کہ پشت سے تشبیہ عام طور پر اس لئے دی جاتی ہو کہ صحبت کے وقت اکثر عورت سیدھی یعنی پشت پر لیٹتی ہے - اس صورت میں یہ حاصل ہوگا کہ جس طرح تمہاری محرم عورت کو بغرض صحبت پشت پر لٹانا حرام ہے۔ ایسے ہی تجھے بھی حرام سمجھتا ہوں۔

یا ظہر بول کر کنایۃً مقام خاص مراد لیا جاتا ہو کیونکہ زبان عرب میں ایسی چیزوں کو شرم کی وجہ سے دوسرے ناموں سے تعبیر کرنے کا دستور اور طریقہ بھی تھا۔ ظہار صرف مرد کر سکتا ہے - عورت اگر شوہر سے یہ کہہ دے انت علی کظہر امی (تو مجھ پر ایسا ہے جیسے میری ماں کی پشت تو ظہار نہیں ہوگا۔ اور نکاح پر بھی کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

پھر ظہار میں وقت اور دن کی قید اگر لگا دی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ آج کے دن تو مجھ پر ایسی ہے جیسے ماں کی پشت تب بھی ظہار نہ ہوگا۔ البتہ امام مالک کے نزدیک ظہار ہو جائے گا۔

منکم خطاب اہل ایمان بالعین کو ہے - خواہ آزاد ہوں یا غلام - اس لئے کافر کا ظہار معتبر نہیں - اور نہ ہی نابالغ کا - امام شافعیؒ فرماتے ہیں جو کوئی طلاق دے سکتا ہے وہ ظہار بھی کر سکتا ہے - ذمیوں کے ایسے افعال کا وہی حکم ہوگا جو مسلمان کا ہے - اہل ایمان کو خطاب بطور غلبہ کے کیا گیا ہے۔

مِنْ نِّسَآئِهِمْ اس سے ثابت ہوا کہ ظہار صرف منکوحہ بیویوں سے ہو سکتا ہے - باندی سے ظہار معتبر نہیں۔

مَا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ظہار کے الفاظ کہہ دینے سے وہ بیویاں مائیں نہیں ہو گئیں تاکہ حرمت ابدیہ قائم ہو جائے۔

اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـئِیْ وَلَدْنَهُمْ - حقیقت میں تو مائیں وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے اور حرمت کے حکم میں وہ مائیں بھی شریک ہیں جن کو ماں کے قائم مقام شریعت نے کہا ہے - جیسے دودھ کی ماں فرمایا گیا وامھاتکم التی ارضعنکم اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں ارشاد ہوا۔ وازواجہ امھاتکم لیکن یہ بیویاں نہ حقیقی مائیں ہیں اور نہ حکمی۔

وانهم لیقولون منکرا الخ درحقیقت انھوں نے اپنی بیویوں کے لئے اس طرح کے جملے بول کر بہت ہی بری نامعقول اور جھوٹ بات کہی ہے جس کی سزا کفارہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ظہار سے روکتا ہے - جو شخص ظہار کرتا ہے اس کے لئے یہ خاص سزا مقرر کی ہے اور سزا ان ہی افعال پر دی جاتی ہے

جن کا روکنا مدِ نظر ہے اور پھر آپ سے منکر اور زور بھی فرمایا ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کا اپنی بیوی کو ماں کہنا تعلیم اسلام کی رو سے ناجائز ہے۔

ثُمَّ یعودون لما قالوا۔ یعنی پہلے اپنی بیویوں کو ماں سے تشبیہ دے کر اپنے اوپر حرام کر لیا اور اب کہی ہوئی بات سے لوٹ کر پھر اس سے ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔

فتحریر رقبۃ۔ تحریر کے معنی حُر بنانا یعنی آزاد کرنا۔ رقبہ کے معنی گردن کے ہیں۔ یہاں جز بول کر کل مراد لیا ہے۔ یعنی گردن والا۔ اردو محاورہ میں بھی سر اور راس بول کر پورا بدن مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفارہ کے طور پر ایک غلام یا باندی آزاد کرنا ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک غلام اور باندی کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔

مِن قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا۔ قبل اس کے کہ ہاتھ لگائے اور چھوئے۔ مراد عام ہے۔ بوس و کنار کرے یا جماع۔ اس سے ثابت ہوا کہ کفارہ ادا کرنے سے پہلے صحبت و دواعی صحبت ناجائز ہیں۔ اگر قبل ادائیگی کفارہ ایسی حرکت سرزد ہوگی تو توبہ لازم ہے۔ کفارہ بہر صورت دینا ہوگا اور اگر بعد ظہار صحبت و دواعی صحبت کا ارادہ نہ ہو اور بیوی کو طلاق دیدے یا وہ مرجائے تو صرف توبہ کافی ہے، اس لئے کہ وجوب ادائیگی کفارہ کی بنیاد عود یعنی ازدواجی تعلق کے قیام کا ارادہ ہے۔

ذلکم توعظون بہ۔ کفارہ کا حکم تمہاری نصیحت کے لئے ہے تاکہ تم دوبارہ ایسی غلط بات نہ کہو اور پہلے جو کہدی ہے اس کی تلافی ہو جائے۔

واللہ بما تعملون خبیر۔ اور اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔ اس لئے کفارہ کے ڈر کی وجہ سے کہی ہوئی بات سے مُکر جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

فمن لم یجد فصیام شہرین متتابعین من قبل ان یتماسا۔ جس کو غلام اور باندی میسر نہ ہو تو وہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے۔

اور اگر دو مہینے کے روزے پورے ہونے سے پہلے درمیان میں کسی وقت بیوی سے صحبت کرلی عمداً ہو یا سہواً تو پھر از سر نو دو مہینے کے روزے رکھنے ہوں گے۔

فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکینا۔ پھر جو شخص بڑھاپے کے ضعف یا بیماری کی شدت یا کسی اور معتبر شرعی عذر کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو دو وقت پیٹ بھر کر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے اور ایک مسکین کو بھی ساٹھ دن تک کھانا کھلانا درست ہو جائے گا، لیکن اگر ساٹھ دن کا بیک وقت ایک مسکین کو دیدیا تو یہ ایک ہی دن کا شمار ہوگا، ۵۹ دن اور کھانا دینا ہوگا۔

پکے ہوئے کھانے کے بجائے غلہ دینا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نصف صاع گیہوں اور ایک صاع جَو یا چھوارے دینے کا حکم دیا ہے۔ نئے (اعشاریہ) تول کے حساب سے ایک صاع کا وزن تین کلو دو سو چھیاسٹھ گرام ہے۔ اس تعین میں احتیاط کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، لہٰذا گیہوں ایک کلو ۶۳۳ گرام فی نفر دینے ہوں گے اور یہی مقدار صدقۂ فطر کی بھی ہے۔

مقصود بیان اللہ تعالےٰ انسانی زندگی کے احکام شرعیہ کے ذریعہ حد بندی فرما رکھی ہے۔ ان ہی حدود کے دائرے میں انفرادی اور اجتماعی حقوق و مراتب کا تعین کیا گیا ہے۔ ان حقوق و مراتب کے عدم تحفظ سے حدود اللہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے، جو بہر اعتبار ایک سنگین جرم ہے۔

یوں تو یہ دنیا دار العمل ہے۔ جزار کا تعلق دوسرے عالم سے ہے۔ یہاں صرف عمل ہے اور وہاں صرف جزار، لیکن یہ اللہ تعالےٰ کا اس کے بندوں پر بڑا احسان ہے کہ احکام شرعیہ میں آسانی کے ساتھ ساتھ کچھ سیأت کی تلافی کی صورتیں بھی تجویز فرما دی ہیں تاکہ ان اعمال میں برائیوں کا بوجھ کم ہو سکے جن پر آخرت میں جزار مرتب ہوتی ہے۔ اور تلافی کی جو صورت تجویز کی اس کا حاصل یہ ہے کہ حدود اللہ کی خلاف ورزی کی پاداش میں مرغوبات نفس کی کچھ تعداد و مقدار کو خدا کی راہ میں قربان کیا جائے تاکہ نفس زجر و تنبیہ ہو اور آئندہ اس طرح کے جرائم کے ارتکاب کے لئے آمادگی نہ ہو سکے۔ اور نفس کے لئے علی العموم چونکہ مالیات زیادہ مرغوب و محبوب ہیں اس لئے ان ہی کی ایک معتد بہ تعداد و مقدار کو راہ خدا میں صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح یہ

کفارہ کفارہ سیئات بھی ہے اور نفس کی اصلاح و نصیحت کا ذریعہ بھی ۔ اور اس کا منشا یہی ہے کہ جس طرح اللہ اور رسول پر ایمان کا عقیدہ ہو جو ایک باطنی امر ہے ۔ اسی طرح اس ایمان کے تقاضوں کا اعمال کے ذریعہ بھی مظاہرہ ہو جو ایک ظاہری امر ہے گویا ظاہر و باطن ہر اعتبار سے مومن بن جائے ۔ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

جو لوگ اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ (دنیا میں بھی) ایسے ذلیل ہونگے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے اور ہم نے کھلے کھلے احکام نازل کئے ہیں اور کافروں

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۚ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

کو ذلت کا عذاب ہوگا جس روز ان سب کو اللہ دوبارہ زندہ کریگا پھر ان کا سب کیا ہوا ان کو بتلا دیگا (کیونکہ) اللہ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اسکو بھول گئے

شَهِيْدٌ ۧ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ

اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ

رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ

(اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم (میں) ہوتی ہے جیسے دو یا چار آدمیوں میں) اور نہ اس سے زیادہ مگر وہ (ہر حالت میں) ان لوگوں کے

مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ساتھ ہوتا ہے (خواہ) وہ لوگ کہیں بھی ہوں پھر انکو قیامت کے روز انکے کئے ہوئے کام بتلا دیگا بیشک اللہ کو ہر بات کی پوری خبر ہے

ربط سورت کا آغاز اس بات سے تھا کہ ایک عورت اپنے شوہر کے بارے میں آپ سے جھگڑتی ہے ۔ اسکے فوراً بعد ان لوگوں کا ذکر آیا جو فرعون پر ظلم و زیادتی کے ذریعہ مخالفت حق کرتے ہیں ۔ اب یہاں اسی کی مناسبت سے اس عظیم مخالفتِ حق کا ذکر فرمایا جارہا ہے جو مخالفین اسلام کی طرف سے ہوتی تھی ۔

تفسیر شریعت اور احکام شرعیہ کے منجانب اللہ نزول اور بذریعہ انبیاء و رسل ان احکام کی ترویج و تبلیغ اور لوگوں کی اصلاح و تبلیغ اور لوگوں کی اصلاح و تذکیر کا سلسلہ پہلے سے چل رہا ہے ، لیکن جن کج باطنوں نے انبیاء سابقین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مخالفت کی ہے اور خلاف منصوبے بنا کر ان کے مقدس کاموں میں روڑے اٹکائے ہیں اور کبر و نخوت ان کو ان ذلیل حرکتوں پر برانگیختہ کئے رکھتی ہے ان کا حشر کیا ہوا ؟ وہ ہر طرح ذلیل و رسوا ہوئے ۔ ان کی ذلیل حرکتوں کی وجہ سے پیغمبروں کا ہرگز کچھ نقصان نہیں ہوا ۔ دنیا ہی میں ان کا ایسا انجام ہوا ہے کہ اس سے بڑھ کر تو اور کوئی ذلت ہو ہی نہیں سکتی ۔

آج جب کہ مخالفتِ حق کے سابقہ انجام کی تاریخ بھی ناقابلِ تکذیب ذرایعہ سے سامنے آچکی ہے ۔ احکام شرعیہ اور انذار و تبشیر کے سلسلہ کی ہدایات بھی واضح طور پر بذریعہ وحی نازل ہو چکی ہیں ۔ اور مبدأ و معاد ، حشر و نشر اور جزاو سزا کے سلسلہ کی آیات بینات بھی اتاری جا چکی ہیں اور اس کے باوجود بھی بدنصیب لوگ اللہ اور رسول کی مخالفت کر رہے ہیں تو ان کو بھی کان کھول کر سن لینا چاہیئے کہ یہ بھی پچھلی امتوں کی طرح اپنی حرکتوں کی وجہ سے ذلیل کئے جائیں گے اور یہ ذلت تو اس دنیا میں ہوگی ، لیکن سب سے بڑھ کر عذاب تو آخرت میں دیا جائے گا جو کفر کرنے والوں کیلئے

تیار کر رکھا ہے۔

قیامت کے دن نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد ایک جگہ جمع ہوگا۔ اُس دن اس کو پتہ چلے گا کہ ان کے کیا کیا کرتوت ہیں۔ بہت سی باتوں کو تو یہ خود بھول جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالےٰ تو ہر چیز سے باخبر ہیں اور اس کے یہاں بھول چوک کا سوال ہی نہیں وہاں ہر چیز محفوظ ہے۔ لہٰذا ہر عمل کی جزا ملے گی۔

اس لئے یہ بات تو اب شک و شبہ سے بالاتر ہو ہی چکی ہے کہ علمِ خداوندی آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں کا پورے طور سے احاطہ کئے ہوئے ہے وہ کائنات کے ایک ایک ذرہ سے پورے طور پر باخبر ہے۔ تین آدمی کسی بھی جگہ خفیہ مشورہ کر رہے ہوں۔ اللہ تعالےٰ ان سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ ان تین آدمیوں کے ساتھ چوتھا اللہ تعالےٰ ہے۔ پانچ آدمی مشورہ کر رہے ہوں تو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تم صرف پانچ ہیں بلکہ چھٹے اللہ تعالےٰ ہیں جو ان کے ساتھ ہیں۔

اور پھر وہ قیامت کے دن ان اعمال کی بوقت جزا خبر دے گا۔ بتلاؤ اس وقت کیسے جھٹلا سکو گے، بھلا علم خداوندی کا تم کیسے مقابلہ کر سکتے ہو۔ اس کے احاطۂ علمی سے تم کس طرح اپنے کو باہر رکھ سکتے ہو۔ جب کہ وہ ایک ایک چیز سے باخبر ہے۔

تحلیل اجزاء

ان الذین یحادّون الخ۔ جو لوگ اللہ و رسول کی مخالفت کرتے ہیں بعض علماء کے نزدیک اسی زمرے میں وہ افراد اور جماعتیں بھی ہیں جو احکامِ شرعیہ کے خلاف قانون اور دستور بناتے ہیں اور غیر اسلامی طریقوں کو اپنے ارادہ و قوت سے نافذ و رائج کرتے ہیں۔ اگرچہ نیت وہ نہ ہو جو کفارِ مکہ اور یہودِ مدینہ کی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب ان کو اختیار اور قدرت احکامِ شرعیہ کی نفاذ کی ہے۔ اور پھر بھی وہ اس کے لئے سعی نہیں کرتے تو عقیدہ سے تو نہیں لیکن عمل سے تو خلافِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔

کبتوا۔ ذلیل کئے جائیں گے۔ چنانچہ متعدد غزوات میں اس کا وقوع بھی ہو چکا ہے اور پھر یہ کہ قیامت تک باقی رہنے والی اور پڑھی و سمجھی جانے والی کتابِ مبین میں ان کی حرکاتِ شنیعہ کا تذکرہ کر کے قیامت تک کے لئے ان کی رسوائی کا سامان کر دیا۔

یَوۡمَ یَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا الخ۔ جس روز اللہ تعالےٰ ان کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

اس دن جب اوّلین و آخرین کا مجمع ہوگا اور ان کے کرتوتوں کی فہرست سامنے آئے گی تو بھرے مجمع میں رسوائی ہوگی۔ اس طرح دنیا میں بھی ذلیل ہوئے اور آخرت میں بھی رسوا ہوئے۔ پھر دردناک عذاب کا اضافہ الگ ہوگا۔

مایکون من نجوی ثلثۃ الخ تین اور پانچ کے عدد کا تذکرہ صراحتہً اس لئے کیا گیا کہ کسی معاملہ میں مشورہ کے لئے عام طور پر یہی تعداد ہوا کرتی ہے۔ ویسے اگر تین سے کم اور پانچ سے زیادہ افراد ہوں تو اس کی طرف بھی ولا ادنیٰ من ذالک ولا اکثر فرما کر اشارہ کر دیا۔

مقصود بیان

اللہ تعالےٰ کو حق بات پسند ہے خواہ کسی کمزور کی طرف سے ہو اور ناحق بات مبغوض ہے چاہے کسی قوی اور طاقتور کی جانب سے ہو۔ خولہ بنت ثعلبہ کی بات اس لئے قابلِ شنوائی ہوئی کہ اس نے اپنی بے چارگی اور مظلومیت کی داد فریاد کی تھی اور اپنے حق کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مجادلہ کیا تھا اور کفارِ مکہ اور یہودِ مدینہ کی مخالفانہ حرکتیں اس لئے لائقِ نفرت اور ان کے لئے باعثِ ہلاکت و رسوائی ہیں کہ حق کے ظاہر اور واضح ہو جانے کے بعد بھی محض کبر و نخوت اور سرکشی کی وجہ سے اللہ اور رسول کی مخالفت کی اور قبولِ حق کو انھوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ سو عزت و ذلت تو اللہ کے قبضہ میں ہے۔ ان کی حرکتوں کی وجہ سے ان کی عزت تو کیا ہوتی وہ اپنی زندگی میں بھی ذلیل ہوئے اور قیامت آنے والی نسلیں بھی ذلیل ہی سمجھتی رہیں گی پھر قیامت میں بھی رسوائی ہوگی، اس لئے کہ جان بوجھ کر انھوں نے مخالفت کی تھی نہ کہ غلط فہمی اور ناواقفیت کی وجہ سے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا (مگر پھر بھی) وہ وہی کام کرتے ہیں جن سے انکو منع کر دیا گیا تھا اور گناہ اور زیادتی

بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ

اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں اور وہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں آپ کو ایسے لفظ سے سلام کہتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو

بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ

سلام نہیں فرمایا اور اپنے جی میں (یا اپنے آپس میں) کہتے ہیں کہ (اگر یہ پیغمبر ہیں تو) اللہ ہم کو ہمارے اس کہنے پر سزا کیوں نہیں دیتا ان کیلئے جہنم کافی ہے اس میں یہ

يَصْلَوْنَهَا ۖ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا

لوگ (ضرور) داخل ہونگے سو وہ بُرا ٹھکانا ہے اے ایمان والو! جب تم سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور

بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا

رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں کرو اور اللہ سے

اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ

ڈرو جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے ایسی سرگوشی محض شیطان کی طرف سے ہے تاکہ مسلمانوں کو رنج میں ڈالے

آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

اور وہ (شیطان) بدون خدا کے ارادے ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا اور مسلمانوں کو (ہر امر میں) اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیئے۔

ربط گزشتہ آیات میں تین یا پانچ یا کم و بیش افراد کی خفیہ سرگوشیوں کا تذکرہ آیا ہے۔ اسی مناسبت سے ان خفیہ مشوروں اور ان سرگوشیوں کا تذکرہ ان آیات سے کیا جا رہا ہے جو یہود اور منافقین مسلمان کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے اور پریشان کرنے کے لئے کیا کرتے تھے۔

شانِ نزول مسلمانوں اور یہودیوں میں صلح تھی، لیکن یہود مدینہ یعنی بنو قریظہ اور بنو نضیر یہ شرارت کرنے لگے تھے کہ جب کسی مسلمان کو دیکھتے تو پریشان خیال بنانے کے لئے آپس میں سرگوشی کرنے لگتے۔ اور اس مسلمان کی طرف آنکھوں اور بھوؤں سے اشارہ کرتے جس سے مسلمان یہ سمجھتا کہ مجھے نقصان پہنچانے کے لئے یہ سرگوشی کر رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اس حرکت سے منع فرمایا مگر وہ باز نہیں آئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر کیا آپ نے ان (یہودی) لوگوں کی حرکت پر توجہ نہیں فرمائی کہ ان کو سرگوشی کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، لیکن منع کئے جانے کے باوجود پھر وہی حرکت کئے چلے جا رہے ہیں اور افسوسناک بات یہی ہے کہ ان کی سرگوشیاں گناہ کے لئے ہوتی ہیں جس میں خود ان کا ہی

ذاتی نقصان ہے۔ اور ظلم و سرکشی کے لئے ہوتی ہیں جس میں دوسروں کو نقصان پہنچانے کی سوچتے ہیں۔ نیز پیغمبر خدا کی مخالفت اور ایذا رسانی کے لئے سرگوشی ہوتی ہے۔

ان کی بدباطنی کا اظہار ان کی دوسری حرکت سے بھی ہوتا ہے کہ جب یہ آپ کے پاس آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے جس لفظ سے آپ کو سلام کیا ہے اس لفظ سے سلام نہیں کرتے بلکہ دعائیہ کی بجائے بددعا کا کلمہ السام علیک کہتے ہیں (السام کے معنی موت کے ہیں) اور پھر سرکشی کی انتہا یہ ہے کہ اپنے دلوں میں اور آپس میں یہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق پر ہیں تو ہماری اس طرح کی باتوں پر اللہ تعالیٰ عذاب کیوں نہیں بھیجتے۔ گمان بدبختوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ جس طرح کے عذاب کا یہ خیال کئے ہوئے ہیں اگر کسی مصلحت سے وہ نہیں بھیجا جارہا ہے تو قیامت کے عذاب سے تو وہ بچ نہ سکیں گے وہاں یہ جہنم کی سزا ضرور پائیں گے جو اپنے گوناگوں عذاب کی وجہ سے بدترین جگہ ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ یہودیوں کی طرح منافقین بھی باہم سرگوشیاں اور خفیہ مشورے کیا کرتے تھے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کی خفیہ تدبیریں کیا کرتے تھے اور چونکہ ظاہری طور پر وہ خود کو مسلمانوں میں ہی شامل کئے ہوئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کی طرح ہی خطاب فرمایا اور ہدایت کی ہے کہ اے ایمان والو۔ تمہاری سرگوشیاں ہرگز گناہ اور سرکشی اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف سازشوں کے لئے نہیں ہونی چاہیئے۔ تمہاری سرگوشیاں تو پرہیزگاری اور آپس کی بھلائی کی خاطر ہونی چاہئیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ بالآخر تمہیں اللہ کے پاس روز حشر حاضر ہونا ہے اور وہ تمہاری سرگوشیوں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے' اس لئے اپنے انجام سے ڈرتے رہو۔

ویسے مخلص مسلمانوں کو بھی یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ سرگوشیاں اور اسی جیسی دوسری مذموم حرکتیں ان یہودیوں اور منافقوں سے شیطان کرا رہا ہے تاکہ مخلص مسلمانوں کو رنج والم میں مبتلا کر سکے۔ لیکن خدا کی مشیت کے بغیر کوئی چیز ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس لئے مخلص مسلمانوں کو ہر معاملہ میں اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

تحلیل اجزاء

النجوی سرگوشی، کانا پھوسی۔ اس میں اور مشورہ میں فرق ہے۔ نجویٰ مخفی اور تھوڑے آدمیوں میں ہوتا ہے اور مشورے میں یہ قید نہیں ہے۔ بلکہ بعض دفعہ بالاظہار اور علانیہ ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختلف ذہنوں کے نتائج فکر سامنے آجائیں۔ پھر ان آراء کے مختلف نکات اور گوشے زیر بحث آ کر معاملہ کا ہر صحیح و سقیم پہلو نمایاں و روشن ہو جائے اور برائی اور بھلائی کے نکھار کے بعد بھلائی کو بغیر لیس و پیش کے اختیار کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں اہل مشورہ کی ہمدردی و تعاون بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مشورہ کا حکم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا۔ وشاورهم فی الامر۔

ویتناجون بالاثم الخ۔ یعنی ایسی سرگوشی کرتے ہیں جس میں ممانعت کی وجہ سے گناہ بھی لازمی ہے اور مسلمانوں کو اذیت میں مبتلا کرنے کی وجہ سے عدوان و سرکشی اور ضرر متعدی بھی ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منع فرما دیئے جانے کی وجہ سے معصیت رسول بھی ہے۔

حیوك الخ تجھے سلام کرتے ہیں ایسے لفظ سے جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بجائے السلام علیک کے السام علیک کہا جس کے معنی تجھ پر موت آئے تو حضرت عائشہ نے جواب میں کہا: علیکم السام ولعنکم اللہ وغضب علیکم۔ تم پر موت آئے اور اللہ کی لعنت ہو اور تم پر اس کا غضب ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی لعنت گوئی کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے نہیں سنا انھوں نے آپ السلام علیکم کی بجائے السام علیک کہا ہے۔ آپ نے فرمایا عائشہ! تم نے نہیں سنا میں نے جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا ہے۔ گویا میں نے ان کی بیہودگی کا مناسب جواب دیدیا ہے۔ اس سے زیادہ کہنا حد سے تجاوز ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک یہودی نے

آکر سلام کیا۔ صحابہؓ نے جواب دیا۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے پوچھا معلوم بھی ہے اس نے کیا کہا تھا۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے سلام کیا تھا۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس نے سام علیکم کہا تھا۔ یعنی تم پر تمہارا دین مغلوب ہو۔ اور مٹ جائے۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس یہودی کو واپس حاضر کیا گیا تو آپ نے فرمایا سچ بتاؤ کیا تم نے سام علیکم نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا۔ ہاں حضور میں نے یہی کہا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا جب کوئی اہلِ کتاب تم میں سے کسی کو سلام کرے تو تم صرف علیک کہہ دیا کرو۔

بما لم یحیك به الله۔ یعنی اللہ تعالٰے کے الفاظ تو یہ ہیں۔ سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ سلام علی المرسلین۔ صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ اور اس دعا کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جو نماز میں بجائے تشہد السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته کی طرف سے حکایۃً کہی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے السلام علیکم کہنا مسنون قرار دیا گیا ہے مگر یہ لوگ یا تو زبان دبا کر السلام علیک کہتے تھے یا انعم صباحاً وغیرہ الفاظ بولتے تھے۔

اس سے مذہبی طور پر السلام علیکم کی اہمیت اور اس کے علاوہ دوسرے طریقہ ہائے آداب وتحیات کی شناعت ظاہر ہوتی ہے۔

دراصل مذہب جس طرح اخلاق و روحانیت کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی طرح بعض مخصوص رسوم اور طریقوں کے اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ جو مذہب کے لئے بطور علامت مقرر کئے گئے ہوں۔ مثلاً شریعتِ اسلام نے ان اوضاع اور ہیئت اور طریقوں کی ہدایت کی ہے جو پیغمبر اور حضرت صحابہ نے بطور خاص اور بالالتزام اختیار رکھے تھے اور وہی آج بھی اہلِ اسلام کے لئے نشان اور علامت بنے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ داڑھی رکھنا مونچھیں کتروانا، ناخن کاٹنا۔ بغل اور زیرِ ناف کے بالوں کو صاف کرنا۔ ختنہ کرانا وغیرہ۔ اسی طرح بوقت ملاقات السلام علیکم کہنا ہے۔ تاکہ سوسائٹی میں یہ طریقے رچے بسے ہوں گے اور ان کو غلبہ ہوگا تو ایک طرف مذہب اور مذہبی قدریں زندہ رہیں گی۔ دوسری طرف غیر قومیں ان کو اختیار کریں گی۔ اس طرح دائرۂ مذہب کی وسعت اور مذہب کی مقبولیت بآسانی ہو سکے گی۔

زندہ قومیں ان باتوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے انگریز نے دنیا میں اپنے لباس اور وضع قطع کو عام کیا ہے۔ اسی وضع کی اہمیت میں انگریز کی اہمیت مضمر ہے۔ کاش مسلم حکومتیں اور جماعتیں اور مسلم افراد اس اہم بات کی اہمیت کو محسوس کرلیں۔

لولا یعذبنا الله بما نقول۔ اللہ تعالٰے ہمارے اس کہنے پر عذاب کیوں نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے جملے کہنا ایک پیغمبرِ خدا کی شان میں گستاخی ہے۔ تو اگر محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں تو ان کی شان میں ہماری یہ گستاخی اللہ کی ناراضگی کا سبب ہوتی اور اللہ تعالٰے اسی طرح ہم پر عذاب بھیجتے جس طرح پچھلی امتوں پر ایذاء ومعصیت رسل کی وجہ سے بھیجا جا چکا ہے۔ لیکن ان حرکتوں کے باوجود ہم پر عذاب کا نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔

تو اس پر فرمایا گیا حسبهم جهنم۔ یعنی اگر بعض مصلحتوں کی وجہ سے عذاب عاجل یعنی دنیوی عذاب نہیں بھیجا گیا تو اس سے مطلقاً عدمِ عذاب کا لزوم کیسے سمجھ لیا گیا۔ جہنم کے عذاب سے یہ ہرگز نہیں بچ سکتے۔ جبکہ وہی دنیوی عذاب سے زیادہ دردناک ہوگا۔

یایها الذین امنوا۔ جس سرگوشی سے منع کیا گیا تھا اس کا ارتکاب تو یہودیوں کی طرح منافقین کرتے تھے، لیکن خطاب ایمان والوں کو کیا گیا۔ جس کی حکمت یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ تشبہ سے ممانعت ہو جائے اور منافقین کو بھی سنانا مقصود ہے کہ جب تم ایمان کے دعوے دار ہو تو ایمان کے تقاضوں پر بھی تو عمل کرو۔

اذا تناجیتم۔ اس پیرایہ سے بیان کیا گیا ہے جس سے نجویٰ کی خوبی ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ ترجمہ یہ ہے کہ اگر سرگوشی کرو یا جب کبھی سرگوشی کیا کرو۔

معلوم ہوا کہ اتفاقاً سرگوشی کر لینے کی اجازت ہے اور وہ بھی ان شرائط کے ساتھ جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

فلا تتناجوا بالاثم والعدوان۔ تو گناہ اور سرکشی اور نافرمانی کے لیے سرگوشی نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ خلافِ شرع امور، بے حیائی، بدخلقی، بدکرداری، اور ایسی باتوں کے لئے سرگوشی کرنا جن سے کسی کی زندگی، عزت، آبرو محفوظ نہ رہ سکے قطعاً ممنوع اور باعثِ گناہ ہے۔

ایسی کانا پھوسی جو کسی مسلمان کے لئے ناگوار ہو حدیث میں اس کی بھی ممانعت ہے۔ مسند احمد میں ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم تین آدمی ایک مجلس میں ہو تو دو مل کر کان میں منہ ڈال کر باتیں نہ کرو۔ اس سے تیسرے کا دل رنجیدہ ہوگا۔ ہاں اگر تیسرے شخص کی اجازت ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

بالبر والتقوىٰ: معلوم ہوا کہ دینی اور شرعی مصلحت کے لئے سرگوشی جائز ہے۔ دنیوی مصالح کے لئے بھی۔ بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہوں اجازت ہے۔

بر۔ بھلائی۔ مراد نفع متعدی ہے مقابلے میں لایا گیا ہے۔ عدوان کے۔ تقویٰ۔ پاکیزگی اور خوف خدا۔ مقابلے میں لایا گیا۔ اثم اور معصیت رسول کے۔

ابن کثیر میں ایک روایت ہے۔ حضرت صفوان فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مومن کی جو سرگوشی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ہوگی اس کے بارے میں کیا سنا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے یہ سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب بلائے گا اور اس قدر قریب کہ اپنا دست مبارک اس پر رکھ دے گا اور لوگوں سے اس کو پردے میں کرے گا اور پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور کہے گا یاد ہے فلاں گناہ تم نے کیا۔ اور فلاں کیا تھا۔ بندہ اقرار کرتا جائے گا اور دل دھڑک رہا ہوگا کہ اب ہلاک ہوا، مگر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ دیکھ۔ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی ہے۔ اور میں نے آج بھی تیری مغفرت کر دی ہے۔ پھر نیکیوں کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا۔

ولیس بضارھم۔ مطلب یہ کہ ان کی سرگوشی اگر ایذاء مسلمین کے لئے بھی ہو تب بھی کوئی ضرر مشیت خداوندی کے بغیر تم تک پہنچ نہیں سکتا۔ تو پھر غم اور فکر کی کیا بات ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔

مقصود بیان آداب معاشرت کے سلسلے میں اہم ترین اور بنیادی درس ہدایت دیا گیا ہے کہ آپس میں ایک قوم ہو یا مختلف اقوام ایک دوسرے کی فلاح و بہبود اور خیر خواہی اور بھلائی کی کوشش کرنی چاہیئے خواہ ظاہر اعمال سے ہو یا باطن قلب سے سرًا ہو علانیۃً بالمشافہ ہو یا غیبت میں۔ دوسروں کی بدخواہی اور ایسے اعمال کرنا کہ جس سے دوسروں کو اذیت اور ناگواری ہو۔ ایسی حرکات و سکنات کہ جس سے دوسرے تشویش میں مبتلا ہو جائیں اور ذہن و قلب مطمئن نہ رہ سکیں۔ اصول معاشرت کے خلاف اور دین فطرت میں ممنوع ہیں۔

جس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے اور یہی زندگی کے ہر معاملے کی روح اور جان ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر جلی و خفی سے واقف اور پتوں کی سرسراہٹ اور چیونٹیوں کے رینگنے تک کی آواز سے باخبر ہے۔ اس کے روبرو ہمیں جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہے، اس لئے برائی ہو یا بھلائی اس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

ویسے مقہور قوموں یا افراد و اشخاص کو یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا جا رہا ہے تو کوئی برائی ان کو پہنچ نہیں سکتی تاوقتیکہ مشیت خداوندی نہ ہو۔ اس لئے بجائے غم والم میں پڑ کر زندگی کو بے کیف بنانے کے یا ذلیل حرکتوں کے مقابلے میں خود بھی کمینہ حرکتیں کر کے امن کو خاکستر کرنے کی بجائے خدا پر بھروسہ رکھیں اور اصلاح معاشرہ کی کوشش کریں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا۟ فِى ٱلْمَجَٰلِسِ فَٱفْسَحُوا۟ يَفْسَحِ ٱللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا

اے ایمان والو　جب تم سے　کہا جائے　کہ مجلس میں جگہ کھول دو　تو تم جگہ کھول دیا کرو　اللہ تم کو (جنت میں) کھلی جگہ دیگا　اور جب

قِيلَ ٱنشُزُوا۟ فَٱنشُزُوا۟ يَرْفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مِنكُمْ وَٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ دَرَجَٰتٍ ۚ

(کسی ضرورت سے) یہ کہا جائے کہ (مجلس سے) اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو　اللہ (اس حکم کی اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور ان کو جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کریگا

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ

اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔ اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے

يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

(مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور (گناہوں سے) پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے پھر اگر تم کو (صدقہ دینے کی) مقدور نہ ہو تو

رَّحِيْمٌ ○ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا

اللہ غفور رحیم ہے کیا تم اپنی سرگوشی کے قبل خیرات دینے سے ڈر گئے سو (خیر) جب تم (اس کو) نہ کر سکے

وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ

اور اللہ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی تو تم نماز کے پابند رہو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور رسول کا کہنا مانا کرو۔

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ

اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے

مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

غضب کیا ہے یہ (منافق) لوگ نہ تو (پورے پورے) تم میں ہیں اور نہ ان ہی میں ہیں اور جھوٹی بات پر قسمیں کھا جاتے ہیں اور وہ (خود بھی) جانتے ہیں۔

ربط اوپر اعدائے اسلام کے خفیہ منصوبوں کا ذکر تھا۔ اب یہاں آدابِ مجلس میں سے ایک اہم بات کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ مجلس میں اپنے دیگر بھائیوں کی سہولت کا لحاظ رکھا جائے۔ آیاتِ سابقہ سے وجہِ تعلق یہ ہے کہ جب ان خفیہ مجالس کا ذکر جہاں گناہ اور زیادتی اور معصیت رسول کے مشورے ہوتے تھے اور اس کے مقابل مسلمانوں کو تعلیم دی کہ جب وہ مجالس قائم کریں تو نیکی اور تقویٰ کے قائم کرنے کے لئے کریں۔ تو اب ان مجالسِ خیر کے کچھ آداب کا بھی ذکر کیا اور گو یہ حکم تمام ہے مگر خصوصیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا ذکر ہے۔ جہاں سامعین کی کثرت کی وجہ سے اور اس شوق سے کہ آنحضرت کے پاس بیٹھا جائے اژدہام زیادہ ہو جاتا تھا۔

پھر سرگوشی اور آدابِ مجلس کے تعلق سے یہ ذکر کیا کہ ہر کس و ناکس اور ہر اہم غیر اہم بات کے لئے پیغمبر سے سرگوشی کر کے پیغمبر کا وقت ضائع نہ کرے۔ بغرض تہدید صدقہ کی ہدایت دی گئی۔

شانِ نزول ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفہ میں تشریف فرما تھے اور مجلس میں مجمع زیادہ تھا۔ کچھ اہلِ بدر آئے تو ان کو کہیں جگہ نہ ملی۔ حاضرینِ مجلس بھی مل کر نہ بیٹھے کہ کہیں جگہ نکل آتی۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ دیکھا تو بعض آدمیوں کو مجلس سے اٹھ جانے کے لئے فرما دیا۔ منافقین نے طعن کیا کہ یہ کیسا انصاف ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے بھائی کے لئے جگہ کھول دے۔ اس پر لوگوں نے جگہ کھول دی۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا الخ۔ اور دوسری آیت یا ایھا الذین اذا ناجیتم الرسول۔ کا شانِ نزول یہ تھا کہ بعض اغنیاء کافی دیر تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے سرگوشی کیا کرتے جس کی وجہ سے فقراء کو استفادہ کا موقع کم ملتا۔ آنحضرت کو ان کا دیر تک بیٹھنا اور دیر تک سرگوشی کرتے رہنا ناگوار گزرتا ایک روایت میں اس طرح ہے کہ یہود و منافقین بلاضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشیاں کرتے تھے۔ ممکن ہے مسلمانوں کو تشویش کرنے یا اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا کرتے ہوں۔ بہرحال اس قسم کی حرکتوں سے ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت ضائع ہوتا اور دوسری طرف عام مسلمانوں کو بارگاہِ نبوت سے استفادہ کا موقع کم ملتا جس سے ان کو پریشانی ہوتی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

پھر ادائیگی صدقہ کے بعد بہت سے آدمی ضروری بات کرنے سے بھی رک گئے تو آیت أَأَشْفَقْتُمْ نازل ہوئی۔

تفسیر اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں یا اولوالامر اور واجب الاطاعت لوگوں میں سے کوئی کہے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تاکہ آنے والے کو بھی جگہ مل جائے تو تم جگہ کھول کر آنے والے کو بیٹھنے کا موقع دے دیا کرو۔ اللہ تعالیٰ جنت میں تم کو کھلی جگہ دے گا اور جب کسی مصلحت و ضرورت سے یہ کہا جائے کہ مجلس سے اٹھ جاؤ تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ اس حکم میں فرماں برداری و اطاعت ہوگی تو اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ایمان والوں میں ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو صاحب علم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس کا عمل بحالتِ ایمان ہے اور کس کا نہیں اور کس کے عمل میں زیادہ خلوص ہے اور کس میں کم، اس لئے مرتبہ عمل کے مطابق ہی جزا ہوگی۔

اے ایمان والو جب تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کا ارادہ کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے مساکین کو کچھ صدقہ دے دیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بغرض حصول ثواب بہتر اور گناہوں سے پاک ہونے کے لئے اچھا ذریعہ ہے۔ پھر اگر صدقہ دینے کی تم میں قدرت اور گنجائش نہ ہو اور سرگوشی کی ضرورت پیش آجائے تو خیر۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔ جب واقعتہً مجبوری ہے تو مواخذہ نہ ہوگا۔

کیا تم اپنی سرگوشی سے قبل صدقہ دینے سے ڈر گئے تو خیر جب تم نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے تم پر مہربانی فرمائی (کہ اس حکم کو منسوخ کر دیا کیونکہ مقصد یعنی سرگوشی میں تحدید وہ حاصل ہو گیا) تو تم دوسرے احکام و عبادات کی پابندی کرتے رہو یعنی نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ و رسول کی اطاعت کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔

تحلیل اجزاء

تفسحوا، فسیح، کشادہ مکان کو کہتے ہیں۔ تفسح کے معنی توسع اور کشادہ ہو جانا ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کھلے کھلے مت بیٹھو۔ مل کر بیٹھ جاؤ گے تو جگہ نکل آئے گی اور دوسرے آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہو جائے گی۔

مَجَالِس مَجْلِس کے معنی بیٹھنا اور مجلس اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں کوئی آدمی بیٹھے۔ اگرچہ ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا ہے، لیکن حکم عام ہے۔ خواہ پیغمبر کی مجلس ہو یا کسی بزرگ کی اور وعظ و نصیحت کی مجلس ہو یا مصالح دینی و ملکی میں مشورہ کرنے کی۔ جیسا کہ لفظ قیل لکم سے واضح ہے۔

یفسح اللہ لکم اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی کرے گا۔ دنیا میں اور دنیاوی امور میں، قبر میں، آخرت میں، فہم و عقل میں، دائرہ محبت میں و اخوت اسلامی میں۔ اس لئے کہ ہر عمل کی جزا و بدلہ اسی کے موافق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائے اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بنا دے گا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو کسی سختی والے پر آسانی کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت میں آسانی کر دے گا۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے اس بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مجلس ذکر کے بارے میں اتری ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مجلسوں میں کشادگی کا حکم جہاد کے بارے میں ہے۔

فانشزوا تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ اٹھنے کے لئے خواہ اس غرض سے کہا جائے کہ آنے والے کے لئے جگہ کھل جائے۔ جیسا کہ بعض اہل بدر صحابہ کے آنے جانے پر آپؐ نے چاہا تھا۔ پھر چاہے بالکل اٹھ جانے سے ہو یا ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھنے سے ہو اور خواہ اس غرض سے کہا جائے کہ اس وقت صدرِ مجلس کو کسی مصلحت اور مشورت خاصہ یا کسی ضرورت مثلاً آرام یا عبادت کے لئے تخلیہ کی حاجت ہو۔ بہرحال صدرِ مجلس کی طرف سے

اٹھ کھڑے ہونے کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ البتہ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق کسی آنے والے کو یہ نہ چاہیئے کہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھے۔ ہاں لوگوں کو چاہیئے کہ ادھر ادھر ہو کر اس کے لئے جگہ بنا دیں اور آنے والے کو چاہیئے کہ جہاں سہولت سے جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ تین شخص آئے۔ ایک تو مجلس کے درمیان خالی جگہ دیکھ کر وہاں بیٹھ گئے۔ دوسرا مجلس کے آخر کنارے پر ہی بیٹھ گیا اور تیسرا واپس چلا گیا۔ آنحضرت نے فرمایا لوگو! میں تمہیں تین شخصوں کے بارے میں خبر دوں کہ ایک نے تو اللہ کی طرف جگہ لی اور اللہ نے اسے جگہ دی۔ دوسرے نے شرم کی، اللہ نے بھی اس سے حیا کی اور تیسرے نے منہ پھیر لیا تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔

یرفع اللہ الذین امنوا منکم۔ یعنی مجلسوں میں جب جگہ دینے یا اٹھ کر چلا جانے کو کہا جائے تو اس میں اپنی بے عزتی اور ہتک نہ سمجھو۔ جیسا کہ منافقین نے ایسا ہی باور کرانا چاہا تھا کہ دیکھا یہ ہیں انصاف کے مدعی پیغمبر، کہ جو لوگ شوق سے آئے اور پہلے آئے اور اطمینان سے پیغمبر کے نزدیک جگہ لی انہیں تو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور دیر سے آنے والوں کو ان کی جگہ دلوا دی یہ کس قدر ناانصافی ہے ———— تو ایسا سمجھنا غلط ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبہ بلند کرنا اور اپنی توقیر کرانا ہے، اسے خدا ضائع نہ کرے گا بلکہ دنیا و آخرت میں نیک بدلہ دے گا۔ جو شخص احکام خدا پر تواضع سے گردن جھکا دے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور اس کی شہرت نیکی کے ساتھ کرتا ہے۔ ایمان والوں اور صحیح علم والوں کا یہی کام ہے کہ خدا کے احکام کے سامنے گردن جھکا دیں اور اسی سے وہ بلند درجوں کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

والذین اوتوا العلم درجٰت سے اہل علم کی بلندی مرتبہ کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے کہ مجلس میں نشستوں کی ترتیب میں اہل علم کو مقدم رکھا جائے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے صفوں کو سیدھا کرتے وقت فرماتے کہ دانائی اور عقلمندی والے مجھ سے قریب رہا کریں۔ آپ کی مجلس میں بھی عام طور پر صدیق اکبرؓ دائیں طرف اور عمر فاروقؓ بائیں طرف اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سامنے بیٹھا کرتے تھے کہ یہ دونوں بزرگ کاتبِ وحی بھی تھے۔

اس آیت کے مطابق اس حکم کی تعمیل کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک غیر اہل ایمان کی جو کسی مصلحت وغیرہ سے مان لیں جیسے منافقین تو لفظ منکم کی قید سے وہ اس وعدہ بلندی درجات سے خارج ہیں۔ دوسرے اہل ایمان غیر اہل علم ان کے لئے نفس رفع درجات ہے۔ تیسرے اہل علم اہل ایمان چونکہ علم و معرفت کی بناء پر ان کے امتثال اور تعمیل کا منشاء خوف و خشیت اور زیادہ خلوص ہے جس سے عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے مزید رفع درجات ہے۔ ان الذین آمنوا منکم کی تعمیم کے بعد والذین اوتوا العلم کی تخصیص اسی پہ دلالت کرتی ہے۔

یا یھا الذین امنوا۔ یہ مذکورہ سرگوشیاں منافق کیا کرتے تھے، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لز اخلاق کریمانہ تھے ہی۔ اللہ تعالیٰ کی ستاری اور دلجوئی کا بھی کس قدر قابل تعریف مظاہرہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اے منافقین تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سرگوشی سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔ کیونکہ اس میں مختلف خرابیوں کا احتمال تھا۔ ایک تو ان منافقین کی حقیقت کھل جاتی۔ دوسرے منافق کہہ دینے میں ان کو شرمندگی و ندامت ہوتی۔ تیسرے ایمان و اخلاق کا راستہ مسدود ہو جاتا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منافق فرما دیا تو پھر مومن کیسے ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعد میں مخلص اور مومن ہو گئے۔ گویا آمنوا کے لفظ سے ان کو خطاب کرنا ان کے حق میں ایک پیشین گوئی بھی تھی اور خوشخبری بھی۔ چوتھے ان میں منافقین ہی کی تخصیص ہو جاتی۔ حکم میں تعمیم باقی نہ رہتی اور مسلمان خود کو مخاطب نہ سمجھتے۔ حالانکہ یہ حکم ان کے لئے بھی تھا۔ کیونکہ ہر کس و ناکس کا ہر بات میں مخفی مشورہ اور سرگوشی کرنا منصب رسالت کے فرائض کے لئے ہرج کا باعث ہے گویا یہ بتلانا ہے کہ سرگوشی میں مشغول رکھ کر پیغمبر کو اس کے اعلیٰ مقاصد رسالت سے روکنا ہے اور یہ بھی ایک قسم کی خطا ہے۔ جس کے تدارک سے پہلے بطور کفارہ صدقہ دینے کا حکم ہوا یا یہ کہیں اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب ہم نے مسلمانوں کو مختلف امور میں صدقہ کا حکم دیا ہے تو منافقوں کو کیوں نہ حکم ہو۔

فقدموا بین یدی الخ تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دیدیا کرو۔ آیت میں اس صدقہ کی مقدار کو متعین نہیں کیا گیا۔ روایات میں بھی مختلف مقداریں آئی ہیں۔ لیکن ایسی مقدار ضرور ہے جو معتدبہ ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف انھوں نے اس حکم کی تعمیل میں صدقہ دے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا ہے۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ اس طرح نہ ان سے پہلے کسی نے صدقہ دیا اور نہ ان کے بعد۔

حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ اور مقاتل رضی اللہ عنہم کے اقوال سے بھی اس آیت کا منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ آیت پہلی والی آیت ءَاَشْفَقْتُمْ الخ سے منسوخ ہے۔ بعض کے نزدیک یہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہوئی۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور پہلی اور دوسری آیت میں اختلاف ہے۔ بلکہ دوسری آیت پہلی آیت کے مطلب کو واضح کرتی ہے۔ پہلی آیت میں صدقہ کے حکم کے ساتھ ہی فان لم تجدوا فرمایا۔ یعنی اگر تم نہ پاؤ تو اللہ غفور رحیم ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی بتایا ہے کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں کرتا۔ چنانچہ فاذ لم تفعلوا کے بعد ہے وتاب اللہ علیکم تو دونوں کا حاصل ایک ہے۔ یعنی جو دینا چاہے دیدینا افضل ہے، لیکن اگر کوئی شخص نہ دے تو مواخذہ اس پر نہیں۔

لیکن اگر صدقہ کے حکم کو واجب مانا جائے۔ جیسا کہ لفظ نقل موا سے ظاہر ہے اور بعض مفسرین بھی واجب ہی مانتے ہیں۔ تو پھر دونوں آیتوں میں تطبیق اور پہلی کو منسوخ نہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مقصود بیان

آداب مجلس کے سلسلے میں دو بنیادی اور اہم ہدایتیں دی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شرکاء مجلس میں یہ جذبہ ہونا ضروری ہے کہ ہر خواہش مند کو شرکت مجلس کا موقع مل سکے۔ جو پہلے سے مجلس میں موجود ہوں وہ بعد میں آنے والوں کے لئے شرکت مجلس سے محرومی یا تنگی کا ذریعہ نہ بنیں بلکہ خود تھوڑی سی تنگی برداشت کرکے ان کو جگہ دیں۔ پھر اس میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ اگر بعد میں آنے والے کسی بھی حیثیت سے باعزت اور ذی حیثیت ہیں تو ان کے مناسب شان جگہ دی جائے۔ دوسری بات یہ کہ امیر مجلس کسی مصلحت سے شرکاء کی نشستوں میں کچھ تبدیلی کرے یا بعض کو یا سب کو اٹھادے تو اس میں قطعاً اپنی ہتک اور بے وقعتی نہیں سمجھنی چاہیئے اور تیسرے یہ کہ امیر مجلس کی عظمت اور جلالت شان کا لحاظ و پاس رہنا چاہیئے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

اللہ نے ان لوگوں کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے (کیونکہ) بیشک وہ بڑے برے کام کیا کرتے تھے انھوں نے اپنی قسموں کو (اپنے بچاؤ کے لئے)

جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ

سپر بنا رکھا ہے پھر خدا کی راہ سے روکتے رہتے ہیں سو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہونے والا ہے ان کے اموال اور اولاد اللہ کے عذاب

وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَوْمَ

سے ان کو ذرا نہ بچا سکیں گے (اور) یہ لوگ دوزخی ہیں وہ لوگ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جس روز

يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ

اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا سو یہ اس کے روبرو بھی (بیہودگی) قسمیں کھا جاویں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں اور یوں خیال کریں گے کہ ہم کسی اچھی حالت

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ

میں ہیں خوب سن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں ان پر شیطان نے پورا تسلط کر لیا ہے سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی یہ لوگ

حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

شیطان کا گروہ ہے ۔ خوب سن لو کہ شیطان کا ۔ گروہ ضرور ۔ برباد ہونے ۔ والا ہے ۔

ربط گزشتہ آیات میں منافقین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ایذا رسانی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ۔ ان آیات میں ان منافقین ہی کی ایک دوسری حرکت کا ذکر ہے جس سے ان کا مقصد مسلمانوں کو اذیت پہنچانا ہی تھا اور دو رنگی ان کی دونلی پالیسی کہ سامنے کچھ، پیچھے کچھ ۔

شانِ نزول رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنے حجرۂ مبارکہ کے سایہ میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تشریف فرما تھے آنحضرت نے ارشاد فرمایا دیکھو ایک شخص آئے گا جو شیطانی نظر سے دیکھتا ہے وہ آئے تو اس سے بات نہ کرنا ۔ تھوڑی دیر میں ایک کیری آنکھوں والا شخص آیا ۔ حضور نے اس کو اپنے پاس بلا کر فرمایا کیوں بھائی تم اور فلاں فلاں مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو ؟ یہ شخص یہاں سے چلا گیا اور جن جن لوگوں کا نام آنحضرت نے لیا تھا ان سب کو لے کر آیا اور پھر سب لوگوں نے قسمیں کھانے لگے کہ ہم میں سے کسی نے بھی حضور کی بے ادبی نہیں کی ۔ اس پر یہ آیات اتریں ۔

تفسیر اے پیغمبر کیا آپ نے ان منافق لوگوں کو نہیں دیکھا جو ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جن پر غضبِ الٰہی ہے یعنی یہود ۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ نہ پورے طور پر تمہارے ہیں اور نہ ان یہودیوں ہی کے ۔ تمہارے پاس آتے ہیں تو تم سے اپنائیگی کی باتیں کرتے ہیں اور مسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں اور چونکہ عقیدۃً کافر ہیں ، اس لئے جب یہودیوں کے پاس جاتے ہیں تو تمہیں برا بھلا کہنے میں لگ جاتے ہیں اور یہودیوں کے سامنے ڈینگیں مارتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو یوں بیوقوف بنا رکھا ہے اور پھر تمہارے پاس آکر جھوٹی قسمیں بھی کھا لیتے ہیں کہ ہرگز ہم نے تمہیں برا نہیں کہا ۔ حالانکہ خود جانتے ہیں کہ سب جھوٹ ہے ، مگر یہ بھی سن لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے ۔ جو ان کی بدکرداریوں کے بدلے میں ان کو بھگتنا ہوگا ۔ اب تو انھوں نے قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے سہارے اپنے کو بچانا چاہتے ہیں ، لیکن ذلت اور دردناک عذاب سے بچ نہیں سکتے ۔ یہ سب حرکتیں مال اور اولاد کے جھوٹے فائدے کی خاطر کرتے ہوں گے ۔ لیکن اس عذاب کے وقت نہ مال ان کو بچا سکے گا اور نہ اولاد ہی کام آئے گی ۔ یہ دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اس عذاب کا دن وہی ہوگا ۔ جب اللہ تعالیٰ دوبارہ سب کو زندہ کریں گے ۔ یہ اُس وقت بھی آج ہی کی طرح قسمیں کھائیں گے اور سمجھیں گے کہ ان کی چال کامیاب ہو جائے گی ۔ اور یہ فائدہ اور اچھی حالت میں رہیں گے ، لیکن یہ غلط ہے ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ اللہ تو خود بھی جانتا ہے اور تمہیں بھی بتلا رہا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں ۔ دراصل ان پر شیطان نے قابو پا لیا ہے ، اس لئے یادِ خدا سے غافل ہو کر خالص شیطان کے گروہ میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ شیطان کا گروہ ضرور برباد ہو کر رہے گا ۔

تحلیلِ اجزاء اَلَمْ تَرَ ۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا ۔ اس مقصد سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا دریافت کرنا نہیں ہے بلکہ یہ محاورہ تعجب اور افسوس کے لئے ہے کہ اے نبی آپ نے وہ لوگ بھی دیکھے جو ایسا کرتے ہیں ۔

قومًا غضب اللہ علیہم ۔ وہ قوم کہ جس پر غضبِ الٰہی ہے ۔ مراد یہود ہیں ۔ مگر یہود کا نام نہیں لیا ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ بالذات یہود سے ملنے کی ممانعت نہیں ۔ وجہ ممانعت ان کے مغضوب ہونا ہے ۔ اس کنایہ سے منافقین کی اس حرکت کی شناعت اور بھی بڑھ گئی کہ یہ دوستی کیے ہیں ۔ ایسی قوم سے جو خدا کے نزدیک مغضوب و مقہور ہے ۔ اور مقہور لوگوں کے ساتھی بھی مقہور، انسان خود بھی قہرِ الٰہی میں آجاتا ہے ۔ خدا کے دشمنوں سے یارانہ کر کے اپنے لئے قہرِ الٰہی کو دعوت دیتا ہے ۔

واتخذوا ایمانہم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ ۔ ان منافقین نے قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں ۔ قسمیں کھا کر لوگوں کو اپنے

بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ وہ ان کی قسموں پر بھروسہ کر کے ان کو سیدھا سچا سمجھ لیتے ہیں اور خیر خواہ بن جاتے ہیں، بلکہ پھر یہ منافق ان کو بھی اپنے جیسا بنا لیتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو راہِ ہدایت اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔

الا انھم ھم الکذبون۔ خوب سن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں۔ کئی تاکیدی الفاظ کے ساتھ منافقین کا جھوٹا ہونا بتلایا جا رہا ہے پہلے لفظ الا پھر انھم پھر ھم، کہ ان سے بڑھ کر کون جھوٹا ہوگا کہ جو خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے نہ چوکیں گے۔

فانسٰھم ذکر اللہ۔ معلوم ہوا کہ ذکرِ خدا سے غفلت علامت ہے اس بات کی کہ شیطان کا تسلط ہو گیا اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شیطان سے بچاؤ کے لئے ذکر و فکر نہایت موثر ہے۔ شیطان اس دل پر اپنا اثر نہیں جما سکتا جو یادِ خدا سے معمور ہو۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں جس بستی میں تین شخص بھی ہوں اور ان میں نماز نہ قائم کی جاتی ہو تو ان پر شیطان غلبہ پا لیتا ہے۔ پس تم جماعت کو لازم پکڑے رہو۔ بھیڑیا اسی بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے الگ ہو۔ حضرت سائب فرماتے ہیں کہ یہاں جماعت سے مراد نماز کی جماعت ہے۔

مقصودِ بیان: منافقت اور دو رخی پالیسی اختیار کرنے والے یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے دوسروں کو بیوقوف بنا لیا ہے اور اس طرح ہم کامیاب ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے دو نقصان ہیں۔ دوسرے تو دوست سمجھیں گے حالانکہ یہ بدترین دشمن ہیں۔ اس طرح وہ جب تک دھوکے میں رہیں گے ان کا نقصان رہے گا اور یہ ہمیشہ کامیاب نہیں رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن چالاکی اور بھرم کھلے گا اور پھر ذلت و رسوائی کا سامنا ہوگا اور اللہ کے یہاں جھوٹ اور دھوکہ دہی و ایذا رسانی کے جرم میں، خود ہو کر سخت اور دردناک عذاب میں مستوجب قرار پائیں گے۔ اس طرح منافقت دنیا میں ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ○ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ سخت ذلیل لوگوں میں ہیں اور اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ

أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے بیشک اللہ قوت والا غلبہ والا ہے جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ

يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

اُن کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھتے ہیں جو اللہ اور رسول کے خلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی

أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ

کیوں نہ ہو ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے (فیض سے مراد نور ہے)

وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ

اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ تعالیٰ

عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے

تفسیر ان ہی کفار و منافقین کے بارے میں یہ آیت بھی ہے جن کا تذکرہ گزشتہ آیات میں آچکا ہے کہ یہ منافقین اللہ کے دشمنوں سے دوستی کر کے اللہ کو ناراض کرتے ہیں اور اللہ کو ناراض کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ وہ تو ذلیل ہو کر رہے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہود سے دوستی کرنے میں ہماری عزت ہوگی اور ہم اپنے دشمنوں یعنی مسلمانوں پر غالب رہیں گے۔ یہاں ان ہی دو باتوں سے ان کی محرومی بیان کی جارہی ہے کہ اولٰئک فی الاذلین یہ تو ذلیل لوگوں میں سے ہیں اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ کتب اللہ لاغلبن اللہ تعالٰی نے اپنے حکم ازلی سے یہ لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالٰی قوت والے اور غلبہ والے ہیں۔ لہٰذا وہ جس کو چاہیں غالب کر دیں۔ آگے منافقین کے حال کے مقابلے میں اہل ایمان کا حال بیان فرمایا گیا کہ جو لوگ اللہ پر اور قیامت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں۔ آپ اے مخاطب ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ اللہ و رسول کے مخالفوں اور دشمنوں سے دوستی رکھیں۔ خواہ وہ مخالف ان کے باپ یا اولاد یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے ان لوگوں کے دلوں میں ایمان کو جاگزیں کر دیا ہے اور ان کے قلوب کو اپنے فیضِ نور سے قوت بخشی ہے اور پھر آخرت میں ان کو یہ نعمت حاصل ہوگی کہ ایسے باغوں میں داخل ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان جنتوں میں ہی ہمیشہ ان کا قیام ہوگا۔ یہ تو جسمانی جنت ہوگی اور روحانی جنت یہ ہے کہ اللہ تعالٰی ان سے راضی ہوگا اور یہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ لوگ اللہ کی جماعت ہیں اور خوب جان لو کہ اللہ کا گروہ فتحیاب ہے۔

تحلیل اجزا اولٰئک فی الاذلین یہ سب ذلیل لوگوں میں ہیں۔ جب اللہ کے نزدیک ذلیل ہیں تو مذکورہ آیات کا ترتب بھی مستفید نہیں اور جس طرح اللہ تعالٰی نے ان منافقین کے لئے ذلت تجویز فرمائی ہے اسی طرح اطاعت گزار مومنین کے لئے عزت تجویز کر رکھی ہے۔

لاغلبن انا ورسلی: میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے اور یہ غلبہ ہی حقیقت ہے عزت کی۔ اپنے غلبہ کا ذکر تشریف انبیاء کے لئے ہے ورنہ مقصود انبیاء علیہم السلام کے غلبہ کو بیان کرنا ہے اور جب انبیاء و رسل ذی عزت ہوئے تو ان کے متبعین بھی باعزت ہو گئے۔
گو بعض رسول منکروں کے مقابلے میں سر دست مغلوب ہو گئے تھے مگر انجام کار دشمن تباہ و برباد ہو گئے۔ اور یہ رسول مع اپنی جماعت کے غالب آگئے۔

لاتجد قومًا۔ حضرت سعید بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جنگ بدر میں ان کے والد کفر کی حمایت میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آئے تھے۔ آپ نے انھیں قتل کر دیا۔
اس ضمن میں یہ واقعہ بھی آسکتا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدری قیدیوں کے سلسلے میں حضرات صحابہؓ سے مشورہ فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رائے پیش کی کہ جس مسلمان کا جو رشتہ دار مشرک ہے اسی مسلمان کو وہ حوالہ کر دیا جائے اور اس کو قتل کا حکم دیا جائے۔ ہم اللہ تعالٰی کو اس بات کا گواہ بنانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ان مشرکین کی کوئی محبت نہیں ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت کسی ایک فرد کے لئے نہیں بلکہ کئی حضرات کے بارے میں اتری ہے۔ مثلاً حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے اپنے والد کو قتل کیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید کو قتل کیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہ بن الحارثؓ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ وغیرہ کو قتل کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

یوادون۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر سے کسی طرح کا تعلق محبت کا رکھ نہیں سکتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو اہل کتاب

کی عورتوں سے نکاح کی اجازت کیوں ہوتی۔ جو ارشاد قرآنی جعل بینکم مودۃ و رحمۃ (سورۂ روم) کا مصداق ہوں گی بلکہ یہاں ان کا فرد کا ذکر ہے جو یحادون اللہ ورسولہ کا مصداق ہیں۔ یعنی دشمنی میں دوسری حد پر چلے گئے۔ جنگ کی حالت میں ایک قوم کل کی کل اس کا مصداق ہو جائے گی۔ خواہ بعض افراد دشمنی کی اس حد پر بھی نہ ہوں گے۔ مگر دوسرے عام حالات میں ہر فرد سے اس کے خیال و عمل کے مطابق ہی معاملہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مودت نہیں ہو سکتی، لیکن جو لوگ اسلام کے دشمن نہیں اور نہ اس کا استیصال کرنے کے درپے ہیں ان سے تعلقات، محبت یا معاملات ہو سکتے ہیں۔

اور یوادون، وُدّ سے ہے جس کے معنی میں محبت کے علاوہ اس چیز کے پائے جانے کی خواہش کا ہونا ہے۔

وایدھم بروح منہ، حضرت سدی فرماتے ہیں کہ منہ کا مرجع الایمان ہے۔ یعنی روح ایمان سے ان کی تائید کی ہے، لیکن "روح" کے بہت سے معنی بتلائے گئے ہیں۔ نورِ قلب، کلامِ الٰہی اور دشمنوں پر فتح یابی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی روح کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے وایدناہ بروح القدس حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے حق میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اللّٰھم ایدہ بروح القدس اس لئے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل کے ساتھ مومنین کی تائید فرماتا ہے

رضی اللہ الخ۔ اس آیت میں متعین طور پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ ہے۔ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی۔ اس سند نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرات صحابہ کی مقدس جماعت قربِ الٰہی کے انتہائی مراتب طے کر چکی ہے۔ اس کے باوجود ان کو برا کہنے والے اہلِ تشیع اور دوسرے افراد یا جماعتیں غور کریں۔

ھم المفلحون منافقین کے بارے میں گزشتہ آیت میں فرمایا گیا کہ یہ گروہ شیطان ہیں اور شیطان کا گروہ خسارہ میں ہی رہے گا۔ اس کے مقابلے میں یہاں اہلِ ایمان کے لئے فرمایا کہ یہ اللہ کا گروہ ہیں اور یاد رکھو اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہوگا۔

مقصود بیان

اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والے کبھی بھی فلاح نہیں پا سکتے۔ وہ احکام و ہدایاتِ ربانی کے باغی ہیں اور یہ بغاوت بر بنائے کبر و نخوت اور عدوان و سرکشی ہے۔ ان دشمنانِ خدا کو خدا کچھ دن کی مہلت تو دیتا ہے، لیکن انجام کار ان کو ذلیل ضرور ہونا پڑتا ہے، اس لئے کہ ان کے اعمال ہی ذلیل ہیں۔ ان کے اخلاق ذلیل ہیں ان کا ظاہر اور باطن ذلیل ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ذلالت ہوگی کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا۔ اس کی ربوبیت کے طفیل پلے بڑھے، اس کی زمین پر چلے پھرے، اس کے آسمان کے نیچے رہے بسے۔ اسی کا کھایا اور پیا۔ اور پھر بھی اس کے مخالف۔ اس کے باغی اور اس کے دشمن! اگر وہ اس کے باوجود بھی عذاب میں مبتلا نہ کئے جائیں گے تو ان میں اور فرماں برداروں میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ پھر تو اندھا اور بینا، نور اور ظلمت، اندھیرا اور اجالا سب برابر ہو جائیں گے۔ قل ھل یستوی الاعمیٰ والبصیر ام ھل تستوی الظلمٰت والنور۔

اس کے برخلاف وہ انسان جو نہ خود خدا و رسول کا دشمن اور اس کے احکام و ہدایات کا مخالف ہے اور نہ دشمنی اور مخالفت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ خواہ نسبی یا صلبی رشتوں سے کتنا بھی قریب ہو، لیکن ایمانی رشتے کے مقابلے میں سارے رشتے اس کے فکر و عمل میں بے حقیقت ہوں۔ قرابت و دوستی ہے تو بر بنائے ایمان و اخلاص۔ دشمنی و عداوت ہے تو بر بنائے کفر و نفاق۔ اپنے دلوں کو بھی ایمان سے مزین کر رکھا ہے اور دوسروں کے دلوں کی اسی زینتِ ایمانی کو محبوب رکھتے ہیں تو ظاہر ہے جس کی نظر میں اس کے اصول (والدین) اور فروع (اولاد) کے رشتے بھی ہیچ ہیں۔ اس کے نزدیک اس کی اپنی دوسری خواہشات کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ اس کی ہر چیز اور ہر بات اللہ و رسول کی پسند اور مرضی کے تابع ہوگی۔

پھر ایسے کو عزت نہ ملتا، رضائے خداوندی سے نہ نوازا جاتا، انعام و اکرام سے بہرہ ور نہ کیا جاتا ایسا ہی ہوتا جیسا اس دشمن کو عذاب نہ دیا جاتا۔ جس طرح اس باغی کو ذلت و نکبت کا عذاب دیا جانا عدل ہے۔ اسی طرح اس مطیع و مومن کو عزت و رحمت سے سرفراز کیا جانا بھی انصاف کا تقاضہ ہے۔ وہ شیطانی گروہ ہے، اس لئے خدا کے نزدیک شیطان کی ذلت میں اس کا گروہ ضرور شریک ہوگا اور یہ خدا کا گروہ ہے۔ خدا

اس گروہ کو ضرور جنت و رحمت اور فلاح و نجات اور رضا و خوشنودی سے نوازے گا۔

سورۃ الحشر

اس سورت کا نام سورۃ حشر ہے۔ اس میں تین رکوع اور ۲۴ آیتیں ہیں۔ یہ سورت مدنی ہے۔ ربیع الاول سنہ ۴ھ میں بنونضیر کے محاصرہ کا واقعہ پیش آیا (جس کی تفصیلات آگے بیان کی جارہی ہیں۔) اور اسی کے ساتھ اس سورت کا نزول ہوا۔ یہاں حشر سے مراد جلا وطنی ہے اور بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس سورت کا نام سورۂ بنونضیر ہے۔

بخاری شریف اور مسلم شریف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ یہ سورۃ الحشر ہے۔ آپ نے فرمایا بنونضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا یہ سورۂ بنونضیر ہے۔

پچھلی سورت میں منافقین کی ناشائستہ حرکتوں کا ذکر تھا۔ اس سورت میں ان کے معین و مددگار یہود کی نالائق حرکت اور منافقین کی دوستی ان کے کام نہ آنا اور منصوبہ بازیوں اور شرارتوں کی سزا جلا وطنی کا ذکر ہے اور بمناسبت عقوبت مذکورہ جلا وطنی کے درمیان میں فئے کے احکام بیان کر دیئے گئے ہیں پھر اخیر حصہ سورت میں مسلمانوں کو اعمال کفار مذکورین سے نفرت اور اجتناب کی غرض سے آخرت کی تیاری اور احکام خداوندی کی مخالفت سے بچنے کا امر کیا گیا ہے۔ پھر اس امر کی تقویت و تاکید کے لئے اپنے صفات جمال و جلال بیان فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ زبردست حکمت والا ہے وہی ہے جس نے

الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِھِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ

کفار اہل کتاب (یعنی بنی نضیر) کو ان کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ (گھروں سے) نکلیں گے

یَّخۡرُجُوۡا وَظَنُّوۡۤا اَنَّھُمۡ مَّانِعَتُھُمۡ حُصُوۡنُھُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنۡ حَیۡثُ

اور انھوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچالیں گے سو ان پر خدا (کا عقاب) ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو

لَمۡ یَحۡتَسِبُوۡا ٭ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الرُّعۡبَ یُخۡرِبُوۡنَ بُیُوۡتَھُمۡ بِاَیۡدِیۡھِمۡ وَ

خیال بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں

اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ٭ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ ۝ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمُ

سے بھی اُجاڑ رہے تھے سو اے دانشمندو عبرت حاصل کرو اور اگر اللہ ان کی قسمت میں جلا وطن ہونا نہ لکھ چکا

الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

تو ان کو دنیا ہی میں سزا دیتا اور ان کے لئے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے یہ اس سبب سے ہے

شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ وَمَن يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ مَا

کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور رسول کی مخالفت کی ہے اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ اس کو سخت سزا دینے والا ہے جو

قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝

کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا ہی کے حکم کے موافق ہیں اور تاکہ کافروں کو ذلیل کرے

شانِ نزول

قبل اسلام جب یہودیوں پر مصائب پڑے تو یہ بڑی تعداد میں سرزمین عرب میں آ بسے تھے۔ ان میں سے بیشتر مدینہ کے قرب وجوار میں آباد ہو گئے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی اسل یہودی خیبر میں۔ اسی طرح بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ یہ سب قبائل مدینہ کے متصل کے اطراف میں دو دو میل کے فاصلہ پر آباد ہو گئے اور اس علاقہ میں ان کی بود و باش بطور خاص اس لئے ہوئی تھی کہ وہ پیغمبر جن کی اطلاع حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی وہ یہیں آکر رہیں گے اور یہی شہر اس کا تجلی گاہ بنے گا۔

لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد جب ان کو یہ علم ہوا کہ جس نبی آخر الزماں کا انتظار تھا وہ ہماری قوم میں سے نہیں ہے تو بجائے ایمان واعانت کے مخالفت وعداوت کا جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔

مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد آپ ہی کی امارت وحکومت مدینہ میں قائم ہو گئی۔ آپ چونکہ اس بات سے باخبر تھے کہ جن مشرکین کی آنکھوں میں دشول چبھو تک کر مدینہ منورہ میں پہنچا ہوا ہے وہ پوری کوشش یہاں سے بھی اکھاڑنے کی کریں گے۔ وہ نہ خود اطمینان سے رہیں گے اور نہ ہمیں رہنے دیں گے تو آپ نے یہود کے ان قبائل سے مطمئن ہونے کے لئے ان کے ساتھ صلح کے معاہدے کر لئے۔ اس طرح کہ یہ یہودی قبائل آپ کے حلیف ہو گئے۔

مگر احد کی لڑائی میں مسلمانوں کو کفارِ قریش سے جو ہزیمت پہنچی۔ اس کے بعد ان کے خیالات بدل گئے تھے۔ دماغوں میں سرکشی ابھرنے لگی تھی۔ اگرچہ اس سے قبل غزوۂ بدر کے بعد سردار قریش ابوسفیان بنو نضیر کے سردار سلام بن مشکم کا اپنے یہاں مہمان رکھا جبکہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شبخون مارنے آیا تھا۔ ان یہودیوں نے اس کی مدد کی۔ ابوسفیان اتنا ہی کر سکا کہ چند مسلمانوں پر جو اطراف مدینہ کھیتوں پر کام کر رہے تھے شبخون مارا۔ لیکن مسلمانوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس کا تعاقب کیا۔ بہرحال یہ تو ہو ا ہی تھا۔ اب نیا واقعہ یہ پیش آیا کہ مشرکین نے دھوکہ بازی سے بئر معونہ میں تقریباً ستر صحابۂ کرام کو شہید کر دیا، لیکن ان میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بچ کر بھاگ نکلے۔ مدینہ منورہ کی طرف آتے وقت نہ معلوم کیوں انھوں نے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا یہ غلط ہوا۔ اب اس کی دیت یعنی خون بہا ہمیں مقتولین کے ورثاء کو دینا ہو گا۔ آپ نے اس مقصد کے لئے چندہ کیا۔ چونکہ یہودی حلیف تھے، اس لئے ان کو بھی شریک چندہ کرنے کے لئے بنو نضیر کی گڑھی تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم تھے۔ بنو نضیر نے آپ سے تو یہ کہا کہ حضرت تشریف رکھئے ہم چندہ جمع کر کے حاضر کر رہے ہیں۔ آپ اس گڑھی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے، مگر ان بدبختوں میں آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ ہم کب تک مشرکینِ عرب کو اپنا مخالف بنائے رکھیں گے۔ آج جب کہ آپ ہمارے پاس ہی آئے ہوئے ہیں تو اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا ہے، اس لئے آج کسی طرح آپ کا کام تمام کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ جس دیوار کے سہارے آپ تشریف رکھتے

تھے اس پر کوئی آدمی جا کر بڑا بھاری پتھر آپ پر گرا دے۔ اس کام کے لئے عمرو بن حجاش بن کعب مقرر ہوا۔ وہ پروگرام کے مطابق پتھر لیوا دیے کر پہنچ گیا۔ پتھر گرانے ہی والا تھا کہ آپ کو بذریعہ وحی خطرہ کا علم ہو گیا اور حسب ہدایت وحی آپ فوراً اس جگہ سے ہٹ گئے اور اپنے رفقاء سمیت واپس تشریف لے آئے۔ اس طرف وہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جو آپ کے ساتھ نہ تھے وہ آپ کے منتظر تھے۔ جب کچھ دیر ہوئی تو وہ تلاش کرنے کے لئے چل پڑے۔ پھر آپ ایک آدمی سے معلوم کرتے آپ مدینہ میں واپس تشریف لے آئے ہیں۔ وہ سب بھی لوٹ آئے اور حاضر خدمت ہو کر دریافت حال کیا۔ حضور ﷺ نے پوری تفصیل سنائی اور جہاد کی تیاری کا حکم دیا اور ساتھ ہی ان یہود بنو نضیر کو مطلع فرما دیا کہ تم نے نقض عہد کیا ہے، اس لئے تم سب یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پھر جہاد ہوگا۔ اس تفصیل کا علم منافقین کو ہوا تو ان میں سے بنو عوف بن خزرج کے قبیلہ میں جس میں رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول اور ودیعہ اور مالک بن نوفل وغیرہ تھے۔ بنو نضیر کے پاس یہ کہلا بھیجا کہ تم باطمینان اپنے گھروں ہی میں رہو اور نکلنے سے انکار کر دو۔ ہم تمہاری مدد پر ہیں۔ تمہارا دشمن ہمارا دشمن ہے۔ ہم تمہارے ساتھ مل کر اس سے ضرور لڑیں گے۔ ان یہودیوں نے کچھ تو اپنے امتیازی غرور اور کچھ اس مدد اور کمک کے بھروسہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کر دی کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے آپ جو چاہیں سو کریں۔ ہم مقابلہ کے لئے بھی تیار رہیں۔ حضور ﷺ کے حکم پر مجاہدین نے کمریں باندھ لیں اور راہ خدا میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہودیوں نے لشکر کو دیکھ کر اپنے قلعہ اور گڑھی کا پھاٹک بند کر لیا۔ اور اس اطمینان پر اندر گھس کر بیٹھ گئے کہ اول تو ہمارا قلعہ نہایت مضبوط ہے۔ اندر گھسنا آسان نہیں ہے۔ دوسرے کمک آنے والی ہے۔ اس کے آنے پر باہر نکل کر لڑیں گے، مگر وائے رے حسرت، یہ منافقین اپنے استادوں کو بھی بھینٹ چڑھا گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مدد کو نہ پہنچا۔ ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ قلعہ کا محاصرہ کر چکے تھے اور حضرات صحابہ نے قلعہ سے باہر مدینہ تک پھیلے ہوئے ان کے باغات اور کھیتوں کو بھی جلا اور کاٹ ڈالا تھا۔ محاصرہ کو گیارہ روز ہو چکے تھے۔ ان سب باتوں سے تنگ آ کر امن کی درخواست پیش کر دی کہ ہم یہاں سے نکل جانے کے لئے تیار ہیں ان کے دلوں میں منجانب اللہ رعب بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے آنحضرت سے جاں بخشی کی درخواست پر مجبور ہوئے۔ اور یہ بھی درخواست کی کہ ہم اونٹوں پر جو مال لاد کر لے جا سکیں وہ لے جانے دیا جائے۔ آپ ﷺ نے از راہ رحم و کرم دس روز کی مہلت دی اور اجازت دی کہ جس قدر مال اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں لے جائیں، مگر ہتھیار لے جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ان یہودیوں نے محض مال و اسباب ہی نہیں گھروں کی کڑیاں اور چوکھٹیں تک اکھاڑ کر لاد لیں۔ کیونکہ ایک طرف تو ورثہ میں ملا ہوا حرص و لالچ اور دوسرے یہ حسد کہ کہیں مسلمانوں کو ان کے استعمال سے فائدہ نہ پہنچ جائے۔ اس واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر کائنات کا ذرہ ذرہ خداوند قدوس کے جبروتی احکام کی گرفت میں ہے۔ چاند، سورج، ستارے، آسمان اور زمین کے باشندے اور ہر ہر چیز زبان حال و قال سے اس کی تسبیح اور اس کی یکتائی و شان و عظمت بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ ہر شے پر اسی کا غلبہ و تسلط ہے وہ زبردست ہے اور ہر چیز اس کے زیر دست! اسی کے ساتھ وہ بے پناہ حکمت والا بھی ہے۔ اس کی رفعت، شان اور بے پناہ حکمت و قدرت کا ایک مظاہرہ یہ بھی ہے کہ وہی ہے جس نے ان کفار اہل کتاب یعنی یہود بنو نضیر کو حشر سے پہلے ہی ان کے گھروں سے باہر نکال دیا حالانکہ ان کی شان و شکوہ اور مکانوں کی رفعت اور بلڈنگوں کے استحکام کی وجہ سے ذہن یہ باور کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ یہودی بھی ایسا ہی کہا کرتے تھے کہ ہم حشر تک بھی یہاں سے نہ نکلیں گے۔ گویا انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اس قدر مامون و محفوظ ہو گئے کہ خدا کے انتقام سے وہ بچے رہیں گے۔ مگر جس طرح کرشمۂ قدرت ظاہر ہوا اور جن راستوں سے عتاب خداوندی پہنچا اس کا تو ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ انھوں نے اس بات کو کب سوچا ہوگا کہ یہ بے سر و سامان مسلمان بھی ان باسامانوں کو نکال سکیں گے۔ مگر یہی خدائے برتر کی قدرت و حکمت کا اثر ہے کہ ایسا ہوا اور اتنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ان یہودیوں کے دل میں رعب بھی ڈال دیا گیا۔ اسی رعب نے ان کو اس فیصلہ پر مجبور کیا کہ مسلمانوں سے مقابلہ بے سود ہے۔ ہم ہرگز کامیاب نہ ہوں گے اس لئے یہاں سے نکل جانے ہی میں عافیت ہے۔ اور پھر نکلے بھی تو ایسی عبرتناک صورت سے کہ جن کوٹھیوں اور بلڈنگوں پر خود کو ناز تھا اُن کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے منہدم کرنا پڑا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی ان کو منہدم کرایا۔

اس طرح اپنے ہی ہاتھوں اپنے سرمایہ اور جائیداد کو تباہ و برباد کرنا یہ بھی اللہ کا عذاب اور اس کی پھٹکار ہی ہے تو جو لوگ چشم بصیرت رکھتے ہیں ان کو اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ مکار اور عیار قوم کے ساتھ اللہ تعالٰی کس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔ جب وہ انتقام لیتا ہے تو ساری مکاری دھری رہ جاتی ہے

یہ جلا وطنی اور بے خانماں ہونا اگرچہ عذاب خداوندی ہی ہے جو ان کے لئے مقسوم ہو چکا تھا، مگر اس صورت میں یہ زندہ تو رہے۔ اپنی زندگیوں سے تو ہاتھ نہیں دھویا۔ یہ بھی ان کے حق میں خدا کی مہربانی ہے۔ اپنی اصلاح کرلیں اور اس موقع کو غنیمت سمجھیں۔ ورنہ اگر یہ جلا وطنی ان کی قسمت میں نہ ہوتی تو جس طرح کے ان کے جرائم ہیں۔ اس کی سزا میں مختلف طریقوں سے عذاب کے ذریعہ ان کو تباہ اور نیست و نابود کر دیا جاتا۔ خواہ سابقہ کی طرح یا بنو قریظہ کی طرح قتل کی سزا دے کر اور بہر صورت آخرت میں عذاب دوزخ تو ان کے لئے ہے ہی جو سب عذابوں سے بڑھ کر ہے اور زیادہ فکر اسی سے نجات کی کرنی چاہیئے۔

ان کے ساتھ یہ معاملہ اسی سبب سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ معاہدہ توڑا اور ایمان تو پہلے ہی سے نہیں لائے ہوئے تھے۔ پھر پیغمبر خدا کے ساتھ مکاری کر کے ان کو شہید کرنے کی کینہ پرورانہ اور عیارانہ تدبیر کی۔ لہٰذا جو اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اس کو یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالٰی سخت ترین سزا دینے والے ہیں۔ مجرموں کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہی قانون قدرت ہے اور یہی آئین عدل و انصاف بھی۔

یہ یہودی طعنہ دیتے ہیں کہ پیغمبر اور مسلمان دوسروں کو زمین پر فساد سے روکتے ہیں اور خود اس کے مرتکب ہوئے کہ دوران محاصرہ کھجوروں کے درختوں کو کاٹا اور جلایا۔ یہ کیسا عدل ہے یہ کیسا انصاف ہے۔ تو اے مسلمانو! تم ان کی طعنہ زنی کو اہمیت نہ دو۔ تم نے کھجور کے درخت کاٹے یا ان کو کھڑے رہنے دیا۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کے حکم سے ہوا تاکہ جو درخت کاٹے گئے اس سے ایک طرف محاصرہ میں سہولت ہو اور دوسری طرف دشمنوں کو ہلاکت مال کا غم ہو اور جو درخت باقی رہ گئے وہ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں آئیں اور ان پر دو صورتوں میں ان مجرمین کی رسوائی ہو اور مسلمانوں کو عزت و افتخار اور قہر و غلبہ حاصل ہو۔

تحلیل اجزاء

ھو الذی اخرج۔ یعنی خدا تعالٰی کے قہر و غلبہ اور حکمت و قوت کے بے شمار مظاہر ہیں۔ ان ہی میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ اس نے کفار اہل کتاب کو ان کی بستی سے نکال دیا۔ ان میں ایک طرف قوت و غلبۂ قدرت خداوندی بھی ظاہر ہوا اور دوسری طرف بے شمار حکمتیں بھی سامنے آئیں۔

لاول الحشر۔ یہ یہود بنو نضیر کہا کرتے تھے کہ ہم حشر تک بھی اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ ان کو اپنی بلڈنگوں اور قلعوں کی مضبوطی پر بڑا ناز تھا۔ اس لئے فرمایا گیا کہ ہم نے حشر سے پہلے ہی ان کو نکال دیا اور بعض مفسرین کے نزدیک معنٰی یہ ہیں کہ پہلی مرتبہ ان کو اکٹھا کر کے نکال دیا۔ گویا اس میں اشارہ ہے ایک پیشین گوئی کی طرف کہ دوسری مرتبہ پھر یہ اپنی بستیوں سے نکالے جائیں گے۔ چنانچہ اول حشر تو اکثر کا خیبر کی طرف ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں خیبر بلکہ پورے عرب سے ان کو نکالا گیا۔ یہ حشر ثانی ہوا اور بعض روایات میں ارض شام کو ارض محشر بھی کہا گیا ہے۔

مانعتھم حصونھم اپنے قلعوں کی مضبوطی پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ان کے دل میں غیبی انتقام کا خطرہ بھی نہیں آتا تھا۔

فاتھم اللہ۔ سو خدا ان تک ایسی جگہ سے پہنچ گیا جس کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ مراد اس سے سزا اور انتقام خداوندی ہے۔

وایدی المؤمنین یعنی مسلمان بھی ان کے ساتھ مل کر ان کے گھروں کو منہدم کر رہے تھے اور یہ بڑی عبرت ناک بات تھی۔ اور مسلمانوں کے منہدم کرنے کو ان کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ اس انہدام کا سبب ان کا نقض عہد اور سرکشی ہی تو تھا۔

فاعتبروا یعنی عبرت حاصل کرو کہ خدا اور رسول کی مخالفت کا انجام بعض اوقات دنیا میں بھی نہایت برا ہوتا ہے۔

ومن یشاق اللہ اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے، اللہ کی مخالفت میں ہی چونکہ نتیجتہً رسول کی مخالفت بھی ہوتی ہے، اس لئے

یہاں رسول کی مخالفت کا صراحتہً ذکر نہیں کیا گیا۔
ما قطعتم اہلِ حرب کے مال و جائیداد کو جلانا اور ویران کرنا جب ان میں مصلحت و ضرورت ہو تو جائز ہے۔ اس سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ اختلافِ مسلک اگر شرعی حد میں اور خلوص سے ہو تو مضر نہیں ہے۔ جیسے فقہاء اور صوفیاء کے مسلک۔
لِینَۃٍ لین کے معنی نرمی کے ہیں اور لینۃ تر و تازہ کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ عجوہ اور برنی جو کھجور کی قسمیں ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ لینۃ میں داخل نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں صرف عجوہ نہیں اور بعض کہتے ہیں ہر قسم کی کھجوریں اس میں داخل ہیں۔

مقصود بیان

اللہ تعالےٰ کے فیصلہ کے سامنے ہر تدبیر ناکارہ اور ہر چیز عاجز ہے۔ کائنات کی ہر چیز اسی کی پیدا کردہ اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی نام لیوا اور تسبیح خواں ہے۔ اسباب کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس لئے اس کی رضا و خوشنودی سے مستغنی ہو کر اور اس کے انتقام اور مواخذہ سے بے فکر ہو کر اسباب اور تدابیر ہی پر بالکلیہ بھروسہ اور اعتماد سراسر حماقت اور نادانی ہے جب وہ انتقام لیتا ہے تو اس سے گلو خلاصی ناممکن ہے۔ وہ چاہتا ہے تو چڑیوں کی چونچ سے کنکریاں گرا کر ہاتھیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ کمزور کو قوی اور قوی کو کمزور بنا دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں
اس لئے ہر فرد اور ہر قوم کی فلاح اسی میں ہے کہ خدا کو راضی کرنے کی فکر و سعی کرے۔ ورنہ سوچ لے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی اور قانون شکنی کی پاداش میں دنیا میں بھی عذاب آسکتا ہے۔ آخرت میں دردناک عذاب تو مل کر ہی رہے گا۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ
اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوایا سو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ لیکن اللہ تعالےٰ

يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ
اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط فرما دیتا ہے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے

مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ
لوگوں سے دلوا دے سو وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابتداروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا

السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا
تاکہ وہ (مالِ فے) تمہارے تونگروں کے قبضہ میں نہ آجاوے اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم

نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ
رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور ان حاجتمند مہاجرین کا حق ہے جو

اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ
اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جُدا کر دیئے گئے اور اللہ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے

رَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ

رسول کی مدد کرتے ہیں ۔ یہی لوگ سچے ہیں اور ان لوگوں کا جو دارالسلام (مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے

مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ

پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ انصار اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم

أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جاوے ایسے ہی لوگ فلاح پانے

الْمُفْلِحُونَ ۝ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ

والے ہیں اور ان لوگوں کا (بھی اس مال فے میں حق ہے) ان کے بعد آئے جو (ان کے حق میں) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے

سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ④

ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق رحیم ہیں

ع ۱۴

ربط اس سے قبل کی آیات میں جو بیان ہوا وہ بنی نضیر کی جانوں کے ساتھ معاملہ ہوا اور ان کے مالوں کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا بیان یہ ہے

تفسیر جو کچھ مال و جائیداد بطور فے کے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان یہود بنو نضیر سے دلوا دیا ہے۔ اس کے لئے تمہیں کوئی مشقت تو برداشت نہیں کرنی پڑی۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، اس لئے اس میں تمہیں استحقاق غنیمت کے چار خمس کی طرح تقسیم و تملیک کا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ یہ سب اپنے فضل سے دلایا ہے۔ کیونکہ یہ خداوند تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رسولوں میں اپنے دشمنوں پر جس پر چاہے محض رعب سے مغلوب کر کے مسلط فرما دیتا ہے جس میں کسی کو کچھ مشقت نہیں اٹھانی پڑتی۔ چنانچہ اس وقت بھی اس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو نضیر پر اسی طرح مسلط فرما دیا کہ ان کے دلوں میں پیغمبر کا رعب ڈال دیا گیا۔ اس لئے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مالکانہ تصرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے گرامی پر موقوف ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل ہے۔ وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے اس لئے وہ جس طرح چاہے دشمنوں کو مغلوب کرے اور جس طرح چاہے اپنے پیغمبر کو مسلط اور حاصل شدہ اموال میں اختیار اور حق تصرف دے۔

اور اموال بنی نضیر کی طرح جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے کفار سے دلوا دے۔ جیسے فدک اور کچھ خیبر کا حصہ (بقیہ حصہ خیبر کا فے نہ تھا کیونکہ وہ عنوۃً فتح ہوا تھا۔) تو اموال بنی نضیر کی طرح ان اموال میں بھی تمہارا کوئی حق ملکیت نہیں ہے بلکہ اللہ کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس طرح حکم کرے اور رسول کا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی کو مالکانہ حق تصرف سپرد کر دیا اور آپ کے قرابت داروں کا حق ہے۔ نیز یتیموں، غریبوں اور مسافروں کا حق ہے۔ گویا مال غنیمت کے چار خمس کی طرح اموال فے میں مسلمانوں کا حق بربنائے شرکت جہاد نہیں ہے بلکہ اوصاف مذکورہ جن مسلمانوں میں ہوں گے۔ وہ اس کے حسب صوابدید پیغمبر مستحق ہوں گے۔

اور یہ حکم اس لئے مقرر کر دیا اور مصارف اس لئے بوضاحت بیان کر دیئے تاکہ وہ مال فے تم میں سے مال داروں کے قبضہ میں نہ آجائے جس طرح جاہلیت میں سب غنائم اور محاصل جنگ باختیار لوگ کھا جایا کرتے تھے اور فقراء، غرباء محروم رہ جاتے تھے۔

اور جب یہ اموال پیغمبر کی رائے پر محوّل ہیں تو تم کو جو کچھ پیغمبر دیدیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز کے لینے سے تم کو روک دیں رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ مخالفت کرنے پر سخت سزا دینے والے ہیں۔

چنانچہ روایات میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال بنی نضیر کا اکثر حصہ مہاجرین اور انصار (میں سے بعض) کو تقسیم فرمایا (زرعی) اور بقیہ میں سے اپنے اہل و عیال کو سال بھر کا خرچ دے کر جو بچتا وہ سامانِ جہاد و سلاح وغیرہ میں صرف فرما دیتے (تفسیر) اور خیبر کی آمدنی سے فقراء مہاجرین کی اور فدک سے مسافروں کی امداد فرماتے (اخرجہ ابو داؤد و ابن مردویہ)

انصار میں سے دو شخصوں کو حصہ دیا ایک سہل بن حنیف اور دوسرے ابو دجانہ سماک بن خرشہ اس لئے کہ یہ دونوں حضرات مساکین تھے۔ بنو نضیر میں سے دو شخص مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ آنحضرت نے ان کا مال ان ہی کو دیدیا۔ ان میں یامین بن عمر تھے جو عمرو بن جحاش کے چچا کا بیٹا تھا۔ یہ عمرو وہ ہے جس نے بنو نضیر کے قلعہ کی دیوار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ دوسرے ابو سعد بن وہب۔

ابو داؤد میں حضرت مالک بن اوس سے روایت ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے دن چڑھے بلایا۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ آپ اپنے مکان میں ایک تخت پر تشریف فرما ہیں۔ جس پر کچھ بچھا ہوا نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہاری قوم کے چند لوگ میرے پاس آئے تھے میں نے ان کو کچھ دیا ہے۔ تم وہ لے کر ان میں تقسیم کر دو۔ میں نے عرض کیا کہ اچھا ہوتا کہ جناب کسی اور کو یہ کام سپرد فرما دیتے۔ آپ نے فرمایا نہیں تم ہی کرو۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ اسی وقت آپ کا غلام یرفا حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت زبیر بن عوام حضرت سعد بن وقاص تشریف لائے ہیں کیا انہیں اجازت ہے؟ آپ نے فرمایا آنے دو۔ چنانچہ یہ حضرات تشریف لائے۔ یرفا پھر آیا اور عرض کیا کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم آئے ہیں اور اجازت طلب کر رہے ہیں۔ آپ نے ان کے آنے کی بھی اجازت دیدی۔ حضرت عباس نے کہا امیر المومنین میرا اور ان کا یعنی حضرت علی کا فیصلہ کر دیجئے۔ پہلے جو چاروں بزرگ آئے تھے ان میں سے کسی بعض نے کہا ہاں امیر المومنین ان کا فیصلہ فرما دیجئے۔ حضرت عمر نے ان چاروں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ تمہیں خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ہمارا متروکہ مال ورثاء میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ ان چاروں نے اس کا اقرار کیا کہ یہ صحیح ہے۔ پھر آپ نے حضرت عباس رضی اور حضرت علی رضی سے بھی اسی طرح قسم دیکر پوچھا تو انھوں نے بھی اقرار کیا پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کا مال بطور فئے کے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا یہ اور کسی کے لئے نہیں تھا۔ آپ نے یہی آیت وَمَا افاء اللہ الخ پڑھی پھر فرمایا کہ خدا کی قسم نہ تو میں نے تم پر اس میں کسی کو ترجیح دی اور نہ خود ہی اسے لے لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا اور اپنے گھر والوں کا سال بھر کا خرچ اس میں سے لے لیتے اور باقی مال کو مصارف بیت المال میں صرف فرما دیتے تھے۔ آپ نے ان سب بزرگوں سے قسم دیکر پوچھا کہ کیا تمہیں اس کا علم ہے۔ ان سب نے جواب دیا بے شک ہمیں یہ بات معلوم ہے۔ پھر فرمایا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ والی بنے۔ اور تم دونوں خلیفۂ رسول کے پاس آئے۔ اے عباس تم تو اپنی رشتہ داری جتا کر اپنے چچا زاد بھائی کے مال میں سے اپنا ورثہ طلب کرتے تھے۔ اور یہ حضرت علی رض اپنا حق جتا کر اپنی بیوی حضرت فاطمہ رض کی طرف سے ان کے والد کے مال سے ورثہ طلب کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رض نے تم دونوں سے فرمایا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارا ورثہ بانٹا نہیں جاتا ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

اللہ خوب جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر یقیناً رشد و ہدایت کے حامل، راست باز اور متبع حق و نیکوکار تھے۔ اس مال کی ولایت حضرت ابوبکر نے کی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ میں بنا۔ اور وہ مال میری ولایت میں رہا۔ پھر آپ دونوں ایک صلاح سے میرے پاس آئے اور مجھ سے یہ مال مانگا۔ میں نے اس وقت کہا تھا کہ اگر تم اس شرط سے یہ مال اپنے قبضہ میں رکھو کہ تم اسی طرح خرچ کرو گے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے تو میں سپرد کر دیتا ہوں۔ تم نے اس وقت اس بات کو مان لیا اور اس مال کی ولایت لے لی۔ پھر تم اب آئے ہو تو کیا اس کے سوا کوئی اور فیصلہ چاہتے ہو؟ قسم خدا کی قیامت تک میں اس کے سوا کوئی فیصلہ

نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تم اپنے وعدے کے مطابق اس مال کی نگرانی اور اس کو خرچ نہیں کر سکتے تو تم اسے مجھے واپس کر دو تاکہ صحیح طور پر کیا جا سکے۔

ان روایات سے آیاتِ مذکورہ کی عملی وضاحت ہو جاتی ہے اور تفسیر آیات کی تائید بھی۔

اس کے بعد بقیہ آیات میں ارشادِ خداوندی ہے۔ للفقراء المہاجرین الخ یوں تو مالِ فے میں مطلقاً مساکین کا حق ہے، لیکن بالخصوص ان حاجتمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مال و جائیداد سے جبراً و ظلماً محروم کر دیئے گئے۔ کفار نے ان کو اس قدر پریشان کیا کہ ان کو مجبوراً گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی اور ان کی یہ ہجرت کسی دنیوی غرض کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے اس عمل میں اللہ کے فضل اور رضامندی کے طلبگار ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے اس عمل سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ ہر طرح سے اللہ اور اس کے رسول کے دین کی مدد کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہی لوگ عقیدۂ عمل کے لحاظ سے سچے ہیں۔

نیز ان لوگوں کا بھی اس مال میں حق ہے جو مہاجرین کے مدینہ منورہ میں آنے سے پہلے ہی سے اس دار السلام (مدینہ) اور ایمان میں قرار پکڑے ہوئے ہیں۔ یہ اپنے وطن مدینہ میں ہی رہے اور یہیں ایمان و اسلام کی طرف لپکے اور اس کو سینے سے لگایا۔

اور جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتا ہے۔ اس کے آنے پر یہ ناگواری محسوس نہیں کرتے بلکہ اس سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مالِ غنیمت وغیرہ میں سے جو کچھ مہاجرین کو ملتا ہے۔ اس کی یہ اپنے دلوں میں کوئی حاجت و طلب بھی نہیں رکھتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کی محبت کا یہ حال ہے کہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات میں ایثار کر کے مہاجرین کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ خود ان پر فاقہ ہی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رہے اور حرص و لالچ سے اپنے کو بچائے رکھے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب و ہمکنار ہوتے ہیں

اور وہ لوگ اس مالِ فے میں حقدار ہیں جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے یا ہجرت کی یا اسلام و ہجرت سے بعد میں مشرف ہوں اور ان کے قلوب متقدمین کی قدر و منزلت اور معاصرین کے ساتھ جذباتِ اخوتِ اسلامی سے معمور ہوں اور اس طرح دعائیں کریں کہ اے پروردگار ہماری بخشش کر دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کسی قسم کا کھوٹ کپٹ نہ ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار آپ بڑے شفیق اور مہربان ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ آپ ہماری دعاؤں کو قبولیت سے نوازیں گے۔

تحلیل اجزاء

وما افاء اللہ۔ فاء یعنی مبرد کے نزدیک اس کے معنیٰ رجوع کے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں کہ فے اس مال کو کہتے ہیں جو مخالفین سے بغیر جنگ و جدل کے حاصل ہو خواہ دشمن چھوڑ کر چلا جائے یا کفار بطور جزیہ دیں یا رعب میں آکر جان بچانے کے لئے کچھ رقم یا چیزیں دیں اس کو لغوی معنیٰ کے اعتبار سے فے اس لئے کہا جاتا ہے کہ کفار سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے پاس بھیجا ہے۔ برخلاف مالِ غنیمت کے وہ جنگ و جدل اور مشقت و محنت سے حاصل ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک فے کے لفظ میں جس کے معنیٰ سایہ کے ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا بیش قیمت مال بھی ایک سایہ کی طرح ہے جو برقرار نہیں رہتا بلکہ زوال پذیر ہوتا ہے۔

اموالِ بنو نضیر کو اس لئے فے کہا گیا کہ یہ مال مسلمانوں کو بغیر جنگ و جدل کے حاصل ہو گیا۔ بدر اور احد کی طرح میدانِ کارزار گرم نہیں ہوا بلکہ مسلمانوں کے محاصرہ کر لینے پر اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ مقابلے پر نہ آ سکے اور نہ جم سکے بلکہ اپنے گھروں سے بے دخل ہو جانے پر تیار ہو گئے اور جو مال وہ لے جا سکتے تھے لے گئے۔ باقی جو مال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا۔ بقول مؤرخین اس میں پچاس خود تین سو پینتالیس اونٹ اور دیگر سامان وغیرہ تھا۔

ممکن ہے حضرات صحابہ کو خیال ہوا ہو کہ یہ بھی مالِ غنیمت کی طرح سب مجاہدین غزوۂ بنو نضیر کا حق ہے، اس لئے اس آیت نے واضح کر دیا کہ یہ مالِ فے ہے جس کا اختیار صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ یہ مالِ غنیمت کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے کہ مال کے حصول میں تمہاری مشقتوں کو دخل نہیں ہے۔ اوجفتم، وجف یجف وجفا وجیفا۔ جلد اور تیز چلنا۔ دوڑنا گھوڑے اور اونٹ کا۔

بلاشبہ اس غزوہ میں بھی حضرات صحابہ کو بھی اپنے گھروں سے نکل کر بنو نضیر کی آبادی کا محاصرہ کرنا پڑا اور محاصرہ بھی کئی روز تک رہا۔ اس سلسلے میں جیسی کچھ محنت اور پریشانی ہو سکتی تھی وہ برداشت کی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بنو نضیر مدینہ منورہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھے۔

حضرات صحابہ کو اس غزوہ کے لئے کچھ زیادہ سامان سفر اور تیاری کی ضرورت نہ ہوئی۔ پا پیادہ جاکر محاصرہ کر لیا گیا۔ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے۔ حاصل یہ کہ جس طرح جنگوں میں محنتیں اور تکلیفیں اٹھا کر کامیابی اور فتح ہوتی ہے۔ اس میں اس قدر محنت و مشقت اٹھانی نہ پڑی۔ گویا مفت ہاتھ آ گیا، اس لئے اس مال کو فئے کہا گیا۔

بعض علماء کے نزدیک ان آیات میں فدک کی طرف اشارہ ہے جو بلا محنت ہی حاصل ہوا تھا۔ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب اور مہمانوں کے لئے خرچ کیا کرتے تھے اور بقیہ سے سامانِ جنگ، گھوڑے، ہتھیار وغیرہ مہیا فرماتے تھے۔

لیکن تمام روایات کے مطابق اموال بنو نضیر کی طرح فدک اور نصف خیبر فئے میں ہی داخل تھے۔ اس لئے کہ یہ سب بغیر قتال کے ہی حاصل ہوئے تھے۔ اس نصف خیبر میں کتیبہ، وطیح، سلالم، وحدہ داخل تھے اور بقیہ نصف خیبر یعنی شق اور نطاۃ فئے نہ تھا بلکہ وہ بالحرب اور عنوۃً فتح ہوا تھا۔

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ یہاں سے مصارف فئے بیان کئے جا رہے ہیں۔ قریٰ قریہ کی جمع ہے۔ گاؤں دیہات کو قریہ اور گاؤں والوں کو اہل قریہ کہا جاتا ہے۔ یعنی کفار سے جو گاؤں اور دیہاتوں میں آباد تھے ان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بشوکتِ اسلامی جو مال و اسباب و جائداد دلوا دی۔ اس کے مصارف یہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔ گاؤں والوں سے مراد قریظہ، نضیر، فدک اور خیبر ہیں۔

فللہ وللرسول الخ آیت میں چھ اشخاص مذکور ہیں۔ اوّل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ یوں تو سب کچھ اسی کا ہے، مگر یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مخصوص حاجتوں کے لئے اپنا خزانہ بنا کر رکھا ہے۔

دوسرے رسولؐ کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو اس مال میں مالکانہ تصرف کا حق ادا فرمایا۔

تیسرے قرابت دار۔ آیت میں یہ قید نہیں ہے کہ قرابت کس کے؟ بظاہر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار مراد ہیں۔

چوتھے یتامیٰ۔ پانچویں مساکین۔ چھٹے ابن السبیل یعنی مسافر۔ یہ تینوں یہ ذی حاجت اشخاص ہیں۔ لیکن ابن السبیل میں شاہی اور سلطنت کے مہمان بھی داخل ہیں۔

تو اب مربوط ترجمہٗ مطلب اس طرح ہوگا کہ یہ اللہ کا مال ہے اس میں لشکر کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ رسولؐ کے پاس رہے گا۔ پیغمبر اس کو ذاتی اور خانگی مصارف میں بقدرِ ضرورت خرچ کریں۔ اور اپنے رشتہ داروں کو بھی اس مال سے بوجہ قرابت صلہ رحمی کریں اور جو قرابت دار محتاج ہوں وہ بدرجۂ اولیٰ صلہ رحمی کے مستحق ہیں اور یتیموں کو بھی دیا جائے خواہ پیغمبر کے خاندان کے یتیم ہوں یا اور کوئی۔ اور مسافروں کو بھی دیا جائے۔ خواہ اس لئے کہ وہ ضرورت مند ہوں۔ یا بطور مہمان پیغمبر کے پاس کسی قوم یا جماعت کے نمائندے وغیرہ کے طور پر آئے ہوں کہ جن کا بار اصولاً حکومت کے خزانہ پر ہی ہوتا ہے۔

آیت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ ان چھ اشخاص کے حصے مساوی ہیں یا کم و بیش، اس لئے کہ ان چھ اشخاص پر تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت ان اشخاص کو دینا مراد ہے۔ جس کی قبل از وقت کوئی مقدار معین نہیں ہو سکتی بلکہ یہ پیغمبر کی رائے اور صوابدید پر موقوف ہے

آیت میں یہ چند ذی حاجت اس لئے مذکور ہیں کہ زیادہ تر ان ہی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور حاجت مند کو یا کسی اور کام میں جو قوم و سلطنت کے لئے مفید ہو صرف نہ کیا جائے۔

اور ان ہی مصارف میں سے یتامیٰ و مساکین و ابن السبیل میں صرف کرنے کا حکم مطلقاً باقی ہے۔ البتہ رسول اور ذوالقربیٰ کے حصے وفاتِ نبوی سے موقوف و مرتفع ہو گئے۔ کیونکہ ذوی القربیٰ آپؐ کے تابع تھے۔ ان کی مدد در اصل آپؐ کی مدد تھی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مالِ غنیمت کی طرح مال فئے میں بھی خمس نکالا جائے گا اور یہ مصارف ان کے نزدیک اس خمس کے ہیں۔ لیکن ما افاء اللہ کے الفاظ اسی پر دال ہیں کہ یہ مصارف جمیع ما افاء اللہ کے ہیں نہ کہ اس کے خمس کے اور یہی مسلک حنفیہ کا ہے۔

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً الخ۔ مبرد کہتے ہیں دولت بالضم اس چیز کو کہتے ہیں جو لوگوں کے ہاتھوں میں آئے۔ کبھی ایک کے ہاتھوں میں اور کبھی دوسرے کے ہاتھ میں۔ اور دولت بالفتح ہو خوشحالی کو کہتے ہیں۔ جو ایک قوم سے منتقل ہو کر دوسری قوم میں آئے۔ لہٰذا دولت بالضم اسم ہے اس چیز کا جو لوگوں کے ہاتھوں میں گھومے اور پھرے۔ یعنی روپیہ پیسہ زیور کپڑا وغیرہ دولت کہلاتا ہے اور دولت بالفتح اس کا مصدر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مصارف وضاحت کے ساتھ اس لئے بتلا دیئے تاکہ اموال فئی بھی مال داروں کے ہاتھوں ہی میں نہ گھومتے پھرتے رہیں۔ جیسا جاہلیت میں ہوتا رہا ہے بلکہ یہ مال اس کے مستحق کے پاس رہے، اس لئے مال داروں کو چاہیئے کہ وہ حرص نہ کریں بلکہ جو کچھ پیغمبر مالِ غنیمت یا کسی اور چیز میں دیں وہ لے لو۔ اور جس چیز سے روکیں جیسے مالِ فئی یا اور کسی چیز سے اس سے باز آؤ۔

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ۔ یوں تو قرآن حکیم کا ہر حکم کسی خاص موقع پر ہی نازل ہوا ہے۔ لیکن بعض الفاظ احکام کا عموم صاف بتلا دیتا ہے کہ یہ حکم خاص اسی موقع کے لئے نہیں ہے۔ اسی طرح اس ارشادِ ربانی کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کل اوامر و نواہی اسی ہدایت کے ذیل میں داخل ہیں۔ لہٰذا احادیث کی حجیت اس آیت سے ثابت ہے کہ از روئے حکم خدا وندی احادیث نبویہ پر عمل کرنے کے اہلِ اسلام مکلف ہیں بشرطیکہ اس حدیث کی صحت ثابت ہو۔

مسند امام احمد اور بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اس عورت پر جو گدوائے اور گودے یعنی ہاتھوں پر یا بدن کے کسی حصے پر سوئی وغیرہ سے گدوا کر تلوں کی طرح یا کسی اور شکل کے نشان بنانا (آج کل بعض ملکوں میں مرد بھی ایسا کرتے ہیں) اور جو اپنی پیشانی کے بال لے اور جو خوبصورتی کے لئے اپنے سامنے کے دانتوں میں کشادگی کرے اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی پیدائش کو بدلنا چاہے۔ یہ سن کر بنو اسد کی ایک عورت جس کا نام ام یعقوب تھا آپ کے پاس آئی اور پوچھا کہ کیا آپ نے اس طرح فرمایا۔ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں اس پر کیوں نہ لعنت کروں جس پر اللہ کے رسول نے لعنت کی ہے اور جو قرآن میں موجود ہے۔ ام یعقوب نے کہا۔ میں نے پورا قرآن جو دو پٹھوں کے درمیان ہے اوّل سے آخر تک پڑھا ہے، لیکن میں نے تو یہ حکم نہیں پایا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اگر تم سوچ سمجھ کر پڑھتیں تو ضرور پاتیں۔ کیا تم نے آیت مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ الخ نہیں پڑھی۔ ام یعقوب نے کہا۔ ہاں یہ تو پڑھی ہے (گویا اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ حکم رسول اور ممانعت رسول واجب العمل ہے) اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نے خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے گودنے اور بالوں میں بال ملانے سے اور پیشانی اور چہرے کے بال نوچنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح نسائی میں حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو کے برتن میں اور سبز ٹھلیا میں اور کھجور کی لکڑی کھکر بنے ہوئے برتن میں اور رال کی رنگی ہوئی ٹھلیا میں نبیذ بنانے سے یعنی کھجور اور کشمش وغیرہ بھگو کر رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ الخ۔

معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک بھی اس آیت سے عمل بالحدیث کی حجیت ثابت تھی۔

لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُہٰجِرِیۡنَ الخ اس سے پہلے کَیۡ لَا یَکُوۡنَ سے شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ تک جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر مالِ فئی کے مزید مستحقین کا ذکر ہے اور تعمیم کے بعد تخصیص ہے کہ اور فقیروں سے زیادہ یہ مہاجر و انصار مستحق ہیں، اس لئے کہ یہ مہاجر وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے لئے اپنا مال اور گھر بار چھوڑا اور دنیوی اعتبار سے بنی بنائی زندگی کو تہ و بالا کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی آکر بس گئے تاکہ ایمان و اسلام بھی محفوظ رہے اور پیغمبر کی اور دینِ حق کی نصرت و مدد بھی کر سکیں۔ اور اس فکر سے اپنے کو مستغنی کر لیا کہ آخر ہماری گزر اوقات کیسے ہوگی۔ اب ان کے پاس سوائے صبر و فاقہ کے اور کیا ہے، اس لئے یہ سب سے زیادہ مستحق نصرت ہیں۔

اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ یہی لوگ (مہاجرین) سچے ہیں۔ ان کے قول و عمل میں تضاد نہیں ہے۔ انھوں نے ایمان و اسلام کے لئے ہر چیز کو قربان کر دینے کا عملاً مظاہرہ کر دیا ہے اور کرتے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا قربانی ہو سکتی ہے کہ کفار کے ظلم و ستم کو ایمان کے مقابلے میں صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے، لیکن جب حد سے تجاوز ہو گیا تو اپنے مال و جائیداد، گھر بار اور اعزاء و اقرباء کو چھوڑا اور خود کو لا کر پیغمبر کے حوالے کر دیا۔

دنیوی عیش و آرام پر ایمان کی سلامتی اور دین متین کی خدمت و حفاظت کو ترجیح دی۔ پھر جب مدینہ میں بھی قربانی کی ضرورت سامنے آئی تو مال سے تو پہلے ہی دست کش ہو چکے تھے۔ جان باقی تھی سو ان کی قربانی کے لئے بدر اور احد کے میدانوں میں خود کو پیش کر دیا اور جان نثاری اور جاں سپاری کے وہ وہ جوہر دکھلائے کہ دنیا اب تک انگشت بدنداں ہے۔ اس سے بڑھ کر صدق و سچائی اور اخلاص کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی گروہ مقدس کے جلیل القدر فرد تھے اور اول الذکر تو وہ ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ کے ساتھی، غار کے ساتھی، ہجرت کے ساتھی، مدینہ کے ساتھی، روضہ کے ساتھی اور جنت کے ساتھی ہیں۔ اور ثانی الذکر وہ جن کے بارے میں ارشاد رسول سب کچھ بتلا دینے کے لئے کافی ہے۔ لوکان بعدی نبیٌ لکان عمرُ (اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے)

اب اگر کوئی فرد یا گروہ ان مقدسین کو ظالم اور اہل بیت کا بدخواہ جتلانے کی کوشش کرے تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے۔ اللہ عقل سلیم اور راہ مستقیم کی ہدایت سے نوازے۔

مہاجرین کے ذکر خیر کے بعد انصار کی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ ارشاد فرمایا۔

والذین تبوؤ الدار الخ یعنی مہاجرین کی طرح ان فقراء، انصار جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی مدینہ منورہ میں رہتے ہیں اور پہلے ہی سے ایمان کی دولت سے مشرف ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبل ہجرت مکہ ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ عرب میں ہر چہار طرف آپ کی نبوت کا شہرہ ہوا۔ تو چند اہل مدینہ ایام حج میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرف بہ اسلام ہو گئے اور پھر مدینہ میں واپس آکر دوسرے اہل وطن کو بھی اس شرف و سعادت میں شریک کرنے لگے اور تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا لگاؤ اتنا بڑھا کہ جب مکہ مکرمہ میں اس تحریک کے مدمقابل ہر قسم کی طاقتیں لاکر کھڑی کر دی گئیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثار صحابہ پر انسانیت سوز مظالم کی انتہا ہو گئی اور کوئی صورت وہاں قیام کی باقی نہ رہی تو اہل مدینہ کی دیرینہ خواہش و دعوت پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق اور یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو لے کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ آپ سے پہلے بہت سے حضرات صحابہ آپؐ کی اجازت و ہدایت پر مدینہ آ چکے تھے۔ اہل مدینہ ان واردین کی جس طرح مدارات کی ہے، اس پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جیسے حضرات مہاجرین کا صبر و استقامت بے مثال تھا ویسے ہی حضرات انصار کی مؤلفات، ایثار و تواضع بے نظیر تھی۔ تاریخ ہر دو قسم کے نمونوں کو دوہرانے سے قاصر ہے۔ تبوؤ الدار انصار کے لئے صفت حسنہ کے طور پر یہ لفظ مذکور ہوا ہے۔ اس صفت میں فضیلت کا حاصل یہ ہے کہ اپنے وطن میں حصول کمال کی جد و جہد اور وہ بھی جب کہ اطاعت و فرمانبرداری کی راہ سے ہو بڑے کمال کی بات ہے۔ علاوہ دیگر وطنی موانع کے ریاست وجاہت کی وجہ سے عار بھی آتی تھی، لیکن ان سب کے علی الرغم اکتساب کمال میں انہماک بہت بڑی بات ہے۔

یحبّون من هاجر الیهم بے سروسامان مہاجرین جو صرف اپنی جانوں کو لے کر مدینہ آئے تھے۔ بعض بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے اور بعض ان کو بھی چھوڑ آئے تھے۔ ایثار صفت انصار نے ان کو نہ صرف کھانے پینے اور پہننے کو دیا بلکہ مواخاۃ اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم کر کے اپنی ملکیت کی ہر چیز کا نصف مہاجر بھائی کو دیا۔ سرمایہ نقد، رہائشی مکان، اثاث البیت غرض ہر چیز کو نصفا نصف کر دیا۔ جن کی دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو طلاق دے کر وہ مہاجر بھائی کے نکاح میں نذر کر دی۔ غرض ان کو محسوس نہ ہونے دیا کہ ہم بے سروسامان اور بے سہارا ہیں یا غریب الوطن اور مسافر ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انصار نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے کھجوروں کے باغات ہم میں اور ہمارے مہاجر بھائیوں میں تقسیم فرما دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا دیکھو کام کاج تم ہی کرنا اور ہم سب کو تو پیداوار میں شریک رکھو۔ انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں یہ بھی بخوشی منظور ہے۔

تو مہاجرین کا مدینہ میں وجود انصار کو بوجھ تو کیسے معلوم ہوتا۔ انھوں نے تو ان کے ساتھ محبت کے رشتے قائم کر لئے۔ ان کے ایثار و تواضع کا اندازہ مہاجرین کے اس ردعمل سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ مسند احمد کی روایت کے مطابق مہاجرین نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے تو ان انصار جیسے لوگ دنیا میں نہیں دیکھے۔ تھوڑے میں سے تھوڑا اور بہت میں سے بہت برابر ہمیں دیئے جا رہے ہیں۔ ایک عرصے سے ہمارا خرچ اٹھا رکھا ہے بلکہ ناز برداریاں

کر رہے ہیں اور کبھی چہرے میں شکن بھی نہیں آتی۔ بلکہ خدمت کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ دیتے ہیں اور احسان نہیں رکھتے کام کاج اور محنت خود کرتے ہیں اور کمائی ہمیں دے دیتے ہیں۔ حضور ہمیں تو اب یہ خیال ہو چلا ہے کہ کہیں ہمارے تمام اعمال کا سارا اجر ان ہی کو نہ مل جائے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں۔ جب تک تم ان کے ممنون رہو گے اور ان کے بیش بہا ایثار کی دل سے قدر کرتے ہوئے ان کے لئے دعائے خیر کرتے رہو گے ایسا نہ ہو گا (بلکہ تمہارا اجر تمہیں ہی ملے گا۔)

یہ تھی مدینہ کی وہ فضا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے جان و مال کو دوسرے کے جان و مال پر فدا کرتا تھا۔

ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا۔ حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ یہاں حاجۃ کے معنی حرارت و حسد و غیظ کے ہیں یعنی مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ مالِ غنیمت سے یا مالِ فئے سے۔ اس سے ان انصار کے دل میں کوئی رنج نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ غزوۂ بنو نضیر سے حاصل شدہ مال جب مہاجرین میں تقسیم کیا گیا تو بعض انصار نے اس پر کچھ کلام کیا۔ اس پر آیت وما افاء اللہ نازل ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارے مہاجر بھی تمہارے پاس مال و اولاد چھوڑ کر آئے ہیں تو انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ہر طرح سے راضی اور خوش ہیں۔ آپ ہمارا مال بھی ان میں اور ہم میں تقسیم فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا تم اس سے بھی زیادہ ایثار کر سکتے ہو اور وہ اس طرح جوں کہ مہاجرین کھیتی اور باغبانی کے کام سے ناواقف ہیں تو تم اپنی جائیدادوں کو اپنے ہی پاس رکھو۔ باغات میں محنت کرو اور پیداوار میں انھیں شریک کر لو۔ انصار نے بھی بخوشی قبول کر لیا۔

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔ یہ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں خواہ خود فقر و فاقہ اور تنگی کی حالت میں ہوں۔

اپنی تنگی اور فقر و فاقہ کے عالم میں بھی مہاجرین کو کھلانا پلانا اور پہنانا اور ان کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا کتنا زبردست ایثار تھا یہ انصار اور مہاجرین کا، اللہ اکبر۔

اس آیت کے ذیل میں ایک واقعہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی صاحب مہمان ہوئے۔ آپ نے اپنی ازواجِ مطہرات سے دریافت کرایا کہ کسی کے پاس مہمان کی مدارات کے لئے کچھ ہے؟ سب نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو بس برکت ہے اور پانی کے سوا کچھ نہیں۔ آپ نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا کون ہے جو اپنے گھر ایک مہمان کو رکھ لے اور آج اس کی مدارات کرے۔ ایک انصاری نے (بعض روایات میں نام ابو طلحہ آیا ہے) عرض کیا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپ نے مہمان کو ان کے ساتھ کر دیا۔ انھوں نے گھر جا کر بیوی سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہمان میرے ساتھ ہے۔ کھانے کا انتظام کرو۔ انھوں نے کہا صرف بچوں کے بقدر کھانا ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں کے لئے کچھ موجود نہیں ہے۔ انصاری نے ہدایت کی کہ ہم دونوں تو پیٹ پر کپڑا باندھ کر سو جائیں گے اور بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دینا اور مہمان کے سامنے جب کھانا رکھ دیا تو کسی بہانے چراغ بجھا دینا تاکہ وہ یہی سمجھتا رہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ بیوی نے ایسا ہی کیا کہ کھانا شروع کرتے وقت چراغ کی لو بڑھانے کے بہانے سے اس کو بجھا دیا اور مہمان خود کھاتا رہا۔ جب یہ انصاری صبح کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اس شخص کے اور اس کی بیوی کے رات کے عمل سے اللہ تعالیٰ خوش ہوا اور ہنس دیا۔ ان ہی کے بارے میں یہ آیت یؤثرون الخ نازل ہوئی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

ومن یوق شح نفسہ الخ۔ اور جو اپنے نفس کے بخل اور لالچ سے بچ گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔ انصار کی رفعتِ شان کی سب سے بڑی توجیہ ان کی صحابیت ہے، لیکن ان کے اعمال بھی رفیع الشان تھے اور جو بھی ان اعمال کو اپنائے گا وہ بھی رفعتوں اور کامیابیوں سے نوازا جائے گا۔

مسلم میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو حرص سے بچو۔ یہی وہ چیز ہے جس نے تم سے پہلے لوگوں کو برباد کر دیا۔ اسی کی وجہ سے انھوں نے خون ریزیاں کیں اور حرام کو حلال بنا لیا۔

ابوداؤد میں ہے اللہ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں کسی بندے کے پیٹ میں جمع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بخل اور ایمان کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

حضرت ابو الہیاج اسدی فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو صرف یہی دعا کرتے ہیں اللھم قنی شح نفسی یعنی اے اللہ! مجھے میرے نفس کی حرص و آز سے بچا لے۔ آخر میں رہ نہ سکا اور پوچھ بیٹھا کہ آخر آپ صرف یہی دعا کیوں کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا جب نفس کی حرص سے بچ گیا تو بہت سے گناہوں سے محفوظ ہو گیا۔ پھر نہ زنا ہو سکے گا، نہ چوری اور نہ کوئی اور برا کام۔ پھر جو میں نے غور کیا تو وہ حضرت عبدالرحمن بن عوف تھے۔ رضی اللہ عنہ۔

والذین جاءو من بعدھم۔ جو لوگ انصار اور مہاجرین کے بعد آئیں اور وہ ان سابقین کے لئے بربنائے تقدم و سبقت ایمانی احترام اور قدر و منزلت کے ساتھ مغفرت کی اور اپنے دلوں کو ان کی طرف سے کینہ اور بغض سے تطہیر و تنزیہ کی دعائیں کریں۔ ایسے صالح اخلاف کو بھی اس مال میں حصہ دیا جائے گا۔

بعد میں آنے والوں کے لئے یہ قید کہ وہ ایسے اور ایسے ہوں اس سے یہ مقصد نہیں کہ اگر ایسے نہ ہوں گے تو مصرف نہ ہوں گے بلکہ اشارہ اور ترغیب ہے کہ بعد والوں کو ایسا ہونا چاہیئے اور بغیر اس کے مصرف کامل اور پسندیدہ نہیں۔

ابن ابی لیلی کیا خوب فرماتے ہیں کہ لوگوں کے تین درجے ہیں۔ مہاجرین، انصار اور وہ جو ان کے بعد آئے اور ان سے محبت رکھتے رہیں، ان کے لئے مغفرت طلب کرتے رہیں، دعائے خیر میں شریک رکھتے ہیں۔ ان کے راستے پر چلتے ہیں۔ پس تو کوشش کر کہ ان تینوں سے خارج نہ ہونے پائے۔ مہاجرین اور انصار تو گزر گئے ان میں داخل ہونا ممکن نہیں مگر تیسرے فریق میں تو شامل رہو کہ ان کو بھلا سمجھے، دل سے ان کی محبت رکھے۔ ان کی بے نظیر قربانیوں اور بے مثل ایثار اور قابل صد تکریم اعمال حسنہ کی دل سے قدر کرے نہ یہ کہ ان پر جھوٹے سچے الزامات قائم کر کے تبرا کرنے کو ایمان و سعادت سمجھے۔ یہود سے اگر پوچھا جائے تو وہ اصحاب موسیٰ علیہ السلام کو اچھا کہتے ہیں اور عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا قدر و منزلت سے ذکر کرتے ہیں، مگر افسوس کہ شیعہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مہاجرین و انصار کو بہ استثنائے چند سب کو برا کہتے ہیں۔ بلکہ برا کہنے کو کمال ایمان اور سعادت و خیر کی علامت قرار دیتے ہیں۔ افسوس ان کی شقاوت پر۔

اس آیت سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب استدلال کیا ہے کہ رافضی کو مال فئے سے امام وقت کچھ نہ دے کیونکہ وہ اصحاب رسول ﷺ کے لئے دعائیں کرنے کے بجائے انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں۔ ان لوگوں کو دیکھو کیسا قرآن کے خلاف کرتے ہیں۔ قرآن کریم تو حکم دیتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے لئے دعائے خیر کریں اور یہ گالیاں دیتے ہیں۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت کی۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ

کیا آپ نے ان منافقین (عبداللہ بن ابی وغیرہ) کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے (ہم مذہب) بھائیوں سے کہ کفار اہل کتاب ہیں (بنی نضیر سے) کہتے ہیں کہ واللہ

أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ

اگر تم نکالے گئے تو ہم تمہارے ساتھ نکل جاویں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کا کبھی کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری

وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوتِلُوا

مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں واللہ اگر اہل کتاب نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی

لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ

جوں تو یہ ان کی مدد کریں گے اور اگر ان کی مدد بھی کی تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر ان کی کوئی مدد نہ ہوگی بے شک تم لوگوں کا ڈر

رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ

ان (منافقین) کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے اور یہ (ان کا تم سے ڈرنا اور اللہ سے نہ ڈرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ سمجھ نہیں رکھتے۔ یہ سب مل کر بھی تم سے

جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ

نہ لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیوار (قلعہ و شہر پناہ) کی آڑ میں ان کی لڑائی آپس میں بڑی تیز ہے اے مخاطب تو ان کو

جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

متفق خیال کرتا ہے حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کی) عقل نہیں رکھتے ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان

قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ

سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں جو اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کیلئے دردناک عذاب ہے شیطان کی سی مثال ہے کہ انسان سے کہتا ہے

لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کہ تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲)

سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔

ربط و تمہید

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت میدانِ بدر میں مشرکین مکہ سے نبرد آزما تھے۔ اس وقت مدینہ میں منافقین کے سردار عبداللہ ابی بن سلول کو مشرکین مکہ کا خط ملا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ تم نے محمد کو مدینہ میں ٹھہرایا ہے۔ یہ بات ہماری ناگواری کا باعث ہے، اسی لئے یا تو تم ان کو ان کے ساتھیوں کو نکال باہر کر دو ورنہ ہم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تم پر حملہ کر کے تمہیں شہر بدر کر دیں گے اور یہی نہیں بلکہ تمہارے لڑنے والوں کو تہ و تیغ کر دیں گے اور لڑکیوں اور عورتوں کو باندیاں بنالیں گے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہو کر رہے گا۔

عبداللہ بن ابی نے اس خط پر اپنی قوم سے مشورہ کیا اور خفیہ طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کرنے کی تجویز پاس کر لی۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر سے واپس تشریف لاتے ہی اس سازش کا علم ہو گیا۔ آپ خود ان منافقین کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل مکہ کا خط کام کر گیا ہے اور تم خود اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے لگے ہو اور اپنے بھائیوں اور اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں ذبح کرنے کا جتن کر رہے ہو، لیکن خوب سوچ سمجھ لو کہ اس کا انجام برا ہوگا۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں لیکن

پھر اپنے برے انجام کے تم خود ہی ذمہ دار ہو گے۔

میدانِ بدر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز کامیابی کا طبعی اثر تھا کہ آپ کے اسی ارشاد سے ان کا نقشہ کافور ہو گیا اور اپنی خام خیالی پر متنبہ ہوا۔

لیکن اہلِ مکہ نے بدر سے واپس آکر پھر ان منافقین کو خط لکھا۔ اسی طرح کے خط بنو نضیر وغیرہ کو بھی لکھے اور ان سب کو ڈرایا دھمکایا اور ان کی طاقت مضبوط قلعوں اور عددی قوت کو جتا کر انھیں اکسایا۔ بنو نضیر تو بھرے میں آگئے اور انھوں نے بدعہدی کر دی۔

ادھر منافقین خود تو تنہا اور براہِ راست رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل آنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، لیکن دوسروں کو اکسا کر مقابلے میں لے آنے اور بھڑا دینے کی منافقانہ چال چل رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بنو نضیر کے پاس پیغام بھیجا کہ مقابلے پر ڈٹ جاؤ۔ اپنے قلعے ہرگز نہ چھوڑنا۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ تمہارا دشمن ہمارا دشمن ہے۔ تمہارے ساتھ مل کر ہم بھی لڑیں گے، اس لئے بے فکر ہو کر مقابلہ کرو اور اگر بالفرض تمہیں دبنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔

بنو نضیر مقابلے پر ڈٹ گئے، لیکن انجام جو کچھ ہوا وہ پہلے گزر چکا ہے۔ منافقین کی تو صرف ایک چال تھی۔ خود لڑنے اور مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی تو پہلے ہی نہ لڑ لیتے۔ یہ منافقت ہی کیوں کرتے۔ ان آیات میں منافقین کی اسی حالت پر تنقید و تبصرہ ہے۔

تفسیر کیا آپ نے منافقین کی یہ حرکت نہیں دیکھی۔ یہ اہلِ کتاب کے اپنے کافر بھائیوں سے کہتے تھے کہ خدا کی قسم اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی ضرور تمہارے ساتھ ہی نکل جائیں گے اور کوئی ہمیں کتنا ہی سمجھائے کہ قتال و جدال اور خروج میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیں، لیکن ہمیں یہ قطعاً منظور نہ ہوگا اور ہم ہرگز تمہارے معاملے میں کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اور اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہوئی تو ہم ہر طرح سے تمہاری مدد کریں گے گویا ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم ہر حال میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ کسی حال میں الگ نظر نہیں آئیں گے، لیکن خدا گواہ ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں (انھوں نے یہاں بھی جھوٹ بولا اور منافقانہ چالبازی کی ہے) بخدا ان کی حالت تو یہ ہے کہ اہلِ کتاب نکالے جائیں تو یہ قطعاً ان کے ساتھ نہ نکلیں۔ ان کے ساتھ لڑائی ہو تو یہ ہرگز ان کی مدد کو نہ آئیں اور اگر بالفرض مدد کو آ بھی جائیں تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں۔ پھر ان کی کوئی مدد نہ ہوگی۔ اصل ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ سے زیادہ تمہارا خوف ہے۔ اللہ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جتنا تم سے ڈرتے ہیں تو بھلا یہ کس طرح تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کرتے۔ ان کی اس حالت کا سبب یہ ہے کہ یہ نادان ہیں۔ خدا کی عظمت کو نہیں جانتے۔ یہ یہود اور منافقین الگ الگ تو کیا مقابلہ کرتے سب مل کر بھی مقابلہ نہیں کریں گے۔ الّا یہ کہ محفوظ بستیوں میں قلعہ بند ہو کر یا دیواروں اور شہر پناہ کی آڑ میں رہ کر مقابلے کی ناکام سعی کریں۔ ان کی لڑائی آپس میں ہی تو سخت ہوتی ہے (لیکن یہ مطلب نہیں کہ تمہارے مقابلے میں بھی سخت لڑائی لڑ سکیں۔ آپ کا یہ خیال کہ اپنے باہمی اتحاد و اتفاق کی بنا پر مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن) آپ ہی تو ان کو متحد و متفق خیال کرتے ہیں۔ ان کے دلوں کو دیکھئے وہ ہرگز جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ان میں توڑ پھوڑ ہے۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ یہ بے عقل قوم ہے (ان میں اتفاق کیسے ہو)

ان یہود بنو نضیر کی مثال تو ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے کچھ ہی دن پہلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے دنیا میں بھی اپنے کرتوت کا مزہ چکھ لیا اور آخرت میں بھی ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے (تو اب بنو نضیر نے بھی خود کو انہی کے زمرے میں شامل کر لیا۔ ان ہی جیسی حرکتیں کر رہے ہیں تو ان ہی جیسا حشر ان کا بھی ہوگا)

اور ان منافقین کی مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ پہلے تو انسان سے کہتا ہے کہ تو کفر اختیار کر لے اور جب وہ کافر ہو جاتا ہے اور کفر کے دنیوی یا اخروی ادبار میں پھنستا ہے تو اس وقت صاف اور ٹکا سا جواب دے دیتا ہے کہ میں تم سے اور تمہاری حرکتوں سے بری ہوں۔ میں تو اللہ ہی سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ سو دونوں کا انجام یہ ہونا ہے کہ دونوں جہنم میں ہوں گے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ اور یہی سزا ظالموں کی ہے۔

تحلیل اجزا یقولون لاخوانھم الذین کفروا الخ۔ یہ منافقین اہلِ کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں۔ کافروں کو

منافقین کا بھائی اس لئے فرمایا گیا کہ کفر ملت واحدہ ہے۔ ایک کافر دوسرے کافر کا بھائی ہے۔ حدیث میں [illegible] الکفر ملۃ واحدۃ۔ اس کے مقابلے میں ایمان اور اسلام کو ایک ملت قرار دیا گیا۔ اور ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی بتلایا گیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ انما المؤمنون اخوۃ، بلاشبہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں) یا یہ منافقین کو اہل کتاب یعنی بنو نضیر وغیرہ کا بھائی اس لئے فرمایا گیا۔ ان میں باہمی معاہدہ مواخاۃ تھا۔ لفظ یقولون کا ترجمہ ہے "کہتے ہیں" لیکن مراد یہ ہے کہ کہتے تھے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے یہ آیتیں [illegible] کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن اس صیغہ کا استعمال اس لئے فرمایا گیا تاکہ گزشتہ واقعہ کا استحضار ہوجائے اور ان کی وہ مخالفت اور [illegible] ہوجائے اور یا اس لئے کہ آئندہ جو احتمال تعاون کا ہو اس کی نفی ہوجائے۔ واللہ اعلم۔ لیکن اگر قبل واقعہ ان آیات کا نزول ثابت ہو تو کسی توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

واللہ یشھد انھم لکٰذبون۔ منافقین کے قول میں تاکید تھی۔ لئن اخرجتم لنخرجن معکم اگر تم کو نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اس سے زیادہ تاکیدی حروف کے ساتھ تردید فرمائی۔ کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ لوگ قطعاً جھوٹے ہیں۔

اس جملہ سے اجمالی طور پر ان کو جھوٹا قرار دیدیا۔ اس کے بعد کی آیت میں ان کے جھوٹا ہونے کی تفصیل بیان فرمائی گئی۔ یعنی اگر یہ اہل کتاب نکالے گئے تو ان کے ساتھ نہ نکلیں گے۔ الخ۔

ثم لاینصرون۔ پھر ان کی کوئی مدد نہ ہوگی جو مدد گار بنتے وہ تو بھاگ گئے اور دوسرا بھی کوئی مددگار نہ ہوگا تو یقیناً مغلوب ہونگے۔ اس طرح منافقین اپنی اس غرض میں ناکام رہے کہ ان کے بھائیوں پر کوئی آفت نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بنو نضیر کا محاصرہ ہوا۔ ان کو ان کے گھر سے نکالا گیا مگر منافقین پر رعب اس قدر غالب رہا کہ مدد کے لئے گھروں سے باہر بھی قدم نہیں نکالا اور ان کے ساتھ خود بھی جلا وطن ہوئے۔ قرآن حکیم کی زبان پیغمبر اس خبر کو جھٹلانے کے لئے ان کے پاس بڑا موقع تھا۔ تھوڑی بہت مدد کر دیتے یا کچھ ہی دن کے لئے جلا وطن ہوجاتے مگر قادر مطلق کیوں تکذیب کرنے دیتا۔

لاانتم اشد رھبۃ الخ۔ تم لوگوں کا خوف ان منافقین کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح دوسرے موقع پر بھی ارشاد فرمایا گیا۔ اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ یعنی ان کا ایک گروہ ہے جو لوگوں سے اتنا ڈرتا ہے جتنا اللہ سے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ منافقین دعویٰ ایمان بھی کرتے تھے لیکن کفر کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

قوم لایفقھون۔ خداوند تعالیٰ سے زیادہ مسلمانوں کا خوف دلوں میں ہونا یہ اسی وجہ سے ہے کہ یہ کم فہم قوم ہے انسان سے ڈرنے کے کیا معنیٰ اصل اور زیادہ خوف تو اللہ سے ہونا چاہیئے کہ وہی قادر مطلق ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں ہر بات ہے۔ اس کی اطاعت میں صلاح و فلاح ہے اور نافرمانی میں تباہی و خسران ہے۔ جو قوم اللہ سے ڈرتی ہے اس سے سب ڈرنے لگتے ہیں۔ ان پر پھر کسی کا خوف غالب نہیں آتا اور یہی شجاعت کا اصل اصول ہے جو صحابہؓ کو حاصل تھا اور منافقین اور یہود کو حاصل نہ تھا۔ اسی لئے مقابلہ نہ کرسکے۔

بأسھم بینھم شدید ان کی آپس ہی کی لڑائی سخت ہوتی ہے۔ یعنی یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ تو بہت بہادر ہیں۔ بڑی سخت لڑائی لڑتے ہیں اور ان کے بعض قبائل جیسے اوس و خزرج کے واقعاتِ جنگ کو دیکھ کر یہ اندیشہ نہ کیا جائے کہ یہ مسلمانوں کے مقابلے میں بھی اسی طرح کارِ نمایاں کرسکیں گے اور ہمارے مقابلے میں بھی بہادری سے لڑیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپس ہی میں ان کی لڑائی سخت ہوتی ہے۔ تم سے مقابلہ نہیں کرسکتے، اس لئے کہ تمہارا خوف اور رعب غالب ہے۔

تحسبھم جمیعاً الخ یعنی یہ خیال بھی نہ کیا جائے کہ اگرچہ یہود و منافقین کمزور بھی ہوں، لیکن باہمی اتحاد و اتفاق کی طاقت ان کو حاصل ہو اور اتفاق کی طاقت سے مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب ہوجائیں، فرمایا گیا کہ آپ ہی تو ان کو متفق خیال کرتے ہیں حالانکہ

ان کے قلوب میں توڑ پھوڑ ہے۔ یعنی گو عداوت اہلِ حق ان سب میں مشترک ہے، لیکن ان میں بھی تو اختلاف عقائد کی وجہ سے اختلاف و افتراق ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا۔ والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء۔

اور یہ بات مسلمانوں کے اطمینانِ قلب اور ہمت افزائی اور زیادہ تقویت کے لئے فرمائی گئی ہے۔ ورنہ مشیتِ خداوندی ان کی مغلوبی و مقہوری کے لئے ناکافی ہے۔ اگر اتفاق بھی ہو تو کام کیا آئے۔

قوم لا یعقلون۔ یہ آپس کی نااتفاقی اور عداوت اسی وجہ سے ہے کہ یہ بدعقل قوم ہے۔ خواہشات میں اختلاف کی وجہ سے دلوں میں اختلاف لازمی ہے۔ ان لوگوں میں دین کی عقل نہیں ہے۔

کمثل الذین من قبلھم قریبًا ان یہود و منافقین سے کچھ ہی پہلے جو لوگ مقہور و مغلوب ہوئے ان کے بارے میں مجاہد کہتے ہیں کہ مشرکین تھے جو "بدر" میں قتل اور قید ہوئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنو قینقاع کی طرف اشارہ ہے۔ جن کا واقعہ یہ ہوا کہ غزوۂ بدر کے بعد سنہ ۲ھ میں انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقضِ عہد کر کے محاربہ کیا پھر مغلوب و مقہور رہوئے اور پھر آپ کے فیصلہ پر قلعہ سے باہر نکلے اور سب کی مشکیں باندھی گئیں پھر عبداللہ بن ابی سردار منافقین کی الحاح و زاری پر آپ نے ان کی اس شرط پر جان بخشی کہ مدینہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ وہ شام کے علاقوں کی طرف چلے گئے اور ان کے اموال کو غنیمت قرار دیکر تقسیم کر دیا گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہاں بنو قریظہ کا تذکرہ ہے کہ ان کو ایسی سزا ہوئی جیسی دو سال پہلے بنو نضیر کو ہوئی تھی۔ واللہ اعلم۔

کمثل الشیطٰن ان منافقین کی مثال شیطان جیسی ہے کہ وہ خود ہی لوگوں کو گمراہی پر آمادہ کرتا ہے اور جب وہ گمراہ ہو جاتے ہیں تو خود ان سے الگ ہو جاتا ہے کہ میں تیری گمراہی سے بری ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ بالارادہ جھوٹ بولا پہلے ہی سے نیت ساتھ دینے کی نہیں تھی۔

فکان عاقبتھما دونوں کا انجام یہ ہے کہ دونوں جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے ایک کو اس لئے کہ اس نے گمراہ بنایا اور گمراہی پھیلانے کا مرتکب اور دوسرے کو اس وجہ سے کہ وہ راہِ حق سے بھٹکے اور گمراہی اختیار کر بیٹھے۔

جزاء الظٰلمین ظالموں کی یہی سزا ہے۔ سو جس طرح شیطان نے انسان کو بہکایا۔ پھر وقت پر ساتھ نہ دیا اور دونوں کا انجام خراب ہوا۔ اسی طرح ان منافقین نے پہلے تو بنو نضیر کو غلط مشورہ دیا اور غلط راستہ دکھلایا کہ تم ہرگز گھروں سے نہ نکلنا اور مقابلے پر جمے رہنا۔ ہم تمہاری مدد کریں گے اور جب وہ بھترے میں آ گئے۔ اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے گھروں کا محاصرہ ہو جانے پر گھروں میں جم کر بیٹھ گئے اور نکل جانے سے انکار کر دیا تو عین وقت پر ان منافقین نے دغا دی۔ نتیجہ یہ کہ دونوں ہی بلا میں پھنسے۔ بنی نضیر تو بلائے اخراج میں اور منافقین ناکامیابی میں۔

مقصود بیان کسی کو بہکانا اور پھسلانا اور فساد نیت کے ساتھ جھوٹے وعدے کرنا اور وقت پر دھوکہ دے جانا یہ سب حرکتیں شیطانی ہیں اور منافقین کا شیوہ ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے وما یعدھم الشیطٰن الا غرورا۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا الشیطٰن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشآء شیطان سے مراد ابلیس ہے۔ وہ ہر روز انسان کو بہکانا اور کفر و بدکاری میں مبتلا کرتا ہے۔ ہر انسان کے اندر قوائے بہیمیہ و شہوانیہ اور غضبیہ ودیعت کی گئی ہیں۔ جن تک بذریعہ سرایت شیطان عمل دخل کرتا ہے۔ اگر غیبی حفاظت شاملِ حال نہ ہو اور قوتِ ملکی و روحانی سے اس کا دفعیہ اور تنقیہ نہ کیا جائے۔ تو یہ بدبخت ان قوتوں میں ناجائز تحریک پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف ان قوتوں کی فسادکاری اور دوسری طرف شیطان کی طرف سے تحریک و تضلیل، نتیجہ یہ کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ دنیا و آخرت کا خسران اس کے لئے مقسوم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس طرح کی تحریک و تضلیل کرتے ہیں وہ شیطان کے جانشین اور اس کے کارندے ہیں۔

انسان کو چاہیئے کہ حق و باطل، نفع و نقصان، برائی بھلائی اور دوستی و دشمنی میں تمیز کرے۔ شریعت غرا نے حق کو آشکارا کر دیا ہے۔ حق کا پہچاننا اب مشکل نہیں رہا۔ گزشتہ قوموں کے حالات و واقعات بھی ہر عمل و کردار کے انجام کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آدمی دھوکہ کھائے اور گمراہی کا شکار ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل قیامت کے واسطے اس نے کیا ذخیرہ بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے

خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

رہو بیشک اللہ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی سو اللہ نے خود ان کی جان سے (انکو) بے پروا بنا دیا

الْفٰسِقُوْنَ ۝ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝

یہی لوگ نافرمان ہیں اہل نار اور اہل جنت باہم برابر نہیں جو اہل جنت ہیں وہ کامیاب لوگ ہیں (اور اہل نار ناکام ہیں)

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

اور ان مضامین عجیبہ کو ہم لوگوں کے نفع کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود

هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

نہیں وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا وہی بڑا مہربان رحم والا ہے وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ

وہ بادشاہ ہے (سب عیبوں سے) پاک ہے سالم ہے امن دینے والا ہے نگہبانی کرنے والا ہے زبردست ہے خرابی کا درست کرنے والا

الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ

ہے بڑی عظمت والا ہے اللہ لوگوں کے شرک سے پاک ہے وہ معبود (برحق) ہے پیدا کرنے والا ہے ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے (یعنی

الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

ہر چیز کو حکمت کے موافق بناتا ہے) صورت بنانے والا ہے اس کے اچھے اچھے نام ہیں سب چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں

وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ع

اور جو زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے

ربط اہلِ سعادت اور اہلِ شقاوت کا ذکر کر کے اہلِ سعادت کو اصولِ سعادت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے جو دونوں جہان میں ان کے لئے فلاح کا باعث ہوں۔

تفسیر اے ایمان والو! فکر و نظر میں اصلاح کی راہ سے تقویٰ اختیار کرو ۔ اللہ سے ڈرو اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے ہر نفس یہ دیکھے کہ اس نے کل قیامت کے دن کے لئے کیا توشہ تیار کیا ہے اور حصولِ طاعات اور سیئات سے اجتناب کے ذریعہ تقویٰ کی راہ اپناؤ ۔ خدا سے ڈرو (اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کے حصول اور معاصی سے اجتناب میں اس بات کو ملحوظ رکھو) کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ تمہارے ہر فعل و عمل سے باخبر ہیں (لہٰذا تم جو بھی اور کیسا بھی عمل کرو اللہ تعالیٰ کی چشمِ نظر سے وہ مخفی نہیں رہ سکتا اور دیکھو) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو ۔ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا ۔ وہ اللہ سے بے پرواہ ہو گئے (تو نتیجہ یہ ہوا کہ) اللہ نے ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو ہی بھول گئے ۔ اللہ نے ان کو اپنے نفس سے ہی بے پرواہ کر دیا ۔ یہی لوگ بدکار ہیں ۔ (یہ اپنے کئے کو بھگتیں گے اور جن دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا یعنی جو اہلِ تقویٰ ہیں اور جو تارکِ احکام ہیں ان میں ایک اہلِ جنت ہیں اور دوسرے اہلِ نار اور) اہلِ نار اور اہلِ جنت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے بلکہ اہلِ جنت جو ہیں وہی کامیاب ہیں (اس سے تم خود ہی سمجھ لو کہ اہلِ نار ناکام و نامراد ہیں ۔ اس لئے تمہیں اہلِ جنت میں خود کو شامل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔) اور یہ اصولِ سعادت اور مفید نصائح یہ سب انسان کو بذریعہ وحی اور الہام خداوندی پہنچے ہیں ۔ جس کا نام قرآن ہے ۔ یہ قرآن کس قدر رفیع الشان اور عظیم المرتبت ہے اس کے بارے میں یہ سمجھ لو کہ اگر ہم پہاڑوں میں فہم کا مادہ رکھ دیتے اور شہوات سے محفوظ کر دیتے اور) ان پہاڑوں پر ہم قرآن کو اتارتے تو اے مخاطب تو دیکھتا اس کو کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھوٹ پڑتا (مگر انسان پر اثر نہیں ہوتا) اور ان جیسے مضامین کو ہم لوگوں کے نفع کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں اور فائدہ حاصل کریں۔

(اصولِ سعادت میں چونکہ فکر و نظر کی اصلاح بنیادی چیز ہے جس کا تعلق خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان سے ہے اور جس قرآن کی عظمتِ شان کا ذکر ہوا وہ اسی کا کلام ہے تو اس معبودِ برحق کی صفاتِ کمال کو بھی ملحوظ رکھو کہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود بننے کے لائق ہی نہیں ۔ اس ذات کی ستودہ صفات میں سے یہ ہے کہ وہ چھپی ہوئی اور ایسے ہی ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے ۔ وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے (اس کی رحمت تمام مخلوقات کو حاوی اور دنیا و آخرت دونوں پر وسیع ہے پھر بہ تاکید سن لو کہ) وہی اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود بننے کی اہلیت نہیں رکھتا ۔ وہ بادشاہ ہے جس کی بادشاہت ہر قسم کے خطرات سے بالاتر اور منزہ ہے اور وہ ماضی و حال کے عیوب سے پاک ہے (اور آئندہ کے نقصان سے) منزہ ہے (وہ اپنی پناہ میں آنے والوں کو آفات و بلیات اور عذاب سے) امن دینے والا ہے (اور ان بندوں کی ہر طرح سے) نگہبانی کرنے والا ہے ۔ وہ زبردست اور غلبہ والا ہے ۔ وہ خرابیوں کو درست کر دینے والا مجبور کر دینے والا ہے (کہ اس کے کاموں سے کوئی روکنے والا نہیں ہے) بڑی عظمت والا ہے ۔ اللہ کی ذات لوگوں کے شرک سے پاک ہے (اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے کی گنجائش ہی نہیں ہے) اللہ وہی جو مادے کا خالق اور روح کا پیدا کرنے والا اور مادہ روح کی باہمی ترکیب سے مخلوقات کو مختلف و متناسب صورتوں میں ڈھالنے والا ہے ۔ اس کے (اور بھی) اچھے اچھے نام ہیں (جو اچھی اچھی صفتوں پر دلالت کرتے ہیں) اور اس کی عظمت و کبریائی کا ڈنکا پوری کائنات میں بجتا ہے) سب چیزیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ (زبانِ حال و قال سے) اسی کی تسبیح پڑھتی ہیں (اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ) وہی زبردست غلبہ والا حکمت والا ہے (اس لئے ایسے معبودِ حقیقی کی عبادت و طاعت اور اس کے احکام کی بجا آوری نہایت ضروری ہے)

تحلیل اجزاء اِتَّقُوا اللّٰہَ ۔ انسان کے لئے اصولِ سعادت میں بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں ۔ ایک فکر و نظر کی اصلاح یعنی ہر قسم کے جہل اور جہالت کی اندھیریوں سے نجات پا کر علم کی روشنی میں آنا اور خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات اور دیگر امورِ ضروریہ پر یقین رکھنا اور توہمات و تخیلات فاسدہ کی دلدل سے خود کو محفوظ کر لینا ۔ اسی کو شریعت میں ایمان کہتے ہیں ۔ پس ایمان والوں کو اس پر ثابت قدم رہنے یا اس پر ترقی کرنے کے لئے تقوے کی ہدایت کی گئی ہے ۔ دوسری چیز اصلاحِ اعمال اور تہذیبِ اخلاق ہے۔

خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی اور اعمال و اخلاق کی روح یہ فکر ہے کہ قیامت میں کیا چیز کارآمد ہوگی اور کون سی تباہ کن۔ اسی لئے اس کے محاسبہ کی ہدایت کرتے ہوئے پھر تقوے کا حکم کیا گیا۔ پہلے اتقوا اللہ کا تعلق فکر و نظر کی اصلاح سے ہے اور دوسرے کا اصلاح اعمال اور تربیت اخلاق سے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے اتقوا اللہ کا تعلق حصول طاعات اور اصلاح اعمال سے ہو جس کا قرینہ ماقدمت لغد ہے اور دوسرے اتقوا اللہ کا تعلق اجتناب عن السیئات والمعاصی سے ہے جس کا قرینہ خبیر بما تعملون ہے۔ واللہ اعلم۔

ولتنظر نفس ماقدمت الخ حضرات صوفیاء کے نزدیک یہ آیت مراقبہ کیلئے حجت ہے

حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم (حضرات صحابہ) دن چڑھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ اسی وقت کچھ لوگ جن میں اکثر بلکہ کل ہی قبیلۂ مضر کے تھے، اس حالت میں آئے کہ سب ننگے سر اور کھلے پیر تھے۔ صرف چادروں یا عباؤں سے بدن کو چھپا رکھا تھا تلواریں گردنوں میں حمائل کئے ہوئے تھے۔ ان کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہوگیا آپ گھر تشریف لے گئے۔ پھر باہر آئے۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا۔ اذان و اقامت ہوئی۔ آپ نے نماز پڑھائی پھر خطبہ شروع کیا اور آیت یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم الخ تلاوت کی پھر سورۂ حشر کی آیت ولتنظر نفس الخ پڑھی اور لوگوں کو صدقہ و خیرات کی ترغیب فرمائی جس پر لوگوں نے صدقہ دینا شروع کیا۔ بہت سے درہم و دینار، کپڑے، گیہوں، کھجوریں وغیرہ جمع ہوگئیں۔ آپ برابر تقریر فرمائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فرمایا کہ آدھی کھجور بھی دے سکتے ہو تو لے آؤ۔ اسی وقت ایک انصاری ایک تھیلی نقدی سے بھرا ہوا اتنا وزنی لے آئے کہ جیسے بمشکل اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر تو لوگوں نے تانتا باندھ دیا جو ملا لے آئے۔ یہانتک کہ ہر چیز کے ڈھیر لگ گئے اور آنحضرت کا اداس چہرہ چمک اٹھا اور سونے کی طرح دمک اٹھا اور آپ نے ارشاد فرمایا جو بھی اسلامی کارِ خیر کو شروع کرے اس کو اپنا بھی اور اس کے بعد جو بھی اس کام کو کرے گا سب کا بدلہ ملتا ہے، لیکن بعد والوں کا اجر گھٹ کر نہیں۔ اسی طرح جو اسلام میں کسی برے اور خلاف شرع طریقے کو رائج کرے۔ اس کو اپنا بھی گناہ ہوتا ہے اور جتنے لوگ بعد میں بھی اس کام کو کرتے رہتے ہیں ان سب کے برابر بھی گناہ اسے ملے گا، لیکن ان بعد والوں کے گناہ گھٹتے نہیں۔

ولاتکونوا کالذین الخ یعنی تم ایسے لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا اور دن رات اس چند روزہ زندگی کے لئے شہوات و لذات میں بالکل ایسے محو ہوگئے کہ اللہ کو بھی بھول گئے پھر آخرت کی فکر اور وہاں جانے کا خیال کیا، اس لئے اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ خود ان کو اپنے سے بے پرواکر دیا۔ سعادت و حیاتِ جاودانی سے محروم کر دیا۔ ان کی ایسی عقل ماری گئی کہ اپنے نفع حقیقی کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا۔ دوسری جگہ قرآن حکیم میں بروز قیامت اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کو نقل کیا ہے فالیوم ننسٰھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا (بس آج کے دن ہم نے ان کو اسی طرح بھلا دیا جس طرح انھوں نے آج کے دن ہم سے اپنے ملنے کو بھلا دیا تھا۔)

ابن کثیر نے طبرانی کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ صبح شام تم اپنے مقررہ وقت (یعنی موت) کی طرف بڑھ رہے ہو۔ اس لئے تمہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے اوقات اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزارو اور یہ کسی مقصد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے صرف اپنی طاقت و قوت سے کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے اپنی عمر کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے علاوہ اور کاموں میں ضائع کیا ہے، ان جیسے تم ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان جیسا ہونے سے منع فرمایا ہے ولاتکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم۔ خیال کرو کہ تمہاری جان پہچان کے تمہارے بھائی آج کہاں ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو اعمال کئے تھے ان کا اجر لینے یا ان کی سزا بھگتنے کیلئے وہ دربارِ خداوندی میں جا چکے ہیں اب یا تو انھیں سعادت و خوش نصیبی حاصل ہوگئی یا نامرادی و بدبختی نصیب میں آئی۔ کہاں ہیں وہ سرکش اور سرپھرے جنھوں نے بارونق شہر بسائے اور مضبوط قلعے اور بلڈنگیں بنائیں آج وہ قبروں میں گڑھوں میں مٹی اور پتھر کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ یہ ہے کتابِ الٰہی قرآن کریم تم نور سے روشنی حاصل کرو جو قیامت کے دن کی اندھیریوں میں تمہارے کام آسکے۔

اس کی طولانی بیان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے احوال درست کر لو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ انھم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورھبا وکانوا لنا خاشعین یعنی وہ نیک کاموں کی طرف سبقت لیتے تھے اور بڑے شوق اور رغبت کے ساتھ ہم سے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے لئے جھکے جاتے تھے۔ سو وہ بات بھلائی سے خالی ہے جس سے خدا تعالیٰ کی رضامندی مطلوب نہ ہو۔ وہ مال خیر و برکت والا نہیں جو راہ خدا میں خرچ نہ کیا جاتا ہو۔ وہ شخص خوش قسمتی سے دور ہے جس کی جہالت بردباری پر غالب ہو۔ اسی طرح وہ شخص بھی نیکی اور بھلائی سے کوسوں دور ہے۔ جو خداوند تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف کھاتا ہے۔

لا یستوی اصحاب النار الخ۔ گزشتہ آیات میں اہل سعادت و اہل شقاوت دونوں کا ذکر آ چکا ہے۔ نیکو کاروں کے لئے جنت ہے اور بدکاروں کے لئے جہنم۔ تو جہنم میں جلنے والے اور جنت میں برابر نہیں ہو سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے سفیدی سیاہی، اندھیرا اجالا، نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ دوسری آیات میں بھی ارشاد فرمایا۔ وما یستوی الاعمی والبصیر ولا الظلمات ولا النور۔ اندھے اور دیکھنے والے (کافر) برابر نہیں اور نہ ظلمت اور نور برابر ہو سکتے ہیں۔ وما یستوی الاحیاء ولا الاموات اور نہ زندہ اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض۔ کیا ہم ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فسادیوں جیسا کر دیں گے یا ہم پرہیزگاروں کو فاجروں جیسا بنا دیں گے۔ ام حسب الذین اجترحوا السیئات الخ۔ کیا بدکاروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انھیں اہل ایمان اور نیکو کار لوگوں کے برابر کر دیں گے۔

علیٰ جبل۔ پہاڑ کو فہم و شعور دے کر اس پر قرآن حکیم نازل کیا جاتا تو وہ بھی کتاب الٰہی اور کلام ربانی کی جلالت شان کو برداشت نہ کر پاتا۔ اور خوف و خشیت کی وجہ سے پھٹ پڑتا، لیکن انسان ہے کہ بوجہ غلبۂ شہوات اس پر اثر نہیں ہوتا۔ انسان کو چاہیئے کہ حصول طاعات اور ترک معاصی کے دواعیہ شہوات کو مغلوب کرے۔ اپنی قوت بہیمیہ پر قوت ملکیہ کو غالب کرے تا کہ مواعظ قرآنیہ کا اثر قبول کر سکے اور تعمیل احکام میں استقامت اور ذکر و فکر میں صلاح و فلاح نصیب ہو

یہ کلام ربانی تو اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ دل اس کے اثر سے لرز جائیں۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، کلیجے کپکپانے لگیں۔ اس کے وعدے وعید سامع کو لرزا دیں اور بارگاہ الٰہی میں اس کو سربسجود کر دیں۔ لیکن انسانی دل اتنا چھوٹا اور نرم ہونے کے باوجود بھی پہاڑوں سے زیادہ سخت اور بے صلاحیت ہو گئے۔

حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ستون سے جو کھجور کا تنہ تھا ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہو کر مسجد میں رکھا گیا اور آپ نے بجائے ستون کے منبر پر خطبہ دینا شروع کیا تو وہ کھجور کا تنہ آپ کے فراق میں رونے لگا۔ روتے روتے اس کی ایسی حالت ہو گئی جیسے کوئی بچہ ہچکیوں سے رو رہا ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے اور اس تنہ پر دست مبارک پھیر کر تسلی دی۔ تب اس کی آواز بند ہوئی۔

حضرت حسن بصریؒ اس حدیث کو بیان کر کے فرماتے تھے کہ لوگو! ایک کھجور کا تنہ اس قدر اللہ کے رسول کا شائق ہو تو تمہیں تو اور بھی زیادہ شوق و ذوق اپنے دل میں رکھنا چاہیئے۔

عام مفسرین نے اس جگہ جبل کے معنی پہاڑ ہی کئے ہیں، لیکن بعض نے اس کو کنایہ قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بلحاظ ثبات کبھی انسان پر بھی جبل کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص پہاڑ کی طرح جما رہا۔

اور عرب کے افراد ایک کیا ہزاروں پہاڑ تھے جو اپنے عقائد و اعمال میں اور خاندانی روایات میں اتنے پکے تھے کہ انھیں نہ یہودیوں کی تعلیم اپنی جگہ سے ہلا سکی نہ عیسائیت کا عروج اور اس کی پرزور تبلیغ۔ پانچ سو سال تک دونوں قوموں نے زور لگایا، لیکن یہود و نصاریٰ کی تبلیغ اگر آندھی اور طوفان تھی تو عرب کے لوگ بھی پہاڑ تھے۔ جن پر اس آندھی و طوفان کا کوئی اثر نہیں تھا، لیکن یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے بیس سال کے مختصر عرصے میں ہی ان پہاڑوں کو ہلا دیا اور گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا یہاں تک کہ علوم و اخلاق کے دریا ان سے بہہ نکلے۔

وان من الحجارة لما يتفجر منه الانهار وان منها لما يشقق فيخرج منه الماء وان منها لما يهبط من خشية الله۔ اور بلاشبہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے نہریں بہنے لگتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو اس میں سے پانی کے سوت رسنے لگتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو خشیتِ الٰہی سے گرنے اور لڑھکنے لگتے ہیں۔

عالم الغيب والشهادة ۔ وہ چھپی ہوئی اور ظاہر چیزوں کو جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے تو ہر چیز شہادۃ ہے۔ غیب کچھ بھی نہیں، لیکن یہاں ہمارے اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ جو ہم سے چھپی ہوئی ہیں اور جو ہم پر ظاہر ہیں ان سب کو وہ جانتا ہے۔

پھر لفظ غیب کے معنیٰ یہی نہیں کہ آنکھوں سے مخفی ہو بلکہ انسانوں کی حواس خمسہ کی دسترس سے باہر ہو وہ غیب ہے۔ اور انسان کیا بلکہ جنات وملائکہ کے احساس وادراک سے جو غائب ہے وہ بھی غیب ہے۔ عالمِ ملکوت انسان کا غیب، عالمِ لاہوت وجبروت اوپر والوں کا غیب بلکہ عالمِ ناسوت ہر ایک پس پردہ چیز کے لحاظ یا بُعدِ زمانی ومکانی کے سبب یا تمام اقسام حواس کے لحاظ سے غیب ہے گو دوسرے کے لئے جس کے آگے حجاب نہیں شہود ہے۔ پھر غیب وشہود دونوں اضافی ہیں عالمِ شہود میں آنے والی چیزیں جو مسافت طے کرتی آتی ہیں اور پھر عالمِ غیب کی بے انتہا وسیع وادیوں کو طے کرتی جاتی ہیں۔ یہ منازل بھی انسانوں کے لئے غیب ہیں۔ اور شہود میں آجانے کے لئے بھی سب کے لئے شہود نہیں۔ بلکہ ماقبل ومابعد والوں کے لئے غیب ہے۔ لیکن یہ سب رب العالمین کے نزدیک حاضر ہیں۔ غیب وشہادت کے تمام مراتب ومراحل اس کے نزدیک حاضر ہیں اور وہ سب سے باخبر ہے۔

هو الرحمن الرحيم۔ رحمٰن ورحیم کے مفہوم ومعنیٰ میں فرق ہے۔ مادہ "رحمت" دونوں میں مشترک ہے، لیکن قلت وکثرت تمام ونا تمام، دنیا وآخرت کی رحمت، مومن وکافر پہ رحمت کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ رحمٰن میں کمال اور وسعت زیادہ ہے، اس لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں۔ برخلاف لفظ رحیم کے۔

اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کی رحمت کا ہی پرتو ہے۔ اگرچہ بعض اشیاء کے بعض منافع کے نزدیک فوت ہو جائیں مگر اس کی رحمت کی وسعتوں سے وہ پھر بھی باہر نہ ہوں گی۔

الملك۔ بادشاہ ہے۔ پوری کائنات میں حقیقی سلطنت وحکومت اللہ تعالیٰ کی ہی ہے نہ اس کے حدود سلطنت سے کوئی چیز باہر ہے نہ اس کے خزانوں کی انتہا ہے نہ اس کے لشکروں کی کوئی حد۔ دنیا میں جو بادشاہتیں ہیں وہ اوّل تو اسی کی بادشاہت کا ادنیٰ پرتو ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہ اس کو استقرار ہے اور نہ استحکام اور غنیم کے حملوں اور خزانوں میں خسارے کا خطرہ الگ لاحق۔ دنیا کی بادشاہت، رعیت اور خزانے کے سہارے چلتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی بادشاہت ان تمام خطرات سے پاک ہے، اسی لئے وہی شہنشاہِ حقیقی اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ دنیاوی بادشاہ کو ملک الملوک کہلانا زیب نہیں۔

القدوس السلام۔ القدوس کے معنیٰ ہیں ہر عیب سے پاک اور خلافِ شان ہر بات سے بری۔ السّلام سلامتی سے لیا جائے تو معنیٰ ہوں گے ہر نقصان وزوال سے سلامت۔ اس صورت میں یہ مصدر ہے اور مبالغۃً مصدر کا اطلاق بطورِ صفت کے اکثر ہوتا ہے۔ قدوس اور سلام دونوں کے معنیٰ عیب ونقصان سے پاک اور بری ہونے کے ہوں گے۔ بس فرق یہ رہے گا کہ "قدوس" زمانۂ ماضی وحاضر کے عیوب ونقصانات سے بری ہونے والا اور سلام زمانۂ آئندہ کے نقصانات سے بری اور زوال پذیر نہ ہونے والا۔

المؤمن امن سے لیا جائے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ ایمان داروں اور اپنی پناہ میں آنے والوں کو امن دینے والا۔ اور ایمان سے لیا جائے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ انبیاء ورسل ملائکہ اور احوالِ آخرت وغیرہ کے معجزات اور آیاتِ قدرت کے ذریعہ تصدیق کرنے والا۔

المهيمن اس لفظ کی تحقیق میں مختلف اقوال ہیں ایک قول جس کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے یہ ہے کہ اس کے معنیٰ محافظ اور نگہبان کے ہیں۔

الجبار۔ بروزن فعّال۔ جبر نقصان سے یعنی وہ فقیر کو غنی کر دینے والا، نقصان کی جگہ فائدہ دینے والا۔ یا جبر بمعنیٰ قہر لیا جائے۔ یعنی

مجبور کر دینے والا۔ اس کے کاموں اور فیصلوں سے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جبار بمعنی عظیم ہے۔

المتکبر۔ کبر اور کبریا سے، بزرگی اور بزرگ ہونا، تکبر اور استکبار بزرگی دکھلانا۔ یہاں یہی معنیٰ ہیں کہ بزرگی والا اور علو و برتری دکھلانے والا اور یہ اسی کی صفت ہے اسی کو زیبا ہے کیونکہ ہر قسم کی حقیقی علو و برتری اس کو حاصل ہے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ کبریا میری چادر ہے۔ جس نے اس کو اختیار کیا گویا اسنے میری چادر پر ہاتھ ڈالا۔ اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا گیا۔ سبحٰن اللہ عما یشرکون۔ اس کو ذات و صفات میں کسی کو جو شریک قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اس سے پاک ہیں۔

الخالق البارئ المصور۔ "الخالق" اور "البارئ" دونوں کے ایک ہی معنی ہیں پیدا کرنے والا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ باری کا استعمال اجسام و جواہر میں ہوتا ہے نہ کہ اعراض میں اور خالق عام ہے۔

یا پھر خالق کے معنیٰ ہوں مادے کو پیدا کرنے والا اور باری کے معنی ہوں روح کا پیدا کرنے والا۔ المصور جواہر و اعراض کی ترکیب سے مختلف صورتوں والے اجسام بنانا یا مادہ اور روح کی ترکیب سے مختلف اجسام اور ان کی مختلف شکلیں بنانے والا۔ حاصل یہ کہ جواہر و اعراض۔ مادہ و روح کا پیدا کرنے والا اور ان کو مختلف شکلیں دینے والا کہ بے شمار مخلوقات ہیں، لیکن سب ایک دوسرے سے ممتاز ہیں) اللہ تعالےٰ ہی ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے فی اَیِّ صورۃٍ ماشاء رکّبک۔

آریہ سماج اللہ تعالےٰ کو صرف المصور مانتے ہیں اور مادہ اور روح کے خالق ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ گویا ان دو صفات کے منکر ہیں اور چونکہ کسی اسم الٰہی کا انکار صریح کفر و شرک ہے اس لئے آریہ سماج بھی ایک مشرک فرقہ ہے۔ کامل توحید سوا اسلام کے کسی کو نصیب نہیں۔ ان اسمائے الٰہی کے انکار کا نتیجہ یہ ہے مادہ اور روح کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ خود بخود ازلی ہونے میں شریک مانتے ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے ۳۳ کروڑ دیوتا چھوڑ دیئے تو کیا دو بڑے خدا بنا لیئے۔ تو صفات خداوندی کا مکمل ترین نقشہ صرف قرآن نے ہی پیش کیا ہے۔

لہ الاسماء الحسنیٰ۔ اس کے (اللہ تعالےٰ کے) اور بھی اچھے اور نیک نام ہیں۔

اللہ تعالےٰ کی بے شمار صفات حمیدہ ہیں۔ ہر صفت کے لحاظ سے اس کا ایک نام ہے جس سے اس کو تعبیر کرتے ہیں اور حدیث میں جو ننانوے نام آئے ہیں ان میں حصر نہیں ہے۔ البتہ حدیث میں مذکور اسمار توفیقی ہیں یعنی اگرچہ مان لیں کہ ہم معنیٰ دوسرے الفاظ بھی ہوں، لیکن بطور اسماء کے وہی متعین ہوں گے جو احادیث میں مذکور ہیں۔ یہی مسلک اہل سنت والجماعت کا ہے۔ ان اسماء الٰہیہ میں بے شمار تاثیرات بھی ہیں۔ یہ بھی ثمرہ ان کے توفیقی ہونے کا ہے۔

مقصود بیان

جس قرآن کی ہم تلاوت کرتے ہیں یہ خداوند ذوالجلال ملک الملوک کا کلام ہے اور اس کی ایک صفت ہے جس طرح اس کی ذات اور دیگر صفات کی تجلی کا تحمل جبال و بحار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کلام ربانی کی جلالت شان بھی ان کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لئے کافی ہے، مگر اللہ تعالےٰ کا فضل ہے کہ اس نے اپنے کلام کو انسانوں کے لئے رحمت و رأفت اور آسان بنا دیا۔ جہاں اس کی جلالت شان اور ثقل مقام کی نشاندہی ان کلمات جلیلہ سے کی گئی۔ انا سنلقی علیک قولاً ثقیلا۔ (ہم جلد ہی دیئے دیتے ہیں آپ کو ایک بھاری قول) وہیں اس کی سہولت بیان اور یسر فیضان کی نوید ان کلمات جمیلہ سے دی گئی۔ ولقد یسرنا القراٰن للذکر فھل (اور یقیناً ہم نے نصیحت کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے پس کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا) بعض روایات میں ہے کہ اگر یہ سہولت نہ بخشی جاتی تو انسانوں کیلئے قرآن حکیم کی تلاوت ممکن نہ ہوتی تو عالم انسانی اور بالخصوص اہل ایمان کو اس انعام ربانی کی قدر کرنی چاہیئے۔ جب کہ صاحب کلام کے تصرفات پوری کائنات میں ہر لمحہ بے روک ٹوک جاری ہیں۔ ان سے استغنار کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ کوئی مخلوق اس کے فیضان رحمت سے ذرا دیر کے لئے بھی اپنا تعلق منقطع کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

اس کا اندازہ اس کی ان بعض صفات سے ہی بخوبی لگایا جا سکتا ہے جن کا تعلق کائنات و ما فیہا کے ایجاد و خلق سے اور اس کی بے پناہ قدرت و تصرف اور بے نہایت رحمت و ربوبیت سے ہے۔ وہی رحمٰن و رحیم ہے۔ وہی ملک الملوک ہے۔ وہی اپنے فرمان بردار بندوں کو ظلم و ضلالت سے امن دینے والا اور آفات و بلیات سے پناہ دینے والا ہے۔ اسی نے کائنات کے ایک ایک ذرّے کو بشمول مادہ و روح اندازہ مقرر کیا اور اس اندازے کے مطابق ان کو پیدا کیا اور کائنات کی ہر چیز کو کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مختلف شکلوں اور صورتوں سے ممتاز اور قابلِ پہچان بنایا۔ اور کائنات کی ہر چیز اسکی تابع فرمان اور اطاعت گذار ہے۔

اس لئے ایک طرف اس کی ذات ہر قسم کے شرکت سے پاک اور بری ہے اور دوسری طرف اسی کی ذات اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور قلب و جوارح کے ہر خیال و عمل کی بنیاد اسی سے خوف کو بنایا جائے جس کا نام تقویٰ ہے، اس لئے کہ وہ ہر قول و عمل اور ہر گوشۂ خیال سے ہر دم باخبر ہے۔

اور اس کے کلام میں بیان فرمودہ احکام و ہدایات اور اصول سعادت کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالا جائے۔ صاحب کلام کے اس انعام یُسرِ کلام اور سہل بیان کے باوجود خود کو اس سے غافل کر دینا اور پہاڑوں اور پتھروں سے زیادہ اپنے دلوں کو قرآن حکیم کے مقابلے میں سخت بنانا اور اس کی انقلاب آفرین پند و نصائح سے کوئی اثر قبول نہ کرنا سوائے تباہی اور بربادی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرے گا۔ اس کفر و عدوان اور فسق و فجور کی سزا جہنم ہوگی۔ اور اس کے مقابلے میں اطاعت گزاروں اور فرماں برداروں کے لئے جنت۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم اپنے احوال اور درجات کے لحاظ سے برابر نہیں ہو سکتے۔

سُورَةُ المُمْتَحِنَة

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاۤءَ تُلْقُوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ

اے ایمان والو — تم میرے دشمنوں — اور اپنے دشمنوں کو — دوست مت بناؤ — کہ ان سے دوستی کا — اظہار کرنے لگو

وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاۤءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللهِ رَبِّكُمْ ط

حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اسکے منکر ہیں — رسول کو اور تم کو — اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار — اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں

إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَاۤءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ

اگر تم میرے راستے میں — جہاد کرنے — کی غرض سے — اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے نکلے ہو تو تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو

وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَاۤ أَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ أَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۤءَ السَّبِيْلِ ○

حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور (آگے اسپر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کریگا وہ راہِ راست سے بھٹکے گا

إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ

اگر ان کو تم پر دسترس ہوجائے تو فوراً اظہارِ عداوت کرنے لگیں اور تم پر برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں (یہ دنیوی اضرار ہے) اور

وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ

(دینی اضرار یہ کہ) وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کافر ہوجاؤ تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے کام نہ آویں گے خدا تمہارے

يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے

وقتِ نزول

۱۳ آیتوں اور دو رکوع پر مشتمل اس سورت کا نام الممتحنہ ہے۔ مدینہ منورہ میں اس وقت نازل ہوئی جبکہ فتح مکہ کے لئے تیاری ہو رہی تھی۔

خلاصۂ سورت مع وجہ تسمیہ

اس میں مسلمانوں کے کفار کے ساتھ تعلقات پر بحث ہے۔ ایک طرف اگر ان کفار سے جو مسلمانوں سے بربنائے قبولِ اسلام جنگ کرتے ہیں اور ہر ممکنہ طریقے سے ان کو ایذا پہنچاتے ہیں ایسے کفار سے ترکِ موالات کا حکم ہے تو دوسری طرف ان غیر مسلمین سے جو جنگ نہیں کرتے احسان کرنے اور انصاف کرنے کا حکم ہے۔ ان ہی باہمی تعلقات میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب ایسی عورتیں اپنے شوہروں سے الگ ہو کر آجائیں جو خود کو مسلمان کہتی ہیں تو ان کا امتحان لے کر ان کے بارے میں پورا اطمینان کرلینا چاہیئے تو وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں تو ان کے ازدواجی اور نکاحی تعلقات پہلے شوہروں سے قائم نہیں رہ سکتے۔ اسی امتحان سے اس سورت کا نام الممتحنہ لیا گیا ہے۔

شانِ نزول

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک مہاجر صحابی تھے۔ خود قریش میں سے نہیں تھے بلکہ یمن سے آکر مکہ مکرمہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ پھر وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں آگئے تھے۔ مکہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حلیف تھے۔ اس لئے مکہ میں ان کے اہل و عیال اور مال و جائیداد کو امن حاصل تھا۔

جب اہلِ مکہ نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا ارادہ فرمایا اور چند مخصوص صحابہ سے اس ارادہ کا ذکر کیا اور عام مسلمانوں کو غزوہ کی تیاری کا حکم دیدیا۔ عام حضرات صحابہ یہی سمجھتے رہے کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کا ارادہ فرمایا ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی کہ مکہ پہنچنے تک قریش کو ہمارے ارادوں اور پروگرام کا علم نہ ہو تاکہ خونریزی نہ ہو اور بسہولت فتح ہوسکے۔ یہ دعا قبول ہوئی۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ طبعی طور پر اپنے اہل و عیال کی طرف سے فکرمند تھے کہ دوسرے حضرات صحابہ کی تو قریش سے کسی نہ کسی قسم کی رشتہ داریاں ہیں۔ جس کے اثر سے ان کے متعلقین مکہ میں محفوظ رہیں گے۔ مگر میری کوئی رشتہ داری قریش سے نہیں ہے تو میرے اہل و عیال اور مال و اسباب کے ساتھ قریش اچھا معاملہ نہ کریں گے۔ اس لئے اب تو یہی صورت ہے کہ میں قریش کے ساتھ ایک احسان کا معاملہ کروں۔ جس کی وجہ سے وہ ازراہِ شکرگزاری میرے متعلقین کی حفاظت کرسکیں۔

یہ سوچ کر انھوں نے ایک عورت کے ذریعہ جو قبیلۂ مزینہ کی تھی اور وہ مدینہ سے مکہ جا رہی تھی۔ کچھ اجرت پر یہ معاملہ کیا کہ وہ ان کا خط قریش مکہ کو پہنچا دے۔ اس خط میں انھوں نے اہلِ مکہ سے اظہارِ تعلق کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ اور پروگرام کی اطلاع

دی تھی۔

وہ عورت یہ خط لے کر مکہ کی طرف چلی جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ حضرت جبریل اس خط کی اطلاع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی آپ نے حضرت علیؓ، حضرت مقداد اور حضرت ابو مرثد اور ایک روایت میں حضرت ابو مرثد کی جگہ حضرت زبیر کا نام ہے اور ایک روایت میں صرف حضرت علی اور حضرت مقداد کا نام ہے رضی اللہ عنہم۔

بہر حال آپ نے ان سب کو یا ان میں سے بعض کو حکم دیا کہ وہ تیزی کے ساتھ جائیں۔ فلاں باغ کے نزدیک ایک سانڈنی سوار عورت ملے گی۔ اس کے پاس ایک خط اہلِ مکہ کے نام ہے وہ اس سے حاصل کر کے لے آئیں۔ چنانچہ ان حضرات نے تیزی سے اس باغ تک پہنچ کر دیکھا کہ واقعی ایک سانڈنی پر سوار عورت چلی جا رہی ہے۔ ایک روایت میں اس جگہ کا نام روضۂ خاخ آیا ہے۔ ان حضرات نے اس عورت کو روک کر کہا کہ تیرے پاس ایک خط ہے وہ ہمیں دے۔ اس نے صاف انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تلوار دکھا کر ڈرایا دھمکایا کہ تیرے پاس خط یقیناً ہے، اگر تو نہیں دے گی تو ہم جامہ تلاشی پر مجبور ہوں گے۔ اس پر وہ گھبرا گئی۔ اور سمجھ گئی کہ ان کو میرے پاس خط ہونے کا پورا علم و یقین ہے۔ لہٰذا خط دینے میں ہی اس نے عافیت سمجھی اور اس نے اپنی چوٹی میں سے خط نکال کر دے دیا۔ یہ حضرات خط لے کر فوراً بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور خط پیش کیا۔ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت حاطب کا خط تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب سے فرمایا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ وہ بہت شرمندہ ہوئے اور عرض کیا حضورؐ میں نے قطعاً آپ کو یا اپنے بھائی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی نیت سے یا خدانخواستہ مخالفتِ اسلام کے سبب یہ کام نہیں کیا بلکہ مجھے یقین اس بات کا تھا اور ہے کہ آپ کو اور آپ کے پروگرام کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ فتح مقدر ہو چکی ہے۔ میں نے صرف اہلِ مکہ کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا چاہا تھا تاکہ وہ اسی احسان کی وجہ سے میرے اہل و عیال کی حفاظت کر سکیں۔ کیونکہ دوسرے مہاجرین کی طرح میری کوئی قرابت اہلِ مکہ میں نہیں ہے۔

تمام حاضرین کو اس بات پر بے حد غم و غصہ تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے مگر آپؐ نے فرمایا کہ حاطب نے سچ بولا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا تم نہیں جانتے۔ یہ اہلِ بدر میں سے ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی۔

اس پر حضرت عمر رونے لگے اور فرمایا کہ اللہ و رسول کو ہی زیادہ علم ہے۔

اس واقعہ پر وحی کے ذریعہ تنبیہ کی گئی اور اللہ و رسول اور مذہب کے دشمنوں کے ساتھ یہ تعلق و مودت کا معاملہ کسی مسلمان کے لئے نازیبا ہے۔

تفسیر اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ تم ان کے ساتھ دوستی کا مظاہرہ کرنے لگو (اگرچہ دل میں محبت بھی نہ ہو) اور جب کہ وہ دینِ حق کے منکر ہیں جو تمہارے پاس آچکا ہے (اور یہی نہیں بلکہ تمہارے ساتھ ان کا برتاؤ یہ ہو چکا ہے کہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تم کو محض اسی بنا پر کہ تم اپنے پروردگار (خداوند تعالیٰ) پر ایمان لے آئے ہو، شہر بدر کر چکے ہیں۔ اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکلے ہو۔ (تو پھر اس کے کیا معنی کہ) تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو۔ حالانکہ (یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ) میں ہر چیز سے خوب ہی باخبر ہوں۔ تم جو چھپا کر کرتے ہو اس سے بھی اور جو کھلے عام کرتے ہو اس سے بھی (یہ سب امور تو اس کے متقاضی تھے کہ دشمنانِ خدا و رسول کے ساتھ تمہارا معاملہ محتاط ہونا چاہیئے نہ یہ کہ بے احتیاطی اور محبت آمیز برتاؤ تمہاری طرف سے ہو۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس طرح کی باتوں کا انجام ٹھیک نہیں ہے) جو شخص بھی ایسا کرے وہ راہِ راست سے بہک گیا (تم اس پر بھی تو توجہ کرو کہ دشمن ہمیشہ تمہاری گھات میں لگا رہتا ہے۔) اور اگر انہیں تم پر قابو ہو جائیں تو اپنی دشمنی نکالنے لگیں اور تم پر دست اندازی اور زبان درازی کرنے لگیں (اور چلو یہ تو جسمانی اور دنیوی

افراد ہے لیکن دینی افراد کے بھی وہ در پے رہتے ہیں، اس لئے کہ) وہ اس بات کے متمنی رہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ (تو بھلا ایسے لوگ کبھی دوستی کے لائق ہوتے ہیں۔)

اگر دشمنوں کے ساتھ دوستی میں اہل و عیال کا کوئی مفاد تمہارے پیش نظر ہے تو یہ سمجھ لو کہ تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔ (اس دن خدا ہی تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور اللہ تمہارے سب اعمال کو دیکھتا ہے۔

تحلیل اجزا

یاایہا الذین آمنوا۔ اس طرح کی آیات دوسری جگہ بھی ہیں۔ فرمایا گیا۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لا تتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء اے ایمان والو تم یہود اور نصاریٰ کو دل سے دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو ان سے دل دوستی کرے گا ان ہی میں سے ہوگا۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا۔ یاایہا الذین امنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزوا ولعبا اے ایمان والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی وہ اور کفار جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ ایسے معاملوں میں تم اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

خوش خلقی اور حسن معاشرت اور چیز ہے۔ اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ روایات میں اس کی تو تاکیدا ور ہدایت ہے، لیکن دل سے لگاؤ اور میلان اور چیز ہے۔ پھر ایسے غیر مسلم جو امن پسند ہیں اور روادارانہ سلوک کرتے ہیں ان میں اور ایسے کافروں میں بھی فرق ہے جو ہمیشہ در پے آزار رہتے ہیں اور کسی وقت بھی دشمنانہ حرکتوں سے نہیں چوکتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ مجرم ہیں۔ مجرموں کے رعایت مروت بھی مضر ہے۔ چہ جائیکہ دوستی اور موالات۔

وقد کفروا بما جاءکم الخ۔ یہ بیان ہے عدو ی کا کہ انھوں نے دین کے ساتھ دشمنی کی اور کفر کیا جو میری طرف سے حق بنا کر تمہارے اوپر اتارا گیا تو اسی دین حق کے ساتھ دشمنی کی راہ سے وہ میرے دشمن ہوئے۔

تسرون الیہم بالمودۃ۔ دشمنوں کے ساتھ کھلی دوستی بھی غلط ہے تو خفیہ سانٹھ گانٹھ کتنی بری ہوگی۔

اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مخالفین کے ساتھ قطع میلان کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ کسی کے ساتھ بغض اور کدورت ہے تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ اور رسول اور حق کا دشمن ہے۔ اسی حالت کا نام بغض فی اللہ ہے۔

لن تنفعکم الخ یہ آیت دلیل ہے اس بات کی کہ دینی امور میں اولاد اور رشتہ داروں کی رعایت کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ روز حشر نفع و نقصان کا اصل مدار دین پر ہوگا۔ دین ہی کی بنیاد پر جزا سزا ہوگی۔ نہ وہاں کوئی رشتہ کام آئے گا نہ نسب و نسبت۔

یفصل بینکم۔ روز قیامت خدا ہی تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے ہر عمل کو دیکھنے والا ہے، اس لئے ہر عمل کا فیصلہ ٹھیک ہی ہوگا۔ سو اگر تمہارے اعمال موجب سزا ہوں گے تو اس سزا سے تمہارے اہل و عیال نہ بچا سکیں گے تو پھر ان کی رعایت میں اپنی عاقبت خراب کرنا کہاں کی دانشمندی ہے اور جب اہل و عیال مفید نہیں ہوں گے تو بخوبی سمجھ لیا جائے کہ مال و جائیداد کسی کام نہ آسکیں گے۔ اس طرح ان کی رعایت کی گنجائش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا

تمہارے لئے ابراہیم میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان و طاعت میں) ان کے شریک حال تھے　ایک عمدہ نمونہ ہے　جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم

بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ

تم سے　اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو　ان سے بیزار ہیں　ہم تمہارے منکر ہیں　اور ہم میں　اور تم میں ہمیشہ

الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ

کر لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہوگیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ لیکن ابراہیم کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی

لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ

کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں اے ہمارے پروردگار ہم آپ پر توکل کرتے ہیں اور

أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ

آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ہی طرف لوٹنا ہے اے ہمارے پروردگار ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنا اور اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر دیجئے

إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ

بے شک آپ زبردست حکمت والے ہیں بے شک لوگوں میں تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کیلئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ کا اور قیامت کے دن

يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝ ع

کا اعتقاد رکھتا ہو اور جو شخص روگردانی کرے گا سو اللہ تعالیٰ بالکل بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

تفسیر (تمہیں تو باہمی تعلقات اور معاملات میں عداوت سی اور دین پسندی کو اسی طرح ملحوظ رکھنا چاہیے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مخلصین ساتھیوں نے رکھا تھا) تمہارے لئے ابراہیم میں اور ان لوگوں میں جو (ایمان و طاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جب کہ ان سب نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے (دین اور تمہارے معبودین کے) منکر ہیں۔ یہ تو بیزاری عقیدے کے اعتبار سے ہے اور بلحاظ معاملہ اور برتاؤ بیزاری یہ ہے کہ) ہم میں اور تم میں (کھلی) دشمنی اور بغض ظاہر ہوگیا (اور یہ عداوت عارضی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔ البتہ ابراہیم کی جو بات اپنے باپ سے ہوئی تھی جس سے تعلق کا وہم ہوتا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم کی اتباع نہیں کی جائیگی اور وہ بات یہ ہوئی تھی کہ انھوں نے اپنے والد سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے لئے ضرور استغفار کروں گا اور استغفار سے زیادہ کوئی بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ دعا کو قبول کرالوں یا باوجود ایمان لانے کے عذاب سے بچالوں۔ اپنی قوم کے کفار و مشرکین سے قطع تعلق کر کے صرف خدا ہی پر انھوں نے بھروسہ کر لیا تھا اور اللہ کی مدد و نصرت کے اس دعا کے ذریعہ طالب ہوئے تھے کہ اے ہمارے پروردگار کفار کے ساتھ بیزاری اور اظہار دشمنی کے بعد ہم آپ پر توکل کرتے ہیں اور ہر طرح کی مشکلات میں مدد و نصرت اور شرور و آفات سے حفاظت کے لئے ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور برملا ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم سب کو آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اے ہمارے رب ہمیں ان کافروں کے لئے فتنہ اور تختۂ مشق نہ بنائیے اور ہمارے گناہوں کو اے پروردگار معاف کر دیجیے۔ بلاشبہ آپ زبردست حکمت والے ہیں۔

اور تاکید کے طور پر پھر بتلایا جاتا ہے کہ درحقیقت ابراہیم اور ان کے متبعین میں تمہارے لئے یعنی ہر اس شخص کے لئے بہترین نمونہ ہے جو اللہ کے سامنے جانے اور قیامت کے دن کے آنے کا اعتقاد رکھتا ہو۔ مگر یہ خوب سمجھ لیا جائے کہ جو شخص اس حکم سے روگردانی کرے گا تو اسی کا نقصان ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بالکل بے نیاز اور بوجہ کمالات ذاتیہ کے لائق حمد ہیں۔ اس لئے نہ کسی فرمانبرداری سے اس کو نفع پہنچتا ہے اور نہ نافرمانی سے

نقصان۔

تحلیل اجزا

قد کانت لکم اسوۃ الخ۔ جیسے اور دوسری باتوں میں تمہاری اسوۂ ابراہیمی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اسی طرح کفار و مشرکین اور تمہارے اور تمہارے دین و ایمان کے دشمنوں کے برتاؤ میں بھی تمہارے لئے اسوۂ ابراہیمی قابل عمل ہے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت حلیم اور بردبار تھے، لیکن جب کافروں کی طرف سے نفرت و دشمنی ظاہر ہو گئی اور انھوں نے اعلان حق کی پاداش میں سخت سزا دی، تکلیفیں پہنچانے حتیٰ کہ اذیت ناک طریقہ پر موت کے حوالے کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان سے قطع تعلق اور بیزاری کا اعلان کر دیا۔

اذ قالوا لقومھم انا برآؤ منکم۔ نینوی اور بابل کے بادشاہ اور ان کی قوم اور سردار بت پرست تھے۔ صرف حضرت ابراہیم اور ان کے بھتیجے لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی بیوی ایمان لائی تھیں۔ اس وقت اس پوری قوم کے مقابلے میں جو ہر طرح سے طاقتور اور قابو یافتہ تھی۔ اس بے کسی کی حالت میں یہ کہہ دینا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودین سے بیزار ہیں۔ اور تمہارے اور تمہارے دین کے منکر ہیں۔ کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ حوصلہ مندی صرف قادر مطلق کے بھروسہ پر اور اس کی محبت کے جذبہ کے تحت تھی

مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ تم کو بھی ابراہیمؑ کی پیروی کرنی چاہیئے۔ مشرکین تمہارا کیا کر سکتے ہیں۔ کس لئے ان سے محبت رکھتے ہو۔ پیار اور دوستی خدا کے دشمنوں کے ساتھ کیسی؟ مسلمان کے خالص ایمان اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ پوری محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دشمنوں ملحدوں اور پیغمبر اور مومنین پر قولاً و فعلاً تمسخر کرنے والوں سے تعلق قطع کر دے۔ ان کے ساتھ مخلصانہ محبت و یگانگت اور دل لگاؤ کے ساتھ میل، محبت ایمان کے ساتھ ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ البتہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ خوش خلقی اور حسن معاشرت کی ممانعت نہیں ہے یہ اور چیز ہے۔

کفرنا بکم یعنی وقت کفر بمعنی برات بھی آتا ہے لیکن کس چیز سے بے تعلقی اور بیزاری۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔ انی کفرت بما اشرکتمون من قبل۔

حتیٰ تومنوا۔ ان مشرکین کے ساتھ قطع تعلق اور بیزاری و برات کسی دنیوی غرض سے نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور ان کے احکامات صادقہ کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اگر وہ ان شیطانی حرکتوں سے باز آجائیں اور راہِ حق کو اختیار کر لیں تو نہ پھر نفرت ہے اور نہ بیزاری۔ پھر تو اموالھم کاموالنا، و ماءھم کدمائنا و انفسھم کانفسنا۔ ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح ان کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح محترم اور لائق تکریم ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نفرت اور بیزاری تو اللہ کے لئے اور تعلق و یگانگت ہے تو اللہ کے لئے [illegible] حالت کا نام حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔

الا قول ابراھیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے دعائے مغفرت کا جو وعدہ کیا تھا اس بات میں اس کی اقتدا نہ ہوگی بعض مسلمان اپنے مشرک اعزا کے لئے استغفار کرتے تھے اور حجت میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوہ پیش نظر رکھتے تھے اس کی ممانعت دوسری جگہ فرما دی گئی۔ ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربی من بعد ما تبین لھم انھم اصحٰب الجحیم۔ وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ۔ (توبہ) پیغمبر اور ایمان والوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے دعا مغفرت کریں۔ اگرچہ وہ اہل قرابت میں سے ہوں جبکہ ان کے لئے یہ واضح ہو گیا کہ وہ مشرکین جہنمی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کا اپنے والد کے لئے استغفار صرف اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اپنے والد سے کیا تھا۔ لیکن جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ (دشمن) ان سے کنارہ کش ہو گئے۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے لئے دعائے مغفرت اس لئے کرتے رہے کہ وہ دشمنِ خدا نہیں ہیں، لیکن جب حقیقت کھل اور دشمنی ظاہر ہو گئی تو استغفار سے باز آگئے اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ استغفار کیسے قابل اقتدا ہو سکتا ہے۔

وما املک یعنی میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ دعا کر دوں، لیکن اس کا اختیار مجھے نہیں ہے کہ اللہ سے دعا قبول کرا لوں یا عذاب دور

ایمان نہ لانے کے تم کو عذاب سے بچا لوں۔

ربنا علیک توکلنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کفار و مشرکین سے قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر کے اللہ کی طرف رجوع کیا اور دعا کی کہ پروردگار ہمارا بھروسہ تیری ہی ذات پر ہے۔ یعنی تو ہی تمام مشکلات میں ہمارا حامی و مددگار ہے اور تو ہی ہر قسم کے شرور و آفات اور مشرکین و شیاطین کے فتنوں سے ہماری حفاظت کر سکتا ہے۔

لا تجعلنا فتنۃ للذین کفروا۔ ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنا یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ ہم پر غالب آجائیں اور ہمیں مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ اسی طرح یہ بھی نہ ہو کہ ہم پر کوئی عتاب و عذاب نازل ہو اور ان کے لئے بہکنے کا سبب بن جائے کہ اگر یہ اہل ایمان حق پر ہوتے تو خدا انھیں عذاب کیوں دیتا۔ اگر یہ کسی میدان میں جیت گئے تو بھی ان کے لئے یہ فتنہ کا سبب ہوگا کہ ہم اس لئے غالب آئے کہ ہم ہی حق پر ہیں۔ ایسے ہی اگر یہ ہم پر غالب آئے تو ایسا نہ ہو کہ ہمیں تکلیفیں پہنچا پہنچا کر تیرے دین سے برگشتہ کر دیں۔

بخاری میں حضرت مجاہد سے یہی ترجمہ مروی ہے کہ ہمیں ان کافروں کے ہاتھوں سے عذاب نہ دے۔ لا تجعلنا فتنۃ لا تعذبنا بایدیھم۔

مقصود بیان

کسی مسلمان کے لئے کسی وقت بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ کسی دنیاوی لالچ کی وجہ سے قومی مفادات کے اندر مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کو ترجیح دے۔ خاص طور پر وہ غیر مسلم جو ہر آن مسلمانوں کے بحیثیت قوم مسلم کے درپے آزار رہتے ہوں۔ ان کی تمام تر دشمنی کی بنیاد یہ ہو کہ یہ مسلمان کیوں ہیں اور کیوں ہمارے غیر اسلامی عقائد و اعمال سے بیزار ہیں۔ ان کے دین کو قبول کر لیا جائے تو ان کی دشمنی و آزار پسندی دوستی و اخوت سے بدل جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہو تو نہ ان کو امن و آشتی کی پرواہ ہو اور نہ انسانی اور ملکی رشتوں کا احترام، درندوں کی طرح پھاڑ کھانے کو تیار رہتے ہوں۔ ہر وقت اس گھات میں رہتے ہوں کہ کب مسلمان نشانے پر آئے اور جو کبھی ہرگز نہ ممکن ہو وہ اس کو پہنچا دی جائے، جانوں کا اتلاف، گھروں، کھیتوں اور جائیدادوں کی بربادی عزت و آبرو کی پامالی وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر قسم کی تکلیف پہنچانا روا رکھیں تو ایسے دشمنوں سے دوستی و اخوت کا برتاؤ ہرگز خدا کو پسند نہیں ہے خواہ یہ کسی دنیاوی نفع کی غرض سے ہی ہو اور خواہ مسلمانوں کی قومی پوزیشن اتنی مضبوط کیوں نہ ہو کہ اس کی اس انفرادی تال میل سے ان کو نقصان نہ پہنچنے کا یقین نہ ہو کیونکہ یہ چاپلوسی ہے۔ ایسے ناہنجاروں سے چاپلوسی تو کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ یہ تو قومی اور ملکی حمیت کے بھی خلاف بات ہے یہ موذی تو اس لائق ہیں کہ ان سے علانیہ اظہار بیزاری و بے تعلقی کیا جائے۔ ورنہ ان سے دوستی کے معنی تو یہ ہوں گے کہ سانپ، بچھو اور شیر بھیڑیوں سے دوستی کی ہے۔

بہرحال اس سے اظہار بیزاری ایک شرعی حکم ہے۔ اس کے مقابلے میں مال و جائیداد اولاد و اقارب کا ظاہری اور عارضی نفع قطعاً قابل لحاظ نہیں ہو سکتا اور نہ شرعی حکم کے مقابلے میں یہ رشتے قیامت کے روز کوئی فائدہ پہنچا سکیں گے۔ اس بارے میں اپنی طاقت و قوت اور کمزوری و ناتوانی کو بھی بنیاد اور معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن حکیم اس موقع پر اسوۂ ابراہیمی کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اس کے اتباع کی ہدایت کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہر طرح کی کمزوری اور بے سروسامانی کے باوجود کفر کے حامل دشمنوں سے کھل کر اظہار بیزاری و بے تعلقی فرما دیا تھا۔

دنیا میں قومی اور ملی عزت و وقار بڑی چیز ہے اس کا تحفظ و نگہداشت نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ عزت و وقار خاک میں ملا دیا گیا تو محض جانوں کو لئے پھرنے سے کیا فائدہ؟

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کر دے اور اللہ کو بڑی قدرت ہے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ

اور اللہ غفور رحیم ہے ۔ اللہ تعالیٰ تم کو اُن لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا

يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞

جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ

صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور

ظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۞

تمہارے نکالنے میں مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گنہگار ہوں گے ۔

تفسیر

قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا کر دے (یعنی یہ ایمان لے آئیں گے اگرچہ سب ایسا نہ کریں، اس لئے یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ان مشرک اقرباء سے ہمیشہ کے لئے قرابتیں اور دوستی ختم ہو گئی یہ تو چند دن کے لئے ہے پھر ان کی دشمنی دوستی سے بدل جائے گی اور اس کو انہونی بات نہ سمجھو بلکہ یہ خیال کرو کہ ضرور ایسا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر بڑی قدرت ہے (اور اب تک جو کسی سے اس سلسلہ میں خطا ہو چکی ہے اور وہ تائب ہو گیا تو) اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

(باقی مشرکین و کفار سے اچھے برتاؤ اور احسان و انصاف کے سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ تم کو ایسے مشرکین و کفار کے ساتھ احسان و انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا۔ جو تم سے دین کے لئے نہ لڑے اور نہ تم کو اس کی وجہ سے گھروں سے نکالا (جیسے ذمی اور معاہد اور مصالح یعنی جن سے امن کی وجہ سے صلح ہو گئی ہو بلکہ) اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ البتہ صرف ایسے لوگوں سے بھلائی و احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے معاملے میں لڑتے ہوں (یا لڑنے کی فکر میں لگے ہوئے ہوں) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو یا تمہارے نکالنے میں نکالنے والوں کی مدد کی ہو۔

اور جو ایسے مشرکوں اور کافروں سے بھلائی اور احسان پر مبنی دوستی کرے گا وہ (اپنے مذہب اور قوم کے لئے) ظالم ہیں۔

تحلیل اجزا

عسی اللہ الخ۔ آیات سابقہ میں بیان فرمودہ احوال و احکام کے نتیجے میں یہ ممکن تھا کہ کفار و مشرکین کی ہمہ جہتی دشمنی و عداوت کو معلوم کر کے مسلمان فکر مند ہو جائیں یا کلیتہً قطع مراسم کے حکم کی وجہ سے کچھ رشتے اور قرابتیں ہمیشہ منقطع معلوم ہوں اور اس کی وجہ سے اہل اسلام رنجیدہ دل ہوں۔ اس کا بھی امکان ہو سکتا تھا کہ خدا و رسول کے ایک ایک حکم کی تعمیل میں تن و من نچھاور کر دینے والے حضرات صحابہ اس دشمنی کو دائمی اور غیر متبدل قرار دے لیں اور کسی بھی تغیر و تبدل کے باوجود عداوت کو برقرار ہی رکھیں۔ اس لئے فرما دیا گیا کہ نہ ان کی دشمنی دائمی ہے اور نہ تمہاری طرف سے برات و بیزاری کا اظہار ابدی ہے۔ بلکہ امید یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین اسلام کی طرف جھکائے گا یا تو یہ اسلام کی حقانیت کو بدل و جان قبول کر کے کلمہ گو ہو جائیں گے یا اسلام کی بڑھتی ہوئی اخلاقی اور افرادی طاقت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ذمی یا مصالح بن جائیں گے۔

اس لئے اگر یہ عداوت دائمی ہوتی تب بھی برات و بیزاری اور قطع تعلق کی ہدایت پر بوجہ مامور بہ ہونے کے عمل واجب ہوتا لیکن یہ تو عارضی صورت ہے پھر کوئی فکر نہ ہونی چاہیے اور نہ قطع قرابات کا غم۔ کیونکہ کچھ ہی عرصہ کے بعد رشتہ داروں سے پھر میل میل ہو جائے گا۔ اور اس قطع تعلق میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ اس میں جہاں تفریط غلط ہے وہیں افراط بھی نامناسب ہے جس کی وجہ سے دوستی کے زمانہ میں شرمندگی اور ندامت ہو۔

اس وجہ سے عقلمندوں کا کہنا ہے کہ کسی دوست کی دوستی میں دشمن کے امکان سے اور کسی دشمن کی دشمنی میں دوستی کے امکان سے ذہن کو فارغ نہ رکھنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں بھی بعینہٖ یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا کہ دوست کی دوستی کے وقت بھی اس بات کو پیش نظر رکھو کہ کیا عجب ہے اس سے کسی وقت دشمنی ہو جائے (اس لئے اس سے کوئی بات ایسی نہ کی جائے کہ اس کے دشمن ہو جانے میں پھر پریشانی اور الجھن زیادہ ہو) ایسے ہی دشمنی میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو کیا خبر کب دوستی ہو جائے۔

واللہ قدیر۔ ان دشمنوں کا پھر دوست بن جانا کچھ بعید نہ سمجھو۔ اللہ کو سب کچھ قدرت ہے۔ وہ مختلف اور متباین چیزوں کو جمع کر دیتا ہے۔ عداوت و تفاوت کے بعد دلوں میں الفت و محبت کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ جیسے دوسری جگہ انصار پر اپنی نعمت بیان فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ واذکروا نعمة اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً یعنی تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہاری دلی عداوت کو الفتِ قلبی سے بدل دیا تم ایسے ہو گئے جیسے حقیقی بھائی ہوں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے ھو الذی ایدک بنصرہٖ وبالمؤمنین یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد سے مومنوں کے ساتھ اے نبی تیری مدد کی اور ایمان داروں میں آپس میں وہ محبت و الفت پیدا کر دی کہ اگر روئے زمین کی دولت خرچ کر کے تو وہ یگانگت پیدا کرنی چاہتا تو نہ کر سکتا تھا۔ یہ الفت منجانب اللہ تھی جو عزیز و حکیم ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے کہ وہ سخت مخالفوں اور دشمنوں کو دوست اور مخلص بنا دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فتح مکہ کے روز بہت سے آدمی خوشی مسلمان ہو گئے اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا

واللہ غفور رحیم۔ (جو اب تک اس حکم کے خلاف عمل کر چکا ہے اور وہ تائب بھی ہو گیا تو ایسے شخص کے حق میں) اللہ مغفرت فرمانے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔ اس سے تائید ہو گئی حضرت حاطب ابن بلتعہؓ کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ معافی کی۔

وتقسطوا الیھم۔ جو کافر تمہارے مدمقابل نہیں آئے اور نہ آنا چاہ رہے ہیں اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ ان کے ساتھ بھلائی و انصاف کرو۔ یہاں وہ کافر مراد نہیں جو ذمی ہوں یا ان سے کوئی معاہدہ صلح و امن ہو گیا ہو یا عورتیں اور بچے وغیرہ۔ یہاں انصاف کے معنی احسان کے ہوں گے۔ کیونکہ احسان ہی ان کے حق میں انصاف ہے۔ ورنہ عام انصاف تو ہر کافر و جانور سے واجب ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی والدہ (جو مشرکہ تھیں اور جن کا نام قتیلہ مروی ہے) مکہ سے مدینہ منورہ آئیں (دوسری روایتوں میں ہے کہ وہ پنیر اور گھی وغیرہ بھی ہدیہ میں لائی تھیں، لیکن حضرت اسماء نے ان کو نہ گھر میں آنے دیا اور نہ ہدیہ قبول کیا) حضرت اسماء نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ میری ماں آئی ہیں اور وہ اب تک دین اسلام سے الگ ہیں کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں ان کے ساتھ سلوک کروں۔ آنحضرت نے فرمایا ہاں جاؤ، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت اسماء نے پھر اپنی والدہ کو اپنے ہاں ٹھہرایا بھی اور ہدیہ بھی قبول کیا)

المقسطین وہ لوگ ہیں جو عدل کے ساتھ فیصلہ اور معاملہ کرتے ہیں خواہ اہل و عیال کا معاملہ ہو یا ماتحتوں اور زیردستوں کا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ

اے ایمان والو جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم اُن کا امتحان کر لیا کرو ان کے ایمان کو

بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ

اللہ ہی خوب جانتا ہے پس اگر ان کو مسلمان سمجھو تو اُن کو کفار کی طرف واپس مت کرو (کیونکہ) نہ تو وہ عورتیں ان

لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ

کافروں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر ان عورتوں کیلئے حلال ہیں اور اُن کافروں نے جو کچھ خرچ کیا ہو وہ انکو ادا کر دو اور تم کو اُن عورتوں سے نکاح کر لینے

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ

میں کچھ گناہ نہ ہوگا جبکہ تم ان کے مہر ان کو دیدو اور تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو (انسے) مانگ لو اور جو

وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ‎﴿۱۰﴾‏ وَاِنْ فَاتَكُمْ

کچھ ان کافروں نے خرچ کیا ہو وہ (تم سے) مانگ لیں یہ اللہ کا حکم ہے وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ بڑا علم والا اور حکمت والا ہے اور اگر تمہاری

شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ

بیبیوں میں سے کوئی بی بی کافروں میں رہ جانے سے تمہارے ہاتھ نہ آئے پھر تمہاری نوبت آئے تو جن کی بیبیاں ہاتھ سے نکل گئیں جتنا انھوں نے خرچ کیا

اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ‎﴿۱۱﴾‏ يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ

تھا اس کے برابر تم اُن کو دیدو اور اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو ڈرتے رہو اے پیغمبر جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس آویں کہ

يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ

آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کرینگی اور نہ اپنے بچوں کو قتل

اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا

کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد لاویں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کرکے)

يَعْصِيْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ‎﴿۱۲﴾

بنا لیویں اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی تو آپ انکو بیعت کر لیا کیجیے اور انکے لئے اللہ سے مغفرت طلب کیجیے بیشک اللہ غفور رحیم ہے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَوَلَّوْاْ قَوْمًا غَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُواْ مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ

اے ایمان والو! اُن لوگوں سے بھی دوستی مت کرو جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا ہے اور وہ آخرت (کے خیر و ثواب) سے

كَمَا يَئِسَ ٱلْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْقُبُورِ ۝

ایسے ناامید ہو گئے ہیں جیسے کفار جو قبروں میں ہیں ناامید ہیں۔

شانِ نزول

بمقام حدیبیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان مصالحت ہوئی تھی۔ ایک صلح نامہ لکھا گیا تھا۔ مشرکین مکہ کی طرف سے سہیل بن عمرو کا نمائندہ تھا۔ اس صلح نامہ میں ایک دفعہ یہ بھی لکھوائی گئی کہ اہل مکہ کا جو آدمی بھاگ کر مدینہ آئے گا۔ وہ واپس کرنا ہوگا خواہ وہ دین محمدی قبول کرے۔ یہ بات مسلمانوں کو بہت شاق معلوم ہوئی اور اس سے انکار کیا۔ لیکن سہیل بن عمرو نے اس پر اصرار زیادہ کیا۔ آخرکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا۔ چنانچہ اسی روز ابوجندل نے جو سہیل بن عمرو ہی کے بیٹے تھے۔ آنحضرت کے پاس حاضر ہوکر اسلام قبول کیا۔ معاہدہ کے مطابق سہیل بن عمرو کے حوالے فرمادیا۔

اس دفعہ کے منظور کر لینے میں بھی مصلحتِ خداوندی تھی۔ چنانچہ ابوجندل اور اس کے بعد مکہ سے بھاگ کر آنے والوں اور اسلام قبول کرنے والوں نے مکہ اور مدینے کے درمیان راستے میں اپنا اجتماع کرلیا اور وہاں اہل مکہ کے قافلوں کو لوٹنا شروع کردیا۔ اس سے تنگ آکر اہل مکہ نے یہی غنیمت سمجھا کہ ایسے لوگ مدینہ میں ہی رہ لیں۔ چنانچہ انھوں نے مفرورین کو واپس لینے کی درخواست آئندہ ترک کردی۔

مگر اس معاہدے میں عورتوں کے بارے میں وضاحت نہیں تھی کہ بعد معاہدہ مکہ سے مدینہ آکر اسلام قبول کرنے والی عورتوں کو بھی واپس کرنا ہوگا یا نہیں۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایمانی عورتوں کو ہرگز واپس نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ ان کے ایمان کا علم بالیقین ہو۔ چنانچہ دو چار عورتیں ہجرت کرکے آئیں۔ اہل مکہ نے ان کو واپس لینا چاہا مگر آپ نے انکار فرمادیا، اس لئے کہ یہ آیتیں حدیبیہ ہی میں نازل ہوچکی تھیں جن میں عورتوں کو واپس کرنے کی ممانعت کی گئی۔ اس طرح ان آیتوں سے مضمون صلح نامہ کا عموم منسوخ ہوگیا۔ پھر ساتھ ہی عورتوں کے دوسرے احوال متعلقہ کفر و اسلام و نکاح و مہر کے بارے میں بھی ہدایات دی گئیں۔

اس آیت سے پہلے مومن عورتوں کا نکاح کافر مردوں سے جائز تھی جیسے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے ہوا تھا۔ حالانکہ یہ اس وقت کافر تھے اور بنتِ رسول مسلمہ تھیں۔ بدر کی لڑائی میں یہ بھی کافروں کے ساتھ تھے اور جب کافر زندہ پکڑے گئے ان میں یہ بھی گرفتار ہوکر آئے تھے۔ حضرت زینب نے اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کا ہار ان کے فدیہ میں بھیجا تھا۔ کہ یہ آزاد ہوکر آجائیں جسے دیکھ کر آنحضرت پر بڑی رقت طاری ہوئی اور آپ نے مسلمانوں سے فرمایا اگر میری بیٹی کے قیدی کو چھوڑ دینا تم پسند کرتے ہو تو اسے رہا کردو۔ مسلمانوں نے بخوشی بغیر فدیہ کے انھیں چھوڑ دینا منظور کرلیا۔ چنانچہ حضورؐ نے انھیں آزاد کردیا اور فرمادیا آپ کی صاحبزادی کو آپ کے پاس مدینہ میں بھیجدیں۔ انھوں نے اسے منظور کرلیا اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھیج بھی دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۲ھ کا ہے۔ حضرت زینبؓ نے مدینہ میں ہی اقامت فرمائی اور یونہی بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ سنہ ۸ھ میں ان کے خاوند حضرت ابوالعاصؓ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق اسلام دی اور وہ مسلمان ہوگئے تو حضورؐ نے پھر اسی سابقہ نکاح پر بغیر نئے مہر کے اپنی صاحبزادی کو ان کے پاس رخصت کردیا اور روایت میں ہے کہ دو سال بعد حضرت ابوالعاصؓ مسلمان ہوگئے تھے۔ اور حضورؐ نے اسی نکاح پر حضرت زینب کو لوٹا دیا تھا۔ یہی صحیح ہے، اس لئے کہ مسلمان عورتوں کے مشرک مردوں پر حرام ہونے کے دو سال بعد یہ مسلمان ہوگئے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ان کے اسلام کے بعد نئے سرے سے نکاح ہوا اور نیا مہر بندھا۔ امام ترمذیؒ

فرماتے ہیں کہ حضرت یزید رضؓ نے فرمایا ہے پہلی روایت کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں۔ وہ روایت از روئے اسناد بہت اعلیٰ ہے اور دوسری روایت کے راوی حضرت عمرو بن شعیبؓ ہیں اور عمل اسی پہ ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ عمرو بن شعیبؓ والی روایت کے ایک راوی حجاج بن ارطاۃ کو حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ضعیف بتلاتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ والی حدیث کا جواب جمہور یہ دیتے ہیں کہ یہ شخصی واقعہ ہے ممکن ہے ان کی عدت ختم نہ ہوئی ہو۔ اکثر حضرات کا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں جب عورت نے عدت کے دن پورے کر لئے اور اب تک اس کا کافر خاوند مسلمان نہیں ہوا تو وہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ ہاں بعض حضرات کا مذہب یہ بھی ہے کہ عدت پوری کر لینے کے بعد عورت کو اختیار رہے اگر چاہے اپنے اس نکاح کو باقی رکھے۔ اگر چاہے فسخ کر کے دوسرا نکاح کر لے اور اسی پر حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو محمول کرتے ہیں۔

پھر حکم ہوتا ہے کہ ان مہاجر عورتوں کے کافر خاوندوں کو ان کے اخراجات جو ہوئے ہیں وہ ادا کر دو۔ جیسے کہ مہر۔
پھر فرمان ہے کہ اب انہیں ان کے مہر دے کر ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ عدت کا گزر جانا، ولی کا مقرر کرنا وغیرہ۔ جو امور نکاح میں ضروری ہیں ان شرائط کو پوری کر کے ان مہاجرہ عورتوں سے جو مسلمان نکاح کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ تم پر بھی اے مسلمانو! ان عورتوں کا اپنے نکاح میں باقی رکھنا حرام ہے جو کافرہ ہیں۔ اسی طرح کافرہ عورتوں سے نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ اس حکم کے نازل ہوتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دو کافر بیویوں کو فوراً طلاق دیدی جن میں سے ایک نے تو معاویہ بن سفیان سے نکاح کر لیا اور دوسری نے صفوان بن امیہ سے۔ حضورؐ نے کافروں سے صلح کی اور ابھی تو آپ حدیبیہ کے نیچے کے حصے میں ہی تھے جو یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ جو عورت مہاجرہ آئے اس کا با ایمان ہونا اور خلوص نیت سے ہجرت کرنا بھی معلوم ہو جائے تو ان کے کافر خاوندوں کو ان کے دیئے ہوئے مہر واپس کر دو۔ اسی طرح کافروں کو بھی یہ حکم سنا دیا گیا۔ اس حکم کی وجہ وہ عہد نامہ تھا جو ابھی ابھی مرتب ہوا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے اپنی جن دو کافرہ بیویوں کو طلاق دی۔ ان میں سے پہلی کا نام قریبہ تھا۔ یہ ابو امیہ بن مغیرہ کی لڑکی تھی اور دوسری کا نام ام کلثوم تھا جو عمرو بن جرول خزاعی کی لڑکی تھی۔ حضرت عبیداللہ کی والدہ یہی تھی۔ اس سے ابو جہم بن حذیفہ بن غانم خزاعی نے نکاح کر لیا۔ یہ بھی مشرک تھا۔ اسی طرح اس حکم کے ماتحت حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ نے اپنی کافرہ بیوی اروی بنت ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کو طلاق دیدی۔ اس سے خالد بن سعید بن عاص نے نکاح کر لیا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے تمہاری بیویوں پر جو تم نے خرچ کیا ہے اسے کافروں سے لے لو جبکہ وہ ان میں چلی جائیں اور کافروں کی عورتیں جو مسلمان ہو کر تم میں آ جائیں انہیں ان کا خرچ دے دو۔

صلح کے بارے میں خدا تعالیٰ کا فیصلہ بیان ہو چکا جو اس نے اپنی مخلوق میں کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تمام مصلحتوں سے باخبر ہے اور اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے کہ علی الاطلاق حکیم وہی ہے۔

اس کے بعد کی آیت وَإِنْ فَاتَكُمْ الخ کا مطلب حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ جن کفار سے تمہارا عہد و پیمان صلح و صفائی نہیں، اگر کوئی عورت کسی مسلمان کے گھر سے جا کر ان میں جا ملے تو ظاہر ہے اس کے خاوند کا کیا ہوا خرچ نہیں دیں گے تو اس کے بدلے تمہیں بھی اجازت دی جاتی ہے کہ اگر ان میں سے کوئی عورت مسلمان ہو کر تم میں چلی آئے تو تم بھی اس کے خاوند کو کچھ نہ دو جب تک وہ نہ دیں۔

حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مسلمانوں نے تو خدا کے اس حکم کی تعمیل کی اور کافروں کی جو عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آئیں ان کے لئے ہوئے مہر ان کے خاوندوں کو واپس کئے، لیکن مشرکوں نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت اتری اور مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ اگر تم میں سے کوئی عورت تمہارے ہاں آ جائے تو تم اپنا وہ خرچ نکال کر باقی اگر کچھ بچے تو دیدو ورنہ معاملہ ختم ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا یہ مطلب منقول ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو مسلمان

عورت کافروں میں جا ملے اور کافر اس کے خاوند کو اس کا کیا ہوا خرچ ادا نہ کریں تو مال غنیمت میں سے آپ اس مسلمان کو بقدر اس کے خرچ کے دیدیں۔ پس فَعَاقَبْتُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ پھر تمہیں قریش یا کسی اور جماعت کفار سے مال غنیمت ہاتھ لگے تو ان مردوں کو جن کی عورتیں کافروں میں چلی گئی ہیں ان کا کیا ہوا خرچ ادا کر دو۔ یعنی مہر مثل، ان اقوال میں کوئی تضاد اور خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی صورت اگر ممکن ہو تو وہ سہی۔ ورنہ مال غنیمت میں سے اسے اس کا حق دے دیا جائے۔ دونوں باتوں میں اختیار ہے اور حکم میں وسعت ہے حضرت امام ابن جریرؒ اس تطبیق کو پسند فرماتے ہیں۔ فالحمد للہ۔

تفسیر صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے جو مسلمان عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے آتی تھیں۔ اُن کا امتحان اسی آیت سے ہوتا تھا۔ جو عورت ان تمام باتوں کا اقرار کر لیتی آ سے حضورؐ زبانی فرما دیتے کہ میں نے تم سے بیعت کی۔ یہ نہیں کہ آپ اُن کے ہاتھ سے ہاتھ ملاتے ہوں۔ قسم خدا کی آپ نے کبھی بیعت کرتے ہوئے کسی عورت کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف زبانی فرما دیتے کہ ان باتوں پر میں نے تم سے بیعت لی۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضرت اُمیمہؓ بنت رُقیقہؓ فرماتی ہیں۔ کئی عورتوں کے ساتھ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ تو قرآن کی اس آیت کے مطابق آپؐ نے ہم سے عہد و پیمان لیا اور ہم اچھی باتوں میں حضورؐ کی نافرمانی نہ کریں گی کے اقرار کے وقت فرمایا یہ بھی کہو کہ جہاں تک تمہاری طاقت ہے ہم نے کہا اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو ہمارا خیال ہم سے بہت زیادہ ہے اور ان کی مہربانی بھی ہم پر خود ہماری مہربانی سے بڑھ کر ہے۔ پھر ہم نے کہا حضورؐ آپ ہم سے مصافحہ نہیں کرتے؟ فرمایا نہیں۔ میں غیر عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتا۔ میرا ایک عورت سے کہدینا سو عورتوں کی بیعت کے لئے کافی ہے۔ پس بیعت ہو چکی۔ امام ترمذی اس حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں۔ مسند احمد میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ ہم میں سے کسی عورت کے ساتھ حضورؐ نے مصافحہ نہیں کیا۔ یہ حضرت اُمیمہؓ حضرت خدیجہؓ کی بہن اور حضرت فاطمہؓ کی خالہ ہوتی ہیں۔

مسند احمد میں ہے حضرت سلمیٰ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ تھیں اور وہ دونوں قبلوں کی طرف حضورؐ کے ساتھ نماز ادا کی تھی۔ بنو عدی بن نجار کے قبیلہ میں سے تھیں۔ فرماتی ہیں انصار کی عورتوں کے ساتھ خدمت نبویؐ میں بیعت کرنے کے لئے میں بھی آئی تھی اور اس آیت میں جن باتوں کا ذکر ہے ان کا ہم نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک اس بات کا بھی اقرار کرو کہ اپنے خاوندوں کی خیانت اور ان کے ساتھ دھوکہ نہ کروگی۔ ہم نے اس کا بھی اقرار کیا بیعت کی اور جانے لگیں۔ پھر مجھے خیال آیا۔ اور ایک عورت کو میں نے حضورؐ کے پاس بھیجا کہ وہ دریافت کر لیں کہ خیانت اور دھوکہ نہ کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ اس کا مال چھپکے سے کسی اور کو نہ دو۔

مسند کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ بنت قدامہؓ فرماتی ہیں کہ میں اپنی والدہ رابطہ بنت سفیان خزاعیہ کے ساتھ حضورؐ سے بیعت کرنے والوں میں تھی۔ حضورؐ ان باتوں پر بیعت لے رہے تھے اور عورتیں اس کا اقرار کرتی تھیں۔ اپنی والدہ کے حکم سے میں نے بھی اقرار کیا اور بیعت والیوں میں شامل ہوئی۔

لہ پھر کس قدر خلاف سنت ہے ان جھوٹے اور دغاباز پیروں کا معمول جو اپنی مرید عورتوں سے پردہ نہیں کرتے۔ بے تکلف ان سے باتیں کرتے ہیں اور ان کے جسم کو چھوتے ہیں۔ الحمد للہ اکابر دارالعلوم نے ہمیشہ عورتوں کی بیعت مسنون طریقہ پر فرمائی۔ سیدی مولائی شیخنا شیخ الکل حضرت مولانا حسین احمد نعماہ اللہ لفیض لہٗ عورتوں کی بیعت ہمیشہ مسنون طریقہ پر فرماتے اور ہرگز ہرگز کسی مرید عورت کو سامنے نہ آنے دیتے۔ بعینہٖ یہی طرز عمل اپنے والد ماجد امام العصر سید الکل شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کا دیکھا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت ام عطیہؓ سے منقول ہے کہ ہم نے ان باتوں پر اور اس امر پر کہ ہم کسی مُردے پر نوحہ نہ کریں گی حضورؐ سے بیعت کی۔ اس اثنا میں ایک عورت نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور کہا میں نوحہ کرنے سے باز رہنے پر بیعت نہیں کرتی۔ اس لئے کہ فلاں عورت نے میرے فلاں مُردے پر نوحہ کرنے میں میری مدد کی ہے۔ تو میں اس کا بدلہ ضرور اتاروں گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ فرمایا۔ وہ چلی گئیں، لیکن تھوڑی ہی دیر میں واپس آئیں اور بیعت کر لی۔ مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے اور اتنی زیادتی بھی ہے کہ اس شرط کو صرف اس عورت نے اور حضرت اُم سلیم بنت ملحان نے ہی پورا کیا اور روایت میں ہے کہ پانچ عورتوں نے اس عہد کو پورا کیا۔ ام سلیمؓ، ام علاءؓ، اور ابو سبرہؓ کی بیٹی جو حضرت معاذؓ کی بیوی تھیں اور دو عورتیں اور یا ابو سبرہؓ کی بیٹی اور حضرت معاذؓ کی بیوی اور ایک عورت اور۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید والے دن بھی عورتوں سے اس بیعت کا معاہدہ لیا کرتے تھے۔

بخاری میں ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رمضان کی عید کی نماز میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور ابوبکرؓ، عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ پڑھی ہے سب کے سب خطبے سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔ پھر نماز کے بعد خطبہ کہتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے اترے وہ نقشہ گویا میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ لوگوں کو بٹھایا جاتا تھا اور آپ ان کے درمیان سے تشریف لا رہے تھے یہاں تک کہ عورتوں کے پاس آئے۔ آپ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ پھر آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے اس اقرار پر ثابت قدم ہو؟ ایک عورت نے کھڑے ہو کر جواب دیا کہ ہاں حضورؐ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ کسی اور نے جواب نہیں دیا۔ راوی حدیث حضرت حسنؒ کو یہ نہیں معلوم کہ جواب دینے والی کون سی عورت تھیں۔ پھر آپ نے فرمایا اچھا خیرات کرو اور حضرت بلالؓ نے اپنا کپڑا پھیلا دیا۔ چنانچہ عورتوں نے اس میں بے نگینہ کی اور نگینہ دار انگوٹھیاں راہِ للہ ڈالیں

مسند احمد کی روایت میں حضرت اُمیمہؓ کی بیعت کے ذکر میں آیت کے علاوہ اتنا اور بھی ہے کہ نوحہ کرنا اور جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنا بناؤ سنگھار غیر مردوں کو نہ دکھانا۔

بخاری مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں سے بھی ایک مجلس میں فرمایا کہ مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو جو اس آیت میں ہیں جو شخص اس بیعت کو نبھائے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو اس کے کچھ خلاف کر گزرے اور وہ مسلم حکومت سے پوشیدہ رہے[1] اس کا حساب اللہ سے ہے اگر چاہے بخش دے۔ اور اگر چاہے عذاب کرے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عقبہ اولیٰ میں ہم بارہ شخصوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور انہی باتوں پر جو اس آیت میں مذکور ہیں آپؐ نے ہم سے بیعت لی اور فرمایا اگر تم اس پر پورے اترے تو یقیناً تمہارے لئے جنت ہے۔ یہ واقعہ جہاد کی فرضیت سے پہلے کا ہے۔ ابن جریر کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ عورتوں سے کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے اس بات پر بیعت لیتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ان بیعت کے لئے آنے والوں میں حضرت ہندؓ بھی تھیں جو عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی اور حضرت سفیانؓ کی بیوی تھیں یہی تھیں جنہوں نے اپنے کفر کے زمانے میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیٹ چیر دیا تھا۔ اس وجہ سے ان عورتوں میں ایسی حالت سے آئی تھیں کہ کوئی انہیں پہچان نہ سکے۔ اس نے جب فرمان سنا تو کہنے لگی۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں، لیکن میں بولوں گی تو حضورؐ مجھے پہچان لیں گے۔ اور اگر پہچان لیں گے تو میرے قتل کا حکم دے دیں گے۔ میں اس وجہ سے اس طرح آئی ہوں کہ پہچانی نہ

---

[1] اور ظاہر ہے کہ اگر اسلامی گورنمنٹ قائم ہے اور کوئی بات جرم کی نوعیت کی پیش آئی مثلاً زنا وغیرہ تو خود حکومتِ اسلامی شریعت کے مطابق سزا دے گی۔ بشرطیکہ جرم حکومت کے علم میں آ بھی گیا ہو۔

جاؤں۔ مگر اور عورتیں سب خاموش رہیں اور ان کی بات اپنی زبان سے کہنے سے انکار کر دیا آخر ان ہی کو کہنا پڑا کہ یہ ٹھیک ہے جب شرک سے ممانعت مردوں کو ہے تو عورتوں کو کیوں نہ ہوگی؟ حضورؐ نے ان کی طرف دیکھا لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا پھر حضرت عمرؓ سے کہا کہ ان سے کہدو کہ دوسری بات یہ ہے کہ چوری نہ کریں۔ اس پر ہندؓ نے کہا میں ابوسفیان کی معمولی سی چیز کبھی کبھی لے لیا کرتی ہوں۔ کیا خبر یہ بھی چوری میں داخل ہے یا نہیں؟ اور میرے لئے یہ حلال بھی ہے یا نہیں؟ حضرت ابوسفیان بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ یہ سنتے ہی کہنے لگے۔ میرے گھر میں سے جو کچھ بھی تو نے لیا ہو خواہ وہ خرچ میں آگیا ہو یا اب بھی باقی ہو وہ سب تیرے لئے حلال کرتا ہوں۔ اب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف پہچان لیا کہ یہ میرے چچا حمزہؓ کی قاتلہ اور اس کے کلیجے کو چیرنے نکالنے اور اسے چبانے والی عورت ہند ہے۔ آپ انھیں پہچان کر اور ان کی یہ گفتگو سن کر اور حالت دیکھ کر مسکرا دیئے اور انھیں اپنے پاس بلایا۔ انھوں نے آکر حضورؐ کو دیکھ کر معافی مانگی۔ آپ نے فرمایا تم وہی ہند ہو؟ انھوں نے کہا گزشتہ گناہ اللہ تعالے نے معاف فرما دیئے۔ حضور خاموش ہو گئے اور بیعت کے سلسلے میں پھر لگ گئے اور فرمایا تیسری بات یہ ہے کہ ان عورتوں میں سے کوئی بدکاری نہ کرے۔ اس پر حضرت ہند نے کہا۔ کوئی آزاد عورت بھی بدکاری کرتی ہے؟۔ آپنے فرمایا ٹھیک ہے۔ خدا کی قسم آزاد عورتیں اس بُرے کام سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتیں۔ آپ نے فرمایا پھر چوتھی بات یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔ ہند نے فرمایا آپ نے انھیں بدر کے دن قتل کیا ہے۔ آپ جانیں اور وہ۔ آپنے فرمایا پانچویں بات یہ ہے کہ خود اپنی ہی طرف سے جوڑ کر بے سر پیر کا کوئی خاص بہتان نہ تراش لیں اور چھٹی بات یہ ہے کہ میری شرعی باتوں میں میری نافرمانی نہ کریں اور ساتواں عہد آپ نے ان سے یہ بھی لیا کہ وہ نوحہ نہ کریں۔ اہل جاہلیت کسی کے مر جانے پر کپڑے پھاڑ ڈالتے تھے۔ منہ نوچ لیتے تھے۔ بال کٹوا دیتے تھے اور ہائے وائے کیا کرتے تھے۔ یہ اثر غریب ہے اور اس کے بعض حصے میں نکارت بھی ہے۔ اس لئے کہ ابوسفیان اور ان کی بیوی ہند کے اسلام کے وقت انھیں حضورؐ کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ بلکہ اس سے بھی آپ نے صفائی اور محبت کا اظہار کر دیا واللہ اعلم۔

ایک اور روایت میں ہے کہ فتح مکہ والے دن بیعت والی یہ آیت نازل ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر مردوں سے بیعت لی اور حضرت عمرؓ نے عورتوں سے بیعت لی۔ اس میں اتنا اور بھی ہے کہ اولاد کے قتل کی ممانعت سن کر حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہم نے تو انھیں بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا، لیکن ان بڑوں کو تم نے قتل کیا اس پر حضرت عمرؓ ہنسی کی وجہ سے لوٹ لوٹ گئے۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ جب ہند بیعت کرنے آئیں تو ان کے ہاتھ مردوں کی طرح سفید تھے۔ آپ نے فرمایا جاؤ ان کا رنگ بدل لو چنانچہ وہ مہندی لگا کر حاضر ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں دو سونے کے کڑے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ فرمایا جہنم کی آگ کے دو انگارے ہیں (یہ حکم اس وقت ہے جب ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے) اس بیعت کو لینے کے وقت آپ کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جب اولاد کے قتل کی ممانعت پر ان سے عہد لیا گیا تو ایک عورت نے کہا کہ ان کے باپ دادوں کو تو قتل کیا اور ان کی اولاد کی وصیت ہمیں ہو رہی ہے[1]۔ یہ شروع صورت بیعت کی تھی لیکن پھر اس کے بعد تو آپ نے یہ دستور کر رکھا تھا کہ جب بیعت کرنے کے لئے عورتیں جمع ہو جائیں تو آپ یہ سب باتیں ان کے سامنے پیش فرماتے وہ ان کا اقرار کرتیں اور واپس لوٹ جاتیں۔ یہ فرمان خدا ہے کہ جب عورت ان امور پر بیعت کرنے کے لئے آئے تو اس سے بیعت لے لو کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ غیر لوگوں کے مال نہ چرانا۔ ہاں اس عورت کو جس کا خاوند اپنی طاقت کے مطابق کھانے پینے پہننے اوڑھنے کو نہ دیتا ہو تو جائز ہے کہ اپنے خاوند کے مال سے مطابق دستور اور بقدر اپنی حاجت کے لے گو خاوند کو اس کا علم نہ ہو۔ اس کی دلیل حضرت ہند والی حدیث ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میرے خاوند ابوسفیان بخیل ہیں۔ وہ مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے

[1] یہ سب [illegible] کر گئی تھیں۔ اس لئے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کوئی اظہار ناراضگی فرمایا اور نہ عورتوں ہی نے ان کے کہنے میں کوئی تامل ۱۲

جو مجھے اور میری اولاد کو کافی ہو سکے ۔ اس لئے ان کی بے خبری میں ان کے مال میں سے لے لوں تو مجھے جائز ہے؟ آپ نے فرمایا بہ طریق معروف اس کے مال سے اتنا لے لے جو تجھے اور تیرے بال بچوں کی کفالت کرے (صحیحین)

اور وہ زناکاری نہ کریں جیسے اور جگہ ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا زنا کے قریب بھی نہ جاؤ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے ۔ حضرت سمرہ والی حدیث میں زنا کی سزا دردناک عذاب جہنم بیان کی گئی ہے ۔

مسند احمد میں ہے حضرت فاطمہؓ بنت عتبہ جب بیعت کے لئے آئیں اور اس آیت کی تلاوت ان کے سامنے کی گئی تو انھوں نے شرم سے اپنا ہاتھ سر پر رکھ لیا ۔ آپ کو ان کی یہ حیا اچھی معلوم ہوئی ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا انہی شرطوں پر سب نے بیعت کی ہے ۔ یہ سن کر انھوں نے بھی بیعت کر لی ۔

حضورؐ کی بیعت کے طریقے اوپر بیان ہو چکے ہیں ۔ اولاد کو قتل نہ کرنے کا حکم عام ہے ۔ پیدا شدہ اولاد کو مار ڈالنا بھی اسی ممانعت میں ہے جیسے کہ جاہلیت کے زمانے والے اس خوف سے کرتے تھے کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گے پلائیں گے اور حمل گرا دینا بھی اسی ممانعت میں ہے ۔ خواہ اس طرح ہو کہ ایسے علاج کئے جائیں کہ حمل ٹھہرے ہی نہیں ۔ یا ٹھہرے ہوئے حمل کو کسی طرح گرا دیا جائے (سے) کسی فاسد غرض وغیرہ سے بہتان نہ باندھنے کا ایک مطلب تو صرف حضرت ابن عباسؓ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ دوسرے کی اولاد کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کریں ۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ ملاعنہ کی آیت کے نازل ہونے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت کسی قوم میں اسے داخل کرے جو اس قوم کا نہیں ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی گنتی میں شمار نہیں اور جو شخص اپنی اولاد سے انکار کر جائے حالانکہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اللہ تعالیٰ اس سے آڑ کرے گا ۔ اور تمام اگلوں پچھلوں کے سامنے اسے رسوا و ذلیل کرے گا ۔ حضورؐ کی نافرمانی نہ کریں یعنی آپ کے احکام بجا لائیں اور آپ کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک جایا کریں ۔ یہ شرط یعنی معروف ہونے کی عورتوں کے لئے اللہ نے لگا دی ہے ۔ حضرت میمونؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اطاعت بھی فقط معروف میں رکھی ہے اور معروف ہی طاعت ہے ۔

حضرت ابن زید فرماتے ہیں دیکھو لوگو کہ بہترین خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کا حکم بھی معروف میں ہی ہے ۔ اس بیعت والے دن آنحضورؐ نے عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا اقرار بھی لیا تھا جیسے حضرت ام عطیہؓ کی حدیث میں پہلے گزر چکا ۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں ہم سے ذکر کیا گیا ہے اس بیعت میں یہ بھی تھا کہ عورتیں غیر محرموں سے بات چیت نہ کریں ۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا یا رسول اللہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم گھر پر موجود نہیں ہوتے اور مہمان آجاتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا میری مراد ان سے بات چیت کرنے کی ممانعت سے نہیں ۔ میں ان سے کام کی بات کرنے سے نہیں روکتا ۔ (ابن جریر)

ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضورؐ نے اس بیعت کے موقع پر عورتوں کو نامحرم مردوں سے بات چیت کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا بعض لوگ وہ بھی ہوتے ہیں کہ غیر عورتوں سے باتیں کرنے ہی میں مزہ لیا کرتے ہیں یہاں تک کہ مذی نکل جاتی ہے ۔ اوپر حدیث بیان ہو چکی ہے کہ نوحہ نہ کرنے کی شرط پر ایک عورت نے کہا فلاں قبیلے کی عورتوں نے میرا ساتھ دیا ہے تو ان کے نوحے میں میں بھی ان کا ساتھ دے کر بدلہ ضرور اتاروں گی ۔ چنانچہ وہ گئیں ۔ بدلہ اتارا ۔ پھر آکر حضورؐ سے بیعت کی ۔ الخ ۔ حضرت ام سلیم جن کا نام ان عورتوں میں ہے جنھوں نے نوحہ نہ

۱؎ غور سے پڑھیں صدیوں پہلے ایک مفسر کے ان جملوں کو کیا بتاتے ہیں ۔ ضبط تولید یعنی بچہ کی پیدائش روکنا اور اس طرح کی ادویہ استعمال کرنا جو استقرار حمل کو مانع ہوں اسلام میں ان کی گنجائش بھی ہے ؟ ۲؎ عربی محاورہ میں بہرحال اس فقرے کا مطلب یہ ہوا کہ زنا سے پیدا شدہ بچہ کو اپنے شوہر کا بچہ بتا دینا یا کسی دوسرے کی اولاد کو چرا کر اپنی اور اپنے شوہر کی اولاد مشہور کر دینا ۔ ۳؎ سبحان اللہ کہاں بیعت میں خصوصیت کے ساتھ اس عہد کا تذکرہ اور کہاں آج کل مسلمان لڑکیاں کہ بے حیائی و بے باکی کے تمام مظاہرے ، اسکول ، کالج ، ملازمت ، فوکل دوستیاں چھپے تعلقات ۔ واہ رے اسلام تجھ کو بھی رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا ۔

کرنے کی بیعت کو پورا کیا۔ کیا یہ ملحان کی بیٹی اور حضرت انسؓ کی والدہ ہیں۔ اور روایت میں ہے کہ جس عورت نے بدلے کے نوحہ کی اجازت مانگی تھی خود حضورؐ نے اسے اجازت دی تھی[1]۔ یہی وہ معروف ہے جس میں نافرمانی منع ہے بیعت کرنے والی عورتوں میں سے ایک کا بیان ہے کہ معروف میں ہم حضورؐ کی نافرمانی نہ کریں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت منہ نہ نوچیں بال نہ منڈوائیں۔ کپڑے نہ پھاڑیں۔ ہائے وائے نہ کریں۔

ابن جریر میں حضرت ام عطیہؓ سے مروی ہے کہ جب حضورؐ ہمارے ہاں مدینے میں تشریف لائے تو ایک دن آپ نے حکم دیا کہ سب انصاریہ عورتیں فلاں گھر میں جمع ہوں۔ پھر حضرت عمرؓ بن خطاب کو وہاں بھیجا۔ آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور سلام کیا ہم نے آپ کے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں۔ ہم نے کہا رسول اللہ کو بھی مرحبا ہو اور آپ کے قاصد کو بھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں حکم کروں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ چوری اور زناکاری سے بچنا۔ اس پر تم بیعت کرو۔ ہم نے کہا ہم سب حاضر ہیں اور اقرار کرتی ہیں۔ چنانچہ آپ نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ اندر کی طرف بڑھا دیا اور ہم نے اپنے ہاتھ اندر سے اندر ہی بڑھائے۔ پھر آپ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہ۔ پھر ہمیں حکم ہوا کہ دونوں عیدوں میں اپنی حائضہ عورتوں[2] اور جوان کنواری لڑکیوں کو لے جایا کریں ہم پر جمعہ فرض نہیں ہمیں جنازوں کے ساتھ نہ جانا چاہیئے۔ حضرت اسماعیل راوی حدیث فرماتے ہیں میں نے اپنی دادی صاحبہ حضرت اُمّ عطیہؓ سے پوچھا کہ عورتیں معروف میں حضور کی نافرمانی نہ کریں۔ اس سے کیا مطلب ہے۔ فرمایا یہ کہ نوحہ نہ کریں۔

بخاری مسلم میں ہے کہ جو کوئی مصیبت کے وقت اپنے کلوں پر تھپڑ مارے، دامن چاک کرے اور جاہلیت کے وقت کی ہائی دہائی مچائے وہ ہم میں سے نہیں اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بری ہیں جو گلا پھاڑ کر ہائے وائے کرے۔ بال نوچے یا منڈوائے یا کپڑے پھاڑے یا دامن چیرے۔

ابو یعلیٰ میں ہے کہ میری اُمت میں چار کام جاہلیت کے ہیں جنھیں وہ نہ چھوڑے گی۔ حسب نسب پر فخر کرنا، انسان کو اس کے نسب کا طعنہ دینا، ستاروں سے بارش طلب کرنا اور میت پر نوحہ کرنا اور فرمایا نوحہ کرنے والی عورت اگر بے توبہ کئے مر جائے تو اسے قیامت کے دن گندھک کا پیراہن پہنایا جائے گا اور کھجلی کی چادر اُڑھائی جائے گی۔

مسلم شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والیوں پر اور نوحہ کو کان لگا کر سننے والیوں پر لعنت فرمائی۔

ابن جریر کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ معروف میں نافرمانی نہ کرنے سے مراد نوحہ نہ کرنا ہے یہ حدیث ترمذی کی کتاب التفسیر میں بھی ہے اور امام ترمذی کی کتاب التفسیر میں بھی ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ حسن غریب کہتے ہیں۔

اس سورت کی ابتدا میں جو حکم تھا وہی آخر میں بیان ہو رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار سے جن پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہو چکی ہے اور خدا کی رحمت اور اس کی شفقت سے دور ہو چکے ہیں۔ تم ان سے دوستانہ اور میل ملاپ نہ رکھو۔ وہ.. آخرت کے ثواب سے اور وہاں کی نعمتوں سے ایسے نا اُمید ہو چکے ہیں جیسے قبروں والے کافر۔ اس پچھلے جملہ کے دو معنی کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ جیسے زندہ کافر اپنے مردہ کافروں کے دوبارہ زندہ ہونے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح مردہ کافر ہر بھلائی سے نا اُمید ہو چکے ہیں اور مر کر آخرت کے احوال دیکھ چکے ہیں اور اب انھیں کسی قسم کی بھلائی کی توقع نہیں رہی۔

---

[1] یہ اجازت غالباً وقتی تھی اور ان کے ساتھ خاص جیسا کہ آپ نے ایک موقع پر ایک صحابی کو کفارہ معاف کر دیا تھا۔ اس کو حجت بنا کر اس وقت نوحہ جائز قرار دینا ظلم ہوگا۔ [2] یعنی بڑی عمر کی عورتیں۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُبحان

کا

پارہ نمبر ۲۸

(دوسرا جزء)

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ

فاضلِ اجل حضرت مولانا عبدالدائم جلالی

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک

وسیم بکڈپو دیوبند۔

(محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند)

اٹھائیسواں پارہ ۲۸

سورۃ الصف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

سب چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں (قالاً یا حالاً) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور وہ ہی زبردست

الْحَكِيْمُ ○ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا

حکمت والا ہے اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو

تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

کرتے نہیں ہو خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا

اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو (خاص طور پر) پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں

كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○

گویا وہ ایک عمارت ہے کہ جس میں سیسہ پلا یا گیا ہے۔

ترکیب: ان تقولوا الجملہ بتاویل المصدر فاعل کبر مقتا تمیز منہ عنداللہ متعلق بکبر صفا حال من فاعل یقاتلون فی سبیلہ متعلق بالم الملائکۃ الک حال منہ وصفا یعنی صافین قال صاحب الکشاف لم لام الاضافۃ داخلۃ علی ما الاستفہامیۃ کما دخل علیہا غیرہا الی حرف لی کقولک بم وفیم وعم ولم وحذف الالف لان ما والحرف کشیء واحد

تفسیر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ ایک دن یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ کوئی جا کر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرے کہ خدائے کریم کو سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے۔ اتنے ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد پہنچا اور ہم سب کو بلا کر لے گیا جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں جمع ہو گئے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پوری سورہ کی تلاوت فرمائی۔ اسمیں ذکر ہے اللہ جل شانہٗ کا سب سے زیادہ محبوب عمل جہاد ہے۔

اس پر سب کو اتفاق ہے کہ یہ سورہ بھی مدینہ شریف میں نازل ہوئی، یہ بھی اس زمانہ میں نازل ہوئی ہے کہ جب تک عرب میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور کفار کا مسلمانوں پر ہر طرف سے نرغہ تھا اور مسلمانوں کی قلیل جماعت کو استقلال اور جواں مردی سے اپنے دین

دشمنوں کا مقابلہ ضروری تھا۔ اس لئے سورت میں ان باتوں کی بھی ترغیب ہے۔ خدا تعالیٰ سب سے اول سورۃ میں یہ بات ظاہر فرماتا ہے کہ ہماری مخلوق میں ہر ایک چیز ہماری قدرت و یکتائی کا نمونہ اور مظہر ہے۔ ہر شے کا حال اور بعض کا مقال اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ یہ ہی ان کی تقدیس اور تسبیح ہے۔ پھر اے انسان (اشرف المخلوقات) تو کس لئے جہل و غفلت و شہوات کے عمیق گڑھوں میں اوندھا پڑا ہے۔ کس لئے اس کی تسبیح اور تقدیس نہیں کرتا اور اس کے احکامات و امر کو بجا نہیں لاتا اور کس لئے لاف زنی کرتا ہے اے مسلمانو اے پاکباز جماعت تمہارا صف باندھ کر ثابت قدمی سے اعدائے دین سے لڑنا بھی تسبیح اور تقدیس ہے جیسا کہ آسمانوں پر صف باندھ کر ہماری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں اسطرح زمین پر صف بستہ ہو کر ہماری جاں نثاری کرتا ہے اس لئے کہ ہم کو یہ نہایت پسند ہے۔

تحلیل اجزاء:۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۔ کہ آسمانوں کے فرشتے اور زمین کے ایماندار خدائے پاک کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں اور بری باتوں اور عیوب سے اسکی ذات بابرکات کو مبرا ٹھہراتے ہیں اور اسی طرح ہر چیز اس کی مخلوق میں سے بزبان حال اس کی پاکی بیان کر رہی ہے پھر ان نادانوں کے عیوب لگانے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں ان کی کیا مقدار اور کیا اعتبار!

اس کے بعد فرمایا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین والوں کی تسبیح اور تقدیس پر موقوف ہیں وہ خود بھی عزیز یعنی ہر شے پر غالب اور حکیم حکمت والا ہے ان دو لفظوں میں بے شمار صفات حمیدہ کے ثبوت اور بری باتوں اور عیوب سے مبرا ہونے پر دلالت ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ غالب ہے کسی کا مقابلہ اسکی مرضی کو روک نہیں سکتا۔ اور حکیم ہے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا میں رسول بھیجتا ہے۔

کفار و مشرکین جو بری باتیں ذات باری کی نسبت بناتے تھے اس پر انکی بڑی حکمت بالغہ سے تنبیہ کی گئی مگر اس کے ساتھ اہل مسلمانوں پر تنبیہ کرنا مناسب ہوا۔ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے اور کرتے کچھ نہ تھے کیونکہ یہ تسبیح اور تقدیس کرنے والوں کی شان سے بعید ہے۔ یعنی ایسا کرنے والے اس باعث میں داخل ہونے کے قابل نہیں اس لئے اس کے بعد فرمایا، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ الخ اے مسلمانو تم کس لئے وہ باتیں کہتے ہو جو کرتے نہیں یہ بری بات ہے مسلمان جو کہے اسکو کرتے بھی صرف زبانی لاف زنی سے کچھ فائدہ نہیں۔ علماء کہتے ہیں یہ آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اظہار محبت کرتے تھے کہ "ہم یہ جان فدا کر دیں گے" اگر احد کی لڑائی میں سست پڑ گئے اور لیت ولعل کرنے لگے بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ ان منافقوں کی طرف اشارہ ہے جو زبان سے دعویٰ ایمانی اور جان نثاری کا کرتے تھے مگر وقت پڑنے پر کچھ بھی نہ نکلے تو یہ تر یہی بات ہے کہ اس میں کسی کی خصوصیت نہیں جو کوئی لاف کرے اس کی نسبت ہے اس آیت میں ایک نکتہ یہ کہ حکم کی جو اس سے پچھلی آیت میں آنے والا ہے تمہید ہے کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ یا رسول کے جانشینوں سے عہد کرو اسکو پورا بھی کیا کرو اس آیت نے صحابہؓ کے دلوں میں ثابت اور بات پر قائم رہنے کا مادہ پیدا کر دیا تھا اور حقیقت میں جس قوم میں یہ مادہ نہیں وہ کبھی کسی کام میں کامیاب نہ ہوگی ان کی مجلسیں اور کمیٹیاں سب بچوں کا کھیل ہیں اس لئے اس کے بعد یہ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۔ کہ اللہ کو ان لوگوں سے محبت ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں یعنی جسطرح کفار و مشرکین خدا تعالیٰ کے رد کرنے میں رد کئے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے مغلوب کرنے میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک بہت برے ہیں۔ اسی طرح ایماندار ان کو ان کے دفع کرنے میں صف بستہ ہو کر لڑنا چاہیئے اسمیں جہاد کی ترغیب ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب وہ لوگ ہیں جو صفیں باندھ کر دشمنان خدا سے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کا بول بالا ہو اسلام کی حفاظت ہو اور دین کا غلبہ ہو اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے ۱۔ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنے والے۔

ؔ۲ نماز کے لئے صفیں باندھنے والے۔ ؔ۳ میدان جنگ میں صف بندی کرنے والے، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفیں نہ بندھوا لیں دشمن سے لڑائی نہیں شروع کرتے تھے پس صف بندی کی تعلیم مسلمانوں کو خدا کی دی ہوئی ہے ایک دوسرے سے ملا ہے، ثابت قدم رہیں اور مقابلہ سے ہٹیں نہیں ایک دوسرے سے ملا ہوا کھڑا رہے تم نہیں دیکھتے کہ عمارت کا بنانے والا نہیں چاہتا کہ اسکی عمارت میں کہیں اونچ نیچ ہو یا ٹیڑھی ترچھی ہو یا سوراخ رہ جائیں اس طرح اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس کے امر میں اختلاف ہو میدان جنگ میں اور بوقت نماز مسلمانوں کی صف بندی خود اس نے کی ہے پس تم اللہ کے حکم کی تعمیل کرو جو احکام بجالائے گا اس کے لئے عصمت اور بچاؤ ہے۔

صف باندھ کر لڑنے سے کیا مراد ہے! لڑائی میں صف باندھ کر عرب لڑا کرتے تھے حال کے زمانے میں باقاعدہ فوجیں صف بستہ ہو کر لڑتی ہیں اس سے مخالف پر رعب بھی پڑتا ہے اور دشمن کے مغلوب کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے کس لئے کہ صدہا آدمی بمنزلہ شخص واحد کے ہو جاتے ہیں پھر ان کے زور کا کیا کہنا! اتفاق عجب چیز ہے اسلام نے عبادت سے لے کر دشمنوں کے مقابلہ کے وقت تک جماعت اور اتفاق کی تاکید کر کے افراد متفرقہ کو جمع کر دیا پھر صف بھی کیسی؟

کانھم بنیان مرصوص :- گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے یعنی بہر مستقل اور بھگوڑے نہ ہوں بلکہ آہنی دیوار کی طرح جم جاویں کسی کے مرجانے زخمی ہو جانے سے تتر بتر ہو کر بھاگ نہ پڑا کریں، مرصوص بالصاص اس وقت کہتے ہیں جب دیوار کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک کر دیا جائے۔ رص کے معنیٰ ہیں ملا دینا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ پتھر پر پتھر رکھ کر چھوٹے پتھروں سے درز بندی کرتے تھے اس کے بعد اینٹ اوپر رکھتے تھے ایسی دیوار کو اہل مکہ مرصوص کہتے تھے۔ بعض علماء کہتے ہیں خاص صف بستہ ہونا بھی مراد نہیں بلکہ یہ ثابت قدمی اور باہمی اتفاق اور یکدلی کے لئے ایک تمثیل ہے یعنی ایک دل ہو کر لڑنا چاہئے۔ اس آیت نے صحابہ رض کا ایک ایسا باقاعدہ اور مستحکم لشکر پیدا کر دیا تھا جس کے مقابلہ اسلام وہیبت کے روکنے والے ٹھہر نہ سکے قیصر و کسریٰ کے چمکدار ہتھیار اور زرق و برق سپاہی کچھ بھی کام نہ آئے ایسے لشکر کا غالب آنا تو معجزہ تھا ہی مگر عرب سے ایسا لشکر ایسے مفلس اور خود سر ملک میں پیدا کر دینا جس پر کسی خزانے سے کسی بادشاہ نے ایک کوڑی بھی صرف نہ کی ہو، ایک عظیم الشان معجزہ اور کتب مقدسہ کی پیشین گوئیوں کی پوری تصدیق تھی آیت کے آخر میں عزیز حکیم اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

صف بستہ ہو کر لڑنا انسان کا اپنے جمیع قوی روحانیہ کو ابھار کر شیطانی قوتوں اور شہوت کے لشکر کو زیر و زبر کرنے کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اس جنگ میں بھی استقامت و استقلال شرط ہے۔ ذرا دنیاوی تجمل دیکھا اور پھسل گئے خواہش نفسانی نے غلبہ کیا اور تجملات دکھائے ڈگمگا گئے ایسے لوگوں کو اس ملک اور شہر قدس کی سلطنت کب نصیب ہوتی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَد

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ موسیٰ ع نے اپنی قوم سے فرمایا　کہ اے میری قوم تم مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو　اور تم کو

تَّعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ

معلوم ہے　کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں　پھر جب (اس فہمائش پر بھی) وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ تعالیٰ

اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

نے ان کے دلوں کو اور (زیادہ) ٹیڑھا کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ (کا معمول ہے کہ وہ) ایسے نافرمانوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ

اور اسی طرح وہ وقت بھی قابل تذکرہ ہے۔ جبکہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں

رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ

تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے جو پہلے توراۃ (آ چکی) ہے میں اس کی تصدیق

التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ؕ

کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا میں اس کی

فَلَمَّا جَآءَہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا ہٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

بشارت دینے والا ہوں۔ پھر جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت) کہنے لگے یہ صریح جادو ہے۔

ترکیب :- واذا منصوب علی المفعولیۃ باضمار اذکر والجملۃ مستانفۃ مقررۃ لما قبلہا من شناعۃ ترک القتال یا قوم بیان منقول قال وقد تعلمون الجملۃ حال موکدۃ لانکار الایذاء والتقدیر برائے تؤذوننی عالمین علما قطعیا انی رسول اللہ وقد تحقیق العلم وصیغۃ المضارع للدلالۃ علی استمرارہ واللہ الخ اعتراض تذییلی مقرر لمضمون ما قبلہ من الازاغۃ۔

تفسیر :- پہلے بعض لاف زنوں کی برائی بیان ہوئی تھی۔ اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہو کر مخالفان راہ راست کے مقابلہ کا حکم تھا وہ لاف زن جن کو بسبب ظاہری ایمان کے مومن کے الفاظ سے تعبیر کیا دراصل وہ منافق تھے وہ علاوہ لاف زنی کے پیغمبر علیہ السلام کی جانب میں اور نیز مخلصین اہل ایمان کے حق میں بدگمانی اور تمسخر بھی کیا کرتے تھے اور ایذائیں بھی دیا کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے رسول مقبول علیہ السلام کو تسلی دیتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ موسیٰ ؑ کو بھی باوجود صدہا معجزات دیکھنے کے اسکی قوم نے ایذائیں دیں اور وہ بس پیغمبر ہے نے سہیں اس لئے فرمایا۔ واذ قال موسیٰ ...... انی رسول اللہ الیکم کو یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم کے پے در پے ایذاؤں کے بعد ان سے یہ کہا کہ اے قوم مجھے کس لئے ستاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں پھر کسی ہادی اور خیرخواہ قوم کو ستانا برا ہے۔ مگر جب کہ اس بدنصیب قوم کو یقین ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ہمارے پاس آئے ہیں تو اور بھی برا ہے۔ موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل تھی آپ کے صدہا معجزات اس نے توم نے مصر میں بھی دیکھے تھے قلزم سے خشکی سے پار ہو جانا اور فرعونیوں کا اسی راستے میں غرق ہونا اور نیز فرعون کی قید سے آزاد کرنا اور یہ بیضا اور پتھر و عصا میں سے پانی نکلنا ابر کا سایہ کرنا من، سلویٰ نازل ہونا وغیرہ سینکڑوں معجزے دیکھے تھے۔ جن سے ان کو آپ کے رسول ہونے کا کامل یقین تھا مگر جبلی شرارت اور ازلی بدبختی سے مجبور تھے۔ پھر حضرت موسیٰ ؑ کو طرح طرح سے یہ پریشان کرتے تھے کہیں بچھڑا پوجنے لگے

ایک جماعت نے موسیٰ ع سے ہارون ع کی امامت کی بابت سخت جھگڑا کیا ایک بار عمالیق کے مقابلے کے وقت پھر گئے کہ ہم سے نہیں لڑا جاتا کبھی سفر کی صعوبتوں پر ناخوش ہو کر مصر کی ترکاریاں یاد کر کے موسیٰ ع کے حق میں سینکڑوں ناشائستہ باتیں کہنے لگے اس پر موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ مجھے کس لئے ستاتے ہو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کمال درجہ کی مشابہت نبوت میں تھی جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہے۔ انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا۔ اس لئے اس بارے میں خاص حضرت موسیٰ ع کا قصہ یاد دلایا ورنہ اور بہت نبیوں کو ان کی قوم نے ایذائیں دی ہیں کسی نبی کے رستہ میں قوم نے ببول بچھائے ہیں بلکہ کانٹے ڈالے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا جس طرح ان کی قوم کو یقین کامل تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ہوشمند کی نظر غائر میں مخفی نہ تھی قطع نظر آیات معجزات کے آپ کی سیرت وصورت پاک بھی ایک اعجاز تھی اس کے سوا سب سے آخر نبی بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کے ظاہر ہونے کی خبر دے چکے تھے اس لئے اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت نیز خاص ان کا معاملہ بھی ذکر کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ صدہا معجزات وآیات دیکھ کر کیا سلوک کیا؟۔ یہ دو نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام موجودہ دنیا کے مسلم الثبوت نبی تھے۔ پھر ان کے ساتھ ایذاء اور نافرمانی کا برتاؤ جو ان کی قوم نے کیا ان کی رسالت میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا تو آپ کی شان میں چند منافقوں کا ایذا دہ معاملہ کیا نقص پیدا کر سکتا ہے؟ پھر جب وہ کج ہوئے تو قضاء وقدر نے ان کے دل ہی ٹیڑھے کر دئے بکام کرتے کرتے بدی کا ملکہ اور دل میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کا ٹیڑھا کرنا ہے۔ اور پھر ہدایت بھی نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ بھی مراد ہے اس سے کہ اللہ بد قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ یا یوں کہو ازلی بدکاروں کو جو علم الٰہی میں ہمیشہ کے لئے بدکار قرار پا چکے ہیں ہدایت نہیں ورنہ عارضی سینکڑوں بدکاروں کو ہدایت ہوتی ہے اور ان ہی کی ہدایت کے لئے قرآن اور نبی علیہ السلام آئے بیمار کو حکیم کی زیادہ ضرورت ہے

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خطبہ بیان ہوتا ہے جو آپ نے بنی اسرائیل میں پڑھا تھا جس میں فرمایا تھا کہ توراۃ میں میری خوشخبری دی گئی تھی اور اب میں تمہیں اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی پیشین گوئی سناتا ہوں جو نبی عربی امی مکی احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں پس حضرت عیسیٰ ع بنی اسرائیل کے نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء اور مرسلین کے ختم کرنے والے ہیں۔ آپ کے بعد نہ تو کوئی نبی آئے نہ رسول، نبوت اور رسالت سب آپ پر من کل الوجوہ ختم ہو گئی۔ صحیح بخاری شریف میں ایک نہایت پاکیزہ حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے بہت نام ہیں، محمد، احمد جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کفر کو مٹایا اور میں حاشر ہوں جس کے قدموں پر لوگوں کا حشر کیا جائے گا۔

عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن میں اکثر جگہ عیسیٰ ابن مریم کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے تاکہ زمانہ موجودہ کے عیسائیوں کا وہ خیال دور ہو جائے کہ عیسیٰ ع اللہ کے بیٹے نہیں، اس میں ارشاد ہے کہ وہ اللہ کے نہیں بلکہ مریم کے بیٹے ہیں حضرت عیسیٰ ع نے باوجودیکہ شام میں اور قومیں بھی تھیں مگر خاص بنی اسرائیل یعنی یہود سے کہا کہ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں اس میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام جہان کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ خاص بنی اسرائیل کے لئے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین مصلح اور کامل کرنے والے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یا قوم نہ کہا بلکہ یا بنی اسرائیل کہا اس کا سبب یہ تھا حضرت موسیٰ کو تو بنی اسرائیل اپنا ہم قوم سمجھتے تھے۔ برخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کا دنیا میں کوئی باپ نہ تھا ہاں ان کی ماں مریم ع ضرور اسرائیل کے خاندان سے تھیں اور اولاد کا نسب باپ کی جانب سے منسوب ہوتا ہے نہ ماں کی طرف سے اسی لئے بنی اسرائیل ان کو اپنی قوم سے شمار کرنے میں کلام کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت کے ثبوت یا اظہار میں علاوہ معجزات وآیات

دہی ہیں جن کی پیشین گوئی ہم نے انجیل میں پڑھی اور یہ دہی ہیں جن کی بشارت ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰؑ نے دی ہے میری طرف سے تمہیں عام اجازت ہے کہ جہاں چاہو ہو سہو خدا کی قسم اگر ملک کے جھنجھٹ سے میں آزاد ہوتا تو میں قطعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا آپ کی جوتیاں اٹھاتا اور آپ کی خدمت کرتا اور آپ کو وضو کراتا اتنا کہہ کر حکم دیا کہ یہ دونوں قریشی تحفے لے کر آئے ہیں وہ انھیں واپس کر دیا جائے۔ ان مہاجرین کرام میں سے حضرت عبداللہؓ بن مسعود جلدی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آملے جنگ بدر میں بھی آپ کے ساتھ شرکت کی اس شاہ حبشہ کے انتقال کی خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگی یہ پورا واقعہ حضرت جعفرؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے منقول ہے۔

تفسیری موضوع سے چونکہ یہ الگ چیز ہے اس لئے ہم نے یہاں مختصراً بطور ذکر قلم بند کیا۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اگلے انبیاء کرام علیہم السلام برابر پیشین گوئیاں کرتے رہے اور اپنی امت کو اپنی کتاب میں سے آپ کی صفتیں سناتے رہے اور آپ کی اتباع اور نصرت کا انہیں حکم کرتے رہے۔ ہاں آپ کے امر کی شہرت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا کے بعد ہوئی، جو تمام انبیاء کے باپ تھے، اسی طرح مزید شہرت کا باعث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوئی باوجود اس قدر شہرت اور باوجود انبیاء کرام کی متواتر پیشین گوئیوں کے بھی جب آپ روشن دلیلیں لے کر آئے تو مخالفین نے اور کافروں نے کہا کہ یہ تو صاف صاف جادو ہے۔ یہ بات عرب کے مشرکین نے بھی کہا اور عیسائی فرقے بھی ان کے ہم زبان ہو گئے جہالت و وحشت میں یہ عیسائی ان مشرکین عرب سے کم نہ تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں فلما جاءھم کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان یہود کے پاس معجزات لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ جادو کھلا ہوا ہے۔ مگر سیاق کلام پہلے معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔ آیات کی تفسیر کے بعد اگر انجیل یوحنا کا مطالعہ کا مطالعہ کیا جائے تو ایک بشارت کا ذکر ہے وہ اس تمام کے مطابق نہیں ورنہ اس کے سوا اب بھی جس قدر پیشین گوئیاں، انجیل، توریت، وصحف انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پائی جاتی ہیں وہ کسی کے حق میں نہیں اس کے سوا صد ہا دلائل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر آفتاب سے زیادہ روشن موجود ہیں۔ لیکن کوری باطن اور شقاوت ازلی کا کوئی علاج نہیں وہ سب کی طرف سے آنکھوں پر پردہ ڈالتی ہیں۔ کانوں میں ٹھیٹھیاں ٹھونس دیتی ہے۔ دلوں پر مہر کر دیتی ہیں پھر ان کو گہری اندھیریوں کی تہوں میں سے کون نور کی طرف لا سکتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی ظلمات جہنم ہی کو ہمیشہ جلاتی رہیں گی۔

اگر کچھ عقل سلیم اور تھوڑا سا بھی دل میں انصاف اور سچی کا خیال جاگزیں ہو تو کسی بھی عیسائی کو خواہ وہ پروٹسٹنٹ یا کیتھولک کے مسلک کا قائل ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار اور عداوت کی گنجائش نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسوی مذہب کے سر مو مخالف نہیں۔ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر نہ حواریوں کے خلاف ہاں اگر اختلاف ہے تو ان ہی نو ایجادیوں میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لوگوں نے دین عیسوی کا جزو قرار دے لیں اور بجبر بالکل اندھا ہے۔ مقلدین کر ان کی نسبت تحقیقات اور کچھ کی کوشش کرنا ممنوع قرار دیدیا اس سے زیادہ بڑی اور تحریف کیا ہو سکتی ہے۔ روشن دماغ عیسائی نیز جنھوں نے پرانی انجیل کی صحیح تشریحات کا مطالعہ کیا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین عیسوی کا مصلح خیال کرتے ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ

اور واقعی اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے حالانکہ وہ اسلام کی طرف

إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○

بلایا جاتا ہو۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ

یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک

نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ

پہنچا کر رہے گا گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں چنانچہ وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اس اتمام نور کے لئے)

رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى

اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دیکر بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام (بقیہ) دینوں پر

الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○

غالب کر دے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

ترکیب: ۔ ولعطف الجملۃ او للاستیناف من مبتدا ء اظلم مع المفضل علیہ وصلتہ خبرہ وھو یدعیٰ والجمہور یدعیٰ من الدعاء مبنیا للمفعول، وقرئ یدعی من الادعاء مبنیا للفاعل وانما عدی بالی لتضمین معنی الانتماء والانتساب والجملۃ حال من فاعل افتریٰ واللہ الجملۃ مقررۃ لمضمون ما قبلہا یریدون جملۃ مبنیۃ لغرضہم من الافتراء لیطفؤا منصوب بان مقدرۃ واللام مؤکدۃ دخلت علی المفعول لان التقدیر یریدون ان یطفؤا (قال ابن عطیۃ) والاطفاء الاخماد واصلہ فی النار واستعیر لما یجری مجراہا من الظہور والمراد من النور القرآن او الاسلام او النبی صلعم فنور اللہ استعارۃ لقرینۃ والاطفاء ترشیح واللہ مبتدا متم نورہ الخبر قرأ الجمہور متم نورہ بالاضافۃ وقرئ بالتنوین والمراد بہا ظاہر وبالہدیٰ حال من رسولہ لیظہرہ ای یغلبہ واللام متعلقۃ بارسل الدین المراد بہ الجنس ای الادیان ولن اصح تاکیدۃ بمکنۃ بکلہ ولو الحالیہ مقررۃ لما قبلہا،

تفسیر: پہلے ذکر تھا کہ جب وہ رسول کہ جس کے آنے کی خبر چلی آتی تھی ان لوگوں کے پاس نشانیاں لے کر آیا تو اس کو جادو کہنے لگے۔ اب فرماتا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کون ظالم اور جفا کار ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھے یعنی اسکی آیات کو سحر کہے اور اس کے لئے بیٹیا اور جورو قرار دے حالانکہ اسکو کسی بری بات کی طرف نہیں بلایا جا سکتا۔ بلکہ اسلام کی طرف یہ جفا کار ہیں دھرم لوگ ہدایت کا منہ نہیں دیکھیں گے۔ اور محروم رہیں گے اور رہتے ہیں۔

دنیا میں جس قدر مذاہب موجود ہیں باوجود خواہ ان کی اصل تو اللہ کی تھی اور بعد میں لوگوں کے خیالات نے اس بے قلعی کر کے انکی اصلی صورت بدل دی یا دہ سرے سے جاہلانہ خیالات اور اوہام باطلہ کا ایک مجموعہ تھا جب ان سب کو اسلام سے مقابلہ کر کے دیکھیں گے تو ان میں سینکڑوں جھوٹی اور خیالی آمیزشیں ملیں گی جن پر ان مذاہب کے مروجین نے خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضی اور نجات و عذاب کو منحصر کیا ہے۔ جو وہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے۔ عیسوی مذہب کو دیکھو تثلیث اور کفارہ و الوہیت مسیح اور اسی طرح عشاء ربانی اور اصطباغ کا مسئلہ اور ان کے بعد پوپوں کے سینکڑوں ڈھکوسلے ایسے ہیں کہ جن پر وہ لوگ نجات کا مدار سمجھتے ہیں اسی طرح ہنود نے گائے کی پرستش اور برہما، وشنو، مہیش کے سوا اور سینکڑوں غیر مرئی چیزوں کو الوہیت و نافع ہونے کی عقیدت اور خودکشی اور تغیر ہیئت جو ان کے جوگیوں اور گسائیوں کا دستور ہے اور گوشت کا ترک اور بتوں کی پرستش اور سینکڑوں دوراز قیاس افسانے جو ان کے کتابوں وید اور پرانوں کا سرمایہ ہے نجات اور مکتی اور سعادت دارین کا باعث اور خدا کی خوشنودی کا سبب قرار دے رکھا ہے۔

اسی طرح عرب کے جاہلوں کے سینکڑوں غلط دستور اور بہت سے جھوٹے افسانے تھے جن کو مرضی الٰہی کا مدار بنا رکھا تھا کہیں کہتے تھے کہ ہمارا فلاں بت قیامت کے روز ہم کو جہنم سے بچائے گا اور فلاں کو رزق و ارزانی کا مختار کر رکھا ہے اور فلاں کو بارش وغیرہ وغیرہ

افسوس اس انسان کی یہ محنت شاقہ اور یوں رائگاں۔ اس لئے اس رحیم و کریم نے دنیا میں وہ رسول بھیجا جو اس اہم مسئلہ کو حل کر دے اور توہمات و تخیلات باطلہ کو دور کر کے مرضیات الٰہی اور نجات و سعادت انسانی کا سیدھا رستہ دکھا دے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام پورا کر دیا اور اس سیدھے رستہ کا نام خداوند تعالیٰ نے اسلام رکھا ہے جس کے ظاہری معنی خدا کی فرمانبرداری اور اس کے آگے گردن جھکانے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ پھر افسوس پر افسوس کہ جب اس گمشتہ وادی توہمات کو سیدھے رستہ کی طرف بلایا جاتا ہے تو اسکو نئی بات جان کر چونکتا ہے۔ اور اس پرانے دستور مالوف کا چھوڑنا شاق جانتا ہے۔ اگر خدا نے اسکو چراغ توفیق دیا ہے تو وہ ادہر سیدھا چلا آتا ہے، ورنہ اس داعی کے مقابلہ میں ان جھوٹے افسانوں اور تخیلات فاسدہ کو پیش کرتا ہے

تحلیل اجزاء | درحقیقت اس سے بڑھکر کون ظالم ہو گا اور اسکو ہدایت بھی نہیں ہوتی یہ ہی معنیٰ ومن اظلم ممن افترىٰ على الله الكذب وهو يدعىٰ الى الاسلام والله لا يهدى القوم الظالمين، کہ اس قدر پر بس نہیں بلکہ اپنے اس ناقص اور قابل ترک مذہب کے غالب کرنے کے لئے اس آسمانی طریقہ کو جس کو پچھلا نبی دنیا میں لایا جو اس پر آشوب تاریکی اور پر خطر ظلمات کے لئے نور یعنی شمع ہے اسکو بجھانا بھی چاہتے ہیں یریدون لیطفؤا نور الله اور بجھانا بھی کا ہے سے افواههم اپنے منہ سے یعنی پھونکیں مار کر افواههم میں اشارہ ہے کہ وہ جو منہ سے من گھڑت افسانے بیان کرتے ہیں اسلام کے مقابل جس کو افتراء علی اللہ کہنا چاہیے ان منہ کی نکلی باتوں سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں پھر کیا وہ ان سے مٹ سکتا ہے کیونکہ والله متم نوره ولو كره الكافرون اللہ تو اپنی روشنی پوری ہی کر کے رہے گا۔ اس کے منکر گو نہ چاہیں

توضیح | یہ بات صادق آئی اور آسمانی شمع کی تمع پر جس کا کتاب یسعیاہ کے ۴۱، ۴۲، اور ۶۱ بابوں میں اشارہ ہے اس وقت کے مخالفوں کے پھونکنے سے نہ بجھی بلکہ وہ خود جل جل کر مر گئے اور یہ شمع اسی قدر روشن ہوتی گئی کہ تمام عرب سے بھی اس کی روشنی نکل کر شام و ایران و خراسان و ممالک یورپ و ایشیا و افریقہ تک پہونچی اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں ان کی سینکڑوں کوششوں کی چمنی نے اسکو حفاظت میں رکھکر اور بھی تیز کر دیا۔ اندھوں نے رستہ پایا راہ ہدایت صاف دکھائی دینے لگی ان کے

بعد جو تند ہوائیں ان پر چلیں وہ اہل تاریخ سے مخفی نہیں باہمی قتال و جدال پھر حرب صلیب کا فتنہ کہ صدیوں تک تمام عیسائیوں نے ملکر زور مارا اور کوئی دقیقہ اس کے گل کرنے میں اٹھا نہیں رکھا مگر آخر وہ ہی ملکر خاکستر ہو گئے۔ پھر چنگیز خاں مغلوں کا حملہ جس نے بغداد جو کہ اس وقت دار الاسلام شہر تھا، نیست و نابود کر دیا۔ اس کے کتب خانوں کی سیاہی سے دجلہ دریا کا پانی سیاہ ہوا اور مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہیں تب بھی کچھ نہ ہوا اور وہ شمع روشن رہی اور نہ ہی قرآن کریم میں ایک حرف کی کمی و زیادتی ہوئی اور نہ ہی اصول اسلام میں فرق آیا۔ اور اب بھی مخالف کوئی کمی نہیں کر رہے ہیں۔ اور برائے نام مسلمانوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے کہیں بدعتی بن کر اس پر حملہ کیا۔ کہیں تعزیہ پرستی، گور پرستی، صدہا رسم و رواج کو جزو اسلام بنا کر اس شمع کے گل کرنے کا کافی بندوبست کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور بفضلہ اس شمع کی روشنی امریکہ اور یورپ کے دور دراز ملکوں تک بھی جا پہنچی اور چین و جاپان میں بھی۔ یہ شمع چونکہ آسمانی ہے اسکو کون بجھا سکتا ہے۔ اس بات کو اس آیت میں بیان فرماتا ہے ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کہ اللہ نے اپنا رسول دنیا میں ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اس کو سب دینوں پر غالب کرے یعنی ان غلط آمیزش کے مذہبوں کو بے رونق کرے۔ ایسا ہی کر دیا کوئی مذہب بجز اسلام دنیا کے عقلمندوں کے نزدیک توہمات جاہلانہ سے پاک نہیں اور یوں بھی جہاں اسل مذہب کے پاک اصول بیان کئے جا دیں اور اسکے مقابلہ میں دوسرے کے بھی تو یہ ہی غالب آوے گا اور یہی وجہ ہے کہ ممالک افریقہ میں اور دیگر بلاد میں بغیر کسی کوشش خود بخود اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اور الفرانیت شکست کھاتی جاتی ہے کوئی دن جاتا ہے کہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہو جائے گا اور اس کے سچے پیرو یوں بھی مخالفوں پر غالب رہے اور رہیں گے ولو کرہ المشرکون، مشرکین عیسیٰ علیہ السلام کے پوجنے والے پادری اور بتوں اور عناصر کے پوجنے والے ہندو آریہ وغیرہ خواہ کتنا ہی قیل و قال کریں اور باتیں بنائیں اور اسلام پر جھوٹے الزام لگائیں مگر کیا ہوتا ہے۔ ان کفار کی تو تمنا یہ ہے کہ حق کو باطل سے روک دیں۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی سورج کو پھونک سے بے نور کرنا چاہے۔ اس طرح یہ بھی محال ہے کہ خدا کا دین ان کفار سے رد ہو جائے۔ اللہ کہتا ہے ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہیں گے۔ کافر اگر برا مانتے ہیں تو مانتے رہیں۔ ؎

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ

اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلا دوں جو تم کو ایسے دردناک

عَذَابٍ أَلِيمٍ ○ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ

عذاب سے بچا لے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں

فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے

إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○

اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (جب ایسا کرو گے تو)

ترکیب | هل ادلكم الخ الجملة نداء هل الاستفهام ايجاب واخبار معنىً و قبل المعنى اساد لكم تنجيكم الجملة صفة تجارة قراء الجمهور تنجيكم من الانجاء اى بالتخفيف و قرئ بالتشديد من التنجية تؤمنون الخ تفسير للتجارة و قيل استيناف كانهم كانهم قالوا كيف نعمل فقال تؤمنون بالله و هو خبر فى معنى الامر و يجوز ان تكون فى موضع جر على البدل او فى موضع رفع على تقدير هى و ان محذوفة و لما حذفت بطل عملها و تجاهدون عطف على تؤمنون ان كنتم شرط جوابه محذوف فافعلوه ؛

تفسیر | عالم بالا پر ایک آسمانی سلطنت قائم کرنے والا ہے۔ جس سے اس نور کے بجھانے والوں کو زیر کیا جاوے اس لئے ان آیات میں ایک بڑے اجر بیش بہا تنخواہ پر جو دنیا و آخرت کی سعادت کو شامل ہے۔ اعلان دیتا ہے اور اس کے ضمن میں اس ضروری کام سے پہلو تہی کرنے پر عذاب الیم کا خوف بھی دلاتا ہے تاکہ بڑی مستعدی سے ایک لشکر جرار تیار ہو جائے جو دنیا کو تمام نجاستوں سے پاک کر دے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رض سے روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کو کون سا ہے؟ اس پر اللہ جل شانہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ جس میں فرمارہا ہے آؤ میں تمہیں ایک سراسر نفع والی تجارت بتلاؤں جس میں نقصان کا کوئی امکان ہی نہیں مقصود حاصل اور ڈر زائل ہو جائے گا وہ یہ ہے کہ تم اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان لاؤ اور اپنی جان و مال اس کی راہ میں قربان کرتے ہوئے تل جاؤ۔

یا یوں کہو انسان اس دنیا میں ناحق نہیں آیا ہے بلکہ اس عمر گرانمایہ میں کچھ حاصل کر کے ایک ابدی جہان میں جانا ہے اس بات کو خدا تعالیٰ اس پیرایہ میں بیان فرماتا ہے کہ انسان تاجر ہے مگر تجارت کرنا نہیں جانتا ہم اسکو تجارت سکھاتے ہیں۔

تحلیل اجزاء | فقال یاایها الذین اٰمنوا هل ادلكم على تجارة تنجيكم من عذاب اليم :- اے ایمان والو میں تم کو ایسی تجارت بتلاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچادے۔ تجارت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے کا دوسری شے معاوضہ۔ تجارت میں دو چیزیں ہوا کرتی ہیں ایک مال جس سے کوئی چیز خریدی جائے دوسری وہ چیز جس کو خریدتا ہے اور تجارت میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی اور عقلاء کے نزدیک وہ تجارت کہ جس میں ضرر کا احتمال بھی نہ ہو اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور اس پر اور بھی خوبی ہو کہ جس سے وہ چیز خریدی جاوے وہ اپنی طرف سے معاوضے کی چیز کے سوا کچھ اور بھی دے اس جگہ سب سے پہلے دفع مضرت کا ذکر کر دیا تنجيكم من عذاب اليم کہ عذاب الیم جو اس انسان کو اس گرانمایہ زندگی کے باعث اور بیکار گناہوں کے کاموں میں صرف کرنے سے ہوتا ہے۔ اس سے تم کو تجارت نجات دے گی۔ بڑا خسارہ انسان کے لئے ہے آخرت میں عذاب الیم کا ہے۔ سو اس دغدغے سے پہلے ہی اطمینان کر دیا کہ اس تجارت میں گھاٹا ہی نہیں اس کے بعد تجارت کے لئے مال بیان فرماتا ہے تؤمنون بالله و رسوله کہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق جانے گا اور ان کو مانے گا تو فرشتوں اور قیامت اور اس کے سب رسولوں اور کتابوں کو بھی برحق سمجھے گا اور ان کے تمام اقوال کی تصدیق کرے گا جو تکمیل خوب نظریہ کا حاوی ہے۔

یاایها الذین اٰمنوا :- سے معلوم ہوا کہ آیت میں ایمانداروں سے خطاب ہے۔ پھر جو ان کو تؤمنون بالله و رسوله فرمایا پھر کیا وہ اللہ اور رسول پر ایمان نہ لائے تھے تو ان کو مومن کیوں کہا؟ اور اگر لائے تھے تو پھر اس کی کیا ضرورت کہ بار دیگر ایمان لاویں؟۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے

الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

نہریں جاری ہوں گی، اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں بنے ہونگے یہ بڑی کامیابی ہے

الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ

اور (اس ثمرۂ اخرویہ کے علاوہ) (ایک اور (ثمرۂ دنیویہ) بھی ہے کہ تم اسکو (بھی خاص طور پر) پسند کرتے ہو (یعنی اللہ کیطرف سے

قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

مدد اور جلدی فتحیابی - اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ مومنین کو بشارت دیدیجئے،

ترکیب یغفر مجزوم اما ھو جواب شرط محذوف ودل علیہ الکلام تقدیرہ ان تومنوا یغفر لکم واما انہ تومنون بمعنیٰ آمنوا الخبر بمعنیٰ الامر ھذا قول الزجاج والمبرد واما انہ جواب لما دل علیہ الاستفہام والمعنیٰ ھل تقبلون ان دللتکم واما انہ جواب استفہام علی اللفظ ھذا قول الفراء ضعفہ بعض ومنہ فخر الرازی فی تفسیرہ ویدخلکم معطوف علی یغفر لکم ومساکن جمع مسکن، منصوب لکونہ معطوفاً علی جنّٰت واخریٰ منصوب علی تقدیرہ ویعطیکم اخریٰ ای نعمۃ اخریٰ وقیل ھی فی محل رفع ای اذ لکم خصلۃ اخریٰ نصر وفتح خبر مبتدأ محذوف ای ھی ولبشر معطوف علی محذوف ای قل ولبشر او علیٰ تومنون بمعنیٰ آمنوا۔

تفسیر گذشتہ آیت کریمہ میں جو سوال ہے اس کا جواب دیا ہے - ایمان داروں سے خطاب تھا مگر بار دیگر خوف رہا کہ ایمان لاؤ تو اس سے اس پر دوام و ثبات مراد ہے۔ یعنی اس ایمان پر ہر وقت قائم رہو یہ ایک محاورے کی بات ہے کہ کسی کام کرنے والے کو جو کہا جاتا ہے کہ کرتے رہو تو یہ مراد ہوتی ہے کہ خوب عمدہ طریقہ سے اور مضبوطی سے ہمیشہ کرو غافل نہ ہوجاؤ ایمان ایک بڑا بیش بہا جوہر ہے اس کے چور بھی بہت ہیں اس لئے بار بار تاکید ہوتی ہے کہ اپنی جیب کو دیکھتے رہو ہر گھڑی اس کی تصدیق قلبی پر نظر کرلیا کرو۔

بعض مفسرین نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ آمنوا کے لفظ سے منافقین کو خطاب ہے وہ بظاہر مومن تھے اس لئے ان کو باطن میں بھی ایمان لانے کی تاکید کی یہ اس تجارتی نقد کا ایک حصہ تھا اب دوسرے کو بیان فرماتا ہے۔ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم کہ اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں کوشش کرو یہ بنا تکمیل قوت عملیہ کے لئے بڑا وسیع المعنی جملہ ہے اس لئے کہ جہاد کے کئی مرتبے ہیں۔

اوّل مرتبہ:۔ اپنے نفس سرکش کا مقابلہ مال سے اور جان سے اور طور کہ طبع نفسانی نہیں چاہتی کہ نیک کاموں میں کچھ خرچ کرے، اقارب، یتامیٰ، مسافر، آفت زدے اسکے ہاتھ کو تنگ نہیں اور نفس ہے کہ دور اندیشو ں کی مہیب صورتیں دکھا دکھا کر اس کے ہاتھ کو روکے لیتا ہے۔ اب اس کو لازم ہے کہ اس نفس بد کا مقابلہ کرے یا وہ نیک اور مفید کام جو قوم یا بنی آدم

کے لئے ناچ اور راس کے یادگار ہوں گے ان میں دینے سے روکتا ہے۔ یا برے کاموں میں ناچ، تماشے، شراب خوری، جوا تھیٹر وغیرہ وغیرہ بیہودہ کاموں میں صرف کرنے کو نفس خبیث ابھارتا ہے وہاں اسکو روکنا اور سخت مقابلہ کر کے شکست دینا چاہئے۔ مال سے زیادہ جان عزیز ہے اس لئے اموالکم سے بعد انفسکم کا لفظ آیا۔ جان کا جہاد اس مرتبہ میں ہے کہ خواہشات نفسانیہ سے روکے اور جو عبادت و ریاضت اور عمدہ کاموں میں اسکو لگا دے یہ نہیں کہ شتر بے مہار کی طرح جس طرف اس کا نفس خبیث لیجاوے دوڑا چلا جائے۔

دوسرا مرتبہ :- حجاب ظلمانیہ کو اٹھا کر انوار قرب الٰہی میں مراقبہ ذکر و فکر اشتغال بالعبادت سے آگے قدم رکھنا اور اس راستہ میں جس قدر دشمن سامنے آویں شمشیر ہمت سے ان کو مار بھگانا آخر مرتبہ جس کو اس جہاد کی شہادت کہتے ہیں یہ ہے کہ اپنی ہستی کو اس باقی کی ہستی میں فنا کر دے جس کے بعد اسکو حیات جاودانی اور بقائے سرمدی عطا ہوتی ہے۔

تیسرا مرتبہ :- اس تکمیل نفس کے بعد تکمیل غیر کا ہے اس میں جان اور مال سے کوشش کرنا بد راہوں کو نرمی اور محبت سے راہ پر لانا۔ ان کی ہدایت کے رستے کھولنا آخر کار جو کجرو اور بد نہاد اس راہ میں کانٹے بچھائے ہیں ان جوان مردوں سے مقابلہ کو یا مال سے لشکر کے سامان تیار کرنا۔ جس میں لشکر کی ہر ضرورت مکمل طور پر پوری کیجا سکے کیونکہ لشکر میں ایک نہیں بہت ضروری اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ ضرورتیں زمانے کے ساتھ ساتھ برابر آگے بڑھتی جاری ہیں،

جس زمانہ میں لشکر کو ترتیب دیتا ہو اس وقت کے تحت اپنے مال سے لشکر کی ضرورتوں کا پورا کرنا جان سے لڑنا یہ جہاد شرعی ہے ہر شہید کے بھی بڑے مرتبے ہیں وہ بھی ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس کے بعد اس تجارتی مال کو بیان فرماتا ہے جو ان دونوں مالوں سے خریدا گیا ہے۔

فقال یغفرلکم ذنوبکم تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ لکم کے لفظ نے یہ بھی فائدہ دیا کہ یہ تمہارے گناہ کسی کے واسطے یا وسیلے سے نہیں بلکہ تمہارے لئے بخش دئے جائیں گے۔ رہی شفاعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان لوگوں کے حق میں گناہوں کے معاف کرانے کے لئے نہ ہوگی بلکہ اور زیادہ انعام و اکرام عطا کرانے کے لئے

دوسری بات و یدخلکم کہ تمہیں ایسی بہشتوں میں لبسادیں گے کہ جہاں نہریں جاری ہیں اور عمدہ مکانوں میں جگہ دیں گے کہ جن کے آگے دنیاوی بادشاہوں کے محل بے حقیقت ہیں۔ مال بھی دو قسم کے تھے اس کے بدلے میں چیزیں بھی دو دیں اب اپنی طرف سے ایک اور تیسری چیز عطا فرماتا ہے۔ واخرمی الخ۔ مدد الٰہی اور فتح جس کو ہر ایک پسند کرتا ہے ہر مرتبے کے جہاد میں فتح اور مدد غیبی ساتھ لگی ہوئی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بڑے بڑے دشمنوں پر کیسی کیسی جلد فتحیابی حاصل کی یہی مضمون قرآن کریم میں ایک اور آیت میں آچکا ہے

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔ اس مبارک سودے کا ثمرہ اے نبی ایمانداروں کو دے دے،

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ

اے ایمان والو تم　　اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ　　جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے (الخ)

مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ

حواریین سے فرمایا　　اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے　　وہ حواری بولے

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ

ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں — سواس کوشش کے بعد بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے — اور

كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ

کچھ لوگ منکر رہے — سو ہم نے ایمان والوں کی — ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی

فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

سو وہ غالب ہو گئے

ترکیب انصار اللہ ، الانصار (جمع نصیر کشریف واشراف) منصوب لکونہ خبر کونوا قرئ انصارا للہ بالتنوین و بالاضافۃ والرسم یحتمل القرائتین کما والکاف فی موضع نصب علی اضمار القول ای اقول لکم کما قال وقیل ھو محمول علی المعنیٰ اذ المعنیٰ انصروا اللہ کما نصر الحواریون عیسیٰ بن مریم الیٰ اللہ ای من یکون معنیٰ فی نصرۃ اللہ، لیطابق السوال وحواری الرجال صفیہ وخلصائہ من الحور وھو البیاض الخاص۔

تفسیر اس تجارت کے بعد صاف صاف لشکر آسمانی میں داخل ہونے کی تاکید فرماتا ہے اور اس کے ضمن میں ایک پہلی قوم سے تشبیہ پیدا کرنے کا ارشاد فرماتا ہے ، فقال یاایھا الذین آمنوا کونوا انصار اللہِ کہ اے اللہ پر ایمان رکھنے والو اللہ کے مددگار ہو جاؤ اللہ پاک بے نیاز ہے اسکو کسی مدد کی کچھ بھی ضرورت نہیں لیکن مراد یہ کہ دین الٰہی کے پھیلانے اور اسکی تعمیل میں سرگرم اور آمادہ ہو جاؤ اس کام کے لئے کمر باندھ کر تیار رہو کما قال عیسیٰ بن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ۔ ایسے سرگرم ہو جاؤ جیساکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری سرگرم اور مستعد ہو گئے تھے۔

جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا میرا کون مددگار ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں تو قال الحواریون نحن انصار اللہِ، حواری بول اٹھے ہم ہیں اللہ کے کاموں میں آپ کے مددگار حواری کا لفظ عربی زبان میں حور سے مشتق ہے جس کے معنیٰ خالص سفیدی کے ہیں اس لئے دھوبی کو بھی حواری کہتے ہیں کہ وہ کپڑے سفید کرتا ہے۔ اور مددگار اور خالص دوست کو بھی جس کے دل میں محبت و نصرت کی سفیدی یعنی روشنی ہے اور یہ جمع نہیں بلکہ بروزن حوالی ہے، جو کثیر الحیل کو کہتے ہیں جمع اسکی حواریون ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ [۱۲] شاگردوں کو جو اوّل اوّل ان پر ایمان لائے اور مددگار ہوئے اس لئے حواری کہتے ہیں نہ اس لئے کہ وہ دھوبی تھے جیساکہ بعض کا خیال ہے۔ ان بارہ شخصوں کے یہ نام ہیں، شمعون جو پطرس کہلاتا تھا اور اسکا بھائی اندریاس زبدی کا بیٹا یعقوب اور اس کا بھائی یوحنا، فیلبوس اور برتھولما، توما اور محصول لینے والا متی حلفا کا بیٹا یعقوب اور لبی جو تہدی بھی کہلاتا تھا، شمعون کنعانی اور یہودا اسکریوتی جس نے اسے پکڑا بھی دیا (انجیل متی باب دسواں)

یہ بنی اسرائیل تھے ان میں سے کچھ ماہی گیر تھے یا یہ کہ ماہی گیری کرتے ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بلایا جیساکہ انجیل متی کے چوتھے باب میں پہلے چاروں حواریوں کی بابت مذکور ہے، ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو

سب سے اوّل قبول کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمدردی اور محبت میں نہایت سرگرم اور مستعد اور مخلصین تھے چنانچہ متی کے دسویں باب میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سی باتیں کہیں کہ پہلے اسرائیل بستیوں میں جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی۔ سامان سفر کچھ ساتھ نہ لو، اور میں تمہیں بھیڑوں میں بھیجتا ہوں لوگ تمہیں کوڑے ماریں گے عدالتوں کے حوالے کریں گے۔ میرے نام کے سبب تم سے سب دشمنی کریں گے پر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا یہ مت خیال کرو کہ میں صلح کرانے آیا ہوں نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی ماں باپ بیٹے بیٹی کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی صلیب اٹھا کر میرے پیچھے نہیں آتا وہ میرے لائق نہیں جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے وہ اسے کھوئے گا اور جو میرے واسطے اسے کھوئے گا جو پائے گا۔ جو تمہیں قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے۔

اسی کے مطابق ان حضرات حوارین نے کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ملک یہودیہ میں بھی منادی کرتے پھرتے پھر سریا کے علاقوں میں سے گزر کر یونان اور روم کے شہروں میں پہنچے اور سفر کی اور لوگوں کی بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائیں اور طرز معاشرت بھی درویشانہ ہی تھا۔ کسی سے کچھ لیتے دیتے نہ تھے۔ ان میں اس خلوص کی بدولت خدا تعالیٰ نے کرامت بھی دی تھی ان کی دعا سے بیمار تندرست ہو جاتے تھے اور ہر طرح کی کرامات و برکات لوگ دیکھتے تھے۔ آخر لوگوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے مگر دین عیسوی خوب پھیلا دیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ فامنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ کہ بہت سے بنی اسرائیل ایمان لے آئے اور بہت سے منکر رہے مگر حواریوں کی کوشش اور جانکاہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بحری اور بری بہت سے ممالک نے مذہب عیسوی قبول کر لیا اور اس عرصہ میں گھر گھر لڑائی اور جنگ کی آتش مشتعل ہوئی مگر آخر کار خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو منکروں پر غلبہ دیا۔

فایدنا الذین آمنوا علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاھرین یہ بات اور ہے کہ پھر ان عیسوی لوگوں میں اصلی دین محرف ہو گیا۔ ان آیات میں امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں جیسے ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ کہ تم بھی اشاعت اسلام کے لئے ویسے ہی کوشش کرو، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری بن جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو پچھلے نبی تھے جو حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ و ابراہیم علیہم السلام کے رستے کے پتھر اور کانٹے صاف کرنے آئے تھے اور قومیں جو اگلے انبیاء کی مخالف تھیں اب تو یہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے نام لیوا یہود و نصاریٰ ہی سب سے بڑھ کر دشمن ہو گئے کس لئے کہ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے بعد جو کچھ دین حق میں ان کے درویشوں اور مولویوں نے کچھ خود تبدیلیاں کیں جو حق کے سراسر خلاف تھیں ان کو ترک کرنا ان کے نزدیک جان دینے سے بھی زیادہ مشکل تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا میں تلوار چلانے اور باپ بیٹے ساس بہو میں جنگ کرانے آئے۔ چنانچہ مکہ میں ظہور اسلام سے لے فتح مکہ تک یہی حال رہا بدر کی لڑائی میں ایک بھائی ایک طرف تو دوسرا دوسری طرف تھا بیٹا ادھر تو باپ ادھر تھا اور جہاں جہاں اسلام پہنچا اسکے ساتھ اسکے رقیبوں اور پرانے دشمنوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کی ایک عمدہ جماعت اس کام کے لئے منتخب کی اور پھر ایک عمدہ انتظام سے ان کو مختلف خدمات پر مامور کیا کچھ قرار تھے تو کچھ قوموں میں جاکر تبلیغ کرتے تھے اور بوقت جنگ سپاہی تو سب ہی تھے یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوارین تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جو کچھ انہوں نے اسلام کے لئے جانثاری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بحکم حدیث لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ والناس اجمعین، متفق علیہ اپنا محبوب سمجھ کر فرمان ولیبلغ الشاھد الغائب پر عمل کیا اور فقر و فاقہ بھی اٹھایا۔

اور ان کی بے شمار کرامات دنیا نے دیکھیں اور پھر تابعین کی تبع تابعین کی کوششوں سے ادھر اسپین اور یورپ و افریقہ کے ممالک تک ادھر ہند و چین، ایران و ترکستان تک اس سرعت کے ساتھ اسلامی جھنڈا بلند کیا جو عیسائیوں اور حواریوں سے صدیوں تک نہ ہو سکا۔ اس فرق بلکہ تفوق کو نصرانی مؤرخ بھی تسلیم کرتے ہیں، سر ولیم میور صاحب کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو ان سے کچھ رتبہ نہیں اس وقت کے مسلمانوں نے حواریوں کا مثل ہونے سے بڑھ کر کام کیا کہ ان سے بھی زیادہ بڑھ گئے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر و سنن نسائی پس یہ امت حق پر قائم رہ کر ہمیشہ تک غالب رہے گی۔ یہاں تک کہ امر اللہ یعنی قیامت آ جائے اور یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو کر مسیح دجال سے لڑائی کریں گے جیسا کہ صحیح حدیثوں میں موجود ہے۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو کہ نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ

سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (قال یا حالاً) اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں جو کہ بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے

الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا

زبردست ہے حکمت والا ہے وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو

مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں، اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اور (علاوہ ان موجودین کے) دوسروں کے لئے بھی (آپ کو بھیجا ہے) جو ابھی تک ان (موجودین) میں شامل نہیں ہوئے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

یہ (رسول کے ذریعہ سے کمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا) خدا کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ترکیب: الملک القدوس العزیز الحکیم مجرور علی انہ صفۃ للہ وقرئ بالرفع علی الاستیناف والجمہور علی ضم

الفاف من القدوس وقرئ بفتحها وهما لغتان منهم صفة رسولا الحال وكذا ما بعده يتلو او يزكيهم ويعلمهم وان مخففة من الثقيلة واسمها محذوف اى وانهم واللام لفى دليل عليها واخرين مجرور عطفا على الاميين اى بعثه فى الاميين الذين فى عهده ﷺ وبعثه فى آخرين منهم لما يلحقوا بهم الى الآن او منصوب على انه عطف على الضمير المنصوب فى يعلمهم اى ويعلم الآخرين او انه عطف على مفعول يزكيهم اى ويزكى آخرين ولما يلحقوا صفة لآخرين۔

تفسیر قرطبی رح کہتے ہیں کہ سب اس بات پر کلی طور پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ ابن عباس رض کا قول اس سورت کریمہ کی بابت یہ ہے کہ مدینہ شریف میں نازل ہوئی اور ابن زبیر رض بھی یہی کہتے ہیں۔ مسلم شریف کے مصنف رح نے ابو ہریرہ رض سے یہ روایت کی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز جمعہ میں یہ سورہ اور سورہ منافقون پڑھتے سنا ہے۔ ابن عباس رض نے نقل کیا ہے کہ جمعہ کی شب مغرب کی نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قل یا ایہا الکفرون اور قل ہو اللہ احد پڑھتے تھے۔ اور عشاء کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھتے تھے۔ مسلم اور اہل سنن نے ابو ہریرہ رض سے نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھتے تھے۔

ہر بے زبان اور ناطق چیز اللہ تعالیٰ عز وجل کی پاکیزگی بیان کرتی رہتی ہے فرمایا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح اسکی حمد کے ساتھ نہ کرتی ہو تمام مخلوق خواہ آسمان کی ہو خواہ زمین کی اسکی تعریف اور پاکیزگیوں کو بیان میں مصروف اور مشغول ہے۔ وہ آسمان اور زمین کا بادشاہ اور ان دونوں میں پورا تصرف اور حکم جاری کرنے والا ہے۔ وہ تمام نقصانات سے پاک اور بے عیب ہے۔ تمام صفات کمالیہ کے ساتھ موصوف ہے۔ وہ عزیز و حکیم ہے۔

اس سے پیشتر یہ ذکر تھا کہ دین و طاعت الٰہی میں ہمیشہ سرگرم اور ثابت قدم رہنا چاہئے۔ اس میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو بندوں کی مدد و اعانت اور دینی استقامت کی حاجت ہے یا کوئی اس کا اس سے فائدہ ہے۔ یا دفع مضرت ہے۔ اس لئے ان خیالات کا ابطال اول سورۃ میں کرتا ہے۔ فقال یسبح للہ ما فی السموات وما فی الارض، کہ آسمان و زمین کے رہنے والے اللہ کی ہر وقت پاکی بیان کرتے رہتے ہیں۔ اسکو کسی کی بندگی و اطاعت کی ضرورت نہیں اب جو کچھ تم کو حکم دیا جاتا ہے۔ وہ صرف تمہاری ہی بھلائی کے لئے ہے۔

پہلی سورت میں سبح بلفظ ماضی ذکر کیا تھا یہاں یسبح بلفظ مضارع تاکہ تجدد و دوام پر دلالت کرے۔ مضارع کے صیغے جیسا کہ تجدد پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیشہ کرنے پر بھی بقرائن یہ بھی ایک وجہ مناسبت اگلی سورہ سے ہے۔ تسبیح کے معنیٰ اور یہ کہ آسمان اور زمین کے رہنے والے کیونکہ اسکی تسبیح کرتے ہیں (بزبان حال و بزبان قال) اسکو کئی بار بیان کیا جا چکا ہے۔ اس جملہ میں پہلے خیال کا ابطال ہے۔ اسکو کوئی حاجت نہیں تمام عالم اس کے آگے مسخر ہے۔ ہر چیز کی قدرتی بناوٹ اور اپنے حالات کا تغیر اپنے خالق کی یکتائی و بزرگی بیان کر رہا ہے۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے آنکھ ہوں دیکھ لے دل ہو سمجھ لے۔

امیوں سے مراد عرب ہیں جیسے اور جگہ ارشاد ہے۔ وقل للذین اوتوا الکتٰب والامیین ءاسلمتم الخ یعنی آپ اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اسلام قبول کیا؟ اور وہ مسلمان ہو جائیں تو راہ راست پر ہیں اور اگر منہ پھیر لیں تو آپ پر صرف اسلام کا پہنچا دینا ہے۔ اور بندوں کی پوری دیکھ بھال کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں عرب کا ذکر کرنا اس لئے نہیں کہ غیر عرب کی نفی ہو بلکہ یہ صرف اس لئے کہ ان پر احسان و اکرام بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ ہے اس بات کو ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ وان من شیئ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقہون تسبیحہم اس کے بعد فرمایا گیا ہے الملک یعنی وہ بادشاہ بھی ہے یعنی غنی اور بے پرواہ ہے اس کے معنیٰ واجب الوجود کے قریب قریب اس موقعہ پر مراد ہیں کس لئے کہ بادشاہت بغیر جمع ہوئے تمام کمالات و اسباب سلطنت کے حاصل نہیں ہوتی اس سے اشارہ ہے نبوت

صفات عالیہ کی طرف جس میں دوسرے خیال کا رد ہے۔ القدوس یعنی پاک ہے۔ اسمیں تیسرے خیال کی طرف اشارہ ہے کوئی مضرت و نقصان اس کی ذات پاک کی طرف عائد نہیں ہوسکتا۔

خیالات کے ابطال کے سوا الفاظ قرآنیہ میں ایک اور مسئلہ بہ ترتیب بیان فرمایا جاتا ہے یسبح للہ مافی السموٰت ومافی الارض سے الحکیم تک توحید کے مسئلہ کا عجیب کیف آمیز پیرایہ میں ثبوت پیش ہے کہ تمام کائنات علوی وسفلی اسی کی تسبیح کر رہی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کے مسخر ہیں، زمینوں کے حالات اور آفتاب و ماہتاب اور دیگر ستاروں کی حالت کہہ رہی ہے کہ کوئی ہے کہ جو نہیں ایک خاص حرکت مجبورانہ گردش دیر رہا ہے۔ جو لوگ کرات ہی کو باعتبار فوق ہونے کے سماوات سمجھتے ہیں اب وہ بھی غور کریں کہ آفتاب دیگر سیارات جو زمین سے ہزاروں حصے بڑے اور کروڑوں کلومیٹر دور ہیں اور اس سرعت کے ساتھ دورہ کرتے ہیں کہ منٹوں میں ہزاروں کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بے شمار ہیں آپس میں ٹکرانے نہیں پاتے پھر ان کی یہ حالت اپنے خالق و مالک و مدبر کی تسبیح ہی تو ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ آسمانوں پر ایک چپہ بھر بھی ایسی جگہ نہیں جہاں ہزاروں روحانی و ملائکہ اسکی تسبیح و تہلیل نہ کرتے ہوں وہ ایک قسم کی غیر مرئی مخلوق ہے جس تک ادراک سے فلسفۂ حال عاجز ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ پھر یہ انسان کیوں بے کار اور غیر معبودوں کی پرستش میں گرفتار ہے اسکو بھی اسکی تسبیح کرنی چاہیئے۔

تحلیل اجزاء الملک میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہی حاکم مطلق ہے وہ ہی قابل پرستش و اطاعت ہے القدوس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو اوہام باطلہ نے خدا کے لئے تثلیث اور بیٹے بیوی سمجھ رکھا ہے وہ ان سب سے پاک ہے۔ اسمیں جمیع مذاہب باطلہ کا اجمالی رد ہے، العزیز وہ زبردست بھی ہے اسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ عزت و غلبہ اسی کو ہے اسی کے احکام قابل پذیرائی ہیں۔ الحکیم وہ حکمت والا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انتظام دنیاوی جس طرح اسکی حکمت بالغہ کا مقتضیٰ ہے اس طرح دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا بھیجنا کتابوں کا نازل کرنا بھی بندوں کی معاد و معاش درست کرنے کے لئے اس حکیم کی حکمت کاملہ کا مقتضیٰ ہے لہذا اس کے بعد مسئلہ نبوت کا اثبات کرتا ہے۔ فقال ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم، کہ اس حکیم نے ان پڑھوں میں جس سے مراد ملک عرب لیا گیا ہے۔ ان ہی میں سے ایک رسول یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا۔ مگر امیوں سے مراد تمام ممالک ہیں اس لئے کہ جن باتوں کی تعلیم کے لئے رسول آیا انسب کی نسبت وہ امی۔ ان پڑھ اور جاہل ہی تھے۔ اور جو کسی کو کچھ خبر بھی تھی تو اس پر سینکڑوں جہالت کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص عرب کے لئے نبی تھے غلط بات ہے۔ اور بالفرض امیوں سے مراد عرب ہی ہوں تو ان میں مبعوث کرنے سے یہ مراد نہیں کہ اور قوموں کے لئے نبی نہ تھے بلکہ یہ ایک حقیقت کا بیان ہے جو دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملک عرب ہی میں پیدا ہوئے اور ظاہر ہوئے تھے۔

کیوں رسول بھیجا؟ یتلوا علیھم ایتہ، کہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سنادے۔ ویزکیھم اور ان کا اخلاق بد کی نجاستوں سے پاک کرے اپنی روحانی روشنی سے ان کے نفوس کو منور کرے۔ کیونکہ کوئی کیسا ہی پرزور واعظ ہو ہزاروں وعظ و پند کرے جب تک اس میں روحانی کشش اور باطنی جذبہ نہیں کچھ بھی اثر پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو جلد زائل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال کیا جائے کہ آخر وہ کیا نقش تھا جو عرب کے سخت دل بت پرستوں، مغرور جاہلوں کے دلوں پر قائم کر دیا تھا جو صدیوں تک نہ مٹا اور ان کی دنیاوی اور دینی ترقی کا رہنما بنا رہا۔ احقر نے بہت سے واعظوں کو دیکھا اور انکی نصیحتیں بھی سنیں مگر عام طور پر ان پند و نصائح کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے دل نشین بیانوں سے پہاڑوں کو موم کر دیا اس کو رسالت کبریٰ کہتے ہیں۔ اور صرف پڑھکر سنانے کو

ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ان کو ویعلمھم الکتاب۔ کتاب یعنی قرآن سکھادے والحکمۃ۔ اور حکمت بھی کتاب سیکھنا اور چیز ہے اور اس کی برکات سے فائض اور دل میں جگہ دینا اور چیز ہے اس لئے الکتاب کے بعد الحکمۃ کا لفظ ارشاد فرمایا۔

وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین۔ کہ اس سے پہلے وہ امی عرب۔ بیشک صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ عرب کی پہلی حالت اور ان کی خصلتیں مورخوں نے بیان کی ہیں مثلاً وہ علم و ہنر سے خالی تھے لکھنا پڑھنا بھی سینکڑوں ہزاروں میں سے کوئی جانتا تھا۔ افلاس و غربت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ قزاقی، چوری، قتل، زنا اور شراب خوری کوئی انتہا نہ تھی، شہوت پرستی یہاں تک تھی کہ بڑا بیٹا اپنے باپ کی بیویوں کو بھی تصرف میں لاتا تھا۔ سنگدلی یہاں تک تھی کہ معصوم بچوں کو زندہ دفن کر دینا ایک عام بات تھی مخاصمت سینہ بسینہ چلی آتی تھی۔ اور اس پر اکثر انتہائی بھیانک جنگیں ہوئیں۔ پھر سینکڑوں معبود پوجے جاتے تھے، رمالوں، کاہنوں، اور عیاروں کے کرشموں پر ایمان تھا۔ فال و شگون پر سفر و اقامت منحصر تھی۔ ہر لحاظ سے پست، گندے اور وحشی بنے ہوئے تھے۔ اور یہ حالت عرب کی آقائے نامدار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت تک تھا۔ اس کے ساتھ ہی عرب میں شاہان یمن کے ذریعہ شائستگی ہوئی ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت تک[عہ] عرب پر چاروں طرف سے افلاس، جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ملت ابراہیمیہ بالکل مٹ گئی تھی، اور اسی طرح تمام مذاہب اور جملہ اقوام کی حالت تھی مثلاً مجوس کا مذہب جو کچھ بھی اصل میں ہو مگر اب تو شہوت پرستی اور عناصر پرستی کا مجموعہ رہ گیا تھا۔ اسی طرح اہل کتاب کی حالت انتہائی خراب تھی، یہود تورات اور انبیاء علیہم السلام کے اصل نسخے کھو بیٹھے تھے۔ جو بخت، ولفرد وغیرہ بادشاہوں کے عہد میں ہوا۔ صرف کچھ مضامین اصل کتابوں اور باقی قصص و حکایت یا مذہبی دستورات تھے جن کو توریت کہتے تھے۔ اس کے سوا ان کی بے ایمانیاں اور قوم کی بیہودگیاں تو اس درجہ تھی کہ جس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شاکی تھے۔ اور دنیا سے شاکی گئے۔ اور اسی طرح مسیحی رہنماؤں کا برا حال تھا۔ انتہائی بد دیانتی پھیلی ہوئی تھی، سینکڑوں فرقے تھے صحیح معنی میں مذہب کوئی نہیں رہا تھا۔ اور جو تھا وہ صرف ایک دستورات کی بجا آوری تھی۔ جس کو مذہب کا رنگ دے لیا گیا تھا۔ اس طرح یہود، اہل چین، نصاریٰ، تو اب تک بت پرستی اور اوہامات باطلہ کے سمندر میں غرق تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا صرف اس عہد تک ہی محدود نہ تھا۔ اور نہ ہی عرب کے لئے تھا بلکہ وآخرین منھم اور آئندہ آنے والوں کے لئے بھی یہ مخبر رہے اسکا عطف امیین پر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضہ سے صحیح بخاری شریف میں مروی ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی جب آنحضرت صلعم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے پوچھا کہ 'آخرین منھم' سے کیا مراد ہے۔ تین مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا، تب آپ نے اپنا ہاتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر پر رکھا اور فرمایا "اگر ایمان ثریا ستارے کے پاس ہوتا تو بھی ان لوگوں میں سے ایک یا کئی ایک پا لیتے" اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ مدنی ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری تمام دنیا والوں کی طرف ہے صرف عرب کیلئے ہی مخصوص نہیں۔ کیونکہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فارس والوں کو فرمایا، اس عام بعثت کی بنا پر آپ نے فارس و روم کے بادشاہوں کے نام اسلام قبول کرنے کے فرامین بھیجے، حضرت مجاہدؒ وغیرہ بھی فرماتے ہیں اس سے مراد عجمی لوگ ہیں یعنی غیر عرب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ کی وحی کی تصدیق کریں۔ ابن حاتم کی حدیث میں ہے کہ اب سے تین تین پشتوں کے بعد آنے والے میرے امتی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

عہ تھا اسکے ساتھ ہی عرب میں شاہان یمن کے ذریعہ شائستگی ہوئی ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت تک

حدیث بالا کی پیشین گوئی کے مطابق بالخصوص اہل فارس میں بڑے بڑے اموار اسلام پیدا ہوئے دین کی ساعی جمیلہ کی اب تک امت محمدیہ مشکور ہے۔ اور یہ بشارت امام ابوحنیفہ رح اور ان کے تلامذہ پر صادق آئی جیسا کہ جلال الدین سیوطیؒ وغیرہ محدثین نے بھی اقرار کیا۔

ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء :- یہ اس کی عنایت ہے جس کو چاہے نصیب کرے اسکی حکمتیں وہی جانتا ہے کہ کس قوم میں اس خدمت کی بجا آوری کا مادہ ہے۔ پھر فرمان ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی زبردست عظیم الشان نبوت کے ساتھ سرفراز فرمانا اور اس فضل عظیم سے بہرہ ور کرنا یہ خاص خدا کا فضل ہے۔

واللہ ذو الفضل العظیم۔ اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ

جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا انکی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی

أَسْفَارًا ۚ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ

کتابیں لادے ہوئے ہے غرض ان لوگوں کی بری حالت ہے جنھوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا (یعنی یہود ہیں) اور اللہ تعالیٰ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا

ایسے ظالموں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیا کرتا اور اگر یہ لوگ یہ کہیں کہ ہم باوجود اس حالت کے بھی اللہ کے مقبول ہیں تو

إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے یہودیو اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکت غیرے اللہ کے مقبول (و محبوب) ہو تو تم اسکی تصدیق کے لیے موت کی

الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا

تمنا کر کے دکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو اور ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اور وہ کبھی اسکی تمنا نہ کریں گے بوجہ (خوف سزا) ان اعمال (کفریہ) کے

قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ قُلْ إِنَّ

جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی آپ (ان سے یہ بھی) کہدیجئے کہ جس

الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ۖ ثُمَّ تُرَدُّونَ

موت سے تم بھاگتے ہو وہ موت (ایک روز) تم کو آ پکڑے گی پھر تم پوشیدہ اور ظاہر

إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

جاننے والے (خدا) کے پاس لیجائے جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلا دیگا (اور سزا دے گا)

ترکیب

مثل الذین مبتدأ کمثل الحمار خبر یحمل الجملۃ اما حال والعامل فیہا معنی المثل او صفۃ للحمار اذ لیس المراد بہ معینا فہو فی حکم النکرۃ کما فی ھذا القول ولقد امر علی اللئیم یسبنی مثل القوم فاعل بئس الذین فی موضع خبر مثل القوم والمخصوص بالذم محذوف ای ھذا المثل ویمکن ان یکون فی موضع رفع تقدیرہ بئس مثل الذین فمثل المحذوف ھو المخصوص بالذم وقد حذف واقیم المضاف الیہ مقامہ (ابن الصائغ) وقدر العلامۃ ابو السعود ھکذا ای بئس مثلا مثل القوم الذین کذبوا علی ان التمیز محذوف والفاعل المفسر بہ مستتر ومثل القوم ھو المخصوص بالذم والموصول صفۃ القوم فانہ ملاقیکم الجملۃ خبر ان ودخلت الفاء لما فی الذی شبہ الشرط وقیل الفاء زائدۃ وفیہ ما فیہ۔

تفسیر

پہلے فرمایا تھا کہ اس حکیم کی حکمت کاملہ کا مقتضا ہے کہ اس نے رسول بھیجا تاکہ لوگوں کو پاک کرے اور علم و حکمت سکھائے اور یہ رسول عرب میں ظاہر کیا جو ان پڑھ لوگ تھے یہود کی قوم کو اپنے علم و خاندان کا بڑا گھمنڈ تھا (اور خاندانی آدمیوں کا جب اصلی کمال جاتا رہتا ہے۔ تو ان میں یہی باقی رہ جایا کرتا ہے) ان کو اس نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اس کے سوز سے مستفید ہونے سے عار ہوا اور کہنے لگے کہ علم و حکمت کا خزانہ ہمارے پاس ہے۔ بڑے بڑے کتابوں کے ذخیرے ہمارے یہاں موجود ہیں، یہ جاہلوں کے سمجھانے کے لئے نہ کہ ہمارے لئے اس لئے خدا تعالیٰ اس قوم بد نصیب کی اصل حالت بیان فرماتا ہے۔ اور ان کے علم بے عمل کی پوری تشبیہ دیتا ہے۔

فقال مثل الذین الخ۔ کہ ان کی مثال جن پر توریت لادی گئی یعنی اسکی پابندی کی تاکید کی گئی گو یا توریت کو ان پر سوار کیا گیا یا یہ معنی کہ توریت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ کیونکہ یہ حمل بمعنی اٹھانے کے نہیں بلکہ حمالۃ بمعنی کفالۃ و ضمان سے ہے (یہ زمخشری رح کا قول ہے اور پھر انھوں نے اس کی پوری ذمہ داری نہ کی۔ ایک (چوپائے گدھے) کی مثال ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں پھر اس (چوپائے گدھے) کو ان کتابوں سے کیا فائدہ بجز اس کے کہ ان کے بوجھ کی مشقت اٹھا رہا ہے،

اور یہی حال ان یہود کا ہے۔ گدھا حیوانات میں سے بالخصوص بارکش اور بدعقل جانور ہے۔ اس لئے اس سے تشبیہ دی نہ کہ گھوڑے سے اور صریحاً یہود کا نام نہ لیا گیا بلکہ یہ فرمایا کہ ان لوگوں کی مثال جن پر توریت لادی گئی ایک گدھے کی مثال ہے۔ جو کتابیں اٹھائے پھرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ ان میں کیا ہے۔ اسفارا۔ سفر کی جمع ہے۔ اور سفر بڑی کتاب کو کہتے ہیں اس وجہ اس کے اصلی معنی روشنی کے ہیں کہتے ہیں اسفر الصبح چونکہ کتاب جب پڑھی جاتی ہے۔ تو پڑھنے اور سننے والے کو علم کا نور اور روشنی بخشتی ہے۔ اس لئے اسکو سفر کہنے لگے۔

اسی طرح یہ یہود ہیں کہ ظاہری الفاظ تو خوب پڑھتے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ تو یہ معلوم ہے کہ مطلب کیا ہے؟ نہ اس پر ان کا عمل ہے بلکہ اور تبدیل اور تحریف کرتے رہتے ہیں۔ پس درا صل یہ اس بے سمجھ جانور سے بھی بدترین ہیں کیونکہ اسے تو قدرت نے سمجھ ہی نہیں دی لیکن یہ سمجھ رکھتے ہوئے پھر بھی اسکو استعمال نہیں کرتے

تحلیل اجزاء

پھر فرماتا ہے۔ بئس مثل الذین کذبوا بآیات اللہ۔ کہ اس قوم کی جس نے آیات اللہ کو جھٹلایا یعنی یہود بری مثال ہے مثل کے برے ہونے سے یہ مراد نہیں کہ یہ مثل بیجا اور نامناسب ہے بلکہ یہ تمثیل ٹھیک ہے۔ اور ان پر چسپاں ہے۔ مگر وہ بہت بری قوم ہے کہ جس کی یہ مثل ہو آیات اللہ سے مراد آیات قرآنیہ ہی نہیں بلکہ وہ دلائل بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اسلام کے برحق ہونے پر دلائل کرتے ہیں خواہ وہ عقلیہ ہوں خواہ نقلیہ یعنی وہ بشارتیں جو ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت مذکور ہیں۔ جب ان پر عمل نہ کیا بلکہ ان کے برخلاف کیا اور ان کو جھٹلا دیا یا یوں کہا جائے کہ جب یہود نے توریت و صحف انبیاء ان ہدایات و تاکیدی احکام کو پس پشت ڈال دیا۔ یا اور ان پر عمل نہ کیا تو

گویا ان کو جھٹلا دیا یہ بھی ایک قسم کی تکذیب ہے لسانی نہ ہو حالی سہی

پھر فرمایا گیا ہے اے یہودیو اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم حق پر ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ناحق پر ہیں تو آؤ اور دعا مانگو کہ ہم دونوں میں سے جو ناحق پر ہو خدا تعالیٰ موت دے پھر یہ فرمایا گیا ہے کہ انھوں نے جو اعمال بدکر رکھے ہیں۔ مثلاً، کفر، فسق دفجور، ظلم نافرمانی وغیرہ اس وجہ سے ہماری پیشین گوئی ہے کہ وہ اس پر تیار نہ ہوں گے، ان ظالموں کو خدا بخوبی جانتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت قل ان کانت الخ کی تفسیر میں یہودیوں کے ان مباہلے کا پورا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنے اوپر اگر خود گمراہ ہوں یا اپنے تقابل پر اگر وہ خود گمراہ ہوں تو موت کی بددعا کریں۔ جیسے کہ نصرانیوں کے مباہلے کا ذکر سورۂ آل عمران میں کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت فمن حاجک الخ مشرکین سے بھی مباہلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ مریم آیت قل من کان فی الضلالۃ الخ یعنی اے نبی ان سے کہہ دے کہ جو گمراہی میں ہو رحمٰن اسے اور بڑھا دے، مسند احمد میں حضرت ابن عباس رض سے مروی ہے کہ ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس دیکھوں گا تو اس کی گردن ناپوں گا۔ جب یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا کرتا تو سب دیکھتے کہ فرشتے اسے پکڑ لیتے اور اگر یہود میرے مقابلہ پر آکر موت طلب کرتے تو یقیناً وہ مرجاتے اور اپنی جگہ جہنم میں دیکھ لیتے؛ اور اگر مباہلہ کے لئے لوگ نکلتے تو وہ لوٹ کر اپنے اہل وعیال کو ہرگز نہ پاتے۔ یہ حدیث بخاری، ترمذی اور نسائی میں موجود ہے۔

یہود کہتے تھے کہ ہم پر یہ الزام غلط ہے کس لئے کہ ہم خدا کے خاص اور پیارے بندے ہیں۔ خواہ کچھ بھی کریں۔ اس کے جواب میں فرمایا ہے قل یایھا الذین ھادوا ان زعمتم الخ۔ اے پیغمبر۔ یہودیوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو گمان ہے کہ ہم اللہ کے خاص دوست ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہونے کے سبب موروثی بزرگی اور آخرت میں جنت کے مستحق ہیں تو فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین، موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو تاکہ تم مرنے کے بعد عیش وآرام اپنے ادعا کے موافق پاؤ مگر دل بڑا منصف ہے اپنے اعمال بد کی شامت اسے معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ولا یتمنونہ ابدًا بما قدمت ایدیھم۔ وہ اس کی ہرگز تمنا نہ کریں گے، اپنے اعمالِ بد کے خوف سے۔ جیسے ملزم عدالت میں جانے سے ڈرتا ہے۔ لیکن جس کا دامن پاک وصاف ہو اسکو کوئی خوف نہیں ہوتا نیک اور باخدا لوگ جن کو دار آخرت کے نعماء پائیں گا ان کے رب کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے مرنے کے مشتاق رہا کرتے ہیں وہ دنیا کے عیش وآرام کو قید خانہ کے آب ودانہ سے کم نہیں سمجھتے مگر خدا تعالیٰ کی ملزم زبان سے لاکھ لاف زنی کریں مرنے سے ڈرتے ہیں یہیں کی زندگی پر مرتے ہیں۔ یہیں کے سامان واسباب پیدا کرنے کی فکر پیدا کرتے ہیں

واللہ علیم بالظٰلمین اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ وہ بدکاروں کو ابرار کے درجے نہیں دیتا۔ البتہ نیک نسل اپنے بزرگوں کے انعام کا حصہ پاتے ہیں۔ یہود اس امتحان سے بھاگ نکلے اور موت سے ڈرتے تھے اس لئے فرمایا گیا ہے قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملٰقیکم۔ کہدو کہ جس موت سے تم بھاگ رہے ہو آخر وہ ایک روز تمہیں آپکڑے گی اس سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔

ثم تردون الیٰ عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون، مرنے کے بعد تم اسکے پاس پہنچائے جاؤ گے، جو چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے۔ یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں پھر وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم دنیا میں کرتے تھے۔

ان آیات میں مسئلہ معاد بھی کس خوبی کے ساتھ بیان کر دیا اور ہدایات انبیاء علیہم السلام سے بے خبر ہونیکا نتیجہ اور ان سے مفاخر آبائی کے غرور میں سرتابی کا انجام بڑے پُر اثر الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

لہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صداقت الصدق کے زور پر عیسائیوں سے بھی مباہلہ کیا اور یہود سے بھی مگر وہ ڈر گئے بخاری، ترمذی، نسائی اور احمد نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مکہ مکرمہ میں ابو جہل کعبہ کے پاس

پر جملہ کرتا جیسا کہ وہ کہتا تھا کہ کعبہ میں پاؤں تو گردن مروڑ دوں تو سب کے روبرو اسکو فرشتے اچک لیتے اور اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو فوراً مرجاتے اور اپنا گھر دوزخ میں دیکھ لیتے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مباہلہ کرنے کو نکلتے تو گھر آکر بال دار بچہ نہ دیکھتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ

اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا

فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن

کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو، یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو

كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي

کیونکہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا فانی) پھر جب نماز (جمعہ) پوری ہو چکے تو (اس وقت تم کو اجازت ہے کہ) تم زمین پر چلو پھرو

الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا

اور خدا کی روزی تلاش کرو اور (اس میں بھی اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو

لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا

تاکہ تم فلاح پاؤ اور (بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ) وہ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں

إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ

تو اسکی طرف دوڑنے کے لئے بکھر جاتے ہیں اور آپکو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ جو چیز (از قسم ثواب و قرب) خدا کے پاس ہے

وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝

وہ ایسے مشغلہ اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے، اور اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے۔

ترکیب اذا شرط یوم من بمعنی فی ای فی یوم الجمعۃ فاسعوا جوابہ وذروا عطف علی فاسعوا الجمعۃ الیم مصدر بمعنی الاجتماع فاذا قضیت شرط فانتشروا جوابہ کثیراً ای ذکراً کثیراً واذا راوا شرط انفضوا جوابہ وترکوا معطوف علیہ قائماً حال من المفعول فی ترکوک ما موصول عند اللہ صلۃ خیر خبر للموصول واصلہ

تفسیر یہود پر تین زجر و توبیخ ہوئیں، ۱ جب انھوں نے اپنے علم و فضل کا فخر کیا اور عرب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جاہل قرار دیا تو ان کو گدھے سے تشبیہ دی، ۲ اور جب انھوں نے یہ فخر کیا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

اولاد ہونے کے سبب خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور خاص دوست ہیں دار آخرت کی نعمتیں ہمارے لئے تیار ہیں تو ان کی تکذیب کی اور فرمایا کہ اگر سچے ہو تو موت کی آرزو کرو کہ وہ چیزیں تمکو تیار ملیں ۳ ان کا ایک اور فخر تھا کہ ہمارا دین میں سبت (ہفتہ کا دن) رکھا ہے جسکی تعظیم و حرمت ہم پر واجب ہے۔ اور اسمیں بڑے برکات ہمارے لئے ہیں مسلمانوں کے لئے یہ نعمت نہیں اس تفاخر کے مقابلہ میں یا اسکی بجائے خدا تعالیٰ مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن مقرر کرتا ہے۔ جو ہفتہ اور اتوار سے بھی مقدم ہے۔ اس لئے اس دن کی خاص عبادت کے لئے حکم دیتا ہے یاایھا الذین اٰمنوا الخ ان کنتم تعلمون کہ اے ایماندارو جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دیجائے تو اس کی طرف چلو اور جاکر یاد الٰہی کرو، اور سوداگری یا اور کوئی دنیاوی کام ہو اسکو چھوڑ دو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانو کس لئے کہ دنیا اور اسکی نعمتیں حق کے حاصل کرنے میں تم سرگرمی اور کوشش کرتے ہو فانی ہیں تم کیا یہاں سدا رہو گے اور کیا تمہارے کام یہ چیزیں ہمیشہ آویں گی؟ جہاں تمہیں جانا ہے اور وہاں جاکر سدا رہنا ہے۔ اس کے لئے کوشش کرنا بہتر ہے اور منجملہ ان کے جمعہ کے لئے چلنا اور تیار ہونا اور دنیا کے کاموں کو چھوڑ دینا۔

جمعہ کا لفظ جمع سے مشتق ہے، وجہ اشتقاق یہ ہے کہ اس دن مسلمان بڑی بڑی مساجد میں خدا کی عبادت

فضائل جمعہ کے لئے جمع ہوتے ہیں اور یہ بھی وجہ ہے کہ جمعہ کے دن ہی تمام مخلوق کامل ہوئی چھ دن میں ساری کائنات بنائی گئی ہے۔ چھٹا دن جمعہ کا ہے۔

فضائل جمعہ احادیث صحیحہ میں بکثرت وارد ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم پچھلے ہیں مگر قیامت میں سب سے آگے رہیں گے، یہی بات ہے کہ ان کو ہم سے پہلے کتاب ملی اور ہم کو بعد میں پھر یہ دن جمعہ کا ان پر فرض ہوا، وہ اس میں جھگڑے اللہ نے ہم کو بتادیا، سب لوگ اسمیں ہمارے پیچھے ہیں یہود اس کے ایک روز بعد نصاریٰ اس کے ایک دن بعد (متفق علیہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب دنوں سے جمعہ افضل ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی دن جنت میں گئے اسی دن وہاں سے نکلے اسی دن قیامت ہوگی (رواہ مسلم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے روز ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ جو بندہ اس ساعت میں مانگتا ہے پاتا ہے۔ (متفق علیہ) مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حسب قول عبداللہ بن سلام وہ ساعت آخری ساعت ہے۔ یعنی عصر سے لیکر غروب کے قریب تک۔ ابوداؤد، نسائی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ دن تمہارے سب دنوں سے افضل ہے۔ اس دن مجھ پر درود بھیجا کرو وہ میرے سامنے لایا جاتا ہے۔

یہ مسلمان ہر عاقل بالغ غیر معذور پر واجب ہے مگر علمائے احادیث و آثار میں غور کرکے اس نماز کے وجوب

احکام جمعہ کے لئے بارہ شرطیں قائم کی ہیں چھ خاص پڑھنے والے کے لئے وہ یہ ہیں (۱) حریۃ یعنی آزاد ہو کسی کا غلام نہ ہو کس لئے کہ وہ بیگانہ تابعدار معذور ہے ۲ ذکورۃ یعنی مرد ہو عورت پر واجب نہیں ۳ اقامۃ یعنی مقیم ہو مسافر نہ ہو کس لئے کہ اس پر واجب نہیں (۴) صحت و تندرستی کس لئے کہ بیمار پر واجب نہیں ۵ سلامۃ الرجلین یعنی پاؤں ہوں لنگڑا اپاہج نہ ہو کس لئے کہ اس پر بھی واجب نہیں ۶ سلامۃ البصر بینا ہو کس لئے کہ اندھے پر واجب نہیں لیکن بعض کہتے ہیں کہ جب اندھے کو لیجانے والا ہو تو اس پر بھی واجب ہے

اور چھ دوسری شرطیں ہیں ۱ مصر جامع کہ مشہور ہو جسمیں بازار وغیرہ ہوں کس لئے کہ دیہات میں جمعہ واجب نہیں امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ یہ شرط ثابت نہیں بلکہ جس بستی میں چالیس آدمی جمعہ میں آسکتے ہوں وہاں جمعہ واجب ہے اور یہی امام احمد بن حنبل رح کا قول ہے اور امام مالک رح کہتے ہیں کہ چالیس سے بھی کم ہوں۔ تو بھی واجب ہے۔ ۲ سلطان یا اس کا نائب منتظم بھی ہو اس شرط میں بھی دیگر ائمہ کو کلام ہے۔ ۳ جماعت اگر جماعت میسر نہ آئے تو جمعہ واجب نہیں

امام اعظم رح کے نزدیک کم از کم امام کے علاوہ تین آدمی اور ہوں گے، تو جماعت ہو جائے گی صاحبین کہتے ہیں کہ امام کے سوا دو اور ہوں تو کافی ہے ۔ عۓ وقت ظہر کے وقت پر ہونا چاہئے ۔ ظہر کے وقت سے پہلے یا اس کے بعد جمعہ نہ ہوگا مگر حنبلیوں کے نزدیک زوال سے پہلے بھی جمعہ پڑھنا جائز ہے ۔ احادیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اول وقت جمعہ پڑھا انکو دیواروں کا سایہ دیکھ کر بعض نے زوال کا وقت سمجھ لیا ہوگا عۓ اظہار یعنی مخفی اور پوشیدگی کی حالت میں جمعہ نہیں شہرت اور اذن عام ہونا چاہئے عۓ خطبہ بھی ہونا نماز سے پہلے شرط ہے اگر خطبہ نہ ہوگا تو جمعہ صحیح نہ ہوگا باقی طہارت مثلاً وغیرہ اور نماز کی شرطیں شرطیں ہیں جب یہ شروط پائی جاویں تو جمعہ واجب اور فرض ہے ۔ اسکا ترک کرنے والا گنہگار رہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے ہوئے فرماتے تھے کہ لوگ جمعہ کو ترک کرنے سے باز آویں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دے گا (رواہ ابو داؤد ، نسائی ، الترمذی ، ابن ماجہ ، الدارمی ، مالک ، احمد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے قصد کیا تھا کہ کسی کو جمعہ پڑھانے کے لئے کہوں پھر دیکھوں جو شریک نہیں ہوتے ہیں ان کے گھروں میں آگ لگا دوں (رواہ مسلم) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ حق اور واجب ہے ہر مسلمان پر واجب کے ساتھ مگر چار شخص (۱) غلام (۲) عورت (۳) لڑکے (۴) بیمار پر نہیں (رواہ ابو داؤد)

مسنون طریقہ مسنون یہ ہے کہ جمعہ کے روز غسل کرے اچھے اور صاف کپڑے پہنے خوشبو لگائے اور جب اول اذان ہو تو خرید و فروخت سب کاروبار بند کر دے اور مسجد میں جا کر جہاں جگہ ملے چار رکعت سنتے پڑھے پھر امام منبر پر چڑھے اور اذان ثانی شروع ہو تو بات چیت بند کر دے اور نوافل و سنتیں بھی نہ پڑھے متوجہ ہو کر خطبہ سنے امام خطبہ منبر پر کھڑا ہو کر پڑھے اور بیچ میں تھوڑی دیر بیٹھ جائے ۔ پھر شروع کرے ۔ خطبہ میں خدا کی حمد و ثنا اور پیغمبر علیہ السلام پر درود کے بعد وعظ و پند اور احکام الٰہی کی تعلیم و ترغیب ہو صاف اور سادی ہو اور خطیب لباس مسنون پہنے ہاتھ میں عصا لئے اور اس پر سہارا کئے ہو خطبہ عربی زبان میں ہو اور جو قوم بالکل نہ سمجھے ان کو ترجمہ کر کے سمجھا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں خطبہ کے بعد امام منبر سے اتر آئے اور اقامت کے بعد دو رکعت نماز پڑھائے بآواز بلند نماز میں الحمد اور اس کے ساتھ اور سورۃ آیات قرآنیہ پڑھے سلام کے بعد چار رکعت اور پھر دو رکعت یا صرف چار علی حسب اختلاف الروایات ۔ اور بھی ہر ایک جداگانہ پڑھے یہ مسنون ہے واجب نہیں ۔ جمعہ کی نماز سے ظہر کے چار فرض ساقط ہو جاتے ہیں ۔ اور مسافر وغیرہ جو جمعہ میں شریک ہو جاویں تو ان سے بھی ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے ۔ اور جو کوئی بلا عذر شریک نہ ہو ۔ گو شریک نہ ہونے سے گنہگار ہوگا مگر وہ ظہر پڑھے ۔ لیکن جماعت نہ کرے جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد کاروبار دنیاوی کی ممانعت نہیں ہاں جو اس تمام روز منبر کس میں خیرات و عبادات کے لئے تعطیل کرے تو بڑی برکت ہوگی ،

جمعہ جمعہ کو اس لئے جمعہ کہتے ہیں کہ اس دن لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں جس نے سب سے اول ... اس دن کا نام جمعہ رکھا ہے ۔ بعض کے نزدیک کعب بن حذری ہے ، مگر کعب کے عہد میں اسلام نہ تھا ہو سکتا ہے کہ اس نے اس دن کا نام جمعہ یوں رکھا ہوگا ، کہ اس دن بازار لگتا ہوگا ۔ اور لوگ خرید و فروخت کیلئے بازار میں جمع ہوتے ہوں گے اور عرب پہلے اس دن کو عروبہ کہا کرتے تھے ، بعض کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق انصار نے ہجرت سے پہلے جمع ہونے کا اور مل کر عبادت کرنے کا یہ دن مقرر کیا اس لئے کہ ہفتہ یہود کے لئے اتوار نصاریٰ کے لئے تھا تب کہ سعد بن زرارہ کے پاس جمع ہوئے ۔ انھوں نے انکو دو رکعت نماز پڑھائی ۔ اور اس سے پیشتر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا ، جس میں وعظ و لطائف تھے جب اس دن کا نام جمعہ قرار دیا گیا ۔ یہ پہلا جمعہ اسلام میں ہوا ۔ جب ہجرت کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے ۔ اور قبا میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں اترے اور پیر و منگل بدھ اور جمعرات کے روز وہیں رہے ۔ اور مسجد کی بنیاد ڈالی پھر جمعہ کے

روز وہیں رہے۔ اور مسجد کی بنیاد ڈالی۔ پھر جمعہ کے روز نکلے مدینہ میں آنے کے لئے تو آپ نے جمعہ بنی سالم ابن عوف میں پڑھا خطبہ پڑھ کر نماز پڑھائی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا جمعہ تھا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ کہ جب جمعہ کے روز نماز کے لئے آواز دیجائے اس سے مراد وہ اذان ہے جو امام خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھتا ہے۔ اس وقت دی جاتی ہے۔ کس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضہ وعمر رضہ کے عہد تک صرف ایک یہی اذان تھی مگر عثمان رضہ کے عہد میں جب آبادی بڑھ گئی اور لوگ زیادہ ہوگئے، اور یہ اذان کافی نہ سمجھی گئی تو حکم دیا کہ اس سے پہلے اور اذان دیا کرو جو ان کے مکان پر دیجاتی تھی۔ اسکو سنکر لوگ نماز کے لئے آنے لگتے تھے۔ پھر جب سب جمع ہوجاتے تھے تو امام جب منبر پر بیٹھتا تھا اس وقت دوسری اذان بدستور ہوتی تھی، گو یہ حضرت عثمان رضہ کا فعل تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ کہ میرے طریقہ کو اور میرے بعد جانشینوں کے طریقہ کو لازم پکڑو اس لئے یہ بھی مسنون ہوگئی اور اس وقت صحابہ رضہ میں سے کسی نے اس میں کلام نہ کیا تو آج تک یہ دستور چلا آیا اس پہلی اذان سننے سے بھی نماز جمعہ کا علم ہوجاتا ہے۔ اس لئے علماء احناف فرماتے ہیں کہ اس اذان سننے کے بعد بیع اور کاروبار دنیاوی ممنوع ہیں

تحلیل اجزاء فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ تو ذکر اللہ یعنی خطبہ اور نماز کے لئے چلو ذکر اللہ سے دونوں چیزیں مراد ہیں خطبہ اور نماز بعض کہتے ہیں، خطبہ۔ اور سعی سے مراد دوڑنا یا بھاگنا نہیں کہ دوڑ بھاگ کر آؤ بلکہ چلنا اور قصد کرنا اور کوشش کرنا ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ غسل کرنا کپڑے پہننا بھی اس سعی میں داخل ہے وَذَرُوا الْبَیْعَ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، مراد کاروبار دنیاوی ہیں۔ کیونکہ اس دن لوگ ان کاموں میں زیادہ مصروف رہتے تھے اس لئے اس کا ذکر کیا اذان سننے کے بعد خرید و فروخت حرام ہے۔ کشاف میں ہے کہ عام علماء کے نزدیک باوجود ممنوع ہونے کے جو کوئی کرے گا تو بیع فاسد نہ ہوگی کس لئے کہ۔ چنانچہ اذان کو سنکر چلتے ہوئے جو کوئی بیع کرے گا تو یہ فاسد نہ ہوگی، کس لئے کہ چنانچہ اذان کو سنکر چلتے ہوئے جو کوئی رستہ میں بیع و شراء کرے اسمیں کچھ قباحت نہیں۔ امام مالک رح کہتے ہیں، بیع فاسد ہوگی، ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، اس وقت خرید و فروخت چھوڑنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں علم ہے کہ دنیا، فانیہ کی تجارت سے آخرت باقیہ کی تجارت بہرحال بہتر ہے۔ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ، اور جب نماز سے فارغ ہوچکو تو زمین پر چلو پھرو اور اللہ کے فضل و رزق و روزی کو تلاش کرو فضل اللہ سے مراد روزی ہے۔ یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ پہلے جو ممانعت کی تھی اس کی اجازت ہے،

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اور صرف روزی ہی کی تلاش میں بے ہوش نہ ہوجاؤ بلکہ اللہ کو یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ تسبیح استغفار، و ذکر قلبی و لسانی بہرحال میں اللہ کو نہ بھولو، بخاری، مسلم وغیرہما نے جابر بن عبد اللہ رضہ سے نقل کیا کہ ایک وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے کہ مدینہ کا کارواں شام سے غلہ لے کر آیا اسکی ڈگڈگی بجی تو لوگ اسکو دیکھنے کو چلے گئے۔ یہاں تک کہ صرف ۱۲ آدمی رہ گئے جن میں ابوبکر رضہ و عمر رضہ بھی تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی

تنبیہ حضرت مقاتل بن حیان رح فرماتے ہیں کہ یہ مال تجارت دحیہ بن خلیفہ کا تھا اور حضرت دحیہ رضہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان بارہ حضرات سے کہ اگر تم سب بھی اٹھ کر چلے جاتے تو وادی آگ بن کر بھڑک اٹھتی۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَیْهَا کہ جب تجارت یا لہو لعب دیکھتے ہیں تو اسکی طرف اور بڑھتے ہیں وَتَرَکُوْکَ قَائِمًا، اور تجھے اے نبی کھڑا چھوڑ جاتے ہیں شاید اسوقت خطبہ عیدین کی طرح بعد میں تھا لوگ یہ سمجھے کہ نماز تو ہو چکی،

قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ کہدے جو کچھ اللہ کے پاس ہے ثواب اور آخرت کی نعمتیں جو خطبہ اور نماز سے حاصل ہیں وہ لہو (ڈگڈگی کی آواز) اور تجارت سے بہتر ہیں کس لئے کہ وہ ہمیشہ باقیہ ہیں پھر عمدہ چیز چھوڑ کر بری کی طرف دوڑنا کہاں کی عقل مندی ہے، وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ اللہ بہتر ہے روزی دینے والوں سے درا صل وہی روزی دیتا ہے نہ تجارت نہ زراعت اور نہ نوکری۔

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ ○ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ

جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بیشک اللہ کے رسول

اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ

ہیں اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اسمیں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کیجاتی) اور باوجود اسکے اللہ تعالیٰ گواہی

الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً

دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس نیت میں) جھوٹے ہیں ان لوگوں نے اپنی قسموں کو (اپنی جان و مال کے بچانے کے لئے) سپر بنا رکھا ہے

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

پھر یہ لوگ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں بیشک ان کے یہ اعمال بہت برے ہیں (اور ہمارا یہ دکھانا کہ انکے اعمال بہت ہی

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

برے ہیں اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (اول ظاہر میں) ایمان لائے پھر (کلمات کفریہ کہکر) کافر ہو گئے سو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو یہ (حق بات کو)

فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ○ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ط وَ

نہیں سمجھتے اور جب آپ انکو دیکھیں تو ان کی شان و شوکت ظاہری کیوجہ سے انکے قد و قامت آپکو خوشنما معلوم ہونگے

اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ط كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط

اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی باتیں سن لیں گویا یہ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے سے لگا دی ہوئی (کھڑی) ہیں

يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ

ہر غل پکار کو (خواہ وہ کسی وجہ سے ہو) اپنے ہی اوپر (پڑنے والی) خیال کرنے لگتے ہیں۔ یہی لوگ (تمہارے پورے) دشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہئے

قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○

خدا ان کو غارت کریں گے، (دین حق سے) کہاں پھرے چلے جاتے ہیں۔

ترکیب اذا شرط قالوا جوابہ وقیل محذوف وقالوا حال ای جاؤک قائلین نشہد نکیت تلا تقبل منہم وقیل جوابہ اتخذوا وفیہ ما فیہ والله یعلم الخ جملۃ معترضۃ مقررۃ لمضمون ما قبلہا وھو اشہادۃ بالسان مع الانکار فی القلب اتخذوا الخ الجملۃ مستانفۃ لبیان کذبہم وحلفہم علیہ ایمانہم عند الجمہور بفتح الہمزۃ جمع الیمین وقری بکسرہا والجنۃ ما ء ھھنا بئس فی افادۃ الذم فطبع قراء الجمہور مبنیاً للمفعول وقری مبنیاً للفاعل واذا رایتہم شرط تعجبک جوابہ وان یقولوا شرط تسمع جوابہ وقری یسمع علی البناء للمفعول کانہم خشب مسندۃ خبر الرفع علی انہ خبر مبتدأ محذوف او کلام مستانف لا محل لہ وقری بالتثقیل مسندۃ من الاسناد بمعنی الامالۃ والتشدید للمبالغۃ وقری خشب باسکان الشین وقری۔

تفسیر یہ سورہ بھی مدینہ میں نازل ہوئی۔ ابن عباس رض وغیرہ اکثر اس کے قائل ہیں جمعہ کی نماز میں اول رکعت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ جمعہ پڑھتے تھے ایمانداروں کو بیدار اور ہوشیار کرنے کے لئے اور دوسری رکعت میں اس سورہ کو پڑھتے تھے منافقین کی سرزنش کے لئے (اس مضمون کو سعید بن منصور نے اور اوسط میں طبرانی نے نقل کیا ہے) بخاری اور مسلم وغیرہما نے زید ابن ارقم سے نقل کیا ہے۔ کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں نکلے تو وہاں لوگوں کو تکلیف پہنچی، (بھوک پیاس کی) اور بخاری وغیرہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کے کسی بات میں خفا ہو کر تھپڑ مار دیا انصاری نے مدد کے لئے انصار کو پکارا اور مہاجر نے مہاجرین کو اور اس وقت مہاجر تھوڑے اور انصار بہت تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا کہ یہ کیا گندی بات ہے۔ بات گئی گذری ہوئی (مگر عبداللہ بن ابی انصار میں بڑا شخص تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لانے سے پہلے اسی کو سرداری کی پگڑی بندھنے والی تھی جو آپ کے آنے سے ٹل گئی، اس کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی عداوت تھی اور منافقوں کا سردار تھا اس نے کہا کہ کیا مہاجر نے ایسا کیا ہے تب تو اس کو دلی بغض نکالنے کا موقع مل گیا جوش میں آکر کہنے لگا کہ دیکھو ہمارے ٹکڑوں پر پلے کھا کر ان لوگوں کو یہ دن لگے ہیں، بخدا مدینہ پہنچ کر ہم شہر کے رئیس الذلیل پردیسیوں کو نکال دیں گے، اور لوگوں سے کہا کہ جو اس نبی کے پاس ہیں یعنی مہاجرین ان کو آئندہ سے کچھ دیا لیا نہ کرو۔ پریشان ہو کر بھوک کے مارے آپ ہی بھاگ جاویں گے۔ یہ بات زید کہتے ہیں کہ میں نے سن لی اور میں نے اپنے چچا (طبرانی کے نزدیک چچا سے مراد سعد بن عبادہ ہے۔ جو قوم کا سردار تھا) نمبر رفع سے ذکر کر دیا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا۔ آپ نے مجھے بلا کر دریافت فرمایا میں نے صاف صاف عرض کر دیا۔ پھر عبداللہ بن ابی سردار منافقین کو بلا کر پوچھا اس نے انکار کر دیا اور قسمیں کھانے لگا اور بڑی باتیں اخلاص مندی کی کرنے لگا تو زید کہتے تھے لوگوں نے مجھے چھوٹا سمجھ کر بڑی ملامت کرنی شروع کی یہاں تک کہ میں شرمندگی کے مارے گھر میں بیٹھ رہا۔ مگر خدا تعالیٰ سے امید تھی کہ قرآن مجید میں میری بات کوئی بات ضرور نازل فرمائے گا، پھر جب آیات نازل ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے مجھے بلا کر فرمایا اے زید خدا نے تجھے سچا کر دیا۔

شان نزول ان آیات میں خدا تعالیٰ منافقوں کے اس قول کو بھی نقل کرتا ہے اور پھر ان کے قسمیں کھانے اور اخلاص ظاہر کر کے جان بچانے کا بھی حال بیان کرتا ہے مگر شان الٰہی کی رحمت خداوندی یہ ہے کہ کسی کا نام نہیں لیا جاتا فرماتا ہے، اذا جاءك المنفقون قالوا نشهد انك لرسول الله، جبکہ آپ کے منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اے محمد اللہ کا رسول ہے۔

منافق کے معنی منافق شرع میں اسکو کہتے ہیں جو بظاہر مسلمان اور در پردہ کافر ہو اور وہ عنداللہ بھی کافر ہے گو شرع ظاہر سے اسلام کے ظاہری احکام اس پر جاری ہیں۔ اس پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی میراث کا حصہ بھی پائے گا، لیکن مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔ جس کا ظاہر کچھ ہو باطن کچھ اور ہو اسکو بھی عام طور پر منافق کہتے ہیں مگر وہ حقیقی منافق نہیں اسی طرح جسمیں منافقوں کے عادات ہوں، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، گالی بکنا، نماز میں سستی کرنا، وہ حقیقی منافق نہیں بشرطیکہ دل میں کلمہ کی تصدیق ہے۔ مگر ان بری عادتوں کے سبب گنہگار اور نفاق کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، مدینے میں ابتدائے اسلام کے وقت چند لوگ ایسے تھے جن کا سردار عبد اللہ بن ابی تھا وہ اور اسکا گروہ آنحضرت ﷺ کے سامنے آ کر ایسی ہی گواہی دیتے تھے، والله يعلم انك لرسوله (اللہ جل شانہٗ) فرماتا ہے کہ ان کی گواہی پر موقوف نہیں۔ اللہ خود جانتا ہے کہ تو اے محمد رسول ہے۔ یعلم اللہ کا لفظ عرب کے محاورہ میں قسم میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ تب اس جملہ میں قسم سے تاکید اور زیادہ ہو جانے گی مگر ان کی گواہی دل سے نہیں اور گواہی میں دل اور زبان کا موافق ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں موافق نہیں تو وہ شہادت جھوٹی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق اپنی شہادت میں ضرور جھوٹے ہیں نہ اس کہنے میں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ یہ خبر تو صادق ہے واقع کے مطابق ہے تو صادق ورنہ کاذب۔ مخبر کے اعتقاد کا اعتبار جمہور کے نزدیک نہیں۔ مگر جس طرح شہادت کے سچے ہونے میں واقع سے مطابق ہونے کے ساتھ اعتقاد سے مطابق ہونا بھی شرط ہے، اسی طرح خبر میں بھی کسی نے کہ شہادت بھی خبر ہے۔ باطل مؤکد ہے۔ چونکہ ان کی خبر اعتقاد کے مطابق نہ تھی گو واقع کے مطابق تھی اس لئے ان کو خدائے پاک نے جھوٹا کہا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے جو انھیں اس سچی بات کے کہنے میں جھوٹا کہا تو اس کے یہ معنیٰ کہ وہ اپنے نزدیک جھوٹے ہیں، کس لئے کہ وہ انك لرسول الله کو جھوٹ جانتے تھے، نہ یہ کہ وہ دراصل جھوٹے تھے کس لئے کہ بات تو سچی ہی کچھ قسم کھا کر کہنے پر موقوف نہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ جھوٹی قسمیں اس لئے کھاتے ہیں۔ اتخذوا ايمانهم جنة فصدوا عن سبيل الله کہ اپنی قسموں کو آڑ بنا کر کہا ہے۔ الزام سے بچنے کے لئے۔ پھر وہ اللہ کے رستے سے روکتے ہیں یا خود رک گئے۔ مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، منافقوں کی بہت سی علامتیں ہیں جن سے وہ پہچان لئے جاتے ہیں، ان کا سلام لعنت ہے ان کی خوراک لوٹ مار ہے۔ ان کی غنیمت حرام اور خیانت ہے، وہ مسجدوں کی نزدیکی ناپسند کرتے ہیں، وہ نمازوں کے لئے آخری وقت آتے ہیں تکبر اور نخوت والے ہوتے ہیں نرمی اور سلوک تواضع اور انکساری سے محروم ہوتے ہیں، نہ خود ان کاموں کو کریں نہ دوسروں کی ان کاموں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں، دن کو خوب کھانے پینے والے اور رات کو خشک لکڑیوں کی طرح پڑے رہنے والے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) پاس آؤ تمہارے لئے رسول اللہ استغفار کریں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں،

رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُونَ ۝

اور آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ (اس نا صح اور تحصیل استغفار سے) تکبر کرتے ہوئے بے رخی کرتے ہیں کہ جب ان کے کفر کی یہ حالت ہے تو)

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ

ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ ان کے لئے آپ استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں (اللہ تعالیٰ)

لَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ؕ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

ہرگز نہ بخشے گا بے شک اللہ تعالیٰ ایسے نافرمان لوگوں کو (توفیق) ہدایت (کی) نہیں دیتا

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ

یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس (جمع) ہیں ان پر کچھ خرچ مت

اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ

یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں گے اور ان کا کہنا جہل محض ہے کیونکہ اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

لَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى

ولیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں (اور) یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ لوٹ کر جائیں گے

الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ

تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دیگا اور (یہ کہنا جہل محض ہے بلکہ) اللہ ہی کی ہے عزت (بالذات) اور اس کے

وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

رسول کی (بواسطہ تعلق مع اللہ کے) اور مسلمانوں کی (بواسطہ تعلق مع اللہ والرسول کے) ولیکن منافقین جانتے نہیں

ترکیب واذا قیل شرط یستغفر مجزوم لوقوعہ فی جواب الامر وتعالوا لووا جواب شرط وہم مستکبرون الجملۃ حال من فاعل یصدون ودایت لوکان من الروایۃ البصریۃ فیصدون حال والا فہو مفعول ثان، حتی ینفضوا قرا الجمہور من الانفضاض وھو التفرق وقری ینفضوا من النفض التوہم انا فنیت ازوادہم۔

تفسیر فرمایا تھا کہ اپنی جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے پس لوگوں کو اللہ کے رستہ جہاد ایمان واعمال صالحہ سے روکتے ہیں۔ اور دلوں میں شبہ ڈالا کر اور اسلام میں عیب اور اتہام لگا کر اور جو ان کا یہ جرم کسی نے ظاہر کر دیا

تو تمہیں کہا کر سزا سے بچ گئے یہ دستور کر رکھا ہے۔ لیکن ساء ما کانوا یعملون یہ بہت بڑی بات ہے اب ان کے اس جرم کے ارتکاب کا سبب بیان فرماتا ہے ذالک بانھم آمنوا ثم کفروا کہ وہ زبان سے ایمان لائے پر دل سے منکر ہو گئے یا یوں کہو کہ اول ایمان لائے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں کافر و مرتد دل میں ہو گئے فطبع علی قلوبھم پھر ان کے دلوں پر مہر لگ گئی، فھم لا یفقھون پھر کچھ نہیں سمجھتے حق و باطل میں امتیاز نہ رہا۔ اب اس کے بعد ان کی ظاہری حالت بیان فرماتا ہے۔ واذا رأیتھم تعجبک اجسامھم کہ بڑے چیرہ پھبنے ڈیل ڈول کے خوبصورت بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں، وان یقولوا تسمع لقولھم اور خوش بیان دچرب زبان بھی ہیں کہ مجلس میں بات کریں تو ان کی بات کان لگا کر دھیان سے سنی جائے مگر یہ ظاہر کا ڈھول ہے اندر سے خالی ہیں۔ کانھم خشب مسندۃ گویا وہ دیوار سے لگی ہوئی لکڑیاں ہیں کیونکہ خشک لکڑی جلنے کے سوا اور کسی کام میں نہیں آتی ہے اس لئے ایسی لکڑیوں کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے ہیں۔ انھیں خود کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہیں یہ حال ان منافقوں کا ہے نکمے ہیں۔ دل خالی ہیں خیر دایمان سے، جہنم میں جلانے کے قابل ہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں اس لئے کہ دلوں پر مہر ہے کوئی بات خود حق و باطل کی سمجھ نہیں سکتے،

منافقین کو دعوت کفران کا اسکی قبولیت سے انکار:۔ ملعون منافقین کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان کے گناہوں پر جب ان سے سچے مسلمان کہتے ہیں کہ آؤ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا تو یہ تکبر کے ساتھ سر ہلانے لگتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں اور رک جاتے ہیں، اس کا بدلہ یہی ہے کہ اب ان کے لئے بخشش کے دروازے بند ہیں نبی کا استغفار بھی انھیں کچھ نفع نہ دے گا بھلا ان فاسقوں کی قسمت میں ہدایت کہاں؟ سورہ براءت میں بھی اس مضمون کی آیت گذر چکی ہے۔ اور وہیں اسکی تفسیر اور ساتھ ہی اسکے متعلق کی حدیثیں بھی بیان کر دی گئی ہیں، ابن ابی حاتم میں ہے۔ سفیان منافق نے اپنا منہ دائیں جانب پھیر لیا تھا اور غضب و تکبر کے ساتھ ترچھی آنکھ سے گھورا تھا اسی کا ذکر اس آیت میں ہے۔ اور سلف میں سے اکثر حضرات کا فرمان ہے کہ یہ سب کا سب بیان عبداللہ بن ابی بن سلول کا ہے۔ جیسے کہ عنقریب آ رہا ہے۔

سیرت محمد ابن اسحاق میں ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی قوم کا بڑا شخص تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھتے تھے تو یہ کھڑا ہو جاتا تھا اور کہتا تھا لوگو یہ ہیں اللہ کے رسول جو تم میں موجود ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا اکرام کیا اور تمہیں عزت دی اب تم پر فرض ہے کہ تم آپ کی مدد کرو اور آپ کی عزت و تکریم کرو اور آپ کا فرمان سنو اور جو فرمائیں بجا لاؤ یہ کہہ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ احد کے میدان میں اس کا نفاق کھل گیا اور یہ وہاں سے حضور کی کھلی نافرمانی کر کے تہائی لشکر کو لے کر مدینہ کو واپس لوٹ آیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد سے فارغ ہوئے اور مدینہ میں بخیریت تشریف لائے۔ جمعہ کا دن آیا اور آپ منبر پر چڑھے تو حسب عادت یہ آج بھی کھڑا ہوا اور کہنا چاہتا ہی تھا کہ بعض صحابہ ادھر ادھر سے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے کپڑے پکڑ کر کہنے لگے او دشمن خدا بیٹھ جا تو اب یہ کہنے کا منہ نہیں رکھتا تو نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اب تو اس کا اہل نہیں زبان سے جو جی میں آئے بکا کرے، وہ ناراض ہو کر لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا باہر نکل گیا اور کہتا جاتا تھا کہ گویا میں کسی بات کے کہنے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ میں تو اسکا کام مضبوط کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ چند انصاری اسے مسجد کے دروازے پر مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ تو کہا کہ میں تو اس کا کام مضبوط کرنے کے لئے کھڑا ہوا تھا جو چند اصحاب مجھ پر اچھل کر آ گئے مجھے گھسیٹنے لگے، اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے گویا کہ میں کوئی بات بری کہنے کے لئے کھڑا ہوا تھا حالانکہ میری نیت یہ تھی کہ میں آپ کی باتوں کی تائید کروں اس پر ان انصاریوں نے کہا خیر اب تم واپس چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے عرض کریں گے، آپؐ تمہارے لئے خدا سے بخشش چاہیں گے، اس نے کہا مجھے کوئی ضرورت نہیں، حضرت قتادہؓ
اور حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی کے بارے میں اتری ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ اس کی قوم کے ایک
نوجوان مسلمان نے اس کی ایسی چند بری باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
اسے بلوایا تو یہ صاف انکار کر گیا۔ اور قسمیں کھا گیا۔ انصاریوں نے اس صحابی کو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کی اور اسے
جھوٹا جانا، اس پر یہ آیتیں اتریں اور اس منافق کی جھوٹی قسموں کا اور اس نوجوان صحابی کی صداقت کا اللہ تعالیٰ نے
بیان فرمایا اب اس سے کہا گیا کہ تو چل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغفار کر تو اس نے انکار کے لہجے میں سر ہلا دیا
اور نہ گیا۔ ابن حاتم میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ جس منزل پر اترتے وہاں سے کوچ نہ
کرتے جب تک نماز نہ پڑھ لیں غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ عبد اللہ بن ابی کہہ رہا ہے کہ ہم
عزت والے ان ذلت والوں کو مدینہ پہنچ کر نکال دیں گے۔ پس آپ نے آخری دن میں اترنے سے پہلے ہی کوچ کر دیا
اس سے۔۔ کہا گیا کہ حضورؐ کے پاس جا کر اپنی خطا کی معافی اللہ سے طلب کر اس کا بیان اس آیت میں ہے۔ اس کی اسناد
سعید بن جبیرؓ تو صحیح ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کا ہے اسمیں تامل ہے۔ بلکہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے کہ
عبد اللہ بن ابی بن سلول تو اس غزوہ میں تھا ہی نہیں بلکہ لشکر کی ایک جماعت کو لے کر یہ تو لوٹ گیا تھا۔ کتب سیر و مغازی
کے مصنفین میں تو یہ مشہور ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ مریسیع یعنی غزوۂ بنو المصطلق کا ہے۔ چنانچہ اس قصہ میں حضرت محمد بن
یحییٰ بن حبان اور حضرت عبد اللہ بن ابو بکر اور حضرت عاصم بن عمر بن قتادہؒ سے منقول ہے کہ اس لڑائی کے موقعہ
پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جگہ قیام تھا وہاں حضرت جہجاہؓ بن سعید غفاری اور حضرت سنانؓ بن یزید کا پانی
کے ازدحام پر کچھ جھگڑا ہو گیا۔ جہجاہ حضرت عمرؓ کے کارندے تھے جھگڑے نے طول پکڑا سنان نے انصاریوں کو اپنی
مدد کیلئے آواز دی اور جہجاہ نے مہاجرین کو اس وقت حضرت زیدؓ بن ارقم وغیرہ انصار کی ایک جماعت عبد اللہ بن
ابی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے جب یہ فریاد سنی تو کہنے لگا لو ہمارے ہی شہروں میں ان لوگوں نے ہم پر حملے شروع
کر دئے۔ خدا کی قسم ہماری اور قریشیوں کی مثال وہی ہے جو کسی نے کہا ہے کہ اپنے کتے کا موٹا تازہ بچہ اپنے ہی کو
کاٹے۔ خدا کی قسم اگر ہم لوٹ کر مدینہ گئے۔ تو ہم ذی مقدور لوگ ان بے مقدوروں کو وہاں سے نکال دیں گے
پھر اس کی قوم کے جو لوگ اس کے پاس بیٹھے تھے ان سے کہنے لگا کہ یہ سب آفت تم لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے اوپر
لی ہے۔ تم نے انہیں اپنے شہر میں بسایا تم نے انہیں اپنے مال کا آدھا حصہ دیا اب بھی اگر تم ان کی مالی امداد نہ کرو تو یہ خود
تنگ آکر مدینہ سے نکل بھاگیں گے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تمام باتیں سنیں آپ اس وقت بہت کم
عمر تھے، سیدھے سرکار نبوت میں حاضر ہوئے۔ اور کل واقعہ بیان فرمایا۔ اس وقت آپ کے پاس حضرت عمر بن خطاب رضی
اللہ تعالیٰ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ غضب ناک ہو کر فرمانے لگے، یا رسول اللہ عباد بن بشر کو حکم فرمائیے کہ اس کی گردن
الگ کر دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو لوگوں میں مشہور ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کی
گردنیں مارتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں جاؤ لوگوں میں کوچ کی منادی کر دو، عبد اللہ بن ابی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس گفتگو کا علم
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گیا ہے تو بہت سٹ پٹایا اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عذر معذرت اور حیلے حوالے
تاویل اور تحریف کرنے لگا اور قسمیں کھا گیا کہ میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا، چونکہ یہ شخص اپنی قوم میں بڑی عزت اور باوقعت
تھا اور لوگ بھی کہنے لگے حضورؐ شاید اس بچے نے ہی غلطی کی ہو اسے وہم ہو گیا ہو واقعہ ثابت ہوتا نہیں۔ حضور یہاں سے
جلدی ہی کوچ کے وقت سے پہلے ہی تشریف لے چلے۔ راستے میں حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے اور آپؐ کی شان

نبوت کے قابل باادب سلام کیا پھر عرض کیا کہ حضور آج کیا بات ہے جو وقت سے پہلے ہی جناب نے کوچ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ تمہارے ساتھی ابن ابی نے کیا کہا وہ کہتا ہے کہ مدینہ جاکر ہم عزیز ان ذلیلوں کو نکال دیں گے، حضرت اسید رضؓ نے کہا یا رسول اللہؐ عزت والے آپ ہیں اور ذلیل وہ ہے۔ یا رسول اللہ آپؐ اسکی باتوں کا خیال بھی نہ فرمائیے دراصل یہ بہت ہی جلا ہوا ہے۔ سنیئے اہل مدینہ اسے سردار بنانے پر اتفاق کر لیا تھا تاج تیار ہو رہا تھا کہ اللہ رب العزت آپ کو لایا اس کے ہاتھ سے ملک نکل گیا۔ بس یہ چراغ پا ہو رہا ہے۔ حضورؐ چلتے ہی رہے دوپہر کو ہی چل دیئے تھے شام ہوئی رات ہوئی صبح ہوئی یہاں تک کہ دھوپ میں تیزی آگئی۔ تب آپؐ نے پڑاؤ کیا تاکہ لوگ اس بات پر پھر نہ الجھ جائیں، چونکہ تمام لوگ تھکے ہارے اور رات کے جاگے ہوئے تھے اترتے ہی سب سو گئے ادھر یہ سورۃ نازل ہوئی (سیرۃ ابن اسحاق) بیہقی میں ہے کہ ہم غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو پتھر مار دیا اسی پر بات بڑھ گئی اور دونوں نے اپنی اپنی جماعت سے فریاد کی اور انہیں پکارا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ یہ کیا جاہلیت کی بات لگانے لگے؛ اس فضول اور خراب عادت کو چھوڑو، عبداللہ بن ابی بن سلول کہنے لگا اب مہاجر یہ کرنے لگ گئے، اللہ کی قسم مدینہ پہنچتے ہی ہم ذی عزت ان ذلیلوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے، اس وقت مدینہ شریف میں انصار کی تعداد مہاجرین سے بہت زیادہ تھی۔ گو بعد میں مہاجرین بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب ابن ابی کے اس قول کا علم ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کے قتل کرنے کی اجازت چاہی مگر آپؐ نے روک دیا۔

مسند احمد میں حضرت زید بن ارقم سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک میں میں نے جب اس منافق کا یہ قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا۔ اور اس نے آکر انکار کیا اور قسمیں کھا گیا، اس وقت میری قوم نے مجھے بہت کچھ برا کہا اور ہر طرح ملامت کی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نہایت غمگین دل ہو کر وہاں سے چل دیا اور سخت رنج و غم میں تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یاد فرمایا، اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرا عذر نازل فرمایا، اور تیری سچائی ظاہر کی ہے اور آیت اتری ھم الذین الخ یہ حدیث اور بھی بہت سی کتابوں میں ہے۔ مسند احمد میں حضرت زیدؓ بن ارقم کا بیان اس طرح ہے کہ میں اپنے چچا کے ساتھ ایک غزوہ تھا اور میں نے عبداللہ بن ابی کی یہ دونوں باتیں سنیں میں نے اپنے چچا سے بیان کیں اور میرے چچا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیں جب آپؐ نے اسے بلایا اس نے انکار کیا اور قسمیں کھا گیا تو حضور نے اسے سچا اور مجھے جھوٹا جانا میرے چچا نے بھی مجھے بہت برا بھلا کہا کہ مجھے اس قدر غم اور ندامت ہوئی کہ میں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ یہ سورۃ اتری اور آپؐ نے میری تصدیق کی اور مجھے یہ سنائی مسند کی اور روایت میں ہے کہ ایک سفر کے موقع پر جب صحابہ رضی اللہ عنہ کو تنگی پہنچی تو اس نے انہیں کچھ دینے کی ممانعت کر دی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں اس لئے بلوایا کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں تو انہوں نے اس سے بھی منہ پھیر لیا۔ قرآن کریم نے انہیں ایندھن یعنی جلنے والی لکڑیوں سے مشابہت دی ہے۔ ترمذی وغیرہ میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ ہمارے ساتھ کچھ بدوی بھی تھے۔ پانی کی جگہ پہلے وہ پہنچنا چاہتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی اسی کوشش میں تھے ایک مرتبہ ایک اعرابی نے جاکر پانی پر قبضہ کر کے حوض پر پڑ گیا اور اس کے اردگرد پتھر رکھ دیئے اور اوپر سے چمڑا پھیلا دیا ایک انصاری نے آکر حوض میں سے اپنے اونٹ کو پانی پلانا چاہا اس نے روکا انصاری نے پلانے پر زور دیا اس نے ایک لکڑی اٹھا کر انصاری کے سر پر ماری جس سے اسکا سر زخمی ہو گیا یہ چونکہ عبداللہ بن ابی کا ساتھی تھا سیدھا اس کے پاس آیا اور تمام ماجرا سنایا عبداللہ بہت بگڑا اور کہنے لگا اعرابیوں کو کچھ نہ دو یہ

خود بھوکے مرتے بھاگ جائیں گے۔ یہ کھانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آجاتے تھے، اور کھالیا کرتے تھے، تو عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ تم حضور کا کھانا ایسے وقت لے جاؤ جب یہ لوگ نہ ہوں۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھالیں گے یہ رہ جائیں گے، یونہی بھوکوں مرتے مرتے بھاگ جائیں گے، اور ہم مدینہ جا کر ان کمینوں کو نکال باہر کریں گے، میں اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردیف تھا، اور میں نے یہ سب سنا اپنے چچا سے ذکر کیا، چچا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، آپؐ نے اُسے بلوایا وہ انکار کر گیا اور حلف اٹھالیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے سچا سمجھا اور مجھے جھوٹا قرار دیا، میرے چچا میرے پاس آئے۔ اور کہا کہ یہ تم نے کیا حرکت کی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم سے ناراض ہو گئے، اور تجھے جھوٹا جانا۔ اور دیگر مسلمانوں نے بھی تجھے جھوٹا سمجھا، مجھ پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، سخت غمگین حالت میں سر جھکائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر گذری ہو گی جو آپؐ میرے پاس آئے میرا کان پکڑا جب میں نے سر اٹھایا تو آپ کی طرف دیکھا تو آپ مسکرائے اور چلائے، اللہ کی قسم مجھے اسقدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر دنیا میں ابدی زندگی مجھے مل جاتی جب بھی میں اتنا خوش نہ ہو سکتا تھا۔ پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے کیا کہا؟ میں نے کہا کہ فرمایا تو کچھ بھی نہیں مسکراتے ہوئے تشریف لے گئے، آپ نے فرمایا بس خوش رہو آپ کے بعد ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور یہی سوال مجھ سے کیا، اور میں نے یہی جواب دیا، صبح کو سورۂ منافقون نازل ہوئی: دوسری روایت میں اسی سورہ کا مِنْهَا الْأَذَلَّ تک پڑھنا بھی مروی ہے۔

عبد اللہ بن لہیعہ اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی اس حدیث کو مغازی میں بیان کیا ہے، لیکن ان دونوں کی روایت میں خبر پہنچانے والے کا نام اوس بن اقرم ہے۔ جو قبیلہ بنو حارث بن خزرج میں سے تھا، تو ممکن ہے کہ حضرت زیدؓ ابن ارقم نے بھی خبر پہنچائی ہو۔ اور حضرت اوس نے بھی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ راوی سے نام میں غلطی ہو گئی ہو، واللہ اعلم،

ابن حاتم میں ہے کہ واقعہ غزوۂ مریسیع کا ہے۔ یہ وہ غزوہ ہے، جس میں حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیج کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مناۃ بت کو تڑوایا تھا جو قفا مشلل اور سمندر کے درمیان تھا، اس غزوہ میں دو شخصوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا، ایک مہاجر تھا دوسرا قبیلہ بہز کا تھا اور قبیلہ بہز انصاریوں کا حلیف تھا، بہزی نے انصاریوں کو اور مہاجر نے مہاجرین کو آواز دی کچھ لوگ دونوں طرف کھڑے ہو گئے، اور جھگڑا ہونے لگا۔ جب ختم ہوا تو منافق لوگ عبد اللہ بن ابی کے پاس جمع ہو گئے اور کہنے لگے ہمیں تو تم سے بہت کچھ امیدیں تھیں، تم ہمارے دشمنوں سے ہمارا بچاؤ کرتے تھے۔ اب تم بے کار ہو گئے نہ نفع کا خیال ہے نہ گردان کا، تم نے ہی ان جلابیب کو اتنا چڑھا دیا کہ بات بات پر ہم پر چڑھ دوڑیں، نئے مہاجرین کو یہ لوگ جلابیب کہتے تھے، اس دشمن خدا نے یہ جواب دیا کہ اب مدینہ پہنچتے ہی ان سب کو وہاں سے دیس نکالا دیں گے، مالک بن دخشن جو منافق تھا اس نے کہا کہ میں تو تمہیں پہلے سے ہی کہتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ سلوک کرنا چھوڑ دو خود بخود منتشر ہو جائیں گے، یہ باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سن لیں۔ اور خدمت نبوی میں آکر عرض کرنے لگے کہ اس بانیٔ فتنہ عبد اللہ بن ابی کا قصہ پاک کرنے کی مجھے اجازت دیجیئے، آپؐ نے فرمایا اچھا اگر اجازت دوں تو کیا تم اسے قتل کر ڈالو گے، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ خدا کی قسم ابھی اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مار دوں گا، آپ نے فرمایا، اچھا بیٹھ جاؤ، اتنے میں حضرت اسید بن حضیرؓ بھی یہی کہتے ہوئے آئے۔ آپ نے ان سے بھی یہی پوچھا اور انھوں نے بھی یہی جواب دیا، آپؐ نے انہیں بھی بٹھا دیا پھر تھوڑی دیر گذری ہو گی جو کوچ کرنے کا حکم دیا، اور وقت سے پہلے ہی لشکر نے کوچ کیا وہ دن رات، دوسری صبح تک برابر چلتے رہے جب دھوپ میں تیزی آگئی اترنے کو فرمایا پھر دوپہر ڈھلتے ہی جلدی سے کوچ کیا اور اسی طرح چلتے رہے تیسرے دن صبح کو قفا مشلل سے مدینہ شریف پہنچ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوایا ان سے پوچھا، اگر میں اسے قتل کرنے کا تمکو حکم دیتا تو تم اسے

مار دیتے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یقیناً میں اس کا سر تن سے جدا کر دیتا ، فرمایا اگر تم اسے اس دن قتل کر دیتے تو بہت سے لوگوں کی ناک خاک آلود ہو جاتی کہ میں اگر انہیں کہتا تو وہ بھی اسے مار ڈالنے میں تامل نہ کرتے پھر لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو بھی بے دردی کے ساتھ مروا ڈالتا ہے۔ اس واقعہ کا بیان ان آیتوں میں ہے یہ سیاق بہت غریب ہے۔ اور اس میں بہت سی ایسی عمدہ باتیں ہیں جو دوسری روایتوں میں نہیں۔

سیرۃ محمد بن اسحاق میں ہے کہ عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو سچے مسلمان تھے اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گزارش کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے سنا ہے کہ میرے باپ نے جو بکواس کی ہے اس کے بدلے آپ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں اگر یونہی ہے تو اس کے قتل کا حکم آپ کسی اور کو نہ کیجئے میں خود جاتا ہوں اور ابھی اس کا سر آپ کے قدموں تلے ڈال دیتا ہوں۔ قسم خدا کی قبیلہ خزرج کا ایک ایک شخص جانتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے احسان و سلوک اور خدمت و عزت کرنے والا نہیں (لیکن میں فرمان رسول پر اپنے پیارے باپ کی گردن مارنے کو تیار ہوں) اگر آپ نے کسی اور کو حکم دیا اور اس نے انہیں مارا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں جوش انتقام میں میں اسے نہ مار بیٹھوں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر یہ حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی تو میں ایک کافر کے بدلے ایک مسلمان کو مار کر جہنمی ہو جاؤں گا آپ میرے باپ کے قتل کا حکم نہ دیجئے۔ آپ نے فرمایا میرا اسے قتل کرنا نہیں چاہتا ہم تو اس سے اور نرمی برتیں گے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کریں گے، جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اور حضرت ابن زید رح کا بیان ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر سمیت مدینے پہنچے تو اس منافق عبداللہ بن ابی کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مدینہ شریف کے دروازے پر کھڑے ہو گئے، تلوار کھینچ لی، لوگ مدینہ میں داخل ہونے لگے، یہاں تک کہ ان کا باپ آیا تو یہ فرمانے لگے کہ پرے رہو مدینہ میں نہ جاؤ۔ اس نے کہا کیا بات ہے؟ مجھے کیوں روک رہا ہے؟ حضرت عبداللہ رض نے فرمایا تو مدینہ میں نہیں جا سکتا جب تک اللہ کے رسول تیرے لئے اجازت نہ دیں، عزت والے آپ ہی ہیں، اور تو ذلیل ہے۔ وہ کھڑا رہ گیا یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ کی عادت مبارک تھی کہ لشکر کے آخری حصے میں ہوتے تھے۔ آپ کو دیکھ کر اس منافق نے اپنے بیٹے کی شکایت کی آپ نے اس سے پوچھا کہ اسے کیوں روک رکھا ہے؟ انہوں نے کہا قسم ہے خدا کی جب تک آپ کی اجازت نہ ہو یہ اندر نہیں جا سکتا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، اب حضرت عبداللہ نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے دیا۔ مسند حمیدی میں ہے۔ کہ آپ رض نے اپنے والد سے کہا جب تک تو اپنی زبان سے یہ نہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں اور میں ذلیل تو مدینہ میں نہیں جا سکتا اور اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے باپ کی ہیبت کی وجہ سے میں نے آج تک نگاہ اونچی کر کے ان کے چہرے کو نہیں دیکھا لیکن آپ اگر اس پر ناراض ہیں تو مجھے حکم دیجئے ابھی اس کی گردن حاضر کرتا ہوں۔ کسی اور کو اس کے قتل کا حکم نہ دیجئے ایسا نہ ہو کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو اپنی آنکھوں چلتا پھرتا نہ دیکھ سکوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ

اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد (مراد اس سے کثرت دنیا ہے) اللہ کی یاد (مراد اس سے عبادت ہے یعنی دین ہے) غافل نہ کرنے

عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ⓽

پاویں　　اور جو ایسا کرے گا　　ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں (اور نقصان اٹھانے والے ہیں)

وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

ذیعہ کا حکم کیا جاتا ہے کہ جو ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اسمیں سے حقوق واجبہ) اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو

فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَ

پھر وہ (بطور تمنا و حسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھکو اور تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور

أَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ

نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اسکی میعاد (عمر کے ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا

أَجَلُهَا ط وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے (ویسی ہی جزا کے مستحق ہوں گے)

ترکیب فیقول بالنصب بعد الفاء الواقعۃ فی جواب الامر وانفقوا لاحد ف التحضیض معناھا حض علی الفعل ان دخلت علی المضارع ولوم ان دخلت علی الماضی فاصدق بالنصب لوقوعہ فی جواب لولا واصلہ اتصدق والجمہور علی ادغام التاء فی الصاد ، واکن اصلہ اکون سقطت الواو بالجزم عطفا علی محل فاصدق کانہ قیل ان اخرتنی واکن وقری اکون بالنصب عطفا علی لفظہ فاصدق ، لن یؤخر الخ الجملۃ تدل علی جواب اذا جاء :-

تفسیر منافقوں کی افسوسناک حالت بیان فرماکر مسلمانوں کو یاد الٰہی اور خیرات کی طرف ابھارتا ہے اور ایک ناگہانی آجانے والے وقت سے ڈراتا ہے فقال، یاَیُّھا الذین اٰمنوا - کہ اے ایماندارو مال اور اولاد کے شغل میں اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو جانا اور جو غافل ہو گیا، فاولٰئک ھم الخاسرون وہ تو بڑے نقصان میں ہے یہ مانا کہ حق سے غافل ہو کر آپ نے بہت مال جمع کیا نقد، بڑی جائداد یں حاصل کیں زیور، جواہرات، ہاتھی، گھوڑے شال، دوشالے کی کوئی کمی نہیں رہی مکان بھی اور ان میں باغ بھی بہت آراستہ کئے نہریں بھی ہیں - حوض چھلک رہے ہیں عیش و نشاط کے ہزاروں سامان موجود ہیں۔ خوبصورت ماہر عورتیں بھی بناؤ سنگار کئے ان باغوں میں آپکے ساتھ گا بجا کر دل بہلا رہے ہیں اولاد بھی ہے - مگر عمر گراں مایہ کہاں وہ جوانی اور طبیعت کے جوش نہ رہے تو سب ہیچ دنیا ہی معلوم ہونے لگا پھر ایک دن چلا نے سب کچھ یہیں پڑا رہا ایک گڑھے میں پڑے ہیں۔

کسی شاہی اجڑی ہوئی دارالامارۃ کو دیکھ لو اور خیال کرو کہ کبھی یہاں کس قدر مہ جبیں عورتیں جواہرات میں غرق پھرتی ہوں گی ، مکان اور باغوں کی روشیں کیسی آراستہ ہوں گی - باہر سینکڑوں سپاہ کمر بستہ کھڑے ہوں گے اور کیا کیا ہوگا ہائے مگر آج کچھ بھی نہیں الا جنیں عورتوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں کہ اس محل کا حال اس سے ہی دریافت کرتے اور نہ تاریخ ایسی ملتی ہے جس سے اس زمانہ کے بارے میں کچھ معلومات ہو سکیں کہ وہ بے شمار فوج ہزاروں ہاتھی گھوڑے جو آراستہ پیراستہ کھڑے رہتے تھے اب کہاں روپوش ہو گئے خدا معلوم اس محل کو کن کن ہاتھوں نے بنایا ہوگا اب نہ محل ہی رہا اور نہ رہنے والے اور نہ ہی بنانے والے جس عیش پر یہ فنا اور اس پر مرنے والوں پر تلف ہے - چند روز کے بعد ہڈیوں کے ریزے ریزے ہو گئے یہ سب عیش خواب پریشان معلوم ہونے لگا گناہوں کا بوجھ سر پر اور وبال ہمیشہ رہتا ہے - افسوس اسکا کوئی سامان

نہیں پھر ہمیشہ طرح طرح کی ذلت اور اذیت اور حسرت و ندامت اگر خسارہ اور نقصان نہیں تو اور کیا ہے لعنت ہے اس تھوڑی دیر کے عیش پر جس کے بعد ہمیشہ کی مصیبت ہو۔

بس دار الآخرت کا توشہ تو وہ کیا ہے؟ یاد الٰہی اسے ایک گھڑی بھی نہ بھولو روح جو بر لطیف ہے آلودگی جسمانی سے یہ اس تو رتقیقی کی طرف متوجہ ہونے میں پس و پیش کرتی ہے۔ اور دنیا کی لذتوں پر گر پڑتی ہے۔ یہ اس کے حق میں زہر ہے اس کو روک تھام کر اسکی یاد میں رکھنا سعادت ہے۔ اسکے بعد اسکی رضامندی کے لئے مال جو تمام آسائش دنیاوی اور جملہ خلافات کا ذریعہ ہے۔ اسکے دینے کا حکم کرتا ہے وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم کہ ہمارے دئے میں سے دو جس طرح ذکر اللہ میں نماز فرائض یا نوافل حج وغیرہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ عام مراد تھی نماز روزہ حج بھی اور ایسے ذکر و فکر مراقبہ بھی ہو۔ اسی طرح یہاں خرچ کرنے سے خاص زکوٰۃ و صدقات واجبہ مراد نہیں بلکہ عام ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ یہ کام بہت جلد کرو پرسوں کے آنے والے سامانوں پر منحصر نہ رکھو کہ یوں ہوگا اور اس قدر ہو جائے گا۔ تب دیں گے اور فرصت سے اللہ کو یاد بھی کیا کریں گے۔ اس لئے کہ موت کا کوئی وقت متعین نہیں۔ ہر وقت کھٹکا لگا ہوا ہے۔ عمر بھر تو یاد الٰہی نہ کی حتیٰ کہ نماز پنجگانہ سے بھی غافل پڑے رہے اللہ کی راہ میں کوڑی تک نہ دی۔ زکوٰۃ و صدقات واجبہ بھی نہ دئے۔ اور خیالات دنیاوی میں بے فکر تھے کہ موت کے سامان پیدا ہو گئے اور یقین ہو گیا کہ اب ان سب رفیقوں کو چھوڑتے ہیں ایسا کہ پھر کبھی یہاں آنا نہ ہوگا تو اب لگے حسرت و افسوس سے یہ کہنے کہ اے خدا مجھے ذرا تو مہلت دے کہ میں خیرات دے لوں نیک ہو جاؤں مگر اس وقت کس کو ایک ذرا کی بھی مہلت نہیں اللہ دیتا، لہذا اب تم کو مہلت بہت ہے۔ جو نیک کام یا فرائض واجب ہیں کر لو کیونکہ اللہ جل مجدہٗ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اور وہ تمہارے ذرا ذرا سے کاموں سے بخوبی خبردار ہے۔ اس سے کوئی تمہارا فعل پوشیدہ نہیں ہے۔

سورۃ التغابن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ج لَهُ الْمُلْكُ

سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اللہ کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان کرتی ہیں   اسی کی سلطنت ہے

وَلَهُ الْحَمْدُ ز وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ هُوَ الَّذِيْ

اور وہی تعریف کے لائق ہے   اور وہ ہر شے پر   قادر ہے   وہی ہے جس نے تم کو

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا

پیدا کیا ہے   سو باوجود اس کے بھی تم میں بعضے کافر ہیں اور بعضے مومن ہیں   اور اللہ تعالیٰ

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ

تمہارے اعمال (ایمانیہ و کفریہ) کو دیکھ رہا ہے۔   اسی نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا۔

مناسبت اس سورہ کو اوّل سورہ منافقون سے مناسبت ہے۔ گذشتہ سورۃ میں منافقوں کی مذمت تھی اور اس سورۃ میں مصادقوں کی مدح و خوبی ہے اور یہ بھی ہے کہ اس سورۃ کے آخر میں تھا کہ تمہارا مال و اولاد تمہیں یاد الٰہی سے غافل نہ کرے۔ جو سراسر نقصان ہے اور موت کا ہر وقت کھٹکا ہے پھر اس وقت مہلت نیکی کرنے کی نہیں ملے گی۔ اس مضمون پر ہدایت کی اس سورۃ میں تاکید فرماتا ہے کہ اسکی یاد کچھ تم پر موقوف نہیں۔

مسبحات کی سورتوں میں سب سے آخری سورہ یہ ہی ہے۔ مخلوقات کی تسبیح الٰہی کا بیان کئی دفعہ ہو چکا ہے۔ ملک و حمد واﷲ اللہ ہی ہے۔ ہر چیز پر اس کی حکومت، ہر کام میں، اور ہر چیز کا انداز مقرر کرنے میں وہ قادر ہے۔ جس چیز کا وہ ارادہ کرے اسے پورا کرنے کی قدرت، نہ کوئی اس کا مزاحم بن سکے نہ اسے کوئی روک سکے وہ اگر نہ چاہے۔ تو کچھ بھی نہ ہو، وہ ہی تمام مخلوق کا خالق ہے۔ اس کے ارادے سے بعض انسان کافر ہوگئے، بعض مؤمن، وہ بخوبی جانتا ہے کہ مستحق ہدایت کون ہے؟ اور مستحق ضلالت کون ہے؟۔ وہ اپنے بندوں کے اعمال پر شاہد ہے۔ اور ہر ہر عمل کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس نے عدل و حکمت کے ساتھ آسمان و زمین کی پیدائش کی ہے۔ اس نے تمہیں پاکیزہ، خوبصورت شکلیں دے رکھی ہیں، جیسے اور جگہ ارشاد ہے یا ایہا الانسانُ مَا غَرَّكَ الخ۔ اے انسان تجھے تیرے رب کریم سے کس نے غافل کر دیا، اس نے تجھے پیدا کیا، پھر درست کیا اور جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دی، اور جگہ ارشاد ہے۔ اللہ الذی جعل لکم الارض قرارًا الخ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرار گاہ اور آسمان کو چھت بنایا، اور تمہیں بہترین صورتیں دیں اور پاکیزہ چیزیں کھانے کو عنایت فرمائیں آخر سب کو اسی طرف لوٹنا ہے، آسمان و زمین۔ اور ہر ہر نفس کل کائنات کا علم اسے حاصل ہے۔ یہاں تک کہ دل کے ارادوں اور پوشیدہ باتوں سے بھی۔

یسبح للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض، کہ آسمان و زمین کے رہنے اسکی ہر وقت تسبیح و تقدیس کیا کرتے ہیں اور وہ اسی۔۔ کے لائق بھی ہے۔ اس لئے کہ لہ الملک ولہ الحمد بادشاہت و ستائش اسی کی ہے۔ بادشاہت حقیقی کے تو کیا کہنے ہیں مجازی بادشاہت جسکو حاصل ہوتی ہے۔ سب اسی کی طرف جھکتے ہیں۔ اسی کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ ہر ایک رعیت اسی طرف دوڑتی ہے پھر جب کہ بادشاہت میں صفات حمیدہ بھی ہوں۔ (جن کی طرف لہ الحمد میں اشارہ ہے۔ اس لئے کہ حمد کسی نہ کسی ذاتی یا صفاتی خوبی پر ہوا کرتی ہے۔ اور اس لئے اس جملہ کو بعد میں ذکر کیا) تو اور بھی مرغوب و محمود ہوتا ہے چہ جائیکہ بادشاہ حقیقی ہو اور اسمیں تمام خوبیاں بھی ہوں، عفو کا دھیا، جواد کریم آنکھوں میں ہے۔ انتہائی مروت جب کوئی سامنے جا کر عذر آور ہو معاف کر دے۔ اور وھو علی کل شیئ قدیر، ہر چیز پر قادر بھی ہو، بھلا کرنے پر بھی اور مفرت پہنچانے پر بھی جیسا کہ وہ صاحب نعمت وجود ہے۔ ویسا ہی صاحب ہیبت و جبروت بھی ہے، ہر بادشاہ ہر بات پر قادر نہیں ہوتا۔ لیکن وہ ہر بات پر قادر ہے اسی لئے اور بھی ہر ایک مخلوق اسکی تسبیح و تہلیل کر رہی ہے۔ غیر ذوی العقول کی صرف حالت امکانیہ وصورت احتیاجیہ زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ سبوحٌ قدوسٌ لکَ الملکُ ولکَ الحمدُ۔ اور ذوی العقول میں سے ایمان دار تو زبان سے بھی ثنا خواں ہیں۔ خصوصًا ملائکہ جو بڑی جاں نثار رعیت ہے۔ ہمہ وقت اسی میں رہتی ہیں پھر اے انسان تو کیوں غافل اور مہلت چند روزہ میں دنیاوی لذات و شہوات میں مشغول ہے۔

اس کے بعد حضرت انسان کی طرف خطاب کر کے اپنے انعام و افضال سابقہ و لاحقہ یاد دلا کر تسبیح و تقدیس پر آمادہ کرتا ہے۔ (اور نبوت کا یہ فرض منصبی ہے)، فقال ھُوَ الَّذِی خلقکم، کہ اللہ جس کی ہمہ وقت تسبیح و تقدیس آسمانوں اور زمین میں ہو رہی ہے۔ وہ ہے جس نے تم کو بھی پیدا کیا۔ اس لئے وہ لائق ہے کہ تم بھی اسی کی تسبیح کرو مگر تمہاری یہ حالت ہے فمنکم کافر ومنکم مؤمن کہ تم میں سے کچھ کافر و ناشکرے ہیں نہ اللہ کو جانتے ہیں نہ مانتے ہیں تسبیح و تقدیس کیسی۔ بجائے اس کے

بغیر معبودوں کی طرف رجوع لاتے ہیں۔ اور بعض مومن ہیں اسی کی پرستش کرتے ہیں اسی کو مانتے ہیں، اس دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہیں اللہ اسکو دیکھ رہا ہے۔ ضرور جزا و سزا دے گا، واللہ بما تعملون بصیر،

اہل سنت کے نزدیک بندہ اور اسکے جملہ افعال و کفر و ایمان، نیکی و بدی اللہ کے مخلوق ہیں بدلیل قولہ تعالیٰ، واللہ خلقکم وما تعملون چونکہ بندہ کاسب ہے اس لئے اس کے اعمال کی جزا اور سزا اسکو ملتی ہے۔ اور کاسب و خالق فرق ہے معتزلہ کہتے ہیں۔ خدائے پاک کفر وغیرہ قبائح کا خالق نہیں، کیونکہ یہ اسکی تصدیق میں فرق ڈالتا ہے۔ اس لئے اس آیت کو معتزلہ نے یوں بیان کیا کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا کچھ کافر پیدا کئے، کچھ مومن اس آیت کے معنی عطاء و حسین بن فضیل وغیرہ کے نزدیک یہی ہیں کہ تم میں کچھ کافر بن گئے کچھ مومن بن گئے اور یہی سیاق کلام کے مناسب ہے، اہل سنت کا استدلال کچھ اس پر موقوف نہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ تمہیں کو پیدا نہیں کیا بلکہ خلق السموات والارض آسمانوں اور زمین کو بھی اس نے پیدا کیا یہ نہیں کہ حرکات فلکیہ اور کواکب کی تاثیرات سے حوادث ظہور کرتے ہیں اور اچھی بری صورتیں تاثیرات فلکیہ سے ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ سعادت و نحوست بھی انہیں سے ہے۔ جیسا کہ بہت حکما اور عرب و یونان و ہند وغیرہ کے لوگوں کا خیال تھا ان کا رد کرتا ہے، وصورکم فاحسن صورکم کہ تمہاری صورتیں بھی اسی کے ید قدرت نے بنائیں پھر دیکھو کیا عمدہ نقشہ کھینچا۔ ناک کی جگہ کان اور منہ کی جگہ شانے ہوتے تو کیا ہی بدنما معلوم ہوتا یہ اور بات ہے کہ انسانوں میں بھی تفاوت ہے۔ کوئی خوبصورت کوئی اس کے لحاظ سے بدصورت مگر یہ صورت بھی مناسب و اعتدال فطری کے لحاظ سے خوبصورت ہے۔ اس کی شکل کو طبعی مناسبت و اعتدال کے خلاف تصور کرکے دیکھو تو کیسا برا معلوم ہوگا۔ پھر فرماتا ہے کہ پیدا کرکے آزاد نہیں کردیا کہ آئندہ اس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ بلکہ والیہ المصیر۔ اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔ دنیا میں بھی جب اسباب منقطع ہوجاتے ہیں تو بندہ اس طرف پھر کر جاتا ہے پھر وہی سوجھتا ہے۔ اس کے بعد اپنے وصف علم کا ثبوت کرتا ہے۔ فقال یعلم ما فی السموات الخ کہ آسمانوں اور زمین کی اور تمہارے دل کی مخفی باتیں جانتا ہے۔ اسمیں تنبیہ ہے۔ منافقوں پر کہ دل میں کفر و نفاق رکھ کر خدا سے کہاں چھپاؤ گے؟۔ یہ تمام امور اسباب کی دلیل ہیں کہ وہی تسبیح اور تقدیس کے لائق ہے۔ اور جو کوئی احسان فراموشی کرکے خدا تعالیٰ سے سرکشی کرتا ہے تو وہ دنیا میں بھی گردن مروڑ دیتا ہے اس لئے کہ پہلے برباد شدہ قوموں کے حالات کی طرف اجمالاً اشارہ فرماتا ہے۔ الم یاتکم الخ کہ تمہیں پہلے لوگوں کی خبر نہیں معلوم ہوئی کہ دنیا میں بھی انھوں نے اپنے کردار کا مزہ چکھا اور آخرت میں عذاب کے حوالے ہوئے اور یہ کیوں ہوا اس لئے کہ ان کے پاس رسول نشانیاں اور معجزے لے کر آئے تو وہ منکر ہوگئے اور کہنے لگے کہ یہ بھی آدمی اور ہم بھی پھر ان میں کیا فوقیت ہے۔ جو یہ ہمکو ہدایت کرنے آئے ہیں (یعنی رسول بشر نہیں ہونا چاہیے مگر خدا مجرہو جائے تو مضائقہ نہیں) منہ موڑ لیا اور نخوت و تکبر سے بے پروائی کی پھر تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بے پروائی کی، چاہتا تو ان کو راہ راست پر لاتا۔ اور ان سے دلوں کو روشن کرتا۔ مگر متکبر سے وہ بھی متکبرانہ پیش آیا کرتے ہیں اور اسکو خاک میں ملایا کرتے ہیں اسے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ذات باری بے پرواہ ہے۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ

یہ کافر (مضمون عذاب آخرت کو منکر ہیں) دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جاویں گے، آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں واللہ ضرور دوبارہ زندہ

لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ

کیے جاؤ گے پھر جو جو کچھ تم نے کیا ہے۔ تم کو سب جتلا دیا جاوے گا، (اور اس پر سزا دیجاوے گی) اور یہ (بعث و جزا) اللہ کو بالکل آسان ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

سو تم (کو چاہیئے کہ) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر (یعنی قرآن پر) کہ ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ اور اللہ تمہارے سب

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ

اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس دن کو یاد کرو) کہ جس دن تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا، یہی دن ہے سود و

يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ

زیاں کا اور (بیان اس کا یہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہوگا اور نیک کام کرتا ہوگا اللہ تعالیٰ اسکے

عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

گناہ دور کر دیگا اور اسکو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جسمیں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَ

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے یہ (اور) بڑی کامیابی ہے اور

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ

جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا یہ لوگ دوزخی ہیں۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

اسمیں ہمیشہ رہیں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ترکیب زعم یتعدی الی المفعولین کالعلم ان مخففۃ واسمہا ضمیر الشان محذوف ای انہم لن یبعثوا فان مخففۃ مع اسمہا وخبرہا قامت المفعولین قل بلیٰ الخ لایجاب النفی وربی قسم لتبعثن جواب القسم لتنبؤن الخ جملۃ مستقلۃ داخلۃ تحت الامر وارادۃ لتاکید ما افادہ کلمۃ بلیٰ من اثبات البعث فامنوا الفاء فصیحۃ تدل علی شرط حذف لظہورہ ای اذا کان الامر کذا فامنوا باللہ الخ والجملۃ تذییلی مقرر لما قبلہ من الامر یوم قال النحاس الناصب فیہ لتنبؤن فیوم ظرفۃ وقیل خبرہ وقیل محذوف ھو اذکر وقیل مادل علیہ الکلام ای تتفاوتون یوم یجمعکم خٰلدین فیہا ابدا حال مقدرۃ وفیہ مراعاۃ معنیٰ من والذین الموصول وصلۃ مبتدا

او ذلک الخ الجملۃ خبرہ و مبتدا الخ بیان لکیفیۃ التغابن ،

تفسیر

مسئلہ توحید و نبوت کے بعد مسئلہ معاد کو بیان فرماتا ہے تاکہ بیان پورا ہو جائے ۔

خیال باطل : فقال زعم الذین کفروا الخ :۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار مشرکین کہ معظمہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد حشر نہیں ہوگا ، ان کا گمان ہے مرکر اٹھائے نہ جانے کے بارے میں کیونکہ وہ حشر کے منکر تھے اور سمجھتے تھے کہ بس مرکر خاک میں ہو گئے گویا روح بھی مر گئی بار دیگر زندہ ہونا اور حساب و کتاب کیسا ؟ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ اے محمد کہہ دیجئے ، بلیٰ کیوں نہیں قیامت ہوگی ، اٹھائے جاؤ گے ۔ پھر بلا کی تاکید کرتا ہے ۔ و ربی لتبعثن کہ اے محمد کہو کہ مجھے اپنے رب کی قسم ضرور زندہ کرکے تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے ، ثم لتنبؤن بما عملتم ، پھر تم کو بتایا جائے گا کہ تم کیا کرتے تھے یعنی نیک و بد کاموں کی جزا اور سزا ہوگی مکہ مدینہ ملک عرب اور دیگر ممالک کے باشندے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ مرکر پھر جینا نہیں ہاں اعمال کی اگر جزا اور سزا ہے تو اس زندگی میں برے کام کئے کسی کو ستایا بیمار ہو گیا اولاد مر گئی یا مال کا نقصان ہو گیا اور اچھے کام کئے تو تندرستی مال اور اولاد کی ترقی عزت و آبرو حاصل ہوگی یا دوسرے جنم میں برائی بھلائی ظاہر ہوگی بعض کا یہ تھا کہ جزا و سزا بھی کس کے ہاتھ میں نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے تو وہ قائل ہی نہ تھے ۔

دھریئے :۔ دہریئے کہتے تھے کہ طبیعت اجسام ہی مدبر ہے جس کو آجکل نیچر کہتے ہیں ۔ پس اگر خدا بھی کچھ ان کے اعتقاد میں تھا تو وہ بھی نیچر جیسا بے اختیار کہ عالم میں خلاف قانون نیچر کچھ کر نہیں سکتا جیسا کسی مشین یا کل کا محرک کہ اب اسکو چلانے کے بعد اسکو کچھ اختیار نہیں ۔ حالانکہ یہ نہ سوچا کہ جو محرک کل کو چلاتا ہے وہ اسکو روک بھی سکتا ہے)

آریہ دھرم :۔ آریہ دھرم والوں کا خدا بھی اس کے قریب ہے ۔ اس لئے وہ لوگ شہوت پرستی ، جفا کاری ، عیاری وغیرہ افعال قبیحہ کی مضرت کا کچھ زیادہ اندیشہ نہیں کرتے ، اور افعال کا حسن و قبح بھی انہیں کے خیالات ، رسم و اعتقاد پر منحصر ہے ۔ مخلوق خدا پر رحم کرنا ، نفع پہنچانا ، بڑوں کی تعظیم ، محسن کی شکر گذاری کو وہ بھی نیکی سمجھتے ہیں اور اسکے برخلاف بدی کو اسقدر سمجھنے میں ان کا کوئی خیال غلط نہیں مگر اور بہت سے بد اور بیہودہ کام ہیں جن کو یا تو وہ بد اور بیہودہ ہی سمجھتے ہیں یا اسکے برعکس وہ اسکو عبادت کا جزو سمجھتے ہیں ۔ جیسا کہ بت پرستی ، شراب خوری ، عیاری کھیل کود ، گانا بجانا ، ناچنا ، کودنا ، شادی و غمی کے بیہودہ اور لغو مصارف وغیرہ اسی طرح بہت سے نیک کاموں کو بد یا عبث سمجھتے ہیں ان سب کے فیصلے کے لئے الہام و نبوت کی ضرورت تھی ۔ اور پھر دار آخرت اور وہاں ان اعمال کی جزا و سزا دوسری زندگی میں بانا وغیرہ امور کا بیان کرنا بھی الہام ہی کا کام تھا ۔ اس لئے مسئلہ نبوت کے بعد مسئلہ حشر شروع کیا اور ان جزا امور کو ثم لتنبؤن بما عملتم میں اشارہ کردیا اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ذٰلک علی اللہ یسیر ۔ کہ بار دیگر زندہ کرنا

تکمیل الجزا

اللہ کو آسان ہے ۔ کچھ مشکل نہیں پھر جب یہ ہے تو فاٰمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا ، اللہ اور اسکے رسول اور اس نور پر کہ جس کو ہم نے نازل کیا ایمان لاؤ تاکہ تم کو اس جہان کی خوبی حاصل ہو اور وہ کس دن حاصل ہوگی ، یوم یجمعکم لیوم الجمع ، کہ جس دن وہ سب کو جمع کرے گا ، جمع کرنے کے دن یعنی قیامت میں ذٰلک یوم التغابن وہ دن خسارے کا ہے اس لئے کہ دنیا میں جن کاموں کو عمر بھر محنت اٹھا کر نیکی سمجھ کر کیا تھا آج عدالت آسمانی میں وہی سزا اور ناراضگی کے سبب ہو گئے ۔ محنت برباد گناہ لازم ہو گئے ۔ اس خسارے کو ایک اور آیت میں فرماتا ہے ۔ ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا ۔ کہ کہو کہ کہو تو میں تم کو سب سے زیادہ نقصان پانیوالے کو بتاؤں ؟ ۔ کہ جن کی دنیا کی کوشش بیکار گئی وہ سمجھتے رہے کہ ہم اچھا کر رہے ہیں ، اس دن سینکڑوں خیالات اور ہزاروں غلط مذاہب کا فساد معلوم ہو جائے گا ، پھر اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ و غبن ہوگا ۔ و التغابن تفاعل من الغبن فی

المجازات والتجارات کبیر) اور اس تغابن کے لفظ کی وجہ سے اس سورۃ کا نام تغابن ہو گیا۔
پھر اس دن کا م آنیوالی چیزیں بیان فرماتا ہے۔ ومن یؤمن باللّٰہ ویعمل صالحًا۔ کہ جو دنیا میں اللہ پر ایمان لایا اسکو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے موافق ویسا ہی جانا اور یقین کیا اور اس کے ساتھ ہی نیک کام بھی کئے، نیک وہ ہی کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے موافق ہیں۔ جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور عقل سلیم نے بعض کی تصدیق کی۔ خالی ایمان بغیر نیک کاموں کے درخت بے برگ جیسے ثمر ہے۔
یعقوب حواری اپنے خط میں بھی لکھتا ہے۔ اور اعمال کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ معاذ اللہ جس مذہب میں اعمال کوئی چیز نہ ہوں صرف ایمان کافی سمجھا جائے۔ ان کی بدکاری ظلم و عیاری عجب قدر ہو کم ہے جس کی نظیر عیسائی ممالک میں جہاں شراب وزنا کی کوئی انتہا نہیں۔ پھر اس ایمان اور اعمال صالحہ کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یکفر عنہ سیئاتہ کھلی بات یہ ہوگی کہ اس سے گناہ مثلاً بشریت سے گناہ بھی ہو گئے ہیں۔ تو ان کے لئے کفارہ اسی کے اعمال صالحہ اور ایمان ہے اور یہ سمجھ میں بھی آتا ہے اس لئے کہ دل سے خلوص و محبت رکھ کر اطاعت کرنے والے غلام کے قصور معاف ہونے کا سبب اگر ہے تو اسی کا خلوص و اطاعت ہے نہ کوئی اور وہاں اس خلوص و اطاعت پر نظر کر کے شاہی منشاء دیکھ کر اور کوئی مقرب سفارش کو سکتا ہے۔ یہاں سے شفاعت و کفارہ کا فرق بھی معلوم ہو گیا۔ گناہوں کو مٹا دینا فرمایا بخشنا نہیں کہا۔ اسمیں یہ بات ہے کہ گویا سرے سے گناہوں کا وجود ہی اس کے نامۂ اعمال میں نہ رہے گا۔ اور بخشنے میں یہ ہوتا ہے کہ گناہ تو ہیں مٹے نہیں مگر ان کی سزا سے درگذر کیا گیا۔ بلکہ ایسے مخلصین کے وہ قصور جن کے بعد وہ گریہ وزاری کر کے معافی مانگتے ہیں نیکیاں بنجاتے ہیں۔۔۔۔۔۔

تحلیل اجزا

کما قال۔ اولئک یبدل اللہ سیئاتہم حسنات۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ویدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر خالدین فیہا ابدًا کہ اسکو معاف کرنے کے بعد ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ جہاں بہتی ہوں گی۔ اور وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔ نہ وہاں سے کبھی باہر کئے جائیں گے۔ نہ موت اور بیماری دیکھیں گے۔ وہ باغ اس جہاں کے باغ نہیں۔ بلکہ دوسرے جہاں کے جہاں آدمی مرنے کے بعد ہی جاتا ہے اگر اسکی باری تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بخشش فرما دیں۔ وہاں نہ غم ہے نہ کوئی اندیشہ ہے۔ صرف سرور و فرحت ہے۔ وذٰلک الفوز العظیم۔ اور یہ بڑی مراد کا پانا ہے۔ اس سے زیادہ اور کون سی داد اور کامیابی ہوگی۔ اس کے بعد فریق مخالف کا حال بیان فرماتا ہے، والذین کفروا، اور جنھوں نے کفر کیا یعنی اللہ اور رسول کو نہ مانا وکذبوا بایاتنا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ اعمال صالحہ کے بدلے میں کیا۔ آیات سے عام مراد ہے۔ خواہ آیات الہامیہ یعنی کتاب اللہ کے مطالب۔ اور جملے ہوں؟ خواہ اسکی قدرت اور یکتائی وہ دلائل جو شب و روز بندہ کے سامنے آتے ہیں۔ اور یہ ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور یہی جھٹلانا ہے۔ ان کی اس جہان میں کیا حالت ہوگی؟۔

اولئک اصحاب النار، یہ آگ والے ہوں گے یعنی جہنم کی آگ میں جلا کریں گے، خالدین فیہا، ہمیشہ رہا کریں گے، وبئس المصیر اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ پھر اس دن سے زیادہ کون سا دن حسرت اور تغابن کا ہوگا کہ ایک فریق عزت و شادمانی کے ساتھ حیات ابدی پا کر شادمانی کے تخت پر بٹھایا جاتا ہے۔ اور دوسرا فریق ابدی قید خانہ میں ڈالا جاتا ہے۔ جہاں سوائے رونے پیٹنے چیخنے چلانے کے کوئی آرام نہیں اور نہ ہی اس سے رستگاری کی امید ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط وَمَنْ یُّؤْمِنْ

کوئی مصیبت بدون حکم خدا کے نہیں آتی　اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اسکے

بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ط وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ وَاَطِیْعُوا

قلب کو (صبر و رضا کی) راہ دکھا دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر امر میں جس میں مصائب بھی داخل ہیں

اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا

اور اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو　اور اگر تم (اطاعت سے) اعراض کرو گے (یاد رکھو کہ) ہمارے رسول کے ذمہ　صاف صاف

الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ

پہنچا دینا ہے۔　اللہ کے سوا کوئی معبود (بننے کے قابل) نہیں　اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر (مصائب وغیرہ میں)

الْمُؤْمِنُوْنَ ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ

توکل رکھنا چاہیئے　اے ایمان والو　تمہاری　بعض بیبیاں

وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ج وَاِنْ تَعْفُوْا

اور اولاد تمہارے (دین کی) دشمن ہیں　سو تم ان سے ہوشیار رہو اور ان کے ایسے امر پر عمل مت کرو) اور اگر تم

وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ اِنَّمَآ

معاف کر دو اور درگذر جاؤ اور بخشدو　تو اللہ تعالیٰ (تمہارے گناہوں کا) بخشنے والا اور تمہارے حال پر رحم کرنے والا ہے　تمہارے اموال

اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ ط وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○

اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے۔　اور (جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھیگا تو) اللہ کے پاس (اس کیلئے) بڑا اجر ہے

ترکیب　من شرطیہ یھد قلبہ جوابہ، قلبہ بالنصب والرفع فالرفع علی الفاعلیۃ والنصب علی انہ مفعول لیھد مثل نفسہ فان تولیتم شرط فانما الجملۃ جوابہ وعلی اللہ متعلق بیتوکل قدم لتخصیص عدوا بالنصب علی انہ اسم ان وخبرہ من ازواجکم واولادکم۔

تفسیر　فرمایا گیا تھا رب العزت پر ایمان لانے والے نیک کام کرنے والے فائز المرام اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل کا دنیا کا مشاہدہ کرنے پر خیال گزرتا تھا کہ بہت سے ایماندار وں، نیکوں اور اچھے عمل کرنے والوں کو ہم مصائب و آلام و پریشانیوں میں مبتلا دیکھتے ہیں، نفسیاتی طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ پھر وہ کامیابی کہاں جس کا بار با اور متعدد جگہ

قرآن کریم میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

فلسفۂ مصائب

سورہ حدید میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت اور اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اسکی مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا، اب جس شخص کو اگر کوئی تکلیف پہنچے وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے مجھے یہ تکلیف پہنچی ہے۔ پھر صبر و تحمل کرے فرمایا گیا ہے، ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ کہ کوئی مصیبت (بیماری، تنگدستی، اقارب کی موت، دشمنوں کا غلبہ، مال وجاہ کا زوال یا اسمیں کوئی فرق) بغیر حکم الٰہی انسان پر نہیں پڑتی۔ باذن اللہ کے معنیٰ۔ ابن عباس رضؓ نے امر اللہ کے بیان فرمائے، یعنی اسکی تقدیر و مشیت سے، غرض یہ ہے کہ اسمیں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ یا اس کے بعد کوئی سامان عمدہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے۔ جبکو یہ نعمت موجودہ حائل تھی یا مؤمن کا تعلق قلبی اس چیز سے اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔ یا اسکو خدا کی طرف سے اجر دینا مقصود ہوتا ہے۔ یا اسکی غفلت و معصیت کا تازیانہ ہوتا ہے کہ جلد ہوشیار ہو جائے اس سے فائز المرام ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ دنیا کا نور مراد نہیں بلکہ آخرت کا ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ، اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ وہ اس مصیبت کے رمز سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ مومن جان جاتا ہے کہ یہ مصیبت میری فلاں گناہ یا غفلت کی سزا پہنچا ہی ہیں مجھے دیدی، عقبیٰ کے عذاب سے پاک کردیا، اور یہ بھی جان جاتا ہے کہ میرا کیا تھا اس نے دیا تھا۔ اسی نے لے لیا، اب جزع و فزع گلہ و شکایت کیا؟ اسی لئے مصیبت کے وقت مؤمن انا للہ وانا الیہ راجعون کہتا ہے کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کی طرف واللہ بکل شیئ علیم میں اشارہ کرتا ہے۔ حضرت علقمہ رح کے سامنے یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ اور آپ سے اسکا مطلب دریافت کیا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ہر مصیبت کے وقت اس بات کا عقیدہ رکھے کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ پھر راضی و خوشی اسے برداشت کرے۔

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھنے لگا کہ سب سے افضل کون سا کام ہے؟ آپنے فرمایا کہ اللہ پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا، اور اسکی راہ میں جہاد کرنا۔ اس نے عرض کیا اس سے آسان بتائیے آپ نے فرمایا تو اللہ کو کسی کام میں جو تیرے لئے فیصلہ کرے متہم نہ کر یعنی جو فیصلہ قسمت کا تجھ پر جاری ہو تو اس میں اللہ تعالیٰ کا گلہ و شکوہ نہ کر اسکی رضا پر راضی رہ، ایمان باللہ اور نور معرفت کے دو راستے ہیں، نعمت کا شکر اور مصیبت پر صبر، انسان جس طرح حصول نعمت کے لئے بجا اور بیجا کوشش کرکے اپنے وقار و قرار کو برباد کرتا ہے۔ اسیطرح دفع مضرت کے لئے بھی پہلے سے ہزاروں تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ کسی کا بیٹا بیمار پڑا تو پھر علاج وغیرہ جائز تدابیر کے سوا کوئی ناجائز اور خلاف عقل طریقہ بھی نہیں چھوڑا جاتا، ٹوٹکے اور سیانے و برہمن وغیرہ کے سامنے تک ہاتھ جوڑے جاتے ہیں۔ پھر خلاف عقل وہ جو کچھ کہتے ہیں کیا جاتا ہے۔ چوراہے پر چراغ جلاتا ہے۔ نیز مقابر اولیاء کرام سے التجائیں کی جاتی ہیں۔ نیز ضبیاں لکھ لکھ کر نکالی جاتی ہیں اور کیا کیا خرافات کی جاتی ہیں۔ نیز جبکہ دیوانہ بن جاتا ہے۔ نہ دن کو چین نہ رات کو نیند کھانا پینا کیسا یہ سب کچھ ہے مگر ہوتا وہ ہی ہے جو مقدر ہو چکا ہے۔ پھر جبکو یہ یقین کامل ہو جائے کہ ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ۔ وہ کس اطمینان کے ساتھ اپنے خدائے ذوالجلال کی طرف ملتفت ہے۔ اور مصیبت واقع ہو جانے کے بعد دل ٹھہرا ہوا ہے۔ کہ یونہی مقدر الٰہی تھا، یہ باتیں والے شور و فغاں سیع یہ باتیں تیرہ سو برس ہوئے عرب کے وحشیوں کو نبوت نے تعلیم کی تھیں۔ جن پر ان کا پورا عمل تھا۔ آج ترقی یافتہ اور مہذب قومیں ان سے حصہ لینے کا قصد کر رہی ہیں یہ سب کچھ اسلام کی برکات ہیں کہ چند سالوں میں دنیائے عرب کی نہیں بلکہ دو تہائی جہان کی کایا ہی پلٹ گئی مگر افسوس صد افسوس ہم قدیمی مسلمان ان اسوۂ حسنہ سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ان جملہ امور کی پابندی مذہب اسلام کا ایک عمدہ رکن ہے۔ اس لئے فرماتا ہے۔ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کہ اللہ اور اس کے

رسول کی تابعداری کرو اور کسی دوسرے طریقہ پر نہ چلو - فان تولیتم فانما علیٰ رسولنا البلاغ المبین - اگر تم نہ مانو گے تو تمہارا ہی نقصان ہے ۔ ہمارے رسول پر کوئی الزام نہیں - اس لئے کہ اسکا کام صرف کھول کر حکم پہنچانا ہے ۔ اور یہ بھی جان لو اور خوف دھیان کرلو۔ اللہ لا الٰہ الا ھو ۔ اللہ ہی وہ ہے کہ جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں پھر اس سے سرتابی اور عدول حکمی کرکے جاؤ گے کہاں اور کرو گے کیا؟ بعض احادیث قدسیہ میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو میری بھیجی مصیبتوں پر صبر نہ کرے اور میری دی ہوئی روزی پر قناعت نہ کرے تو میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے - میری زمین پر نہ رہے اور کوئی خدا تلاش کرلے ، کس قدر توکل کی تاکید ہے - اس لئے فرماتا ہے - وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون اور اللہ پر (نہ کسی اور پر) ایمان دار بھروسہ رکھا کرتے ہیں -

ایمان کی یہی شان ہے کہ ہر کام میں اسکا اللہ پر بھروسہ ہو اور اسباب کو صرف اسباب ہی سمجھے اور یہ جانے کہ کبھی اسباب ہوتے ہیں اور کام نہیں ہوتا ، اور اسباب بھی پورے ہونے نہیں دیتا - اسباب بناتے اور بگاڑتے اسکو دیر ہی کیا لگتی ہے ، یہی اعتقاد عرب کے غریب اور بے کس مسلمانوں کا رہبر تھا - جو وہ قیصر و کسریٰ جیسے قہار بادشاہوں پر غالب آئے یہ بھی وہ شراب معرفت ہے - جس کو پی کر صرف تیس مسلمانوں نے جنگ یرموک تیس ہزار سپاہ مخالف سے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا یہی اعتقاد آدمی کو قومی کاموں میں محنت جان کی بازی لگانے پر آمادہ کردیتا ہے - ایسے لوگ دنیا میں بھی شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں ۔ توکل اور تعطل میں فرق ہے - اسباب کو ترک کرکے بیٹھنا تعطل ہے نہ توکل - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض ... اسی پر عمل بھی لاتے تھے مثلاً اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی دوا بھی کرنا چاہئے - کوئی دیوار بوسیدہ ہوگئی ہو اسکی مرمت بھی کرنا چاہئے - یہ بھی فرض کا درجہ رکھتی ہے - جبکہ اس بات کا یقین کے درجہ میں شبہ ہے - یہ دیوار گر جانے گی جسکی وجہ سے نقصان شدید ہوسکتا ہے - تو اسکی مرمت بھی ضروری ہے - اب آگے مشیت الٰہی ہے - کہ بیمار کا ہر چند علاج کیا جائے مگر وہ جانبر نہ ہوسکے - ایسے ہی خستہ دیوار کی کماحقہٗ مرمت کیجائے - مگر پھر بھی گر جائے یہ تقدیری معاملات ہیں -

احدی اور سست لوگوں نے جو کاہلی اور عیاشی کے سبب نکمے پڑے رہتے ہیں - اور ہاتھ پیر نہیں ہلاتے اگر اس سستی اور کاہلی کو توکل گرداننے لگیں تو یہ ہرگز توکل نہیں ، مومن کامل نہیں - ایمان کامل کا مزہ اسے نصیب نہیں ، رسمی اسلام کچھ کام نہیں آتا ، حقیقی ایمان اور اسلام حاصل ہونا چاہئے - توکل ترک کرا کے بیقرارانہ کوششوں کی طرف اکثر انسان کی اولاد بیوی مجبور کیا کرتی ہے - ان کی خواہش اور خانگی مصارف توکل چھڑا دیتے ہیں - نیک کاموں سے روک دیتے ہیں - اس لئے خدا تعالیٰ ان کے بیجا تعلق کے رشتہ کو قطع کرتا ہے - فقال یاایھا الذین آمنوا ان من ازواجکم واولادکم عدواً لکم اے ایمان والو تمہاری اولاد اور بیویوں میں سے تمہارے دشمن بھی ہیں حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ بعض اہل مکہ اسلام قبول کرچکے تھے - مگر زن و فرزند کی محبت نے انھیں ہجرت سے روک دیا - پھر جب اسلام کا خوب افشا ہوگیا تب یہ لوگ حاضر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے - دیکھا کہ ان سے پہلے کے مہاجرین نے بہت کچھ علم دین حاصل کرلیا ہے - اب جی میں آیا کہ اپنے بال بچوں کو سزا دیں جس پر یہ فرمان ہوا کہ ان تعفوا الخ یعنی اب درگذر کرو ...... آئندہ کے لئے ہوشیار رہو - اللہ تعالیٰ مال اور اولاد دے کر انسان کو پرکھتا ہے - کہ معصیت میں مبتلا ہونے والے کون ہیں؟ اور اطاعت گذار کون ہیں؟ -

اللہ کے پاس جو اجر عظیم ہے تمہیں چاہئے اس پر نگاہیں رکھو جیسے اور جگہ فرمان ہے ، زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ الخ یعنی بطور آزمائش کے لوگوں کے لئے دنیوی خواہشات یعنی بیویوں اور اولاد اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر مویشیوں اور کھیتی کی محبت کو زینت دی گئی ہے - مگر یہ سب کچھ دنیا کی چندروزہ زندگی کا سامان ہے - اور ہمیشگی والا اچھا ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے - مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ حضرت حسن رض اور حسین رض

لانبے لانبے کرتے پہنے آگئے دونوں بچے کرتوں میں الجھ الجھ کر گرتے پڑتے آرہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں جب ان پر پڑیں تو منبر سے اتر کر انھیں اٹھا کر لائے اور اپنے سامنے بٹھا لیا پھر فرمانے لگے اللہ تعالیٰ سچا ہے اور اس کے رسول نے بھی سچ فرمایا ہے کہ تمہارے مال واولاد فتنہ ہیں۔ ان دونوں کو گرتے پڑتے آتے دیکھ کر صبر نہ آسکا آخر خطبہ چھوڑ کر انھیں اٹھانا پڑا، مجاہد رح کہتے ہیں کہ مال واولاد وغیرہ آدمی کو معصیت اور قطع رحم پر ابھارتے ہیں۔ ہر چند نہیں کرنا چاہتا مگر پھر کرنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً میاں نہیں چاہتا کہ شادی میں ناچ وغیرہ ہو، بھانڈ کو بلائے، دولت اڑائے۔ مگر بیوی صاحبہ کے حکم سے مجبور ہے۔ اور ایسے ہی صد ہا خرافات میں مبتلا کرتے ہیں۔ ابن حاتم نے نقل کیا ہے کہ ابن عباس رض سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے۔ فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں کچھ لوگ اسلام لائے تھے وہ ہجرت کرنا چاہتے تھے ان کے بال بچے اور بیویوں نے نہ چھوڑا رونے لگے چمٹ گئے، ایسا ہی ترمذی وابن جریر نے نقل کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ فاحذروھم کہ ان سے بچو نہ یہ کہ قتل کردو مارو پیٹو اور دلی رنجش جو خلاف کرنے میں بیوی بچوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی نصیحت فرماتا ہے۔ وان تعفوا اگر تم معاف کردو، درگذر کرد، بخشدو تو بہتر ہے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ انما اموالکم واولادکم فتنۃ، مال واولاد آزمائش کی جگہ ہے۔ ان میں مسلمانوں کو اللہ سے غافل نہ ہونا چاہئیے۔ اور نہ ان کے سبب برے کام کرنا چاہئیں نہ مکارم اخلاق اور حسنات باقیات سے رکنا چاہیئے۔ یہ دنیا کے جھگڑے ہیں ان میں بقدر ضرورت مصروف ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ جانا دوسرے جہان میں ہے۔ یہ تو رستہ میں شب باشی کا سامان ہے۔ واللہ عندہ اجر عظیم جس کو حیات جاودانی کہنا چاہیئے اللہ کے پاس ہے۔ مرنے کے بعد ملیگی۔ ان من کے لفظ میں اشارہ ہے کہ سب اولاد اور بیویاں ایسی نہیں بلکہ بعض دین و دنیا میں معین اور مددگار بھی

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا

تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام کو) سنو اور مانو اور (بالخصوص مواقع حکم میں) خرچ (بھی) کیا کرو یہ تمہارے

لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ

اگر تم اللہ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ) قرض دوگے تو وہ تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخشدیگا۔

وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ○ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

اور اللہ بڑا قدردان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے) اور بڑا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا ہے اور زبردست ہے اور حکمت والا ہے

تفسیر پہلے فرمایا تھا تمہارے مال واولاد فتنہ ہیں اور اجر عظیم اللہ کے پاس ہے۔ اور انسان پھر انسان ہے اس فتنہ میں پڑ ہی جاتا ہے۔ اس لئے فرماتا ہے کہ اگر تم مال واولاد کے سبب معاصی میں مبتلا ہو جاؤ تو فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا، تو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو، اللہ اور اسکے رسول کا حکم سنو، اور حسن کرو تو یہ کفارہ زن وفرزند کی بلیا

محبت کا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورہ آلِ عمران کی آیت یاایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ الخ کی ناسخ یہ آیت ہے۔ یعنی پہلے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے اس قدر ڈرو جتنا اس سے ڈرنا چاہیئے۔ لیکن اب فرمادیا کہ اپنی طاقت کے مطابق، چنانچہ حضرت سعد بن جبیر فرماتے ہیں کہ پہلی آیت لوگوں پر بڑی بھاری پڑی تھی۔ اس قدر لمبے قیام کرتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا اور اتنے لمبے سجدے کرتے تھے کہ پیشانیاں زخمی ہوجاتی تھیں پس اللہ کریم نے یہ دوسری آیت اتار کر تخفیف کردی اور بھی بعض مفسرین نے یہی فرمایا ہے۔ اور پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری آیت کو ناسخ بتلایا ہے۔

مگر ابن عباسؓ وغیرہ علماء فرماتے ہیں یہ ناسخ ہیں۔ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اس لئے کہ حق تقاتہ کے معنی یہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ ڈرو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بندے کو اس کی طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیتا بلکہ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے کہ جہاں تک طاقت ہو۔ اور یہی ڈرنے کا حق بھی ہے۔ ابن عطا فرماتے ہیں۔ ما استطعتم اس کے لئے ہے جو اللہ سے ثواب پر راضی ہو اور جو راضی بلا ہو اس پر وہ ہی حکم حق تقاتہ ہے۔

اور مال کی محبت کا یہ کفارہ ہے۔ وانفقوا خیرا لانفسکم اسکو بھلائی کے لئے خرچ کرو اس لئے کہ جو دیدوگے وہ تمہارے ساتھ چلے گا، اس کا اجر یقیناً ملے گا۔ اور جو چھوڑ گئے وہ تمہارے پاس کام آجاتا رہا۔ یا یوں کہو کہ اجر عظیم جو اللہ کے پاس ہے۔ اسکے حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔

(۱) اللہ رب العزت سے ڈرو۔ جہاں تک ہوسکے یہ قوت نظریہ کی تکمیل ہے۔
(۲) سنو اور عمل کرو کہ قوت عملیہ کی تکمیل ہے۔ مگر یہ دونوں بدنی عبادات ہیں۔
(۳) اللہ کی راہ میں خرچ کرو یہ مالی عبادات ہے۔ لفظ خرچ ایک عام ہے۔ مراد ہے۔ زکوٰۃ ہو یا صدقات نافلہ ہوں، کیونکہ اقارب، یتامیٰ، غرباء، ومسافرین وغیرہ اس کے مستحق ہیں۔ پھر فرماتا ہے۔ کہ خرچ کرنا ان کا کام ہے۔ جو لالچی اور حریص نہیں۔ اور جو لالچ وحرص سے بچے ہوئے ہیں وہ ہی دنیا وآخرت میں کامیاب بھی ہیں بخل اور لالچ یہ عام ہے۔ مال کا ہو، جاہ کا ہو، عورت کا ہو۔ انسان کے اوصاف رزیلہ میں سے یہ بھی ایک ایسی بری خصلت ہے کہ عزت سے محروم کرتی ہے۔ اور نیک کاموں سے روکتی ہے بری باتوں چوری، قتل، غصب، جھوٹ بولنے، بدعہدی پر ابھارتی ہے عصمت پارسائی کو کھودیتی ہے۔ پھر اللہ کی راہ میں صرف کرنے کو قرض دینا فرما کر اطمینان دلاتا ہے۔ اور اس کے فوائد ظاہر کرتا ہے یعنی جو کچھ تم نے راہ خدا میں صرف کیا اس کا تم کو دو چند ثواب دے گا، یہاں تک کہ ایک کے سات سو تک ملیں گے اور اسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ اس مال کو بڑھادیگا اور یہ تجربہ ہے کہ سخی کے مال میں برکت ہوتی ہے۔
(۴) تم کو بخشدے گا اور اللہ تعالیٰ قدرداں ہے۔ حلیم بھی ہے۔ سزا دینے میں جلدی نہیں۔ پھر بندے کے اجر ضائع کرنے میں کیونکر جلدی کرے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر صبح فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اے الٰہی دینے والے کو عوض دے دوسرا یہ کہتا ہے بخیل کو برباد کر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ ابن آدم تجھے دیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم سے بچو کہ وہ قیامت کے دن ظلمات ہے۔ اور لالچ سے بچو کیونکہ پہلے تم سے جو ہلاک ہوئے اس لالچ کی وجہ سے ہوئے اس بات نے ان کو خون کرنے اور حرام چیزوں کو حلال کرنے پر آمادہ کیا

مگر صدقہ میں نیت اور خلوص پر مدار ہے۔ اس لئے قرض حسن فرمایا تھا، اسکی طرف عالم الغیب والشہادہ میں اشارہ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کہنے سے اللہ کو قرض دو یہ نہ سمجھو کہ وہ عاجز ہے بلکہ العزیز زبردست اور قادر ہے یوں نہ دوگے تو وہ برباد بھی کرسکتا ہے۔ الحکیم: اس طرح دینے میں تمہارے لئے صد ہا حکمتیں ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صدقہ غضب الٰہی کو بجھا دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔ پس یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ یہ وہ تجارت ہے کہ جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ خسارہ کا نام نہیں اور پھر کس کے ساتھ اپنے اللہ کے ساتھ اللہ جل شانہٗ اپنے بندوں کو ہر پہلو پر ان کے نیک اعمال اور تعمیل ارشاد کی وجہ سے بے پناہ نوازتا ہے

سورۃ الطلاق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

اے پیغمبر (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ (ایسی) عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو

وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ

اور تم عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیونکہ سکنیٰ مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے)

بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ

اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ

اور یہ سب خدا کے مقرر کیے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً اس عورت کو گھر سے نکال دیا) اس نے

ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا

اپنے اوپر ظلم کیا۔ کیا تجھکو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس (طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل میں) پیدا کر دے (مثلاً طلاق دینے پر ندامت ہو تو رجعی میں امکانہ اکہ ہو سکتا)

تفسیر اس سے پہلی سورۃ کے آخر میں فرمایا تھا کہ من ازواجکم واولادکم عدوا لکم فاحذروھم کہ بعض اولاد و بیویاں تمہاری دشمن ہیں ان سے بچو اور بعض مواقع پر پورا بچنا پڑتا ہے۔ یعنی طلاق دینی پڑتی ہے۔ اس لئے اس سورۃ کریمہ میں طلاق کے احکام نازل فرمائے اور عرب میں جو طلاق کے بڑے دستورات تھے۔ ان کو اٹھا کر عمدہ دستور قائم کیا۔ یعنی یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ، کہ اے نبی جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو عدت کے موقع پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو۔

اب یہ بحث کا موضوع ہو سکتا ہے کہ یاایھا النبی سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ خطاب آنحضرتؐ کی طرف ہے مگر مراد امت ہے۔ اے مسلمانوں جب تم طلاق دینا چاہو تو عدت کے موقع پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو یہ کلیہ ہے کہ جب کسی قوم

سے خطاب کرتا ہوتا ہے۔ تو اس کے رئیس سے خطاب کرکے اس قوم سے کہا جاتا ہے کہ تم ایسا کرو بعض کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واُمت دونوں کی طرف خطاب ہے۔ اس لیئے کہ اس حکم میں جس طرح امت پر پابندی ہے ویسی ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی دوسری بات یہ ہے اذا طلقتم النسآء سے یہ مراد نہیں کہ بے ضرورت اور بے قصور جب چاہو عورت کو طلاق دیدو جیسا کہ یہودی شریعت میں تھا۔ جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہود کی سخت دلی پر کمال نفرت ظاہر فرما کر ان کو اس فعل قبیحہ سے روکا اور فرمایا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو سوائے زنا کے اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری عورت سے بیاہ کرے تو وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہے زنا کرتا ہے۔ یعنی صراحتاً اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بغیر عذر صحیح اگر کوئی طلاق دیتا ہے۔ تو وہ انتہائی شقاوت قلبی کی دلیل ہے۔ اور یہ کہ وہ فعل قبیحہ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو تمہیں حکم دیا کہ طلاق نامہ دے کر اسے چھوڑ دے تو تمہاری سخت دلی کے سبب سے تھا۔ اس کی وضاحت انجیل متی میں ہے کہ عرب کا دستور بھی یہودی شریعت کے قریب قریب تھا کہ عورت گائے بھینس کی طرح سمجھی جاتی تھی چاہے رکھا جائے اپنی خواہش کے موافق یا چھوڑ دیا جائے، ہمارے بعض علماء نے بھی اذا لفظ کی تفہیم سے شاید ایسا خیال کیا ہو۔ اور دستور عرب اور ذاتی خواہش نے اس کی تائید کی ہو۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو طلاق دی وہ اپنے میکے آگئیں اس پر یہ آیت اتری اور آپ سے فرمایا گیا کہ ان سے رجوع کرو وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والی اور نماز بہت زیادہ پڑھنے والی ہیں، اور وہ یہاں بھی آپ کی بیوی ہیں اور جنت میں بھی آپ کی ازواج میں داخل ہیں۔ یہی روایت مرسلاً ابن جریر میں ہے اور سندوں سے بھی آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو طلاق دی پھر رجوع کیا،

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی صاحبہ کو حیض کی حالت میں طلاق دیدی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا آپ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ انھیں چاہیئے کہ وہ رجوع کرلیں، پھر حیض سے پاک ہونے تک روکے رکھیں، پھر دوسرا حیض آئے اور اس سے نہالیں، پھر اگر جی چاہے طلاق دیں بہر حال پاکیزگی کی حالت میں طلاق ہونی چاہیئے بات چیت کرنے سے پہلے یہی وہ عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، یہ حدیث اور بھی بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ریحان رحمۃ نے جو عزہ کے مولیٰ ہیں حضرت ابوالزبیرؒ کے سنتے ہوئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ جس نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی، تو آپؓ نے فرمایا، سنو، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں طلاق دی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے لوٹا لے تو چنانچہ ابن عمرؓ نے رجوع کیا۔ اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس کے پاک ہو جانے کے بعد اسے اختیار ہے۔ خواہ طلاق دے خواہ نہ دے۔ یعنی طہر کی حالت میں جماع سے پہلے، بہت سے بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ یعنی حالت حیض میں طلاق نہ دو، نہ اس طہر میں طلاق دو جس میں جماع ہو چکا ہو، بلکہ اسوقت چھوڑ دو۔ جب حیض آجائے پھر اس سے نہالے تب ایک طلاق دو۔

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں عدت سے مراد طہر ہے۔ قرء سے مراد حیض ہے۔ یا حمل کی حالت میں جب حمل ظاہر ہو جس طہر میں مجامعت کرچکا ہے۔ اس میں طلاق نہ دے۔ نہ معلوم حاملہ ہے یا نہیں۔ یہیں سے بانجھ علماء کرام نے احکام طلاق لئے ہیں اور طلاق کی دو قسمیں ہیں ۱ طلاق سنت، ۲ طلاق بدعت۔ طلاق سنت تو یہ ہے کہ طہر کی یعنی پاکیزگی کی حالت میں جماع کرنے سے پہلے طلاق دیدے۔ یا حالت حمل میں طلاق دے۔ اور بدعی طلاق یہ ہے کہ حالت حیض میں طلاق

دے یا طہر میں دے لیکن مجامعت کر چکا ہو اور معلوم نہ ہو کہ حمل ہے یا نہیں؟ ایک قسم تیسری طلاق کی ہے جو نہ طلاق سنت ہے اور نہ طلاق بدعت اور وہ نابالغہ کی طلاق ہے۔ اور اس عورت کی جسے حیض کے آنے سے ناامیدی ہو چکی ہو۔ اور اس عورت کی جس سے جماع نہ ہوا ہو۔ ان سب کے احکام اور تفصیلی بحث کی جگہ کتب فروع ہیں نہ کہ تفسیر

پھر فرمان ہے کہ عدت کی حفاظت کرو۔ اس کی ابتداء، انتہاء کی دیکھ بھال رکھو ایسا نہ ہو کہ عدت کی لمبائی عورت کو دوسرا خاوند کرنے سے روک دے اور اس بارے میں اپنے معبود حقیقی پروردگار عالم سے ڈرتے رہو، عدت کے زمانے میں مطلقہ عورت کی رہائش کا مکان خاوند کے ذمہ ہے۔ وہ اسے نکال نہ دے۔ اور نہ خود اسے نکلنا جائز ہے۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کے حق میں رکی ہوئی ہے۔ فاحشۃ مبینۃ۔ زنا کو بھی شامل ہے۔ اور اسے بھی کہ عورت اپنے خاوند تنگ کرے۔ اس کی مخالفت کرے اور ایذا پہنچائے، یا بدزبانی، کج خلقی شروع کر دے۔ اور اپنے کاموں سے اور اپنی زبان سے سسرال والوں کو تکلیف پہنچائے۔ تو ان صورتوں میں بیشک خاوند کو جائز ہے کہ اسے اپنے گھر سے نکال باہر کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اسکی شریعت اور اسکے بتلائے ہوئے احکام ہیں۔ جو شخص ان پر عمل نہ کرے انھیں بے حرمتی کے ساتھ توڑ دے۔ ان سے آگے بڑھ جائے۔ وہ اپنا ہی برا کرنے والا اور اپنی ہی جان پر ظلم ڈھانے والا ہے۔ شاید کہ اللہ کریم کوئی بات پیدا کر دے اللہ کریم کے ارادوں کو اور ہونے والی باتوں کو کوئی نہیں جان سکتا، عدت کا زمانہ مطلقہ عورت کو خاوند کے گھر گذارنے کا حکم دینا اس مصلحت سے ہے کہ ممکن ہے کہ اس مدت میں اس کے خاوند کے خیالات بدل جائیں۔ طلاق دینے پر نادم ہو دل میں لوٹانے کا خیال پیدا ہو جائے، اور پھر رجوع کر کے دونوں میاں بیوی امن و امان سے گذارنے لگیں نیا کام پیدا کرنے سے مراد بھی رجعت ہے۔ اسی بنا پر بعض سلف اور ان کے تابعین مثلاً حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ وغیرہ کا مذہب ہے کہ مبتوتہ یعنی وہ عورت جس کی طلاق کے بعد خاوند کو رجعت کا حق باقی نہ رہا ہو اس کے لئے عدت گذارنے کے زمانہ تک مکان کا دینا خاوند کے ذمہ نہیں

اسی طرح جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اسے بھی رہائش کا مکان عدت تک کے لئے دینا اس کے وارثوں پر نہیں ان کی اعتمادی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیس فہریہ رضہ والی حدیث ہے کہ جب ان کے خاوند حضرت ابو عمرو بن حفص نے ان کو تیسری اور آخری طلاق دے دی تھی تو ان کے وکیل نے ان کے پاس تھوڑے سے جو بھیجدیے تھے کہ یہ تمہاری خوراک ہے یہ بہت ناراض ہوئیں۔ وکیل نے کہا بگڑتی کیوں ہو؟ تمہارا نفقہ کھانا پینا ہمارے ذمہ نہیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ تیرا نفقہ اس پر نہیں اور نہ تیرے رہنے سہنے کا گھر۔ اور ان سے فرمایا کہ تم ام شریک کے گھر اپنی عدت گذارو، پھر فرمایا وہاں تو میرے اکثر صحابہ رضہ جایا آیا کرتے ہیں۔ تم عبداللہ بن ام مکتوم کے یہاں اپنی عدت کا زمانہ گذارو وہ ایک نابینا آدمی ہیں، تم وہاں آرام سے اپنے کپڑے بھی رکھ سکتی ہو مسند احمد میں ہے کہ انکے خاوند کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جہاد پر بھیجا تھا۔ انھوں نے وہیں سے انہیں طلاق بھیجدی۔ ان کے بھائی ان سے کہا کہ ہمارے گھر سے چلی جاؤ۔ انھوں نے کہا نہیں جب تک عدت ختم نہ ہو جائے میرا رہنا سہنا اور کھانا پینا خاوند کے ذمہ ہے۔ اس نے انکار کیا آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ معاملہ پہنچا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ آخری اور تیسری طلاق ہے تب آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا نان نفقہ گھر بار خاوند کے ذمہ اس صورت میں ہے کہ اسے حق رجعت حاصل ہو جب یہ نہیں تو وہ بھی نہیں تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور فلاں عورت کے گھر اپنی عدت گزارو پھر فرمایا کہ وہاں تو صحابہ رضہ کی آمد و رفت ہے تم ابن ام مکتوم رضہ کے گھر عدت کا زمانہ گذارو وہ نابینا ہیں تمہیں دیکھ نہیں سکتے

طبرانی میں ہے یہ حضرت فاطمہ رضہ بنت قیس ضحاک بن قیس قرشی رضہ کی بہن تھیں۔ ان کے خاوند مخزومی قبیلہ کے

اور وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھے بلکہ یمن میں تھے اور وہیں سے طلاق دی تھی

تھے طلاق کی خبر کے بعد ان کے نفقہ طلب کرنے پر ان کے خاوند کے اولیاء نے کہا تھا کہ نہ تو تمہارے میاں نے کچھ بھیجا ہے نہ ہمیں دینے کو کہا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں یہ بھی ہے کہ جب عورت کو وہ طلاق مل جائے جس کے بعد وہ اپنے اگلے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے۔ جب تک دوسرے سے نکاح اور پھر قطعاً علیحدگی نہ ہو جائے تو اس صورت میں عدت کا نان نفقہ اور رہنے کا مکان اس خاوند کے ذمہ ہیں

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ

پھر جب وہ (مطلقہ عورتیں اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جائیں تو (تم کو دو اختیار ہیں یا تو) انکو قاعدے کے موافق نکاح میں رہنے دو یا

بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ

قاعدے کے موافق انکو رہائی دو۔ اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کر لو اور (اے گواہو اگر گواہی کی حاجت پڑے تو) ٹھیک ٹھیک اللہ کے

لِلَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ

واسطے (بلا رو رعایت) گواہی دو۔ اس مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتا ہو۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ

اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے۔ اور اسکو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے۔ جہاں اسکا

لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ

گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس (کی مہمات) کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ

اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

اپنا کام جس طرح چاہے پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ (اپنے علم میں) مقرر کر رکھا ہے (اس میں عدت کا اندازہ بھی آ گیا)

اسلام نے نہ عیسوی مذہب کی طرح طلاق کا جواز صرف زنا پر منحصر کر کے دائرہ معیشت کو تنگ کیا اور نہ یہود کی طرح ادنیٰ ادنیٰ بات پر طلاق روا رکھ کر ہمدردیٔ انسانی پر دھبہ لگایا۔ اس عہد میں یہودیوں کا دستور طلاق کے بارے میں سخت نفرت خیز اور وحشیانہ تھا، حضرت مسیح علیہ السلام نے طلاق کا دروازہ بند کرنا مناسب جانا اور صرف ایک ہی سبب طلاق کے لئے جائز رکھا، مگر یہ حکم عام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے زنا کے سوا اور بھی بہت سے ایسے اسباب پیش آ جاتے ہیں کہ جہاں بغیر طلاق کے مرد اور عورت کے لئے رستگاری اور عافیت کی اور کوئی صورت نہیں ہوتی،

اسلام نے بھی طلاق کو بہت بند کیا اور بجز قوی سبب کے اجازت نہیں دی اور عورتوں کی بد خلقی پر صبر و برداشت کی تاکید فرمائی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عورتوں کے حق میں نیکی کرنے کی تاکید کرتا ہوں، پھر فرمایا، ایماندار مرد، ایماندار عورت سے نفرت نہ کرے، اگر اسکی کسی بات سے ناخوش ہوگا تو دوسری بات سے خوش ہو جائیگا

اور پھر فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح نہ مارے پیٹے کہ پھر شام کو گلے لگا کر سوئے۔ پھر فرمایا کہ خدا کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ مکروہ ہے (دارقطنی) ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو طلاق نہ دو بغیر زنا کے شبہ کے بیشک اللہ تعالیٰ کو مزہ لینے والے مرد و عورتیں پسند نہیں (طبرانی و دارقطنی) یہ حدیث تو حضرت مسیح علیہ السلام کے مقولہ کے قریب قریب ہے اور اسمیں اس بات کی صاف تشریح بھی ہو گئی کہ جو کوئی بغرض شہوت طلاق دے کہ اسکو چھوڑ کر دوسری کو لے یا عورت ایک مرد کو چھوڑ کر مرغوب دل مرد کو لینے کے لئے طلاق حاصل کرے تو یہ امر خدائے عظیم و برتر کے نزدیک سخت ناپسند ہے۔ اسی کو حضرت مسیح علیہ السلام نے زنا کاری سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن اسلام نے زنا کی قید پر انحصار نہیں کیا۔ صرف یہ فرق ہے۔ اور اسکو زمانہ اور ملکوں اور قوموں کی مصلحتوں پر لحاظ رکھنے والے ضرور پسند کریں گے باقی حسن معاشرت اور عورتوں سے نرمی و اخلاق سے پیش آنا اسلام کی بڑی ہدایت ہے۔ مگر اسمیں بھی اس قدر ترمیم ضرور کی ہے کہ میاں کو جورو کا غلام نہیں بنایا۔ اور عورت کے اسقدر اختیارات وسیع نہیں کئے کہ جن کو کوئی بھی غیرت مند طبیعت پسند نہیں کر سکتی، باقی اور کوئی فرق نہیں۔ اور وہ جھوٹے الزامات ہیں جنکے ذمہ دار وہ بی وحشی جاہل مسلمان ہیں جو ایسا ظالمانہ برتاؤ اپنی بیویوں سے کرتے ہیں نہ کہ اسلام۔

عدت کے اختتام کے ضروری ہدایتیں:- ارشاد ہوتا ہے کہ عدت والی عورتوں کی عدت جب پوری ہونے کے قریب پہنچ جائے۔ تو ان کے خاوندوں کو چاہیے کہ دو باتوں میں سے ایک کر لیں یا تو انہیں بھلائی اور سلوک کے ساتھ اپنے ہی نکاح میں رکھ لیں یعنی جو دی تھی اس سے رجوع کر کے باقاعدہ اس کے ساتھ بود و باش رکھیں یا انہیں اور طلاق دے دیں لیکن برا بھلا کہے بغیر گالی گلوچ دئے بغیر سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ بغیر بھلائی، اچھائی اور خوبصورتی کے ساتھ یاد رہے کہ رجعت کا اختیار اس وقت ہے جب ایک طلاق ہوتی ہو یا دو ہوتی ہوں) پھر فرماتا ہے اگر رجعت کا ارادہ ہو اور رجعت کرو یعنی لوٹا لو تو اس پر دو عادل مسلمان گواہ رکھ لو، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس سے جماع کرتا ہے نہ طلاق پر گواہ رکھتا ہے نہ رجعت پر تو آپ نے فرمایا کہ اس نے خلاف سنت طلاق دی۔ اور خلاف سنت رجوع کیا، طلاق پر بھی گواہ رکھنا چاہیے اور رجعت پر بھی اب دوبارہ ایسا نہ کرنا، حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نکاح، طلاق، رجعت بغیر دو عادل گواہوں کے جائز نہیں جیسے فرمانِ خدا ہے، ہاں مجبوری ہو تو اور بات ہے۔ پھر فرماتا ہے گواہ مقرر کرنے کا اور سچی شہادت دینے کا حکم انہیں ہو رہا ہے۔ جو اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان رکھتے ہوں، خدا کی شریعت کے پابند اور عذاب آخرت سے ڈرنے والے ہوں۔ حضرت امام شافعی رح فرماتے ہیں رجعت پر گواہ رکھنا واجب ہے۔ گو آپ سے ایک دوسرا قول بھی منقول ہے۔ اسی طرح نکاح پر گواہ رکھنا بھی آپ واجب بتلاتے ہیں۔ ایک اور جماعت کا بھی یہی قول ہے اس مسئلہ کو ماننے والے علماء کرام کی جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ رجعت بغیر زبانی کہے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ گواہ رکھنا ضروری ہے اور جب تک زبان سے نہ کہے گواہ کیسے مقرر کئے جائیں۔ پھر فرماتا ہے کہ جو احکام خدا بجا لائے اسکی حرام کردہ چیز دل سے پرہیز کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے مخلصی پیدا کرتا ہے۔ اور ایسی جگہ سے اس طرح رزق پہنچاتا ہے کہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو۔ مسند احمد میں ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ نے اس آیت کی تلاوت کی پھر فرماتا ہے اے ابوذر رح اگر تمام لوگ صرف اسے ہی لے لیں تو کافی ہے پھر آپ نے بار بار اس کی تلاوت شروع کی جہاں تک کہ مجھے اونگھ آنے لگی، پھر آپ نے فرمایا ابوذر تم کیا کرو گے جب تمہیں مدینہ سے نکال دیا جائے گا؟ جواب دیا کہ میں اور کشادگی اور رحمت کی جگہ چلا جاؤں گا، یعنی مکہ شریف کو، وہیں کی کبوتر بنکر رہ جاؤں گا،

آپ نے فرمایا، پھر کیا کرو گے جب تمہیں وہاں سے بھی نکال دیا جائے گا، میں نے کہا شام کی پاک زمین میں چلا جاؤں گا، پھر فرمایا جب شام سے نکالا جائے گا، تو کیا کرو گے؟ میں نے کہا حضورؐ خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ پھر تو اپنی تلوار اپنے کندھے پر رکھ کر مقابلہ پر اتر آؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اس سے بہتر ترکیب بتلاؤں؟ میں نے کہا حضورؐ ضرور ارشاد ہو، فرمایا بس سنتے اور مانتے رہو، اگرچہ تمہارا امیر حبشی غلام ہو، ابن حاتم میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں بہت ہی جامع آیت، اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ ہے۔ اور سب سے زیادہ کشادگی کا وعدہ اس آیت وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ الخ میں ہے۔ مسند میں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو شخص بکثرت استغفار کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر غم سے نجات اور ہر تنگی سے فراخی دے گا اور ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں کا اسے خیال وگمان تک نہ ہو، حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کی کربلہ بلاؤں سے نجات دے گا، ربیع فرماتے ہیں لوگوں پر جو کام بھاری ہوں اس پر آسان ہو جائے گا، حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو خدا کے حکم کے مطابق طلاق دے گا۔ اللہ اسے خلاصی کی راہ اور نجات دے گا، ابن مسعود رضؓ سے منقول ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ اگر چاہے دے اگر نہ چاہے نہ دے، حضرت قتادہ رضؓ فرماتے ہیں تمام امور کے شبہ سے اور موت کی تکلیف سے بچائے گا، اور روزی ایسی جگہ سے دے گا جہاں کا گمان بھی نہ ہو۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں یہاں اللہ سے ڈرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ سنت کے مطابق طلاق دے اور سنت کے مطابق رجوع کرے، آپ فرماتے ہیں حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے کو کفار گرفتار کر کے لے گئے اور انہیں جیل خانہ میں ڈالدیا ان کے والد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور اپنے بیٹے کی حالت اور حاجت اور مصیبت اور تکلیف بیان کرتے رہتے، آپ انہیں صبر کرنے کی تلقین کرتے اور فرماتے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے نجات کی سبیل بنا دے گا۔ تھوڑے دن گذرے ہوں گے جو ان کے بیٹے دشمنوں میں سے نکل بھاگے۔ راستہ میں دشمنوں کی بکریوں کا ریوڑ مل گیا۔ جسے اپنے ساتھ ہنکا لائے اور بکریاں لئے ہوئے اپنے والد کی خدمت میں جا پہنچے پس یہ آیت اتری کہ متقی بندوں کو خدا نجات دیتا ہے اور اسکا گمان بھی نہ ہو وہاں سے اسے روزی پہنچاتا ہے۔ مسند احمد میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ گناہ کی وجہ سے انسان اپنی روزی سے محروم ہو جاتا ہے۔ تقدیر کو لوٹانے والی چیز صرف دعا ہے عمر میں زیادتی کرنے والی چیز صرف نیکی اور خوش سلوکی ہے۔ سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ حضرت مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لڑکے حضرت عوف رضی اللہ عنہ جب کافروں کی قید میں تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سے کہلوا دو کہ بکثرت لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتے رہیں۔ ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے ان کی قید کھل گئی اور یہ وہاں سے بھاگے ان لوگوں کی ایک اونٹنی ہاتھ لگ گئی جس پر سوار ہو لئے راستے میں ان کے اونٹوں کے ریوڑ ملے انہیں اپنے ساتھ ہنکا لائے وہ لوگ پیچھے دوڑے لیکن یہ کسی کے ہاتھ نہ لگے، سیدھے اپنے گھر آئے۔ اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی، باپ نے آواز سن کر فرمایا خدا کی قسم یہ تو عوف ہے۔ ماں نے کہا ہائے وہ کہاں وہ تو قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہا ہوگا، اب دونوں ماں باپ اور خادم دروازے کی طرف دوڑے کھولا دیکھا تو ان کے لڑکے حضرت عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور تمام انگنائی اونٹوں سے بھری پڑی ہے۔ پوچھا کہ یہ اونٹ کیسے ہیں؟ انہوں نے واقعہ بیان کیا تو فرمایا اچھا ٹھہرو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بابت مسئلہ دریافت کر آؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ سب تمہارا مال ہے۔ جو چاہو کرو اور یہ آیت اتری کہ اللہ سے ڈرنے والوں کی مشکل خدا آسان کرتا ہے۔ اور بے گمان روزی پہنچاتا ہے۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے جو شخص ہر طرف کھینچ کر اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ہر مشکل میں اسے کفایت کرتا ہے اور بے حساب روزیاں

دیتا ہے۔ اور جو خدا سے ہٹ کر دنیا ہی کا ہو جائے اللہ تعالیٰ بھی اسے اس کی طرف سونپ دیتا ہے۔ مسند احمد میں ہے ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو آپ نے فرمایا میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں، سنو
تم اللہ تعالیٰ کی یاد رکھو وہ تمہیں یاد رکھے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی حفاظت کرو، تو اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس بلکہ اپنے سامنے پاؤ گے، جب
مدد طلب کرنی ہو اس سے مدد چاہو کہ تمام امت مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے اور خدا تعالیٰ کو منظور نہ ہو تو ذرا سا بھی نفع نہیں پہنچا سکتی، اور
اس طرح سارے کے سارے جمع ہو کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو بھی نہیں پہنچا سکتے۔ اگر تقدیر میں نہ لکھا ہو، قلمیں اٹھ چکیں اور
صحیفے خشک ہو گئے، ترمذی میں یہ حدیث ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔ مسند احمد میں بھی یہ حدیث ہے کہ جسے کوئی
حاجت ہو اور وہ لوگوں کی طرف لے جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ سختی میں پڑ جائے اور کام مشکل ہو جائے۔ اور جو اپنی حاجت اللہ کی طرف
لے جائے اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مراد پوری کرتا ہے یا تو جلدی اسی دنیا ہی میں یا دیر کے بعد یعنی موت کے بعد، پھر ارشاد ہوتا ہے
کہ اللہ تعالیٰ اپنے قضایا اور احکام میں جسطرح اور جیسے چاہے اپنی مخلوق میں پورے کرنے والا اور اچھی طرح جاری رکھنے والا ہے
ہر چیز کا اس کے نزدیک اندازہ مقرر کیا ہوا ہے، جیسے اور جگہ ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ۔ ہر چیز اس کے پاس ایک اندازے سے ہے

وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ

اور (تفصیل یہ کہ) تمہاری (مطلقہ) بیبیوں میں جو عورتیں (بوجہ زیادت سن کے) حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو ان کی عدت کی تعیین میں شبہ ہو

ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ ۚ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ

تو ان کی عدت تین مہینے ہیں　اور اسی طرح جن عورتوں کو اب تک (بوجہ نوعمری کے) حیض نہیں آیا۔　اور حاملہ عورتوں کی عدت اس حمل کا

أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ○

پیدا ہو جانا ہے　اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا

ذَٰلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنزَلَهُ إِلَيْكُمْ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ

یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اور جو شخص (ان معاملات میں اور دوسرے امور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈریگا

سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ○

اللہ تعالیٰ اسکے گناہ دور کر دے گا (کہ مغفرت عظیم کا سبب ہے) اور اسکو بڑا اجر دے گا۔

حیض میں طلاق نہ دے جو فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کا خلاصہ و مطلب ہے۔ اس بات پر جمہور کا اتفاق ہے اور حدیث مذکور اس پر
پوری دلیل ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کو رجوع کرنے کا حکم دیا اور خفا ہوئے، یہ اس لئے کہ حیض میں عورت سے دل راغب نہیں ہوتا اور
دو دلی کیلئے بھی ہوتی ہے۔ شاید اسی نفرت طبعی نے کسی رنجش سے طلاق دینے پر ابھار دیا ہو۔ اسی لئے طہر میں طلاق دینی چاہیئے تاکہ
اصلی مصلحت کا تقاضہ معلوم ہو۔ قرآن کریم میں عدت طلاق ثلاثۃ قروء بیان ہوئی، صدی اول کے بعد جب علماء نے احکام میں
زیادہ غور و تامل کرنا شروع کیا تو اس لفظ کے معنی میں بھی غور و تامل کرنا شروع کیا تو اس لفظ کے معنی میں بھی غور کیا گیا، امام ابوحنیفہؒ

اور بہت سے علماء نے یہ فرمایا کہ اس کے معنیٰ ہیں تین حیض اور پھر اس قول کو لغت اور صحابہ کبار رضی کے اقوال سے مستند کیا، امام شافعی رح اور ان سے آگے اور علماء نے کہا اس کے معنیٰ ہیں تین طہر یعنی وہ زمانہ جس میں عورت حیض کے بعد پاک ہوتی ہے، امام شافعی رح کے دلائل میں سے یہ آیت بھی ہے فطلقوھن لعدتھن اس لئے کہ لام بعدتھن میں وقت کے معنیٰ دیتا ہے، یعنی عدت کے وقت میں طلاق دو اور مسلم ہے کہ طلاق کا وقت طہر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عدت بھی طہر ہے نہ کہ حیض، اس کے جواب میں امام ابو حنیفہ رح کی طرف سے ایک آیت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء کہ طلاق دی ہوئی عورتیں تین قروء تک اپنے آپ کو روکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدت تین قروء ہیں، اور قروء حیض کو کہتے ہیں گو طہر پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر ثلثۃ کا لفظ کہہ دیتا ہے کہ تین حیض مراد ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ طلاق تو بالاتفاق طہر میں ہونی چاہئے۔ پھر اگر اس طہر کو بھی عدت میں شمار کیا گیا تو تین پورے نہ ہوئے اس لئے کہ کچھ زمانہ اس طہر کا طلاق دینے سے پہلے ضرور گذر گیا تھا

عمر رسیدہ مستورات جن بڑھیا عورتوں کے بوجہ اپنی بڑی عمر کے ایام بند ہو گئے ہوں ان کی عدت یہاں بتلائی جاتی ہے کہ تین ماہ کی مدت گذاریں جبکہ ایام والی عورتوں کی عدت تین حیض ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ کی آیت کریمہ، اسی طرح وہ نابالغ لڑکیاں جو اس عمر کو نہیں پہونچیں کہ انہیں حیض آئے ان کی عدت بھی تین مہینے کی رکھی اگر شک اس تفسیر میں ہو تو اسکی بابت دو قول ہیں ایک تو لڑکر یہ خون دیکھ لیں اور اس پر شبہ گزرے کہ آیا حیض کا خون ہے یا بیماری کا، دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی عدت کے حکم میں شک باقی رہ جائے اور اسے پہچان نہ سکو تو تین مہینے یاد رکھ لو، یہ دوسرا قول ہی زیادہ واضح ہے۔ اسکی دلیل یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے کہا تھا یا رسول اللہ بہت سی عورتوں کی عدت ابھی بیان نہیں ہوئی، کم سن لڑکیاں، بوڑھی بڑی عورتیں اور حمل والی عورتیں اس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ پھر حاملہ کی عدت بیان فرمائی کہ وضع حمل اسکی عدت ہے۔ گو طلاق یا خاوند کی موت کے ذرا سی دیر بعد ہی ہو جائے، جبکہ اس آیت کریمہ کے الفاظ میں اور احادیث نبویہ سے ثابت ہے، اور جمہور علماء سلف و خلف کا قول ہے، ہاں حضرت علی رض اور حضرت ابن عباس رض سے منقول ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت اور اس آیت کو ملا کر ان کا فتویٰ ہے کہ ان دونوں میں سے جو زیادہ دیر میں ختم ہو وہ عدت یہ گذارے یعنی اگر بچہ تین ماہ سے پہلے پیدا ہو گیا تو تین ماہ کی عدت ہے۔ اور تین مہینے گذر چکے اور بچہ پیدا نہیں ہوا تو بچے کے ہونے تک عدت ہے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابو سلمہ رض سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباس رض کے پاس آیا اس وقت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی وہیں موجود تھے اس نے سوال کیا کہ اس عورت کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے جسکے اپنے خاوند کے انتقال کے بعد چالیسویں دن بچہ ہو جائے۔ آپ نے فرمایا دونوں عدتوں میں سے آخری عدت اسے گذارنی پڑے گی یعنی اس صورت میں تین مہینے کی عدت اس پر ہے، ابو سلمہ رض نے کہا کہ قرآن کریم میں جو ہے۔ حمل والیوں کی عدت بچے کا ہو جانا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رض نے فرمایا میں بھی اپنے چچازاد بھائی حضرت ابو سلمہ رض کے ساتھ ہوں یعنی میرا بھی یہی فتویٰ ہے۔ حضرت ابن عباس رض نے اسی وقت اپنے غلام کریب کو حضرت سیدہ ام سلمہ رض کے پاس بھیجا کہ جاؤ ان سے یہ مسئلہ پوچھ آؤ انھوں نے فرمایا کہ سبیعہ اسلمیہ رض کے شوہر قتل کئے گئے، اور یہ اس وقت حاملہ تھیں چالیس راتوں کے بعد بچہ پیدا ہو گیا اسی وقت ان کا پیغام آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کر دیا پیغام بھیجنے والوں میں ابو السنابل رض بھی تھے یہ حدیث قدرے طوالت کے ساتھ اور کتابوں میں بھی ہے حضرت عبید اللہ بن عتبہ رض نے حضرت عمر بن عبد اللہ بن ارقم زہری رض کو لکھا کہ وہ سبیعہ بنت حارث اسلمیہ رض کے پاس جائیں اور ان سے ان کا واقعہ دریافت کر کے انھیں لکھ بھیجیں۔ گئے اور دریافت کیا اور لکھا کہ ان کے خاوند حضرت سعد بن خولہ رض تھے یہ بدری صحابی تھے حجۃ الوداع میں فوت ہو گئے۔ اس وقت یہ حمل سے تھیں تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کے بچہ پیدا ہو گیا جب نفاس سے پاک ہوئیں تو اچھے کپڑے پہن کر آراستہ ہو کر بیٹھ گئیں حضرت ابو السنابل رض بن بعکک جب ان کے پاس آئے تو اس

اس حالت میں دیکھ کر کہنے لگے تم جو اس طرح بیٹھی ہو تو کیا نکاح کرنا چاہتی ہو، واللہ تم نکاح نہیں کر سکتیں جب تک کہ چار مہینے دس دن نہ گزر جائیں، میں سن کر چادر اوڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے یہ مسئلہ پوچھا آپ نے یہ فرمایا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی تم عدت سے نکل گئیں اب تمہیں اختیار ہے اگر تم چاہو اپنا نکاح کر لو (مسلم)، صحیح بخاری میں اس آیت کے تحت میں اس حدیث کے ذکر کرنے کے بعد یہ بھی ہے کہ حضرت محمد بن سیرین رح ایک مجلس میں تھے جہاں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بھی تھے - جن کی تعظیم و تکریم ان کے ساتھی بہت ہی کیا کرتے تھے - انھوں نے حاملہ کی عدت آخری دو عدتوں میں کی میعاد بتلائی میں حضرت ابو عطیہ رح مالک بن عامر سے ملا انھوں نے مجھے حضرت سبیعہؓ والی حدیث پوری سنائی، میں نے کہا تم نے اس بابت حضرت عبداللہ رضؓ سے بھی کچھ سنا ہے؟ فرمایا ہم حضرت عبداللہ کی خدمت میں تھے - سورۃ نساء قصریٰ یعنی سورۃ طلاق سورۃ نساء طولیٰ کے بعد اتری ہے - اور اس میں فرمان ہے کہ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے - ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے میرے فتویٰ کے خلاف جس کا فتویٰ ہو میں تیار ہوں کہ وہ میرے مقابلہ میں آئے اور جھوٹے پر خدا کی لعنت کی دعا کرے - میرا فتویٰ یہ ہے کہ حمل والی کی عدت بچہ کا پیدا ہو جانا ہے پہلے عام حکم تھا کہ جن عورتوں کے خاوند مر جائیں وہ چار مہینے دس دن تک عدت گذاریں اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ حمل والیوں کی عدت بچے کا پیدا ہو جانا ہے، پس یہ عورتیں ان عورتوں میں سے مخصوص ہو گئیں اب مسئلہ یہی ہے -

اقسام طلاق

طلاق تین قسم پر ہے (۱) بہتر یہ ہے کہ جس طہر میں وطی نہیں کی ہو اسمیں صرف ایک طلاق دے یہاں تک کہ عدت گذر جائے اس لئے صحابہ رضؓ ایک طلاق سے زیادہ دینا پسند نہیں کرتے تھے اور اسمیں بغیر مرضی عورت کے عدت کے اندر مرد کو رجوع کر لینے کا اختیار باقی رہتا ہے (۲) احسن وہ ہے کہ وطی کی ہوئی عورت کو تین طہر میں تین طلاق بتفریق دے اسکو بھی حنفی طلاق مسنون کہتے ہیں، مگر امام مالک رح اسکو بدعت کہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ایک طلاق سے زیادہ دینا کسی حالت میں سنت نہیں خواہ ایک طہر میں ہو خواہ کئی میں مگر امام ابوحنیفہ رحؒ اور ان کے اصحاب ایک طہر میں ایک طلاق سے زیادہ دینا بدعت جانتے ہیں، نہ کئی طہر میں، اور امام شافعی رح کے نزدیک ایک بار تین طلاق دینے میں بشرطیکہ طہر میں ہو کچھ حرج نہیں اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ طلاق کی تعداد میں بدعت و سنت کچھ نہیں ایک مباح بات ہے - لیکن امام مالک رح صرف ایک طلاق دینا مسنون جانتے ہیں طہر میں اور امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک تفریق اور وقت طہر کی سنت ہے اور امام شافعی رح کے نزدیک صرف ایک طہر کی رعایت [illegible] (۳) طلاق بدعی یہ وہ ہے جو حالت حیض میں ہو یا ایک طہر میں ایک سے زائد ہو یا اس طہر میں ہو کہ جسمیں وطی کی ہو گو ایک ہی طلاق ہو تمام ہے کہ وہ مدخولہ ہو یا نہ ہو، اور جسکو صغر یا کبر کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو اس کو ایک مہینہ میں ایک طلاق سے زیادہ دینا بھی بدعت ہے - اسی طرح حاملہ کو بھی ایک مہینہ میں ایک سے زیادہ طلاق دینا بدعت ہے - - یہ طلاق بدعی بھی پڑ جاتی ہے - مگر طلاق دینے والا گنہگار ہوتا ہے - پھر فرماتا ہے اللہ تعالیٰ متقیوں کے لئے ہر مشکل سے آسانی اور ہر تکلیف سے راحت عنایت فرما دیتا ہے یہ اللہ کے احکام اور اسکی پاک شریعت ہے - جو اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تمہاری طرف اتار رہا ہے - اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو اور پرہیزوں کے ڈر سے اللہ تعالیٰ بچا لیتا ہے - اور ان کے تھوڑے عمل پر بڑا اجر دیتا ہے -

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ

تم ان مطلقہ عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے اسکی کے

لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ

بارے میں تکلیف مت پہنچاؤ اور اگر وہ مطلقہ عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک انکو کھانے پینے کا)

يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا

خرچ کرو۔ پھر اگر وہ (مطلقہ عورتیں) (جبکہ پہلے ہی سے بچے والیاں ہوں یا بچہ پیدا ہونے سے اُن کی عدت ختم ہوئی ہو) تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر)

بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۝

اجرت دو (اجرت کے بارے میں) باہم مناسب طور پر مشورہ کرلیا کرو۔ اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلادے گی۔

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ

(آگے بچہ کے نفقہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ) وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق (بچہ پر) خرچ کرنا چاہئے۔ اور جس کی آمدنی کم ہو

فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ

اس کو چاہیئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اسمیں سے خرچ کرے خدا تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے خدا تم

اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۝

تنگی کے بعد جلد ہی فراغت بھی دے گا (گو بقدر ضرورت حاجت روائی ہی)

اللہ کریم اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ جب ان میں سے کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے تو عدت گذر جانے تک اس کے رہنے سہنے کو اپنا مکان دے۔ یہ جگہ اپنی طاقت کے مطابق ہے یہاں تک کہ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں اگر زیادہ وسعت نہ ہو تو اپنے ہی مکان کا ایک کونہ اسے دیدے۔ اسے تکلیفیں پہنچا کر اس قدر تنگ کرو کہ وہ مکان چھوڑ کر چلی جائے یا تم سے چھوٹنے کے لئے اپنا حق مہر چھوڑ دے یا اس طرح کی طلاق دی دیکھا کہ دو ایک روز عدت کے رہ گئے ہیں۔ رجوع کا اعلان کر دیا پھر طلاق دیدی اور عدت کے ختم ہونے کے قریب رجعت کرلی تاکہ نہ وہ بیچاری سہاگن رہے اور نہ رانڈ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر طلاق والی عورت حمل سے ہو تو بچہ ہونے تک اس کا نان نفقہ اس کے خاوند کے ذمہ ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ حکم خاص ان عورتوں کے لئے بیان ہو رہا ہے۔ جنھیں آخری طلاق دیدی گئی ہو۔ جس سے رجوع کرنے کا حق ان کے خاوندوں کو نہ رہا ہو اس لئے کہ جن کو رجوع ہو سکتا ہے ان کی عدت تک کا خرچ تو خاوند کے ذمہ ہے ہی وہ حمل سے ہوں تب بھی اور بے حمل ہوں تو بھی اور حضرات علماء فرماتے ہیں یہ حکم بھی انہی عورتوں کا بیان ہو رہا ہے۔ جن سے رجعت کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اوپر بھی ان ہی کا بیان تھا اسے الگ اس لئے بیان کر دیا کہ عموماً حمل کی مدت لمبی ہوتی ہے تو کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عدت کے زمانے کا نفقہ تو ہمارے ذمہ ہے پھر انہیں اس لئے صاف طور پر فرمادیا کہ رجعت والی طلاق کے وقت اگر عورت حمل سے ہو تو جب تک بچہ نہ ہو اس کا کھلانا پلانا خاوند کے ذمہ ہے۔ پھر اسمیں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ خرچ اس کے لئے حمل کے واسطے سے ہے یا حمل کے لئے ہی، امام شافعیؒ وغیرہ سے دونوں قول مروی ہیں اور اس بنا پر بہت سے فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ جب یہ مطلقہ عورتیں حمل سے فارغ ہو جائیں تو اگر تمہاری اولاد کو دودھ پلائیں تو تمہیں ان کے دودھ پلانے کی اجرت دینی چاہیئے ہاں عورت کو اختیار کہ خواہ وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے۔ لیکن اوّل دفعہ کا دودھ اسے ضرور پلانا چاہیئے گو پھر دودھ نہ پلائے کیونکہ عموماً بچہ کی

زندگی اس دودھ کے ساتھ وابستہ ہے۔ تو اگر وہ بعد میں بھی دودھ پلاتی رہے تو ماں باپ کے درمیان جو اجرت طے ہو جائے وہ ادا کرنی چاہیئے، تم میں آپس میں جو کام ہوں وہ بھلائی کے ساتھ باقاعدہ دستور کے مطابق ہونے چاہئیں، نہ یہ اس کے نقصان کے درپے رہے نہ وہ اسے ایذا پہنچانے کی کوشش کرے، جیسے سورۂ بقرہ میں فرمایا، لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ یعنی بچے کے بارے میں نہ اس کی ماں کو منظور نہیں یا ماں زائد مانگتی ہے۔ جو ماں دباپ پر گراں ہے۔ اور موافقت نہیں ہو سکتی اور دونوں کسی بات پر رضا مند نہیں ہوتے تو اختیار ہے۔ اور کسی دایہ کو دیا جانا منظور کیا جاتا ہے اگر اسی پر اس بچے کی ماں رضا مند ہو جائے تو زیادہ مستحق یہی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ بچہ کا باپ یا ولی جو ہو، اسے چاہیئے کہ بچہ پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے تنگی والا اپنی طاقت کے مطابق دے، طاقت سے بڑھ کر تکلیف کسی کو اللہ نہیں، تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کی بابت حضرت عمرؓ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ موٹا کپڑا پہنتے ہیں اور ہلکی غذا کھاتے ہیں آپ نے حکم دیا کہ انھیں ایک ہزار دینار بھجوادو اور جس کے ہاتھ بھجوائے ان سے کہلا دیا کہ دیکھنا وہ ان دیناروں کو پاکر کیا کرتے ہیں؟

جب یہ اشرفیاں انہیں مل گئیں تو انھوں نے باریک کپڑے پہنے اور نہایت نفیس غذائیں کھانی شروع کر دیں قاصد نے واپس آکر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اس نے اس آیت پر عمل کیا کہ کشادگی والا اپنی کشادگی کے مطابق خرچ کرے، اور تنگی ترشی والا اپنی حالت کے موافق، طبرانی کی ایک غریب حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص کے پاس دس دینار تھے۔ اس نے ان میں سے ایک دینار راہ اللہ صدقہ کیا دوسرے کے پاس دس اوقیہ تھے اس نے اس میں سے ایک اوقیہ یعنی چالیس درہم خرچ کئے تیسرے کے پاس سو اوقیہ تھے جس میں سے اس نے اللہ کے نام پر دس اوقیہ خرچ کئے تو یہ سب اجر میں خدا کے نزدیک برابر ہیں، اس لئے کہ ہر ایک نے اپنے مال کا دسواں حصہ فی سبیل اللہ دیا ہے پھر اللہ تعالیٰ سچا وعدہ دیتا ہے کہ وہ تنگی کے بعد آسانی کر دے گا جیسے اور جگہ فرمایا۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ تحقیق سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ مسند احمد کی حدیث اس جگہ ذکر کرنے کے قابل ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا پہلے زمانہ میں ایک میاں بیوی تھے جو فقر و فاقہ سے اپنی زندگی گذار رہے تھے، پاس کچھ بھی نہ تھا ایک مرتبہ یہ شخص سفر سے آیا اور سخت بھوکا تھا بھوک کے مارے بیتاب تھا۔ آتے ہی اپنی بیوی سے پوچھا کچھ کھانے کو ہے؟ اس نے کہا ہاں آپ خوش ہو جائے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی ہمارے ہاں آپہنچی ہے اس نے کہا پھر لاؤ جو کچھ ہو دیدو میں بہت بھوکا ہوں، بیوی نے کہا اور ذرا سی دیر صبر کر لو اللہ کی رحمت سے ہمیں بہت کچھ امید ہے پھر جب کچھ دیر اور ہو گئی اس نے بیتاب ہو کر کہا جو کچھ تمہارے پاس ہے دیتی کیوں نہیں؟ مجھے تو بھوک سے سخت تکلیف ہو رہی ہے، بیوی نے کہا اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ اب تنور کھولتی ہوں۔ تھوڑی دیر گذرنے کے بعد جب بیوی نے دیکھا کہ اب تقاضہ کرنا چاہتے ہیں تو خود بخود کہنے لگیں اب اٹھ کر تنور کو دیکھتی ہوں، اٹھ کر جو دیکھتی ہیں تو قدرت خدا سے ان کے توکل کے بدلے وہ بکری کے پہلو سے ہوئے گوشت سے بھرا ہوا ہے اور دیکھتی ہیں کہ گھر کی دونوں چکیاں از خود چل رہی ہیں اور برابر آٹا نکل رہا ہے۔ انھوں نے تنور میں سے سب گوشت نکال لیا اور چکیوں میں سے سارا آٹا اٹھا لیا اور جھاڑ دیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر وہ صرف آٹا لے لیتیں اور چکی نہ جھاڑتیں تو قیامت تک چلتی رہتیں، اور روایت میں ہے کہ ایک شخص اپنے گھر پہنچا دیکھا کہ بھوک کے مارے گھر والوں کا برا حال ہے آپ جنگل کی طرف نکل کھڑے ہوئے یہاں ان کی نیک بخت بیوی صاحبہ نے جب دیکھا کہ میاں بھی پریشان حال ہیں اور یہ منظر دیکھ نہیں سکے اور چل دیئے تو چکی کو ٹھیک ٹھاک کیا تنور سلگایا اور دعا کرنے لگیں کہ اے اللہ ہمیں روزی دے دعا کر کے انھیں تو دیکھا کہ ہنڈیا گوشت سے پر ہے تنور میں روٹیاں لگ رہی ہیں۔ اور چکی سے برابر آٹا ابلا چلا آتا ہے۔ اتنے میں میاں بھی

تشریف لائے، پوچھا کہ میرے بعد تمہیں کچھ ملا؟ بیوی صاحبہ نے کہا ہاں ہمارے رب نے ہمیں بہت کچھ عطا فرمایا ہے اس نے جا کر چکی کے دوسرے پاٹ کو اٹھا لیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان ہوا تو آپ نے فرمایا اگر وہ اسے نہ اٹھاتی تو قیامت تک یہ چکی چلتی رہتی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا

اور بہت سی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم (ماننے) سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی سو ہم نے ان (کے اعمال) کا

حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ

سخت حساب کیا اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی (کہ وہ سزا ہلاک بالعذاب ہے) غرض انھوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا

اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا

اور ان کا انجام کار خسارہ ہی ہوا۔ یہ تو دنیا میں ہوا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک سخت

شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ

عذاب تیار کر رکھا ہے اور جب انجام نافرمانی کا یہ ہے تو اے سمجھدارو جو کہ ایمان لائے ہو تم خدا سے ڈرو

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ○ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

خدا نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا (اور وہ نصیحت نامہ دیکر) ایک ایسا رسول (بھیجا) جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر

مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ

سناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لاویں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان و علم و عمل کے)

اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ

نور کی طرف لے آویں، اور آگے ایمان وغیرہ طاعت پر وعدہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان لاوے گا اور اچھے عمل کرے گا خدا اس کو

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ

(جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہا کریں گے۔ بلاشک اللہ نے

اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ○

(بہت اچھی روزی دی (آگے اللہ کا [illegible] بیان کیا جاتا ہے [illegible])

مندرجہ بالا آیت کریمہ کے بعد اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بہت سی بستیوں یعنی شہر والوں نے اپنے رب سے سرکشی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تھی جیسا کہ لوط کی بستیاں وغیرہ تو خدا تعالیٰ نے ان سے سخت حساب لیا ان کے اعمال بد کا گن گن کر پورا بدلہ ان کی گودوں میں ڈالا ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا،

فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسرًا - پس ان لوگوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور انجام خسران ہوا آخرت میں عذاب شدید ان کے لئے مہیا کیا گیا، اجڑے ہوئے شہروں اور برباد شدہ قوموں اور خاندانوں کو دیکھ کر، فاتقوا اللہ یا اولی الالباب، اے ہوشمند اور عقل والو اللہ سے ڈرو اسکی نافرمانی سے بچو، عبرت حاصل کرو، پھر آپ ہی بتلاتا ہے کہ عقلمند کون ہیں، الذین اٰمنوا وہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، دراصل یہی لوگ عقلمند ہیں جن کی انجام پر نظر ہے، اور یہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں کافر بے عقل کیا ڈرے گا، قد انزل اللہ الیکم ذکرًا، تحقیق اللہ نے تمہارے پاس ذکر یعنی مذکر (یاد دلانے والا سمجھانے والا) بھیجا ہے۔ وہ کون رسولاً رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یتلوا علیکم اٰیات اللہ مبینات، جو تم کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے۔ جو صریح اور ظاہر ہیں، جنہیں کوئی پیچیدگی اور خلاف عقل بات نہیں لیخرجکم من الظلمات الی النور، تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لائے، مذہب باطل کی اندھیری، اخلاق بد کی اندھیری، رسم ورواج کی پابندی کی اندھیری تھا اور آخرت سے جہالت کی اندھیریاں عرب پر گھٹا کی طرح چھائی ہوئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکال کر نور میں لائے ومن یؤمن باللہ ویعمل صالحًا - پس جو اس نور میں آگیا یعنی اللہ پر ایمان لایا اعتقاد درست کر لیا اور پھر اچھے کام کئے جن کا اللہ اور اسکے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اصل یہی نور ہے جو قیامت میں آگئے۔ دائیں، بائیں دوڑتا چلے گا، اور مرنے کے بعد عالم قدس میں پہنچا دے گا، تکمیل قوت نظریہ وعملیہ دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

یدخلہ جنات تجری من تحتھا الانھار، اس کو مرنے کے بعد ایسے باغوں میں بسا دیگا جہاں نہریں بہتی ہونگی یعنی عالم قدس میں باغ اور نہریں اس کی قوت نظریہ اور عملیہ کا مظہر ہوں گی، خالدین فیھا ابدًا وہاں ہمیشہ رہا کرے گا، ایمان واعمال بھی اس کے ساتھ ہمیشہ تھے۔ ان کی نہریں جاری رہا کرتی تھیں، قد احسن اللہ لہ رزقا اللہ کریم نے اس کے لئے عمدہ روزی تیار کر رکھی ہے۔ وہاں کے نعماء اور دیدار الٰہی یہ قابل اعتبار بات ہے اس لیے کہ اس اللہ نے خبر دی ہے جس نے خلق سبع سمٰوات، سات آسمان ومن الارض مثلھن، اور ان کے مانند زمین بنائی یتنزل الامر بینھن ان میں اس کا حکم نازل ہوتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں بغیر حکم خداوند قدیر کے ذرہ نہیں ہلتا یہ اس لئے لتعلموا ان اللہ علی کل شیٔ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیٔ علمًا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ کے علم میں ہر چیز ہے لہٰذا وہ قادر بھی ہے کہ دار آخرت میں اپنے وعدے کو پورا کرے، دنیا میں مخالف کو تباہی آخرت میں رسوا بنا دے۔ اور اس کا فرمانا خبر دینا اس کے علم کی وجہ سے صداقت پر مبنی ہے۔

اللہ کریم اپنی قدرت کاملہ اور اپنی عظیم الشان سلطنت کا ذکر فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ

اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے | اور ان ہی کی طرح زمین بھی (اور) ان سب میں اللہ تعالیٰ کے احکام

الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ

نازل ہوتے رہتے ہیں (اور یہ اس لئے بتلایا گیا) تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ ہر شے کا

اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

(اپنے) احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

کی آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے تاکہ مخلوق اسکی عظمت وعزت کا خیال کرکے اس کے فرمان کو قدر کی نگاہ سے دیکھے اور اس پر عامل بن کر اسے خوش کرے۔ تو فرمایا کہ ساتوں آسمانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ پاک نے ساتوں آسمانوں کو کس طرح اوپر تلے پیدا کیا؟ اور جگہ ارشاد ہے یعنی ساتوں آسمانوں اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے، سب اس خدا کریم ویکتا کی تسبیح وتحلیل کرتے رہتے ہیں کوئی بھی اس سے غافل نہیں، پھر فرماتا ہے۔ اسکی مثل زمینیں ہیں۔ جیسے کہ صحیحین کی صحیح حدیث میں ہے۔ جو شخص ظلم کرکے یعنی ناحق طریقہ سے کسی کی ایک بالشت بھر زمین لے لے گا اسے ساتوں زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، صحیح بخاری میں ہے اسے ساتویں زمین تک دھنسایا جائے گا،

جن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہفت اقلیم ہے۔ وہ اختلاجات میں پھنس گئے ہیں اور بلا دلیل قرآن وحدیث کا صریح خلاف کیا ہے۔ اسکی وضاحت سورۃ حدید سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں ساتوں زمینوں کا اور ان کے درمیان کی مسافت کا اور ان کی موٹائی کا جو پانچ سو سال کی ہے۔ پورا بیان ہے۔ اسکی بابت حضرت ابن مسعود رضؓ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں بھی ہے۔ ساتوں آسمان اور جو کچھ ان میں اور ان کے درمیان ہے اور ساتوں زمینیں اور جو کچھ ان میں اور ان کے درمیان میں ہے کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں۔ جیسے کسی لمبے چوڑے بہت بڑے چٹیل میدان میں ایک چھلا پڑا ہو، ابن جریر میں حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ اگر میں اسکی تفسیر تمہارے سامنے بیان کروں تو اسے نہ مانو گے اور نہ ماننا جھوٹا جاننا ہے اور روایت میں ہے کہ کسی شخص نے اس آیت کریمہ کا مطلب دریافت کیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ میں کیسے باور کرلوں کہ جو میں تجھے بتلاؤں گا تو اسکا انکار نہ کرے۔ کیونکہ تمکو وہ بات خلاف عقل نظر آئے گی۔ اگرچہ واقعہ کے اعتبار سے وہ قطعاً خلاف عقل نہ ہوگی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو شریعت کی منصوص اور صاف وقطعی باتوں کو رد نہ کرنا چاہئیے۔ کیونکہ وہ ہوتی ہیں صحیح اور ہم اپنی عقل کے پیمانے پر ان کو ناپ کر ظلم کرتے ہیں اور روایت میں مروی ہے کہ ہر زمین مثل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اور اس زمین کے مخلوق کے ہے اور ابن مثنیٰ والی اس روایت میں آیا ہے کہ ہر آسمان میں نبی ہے مثل تمہارے نبی کے اور آدم ہیں مثل آدم ؑ کے اور نوح ہیں مثل نوح علیہ السلام کے اور ابراہیم ہیں مثل ابراہیم علیہ السلام کے اور عیسیٰ ہیں مثل عیسیٰ علیہ السلام کے، پھر امام بیہقی نے ایک اور روایت بھی حضرت ابن عباس رضؓ کی ذکر کی ہے اور فرمایا ہے کہ اسکی اسناد صحیح ہے۔ لیکن یہ بالکل شاذ ہے،

یہ سب اللہ جل شانہٗ کی قدرتیں ہیں جن کا اظہار فرمایا گیا یہ اس لئے کہ مخلوق سیکھ ولے سے اسکی عظمت، کبریائی، بڑائی وعزت کا خیال کرکے اس کے فرمان کو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ قدر کی نگاہ سے دیکھے، صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ سچے دل کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونا کہ اللہ جل شانہٗ راضی اور خوش ہو جائیں جس سے ابدی زندگی کی راحت میسر ہو۔

آمین۔

سُورَةُ التَّحْرِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ج تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر اسکو اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں پھر وہ بھی (اپنی بیبیوں کی

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ج

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اسکے کفارہ

وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ج وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ

کا طریقہ) مقرر فرما دیا ہے۔ اور اللہ تمہارا کارساز ہے۔ اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

اور جب کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کسی

اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ج فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ

پھر جب اس بی بی نے وہ بات (دوسری بی بی کو) بتلا دی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے

بی بی سے ایک بات چپکے سے فرمائی

عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ج فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ

(بذریعہ وحی) اسکی خبر کر دی تو پیغمبر نے (اس ظاہر کر دینے والی بی بی کو) تھوڑی سی بات تو جتلا دی اور تھوڑی سی بات کو ٹال گئے سو جب پیغمبر نے

مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا ط قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ○ اِنْ تَتُوْبَآ

اس بی بی کو وہ بات جتلائی وہ کہنے لگی کہ آپ کو اسکی کس نے خبر دی، آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے خبر رکھنے والے (یعنی خدا) نے خبر کر دی اے پیغمبر کی

اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ج وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ

دونوں بیبیو اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کر لو تو (بہتر ہے کیونکہ) تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں اور اگر اسی طرح پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں کارروائیاں

اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ج وَالْمَلٰٓئِكَةُ

کرتی رہیں تو یاد رکھو کہ پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرئیل ہے اور نیک مسلمان ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے (آپ کے)

بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝

مددگار ہیں

تفسیر یہ سورہ شریف بالاتفاق مدینہ شریف میں نازل ہوئی۔ قرطبی کہتے ہیں اسمیں کسی کا بھی اختلاف نہیں، ابن عباس رضی اللہ اور ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ **ربط** اس کا اول سورۃ سے یہ ہے کہ اول سورۃ میں طلاق کے بارے میں احکام بیان کئے گئے ہیں جو عورتوں کے متعلق مختلف طلاق کے مسائل اور اس کے ضمنی حالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور نیز طلاق کے بعد جو عورت حلال تھی حرام ہو جاتی ہے۔ اس لئے سورۃ میں اور بیوی کی ضد خواہش ہٹ اور اصرار سے مباح چیز کو اپنے اوپر ممنوع کر کے معاشرت کے دائرہ کو تنگ کرنے کی ممانعت کا ذکر ہے اسی لئے فرماتا ہے۔ یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک اے نبی کیوں حرام کرتے ہو اس چیز کو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دی ہے اس سورۃ کے ابتدائی آیتوں کے شان نزول میں مفسرین کے اقوال یہ ہیں،

(۱) بعض تو کہتے ہیں کہ حضرت ماریہ رضی اللہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، نسائی میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ کے کہنے سننے سے ایسا ہوا تھا کہ ایک لونڈی کی نسبت آپ نے فرمایا تھا کہ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، تبتغی مرضات ازواجک اس حرام کرنے میں اپنی بیویوں کی رضامندی چاہتے ہو، یعنی ایسا نہ کرو، یہ ایک قسم کی ناپسند بات ہے۔ اللہ غفور رحیم خدا معاف کرنے والا ہے، تم جو بیویوں کے کہنے سے قسم کھا بیٹھے ہو تو قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم تو اللہ نے تمہارے لئے ایسی قسموں کو کا توڑ دینا فرض کر دیا ضرور توڑ دو اس لئے کہ اللہ مولٰکم وھو العلیم الحکیم۔ اللہ تعالیٰ تمہارا رفیق اور کارساز ہے وہ جانتا ہے کہ اسمیں تمہیں وقتا فوقتاً تنگی پیش آئے گی اور ہمیشہ کے لئے ایک مباح چیز امت میں حرام سمجھی جائے گی، اور یہ اصول امت محمدیہ کے برخلاف ہے۔ اللہ علیم حکیم ہے کسی چیز کو حرام اور ممنوع قرار دینا اس کے عواقب امور پر نظر کر کے اسی کا کام ہے پھر جسکو وہ حرام نہ بنا دے تم نہ بناؤ۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ تو مجھ پر حرام ہے اللہ کی قسم میں تجھ سے صحبت نہ کروں گا۔ حضرت مسروق رضی اللہ فرماتے ہیں پس حرام کرنے کے باب میں تو آپ پر عتاب کیا گیا اور قسم کے کفارے کا حکم ہوا، ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ سے دریافت کیا کہ دونوں عورتیں کون تھیں؟ فرمایا عائشہ رضی اللہ اور حفصہ رضی اللہ اور ابتدا ام ابراہیم قبطیہ کے بارے میں ہوئی، حضرت حفصہ رضی اللہ کے گھر میں ان کی باری والے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مل لئے تھے جس پر حضرت حفصہ رضی اللہ کو رنج ہوا کہ میری باری کے دن میرے گھر اور میرے بستر پر؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں رضامند کرنے منانے کے لئے کہہ دیا کہ میں اسے اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، رہبانیت جسے اسلام نے رد کر دیا، اس میں بھی یہی بات تھی کہ نفس کو تکلیف دینے کے لئے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہنود وغیرہ توہوں کے درویش کیا کرتے ہیں کوئی دودھ نہیں پیتا تو کوئی میٹھا نہیں کھاتا کوئی نکاح نہیں کرتا تو کوئی ایک قسم کی چیز جو بے مزہ ہو اور ایک قسم کا کپڑا جو بے قدر ہو پہننا شروع کرتا ہے اور اسکو تقرب الی اللہ اور سعادت آخرت کا عمدہ ذریعہ سمجھا جاتا ہے شریعت مصطفویہ نے ان باتوں کو بے اصل قرار دیکر سچے اصول سعادت بیان کر دئے وہ اخلاق وعقائد کی درستی کے بعد اللہ کی عبادت ومراقبہ وفکر وذکر اور مخلوق کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنا ہے اور اہل اسلام میں جو ریاضت ہے وہ اور معنوں پر مبنی ہے۔ وہ ان چیزوں کو حرام وممنوع نہیں قرار دیتا بلکہ مباح امور میں نفس بد کی خواہش روکنے کی مشاقی کرتا ہے، اور انہی دونوں باتوں پر ترقی ہے

کہنا کہ تمہارے پاس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم آئیں اور قریب ہوں تو تم کہنا کہ آج کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے آپ نے فرمائیں گے نہیں تم کہنا پھر یہ بدبو کیسی آتی ہے؟ آپ فرمائیں گے مجھے حفصہ رضہ نے شہد پلایا تھا تو تم کہنا کہ شاید شہد کی مکھی نے عرفط نامی خاردار درخت چوسا ہوگا۔ میرے پاس آئیں گے۔ تو میں بھی یہی کہوں گی پھر اے صفیہ رضہ تمہارے پاس جب آپ آئیں تو تم بھی یہی کہنا حضرت سودہ رضہ فرماتی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر آئے ابھی تو دروازے ہی پر تھے جو میں نے ارادہ کیا کہ تم نے جو کچھ مجھ سے کہا ہے میں آپ سے کہہ دوں کیونکہ میں تم سے بہت ڈرتی ہوں۔ لیکن خیر اس وقت تو خاموش رہی جب آپ میرے پاس آئے میں نے تمام تمہارا کہنا پورا کر دیا، پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے میں نے بھی یہی کہا پھر حضرت صفیہ رضہ کے پاس گئے انھوں نے بھی یہی کہا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حفصہ رضہ کے پاس گئے تو حضرت حفصہ رضہ نے شہد کا شربت پلایا چاہا آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی حاجت نہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ بات قرین قیاس ہے اس لئے کہ عورتوں کی باہم رقابت معمولی بات ہے، زینب رضہ کے ساتھ یہ خصوصیت ہر روز شاق گذری، شہد میں کیکر وغیرہ پھولوں کی اکثر خوشبو یا بدبو بھی ہوا کرتی ہے، اس میں بھی ہوگی۔ پھر ایک نے نفرت دلانے کے لئے اس بات کو بڑھا کر اور زدار دیکر کہا اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہوگا، اور رنجیدگی بھی ظاہر کی ہوگی، اور آپ نے اس کی تسلی بھی کی ہوگی، بیویوں کی دلجوئی معمولی بات ہے آپ نے زینب رضہ کے گھر جا کر شہد کھانے کو اپنے اوپر ممنوع کیا اور قسم بھی کھائی ہوگی پھر ایک نے دوسری سے خوب اظہار مسرت کیا ہوگا کر لو داؤ چل گیا، یہ بات خدائے پاک کے نزدیک اچھی نہ معلوم ہوئی اور شان اولوالعزمی کے مخالف بھی ہے اس لئے آپ کو تنبیہ بھی ہوئی اور قسم کے توڑ ڈالنے کا حکم دیا گیا، اب مطلب آیات کا صاف ہو گیا اور ظاہر ہوا اور کوئی تعجب بھی پیدا نہیں ہوا۔

پھر آگے اس معاملہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً اور جب نبی نے اپنی کسی ایک بیوی سے مخفی بات کہی اکثر مفسرین کہتے ہیں وہ حفصہ رضہ ہیں اور مخفی بات شہد یا ماریہ رضہ کے حرام کرنے کی تھی، اور اپنے بعد ابوبکر رضہ و عمر رضہ کی خلافت کی بشارت بھی دی تھی، مگر یہ تحقیق کرنا کہ وہ مخفی بات کیا تھی لیکن قرینہ کہتا ہے کہ اس قسم کی بات ہوگی کہ جو شوہر اپنی بیوی سے اسکی محبت اور دوسری پر فوقیت کے بارے میں کہا کرتا ہے۔ فلما نبأت بہ پھر جب اس بیوی نے اس بات کو کہلایا جس سے کہا، اکثر مفسرین کہتے ہیں عائشہ رضہ سے واظہرہ اللہ علیہ اور خدا نے یہ معاملہ نبی صلعم پر ظاہر کر دیا عرف بعضہ واعرض عن بعض تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر کا عائشہ رضہ سے اظہار کیا کہ تجھ سے حفصہ رضہ نے یہ کہا ہے اور کسی قدر سے اعراض و سکوت کیا وہ کہنی مناسب نہ جانی ہوگی، بہت سی باتیں خاوند ایک بیوی سے کہہ دیتا ہے، جو دوسری سے کہنی مناسب نہیں سمجھتا بعض کہتے ہیں وہ خلافت ابوبکر رضہ و عمر رضہ کی بات تھی جس سے مصلحت جان کر سکوت کیا۔ پھر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضہ کو یہ بات بتادی کہ تجھ سے حفصہ رضہ نے یہ کہا تو تعجب سے حضرت عائشہ رضہ نے کہا، من انباک ھذا، آپ سے کس نے کہا کہ حفصہ رضہ نے تجھ سے یہ کہا، قال نبانی العلیم الخبیر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضہ کو یہ بتایا کہ مجھے علیم و خبیر نے بتا دیا قصہ تمام ہوا، اب حفصہ رضہ اور عائشہ رضہ کو اس کیلئے کرنے تنبیہ کرتا ہے، ان تتوبا الی اللہ، اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرو تو بہتر ہے اس لئے کہ فقد صغت قلوبکما، تمہارے دل تو ضرور مائل ہے کہ آپ ۲ زینب سے یہ خصوصیت ترک کر دیں شہد نہ کھا دیں یا ماریہ رضہ کو ترک کر دیں، خیر دار ایسے رشک و رقابت سے باز آؤ، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چڑھائی نہ کرو، وان تظاھرا اگر چڑھائی کر دگی فان اللہ ھو مولہ تو اللہ تعالی اسکا رفیق اور چارہ گر ہے۔ وجبریل اور عالم ملکوت میں جبریل بھی چارہ گر ہے۔ الہامات میں مؤید ہے اور ناسوت میں صالح المومنین نیک بندے ابیا غدار اور مددگار ہیں خلفاء اربعہ وغیرہ اور اسکے ہر وقت ہر جگہ فرشتوں کا حفاظتی لشکر آپ کے

ساتھ رہتا ہے۔

وضاحت

حلال چیز کا اپنے اوپر حرام کر لینا جیسا کہ آیت میں لم تحرم ما احل اللہ لک۔ یہ امام ابوحنیفہ وغیرہ
فقہاء و کبار کے نزدیک یمین ہے، اسلئے کہ تعذیمین خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم
کہ اللہ تعالیٰ نے یمین کا کھولنا فرض کیا ہے۔ اور یمین کا کھولنا کفارہ دینا ہے۔ اگر کفارہ کی بات پر قسم کھائے یا خواہ مخواہ کسی مباح
یا حلال چیز پر قسم کھا بیٹھے کہ ایسا نہ کروں گا تو کفارہ دے کر اس قسم سے الگ ہو جانا چاہئے، فرض اللہ لفظ بتا رہا ہے کہ
ضرور اس قسم سے دور ہونا چاہئے کفارہ یمین غلام آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو اس قدر کپڑا دینا کہ نماز پڑھ سکیں اور
زیادہ دے تو توفیق ہے یا دس مسکینوں کو کھانا پیٹ بھر کر کھلانا، اور مقدور نہ ہو تو تین روزے رکھنا یہ متحمل یمین ہے،
بعض کہتے ہیں یمین میں انشاء اللہ کہہ دینا بھی متحمل ہے۔ امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ مباح کا حرام کر لینا یمین نہیں لیکن
کفارہ دینا خاص اس صورت میں ہوگا کہ جب اپنی عورت کو اپنے اوپر حرام قرار دے لے گا آیت میں یہی بات تھی اور اگر
شہد کا معاملہ تھا تو آپ نے بعد میں اس پر حلف بھی کیا تھا اس لئے اسکو یمین قرار دیا گیا نہ محض اس لئے کہ مباح کو
حرام کر لیا تھا

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ دیا اور ایک غلام آزاد کیا (اپنی کنیز) حسن رح کہتے ہیں کہ کفارہ
نہیں دیا اس لئے کہ آپ مغفور تھے کفارہ اور یمین میں جو ائمہ رح کے اقوال ہیں ان کی کتابوں میں مذکور ہیں،

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ

اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدیگا جو

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ○

اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنیوالیاں روزہ رکھنے والیاں ہونگی بیوہ اور کنواریاں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا

اے ایمان والو تم اپنے کو اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (اور سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ

جس پر تند خو (اور) مضبوط فرشتے (متعین) ہیں جو خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے

اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○

کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اسکو (فوراً) بجا لاتے ہیں اور کافر کو دوزخ میں داخل کرتے وقت کہا جائے گا

اس کے بعد ازواج مطہرات کو ڈرایا جاتا ہے۔ فقال عسٰی ربہ الخ کہ تم کسی اور خیال میں نہ رہنا اگر نبی علیہ السلام نے تمکو
طلاق دیدی تو اللہ تم سے بہتر اور عورتیں اسکو دے دے گا جو مسلمات حضرت کی دل سے مطیع ہوں گی یا ان کا ظاہر بھی اسلام

ہوگا مومنات کے دل میں بھی ایمان ہوگا یعنی ظاہر و باطن ایماندار و دیندار ہوں گی قانتات عبادت کرنے والیاں قنوت کے معنی طاعت ہیں اس سے مراد تہجد گذار، پنجگانہ نماز پڑھنے والیاں دعائیں مانگنے والیاں یعنی صرف ایمان و اسلام ہی پر بس نہیں بلکہ اس کے بعد عملی حصہ میں بھی بڑا حصہ پانے والیاں ہوں گی، ایمان اسلام کے بعد اگر طاعت و عبادت نہیں تو ایمان میں رونق نہیں اور اپنی طاعت پر فخر کرنے والیاں اور بشریت سے جو قصور ہوا اس پر ہٹ اور ضد کرنے والیاں نہ ہوں گی بلکہ تائبات توبہ کرنے والیاں ہوں گی توبہ کے معنی رجوع کے ہیں گنہگار گناہ سے توبہ یعنی رجوع کرتے ہیں،

ہر انسان بالخصوص عورتیں یہ وصف اپنے میں رکھتی ہیں کہ وہ اپنے قصور پر نادم ہوں، ہٹ دھرم اور اڑیل بے امید نہیں کہ وہ اس بد عادات سے باز آوے، عابدات یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے کہ نماز و دعاء کی عبادت پر بس نہیں بلکہ ہر قسم کی عبادت کرنے والیاں ہوں گی، صدقہ خیرات، حج و زکوٰۃ خدمت شوہر و پرورش اولاد عزت و مال کی حفاظت صلہ رحمی خاوند سے ادب و خوش تعلقی اور اس کی فرمانبرداری اور اس کے ساتھ ہمدردی سب عورت کی عبادت ہے عبادت کے معنی ہیں تذلل یعنی پستی اور جھکنا خدا وند تعالیٰ کے آگے اور اس کے بعد اپنے دنیاوی آقا کے آگے جھکنا عبادت ہی اسی میں اشارہ ہے کہ نرم اور خوش خلقی بھی ہوں گی بعض عورتیں نیک بخت نمازی پرہیزگار تو ہوتی ہیں مگر سخت بدمزاج سرکش، شوخ بھی ہوتی ہیں یہ وصف خاوند کے حق میں زہر اور معاشرت کے لئے قہر ہے اور وہ اس سے بھی مبرا ہوں گی سائحات یہ سیاحت سے مشتق ہے، جس کے معنی بلحاظ سیاحت مفسروں نے مختلف طور پر بیان کئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں روزہ رکھنے والیاں، روزے میں صبح و شام تک بھوک پیاس کے میدان کو طے کرنا پڑتا ہے اس لئے اسکو بھی سائح اور عورت کو سائحہ کہتے ہیں، زید بن اسلم رح اور حسن بصری رح فرماتے ہیں اس کے معنی ہیں ہجرت کرنے والیاں، اس لئے کہ ہجرت یعنی وطن چھوڑ کر خاص اللہ کے لئے مدینہ میں عورتیں آئی تھیں یہ ان کی سیر تھی اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ مدینہ میں ہم سے زیادہ بہتر اور کون جو ہماری جگہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ زوجیت میں داخل ہوں گی بلکہ ممکن ہے کہ باہر سے ہجرت کر کے آبادی خدا کے ملک میں کیا کمی ہے۔ ہم کہتے ہیں معنی کو عام رکھنا ہے تخصیص کی حاجت کیا ہے اب اسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ صرف زمین اور پہاڑوں کے میدان کی ہی سیر کرنے والیاں نہ ہوں گی بلکہ دنیا اور اس کے تجلیات فانیہ کے میدانوں کی بھی سیر کرنے والیاں ہوں گی، ان کی نگاہوں میں یہ دنیا اور اسکی آرائش ہیچ ہوگی ہر حوادث دہر اور انقلاب جسمانی سے وہ سبق اور عبرت لینے والیاں ہوں گی اور اس کے بعد صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو سیر آفاق و انفس بھی نصیب ہوگی وہ امکان و وجود کے منازل کر کے بارگاہ قدس میں پہنچنے والیاں ہوں گی، ان میں سے کچھ خاوند برتے ہوئے اور کچھ کنواریاں ہوں گی ثیبات و ابکارا کی یہی تشریح ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بیوہ اور کنواریاں بھی تھیں، ان کے جواب میں یہ کلام صادر ہوا، اور اسمیں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح حظ نفسانی سے نہیں کرتے بلکہ اشاعت دین کے لئے یہ جماعت زمرۂ ازواج مطہرات میں داخل کی گئی اور شرف زوجیت عطا کیا گیا، ان صفات میں عجب لحاظ رکھ کر تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ اول اجمالی طور پر خیرا منکن فرمایا گیا ہے، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات تمام دنیا کی عورتوں سے بہتر پھر ان سے بہتر اور کون عورتیں ہوں گی اس کا جواب یہ ہے کہ اول میں ان طلقکن فرما دیا ہے طلاق کے بعد جب شرف زوجیت جاتا رہا تو پھر ان سے وہی عورتیں بہتر ہوں گی ہیں جو آپ کے نکاح میں آ رہی گی،

ان طلقکن شرطیہ کلام ہے اس کے لئے تحقیق شرط نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر کسی بیوی کو طلاق نہیں دی اجمالی کے بعد ازواج کے اوصاف حمیدہ بیان فرماتا ہے اوصاف تین قسم پر ہیں،

اوّل:- ایمان و اسلام جو تمام حسنات کی اصل ہے۔ ایمان کے ساتھ اسلام کا لفظ ظاہری و باطنی دینداری کے لئے آیا۔

دوم:- اعمال حسنہ اس کو چار صفتوں میں محصور کیا (۱) قانتات (۲) تائبات (۳) عابدات (۴) سائحات ان میں خدا تعالیٰ کی بندگی بھی آگئی اور خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف بھی اشارہ ہے۔

سوم:- ان کی جسمانی خوبی اور حسن ظاہر ان کے لئے یہ دو لفظ کافی تھے، ثیبات و ابکارا۔ کنواری کی خوبی اور اس پر رغبت تو عام طبائع کا بھی فعل ہے مگر بہت سی بیوائیں مطلقہ اپنے ذاتی کمالات اور حسن و خوبی کی وجہ سے کنواریوں سے بدرجہا فائق ہوتی ہیں۔ ان کا امور خانہ داری میں تجربہ اپنے ناز و ادا سے دو گز رکر کے مرد کی ناز برداری و اطاعت اور پھر ہمسری عجیب لطف دیتی ہے۔

ازواج مطہرات پر تنبیہ تھی۔ اس کے ضمن میں مردوں کو بھی نصیحت دینا لازمی تھا۔ اس لئے کہ عورتوں کی محبت و رغبت میں اور شہوت کی آگ میں مرد دیوانہ ہو کر اصول حسنات سے غافل ہو جاتا ہے اور جو نہ کرنا ہو وہ کرتا ہے۔ تعالیٰ یا ایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارًا کہ اے ایماندار (صرف ایمان پر تکیہ کر کے نہ بیٹھو) بلکہ آپ کو اپنے گھر پیاری بیوی اور مرغوب اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ ایسے کام نہ خود کرو نہ ان کو کرنے دو، جس سے جہنم کی آگ میں جانا پڑے۔ اور فرائض و واجبات کی تاکید کرو صرف آپ ہی دیندار پھر پرہیزگار ہونا کافی نہیں، زن و فرزند کی تعلیم و تدبیر کرنی چاہیئے، حق محبت بھی یہی ہے، کیونکہ آپ جنت میں گئے یہ دوزخ میں گئے تو جدائی میں کیا لطف؟ احادیث صحیحہ میں بڑی تاکید ہے کہ اپنے گھر والوں کو بری باتوں سے روکو فرائض و واجبات پر مامور کرو، پھر وہ آگ بھی کیسی آگ ہے۔

(۱) وقودھا الناس والحجارۃ۔ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں یعنی معمولی آگ نہیں، بلکہ سخت اور تیز جس میں پتھر اور آدمی جلتے ہیں، یا یوں کہو۔ بت پرست اور گنہگار اور ان کے جھوٹے معبود جو پتھر کے سب جہنم میں جائیں گے اور کس کے کام نہ آئیں گے،

(۲) علیھا ملئکۃ غلاظ شداد، اس کے داروغہ یا محافظ فرشتے ہیں۔ سخت دل یا بڑے سخت دل یا بڑے تند و طاقت والے جن پر کوئی مجرم زور سے غالب نہیں آسکتا نہ وہ کسی پر رحم کرتے ہیں۔

(۳) لایعصون اللہ ما امرھم، خدا کے حکم میں ذرا بھی قصور کرنے والے نہیں، نہ رشوت لیں نہ سفارش مانیں اور نہ کسی کی منیں

(۴) ویفعلون ما یؤمرون۔ وہ وہی کرتے ہیں۔ جس کا انہیں حکم ہوتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ

اے کافرو آج تم عذر (و معذرت) مت کرو (کہ بے سود ہے) پس تم کو تو اسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم

تَعْمَلُونَ ۝ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا

(دنیا میں) کیا کرتے تھے اے ایمان والو تم اللہ کے آگے سچی توبہ کرو (توبہ کا ثمرہ فرماتے ہیں کہ)

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ

امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمہارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ

داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور یہ اس روز ہوگا) جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلعم) کو اور جو مسلمان (دین

اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ

کی رو سے) ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑتا ہوگا (اور) یوں دعا کرتے ہوں گے،

یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ

کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھئے (یعنی راہ میں گل نہ ہو جائے) اور ہماری مغفرت فرما دیجئے آپ ہر شئے پر

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

قادر ہیں،

تفسیر یہ کلام سابق کا تتمہ ہے کہ ملائکہ اس روز عذاب کریں گے اور سخت و تند ہوں گے ان کے عذاب پر کفار معذرت کریں گے ان کے جواب میں کہا جائے گا اے منکرو آج عذر نہ کرو باتیں نہ بناؤ اس لئے کہ آج معذرت کا دن نہیں اس کا موقعہ دنیا میں تھا جو گذر گیا اور یہ بھی نہ سمجھو کہ تم کو ناحق عذاب دیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم کو وہ ہی بدلہ دیا جاتا ہے جو تم دنیا میں کرتے تھے یعنی تمہارے اعمال بد کی سزا ہے جو بویا تھا اسکو کاٹ رہے ہو، دنیا میں اعمال بد کی برائی چنداں ظاہر نہ تھی اب حجاب کھل گیا وہ برائی آنکھوں کے سامنے آ گئی

اور ایمانداروں سے شفقت کی راہ سے فرماتا ہے اے ایمان والو دنیا میں توبہ کا وقت ہے۔ بشریت سے جو گناہ ہو جائے۔ اس پر توبہ کرو تو یہ بھی کیسی توبہ نصوحا یعنی خالص سچے دل سے حسن رح کہتے ہیں کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ اس گناہ کو برا اور مکروہ جاننے لگے، جس کو مرغوب جان کر کیا تھا، اور جب یاد کرے تو استغفار کرے، کلبی کہتے ہیں تو یہ نصوح دل میں ندامت زبان سے استغفار اور اس کام سے باز رہنا، سعید رض بن جبیر کہتے ہیں۔ تو یہ مقبولہ کا نام تو یہ نصوح ہے۔ حضرت عمر رض سے کسی نے پوچھا کہ توبہ نصوح کیا ہے؟ فرمایا برے کام سے باز آنا، امام احمد رح و ابن مردویہ رح نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ توبہ گناہ سے یہ ہے کہ پھر نہ کرے اور روایت میں ہے پھر اس کے کرنے کا ارادہ بھی نہ کرے حضرت عبداللہ رض سے بھی اس کے قریب مروی ہے ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ ہی آیا ہے جو ضعیف ہے۔

حضرت ابی رض بن کعب فرماتے ہیں ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس وقت امت کے آخری لوگ قیامت کے قریب کیا کام کریں گے؛ ان میں ایک یہ ہے کہ انسان اپنی بیوی یا لونڈی سے اسکے پاخانہ کی جگہ میں وطی کرے گا جو اللہ اور اس کے رسول ص نے حرام کر دیا ہے اور جس فعل پر خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی ناراضگی ہوتی ہے۔ اس طرح مرد مرد سے بدفعلی کریں گے۔ جو حرام اور باعث ناراضگی خدا اور رسول ص ہے۔ ان لوگوں کی نماز بھی خدا کے یہاں مقبول نہیں جب تک کہ یہ توبہ نصوح نہ کرو ملو، لیس، بھلا بات کی دلیل تو یہ [illegible] ہے جو شخص اسلام میں نیکیاں کرے وہ اپنی پہلی [illegible]

کی برائیوں پر پکڑا نہ جائے گا اور جو اسلام لا کر بھی برائیوں میں مبتلا رہے وہ اسلام کی اور جاہلیت کی دونوں برائیوں میں پکڑا جائے گا، پس اسلام ہو کر گناہوں کو دور کرنے میں توبہ سے بڑھ کر ہے۔ جب اس کے بعد بھی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے پہلی برائیوں میں بھی پکڑ ہوئی تو توبہ کے بعد تو بطور اولیٰ ہونی چاہئے۔ پس فرمان ہے کہ خالص توبہ کرنے والے قطعاً اپنے گناہوں کو معاف کروالیں گے اور سرسبز و شاداب جنتوں میں جائیں گے، پھر ارشاد ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو ہرگز شرمندہ نہ کرے گا انہیں خدا کی طرف سے نور عطا ہوگا جو ان کے آگے آگے اور دائیں طرف ہوگا اور سب اندھیروں میں ہوں گے اور یہ روشنی میں ہوں گے جیسے کہ پہلے سورۂ حدید کی تفسیر میں گذر چکا۔ جب یہ دیکھیں گے کہ منافقوں کو جو روشنی ملی تھی عین ضرورت کے وقت وہ ان سے چھین لی گئی، اور وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہ گئے: تو وہ دعا کریں گے کہ خدایا ہمارے ساتھ ایسا نہ ہو ہماری روشنی تو آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہے ہمارا نور ایمان بجھنے نہ پائے؛ بنو کنانہ کے ایک صحابی فرماتے ہیں فتح مکہ والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے میں نے نماز پڑھی تو میں نے آپ کی اس دعا کو سنا الٰہی مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کرنا۔ ایک حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سب سے پہلے سجدے کی اجازت مجھے دی جائے گی اور اسی طرح سب سے پہلے سجدے سے سر اٹھانے کی اجازت بھی مجھ ہی کو مرحمت ہوگی میں اپنے سامنے اور دائیں بائیں نظر ڈال کر اپنی امت کو پہچان لوں گا، ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا حضورؐ انہیں کیسے پہچانیں گے؟ وہاں تو بہت سی امتیں ہونگی، آپؐ نے فرمایا میری امت کے لوگوں کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ ان کے اعضاء وضو منور ہوں گے کسی اور امت میں یہ بات نہ ہوگی، دوسری پہچان یہ ہے کہ ان کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے، تیسری نشانی یہ ہوگی کہ سجدے کے نشان ان کی پیشانیوں پر ہوں گے، جن سے میں پہچان لوں گا۔ چوتھی علامت یہ ہے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے ہوگا

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ

اے نبی (صلعم) کفار سے (بالسنان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے دنیا میں تو یہ اس کے

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

مستحق ہیں) اور آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے   اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح (علیہ السلام)

لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ

کی بی بی   اور لوط (علیہ السلام) کی بی بی کا حال بیان فرماتا ہے، وہ دونوں ہمارے

عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ

خاص بندوں میں سے   دو بندوں کے نکاح میں تھیں   سو ان عورتوں نے ان دونوں بندوں کا حق ضائع کیا؛

اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○ وَضَرَبَ اللّٰهُ

تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلہ میں ان کے ذرا کام نہ آسکے اور ان دونوں عورتوں کو بوجہ کافر ہونے کے حکم ہوگیا کہ اور جانے والوں کے ساتھ تم دونوں

مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ

ابھی دوزخ میں جاؤ۔ اور مانند تعالیٰ مسلمانوں (کی تسلی) کے لئے فرعون کی بیوی (حضرت آسیہ) کا حال بیان کرتا ہے جب کہ اُن بی بی نے دُعا کی کہ اے

عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ

میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے، اور مجھکو فرعون کے شر سے اور اسکے عمل (کفر) کے ضرر اور اثرات محفوظ رکھ

الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ

اور مجھکو تمام ظالم (یعنی کافر) لوگوں سے محفوظ رکھئے اور (نیز مسلمانوں کی تسلی کے لئے) عمران کی بیٹی (حضرت مریم علیہا السلام) کا حال بیان کرتا ہے

فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ

جنھوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا سو ہم نے انکے چاک گریبان میں اپنی روح پھونک دی اور انھوں نے اپنے پروردگار کے

كُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝

پیغاموں کی (جو انکو ملائکہ کے ذریعے پہنچے تھے) اور اسکی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت والوں میں سے تھیں

تفسیر پہلے ذکر ہوا تھا کہ اے ایماندارو توبہ خالص کرو تاکہ تمہارا عاقبت میں بھلا ہو اور کفار و منافقوں کی بھی اصلاح مقصود تھی۔ جس کا ذریعہ کفر و بدکاریوں سے توبہ و استغفار ہے مگر یہ بھی انسانی خاصہ ہے کہ وہ بدی سے کبھی محض وعظ و نصیحت سے باز نہیں آتا اور وہاں مشفق اور دردمند ناصح کو بشرط قدرت یہ بھی کرنا ضروری ہے کہ اسکو دھمکا کر ڈرا کر اس بدی سے روکے جب نادان شخص ہمارے سامنے سنکھیا ہاتھ میں لے کر کھانے کو تیار ہے اور ہماری نصیحت سے باز نہیں آتا پھر ہماری دردمندی کا یہ مقتضا نہیں کہ چپ ہو کر دیکھیں اور اسے مرتے دیکھیں بلکہ دھکا کر مار کر ہاتھ سے چھین لیں اس لئے خداتعالیٰ اپنے نبی رحیم و کریم کو ان نادانوں کی بابت حکم دیتا ہے کہ اے نبی ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر، اور ان پر سختی کر، جہاد عام لفظ ہے۔ اسمیں زبانی نصیحت اور دلیل و حجت سے الزام قائم کرنا بھی شامل ہے اور جو مخالف شمشیر بکف ہو کر مقابلہ میں کھڑا ہو تو وہاں اس کے لئے تلوار سے بھی کام لینے کو بھی شامل ہے اور منافقوں سے جہاد کر، حدود خدا جاری کرنے کے ساتھ ان پر دنیا میں سختی کرو۔ آخرت میں بھی ٹھکانا جہنم ہے، جو بدترین بازگشت ہے پھر مثال دیکر سمجھایا کہ کافروں کا مسلمانوں سے ملنا جلنا خلط ملط رہنا انھیں ان کے کفر کے باوجود خداتعالیٰ کے یہاں کچھ نفع نہیں دے سکتا، دیکھو دو پیغمبروں کی عورتیں (حضرت نوح علیہ السلام کی اور حضرت لوط علیہ السلام کی) جو ہر وقت نبیوں کی صحبت میں رہنے والی تھیں، لیکن چونکہ ایمان میں ان کے ساتھی نہ تھیں اور اپنے کفر پر قائم تھیں، پس پیغمبروں کی آٹھ پہر صحبت انھیں کچھ کام نہ آئی، انبیاء اللہ انھیں اخروی نفع نہ پہونچا سکے اور نہ ہی اُخروی نقصان سے بچا سکے بلکہ ان عورتوں کو بھی جہنمیوں کے ساتھ جہنم میں جانے کو کہدیا گیا۔ یہ یاد رہے کہ خیانت کرنے سے مراد یہاں بدکاری نہیں، انبیاء علیہ السلام کی حرمت عصمت اس سے بہت اعلیٰ اور بالا ہے کہ ان کی گھر والیاں فاحشہ ہوں، بلکہ یہاں مراد خیانت فی الدین ہے۔ یعنی دین میں اپنے خاوندوں کی

خیانت کی ان کا ساتھ نہ دیا، حضرت ابن عباس رضہ فرماتے ہیں کہ ان کی خیانت زنا نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی تو لوگوں سے کہا کرتی تھی کہ یہ مجنون ہیں، اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی جو مہمان حضرت لوط ع کے یہاں آتے تو کافروں کو خبر کر دیتی تھیں، یہ دونوں بددین تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی راز داری اور پوشیدہ طور پر ایمان لانے والوں کے نام کافروں پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضہ سے منقول ہے کہ کسی پیغمبر کی کسی عورت نے بھی بدکاری نہیں کی، اسی طرح حضرت عکرمہ رح حضرت سعید بن جبیر رح حضرت ضحاک رح وغیرہ سے مروی ہے اس سے استدلال کر کے بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ جو عام لوگوں میں مشہور ہے کہ حدیث میں ہے جو شخص کسی ایک بدکار کے ساتھ کھانا کھائے وہ بخشا ہوا ہے اسے بھی بخش دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیث بالکل ضعیف ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ حدیث محض بے اصل ہے ہاں ایک بزرگ سے مروی ہے کہ انھوں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور پوچھا کیا حضور ص نے یہ حدیث ارشاد فرمائی؟ آپ نے فرمایا نہیں۔

اس کے مقابلہ میں مسلمان ایمانداروں کے لئے دو نیک بیویوں کی مثال بیان فرماتا ہے جو دنیا داروں کے پنجہ اور ظلم میں مبتلا تھیں؛ مگر اپنی ایمانداری اور نیکی سے باز نہ آئیں، بعض مسلمان مرد یا عورتیں کفار کے پنجہ میں تھے اور اسکو ایک عذر سمجھتے ہوں گے ان کے لئے یہ مثال از حد نافع ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ فرماتا ہے۔ مثال میں تو فرعون کی بیوی کی، حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں، روئے زمین کے تمام تر لوگوں میں سب سے زیادہ سرکش فرعون تھا۔ لیکن اس کے کفر نے بھی اسکی بیوی کو کچھ نقصان نہ پہنچایا، اس لئے کہ وہ اپنے زبردست ایمان پر پوری طرح قائم تھی، اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ عادل وحاکم ہے، وہ ایک گناہ پر دوسرے کو نہیں پکڑتا، حضرت سلمان رضہ فرماتے ہیں فرعون اس نیک بخت بیوی کو طرح طرح سے ستاتا تھا، سخت گرمیوں میں انھیں دھوپ میں کھڑا کر دیتا تھا لیکن پروردگار اپنے فرشتوں کے پروں کا سایہ ان پر کر دیتا تھا، اور انھیں گرمی کی تکلیف سے بچا لیتا تھا، بلکہ انھیں ان کے جنتی مکانوں کو دکھاتا تھا، جس سے انکی روح تازگی اور ایمان کی زیادتی ہو جاتی۔ فرعون اور حضرت موسیٰ کی بابت یہ دریافت کرتی رہتی تھیں کہ کون غالب رہا تو ہر وقت یہی سنتیں کہ موسیٰ ع غالب رہے، بس یہی ان کے ایمان کا باعث ظہور یہ پکار اٹھیں کہ میں موسیٰ ع اور ہارون کے رب پر ایمان لائی، فرعون کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کہا جو بڑی سے بڑی پتھر کی چٹان تمھیں ملے اسے اٹھا لاؤ اور اسے چت لٹاؤ اور اسے کہو کہ اپنے اس عقیدے سے باز آئے اگر باز آجائے تو میری بیوی ہے عزت وحرمت کے ساتھ واپس لاؤ اور اگر نہ مانے تو وہ چٹان اس پر گرا دو اور اسکا قیمہ کر ڈالو جب یہ لوگ پتھر لائے انھیں لے گئے اور لٹایا گیا اور پتھر پر گرانے لئے اٹھایا تو انھوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، پروردگار نے حجاب ہٹا دے اور جنت کو اور وہاں جو جو مکان ان کے لئے بنایا گیا تھا اسے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اسی میں ان کی روح پرواز کر گئی، جس وقت پتھر پھینکا گیا اس وقت ان میں روح تھی ہی نہیں، اپنی شہادت کے وقت دعا مانگی تھیں۔ خدایا جنت میں اپنے قریب کی جگہ مجھے گھر عنایت فرما۔ اس دعا کی باریکی پر نظر ڈالئے کہ پہلے خدا کا پڑوس مانگا جا رہا ہے پھر گھر کی درخواست کی جا رہی ہے اس واقعہ کے بیان میں مرفوع حدیث بھی وارد ہوئی ہے، پھر دعا کرتی ہیں کہ مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے میں اسکی کافرانہ حرکتوں سے بیزار ہوں مجھے اس ظالم قوم سے عافیت میں رکھ، ان بیوی صاحبہ کا نام آسیہ رضہ بنت مزاحم تھا، ان کے ایمان لانے کا واقعہ حضرت ابو العالیہ رح اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ فرعون کے داروغہ کی عورت کا ایمان ان کے ایمان کا باعث بنا، وہ ایک روز فرعون کی لڑکی کا سر گوندھ رہی تھی اچانک کنگھی ہاتھ سے گر گئی، اور ان کے منہ سے نکل گیا کہ کفار برباد ہوں، اس پر فرعون کی لڑکی نے کہا کیا میرے باپ کے سوا

تو کسی اور کو اپنا رب مانتی ہے؟ اس نے کہا میرا اور تیرے باپ کا اور ہر چیز کا رب اللہ تعالیٰ ہے، اس نے غصہ میں آکر انھیں خوب مارا پیٹا اور اپنے باپ کو اسکی خبر کردی فرعون نے بلا کر خود ان سے پوچھا کیا تم میرے سوا کسی اور کی عبادت کرتی ہو؟ جواب دیا کہ ہاں میرا اور تیرا اور تمام مخلوق کا رب اللہ ہے میں اسی کی عبادت کرتی ہوں: فرعون نے حکم دیا اور انھیں چت لٹا کر ان کے ہاتھ پیروں میں میخیں گڑوا دیں اور سانپ چھوڑ دیئے جو انھیں کاٹتے رہیں پھر ایک دن اور کہا اب بھی تیرے خیالات درست ہوئے؟ وہاں سے جواب ملا کہ میرا اور تیرا بلکہ ساری مخلوق کا رب اللہ ہی ہے فرعون نے کہا اب تیرے سامنے تیرے لڑکے کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دوں گا ورنہ اب بھی میرا کہنا مان لے اور اس دین سے باز آجا۔ انھوں نے جواب دیا جو کچھ تو کر سکتا ہے کر ڈال، اس ظالم نے اس لڑکے کو پکڑوا کر منگوایا، اور ان کے سامنے اسے مار ڈالا، جب اس بچہ کی روح نکلی تو اس نے کہا اے ماں خوش ہو جا تیرے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے ثواب تیار کر رکھے ہیں اور فلاں فلاں نعمتیں تجھے ملیں گی، انھوں نے اس روح فرسا سانحہ کو بچشم خود دیکھا لیکن صبر کیا اور راضی بقضا ہو کر بیٹھ رہیں، فرعون نے پھر انھیں اسی طرح باندھ کر ڈلوا دیا اور سانپ چھوڑ دئے۔ پھر ایک دن آیا اور اپنی بات دہرائی، بیوی صاحبہ نے پھر نہایت صبر و استقلال سے وہی جواب دیا اس نے پھر وہی دھمکی دی، اور ان کے دوسرے بچے کو بھی ان کے سامنے ہی قتل کرا دیا، اس کی روح نے اسی طرح اپنی والدہ کو خوشخبری دی اور صبر کی تلقین کی، فرعون کی بیوی نے بڑے بچے کی روح کی خوشخبری سنی تھی، اب اس چھوٹے بچے کی بھی خوشخبری سنی اور ایمان لے آئیں ادھر ان بیوی صاحبہ کی روح اللہ تعالیٰ نے قبض کرالی اور ان کی منزل و مرتبہ جو خدا کے یہاں تھا وہ حجاب ہٹا کر فرعون کی بیوی کو دکھلا دیا، یہ اپنے ایمان اور یقین میں بہت بڑھ گئیں، یہاں تک کہ فرعون کو بھی ان کے ایمان کی خبر ہو گئی، اس نے ایک روز اپنے درباریوں سے کہا تمہیں کچھ میری بیوی کی بھی خبر ہے؟ تم اسے کیا جانتے ہو؟ سب نے بہت تعریف کی اور بھلائی بیان کیں، فرعون نے کہا تمہیں نہیں معلوم، وہ میرے سوا دوسرے کو خدا مانتی ہے۔ پھر مشورہ ہوا کہ انھیں قتل کر دیا جائے، چنانچہ میخیں گاڑ دی گئیں اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالدیا گیا اس وقت حضرت آسیہ رضؓ نے اپنے رب سے دعا کی کہ پروردگار میرے لئے جنت میں مکان اپنے پاس بنا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا مقبول کی اور حجاب اٹھا کر انھیں ان کا جنتی درجہ دکھا دیا، جس پر یہ ہنسنے لگیں۔ ٹھیک اسی وقت فرعون آگیا اور انھیں ہنستا ہوا دیکھ کر کہنے لگا لوگو تمہیں تعجب نہیں معلوم ہوتا؟ کہ اتنی سخت سزا میں مبتلا ہے اور پھر ہنس رہی ہے۔ یقیناً اس کا دماغ ٹھکانے نہیں الغرض انہی عذابوں میں یہ شہید ہوئیں۔ ——— پھر دوسری مثال حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کی بیان کیجاتی ہے کہ وہ نہایت پاکدامن تھیں ہم نے اپنے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی معرفت ان میں روح پھونکی حضرت جبرئیلؑ کو انسانی صورت میں اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ اپنے منہ سے ان کے گریبان میں پھونک ماردیں، اس سے حمل رہ گیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، پس ارشاد ہے کہ ہم نے اسمیں اپنی روح پھونکی، پھر حضرت مریمؑ کی اور تعریف ہو رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی تقدیر اور شریعت کو سچے ماننے والی تھیں اور پوری فرمانبردار تھیں مسند احمد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر چار لکیریں کھینچیں اور صحابہ رضؓ سے دریافت کیا جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولؐ ہی کو پورا علم ہے۔ آپ نے فرمایا تمام جنتی عورتوں میں سے افضل خدیجہ رضؓ بنت خویلد اور فاطمہ رضؓ بنت محمدؐ اور مریم بنت عمران رضؓ اور آسیہ بنت مزاحم رضؓ ہیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔ صحیح بخاری صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردوں میں سے تو صاحب کمال بہت سارے ہوئے ہیں، لیکن عورتوں میں سے کامل عورتیں صرف حضرت آسیہ رضؓ ہیں جو فرعون کی بیوی تھیں، اور حضرت مریمؑ بنت عمران ہیں اور حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں اور حضرت عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے سالن میں بھیگی ہوئی روٹی کی فضیلت باقی کھانوں پر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنتی بیویوں میں ایک حضرت آسیہ رضؓ بنت مزاحم بھی ہیں یہ اعزاز حضرت آسیہ رضؓ کے قسمت میں تھا جو باری تعالیٰ نے ان کے لئے خوش ہو کر ان کو بخشا حضرت آسیہؓ کی خوش قسمت ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہے

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السبحان

کا

پارہ نمبر ۲۹

تَبَارَكَ الَّذِیْ

فاضل اجل حضرت مولانا عبدالدائم جلالی

مالک
عطاء الرحمٰن صدیقی
مطبوعہ:۔ محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ

وہ (خدا) بڑا عالیشان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے،

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا

اچھا ہے۔ اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے، جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ

تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا۔ سو تو (ایک بار) پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے

تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ

کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے (یعنی بلا تامل تو نے بہت بار دیکھا ہوگا ایک بار تامل سے نگاہ کر) پھر بار بار نگاہ

الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا

ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئیگی۔ اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (یعنی

بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ

ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان (ستاروں) کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنا دیا ہے، اور ہم ان شیاطین

عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝

کے لئے (آخرت میں بوجہ ان کے کفر کے) دوزخ کا عذاب (بھی) تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر: مسند احمد میں بہ روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن شریف میں ایک سورت ہے جس میں تیس ۳۰ آیتیں ہیں، جو اپنے پڑھنے والوں کی حق تعالیٰ سے سفارش کرتی رہے گی تاآنکہ وہ شخص جس کے لئے سورۃ شریف سفارش کر رہی ہے بخش نہ دیا جائے۔ اور وہ سورۃ سورۃ ملک ہے۔

ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ میں یہ بھی حدیث ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قبر پر خیمہ نصب کیا انہیں یہ علم نہ تھا کہ یہاں قبر ہے وہاں ایک آدمی کو سنا کہ تبارک الذی پڑھتا ہے، اس صحابی رضی اللہ تعالیٰ نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سورۃ مانعہ ہے یہ منجیہ ہے جو کہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے نجات دیتی ہے۔ (رواہ الترمذی)

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک سوتے نہ تھے جب تک کہ الم تنزیل الخ وتبارک الذی الخ تمام نہ کر لیتے تھے (رواہ الترمذی والدارمی) یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی، قرطبی کہتے ہیں اس پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اس کے بعد سورۃ حاقہ وسورۃ معارج نازل ہوئی۔ مگر حسن بصری رح وغیرہ فرماتے ہیں، مدینہ شریف میں نازل ہوئی، لیکن ساتھ ہی کلام کے طرز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اور یہ سورہ رحمانیات سے ہے کہ بجائے اسم ذات کے اسم رحمٰن اس میں مستعمل ہے اور دیگر سورتیں کہ ان میں اسم رب کا استعمال ہے ان کو ربانیات کہتے ہیں۔

اس سورۃ میں بتلایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ بادشاہ حقیقی ہے۔ موت وحیات کا مالک ہے دنیاوی گھر، آسمان وزمین، اسی نے بنائے، اس گھر کو قندیلوں سے آراستہ وپیراستہ کیا، رزق وروزی کے سامان پیدا کئے، دار آخرت کا راستہ بتانے والے ہادی بھیجے اور پھر ہر طرح سے اس کا قبضۂ قدرت ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کے بندے اس کی کیا کیا نافرمانی کرتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ اسکی خدائی میں اوروں کو حصہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مگر وہ دنیا میں اس پر بھی کسی کے رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا بلکہ اپنے فضل وکرم سے درگزر کرتا ہے اس میں بالادستوں کے لئے بہت بڑی تعلیم مضمر ہے کہ وہ بھی زیردستوں پر رحم کیا کریں اور اپنے بالادست کی نافرمانی سے باز آئیں ورنہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ دوسرے جہان میں جہنم کے قیدخانہ میں سخت سزا بھگتنی پڑے گی ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مخالفت ونافرمانی سے اس کی بادشاہت میں کوئی بھی قصور نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی تعریف بیان فرما رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ تمام مخلوق پر اسی کا قبضہ ہے جو چاہے کرے کوئی اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا، اس کے غلبہ، حکمت اور عدل کی وجہ سے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے۔ پھر موت وحیات کا پیدا کرنا بیان فرما رہا ہے۔ اس آیت سے اُن لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ موت ایک وجودی امر ہے کیونکہ وہ بھی پیدا کی ہوئی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوق کو عدم سے وجود میں لایا تاکہ اچھے اعمال والوں کا امتحان ہو جائے۔ جیسے اور جگہ ہے۔ کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو؟ تم تو مردہ تھے پھر اس نے تمہیں زندہ کر دیا، پس پہلے حال یعنی عدم کو یہاں بھی موت کہا گیا، اور اس پیدائش کو حیات کہا گیا۔ اس لئے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، ثم یمیتکم ثم یحییکم وہ پھر تمہیں مار ڈالے گا، اور پھر زندہ کر دے گا،

ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بنی آدم موت کی ذلت میں تھے۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے حیات کا گھر بنا دیا۔ پھر موت کا اور آخرت کو جزاء کا، پھر بقاء کا، لیکن یہی روایت ایک دوسرے موقع پر حضرت قتادہ کا قول بیان کیا گیا ہے۔ آزمائش اس امر کی ہے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے؟ اکثر عمل والا نہیں بلکہ بہتر عمل والا عامیوں اور سرتاب لوگوں کے لئے جب رجوع کریں اور توبہ کریں تو معاف کرنے والا اور بخشنے والا بھی ہے جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے ایک پر ایک، گو بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک پر ایک ملا ہوا ہے۔ لیکن دوسرا

قول یہ ہے کہ درمیان میں جگہ ہے۔ اور ایک دوسرے اوپر فاصلے سے ہے۔ زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ اور حدیث معراج وغیرہ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پیدائشی پروردگار میں تو کوئی کمی و عیب نہ پائے گا۔ بلکہ تو دیکھے گا کہ وہ برابر ہے نہ ہیر پھیر ہے۔ نہ مخالفت اور بے ربطی ہے، نہ کمی اور عیب اور خلل ہے۔ اپنی نظر آسمان کی طرف ڈال اور غور سے دیکھ کہ کہیں کوئی عیب، ٹوٹ پھوٹ، شگاف، سوراخ دکھلائی دیتا ہے؟ پھر بھی اگر شک رہے تو دو دو دفعہ دیکھ لے کوئی کمی نظر نہ آئے گی۔ تیری نگاہیں تھک کر اور ناکام ہوکر نیچی ہوجائیں گی۔ کمی کی نفی کرکے اب کمال کا اثبات ہورہا ہے۔

فرماتا ہے آسمانِ دنیا کو ہم نے ان قدرتی چراغوں یعنی ستاروں سے بارونق بنا رکھا ہے۔ جن میں بعض چلنے پھرنے والے ہیں۔ پھر ان کا ایک فائدہ اور بیان ہورہا ہے کہ ان سے شیطان کو مارا جاتا ہے۔ ان میں سے شعلے نکل کر ان پر گرتے ہیں یہ نہیں کہ خود ستارہ ان پر ٹوٹے۔ شیاطین کی دنیا میں یہ رسوائی تو دیکھتے ہی ہو آخرت میں بھی اُن کے لئے جلانے والا عذاب ہے۔ جیسے سورۃ صافات کے شروع میں ہے کہ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی ہے، اور سرکش شیاطین کی حفاظت ان کے ذمہ کردیا ہے۔ وہ بلند و بالا فرشتوں کی باتیں سن نہیں سکتے، اور ہر طرف کی مار سے ہٹا دئے جاتے ہیں، اور ان کے لئے یہ دائمی عذاب ہے۔ اگر کوئی ان میں سے ایک آدھ بات اچک لے کر بھاگتا ہے تو اس کے پیچھے چمکدار اور تیز مشعلہ لپکتا ہے۔

حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں۔ ستارے تین فائدوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ آسمان کی زینت، شیطانوں کی مار اور راہ پانے کے نشانات جس شخص نے اس کے سوا اور کوئی بات تلاش کی اس نے رائے کی پیروی کی اور اپنا حصہ کھو دیا، اور باوجود علم نہ ہونے کے تکلف کیا، (ابن جریر، اور ابن ابی حاتم)

حال کا فلسفہ سات آسمانوں کا قائل نہیں۔ وہ ان بلند سات ستاروں کو سبع سموات کا مصداق سمجھتے ہیں مگر توریت کے اوّل باب اور دیگر مقامات پر بھی آسمانوں کا بنانا مذکور ہے، پاک کتابیں اور اگلے حکیم سب اسکی شہادت دے رہے ہیں۔ اور ان ستاروں کی ایسی تیز حرکت کہ منٹوں میں سیکڑوں کوسوں کا فاصلہ طے کرجاتے ہیں، پھر باہم ٹکرانے نہیں پاتے ہر ایک اپنے مدار پر دورہ کررہا ہے یہ اسی بادشاہ ذوالجلال قادر کا کام ہے نہ طبائع اجرام علویہ کا نہ کسی زور کا، پھر ان شعاعوں سے جو کچھ تاثرات زمین پر ہوتے ہیں وہ بھی قابل غور ہیں۔

اُس کے بعد اس محکم عمارت کی استواری ہے۔ فقال ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت۔ اے نظر کرنے والے تو رحمٰن کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں جو بڑا بابرکت اور بادشاہ اور قادر ہے، کوئی فرق نہیں دیکھے گا، قدرت نے اپنی کاریگری میں کہیں فرق نہیں کیا ہر چیز میں انسان سے لے کر حیوانات نباتات عناصر اجرام علویہ سبع سماوات اور ذرات تک یکساں کاریگری کی ہے یہ نہیں کہ بعض اشیاء کو حکمت و بصیرت سے بنایا اور بعض کو یونہی کیف ما اتفق بے سوچے سمجھے یا بیکار فضول بنا ڈالا ہے۔ خود انسان کے اعضاء کا تناسب اور حسن ترتیب عقل کو حیرت میں ڈالنے والی چیز ہے۔ کسی درخت کے پتے یا پھول کو ہاتھ میں لے کر دیکھے گا تو آپ بول اٹھے گا کہ سبحان اللہ تیری صنعت یہ ہیں، ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت کے یہ معنی مراد نہیں کہ مخلوقات میں باعتبار ان کی جسامت اور رنگت اور تاثیر کے کوئی فرق نہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو مشتبہ ہوجائے کہ طبیعت اجسام کا یکساں فعل ہے۔ اور نیز کارخانۂ دنیا میں انتظام نہ رہے۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور۔ اگر ایک بار دیکھنے میں شبہ باقی رہ جائے تو پھر دیکھ تجھکو کوئی اس کی صنعت میں فطور بھی دکھائی دیتا ہے؟ جواب یہی ہوگا ہرگز نہیں۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ

اور جو لوگ اپنے رب کی توحید کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بری جگہ

الْمَصِيْرُ ۝ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ

ہے جب یہ لوگ اس میں ڈالے جاویں گے تو اس کی ایک بڑی زور کی آواز سنیں گے اور وہ اس طرح جوش

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ

مارتی ہوگی، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ (ابھی) غصہ کے مارے پھٹ پڑیگی، (اور) جب اس میں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جاویگا تو اسکے محافظ

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا

ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانیوالا (پیغمبر) نہیں آیا تھا وہ کافر بطور اعتراف کے) کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر)

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝

اور کہہ دیا خدا تعالٰی نے (از قبیل احکام وکتب) کچھ نازل نہیں کیا (اور) تم بڑی غلطی میں پڑے ہو

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

اور کافر فرشتوں سے یہ بھی کہیں گے کہ ہم اگر سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں شامل نہ ہوتے

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے، سو اہل دوزخ پر لعنت ہے،

تفسیر جہاں شیاطین کے لئے عذاب السعیر تیار کرنا فرمایا تھا، اس کے ساتھ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ جو بھی اسکے ساتھ کفر کرے وہ جہنمی ہے۔ اس کا انجام اور جگہ بد سے بدتر ہے۔ یعنی جس قدر کفار اور مشرکین ہیں ان کا بھی انجام کار بیان فرماتا ہے، فقال للذین کفروا بربھم عذاب جھنم کہ ان کے لئے جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا جہنم کا عذاب ہے، جو بری جگہ ہے۔ رب کا لفظ مربی اور محسن کے ہم معنیٰ ہے۔ پھر خیال کیجئے جو اپنے مربی اور محسن کا انکار کرے اس کے لئے عذاب جہنم نہ ہو تو اور کیا ہو۔ اب انکار کی وضاحت بیان کی جاتی ہے کہ انکار کرنا ایک تو یہ ہی معمولی انکار ہے کہ اس کے برگزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانا یا اس کے احکام کو نہ مانا یا صفات توحید کے خلاف اعتقاد کیا انہی سب باتوں کے مرتکب کو کافر کہا جاتا ہے۔ اور اسی ضمن میں مشرک بھی آگیا لیکن سرے سے اس ذات باری کا ہی انکار کردینا کہ خدا تعالٰی ہے ہی نہیں۔ جیساکہ دہریہ کہتے ہیں یہ سب لوگ کافر سمجھے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اسکی بے پایاں نعمتوں کی ناشکر گذاری اور گلہ کرنا بھی ایک قسم کا کفر یا کفران نعمت ہے ایسے لوگوں کے لئے بھی عذاب جہنم ہے گو وہ ابدی نہ ہو۔

اس کے بعد جہنم اور جہنمیوں کے کچھ خوفناک حالات بیان فرماتا ہے کہ جب یہ کفار جہنم میں ڈالے جائیں گے جو کہ بہت وسیع اور مکروہ گڈھا ہے کی سی آوازیں مارنے والے اور جوش مارنے والی ہے جو کہ ان جہنمیوں پر جل نہیں رہی ہے۔ اور جوش و غضب سے اس طرح دانت بھینچ رہی ہے کہ گویا ابھی ان جہنمیوں پر ٹوٹ پڑے گی، جب کفار اس دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ تو وہاں ان کا کوئی خیر مقدم کرنے والا نہ ہوگا۔ بلکہ جہنم کی پرخوف اور دل ہلا دینے والی آوازیں سنیں گے، جو اس کے فرط جوش و غضب سے نکلتی ہوں گی اور یہ ایک کلیہ ہے کہ جب آگ زیادہ گرم اور تیز ہوتی ہے۔ تو اس کے شعلوں میں سے ایک مہیب آواز آیا کرتی ہے۔ اور یہ دنیاوی آگ کا خاصہ ہے۔ جو کہ جہنم کی آگ کا عشر عشیر نہیں ہے۔ پھر خیال کرو کہ جہنم کی آواز کس قدر مہیب اور دل ہلا دینے والی ہوگی، اور ساتھ ہی دوزخ کے فرشتے جو کہ دوزخیوں کے عذاب کے لئے متعین ہیں۔ ان میں رحم دلی کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہوگا، جب جہنم میں ایک گروہ داخل ہوگا، تو ان سے جہنم کے فرشتے سوال کریں گے، کہ بتاؤ تمہارے پاس دنیا میں ڈرانے والا نہیں آیا اور تم کو اس گمری سے نہیں روکا، جسکی وجہ سے تم آج اس بلا میں گرفتار ہوئے ہو؟ کفار اس وقت کف افسوس ملیں گے اور فرشتوں سے کہیں گے کیوں نہیں ڈرانے والا ہمارے پاس آیا اور ہمکو ڈرایا لیکن وائے قسمت ہم نے اسکو جھٹلا دیا اس کے بعد کفار کہیں گے ہم نے صرف جھٹلایا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا ما نزل اللّٰہ من شیٔ کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں نازل کی نہ کتاب بھیجی اور نہ ہی احکام نہ حوادث نہ مصائب اور یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے اور موت یونہی آئی۔ افلاس یوں آگیا تھا، اقبال اس لئے جا رہا تھا۔ بیماری اس وجہ سے ہوگئی تھی، یہ سب امور اسباب پر مبنی تھے، خدا تعالیٰ نے کیا کیا؟ غرضیکہ ہر طرح سے محنتیں کی گئیں اور سب باتوں کو جھٹلا یا گیا۔ ان انتم فی ضلٰلٍ کبیر ۔ اے جو تم نذیر کہلاتے ہو بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو، خدا نے کتاب بھیجی، رسول بھیجا، احکام بھیجے، اس کو کیا پڑی تھی جو وہ ایسا کرتا؟ گناہوں کے سبب مصیبت آئی، وبا زنا سے پہنچی، قحط بھیجا بیماری بھیجی، اس نے کچھ نہیں بھیجا، یہ پرانے خیالات اور جہالت کی باتیں ہیں، اوّل تو خدا ہی کہاں ہے، اور ہے بھی تو وہ اس عالم میں کیا کر سکتا ہے؟

یہ سب گفتگو کفار دوزخ کے فرشتوں سے اقرار جرم کے وقت کریں گے اور ہر بات کا جو دوزخ کے فرشتے پوچھیں گے اقرار کریں گے، والذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ اس سے بہت سے مذاہب اور عقائد فاسدہ کی اصلاح درکار ہے کس لئے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے سوا کسی اور کو پوجتے ہیں یا اس کی خدائی میں حصہ دار ٹھہراتے ہیں اور نیز دنیا کے مغروروں کو متکبروں کو بھی سمجھا دیا کہ تم اپنی شان و شوکت ناز کرے ہم سے سرکشی نہ کرو تمہاری بادشاہی ہمارے مقابلے میں کیا چیز ہے۔

تم کو قدرت کیا ہے! تم موت وحیات کے کیا مالک ہو! تم نے آسمان اور ستارے کہاں سے بنائے ہیں؟ لہٰذا ہماری طرف رجوع کرو سر نیاز جھکاؤ ورنہ جہنم کا قیدخانہ تیار ہے۔

مسلمانوں کا ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ للذین کفروا کی تخصیص سے ثابت ہوتا ہے کہ جہنم میں کفار ہی جائیں گے، مومن نہ جائیں گے، خواہ وہ کیسے گنہگار کیوں نہ ہوں، ایمان کے بعد کوئی عمل بد جہنم میں نہیں لے جا سکتا، لیکن یہ خیال غلط ہے، کس لئے کہ کفروا کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ کفار شرعی بھی شامل ہیں، جو ایماندار ہو کر اس کی ناشکری کرتے ہیں ان کو بھی گو ابدی جہنم نہ ہوگا کہیں بقدر گناہ عذاب ہے۔ لیکن عذاب دائمی نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ

بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم (مقرر) ہے۔

بِکَبِیْرٌ ○ وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ

اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو (اس کو سب خبر ہے کیونکہ) وہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ (اور

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ

بھلا کیا وہ نہ جانے گا　　جس نے پیدا کیا ہے،　　اور وہ باریک بین (اور) پورا

الْخَبِیْرُ ○

باخبر ہے

تفسیر اس سے پیشتر کی آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نہ مانیں گے اور جھٹلائیں گے ان کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ اب باری تعالیٰ ان لوگوں کو خوشخبری دے رہا ہے کہ وہ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں دنیا میں کیونکہ یہاں آخرت کا ثواب و عذاب ان کی آنکھوں سے غائب ہے محض اللہ کے رسول کے کہنے پر ایمان لاکر آئندہ آنے والی مصیبتوں سے ڈرتے اور خدا کی نافرمانیوں سے بچتے ہیں، ان کے گناہ بھی وہ معاف فرمادے گا اور زبردست ثواب اور بہترین اجر عطا فرمائے گا۔ اگر بشریت سے ان سے کوئی گناہ سرزد بھی ہوا جس کے بعد میں اظہار ندامت کیا گیا تو ان کے لئے مغفرت ہے اور اجر ہے۔

جیسے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ کچھ شخصوں کو جناب باری اپنے عرش کا سایہ اس دن دے گا، جس دن اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں سے ایک وہ ہے جیسے کوئی مال و جمال والی عورت زنا کی طرف بلائے اور وہ کہلائے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ دوسرا جو اس طرح پوشیدگی سے صدقہ کرے کہ دائیں کی خبر بائیں ہاتھ کو بھی نہ لگے مراد اس سے بہت خاموشی کی ہے۔

اور سورۃ کا سیاق اظہار شان شاہنشاہی ہے کہ وہ ایسا شاہنشاہ حقیقی ہے۔ اس کے لئے ڈرنا اور عجز و نیاز سے پیش آنا ہی مناسب ہے، اور خدا سے جو ڈرے گا وہ شکر گذاری تو بدرجۂ اولیٰ کرے گا لیکن شکر گذاری عبودیت و محکومیت ہیں۔ ظاہر کرتی جبکہ ڈرنا اور کانپنا ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ شکر گذاری برابر والا بھی اپنے مساوی درجہ کے محسن کی کرسکتا ہے۔ اور اس جگہ عجز و نیاز زیادہ مرغوب ہے۔ جو خشیت میں پوشیدہ ہے۔ لہذا اپنے رب کا ڈر و خوف ہر وقت ہر لمحہ ہونا چاہیئے،

فرمایا تھا کہ غائبانہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ کس لئے کہ ظاہری ڈر اور اطاعت ایسے شخص کی جس کے مخفی امور اور دلی اسرار کو اللہ تبارک و تعالیٰ بخوبی جانتا ہے۔ کچھ زیادہ مفید نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کو ہر بات کی بخوبی خبر ہے۔ خواہ تم اس بات کو ظاہر میں کردو یا پوشیدگی میں کیونکہ دلوں کی باتیں بھی جانتا ہے اس لئے کہ وہ خالق ہے اور خالق کو اپنی مخلوق کا ہر ہر چیز کا بخوبی علم ہونا ضروری ہے۔ اگر علم نہ ہو تو ارادہ و اختیار سے پیدا نہ کرسکے۔ حکماء نے مدلل ثابت کیا ہے کہ جسمانیت کے علم و ادراک سے مانع ہیں۔ اس لئے ملائکہ جسمانی کثافت سے بری ہونے کے سبب اور ان کے بعد روحانیت اور ان کے بعد جن اور دیگر لطیف اجسام سے مرکب چیزیں نہیں جو ہماری آنکھوں یا حواس سے باہر ہوتی ہیں۔ مثلاً خواب میں جب روح

تعلق جسم سے کسی قدر کم ہو کر دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو ہزاروں باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب ریاضیات و افکار سے روح منور ہو جاتی اور جسمانی حجاب کمزور ہو جاتے ہیں تو سینکڑوں چیزیں دور اور دراز کی دکھائی دے جاتی ہیں اسی طرح بعد مردن تو پردہ ہی کھل جاتا ہے۔ مگر حق سبحانہٗ لطیف ہے اسکے علم کی تو کچھ انتہا ہی نہیں اور سب علوم کے خزانے اس کے پاس ہیں وہ جس قدر جس کو چاہے دیتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے دلوں کی جو کیفیت آپؐ کے سامنے ہوتی ہے آپؐ کے بعد وہ نہیں رہتی، آپؐ نے فرمایا کہ بتاؤ باری تعالیٰ کے ساتھ تمہارا کیا خیال رہتا ہے؟ جواب دیا کہ بظاہر و باطن اللہ ہی کو رب مانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ۔ پھر یہ نفاق نہیں پھر فرمایا کہ تمہاری کھلی چھپی باتوں کا مجھے علم ہے، دلوں کے خطروں سے بھی آگاہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ جو خالق ہو وہ عالم نہ ہو، اور یہ کہ مخلوق سے خالق بے خبر ہو) بعض علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے یہاں تک کہ بندہ اور اس کے اعمال سب کا وہی خالق ہے، اگر بندہ خالق ہوتا تو اس کو علم بھی ہوتا، حالانکہ جس کام کو کرتا ہے۔ اس میں اپنے عضلات کی حرکت و سکون کا بھی اس کو علم نہیں چہ جائیکہ اس کی تمام باریکیوں کی خبر ہو، جب خبر نہیں بالارادہ خالق بھی نہیں رہا۔ نیک و بد کا بدلہ تو محض اختیار و ارادے کو نیک و بد کام میں متوجہ کرنے پر ہے اور ارادہ متوجہ کرنیکے بعد وہ کام خدا تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَ

وہ ایسا (منعم) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا، سو تم اس کے رستوں میں چلو (پھرو)

كُلُوا مِن رِّزْقِهِ ۖ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ۝ أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ

اور خدا کی روزی میں سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ (پیو) اور کھا پی کر اسکو بھی یاد رکھنا کہ اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے، کیا تم لوگ

أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ۝ أَمْ أَمِنتُم مَّن

اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم و تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے پھر وہ زمین تھر تھرا کر الٹ پلٹ ہونے لگے یا

فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ

تم لوگ اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم و تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم پر (مثل عاد کے) ایک ہوائے تند بھیج دے (جس سے تم ہلاک ہو جاؤ) سو

نَذِيرِ ۝ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ

اور ان سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں انھوں نے دین حق کو جھٹلایا تھا سو (دیکھ لو ان پر) میرا عذاب کیسا واقع ہوا۔

تفسیر اب تک اس شہنشاہ بابرکت کے وہ انعام و فضائل بیان ہوئے تھے جو عالم بالا سے متعلق تھے۔ جیسا کہ آسمانوں اور ستاروں کا پیدا کرنا جو اس کی قدرت کاملہ کے شواہد تھے، اب یہاں سے زمین کے متعلق اپنی بادشاہی اپنی نعمت کا اظہار کرتا ہے

کہ زمین کو اس نے تمہارے لئے مسخر کر دیا، وہ سکون کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ ہل کر تمہیں نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ پہاڑوں کی میخیں اس میں گاڑ دی ہیں، پانی کے چشمے اس میں جاری کر دیے ہیں، راستے اسمیں مہیا کر دیے ہیں۔ قسم قسم کے نفع اسمیں رکھ دیے ہیں۔ پھل اور اناج اسمیں سے نکل رہا ہے۔ جس جگہ تم جانا چاہو جا سکتے ہو۔ طرح طرح کی سودمند تجارتیں کر رہے ہو، تمہاری کھیتی وہ بار آور کرتا ہے۔ اور تمہیں اپنی روزیاں کن اسباب سے دے رہا ہے، ان سب بخشش بہا نعمتوں کے ساتھ ساتھ ہماری مخالفت سے ڈرو اور نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔ ورنہ ہم چاہیں تو اس زمین کو تمہارے لئے امن کا گھر ہے تمہاری ہلاکت کا باعث کر دیں تم کو اسی میں غرق کر دیں۔ اور اگر چاہیں تو اس گھر کی چھت (مراد آسمان) سے تم پر پتھراؤ کر دیں جیسا کہ تم سے پہلوں کے ساتھ ہوا ہے۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً، اس نے زمین کو تمہارے لئے نرم اور مسخر کر دیا۔ اس جملے میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں۔ مثلاً یعنی زمین کو اس قدر سخت اور خشک کیا کہ اس پر چل پھر سکتے ہیں۔ یا یہ کہ اس کو اس قدر نرم بنا دیا کہ جس کو کھود سکتے ہیں۔ مکانات وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں، یا یہ کہ اگر اس قدر سخت ہوتی جیسا کہ لوہا، پتھر، تانبا، چاندی وغیرہ تو گرمی میں حد درجہ گرم اور سردی میں حد درجہ سرد ہو جاتی۔ جس کی وجہ سے زندگی معطل ہو کر رہ جاتی نہ کھیتی ہو سکتی نہ باغ لگ سکتے یعنی روزی و رزق کا سامان مہیا نہ ہوتا، اس جگہ مسخر سے مراد ہے۔ اگر زمین ہے تو اس پر چلنا پھرنا ممکن ہوتا یا کہ زمین پانی یا ہوا کی طرح ہوتی تو اس پر کوئی انسان بس نہیں سکتا تھا، آگے فرماتا ہے فامشوا فی مناکبھا۔ زمین کے رستوں پر چلو۔ مناکب کے معنی ہیں صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یہ ایک محاورہ ہے جو کہ مسخر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ زمین کے مناکب پہاڑ اور ٹیلے ہیں۔ جب کہ انسان کے مناکب (مونڈھے) اونچے ہوتے ہیں۔ اور پہاڑ اور ٹیلے پر بھی اونچے اور بلند ہوتے ہیں، اسی لئے پہاڑ اور ٹیلوں کو جو اونچے اونچے ہوتے ہیں تو اصطلاح میں مناکب الارض کہتے ہیں۔ لیکن مناکب الارض سے مراد زمین کے رستے اور گھاٹیاں، کنارے اور اطراف بھی ہیں، اس مناسبت سے زمین کے کناروں اور جوانب اور رستوں کو بھی مناکب کہنے لگے۔

ابن عباس رضؓ کا قول ہے دکلوا من رزقہ، اللہ کی پیدا کی ہوئی روزی کھاؤ جو تمہارے لئے زمین سے پیدا کی اس میں اس بات کی کھلی طور پر صراحت بیان کی ہے۔ کہ رزق خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تمہارا نہیں ہے۔ اور رزق بھی کل نہیں بلکہ جو رزق پاشیے تم پر حلال کر دی، پھر یہ فرمایا گیا کہ دنیا میں چلنا پھرنا، کھانا پینا، مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ چند روزہ منزل ہے۔ کچھ عرصے کا قیام ہے۔ آخر میں جانا اور جمع ہونا اسی اصلی منزل پر ہوگا جس کو آخرت کے نام موسوم کیا گیا ہے۔ بس دنیا اور اسکی وقتی نعمتوں پر ایسا فریفتہ نہ ہونا چاہیے کہ اصل منزل یعنی منزل مقصود کو ہی بھول جاؤ۔ بھول سے یہ مراد ہے کہ کفر و بدکاری اور شہوت پرستی میں بیہوش پڑے رہو، اس کے بعد دنیا اور اسکی بے شمار لذتوں میں پھنسے ہوئے متوالوں اور کفر اور بدکاریوں کے مستوں کو جو خدا کی زمین میں رہ کر باغی ہو گئے ہیں آگاہ کیا جاتا ہے۔ ءامنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمور، اے بے خبرو زمین پر وقتی تسلط پا کر کیا تم آسمان والے سے نڈر ہو گئے، اور تم اپنے لئے امن محسوس کرنے لگے، حالانکہ اس کو قدرت ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور یکایک زمین تم کو دھنسانے کے لئے ہلنے اور لرزنے لگے، جیسا کہ زلزلے کے وقت ہوتا ہے زمین ہل کر پھٹ جاتی ہے۔ اور جہاں کی زمین پھٹ کر دھنس جاتی ہے۔ وہاں کی ہر چیز اندر سما جاتی ہے۔

بعض علماء نے یہ سمجھا ہے کہ خدا تعالیٰ آسمان میں رہا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال فاسد ہے۔ کس لئے کہ آسمان حادث ہیں اور خدا کی ذات قدیم ہے۔ جب آسمان نہ تھے تو بھی تھا۔ دوسرے وہ مکان میں ہونے سے پاک ہے۔ البتہ احادیث

صحیح ہیں جو خدا تعالیٰ کو آسمانوں کے اوپر مظہر تجلیات بارگاہ قدس ہیں۔ اس لئے نا واقفوں کو اس کا بستر بتانا مکانیت ثابت نہیں کرتا۔ اور آیت میں من فی السماء سے بالخصوص خدا پاک مراد نہیں ہے بلکہ اس کے کارکن ملائکہ کس لئے کہ ہر بلا اور نعمت عالم بالا سے آتی ہے اور اسکا بھی امکان ہے کہ عرب کے جاہل اس بات کے ماننے والے تھے کہ خدا تعالیٰ آسمان پر ہے۔ ان کے خیالات کے موافق ان کو ڈرایا گیا۔ اے لوگو! آسمان والے سے نڈر نہ ہوجاؤ۔ اور یہ بات قدرتی ہے کہ جب کسی کے دل میں کسی کا خوف اور ڈر ہوگا تو حتی المقدور اسکا قدم دیکھ بھال کر اٹھتا ہے۔ اور اسکو یہ بھی فکر رہتی ہے کہ کہیں میری پکڑ نہ ہوجائے یہ تو دنیاوی مثال ہے خالق کون ومکان جو کہ ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ غیب کا حال جانتا ہے۔ اگر اس کا خوف دل میں ہو تو انسان ہر برائی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پر پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں اور کبھی اسی حالت میں پر سمیٹ

إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۝ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي

بجز خدائے رحمٰن کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے۔ بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (اور جسطرح چاہے اسمیں تصرف کر رہا ہے

هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ

(اور کافر جو اپنے معبودوں) ہاں رحمٰن کے سوا وہ کون ہے کہ وہ تمہارا لشکر بن کر (آفات سے) تمہاری حفاظت کر سکے

إِلَّا فِي غُرُورٍ ۝ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ

کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں) تو (وہ) نرے دھوکے میں ہیں (اور) ہاں (یہ بھی بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو تم کو روزی پہنچا دے

أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ۝

اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی بند کرلے (مگر یہ لوگ اس سے بھی متاثر نہ ہوئے) بلکہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت (عن الحق) پر جمے ہوئے ہیں

تفسیر اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ کیا تم اس کے ارضی وسماوی عذاب سے نڈر ہوگئے ہو؟ اب اپنی قدرت کاملہ کا تصرف آسمان وزمین کے سوا فضا یعنی ہوا میں دکھاتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ کیا وہ اپنے اوپر پرندوں کی ٹکڑیاں ہواؤں میں اڑتے نہیں دیکھتے جو کہ پر کھولے ہوئے اور سمیٹے ہوئے نظر آئیں گے، دیکھنے والے اسکا مشاہدہ روزمرہ کر سکتے ہیں کہ اڑنے میں بعض وقت پرند پروں کو کھول دیتا ہے۔ اور جب اسکو اپنی اڑان کو تیز کرنا ہوتا ہے۔ تو وہ پروں کو سمیٹ بھی لیتا ہے۔ لیکن ان دونوں حالتوں میں اڑتا اور ہوا میں معلق رہتا ہے۔ نیچے نہیں گر پڑتا۔ پھر کیا میرے سوا کوئی اور انھیں تھامے ہوئے ہے۔ میں نے ہواؤں کو مسخر کردیا ہے۔ اور معلق اڑتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی میرا لطف وکرم اور رحمت ونعمت ہے۔ مخلوقات کی حاجتیں، ضرورتیں ان کی اصلاح اور بہتری کا نگراں اور کفیل میں ہی ہوں

یقیناً اس میں ایمانداروں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں مضمر ہیں
اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کی ہوا اور فضاء پر بھی بادشاہت ۔ باری تعالیٰ قادر مطلق ہے جو ایسی بوجھل
چیز کو ہوا میں معلق دوڑانے پر یا اڑانے پر قادر ہے تو پھر کیا وہ اوپر سے پتھراؤ نہیں کر سکتا ہے؟ یا زمین پر رہنے
والوں کو زمین میں نہیں دھنسا سکتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہر شئے کو دیکھ رہا ہے ۔ اور اس کی نگہبانی کر رہا ہے
اگر ذرا بھی اپنی نگہبانی چھوڑ دے تو ہر چیز ہلاک ہو جائے ۔ ساتھ ہی بڑے بڑے ستارے جو کہ زمین سے کئی گنے بڑے
ہیں کس تیزی اور توازن کے ساتھ مسلسل حرکت میں ہیں ۔ ان کا بھی وہ ہی نگہبان ہے ۔ انسان کا وجود اور اس کی
حیات و ممات میں خلل انداز چیزوں کی روک و تھام اس کا کام ہے ۔ مگر افسوس ایک کور باطن ان سب باتوں کو اسباب
سے جانتا ہے ۔ لیکن ایک روشن ضمیر مسبب الاسباب کی طرف سے ہی سمجھتا ہے ۔ توحید و شرک کفر و اسلام میں یہی
فرق ہے ۔ کیونکہ کافر اپنے اسباب پر مغرور رہتا ہے اور انہیں کو اپنے فتح و نصرت کا لشکر سمجھتا ہے ۔ اس لئے
خداوند قدوس فرماتا ہے کہ اے کور باطنوں بتاؤ تمہارا کون سا لشکر ہے ۔ جو تم کو رحمٰن کے مقابلہ میں تمہارے
دنیاوی عالی اسباب مدد نہیں دے سکتے ، ہم جو چاہیں گے ، اور جو ہم کو منظور ہوگا وہ کریں گے ۔ جس کا مشاہدہ
رات دن زندگی میں حوادثات کے دیکھنے سے ہوتا ہے ۔

أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا

(جس کافر کا حال اوپر سنا ہے اسکو سن کر سوچو کہ) کیا جو شخص منہ کے بل گر گر کر چل رہا ہو وہ منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ شخص

عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ

جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو ۔ آپ (ان سے) کہئے کہ وہی (ایسا قادر و منعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو

السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝

کان اور آنکھیں اور دل دیے (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو ،

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

اور آپ (یہ بھی) کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو روئے زمین پر پھیلایا اور تم اسی کے پاس (قیامت کے روز) اکٹھے کئے جاؤ گے ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝

اور یہ لوگ (جب قیامت کا ذکر سنتے ہیں تو) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ)

قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝

آپ کہہ دیجئے کہ یہ (تعیین) کا علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو محض (علی الاجمال مگر) صاف صاف ڈرانے والا ہوں

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قِیْلَ

پھر جب اس (عذاب موعود) کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے تو اس وقت مارے غم کے، کافروں کے منہ بگڑ جائیں گے اور ان سے کہا جاویگا

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝

یہی ہے وہ جسکو تم مانگا کرتے تھے،

(ذکر عذاب لاؤ عذاب لاؤ)

تفسیر مومن اور کافر کی مثال بیان فرماتا ہے کہ کافر کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص کمر کبڑی کر کے سر جھکائے، نظریں نیچی کئے جا رہا ہے۔ نہ راہ دیکھتا ہے نہ اسے معلوم ہے کہ کہاں جا رہا ہے بلکہ حیران اور پریشان راہ بھولا ہکا بکا ہے۔ اور مومن کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص سیدھی راہ پر کھڑا ہوا چل رہا ہے۔ راستہ خود صاف اور بالکل سیدھا ہے اور یہ شخص خود ہی بخوبی اسے جانتا ہے۔ اور برابر صحیح طور پر چل رہا ہے۔ بالکل یہ حال ان کا قیامت کے دن ہوگا کہ کافر تو اوندھے منہ جہنم میں جمع کئے جائیں گے، اور مسلمان عزت کے ساتھ جنت میں پہنچائے جائیں گے۔

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ اس میں کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں بلکہ عموم مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شخص خاص کی طرف دونوں مثالوں میں اشارہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ابوجہل مراد ہیں۔ ابن عباس رضؓ کہتے ہیں حمزہؓ بن عبدالمطلب اور ابوجہل مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آیت میں کافر و مومن کی روش کجی اور راستی کا بیان ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آخرت کے حال کا ذکر ہے کہ کفار آخرت میں اوندھے گرتے ہوئے چلیں گے،

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضورؐ کہ لوگ منہ کے بل چلا کر کس طرح لے جائے جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جس نے پیروں کے بل چلایا ہے وہ منہ کے بل بھی چلانے پر قادر ہے۔ اس کے بعد اثبات قدرت کاملہ پر پھر ایسے دلائل شروع کرتا ہے۔ جن سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ مرنے کے بعد بار دیگر زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ کس لئے کہ کفار عرب حشر کے منکر تھے، اور یہ انکا انکار اصول حسنات سے روکنے والا اور شہوت پرستی پر جرأت دلانے والا تھا۔

یہ دلائل صحت و ثبوت حشر و نشر کے لئے تھے تاکہ وہ آزمائش صحیح سمجھی جاوے جس کا اول سورہ میں ذکر تھا۔ پھر اس مقصود کو ثابت کرنے کے لئے اپنے کمال قدرت پر چند دلائل بیان فرمائے اور یہ ثابت کر دیا کہ جس کو ابتداءً پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ کر سکتا ہے۔ جس کے ثبوت میں کسی عقلمند کو ذرا بھی کلام نہ ہونا چاہیئے۔ اس جملے کو سن کر منکرین حشر کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی مگر صرف تمسخر کے طور پر کہتے لگے قیامت ہے اگر تم سچے ہو تو اسکی تعیین کرو۔ حالانکہ یہ ایک سراسر مہمل سوال ہے کیونکہ قیامت خواہ کبھی بھی ہو اس کے لئے عاقل کو تیاری کرنا چاہیئے، دنیاوی سفر کی منقولہ ذلوں پیشتر امکانات کئے جاتے ہیں اور جو سفر صحیح معنوں میں اصل سفر ہے اس کے لئے اس قدر غافل کیوں رہا جائے؟ اس لئے اس کا جواب بھی دوسری طرح سے دیا گیا، کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دو کہ اس کے وقت کا (یعنی قیامت) کا

علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور اسمیں جو تو تمہیں ڈرانے والا ہوں۔ صاف صاف اس کے لئے تعیین وقت کا علم کوئی ضروری نہیں، ہاں اسکا علم ضروری ہے۔ جو نذیر کے لئے کافی ہے۔ سو وہ مجھے ہے۔ پھر جب وہ وقت آئے گا تو کیا حال ہوگا ——— جب منکرین اس وعدے کو دیکھیں گے کہ قریب آگیا تو ان کے مارے دہشت، ہیبت اور خوف کے منہ بگڑ جائیں گے، اور چہرے سیاہ پڑ جائیں گے، اور اس وقت ان کو شرمندہ اور ذلیل کرنے کے لئے کہا جائیگا تو یہ ہے وہ وقت جسکی بابت تمکو دعویٰ تھا کہ ہرگز نہیں آئے گا، اور فرشتے یہ بھی کہیں گے یہ ہے وہ وقت جس کی بابت تم دنیا میں تمسخرانہ کہا کرتے تھے کہ وہ وقت کب آئے گا اور کیوں نہیں جلد آ چکتا

اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے مصیبت کا وقت بھی کسقدر اندوہناک ہوتا ہے۔ اور پھر خصوصًا ایسا جس کا کوئی تدارک نہ ہو سکے۔ جب وہ سامنے آتا معلوم ہوتا ہے۔ تو ہوش و حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ اور رنج و کلفت ہیبت اور دہشت کے آثار چہرے پر ایسے صاف نمایاں ہوتے ہیں کہ چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ ساتھ ہی ایسی مصیبت جس کے آنے کا یقین ہو تو اس سے اپنے غرور و گھمنڈ کے باعث لاپرواہ رہنا اور حجت بازی کرنا کس قدر حماقت اور بدنصیبی ہے۔

حشر کا تو ایک وقت متعین ہے کہ آسمان و زمین فنا ہو کر عالم ملکوتی ظہور پذیر ہوگا اور وہاں اس عالم کی ہر چیز اپنی مناسب صورتوں میں ظاہر ہوگی، اور تمام بنی آدم خدائے قدوس کے پاس حاضر کئے جائیں گے جزا و سزا کے لئے، اور اس جہاں میں آنے کا اصل میں یہ ہی راز ہے کہ مرنے کے بعد خداوند تعالیٰ کے پاس ارواح جزا اور سزا کے لئے حاضر کی جاتی ہیں۔ اور اسی کو قیامت صغریٰ کہتے ہیں،

کفار و مشرکین کی قوت نظریہ اور عملیہ دونوں خراب ہو چکی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کی بابت تعیین وقت دریافت کرتے تھے کہ وہ حادثہ جس کو ہم محض خدا کی طرف سے اپنے کفر اور بت پرستی کی سزا میں سمجھیں کب آئے گا، یہ انتہائی گستاخانہ سوال تھا، اس لئے جب وہ وقت موعود آئے گا تو کفار و مشرکین کے منہ بگڑ جائیں گے، اور کف افسوس ملنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا،

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ أَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ

آپ (ان سے) کہئے کہ تم یہ بتلاؤ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے ساتھ والوں کو (موافق تمہاری تمنا کے) ہلاک کردے یا (موافق ہماری امید اور

يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ ۝ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا

اپنے وعدہ کے) ہم پر رحمت فرمادے تو کافروں کو عذاب دردناک سے کون بچائیگا (اور) آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے اور ہم

بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

اس پر ایمان لائے اور ہم اس پر توکل کرتے ہیں سو عنقریب تم کو معلوم ہو جائیگا کہ صریح گمراہی میں کون ہے (یعنی تم جیسا کہ تم کہتے ہیں یا ہم جیسا کہ

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝

تم کہتے ہو) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی (جو کنوؤں میں ہے نیچے کو اتر کر) غائب ہی ہو جائے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی

تفسیر

ان امور آخرت کو سن کر کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہدیا کرتے تھے کہ کیا ہم پر قحط و وبا کا عذاب آئے گا تو بچ جاؤ گے۔ یہ کسقدر نامعقول اور بیہودہ گفتگو تھی۔ اسی لئے باری تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے۔ اے نبی ان مشرکوں سے کہو جو خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کا مسلسل انکار کر رہے ہیں کہ تم جو اس بات کی تمنا میں ہو کہ ہمیں نقصان پہنچے تو فرض کرو کہ ہمیں خداوند تعالیٰ کی طرف سے نقصان پہنچا یا اس نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر رحم کیا۔ مگر تم عذاب الیم سے جو تمہارے کفر کا بدلہ ہے۔ کس طرح بچ سکتے ہو۔ صرف اس امر سے تمہارا چھٹکارا نہیں ہو سکتا، تم اپنی فکر کرو۔ تمہاری نجات کی صورت یہ تو نہیں؟ نجات تو موقوف ہے توبہ کرنے پر۔ خدا کی طرف جھکنے پر، اس کے دین کو مان لینے پر ہمارے بچاؤ یا ہلاکت پر تمہاری نجات نہیں، تم ہمارا خیال چھوڑ کر اپنی بخشش کی صورت تلاش کرو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض کو برا بھلا کہتے تھے اور کوستے تھے کہ یہ لوگ ہمارے معبودوں کو نہیں مانتے یہ جلد ہلاک اور برباد ہوں گے اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہمارا سب کچھ اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ چاہے ہلاک کرے چاہے بچالے۔ مگر تم کو تمہارے معبود عذاب الیم سے کس طرح نہیں بچا سکتے۔ ہم کو ہلاک کرے یا مہربانی کرے تشکک کے طور سے نہیں کہا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر اور اپنے گروہ پر مہربانی کا بھروسہ کامل تھا اور آپ کو وعدہ دیا گیا تھا۔

پھر فرمایا کہ ہم رب العالمین رحمٰن اور رحیم پر ایمان لاچکے اپنے تمام امور میں ہمارا بھروسہ اور توکل اسی کی پاک ذات پر ہے۔ جیسے ارشاد ہے۔ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ انکی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ کر باری تعالیٰ فرماتا ہے قل هو الرحمٰن آمنا به وعليه توكلنا اے نبی ان سے کہدو وہ رحمٰن جو کہ نہایت مہربانی کرنے والا ہے۔ ہم اسی پر ایمان لائے۔ اور اسی پر ہمارا ہر کام میں بھروسہ ہے۔ بیشک وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں، ایمان لانے والوں کو نوازتا ہے۔ اور اب تم عنقریب جان لوگے کہ دنیا اور آخرت میں فلاح و بہبود کسے ملتی ہے اور نقصان و خسران میں کون پڑتا ہے؟ رب کی رحمت کس پر ہے؟ اور ہدایت پر کون ہے؟ خدا کا غضب کس پر ہے؟ اور بری راہ پر کون ہے؟

تمہارے بت ہمارا کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ تم ایسے بیہودہ خیالات کی صریح گمراہی میں ہو ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ یہاں ابھی مراد وہ وقت جو موت کے بعد قریب ہے۔ یا وہ بلائیں عنقریب تم پر آنے والی ہیں چنانچہ قحط آیا۔ مقہور ہوئے۔ اس کے بعد ان کے بتوں کی کمزوری اور خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایک دلیل بیان فرماتا ہے۔ اگر اس پانی کو جس کے پینے پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے زمین جوس لے یعنی کنوؤں یا چشموں کے پانی کو سکھا دے یا زمین سے نکلے ہی نہیں گو تم کھودتے کھودتے تھک جاؤ تو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی ہے جو بہنے والا اور ابلنے والا اور جاری ہونے والا پانی تمہیں دے سکے۔ بس میرا بادشاہ بابرکت جس نے برکت کے یہ سامان کئے اس پر بھی قادر ہے کہ وہ پانی جس پر تمہاری زندگیوں کا مدار ہے خشک کر دے۔ پھر وہ قادر ہے یا تمہارے معبود؟ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا [illegible] کوئی قادر نہیں وہ ہی ہے۔ جو اپنے فضل و کرم سے پاک و صاف ستھرے ہوئے پانی کو زمین پر جاری کرتا ہے۔ جو ادھر سے ادھر تک بھر جاتا ہے۔ اور بندوں کی حاجتوں کو پورا کرتا ہے۔ اور ضرورت کے مطابق ہر جگہ خواہ ریگستان ہو اونچے اونچے پہاڑ ہوں یا میدان با آسانی مہیا ہو جاتا ہے۔ بعض متکبرین نے یہ آیت سن کر کہا کہ ہم پانی کھود کر نکال لائیں گے، پس اللہ رب العزت نے اس گستاخی کے بدلے میں ان کی آنکھوں کا پانی ختم کر دیا۔

اس آیت سے صحیح طور پر یہ علم ہوا کہ ایمان اور اسکی برکات کیا ہیں۔ اور کس قدر ہیں برخلاف کفر اور اسکی نحوستیں کیا ہیں۔ اور بے شمار ہیں۔ پس لازم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتا رہے۔ گستاخی نہ کرے اور اس کے تبلائے ہوئے راستے اور اصولوں کو جو کہ اس نے اپنے رسول کے ذریعہ بندوں تک پہنچائے ہیں بے چون و چرا ماننا رہے۔ اس میں نفع اور بھلائی ہے۔ وگرنہ خدا نخواستہ اس کی نعمتوں اور برکات سے محروم ہو کر راندۂ درگاہ ہو جائے گا۔

اگر آدمی کے دل میں نور ایمان ہو تو یہ سب باتیں اس پر دلائل کرتی ہیں کہ صرف ایک ذات باری کی ہی ذات بابرکات ہے۔ جو کہ ہر چیز پر قادر مطلق ہے۔ پس اسکی ڈوری مضبوطی سے پکڑنا چاہیئے۔ یہ ہی ذریعہ سعادت دارین حاصل کرنے کا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ○ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ

نٓ قسم ہے قلم کی اور (قسم ہے) ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتب الاعمال ہیں) کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون

بِمَجْنُوْنٍ ○ وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ○ وَاِنَّکَ

نہیں ہیں (جیسا منکرین نبوت کہتے ہیں) اور بیشک آپ کیلئے (اس تبلیغ احکام پر) ایسا اجر ہے جو (کبھی) ختم ہونیوالا نہیں، اور بیشک آپ

لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○ فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَ ○ بِاَیِّکُمُ

اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں سو (ان کے مہملات کا غم نہ کیجیئے کیونکہ) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے، اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں

الْمَفْتُوْنُ ○ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ

کس کو جنون تھا۔ آپ کا پروردگار اسکو بھی خوب جانتا ہے۔ جو اسکی راہ سے بھٹکا ہوا ہے

وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ○ فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ ○

اور وہ راہ (راست) پر چلنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ تو آپ ان تکذیب کرنیوالوں کا کہنا نہ مانیئے (جیسا کہ اب تک نہیں مانا)

تفسیر یہ سورہ بھی مکہ میں نازل ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ سب سے اول اقْرَاْ نازل ہوئی۔ پھر سورہ ن۔ اور پھر سورۃ مزمل۔ اس بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی ایسا ہی فرماتی ہیں۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہ سورہ کچھ مکہ اور کچھ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس سورہ کو دو ناموں سے پکارا جاتا ہے سورہ نون اور سورہ قلم وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس سورۃ کے شروع میں نون اور قلم (دو لفظ) ہیں۔

اس سورۃ میں مسئلہ نبوت پر بڑے اچھے پیرائے میں بحث ہے۔ جو مخالفین نبوت اپنے فاسد خیالات کے باعث، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں عیب ثابت کرتے تھے، مثلاً آپ دیوانے ہیں۔ بد خلق ہیں۔ اور بلاوجہ دنیا سے لڑتے جھگڑتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہ تھی ملک عرب جس میں مکہ بھی ہے اس وقت گمراہی میں بری طرح گھرا ہوا تھا ایسے وقت میں خدائے پاک کی توحید، عظمت، کبریائی بزرگی بیان کرنا۔۔۔ اور حسن اخلاق کی تعلیم دینا اور ان غلط اور بری باتوں کی مخالفت کرنا جو ان لوگوں کی عادت ثانیہ بن چکی تھیں، (اور یہ بری تھیں عربوں کے باپ دادا صدہا برس سے انھیں پر چلتے آئے تھے اور یہ بری باتیں ان کی اولاد نے ورثہ میں پایا) جس کے قائل کو دیوانہ کہنا کچھ بڑی بات نہ تھی کیونکہ یہ سب کچھ ان مخالفین کے لئے ان کے اعتبار سے بالکل نئی چیز تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دردمندی اور خوش خلقی سے ان لوگوں کو بچانے کی کوشش فرماتے تھے، چہ جائیکہ وہ راہ راست اختیار کرتے۔ بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تعصب اور بد خلقی کا الزام لگایا کیونکہ ان کے کان ان سچی باتوں کے سننے کیلئے تیار نہ تھے اور یہ ہی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیک کوششوں کے نتائج کو اپنے حق میں برا اور مہلک خیال کرتے تھے بلکہ آپ کو بھی اپنے خیالات کے مطابق کرلینا اچھا سمجھتے تھے ان سب باتوں کا ان آیات بینات میں انتہائی مدلل اور تسلی بخش الفاظ میں جواب دیا گیا ہے۔

عرب میں یہ دستور عام تھا کہ غلط اور جھوٹی بات پر کم ہی قسم کھاتے تھے اس کی وجہ یہ ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھائے گا وہ برباد ہو جائے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی بات پر قسم کھائی جاتی تھی وہ صحیح مانی جاتی تھی۔ اس لئے خدائے پاک اپنے کلام کو قسم سے شروع کرتا ہے۔

نون سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ لفظ نون کسی کلمہ کا پہلا یا آخری حرف ہے بعض علماء فرماتے ہیں ناصر کا ابتدائی لفظ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نور کا ابتدائی حرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الرحمٰن کا آخری حرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نون سے مراد مچھلی ہے۔ اس پر بعض کہتے ہیں وہ مچھلی کہ جس نے حضرت نوح علیہ السلام کو لقمہ کیا تھا، بعض فرماتے ہیں وہ مچھلی ہے جس کی پشت پر زمین ہے۔ بہرحال اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔

قلم سے کیا مراد ہے؟ بظاہر یہاں مراد عام قلم ہے۔ جس سے لکھا جاتا ہے۔ جیسے اور جگہ فرمان ہے الذی علم بالقلم یعنی اس خدائے تعالیٰ نے قلم سے لکھنا سکھایا و القلم و ما یسطرون سے قسم شروع ہوتی ہے کہ ہمیں قلم کی قسم اور اسکی جو لکھتے ہیں۔ ترمذی رح نے روایت کی ہے کہ اول خدا نے قلم کو پیدا کیا۔ پھر اسے کہا لکھ اس نے کہا کیا لکھوں، فرمایا تقدیر لکھ، پھر جو ہوا اور ہوگا سب کچھ لکھا گیا۔ قلم اور لوح دونوں تقدیر علمی اور مرتبہ ثبوت فی علم اللہ ہے جو ازل میں تھا جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا سدی رح فرماتے ہیں کہ مراد اس کا لکھنا ہے۔ جو بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور مفسرین کہتے ہیں کہ مراد اس سے وہ قلم ہے۔ جو قدرتی طور پر چلا اور تقدیریں لکھیں آسمان اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے۔

حضرت مجاہد رح فرماتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر لکھا گیا۔ اس سے یہاں نون، قلم اور تحریر سے وہ بات بھی ثابت کردی قلم کے فضائل یعنی علم کی خوبیاں اور نبوت کی مناسبت کہ قلم میں جس طرح لکھنے والے کے ہاتھ میں مجبور ہے۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام تابع الہام ہیں آپ سے کچھ نہیں فرماتے۔ یہاں تین چیزوں کی قسم کھائی۔ ن، قلم، اور تحریر کی اور قسم کھا کر تین باتیں بیان فرمائیں،

(۱) ماانت بنعمة ربك بمجنون کہ اے نبی ص! بحمد اللہ دیوانہ نہیں، اور وجہ دیوانہ یا مجنون کہنے کی وہ ہی تعلیم توحید و مکارم اخلاق تھی اسی کے ساتھ ایک نیا سبب اور بھی پیدا ہو گیا تھا وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار نبوت کے بعد کہ جس سے تمام مکہ میں کھلبلی مچ گئی تھی، حضرت خدیجہ رض، حضرت علی رض، حضرت ابو بکر صدیق رض، ام ایمن رض اور زید رض آپ کے متبنی ایمان لائے۔ تو آپ نے اُن کو وضو اور نماز کے طریقے سکھائے۔ جس سے اور بھی اہل مکہ کو نئی بات دیکھ حیرت ہوئی، اور آپ کو دیوانہ کہنا شروع کر دیا اور سب سے زیادہ لطف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دانائی، امانت، راست گوئی کے نبوت سے پہلے صرف قریش مکہ ملکہ اور اطراف و جوانب کے لوگ بھی قائل تھے۔ اور آپ کی زیرکی اور دانائی ضرب المثل تھی، مگر ان سب باتوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ کہا گیا، اور یہ سب منکرین حق اور جاہل تھے۔

(۲) وان لك لاجرا غير ممنون کہ آپ کے لئے بے انتہا اجر ہے۔ اور ثواب بے پایاں ہے، جو ختم نہ ہو نہ ٹوٹے نہ کٹے کیونکہ تو نے حق رسالت ادا کر دیا ہے۔ اور ہماری راہ میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلی ہیں ہم تجھے بے حساب اجر دیں گے، ان تمام مساعی جمیلہ کا اس لئے کہ دنیا میں توحید، خدا پرستی، اور مکارم اخلاق کے آپ ہی مروج اور معلم ہیں، جب تک دنیا میں یہ باتیں جاری رہیں گی۔ آپ کو بھی برابر اجر ملتا رہے گا، یہ اس کے باقیات الصالحات میں شمار ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے دنیا میں نیک کام میں حصہ لینے والے شمار ہوتے ہیں اور زندہ تصور کئے جاتے ہیں۔

(۳) وانك لعلى خلق عظيم۔ اور بیشک تو بڑے خلق پر ہے۔ یہ بھی اس جملے کی ایک دلیل قوی ہے۔ کیونکہ مجنون کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اس کے خلاف آپ ص کے اخلاقِ حمیدہ اور پسندیدہ افعال کے وہ لوگ بھی قائل تھے جو کہ آپ ص کو دیوانہ کہتے تھے۔

خلق ایک ملکۂ نفسانی ہے۔ جسکی وجہ سے انسان اچھے اور نیک کام بآسانی کر سکتا ہے۔ اچھے کام کرنا اور بات ہے۔ اور ان کو آسانی سے کرنا اس سے مختلف ہے۔ لہٰذا وہ حالت جس کی وجہ سے سہولت سے اچھے اور نیک کاموں کو کر سکے تو اسکو ہی خلق کہتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اخلاق نبوی ص کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ آپ ص کا خلق قرآن تھا، سعید رح فرماتے ہیں یعنی جیسا کہ قرآن میں ہے۔ اور حدیث میں ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رض نے پوچھا کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا؟ حضرت سعید بن ہشام رض نے کہا ہاں پڑھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بس تو آپ ص کا خلق قرآن کریم تھا، بنو سواد کے ایک شخص نے حضرت عائشہ رض سے یہ ہی سوال کیا تھا تو آپ نے یہ ہی فرما کر پھر آیت وانك لعلى خلق عظيم تلاوت فرمائی۔ اس نے کہا کوئی ایک آدھ واقعہ تو بیان کیجئے تو حضرت عائشہ رض نے فرمایا سنو! ایک مرتبہ میں نے بھی آپ ص کے لئے کھانا پکایا۔ اور حضرت حفصہ رض نے بھی اپنی لونڈی سے کہا کہ دیکھ اگر میرے کھانے سے پہلے حضرت حفصہ رض کے یہاں کا کھانا آجائے تو تو گرا دینا، چنانچہ اس نے یہ ہی کیا اور برتن بھی ٹوٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بکھرے ہوئے کھانے کو سمیٹنے لگے، اور فرمایا اس برتن کے بدلے ثابت برتن تم دو، واللہ اور کچھ ڈانٹا ڈپٹا نہیں (مسند احمد) مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ ایک تو آپ کی جبلت اور پیدائش میں ہی خدائے عالم نے پسندیدہ اخلاق بہترین خصلتیں اور پاکیزہ عادتیں رکھی تھیں تو اس طرح آپ ص کا عمل قرآن کریم پر ایسا تھا کہ گویا احکام قرآن کا مجسم عملی نمونہ آپ ص ہیں۔

ہر حکم بجا لانے اور ہر ممنوع چیز سے رُک جانے میں آپ کی حالت یہ تھی کہ گو یا فراق میں جو کچھ ہے وہ آپ ؐ کی عادتوں اور آپ ؐ کے کریمانہ اخلاق کا بیان ہی ہے۔ حضرت انس رض کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی لیکن کسی دن بھی آپ ؐ نے ادنیٰ درجہ کی ناراضگی کا اظہار تک نہیں فرمایا کسی کرنے کے کام کو نہ کروں، یا نہ کرنے کے کام کو کر گزروں تو بھی ڈانٹ ڈپٹ تو کجا اتنا بھی نہ فرماتے کہ ایسا کیوں ہوا؟ خلق محمدی ؐ دنیا میں مشہور ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پاک میں معارف الہیہ حقہ کے قبول کرنے کی نہایت استعداد رکھی تھی اور بری باتوں وغلط عقائد کے قبول کرنے کی مطلقاً استعداد نہ تھی اس لئے یہ ملکہ آپ ؐ میں تھا جس کو خلق سے تعبیر کیا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مقدس بالطبع عالم قدس کی طرف مائل اور اس کے ساتھ جس قدر چیزیں متعلق ہیں ان کی طرف راغب تھا۔ اور لذات بدنیہ اور سعادت دنیویہ سے بالطبع آپ ؐ کو سخت نفرت تھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ؐ سے زیادہ کوئی خوش خلق نہ تھا، جب کسی نے بلایا تو آپ ؐ نے فرمایا لبیک یعنی حاضر، نہ عمر بھر کسی کو مارا نہ گالی دی نہ ہی سخت کلامی سے پیش آئے۔

یہ تین چیزوں کی قسم کھا کر بیان فرمایا جنمیں سے ہر ایک دوسروں سے مناسبت پوری رکھتا ہے۔ اور پھر ہر ایک چیز سے کہ جس کی قسم کھائی ہے کس قدر عجیب مناسبت ہے۔ اور سب سے لطف یہ ہے کہ یہ تینوں باتیں جدا جدا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہیں۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا آئندہ آنے والی نشانی سے پورا پورا اطمینان دلاتا ہے اور ایک پیشین گوئی کرتا ہے۔ جسکو اہل مکہ نے بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بعض علماء کہتے ہیں دنیا کی سزا جو بدر کے دن اور ایک قحط عظیم سے قریش کو ملی، جس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی بعض فرماتے ہیں کہ یہ عذاب آخرت کی طرف اشارہ ہے کہ مرنے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ لیکن چند ہی برسوں کے بعد جب آفتاب ہدایت اور بلند ہوا، اور اسکی روشنی پھیلنے لگی تو تمام عرب نے جان لیا کہ واقعی ہم گمراہی پر تھے، ہم ناحق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ غلام بوڑھے، بچے، جوان، سب کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ پہلی حالت جو بت پرستی کی وجہ سے تھی متبدل ہو گئی۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ کوئی شخص جو در اصل خدا تعالیٰ کا فرستادہ نہ ہو اور اسکو اپنے نور باطن کا بھروسہ پوری طرح سے نہ ہو، ایسی جاہل بت پرست، مغرور، بدکار قوم کی نسبت یہ دعویٰ کر سکتا ہے؟

نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قوم کی اتنی قلیل مدت میں کایا پلٹ دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور نہ اٹھا سکتے تھے۔ اس اعجاز سے بڑھ کر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی نبی نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ اس لئے اس کے بعد فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ کہ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا اور کون راستے پر ہے؟ جو گمراہ ہے وہ صرف گمراہی کو ہدایت جانتا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ بھلا اس سے بڑھکر کون دیوانہ ہے۔ اور ہدایت پانے والے جو سیدھی راہ چلا جارہا ہے۔ کون عقلمند ہے، اس میں اشارہ ہے کہ جو اپنے آپ کو عاقل اور آپ کو دیوانہ کہتے ہیں جھوٹے ہیں کس لئے کہ آپ تو ہدایت پر ہیں۔ اور وہ گمراہی پر ہیں۔ پھر جب یہ دیوانے ہیں اور دیوانگی سے جھٹلاتے ہیں تو فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ۔ ان جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مان، کیونکہ وہ تجھے اسی حالت خراب کی طرف بلا رہے ہیں

بس یوں وہ خود بتلاتا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے نبی ؐ! جو نعمتیں ہم نے تجھے دین، جو صراط مستقیم اور خلق عظیم ہم نے تجھے عطا فرمایا۔ اب تجھے چاہئے کہ ہماری نہ ماننے والوں کی تو نہ مان

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝

یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے میں ڈھیلے ہو جائیں تو یہ لوگ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے، اور آپ (بالکل) کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں

هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ

مراد جھوٹی قسمیں کھانیوالا ہو بے وقعت ہو طعنے دینے والا ہو چغلیاں لگاتا پھرتا ہو نیک کام سے روکنے والا ہو حد (اعتدال) سے گذرنیوالا ہو سخت مزاج ہو (اور)

ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ

ان سب کے علاوہ حرامزادہ بھی ہو　اس سبب سے کہ وہ مال اولاد والا ہو　جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھ کر سنائی

آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ ۝

جاتی ہیں　تو وہ کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں ہیں۔ جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں، ہم عنقریب اس کے ناک پر داغ لگا دیں گے

تفسیر　بارادل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی اطاعت سے منع کیا تھا۔ اب تاکید فرماتا ہے کہ وہ (کفار) چاہتے ہیں بلکہ ان کی تو عین خوشی ہے کہ آپ ذرا بھی نرم پڑیں تو یہ کھل کھلیں اور یہ بھی مطلب ہے یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کے معبودان باطل کی طرف کچھ تو رخ کریں حق سے ذرا سا تو ادھر ادھر ہو جائیں حق سے چشم پوشی کریں یعنی صاف صاف بتوں اور بت پرستی کی برائی نہ کریں۔ تو وہ بھی آپ سے تشدد نہ کریں گول مول باتیں کہیں کچھ ممانعت نہ کریں مفسرین نے ان آیات کے متعلق نقل کیا ہے کہ ابو جہل و اسود بن عبد یغوث و اخنس بن شریق وغیرہ مکہ کے رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ اگر اس پند و نصیحت سے آپ کی یہ غرض ہے کہ دنیا کی عیش و عشرت میسر آئے تو آپ فرمائیے اگر عورتوں سے رغبت ہے تو عمدہ سے عمدہ کنواری لڑکیاں آپ کے لئے حاضر کریں اور آپ جس سے فرمائیں نکاح کرا دیں، اگر دولت مقصود ہو، تو ہم مال اور مویشی حاضر کریں اگر سرداری مقصود ہے تو آپ ہماری قوم میں عالی نسب عقلمند ہیں۔ ہم آپ کو سردار بنا دیں۔ آپ ؐ نے فرمایا مجھے ان باتوں میں کوئی مطلوب نہیں صرف تمہاری بھلائی مقصود ہے۔ تم [illegible] اس پر انھوں نے کہا اچھا تو آپ عہد کیا کریں مگر بتوں کی مذمت، اور ان کی پرستش سے منع نہ کریں۔ ہم آپ پر طعن نہ کریں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا تب یہ آیت شریف نازل ہوئی۔ ودّوا لو تدھن الخ

[illegible] کفار میں ولید بن المغیرہ بڑا بدذات تھا اس کی بدذاتی یہ تھی کہ جھوٹا بات بات پر قسم کھاتا [illegible] نیک کاموں سے روکنے والا، بدمزاج، سرکش، حرامی تھا، مال و اولاد کا بڑا گھمنڈ تھا وہ اپنی دنیاوی [illegible] کے نشہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حقیر سمجھتا تھا۔ اور اپنی حکومت کی [illegible] تو [illegible] نہیں۔ [illegible] حکمی نہ کریں۔ اس توحید اور خدا پرستی سے باز آ دیں، اس لئے بالخصوص اس کی اطاعت

سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا۔ آپ خود بھی اسکی اطاعت کرنے والے نہیں تھے، مگر تاکیداً حکم دیا اور
ایکا نام نہیں لیا۔ اس کے اوصاف رذیلہ بیان کر دیئے۔ تاکہ لوگوں کو ایسے اوصاف سے نفرت ہو اور ترک کریں
اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ایسے اوصاف کا شخص اس قابل نہیں کہ اس کی کوئی اطاعت کرے۔ خصال دوالا قطع
کان حلاف الخ پھر فرماتا ہے کہ زیادہ قسمیں کھانے والے کمینے شخص کی بات نہ مان، چونکہ جھوٹے شخص کو اپنی
ذلت اور کذب بیانی ظاہر ہو جانیکا ڈر ہوتا ہے، اس لئے وہ قسمیں کھا کھا کر دوسرے کو اپنا یقین دلانا چاہتا
ہے۔ اور خداوند کریم کے ناموں کو بے موقع استعمال کرتا پھرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضہ فرماتے ہیں کہ مہین سے مراد
کاذب ہے۔ مجاہد رحمہ فرماتے ہیں کہ ضعیف دل والا ہے۔ حسن رحمہ فرماتے ہیں۔ حلاف ہر کارہ کرنے والا اور مہین ضعیف
کمزور ھماز، غیبت کرنے والا مشاء بنمیم۔ چغل خور ایک دوسرے کو لڑانے والا، مناع للخیر نیکی سے منع کرنے
والا۔ مثلاً اگر اس کی اولاد یا نوکروں میں سے کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو یہ دھمکاتا کہ کھانا بند
کردوں گا، معتد، ظالم، لوگوں کے حقوق تلف کرنے والا۔ اثیم، بدکار، شراب پینے والا، زنا لواطت کرنے
والا عتل سرکش اڑیل بدمزاج، کسی کی بات خود پسندی سے نہ ماننے والا ان سب عیبوں کے بعد زنیم ولد
الزنا یعنی حرام کا نطفہ بیشتر اخلاق رذیلہ کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ ولید کو اٹھارہ برس کے بعد اس کے باپ نے کہا
تھا کہ یہ میرے نطفے سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں دو قبریں آگئیں آپ نے فرمایا کہ ان
دونوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور کسی بڑے گناہ پر نہیں۔ بلکہ ایسے امور پر جو بظاہر بہت ہلکے معلوم ہوتے ہیں۔
ایک تو پیشاب کرنے میں پردے کا خیال نہ رکھتا تھا۔ دوسرا چغل خور تھا۔ (بخاری، مسلم) فرماتے ہیں چغل خور
جنت میں نہ جائے گا۔ (مسند) دوسری روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ یہ حدیث اس وقت سنائی تھی جب
آپ نے کہا گیا کہ یہ شخص خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے بھلا شخص کون ہے؟

لوگوں نے کہا ضرور ارشاد فرمائیے۔ فرمایا کہ جب اسے دیکھا جائے خدا یاد آجائے اور سن لو سب سے بدتر
شخص وہ ہے جو چغل خور ہو۔ دوستوں میں فساد ڈلوانے والا ہو، پاک دامن لوگوں کو تہمت لگانے والا ہو،
ترمذی شریف میں یہ بھی روایت ہے۔ پھر ان بد لوگوں کے ناپاک خصائل بیان ہو رہے ہیں۔ بھلائیوں سے باز رہنے
والا، اور دوسروں کو روک لینے والا، حلال چیزوں اور حلال کاموں سے ہٹ کر حرام خوری اور حرام کاموں میں پڑنا ہے
گنہگار، بدکردار، محرمات کو استعمال کرنے والا، بدخو، بدگو، جمع کرنے والا اور نہ دینے والا ہے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی لوگ عاجز و ضعیف ہیں، جو خدا
کے یہاں اس بلند مرتبہ پر ہیں۔ کہ اگر وہ قسم کھا بیٹھیں تو خدا پوری کر دے۔ اور جہنمی لوگ سرکش، متکبر، اور خود بین
ہوتے ہیں۔ ان کان ذامال و بنین، اس لئے کہ وہ مال اور لڑکوں والا ہے۔ اور نافرمان ہو جاتے
اور اس نالائقی پر یہ نعمت پا کر شکر گذاری نہیں کرتا، ہماری آیتوں کو جھٹلاتا ہے۔ اور توہین کر کے کہتا پھرتا
ہے یہ تو پرانے افسانے ہیں۔ اور دوسری جگہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ذرنی ومن خلقت وحیداً مجھے
چھوڑ دے اور اسے جسے میں نے تنہا پیدا کیا۔ اور بہت مال اس کو دیا ہے۔ اور حاضر باش رہنے والے بیٹے ہیں
اور بہت کشائش دے رکھی ہے۔ پھر اس کی طمع ہے کہ میں اسے اور دوں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا اذا تتلی
علیہ آیتنا قال اساطیر الاولین جب اسے ہماری آیتوں کا افسانے ہیں اسے عنقریب بدترین مصیبت

میں ڈالوں گا، اس نے غور و فکر کر کے اندازہ لگایا یہ تباہ ہو کتنی بری تجویز اس نے سوچی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ پیہ باد ہو اس نے کیسی بری تجویز کی، اس نے پھر نظر ڈالی اور ترش رو ہو کر منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ یہ کلام اللہ تو پرانا نقل کیا ہوا جادو ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ انسانی کلام ہے۔ اس کی اس بات پر میں بھی اسے دوزخ میں ڈالوں گا۔ تجھے کیا معلوم سقر کیا ہے؟ نہ وہ کسی کو باقی رکھتی ہے، نہ چھوڑتی ہے۔ اس پر انیس فرشتے متعین ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ اس کی ناک پر جو بڑی اور بے ڈول ہے۔ ہم داغ لگائیں گے، یعنی ہم اسے اس قدر رسوا کریں گے کہ اس کی برائی کسی سے پوشیدہ نہ رہیگی، ہر ایک اسے جان پہچان لے گا۔ جیسے نشان دار ناک والے کو ایک نگاہ میں ہزاروں آدمیوں میں لوگ پہچان لیتے ہیں اور جو داغ چھپائے گا۔ تو چھپ نہ سکے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر والے دن اس کی ناک پر تلوار لگے گی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت والے دن جہنم کی مہر لگے گی۔ یعنی منہ کالا کر دیا جائے گا، امام ابو جعفر ابن جریرؒ نے ان تمام اقوال کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ان سب میں تطبیق اس طرح ہو جاتی ہے کہ یہ تمام امور اسمیں جمع ہو جائیں گے، دنیا میں بھی رسوا ہو گا۔ سچ مچ ناک پر نشان لگے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بدر کی لڑائی میں کسی انصاری کی تلوار سے اس کی ناک پر چرکا لگا مگر میں آکر اس پر پھایا لگایا اچھا ہی نہ ہوا۔ ایک داغ ہو گیا، اور آخر اس مرض میں سخت تلخی اٹھا کر سیدھا جہنم میں گیا، اور آخرت میں بھی نشان دار مجرم بنے گا۔ فی الواقع یہ ہے بھی درست،

ابن ابی حاتم میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ بندہ ہزار ہا برس تک خدا کے یہاں مومن لکھا رہتا ہے۔ لیکن مرتا اس حالت میں ہے کہ خدا اس پر ناراض ہوتا ہے۔ اور بندہ خدا کے یہاں کافر ہزارہا سال تک لکھا رہتا ہے۔ پھر مرتے وقت خدا تعالیٰ اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ جو شخص عیب گوئی چغل خوری کی حالت میں مرے گا۔ اور جو لوگوں کو بدنام کرنے والا ہو گا۔ تو قیامت کے دن اس کی ناک پر ہونٹوں کے لوٹ سے نشان لگا دیا جائے گا۔ جو اس مجرم کی علامت بن جائے گی،

اور یہ ایسی علامت ہو گی لاکھ چھپائی جائے مگر چھپ نہ سکے گی، اور ہر دیکھنے والا بخوبی سمجھ جائے گا کہ یہ مجرم ہے اور نافرمانی کی وجہ سے اسکو یہ سزا دی گئی ہے تاکہ یہ شرمسار رہے، اللہ اللہ دنیا میں جس کو لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور وہ شخص غرور و تکبر سے سینہ تان کر چلتا تھا، آج اگر وہ لوگ سامنے ہو جائیں تو وہ ہی ان سے منہ چھپائے گا، اور سرنگوں ہو جائے گا،

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا

ہم نے ان کی آزمائش کر رکھی جیسا ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی۔ جبکہ ان لوگوں نے (یعنی اکثر یا بعض نے) قسم کھائی کہ اس

مُصْبِحِينَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُونَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن

(باغ) کا پھل ضرور صبح چل کر توڑ لیں گے، اور اب ایسا وثوق ہوا کہ) انھوں نے انشاء اللہ بھی نہیں، سو اس باغ پر آپ کے رب کی طرف سے ایک

رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝ فَتَنَادَوْا

پھرنے والا (عذاب) پھر گیا، اور وہ سو رہے تھے، پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا جیسے کٹا ہوا کھیت (کہ خالی زمین رہ جاتی ہے) ہو صبح کے وقت

مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ ۝

سو کر جو اٹھے تو ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے سے چلو۔ اگر تم کو پھل توڑنا ہے۔

فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝ أَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ

پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج و مسکین

مِسْكِينٌ ۝ وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَوْهَا

نہ آنے پائے۔ اور (بزعم خود) اپنے کو اس کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے، پھر جب وہاں پہنچے اور اس باغ کو

قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ قَالَ أَوْسَطُهُمْ

(اس حالت میں) دیکھا، تو کہنے لگے بیشک ہم رستہ بھول گئے۔ بلکہ (جگہ تو وہی ہے لیکن) ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی (کہ باغ کا یہ حال ہوگیا) ان میں جو کسی قدر اچھا آدمی تھا

أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا

کہنے لگا کیوں میں نے تم کو نہ کہا تھا اب (توبہ اور) تسبیح کیوں نہیں کرتے یہ سب (توبہ کے طور پر) کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار پاک ہے۔ بیشک ہم

ظَالِمِينَ ۝ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ۝ قَالُوا

قصوروار ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو مخاطب بنا کر باہم الزام دینے لگے۔ (پھر سب متفق ہو کر) کہنے لگے

يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ ۝ عَسَىٰ رَبُّنَا أَنْ يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِنْهَا

بیشک ہم حد سے نکلنے والے تھے (سب مل کر توبہ کرلو) شاید (توبہ کی برکت سے) ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا (باغ) بدلہ میں دیدے

إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۝ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ

(اب) ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اسی طرح عذاب ہوا کرتا ہے۔ اور آخرت کا عذاب اس (عذاب دنیوی)

أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

سے بھی بڑھ کر ہے کیا خوب ہوتا کہ یہ لوگ (اس بات کو) جان لیتے (تاکہ ایمان لے آتے)۔

تفسیر اہل مکہ خصوصاً ولید وغیرہ دنیاوی ثروت و حشمت پر نازاں ہو کر کہتے تھے کہ ہم پر خدا کی نظر عنایت ہے جو اس نے دنیا میں ہم کو اتنا کچھ دیا۔ وہ آخرت میں بھی اس سے زیادہ ہم کو دے گا۔ ایسے خیالات اکثر بے دین امیروں کے دل میں آتے تھے اور آتے رہیں گے، اور یہ خیالات دین دار، غریبوں کی دل شکنی اور شبہ کا باعث ہوتے

ہیں چونکہ اللہ رحیم وکریم دین داروں سے محبت فرماتا ہے۔ اس لئے اس دنیاوی تموّل وشان وشوکت کی وجہ بیان فرماتا ہے۔ فقال انا بلونٰھم کہ ہم نے جو ان کو فراخ دستی اور سکون وراحت دے رکھے ہیں۔ یہ سب ان کی آزمائش کے لئے رکھا ہے۔ بدکار، منافق، فاجر، بت پرستوں کو دنیا میں نعمتیں دی جایا کرتی ہیں۔ چونکہ یہ سب کچھ آزمائش کیلئے دی جاتی ہیں لہذا ان پر ان کو اترانا نہیں چاہیئے یہ اور بھی ان کی غفلت، گمراہی اور سرکشی کا سبب بنجاتا ہے۔ خداتعالیٰ آخرت میں ان گمراہوں سے سوال فرمائے گا کہ کیا تم نے اسقدر کوتاہیوں کے باوجود تم نے میری نعمتوں پر شکر کیا تھا۔ حالانکہ یہ دنیاوی نعمتیں فانی ہیں۔ جبکہ یہ دنیا ہی فنا ہوجائے گی، تو اسکی نعمتیں بھی فنا ہوجائینگی۔ اور ان کے فنا ہونے کا صدمہ ان کے دلوں پر اور بھی زیادہ ہوگا،

کما بلونا اصحاب الجنۃ :۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جیسا کہ ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، باغ والے کون تھے، اور کب تھے؟ اور یہ ذکر کفار کے سامنے کیوں کیا گیا۔ ان کی نسبت مورخین نے لکھا ہے کہ ملک یمن میں شہر صنعاء کے کچھ فاصلہ پر ایک مرد مومن کا باغ تھا، اس مرد خدا نے آمدنی میں سے غرباء اور مساکین کے حصے مقرر کر رکھے تھے، جو باغ کے اندر پیدا ہوتا تھا۔ اس میں سے بھی حصے مقرر کر رکھے تھے۔ پھر جب وقت موعود آیا اور وہ مرد خدا اس جہاں سے رحلت کر گیا تو اسکی جائداد واملاک کے اس کے بیٹے وارث ہوئے۔ بدقسمتی سے اُن کی نیتوں میں فرق آگیا۔ شیطان نے اُن کے دلوں میں غلو کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم عیالدار ہیں۔ بیوی، بچے والے ہیں۔ اگر ہم بھی باپ کی طرح لٹائیں گے تو کیسے کام چلے گا۔ اور آمدنی کا نقصان کس قدر ہوگا۔ آخر یہ بات طے پائی کہ بہت سویرے اٹھ کر پھل توڑ کر گھر لے آنا چاہیئے فقراء کے آنے سے پہلے، مگر خدا نے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔ ان بھائیوں میں سے ایک بھائی خدا ترس بھی تھا اس نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ ایسا مت کرو فقراء ومساکین کے دینے سے کمی نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ برکت ہوتی ہے۔ اور ان کی دُعائیں خالی نہیں جاتی ہیں۔ پھل وغیرہ میں اللہ کریم زیادتی کرے گا۔ اور جو اللہ کی مخلوق پر رحم کرتے ہیں یعنی اللہ کریم ان سے محبت فرماتا ہے۔ اور مہربان رہتا ہے۔ لالچ میں پڑ کر اپنے خدا پاک کو فراموش نہ کرو۔

یہ تدابیر عبث نہیں ان پر ہرگز ہرگز نازمت کرو کیونکہ وہ ذات باری تدابیر درست فرماتا ہے اور وہ ہی بگاڑ دیتا ہے۔ مگر افسوس اسکی بات نہ مانی اور اپنے ارادوں پر اٹل رہے اور صبح بہت سویرے اٹھ کر چلے تاکہ پھل وغیرہ توڑ کر لے آئیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ دلوں کی حالات کو بخوبی جانتا ہے۔ رات میں ان لوگوں کی نیت بدلی اس رات اس تیار باغ پر مصیبت آگئی لُو کا ایک جھونکا چلا کہ جس نے سارے باغ کو جلا کر برباد کر دیا۔ جب باغ کے قریب وہ لوگ پہونچے تو سارا جھلسا ہوا دیکھتے ہیں۔ پہلے یہ خیال ہوا کہ شاید یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ہم راستہ بھول کر اور کسی کے برباد باغ پر آنکلے ہیں۔ ہمارا باغ تو شاداب وتروتازہ ہے۔ مگر جب کچھ وقفہ تک غور سے دیکھا اور محل وقوع کو دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ہمارا ہی باغ ہے۔ اس پر اچانک آسمانی مصیبت آپڑی پھر آپسمیں میں کڑھنے لگے، اور ایک دوسرے کو مطعون کرنے لگا۔ کہ تونے یہ صلاح دی تھی دوسرا کہتا کہ تونے ہی تو یہ کہا تھا، جب یہ معاملہ طول کھینچتا دیکھا ذراس مرد خدا نے کہا کیوں بھائیو میں نہ کہتا تھا کہ خدائے پاک اور اس کی تقدیس کو کبھی بھی فراموش نہ کرو وہ پل بھر میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے اور نیتوں کا حال اس سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس پر سب شرمندہ ہو اور کہنے لگے کہ بیشک ہم خطاوار ہیں ہمارے رب کی پاک ذات ہے۔ ہم ندامت کے ساتھ اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے کیئے پر بہت شرمسار ہیں۔ ہمیں اس کے رحم وکرم سے امید ہے کہ وہ ہمیں پھر نوازے گا، اور اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ چنانچہ اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل فرمایا اور اس باغ میں بڑی برکت دی،

ابو خالد یمنی کہتے ہیں کہ میں نے وہ باغ دیکھا ہے جس میں ایک ایک خوشہ انگور کا ایسا تھا کہ جیسا سیاہ آدمی کھڑا ہو آزمائش ان کی یہ تھی کہ انھوں نے اس نعمت کا جو کہ خدا تعالیٰ نے ان کو بخشی تھی شکر نہ کیا۔ شیطان نے غلو کیا اور نیت میں فتور آگیا۔ اس لئے اس پر بلا آ گئی۔ اور جب توبہ کی اور اپنے رب کے حضور میں شرمساری سے گردن جھکائی تو اس نے ان پر فضل فرمایا اور بعد ہا اس سے بہتر ان کو دیا۔ اور کذٰلک العذاب کا صاف یہ مطلب ہے کہ جو کوئی خداوند تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکریہ ادا نہ کرے اور اس کو موقع پر صرف نہ کرے گا، تو اس پر بلائے آسمان ضرور بالضرور آئے گی وہ اس بلائے ناگہانی سے بچ نہیں سکتا خواہ کسقدر تدابیر کیوں نہ کرے؛

اس طرح سے عمر، جوانی اور تندرستی بھی باری تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کو بیکار اور بیہودہ افعال میں صرف کرنے والے آخر ایک نہ ایک دن مصیبت کا سامنا ضرور کرتے ہیں اس کے سبب سے بیماری مسلسل اور وقت سے پہلے بڑھاپا اور کم ہمتی ان پر جاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب مصائب کی شکلیں ہیں بہت سی خطرناک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کثرت مے نوشی سے بدن میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دانت گر جاتے ہیں۔ چہرہ کی تازگی اور شگفتگی جاتی رہتی ہے۔ اور بہت سی قسم کی بیماریاں عیاش لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جس چیز کو کھونے میں انسان اس قدر لذت محسوس کرتا ہے کہ اسکو نہ حیا، نہ شرم نہ لحاظ باقی رہتا ہے۔ اگر اسکی صحیح معنوں میں حفاظت کرے تو دیکھے کہ کس قدر لذت حاصل ہوتی ہے اور زندگی کس قدر آرام و آرائش کے ساتھ گزرتی ہے۔ یہ تو دنیاوی تکالیف تھیں جس سے زندگی بے کیف، اور بدمزہ ہو جاتی ہے۔ ابھی آخرت کا عذاب باقی ہے۔ اس طرح مال اور ملک بھی ایک نعمت الہٰی ہے۔ اس میں عدل و انصاف کا خیال نہ رکھنا، فقراء اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا بلکہ بیہودہ کاموں میں مبتلا ہو کر فضول خرچی میں اڑا دینا اور حق داروں کا حق مار کر غیر حق داروں کو یا بیہودگی میں خرچ کر دینا انتہائی پریشان کن ثابت ہوتا ہے دنیاوی طور پر بھی ایسے پیسہ اور مال میں برکت نہیں رہتی جس کا مصرف غلط جگہ اور غلط طریقوں پر ہو۔ خواہ کس قدر ہی مال و دولت ہو، سب ختم ہو جاتی ہے۔ جس دولت کی وجہ سے معصر لوگوں میں بظاہر اس کی عزت تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اس سے کترانے لگتے ہیں۔ اور ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ وہ شخص اپنا گھر و بار چھوڑ دیتا ہے، اور اس کی وجہ سے زندگی بھر کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا ہے اس کی بہت سی مثالیں سنن ماضیہ میں گذر چکی ہیں اور آج تک ایسے ہزاروں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں:

مناعٍ للخیر۔ کفار مکہ اس قصہ کو بخوبی جانتے تھے، کیونکہ وہ ہر موسم میں تجارت کی وجہ سے شام اور یمن کا سفر کرتے تھے اور یہ بات بھی ان کے دلوں میں جاگزیں تھی کہ خدا کی راہ میں دینا باعث برکت ہوتا ہے اور اس کے نتیجے اچھے ہوتے ہیں۔ برخلاف سرکشی اور کنجوسی کے برے نتائج پیدا کرتی ہے۔ دہریہ تو ایک سرے سے خدا کے وجود کا منکر ہوتا ہے۔ کفار مکہ چونکہ دہریہ خیالات کے نہ تھے لہٰذا وہ خدا اور اس کی قدرتوں کو مانتے ضرور تھے۔ مگر اپنے فاسد خیالات کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی ان امور میں شریک سمجھتے تھے کہ خدا نے انکو یہ اختیارات دے رکھے ہیں۔

ولید اور مکہ کے دوسرے سردار اپنی دولت اور دنیاوی ثروت پر گھمنڈ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکشی کرتے تھے، اور مساکین اور غرباء سے بے رحمی کرتے تھے ان غلط کاموں کی وجہ سے عذاب الیم میں گرفتار ہوئے جو کہ قحط کی شکل میں ان لوگوں پر سات سال تک مسلط رہا، حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ جانوروں کو بھون بھون کر کھانے لگے۔ اور جانور بھی وہ مثلاً کتا وغیرہ اور جب اسلام لائے اور توبہ کی تو خدا نے ان پر

اپنا فضل وکرم کیا اور ان کو ان ملکوں کا مالک بنا دیا اور خوشحالی عطا فرمائی - چونکہ خداوند کریم کا فضل وکرم اپنی مخلوق پر ہمیشہ جاری رہتا ہے - اگر بندہ تائب ہو کر اپنے مولیٰ سے اچھائی کی طلب کرے تو وہ رحیم وکریم اس کو نوازتا ہے - اور اتنا نوازتا ہے کہ پچھلی پریشانیاں اور مصائب بھلا دیئے جاتے ہیں - اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مومن پر کوئی مصیبت آئے - تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا چاہیئے تاکہ دنیا وآخرت میں اسکا بدلہ ملے اور اس سے دل کو طمانیت حاصل ہوتی ہے -

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ

بیشک پرہیزگاروں کیلئے ان کے رب کے نزدیک آسایش کی جنتیں ہیں ۔ کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کے

كَالْمُجْرِمِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ

برابر کردیں گے ، تم کو کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی (آسمانی) کتاب ہے

فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ

جس میں پڑھتے ہو ، کیا اسمیں تمہارے لیے وہ چیز (لکھی) ہے جسکو تم پسند کرتے ہو کیا تمہارے

لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا

ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہاری خاطر سے کھائی گئی ہوں (اور تمہیں) قیامت تک باقی رہنے والی ہوں (جن کا مضمون یہ ہو) کہ تمکو

تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ

وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کر رہے ہو (یعنی ثواب وجنت) ان سے پوچھئے کہ ان میں ان کا کون ذمہ دار ہے - کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے

لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ

کچھ شریک (خدائی میں) سو ان کو چاہیئے کہ یہ اپنے ان شریکوں کو پیش کریں اگر یہ سچے ہیں - (وہ دن یاد کرنیکے قابل ہے)

تفسیر

اوپر چونکہ ان لوگوں کا حال بیان فرمایا گیا ہے - جن کو خدا تعالیٰ نے دنیا میں ہر قسم کا عیش وآرام عطا فرمایا تھا اس کے باوجود خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے حکم کے خلاف کرنے سے ان پر جو بلا وآفت آئی تھی اسکا ذکر تھا - اب فرماتا ہے - ان للمتقین عند ربھم جنات نعیم کہ پرہیزگاروں اور متقی لوگوں کے لیے - ان کے رب کے پاس آخرت میں نعمت اور عیش کے باغ ہیں - جن میں کچھ بھی پریشانی ومشکل نہیں ہے - جیسا کہ دنیاوی باغوں میں ارضی وسماوی افتاد کا بھی ڈر رہتا ہے - اور باغ کی نگہبانی اور اس کی پرورش کرنی پڑتی ہے - اس آیت کریمہ کو سن کر کفار مکہ کہتے تھے کہ جب دنیا میں خدا نے ہمکو مسلمانوں سے دولت اور مال میں بہتر کیا تو آخرت میں کیا بڑھکر نہیں دے گا ، اور اگر بڑھکر نہیں دے گا تو کم از کم اسکے مطابق ضرور دے گا ، جو مقدر مسلمانوں

کو دے گا۔ کفار کا یہ خیال تھا کہ جب دنیا میں ہم ذی رتبہ اور دولتمند رہے تو آخرت میں بھی ہمارا پلہ بڑھا ہوا ہوگا، اس کے رد میں یہ آیت آئی افنجعل المسلمین کالمجرمین کہ ہم فرمانبرداروں اور پرہیزگاروں کو نافرمانوں و بدکاروں جیسا ہرگز نہیں کریں گے، دونوں برابر نہیں ہوں گے، اور یہ بھی فرمایا جا چکا ہے کہ نافرمانوں و کفار کے لئے جہنم ہے۔ پس مسلمانوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔ اب ان کے لئے جنت النعیم ہیں۔ جن میں کفار کو کسی بھی طرح کوئی حصہ نہیں۔ پھر برابر ہونا کیسا؟ مالکم کیف تحکمون۔ تم اپنا کیا ہوا ہی فیصلہ کرتے ہو۔ کہیں نیک اور بد برابر ہوتے ہیں؟

پھر تاکید فرماتا ہے۔ ام لکم کتب فیہ تدرسون ان لکم فیہ لما تخیرون۔ اس تمہارے خیال کو عقل سے کچھ بھی تو تقویت نہیں مل سکتی۔ پھر کیا کوئی دلیل نقلی تمہارے پاس ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے۔ جسمیں یہ لکھا ہوا ہے کہ جو تم پسند کرو گے اور چاہو گے، قیامت میں تمہیں وہی ملے گا؟ پھر خود ہی فرماتا ہے۔ ایسی کوئی کتاب نہیں جسمیں یہ سب کچھ ہو۔ پھر تم کس لئے کہتے ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ خدا نے تمہارے لئے کوئی عہد یا ذمہ داری کر لی ہو۔ اور قسم کھائی ہو کہ جو تم کہتے ہو وہ وہی کرے گا، مگر یہ بات بھی نہیں ہے۔

ام لکم ایمان علینا بالغۃ الی یوم القیامۃ ان لکم لما تحکمون۔ پھر فرماتا ہے کہ کیا تمہارے لئے ہم پر عہد اور قسم ہیں۔ قیامت یعنی اسقدر مستحکم ہو کبھی نہ ٹوٹے کہ ہم تمہیں وہی دیں گے، جو تم کہتے ہو۔ ایسے غلط خیالات مذاہب باطلہ میں لوگوں کو ہوا کرتے ہیں۔ یہود کو بھی تھا، ہندوؤں کو بھی ہے۔ اور اکثر جاہل بزرگ مسلمانوں کی اولادوں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں ہم پر آگ حرام ہے۔ یا یہ مصائب ہم پر نہیں آئیں گے، اس لئے فرماتا ہے۔ سلھم ایھم بذلک زعیم کہ ان سے پوچھو ان کا اس کا دعویدار ہے۔ جب کہ خدا کی طرف یہ نہیں ہے تو کیا تم اپنے معبودوں کے گھمنڈ پر ایسا کہتے ہو کہ وہ ایسا کر دیں۔۔۔، کیوں کہ ہم ان کو پوجتے ہیں۔ نذر چڑھاتے ہیں۔ اس لئے فرماتا ہے۔ ام لھم شرکاء فلیاتوا بشرکائھم ان کانوا صادقین۔ کیا ان کے معبود ہیں جن کو وہ ہمارا شریک اور کار مختار جان کر پوجتے ہیں اور ان سے مدد مانگتے ہیں کہ وہ ایسا کر دیں گے، اچھا ان کو لاؤ اور اپنے لالا تو دو اگر وہ سچے ہیں یعنی اس سے یہ مراد ہے کہ یہ معبود کچھ بھی تو نہیں کر سکتے یہ خود محتاج ہیں نہ اپنے اوپر کی مکھی اڑا سکتے ہیں نہ ہی کسی کو کوئی سہارا دے سکتے ہیں لہذا یہ مندرجہ بالا خیالات فاسدہ ہیں اور باطل ہیں، جو کچھ کرتے ہیں وہ قدرت والے کرتے ہیں۔ ان ہی کو سزاوار ہے وہ قادر مطلق ہے۔

یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون

جس دن ساق کی تجلی فرمائی جا دیگی اور سجدہ کی طرف بلائے جائیں گے ... تو کر نہ سکیں گے

خاشعۃ ابصارھم ترھقھم ذلۃ وقد کانوا

... آنکھیں مارے شرمندگی کے جھکی ہوں گی، اور ان پر ذلت چھائی ہوگی، اور وجہ اسکی یہ ہے ...

إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ○ فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ

بلائے جایا کرتے تھے، اور وہ صحیح سالم تھے، (یعنی اس پر قادر تھے) تو مجھکو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں ان کو اس حال میں (موجودہ)

بِهَٰذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ○

پر رہنے دیجیئے۔ ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لئے جارہے ہیں اس طور پر کہ اُن کو خبر بھی نہیں۔ اور دنیا میں عذاب کر ڈالنے

وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ○ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ

سے) ان کو مہلت دیتا ہوں، بلاشبہ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ کیا آپ ان سے معاوضہ مانگتے ہیں کہ وہ اس

مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ○ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ

تاوان سے دبے جاتے ہیں (اسلئے آپکی اطاعت سے نفرت ہے) یا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اسکو)

يَكْتُبُونَ ○

لکھ لیا کرتے ہیں۔

تفسیر اوپر چونکہ بیان ہوا تھا کہ پرہیزگاروں کے لئے نعمتوں والی جنتیں ہیں اس لئے یہاں بیان ہو رہا ہے کہ نعمتیں انھیں کب ملیں گی؟ تو فرمادیا کہ اس دن جس دن پنڈلی کھول دیجائے گی، ساق کے لغوی پنڈلی کے ہیں پھر کیا حقیقت پر محمول ہے یا کنایہ ہے؟ کہتے ہیں اس روز دراصل خدا تعالیٰ بندوں پر تجلّی کرے گا۔ اور پوری تجلّی دیکھنے کی کسی کو قدرت نہ ہوگی، اس لئے صرف پنڈلی کھل جائے گی۔ اور جو ادنیٰ تجلّی ہوگی، گو وہ پنڈلی ہماری جیسی پنڈلی نہ ہوگی لیکن اسکی ذات کے مناسب ہوگی، صحیح بخاری شریف میں ابوخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ ہمارا رب اپنی پنڈلی کھول دے گا، بس ہر مومن مرد اور ہر مومنہ عورت سجدے میں گر پڑے گی، ہاں دنیا میں جو لوگ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے یا لوگ دکھانے یا سنانے کے لئے سجدے کرتے تھے وہ بھی سجدہ کرنا چاہیں گے، لیکن وہ سجدہ نہ کر سکیں گے، ان کی پشت تختہ کی طرح ہو جائے گی۔ یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے اور دوسری کتابوں میں بھی ہے۔ جو کئی کئی سندوں سے الفاظ کے تھوڑے تغیر کے ساتھ مروی ہے اور اہل ظاہر کا اس طرف رجحان ہے۔ مگر اہل حق کہتے ہیں استعارہ مراد ہے۔ اس لئے کہ لفظ حقیقی معنیٰ پر محمول ہو نہیں سکتا، کیونکہ خدا تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے۔ پھر اس سے کیا مراد ہے؟ اسمیں چند قول ہیں۔

(۱) یہ کہ مراد شدت و تکلیف ہے۔ جو قیامت کے روز ہوگا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس کے معنی دریافت کیے آپ نے یہی بیان فرمائے اور فرمایا جب تم کو کسی لفظ قرآن کے معنیٰ معلوم نہ ہوا کریں تو شعراء عرب کے اشعار کو دیکھو اکرو۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان جب کسی کام پر زور کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو پائینچے چڑھاتا ہے۔ جسکی وجہ سے پنڈلی کھل جاتی ہے۔ اسی لئے شدت کے موقع پر کہا کرتے ہیں، تشف عن الحاجتا

(۲) ابی سعید ضریر وغیرہ کا قول ہے کہ کشف ساق سے مراد پردہ ہے اور اصل پردہ کا کھل جانا ہے یہ ایک محاورہ ہے۔ اور ساق ہر شے کی اس کی اصل اور جڑ ہے۔ جس پردہ کھڑی ہوتی ہے۔ تب یہ معنیٰ ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن یہ گھڑی بہت سخت ہوگی۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ امر بہت سخت اور بڑی گھبراہٹ والا اور ہولناک ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس وقت امر کھول دیا جائے گا، اعمال ظاہر ہو جائیں گے، اور یہ کھلنا آخرت کا نشان ہے یعنی آخرت کا آجانا ہے۔ یہی قول درست ہے۔ اور بھید اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ایک تو ذات ہے کہ جس کا ادراک محال ہے۔ اور وہ مستقل محض ہے۔ دوسرے صفات کمال ہیں۔ جو الگ الگ عالم میں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ علم بغیر قدرت کے اور قدرت بغیر علم کے اور دونوں بغیر حیات کے پائے نہیں جاتے، اور صفات تابع محض ہیں ذات کے ان میں بغیر ذات کے کچھ بھی استقلال نہیں

(۳) جہات کمال کو جن کو حقائق الٰہیہ بھی کہتے ہیں اور وہ بین بین ہیں نہ صفات کی طرح محض غیر مستقل نہ ذات کی طرح غیر مستقل اور ان جہات کمال کو اس عالم میں انسان کے اعضاء کے ساتھ پوری مشابہت اور ایک خاص نسبت ہے کیونکہ انسان کے اعضاء، ہاتھ، پاؤں، پنڈلی، منہ وغیرہ نہ اسکی صفات کی طرح محض غیر مستقل اور نہ ذات انسان کی طرح مستقل ہیں۔ اور انسان کے کمالات کا مظاہرہ بھی نہیں شرع میں ان حقائق کی چند چیزوں کے ساتھ تفصیل واقع ہوئی ہے۔ اور یہ چیزیں ان حقائق تمثیل و تشبیہ ہیں نہ عین۔ یعنی کمر، قدم، منہ، آنکھ، ہاتھ، اور انگلیاں، اور پنڈلی اب جسطرح ساق اور قدم وغیرہ کو جو حقائق الٰہیہ ہیں اور ان الفاظ میں ایک استعارہ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ خود بھی پنڈلی اور پاؤں سمجھ لینا غلطی ہے۔ اور تشبیہ ہے۔ جیساکہ اہل ظواہر کا مذہب ہے۔ اسی طرح ان کی تاویل و انکار کرنا جیساکہ معتزلہ کرتے ہیں محض غلطی ہے۔

اہل سنت اس سے بری ہیں اور اہل سنت کے اس عقیدے کی بخاری و مسلم کی وہ حدیث بھی مخالف ہیں جو ابی سعید رض سے مروی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن اپنی ساق کھولے گا تو ہر ایماندار مرد و عورت سجدہ کریں گے اور جو دنیا میں ریاکاری کے سجدہ کرتے تھے وہ سجدہ کرنا چاہیں گے، تو ان کی پیٹھ تختہ کی طرح اکڑ جائے گی۔ لہذا وہ سجدہ نہ کر سکیں گے، اور صحیح مسلم میں اس سے بھی زیادہ مصرح روایت ہے اس لئے کہ ان روایت میں بھی کشف ساق سے اس جہت کمالیہ کا ظاہر ہونا مراد ہے۔ جسکو استعارہ کے طور پر ساق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الغرض محشر میں رب العزت کی ایک خاص تجلّی ہوگی جسکو کشف ساق سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے آگے کفار و مشرکین سجدہ نہ کر سکیں گے، اور یہ نہیں بلکہ اس نورانی تجلّی کی طرف نظر بھی نہ کر سکیں گے، خاشعۃ ابصارھم۔ بلکہ ان کفار کی آنکھیں نیچی ہوں گی، و ترھقھم ذلۃ۔ اور ان پر ذلّت و رسوائی چڑھے گی۔ کیونکہ انھوں نے غیر اللہ کی پرستش کر کے اس کے نام مبارک کی توہین و تذلیل کی تھی۔ بتوں کو پوجا تھا اور یہ سجدہ جمال باکمال پر نظر کیوں نہ کر سکیں گے؟ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وقد کانوا یدعون الی السجود وھم سالمون، دنیا میں انھوں نے اس مادہ غیبیہ کو جو انسان میں خدا و ند عالم نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اور وہ ہی اس کا مشتاق دیدار اور مطیع بناتا ہے نافرمانی اور سرکشی کر کے ضائع کر دیا تھا۔ اس بات کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ دنیا میں ان کو سجدے کے لئے بلایا جاتا تھا وہ سالم تھے، ان کی فطرت اور اعلیٰ مادہ میں کوئی نقصان نہیں آیا تھا۔ پھر انھوں نے انکار و سرکشی کی اور رفتہ رفتہ اس کو برباد کر دیا۔ آج اس تجلّی کے میدان میں کہ جہاں کہ تجلّی نورانی کھولا جاوے گا

تاکہ شقی و نیک کا پورا امتیاز ہو جائے۔ پھر وہ جو دنیا میں اس کے آگے جھکتے تھے۔ سر کے بل اس کے آگے عاجزی کرتے ہوئے کرتے تھے۔ دل بھی اس کے آگے جھکے ہوئے تھے، اور ان کے دلوں میں وہ اشتیاق و محبت کا شعلہ تھا جس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ فوراً اس کے آگے سجدہ میں گر پڑیں گے، انھیں کہاں تاب رہے گی۔ اور اس کے دیدار فیض آثار سے سرفرازی حاصل کریں گے، اسی وقت مشتاقانِ جمال کبریائی کی عجیب حالت ہوگی، اور برے لوگ نہ کر سکیں گے۔ وہ جنت میں یہ جہنم میں بھیجدیے جائیں گے،

ابراہیم تیمی کہتے ہیں کہ وہ اذان اور تکبیر کی آوازوں سے بلائے جاتے تھے پر نہ آتے تھے، سعید بن جبیر رح کہتے ہیں۔ حیّ علی الفلاح سنتے تھے اور نہ آتے تھے۔ کعب احبار کہتے ہیں یہ آیت نازل ہوئی مگر ان لوگوں کے لیے جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں۔ ابن عباس رض کہتے ہیں وہ کفار دنیا میں بلائے جاتے تھے اور وہ امن کی حالت میں تھے۔ پھر آج پلٹ جائیں گے۔ اور وہ خائف ہوں گے،

ابی مسلم اصفہانی کہتے ہیں کہ آیت میں قیامت کا معاملہ مراد نہیں کیونکہ اس روز عبادت و سجدہ نہیں۔ وہاں تو دنیا ہی کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ بلکہ یہ بھی مراد ہے کہ انسان کے آخر وقت کا معاملہ ہے۔ اس وقت خدا کی طرف نہیں کر پاتا۔ پہلے لوگ نماز کی طرف بلاتے تھے، وہ نہیں آتا تھا۔ اب بجز حسرت کے کچھ نہیں۔ کیونکہ وقت آخر میں ہر چیز ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اعضاء اپنا ٹھیک کام نہیں کر پاتے۔ اس لئے اس وقت یہ خیال کرکے بجز حسرت افسوس کے اور کیا ہو سکتا ہے یا یوں سمجھ لینا چاہئے بڑھاپے اور مرض کی حالت میں، جوانی اور تندرستی میں جبکہ اعضاء ٹھیک ٹھیک کام کرتے تھے۔ اور وہ وقت صحت و سلامتی کا تھا۔ لوگوں کے کہنے سننے اور پند و نصائح کرنے کے باوجود خدا کی عبادت نہیں کرتے تھے اور جوانی کے نشہ میں چور رہتے تھے

بمصداق :- اب تو گذرتی ہے آرام سے عاقبت کی خبر خدا جانے

برخلاف اسکے اب جبکہ بڑھاپا اور بیماری آئی تو ارادہ کرنے کے باوجود اعضاء کام نہیں کرتے۔ یعنی اب عبادت کی ان میں قدرت نہیں رہی گو کہ ان کا ارادہ ہو کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے کچھ اپنے معبود کی بندگی کر لیں۔ مگر اب تو وقت نکل چکا تھا جب وقت بندگی کا تھا اس وقت اپنی بدقسمتی میں ضائع کر دیا۔ اور اب بجز کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ حاصل نہیں رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کو نیکی کی طرف، عبادت کی طرف بلاتے تھے تو وہ بدبخت سخت تکذیب کرتے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے تھے، اور دھمکاتے بھی تھے۔ ان کے اس فعل بد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بدنصیبی اور سرکشی پر بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ اس لئے باری تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی و تشفی فرماتا ہے۔ فقال، فذرنی ومن یکذب بهذا الحدیث مجھے اور میری اس حدیث یعنی قرآن کریم کے جھٹلانے والوں کو تو چھوڑ دے، اس میں بڑی وعید ہے۔ اور سخت ڈانٹ ہے کہ تو ٹھہر جا میں اب ان سے نمٹ لوں گا۔ دیکھ تو سہی کہ کس طرح۔ تدریج انہیں پکڑتا ہوں۔ یہ اپنی سرکشی اور غرور میں بڑھتے جائیں گے، میری ڈھیل کے راز کو نہ سمجھیں گے، اور پھر ایک دم پاپ کا گھڑا پھوٹے گا انہیں اچانک۔ انھیں پکڑ لوں گا۔ میں انھیں بڑھاتا رہوں گا۔ یہ بدمست ہوتے چلے جائیں گے، اور وہ اسے کرامت سمجھیں گے۔ حالانکہ وہ ان کی اہانت ہوگی،

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا استدراج بندہ کے لئے یہ ہے کہ نعمت پر نعمت، مراد پر مراد ملے جائے، اور یہ بدکاری ناشکری، اور کفر میں پڑا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ کشتی بھر جائے۔ جاکر ڈوب جائے۔ عذاب الٰہی نازل ہو جائے۔ یکایک موت آجائے۔ یا اور کوئی مصیبت ایسی آئے کہ سر بھی نہ اٹھا سکے، تو بہ اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کی مہلت بھی نہ ملے

عیش ونشاط میں پڑا ہوا مگن ہے۔ اور اپنی بدکاری کا عمدہ پھل سمجھ رہا ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ چپکے چپکے موت اس کے پاس آن لگی ہے۔ اور اس کمبخت کو خبر بھی نہیں آج کن شادمانیوں کے ساتھ لہو ولعب اور بیہودگیوں میں لگ رہا ہے۔ شام کو مر گئے کل کو کورے تنگ اور اندھیرے گڑھے میں پڑے اعمال کو بھگت رہے ہیں۔ یہ ہے اللہ کریم کا استدراج جس سے بندہ واقف بھی نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا استدراج ہے کہ انسان کی عمر گراں مایہ کس قدر سرعت کے ساتھ کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ دن رات کی بہاریں لوٹتا ہے۔ مگر اس کو اسکی خبر نہیں ہوتی ہے کہ جو نیا پن اسکی زندگی میں آرہا ہے۔ وہ اسکی عمر میں سے کم ہوتا جارہا ہے۔ اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ منزل پوری ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی تم ان کو علوم نافعہ بتلا رہے ہو۔ میاں علوم نافعہ سے مراد الہی سنے دی گئی ہے جو شاذ ہی کسی کو میسر آسکے مثلاً آب حیات، اور کفار ہیں کہ آپ ؐ کے مقابلہ میں سرکشی کرتے ہیں۔ اور ان عقل کے دشمنوں کو یہ بھی احساس نہیں کہ آپ ان سے صلہ مانگتے ہیں۔ جس کے بوجھ سے دبے جارہے ہیں۔ جس لئے آپ سے وہ کفار استفادہ نہیں کرتے، پھر فرماتا ہے کہ جب وہ آپ سے استفادہ نہیں کرتے تو پھر ان کے پاس علم غیب ہے۔ یعنی امور غیبیہ احکام الہیہ کا علم ہے۔ پھر جب یہ دونوں باتیں ہیں تو قطعاً جان لینا چاہیے کہ وہ غفلت میں گرفتار ہیں اور یہ غفلت اللہ تعالیٰ نے ان پر مسلط کر رکھی ہے۔ اور یہ بھی وجہ ہے کہ آپ کے علوم نافعہ ان کے دلوں تک نہیں پہونچتے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ

تو آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیے اور (تنگدلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کیطرح نہ ہو جیسے جبکہ یونس نے

مَكْظُومٌ ۝ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ

اگر خداوندی احسان ان کی دستگیری کرتا تو وہ جس میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈالے گئے تھے (اسی) میں بدحالی

وَهُوَ مَذْمُومٌ ۝ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ

کے ساتھ ڈالے جاتے (دستگیری سے مراد قبول توبہ ہے) پھر ان کے رب نے ان کو اور برگزیدہ کر لیا اور ان کو صالحین میں سے کر دیا۔

وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا

اور یہ کافر جب قرآن سنتے ہیں تو شدت عداوت سے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آپکو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرادیں گے (یہ ایک محاورہ ہی ادہ راسی

سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ وَمَا هُوَ

عداوت سے آپکی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ مجنون ہیں حالانکہ یہ قرآن (جسکے ساتھ آپ تکلم فرماتے ہیں)

إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۝

تمام جہان کے واسطے نصیحت ہے۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ اپنی قوم کی ایذا رسانی اور ان کے صریحاً جھٹلانے پر صبر و تحمل کرو عنقریب اپنے رب کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ آخر کار آپ ﷺ کا اور آپ کے متبعین کا ہی غلبہ ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دیکھو تم مچھلی والے نبی کی طرح نہ ہونا۔ (مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں) جب کہ وہ اپنی قوم پر غضبناک ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ آپ کا جہاز پر سوار ہونا، مچھلی کا آپ کو نگل جانا اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانا، اور اس نہ بہ نہ اندھیریوں میں اس قدر نیچے آپ کا سمندر کو خدا تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے سننا اور خود آپ کا بھی پکارنا پھر آپ کی دعا کا قبول ہونا۔ اور اس سے نجات پانا وغیرہ۔ جس واقعہ کا مفصل بیان پہلے گذر چکا ہے۔ جس کے بیان کے بعد اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ ہم اس طرح ایمانداروں کو نجات دیا کرتے ہیں۔ اور فرماتا ہے کہ اگر وہ تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے۔ یہاں بھی فرماتا ہے کہ جب اس نے غم اور دکھ کی حالت میں ہمیں پکارا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی زبان سے نکلتے ہی یہ کلمہ عرش پر پہونچا۔ فرشتوں نے کہا خدایا اس کمزور کی آواز تو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے پہلے سنی ہوئی ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اسے پہچانا نہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا نہیں۔ جناب باری نے فرمایا یہ میرے بندے یونس علیہ السلام کی آواز ہے۔ فرشتوں نے کہا پروردگار پھر تو یہ بندہ وہ ہے جس کے اعمال صالحہ ہر روز آسمان پر چڑھتے رہے، جس کی دعائیں ہر وقت قبولیت کا درجہ پاتی رہیں،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سچ ہے، فرشتوں نے کہا پھر اے ارحم الراحمین ان کے نیک اعمال کی بنا پر انہیں اس سختی سے نجات عطا فرمایا۔ چنانچہ ارشاد جاری ہوا کہ اے مچھلی تو انہیں اگل دے۔ اور مچھلی نے انہیں کنارے پر آ کر اگل دیا۔ یہاں بھی یہ ہی بیان ہو رہا ہے کہ خدا نے انہیں پھر برگزیدہ بنا لیا، اور نیک کاروں میں کر دیا، مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو حضرت یونس ؑ سے افضل بتائے۔ صحیحین میں یہ بھی حدیث ہے۔

اے نبی تیرے بغض و حسد کی وجہ سے یہ کفار تو اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر تجھے پھسلا دینا چاہتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے حمایت، اور تحفظ نہ ہوتا تو یقیناً یہ تو ایسا کر گذرتے، اس آیت میں دلیل ہے۔ اس امر پر کہ نظر کا لگنا اور اس کی تاثیر کا خدا تعالیٰ کے حکم سے ہونا حق ہے۔ اور یہ کفار ایسی حرکتیں کب کرتے ہیں۔ لما سمعوا الذکر جبکہ قرآن کریم سنتے ہیں یہ اس لئے کہ عین نصیحت کے وقت جو سراسر خیر خواہی کا وقت ہوتا ہے، ایسی سخت مخالفت ناصح کو جوش میں لے آتی ہے، اور یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت محبوب تھا، اور اپنی برائی سننے سے اس قدر غصہ نہیں آتا، جس قدر کہ محبوب کی تحقیر سن کر غصہ آتا ہے۔ یہ ان کی ایک بات ہے۔ جو آنکھوں سے متعلق ہے۔ اس پر بس نہیں کرتے بلکہ زیادتی سے بھی برا بھلا کہتے ہیں۔ ویقولون انہ لمجنون۔ اور کہتے ہیں تحقیق یہ شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیوانہ ہے۔ حالانکہ کوئی جنون اور دیوانگی کی بات آپ میں یا آپ کے کلام میں نہیں پاتے کس لئے کہ جو کلام آپ لوگوں کو سناتے ہیں۔

وما ھو الا ذکر للعالمین، وہ نہ صرف ایک قوم یا ایک ملک یا ایک خاندان کے لئے مفید و سودمند ہے بلکہ تمام جہاں کے لئے یکساں سودمند اور نافع ہے کیونکہ اس عہد میں تمام جہاں بت پرستی و بدکاری کی نجاست میں آلودہ تھا، اور قرآن مجید تمام نجاستوں کو دور کرنے والی چیز ہے۔ اس کے علاوہ مکارم اخلاق و اصول حسنات و ارکان سعادت دارین کے زیور اور لباس سے مزین کرنے والی ہے

پھر جب ایک قوم یا ایک شخص کو نصیحت و سعادت سکھانے والے کو مجنون نہیں کہا جاتا تو تمام جہان کے ناصح

اور سلم سعادت کو کیونکر دیوانہ کہدیا اور وہ کیونکر دیوانہ ہو سکتا ہے۔

سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

اَلْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ

وہ ہونے والی چیز کیسی کچھ ہے۔ وہ ہونے والی چیز (انسان کو کچھ خبر ہے کہ کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز (یہ استفہامات تہویل کے لئے ہیں) ثمود اور عاد

ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝

نے اس کھڑکھڑانے والی چیز (یعنی قیامت) کی تکذیب کی　　سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ

اور عاد جو تھے سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے۔

سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى

رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کر دیا تھا سو (اے مخاطب اگر) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝

کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں　　سو کیا تجھکو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے (یعنی بالکل استیصال ہو گیا)

تفسیر قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے سے پیشتر اس سورۃ کا نزول ہوا۔ ابن عباس رضؓ و ابن زبیر رضؓ بھی یہی فرماتے ہیں ایک روایت ہے جو کہ طبرانی کے منسوب کیجاتی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں سورۃ حاقہ اور اس کی مثل کی اور سورۃ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اب بھی حفاظ اور علماء حضرات اکثر و بیشتر سورۃ حاقہ فجر کی نماز میں پڑھتے ہیں۔ اس سورۃ کی مناسبت سورۃ نون سے اس لئے ملتی ہے کہ اس سورۃ میں بھی انسان کی بدکرداری دکفر بہ خداوند قدوس کی طرف سے سزا کے نازل ہونے کا بیان ہے۔ اور انسان پر کیونکہ خدا تعالیٰ کیطرف سے سزا نازل ہوتی ہے وہ دراصل انسانوں ہی کے افعال بد کا نتیجہ یا ایک اثر غیر منفک ہوتا ہے۔ اس کی مفسرین و علماء کرام نے تقسیم تبلائی ہیں

(۱) ابتلاء یہ محض انسان کی بدافعالی کے نتیجہ میں اس لئے کہ سرزنش اور تنبیہ کے لئے ہوتی ہے کہ اس تنبیہ اور سرزنش کی وجہ سے وہ اپنے افعال بد سے باز آجائے۔ اور اسی کو امتحان اور آزمائش بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً قحط۔ وبا۔ بدامنی، باہمی نفاق

باہمی قتال وجدال، سخت حاکم کا تسلط، زلزلہ، ژالہ باری اور طوفان وغیرہ وغیرہ - یہ مصیبتیں ایک حیثیت سے قہر ہیں، تو دوسری طرف مہر بھی ہیں - کیونکہ ان حالات میں اکثر و بیشتر بدوں کے ساتھ نیک بھی پس جاتے ہیں تاکہ نیکوں کو تنبیہ ہو جو امر معروف میں ان سے کوتاہی ہوئی تھی یا ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے - یا درجات علیا کا وسیلہ ہو جائے نیز ان کا امتحان بھی مقصود ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں -

(۲) انتقام جو مصائب میں پھنس کر بھی نہ سمجھے اور ایسی سزا کو حاقہ بھی کہتے ہیں - جو کسی کے ٹالے سے نہیں ٹلتی اور انتقال الٰہی بہت کچھ ڈھیل دینے کے بعد آخر میں ہوتا ہے، جہاں نہ توبہ کی مہلت نہ استغفار کی فرصت ملتی ہے، اور اس کے بعد دنیا سے کوچ کر کے عالم برزخ کا قید خانہ ہوتا ہے - اس میں نیک لوگ شامل نہیں ہوتے - ان کو خدائے پاک اپنے بے پایاں فضل و کرم سے بہر طور محفوظ ہی رکھتا ہے

سورۃ نون میں کفار مکہ کو مصائب و آلام اور قہر خداوندی سے ڈرایا گیا تھا اور ان کو سمجھانے کیلئے باغ والوں کا قصہ بھی یاد دلایا تھا - مگر کفار مکہ جن کے دلوں پر خداوند تعالیٰ نے مہر کر دی تھی، اس ابتلاء کو جس کا سلسلہ سات برس تک بشکل قحط رہا تھا، اس لئے اس سورۃ شریف میں حاقّہ - عذاب بیان فرماتا ہے - جو زیادہ تر قیامت میں ہوگا - اور کبھی غیرت الٰہی دنیا میں بھی نازل کر دیتی ہے، جیسا کہ پہلی امتوں پر جو دنیا میں حاقہ میں نازل ہوا اس کی ان کی تسلیم شدہ واقعات کی نظیر دیتا ہے -

فقال الحاقۃ ما الحاقۃ کیا ہی حاقہ ہے ؟ اس کے بعد وما ادراک ما الحاقۃ کہ تو کیا جانے کیا ہے - حاقہ قیامت کا نام ہے - اور اس نام کی وجہ یہ ہے کہ وعدہ وعید کی حقانیت اور حقیقت کا دن وہی ہے اسی لئے اس دن کی ہولناکی بیان کرتے ہوئے فرمایا - تم اس حاقہ کی صحیح کیفیت سے بے خبر ہو، پھر ان لوگوں کا بیان جن لوگوں نے اسے جھٹلایا تھا، اور پھر اپنے اس انکار کا خمیازہ اٹھایا، اب اس کے بعد چند نظائر حاقہ کے بیان فرمایا ہے جو اگلی قوموں پر دنیا میں نازل ہوئیں، عاد، و ثمود کی ہلاکت جو عرب کے ملک میں ہوئی - اور وہ ایک متواتر روایت تھی، جس کا کوئی عرب انکار نہیں کر سکتا تو فرمایا قوم ثمود جو عرب کے شمال و مغرب کے حصہ میں آباد تھی، جن کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے گھر اب تک یادگار ہیں - اسی طرح ان سے پہلے قوم عاد تھے جو یمن میں رہتے تھے

تو فرمایا کہ ثمودیوں کو دیکھو ایک طرف تو فرشتے کی دھاڑیں کہ جس سے کلیجہ پاش پاش ہو جاتے تھے - آواز آتی ہی دوسری جانب سے زمین میں غضب کا بھونچال آتا ہے اور سب تہہ و بالا ہو جاتے ہیں، پس بقول حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ طاغیۃ کے معنی ہیں چنگھاڑنے کے، اور مجاہد رح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گناہ ہیں - یعنی وہ اپنے گناہوں کے باعث برباد کر دئے گئے، ربیع بن انس رح اور ابن زید رح کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کی سرکشی ہے، ابن زید رح نے اس کی شہادت میں یہ آیت پڑھی، کذبت ثمود بطغواھا - یعنی ثمودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث جھٹلایا یعنی اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں، اور، اور ٹھنڈی ہواؤں کے تیز جھونکوں نے جنھوں نے ان کے دل تک زخمی کر دے تہس نہس کر دیئے گئے، یہ آندھیاں جو خیر و برکت سے خالی تھیں اور فرشتوں کے ہاتھوں سے نکلی جاتی تھیں برابر پے درپے لگاتار سات راتیں اور آٹھ دن تک چلتی رہیں، ان دونوں میں ان کے لئے سوائے نحوست اور بربادی کے اور کوئی بھلائی نہ تھی، حضرت ربیع رح فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن سے یہ آندھیاں شروع ہوئی تھیں، بعض کہتے ہیں بدھ سے ان ہواؤں کو عرب اعجاز اسی لئے بھی کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ ان عادیوں کی حالتیں اعجاز یعنی کھجوروں کے کھوکھلے تنوں جیسی ہو گئیں، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عموماً یہ ہوائیں جاڑوں کے آخر میں چلا کرتی ہیں اور عجز کہتے ہیں

آخر کو، اور یہ وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ عادیوں کی ایک بڑھیا غار میں گھس گئی تھی جو ان ہواؤں سے آٹھویں
روز وہیں تباہ ہو گئی، اور بڑھیا کو عربی میں عجوز کہتے ہیں۔ واللہ اعلم
خاویہ کے معنی ہیں خراب سڑا گلا کھوکھلا، مطلب یہ ہے کہ ہواؤں نے انہیں اٹھا اٹھا کر الٹا دے پٹخا، ان
کے سر پھٹ گئے، سروں کا تو چورا چورا ہو گیا اور باقی جسم ایسا رہ گیا جیسے کھجور کے درخت کا سرا پتوں والا کاٹ کر
ٹھنڈ رہنے دیا ہو۔ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری مدد کی گئی صبا
پروا ہوا کے ساتھ اور عادی ہلاک کئے گئے، دبور سے یعنی پچھوا ہوا سے، ابن ابی حاتم میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرماتے ہیں کہ عادیوں کو ہلاک کرنے کے لئے ہواؤں کے خزانے میں سے صرف انگوٹھی کے برابر جگہ کشادہ
کی گئی تھی، جس سے ہوائیں نکلیں اور پہلے وہ گاؤں و دیہات والوں پر آئیں ان تمام مردوں اور عورتوں کو، چھوٹے بڑوں
کو ان کے مال اور جانوروں سمیت لیکر آسمان اور زمین کے درمیان معلق کر دیا،
شہر والوں کو بوجہ بہت بلندی اور کافی اونچائی کے یہ معلوم دینے لگا کہ سیاہ رنگ بادل چڑھا ہوا ہے خوش
ہونے لگے کہ گرمی کے باعث جو ہماری بری حالت ہو رہی ہے۔ اب پانی برس جائے گا، اتنے میں ہواؤں کو حکم ہوا
اور اس نے ان تمام کو ان شہریوں پر پھینک دیا یہ اور وہ سب ہلاک ہو گئے، حضرت مجاہد رح فرماتے ہیں کہ اس
ہوا کے پر اور دم تھی۔ پھر خداوند قدوس فرماتا ہے بتلاؤ ان میں سے ان کی نسل میں سے ایک کو بھی تم دیکھ رہے ہو،
یعنی سب کے سب تباہ کر دئے گئے۔ کوئی نام لیوا پانی دینے والا بھی باقی نہ رہا۔ پھر فرمایا کہ فرعون اور اس کے اگلے خطا
کار نافرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی انجام ہوا قِبَلَهٗ تو معنی یہ ہوں گے کہ فرعون اور اس کے پاس اور
ساتھ کے لوگ یعنی فرعونی، قبطی، کفار، مُؤتفِکات سے مراد بھی پیغمبروں کو جھٹلانے والی اگلی امتیں ہیں، خاطئة
سے مطلب معصیت اور خطائیں ہیں۔ پس فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے زمانے کے رسول کی تکذیب کی،
اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ ایک پیغمبر کا انکار گویا تمام انبیاء کا انکار ہے جیسے قرآن میں فرمایا گیا ہے کذبت
عادن المرسلین عادیوں نے رسول کو جھٹلایا، حالانکہ سب کے پاس یعنی ہر ایک امت کے پاس ایک ہی رسول
آیا تھا، یہی مطلب یہاں بھی ہے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغمبر کی نافرمانی کی، پس خدا تعالی نے انہیں سخت تر مہلک
بڑی دردناک و المناک پکڑ میں پکڑ لیا، اس کے بعد اپنا احسان جتاتا ہے کہ دیکھو جب نوح علیہ السلام کی دعا کی وجہ
سے زمین پر طوفان آیا اور پانی حد سے گذر گیا چاروں طرف سیلاب ٹھاٹھیں مارنے لگا، نجات کی کوئی جگہ نہ رہی اس
وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھا لیا، حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں جب قوم نوح ع نے اپنے نبی ع کو جھٹلایا اور ان کی
مخالفت اور ایذا رسانی شروع کی خدا تعالی کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے لگے، اس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے
تنگ آکر ان کی ہلاکت کی دعا کی۔ جسے خدا تعالی نے قبول فرمایا۔ اور مشہور طوفان نوح ع نازل فرمایا۔ جس سے سوائے ان
لوگوں کے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے، روئے زمین پر کوئی نہ بچا پس سب لوگ حضرت نوح علیہ
السلام کی نسل اور آپ ع کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ پانی کا ایک ایک قطرہ بہ اجازت
خداوند قدوس پانی کے داروغہ فرشتے کے ناپ تول سے برستا ہے۔ اسی طرح ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی بے ناپ
ہوئے نہیں چلتا۔ لیکن ہاں عادیوں پر جو ہوائیں چلیں اور قوم نوح ع پر جو طوفان آیا وہ تو بیحد اور بے شمار اور بغیر ناپ
تول کے تھا، خداوند قدوس کی اجازت سے پانی اور ہوا نے وہ زور باندھا کہ نگہبان فرشتوں کی کچھ نہ چلی اسی لئے قرآن
کریم میں طغی الماء اور بریح صرصر عاتیة کے الفاظ ہیں، اس لئے اس اہم احسان کو خداوند تعالی یاد دلا رہا

کہ ایسے پرخطر موقع پر ہم نے تمہیں چلتی کشتی پر سوار کرادیا، تاکہ یہ کشتی تمہارے لئے نمونہ بنجائے، چنانچہ آج تک لوگ کشتیوں پر سوار ہوکر سمندر کے لمبے چوڑے سفر طے کئے جارہے ہیں، جیساکہ قرآن کریم میں آیا ہے، وجعل لکم من الفلك والانعام یعنی تمہاری سواری کے لئے کشتیاں اور چوپائے جانور بنائے تاکہ تم ان پر سواری کرو اور سوار ہوکر اپنے رب کی نعمت یاد کرو قرآن کریم میں آیا ہے۔ وآیة لهم انا حملنا یعنی ان کے لئے ایک نشانِ قدرت یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری کشتی میں چڑھالیا۔ حضرت قتادہ رح نے اوپر کی اس آیت کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے یہ اس لئے بھی کہ یاد رکھنے اور سننے والا کان اسے یاد کرلے اور محفوظ رکھ لے اور اس نعمت کو نہ بھولے۔ یعنی صحیح سمجھ اور سچی سماعت والے، عقلِ سلیم اور فہمِ مستقیم رکھنے والے جو خدا تعالیٰ کی باتوں اور اس کی نعمتوں سے بے پرواہی اور لاابالی نہیں برتتے، ان کی پند ونصیحت کا ایک ذریعہ بھی بن گیا، ابن ابی حاتم میں ہے جب یہ الفاظ اترے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ علی کرم اللہ وجہہ کو ایسا ہی بنادے، چنانچہ حضرت علی رض فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر کوئی چیز میں نے فراموش نہیں کی، یہ روایت ابن جریر میں بھی ہے۔ لیکن مرسل ہے، ابن ابی حاتم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض سے فرمایا کہ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں تجھے نزدیک کروں دور نہ کروں، اور تجھے تعلیم دوں اور تو بھی یاد رکھے اور یہی تجھے بھی چاہیے، اس پر آیت اتری، یہ آیت دوسری سند سے بھی ہے۔ ابن جریر میں مروی لیکن وہ بھی صحیح نہیں

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝ فَعَصَوْا

اور (اسی طرح) فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے اور (قوم لوط کی) الٹی ہوئی بستیوں نے بڑے بڑے قصور کئے (یعنی کفر وشرک اس پر انہوں نے)

رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝ اِنَّا لَمَّا طَغَا

اپنے رب کے رسول کا کہنا نا مانا) تو انکو اللہ تعالیٰ نے بہت سخت پکڑا یعنی ہم نے جبکہ (نوح علیہ السلام کے وقت میں) پانی کی طغیانی ہوئی تو

الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ

کشتی میں سوار کیا (اور باقیوں کو غرق کردیا) تاکہ ہم اس معاملہ کو تمہارے لئے یادگار (اور عبرت) بنائیں اور یاد

تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ

رکھنے والے کان اسکو یاد رکھیں۔ پھر جب صور میں یکبارگی پھونک ماری جاوے گی (مراد نفخۂ اولیٰ ہے) اور اس وقت

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝

زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اُٹھالئے جاویں گے پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردئے جاویں گے،

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ

تو اس روز ہونے والی چیز ہو پڑے گی۔ اور آسمان پھٹ جاویگا اور وہ (آسمان)

يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ

اس روز بالکل بودا ہوگا۔ اور فرشتے (جو آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں) اسکے کنارے پر آجاویں گے، اور آپکے پروردگار کے عرش کو

رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى

اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔ جس روز (خدا کے روبرو حساب کے واسطے) تم پیش کئے جاؤ گے، (اور)

مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ

تمہاری کوئی بات (اللہ تعالیٰ سے) پوشیدہ نہ ہوگی۔ پھر نامۂ اعمال ہاتھ میں دئے جائیں گے تو جس شخص کا نامۂ اعمال اسکے داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا وہ تو

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝

(خوشی کے مارے پاس والوں سے) کہیگا کہ لو میرا نامۂ اعمال پڑھ لو۔ میرا (تو پہلے ہی سے) اعتقاد تھا کہ مجھکو میرا حساب پیش آنے والا ہے۔

تفسیر ۝ دنیاوی حاقہ کے نظائر بیان فرما کر ایک انتہائی سخت حاقہ کا ذکر کرتا ہے یعنی قیامت کے برپا ہونے کا اور اسکی ہولناکیوں کا بیان فرماتا ہے کہ صور پھونکا جائے گا۔ ایک ہی دفعہ کے پھونکنے میں سب کے دل دہل جائیں گے، پھر نفخہ پھونکا جائے گا جس سے تمام زمین و آسمان کی مخلوق بے ہوش ہو جائیگی، زمین اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر اس کے بعد علویات فنا ہوں گے، آسمان پھٹ جائیں۔ اور فرشتے جو آسمانوں میں تھے نکل کر اس کے کناروں پر آجائیں گے، اس طرح کہ جب کوئی عمارت گرتی ہوئی ہو تو اس کے رہنے والے چھوڑ کر اس کے گرد ہو جاتے ہیں اس کے بعد جب تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ جس کی آواز سے تمام مخلوق اپنے رب کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔ یہاں اس پہلے نفخہ کا بیان ہے۔ امام ربیع رح فرماتے ہیں اس سے مراد آخری نفخہ ہے۔ لیکن واضح قول وہی ہے جو ہم نے پہلے لکھا۔ اسی لیئے یہاں اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ زمین و آسمان اٹھالئے جائیں گے، اور کمان کی طرح پھیلادیئے جائیں گے، اور زمین بدل دی جائے گی اور قیامت واقع ہو جائے گی

حضرت علی رض فرماتے ہیں کہ آسمان پر کھلنے کی جگہ سے پھٹ جائے گا۔ جیسے سورۃ نبا میں ہے کہ آسمان کھول دیا جائے گا۔ اور اسمیں دروازے ہو جائیں گے حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں آسمان میں سوراخ اور غار پڑ جائیگے اور شق ہو جائے گا عرش اس کے سامنے ہو جائے گا فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے، جو کنارے ابتک ٹوٹے نہ ہوں گے، اور دروازوں پر ہوں گے، آسمان کی لمبائی میں پھیلے ہوئے ہوں گے، اور زمین والوں کو دیکھ رہے ہوں گے پھر فرمایا، قیامت والے دن آٹھ فرشتے خداوند تعالیٰ کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، واللہ اعلم بالصواب حضرت عباس بن عبدالمطلب رض فرماتے ہیں۔ یہ فرشتے پہاڑی بکروں کی صورت میں ہوں گے، حضرت عبداللہ

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ان کی آنکھ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا ایک سو سال کا راستہ ہے مطلب یہ ہے کہ
بہت بڑے ہوں گے۔ ابن حاتم کی مرفوع حدیث میں ہے کہ مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں عرش کے اٹھانے والے فرشتوں
میں سے ایک فرشتے کی نسبت خبر دوں کہ اسکی گردن اور کان کے نیچے تک کی لو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ اڑنے والے
پرند سات سو سال تک اڑتا چلا جائے، اس کی اسناد بہت عمدہ ہیں۔ اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں، اسے امام
ابوداؤد نے بھی اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح فرمایا، حضرت سعید بن جبیرؒ
فرماتے ہیں کہ اس سے مراد آٹھ فرشتوں کی صفیں ہیں اور بھی بہت سے بزرگوں سے یہ منقول ہے حضرت ابن عباسؓ
فرماتے ہیں کہ اعلیٰ فرشتوں کے آٹھ حصے ہیں، جن میں سے ہر ایک حصہ کی گنتی تمام انسانوں جنوں سب فرشتوں کے برابر
ہے، پھر فرمایا قیامت کے روز تم اس خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے، جو پوشیدگی کو اور ظاہر کو بخوبی جانتا ہے
جس طرح کھلی سے کھلی چیز کا وہ عالم ہے۔ اسی طرح چھپی سے چھپی چیز کو بھی وہ جانتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ تمہارا کوئی
بھید اس روز چھپ نہ سکے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ لوگو! اپنی جانوں کا حساب کر لو،
اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کا خود اندازہ کر لو اس سے پہلے کہ ان اعمال کا وزن کیا جائے
تاکہ کل قیامت والے دن تم پر آسانی ہو جس دن کہ تمہارا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ اور ایک بڑی پیشی میں خود
خدائے عزوجل شانہٗ کے سامنے تم پیش کر دئے جاؤ گے۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگ تین مرتبہ خدا کے
سامنے پیش کئے جائیں گے، پہلی اور دوسری مرتبہ تو عذر و معذرت اور جھگڑا کرتے رہیں گے، لیکن تیسری پیشی
جو آخری ہوگی اس وقت نامۂ اعمال اڑا لئے جائیں گے، کسی کے داہنے ہاتھ میں آئے گا۔ اور کسی کے بائیں ہاتھ میں
یہ حدیث ابن ماجہ میں بھی ہے۔ حضرت عبداللہؓ کے قول سے بھی یہی روایت ابن جریر میں موجود ہے۔ اور
حضرت قتادہؓ سے بھی اس جیسی روایت مرسل منقول ہے۔ یہاں یہ بیان ہو رہا ہے کہ جن خوش نصیب لوگوں کو
قیامت کے دن ان کے نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دئے جائیں گے، وہ سعادت مند حضرات بے حد خوش
ہوں گے، اور جوش مسرت میں بے ساختہ ہر ایک سے کہتے پھریں گے کہ میرا نامۂ اعمال تو پڑھو یعنی اسکو اسقدر
مسرت اور خوشی کہ اپنے ساتھیوں کو دکھائیں گے اور پڑھواتے پھریں گے، یہ اس لئے کہ جو گناہ بمقتضائے بشریت ان سے
ہو گئے تھے، وہ بھی ان کی توبہ کی وجہ سے نامۂ اعمال میں سے مٹا دئے گئے ہیں بلکہ ان کے بجائے نیکیاں لکھ دی
گئی ہیں۔ پس یہ سراسر نیکیوں کا نامۂ اعمال ایک ایک کو پورے سرور اور سچی مسرت سے دکھاتے پھریں گے، حضرت
ابوعثمان رح فرماتے ہیں کہ چپکے سے حجاب میں مومن کو اس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ جسمیں اسکے گناہ لکھے ہوئے
ہوں گے، وہ اسے پڑھتا ہوگا۔ اور ہر ایک گناہ پر اس کے ہوش اڑ جاتے ہوں گے، چہرے کی رنگت اڑتی ہوگی
اتنے میں اس کی نگاہ اپنی نیکیوں پر پڑ جائیگی۔ جب انہیں پڑھنے لگے گا، تب ذرا چین آئے گا۔ ہوش و حواس
اڑتے ہوں گے، اور چہرہ کھل جائے گا۔ پھر نظر ڈال کر پڑھیگا تو دیکھے گا۔ اس کی برائیاں بھی بھلائیوں سے بدل
دی گئی ہیں۔ ہر برائی کی جگہ بھلائی لکھی ہوئی ہے۔ اب تو اس کی خوشی سے باچھیں کھل جائیں گی، اور خوش خوش نکل
کھڑا ہوگا۔ اور جو بھی ملے گا اس سے کہے گا کہ ذرا میرا نامۂ اعمال تو پڑھو۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں
فرشتوں نے ان کی شہادت کے بعد غسل دیا تھا۔ ان کے لڑکے حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے
کو قیامت والے دن اپنے سامنے کھڑا کرے گا۔ اور اس کی برائیاں اس کے نامۂ اعمال کی پشت پر لکھی ہوئی ہوں گی

جو اس پر ظاہر کی جائیں گی - اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ بتا کیا تو نے یہ اعمال کئے ہیں ؟ وہ بندہ اقرار کریگا
ہاں بیشک میرے معبود حقیقی یہ برائیاں مجھ سے ہوئی ہیں - اس پر اللہ کریم فرمائے گا - دیکھ میں نے دنیا میں بھی تجھے
رسوا نہیں کیا اور نہ فضیحت کی اب یہاں بھی تجھ سے درگذر کرتا ہوں اور تیرے تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں ،
جب وہ بندہ اس سے فارغ ہو گا تب اپنا نامۂ اعمال خوشی اور مسرت کے ساتھ ایک ایک کو دکھاتا پھرے گا پھر
اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا - جسمیں نیکیاں ہی نیکیاں ہوں گی - لیکن کافروں اور منافقوں کے بارے
میں تو گواہ پکار اٹھیں گے کہ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے خدا تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ کہا - لوگو سنو . ان ظالموں
پر خدا کی پھٹکار ہے پھر فرماتا ہے کہ یہ داہنے ہاتھ کے نامۂ اعمال والا کہے گا - مجھے تو دنیا میں ہی یقین کامل تھا کہ یہ
حساب کا دن قطعاً آنے والا ہے

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ قُطُوفُهَا

غرض وہ شخص پسندیدہ عیش یعنی بہشت بریں میں ہوگا جسکے میوے اس قدر جھکے ہوں گے کہ جس حالت میں چاہیں لے سکیں گے

دَانِيَةٌ ○ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ

اور حکم ہوگا کہ کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے گذشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام دنیا) میں کئے ہیں

الْخَالِيَةِ ○ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ

اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا - سو وہ نہایت حسرت سے

يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ○ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ○

کہیگا کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامۂ اعمال ہی نہ ملتا - اور مجھکو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے

يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ○ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ○ هَلَكَ

کیا اچھا ہوتا کہ موت اول ہی خاتمہ کر چکتی (افسوس) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا میرا جاہ (بھی)

عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ○ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ○ ثُمَّ الْجَحِيمَ

مجھ سے گیا گذرا (ایسے شخص کیلئے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑو اور اسکے طوق پہنادو پھر دوزخ میں اسکو داخل کرو

صَلُّوهُ ○ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا

پھر ایک ایسی زنجیر میں جسکی پیمائش ستر گز ہے اسکو جکڑ دو

فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ

یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا اور خود تو کسی کو کیا کھاتا اور

عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝

کوبھی، غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا اس لئے مستحق عذاب ہوا۔ سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوستدار ہے

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ ۝

اور نہ اسکو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھووں کے جسکو بجز بڑے گنہگاروں کے کوئی نہ کھاوے گا۔

تفسیر — فرمایا ان کی جزا یہ ہے کہ یہ پسندیدہ اور دل خوش کن زندگی پائیں گے، اور بلند و بالا جنت میں رہیں گے، جس کے محلات او نچے او نچے ہوں گے، جس کی حوریں قبول صورت اور نیک سیرت ہوں گی، اور وہ گھر نعمتوں کے بھرپور خزانے ہوں گے۔ اور یہ تمام نعمتیں نہ ختم ہونے والی بلکہ کمی سے بھی محفوظ ہوں گی۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا اونچے نیچے مرتبے والے جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں بھی کریں گے، آپ نے فرمایا بلند مرتبہ کے لوگ کم مرتبہ کے لوگوں کے پاس ملاقات کے لئے اتریں گے۔ اور خوب محبت و اخلاص کے ساتھ سلام مصافحہ اور خاطر و مدارت ہوگی، ہاں البتہ نیچے درجے والے یہ سبب اپنے اعمال کی کمی کے اوپر نہ چڑھ سکیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک سو درجے ہیں ہر درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے۔ جتنا زمین و آسمان میں، پھر فرماتا ہے کہ اس کے پھل نیچے نیچے ہوں گے اور اس قدر جھکے ہوئے ہونگے کہ جنتی اپنے چھپر کھٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ان میووں کو توڑ لیا کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر ایک جنتی کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک لکھا ہوا پروانہ ملے گا۔ جس پر لکھا ہوا ہوگا، یہ اجازت نامہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فلاں شخص کے لئے جو فلاں کا بیٹا ہے۔ اسے بلند و بالا جھکی ہوئی شاخوں اور لدے پھندے ہوئے خوشوں والی خوشگوار جنت میں جانے دو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ پروانہ پل صراط پر عطا کر دیا جائے گا۔ پھر فرمایا انھیں بطور احسان اور مزید لطف و کرم کے زبانی بھی کھانے پینے کی رخصت مرحمت ہوگی۔ اور کہا جائے گا کہ یہ تمہاری نیک اعمالیوں کا بدلہ ہے۔ اعمال کا بدلہ کہنا صرف بطور لطف و کرم کے ہے۔ ورنہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عمل کرتے جاؤ سیدھے اور قریب قریب رہو، اور جان رکھو کہ صرف اعمال جنت میں لیجانے کے لئے کافی نہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کیا۔ حضور! آپ کے اعمال بھی نہیں، فرمایا نہ میرے ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اسکی رحمت شامل حال ہو۔

یہاں گناہگاروں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جب میدان قیامت میں انھیں نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ نہایت پریشان اور پشیمان ہوں گے۔ اور حسرت و افسوس سے کہیں گے کہ کاش ہمیں ہمارا اعمال نامہ ملتا ہی نہیں۔ اور کاش ہم اپنے حساب کی اس کیفیت سے آگاہ ہی نہیں ہوتے، پھر وہاں کی سختی دیکھا ہے اور طرح طرح کی رسوائی کو دیکھ کر کہیں گے اگر کاش موت ہی ہمارا کام ختم کر دیا ہوتا۔ اور یہ دوسری زندگی ہمیں ملتی ہی۔ کاش میں بھی اس بلا سے چھوٹ جاتا جس موت سے دنیا میں بہت گھبراتے تھے، آج اسکی آرزو ئیں کریں گے۔ مگر یہاں پھر موت کہاں، وہاں دنیا کی نعمتوں کو

یاد کر کے روئے گا۔ اور افسوس کرے گا۔ کہ ہمارے مال وجاہ نے بھی آج ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ افسوس آج میرا مال کچھ بھی تو کام نہ آیا نہ کوئی رشوت لیتا ہے۔ نہ مالدار سمجھ کر لحاظ عزت کرتا ہے۔ یا یہ کہ دنیا میں نیک کاموں میں صرف کرتا تو یہاں کام آتا۔ جیسا کہ اوروں کے کام آ رہا ہے۔ اس کے بدلے میں اس کی سزائیں کم ہو رہی ہیں۔ اجر مل رہے ہیں اور نہ آج میری عزت و حشمت کام آئی۔ یہاں بادشاہ و فقیر دونوں برابر ہیں۔ نہ کوئی خاندان کو پوچھتا ہے۔ نہ حسب نسب دریافت کرتا ہے۔ یا یہ کہ میری عزت و دلیل باطل ہو گئی۔ جو دنیا میں باطل مذہب اور بیہودہ باتوں کے برحق ثابت کرنے میں کیا کرتا تھا۔ اور بڑی زبان چلایا کرتا تھا۔ پھر اس کے لئے حکم ہو گا۔ اسکو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق پہناؤ اور اسکو دہکتی آگ میں ڈالو۔ حضرت منہال بن عمرو رح فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے اس فرمان کو سنتے ہی کہ اسے پکڑو ستر ہزار فرشتے اسکی طرف لپکیں گے۔ جن میں سے اگر ایک فرشتے کو بھی اس طرح اللہ تعالیٰ حکم کرے تو ایک چھوڑ ستر ہزار لوگوں کو پکڑ کر جہنم میں پھینک دے۔ ابن ابی الدنیا میں ہے کہ چار لاکھ فرشتے اسکی طرف دوڑیں گے۔ اور کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ مگر اسے توڑ پھوڑ دیں گے۔ یہ کہے گا تمہیں مجھ سے کیا تعلق؟ فرشتے جواب دیں گے خداوند تبارک تعالیٰ تجھ پہ غضبناک ہے۔ اور اس وجہ سے ہر چیز تجھ پر غضبے میں ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض رضہ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے صادر ہوتے ہی ستر ہزار فرشتے اس کی طرف غضبے میں دوڑیں گے۔ یقیناً ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہے گا۔ کہ میں طوق پہناؤں، پھر اسے جہنم کی آگ میں غوطہ دینے کا حکم ہو گا۔ پھر ان زنجیروں میں جکڑا جائے گا۔ جن کا ایک ایک حلقہ بقول حضرت کعب احبار رضہ دنیا بھر کے لوہے کے برابر ہو گا حضرت ابن عباس رضہ اور ابن جریج رح فرماتے ہیں۔ کہ یہ ناپ فرشتوں کے ہاتھ کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضہ کا فرمان ہے کہ یہ زنجیریں اس کے جسم میں پرو دی جائیں گی۔ پاخانہ کے راستے میں ڈالی جائیں گی۔ اور منہ سے نکالی جائیں گی۔ اور اس طرح آگ میں بھونا جائے گا۔ جیسے سیخ میں کباب یا تیل میں ٹڈی، یہ بھی مروی ہے کہ پیچھے سے زنجیریں ڈالی جائیں گی۔ اور ناک کے دونوں نتھنوں سے نکالی جائیں گی۔ جس سے کہ وہ پیروں کے بل کھڑا ہی نہ ہو سکے گا۔ مسند احمد کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بڑا سا پتھر آسمان سے پھینکا جائے تو زمین پر وہ ایک رات میں آ جائے۔ لیکن اگر اسی کو جہنمیوں کے باندھنے کی زنجیر کے سرے پر سے چھوڑا جائے تو دوسرے سرے تک پہنچنے میں چالیس سال لگ جائیں گے۔

ان جہنمیوں کا اصلی جرم بیان فرماتا ہے کہ جس کے سبب وہ آج اس جرم میں گرفتار ہوئے۔ فقال انہ کان کہ مسلسل حوادث کا قائل تھا۔ اور اسباب کی زنجیروں میں بند تھا۔ ہر حادثہ کو اس کے سبب کی طرف منسوب کرتا تھا مسبب الاسباب تک نظر نہیں پہنچتی تھی۔ اس لئے لا یؤمن باللہ العظیم۔ وہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان نہیں لاتا تھا یہ اشارہ ہے اسکی قوت نظر کا جو باطل ہو چکی تھی۔ وہ احمق ان ملیولوں کو آپ سے حرکت کرنے والا سمجھتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ پس پردہ کوئی اور حرکت دے رہا ہے۔ ایک خدا بزرگ و برتر کو چھوڑ کر سینکڑوں اسباب کی طرف دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔ اور اپنی طمع اور خام خیالی سے بہت چیزوں کو قضا و قدر کا مالک و مختار جان کر ان کی طرف رجوع کرتا تھا۔ الغرض یہ کافر مشرک تھا۔ توحید و ایمان کی روشنی نصیب نہ تھی اس لئے سواقوت عاقلہ بھی باطل ہو گئی تھی ولا یحض علی طعام المسکین اس لئے کہ عملی کاموں میں عبادت کے بعد نفع خلائق اعلیٰ درجہ کی نیکو کاری ہے۔ پھر یہ بدبخت خدائے بزرگ و برتر پر تو ایمان ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ اس کا کھانا کھلانے کا بدلہ دنیا و آخرت میں خدا اسے پاک دے گا۔ اسکی رضا مندی ہمارے نئے کام آوے گی۔ پھر

آپ مسکین اور غریب کو روپیہ دینا، کپڑا پہنانا، راحت پہنچانا تو درکنار معمولی کھانا بھی نہیں دیتا تھا اور دینا بھی تو درکنار اوروں کو بھی اس طرف رغبت نہیں دلاتا تھا۔ بلکہ اس کام کو عبث اور فضول سمجھتا تھا۔ کبھی یہ حیلہ کرتا تھا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ کبھی یہ کہ ان کا ہمارے اوپر حق کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو دینا بے معنی بے غیرتی گداگری سکھانا ہے۔ یہ گفتگو ان پریشان اور درماندوں کے حق میں کہ جو دراصل قابل ترحم ہیں محض بخل اور اندرونی خباثت پر مبنی ہے۔

ایسی مصیبت و تنگی کے دفع یا کم کرنے کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تسلی دلاسا دینے والا اور چارہ گری کرنے والا ہو۔ دوم یہ کہ ایسی پریشانی اور درماندگی کے وقت کھانا کھلا دیا جائے اور اسی لئے اہل مصیبت کے ساتھ تعزیت میں یہ دونوں باتیں برتی جاتی ہیں۔ تسلی اور دلاسا بھی دلایا جاتا ہے۔ کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔ مواد اس کے لئے یہ دونوں بات نہ ہوگی۔ فلیس لہ الیوم ھھنا حمیم کہ آج اس کا یہاں کوئی دوست حمایتی نہ ہوگا جو اس کا دکھ بٹا دے گا۔ یہ اس لئے کہ یہ حمایت کرنے والا اللہ ہے۔ اور اس کی حمایت کا پرتو دوسرے حامیوں کے دلوں پر پڑتا ہے جو حمایت پر کمر باندھتے ہیں۔ سو اس اللہ پر تو اس کا ایمان ہی نہ تھا۔ اس سے بگاڑ ہی رکھی تھی۔

ولا طعام ۔ اور نہ اس کے لئے کوئی کھانا ہے کیونکہ یہ کسی کو نہ کھلاتا تھا۔ الا من غسلین۔ سوائے بدترین جیسی بیکار چیز کے جس کا نام غسلین ہے۔ یہ جہنم کا ایک درخت ہے۔ اور ممکن ہے کہ اسی کا نام دوسرا زقوم ہو۔ اور غسلین کے یہ معنی بھی لئے گئے ہیں۔ زخموں کا پانی جو جہنمیوں کے بدن سے نکلے گا۔ مراد پیپ وغیرہ اور یہ خطاکاروں کا کھانا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝

یعنی قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور اُن چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے — کہ یہ قرآن (اللہ کا)

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ

کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا (یعنی جس پر آیا وہ ضرور رسول ہے) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے (جیسا کہ کفار آپ

قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا

کو شاعر کہتے تھے) مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو — اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے (جیسا کفار آپ کو کہتے تھے) تم بہت کم سمجھتے ہو

تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ

رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا (کلام) ہے　　اور اگر یہ پیغمبر

تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝

ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے

تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ

پھر ہم ان کی رگِ دل کاٹ ڈالتے پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا

حٰجِزِيْنَ ○ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ

اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے۔ اور ہم کو معلوم ہے کہ

اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ○ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

تم میں بعضے تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے، اور (اس اعتبار سے) یہ قرآن کافروں کے حق میں موجب

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ○ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○

حسرت ہے۔ اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے۔ سو جسکا یہ کلام ہے، اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے۔

تفسیر یہاں تک امور حاقہ کا بیان ثمود کے ساتھ اور آخر حاقہ یعنی قیامت کا مفصل بیان کیا تھا کہ اس اس طرح سے ہوگی۔ اور اس کے بعد نیکوں کی یہ حالت، اور بدوں کی یہ صورت ہوگی۔ اس بیان میں دو مسئلے ثابت کئے گئے جو کہ اہم ترین ہیں۔

(۱) توحید باری تعالیٰ یعنی اللہ جل شانہٗ کی وحدانیت کہ اسکی نافرمانی کی سزا کوئی دوسرا کسی بھی طرح اور کسی حالت میں روک نہیں سکتا۔ مثالاً، عاد، ثمود اور نوح علیہ السلام کی قوم پر جو کچھ حوادث بصورت عذاب آئے اہل دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور سینہ بسینہ سن کر یاد رکھے۔ یہ اس ذات باری کی توحید کی پوری دلیل ہے اس لئے کہ اگر کوئی دوسرا بھی اس ذات باری تعالیٰ میں (نعوذ باللہ) شریک ہوتا جیسا کہ ان منکرین اور بدوں کا اعتقاد تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ منکرین اس کی پرستش کرتے تھے۔ تو ایسے اندوہناک اور دہشتناک مواقع میں ان کی مدد کرتا اور عذاب الٰہی کو ٹال دیتا اور اپنے پجاریوں کی جان و مال کو اس عذاب سے نجات دلاتا

(۲) معاد۔ قیامت برپا ہوگی۔ اور وہاں یہ ہوگا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے گا کوئی بات ڈھکی چھپی نہ رہے گی۔

اب یہاں تیسرا مسئلہ نبوت کو ثابت کرتا ہے۔ جس پر دونوں مسئلوں کا دارومدار ہے، بلکہ دونوں مسئلوں کی بنیاد ہے۔ اس لئے کہ پچھلے واقعات ان لوگوں کے ذہن نشین تھے۔ مگر بدبختی وہ جاہل ان واقعات کو اسباب پر مبنی کرتے تھے۔ اس کے بعد قیامت کا واقعہ ہے جو کہ کسی نے دیکھا نہیں۔ اب اس لئے اصل دارومدار نقل پر رہا ہے۔ اسی لئے نقل کا استحکام بہت ضروری ہوا۔ فقال فلا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون کہ میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے ہو۔ مفسرین نے اسباب میں بہت سے اقوال بیان فرمائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ بما تبصرون سے مراد آسمان و زمین وغیرہ اور وما لا تبصرون عالم غیب۔ جن و ملائک۔ اس لئے دونوں کو ملا کر سب چیزیں آگئیں۔ لیکن بعضے کہتے ہیں بما تبصرون سے

مراد ان واقعاتِ گذشتہ سے ہے۔ جن کے آثار اتنک عالم ظہور میں ہیں۔ اور وما لا تبصرون سے مراد دنیا کا قیامت کا واقعہ ہے۔ جو نظروں سے غائب اور اوجھل ہے۔ بعض کہتے ہیں بما تبصرون سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو کفار کے سامنے تھے اور وما لا تبصرون سے مراد جبریئل علیہ السلام ہے جو ان کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ غرضیکہ مختلف مفسرین نے اپنی بصیرت کے مطابق اظہار کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے لانے میں یہ ہی دو واسطے تھے۔ اس لئے ان کی قسم کھا کر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محترم تھے یہ فرمایا گیا ہے، انّہٗ لقول رسولٍ کریمٍ کا قول ہے۔ یہاں مراد رسول کریم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جن کو کافر شاعر و کاہن کہتے تھے نہ کہ جبریئل امین اس لئے کہ ان کی نسبت وہ یہ نہیں کہتے تھے اس جگہ بیان فرمایا ہے۔ وما ھو بقول شاعر کہ یہ شاعر کا کلام نہیں۔ جیسا کہ ابوجہل کہتا ہے۔ اس لئے کہ جو شاعر ہیں وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ شعراء کو وزن اور بحر لازم ہے۔ ورنہ شعر صحیح نہیں ہوتا۔ اور قرآن کریم میں یہ بات نہیں۔ دوسرے شعراء کے تخیلات کو بہت وسعت ہے اور مبالغہ سے بہت کام لیتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں یہ بھی بالکل نہیں ہے برخلاف قرآن کریم میں حقائق و معارف بدلائل ثابت کئے گئے ہیں۔ دونوں کلاموں میں یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں اور شعراء کلام میں بدیہی فرق ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے۔ قلیلاً ما تؤمنون تم بہت کم مانتے ہو محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور یہ ولا بقول کاھن کسی کاہن کا کلام نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اور ایسے کلام میں بہت بڑا فرق ہے۔ اوّل تو کاہن مکارم اخلاق واصلاح کی تعلیم کیا جاتیں اور نہ ہی ان کو عالم آخرت کے احوال کی خبر برخلاف اس کے قرآن کریم میں یہ سب باتیں موجود نہیں پھر فرمایا "قلیلاً ما تذکرون۔ تم کم غور کرتے ہو بہت کم سمجھتے ہو۔

قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کلام ہے۔ جیسا کہ آپ ہی فرماتا ہے۔ تنزیل من رب العالمین کہ یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ کلام اپنے متکلم کی شان خود بیان کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی شان و انداز بتا رہا ہے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں کو اس شانِ ربوبیت سے مامور کرتا ہے۔ ہر شخص کو مغفرت کا وعدہ اور سزا کی خبر دیتا ہے۔ پھر قرآن مجید در اصل کلام الٰہی ہے۔ مگر عالم ملکوت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک لانے میں جبریئل علیہ السلام واسطہ ہیں۔ اس لئے ان کا کلام کہہ دینا وہ ہی اپنی زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے امت کو سناتے ہیں اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہہ دینا بھی بیجا ہے۔

ان حالات میں ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے رسول اپنی طرف سے بھی کچھ اس کلام میں جو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوتا تھا ملا دیتے ہوں۔ اس کو دفع کرتا ہے۔ ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین الخ کہ اگر وہ یعنی رسول ہم پر اپنی طرف سے کوئی بات بھی بناتا تو ہم اسکا داہنا ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن مار دیتے۔ عرب میں دستور تھا کہ جب مجرم کو قتل کرتے تھے تو اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے تھے کہ کچھ نہ کر سکے پھر اس کی گردن مار دیتے تھے۔

ابن عباس رضی کہتے ہیں وتین دل کی رگ کو کہتے ہیں بعض کہتے ہیں شہ رگ مراد ہے۔ جو گردن میں نمایاں ہے حلقوم کے قریب اس کے کٹ جانے سے آدمی بچ نہیں سکتا۔ فما منکم من احد عنہ حاجزین پھر تم سے کوئی بھی اسکو بچا نہیں سکتا خلاصہ یہ کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ کہتے اور ہماری طرف منسوب کرتے جیسا کہ منکرین نبوت کا شبہ ہے۔ تو ہم اپنے قدیم قانون کے موافق جیسا کہ ہم نے توریت میں بھی ذکر کیا ہے

ضرور ہلاک کر دیتے۔ سر سبز نہ ہونے دیتے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اظہار نبوت کے بعد سر سبز ہوتے گئے روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ ان کے خلفاء کے عہد میں عرب کے ریگستان سے نکل کر مشرق و مغرب میں کس شان و شوکت اور آسمانی برکت کے ساتھ اسلام پھیلا اور جاہل اور وحشی قوموں پر ابر رحمت کی طرح سایہ فگن ہوا۔ ساتھ ہی جس نے اسکو نہیں مانا بہت جلد خوار و ذلیل یا دل میں پشیمان ہوا۔ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، وانّہٗ لتذکرة للمتقین کہ یہ قرآن پرہیزگاروں خدا ترس لوگوں کے لئے نصیحت و پند ہے۔ اسمیں کہانت اور شاعری اور شہوانی کونسی بات ہے۔

جو قومیں انتہائی بدمزاج، سخت، وحشی، اور درندہ صفت تھیں۔ پھر وہ اسقدر قلیل مدت میں کایا پلٹ ہو گئیں۔ یعنی مہذب، خدا پرست، راستباز، رحمدل، حقیقی بن گئیں، ان کے لئے اس پند نامہ (قرآن کریم) کے سوا اور کون سی کتاب تھی؟ جب کہ آپ قرآن کریم کو تذکرہ تسلیم کر لیں گے، وانّا لنعلم انّ منکم مکذبین اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اے کفار قریش تم میں سے جھٹلانے والے ہیں جو کبھی بھی اس پر ایمان نہ لا دیں گے۔ اور ان کا کفر ہی پر خاتمہ ہو گا۔ ان کو بیشک اس قرآن سے کچھ نفع نہیں۔ بلکہ وانّہٗ لحسرة علی الکافرین، بلکہ وہ ان کے لئے حسرت اور افسوس کا باعث ہے۔ دونوں حالتوں میں دنیا میں غلبہ و شوکت اسلام کے وقت آخرة میں عذاب کے وقت کہ ہائے ہم نے اسکو کیوں نہ مانا اور یہ شک و شبہ جو لوگ پیدا کرتے ہیں ان ہی کو رفہمی کا سبب ہے ورنہ قرآن تو لحق الیقین سراپا یقین کرنے کے قابل ہے۔ کوئی بات شبہ انکار کی نہیں۔

ان تینوں مباحث و خدشات پورا کر کے کلام کو اپنی تقدیس و تسبیح کرنے پر تمام کرتا ہے۔ فسبّح باسم ربّك العظیم پھر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ اپنے رب کی پاکی بیان کر جس نے قرآن اپنے بندوں کی بہتری کے لئے نازل کیا۔ اس آیت اور اس قسم کی دیگر آیات پر عمل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجود میں سبحان ربی العظیم، سبحان ربی الاعلیٰ فرماتے تھے، اور پھر ہر نماز میں یہی طریقہ مسنون ہو گیا، ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کریم کے فرمان کی تکمیل کی دوسری طرف اپنے اس عمل سے اپنے رب قدیر کو اپنا ثناء خواں بنا لیا۔

سورة المعارج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ○ لِّلْكٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ

ایک درخواست کرنے والا (براہ انکار) اس عذاب کی درخواست کرتا ہے جو کہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے۔ اور جسکا کوئی دفع کرنے والا نہیں

دَافِعٌ ۝ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ۝ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ

(اور) جو اللہ کی طرف سے واقع ہوگا۔ جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے (جن میں سیڑھیوں کے) فرشتے اور (اہل ایمان کی)

وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ

روحیں اسکے پاس چڑھکر جاتی ہیں اور وہ عذاب ایسے دن میں ہوگا۔ جسکی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال کی (برابر) ہے۔

سَنَةٍ ۝ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ

سو آپ (ان کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جسمیں شکایت کا نام نہو یہ لوگ اس دن کو (بوجہ اعتقاد نفی کے

بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝

وقوع سے بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم اسکو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں۔

قرطبی کہتے ہیں کہ یہ سورہ بھی بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی۔ ابن عباس رضہ و ابن زبیر رضہ کا بھی یہی قول ہے۔

شان نزول :- نسائی اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضہ سے نقل کیا ہے کہ یہ عذاب کا سوال کرنیوالا نضر بن حارث بن کلدہ کافر تھا۔ سورۃ الحاقہ سنکر اس سنگدل کافر نے تمسخر شروع کر دیا اور کہنے لگا۔ اگر یہ حق ہے تو ضرور ہم پر عذاب آوے اور اس طرح سے اس کے ہمخیال بد باطنی اور سیاہ قلب والے لوگ بھی تمسخر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ وہ عذاب کیوں نہیں آتا ؟

تفسیر ان کے خیال میں قیامت کا آنا ایک امر محال تھا اس لئے انکار کے طور سے سوال کرتے تھے۔ اس پر یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی جسمیں ان کی ہیئات وکیفیت اور اس عذاب کا آنا مذکور ہے جو کسی تدبیر سے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ مناسبت اس سورۃ کی سورہ الحاقہ سے ہے۔ اس لئے اس سورۃ میں اسی حاقہ یعنی قیامت کی تفصیل و تاکید ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جس دن حاقہ ظہور ہوگی۔ اس دن کی درازی پچاس ہزار برس کی ہوگی۔ اور قیامت کا اصل مقصد بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ دراصل وہ دن ملائکہ اور ارواح کے عالم اجسام سے فراغت پاکر اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے کا دن ہے۔ وہ اس دن کی طرف چڑھیں گے۔ تعرج الملٰئکۃ الخ گویا اس عالم کی تعمیر و بقا کی تدابیر ہیں جو مصروف تھے انہیں سے (کوئی فرشتہ ابر سے متعلق تو کوئی پانی سے متعلق تھا) پھر جمادات نباتات وحیوانات پر باری تعالیٰ نے متعین فرمایا تھا۔ اس تعیین سے ان کی تولید و غذا کا بندوبست ہوتا ہے کرات افلاک و سیارات کو حرکت دے رہے تھے، اس دن یہ عالم خراب ہوجائے گا۔ وہ فرشتے فارغ ہوجائیں گے۔ اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کی طرف عروج کر جائیں گے۔

فقال سائل سائل بعذاب واقع، سائل نضر بن حارث نے عذاب کی درخواست کی جو کہ آنے والا تھا حالانکہ اس دلیل کا قرآن مجید میں نام نہیں لیا گیا مگر مفسرین حضرات نے اس کا نام تعین کیا ہے۔ قرآن کریم کی یہ عادت نہیں کہ عیبوں میں کسی کا نام لیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر نام لے لیا جائے تو ایک ہی کی ذات

تک محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت بہت سے مفسد کافر تھے۔ جو کہ نضر بن حارث کے ہم خیال تھے۔ ان لوگوں کی رعونت ...... اور سرکشی کی حد کا علم اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مانگا بھی تو وہ عذاب جو کہ قطعاً آنے والا تھا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سوال کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ آپ کو جب کفار کی تکذیب و تمسخر سے رنج ہوا تو بارگاہ قدس میں سوال کیا الٰہی ان پر عذاب کا تازیانہ نازل کر تا کہ ان سرکشوں اور مفسدوں کی سرکشی ٹوٹے اور غرور ختم ہو جائے۔ آپ کی دُعا قبول ہوئی اور قریش پر سات برس کا وہ اندوہناک اور روح رسا قحط پڑا کہ مردار اور ہڈیوں تک کے کھانے کی نوبت آئی جس پر وہ چلا اٹھے، اس لئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی گئی۔ فاصبر صبراً جمیلاً۔ (اے نبی) دعا کے اثر ظاہر ہونے میں جلدی نہ کرو، بلکہ صبر کرو اور اسمیں قدرے تنبیہ بھی ہے کہ ایذا کی برداشت کرو بددُعا نہ کرو۔ مگر یہاں یہ بھی بات غور طلب ہے جب کہ مشفق ناصح نا امید ہو جاتا ہے۔ اور اسکو لگاتار حد درجہ ایذائیں پہنچتی رہیں تو وہ بد دعا بھی کر دیا کرتا ہے۔ یہ بھی ایک انسانی خاصیت ہے۔ اور اسمیں ایک مصلحت بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر جو درخت پھلدار نہیں ہوتے سوکھ جاتے ہیں۔ تو ان کو کٹوا دیا جاتا ہے۔ اور اسکی جگہ اچھے درختوں کے قلم لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو جانور دودھ سے بھاگ جاتے ہیں تو ان کو فروخت کر ڈالا جاتا ہے۔ اور اسکی جگہ اچھا اور دودھ والا جانور خریدا جاتا ہے۔ اس لئے حضرت نوح علیہ السلام نے بھی عذاب کی درخواست کی تھی، جس پر طوفان آیا اور دنیا غرق آب ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا کی تھی۔ پھر فرمایا ہے للکافرین اور لیس لہٗ دافع کہ اس (عذاب) کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور من اللہ ذی المعارج کہ وہ عذاب اللہ کی طرف سے ہوگا۔ جو بڑا بلند مرتبہ ہے اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجابت کی تسلی بھی ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہیگا جسمیں عذاب دنیا کی طرف اور عذاب آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً دنیا میں قحط آیا اور مسلمانوں کے ہاتھ میں مسخر ہوئے۔ اور آخرت کا عذاب،

اس کے بعد فرماتا ہے تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ کہ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھیں گے۔ اس دن جسکی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے۔ روح سے مراد بعض مفسرین نے فرمایا حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ ان کی عظمت کے لئے ان کو ملائکہ سے جداگانہ روح کے الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے۔ تنزل الملائکۃ والروح وقولہ تعالٰی یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا۔ اور ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روح درجہ نزول میں اوّل اور صعود میں آخر ہے۔ اور بعض اہل کشف نے کہا ہے کہ روح نور عظیم ہے۔ اور وہ جمیع انوار سے جلال الٰہی کے قریب تر ہے۔ اور اسی سے تمام ارواح ملائکہ اور ارواح بشریہ جو تمام ارواح سے آخر درجہ میں ہیں پھیلتی ہیں۔ اور دونوں طرفوں کے درمیان معارج، مراتب ارواح ملکیہ و مدارج منازل انوار قدسیہ کے ہیں اور ان کی مقدار حق سبحانہٗ تعالٰی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ ارواح بشریہ مراد ہیں۔ تعرج سے مراد اوپر چڑھنا لیکن بعض کہتے ہیں یا عروج رتبۃً یعنی اسرار ملائکہ اور ارواح کو خداوند کے نزدیک عروج یعنی بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔ فی یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ بعض کہتے ہیں دنیا کا دن ہے۔

(مقدارہ خمسین الف سنۃ) پچاس ہزار کی درازی جمہور کے نزدیک دراصل ہوگی۔ لیکن ایا اندازہ کے

حق میں نہ ہوگی۔ دلیل اس پر آیت اصحاب الجنۃ یومئذٍ خیر مستقراً و احسن مقیلا ہے اور یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ جو ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا حضرت پچاس ہزار برس کی درازی اس دن کی بڑی درازی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ مومن پر بہت کم ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ دن نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہوگا۔ اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ اس دن کی درازی مومن پر اسقدر ہوگی کہ جس قدر عصر اور ظہر کا وقت ہے۔ اس لئے کہ اس درازی کو کبھی ہزار برس سے کبھی زیادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا سے لے کر اول آسمان تک کی مسافت ہزار برس ہے اور اسفل عالم سے لیکر انتہاء عرش تک پچاس ہزار۔ بعض علماء کہتے ہیں کثرت اندوہ و رنج مراد ہے کیونکہ رنج و اندوہ کے دن کی درازی محاورہ میں بہت بڑی بیان کی جاتی ہے۔

یَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ

وہ عذاب اس دن واقع ہوگا جس دن کہ آسمان رنگ میں، تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا اور (اس روز) پہاڑ رنگین اون کی طرح (جو کہ دھنی ہوئی ہو)

كَالْعِهْنِ ۝ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝ يُبَصَّرُونَهُمْ

ہو جائیں گے (یعنی اڑتے پھریں گے)۔ اور (اس روز) کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ باوجودیکہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیے جاویں گے

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيهِ

(اور اس روز) مجرم (یعنی کافر) اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں کو اور

وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُـْٔوِيهِ ۝ وَمَنْ

بیوی کو اور بھائی کو اور کنبہ کو جنمیں وہ رہتا تھا اور تمام اہل زمین

فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ۝ كَلَّآ ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً

کو اپنے فدیہ میں دیدے پھر یہ (فدیہ میں دیدینا) اسکو (عذاب سے) بچالے یہ ہرگز نہ ہوگا (بلکہ) وہ آگ ایسی شعلہ زن ہے جو کھال

لِّلشَّوَىٰ ۝ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝ وَجَمَعَ

تک اتار دے گی (اور) وہ اس شخص کو (خود) بلا دے گی جس نے دنیا میں حق سے پیٹھ پھیری ہوگی اور (طاعت سے) بے رخی کی ہوگی اور جمع

فَأَوْعَىٰ ۝

کیا ہوگا پھر اسکو اٹھا اٹھا رکھا ہوگا۔

تفسیر اس سے پہلے قیامت کے دن کی درازی کے بارے میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اب مزید اسکی تشریح ہولناک حالات سے بیان فرماتا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آج جو (منکر ہیں) اس دن (یعنی قیامت کے دن کے) منکر ہیں، دنیا ہی کو اور اس کے اسباب کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور دنیاوی لوازمات پر فریفتہ اور اس کے دلدادہ ہیں۔ اس روز ان کی حالت بیحد خراب و خستہ ہوگی۔

بیان فرمایا گیا ہے یوم تکون السماء کالمھل کہ جس دن آسمان پگھلے تانبے۔ جیسے ہو جائیں گے۔ جیسے تانبہ پگھل کر رقیق ہو جاتا ہے۔ اور اسکا حجم ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مہل تیل کی تلچھٹ کو کہتے ہیں۔ جیسے تیل جلنے کے بعد کچھ گاڑھا اور بدرنگ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آسمان بے رنگ ہو جائیگا اس کے بارے میں ابن عباس رض کا قول ہے۔ سماوات پر جب اللہ کریم کا جلال طاری ہوگا۔ تو ان کا مادہ ایسی رنگتوں میں آجائے گا جیسے کسی مکان کو اگر مسمار کیا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کی چھت گرد کی جاتی ہے اس کے بعد اس کی دیواریں توڑی جاتی ہیں اس طرح پہلے آسمان لڑٹ جائیں گے۔ پھر فرمایا ہے۔ وتکون الجبال کالعھن، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنی ہوئی روئی یعنی جو پہاڑ دنیا میں ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی یہ حالت ہو جائے گی کہ جیسے روئی دھنی ہوئی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اتنی باریک ہو جاتی ہے کہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں مختلف پہاڑ مختلف رنگوں کے ہیں۔ کوئی لال، کوئی سیاہ، کوئی سفید۔ کوئی زرد جب ان جملہ پہاڑوں کے ریزے ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ تو باہم ملکر رنگین نظر آئیں گے۔ یہ حالات پہلے صور پھونکنے پر ہوں گے۔ دوسری مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا۔ تو ہر چیز دوسری مرتبہ پیدا ہوگی۔ اس وقت کے بارے میں فرمایا گیا

ولا یسئل حمیم حمیما، اس وقت ایسی افراتفری پڑی ہوگی کہ کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ یہاں دنیا اور عقبیٰ کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اکثر ایسا سننے میں آیا ہے کہ دو دوستوں میں ایک امیر و کبیر و با اثر ہے۔ اور دوسرا اسکے مقابلہ میں کم اثر ہے۔ تو ایک دوسرے معاملات میں کچھ مدد کر سکتا ہے۔ مگر عقبیٰ میں نہ کسی کا اثر کام آئے گا اور نہ سفارش سنی جائے گی۔ اور یہ ہی نہیں اسکے بعد فرمایا گیا ہے یبصرونھم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن کوئی التفات نہ کرے گا۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں ایسا غلطاں و پریشان ہوگا کہ دوسرے کا حال پوچھنے کا بھی ہوش نہ ہوگا۔ سب کو صرف اپنی ہی فکر ہوگی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن ایک دوسرے کو دیکھے گا۔ لیکن پھر بھاگ کھڑا ہوگا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ ملائکہ کیطرف سے کہ [illegible] دیکھیں گے۔ کوئی چھپ نہ سکے گا۔ دوست کا دوست کو پوچھنا درکنار بلکہ یود المجرم الخ گنہگار اس وقت آرزو کرے گا کہ کاش مجھکو چھوڑ دیا جائے اور میرے بدلے میں میری اولاد بیوی اور بھائیوں کو لے لیا جائے لیکن اسکو آزاد کر دیا جائے۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ اور اس دن کا خوف کرو جس دن باپ اپنی اولاد کو اور اولاد اپنے ماں باپ کے کچھ کام نہ آئے گی۔ گو قرابت دار ہوں گے۔ لیکن کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائیگا اور جگہ فرمایا ہے کہ صور پھونکتے ہی سب آپس کے رشتے ناتے اور ایک دوسرے کی غمخواری ختم ہو جائے گی۔ کس قدر عبرتناک مقام ہوگا کہ اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں تک کو قربان کرنے کیلئے تیار ہے تاکہ خود بچ جائے۔

غرضیکہ تمام چیزوں کو فدیہ کے طور پر دینے کو تیار ہوگا۔ لیکن کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ کوئی بدلہ، کوئی فدیہ، کوئی عیوض کوئی معاوضہ قبول نہ کیا جائے گا۔

فصیلہ کے ایک معنی امان کے بھی لئے گئے ہیں۔ غرض کہ تمام تر محبوب ہستیوں کو اپنی طرف سے فدیہ کے طور پر دینے میں رضامند ہوگا۔ لیکن کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ کوئی بدلہ اور فدیہ نہ قبول ہوگا۔ اور نہ ہی کوئی عیوض اور معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ بلکہ اس عذاب میں جو کہ دہکتی ہوئی آگ کا ہوگا۔ ڈال دیا جائے گا جو اونچے اونچے اور تیز تیز شعلے پھینکنے والی اور سخت بھڑکنے والی ہے۔ جو اندر کی کھال تک جھلسا کر کھینچ لاتی ہے بدن کی کھال وار کر دیتی ہے۔ اور کھوپڑی پلپلی کر دیتی ہے۔ ہڈیوں کو گوشت سے الگ کر دیتی ہے۔ رگ، پٹھے کھنچنے لگتے ہیں۔ ہاتھ، پاؤں، اینٹھنے لگتے ہیں پنڈلیاں لٹی جاتی ہیں۔ چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ ہی نہیں ہر ہر عضو بگڑ جاتا ہے۔ چیخ پکار کرتا رہتا ہے۔ ہڈیوں کا چورا کرتے ہوئے کھالیں جلائی جاتی ہیں۔ یہ آگ اپنی فصیح زبان اور اونچی آواز سے اپنوں کو جنہوں نے دنیا میں بدکاریاں اور خدا کی نافرمانیاں کی تھیں پکارتی ہے۔ پھر جس طرح پرندہ دانہ چگتا ہے۔ اسی طرح میدان محشر میں سے ایسے بدکردار لوگوں کو ایک ایک کر کے دیکھ بھال کر چن لیتی ہے۔ اب ان کی بداعمالیاں بیان ہو رہی ہیں کہ یہ دل سے جھٹلانے والے اور عمل چھوڑ دینے والے تھے۔ یہ مال جمع کرنے والے اور سر بند کر کے رکھ چھوڑنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام میں بھی مال خرچ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بلکہ زکوٰۃ تک ادا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ مال کو سمیٹ سمیٹ کر اور سینت سینت کر نہ رکھو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے روک دے گا۔ یعنی مراد اسکی یہ ہے کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات اور ضرور تمندوں کو اپنے مولیٰ کے نام پر دیتے رہو۔ نیک کاموں میں مال خرچ کرنے سے کمی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ تبارک تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن حکم رضہ تو اس آیت پر عمل کرتے ہوئے کبھی تھیلی کا منہ ہی نہ باندھتے تھے۔ امام حسن بصری رح فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم اللہ تعالیٰ کی وعید سن رہا ہے۔ پھر بھی مال سمیٹتا جا رہا ہے۔ حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں کہ مال کو جمع کرنے میں حلال و حرام کا پاس نہ رکھتا تھا۔ اور فرمان خدا ہوتے ہوئے خرچ کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ایک تو اپنے مولیٰ کریم سے روگردانی اس پر یہ بخل و حرص و مردم آزاری۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا

انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔ یعنی جب اس کو تکلیف پہونچتی ہے تو (تو حد اباعث سے زیادہ) جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ

اور جب اسکو فارغ البالی ہوتی ہے تو (حقوق اللہ ادا کرنے سے) بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ نمازی (یعنی مومن) جو اپنی نماز پر

هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ

برابر توجہ رکھتے ہیں اور جن کے مالوں میں ۔۔۔ والی اور

حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ

بے سوالی سب کا حق ہے۔ اور جو قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتے

بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ

ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔

مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ○

(اور) واقعی ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں۔ (یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے)

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ

اور جو اپنی شرمگاہوں کو حرام سے محفوظ رکھنے والے ہیں، لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ

سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ (اور جگہ شہوت

ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ

رانی کا) طلبگار ہو۔ ایسے ہی لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں۔ اور جو اپنی (سپردگی میں

هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ

لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں کو

بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ

ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

يُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ○

بس ایسے لوگ بہشتوں میں عزت سے داخل ہوں گے۔

تفسیر یہاں انسانی جبلّت اور اسکی کمزوری بیان ہو رہی ہے کہ انسان بڑا ہی بے صبرا ہے۔ مصیبت کے وقت تو گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ مال جمع کرنا اور کنجوسی کرنا اس لئے ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ

خُلِقَ هَلُوعًا۔ انسان (بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کفار ہے) فطری طور پر لالچی اور بے صبرا پیدا ہوا ہے اس کمبخت کی دور اندیشی اور زیرکی (جو خداوند قدوس کیطرف سے بہ نسبت اور حیوانات کے زیادہ ملی تھی) اس کو بخل اور لالچ پر آمادہ کرتی ہے۔ اور بڑے بڑے خیالات اور امیدیں بندھاتی ہے کہ سینکڑوں برسوں کا انتظام کر جائے اور اپنی عمر رواں کی بے ثباتی سے بے خبر ہو کر دنیا ہی میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ سب حالتیں آخرت اور حق سبحانہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہیں۔

ابن عباس رضؓ سے کسی نے ھلوعا کے معنٰی دریافت کئے فرمایا آپ ہی حق سبحانہ تعالیٰ اس کی تفسیر کرتا ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا الخ۔ جب اسکو برائی پہنچتی ہے۔ بیماری۔ تنگدستی، زن و فرزند اقارب کی موت یا کسی مقصد میں ناکامی، مال وجاہ کا زوال وغیرہ کوئی بات پیش آجاتی ہے تو فریاد کرنے لگتا ہے۔ صبر و شکیبائی کو کھو بیٹھتا ہے۔ کفر کے کلمات اور خدا کا گلہ شکوہ کرنے لگتا ہے۔ غرضیکہ اپنے رب سے امید کی رسی کو کاٹ ڈالتا ہے یہ ضعف ایمان اور خدائے برتر و توانا پر توکل نہ کرنے کی دلیل ہے۔

وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا۔ اور جب خیر بھلائی۔ تندرستی، اولاد و مال اور دیگر مقاصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ تو ہاتھ روک لیتا ہے کہ بس اب تو یہ نعمتیں چل ہی گئی ہیں۔ اور روز روز کہاں یہ نعمتیں ملتی ہیں اسکو روکے رکھو حتی کہ حقداروں کا حق بھی ادا نہ کرو اس سے صاف یہ مراد ہے کہ اس نعمت کو خدائے پاک کا عطیہ نہیں سمجھتا ہے۔ بلکہ اپنی محنت کوشش اور اپنے نصیب اور اتفاقی وقت کی یاوری خیال کرتا ہے۔ یہ بھی ضعف ایمانی ہے جسکو ایمان کی روشنی سے کچھ بھی واسطہ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بدترین چیز انسان میں بخل ہے (ابوداؤد) میں آیا ہے اس مذموم خصلت سے وہ لوگ دور ہیں۔ جن پر خاص فضل الٰہی ہے۔ اور جنھیں توفیق خیر ازل سے مل چکی ہے۔ جن کی صفتیں یہ ہیں کہ وہ پورے نمازی ہیں یہ نہیں کہ اِلَّا الْمُصَلِّينَ ایک بار یا دو بار نماز پڑھنا کافی نہیں بلکہ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ وہ اپنی نمازیں ہمیشہ ادا کئے چلے جاتے ہیں۔ کبھی ترک نہیں کرتے۔ یہ فرقہ سب فرقوں سے اوّل الذکر ہوا اور یہ ہے بھی اوّل اور یہ اس لئے مستحق ہے کہ نماز بندے اور خدا تعالیٰ میں ایک ارفع اور اعلیٰ رابطہ ہے جو اس کو ہمیشہ اس کی بارگاہ تک باریابی کا موقع دیتی ہے۔ بھلا جو پانچ وقت دن رات میں حضور قلب اور نیازمندی سے اس کے سامنے جائے گا۔ پھر اسکی روح پر اس کے انوار کا پرتو کیونکر نہ پڑے گا۔ اور اسکی یہ ظلمت کیونکر دور نہ ہوگی۔ اور اس کا سختی و نرمی میں اپنے قادر مطلق پر کیونکر توکل نہ ہوگا۔ اور جو ہمیشہ اس کے دربار میں حاضر ہو کر اس کے آگے سر نیاز خم کرتا ہے تو اس پر اسکی کیونکر رحمت نہ ہوگی۔ وہ ضرور آخرت کی بلاؤں سے نجات پائے گا۔

سب سوال طلب یہ ہے کہ نماز کسطرح ادا کی جائے کہ وہ بارگاہ خداوند قدوس مقبول ہو۔ جو شخص اپنے رکوع و سجدے پوری طرح ٹھہر کر باطمینان ادا نہیں کرتا تو اپنی نماز پر دائم نہیں کیونکہ نہ وہ سکون کرتا ہے۔ نہ اطمینان ایسی نماز اسے نجات نہیں دلوائیگی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر نیک عمل پر صحیح طور سے مداومت کیجائے گو کم ہو۔ حضور علیہ السلام کی عادت مبارک بھی یہی تھی کہ جس کام کو کرتے اس پر مداومت فرماتے حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ حضرت پیغمبر ہو نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایسی نماز پڑھیگی کہ اگر قوم نوح ؑ ایسی نماز پڑھتی تو ڈوبتی نہیں۔ اور قوم عاد کی اگر ایسی نماز

ہوتی تو ان پر بے برکتی کی ہوائیں نہ بھیجی جاتیں۔ اور اگر قوم ثمود کی نماز ایسی ہوتی تو انہیں چیخ سے ہلاک نہ کیا جاتا پس آپ لوگو نماز کو اچھی طرح پابندی سے پڑھا کرو۔ مومن کا یہ زیور اور اس کا بہترین خلق ہے۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم کہ جن کے مال میں سائل اور محروم یعنی سوال کرنیوالا نہ مانگنے کی وجہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ حق ہے اور حق بھی کیسا معلوم کہ اس نے کھول دیا ہے کہ اس قدر دیا کرو گا یہ نہیں کہ کبھی دیا اور کبھی نہیں دیا۔ بلکہ ایک معین کر دیا۔ قتادہ ومحمد بن سیرین وغیرہ علماء فرماتے ہیں کہ حق معلوم سے مراد زکوٰۃ ہے۔ جو خدا تعالیٰ کیطرف سے معلوم اور معین کیا گیا ہے۔ ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کے بعد اگر اور نہ دے تو اس پر کچھ الزام نہیں۔

فی اموالھم۔ جمع کا صیغہ بتا رہا ہے کہ سب مالوں میں خیرات جاری رہے۔ مثلاً زراعت میں سے مویشیوں میں سے، تجارت میں سے۔ اور نقدی میں سے بشکل روپیہ، جسطرح ممکن ہو نفع پہنچاتے ہیں۔ مثلاً اگر مکان متعدد ہیں تو مفت ان میں سے مساکین وغرباء کو دیدیتے ہیں یہ کریم النفس دریغ نہیں کرتے، حق کا لفظ کہہ رہا ہے کہ ان درماندوں کا ان کے مال میں حق ہوا کرتا ہے اور حصہ متعین ہے۔ جیسا کہ شریکوں کا ہوتا ہے۔ ان کے دامن ہمیشہ مسکینوں کے ہاتھ میں رہا کرتے ہیں۔

سائل تو معلوم ہوتا ہے مگر محروم کے معنی میں علماء کے متعدد قول ہیں۔ مثلاً بے زبان منہ بند، بعض کہتے ہیں کہ محروم بے زبان جانور ہیں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے لہذا محروم رہ جاتے ہیں ان پر رحم کرنا اور نفع پہنچانا چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں۔ محروم وہ مصیبت زدہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں، حالانکہ ان کو دینا زیادہ ثواب ہے۔ اس لیئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسکین وہ نہیں کہ جو لقمہ یا دو لقمہ مانگ کر لیجائے۔ بلکہ وہ جو حاجتمند ہے اور کسی سے سوال نہیں کرتا۔

والذین یصدقون بیوم الدین وہ جو جزاء کے دن کو سچا جانتے ہیں یعنی حساب اور جزاء کے دن پر بھی یقین کامل اور پورا پورا ایمان رکھتے ہیں۔ اسمیں سب نیکیوں کیطرف اشارہ ہے۔ اور ہر قسم کی بدی سے بچنے کیطرف ایماء ہے اس لیئے کہ جو شخص جزاء کے دن کا معتقد ہوگا وہ جو نیکی کرے گا دل کھول کر نیکی کرے گا غرباء و اقارب، اور ضرورتمندوں کو دینا اور ان پر رحم کرنا مرنے کے بدلے کی یقینی امید ضرور تحریک کرتی ہے، اس طرح ہر قسم کے ظلم اور ناحق شناسی سے روکنے کو بھی یہ یقین سند قوی ہے۔

والذین ھم من عذاب ربھم مشفقون، یہ ان کی صفت بیان کیجاتی ہے کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں اس لیئے کہ ان عذاب ربھم غیر مامون ان کے رب کے عذاب کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب اور کس وقت نازل ہوجائے۔ اس سے نڈر رہنا نہ چاہیئے۔ مگر انسانی حرص طمع وشہوت کبھی اسی قدر دور دراز کی سزا یا جزاء سے غافل کر کے بدی میں ڈالدیتے ہیں۔ مگر جب اسکو برے کام پر دنیا ہی میں تازیانے پڑنے کا خوف دلایا جاتا ہے۔ کیونکہ آخرت تو آخرت ہے۔ دنیا ہی میں اسے بد کاموں کی سزا مل جاتی ہے۔ مثلاً تنگدستی، بیماری، کوئی ناگہانی مصیبت ارض وسماوی وغیرہ تو بہت جلد متنبہ ہوجاتا ہے۔ اس لیئے اس کے بعد ان عذاب ربھم غیر مامون بھی سنا دیا اور دنیا میں اعمال بد پر سزا ملنا یقینی بات ہے۔ وقت کا تعین تو نہیں مگر ملتی ضرور ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی کور باطن اس سزا من اللہ کو نہ سمجھے اور اسباب کیطرف منسوب کرے۔ مگر عاقل جب غور کر کے دیکھے گا۔ تو اسباب کا سلسلہ بھی اسی مسبب الاسباب کے ہاتھ میں دیکھے گا۔

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین - کہ وہ اپنے
ستر کو یعنی شرمگاہوں کو کسی پر نہیں کھولتے ہیں - یعنی حرام کاری سے روکتے ہیں - مگر اپنی بیوی - بس کرنا انسان کی
طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالنا ہوتا کیوں؟ یہ اس لیے کہ انسان میں ایک ایسی قوت رکھی گئی ہے کہ وہ انسان
کو بعض حالات میں مجبور و مقہور کر دیتی ہے - اور اس کے عقل و حواس میں فتور ڈال دیتی ہے - اور انسان مجبوراً بہک جاتا
ہے - اس لئے اسلام میں تجرد عمدہ بات نہیں ہے - خداوند قدوس نے جو کہ حکیم مطلق ہے وہ اس قوت کو جو انسان میں
پیدا کی گئی ہے - بخوبی جانتا ہے - اسی لئے اس حکیم مطلق نے دو جگہ کے لئے اجازت دیدی - الا علی ازواجھم اور
بیوی کے لیے - مرد کو اپنی بیوی سے جماع درست ہے - بیوی کون ہے - اور کیا شرطیں ہیں اسکو عرف پر چھوڑ دیا - اور ا
قرآن کریم میں متعدد جگہ بتلایا گیا ہے - نیز نسل انسانی کا انعقاد منشاء خداوندی ہے - اور وہ بجز اس کے عادتاً
ہو نہیں سکتا -

او ماملکت ایمانھم - لونڈی ہو - جو مردوں کے ہاتھ کا مال ہیں - یہاں بھی جماع کرنا ممنوع نہیں اسی لئے
اس پر کوئی ملامت اور اعتراض نہیں ہے تو شہوت انسانی کی خاطر قدرت نے جائز طریقے بیان فرمادئے - اب دوسری
آیت کریمہ میں تبلایا ہے -

فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ھم العادون - جو ان دونوں طریقوں کے سوا قضاء شہوت کے لئے
اور کوئی طریقہ عمل میں لادے وہ حد سے تجاوز کرنے والا سرکش اور خدا کا باغی ہے - یہاں ایک اشکال اور پیدا
ہوتا ہے متعہ کی بابت - لیکن آیت کریمہ کے مفہوم سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ متعہ کی ہوئی عورت بھی حرام ثابت
ہوتی ہے - کیونکہ وہ بیوی کے درجہ میں نہیں آتی کیونکہ اس پر حق زوجیت کا اطلاق نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ لونڈی
کے درجہ میں آتی ہے - کیونکہ لونڈی کی جو شرائط ہیں وہ اس سے بالکل الگ ہے -

اسی طرح وطی فی الدبر بھی ممنوع ہے خواہ لڑکے سے ہو، یا غیر عورت سے یا بیوی یا لونڈی سے ہو یعنی جماع
کو شرعاً علاوہ بیوی یا لونڈی کے حرام فرمایا گیا ہے - مگر وطی الدبر کا اطلاق بیوی لونڈی پر بھی وہی درجہ رکھتی
ہے جو کہ لڑکے کے لئے ہے -

اور حلق لگانا اور عورت کو عورت سے مساحقت کرنا یا عورت کو اس کام کے لئے رکھنا یا مخفی آشنائی کرنا یا اجرت
دے کر یہ فعل کرنا سب ممنوع ہیں - اور شرع میں ان سب باتوں کی حد مقرر ہے -

والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون - وہ جو اپنی امانتوں اور عہدوں کو وعدوں اور قرار
اقرار کو مانتے ہیں اور پورا کرتے ہیں - اور اسمیں رعایت رکھتے ہیں - اب یہاں امانت کی کئی قسمیں ہیں یعنی امانت
کئی طرح کی ہوتی ہے - اول وہ قوی و احوال جو کہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے ودیعت کیے گئے ہیں - دوم بات کی امانت
سوم آقا اور میاں کے مال کی امانت چہارم علم کی امانت جن کے علماء امین ہوتے ہیں -

اسی طرح عہد کی بھی کئی قسمیں ہیں - اول خدا کا عہد کہ اسکی عبادت کریں گے - دوم باہمی بندوں کے جائز
عہد، سوم خاوند و بیوی کے عہد جو لفظ نکاح سے قائم ہوتے ہیں - سب کی رعایت لازم ہے -

والذین ھم بشھاداتھم قائمون - وہ جو اپنی گواہی پر قائم ہیں یعنی گواہی ادا کرنے میں کسی کی رعایت نہیں
کرتے اور نہ ہی کسی سے ڈرتے ہیں - اس سے انتظام عالم کا قیام اور حقوق العباد کا تحفظ تام ہے - لہٰذا قائم م
یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ نہ تو گواہی کو چھپایا جائے یعنی جانتے ہوئے یہ کہدے کہ میں نہیں جانتا اور نہ ہی

نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ○ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ

(مارے شرمندگی کے) نیچے کو جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی

ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ○

(بس) یہ ہے ان کا وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (جو کہ اب واقع ہوا)

تفسیر

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین مکہ اہل جنت کا اعزاز و اکرام کی بابت سنکر جمع ہو کر آتے اور چاروں طرف بیٹھ کر تمسخرانہ انداز میں کہتے تھے کہ اگر جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ حق ہے کہ آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں گی مشرکین مکہ غرور گھمنڈ کی وجہ سے یہ کہتے تھے کہ ان ذلیل و خوار لوگوں سے جو آپ کے تابع ہو گئے ہیں۔ ہم اشراف ان نعمتوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ مثال آدی کہ دنیا میں بھی ان سے ہم زیادہ عزت و شوکت و حشمت والے ہیں۔ پھر وہاں ان کو تو ہم دھکے دے دے کر نکال باہر کر دیں گے۔ اور آپ اسی جگہ جا بیٹھیں گے اس آیۃ کریمہ میں ان مشرکین کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ عز و جل ان کافروں پر انکار کر رہا ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں تھے جو وہ آپ کو دیکھ رہے تھے۔ اور آپ جو ہدایت لے کر آئے تھے وہ ان کے سامنے تھی اور یہ آپ ؐ کے کھلے معجزے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ ان منکروں کو کیا ہوا جو تیرے پاس پاس پرا باندھے دوڑتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا ان میں سے ہر ایک کو یہ طمع ہے کہ وہ جنت النعیم میں داخل کیا جائے گا۔ پھر فرماتا ہے ہرگز ایسا نہ ہوگا۔

ابن کثیر اپنی تفسیر میں ان آیات کے اس طور سے معنی بیان کرتے ہیں کہ ان کفار کو کیا ہو گیا جو باوجودیکہ معجزات دیکھتے ہیں۔ اور پھر جماعتیں کی جماعتیں تیرے پاس سے بھاگ جاتے ہیں۔ ذرا نہیں ٹھہرتے اور دھیان سے نہیں سنتے۔ حسن بصری رحہ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہر شخص ہے انسان گندہ جب تک ایمان اور عمل صالح سے پاکیزگی حاصل نہ کرے۔ محض اس دنیاوی مال و حشمت و شوکت کی وجہ سے اس عالم قدس تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ پاک مطہر جگہ ہے۔ جو کہ ناپاکوں کے ہرگز قابل نہیں، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت فمال الذین الخ مما یعلمون۔ تک پڑھی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم کیا تو مجھے عاجز کر دے گا۔ حالانکہ میں نے تجھے ایسی چیز سے پیدا کیا یہاں تک کہ تیرے ہاتھ پاؤں بنائے تو کپڑے پہن کر پھرنے لگا۔ زمین کا تجھے پیوند ہوتا ہے۔ جمع کر کر رکھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گلے میں دم آ گیا۔ تو کہنے لگا کہ مجھے صدقہ دینے کی مہلت دی جائے۔ انسان نسب و حسب و دنیاوی دولت پر جو کہ محض عارضی شے ہے کیا فخر کرتا ہے۔ سب کی ایک ماں اور ایک باپ ہے۔ ایک ہی نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سب ایک راہ آئے ہیں۔ سب خاک ہو جائیں گے۔ اسمیں شاہ گدا سب برابر ہیں۔

کفار مکہ حشر کے منکر تھے اور سخت سرکشی کیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کو سنایا جاتا ہے۔ فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقدرون مجھے قسم ہے اسکی جس نے زمین و آسمان پیدا کیا اور مشرق

مغرب متعین کیں اور ستاروں کے چھپنے اور ظاہر ہونے جگہیں مقرر کردیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! جیسا تمہارا گمان ہے۔ ویسا معاملہ نہیں کہ نہ حساب کتاب ہوگا۔ نہ حشر ونشر ہوگا بلکہ یہ سب یقیناً ہونے والی چیزیں ہیں اسی لئے قسم سے پہلے ان کے باطل خیال کی تکذیب کی اور اسے اسطرح ثابت کیا کہ اپنی قدرت کاملہ کے مختلف نمونے ان کے سامنے پیش کئے مثلاً آسمان وزمین کی پیدائش ابتدائی اور ان میں حیوانات، جمادات، اور مختلف قسم کی مخلوق کی موجودگی، جیسے اور جگہ آیا ہے آسمان وزمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب بڑی بڑی چیزوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پیدائش پر کیوں قادر نہ ہوگا۔

جیسے اور جگہ ہے۔ یعنی کیا یہ نہیں دیکھتے کہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اور ان کی پیدائش میں عاجز نہ ہوا۔ کیا وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ بیشک وہ قادر ہے۔ اور ایک اسی پر کیا ہر ہر چیز پر اسے قدرت حاصل ہے۔ اور جگہ ارشاد ہے۔ اولیس الذی الخ۔ یعنی کیا زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ان جیسا پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ ہاں ہے اور وہ ہی پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے وہ جس چیز کا ارادہ کرے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم ہم ان کے ان جسموں کو جیسے یہ اب ہیں اس سے بھی بہتر صورت میں بدل ڈالنے پر پورے پورے قادر ہیں۔

کوئی چیز، کوئی شخص اور کوئی کام ہمیں عاجز اور درماندہ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ارشاد ہے، ایحسب الانسان ان لن نجمع الخ۔ کیا کسی شخص کا یہ گمان ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو نہ جمع کر سکیں گے؟ غلط گمان ہے بلکہ ہم تو اسکی پور پور جمع کر کے ٹھیک ٹھاک بنا دیں گے اور جگہ فرمایا۔ نحن قدرنا بینکم الموت الخ ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کر دی ہے۔ اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تم جیسوں کو بدل ڈالیں اور تمہیں اس نئی پیدائش میں پیدا کریں۔ جسے تم جانتے بھی نہیں۔ پس ایک مطلب تو آیت مندرجہ بالا کا یہ ہے۔ دوسرا مطلب امام ابن جریر رحہ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ہم اس امر پر قادر ہیں کہ تمہارے بدلے ایسے لوگ پیدا کر دیں جو ہمارے مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ اور ہماری نافرمانیوں سے رکے رہنے والے ہوں جیسے اور جگہ ہے۔

وان تتولوا الخ یعنی اگر تم نے منہ موڑا تو خدا تعالیٰ تمہارے سوا اور قوم کو لائے گا اور وہ تم جیسی نہ ہوگی۔ لیکن پہلا مطلب دوسری آیتوں کی صاف دلالت کیوجہ سے زیادہ ظاہر ہے۔ واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم،

پھر فرماتا ہے اے نبی ﷺ! انھیں ان کے جھٹلانے اور کفر کرنے اور سرکشی میں بڑھنے ہی میں چھوڑ دو، جس کا وبال ان پر اس دن آئے گا جس کا ان سے وعدہ ہو چکا ہے۔ جس دن خداوند تعالیٰ انھیں بلائے گا اور یہ میدان حشر کی طرف جہاں انھیں حساب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔ اس طرح لپکتے ہوئے جائیں گے۔ جس طرح دنیا میں کسی بت یا علم کو چھونے کیلئے ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے جاتے ہیں، مارے شرم اور ندامت کے نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی ہوں گی۔ اور چہروں پر پھٹکار برس رہی ہوگی۔

دنیا میں خدا کی اطاعت سے سرکشی کرنے کا نتیجہ؛ اور یہ ہے وہ دن جس کے ہونے کو آج محال جانتے ہیں اور ہنسی مذاق میں نبی ﷺ کی اور شریعت کی اور کلام خدا کی حقارت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیامت کیوں نہیں قائم ہوتی؟ ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ مگر قیامت کے دن جس روز جزاء سزا کا دن ہوگا۔ وہ سارے وعدے وہ جو اللہ رب العزت

کی طرف سے لئے گئے ہیں۔ مصب پور سنے ہوں گے۔

سورۃ نوح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تھا کہ تم اپنی قوم کو (وبال کفر سے) ڈراؤ قبل اس کے کہ

اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ○ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ

ان پر دردناک عذاب آئے۔ انھوں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم میں تمہارے لئے صاف صاف

مُّبِیۡنٌ ○ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ○

ڈرانے والا ہوں (اور کہتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت (یعنی توحید اختیار) کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو تو وہ تمہارے

یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ

گناہ معاف کر دے گا۔ اور تم کو وقت مقرر (یعنی وقت موت) تک (بلا عقوبت) مہلت دے گا۔ اللہ کا

اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○

مقرر کیا ہوا وقت (وہ ہے) جب (وہ) آ جاوے گا تو ٹلے گا نہیں کیا خوب ہوتا اگر تم (ان باتوں کو) سمجھتے، جب مدتہائے دراز تک

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ○ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ

ان لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا تو) نوح علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف)

دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ○ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ

بلایا سو میرے بلانے پر (دین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے۔ (اور وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی ان کو دین حق کی طرف بلایا تاکہ

جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ

(ان کے ایمان کے سبب) آپ ان کو بخش دیں۔ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں (تاکہ حق بات کو سنیں بھی نہیں) اور زیادہ اصرار

وَّاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝

اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے - اور اصرار کیا اور (میری طاعت سے (ان لوگوں نے غایت درجہ کا تکبر کیا)

تفسیر یہ سورۃ مبارکہ بھی بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی قریش کی سرکشی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں پر تمسخر اور دعدوں کی تکذیب اور تکفیر حد کو پہنچ گیا تھا اس لئے ان لوگوں کی مثل سرکش اور نافرمان قوم کا عبرتناک واقعہ سنایا جاتا ہے۔

توریت یا اور کسی صحیفہ سے یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کس ملک میں اور کس شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر اکثر مورخین کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام آرمینیا و کردستان وغیرہ ایشیائے کوچک میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اس شہر دگاؤں کا نام معلوم نہ کیا تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام رہا کرتے تھے - اور طوفان کے بعد بار دگر دنیا آباد ہوئی ۔ تو سب سے پہلا یہی ملک بنی آدم کا وطن معلوم ہوتا ہے۔ انھیں اطراف میں وہ برج بنایا گیا تھا جو طوفان کے بعد آئندہ طوفان سے بچنے کے لئے لوگوں نے بنایا تھا۔ اس کے نشان اب تک بغداد کے نواح میں سیاحوں کو دکھائی دیتے ہیں۔ اور شہر بابل اور نینوا بھی یہیں بسے تھے - جو اب خاک کے تودے اور ڈھی ہوئی عمارت کے نشان کچھ کچھ معلوم ہوتے ہیں۔ اور کھودنے سے بڑی بڑی اینٹیں اور حیرت انگیز بنیادیں نکلی ہیں۔

اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کیطرف اپنا رسول بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ عذاب کے آنے سے پہلے اپنی قوم کو ہوشیار کردو - اگر توبہ کر لیں گے اور اپنے رب کی طرف جھکنے لگیں گے - تو عذاب ان سے اٹھ جائے گا۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ پیغام اپنی امت کو پہونچا دیا اور صاف کہدیا کہ دیکھو میں کھلے لفظوں میں آگاہ کئے دیتا ہوں - میں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی عبادت ، اس کا ڈر اور میری اطاعت لازمی چیز ہیں ، جو کام تمہارے رب نے تم پر حرام کئے ہیں ان سے بچو گناہ کے کاموں سے الگ رہو - جو کچھ میں کہوں بجا لاؤ - جس بات سے روکوں ، رک جاؤ - میری رسالت کی تصدیق کرو تو خداوند قدوس تمہاری خطاؤں سے درگذر فرما دے گا - یغفر لکم من ذنوبکم میں لفظ من یہاں زائد ہے - اثبات کے موقعہ پر بھی کبھی لفظ من زائد آجاتا ہے - بلکہ ابن جریر ؒ کا قول بھی ہے یعنی تمہارے کچھ گناہ معاف فرما دے گا - یعنی وہ گناہ جن پر سزا کا وعدہ ہے - اور بڑے بڑے گناہ ہیں - اگر تم نے یہ تینوں کام کئے تو وہ معاف ہو جائیں گے - اور جن عذابوں سے وہ تمہیں اب تمہاری ان خطاؤں اور غلط کاریوں کی وجہ سے برباد کرنے والا ہے - اس عذاب کو ہٹا دے گا - اور تمہاری عمریں بڑھا دیگا -

اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ اطاعت خدا ، نیک سلوک اور صلہ رحمی سے حقیقتاً عمر بڑھ جاتی ہے حدیث میں یہ بھی ہے کہ صلہ رحمی سے عمر بڑھ جاتی ہے - پھر ارشاد ہوتا ہے - کہ نیک اعمال اس سے پہلے کرلو کہ خدا کا عذاب آجائے - اس لئے کہ جب وہ آجاتا ہے - تو پھر نہ اسے کوئی ہٹا سکتا ہے اور نہ روک سکتا ہے - اس خدائے اعظم و اکبر کی کبریائی نے ہر چیز کو پست کر رکھا ہے - اسکی عزت و عظمت کے سامنے تمام مخلوق پست ہے خالق و مخلوق میں جو فرق ہے وہ مندرجہ بالا سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے -

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝

اے رب میں نے اپنی

قوم کو رات دن ہدایت کیطرف بلایا، وعظ دیا۔ کیا اس کام میں کوئی کمی نہیں کی مگر وہ اس سے اور بھی بھاگنے لگے۔ وانی کلما دعوتہم لتغفر لہم جعلوا اصابعہم فی اذانہم واستغشوا ثیابہم واصروا واستکبروا استکبارا۔ اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا کہ تو انھیں معاف کر دے یعنی تیری طرف معافی کے لئے بلانا چاہا تو انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیں کہ کہیں میری بات سننے میں نہ آ جائے۔ اور اس پر بس نہیں بلکہ اپنے اوپر کپڑا ڈال لیا منہ چھپا لئے کہ میری صورت بھی نہ دیکھیں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ یہ عداوت کرنے سے کنایہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں نے دشمنی کا جامہ پہن لیا۔ ابن عباس رض کہتے ہیں کہ اس لئے کپڑا اڈالتے تھے کہ پہچانے نہ جائیں اور ان کو پیغمبر نہ بلا دے اور اپنے کفر و بدکاری پر اڑ گئے ہرگز توبہ و ندامت نہیں کرتے۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ

پھر بھی میں نے ان کو با آواز بلند بلایا۔ پھر میں نے ان کو خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا۔ اور ان کو الگ

لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ

حفیہ بھی سمجھایا اور (اس سمجھانے میں) میں نے (ان سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا ہے

غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ

کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا۔ اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دیگا

بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ

ترقی دے گا۔ اور تمہارے لئے باغ لگا دے گا۔

وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا

اور تمہارے لئے نہریں بہا دے گا (میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ

(اور نہ شرک کرتے ہو) حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ

پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور سورج کو

جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

(مثل) چراغ (روشن کے) بنایا اور اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا۔

نَبَاتًاۙ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَ یُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۝ وَ

پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لیجا دے گا اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آویگا اور اللہ

اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًاۙ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا

تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا۔ تاکہ تم اس کے کھلے رستوں میں

فِجَاجًا۝

چلو۔

پھر فرمایا گیا کہ اسی پر بس نہیں کہ ثم انی دعوتھم جھاراً اس کے بعد بھی میں نے باآواز بلند ان کو بلایا ثم انی اعلنت لھم پھر میں نے ان کو خبردار بھی کیا اور جتا دیا کہ میں خدا تعالیٰ کیطرف سے تمہارے پاس پیغام لایا ہوں۔ واسررت لھم اسراراً اور مخفی طور پر بھی سمجھا دیا یعنی ہر طور سے بلایا اور نصیحت کی۔ فقلت استغفروا ربکم کہ تم اور کسی سے نہیں بلکہ اپنے پرورش کرنے والے محسن اور مربی سے معافی مانگو، انہ کان غفاراً۔ کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے

یرسل السماء علیکم مدراراً، وہ تم پر بارش برساوے گا۔ قحط و گرانی کے عذاب سے نجات دے گا۔ لفظی معنی یہ ہوئے کہ وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجے گا۔ سماء سے مراد بادل ہے۔ ویمددکم باموال وبنین اور تم کو مال اور اولاد میں ترقی دے گا۔ اولاد اس لئے کہا کہ اس لفظ سے مراد دونوں لیا گیا ہے۔ کیوں کہ لڑکیوں کی پیدائش سے وہ ناخوش ہوتے تھے۔ اس لئے بنین کہا یعنی لڑکے دے گا۔

ویجعل لکم جنات۔ اور تمہارے لئے باغ تیار کر دے گا۔ خوب میوے کھاؤ گے۔ ویجعل لکم انھاراً۔ اور تمہارے لئے نہریں تیار کر دے گا۔ یہ سب مثالیں اس لئے دیں کہ ان دنیا کی چیزوں کی طرف طبائع عامہ کی رغبت ہوتی ہے۔ اور وہ قوم بھی انھیں پر فریفتہ تھی۔ اس لئے معافی مانگنے پر ان چیزوں کا وعدہ دیا اور یہ وعدہ سچا تھا۔ طمع خام نہ تھی۔ اب بھی استغفار کی یہ خاصیت ہے کہ جو کوئی سچے دل سے اور عجز و نیاز سے اپنے رب العالمین سے معافی مانگتا رہے گا۔ اس کے مال و اولاد میں برکت ہوگی۔ قحط سالی رفع ہوگی۔ زمین کی پیداوار زیادہ ہوگی۔

استغفار کے فوائد میں حسن بصری رح سے نقل کیا ہے کہ کسی نے قحط سالی کی شکایت کی فرمایا استغفار کر ایک نے تنگدستی کا گلہ کیا کسی اور نے نسل کی قلت کا شکوہ کیا ایک اور نے کہا زمین کی پیداوار کم ہوتی ہے۔ سب کو آپ نے اللہ سے مغفرت مانگنے کا حکم دیا۔ ربیع بن صبیح نے کہا کہ آپ سے لوگوں نے مختلف اغراض اور حاجتیں بیان کیں اور جدا جدا چیزیں چاہیں۔ آپ نے سب کو استغفار کا ہی حکم دیا اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ استغفار کی کس قدر فضیلت ہے۔

اب اس سلسلے میں علماء کرام کا اپنا موقف بالکل الگ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف زبان سے استغفر اللہ کہنا کافی نہیں بلکہ گناہوں سے باز آوے اور دل و زبان کو پاک رکھے اور عجز و نیاز اور خلوص دل سے استغفار کرے دنیا میں اس کی یہ برکتیں ہیں۔ آخرت میں جنت ہے۔ اس لئے کہ اہل جنت کی شان میں آیا ہے وبالاسحار ھم

یستغفرون کہ صبح کے وقت خدا سے معافی مانگا کرتے تھے۔ اور احادیث صحیحہ میں استغفار کے بہت سے فوائد بیان ہوئے ہیں مگر واہ رے بدنصیب قوم اس پر بھی حضرت نوح علیہ السلام کا کہا نہ مانا جس پر ناچار ہو کر حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا مالکم لا ترجون للہ وقارا کہ تمہیں کیا ہو گیا کہ جو تم اللہ سے عزت و حرمت کی امید نہیں رکھتے اور اپنے بتوں سے رکھتے ہو کہ فلاں عزت دے گا۔ فلاں مال دے گا۔ یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا جو تم اللہ کی توقیر و عزت نہیں خیال کرتے۔ اور دل میں نہیں لاتے۔ بتوں کی عزت اور حرمت دل میں ہے۔ مگر افسوس کہ اللہ کی نہیں۔ بتوں سے ڈرتے ہو اور نذر و نیاز کرتے ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اول توحید کا حکم دیا اس کے بعد اس کے ثبوت میں چند دلائل بیان فرمائے۔

اول:۔ کہ اللہ رب العزت نے تم کو طرح طرح سے بنایا۔ اول نطفہ تھے۔ پھر علقہ ہوئے۔ پھر مضغہ ہوئے۔ پھر انسان ہے یا یہ کہ کسی کو امیر کسی کو غریب کسی کو خوبصورت کسی کو بدصورت بنایا۔ پھر سب کا ڈھانچہ ایک ہے۔ مگر صورتیں جدا جدا۔ آخر کوئی علیم و خبیر ہے کہ جس نے یہ بڑا کام کیا ہے۔ یہ بڑی مستحکم دلیل ہے۔ جو انسان ہی کے حالات سے متعلق ہے۔ اپنے آپ ہی میں غور کرے گا۔ تو یہ سینکڑوں نشان قدرت پائے گا۔

دوم:۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس نے کیسے سات آسمان اوپر تلے بنائے؟

سماوات اس کی قدرت کاملہ کا بڑا نمونہ ہیں۔

سوم:۔ کہ اس نے آسمانوں میں چاند کو روشنی اور سورج کو چراغ بنایا، آفتاب و ماہتاب کا فرق دہریوں مادیت پرستوں کو حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اور ناچار ان کو ایک حکیم، علیم و قدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

مقصود صرف اس قدر ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے ہیں اور وہ اوپر تلے ہیں پھر ان میں سورج و چاند کو پیدا کیا، دونوں کی چمک دمک اور روشنی اور اجالا الگ الگ ہے۔ جس سے دن رات کی تمیز ہو جاتی ہے۔ پھر چاند کی مقررہ منزلیں اور بروج ہیں۔ پھر اسکی روشنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اور ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ بالکل چھپ جاتا ہے۔ اور ایسا وقت بھی کہ وہ بالکل اپنی پوری روشنی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس سے مہینے اور سال معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے فرمان ہے۔ ھو الذی جعل الشمس ضیاءً الخ۔ خدا وہ ہے جس نے سورج اور چاند خوب روشن اور چمکدار بنائے۔ اور چاند کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تمہیں سال اور حساب معلوم ہو جائیں، ان کی پیدائش حق ہی کے ساتھ ہے۔ عالموں کے سامنے قدرت خدا کے یہ نمونے الگ الگ موجود ہیں۔ پھر فرمایا خدا تعالیٰ تمہیں زمین سے اگایا،، اس تعبیر نے مضمون بجد لطیف کر دیا، پھر تمہیں مار ڈالنے کے بعد اسی میں لوٹالے جائے گا پھر قیامت کے دن اس سے نکالے گا۔ جیسے اول دفعہ پیدا کیا تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنا دیا اس پر مضبوط پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ ہلے نہیں، اس زمین کے کشادہ راستوں پر تم چلتے پھرتے ہو اسی زمین پر اونچی اونچی فلک بوس عمارتوں میں رہتے ہو، اسکا نہیں پر تم ادھر سے ادھر جاتے ہو۔

غرض حضرت نوح علیہ السلام نے عظمت خدا، اور قدرت خداوند قدوس کے نمونے اپنی قوم کے سامنے رکھے اور انہیں آمادہ کرنے کی ہر سعی کر رہے ہیں کہ زمین و آسمان کی برکتوں کے دینے والے ہر چیز کو پیدا کرنے والے، عالیشان قدرت کے رکھنے والے رازق و خالق خدا کا کیا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ تم اسی کی عبادت کرو، اس کا لحاظ رکھو اور اس کے کہنے سے اسکے سچے نبیؑ کی راہ اختیار کرو، یہ نہیں بلکہ یہ فرمایا کہ تمہیں ضرور چاہیئے کہ صرف اسی کی عبادت کرو۔

کسی اور کو معبود برحق نہ جانو اس جیسا اس کا شریک اس کا ساجھی اس کا مثیل کسی کو نہ جانو۔ اسے جورو، بیٹوں پوتوں سے، وزیر و مشیر سے عدیل و نظیر سے، پاک مانو، اسی کو بلند و بالا اور عظیم و اعلیٰ مانو، سبلاً فجاجًا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کفر و بدکاری کے رستے تنگ، اور پر خار اور پر خطر ہیں۔ ان پر نہ چلو، توحید و خدا پرستی کا وسیع رستہ ہے۔ اسی پر چلو تاکہ منزلِ سعادت کو پہنچو۔

لفظ منزل سعادت بظاہر ایک عام لفظ ہے۔ مگر یہ لفظ بہت سی خوبیوں اور اچھائیوں کا حامل ہے یہاں منزل سعادت کے صحیح معنیٰ یہ ہی ہو سکتے ہیں کہ وہ جگہ جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو انکی دنیاوی اچھائیوں کے بدلے عنایت فرمائے گا۔ اب وہ جگہ کیسی ہو گی۔ جو خود باری تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو مرحمت فرمائے گا۔ اس کے تصور سے ہی مومن کا دل فرط مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ اور صحیح کیف و انبساط وہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ

اور یہ سب حکایات عرض کر کے) نوح علیہ السلام نے یہ کہا کہ اے میرے پروردگار ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا۔ اور ایسے شخصوں کی پیروی

مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۝

کی کہ جن کے مال و اولاد نے ان کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا اور انھوں نے جن کا اتباع کیا ہے وہ ایسے ہیں کہ) جنھوں نے حق مٹانے

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا

میں، بڑی بڑی تدبیریں کیں، اور جنھوں نے (اپنے تابعین سے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا، اور نہ (بالخصوص) ود کو اور نہ سواع

سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ

کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا اور ان (رئیس) لوگوں نے

أَضَلُّوا كَثِيرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ۝

بہتوں کو بہکا بہکا کر) گمراہ کر دیا اور اب آپ) ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے۔

تفسیر حضرت نوح علیہ السلام نے دلائل بھی قائم کئے اور ہر طرح اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی پھر بھی اس بدبخت قوم نے خدائے پاک کیطرف رجوع نہ کیا اور کوئی امید ان کی ہدایت کی باقی نہ رہی تب ناامید ہو کر اپنی گذشتہ شکایتوں کے ساتھ جناب باری میں اپنی قوم کے لوگوں کی اس روش کو بھی بیان کیا، قال نوح رب انھم عصونی، کہ میری پکار کو جو ان کے لئے سراسر نفع بخش تھی انھوں نے کان تک نہ لگایا۔ یعنی مطلق دھیان نہ دیا، واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ الا خسارا، اور ان ناپاک گمراہوں کے تابع ہو گئے کہ جن کے مال اور اولاد نے بجائے فائدہ آخرت کے ان کو اور نقصان دیا اور وہ بد نصیب اولاد کی افزائش سے اور بھی سرکشی اور گمراہی میں پڑ گئے اور اترا گئے وہ مال اور اولاد کے پیچھے بدمست تھے گو فی الواقع

وہ مال اور اولاد بھی ان کے لئے سراسر وبال جان تھا، کیوں کہ ان کی وجہ سے وہ پھولتے تھے۔ اور خدا کو بھولتے تھے۔ اور یہ سمجھنے لگے کہ ہم جس طریقے پر ہیں وہ ہی برحق ہے۔ اس لئے کہ اگر برحق نہ ہوتا تو پھلتے پھولتے نہیں افسوس انسانی بدکاری پر بدکاری و بت پرستی کرے، اور خدا کی طرف سے اس کو کوئی رد کرنے والی سزا نہ ملے۔ اور وہ افزائش مال اور اولاد میں ترقی کرتا جائے۔ تو پھر وہ اپنے طریقہ کو کبھی برا نہ سمجھے گا۔ بلکہ اور دل کھول کر وہ برے کام جو کرتا آرہا ہے کرے گا۔ اور مغرور ہوتا جائے گا۔ دراصل یہ بہت بڑا فتنہ اور آزمائش ہے یہی وجہ ہے کہ یہ روزمرہ کا مشاہدات میں سے ہے کہ بت پرست اور بدکار قومیں کس طرح پھولتی پھلتی ہیں، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے لئے دنیا و آخرت میں کوئی مہلک عذاب تیار ہے۔

ومکروا مکرًا کبارًا، اور انھوں نے بڑے مکر و فریب کئے ہیں۔ ان بتوں کی پرستش کی عجیب دلیلیں بنا رکھی تھیں، اور بحث میں ہارتے نہ تھے، کمینوں اور بدمعاشوں کو لالچ دے کر حضرت نوح علیہ السلام کی توہین، ایذا پر آمادہ کیا اور انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

وقالوا لا تذرن آلہتکم، ان کے سرداروں نے بڑی دلیری سے کہدیا کہ خبردار اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا ان کے نام یہ ہیں، ودّ کو، سواع کو، یغوث کو، یعوق کو، نسر کو، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ قوم نوح ؑ کے بتوں کو کفار عرب نے لے لیا، دومتہ الجندل میں قبیلہ کلب ودّ کو پوجتے تھے، ہذیل قبیلہ سواع کو پوجتا تھا۔ قبیلہ مراد اور قبیلہ بنو غطیف، جو صرف کے رہنے والے تھے۔ یغوث کی پوجا کرتا تھا۔ ہمدان قبیلہ یعوق کا پجاری تھا۔ آل ذی کلاع کا قبیلہ حمیر نسر بت کا ماننے والا تھا۔ یہ سب بت دراصل قوم نوح ؑ صالح بزرگ اولیاء اللہ لوگ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد شیطان نے اس زمانہ کے لوگوں کے دلوں میں بات ڈالی کہ ان بزرگوں کی عبادت گاہوں میں ان کی کوئی یادگار قائم کریں۔ چنانچہ انھوں نے وہاں نشان بنادئے اور ہر ہر بزرگ کے نام پر انھیں مشہور کیا۔ جب تک یہ لوگ زندہ رہے تب تک تو اس جگہ کی پرستش نہ ہوئی۔ لیکن ان نشانات اور یادگار قائم کرنے والے لوگوں کے مرجانے کے بعد اور علم کے اٹھ جانے کے بعد جو لوگ آئے بوجہ جہالت کے انھوں نے باقاعدہ ان جگہوں کی اور ان ناموں کی پوجا پاٹ شروع کردی۔

حضرت عکرمہ رح، حضرت ضحاک رح حضرت قتادہ رح، حضرت ابن اسحاق رح اور حضرت محمد بن قیس رح فرماتے ہیں یہ بزرگ اللہ والے اولیاء اللہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام سچے تابع فرمان صالح لوگ تھے جن کی پیروی اور لوگ بھی کرتے تھے، جب یہ وفات پاگئے تو ان کے معتقدوں نے کہا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں تو ہمیں عبادت میں خوب دلچسپی رہے گی۔ اور شوق عبادت ان بزرگوں کی صورتیں دیکھ کر بڑھتا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا جب یہ لوگ بھی ختم ہوگئے۔ اور ان کی نسلیں آئیں تو شیطان نے انھیں یہ سمجھایا کہ تمہارے بڑے تو ان کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ اور انھیں سے بارش وغیرہ کی دعا مانگتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اب باقاعدہ ان بزرگوں کی تصویروں کی پرستش شروع کردی، حافظ ابن عساکر رح حضرت شیث ؑ کے قصے میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے چالیس بچے تھے، بیس لڑکے، بیس لڑکیاں ان میں سے جن کی بڑی عمریں ہوئیں۔ ان میں ہابیل، قابیل، صالح اور عبدالرحمٰن تھے۔ جن کا پہلا نام عبدالحارث تھا۔ اور ودّ تھا جنہیں شیث بھی کہا جاتا ہے۔ تمام بھائیوں نے سرداری ان ہی کو دی، ان کی اولاد میں یہ چاروں تھے۔ یعنی سواع، یغوث۔ یعوق اور نسر تھے، حضرت عروہ بن زبیر رح فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بیماری کے وقت ان کی اولاد ودّ۔ یغوث

یعوق، سواع، اور نسر تھی۔ ودّ ان سب میں بڑا۔ اور سب سے نیک، سالک تھا۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھ رہے تھے، اور لوگوں نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا کہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا وہ وہاں قتل کیا گیا۔ جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی پرستش ہوئی، واقعہ یوں ہوا کہ ایک دیندار ولی اللہ مسلمان تھا جسے لوگ بہت چاہتے تھے۔ اور بڑے معتقد تھے۔ وہ مر گیا، یہ لوگ مجاور بن کر اس کی قبر پر بیٹھ گئے اور رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کو یاد کر کے اور بہت بےچین اور مصیبت زدہ ہو گئے۔

ابلیس لعین نے یہ دیکھ کر انسانی صورت میں ان کے پاس آ کر کہا کہ اس بزرگ یادگار کیوں قائم نہیں کرتے جو ہر وقت تمہارے سامنے رہے اور تم اسے نہ بھولو۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا، ابلیس نے اس بزرگ کی تصویر بنا کر ان کے پاس کھڑی کر دی، جسے دیکھ دیکھ کر یہ لوگ اسے یاد کرتے تھے۔ اور اسکی عبادت برابر کرتے رہتے تھے۔ جب وہ سب اسمیں مشغول ہو گئے تو ابلیس نے کہا کہ تم سب کو یہاں آنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ میں اسکی بہت سی تصویریں بنا دوں۔ تم انھیں اپنے اپنے گھروں میں رکھ لو وہ اس پر راضی ہوئے۔ اور ابلیس نے اس بزرگ کی بہت سی تصویریں بنا دیں، اب تک صرف یہ تصویریں اور بت بطور یادگار کے ہی تھے مگر ان کی دوسری نسل میں جا کر براہ راست ان ہی کی پوجا اور عبادت ہونے لگی۔ اصلی واقعہ سب فراموش کر گئے اور اپنے باپ دادوں کو بھی ان کی عبادت کرنے والا سمجھ کر خود بھی بت پرستی میں مشغول ہو گئے۔ پہلے بت کا نام ودّ تھا۔ جس کی پوجا خدا کے سوا کی گئی، انھوں نے بہت مخلوق کو گمراہ کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک عرب و عجم میں خدا کے سوا دوسروں کی پرستش شروع ہو گئی اور مخلوق خدا بہک گئی۔ چنانچہ خلیل اللہ علیہ السلام اپنی دعائیں عرض کرتے ہیں کہ اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ خدایا انہوں نے اکثر مخلوق کو گمراہ کر دیا ہے۔

جب حضرت نوح ؑ بالکل ناامید ہو گئے تو اس ناپاک قوم کی نسبت یہ بددعا کی، ولا تزد الظالمین الا ضلالا کہ یہ ظالم اور بھی گمراہی میں پڑیں کہ جلد عذاب آ کر تمام مر جائیں یا یہ معنیٰ کہ ان پر عذاب نازل ہو اس لئے کہ ضلال کے معنیٰ ہلاکت و تباہی کے بھی ہیں۔

مِّمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا

ان لوگوں کا انجام یہ ہوا کہ اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کئے گئے پھر (بعد غرق) وہ دوزخ میں داخل کئے گئے اور خدا کے سوا

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ○ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ

ان کو کوئی حمایتی بھی میسر نہ ہوئے۔ اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے

لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ اِنَّكَ

پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ کیونکہ اگر آپ ان کو

إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا

روئے زمین پر رہنے دیں گے۔ تو آپ کے بندوں کو گمراہ ہی کر دیں گے۔ اور آگے بھی، ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔

فَاجِرًا كَفَّارًا ○ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ

اے میرے رب مجھکو اور میرے ماں باپ کو اور جو مومن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کو

دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلَا

(یعنی اہل وعیال باستثناء زوجہ و کنعان) اور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دیجیے۔ اور ان

تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ○

ظالمین کی ہلاکت اور بڑھایئے

تفسیر خطیئتھم کی دوسری قرارت خطایاہم بھی ہے۔ اس کشمکش میں حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس گذر گئے اور سوائے چند شخصوں کے کوئی بھی ہدایت پر نہ آیا تب اس قوم پر حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعا کے سبب عذاب آیا کہ آسمان سے بے انتہا پانی برسا۔ اور زمین نے بھی اپنی سوتیں کھول دیں تمام قوم غرق ہوگئی ان کے گناہوں کے سبب اور غرق ہو کر بھی چھٹکارا نہ ہوا بلکہ ادخلوا نارًا، مرنے کے بعد آگ یعنی جہنم میں داخل کیئے گئے دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے عذاب ہوئے۔

فلم یجدوا لہم من دون اللہ انصارًا، اور ان کے معبودوں میں سے ان کے کوئی بھی کام نہ آیا، کسی نے مدد نہ کی، کوئی بچا نہ سکا، جن کی پرستش کیا کرتے تھے اور نہ ہم باطل میں تھے کہ یہ ہدایت جو ہم کو دی جا رہی ہے سب فضول ہے۔ ہمارے معبود جن کی پرستش ہمارے بزرگ کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے مددگار ہیں۔ اس لیے کہ اس وقت کچھ بھی کوئی ٹوٹکا شعبدہ، دیوتا کام نہ آیا اور نہ آسکتا تھا۔ اس سے یہ بات وضاحت کو پہنچ گئی کہ معبود برحق وہ ہی ایک ہے۔ اس کی عبادت، اس کی اطاعت فرض ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی اسکو روک نہیں سکتا حضرات انبیاء علیہ السلام محض اس راستہ کا رہنما ہیں اور جب قوم غرق ہونے لگی۔ تب حضرت نوح علیہ السلام نے اسی قہر الٰہی کی تجلّی میں حق سبحانہ سے یہ عرض کیا، رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارًا، کہ اے رب زمین پر کسی کافر کو بسنے کے لئے نہ چھوڑ۔

انک ان تذرہم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا، اس لئے کہ اگر آپ نے کسی کو چھوڑا تو جبلّی گمراہ تو رہے اور بندوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ان کا خبیث مرض اوروں تک نہ پہنچ جائے۔ ان سے دنیا کو پاک ہی کرنا چاہیئے اور ان کی گمراہی اور کج جنس کا میں نے سیکڑوں برس تجربہ کیا ہے۔ ان کے ضمیر میں داخل ہوگی اصلی فطرت کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس لئے اگر ان کی نسل سے اولاد بھی ہوگی، تو بدکار اور کافر ہی پیدا ہوں گے نہ ان میں ہدایت پلنے کا مادہ باقی رہا۔ نہ ان کی نسلوں میں پھر جب یہ دونوں باتیں نہیں تو ایسے خار دار ناپاک پیڑ سے

باغ دنیا کو پاک ہی کرنا چاہتے ہیں۔
اس کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام نے جب قہر الٰہی سے شعلے بلند ہوتے دیکھے تو اسکی شان کبریائی اور بے پروائی سے ڈرے۔ اور ڈرنا چاہیئے بھی۔ اور یہی کمال ایمان بھی ہے۔ تو اپنے لئے اور اپنے والدین اور متبعین کے لئے یہ دعا کرنے لگے۔ رب اغفرلی کہ الٰہی مجھے بخشدے۔ جو کوئی بشریت سے چوک ہوگئی ہے اس کا انتقام نہ لے ولوالدی اور میرے ماں باپ کو بھی (اولاد کو حق ہے کہ ماں باپ کے لئے دعاء خیر کرے) پہلے آپ مغفور ہوئے کہ دعاء مستجاب ہو اور آپ کے والدین موحد اور با خدا تھے۔ ولمن دخل بیتی مؤمنا اور جو کوئی ایمان لاکر میرے گھر میں آجائے (یعنی کشتی میں) اس لئے کہ یہ تیری پناہ کی جگہ ہے اور ان کے سوا، للمؤمنین والمؤمنات۔ اور جس قدر ایماندار مرد اور عورت ہوں کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں سب کو معاف کر۔
اب یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تمام مؤمنوں کے لئے دعاء خیر کی ہے۔ پھر جس طرح ان کی بد دعا کفار پر پڑی کوئی نہ بچا اور مقبول ہوگئی تو دعائے خیر کے مقبول ہونے میں کیا کلام ہے۔ لیکن شرط مومن کی ہے۔ مومن کی بابت بہت سی آیات ہیں۔ بیان آچکا ہے کہ مومن کی کیا صفات ہیں۔
اکثر مورخین کہتے ہیں کہ طوفان تمام دنیا پر آیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت دنیا میں یہی بدکاری پھیلی ہوئی تھی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی نسل کے سوا اور کوئی نسل باقی نہیں رہی یہ بھی ایک دلیل ہے۔ اور نیز قرآن مجید کی ان ہی آیات میں ولا تذر علی الارض من الکافرین دیارا آیا ہے۔ کہ زمین پر کسی کافر کو نہ چھوڑ۔ نیز کشتی میں ہر ایک چیز کا جوڑا لینا بھی اس کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ طوفان اگر تمام دنیا پر نہ تھا تو ان چیزوں کی نسل منقطع ہوجانے کا سبب نہ تھا۔ پھر کشتی میں لینے سے کیا فائدہ تھا۔
مندرجہ بالا آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہوگئی۔ اور مستحب ہے کہ ہر شخص اپنی دعاؤں میں دوسرے مؤمنوں کو بھی شامل رکھے تاکہ حضرت نوح علیہ السلام کی اقتداء بھی ہو اور ان حدیثوں پر عمل ہوجائے۔ جو اس بارے میں ہیں۔ اور وہ دعائیں بھی آجائیں جو منقول ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبحَانُ

کا

پارہ نمبر ۲۹

(دوسرا جزء)

تَبَارَكَ الَّذِی

فاضلِ اجل حضرت مولانا عبد الدائم جلالی مدظلہ

وسیم بکڈپو دیوبند۔ یو۔ پی

مالک

عطاء الرحمٰن صدیقی

مطبوعہ:۔ محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

قیمت ۵/۵

سُورَةُ الجِنّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا

آپ (ان لوگوں سے) کہیے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر (اپنی قوم میں واپس جا کر) انہوں

قُرْاٰنًا عَجَبًا ○ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ

نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو راہ راست بتلاتا ہے۔ سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم (اب)

نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ○ وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ

اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے۔ اس نے نہ کسی کو

صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ○ وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى

بیوی بنایا نہ اولاد اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے۔

اللّٰهِ شَطَطًا ○ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ

اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے،

الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ○ وَّاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ

اور بہت سے لوگ آدمیوں سے ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا

يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ○

کرتے تھے۔ سو ان آدمیوں نے ان جنات کی بددماغی بڑھا دی

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ○

اور جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ

اور ہم نے آسمان (کی خبروں) کی تلاشی (موافق عادت سابقہ کے) لینا چاہا سو ہم نے اسکو سخت پہروں (یعنی محافظ فرشتوں) اور

شُهُبًا ○ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ

شعلوں سے بھرا ہوا پایا، اور (اسکے قبل) ہم آسمان (کی خبریں سننے) کے موقعوں میں (خبر) سننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے۔ سو جو کوئی

يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ○ وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْٓ

اب سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ (ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے

اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ

مبعوث فرمانے سے) زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ یا ان کے رب نے ان کو ہدایت کرنے کا قصد

رَشَدًا ○

فرمایا ہے۔

تفسیر

قرطبی کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ ہی ابن عباس رضؓ و عائشہ رضؓ و ابن کثیر رحؒ و ابن زبیر رضؓ کا قول ہے اور اس پر جمہور کا اتفاق ہے۔ سورۃ نوح میں یہ بات بتلائی گئی تھی کہ نوح علیہ السلام نے سیکڑوں برس وعظ و تبلیغ کیا مگر چند اشخاص کے سوا اس شقی قوم نے نہ مانا آخر ہلاک ہوئی۔ اب اے قریش تم جو نہیں مانتے اور عذاب کے خواستگار دلیری سے ہوئے ہو جیسا کہ سورہ نوح سے پہلے سورۃ سال سائل میں بیان ہوا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہمارے پیغمبر کی تعلیم میں قصور ہے۔ بلکہ تمہاری فہم استعداد کا فتور ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ اپنی قوم کو اس واقعہ کی اطلاع دیجئے کہ جنھوں نے قرآن کریم سنا اسے سچا مانا۔ اس پر ایمان لائے۔ اور اس کے مطیع بن گئے۔ تو فرماتا ہے۔ کہ اے نبی ﷺ تم کہو کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن کریم کو سنا اور اپنی قوم میں جاکر خبر کی کہ آج ہمنے عجیب و غریب کتاب سنی جو سچا اور نجات کا راستہ تبلاتی ہے۔ ہم تو اسے مان چکے یہ نا ممکن ہے کہ اب ہم خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت کریں۔

پھر جنات اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ ہمارے رب کی قدرت اور اس کا امر بہت بلند و بالا بڑا ذی شان اور ذی عزت ہے، اس کی نعمتیں، قدرتیں اور مخلوق پر مہربانیاں بہت ہیں، اس کی جہالت و عظمت بلند پایہ ہے۔ اس کا جلال و کرام بہت بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ اس کا ذکر بلند مرتبہ ہے۔ اس کی شان اعلیٰ ہے۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضؓ سے منقول ہے کہ جدّ کہتے ہیں باپ کو اگر جنات کو علم ہوتا کہ انسانوں میں جدّ ہوتا ہے۔ تو وہ خدا کی نسبت یہ بات نہ کہتے۔ یہ قول گو سنداً قوی ہے۔ لیکن اس کا کوئی مطلب سمجھ

میں نہیں آتا ممکن ہے کہ اس کے کچھ اجزاء ہوں جو چھوٹ گئے ہوں کیوں کہ یہ قول اس طور پر بے ربط ہو گیا ہے واللہ اعلم! ۔ پھر اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس سے پاک اور برتر ہے۔ کہ اسکی بیوی ہو یا اسکی اولاد ہو، پھر کہتے ہیں کہ شیطان خدا پر جھوٹ تہمت رکھتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہو یعنی جو شخص خدائے تعالیٰ کی اولاد یا بیوی ثابت کرتا ہے، بے عقل ہے جھوٹ بکتا ہے باطل عقیدہ رکھتا ہے اور ظالمانہ بات منہ سے نکالتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ ہم تو اسی خیال میں تھے کہ جن و انس خدا پر جھوٹ نہیں باندھ سکتے۔ لیکن قرآن سنکر معلوم ہوا کہ دونوں جماعتیں رب العالمین پر تہمت رکھتی تھیں، دراصل خدا تعالیٰ کی ذات اس عیب سے پاک ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ جنات کے زیادہ بہکنے کا سبب یہ ہوا کہ وہ دیکھتے تھے کہ جب کبھی انسان کسی جنگل یا ویرانے میں جاتے ہیں تو جنات کی پناہ طلب کیا کرتے ہیں۔ جیسے کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب کی عادت تھی کہ جب کبھی کسی بڑاؤ پر اترتے تو کہتے کہ اس جنگل کے بڑے جن کی پناہ میں ہم آتے ہیں اور سمجھتے تھے کہ ایسا کہنے کے بعد تمام جنات کے شر سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

مثلاً جس طرح کسی بڑے شہر میں جاتے تو وہاں کے بڑے رئیس کی پناہ لیتے تاکہ شہر کے اور دشمن لوگ انھیں ایذا نہ پہونچائیں۔ جنوں نے جب یہ دیکھا کہ انسان بھی ہماری پناہ لیتے ہیں تو ان کی سرکشی اور بڑھ گئی اور انھوں نے اور بری طرح انسانوں کو ستانا شروع کر دیا، اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جنات نے یہ حالت دیکھ کر انسانوں کو اور خوف زدہ کرنا شروع کیا اور انھیں طرح طرح سے ستانے لگے، دراصل جنات انسانوں سے ڈرا کرتے تھے۔ جیسا کہ انسان جنوں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہاں تک کہ جس جنگل و بیابان میں انسان جا پہنچتا تھا تو وہاں سے جنات بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن جب سے اہل شرک نے خود ان سے پناہ مانگنی شروع کی اور کہنے لگے، کہ اس وادی کے سردار جن کی پناہ میں ہم آتے ہیں اس سے کہ ہمیں یا ہماری اولاد و مال کو ضرر نہ پہنچے، اب جنوں نے سمجھا کہ یہ تو خود ہم سے ڈرتے ہیں تو ان کی جرأت اور بڑھ گئی اور اب انھوں نے طرح طرح سے ڈرانا، ستانا، چھیڑنا، شروع کر دیا، وہ گناہ اور سرکشی میں اور بھی بڑھ گئے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنات آسمانوں پر جاتے کسی جگہ بیٹھتے اور کان لگا کر فرشتوں کی باتیں سنتے، اور پھر آکر کاہنوں کو خبر دیتے تھے۔ اور کاہن ان باتوں کو بہت کچھ بڑھا چڑھا کر اور ایک میں سو جھوٹ ملا کر اپنے ماننے والوں سے کہتے۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور آپؐ پر قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تو آسمانوں پر زبردست پہرے بٹھا دیے گئے۔ اور ان شیاطین کو پہلے کی طرح وہاں جا بیٹھنے اور باتیں اڑا لانے کا موقع نہ رہا تاکہ قرآن کریم اور کاہنوں کا کلام خلط ملط نہ ہو جائے اور حق کے متلاشی کو دقت واقع نہ ہو یہ مسلمان جنات اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ پہلے تو ہم آسمان پر جا بیٹھتے تھے، مگر اب تو سخت پہرے لگے ہوئے ہیں اور آگ کے شعلے تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے چھوٹ کر آتے ہیں کہ خطا ہی نہیں کرتے۔ جلا بھسا دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں بمقام نخلہ ٹھہرے اور صبح کی نماز -- جماعت سے پڑھانے

کھڑے ہوئے، شہر نصیبین کے ۹ جن جو اس تلاش میں نکلے ہوئے تھے کہ ان پر آسمانی خبریں بند ہونیکا
کیا سبب ہے۔ یہاں بھی آنکلے۔ آپ سے قرآن سنکر ششدر رہ گئے۔ اور کان دھیان لگا کر سننے لگے۔ جب
سُن چکے تو کہنے لگے، واللہ یہ ہی چیز ہے جس سے ہم کو اوپر رسائی نہیں ہوتی۔ یہ خود بھی ایمان لائے اور قوم
کو جا کر ہدایت کی۔

اس واقعہ کی خبر اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتا ہے۔ اور سورہ احقاف
میں بھی اسی واقعہ کیطرف اشارہ تھا۔ اس کے بعد پھر ان جنوں کی قوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں مکہ میں آئی اور آپ عبداللہ بن مسعودؓ کو لیکر شب میں جنگل میں تشریف لے گئے اور جنوں کو
رات بھر تلقین وتعلیم فرماتے رہے، پھر ایک بار جن مدینہ منورہ میں بھی حاضر ہوئے تھے۔

بخاری ومسلم وغیرہ محدثین نے بسند صحیح نقل کیا ہے۔ اے محمدؐ کہہ دیجئے کہ مجھے وحی سے بتایا گیا
کہ چند جن قرآن سُن گئے اور سُن کر اپنی قوم سے آکر کہنے لگے، ہم نے قرآن سنا نا عجیب ہے کہ کوئی بشر یا
جن ایسا کلام بنا نہیں سکتا، وہ راہِ حق بتاتا ہے۔ اس پر ایمان لائے۔ غرضیکہ اس طوفان بے تمیزی میں
دنیا ڈوبی ہوئی تھی۔ اور ارواح بشریہ کی ترقی روئے زمین پہ پتھر حائل تھا۔ اب خدائے پاک کی رحمت نے
جلوہ کیا اور دنیا کو اس ورطۂ ضلالت سے بچانا چاہا تو سرِ عرب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث
کیا، اور آپؐ کی بعثت سے کسی قدر اوّل ہی جنوں کی دشاہی چھین لی اور ان کے کرشموں کو روک دیا اور
جب آفتاب جلوہ گر ہونے کو ہوتا ہے۔ تو رات کے چمر صبح صادق سے پہلے چھپنے لگتے ہیں اس لئے جنوں پر عالم
بالا کے اسرار بند کئے گئے۔ اب جو اوپر جاتے ہیں تو شہاب ثاقب سے مار کر نکالے جاتے ہیں۔ اپنے کاہنوں
کو کوئی خبر لاکر نہیں لاکر دیتے۔ بلکہ شرمندگی کے مارے ان کے پاس آنا بھی کم دیا، ادھر جہاں جہاں ۱۰۰ ان
شیاطین کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے بھی الوداع کہہ کر چلنے لگے۔ چنانچہ صحیح روایات سے یہ
ثابت ہوا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ کتابوں میں موجود ہے کہ عمر بن الخطاب رضؓ فرماتے ہیں۔ ایام جاہلیت میں اپنے
بتوں کے پاس میں حاضر تھا کہ ایک شخص نے آکر بت پہ گائے ذبح کی جو اس کی نذر کے لئے لایا تھا۔ اس بت
کے پیٹ میں سے یہ آواز اس درجہ بلند ہوئی کہ سب نے سُنی وہ کون تھا۔

یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا الٰہ الا اللہ (اے مرد قوی ایک بات پیش آئی کہ جس میں کامیابی
ہے۔ کہ ایک شخص بآواز بلند کہہ رہا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ کوئی معبود نہیں اللہ تعالیٰ کے سوا، امیر المومنین فرماتے
ہیں کہ لوگ یہ آواز سُن کر بھاگ گئے میں وہیں بیٹھا رہا کہ اس آواز کی حقیقت دریافت کروں، دوبارہ پھر
وہ ہی آواز بلند پیدا ہوئی۔ تیسری بار پھر وہ ہی آواز بلند ہوگی اب تک کہ میں حیرت میں تھا کہ لوگوں نے
مجھے خبر دی کہ اس جگہ ایک پیغمبر ظاہر ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ تعلیم فرماتا ہے۔

اسی طرح مجاہد رحؒ دوسرے شخص کا واقعہ نقل کیا ہے اسی طرح بیہقی رحؒ نے سواد ابن قارب کا قصہ
نقل کیا ہے کہ ایام جاہلیت میں ایک جن میرا یار تھا آئندہ کی خبریں بتلایا کرتا تھا۔ میں لوگوں سے کہتا خوب
چڑھتا آتا تھا۔ ایک رات میرے خواب میں آکر کہا اٹھ اور ہوشیار ہو کر کچھ شعور ہے ایک پیغمبر لوی بن غالب
کی نسل سے پیدا ہوا ہے سواد کہتے ہیں برابر تین راتوں مجھے یہ معاملہ پیش آیا۔ آخر میں مکہ میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں آکر مشرف باسلام ہوا اسی طرح اور بھی روایات ہیں۔

یہاں تک تو ان ایماندار جنوں کا کلام اپنی قوم کے سامنے توحید اور حشر کے مسئلہ میں تھا اس کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت کرنے کیلئے ایک تمہید بیان کرتے ہیں تا کہ قوم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

فقالوا وانا لمسنا السماء فوجدناها ملئت حرسا شدیدا کہ ہم نے آسمان جا چھوا یعنی اسرار آسمانی کی بہت تلاش کی اور بہت بلند اڑ کر گئے گویا کہ آسمانوں کو چھو لیا اور وہاں تک پہنچ گئے تو وہاں بے شمار پہرے چوکی والے پاسبان پائے جو اسرار آسمانی سننے سے منع کرتے ہیں۔ وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع، اور اس سے پہلے تو ہم اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا بیٹھتے، اور آسمانوں کے ملائکہ کی باتیں سننے اور کاہنوں کو لا کر دیتے اور اپنی غیب دانی اور خدائی کا سکہ جمایا کرتے تھے فمن یستمع الآن یجد له شهابا رصدا! پھر اب جو کوئی سننے لئے جاتا ہے۔ تو اپنے لئے ایک انگارا تیار اور نگہبان پاتا ہے۔ جو اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔

حاصل یہ کہ پہلے تو یہ حال تھا کہ عالم بالا کے اسرار ہم حاصل کر لاتے تھے۔ اور اب یہ دروازہ بند ہو گیا یہ ایک بڑا حادثہ ہے۔ وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بهم ربهم رشدا، اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سے خدا نے اپنے بندوں کی بھلائی چاہی یا برائی۔ اس بات کو فہم مخاطبین پر چھوڑ کر یہ کہلانا منظور ہے کہ خدا نے بندوں کی بہتری چاہی، کہ جنوں کے بیجا تسلط اور باطل خدائی کو پست کر کے ایک ایسے شخص کو برپا کیا جو نور ہدایت کی شمع ہاتھ میں لے کر اٹھا ہے۔ جنوں کے لئے اس سے بڑھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر اور کوئی دلیل ہو نہیں سکتی کہ انہوں نے آسمانی اسرار کا بند ہونا وغیرہ امور بظہور نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دیکھ لیا، اور اس کلام میں طریقہ ادب کہاں تک ملحوظ رکھا ہے کہ شر کی نسبت خدا پاک کیطرف نہیں کی بلکہ صیغہ مجہول بولا گیا۔ اور رشد کو خدا کی طرف منسوب کر دیا تا کہ معلوم ہو کہ وہ اپنے بندوں کی رہنمائی اور بہتری چاہا کرتا ہے اور شر کے مقابلہ میں خیر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر خیر عام تھی۔ اس کا جو فرد کامل یہاں مقصود تھا۔ اسی کا ذکر کیا تا کہ معلوم ہو کہ اصل خیر رشد ہے۔

آفرین ہے ان صاحبوں پر کہ جن کے دماغ نے ایک صحبت ہادی برحق سے ایسی ترقی کی اور افسوس ہے ان عقلمند آدمیوں پر کہ وہ اندھیرے گڑھے سے باہر نہیں نکل سکتے، اور اس طوفان بے تمیزی میں مبتلا ہو گئے

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ

اور ہم میں (پہلے سے بھی) بعض نیک (ہوتے آئے) ہیں اور بعض اور طرح کے (ہوتے آئے) ہیں۔ ہم مختلف طریقوں پر تھے،

قِدَدًا ۝ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ

اور ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ) ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین (کے کسی حصے) میں (جا کر) اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ

لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۝ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ

(اور کہیں) بھاگ کر اسکو ہرا سکتے ہیں۔ اور ہم نے جب ہدایت کی بات سن لی تو ہم نے اس کا یقین کر لیا۔

فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝

سو ہماری طرح) جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آویگا تو اسکو نہ کسی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا -

وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ

اور ہم میں بعضے تو مسلمان (ہو گئے) ہیں اور بعضے ہم میں (بدستور سابق) بے راہ ہیں سو جو شخص مسلمان ہو گیا اُنھوں

فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا

نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا - اور جو بے راہ ہیں دوزخ کے

لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝

ایندھن ہیں -

تفسیر جنات اپنی قوم کا اختلاف بیان کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم میں نیکو کار بھی ہیں اور بدکار بھی ہیں ہم مختلف راہوں پر لگے ہوئے تھے، پھر اس کا فیصلہ کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر بجز نبوت اور الہام الٰہی کے کون کر سکتا ہے

حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جن ہمارے پاس آیا کرتا تھا میں نے اس سے ایک مرتبہ پوچھا کہ تمام کھانوں میں تمہیں کون سا کھانا پسند ہے - اس نے جواباً کہا کہ چاول میں نے لا دیئے تو دیکھا کہ لقمہ برابر اٹھ رہا ہے - لیکن کھانے والا کوئی نظر نہیں آتا - میں نے پوچھا کہ جو خواہشات ہم میں ہیں کیا وہ تم میں بھی ہیں؟ اس نے جواباً کہا کہ ہاں ہیں -

ابن عساکر میں ہے کہ حضرت عباس بن احمد دمشقی رح فرماتے ہیں کہ میں نے رات کے وقت ایک جن کو اشعار میں یہ کہتے سُنا کہ دل خدا کی محبت سے پُر ہو گئے ہیں - یہاں تک کہ مشرق، مغرب میں اس کی جڑیں جم گئیں ہیں - اور وہ حیران و پریشان اِدھر اُدھر خدا کی محبت میں پھر رہے ہیں - جوان کا رب ہے انھوں نے مخلوق سے تعلقات کاٹ کر اپنے تعلقات خدا سے وابستہ کر لئے ہیں، ہمیں معلوم ہو چکا کہ خدا کی قدرت ہم پر حاکم ہے - ہم اس سے بھاگ کر نہ بچ سکیں گے، اب فخریہ کہتے ہیں ہم تو ہدایت نامے کو سنتے ہی اس پر ایمان لا چکے، فی الواقع ہے بھی یہ فخر کا مقام اس سے زیادہ شرف اور فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ رب کا کلام فوری اثر کرے -

ہم کو یقین ہو گیا ہے کہ جن گو قوی اور زبردست اور جاہل دماغ انسانوں پر حکمراں ہیں، مگر خدا تعالیٰ کے آگے کچھ حقیقت اور زور نہیں رکھتے صرف آسمانی رازہی کے بند کرنے پر دیکھ لیا کہ کسی کی تدبیر اور زور کارگر نہیں ہوا - اوپر چڑھتے ہیں تو انگارے برستے ہیں - پھر جو تم نے اس کے طریقہ کے خلاف کیا اور ہم پر اس کا قہر نازل ہوا تو ہم اس کے بس سے نہیں نکل سکیں گے - اور نہ بھاگ کر کہیں پناہ گزین ہو سکیں گے

اس لئے نبی آخر الزمان کا ماننا ضرور ہوا۔ اب اے قوم تم مانو۔ لیکن ہم نے جب ہدایت یعنی قرآن سن لیا تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ پھر جو تم میں کوئی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا تو اس کو دنیا و آخرت میں کسی نقصان کا خوف نہ رہے گا۔ نہ اس کو خداوندی انتقام وسزا کا ڈر باقی رہے گا۔
اب رہی یہ بات کہ قوم کی حالت یکساں ہے تاکہ عذاب و ثواب میں سیکھے جاویں، سو یہ تو ہرگز نہیں اس لئے کہ ہم میں سے اس کے فرمانبردار بھی ہیں اور جفاکار بھی ہیں۔ پھر دونوں مساوی کیونکر ہو سکتے ہیں، پھر طورہ قوم میں سے ایک گروہ پر مصائب دنیا و آخرت کا نازل ہونا یقینی ہے۔ پھر اس کے بچاؤ کا ادراکی عدالت سے رستگاری کا یہی قانون ہے کہ جو ایمان لے آیا اور اس کا حکم بردار ہو گیا، تو اس نے دنیا و آخرت کے لئے عمدہ صحیح راستہ تلاش کر لیا، اور ہر ایک مصیبت سے بچنے کے لئے امن الٰہی کا مستحکم قلعہ ڈھونڈ لیا، اور جو جفاکار و بدکار رہے ایمان نہ لائے آخر وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۝

اور مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی کہ) اگر یہ (مکہ والے) لوگ (سیدھے) رستہ پر قائم ہو جاتے تو ہم ان کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے

لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ

تاکہ اس میں ان کا امتحان کریں۔ اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان و طاعت) سے روگردانی کرے گا　الله تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں

عَذَابًا صَعَدًا ۝ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ

داخل کرے گا۔　اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جتنے سجدے ہیں وہ سب الله تعالیٰ کا حق ہیں، سو

اللّٰهِ اَحَدًا ۝ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ

الله کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو اور جب خدا کا خاص بندہ (مراد رسول الله صلی الله علیہ وسلم ہیں) خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ کافر

كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝

تو یہ کافر لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو ہو جاتے ہیں۔

تفسیر جنوں کا کلام نقل کر کے جو آنحضرت صلی الله علیہ وسلم کو وحی کے طور پر بتلایا گیا تھا، تین اور باتیں ارشاد فرمائی ہے کہ اے محمد صلی الله علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دو کہ جس طرح مجھے جنوں کا کلام وحی کے طور پر بتلایا گیا ہے یہ باتیں اور بھی وحی کی گئیں ازانجملہ یہ کہ:-
وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقینٰھم ماءً غدقا لنفتنھم فیہ ط ومن یعرض عن ذکر ربہ یسلکہ عذابا صعدا ہ کہ اگر لوگ سیدھے رستے پر قائم رہیں تو ہم ان کو بہت پانی پلائیں یعنی مال و اولاد کھیتی باڑی، تندرستی، عافیت عطا کریں۔ اور جو ہماری یاد سے منہ موڑے گا۔ ہم سے توڑ کر شیاطین سے جوڑے گا۔ تو ہم

اس کو سخت عذاب میں داخل کریں گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اس جملہ میں یہ بھی بتلایا گیا کہ جن داخل اطاعت الٰہی اور نیک چلنی پر مامور ہیں، نیکی کی جزا اور بدی کی سزا پاتے ہیں، پھر ان میں شان معبودیت کیا ہے اور ان کی پرستش محض بیجا ہے۔ استقاموا کے جملہ میں بعض مفسرین کہتے ہیں جنوں کی طرف ضمیر پھرتی ہے اس لئے کہ انھیں کا ذکر چلا آتا ہے اور انھیں کی حقیقت کا اظہار بھی مقصود ہے کہ اے مشرکین تمہارے معبود مامور و محکوم ہیں۔

بعض کہتے ہیں آدمیوں کی طرف ہے اس لئے اہل مکہ اس وقت سات برس کے قحط میں مبتلا تھے پانی اور رزق کی تنگی سے جان لبوں پر آرہی تھی۔ ان کو تلایا جاتا ہے کہ یہ تمہاری بُت پرستی اور حول سے مدد مانگنے اور بدکاری کا نتیجہ بد ہے اگر تم راستی اختیار کرتے اور ہمارے آگے جھکتے تو ہم تم کو بہت پانی پلاتے اور ارزانی کرتے، لیکن یہ بھی تمہاری آزمائش کے لئے کہ شکریہ کرو نہ کہ اترا کر سرکشی کرو۔

(۲) ربیع بن انس، زید بن اسلم اور ابن کیسان وغیرہ کہتے ہیں کہ آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کفار اگر اپنے اس طریقہ کفر پر رہتے۔ جس پر کہ ہیں اور سب کفار ہوتے تو ان کی آزمائش کے لئے دنیا میں ان کو فراخی دیتا اور پھر آخرت میں عذاب دیتا۔

(۳) یہ بات جو وحی کی گئی ہے وان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدًا، کہ سب عبادت گاہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اس کے سوا ان میں اور کوئی کیا پکارے جانے عبادت کے جانے کا مستحق نہیں، اسی کو پکارو۔

مساجد کے کئی معنیٰ ہیں۔ ایک تو مسجدیں عبادت گاہیں، گرجا، کنیسہ، مسجد اہل اسلام سب کو شامل ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی عبادت خانہ اس کے سوا اور کے لئے نہ ہونا چاہیئے۔

سعید بن جبیر رض کہتے ہیں۔ جنوں نے عرض کیا کہ آپ کے ساتھ کس طرح سے مسجد میں آکر نماز میں شریک ہوا کریں حالانکہ ہم دور دراز رہتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہر جگہ اس کے لئے عبادت ہو سکتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ تمام زمین میرے لئے عبادت گاہ بنائی گئی ہے کسی خاص جگہ پر منحصر نہیں سعید بن المسیب رض کہتے ہیں کہ مساجد سے مراد وہ اعضاء جو سجدے میں کام آتے ہیں۔ ہاتھ، پاؤں پیشانی، گھٹنے اور ناک کہ یہ نعمت الٰہی ہیں۔ اور کے لئے نہ جھکنے چاہئیں۔

بعض کہتے ہیں مساجد سے مراد سجدے ہیں کہ سجدہ اس کے سوا اور کے لئے نہ ہونا چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں یہ معنیٰ ہیں کہ مساجد خاص عبادت کے لئے ہیں اور کام وہاں نہ ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جو کوئی مسجد میں گم شدہ چیز کو ڈھونڈنے کے لئے آوے تو کہدو کہ خدا کرے نہ ملے اس لئے کہ مساجد اور کام کے لئے نہیں بنائی گئیں ہیں۔ ہر ایک معنیٰ آیت کریمہ میں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق معنی مراد لئے گئے ہیں۔

وانہ لما قام عبد اللّٰہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدًا کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسکی عبادت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو اس پر اژدہام کر لیتے ہیں۔ کون اژدہام کر لیتے ہیں اور کس لئے؟

اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ کفار مکہ جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اسی کو پکارتے دیکھتے

تو گرداگرد جمع ہو کر تمسخر کرتے تھے، اس بات کو خدا تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کو سنواتا ہے کہ یہ کیسی بات ہے اور ان کی عبادت کرنے والے پر تو یہ اژدہام اور تمسخر نہ ہو اور ہماری عبادت کرنے والے کے لئے یہ ہو، یہ بہت نازیبا اور ناحق شناسی ہے۔

بعض کہتے ہیں یہ مراد کہ جب ہمارا بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کو پکارنے قرآن مجید سنانے جنوں کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ اس کے سننے کے لئے ہر طرف سے آکر اژدہام کر لیتے ہیں۔ جیسا اس رات کو ہوا کہ جس رات آپ مکہ سے باہر عبداللہ بن مسعود کو لے کر جنوں کو قرآن سکھانے گئے تھے مگر اے قریش مکہ تم پر افسوس ہے کہ تم قرآن سے بھاگتے ہو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ○ قُلْ

آپ ان سے، یہ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ آپ یہ بھی کہہ دیجئے

اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ○ قُلْ اِنِّيْ لَنْ

کہ میں تمہارے نہ کسی کا ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا نخواستہ میں ایسا

يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○

کروں تو، مجھکو خدا کے غضب سے کوئی نہیں بچا سکتا، اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ (کی جگہ) پا سکتا ہوں۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

لیکن خدا کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغاموں کا ادا کرنا یہ میرا کام ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہیں مانتے تو

فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ○

یقیناً اُن لوگوں کے لئے آتش دوزخ ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، لیکن یہ کفار اس جہالت سے باز نہ آئیں گے۔

تفسیر کفار مکہ جب آپ کے ارد گرد قرآن شریف پڑھنے اور خالص اللہ کو پکارنے میں جمگھٹا کرتے تھے تو یہ بھی کہتے تھے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس بات سے باز آ اور ہمارے معبودوں کی ہجو نہ کر اور نہ ان کی پرستش سے منہ موڑ کیونکہ وہ نفع اور ضرر کے مالک ہیں۔ اور ہمارے معبود آپ کو مصائب سے پناہ دیں گے۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ قل ان کافروں سے کہہ انما ادعوا ربی میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور آئندہ بھی اسی کو پکاروں گا، ولا اشرک بہ احدا اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کروں گا۔ تمہارے معبود خواہ روحانیات ملائکہ ہوں یا جن ہوں، خواہ اس کے برگزیدہ لوگ ہوں نہ خواہ ستارے ہوں۔ خواہ خیالی چیزیں ہوں۔ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں۔ خواہ عناصر و نباتات و حیوانات ہوں کسی کو بھی اس کی خدائی میں کچھ بھی دخل نہیں وہ

چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی اس کا حکم ٹال نہیں سکتا۔ اور نہ اس کے حکم کے بغیر نفع وضرر دے سکتا ہے۔ میں بادجو دیکہ نبی مرسل ہوں۔ اور مراتب قرب میں اس نے میرے لئے اعلیٰ مرتبہ تجویز کیا ہے مگر میں بھی تمہارے ضرر یعنی گمراہی و رہنمائی کا مالک نہیں کہ جس کے لئے میں بھیجا گیا ہوں اور باتوں کا تو کیا ذکر ہے بالآخر سب سے وہ خود جس کو چاہتا ہے گمراہی اور ہدایت دیتا ہے۔

اور اسی لئے دنیا میں مجھے بھیجا ہے۔ اور یہ بھی کہدے، قل انی لن یجیرنی من اللہ احد کہ اگر میں اسکی نافرمانی کروں اور مجھ پر کوئی مصیبت آوے، تو خود مجھے اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر تمہارے معبود تو کیا پناہ دیں گے، جن کے بھروسہ پر تم... گمراہی میں پڑے ہو۔ الغرض میں بھی بشر ہوں اور جمیع مخلوقات خواہ وہ کوئی کیوں نہ ہو اسکی ذات وصفات، قدرت والوہیت میں شریک نہیں، اور جس قدر دنیا میں ہدایت کے لئے اس نے رسول بھیجے ہیں کسی چیز کے مالک نہیں کئے گئے الا بلاغا من اللہ و رسلاتہ۔ مگر اللہ تعالیٰ کے پیغام واحکام پہنچانے کے، جیسے اور جگہ ہے۔

یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک الخ۔ یعنی اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف جو تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اسے پہنچا دے۔ اور اگر تو نے یہ نہ کیا تو تو نے حق رسالت ادا نہ کیا۔ ہاں یہ ان کو اختیار دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ نبوت تبلیغ من اللہ ہے الوہیت میں نبی کو کوئی شرکت نہیں۔

اس کی ذات پاک سب سے ممتاز ہے بعض مفسرین نے الا بلاغا کا متعلق لا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اگر میں حکم پہنچانے میں کمی کروں تو مجھے اس کے عذاب سے بچنے کیلئے کوئی پناہ نہ ملے۔ ساتھ ہی اگر اپنے مولیٰ کریم کے ارشاد کے مطابق تعمیل کروں گا۔ تو میرا رب کریم مجھکو میرے دشمنوں سے بچالے گا اور نافرمانوں کے لئے ہمیشگی والی جہنم کی آگ ہے۔ جس میں سے وہ نہ نکل سکیں گے۔ اور نہ بھاگ سکیں گے، جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا کفر اور بت پرستی سے باز نہ آئیگا وہ ابداً جہنم میں جائے گا۔

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ

یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے۔ جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت جانیں گے، کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کی

نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا

جماعت کم ہے

آپ ان سے کہدیجئے۔ کہ مجھکو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا

تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ

ہے آیا وہ نزدیک آنے والی ہے۔ یا میرے پروردگار نے اس کیلئے کوئی مدت دراز مقرر کر رکھی ہے۔ (اور) غیب کا

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ

جاننے والا وہی ہے۔ سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو تو وہ اس طرح

رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ

اطلاع دیتا ہے کہ) اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے۔

رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ

اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ (ظاہری طور پر) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جاوے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے

وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝

پیغام (رسول تک محافظت سے) پہنچا دے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن (پہرہ داروں) کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اسکو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے

تفسیر ان نصائح اور دلائل کے بعد بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کفار مکہ سرکشی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین، اور ان کے گرد بیجا ہجوم اور جاہلانہ حرکتیں کرنے سے باز نہ آتے تھے، چونکہ اس وقت مسلمان بہت قلیل تعداد میں تھے لہذا اپنی قوت وشوکت کا گھمنڈ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مسلمانوں کو ایذائیں دیتے تھے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے محبوب تھے اس لئے ان کی امت بھی محبوب ہوئی لہذا ایماء نداء اور مومنوں کی تسلی اور کفار مکہ کی تنبیہ کے لئے فرمایا گیا۔
حتی اذا راوا ما یوعدون فسیعلمون من اضعف ناصرا واقل عددا، کہ یہ لوگ اس وقت نہیں مانیں گے۔ کہ ان کو وہ چیزیں نہ دکھائی جائیں کہ جن کا ان سے وعدہ ہوا ہے۔ (یعنی دنیا کے ان کا قتل ومغلوب ہونا یا مرنے کے بعد عذاب اور مصائب کا دیکھنا یا قیامت جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے من اللہ بار بار ان سے وعدہ کیا تھا)
پھر جب یہ چیزیں دیکھ لیں گے۔ انھیں آپ معلوم ہو جائے گا کہ کس کی مدد کمزور اور قلیل ہے جب یہ مشرکین جن وانس قیامت والے دن ان خوفناک عذاب کو دیکھیں گے۔ تو اس وقت ان کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ کمزور مددگاروں والا اور بے وقعت گنتی والا کون ہے؟
یعنی مومن موحد یا مشرک، حقیقت یہ ہے کہ مشرکوں کا برائے نام بھی کوئی مدد کرنے والا اس دن نہ ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کے لشکر کے مقابلے میں ان کی گنتی بھی گویا کچھ بھی نہ ہوگی۔ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی، مگر پھر کیا فائدہ ہوگا، توبہ اور ایمان لانے کا وقت باقی نہ رہے گا۔ ان کو سن کر کفار مکہ تمسخر کی راہ سے کہنے لگے کہ ان چیزوں کا کہ جن کا آپ ہم سے وعدہ کرتے ہیں یعنی عذاب و مصائب کون وقت ہے ٹھیک وقت بتلائے یہ سوال محض جاہلانہ اور انتہائی گستاخانہ ہے۔ کیونکہ کلیہ ہے کہ جو امر بالیقین جبکہ یقینی ہو تو اس کا وقت دریافت کرنے سے کیا فائدہ بلکہ اس سے بچنے کی تدابیر میں مصروف

ہونا موجب تشمیری اور دلیل سعادت ہے کیونکہ اگر وقت کا تعین کر دیا جائے تو فطرت انسانی ہے کہ یہ سوچتا ہے کہ ابھی تو بہت موقع ہے جب وقت آئے گا۔ تو اس کی تدابیر کریں گے اور یہ نہیں خیال کرتا کہ زندگی موت کا علم صرف اس ذات باری کو ہے۔ ایک شخص کل کی بابت کوئی ارادہ کرتا ہے مگر رات کو ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے وقت نہ بتایا گیا۔ جو اس سے پہلے ان کے نڈر ہونے کا باعث بنتا بلکہ اپنے نبی کو کہہ دیا۔ قل ان ادری اقریب ما توعدون ام یجعل لہ ربی امدا کہ لوگوں سے کہہ دو قیامت کب ہوگی۔ اس کا مجھے علم نہیں بلکہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا وقت قریب ہے یا دور ہے یا پروردگار اس کو دیر میں بھیجے گا۔ یہ جواب سعادتمندوں کے لئے اطمینان بخش مستعدی اور سرگرم عمل رہنے کا باعث ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے

عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدا وہ ہی غیب کی باتیں جاننے والا ہے ہر آئندہ آنے والی بات کا وقت اسی کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہے۔ اس لئے وہ اپنے غیب پر کسی کو واقف نہیں کرتا، کیونکہ یہ اسی کا خاصہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے اس امر کی کہ اکثر جاہلوں میں جو مشہور ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زمین کے اندر کی چیزوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہے۔ اس روایت کی کوئی اصل نہیں محض جھوٹ ہے۔ اور بالکل بے اصل روایت ہے ہاں اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے قائم ہونے کا وقت پوچھا جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معین وقت سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے تھے ایک مرتبہ اعرابی کی صورت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بھی آکر جب قیامت کے بارے میں سوال کیا تھا تو آپ ؐ نے صاف فرما دیا تھا کہ اس کا علم نہ پوچھنے والے کو ہے اور نہ اسے ہے جس سے پوچھا جاتا ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک دیہات کے رہنے والے نے بآواز بلند آپ ؐ سے دریافت کیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کب آئے گی؟ آپ ؐ نے فرمایا وہ آئے گی ضرور اور تبا کہ تو نے اس کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے؟

اس نے کہا میرے پاس روزے نماز کی کثرت تو نہیں البتہ اللہ اور رسول ؐ کی محبت ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ پھر تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کسی حدیث سے اس قدر خوش نہیں ہوئے۔ جتنے اس حدیث سے ہوتے ہیں، اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ قیامت کا ٹھیک وقت آپ ؐ کو معلوم نہ تھا۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر تم کو کچھ علم ہے تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کیا کرو خدا کی قسم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ایک وقت آنے والی ہے۔ یہاں بھی آپ ؐ اس کا کوئی مقررہ وقت نہیں تلاتے

ابوداؤد میں کتاب الملاحم کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو کیا عجب ہے کہ آدھے دن تک کی مہلت دیدے، ایک اور روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ حضرت سعد رح سے پوچھا گیا۔ کہ آدھے دن سے کیا مراد ہے؟

فرمایا ۵۰۰ (پانچ سو) سال

جیسے اور جگہ ہے ولا یحیطون بشیٔ من علمہ الا بما شاء یعنی اس کے علم میں سے کسی چیز کو نہیں

سے (یعنی معلوم کر سکتے) مگر جو خدا چاہے، یعنی رسول خواہ انسانوں میں سے ہوں خواہ فرشتوں میں سے ہوں۔ جیسے خدا جتنا چاہتا ہے بتلا دیتا ہے بس وہ اتنا ہی جانتے ہیں
پھر آگے فرمایا الا من ارتضیٰ من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہ رصدا مگر جب پسندیدہ اور برگزیدہ رسول کو چاہتا ہے واقف کر دیتا ہے۔ اور اس کو بھی احتیاط اور حفاظت سے واقف کر دیتا ہے۔ کہ اس رسول کے آگے پیچھے یا اس غیب کی بات کے آگے اور پیچھے ملائکہ کی ایک چوکی مقرر کرتا ہے جو اس کو شیاطین کے لئے اچکنے سے بچاتے ہیں یعنی خداوندی غیب کا خزانہ جب رسول کے پاس آتا ہے تو اس کے آگے پیچھے فرشتوں کا باڈی گارڈ کا ایک رستہ ہوتا ہے تاکہ کوئی شیطان جن اس غیب کی بات سے کچھ واقف نہ ہو جائے وہ ملائکہ شیاطین کو مار بھگاتے ہیں۔ اور یہ کس لئے
لیعلم ان قد ابلغوا رسلٰت ربھم واحاط بما لدیھم و احصیٰ کل شیءٍ عددًا۔ تاکہ خدا تعالیٰ معلوم کرے کہ فرشتوں نے رسول تک بحفاظت اس کے احکام پہنچا دئے کہ یہ فرشتوں کی چوکی معین کرنا اور حفاظت اس غیب کا رسولوں تک پہنچنا ایک عادت اللہ کے موافق ہے ورنہ اس کے احاطہ علمی میں ہے جو کچھ بندوں کے پاس ہے کوئی بات اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ اور علم بھی کیسا علم کہ اس نے ہر ایک چیز کو گن رکھا ہے، دریا کے قطرے ریگستان کے ذرے، درختوں کے پتے ہر ایک کی گنتی۔ اور تعداد اس کو معلوم ہے۔ یہ کمال احاطہ علمی کی علامت ہے
ولیعلمن اللہ الذین امنوا الخ، یعنی اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اور منافقوں کو برابر جانا کرے گا (کہ مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں) اور ابھی اسی قسم کی آیتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا پہلے ہی سے جانتا ہے لیکن اسے ظاہر کر کے بھی جان لیتا ہے۔ اسی لئے یہاں اس کے بعد ہی فرمایا کہ ہر چیز اور سب کی گنتی خدا کے علم کے احاطہ میں ہے۔

سُورَۃُ المزَّمِّل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ○ نِّصْفَہٗٓ اَوِ

اے کپڑوں میں لپٹنے والے　رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات (کہ اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو)

انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ

یا اس نصف سے کسی قدر کم کر　یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (کہ ایک ایک حرف

تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ

الگ الگ ہو) ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں (مراد قرآن مجید ہے۔ بیشک رات کے اٹھنے میں دل اور

اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ

زبان کا خوب میل ہوتا ہے۔ اور دعا ہو یا قرأت ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔ بیشک تم کو دن میں بہت

فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ

کام رہتا ہے (دنیوی بھی اور دینی بھی) اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو، اور سب سے قطع کرکے

تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

اسی کی طرف متوجہ رہو، وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝

قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کر دینے کے لئے قرار دیے رہو،

تفسیر:- یہ سورہ بھی مکہ میں نازل ہوئی بیہقی اور ابن مردویہ وغیرہ محدثین نے ابن عباس رض وابن زبیر رض سے نقل کیا ہے کہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتا ہے کہ راتوں کے وقت کپڑے لپیٹ کر سو رہنے کو چھوڑ دیں اور تہجد کی نماز کے قیام کو اختیار کر لیں جیسے فرمان ہے۔ ان کی کروٹیں بستروں سے الگ ہوتی ہیں اور اپنے رب کو خوف اور لالچ سے پکارتے ہیں، اور ہمارے دئے ہوئے میں سے دیتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوری عمر اس حکم کی بجا آوری کرتے رہے، تہجد کی نماز صرف آپ پر واجب تھی یعنی امت پر واجب نہیں ہے۔ جیسے اور جگہ ہے۔ ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک الخ۔ راتوں کو تہجد پڑھا کر یہ حکم فضل کے طور پر صرف تجھے ہے۔ تیرا رب تجھے مقام محمود میں پہنچانے والا ہے۔ یہاں اس حکم کے ساتھ ہی مقدار بھی بیان فرمادی۔ کہ آدھی رات یا کچھ کم و بیش، مزمل کے معنی سونے والے اور کپڑا لپیٹنے والے کے ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اے قرآن کے اچھی طرح سے لپیٹنے والے تو آدھی رات تک تہجد میں مشغول رہا کر۔ یا کچھ بڑھا گھٹا دیا کر۔ اور قرآن شریف کو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کر تاکہ خوب سمجھا جائے۔ اس حکم کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم عامل تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رض کا بیان ہے کہ آپ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے بڑی دیر میں سورہ ختم ہوتی تھی۔ گویا چھوٹی سی سورۃ بڑی سے بڑی ہو جاتی تھی۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انس رضہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی کیفیت معلوم کی گئی۔ تو آپ فرماتے تھے کہ خوب مد کھینچکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ یہ حدیث مسند احمد ابوداؤد، اور ترمذی میں بھی ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کے قاری سے قیامت کے دن کہا جائیگا پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ترتیل سے پڑھ جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا۔ تیرا درجہ وہ ہے۔ جہاں تیری آخری آیت ختم ہو، یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں بھی ہے۔ اور امام ترمذی رح اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے مزین کر، اور وہ شخص ہم میں سے نہیں (مسلمان نہیں) جو خوش آوازی سے قرآن نہ پڑھے۔

اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اسے آل داؤد کی خوش آوازی عطا کی گئی ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمانا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سُن رہے ہیں تو میں اور اچھے گلے سے زیادہ عمدگی کے ساتھ پڑھتا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ کا یہ فرمان کہ ریت کی طرح قرآن کریم کو نہ پھیلاؤ اور شعروں کیطرح قرآن کریم کو بے تہذیبی سے نہ پڑھو، اس کے عجائب پر غور کرو اور دلوں میں اتر لیتے جاؤ، اور اس کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ جلد سورۃ ختم ہو (بغوی)

ایک شخص نے آکر حضرت ابن مسعود سے کہا کہ میں نے مفصل کی تمام سورتیں آج کی رات ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالیں، آپ نے فرمایا کہ پھر تو تونے شعروں کی طرح جلدی جلدی پڑھا ہوگا۔ مجھے وہ برابر برابر کی سورتیں خوب یاد ہیں جنھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ملاکر پڑھا کرتے تھے، پھر مفصل سورتوں میں سے بیس سورتوں کے نام لئے کہ ان میں سے دو، دو سورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ پھر خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تجھ پر عنقریب ایک عظیم بات اتاریں گے۔ یعنی عمل میں ثقیل ہوگی، اور اترتے وقت بوجہ اپنی عظمت کے گراں قدر ہوگی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتری اس وقت آپ کا گھٹنا میرے گھٹنے پر تھا وحی کا اتنا بوجھ پڑا کہ میں تو ڈرنے لگا کہ میری ران کہیں ٹوٹ نہ جائے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وحی کا احساس بھی آپ م کو ہوتا ہے؟ آپ م نے فرمایا میں ایسی آواز سنتا ہوں جیسے کسی زنجیر کے بجنے کی آواز ہو، اس وقت میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ جب بھی وحی نازل ہوتی ہے مجھ پر اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری جان نکل جائیگی۔ صحیح بخاری شریف کے شروع میں ہے کہ حضرت حارث بن ہشام پوچھتے ہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کبھی تو گھنٹی کی آواز کی طرح ہوتی ہے جو مجھ پر بہت بھاری پڑتی ہے۔، اور جب وہ گن گناہٹ کی آواز ختم ہو جاتی ہے تو اس دوران میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ مجھے خوب محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی فرشتہ انسانی صورت میں میرے پاس آتا ہے۔ اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ اور میں یاد کر لیتا ہوں اور حضرت عائشہ رضہ تو فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ سخت جاڑے والے دن میں بھی جب آپ م پر وحی اتر چکتی تو آپ م کی پیشانی مبارک پسینہ سے قطرے ٹپکتے تھے۔

مسند احمد میں ہے کہ کبھی اونٹنی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوتے اور اسی حالت میں وحی آتی تو اونٹنی جھک جاتی ، ابن جریر میں یہ بھی ہے کہ پھر جب تک وحی ختم نہ ہولیتی اونٹنی سے قدم نہ اٹھایا جاتا اور نہ اس کی گردن اونچی ہوتی ، مطلب یہ ہے کہ خود وحی کا اترنا بھی اہم اور بوجھل تھا - پھر احکام کا بجالانا اور ان کا خطبہ نازل بھی ایسا ہی تھا ، یہ قول حضرت امام ابن جریر رح کا ہے - حضرت عبدالرحمٰن سے منقول ہے کہ جس طرح دنیا میں ثقیل کام ہے - اسی طرح آخرت میں اجر بھی بھاری ملے گا -

پھر فرماتا ہے - رات کا اٹھنا نفس کو مغلوب کرنے کے لئے - اور زبان کو درست کرنے کیلئے اکسیر ہے - نشاء کے معنی حبشی زبان میں قیام کرنے کے ہیں - رات بھر میں جب اٹھے اسے ناشئۃ اللیل کہتے ہیں - تہجد کی نماز کی خوبی یہ ہے کہ دل وزبان ایک ہوجاتا ہے - اور تلاوت کے جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں دل میں گڑ جاتے ہیں - اور بہ نسبت ان کے رات کی تنہائی میں معنی مطلب خوب ذہن نشین ہوتا جاتا ہے - کیونکہ دن ، مشغولیت ، شور غل وفکر معاش کے لئے مخصوص ہوتا ہے -

حضرت انس رض نے اَقومُ قیلاً کو اَصوبُ قیلاً پڑھا تو لوگوں نے کہا ہم تو اقوم پڑھتے ہیں آپ نے فرمایا ، اقوم ، اصوب یہ الفاظ ہم معنیٰ ہیں -

پھر فرماتا ہے ان میں تجھے بہت فراغت ہے ، آرام کر سکتے ہو ، سو اور بیٹھ سکتے ہو ، راحت حاصل کر سکتے ہو - نوافل بکثرت پڑھ سکتے ہو - اپنے دنیوی کام پورے کر سکتے ہو - پھر رات کو آخرت کے کام کے لئے خاص کر لو ، اس بنا پر یہ حکم اس وقت تھا جب رات کی نماز فرض تھی - پھر اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان کیا اور بطور تخفیف کے اس میں کمی کردی اور فرمایا کہ تھوڑی رات قیام کرلیا اسی فرمان کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن اسلم رح نے اِنَّ رَبَّکَ سے فاقرؤا ما تیسر منہ تک پڑھا سر آیت ومن اللیل کی بھی تلاوت کی ، آپ کا یہ قول بھی ٹھیک ،

مسند احمد میں ہے کہ حضرت سعید بن ہشام رح نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ، اور مدینہ کیطرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں اپنے مکانات بیچ ڈالیں اور ان کی محبت سے ہتھیار وغیرہ خرید کر جہاد میں جائیں اور رومیوں سے لڑتے رہیں یہاں تک کہ یا تو روم فتح ہو یا شہادت نصیب ہو ، مدینہ شریف میں اپنی قوم سے لے - اور اپنا ارادہ ظاہر کیا - تو انھوں نے کہا سنو ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں آپ ہی کی قوم سے چھ شخصوں نے یہی ارادہ کیا تھا کہ عورتوں کو طلاق دے دیں مکانات وغیرہ بیچ ڈالیں اور ان کی قیمت سے ہتھیار وغیرہ خرید کر جہاد میں جائیں اور رومیوں سے لڑتے رہیں - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا کہ تو آپ نے ان سے فرمایا کہ جس طرح میں کرتا ہوں اسی طرح کرنے میں تمہارے لئے اچھائی ہے - اپنے اس ارادے سے باز آجاؤ ، یہ حدیث سن کر حضرت سعید رض نے بھی اپنا ارادہ ترک کردیا - اور وہیں اس جماعت سے کہا کہ تم گواہ رہنا میں نے اپنی بیوی سے رجوع کرلیا ہے ، اب حضرت سعید رض چلے گئے پھر جب اس جماعت سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ یہاں سے جانے کے بعد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اور ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر پڑھنے کی کیفیت دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ اس مسئلے کو سب سے زیادہ بہتر طور پر حضرت عائشہ رض بتلا سکتی ہیں - تم وہیں جاؤ اور انھیں سے دریافت کرو اور ان سے جو سنو وہ ذرا مجھ سے کہہ جانا -

میں حکم بن افلح رح کے پاس گیا اور ان کے ساتھ حضرت عائشہ رضؓ کے پاس گیا۔ ام المومنین رضؓ نے حضرت حکم رح کی آواز پہچان لی اور فرمایا کیا حکم رح ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں حضور میں حکم بن افلح ہوں۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے۔ جواب دیا گیا سعید بن ہشام، پوچھا ہشام کون؟ عامر رضؓ کے لڑکے، جواب دیا گیا ہاں عامر کے لڑکے، تو حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت عامر رضؓ کے لیے دعائے مغفرت کی اور فرمایا عامر رضؓ بہت اچھے آدمی تھے خدا ان پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کیا ام المومنین مجھے بتلائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارک کیا تھے؟

آپ نے فرمایا کہ! تم قرآن نہیں پڑھتے ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں؟ فرمایا بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ اب میں نے اجازت مانگنے کا قصد کیا لیکن فوراً ہی یاد آگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کا حال بھی دریافت کرلوں۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا کیا تم نے سورۃ المزمل نہیں پڑھی؟ میں نے کہا ہاں پڑھی ہے۔

فرمایا۔ سنو اس سورۃ کے اول حصے میں قیام لیل فرض ہوا اور سال بھر تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضؓ تہجد کی نماز بطور فرضیت کے ادا کرتے رہتے، یہاں تک کہ قدموں پر ورم آگیا، بارہ ماہ کے بعد اس سورہ کے خاتمہ کی آیتیں اتریں اور خداوند تعالیٰ نے تخفیف کردی۔ فرضیت اٹھ گئی۔ اور نفلیت باقی رہ گئی۔ پھر میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن خیال آیا کہ وتر کا مسئلہ بھی دریافت کرلوں تو میں نے کہا ام المومنین رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر پڑھنے کی کیفیت سے بھی آگاہ فرمائیے آپؓ نے فرمایا ہاں سنو! ہم آپؐ کی مسواک وضو کا پانی وغیرہ تیار کرکے ایک طرف رکھ دیا کرتے تھے۔ جب بھی خدا چاہتا اور آپ کی آنکھ کھلتی اٹھتے مسواک کرتے وضو کرتے اور آٹھ رکعتیں پڑھتے۔ بیچ میں تشہد میں بالکل نہ بیٹھتے، آٹھویں رکعت پوری کرکے آپؐ التحیات میں بیٹھتے اللہ تبارک تعالیٰ کا ذکر کرتے، دعا کرتے اور زور سے سلام پھیرتے کہ ہم بھی سن لیں۔ پھر بیٹھے ہی بیٹھے دو رکعتیں اور ادا کرتے، اور ایک ذرا بیٹا یہ سب ملکر گیارہ رکعتیں، پھر جب آپ عمر رسیدہ ہوگئے۔ اور بدن بھاری ہوگیا تو آپؐ نے سات وتر پڑھی۔ پھر سلام پھیرنے کے بعد دو رکعتیں ادا کیں، بس بیٹا یہ نو رکعتیں ہوئیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ جب کسی نماز کو پڑھتے تو اس پر مداومت فرماتے ہاں اگر کسی شغل یا نیند یا دکھ تکلیف درد بیماری کی وجہ سے رات کو نماز نہ پڑھ سکتے تو ان کو بارہ رکعت ادا فرمالیا کرتے، میں نہیں جانتی کہ کسی ایک رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا قرآن صبح تک پڑھا ہو اور نہ رمضان کے سوا کسی اور مہینے میں پورے روزے رکھے ہوں۔ اب میں ام المومنین سے رخصت ہوکر حضرت ابن عباس رضؓ کے پاس آیا اور وہاں کے تمام سوال و جواب دوہرا دیئے۔ آپ نے سب کی تصدیق کی اور فرمایا اگر میری بھی آمد و رفت ان کے پاس ہوتی تو جاکر خود اپنے کانوں سے سن آتا، یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں بھی ہے۔

ابن جریر میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بوریا رکھ دیا کرتی تھی۔ جس پر آپ تہجد کی نماز ادا فرمالیا کرتے تھے، لوگوں نے کہیں یہ خبر سن لی اور رات کی نماز میں حضور صلی اللہ کی اقتدا کرنے کیلئے وہ بھی آگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ برہم ہوکر باہر تشریف لائے، چونکہ آپؐ کو امت پر شفقت اور محبت تھی اور ساتھ ہی ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ نماز فرض ہو جائے

لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمانے لگے - کہ لوگو! ان ہی اعمال کی تکلیف اٹھاؤ جن کی تم میں طاقت
ہو اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں تھکے گا - البتہ تم عمل کرنے سے تھک جاؤ گے ، سب سے بہتر وہ عمل ہے جس پر
[illegible] سکے اور انسان اسے نبھا سکے ، ادھر قرآن کریم میں یہ آیتیں اتریں اور صحابہ رض نے قیام
لیل شروع کیا یہاں تک کہ رسیاں باندھنے لگے کہ نیند نہ آجائے - آٹھ مہینے اسی طرح گذر گئے ان کی اس
کوشش کو جو وہ خدا کی رضامندی کی طلب میں کر رہے تھے ، یہ دیکھ کر خدا نے بھی ان پر رحم کیا اور اسے
فرض عشاء کی طرف لوٹا دیا اور قیام لیل چھوڑ دیا گیا - یہ روایت ابن ابی حاتم میں بھی ہے لیکن اس کا
راوی موسیٰ بن عبیدہ زبیدی ضعیف ہے - اصل حدیث بغیر سورۃ مزمل کے نازل ہونے کے ذکر کے صحیح میں
بھی ہے - اور اس حدیث کے الفاظ سے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی - حالانکہ یہ سورۃ مکہ شریف
میں اتری ہے - اسی طرح اس روایت میں ہے کہ آٹھ مہینے کے بعد اس کی آخری آیتیں نازل ہوئیں - یہ قول بھی غریب
ہے - صحیح وہ ہے جو بحوالہ مسند گذر چکا کہ سال بھر کے بعد آخری آیتیں نازل ہوئیں -

حضرت ابن عباس رض سے بھی ابن ابی حاتم میں منقول ہے کہ سورۃ مزمل کی ابتدائی آیتوں کے اترنے
کے بعد صحابہ کرام رض مثل رمضان شریف کے قیام کرتے رہے - اور اس سورۃ کی اول آخر کی آیتوں کے
اترنے کے بعد صحابہ کرام رض نے سال بھر تک قیام کیا یہاں تک کہ ان کے قدم اور پنڈلیاں ورم آگئیں پھر
فاقرؤا ما تیسر منہ نازل ہوئی اور لوگوں نے راحت پائی -

حسن بصری رح کا بھی یہی قول ہے - ابن ابی حاتم میں بروایت حضرت عائشہ رض سولہ مہینے کی مدت منقول
ہے - حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں کہ ایک سال تک یا دو سال تک قیام فرماتے رہے - قدم اور پنڈلیاں سوج گئیں
پھر آخری سورت کی آیتیں اتریں - اور تخفیف ہو گئی - حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ دس سال کی مدت بتاتے
ہیں - (ابن جریر) میں حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ پہلی آیت کے حکم کے مطابق ایمانداروں نے قیام
لیل شروع کیا - لیکن بڑی مشقت پڑتی تھی - پھر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور علم ان سیکون سے ما تیسر منہ
روز آیتیں نازل فرما کر وسعت کر دی اور تنگی نہ رکھی -

حضور کا یہ فرمان ہے کہ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کر اور اس کی عبادت سے فارغ ہو جا - یعنی امور دنیا سے
فارغ ہو کر دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ بکثرت اس کا ذکر کر ، اس کی طرف مائل اور سراسر راغب ہو جا - جیسے
اور جگہ ہے - فاذا فرغت فانصب - یعنی جب اپنے شغل سے فارغ ہو تو ہماری عبادت محنت سے بجا لاؤ - ایک
حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبتل سے منع فرمایا یعنی بال بچے اور دنیا کو چھوڑ دینے سے یہاں
مطلب یہ ہے علائق دنیوی سے کٹ کر خدا کی عبادت میں توجہ اور انہماک کے وقت بھی ضرور نکالا کر وہ
ایک ہے وہ متصرف ہے مشرق و مغرب سب اسی کے قبضے میں ہیں - اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں
تو جس طرح صرف اس خدا کی عبادت کرتا ہے - اسی طرح صرف اس پر بھروسہ بھی رکھ اس کی ذات عبادت
اطاعت توکل اور بھروسہ کے لائق ہے -

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ○ وَ

اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو　اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ ۔　اور مجھ کو اور

ذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا ○

ان جھٹلانے والوں کو ناز و نعمت میں رہنے والوں کو (حالتِ موجودہ پر) چھوڑ دو (یعنی رہنے دو) اور ان لوگوں کو تھوڑے

اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا ○ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ

دنوں اور مہلت دیدو ۔ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے ۔　اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے

عَذَابًا اَلِیْمًا ○ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَ

جس روز کہ زمین اور پہاڑ　جس روز کہ زمین و پہاڑ ہلنے لگیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر)

كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِیْبًا مَّهِیْلًا ○

ریگ رواں ہو جائیں گے ،

تفسیر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی طعن آمیز باتوں پر صبر کرنے کی ہدایت کرتا ہے ۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ کہ ان کفار کی باتوں پر صبر کر ۔ کفار مختلف قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے اصحاب رضؓ کو برا کہتے اور گالیاں دیا کرتے تھے ۔ نیز دیوانہ ، احمق اور سخت باتیں بھی کہتے تھے ۔ جس سے جوش آتا اور درپے انتقام و مقابلہ ہونا ایک فطری بات ہے مگر اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا گیا ، کس لئے کہ اس سے عداوت قائم ہوتی ہے ۔ جس سے ہدایت کا دروازہ بند ہوتا ہے ۔ جو کچھ کہیں کہنے دو برا نہ مانو ، اپنا کام عبادت و ہدایت کا کئے جاؤ ۔

کفار اپنے بتوں کی مدح اور کرامات کے کرشمے اور آخرت کا انکار کر کے لوگوں کو توحید اور آخرت کے مفید اعمال حسنہ سے روکتے تھے ۔ ایسی باتوں پر خدا پرست طبائع کو غصہ آنا معمولی بات ہے مگر ابتدا میں ان کے جواب و مقابلے سے روکا گیا ۔ یہ فرمایا گیا کہ میں خود ان سے نمٹ لوں گا ۔ میرے غضب اور غصے کے وقت دیکھ لوں گا کہ کیسے یہ لوگ نجات پاتے ہیں ۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا اور ان بے وقوفوں کو اچھی طرح سے چھوڑ دے ۔ ہجر جمیل یہ ہے کہ کینہ نہ رکھے ، ان کو برائی اور ایذا پہنچانے کا قصد نہ کرے ، نہ گلہ و شکوہ کرے ۔ ہجو تو بہیں تو کجا ۔ جہاں تک ہو سکے بھلائی اور نصیحت سے بھی درگزر نہ کرے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جب یہ اخلاق حمیدہ کفار سے برتے تو پھر ان کے دلوں پر ایک ایسا اثر ہوا کہ روز بروز سیکڑوں اسلام کی طرف مائل ہونے لگے ، واعظ اسلام میں یہ باتیں شرط ہیں اگر ایسی طبیعت نہ ہو تو اسکو وعظ و ہدایت کی مسند پر

بلیمنار وا نہیں۔ کس لئے کہ بجائے ہدایت کے اس کے اخلاق اور منتقم طبیعت اور لڑنے والی زبان سے اور
بھی عداوت ہوکر لوگوں کو اپنی بری باتوں پر اصرار ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ اگر کسی مسئلے کو
سختی کے ساتھ دبایا جاتا ہے۔ تو اوّل تو وہ دبتا ہی نہیں اور اگر وہ بظاہر دب بھی جائے تو وہ مثل اسی
چنگاری کے ہوتا ہے جو راکھ میں دب جاتی ہے۔ اور جب اس کو کریدا جائے تو وہ جلا دینے کی پوری تاثیر رکھتی ہے
وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ کہ مالدار جھٹلانے والوں کو (یہاں مراد قریش مکہ ہے) چھوڑ دے
مجھ پر آپ ان کے لئے بد دعا بھی نہ کریں ومہلهم قلیلا اور ان کو تھوڑی مہلت بھی دیجئے، اوّل تو ایسے
گمراہ اور گمراہ کرنے والوں کو جو اپنے خداداد مال وجاہ کا شکر نہیں کرتے بلکہ اس کو خدا کے مقابلے میں صرف
کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو اکثر دنیا ہی میں سزا مل جایا کرتی ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد تو ضروری ملے گی اور یہ
چند روزہ مہلت ہے۔ اور وہ سزا کیا ہے؟

ان لدینا انکالا وجحیما وطعاما ذا غصۃ وعذابا الیما، کہ ان کے لئے ہمارے پاس بیڑیاں
تیار ہیں۔ اس لئے کہ ان پاؤں سے خدا کی راہ میں چل کر نہیں آتے تھے۔ اور ان پر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھتے
تھے۔ بلکہ فساد اور نفسانی خواہشوں کے لئے ان پیروں سے کام لیتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے آگ
جلانے والی بھی تیار ہے۔

یہ ان کے عشق ومحبت دنیا کی آگ ہے۔ اور نیز دین حق کے مقابلہ کی آگ ہے۔ اور شہوات اور
لذات کی آگ ہے۔ جو ان کے دلوں میں جلا کرتی ہے۔ یہ انہیں جلا کریں گے۔ اور کھانے میں ایسی چیز
دیا جائے گی۔ تو حلق میں جا کر اٹک جائے گی۔ نہ نگل سکیں گے۔ سخت کڑوا محسوس ہوگا۔ یہ ان کے دنیا میں
عمدہ عمدہ کھانوں کا بدلہ ہے۔ جو کھا کر شہوت پرستی اور بدکاری بو بدکاری کرتے تھے۔ اور نیز وہ بزرگان
دین کی نصیحتیں بھی ہیں جو ان کے گلا سے نیچے دل میں نہیں اترتی تھیں۔ اوپر ہی اوپر اڑا دیتے تھے، اور
یہ شہر دنیا سا ناچ ورنگ کھیل تماشے بھی نہیں کہ جن میں بری طرح مگن رہتے تھے۔ اور بہت مسرور
رہتے تھے۔ اور خدا سے دور رہتے تھے۔ وہ سب باتیں آج ان کے گلا گیر ہوں گی۔ اور طرح طرح کے
دردناک عذاب بھی ہیں۔ یہ سب سامان ان کے لئے تیار ہیں بس مرنے کی دیر ہے۔

اس چند روزہ زندگی میں جو کچھ کرنا ہے کر لیں اور یہ چیز بن پوری پوری ان کو کس دن ملیں گی
یوم ترجف الارض کہ جس دن زمین لرزنے وکانت الجبال کثیبا مہیلا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر
ریت کے ٹیلوں جیسے بن جائیں گے۔ یعنی یہ دن قیامت کا ہوگا۔ یعنی نہ زمین رہے گی اور نہ ہی پہاڑ ہر
چیز اپنی صحیح شکل کھو بیٹھے گی۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا

بیشک ہم نے تمہارے پاس ایک ایسا رسول بھیجا ہے۔ جو تم پر (قیامت کے روز) گواہی دیں گے،

جیسا کہ ہم نے فرعون

أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ

کے پاس ایک رسول بھیجا تھا۔

پھر فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا ہم نے اسکو

الرَّسُولَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ

سخت پکڑنا پکڑا۔ سو اگر تم (بھی بعد بھیجے

اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝ السَّمَآءُ

رسول کے نافرمانی اور) کفر کرو گے تو اس دن سے کیسے بچو گے جو (غایت درجہ اشتداد و امتداد سے) بچوں کو بوڑھا کر دیگا جس میں آسمان

مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ هٰذِهٖ

پھٹ جائے گا۔ بلاشک اس کا وعدہ ضرور ہو کر رہے گا یہ تمام مضمون) ایک (بلیغ)

تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝

نصیحت ہے، سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف رستہ اختیار کرے،

تفسیر قریش اپنے تکبر اور سرکشی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع نہیں ہوتے تھے۔ اور ان کو فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی معلوم تھا۔ اسی لئے ان آیات میں بتلایا جاتا ہے کہ ہم نے تمہارے پاس بھی ویسا ہی رسول بھیجا جیسا کہ فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ پھر اس نے سرکشی کی سزا پائی۔ غرق ہوا۔ پھر تم خود سوچ لو اور سمجھ لو کہ فرعون سے زیادہ مالدار اور صاحب حشمت و شوکت نہیں ہو ہم نے اسے بری طرح برباد کیا۔ اور سختی سے پکڑ لیا۔

یہاں مسئلہ نبوت پر بھی روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جب بدکاری اور بت پرستی کا بازار گرم ہو گیا اور فسق و فجور حد درجہ بڑھ گیا۔ تو ہدایت کے لئے نبی آیا جیسا کہ پہلے فرعون کے پاس موسیٰ علیہ السلام آتے تھے۔ تمہارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ فرماتا ہے۔ انا ارسلنا الیکم رسولاً ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا کیسا رسول۔ شاھداً علیکم تم پر تمہارے نیک و بد کاموں کی شہادت دینے والا یعنی وہ (رسول) خدا کی طرف سے گواہی دیتا ہے۔ کہ یہ کام برے اور ناپسند ہیں۔ اور یہ کام عمدہ اور قابل نجات ہیں۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ (رسول) قیامت میں تمہارے اوپر گواہی دے گا جو کچھ تم نے دنیا میں کیا اور کر رہے ہو وہ سچا گواہ آسمانی عدالت میں تم پر ثابت کر دے گا۔ اور تم کو ملزم ٹھہرائے گا۔ اگر برائی سے باز نہ آؤ گے۔ اور نیک کام اختیار نہ کرو گے۔ تو کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً۔ جیسا کہ فرعون کے پاس ہم نے رسول یعنی موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ اس میں اس طرف صاف اشارہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی تو قید فرعون سے نجات پائی۔ شام کی سرزمین اللہ رب العزت کی طرف سے ان کو عطا کی گئی اور یہی نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ نے ان کو وہاں سردار بنایا یعنی ان پر بڑی بڑی نوازشات ہوئیں اور اس کے مقابلہ میں فرعون جو کہ صاحب حشمت و شوکت و اسلحے تھے حضرت علیہ السلام کا کہنا نہ مانا اور سرکشی کرتا گیا۔ تو ہلاک ہوا۔ اسی طرح اس نبی کے مطیع بنے آپ ہر روز ہر چیز کے

۔ تک ہوں گے۔ اور آخرت میں بھی درجات حاصل کریں گے۔ اور دوسری جانب نافرمان اور سرکش ذلیل و خوار ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قریش جنگ بدر میں مارے گئے، سات سال تک قحط میں گرفتار رہے اور صحابہ دین و دنیا کے سردار ہوئے۔ اس جملہ میں اس بشارت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت منقول ہے۔ اس میں موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل کو پہلے سے سناتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کردوں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔

متعصب عیسائی اس بشارت کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ٹھہراتے ہیں۔ مگر یہ بشارت بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر صادق نہیں آتی۔ اس لئے کہ اصل بشارت میں موافق عبرانی ترجمے کے ان کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں برکت دینے کا وعدہ بھی ہوا ہے۔ اگر اس کا مصداق حضرت عیسیٰ یا اور کوئی اسرائیلی نبی ہو تو بنی اسرائیل میں سے سمجھا جائے گا۔ نہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے، دوسرے اس نبی کی نسبت یوں فرمایا کہ وہ موسیٰ کے مانند ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کوئی بھی موسیٰ ؑ کے مانند نہیں گزرا بلکہ ہر ایک ان کی شریعت میں متبع تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو کوئی بھی مشابہت حضرت موسیٰ ؑ سے نہیں تھی اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ بیوی اولاد رکھتے تھے۔ ایک درماندہ قوم کو سرکشوں کے پنجوں سے چھڑا کر لائے اور اس کو ایک ملک کا سردار کر گئے۔ برخلاف حضرت عیسیٰ ؑ کے کہ وہ بقول نصاریٰ آدم زاد ہی نہ تھے۔ بلکہ خدا کے بیٹے تھے (نعوذ باللہ) اور نہ ان کی بیوی بیٹے تھے نہ قوم کو رومیوں کی قید سے آزاد کرا گئے۔

اور نیز حضرت موسیٰ ؑ کے جانشین ان کی نسل کے غیر لوگ ہوئے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرت ابوبکر ؓ ہوئے باوجودیکہ آپ کے اقارب و اولاد بھی تھی۔ حضرت موسیٰ ؑ نے جہاد کئے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام لوگوں میں صاحب شوکت اور ذو وجاہت تھے۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی مخالف قتل نہ کر سکا۔ اپنی موت سے مرے، ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ الغرض پیدائش سے لیکر شریعت و احکام اور زیست و موت کے حالات اور بعد جانشینوں تک کے حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جیسی مشابہت ہے اس کا سوال حصہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی نہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ اے قریش تم ہمارے نبی الرحمۃ کی وجہ سے دنیاوی ہلاکت سے تو بچ گئے تو کیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل الولدان شیبا۔ اس دن سے کیوں کر بچو گے (اگر تم کافر رہے اور کفر میں مر گئے) جو لڑکوں کو بوڑھا کر دے گا۔ قیامت کے دن کی شدت اور درازی سے غم کے مارے لڑکے بوڑھے ہو جائیں گے۔ بیضاوی میں فرماتے ہیں۔ فرض کے طور پر ہے کہ اگر لڑکے بھی ہوں گے تو غم کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے۔ کیونکہ غم دائم سے بڑھاپا جلد آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن بڑا اندوہناک ہوگا۔

طبرانی میں ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا ۔ اٹھو اور اپنی اولاد میں سے جہنمیوں کو الگ کرو ۔ حضرت آدم علیہ السلام پوچھیں گے ۔ خدایا کتنی تعداد میں سے کتنے ۔ رب العزت کا حکم ہوگا ۔ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے ۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے اور گھبرا گئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے چہرے دیکھ کر سمجھ گئے اور بطور تشفی کے فرمایا ۔ سنو بنی آدم بہت سے ہیں ۔ یاجوج ماجوج بھی اولاد آدم میں سے ہیں ۔ جن میں سے ایک ایک اپنے پیچھے خاص اپنی صلبی اولاد ایک ایک ہزار چھوڑ کر جاتا ہے ۔ پس ان میں اور ان جیسوں میں ملکر جہنمیوں کی یہ تعداد اور جنت تمہارے لئے ہو جائے گی ۔ لیکن یہ حدیث غریب ہے ۔

السَّمَآءُ مُنفَطِرٌ بِهٖ اور آسمان بھی پھٹ جائے گا ۔ اس دن کی ہیبت اور دہشت کی وجہ سے کہ کانَ وَعْدُهٗ مَفْعُولًا ۔ اس کا وعدہ جو اس نے اپنے رسول کی معرفت کیا ہے ، قیامت کے آنے کی بابت اور جزاء و سزا کی بابت ضرور ہو کر رہے گا ۔ اب جو جو تم کو سمجھایا اور ڈرایا جاتا ہے ۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ یہ محض تمہاری نصیحت اور خیر خواہی اور تمہاری آگاہی کے لئے ہے ۔ ورنہ کچھ غرض نہیں ۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا فرمایا جاتا ہے کہ ہم نے اپنے تک تقرب حاصل کرنے کی راہ بیان فرما دی ہے ۔ پھر جو چاہے ہمارے دربار میں لطف و کرم میں جگہ پائے ، اور ہمارے پاس آنے کا راستہ اختیار کرے ۔ وقت ہے وگرنہ دوسرے راستہ کا انجام جہنم اور مغضوبیت دائمی ہے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ صورت عقلمندوں کے لئے سراسر نصیحت و عبرت ہے ۔ جو بھی طالب ہدایت ہو ، وہ مرضی مولیٰ سے ہدایت کا راستہ پائے گا ، اور اپنے رب کی طرف پہنچ جانے کا ذریعہ حاصل کرے گا ۔ اور اگر اس ہدایت کے راستہ کو اختیار نہ کیا تو پھر وہ اپنے رب سے دور ہوگا ۔ یعنی واصل جہنم ہوگا ۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ

آپ کے رب کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعضے آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی)

وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ

تہائی رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں ۔ اور رات و دن کا پورا اندازہ

يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ

اللہ ہی کر سکتا ہے ۔ اس کو معلوم ہے کہ تم اس (تقدیر وقت) کو ضبط نہیں کر سکتے تو اس وجہ سے

عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ

اس نے تمہارے حال پر عنایت کی سو (اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو ۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ

سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي

بعضے آدمی تم میں بیمار ہوں گے، اور بعضے تلاش معاش کے لئے

الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ

ملک میں سفر کریں گے، اور بعضے اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، (اس لئے بھی اس

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا

حکم کو منسوخ کر دیا) سو (اس لئے بھی تم کو اجازت ہے کہ اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو اور نماز

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا

(فرض) کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اخلاص سے) قرض دو

حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ

اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے (ذخیرۂ آخرت بنا کر) بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس

عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا

پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑھا پاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ سے گناہ معاف

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

کراتے رہو بلاشبہ اللہ غفور رحیم ہے۔

تفسیر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابہ رضی تہجد کی نماز میں کبھی آدھی رات کے قریب سے اٹھتے جیسے قم اللیل الا قلیلاً - سے سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی دو ثلث رات سے اٹھتے تھے جیسا کہ او زد علیہ سے سمجھا جاتا ہے۔ اور نماز پڑھتے اور نماز میں قرآن مجید درد سوز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ ورتل القرآن ترتیلاً سے سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کمی و زیادتی صحت و مرض اور غلبہ شوق و فرحت اور خواب و بیداری سے تھی، اب عام ہے کہ یہ شب بیداری آپ پر اور آپ کے اصحاب پر فرض ہو۔ مگر مدتوں تک آپ اور آپ کے اصحاب اسی شب بیداری کے پابند رہے۔ اور کم از کم ایک ثلث رات شب بیداری کو بہت ہی ضروری سمجھتے رہے۔ اور اس لئے رات کا اندازہ ستاروں سے کیا کرتے تھے۔ اس حالتِ محمودہ کو خداوند قدوس ان آیات میں بیان فرماتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ

واللہ یقدر اللیل والنہار کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ محمدؐ آپ اور آپ کے ساتھی دو ثلث اور نصف اور ایک ثلث رات سے اٹھتے ہیں اور صحیح اندازہ رات دن کا اللہ ہی کرتا ہے کہ دراصل اب آدھی رات رہی یا ثلث یا دو ثلث مگر تم بھی اپنے نزدیک ان اوقات کی پابندی کرتے ہو۔ اور اپنے اندازہ کے موافق دو ثلث و نصف ثلث [illegible] اٹھتے ہو، اس کے بعد اس پابندی کو بھی اپنی مہربانی سے معاف کرتا ہے کس لئے کہ یہ دو ثلث و نصف ثلث کی پابندی تم سے ہمیشہ نبھ نہ سکے گی۔ کیونکہ بیماری بھی لگی ہوئی ہے۔ اور سفر و جہاد بھی پیش آنے والا ہے پھر بیمار و مسافر اور مجاہدوں کے بارے تھکے ہونے کے باعث رات میں اٹھنا ایک شاق امر ہے۔ اس لئے دو ثلث اور نصف اور ثلث کی قید بھی تمہارے لئے کوئی لازمی بات نہیں۔ بلکہ جس قدر تم سے ہو سکے اتنی رات جاگو۔ اور جس قدر قرآن باسانی تم سے پڑھا جاوے پڑھ لیا کرو، اس مضمون کو ان میں ارشاد فرماتا ہے۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ۔ (تحصوہ کی ضمیر قیام لیل کیطرف دلالت کرتی ہے۔) کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اس پابندی کو نبھا نہ سکو گے، فَتَابَ عَلَيْكُمْ، اس نے (یعنی اللہ رب العزت نے) تم پر مہربانی کی اس لئے حکم دیا کہ فاقرءوا ماتیسر من القرآن کہ جسقدر قرآن پڑھنا تمہیں آسان ہو اتنا پڑھ لیا کرو، جسقدر نماز تہجد تم سے ادا ہو سکے ادا کر لیا کرو (چونکہ نماز میں قرآن شریف پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے اسکو قرأت قرآن سے تعبیر کیا) اور یہ پابندی [illegible] بھی اٹھادی، علم ان سیکون منکم مرضیٰ واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واخرون یقاتلون فی سبیل اللہ کہ اس کو (یعنی خداوند تعالیٰ کو) معلوم ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار بھی ہوں گے، اور کسی کو سفر بھی درپیش ہوگا۔ اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لئے تجارت اور علم سیکھنے اور سکھانے کے لئے اور ہجرت کے لئے بزرگان دین سے ملنے کے لئے غربا و مساکین یا درماندوں کی چارہ جوئی حاجت براری کے لئے۔

یہ سب صورتیں ایسی ہیں کہ جنمیں اس کے حکم کی پابندی کہ اس قدر رات سے اٹھو اور اتنا قرآن پڑھو ایک امر مشکل ہے۔ اس کے بعد تین حکم دیتا ہے واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً کہ نماز قائم کیا کرو زکوٰۃ دو اور اللہ تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دو۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ پنجگانہ نماز کی فرضیت شب معراج میں ہوئی۔ اور یہ سورت شب معراج سے کئی برس پہلے نازل ہوئی اور نیز اس وقت تک زکوٰۃ مفروضہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ زکوٰۃ مدینہ میں آکر فرض ہوئی۔ پھر اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ سے کیا مراد ہے۔ اس کا جواب محققین نے حسب ذیل دیا ہے۔

کہ گو پنجگانہ نماز اور زکوٰۃ معینہ واجب نہیں ہوئی تھی۔ مگر مطلقاً نماز و زکوٰۃ تھی۔ اور مطلقاً سے مراد یہ ہے کہ رکوع و سجود قیام و قعود میں دعا کرنا فرض تھا۔ اور اسی کو نماز کہتے تھے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ان میں کفار کا ہجوم رہتا تھا۔ صرف تہجد کی نماز تھی ممکن ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ میں اسی طرف اشارہ ہو کہ جس قدر تم سے قرآن پڑھا جا سکے پڑھو اور نماز تہجد ادا کئے جاؤ۔ پابندی دو ثلث اور ثلث اور نصف کی نہیں۔

اور خیرات کا بھی اسی وقت فرض تھا گو کوئی مقدار خیرات کی معین نہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں ہوئی سو واٰتوا الزکوٰۃ سے وہی خیرات مطلقہ مراد ہے۔ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً، واٰتوا الزکوٰۃ کی تاکید ہے جس میں بتلانا مقصود ہے کہ خیرات دینا...... اللہ کو قرض دینا ہے بایں معنیٰ کہ خدا اس کا بدلہ نفع کے ساتھ تم کو دنیا اور آخرت میں دے گا۔ گویا وہ تمہارے اس دئے ہوئے مال کی ضمانت کرتا ہے تاکہ تم کو اطمینان ہو ورنہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) قرض لینے سے پاک ہے اسکو کوئی حاجت نہیں اور قرضاً حسناً میں یہ بھی بتلا دیا جاتا ہے کہ ناپاک اور حرام کا

مال منظور اور مقبول نہیں۔ اور یہ بھی کہ فقیر کو طعنہ نہ دو۔ اور دے کر کسی کو شرمندہ نہ کرو اس لیئے حکم ہے کہ اچھی طور پر دے۔ اور خلوص نیت سے دے۔ اس میں خیرات کے سب آداب کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا اس کے بعد باری تعالیٰ پھر اطمینان دلاتا ہے۔ وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ کہ جو نیکی تم اپنے لیئے کرو گے، اور آگے بھیجو گے، تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَاَعْظَمَ اَجْرًا، اس کو اللہ کے یہاں بہتر اور ثواب میں بڑھکر پاؤ گے وہ نیکیاں رائیگاں نہ جائیں گی ہم گن کر جمع رکھتے ہیں۔ مر کر جب آؤ گے بہتر اور بڑھکر پاؤ گے، ایک پیسہ کا ثواب دس پیسہ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ کا موجود ہے۔ یہاں لانفسکم میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس عبادت اور خیرات میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے لئے ہی فائدہ ہے۔

ابو یعلیٰ موصلی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضہ سے ایک مرتبہ دریافت فرمایا تم میں سے ایسا کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ انھوں نے جواب دیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے تو ایک بھی ایسا نہیں، آپؐ نے فرمایا اور سوچ لو انھوں نے پھر جواب دیا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم یہی بات ہے) تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا سنو! تمہارا مال وہ ہے جسے تم راہِ خدا میں دے کر اپنے لئے آگے بھیجدو، اور جو چھوڑ جاوگے وہ تو تمہارا مال نہیں، وہ تو تمہارے وارثوں کا مال ہے۔ یہ حدیث بخاری شریف اور نسائی میں بھی ہے۔ پھر فرماتا ہے، وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ کہ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش اور معافی مانگا کرو۔ کیونکہ وہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ اور اپنے تمام کاموں میں استغفار کیا کرو۔ کیونکہ جو استغفار کرتا ہے وہ مغفرت حاصل کر لیتا ہے۔

اس میں اسطرف اشارہ ہے کہ نماز و خیرات پر غرور نہ کرو اس کے بعد بھی معافی مانگا کرو جو مقتضائے عبودیت ہے، اور نماز و زکوٰۃ میں جو کوئی فتور و قصور ہو جائے اس پر باری تعالیٰ فرماتا ہے وہ معاف کیا جاوے گا، آخر کار ہمارے فضل پر مدار ہے۔

سُورَۃُ الْمُدَّثِّر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ

اے کپڑے میں لپٹنے والے اٹھو (یعنی اپنی جگہ سے اٹھو یا یہ کہ مستعد ہو) پھر (کافروں کو) ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو اور اپنے کپڑوں

فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَ

کو پاک رکھئے　　اور بتوں سے الگ رہو (جسطرح کہ اب تک الگ ہو) اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ (دوسرے وقت) زیادہ معاوضہ چاہو

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ○ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ○ فَذَٰلِكَ

اور پھر دنیا میں جو ایذا پیش آئے اس پر، اپنے رب (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجیے، پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا، سو وہ وقت یعنی

يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ○ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ○

وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی (آگے بعض خاص کفار کا ذکر ہے)

تفسیر :۔ بخاری و مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے کہا سب سے پہلے یاایھا المدثر نازل ہوئی اور یہ روایت حضرت جابر رض سے بخاری شریف کے حوالہ سے مروی ہے۔ اس پر یحییٰ بن ابن کثیر نے کہا کہ جمہور کا قول ہے۔ سب سے اول اقرء کا نازل ہونا بیان کرتے ہیں۔ ابو سلمہ نے کہا میں نے بھی یہ بات جابر بن عبداللہ سے پوچھی تھی تب اس نے کہا میں آپ کو وہی بات سناتا ہوں۔ جو مجھکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی آپ نے فرمایا کہ میں غار حرا میں ایک ماہ خلوت نشین تھا۔ جب نیچے اترا تو آواز آئی میں نے دائیں بائیں پیچھے دیکھا تو کچھ بھی نظر نہ آیا تب اوپر کو نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو حرا میں نظر آیا تھا ایک کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ یا آسمان وزمین کے درمیان، اس سے مجھے دہشت معلوم ہوئی اور گھر میں آیا اور کہا دثرونی دثرونی کپڑا اڑھاؤ تب یہ سورۃ نازل ہوئی، والرجز فاھجر تک،

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے رک جانے کی حدیث بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں چلا جا رہا تھا کہ ناگہاں آسمان کی طرف سے مجھے صدا سنائی دی میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ جو فرشتہ میرے پاس غار حرا میں آیا تھا۔ وہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے میں خوف وگھبراہٹ کی وجہ سے زمین پر جھک گیا، اور گھر آتے ہی کہا۔ مجھے کپڑوں سے ڈھک دو۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھے کپڑے اڑھا دیئے پھر وحی برابر آنے لگی۔ یہ لفظ بخاری شریف کے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کوئی وحی آئی تھی کیونکہ آپ کا وہ فرمان موجود ہے کہ یہ وہی فرشتہ تھا جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام جب کہ غار حرا میں سورۃ اقراء کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھا گئے تھے۔

علماء نے احادیث میں غور کرکے فیصلہ کردیا ہے کہ سب سے اول سورۃ اقراء نازل ہوئی، اس کے بعد سورۃ المزمل، بعض کہتے ہیں۔ مزمل نازل ہونے کے بعد، سورۃ مدثر نازل ہوئی۔ مگر یہ بالاتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اور اسمیں بھی وہی توحید وغیرہ کے مطالب ہیں۔

اس سورۃ کی سورۃ مزمل سے مناسبت یہ ہے کہ سورۃ مزمل میں اپنے آراستہ کرنے کا حکم تھا۔ کہ رات کی نماز اور تلاوت سے پہلے خود کامل ہو جاؤ۔ اس کے بعد اس سورۃ میں لوگوں کو کامل کرنے کا حکم دیا گیا، اس کے سوا دونوں کے مطالب میں بھی بہت کچھ مناسبت ہے۔ وہاں رات میں نماز وتلاوت کا حکم تھا۔ یہاں اس کے شرائط کپڑے اور جسم کی پاکی بتائی گئی ہے۔ اس سورۃ میں بھی قیامت کا ہولناک واقعہ بیان ہوا تھا مثلاً کہ لڑکوں کو بوڑھا کردینے والا دن آنے والا ہے۔ یہاں اس کی نسبت بیان فرمایا گیا۔ یوم عسیر علی الکافرین غیر یسیر۔ کہ وہ دن بڑا سخت ہے۔ کافروں پر آسانی نہیں وہاں خاتمہ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم

نے اس سے بخشش مانگو۔ اس میں بھی خاتمہ میں ھو اھل التقوٰی و اھل المغفرۃ ہے۔ اس سے ڈرنا چاہئے اور وہ بخشش والا ہے۔

مُدَّثِّر! یاایھا المدثر کہ اے کپڑے پہنے ہوئے۔ کپڑے بدن پر دو قسم کے پہنے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جو جسم سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اسکو شعار کہتے ہیں۔ دوسری قسم کپڑے پر کپڑا پہننا۔ اسکو دثار کہتے ہیں۔ اور ایسے کپڑے اوڑھے ہوئے کو مدثر کہتے ہیں۔

عام مفسرین اس کے ظاہری معنی لیتے ہیں کہ آپ سردی کی وجہ سے کپڑا اوڑھے ہوئے تھے۔ باری تعالیٰ نے اسی نام سے پیار سے یاد فرمایا۔ علماء نے اس کپڑا اوڑھنے کی چند وجوہ بیان کی ہیں۔

اوّل فرشتہ کو دیکھ کر دہشت ہوئی تھی۔ اور اس سے سردی معلوم ہوئی تھی۔ جس کے لئے کپڑا اوڑھے ہوئے تھے اور اسی حالت میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اور اسی حالت پر محبت سے خطاب کیا گیا۔

دوم :۔ کفار قریش نے جمع ہو کر لوگوں کو آپ سے بدگمان کرنے کے لئے ساحر کہا۔ اس سے آپ کو رنج ہوا اور طبع مبارک پر کسل طاری ہوا۔ جس کے لئے کپڑا اوڑھ کر پڑے ہوئے تھے۔

سوم :۔ آپ کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے۔ اس حالت میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ جسمیں جتلایا جاتا ہے کپڑا منہ سے اتارو۔ اور نیند سے ہوشیار ہو۔ اور منصب نبوت پر قائم ہو۔

علماء کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ظاہری کپڑا اوڑھنا مراد نہیں ۱۔ یہ کہ نبوت و رسالت کی چادر اوڑھنے والا کپڑا ہو۔ ۲۔ یہ کہ اے خلوت و گوشہ نشینی کی چادر اوڑھنے والے کب تک مخفی رہے گا۔ کھڑا ہو اور لوگوں کو متنبہ کر کیونکہ دنیا میں گناہ بکثرت ہو رہے ہیں۔ ۳۔ یہ کہ اے خلق عظیم اور رحمت عالمین کی چادر اوڑھنے والے اس لباس کو پہن کر چپ کیوں لیٹے ہو۔ اٹھو کھڑے ہو۔ اور لوگوں کو متنبہ کرو اور دین وحق کی منادی کرو

قُمْ فَأَنذِرْ! کھڑا ہو یعنی اس مرتبہ پر مستعد و آمادہ ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خواب گاہ سے اٹھ کھڑے کے معنی لغوی اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔ پھر کھڑے ہو کر کیا کرو۔ فانذر۔ اور لوگوں کو ہماری ذات سے ان کے بداعمال کی سزا سے پورے عزم اور قوی ارادے کے ساتھ ڈراؤ جیسے کہ آپ نذیر تھے۔ بشیر بھی تھے مگر ابتدائی حالت میں بشارت کا موقع نہ تھا۔ کیونکہ دنیا بدکاری اور بت پرستی کے گرداب میں پھنسی پڑی تھی۔ اس لئے مقدم یہی بات تھی کہ ان کو ہلاکت کے کاموں سے ڈرایا اور بچایا جاوے اس کے بعد اصول حسنات پر قائم ہونے سے بشارت کا موقع آئے گا۔ پہلی وحی سے نبوۃ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز کیا گیا۔ اور اس وحی سے آپ رسول بنائے گئے۔

اور لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ڈرانا اور عذاب آخرت اور مصائب دنیا کی خبر دینا جو بدکاری اور بت پرستی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ بغیر اس کے مخاطبین کے ذہن نشین نہیں ہوتا کہ خداوند عالم کی عظمت و جبروت بیان کیا جائے۔ اس لئے حکم دیا اور بتایا گیا اپنے رب کی عظمت و شوکت بیان کر۔ اور اس کے آثار جبروت قدرت کا اظہار تاکہ مشرکین کے دلوں سے اس کی قدرت و یکتائی سن کر بتوں اور خیالی معبودوں کی وقعت کم ہو۔ اور وہ توحید کی طرف مائل ہوں۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ یہ بھی خوب سمجھ لیں کہ نافرمانی پر جو بلا آئے گی اس کو ہمارے معبود دفع نہ کر سکیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبہ نبوت و تبلیغ عطا کیا اس لئے اس

پر تکبیر کہنا فرمایا، خوشی اور شادمانی کے وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور آپ کے ساتھ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کی اہلیہ نے، اور اسی لئے اہل اسلام میں یہ عام دستور ہوگیا کہ خوشی کے وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اور اسی لئے نماز عیدین اور حج میں تکبیر باواز بلند کی جاتی ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ دشمنوں کو مقہور کرنے کے لئے اور آفات دور کرنے کیلئے بھی تکبیر اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ عظمت ہیبت الہٰی مخالفوں کے دلوں کو ہلا دیتی ہے (یہ مشاہدہ ہے) مصیبت کو دفع کرتی ہے اسی لئے صحابہ رضی اللہ عنہم جہاد میں اور ہر خوشی کے موقع پر اس آواز کو بلند کرتے تھے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے، تحریمہ کے وقت اور رکوع و سجود کے وقت اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ مگر اس سورۃ کے نازل ہونے کے وقت تک نماز پنجگانہ فرض نہ تھی۔ مگر نوافل ضرور تھے انہیں میں تکبیر کہنا مامور بہ تھا۔

جہاں تک تکبیر کے فوائد اور اسکی عظمت کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ ایک مسلمہ امر ہے لیکن اگر طہارت ظاہری و باطنی ہو تو تکبیر کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے وثیابک فطھر کہ اپنے کپڑے پاک کر بعض علماء کرام کے اس کی تفسیر میں چند اقوال ہیں۔ طہارت ظاہری و طہارت باطنی،

اول :۔ ثیاب اور طہر حقیقی معنے پر محمول کئے جائیں یعنی کہ ظاہری کپڑوں کو ظاہری نجاست سے دور رکھ اور جب کپڑوں کو دور رکھنا فرمایا تو بدن جو کپڑوں کے نیچے چھپا ہوا ہوتا ہے۔ بدرجۂ اولیٰ نجاست سے دور رکھنا اور پاک رکھنا مراد ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ناپاک کپڑوں اور ناپاک بدن سے نماز درست نہیں۔ کیونکہ نوافل اور ذکر الہٰی میں مومن کو ہمیشہ مشغول رہنا اور عالم قدس سے مناسبت پیدا کرنا چاہیئے کہ نجاست ظاہر ہے کہ اس مناسبت میں خلل انداز ہے۔

ناپاک چیزوں سے خواہ وہ بشکل حیوان یا بشکل غذا ہوں۔ ان سے ہر وقت دور رہنا چاہیئے خصوصاً نماز کے وقت جو فرض ہے یہ حکم آپ کو کیوں دیا گیا کیوں کہ مشرکین اپنے بدن اور کپڑوں کو نجاست سے پاک نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے آپ کو اور آپ کی امت کو پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

کچھ مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اکثر مشرکین مکہ آپ پر نجاست ڈال دیا کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ ان مشرکین کی حمایت کا خیال نہ کریں۔ کپڑے پاک کر لیا کریں کیونکہ بغیر طہارت کے نماز نہیں ہو سکتی ہے اس لئے فرمایا گیا۔

دوم :۔ کپڑے کو حقیقی معنیٰ پر اور طہارت کو مجازی پر معنیٰ باطنی پاکی پر محمول کریں۔ یہ معنیٰ کہ اپنے کپڑوں معنوی نجاست سے پاک کریں۔ غصب اور چوری کے کپڑے اسی طرح ناجائز کمائی کے اور وہ کہ جن پر تصاویر ہوں۔ اور ریشمی کپڑے جو مردوں کے لئے درست نہیں معنوی ناپاکی رکھتے ہیں۔ ان سب سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہیئے خصوصاً یاد الہٰی کے وقت ایسے کپڑے دور پھینک دینے چاہئیں، اسی طرح مرد کے لئے زنانہ لباس اور زنانہ آرائش اور عورت کے لئے مردانہ لباس معنوی نجاست ہے۔

سوم :۔ یہ کہ کپڑوں کے مجازی معنیٰ اور طہارت کے حقیقی لئے جاویں۔ آپ کی ذات وصفات و اخلاق مراد نہیں کہ آپ کو نجاست سے دور رکھیں۔ کپڑا بول کر شخص مراد لینا محاورہ ہے جیسا کہ کہتے ہیں پاکدامن اپنے بدن کو استنجے وغیرہ سے پاک رکھیں اور بول و براز منی وغیرہ سے پاک رکھیں کیونکہ طہارت ظاہری کو

طہارت قلبی میں بڑا اثر ہے۔
چہارم :۔ دونوں کے معنیٰ مجازی لئے جاویں تب یہ معنیٰ ہوں گے کہ اپنے دل کو صفات مذمومہ سے پاک رکھ یا اس لئے فرمایا کہ جب کفار نے آپ کو ساحر کا لقب دیا اور آپ کو رنج ہوا تو یہ بدخلقی اور انتقام کا مقتضیٰ تھا جس سے منصب اور انداز میں فرق آجانے کا موقعہ تھا اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کی حماقت سے وعظ نہ چھوڑیں اور ان کے اخلاق رذیلہ اور کج خلقی کو دل میں جگہ نہ دیں اور یہ حکم اس لئے دیا کہ اول میں آپ کو مدثر فرمایا اور دثار۔ لباس اور کپڑوں کو کہتے ہیں اس لئے ارشاد فرمایا کہ جو جامہ آپ پہنے ہوئے ہیں اس جامہ نبوت کو ان داغ دھبوں سے پاک رکھیں تاکہ تکبیر کا اثر نمایاں ہو اور تکبیر کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کس لئے کہ اللہ کی کبریائی کا سب سے اول تکبیر کہنے والے کے دل اور اخلاق پر اثر ہونا چاہئے جس سے اس کا بعد انسانیت شہوات لذات اور غضب اور کبر کے دھبوں سے پاک ہوجانا لازمی بات ہے اس لئے اس کے بعد فرماتا ہے ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ یہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کا تکملہ ہے اگر اس کی جگہ بدن اور کپڑے کی ظاہری طہارت مراد تھی تو یہاں طہارت باطنی مراد ہے ۔ اخلاق رذیلہ سے غرض یہ کہ ظاہر و باطن کو پاک رکھ اور منجملہ نجاسات قبیحہ کے جو باہمی دین کے لئے دھبہ لگانے والی بات ہے ۔ اس سے بھی منع کیا۔
اے نبی اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی نہ مانو ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا تھا ۔ اے ہارون (علیہ السلام) میرے بعد میری قوم میں تم میری جانشینی کرو اصلاح کے درپے رہو اور مفسدوں کی راہ پر نہ لگو ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ یعنی قرآن مجید تعلیم و تبلیغ احکام الٰہی کا کسی پر احسان نہ جتلا کہ تو مریدوں اور معتقدوں کی کثرت کر کے مال و جاہ پیدا کرے اور لوگوں سے کچھ حاصل کرے یا کسی کو کچھ دے اور حاجت براری اس نیت سے کرے کہ وہ اس کے بدلے میں مجھے زیادہ دے گا یا عطیہ دے کر زیادتی کے خواہاں نہ ہوں۔
ابن مسعود رض کی قراءت اَنْ تَسْتَكْثِرَهٗ ہے یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اپنے نیک اعمال کا احسان خدا پر طلب زیادتی کے ساتھ نہ رکھو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیر کی طلب کثرت سے کرو کمزوری نہ برتو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی نبوت کا بار احسان لوگوں پر رکھ کر اس کے عوض دنیا طلبی نہ کرو۔ یہ کل چار قول ہوئے لیکن اول اولیٰ ہے ۔
پھر فرمایا گیا ہے ۔ فَاِذَا نُقِرَ فِى النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ کہ دنیا چند روزہ ہے ایک دن آنے والا ہے جو کافروں پر سخت ہوگا ۔ کچھ آسانی ان کے لئے نہ ہوگی وہ دن وہ ہے کہ جس دن صور پھونکا جائے گا، اس روز یہ لوگ اپنے کئے کی سزا پائیں گے۔ اور آپ کو صبر کا بدلہ ملے گا۔
منجملہ ان ایذا دینے والوں کے کہ جنکی ایذاء پر آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا گیا ایک شخص ولید بن المغیرہ تھا چونکہ وہ بڑا مالدار تھا اسکی اولاد بھی بہت تھی اور بڑا عزت دار کہلاتا تھا اسکو لوگ یکتا اور یگانہ کے لقب سے ملقب کیا کرتے تھے ۔ اب آئندہ آیات میں اسکی ایذاء کا اور جو کچھ خداوند تعالیٰ نے اس پر فضل و کرم کیا تھا اس کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلاتا ہے اور عام ایمانداروں کو متنبہ کرتا ہے کہ دنیاوی مال و جاہ اولاد و حشمت اس کا فضل و کرم ہے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے نہ یہ کہ اس کے

گھمنڈ میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے مقابلہ کرے جسکا انجام دنیا کی بربادی اور آخرت کی ابدی جہنم ہے یہ اس لئے کہ ولید کو اپنے زور اور اقارب کی حمایت کا بڑا غرور تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے جہنم میں کون عذاب دے سکتا ہے؟ اس لئے بیان کیا گیا کہ وہاں بڑے طاقتور فرشتے متعین ہیں اور وہ انیس ۱۹ ہیں۔ اور ان کی یہ تعداد اس لئے بیان کی گئی کہ اہل کتاب کو اور ایمانداروں کو یقین کامل ہو، اور کافر اور بھی تمسخر کریں مصیبت اور آزمائش میں پڑیں۔ اس لئے کہ یہ نکتہ ان کی ناقص سمجھ سے باہر ہے، ولید بن المغیرہ کی بابت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ؐ نے اس کو کچھ قرآن کریم سنایا جس سے اسکا دل کچھ نرم ہوا۔ یہ خبر ابو جہل کو پہونچی تو ولید کے پاس آکر کہنے لگا کہ اے چچا آپ کی قوم چندہ کرکے آپ کو دینا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ قریش کو معلوم ہے کہ میں سب سے زیادہ مالدار ہوں مجھے اس کی حاجت نہیں، تب اس نے کہا آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں ایسی بات کہئے جس سے آپ کی قوم کو معلوم ہو کہ آپ ان کے منکر ہیں۔ اس نے کہا کہ میں کیا کہوں مجھ سے زیادہ کوئی شعر سے بھی واقف نہیں ہر قسم کے اشعار سے واقف ہوں۔ جنوں کے اشعار بھی مجھے معلوم ہیں۔ خدا کی قسم کہ اس کا کلام شعر نہیں بلکہ اس میں شیرینی اور برکت ہے۔ وہ غالب ہے مغلوب نہیں۔

ابو جہل نے کہا خدا کی قسم آپ کی قوم ہرگز خوش نہ ہوگی۔ جب تک ان کے حق میں آپ کوئی بری بات نہ کہیں گے تب ولید نے کہا کہ مجھے کچھ مہلت دو سوچ کر کچھ تجویز کردوں۔ تب اس نے سوچ کر تجویز کیا کہ یہ جادو ہے جو کسی سے سیکھا ہے۔

ابو جہل نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اگر ولید کے دل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن سنانے کا اثر ہونے لگا تو ہماری جماعت میں ایک دراڑ پڑ جائے گی۔ اور ہمکو نقصان عظیم پہنچے گا۔ لہذا اس نے یہ چال چلی کہ ایسی بات کہی جائے کہ جس سے ولید کی آن کو ٹھیس لگے۔ لہذا اسکو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ حضور ؐ کی شان میں ایسی کوئی بری بات کہے کہ جو قوم قریش کے لئے ایک نیا انکشاف ثابت ہوا۔ لہذا وہ اپنے مکر میں کامیاب ہوگیا۔ اور ولید کو بدستور گمراہی کے گڑھے میں جھونک دیا۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا

مجھ کو اور اس شخص کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو جسکو میں نے اکیلا پیدا کیا　اور اسکو کثرت سے مال دیا

مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۝

اور پاس رہنے والے بیٹے (دئے)　اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کر دیا۔

ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۝ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ۝

پھر بھی اس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اسکو اور زیادہ دوں) ہرگز وہ زیادہ دینے کے قابل نہیں کیونکہ وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ

اسکو عنقریب (یعنی مرنیکے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا - اس شخص نے سوچا پھر ایک تجویز کی پس یہ شخص غارت ہو کیسی بات

قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ

تجویز کی (اور) پھر (مکرر) اس پر خدا کی مار کیسی بات تجویز کی پھر (حاضرین کے چہرے) کو دیکھا پھر منہ بنایا اور تیوری چڑھائی پھر منہ پھیرا

وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ

زیادہ کراہت ہے) اور زیادہ منہ بنایا پھر منہ پھیرا اور تکبر ظاہر کیا - پھر بولا بس یہ تو جادو ہے (جو اوروں سے منقول ہے) بس یہ تو آدمی کا

اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا

کلام ہے - میں اس کو جلدی دوزخ میں داخل کروں گا - اور تم کو کچھ خبر بھی ہے کہ دوزخ کیسی چیز ہے

سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا

مقصود اس سے تہویل ہے وہ ایسی ہے کہ) نہ تو باقی رکھے گی اور نہ چھوڑیگی (اور وہ) (جلا کر) بدن کی حیثیت بگاڑ دیگی - اس پر انیس (فرشتے)

تِسْعَةَ عَشَرَ ۝

اسکے خازن ہیں نہیں ایک سالک ہے مقرر ہوں گے -

تفسیر ان آیات میں اس کی طرف اشارہ ہے مگر روئے سخن تمام ناشکرے دولتمندوں کی طرف ہے - اور اسی لئے اس کا نام نہیں لیا گیا - ولید کی تخصیص نہیں - جس خبیث شخص نے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کیا اور قرآن مجید کو انسانی قول کہا اس کی سزا دینے کا ذکر ہو رہا ہے - نیز پہلے جو نعمتیں اس پر انعام ہوئیں ان کا بیان ہو رہا ہے - فرمایا گیا ہے - چھوڑ مجھے - اور اسکو کہ جس کو میں نے پیدا کیا نہ اس کے جھوٹے معبودوں نے یا یہ معنی کہ جسکو میں نے یگانہ پیدا کیا - اس میں اس پر تعریض بھی ہے کہ جب پیدا ہوا تھا کیا ساتھ لایا تھا اکیلا تھا - اولاد و مال کچھ نہ تھا - یہ سب ہم نے دیا - یا یہ کہ وہ اپنے آپ کو وحید کہلاتا تھا - اسی لقب سے اسکو استہزاءً یاد کیا کہ آپ تو بڑے یگانہ اور یکتائے روزگار ہیں - اور اسمیں بھی یہ تعریض ہے کہ باپ نہیں اکیلا ہے - یہ چوٹ ہے اس پر کس لئے کہ قریش میں بدنام بدنسل مشہور تھا - مدتوں تک اس کا باپ کہتا رہا کہ میرا نطفہ نہیں - وجعلت له مالا ممدودا - اور اسکو بہت مال دار بنا دیا - ہزاروں لاکھوں دینار زر، زمین وغیرہ عنایت فرمائی - اور باعتبار اقوال تیرہ اور بعض اقوال کے دس لڑکے دیئے جو سب کے سب اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے - نوکر چاکر لونڈی غلام کام کاج کرتے تھے اور یہ فرے سے اپنی زندگی اپنی اولاد کے ساتھ گزارتا، غرض دھن دولت لونڈی غلام، بال بچے، آرام و آسائش ہر طرح کی نعمت مہیا تھی - علماء فرماتے ہیں ولید کے پاس بہت مال تھا تجارت سے بھی بہت نفع حاصل ہوتا تھا اور طائف میں اسکا

باغ اور زمینیں تھیں - اونٹ، گھوڑے، بھیڑ، بکری ہر قسم کا مال تھا اور ان سے نفع حاصل ہوتا تھا - اور ہر ایک میں سے نفع آتا تھا - اور روز افزوں ہوتا تھا - سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ تیرہ ۱۳ بیٹے تھے مقاتل کہتے ہیں سات ۷ تھے سب لڑکے ہی تھے لڑکی نہ تھی - ان میں سے ہشام اور خالد بن ولید اور ولید بن الولید مسلمان ہو گئے تھے -

ان سب دنیاوی اعزاز اور خوشحالی کے باوجود پھر بھی خواہش نفس پوری نہ ہوتی تھی اور چاہتا تھا کہ خدا اور بڑھا دے حالانکہ ایسا اب نہ ہوگا - یہ ہماری باتوں کے علم کے بعد کفر و سرکشی کرتا ہے ایسے تو صعود پر چڑھایا جاوے گا - مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے - کہ ویل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے - جسمیں کافر کو گرایا جائے گا - چالیس ۴۰ سال تک اندر ہی اندر جاتا رہے گا - لیکن پھر بھی تہہ تک نہ پہنچے گا - اور صعود جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ہے - جس پر کافر کو چڑھایا جائیگا ستر سال تک تو چڑھتا ہی رہے گا - اور پھر وہاں سے نیچے گرا دیا جائے گا - ستر سال تک نیچے لڑھکتا رہے گا - اور اسی ابدی سزا میں گرفتار ہوگا - یہ حدیث ترمذی شریف میں بھی ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسے غریب کہتے ہیں ابن حاتم میں ہے - صعود جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ہے - جو آگ کا ہے کافر کو مجبور کیا جائے گا - ہاتھ رکھتے ہی گھل جائیگا اور اٹھاتے ہی بدستور ہو جائے گا - اسی طرح پاؤں بھی - حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ صعود جہنم کی ایک چٹان کا نام ہے - جس پر کافر منہ کے بل گھسیٹا جائے گا -

سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ پتھر بڑا چکنا ہے - جس پر آدمی پھسل جاتا ہے - مجاہد رح کہتے ہیں کہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم اسے مشقت والا عذاب دیں گے - قتادہ رح فرماتے ہیں کہ ایسا عذاب جس میں اور جس سے کبھی بھی راحت حاصل نہ ہو - امام ابن جریر رح اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں پھر اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے اسے اس تکلیف عذاب سے اس لیئے قریب کر دیا کہ وہ ایمان سے بہت دور تھا - اور وہ سوچتا تھا کہ قرآن کو کیا کہے اور کیا نئی بات بنائے - پھر اس پر افسوس کیا جاتا ہے - اور محاورہ عرب کے مطابق اس کی ہلاکت کے کلمے کہے جاتے ہیں کہ یہ غارت کر دیا جائے یہ برباد کر دیا جائے - کسقدر بد کلام سوچا اور کتنی بے حیائی کہ جھوٹ بات گڑھ نکالی - بار بار کے غور و فکر کے بعد پیشانی پر بل ڈال ڈال کر منہ بگاڑ بگاڑ کر حق سے ہٹ کر بھلائی سے منہ موڑ کر اطاعت خدا سے سر پھیر کر دل کڑا کر کے صاف کہہ دیا کہ یہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے لوگوں کا جادو یا منتر وغیرہ نقل کر لیا کرتے ہیں - اور انہی کو سنا رہے ہیں - یہ کلام خدا نہیں بلکہ انسان کا قول ہے - اور جادو ہے - جو نقل کیا جاتا ہے - اس ملعون کا نام ولید بن مغیرہ تھا جو کہ قریش کا سردار تھا -

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ ولید حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا - اور خواہش ظاہر کی کہ آپ کچھ قرآن سنائیں - اس پر حضرت صدیق اکبر رض نے چند آیتیں پڑھ کر سنائیں - جو اس کے دل میں گھر کر گئیں - جب یہاں سے نکلا اور کفار قریش کے مجمع میں پہنچا تو کہنے لگا لوگو! تعجب کی بات ہے - (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو قرآن پڑھتے ہیں خدا کی قسم نہ تو وہ شعر ہے نہ تو جادو منتر ہے - نہ مجنونانہ بڑ ہے بلکہ واللہ وہ تو خاص خدا کا کلام ہے - اس میں کوئی شک نہیں ہے - بلکہ قریشیوں نے سن کر سر پکڑ لیا - اور کہنے لگے - کہ اگر یہ مسلمان ہو گیا تو پھر بس قریش میں سے ایک بھی اسلام لائے بغیر باقی نہ رہے گا - ابوجہل کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے کہا گھبراؤ نہیں - دیکھو میں ایک ترکیب سے اسے اسلام سے پھیر دونگا - یہ کہتے ہی اپنے ذہن میں ایک ترکیب سوچ کر ولید کے گھر پہونچا - اور کہنے لگا کہ آپ کی قوم نے آپ کے لیئے چندہ کر کے بہت سامان جمع کر لیا ہے - اور وہ آپ کو صدقہ میں دینے والے ہیں - ولید نے جواب دیا مجھے ان کے چندوں اور

صدقہ کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ان سب میں مجھ سے زیادہ مالدار و اولاد والا کوئی نہیں۔ ابوجہل نے جواباً کہا یہ سب درست اور صحیح ہے۔ لیکن لوگوں میں ایسی باتیں ہو رہی ہیں کہ آپ جو ابوبکر کے پاس آتے جاتے ہیں وہ صرف اس لئے کہ ان سے کچھ حاصل وصول ہو۔ ولید نے جواب دیا۔ اد ہو کیا میرے خاندان میں میرے متعلق ایسی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مجھے مطلق معلوم نہ تھا۔ اچھا اب قسم خدا کی نہ میں اب ابوبکر رض کے پاس کر جاؤں گا، نہ عمر کے پاس جاؤں گا۔ اور نہ محمد ص کے پاس جاؤں گا۔ اور وہ تو جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں کہ اس نے کہا تھا کہ میں قرآن کے بارے میں بہت کچھ غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ شعر تو نہیں۔ اس میں حلاوت ہے اس میں چمک ہے یہ غالب ہے مغلوب نہیں لیکن ہے یقیناً جادو۔ اس پر یہ آیتیں اتریں۔ ابن جریر میں ہے کہ ولید حضور علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ اور قرآن سن کر اس کا دل نرم پڑ گیا تھا۔ اور پورا اثر ہو چکا تھا۔ جب ابوجہل کو یہ معلوم ہوا تو وہ دوڑا ہوا آیا۔ اور اس ڈر سے کہیں یہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اسے بھڑکانے کے لئے جھوٹ بولنے لگا۔ کہ چچا آپ کی قوم آپ کے لئے مال جمع کرنا چاہتی ہے۔ ولید نے پوچھا کیوں ؟

ابوجہل نے کہا اس لئے کہ آپ کو دیں اور آپ کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جانا چھڑائیں۔ کیونکہ آپ وہاں مال حاصل کرنے کی غرض سے ہی جاتے ہیں۔ ولید نے غصہ میں آکر کہا کہ میری قوم کو معلوم نہیں کہ میں ان سب سے زیادہ مالدار ہوں ؟۔ ابوجہل نے کہا کہ یہ تو بالکل درست ہے لیکن اس وقت عام لوگوں کا یہ خیال پختہ ہو گیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مال حاصل کرنے کی غرض سے آپ اس کے ہو گئے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے دلوں سے اٹھ جائے تو آپ اس کے بارے میں کچھ سخت الفاظ کہیں تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ آپ اس کے مخالف ہیں۔ اور آپ کو اس سے کوئی لالچ نہیں۔ ولید نے کہا کہ بات تو یہ ہے کہ اس نے جو قرآن مجھے سنایا ہے۔ قسم خدا کی نہ تو شعر ہے، نہ قصیدہ، اور نہ رجز ہے۔ نہ جنات کا قول اور ان کے اشعار ہیں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ جنات و انسان کا کلام مجھے خوب یاد ہے، میں خود بھی شاعر ہوں۔ کلام حسن سے خوب واقف ہوں۔ لیکن خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ اللہ جانتا ہے اس میں عجیب حلاوت اور مٹھاس، لذت، شگفتگی اور دلیری ہے کہ وہ تمام کلاموں کا سردار ہے۔ اس کے سامنے اور کوئی کلام جچتا نہیں وہ سب پر چھا جاتا ہے۔ اس میں کشش بلندی اور جذب ہے اب تم ہی بتلاؤ کہ اس کلام کی نسبت میں کیا کہوں؟

ابوجہل نے کہا سنو! جب تک تم اسے برائی کے ساتھ یاد نہ کرو گے۔ تمہاری قوم کے خیالات تمہاری نسبت صاف نہیں ہوں گے۔ ابوجہل نے کہا تو مجھے مہلت دو میں سوچ کر اس کی نسبت کوئی ایسا کلمہ کہوں گا۔ چنانچہ سوچ ساچ کر قومی حمیت اور ناک رکھنے کی خاطر اس نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے جسے وہ نقل کرتا ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دار الندوہ میں بیٹھ کر ان سب لوگوں نے مشورہ کیا کہ موسم حج پر لوگ بکثرت آئیں گے۔ تو بتلاؤ انہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت کیا کہیں؟ کوئی ایسی بات تجویز کرو کہ سب یک زبان وہی بات کہیں تاکہ سب عرب میں اور پھر ادھر بھی وہی مشہور ہو جائے۔ تو اب کسی نے شاعر کہا کسی نے جادوگر کہا کسی نے کاہن اور نجومی کہا کسی نے مجنون اور دیوانہ کہا۔ ولید بیٹھا سوچتا رہا۔ اور غور و فکر کر کے دیکھ بھال کر تیوری چڑھا کر اور منہ بنا کر کہا کہ اگلے جادوگروں کا قول ہے جسے یہ نقل کر رہا ہے۔

فقال ان ھذا الا سحر یؤثر ۔ یہ کہہ دیا کہ یہ جادو ہے جو چلا آتا ہے بابل یا عجم سے یا پہلے ساحروں سے سیکھا ہے ۔ حال کا جادو نہیں ۔ بڑا قدیم جادو ہے ۔ جو سینہ بسینہ چلا آتا ہے یہ خدا کا کلام نہیں ۔ ان ھذا الا قول البشر ۔ بلکہ یہ آدمی کا کلام ہے ۔ اس عناد کی سزا یہ ہے کہ سا صلیہ سقر کہ ہم اسکو ابھی سقر میں داخل کریں گے ۔ یہ جہنم کے ایک طبقہ کا نام ہے ۔ جس میں اس قسم کے معاندین ڈالے جائیں گے ۔ پھر سقر کی ہولناک حالت بیان کرنے کے لئے جیسا کہ محاورہ عرب ہے فرماتا ہے وما ادراك ما سقر کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ جانتے ہیں کہ سقر کیا ہے؟ پھر اس کی چند صفات بیان فرماتا ہے ۔

ولا تبقی ولا تذر کہ کسی جنس کو جو اس میں داخل ہونے کے قابل ہے باقی نہیں چھوڑے گی یا یہ کہ ہڈی اور گوشت پوست کو باقی نہ چھوڑے گی جلا دے گی اور پھر جلانے سے وہ چھوٹ نہ جائیں گے ۔ بار دگر جسم تیار ہوگا اور جلے گا ابد الآباد یہی معاملہ رہے گا ۔

لواحۃ للبشر ، آدمیوں کو بڑی دور سے دکھائی دینے والی ہے ۔ وہ ذات الجحیم آخرت میں دور سے نظر آوے گا ۔ اور جو آنکھیں رکھتے ہیں ان کو یہیں سے دکھائی دیتی ہے ۔ یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ جھلس دینے والی ہے جہنم کے داروغہ جو اس پر معین کئے گئے ہیں ۔ انیس ہیں ۔ علیہا تسعۃ عشر انیس فرشتوں کی تعداد بیان کرنے کی وجہ تو وہی ہے جو آئندہ آیات میں حق سبحانہ بیان فرماتا ہے کہ کافروں کی آزمائش ، اہل کتاب کی تصدیق ، ایمانداروں کے ایمان کا استحکام مگر تعداد میں جو کچھ حکمت ہے اسکی بابت علمائے کرام کے چند اقوال ہیں ۔

(۱) دوزخ غضب وقہر الہی کا مظہر ہے جیسا کہ جنت رحمت کا مظہر ہے اور تمام کارخانوں کے انجام کے لئے ارواح وملائکہ متعین ہیں ۔ عرش ، کرسی ، سات آسمان ، چار عنصر ، آب ، آتش ، ہوا اور خاک اور تین موالید ثلاثہ ۔ حیوانات ، نباتات وجمادات پھر حیوانات میں سے انسان اشرف ہے ، اس کی بنیاد اور اجزاء کا ان تین پر ہے ۔ طبع کا محل اس کا جگر ہے ۔ قلب کی فرحت وسرور اور حیات کے کارخانے اس سے متعلق ہیں ۔ اور دماغ کی حس وادراک بھی اس سے متعلق ہے ۔ ان سب چیزوں کے موکلات ملائکہ ہیں عذاب دوزخ کے سرانجام دینے کو بھی وہ ملائکہ موکل ہوں گے ۔ ان میں جو موکل عرش ہے وہ مالک ہوگا ۔ اس کو وہاں کے کامخانہ کا بادشاہ سمجھنا چاہئے اور اسی طرح ہر آسمان کا فرشتہ ایک ایک خدمت پر متعین ہوگا ۔ اور اسی طرح عناصر کے فرشتے اپنے اپنے موافق کام سرانجام دیں گے ۔ معدنیات کا فرشتہ لوہے کی زنجیر میں ڈالے گا ۔ نباتات کا فرشتہ زقوم کھانے کو دے گا ۔ حیوانات کا فرشتہ سانپ بچھوؤں کو ڈسنے کے لئے متعین کرے گا ۔ طبع کا موکل پیاس بھوک دیوے گا ۔ قلب کا فرشتہ خوف اور غم اور رنج دے گا ۔ دماغ کا فرشتہ جو عقل کا محل ہے ان کو ان کی گذشتہ خطاؤں پر متنبہ کرے گا ۔ اور ان کے خیالات فاسدہ وتخیلات باطلہ کی جس میں وہ گرفتار تھے قلعی کھولے گا ۔ جس پر حسرت اور افسوس پر افسوس ہوگا ۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ

اور ہم نے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں ۔ اور ہم نے جو ان کی تعداد (ذکر دہ کتابت میں) صرف ایسی

إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ

رکھی ہے جو کافروں کی گمراہی کا ذریعہ ہو، تو اس لئے کہ اہل کتاب (سننے کے ساتھ) یقین کریں اور ایمان والوں کا

وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ

ایمان بڑھ جائے۔ اور اہل کتاب اور مومنین

أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم

شک نہ کریں۔ اور تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں (شک کا)

مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ

مرض ہے وہ اور کافر لوگ کہنے لگیں کہ اس عجیب مضمون سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے (جس طرح اس خاص باب میں خدا تعالیٰ نے کافروں کو

يُضِلُّ اللّٰهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ

گمراہ کیا) اسی طرح اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جسکو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے اور یہ انیس ۱۹ فرشتوں کا مقرر ہونا کسی حکمت سے

جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ كَلَّا

ہے ورنہ) تمہارے رب کے لشکروں (یعنی فرشتوں کی تعداد کو) بجز رب کے کوئی نہیں جانتا اور دوزخ کا حال بیان کرنا) صرف آدمیوں کی نصیحت کے لئے ہے

وَالْقَمَرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝

بالتحقیق قسم ہے چاند کی اور رات کی جب جانے لگے۔ اور صبح کی جب روشن ہو جائے۔

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۝ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ

کہ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے جو انسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے۔ یعنی تم میں سے جو آگے (کی طرف) کو بڑھے

أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝

اسکے لئے بھی یا جو (خیر سے) پیچھے کو ہٹے اسکے لئے بھی۔

تفسیر واعظوں کا قول ہے وہ کہتے ہیں دن رات کے جو بیس ۲۴ گھنٹے یا گھڑی یا ساعت ہوتی ہیں۔ پنجگانہ نماز کی برکت سے پانچ گھنٹوں کو تو معاف کیا جاوے گا۔ باقی ہر ایک گھنٹے پر ایک فرشتہ عذاب کے لئے متعین ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت وہ ہی جانتا ہے۔ اس مقدار پر کفار مکہ مضحکہ کرتے تھے چنانچہ ابو الاشد نے قریش

سے کہا کیا تم مجھے قیامت کے دن اس کو دائیں کندھے سے فوراً بائیں کندھے پھینک دوں گا۔ اور ہم نکل کر جنت میں سیدھے چلے جائیں گے اس پر ابوجہل نے کہا کہ اے قریش تمہاری اس قدر جماعت ہے کیا تم میں سے سو آدمی ایک کا بھی مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ان بیہودہ دماغوں کو دوزخ کے داروغوں کی حالت بیان کرنے کے لئے یہ بھی فرمایا گیا۔
وَمَا جَعَلْنَا أَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۔ کہ ہم نے دوزخ پر اور کوئی معین نہیں کئے بلکہ فرشتے جن کی قوت کو بنی آدم کی قوت سے کوئی نسبت نہیں ایک فرشتہ لاکھوں کروڑوں کو کافی ہے۔ اور نیز وہ غیر جنس ہیں رعایت مروت رحم بھی نہ کریں گے۔ بلکہ سخت کلامی کرنے والے ہیں۔
وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور ان فرشتوں کی تعداد ہم نے انیس 19 اس لئے کی تاکہ وہ عذاب کے فرشتے ان کافروں پر انیس 19 قسم کا عذاب کریں۔ اور یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں کہ کافر آزمائش میں پڑیں۔ ان کی تعداد کو کم سمجھ کر تمسخر کریں اور کفر میں دلیر ہوں۔ تقدیر الٰہی میں ان کا گمراہ ہونا بھی مقدر بن چکا ہے اس کے بعد ظاہر کرتا ہے کہ اس تعداد کے بیان کرنے میں کئی فائدے ہیں
لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۔ تاکہ اہل کتاب کو آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین کامل ہو اس لئے کہ وہ فرشتوں کی طاقت کے قائل تھے۔ سدوم اور عموره لوط علیہ السلام کی بستیوں کو دو فرشتوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ اور بہت واقعات ہیں جن سے فرشتوں کی طاقت معلوم ہوتی ہے۔ اور اس بات کے بھی اہل کتاب قائل تھے کہ جہنم میں کفار اور بت پرست ڈالے جائیں گے۔ اس بات میں بھی اس آیت سے دار آخرت کے معاملہ میں ان کو وثوق اور یقین ہونا ایک معقول بات ہے۔ یہودیوں میں دو فرقے تھے ایک قیامت اور وہاں کے عذاب اور حشر کا منکر تھا۔ دوسرا قیامت اور وہاں کے عذاب و حشر کا قائل تھا۔ لہٰذا یہ بیان ان کے اعتقاد دار آخرت اور وہاں کے عذاب و ثواب کو قوت دینے والا ہے اس لئے ان کو اس کے یقین کرنے میں کچھ تامل نہیں ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی خدا ترس اہل کتاب کو یقین کرنے کا موقعہ ہے۔ جس نے ایک مختلف فیہ مسئلہ آخرت کا فیصلہ کر دیا۔
وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا کہ ایمانداروں کا ایمان زیادہ ہو جائے یعنی اور بھی تقویت اس لئے کہ اب تک قرآن کریم میں جہنم کی زیادہ تشریح نہ تھی اس سے ان کے اعتقاد میں اور بھی قوت ہو جائے گی اس لئے کہ اجمال کے بعد تفصیل علم اور یقین کو قوی کرنے والی بات ہے۔
وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ تاکہ اہل کتاب اور ایمانداروں کو آخرت کے بارے میں شک نہ ہو یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں شک نہ ہو۔ ان کو شک نہ تھا مگر اور اہل شک پر اس میں تعریض ہے۔ اس لئے یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔
وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ تاکہ جن کے دلوں میں شک ہے اور منکر ہیں یہ کہیں کہ اس مثل یعنی بیان سے اللہ تعالیٰ نے کیا ارادہ کیا ہے؟ یعنی وہ اس میں اور نکتہ چینی کر کے اور زیادہ گمراہ ہوں اس لئے اس کے بعد فرماتا ہے۔ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے یا اس کے لئے اسباب ہدایت پیدا کرتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ یا اسباب گمراہی پیدا کرتا ہے ہدایت و گمراہی اسی کی طرف سے ہے یعنی جس طرح جہنم اور اس کے کارکنوں کے بارے میں کسی کو سمجھ میں آنے اور ایمان لانے سے ہدایت ہوئی اور کسی کو سمجھ میں نہ آنے اور انکار کرنے سے گمراہی

ہوئی - ہر معاملہ میں ایسا ہی کرتا ہے - کسی کو اس بات کے بھید سے مطلع کرتا ہے - اور اس کے دل ... میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے - اور کسی کو نہیں ہوتی اس لئے کہ شک اور تردد میں پڑ کر انکا دل تمسخر سے پیش آتے ہیں -

تیرے رب کے لشکروں کی گنتی اور ان کی صحیح تعداد اور ان کی کثرت کا کسی کو علم نہیں وہ ہی خوب جانتا ہے یہ نہ سمجھو کہ بس انیس ۱۹ ہی نہیں جیسے یونانی فلسفیوں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے سمجھ لیا کہ اس سے مراد عقول عشرہ اور نفوس تسعہ ہیں، حالانکہ صرف یہ ان کا دعویٰ ہے - وما یعلم جنود ربک الا ھو جس پر دلیل قائم کرنے سے وہ بالکل عاجز ہیں، افسوس کہ آیت کے اول حصہ پر تو ان کی نظر پہنچی نہیں لیکن آخری حصے کے ساتھ وہ کفر کر رہے - جہاں صاف الفاظ موجود ہیں کہ تیرے رب کے لشکروں کو سوا اس کے کوئی نہیں جانتا پھر انیس ۱۹ صرف کے کیا معنی الصحیحین کی معراج والی حدیث میں ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المعمور کا بیت المعمور کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ساتویں آسمان ہے اور اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے جاتے ہیں، اسی طرح دوسرے روز یہ سلسلہ قیامت جاری رہے گا - فرشتوں کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ جو آج گئے ان کی باری پھر قیامت تک نہیں آنے کی، مسند احمد میں ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے، آسمان چرچرا رہے ہیں، ایک انگلی لگانے کی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ سجدے میں نہ پڑا ہو اگر تم وہ جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے - اور بستروں پر اپنی بیویوں کے ساتھ لذت نہ پا سکتے بلکہ فریاد و فغاں کرتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل کھڑے ہوتے، اس حدیث کو بیان فرما کر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس سے بیساختہ نکل گیا کہ کاش میں درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا،

یہ حدیث ترمذی شریف اور ابن ماجہ شریف میں بھی ہے - طبرانی میں ہے کہ ساتوں آسمانوں میں قدم رکھنے کی بالشت بالشت بھر یا ہتھیلی جتنی جگہ بھی ایسی نہیں کہ جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ قیام کی یا رکوع کی یا سجدے کی حالت میں نہ ہو پھر بھی یہ سب قیامت کے دن کہیں گے کہ خدایا تو تو پاک ہے ہمیں جسقدر تیری عبادت کرنی چاہئے تھی اتنی ہم سے نہ ہو سکی، البتہ ہم نے تیرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، امام محمد بن نصر مروزی رح کی کتاب الصلوٰۃ میں ہے - کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے سوال کیا کہ کیا جو میں سن رہا ہوں تم بھی سن رہے ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا یا رسول اللہ ہمیں تو کچھ سنائی نہیں دیتا، آپ نے فرمایا آسمانوں کا چرچر بولنا میں سن رہا ہوں - کیوں کہ اس پر اس قدر فرشتے ہیں کہ ایک بالشت بھر جگہ خالی نہیں ہے کہیں کوئی رکوع میں ہے اور کہیں کوئی سجدے میں ہے

اور دوسری روایت میں ہے کہ آسمان دنیا میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں سجدے میں یا قیام میں کوئی فرشتہ نہ ہو - عالم محسوس میں ٹڈیوں، چیونٹیوں اور مچھر وغیرہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تعداد پر عقل حیرت میں آجاتی ہے - پھر عالم روحانی کی وسعت اور وہاں کے رہنے والوں کی تعداد اس کے سوا اور کون جان سکتا ہے -

پھر فرماتا ہے وما ھی الا ذکریٰ للبشر کہ جہنم انسان کے لئے ایک نصیحت دینے والی چیز ہے کہ اس کے حالات سن کر غضب و قہر الٰہی سے ڈریں اور نافرمانی سے باز آویں نہ یہ سن کر انکار کریں اور تمسخر سے پیش آویں بعض مفسرین کہتے ہیں ما ھی کی ضمیر آیات کی طرف راجع ہے جو جہنم کی کیفیت بیان کر رہی ہے کہ یہ آیات بشر کیلئے پند و نصیحت ہیں

کفار کی بیہودہ باتوں کا رد کر کے اب اور دوسرے قسم کے دلائل قیامت برپا ہونے اور دنیا میں نبی بھیجے پر بیان فرماتا ہے۔ ایک انتہائی مؤثر بیان سے اہل جہنم کی حالت کی تصویر کھینچتا ہے اور جہنم پر ۱۹ فرشتوں کے ہونے کا ذکر فرماتا ہے۔ ان چند آیات میں مسئلہ حشر اور وہاں کی کیفیت اور دخول نار کے اسباب اور مسئلہ نبوت اور دنیا کی ابتداء و انتہا اور انسان کا انجام کار جو اس کے اس دنیا میں آنے کا نتیجہ ہے۔ اور ضمناً مذاہب باطلہ کا رد بھی فقال کلا۔ نہیں نہیں ضرور قیامت برپا ہوگی اور ضرور جہنم کے اوپر انیس ۱۹ فرشتے مقرر ہیں۔ اور تمہارا زور کام نہ آوے گا اور تم جو کہتے ہو نبی کی کیا حاجت ہے بھیجنے کی نہیں نہیں اس کی بہت ضرورت ہے۔ اور ان باتوں کے ثبوت میں چند چیزوں کی قسم کھا کر بیان کرنا عرب کے لئے کافی تھا۔ اس لئے کہ وہ قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اور اس کو مصیبت آنے کا سبب تصور کرتے تھے اس لئے فرماتا ہے والقمر والليل اذ ادبر والصبح اذا اسفر - تین چیزوں کی ایک چیز ہے کچھ ایسی ویسی بات نہیں جس کو ہلکا سمجھ رہے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جواب قسم محذوف ہو۔ اس لئے کہ وہی جواب قسم ہے جس کی بابت مخاطبین کے رد و بدل ہو رہی ہے اس قرینہ سے اس کو حذف کرنا عین بلاغت ہے۔ اور انها لاحدى الكبر ان تینوں چیزوں کی بابت ہو کر قسم کھائی ہے یعنی ہم ان چیزوں کی اسی لئے قسم کھاتے ہیں کہ یہ بڑی چیزوں میں سے ہیں۔ اور نذیرا للبشر کی ان تینوں چیزوں کی نسبت کہنا ان کے واقعی حال کو بیان کرنا ہے یا یہ کہ ہم ان کی قسم انسان کے تنبیہ کرنے کے لئے کھاتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کے متنبہ کرنے کے لئے بھیجا ہے یا یہ کہ قیامت کا واقعہ انسان کے ڈرانے اور ہوشیار کرنے کو بیان کیا ہے۔ عرب کے یقین دلانے کو تو صرف ان چیزوں کی قسم کھانا کافی تھا۔ مگر اور لوگوں کے لئے خود ان تین چیزوں میں قیامت کا برپا ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی مرسل ہونا ثابت ہو جاتا ہے اب اختیار ہے کہ ان حالات کا نتیجہ نکالا جاوے یہ تینوں چیزیں وجود قیامت پر اس لئے دلیل ہیں۔ چاند اس لئے کہ اس کے نور کا گھٹنا بڑھنا اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے اور یہ نمونہ ہے دنیا کو آباد کر کے بگاڑنے اور پھر دوسری بار زندہ کرنے کا۔ چاند رفتہ رفتہ روشنی زیادہ دیتا جاتا ہے آخر جب کامل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد نقصان شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی روشنی میں وقت کے اعتبار سے کمی آتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر چاند نمودار ہوتا ہے۔ اور اگلے مہینہ میں روشنی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی اصول و ضوابط کے ساتھ جبکہ پہلے ہوا تھا۔ اسی طرح دنیا نے تدریجاً ترقی کی اور کرتی جا رہی ہے۔ حالات حاضرہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اب انسان نے خلار میں بھی کامیابی حاصل کر لی جو کہ پہلے ایک امر ناممکن تھا اب اس کو ممکن کر دکھایا۔ جب پوری ترقی اور حد پر پہنچ جائے گی۔ تو رفتہ رفتہ انحطاط شروع ہو جائے گا۔ اچھے نیک لوگ اور اچھائیاں اٹھتی جائیں گی۔ آخر ایک روز فنا ہو جاوے گی اور اس تاریکی عدم کے بعد اس کو دوسری زندگی کا نور بخشا جائے گا جو پھر فنا نہ ہوگا۔ اور اس لئے بھی چاند قیامت کی نشانی ہے کہ قیامت کے قریب اس کا شق ہونا پہلی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر چاند اس لئے دلیل ہے کہ یہ رات کو روشن و منور کرتا ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں بھی اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس قادر مطلق نے اپنی حکمت و فضل سے نبی آخر الزماں کو بھیجا۔ جو دنیا کی تاریکی دور کرنے والا چاند کے مثل ہے۔ مذکورہ آیت میں تو صاف اشارہ ہے کہ رات کی اندھیریاں ختم ہو چلیں۔ ظلمت کا زمانہ رخصت ہوتا چلا ہے۔ اور صبح ہدایت روشن ہوتی جاتی ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں چراغ روشن سے کہیں چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور ایام جاہلیت کو رات سے اور قیامت کی طرف اس لئے اشارہ ہے کہ دنیا مع اپنے چاند اور ستاروں کے تمام ہوا چاہتی ہے

اس کا وجود عارضی اور چند روزہ ہے - اور یہاں کی ہستی کدورتوں اور خلش سے صاف نہیں - اسی لئے اس کو رات سے تشبیہ دی ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس کی صبح ہے - آخر زمانہ اور تنویر کے لحاظ سے - اب اس کے بعد آفتاب برآمد ہونے والا ہے - جس سے دار آخرت اور اس ابدی جہان کی طرف اشارہ ہے وہاں ہر ایک کو اصلی روشنی میں اپنے نیک و بد کا اور علم و جہل کی حقیقت معلوم ہو جائے گی - یہ جہاں رات ہے اس میں جو کچھ نور ہے - تو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و ارشاد کا نور ہے - حق و باطل میں امتیاز کرنے کو اسی قدر روشنی کافی ہے کہ جس قدر چاند سے رات میں پیدا ہوتی ہے - مگر انکشاف کلی قیامت کے دن ہی میں ہوگا - جس کی صبح نمودار ہو چلی - اس لئے فرمایا گیا ہے

انها لاحدى الكبر یہ ایک بڑی بات ہے نذيرا للبشر - انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والی ہے - فرماتا ہے - لمن شاء منكم ان يتقدم او يتاخر اب جو چاہے تم میں سے آگے آئے سعادت کے رستہ میں بڑھ کر قدم رکھے جو چاہے پیچھے ہٹے اور جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے مگر جو پیچھے ہٹے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں دار آخرت کی پوچھ تاچھ سے آزاد ہو جاؤں گا - میرے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی -

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ○ إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ○ فِي جَنّٰتٍ

ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) کے بدلے میں (دوزخ میں) محبوس ہوگا - مگر داہنے والے کہ وہ بہشتوں میں ہوں گے مزا اور مجرموں (یعنی

يَتَسَآءَلُونَ ○ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ○ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ

کفار) کا حال (خود ان کفار ہی سے) پوچھتے ہوں گے - یعنی مومنین کفار سے پوچھیں گے) کہ تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے

نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ○ وَكُنَّا نَخُوضُ

ہم - تو نماز پڑھا کرتے تھے - اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور مشغلہ میں رہنے والوں کیساتھ

مَعَ الْخَآئِضِينَ ○ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ○ حَتّٰىٓ أَتٰىنَا

ہم بھی (دائمی) شغل میں رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے - یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو

الْيَقِينُ ○ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفٰعَةُ الشّٰفِعِينَ ○ فَمَا لَهُمْ عَنِ

موت آ گئی سو (اس حالت مذکورہ میں) انکو سفارش نفع نہ دیگی (اور جب کفر و اعراض کی بدولت انکی یہ گت بننے والی ہے) تو ان کو کیا ہوا

التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ○ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ○ فَرَّتْ مِن

کہ اس نصیحت (قرآنی) سے روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں

قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً

بلکہ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسکو کھلے ہوئے (آسمانی) نوشتے دے جائیں۔ آگے اس بیہودہ درخواست کا رد ہے

كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ

کہ یہ ہرگز نہیں (ہو سکتا) بلکہ یہ لوگ آخرت (کے عذاب) سے نہیں ڈرتے (پس یہ) ہرگز نہیں (ہو سکتا بلکہ قرآن ہی)

شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ

نصیحت (کے لئے) کافی ہے۔ سو جسکا جی چاہے اس نصیحت سے نصیحت حاصل کرے اور بدون خدا کے چاہے یہ لوگ نصیحت قبول

التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝

نہیں کریں گے۔ وہی ہے جس (کے عذاب) سے ڈرنا چاہئے اور وہی ہے جو بندوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ جل شانہٗ خبر دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال میں قیامت کے دن جکڑا بندھا ہوگا۔ خواہ وہ امیر، غریب، شریف ہو، الا اصحاب الیمین۔ لیکن جن کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ آیا ہے وہ جنت کے بالاخانوں میں چین سے بیٹھے ہوں گے۔ جو قیامت کو تخت رب العالمین کے دائیں طرف کھڑا ہوگا۔ ان کو ان کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دے جائیں گے۔ اور روز میثاق بھی وہ دائیں طرف تھے اور یمین یمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی برکت اور بہتری کے ہیں یعنی اہل خیر ایماندار اور نیکوکار وہ اپنے اعمال میں ماخوذ نہ ہوں گے، اس لئے کہ ان کے اعمال قابل مواخذہ ہی نہیں۔

اور وہ اصحاب الیمین اس روز روشنی میں کہ جس کی صبح نمودار ہونے والی ہے۔ کہاں رہیں گے، باغوں میں جہاں اپنے اعمال و ایمان کے پھل کھائیں گے۔ اور یہ ان کی اس محنت کا نتیجہ ہے جو انھوں نے دنیا میں اٹھائی تھیں پھر فرمایا گیا ہے۔ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ۔ گناہگاروں سے پوچھیں گے کہ تم کو کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا (کیونکہ حجاب جسمانی جو قرب و بعد کا رویت میں فرق پیدا کر دیتا ہے اٹھ جائے گا) دوزخی ان جنتیوں کو جواب دیں گے۔ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ہم دنیا میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اہل صلوٰۃ کی جماعت میں نہ تھے وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ اور نہ فقیروں اور محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے یعنی نہ تو بدنی و روحانی عبادت کرتے تھے اور نہ مالی عبادت کرتے تھے۔ اور یہ ہی نہیں وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ اور خدا اور رسولؐ کی باتوں میں اور غوطہ لگانے والوں کے ساتھ ہم بھی غوطہ لگاتے تھے۔ کہتے تھے کہ قیامت نہ ہوگی، وہاں کی کیا خبر ہے کون دیکھ کر آیا ہے۔ اب تو مزے کر لو یہ دونوں باتیں قوت نظریہ کے خراب کرنے والی ہیں تھیں، اعمال نیک بھی نہ کئے، ایمان بھی نہ لائے تھے پھر یہ بات کب تک رہی۔ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ۔ یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی اور مرتے دم تک کسی سمجھانے والے کی بات کو نہ مانا اسی جہالت میں پڑے رہے۔ موت کو یقین اس لئے کہتے ہیں کہ اسی کی بابت دنیا میں کسی کو بھی شک نہیں ہر شخص خواہ نیک بخت ہو یا بدبخت ہو عالم ہو یا جاہل ہو سب اس کے قائل ہیں اور یہ بھی ہے

کہ مرنے کے وقت وہ پھر جو اس جہاں میں پڑا ہوا ہے اٹھ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی ہر بات دکھائی دینے لگتی ہے یقین آجاتا ہے۔ مگر اس وقت کیا فائدہ ایمان و عمل کا وقت جاتا رہا اسی لئے خود ہی فرماتا ہے۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ کہ اس روز شفارش کرنے والوں کی شفارش کام نہ آوے گی۔ اس لئے کہ شفاعت یا ایمان واعمال صالحہ کرتے ہیں وہ ان کے پاس نہیں تھیں یا حضرات انبیاء و اولیاء کرتے ہیں ان سے بیزاری پیدا کر لی تھی۔ وہ ان سے بیزار تھے۔ ان آیات میں انسان کا انجام بتایا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ دار آخرت میں کارآمد یا تیں یہ ہیں۔ نماز، خیرات، ایمان اور اطاعتِ خدا اور رسول اور ان کے برخلاف کرنے سے جہنم میں داخل ہونا یقینی امر ہے۔ اور جہنم کے عذابوں سے گذرنا بھی لازمی اور یقینی ہے۔ پھر فرمایا گیا۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے جو اس روز کے لئے کارآمد نصیحتوں سے منہ پھیر لیتے ہیں اور نہ بھی کس طرح پھیرتے ہیں۔ اور بھاگتے ہیں كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ گویا کہ وہ جنگلی گدھے ہیں جنگل میں شیر کو دیکھ کر یا آواز اور شور و غل سن کر بدک کر بھاگتے ہیں۔ نفع و نقصان کچھ نہیں دیکھتے ہیں نہ سوچتے ہیں۔ نصیحت اور بھلائی سے پھیرنا کبھی کم فہمی اور بے عقلی سے ہوتا ہے کہ اس کے فوائد معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ بیمار دوا پینے سے احتراز کرتا ہے۔ اور کبھی کسی وہم اور خیالی اندیشے جیسا کہ فصد سے جسمیں وہم ہوتا ہے کہ رنج ہوگا۔ اور کبھی عادات و رسومات کی پابندی جس لئے اس کے خلاف کسی کی نصیحت سننا نہیں چاہتا جیسا کہ عوام جاہل اپنے مالوفات اور رسوم بد کے خلاف سننا گوارا نہیں کرتے اور فسق و فجور کی ناپاک خواہش ان کی عقل پر غالب آجاتی ہے وہ بد سے بدتر کام نہیں چھوڑتے کیونکہ ان کی عقل سلیم مغلوب ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کو جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیا اور ناصح مشفق کو شیر سے جس کی نصیحت کو اپنی قوت متوہمہ کے سبب مضر اور خطرناک جانتا ہے۔ بہت ٹھیک تشبیہ ہے۔ ایک پانچویں صورت اور بھی اعراض کی ہے کہ اس کا تکبر اور غرور اجازت نہیں دیتا کہ کسی اور سے مستفید ہو حالانکہ ہر معاملہ میں اسکی بھلائی سمجھتا ہے۔ اس لئے فرماتا ہے۔ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً۔ بلکہ اس لئے بھی نہیں مانتے کہ ہر ایک ان میں سے یہی چاہتا ہے کہ اس پر آسمان سے بند اور ملفوف نہیں یعنی ہر ایک بغیر وسیلہ نبی مرسل خدا پاک سے ہمکلام اور مخاطب ہونیکی ہوس رکھتا ہے۔ جیسا کہ بعض حکماء کہتے ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ کفار قریش کہتے تھے کہ ہم آپ کو جب مانیں گے کہ ہر ایک کے پاس آسمان سے ایک فرمان آوے جسمیں لکھا ہو یہ فرمان رب العالمین کی طرف سے فلاں بن فلاں کی طرف ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کا) کہنا مان لو۔ اسی مضمون ایک اور آیت میں بھی ہے۔ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ فرماتا ہے۔ كَلَّا یہ ہرگز نہ ہوگا اس لئے کہ ہر ایک میں اس سے مخاطب ہونیکی قابلیت نہیں۔ کیونکہ نفوس انسانیہ کے درجات متفاوت ہیں بعض کو عالم علوی سے مناسبت ہے اور بعض کو نہیں دنیاوی کاروبار میں دیکھ لو۔ عمدہ کام کی ہر ایک صلاحیت نہیں رکھتا چہ جائیکہ عالم ملکوت کے اسرار پر مطلع ہونے کے یہ تو ان کفار کی خرمستی کی باتیں ہیں بلکہ بات یہ ہے۔ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ کہ وہ کفار آخرت کے معاملات سے ڈرتے نہیں اسی لئے ان کا ان باتوں پر ایمان نہیں، اگر ان کو کچھ بھی ان پیش آنے والی مصیبتوں کا خوف اور اندیشہ ہوتا جیسا کہ دنیاوی امور میں ہوتا ہے۔ اور اس کی چارہ جوئی کے لئے ہر ایک کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ اور اپنی کمیابگی اور فروتنی کا اظہار کرتے ہیں تو ضرور ہمارے نبی علیہ السلام

کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے دفعیہ کی تدابیر پوچھتے۔
باری تعالیٰ پھر اعادہ فرماتا ہے کلا کہ تم جو چاہیئے ہو وہ ہرگز نہ ہوگا۔ انہ تذکرۃ یہ قرآن ایک نصیحت ہے فمن شاء ذکرہ جو چاہے اس کو یاد کرے نصیحت سے مستفید ہو اس لیے کہ اس کا اسی کو نفع ہے اور چاہے نہ مانے جہنم میں جاوے مگر وما یذکرون الا ان یشاء اللہ۔ اس کو یاد بھی وہ ہی کرتے ہیں جن کو یاد کرانا اللہ چاہتا ہے۔ ٹھیک اس مصداق کے۔

این سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدار بخشندہ

یعنی یہ سعادت انسان کے قوت عمل پر بالکل منحصر نہیں ہے بلکہ جب باری تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سعادت دینا چاہتے ہیں۔ جب ہی دیجاتی ہے۔ کس لیے کہ ھو اھل التقویٰ واھل المغفرۃ وہ ہی متقی بناتا ہے اور وہ ہی متقی بنا کر بخش دیتا ہے۔ یا یوں کہیئے وہ ہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرنا چاہیئے تمام نفع و نقصان کی باگ دوڑ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر جب اس سے کوئی ڈرتا ہے تو وہ بخشدیتا ہے وہ بخشنے کے قابل ہے۔ اس کے ڈر کے ساتھ بخشش لگی ہوئی ہے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ہی اسی قابل ہوں کہ مجھ سے ڈرے پس میرے ساتھ کوئی شریک نہ بنایا جائے۔ پھر جو مجھ سے ڈرے گا۔ میرے ساتھ اور معبود نہ ٹھہرائے گا تب میں اسکو بخشش دوں گا۔ اس حدیث کو ترمذی ونسائی وغیرہ محدثوں نے نقل کیا ہے۔
مسند احمد میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ تمہارا رب فرماتا ہے کہ میں اس کا حقدار ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرے ساتھ دوسرا معبود نہ ٹھہرایا جائے جو میرے ساتھ شریک بنانے سے بچ گیا وہ میری بخشش کا مستحق ہو گیا۔

سُورۃ القیامۃ	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	پارہ ع ۲۹

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ○

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے (آگے منکرین

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ○ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ

بعثت پر رد ہے یعنی کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیاں ہرگز نہ جمع کریں گے۔ ہم ضرور جمع کریں گے۔ اور یہ جمع کرنا ہم کو

نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ○ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ ○ یَسْئَلُ

کچھ دشوار نہیں۔ کیونکہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اسکی انگلیوں کی پوریوں تک درست کر دیں۔ بلکہ بعض آدمی (قیامت کا منکر ہو کر) یوں چاہتا ہے کہ آئندہ زندگی میں بھی (بیخوف وخطر ہو کر) فسق وفجور کرتا رہے۔

أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ۝ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ

اس لئے بطور انکار کے پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آوے گا۔ سو جس وقت (مارے حیرت کے) آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اور چاند بے نور

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا

سکی کیا تخصیص ہے بلکہ، سورج اور چاند دونوں) ایک حالت کے ہو جائیں گے (یعنی دونوں بے نور ہو جائیں گے) اس روز انسان کہیگا کہ اب کدھر جاؤں

لَا وَزَرَ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّأُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ

ہرگز بھاگنا ممکن نہیں (کیونکہ کہیں پناہ کی جگہ نہیں اس دن صرف آپ ہی کے رب کے پاس ٹھکانا (جانیکا) ہے اس روز انسان کو اس کا سب اگلا

بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ

پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جاویگا۔ (اور انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا، بلکہ انسان خود اپنی حالت پر

مَعَاذِيرَهُ ۝

خوب مطلع ہوگا۔ گویا قضائے طبیعت اسوقت بھی اپنے (حیلے حوالے) پیش لاوے

تفسیر :- یہ سورۃ بھی بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ابن عباس رض اور ابن زبیر رض کا بھی یہی قول ہے اس کی چالیس آیات ہیں اس میں سورۃ کے شروع ہی میں قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور بعد میں بھی قیامت کے حالات مذکور ہیں اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۃ قیامہ ہوا۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جس چیز پر قسم کھائی جائے اگر وہ رد کرنے کی چیز ہو تو قسم سے پہلے "لا" کا کلمہ نفی کی تاکید کے لئے لانا جائز ہے

سورۃ مدثر سے مناسبت :- سورۃ مدثر میں قیامت کے ظاہری واقعات کی ابتدا مذکور تھی۔ اور اس سورۃ میں قیامت کے باطنی واقعات کی ابتداء اور انتہا مذکور ہے۔

ابتداء یہ کہ عقل اس روز متحیر ہو جائے گی۔ اور انتہا دیدار الٰہی یا اس سے محرومی کے بعد سیاہ روئی حسرت و ندامت ہے۔ سورۃ مدثر میں آخر میں فرمایا گیا ہے۔ یہ اسی کی شان ہے کہ اس سے خوف کیا جائے اور وہی معافی دیتا ہے۔ مگر دنیا چند روزہ جو دار العمل ہے۔ اس تقویٰ اور مغفرت کے آثار تو یہ ظاہر ہونے کی جگہ نہیں، بلکہ یہ ایک دوسرا جہان ہے۔ جو ابدی ہے۔ اور اس کی ابتدا قیامت سے ہے، اس لئے قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ اسی کے بعد نفس اللوامہ کی بھی یعنی اچھے لوگوں کی جان کی بھی جو اپنے برے کاموں پر ملامت کرتے ہیں۔ اور واقعی ایسے ہی لوگ متقی و پرہیزگار رہیں اور لوگ اس روز مغفرت کے آثار دیکھیں گے۔

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۔ یہاں لا قیامت کے ہونے پر اور جاہلوں کے اس قول کی تردید پر کہ قیامت نہ ہوگی قسم کھائی جا رہی ہے کہ ہم قسم کھاتے ہیں قیامت اور نفس

لوّامہ کی کہ انسان اس روز اپنی تقصیرات پر حسرت کرے گا۔ اور سخت نادم ہوگا۔ نفس لوّامہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اچھے لوگ دنیا میں اپنی تقصیرات پر حسرات وندامت کرتے ہیں کیونکہ ان کو چشم بصیرت ہے۔ برے بھلے میں امتیاز کرتے ہیں۔ نفس کی خواہش سے اگر کوئی تقصیر ہوجاتی ہے۔ تو فوراً نادم بھی ہوجاتے ہیں۔

حضرت حسن رح فرماتے ہیں کہ قیامت کی قسم ہے اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم نہیں ہے۔ حضرت قتادہ رح فرماتے ہیں کہ دونوں کی قسم ہے۔ لیکن صحیح قول یہی ہے کہ دونوں کی قسم کھائی ہے، جیسے حضرت قتادہ رح کا فرمان ہے۔ حضرت ابن عباس رض اور سعید بن جبیر رح سے بھی یہی مروی ہے۔

چشم بصیرت رکھنے والے تو نادم ہوجاتے ہیں، ان اندھے جاہلوں کی طرح اس پر اڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ اندھے اس روز حسرت وندامت کریں گے۔ کیونکہ اس روز روشنی میں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی مگر لاحاصل کیونکہ وقت گزر چکا۔

نفس سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد جان یا روح انسانی ہے اور وہی مدرک ہے اور وہ دراصل انسان ہے، اور یہ جسم اکتساب کمالات کے لئے اس کا آلہ یا اوزار ہے۔ نفوس انسانیہ کی بھی کئی قسمیں ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے نفوس قدسیہ مطمئنہ ہیں کہ ان کو حق سبحانہ کی قربت سے اطمینان وسکون و فیضان حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد صالحین ہیں ان کے قلوب کو بھی ذکر الہی سے اطمینان ہے مگر نہ اتنا اور نہ ان میں اپنی تقصیرات پر ملامت کرنے کی صفت غالب ہے اس لئے ان کے نفس کو نفس لوّامہ کہتے ہیں۔

اس کے برعکس بدکار، فاسقوں اور کافروں کا نفس امارہ ہے۔ اس لئے قیامت کے روز فلاح مندی بتا کر تسلی کا باعث ہے۔ مگر قیامت کا آنا ان کے لئے دلائل سے ثابت کر دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے بعد ان کے شک کو اور بھی رفع کرتا ہے۔ ان کے دو قسم کے شبہات تھے اوّل جہالت کی وجہ سے کہ وہ قیامت اور حساب وکتاب کے دن کا خیال بھی نہ کرتے تھے۔ اپنے لہو ولعب کی وجہ سے، اوّل شبہ کو بیان کر کے اس کا رد کیا جاتا ہے۔ ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ، وہ انسان جو قیامت کے منکر ہیں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان کی بوسیدہ ہڈیوں کو پھر جمع نہ کر سکیں گے۔؟

مشرکین مکہ کا قیامت کے بطلان پر کسی دلیل وبرہان پر اعتماد نہ تھا وہ اسی شبہ سے باطل کرتے تھے کہ ہم دیکھتے ہیں انسان مرجاتا ہے۔ اس کی ہڈیاں اور گوشت پوست خاک میں مل جاتا ہے ہوا اڑا کر لے جاتی ہے۔ اب یہ دوبارہ کیونکر جمع ہو سکتے ہیں۔ ان کافروں کو اس بات کا جواب وضاحت سے دیا جاتا ہے۔

بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ۔ ہاں جمع کریں گے کہ ہم اس کی انگلیوں کے پوروں کے درست کرنے پر قادر ہیں۔ انسان کے بدن میں سب بدن تیار ہونے کے بعد آخر میں انگلیوں کی کھال ہوتی ہے۔ یہ اس کی تعمیر بدن کا خاتم ہے۔

آسمان وزمین کی پیدائش اور انسان کا اوّل بار منی کے قطرے سے بنتا وغیرہ ہزاروں اس کی قدرت کاملہ کے نمونہ ان لوگوں نے دیکھے تھے، وہ سب دیکھتے ہیں۔ پھر جو ایسا قادر وحکیم ہے کہ جس نے اوّل

بار، اس کو ایسی چیزوں سے پیدا کر دیا وہ بار دگر پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ یہ بات عقل سلیم میں آجائے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے۔ اور یہی ایک بڑی قوی دلیل حشر کے برپا ہونے پر ہے اس سلئے فرماتا ہے کہ یہ انکار و تعجب دراصل کچھ نہیں ہے

بل یرید الانسان لیفجر امامہ۔ بلکہ اس انکار سے اس کی غرض یہ ہے کہ پہلے تو جو کچھ کیا تھا سو کیا تھا۔ آئندہ بھی دل کھول کر بدکاری پر بدکاری کرے۔ اس لئے کہ اب قیامت اور وہاں کی باز پرس کا کھٹکا تو اس نے اس انکار سے نکال ہی دیا۔ اس فسق و فجور کا نشہ اس قیامت کا لفظ بھی منہ پر نہیں لانے دیتا۔ اور نہ اس کے دلائل میں غور و فکر کی مہلت دیتا ہے۔ اس لئے دلیر ہو کر دریافت کرتا ہے۔ یسئل ایان یوم القیامۃ کہ کب ہے قیامت کا دن؟ یسئل سے یہاں تک دوسرے شبہات کا رد ہے جو شہوات پر مبنی ہے۔ بعض مفسرین امامہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرتے ہیں تب یہ معنی ہوں گے۔ کہ قیامت کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے بدکرداری کرنا چاہتا ہے جو پوچھتا ہے کہ ایان یوم القیامۃ کہ کب ہے قیامت کا دن؟ یہ انسان کی کمال بے شرمی اور بعد دلیری ہے کہ اپنے مولا کے روبرو گستاخانہ سوال کرتا ہے۔ اس لئے اسکو ڈرنا اور اپنے حال کی اصلاح کرنی چاہئے، کوئی طبیب حاذق خبر دے کہ یہ مرض تجھکو لاحق ہے علاج کر ورنہ مر جائے گا پھر یہ مڑے جاہل کا کام ہے کہ اس سے پوچھے کب اور کس تاریخ کو مروں گا۔ اس کے بعد قیامت کی علامات و حالات بیان کرتا ہے جسکے سننے سے دل لرزتا ہے۔ دہشت معلوم ہوتی ہے۔

فاذا برق البصر کہ جب آنکھیں چوندھیا جاویں یہ اور اس روز کی تجلی نورانی سے ہوگا۔ جبکہ تخت رب العلمین عدالت کے لئے فرشتے ملکر رکھیں گے۔ اس قہر اور جبروت کی تجلی کو آنکھیں دیکھ نہ سکیں گی مثلاً آفتاب کے سامنے دیکھا نہیں جاتا۔ آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ پھر وہ تجلی تو اس سے لاکھوں درجہ بڑھ کر ہوگی جس کے آگے بجلی جیسی چیز کی چمک بھی کوئی چیز نہیں۔

مفسرین حضرات نے اس سلسلے میں مختلف تشریحات کی ہیں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قیامت دو قسم کی ہوگی۔ قیامت صغریٰ۔ قیامت کبریٰ۔ قیامت صغریٰ موت کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے جبکہ اس عالم ناسوتی پر پردہ پڑ جائے گا۔ اور دوسرے عالم کا پردہ اٹھ جائے گا تو وہاں کے ہولناک حالات دیکھکر کافر و فاسق کی آنکھیں حیرت و دہشت کے مارے اوپر چڑھ جائیں گی۔ وہ شہوت کا نشہ جس کی وجہ سے انکار قیامت کرتا تھا فوراً اتر جائے گا۔ پھر موت کے بعد اسکو قیامت کبریٰ کا آپ ہی یقین ہو جائے گا۔ یہیں سے اسکا وقت شروع ہے۔ اور ایماندار اور نیک لوگوں کی آنکھیں عالم ملکوت کی تجلیاں دیکھ خیرہ ہو جائیں گی۔ اور اولیاء کرام و انبیاء عظام کی اس کی تجلی ذاتی سے جو عین وصال ہے۔

یہ قیامت کی پہلی علامت تھی۔ اس کے بعد دوسری علامت بیان فرماتا ہے۔ وخسف القمر کہ چاند بے نور ہو جائے گا۔ یہ قیامت کبریٰ کے قریب ہوگا۔ لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ بھی موت کے وقت ہوگا کیونکہ اکثر کسی لفظ کے لغوی معنیٰ لئے جاتے ہیں اور اکثر معنوی، اور بعض وقت مراد لی جاتی ہے۔ جن مفسرین کا مذکورہ بالا خیال ہے وہ قمر سے مراد قمر عقل لیتے ہیں جب یہ سب کچھ واقعات ہوں گے۔ تو ظاہر ہے کہ عقل انسانی ماری جائے گی۔ تیسری علامت وجمع الشمس والقمر چاند و سورج جمع کئے جائیں گے۔ یہ بھی

قیامت کے وقت نفخ صور پھونکا جائیگا کہ دونوں بے نور کر کے عدم کے گڑھے میں ایک ساتھ پھینک دئے جائیں گے۔ اور نفخ صور دوم پر نیا آسمان نئی زمین نئے چاند اور سورج پیدا ہوں گے۔ جو مفسرین ان کو بھی علامات موت سے قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قمر و شمس کے جمع ہونے سے بطور کنایہ کے روح آفتاب و قمر دل کا جمع ہونا مراد ہے کہ پھر اس وقت دل پراد ھر ادھر کے خیالات طاری ہوں گے۔ بلکہ صرف روحانی یا ذات و صفات کا اجتماع مراد ہے۔

بہر حال علم کی روشنی میں ہر ہر پہلو پر مفسرین نے ہر ہر زاویہ سے روشنی ڈالی اس وقت انسان کی عجیب حالت ہوگی یَقُولُ الْاِنْسَانُ اَیْنَ الْمَفَرُّ۔ انسان جب یہ پریشانی، شدت ہول، گھبراہٹ اور نظام عالم کی یہ خطرناک حالت دیکھے گا تو بھاگتا جائے گا اور کہے گا کہ جائے پناہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔ جو اس مصیبت سے امن پاؤں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا۔ کَلَّا نہیں نہیں۔ لَا وَزَرَ کوئی امن و پناہ کی جگہ اس دن نہ ہوگی۔ جس نے آج پناہ کی جگہ پیدا نہیں کی اس کو اس دن نہ ملے گی۔ بلکہ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ۔ اس روز تیرے رب کے پاس ٹھہرنے کی جگہ ہوگی مشتاقان دیدار خود بخود آئیں گے۔ اور اشرار و فجار بال پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دربار میں لائے جائیں گے۔ پھر وہاں حساب و کتاب شروع ہوگا۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ۔ اس روز آدمی کو بتا دیا جائے گا۔ کہ اس نے کیا نیک کام آج کے دن کے لئے آگے بھیجے تھے۔ مراد ہے دنیا میں رہتے ہوئے کیا نیک کام کئے تھے۔ اور کیا نہیں کئے تھے۔ مثلاً دنیا میں رہتے ہوئے مساجد، مدارس کا قیام اور غرباء کے لئے طعام کا انتظام اور بھی بہت سے نیک کام ہوتے ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے کئے تھے۔ قرون اولیٰ کے لوگ کنواں کھدواتے تھے اور قیام کی جگہ مسافروں کے لئے تیار کراتے تھے۔ یہ سب باتیں اچھی ہیں۔ نیک کام ہیں ان کا صلہ باری تعالیٰ اچھا عطا فرمائے گا برخلاف دنیا میں رہتے ہوئے غلط کام کرنا بری رسمیں چھوڑنا اور بنی نوع کو تکلیف پہونچانا یہ سب باتیں باعث عذاب ہیں ان کا عذاب ملنا ہے۔ روز جزا و سزا میں بتلانے کی ضرورت بالکل نہ ہوگی۔ محض الزام و اکرام مقصود ہوگا۔ ورنہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ آدمی خود اپنے حال اور نیک و بد اعمال سے واقف ہوگا۔ اور اب بھی جو لوگ منصف ہیں وہ واقف ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو یہ علم تو رہتا ہی ہے کہ میں نے آج کیا اچھا کام کیا اور کیا برا کیونکہ جو کچھ سرزد ہوتا ہے انسان کے علم میں ہوتا ہے۔ خواہ وہ نیک کام ہو یا بد کام۔

وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ قیامت کے دن انسان فضول بہانے بنائے اور جھوٹی دلیلیں دے اور بیکار عذر پیش کرے ایک بھی قبول نہ کیا جائے گا، یا پردے ڈالے اور چھپائے اور اہل یمن پردے کو عذر کہتے ہیں۔ لیکن صحیح معنا پہلے ہیں جیسے دوسری جگہ بھی بیان فرمایا گیا کہ کوئی معقول عذر نہ پاکر اپنے شرک کا سرے سے انکار ہی کر دیں گے کہ قسم خدا کی ہم مشرک تھے ہی نہیں۔ نیز یہ بھی جہاں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن مشرک خدا کے سامنے بھی قسمیں کھا کھا کر سچا ہونا چاہیں گے۔ لیکن خدائے برتر و توانا پر ان کا سب جھوٹ ظاہر گو اپنے آپ کو وہ کچھ بھی سمجھتے رہیں —— غرضیکہ عذر و معذرت انہیں قیامت کے دن کچھ کار آمد نہ ہوگی۔ ایسے ہی اور جگہ فرمایا ہے کہ ظالموں کو ان کی معذرت کچھ کار آمد نہ ہوگی۔ اس لئے نہ ہوگی یہ کا فرد مشرک، اپنے شرک کے ساتھ ہی اپنی تمام بد اعمالیوں کا انکار کر دیں گے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قسمیں کھائیں گے۔ اور باری تعالیٰ کے سامنے طرح طرح کے عذر کریں گے۔ لیکن یہ سب کچھ اس دن بے سود ہوگا

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○

اور ۔ اے پیغمبر آپ (قبل وحی کے ختم ہو چکنے کے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے تاکہ آپ اسکو جلدی جلدی لے لیں ۔ کیونکہ ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں)

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ○ كَلَّا بَلْ

آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اسکو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجیے ۔ پھر ہمارا

تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ○ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ

اے منکرو (قیامت کی بابت جیسا تم سمجھ رہے ہو) ہرگز ایسا نہیں بلکہ (صرف یہ بات ہے کہ) تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو ۔ بہت سے چہرے تو اس

نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ○

روز بارونق ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے ۔ یہ تو مؤمنین کا حال ہوا) اور بہت چہرے اس روز بدرونق ہوں گے (اور وہ لوگ)

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ○ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ○ وَقِيْلَ

خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ کیا جاویگا ۔ یعنی ان کو عذاب شدید ہوگا ۔ ہرگز ایسا نہیں جب جان ہنسلی تک پہنچ جاتی ہے اور

مَنْ ۜ رَاقٍ ○ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ○ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ○

کہ کوئی جھاڑنے والا ہے اور (اس وقت) وہ (مردہ) یقین کر لیتا ہے کہ یہ مفارقت (دنیا) کا وقت ہے اور (شدت سکرات موت سے) ایک پنڈلی دوسری

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ○

پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے اس روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے ۔

تفسیر :- پہلے ذکر بیان فرمایا گیا ہے کہ انسان جلد باز ہے ۔ اور یہ جلد بازی خواہ دینی کاموں میں ہو خواہ دنیاوی اس حکمت کے خلاف ہے جو اس نے باوجود ایک دم میں پیدا کر سکنے کے آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا ۔

کفار قیامت کے بارے میں جلد بازی کر کے پوچھتے تھے ۔ **ایک حکم** :- یہاں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دیتا ہے کہ فرشتے سے وحی کس طرح لیں ، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لینے میں بہت جلدی کرتے تھے ۔ ادھر جبرئیل علیہ السلام نے وحی سنانا شروع کیا ۔ ادھر اس کے ساتھ ساتھ شوق میں آپ بھی پڑھتے تھے اور یہ خیال فرماتے تھے کہ کبھی بھول نہ جاؤں اور نیز یہ بھی شوق تھا کہ جلد مطلع ہو کر لوگوں کو مطلع کر دوں اس لئے قیامت کے بیان میں بطور جملہ معترضہ کے لا تحرک بہ لسانک سے لے کر ثم ان علینا بیانہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس جلدی سے منع فرمایا اور تلقی وحی کا قاعدہ ، اصول و ادب سکھایا ۔ اور اس اندیشہ کی بابت کہ شاید آپ

بھول نہ جائیں کہ آپ تسلی رکھیں ۔ حکم کہ آپ کو بھولنے نہ دیں گے اور ہم خود اس کو لوگوں پر ظاہر کر دیں گے ۔

اور یہ جملہ معترضہ اس مسلسل بیان میں ایسا ہے کہ جیسے کوئی معلم کسی شاگرد کو تعلیم دیتا ہو ۔ اور اثناء درس میں شاگرد ادھر ادھر متوجہ ہوتا ہو تو وہ اس کو بیچ میں ٹوک دے اور کہہ دے کہ ادھر ادھر متوجہ نہ ہو اور یہ بھی ایسا ہوتا ہے ۔ استاد کی جس شاگرد پر نظر خاص ہوتی ہے وہ ہی اسکی بابت گہری نظر رکھتا ہے ۔ پھر کیا اس کے کلام میں بے ربطی کا باعث تصور ہو سکتا ہے ۔ ایسے موقع پر یہ الزام قائم کرنا معترض کی کم فہمی ہے ۔

بخاری و مسلم وغیرہما نے ابن عباس رضؓ سے اس آیت لا تحرک بہ لسانک کے متعلق یوں روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت ایک گرانی معلوم ہوتی تھی ۔ اس لئے آپ بھی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے تاکہ آپ بھول نہ جائیں اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ کہ آپ قرآن سیکھنے میں زبان جلدی نہ ہلا دیں ۔ بلکہ متوجہ ہو کر تمام وحی کو سن لیا کریں ۔ اسی طرح ایک اور روایت میں بھی یہی مضمون آیا ہے ۔ کہ ہمارے ذمہ ہے ۔ اس کا تیرے دل میں جمع کرنا یہانتک کہ آپ کے سینہ سے کچھ بھی فراموش نہ ہوگا اور اس بات کا بھی ذمہ ہے کہ تیری زبان سے پڑھوا دیں اور یہ بھی معنےٰ ہو سکتا ہے کہ متفرق کلام کو جمع کر دیں سب اکٹھا مجتمع ہو جائے گا ۔ تب قرآن بمعنےٰ قرات نہ ہوگا ۔ پھر جب ہم آپ کو جبرئیل کے ذریعے سے پڑھکر سنا دیں تو آپ اسکو چپ ہو کر سنیں یہ معنےٰ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس پر چلیں اور اس کے تابع ہوں اور اسی کے موافق کریں ۔ اور اسی پر موقوف نہیں بلکہ پھر یہ بھی ہمارا ذمہ ہے کہ اس کو آپ سے بیان بھی کرا دیں گے ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اثناء وحی میں اس کے اشکالات نہ دریافت فرما دیں ۔ بعد میں ہم خود آپ کو الہامی طور پر بتا دیں گے ۔ خدا تعالیٰ نے اپنے وعدے کو سچا کر دیا قرآن کریم کو ایک جگہ مجتمع کرا دیا ۔ اور تمام قرآن مجید ٹکڑے ٹکڑے اور سورتیں ہو کر نازل ہوا ہے ۔ اب سب اکٹھا ترتیب سے موجود ہیں اور آپؐ کے سینہ میں بھی جمع کرا دیا ، اور تمام قرآن مجید کے حافظ بھی تھے ۔ اور آپ کی برکت سے بہت سے صحابہ رضؓ بھی حافظ تھے اور بعدہٗ امت میں بھی اب تک لاکھوں حافظ ہیں ۔ جو ایک ایک حرف اور زیر و زبر پر حاوی ہیں یہ عہد آدم علیہ السلام سے اب تک کسی مذہبی کتاب کی بابت نہ دیکھا گیا اور نہ ہی سنا گیا ۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا ۔ انشاء اللہ اور یہ کھلا ہوا معجزہ ہے ۔ جس کی آنکھیں ہوں دیکھے ، کان ہوں سنے ، دل ہو سمجھے ۔ اس کے بعد قیامت اور اس کی نسبت انسانی طبیعت کا نقص بیان فرما کر خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے ۔

کلا بل تحبون العاجلۃ ۔ نہیں ہرگز جلدی نہ کیا کرو ۔ مگر کیا کیجئے ۔ انسان جلد باز ہے ۔ اس لئے اے بنی آدم تم جلدی کی بات پسند کرتے ہو ۔ دیر اور بعد میں آنے والی چیز کو چھوڑتے ہو ۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تنبیہ ہے اور نیز یہ بھی کہ آئندہ بیان آخرت کی تمہید بھی ہے ۔ اور سلسلہ دار کفار سے کلام بھی ہے کیونکہ وہ جلد بازی کر کے پوچھتے تھے کہ کب ہے قیامت کا دن ؟ ۔

اس کے جواب میں یہ جملہ ہے کہ کیوں جلدی کرتے ہو ۔ ٹھہرو وہ دن بھی آتا ہے اور نیز انسان غفلت شعار کو اسکی عاقبت اندیشی پر ملامت بھی ہے ۔ خصوصاً کفار کو جو عاجلہ یعنی دنیا اور اس کے عیش و نشاط فانی کو پسند کرتے ہیں ۔ اور ان پر فریفتہ ہو کر آخرت پیچھے آنے والی یعنی قیامت یا موت کو بھلا بیٹھے ۔ اس کا سامان اور سرانجام کچھ نہیں کرتے ۔ دنیا کا دستور ہے ۔ کہ اگر کہیں کوئی آدمی سفر کرتا ہے ۔ تو اسکی سفر (وہ) پہلے سے تیاری کرتا ہے اور وہ سفر (دنیا) یعنی وقتی ہوتا ہے ۔ جبکہ موت آنے والی ہے ۔ اور وہ سفر لمبا اور ہمیشگی کا ہوگا ۔ تو اگر اس کی

تیاری کوئی نہیں کرتا تو کس قدر بدنصیب اور نافہم ہے ۔ اب اس آخرت کا حال سُن لو جس کو دنیا پر فریفتہ ہو کر چھوڑ بیٹھے ۔ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ کہ بہت سے منہ یعنی ایماندار نیکوں کے منہ جو دنیا میں آخرت کی تیاری میں رات دن مصروف رہتے ہیں ۔ تازہ اور روشن ہوں گے ۔ فرحت اور سرور کی وجہ سے یا اس کی تجلی خاص سے کہ جس کا اثر بدن انسانی پر بھی نمایاں ہوگا ۔ اور دنیا میں بھی خدا پرست چہروں پر ایک خاص نورانیت ہوتی ہے ۔ اور وہ ہی اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے ۔ یعنی دیدار الٰہی کی دولت سے سرفراز ہوں گے ۔ اور اسی کی خوشی میں ان کے منہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے ۔

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ۙ ۔ اور بہت منہ اس روز ترش اور بگڑے ہوئے یا سیاہ ہوں گے قیامت کی دہشت اور سخت سزاؤں کے خوف سے اور بجائے کسی نیک توقع اور دیدار الٰہی کے تَظُنُّ اَنۡ یُّفۡعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ؕ یہ یقین ہوگا کہ ابھی ہم پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ۔ اس لئے کہ آنکھوں کے سامنے جہنم جوش مارتی ہوگی ۔ فرشتے طوق و زنجیر لئے ہوئے اس قید خانے میں داخل کرنے کے لئے پولیس کے سیاہ پوش گارڈ کی طرح تیار کھڑے ہوں گے ۔ اس وقت ادھر ادھر دیکھے گا کہ کوئی چھڑانے والا پیدا ہو لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا ۔ اس کے بعد قیامت صغریٰ کا حال بیان فرماتا ہے ۔ جو انسان کے ہر وقت دروازہ پر کھڑی رہتی ہے یعنی موت جس کا ذائقہ چکھے بغیر چھٹکارا نہیں ۔ کَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۙ ضرور ضرور جب جان گلے میں پہونچ جاوے گی ۔ یعنی یہ نزع کا وقت کا ذکر ہے ۔ جبکہ جان نکلنے کو ہوتی ہے ۔ گویا حلق تک آ گئی یہ اس حالت بے کسی کی تصویر کھینچی جاتی ہے جبکہ آدمی ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے ۔ اور کوئی صورت بچنے کی نظر نہیں آتی ۔

وَ قِیۡلَ مَنۡ ٜ رَاقٍ ۙ اور لوگ کہیں گے کہ کوئی جھاڑنے یا علاج کرنے والا ہے ؟ پہلے زمانے میں جاہل عرب ٹوٹکوں ، شعبدوں ، تعویذ ، گنڈوں ، جھاڑ پھونکوں کے بہت قائل تھے اس لئے ان کے خیال اور حال کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ایسے وقت میں وارث پریشان سرگرداں جھاڑنے والے کی تلاش میں پھرتے ہیں کہ کوئی شخص جھاڑ پھونک اور منتر سے اسکو ہوش میں لاوے ۔

وَّ ظَنَّ اَنَّہُ الۡفِرَاقُ ۙ مگر وہ بیمار قریب الموت ، علامات موت اور ملائکہ کو دیکھ کر یہ سمجھ رہا ہے کہ اب دائمی جدائی کا وقت آگیا ہے ۔ اور وہ زبان حال سے یہ کہتا ہے پیارے فرزند اور محبوبہ بیوی یہ گھر یہ املاک اور یہ احباب اور یہ مادر مہربان جس نے گود میں پالا تھا ۔ اور شفیق باپ کہ جو جان بھی نثار کرنے کو تیار تھا اور یہ بہن بھائی ہائے افسوس آج مجھ سے سب چھوٹتے ہیں اب میرے مقسوم میں صرف جدائی اور جدائی بھی کیسی دائمی لکھدی گئی ہے ۔ جس کو کوئی ہمدرد بیٹا ، بیوی ، بہن بھائی ۔ اور دوست کسی بھی طرح نہیں ٹال سکتا یہ ان سب کی دسترس سے باہر ہے ۔

آخر روح پرواز کر گئی ۔ وَ الۡتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اور پنڈلی سے پنڈلی مل گئی ، مردے کے پاؤں اور ٹانگیں ملا دیتے ہیں یہ علامت موت کی ہوتی ہے ۔ اور سید ھا چت لٹا دیتے ہیں ۔

امام احمدؒ و نسائیؒ نے ابو ہریرہؓ سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں مرنے کے بعد کی کیفیت مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مومن مرتا ہے تو رحمت کے فرشتے آتے ہیں ۔ نہایت خوبرو گویا ان کے منہ آفتاب ہیں اور ان کے پاس جنت کا کفن اور خوشبو بھی ہوتی ہے ۔ وہ جہاں تک نظر جاتی ہے ۔ آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ملک الموت آ کر نہایت نرمی کے ۔ ساتھ جان قبض کر کے ان کو دیدیتا ہے ۔ اور وہ فرشتے اس کو لے کر عالم بالا کو جاتے ہیں اور اس

کی روح سے خوشبو آتی ہے، اثنائے راہ میں ملائکہ پوچھتے ہیں یہ کون ہے، تو فرشتے اس کا نام تعظیم سے لیتے ہیں یہاں تک کہ آسمانوں پر حق سبحانہٗ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ تب حکم ہوتا ہے کہ اس کو علیین میں لیجاؤ جہاں اور مومنین کی ارواح رہتی ہیں، یہ وہاں آتا ہے وہاں کے لوگ اس سے اپنے دنیا کے قرابت داروں کا حال پوچھتے ہیں اگر سنتے ہیں کہ فلاں مر گیا اور یہاں نہیں آیا تو کہتے ہیں کہ جہنم میں گیا۔

اور کافر کے پاس سیاہ رنگ اور بری شکل کے ملائکہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملک الموت شدت سے جان قبض کر کے ان کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اس ناپاک اور بدبودار روح کو اوپر لیجاتے ہیں۔ اوّل آسمان تک جا کر اوپر جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ مگر اوپر جانے کا حکم نہیں ہوتا پھر حکم ہوتا ہے اس روح کو عالم سفلی کے گڑھے میں ڈال دو پھر اس روح کو پھینک دیتے ہیں۔ اور وہ روح جہنم میں آ گرتی ہے۔ جب یہ سامان موت سب مہیا ہو چکتے ہیں اور ملائکہ روح قبض کر لیتے ہیں تو کہتے ہیں اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ۔ آج تیرے رب کے پاس جانا ہے۔ چلئے وہاں سامنا ہونا ہے۔ اب تجھکو وہاں کی حاضری جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ مومن کو عزت و احترام کے ساتھ سماوات پر حضوری ہوتی ہے۔ اور کافر کی آسمان اوّل سے نیچے ہی پیشی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد جنت میں جو عالم قدس ہے اور کافر جہنم میں رہتا ہے۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ○ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ○ ثُمَّ ذَهَبَ

تو اس نے نہ تو خدا و رسول کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی تھی اور لیکن (خدا و رسول کی) تکذیب کی تھی اور (احکام سے) منہ موڑا تھا پھر ناز کرتا ہوا

اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ○ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ○ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ○

اپنے گھر چل دیتا تھا۔ تیری کم بختی پر کم بختی آنے والی ہے پھر (سکر رسن لے کہ) تیری کم بختی پر کم بختی آنے والی ہے

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ○ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یونہی نہیں مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا یہ شخص (ابتدا میں محض) ایک قطرہ منی نہ تھا جو عورت کے

مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ

رحم میں ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (اسکو انسان) بنایا پھر اعضا درست کئے پھر اسکی دو قسمیں کر دیں

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ○

مرد اور عورت۔ (تو) کیا وہ (خدا جس نے ابتدا میں اپنی قدرت سے یہ سب کچھ کیا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دے

تفسیر اب اس روح کی حالت و کیفیت بیان فرماتا ہے کہ خدا کے پاس جانے کے بعد اس سے کیا معاملہ پیش آئے گا اور اسکو کیا کہا جائے گا۔ مومن کا حال چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ سرکش کافروں کا حال بیان کرنا ایک اہم مقصد تھا۔ اسی لئے ان آیات کریمہ میں کافر و بت پرست اور گنہگاروں کا حال بیان فرماتا ہے۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی کہ جب

وہ دربار میں حاضر ہوگا تو کہا جائے گا تو نے دنیا میں نہ تو مالی عبادت کی یعنی نہ خیرات دی۔ بلکہ جوڑ جوڑ کر روپیہ رکھتا رہا اور خلق خدا پر رحم نہ کھایا اور نہ جانی عبادت کی نہ نماز پڑھی نہ خدا کے سامنے رکوع و سجود کیا نہ عاجزی اور دعا کی بلکہ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى۔ بلکہ اپنے گھر کی طرف اکڑتا ہوا چلا گیا۔ خدا کی طرف کے داعی سے منہ موڑ لیا یا یوں کہہ لیا جائے کہ تصدیق نہ کی اللہ اور اس کے رسول کی باتوں پر اور ایمان نہ لایا اور نہ ہی اعمال اچھے کئے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى۔ اس کے بعد غصہ سے اس کو کہا جائے گا کمبختی ہو تیری پھر کمبختی ہو تیری یعنی تیری زندگی پر پھٹکار اور مرنے پر پھٹکار اور یہاں زر در زر خالی ہاتھ آنے پر پھٹکار۔ پھر تیرے جہنم میں جانے پر پھٹکار۔ یہ کلمہ زبان عرب میں ایسے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جہاں مواقع کے لحاظ سے اس کے مطالب لئے جائیں۔ اس کے بعد اس کو اس اندوہناک اور تاریک قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں کی لپٹیں اور طرح طرح کے عذاب ہیں

اس قیامت صغریٰ (موت) کے واقعہ کا بیان فرما کر حشر برپا ہونے پر ایک دلیل قائم کرتا ہے۔ اس انداز میں کہ اس کو کم عقل کے لوگ بھی بخوبی سمجھ سکیں۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسکو بیکار، آزاد اور نکما چھوڑا جائے گا؟ پھر فرماتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح اور آیات ہیں جو حشر برپا ہونے کی دلیل ہیں کہ انسان کو قدرت و اسباب عقل عطا کئے گئے ہیں کہ اس کو چند نامناسب باتوں سے منع کیا جائے کہ اگر نیک عمل کروگے تو ثواب ملے گا۔ اور غلط کام کروگے تو عذاب میں مبتلا ہوگا۔

اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ کس کام کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ اس کی زندگی کا بھی ایک خاص مصرف ہے اور اس مصرف کو پورا کرنے کے لئے روحانی معلم کو بھی پیدا فرمایا جس پر اس جہان (آخرت) کے اسرار منکشف کئے تاکہ وہ اس جہان کی مناسب باتوں کو بتلائے اور سمجھائے اور ایسا شخص نبی ہوتا ہے۔ پھر اس کی اتباع ہر حالت میں ضروری ہے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى کہ وہ انسان کیا ایک منی کا قطرہ نہیں تھا؟ ضرور اس کی ابتدا یہی ہے اس کو کافر و مومن سب جانتے ہیں۔ پھر کیا وہ قطرہ خود بخود انسان بن گیا۔ اس میں یہ تناسب اعضاء پیدا ہوگیا پھر عقل و حواس عطا کر دے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس نے بالترتیب بنایا کس لئے کہ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى۔ قطرہ منی سے خون کا لوتھڑا بنا پھر بتدریج اس کے اعضاء بنے پھر اعضاء بھی ایسے بنائے کہ جن کی تشریح و تناسب میں عقل حیران ہے۔ ہر ایک عضو اس کی کمال صنعت و قدرت کی بآواز بلند گواہی دے رہا ہے۔ پھر خود انسان تو بن سکتا نہیں۔ بلکہ کسی نے بنایا ہے۔ پھر کیا اس کے ماں باپ نے بنایا ہے؟۔

ہرگز نہیں ان کو (والدین) کو خبر بھی نہیں کہ پیٹ کے اندر کیا چیز نشوونما پا رہی ہے۔ پھر کیا یہ مادہ کا کام ہے۔ نہیں ہرگز نہیں کس لئے کہ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اس نے ایک قطرہ منی سے مرد بھی پیدا کئے اور عورت بھی، مادہ منویہ برابر تھا طبیعت کا مقتضی یکساں تھی پیٹ بھی وہی پیٹ ہے اور نطفہ بھی اسی شخص کا نطفہ ہے پھر یہ مرد عورت کا تفاوت کیونکر ہوگیا؟ یہی نہیں کہ ایک ہی حمل میں ایک لڑکی دوسرا لڑکا کبھی دونوں لڑکے کبھی دونوں لڑکیاں یہ تفاوت کیوں ہوا اور کس نے کیا؟۔

بیشک اس حکیم مطلق نے اور یہ بھی اس کی کمال قدرت و صنعت اور انسان پر رحمت و فضل کی دلیل ہے کس لئے کہ اگر سب عورتیں ہی عورتیں یا سب مرد ہی ہوتے تو انسانی توالد کا سلسلہ ہی ختم ہو جاتا۔ یعنی یہ سب باتیں وہ قادر مطلق ہی کر سکتا ہے۔ پھر جس نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ سب کر دیا تو اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى

کیا وہ مردے کو حشر میں زندہ کر دینے پر قادر نہیں؟ ضرور قادر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ یقیناً پہلی مرتبہ کا پیدا کرنے والا دوبارہ بنانے پر بہت زیادہ اور بطور اولیٰ قادر ہے۔ یا کم از کم اتنا ہی جتنا پہلی مرتبہ تھا۔ جیسے فرمایا گیا ہے۔ اس نے ابتداءً پیدا کیا وہ ہی پھر لوٹا لائے گا۔ اور وہ اس پر بہت زیادہ آسان ہے اس آیت کے مطلب میں بھی دو قول ہیں لیکن پہلا قول ہی زیادہ مشہور ہے۔ جبکہ سورۃ روم کی تفسیر میں اس کا بیان اور تقریر گذر چکی

سُورَۃُ الدَّھْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○

بے شک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے جسمیں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا۔)

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖق نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا

ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا اس طور پر کہ ہم اسکو مکلف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اسکو سنتا

بَصِيْرًا ○ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○ اِنَّآ اَعْتَدْنَا

دیکھتا (سمجھتا) بنایا۔ ہم نے اسکو (بھلائی برائی پر مطلع کرکے) رستہ بتلایا (یعنی احکام کا مخاطب بنایا پھر یا تو وہ شکر گذار مومن ہو گیا یا ناشکر

لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ○ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ

زنجیریں اور طوق آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے (اور) جو نیک (لوگ) ہیں وہ ایسے جام شراب سے (شرابیں) پیویں گے جسمیں

كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ○ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا

کافور کی آمیزش ہوگی۔ یعنی ایسے چشمہ سے (پیویں گے) جس سے خاص خدا کے بندے پیویں گے۔ (اور) جسکو وہ (خاص بندے

تَفْجِيْرًا ○

جہاں چاہیں بہا کر لے جائیں گے۔

تفسیر:- اس سورہ کا نام اسی کے الفاظ کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس کو سورۃ دہر، سورۃ انسان اور سورۃ ھل اتی اور سورۃ امشاج بھی کہتے ہیں۔ اس کے نزول میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عباس رض، ابن زبیر رض، مقاتل رض اور کلبی رض کہتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی۔ اور دوسری طرف

بیضاوی و زمخشری رح کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی بعض نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کچھ حصہ مکہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ میں واللہ اعلم بالصواب۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ الم، تنزیل الخ اور سورۃ ھل اتی علی الانسان الخ قراءت فرماتے تھے۔

سورۃ قیامہ سے مناسبت :- اسمیں دو فریق کے معاملوں کا بیان تھا جو روز قیامت پیش آئے گا۔ ایک وہ لوگ جن کے منہ روشن ہوں گے۔ اور دوسرے وہ لوگ کہ جن کے منہ سیاہ ہوں گے۔

تتمہ کے طور پر اس سورۃ میں فریق اوّل کے اور بھی حالات بیان کئے گئے۔ یہاں قیامت پر انسان کے حادث ہونے سے استدلال ہے۔ مثلاً (الف) خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کاملہ کا ثبوت۔

(ب) قیامت کا برپا ہونا اور وہاں کے حالات۔

(ج) انسان کی ابتداء و انتہا اور اس کے اس جہان (دنیا) میں آنے کی وجہ۔

(د) انسان کے اسباب سعادت و شقاوت، اور ہر ایک بحث پر دوسرے مسئلہ کا لحاظ رہا ہے۔

ابتدائے انسانی :- ھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً کہ بیشک انسان پر ایسا زمانہ بھی گذر گیا ہے کہ اس کا کوئی ذکر بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ انسان کو پیدا کیا حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنی بے مائگی اور اپنے ضعف کی وجہ سے ایسی چیز نہ تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ حاصل یہ کہ انسان پر ایک ایسا وقت گزرا ہے کہ اس وقت نہ یہ دنیا میں موجود تھا نہ اہل دنیا میں اس کا تذکرہ تھا کوئی حضرت کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

اس کا ثبوت کہ نسل انسانی ایک وقت دنیا پر نہ تھی اور اس کی پیدائش کی ایک ابتداء ہے۔ اہل کتاب کے نزدیک مسلم ہے کیونکہ ان کے یہاں آفرینش انسان کا زمانہ تخمیناً سات ہزار برس کا ہے۔ گو کہ اس مسئلہ میں حکماء اور فلاسفروں کا اختلاف ہے۔ اس کے بعد نسل انسانی پھیلنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ جو خاص اس کے قبضہ و تصرف کی بات ہے۔

ان خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج کہ اور کسی نے نہیں بلکہ خود ہم نے انسان کو منی کے لچھے سے پیدا کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہے۔ کہ ان کو مٹی سے بنایا اس لئے ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا۔ مقصود نسل انسانی کا پھیلانا بتایا ہے۔ اگرچہ مبدء ان کا آدم ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل قطرۂ منی سے شروع ہوتی ہے۔

منی کو امشاج چیپ اور لچھ کہتے ہیں۔ انسان کی حقیقت بیان کرتا ہے کہ انسان جو اپنی کم فہمی کے باعث زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اور خدا کا انکار کر کے کہیں دہر کو کہیں مادہ کو خالق کہتا ہے اس پر فرمایا گیا ہے کہ اے انسان تجھکو شعور ہی کیا ہے۔ پہلے اپنی اصل تو پہچان لے کہ وہ منی جس میں چیپ تھا اور نر اور مادہ کی منی رحم میں مل کر لچھ سا ہو گیا تھا۔

وہ کون کون سی غذاؤں کے کھانے سے بنی تھی۔ اور رحم میں اس پر کس کس وقت کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے تھے۔ اور اس سے پہلے تو کیا تھا۔ تیرا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اور پھر تجھکو ان باتوں کا علم نہیں تو اے انسان کس اعتماد پر دہر اور مادہ کو خالق کہتا ہے۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی خالق نہیں تو پھر تو خود بخود کیوں کر تدریج بن گیا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ فعل بغیر فاعل کے اور حادث بغیر محدث کے کیوں کر ہو گیا؟ اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے یہی نطفہ کا تخم تو ہے جسمیں انسان کی تمام قوتیں اور اعضاء ودیعت ہیں، بھلا اب کوئی بتلائے تو سہی کہ نطفہ کے کون سے جزو میں سے کون سی قوت اور کونسا عضو ودیعت رکھا گیا؟

اور یہ بھی ہے کہ انسان ایسی حقیر اور ناپاک چیز سے بنا جو کپڑے پر لگے تو دھو کر کپڑے کو پاک کیا جائے پھر یہ غرور اور گھمنڈ۔

اب انسان کے دنیا میں پھیلانے اور پیدا کرنے کا راز بھی بیان کیا گیا ہے۔ نبتلیہ کہ ہم اسکو آزمائیں کہ دنیا کی اندھیری میں کیا کرتا ہے۔ اور ہماری طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ یا لذات و شہوات ہی پر فریفتہ رہتا ہے اور اسی لئے فجعلناہ سمیعًا بصیرًا۔ اس کو ہم نے سننے اور دیکھنے والا بھی کر دیا یعنی کان دئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی باتیں سُن کر ایمان لائے۔ اگلے مشرکوں کے حالات اور ان پر آفات آئیں ان کو سُن کر عبرت حاصل کرے۔ اور ان بیہودہ کاموں سے بچے۔ آنکھ دی ہیں کہ آیات الٰہی دیکھ کر ایمان لائے، بُرے بھلے کو دیکھے اور امتیاز کرے دنیا کی بے ثباتی دیکھ کر اپنے سفر آخرت کی بھی فکر کرے۔

اس آزمائش کی پھر تشریح کیجاتی ہے۔ انا ھدینٰہ السبیل کہ ہم نے انسان کو کان آنکھ دے کر بری بھلی سب راہیں دکھادیں اور بتادیں کہ بُرا راستہ یہ ہے جس پر چلنے سے سیدھا آدمی جہنم کو جاتا ہے۔ اور سیدھا سچا راستہ یہ ہے۔ جس پر چلنے سے آدمی جنت کو جاتا ہے۔ اور اے انسان تجھے چلنے کا دونوں پر قضا و قدر نے اختیار دیا ہے۔ فاما شاکرًا و اما کفورًا۔ پھر کچھ شاکر یعنی شکر کرنے والے ہو گئے جنت کی راہ پر چلے گئے اور کچھ کافر ناشکرے ہو گئے جہنم کی راہ پر چلے۔ اب اے انسان تو خواہ شاکر ہو یا کافر ہو۔

انا اعتدنا للکافرین سلاسل واغلالا وسعیرا کہ ہم نے کافروں ناشکروں کے لئے زنجیریں اور طوق کان اور آنکھ کی ناشکری اور ان کو اچھے کاموں میں استعمال نہ کرنے پر دل اور عقل کو راہ راست پر کام میں نہ لانے پر دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ذرا مرنے کی دیر ہے۔ اور جو شاکر ہیں اپنے منعم حقیقی کے احسان کا بدلہ اپنے ہاتھ پاؤں دل و دماغ سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے جنت کی نعمتیں ہیں۔

فرماتا ہے۔ ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا کہ نیکوں کو جنت میں شراب طہور کا پیالہ پینے کو ملے گا جسمیں چشمہ کافور کی آمیزش ہوگی یا اس کا مزاج کافوری ہوگا۔ کوئی گرمی اور سوزش نہ ہوگی تاکہ حشر کی گرمی سب دور ہو جائے۔

بلکہ عینًا یشرب بھا عباد اللہ وہ اللہ کے نیک بندے ایک چشمہ کو پئیں گے یعنی ان کے لئے چشمہ تیار ہے جو جاری ہے کبھی بند نہیں ہوتا۔ نہ اسکیں کمی ہوتی ہے۔ اور نہ ہوگی۔ وہ نہ صرف پئیں گے۔ بلکہ یفجرونھا تفجیرا۔ کہ اس کو بہا دیں گے۔ جس طرح سے چاہیں گے کام میں لا دیں گے۔ دنیا میں جو نہ صرف ایک ہی جام پیتے ہیں بلکہ چشمہ محبت الٰہی سے پیتے ہیں اور اسکو بہاتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں اور ہر بات میں اور ہر شان میں محبت الٰہی کا منشا ہے۔ وہ وہاں چشمہ کافور کا بھی اسی طرح دل کھول کر استعمال کریں گے۔ اور وہ کافور یہ دنیا کا کافور نہیں بلکہ وہ ایک دوسری چیز ہے۔ جس کو اس کافور سے کسی خاص خاصیت میں مناسبت ہے۔ سردی اور سپید تقویت دل و دماغ نہیں

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ

واجبات کو پورا کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی اور وہ لوگ (محض) خدا کی محبت

الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ

سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور ہم تم کو محض خدا کی رضامندی

لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ

کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے (اس کا فعلی) بدلہ چاہتے ہیں اور نہ (اس کا قولی) شکریہ (چاہتے ہیں) ہم اپنے رب کی طرف سے

مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ

ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان کو (اس اطاعت اور اخلاص کی برکت سے) اس دن کی سختی سے محفوظ رکھیگا۔

وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَ

اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا۔ (یعنی چہروں پر تازگی اور قلوب میں خوشی دے گا۔ اور ان کی پختگی (یعنی استقامت فی الدین) کے بدلے میں ان کو

حَرِيرًا ۝ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا

جنت اور ریشمی لباس دے گا۔ اس حالت میں کہ وہ وہاں (جنت میں) مسہریوں پر (آرام اور عزت سے) تکیہ لگائے ہوں گے۔ نہ وہاں تپش (دھوپ کی گرمی) پائیں گے

وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا

اور نہ جاڑا (بلکہ فرحت بخش اعتدال ہوگا) اور یہ حالت ہوگی کہ (وہاں یعنی جنت کے) درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوں گے۔ اور ان کے میوے

تَذْلِيلًا ۝

ان کے اختیار میں ہوں گے (کہ ہر وقت ہر طرح بلا مشقت لے سکیں گے)۔

تفسیر :- یہاں سے ان ابرار کے اوصاف و حالات بیان فرماتا ہے۔ جن کے سبب وہ (انسان) ابرار ہوگئے۔ یوفون بالنذر ویخافون یوما کان شرہ مستطیرا کہ وہ اس دن کے شر سے بھی ڈرا کرتے ہیں کہ جسکا شر پھیل پڑے گا۔ گرمی اور سردی کا جس طرح دنیا میں ایک عام اثر ہوتا ہے اسی طرح قیامت کا شر اور اس کا ہول اور دنیا کے زیر و زبر ہونے کا حادثہ اور پھر نفخ صور اور اس کے بعد قبروں سے نکلنے کا حادثہ ایک عام وحشت انگیز ہوگا۔ وہ ابرار اس دن کے حادثہ عظیمہ سے ڈرا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس دن کی تیاری میں نذریں پوری کرتے ہیں اور اپنے جان و مال کو انھوں نے دنیا میں نذر اللہ کر دیا ہے۔ اسی لئے ویطعمون الطعام کھانا کھلاتے ہیں۔

محض اللہ ہی کی محبت سے نہ ریا کاری اور شہرت کے لئے یہ بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں کہ باوجودیکہ اس کھانے کی ان کو رغبت و محبت ہوتی اور حاجت دامنگیر ہوتی ہے - اس پر بھی وہ کھلا دیتے ہیں کس کو ؟ مسکینًا فقیر کو، ویتیمًا یتیم کو واسیرًا قیدی کو - بعض علماء کہتے ہیں اسیر سے مراد وہ بے لبس لوگ ہیں جو خود کوئی کام نہیں کر سکتے یاوہ لڑکے عورتیں اور غلام ہیں - جو ظالموں کے پنجے میں گرفتار ہیں - اور ان کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا بیچارے ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں - اس میں بے زبان جانور بھی داخل ہیں - جو ایسے موذیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہیں اور دانہ پانی نہیں ملتا اور ان پر اپنا کچھ احسان بھی نہیں جتلاتے

بلکہ یہ کہتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا کہ ہم تو خالص اللہ کے لئے تمہیں کھانا کھلاتے ہیں کہ وہ خوش ہو جاوے اپنی مخلوق پر رحم کرنے سے نہ ہم کو تم سے اس کا بدلہ مقصود ہے - نہ یہ کہ تم شکر گذاری کرو ہماری تعریف و مدح کرتے پھرو اور یہ بھی کہتے ہیں اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا کہ ہم اپنے رب سے ڈرتے ہیں اس دن کے عذاب سے جو نہایت سخت اور دشوار گذار ہوگا - اس روز کے لئے یہ ذخیرہ جمع کرتے ہیں یہ کچھ ضروری نہیں کہ اللہ کے نیک بندے یہ باتیں مسکین ویتیم واسیر کے سامنے زبان سے کہتے ہیں - بلکہ ممکن ہے کہ زبان حال سے کہتے ہوں اور ان کے دل میں یہ مضمون ہو اور ان کی اس نیت اور حسن اخلاص کو خدا پاک ان کے قول سے تعبیر کرتا ہو اور ایسا ہوتا ہے اور یہی قوی ہے -

اس کے بعد ان ابرار کی جزا خیر کا ذکر کرتا ہے - فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس روز کے شر سے محفوظ رکھے گا ان پر کوئی مصیبت اور آفت اس روز نہ آئے گی، اور نہ صرف یہی بات کہ ان کو شر سے بچا کر نعمتوں سے محروم رکھے گا - بلکہ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ان کو فرحت اور خوشی عطا کرے گا - اور دیدار الٰہی کی فرحت سے شادان ہوں گے - یہ جنت روحانی تھی - اس کے بعد جنت جسمانی کا ذکر کیا جاتا ہے - وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا کہ ان کے صبر کے بدلے میں جو نذر کے وفا کرنے اور اسیروں، یتیموں اور فقیروں کو کھلانے میں کفالت برداشت کرتے تھے جنت دے گا - اور اس میں ریشمی لباس پہننے کو ملے گا - اور نہ یہی کہ صرف ایسے کپڑے اور خوشی ملے گی - بلکہ ان کے رہنے کے لئے اور بیٹھنے اور سونے کے لئے مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ جنتیوں کی نعمتوں اور راحتوں کا ان کے ملک ومال اور جاہ ومنال کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ لوگ بآرام تمام پورے اطمینان اور خوش دلی کے ساتھ جنت کے مرصع اور مزین جڑاؤ تختوں پر بے فکری سے تکئے لگائے مسرور راحت سے بیٹھے مزے لوٹ رہے ہونگے

لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا - جنتی جنت میں نہ دھوپ دیکھیں گے کس لئے کہ وہاں عرش کا سایہ ہوگا - آفتاب کی روشنی کی وہاں حاجت نہ ہوگی - اور نہ وہاں سردی ہوگی ایک معتدل موسم ہوگا - جو بہت ہی پر بہار موسم ہوگا - نہ خزاں کا ڈر، نہ برسات کی کیچڑ، نہ مچھر نہ پسو نہ گرمی نہ سردی دنیا میں جو نہایت پر بہار موسم باغوں میں ہوا کرتا ہے اور اچھے آب وہوا کے ملکوں میں ہوتا ہے - یہ جنت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے -

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا - اور جنت کے سائے ان پر جھکے ہوں گے گرچہ وہاں آفتاب نہ ہوگا اور نہ اس کی دھوپ مگر اور اجرام نورانیہ بھی پرتو فگن ہوتے ہیں - انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ طبیعت یکساں حالت سے جلدی گھبرا جاتی ہے - اسی لئے فطری تقاضہ کے سبب تغیر وتبدل کو دل چاہتا ہے - اس لئے جنت میں

ان جنتیوں کے لئے بڑے بڑے سائے ہوں گے، جن کے نیچے عالیشان تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھیں گے۔ اور آپس میں باتیں کریں گے۔ اور دنیا کے تذکرے بھی آئیں گے۔ اور غیر پھل دار درختوں کے سائے نہ ہوں گے۔ بلکہ وذللت قطوفها تذليلا۔ اور میوے ان جنتیوں سے بالکل قریب ہوں گے۔ چاہے لیٹے لیٹے توڑ کر کھالیں چاہے بیٹھے بیٹھے لے لیں۔ چاہے کھڑے ہو کر لے لیں درختوں پر چڑھنے کی تکلیف نہ ہوگی۔

سروں پر میوے دار گچھے اور لدے ہوئے گچھے لٹک رہے ہوں گے۔ توڑا اور کھا لیا۔ اگر کھڑے ہیں تو میوے اتنے اونچے ہیں، بیٹھے تو قدرے جھک گئے، لیٹے تو اور قریب آگئے، نہ تو کانٹے کی رکاوٹ ہے اور نہ دوری کی دردسری جس وقت جس چیز کو دل چاہے وہ چیز حکم الٰہی سے جنتی کے قریب ہوگی۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ○

اور ان کے پاس چاندی کے برتن لائے جاویں گے اور آبخورے جو شیشے کے ہوں گے (اور) وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے

قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ○ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَأْسًا

والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا اور وہاں ان کو (علاوہ جام شراب مذکور کے) ایسا جام شراب

كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ○ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ○ وَيَطُوْفُ

پلایا جاوے گا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمہ سے (ان کو پلایا جاوے گا) جو وہاں ہوگا جس کا نام (وہاں) سلسبیل مشہور

عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا

ہوگا اور ان کے پاس (یہ چیزیں لے کر) ایسے لڑکے آمد و رفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے (اور اس قدر حسین ہیں کہ) اے مخاطب اگر تو ان کو چلتے

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ○ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ

پھرتے) دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں اور اے مخاطب اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھلائی دے اور ان جنتیوں

خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ

باریک ریشم کے کپڑے ہوں گے اور دبیز ریشم کے کپڑے بھی (کیونکہ ہر لباس میں جدا لطف ہے) اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ

رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ○ إِنَّ هٰذَا كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ○

شراب پینے کو دے گا (جس میں نہ نجاست ہوگی نہ کدورت) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو دنیا میں کرتے تھے) مقبول ہوئی

تفسیر

جنت میں جنتیوں کے کھانے پینے کا بھی شاہانہ سامان ہوگا صرف میووں پر ہی بس نہ ہوگی۔ برتن آبخورے اور لوٹے وغیرہ چاندی کے ہوں گے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ جنت کی زمین چاندی کی ہے اور اس کی مٹی مشک خالص ہے، ان کے درختوں کے تنے سونے چاندی کے ہیں ڈالیاں لولو زمرد اور یاقوت کی ہیں ان کے درمیان پتے اور پھل ہیں جن کے توڑنے میں کوئی دقت اور مشکل نہیں۔

قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۔ وہ برتن ایک عجیب صنعت اور اندازہ سے بنائے اور ڈھالے جائیں گے اور ہر ایک برتن میں وقت حاجت کی رعایت ہوگی۔ جس قدر پانی اور کھانا مطلوب ہو اور جس وقت اور موقع کے لئے ہو اسی قدر ان میں آئے گا۔ نہ کم نہ زیادہ۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۔ ان کو ایک ایسی عمدہ چیز کا پیالہ پلایا جائے گا جس کا مزاج اور کیفیت یا آمیزش سونٹھ کی ہوگی۔ تاکہ حرارت عزیزی جوش میں آوے اور عیش و نشاط کا لطف تازہ ہو اور شوق دیدار الٰہی بڑھے تاکہ شوق کے بعد جو چیز ملے اس کی قدر و منزلت اور لذت زیادہ ہو۔۔۔ جنتیوں کو اول مرتبہ کا موزوں شراب کا پیالہ پلایا جانا فرمایا تھا کہ حشر کی گرمی بالکل جاتی رہے بعدہٗ شراب زنجبیل کا پلایا جانا فرمایا ہے کہ ایک دوسری گرمی پیدا ہو جو لذات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ جب انسان کی اصلی گرمی کم ہو جاتی ہے، اس لئے کسی مہ جبیں کے وصال کا شوق نہیں رہتا لیکن دنیاوی اور جنت کی زنجبیل میں بہت فرق ہے۔

بلکہ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۔ جنت میں ایک چشمہ ہوگا جس کا سلسبیل ہوگا۔ سلسبیل کے معنی ہیں پوچھ رستہ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اسکو پی کر شوق بڑھے گا۔ اور ساقی سے محبوب کا رستہ پوچھے گا۔ یہ دنیا میں شراب شوق الٰہی اور اس کی گرمی کا اثر ہے۔ جو خاصانِ خدا کو نصیب تھا۔ اور اسی شراب کو اور ان لذیذ نعمتوں کو لائیں گے۔ لیجائیں گے۔

یہ سوال قدرتی ہے کہ یہ سب نعمتیں ہوگی جیساکہ دنیا میں کسی اچھے ہوٹل میں جہاں لذیذ کھانے اور آرام و آسائش کا معقول انتظام ہوتا ہے تو وہاں کے بیرے بھی اچھے لباس پہنے ہوئے اور شائستہ ہوتے ہیں اور سروس انتہائی پھرتی سے کرتے ہیں اسی طرح جنت میں۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۔ لڑکے ہوں گے جن کا لڑکپن ہمیشہ باقی رہے گا۔ جوان اور بوڑھے نہ ہوں گے۔ ہمیشہ اسی حالت پر رہیں گے۔ لڑکوں میں شوخی شرارت اور بھولا پن ہوتا ہے۔ ایسی نشاط کی محفلوں میں ان کا کھلانا پلانا عجیب پرلطف ہوگا یہ ہی نہیں بلکہ وہ لڑکے جنتیوں کے خلوت خانوں میں بے روک ٹوک آجا سکتے ہیں۔ ناگوار نہیں معلوم ہوتے نہ وہ عورت ہوں گے۔ اور نہ مرد اس لئے ہر دو کو ان کا آنا جانا برا نہیں معلوم ہوگا۔ بلکہ محظوظ ہوں گے۔

اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۔ وہ لڑکے ایسے حسین پرنور ہوں گے۔ اور دلکش ہوں گے کہ ان کو جنتی اپنی خلوت اور خدمت میں آتے جاتے دیکھ کر خوش ہوں گے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جو کوئی دیکھے وہ یہ سمجھے کہ جیسے لڑی کے موتی بکھر گئے یہ مثال کس قدر دلکش اور خوبصورت دی ہے۔ موتی سے مثال ان کی زیادتی حسن سے دی گئی ہے۔ اور بکھرے سے مثال اس لئے دی گئی ہے کہ جنت میں ایسے لڑکے دو چار نہ ہوں گے۔ بہت بڑی تعداد میں ہوں گے۔ جب وہ ادھر اُدھر کام میں مصروف ہوں گے۔ تو ایک جگہ جمع ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لئے اسکی مناسبت سے بکھرنے کی مثال دی ہے۔ جو کچھ نعمتیں اوپر

بیان کی گئی ہیں کچھ ان ہی پر موقوف نہیں۔ بلکہ وَاِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّمُلۡکًا کَبِیۡرًا۔ دیکھنے والا جب جنت میں دیکھے گا تو ہزاروں نعمتیں اور بڑی سلطنت کے شاہانہ تکلفات دیکھے گا۔ جو دنیا میں عمدہ باغات اور سنگ مرمر کے، طلائی اور جواہرات کے کام کئے ہوئے مکانات اور بڑے بڑے عیش و نشاط کے سامان بڑے بڑے سلاطین کو حاصل ہیں وہ لاکھواں حصہ بھی وہاں کی نعمتوں کا نہیں جو ایک ادنیٰ سے شخص کو جنت میں ملیں گی۔

اب ان کی پوشاکوں کا حال بیان فرماتا ہے عٰلِیَهُمۡ ثِیَابُ سُنۡدُسٍ کہ ان کو خلعت کے طور پر چمکنے والے اور صاف ریشم کے مہین کپڑے سبز رنگ کے ہوں گے۔ اور ریشم کے دبیز کپڑے ہوں گے کا شاہی مخمل جس طرح دنیا میں ہے یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ لباس شاہوں جیسا ہوگا۔ اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور کسی کو سونے کے بھی۔

وَسَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا اور ان کا رب انھیں شراب طہور پلائے گا.........

طہور میں نہ نشہ ہے اور نہ ہی سرور اور نہ خمار شراب طہور کنایہ ہے۔ شراب وصال سے کہ ان کو وہاں اس معشوق محبوب حقیقی کا پر کیف وصال نصیب ہوگا۔ جس کے نشہ میں وہ ابد الآباد مسرور ہوں گے جسمانی نعمتوں کے بعد روحانی نعمتوں کا ذکر کیا کہ اس کے آگے وہ سب ہیچ ہیں یہی نہیں بلکہ وہ خود اپنے دست مبارک سے یہ جام بھر بھر کر پلائیں گے۔ پھر اس سے زیادہ اور اس کے آگے اور کیا نعمت ہوگی؟۔

اہل جنت سے کہا جائے گا۔ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمۡ جَزَآءً کہ یہ تھی تمہاری جزا اور تمہاری دنیاوی کوششوں ایمان اور عمل صالح اور محبت الٰہی کا بدلہ جو تمہارے لئے پہلے سے تیار رکھا۔ اس میں اطمینان دلایا جاتا ہے کہ تمہاری نیکی اور پرہیزگاری رائیگاں نہ جائیگی۔ وَكَانَ سَعۡیُكُمۡ مَّشۡكُوۡرًا اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی، اس کی قدر دانی کی گئی، اکارت نہیں گئی۔ اور یہ سب صلہ انہی نیکی اچھائیوں کی قدر دانی کی وجہ سے تم کو دیا جاتا ہے یعنی حق الیقین کرلو کہ جو جو تم نیکیاں کرو گے اپنے اللہ کے لئے وہ رائیگاں نہیں جائیں گی ان کا صلہ کہیں زیادہ تمہارا رب تم کو عطا کرے گا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ۝ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ

ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر (کہ اس میں تبلیغ بھی داخل ہے) مستقل رہئے اور ان میں سے کسی

رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا اَوۡ كَفُوۡرًا ۝ وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ

فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے (اور آگے عبادات لازمہ کا ذکر ہے یعنی) اپنے پروردگار کا صبح و شام نام لیا کیجئے

بُكۡرَةً وَّاَصِیۡلًا ۝ وَمِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَسَبِّحۡهُ لَیۡلًا

اور کسی قدر رات کے حصہ میں بھی اسکو سجدہ کیا کیجئے (یعنی نماز فرض پڑھا کیجئے) اور رات کے بڑے حصہ میں

طَوِيلًا ۝ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ

اسکی تسبیح کیا کیجئے (مراد اس سے تہجد ہے علاوہ فرائض کے) یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو

وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ۝ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ

چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ہم ہی نے اُن کو پیدا کیا ہے۔ اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کئے اور

وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ۝ إِنَّ هَٰذِهِ

(نیز) جب ہم چاہیں ان ہی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں یہ (سب جو کچھ مذکور ہوا کافی) نصیحت ہے سو جو شخص

تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝ وَمَا

چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے اور بدون خدا کے چاہے تم لوگ

تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا

کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لئے خدا کے نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہوتی ہیں کیونکہ) خدا تعالیٰ بڑا علم والا

حَكِيمًا ۝ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ

حکمت والا ہے۔ وہ جسکو چاہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور (جسکو چاہے کفر اور ظلم میں مبتلا رکھتا ہے)

أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

ظالموں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر :- اس سورۃ کے شروع میں یہ فرمایا گیا کہ آدمی معدوم تھا وجود میں لایا گیا اور اسکی پیدائش کس صورت اور کس طرح سے ایک قطرہ منی سے ہوئی پھر فرمایا گیا کہ وجود میں لانا بیکار نہیں تھا بلکہ امتحان اور آزمائش کے لئے وجود میں لایا گیا ساتھ ہی امتحان میں کامیاب ہونے پر خوشی کی بشارت اور ناکامی پر سختی کی اطلاع دی گئی۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ، کہ لوگوں کی آسانی لئے خود ہم نے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھ پر تھوڑا تھوڑا قرآن اتارا (نازل کیا) یہ قرآن کریم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے از خود نہیں بنالیا ہے نہ جن کا قول ہے، نہ کسی کاہن کا۔ وہ لوگ ناقص ہیں جو اس میں شبہ کرتے ہیں اور اس کے بیان اور آخرت پر تمسخر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کس نے دیکھا ہے۔ کیا اُن کا یہ وسوسہ شیطانی ٹھیک ہے۔ یا ہمارا فرمانا جو ہم رب العالمین اور عالم الغیوب ہو کر اس میں تاکید سے کہتے ہیں کہ بیشک ہم نے قرآن نازل کیا۔ بلا تردد تم اس پر عمل کرو

اس کے وعدوں کے موافق ضرور حیات جاودانی پا گئے اور اگر مخالفت کی تو جہنم کے تاریک گڑھے میں جاؤ گے فاصبر لحکم ربک پس اے محمدؐ اور محمدؐ کی جماعت اپنے رب کے حکم کی پابندی کرو۔ اس کی راہ دیکھو آپ معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کس نے بھیجا ہے۔ اس کے بعد دو باتوں سے منع فرماتا ہے اور دونوں کو ایک ہی جملے میں جمع کرتا ہے لا تطع منہم اثماً او کفوراً کہ تو ان میں سے کسی گنہگار، بدکار کا کہنا مان نہ کسی ناشکرہ کا۔

بعض اہل تفسیر یہ کہتے ہیں اثم سے ولید کی طرف اور کفور سے عتبہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں کا مصداق ایک شخص۔۔ مراد ہے یعنی ابو جہل۔ اس کے بعد تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔

(۱) واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا کہ صبح و شام اپنے رب کا نام لیا کرو۔

(۲) ومن اللیل فاسجد لہٗ اور رات میں اسکو سجدہ کیا کرو۔ مراد یہ ہے کہ رات میں تہجد کی نماز پڑھا کرو۔

(۳) وسبحہ لیلاً طویلاً اور بڑی رات سے اسکی تسبیح اور تقدیس کیا کرو۔

ان آیات میں مفسرین کے دو قول ہیں اول یہ کہ ان آیات میں نماز پڑھنا مراد ہے بکرۃ سے نماز صبح اور اصیلاً ظہر و عصر کی نماز، و من اللیل فاسجد لہٗ مغرب و عشاء مراد ہے اور سبحہ لیلاً سے تہجد۔

دوسرے اس وقت نماز پنجگانہ فرض نہ ہوئی تھی۔ تہجد کی نماز اور رات میں عبادت کرتا تھا ان آیات کریمہ میں مقصود ہر حال میں عبادت کی ترغیب ہے۔ اس لئے کہ ان ھؤلاء یحبون العاجلۃ ویذرون وراءھم یوماً ثقیلاً یہ تو دنیا اور اس کی لذات و شہوات پر فریفتہ ہیں شب و روز دنیا کا مال و اسباب جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ انہیں باتوں میں ان کو مزہ اور حلاوت ہے۔ اور افسوس آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہیں اول تو ان کو اس کا یقین ہی نہیں اور جو کچھ ہے۔ اس کیلئے نہ تو تدابیر کرتے ہیں اور نہ ہی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ہی نہیں بلکہ ان کے دل اس تصور سے بالکل خالی ہیں اور نہ ہی ان کی طبیعت اس طرف راغب ہوتی ہے اور اس کا یہ عذر کہ ہم میں دار آخرت کی قدرت نہیں۔ کاروبار دنیا سے مہلت نہیں۔ نماز پنجگانہ خصوصاً۔ صبح، عشاء اور تہجد بھلا ہم میں سے کیونکر ادا ہو سکتی ہیں۔ محض غلط ہے۔ اس

اس لئے کہ نحن خلقناھم وشددنا اسرھم کہ ہم نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور ان کے جسم کو مضبوط کیا ہے۔ نیک و بد کی سمجھ رکھتے ہیں۔ بدبخت اکثر اپنی کمزوری اور ناچاری کا عذر کیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ان کو پیدا کیا ہے۔ ان سرشت بد سے ہم خوب واقف ہیں۔ وشددنا اسرھم اور ان کی قوت شہوانیہ کو قوی کر دیا ہے۔ کتوں اور خنزیروں جیسی قوت بہیمیہ ان میں بہت رکھی گئی ہے۔ رات دن کھانے اور جفتی کرنے کے سوا انجام کار سوچنے اور فکر کرنے کی ان میں قابلیت ہی نہیں اور جو کچھ ہے تو مہلت نہیں۔ واذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلاً۔ ہم جب چاہیں ان کو مٹا کر ویسی ہی شکل و صورت و قوت میں پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ایسا ہی کرتے بھی ہیں۔ قوم نوح برباد ہو کر اور قومیں پیدا ہوئیں۔ ہر صدی پر دوسرا ہی نقشہ جم جاتا ہے۔ قرون اولیٰ میں سے صدی دو صدی کے بعد انسان تو کیا ان کے استعمال کے جانور بلکہ اکثر مکانات بھی نہیں رہتے

اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان کے بدلے اے پیغمبرؐ اور لوگ ہم تیرے لئے پیدا کر سکتے ہیں چنانچہ عتبہ کے بدلے اس کے بیٹے حذیفہ کو اور ولید کے بدلے اس کے بیٹے خالد کو معین دین بنا دیا۔

اس لئے کہ ان ھذہ تذکرۃ یہ آیات پند و نصیحت ہیں کوئی برادری کا حصہ بخرا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواہ مخواہ تمہارے سمجھانے کے لئے مجبور ہوں۔

فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۔ پھر جو کوئی ہو عرب یا عجم قریب یا بعید جو چاہے ان آیات سے اپنے رب تک پہنچے اور اس کی مہمان سرائے جنت میں حیات جاوداں حاصل کرنے کا راستہ اختیار کرے۔ خدا تعالیٰ تمام جہان اور تمام قوموں کا خدا ہے۔ اس کا دین بھی سب کے لئے برابر ہے۔ سب کے لئے اس کی رحمت کی راہیں کشادہ ہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی کوئی خصوصیت نہیں۔ مگر یہ جاننا بھی درحقیقت اسے بندگانِ خدا اے خدا تمہارے بس میں نہیں۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ تم جب ہی چاہ سکتے ہو جب اللہ چاہے۔ اور فائدہ توفیق تمہیں ادھر کھینچ کر لے چلے ہر چند قوت و قدرت ہر ایک میں رکھی ہے۔ تاکہ اور امتحان کا معاملہ معطل نہ ہو۔ لیکن محرک اس کی توفیق ہے۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۔ بیشک اللہ خبیر و حکمت والا ہے جس میں صلاحیت اور نور ازلی دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی رحمت یعنی راہ راست پر لاتا ہے دین حق سمجھاتا ہے۔ ورنہ بڑے بڑے فاضل ہوشیار، ماہر فن، خوبصورت، مالدار یونہی دار کی ضلالت ٹکڑا ٹکڑا کر مر گئے اور جہنم کے عمیق گڑھے میں جا پڑے۔ اور غریب کم مایہ کو کھینچ لیا۔ اس میں قریش پر تعریض ہے کہ تم نے دین حق کو قبول نہیں کیا۔ دین حق نے تم کو ردی جان کر پھینک دیا اور تمہاری سرکشی اور بدکاری کی ناپاکی نے بارگاہِ قدس میں آنے کے قابل نہ رکھا اس پر بھی بس نہیں یہ تو دنیا میں تمہارے نامعقول اور مردود ہونے کی وجہ ہے۔

مگر آخرت میں وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ظالموں کے لئے ان نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔ مرنے کی دیر ہے یعنی اس کے عذاب گنہگاروں، ظالموں اور ناانصافوں کے لئے ہی مخصوص ہیں۔

سورۃ المرسلٰت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۝ فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا ۝ وَالنَّاشِرَاتِ نَشْرًا ۝

قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کیلئے بھیجی جاتی ہیں۔ پھر ان ہواؤں کی جو تندی سے چلتی ہیں جس سے خطرات کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ان ہواؤں کی

فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا ۝ فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا أَوْ نُذْرًا ۝ إِنَّمَا

پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کر دیتی ہیں۔ جیسا بارش کے بعد ہوتا ہے پھر ان ہواؤں کی جو دل میں، اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا القا کرتی ہیں کہ جس چیز کا تم

تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ۝ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءُ

وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے (مراد قیامت ہے) سو جب ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔

فُرِجَتْ ○ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ○ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ○

اور جب پہاڑ اڑتے پھریں گے۔ اور جب سب پیغمبر وقت معین پر جمع کئے جاویں گے۔

لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ○ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ○ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ

کس دن کے لئے پیغمبروں کا معاملہ ملتوی رکھا گیا ہے۔ (آگے جواب ہے) فیصلہ کے دن کے لئے (ملتوی رکھا گیا ہے) (اور آگے اس فیصلہ کے دن کی تہویل ہے)

الْفَصْلِ ○ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ○

کہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ فیصلہ کا دن کیسا کچھ ہے۔ (یعنی بہت سخت ہے) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

تفسیر یہ سورۃ حسن وعکرمہ وعطاء وجابر کے نزدیک مکہ میں نازل ہوئی اور جمہور کا اسی طرف رجحان ہے۔ قتادہ کہتے ہیں مگر یہ آیت واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون مدینہ میں نازل ہوئی، اور بخاری ومسلم کی روایت جو ابن مسعود سے ہے۔ اسی کی مؤید ہے۔ وہ یہ کہ " ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ کے غار میں تھے کہ سورۃ مرسلٰت نازل ہوئی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھ رہے تھے اور میں آپ کے منہ سے لے رہا تھا۔ ہنوز آپ کا دہن مبارک تر ہی تھا کہ ایک سانپ ہم پر کود پڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو مار دو، ہم مارنے دوڑے، لیکن وہ چلا گیا آپ نے فرمایا کہ اس کو حق سبحانہ نے تم سے بچالیا۔ جس طرح تم کو اس سے بچایا

ربط اس سورۃ کو سورۃ دہر سے ربط یہ ہے کہ اس کی ابتداء میں کافروں کے لئے عذاب شدید کی تہدید تھی اور اس کے آخر میں ظالموں کے لئے عذاب الیم فرمایا ہے۔ کفار کو اس عذاب میں شک تھا کس لئے کہ دنیا میں اس کا ظہور نہیں تھا۔ اور آخرت کے وہ منکر تھے، اس سورۃ شریف میں چند چیزوں کی جو اس کے کمال قدرت میں نمونہ اور تغیرات عالم کے اسباب ہیں قسم کھا کر یہ ثابت فرماتا ہے اس عذاب کا گھر اور موقع دار آخرت ہے نہ دار دنیا

اس سورۃ میں مسئلہ معاد پر تمام کلام کیا تھا، اس سورۃ کی ابتداء میں مسئلہ معاد کو ایک نئے اسلوب سے ثابت کیا اور نئے نئے اسلوب سے ایک مدعا کو بار بار دلکش عبارت میں بیان فرمایا۔ اس سے دل بہت متاثر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک مضمون کو متعدد سورتوں میں بیان فرمایا گیا ہے۔

مقصود بیان اس سورۃ میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر بیان فرمایا ہے۔ انما توعدون لواقع کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، دار آخرت میں منکروں کے ان کے اعمال بد پر عذاب اور نیکوں کے لئے اعمال صالحہ پر ثواب ہو کر رہے گا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ مسئلہ کہ روح جسم چھوڑنے کے بعد ایک خاص پیکر میں باقی رہتی ہے۔ اور اس کو جسمانی وقت کی باتیں یاد رہتی ہیں۔ اور اس کے دنیاوی اعمال واعتقادات اس کے سامنے عذاب وثواب رنج وراحت بنکر پیش آتے ہیں۔

ان پانچ چیزوں میں قدماء مفسرین کے کہ جن میں جلیل القدر صحابہ وتابعین بھی ہیں مختلف اقوال ہیں۔ ان چیزوں سے مراد ملائکہ ہیں۔ مرسلٰت عرفا وہ فرشتہ جو وحی کے ساتھ حضرات انبیاء علیہم السلام تک لگاتار بھیجے گئے۔ یعنی انتظام دنیا اور مصالح دینی کے لئے ملائکہ جو بھیجے ہیں۔ اور ان سے تدابیر وابستہ ہیں۔ ہم ان کی قسم کھاتے ہیں

فالعاصفات عصفاً - پھر ان ملائکہ کی قسم جو ہلاک کرتے ہیں - اور عالم میں تغیرِ عظیم پیدا کرتے ہیں اور ہلاک ڈالدیتے ہیں والناشرات نشراً اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو پھیلاتے ہیں کھول کر دنیا میں جو امور آئندہ مخفی ہوتے ہیں - ان کے اظہار اور نشر کے لئے، ملائکہ کی ایک جماعت ہے اقبال و تحط و ارزانی تمام امور مخفیہ جو ظاہر ہوتے ہیں اور دنیا میں پھیل جاتے ہیں - قضا و قدر نے ان کے لئے ملائکہ معین کر رکھے ہیں - اس میں ادیان حقہ اور وحی کا پھیلانا بھی آگیا ہے۔

فالفارقات فرقاً - پھر ان فرشتوں کی جو ہر ایک معاملہ میں فرق اور امتیاز کر دیتے ہیں - مذاہب حقہ و باطلہ میں تابع و مفتوح قوموں میں، سعادتمندوں اور محسنوں میں - فریبیوں اور خدا پرستوں میں فرق کرنے والے اور اسیطرح عہد جوانی بڑھاپے اور لڑکپن اور حیات و ممات اور ایک قرن سے قرن میں فرق کرنا ظلمات کو نور سے الگ کرنا اشبار عنصریہ میں قوت نامیہ کے ہر ایک کام میں اور اسی طرح اجزار متشابہ انسان، حیوانات و نباتات میں فرق کر کے پتے پھول اور شاخ و ثمر کو جدا کر دینا - اور ہر ایک کو اس کے خواص و کمال میں دوسرے سے امتیاز دینا، اسی طرح انسانی نطفہ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا پھر اسی میں سے سر اور پاؤں اور ناک اور آنکھ وغیرہ اجزار جدا جدا نمودار کر دینا سب اس جماعت کے متعلق ہے ان کی بھی قسم کھاتا ہے۔

فالملقیٰت ذکراً عذراً او نذراً - پھر ان فرشتوں کی قسم جو مخلوق کی تکمیل کے بعد ان میں ذکر ڈالدیتے ہیں - ذکر الٰہی اور اپنے خالق کے وجود قدرت کاملہ پر گواہی دینا بھی ذکر ہے - یہ ذکر ان ملائکہ نے ہر مخلوق کی سرشت میں ڈالدیا ہے - نباتات، حیوانات، پرند، چرند - طیور سب اس کے ذکر میں مصروف ہیں۔

ان پانچ اقسام کے فرشتوں کی قسم کھاتے ہیں - عالم کی آفرینش اور ہر چیز کے وجود کی ابتدائی حالت اور پھر اس کی قدرت کمال تک پہنچ جانے کی امکانات کے اکتساب خیر و شر اور اس کے بعد تک کی حالت اور پھر بقاء عالم کے اسباب اور ہر چیز کی نشو و نما کی کیفیت کہ عالم عدم سے ظہور میں ایک چیز کی کیا کیا صورتیں پیدا کرتی ہے۔ اور اس پر کیا کیا انقلاب ہوتے ہیں - اور پھر سب کی پیدائش کا نتیجہ اور آخرت کی تیاری کس عمدہ اسلوب میں بتائی گئی ہے۔

بعض مفسرین کا یہ بھی قول ہے ان پانچوں چیزوں سے مراد ہوتا ہے - ہر چند فرشتے مخلوق ہیں اور مخلوق بھی بہترین مخلوق ہیں - مگر ہوا کو بھی اس عالم کی بقاء اور فناء اور دنیاوی کاروبار میں عجیب دخل ہے مثلاً سننا، دیکھنا، چکھنا، ٹٹولنا - اور سونگھنا ہوا ہی پر موقوف ہے - کس لئے آواز ہوا کے ذریعہ ہی کان تک پہونچتی ہے - اور دیکھنے میں شعاعیں آنکھوں سے نکلتی ہیں - اور ہوا چونکہ عنصر لطیف ہے - لہٰذا حائل نہیں ہوتی اس وجہ سے چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور سونگھنے میں ہوا ہی تکیف ہو کر ناک کے راستے سے سونگھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے - زندگی کے لئے جزو اعظم ہوا ہی ہے - اور چیزوں کے بغیر تو زندگی کئی کئی دن تک چل سکتی ہے - مگر ہوا کے بند ہونے سے چند منٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔

لہٰذا والمرسلٰت عرفاً سے مراد وہ نرم نرم ہوائیں ہیں جن کے چلنے سے دل کو بالیدگی اور

اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہوا سے ہی روئیدگی ہوتی ہے۔ ابر اٹھتا ہے۔ اور برستا ہے۔

اور عاصفات عصفاً سے مراد آندھیاں ہیں اور سخت ہوائیں ہیں جن سے کافی نقصانات اور ردّوبدل ہوتے ہیں۔

والنشرات نشراً قسم ہے ان ہواؤں کی جو دنیا میں بادلوں کو پھیلاتی ہیں اور ہر چیز کے اجزاء لطیفہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہے۔ فالفارقات فرقاً۔ بس قسم ہے۔ ان ہواؤں کی جو بالکل جدا کرتی ہیں۔ یہ بھی ہوا کا کام ہے کہ دانہ گھاس سے جدا کرنا، اور اجزاء نباتیہ و حیوانیہ کا باہم جدا ہونا ہوا ہی کے نشوونما سے ہے۔

فالملقیت ذکراً۔ پھر قسم ہے ذکر پہنچانے والی ہواؤں کی۔ ذکر سے مراد کلام اللہ کا جو لفظی ہے۔ اس کے ذکر کے پہنچانے میں ہوا کو دخل ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہواؤں پر ہواؤں پر مؤکل ہیں۔ عذراً یعنی کلام الٰہی کا پہچانا۔ بہرحال لفظ عذراً بطور سند اور دستاویز کے استعمال کیا گیا۔

اور نذراً اور شقی ازلی ہے۔ اس کو کلام الٰہی محض ڈرانے کے لئے سنایا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ان پانچوں چیزوں سے مراد آیات قرآنیہ ہیں کہ اہل ایمان کے دل کو نرم کرتی ہیں پے درپے نازل ہوتی ہیں۔ کفار و مشرکین پر آندھی کا اثر رکھتی ہیں۔ اور آثار ہدایت و انوار سعادت کو جہاں میں منتشر کرتی ہیں۔ پھر اہل حق و باطل میں فرق ظاہر کردیتی ہیں، پھر ایمانداروں کے دل یاد خدا کرتے ہیں، اگر عمل کیا تو محبت ہے۔ ورنہ خوف کا پیغام

بعض مفسرین سب سے حضرات انبیاء مراد لیتے ہیں۔ اور حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ مرسلات عرفاً سے مراد دائمی والہامات ربانیہ ہیں کہ سالک کے نفع کے لئے پے درپے وارد ہوتے اور عاصفات سے مراد جذب وکشش الٰہی کے جھونکے ہیں کہ اس کے دل کو حبّ ماسوائے اللہ سے اکھیڑ دیتی ہیں۔

اور ناشرات سے مراد اشتغال داذکار ہیں کہ تمام روح میں انوار پھیلا دیتی ہیں اور فارقات سے مراد واردات الٰہیہ ہیں کہ وجود ناسوتی کو فنا کر کے وجود حقیقی اور مجازی میں فرق کردیتے ہیں اور مُلقیات ذکراً سے مراد علوم و معارف ہیں۔ جو بقا حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ محبت کے طریق سے جو عذر ہے یا خوف کے طریق سے جو نذر ہے۔ مختلف حضرات نے اپنی فہم و فراست وادراک کے مطابق پانچ چیزوں کے قسم کے متعلق ادراک کا اظہار کیا ہے۔ اب طلب کرنے والوں کی نوعیت و حالات پر منحصر ہے۔ جو چاہے قبول کرے۔ اب یوم جزاء کے واقع ہونے کو خبر دے کر اس کے علامات و اسباب بیان فرماتا ہے۔

فاذا النجوم طمست۔ اس دن ستاروں کا نور اور ان کی چمک ماند پڑ جائے گی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جبکہ ستارے بے نور ہوجائیں گے۔ یا اکھڑ جاویں گے۔ اسی بات کو ایک جگہ یوں فرمایا ہے واذا النجوم انکدرت اور جگہ فرمایا گیا ہے۔

واذا الکواکب انتثرت۔ ستارے بے نور ہوکر جھڑ جائیں گے۔ اور آسمان پھٹ جائے گا ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا۔ اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر اڑ جائیں گے۔ یہاں تک کہ نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ صورت اس وقت ہوگی۔ کہ جب کہ موکل فرشتہ ان سے الگ ہوجائے گا۔ جو ان کو حرکت دیرہا ہے۔ اور وہ

الساہے جیسے بدن انسانی کے لئے روح یا نفس ناطقہ اس کا علیحدہ ہوتا ہے۔ فلسفہ قدیم کے نزدیک آسمان اور ستاروں کا گرنا اور پھٹنا محال ہے جن دلائل کے بھروسہ پر حکماء نے یہ کہا ہے ان کا نقص علماء کلام نے ثابت کر دیا ہے۔ موجودہ فلاسفی کے نزدیک آسمان کوئی چیز نہیں ایک فضاء وسیع ہے جس میں ستارے اور ماہتاب لاکھوں میل کے فاصلے پر ایک خاص مدار پر حرکت کرتے ہیں بعض ستارے بہت تیز رفتار ہیں مثلاً مشتری ایسا جلد رفتار ستارہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں کئی ہزار میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اور یہ اجرام علویہ زمین سے سینکڑوں حصے بڑے ہیں، اور زمین بھی ایک چھوٹا سا ستارہ ہے جو کہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگران فلاسفروں کے نزدیک ان سب باتوں کا موجد و محرک مادہ ہے جسکو وہ قدیم کہتے ہیں

مگر جب الہامی عقل کی دوربین سے فصیح النظر ذرا بھی دیکھے گا۔ تو فوراً ایمان لے آئے گا کہ یہ مادہ کا کام نہیں کس لئے کہ اگر مادہ ہی سب باتوں کی علت فاعلیہ ہے تو مادہ سب یکساں ہے۔ پھر اس نے سب جا یکساں کام کیوں نہیں کیا۔ اور سب کو ایک صورت کیوں نہیں دی، اور پھر یہ نظام ہزار ہا برسوں سے چلا آتا ہے کوئی ستارہ دوسرے ستارے سے ٹکرا نہیں جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس کا خالق بجز باری تعالیٰ کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا، اور فضاء وسیع کو فلاسفر مانتے ہیں۔ دراصل یہی تو آسمان ہے لطافت کی وجہ سے اس کا جسم دوربین سے بھی نظر نہیں آتا۔ جب یہ سب کچھ کارخانہ قدرت سے پیدا کیا گیا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خالق اُن ستاروں کو باہم ایک وقت ٹکرا کر چوراچورا کر دے اور آسمان پھٹ جائے

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ۔ جب پہاڑ اڑ کر بکھریں اور زمین سے اکھڑ جاویں، قیامت کے دن جو واقع پہاڑوں پر گذرے گا اس کا قرآن کریم میں متعدد الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ان سب کی مطابقت اس طور پر کہ اوّل زلزلۂ عظیم کے سبب پہاڑ آپس میں ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اور جگہ فرمایا گیا ہے وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ۔ پھر اس چورا ہونے کے بعد ان زیروزبر ہونے سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ دکانت الجبال کثیباً مہیلاً اور فرمایا فکانت ھباءً منبثا۔ پھر ہوا کی شدت اور تموج سے وہ بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس اڑنے میں پہاڑوں کی رنگتوں کے سبب ایک رنگت سرخی نما معلوم ہوگی، فرمایا گیا ہے۔ وتکون الجبال کالعھن المنفوش، پھر زمین پہاڑوں سے صاف ہو جائے گی جبکہ فرمایا گیا ہے۔

ویوم نسیر الجبال وتری الارض بارزۃ۔ یہ تینوں علامت نفخ صور کے بعد ہوں گی یہاں تک کہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ اس وقت کے حالات جو رونما ہوں گے۔ باری تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔ واذا الرسل اقتت اور جبکہ رسولوں کے میدان حشر میں وقت مقرر کیا جاوے تاکہ باری باری ہر ایک رسول اپنے وقت مقررہ پر اپنی امت کی کوشش کرے جب یہ باتیں ہوں گی۔ تب وہ عہد پورا ہو جائے گا۔ جو تم سے رسول و کتاب آخرت کی بابت کرتے ہیں۔ اور تم اپنی غفلت یا دنیا کی محبت اور لذات نفس کی وجہ سے انکار کرتے ہو۔

اس بیان کو سن کر بھی منکرین قیامت یہ کہتے تھے کہ پھر کس دن کے لئے دیر کی گئی ہے۔ لای یوم اجلت کہ کس دن کے لئے ان باتوں کے آنے میں دیر کی گئی ہے۔ کیوں ابھی نہیں ہو جاتیں ؟۔

اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ لیوم الفصل کہ فیصلہ کے دن آنے کے لئے دیر کی گئی ہے

جب وہ دن آئے گا تو یہ سب چیزیں واقع ہوں گی اور اس دن کی تاخیر کا راز ایسا نہیں کہ تمہاری ناقص سمجھ میں آجاوے۔ اس مضمون کو اس آیت میں بیان فرمایا۔

وما ادراك ما يوم الفصل کہ اے مخاطب تو اس فیصلہ کے دن کی حقیقت کیا جانے اور کیا کیا راز اس کی تاخیر میں ہیں۔ اور یوں بھی اس عالم کی تخریب اور باردگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتی مگر سمجھ میں آوے یا نہ آوے وہ دن مصیبت کا ضرور آنے والا ہے۔ جسمیں ويل يومئذ للمكذبين اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔ ہو سکے تو کچھ اس کا بندوبست کرو۔

کفار و مشرکین کو قیامت کی بابت سخت انکار تھا اور کہتے تھے کہ بھلا یہ تو دیکھا اور سنا بھی گیا ہے کہ ایک حادثہ، ایک مکان، یا شہر، یا خاندان پر آیا اور وہ برباد ہوا۔ مگر یہ نہیں کہ تمام دنیا اور آسمان و زمین سب ایک بار برباد ہو جائیں۔ اس کا جواب باری تعالیٰ یہ دیتا ہے۔

الم نهلك الاولين کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کر دیا ہے۔ اپنے سے دو سو برس پہلے لوگوں کا خیال کرو۔ اور ان کے اسباب معاشں اور مکانوں کو بھی غور کرو۔ اس دنیا میں اب کوئی ایک بھی باقی ہے ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں پھر یہ سب مخلوق فنا ہوگئی یا نہیں اور اسی طرح تمہارے بعد آنے والے اور تم فنا ہو جاؤ گے ثم نتبعهم الآخرين۔ ان کے پیچھے لگاتے ہیں۔ ہم فنا ہونے میں پچھلوں کو کہ یہ پچھلے تر دن بھی یوں ہی ہلاک ہوں گے۔

كذلك نفعل بالمجرمين یہاں تک کہ پچھلے قرنوں میں قریب قیامت کے کوئی نیک بندہ باقی نہ رہے گا۔ جو قیامت برپا ہونے میں حاجب ہو۔ سب بدکار اور گنہگار ہی رہ جائیں گے۔ جس طرح کہ پہلے اور بعد کے قرنوں کو ہم نے فنا کر دیا، یکبارگی ان کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ صور پھونکنے سے بس یہی سلسلۂ قیامت کا ہے جس کا ایک سرا اب بھی موجود ہے اور پہلے سے چلا آتا ہے۔ پھر اس میں شک و شبہ کیا بات ہے۔

باری تعالیٰ کا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اے کفار قریش تم اپنے اقتدار پر غرور کر کے کیوں حکم خداوند تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہو کیا تم نے نہیں سنا کہ ہم نے پہلے نافرمان لوگوں کو ہلاک کر دیا حالانکہ وہ تم سے بھی زیادہ ہر صورت میں ذی حیثیت اور صاحب شوکت و دبدبہ تھے۔ مثلاً عاد کا حال تمکو معلوم ہے۔ اور اسی طرح قوم ثمود کو ہلاک کیا۔ اور قریات لوط علیہ السلام کو الٹ دیا۔ اور ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہماری عادت ہے ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں، پھر تم کیا چیز ہو جو اس سرکشی اور مقابلہ میں ہمارے سامنے ٹھہر و گے۔ اس میں صراحت سے ان کفار قریش کو اور ان جیسے بدکار لوگوں کو خداوند قدوس کی طرف سے ایک اعلان ہلاکت ہے۔ جس سے ہر عاقل کو لرزنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی بدکار قوم دنیا میں ہلاکت کی سزا سے نہیں بچی ہے اور اب بھی اس کا یہ قانون جاری ہے

اب بھی وقت ہے کہ اپنے آپ کو صحیح راستے پر لگالیں کیونکہ وہ دن آنے والا ہے جبکہ کفار کو کسی بھی صورت سے چھٹکارا نہ ملے گا۔ اور وہ دن سخت ہوگا۔
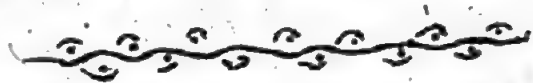
أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ○ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ○ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ

(یہ عذاب کی نظیر ہے یعنی) کیا ہم اگلے (کافر) لوگوں کو (عذاب سے) ہلاک نہیں کر چکے پھر پچھلوں کو بھی (عذاب میں) ان (پہلوں) ہی کے ساتھ ساتھ کر دیں گے۔ ہم

بِالْمُجْرِمِينَ ○ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ○ أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ

مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ (یعنی انکے کفر پر سزا دیتے ہیں۔ اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ آگے قدرت علی البعث کی تقریر ہے یعنی)

مَاءٍ مَهِينٍ ○ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ○ إِلَىٰ قَدَرٍ مَعْلُومٍ ○

کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی (یعنی نطفہ) سے نہیں بنایا پھر ہم نے اسکو ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ (یعنی عورت کے رحم) میں رکھا۔ غرض ہم نے ان

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ○ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ○ أَلَمْ

تصرفات کا) ایک اندازہ ٹھہرایا۔ سو ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھہرانے والے ہیں۔ اس روز حق کے جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ کیا ہم نے زمین کو

نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ○ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ○ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ

زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا اور ہم نے اس زمین میں اونچے اونچے پہاڑ بنائے (جن سے

وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا ○ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ○

بہت سے منافع متعلق ہیں) اور ہم نے تم کو میٹھا پانی پلایا۔ اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

تفسیر منکرین حشر ونشر کا زیادہ انکار اس وجہ سے تھا کہ جبکہ وہ مرکر مٹی ہو جائیں گے اور اجزاء بدن منتشر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا باہم جمع کرنا اور حسب اوّل اسی قالب میں ہزاروں برسوں کے بعد جان ڈالنا اور اس کی زندگی چند روزہ کے افعال واقوال یاد کرانا سمجھ میں نہیں آتا تھا حالانکہ یہ ان کی انتہائی نادانی اور عقل کی خرابی کی بات ہے۔ اسی پر فرمایا گیا ہے۔

الم نخلقکم من ماءٍ مھین۔ کیا ہم نے تم کو اے بنی آدم ذلیل، بے قدر اور بدبودار پانی سے نہیں بنایا؟ اس کو سب مانتے ہیں اور مسلم الثبوت ہے کہ انسان کی پیدائش منی سے ہوتی ہے، پھر دوسری بات قابل عبرت یہ ہے کہ اس قطرہ میں تمام وہ قوتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اس سے بننے والے شخص میں ہوں گی۔ اور اجزاء انسانیہ کا بھی مادہ اسی میں رکھا ہوا ہے۔ کوئی حکیم و دانشمند تمیز نہیں کر سکتا۔ کہ اس قطرے کے کون سے حصے سے سر بنے گا۔ کس سے دل۔

فجعلناہ فی قرارٍ مکین کہ ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے اس نطفہ کو خارجی مفسدات اور داخلی مفسدات سے بچا کر آلہ تناسل کی محفوظ نلی سے عورت کے رحم میں پہنچایا اور وہاں کس حکمت بالغہ سے رکھا کہ جس سے بڑے بڑے حکیم حیرت میں ہیں۔ کیونکہ رحم کی تشریح اور اس میں نطفہ کا جاکر نئی نئی صورتیں پیدا ہونا

پھر اس میں اعضاء اور دیگر چیزوں کا نمو دہونا اس کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے۔ پھر یہ فرمایا ہے۔ الیٰ قدرٍ معلوم اس نطفہ کو رحم میں ایک وقت متعین تک رکھا جس سے مراد مدت حمل ہے پھر اس مدت میں ہم نے اس کے اعضاء بنائے اور اس کی تکمیل کے تمام اسباب جمع کئے اور ان سب باتوں کے کرنے پر ہم قادر ہوئے۔

فقدرنا فنعم القادرون۔ پھر دیکھو ہم کیسے قادر ہیں، جب وہ کامل ہو چکا (نطفہ) تو اپنی قدرت کاملہ کے زور سے اس کو کشاں کشاں اس تنگ و تاریک مکان سے باہر لائے۔ پھر جب یہ ثابت ہوا کہ ہم بڑے قادر ہیں اور ہماری بے انتہا قدرت کا تم نمونہ دیکھ چکے تو کیا اس کے اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے بار دگر اس میں روح پھونکنے پر قادر نہیں ہیں، ضرور قادر ہیں۔ اے کوتاہ بینوں ابتدائی حالت پر انتہائی کا قیاس کیوں نہیں کرتے، پھر کس لئے حشر کا انکار کرتے ہو۔ بلکہ یہ بھی انسانی تکمیل کا تتمہ ہے کہ جس طرح اس کو اس تنگ و تاریک مکان سے باہر لائے اور وسیع جگہ میں رکھا۔ اسی طرح یہ جہاں اس دوسرے جہاں کی نسبت ایسا ہی تنگ و تاریک ہے۔ جیسا کہ ماں کا پیٹ دنیا کی نسبت۔ جس طرح حمل کی حالت کا تصور بھی یہاں نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس حمل سے باہر ہونے کے بعد معلوم ہوگا۔ یعنی دوسرے جہاں میں صرف اتنا فرق ہے کہ حمل مادری میں تم کو اپنی تکمیل کی قدرت نہ تھی۔ اس حمل دنیا ہی میں تم کو قدرت دی ہے۔ پھر جیسے اعمال و اقوال بد اور عقائد کے تصور رہیں گے۔ اس جہان میں اس فیصلہ کے دن ان ناقصوں کو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑیگا جو اس دن کو جھٹلاتے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے۔ الم نجعل الارض کفاتاً احیاءً وامواتاً کہ کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے سمیٹنے والی اور جگہ دینے والی نہیں بنایا؟ زندوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی یعنی زمین وہ صلاحیت رکھتی ہے جس سے تمہاری معاش اور بود و باش کا زندگی میں کام چلتا ہے۔ اور مرنے کے بعد اسمیں دفن ہوتے ہو یا یوں کہا جاوے زمین تمہارے اسباب معاش اور بود و باش کے لئے ہم نے بنادی سرسبزی کی حالت میں بھی اور اسکی خشکی کی حالت میں بھی، زمین سرسبز کو زندہ سے اور خشک مردہ سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ پھر فرماتا ہے۔

وجعلنا فیھا رواسی شامخٰتٍ واسقینٰکم ماءً فراتاً۔ اور اس زمین میں ٹھہرنے والے بڑے بڑے پہاڑ بنائے۔ جن کے منافع بے شمار ہیں۔ مثلاً پہاڑوں سے شیریں پانی کے چشمے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ اور ندیاں بنکر بہتے ہیں۔ جن کا پانی پیکر انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک چیز کی قدرتی بناوٹ اور ان کے منافع میں غور کرنے سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ اس حکیم مطلق کا ہی کام ہے جو بار دگر دنیا کو فنا کر کے قائم کر سکتا ہے۔ پھر ان ناشکروں کے لئے ویلٌ یومئذٍ للمکذبین خرابی ہے۔ وہ اس کی قدرت اور نعمت کو جھٹلاتے ہیں

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ‎ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ

تم اس عذاب کی طرف چلو جس کو جھٹلایا کرتے تھے ایک سائبان کی طرف چلو

ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ‎ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ ‎ اِنَّهَا تَرْمِىْ

جس کی تین شاخیں ہیں۔ جس میں نہ (ٹھنڈا) سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے۔ وہ انگارے برسائے گا

بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ‎ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ‎ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ‎

جیسے بڑے بڑے محل جیسے کالے کالے اونٹ اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ‎ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ‎ وَيْلٌ

یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے۔ اور نہ ان کو اجازت (عذر کی) ہوگی سو عذر بھی نہ کر سکیں گے۔ اس روز (حق کے)

يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ‎ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ

جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔ ان لوگوں سے کہا جاوے گا کہ) یہ ہے فیصلہ کا دن (جسکی تم تکذیب کیا کرتے تھے) ہم نے (آج تم کو اور

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ‎ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ

اگلوں کو (فیصلہ کے لئے) جمع کر لیا سو اگر تمہارے پاس (آج کے فیصلے سے بچنے کی) کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلاؤ اس روز (حق)

کے جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

تفسیر دلائل اور قرائن سے قیامت کا برپا ہونا ثابت کر کے اس کے بعد قیامت میں جو کچھ مشرکین و منکرین کی حالت ہوگی۔ اس کو بیان فرماتا ہے۔ انطلقوا الی ما کنتم بہ تکذبون۔ کہ منکرین سے قبروں سے اٹھانے کے بعد جبکہ آفتاب کی تپش کے مارے دماغ ابلتے ہوں گے۔ اور ایمانداروں کے لئے عرش کا سایہ ہوگا۔ اور منکرین کے لئے نہ ہوگا۔ اور یہ منکرین انتہائی شدت کی حالت میں ہوں گے تو فرشتے یوں کہیں گے چلو اس چیز کی طرف جس کو تم دنیا میں جھٹلایا کرتے تھے یعنی حساب اور اعمال بد پر عذاب چلو اس کو دیکھ لو۔ یہ سنکر منکرین نہایت گریہ وزاری سے کہیں گے کہ سردست ہم کو سایہ ملے کہ کچھ تو اس بلا سے نجات پاویں اس پر جواب ملے گا فرشتوں کی طرف سے

انطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب چلو اس سایہ کی طرف جس کی تین شاخیں نمودار ہیں، وہ دور سے سایہ نمودار ہوگا۔ مگر جب وہاں آدیں گے۔ تو کچھ اور ہی پاویں گے۔

لا ظلیل ولا یغنی من اللھب نہ دراصل وہ سایہ ہے کہ جس میں ٹھنڈک ہو اور نہ بیرونی تپش اور لو کے دفع کرنے میں کارآمد ہے۔ پھر وہ کیا ہے؟ جہنم کا دھواں ہے اور جب دھواں گرم اور بہت ہوتا ہے

اور اوپر کو اٹھتا ہے تو اوپر سے اس کی کئی شاخیں ہو جایا کرتی ہیں۔ جیسا کہ آجکل کارخانہ و ریلوں کے دھوئیں کو دیکھکر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علمار کرام نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اس دھوئیں کی ایک شاخ ان منکرین کے دائیں اور ایک بائیں اور ایک سر پر محیط ہوگی۔ مراد اس سے یہ ہے کہ وہ دھواں منکرین کو ہر طرف سے گھیرے گا۔ اور بعض مفسرین نے یوں بھی فرمایا ہے کہ عالم مثالی میں منکرین کے اعمال و عقائد فاسدہ دھوئیں کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

اس کے بعد جہنم کی کیفیت بیان فرماتا ہے۔ جہاں سے یہ دھواں اٹھتا ہوگا۔ انہا ترمی بشرر کالقصر کہ جہنم سے محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں اڑیں گی۔ قصر کے معنیٰ میں علمار و مفسرین کے دو قول ہیں اوّل تو یہ ہی کہ قصر سے مراد محل ہے دوم قصرہ لکڑیوں کے انبار کو کہتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے جو کسی نے معنیٰ دریافت کئے تو انھوں نے بھی یہی معنیٰ بتلائے اس کے مطابق یہ معنیٰ ہوں گے کہ اسقدر بڑی بڑی چنگاریاں باہر نکلیں گی جبکہ لکڑیوں کے بہت بڑے ڈھیر میں سے چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ مجاہد اور سعید بن جبیر قصر بڑے تنے کو کہتے ہیں اس سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ ایسی چنگاریاں اٹھیں گی جیسے درخت کے بڑے بڑے تنے ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے کانہ جملت صفر وہ چنگاریاں گویا زرد اونٹ ہیں کہ قطار میں ایک کے بعد دوسرا چلا آتا ہے۔ چنگاریوں کو زرد اونٹوں سے کئی باتوں میں تشبیہ دی گئی۔ لمبائی، رنگت، اور پے در پے جلد جلد ایک کے بعد دوسرے کے آنے میں۔ چنگاریاں جو جہنم سے اڑیں گی آگ ہوں گی۔ اور روشن آگ زرد ہوتی ہے۔ اور ایک کے بعد دوسری آئیگی لگاتار جیسا کہ قطار میں ایک اونٹ کے بعد دوسرا اونٹ متصلاً آتا ہے۔ اور اونٹ لمبا اور بڑا بھی ہوتا ہے اسی قدر جسامت کی چنگاریاں گول نہیں ہوتی ہیں بلکہ لمبی اور آگے سے پتلی ہوتی جاتی ہیں جیسے اونٹ کی گردن۔ اور زرد اونٹ عرب کے نزدیک ایک بہت ہی مرغوب ہے۔ گویا یہ دکھایا جاوے گا کہ تو تمہارے سایہ کرنے کا سامان لے کر یہ زرد اونٹ قطار باندھے نکل رہے ہیں۔ نفسیاتی طور پر جب ان منکرین کو ان اونٹوں کا خیال آوے گا تو کیسی حسرت اور روح کو کس قدر تکلیف ہوگی کہ جو چیز دنیا میں ہمارے لئے آرام و آسائش کا سبب تھا آج اسی کی شبیہ ہماری روح تک کو لرزا رہی ہے۔ اس لئے فرماتا ہے

ویل یومئذ للمکذبین کہ اس روز جھٹلانے والوں کی خرابی ہے یعنی ایک تو سایہ کی جگہ جہنم کے گرم دھوئیں کا سایہ جسمیں جی بھی گھٹے۔ اور ٹھنڈک بھی نہ ہو، دوسرے یہ چنگاریاں جو اڑ اڑ کر گر رہی ہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ جب وہ ہر طرح سے مایوس و مجبور ہوتا ہے۔ تو اور خلاصی کی امید نہیں رہتی تو اپنی چرب زبانی سے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی الٹی سیدھی تاویلیں دیتا ہے۔ اسی طرح منکرین اس امر کی کوشش کریں گے۔ سو یہ باتیں ان کو وہاں کچھ کام نہ دے سکیں گی۔

اس لئے کہ ھذا یوم لا ینطقون یہ وہ دن ہو گا کہ جسمیں اس وقت بات نہ کر سکیں گے۔ حیرت و دہشت کی وجہ سے بدحواس ہوں گے، چرب زبانی اور انکار منہ سے نہ نکلے گا۔ بالکل سُن یعنی دم بخود ہو جائیں گے۔

وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ اور نہ ان کو عذر و معذرت کی اجازت ہوگی اس لئے فرماتا ہے

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ کہ اس دن جھٹلانے والوں کی یہ ایک اور خرابی ہوگی۔

ھذا یوم الفصل - یہ دن فیصلہ کا ہے اور فیصلہ کے وقت مجرم کو مہلت نہیں دیجاتی - روز آنا کا زندگی کا مشاہدہ ہے کہ عدالت میں مجرم کے خلاف پیشیاں لگتی رہتی ہیں - اور ہر پہلو پر بیانات اور گواہان کے بیانات لئے جاتے ہیں اس دوران میں مجرم کو مکمل اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بریت یعنی صفائی میں جو چاہے بیان دے سکتا ہے مگر جب فیصلہ کا وقت ہوتا ہے - اس وقت کسی کی بات مسموع نہیں ہوتی ہے - کیونکہ وہ کہنے اور سننے کا وقت گذر چکا -

دوسرے معنیٰ فصل کے فرق کے بھی ہیں یعنی نیک و بد میں جدائی کر دی جائے گی - وہ ان سے جدا اور یہ اُن سے جدا اب یہ بھی توقع ختم ہو جائے گی کہ ان بزرگواروں سے شفاعت کرائیں اور ان کی عرض و معروض پر رستگاری ہو جائے - پھر فرماتا ہے

جمعنٰکم والاولین کہ ہم نے تمہیں اور پہلوں سب کو جمع کر لیا - اب یہ روسیاہی اور ذلت تمام خلائق اولین اور آخرین کے سامنے ہوگی - اور نیز معاصروں سے قرابت و محبت کے رشتے منقطع ہوں گے - اسی طرح اگلے بھی جن سے رشتہ قرابت و عقیدت تھا جدا ہو جائیں گے - اب یہ بھی امید نہیں کہ حضرت آدم، حضرت نوح حضرت ابراھیم، حضرت موسیٰ علیہم السلام کچھ عرض کریں گے -

کس لئے کہ ان میں اور ان میں بھی جدائی ہو جائے گی مصیبت کے وقت ایک یہ بھی ارمان ہوا کرتا ہے کہ گذشتہ ناموروں کو جن کی جناب میں عقیدت ہوتی ہے یاد کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر وہ ہوتے تو مشکل کشائی ہو جاتی - فرماتا ہے اس روز وہ سب بھی جمع ہوں گے -

فان کان لکم کید فکیدون - کافروں اور مشرکوں سے کہا جائے گا کہ اگر ان کی مدد سے کچھ داؤں کر سکتے ہو یعنی ہمارے عذاب کو ٹال سکتے ہو تو لوٹا لو اور مجھ سے داؤں کرو - اور کوئی حیلہ باقی نہ چھوڑو - مگر کیا کر سکیں گے - ان (کافروں و مشرکوں) کے سب وسائل منقطع ہو جائیں گے - پھر اس وقت ویل یومئذ للمکذبین - جھٹلانے والوں کی ضرور خرابی ہوگی -

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ۞ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ

پرہیز گار لوگ سایوں میں اور چشموں میں اور مرغوب میووں میں ہوں گے، (اور اُن سے کہا جاوے گا کہ) اپنے اعمال کے (نیک) صلہ

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۞ إِنَّا كَذَٰلِكَ

میں خوب مزے سے کھاؤ پیو ہم نیک لوگوں کو

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۞ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۞ كُلُوا

ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (اور یہ کفار نعماء جنت کی بھی تکذیب کرتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی -

وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ ۞ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ

تم (دنیا میں) تھوڑے دن اور کھالو برت لو (عنقریب کم بختی آنے والی ہے کیونکہ) تم بیشک مجرم ہو اُس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ　　　وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ

اور ان کافروں کی سرکشی اور جرم کی یہ حالت ہے کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کی طرف جھکو تو نہیں جھکتے ، اس روز حق کے جھٹلانے والوں کی بڑی

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ

خرابی ہوگی۔ تو پھر اس (قرآن بلیغ الالفاظ و الانذار) کے بعد اور پھر کونسی بات پر ایمان لاویں گے ،

تفسیر :- اس سے پیشتر بدکاروں کی سزا کا بیان فرمایا گیا تھا۔ اب یہاں نیکو کاروں کی جزا کا بیان ہو رہا ہے۔ اِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ، پرہیزگار، ایماندار یا نیکوکار اس روز ٹھنڈی چھاؤں میں ہوں گے۔ یعنی جو لوگ متقی پرہیزگار تھے۔ خدا کے عبادت گذار تھے۔ فرائض و واجبات کے پابند تھے۔ خدا تعالیٰ کی نافرمانیوں سے حرام کاموں سے بچتے تھے۔ وہ قیامت کے دن جنت میں ہوں گے۔ جہاں ہر طرح کا عیش و آرام ہوگا۔

برخلاف اُس کے کفار دھوئیں کی چھاؤں میں ہوں گے۔ اور آتش دوزخ کی چنگاریوں میں جلتے ہوں گے۔ مگر ایماندار اس کے بدلے چشموں میں نہاتے پانی پیتے عیش کرتے ہوں گے۔ کفار کو زقوم اور پیپ اور لہو کھانے کو ملے گا یا غصہ اور غم۔ مگر ایمانداروں کے لئے میوے ہوں گے ، اور میوے بھی وہ جن کو دل چاہے گا۔ وہی حاضر ہوں گے۔

برخلاف اُس کے کفار کو لعنت ملامت ہوگی۔ اور ایمانداروں سے یہ کہا جائے گا۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ کہ خوب کھاؤ پیو مزے کرو اس سے مراد یہ ہے کہ نہ روک ٹوک ہوگی نہ کمی اور نقصان کا اندیشہ ہوگا۔ نہ فنا ہونے اور ختم ہونے کا خطرہ ہوگا۔ پھر حوصلہ بڑھانے اور دل میں خوشی کو دوبالا کرنے کے لئے خداوند تبارک تعالیٰ کی طرف سے بار بار فرمان ہوگا۔ کہ یہ سب نعمتیں ان نیک عملوں کے بدلے میں ہیں۔ جن کو تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ باری تعالیٰ کی طرف سے فرمان ہوگا اے میرے پیارے بندو اے جنتیو! ہم نیکوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ایک نیکی کے بدلے دس بلکہ اس سے بھی زیادہ اور فانی کے بدلے باقی عطا کرتے ہیں۔ یہ سب کیفیت کفار کے جہنم میں فیصلہ ہو کر جانے سے پہلے کی ہے، پھر جب کفار ایمانداروں کے لئے انعام و اکرام دیکھیں گے۔ اور اپنے لئے ذلت اور عذاب دیکھیں گے۔ تو کس قدر رنج و غم محسوس کریں گے۔ اور نیز اس بات سے بھی کہ ہم نے ایسے کریم کی کیوں نافرمانی کی جو آج ایسے صلے دے رہا ہے اس سے اور بھی مزید رنج ہوگا۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ کہ خرابی ہے اس روز جھٹلانے والوں کی۔ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ۔ کفار سے تمسخر کے طور پر کہا جائے گا کہ چند روز کھا لو پی لو آخر تم تو مجرم ہو یہ اُن کی دنیاوی حالت کو یاد دلا کر ان پر تعریض کی جائے گی۔ کیونکہ منکرین قیامت دنیا ہی کو سمجھتے تھے اور کہتے تھے ابھی قیامت روز سنتے ہیں۔ کل کے وعدے پر آج کے عیش و عشرت کو کیوں چھوڑا

جائے جیسا ملے اور جس طرح بھی ملے خوب کھاؤ پیو جوانی کے مزے لوٹو۔ کیوں اپنی جوانی کو گھن لگاتے ہو یہ کچھ روز کی جوانی ہے۔ اور یہ خشک دماغ کل کے وعدے پر ناحق ایسے مزوں سے محروم رہتے ہیں بھلا قیامت کس نے دیکھی، دن بھر روزے میں بھوکا پیاسا مرنا کہاں تک عقلمندی کا کام ہے۔ دنیا میں ایک مرتبہ ہی تو آنا ہے دوبارہ تو آنا نہیں۔ پھر یہ مزے کیوں چھوڑیں۔ تب فرشتے انھیں کی کہی ہوئی ان باتوں کو دنیاوی خیالات یاد دلانے کے لئے اس میں نمک مرچ لگا کر یوں کہیں گے۔ کہ کھاؤ اور مزے کر لو۔ چند روز آخر تم مجرم ہو۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کلام دنیا میں کفار کی طرف بالفعل ہے کہ اے کفار تم قیامت کے منکر ہو، دنیا ہی کی لذات پر دلدادہ ہو تھوڑے دنوں کھالو عیش کر لو آخر تم مجرم ہو حبس دائمی اور سزا ابدی میں گرفتار ہو گے اس لئے ویل یومئذ للمکذبین۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لئے خرابی ہے جیسے اور جگہ ارشاد ہے۔

نمتعھم قلیلاً ثم نضطرھم الی عذاب غلیظ۔ دنیا میں ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے پھر تو ہم انھیں سخت عذاب کی طرف بے بس کر دیں گے۔ ایسے ہی اور جگہ فرمان ہے۔ ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون متاع فی الدنیا ثم الینا مرجعھم ثم نذیقھم العذاب الشدید بما کانوا یکفرون۔ یعنی خداوند قدوس پر جھوٹ باندھنے والے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں معمولی اور فانی فائدہ اٹھالیں۔ پھر ان کا لوٹنا تو ہماری ہی طرف ہے۔ ہم انھیں ان کے کفر کی سزا میں سخت تر عذاب چکھائیں گے فرماتا ہے۔ واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون۔ یعنی وہ ایسے سرکشی اور حق کی طرف سے پھرے ہوئے ہیں کہ جب دنیا میں کہا جاتا ہے۔ (رسول یا اس کے نائب) خدا کی طرف جھکو اس کے احکام مانو یعنی جماعت کے ساتھ نماز تو ادا کرو تو ان سے یہ بھی نہیں ہو سکتا، اس سے بھی جی چراتے ہیں۔ بلکہ اسے حقارت سے دیکھتے ہیں اور تکبر کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔

مومن و کافر میں ایک یہ بھی بڑا امتیاز ہے کہ مومن مصیبت کے وقت راحت کے وقت بیماری میں تندرستی افلاس میں تونگری میں ہر حال میں خدا کی طرف جھکتا ہے۔ اس کا مرکز اصل وہی ہے مقاتل کہتے ہیں کہ یہ آیت قوم ثقیف کے معاملہ میں نازل ہوئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اظہار اسلام کیا آپ نے فرمایا نماز پڑھو نماز تعلیم فرمائی۔ انھوں نے کہا ہم رکوع نہ کریں گے۔ کیونکہ اسمیں عار ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ کفار سے اس وقت کہا جائے گا جبکہ تجلی الہی ہو کر کشف ساق ہوگا اور لوگوں کو سجدہ کا حکم ہوگا۔ پھر جو دنیا میں سجدہ نہیں کرتے وہاں بھی نہ کر سکیں گے۔ تختے کی طرح بیٹھ اور گردن اکڑ جائے گی۔ رکوع اور سجود میں خم نہ ہو سکیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کفار جب قیامت میں رکوع و سجود کرنے والوں کو دیکھیں گے کہ طرح طرح کے انعام و اکرام ان پر ہو رہے ہیں۔ تو سخت رنج و افسوس ہوگا کہ ہائے ہم نے کس لئے اس حکم کو نہ مانا۔ ویل یومئذ للمکذبین، اس دن جھٹلانے والوں کے لئے خرابی ہے۔

پھر جب ان کفار کو دار آخرت کا حال اسطرح تفصیل کے ساتھ معلوم کرایا گیا۔ اور بتلایا گیا کہ منکروں اور مشرکوں کے لئے یہ..... خرابیاں اور نیکوکار لوگوں کے لئے یہ نعمتیں ہیں تو پھر اگر سنکر بھی

ایمان نہ لائے تو فبای حدیث بعدہٗ یومنون پھر کس بات پر اس بیان کے بعد ایمان لائیں گے؟
مفسرین کہتے ہیں بعدہٗ کی ضمیر واضح قرآن کریم کی طرف راجع ہے۔ جیسے اور جگہ ہے۔ فبأی حدیث بعد اللہ و آیتہٖ یؤمنون۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ پر اور اس کی آیتوں پر جب یہ ایمان نہ لائے تو اب کس بات پر ایمان لائیں گے۔؟
ابن ابی حاتم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس سورت کی اس آیت کو پڑھے تو اسے اس کے جواب میں آمنت باللہ و بما انزل کہنا چاہیئے (تا کہ ان منکرین سے قطعاً آپ ممتاز ہو جائیں جو کہ خدا تعالیٰ اور اس کی نازل کردہ کتابوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفار سے عملاً تو جدا ہونا ہی ہے قولاً بھی علیحدگی پسندی اسلام میں مطلوب ہے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کی اتاری ہوئی کتابوں پر ایمان لایا۔ یہ حدیث سورہ قیامہ کی تفسیر میں بھی گذر چکی ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۳۰

عَمَّ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

عطاء الرحمٰن صدیقی وسیم بک ڈپو دیوبند

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

تیسواں پارہ ۳۰

سورۃ النبا

اس سورت کا نام سورہ عم یتساءلون سورت نبا اور سورت تساؤل ہے۔ اس میں ۴۰ یا ۴۱ آیات ۱۷۳ کلمات اور ۷۷۰ حروف ہیں (سراج منیر للخطیب) حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ یہ پوری سورت مکی ہے۔ قرطبی نے باتفاق علماء اس کا مکی ہونا نقل کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۙ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ؕ كَلَّا

یہ (قیامت کا انکار کرنیوالے) لوگ کس چیز کا حال دریافت کرتے ہیں اس بڑے واقعہ کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ اہل حق کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں ہرگز ایسا نہیں

سَیَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ

(بلکہ قیامت آئیگی اور) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (مکرر کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ آئیگی) زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا اور (ع ۱)

اَوْتَادًا ۪ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا

(اس کے علاوہ ایک اور بھی اپنی قدرت ہم نے ظاہر کی چنانچہ) ہمیں نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد عورت) بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۪ وَّبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا

کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا

وَّهَّاجًا ۪ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ

(مراد آفتاب ہے) اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گنجان

وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا ۙ یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ

باغ پیدا کریں بیشک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا پھر تم لوگ گروہ گروہ (ع ط)

اَفْوَاجًا ۙ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ وَّسُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا

ہو کر آؤ گے اور آسمان کھل جائے گا پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہو جائینگے

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِّلطَّاغِينَ مَآبًا ۝ لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝ لَا

(آگے اس یوم الفصل میں جو فیصلہ ہوگا اس کا بیان ہے) یعنی بیشک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) جس میں وہ بے انتہا زمانوں (پڑے) رہیں گے (اور)

يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ۝ جَزَاءً وِفَاقًا ۝

اسمیں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا (جو کہ مسکن عطش ہو) بجز گرم پانی اور پیپ کے اور (اُن کی) پورا پورا بدلہ ملے گا (اور وہ اعمال ان کا یہ)

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ۝ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ

جملہ ہے یہ ہیں کہ) وہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (ان کے اعمال میں سے) ہر چیز کو (انکے نامۂ)

كِتَابًا ۝ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۝ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝ حَدَائِقَ

اعمال میں) لکھ کر منضبط کر رکھا ہے سو مزہ چکھو تم کو سزا ہی بڑھاتے جائیں گے خدا سے ڈرنے والوں کیلئے بیشک کامیابی ہے یعنی (کھانے اور سیر کو) باغ (جن میں طرح طرح کے میوے)

وَأَعْنَابًا ۝ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَ

ہونگے) اور انگور اور (دل بہلانے کو) نوخاستہ ہم عمر عورتیں اور (پینے کو) لبالب بھرے ہوئے جامِ شراب (اور) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ (کیونکہ)

لَا كِذَّابًا ۝ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ۝ رَّبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا

یہ باتیں وہاں محض معدوم ہیں) یہ (ان کو انکی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا (آپکے رب کیطرف سے جو مالک ہے) آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن چیزوں کا جو دونوں کے

بَيْنَهُمَا الرَّحْمَٰنِ ۖ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا

درمیان ہیں (اور جو) رحمٰن ہے (اور) کسی کو اسکی طرف سے (مستقل) اختیار نہ ہوگا کہ (اُس کے سامنے عرض معروض کر سکے) جس روز تمام ذی ارواح اور فرشتے (خدا کے روبرو)

لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ

صف بستہ (خشوع وخضوع کے ساتھ) کھڑے ہوں گے (اُس روز) کوئی نہ بول سکے گا بجز اسکے جس کو رحمٰن (بولنے کی) اجازت دیدے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے یہ (دن جس کا اوپر ذکر ہوا)

فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا ۝ إِنَّا أَنذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا ۚ يَوْمَ

یقینی دن ہے سو جس کا دل چاہے (اسکے حالات سن کر) اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے ہم نے تم کو ایک نزدیک آنیوالے عذاب سے ڈرایا ہے (جو کہ ایسے دن واقع ہوگا کہ)

(ع)

يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا ۝

جس دن ہر شخص اُن اعمال کو (اپنے سامنے حاضر) دیکھ لے گا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کئے ہونگے اور کافر (حسرت سے) کہے گا کاش میں مٹی ہو جاتا (تاکہ عذاب سے بچتا)

سورۂ مرسلات کی پچاس آیات میں دس واضح دلائل سے قیامت کا اثبات کیا تھا جن پر غور کرنے کے بعد اہلِ دانش و یقین کے لئے کوئی زاویہ پوشیدہ

تفسیر نہیں رہا تھا لیکن سیاہ بینش اور تاریک روح رکھنے والوں کی علمی اور عملی قوتوں کا زنگ کیسا ہی دُور کیا جائے اور کتنا ہی رگڑ رگڑ کر صیقل کیا جائے
پھر بھی زنگ خوردہ دماغ اور کثافت سے بھری ہوئی روحیں کثیف ہی رہتی ہیں لیکن ارحم الراحمین کی رحمت کو گوارا نہیں کہ سرکش کور باطن انسان اپنی بناوٹ
پر قائم رہے اور سورج کی روشنی کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنے انکار پر مُصر رہے۔ اس لئے طرح طرح سے براہین پیش کرتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری
اور دوسری کے بعد تیسری اور اسی طرح ان گنت دلائلِ واضحہ بیان کرکے بغیر جبر و اکراہ کے صرف فہمائش اور انگیخت سے چشمِ عقل کی پٹی کھول کر حقیقت
کو دیکھنے کی ترغیب دیتا ہے مگر نادان انسان یا بیوقوف بننے والا مکار کج بحثی سے باز نہیں آتا معقولات کو موہومات قرار دے کر گوناگوں شبہات کرتا ہے
کبھی کہتا ہے قیامت کب آئے گی، کبھی کہتا ہے کیوں آئیگی، کبھی کہتا ہے کیسے آئے گی۔ کبھی قیامت کی حقیقت اور ماہیت کی تنقیح کرنی چاہتا ہے۔ کہتا
ہے دوبارہ بعثت کا امکان ہی کہاں ہے اور ممکن ہے تو بعثت روحانی ہوگی یا جسمانی۔ مادی یا غیر مادی، غرض اسی کشمکش اور کنج کاوی میں
اعمالِ صالحہ کی طرف سے منہ موڑے رہتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ قیامت کی حقیقت ایسی عظیم الشان ہے کہ کسی ذہنِ رسا اور عقلِ دراز
کی اس کی حدود میں رسائی ممکن نہیں۔ ہاں اس کی کیفیات و حالات کو مجملاً بیان کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت بہرحال حقیقت ہے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو فہم کا
باعث تنگیٔ دامان اور صغرِ میزان ہے، حقیقت کا انکار نامعقول ہے۔ جب حیاتِ دنیوی کا پردہ اٹھے گا تو حقیقت بھی سامنے آجائے گی۔ اس
وقت اہلِ اقرار ہوں یا اہلِ انکار سب کو اپنی آنکھوں سے عذاب و ثواب اور سزا و جزا دکھائی دے جائیگی۔ اس وقت تو صرف احوال کو دیکھا جاسکتا ہے۔
ماضی اور حال پر مستقبل کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ شواہد اور براہین کی روشنی میں صورتِ قیامت دیکھی جاسکتی ہے مستقبل کو حاضر اور غیر مرئی کو مرئی نہیں
بنایا جاسکتا۔ مقامِ غور ہے کہ انسان کی بقا اور پروان چڑھانے کے لئے اللہ نے کیا کیا سامان کئے۔ رہنے اور قرار پکڑنے کے لئے زمین کا فرش بچھایا اور ساکنانِ
زمین کو اضطراب اور لرزہ خیز حرکات سے بچانے کے لئے زمین کا توازن پہاڑوں کے ذریعے سے قائم رکھا تاکہ جابجا پہاڑوں کی میخیں ٹھونک دیں کہ کہیں پانی
کی تبخیر اور علویات کی کشش اس کو متزلزل نہ بنا دے جس کی وجہ سے زمین پر زندگی کا سانس لینا دشوار ہو جائے۔ پھر اوپر چھت کی طرح سات آسمان مضبوط
قائم کئے۔ اب یہ کائناتِ علوی اور سفلی درست ہوگئی اور ہمہ وقت متحرک انسان کو تعب اور تھکان دور کرنے کی ضرورت پڑی تو سکون حاصل کرنے اور تھکان
دور کرنے کے لئے نیند کو پیدا کیا۔ لیکن نیند کے لئے حواس کو مکمل سکون کی ضرورت تھی اور مکمل سکون بغیر بیرونی تاریکی کے ناممکن تھا اس لئے رات کی تاریکی کو حواس
کا ساتر اور پردہ بنایا مگر ہمہ وقت سکون تو پیامِ موت ہے۔ وقتِ ضرورت حرکت ذریعۂ بقا ہے۔ صرف کے لئے کمائی کی بھی ضرورت ہے اور حیاتِ
جسمانی بغیر ضروریاتِ حیات کی فراہمی کے ناممکن ہے اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے دوامی ظلمت مانع ہے، روشنی کی ضرورت ہے اس لئے روشن
دن بنایا تاکہ انسان اسبابِ زندگانی کی فراہمی کرسکے، لیکن انسان اسبابِ زندگی کا خالق تو نہیں۔ نہ ذریعۂ تخلیق ہے روزی کی پیدائش کے ذرائع بنانے کی
ضرورت تھی اس لئے اللہ نے کائناتِ علوی و سفلی کے تاثیر و تاثر کو انسانی رزق کی تخلیق کا ذریعہ بنایا۔ سرچشمۂ نور و حرارت آفتاب کو قرار دیا۔ آفتاب کی گرمی
نے پانی کا گیس بنایا اور اس عملِ تبخیر سے ہوائیں حرکت میں آئیں اور بادل بن کر ہواؤں کی وساطت سے جابجا پھیل گئے اور ہواؤں کی ہی برودت اور دباؤ
سے پھر پانی بن کر نیچے ٹپکنے لگا اور اس طرح آبِ رواں کھیتوں، باغوں، سبزہ زاروں اور میدانوں کی رگ رگ میں داخل ہوگیا۔ پھر اس پانی کے ذریعے
سے اندرونی مادۂ ارضی اُبھر کر آیا۔ غلہ سے بھرے ہوئے کھیت، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور گھنے گھنے باغات سطحِ ارض پر نمودار ہوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے
کہ تخلیق تکوین اور اعدام و افناء کے ان تمام مدارج کو طے کرنے کے لئے کس طرح عدمِ سابق اور وجودِ لاحق کی نوبہ نو شکلیں سامنے آتی رہیں اور دوسری
نمودار ہونے سے پہلے اوّل فنا ہوتی رہی بلکہ پہلی کا فنا ہی دوسری کے ظہور کا موجب ہوا۔ اصل ذات کے لحاظ سے کوئی چیز قدیم نہیں رہی اور جب چیز کا
قدم نہ ہوا اس کا عدم جائز ہے تو کونسی وجہ ہے کہ اس عالم کا سلسلۂ انواع کبھی ختم نہ ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ قیامت ہونا ممکن صحیح، لیکن ہر ممکن چیز کا وقوع ضروری نہیں۔ پھر وجودِ قیامت کی ضرورت کیوں تسلیم کی جائے تو اس کا جواب بالکل
ظاہر ہے۔ انسان کی پرورش اور بقائے زندگی کے لئے جب اتنا بڑا کارخانۂ ہست و بود سرگرمِ عمل ہے تو کیا انسانی زندگی ایک ناکارہ چیز ہے کیا اس
کی حیات کے تمام اوقات ساعات اور لمحات بے مغز ہیں جس کی حرکت و سکون اور شعور و عمل کے لئے ساری کائنات کی مشینری متحرک ہے کیا وہ خود

جنس کا سد ہے اور اس کا ہر عمل رائیگاں جانے کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ عقلِ نکتہ رس اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ یقیناً انسانی زندگی کا یہ مد وجزر اور یہ حرکت و سکون اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ اور ہر تاثیر کا ایک اثر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اچھے برے عمل کے نتیجہ کی تمیز بھی ضروری ہے اور ثواب و عذاب کا فیصلہ بھی لازم ہے اور اس کارخانہ عمل اور ہنگامہ کردار کے بعد ایک یوم الفصل کی ضرورت ہے اور اس کا ایک وقت مقرر ہے مگر مقرر ہونے کے باوجود نامعلوم ہے۔ کسی کو (اللہ کے سوا) تعیینِ صحیح کا پتہ نہیں نہ اس پورے سنسار میں کسی چیز کے ظہور کی غیر متبدل پل اور نا متغیر لمحہ کسی کو معلوم ہے۔ یہ ہست و بود کا کارخانہ اور اس میں عدم سے آیا ہوا ہر وجود جب تک شکست و ریخت کی تمام منزلیں طے نہ کر لے موجود نہیں ہو سکتا لیکن ایک وجود کے کیسے کتنے مراحلِ عدم و وجود طے کرنے ضروری ہیں اب تک کوئی عالم اس کو جاننے والا پیدا نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ تغیر انواع اور انقلابِ ماہیات کا سطحی مجمل علم رکھنے والے مدعی بن بیٹھیں کہ جرثومۂ اولی کی آغاز آفرینش سے نوعِ انسانی بننے تک تمام طے ہونے والی منازل کا ہم کو علم ہے۔ مگر اول تو یہ اُن کی تمام خیالی ہے۔ فکر و عقل ہر روز تغیر پذیر اور ترقی کی طرف قدم انگن ہے۔ اس کے علاوہ چند کیفیاتی تغیرات کو بیان لینے کا نام علمِ حقیقت نہیں۔ اور جو کچھ ہے وہ بھی لب۔ از دقوع۔ پھر اشخاص اور افراد کے تغیرات کو قبل از وقت جاننا تو امکان سے خارج ہے۔ جب کسی چیز کی تغیراتی حقیقت کے وقتِ مقرر کا صحیح علم کسی کو نہیں تو قیامت قائم ہونے کا مقرر وقت کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ ہاں وہ علامات بتائی جا سکتی ہیں جن کے بعد قیامت نمودار ہوگی۔ یوں تو ہر آن شکست و ریخت اور ہست و بود کا جہانگیر نظام جاری ہے۔ لیکن اس کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے پُر حکمت عقل اور رسا دانش کی ضرورت ہے کور دانش کچھ نہیں سمجھتا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے قیامت کشاکشِ عدم و وجود کا مظہر اتم اور صورتِ اکمل ہوگی اس لئے ہر دانشور اور نافہم اس کو دیکھ لے گا اور مان لے گا مثلاً تمام پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پہلے ذرہ ذرہ جمع ہو کر بنے تھے قیامت کے دن پھر منفصل ذرات کی شکل میں ہو جائیں گے۔

تمام علوی اجسام کے دروازوں سے غیبی مخلوق نکل کر عالمِ اجسام میں آجائے گی اور رحمٰن ذوالجلال کے سامنے مؤدب صف بستہ کھڑی ہوگی دکھ اور سکھ کے دو الگ الگ مقام موجود ہوں گے جن میں گوناگوں عذاب اور رنگا رنگ راحت ہوگی، صور پھونکا جائے گا یعنی ذرات کو جمع کر کے جسمانی صورتیں بنا کے ان میں جانیں ڈالی جائیں گی اور سب لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ وسیع ترین میدان میں نکل کر جمع ہوں گے اور چونکہ علمِ الٰہی کی کتاب میں کائناتِ انسانی کا ذرہ ذرہ موجود ہے اور آدمی کی کوئی حرکت یا سکون معدوم خالص نہیں ہاں آدمی کی نظر سے غائب ہو جاتا ہے مگر صحیفۂ علمِ الٰہی میں تو اس کا فوٹو بلکہ وہی بعینہ موجود رہتا ہے اور اللہ چونکہ رحمٰن ہے اس لئے اس نے اس زندگی میں دنیا کے سامنے اس کی ورق گردانی نہیں کی اور محاسبہ و مواخذہ نہیں کیا مگر ہے وہ سارے جہان کا مالک۔ اس کے اقتدار اور علم سے کوئی چیز باہر نہیں اس لئے تمام اچھے برے اعمال اپنی اصلی شکل میں دائرۂ خفاء سے نکل کر میدانِ ظہور میں آجائیں گے اور سارا کیا کرایا سامنے کر دیا جائے گا اس وقت کسی کو انکار کرتے نہ بنے گی جو لوگ اس زندگی میں وجودِ قیامت اور جزا سزا کے قائل نہ تھے قیامت کے دن ان کو سوائے عدمِ محض کی طرف لوٹنے کی تمنا کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا وغیرہ۔

تحلیلِ اجزاء

عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔ ابن کثیر کی قرأت میں ہا سکتہ کے ساتھ عَمَّہْ آیا ہے۔ يَتَسَاءَلُوْنَ باہم گفتگو کرتے ہیں (قراء) یا رسول اللہ سے پوچھتے ہیں۔ یعنی صرف کفار دریافت کرتے ہیں یا کفار اور بعض مسلمان دریافت کرتے ہیں۔ کافر اس لئے کہ منکر ہیں، مسلمان اس لئے کہ اطمینان چاہتے ہیں۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ۔ ایک عظیم الشان چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں جس کے متعلق خود ان کے آپس میں اختلاف ہے۔ کوئی بالکل منکر ہے کوئی معادِ جسمانی کا منکر۔ کوئی شک میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی اقرار تو کرتا ہے لیکن اس کا اقرار مثل انکار کے ہے کوئی وجودِ قیامت کو ممکن جانتا ہے لیکن غیر ضروری۔ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ۔ کلّا حرفِ ردع ہے جو کلامِ سابق سے باز داشت اور

مفہوم گزشتہ کو رد کرنے کے لئے مستعمل ہے۔ یعنی وجودِ قیامت ہرگز غلط نہیں ہے۔ کافر ہوں یا مومن عنقریب سب کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ نزول اکھیں گے اور مومن جزا، تکذیب اور تصدیق کا نتیجہ ہر گروہ کو دکھ جائے گا۔ کلا کو دوبارہ ذکر کرنا کلام کو پختہ کر رہا ہے اور بقول ضحاک پہلے یعلمون کا فاعل کفار ہیں اور دوسرے یعلمون کا فاعل اہلِ ایمان۔ بعض اہلِ تفسیر نے کلا کے معنی حَقًّا لکھے ہیں یعنی یقیناً اور حقیقتاً سب لوگ جان لیں گے کہ وجودِ قیامت حق ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا۔ مخلوق مصنوع اور آثار خالق صانع اور مؤثر کے وجود، قدرتِ کاملہ اور علم محیط پر دلالت کرتے ہیں۔ جب اللہ کی قدرت اور اس کا علم ہمہ گیر ہے اور اس سنسار کی ہر بالائی اور زیریں چیز حادث اور معدوم الاصل ہے تو کیا وجہ کہ اس عالم کو برباد کر کے اللہ دوسرا عالم نہ پیدا کر سکے۔ جب موجودات کی ذات اور احوال قدامت کا تقاضا نہیں کرتے تو دوامی بقا کے متقضی کیسے ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سارے جہان کا یہ نظام بے مقصد تو نہیں۔ ہر سبب کا ایک نتیجہ ہے جو سبب کے پیشِ نظر اب بھی ہے اور تخلیق اسباب سے پہلے بھی تھا اور یہ تمام اسباب بے ربط اور بغیر وحدتِ نظام کے منتشر بھی نہیں ہیں۔ ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے تو نظر طلب ہے یہ امر کہ ربط اسباب اور وحدتِ نظام اور نتائج و اسباب کے چند در چند اور گوناگوں ہونے کے باوجود سب کے ایک اکائی میں منسلک ہونے کا مقصدِ اصلی اور نتیجۂ آخری کیا ہے۔ سفلی، علوی اور فضائی کائنات کی اتنی گہری وابستگی ایک خصوصی مقصد کو اپنے آغوش میں ضرور لئے ہوئے ہے۔ وہ مقصد ہے صرف انسان کی تربیت اور خدمت۔ اس پورے مضمون کو اس آیت سے آیت يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ تک بیان فرمایا ہے۔

مہاد مصدر ہے یا بمعنی اسم مفعول جیسے فراش۔ یعنی اللہ نے استقرار کے لئے زمین کو مثل بستر کے بنایا (دیکھو سورۂ بقرہ کی آیت جعل لکم الارض فراشا)

وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا۔ یعنی پانی کی تبخیر اور تموجی حرکات کی وجہ سے زمین کو استقرار نہیں ہو سکتا تھا اور ہر وقت اضطرابی ارتعاشی حرکت ہوتے رہنے کا اندیشہ تھا اس لئے توازن درست رکھنے کے لئے پہاڑوں کو میخوں کی طرح زمین میں پیوست کر دیا تاکہ زندہ مخلوق کا زمین پر زندہ رہنا اور آرام پانا ممکن اور سہل الحصول ہو جائے۔

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا۔ ہم نے تم کو جوڑے جوڑے پیدا کیا۔ یعنی مرد و عورت، نر و مادہ۔ اللہ کی یہ بڑی حکمت اور عجیب صنعت ہے کہ ایک ہی مادہ سے ایسی دو صنفیں بنائیں کہ ہر ایک اپنی ساخت، صلاحیت، ہیئت، منفعت اور خصوصیت میں دوسری سے بالکل جدا ہے۔ مرد کی بناوٹ، مزاجی افتاد، قوت، خصلت، میلان، عواطف اور ہر صلاحیت و استعداد، عورت کی مختلف کیفیات و احوال سے جدا ہے۔ نطفہ دونوں کا قوامی مادہ ہے۔ رحم مادر دونوں کا تنور ہے۔ قوتِ واہبہ دونوں کی تخلیق کی ایک ہی ہے لیکن دونوں صنفیں اپنے لوازم کے اعتبار سے الگ ہیں۔ پھر الگ الگ تخلیق اور جدا جدا کیفیات کی حامل ہونے کے باوجود ہر ایک کی ساخت، جذبات، عواطف اور افتادِ مزاجی ایسی ہے کہ دونوں باہم میل کھا سکیں۔ ساخت میں اگر باہم تضاد ہوتا تو فرضِ زوجیت کیسے ادا ہوتا اور زوجیت ناممکن ہوتی تو بقائے نسل کا امکان کس طرح ہوتا۔ اگر ایک کا دوسرے کی طرف میلانِ خاطر نہ ہوتا، الفت و مودت نہ ہوتی، شغف اور کھنچاؤ نہ ہوتا تو دونوں کا ملاپ کس طرح ہوتا اور بغیر ملاپ کے تناسل کیسے ہوتا۔ پس انسانوں میں سلسلۂ زوجیت قائم کرنا یعنی الگ الگ لوازمِ زوجیت بنانا اور اس طرح نسلِ انسانی کو پھیلانا اللہ کی قدرتِ کاملہ اور علمِ محیط پر دلالت کرتا ہے۔

امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ زوج زوج بنانے سے متضاد صفات اور متقابل اشیاء کو پیدا کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ امام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کائناتِ انسانی کو متضاد صفات کا حامل بنایا ہے۔ کالا اور گورا، خوبصورت اور بدصورت، طاقتور اور کمزور، جوان اور بوڑھا، تندرست اور بیمار، بہادر اور بزدل، سخی اور کنجوس، دانشمند اور احمق، مومن اور کافر، اچھا اور برا، غرض ہر صفت کے مقابلہ میں اس کی ضد موجود ہے جس سے کمال کا نقصان سے، حق کا باطل سے اور خیر کا شر سے امتیاز ہو جاتا ہے۔ اگر یہ زوجیت اور جوڑا جوڑا نہ ہوتا تو کوئی صفتِ کمال نہ قرار پاتی۔ فرقِ مراتب نہ ہوتا، باہم تعاون ناممکن ہوتا، کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا، نہ کوئی کسی کا مددگار۔ اجتماعی زندگی محال ہو جاتی اور مدنیت

مشغول ہیں کہ قدسی روح رکھنے والا انسان ان میں تصرف کرے، ان پر حکومت کرے اور ساری مادی کائنات سے کام لے کہ مرکز ایجاد اور سرچشمۂ قدرت کی طرف بڑھے اور اس طرح تخلیقِ عالم کا مقصد پورا ہو اور کنز مخفی میدانِ ظہور میں آجائے۔ پس ہر چیز انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان خدا کے لئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ مراد کلامہ۔

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۔ کیا ہم نے تمہاری نیند کو راحت نہیں بنایا (ابن قتیبہ) حرکات کو منقطع کرنے والا نہیں بنایا (ابن کثیر) منقطع یعنی غیر دوامی نہیں بنایا (مبرد) سلسلۂ تناسل اور زمین پر انسانوں کے پھیلنے کی جو ضروریات تھیں ان کی پیدائش و ایجاد کا مجمل بیان مذکورۂ بالا آیت میں کر دیا گیا تھا لیکن صرف اسبابِ تناسلی اور لوازمِ افزائشِ نسل کی تخلیق سے تو بقاءِ شخصی نہیں ہوتی۔ انسان پیدا ہونے کے بعد زندہ رہنے کے اسباب و ذرائع کا بھی تو محتاج ہے۔ حرکت کرتے رہنے سے تھکان ضرور ہوتی ہے، اس لئے سکون ضروری ہے، لیکن زیادہ سکون سے جمود پیدا ہوتا ہے اور جمود موت ہے، اس لئے دماغ، حواس اور اعصاب کی تھکان دور کرنے کے لئے نیند کی ضرورت ہے، مگر نیند بھی راحت رساں، تعب شکن، سکون بخش یعنی عارضی اور دوامی نہ ہو۔ ایسی بے ہوشی نہ ہو کہ اس کے بعد ہوش نہ ہو۔ ایسی اچاٹ نہ ہو کہ سوتے میں بھی حواس میں انتشار اور دماغ میں تشویش باقی رہے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۔ اس لئے اندرونی دماغی سکون کے لئے بیرونی تاریکی بھی ضروری ہے۔ باہر کی روشنی قوتِ حس کو بیدار رکھتی ہے اور دماغ میں راحت آفریں سکون نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ تو ہے کہ اللہ نے رات کو لباس یعنی تشویشِ حواس کا پردہ پوش اور بیرونی کرب و بے چینی سے دماغ کو بچانے والی بنایا۔ رنگ کا نکھار، چہرے کی تازگی، پٹھوں میں شادابی اور جلد میں لطافت اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ گویا رات کیا ہے انسان کے لئے زینت افزا، سکون بخش، سکون رساں، راحت آفریں اور بکثرت بیرونی مضرتوں سے بچانے والی، لیکن دوامی سکون موت ہے۔ آخری نقطۂ راحت الم ہے۔ چہرہ کی انتہائی تازگی انتہاب تک پہنچتی ہے اور التہاب کے بعد افسردگی موت طاری ہونی لازم ہے۔ تاریکی اور سکون آخری درجہ پر پہنچ کر اعصاب کو سست اور افسردہ کر دیتے ہیں۔ پھر تحصیلِ غذا کیسے ہو اور بغیر غذا کے نمو اور بقائے بدن کا کس طرح امکان ہے اس لئے سکون بخش خواب اور راحت آفریں رات کے ساتھ

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا روشن دن کو بھی بنایا تاکہ لوگوں کو تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور مشاغلِ حیات کی فراہمی کا وقت مل جائے۔ (رازی)۔ اور روشنی کے ذریعہ سے لوگ اپنا کاروبار کر کے فراہمی رزق کر سکیں۔ (ابن کثیر) گویا روز روشن کو اللہ نے عینِ حیات (خطیب فی السراج) یا وقتِ حیات (ابوالسعود) بنا دیا۔ کیونکہ سوتے میں آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نہ دینی نہ دنیوی۔ نیند تو موت کی بہن ہے۔ خواب آدھی موت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک پہیے سے زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ ہر حرکت نہاری کا مددگار سکونِ شبینہ ہے اور لیل و نہار دو ہمزاد ہیں لیکن مشاغلِ حیات کا وقت تو عموماً دن ہی ہے۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۔ بقائے زندگی زمین کے استوار اور انسان کی حرکت و سکون کی خواستگار ہے۔ حرکت و سکون کے بغیر فراہمی معاش اور حصولِ غذا ممکن نہیں لیکن صرف طلب، کوشش اور حرکت و سکون سے پیدائشِ رزق کے سارے اسباب تو فراہم نہیں ہو سکتے۔ تخلیقِ رزق میں اسبابِ فضائی اور مؤثراتِ سماوی کی فعالیت کو سب سے بڑا دخل ہے اور ان اسباب و مؤثرات کا تحفظ باہم وابستگی کے بغیر ناممکن ہے اس لئے اللہ نے سات آسمانوں یا کروں کی تعمیر کی جو ہر طرح محکم ہیں۔ قوام میں بھی باہم وابستگی میں بھی نظام کی درستگی اور ہمواری میں بھی تاثیرات اور کیفیات میں بھی باہم تضاد بتائیں اور تخالف سے بھی جذب اور کشش میں بھی۔ ان ساتوں کروں کی فعالیت کس قسم کی ہے سفلی کائنات پر ان کی اثر اندازی کی نوعیت، کیفیت اور حیثیت کیا ہے۔ یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ نہ یہ پتہ چل سکا کہ ساکنانِ زمین اور زمین کن کن امور میں مؤثراتِ علویہ کے محتاج ہیں۔ مگر اتنی حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۔ اللہ نے بالائی کائنات میں ایک چراغ روشن کر رکھا ہے جس کی روشنی بھی ہر چیز سے زائد ہے۔ اور گرمی بھی غیر محدود۔ وہی نور و حرارت کا سرچشمہ ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ زمین پر سورج کی روشنی اور گرمی کے تو ہے لاکھ حصوں میں سے ایک حصہ آتا ہے۔ باقی حصے دوسری کائنات کو پہنچتے ہیں۔ اللہ جانے یہ صحیح ہے یا غلط مگر اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی اور گرمی کائنات کی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے اتنی ضروری ہے کہ اس کے بغیر نہ تحلیلِ رطوبات ہو سکتی ہے، نہ زہریلے جراثیم سے زمین پاک ہو سکتی ہے۔

نہ پھل پک سکتے ہیں۔ نہ دورانِ خون ہو سکتا ہے۔ نہ دودھ اور روغن کی تولید آسان نہ کسی رطوبت میں نشو و نما کا ہونا ممکن ہے، نہ کائناتِ عمل و حرکت کا نکھار دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی روشن چراغ سارے جہان کو روشن بھی رکھتا ہے اور قوام کائناتی کو پکانے والی حرارت بھی پہنچاتا ہے۔

وہاج کے لغوی معنی اہلِ عرب نے مختلف طور پر بیان کئے ہیں۔ خلیل کا قول ہے وہاج بہت تیز گرم کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہج کا معنی ہے آگ اور سورج کی گرمی۔ ابن عباس کا قول بروایت کلبی ہے کہ بہت زیادہ روشن اور کامل نورانی وہاج کا معنی ہے۔ خطیب اور ابو السعود نے بھی اسی معنی کو بیان کیا ہے۔ امام رازی نے کہا۔ بہرحال مطلب حاصل ہے۔ آفتاب سرچشمہ نور بھی ہے اور کائناتِ سماویہ و ارضیہ میں سبب حرارت آتشکدہ بھی۔ سورج کے پوشیدہ اور دقیق آثار کو تو اہلِ علم کے لئے چھوڑ دو۔ اتنی موٹی بات ہی پہ غور کر لو کہ آفتاب کی شعاعیں

وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا جب سمندروں اور مرطوب مقاموں پہ پڑتی ہیں تو تمام رطوبات اور آبی اجزاء حرارت پاکر عمل تبخیر کے ذریعہ سے ہوا اور گیس کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسی آبی و ہوائی معجون کا نام ابر ہے جو دوبارہ گرمی پاکر پھر پانی کی شکل میں نیچے برستا ہے کہ تھمنے کا نام اس وقت تک نہیں لیتا جب تک سارا قوامِ سحابی ختم نہ ہو جائے۔

معصرات سے مراد ہیں ہوائیں (ابن کثیر بروایت عوفی از ابن عباس و ابن ابی حاتم بطریق سعید بن جبیر از ابن عباس و اقوال عکرمہ و مجاہد و قتادہ و مقاتل و زید بن اسلم و عبد الرحمٰن بن زید) علی بن ابی طلحہ کی روایت میں ہے کہ ابن عباس کے نزدیک معصرات سے بادل مراد ہیں۔ ضحاک، ابو العالیہ، حسن بصری، اور ربیع بن انس کے بھی یہی اقوال ہیں۔ سفیان ثوری اور شیخ ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔

فراء نے کہا کہ معصرات ان بادلوں کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرے ہوئے ہوں اور برسنے ہی والے ہوں۔

ثجاج کا معنی ہے پیہم مسلسل برسنے والا یعنی جھڑی (سفیان ثوری و شیخ ابن جریر و مجاہد و قتادہ و ربیع بن انس وغیرہم) لیکن عبد الرحمٰن بن زید نے کہا کہ بکثرت برسنے والے پانی کو مار ثجاج کہتے ہیں۔

بہرحال آفتاب کی تمازت اور گرمی سے گیس بنا اور گیس سے ابر۔ پھر ابر سے پانی برسا۔ کیوں؟

لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا۔ اس لئے کہ (زمین میں مٹی سے مل کر کھاد بن کر) پانی کے ذریعہ سے غلہ سبزی اور گھنے باغ پیدا ہو سکیں اور جاندار اپنی روزی حاصل کر سکے۔ اب دعوتِ نظر ہے ناشناسندوں کے لئے کہ انسانی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے اللہ کی حکمتِ کاملہ اور قدرتِ تامہ نے کائناتِ عالم کو عدم و وجود کے کتنے درجات طے کرائے۔ تناسلی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے زوج زوج بنایا اور شخصی حیات کے قیام کے لئے آبار علوی اور امہاتِ سفلی اور کائناتِ فضائی کے انفعالی اور فعالی لاتعداد مدارج بنائے۔ ہر صورت سابقہ کے عدم کے بعد صورتِ لاحقہ کو موجود کیا۔ تو کیا یہ سارا سلسلۂ عدم و وجود اور تمام تخلیقات لاحاصل ہیں۔ انسانی زندگی کے بقا کے لئے یہ پوری فیکٹری متحرک ہے تو کیا۔ انسانی زندگی کی پوری رعنائیاں، دلفریبیاں اور عجوبہ کاریاں بے مغز ہیں۔ اس کی زندگی کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ تمام کائنات کی حرکت کا تو ایک حاصل ہے۔ تو کیا انسانی عمل و کردار بے نتیجہ ہے۔ جب ہر عدم کے بعد وجود اور وجود کے بعد عدم بے نتیجہ نہیں تو انسانی حرکت و سکون اور گفتار و اطوار کس طرح غیر مثمر ہو سکتے ہیں۔ یقیناً اس کے افعال و اعمال خواہ جسمانی ہوں یا دماغی کارخانۂ قدرت میں بے فائدہ پرزہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ پرزہ تمام پرزوں کا سرتاج اور مخدوم بھی ہے اور خود بھی اپنے اعمال کا جواب دہ۔ لیکن اس کے اعمال کا نتیجہ کب سامنے آئے گا یہ کسی کو معلوم نہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ایک پاداشِ اعمال کا دن ضرور ہوگا اور اس کا ایک وقت ہے جس کی صورت یہ ہوگی کہ ساری کائنات

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ارضی کی توڑ پھوڑ کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو گروہ در گروہ انسان زندہ ہو کر میدانِ قیامت میں جمع ہوں گے (مجاہد) یعنی ہر امت اپنے پیغمبر کے ساتھ آئے گی (ابن جریر) شیخ ابو السعود نے مجاہد کے قول کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جدا جدا جماعتیں ہوں گی جن کی وضع اور حالات الگ الگ ہوں گے۔ اس کی توضیح کے لئے شیخ نے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس نے حضرت معاذ بن جبل کے استفسار کے جواب میں روتے ہوئے فرمایا۔ معاذ تو نے بڑی

بات دریافت کی۔ میری امت میں دس قسم کے گروہ محشور ہوں گے۔ (۱) بندروں کی شکل پر (یعنی چغل خور) (۲) سؤروں کی شکل پر (یعنی حرام خور) (۳) ایسے لوگ جن کی ٹانگیں اوپر کو ہوں گی اور منہ کے بل گھسٹتے جائیں گے (یعنی سود خوار) (۴) نابینا (یعنی فیصلہ میں ظلم کرنے والے) (۵) گونگے بہرے (یعنی اپنے نیک کاموں پر گھمنڈ کرنے والے) (۶) وہ لوگ جن کی زبانیں سینوں پر لٹکتی ہوں گی (یعنی واعظ بے عمل) (۷) ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے (یعنی ہمسایوں کو ایذا دینے والے) (۸) آگ کے ستونوں کی سولیوں پر لٹکے ہوئے (یعنی حاکموں سے چغلیاں کھا کر بے قصوروں کو دکھ پہنچانے والے) (۹) گندگی کی طرح انتہائی بدبودار گندے (یعنی خواہشات کے پرستار جو اللہ کے قائم کئے ہوئے مالی حقوق ادا نہیں کرتے) (۱۰) روغن قطران کے بھڑکتے سوختہ جبے پہنے ہوئے (یعنی مغرور و متکبر) (نقلہ ابن کثیر والزمخشری والرازی وشیخ الصوفیۃ ابن العربی والخطیب) خطیب نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تفسیر سراج المنیر میں اس کی صحت میں کلام کیا ہے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا - روزِ قیامت کے احوال میں سے ایک یہ بھی ہوگا کہ آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ دروازے دروازے بن جائیں گے۔ یعنی بجائے آسمان کے دریچے دریچے نظر آئیں گے جن میں سے غیبی مخلوق یعنی ملائکہ نازل ہوں گے۔ شیخ ابو السعود نے لکھا ہے کہ آیت یوم تشقق السماء بالغمام کا بھی یہی مطلب ہے کہ قیامت کے دن آسمان شق ہو کر اس میں سے غمام یعنی ملائکہ نازل ہوں گے۔ لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ آسمان کا شگافتہ ہونا الگ چیز ہے اور اس کو کھول کر دروازے نمودار کرنا جدا معنی رکھتا ہے۔ یہاں صرف یہ مراد ہے کہ آسمان کو کھول دیا جائے گا اور مسدود راستے کھل جائیں گے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ جس طرح اس وقت آسمان ہموار بغیر کسی دریچے اور دروازے کے نظر آرہا ہے قیامت کے دن اس کی صورت کچھ اور ہو جائے گی۔ کہیں ہمواری نظر نہ آئے گی اور اتنے دروازے کھلے دکھائی دیں گے کہ دریچے ہی دریچے اور دروازے ہی دروازے نظر کے سامنے آئیں گے۔ ہموار سطح دکھائی نہ دے گی۔ گویا پورا آسمان دروازے بن جائے گا۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ فرشتے اتنی کثرت سے میدانِ قیامت میں نازل ہوں گے کہ آسمان کا ہر حصہ اُن کے نزول کے لئے ایک دروازہ بن جائے گا۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا - اور پہاڑ جو اس وقت جمے ہوئے اپنی جگہ پر قائم نظر آتے ہیں قیامت کے دن باقی نہیں رہیں گے ہیچ ہو جائیں گے۔ ایک نظری دھوکا، سراب ریت کے اس میدان کو کہتے ہیں جو چاندنی رات یا دھوپ میں دُور سے پانی کی طرح محسوس ہوتا ہے حالانکہ وہ صرف نظر کی غلطی ہوتی ہے پانی نہیں ہوتا چمکدار ریت ہوتا ہے۔ کسی چیز کے سراب ہونے کے معنی ہوتے ہیں بے حقیقت اور لاشی ہو جانا۔ امام رازی اور خطیب وغیرہ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن پہاڑوں کے احوال مختلف ہوں گے۔ اول تو ان کو مع زمین کے اٹھا کر ایکدم کوفتہ کر دیا جائے گا جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے حملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ۔ پھر دھنی ہوئی روئی کی طرح کر دیئے جائیں گے۔ آیت میں آیا ہے۔ وتکون الجبال کالعھن المنفوش۔ پھر ریزہ ریزہ کر کے ریت کے باریک ترین ذرات کی شکل میں بنا دیا جائے گا آیت میں وارد ہے وبست الجبال بسا فکانت ھباء منبثا پھر ہوا کے جھونکے ان کو اڑا کر لے جائیں گے اور زمین چٹیل میدان بن جائے گی۔ آیت میں ارشاد ہوا ہے۔ ینسفھا ربی نسفا فیذرھا قاعا صفصفا۔ آخر میں پہاڑ سراب ہو جائیں گے یعنی نابود۔ شیخ ابو السعود نے بھی پہاڑوں کے یہ سب احوال لکھے ہیں مگر ترتیب میں کچھ تقدیم تاخیر کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ آیت مذکورہ میں پہاڑوں کی دو کیفیتوں کا بیان کیا ہے۔ اول تو یہ کہ پہاڑ جامد اور قائم نہیں رہیں گے ان کو چلایا جائے گا ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۶ء کو منگولیا میں ایسا زلزلہ آیا تھا کہ پہاڑوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دریا کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ کچھ بالکل ہی معدوم ہو گئے۔ زمین پھٹ کر یہ پہاڑ ایک جگہ سے میلوں فاصلہ پر دوسری جگہ پہنچ گئے۔ پندرہ روز کے بعد جب سیاح دیکھنے گئے تو اس وقت تک ساری فضا گرد و غبار سے تاریک ہو رہی تھی۔ دوسری حالت یہ ہے کہ پہاڑ سراب یعنی معدوم محض بن جائیں گے یا ریت بن جائیں گے۔ مؤخر الذکر تشریح پر یہ پہاڑوں کی کوئی

جدا مستقل حالت کا بیان نہ ہوگا بلکہ اسی مضمون کا بیان ہوگا جو آیت فکانت ھباءً منبثا میں بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِلطَّاغِينَ مَآبًا۔ اوپر کی آیت میں قیامت کے کچھ احوال و کیفیات کا بیان تھا۔ یہاں سے قیامت کی اصل غرض کی تفصیل ہے۔ گویا یوم الفصل کے لفظ میں جو بات مجمل مذکور تھی اس کی تفصیل اس جگہ سے شروع کر دی۔

اس آیت میں تین امور تشریح طلب ہیں۔ (۱) مرصاد کا معنی (۲) طاغین سے مراد (۳) طاغین کا تعلق۔ (۱) مرصاد کا معنی ہے گھات تاک یا انتظار کا مقام۔ اہلِ تفسیر نے جہنم کے مرصاد ہونے کے تین معانی بیان کئے ہیں۔ اول یہ کہ جہنم خود اہلِ جہنم کے انتظار میں ہے کہ کب آئیں اور کب وہ ان کو اپنے اندر سمائے۔ دوسرے یہ کہ جہنم کے ملائکہ کافروں کے منتظر ہیں۔ تیسرے یہ کہ جنت کے خادم دوزخ کے پل پر نظر رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی جنتی راستہ میں ہی جہنم کی لپٹ سے جل نہ جائے (خطیب و رازی و اکثر اہلِ تفسیر) شیخ ابو السعود نے مرصاد کی دوسری توجیہ ہی بیان کی ہے۔ اور ابن کثیر نے تیسری توجیہ کا ذکر نہیں کیا (۲) طغیان کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ دنیا میں اللہ نے خیر و شر کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ حق و باطل معصیت اور فرمانبرداری ناجائز اور جائز ممنوع اور حلال کی توضیح کر دی ہے۔ عملی اور علمی صحت و غلطی کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ نظریات و افکار اور اعمال و کردار کی درستی و نادرستی کی تشریح فرما دی ہے۔ ایک طرف صغیرہ گناہ سے لے کر کفرِ عملی تک تمام ممنوعات ہیں۔ دوسری طرف جائز سے لے کر وجوبی عمل تک تمام امورات یا مباحات ہیں۔

اسی طرح اللہ کی ذات و صفات وجودِ ملائکہ صفاتِ ملائکہ رسالت کتاب اللہ، تشریعاتِ آسمانی، بعث جسمانی، حساب کتاب اور جنت دوزخ وغیرہ کے صحیح عقائد کا ایک طرف اظہار ہے جو عقل و ادراک کو صحیح فکری درس دیتا ہے۔ دوسری طرف انکارِ نبوت و قیامت اور شرکِ صفاتی و ذاتی سے باز داشت ہے۔ اب طاغی اور حد سے تجاوز کرنے والا وہی شخص ہوگا جو علمی اور عملی مقررہ حدود سے آگے بڑھ جائے۔ خواہ ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز قرار دے یا صغیرہ سے لے کر کفرِ فعلی تک کسی ممنوع فعل کا ارتکاب کرے یا مندوب سے لے کر فرض تک کسی عمل کو ترک کرے۔ یا عقیدہ کی معمولی غلطی سے لے کر شرک فی الصفات و الذات تک پہنچ جائے۔ لفظ طاغین میں تمام نافرمان، غلط کار اور باطل افکار و عقائد رکھنے والے شامل ہیں لیکن اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ صرف کافر مراد ہیں اس لئے کہ آئندہ انہی اہلِ طغیان کی صفت تکذیب آیات اللہ اور انکارِ قیامت وغیرہ بیان فرمائی ہیں اور ظاہر ہے مومن عاصی کو نہ انکارِ قیامت ہوتا ہے نہ وہ مکذب آیات اللہ ہے اس لئے اہلِ طغیان سے مراد اس جگہ صرف کافر ہیں۔ طغیان اگرچہ عملی بھی ہوتا ہے لیکن علمی اور نظری طغیان سب سے بڑا طغیان ہے۔ جس طرح عقیدہ اور نظریہ کی درستی کردار کی درستی کی جڑ ہے اسی طرح عقیدہ کی غلطی اور نادرستی اور کجی کردار و عمل کی عمارت کو ٹیڑھا ہی لے جاتی ہے۔ دیوارِ عمل کی تعمیر میں کیسا ہی مضبوط اور عمدہ مصالحہ لگایا جائے مگر چونکہ بنیاد کج ہوتی ہے اس لئے تعمیرِ دیوار کا بے سود ہونا اور جڑ سے گر پڑنا یقینی ہے۔ خلاصہ یہ کہ طاغین سے مراد کافر ہیں کیونکہ سب سے بڑے طاغی وہی ہیں۔

(۳) عام اہلِ تفسیر نے تو للطاغین کو مرصاداً سے متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی دوزخ اہلِ طغیان کی گھات اور انتظار کا مقام ہے لیکن امام رازی اور بعض دوسرے اہلِ تحقیق نے مآباً سے تعلق ظاہر کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب کی توضیح اس طرح ہوگی کہ دنیوی زندگی کا مآل اور نتیجہ بہر حال کچھ ہونا ہے۔ آخری ٹھکانہ کہیں تو ہوگا۔ لوٹ کر آدمی کہیں تو پہنچے گا تو کافروں کی جائے رجوع اور مآل زندگی جہنم ہوگا یعنی دنیوی سفر سے لوٹ کر آخر میں کافر جہنم ہی میں جائیں گے۔ یہی ان کا آخری مقام ہوگا اور یہی انتہائی منزل۔ اس سے آگے نہ کوئی فرودگاہ ہے۔ نہ ان کے لئے مقامِ عبور و مرور اور نہ امکانِ نجات۔

لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا۔ احقاب حقب کی جمع ہے اور حقب حقبۃ کی۔ ایک حقبہ اسی برس۔ ہر برس بارہ ماہ۔ ہر ماہ تیس یا انتیس دن اور ہر دن ۲۴ گھنٹہ۔ لیکن علماء نے کہا کہ اس جگہ حقبۃ سے مراد اسی برس، ہر برس بارہ ماہ، ہر ماہ تیس دن اور ہر دن ایک ہزار سال کے برابر۔ ہلال ہجری، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عمر بن عاص، عبد اللہ بن عباس، سعید بن جبیر، عمرو بن میمون، حسن بصری، ضحاک، ربیع بن انس سے یہی قول مروی ہے (تفسیر ابن جریر) ایک روایت میں حسن بصری اور سدی کا قول یہ بھی آیا ہے کہ حقبۃ ستر سال کا ہوتا ہے۔ باقی آئندہ

حسب سابق ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کے ایک قول میں ایک حقبہ کا چالیس برس ہونا منقول ہے ۔ اور بشیر بن کعب رضی نے ایک حقبہ کی مقدار تین سو ساٹھ سال بیان کی ہے (رواہ ابن ابی حاتم)

ابوبکر بزار نے حضرت عبد اللہ بن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ ایک حقب کچھ اوپر اسی برس کا ہوتا ہے ۔ بہر حال حقبہ کی مدت ستر سال کہی جائے یا اسی یا کچھ اوپر اسی یا ۳۶۰ برس اور ہر دن ہزار برس کا ہی مان لیا جائے تب بھی احقاب کی مدت کی ایک انتہا نکلے گی اور کافروں کا جہنم میں ہمیشہ رہنا ثابت نہ ہوگا ۔ حالانکہ دوسری صریح نصوص موجود ہیں کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ۔ مثلاً لہم عذابٌ مقیم یا خالدین فیہا ابدا یا وماھم بمخرجین ۔

اس سوال کے ازالہ کے لئے مختلف علماء نے الگ الگ جواب دیئے ہیں

(۱) مقاتل بن حبان نے کہا یہ آیت آئندہ آیت فذوقوا فلن نزیدکم الا عذابا سے منسوخ ہے ۔

نسخ کا قائل ہونا اس جگہ قطعاً غلط ہے کیونکہ یہ خبر ہے اور خبر میں نسخ نہیں ہوتا احکام نہیں ہوتا ہے ۔

(۲) خالد بن معدان نے کہا ۔ یہ آیت ان مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی جو گناہوں سے توبہ کئے بغیر مر گئے ہوں ۔

یہ جواب بھی غلط ہے ۔ تکذیب آیات اور انکار قیامت مسلمان کا شیوہ نہیں ۔ نہ کوئی مسلمان منکر مکذب ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ آیت کا نزول مکذبین آیات اور منکرین قیامت کے حق میں ہوا ہے

(۳) شیخ ابن جریر نے جواب دیا ہے کہ حمیم وغساق پینے اور ہر دو شربت کا مزہ نہ چکھنے کا عذاب کافروں پر احقاب تک ہوگا ۔ بعد احقاب گزرنے کے بعد دوسری قسم کے عذاب ہوں گے ۔ آیت فلن نزیدکم الا عذابا میں دوسری قسم کے عذابوں ہی کی طرف اشارہ ہے ۔

امام رازی نے شیخ زجاج سے بھی یہی قول نقل کیا ہے مگر یہ بھی ضعف سے خالی نہیں ۔ نری تاویل ہی ہے ۔

(۴) امام رازی نے لکھا ہے کہ آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ احقاب گزرنے کے بعد کافر عذاب سے رہا کر دیئے جائیں گے لیکن دوسری نصوص صریحہ میں موجود ہے کہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور صراحت کے مقابلہ میں اشارہ کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے اگر لفظ احقابا سے کسی وقت جہنم سے رہا ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے تو اس کا ازالہ دوسری صریح نصوص سے ہو جاتا ہے ۔ یہ جواب کسی قدر اچھا ہے ۔

(۵) علامہ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ احقاب سے مراد اس حقب کی جمع نہیں ہے جس کا معنی ستر یا اسی یا ۳۶۰ سال ہے بلکہ اس کا ماخذ عربی کا ایک محاورہ ہے ۔ عربی میں حقب عامہم اس وقت بولا جاتا ہے جب قحط پڑ جائے ۔ پورا سال خشک گزر جائے اور لوگ فقر وفاقہ کی تکلیف میں مبتلا ہو جائیں ۔ اس صورت میں احقابا مفعول فیہ یا ظرف نہ ہوگا بلکہ حال ہوگا اور تفسیری معنی اس طرح ہوگا کہ کافر جہنم میں ہوں گے اور سختی دشواری اور تکلیف کی حالت میں ہوں گے خشکی اور پینے کی ہر چیز سے محروم ہوں گے ۔

زمخشری کی یہ تاویل کچھ بہتر ہے مگر تشفی بخش نہیں ۔ اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اعتراض سے بچنے کے لئے کسی قدر قابل قبول تاویل کی گئی ہے ۔ اصل جواب یہ ہے کہ حقب ایک مدت مقررہ کو کہتے ہیں خواہ اس کی مقدار کچھ ہی بیان کی جائے اور احقاب جمع ہے اور جمع کی قلیل ترین تعداد دو ہے لیکن زیادہ کا کوئی حصر نہیں ہے ۔ ان گنت غیر محدود اور ناقابل انتہا کو بھی بہر حال احقاب ہی کہا جائے گا ۔ جمع کی آخری کوئی مقدار مقرر نہیں ۔ پھر لفظ احقاب سے اختتام مدت کا شبہ ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے ۔ کیا حقب کی انتہا سے احقاب مدت کا بھی اختتام پذیر ہونا ضروری ہے ۔ تمام جمع بلکہ اسم جمع کے صیغے غیر متناہی تعداد اور لامحدود مقدار کو شامل ہیں اور یہاں احقاب کی کوئی خاص مقدار اور تعداد بیان نہیں کی کہ ختم مدت کا شبہ ہو سکے بلکہ آیت فلن نزیدکم الا عذابا اور لہم عذاب مقیم جو آئندہ آتی ہے بتا رہی ہے کہ مدت عذاب غیر منقطع ہوگی اور امام لغت فراء نے لفظ حقب کی جو لغوی تشریح بیان کی ہے اس سے بھی اس مضمون کو استنباط کیا جا سکتا ہے ۔ فراء نے لکھا ہے کہ حقب کے لغوی مفہوم میں تواتر پیہم اور ایک کے بعد دوسرے کے پیچھے آنے کا معنی پایا جاتا ہے ۔ اسی لئے کمر سے باندھی جانے والی ہمیانی کو حقیبہ کہا جاتا ہے اور حقب کا معنی ہے کسی کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھا لیا ۔ سالوں اور برسوں کو بھی حقب کہنے کی یہی وجہ ہے کہ سال کے بعد سال آتے چلے جاتے ہیں ۔ اس صورت

میں احقابا کا ترجمہ ہوگا پیہم اور متواتر برسیں۔ اس سے نہ انتہا مترشح ہوتی ہے۔ نہ مدت کے ختم ہونے کا شبہ ہوسکتا ہے، نہ کسی مزید تاویل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کی تائید شیخ ابن جریر کے آخری قول اور حضرات قتادہ ربیع بن انس، حسن بصری اور دوسرے اہل تحقیق کی صراحتوں سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا۔ یعنی اہل جہنم جہنم کے اندر کسی ایسی چیز کا مزہ بھی نہ چکھیں گے جس میں کچھ بھی خنکی ہو جیسے ہوا، سایہ وغیرہ) اور نہ پینے کی کسی ایسی چیز کا مزہ چکھیں گے جو تسکین بخش ہو (رازی واکثر مفسرین) شیخ ابن جریر نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اس آیت میں برد سے خواب مراد ہے۔ ابن ابی حاتم نے مرۃ طیب اور مجاہد کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ بغوی نے امام لغت ابو عبیدہ، وکسائی کا بھی یہی قول قرار دیا ہے۔ امام رازی نے صراحت کی ہے کہ اخفش، فراء، قطرب اور عتبی اسی کے قائل ہیں۔ فراء نے یہ بھی کہا ہے کہ خواب کو برد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نیند سے پیاس کی شدت میں کمی اور حرارت میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ مبرد نے کہا کہ عرب بولتے ہیں۔ مَنَعَ الْبَرْدُ الْبَرْدَ شدتِ سردی نے نیند نہیں آنے دی۔ امام رازی نے اول معنی کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ وہی حقیقی معنی ہے اور نا ممکن بھی نہیں ہے۔ دوسرا معنی اگرچہ مستعمل ہے مگر مجازاً اور جب حقیقت ممکن ہے تو مجاز کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یا مناسب نہیں۔

ایک شبہ۔ جہنم میں عذاب زمہریر بھی ہوگا اور زمہریر انتہائی سردی کا نام ہے پھر خنکی نہ چکھنے کا معنی کیا ہے۔

ازالہ۔ بَرْدًا اگرچہ نکرہ ہے اور نفی کے بعد نکرہ عموم نفی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن سیاق کلام کا قرینہ بتا رہا ہے کہ اس جگہ راحت رساں اور تسکین بخش برودت مراد ہے۔

اِلَّا حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا۔ حمیم بہت ہی گرم پانی۔ غساق پیپ اور جو دوزخیوں کے بدن سے نکل کر دوزخ کے کسی گڑھے میں جمع ہوگا اور سخت بدبودار اور سرد ہوگا (ابن کثیر) رازی نے لکھا ہے کہ غساق غسق سے بنایا گیا ہے اور غسق کا معنی ہے تاریکی اس لئے غساق کا معنی ہوا بہت کالا (بدبودار) توام۔ ابو معاذ نے اپنے مشائخ کا قول نقل کیا ہے کہ غساق خاشاک کا معرب ہے۔ میری رائے میں یہ لغت پر جبر ہے۔ کیونکہ خاشاک کا معنی فارسی میں وہ نہیں ہے جو عربی میں غساق کا ہے۔ نہ خاشاک کے مفہوم میں سردی ہے نہ سیاہی نہ بدبو، نہ کوئی اور معنی مشترک ہے۔ پھر غساق کا ماخذ اور ماخذ کے دوسرے مشتقات بھی عربی میں مستعمل ہیں۔ غسق اور غاسق جیسے الفاظ موجود ہیں اس لئے غساق کو معرب کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

جَزَاءً وِّفَاقًا۔ اہل جہنم کو یہ عذاب بطور سزا ہوگا اور سزا بھی جرم کے موافق۔ شرک اور کفر گناہ اور طغیان کی آخری حد ہے۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی عملی معصیت ہوسکتی ہے نہ فکری غلط روی۔

اللہ کی ہستی کا انکار کرنا یا اس کو مالک کائنات اور حاکم نہ ماننا یا اس کی تشریعات کا انکار کر دینا یا کسی مخلوق کو اللہ کی صفات یا شارع وحاکم ہونے میں ساجھی جاننا یا رسالت کی ضرورت نہ ماننا یا کسی سچے نبی کو جھوٹا قرار دینا یا جزائے اعمال کا منکر ہونا یا اس طریقہ سے نہ ماننا جس طرح اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ یہ اور اس جیسی دوسری باتیں اگرچہ انتہائی طغیان کے مظاہر ہیں اور سب کا تقاضا ہے کہ ان کی سزا غیر محدود ہو مگر ان میں باہم فرق مراتب ہے اس لئے ہر درجہ کے کفر کی سزا اس کے موافق دی جائے گی۔ اگرچہ سزا ہر ایک کی دوامی ہوگی اور دم بھر کے لئے راحت کسی کو حاصل نہ ہوگی۔ اسی لئے مجاہد، عکرمہ اور قتادہ وغیرہم نے اس لفظ کی تشریح میں فرمایا کہ ان لوگوں کی بدانجامی اُن کی بداعمالی کے بالکل مطابق ہوگی۔ (ابن کثیر)

انھم کانوا لا یرجون حسابا وکذبوا بآیاتنا کذابا۔ یہی وہ بنیادی غلط روی اور کور دانشی ہے جس کی سزا کا بیان گزشتہ آیات میں ہے۔ اللہ کی ذات صفات اور اس کے شارع وحاکم ہونے پر کلام الٰہی کی صداقت پر انسان کے شارع نہ ہونے پر خیر وشر اور حق وباطل کے فیصلہ کے لئے الٰہی قوانین کی ضرورت پر نبوت کی حاجت اور حجیت پر اور پاداشِ عمل کے لئے روز قیامت کے لازم ہونے پر بے شمار غیر محدود دلائل قدرت ہیں، براہین فطرت ہیں، آیات تقلیدیہ ہیں، شواہد عقلیہ ہیں۔ خاموش اور ناطق، آفاقی اور کتابی، بیرونی اور اندرونی ان گنت ثبوت موجود ہیں۔ کتب الہیہ

کی صراحت انبیاء کے معجزات و دعوت اور اہلِ بصیرت کی شہادت کے علاوہ ہر شخص کی فطرتِ سلیمہ اور ہر ذرہ کا روابطِ سبب و مسبب میں وابستہ ہونا بتا رہا ہے کہ مذکورہ بالا حقائق ناقابلِ انکار ہیں لیکن جو لوگ محاسبۂ اعمال کا یقین ہی نہیں رکھتے، جن کو نہ ثواب کی امید نہ عذاب کا خوف اور نتیجۂ قول و عمل کی توقع وہ کیوں کسی ثبوت کو مانیں اور پیہم آیات کی کامل تکذیب کیوں نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ طغیان کو حساب کتاب کا کوئی اندیشہ نہیں۔ نہ کسی نقلی عقلی ثبوت کا یقین، نہ امیدِ ثواب نہ خوفِ عذاب۔ پس ایسے لوگوں کی سزا دوامی جہنم ہوگی۔

ضروری تنقیح رازی نے لکھا ہے کہ امید کسی اچھی چیز کی ہوتی ہے اور حسابِ قیامت تو بڑا دشوار امر ہے۔ اس میں کوئی ایسی کشش نہیں جس کی امید کی جا سکے پھر لفظ حساباً کے ساتھ لا یرجون کیوں استعمال کیا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے رازی اور دوسرے علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ مثلاً اس جگہ رجاء بمعنی توقع یا بمعنی خوف ہے۔ یعنی کافروں کو روزِ حساب اور محاسبہ کی توقع ہی نہیں یا یہ روزِ قیامت اور حساب سے ڈرتے ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ یوں توجیہ کی جائے کہ کافروں کو کسی اچھے عمل کا ثواب ملنے اور حساب میں جمع ہونے کی امید نہیں یا عقیدہ اور یقین نہیں۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا۔ کور دانش اور تاریک ذہن رکھنے والے منکرینِ قیامت کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اعمال کی جزا سزا اسی وقت ممکن ہے جب تمام اطوارِ زندگی کسی فہرست میں موجود ہوں، سب کا حساب درج ہو۔ حالانکہ ان گنت احوالِ حیات اور غیر محدود حرکاتِ زندگی کا اجتماع ایک جگہ کہیں نہیں۔ زمانہ اور زمانہ میں پیدا ہونے والی ہر حرکت غیر مستقر ہے، فنا پذیر ہے۔ ہر ماضی ایک افسانۂ پارینہ ہے، معدوم محض ہے، جو ہو چکا ہو چکا لوٹ کر نہیں آسکتا جس طرح گزشتہ زمانہ نہیں لوٹ سکتا اسی طرح اعمال، ماضیہ نذرِ عدم ہو گئے جن کا لوٹ کر آنا محال ہے۔ حالانکہ یہ زنگ خوردہ فہم رکھنے والے اگر نورِ علم سے بالکل ہی محروم نہ ہوتے تو اتنا ضرور غور کرتے کہ نقوشِ فطرت مٹا نہیں کرتے۔ اللہ کے علم کو اپنے علم پر قیاس کرنا اور فوق المحسوسات کو محسوس کی طرح جاننا بنیادی فلطی فکر ہے فہرست صرف کاغذ، پیتل، تانبا، لکڑی، لوہا، سونا، چاندی اور دوسری معدنی چیزوں کی ہی بنی ہوئی ہونا ضروری نہیں۔ اللہ کا علم محیطِ کل ہے۔ اس کے علم کی ہمہ گیری کے سامنے نہ ماضی ماضی ہے نہ مستقبل مستقبل۔ اس کی لوحِ علمی سے جہان کا کوئی نقش غائب نہیں، وہ امٹ ہے، غیر مادی ہے۔ مادہ اور مادیات سے ماوراء ہے، کیف و کم کے عوارض سے پاک ہے۔ اس میں ہر چیز کا اندراج احاطہ اور شمار یقیناً ناقابلِ فہم ہے لیکن اگر فوق المادہ تک علم نارسا اور فکرِ قاصر نہ پہنچے تو یوں ہی سمجھ لو کہ برقی لہریں اور کہربائی فضائی موجیں ماضی اور حال کے تمام نقوشِ حیات کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اعضاء و جوارح کی کوئی حرکت، رفتارِ تنفس کا سینہ کے اندر اتار چڑھاؤ اور کائنات کی کوئی آواز کتنی ہی پرانی ہو فضائی سمندر کی موجوں سے محو نہیں ہو جاتی۔ ریڈیو، وائرلیس تو ایجاداتِ کہنہ ہو کر رہ گئیں اب تو ٹیلی ویژن نے قائل و قائل کی تصویر اصلی لا کر سامنے رکھ دی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ماضی ماضی ہو گیا اور گزشتہ اطوار و گفتار داستانِ پارینہ اسی محسوس مادی کتاب کائنات نے ثابت کر دیا کہ اعمال و اقوال کو فنا نہیں تو اللہ کی کتاب علمی جو غیر مادی اور محض مجرد ہے کیسے احاطۂ اعمال سے عاجز ہو سکتی ہے پس جب سب کیا دھرا کہا سنا اعمال نامہ میں موجود ہے تو اس کی حساب فہمی بھی ضرور ہوگی اور کافروں کو سزا بھی ضرور ملے گی اور سزا بھی ایسی جو زوال پذیر ہونے کا نام نہ لے گی بلکہ دکھ بڑھتا ہی جائے گا۔ واللہ اعلم

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا۔ انسان ناخوش گوار چیز سے نفرت کرتا اور بھاگتا ہے اور مرغوب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ دونوں طاقتیں فطری ہیں سعید ہیں۔ وہ لوگ جو عقل کی روشنی میں دونوں طاقتوں سے کام لیتے ہیں اور بدبخت ہیں وہ بے وقوف جنہوں نے عقل کو مہلک خواہشات کا غلام بنا رکھا ہے۔ قرآنی طرزِ بیان فطری ہے، یہ تمام انسانوں کو اپیل کرتا ہے تو اس طرح کہ ہر آدمی دکھ اور ہلاکت سے بھاگے اور راحتِ دوامی کے حصول کی طرف دوڑے۔ جہاں ترغیب دیتا ہے وہاں ڈراتا بھی ہے۔ مرغوب کی بھی نمود پیش کرتا ہے اور نامرغوب کی بھی۔ محض روحانی الم و راحت اور رنج و مسرت تو بشری احساس و ادراک سے بالاتر ہے، اس لئے اس کو اگر کہیں بیان کرتا ہے تو اجمالاً۔ تفصیل انہی مرغوبات و مکروہات کی کرتا ہے جن سے انسان مانوس ہے۔ اور جن کو سمجھ سکتا ہے۔ گزشتہ آیات میں کافروں کے عذاب اور کیفیتِ عذاب کا بیان تھا اس آیت میں اہلِ ایمان کی جزائے نشاط آفریں کا اظہار ہے۔

متقی کے درجات مختلف ہیں: ۱۔ ماسوی اللہ کو اللہ کے لئے ترک کرنے والا اور ہر چیز سے تعلق توڑ کر اللہ سے تعلق جوڑنے والا اور ہر تصور یہاں تک کہ خودی اور انانیت کے خیال کو بھی فنا کر کے بقاء باللہ حاصل کرنے والا۔ ۲۔ (اوامر و نواہی کا پابند واجبات کو ادا کرنے والا اور) ممنوعات سے پرہیز رکھنے والا۔ ۳۔ کبائر اور صغائر سب سے بچنے والا ۴۔ صرف شرک اور کفر سے اجتناب کرنے والا خواہ دوسرے گناہوں کا صدور اس سے ہو جائے۔ بقول امام رازی و شیخ ابن کثیر اس جگہ متقین سے مراد یہی آخری معنی ہے یعنی شرک و کفر سے بچنے والے کیونکہ اس سے پہلے جہنمی کافروں کا بیان تھا۔ تقابل چاہتا ہے کہ جو کافر نہ ہوں اس جگہ وہی مراد ہوں۔

مفاز مصدر میمی یعنی کامیابی۔ اسم ظرف۔ کامیابی کا مقام۔ اہل تفسیر کہتے ہیں کہ مفاز سے مراد اس جگہ عذاب سے بچاؤ یا حصول جنت یا دونوں کا مجموعہ ہے۔ قتادہ نے کہا عذاب سے نجات کا مقام مراد ہے۔ ضحاک اور حضرت ابن عباس نے مفاز کی تفسیر لفظ مُتَنَزَّہ سے کی ہے۔ یعنی عیش و نشاط اور نزہت و فرحت کا مقام عیش و نزہت (اول اسم ظرف اور دوسرا مصدر میمی) اس فقیر کی رائے میں حضرت ابن عباس کا قول راجح ہے۔ کیونکہ بقول امام رازی آئندہ جو حَدَائِقَ وَاَعْنَابًا وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا آتا ہے وہ مفازا سے بدل ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نزہت گاہ یا نزہت مفاز سے مراد نہ ہو تو اس کو بدل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری نہیں کہ عیش و نشاط بھی حاصل ہو۔ سلب عذاب کا موجب ثواب ہونا لازم نہیں۔

حَدَائِقَ وَاَعْنَابًا وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا وَّكَاْسًا دِهَاقًا لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا۔ ان الفاظ میں محسوس کامیابی کو اس طرح کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی جانب آدمی کا فطری میلان ہے۔ انسان نظری تفریح بھی چاہتا ہے اور سونگھنے والی طاقت کی خوشگوار ضیافت بھی۔ لذت اکل حاصل کرنے کا بھی خواہشمند ہوتا ہے اور لطیف مشروبات کا بھی خواستگار۔ پھر لطافت مشروب کے بعد ایک خاص کیف و سرور کا بھی طالب ہوتا ہے اور اہتزازی نشاط کا بھی بشرطیکہ خمار بے خودی نہ ہو جائے کہ کو اس کرنے لگے یا دوسرے کی بیہودہ گفتگو سننا پڑے پھر تمام لذائذ کے حصول کے بعد نشاط جنسی کے حصول کا بھی طلب گار ہوتا ہے ان تمام خواہشات کی تسکین بخشی مذکورہ الفاظ میں کی گئی ہے۔ حدائق باغات اور سبزہ زار نظر نواز بھی ہوتے ہیں اور ضیافت شامہ کے لئے سرچشمہ طیب بھی۔ رنگ رنگ کے پھول، بوٹے، مرغزار، خنکی شبنم بھی پیدا کرتے ہیں اور بھینی بھینی سادہ لطیف خوشبوئیں قوت شامہ کو تازگی بخشتی ہیں۔ اَعْنَاب یعنی انگور (بطور تمثیل) لطیف ترین سادہ غذا ہے جس میں لذت کام و دہن کا ذخیرہ پوشیدہ ہے۔ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا یعنی ہم سن نوجوان صنف مؤنث۔ مردوں کی جنسی خواہشات کا مرکز بھی ہے اور منبع بھی۔ كَاْسًا دِهَاقًا یعنی چھلکتے ہوئے لبریز ساغر مے (مجاہد، حسن بصری، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید) یا وہ جام جس کا دور چلتا رہے۔ (سعید بن جبیر) یعنی ساغر لبریز کا دور پیہم (حضرت ابن عباس) یہ شرب کی سیرابی کا بھی کفیل ہے اور کیف اندرونی کو ابھارنے والا بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایسی بے خودی نہ ہو جائے جو خود فراموشی کی حد تک پہنچا دے اور ہر بادہ خوار دوسرے کو جو بیہودہ الفاظ چاہے منہ سے اور جو دیکھنے والا اس پر طعن کرتا چلا جائے۔ اس لئے جنت میں دور ساغر چلانے والے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا۔ شراب طہور کے دور کے وقت نہ باہم لغو کلام سنیں گے نہ کوئی ایسی غلط اور مدہوشی کی بات کہیں گے کہ دوسرے ان کی تکذیب کریں۔ یہ مطلب اس وقت ہوگا جب آیت مذکورہ میں فیہا کی ضمیر کاس کی طرف راجع کی جائے۔ لیکن اگر اس ضمیر کا مرجع جنت ہو تو مطلب ظاہر ہے کہ جہاں جنت میں ضیافت چشم و بینی اور تسکین کام و شرب کے اسباب ہوں گے وہاں کوئی ایسی بات بھی نہ ہوگی جو سامعہ کے لئے ناگوار ہو نہ بیہودہ گفتگو نہ کسی طرف سے تکذیب کی آواز نہ ملامت کی باتوں کا الٹ پلٹ۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا۔ یہ مذکورہ بالا نعمتوں کی علت کا بیان ہے۔ یعنی ہم نے اپنی گزشتہ ... میں الحمد کی ... ربوبیت کا اصل معنی ہے کسی چیز کو تدریجاً ترقی دے کر اس کے کمال تک پہنچا دینا۔ اللہ رب ہے۔ یعنی ... کمال کی حد تک پہنچا دینا اسی کا کام ہے۔ ... ثواب ... ہوتو نہ تک ملنا تو نص قرآن میں ہی موجود ہے۔ لیکن بعض اہل سنت ... ظاہر ہے کہ جب رب دینے والا ہے تو اس کی دین کا کیا ٹھکانا۔ اس کے فضل کا کوئی حساب نہیں ... لیکن یا اعمال موجب جزا نہیں۔ اب نہیں ہے۔ کیونکہ اعمال کی توفیق اور قوت دینے والا بھی وہی ہے۔ عطا قوت اور توفیق بھی ایک نعمت ہے، اور ایسے اعمال ... خود موجب ثواب نہیں بلکہ یہ انعام ہو جزا کی شکل

میں سامنے آئے گا محض رب کی بخشش ہے اسی کا عطیہ ہے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ نیک عمل کے بعد ثواب دینا خدا کے ذمہ لازم ہو گیا پھر بخشش بھی نا تمام نہیں بلکہ (پوری پوری) اتنی کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ بس اس کو کافی ہی کہہ سکتے ہیں اور کفایت لامحدود ہے، اس لئے اہل جنت کو جو کچھ ملے گا وہ اتنا ملے گا کہ اس کو بس کافی ہی کہا جا سکتا ہے۔ عربی میں بولا جاتا ہے ہُوَ اَعْطَانِی فَحَسْبَنِیْ۔ اس نے مجھے اتنا دیا کہ میں سیر ہو کر کہا بس مجھے کافی ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا۔ یوں تو پرجا راجا کو ان داتا اور رعایا بادشاہ کو غریب پرور کہہ دیتی ہے اور ہر شخص اپنے کو مالک بھی کہتا ہے، لیکن ایسے مالکوں اور داتاؤں کے ہاتھ میں ہے کیا چند ٹکے، کچھ مٹی کی پیداوار اور چند گز زمین۔ ایسا مالک اور داتا کسی کو کیا دے گا۔ پھر یہ ملکیت بھی صرف ظاہری ہے نہ خود خالق نہ مبدع۔ اپنی ہستی اپنے اختیار میں نہیں۔ اپنی ہستی اور بقاء ہستی کا بھی خود مالک نہیں۔ حقیقت میں دینے والا تو وہ ہے جو (ساری کائنات کا مالک) اور متصرف اور حکمران ہے (آسمان زمین اور درمیانی مخلوقات اسی کی مملوک اور محتاج ہے)

اَلرَّحْمٰنِ۔ جو شخص کسی کو کچھ دیتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے۔ کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا پیش نظر ہوتا ہے یا حاصل ہو جاتا ہے۔ کم سے کم غریب پروری اور اقربا نوازی سے اپنے جذبۂ تربیت کی پیاس ہی بجھ جاتی ہے اور دیگر سکون خاطر ہی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اللہ رحمٰن ہے۔ بے غرض سب سے بڑھ کر دینے والا، ہر چھوٹی بڑی چیز عطا کرنے والا۔ ایسا مہربان کہ اس کی برابر کوئی مہربان نہیں اور اس کی مہربانی اس کے لئے فائدہ بخش نہیں نہ دینے سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ پس اہل جنت کو جو کچھ وہ دے گا محض اپنے فضل سے دے گا۔

لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا۔ رحمان ہونا تو اللہ کی شانِ جمالی ہے۔ رہی شانِ جلال، تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ساری کائنات میں سے کوئی بھی اس سے کلام کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ایسی ہیبت، ایسا جلال، ایسا رعب کہ کوئی بھی اس کو خطاب کر کے آمنے سامنے ہو کر بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی اس کو پکارنا اور غائبانہ خطاب کرنا اور دعا کرنا تو شانِ عبدیت ہے ہی، لیکن رو در رو ہو کر مخاطب بنانا محال ہے۔

ضروری تنقیح بعض لوگوں نے لا یملکون کی ضمیر اہلِ جنت کی طرف راجع ہے۔ شاید یہ قول قاضی معتزلی کا ہے یعنی قیامت کے دن اہلِ ایمان کو جب اہلِ جنت کا ثواب اور کافروں کا عذاب نظر آئے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ ان کے اعمال موجب جنت ہیں اور ان کے اعمال موجب جہنم اور خدا عادل ہے اس کے لئے عدل واجب ہے اس نے جو کچھ کیا عدل سے کیا، اس لئے ان کو اللہ سے بات کرنے کی مجال نہ ہو گی۔ یہ عجیب تفسیر ہے۔ اپنے مفروضات اور مسلمات کو تفسیر میں لا کر داخل کر دیا گیا۔ اللہ پر عدل کا واجب بالذات ہونا اور اعمال کا موجب ہونا یہ مفروضات تو اہلِ اعتزال کے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ان کو کیا دخل۔ پھر بات کرنے کی ضرورت نہ ہونا دونوں مضمون جدا جدا ہیں۔ انصاف کا فیصلہ دیکھ کر بولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نہ یہ کہ بولنے اور خطاب کرنے کی قدرت ساقط ہو جاتی ہے۔ آیت میں تو مؤخر الذکر مضمون کو بیان کیا ہے۔ اور تفسیر مذکور کی بناء پر بیان کرنا چاہیئے تھا اول مطلب۔

بعض علماء نے لا یملکون کی ضمیر کا مرجع کافروں کو قرار دیا ہے اور اس قول کا انتساب حضرت ابن عباس کی طرف کیا ہے یعنی قیامت کے دن کافر اپنے عذاب کے متعلق اللہ سے کلام نہ کر سکیں گے۔

امام رازی نے لا یملکون کا فاعل عام قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی اللہ سے کلام نہ کر سکے گا۔ نہ کافر نہ مومن نہ جن نہ ملک، لیکن شبہ ہوتا ہے کہ پھر شفاعت کیسے ہو گی، تو اس کا جواب رازی اور ابن کثیر وغیرہ نے دیا ہے کہ بغیر اذن کے شفاعت بھی نہ ہو گی۔ گویا کلام کر سکنے سے مراد ہے بغیر اذن کے کلام کرنا۔ بہرحال فاعل صرف اہل ایمان کو قرار دیا جائے یا کافروں کو یا سب کو اتنا مضمون مشترک ہے کہ یہ کلام نہ کر سکنا قیامت کے دن ہو گا، لیکن اس ایچ مدان کی رائے میں یہ حول قیامت کا حال نہیں، ہے کیونکہ اگلی متصل آیت میں بغیر اذن کے کلام نہ کر سکنے کا بیان تو موجود ہی ہے۔ تکرار مضمون کوئی خاص ندرت نہیں رکھتی پھر کلام نہ کر سکنے کا بیان آیت میں کہاں ہے بلکہ خطاب نہ کر سکنے کا بیان ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے بلکہ سیاق بتا رہا ہے کہ جس طرح رب السموات والارض وما بینہما اللہ کی صفت دوامی ہے صرف قیامت کے ساتھ مخصوص نہیں اور جس طرح الرحمٰن ہونا کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں بلکہ دنیا ہو یا آخرت ہر جگہ اللہ رحمٰن ہے۔ اسی طرح فقرۂ مذکورہ کا مضمون روزِ قیامت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ عموم شانِ جلال کی طرح اس کی

شانِ جلال بھی ہمہ گیر ہے۔ اسی بنا پر جو تفسیری مطلب اس فقیر نے بیان کیا ہے وہی زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ متصلہ آیت میں اللہ کے مالک ہونے اور صفتِ جمال و کمال کے ساتھ بدرجۂ اتم موصوف ہونے کا بیان گو یا مجمل خاکہ تھا۔ اس علت و استحقاق کا جو کافروں کو عذاب اور مومنوں کو ثواب دینے کا موجب تھا۔ اور اس سے پہلے یوم الفصل کے فیصلے کی تفصیل تھی۔ اس آیت میں روزِ قیامت کے ہولناک اور پُر جلال ہونے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان ناسمجھوں کو تنبیہ ہو جائے جو سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمارے معبود قیامت کے دن ہم کو سفارش کر کے بچا لیں گے۔ ہم شرک کریں یا کفر سینکڑوں کے دروازہ پر سجدے کرتے پھریں۔ ہر فرشتے یا انسان یا جانور یا پتھر یا کسی دوسری علوی سفلی مخلوق کو قاضی الحاجات رب اور دافع البلیات قادرِ مطلق سمجھتے رہیں مگر ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ ہمارے یہ مددگار قیامت کے دن ہماری حمایت اور شفاعت کر کے ہم کو بچا لیں گے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس روز روح اور ملائکہ با ادب خاموش صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کسی کو مجال دم زدن نہ ہوگی۔ بغیر اذن الٰہی کے کوئی (کسی کے لئے) بول بھی نہ سکے گا اور اذن کے بعد بھی اگر بولے گا تو صحیح یعنی کوئی بے جا بات زبان سے نہ نکال سکے گا۔ یا یہ مطلب کہ شفاعت اذن کے بعد بھی اسی کی کرے گا جو کلمۂ حق یعنی لا الٰہ الا اللہ کا قائل تھا۔ مشرک اور کافر کی کوئی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ اب ہم تنقیح اجزا کرتے ہیں۔

اس آیت میں چند امور تشریح طلب ہیں (۱) روح کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے (۲) ملائکہ سے کون سے ملائکہ مراد ہیں (۳) لا یتکلمون کا فاعل کون ہے اور کلام سے کیا مراد ہے (۴) قال کا فاعل کون ہے اور صوابًا سے کیا مراد ہے۔

۱۔ روح سے مراد تمام آدمیوں کی روحیں ہیں (عوفی از ابن عباس) یا تمام آدمی مراد ہیں (حسن بصری) اور قتادہ۔ قتادہ نے یہ بھی کہا کہ حضرت ابن عباس اس بات کو چھپاتے تھے) روح نہ آدمی ہے نہ فرشتہ نہ جن بلکہ ایک جدا مخلوق ہے جو آدمی کی شکل پر ہے اور کھاتی پیتی ہے (مروی از ابن عباس و مجاہد و اعمش) تفسیر فتح البیان میں ہے کہ حضرت ابن عباس سے یہ روایات مرفوعًا مروی ہے۔ اس روایت میں اتنا مزید ہے کہ روح فرشتے نہیں اور ہاتھ پاؤں بھی اور ابن عباس نے یہ فرمانے کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی اور فرمایا روح کی ایک صف ہوگی اور ملائکہ کی دوسری صف (رواہ ابن ابی حاتم و ابو الشیخ و ابن مردویہ) یہ روایت غریب ہے۔ روح سے مراد حضرت جبرئیل ہیں (شعبی ضحاک و سعید بن جبیر) مقاتل ابن حیان سے بھی اسی کے ہم معنی الفاظ مروی ہیں۔ مقاتل نے کہا روح وحی کا فرشتہ سب فرشتوں سے مقرب اور عالی قدر ہے (ابن کثیر) اسی قول کو قاضی نے ترجیح دی ہے (رازی) روح سے مراد قرآن ہے (عبد الرحمٰن بن زید) روح ایک ایسا فرشتہ ہے جو تمام مخلوق کے برابر ہے۔ یہ قول علی بن ابی طلحہ کی روایت سے حضرت ابن عباس سے مروی ہے (کبیر) اور شیخ ابن جریر نے بطریق ابن الجراح حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ روح چوتھے آسمان پر ہے جو ملائکہ اور آسمانوں اور پہاڑوں سے بڑا ہے۔ قیامت کے دن تنہا وہ ایک صف ہوگا۔ ابن کثیر نے اس روایت کو بھی بہت قریب قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے ارواحِ انسانی مراد لینے کو ترجیح دی ہے۔ یعنی روحیں مجسم ہو کر ملائکہ کے ساتھ صف بستہ ہو کر کھڑی ہوں گی۔ عام اہلِ تفسیر نے جبرئیل مراد لینے کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ ملائکہ سے مراد کون سے فرشتے ہیں، زمین والے یا آسمان والے، مدبرِ عالم یا وہ جو عبادت میں مستغرق ہیں، کل یا بعض۔ آیت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں۔ کسی صحیح حدیث میں بھی وارد نہیں، اس لئے تفصیل مجہول ہے۔ خود ساختہ تعین ناقابلِ اعتبار ہے۔

۳۔ لا یتکلمون کا لفظ مطلق ہے۔ یعنی کسی قسم کا کلام کوئی شخص بھی نہ کر سکے گا نہ آدمی نہ فرشتہ۔ اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے۔ یوم یات لا تکلم نفس الا باذنہ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض مفسرین نے کلام کرنے سے مراد لی ہے کسی کی شفاعت کرنی گویا اس صورت میں اس آیت اور آیت لا یشفع عندہ الا باذنہ کا مطلب ایک ہی ہوگا۔

۴۔ قال کا فاعل وہی متکلم ہے یعنی اذن الٰہی کے بعد جو شخص کلام کرے گا وہ صحیح بات ہی کہے گا۔ یا قال کا فاعل من ہے اور من محل نصب میں ہے (یعنی مفعول ہے) مگر بحذف حرف جار۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی کلام اور شفاعت نہ کر سکے گا مگر صرف اس شخص کے حق میں جس کے متعلق اللہ نے اجازت دیدی ہو اور اس نے (دنیا میں) کلمۂ توحید بھی کہا ہو یعنی مشرک نہ ہو۔ حاصل یہ کہ شفاعت دو باتوں پر موقوف

ہے اول یہ کہ جس کی شفاعت کی جائے گی وہ مشرک نہ ہوگا۔ دوئم یہ کہ شفاعت اللہ کی اذن کے بعد ہوگی۔ (رازی فی تفسیرہ)

ایک لطیفہ آیت مذکورہ میں الرحمٰن کا لفظ اشارتاً بتا رہا ہے کہ شفاعت کی اجازت محض اللہ کی مہربانی ہے۔ ذاتی طور پر استحقاق شفاعت نہ کسی فرشتہ کو ہے نہ پیغمبر کو۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ یعنی مذکورہ بالا احوال وصفات والا دن ہی روزِ حق ہے۔ ضرور آئے گا کوئی اس کو روک نہیں سکتا (رازی و ابوالسعود) یا قیامت کے دن کسی باطل کی گنجائش نہ ہوگی جو کچھ ہوگا حق ہوگا (رازی)

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا۔ یعنی جو شخص سعادت چاہے وہ اس زندگی میں ایسے ذرائع (ایمان اور اعمال صالحہ) اختیار کرے جن سے قیامت کے دن اس کو اپنے رب کی رحمت میں داخل ہونے کا ٹھکانہ مل جائے۔ حضرت ابن عباس نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا کہ جس کی اللہ چاہتا ہے وہ اپنے رب کی رحمت کا ٹھکانہ اختیار کر لیتا ہے (رازی) اس صورت میں شَآءَ کا فاعل اللہ ہوگا اور مَنْ مفعول مقدم۔ اور اتَّخَذَ خبر۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ۔ شروع سورت میں منکرین قیامت کے انکار کو زائل کرنے کے لئے تنبیہاً فرمایا تھا۔ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ۔ یہاں سورت کے ختم پر فرمایا کہ عذاب قریب ہے۔ ہم نے تم کو آگاہ کر دیا۔ ہر شخص نے جو کچھ کیا ہوگا اس کے سامنے آجائے گا۔ وہ خود اپنے اعمال دیکھ لے گا۔ اور پھر ان کا اچھا برا نتیجہ بھی اٹھائے گا۔ كَلَّا حرف ردع یا حرف تحقیق ہے اور سیعلمون میں سین قرب استقبال کے مفہوم پر دلالت کر رہا ہے اور یعلمون سے مراد ہے مشاہدہ کر لینا۔ انہی تینوں معانی پر یہ آیت دلالت کر رہی ہے۔ اِنَّا حرف تحقیق بھی ہے عذاب کا یقیناً قریب ہونا بتایا ہے اور اعمال کا سامنے آنا اور ان کو مشاہدہ کر لینا بھی ظاہر فرمایا ہے۔ اس سے اس باطل خیال کی بھی تردید ہو گئی کہ اعمال اعراض ہیں لوٹ کر کیسے آئیں گے۔ جو گیا وہ گیا۔ ماضی کیسے لوٹ سکتا ہے۔ جب سب اعمال نظروں کے سامنے آجائیں گے تو دنیا میں جو لوگ یوم قیامت اور حساب اعمال اور جزا سزا کے منکر تھے ان کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مشاہدہ کے بعد انکار کا تصور ہی کیسے کیا جا سکتا ہے اور اعمال نامہ میں کفر و شرک کا اندراج ہوگا اور دوزخ بھی سامنے ہوگی اور نتیجہ اعمال بھی یقینی ہوگا۔ اس وقت

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۔ ہر منکر سوار تمنائے خام کے اور کچھ نہ کر سکے گا۔ کہے گا کاش میں خاک ہو جاتا۔ (یعنی انسان ہی نہ ہوتا جس طرح دوسرے قیامت کے دن خاک ہو گئے ہیں میں بھی انہی کی طرح آج خاک ہو جاتا اور عذاب جہنم سے چھوٹ جاتا (ابن کثیر) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن سب زندہ مخلوق کا حشر ہوگا۔ یہاں تک کہ مویشی درندے چرندے اور پرندے بھی اٹھائے جائیں گے۔ جن کے سینگ نہیں ہوتے ان کا انصاف سینگوں والے جانوروں سے دلایا جائے گا پھر سب کو خاک کر دیا جائے گا۔ اس وقت کافر کہے گا کاش میں بھی خاک ہو جاتا۔ (رواہ عبد بن حمید و ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم والبیہقی) یا یہ مطلب ہے کہ مرنے کے بعد آدمی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے اور جب تک قیامت نہ آئے گی مٹی ہی رہے گا۔ اس حال کو پیش نظر رکھ کر کافر کہیں گے کہ کاش جو موت ہم پر آئی تھی اور جس کے بعد ہم مٹی ہو گئے تھے، آخری موت ہوتی اور ہم مٹی ہی بنے رہتے۔ اور دوبارہ آج زندہ کر کے نہ اٹھائے جاتے۔ (رازی) امام رازی نے ایک احتمال یہ بھی نقل کیا ہے کہ کافر سے مراد صرف ابلیس ہے اور مٹی ہونے سے مراد ہے تخلیقاً مٹی ہونا۔ یعنی ابلیس تمنا کرے گا کہ کاش مجھے مٹی سے بنایا جاتا آگ سے نہ بنایا جاتا۔ یعنی اس زندگی میں ابلیس جس چیز کو حقیر سمجھتا تھا قیامت کے دن اسی کے حصول کی تمنا کرے گا۔ یہ مطلب ضعیف ہے۔ خود ساختہ تعین ناقابل قبول ہے۔ واللہ اعلم

مقصودِ بیان قیامت عظیم الشان خبر ہے یعنی مشاہدہ نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ اسی زندگی میں قیامت ہونے کے قائل ہیں اور یہاں کے راحت و الم کو قیامت کا ثواب عذاب جانتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اس عقیدہ کا قرآن میں کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دنیا کے سکھ دکھ کا مشاہدہ تو ہر شخص کرتا ہی ہے اور ہر زمانے میں کرتا رہا ہے جو چیز ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہے اس کو خبر قرار دینا کس طرح صحیح ہے۔ پھر سیعلمون کا سین استقبال پر دلالت کر رہا ہے جس کا معنی صاف ہے کہ نزول آیت کے وقت تک تمام اقوام و اشخاص پر اگرچہ دکھ سکھ آ رہا اور زمانۂ نزول میں بھی کچھ لوگ راحت میں اور کچھ تکلیف میں تھے۔ مگر قرآن نے گزشتہ اور موجودہ الم و راحت کو قیامت کا عذاب و ثواب

نہیں قرار دیا بلکہ آنے والے دن کو قیامت قرار دیا۔ سین سے قرب استقبال بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز یقینی آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے یا یہ کہ موت بجائے خود قیامت ہے۔ سزا جزا کی ہوا مرنے کے بعد ہی چلنے لگتی ہے اور موت بہرحال قریب ہی ہے۔ غرض اس لفظ سے دور کرنا مقصود ہے اس احمقانہ غفلت کو جس میں بعض لوگ مبتلا ہیں۔ اول تو قیامت کے قائل ہی نہیں اور مانتے بھی ہیں تو بہت دور سمجھتے ہیں۔ اس طرح گناہوں پر جرأت کرنے کا بہانہ تراش لیتے ہیں۔ الم نجعل سے ان یوم الفصل تک ثبوتِ قیامت کے لئے آیاتِ تخلیق اور کیفیات وجود کائنات کی تصویر کشی کی ہے اور پیدائش و تربیتِ عالم کو اپنے علمِ محیط کے زیر اثر دستِ قدرت میں ظاہر کر کے نظمِ کائنات کو محتاج نتیجہ قرار دیا ہے۔ زمین کا مہاد ہونا، پہاڑوں کا اوتاد ہونا، سماوات کا محکم اور سخت ہونا، سورج کا سرچشمۂ حرارت و نور ہونا ابر سے بارش ہو کر سبزہ پھول پھل اور غلہ پیدا ہونا، رات کا تاریک اور دن کا روشن ہونا، انسانوں کا زوج زوج ہونا اور حرکت و سکون سے دوچار ہوتے رہنا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ نہیں۔ یوم الفصل کا لفظ بتا رہا ہے کہ قیامت کا دن نیکی بدی کے فیصلے کا دن ہوگا اور وہ ایک مقررہ دن ہے۔ جزاءً وفاقا سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو سزا ان کے جرم کے موافق ملے گی۔ یعنی دوامی جہنم کی سزا ان کے جرم سے زائد نہیں کل شیٍٔ احصیناہ کتٰباً سے واضح ہے کہ اعمال فنا پذیر نہیں۔ اللہ کی علمی کتاب میں سب موجود ہیں۔ متقین کے لفظ سے اطلاق اور منکرین کے مقابلے پر اس لفظ کا آنا اشارہ کر رہا ہے اس بات کی طرف کہ مومن کیسا ہی عاصی ہو مگر فوز و فلاحِ جنت اس کو ضرور حاصل ہوگی۔ خواہ بلا عذاب ہو یا عذاب کے بعد۔ من ربک عطاءً میں گویا نص ہے اس امر کی کہ جنت کو اگرچہ اللہ نے ایمان اور اعمال کی جزا قرار دیا ہے مگر حقیقت میں یہ محض عنایت الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے یعنی ایمان اور اعمال بذاتِ خود موجبِ جنت نہیں یوم ینظر المرء الخ سے ثابت ہو رہا ہے کہ تمام کیا دھرا ہر شخص کے سامنے آئے گا اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ جائے گا وغیرہ۔

سورة النازعات

اس سورت کا نام الساہرہ بھی ہے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر کے قول کے موافق یہ پوری سورت مکی ہے۔ اس میں ۴۵ یا ۴۶ آیات ۔۔۔ کلمات اور ۷۳۰ حروف ہیں (سراج منیر) شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی تفسیر میں کلمات ۱۸۹۔ اور حروف ۷۵۳ ہونا تحریر کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانچ سورتوں کا ابتدائی طرز ادا باہم مشابہ ہے۔ سب کے آغاز میں صفات۔ صافات۔ ذاریات۔ مرسلات۔ نازعات، عادیات۔ اول میں تین دوسری میں چار اور باقی تینوں میں پانچ پانچ صفات کو بیان کیا ہے اور موصوف کسی کا ظاہر نہیں فرمایا۔ یہ سورۂ نازعات گزشتہ سورۂ تساؤل کے ساتھ لفظی مناسبت بھی رکھتی ہے اور معنوی بھی۔ عموماً الفاظ اور معانی میں اتنی کامل مشابہت ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا دونوں سورتیں ایک ہی ہیں۔ اسی لئے دونوں کو متصل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً گزشتہ سورت میں قیامت کے متعلق لوگوں کا باہم سوال کرنا مذکور تھا۔ اس جگہ رسول اللہ سے قیامت کے متعلق لوگوں کا سوال کرنا مذکور ہے۔ وہاں فرمایا تھا الم نجعل الارض مهاداً یہاں فرمایا والارض بعد ذٰلک دحاها۔ دونوں جگہ زمین کے پھیلانے کا تذکرہ ہے۔ وہاں فرمایا تھا والجبال اوتاداً یہاں فرمایا والجبال ارساها پہاڑوں کا میخوں کی طرح ہونا اور زمین میں گاڑنا گویا ہم معنی ہے۔ وہاں فرمایا تھا والليل لباساً والنهار معاشاً یہاں فرمایا واغطش ليلها واخرج ضحاها وہاں آسمانوں کے متعلق وبنينا فوقكم سبعاً شداداً فرمایا تھا۔ یہاں فرمایا ءانتم اشد خلقاً ام السماء بناها دونوں جگہ لفظ بنا موجود ہے۔ اور آسمان کی تخلیقی مضبوطی کو بیان کیا ہے وہاں فرمایا تھا۔ لنخرج به حباً ونباتاً یہاں بھی زمین سے پانی اور سبزہ پیدا کرنے کا تذکرہ کیا اور فرمایا اخرج منها ماءها ومرعاها لفظ اخراج اور ماء دونوں جگہ موجود ہے۔ وہاں فرمایا تھا۔ یوم ینفخ فی الصور۔ یعنی صور دوئم۔ یہاں فرمایا تتبعها الرادفة۔ وہاں دوزخ کو للطاغين مآباً فرمایا تھا یہاں بھی طاغی کا ٹھکانا دوزخ کو قرار دیا اور فرمایا۔ فاما من طغٰی وآثر الحيوٰة الدنيا فان الجحيم هي المأوٰی۔ وہاں دوزخ میں رہنے کے متعلق لفظ لبث استعمال کیا تھا اور فرمایا تھا لابثين فيها احقاباً۔ یہاں دنیا یا قبر میں رہنے کے متعلق فرمایا لم يلبثوا الا عشية او ضحاها۔ وہاں ڈرنے والوں کے لئے مفاز یعنی جنت مقرر کی تھی اور فرمایا تھا۔ ان للمتقين مفازاً حدائق یہاں بھی ڈرنے والوں کے لئے جنت کو ٹھکانا قرار دیا اور فرمایا واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوٰى فان الجنة هي المأوٰى۔ ظاہر ہے کہ متقین وہی ہوتے ہیں جو اللہ اور اس کے سامنے محاسبۂ اعمال ہونے سے ڈر کر ناجائز خواہشات کو ترک کر دیتے ہیں۔ یہی مفہوم رب کے سامنے کھڑے

ہونے اور خواہشات سے نفس کو روکنے کا ہے ۔ غور کرنے کے بعد دونوں سورتوں میں اسی طرح کی دوسری مشابہتیں اور بھی ظاہر ہوتی ہیں جن سے اہل بصیرت واقف ہوتے ہیں۔

سارے جہان کا عمومی ضابطہ ہے اور کائناتِ انسانی کا کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں کہ مقصد اور مطلب کو حاصل کرنے اور کامل طور پر اپنے مقصود پر دلت رس پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل پانچ ترتیبی درجات طے کرنے ہوتے ہیں ۔ مقصد دنیوی ہو یا آخرت سے تعلق رکھنے والا، حصولِ مال و جاہ ہو یا کسب حرفہ اور تحصیل ہنر، اچھا ہو یا برا، خیر ہو یا شر، شیطانی اور طغیان میں کمال حاصل کرنا ہو یا علم و عرفان میں ۔ بہرحال اسی ترتیب سے زینہ بزینہ اور قدم بقدم چڑھنا ہوتا ہے ۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی کہ کوئی اول سیڑھی پر چڑھ کر آگے قدم نہ رکھے ۔ اور آئندہ ترقی سے محروم رہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ تدریجی مرقاتِ ترقی پر چڑھنے کی بجائے یکدم کود کر اوپر پہنچ جائے ۔ اگر کوئی مقصد پیشِ نظر ہوتا ہے تو آدمی تمام موانع اور عوائق؛ ادھر اس چیز سے اپنی ذہنی توجہ اور عملی کوشش کا رُخ موڑ لیتا ہے جو مقصد برآری کے لئے سنگِ راہ ہو خواہ طبیعت کا میلان اور فطری جذب کتنا ہی دوسری طرف ہوتا ہو مگر وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے پیشِ نظر اس طرف سے اپنی توجہ کو ہٹاتا اور کوشش کو ہٹاتا ہے ۔ اس کا میلانِ طبع ساتھیوں کی دعوت، طرح طرح کی ترہیب و ترغیب اور اہل و اقربا کی بازداشت یا فہمائش سب کچھ اس کے سامنے آتی ہے ۔ مگر چونکہ اپنا مقصد اس کی نظر کے سامنے ہوتا ہے، اسی لئے سب سے اپنا دامن چھڑاتا ہے اور اپنے فکر و عمل کو ہر طرف سے مقصد کی جانب کھینچتا ہے ۔ یہ تو مقصد کو حاصل کرنے کا ابتدائی زینہ ہوتا ہے ۔

دوسری سیڑھی یہ ہوتی ہے کہ اپنے مقصد کے تصور اور تحصیل میں وہ ہمہ اوقات مشغول رہتا ہے ۔ مقصد سے اس کو محبت ہوتی ہے ۔ ایسی محبت کہ باوجود بیرونی مصائب و آلام کے گوناگوں ہونے اور پیہم حوادث و بلیات کا شکار ہونے رہنے کے اس کو حصولِ مقصد سے ایک کیف حاصل ہوتا رہتا ہے ۔ ایک سرور اس پر چھایا رہتا ہے، راستہ کی کسی تلخی دشواری کی اس کو پرواہ نہیں ہوتی ۔ خارِ مغیلان اور نوکیلے پتھر اس کے پاؤں کو چھلنی کردیں یا بادِ سموم و زمہریر کے جھکڑ اس کو سوختہ درون بنا دیں یا شعلہ آفرین جہنمی دھوپ اس کے بدن کو بھون دے ۔ مگر اس پر بادۂ مطلوب کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اہتزاز و انبساط سے سرشار و بدمست رہتا ہے ۔

تیسرا درجہ یہ ہوتا ہے کہ حصولِ مقصد کی کوشش کرتے کرتے اور ہر وقت اسی میں غرق رہنے کی وجہ سے آدمی کو ایک ملکہ حاصل ہوجاتا ہے ۔ اب کوشش و عمل کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ مقصد کے ماسوا سے توجہ ہٹانے کے لئے اندرونی کشاکش باقی رہتی ہے بلکہ ہر آن ہاتھ سے پاؤں سے زبان سے آنکھ سے کان سے حرکت سے سکون سے دماغی تصور اور قلبی وجدان سے اسی عمل و فکر کا ظہور خود بخود ہونے لگتا ہے جو تحصیل مقصد کے لئے ضروری ہے ۔ خلافِ مقصود نہ ہاتھ اٹھتا ہے نہ پاؤں نہ زبان نہ نگاہ ۔ اس درجہ میں پہنچ کر ارادہ اور فکر کی ضرورت نہیں رہتی ۔ جیسے باجہ بجانے والا یا لکھنے والا جب شروع شروع میں محنت اور شوق کے ساتھ انگلیوں کو تاروں اور حرفوں پر چلانے کی مشق کرچکتا ہے تو پھر بے ساختہ بغیر ارادہ و فکر کے ہاتھ اور انگلیوں کی حرکت انہی تاروں کو ہلاتی اور انہی حرفوں کو بناتی ہے جو مقصود اصلی ہوتے ہیں یا جیسے پانی میں تیرنے والا شروع میں مشق کرتا ہے، بڑی محنت اور کوشش سے سیکھتا ہے ۔ جب رفتہ رفتہ سیکھ جاتا ہے اور استاد کامل ہوجاتا ہے تو پھر پانی میں بغیر ارادہ اور بدون احتیاط و تدبیر تیرتا چلا جاتا ہے نہ اس کو سوچ کر ہاتھ مارنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ سمجھ کر پاؤں ہلانے کی ۔ اس درجہ میں پہنچ کر آدمی اپنے کام پر پورا پورا قابض ہوجاتا ہے ۔

چوتھی منزل یہ ہوتی ہے کہ مختلف اہلِ فن جو اپنے فن میں مہارت رکھتے ہوں اور جن کو ملکۂ فنی حاصل ہو مجلسِ مقابلہ منعقد کریں یا میدانِ مسابقت میں نکلیں اور ہر ایک اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کرے ۔ اس وقت ہر ایک کو اپنی انتہائی فکری اور عملی طاقتوں سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ سب کے مقابلے میں اس کو امتیاز حاصل ہوجائے ۔ اب جو شخص سب سے آگے بڑھ جائے گا وہی بازی لے جائے گا ۔ یہی درجۂ سبقت و تفوق ہے اور اسی مرتبہ میں پہنچ کر خود بھی اور دوسروں کو بھی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

پانچویں عنایت یہ ہے کہ سب سے آگے بڑھ جانے والا استاذِ کل ہونے کا شرف حاصل کرلیتا ہے ۔ فن، ہنر، پیشہ وغیرہ میں بڑے بڑے

ماہرین کو جو دشواریاں اور لاینحل مشکلیں سامنے آتی ہیں ان کا حل اس استاذ سے پوچھا جاتا ہے۔ اسی کی تدبیر اور مشورہ سے لوگ بہت زیادہ پیچیدہ گتھیاں کو سلجھا لیتے ہیں اور اسی کی ہدایت پر عمل کر کے فن کی تکمیل کرتے ہیں۔

یہ پانچوں درجات طے کرنے کی ضرورت ہی اس شخص کو پڑتی ہے جو کسی کام کی مہارت میں آخری چوٹی پر پہنچنے کا خواستگار ہو۔ پہلے تینوں درجات کوشش اور تحصیل کے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ چوتھا درجہ کوشش اور تحصیل کا نہیں بلکہ کوشش کسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے پہلے ہو چکتی ہے۔ چوتھے درجہ میں تو صرف ماہرانہ مقابلہ اور استاذانہ مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ مرتبہ پہلے تینوں مرتبوں سے بالکل الگ ہے۔ اور پانچویں نمبر تو حصول بالفعل اور فوقیت کلی کا ہے۔

ہر مرتبہ میں رہنے والا اپنے ہم رتبہ والوں سے مل کر ایک گروہ بن جاتا ہے اور اس صورت میں انسان طبقہ در طبقہ اور فوج فوج بن جاتے ہیں۔
ان پانچوں مراتب کو نظر کے سامنے رکھ کر دنیا کے ہر علمی اور عملی گروہ اور دنیوی یا دینی علمبرداروں نے تقسیم درجات کے لحاظ سے ہر درجہ کے لئے ایک اصطلاحی نام تجویز کر لیا ہے۔ مثلاً اہل سلوک اول درجہ کو توبہ و مجاہدہ اور دوسرے درجہ کو ارادہ، شوق، ذوق اور تیسرے درجہ کو سیر احوال و مقامات اور آغاز کمال کہتے ہیں پھر چوتھے درجہ کو طیران و عروج اور پانچویں درجہ کو مرتبۂ رجوع و نزول اور دعوت الخلق الی الحق اور خرقۂ تکمیل و ارشاد قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ چوتھے درجہ میں مسابقت ہوتی ہے اور پانچویں درجہ میں پہنچ کر آدمی کو ہر کمال بالفعل حاصل ہوتا ہی ہے تو لامحالہ بجائے آگے بڑھنے کے اپنے پیچھے والوں کی طرف دیکھنا ہوتا ہے اور ان کو سیدھا راستہ بتانا ہوتا ہے تاکہ وہ بھی مرتبۂ عروج تک پہنچ جائیں۔

یا علماء ظاہری اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اول درجہ مبتدی کا ہوتا ہے جو تحصیل علم کے لئے ہر بیرونی مانع و عائق سے اپنے نفس کو کھینچتا ہے دوسرا درجہ متوسط کا ہے۔ جو الجھی ہوئی باریکیوں کو سمجھنے میں نشاط محسوس کرتا ہے۔ رات بھر کے مطالعہ کے بعد اگر اس کو ایک مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے اور کتاب کا کوئی دقیقہ حل ہو جاتا ہے تو رات بھر کے جاگنے کی تکلیف کا احساس اس کو نہیں رہتا اور ایک خاص سرور و کیف اس کے دماغ پر چھا جاتا ہے۔ تیسرا درجہ فارغ التحصیل اور فاضل کا ہے جس کو کسی کتاب کا مطلب سمجھنے اور کسی عبارت کو حل کرنے میں کوئی دقت نہیں وہ ہر فن یا اپنے حاصل کردہ فن میں ایسا سبک رفتار ہو جاتا ہے۔ جیسے بہت بڑا پیراک پانی میں پیرتا ہے۔ چوتھا درجہ ان دقیقہ رس باریک بین ماہرین کا ہے جو کسی فن میں دوسرے اہل مہارت سے مناظرے کرتے اور میدان سبقت میں آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ پانچواں مرتبہ ائمہ اور اہل استخراج و استنباط اور اصحاب اجتہاد کا ہے جو فنون کے اصول و فروع قائم کرتے ہیں اور دوسروں کی رہنمائی اور مشکل کشائی کے لئے تفصیلات علمی پھیلاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ○ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ○ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ○ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ○

قسم ہے ان فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں اور جو (مسلمانوں کی) آسانی سے نکالتے ہیں گویا ان کا بند کھول دیتے ہیں اور جو تیرتے ہوئے چلتے

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ○ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ○ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ○ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ○

ہیں پھر تیزی کے ساتھ دوڑتے ہیں پھر ہر امر کی تدبیر کرتے ہیں (ان سب کی قسمیں کھا کر ہم کہتے ہیں کہ) قیامت ضرور آئیگی جس روز ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی جس کے بعد ایک

اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ○ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ؕ○ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ○

پیچھے آنیوالی چیز آئیگی (مراد نفخۂ ثانیہ ہے) بہت سے دل اس روز دھڑک رہے ہونگے انکی آنکھیں (مارے ندامت کے) جھک رہی ہونگی کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہونگے [illegible]

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۞ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۞

سے مراد حیات قبل از موت ہے) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائینگے پھر (حیات کی طرف) واپس ہونگے (اگر ایسا ہوا تو) اس صورت میں یہ واپسی بڑے خسارہ کی ہوگی تو یہ سمجھ رکھیں کہ ایک ہی سخت آواز ہوگی

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ۔

تحلیل اجزاء ہم تفسیری مقالہ میں اوپر لکھ چکے ہیں کہ انسانوں کی ہر جماعت اور ہر شخص تحصیل مقصد اور حد کمال تک پہنچنے کے لئے پانچ ترتیبی مدارج طے کرتا ہے۔ ابتدائی درجہ تو کھرے زور اور کشاکش کا ہوتا ہے۔ آرام طلب یا پست حوصلہ طبیعت یا بیرونی عوائق یا کسی کی ترہیب و ترغیب مقصد سے روکتی ہے، لیکن مقصد کو حاصل کرنے کا خواستگار بالجبر انتہائی شدت اور قوت سے ہر طرف سے اپنی فکری اور عملی توجہ کو کھینچتا ہے۔ ایسی جماعتیں یا ایسے نفوس النازعات غرقًا کے تحت آتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں آدمی کا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہر وقت استغراق اور انہماک رہتا ہے۔ مقصد سے محبت ہو جاتی ہے اور محبت ہر دو ذات کا باعث ہوتی ہے۔ ہر وقت دماغ پر ایک کیف آور نشہ چھایا رہتا ہے۔ اس درجہ میں پہنچنے والے گروہ یا نفوس النّاشطات نشطًا میں مندرج ہیں۔ تیسرے درجہ میں پہنچ کر آدمی کو سعی و عمل اور فکر و نظر کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ تحصیل مقصد کے طریقوں سے ہٹ کر نہ اس کے دماغ میں کوئی تصور آتا ہے نہ جسم کے کسی حصے سے کوئی حرکت سرزد ہوتی ہے اور ہمہ اوقات اس فکر و سعی میں مستغرق ہونے سے اس کو کسی قسم کی زحمت بھی نہیں ہوتی۔ گویا بلا ارادہ اور بغیر شعور اس سے وہی حرکات پیدا ہوتی ہیں جو مقصد برآری کے لئے مفید ہیں اور بام کمال پر پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ ایسے لوگ السّابحات سبحًا کے ذیل میں آتے ہیں۔ بلا ارادہ اور بے شعور بغیر کسی زحمت و تکلیف کے ان کا منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہونا گویا ہموار کے ساتھ تیرنا ہے۔ ہموار رفتار سے چلنے والے مشاق گھوڑے کو سبوح اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ چوتھے درجہ میں پہنچ کر صرف استاذانہ مہارت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر کامل دوسرے سے آگے بڑھنے کا خواستگار ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو السابقات سبقًا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں استاذ الاساتذہ اور ماہر یگانہ ہو کر آدمی امامت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے اور بڑے بڑے ماہرین اور فنی کار اپنی ذہنی اور عملی گتھیاں حل کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ سب کا مدبر بنتا ہے۔ ایسے نفوس المدبرات امرًا میں داخل ہیں۔

آیت میں چونکہ صفات کے صیغے آئے ہیں اور موصوف مذکور نہیں ہیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم بھی آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے کسی موصوف کی تعیین نہ کریں بلکہ یوں کہیں کہ چونکہ تمام انسان ان مدارج سے گزرتے ہیں۔ خواہ مقصد کچھ بھی ہو۔ اچھا یا برا، اس لئے انسانوں کے تمام نفوس یا تمام جماعتوں کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ قیامت کا زلزلہ ضرور آئے گا اور سب لوگ ضرور دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ تمام انسانوں کا مختلف مدارج کمال طے کرنا اور منزل حیات کی جستجو کرنا شاہد ہے کہ انسانی زندگی کی ایک غایت مقصودہ اور منزل اعلیٰ ضرور ہے۔ زندگی کے یہ مدارج و منازل تو دستی فرودگاہیں اور نشان راہ ہیں۔ آخری منزل قیامت ہی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

اب ہم ان تفسیری مضامین کو بیان کرتے ہیں جنہیں مختلف علماء تفسیر نے ہر صیغۂ صفت کے موصوف کی تعیین کی ہے۔
حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، مسروق، سعید بن جبیر، ابو صالح، ابو الضحیٰ، سدی وغیرہم سے منقول ہے کہ نازعات اور ناشطات دونوں گروہ ملائکہ کے ہیں۔ ملائکہ بعض آدمیوں کی روحیں تو سب کی نیز سختی کے ساتھ کھینچتے ہیں اور بعض کی روحیں آسانی کے ساتھ۔ ایسا جیسے کوئی گرہ بستی اس کو کھول دیا۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس نے نوعی صراحت نہیں فرمائی کہ کن لوگوں کی روحیں سختی سے نکالی جاتی ہیں اور کن کی آسانی کے ساتھ۔ لیکن امام رازی اور خطیب اور اکثر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ کافروں کی روحیں سختی سے نکالی جاتی ہیں اور اہل ایمان کی روحیں آسانی کے ساتھ۔ مگر حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے جو صحیحین میں مذکور ہے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سکرات کی تکلیف بہت زیادہ ہوئی تھی، اس لئے رازی بیضاوی وغیرہ کے قول کی یہ تاویل کرنی ہوگی کہ سختی سے نکال لینے کا مطلب یہ ہے کہ غضب اور غصہ کے ساتھ نکالنا۔ اور انشاط کے ساتھ نکالنے سے مراد ہے رحمت اور آسانی کے ساتھ نکالنا جس طرح اونٹ کے پاؤں سے رسّی کھول دی جاتی ہے اور وہ آزاد ہو جاتا ہے اور ان سے

اس کو نشط حاصل ہوتی ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ غرق اور اغراق (مجرد و مزید) کے ایک ہی معنی ہیں۔ اگر کمان کو پوری قوت سے کھینچا جائے تو اس کو اغراق کہتے ہیں۔ اور جس میں سہولت اور سبکی کے ساتھ ڈول کو کنویں سے کھینچا جائے تو اس کو نشط اور انتشاط کہتے ہیں۔

حضرت علی سے ایک قول مروی ہے کہ دونوں فقروں میں کافروں کی روحیں کھینچنے والے ملائکہ ہی مراد ہیں اور نشاط کے ساتھ روحیں کھینچنے کا مطلب یہ ہے کہ کھال اور ناخنوں سے جھٹک کر روحیں نکال لیتے ہیں۔ شاید حضرت کا مطلب یہ ہے کہ نزع غرق کی شکل تو یہ ہوتی ہے کہ روح کو کھینچ کر کنارے لاکر پھر ڈھیل دیتے ہیں کہ روح پھر کچھ پیچھے لوٹ جاتی ہے پھر دوبارہ اسی طرح کھینچتے ہیں اور نشاط کا معنی یہ ہے کہ یکدم کھال اور ناخنوں کو جھٹک کر روحوں کو کھینچ لیتے ہیں۔ ڈھیل نہیں دیتے (خطیب) السابحات سے مراد حضرت علیؓ کے نزدیک وہ ملائکہ ہیں جو مومنوں کی روحوں کو لے کر آسمان کی جانب سیر کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود، مجاہد، سعید بن جبیر اور ابو صالح وغیرہم نے بھی سابحات سے ملائکہ ہی مراد لئے ہیں، لیکن روحوں کو لے جانے کی تشریح نہیں کی۔ بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ روحیں نکالنے کے لئے رحمت کے فرشتے اہل ایمان کے اجسام میں لطف و نرمی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں گویا پیرتے ہیں۔ مجاہد اور ابو صالح سے یہ بھی مروی ہے کہ تیزی سے اترنے والے ملائکہ سابحات ہیں جو اللہ کے حکم کی تعمیل کے لئے یکدم نازل ہوتے ہیں

السابقات بھی حضرت علیؓ کے قول کے مطابق ملائکہ ہی ہیں جو مومنوں کی روحوں کو عالم بالا کی طرف لے جانے کے لئے خود سبقت کرتے ہیں۔ مسروق، مجاہد، ابو صالح اور اکثر سلف سے یہی منقول ہے، لیکن ملائکہ کو سابقات کہنے کی وجوہ مختلف بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اہل ایمان کے اعمال حسنہ لے کر فرشتے چڑھتے اور سبقت کرتے ہیں۔ ربیع بن انس نے کہا کہ سابقات سے مراد خود مسلمانوں کی روحیں ہیں جو نکلنے کی مشتاق ہوتی ہیں۔ اور جب ملائکہ کو دیکھتی ہیں تو ان کی طرف بڑھتی ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے بھی ایک روایت میں یہی قول منقول ہے۔

المدبرات بھی بقول حضرت علیؓ ملائکہ ہی ہیں۔ جو ایک سال سے دوسرے سال تک تمام کائناتی امور کی تدبیر بحکم الٰہی کرتے ہیں۔ ایک عالم نے لکھا شاید لیلۃ القدر کے متعلق جو آیت فیہا یفرق کل امر حکیم آئی ہے اس سے یہی مراد ہو۔ تفسیر فتح البیان میں حضرت ابن عباس کا قول مروی ہے کہ مدبرات سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو ملک الموت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ بعض مردہ کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں بعض مردہ کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ بعض دعا پر آمین کہتے ہیں اور یہ سلسلہ دفن کے وقت تک جاری رہتا ہے۔

عبدالرحمٰن بن سابط تابعی کا قول ہے خطیب نے سراج منیر میں نقل کیا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے مختلف امور کی تکمیل پر مامور ہیں۔ میکائیل نظم نباتات پر، عزرائیل قبض ارواح پر۔ جبرئیل ہواؤں اور لڑنے والے لشکروں پر (اور وحی کے پہنچانے پر) اور اسرافیل خدمت صور پر۔ شیخ ابو السعود نے لکھا ہے کہ مدبرات سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو عذاب و ثواب پر مامور ہیں۔ یعنی مومن و کافر، صالح و فاسق کو عذاب ثواب دینے کی خدمت یہی ملائکہ انجام دیتے ہیں۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ اکثر علماء سلف کے نزدیک پانچوں صفات ملائکہ کی ہیں اور ہر صفت کا موصوف ملائکہ کا گروہ ہے۔

شیخ شیرازی نے عرائس البیان میں لکھا ہے کہ ان پانچوں الفاظ سے ارواح کاملین کی طرف اشارہ ہے۔ النازعات وہ ارواح ہیں جو عالم قدس میں عالم حدوث کی تمام ارواح سے جدا کر کے عالم تجلی میں لائی گئیں اور ناشطات وہ ارواح ہیں جو شوق و محبت سے بھرپور ہیں اور بحر قدس میں پیرنے والی روحیں سابحات ہیں۔ اور سابقات سے ارواح سابقین کی طرف اشارہ ہے اور مدبرات وہ عقول قدسیہ ہیں جو الہام و ادب کی شرائط کے تحت تدبیر امور میں مشغول ہیں۔ شیخ کے اشارات کچھ زیادہ واضح نہیں اور تکلف سے بھی خالی نہیں۔ اس کے مقابلے میں شیخ الصوفیہ ابن العربی نے لکھا ہے جو نہایت واضح اور قابل قبول ہے کہ نازعات وہ نفوس ہیں جو سب کو چھوڑ کر ہر ایک کی طرف سے منہ موڑ کر جناب قدس کے مشتاق (نازع بمعنی مشتاق۔ نزوع النفس بمعنی اشتیاق نفس سے ماخوذ) اتنے ہیں کہ بحر شوق و محبت میں ڈوبے ہیں۔ اور جو نفوس نفسانی صفات اور بدنی کدورتوں سے پاک، آزاد اور قید طبیعت سے رہا ہو گئے وہ ناشطات ہیں اور جو نفوس بحر صفات میں پیرتے ہیں وہ سابحات ہیں پھر بحر صفات میں پیر کر جو نفوس عین ذات کی طرف سبقت کرتے ہیں وہ سابقات ہیں اور سابقات میں سے جو نفوس مقام وحدت میں فنا ہو کر باقی بالحق ہوتے ہیں اور پھر دوسروں کو دعوت الی الحق اور ہدایت کرنے کی تدبیروں میں مشغول ہوتے ہیں وہ مدبرات ہیں۔

حاصل یہ کہ پانچوں صیغوں سے ارواح اور نفوس مراد ہیں۔ عطاء اور عکرمہ کا قول بھی اسی طرح منقول ہے کہ مراد نفوس ہیں مگر ابن عربی کی بیان کردہ تفصیل

حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ایک روایت آئی ہے کہ نازعات سے مراد نفوس کفار ہیں (معالم و سراج منیر)
مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ملائکہ مراد لینا جمہور کا قول ہے اور نفوس وارواح مراد لینا صوفیہ کا مسلک ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اقوال بھی سلف سے منقول ہیں۔ لیکن تطویل کو چھوڑ کر ہم اختصار پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً ابو النصر شیخ حسن بصری کی طرف نسبت کی جاتی ہے اس قول کی کہ آپ کے نزدیک ان سے نجوم مراد ہیں۔ کچھ ستارے ایسے ہیں کہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح فلک اعظم کی حرکت سے بالجبر حرکت کرتے ہیں یہ نازعات ہیں کچھ ستارے ایک برج سے دوسرے برج کی طرف انتقال کرتے ہیں۔ یہ ناشطات ہیں کیونکہ نشط کا معنی خروج بھی ہے۔ ثور ناشط اس بیل کو کہتے ہیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر کو جائے۔ کچھ ستارے ایسے بھی ہیں جو اپنے مراکز میں مچھلیوں کی طرح تیرتے نظر آتے ہیں وہ سابحات ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ مخالف حرکات ہونے کے سبب باہم مسابقت کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ سابقات ہیں بعض ستارے اختلاف اوضاع کی وجہ سے فصول کے تغیرات شناخت اوقات اور ایجاد حوادث میں دخل رکھتے ہیں یہ مدبرات ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نازعات سے مراد غازیوں کی کمانیں ہیں جو تیروں کو اپنے اندر کھینچتی ہیں۔ اس قدر کہ تیر کمان کے قبضہ و تانت کے اندر آجاتے ہیں گویا ڈوب جاتے ہیں۔ بعد ناشطات سے مراد وہ بیل اور اونٹ ہیں جو کنوؤں سے چرس کھینچتے ہیں (نشط بمعنی جذب) اور سابحات سے کشتیاں اور سابقات سے دوڑنے والے گھوڑے۔ اور مدبرات سے عقول انسانی مراد ہیں۔ ہم نے یہ اقوال پاریزہ صرف اس لئے نقل کر دیئے کہ ہر قول سلف میں سے کسی نہ کسی کا ہے مگر سلف سے منقول ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ صحیح بھی ہے۔ خود ساختہ تعین جس کا استناد کسی باوثوق مرجع کی طرف نہ ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔

یوم ترجف الراجفۃ تتبعہا الرادفۃ — راجفہ لرزہ رادفہ پیچھے آنے والا یعنی دوسرا لرزہ اول لرزہ پہلا صور پھونکنے سے ہوگا۔ جس سے پہاڑ زمین اور ہر چیز ایسی بھونچال میں آجائے گی کہ درہم برہم ہو جائے گی۔ پہاڑ ریت بن جائیں گے اور دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو ایک لرزہ اور جنبش پیدا ہوگی جس سے تمام ذرات اجسام جو منتشر تھے باہم مل جائیں گے۔ جسم بن جائیں گے اور روحیں اپنے اجسام میں داخل ہو جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ نازعات و ناشطات وغیرہ شاہد ہیں اس امر کے کہ نفخ صور کے دن دنیا میں مکمل انقلاب ہوگا۔ جواب قسم یہی جملہ محذوف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ راجفہ اول نفخہ صور ہے اور رادفہ دوبارہ صور پھونکنا۔ مجاہد سے ایک قول مروی ہے کہ راجفہ سے زمین اور پہاڑ مراد ہیں۔ اس لئے کہ دوسری آیت میں آیا ہے یوم ترجف الارض والجبال۔ اس آیت میں ترجف کا فاعل ارض و جبال ہے۔ اور آیت مذکورہ میں الراجفہ۔ ترجف کا فاعل ہے۔ معلوم ہوا کہ الراجفہ اور الارض والجبال ایک ہی ہیں اور الرادفہ سے آسمان اور ستارے مراد ہیں۔ حسن بصری، قتادہ، ضحاک اور مجاہد کے قوی قول سے حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)
عبدالرحمٰن بن زید سے مروی ہے کہ راجفہ زمین ہے اور رادفہ قیامت۔ مجاہد سے ایک اور روایت آئی ہے کہ راجفہ زلزلہ ہے اور رادفہ ایک سخت دھماکہ۔ شاید ابن زید کی یہ مراد ہے کہ زلزلے سے زمین شق ہو کر مردے قبروں سے نکل آئیں گے اور ایک پھر ایک سخت چیخ یا دھماکے کے ساتھ آسمان پھٹ جائیں گے۔ اور پہاڑ اڑ کر منتشر ہو جائیں گے۔
خطیب نے لکھا ہے کہ راجفہ بھی ایک چیخ ہوگی۔ یعنی سخت دھماکے سے مراد یہ کہ صور کی آواز سخت ہوگی۔ جس سے زمین میں بھونچال آجائے گا۔ اور کل زندہ مخلوق مر جائے گی۔ اور رادفہ دوبارہ صور کی آواز ہوگی جو پہلی آواز سے چالیس برس بعد کو ہوگی۔ قتادہ نے کہا اسی دوسری آواز سے سب مردے زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔
عطاء کا قول ہے کہ راجفہ قیامت ہے اور رادفہ زندہ ہو کر اٹھنا۔ عطاء کی مراد بھی غالباً وہی ہے جو خطیب کے بیان سے ظاہر ہو رہی ہے۔
ابن زید کے قول کی تائید ابن مردویہ، ابو الشیخ اور دیلمی کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ان محدثین نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا زمین میں سخت زلزلہ آئے گا کہ آدمیوں سمیت لرزے گی۔ جیسے سمندر میں کشتی آدمیوں سمیت ڈانواڈول ہوتی ہے اور جیسے (ہوا میں) لٹکتی ہوئی قندیل۔ یہی اللہ نے فرمایا ہے یوم ترجف الراجفۃ تتبعہا الرادفۃ۔

تکمیل مبحث

ہر شخص کی موت اس کی قیامت ہے۔ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو مر گیا اس کی قیامت بپا ہو گئی۔ موت بھونچال زلزلہ ہے بند بند ٹوٹ جاتا ہے۔ دل و دماغ دہل جاتا ہے جسم خاکی بوسیدہ اور ہڈیاں فرسودہ ہو کر بدن کے تمام ذرات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ ایک تہائی یا چوتھائی رات گئے حضور اٹھتے اور فرماتے تھے لوگو اللہ کو یاد کرو راجفہ آگئی ہے، اس کے پیچھے رادفہ ہے۔ موت اپنے سامان کے ساتھ آگئی الخ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن جریر وابن ابی حاتم والحاکم)

حقیقت یہ ہے کہ قیامت تو سب ہی پر آنی ہے اول صور پھونکنے کے وقت جو لوگ زندہ ہوں گے وہ تو بہر حال صور کی آواز سے مر جائیں گے لیکن آغاز آفرینش سے جو لوگ نفخۂ اولیٰ ہونے سے پہلے مر چکے ہوں گے ان کے لئے راجفہ ان کی اپنی موت ہے۔ موت حقیقتاً ایک بھونچال ہے جو انسانی ذات کی زمین کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ شاید حدیث مذکور میں اسی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ۔ یعنی لرزۂ قیامت عجیب ہولناک ہوگا۔ جب مردے دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو بکثرت دل (یعنی تمام منکرین قیامت کے دل) اس روز وحشت زدہ ہوں گے (حضرت ابن عباس و مجاہد) دھڑکتے ہوں گے (عام اہل تفسیر)

ابصارها خاشعة۔ ان کی آنکھیں خیرہ اور تاریک ہوں گی۔ (شاہ عبدالعزیز) ذلیل و خوار ہوں گی (ابن کثیر) بعض نے خاشعۃ کا معنی لکھا ہے ذلت سے نیچی ہوں گی۔ کیونکہ دوسری آیت خاشعین من الذل کا یہی معنی ہے۔

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ۔ منکرین قیامت بطور اعتراض کہتے ہیں کہ کیا ہم کو دوبارہ اصلی حالت پر لوٹا دیا جائے گا کیا ہم کو الٹے پاؤں پھیر دیا جائے گا۔ فراء، خلیل اور مجاہد کا قول ہے کہ حافرہ قبر ہے یعنی کافر کہتے ہیں کیا ہم کو قبروں میں پھر زندہ کیا جائے گا۔ بعض مفسرین نے بے ثبوت حافرہ کا معنی فی الحال بیان کیا ہے۔ یعنی ہم کو کیا پھر دنیا میں موجودہ حالت پر لایا جائے گا۔ اس قول کا قائل مجہول ہے اور اس تفسیر سے عقیدۂ تناسخ کی بو آتی ہے کیونکہ قرآن نے تو دوبارہ دنیا میں پہنچنے کی کہیں صراحت نہیں کی۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں حافرہ کا ترجمہ زندگی اور دوسری روایت میں نئی زندگی منقول ہے (خطیب در فتح البیان) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس، محمد بن کعب، سعید بن جبیر، ابو مالک، سدی، اور قتادہ کے نزدیک حافرہ سے مراد مرنے کے بعد دوسری زندگی ہے۔ ابن زید نے کہا حافرہ جہنم ہے۔ اکثر مفسرین نے ابن کثیر کی نقل کردہ صراحت کو ترجیح دی ہے اور حضرت ابن عباس وغیرہ کے اسی قول کو مختار قرار دیا ہے۔

منکرین قیامت کا خیال تھا کہ جو دکیا گیا۔ معدوم کو وجود سابق کی طرف نہیں کھینچا جا سکتا۔ بوڑھا جوان اور جوان دوبارہ بچہ نہیں بن سکتا اور پیدا شدہ بچے کو پھر جنین (بچۂ حمل) نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے مرنے کے بعد ہمارا دوبارہ زندہ ہو کر اٹھایا جانا اور اس زندگی کی طرح زندگی پانا محال ہے، ممکن کس طرح ہو سکتا ہے۔

ءَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً۔ جب کہ ہم گل سڑ گئے۔ ہماری ہڈیاں بوسیدہ فرسودہ ہو گئیں تو پھر ان کو جوڑ کر اول حالت پر کس طرح لایا جا سکتا ہے۔ جوڑنے والی رطوبت فنا ہو گئی۔ اجزائے جسم بوسیدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔ اور بوسیدہ و منتشر ہونے کے سبب مجہول الحال اور مجہول المقام بھی ہو گئے۔ تو اس معدوم محض کو لوٹا کر موجود کر دینا عقل بدیہی کے خلاف ہے اور بالفرض ہم کو دوبارہ زندہ کیا بھی گیا تو

تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ۔ زندگی کا وہ دور تو گھاٹے کا ہوگا۔ کچھ اجزا یقیناً دستیاب نہ ہوں گے۔ رطوبات فانیہ لوٹ کر نہیں آئیں گی۔ تخلیق ثانی ناتمام رہے گی۔ اس دنیا کا کمایا ہوا مال بھی [illegible] موجود نہ ہوگا۔ املاک اور جائیدادیں بھی نہ ہوں گی۔ گویا ان بیوقوفوں نے تخلیق دوم کا اعادۂ معدوم قرار دیا۔ اور اللہ کی قدرت کو اپنی قدرت پر اور اللہ کے علم کو اپنے علم پر [illegible] لیا۔ حالانکہ اللہ کا علم ہمہ گیر اور دقیقہ رس ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ نہ اس کے کام کے لئے تدریج وقت کی ضرورت ہے نہ پہلے سے اسباب و ذرائع و آلات کے موجود ہونے کی۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ۔ بعثت ثانیہ اور تخلیق دوم نام تو صرف ایک جھڑکی اور سخت جنبش کا ہے جو زمانی نہیں آنی ہے۔ تدریجی نہیں دفعی ہے۔ اس کے لئے صور کی دوسری پھونک کافی ہے۔ کیسا اعادۂ معدوم اور کہاں کی فراہمی اسباب اور کیسا تدریجی نمو۔ حمل، بچہ، جوان، بوڑھا۔ یہ تو اس زندگی کے مختلف مراتب ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ دوسری زندگی کے لئے ان مراحل کو طے کرنے کی ضرورت نہیں

دوسری ایک سخت جھڑکی ہوگی جس کے بعد۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ - سب آدمی ایک وسیع ہموار چٹیل میدان میں نکل پڑیں گے۔ یہ زندگی اور حالتِ قبر ایک خواب تھی جو ایک جھنجوڑ سے جاتی رہے گی۔ اور سب بیدار ہوجائیں گے۔

نَّخِرَةً - فرسودہ بوسیدہ (ابن عباس، مجاہد، قتادہ) ابن عباس نے فرمایا وہ کھوکھلی بوسیدہ ہڈی جس میں سے ہو کر ہوا گزرتی ہے اور آواز پیدا ہوتی ہو۔

الساہرۃ سے مراد زمین (حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، قتادہ اور ابوصالح وغیرہ) یا روئے زمین (حسن بصری، ضحاک، عبدالرحمٰن ابن زید) یا ہموار میدان (مجاہد)، سفیان ثوری نے سرزمین شام اور عثمان بن ابی العالیہ نے سرزمین بیت المقدس مراد لی ہے اور وہب بن منبہ نے بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑ کا نام بتایا ہے۔ لیکن شیخ ابن کثیر نے مؤخر الذکر تینوں اقوال کو غریب قرار دیا ہے۔ امام زین العابدین کے سلسلۂ روایت سے ثابت ہے کہ حضرت سہل بن سعد ساعدی صحابی نے آیتِ مذکورہ کی تشریح میں فرمایا۔ ساہرہ صاف زمین، بے نشان اور بغیر کسی نباتات کے ایسی صاف جیسے میدہ کی سفیدی۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

مقصودِ بیان

اگر ابتدائی پانچوں صفات کے صیغوں سے ملائکہ مراد لئے جائیں تو ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی جانیں بڑی سختی سے نکالی جاتی ہیں۔ اور کچھ آدمیوں کو موت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے بندھن کھل گیا۔ اور وہ آزاد ہوگئے۔ کچھ ملائکہ تعمیلِ حکم الٰہی میں سبک رفتاری کے ساتھ سیر کرتے یا پیراک کی طرح بدن کے اندر بے تکلف و زحمت کے داخل ہوتے یا روحیں یا اعمالِ حسنہ لے کر ملاءِ اعلیٰ کی جانب جاتے ہیں اور کچھ تدبیرِ کائنات کی خدمت بجالاتے ہیں۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت نام دو لرزوں یا جھٹکوں کا ہے۔ اوّل تباہ کن اور ہلاکت انگیز اور دوسرا حیات آفریں بعثت آگیں۔ راجفہ اور خاشعۃ سے واضح ہورہا ہے یہ بات کہ منکرینِ قیامت کے دل قیامت کے دن خوف کی شدت سے دھڑکتے ہوں گے اور نگاہیں خیرہ ہوں گی یعنی حیرانی و سراسیمگی انتہائی درجہ پر ہوگی۔ یقولون سے خاسرۃ تک کافروں کے حماقت آمیز شبہات کو بیان کیا ہے۔ جس کے قائل عام منکرینِ قیامت ہر زمانے میں قوتِ واہمہ کے زیرِ اثر ہوا کرتے ہیں اور فلسفہ زدہ منکرینِ بعثت فلسفی رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کبھی ماضی کو ناقابلِ رجوع قرار دیتے ہیں۔ کبھی اعادۂ معدوم کو محال کہتے ہیں، کبھی لوازمِ ترکیبی کے فنا ہوجانے کے بعد دوبارہ ترکیبِ اجسام کو ناممکن بتاتے ہیں۔ ان سب کی تردید ایک لفظ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ سے کردی گئی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقِ دوم موجودہ مادی اسباب اور اس دور کے لوازمِ تخلیق کی محتاج نہیں۔ نہ وہ زمانی ہے نہ تدریجی بلکہ دفعی اور آنی ہے۔ اس تصریح سے تردید ہوجاتی ہے ان مدعیانِ تفکرِ اسلامی کی جو حقیقت میں اپنے عقیدۂ انکارِ قیامت کو اسلامی لبادہ اوڑھا کر فکرِ اسلامی کے نام سے پیش کرتے ہیں کبھی اس دنیا کی پستی اور زبوں حالی کو عذابِ قیامت اور جاہ و جلال کی فراوانی کو ثوابِ قیامت قرار دیتے ہیں اور کبھی بعثتِ آخرت کو بعثتِ روحانی بتاتے ہیں اور اس سے زیادہ عجیب فرقۂ بہائی کا عقیدہ ہے کہ قیامت کا معنی ہے کسی جدید نبی کا دعوتِ حق کے لئے قائم ہونا۔ اور نفخۂ اوّل سے مراد ہے آوازِ حق سے اہلِ باطل کے برائین کے قلعوں کا تباہ ہوجانا اور نفخۂ دوم سے مراد ہے دعوتِ حق سے اہلِ حق کے دلوں کا زندہ ہونا۔ یہ خرافات محض خرافات ہی ہے۔ فاذاہم بالساہرۃ سے اس سب کی بیخ کنی ہوجاتی ہے وغیرہ۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝

کیا آپ کو موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے جبکہ ان کو ان کے پروردگار نے ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں (یہ اس کا نام ہے) پکارا۔ کہ تم فرعون کے پاس جاؤ

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ

اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے سو اس سے (جاکر) کہو کہ کیا تجھ کو اس بات کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جائے اور (میں) تیری (دین کی) رہنمائی کروں

إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ۝ فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ۝ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ

میں تجھ کو تیرے رب کی طرف (ذات وصفات کی) رہنمائی کروں، تو (یہ سنکر اس سے) ڈرنے لگے پھر (جب اس نے دلیل نبوت طلب کی تو) اسکو بڑی نشانی (نبوت کی) تو اس

يَسْعَىٰ ۝ فَحَشَرَ فَنَادَىٰ ۝ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ۝ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ

(فرعون) نے (اسکو) جھٹلایا اور (اسکا) کہنا نہ مانا پھر (موسیٰ سے) جدا ہو کر (انکے خلاف) کوشش کرنے لگا اور (لوگوں کو) جمع کیا پھر (انکے سامنے) باواز کہا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں

الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِمَنْ يَخْشَىٰ ۝

سو اللہ تعالیٰ نے اسی کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا بیشک اس (واقعہ) میں ایسے شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو خدا سے ڈرے۔

آغاز آفرینش سے زیادہ آدمی بے بصیرت ہوتے چلے آئے ہیں کور دانش اور زنگ خوردہ روح والوں کی کثرت رہی ہے۔ جس طرح اہل ہوش، صحیح الفکر آدمی ہر دور میں فکر وعمل میں مختلف ہونے کے باوجود اس قدر باہم مشابہ رہے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے مکتب فکر اور تربیت گاہ عمل سب کی ایک ہی ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی دماغ سے ایک ہی طرح سب سوچتے سمجھتے اور ایک ہی جسم کے اعضاء سے ایک ہی طرح کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح کج فہم سیاہ درون تاریک دماغ والے بھی ہر زمانے میں اپنے فہم وکردار کے لحاظ سے بہت ہی ہم جنس، ہم کیف اور متحد الاحوال نظر آتے ہیں۔ زمانے کا اختلاف ماحول کا تغیر بیرونی حالات کا تلون ان کی فکر وعمل کی یگانگت پر اثر انداز نہیں ہوتا بداہۃً محسوس ہوتا ہے کہ سب ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے اور ایک آوے میں پکے ہوئے ہیں، اس لئے ہر دور میں اہل حق اور مدعیان صداقت اور علمبرداران ہدایت کا مقابلہ تمام منکروں نے ایک ہی قسم کے ہتھیاروں سے کیا۔ ہر زمانے کے منکر صداقت اور اعداء انبیاء اللہ کے اقتدار اعلیٰ حاکمیت ربوبیت عامہ اور آخری جزاء اعمال اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے منکر رہے۔ ان کی نظر میں انسانوں کی برتری باہم ترجیح اور صداقت وحقانیت کا مدار، مال کی فراوانی، حکومت کی قوت، دنیوی عزت کی بلندی اور عیش وتنعم پر رہتا چلا آیا ہے۔ اہل حق کو افلاس اور مالی یا جماعتی کمزوری کی وجہ سے وہ حقیر جانتے رہے ہیں یا اقتدار دولتمند کا طغیان ان کی نگاہ میں معیوب نہیں رہا۔ اعمال کی پاکیزگی اور روح کی نظافت اور مرنے کے بعد انجام کی فکر ان کے لئے توہمات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ رسول اللہ کے زمانے کے منکر صداقت اور گزشتہ انبیاء کے مخالف سب کی یہی حالت تھی۔ ابولہب، ابوجہل اور موٹے موٹے لال کا فر ہامان اور فرعون سے کم نہ تھے۔ فرعون کی چشم بصیرت بھی نابینا تھی حضرت موسیٰ کو دھوکے میں آ کر اس نے پرورش کیا تھا۔ ادھر بنی اسرائیل غریب اور محکوم قوم تھی۔ فرعون ان پر غالب اور جابر تھا۔ مصر کی سرزمین کا خود مختار حکمراں ہونے نے اس کا دماغ بگاڑ دیا تھا۔ بنی اسرائیل کو خانہ زاد غلام سرزمین مصر کو ماں کا دودھ اور مصری رعایا کو اپنی پرستار اور کنیز جانتا تھا۔ صداقت کا مقابلہ مادی طاقت اور فوج کی کثرت اور حکومت کی سطوت سے کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ جادوگروں کی بے حقیقت شعبدہ بازی اور طلسمی نیرنگیوں پر اس کو بھروسہ تھا۔ عجیب بیوقوف تھا مقابلہ کرنے چلا تھا۔ ایک عالم صادق العقول والعمل کا خود مدعی تھا ربوبیت تامہ اور حکومت مستبدہ کا۔ جانتا تھا اپنی ذات کو جامع الصفات اور رب السموات والارض سے بے نیاز بلکہ اس کا مقابل۔ اور مدد مانگنے لگا تھا بے حقیقت جادوگروں سے۔ حضرت موسیٰ نے اس کو اللہ کی شان رحمت بھی دکھائی تھی۔ اور لمعۂ جلال بھی۔ ہدایت روشن بھی اور فرعون کے غرور کا سر توڑنے والی لاٹھی بھی۔ حضرت کے ہاتھ میں آفتاب ہدایت بھی تھا۔ کور چشموں کی نظروں کو خیرہ کرنے والا غضب آلود اژدہا بھی تھا بصورت عصا یا عصا بشکل افعی۔ ہر باطل طاقت کو نگل جانے والا گرج دار پھنکاروں سے قصر رعونت واقتدار میں زلزلہ پیدا کرنے والا، مغرور دماغوں کو کچلنے والا اور سرکش دلوں کو دہلانے والا۔ جمال اور جلال کے اس مجموعہ سے بڑھ کر صداقت کی اور نشانی کیا ہو سکتی ہے، مگر سرکش مغرور پندار کے نشے میں سرمست نہ ہوا آخر تباہ ہوا۔ دریا میں لشکر سمیت غرق ہو کر جہنم کی آگ میں پہنچا۔ وہ مال کی کثرت، فوجوں کی قوت، جتھے کی فراوانی، اقتدار کی ہمہ گیری اور حکومت کی

ہوتے فلک کام نہ آئی۔ ایسی طرح جنکو دوسرے دیکھنے اور سننے والوں کے احساس کا اعتو دور میں عبرت بن گیا۔ بشرطیکہ آخرت کا یقین ہو۔ جنا اعمال کا ہو۔ دل میں اللہ کا خوف ہو اور قیامت کا تصور ہو۔ لیکن جس بیوقوف احمق کو پھانسی کا ڈر، قیامت کا اندیشہ اور جہنم کا خوف نہ ہو اس کو اس سے کیا نصیحت ہوگی۔

تحلیلِ اجزاء

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى۔ اس جگہ استفہام اپنے اصلی معنی پہ نہیں ہے بلکہ تقریری ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نزول سے پہلے کئی جگہ اور کئی مرتبہ حضرت موسیٰ کا واقعہ حسبِ ضرورت مطابق موقع ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ قرآن مجید سے پہلے مجموعۂ دستور صرف حضرت موسیٰ کو عطا فرمایا گیا تھا۔ زبور تو دستور کی کتاب ہی نہ تھی۔ صرف مواعظ اور مناجات کا مجموعہ تھی اور انجیل محرف تورات کی درستی کے لئے نازل کی گئی تھی۔ چند جزئی احکام تورات سے الگ تھے، اس لئے تورات کے بعد دستورِ اکمل صرف قرآن مجید نازل کیا گیا۔ قرآن کے کتاب اللہ ہونے اور اس کی صداقتوں کے صحیح ہونے کا لوگوں کو اسی طرح انکار تھا جس طرح حضرت موسیٰ کی رسالت کا فرعون اور اس کے ساتھیوں کو تھا۔ جو نشہ فرعون کے دماغ کو سرفراز کئے ہوئے تھا وہی نشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے سرداران کفر کے سروں پر بھی سوار تھا۔ فرعون حضرت موسیٰ کو حقیر جانتا تھا۔ قریش مکہ کے سردار سرکار عالی کو یتیمی، تنگ دستی اور ظاہری بے بضاعتی کے سبب قابلِ توجہ نہیں جانتے تھے۔ فرعون دلائل و براہینِ موسوی سے عاجز آ کر حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں کو پکڑنے اور ہلاک کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ قریش کے کافر بھی مسلم آزاری میں اس سے کم نہ تھے۔ حضور اقدس اور مخلص مومنوں کی جانوں کے درپے ہو گئے تھے۔ آخر فرعون اپنے رفقاء سمیت ہلاک ہو گیا۔ اور قریش کا بھی یہی نتیجہ ہوا۔ کسی قدر تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ کا واقعہ سورۂ طٰہٰ اور قصص میں مذکور ہے۔ اس جگہ اختصار کے ساتھ تنبیہ کفار کے لئے ذکر فرمایا۔ تاکہ منکر رسالت اپنی طاقت، سطوت، دولت اور کثرت پر نازاں ہو کر نتیجہ کی طرف سے غافل نہ ہوں اور سمجھ لیں کہ فرعون ہم سے زیادہ طاقت ور تھا، مالدار تھا، جتھہ دار تھا، حکمران تھا یہاں تک کہ ربِ اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ مگر حاملِ نبوت علمبردارِ ہدایت مرسل من اللہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اس نے بھی شکست کھائی اور آخر تباہ ہوا۔ اسی طرح ہم بھی پیامِ الٰہی اور کلامِ ربانی کی روشنی کو پھیلنے سے روک نہ سکیں گے۔ مآل کار ہمارا بھی وہی ہوگا جو فرعون کا ہوا۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ ۔ حضرت موسیٰؑ اپنی بی بی اور دو غلاموں کو ساتھ لے کر حضرت شعیب کے وطن مدین سے مصر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ رات کو جنگل میں ایک جگہ فروکش ہوئے۔ سردی سخت تھی۔ بی بی کو وضع حمل کا درد ہونے لگا۔ آپ کو سینکنے کے لئے آگ کی ضرورت ہوئی۔ کوئی راہنما نہ تھا کہ کسی قریبی آبادی کا راستہ بتا دیتا، اس لئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ شاید کہیں سے آگ مل جائے۔ یا آبادی میں پہنچانے والے کسی راہبر سے ملاقات ہو جائے۔ پاک میدان میں جس کا نام طویٰ تھا پہنچے ہی تھے کہ دائیں طرف والے پہاڑ پر کچھ روشنی دکھائی دی۔ آگے بڑھے تو ایک درخت سے نور کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ گویا نور کے غلاف میں درخت لپٹا ہوا تھا۔ قدوسیوں کی تسبیح کی آواز آ رہی تھی۔ موسیٰ کچھ اور آگے بڑھے تو شعلۂ نور میں مزید چمک پیدا ہوئی اور ایک گنبدِ نور اٹھ کر آسمان کی طرف بڑھا۔ موسیٰ کی آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو گئی۔ شعلۂ نورانی میں سے آواز نکلی سنائی دی۔ موسیٰ پاک وادی میں ہو اپنے جوتے اتار دے۔ پورا قصہ دوسری سورتوں میں مذکور ہے۔ نبوت و رسالت سے حضرت موسیٰ کو سرفراز کیا گیا۔ آپ کی درخواست پر حضرت ہارون کو بھی ذیلی نبوت عطا کی گئی۔ اور حکم ہوا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فرعون کے پاس (اس کو فہمائش کر لے) جاؤ وہ حد سے بڑھ چلا ہے۔ یہاں طغیان کی کوئی خاص صورت نہیں بیان فرمائی۔ اس لئے مطلق ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ فرعون بنی اسرائیل پر طرح طرح کے مظالم کرتا تھا یہ بھی اس کا طغیان تھا۔ تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ یہ بھی طغیان تھا، ملک میں بت پرستی پھیلا رکھی تھی یہ بھی طغیان تھا۔ حدِ ملوکیت سے آگے بڑھ کر ربوبیتِ اعلیٰ کا مدعی بن گیا تھا یہ بھی طغیان تھا۔ غرض موسیٰ کو حکم ملا کہ فرعون کے پاس جا کر اس کو سمجھاؤ۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۔ اور اس سے کہو کیا تجھے پاکیزہ ہو جانے کی رغبت ہے یعنی باوجود کثرتِ دولت، راحت و نعمت اور سلطنت و حکومت کے تیری انسانیت غیر پاکیزہ ہے، تیرے اعمال ستھرے نہیں۔ تیری روح کثافت سے خالی نہیں۔ تیرے پاس حیوانیت کی پوری تکمیل ہے۔

لیکن نظیف انسانیت تجھے حاصل نہیں تو حیوانی اور خود ساختہ ضوابط پر چلتا ہے۔ تیرا کوئی معیارِ عدل ہے نہ میزانِ ظلم۔ کیا تو پاکیزگی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اور کیا

وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ۔ تجھے خواہش ہے کہ میں تجھے مالک اور رب کا راستہ بتا دوں تاکہ تو اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرے کیونکہ اور بصورتِ خلاف ورزی تجھے اپنے انجامِ بد کا اندیشہ لگا ہے۔ آدمی کو نیکی کی طرف مائل کرنے والی دو چیزیں ہیں منافع کا حصول اور ضرر سے حفاظت ہلاکت و تباہی کا خوف زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ منافع کا لالچ اگرچہ جاذب ہوتا ہے لیکن اتنا اثر انداز نہیں ہوتا جتنا خوفِ ہلاکت۔ اسی لئے انعام احسان کو تو مجمل مبہم طور سے لفظ تزکیہ بول کر ظاہر کر دیا اور تخشی کے لفظ سے کھول کر ڈرنے کی تلقین کی۔ امام رازی نے تخشی کا معنی ڈرنا نہیں بلکہ دل کا نرم ہونا لکھا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ تم فرعون سے کہو کہ کیا تجھے خواہش ہے کہ تو پاکیزہ ہو جائے اور میں تجھے تیرے رب کا راستہ بتا دوں کہ تیرا دل نرم پڑ جائے۔ شاید امام کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو دو حکم ملے تھے۔ ایک تو یہ کہ فرعون کے پاس جا کر اس کو عقائد کی پاکیزگی اور اعمال کی طہارت کا مشورہ دیں۔ افکار ہیں اور افعالِ ظاہرہ کی رغبت دلائیں۔ پھر یہ بھی کہیں کہ اگر تیری خواہش ہو تو میں تجھے معرفتِ رب کا راستہ بتا دوں مطلب یہ کہ صحیح عقیدہ و عمل کے بعد بھی رب شناسی کے لئے فرعون کو نبی کی ضرورت باقی تھی۔ رسالت کی شخصیت اور نبوت کی وساطت سے وہ بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ مبدء و معاد اور تخلیق و حشر کے عقیدہ کی درستی اور فرائضِ عمل کی ادائیگی کے بعد بھی نبی کی شخصیت بے فائدہ نہیں ہو جاتی بلکہ تصحیحِ عقائد و اعمال کے بعد راہِ عرفان دکھانے کے لئے شمعِ نبوت کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہ توضیح ہے تو اچھی، مگر بڑی موشگافی کی محتاج ہے۔ آیت کا سادہ مطلب واضح ہے کہ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ جا کر اول جذبۂ پاکیزگی پیدا کرنے کا مشورہ دیں اور کہیں تجھے پاکیزہ اعمال اور صحیح افکار کی رغبت ہونی چاہیے اور یہ بھی کہیں کہ میں تجھے رب سے تعلق جوڑنے اور اس کی مرضی حاصل کرنے کا راستہ بتا دوں گا۔ مگر یہ اسی وقت ہو گا جب طہارتِ نفس کی خواہش ہو۔

رازی اور خطیب نے اس جگہ لکھا ہے کہ آیت میں دلیل ہے اس بات کی کہ جب معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے تو اس کے بعد خشیہ یعنی ہیبت آمیز خوفِ الٰہی قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ یعنی بندوں میں سے (وہ) بندے اللہ سے خشیہ رکھتے ہیں جو اہلِ علم ہیں، وحدت و عظمت کے عارف ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات اس جگہ مذکور نہیں۔ حضرت موسیٰ نے کیا کہا، کیا حکم ملا، لوٹ کر کب آئے، کب مصر پہنچے، حضرت ہارون سے کیا مشورہ کیا، فرعون کے پاس کیسے پہنچے، دربارِ شاہی میں پہنچ کر کیا پیام پہنچایا، فرعون نے کیا کہا، کیا سوال جواب ہوئے کسی بات کا اس جگہ ذکر نہیں۔ دوسری آیات میں کچھ مفصل کچھ مجمل مذکور ہے۔ بہرحال حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے کر دربارِ فرعونی میں پہنچے۔ پیغمبر مرسل من اللہ ہونا ظاہر کیا اور حکمِ الٰہی کے مطابق تبلیغ کی۔ فرعون نے مرسل ہونے کا ثبوت طلب کیا۔ آپ نے اپنی خداداد محیر العقول غالبِ کل طاقتِ رسالت کا مظاہرہ کیا۔ اور

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ۔ فرعون کو اپنے پیغمبر ہونے کی سب سے بڑی نشانی دکھائی۔ وہ نشانی کیا تھی۔ اکثر اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ وہ معجزۂ ید بیضا اور عصا تھا۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ مقاتل و کلبی نے صرف ید بیضا اور عطا نے صرف عصا کہا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے اس آیت کا لغوی معنی (نشانی) اس جگہ مراد لیا ہے۔ ہر معجزہ دلیلِ نبوت اور آیتِ رسالت ہوتا ہے، اس لئے شیخ کے نزدیک ہر معجزہ مراد ہے اور یہی سیاقِ کلام کے بھی مناسب ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو صرف ایک یا دو معجزے ہی نہیں دکھائے تھے۔ بلکہ نو آیاتِ بینات کا مظاہرہ کیا تھا۔ فرعون نے معجزات دیکھنے کے بعد کیا کہا، کس طرح مقابلہ کیا، کس طرح شکست کھائی۔ اس کا ذکر اس جگہ نہیں مگر اتنا ضرور رہا اور ہوتا رہا کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی۔

فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ۔ تصدیق کسی کی نہیں کی۔ موسیٰ کو رسولِ برحق نہ مانا، اللہ کو الٰہِ مطلق اور قادر و معبود نہ جانا اور صرف تکذیب پر بس نہیں کیا بلکہ (بنی اسرائیل کو آزاد کرنے اور ظلم نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنے کا جو حکم اس کو دیا گیا تھا اس کو بھی اس نے ٹھکرا دیا اور) کسی حکم کے موافق عمل نہیں کیا (لیکن موسیٰ کا ڈر تو بہرحال لگا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بہرحال طاقت آ گئی تھی، ان کی

دلیری موسیٰ ہی تھی اور موسیٰ پر فرعون کا کوئی قابو نہ چلتا تھا۔ ساری فوج اور تمام انتظامی قوت مقابلے سے عاجز تھی۔ نہ آپ کو قتل کیا جاسکتا تھا نہ قید و بند اور دریوں کا نتیجہ یہ ہو رہا تھا ... اپنے اقتدار کے خلاف قائم ہوتے دیکھنا تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اس لئے موسیٰ کی طرف سے تو) اس نے منہ پھیرا (ان کے پیغام ہدایت کو ٹھکرا دیا ... سمجھا اور لگا موسیٰ کے مقابلے کی کوشش کرنے) اور تدبیریں سوچنے۔

فَحَشَرَ فَنَادٰی۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی۔ نبوت کی فوق البشریت اور غیر ظاہری طاقت کو ہمیشہ کوتاہ بین نافہم اور روحانیت سے خالی لوگ جادو سمجھتے چلے آئے ہیں۔ فرعون بھی جب حضرت موسیٰ کی روحانیت کا مقابلہ پوری مادی طاقت سے نہ کرسکا تو اس نے بھی حضرت موسیٰ کو جادوگر ہی سمجھا۔ اس لئے آخر میں مقابلہ کرنے کی یہی تدبیر سوچی اور وزیروں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ افریقہ کے جادوگروں کو جمع کیا جائے۔ اور جادو کا مقابلہ جادو سے کرایا جائے چنانچہ۔ فرعون نے جادوگروں کو جمع کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اگر جادوگر غالب نہ آسکے تو مصر کی رعایا موسیٰ کی تصدیق کرنے لگے گی۔ اور میرے خلاف ہو جائے گی، اس لئے پکار کر سب سے کہدیا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں یعنی اول تو میرے علاوہ کوئی دوسرا رب موجود ہی نہیں۔ کسی کو تم سے اپنی حاکمیت منوانے اور تم پر اپنے احکام چلانے کا حق ہی نہیں ہے اور اگر موسیٰ جس کو رب کہتا ہے وہ موجود بھی ہو تو اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا رب اعلیٰ میں ہوں۔ میرے ہی احکام تم پر جاری ہیں (خالق نہ سہی) تمہارا پروردگار، تم کو روزی دینے والا، تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والا میں ہی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا جادوگروں کا مقابلے سے عاجز آنا اور مسلمان ہو جانا، فرعون کا ان کو قتل کرا دینا، موسیٰ کی فہمائش ناکام ہو جانا، فرض رسالت پورا ہو جانا، حجت اللہ کا تمام ہو جانا۔ آخر بنی اسرائیل کا موسیٰ کے ساتھ راتوں رات ترک وطن کرنا، ان کے پیچھے فرعون کا لشکر کشی کرنا، تعاقب میں دوڑنا، بنی اسرائیل کا دریا کے پار ہو جانا، فرعون کا دریا کے کنارے پر پہنچ کر رک جانا۔ پھر پانی کو پایاب اور خشک دیکھ کر فوج سمیت گھس پڑنا اور آخر ایک عذاب کی موج آنا۔ یہ تمام واقعات دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کہتے تھے کہ فرعون پہلے اپنی قوم سے کہا کرتا تھا کہ۔ ماعلمت لکم من الٰہ غیری۔ میں کسی دوسرے کو اپنے سوا تمہارے لئے قابل پرستش نہیں جانتا۔ پھر چالیس برس کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ رب الاعلیٰ کے لفظ سے لوگ بظاہر یہ سمجھ گئے کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے وہ خالق کائنات ہونے کا مدعی نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ پاگل تھا۔ دنیا اس کو پاگل ہی کہتی اور اللہ بھی اس کی ہدایت کے لئے حضرت موسیٰ کو نہ بھیجتا۔ دیوانے کو ہدایت کیسی۔ حقیقت میں وہ دہریہ تھا یعنی (وجود الٰہی کا منکر) عالم کو وجود خالق سے بے نیاز سمجھنے والا۔ رہا سوال ربوبیت تو ظاہر ہے کہ فطری اسباب نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ بارش اور سورج سے سبزہ، غلہ، پھل پھول پیدا ہوتے ہی ہیں۔ فرعون ایسا مجنون نہ تھا کہ اسباب فطریہ کا حکمران اپنے کو قرار دیتا۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ پیدا شدہ اشیاء کو فراہم کرنا، رعایا کو کھلانا پلانا اور ان کے رزق کی کفالت کرنا میرا کام ہے۔ اگر میں کسی کو نہ دوں تو اس کو کچھ نہیں مل سکتا اور عطا کروں تو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس لئے رب اعلیٰ میں ہوں، حاکم مطلق ہوں قابل پرستش میں ہوں)

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰی ٥ آخر اللہ نے فرعون کو پکڑا اور دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا۔ دنیا میں غرق اور آخرت میں جہنم۔ عذاب آخرت سے مراد مرنے کے بعد کا عذاب اور عذاب اولیٰ سے مراد غرقابی ہے۔ قتادہ کا یہی قول ہے اور ابن کثیر نے اسی کو پسند کیا ہے۔ باقی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ عام اہل تفسیر نے بھی یہی تشریح کی ہے، لیکن رازی، خطیب اور بیضاوی نے لکھا ہے کہ کلبی نے حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ کلمہ آخر اور کلمہ اول کا عذاب مراد ہے۔ فرعون کا کلمہ اول تو یہ تھا کہ اس نے قوم سے کہا تھا۔ ماعلمت لکم من الٰہ غیری۔ اور دوسرا کلمہ تھا انا ربکم الاعلیٰ کہنا۔ اللہ نے ان دونوں لفظوں کی سزا میں اس کو پکڑا۔ کلبی ناقابل اعتبار راوی ہے۔ اس لئے حضرت ابن عباس سے اس تفسیر کا منقول ہونا ثابت نہیں۔ ہاں امام رازی نے لکھا ہے کہ یہی قول مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی اور مقاتل سے بھی مروی ہے۔ معلوم نہیں امام کے اس انتساب کا ماخذ کیا ہے اور مجاہد وغیرہ کا یہ قول امام تک کیسے پہنچا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ٥ ۔ قرآن مجید داستان کی کتاب نہیں، قصص و حکایات کا مجموعہ نہیں۔ تذکرہ ہے ہدایت نامہ ہے، دستور زندگی ہے، اس لئے جتنے قصے کہیں مجمل کہیں مفصل قرآن میں ذکر کئے گئے ہیں ان کا تذکرہ نہیں بلکہ برائے درس ہے۔ حال کو ماضی پر قیاس کرنے والوں کے

یہ عبرت کا سبق ہے۔ اپنی بدانجامی سے ڈرنے والوں کے لئے تنبیہ ہے ہر دعوے حاضر ہونے کے لئے۔ اپنے اعمال کو ماضی کے آئینے میں دیکھنے کی ایک تلقین ہے۔ پس جو لوگ دنیا و آخرت میں اپنی نامرادی سے ڈرتے ہیں ان کے لئے فرعون کی زندگی اور اس کا انجام ایک عظیم الشان عبرت ہے۔

چند غیر تفسیری نکات و رموز

شیخ ابن عربی نے اشارات کے ذیل میں لکھا ہے کہ وادی مقدس اہل باطن کے لئے جہاں روح مجرد ہے تمام موجودات پر اس کی حکومت ہے۔ اجسام ہوں یا نفوس سب اسی کے اقتدار میں منطوی اور مطوی ہیں، اس لئے وہ وادی مقدس طویٰ ہے۔

عالم روح عالم صفات ہے اور کلام حق بھی صفت رب ہے۔ اسی لئے اس عالم روح یعنی عالم صفات میں اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا۔

فرعون کا طغیان یہ تھا کہ اس نے مقام توحید صفات میں اپنی خودی اور انانیت کا دعویٰ کیا۔ میدان افعال وہ طے کر چکا تھا۔ لیکن جب وادی صفات میں اس نے قدم رکھا تو نفس کے تکبر نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ خودی اس کے لئے حجاب بن گئی۔ صفت ربوبیت کو اپنے لئے ثابت کرنے لگا۔ شیخ کا مطلب یہ ہے کہ اہل سعادت وادی صفات میں پہنچ کر سارے جہاں یہاں تک کہ اپنے نفس سے بھی ہر صفت کی نفی کرتے ہیں۔ عالم افعال میں تو تاہم اپنے کو قادر اور مدبر سمجھتا ہے۔ مگر عالم صفات میں ہر اہل سعادت اپنی ہر ظاہری صفت کی بھی نفی کرتا ہے اور اس طرح کل عالم اس کی نظر میں فانی دکھتا ہے۔ اور بقا صرف حق تعالیٰ کے واسطے مخصوص ہوتی ہے۔ مگر فرعون بجائے فنائے نفس کے اپنی خودی کا قائل ہوا اور یہ بدترین حجاب تھا، اس لئے حضرت موسیٰ نے سب سے اول بہت ہی نرمی سے اس سے فرمایا: ہل لک الیٰ ان تزکیٰ۔ یعنی سب سے اول تجھے اپنی خودی کا تزکیہ کرنا چاہیئے۔ حجاب خودی سے باہر نکلنا لازم ہے۔ اس کے بعد فرمایا: واہدیک الیٰ ربک فتخشیٰ۔ یعنی میں تجھے معرفت حقیقیہ کا راستہ بتا دوں گا جہاں صرف وحدت ذاتیہ ہوگی۔ الوہیت اور ہر کمال سوا باری تعالیٰ کے کہیں نظر نہ آئے گا اس وقت تیرے اندر خشیہ پیدا ہوگا کہ اپنے نفس کی طرف مطلقاً نظر نہ رہے گی اور بقا حق ہی دکھائی دے گی۔ حضرت موسیٰ نے اس کو آیت کبریٰ بھی دکھائی لیکن اس کو نہ دیکھی۔ حجاب خودی بہت موٹا حائل تھا، اسی لئے اس نے انکار کیا۔ دعوت موسوی کو معجزہ نہ جانا اور ارشاد موسوی سے سرتابی کی۔ کیونکہ اس کے اندر حماقت بھی جمع تھی اور رعونت بھی۔ آخر مقام صفات کی طرف سے اس نے پشت موڑ لی اور بالکل مقام نفس میں ہی جا گرا۔ حضرت موسیٰ کو دفع کرنے کے لئے اس نے شیطانی فریب اور نفسانی حیلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ اور نفس کی خودی اس پر اتنی چھا گئی کہ رب العالمین کے ساتھ کبریائی میں بھی جھگڑنے لگا۔ آخر قہر الٰہی میں گرفتار ہوا۔

مقصود بیان

حضرت موسیٰ اور فرعون کا واقعہ عبرت آفریں ہے، لیکن صرف ان لوگوں کے لئے جن کے اندر مادۂ خشیت موجود ہو۔ برے انجام کا ڈر بھی ہو اور خالق کی محبت بھی دلوں میں صلابت نہ ہو۔ نرمی ہو جو جذبۂ خوف و محبت کے زیر اثر واقعہ پر غور کرلے۔

لفظ حدیث کا اطلاق بتا رہا ہے کہ پورے واقعہ کو بھی حدیث کہا جا سکتا ہے۔

رَبُّہٗ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ نے براہ راست حضرت موسیٰ کی روحانی تربیت کی تھی۔ پہلے حضرت شعیب کی صحبت میں رکھا پھر اپنی جلوہ گاہ خاص میں بلا کر ندا دی۔ ندا غائبانہ ہوتی ہے۔ رو در رو گفتگو کو خطاب کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ حضرت موسیٰ کے سامنے بے حجاب نہیں آیا تھا۔ نہ حضرت خدا کو دیکھ کے صرف جلوہ پاشی اور نور جلیبی ہوئی۔ ایک طرف سے نور برسایا گیا۔ دوسری طرف دل کی کثافت اور روح کا میل صاف کر لیا گیا۔ اور وہ آواز جو حضرت موسیٰ نے سنی تھی اللہ کی تھی۔ اگر جبرئیل کی آواز قرار دیا جائے گا تو تاویل کرنی پڑے گی۔ معلوم ہوا کہ آدمی براہ راست اللہ کی آواز سن سکتا ہے لیکن کس قوت سامعہ سے، گوش دماغ سے یا روح کے کانوں سے۔ خودی کو فنا کر کے عالم مثال میں داخل ہو کر یا اسی مادی دنیا میں رہ کر بدلے ہوئے حواس۔ ظاہر ہے کہ اسی ندائے غیبی سے حضرت موسیٰ کو رسول بنایا گیا تھا۔ اور فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا تھا تو سننے والی روح کے کان ہی ہوں گے اور جلوہ دیکھنے والی روح کی آنکھیں۔

المقدس کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ کی خصوصی پرتو اندازی کی بنا پر بعض مقامات کو مقدس کہا جا سکتا ہے پس ہر مقام خواہ عبادت خانہ ہو یا تعلیم گاہ دینی یا اللہ کے خاص بندوں کا مقام استراحت۔ اگر اس نور پاشی اور جلوہ انگنی کے لحاظ سے اس کو مقدس کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

ہے۔ اس کے مزاج میں ایسا اعتدال ہے کہ نہ بیماری کو اس کے حدود میں داخل ہونے کی اجازت ہے نہ پیری اور فرسودگی کو۔ وہ اتنا اونچا ہے کہ فلک پیمائی کا تصور اور نیلا سمندر، کالا محدود تخیل بھی اس کی بلندی کو آج تک صحیح طور پر ناپ نہ سکا کسی صانع کی صنعت، کسی حکیم کی حکمت اور کسی دانشور کی دانش کو دانش افلاک سمجھنے کی ہمت تو بیچاری خود رہی، اس کے مظاہر کو بھی پورا جاننے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کا اصلی اقتدار کتنا ہے یہ کون جانے، اس کی سطوت کی مقدار کتنی ہے اس کا کس کو علم، لیکن اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی حرکت و گردش کی ادنیٰ تاثیر بصورت شب دیجور نمودار ہوتی ہے۔ جو کل جہاں پر چھا جاتی ہے۔ نہ اس سے کوئی بادشاہ بچ سکتا ہے نہ فقیر نہ سمندر نہ پہاڑ نہ ریگستان بیابان نہ جنگل سنسان نہ کوئی میدان نہ مکین نہ مکان، کون اس کی سطوت کو دفع کر سکتا ہے اور کون اس کے اقتدار سے سر باہر نکال سکتا ہے۔ اس کی فیاضی اللہ جانے کتنی ہے اور اس کے فیض کے دریا کہاں کہاں بہہ رہے ہیں، لیکن اتنی بات کھلی ہوئی ہے کہ سورج کی انتہائی چمک سے کوئی جاندار و بے جان بہرہ ور ہونے سے خالی نہیں رہتا۔ کیسا فیض ہے عمومی اور کیسی سخاوت ہے ہمہ گیر۔ سورج کی روشنی دور سے پہاڑوں میں کہاں کہاں پہنچتی اور پلٹتی ہے یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا نہ جانتا ہے نہ جان سکتا ہے صرف اسی زمین کو جو حقیر ترین حصہ ملتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ کچھ بد دماغ بے وقوفوں کو سورج کے دیوتا اور معبود ہونے کا دھوکہ ہو گیا اور دھوکہ کیسا وہ سورج کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرنے لگے۔ حالاں کہ یہ سب صنعت، حکمت، قدرت اور سخاوت اللہ کی ہے نہ آسمان کی نہ سورج کی۔

پھر آسمان تو دور ہے وہاں کون پہنچا ہے اور پہنچ سکتا ہے۔ زمین تو سامنے ہے۔ آدمی سے کہیں زیادہ طاقت ور لمبی چوڑی ایسی سخی کہ جگہ جگہ پانی کی نہریں، دریا اور چشمے بہا دیئے۔ ایسی حسین اور دلآویز کہ مخملی سبزہ جا بجا پھیلا ہوا ہے۔ ایسی مضبوط کہ ان گنت مقامات پر پہاڑوں کی میخیں ٹھکی ہوئی ہیں۔ انسان اور دوسرے جانور اپنی روزی اور معاشِ حیات میں اس کے محتاج ہیں۔ پھر کس بوتے پہ آدمی غرور کرے اور کیوں انانیت اور رب اعلیٰ ہونے کا ڈنکا پیٹے۔ اگر آدمی کی اس ساری فوقیت پر برتری ہے تو وہ روحانیت درستی اخلاق محاسن و مکارم اور اطاعت الٰہی کے تحت ہے کیونکہ انہی کے نتائج و ثمرات سامنے آئیں گے ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ آدمی تو کیا سارا جہان الٹ پلٹ ہو جائے گا پس جس نے دنیاوی زندگی میں انانیت کا جھنڈا بلند کیا ہو گا اور اطاعت رب سے قدم باہر رکھا ہو گا۔ وہ جہنم میں جائے گا اور جائے گا ہی نہیں بلکہ رہے گا۔ اس کا ٹھکانا ہی وہاں ہو گا، لیکن جس کو اس زندگی میں آخرت کی لو لگی رہی اور رب کے سامنے جا کر حساب فہمی کا ڈر لگا رہا اور اسی ڈر سے اس نے رب کے خلاف میلان کرنے سے اپنے کو روکے رکھا اس کا آخری مقام جنت ہو گا۔

تحلیل اجزاء ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کا عبرت انگیز مختصر قصہ نقل کرنے کے بعد اب پھر وجودیات اور بعثتِ ثانیہ کو ثابت کرنے کے لئے تخلیق عالم کی تصویر کشی فرمائی جا رہی ہے تاکہ تخلیق ثانی کے متعلق کافروں کے شبہات کا قطعی ازالہ ہو جائے۔ ہم تفسیری مقالہ میں اوپر لکھ آئے ہیں کہ انسان مندرجہ ذیل چیزوں میں اپنے کو منفرد اور ممتاز جانتا ہے۔ جسمانی بناوٹ کا استحکام حسن صورت اور اعتدال مزاج، علم و حکمت کی بلندی، اقتدار و سطوت، عمومی افادہ اور اسی طرح کے دوسرے امتیازی اوصاف۔ ان خصوصیات پر کوتاہ فکر والا آدمی جب نظر ڈالتا ہے تو کہتا ہے مرنے کے بعد جسم کے ساتھ ساتھ یہ تمام خصوصیات فنا ہو جائیں گی۔ پھر ان خصوصیات کی حامل دوسری تخلیق کیسے ہو گی۔ اوّل تو ذراتِ منتشرہ فانیہ کا اجتماع ممکن نہیں اور اجتماع ہو بھی جائے تو اس میں دوبارہ روحِ حیات پھونکنا محال ہے۔ ان تمام توہمات کو دور کرنے کے لئے اللہ نے اس آیت سے تخلیقِ عالم کا اجمالی ذکر شروع فرمایا:۔ سب سے پہلا شبہ انسان کی بناوٹ اور اس کے استحکام کی بنا پر تھا کہ دوبارہ ایسا مستحکم تخلیق کیسے ہو گی تو فرمایا: کیا تمہاری بناوٹ زیادہ مستحکم ہے یا آسمان کی۔ بدیہی بات ہے کہ آسمان کی زیادہ مضبوط ہے۔ انسان تو ہر آن فنا پذیر ہے اور آسمان اتنا طویل العمر ہونے کے بعد نہ فرسودہ ہوتا ہے نہ ضعیف اور کہنہ۔ امتدادِ زمانہ اور حوادث اس پر اثر انداز نہیں۔ پھر حجم و ضخامت کی بڑائی اور شدت تو ظاہر ہی ہے۔ بقول امام رازی آیت میں استفہام تقریری ہے۔

بَنٰهَا۔ آسمان کی یہ عمارت اللہ نے بنائی عدم سے وجود میں لایا۔

رَفَعَ سَمۡكَهَا ہماری آدمی کی حکمت و دانش کی رفعت اور تخیل کی بلند پروازی تو ظاہر ہے کہ آسمان کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ اللہ نے آسمان کی بلندی کو اوپر اٹھایا اور اونچا بنایا ہے یعنی اتنا اونچا کیا کہ انسان کی فلک رسا دانش وہاں تک نہیں پہنچ سکتی نہ اس کے حجم کو ناپ سکتی ہے نہ وسعت رفعت در

بھی اندازہ کر سکتی ہے

ابن جریر نے سمک سے آسمان کی موٹائی مراد لی ہے اور بغوی نے معالم میں سمک کا ترجمہ سقف کیا ہے۔ خطیب نے اونچائی لکھا ہے۔ ابوالسعود وغیرہ نے لکھا ہے کہ زمین سے اوپر کی جانب آسمان کی اونچائی اور پھیلاؤ اٹھایا۔ اس طرح کہ زمین سے پانچ سو سال کا راستہ دوری کا ہو گیا۔ ابوالسعود نے یہ نہیں بیان کیا کہ پانچ سو برس کی راہ ہونے سے کیا مراد ہے۔ کسی سواری کا یا بجلی کا یا نظر کا یا تصور و تخیل کا یا نور کا یا صرف مدت کثیرہ مراد ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے فتح العزیز میں لکھا ہے کہ نیچے سے اوپر کی جانب کا لحاظ کیا جائے تو اس کو عمق کہا جاتا ہے۔

فَسَوّٰىهَا۔ انسان کا حسن صورت اور اعتدال مزاج آسمان کے تناسب وضع زینت نجوم اور درستی خلقت پر غور کرنے کے بعد ہیچ نظر آتا ہے۔ اللہ نے آسمان کو مستوی کیا یعنی تخلیقی درستی کی وضع میں تناسب و توازن رکھا۔ حجم و ضخامت میں ضرورت ملحوظ رکھی اور زینت کے لئے ستاروں سے آراستہ کیا اور مزاج میں ایسا اعتدال رکھا کہ تغیر، تبدل اور تعفن و فنا سے وقت مقرر تک محفوظ رہے۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا۔ انسان اپنے اقتدار و سطوت میں اتنا مست ہے کہ اترا اترا پھرتا ہے، پہاڑوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے سمندروں کے گہراؤ پاٹ دیتا ہے۔ ریگستان کو سبزہ زار اور سبزہ زار کو ریگستان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عظیم الشان دریاؤں کے رخ موڑ دیتا ہے اور اس طرح دنیا میں کو لس بن جاتا ہے، لیکن وہ نہیں جانتا کہ ہے کہ آسمان کی ایک ادنیٰ حرکت سے جب زمین کا رخ سورج کی طرف سے اور سورج کی محاذات زمین کی طرف بدلی اور اللہ نے رات کا اندھیرا دنیا پر مسلط کیا تو دنیا کا ذرہ ذرہ پردۂ ظلمت میں گم ہو جاتا ہے۔ کون ہے جو رات کو آنے سے روکے کون ہے جو شب دیجور کی ذرہ ذرہ پر چھا جانے سے باز داشت کرے۔ لاکھوں نورانی قمقمے اور لاتعداد شعلہ باریاں رات کو دن نہیں بنا سکتیں شاید کسی خاص جگہ پر کچھ روشنی کر سکیں، لیکن رات کا عمومی اقتدار اور ہمہ گیر سطوت کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔

اَغْطَشَ باب افعال سے متعدی ہے اور غَطَشَ باب ضرب سے لازم۔ متعدی کا معنی تاریک بنا دیا اور لازم کا معنی تاریک ہو گیا چھا گیا۔ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر نے اغطش کا یہی معنی بیان کیا ہے۔

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۔ انسان کو اپنے افادۂ عمومی پر بھی بڑا ناز ہے، لیکن اللہ نے جو آسمان کی گردش سے دنیا میں روشنی پھیلائی اور نور برآمد کیا اس کی افادیت ایسی جہاں گیر ہے کہ زمین کے اندر جاندار اور بے جان کا کوئی فرد ہو یا بالائے زمین کوئی ذرہ یا فضا اور خلا میں کوئی برقی جرثومہ سب اُس سے فائدہ اندوز ہیں۔ روشنی اور حرارت بقائے عالم کا اصل سرچشمہ ہے۔ دن نہ نکلے اور روشنی نمودار نہ ہو تو کھیل پیدا ہوں نہ پھول نہ درخت میں ثمر ہو نہ سبزہ کی نمود نہ جاندار کا دورانِ خون ہو نہ تنفس کی آمد و رفت۔ سارے جہان میں جمود ہو جائے جو پیام موت ہے اور موت صرف حیوانی ہی نہیں بلکہ موتِ نامی بھی اور موتِ جمادی بھی۔ تمام فلزات اور معدنیات کے تکون اور تجوہر کی اصل علت حرارت شمس اور نور النہار ہے اور ہر نامی کی روئیدگی اور بالیدگی اور ثمر آوری اسی پر موقوف ہے۔ جانور یا آدمی کے پستان میں دودھ ہو یا رگوں میں خون سب کی پیدائش سیلان اور دوران کا سبب یہی نور سراپا ظہور ہے۔

تو اب قابل طلب ہے یہ امر کہ ایسا عالم کل قادر مطلق خدا جس کی قدرت سراپا حکمت نے ایسا آسمان بنایا کیا وہ ضعیف البنیان انسان کی دوبارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ مزید غور کرو۔

وَالْاَرْضَ۔ اللہ نے زمین پیدا کی، کیسے پیدا کی، کس چیز سے بنائی، نیستی سے ہستی میں کس طرح لایا۔ یہ کون جانے۔ بہرحال آدمی کی طاقت جسامت، ضخامت، ثقل، قدرت، افادیت وغیرہ سے تو زمین کی حیثیت زائد ہی ہے۔

بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ پیدائش کے بعد (معلوم نہیں کتنے بعد) زمین کو بچھایا اس کو فراش اور مہاد بنایا۔

تنقیح مبحث آیت والارض بعد ذلک دحاھا کا مطلب عام اہل تفسیر نے یہ سمجھا ہے کہ تسویۂ سماء کے بعد اللہ نے زمین کو بچھایا لیکن سورۂ بقرہ کی آیت خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء فسوٰھن سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کا تسویہ تخلیق زمین اور کائنات زمین سے مؤخر ہے۔ اسی طرح سورۂ فصلت میں زمین کی پیدائش کو آسمان کی تخلیق سے مقدم قرار دیا ہے۔ دونوں

میں کھلا ہوا تعارض دیکھ کر مختلف اہل تفسیر نے مختلف جواب دیے ہیں ۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ زمین کی تخلیق تو آسمان کی تخلیق سے مقدم ہے ۔ جیساکہ سورۂ بقرہ اور فصلت میں بیان کیا ہے مگر زمین کا پھیلانا اور بچھانا آسمان کی پیدائش کے بعد ہوا جیساکہ اس جگہ آیت میں ظاہر فرمایا ۔ مگر صاحب کشاف کا یہ قول ناقص ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں ارض اور ما فی الارض کی تخلیق کو آسمان کی تخلیق پر مقدم ظاہر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ کائنات ارضی کی تخلیق بغیر تسویہ کے نہ ہوگی ، اس لئے زمین کا بچھانا بھی آسمان کی تخلیق پر مقدم ہوا ۔

بعض علماء نے جواب دیا کہ آسمان کی تخلیق زمین کی تخلیق سے مقدم ہے جیساکہ اس جگہ بیان کیا ، لیکن آسمان کا تسویہ زمین کی پیدائش کے بعد ہوا جیساکہ سورۂ بقرہ کی آیت سے واضح ہے مگر یہ جواب بھی ناقص ہے کیونکہ اس جگہ تسویۂ سماء اور تخلیق لیل ونہار سب کو تخلیق ارض سے مقدم قرار دیا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز نے صراحت کی ہے کہ اس جگہ زمین کے بچھانے سے مراد ہے مرتبۂ قضا اور کائنات ارضی کی ایجاد بالفعل اور یہ یقیناً تسویۂ سماء سے مؤخر ہے ۔ کیونکہ معادن نباتات بلکہ کائنات فضائی کا وجود بھی آسمانی شعاعوں اور ان کی پرتو اندازیوں پر موقوف ہے ، اس لئے تسویۂ سماء مقدم ہی ہوگا اور سورۂ فصلت و بقرہ میں جو ارض اور کائنات ارض کی تخلیق کو تخلیق و تسویۂ سماء سے مقدم کہا ہے تو اس سے مراد مرتبۂ قدر اور ایجاد بالقوت ہے ۔ یعنی اللہ نے علمی اندازہ کیا اور قوت پیدا کی کہ اس پانی یا گیس کو زمین بننا ہے اور اس طرح بننا ہے اور اس میں فلاں فلاں چیزیں پیدا ہونی ہیں ۔ ان کے لئے ایسی قوت کی ضرورت ہے ۔ خطیب نے سراج منیر میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا اللہ نے زمین کو اس کی نباتات وغیرہ کے ساتھ پہلے پیدا کیا ۔ لیکن اس کو بچھایا نہیں پھر سات آسمانوں کا تسویہ کیا پھر زمین کو بچھایا اور اس کے مقدرہ رزق اور دوسری چیزیں موقع موقع سے ظاہر فرمائیں ۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے سب چیزیں زمین کے اندر بالقوت پیدا کیں اور مضمر کر دیں پھر آسمان کو پیدا کر کے زمین کو بچھایا اور جو چیزیں زمین میں بالقوۃ تھیں وہ بالفعل ظاہر کر دیں ۔ حضرت ابن عباس کے قول کا یہی مطلب ہے اور شیخ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے ۔ غالباً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے دلکش متکلمانہ طرز بیان میں اسی مضمون کو بیان کیا ہے ۔ اس طرح سوال کا جواب پورا ہو جائے گا ۔ مگر ان تمام جوابوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جواب دینے والوں نے شبۂ تعارض کو صحیح قرار دے کر جواب دیے ہیں ۔ اور سب کی نظر میں بظاہر تعارض آیات یقینی ہے ۔ لیکن اس فقیر نے جب آیات پر غور کیا تو تعارض بالکل سمجھ میں نہ آیا کیونکہ سورۂ بقرہ اور فصلت میں زمین اور کائنات زمین کی پیدائش کو مقدم بتایا ہے ۔ یہ درست ہے ، لیکن اس جگہ کسی قسم کی نہ صراحت ہے نہ اشارہ کہ زمین یا کائنات زمین کو آسمان یا تسویۂ آسمان سے مؤخر کیا ہے ۔ بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ آیت :

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا میں اَلْاَرْضَ مفعول ہے اور اس کا فعل محذوف مانا گیا ہے ، لیکن وہ فعل کون سا ہے اس کی تعیین کی ضرورت ہے پھر ذالک کا مشار الیہ کیا ہے ۔ عام مفسروں نے ذالک کا اشارہ آسمان کی بناء اور تسویہ اور تخلیق لیل ونہار کی طرف کیا ہے ۔ اس صورت میں تعارض پیدا ہوا کہ آسمان کے تسویہ کے بعد زمین اور تمہید زمین ہوئی ہے ۔ تو آیت بقرہ اور فصلت کی صراحت کے خلاف ہوا ، لیکن حقیقت میں ذالک سے اشارہ آسمان اور تسویۂ آسمان کی طرف ہے ہی نہیں کہ اعتراض پیدا ہو بلکہ مشار الیہ تخلیق ارض ہے ۔ کیونکہ یہی قریب ہے ۔ اس صورت میں والارض ایک جملہ ہوگا جس کا عطف بنٰہا کے مفعول یعنی ۔ ہا ۔ پر ہوگا ۔ یہ فعل محذوف کا مفعول نہ ہوگا ۔ لیکن اللہ نے آسمان کو بنایا اور تسویہ کیا اور لیل ونہار کو بنایا ۔ اور زمین کو بنایا اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس کو بچھایا کتنی مدت بعد بچھایا اس کی کچھ صراحت نہیں کی ۔ نہ یہ اس جگہ بتایا کہ آسمان کو پیدا کرنے کے بعد زمین کو بنایا ۔ زمین کے بعد آسمانوں کو کیونکہ عطف بالواو ہے جو صرف جمع کے لئے آتا ہے تعقیب پر دلالت نہیں کرتا ۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ زمین کا بچھانا زمین کی پیدائش کے بعد ہوا اور یہ ایک واقعہ کا اظہار بھی ہے اور اس بات کا اس سے ترشح ہوتا ہے کہ اول قوام زمین بنا پھر اس قوام کو پھیلایا گیا ۔ پھیلی ہوئی زمین جیسی کہ اب ہے نہیں بنائی گئی ۔ بلکہ تمہید تخلیق سے مؤخر ہوئی ۔ واللہ اعلم

أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۔ زمین کے اندر پانی، سبزہ، پھل، پھول، غلہ سب کچھ موجود تھا۔ گر بالقوۃ۔ تخلیق زمین کے وقت بالفعل نہ تھا نہ بچھانے کے وقت بالفعل تھا بلکہ زمین ہر سبزہ کو پیدا کرنے کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ اللہ نے زمین سے پانی برآمد کیا: چشمے، نہریں، دریا پھوٹ کر سطح ارض پر بہنے لگے۔ اور جا بجا سبزہ زار، مرغزار اور چمنستان و گلستان لہلہانے لگے۔ غلے سے بھرے ہوئے کھیت پیدا ہوئے۔ پانی کیا نکلا کہ ہر جاندار کے لئے آبِ حیات نکلا۔ پانی سے زمین کی اندرونی اور آفتاب کی بیرونی گرمی میں بھی تسکین پیدا ہوئی اور رطوبت سے حرارت مل کر مادۂ زمین سے ہر چیز کی تولید کا سبب بنی۔

وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا ۔ اور اللہ نے پہاڑوں کو بنایا (کس چیز سے بنایا کیسے بنایا کچھ معلوم نہیں) اور زمین میں ان کو گاڑ دیا۔ زمین کے لئے پہاڑوں کو میخوں کی طرح نصب کر دیا۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام احمد نے حضرت انس کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو اس نے لرزنا شروع کیا تو اللہ نے پہاڑوں کو پیدا کر کے زمین پر ڈالا اور زمین ٹھہری۔ الخ۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۔ یہ پانی نکالنے اور سبزہ پیدا کرنے کی غرض کا بیان ہے۔ یوں تو ہر جاندار کی زندگی پانی پر موقوف ہے اور بکثرت حیوان زمین کی پیداوار سے براہِ راست یا بالواسطہ غذا حاصل کرتے ہیں، لیکن ان گنت جانوروں کے احوال کا مطالعہ ناممکن ہے۔ انواع حیوانات کا علمی معائنہ آج تک نہ ہو سکا۔ اشخاص و افراد کی تعداد اور ان کے تمام احوال کو جاننا کس طرح ممکن ہے۔ ہاں پانی اور زمین کی پیداوار کا کھلا ہوا فائدہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ:

اللہ نے یہ سب کچھ انسانوں اور انسانوں کے چوپایوں کے کام چلانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ آدمی، اونٹ، گھوڑا، گائے، بکری، بھینس اور استعمال میں آنے والے دوسرے جانور پانی پی کر اور زمین کی پیداوار بالواسطہ یا براہِ راست کھا کر ہی زندہ ہیں۔

یہاں تک تو کائنات کی تخلیق کا اظہار تھا، لیکن کیا یہ کارخانہ یونہی چلتا رہے گا۔ حالانکہ جس کا آغاز ہے اس کا انجام بھی ہونا چاہیئے۔ عدم سابق قدم ہے حادث المبدء قدیم المنتہی نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ ایک دن اس فیکٹری کے سارے کل پرزے بکھرنا، جوڑ جوڑ کھلنا اور سب کو ٹوٹنا پھوٹنا ہے، اس لئے فرمایا:

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ طامۂ کبریٰ قیامت ہے کیونکہ وہ سب آفات پر غالب ہوگی (ابن کثیر) ابن عباس کا قول ہے طامۂ کبریٰ قیامت کا نام ہے۔ (فتح البیان) ابن عباس سے مروی ہے کہ طامۂ کبریٰ دوبارہ نفخ صور ہے (خطیب) ابن عباس سے یہ مختلف اقوال مروی ہیں۔ رازی نے لیث اور قفال کا قول نقل کیا ہے کہ جو چیز دوسری چیزوں کو مغلوب اور گم کر دے وہ طامہ ہے۔ قیامت ظاہر ہوتے ہی ہر بڑی سے بڑی مصیبت فراموش ہو جائے گی (تفسیر کبیر) اس قول سے حضرت ابن عباس کے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ قاسم بن الولید ہمدانی نے کہا طامۂ کبریٰ وہ ساعت ہے جس میں اہلِ جنت کو جنت میں داخل ہونے کا اور اہلِ جہنم کو جہنم میں جانے کا حکم ہوگا (سراج)۔ حسن بصری اور اکثر اہلِ تفسیر نے کہا کہ طامۂ کبریٰ کی تشریح خود آگے یوم یتذکر الانسان ما سعیٰ موجود ہے۔ اعمال ناموں کی پیشی اور دوزخ کے سامنے آنے کا دن طامۂ کبریٰ کا ہے۔ اس صورت میں فاما من طغیٰ الخ سے فان الجنۃ ہی الماویٰ تک جزا ہوگی اور فاذا جاءت الطامۃ الکبریٰ سے الجحیم لمن یریٰ تک شرط۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ ساعتِ غالبہ جو سب سے بڑی ہے آجائے گی اور سامنے گی اعمال کی پیشی اور دوزخ کے ظہور کے دن تو اس وقت انسانوں کے دو گروہ ہوں گے۔ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم۔ حاصل کلام یہ نکلا کہ ساری کائنات کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ایک دن ہے۔ ایک مصیبت کا وقت ضرور آئے گا جو تمام آفتوں پر غالب ہوگا یا ایک ایسی ساعت ضرور آئے گی جو سارے جہان پر غالب ہوگی، سب کو تباہ و برباد کر دے گی۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ۔ طامۂ کبریٰ اس روز ہوگی جس روز انسان اپنی ہر کوشش کو یاد کرے گا یعنی دنیا میں تو گزشتہ زندگانی کی کثرت واقعات بھولا ہوا ہے۔ قیامت کے دن جب اعمال کی فہرست سامنے آئے گی تو تمام گزشتہ اعمال یاد ہو جائیں گے۔ پھر ہر عمل کی سزا جزا بھی سامنے ہوگی تب بھی وہ عمل یاد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ قیامت یوم الجزاء ہے تمام اعمال کا بدلہ ملے گا۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ۔ ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر کر دی جائے گی۔ رازی کے نزدیک آیت مطلق ہے مومن

ہو یا بالقریب دوزخ کو دیکھیں گے۔ خطیب نے کہا لِمَن یَرٰی محاورہ کے موافق فرمایا۔ اگر کوئی چیز کسی سے مخفی نہ رہے تو ایسے موقع پر بولا جاتا ہے فلاں چیز ہر دیکھنے والے کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ مگر اس سے وہ مومن مستثنیٰ ہیں جن کا رخ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے گا۔ کیونکہ سورۃ الشعراء میں بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ آیا ہے۔ صرف کافروں کو جہنم دکھانے کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض او نچے درجے کے لوگ کہیں گے ہم سے تو دنیا میں کہا گیا تھا کہ جہنم سے پار ہونا پڑے گا۔ ہم نے تو جہنم کو نہیں دیکھا۔ یہ کیا بات ہے۔ متوسط درجے کے لوگ جواب دیں گے آپ کو خیال نہیں رہا۔ وہ جو ہم نے دور سے چمکتی ہوئی سراب دیکھی تھی وہی تو جہنم ہے۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ اونچے درجے والوں کو تو جہنم بالکل نظر نہیں آئے گی اور متوسط درجے کے اہلِ جنت کو دور سے سراب کی طرح کچھ دکھائی دے گا اور یہ بات واضح ہے کہ اس کو بروز نہیں کہتے۔ بروز کا معنی تو کھلم کھلا کسی چیز کا سامنے آنا ہے۔ اگر جہنم سراب کی شکل میں دور سے دکھائی بھی دے گی تو وہ بروزِ جہنم نہ ہوگا۔ اس لئے لِمَن یَّرٰی صرف محاورہ کا لفظ ہے۔ دیکھنے والے کا عموم ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی۔ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ یہاں سے طامۂ کبریٰ کی اصل غرض بیان فرمائی ہے دنیا میں عقیدہ و عمل کے لحاظ سے دو گروہ ہیں۔ پہلا گروہ کافر۔ دوسرا گروہ مومن۔ اوّل طبقے میں دو قبیح اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ طاغی ہے یعنی اس کا عقیدہ صحیح نہیں۔ صحت فکر کی حدود سے باہر ہے یا منکرِ خدا ہے یا خدا کے خصوصی اوصاف میں دوسروں کو شریک جانتا ہے یا خدا میں مخلوق کی صفات مانتا ہے یا انسانی زندگی کو قوانینِ الٰہی سے بے نیاز سمجھتا ہے اور انسان کو انفراداً یا اجتماعاً اپنی زندگی کا خود دستور العمل بنانے والا خیال کرتا ہے۔ اس لئے نہ وہ آسمانی کتابوں کی ضرورت جانتا ہے نہ ملائکہ کا قائل ہے نہ انبیاء اور پیغمبروں کی اس کو ضرورت ہے نہ روحانیات اور عالمِ غیب سے اس کو کوئی تعلق ہے نہ یوم الجزاء کا قائل ہے۔ اگر جزا کا قائل ہے تو صرف اسی زندگی میں۔ اس کا دوسرا قبیح وصف یہ ہے کہ اس کا مرکزِ توجہ اسی زندگی کا عیش ہے خواہ اس کے حصول کا راستہ کوئی بھی ہو۔ جائز ناجائز کا وہ قائل نہیں۔ آخرت کا اس کو تصور نہیں۔ اس لئے اسی زندگی پر ریجھا ہوا ہے۔ غرض اس کو نہ صحیح فکر و نظر حاصل ہے نہ درست عمل اور راست کردار۔ ایسے آدمی کا ٹھکانا دوامی جہنم ہے اس کا مقام رجوع ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ ایمان کا آخری اور ضعیف ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی کے نزدیک آخرت دنیا سے بہتر ہو اس کی شناخت یہ ہے کہ آخرت میں کام آنے والی نیکیوں کو منافع دنیوی پر مقدم سمجھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ نام کا مسلمان ہے۔ حقیقت میں منافق۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ یہ دوسرا گروہ ہے جس کی نظر بھی صحیح ہے اور عمل بھی۔ اس زندگی میں اس کو ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے (مجرموں کی طرح) کھڑا ہونا ہوگا۔ اعمال کی پیشی ہوگی، اس لئے وہ اللہ کے احکام کو مانتا، اس کے شرائع اور ضوابطِ حیات اور کتابوں کو سچا جانتا ہے۔ انبیاء کی تصدیق کرتا ہے۔ کسی کو اللہ کا ساجھی نہیں بناتا نہ عبادت میں نہ دستورِ حیات کی وضع میں۔ پھر عقیدے کی درستی کے ساتھ اس کا کردار بھی صحیح ہوتا ہے۔ ممنوعات سے اپنے نفس کو روکے رکھتا ہے۔ فرائض کا ترک ممنوع ہے۔ منہیات کو کرنا ممنوع ہے، اس لئے نہ ترکِ فرائض کرتا ہے نہ ارتکابِ منہیات۔ اس کا دل ممنوع منافعِ حیات کا کتنا ہی خواستگار ہو، اس کا نفس کتنا ہی عیش و نشاط اور جاہ و حکومت کی طرف مائل ہو، مگر وہ حدودِ الٰہی کے پار ہونے سے نفس کو باز داشت کرتا ہے اور محرمات کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا۔ ایسے آدمی کا ٹھکانا دوامی جنت ہے جنت ہی اس کا مقام رجوع ہے۔

مقام اسم ظرف بھی ہے اور مصدر میمی بھی۔ کھڑے ہونے کی جگہ یعنی قیامت کے دن اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا مقام۔ یا اعمال کی پیشی کے لئے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا۔ قتادہ اور اکثر مفسرین نے مقام ربہ کا یہی معنی بیان کیا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے بھی یہی ذکر کیا ہے، لیکن مجاہد کے نزدیک مقام ربہ کا معنی ہے اللہ کی عظمت۔ یعنی جو شخص اس زندگی میں اللہ کی عظمت سے ڈرتا ہے اس کو ہر وقت حاضر ناظر قادر مطلق سمجھتا ہے اور پھر ڈر کر ممنوعات کو چھوڑ دیتا ہے۔

مجاہد کا قول دقیق اور لطیف معنی کا حامل ہے اور خوف کے بلند ترین درجہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں آیات حضرت مصعب بن عمیر اور ان کے بھائی ابو عزیز (عامر) بن عمیر کے حق میں نازل ہوئی ہیں

بدر کے دن عامر کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا اور فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ جنگ میں مارا گیا تھا۔ یہ بڑا مالدار تھا۔ سارا ترکہ اسی کو ملا تھا۔ اس کے والدین بہت زیادہ مالدار تھے۔ اس کے بھائی حضرت مصعب بڑے جان نثار صحابی تھے۔ جنگ احد میں حضور اقدس پر نثار ہو گئے۔ ضحاک نے یہ شانِ نزول حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی آئی ہے کہ طاغی سے مراد ابوجہل ہے اور مَنْ خَافَ سے مراد حضرت مصعب بن عمیر۔ سدی نے مَنْ خَافَ کا نزول حضرت ابوبکر کے حق میں قرار دیا ہے۔ کلبی نے پہلی آیت تمام کافروں کے لئے اور دوسری آیت تمام اہلِ ایمان کے لئے قرار دیا ہے۔ اصولِ تفسیر کے موافق یہی قول ہے۔ کیونکہ نزولِ آیات کے وقت مختلف واقعات ہوتے تھے۔ سب ہی کو موردِ آیات نزول کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر حضور والا خود ارشاد فرما دیں کہ اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ فلاں شخص ہے۔ تب تو تعیین کی جا سکتی ہے پھر بھی موردِ نزول کی تعیین سے حکم میں تخصیص نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مانعِ عموم نہ ہو تو حکم عام ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کلبی کا قول تفسیر قرآنی کے اصول کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔

مقصودِ بیان

ءَاَنْتُمْ سے لِاَنْعَامِكُمْ تک آسمان کی عظمت رفعت افادیت اور زمین کی وسعت استحکام اور فیض بخشی کو بیان کر کے انسان کی بعثتِ ثانیہ پر استدلال کیا ہے۔ اس کا بالفعل موجود کرنا آدمی کی آئندہ تخلیق کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے۔ لیکن یہ دشواری اور سہولت اور شدت و نرمی فہمِ انسانی کے لئے ہے۔ آدمی کی دانش اس فرقِ مراتب کو سمجھتی ہے۔ ہر ایک کو دشوار اور دوسرے کو آسان جانتی ہے۔ ورنہ خالق کے لئے نہ کوئی چیز دشوار ہے نہ اس مفہوم کے ساتھ آسان ہے جو آسان ہونے کا مفہوم ہم سمجھتے ہیں۔ خالق کے لئے تو نہ کسی چیز کے مادے کا پیدا کرنا دشوار ہے نہ صورت اور خاصیت کا۔ نہ اس کا فعل زمانی ہے نہ مکانی۔ تمام خواصِ مادیت سے پاک اور ہر کیف و کم کی احتیاج سے منزہ ہے۔

لَيْلَهَا اور ضُحٰهَا کی ضمیریں سماء کی طرف راجع ہیں جو دلالت کر رہی ہیں کہ رات اور دن کا آسمان سے کوئی خصوصی علاقہ ہے۔ علاقہ کون سا ہے اس کی تعیین نہیں فرمائی۔ ہو سکتا ہے کہ آسمان کا دور یا سورج کا چکر یا صرف سورج کی روشنی کے سامنے آنا اور آڑ میں ہو جانا۔ ان دونوں کی تخلیق کا سبب ہو یا اضافت کی وجہ صرف یہ ہو کہ رات اور دن کا تبادلہ آسمان کے نیچے ہوتا ہے۔ یا آسمان کا ان سے کوئی ایسا مخفی علاقہ ہو جو اب تک طبعیات کی رسائی سے خارج ہے۔

مَآءَهَا کی اضافت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ زمین پانی کی تخلیق کا سبب ہے۔ بلکہ پانی اور زمین کا باہم تعلق صرف مصاحبت کا ہے۔ زمین کے اندر سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے۔ ہاں مَرْعٰهَا کی اضافت سبب کی طرف سے زمین سبزہ کا مقام اور مادہ ہے۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہر چیز آدمی اور چوپایوں کے کام چلانے کے لئے بنی ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے اندر لاتعداد کیڑے اور لاکھوں اقسام کی گھانس سب ہی انسان و مویشی کی خوراک یا نفع اندوزی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پانی اور سبزہ نہ ہوتا تو انسان نہ حیوان کیلئے متاعِ حیات فراہم نہ ہوتی۔ انسان اور چوپایوں کی حیات کو باقی رکھنے کے لئے اللہ نے زمین سے پانی اور سبزہ پیدا کر دیا۔

الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى میں اصل تو طامۃ کا لفظ خود ہی بتا رہا ہے کہ ساعتِ قیامت ہر مصیبت سے بڑی مصیبت، ہر حادثہ سے بڑا حادثہ اور ہر چیز پر غالب آنے والی طاقت کی حامل ہوگی۔ جو کروڑوں برس کے سلسلۂ مادیت کو ختم کر دے اور لاکھوں سال کے دار العمل کو تباہ کر دے۔ اس سے بڑا حادثہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ الکبری سے اس کی تائید کر دی اور اس کی عظمت کی صراحت فرما دی۔ یومَ یتذکر سے واضح ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو اپنے تمام گذشتہ اعمال یاد ہو جائیں گے طَغٰى اور اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دوزخی بنانے کے یہی دو سبب ہیں۔ قوتِ علمیہ کی تباہی اور کج روی اور دنیوی حیات کو مرکزِ زندگی قرار دینا۔ خاف اور نہی سے تلقین کی گئی ہے اس امر کی کہ عظمتِ شانِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی عبدیت اور عجز کا مظاہرہ کرنا اور امرِ الٰہی کے مقابلے میں اپنی مرغوبات سے کنارہ کش ہو جانا اہلِ جنت کا شیوہ ہے وغیرہ۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ۝

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا (س) اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق

خاص وقت سے ناواقف رکھا گیا۔ اس کی تائید میں وہ حدیث پیش کی گئی ہے جس کو ترمذی نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہؐ قیامت کب ہوگی۔ حضورؐ نے (وقت نہیں بتایا بلکہ) ارشاد فرمایا کہ تو نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ ایک اور متفق علیہ صحیح حدیث آئی ہے جس میں حضورؐ نے صراحۃً وقتِ قیامت کے علم کا انکار فرمایا ہے اور یہ واقعہ وفات سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ ایک بار حضرت جبرئیل بہ شکلِ اعرابی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان اور اسلام کی حقیقت دریافت کی اور حضورؐ نے مفصل جواب دیا۔ لیکن آخر میں حضرت جبرئیل نے جو بصورتِ انسانی تھے وقتِ قیامت دریافت کیا تو حضورؐ نے فرمایا جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ اس کو نہیں جانتا البتہ میں تم کو اس کی علامات بتاتا ہوں۔ اس کے بعد حضورؐ والا نے قیامت کی نشانیاں بتائیں الخ۔

رازی اور خطیب نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے فیمَ کو ماقبل اور مابعد سے الگ مستقل جملہ قرار دیا ہے۔ اور اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا کو جدا جملہ۔ دونوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ان کو تردد کس بات میں ہے۔ قیامت کو یاد دلانے والے تو تم خود ہو۔ مطلب یہ کہ تمہارا پیغمبر بنا کر بھیجنا تو خود قیامت کا ذکر اور علامت ہے۔ حاصل یہ کہ قیامت بہت قریب ہے۔ حجت اللہ تمام ہو چکی، سلسلۂ انبیاء ختم ہو گیا۔ آخری پیغمبر بھی آچکے اب قیامت ہی آنا باقی ہے۔

اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا۔ قیامت کے وقتِ علم کی انتہا تو صرف تمہارے رب پر ہے یعنی قیامت کا علم تو تمہارے رب پر ختم ہے۔ کوئی دوسرا اس سے واقف نہیں۔ کیونکہ قیامت کے وجود کا سبب اللہ کا ارادۂ قہری ہے۔ اس ارادہ کا ظہور کب ہوگا اور ابتدائی تخلیق انسانی کو ختم کر کے فہرستِ اعمال کو لپیٹ دینا اور دوبارہ تخلیق کر کے اعمال کا بدلہ دینا کب مناسب ہے۔ اس سے تو اللہ ہی واقف ہے۔ آپ کو اس سے کیا تعلق۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا۔ آپ کا کام تو عذابِ قیامت سے ڈرانے کا ہے۔ آپ ڈرانے والے ہیں (لیکن اس ڈراوے کا فائدہ بے خوف لوگوں کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے) گویا آپ صرف انہی لوگوں کو ڈرانے والے ہیں جو قیامت کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا۔ امام رازی نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ ضحٰھا کی ضمیر عشیۃ کی طرف راجع ہے یعنی عشیہ کی ضحا لیکن عشیہ میں تو ضحا نہیں ہوتی، اس لئے مراد یہ ہے کہ دن کا پچھلا وقت یا دن کا چاشت کا وقت۔ ابن کثیر نے توضیح مطلب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قیامت کے دن لوگ دنیوی زندگی کو بہت کم خیال کریں گے۔ اتنی قلیل جیسے دن کے پچھلے وقت تک یا چاشت تک کی مدت ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے شاید یہ مراد ہے کہ لوگ خیال کریں گے ہم دنیا میں دن چڑھے تک رہے اور دوپہر سے پہلے مر گئے۔ یا پچھلے دن میں مر گئے۔ ابن عباسؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ ضحیٰ دوپہر تک کے وقت کو کہتے ہیں یعنی دن کا نصف اول اور عشیہ تو بہر حال دن کے نصف آخر کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب زیادہ واضح ہو جائے گا کہ دنیوی زندگی آدھے دن کی برابر معلوم ہوگی۔ اول نصف یا آخر نصف۔ بعض نکتہ رس لوگوں نے لکھا ہے کہ نصف اول اور نصف دوم کی اظہار کی وجہ یہ ہے کہ عرب کبھی مصیبت کے زمانے کو عشیہ اور راحت کے زمانے کو ضحی کہتے ہیں۔ اس لئے عیش میں زندگی گزارنے والے تو پوری زندگی کو عیش کا آدھا دن قرار دیں گے اور دکھ میں بسر کرنے والے کل زندگی کو مصیبت کے دوپہر خیال کریں گے۔ محسوس دونوں کو ہو جائے گا کہ دنیا کا دکھ بھی قلیل تھا اور سکھ بھی حقیر۔

مقصود بیان

یَسْئَلُوْنَکَ میں صراحت ہے کہ لوگ رسول اللہؐ سے قیامت کا وقت اور تاریخ دریافت کرتے تھے فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا کو اگر ایک جملہ قرار دیا جائے تو اس سے روشنی پڑتی ہے اس امر پر کہ تاریخ اور وقتِ قیامت کا تذکرہ نبوت کے فرائض میں داخل ہے نہ مناسبت ہے۔ نہ نبی کو خود معلوم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ اور اگر فیمَ کو مابعد سے الگ قرار دے کر دو جملے رکھے جائیں تو تشریح ہوگا یہ امر کہ رسول اللہؐ کی بعثت خود قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشان ہوگا اور آپ خاتم الانبیاء تھے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ کا کام صرف یہ تھا کہ روزِ قیامت کے عذاب اور ہولناکی سے لوگوں کو ڈرائیں۔ یوم حساب، میزان اور عذاب کی کیفیت بیان کریں تاکہ لوگ عقیدہ کی صحت اور اعمال کی اصلاح کی طرف مائل ہوں۔ تاریخ، وقت اور مدت کی تعیین لوازم نبوت میں سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہدایت، تبلیغ اور انذار کا فائدہ صرف انہی لوگوں تک ہی محدود ہے جن پر انذار کا اثر مرتب ہو سکے۔ اور وہ قیامت کو سچ جانتے ہوئے اس کے خوف سے اپنی زندگیوں کی اصلاح کریں۔ جن لوگوں کو انذار و تخویف کے بعد بھی وجود

قیامت کا یقین نہیں یا صرف زبانی اقرار ہے اور دل میں خوف نہیں۔ اُن کو ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں، اس لئے رسول اللہ کی حقیقی ہدایت صرف اول گروہ کے لئے ہی ہوئی اور آپ اُسی کے لئے ہی ہادی قرار پائے۔ دوسرے گروہ کے لئے آپ کی ہدایت کالعدم قرار پائی وغیرہ۔

سُوْرَةُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اس سورت کا نام سورۃ السفرۃ بھی ہے (سراج) اور سورۃ الأعمٰی بھی (فتح البیان) حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر نے فرمایا یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ قرطبی نے اس کے مکی ہونے پر اجماع علماء نقل کیا ہے۔ ابو السعود نے آیات کی شمار ۴۱ اور سراج و کبیر وغیرہ میں ۴۲ ظاہر کی ہیں۔ خطیب نے سراج میں کلمات کی تعداد ۱۲۰ اور حروف کی تعداد ۵۳۰ لکھی ہے اور تفسیر فتح العزیز میں ۱۳۰ کلمات اور ۵۳۵ حروف لکھا ہے۔ حقیقت میں آیات کا شمار قرآنی تنزیل سے غیر متعلق چیز ہے۔ اس سے صرف علماء مجتہدین کا اجتہاد مسائل کا تعلق ہے کسی مسئلہ کے مثبت یا نفی ہونے پر دو آیتوں کی وحدت یا کثرت سے اثر پڑتا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰى ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ أَوْ يَذَّكَّرُ

پیغمبر چیں بجبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ اُن کے پاس اندھا آیا　اور آپ کو کیا خبر شاید نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر سنور جاتا یا (کسی خاص امر میں)

فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَأَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ وَمَا عَلَيْكَ

نصیحت قبول کرتا سو اسکو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا تو جو شخص (دین سے) بے پرواہی کرتا ہے　آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں　حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں

أَلَّا يَزَّكّٰى ؕ وَأَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ

کہ وہ نہ سنورے　اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے　اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے　آپ اُس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ

(آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے　وہ (قرآن) ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں رفیع المکان ہیں　مقدس

مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ؕ

ہیں　جو ایسے　لکھنے والوں (یعنی فرشتوں کے) ہاتھوں میں (رہتے) ہیں اور وہ مکرم اور نیک ہیں

تفسیر انسانوں کی باہمی بزرگی و برتری اور عزت کا معیار کیا ہے۔ کم فہم دنیا پرست لوگ تو دولت کی کثرت، جماعت کی قوت اور حکومت کی سطوت کو معیار فضیلت جانتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیش نظر یہی چیزیں ہیں اور زندگی کا ماحصل انہیں یہ چیزیں ہیں یا چیزوں کا حصول ہے۔ لیکن روشن فہم مآل اندیش، سنجیدہ دماغ مالاگروہ ان ظاہری تمیزی اوصاف کو لعبت اطفال سے زیادہ باوقعت نہیں جانتا۔ وہ مکارم اخلاق اور محاسن کردار کا خواستگار ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر صحت فکر و عمل ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک معیار فضیلت اور مرکز توجہ صرف طلب

انسانی تخلیق و تربیت کے مدارج بیان کر کے قدرتِ عمومی اور علم اکمل کو ثابت کیا۔ اسی طرح کی دوسری مناسبات ہیں جو اہلِ فکر دونوں سورتوں کو سامنے رکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ امام رازی نے کبیر میں اور شاہ عبدالعزیز نے تفسیر فتح العزیز میں اس کو بسط سے لکھا ہے۔

شانِ نزول

شانِ نزول کے متعلق توضیحی بحث اور آیات کی تشریح تو ہم تحلیل اجمالی کے موقع پر کریں گے۔ یہاں پہلے قصہ نزول نقل کیا جاتا ہے کہ پیدا ہونے والے شبہات اور ان کے جواب پر مفصل روشنی آئندہ پڑ سکے۔

ایک روز حضور والا کعبہ میں تشریف فرما تھے۔ ابوجہل بن ہشام، ربیعہ بن شیبہ، عباس بن عبدالمطلب حضور کے چچا اور دوسرے اکابر قریش گرد آگرد جمع تھے۔ حضور اقدس ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی بہت زیادہ کوشش کر رہے تھے۔ شرک کی خرابیاں اور اسلام کی خوبیاں ذہن نشین فرما رہے تھے اور خیال یہ تھا کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو پھر کوئی مخالف نہیں رہے گا۔ یہ سردارانِ قوم ہیں۔ ان کے ایمان لانے سے ساری قوم مسلمان ہو جائے گی۔ یہی خواہش رہے کہ یہ تمام لوگ جہانِ کفر کے سرتاج تھے۔ ان کی نظر میں غریبی، شکستہ حالی اور کمزوری انسان کو ذلیل، حقیر بلکہ جانور بنا دیتی ہے۔ وہ ناداروں اور کمزوروں کو اپنا ہم وزن نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے مغرور تھے کہ اپنے مقابلے میں نہ صرف مفلس طبقہ کو بلکہ جزیرۂ عرب کے کل باشندوں کو حقیر خیال کرتے تھے۔ ثروت، طاقت، شجاعت، خطابت، بلاغت، کعبہ کی دربانی اور حرم کی پاسبانی نے ان کے دماغوں کو اتنا اونچا کر دیا تھا کہ وہ اپنا حریف کسی کو نہیں جانتے تھے۔ حضور والا جانتے تھے کہ یہ ان کی جہالت ہے، حماقت و نادانی ہے، کم فہمی اور ذہنی تنگی ہے، لیکن مصلحتِ اسلامی کا تقاضہ اور بصیرتِ بشری کی انگیخت تھی کہ آپ ان کی طرف کامل طور پر متوجہ ہو کر گفتگو کر رہے تھے تاکہ ان کے جذبۂ جہالت کو برانگیختہ ہونے کا موقع نہ ملے اور وہ حضور کی گفتگو سے متنفر نہ ہونے پائیں۔

اتنے میں ایک نابینا عبداللہ بن شریح بن مالک افہری جو ابن ام مکتوم کی کنیت سے سیر کی کتابوں میں مشہور رہیں آئے اور موقع محل کو جانے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگے میں بڑی تکلیفیں اٹھا کر پوچھتا پوچھتا بغیر رہبر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے فلاں فلاں سورتیں سکھا دیجئے۔ حضور والا کو ایسے وقت میں ان کا آنا اور تعلیم قرآن کی درخواست کرنا ناگوار گزرا۔ نابینا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ان کی طرف توجہ کی۔ سردارانِ قوم ہی کی طرف اپنا رخ رکھا اور انہی سے باتیں کرنے میں مشغول رہے۔ نابینا نے کچھ دیر توقف کرنے کے بعد پھر وہی درخواست کی اور اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، مگر حضور والا نے نہ ان کی طرف رخ کیا نہ کچھ جواب دیا۔ نابینا نے کچھ دیر توقف کے بعد پھر وہی باقول عرضداشت پیش کی۔ اسی طرح چند بار واقعہ ہوا تو حضور والا کو ناگوار گزرا۔ چہرۂ مبارک پہ شکنیں آ گئیں اور چیں بہ جبیں ہو کر نابینا کی طرف سے بالکل ہی منہ پھیر لیا۔ اس سے غریب طالب علم کی دل شکنی ہوئی اور اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی جس میں بغیر کسی تمہید یا کنایہ کے کھول کر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور حضور نے جو سلوک عبداللہ سے کیا تھا اس پر اپنے حبیب کو عتاب آمیز لہجہ میں متنبہ فرمایا۔

ایک شبہ

ہر نبی کا معصوم ہونا یقینی ہے۔ خصوصاً سید الانبیاء کی عصمت پر تو قرآن خود شاہد ہے پھر حضور والا سے ایسی بے اعتنائی کیوں ہوئی؟ اور ایک غریب کے ساتھ ایسی بدخلقی کس طرح کی۔

ازالہ

کوئی انسان ہو خواہ انسانیت کے مرتبۂ حیوانیت سے کچھ ہی اوپر ہو۔ جس کو صرف شکل کو دیکھ کر انسان کہنا صحیح ہو، لیکن جوہرِ انسانیت سے وہ یکسر خالی ہو اور جلیل القدر پیغمبر برحق یہاں تک کہ سید المرسلین سب ہی کے اندر جبلتِ بشری اور جبلتِ بشری کے اقتضائیات موجود ہونا لازم ہیں۔ لوازمِ انسانیت سے ذاتِ انسان خالی نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام صفات جو ذاتِ بشری کے لئے ضروری ہیں سب میں موجود ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بارگاہِ حق سے اگر کوئی حرکت باقتضائے بشری رائے کی غلطی اور اجتہادی کمزوری کی بنا پر سرزد ہو جاتی ہے تو چونکہ وہ حرکت توفیق کے لئے حجاب ہوتی ہے، اس لئے فوراً ان کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ تمہاری فلاں حرکت غلط ہے اس کی درستی ہونی چاہیئے۔ نازیبا حرکت کتنی ہی حقیر ہو اور ہوتی ہی حقیر ہے مگر چونکہ لغزش ہوتی ہے اس لئے وہ خدا جو ان کا ناصر اور ہر وقت مددگار ہے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور گرنے نہیں دیتا۔ لغزش پر عتاب ہوتا ہے مگر لطف آمیز ادب سکھایا جاتا ہے مگر ناز آمیز طریقے سے۔ اسی بات کی طرف حضور والا نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ أدبني ربي فأحسن تأديبي وعلمني فأحسن تعليمي۔ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا۔ مجھے تعلیم دی اور اچھی تعلیم دی۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اس طرح کی حرکت کا صدور اور اس پر مؤدبانہ عتاب مرتبۂ نبوت کے منافی نہیں بلکہ ایسی حرکت پر تادیب و عتاب تو حضور کے مرتبہ کی بلندی کو ثابت کر رہا ہے۔ یہ تو باعث ہے فنائے نفس کے مرتبہ کو طے کرانے اور مقام تمکین و استقلال میں پہنچانے کا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ عتاب نامہ جبرئیل نے پڑھنا شروع کیا تو خوف سے حضور کا

رنگ فق ہو گیا۔ جبرئیل جو لفظ پڑھتے تھے چہرہ مبارک کا اتنا ہی بگڑ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جبرئیل نے جب کلا انہا تذکرہ پڑھا تو چہرہ کا رنگ ٹھکانے پر آیا۔ دل کا خوف کم ہوا اور سمجھ گئے کہ یہ عتاب بھی مہربانی ہے۔ تقاضائے محبت ہے۔ مرتبہ کو کم کرنا مقصود نہیں ہے۔ غضب اور ناراضگی نہیں ہے بلکہ تادیب و تعلیم ہے۔ اسی تادیب کا یہ اثر ہوا کہ نزولِ سورت کے بعد حضور والا فوراً نابینا کے گھر تشریف لے گئے۔ ان سے معذرت کی۔ ساتھ لے کر نبوت خانہ پر آئے۔ چادر مبارک بچھائی ان کو بٹھایا۔ اس کے بعد اگر کبھی وہی نابینا خدمتِ گرامی میں حاضر ہوتے تو آپ ان کی بڑی عزت و تعظیم کرتے اور فرماتے خوش آمدی اے وہ شخص جس کے سلسلے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب کیا۔

جب ان سے ملاقات ہوتی تو فرماتے جو کام ہو کہو جو حاجت ہو ظاہر کرو۔ باوجود ان کے نابینا ہونے کے اپنی غیر حاضری کے زمانے میں مدینہ کے اندر اپنی جگہ نماز کی امامت دو مرتبہ ان کے سپرد فرمائی اور اپنا قائم مقام بنایا۔ یہ بھی مروی ہے کہ اس قصے کے بعد حضور والا کسی فقیر غریب کی طرف سے چیں بجبیں نہیں ہوتے تھے اور کسی مصلحت کے تحت بھی کسی سردار اور امیر کو مرکزِ توجہ نہیں بناتے تھے۔ یہ تھا وہ عتاب جس سے حضور والا کا مرتبۂ تمکین پر فائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ حقیر لغزش جس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ کو اپنے حبیب کی کتنی دست گیری منظور تھی اور آپ سے خدا کو کیسی انتہا محبت تھی۔

چند توہمات

اہلِ تفسیر اس جگہ مختلف توہمات کا شکار ہوئے ہیں۔ ان توہمات کو شبہات کہیے یا خدشات یا نفس کے وسوسے۔ اس سے زیادہ کسی لقب کے یہ مستحق نہیں ہیں۔ ہم نمبر وار تفصیلی طور پر اہلِ شبہات کے شبہات کو بیان کرتے ہیں:

(۱) رسول اللہ ؐ نے کوئی حرکت خلافِ شرع نہیں کی۔ پھر یہ عتاب کیوں ہوا۔ شرعی ضابطہ ہے کہ عمومی نفع خصوصی فائدہ پر ترجیح رکھتا ہے۔ حضور کے پیش نظر اکابر قریش کا اسلام تھا اور سرداروں کے مسلمان ہونے کے بعد تمام قریش بلکہ کل اہلِ مکہ کے مسلمان ہو جانے کی اُمید تھی اور نابینا کو چند صورتیں پڑھانے کا فائدہ عمومی نہ تھا۔

(۲) غرضِ اسلام تعلیمِ قرآن سے مقدم ہے۔ فقہاء کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلام کی خواہش کرنے والا قرآن کی تعلیم کے خواستگار سے مقدم ہے اس لئے حضور ؐ نے کوئی ناروا حرکت خلافِ شرع نہیں کی۔

(۳) نابینا کی بے محل مداخلت سے حضور کی ناگواری فطری اور غیر اختیاری تھی۔ پھر عتاب کیوں کیا گیا۔ غیر اختیاری فعل کا مکلف کرنا تکلیف مالا یطاق ہے جو ناممکن ہے۔

(۴) چیں بہ جبیں ہونا اور منہ پھیر لینا یا کشادہ ہو کر متوجہ ہونا نابینا کے لئے برابر ہے۔ اس کو مخاطب کی نہ ترشروئی دکھتی ہے نہ شکنِ پیشانی۔ پھر کس جرم کی بناء پر یہ عتاب ہوا۔

(۵) حضور والا کو اس وقت اس فعل کا عدمِ جواز اور ممنوع ہونا معلوم نہ تھا۔ اگر بالفرض غلطی کی تھی تو مصلحتِ اسلامی کی خاطر محض اجتہادی۔ نص میں اس سے پہلے تو کوئی ممانعت وارد ہی نہیں ہوئی تھی پھر ابتداءً ممانعت میں اتنی خفگی کا کیا سبب۔

ازالہ۔ تمام توہمات کو دور کرنے کے لئے ہم اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

نابینا نے کچھ نہیں دیکھا نہ ترش روئی نہ طلاقتِ وجہ۔ لیکن دوسروں نے پیشانی کے بل دیکھے ان کو تو یہ رائے قائم کرنے کا موقع ملا کہ رسول اللہ ؐ کی نظر میں غربت بے اعتنائی کی مستحق ہے اور دنیوی عزت و مرتبت جاذب اور دلکش ہے۔ رسول اللہ کے خیال میں بھی فقیر خواہ وہ کتنا ہی طلب گارِ حق ہو منہ لگانے کے قابل نہیں ہے۔ اور دولت مند مغرور خواہ کیسا ہی منکر معاند ہو رسول اللہ کی توجہ کا مرکز بننے کے اہل ہے۔ حالانکہ بعض خاکساروں اور فقیروں کے دلوں میں جو نورِ ایمان روشن ہے اس سے بکثرت دولت مند پرستار دنیا محروم ہیں۔ سب باتوں کے علاوہ یہ بات تو بالکل ہی ظاہر ہے کہ ترش روئی اور اندرونی احساسِ ناگواری سے اللہ تو واقف تھا وہ اپنے حبیب کو کیسے اس لغزش میں آزاد چھوڑ دیتا کیا وہ اپنے رسول کا سب سے بڑا مددگار نہ تھا۔ کیا اس کو اپنے حبیب سے سب سے زیادہ محبت نہ تھی۔ اگر بروقت عتاب نہ ہوتا تو کیا خلقِ عظیم پر دھبہ نہ آجاتا۔ حقیقت میں نہ یہ گناہ تھا نہ تقصیر۔ مصلحتِ اسلامی بھی جس تبلیغ تھی۔ فرض میں انہماک تھا مگر ہر جائز چیز ہر ایک کیلئے تو جائز نہیں ہوتی۔ گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ حسنات الابرار سیأت المقربین۔ مشرعِ اسلام

میں ایسی چیزوں کا جواز ہے سہولت پسندوں کے لئے ۔ یہ افعال ناقابلِ مواخذہ ہیں دوسروں کے لئے پیغمبر کی ذات تو بہت اونچی ہے بخلاف حکم قدم اٹھانا تو درکنار قبل از حکم پلک مارنا بھی وہاں قابلِ گرفت ہے ۔ ادب شناسانِ حریمِ قدس کے آداب دوسرے ہیں اور مہجورانِ بارگاہ کے لئے سہولت آفرینیاں جدا ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۔ دونوں صیغوں کی ضمیریں رسول اللہ کی طرف راجع ہیں ۔ اظہارِ عتاب کے لئے آغازِ کلام میں خطاب نہیں فرمایا بلکہ آغاز کے صیغے استعمال کئے ۔ دونوں صیغوں میں جدا جدا حالت کا بیان حضور نے اوّل ترش روئی کا اظہار کیا تھا نابینا کی مزید مداخلت پر بالکل ہی منہ پھیر لیا تھا ۔

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى یہ فعل سابق کی علت ہے ۔ یعنی نابینا کے آنے کی وجہ سے ترش روئی اور روگردانی کی ۔ رازی اور خطیب نے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے دل میں خیال کیا کہ اس وقت اس نابینا کو دیکھ کر یہ سردار سمجھیں گے کہ محمدؐ کے پیرو ایسے ہی اندھے دُھندے لوگ ہیں ۔ یہ خیال کر کے آپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے انتہی ۔ ممکن ہے کسی روایت میں ایسا آیا ہو ۔ میری نظر سے کوئی روایت اس مضمون کی نہیں گزری ۔ یہ نابینا کون بزرگ تھے ۔ اکثر روایات میں ان کا نام عبداللہ آیا ہے ۔ اور ابن ام مکتوم کنیت تو باتفاقِ اہلِ روایت منقول ہے ، لیکن قسطلانی میں ابن ام مکتوم کا نام عبداللہ یا عمرو کہا ہے ۔ یعنی نام میں تردد ظاہر کیا ہے ۔ صحیح بخاری میں عمرو آیا ہے ۔ ان کے باپ کا نام عام طور پر شریح مشہور رہے ۔ لیکن صاحب قسطلانی نے زائدہ لکھا ہے ۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۔ تم کو اس کی حالت کا کیا علم ۔ تم اس کے مرتبے کو کیا جانو ۔ اس کے پاکیزہ ہونے کی تو (واقعی) امید ہے یعنی تم کو واقعی امید رکھنی چاہیئے یا امید رکھنی چاہیئے تھی کہ وہ نابینا پاک دل پاک نفس اور پاکیزہ کردار ہو جائے گا ۔

حضرت عبداللہ کے پاکیزہ ہو جانے کی یہ پیشین گوئی ہے جو یقینی ثابت ہوئی ۔

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى گزشتہ آیات میں پاکیزہ ہونے کی امید دلائی تھی ۔ یعنی ممنوعات سے باز رہنے کی طرف اشارہ تھا ۔ اس آیت میں نصیحت پذیر ہونے اور نصیحت کے مفید ہونے کا ذکر ہے یعنی اطاعت کرنے اور احکام کو بجا لانے کی طرف اشارہ ہے (رازی) مراد یہ کہ نابینا کے متعلق آپ کو کچھ معلوم نہیں ۔ شاید وہ ممنوعات سے اجتناب کرے اور مامورات کو ادا کرے اور اس طرح اس کی زندگی سدھر جائے ۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى جو مستغنی رہتا ہے آپ اس کے ہدایت کرنے کے در پے ہوتے ہیں یعنی جو ایمان سے (عطاء) یا اللہ سے (کلبی) استغناء کرتا ہے یعنی مال کے نشہ میں بست ہے اس کو نہ ایمان کی رغبت اور کشش نہ خدا کی ضرورت ۔ آپ ایسے آدمی کو ہدایت کرنے کے در پے ہوتے ہیں باوجودیکہ

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۔ اگر وہ ہدایت یاب نہ ہو اس کا عقیدہ پاک اور کردار ستھرا نہ ہو تو آپ کا اس سے کچھ نقصان نہیں یعنی آپ سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی ۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى یعنی اللہ سے ڈرتا ہوا دل میں خشیۂ الٰہی لے کر انتہائی محبت کے ساتھ آپ کے پاس آتا ہے فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى تو آپ اس کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ۔ دوڑتے ہوئے آنے سے مراد بطور کنایہ انتہائی رغبت سے آنا ہے اور ڈرنے سے مراد یہ ہے اللہ سے ڈرنا ۔ چند مفسروں نے کافروں سے ڈرنا مراد لیا ہے ، مگر یہ سیاقِ کلام سے بعید ہے ۔ بعض نے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ مراد لیا ہے ۔ کیونکہ نابینا کے آنے کا بیان ہے اور ٹھوکر کھانے کا خوف اس کے لئے لازم ہے ۔ یہ مراد اگرچہ واضح ہے ، لیکن کچھ زیادہ لطیف نہیں ۔

كَلَّآ ایسا ہرگز نہ کرنا یعنی آئندہ اس قسم کے اخلاق سے باز رہنا ۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ آیاتِ قرآنی تو ایک یادداشت اور نصیحت نامہ ہیں ۔ برے انجام سے ڈراتی ہیں ۔ اچھے برے اور حق و باطل کا ان میں ذکر ہے ۔ کسی پر جبر نہیں کرتیں ۔ نہ کسی کو زبردستی روکتی ہیں اپنا اپنا اختیار رہے جو چاہے نصیحت مانے ۔ مقصد یہ کہ آپ کا کام احکامِ قرآنی پہنچا دینا ہے ۔ اور سننے والے کا فرض ان کو ماننا اور عمل کرنا ہے ۔ جب آپ نے آیاتِ قرآنیہ کی تبلیغ کر دی تو آپ کا فرض پورا ہو گیا ۔ اب جس کا جی چاہے مانے نہ جی چاہے نہ مانے ۔ نتیجہ اس کو خود برداشت کرنا ہوگا ۔

فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ ۔ یعنی آیاتِ قرآن مجید عزت والے صحیفوں میں ہیں یعنی لوحِ محفوظ سے صحیفوں میں منقول ہیں (خطیب) یا یہ مطلب ہے کہ قرآن مجید کی آیات یعنی ان کے مضامین انبیاء سابقین کے صحیفوں میں مذکور ہیں ۔ ایک اور آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ فرمایا ہے اِنَّ ہٰذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراہیم وموسیٰ ۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کی بعض آیات کے مشترک مضامین گزشتہ انبیاء کے صحیفوں میں مذکور تھے ۔ کل آیات کا مذکور ہونا ضروری نہیں ۔ کیونکہ بعض آیات کا قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہونا صحیح روایات میں آیا ہے جیسے سورۂ بقرہ کی آخری آیات ۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ قٓ سے آخر تک تمام مفصلات ۔ گویا قرآن ان مضامین ہدایت کو بھی جامع ہے جو گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں تھا اور ان کے علاوہ مزید آیات بھی اس میں موجود ہیں ۔ مرفوعۃ سے مراد ہے عالی قدر (ابن جریر) یا ساتویں آسمان میں بلند (واحدی)

مطہرۃ ۔ پاک کردہ یعنی شیاطین کے چھونے سے محفوظ ۔ (ابوالسعود ۔ سراج) یا یہ مراد کہ ان کو پاک ملائکہ ہی چھوتے ہیں ، اس لئے یہ بھی پاک ہیں (قفال) یہ مطلب غیر واضح ہے ۔

بایدی سفرۃٍ ۔ سفرۃٌ مسافر کی جمع ہے اور مسافر اسم فاعل ہے ۔ اس کا مصدر سفر ہے ۔ سفر کا معنی کھول دینا ۔ مسافر کاتب کو بھی کہتے ہیں ، اور درمیانی سفیر کو بھی ۔ زجاج ۔ مجاہد ۔ قتادہ ۔ مقاتل اور حضرت ابن عباس کے نزدیک اس جگہ مسافر کا معنی کاتب ہے اور مراد ملائکہ ہیں (جنھوں نے لوحِ محفوظ سے صحیفوں میں نقل کیا) فراء نے کہا مسافر کا معنی سفیر ہے اور اس جگہ ملائکہ ہی مراد ہیں کیونکہ اللہ کی وحی انبیاء پر کھول دیتے ہیں (اختیار ابن جریر) وہب ابن منبہ کے نزدیک صحابۂ کرام مراد ہیں ۔ قتادہ کا ایک قول منقول ہے کہ قرآن پڑھنے والے مراد ہیں ۔ اول قول قوی ترین ہے ۔ ابوالسعود نے مؤخر الذکر دونوں قولوں کو کمزور قرار دیا ہے ۔

کِرامٍ بررۃٍ ۔ کرام عزت والے یعنی اللہ کے نزدیک بَرَرَۃٌ بارٌّ کی جمع ہے یعنی فرماں بردار (مقاتل)

مقصودِ بیان

پورے قصے میں عبرت کے خزانے پوشیدہ ہیں ۔ اُن دولت مندوں کے لیے جو اپنی دولت کو معیارِ برتری جانتے اور غریبوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اُن حاکموں کے لئے جو حکومت کے نشے میں بدمست ہو کر رعایا کو ذلیل خیال کرتے اور اپنی بداعمال ہستیوں کو فوق الانسانیت قرار دیتے ہیں اور ان خاندان پرستوں کے لئے جنہوں نے کسی بڑے بادشاہ یا جلیل القدر ولی یا عالی مرتبہ نبی کی اولاد اور نسل میں ہونے کے سبب اپنے کنبے اور قوم کو تمام انسانوں کا تاجِ سر سمجھ رکھا ہے جو دوسری قوموں کو اپنی قوم کے مقابلے میں پرِکاہ سے بھی زیادہ حقیر سمجھتے ہیں ۔ خواہ وہ اور ان کی ساری قوم جاہل ہو ، قاتل ، غارت گر اور خون ریز ہو ، سود خوار اور بداعمال ہو مگر وہ غیر قوم کے عالم باعمل کے مقابلے میں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور ان تندرست اور توانا انسانوں کے لئے جو بیماروں اور کمزوروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور اُن دنیا پرست مولویوں اور درویشوں کے لئے جو اپنی نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر محض دنیوی جاہ و منصب یا مال و دولت کے حصول کی خاطر بدکردار امیروں اور دہریت پسند بدطینت حاکموں کے دروازوں کو درگاہ بنائے رہتے ہیں اور کمزور حق پرستوں کی طرف کوئی رُخ نہیں کرتے ۔ اور اس کا نام خلق اسلامی رکھتے ہیں ۔

وما یدریک کا لفظ رسول اللہ ﷺ سے علم غیب کی نفی کر رہا ہے ۔ لعلہ یزکّٰی میں عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے مومن پاک ہونے کی پیشین گوئی بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کو امید بھی دلائی ہے

وما علیک میں صراحت ہے کہ پیغمبر کا کام کسی کو مومن بنانا نہیں ۔ پیام پہنچانے کے بعد اگر کوئی اپنی حالت درست نہیں کرتا تو نبی سے اس کی بازپرس نہ ہوگی ۔ تذکرۃ کا لفظ بتا رہا ہے کہ قرآن کوئی جبری دستور العمل نہیں بلکہ اصلاحات کا مجموعہ اور موعظت نامہ ہے فمن شاء سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ نے انسان کو اختیار کی آزادی دی ہے ۔ عمل خیر کی قوت سلب نہیں کی ۔

فی صحف میں اگر صحف سے مراد صحف انبیاء رسول لو تو صراحت ہوگی اس بات کی کہ آیاتِ قرآنیہ کے مضامین انبیاء سابقین کے صحیفوں کے منافی نہیں ہیں وغیرہ ۔

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝ مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝

آدمی پر (جو ایسے تذکرہ سے کچھ حاصل نہ کرے) خدا کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ نے اسکو کیسی حقیر چیز سے پیدا کیا نطفہ سے اُس کی صورت بنائی پھر اس کے

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۝ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ۝ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ ۝

اعضاء کو بنایا پھر اسکو نکلنے کا راستہ آسان کر دیا پھر اس کو موت دی پھر اسکو قبر میں لے گیا پھر جب اللہ چاہے گا اسکو دوبارہ زندہ کر دیگا ہرگز (شکر) نہیں کیا اللہ کا حکم بجا

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝

نہیں لایا سو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے اللہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا

فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً

پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ

وَأَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ۝ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ

پیدا کیا (بعض چیزیں) تمہارے اور تمہارے مواشی کے فائدے کے لئے پھر جس وقت کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی سے اپنی

أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ

سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی سے ہمدردی نہ کرے گا) ان میں ہر شخص کو ایسا مشغلہ ہوگا جو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا

شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌ

بہت سے چہرے اُس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن اور (مسرت سے) خنداں و شاداں ہوں گے اور بہت سے چہروں پر اس روز

يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

(کفر کی وجہ سے) ظلمت ہوگی (اور ظلمت کے ساتھ) ان پر (غم کی) کدورت چھائی ہوگی یہی لوگ کافر فاجر ہیں۔

رکوع ۵

تفسیر کائنات عنصری کا ہر فرد جب تک نیستی اور ہستی کے تمام غیر معلوم مدارج طے کر لیتا ہے تو اپنی نوعی حدود میں داخل ہو کر شخصیت اور انانیت کا لباس پہن کر نمودار ہوتا ہے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ کسی درخت اور سبزہ کا نیستی سے ہستی کی طرف خروج کیسے ہوتا ہے۔ اول وہ نامعلوم ان گنت مدارج انقلاب طے کرتا ہے اور چونکہ وہ نامعلوم اور غیر محصور ہیں اس لئے اُن پر غور کرنا بے سود ہے۔ ہاں صرف قریب ترین مراتب عدم و وجود کو دیکھو جو کسی سبزہ کی نمود کے لئے کار فرما ہیں۔ پانی کا برسنا اور زمین کی رگوں میں پیوست ہونا دن رات کا مشاہدہ ہے۔ پھر مٹی کا پھولنا۔ خاک اور پانی کا باہم آمیز ہونا پھر زمین کا پھٹنا اور سبزہ کا نمودار ہونا۔ پھر اُس کا زمین پر پھیلنا یا ڈنڈی، تنہ اور ساق بن کر سربلند ہونا اور سایہ دار ثمر آور درخت بن جانا ناقابل انکار ہے۔ گھاس ہو یا درخت سب کا مادہ ایک قوت نامیہ ایک محل پیدائش ایک طریقہ تولید ایک۔ ان تمام ابتدائی مراحل میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی کو کسی پر

فضیلت نہیں ۔ نہ کمزور کو طاقتور پر نہ بدصورت کو خوبصورت پر ، نہ سربلند درخت کو خاک نشین گھاس پر نہ سایہ دار کو بے سایہ پر ۔ اگر ایک کو دوسری پر برتری حاصل ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ تخلیقی غرض کو کون کامل طور پر پوری کر رہا ہے ، کون نظامِ فطری کا صحیح طور پر جزو ہے اور کون اس مشینری کا عامل نرین پرزہ ہے ۔ اگر کوئی سبزہ یا درخت انسان اور مویشیوں کے کام کا نہ ہو ، حیاتِ حیوانی کو باقی رکھنے کی خدمت انجام نہ دے رہا ہو وہ بدترِ ذلیل ہے ۔ کم رتبہ ہے اور جو انسان اور مویشیوں کے کاروانِ حیات کو چلانے میں مددگار ہو وہ برتر افضل ہے ۔ کس نسل و خاندان کا درخت ہے ، کس زمین پر قائم ہے ، کس ملک میں واقع ہے ، کس صورت اور قوت کا حامل ہے ، گھاس ہے یا بانس ، نخلِ کھجور ہے یا درختِ انگور ، زیتون ہے یا کسی دوسرے پھل کا پودا ۔ الغ تمام خصوصیات کو خلقی برتری میں کوئی دخل نہیں ۔ وجہِ فضیلت صرف اطاعتِ خلق ہے یا اطاعتِ فطرتِ خالق ۔

یا مثلاً یوں سمجھیے کہ دنیا میں انسان کے لئے ان گنت درجاتِ انقلاب طے ہونے ضروری ہیں حالتِ نطفہ سے پہلے کے احوال لامحدود اور نامعلوم ہیں ۔ عنصرِ بسیط سے لے کر باپ کے اندر نباتی اور حیوانی تغذیہ تک بلکہ باپ کی رگوں میں خون پیدا ہونے تک کتنے احوال کا انقلاب ہوا اور نیستی و ہستی کی کتنی کشاکش ہوئی اس کو کوئی نہیں جانتا ۔ ہاں ابتدا از نطفہ سے پیدائش کے بعد تک کے ترتیبی مدارج کو سمجھا جا سکتا ہے ۔ حضرت آدم کی اولاد (علاوہ حضرت عیسیٰ کے) سب کی سب نطفہ سے بنی اور ہر شخص کی تخلیق شخصی ایک اندازۂ علمی کے تحت ہوئی ۔ جب نطفہ بن کر مضغۂ گوشت بن کر انسانی پتلے کے خدوخال سے منقش ہو کر تیار ہو جاتا ہے تو اس میں روحِ حیات ڈال دی جاتی ہے اور اللہ اس کے باہر آنے کا راستہ سہل کر دیتا ہے ۔ جب وہ باہر آ جاتا ہے تو حصولِ غذا کا طریقہ اس کو بتا دیتا ہے ۔ پھر جب اور بڑھ جاتا ہے تو اچھے برے میں کسی قدر تمیز کرنے کے لئے اس کو شعور عطا کر دیتا ہے ۔ جب جوان ہو جاتا ہے تو سمجھنے والی دانش اور آلاتِ فہم درست کر دیے جاتے ہیں ۔ ترقی کے یہ تمام ذرائع ہر شخص کو اللہ ہی سکھاتا ہے ۔ اللہ کی اس عطا میں کوئی تمیز نہیں ۔ ہر آدمی مالدار ہو یا نادار ، بادشاہ ہو یا فقیر ، طاقتور ہو یا ضعیف خوبصورت ہو یا بدصورت غرض کسی خاندان سے ہو کسی ملک کا رہنے والا ہو ، کوئی زبان بولتا ہو ، اعضاءِ جسمانی مکمل رکھتا ہو یا نامکمل ۔ بہرحال ہر آدمی کو ان تدریجی مراتبِ آفرینش سے گزرنا ہوتا ہے ۔ اس لئے تخلیق کے لحاظ سے کسی کو کسی پر برتری نہیں ۔ اصل وجہِ فضیلت یہ ہے کہ افرادِ انسانی کی تخلیق کی غرض کو حاصل کیا جائے ۔ انسان کو بیکار نہیں پیدا کیا گیا اس کی تخلیق کی غایت ضرور ہے ۔ آدمی کو جس خصوصیت کی وجہ سے آدمی کہا جا سکتا ہے وہ علم و عمل کی پاکیزگی سے عقل کی پختگی اور کردار کی نظافت ہے ۔ روح کی صفائی اور اطوارِ حیات کا ستھراپن ہے جس میں یہ اوصاف ہوں وہ خواہ فقیر بے نوا ہو ، اپاہج اور معذور ہو ۔ خستہ حال ہو اور شکستہ بال ہو تب بھی اس کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ اور جو صفاتِ مذکورہ سے عاری ہو خواہ وہ ذی شان سردار ہو ، فیل تن پہلوان ہو ، صحت مند جوان رعنا ہو ، مال دار قارون ہو ۔ کچھ بھی ہو اس کی دنائت ، ذلت ، رذالت اور پستی مرتبہ میں شبہ نہیں ۔ اول الذکر اشخاص اہلِ حق کے مرکزِ توجہ بننے کے مستحق ہیں ۔ اور مؤخر الذکر گروہ چونکہ منکرِ حق ہے اور خودساختہ ضوابطِ برتری کے نشہ میں مدہوش ہو کر ہادیٔ برحق کی ہر ہدایت سے اپنے کو مستغنی جانتا ہے ، اس لئے اہلِ حق کے لئے وہ ناقابلِ اعتناء ہے ۔ اس گروہ نے اپنی انسانیت کو خود قتل کر دیا اور حیاتِ حیوانی پر ہی ریجھنے لگا ۔ تخلیقِ انسانی کی اصل غرض سے منکر ہو کر جزا سزا سے بے نیاز ہو گیا ۔ اس کو انکار ہے حق و باطل اور خیر و شر کے فیصلے کے دن کا یقین نہیں رکھتا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ دھن دولت بیوی بچے دوست عزیز کنبہ قبیلہ کوئی کام نہ آئے گا ۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہو گی چہرہ کی شگفتگی اور چمک یا افسردگی ، پژمردگی اور سیاہی کردارِ حیات کے مطابق ہو گی ۔ کوئی شگفتہ رو ہو گا پُرمسرت زندگی کا حامل ۔ کوئی سیاہ رو ہو گا الم و عذاب میں مبتلا ہو گا ۔

تحلیلِ اجزاء

قُتِلَ الْإِنْسَانُ ۔ الانسان سے مراد کافر ہے ۔ کلام خبری ہے ، لیکن مقامِ انشاء میں بولا جاتا ہے ۔ مارا گیا کافر یعنی مارا جائے ۔ ابوالسعود اور بعض دوسرے اہلِ تفسیر نے لکھا ہے یہ سخت دعا ہے ، لیکن یہ بددعا وہ کرتا ہے جو عاجز ہو اور اللہ عاجز نہیں ہر طرح کے انتقام پر قادر ہے ، اس لئے اس جگہ بددعا حقیقتاً مراد نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ محاورۂ عرب کے موافق کافر کی بدبختی ظاہر کرنے کے لئے اس کو استعمال کیا گیا ہے ۔ اسی لئے حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور ابومالک نے بھی اسی کو پسند کیا ہے کہ اس جگہ کافر کا ملعون ہونا ظاہر کیا ہے ۔ خطیب نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے زاویہ ہے کہ کافر عذابِ الیم کے قابل ہے ۔

اس فقیر کے خیال میں مناسب تشریح یہ ہے کلام جس طرح لفظاً خبری ہے اسی طرح اس کو معنوی حیثیت سے بھی خبری کہا جائے اور انشاء نہ قبول کیا جائے کہ بددعا کا معنی ہو اور تاویل کی ضرورت پڑے ۔ مطلب یہ ہوگا کہ کافر قتل کر دیا گیا یعنی اس کی انسانیت قتل کر دی گئی ۔ اس کے اندر صرف حیوانیت باقی ہے ۔ وہ مُردہ انسان ہے ۔ اگرچہ حیوانی لحاظ سے زندہ ہے کیونکہ وہ اپنی حیوانیت پر مغرور ہے ۔ اپنی غرض تخلیق سے غافل ہے ۔ نہ اس کے افکار میں صحت ہے نہ اعمال میں پاکیزگی ۔ وہ جزا سزا سے اپنے کو بے نیاز جانتا ہے ۔ انسان کی تخلیقی بے بسی ظاہر ہے جس کو آگے آیت من نطفۃ سے انشرہ تک بیان کیا ہے اور بقاء حیات کے لئے فراہمی غذا کی ضرورت ہے اور انسان تخلیق غذا سے بھی عاجز ہے اس مضمون کو آیت فلینظر الانسان سے والانعامکم تک اشارہ کیا گیا ہے ۔ ان تمام مراحل سے جس طرح انسان کی بے بسی اور اللہ کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے ۔ اسی طرح جزا سزا کی ضرورت اور ثبوت قیامت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان براہین فطرت سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ یوم الفصل ضرور آئے گا اور انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس ہوگی ۔ اگر کوئی شخص ایسی کھلی حقیقتوں کا انکار کرے تو اس کو انسان ہی نہیں کہا جا سکتا ۔ وہ مُردہ انسان ہے ۔ انسانی خصوصیت سے بے بہرہ انسان ۔ کھانے اور چرنے کا دلدادہ حیوان اور حیوانی قوتوں پر ریجھنے والا حیوان ۔ واللہ اعلم ۔

ما اکفرہ کا ۔ ابن جریج ، خطیب اور اکثر مفسروں نے لکھا ہے کہ یہ فعل تعجب ہے ، لیکن اللہ کے لئے کوئی بات عجیب نہیں ۔ پھر اس کے تعجب کرنے کا کیا معنی ۔ اس لئے لیطار تاویل کہا جائے گا کہ اللہ خود تعجب نہیں کرتا بلکہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کافر کا کفر واقع میں تعجب انگیز ہے ۔ نفسی اور آفاقی دلائل سب کی سب ایمان کی دعوت دے رہی ہیں ، مگر ان سب کی طرف سے کافر کا آنکھیں بند کر لینا اور کفر پر جما رہنا اہل دانش کے لئے اچنبا پیدا کرنے والا ہے ۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ شاید یہ کلمۂ تعجب نہ ہو بلکہ لفظاً استفہامیہ ہو اور اکفر ماضی کا صیغہ ہو یعنی کس چیز نے کافر کو کفر پر آمادہ کیا ۔ کافر کو کافر بنانے والی کیا چیز ہے ۔ شواہد کائنات تو ایمان کی دعوت دے رہے ہیں پھر کفر کا کیا باعث ہے ۔ بغوی نے تفسیر معالم میں اس قول کو مقاتل اور کلبی کی طرف منسوب کیا ہے ۔

من ای شئ خلقہ من نطفۃ اس جگہ سے اللہ اپنی قدرت محیط اور انسان کی تخلیقی بے بسی اور مساوات کو نمایاں فرماتا ہے ۔ ایک قطرہ کو ترقی دے کر پیر فرتوت کے درجہ تک پہنچانا اور اس درمیانی دور میں تمام مراحل شعوری و غیر شعوری کو فطری طور پر طے کرانا پھر آخر میں بے جان بنا کر قبر میں پہنچانا ، اللہ کی ہمہ گیر قدرت پر بھی دلالت کرتا ہے ۔ اور آدمی کی تخلیقی لاچارگی پر بھی اور اس امر پر بھی کہ ہر انسان پیدائش اور مدارج شعور و عدم شعور طے کرنے اور آخر تک پہنچ کر مرنے میں برابر ہے ۔ نہ اس سے مالدار اور حاکم ذی استعداد مستثنیٰ ہے نہ جوان پیل تن نہ فلک پیما دانشور ۔ نہ حسین رشک قمر ۔ اس لئے وجۂ فضیلت نہ دولت ہے نہ حکومت نہ جسمانی طاقت نہ نسلی شرافت بلکہ برتری پیدا کرنے والی اور عزت عطا کرنے والی چیز حکم الٰہی کے مطابق فکر صحت اور عمل کی پاکیزگی ہے ۔

آیت میں پہلے سوال کیا گیا ہے کہ جانتے ہو کس چیز سے اللہ نے انسان کو بنایا ہے پھر خود ہی جواب دیتا ہے ایک بوند سے بنایا ہے ۔ یہ طرز کلام ایک بلیغانہ طریقۂ ادا ہے ۔ اللہ کو استفہام کی ضرورت نہیں ۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ۔ اس نے تو خود ہی بنایا ہے وہ خود جانتا ہے کہ کس چیز سے بنایا ہے ۔ حقیقت میں انسان کو متنبہ کرنا مقصود ہے تاکہ وہ سمجھے اور غور کرے کہ دولت ، ثروت ، حکومت ، صحت ، طاقت اور شرافت پر مغرور ہونا بے حقیقت ہے ۔ ایک بے جان بوند کی بساط ہی کیا ہے ۔ وہ خلقی طور پر کمتر ہی کیا کہ غرور کرے ۔ یہ تمام انعامات تو خداداد اور عارضی ہیں پھر بیوقوف آدمی کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جس اللہ نے نیست سے ہست کیا اور پھر ترقی دے کر حد کمال پر پہنچا کر وہی بے جان کر دیتا ہے ۔ کیا وہ پھر جاندار نہیں بنا سکتا ۔

خلقہ فقدرہ ۔ ایک بوند سے آدمی کو بنایا پھر ایک خاص اندازہ اس کے لئے مقرر کیا ۔ یعنی نطفہ سے لوتھڑا پھر بوٹی پھر ہڈیاں وغیرہ مدت مقررہ بہ تدریج ترقی دی (فراء) یا یہ مراد کہ اس کو ہمواری اور جسمانی درستگی عطا کی (زجاج) یا یہ مطلب کہ نطفہ سے انسان کو بنایا اور اس کے ہر عضو کا ایک خاص اندازہ کیا اور ہر عضو کے لئے جو کیفیت مناسب اور جو حالت اس کی مصلحت کے موافق تھی عطا فرمائی (رازی)

ثم السبیل یسرہ پھر آدمی کے لئے راستہ آسان کر دیا یعنی پیٹ سے باہر آنے کا راستہ بتا دیا اور اس کو توفیق دی کہ فطری طور پر وہ عالم شہود میں آ جائے (حضرت ابن عباس ، عکرمہ ، ضحاک ، قتادہ ، ابو صالح ، سدی ، دا مختارہ ابن جریر الطبری) یا یہ مراد کہ زندگی گزارنے کا اچھا برا راستہ جس کے لئے آسان کر دیا ۔

دونوں راستوں پر چلنے کی اس کو طاقت عطا کر دی ۔ اسی مطلب کو دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے انا ہدیناہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا ۔ ایک اور آیت میں آیا ہے وہدیناہ النجدین یعنی خیر و شر میں تمیز کرنے کا راستہ ہم نے انسان کو بتا دیا اور ہر راستے پر چلنے کی اس کیلئے آسانی کر دی۔ (مجاہد، حسن بصری، عبدالرحمٰن بن زید۔ واختارہ ابو مسلم و ابن کثیر)

ثم اماتہ فاقبرہ پھر انسان پر موت مسلط کی اور اس عالم میں پہنچایا اور دنیوی اور قیامت کے درمیان ہے ۔ اَقْبَرَہٗ کا لفظی ترجمہ ہے اس کو قبر میں دفن کرایا ۔ اور ظاہر ہے کہ ہر کافر بلکہ ہر مسلم بھی اس قبر میں دفن نہیں کیا جاتا یا نہیں کیا جا سکتا ہے جس کو ہم قبر کہتے ہیں، اس لئے قبر سے مراد ہوگا عالم برزخ جو قیامت سے پہلے اور اس زندگی کے بعد ہے یا قبر سے مراد ہوگا جوف زمین ۔ کیونکہ ہر شخص مرنے کے بعد جوف زمین میں ضرور چلا جاتا ہے خواہ اس کو جلا کر ہوا میں اڑا دیا جائے یا کسی درندے کی خوراک بن جائے یا سمندر میں ڈوب کر گل سڑ جائے ۔ بالآخر اس کے تحلیل شدہ اور انقلاب یافتہ اجزاء کو زمین میں پہنچنا پڑتا ہے ۔ وقتِ پیدائش سے آخری لمحۂ حیات تک زندگی کا تسلسل موت کے نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اگر موت نہ ہوتی تو یہ تسلسل ختم نہ ہوتا ۔ اور عمل کی دنیا ختم ہو کر دارالجزاء میں آدمی کو کبھی داخلہ نہ ملتا ۔ موت سفرِ حیات کا خاتمہ ہے اور عالم برزخ میں داخل ہونے کا دروازہ ۔ مرنا اور عالم برزخ میں پہنچنا صرف غریب، نادار، لاچار، بیمار اور فقیر، شکستہ حال کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ بلکہ اس شکاری سے بچانے والی نہ دولت ہے نہ حکومت نہ جسمانی طاقت نہ جاہ و حشم اور خیل و خدم، اس لئے ان چیزوں پر ریجھنا اور فخر و غرور کرنا اور ان لوگوں کو حقیر سمجھنا جو ان اشیاء سے محروم ہیں نہ مقتضاء دانش ہے نہ داعیۂ انسانیت ۔

ثم اذا شاء انشرہ ۔ پھر جب اللہ چاہے گا انسان کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا ۔ جب انسان کی آفرینش اللہ کے قبضہ سے باہر نہیں اور آغاز آفرینش سے وقت موت تک انسان اس کی قدرت سے خارج نہیں اور عالم برزخ میں پہنچ کر بھی اسی کے زیر حکم ہے تو یقیناً وہ جب چاہے گا پھر زندہ کر دے گا اور اس طرح دارالعمل سے نکال کر دارالجزاء میں پہنچا دے گا ۔

کلا ہرگز اس کافر کو نہ تکبر و غرور کرنا چاہیے نہ کفر و توحید و حشر کا انکار (حاصل اقوال بیضاوی و زمخشری و رازی) اس صورت میں کَلَّا کا تعلق بعد کو آنے والی آیت سے نہ ہوگا ۔ بلکہ کلام سابق سے ہوگا اور کفر و انکار سے باز داشت ہوگی ۔ شیخ ابن جریر اور شیخ جلال نے کَلَّا کو بعد والے کلام سے متعلق قرار دیا ہے لیکن ابن جریر نے اس صورت میں بھی کلا کو کلمۂ باز داشت کہا ہے یعنی بات اس طرح نہیں ہے کہ کافر اپنا فرض ادا کر چکا بلکہ ابھی اس نے حکم کو پورا نہیں کیا (یہ مطلب ضعیف ہے) شیخ جلال نے کَلَّا کو حَقًّا کا ہم معنی قرار دیا ہے یعنی یقیناً کافر نے امر الٰہی کو ادا نہیں کیا ۔

لما یقض ما امرہ مجاہد نے اس آیت کا مطلب بیان کیا ہے کہ انسان تمام فرائضِ الٰہیہ کو کبھی ادا نہیں کرتا ۔ معالم میں بغوی نے حسن بصری کی طرف بھی اسی تفسیر کی نسبت کی ہے، لیکن امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ یہ مطلب غلط ہے ۔ عام انسان کا اس آیت میں تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ الانسان یعنی کافر کا ذکر ہے ۔ استاذ ابوبکر بن فورک نے ایک لطیف مطلب بیان کیا ہے جو ندرت خیز ضرور ہے مگر ظاہر کے خلاف ۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے کافر کو ایمان اور ترک تکبر کا حکم دیا ہے مگر قضاء الٰہی یعنی اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لا سکتا ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے جس چیز کا حکم کافر کو دیا ہے (حکم تو دیا ہے مگر) قضاء الٰہی اس کے خلاف ہے ۔ اللہ ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ کافر حکم کے مطابق نہ کرے (کبیر) شیخ ابن کثیر نے واضح تفسیر کی ہے ۔ لکھا ہے کہ جب اللہ نے ثم اذا شاء انشرہ فرمایا تو کافروں کو خیال ہوا کہ قیامت کیسی اور روز جزا کب جو کچھ ہونا ہے ابھی ہو جائے تو اس خیال کو رد کرنے کے لئے فرمایا کلا یعنی عذاب و ثواب ابھی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ لما یقض ما امرہ جس کام کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو کرنے کا ابھی فیصلہ نہیں کیا یعنی حشر کا ارادہ حکم ضرور ہو گیا ہے، لیکن ابھی ایسے حالات نہیں کہ اس امر کو پورا کر دیا جائے ۔ ابھی نسل انسانی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا جتنے آدمیوں کا پیدا ہونا ضروری ہے ابھی وہ سب پیدا نہیں ہو گئے ۔ جب حیاتِ دنیا کا دور ختم ہو جائے گا تو حشر کا وقت آئے گا ۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ہم نے سوا اس تشریح کے سلف کا کوئی اور قول نہیں پایا یعنی تمام متقدمین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے ۔

فلینظر الانسان الی طعامہ ۔ خطیب اور رازی نے لکھا ہے کہ قرآن کا طرز استدلال یہ ہے کہ انسان کے اندر آیات قدرت کا بیان کیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ بیرونی شواہد کا بھی اظہار کرتا ہے ۔ اس طرح انفسی اور آفاقی دونوں قسم کی براہین قدرت کا بیان ہو جاتا ہے ۔ گزشتہ آیات میں انسان کی تخلیق جسمانی، زندگی اور موت سب کچھ بیان کر کے حشر جسمانی کو ثابت کیا تھا ۔ اور اسی ذیل میں انسان کی تخلیقی مساوات کے پیش نظر انسان کی خود ساختہ وجوہ فضیلت کا بھی ابطال ہو گیا

تھا۔ انھیں دونوں اغراض کے لئے اب طعامِ انسانی کی پیدائش پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ہر قسم کے پھل، پھول، اناج اور سبزہ کی پیدائش ایک حقیر ترین دانہ سے ایسی ہی ہے جیسے انسان کی پیدائش نطفہ سے۔ ان سب میں تخلیقی مساوات ہے۔ مدارج نمو و ذبول سب کو طے کرنے ہوتے ہیں نشوونما اور بالآخر موت سے سب کو واسطہ پڑتا ہے۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ ان کی افادیت غذائیت کے لحاظ سے ہے اور انسان کی فضیلت صحت نظر اور صلاحِ عمل کے لحاظ سے۔ یہ سب فاطر و خالق کے حکم کے مطابق امتثال مجسم ہیں، اس لئے انسان کو بھی اپنے خالق کی اطاعت کرنی لازم ہے۔ ان کے تمام تغیرات سے قادر کی ہمہ گیر قدرت کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے وہ خدا جو حقیر دانہ سے انسانوں اور چوپایوں کے لئے اربوں ٹن غذا عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ مردہ آدمی کو بھی دوبارہ پیدا کرسکتا ہے اور جس طرح ان اشیاء کی تخلیق سے مقصود انسان اور چوپایوں کو فائدہ پہنچانا ہے اسی طرح انسان کی پیدائش بھی رائیگاں نہیں۔ اس کی پیدائش کی بھی کوئی خاص غرض ہے یعنی اطاعت خالق جس کا ثمر آخرت میں ملے گا۔

طعام کا لفظ عام ہے، لیکن اس جگہ صرف غلہ اور پھل مراد ہیں۔ دودھ، دہی، گھی، مکھن، پنیر، گوشت وغیرہ کی پیدائش اسی غلہ اور فواکہ اور گھاس پات کی خوراک سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس جگہ مستقلاً ان کا بیان نہیں کیا۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۔ غذا کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ اول ابر سے اللہ پانی بہاتا ہے۔ اتنا برساتا ہے کہ بہا دیتا ہے۔ جب پانی زمین کی رگ رگ میں داخل ہو جاتا ہے اور مٹی نرم ہو جاتی ہے اور ایک خاص قوام تیار ہو جاتا ہے اور دانہ اندر پہنچ جاتا ہے۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۔ اور کونپل کا سر باہر نکلنا چاہتا ہے تو اللہ ایک خاص طرز کے ساتھ زمین کو پھاڑ کر کونپل کو باہر نکالتا ہے۔ اس طرح غلہ پیدا ہوتا ہے۔

وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۔ اور اللہ نے پیدا کئے انگور اور ساگ آدمیوں کے کھانے کا (ابن عباس، ضحاک، مقاتل، ابو عبیدہ، اصمعی، سدی، قتادہ، فراء) یا مویشیوں کا چارہ (مبرد، حسن بصری)

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۔ اور زیتون کے پھل اور کھجور کے درخت اور گھنے باغ (ابن عباس، مجاہد) یا سایہ دار درختوں والے باغ (حضرت ابن عباس کا ایک قول) یا اونچے درختوں والے باغ (ابن عباس کا قول بروایت علی بن ابی طلحہ) یا موٹے درختوں والے باغ (عکرمہ) یا کھجور کے موٹے درختوں والے باغ (فراء) یا کھجور کے موٹے اور اونچے درختوں والے باغ (حسن بصری، قتادہ)

وَّفَاكِهَةً ۔ اور ہر قسم کے تازہ پھل۔ امام رازی نے لکھا ہے اس آیت سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ انگور، زیتون اور کھجور وغیرہ کا شمار فواکہ میں نہیں ہو سکتا۔ ورنہ فاکہۃ کا عطف صحیح نہ ہوگا۔ معطوف معطوف الیہ سے مغائر ہوتا ہے، اس لئے یہ قول قریب صواب ہے۔ اس فقیر کی سمجھ میں یہ استدلال نہیں آیا۔ کیونکہ خاص کے بعد عام کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے بلکہ اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عام پر خاص کا عطف بھی ہوتا ہے۔ فواکہ کے چند اقسام کا ذکر کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں طرح کے پھل ہیں جو لذت یا غذائیت و لذت کے لئے مختلف ممالک میں کھائے جاتے ہیں، سب کا ذکر تو بہت دشوار اور نامناسب تھا۔ اس لئے چند اقسام کو ذکر کرنے کے بعد عام فواکہ کا اجمالی ذکر کردیا۔ فاکہۃ میں تنوین تکثیر اور عموم کے لئے ہے۔ جس میں ہر طرح کے پھل آگئے۔ خواہ انگور، زیتون و کھجور ہوں یا سیب، انار اور امرود یا کچھ او[ر]۔ پہلے خاص کو ذکر کرنے کے معنی یہ تو نہیں کہ اس کے بعد اگر عام کو ذکر کیا جائے تو خاص عام کے تحت مندرج نہ ہوگا۔ (واللہ اعلم)

وَّاَبًّا اور جانوروں کا چارہ (قول حضرت ابن عباس بروایات مختلفہ) یا سبز گھاس (مجاہد، سعید بن جبیر، ابو مالک) مجاہد، حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے کہ چارپایوں کے لئے اَب ایسی ہی ہوتی ہے جیسے آدمیوں کے لئے فواکہ۔ اس قول پر اَبّ کا ترجمہ ہوگا دُوب گھاس۔ عطاء نے کہا زمین سے اُگنے والے ہر سبزہ کو اَبّ کہا جاتا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ فواکہ کے علاوہ زمین کی ہر پیداوار کو اب کہتے ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم نے سورۂ عبس پڑھی۔ جب آیت فاکہۃ و ابًّا پر پہنچے تو فرمایا فاکہہ کو تو ہم جانتے ہیں، لیکن اَب کیا چیز ہے۔ پھر خود ہی فرمایا ابن الخطاب (اس پر غور کرنا بے فائدہ) تکلف ہے (رواہ ابن جریر وصححہ ابن کثیر) یعنی حضرت عمرؓ کو معین طور پر معلوم نہ تھا کہ اَبّ کی شکل اور کیفیت کیا ہوتی ہے اور اس کی تعیین پر غور کرنا آپ کے نزدیک آیت کا مطلب سمجھنے کے لئے ضروری نہیں تھا۔

متاعا لکم و لانعامکم ۔ یعنی مذکورۂ بالا اشیاء کی غرض یہ ہے کہ کچھ انسان کے لئے غذا بنیں اور کچھ چوپایوں کے لئے ۔ اَبّ کے علاوہ ہر چیز آدمی کے لئے غذا ہے اور اَبّ چوپایوں کے لئے ۔

فاذا جاءت الصاخۃ ۔ رازی ، خطیب اور ابو السعود نے لکھا ہے کہ دوسری بار صور پھونکنے کی سخت آواز صاخہ ہے یعنی ایسی سخت آواز جو ضرب شدید کی وجہ سے کانوں کو بہرا پٹ کردے ۔ خلیل بن احمد نے بھی یہی تنقیح کی ہے ۔ فراء نے کہا روز قیامت کی سخت آواز کا نام صاخہ ہے ۔ اس کا مادہ صخ ہے (ابن کثیر) ابن عربی نے لکھا ہے کہ سننے والے کانوں کو بہرا بنا دینے والی آواز صاخہ ہے (کبیر و سراج) حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ صاخہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے ۔

یوم یفر المرء سے **وبنیہ** تک ۔ آدمی کو اپنے جتھے کی کثرت پر غرور ہوتا ہے ۔ خصوصاً قریب ترین عزیز تو عموماً لوگوں کے لئے سرمایۂ استغفار ہوتے ہیں والدین اولاد اور بیوی کی محبت و خدمت ہر دکھ میں کام آتی ہے ، لیکن قیامت کے دن یہ بضاعت گراں بہا بے مقدار ہو کر رہ جائے گی ۔ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی ۔

لِکُلِّ امْرِئٍ سے **شَانٌ یُّغْنِیْہِ** اپنی ہی مصیبت سے فرصت نہیں ملے گی کہ دوسرے کی طرف توجہ کر سکے ، اس لئے ہر شخص دوسرے سے بھاگے گا ۔ یہ حالت اور دہشت قیامت کے دن شروع میں ہوگی ۔ اس سے ان احادیث صحیحہ کی تکذیب نہیں ہوتی جن میں ملائکہ نابالغ مردہ اولاد اور دوسرے نیکوں کی شفاعت کو بیان کیا گیا ہے ۔ خصوصاً حضور خاتم المرسلین کی شفاعت کبریٰ کا اظہار بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے ۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ سے **الْکَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُ** تک ۔ ان آیات میں اخروی نتائج کا بیان ہے اور اس طاقت کا اظہار ہے جو فیصلے کے بعد نمایاں ہوگی ۔ اہل ایمان کے چہرے چمکیلے ، شگفتہ اور مسرور ہوں گے اور بدکار کافروں کے چہرے افسردہ سیاہ دخان آلود ۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اہل ایمان کے نورانی چہرے رات کو نمازیں پڑھنے کی وجہ سے ہوں گے ۔ (رازی و خطیب) ضحاک نے کہا وضو کے اثر سے مسفرہ ہوں گے

تنبیہ آخر آیت میں صراحت ہے کہ چہروں کی سیاہی اور دخانی رنگ صرف کافروں کے ساتھ مخصوص ہوگی ۔ یعنی گنہگار اہل ایمان کی یہ حالت نہ ہوگی ۔ پہلا گروہ ان مومنین صالحین کا ہوگا جن کی مغفرت ہو چکی ہوگی اور دوسرا گروہ بدکار کافروں کا ۔ رہے فاسق اہل ایمان ان کا ذکر آیات میں نہیں ہے ۔ احادیث و آثار سے ثابت ہے کہ ان کے چہرے مسخ نہ ہوں گے ۔ واللہ اعلم ۔

مقصودِ بیان **قُتِلَ الْاِنْسَانُ** کو اگر خبر قرار دیا جائے تو مترشح ہوگی یہ بات کہ کافر انسان کی انسانیت قتل کر دی گئی ہے وہ صرف زندہ حیوان ہے ۔ انسانی زندگی نام ہے ۔ حکم شریعت کے مطابق پاکیزگی اعمال اور صحت عقیدہ کا اور کافر اس سے محروم ہے ۔ من نطفۃ الخ میں دعوتِ غور ہے ان مغرور بر خود غلط انسانوں کے لئے جو دنیوی عیش فانی پر ریجھے ہوئے ہیں اور کمتری و بہتری کا معیار انہی دنیوی اسباب کے حصول و فقدان کو جانتے ہیں ۔ وہ اپنی تخلیق بے مقداری کو نہیں دیکھتے ۔ بلکہ اس سلسلۂ اسباب پر ان کا اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ آخرت کو محال سمجھنے لگتے ہیں ۔ اس طرح اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری کا بھی ان کو انکار ہوتا ہے ۔ اور اعمال کی جزا سزا کا بھی اور یوم الفصل آنے کا بھی ۔

متاعا لکم ولانعامکم سے اللہ کے انعام عظیم کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ یہ دنیا اور اس کی ساری پیداوار صرف کاروانِ حیات کو چلانے کے لئے ہے ۔ انسان کو لازم ہے کہ اس کو مقصود اصلی نہ بنالے ۔ یہ منزلِ مقصود نہیں ۔ زادِ حیات ہے ۔ قیامت کے دن اس میں کوئی چیز نہ ہوگی ۔ یوم یفر الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ دنیا میں آدمی جن لوگوں کے بھروسہ پر جیتا اور اتراتا ہے ۔ قیامت کے دن وہ سب اس سے منہ موڑ لیں گے ۔ جن کے لئے احکام الٰہی سے سرتابی کی ہوگی وہ قیامت کے دن اس سے کٹ کر جائیں گے وغیرہ ۔

سورۃ التکویر

اس سورت کا نام سورۃ التکویر ہے اور یہ نام صرف توقیفی ہے ۔ باجماع علماء پوری سورت مکّی ہے ۔ آیات کا شمار بالاتفاق ۲۹ ہے اور بقول

خطیب کلمات کی تعداد ۱۰۴ - اور حروف کی تعداد ۴۲۴ ہے (سراج)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ○ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ○ وَاِذَا الْعِشَا

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینہ

عُطِّلَتْ ○ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ○ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ○ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ

کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور جب وحشی جانور (مارے گھبراہٹ کے) سب جمع ہو جائیں گے اور جب دریا بھڑکائے جائیں گے اور جب ایک ایک قسم کے لوگ اکھٹے کئے جائیں

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○ وَاِذَا السَّمَآءُ

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی اور جب نامۂ اعمال کھولے جائیں گے اور جب آسمان کھل جائیگا

كُشِطَتْ ○ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ○ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ○

اور اسکے کھلنے سے آسمان کے اوپر کی چیزیں نظر آنے لگیں گی اور جب دوزخ دہکائی جائیگی اور جب جنت نزدیک کر دی جائیگی ہر شخص اُن اعمال کو جان لیگا جو لیکر آیا ہے تو میں

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ○ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ○ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ○ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ○

قسم کھاتا ہوں اُن ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں (اور پیچھے ہی کو چلتے رہتے ہیں) (اور اپنے مطالع میں جا چھپتے ہیں) اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے کہ یہ قرآن کلام ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ○ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ○ وَمَا

ایک معزز فرشتہ (جبرئیلؑ) کا لایا ہوا جو قوت والا ہے (اور) مالک عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے اور وہاں اس کا کہنا مانا جاتا ہے (اور) امانتدار ہے اور یہ

صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ○ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ○ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ○ وَمَا هُوَ

تمہارے ساتھ کے رہنے والے (محمدؐ) مجنون نہیں ہیں انہوں نے اس فرشتہ کو صاف کنارے پر دیکھا بھی ہے اور یہ پیغمبر غیبی باتوں پر بخل کرنے والے بھی نہیں اور یہ قرآن کسی

بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ○ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ○ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ لِمَنْ شَآءَ

شیطان مردود کی کہی ہوئی بات نہیں ہے تو تم لوگ کدھر کو چلے جا رہے ہو بس یہ تو دنیا والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے ایسے شخص کے لئے جو

مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ○ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ع ۱ / ۶

تم میں سے سیدھا چلنا چاہے اور تم بدون خدائے رب العلمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے -

تفسیر جب موجودہ نظامِ کائنات تباہ ہوجائے گا اور عمومی انقلاب کے بعد اللہ جہانِ نو پیدا کرے گا اس وقت اچھے بُرے اعمال سامنے آئینگے اور جزا سزا ہوگی۔ لیکن اچھے برے کا معیار کیا ہے۔ کون سا عقیدہ وعمل اچھا ہے اور کون سا بُرا۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ خیر وشر کو جانچنے کی کسوٹی کون سی ہے اس سوال کو حل کرنے کے لئے دنیا دو گروہوں میں ہمیشہ منقسم رہی ہے۔ جو لوگ عقل وشعور کے اوپر روحانیت کی دنیا کے قائل نہیں اُن کے علم کا مرکزی نقطہ صرف احساس اور تعقل ہے۔ اُن کے نزدیک ان کے اندرونی حواس آلات شعور اور عقل نہ فقط اسباب ادراک ہیں۔ بلکہ حکمرانِ مطلق بھی ہیں۔ عقل کی رسائی سے جو چیز خارج ہے وہ ممکن ہی نہیں ہے۔ صحیح وغلط، خیر وشر اور حسن وقبح کا فیصلہ عقل پر موقوف ہے جس کو عقل صحیح، خیر اور حسن سمجھے وہ صحیح خیر اور حَسَن ہے۔ اور جس کو غلط، شر اور قبیح قرار دے وہ غلط، شر اور قبیح ہے۔ عقل کا ادراک آخری ادراک ہے۔ اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ۔ یہ گروہ اسنا بر عقل غلط واقع ہوا ہے کہ اس کو نہ نبوت کی ضرورت ہے نہ روحانیت کی نہ شریعت کی نہ ملائکہ اور روحانی پیغمبروں کی۔ یہ بے نیاز ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے ہر قانون اور ہر دستور سے مستغنی ہے۔ اللہ کی رضا جوئی، مصلحت اندیشی اور اطاعت شعاری سے۔ اس ناواقف گروہ کو نہیں معلوم کہ آلاتِ شعور صرف پانچ ہی نہیں ہیں جو عقل نارسا کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ مادیات سے اوپر کچھ بے مادہ دنیا بھی ہے۔ اس مادی کائنات کی حاکم اور ان کا علم دانش وبینش سے نہیں۔ بلکہ قلبی وجدان اور روحانی عرفان سے ہوتا ہے جب سارے حواس بے ہوش ہوجاتے ہیں جب عقل فرزانہ معطل ہوجاتی ہے۔ جب دماغ کی فلک پیمائی ختم ہوجاتی ہے اس وقت وجدان بیدار ہوتا ہے۔ اور غیر مادی عرفان کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اس وقت مدہوش شعور والے انسان کا تعلق عالمِ ملکوت سے پیدا ہوجاتا ہے۔ اور مادی انسان مادیات سے غافل ہوکر مجردات کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے۔

عقل اور خدام عقل نہ صرف یہ کہ نارسا اور ناقص الفہم ہیں بلکہ ان کی بینش اکثر بھینگے کی بینش سے زیادہ صحیح نہیں ہوتی بلکہ اگر ان کو نوسو ننانوے فی ہزار معلومات میں بینشِ نابینا سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہ ہوگی۔

عقل کی علمی بے بضاعتی اور راز خود رفتگی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ایک عقل کیفیت فہم اور فیصلۂ حقیقت میں دوسری عقل کے خلاف ہوتی ہے بلکہ ایک ہی شخص مختلف اوقات میں ایک ہی عقل سے مختلف فیصلے کرتا ہے آخر واقعی حقانیت اور حقیقی صداقت تو ایک ہی ہوگی یہ اختلافِ دانش وبینش کیوں ہوتا ہے۔ کیا اس سے عقل کی نارسائی اور کج روی کا ظہور نہیں ہوتا۔ عقل کی تہی دامنی ہی کو دیکھ کر دوسرا گروہ فوق الشعور وجدانی طاقت کا قائل ہوا ہے جس کا علم برہانی نہیں عرفانی ہے جو حق کی تصویر دماغی روشنی سے نہیں روحانی نور سے دیکھتا ہے اس کے علم وانکشاف کا مدار دماغی صورتیں اور وہمی معانی اور عقلی کلیات نہیں بلکہ ملکوتی انجلائی کیفیات ہوتی ہیں اس کی راہ دانش استدلال نہیں بلکہ القاء قلبی ہوتا ہے۔ مقدمات اور مبادی کی ترتیب سے وہ نتیجہ نہیں نکالتا بلکہ ایک روحانی چمک اس کے دل کو حقائق آگاہ بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ لیکن کوتاہ فہم اور قاصر النظر لوگ جب حصول علم کے وقت اس کے آلاتِ شعور اور حواس دماغی کو (مختل نہیں) معطل پاتے ہیں۔ تو تعطل سے ان کو اختلال کا دھوکہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے عقلی فکر رکھنے والے اس کو دیوانہ اور مختل الحواس کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ فیصلہ خود ان کے اختلالِ حواس کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک وقت میں حواس کو معطل چھوڑ دینا اور ان سے کام نہ لینا دماغی اختلال اور جنون کہنے کا تو مستحق نہیں۔ فسادِ حواس الگ چیز ہے۔ اور تعطل شعور جدا حقیقت رکھتا ہے۔ ملأ اعلیٰ اور عالم بالا سے اکتسابِ علم کرنے کے وقت عارف تمام کائناتِ مادی کی طرف سے چشم حواس بند ضرور کرلیتا ہے۔ اور آفتاب تجرد کی شعاعیں براہِ راست اس کے دل پر پرتو افگن ضرور ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس کے تمام مشاعر مادیت اپنی جگہ درست اور سالم ہوتے ہیں ان میں کوئی اختلال نہیں ہوجاتا۔ بات صرف یہ ہوتی ہے کہ حواسِ شعوری میں اتنی طاقتِ برداشت نہیں ہوتی کہ فیضانِ قدس کے وقت اپنی ہستی کو بیدار رکھ سکیں اور اس بارِ عظیم کو اٹھا سکیں۔ اس لئے از خود رفتہ ہوجاتے ہیں۔ کم فہم، ناقص العلم لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ عارف برحق مجنون ہوگیا اور دیوانہ کی طرح بکواس کررہا ہے۔ حالانکہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ خزانۂ علم کا جوہر ثمین اور درِ بے بہا ہوتا ہے جس نے حرف یاروں کے سوا کچھ دیکھا نہ ہو وہ لائی آبدار کیا جانے۔ حواس مادی سے ماوراء قلبی وجدان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو خالص نور اور ہر کدورت سے پاک چمک، دوسرے دخان آلود، کدورت آمیز ناریت۔ چمک دونوں میں ہوتی ہے۔ انکشاف سے دونوں خالی نہیں، لیکن اوّل

خالص لمعۂ نور ہوتا ہے۔ اس کی ہر کرن صدق وصفا سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس میں نفسانیت ایجاد حواس اور اختراع دماغی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ محض پیام حق ہوتا ہے۔ وحی رحمانی ہوتی ہے۔ کشف ربانی، القاء ملکوتی اور الہام الٰہی ہوتا ہے۔ دوسرے میں اصلی نور کی ایک کرن ضرور ہوتی ہے، مگر ہزاروں اختراعی کثافتوں اور خود ساختہ ظلمتوں میں ملی ہوئی جس طرح آگ کی خفیف ترین چمک کو روشنی ضرور کہا جاتا ہے، مگر دھوئیں کے ہزاروں پردوں اور دخانی ظلمتوں میں لپٹی ہوئی شعاع نوری نور بخش نہیں ہوتی۔ ماحول کو روشن نہیں کر سکتی۔ بلکہ کثرت دخان لوگوں کے ظاہری حواس کو بھی خراب کر دیتی ہے۔ دھواں آنکھوں میں بھر جاتا ہے اور دیکھنے والوں کی بینائی خراب ہو جاتی ہے۔ کانوں میں بھر جاتا ہے اور شنوائی پر برا اثر ڈالتا ہے۔ ناک میں بھر جاتا ہے اور قوت شامہ کو بگاڑتا ہے۔ دخان زدہ لوگوں کے چہروں کو سیاہ اور کپڑوں کو کثیف بنا دیتا ہے۔ غرض آگ کی اصلی کرن اگر کوئی خفیف ترین ہوتی بھی ہے تو ان ظلمتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اسی کو کہانت کہا جاتا تھا۔ یہ القاء شیطانی ہوتا ہے وجدان نفسانی ہوتا ہے۔ عرفان حقیقت سے بے بہرہ اور ہر صداقت سے محروم۔ لیکن کور چشمان مدعاینت کو دونوں میں فرق نہیں دکھتا۔ نور و نار میں تمیز کرنے سے وہ عاجز ہوتے ہیں۔ ثریٰ اور ثریا ان کو ایک نظر آتا ہے۔ کاہن کی کہانت اور پیغمبر کی وحی میں امتیاز کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ملکوتی نغمہ کو وہ شیطانی صوت غیر مربوط قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ کہاں رسول کریم کی صداقت وامانت سے بھری ہوئی نواسنجی جو انسانیت کے ہر بن مو کو کیف روحانی سرور ایمانی اور صلاح اعمال سے مخمور کر دیتی ہے اور کہاں شیطان رجیم کی گلوسوزی جو اہل دانش کے صحیح الفکر دماغ کے پردوں کو پھاڑ دیتی ہے اور روح کے کانوں کو بہرا کر دیتی ہے۔ ایک ذکر للعالمین اور تذکرہ للعالمین ہوتا ہے۔ تبصرۂ حیات۔ زندگیوں کو سدھارنے والا۔ گمراہوں کو منزل حیات دکھانے والا۔ نابیناؤں کو بینائی عطا کرنے والا۔ بہروں کے کانوں میں شنوائی پیدا کرنے والا۔ دوسرا صدائے شیطانی ہوتا ہے۔ ضلالت آفریں۔ غوایت آگیں۔ زندگیوں کو بگاڑنے والا۔ پاکیزہ افکار اور ستھرے کردار کو ناپاک اور کثیف بنا دینے والا۔ آنکھوں میں تاریکی اور روحوں میں کثافت پیدا کرنے والا۔ تباہی خیز۔ بربادی انگیز۔ کھرے کو کھوٹے سے الگ کرنا اور قول رسول کریم کو ہفوات شیطان رجیم سے ممتاز کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کے شامل حال مشیت الٰہی ہو۔ انسان اور انسان کی مشیت سب مشیت الٰہیہ کے تابع ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ اس نے قرآن کو ضرور ذکر للعالمین بنا کر بھیجا ہے وہ رب العالمین ہے۔ مگر کون اس کو سچا سمجھتا ہے اور کون تکذیب کرتا ہے یہ تو مشیت ربانی ہے۔

تحلیل اجزاء

اس سورت کے آغاز میں قیامت کے بارہ واقعات کا تذکرہ کر کے صراحت فرمائی ہے کہ اس وقت ہر شخص کو اپنے پیش کردہ اعمال کا علم ہو جائے گا۔ یعنی اعمال کی جزا سزا دیکھ لے گا۔ ان بارہ واقعات میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا ظہور نفخۂ اول کے وقت ہوگا اور کچھ ایسے ہیں جو دوبارہ صور پھونکے جانے پر نمودار ہوں گے۔

اذا الشمس کورت۔ کورت کا مصدر تکویر اور مادہ کور ہے۔ تکویر کا معنی ہے کسی چیز کو عمامہ کی طرح لپیٹ دینا اور ظاہر ہے جو چیز لپیٹ دی جاتی ہے وہ سمٹ بھی جاتی ہے۔ اور چھپ بھی جاتی ہے۔ تکویر کا دوسرا معنی ہے گرا دینا، پھینک دینا، پٹک دینا۔ کورت الحائط میں نے دیوار کو گرا دیا۔ انہیں دونوں معنی کے لحاظ سے مختلف علماء نے کورت کی تفسیر مختلف طور پر کی ہے اور اپنے قول کے ثبوت میں بعض علماء نے روایات بھی ذکر کی ہیں مثلاً...... دور کر دیا جائے گا (مجاہد وضحاک) روشنی زائل کر دی جائے گی (قتادہ) پھینک دیا جائے گا (ربیع بن خثیم) زمین پر پھینک دیا جائے گا (زید بن اسلم) غار میں ڈال دیا جائے گا (سعید بن جبیر) سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے گی اس کو بے نور کر دیا جائے گا (ابو السعود کا ایک قول) شیخ ابن جریر نے لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک آفتاب کی تکویر یہ ہے کہ اس کے بعض اجزاء کو بعض میں لپیٹ کر پھینک دیا جائے گا۔ اور اس طرح اس کا نور جاتا رہے گا۔

واذا النجوم انکدرت۔ ستارے بے نور ہو جائیں گے یا جھڑ جائیں گے اور قول بروایت علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور دوسرے قول کے قائل اکثر تابعین ہیں جیسے مجاہد، حسن بصری، ابو صالح، حماد بن ابی سلیمان، ضحاک وغیرہ۔ یہ تفسیر دوسری آیت کے بھی موافق ہے جس میں کواکب کے انتثرت آیا ہے۔ خلیل نے لفظ انکدار کی جو توضیح کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

واذا الجبال سیرت۔ پہاڑ رواں کئے جائیں گے یعنی زلزلہ کی وجہ سے اپنے مقام سے ہٹ جائیں گے (ابو السعود) ابو السعود کے نزدیک

یہ واقعہ نفخ اول کے وقت ہوگا اور اسی آیت میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ رہا پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو کر دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑنا تو یہ نفخ دوئم کے وقت ہوگا ۔

واذا العشار عطلت ۔ عشار جمع عشراء مفرد ۔ دس مہینے کی حاملہ اونٹنی کو عشار کہتے ہیں ۔ ایسی اونٹنیاں عربوں کی نظر میں متاع عزیز ہوتی ہیں ۔ ان سے زیادہ مرغوب ان کو کوئی مال نہ تھا ۔ بقول رازی اس جگہ مراد اموال نفیسہ ہیں ۔ قیامت کے احوال کی دہشت اور ان کی وجہ سے دلوں پر چھائی ہوئی ہیبت کا تقاضا ہوگا کہ کسی کو اپنے عزیز ترین بیش بہا مال کی طرف توجہ بھی نہیں رہے گی حضرت ابی بن کعب رض سے مروی ہے کہ ہولناک دہشت کے سبب ایسے نفیس مال کی طرف لوگوں کی توجہ بھی نہ ہوگی بلکہ یوں ہی چھوڑ دی جائیں گی خواہ مر جائیں یا کہیں چلی جائیں ۔ مجاہد اور ضحاک سے بھی اسی تفسیر سے ملتی جلتی تشریح مروی ہے یہ واقعہ بھی نفخ اول کے وقت ہوگا ۔

خطیب نے مذکورۂ بالا چار واقعات نفخ دوئم کے بعد کے قرار دئے ہیں اور زمخشری نے بھی اسی کو مناسب قرار دیا ہے ۔

شیخ ابن کثیر اور امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک آیت مذکورہ میں عشار سے بطور کنایہ ابر مراد ہے ۔ (یعنی حاملہ اونٹنی سے چونکہ ابر مشابہ ہے اسی لئے بادل کے متعلق الحاملات وقراً فرمایا ہے ۔ اس مناسبت سے عشار سے مراد بھی ابر ہے) مراد یہ کہ ابر اٹھیں گے مگر پانی سے خالی ہوں گے ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ چونکہ اوپر کی آیات میں سورج اور ستاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے سباق اور سیاق کا تقاضا ہے کہ عشار سے مراد ابر لیا جائے اگرچہ یہ مراد مجازی ہے ۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک عشار سے مراد بستیاں ہیں ۔ یعنی بستیاں ویران پڑی ہوں گی ۔ کوئی رہنے والا نہ ہوگا ۔ قرطبی نے صراحت کی ہے کہ عشار سے اونٹنیاں مراد لینا قوی اور راجح قول ہے ۔ اکثر علماء اسی طرف گئے ہیں ۔ بلکہ شیخ ابن کثیر نے تو صاف صراحت کی ہے کہ سوا اس کے سلف صالحین سے کوئی دوسرا قول منقول ہی نہیں ہے ۔

واذا الوحوش حُشِرت ۔ وحوش جمع ۔ وحش مفرد ۔ جنگلی جانور ۔ حُشِرت اٹھائے جائیں گے یعنی زندہ کر کے (حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول ۔ ربیع بن خثیم کا بھی یہی قول ہے) یا جمع کئے جائیں گے (ابن کثیر واختارہ ابن جریر) یعنی دہشت کی وجہ سے وحشی جانور ادھر ادھر بھاگتے ہوئے آ کر آدمیوں میں گھس پڑیں گے ۔ نہ چرندہ کو درندہ سے خطرہ رہے گا نہ درندہ چرندہ کی طرف توجہ کرے گا ۔ ہر ایک دہشت زدہ ہوگا ۔ حضرت ابی بن کعب سے اسی جیسی تشریح مروی ہے ۔

واذا البحار سُجِّرت ۔ سمندر دہکائے جائیں گے (قفال اور اکثر اہل تفسیر) یعنی سمندر خشک ہو جائیں گے اور ان میں آگ لگ جائیگی ۔ اور ایسے بھڑکیں گے جیسے تنور آگ سے بھڑکتا ہے یا سُجِّرت کا معنی ہے فُجِّرت یعنی شیریں اور شور سمندر جو اس وقت باوجود ایک جگہ ہونے کے ایک دوسرے سے الگ ہیں ۔ گویا دونوں کے درمیان حجاب اور روک ہے ۔ یہ حجاب پھاڑ دیا جائے گا اور روک دور کر دی جائے گی ۔ شیریں اور شور مخلوط ہو جائیں گے ۔ یہ قول کلبی کا ہے (رازی وابن کثیر) سمندروں میں آگ لگ جانے اور بھڑک جانے کی تاویلیں قفال نے عجیب عجیب کی ہیں ۔ کبھی کہتے ہیں سمندروں کے نیچے جہنم کی آگ ہے ۔ جو سمندروں میں آگ لگا دے گی ۔ کبھی کہتے ہیں چاند سورج کو سمندر میں گرا دیا جائے گا ۔ کہیں لکھا ہے سمندروں کے نیچے اللہ آگ پیدا کر دے گا ۔ امام رازی نے ان تاویلوں کو ناپسند کیا ہے ۔ اور علانیہ ظاہر کی طرح کسی تغیر اور انقلاب کو ناممکن نہیں قرار دیا اور صراحت کر دی کہ جو اللہ دنیا کو تباہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ سمندر کے پانی کو آگ بنا سکتا ہے ۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ فلاسفۂ یونان خصوصاً حکماء مشائیہ کے نزدیک انقلاب عناصر ممکن ہے ۔ پانی کا تبخیر کے ذریعہ سے ہوا بن جانا اور پھر ہوا کا آگ ہونا محسوس واقعات ہیں ۔ اس لئے فلاسفہ کی نظر میں بھی سمندروں کا آگ بن جانا ناممکن نہیں ہے ۔ اب تو اللہ نے انسان کو اتنا علم عطا فرما دیا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے اڑا سکتا ہے بلکہ اڑا دیتا ہے ۔ سمندروں میں آگ لگا دیتا ہے ۔ زمین کا طبقہ الٹ دیتا ہے ۔ سمندروں کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا ہے ۔ کرۂ ہوا میں آگ لگا سکتا ہے ۔ اس دور سے پہلے انسان نے طبعیات میں اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی اس زمانے میں کر چکا ہے اور برابر آگے بڑھ رہا ہے ۔ اسی لئے اخوان الصفا اور دوسرے متکلمین اسلام خصوصاً محدثین اور ظاہریہ دوزخ ۔ جنت ۔ قیامت اور دوسرے امور طبعیات تک کے متعلق بغیر غور وفکر کئے اور بدون استدلال اور

[illegible] کے متعلق جو عقیدہ رکھتے تھے ۔ اور ہر وہ بحث اور مسئلہ جو فلسفۂ قدیم کی کسوٹی پر صحیح نہیں اترتا تھا خالص اسلامی روشنی میں اس کو تسلیم کرتے تھے یا فلاسفۂ اسلام ان کی تاویلیں کرنے اور صراحت کو کنایہ اور استعارہ بنا کر اصل بحث کو مسخ کر دیتے تھے ، لیکن اب طبعیاتی انکشافات اس حد پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر [illegible] صراحتوں کو مقصد میں نہ ذار دیا جائے تب بھی علمی تحقیقات اسی نتیجہ پر پہنچا دیتی ہیں جو سائنس نے بتایا ہے اور اگر کہیں کوئی اتفاقاً قرآنی صراحت سمجھ میں [illegible] اور بظاہر فلسفہ سے اس کا تضاد محسوس ہو رہا ہو تو موجودہ دور کے ترقی پذیر انکشافات کی روشنی ہم کو یقین دلا رہی ہے کہ قرآنی صراحتوں تک مستقبل قریب میں انسانی دماغ کی رسائی ہو جائے گی ۔

۔ ذا النفوس زوجت ۔ روحوں کو جسموں سے ملا دیا جائے گا یعنی مردہ اجسام میں روحیں ڈالی جائیں گی ۔ ابوالعالیہ ، عکرمہ ، شعبی ، حسن بصری ، سعید بن جبیر اور بروایت سعید بن جبیر ابن عباس کا ایک قول) رواہ ابن کثیر یا یہ مراد ہے کہ آدمیوں کے اقسام بنا دیئے جائیں گے ۔ کچھ سابقین کچھ اصحاب یمین کچھ اصحاب شمال ۔ یہی تفصیل آیت ذیل میں آئی ہے ۔ وکنتم ازواجاً ثلاثۃ فاصحاب المیمنۃ ما اصحاب المیمنۃ واصحاب المشئمۃ ما اصحاب المشئمۃ والسابقون السابقون (حسن بصری کا ایک قول) یا یہ مراد کہ ہر شخص کو اس کے گروہ کے ساتھ ملا دیا جائے گا ۔ مشرک کو مشرک کے ساتھ مومن کو مومن کے ساتھ ۔ نیک کو نیک کے ساتھ اور گنہگار کو گنہگار کے ساتھ ۔ حضرت نعمان بن بشیر راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا النفوس کے جوڑے لگانے کی یہ کیفیت [illegible] کہ بدکار کو بدکار کے ساتھ جہنم میں ڈالا جائے گا اور نیک مرد کو نیکوں کے ساتھ ملا دیا جائے گا ۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ سے اس آیت کا مفہوم پوچھے گئے تو آپ نے سکوت کیا پھر فرمایا ہاں میں جانتا ہوں کہ جنتی آدمی کو اسی جیسے جنتی آدمی کے ساتھ کیا جائے گا اور جہنمی کو جہنمی کے ساتھ [illegible] جائے گا ۔ پھر آیت ذیل تلاوت کی ۔ احشروا الذین ظلموا وازواجھم (ابن ابی حاتم) یا یہ مراد ہے کہ مومنوں کا جوڑ حوروں سے اور کافروں کا جوڑ [illegible] سے لگایا جائے گا ۔ (عطاء ۔ رواہ الخطیب فی السراج والقرطبی فی کتاب التذکرہ) امام رازی نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف کی ہے یا یہ مراد ہے کہ ہر شخص اس کے فرقہ کے ساتھ ملا دیا جائے گا ۔ یہودی کو یہودی کے ساتھ اور عیسائی کو عیسائی کے ساتھ ۔ اس مضمون کی ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے (رازی فی الکبیر) زجاج کا قول ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے گا ۔ واللہ اعلم

واذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت ۔ زندہ دفن کی ہوئی عورت سے پوچھا جائے گا کہ کس قصور میں اس کو قتل کیا گیا ۔ عرب کے بعض قبیلوں میں دستور تھا (اگرچہ بہت کم تھا) کہ اگر کسی کی لڑکی پیدا ہوتی اور وہ اس کو زندہ رکھنا چاہتا تو اس کو کمبل وغیرہ کا کرتہ پہنا دیتا اور جب بڑی ہو جاتی تو اونٹوں اور بھیڑوں کے چرانے کی [illegible] سے خدمت لیتا تھا ، لیکن اگر وہ اس کو زندہ نہ رکھنا چاہتا (اس خیال کا باعث کبھی یہ ہوتا تھا کہ کہیں لڑکی کے جوان ہونے پر اس کو کسی کو داماد بنانا پڑے اور اس طرح [illegible] ہونے کی ذلت برداشت کرنی پڑے ۔ ایسا خیال تو کسی کا ہوتا تھا ، لیکن عموماً یہ تصور تھا کہ فقر ہوتا تھا کہ لڑکی کمائی نہیں کر سکتی پھر اس کے کھانے پینے کا صرف کس طرح برداشت کیا جائے گا ۔ کھیتی باڑی تجارت مزدوری نوکری ۔ کوئی معاشی ذریعہ قبائل میں موجود نہ تھا ۔ مویشی پالنے اور دودھ [illegible]) تا [illegible] کو ٹنے پر ان کی معاش موقوف تھی ۔ اور لڑکی اس خدمت کو ادا کرنے سے قاصر ہوتی تھی ۔ اس لئے) کچھ دنوں تک تو اس کو چھوڑ دیتا تھا ۔ جب لڑکی ڈیڑھ بالشت کا ہو جاتا تو لڑکی کی ماں سے کہتا اس کا لباس بدلوا کر ذرا بنا سنوار دے میں اس کو [illegible] کے ہاں لے جاؤں گا ۔ پھر پہلے سے جا کر ریگستان میں گڑھا کھود آتا تھا اور لڑکی کو لے جا کر بہانے سے اس گڑھے میں گرا کر اوپر سے مٹی پاٹ دیتا تھا ۔ عرب کی تاریخ میں زندہ درگور کرنے کی صورت اس طرح بھی منقول ہے کہ حاملہ عورت کی مدت حمل جب پوری ہو جاتی تو وہ کسی گڑھے پر جا کر وضع حمل کرتی اور نوزائیدہ بچی کو گڑھے میں پھینک دیتا اور اوپر سے مٹی ڈال دیتی (رازی فی الکبیر)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

سوال کیا جا سکتا ہے کہ بیچاری معصوم روح کا قتل ہونے میں کیا قصور کہ اس سے سوال کیا جائے گا باز پرس تو قاتل سے ہونی چاہیئے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں باز پرس تو قاتل ہی سے ہوگی ، لیکن وہ بے رحم ظالم اتنا بڑا مجرم ہے کہ اس سے براہ راست [illegible] کی کوئی ضرورت نہ ہوگی بلکہ معصوم جان سے اس کی دلدہی کے لئے پوچھا جائے گا تاکہ قاتل کو تنبیہ ہو اور وہ سمجھ جائے کہ میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کے لئے کسی بہانہ اور تاویل کا بھی امکان نہیں ۔ اس مفہوم کا جواب امام رازی نے کبیر میں دیا ہے اور اسی قسم کے طرز [illegible] ثبوت میں آیت ذیل کو پیش کیا ہے ۔ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ سے سوال ہوگا ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰہین

من دون اللہ ۔ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کا کوئی قصور نہیں اور نہ انہوں نے حکم دیا تھا کہ میری پرستش کرو ۔ یہ صرف بلاغت کلام ہے کہ مجرموں کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے ۔ ان کو خطاب کا اہل بھی نہیں سمجھا جاتا اور معصوم نبی سے سوال کیا جاتا ہے ۔

اس فقیر کی نظر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ باز پرس قاتل سے ہی قرار دی جائے اور عنہا کو محذوف ملا جائے یعنی مؤدہ کے متعلق باز پرس کی جائے گی ۔ کہ کس قصور پر اس کو قتل کیا گیا ۔

بعض روایات میں سَأَلَتْ معروف کا صیغہ آیا ہے یعنی مؤدہ سوال کرے گی کہ مجھے کس قصور پر قتل کیا گیا ۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس کے اس قول سے ہوتی ہے جس کو علی بن ابی طلحہ نے نقل کیا ہے ۔ ابو الضحیٰ، قتادہ اور سدی سے بھی یہی مروی ہے ۔

بعض احادیث کا تعارض اور اس کا ازالہ امام احمد نے حضرت سلمہ بن یزید جعفی کی ایک حدیث طویل نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ حضرت سلمہ نے عرض کیا میری ماں (ملیکہ) نے میری ایک بہن کو زندہ دفنا دیا تھا کیا اس (بہن) کو کچھ فائدہ ہوگا ۔ فرمایا زندہ دفنانے والی اور زندہ دفنائے جانے والی دونوں جہنم میں ہیں ۔ امام نسائی نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے ۔

اسی طرح ابن ابی حاتم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور اقدس نے فرمایا زندہ دفنانے والی اور زندہ دفنائی گئی دونوں جہنم میں ہیں ۔ اس حدیث کی اسناد بھی صحیح ہیں ۔ لیکن حضرت خنساء بنت معاویہ کی پھوپھی سے ایک روایت آئی ہے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے کہ حضور والا نے ارشاد فرمایا زندہ دفنائی ہوئی جنتی ہے ۔ اس روایت کی تائید حسن بصری کی مرسل روایت سے ہوتی ہے کہ حضور نے فرمایا زندہ دفنائی ہوئی جنتی ہے ۔ ان دونوں متضاد روایتوں میں ہمارے نزدیک مؤخر الذکر روایت زیادہ قوی الاسناد ہے ۔ اس لئے اسی کو ترجیح حاصل ہے ۔ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کیونکہ آیت مذکورہ سے یہی واضح ہوتا ہے ۔ کہ اللہ نے مؤدہ کو بے قصور قرار دیا ۔ اسی لئے بای ذنب قتلت قرار دیا ۔ واللہ اعلم ۔

ایک لطیف استنباط آج کل بعض ممالک میں اسقاط حمل کو قانونا جائز قرار دے دیا گیا ہے ۔ شاید ایسا قانون اس بچے کے اسقاط کو جائز قرار دیتا ہوگا جس میں جان نہ پڑی ہو ۔ وجہ جواز یہ قرار دی گئی ہے کہ آبادی کی کثرت اتنی ہو گئی کہ ملک مزید معاشی بار اٹھانے سے قاصر ہے ۔ نو مولود انسانوں کے لئے کھانے کو کہاں سے ملے گا ۔ اسقاط حمل کی یہ وجہ جواز وہی دور جاہلیت کے قبیلہ ہم بالا نہ ہے ۔ وہ لوگ بھی افلاس اور نادری کی وجہ سے بچیوں کو زندہ درگور کرتے اور پڑھے لکھے جاہل مفکر بھی انہیں کے راستہ پر چل رہے ہیں ۔

برائے نام مہذب ممالک کی تقلید میں بعض اسلامی ممالک نے بھی دورِ دین کوشش شروع کر دی ہے کہ ان کے ملک میں ایسا قانون بنا دیا جائے ۔ لیکن ان کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ حقیقت میں اسقاط حمل خواہ بے جان کا ہی ہو پوشیدہ زندہ درگور کرنا ہے اور ہم یہ اپنی طرف سے استنباط نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس حدیث میں اس کی صاف صراحت ہے جس کو امام مسلم ، ابو داؤد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ سب نے نقل کیا ہے کہ صحابہ نے عزل کے متعلق حضور سے دریافت کیا تو فرمایا یہ خفی زندہ درگور کرنا ہے ۔ یہ تو عزل کے متعلق فرمایا جس میں نطفہ کا استقرار رحم میں نہیں ہوتا بلکہ مادہ منویہ باہر خارج کر دیا جاتا ہے ۔ استقرار حمل کے بعد اسقاط کی حرکت تو اس سے کہیں زیادہ مجرمانہ ہے ۔ کیونکہ استقرار کے بعد بچہ کا زندہ پیدا ہونا یقینی نہیں تو غالب طور پر ضرور ہے ۔ پھر اسقاط کا جواز کہاں سے نکلے گا ۔ رہی تنگی معاش کی فلاسفی تو اس کو ہم سوائے حماقت کے کیا کہیں ۔ خود کلام مجید میں جہاں قتل اولاد کی مخالفت فرمائی ہے وہاں صراحت فرما دی ہے ۔ نحن نرزقکم وایاھم ہم تم کو اور ان کو سب سے زیادہ رزق دیتے ہیں اور دیں گے ۔ اس لئے یہ اندیشہ ہی غلط ہے ۔

واذا الصحف نشرت اعمال نامے کھولے جائیں گے یعنی کھول کر دائیں اور بائیں ہاتھوں میں دے دیئے جائیں گے (ضحاک) قتادہ نے کہا : اے آدمی تیرا صحیفہ لکھا جاتا ہے ۔ اس میں تیرے سب اعمال درج ہوتے ہیں پھر وہ تہہ کر دیا جائے گا ۔ پھر قیامت کے دن تیرے فیصلے کے لئے اس کو کھولا جائے گا ۔ (ابن کثیر)

واذا السماء کشطت ۔ جب آسمان دور کر دیا جائے گا ۔ کَشْطٌ اونٹ کی کھال اتارنا ۔ سَلْخٌ بکری کی کھال اتارنا (قرطبی) اور یہ معنی ہے آسمان سے اس طرح ہٹا دیا جائے گا جیسے بکری یا اونٹ کی کھال اتار دی جاتی ہے (سراج منیر للخطیب) فراء نے کہا اپنی جگہ سے جدا کر کے لپیٹ دیا جائے گا (کبیر) زجاج نے کہا جیسے کپڑا اکھاڑ دیا جاتا ہے (معنی) واحدی نے کہا کشط کا معنی ہے ڈھانکنے والی چیز کو ڈھانکی ہوئی چیز سے اٹھا لینا ۔ ابن کثیر نے

کہتے ہے کہ کو ہر ہے تشریح کرتے ہے کہ آسمان کو کھینچ لیا جائے گا۔ سدی نے کہا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ضحاک نے کہا آسمان کو کشط کرنا (یعنی کھینچ کے) اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ ان تمام تشریحی اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کشط کا معنی ہے کھینچنا جگہ سے ہٹا دینا۔ سرپوش اٹھا دینا۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ۔ دوزخ کو خوب گرم کر دیا جائے گا۔ (سدی) اس کی آگ کو اور تیز کر دیا جائے گا۔ جہنم کو بھڑک حقیقت میں اللہ کا غضب اور لوگوں کا گناہ ہے (قتادہ) یعنی اللہ کا غضب اور لوگوں کے گناہ آگ کی تیزی کی شکل اختیار کر دیں گے۔ شُنَن کی حدیث میں آیا ہے کہ جہنم کی آگ ہزار برس تک دکھائی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئی پھر ہزار برس دکھائی گئی پھر وہ سفید ہو گئی پھر ہزار برس دکھائی گئی کہ وہ سیاہ ہو گئی۔ اب جہنم سیاہ اندھیری ہے (سراج) ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جہنم کی آگ دنیوی آگ سے ستر گونہ یعنی بدرجہا زائد (تیز) ہے

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ۔ جنت نیک مومنوں کے قریب کر دی جائے گی (ضحاک، قتادہ، ابو مالک، ربیع بن خثیم) ابن کثیر۔ یعنی اہل جنت کو جنت کے قریب کر دیا جائے گا۔ یہ معنی نہیں کہ جنت کو اس کی جگہ سے ہٹا کر قریب کر دیا جائے گا (حسن بصری بروایت خطیب)

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ۔ مذکورہ بالا بارہ احوال ہونے کے بعد ہر شخص کو اپنے حاضر کردہ اعمال معلوم ہو جائیں گے یعنی اعمال ناموں میں لکھے ہوئے اعمال یعنی حساب فہمی کے لئے پیش کردہ اعمال یا وزن کرنے کے وقت اعمال کے جو آثار نمودار ہوں گے وہ معلوم ہو جائیں گے (کبیر) ہو سکتا ہے کہ کلام حقیقت پر محمول ہو۔ آدمی اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا اصل قوتو فضائی لہروں میں موجود رہتا ہے۔ زندگی کی ان گنت حرکات کے بے تعداد عکس کہربائی لہروں میں موجود ہیں۔ قیامت کے دن یہ تمام عکس سامنے لے آئے جائیں گے اور آدمی کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے یہ اعمال کئے تھے یا مجازی معنی مراد ہو اور عمل سے مراد پاداش عمل ہو یعنی ہر شخص کو اپنے پیش کردہ اعمال کی جزا سزا معلوم ہو جائے گی۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ اس جملہ میں تین امور تنقیح طلب ہیں ۱۔ فلا اقسم میں ۔لا۔ کا کیا معنی ہے ۲۔ الخنس کا معنی کیا ہے ۳۔ الکنس سے مراد کیا ہے ۔ ۱۔ خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ لا زائد ہے، لیکن بے فائدہ نہیں۔ سیوطی نے اتقان میں اور اہل تفسیر کی کثیر جماعت نے صراحت کی ہے کہ فعل قسم پر لا کو ذکر کرنے سے نفی کی تاکید ہو جاتی ہے ۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات القرآن جلد پنجم باب اللام مؤلفہ فقیر۔

۲۔ ۳۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ الخنس جمع ہے الخانس کی ۔ خنوس مصدر ہے جس کا معنی ہے سمٹ جانا، چھپ جانا اور الکنس جمع ہے الکانس کی کنس مصدر ہے جس کا معنی ہے ہرن نیل گائے وغیرہ کا اپنی جھاڑی میں چھپ جانا۔ الجوار جمع ہے الجاریہ کی جری کا معنی ہے چلنا رواں ہونا۔ اس توضیح پر جملہ کا ترجمہ ہوگا میں پکی قسم کھاتا ہوں سمٹنے والوں، چلنے والوں، چھپنے والوں کی۔ یہ الفاظ مبہم ہیں۔ مراد کی تعیین میں متعدد اقوال اکابر سے مروی ہیں۔

۱۔ ستارے مراد ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حارث اعور کے طریق سے اس قول کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا ہے لیکن حارث اعور کے متعلق بعض اہل نقد نے کلام کیا ہے۔ خالد بن عرعرہ کے طریق سے بھی حضرت علی کا یہی قول مروی ہے جس کو حضرت ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے خالد مذکور کے طریق سے ہی روایت کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا الخنس ستارے ہیں جو دن میں چھپ جاتے ہیں اور رات میں کنس ہو جاتے ہیں۔ ابن کثیر نے اس اسناد کو صحیح قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، حسن بصری اور سدی وغیرہم سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سے ستارے مراد ہیں۔ خالد مذکور کی روایت سے حضرت علی کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں مخصوص ستاروں کی تعیین نہیں ہے۔ دن کو چھپنے والے اور رات کو اپنی جگہ پر نمودار ہونے والے تمام ستارے مراد ہو سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک اور قول مروی ہے کہ زحل، مریخ، مشتری، زہرہ، عطارد ۔ یہ پانچ ستارے مراد ہیں۔ یہی کہکشاں کو قطع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا ستارہ اس پر نہیں گزرتا۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں دو قول نقل کئے ہیں اول یہ کہ خمسہ متحیرہ (زحل، مریخ، مشتری، زہرہ، عطارد) مراد ہیں۔ ان ستاروں کی چال عجیب ہے۔ کبھی پیچھے کو لوٹتے ہیں کبھی آگے ہو جاتے ہیں اس لحاظ سے ان کو خنس کہا گیا اور چونکہ آفتاب کی روشنی میں یہ غائب ہو جاتے ہیں اس لئے کنس کہا گیا۔ بعض علماء نے کنس کہنے کی وجہ سورج میں چھپ جانے کو قرار دیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چاند سورج اور پانچوں مذکورہ بالا کل ساتوں سیارے مراد ہیں۔ ان کے طلوع و غروب کے مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ شروع ماہ میں ایک مقام سے طلوع ہو کر دور ہوتا رہتا ہے اور اسی طرح مطلع

اوّل ہمیشہ دور ہوتا چلا جاتا ہے اس لحاظ سے ان کو خنس کہا گیا (یعنی خنوس کا معنی دور ہونا مطلع اوّل کو چھوڑ دینا) پھر آخر سال میں مطلع اوّل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے کنس ہوئے۔ (یعنی جس طرح ہرن، نیل گائے وغیرہ اپنی جھاڑی کے اندر کہیں سے واپس آکر چھپ جاتے ہیں اسی طرح یہ ستارے مطلع اوّل کی طرف رجوع کرتے ہیں) حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔

ابو داؤد طیالسی نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نیل گائیں مراد ہیں جو (جھاڑی کے) سایہ میں داخل ہو جائیں۔ دوسری روایت میں ہرن مراد ہونے کا قول حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہی قول مجاہد و ضحاک کا بھی مروی ہے۔ ابو الشعثاء نے دونوں قولوں کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف کی ہے۔

شیخ ابن جریر نے یعقوب دورقی کی اسناد سے بطریق مغیرہ نقل کیا ہے کہ مجاہد نے کہا لوگ کہتے ہیں یہ نجوم ہیں لیکن ہم سنتے تھے کہ وحشی گائیں ہیں جو اپنے مسکن میں چھپ جائیں۔

ابراہیم نخعی نے مرسلاً کہا کہ ابو میسرہ نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا الخنس جنگلی گائیں ہیں۔ شاید حضرت کی مراد تفسیر آیت نہ ہو بلکہ یہ بیان مقصود ہو کہ الخنس لغت میں نیل گایوں کو کہتے ہیں۔

اکثر مفسرین مثلاً شیخ ابو السعود، رازی، خطیب وغیرہم نے صراحت کی ہے کہ نجوم ہی مراد ہیں۔ رازی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

واللیل اذا عسعس۔ عسعس لغات اضداد میں سے ہے۔ سامنے آنا اور پشت پھیرنا دونوں معنی کے لئے مستعمل ہے۔ اوّل صورت میں رات کی ابتدائی تاریکی آنا اور دوسری صورت میں رات کی آخری تاریکی جانا مراد ہوگی۔ یعنی مغرب کے بعد کا وقت اور فجر کا وقت۔ ابن کثیر نے اکثر علماء شافعیہ کی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک وقت میں دونوں معنی کا مراد لینا جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ شافعیہ کے نزدیک مشترک کے دونوں معنی ایک وقت میں مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن شیخ نے اوّل معنی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ ترجیح آگے آتی ہے۔

مجاہد کے نزدیک تاریکی ہو جانا، حسن بصری کے نزدیک تاریکی چھا جانا اور سعید بن جبیر کے نزدیک تاریکی شروع ہو جانا مراد ہے۔

علی بن ابی طلحہ اور عوفی کی روایت سے ابن عباس کے نزدیک دوسرا معنی مراد ہے۔ ایک قول مجاہد کا بھی یہی ہے۔ قتادہ، ضحاک، زید بن اسلم اور عبد الرحمن بن زید نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابو داؤد طیالسی نے باسناد جید نقل کیا ہے کہ ابو عبد الرحمن نے کہا ایک روز جب مؤذن نے صبح کی اذان دی تو حضرت علیؓ باہر تشریف لائے۔ اور فرمایا ایسے لوگ جو وتر (کے آخری وقت) کو دریافت کرتے ہیں اور واللیل اذا عسعس والصبح اذا تنفس کو پوچھتے ہیں کہاں ہیں اس کا وقت یہی ہے جب رات پشت پھیر کر جا رہی ہے۔ اس روایت سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک عسعس کا دوسرا معنی مراد ہے اور یہی تنفس صبح کا وقت ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے اور شہادت میں شاعر کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے

حتی اذا الصبح لہ تنفسا   وانجاب عنہا لیلہا وعسعسا

یہاں تک کہ جب صبح کی ہوا چلنے لگی اور رات کی تاریکی لپٹ گئی اور رات پشت پھیر کر جانے لگی۔

فراء نے اسی معنی پر مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے۔ (نقلہ الجوہری عن الفراء) رازی، خطیب اور صاحب فتح البیان نے صراحت کی ہے کہ حضرت ابن عباس سے عسعس کے دونوں معنی مروی ہیں۔ ابن کثیر نے معنی اوّل کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دوسرے معنی مراد لینے پر والصبح اذا تنفس سے تکرار ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں تنفس صبح اور ادبار لیل کا ایک ہی وقت ہوگا اور اوّل معنی مراد لیا جائے تو اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں اللہ نے صبح اور شام دونوں وقتوں کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ۔ یا۔ واللیل اذا یغشیٰ والنہار اذا تجلیٰ۔ مگر شیخ کا یہ شبہ بے بنیاد ہے۔ تکرار مفہوم کسی طرح نہیں ہوتی کیونکہ تنفس صبح سے مراد ہے صبح کا کامل طور پر نکل آنا اور رات کے پشت پھیرنے سے مراد ہے اوّل صبح یعنی فجر کاذب جب رات کا اندھیرا روبزوال ہوتا ہے یہ دونوں وقت ایک نہیں ہیں بلکہ متصل ہوتے ہیں۔ رہی دوسری آیات کی نظیر تو جس طرح اوّل معنی مراد لینے کی تائید میں نظیری آیات کو پیش کیا گیا ہے۔ ایسا ہی دوسرے معنی کا مراد ہونا بھی بعض دوسری آیات سے ظاہر ہے جیسے واللیل اذ ادبر والصبح اذا اسفر بلکہ اس آیت میں ادبار اور اسفار کے الفاظ بالکل وہی ہیں جو عسعس اور تنفس کے ہم معنی ہیں۔

والصبح اذا تنفس۔ صبح کا سانس لینا کیا ہے۔ طلوع ہو جانا (ضحاک) روشن ہو جانا (قتادہ) نمودار ہو جانا (سعید بن جبیر وغیرہ روی عن امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) ابن جریر نے کہا دن کی روشنی صاف طور پر سامنے آ جانا مراد ہے۔ ابو السعود نے لکھا ہے یہ دن کا آغاز ہوتا ہے۔ خطیب نے لکھا ہے جب صبح آنے لگتی ہے تو نسیم کے خوشگوار جھونکے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی کو مجازاً تنفس صبح قرار دیا۔

ضروری تنقیح ہیئت قدیم کے عالم کہتے ہیں کہ ستارے دو قسم کے ہیں ثوابت اور سیارے۔ ثوابت کی حرکات مختلف نہیں ہیں۔ ان کے افلاک کی حرکات بھی بہت سست ہیں۔ اور کم دکھائی دیتی ہیں۔ سیارے محسوس الحرکات ہیں ان کی حرکات بھی مختلف ہیں۔ تعداد میں یہ سات ہیں۔ پانچ کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ اور چھٹا ساتواں چاند اور سورج ہے۔ چاند اور سورج کی تاثیرات اور آثار ہر بیوقوف اور دانشمند جانتا ہے۔ چاندنی، دھوپ، درختوں اور سبزوں کا نشو و نما، پھلوں کا پیدا ہونا اور پکنا، فصلوں کا تبادل، موسموں کا اختلاف، تاریکی اور روشنی، سمندروں کا جوار بھاٹا اور ان کے علاوہ ہزاروں اقسام کے تغیرات چاند اور سورج کی تاثیرات سے وابستہ ہیں۔ خمسہ متحیرہ یعنی زحل، مریخ، عطارد، مشتری اور زہرہ کی تاثیرات سے اہل تنجیم تو واقف ہیں، لیکن عام لوگ نہیں جانتے۔ ان کی چال عموماً مشرق سے مغرب کی جانب ہوتی ہے۔ ترتیب وار برج حمل سے ثور، ثور سے جوزا میں جوزا سے اسد میں، اسد سے سنبلہ میں اسی طرح بارہ برجوں میں ان کی حرکت ہوتی رہتی ہے۔ ان کی اس ترتیبی حرکت کو استقامت کہتے ہیں، لیکن چند روز کے لئے ان میں حرکت بالکل نمودار نہیں ہوتی۔ اس حالت کو وقوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وقوف کے بعد یہ پیچھے کو پلٹتے ہیں اور ان کی حرکت مشرق سے مغرب کی طرف ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس حالت کو رجعت یا رجوع کہا جاتا ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوڑتا ہوا آدمی برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوران رفتار میں اس کو کوئی خارجی تخیل دوڑنے سے روکتا ہے وہ متحیر ہو کر رک جاتا ہے۔ پھر اسی تحیر کی حالت میں کچھ سوچ کر لوٹ پڑتا ہے۔ استقامت وقوف اور رجعت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اس کی صراحت اہل ہیئت نے کی ہے۔ یہ جگہ طولانی بحث کی نہیں ہے۔ اس جگہ اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ ان سیاروں کی رفتار کی یہ تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ان کا باہم ربط اور جذب مختلف طور پر ہوتا ہے اور چاند سورج سے بھی ان کے مخصوص متعدد اور مختلف روابط ہیں اور ان کل روابط کے نتیجہ میں اس کائنات میں لاکھوں تغیرات ہوتے ہیں نیستی کے بعد ہستی اور وجود کے بعد عدم لاکھوں چیزوں کا ان کی تاثیرات اور ارتباطات سے وابستہ ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کے ہمہ گیر تصرف اور محیط کل حکمت کے زیر اثر ہوتا ہے۔ سلسلۂ اسباب کی یہ باہم وابستگی اور ہر کڑی کا دوسری کڑی سے مربوط ہونا حاکم مطلق کے زیر حکم ہے۔ کائنات کو زیر و زبر کرنے والے سیارے خود مختار نہیں خود مؤثر نہیں۔ ان کی حالت، کیفیت، حرکت، سکون، تاثر، تاثیر ہر آن متغیر اور زوال پذیر ہے۔ ان سیاروں سے بھی زیادہ نمایاں تغیرات اور دن کے تبادلے سے ہوتے ہیں۔ دن کا آثارات کا ہوتا کون نہیں جانتا۔ رات کی تاریکی پردہ پوش ہے۔ سکون بخش ہے۔ نمونہ موت ہے۔ زندہ اجسام کو مشاغل حیات سے معطل کرنے والی ہے سفیدۂ صبح آغاز حرکت ہے نمونہ حیات ہے۔ عدم کے پردہ کو ہٹانے والی ہے۔ تعطل حواس کو دور کرنے والی ہے۔ بس یہ سارا بیان جن عظمتوں کا حامل ہے ان ساری عظمتوں کی قسم کہ یہ قرآن سچا ہے۔ اللہ کے رسول کی وساطت سے اللہ کے رسول پر نازل کیا گیا ہے۔

انہ لقول رسول۔ رسول سے اس جگہ مراد حضرت جبرئیل ہیں (حضرت ابن عباس، شعبی، میمون بن مہران، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس وغیرہم) جبرئیل کا قول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی طرف سے وحی ہے جو جبرئیل کی وساطت سے ہوئی۔ وحی غیر متلو نہیں جو بغیر جبرئیل کی وساطت سے ہوئی ہو اور جس میں محمد الرسول اللہ کے اختراع دماغی، تصرف ذہنی یا القاء شیطانی کا وہم کیا جا سکے۔ یہ تو وحی منطوق ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ جبرئیل نے پہنچایا ہے۔ وحی غیر منطوق کے معانی اللہ کی طرف سے اخباری یا انشائی پیرایہ میں ہوتے ہیں، لیکن ان معانی کو الفاظ کا جامہ پہنانا رسول اللہ کا کام ہے، اس لئے الفاظ اعجازی نہیں ہوتے۔ اگرچہ بلاغت کی آخری چوٹی پر فائز ہوتے ہیں۔ الفاظ کی ترتیب، ترکیب اور ہیئت اجتماعی میں انسانی ساخت کو دخل ہوتا ہے۔ تمام صحیح احادیث اس کی شاہد ہیں۔ کوئی بد اندیش، کج فہم یہ وہم کر سکتا ہے کہ الفاظ رسول اللہ کے ساختہ پرداختہ ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ الفاظ کے معانی بھی رسول اللہ کے خود تراشیدہ اور پیش کردہ ہوں جس طرح ہر حکیم اور دانشمند خود دماغ سے ابطال اور علم و عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ اور انسانی زندگی اس کی نظر میں جن اصول کی پابندی ہونی چاہیئے ان کو بیان کرتا ہے، لیکن اس کے فہم کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ عصمت و غلطی دونوں کا

انسانی صوابدید میں احتمال ہوتا ہے، اس لئے نبی کی تعلیم بھی یقینی نہیں عقل کی زائیدہ ہے وحیانی نہیں۔ ربانی ہے۔ پھر کیوں ہم دوسرے دانشوروں کو چھوڑ کر پیغمبر کی تعلیم ہی کو صحیح مانیں اور کیوں ان کی ہی پیروی کو فرض جانیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ قرآن وحی منطوق ہے۔ جبرئیل کی وساطت سے اللہ کا بھیجا ہوا ہے نہ اس کے معانی میں اختراع فہمی کا احتمال ہے نہ الفاظ میں عقلِ انسانی کے عمل کا دخل۔ رہی یہ بات کہ جبرئیل کون ہیں۔ ان کا خدا سے کیا تعلق۔ انسان اور خدا کے درمیان ان کو ایلچی بننے کا کیا حق۔ کیا ان کو نسیان طاری نہیں ہو سکتا۔ کیا ان کے معلومات اور محفوظات میں وہم کا دخل نہیں ہو سکتا۔ کیا نفسانی کدورتوں سے یہ پاک ہیں۔ کیا خدا اور انسان کے درمیان ان کا فرستادہ ہونا اور پیام پہنچانا ہر طرح کے جذبۂ خیانت سے پاک ہے۔ ان معانی کی توضیح کے لئے فرمایا۔

کریم۔ وہ باوجاہت (ابن کثیر) عالی قدر (عام مفسرین) ہیں اور ظاہر ہے کہ عزت و جاہت اور مرتبہ کی بزرگی تقوی کے بغیر ممکن نہیں، اسلئے جبرئیل کا صاحبِ تقویٰ اور صالح الاعمال، مومن کامل ہونا ضروری ہے۔ اور راوی کے ثقہ ہونے کے لئے سب سے اول اسی کی ضرورت ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے الکرم التقوی۔ اَتقیٰ کو اَکرم عند اللہ آیت اِن اکرمکم عند اللہ اتقٰکم میں قرار دیا ہے۔

ذی قوۃ۔ جبرئیل قوت والے بھی ہیں۔ کیسی قوت، کتنی قوت اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ دوسری آیت میں جبرئیل کے متعلق شدید القویٰ ذو مرّۃ فرمایا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب جبرئیل کی تمام قوتیں اعلیٰ اور اکمل ہیں تو قوتِ حافظہ بھی درجۂ کمال پر فائز ہے، اس لئے نسیان کا احتمال نہیں۔ راوی کے ثقہ ہونے کے لئے جس طرح عدل ضروری ہے اسی طرح ضبط و حفظ بھی لازم ہے تاکہ بے کم و کاست اور بغیر بیشی اور تغیر کے جس طرح سنا ہے ویسا ہی یاد رکھے اور پہنچا دے۔

عند ذی العرش مکین۔ عدل اور ضبط کے بعد قبول روایت کے لئے اگرچہ کسی مزید شرط کی ضرورت نہیں، لیکن باوجود صالح الاعمال اور جید الحافظہ ہونے کے بے وقار آدمی جس کی ساکھ لوگوں میں کمزور ہو ناقابلِ توجہ ہوتا ہے اور اس کی بات عام لوگوں کے لئے کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ مگر جبرئیل اس عیب سے بھی پاک ہیں۔ سب سے اونچے شاہی دربار میں ان کا بڑا وقار ہے۔ عرشِ خداوندی جو سب سے بڑا مظہرِ اقتدارِ الٰہی ہے اس عرش کے مالک کی بارگاہ میں جبرئیل بڑی عزت والے ہیں۔ بقول ابو صالح ستر نوری پردوں کے اندر داخل ہونے کی ان کو اجازت ہے۔ گویا مقامِ الوہیت کے سب سے بڑے رازدار اور نقیب وہی ہیں۔ امام رازی نے لکھا ہے مکین اس باعزت شخص کو کہتے ہیں جس کی ہر خواہش مقبول ہو۔ پھر اُن کو فقط عزت قرب ہی حاصل نہیں بلکہ کارخانۂ قدرت کے سب سے بڑے کارندے بھی ہیں۔ لامحدود غیبی قوتیں جن کو ملائکہ

مُطاعٍ ثَمَّ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے متعلق نظمِ کائنات کی خدمت ہے اور عالم بطون و شہود کا انتظام اُن سے متعلق ہے سب جبرئیل کے فرماں بردار اور اطاعت گزار ہیں۔ اقتدارِ الٰہی کی بارگاہ کے تمام مقرب فرشتے ان کو اپنا سردار مانتے اور ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ رہا احتمال خیانت اور پیام رسانی میں خرد برد کا وہم تو وہ اس سے بھی پاک ہیں۔

امین۔ اللہ نے ان کو امین قرار دیا ہے۔ وہ امانت دار ہیں۔ نہ خلافِ حکم کوئی پیام پہنچاتے ہیں نہ وحی میں کوئی کمی بیشی کرتے ہیں۔

وما صاحبکم بمجنون۔ صاحبکم سے مراد ہے رسول اللہ صلعم کی شخصیتِ مبارکہ۔ (میمون بن مہران۔ شعبی۔ قتادہ) کوئی دیوانہ اگر وہم کرنے لگے (بلکہ معاند کافر کبھی دوسروں کو روکنے کے لئے کہتے بھی تھے) کہ کہاں جبرئیل جو مقامِ قرب کا رازدار اور سید الملائکہ ہے اور کہاں قریش کا یہ جوان۔ اپنا تعلق جو جبرئیل سے بتاتا ہے اور قرآن کو وحیٔ الٰہی کہتا ہے یہ محض دیوانگی ہے۔ اس کی عقل اور ہوش حواس پر جنون کا پردہ پڑ گیا ہے جس سے دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ اس کو کیسے یقین کہ قرآن سکھانے والا جبرئیل ہے۔ یہ جبرئیل کو کیا جانے۔ کسی جن نے اس کو سکھا دیا اور یہ جن کو جبرئیل سمجھنے لگا۔ اس شیطانی وہم اور دیوانے کی بڑ کو دفع کرنے کے لئے فرمایا کہ تمہارا ساتھی قطعاً دیوانہ نہیں۔ یعنی یہ کوئی اجنبی اور غیر معروف آدمی نہیں جس سے تم ناواقف ہو۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا۔ پیدائش سے کہولت تک تمہاری صحبت میں اس نے زندگی گزاری کبھی اس پر جنون کا دورہ نہیں پڑا، اس لئے اس کے متعلق مجنون ہونے کا شبہ کرنا ہی بے بنیاد ہے۔ باقی رہا جبرئیل کو جاننے اور پہچاننے کا سوال تو اُس کے متعلق فرمایا۔

ولقد راٰہ بالافق المبین۔ رسول اللہ اس وقت جبرئیل کو دیکھ چکے تھے جب جبرئیل اُفقِ مبین میں تھے۔

اُفق مبین - آسمان کا روشن کنارہ (ربیع بن انس) یعنی مشرقی اُفق (سفیان ثوری) یا مغربی اُفق (ابن الجبیر) اجیاد کی جانب جو مکہ سے مشرق کی طرف ہے (مجاہد)

مؤلف فتح البیان نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے نزدیک اُفق مبین سے مراد ساتویں آسمان کا اُفق ہے جب کہ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس رسول اللہ ؐ نے جبرئیل کو دیکھا۔ صاحب فتح کی یہ روایت اوّل تو اسناداً غلط ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہاں اس قول کا ثبوت نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ سورۂ والنجم کی آیت لقد رآہ بالافق الاعلیٰ کی تشریح کے ذیل میں ابن عباس نے فرمایا ہو۔ دوسری بات یہ کہ اگر قول مذکور کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دیکھنا دوسری مرتبہ ہوگا کیونکہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس رویت جبرئیل کے متعلق آیت میں لقد رآہ نزلۃ اخریٰ آیا ہے اس سے پہلے کا دیکھنا یہاں مذکور نہیں ہے۔ گویا اس سورت کا نزول معراج کے بعد ماننا پڑے گا۔ جس میں گزشتہ شب معراج میں دیکھ چکنے کا اظہار کیا گیا ہے۔ حالانکہ شیخ ابن کثیر اور بعض دوسرے اہل تفسیر نے اس سورت کے نزول کے بعد واقعۂ معراج ہونے کی صراحت کی ہے۔

تحقیق مبحث یہ ہے کہ صحیح حدیث کے مطابق رسول اللہ نے حضرت جبرئیل کو اصلی شکل میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ سورۂ مدثر کے نزول سے چند ساعت پہلے زمین آسمان کے درمیان معلق ایک زریں کرسی پر۔ اس ہیئت کے ساتھ کہ جبرئیل کے چھ سو بازو تھے اور اجیاد کی جانب سے سارے افق اعلیٰ کو جبرئیل کی ضخامت نے گھیر لیا تھا۔ دوسری بار شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اسی صورت میں۔ گویا وجود جبرئیل کا یقین دلانے کے لئے وہ آغاز صورت نمودار کی گئی تھی۔ اور نبوت و رسالت کی چوٹی پر پہنچا کر آخر میں اُسی اوّل صورت کو نمایاں کر کے اوّل مرتبہ دیکھنے کی تائید کر دی گئی۔ اس طرح حقیقت جبرئیل سے رسول اللہ کی طبیعت بشری مانوس بھی ہوگئی۔ اور وہم دماغی کا ازالہ ہو کر یقین روحانی میں قوت بھی پیدا ہوگئی۔

سورۂ والنجم میں دونوں مرتبہ کا دیکھنا مذکور ہے دیدار اوّل جہاں ہوا سورۂ والنجم میں اس کو افق اعلیٰ کہا گیا ہے اور یہاں افق مبین۔

ایک لطیف نکتہ ارباب شہود اور اصحاب کشف کہتے ہیں کہ افق اعلیٰ اور افق مبین سے آسمان کا کنارہ مراد نہیں۔ بلکہ عالم مثال کے دونوں کنارے مراد ہیں۔ اعلیٰ اور اسفل۔ بالائی اور زیریں۔ عالم مثال کا بالائی کنارہ عالم تجرد سے ملا ہوا ہے۔ جو خالص عالم ملائکہ ہے اور نچلا کنارہ اس عالم بشری سے ملا ہوا ہے۔ گویا عالم ایک برزخ ہے عالم ملائکہ اور عالم بشری کے درمیان۔ اوّل جبرئیل کی حقیقت ملکوتی نے عالم مثال کا جامہ پہنا۔ اسی عالم برزخ کے افق پر نمودار ہوئی۔ جسم مثالی کی شکل اختیار کی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ذات محمدیؐ سے قریب ہوتے ہوتے متصل ہوگئی۔ پھر مزید تنزلی شکل اختیار کی۔ یہاں تک کہ عالم مثال کے نچلے کنارے تک پہنچ گئی۔ اور ایسے افق سے نمودار ہوئی کہ شناخت میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ رسول اللہؐ کی نظر میں حقیقت جبرئیل کا ظہور عالم مثال کے زیریں درجہ سے شروع ہوا تھا جو ترقی کرتے کرتے عالم مثال کی سطح اعلیٰ تک پہنچ گیا۔ واللہ اعلم۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ۔ اس آیت میں غیب سے مراد ہے قرآن مجید اور ہُوَ کی ضمیر رسول اللہؐ کی طرف راجع ہے یعنی قرآن مجید کی تعلیم دینے میں رسول اللہؐ بخل نہیں کرتے۔ ہر غریب فقیر، غلام، دولتمند اور آزاد کو تعلیم دیتے ہیں (قتادہ، عکرمہ، ابن زید وغیرہم)

اس صورت میں اس آیت سے اس شیطانی وہم کا ازالہ مقصود ہوگا کہ کسی جن نے رسول اللہؐ کو قرآن مجید سکھا دیا ہے۔ یہ وحی خداوندی نہیں بلکہ القاء شیطانی ہے جیسے کاہنوں کو جن الہام کرتے ہیں۔ اور کچھ باتیں بتا دیتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی جن رسول اللہؐ کو قرآن کی آیات القاء کر دیتا ہے۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح ہوگا کہ کاہنوں کو کچھ باتیں جنات القاء کر دیتے ہیں اور وہ ایک بات میں اپنی طرف سے سو باتیں ملا کر لوگوں سے کہتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں صرف انہی لوگوں سے جن سے ان کو مالی فائدہ ہوتا ہے۔ بغیر لالچ کے وہ کچھ نہیں بتاتے۔ پھر ان کی خبریں غیبی نہیں ہوتیں نہ ضوابط حیات سے اُن کا تعلق ہوتا ہے نہ تعلیم دین سے نہ آخرت کے عذاب ثواب سے۔ چند خود ساختہ قیاسی اور بکثرت الملابس ہوتی ہیں جو کبھی سچ نکلتی ہیں کبھی جھوٹ۔ وجدان سے اُن کا کوئی علاقہ نہیں محض دماغی جوڑ توڑ اور تخیل و ترکیب کے نتائج ہوتے ہیں۔ رسول اللہؐ کو اوّل تو کسی سے لالچ نہیں۔ امیر غریب اور آزاد غلام کا کوئی فرق نہیں۔ سب کو بغیر اجرت اور طمع کے آپ قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔ پھر یہ تعلیم قیاسی اور بکثرت اور واہی تباہی نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی معاش و معاد اور زندگی کی صلاح و فلاح کی غیبی حقائق سے ہے۔ جہاں عقل انسانی کے عمل اور فکر بشری کی رسائی کا دخل نہیں۔ وہ ضوابط حیات، وہ اصول زندگی، وہ حقائق مبدء اور وہ نتائج معاد محض غیبی تعلیم اور وحی الٰہی سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہانت اور القاء جنات سے قرآن کی کچھ بھی مشابہت نہیں۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی اور بعض دوسرے اہلِ تفسیر کے نزدیک ھو کی ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع ہے اور غیب سے مراد ہیں ضوابطِ حیات ۔ اور وہ شرعی اصول زندگی جو عقلِ انسانی کی رسائی سے خارج ہیں اور احساس و تعقل سے غائب ہیں اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید ایسے ضوابطِ حیات، حقائق کائنات اور تاریخ معاد کا مظہر ہے جو اختراع دماغی اور عمل فکری کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے جبرئیل کی وساطت سے نازل کردہ ہیں اور رسول اللہ کو ان کا علم وجدان کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے۔

بعض متواتر قرائتوں میں ضنین کی بجائے ظنین آیا ہے۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ رسول اللہ ان چیزوں اور معاملوں کے متعلق جو فکر بشری سے بلند ہیں متہم نہیں ہیں اور نہ اُن پر تہمت لگائی جا سکتی ہے کہ خود ساختہ اور دماغی تراشیدہ کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیں اور اپنے کلام کو اللہ کا کلام قرار دے دیں۔ (کیونکہ اس سے پہلے کسی دروغ بافی اور کذب تراشی کی تہمت ان پر نہیں لگائی گئی۔ پس جو شخص چالیس برس کی عمر تک صادق امین رہا ہو اور کسی دنیوی معاملے میں جھوٹ نہ بولا ہو وہ ضوابطِ حیات اور غیبی امور کے متعلق بڑھاپے میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہے)

وما ھو بقول شیطان رجیم فاین تذھبون۔ یہ مزید تائید ہے قرآن کے وحی الٰہی اور قولِ جبرئیل ہونے کی اور صراحت ہے نفیٔ کہانت اور القاء جن کی۔

ان ھو الا ذکر للعالمین۔ اس آیت کا مطلب تین طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے ۱۔ قرآن مجید سارے جہان کا تذکرہ ہے۔ نامی ہو یا جامد حیوان ہو یا غیر حیوان، انسان ہو یا فرشتہ اور جن سفلی ہو یا علوی، آسمان ہو یا زمین سب کی حالت، کیفیت اور لوازم ذات و صفات کا اس میں بیان ہے۔ یعنی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ متغیر ہے۔ منافی قدم ہے مقتضی عدم ہے، محتاج ہے، معدوم الاصل ہے۔ نیستی سے ہستی میں آئی اور نیستی کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ اللہ کی خلاقیت، صانعیت، الوہیت اور ربوبیت پر ذرہ ذرہ دلالت کر رہا ہے۔ قطرہ قطرہ اور پتہ پتہ اپنے مرکز کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔

۲۔ یا عالمین سے مراد ہیں انسان، جن اور فرشتے۔ کیونکہ یہی تینوں مکلف ہیں۔ اصحاب ارادہ ہیں۔ فرشتوں کے لئے قرآن مجید کے تشریعی احکام اگرچہ نازل نہیں کئے گئے، لیکن توحید، تمجید، اقرار الوہیت و ربوبیت اور ایمان بالرسل والکتب پر سب مکلف ہیں۔ قرآن مجید ان سب کے لئے یادداشت توحید ہے، ذکر تمجید ہے، تذکرۂ الوہیت و ربوبیت ہے، ہدایت نامہ ہے۔

۳۔ یا عالمین سے مراد صرف انسان ہیں۔ سارے جہان کے انسان، قیامت تک آنے والے تمام انسان۔ قرآن کے اندر ہر شخص کے لئے درس بصیرت ہے۔ پیام موعظت ہے، ضوابطِ حیات کا بیان ہے، حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کرانے والی تعلیم ہے۔ مفید اور مضر کو جدا جدا ظاہر کر دیا ہے۔ واجبات اور ممنوعات کی تشریح کر دی گئی ہے۔ گویا سارے جہان کے آدمیوں کے لئے تذکرہ ہے

پس ایسا کلام جو حقائق کائنات اور کیفیات جہان کا آئینہ ہو جو تمام ارادی طاقت رکھنے والی مخلوق کے لئے ہدایت نامۂ توحید اور یادداشت الوہیت ہو، جو تمام انسانوں کے لئے ضوابطِ زندگی کو بیان کرنے اور نجات و ہلاکت کے راستے الگ الگ متعین کرنے والا ہو، جن اور شیطان کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔ کہانت سے اس کا کیا تعلق۔ دماغی اختراع اور شعوری دیوانگی سے کیا ربط۔ وحی ربانی اور الہام شیطانی میں تمیز کرنا قرآن کو دیکھ کر بہت آسان ہے۔ عرش سے فرش کو اور ثریا سے ثری کو مشابہت کیسے ہو سکتی ہے۔

لمن شاء ان یستقیم۔ یوں تو قرآن مجید سارے جہان کے لئے یادداشت ہے، لیکن آفتاب کی روشنی سے سب کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ظرف اور قابلیت کا اختلاف ہمہ گیر افادیت میں نیرنگی اور گوناگونی پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ بعض کی محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔ طلب نجات کے بغیر ہر ہدایت نامہ بے سود ہے۔ اگر زندگی کی چال سیدھی کرنی اور سیدھی رکھنی منظور نہ ہو تو موعظت نامہ کا کیا فائدہ۔ علمی صحت اور عملی راستی کی طلب اولین شرط ہے اور طلب کے بعد راستی کو اختیار کرنا اور پھر ثابت قدم رہنا ضروری ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عالمی یادداشت سے صرف استقامت کے طلبگار ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ گویا حاصل نزولِ قرآن انہی کی ہدایت ہے۔

وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ مگر اس سے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آدمی بے لگام ہے، مطلق العنان ہے۔ اپنی منشا اور اختیار کا مالک اور خالق ہے۔ آدمی کے اندر مشیت پیدا کرنا تو اللہ ہی کا کام ہے۔ اللہ ہی کی مشیت آدمی کی مشیت کی خالق ہے۔

رب العالمین ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ سارے جہان کا مالک اور حاکم ہے۔ خیر کے ساتھ شر اور ایمان کے ساتھ کفر کو پیدا کرنا، نور کے ساتھ ظلمت اور دن کے ساتھ رات کو لگا رکھنا اس کی حکمت ہے۔ اس کے نظم کا اقتضا ہے۔ اس کی مرضی جیسا چاہا ویسا کر دیا۔ جیسی مشیت ہوئی ویسی ہی تخلیق کر دی۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

جب انسان کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے تو آدمی نہ سزا کا مستحق ہو سکتا ہے نہ جزا کا۔ نہ وہ خود مختاری کے ساتھ اچھا کرتا ہے نہ بُرا نہ نیکی بدی۔ پھر ثواب عذاب کیسا اور اوامر و نواہی کی کیا ضرورت۔ بات یہ ہے کہ انسان واقعی اپنی مشیت کا خالق تو نہیں ہے۔ کسی نے اپنا ارادہ اور اختیار خود نہیں بنایا۔ آدمی کے اندر ارادہ کی طاقت خود ساختہ نہیں خداداد ہے، مگر قوتِ ارادہ ملنے کے بعد اپنے اختیار کو استعمال کرنا تو اس کے بس میں کر دیا ہے۔ بازی گر تار کو حرکت دیتا ہے پُتلیاں ناچتی ہیں۔ پتلیوں کا ناچ پتلیوں کا فعل نہیں ہوتا۔ کیونکہ پتلیوں کے اندر بازی گر نے قوتِ ارادہ نہیں پیدا کی نہ وہ پیدا کر سکتا ہے، مگر آدمی ایسی کٹ پتلی نہیں۔ اس کو تو خدا نے ارادہ کی طاقت عطا کی ہے۔ یہ درخت نہیں، پتھر نہیں، ریگستان کے ذروں اور پانی کے قطروں کی طرح نہیں۔ سورج کی کرنوں اور بادل کے ٹکڑوں کے مانند نہیں۔ اس کو قوتِ ارادہ کے استعمال کا اختیار دیا گیا ہے، اس لئے اچھے بُرے ہر عمل کی نسبت اُس کی طرف کی جاتی ہے اور پاداشِ عمل کا یہ مستحق قرار پاتا ہے۔ اسباب کی کڑیاں ضرور باہم مربوط اور وابستہ ہیں۔ مادہ پرست لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ درخت سے پتہ گرتا ہے، اس لئے کہ اس کو گرنا ہی چاہیئے تھا، کونپل پھوٹتی ہے، اس لئے کہ اس کو پھوٹنا ہی چاہیئے تھا۔ اسباب کا یہی تقاضا ہے، لیکن وہ نہیں سوچتے کہ غیر مختار سلسلۂ اسباب کو انسان کی انانیت شکست کر دیتی ہے۔ باہم وابستگی میں رخنہ پیدا کر دیتی ہے انسان پتھر کی طرح بے حس تو نہیں ہے اور بادلوں کی طرح شعور و ارادہ سے خالی تو نہیں، کائنات کا مزاج ہے، اسباب کا بالکل محکوم و غلام نہیں حکمران بھی ہے۔ جہاں تک دوسرے جامد اور نامی، متحرک اور ساکن اجسام کے ساتھ شرکت کا سوال ہے وہاں تک انسان دوسری کائنات کی طرح محکوم اور غلام ہے۔ تکوینی قانون کے سامنے دوسری مخلوق کی طرح سرافگندہ ہے۔ اندرونی اور بیرونی اعضاء کی بناوٹ اور تخلیق میں مجبور ہے۔ ہضم غذا دورانِ خون اور حرکاتِ تنفس میں اس کا کوئی دخل نہیں تخلیق ارادہ بھی اضطراری ہے لیکن وہ خصوصیت جو انسان کو انسان اور ساری کائنات کو سردار بنا رہی ہے وہ بھی تو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کے استعمال میں یہ آزاد ہے۔ اس کی یہی خصوصیت جس کو ارادہ و اختیار کہا جاتا ہے تسلسلِ اسباب اور فطری تسلسل کائنات کو توڑ دیتی ہے۔ دنیوی سزا جزا کا استحقاق بھی اس کو اس لئے ہوتا ہے۔ قاتل کو قتل کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اس نے قتل کیا ہے، اس لئے نہیں کہ اسباب کے زیرِ حکم اس سے قتل ہوا ہے۔ چور کو پکڑا جاتا ہے اس لئے کہ وہ چوری کرتا ہے، اس لئے نہیں کہ اس سے اضطراری اسباب کے تحت چوری ہو جاتی ہے۔ اضطراری جرم تو جرم نہیں، قابلِ گرفت نہیں، عقلمندوں کا کوئی قانون مجبور کو نہیں پکڑتا۔ دفاعی قتل اور اضطراری چوری ناقابلِ مواخذہ ہے۔ پس مشیتِ انسانی کی خالق اگرچہ مشیتِ الٰہیہ ہے، مگر پھر بھی مشیتِ انسانیہ ہے تو مشیت۔ یہ مشیت دوسری کائنات کو تو نہیں دی گئی۔ یہ تو صرف انسان کے لئے طرۂ امتیاز ہے۔ اگر انسان اس کے استعمال میں بھی ایسا ہی بے بس ہے جیسے اس کی تخلیق میں تو پھر انسان میں اور پتھر میں کوئی فرق نہیں۔ انسان کو ترقی یافتہ مخلوق اور کائنات کا سردار کہنا غلط ہے۔ عقل و شعور بھی دوسری کائناتی طاقتوں کی طرح جب اضطرار کے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے تو کچھ فرق نہیں بے حسی اور حس میں کچھ تمیز نہیں۔ جہالت اور عقل میں کوئی امتیاز نہیں۔ اختیار اور اضطرار میں اور کوئی تفاوت نہیں۔ ترقی یافتہ انسان اور مادہ کے جز تو مُرادِی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رب العالمین کی شانِ ربوبیت عامہ اور نظم کامل کا تقاضا تھا کہ انسان کو کوئی ایسی خصوصیت دی جائے کہ اس کے استعمال میں اس کو آزادی حاصل ہو اور اس طرح وہ قابلِ مواخذہ قرار پائے۔ اگر سب کو بے اختیار بنا دیا جاتا یا شر کی طرف چلنے کی طاقت ہی نہ دی جاتی۔ ظلمت، شب، تاریکی، کفر و معصیت کا وجود ہی نہ ہوتا تو قدرتِ الٰہیہ معطون ہو جاتی۔ اس کو قادر کیسے کہا جا سکتا۔ اس کے اندر حقوق ترجیحی کیسے ثابت کئے جا سکتے وہ تو تخلیق میں ایسا ہی بے بس قرار پاتا جیسا سورج شعاع پاشی اور صنوبر انگنی میں، پھول خوشبو پھیلانے میں۔ پانی سیال ہونے اور ہوا موج انگیزی میں اور رات تاریک ہونے میں۔ پھر خالق کا مخلوق سے کچھ امتیاز نہ رہتا۔ صانع لوازم مصنوع کا محتاج ہو جاتا۔ اور اگر انسان اپنی مشیت کی تخلیق میں آزاد ہوتا تو پھر بعض مخلوق خالق سے بے نیاز ہو جاتی۔ مخلوق میں خالق کی خصوصیت موجود ہوتی اس کو خالق کی کیا ضرورت رہتی۔ نہ رب رب ہوتا نہ مربوب مربوب۔ جو مملوک ہوتا وہی مالک ہوتا۔ اور مخلوق خود اپنی خالق۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

اللہ رب العالمین ہے۔ سارا عالم اس کا مربوب ہے۔ انسان بھی مخلوق، مربوب، مملوک اور محکوم ہے۔ ہاں تخلیق میں محتاج ہونے کے بعد استعمال ارادہ میں آزاد ہے۔

تخلیق واستعمال کے فرق کی مزید توضیح

ہر ذرہ کائنات کا ایک فطری مزاج ہے، خاصیت ہے، خصوصیت ہے، لازمہ اور مناسبت ہے۔ اعناصر بسیطہ میں سے ہر ایک کی ایک خاص کیفیت اور لازمی نوعیت ہے۔ ہر عنصر اور ہر ذرۂ ایٹمی کی نیچرل خصوصیت کی تخلیق میں سے کسی مخلوق کی کارفرمائی کو دخل نہیں۔ کسی کی مشیت، حکمت اور ارادہ ان نیچرل خواص کو بدل نہیں سکتا۔ آکسیجن اپنی خصوصیت کا حامل ہے۔ اور ہائیڈروجن اپنی تخلیق سے مزاجی یا نوعی وابستگی رکھتا ہے اور نائٹروجن اپنی خاصیت میں امتیاز رکھتا ہے جس طرح ایٹمی ذرات کی تخلیق مخلوق کی دست رس سے خارج ہے۔ اسی طرح ان ذرات اور خلیات کی خصوصیات بنانے میں بھی سوا خالق کسی کو دخل نہیں۔

پھر انہی بسائط کی ترکیب سے مختلف المزاج اور متعدد خصوصیات والے مرکبات بنے ہیں اور بنتے ہیں ہر مرکب کے بننے اور اس کا مزاج پیدا ہونے میں بسائط کی مخصوص مقدار کی ضرورت پڑتی ہے۔ بسائط کی فطری مقدار سے ہٹ کر اگر نئی مقدار ملاکر ترکیب کی جائے تو وہ مرکب نہیں بنے گا جس کی خاص کیفیت اور خاص مزاج ہوتا ہے بلکہ کوئی دوسرا مرکب بن جائے گا جس کی کیفیت اور خصوصیت مرکب اول سے جدا ہوگی۔ مثلاً آکسیجن ½ اور ہائیڈروجن ½ کا مرکب اندازۂ فطری کے مطابق ایک خاص مرکب بناتا ہے جس کی مخصوص کیفیت اور مزاجی نوعیت ہوتی ہے۔ اگر آکسیجن ½ اور ہائیڈروجن ½ مخلوط کیا جائے یا قدر فطری سے ہٹ کر کوئی دوسری مقدار ملائی جائے تو مرکب اول کے مزاج و خاصیت والا مرکب تیار نہ ہوگا بلکہ کوئی دوسرا مرکب بن جائے گا۔

ہر عمل اور فعل کے کچھ فطری اور تخلیقی نتائج ہیں اور ہر عمل طاقتِ عمل کا محتاج ہے۔ ہاتھ اٹھانا، تلوار پکڑنا، مارنا طاقتِ دست اور قوتِ اعصاب کا محتاج ہے جو فطری ہے۔ تلوار کی دھار کا مضروب کو کاٹنا فطری ہے۔ قطع گلو کے بعد ہلاکت فطری ہے۔ یا سنکھیا کے اجزاء کا تناسب فطری ہے اور اس کا پس جانا، پھانک کا جانا، معدہ میں تصرف ہونا، خون میں شامل ہونا اور آخر میں مرجانا یہ سب کچھ تخلیقی ہے، نیچرل ہے مخلوق کی دست رس سے باہر ہے۔

بسائط کو ترکیب اور ترتیب دینا، ان کا مخصوص مرکب تیار کرنا یا کسی مرکب کو تحلیل کرکے اجزاء کو الگ الگ کر دینا یا اجزاء کے تناسب فطری کو بگاڑ کر ان کی نیچرل ترتیب بدلنا غیر شعوری مخلوق کا کام نہیں۔ ذی شعور مخلوق ایسا کر سکتی ہے۔ اسی کو استعمال کہتے ہیں۔ یعنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو ترکیب دینا یا ان کے اجزاء کو تحلیل کرنا۔ سائنٹفک طور پر تمام مصنوعات اور معلولات اسی جوڑ توڑ کا فطری نتیجہ ہیں۔ اس ترکیب اور تحلیل اجزاء کا علم سوا انسان کے کسی کو نہیں دیا گیا نہ کسی دوسری مخلوق کی مشیت کو اس کی حدود تک رسائی ہے۔

انسان کا ہر عمل نام ہے فطری طاقتوں کو ملانے، جوڑنے یا جدا جدا کرنے اور رکھو لینے کا جن سے نتیجہ کا پیدا کرنا انسان کا کام نہیں ہے بلکہ فطری نتیجہ خود بخود بقدرت الٰہی پیدا ہو جاتا ہے جو ان طاقتوں کے مجموعہ سے فطری طور پر وابستہ ہے۔ مثلاً قوتِ اعصاب اللہ نے دی تلوار اور تلوار کی دھار میں کاٹنے کی قوت اللہ نے بنائی۔ قوتِ اعصاب سے کام لینے والی مشیت اللہ نے تخلیق کی۔ ہاتھ میں تلوار کو پکڑ کر مارنے اور مارنے کے بعد کاٹنے کا تسلسل تمام کا تمام اللہ کا قائم کردہ ہے پھر گلو کٹ جانا اور کٹنے کے بعد ہلاک ہو جانا سب کچھ اللہ کی مشیت کا محتاج ہے، لیکن مشیتِ انسانیہ کو رفع دست سے جوڑنا اور ہاتھ کو تلوار سے ملانا اور ملا کر اٹھانا اور اٹھا کر مارنا اور مار کر کھینچنا یہ خداداد طاقتوں کا استعمال ہے جو انسان کرتا ہے اور اس کے بعد نتیجہ اللہ اپنی قدرت سے اگر چاہتا ہے تو مرتب کر دیتا ہے۔ پھر جس طرح تمام اسباب کی تخلیق اور فطری تاثیر میں انسان کی مشیت کو دخل نہیں۔ اسی طرح اگر انسان کوئی نتیجہ پیدا کرنا چاہے تو یہ اس کے بس میں نہیں ہے بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر نتیجہ کو پیدا کرنے کی علت تامہ اسباب کو جوڑنا توڑنا نہیں یہ تو اسباب ہیں علت تامہ اللہ کی مشیت ہے۔

حاصل یہ کہ انسان نہ اپنی مشیت پیدا کر سکتا ہے نہ مشیت کو استعمال کرکے نتیجہ کی خلق کر سکتا ہے۔ مشیتِ انسانی کی تخلیق اللہ کا کام ہے اور انسانی مشیت کے استعمال کے بعد نتیجہ کو خلق کرنا بھی اللہ ہی کا کام ہے۔

مقصود بیان

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمام قرآن مجید حضرت جبرئیل کی وساطت سے نازل کیا گیا ہے۔ کوئی آیت بھی براہ راست یا بلا واسطہ مکالمہ سے حاصل نہیں ہوئی۔ لفظ رسول کا اطلاق جبرئیل پر کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں میں پیغمبروں پر جس طرح رسول کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح وحی کے فرشتہ پر بھی اس کا اطلاق صحیح ہے۔ جبرئیل کے مختلف خصوصی اوصاف

کی واضح دلالت کرتی ہے۔ تین باتوں پر ایک تو یہ کہ حامل وحی فرشتہ بڑے عظیم الشان صفات کا حامل ہے۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ کا مرتبہ بہت بڑا تھا کہ اتنے عالی قدر فرشتہ کو پیام دے کر آپ کے پاس بھیجا گیا۔ تیسری یہ کہ کلام الٰہی کا حامل ہونا، دو پیغام خداوندی انسانوں کو پہنچانا کتنی بڑی اور جلیل القدر خدمت ہے جس کو انجام دینے کے لئے سب سے بڑے فرشتہ کا تقرر ہوا ہے۔ صاحبکم کا لفظ اس جگہ بتا رہا ہے کہ ہر وقت صحبت میں رہنے والے صادق امین کے متعلق کسی قسم کا غلط وہم نہ ہونا چاہیئے۔ جب صحبت دیرینہ میں ایک بار بھی کسی شخص کے متعلق رسول اللہ نے جھوٹ نہیں بولا تو اللہ پر دروغ بافی کس طرح کر سکتے ہیں۔ گویا لفظ صاحب کو ذکر کرنے سے صداقت قرآن کی ایک مجمل دلیل مستفاد ہوتی ہے۔ آیت ولقد راٰہ بالافق المبین سے واضح ہو رہا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت جبرئیل کو اصلی شکل میں افق پر دیکھا تھا اور افق بھی ایسا جس میں کوئی اشتباہ، دھندلاپن اور مغالطہ نہیں ہو سکتا۔ آیت وما ھو علی الغیب میں غیب کا اطلاق وحی پر کیا گیا ہے۔ اگر ھو کی ضمیر رسول اللہ کی طرف راجع کی جائے تو اس صورت میں اللہ کا عالم الغیب ہونا مستفاد ہوتا ہے۔ یعنی عالم وحی ہونا۔ ان ھو الا ذکر للعالمین سے مترشح ہو رہا ہے کہ قرآن کے اندر سارے جہان کا تذکرہ اجمالی ہے۔ گویا یہ سارے جہان کے لئے ایک یادداشت اور دستاویز ہے یا ذی عقل مخلوق کے لئے ہدایت نامہ ہے یا صرف انسانوں کے لئے دستور حیات ہے۔ گویا قرآنی ہدایت یابی سے کسی کو روکا نہیں گیا۔ دوسری آسمانی کتابوں کی طرح پیام قرآنی کسی خاص قوم یا نسل کے لئے مخصوص نہیں بلکہ عمومی ہے۔ دعوت عامہ کا رخ سب کی طرف ہے۔ البتہ آیت لمن شاء سے معلوم ہو رہا ہے کہ دعوت عامہ سے سب کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ نفع اسی کو ہوگا جو زندگی کی چال سیدھی رکھنی یا سیدھی کرنی چاہے۔ یستقیم کا لفظ در پردہ تلقین کر رہا ہے کہ اگر کسی کو زندگی کی صحیح رفتار مطلوب ہو اور علم و عمل کا سچا نافع بے ضرر سہل القبول اور سہل العمل دستور حاصل کرنا ہو تو وہ قرآن میں ملے گا۔ ایسے آدمی کے لئے قرآن ہی ہدایات کا مجموعہ اور اصول زندگی کا خزانہ ہے۔ وغیرہ۔

سورۃ الانفطار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا یہ سورت مکی ہے۔ قرطبی نے بالاتفاق علماء اس کو مکی قرار دیا ہے۔ اس میں ۱۹ آیات ۸۰ کلمات اور ۳۲۷ یا ۳۲۹ حروف ہیں۔ ابن کثیر نے ۳۲۹ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ۳۲۷ حروف ہونے کی صراحت کی ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے۔ جو شخص قیامت کو نظر کے سامنے دیکھنا چاہے وہ اذا الشمس کورت اور اذا السماء انفطرت اور اذا السماء انشقت کی تلاوت کرے۔ الحدیث قال۔

إِذَا السَّمَآءُ انفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے (ٹوٹ کر) جھڑ پڑیں گے اور جب سب دریا بہہ پڑیں گے

وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۝ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ

اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی (یعنی ان کے مردے نکل کھڑے ہوں گے اس وقت) ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا اے انسان تجھ کو کس چیز نے

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ

تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو (انسان) بنایا پھر تیرے اعضا کو درست کیا پھر تجھ کو مناسب اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا

صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝

جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا۔ ان سب امور کا مقتضا یہ ہے کہ تم کو ہرگز (مغرور) نہیں ہونا چاہیئے مگر تم باز نہیں آتے بلکہ تم جزا و سزا (ہی) کو جھٹلاتے ہو اور تم پر (تمہارے سب اعمال)

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ

یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں جو تمہارے سب افعال کو جانتے ہیں نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بدکار لوگ

الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ

بے شک دوزخ میں ہوں گے روزِ جزا کو اس میں داخل ہوں گے اور پھر اس سے باہر نہ ہوں گے (بلکہ اسمیں خلود ہوگا) اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ

مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ (ع)

وہ روزِ جزا کیسا ہے (اور ہم) پھر (کہہ کہتے ہیں) کہ آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روزِ جزا کیسا ہے۔ وہ ایسا دن ہے جس میں کسی کا کسی کے نفع کے لئے کچھ بس نہ چلے گا اور تمام تر حکومت ..... اس روز اللہ ہی کی ہوگی

ع ۲

تفسیر سورۂ تکویر میں احوالِ قیامت کا جزئیاتی طور پر اظہار کر کے کلی طور پر اعمال ناموں کے سامنے آنے کی صراحت فرمائی تھی۔ پھر قرآن مجید کو خالص پیغام الٰہی ثابت کر کے اس کی عمومی دعوت اور خصوصی ہدایت بخشی کو بیان فرمایا تھا۔ اس سورت کے آغاز میں بھی تخریبِ عالم اور احوالِ قیامت کو ظاہر کر کے اعمال ناموں کی تفصیلی پیشی کا تذکرہ کر کے انسان کے ہر کردار و گفتار کی مکمل نگہداشت نگارش اور تحفظ کو ظاہر کرنے کے بعد سزا جزا پر ایک دقیق تبصرہ فرمایا ہے۔ اور اللہ کے عمومی تخلیقی احسان کو بیان کر کے اثباتِ قیامت پر لطیف استدلال کیا ہے اور آخر میں قیامت کے دن ہر شخص کی بے بسی اور اللہ کی حکومتِ مطلقہ کاملہ کی صراحت فرمائی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے کے بعد بیشتر حصہ مشترک نظر آتا ہے۔ لیکن اسلوبِ بیان مشترک حصہ کا بھی جدا جدا ہے اور نیرنگی بیان نے ہر مضمون کو نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ استدلال اور خطاب کی یہ نیرنگی عجیب پر تاثیر ہوتی ہے جو سرکش دماغوں کے لئے تنبیہ اور پاکیزہ دماغوں کے لئے ولولہ انگیز ثابت ہوتی ہے اور اس طرح مخالفوں کے ذہنوں میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اہلِ ایمان کے دل خوف زدہ ہو کر محبت سے سرشار ہو جاتے ہیں اور یہ جذباتِ خوف و محبت ان کی زندگیوں کو سنوار دیتے ہیں۔ انسانی تحریر و تقریر میں مترادف الفاظ کا باہم استعمال اس لئے کیا جاتا ہے کہ سننے والے کے دماغ میں مفہوم جم جائے اور مخاطب کے ذہن اس کے اثر کو قبول کر لیں۔ لیکن ترادف میں تاکید و تائید کے علاوہ اور کوئی پرکشش جدت بیان ظاہر نہیں ہوتی۔ قرآن مجید میں الفاظ مترادفہ باہم استعمال نہیں کئے گئے بلکہ اسلوبِ بیان کو جا بجا بدلا گیا ہے۔ اور یہ طرزِ خطاب صرف تبدیلِ اسلوب ہی نہیں بلکہ پرلطف اور اثر آفرین بھی ہوتا ہے ایسا طرزِ بیان قرآن سے پہلے نہ کسی شاعر نے اختیار کیا تھا نہ خطیب نے نہ نزولِ قرآن کے بعد اس کی کوئی تقلید کر سکا۔ اسی لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ قرآن مجید نہ نظم ہے نہ نثر نہ مکمل استدلالی رنگ میں ہے نہ خطابی طرز زمین بلکہ نئے معجز اسلوب کا حامل ہے جس کا موجد بھی خود ہی ہے اور خاتم بھی خود ہی۔

آخرت کی جزا سزا اور وجود قیامت کا انکار عموماً بے دانش یا کوتاہ اندیش لوگ کرتے ہیں۔ منکروں کے گروہ میں یا تو عموماً جاہل واہمہ پرست شامل ہوتے ہیں یا مادہ پرست صرف محسوسات کو علم سمجھنے والے۔

مادہ پرست عالم جب ساری کائنات کو سلسلۂ اسباب میں وابستہ دیکھتا ہے اور ہر کرہ کی کشش میں کوئی غیر مناسب کمی محسوس نہیں کرتا اور زمین کو اپنی موجودات سمیت حرکت کرتے پاتا ہے۔ اور محیطِ ارض سمندر کو ایک تناسب کے ساتھ ہمیشہ موجزن بخار انگیز دیکھتا ہے تو اس کی سمجھ میں

نہیں آتا کہ پھر قیامت کا امکان کس طرح ہو سکتا ہے۔ تدریجی صوری تغیر تو اس کو ہر آن دکھتا ہے اور تمام مرکباتِ عنصری کا انقلاب اور دفعۃً انقلاب اور سماوی موجودات کا تغیر اس کے حدودِ فہم سے خارج ہے۔ جب آج تک سمار اور سماویات میں کوئی جدید تخریب و تعمیر نہیں ہوئی اور ہمیشہ سے ایک ہی رفتار تمام علوی کائنات کی چلی آتی ہے تو آئندہ کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی رفتار، ہیئت، صورت، خاصیت اور حالت میں کوئی انقلاب ہو سکے گا۔ اسی طرح کائناتِ عنصری کی تدریجی حالت ایک اسلوب پر جاری ہے۔ ہر مادی ذرہ ہر آن تغیر پذیر ہے۔ صورتیں بدلتا رہتا ہے، لیکن یہ تمام تغیرات تدریجی ہوتے رہتے ہیں۔ انقلابی نہیں ہوتے۔ پھر ایک خاص نظم اور متناسب ضابطہ کے تحت ہوتے ہیں دفعۃً نہیں ہوتے۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بے ضابطہ انقلاب ان کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔

جاہل واہمہ پرست گروہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ فنا ہو جاتا ہے۔ ماضی لوٹ کر حال نہیں بن سکتا۔ اپنے کئے ہوئے کاموں کا بیشتر حصہ ہم کو خود یاد نہیں۔ زندگی کے لامحدود اعمال کیسے یاد رہ سکتے ہیں۔ پھر ان اعمال کا دوبارہ آنا اور ان پر مواخذہ ہونا سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مٹی ہوئی صورت اور حالت از سرِ نو کیسے ابھر سکتی ہے۔ مردہ منتشر ذرات کا اجتماع کیسے ممکن ہے۔ معدوم موجود کیسے ہو جائے گا۔

حقیقت میں یہ سب کچھ دانش کے فقدان یا کمی کا نتیجہ ہے۔ سنسار کی کوئی چیز قدیم نہیں۔ عالمِ بالا و زیریں کا ہر ذرہ متحرک ہے اور متحرک ہونا زوال پذیری کی علامت ہے۔ اور زوال پذیر چیز قدیم نہیں ہو سکتی۔ اور ہر ذرہ کی ترکیب اور ہیئتِ ترکیبی اور کیفیتِ ترکیبی حدوث کو ظاہر کر رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حدوث انتشارِ اجزاء اور تبدیلِ صورت کو پکار رہا ہے۔ کائنات علوی ہو یا سفلی اجزاءِ منتشر کے مجموعہ کا ہی تو نام ہے۔ پہلے ذراتِ مادیہ اور جراثیم اصلیہ پراگندہ ہی تو تھے جن کی ترکیبی اور اجتماعی صورتوں کا نام آسمان اور ستارے اور زمین اور کیا اور کیا رکھا گیا۔ پھر اتصالِ اجزاء کو پراگندگی سے روکنے والی کون سی دلیل ہے۔ عالم کا ہر کرہ پھٹے گا اور ایسا پھٹے گا کہ کوئی چیز اس کے پھٹنے کو روک نہ سکے گی۔ ستارے ٹوٹیں گے اور بکھریں گے اس طرح کہ کوئی بھی ان موتیوں کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے باز نہ رکھ سکے گا۔ سمندر پھوٹیں گے، پھٹیں گے، ابلیں گے ایسے کہ ان کا ایک ایک قطرہ الگ ہو جائے گا اور ہر بوند کا ہر خورد ترین ذرہ لباب بن کر تحلیل ہو جائے گا اور زمین کے اندرونی مواد ایسے ابال کھا کر باہر نکل پڑیں گے کہ یہ زمین زمین ہی نہیں رہے گی۔ زلزلے کا ایک جھٹکا اس کی ترکیبی ہیئت اور اجتماعی صورت کو بگاڑ دے گا۔ سماوی کروں کی کشش، ستاروں کی روشنی، خنکی اور گرمی، سمندر کی بخار انگیزی اور آب پاشی، زمین کا مادری شکم۔ یہ سب چیزیں اصول ہیں۔ تعمیر انسانی کے آباءِ علویہ اور امہاتِ سفلیہ کے ملنے سے انسانی بچہ کا جنم ہوتا ہے اور انہیں کی لوریوں، تھپکیوں اور خدمت گذاریوں سے یہ پودا پروان چڑھتا ہے، لیکن کتنا نادان ہے یہ بچہ کہ ان مالک الاصل ماں باپ کو ابدی اور لازوال سمجھتا ہے اور نہیں جانتا کہ باپ میں کمانے اور بچہ کو کھلانے پلانے کی صلاحیت ہمیشہ نہیں رہے گی اور ایک دن آئے گا کہ ماں کی پستان شیر ریز خشک ہو جائیں گی جن سے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ نکلے گا اور یہ بوڑھی ماں بدحواس ہو کر لوریاں دینی بھول جائے گی اور سارا جہان اجڑ جائے گا۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی، اس کی بنیادیں اکھڑ جائیں گی۔ یہ سرسبز سنسار ویران ہو جائے گا اس کی ساری موجودات ختم ہو کر عدم میں جا سوئے گی۔ اس وقت نہ ماضی ماضی رہے گا نہ مستقبل مستقبل بس حال ہی حال ہوگا۔ مالکِ کل کے سامنے ماضی اور مستقبل جس طرح اب بھی ماضی و مستقبل نہیں حال ہیں۔ اسی طرح تعمیرِ جدید کی جب بنیاد پڑے گی تو گردشِ لیل و نہار کے بنائے ہوئے ماضی اور مستقبل حال سے بدل جائیں گے اور سارا کیا دھرا سامنے آئے گا اس وقت کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا کسی کے بنائے کچھ نہ بنے گا۔ اختیار کی دنیا ختم ہو چکی ہوگی۔ اضطرار کی عمارت برسرِ ظہور ہوگی۔ نیکی بدی کا آخری فیصلہ ہوگا۔ نیکوں کو سکھ اور بدوں کو دکھ کی زندگی ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ پاداشِ عمل یہیں مل جائے لیکن جزا سزا کا ایک دن مقرر کر دیا گیا ہے۔ گرفتِ غیبی سے اب بھی انسان باہر نہیں، مگر حکمِ الٰہی اور اللہ کی طرف سے دی ہوئی آزادی کی وجہ سے انسان فریب خوردہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اللہ شکمِ مادر میں ہر ایک کا سانچہ بناتا ہے۔ اعضاء کا تناسب قائم کرتا ہے باہم جوڑتا ہے اور جیسی صورت مناسب سمجھتا ہے بخش عنایت کرتا ہے، گر نادان ایسے قادر، حکیم، مہربان، محسن خدا ہی کو نہیں مانتا یا مانتا بھی ہے تو بے بس، مجبور، غافل۔ یہ انسان کی فریب خوردگی نہیں تو اور کیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

واذا السماء انفطرت۔ پہلا صور پھونکے جانے کے بعد تخریبِ عالم اوپر سے شروع ہوگی (کسی عمارت کو ڈھانے کا آغاز اوپر سے ہی ہوتا ہے) اور آسمان پھٹ جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک ستارہ کوئی چیز عرش کے نیچے سے گرے گی جس کے ٹکراؤ سے تمام

علوی کرّے پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ حقیقت میں وہ قہر الٰہی کی تجلی ہوگی جو گیس یا بخارات کثیف جسم کی شکل اختیار کرلے گی۔

واذا الکواکب انتثرت۔ ستارے جھڑ جائیں گے۔ حاصل یہ کہ کسی کرّے یا ستارے میں کشش نہ رہے گی۔ قوت جاذبہ سب کی ختم ہو جائے گی۔ نتیجہ میں تصادم سقوط، انتشار اور پراگندگی پیدا ہو جائے گی اور تصادم کے سبب کائنات سماویہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور چونکہ علویات کا سفلیات سے خاص تعلق ہے۔ علویات اور سفلیات کی جداجدا مناسب قوت ضابطہ سب کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ عالم سفلی کی مختلف حالات اور کیفیات بھی علویات کے دامن سے وابستہ ہیں، اس لئے سماء سماویات کا حفظ نظام شکستہ ہونے کے ساتھ ہی زیرینی نظام کا شیرازہ بھی پراگندہ ہو جائیگا

واذا البحار فجرت۔ اور سمندر پھٹ جائیں گے پھیل جائیں گے۔ رکاوٹ ختم ہو کر پھیلاؤ پیدا ہو جائے گا (قتادہ) شیخ ابوالمنصور ماتریدی نے کہا کہ پہلے سب دریاؤں اور سمندروں کو ملا دیا جائے گا۔ سب کی ایک سطح کردی جائے گی (شور اور شیریں اور مختلف الکیفیات) سمندروں کے جمع ہونے سے پانی میں ابال اٹھے گا۔ (ایسا تیز ابال جیسا جوالامکھی پہاڑوں کے پھٹنے سے اٹھتا ہے) اور آگ کے شعلے نکلیں گے جن کی وجہ سے سمندر سوختہ ہو جائیں گے۔ کچھ پانی کا دھواں اٹھ کر میدان حشر کو بھر دے گا۔ اور کچھ پانی دہکتی آگ ہو جائے گا۔ اس آخری حالت کو سورۂ تکویر میں بیان کیا ہے اور فرمایا ہے۔ واذا الجحیم سعرت اور اول الذکر انقلاب کو اس سورت کی مذکورہ آیت میں ظاہر فرمایا ہے۔ شیخ کی توضیح نہایت لطیف ہے۔

واذا القبور بعثرت۔ قبریں اکھاڑی جائیں گی (حضرت ابن عباس) ہلائی جائیں گی کہ مردے زندہ ہو کر باہر آجائیں گے (سدی) رواہ ابن کثیر۔ ہر شخص کے بدن کے خاکی ذرات مرنے کے بعد کسی نہ کسی طرح زمین کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ خواہ اس کو جلا کر خاک بنا کر اڑا دیا جائے یا سمندر میں پھینک دیا جائے یا کسی درندہ کا لقمہ بن جائے یا پرندے اس کو نوچ کر کھا جائیں یا زمین میں دفن کر دیا جائے۔ بہرحال خاک میں ملنا ضرور ہے۔ جب سمندر ابال کھائیں گے اور تمام علویات کی کشش ختم ہو جائے گی تو زمین کا انقلاب بھی ضرور ہوگا۔ زلزلے ایسے آئیں گے کہ شکم زمین پھٹ پڑے گا۔ زمین الٹ جائے گی جو کچھ جوف ارض میں ہوگا باہر نکل پڑے گا۔ سونا چاندی ہیرے گندھک اور ہر معدنی چیز اوپر آجائے گی۔ اس وقت تمام مردوں کے بدنی ذرات سمٹ کر اکھٹے ہو کر مجسم بن کر زندہ ہو کر نمودار ہو جائیں گے۔ زندہ ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ زمین عرش سے ایک ابر حیات پانی برسائے گا جو انسانی مجسموں کے لئے باعث زندگی ہو جائے گا۔ اور حضرت اسرافیل کے دوبارہ صور پھونکتے ہی سب زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔

مذکورہ بالا چاروں انقلابات اصول عالم کی تخریب کے لئے ہوں گے۔ سماوی کرے اور ستارے زیریں کائنات پر مختلف قسم کے اثر ڈال رہے ہیں۔ سمندروں سے تبخیری شکل میں ابر باراں اٹھ کر سامان رزق فراہم کر رہا ہے۔ روشنی، گرمی سردی اور پانی کی تاثیر سے شکم زمین سے مواد غذائی کی تخلیق ہو رہی ہے۔ اور انہی اصول سے انسانی حیات اور بقائے حیات وابستہ ہے۔ اصولی تخریب کے ساتھ دوسری تباہیاں اور بربادیاں بھی ضرور ہوں گی۔ جن کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا۔ دوسری آیات میں مختلف مقامات پر مفصل مذکور ہے۔ غرض بنار قدیم کی ویرانی کے بعد عالم جدید کی عمارت بننے کا وقت آئے گا تو انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور حساب فہمی کا وقت آجائے گا اور اعمال نامے سامنے آجائیں گے۔ اگلے پچھلے تمام اعمال نامے چاہے از خود یاد ہوں یا نہ ہوں جب مجسم شکل میں سامنے آئیں گے تو مجال انکار نہ رہے گی اور زندگی کی تمام سرگزشت کا علم عینی ہو جائے گا۔ آدمی خود مشاہدہ کرلے گا کہ یہ میری زندگی کے سارے کرتوت ہیں۔

علمت نفس ما قدمت واخرت ہر شخص جان لے گا یعنی مشاہدہ کرلے گا کہ میری زندگی کے یہ اگلے پچھلے اعمال ہیں، اقوال ہیں۔ عقائد ہیں، افکار ہیں، خیالات ہیں، تصورات ہیں۔ مَا کا لفظ عام ہے ہر عمل، فکر، عقیدہ اور تصور کو شامل ہے۔ محاسبہ تو بہرحال تصورات اور افکار کا بھی ہوگا۔ ارادوں، نیتوں اور عقیدوں کی تصویریں بھی سامنے آئیں گی۔ خواہ اللہ کی رحمت سے گناہ کی نیت اور بدی کے تصور پر مواخذہ نہ ہو۔

ما قدمت اور ما اخرت کی تفسیر مختلف اہل تفسیر نے مختلف طور پر کی ہے۔ ما سے وہ اچھے برے کام جو انسان اپنی زندگی میں کرتا ہے قَدَّمَتْ۔ میں داخل ہیں اور جن کاموں کو نہیں کرتا اَخَّرَتْ سے مراد ہیں گویا اخرت سے مراد ہے ترک فعل۔ کسی کام کا نہ کرنا۔ یعنی اعمال ناموں میں جو کام درج ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام میں نے کئے تھے اور جو کام نامۂ اعمال میں مندرج نہ ہوں گے ان کے متعلق سمجھ لیا جائے گا کہ میں نے نہیں کئے تھے۔

۱۔ قَدَّمَتْ سے وہ مال مراد ہے جو راہِ خدا میں خرچ کیا تھا اور اَخَّرَتْ سے وہ مال مراد ہے جو وارثوں کے لئے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

۲۔ قَدَّمَتْ سے وہ اولاد مراد ہے جو ماں باپ کے سامنے مر جاتی ہے اور اَخَّرَتْ سے وہ اولاد مراد ہے جس کے سامنے ماں باپ مر جاتے ہیں۔

۳۔ تقدیم سے مراد ہیں اول عمر میں کئے ہوئے اچھے برے کام اور تاخیر سے مراد ہیں آخر میں کئے ہوئے اعمال۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ قَدَّمَتْ سے مراد ہیں وہ اعمال جو انسان اپنی زندگی میں کر گزرتا ہے اچھے ہوں یا برے اور اَخَّرَتْ سے مراد وہ رسمیں اور طریقے جن کی بنیاد ڈال کر آدمی مر جاتا ہے اور بعد میں اس کے پیچھے چلتے ہیں خواہ وہ طریقے اچھے ہوں یا برے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ بما قدمت من خیر او شر وما اخرت من سنة حسنة عمل بها بعده فله اجره واجور من اتبعه من غیر ان ینقص من اجورهم شیء او سنة سیئة عمل بها بعده فعلیه وزره ووزر من عمل بها لاینقص من اوزارهم شیء۔ یعنی آگے بھیجنے سے مراد ہے نیکی اور بدی اور پیچھے چھوڑ جانے سے مراد ہے وہ اچھا طریقہ جس پر لوگ اس کے بعد چلیں۔ اس صورت میں اس سنت حسنہ چھوڑ نے والے کو اپنے کئے کا اجر بھی ملے گا اور ان لوگوں کو ثواب بھی ملے گا جو اس طریقے پر چلے ہوں گے مگر ان لوگوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور وہ بری رسم بھی مراد ہے جس پر بعد کو آنے والے چلیں۔ اس صورت میں چھوڑ کر جانے والے پر اپنے عمل کا گناہ بھی ہوگا اور ان لوگوں کا بھی ہوگا جو اس کے بعد اس رسم پر چلیں۔ مگر اس کے بوجھ میں اس سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔

حضرت حذیفہ بن یمان کی نقل کردہ ایک طویل روایت صحاح میں آئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبائل مضر کے کچھ شکستہ حال فقراء حاضر خدمت ہوئے ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور جسم پر ایک ایک کملی اور چہروں سے فقر کے آثار نمایاں تھے۔ حضور نے ان کے لئے چندہ کی اپیل کی، صحابہ خاموش رہے۔ پھر اپیل کی تو ایک شخص اٹھ کر گئے اور ایک تھیلی درہموں کی لا کر پیش کی۔ پھر دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی ولولہ اٹھا اور مختلف لوگوں نے مختلف چیزوں کا ڈھیر لا کر جمع کر دیا۔ حضور والا کا چہرۂ مبارک شگفتہ ہو گیا اور فرمایا جس نے نیک طریقہ اختیار کیا اور اس کی نیک چلنی کی پیروی دوسروں نے کی تو اس کو اپنا ثواب اور پیروی کرنے والوں میں سے ہر ایک کی مثل ثواب ملے گا اور پیروی کرنے والے کے ثواب میں سے کوئی حصہ کم نہیں کیا جائیگا۔ اور جس نے برا چلن نکالا اور لوگوں نے اس کی پیروی کی تو اس پر اپنی بدچلنی کا بھی گناہ ہوگا اور پیروی کرنے والوں میں سے ہر ایک کے گناہ کی برابر بھی گناہ ملے گا اور پیروی کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت حذیفہ نے آیت علمت نفس ما قدمت واخرت تلاوت کی۔ گویا حضرت حذیفہ کی نظر میں قدمت سے مراد ہوئے وہ صحابہ جنہوں نے سب سے پہلے درہموں کی تھیلی پیش کی تھی اور اَخَّرَتْ سے مراد وہ دوسرے حضرات جنہوں نے اول صحابی کی پیش کش کو دیکھ کر ہر ممکن چیز پیش کی تھی۔ بہرحال مورد کوئی اور کچھ بھی ہو۔ آیت میں عموم ہے بمصداق اول کے صفات۔ جو کوئی شریک ہوگا اس کو اس آیت کا مصداق قرار دیا جائے گا۔

یایها الانسان ما غرک بربک الکریم۔ اللہ نے آدمی کو پیدا کیا یعنی عدم سے وجود میں لایا۔ آدمی کا کوئی استحقاق نہ تھا کہ اس کو نعمت وجود عطا کی جاتی۔ پھر اس کی تدریجی پرورش کی۔ علمی طاقتیں بھی بڑھائیں اور عملی بھی۔ شعور پیدا کرنے والی قوتیں بھی۔ اور حرکت دینے والی بھی۔ پھر حرکت و شعور کے کچھ حصے کو ارادہ کے تابع بنایا۔ کچھ حصے کو غیر ارادی۔ پھر غیر محدود اسباب تربیت کو آدمی کے رزق کی فراہمی کے لئے حرکت دی۔ اور اس طرح مواد غذائی کو بہم کیا۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اللہ انسان کا مالک اور رب ہے اور کریم بھی ہے۔ یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس سے ہر نادان اور جاہل بھی واقف ہے

تماب کس قدر تعجب خیز ہے اللہ کا انکار اور کیسی ناحق کوشی ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا اور کتنی غفلت پر مبنی ہے اس کے احکام کو نہ ماننا یا مان کر عمل نہ کرنا۔

انسان کی یہ فریب خوردگی کیوں ہے اور اس کا باعث کیا ہے یا اغوار شیطانی یا استیلاء غضبی اور تسلط شہوانی۔ بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ کریم ہے۔ اور رب بھی ہے، پردہ پوش بھی ہے، گناہوں پر رسوا نہیں کرتا اور حلیم بھی ہے نافرمانی اور سرکشی کی فوری سزا نہیں دیتا، اس لئے نادان انسان فریب خوردہ

ہوگیا ۔ اللہ کے کرم عام اور حلم عمیق سے وہ سمجھا کہ آئندہ سزا نہیں ملے گی اور بپاداش عمل سے وہ محفوظ رہے گا ۔ اس لئے گناہوں کی جرأت اس کو زیادہ ہوئی ۔ یہی اس کی فریب خوردگی ہے ۔

اگر مالک اور آقا ظالم، تندخو اور درشت مزاج ہو تو نوکر اور غلام اس سے ڈرتے ہیں ۔ اور مہربان، حلیم، شفیق ہو تو اس کے عفو و درگزر پر اعتماد کرتے ہوئے نافرمانی بھی کر بیٹھتے ہیں ۔ حضرت علیؓ نے گھر کے اندر سے کسی کام کے لئے غلام کو آواز دی ۔ غلام نے سنی ان سنی کر دی اور جواب نہ دیا اور پیہم پکار سننے کے بعد بھی خاموش رہا ۔ حضرت نے خیال کیا کہیں گیا ہوگا ۔ باہر نکل کر دیکھا تو دروازہ پر موجود پایا ۔ فرمایا تو نے میری آواز پر جواب کیوں نہیں دیا ۔ غلام نے عرض کیا مجھے آپ کے کرم پر اعتماد تھا اور یقین تھا کہ آپ مجھے نہیں ماریں گے ۔ حضرت نے اس کے جواب کو پسند کیا اور آزاد کر دیا ۔

حضرت عمر فاروقؓ کا قول مروی ہے آپ فرماتے تھے الٰھی غرنی حلمك لو اخذتنی بالاولی ما اجرت علی الثانیۃ اے اللہ تیرے حلم نے مجھے فریب خوردہ کر دیا ۔ اگر پہلی خطا پر ہی تو میری پکڑ کرتا تو دوسری خطا کی مجھے جرأت نہ ہوتی ۔

حضرت فضیل بن عیاض سے کسی نے پوچھا ۔ اگر قیامت کے دن اللہ آپ سے دریافت کرے ما غرک بربک الکریم تو آپ کیا جواب دیں گے ۔ فرمایا میں عرض کروں گا ۔ غَرَّنِیْ سُتُوْرُکَ الْمُرْخَاۃُ مجھے تیری پردہ پوشی نے فریب دیا ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کَمْ مِنْ مَغْرُوْرٍ بِالسَّتْرِ عَلَیْہِ وَکَمْ مِنْ مُسْتَدْرَجٍ بِالْاِحْسَانِ اِلَیْہِ ۔ بہت آدمی جرم کی پردہ پوشی سے فریب خوردہ ہیں اور بہت لوگ کرم کی وجہ سے ڈھیل میں پڑے ہوئے ہیں ۔

لیکن کیا اس قسم کی فریب خوردگی جائز ہے یا نہ خود پیہم معصیت کوشیوں اور نافرمانیوں کے عفو کی تمنا خام کوئی اچھا فعل ہے ۔ اگر برا ہے تو رحمت کے امیدوار ہونے کا کیا معنی ۔

حقیقت یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم، فرمانبردار اور عاصی، مومن اور کافر، موحد اور مشرک، شکرگزار اور احسان فراموش، پرہیزگار اور بدکار میں فرق اتنا واضح ہے کہ اس کے خلاف کرنا عدل انسانی کے بھی خلاف ہے ۔ اور وعدۂ الٰہیہ کے بھی ۔ اگر غیر مستحق اور غیر محسن کی نافرمانی کی جائے تو کوئی وجہ جواز ہو سکتی ہے ، لیکن بے غرض، بلاعوض کرم و احسان کرنے والے کی ناشکری اور نافرمانی سخت ترین جرم ہے جس کی سزا کا خوف ہم کو زیادہ ہونا چاہیئے ۔ اگر محسن اعظم کے حکم سے سرتابی کی جائے خصوصاً خالق رب کریم کے خلاف جرأت رندانہ سے کام لیا جائے تو اس کو حماقت و نادانی کہہ دیا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔ اسی لئے حدیث مبارک میں آیا ہے ۔ غَرَّہٗ بِاللّٰہِ جَہْلُہٗ ۔ بندہ کی نادانی اور جہالت نے اللہ کے متعلق اس کو فریب خوردہ کر دیا ہے ۔ غرور، تمنا اور امید میں بڑا فرق ہے ۔

غرور، تمنائے خام اور امید کا فرق

اگر اچھی زمین کو کاشت کار اچھی طرح وقت مناسب پر کھود جوت کر اچھا بیج اصول کاشتکاری کے موافق بکھیر دے ، اور مناسب اوقات میں سینچائی بھی کرتا رہے اور غیر جنس گھاس بھی کھیت سے الگ کرتا رہے ۔ غرض اچھا غلہ حاصل کرنے کے تمام اسباب فراہم کر دے اور تمام شرطیں پوری کر دے اور پھر اچھی فصل کی اس کو رغبت ہو اور اچھے نتیجے کا منتظر رہے تو ایسی رغبت اور ایسے انتظار کو امید اور رجا کہتے ہیں ۔

لیکن اگر اچھی زمین ہی نہ ہو بالکل اوسر بنجر ہو یا بیج ناقابل روئیدگی ہو یا وقت پر بونی نہ ہو یا ضروری سینچائی نہ ہو ۔ غرض ضروری اسباب و شرائط میں سے کسی کی تکمیل نہ ہو اور پھر حسب منشا غلہ حاصل ہونے کی رغبت کرے اور اچھی فصل کا منتظر رہے تو یہ فریب خوردگی اور غرور ہے ۔ اگر بعض شرائط اور اسباب کی تکمیل ظاہری کر لی ہو اور بعض ضروری اسباب و شرائط مفقود ہوں اور بہترین نتیجہ کا انتظار کیا جائے تو یہ محض آرزو اور تمنا ہے ۔

امید قابل ستائش ہے ۔ قرآن مجید میں جابجا امیدوار کیا گیا ہے اور ناامیدی کو کفر قرار دیا ہے کیونکہ ناامیدی سے اللہ کے ظالم ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو سراسر کفر ہے ۔ یرجون رحمۃ اللہ ۔ لا تایئسوا من روح اللہ ۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور اسی طرح کی بکثرت آیات ۔ امید کو لازم اور ناامیدی

کو کفر قرار دے رہی ہیں۔

غرور اور فریب خوردگی محض جہالت اور حماقت ہے اسی لئے ممنوع ہے ولا یغرنکم باللہ الغرور۔ غرتہم الحیوٰۃ الدنیا۔ کی طرح۔ دوسری آیات اسی پر دلالت کر رہی ہیں۔

تمنا اور آرزو بھی مذموم اور غیر مقبول ہے۔ نجات اور فلاح محض تمنا سے حاصل نہیں ہوتی۔ لیس بامانیکم ولا امانی اہل الکتاب۔ تلک امانیہم اور دوسری آیات میں آرزو محض کو ذم کے لہجہ میں بیان فرمایا ہے۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اموی نے حضرت ابو حازم مدنی سے پوچھا بندوں کی ملاقات پروردگار سے کس طرح ہوگی۔ فرمایا جو مسافر مدت دراز سفر میں گذارنے کے بعد بکثرت مال و دولت لے کر صحت و عافیت کے ساتھ اپنے اہل و عیال میں واپس آجائے اس کے گھر والے اس کی خدمت، تواضع اور خاطر بہت زیادہ کرتے ہیں۔ سب اس سے خوش ہوتے ہیں اور سب اس کے اشارۂ ابرو پر چلتے ہیں۔ یہ حالت اس نیک بندے کی ہوگی جو نیکیاں اور اطاعت گذاریاں لے کر دربار الٰہی میں پہنچے گا، لیکن اگر کسی کا غلام آقا کا مال چرا کر راتوں رات بھاگ جائے اور یہ سمجھے کہ اب میں آقا کے ہاتھ نہ آؤں گا، لیکن آقا کی طرف سے مقرر کئے ہوئے سپاہی اس کو گرفتار کرلیں اور طوق و زنجیر میں باندھ کر ہتھکڑی بیڑی پہنا کر کشاں کشاں لا کر حاضر کردیں تو ظاہر ہے کہ آقا کی نظر میں وہ قابل نفرت اور مستحق سزا ہوگا اور سخت سزا میں گرفتار کیا جائے گا۔ ایسی طرح پیشی بدکاروں اور نافرمانوں کی ہوگی۔

یہ سن کر سلیمان کے دل میں رقت پیدا ہوئی کہنے لگا۔ معلوم نہیں میری پیشی کی کیا صورت ہو۔ ابو حازم نے فرمایا اس کا فیصلہ بھی قرآن نے کر دیا ہے۔ فرمایا ہے ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم۔ سلیمان نے کہا جب انجام کا مدار اعمال پر ہے تو رحمت کہاں گئی۔ ابو حازم نے فرمایا یہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔ اچھے عمل کرنے والوں کے قریب اللہ کی رحمت ہے۔ واللہ اعلم۔

الذی خلقک یہ بے غرض اور بلا عوض محسن کریم کی ابتدائی نعمت کا بیان ہے۔ کسی کوشش اور اچھے عمل کے بعد تو ممکن ہے۔ بعض کوتاہ فہم اللہ کی پیہم نعمتوں کو اپنی کوشش کا نتیجہ اور اپنا استحقاق قرار دے لیں۔ لیکن پیدائش سے پہلے تو استحقاق نتیجہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ جب خود موجود ہی نہ تھا تو کوشش اور استحقاق کا تصور ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ نے انسان کو (نطفہ یا مٹی سے) اپنے خاص اندازہ کے موافق بنایا۔

فسوٰک پھر جوڑ جوڑ بند بند ٹھیک کیا۔ ہاتھ کو ہاتھ کی برابر پاؤں کو پاؤں کی برابر، کان کو کان کی برابر، آنکھ کو آنکھ کی برابر غرض ہر عضو کو اس کے مناسب اجزا سے مناسب جگہ قائم کیا۔ عموماً دونوں ہاتھ برابر ہوتے ہیں، دونوں پاؤں برابر ہوتے ہیں۔ دونوں آنکھیں دونوں کان اور ناک کے دونوں سوراخ برابر ہوتے ہیں۔ متقابل پسلیاں برابر ہوتی ہیں۔ شریانوں، وریدوں، پٹھوں اور بندھنوں میں تناسب اور یکسانی ہوتی ہے۔ ایک ران کی ہڈی دوسری ران کی ہڈی کے برابر اور ایک ہاتھ کی ہڈی دوسرے ہاتھ کی ہڈی کی مثل ہوتی ہے غرض ایک ہموار سانچہ اور یکساں ڈھانچہ بن جاتا ہے تو

فعدلک اس کو مناسب مزاج، مناسب صلاحیت و استعداد، مناسب قوت اور مناسب ضروریات حیات عطا کئے جاتے ہیں۔ انسان کی صلاحیت، مزاج، قوت اور لوازم زندگی ہاتھی یا چیونٹی یا کسی دوسری نوع کی طرح نہیں ہوتے۔ اس کے بعد

فی ای صورۃ ما شاء رکبک جو نقشہ مشیت الٰہی میں ہوتا ہے عطا کر دیا جاتا ہے جس صورت میں اللہ چاہتا ہے جوڑ دیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بچے کا نقشہ چہرہ مہرہ ماں باپ کی ہم شکل ہو یا ننھیال ددھیال میں سے کسی کی طرح ہو۔ ایک شخص سے حضور اقدس ؐ نے دریافت فرمایا۔ ما ولد لک۔ تیری اولاد کیا ہے (یعنی لڑکا یا لڑکی) اس نے عرض کیا۔ وما عسی ان یولد لی اما غلام واما جاریۃ ابھی تو کوئی نہیں۔ عنقریب کچھ پیدا ہوگا لڑکا یا لڑکی ارشاد فرمایا فمن تشبہ کس کے مشابہ۔ اس نے عرض کیا تشبہ امہ او اباہ ماں یا باپ کے ہم شکل ہوگا۔ فرمایا لا تقل ہکذا ان النطفۃ اذا استقرت فی الرحم احضر اللہ کل نسب بینہا وبین آدم اما قرأت ہذہ الآیۃ فی ای صورۃ ما شاء رکبک ایسا مت کہو۔ نطفہ جب رحم میں ٹھہر جاتا ہے تو اللہ آدم تک کے تمام رشتہ داروں (کی صورتوں) کو بلواتا ہے۔ کیا تو نے یہ آیت فی ای صورۃ ما شاء رکبک نہیں پڑھی۔

آیت مذکورہ کی تشریح میں بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے جیسی چاہی صورت بنا دی۔ خوبصورت یا بدصورت۔ بعض علماء نے آیت کے مفہوم کو صورتوں اور شکلوں کی کثرت پر محمول کیا ہے۔ اربوں انسانوں میں سے ہر شخص کی شکل اور نقشہ جدا ہے۔ بعض نے نر اور مادہ کے اختلاف کی طرف اشارہ

قرار دیا ہے اور بعض نے اختلافِ رنگ مراد لیا ہے۔ بعض کے نزدیک اختلافِ صور سے مقصود ہے۔ مزاج اور اخلاق اور طریقِ زندگانی کا اختلاف ایمان و کفر کا اختلاف اور اعمالِ زندگی کا اختلاف۔

کلا بل تکذبون بالدین۔ انسان کے مغرور اور فریب خوردہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ حقیقت میں اللہ کے کرم پر اعتماد نہیں۔ اپنی بداعمالی کا انکار نہیں۔ جہالت اور حماقت بھی اس کی اصل وجہ نہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ پاداشِ عمل کو آدمی نہیں مانتا، قیامت کا منکر ہے حالانکہ

وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین۔ اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے تمام اعمالِ انسانی کے نگراں موجود ہیں اور ہیں بھی وہ باعزت نہ قابلِ اعتماد۔ اچھے کو برا اور برے کو اچھا نہیں قرار دیتے۔ غلط طور پر کچھ نہیں لکھتے۔ ان کی سرشت میں کرم ہے۔ کسی کے اعمال پر رسوا نہیں کرتے، ایک کے عمل کی دوسرے کو اطلاع نہیں دیتے۔ نیکی کو دس گونہ اور بدی کو صرف ایک بدی لکھتے ہیں۔ انسان گناہ کرتا ہے تو گھنٹوں منتظر رہتے ہیں کہ وہ توبہ کر لے، استغفار کر لے تو ہم گناہ کو نہ لکھیں۔ اُن کے متعلق بھول چوک کا بھی احتمال نہیں۔ قدرتی قلم سے فطری صحیفہ پر وہ لکھتے ہیں۔ جو کلک کا مٹتا نہیں، مٹتا نہیں، دیمک اس کو نہیں کھاتی کیڑا اس کو نہیں لگتا۔

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ ہر آدمی کے اعمال لکھنے والے چار فرشتے مقرر ہیں۔ دو فجر کو آتے ہیں اور مغرب کو چلے جاتے ہیں اور دو مغرب کو آتے ہیں فجر کو چلے جاتے ہیں۔ ایک نیکی کو لکھتا ہے دوسرا بدی کو۔ جو کچھ لکھتے ہیں بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ کو عالم کی ہر چیز معلوم ہے وہ ملائکہ کے لکھنے کا محتاج نہیں۔ صرف انسان پر حجت تمام کرنے کے لئے ملائکہ کو مقرر کیا گیا ہے۔ اعمال ناموں کا لوحِ محفوظ کی تحریر سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور مقابلہ کے بعد حکم ہوتا ہے اطاعت اور گناہ کے علاوہ ہر چیز مٹا دو۔ یعنی اوامر و نواہی کی پابندی اور نافرمانی کو لکھا رہنے دو باقی مباحات جن پر نہ ثواب مرتب ہوگا نہ عذاب مٹا دو۔ ان کو لکھنے کا کچھ حاصل نہیں۔

یعلمون ما تفعلون۔ اللہ کی طرف سے یہ پرچہ نویس بڑے دقیقہ رس اور وسیع العلم ہیں۔ آدمی کی کوئی حرکت ان سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تہ خانوں کے اندر بند ہو کر تنہائی میں بھی اگر آدمی کوئی کام کرتا ہے تو اس سے یہ واقف ہوتے ہیں۔

اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ ملائکہ آدمی کی نیت اور ارادہ کو بھی جانتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ نیکی کے ارادہ کو بغیر کئے ہوئے نیکیوں کی فہرست میں لکھ لیتے ہیں۔ اور بدی کی نیت کو بدی نہیں لکھتے بلکہ ارادہ کے بعد اگر بدی پر عمل نہ کیا جائے تو اس کو بھی نیکی قرار دیتے ہیں۔

توضیح مبحث مذکورہ بالا سطروں میں ہم نے آیاتِ مبارکہ کی جو تشریح کی ہے اس کی حیثیت محض اعتقادی ہے۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر غیبی غیر مبصر طاقت جو کسی خدمت پر مقرر ہے۔ شریعت کی زبان میں اس کو ملک کہا جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب میں تصنع طلب طبعی علماء موجود نہ تھے کہ وہ عقائد اور علوم الٰہیات کی ماہیت تلاش کرتے اور علمی انکشافات کو طبعی دلائل سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے عقائد کو عقائد ہی سمجھا اور بغیر کسی توجیہہ کے مان لیا۔ فکری غلطی اور عملی کجی سے محفوظ رہنے کا یہ راستہ ہے بھی بے خطر۔ نہ غار میں گرنے کا ڈر نہ پتھر سے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ نہ قوتِ واہمہ کے کانٹے چبھنے کا خوف۔ پیغمبر معصوم کی زبان وحی ترجمان سے جو کچھ سنا بے کم و کاست اور بلا شک و تردد تسلیم کر لیا۔ قرآن منطوق اور وحی غیر منطوق میں اعمال نامے لکھنے والے فرشتوں کی صراحت کی گئی تاکہ کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ فنا ہو جاتا ہے اس کی باز پرس نہ ہوگی۔ کس کو معلوم ہے کہ ہم نے کیا کیا اور معلوم بھی ہو تو آئندہ اس کا لوٹ کر آنا ممکن نہیں۔ اس خرافات کو دور کرنے کے لئے اعمال کو لکھنے اور مشغول کے تحریر اعمال پر مقرر ہونے کی صراحت کی گئی۔ اہلِ ایمان اور اربابِ نظر نے بے چون و چرا مان لیا۔

پھر جب عباسیہ دور میں مسلمان علماء کے دماغوں پر فلسفہ کی ضرب پڑی اور ہزاروں برس پہلے کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو عقائد ضعیفہ کو تزلزل سے بچانے کے لئے اہلِ حق نے مخالفوں کے ہتھیار چھین کر انہی کے ہتھیاروں سے ان کی مدافعت کی۔ مطلب یہ کہ عقلی معیار پر اسلامی عقائد کی پرکھ شروع ہوئی۔ اس سے معترضین کے اعتراضوں سے تو نجات مل گئی مگر ایک خرابی اور پائیدار خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ اسلامی عقائد و افکار کو علوم عقلیہ کے سانچے میں ڈھالنے کی رسم پڑ گئی اور جو عقیدہ عقلی سانچے میں فٹ نہ ہو سکا تو خواہ مخواہ اس کو توڑ مروڑ کر فٹ کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس سے اسلامی عقیدہ کی صورت تو مسخ ہو ہی گئی۔ کہیں کہیں وہ روح بھی باقی نہیں رہی جو وجدانی اور ربانی تھی۔ اب یہ تھی کہ گہری اور سطحی الہام کا اختیار اور تسلیم و تفہیم

دانش کی تفریق بہت دشوار تھی۔ اور اب بھی ہے۔ اس لئے ہر کور دانش یا کوتاہ فہم کی عقل نارسا سے جو اسلامی عقیدہ خارج تھا۔ اس کی ٹیڑھی تاویل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ نہ سوچا کہ انجینیری کے مسائل ڈاکٹر کیا جانے۔ عام بازاری طبیب حاذق کی تجویز کو کیسے سمجھے اور جس کو قانون دانی میں قلیل ترین سند بہ موجودہ نتیجہ [illegible] ماہر قانون کی موشگافیوں کی تہ تک کس طرح پہنچے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہیروں کی تلاش معدن میں کی جاتی اور جواہر کی پرکھ جوہری سے کرائی جاتی۔ اور [illegible] طبیعیاتی افکار کو حامل وحی کی ملفوظات میں ڈھونڈا جاتا۔ وحی الٰہی کو معیار قرار دیا جاتا۔ اور علوم وجدانیہ اصل قرار پاتے جن میں غلطی کا امکان ہی نہ تھا پھر عقلی استدلال کو وحی پر منطبق کیا جاتا۔ اگر فہم رسا برہان کی روشنی میں علوم وحی تک پہنچ جاتا تو عقیدۂ غیبی علوم شہودی کے مرتبے پر پہنچ جاتا اور اگر سطحی عقل نارسا کی رسائی حدود فکر میں ممکن نہ ہوتی تو کوتاہی فہم کا اقرار کر لیا جاتا اور دوسروں کے لئے سوچنے اور سمجھنے کا میدان خالی چھوڑ دیا جاتا۔ کسی شخص یا اشخاص کی عقلی نارسائی سے کسی مسئلہ کی غلطی یقینی تو نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سوچنے والے وحی کی گہرائی تک پہنچ جائیں اور ان کی دانش فرزانہ علوم نبوی کی صداقت کو دلیل کی روشنی میں سمجھ لے۔ کیا ارسطو، افلاطون، دیمقراطیس، لوتھر اور نیوٹن نے ہی عقل کل ہونے کا ٹھیکہ لیا ہے اور ان کی عقلیں سر سے پاؤں تک بے داغ ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو دوسرے سمجھنے والوں کو موقع دینا ضروری ہے کہ فلسفۂ پارینہ جس گتھی کو نہ سلجھا سکا اس کو آنے والے دانشور سلجھانے کی کوشش کریں اور وہ بھی وحی کے عمق تک نہ پہنچ سکیں تو دوسرے تو دوسرے موزوں ذہن اور روشن دماغ ممکن ہے آئندہ سمجھ لیں۔ بہر حال وحی کی صداقت میں شبہ نہیں اور علوم عقلیہ ترقی پذیر ہیں۔ پیچھے آنے والے ہر نئی علمی لہر گذرنے والی ہر لہر پر غالب آتی ہے یا آسکتی ہے۔ مثلاً کراماً کاتبین اور تحریر اعمال کا عقیدہ وحی الٰہی سے ثابت ہے۔ چھ ہزار برس پہلے کا فرسودہ فلسفہ اس کو طبیعیاتی سانچہ میں ڈھال سکا۔ زیادہ سے زیادہ الٰہیاتی رنگ میں اللہ کے علم کو حضوری ثابت کر کے محیط کل مان لیا۔ اور فرشتوں کی تحریر کو مجاز پر محمول کر کے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح تحریر کے بعد کوئی چیز فراموش نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسانی اعمال اللہ کی لوح علمی سے مٹ نہیں سکتے۔ یہ تاویل اگر صحیح بھی ہو تب بھی تاریکی میں تیر اندازی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔ الٰہیاتی مسئلہ کو طبیعیاتی علوم کے سانچہ میں نہ ڈھالا جاسکا۔ ایک فوق الطبیعاتی مفروضے کو دوسرے الٰہی مفروضے سے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کے علاوہ اس کی کوئی پوزیشن نہیں۔ موجودہ زمانے کے طبیعیاتی علماء کہتے ہیں اور کہتے کیا ہیں محسوس کرتے ہیں، خود دیکھتے ہیں اور دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ ان کی برہانی روشنی درجۂ شہود تک پہنچ چکی ہے کہ یہ ساری خلا نور لہروں سے بھری ہوئی ہے۔ برقیاتی موجیں تمام فضا کو جگمگا رہی ہیں۔ بحر محیط ہو یا فلک بوس ہمالیہ کی چوٹی یا عرب کا صحرا دہنار یا راجپوتانہ کا ریگزار یا افریقہ کا تپتا ہوا میدان یا کشمیر اور کینیڈا کے سر سبز مرغزار یا کسی پہاڑ کی مخفی تاریک غار کی کوئی نشیبی تہ یا نہ بہ تہ ہمات آہنی صندوقوں کی اندرونی خلا یہاں تک کہ شریانوں اور وریدوں کے اندر بہتے ہوئے خون کا قطراتی تسلسل اور دل کے نقطۂ سیاہ میں گزرنے والا کوئی خطرہ اور دماغ کی مخفی خلاؤں سے ابھرنے والے تصور کی لہر۔ کوئی بھی ان برقی لہروں کی اثر پذیری اور اثر انگنی سے خالی نہیں کائنات کے ذرہ ذرہ کی عکاسی اس برقی آئینہ میں ہوتی ہے اور ایسی ہوتی ہے کہ پھر کبھی نہیں مٹتی نہیں بگڑتی، رو بہ زوال نہیں ہوتی۔ انسان نے ایک حد تک ان لہروں پر قابو پا لیا ہے۔ بغیر ٹیلیگرافی سلسلہ کے انہی لہروں کی زبان سے انسان کی ہر جسمانی حرکت و سکون اور ہر لفظ و لہجہ کو ہزاروں میل دور منتقل کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ تنفس کی آمد و رفت کی آواز بھی سینکڑوں کوس پر سنی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پلک جھپکنے کی کیفیت اور دیکھنے [illegible] نگاہ کی حکونگی کا مطالعہ بھی انہی لہروں کی عکس ریزی سے ہونے لگا ہے۔ بلکہ تصوراتی اور خطراتی شعاعوں کو جذب کرنے والی کیمرے روشن کر رہیں ہیں اور [illegible] دار ہیں کہ لاکھوں برس پرانے واقعات، حرکات و سکنات اور افکار و تخیلات کے اصل فوٹو انہوں نے محفوظ رکھے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ کوئی حصہ مٹ گیا ہو یا بگڑ گیا ہو یا ان کی عکس پذیری سے رہ گیا ہو یا دوسرے سے مل گیا ہو۔ کراماً کاتبین کا عقیدہ الٰہیاتی ہے۔ فوق الطبیعیاتی ہے۔ [illegible] اور حقیقت خدا جانے کیا ہے لیکن اگر اس کو طبیعیاتی رنگ میں سمجھنا اور سمجھانا ہی ضروری ہے تو موجودہ زمانے کے فضائی انکشافات [illegible] فضائی لہروں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو احادیث و آیات میں کراماً کاتبین کی بیان کی گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے بلکہ قریب الوقوع ہے بلکہ یقینی ہے یہ امر کہ ہر آدمی کی ہر حرکت، و سکون ہر سانس اور ہر تصور کا فوٹو جو ان لہروں میں قلم قدرت سے لکھا ہوا اور کھنچا ہوا موجود ہے۔ [illegible] ہر لوح کے یکجا جمع کر کے پردۂ خفا سے جلوہ گاہ مشاہدہ میں لے آیا جائے اور آدمی خود اس کا ملاحظہ کرلے اور انکار کی مجال ممکن نہ ہو۔ جب [illegible] کان آنکھ اصل حالت میں کسی کام میں مشغول سامنے نظر آجائے اور آدمی خود اس کا ملاحظہ کرلے اور انکار کی مجال ممکن نہ ہو۔ جب اپنا

ہاتھ پاؤں آنکھ کان اصلی حالت میں کسی کام میں مشغول سامنے نظر آجائے تو کسی کو انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا کب ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جب بھی ہوگا وہی روزِ جزا ہوگا۔ تخریب کائنات کے بعد ہوگا۔ تعمیر جدید کے دن ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ان الابرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم۔ محاسبۂ اعمال کے بعد نیک فرماں بردار لوگ سکھ اور چین (جنت) میں ہوں گے اور نافرمان بھڑکتی ہوئی آگ میں۔ الابرار سے مراد ہیں صحیح الایمان مومن جو یومِ جزا کا یقین کامل رکھتے ہیں اور عذابِ آخرت سے ڈرتے ہیں ان کے اقسام مختلف ہیں ۱۔ صالحین کاملین ۲۔ صالحین ناقصین ۳۔ مرتکب بعض منہیات اور تارک بعض اوامر۔ الفجار سے وہ کافر مراد ہیں جو روزِ قیامت کا صحیح یقین نہیں رکھتے۔ اکثر علماء نے یہی تشریح کی ہے اور سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

یصلونھا یوم الدین دوزخیوں کا دوزخ میں داخلہ بروزِ جزا ہوگا۔

وما ھم عنھا بغائبین اور ایسا ہوگا کہ دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا وہ دوزخ سے غیر حاضر نہ ہوں گے۔ عام علماء تفسیر نے یہی مطلب بیان کیا ہے، لیکن اس فقیر کے خیال میں اس آیت کا مطلب اس طرح بھی آیا ہے کہ کافروں کا داخلہ جہنم میں بروزِ جزا ہوگا (مگر) وہ دوزخ سے غائب اب بھی نہیں ہیں۔ دوزخ ان کے سامنے ہے اور وہ دوزخ کے سامنے صرف داخلہ اس دنیا میں نہیں ہوا وہ مرنے کے بعد ہو جائے گا واللہ اعلم۔

لیکن یومِ جزا کیا ہے کن عظمتوں اور مصیبتوں کا حامل ہے اور کس قدر ہولناکیاں اور دہشت زدگیاں اس روز ہوں گی اس کا اندازہ آسان نہیں۔

وما ادراک ما یوم الدین ثم ما ادراک ما یوم الدین۔ تم کیا جانو کہ یوم الدین کی حقیقت کیا ہے۔ خطاب بظاہر رسول اللہ کو ہے، مگر ہر مخاطب مراد ہو سکتا ہے کیونکہ جب حضور کو قیامت کی پوری حقیقت معلوم نہیں تو دوسرے کو کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔ یومِ جزا کی حقیقت ناقابلِ بیان ہے۔ بس اتنا مختصر طور پر جان لو کہ۔

یوم لا تملک نفس لنفس شیئا والامر یومئذ للہ۔ یومِ جزا وہ ہوگا کہ کسی کو کسی کے کام آنے کا قابو نہ ہوگا۔ مجازی اقتدار بھی کسی کا نہ ہوگا۔ حاکم صرف اللہ ہوگا اور حکم صرف اسی کا۔

ایک شبہ کیا انبیاء، ملائکہ، علماء، اولیاء اور نابالغ اولاد کی شفاعت کسی کے لئے نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی یقیناً احادیث سے ثابت ہے کہ ہوگی تو پھر آیت کے اندر جو نفی مالکیت کی صراحت کی گئی ہے اس کا کیا معنی۔

ازالہ آیت مذکورہ شفاعت کے منافی نہیں۔ شفاعت تو اذن کے بعد ہوگی اور اذن دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہوگا۔ از خود کسی کے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم دینا جس طرح کسی کے بس میں نہ ہوگا اسی طرح از خود شفاعت کرنے پر بھی کسی کو قابو نہ ہوگا۔ جب اجازت ملے گی تو اہلِ شفاعت گناہگاروں کی سفارش کریں گے۔

مقصودِ بیان شروع کی چار آیات میں اصولِ عالم کی تخریب کا اظہار ہے اور اصول کی تخریب چونکہ فروع کی تخریب کو متضمن ہوتی ہے، اس لئے اصول تخریب کی صراحت کرنے سے فروعی تخریب مترشح ہو گئی اور سارے جہان کا تہ و بالا ہونا سمجھ میں آگیا۔

آیت علمت الخ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زندگی کی تمام جزئیاتی روئیداد یا اس کی پاداش تخریبِ عالم کے بعد ہی معلوم ہوگی جب تک یہ دنیا باقی ہے عمل کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس لئے زندگی کے اعمال کی پوری فہرست تو زندگی ختم ہو جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

آیت بربک الکریم میں لفظ رب اور کریم سے اس طرف اشارہ ہے کہ بے غرض ربوبیت اور بے لالچ کرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ رب کریم کے احکام کی خلاف ورزی نہ کی جاتی اس کا انکار نہ کیا جاتا اس کا شریک نہ بنایا جاتا اس کی ناشکری نہ کی جاتی۔ مگر انسان ایسا کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو قیامت کا یقین ہی نہیں۔ روزِ جزا کا اقرار نہیں۔ پاداشِ عمل کا ڈر نہیں۔ وہ اللہ کے کرم پر غرہ ہے اور قہر سے بے باک۔

آیت الذی خلقک الخ سے واضح ہے کہ انسان کی تخلیقی شکل ماں باپ یا خلط ان کے تابع ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک اندازہ کے ساتھ ارادہ کے زیرِ اثر ہے۔ پورے انسانوں کے اعضاء میں ہمواری اور یکسانیت ہے۔ انسان کی بناوٹ میں ہر حیثیت سے اعتدال ہے کیفی بھی مزاجی بھی۔ نوعی بھی ضروریات کے لحاظ سے بھی۔

فی ای صورۃ ماشاء رکبک سے واضح ہے کہ انسان کی تخلیقی شکل ماں باپ یا خاندان کے تابع ہونا ضروری نہیں ۔ اسی طرح معنوی شکل یعنی خو خصلت انداز طبع، میلان قلب، علمی قوت و استعداد اور کفر و ایمان کا جذبہ بھی اسلاف کے موافق ہونا لازم نہیں بلکہ یہ شخصی خصوصیات ہیں جن کی عطاء کا مدار اللہ کی مشیت پر ہے ۔

لفظ کلا اور بل سے ظاہر ہو رہا ہے کہ معصیت کی بنیاد صرف یہ ہے کہ آدمی پاداش عمل کا یقین نہیں رکھتا اسی لئے وہ سزا کی طرف سے بے باک اور ہر خیر کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔

آیت ان علیکم لحافظین سے اعمال نامے لکھنے والے فرشتوں کے چار اوصاف معلوم ہوتے ہیں ۔ ۱ وہ تمام اعمال، اقوال اور روئیداد زندگی کے نگران ہیں ۔ ۲ وہ معزز اور کریم ہیں یعنی اللہ کے نزدیک وہ قابل اعتماد اور ثقہ ہیں جھوٹے اور غلط نویس نہیں اور انسانوں کے لئے وہ مہربان ہیں، چاہتے ہیں کہ اعمال ناموں میں زیادہ سے زیادہ خیر کا اندراج ہو اور کسی طور پر گناہ کا اندراج نہ ہو تو بہتر ہے ۔ وہ جذبۂ انتقام اور ظلم و حق تلفی سے پاک ہیں ۔ کسی کے لئے کوئی بے جا بات نہیں لکھتے ۔ ناقل اور راوی کے لئے یہ دونوں شرطیں بنیادی ہیں قوت یادداشت اور عدالت ۔ ۳ یادداشت یوں تو قوی الحافظہ اپنے حافظے کے اعتماد پر کرتا ہی ہے لیکن کوئی قوی الحفظ احتمال نسیان سے محفوظ نہیں ۔ اصل واقعہ یاد رکھنے کے باوجود ترتیب میں تقدیم تاخیر یا الفاظ میں کچھ تغیر تبدیل کا احتمال بہر حال قائم رہتا ہے، لیکن اگر کسی واقعہ کو ترتیب واقعی کے موافق اور کسی کلام کو اصلی عبارت کے ساتھ لکھ لیا جائے تو احتمال نسیان و تغیر بھی باقی نہیں رہتا ۔ اسی لئے باوجود قوی الحفظ اور صحیح یادداشت کے فرشتے آدمی کے ہر قول و عمل کو لکھ لیتے ہیں ۔ ۴ انسان جو کچھ کرتا ہے خواہ فعل دست ہو یا چشم و گوش یا کوئی عمل یا فعل زبان ہو یعنی بات یا فعل قلب ہو یعنی تصور اور ارادہ سب سے فرشتے واقف ہوتے ہیں، اس لئے انسان کی زندگی کے کسی خفیہ حصہ کا مخفی اور مجہول رہنا بھی ناممکن ہے ۔

آیت یوم لا تملک نفس الخ سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان کو جو شفاعت کے بھروسے پر گناہوں کی جرأت بے باکانہ کرتے ہیں ۔ مایوس ہونا چاہیئے ان لوگوں کو جو اللہ کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں، فرشتوں، نیک روحوں اور دیوی دیوتاؤں سے رشتہ جوڑتے اور ان پر بھروسہ رکھتے ہوئے ان کی عبادت کرتے اور ان کو عذاب الہی سے بچانے والا سمجھتے ہیں ۔ اس آیت سے خصوصیت کے ساتھ مترشح ہوتی ہے یہ بات کہ جب تک انسان عالم اختیار میں ہے اور اپنے کو مالک، متصرف اور حاکم جانتا ہے ۔ خواہ اس کی یہ ملکیت، حکومت اور تصرف مجازی ہی ہے اس وقت تک حقیقی پاداش عمل کا کوئی معنی نہیں ۔ یوم الجزاء وہ ہے جب انسان کے یہ سارے اختیارات سلب کر لئے جائیں گے اس کو کسی قسم کا کوئی قابو نہ رہے گا ۔

سورۃ التطفیف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورت کا نام سورۂ مطففین بھی ہے ۔ اس سورت میں ۳۶ آیات ۱۹۹ کلمات اور ۷۸۰ حروف ہیں (خطیب)

قرطبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود، ضحاک اور مقاتل کے نزدیک یہ پوری سورت مکی ہے اور حسن بصری اور عکرمہ کے نزدیک مدنی ۔ جابر بن زید، کلبی اور عطاء کے قول کے مطابق مکہ اور مدینہ کے درمیان راستہ میں نازل ہوئی ۔

حضرت ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے کہ ان الذین اجرموا سے آٹھ آیات تک مکہ میں نازل ہوئیں اور باقی سورت مدینہ میں ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن الزبیر اور حضرت ابن عباس پوری سورت کو مکی قرار دیتے ہیں ۔ ابن عباس تو یہ بھی فرماتے تھے کہ مکہ میں سب سے آخر میں یہی سورت نازل ہوئی ۔ ابن عباس کا دوسرا قول جس کو نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے اور سیوطی نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے ۔ یہ ہے کہ جب رسول اللہ مدینہ میں تشریف لائے تو ملاحظہ فرمایا کہ مدینہ کے لوگ ناپ تول میں بڑی خیانت کرتے ہیں ۔ اس پر اللہ نے ویل للمطففین نازل فرمائی ۔

اختلاف روایات اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ان الذین اجرموا سے آٹھ آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور باقی سورت مدینہ میں جس نے آخری

آیات پر نظر کی اس نے سورت کو مکی قرار دیا اور جس نے آغاز سورت کو پیش نظر رکھا اس نے سورت کو مدنی کہا۔

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ ہلال بن طلق نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا ناپ تول میں سب لوگوں سے بہتر مکہ یا مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ان کو ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ فرماتا ہے ویل للمطففین (ابن کثیر)

مفسر ابوالسعود نے لکھا ہے کہ مدینہ میں ایک شخص ابو جہینہ تھا جس کے پاس دو ناپ تھے ایک لینے کا جو بڑا تھا۔ دوسرا دینے کا جو چھوٹا تھا۔ یوں بھی مدینہ کے تاجر ناپ تول میں تطفیف کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ جب مدینہ میں تشریف لائے اور یہ بات ملاحظہ فرمائی تو یہ سورت نازل ہوئی اور آپ نے لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ اور فرمایا پانچ باتوں کے عوض پانچ نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔ عہد شکن قوم پر اللہ دشمن کو مسلط کرتا ہے اور حکم خدا کے خلاف فیصلے کرنے والوں میں محتاجی پھیل جاتی ہے اور جن لوگوں میں زنا کا پھیلاؤ ہوتا ہے ان میں موت کی کثرت ہوتی ہے اور جب لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگتے ہیں تو ان کی پیداوار گھٹ جاتی ہے اور کال پڑنے لگتا ہے اور جو قوم زکوٰۃ روکتی ہے اس سے بارش روک لی جاتی ہے۔ اس حدیث کو خطیب نے بھی (غالباً ابوالسعود سے ہی) نقل کیا ہے، لیکن معلوم نہیں شیخ ابوالسعود کا ماخذ کیا ہے۔

سورۂ انفطار اور سورۂ تطفیف میں تین امور مشترک ہیں ۱۔ یوم الدین کی تکذیب پر وہاں بھی وعید ہے اور یہاں بھی۔ یوم الجزا کو ماننے پر دونوں جگہ زور دیا گیا ہے ۲۔ زندگی کے تمام اعمال کے باقی رہنے کی وہاں بھی صراحت ہے اور یہاں بھی۔ فرق یہ ہے کہ وہاں اعمال نامے لکھے جانے کا اظہار ہے اور یہاں ان کو رکھے جانے کے مقامات کی تعین کی ہے کہ کچھ علیین میں ہوتے ہیں اور کچھ سجین میں اور اس سے آگے سورۂ الانشقاق میں اعمال ناموں کی واپسی کو ظاہر کیا گیا ہے جب دائیں یا بائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے ۳۔ گزشتہ سورت میں ابرار کے لئے نعیم اور فجار کے لئے جحیم مقرر ہونے کی مجمل صراحت تھی۔ اس سورت میں جنتیوں اور دوزخیوں کے احوال کی تفصیل کی گئی ہے۔ گویا زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کے تین بنیادی اصول اور تصورات تھے ان کو دونوں سورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اعمال کی جزا سزا کا دن اور اعمال کا اچھا برا نتیجہ اور ان دونوں اصول کی تکذیب یا تصدیق کی بنیاد پر اعمالی زندگی کی درستگی یا بربادی۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی — کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کر لیں — تو پورا لیں — اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر

أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

دیں تو گھٹا کر دیں (آگے مطففین کو تہدید ہے) — کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

جس دن تمام آدمی رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے

تفسیر شریعت الٰہیہ نام ہے اس الٰہی دستور حیات کا اور مجموعۂ ضوابط کا جو انسان کی عملی و علمی اصلاح کا کفیل ہے اور فکری و کرداری فلاح کا درس دیتا ہے۔ مخلوق کا خالق سے براہ راست رشتہ جوڑتا ہے۔ مبدء اور معاد کے متعلق صحیح نظریہ پیش کرتا ہے۔ کچھ ایسے فکریات اور عملیات کی تعلیم دیتا ہے جن کا علاقہ خالص طور پر ذات معبود سے ہے۔ کچھ ایسی عبادتیں بھی سکھاتا ہے جو ایک طرف مناجات، مراقبہ اور خوف و رجا کے جذبات اور ولولوں میں جوش پیدا کر کے سکون روح اور نشاط قلب حاصل کرنے کا سبب بنتی ہیں تو دوسری طرف انسان کی معاشرت اور سماج اور سیاست کو غرور، انانیت اور خود غرضی کی تباہ کاریوں سے بچاتی ہیں۔ پیدائش، نسلی، لسانی، ملکی، جغرافیائی اور دوسرے فرضی تفرقوں کو مٹا کر

انسان کے خودساختہ داغ دھبوں سے انسانیت کے چہرے کو صاف کر کے سورج سے زیادہ روشن، چاند سے زیادہ فرحت بخش، ستاروں سے زیادہ حسین اور پھولوں سے زیادہ شگفتہ کر دیتی ہیں۔ پھر ایسے باہم معاملاتی اصول بھی بتاتا ہے جو اس زمین پر تعمیر انسانیت کے لئے اصل الاصول ہیں اور اساس اوّلیں ہیں۔ اگر ان اصولوں پر انسانی معاشرت و سماج کی عمارت قائم نہ کی جائے تو اوّل تو تعمیر ہی نہ ہوگی اور ہو بھی جائے گی تو ٹیڑھی۔ زمین کی طرف اتنی جھکی ہوئی کہ بہت ہی قلیل مدت میں زمین پر گر پڑے گی۔ اُلٹ جائے گی۔ تہ و بالا ہو جائے گی۔ ایسی کہ روئے زمین پر اس عمارت کا کہیں نام نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ گویا آسمانی شریعت تین طرح کی تعلیم دیتی ہے ۱۔ اللہ کی ذات اور صفات کے متعلق عقائد بتاتی ہے۔ سارے جہان کو اللہ کی مخلوق اور محتاج قرار دیتی ہے اور اللہ کو سب کا خالق اور رب۔ روزِ قیامت کی حقانیت کو اس کی تفصیل کے ساتھ ثابت کرتی ہے جس کا مقدمہ قبر کو قرار دیتی ہے ۲۔ ایسی عبادتیں فرض قرار دیتی ہے جن میں اللہ سے مناجات اور دعا بھی ہے۔ مراقبہ بھی ہے، ہر طرف سے منہ موڑ کر اللہ ہی کی طرف رُخ کرنے کی تعلیم بھی ہے۔ اللہ کے عذاب سے ڈر اور اس کے ثواب کی امیدواری بھی ہے اور اسی کے ساتھ معاشرت و اخلاق کی درستگی، سماج کی اصلاح اور سیاست کی ژولیدگیوں کے سلجھاؤ کی مخصوص عملی تلقین بھی ہے۔ گویا ایسی عبادات میں حقوق اللہ کی ادائیگی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور انسانی حقوق و فرائض کی بھی اجمالی تعلیم دی گئی ہے۔ ۳۔ اُن خالص معاملاتی اصول کی تعلیم ہے جس کا تعلق صرف انسان کی سماجی بہبودی اور معاشرتی و سیاسی فلاح سے ہے۔ بے جا خوں ریزی، آبرو شکنی، حق تلفی، چوری، غبن، فریب، دغا، جعل سازی، ڈاکہ زنی اور ناجائز خورد برد سے روکا گیا ہے۔ ہر شخص کے حقوق و فرائض کی حد بندی کر دی گئی ہے۔ اس تعلیم کی اصل غرض ظلم کی بیخ کنی اور عدل کی اشاعت ہے جس کی تین صورتیں ہیں ۱۔ ناجائز طور پر کسی کا خون نہ بہایا جائے نہ جسمانی ضرر پہنچایا جائے ۲۔ ناجائز طور پر کسی کی عزت و ناموس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ کسی کو گالی نہ دی جائے، کسی کی توہین نہ کی جائے نہ ایسی کوئی تدبیر یا حرکت نہ کی جائے جس سے براہِ راست یا بالواسطہ دوسرے کی آبرو ریزی ہوتی ہو۔ ۳۔ ناجائز طور پر کسی کا مال نہ لیا جائے۔ چوری، ڈاکہ، غبن، رشوت، دغا، فریب سے مال کا حصول اسی ذیل میں شمار کیا گیا ہے۔

اصلاح فکر و عقیدہ اور عبادات سے بے شک انسانیت کا چہرہ جہالت، اضطرابِ قلبی اور کثافتِ روحی سے بے داغ ہو کر نورِ الٰہی سے چمکنے لگتا ہے شگفتہ اور شاداب ہو جاتا ہے۔ حزن کی جگہ نشاط، اضطراب کی جگہ اطمینان، اضطرار کی جگہ سکون اور کدورت کی جگہ نظافت پیدا ہو جاتی ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان محاسن کی ضد برائیاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن انسانی سوسائٹی کامل طور تباہ نہیں ہوتی، انسانیت کی عمارت جڑ سے منہدم نہیں ہو جاتی، شرک سے آئینۂ روح مکدر ہو جاتا ہے، ترک نماز سے دل میں سیاہی آ جاتی ہے، روزہ نہ رکھنے سے نفس کی بے جا شہوانیت اور انانیت قائم رہتی ہے۔ انسانیت کا چہرہ داغ دار ضرور ہو جاتا ہے، حسن سے محرومی، دل میں بے چینی ضرور پیدا ہوتی رہتی ہے اور انسان گم کردہ منزل مسافر کی طرح بھٹکتا رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود انسان نما حیوان اس زمین پر آباد رہتا ہے جو فرائض انسانیت اور امتیاز انسانیت کی شناخت سے بے بہرہ ہوتا ہے۔

لیکن اگر کسی بستی والوں کی جانیں محفوظ ہوں نہ آبرو۔ عورتوں کی عصمتیں مامون ہوں نہ معصوم بچوں کی معصومیتیں بے خطر۔ کمزوروں کی کمزوری پر رحم کیا جائے نہ عزت والوں کی عزت کا پاس لحاظ، کسی تاجر کے تجارتی مال کی نگہداشت ممکن ہو نہ زردار کے زر کی۔ چوری، ڈاکہ، غبن، فریب، دھوکہ دہی اور جعل سازی عام ہو۔ اس وقت انسانیت تو بہرحال تباہ ہو ہی جاتی ہے۔ روئے زمین پر انسان نما حیوان بھی باقی نہیں رکھا جاتا جب انسان خود اپنی انانیت کا گلا کاٹنے لگتے ہیں۔ وضع فطرتِ انسانی کے خلافِ وضع اختیار کر لیتے ہیں اور ہر شخص ہر ممکن طریقے سے دوسرے کے حق پر دست درازی کرنے سے دریغ نہیں کرتا تو اللہ بھی ایسے حیوانوں کو زمین کے اوپر نہیں چھوڑتا۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا زمین کا جوف ہوتا ہے نہ کہ زمین کی سطح۔

مالی عدل شکنی، سماجی بربادی اور اخلاقی تباہی کے ایک مجموعہ کا نام تطفیف ہے۔ ناپ، تول میں اپنا حق پورا پورا وصول کرنا اور دیتے وقت دوسروں کو کم دینا ایک ایسا جرم ہے جو کتنے ہی جرائم کا مجموعہ ہے۔ یہ چوری بھی ہے، ظلم بھی، حق تلفی بھی، بے ایمانی بھی، غبن اور جعل سازی بھی، مکر آمیز ٹھگی بھی اور بے رحمی بھی، یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کے لیے سنگدلی کا مظاہرہ بھی، عمومی بے چینی اور بے اطمینانی کی اشاعت بھی اور انتہائی

دنائت رکیک چھچھور ، حوصلہ کی پستی اور ہمت کی پسپائی ہو۔ ایسے انسان کو انسان کہنا تو کیا حیوان کہنا بھی نازیبا ہے۔ مختلف حیوانوں میں مختلف برائیاں ہوتی ہیں۔ کوئی مکار ہوتا ہے، کوئی سخت دل اور ظالم، لیکن ناپ تول میں کمی کرنے والا تو بدترین حیوان ہوتا ہے۔ حیوانی عیوب کا مجموعہ۔ انسانی سوسائٹی کو تباہ کرنے والا، سماج کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والا۔ اس لئے شعیب کی قوم ہو یا کوئی اور بے ایمان آبادی روئے زمین سے اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ عظیم الشان اور بڑی ہلاکت ہے۔ ان بے ایمان دوکانداروں کے لئے جو دیتے وقت تو کم دیتے ہیں اور لیتے وقت پورا پورا لیتے ہیں۔ شاید ان کو یقین نہیں۔ یقینی تو کیا غالب گمان بھی نہیں کہ ایک دن اللہ کے سامنے جا کر کھڑا ہونا ہوگا۔ اللہ رب العالمین ہے۔ اس کے رب العالمین ہونے کے طریقہ میں جس نے رخنہ اندازی کی ہوگی اس کی پکڑ ہوگی۔ مظلوم کا ظالم سے، بھولے کا مکار سے، بیوقوف کا فریبی سے اور ہر شخص کے حق کا حق... مارنے والے سے حساب لیا جائے گا۔ اللہ نے میزانِ عدل نازل کر دی۔ لوگو! انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپ تول کرو۔ کمی نہ کرو۔ میزانِ عدل کو چھوڑو گے۔ دنیا ہی میں تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ دوزخ میں تو بہر حال ایسے لوگوں کے لئے ویل مقرر ہی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

ویل للمطففین۔ ویل کا معنی ہلاکت یعنی عذاب شدید یا دوزخ کے اس غار کا نام ہے جس میں گرنے والا چالیس برس تک گرتا چلا جائے گا۔ کما فی الحدیث۔ (ابوالسعود) المطففین۔ ناپ تول میں کم دینے والے اور پورا لینے والے۔ تطفیف کم مال کی ہو یا زیادہ کی بہرحال گناہ کبیرہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چوری کے نصاب سے کم تطفیف کی جائے تو صغیرہ ہے ورنہ کبیرہ۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں تطفیف کا عزم کرنے کو بھی گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔

شیخ ابوالقاسم قشیری اور بعض دوسرے اکابر سے منقول ہے کہ تطفیف میں مندرجہ ذیل امور بھی داخل ہیں اور ان کا حکم بھی تطفیف ہی کی طرح ہے۔ اپنے عیب کو چھپانا اور اگر وہی عیب دوسروں کے اندر بھی ہو تو اس کو ظاہر کرنا۔ دوسرے کا عیب دیکھنا اور اپنا عیب نہ دیکھنا۔ دوسروں سے انصاف چاہنا اور خود انصاف نہ کرنا۔ دوسروں سے اپنی تعظیم کا خواستگار رہنا اور خود ان لوگوں کی تعظیم نہ کرنا جو شرعاً واجب التعظیم ہیں۔ نوکر یا مزدور سے کام پورا لینا اور اجرت کم دینا۔ اللہ کی اطاعت میں کمی کرنا اور رزق پورا مانگنا (سراج وغیرہ)

ایک حدیث میں آیا ہے اَلصَّلٰوۃُ مِکْیَالٌ فَمَنْ وَفّٰی وُفِّیَ لَہٗ وَمَنْ طَفَّفَ فَقَدْ عَلِمْتُمْ فِیْہِ مَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔ نماز ایک پیمانہ ہے جو پورا دے گا اس کو پورا دیا جائے گا جو کم دے گا تو تم جانتے ہی ہو کہ تطفیف کے متعلق اللہ نے کیا فرمایا ہے۔

حدیث قدسی ہے اَوْفِ ابْنَ آدَمَ کَمَا تُحِبُّ اَنْ یُّوْفٰی لَکَ وَاعْدِلْ کَمَا تُحِبُّ اَنْ یُّعْدَلَ لَکَ۔ اے ابن آدم پورا ادا کر جس طرح تو پسند کرتا ہے کہ تجھے پورا دیا جائے اور انصاف کر جس طرح تو پسند کرتا ہے کہ تیرے ساتھ انصاف کیا جائے۔

اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ۔ کبھی بائع کی مزاج کی بے پروائی یا نادانستگی میں خریدار کو چیز کم پہنچ جاتی ہے ایسے لوگ واقع میں مطفف تو ہوتے ہیں مگر ان کے لئے وعید عذاب نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہلاکت ان مطففوں کے لئے ہے جب لوگوں سے پیمائش کر کے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔

کیل کا معنی ہے کسی خاص پیمانہ سے ناپ کر غلہ، میوہ، نمک وغیرہ دینا اور اکتیال کا معنی ہے ان چیزوں کو پیمانہ سے ناپ کر لینا۔ کپڑے یا زمین کی پیمائش کو کیل نہیں ذرع کہتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا اور بعض ملکوں میں اب بھی رواج ہے کہ غذائی اجناس پیمانہ سے ناپ کر دیتے لیتے ہیں۔ ہمارے دیس میں غذائی جنس اور دوسری چیزیں تول کر دی جاتی ہیں۔ بعض چیزیں شمار سے خریدی جاتی ہیں اور کپڑا، زمین وغیرہ کو گز سے ناپا جاتا ہے۔ آیت میں کیل اور وزن کا عرب رواج کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے مگر اصل غرض تطفیف کا بیان ہے۔ خواہ کسی چیز میں ہو اور کسی طرح ہو۔ جیسا رواج ہو اسی رواج کے موافق کم دینے اور زیادہ لینے کو تطفیف کہا جائے گا۔ اسی لئے بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ تطفیف سے مراد ہے بخس یعنی کم دینا۔ کیونکہ دوسری آیت میں فرمایا ہے وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَھُمْ یعنی معاملات میں لوگوں کو چیزیں کم نہ دو

یہاں ایک شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس جگہ علی الناس کی بجائے من الناس ہونا چاہئے۔ عرب کا محاورہ ایسے موقع پر یہی ہے۔ مگر یہ شبہ بے اصل ہے۔ بقول زجاج اِکْتَالَ مِنَ النَّاسِ اور عَلَی النَّاسِ دونوں صحیح ہے اور یہاں علی الناس کہنے میں ایک خوبی ہے کہ وہ لوگ ناپ کر لیتے ہیں اور اپنے ناپ کا بار لیے

دائے پڑ جاتے ہیں۔ گویا ان کے لینے سے دینے والے کا نقصان ہوتا ہے۔

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ اصل میں کالوا لہم او وزنوا لہم تھا یعنی جب کیل یا وزن کر کے ان کو دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ دونوں جگہ ضمیر ہُم مفعول نہیں ہے بلکہ یخسرون کا مبتدا ہے اور مفعول محذوف ہے۔ یعنی جب کوئی چیز کو ناپ تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ خطیب نے لکھا ہے کہ اشعار عربی اور محاورات عربیہ سے ثابت ہے کہ ہُم اور لہُم دونوں طرح کیل اور وزن کے بعد استعمال کرنا صحیح ہے، اس لئے ہُم کو اصل میں لہُم قرار دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

لین دین کی چار صورتیں ہیں۔ پورا لے اور پورا دے۔ کم لے اور کم دے۔ پورا لے اور کم دے۔ کم لے اور پورا دے۔ آخری صورت سب سے افضل ہے اور عالی حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔ تیسری صورت بدترین ہے اسی کو آیت میں بیان کیا ہے۔ دوسری صورت بھی ممنوع ہے، مگر اس کی بلا تیسری صورت سے کم ہے۔ اول صورت نہ قابل مذمت ہے نہ موجب ستائش جو انکی ایک شکل ہے۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ناپ تول میں کم دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ جن لوگوں کو قیامت قائم ہونے اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب دینے کا یقین ہے وہ اس کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتے بلکہ اگر قیامت کے دن اٹھنے کا گمان غالب بھی ہو خواہ یقین نہ ہو تب بھی ایسی حرکت کرنا مناسب نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تطفیف کرنے والوں کو قیامت کا یقین کیا، گمان غالب بھی نہیں ہے جب ہی تو اس کی جرأت کرتے ہیں۔ یوم عظیم یعنی قیامت کا دن پچاس ہزار برس کا۔ بڑا ہولناک۔ ذرہ ذرہ کے حساب اور بازپرس کا دن۔ زمین آسمان کے انقلاب کا دن۔ مجرموں پر اللہ کے غضب نازل ہونے کا دن ہوگا (ابن کثیر)

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ قبروں سے بعثت۔ دوبارہ زندگی۔ اس ہولناک دن ہوگی جب سب آدمی رب العالمین اور مالک جہان کے [illegible] ہوں گے۔ یعنی زندہ ہو کر رب العالمین کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور حاضری بھی بصورتِ قیام ہوگی۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے قیامت کے دن لوگ بقدر تین سو برس میدانِ حشر میں کھڑے رہیں گے۔ اتنی طویل مدت تک ان کا کوئی فیصلہ نہ ہوگا، مگر مسلمان کو اتنی لمبی مدت ایسی معلوم ہوگی جیسے ابھی نماز سے فارغ ہوا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے بعض روایات میں ستر برس تک بعض روایات میں چالیس ہزار برس تک قیام آیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے حضور والا نے بشیر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا بشیر اس روز تیرا کیا حال ہوگا جب دنیوی گنتی کے موافق تین سو برس تک لوگ رب کے سامنے کھڑے ہوں گے نہ آسمان سے ان کے لئے کوئی حکم نازل ہوگا نہ کسی بات کا فیصلہ ہوگا۔ الخ (ابن جریر)

حضرت ابن عمر کی روایت میں سو برس تک اس طرح کھڑا رہنا آیا ہے (ابن جریر) حضرت ابن عمر کی روایت میں آیا ہے رب العالمین کے روبرو کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ بعض لوگ اپنے پسینہ میں کانوں تک ڈوبے ہوئے ہوں گے (بخاری و مسلم و احمد) مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور والا نے فرمایا آفتاب ایک یا دو میل کے فاصلے پر آجائے گا۔ شدتِ حرارت کی وجہ سے لوگ اپنے اعمال کے موافق پسینے میں کھڑے ہوں گے۔ بعض کے ایڑیوں تک، بعض کے ٹخنوں تک بعض کے زانوں تک، بعض کے کمر تک اور بعض کے منہ تک پسینہ آجائے گا۔ (احمد و مسلم و ترمذی)

حضرت ابن عمر نے جب یہ آیت پڑھی تو بڑی دردناک آواز سے رونے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔

اللہ کی عمومی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اس کا پورا حصہ دیا جائے۔ ناپ تول میں کم دینے والا اللہ کی ربوبیت میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور یقین نہیں کرتا کہ رب العالمین کے سامنے حاضر ہو کر اپنے جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

مقصودِ بیان: ناپ تول میں کم دینے والوں کو عام بربادی کی سخت وعید۔ لفظ ویل کا عموم بتا رہا ہے کہ ایسے لوگوں کی بربادی دنیا میں بھی ضرور [illegible]۔ مطففین کی تشریح الذین اذا اکتالوا الخ سے بتا رہی ہے یہ بات کو بے پروائی کی وجہ سے اگر بغیر نیت خیانت کے اگر کوئی شخص کسی کو کوئی چیز کم دے دے تو [illegible] وعید میں داخل نہیں، اسی طرح وہ شخص بھی مستحق وعید نہیں۔ جو لین دین میں کمی بیشی کرتا ہے۔ جس کی عادت ہی ہو کہ لیتا ہو تب بھی زیادہ لیتا ہو اور دیتا ہو تب بھی بیشی کے ساتھ دیتا ہو۔ یا لیتا بھی کم ہو اور دیتا بھی کم ہو ان دونوں صورتوں میں صرف عادت کو دخل ہے نیت خیانت کو دخل نہیں، اس لئے ایسا آدمی مستحق وعید نہیں۔ اگرچہ ماخوذ ضرور ہوگا اور حساب ضرور دینا پڑے گا۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

ہرگز (ایسا) نہیں ہوگا (یعنی کافر) لوگوں کا نامۂ عمل سجین میں رہے گا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجین میں رکھا ہوا نامۂ عمل کیا چیز ہے وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ

اُس (قیامت) کے روز جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اس کو تو وہی جھٹلاتا ہے جو

اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ كَلَّا

حد (عبودیت) سے گزرنے والا ہو (اور) مجرم ہو (اور) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جائیں تو (یوں) کہہ دیتا ہو کہ یہ بے سند باتیں ہیں اگلوں سے منقول ہیں

بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝

ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے ہرگز ایسا نہیں یہ لوگ اپنے رب (کا دیدار دیکھنے) سے روک دیئے جائیں گے۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

پھر یہ دوزخ میں داخل ہوں گے پھر (ان سے) کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ہرگز ایسا نہیں۔

تفسیر کلا ان کتب الفجار لفی سجین بدعقیدہ کافر جزا سزا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ قیامت روزنامچوں اور اعمال ناموں کا۔ مگر یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ان کے روزنامچے لکھے لکھائے تیار موجود ہیں۔ منتشر متفرق اعمال کو دوسروں کے اعمال میں اختلاط سے محفوظ رکھنا اور یکجا جمع کرنا کو کتنا ہی دشوار ہو مگر ہے امر واقعی۔ اللہ نے ایک بدترین زندان خانہ کے دفتر میں جس کا نام سجین ہے ہر ایک کافر کے اعمال کو خصوصی علامات کے ساتھ محفوظ رکھا ہے

وما ادرٰک ما سجین کتاب مرقوم سجین کیا ہے۔ کیسا ہیبت ناک، اذیت رساں، تنگ تاریک جیل ہے یہ کسی کو کیا معلوم۔ بس اتنا سمجھ کہ وہ کافظ خانہ ہے۔ ایک دفتر ہے جو خصوصی علامات سے نشان زدہ ہے۔ یعنی ایک کے اعمال کا دوسرے کے اعمال سے اختلاط وہاں ناممکن ہے۔ ہر ایک کے اعمال نامے پر مخصوص علامات ہیں۔

کلا حرف بازداشت اور کلمۂ زجر و ردع بھی ہے اور حرف تاکید و تحقیق بھی۔ اول صورت میں پہلے کلام سے مربوط ہوگا اور دوسری صورت میں ابعد سے متعلق۔ امام رازی نے اسی شق کو اس جگہ پسند کیا ہے یعنی تطفیف کرنے والے جو روزِ حساب سے غافل ہیں اُن کو غافل نہ رہنا چاہیئے۔ بقول خطیب، شیخ جلال اور اکثر اہلِ تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حسن بصری، ابو حاتم بغوی اور ابن کثیر نے شق دوم کو اختیار کیا ہے۔ یعنی حقیقت یہ ہے کہ بلاشک کافروں کا اعمال نامہ یا نوشتۂ تقدیر سجین میں ہے۔ ابن کثیر کے نزدیک اس جگہ کتاب سے مراد نوشتۂ تقدیر ہے باقی اہلِ تفسیر نے اعمال نامہ مراد لیا ہے۔

کتابٌ مرقومٌ یعنی سجین کتاب مرقوم کا مقام ہے۔ سجین کو کتاب مرقوم کہنا مجازی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سجین وہ ہے جو کافروں کے لئے تحریر ازلی مقرر ہے۔ یا بقول ابن کثیر و محمد بن کعب قرظی ان کتاب الفجار کی دوسری خبر ہوگی اور ما ادرٰک ما سجین۔ جملہ معترضہ ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کے متعلق ازلی نوشتہ جو سجین میں رہنے کے متعلق ہے وہ مقرر اور معین تحریر ہے جس میں کمی بیشی نہ ہوگی

سجین کیا ہے۔ سب سے نچلی ساتویں زمین کا نام سجین ہے (قول حضرت ابن عباس بروایت عطاء واختیار مجاہد وقتادہ وضحاک وابن زید) حضرت براء نے
اس کو مرفوعاً رسول اللہ ﷺ سے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سجین جہنم کے ایک کنوئیں کا نام ہے۔ کلبی نے کہا کہ ساتویں زمین کے
نیچے ایک پتھر ہے (کبیر) کعب احبار کا قول ہے کہ کافر فاجر کی روح آسمان کی طرف لے جاتے ہیں، لیکن آسمان اس کو قبول نہیں کرتا۔ اللہ نے فرمایا ہے لا تفتح
لھم ابواب السماء پھر اس کو زمین کی طرف لایا جاتا ہے۔ زمین بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو ساتویں زمین کے نیچے لے جا کر سجین میں داخل کرتے ہیں جو ابلیس
کے لشکر کا مقام ہے۔ وہاں شیاطین حاضر رہتے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں سجین ایک دفتر کا نام ہے جس میں شیاطین اور کافروں اور فاسقوں کے اعمال کا
اندراج ہوتا ہے۔ (مظہری)

ابو عبیدہ، مبرد، زجاج اور فراء قائل ہیں کہ سجین سجن سے مبالغہ کا صیغہ ہے جیسے عریف عارف سے اور فسیق فاسق سے یعنی تنگ ترین اور
سخت دکھ کا جیل خانہ (رازی) زمخشری نے کشاف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

ابن جریر نے سجین کے مقام اور کیفیت کے متعلق بعض احادیث نقل کی ہیں جو بقول ابن کثیر منکر غریب ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۸۹۶ء کے اودھ اخبار کے کسی شمارہ میں ایک عجیب اطلاع شائع ہوئی تھی۔ ایک انگریز جو جہازوں کا تاجر تھا انگلستان سے ایک جہاز میں ہندوستان
کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ جہاز میں کپتان اور کچھ دوسرے مسافر تھے۔ مالک جہاز بیمار تھا۔ راستے میں ایک جگہ جہاز نے لنگر ڈالا۔ مقامی باشندوں نے بتایا کہ یہاں ایک
پہاڑ میں ایک غار ہے جس میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔ مسافروں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مالک جہاز تو بیماری کی وجہ سے نہ جا سکا۔ باقی لوگ پہاڑ
کی طرف چل دیئے۔ وسط راہ میں پیچھے سے شور و غل کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو لوگ پکار رہے تھے۔ ہوشیار رہو۔ بندوقیں سیدھی کرو خطرہ سامنے ہے۔
لوگ تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد بندرگاہ کی طرف سے دو آدمی آتے نظر پڑے۔ اگلا جہاز کا مالک تھا اور سامنے کے پیچھے آدمی نما حیوان تھا جس کو سارا
بدن بالوں سے چھپا ہوا تھا اور سر کے اگلے حصے میں آگے پیچھے دو سینگ تھے۔ دونوں دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ یہ لوگ ان کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ کہ وہ
ان کی طرف سے اتر کر پہاڑ کی طرف نکل گئے اور آگ والے غار پر پہنچ کر اول مالک جہاز اس میں کود پڑا اور پیچھے سے وہ انسان نما حیوان بھی گر گیا۔ یہ لوگ لوٹ کر
جہاز پر آئے تو دیکھا مالک جہاز کا جنازہ رکھا ہوا ہے جو ان کے پیچھے مر چکا تھا۔ کچھ مدت کے بعد یہ جہاز واپس انگلستان پہنچا تو مالک جہاز کے وارثوں نے ان لوگوں
پر الزام لگایا کہ تم نے مالک جہاز کو قتل کر کے یہ افسانہ خود تراشا ہے۔ معاملے کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر ہوا۔ کمیشن کی تحقیقات سے واقعہ صحیح ثابت ہوا۔

اس فقیر کے خیال میں سجین یقیناً ایک قید خانے کا نام ہے جو تنگ بھی ہے، تاریک بھی ہے دکھ کا مقام بھی ہے۔ عذاب کی جگہ بھی ہے۔ کافروں اور
شیطانوں کی روحوں کا مسکن اور مستقر بھی ہے، لیکن کوئی محسوس خارجی چیز نہیں جو آنکھوں سے ہر شخص دیکھ لے۔ عالم مثال کا ایک پست ترین نہایت ہی تنگ و
تاریک مقام ہے۔ سلسلۂ مادی جسمانی منقطع ہونے کے بعد خبیث روحیں وہاں پہنچتی ہیں جس حدیث یا اثر میں اس کا مقام معین بیان کیا گیا ہے وہ صرف
کنائی الفاظ میں سمجھانے کے لئے جس طرح عالم خواب کے دکھ سکھ اور راحت افزا یا تکلیف رساں مقامات کو صحیح طور پر تو وہی جانتا ہے جو دیکھتا ہے،
لیکن دوسروں کو سمجھانے کے لئے وہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو خارجی محسوس اشیاء کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح عالم مثال کی چیزوں کو بتانے
کے لئے بھی احادیث اور آثار و اخبار میں یہی مستعمل الفاظ بولے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سمجھانا اور سمجھنا ناممکن ہو جاتا، لیکن بعض لوگوں کی نظر سے اللہ اپنی
مصلحت کے تحت پردے اٹھا دیتا ہے اور کچھ دیر کے لئے وہ اسی زندگی میں عالم مثال کی سیر کر لیتے ہیں اور ان کو عالم مثال میں ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں جیسے اس
مادی زندگی میں ہیں، اس لئے وہ ان چیزوں کو انہی الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عبرت دلانے اور سبق سکھانے کے لئے اللہ نے جہازیوں کے سامنے
اپنی قدرت و حکمت کی نشانی ظاہر کی ہو اور مالک جہاز کی خبیث روح کو کوئی ہیبت ناک بدصورت فرشتہ ہانک کر جیل خانے کو لے جا رہا ہو۔ واللہ اعلم

ویل یومئذ للمکذبین الذین یکذبون بیوم الدین۔ جس طرح دوسرے کافروں کے گروہ روز جزا کے منکر ہیں۔ اسی طرح تطفیف کرنے والے
تاجروں کی بے ایمانی کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ یہ بھی حساب و قیامت کے منکر ہیں یا کم سے کم ان کو یقین نہیں ہے۔ ایسے تمام منکروں کے لئے قیامت کے دن
ہلاکت و تباہی ہوگی یعنی سخت عذاب ہوگا۔ اسی لئے بعض مفسروں کو یہاں دھوکہ ہوا ہے۔ تطفیف کرنے والوں کا عملی مظاہرہ چونکہ انکار قیامت پر دلالت
کرتا ہے، اس لئے قیامت پر یقین رکھنے والے اس مومن فاسق کو جو ناپ تول میں بے ایمانی کرتا ہے ان لوگوں نے مصداق آیت میں داخل سمجھا ہے، مگر یہ غلط ہے

کیونکہ کسی سے استدلال الگ چیز ہے اور یقین قلبی نہ ہونا الگ چیز ہے۔ اس کے علاوہ منکرین قیامت کی تشریح آئندہ آیت میں کی گئی ہے اور صراحت کی گئی ہے کہ ہر وہ حد سے تجاوز کرنے والا گنہگار ہے جو آیات قرآنیہ کو داستانِ پارینہ کہتا ہے۔ روزِ قیامت کا منکر ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی تطفیف کرنے والا فاسق مومن آیاتِ قرآنیہ کو داستانِ پارینہ نہیں کہتا، اس لئے آیت کا مصداق صرف کفار ہیں۔

وما یکذب بہ الا کل معتد اثیم قیامت کا منکر معتدی اثیم ہی ہوتا ہے اس سے مراد کافر ہے۔ معتدی حد سے تجاوز کرنے والا۔ اثیم گنہگار۔ منکر قیامت حقیقت میں اللہ کی ملکیت عامہ ربوبیت کاملہ اور قدرتِ تامہ کا منکر ہے وہ وقوعِ قیامت کو محال جانتا ہے۔ گویا اللہ کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں جانتا۔ اللہ کی ملکیت اور ربوبیت کو اسی دنیا میں ختم سمجھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ اللہ کو اس زندگی کے بعد انسان کی ملکیت و تصرف، حکومت اور ربوبیت سے معزول کر دیتا ہے اس طرح اللہ سے صفتِ عدل بھی نا قابل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں تو بہر حال مظلوم کا ظالم سے انتقام عموماً نہیں لیا جاتا۔ اگر آخرت نہ ہو تو پھر اللہ کے عدل کا کیا معنی ہو سکتا ہے۔

بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ معتدی سے مراد ہے انسانی حقوق تلف کرنے والا اور اثیم وہ ہے جو صرف اللہ کا مجرم ہو اس کے حقوق ادا نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا بدترین مجرم وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو سزا کا اندیشہ نہ ہو اور منکر قیامت کو ہی سزا کا ڈر نہیں ہوتا۔ نتیجہ میں قیامت کا منکر شریعتِ الٰہیہ اور ضوابطِ آسمانی کو غیر ضروری بلکہ ہیچ خیال کرتا ہے کیونکہ سزا کا ڈر نہیں تو اوامر و نواہی کی کیا ضرورت اور بعثت رسالت کتب الٰہی اور قوانین و تبلیغ کی کیا حاجت لیکن

اذا تتلیٰ علیہ ایاتنا قال اساطیر الاولین اگر اس کو اللہ کے احکام اور قرآن مجید کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کو گزشتہ لوگوں کی طرح کہانیاں اور پارینہ داستان قرار دیتا ہے۔ یعنی کہتا ہے کہ سلف نے فتنہ فساد سے روکنے، ظلم سے باز داشت کرنے اور امن پھیلانے کے لئے خود بنا لئے تھے۔ ان کی کوئی خدائی اصل ہے نہ یہ آسمانی اور ربانی ہیں۔

کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون ایسا گنہگار معتدی تو سمتِ حقیقہ کی حدود کو بھی توڑ چکا ہے اور درستی عمل کے دائرہ سے بھی باہر نکل چکا ہے جو انانیت اور خود پسندی میں اتنا بے ہوش ہے کہ اس کو نہ اللہ کے حقوق کی پاسداری ہے نہ بندوں کے حقوق کا لحاظ جس کی قوتِ علمیہ بھی تباہ ہو چکی ہے اور قوتِ عملیہ بھی اس لئے اس کو حق و باطل کا امتیاز نہ خود اپنی عقل سے ہوتا ہے نہ انبیاء اور آسمانی کتاب سے بلکہ کتاب اللہ کی صراحتوں اور ہدایتوں کو وہ داستانِ پارینہ کہتا ہے اور انسانی دماغوں کا زائیدہ کہتا ہے۔ حقیقت میں اور کوئی وجہ نہیں اس کی بدکرداری نے اس کی قوتِ ممیزہ کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ اس کے لطیفۂ قلب پر گناہوں کا میل تہ بہ تہ چڑھ گیا ہے۔ جلا اور نورانیت مفقود ہو گئی ہے عکس پذیری کی صلاحیت جاتی رہی۔ اب نہ فطری ہدایت سے اس کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے نہ نبی کی بعثت اور کتاب الٰہی کی راہنمائی سے۔

اہل قرب سے اگر کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو دل پر قدرے کثافت آ جاتی ہے اس کو غین کہتے ہیں۔ تنبہ اور ندامت کے پانی سے یہ کثافت دھل جاتی ہے ابرار کے دلوں پر بھی گناہ کی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو غیم کہلاتی ہے۔ توبہ سے اس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے، لیکن بداعمالی جب حد سے بڑھ جاتی ہے، حق حق اور باطل باطل نہیں نظر آتا تو دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے۔ پورا دل کالا ہو جاتا ہے۔ لطیفۂ حق کی روشنی مفقود ہو جاتی ہے۔ بصیرت اندھی ہو جاتی ہے اس کو رین کہتے ہیں۔ کفر کی حد میں یہ ابتدائی داخلہ ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جب دنیا کی محبت دل میں اتنی رچ جاتی ہے کہ اس سے معرفت سے عداوت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے تو گمراہی کے اس مرتبہ کو ختم کہتے ہیں۔ گویا دل پر گمراہی کی مہر لگ گئی۔ گمراہی کی اس مہر میں اگر مزید استحکام پیدا ہو جائے گویا دل پر ضلالت کے تالے پڑ جائیں جن کی کنجی گم ہو جائے تو یہ مرتبہ قفل لگ جانے کا ہوتا ہے۔ گمراہی کے یہ تینوں مراتب تدریجی ہیں جو ایک کے بعد دوسرا آتا ہے ۔ ران علی قلوبھم ۔ ختم اللہ علی قلوبھم ۔ طبع اللہ علی قلوبھم ۔ ام علی قلوب اقفالھا ۔ میں انہی تینوں مراتب کی طرف اشارہ ہے ختم اور طبع کا ایک ہی مرتبہ ہے یہ تینوں درجات کفر ہیں۔ (مستفاد از ابن کثیر و خطیب و رازی و خلاصہ تفسیر)

ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا گناہ کرنے سے بندے کے دل پر شروع میں سیاہی کا ایک نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ توبہ کر لیتا ہے تو وہ معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مزید گناہ کیا تو سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے۔ یہی اللہ نے فرمایا ہے۔ بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون بظاہر اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ مسلمان گنہگار بھی جس کے دل پر سیاہی کچھ بڑھ گئی ہو اس آیت کا مصداق ہے اور رین ہو جانے کی صراحت کافر کے ساتھ

منسوخ نہیں ہے ۔ مگر امام احمد نے جو حدیث نقل کی ہے اس سے ترمذی کی نقل کردہ حدیث کے مفہوم کی توضیح ہوجاتی ہے ۔ احمد کی حدیث اس طرح ہے کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو دل پر کالا نقطہ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اگر توبہ کرلیتا ہے اور اللہ سے معافی کا طالب ہوجاتا ہے تو دل پر جلا ہوجاتی ہے (سیاہی دور ہوجاتی ہے) لیکن اگر گناہ پر اڑا رہے ، زیادتی کی تو سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے ۔ یہی وہ رین ہے جس کی صراحت اللہ تعالیٰ نے آیت بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون میں فرمائی ہے ۔ گویا سیاہی اگر پورے دل پر چھا جائے تو اس کو رین کہا جائے گا اور یہی کفر کا ابتدائی درجہ ہوتا ہے اسی کا مدعیٰ حسن بصری نے فرمایا تھا رین نام ہے گناہ پر گناہ کرنے کا ۔ اس حد تک کہ دل اندھا ہوکر مرجائے ۔ مجاہد ، سعید بن جبیر ، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید کے اقوال بھی اسی مفہوم کی تائید میں ہیں ۔ (ابن کثیر)

پس جب اس زندگی میں نور بصیرت بجھ جاتا ہے ، دل کی آنکھ بے نور ہوجاتی ہے ۔ معنوی ظلمت ہر جانب سے گھیر لیتی ہے ۔ جلوۂ صداقت و حقانیت چشم دل کو نظر نہیں آتا ۔ کوئی ظلمی نور فطرت اور ضیائے ہدایت دیکھنے سے مانع ہوتی ہے تو ۔

کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون ۔ قیامت کے دن جلوۂ الٰہی بھی ان کو نظر نہ آئے گا (وہ بے کیف دیدار الٰہی جو اہل ایمان کو دکھایا جائے گا ان کو نصیب نہ ہوگا ۔ ایسے لوگوں اور جلوۂ خداوندی کے درمیان رین کا پردہ حائل ہوگا ۔

جو قوانین کو دیکھنے سے روکنے والی قلبی کثافت ، روحانی کدورت اور موت بصیرت ہے ۔ باہر کتنی ہی روشنی ہو سارا جہان بقعۂ نور بنا ہوا ہو ۔ مگر چشم بینا نہ ہو ، نور بصارت مفقود ہو تو بیرونی کوئی کرن نہیں دکھ سکتی ۔ لیکن اگر بصیرت روشن ، لطیفۂ قلب نورانی اور چشم روح بینا ہو تو جلوۂ الوہیت اور چہرۂ ربوبیت کے دیکھنے سے کون چیز مانع ہوسکتی ہے ۔ نور نور کو دیکھ سکتا ہے ، نورانی چہرہ نورانی آئینہ میں عکس ریزی کرسکتا ہے ، لیکن نورانیت کا یہ جذب و انجذاب یہ کشش اور تقاضا اور یہ ساری جلوہ پاشی بے کیف ہوگی ، غیر مادی ہوگی ، انتہائی لطیف ہوگی ، بے رنگ ہوگی ، بے احاطہ ہوگی ۔ جسمانی تشکل تحیز سے پاک ہوگی ۔ بصر اور بصیرت میں وہاں فرق نہ ہوگا ۔ چشم روح اور چشم سر میں جدائی کرنے والی مادی جسمانی کثافت ہے اور یہ کثافت وہاں مفقود ہوگی ، اس لئے چشم سر میں عین روحانی طاقت ہوگی ۔ پھر کون حجاب حائل ہوسکتا ہے بندہ کی چشم سر اور نور الٰہی میں ۔ دنیا میں چشم روح سے تو عارف کامل اور روشن بصیرت رکھنے والے پیغمبر نور الٰہی کو دیکھتے ہیں ، ان کے آئینۂ روح پر قدسی جلوہ پاشیاں ہوتی ہیں ، مگر نور بصیرت یہاں کتنا ہی تیز ہو ، چشم روح کتنی ہی نورانی ہو پھر بھی مادیت سے بالکل انقطاع ناممکن ہے ۔ فطرت الٰہی نے اس زندگی کو خواہ کیسی ہی نورانی زندگی دی ہو ، مادیت کا ہمزاد بنایا ہے دونوں توام ہیں ۔ مکمل جدائی ناممکن ہے ، اس لئے کوئی نور بصیرت چشم سر سے جلوۂ مجرد کو نہیں دیکھ سکتا ۔ اس پر آخرت کے احوال اور کیفیات کو قیاس کرنا صحیح نہیں ۔ آخرت میں ملنے والے جسم بھی نور خالص کے ہوں گے ، سراسر نور ہوں گے ۔ طلعات ہی بصیرت ہوگی اور وہ چشم سر بھی عین روح ہوگی ، اس لئے دیدار خداوندی ناممکن نہ ہوگا ۔ ہاں جن لوگوں کے دل سیاہ ہیں ۔ سیاہی دلوں پر چھائی ہوئی ہے اتنی کہ ہر طرف سے محیط ہے ۔ جن کے آئینۂ روح مکدر ہیں ، کثیف ہیں اتنے کہ کوئی گوشہ روشن نہیں رہا ۔ عقائد و اعمال کی تاریکی نے ان کی چشم بصیرت کو بالکل کور کردیا ہے ۔ عالمی انقلاب اور مادی علائق منقطع ہوکر عالم تجرد کا ظہور بھی ان کے دلوں کے رین کو دور نہ کرسکے گا ۔ مادی کثافتیں وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑیں گی ، اس لئے ان کی آنکھ بے نور جیسے یہاں ہے ویسے ہی نابینا وہاں رہے گی اور حجاب ظلمانی کی وجہ سے وہ جلوۂ ربانی نہ دیکھ سکیں گے ۔ سچ ہے من کان فی ہذہ اعمی فہو فی الآخرۃ اعمی ۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ آیت میں صراحت ہے کہ کافروں کو دیدار الٰہی نہ ہوگا ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو دیدار نصیب ہوگا ورنہ ذکر میں کافروں کی تخصیص بے معنی ہوجائے گی ۔ (وصرح بہ الرازی ایضاً)

آیت وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ ۔ صراحۃً دیدار الٰہی ہونے کو ثابت کررہی ہے ۔ متواتر المعنی احادیث بھی اس کے ثبوت کے لئے بکثرت ہیں ۔

شیخ ابن جریر نے ابو معمر مقری از عبدالوارث بن سعید اسی آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ حسن بصری نے فرمایا اس روز حجاب اٹھا دیا جائے گا ۔ کافر و مومن سب اس کی طرف نظر کریں گے ۔ پھر کافر محجوب کردیے جائیں گے اور اہل ایمان کو ہر روز صبح شام دیدار ہوگا ۔ اس روایت میں ابو معمر مقری مجہول ہے لیکن اگر یہ ابو معمر مقری ہیں جن کی روایت صحاح میں لی گئی ہے تو ان کا انتقال سنہ ۲۲۱ھ میں ہوا تھا اور ابن جریر کی پیدائش بھی اسی سال ہوئی ، اس لئے روایت کا کوئی معنی نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ کافروں کو دیدار ہونے کا قول علماء کے اجماعی قول اور تمام نصوص ظاہرہ کے خلاف ہے ، اس لئے ساقط الاعتبار ہے ۔

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ۔ نعمت دیدار سے محرومی کی صراحت اور پہلی آیت میں کی نفی تو حقیقت میں عذاب کی وعید تھی۔ محبوب کا رُخ پھیر لینا گردانی عذاب کی علامت اور عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ اس آیت میں کافروں کے دائمی دوزخی ہو جانے کی صراحت کر دی گئی اور بطور توبیخ کہہ دیا گیا کہ جس عذاب اور سزا کے تم منکر تھے یہ وہی ہے۔

شیخ واسطی نے کہا کفار دوامی حجاب میں رہیں گے کبھی باری تعالیٰ کا جلوہ نہ دیکھ سکیں گے۔ اور عام مومن کسی وقت دیکھیں گے اور کسی وقت نہ دیکھ سکیں گے۔

شیخ ابن عطاء نے فرمایا حجاب دو طرح کا ہوتا ہے۔ حجاب لعنت اور حجاب ادب۔ حجاب لعنت کبھی دور نہ ہوگا۔ یہ حجاب اہل کفر اور ابلیس کے لئے مخصوص ہے اور حجاب ادب دوامی نہیں ہوتا، کچھ وقت کے لئے ہوتا ہے جیسے حضرت آدم کو کچھ مدت کے لئے محجوب کر دیا گیا تھا۔

مقصودِ بیان

کافروں کے اعمال ناموں کا مستقر سجین ہے۔ اعمال نامے باہم مخلوط نہیں۔ ہر ایک کے نامۂ اعمال پر امتیازی علامت موجود ہے۔ قیامت کو نہ ماننا اور جزا سزا کا قائل نہ ہونا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ منکر معتدی بھی ہے اور اثیم بھی، صحت فکری سے بھی محروم ہے اور صحت عمل سے بھی، حقوق اللہ کو بھی تلف کرنے والا ہے اور حقوق انسانی کو بھی۔ وہ شریعت آسمانی اور دین الٰہی کا قائل ہی نہیں۔ تمام آسمانی کتابوں کو عقلمند انسانوں کی ساختہ پرداختہ جانتا ہے۔ گویا اس کی نظر میں ہر مذہب کا موجد انسان ہے۔ آیت بل ران الخ سے واضح ہو رہا ہے کہ بدکرداری سے لطیفۂ قلب اور جوہر روح زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ بداعمالی حرمان دیدار الٰہی کی موجب ہے۔ آیت انہم عن ربہم الخ سے مستفاد ہو رہی ہے یہ بات کہ اہل ایمان آخرت میں دوامی طور پر دیدار الٰہی سے محروم نہ ہوں گے اور کافر ہمیشہ محروم رہیں گے وغیرہ۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ○

نیک لوگوں کا نامۂ عمل علیین میں ہوگا اور (آگے تفخیم کے لئے سوال ہے کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علیین میں رکھا ہوا نامۂ عمل کیا چیز ہے

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ○ عَلَى

وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے جس کو مقرب فرشتے دیکھتے ہیں (آگے ان کی جزائے آخرت کا بیان ہے) کہ نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے مسہریوں پر

الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ○ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ○ يُسْقَوْنَ

(بیٹھے بہشت کے عجائبات) دیکھتے ہوں گے (اے مخاطب) تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا (اور) ان کو پینے کے لئے

مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ○ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ○

شراب خالص سربمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیے

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ○ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ○

اور اس (شراب) کی آمیزش تسنیم کی ہوگی یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔

تفسیر

فجور بدکاری کا آخری درجہ ہے اور بر نیکوکاری کا ابتدائی مرتبہ۔ نیکوں میں سب سے بلند رتبہ والے مقرب کہلاتے ہیں۔ ابرار کو اصحاب الیمین بھی کہا گیا ہے اور مقربین کو سابقین۔

عالمِ مثال تمام ایسی بری روحوں کا مستقر ہے اور ملائکہ مجبورہ کی اصلی قرارگاہ بھی ہے۔ جس طرح ہر خوشبیت دوسرے سے جدا مقام رکھتا ہے اسی طرح روحوں میں بھی فرقِ مراتب ہے۔ اہلِ تصوف نے عالمِ مثال کو ایک گول دائرہ سے تشبیہ دی ہے۔ دائرہ کا مرکز سب سے نیچا اور تنگ اور خورد ترین ہوتا ہے۔ مگر مرکز سے محیط کی طرف کو حرکت کی جائے تو وسعت بڑھتی جاتی ہے اور محیط دائرہ سب سے زیادہ وسیع اور بڑا ہوتا ہے۔ عالم مثال کے اسی پست ترین تنگ ترین اور خورد ترین مقام کو سجین کہا گیا ہے جو کافروں کی روحوں کا مستقر ہے اور باقی مراتب و مقامات اہلِ ایمان کی روحوں کے ہیں جو اوپر نیچے ہیں، فراخ ہیں اور اوپر نیچے فراخ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ علیین یعنی آخری چوٹی پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی اعلیٰ علیین اہلِ قرابت اور سابقین کی دوامی قرارگاہ ہے اور دوسرے علیین ابرار کی کبھی کبھی سیرگاہ بن جاتی ہے۔ اصلی مستقر ابرار کا علیین نہیں ہے بلکہ مرتبہ اور اعمال کے موافق کسی کا مستقر پہلا آسمان ہے کسی کا دوسرا کسی کا تیسرا اور کسی کا زمین آسمان کے درمیان وغیرہ۔ علیین تمام صالحین و ابرار کی اسم نویسی کا دفتر ہے۔ کبھی کبھی ان کو اس کی سیر کرنے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس طرح زمین کا کوئی آدمی کبھی آسمان کے ستاروں کو دیکھ لیتا ہے۔

بقول حضرت ابن عباس علیین کا نچلا حصہ سدرۃ المنتہیٰ سے متصل اور بالائی سرا عرش کے سیدھے پائے سے متعلق ہے اور یہ زمرد سبز کی ایک تختی ہے۔ معلوم نہیں روایۃً اس قول کا ماخذ کیا ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو اہلِ تصوف نے کشف و مشاہدہ کے بعد بیان کی ہے کیونکہ سجین کی طرح علیین بھی عالمِ مثال کے ایک مخصوص مقام کا نام ہے۔ جو سب سے عالی مرتبہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں ابرار کی اسم نویسی کا کوئی مثالی رجسٹر یادی دفتر بھی ہو جو اس دنیا کے زمرد کی تختی کی طرح اہلِ مشاہدہ کو دکھائی دیتا ہو۔ لیکن سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر عرش کے نیچے اس کا مقام قرار دینا ناقابلِ فہم ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ تو مخلوق کے اعمال پہنچنے کی آخری حد ہے۔ حدیث معراج سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

ابن عباس کا قول (بروایت علی بن ابی طلحہ) ہے کہ علیین جنت ہے۔ ابن عباس (بروایت عوفی ضحاک) ہے کہ علیین آسمان ہے۔ اسی طرح علماء کے دوسرے اقوال ہیں جن میں علیین کی غیر مفید تعیین محض قیاس سے کی گئی ہے۔

عام اہلِ معانی کہتے ہیں کہ علیین اور علیون جمع ہے اس کا واحد علی ہے اور علی صیغہ مبالغہ ہے۔ علو مصدر ہے یعنی بہت اونچے مقامات۔ زجاج اور فراء قائل ہیں کہ یہ لفظ جمع نہیں بصورت جمع ہے۔ جیسے عشرین، ثلاثین، قنسرین۔

بعض علماء قائل ہیں کہ علیین ملائکہ کا نوشتہ اعمال ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اس آیت کے بعد علیین کی تشریح میں کتاب مرقوم یشھدہ المقربون فرمایا۔ یعنی وہ معین کتاب ہے جس پر ملائکہ کی شہادت ہے علیین ہے۔ باقی تشریح تحلیل اجزاء میں آتی ہے۔

تحلیل اجزاء

کلا ان کتب الابرار لفی علیین۔ ابرار تمام سچے ایمان والے بندے (سراج) الفجار سے الابرار کا تقابل چاہتا ہے کہ جب الفجار سے کافر مراد ہیں تو الابرار سے عام مومن مراد ہوں۔ خطیب کے قول کی مراد یہی ہے۔

شیخ ابن کثیر نے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر بیان کیا ہے کہ بلندی وسعت، روشنی اور پاکیزگی سعادت مندی اور جنتی ہونے کی نشانیاں ہیں اور پستی، تنگی، تاریکی اور نجاست بدبختی اور جہنمی ہونے کی علامات ہیں۔ پس فجار، کفار اور ابرار نیکوکاروں کی کتابیں ایسی ہی جگہ رکھنے سے مراد ہے اول گروہ کی ذلت و نکبت اور دوسرے گروہ کی عزت و راحت۔

وما ادراک ما علیون کتاب مرقوم یشھدہ المقربون۔ المقربون سے مراد ملائکہ ہیں (قتادہ) ہر آسمان کے مقرب ملائکہ اس کے شاہد ہیں (عوفی از ابن عباس) ابن کثیر

شاہد ہونے کا معنی یا گواہ ہونا ہے یعنی جب ابرار کے اعمال صالحہ کو چڑھایا جاتا ہے تو ہر آسمان کے مقرب ملائکہ دیکھ کر اس کے گواہ ہو جاتے ہیں۔ یا حاضر ہونا یعنی اعمال ناموں کو لینے کے لئے ان کے استقبال کے لئے اور ان کی نگہبانی کے لئے مقرب فرشتے حاضر ہوتے ہیں یا المقربون سے مراد ہیں مقرب بندے نیک اعمال والے مومن جو پہلے مر چکے ہیں۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ علیین میں مقرب مومن بندے موجود اور حاضر رہتے ہیں اور حاضر رہتے ہیں۔ اس مفہوم کی تائید ان تمام احادیث و آثار سے ہوتی ہے جن میں مرنے کے بعد تمام ارواح مومنین کے باہم ملنے اور بات چیت کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت کعب بن مالک کی وفات کا وقت آیا تو حضرت ام بشیر آئیں اور کہنے لگیں کعب اگر تم سے میرے بیٹے کی ملاقات ہو تو اس سے میرا سلام کہہ دینا۔

کعب نے فرمایا ۔ ام بشیر اللہ آپ کی مغفرت کرے ۔ ہم تو اپنی ہی حالت میں ہوں گے ملاقات کیسی ۔ ام بشیر نے کہا ۔ آپ کیا کہتے ہیں ۔ کیا رسول اللہ سے آپ نے نہیں سنا کہ مومن کی روح جنت میں جہاں چاہتی ہے سیر کرتی ہے اور کافر کی روح سجین میں قید رہتا ہے ۔ کعب نے جواب دیا ہاں سنا تو ہے ۔ ام بشیر نے کہا اسی لئے تو میں نے یہ بات کہی (ابن ماجہ ، طبرانی ، بیہقی ، عبد بن حمید ۔ ام بشیر کے بیٹے بشیر بن براء بن معرور کا جب انتقال ہو گیا تو ان کو بڑا دکھ ہوا) خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میرے خاندان میں سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی مرتا رہا ہے تو کیا وہ مُردے ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے ۔ میں بشیر کو سلام کہلوانا چاہتی ہوں ۔ ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے ۔ کوئی شک نہیں کہ مُردے باہم اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح چڑیاں باہم شناخت کرتی ہیں ۔ اس کے بعد خاندان بنی سلمہ میں اگر کسی کا انتقال ہوتا تو ام بشیر اس سے کہہ دیتی کہ میرا سلام میرے بیٹے بشیر کو کہہ دینا (رواہ ابن ابی الدنیا)

حضرت جابر بن عبد اللہ کی وفات ہونے لگی تو محمد بن المنکدر تابعی نے ان سے کہا آپ میرا سلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیں (رواہ ابن ماجہ)

حضرت ابو قتادہ کی وفات سے پندرہ روز کے بعد ان کی بیٹی حضرت ام البنین عبد اللہ بن انیس کے پاس آئیں ۔ عبد اللہ اس وقت صاحب فراش تھے ۔ کہنے لگیں چچا اگر آپ جائیں تو میرے باپ سے میرا سلام کہہ دینا (رواہ البخاری فی التاریخ)

حضرت ابو ایوب کی روایت ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا جب مومن کی روح قبض کی جاتی ہے تو اللہ کے مغفور بندے اس کا استقبال کرتے ہیں ۔ جیسے تم دنیا میں سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کرتے ہو اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں الخ (رواہ ابن ابی الدنیا والطبرانی فی الاوسط)

حضرت ابو ہریرہ رضی کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے آگاہ فرمایا جب مومن کی روح کو آسمان کی طرف چڑھا کر لے جاتے ہیں تو اس کے پاس مومنوں کی روحیں آتی ہیں اور اپنی جان پہچان کے لوگوں کی خبریں پوچھتی ہیں ۔ اگر وہ کہتا ہے میں نے اس کو دنیا میں چھوڑا تھا تو اس کو یہ بات پسند آتی ہے اور اگر وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے مر چکا تو کہتے ہیں وہ تو ہمارے پاس نہیں آیا الخ ۔ (رواہ البزار باسناد صحیح)

اسی طرح کی بکثرت اخبار و آثار آتی ہیں جن سے مومنوں کا مرنے کے بعد باہم ملنا ثابت ہوتا ہے ۔

ان الابرار لفی نعیم ۔ فجار کا اعمال نامہ سجین میں اور ابرار کا علیین میں ہوگا ۔ اس سے شاید کسی کو یہ وہم گزرتا کہ اعمال ناموں کے اچھے برے مقام میں ہونے سے اعمال والوں کو نہ کوئی ضرر نہ نفع ۔ کتابچہ کہیں ہو جزا سزا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے کافروں کے ویل ہونے ، ان کے دوزخی اور دیدار الہی سے محجوب ہونے کی صراحت فرمائی تھی ، اور نامہ ہائے بطور تقابل اہل ایمان کے لئے نعیم اخروی حاصل ہونے کا اعلان فرما دیا ۔

اگر عبارت کے تسلسل اور مضمون کے ربط کو ثابت کرنے کے لئے توضیح اس طرح کی جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ علیین اور سجین یا تو روحوں کا مقام ہوں یا روحوں کا رہنا تو عالم مثال کی کیفیت کا بیان ہے جو مرنے کے بعد قیامت تک ہر مومن و کافر کے لئے رہے گی ۔ قیامت برپا ہونے کے بعد ایک دوسرا عالم نمودار ہوگا جو اپنے احوال اور کیفیات میں عالم مثال سے جدا ہوگا ۔ عالم مثال میں اجسام رشتہ سے روحوں کی وابستگی باقی نہیں رہی تھی ۔ بدنی ذرات منتشر ہو چکے تھے (باستثناء البعض) روح کو جسم مثالی کے ساتھ تکلیف یا راحت کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور عالم مثال کا ہر دکھ سکھ حقیقی نہ تھا بلکہ آخرت کے عذاب ثواب کا پیش خیمہ تھا ، عنوان تھا ، دلالت کرنے والا نقشہ تھا ۔ آخرت کی جزا سزا اصلی ہوگی ، حقیقی ہوگی ، جسمانی ہوگی اور جسم مثالی کے بجائے جسم اخروی کے ساتھ ہوگی ۔ اس لئے کافروں کے لئے قیام سجین کے بعد اخروی ویل جہنم اور دیدار سے محرومی کو ظاہر فرمایا اور مومنوں کے لئے قیام علیین کے بعد نعیم و عیش حاصل ہونے کی صراحت فرمائی ۔

علی الارائک ینظرون ۔ الارائک جمع ۔ اریکۃ واحد ۔ پردہ والی مسہری ۔ چھپر کھٹ ۔ جو دلہنوں اور خوش عیش لوگوں کی آرام گاہ اور استراحت ہوتی ہے ۔ جنت کے ارائک کی حقیقی تصویر الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی ۔ اخروی ہر نعمت ناقابل تصور ہے ، لیکن مناسب الفاظ میں ان نعمتوں کا کچھ نہ کچھ اظہار ضروری ہے ، اس لئے انہی الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے جو دنیوی نعمتوں کی تعبیر کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں ۔ اہل جنت اسی

اپنی آرام گاہوں پر بیٹھے ہوئے تمام خداداد نعمتوں کی سیر کریں گے ۔ کوئی چیز ان کے لئے حاجب اور ساتر نہ ہوگی ۔ اپنی پوری بادشاہت کو بھی اپنے مستقر سے ہی دیکھیں گے ۔ اور جلوۂ خداوندی کو بھی اور ہر اس چیز کو بھی جو اللہ ان کو دکھانا چاہے گا ۔

امام رازی نے لکھا ہے اس جگہ دیکھنے سے مراد ہے دیدار الٰہی ۔ کیونکہ اس سے آگے بیان کیا گیا ہے کہ ان کے چہروں پر نضرت النعیم محسوس ہوگی اور نضرت ، وہی تازگی ہے جو جلوۂ خداوندی دیکھنے کے بعد حاصل ہوگی ۔ کیونکہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ ۔
امام کی بیان کردہ یہ تخصیص ظاہری لغت کے خلاف معلوم ہوتی ہے ۔ نضرت تو چہرہ کی ہر رونق چمک اور تازگی کو کہتے ہیں خواہ کسی طور سے حاصل ہو ۔ پھر اگر مفعول میں تعمیم مقصود نہ تھی اور خاص مفعول مقصود تھا اور مفعول بھی ایسا جو عجیب وغریب اور بے مثال ہے تو اس کا ذکر ضروری تھا ۔ اگر عام گریہ وبکا کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی اور کہا جاتا ہے میں روتا ہوں ، لیکن اگر مفعول خاص اور نادر ہو تو اس کا ذکر ضروری ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے میں خون کے آنسو روتا ہوں ۔

تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم اللہ اہل بہشت کے چہروں پر ایسا حسن پیدا کر دے گا کہ دیکھتے ہی ان کو ہر کوئی پہچان لے گا (عطاء) نعیم جنت کی شادابی ، تروتازگی اور رونق مخفی نہ ہوگی ۔ یعنی صرف روحانی مسرت ہی نہ ہوگی جس کا اثر صرف روح پر ہو جیسے دنیا میں اہل عرفان کو حاصل ہوتی ہے بلکہ جسمانی ہوگی اور چہروں پر اس کا اثر نمودار ہوگا ۔ ایسا کیف وسرور ہوگا جو چہروں سے پھوٹا پڑے گا اور ہر ایک دیکھنے والے کو محسوس ہو جائے گا ۔

یسقون من رحیق مختوم رحیق جنت کی ایک شراب کا نام ہے (حضرات ابن مسعودؓ وابن عباسؓ ومجاہد وقتادہ)
حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس مومن نے دوسرے مومن کو پیاس میں پانی پلایا ۔ قیامت کے دن اللہ اس کو رحیق مختوم پلائے گا الخ (رواہ احمد)
مختوم سربمہر ہر آمیزش سے محفوظ اور جنت کے چشموں سے بہتی ہوئی شراب سے افضل (نقال) بادشاہوں کے لئے شراب ، شربت اور پانی کی صراحیوں میں سربمہر کر دیتے ہیں ۔ یہ خصوصیت کی علامت ہوتی ہے ۔ ہر جنتی کو بھی سربمہر شراب خاص طور پر دی جائے گی ۔ اور عمومی شراب وہ ہوگی جو چشموں اور نہروں سے جاری ہوگی ۔ جس کے متعلق وانہار من خمر لذۃ للشاربین فرمایا ہے ۔ یا مختوم کا معنی ہے مخلوط شراب میں گلاب ، بید مشک یا آب سرد ملا کر پیا جاتا ہے جنت کی شراب میں بھی اشیاء لطیفہ نظیفہ کی آمیزش کی جائے گی ۔

ختامہ مسک یعنی شراب پینے کے آخر میں مشک کی خوشبو آئے گی ۔ یا یوں کہا جائے کہ دنیا کی ہر شراب کا نتیجہ کثافت ، گندگی اور غلاظت ہوتا ہے مگر جنت کی شراب ان عیوب سے محفوظ ہے ۔ اس کا انجام مشک کی خوشبو ہوگا جو ان کے پسینے کے قطرات اور ماحول کی فضا سے پھیلے گی ۔ اول مطلب حضرت ابن عباس ، قتادہ ، ابراہیم نخعی ضحاک اور حسن بصری وغیرہم نے بیان کیا ہے ۔
حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ ختام کا معنی ہے میل یعنی وہ چیز جو شراب میں ملائی جاتی ہے ۔ گلاب ، سوڈا پانی وغیرہ ۔ جنت کی شراب میں مشک ملایا ہوا ہوگا ۔ مجاہد نے ختام کا معنی خوشبو بیان کیا ہے یعنی اس کی خوشبو مشکی ہوگی (ابن کثیر)
حضرت ابوالدرداء سے مروی ہے کہ مسک جنت کی ایک شراب کا نام ہے جو چاندی کی طرح سفید ہوگی ۔ اہل جنت کی شراب میں اس شراب مسک کی آمیزش ہوگی (رواہ ابن جریر مسندا الی محمد بن حمید الرازی) وقال ابن کثیر اسنادہ لاباس بہ
وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون ایسی نفیس چیز کی طلب اہل طلب کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہونی چاہیے یعنی نیک اعمال کی خلوص نیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے (تعطیب) یعنی یہ نعمت ہی اس قابل ہے کہ اس کے لئے تنافس ہو ۔ دنیا کی ہر چیز میں شدت طلب کے قابل نہیں ہو (رازی)

ومزاجہ من تسنیم عینا یشرب بہا المقربون ۔ رحیق میں تسنیم کی (شراب کی) آمیزش ہوگی ۔ یعنی اس چشمے کی جس سے رحیق میں اہل قربت پئیں گے ۔

مجاہد اور ضحاک نے کہا جنت میں سب سے اعلیٰ شراب اسی چشمے کی ہے ۔ حضرت ابن مسعود ، حضرت ابن عباس ، مسروق اور قتادہ نے

فرمایا کہ تسنیم مقربین کے لئے خاص ہے ، لیکن اس میں سے کچھ حصہ رحیق میں ملا کر اصحاب الیمین (ابرار) کو بھی دیا جائے گا۔ (ابن کثیر و خطیب)

امام رازی نے فرمایا کہ عالم روحانی میں تسنیم نام ہے دیدارِ حق تعالیٰ کا۔ مقربین خاص طور پر اس نعمت سے سرفراز ہوں گے اور اس کا کچھ حصہ رحیق کے ساتھ ملا کر اصحاب الیمین کو بھی دیا جائے گا یعنی ابرار میں سے کسی کو روز صبح شام دوبار دیدار ہوگا۔ کسی کو ہفتہ میں ایک بار۔ کسی کو مہینے میں ایک بار اور مقربین کے لئے تو بہرحال مخصوص ہی ہے۔

اہلِ معرفت کے لئے دعوتِ عرفان

ابرار اس زندگی میں جب اسماء الٰہیہ پر غور کرتے ہیں تو ایسے مقامات کی سیر کرتے ہیں جو چشمِ حس اور عقل کی رسائی سے بلند ہیں۔ عالمِ وجود کے ان غیبی مراتب کا انکشاف عارف پر ہوتا ہے جو دوسرے دانشوروں کو نہیں ہوتا۔ عارف سیر کرتا ہے اور اس کو سیر کرتے کوئی نہیں دیکھتا۔ جنت میں بھی اس کی یہی حالت ہوگی۔ تختِ معرفت متمکن ہوگا اور ان انوار کا مشاہدہ کرے گا جو ابرار کے سوا کسی کو میسر نہ ہوں گے۔

عارف جب اسماء و صفات سے ترقی کر کے ذاتِ الٰہی کی محبت میں مستغرق ہوتا ہے تو ایسا سرشار ہو جاتا ہے کہ مادی حواس نشۂ محبت میں بلاشئی ہو جاتے ہیں۔ بادۂ محبت میں معاصی اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش نہیں ہوتی۔ یہی وہ رحیق ہے جو جنت میں اس کو پلائی جائے گی اور ہر کدورت سے پاک ہوگی۔

پھر محبت کی شراب سربمہر بھی ہوتی ہے۔ کمالِ ہیجان انتہائی جوش اور بڑے درجہ کی سرخوشی کے باوجود شیطانی نجاست ، ہر قسم کی خباثت اور ہر طرح کی کثافت سے پاک ہوتی ہے۔ احکامِ الٰہی کی اس پر مہر لگی ہوتی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ شرعی امر و نہی کی خلاف ورزی ہو جائے اور غلبۂ محبت امر و نواہی کی الٰہی مہر کو توڑ دے۔ پس اسی کے عوض جنت میں شرابِ مختوم ملے گی۔ پھر مئی محبت کی صراحی مہر مٹی ، کافور ، موم ، لاکھ وغیرہ کی نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو بدبودار چیزیں ہیں۔ عارف کی محبت کی مہر سے خوشبو پھیلتی ہے مباحات کی ، مستحبات کی ، مسنونات کی۔ جو اس کے جی جان کو خوش کر دیتی ہے۔ ذوق شوق کو بڑھاتی ہے۔ دل کو روحانی قوت عطا کرتی ہے۔ اسی کی جزا میں جنت کے اندر وہ رحیقِ مختوم ملے گی جس کی ختام مشکی ہوگی۔

اور چونکہ ذاتِ الٰہی کی محبت ایک کیف ہوتا ہے ، بے کیف نہ اس کی کوئی صورت ہوتی ہے نہ حالت نہ صفت نہ تشخص نہ تعین۔ اس لئے ایسی محبت کا صلہ بھی وہ رحیقِ مختوم ہوگی جس میں تسنیم شامل ہوگی۔ تسنیم سنام سے بنا ہے۔ سنام کا معنی ہے ابھار۔ گویا تسنیم وہ چشمۂ شراب ہے کیف آفریں جس میں لذت و سرخوشی کے بلبلے اٹھتے ہیں۔ رحیق میں ملانے سے کیف بڑھ جائے گا۔ سرخوشی اور سرور کے بلبلے اٹھیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے تسنیم کا بہاؤ جنت کی زمین پر نہ ہوگا بلکہ ہوا میں ہوگا۔ یقیناً ہوا کو ملا بننا زیبا ہے۔ اس محبتِ الٰہی کا جو صورت ، صفت ، کیفیت ، مکانیت ، جہت ، تشخص اور تعین سے پاک ہو۔ پھر محبتِ ذاتیہ کے نشہ سے ہمہ وقت سرشاری صرف اہلِ قربت کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے صالحین ابرار اور مومنین تو محبتِ صفات کے مدارج ہی کو طے کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لئے چشمۂ تسنیم سے جنت میں ہمہ وقت کیف اندوزی تو اہلِ قربت ہی کے لئے مخصوص ہوگی۔ لیکن چونکہ تصورِ صفات کے ساتھ تصورِ ذات کا بھی ایک رشتہ بڑھ جاتا ہے۔ مئی صفات میں مئی ذات کی محبت کا چھینٹا مل جاتا ہے جو وہ صفات کے سرشاروں کے نشہ کو دو آتشہ بنا دیتا ہے ، اس لئے بادۂ تسنیم کی آمیزش رحیقِ مختوم کے کیف کو عام ابرار کے لئے دوبالا کر دے گی۔

مقصودِ بیان

ابرار یعنی تمام مومنوں کا روزنامچہ بہت اونچے مقام پر رہتا ہے جس کا نام علیون ہے یا علیون ایک خاص دفتر کا نام ہے جس میں مسلمانوں کے اعمال نامے مندرج ہوتے ہیں۔ اعمال ناموں کے اندراج سے اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان والے عالمِ برزخ میں وہاں رہتے ہیں۔

یشہدہ المقربون۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ ابرار کے اعمال ناموں پر مقرب فرشتوں کی شہادت ثبت ہوتی ہے یا مقرب بندے علیین میں رہتے ہیں۔ علی الارائک۔ سے آخر تک ان نعمتوں کا اظہار ہے جو آخرت میں ابرار کو عطا کی جائیں گی۔ آخر میں بتایا ہے کہ تسنیم ایک ایسے چشمے کا نام ہے جس سے مقرب بندے سیراب ہوں گے۔ وغیرہ۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۲۹﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ

جو لوگ مجرم تھے (یعنی) وہ ایمان والوں سے (دنیا میں تحقیراً) ہنسا کرتے تھے اور یہ (ایمان والے) جب ان (کافروں) کے سامنے سے

يَتَغَامَزُونَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿۳۱﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا

ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب اپنے گھروں کو جاتے تو دل لگیاں کرتے اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ

کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں حالانکہ یہ اُن پر نگرانی کرنے والے کرکے نہیں بھیجے گئے سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر

الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

ہنستے ہوں گے مسہریوں پر (بیٹھے اُن کا حال) دیکھ رہے ہونگے واقعی کفار کو ان کے کیے کا خوب بدلہ ملے گا

تفسیر

دولت مند اہل گروہ جو دنیوی عزت و وجاہت کا مالک ہوتا ہے کتنا ہی گمراہ ہو مگر بعض کو چھوڑ کر عام طور پر اس کے افراد خود غلط اور غرور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دنیوی سیادت اور اونچائی اور مال کی فراوانی ان کے دماغوں کو اس قدر مفلس بنا دیتی ہے کہ وہ غریب کے منہ سے کلمۂ حق سننا بھی گوارا نہیں کرتے وہ اپنی کج راہی کو راست روی، جہالت کو علم اور ہدایت کو گمراہی سمجھتے ہیں، اس لئے قبولِ حق سے بہت دور رہ جاتے ہیں۔

لیکن نرم دل، نرم خو مسکین مزاج فقیر حال نادار، بے وجاہت، سیادت دنیوی سے محروم سادہ دل لوگ عموماً طلب گار سعادت ہوتے ہیں۔ ان کے کان حق کی آواز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں جلوۂ صداقت دیکھنے کی خواہش مند ہوتی ہیں اور ان کے دل نقوشِ ہدایت کو جلد قبول کر لیتے ہیں، مگر غریبوں کے پاس نہ اونچی کوٹھیاں ہوتی ہیں نہ فرنیچر اور ریشمی اسباب نہ نفیس فرش نہ لذیذ کھانے نہ خوشبودار مشروبات نہ زر و جواہر کے زیور نہ سونے چاندی کے برتن نہ عیش کی زندگی۔ بدن پر چیتھڑے، پاؤں جوتوں سے ننگے، بال بڑھے ہوئے، چہروں پر ناتوانی کی خشکی اور پوری صورت ناداری کی مورت، لیکن ان کے دلوں میں نورِ ایمان، آخرت پر یقین، نیکی کی طرف طبعی میلان، اعمالِ صالحہ سے رغبت اور اللہ کے وعدوں پر اعتماد۔ نہ زر و جواہر کا لالچ نہ لذائذ عیش سے لگاؤ۔ نہ اونچے مکانات و مساکن کی تمنائے خام۔ ہر وقت ذخیرۂ آخرت فراہم کرنے کی لگن اور اشاعتِ حق کا شوق۔

منکرینِ حق ان کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے اور جلتے ہیں۔ اوّل تو ان کی ہنسی اڑاتے اور مذاق بناتے ہیں ان کو ہنسی آتی ہے۔ اہلِ ایمان کی دنیوی نداکت اور ناداری کو دیکھ کر دنیوی عیشِ حاضر کی طرف سے لاپروا اور اخروی نعمتوں کے وعدہ پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر صرف یہی عیشِ فانی ہوتا ہے، اس لئے آخرت کی نعمتیں ان کی نظر میں موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر ان کو ہنسی آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسے بیوقوف ہیں کہ موہوم کو موجود کو ترجیح دیتے ہیں۔ صورت تو دیکھو بدن پر چیتھڑا ثابت نہیں۔ گھر میں کھانے کو سوکھا ٹکڑا نہیں۔ بالشت بھر زمین کے مالک نہیں اور ہو رہے ہیں حکومت و بادشاہت، ورسوتے یا ہنسی موتی اور نگینے کے مکانوں کے مالک ہونے کے مدعی۔

پھر وہ اسی پر بس اور دل آزاری پر بس نہیں کرتے بلکہ اگر اہلِ حق ان کی طرف سے یا وہ اہلِ حق کی طرف سے کبھی گزرتے ہیں تو باہم آنکھوں آنکھوں میں غمزہ بازی اور طعن کرتے ہیں اور چشمک زنی سے دلوں کی خباثت کو ظاہر کرتے ہیں گویا مسلمانوں کو مخبوط الحواس پاگل جانتے ہیں اور اپنی نفرت کا ہر گوشۂ ابرو اور اشارہ چشم سے اظہار کرتے ہیں۔

پھر انتہائی نفرت اور عداوت کا مظاہرہ اپنی مخصوص مجلسوں میں بھی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے لوٹ کر آتے ہیں تو مسلمانوں کی طرف سے

پس پشت اُن پر بہتان کستے اور خوش طبعیاں کرتے ہیں۔ آخر بات دلی نفرت سے آگے بڑھ جاتی ہے اور فقط غائبانہ طعن وطنز پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ روبرو گمراہ اور بدراہ کہنے لگتے ہیں۔ مسلمان ان تمام ذلتوں کو دیکھتے۔ اپنی کمزوری اور شرافت اخلاق کی وجہ سے ہر توہین کو برداشت کرتے اور منہ توڑ جواب دینے سے گریز کرتے ہیں۔ قیامت کے دن جب اعمال کا فیصلہ ہو جائے گا مسلمان عیش میں اور کافر عذاب میں پہنچ جائیں گے اور اہلِ ایمان آسائش، نعومت، عزت اور حکومت کی بادۂ دوشینہ ظاہرہ سے اتنے سرشار ہو جائیں گے کہ تھوڑی دیر کے لئے تمکین و وقار کو بھول جائیں گے اور کافروں کو مبتلائے عذاب دیکھ کر ان پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ تمہارا وہ سارا غرور کیا ہوا۔ آخر کار ہم عقلمند اور سچے ثابت ہوئے یا تم۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ یہاں سے آخر تک آیات کو بعض علماء مکی قرار دیتے ہیں اور بعض مدنی۔ مکی قرار دینا زیادہ قوی ہے۔ موردِ نزول کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت صہیب، حضرت بلال، حضرت عمار اور انہی کی طرح کے دوسرے نادار شکستہ حال عزتِ دنیوی سے محروم لوگوں کے حق میں ان آیات کا نزول ہوا۔ ابوجہل ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور بعض دوسرے کافر اور سردار ان غریبوں پر طعن کرتے ان کی ہنسی اڑاتے اور تذلیل کرتے تھے۔

لیکن یتغامزون کا لفظ اس روایت کا انکار کر رہا ہے۔ مکہ میں کافروں کا غلبہ بلکہ پورا اقتدار تھا۔ اور مذکورۂ بالا مسلمان غریب، شکستہ حال اور بعض غلام تھے۔ کفار ان کو کھلم کھلا برا کہتے اور آوازے کستے تھے۔ اشارۂ چشم اور کنایۂ ابرو تو اس شخص کے مقابلے میں کیا جاتا ہے جس کی کوئی وقعت اور حیثیت ہو یا سمجھی جائے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ چند غریب مسلمانوں کے ساتھ راستہ میں جا رہے تھے تو مدینہ کے بعض منافقوں نے دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔ آپس میں اشارے کنائے بھی کئے اور واپس جا کر ابن اُبی بن سلول کے سامنے ٹھٹھے لگائے اور کہا ہم نے آج اصلع کو دیکھا۔

اس روایت میں ایک لغوی ضعف یہ ہے کہ اصلع اس شخص کو کہتے ہیں جس کی چاند اور سر کے اگلے حصے پر بال بالکل نہ ہوں۔ اسی لئے منافق حضرت عمرؓ کو اصلع کہتے تھے۔ حضرت علیؓ کو اس نام سے ذکر نہیں کرتے تھے۔

• اگر اول روایت کو صحیح قرار دیا جائے گا تو فقراء مومنین کے ساتھ اس وقت حضرت ابن مسعود اور حضرت مصعب بن عمیر جیسے عالی مرتبہ لوگوں کو ماننا پڑے گا جن کی دنیوی شرافت کا لحاظ کر کے کافروں نے اشارے کنائے سے ان پر طنز کئے۔ اس صورت میں یہ آیات مکی ہوں گی۔ دوسری روایت میں غالباً راوی کو بھول ہوئی اور حضرت عمرؓ کی جگہ انھوں نے حضرت علیؓ کا نام ذکر کر دیا۔ اس تقدیر پر آیات مدنی ہوں گی۔ شانِ نزول اور مقامِ نزول کوئی ہو۔ کافروں کے جس سلوک بد کو آیات میں بیان کیا ہے وہ ہر جگہ نادار اور عزتِ دنیوی سے محروم اہلِ حق کو پیش آتا ہے۔ ہم تفسیری مقالے میں لکھ چکے ہیں کہ بادۂ پندار سے سرمست کافر ان اصحاب حق وصفا کے ساتھ ہمیشہ انہی چاروں طریقوں سے پیش آتے ہیں۔ مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ اشارات سے طنز بھی کرتے ہیں۔ اپنی نجی صحبتوں میں اہلِ ایمان کے متعلق خوش گپیاں بھی کرتے ہیں اور آخر میں صحت بیند ہو کر کھلم کھلا مومنوں کو گمراہ بھی قرار دیتے ہیں۔ انہی چاروں طرح کی بداخلاقیوں کو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا مروا بھم یتغامزون۔ یہ کافروں کی بداخلاقی کی دوسری سرگذشت کا بیان ہے۔ مروا کی ضمیر کافروں کی طرف اور بھم کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے۔ خطیب نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ کافروں کا گذر مسلمانوں کی طرف سے یا مسلمانوں کا گذر کافروں کی طرف سے ہوتا تھا تو کفار باہم چشم و ابرو سے اشارے کنائے کرتے یا ایک دوسرے کا ہاتھ دبا تا تھا اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ دیکھو ان بیوقوفوں کے گروہ کو۔ ذرا ان کی صورتیں دیکھو۔ فاقہ زدہ افسردہ پھٹے پرانے لگائے خاک چھانتے پھرتے ہیں نہ بدن کو کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ اور مدعی ہیں دین حق پر ہونے اور خدا کے ہاں بادشاہ بننے کے۔ اگر سچے مذہب پر ہوتے اور خدا کو پسند ہوتے تو ایسے شکستہ حال بے پر و بال کیوں ہوتے۔

واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین یہ کافروں کی بدسلوکی اور بدتمیزی کی تیسری صورت کا بیان ہے۔ مطلب یہ کہ جب مسلمانوں پہ طعن وتشنیع کرنے کے بعد گھروں کو لوٹتے ہیں تو اتراتے ہوئے لوٹتے ہیں (کبیر) یعنی خود پرستی اور رعونت کے نشہ میں مست ہیں۔ دولت و تنعم کو لازوال خیال کرتے اور اتراتے ہیں اور مسلمانوں کو ان کو فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل سمجھتے ہیں۔ بعض روایات متواترہ میں فاکہین بھی آیا ہے۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا

کہ گھروں کو لوٹتے ہیں تو عیش کی ہر چیز موجود پاتے ہیں ۔ خوب مزے اڑاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے مزید سرکشی کرتے ہیں اور اللہ کے فرماں بردار بندوں پر طعن کرتے ہیں ۔ (ابن کثیر)

واذا راوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون ۔ یہ کافروں کی ہو گئی بیہودگی کا اظہار ہے ۔ ہیں تو واقع میں خود گمراہ ، بہکے ہوئے ، فانی کو باقی سمجھنے والے ۔ چند روزہ عیش کو غیر فانی جاننے والے ۔ سرمست ۔ غافل ۔ بد تہذیب ۔ انجام کی طرف سے بے پرواہ ۔ مآلِ زندگی کے منکر ۔ اور کہتے ہیں مسلمانوں کو دیکھ کر یہ بیوقوف بہک گئے ہیں ، راستہ سے بھٹک گئے ہیں ۔ حق کو باطل اور باطل کو حق جاننے لگے ہیں ۔ موجود اور حاضر دنیا کو بے حقیقت خیال کرتے ہیں اور موہوم آخرت کو حقیقی سمجھتے ہیں ۔ حقیقت میں دانش و فہم کا راستہ ان سے کھو گیا اور یہ اُس راستے سے کھو گئے ۔

وما ارسلوا علیہم حفظین ۔ لوگوں کے افکار و اعمال کی نگرانی اور اصلاح کا کام تو پیغمبروں کے سپرد کیا گیا ہے یا پیغمبروں کے صحیح جانشین اس خدمت کو انجام دے ۔ دوسروں کو کسی کے اعمال کی نگہداشت اور نکتہ چینی کرنے کا حق نہیں پہنچتا ۔ وہ کافر جو خود گمراہ اور محتاج ہدایت ہیں ان کو اہلِ ایمان کی نگرانی اور اصلاح کے لئے نہیں بھیجا گیا ، اس لئے کافروں کی یہ تمام بیہودگیاں ، بیہودگیاں ہی ہیں محض جذبۂ نفرت و اہانت کے زیر اثر ہیں ۔ اللہ کی طرف سے ان کو نکتہ چینی اور مسلمانوں کی توہین کا حق دے کر نہیں بھیجا گیا ۔

فالیوم الذین امنوا من الکفار یضحکون قیامت کے دن جب اہلِ حق کو اپنا ثواب اور کافروں کو اپنا عذاب دیکھے گا اور ہر فریق کو تصدیق و تکذیب کا نتیجہ مل جائے گا تو اس روز کافروں کو دکھ میں دیکھ کر مسلمان ان پر ہنسیں گے ۔ (یعنی ان کو کافروں پر ہنسنے کا موقع ملے گا اور اس طرح کافروں کی قلبی تکلیف میں مزید اضافہ ہوگا) آخرت میں اہلِ حق کی یہ ہنسی جذبۂ انتقام کے تحت نہ ہوگی نہ اس سے اپنا کینہ اور عناد کا مظاہرہ کرنا مقصود ہوگا ۔ بلکہ کافروں کی حماقت پر ہنسیں گے کہ یہ لوگ کتنے بیوقوف تھے کہ ہم کو بیوقوف جانتے تھے ۔ آج معلوم ہو گیا کہ کون بیوقوف تھا ۔ لیکن دوزخ اور اہلِ جنت میں اتنا فاصلہ ہے جس کا تصور بھی ممکن نہیں ۔ ایمان داروں کا مسکن جنت میں اور کافروں کا مستقر دوزخ میں ہوگا ۔ پھر اہلِ جنت کو دوزخیوں کی حالت کی اطلاع کیسے ہوگی ۔ کیا ملائکہ اطلاع دیں گے ۔ یا الہام ہوگا ، اس لئے فرمایا ۔

علی الارائک ینظرون ایمان دار اپنی اپنی آرام گاہوں اور راحت کدوں سے ہی کافروں کے احوال کو دیکھتے ہوں گے ۔ کعب نے کہا کہ دوزخ جنت کے درمیان دیکھنے کا راستہ ہوگا مومن جب چاہے گا کافروں کو وسط جہنم میں دیکھ لے گا ۔ شیخ ابن کثیر نے ینظرون کا مفعول جلوۂ الٰہی کو قرار دیا ہے یعنی اپنے اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے مومن اللہ کا جلوہ دیکھیں گے اور ان کو پروردگار کا دیدار ہوگا ۔ ابن کثیر کی یہ تشریح سیاق اور سباق کے خلاف ہے اس کے علاوہ کلام کی تکرار بھی ہے ۔ کیونکہ اس سے پہلے مومنوں کے احوال میں بھی یہ آیت آچکی ہے جہاں ابن کثیر نے اللہ کا دیدار مراد لیا ہے پھر تقابل بھی صحیح نہ ہوگا ۔ کافر دنیا میں مسلمانوں پر ہنستے تھے ۔ اس کے مقابلے میں قیامت کے دن فیصلے کے بعد مسلمان کافروں پر ہنسیں گے ۔ دونوں فریق کی ہنسی کا تقابل اس طرح صحیح ہو جائے گا ۔

ابو صالح سے مروی ہے کہ جہنم کا دروازہ کھول دیا جائے گا ۔ مومن اس وقت سیر کر رہے ہوں گے ۔ کفار نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑیں گے ۔ دروازے پر پہنچیں گے تو اس کو بند پائیں گے ۔ مسلمان بے تحاشا دیکھ کر ہنس پڑیں گے ۔ اسی لئے آگے فرمایا ۔

ھل ثوب الکفار ما کانوا یفعلون یعنی کافروں کا جہنم میں رہنا اور مسلمانوں کا ان کی حالت کو دیکھ کر ہنسنا اور کافروں کا اس سے مزید دکھ پانا ان کے اعمال کی پاداش میں ہوگا ۔ رسول اللہ ؐ نے کسی کی حالت پر ہنسنے کی ممانعت فرمائی ہے اور فرمایا ہے جو کسی پر ہنسے گا اس پر دوسرے ہنسیں گے ۔ لیکن آخرت دار التکلیف اور مقام عمل نہیں ۔ مسلمانوں کو تو ہنسایا جائے گا تاکہ کافروں کو زیر دکھ ہو اور مسلمانوں کو دنیوی تکلیف کا پورا صلہ مل جائے ۔

مقصودِ بیان مسلمانوں کے ساتھ کافروں کی جارحانہ بد اخلاقیوں کا ذکر کرنے سے یہ تعلیم مترشح ہوتی ہے کہ اہلِ حق کی ظاہری شکستہ حالی کو دیکھ کر باطل پرست ان پر ہنستے اور طعن و طنز کرتے رہی ہیں ۔ مگر اہلِ اس بدحالی اور کافروں کی طرف سے توہین آمیز سلوک سے ان کو شکستہ دل نہ ہونا چاہیئے ۔ قیامت کے دن اعمال کے فیصلہ کے بعد دونوں فریق کو اپنے اپنے کردار کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا ۔ مجرم مآل کی طرف سے غافل ہو کر اپنی موجودہ راحتوں کے نشہ میں مست رہتا ہے ، اور مومن انجامِ آخرت کا خواہش مند ہوتا ہے ۔ اس لئے موجودہ تکلیفوں پر صبر کرتا ہے ۔ اسی لئے

درسِ عبرت ہے ان مدعیانِ اسلام کے لیے جو اہلِ حق کی شکستہ حالی کو خسرانِ مآل کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور اپنی فارغ البالی اور کثرتِ مال کو آخرت کی کامیابی کی تمہید جانتے ہیں۔ سنن کی صحیح روایات میں آیا ہے کہ آخر زمانہ میں بے شمار فتنے ہوں گے۔ اس وقت دین کو مضبوطی سے تھامے رہنا انگاروں کو ہاتھ میں پکڑنے کی طرح (دشوار) ہوگا۔ مجرموں کے گروہ میں جو شخص ایمان پر سچا ہوگا وہ ذلیل سمجھا جائے گا۔ خطیب نے تو سراج میں یہ بھی روایت لکھی ہے کہ اس وقت مومنوں کے نزدیک عالم کو مردار گدھے سے بھی بدتر قرار دیا جائے گا۔ آیاتِ مذکورہ کی تطبیق جب احادیثِ صحیحہ سے کی جاتی ہے تو صریح تعلیم مستفاد ہوتی ہے اس بات کی کہ اہلِ باطل اہلِ حق کے ساتھ توہین آمیز اور ذلیل کن سلوک کریں مگر ان کو اجرِ آخرت کا یقین کرتے ہوئے اپنی صداقت پر ثابت قدم رہنا چاہیے وغیرہ۔

سورۃ الانشقاق

اس سورت کا نام واذا السماء انشقت اور سورۂ انشقاق ہے۔ اس میں بقول رازی پچیس آیات ہیں۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ ۲۳ یا ۲۵ آیات ہیں۔ کلمات ایک سو نواسی یا ایک سو نو اور حروف ۴۲۰ یا ۴۳۴ ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ بالاجماع یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر نے فرمایا کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ (آسمان) اسی لائق ہے اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائیگی اور اپنے اندر کی

مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ

چیزوں کو باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائیگی اور اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے۔ اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کام میں کوشش کر رہا ہے

كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا

پھر اس سے جا ملے گا تو جس شخص کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا سو اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔

يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ

اور وہ اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا اور جس شخص کا نامۂ اعمال (بائیں ہاتھ میں) پیٹھ کے پیچھے سے ملے گا سو وہ

يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ

موت کو پکارے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔ یہ شخص اپنے متعلقین میں خوش خوش رہا کرتا تھا۔ اس نے خیال کر رکھا تھا کہ اس کو (خدا کی طرف) لوٹنا نہیں ہے

بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ

کیوں نہ ہوتا اس کا رب اس کو خوب دیکھتا تھا۔ سو میں قسم کھا کر کہتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی

پھٹ جائے گا اور زمین پھیل جائے گی۔ آسمان کا زیور ٹوٹ کر خاک میں مل جائے گا۔ زمین کا سنگھار برباد ہو جائے گا۔ اونچے اونچے پہاڑ چٹیل میدان بن جائیں گے۔ انسان بھی چار و ناچار اللہ کی طرف کھنچا جا رہا ہے اور اس کا ایک خاص مقصد بھی ہے اور اس کا حاصل ہونا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ اس کی زندگی کا ایک مآل ہے، ایک نتیجہ ہے۔ آسمان و زمین کی زندگی کا نہ وہ مقصد ہے نہ نتیجہ۔ اس لئے تمام مخلوق سے بڑھ کر نعمت یافتہ اور سربلند انسان پر بدرجۂ اولیٰ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے مآل کو سوچ کر وصال رب کے لئے بارگاہِ الٰہی کی طرف کوشش اور اطاعت کے ساتھ دوڑے اور زندگی کے حساب نامے کو پاک صاف رکھے۔ کیونکہ ایک روز آفتابِ حیات ضرور غروب ہوگا۔ اس سورج پر عدم کی سرخی آئے گی۔ اس وقت انسان روزِ ہستی اور شبِ عدم کے درمیانی درجہ پر ہوگا۔ کچھ یادگارِ زندگی کی روشنی ہوگی اور کچھ عدم کے شبِ تار کا اندھیرا سامنے سے آتا نظر آئے گا۔ آخر کار یہ روشنی بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ دوستوں اور رشتہ داروں کی نہ یاد رہے گی نہ ان کی دعاؤں اور بھیجی ہوئی نیکیوں کا سہارا۔ عدم کی تاریک رات بالکل ہی چھپا لے گی۔ ادراک اور تصرف کی قوتوں کا سلسلہ اس جہان سے بالکل ٹوٹ جائے گا۔ نیستی کی گھٹا ٹوپ رات چھا جائے گی اور روزِ زندگی میں کئے ہوئے تمام اچھے برے کاموں کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لائے گی۔ تمام مرغوبات اور مالوفات رنگا رنگ صورتوں میں ہو کر اس رات کی اندھیری میں روح کے سامنے آئیں گے اور ان کو دیکھ دیکھ کر رنج ہوگا یا خوشی۔ دکھ یا سکھ بدل لینے کی طاقت روح میں نہ ہوگی۔ پھر حشر و نشر کی چودھویں کا چاند نکلے گا جس کی چاندنی عدم کی تاریکی کو بالکل پھاڑ دے گی۔ زندگی کے کردار کی جو جھلک روح نے عدم کی تاریکی میں دیکھی تھی اس کی واضح شکل سامنے آجائے گی۔ اچھے برے کا پورا امتیاز ہو جائے گا۔ کامل روشنی میں وزن حساب پڑتال مکمل ہو جائے گا اور جیسا بویا ہوگا اس کو کاٹنا پڑے گا۔

بہرحال ہر انسان کو طبقہ در طبقہ اور زینہ بزینہ ان مدارج پر چڑھنا اور ان منزلوں کو طے کرنا ہے۔ قرآن مجید نے انہی مدارجِ حیات و موت کو بیان کیا ہے اور زندگی کے مراتب کی نشان دہی کی ہے۔ پھر کیوں ایسی یقینی چیزوں کی تصدیق نہیں کی جاتی اور کیوں آخرت کے دکھ سکھ کا انکار کیا جاتا ہے؟

تحلیلِ اجزاء

وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ کوئی چیز کمزور ہو تو اس کا ٹوٹنا پھٹنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مگر آسمان تو ہر چیز سے زیادہ مضبوط ہے۔ جب آسمان پھٹ پڑے گا تو دوسری چیزوں کا ذکر ہی کیا ہے وہ تو شکستہ ریختہ ہو ہی جائیں گی۔

واحدی نے کہا آسمان پھٹنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک سفید ابر کے تصادم سے اس میں شگاف پڑ جائے گا۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے یوم تشقق السماء بالغمام۔ حقیقت میں یہ قہرِ الٰہی کی تجلی ہوگی جو عرش کو نیچے کی طرف گرائے گی اور اس تصادم سے آسمان پھٹ پڑے گا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا آسمان میں شگاف مجرہ کی جگہ پر ہوگا (رواہ ابن ابی حاتم) مجرہ کہکشاں کو کہتے ہیں یہ ان باریک باریک گنجان ستاروں کا وجود دیکھنے میں الگ الگ نہیں معلوم ہوتے۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا آسمان کا یہ شگافتہ اور پارہ پارہ ہونا بوسیدہ فرسودہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ اللہ کے حکم سے ہوگا۔ آسمان اپنے مالک کا حکم کان لگا کر سنے گا۔ اور تعمیلِ حکم میں شگافتہ ہو جائے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں آسمان کے کان نہیں وہ کیسے سنے گا، اس لئے سننے میں مجازی معنی مراد ہے۔ یعنی اللہ کے حکم سے آسمان پھٹ جائے گا۔ سرتابی کرنے کی اس میں مجال نہ ہوگی۔ اس فقیر کی نظر میں اگر حقیقی معنی ہی مراد لئے جائیں تو کوئی دشواری لازم نہیں آتی۔ آسمان کی قوتِ سامعہ کو انسان کی قوتِ سامعہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آسمان اپنے ان کانوں سے سنے گا جو اس کے سزاوار ہیں۔ ایک آیت میں زمین و آسمان کی فرمان پذیری کو اضطراری نہیں بلکہ طوعاً فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ قالتا اتینا طائعین۔

وحقت۔ آسمان کی رفعت و عظمت کا تقاضا ہے کہ اللہ کے فرمان کو قبول کرے، اس لئے فرمانِ الٰہی کو قبول کرکے شگافتہ ہو جانا اس کی شان کے لائق ہے۔ امام رازی نے تفسیر میں لکھا ہے آسمان ممکن بالذات ہے۔ ممکن ذاتی کی دونوں حالتیں برابر ہوتی ہیں نہ ہستی کو ترجیح نہ نیستی کا غلبہ۔ ذات نہ کسی کو قبول کر لینے پہ انکار کرتی ہے نہ اقتضاء۔ موجود ہو جائے تو اللہ کی قدرت اور معدوم ہو جائے تو اللہ کی مرضی۔ اللہ کا ہر حکم ممکن بالذات پر جاری رہتا ہے۔ آسمان کو اختیار نہیں کہ کسی حکم کو قبول کرنے سے انکار کرے۔

یونانی فلسفی جو کوتہ دماغ تھے وہ قائل تھے کہ آسمان کا فنا ہونا اور ٹوٹنا پھٹنا اگرچہ ممکن بالذات ہے لیکن مستحیل بالغیر ہے۔ امام کی تحریر سے اس

معتزلے کی تردید نہیں ہوئی ۔ قرآنی صراحت سے اس باطل عقیدہ کی جڑ اکھڑ جاتی ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ شگافتہ ہونا آسمان کے سزاوار ہے ۔ یعنی اندرونی یا بیرونی ذاتی یا عارضی کوئی چیز شگافتہ ہونے سے اس کو نہیں روک سکتی ۔ اس کی عظمت شان غیر متبدل صورت اور وحدت مادہ کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کے فرمان کو قبول کرلے اور پھوٹ جائے ۔ فلسفہ کا مسلمہ ہے کہ استحقاق ذاتی سے کوئی عارض روک نہیں سکتا یا بالذات بدل نہیں سکتا ، اس لئے آسمان کا پھٹنا نہ فقط ممکن ہے بلکہ واقع بھی ہوگا امام کی تحریر کو قدرے تاویل کے ساتھ ہم اس مطلب پر محمول کرسکتے ہیں ۔

واذا الارض مدت ۔ جب زمین پھیلا دی جائے گی یعنی کھینچ کر وسیع کردی جائے گی (ابن کثیر) مطلب یہ کہ تمام پہاڑ ہموار کردیے جائیں گے ۔ گڑھے پاٹ دیے جائیں گے ۔ نشیب و فراز ختم ہوکر ہموار میدان ہوجائے گا ۔

بعض نے کہا زمین چمڑے کی طرح کھینچ کر پھیلائی جائے گی کہ اس پر کوئی عمارت یا پہاڑ باقی نہ رہے گا ۔ حضرت ابن عباس کی طرف سے جس قول کی نسبت کی گئی ہے اس سے بھی مقاتل کے قول کی تائید ہوتی ہے ۔ حضرت جابر کی روایت ہے جس کو حاکم نے روایت کیا ہے اور سیوطی نے اس کی اسناد کو جید کہا ہے ۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا زمین چمڑے کی طرح کھینچی جائے گی پھر اس پر کسی آدمی کے لئے اس سے زیادہ گنجائش نہ رہے گی کہ قدم ٹک جائیں ۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مُدَّتْ مد سے ماخوذ ہے یعنی زمین کشادہ کردی جائے گی ۔

والقت ما فیہا وتخلت ۔ زمین کے اندر جو مُردے ہیں ان سب کو زمین باہر نکال پھینکے گی اور خالی ہوجائے گی (ابن کثیر ، مجاہد ، قتادہ سعید) زمین مردوں کو باہر پھینک دے گی اور زندوں سے خالی ہوجائے گی (روایت از ابن عباسؓ) یا زمین کے اندر جو کچھ ہے مردے ، دفینے ، خزانے ، کانیں ، جواہر اور وہ تمام نفع بخش چیزیں جن کے لئے آدمی لڑتے جھگڑتے اور بے ایمانیاں کرتے ہیں سب کو زمین اُگل دے گی اور ان تمام چیزوں سے خالی ہوجائے گی جن سے انسانی عمل کا تعلق ہے (شاہ عبدالعزیزؒ)

پھر اس نکالنے اور اُگلنے کا مقصود نہ کسی کو نفع پہنچانا ہوگا اور نہ ضرر ۔ نہ یہ سلسلۂ اسباب کے زیر اثر ہوگا نہ کوئی معمولی یا غیر معمولی حادثہ ہوگا ۔ بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہوگا ۔

واذنت لربہا وحقت ۔ زمین اپنے مالک کا حکم کان لگا کر سنے گی اور فرمان قبول کرے گی اور یہ فرماں برداری ہی اس کے لئے زیبا ہوگی (اس آیت کی مزید تشریح اوپر گزر چکی)

یہاں تک کلام بطور شرط تھا جس کی جزا محذوف ہے ۔ یعنی جب آسمان اور زمین حکم رب کے سامنے سرافگندہ اور مطیع فرمان ہیں تو اے انسان تو سرکشی کیوں کرتا ہے ۔ خطیب نے لکھا ہے کہ سورۂ تکویر و انفطار میں جو جواب مذکور ہے وہی یہاں محذوف ہے ۔ یعنی جب انقلاب زمین آسمان ہوگا تو ہر شخص کو اپنے اعمال معلوم ہوجائیں گے ۔ فراء نے کہا جواب بہت جگہ قرآن میں مذکور ہے ، اس لئے اس کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ واقعہ کی ہولناکی پر تنبیہ کرنے کے لئے جواب حذف کردیا یعنی جب ایسا وقت ہوگا اور یہ حوادث ہوں گے تو نتیجہ بڑا ہولناک ہوگا ۔

بعض علماء نے کہا جواب محذوف نہیں بلکہ فملاقیہ جزا مذکور ہے ۔ کسائی نے فاما من اوتی الخ کو جزا قرار دیا ہے ۔

یاایہا الانسان انک کادح الی ربک کدحا ۔ کدح کا معنی ہے کسی کام کی کوشش میں مشقت برداشت کرنا ۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ الانسان سے مراد کافر ہے اور ملاقات رب سے مراد وقت موت ہے یعنی اے کافر انسان تو وقت موت تک اپنی کوشش میں لگا رہتا ہے ۔ آخر وہ کیا دھرا تیرے سامنے آئیگا ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا الانسان سے مراد ولید بن مغیرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ دینے میں بڑا سرگرم تھا ۔ اس کو تنبیہ کی گئی ہے ۔ بعض اہل تفسیر کی رائے ہے کہ الانسان سے مومن مراد ہے ۔ کیونکہ مومن ہی اپنے رب کے وصال کا آرزومند ہوتا ہے اور اس کے پاس پہنچنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے ۔ بعض نے کہا رسول اللہؐ کی ذات اقدس مراد ہے ۔ حضور والا تبلیغ اور رسالت اور مرضی مولیٰ کی طلب میں ہر وقت سرگرم رہتے تھے ۔ اس پر حکم ہوا کہ آپ کی یہ کوشش رائیگاں نہ جائے گی ۔ اس کی تائید میں وہ حدیث پیش کی گئی ہے جس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا مجھ سے جبرئیل نے کہا محمد جب تک چاہو جیو ۔ آخر مرنے والے ہو جس سے چاہو پیار کرو آخر اس سے جدا ہونا ہے اور جو عمل چاہو کرو آخر اس کو پاؤ گے (ابن کثیر)

صحیح یہ ہے اور اسی کو اکثر علماء تفسیر نے پسند کیا ہے کہ الانسان سے مراد ہے عام آدمی ۔ کوئی ہو مسلمان یا کافر کی تخصیص نہیں ۔ ہر شخص کچھ کوشش

کرتا ہے اچھی یا بری سب کا رجوع اللہ کی طرف ہے۔ کسی کو یقین ہو یا نہ ہو کوئی اقرار کرے یا انکار۔ بہرحال ہر عمل لوٹ کر اللہ کے پاس پہنچا اور وہاں جمع ہوتا ہے اور وہ رائیگاں نہ جائے گا بے نتیجہ نہ ہوگا۔

فملاقیہ انسان اس کو ضرور پائے گا۔ قیامت کے دن اعمال کی فہرست لکھی لکھائی ملے گی۔

فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا جس کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا اس کی حساب فہمی آسانی کے ساتھ ہوگی۔ سرسری حساب فہمی کر لی جائے گی کیونکہ جب معاف کرنا ہی ٹھہرا تو بس اعمال کی فہرست دکھا دینی کافی ہوگی چھان پھٹک کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ام المومنین حضرت عائشہ رض سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس سے حساب لیا گیا وہ ضرور عذاب بھگتے گا۔ میں نے عرض کیا کیا اللہ نے نہیں فرمایا ہے فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ فرمایا یہ حساب لینا نہیں بلکہ صرف پیشی ہوگی جس سے حساب لیا گیا وہ ضرور عذاب پائے گا۔ (احمد، بخاری، ترمذی، مسلم، نسائی) اسی لئے ام المومنین فرمایا کرتی تھیں جس کسی سے حساب سمجھا جائے گا وہ عذاب میں ضرور پڑے گا۔ حساب یسیر یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی میں صرف پیشی ہو جائے۔ (ابن جریر) حضرت عائشہ صدیقہ رض سے اس طور پر بھی مروی ہے میں نے دریافت کیا حساب یسیر کیا ہے ارشاد فرمایا حساب یسیر یہ ہے کہ بندہ کے اعمال اس کو دکھا دیئے جائیں گے اور آواز آئے گی۔ میرے بندے تو نے بندگی کی اور میں نے قبول کی تیری خطائیں بھی نے بخشدی۔ ایسے شخص سے یوں نہیں کہا جائے گا کہ جو کام کرنے کے تھے وہ تو نے کیوں نہیں کئے اور جو کرنے کے نہ تھے وہ کیوں کئے جس شخص سے حساب نہیں گزارا اور پوچھ گچھ ہوئی وہ آفت میں پڑا۔

وینقلب الی اھلہ مسرورا حساب یسیر کے بعد جب ہر قسم کی زجر تنبیہ اور عذاب سے بندہ بچ جائے گا تو ان لوگوں سے خوش خوش آکر ملے گا جو اس کے اہل ہوں گے یعنی حوریں، نجات یافتہ اعزہ اقارب اولاد بیویاں۔ دنیا میں بے چارے کو خوشی نصیب نہ تھی۔ تنگ حال فقر و فاقہ میں مبتلاء مصائب آلام کا شکار اور دنیوی اعزاز سے محروم تھا۔ حساب کتاب کے بعد ان تمام دکھوں کا بدل مل جائے گا اور ہر قسم کی خوشی حاصل ہوگی۔ ابن عربی کے نزدیک اہل سے مراد ہیں تمام اصحاب الیمین اہل جنت۔

شیخ ابن عطاء نے کہا اس کے لئے مرضی مولیٰ کا حصول باعث مسرت ہوگا۔

شیخ ابوبکر بن طاہر نے کہا بارگاہ میں حاضری اور رضوان و رحمت کا حصول اس کی خوشی کا سبب ہوگا۔

شیخ عبدالواحد نے کہا وہ اس پر مسرور ہوگا کہ ملاقات کا وعدہ سچ ثابت ہوا۔

شیخ ابن ادہم نے کہا جہنم سے نجات اور جنت میں داخل ہونے کا پروانہ اس کے لئے مسرت آفریں ہوگا۔

شیخ ابوعثمان نے کہا اس کو خوشی ہوگی اس بات کی کہ اولیاء و صدیقین کے مقامات میں حاضری نصیب ہوئی۔ حاصل تمام اقوال کا ایک ہی ہے۔

واما من اوتی کتابہ وراء ظھرہ فسوف یدعوا ثبورا ویصلی سعیرا انہ کان فی اھلہ مسرورا جن لوگوں کے اعمال نامے پشت کے پیچھے سے دیئے جائیں گے۔ وہ یقیناً کسی وقت کے بعد موت یا ہلاکت کو پکاریں گے اور بھڑکتی آگ میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ دنیوی زندگی اپنے عیال و اولاد کے ساتھ رہنے میں خوش تھے یعنی ہر قسم کا عیش ان کو حاصل تھا۔ دولت کی کثرت تھی، اسباب راحت کی فراوانی تھی، اولاد کی افزائش اور صحت بھی عورتوں میں حسن و جمال صحت اور اطاعت تھی، خدمت گزاروں کی طرف سے فرماں پذیری تھی۔ غرض کسی قسم کا غم اور دکھ نہ تھا اور ایسی نشہ میں مست ہو کر غریب نادار لوگوں کی تضحیک کرتا اور ان کی توہین و تذلیل میں لگا رہتا تھا۔ قیامت کے دن اس کی سزا ملے گی اور عذاب سے بچنے کے لئے موت کو پکارے گا۔

بعض آیات میں آیا ہے کہ کافروں کے اعمال نامے الٹے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور یہاں پشت کے پیچھے سے دیئے جانے کی صراحت ہے۔ اس ظاہری تضاد کو دور کرنے کے لئے اہل تفسیر نے بیان کیا ہے کہ مومنوں کے اعمال نامے ان کے سیدھے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے اور کافروں کے اعمال نامے الٹے ہاتھوں میں اس طرح دیئے جائیں گے کہ بائیں ہاتھوں کو موڑ کر پیچھے کی طرف لے جایا جائے گا اور پیچھے سے اعمال نامے ہاتھوں میں آ جائیں گے۔

حطیبہ نے لکھا ہے کہ کافر کا دایاں ہاتھ طوق سے گردن کے ساتھ بندھا ہوگا اور بایاں ہاتھ پیچھے کو پھیر دیا جائے گا اور اسی طرح جب اس کو نامۂ اعمال ملے گا تو اس کو پڑھ کر وہ پکارے گا میری ہلاکت آ گئی۔

بات یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے لینا دینا فعل کی رغبت کو ثابت کرتا ہے اور خوشی کو بھی اگر دینے والا سیدھے ہاتھ سے دے اور لینے والا سیدھے ہاتھ سے لے تو ظاہر ہوتا ہے دینے والے نے رغبت اور خوشی سے دیا اور لینے والے نے رغبت اور خوشی سے لیا۔ لیکن اگر لین دین میں بائیں ہاتھ سے کام لیا جائے دینے والا اُلٹے ہاتھ سے دے اور لینے والا اُلٹے ہاتھ سے لے تو اس سے دینے اور لینے والے کی بے رغبتی، ناخوشی اور لاپرواہی و نفرت خاطر کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر بائیں ہاتھ کو پیچھے کی طرف لے جاکر اگر دیا یا لیا جائے تو مزید سونے پر سہاگہ اور کریلا نیم چڑھا ہو جاتا ہے اس سے فاعل کی بہت زیادہ نفرت اور ناگواری کا اظہار ہوتا ہے پس سیدھے ہاتھ سے نامۂ اعمال لینے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے نیکیوں سے بھرے ہوں گے، اس لئے اُن کو اعمال نامے لینے اور پڑھنے کی رغبت ہوگی اور خوشی بھی۔ اور اُلٹے ہاتھوں سے پس پشت سے لینے والوں کے اعمال نامے کفر و معصیت سے بھرپور ہوں گے، اس لئے ان کو لیتے وقت ناگواری ہوگی۔ پروانۂ موت کو لینے میں کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ دائیں اور بائیں ہاتھوں سے لینے کے اگر حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو اس کی حکمت یہی ہوگی اور مجازی معنی یعنی رغبت و خوشی اور ناگواری و نفرت سے لینا اگر مراد لیا جائے تب بھی مطلب میں خرابی نہیں ہوگی۔ گو حقیقی معنی کے امکان اور سہولت کے باوجود مجازی معنی مراد لینا مناسب نہیں

انہ ظن ان لن یحور۔ دنیوی عیش و طرب اور رنگ رلیوں پر وہی ریجھتا ہے جو آخرت کی طرف سے غافل ہو جس کو آخرت کا یقین ہی نہ ہو بلکہ اسی دنیا کی زندگی کا حاصل سمجھتا ہو اور آخرت کا منکر ہو۔ انجام بین اور مآل اندیش آدمی کو کبھی اس دنیا میں سچی خوشی میسر نہیں ہوتی وہ تو ہر وقت خوف و رجاء کے درمیان معلق رہتا ہے۔ آخرت کے عذاب کا خوف اور ثواب کی اُمید رکھتا ہے اور غضبِ الٰہی سے ڈرتا ہے اور رحمت پروردگار کی آس لگائے رہتا ہے۔ ایسے آدمی کو خواہ وہ بادشاہ ہی ہو جائے دنیوی طرب آفرینیوں اور سرور آگینیوں سے کسی طرح سچی خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔

کافر منکر قیامت ہوتا ہے اس کا گمان بلکہ یقین ہوتا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا اور دوبارہ زندہ ہونا تو ہے ہی نہیں پھر عشرت اندوزی میں انہماک اور ہر ہوس رفتہ انداز ہو۔ اس کو جرس رحیل کی آواز نہیں سنائی دیتی جو مسافروں کو سفر کی تیاری کے لئے پکار رہی ہے پھر امن و عیش کی فرودگاہ پر وہ کیوں فریفتہ نہ ہو جائے۔

کافر کے انکار آخرت کی عمارت اس ہوائی بنیاد پر قائم ہے کہ مر کر لوٹنا ممکن نہیں۔ اعادۂ معدوم محال ہے۔ بدن کے خاکی ریزے منتشر ہو جانے کے بعد کیا معلوم کہاں کہاں چلے جاتے ہیں۔ روح کدھر اُڑ جاتی ہے۔ جب علم ہی نہیں کہ خاکی ذرات کہاں چلے جاتے ہیں تو پراگندہ اجزاء کو جمع کرنا اور ان میں جان ڈالنے کا احتمال ہی کیا ہو سکتا ہے۔ ایسی خرافات اور وہمیات کے ازالہ کے لئے فرمایا۔

بلیٰ ان ربہ کان بہ بصیرا۔ اللہ کے پاس لوٹ کر جانا کیوں نہ ہوگا۔ اللہ تو دانا ہے وہ واقف ہے قبل از آغاز سے لے کر لبعد از موت تک۔ زندگی اور موت کی تمام نیرنگیوں چگونگیوں اور کیفیتوں کا اس کو علم ہے کہ پیدائش سے پہلے روح کہاں سے آئی اور مرنے کے بعد کہاں گئی اور زمانۂ حیات میں کہاں رہی۔ وہ جانتا ہے کہ جسم کیسے اور کن ذرات سے بنا اُن میں نشو و نما اور انحطاط و ذبول و زوال کیسے ہوا اور ذرات عنصری کی پراگندگی کیسے ہوئی۔ ذرہ ذرہ کہاں گیا اور کہاں ہے اور کیسے اُن کو جمع کیا جا سکتا ہے اس کے سامنے ہیں زندگی کے تمام کردار، دماغ کے سب تصورات، اور دل کے تمام پوشیدہ راز اور ارادے اور افکار و عقائد۔ پھر ایسے دانا کے لئے جس کی دانائی بینائی کی حضوری ہے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اجزائے فانیہ کو جمع کرنا ان میں روحِ حیات پھونکنا اور زندگی کے ہر قول فعل اور عقیدہ کی بازپرس کرنا کیا دشوار ہے۔ ہر شخص کا حیات و ممات کے مدارج کو طے کرنا یقینی ہے جس کی یقین دہانی کے لئے قسم کی ضرورت نہ ہو، لیکن تاکید مضمون کے لئے قسم فرماتا ہے

فلا اقسم بالشفق ہم شفق کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ یہاں دو امر توضیح طلب ہیں ۱۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے کے نزدیک ہر چیز سے بزرگ اور معزز ترین ہو۔ اسی لئے اللہ کی ذات و صفات کے علاوہ دوسری چیزوں کی قسم ناجائز ہے۔ پھر کیا وجہ کہ اللہ اپنی حقیر مخلوق کی قسم کھاتا ہے۔ علمائے فقہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ تکلیفی احکام ہمارے لئے ہیں اللہ کے لئے نہیں ہیں، اسی لئے رات دن، چاند سورج شفق اور ماہ و سن سب کی قسم خدا کھا سکتا ہے

متکلمین نے سوال سے بچنے کے لئے ہر جگہ لفظ رب محذوف قرار دیا ہے یعنی اللہ نے جو مختلف چیزوں کی قسم کھائی ہے اس سے مراد ہے ان کے

سب کی قسم ۔ یہ قول ظاہر قرآن کے خلاف ہے ۔ صرف اپنے مفروضہ کو ثابت کرنے کے لئے بنایا ہے ۔ فقہا کا قول اتفاقی درست ہے جس سے فقہی مسئلہ کا حل ہوجاتا ہے اور شرعی جواز وعدم جواز کی توضیح ہوجاتی ہے لیکن اصل سوال کا ازالہ نہیں ہوتا ۔ اصل سوال یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا کس طرح صحیح ہے جب کہ ہر زبان میں قسم اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے کی نظر میں سب سے زیادہ بزرگ اور معزز ہو

یہ نادان عرض کرتا ہے کہ سائل کا سوال ہی ناقص ہے ۔ حقیقت میں قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو قسم کھانے والے کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب اور پیاری ہو ۔ عمر کی ، جان کی ، اولاد کی ، روزی کی اور انہی کی طرح دوسری چیزوں کی قسمیں ہر ملک اور ہر زبان میں پہلے بھی رائج تھیں اور اب بھی رائج ہیں ۔ بلکہ جاہل مسلمان جو مسئلۂ فقہ سے ناواقف ہیں اب بھی اولاد ، جان اور جوانی کی قسم کھایا کرتے ہیں ۔ قسم کا اصل منشا یہی ہے ۔ اب اگر مقسم بہ جلیل القدر اور بزرگ ترین بھی ہو تو دونوں حیثیتیں معتبر ہوجائیں گی جیساکہ فقہا نے اعتبار کیا ہے اور مسلمانوں کے لئے قسم کے جواز اور عدم جواز میں اسی مشترک وصف کو علت قرار دیا ہے ۔ اللہ کی ذات وصفات چونکہ اسلام کی نظر میں جلیل ترین ، عزیز ترین اور محبوب ترین چیزیں ہیں ، اس لئے ان کے علاوہ نہ پیغمبر کی قسم کھانا جائز ہے نہ ملائکہ کی نہ کسی مخلوق کی ۔ اور اگر مقسم بہ میں جلالت قدر اور رفعت شان نہ ہو مگر ہو وہ قسم کھانے والے کی نظر میں ہر چیز سے زیادہ محبوب تو اہل زبان (فقہی حکم سے قطع نظر) عرفاً اس کی قسم کھاتے ہیں ۔

اللہ پر فقہی احکام تو جاری کئے ہی نہیں جا سکتے ، اس لئے فقہی قسم کا تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جیسی کہ فقہاء نے اپنے جواب میں صراحت کی ہے صرف عرفی قسم باقی رہ جاتی ہے جس کا جواز اور عدم جواز صرف زبان کے محاورہ کے تابع ہے ۔ اگر قسم کھانے والے کے لئے وہ چیز محبوب ہوگی تو عرف میں اس کا جواز ثابت ہوجائے گا ۔ ورنہ قابل نفرت چیزوں کی قسم کہیں بھی نہیں کھائی جاتی ۔

تمام مخلوق اللہ کو پیاری ہے ۔ اسی کی مخلوق تو ہے پیاری کیوں نہ ہو ۔ خالق کو اپنی مخلوق سے جتنی محبت ہے اتنی مخلوق کو مخلوق سے نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ اللہ اپنی پیاری مخلوق کی قسم کھاتا ہے اور مخلوق میں سے اس مخلوق کا قسم کھانے کے لئے انتخاب کرتا ہے جو دوسری مخلوق سے افادیت اور عظمت مرتبہ میں زائد ہو خواہ سب سے زیادہ جلیل القدر نہ ہو ۔ سورج چاند ، رات دن ، صبح شام ، آسمان زمین ، ستارے سیارے ، لذیذ نافع پھل ، مساکن انبیاء ، اور اماکن مقدسہ سب کی قسم اسی اعتبار سے کھائی ہے ۔ انتہائی پیار کو ظاہر کرنے کے لئے ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی عمر کی بھی قسم ذکر کی ہے ۔

قسم کھانے سے مقصود مقسم بہ کو گواہ کرنا اور اس کو شہادت میں پیش کرنا ہوتا ہے ۔ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا شاہد علیم ہو نہیں سکتا ۔ جب انسانی شہادت پیش کرنے سے آدمی عاجز ہوتا ہے تو ایسے شاہد کی تلاش کرتا ہے اور غائب ہوتے ہوئے حاضر ناظر سوا ، خدا کے اور کوئی موجود نہیں ہے ۔ اس لئے صرف خدا کی قسم کھاتا ہے ۔ لیکن اگر کسی ایسی چیز کو گواہی میں پیش کیا جائے جس کی نہ آنکھیں ہوں کہ واقعہ دیکھ سکے نہ کان ہوں کہ سن سکے نہ فہم و دانش ہو کہ سمجھ سکے ۔ نہ زبان ہو کہ شہادت ادا کر سکے تو ایسی شہادت پیش کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اتنا یقینی اور ناقابل شک ہے کہ جس میں بولنے ، دیکھنے ، سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں ۔ وہ بھی اسی کی تائید میں بول سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کر سکتا ۔ مثلاً کوئی سپاہی میدان جنگ میں اپنی شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہے میری بہادری کا شاہد میدان کارزار ہے ۔ وہاں کے در و دیوار اس کے شاہد ہیں ۔ یہ شہادت حقیقی شہادت نہیں ہوتی ۔ بلکہ واقعہ کے یقینی ناقابل شک اور ضروری ہونے کو ثابت کرتی ہے ۔ اور اسی لئے جامد صامت اور ساکت چیزوں کو شہادت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ اللہ نے اپنی مخلوق کی جو قسمیں کھائی ہیں اور اپنے قول کی صداقت کی تائید میں ان کو پیش کیا ہے حقیقی قسم اور شہادت تو وہاں ممکن ہی نہیں ۔ اللہ اصدق الصادقین ہے اس کا ہر قول ناقابل شک ہے ۔ مخلوق اس کو سچا قرار دینے کی صلاحیت کب رکھتی ہے ۔ کون جرأت کر سکتا ہے کہ اللہ کے قول کی تصدیق کرے اور مخلوق کی تصدیق کی وجہ سے اللہ کے قول کو سچا قرار دیا جائے ۔ اس شہادت کا فائدہ تو شاہد کو پہنچتا ہے ۔ اقرار حق تصدیق کرنے والے کے لئے مفید ہوتا ہے مشہود بہ کو اس سے فائدہ نہیں پہنچتا ۔ کوئی شہادت دے یا نہ دے اللہ کا قول تو بہرحال سچا ہے ۔

اللہ کی طرف سے مخلوق کی قسم کھانا اور مخلوق کی شہادت میں پیش کرنا مجازاً ہوتا ہے ۔ اس سے قول کی تائید مقصود نہیں ہوتی ۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ بات اتنی واضح بدیہی ، یقینی اور ناقابل شک ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا ۔ نہ جامد نہ نامی نہ ناطق نہ صامت نہ تاریک نہ

روشن - واللہ اعلم -

۲ شفق کسے کہتے ہیں - شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ کے نزدیک شفق کا اطلاق اس سفیدی پر بھی ہوتا ہے جو سرخی کے بعد سیاہی سے پہلے نمودار ہوتی ہے - ظاہر روایات میں امام ابوحنیفہ اسی کے قائل ہیں - عمر بن عبدالعزیز، اوزاعی، مزنی، ابن المنذر اور خطابی کا بھی یہی قول ہے - مبرد اور ثعلب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے -

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علی، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت شداد بن اوس، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور اکثر صحابہ قائل ہیں کہ شفق سرخی کا نام ہے - امام ابویوسف، امام محمد، امام مالک، فقیہہ ابن ابی ذیب عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون، واہل فراء، خلیل، کلبی، مقاتل، زجاج، جوہری صاحب صحاح اور غیر ظاہر الروایت میں امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے - امام باقر بھی اسی کے قائل ہیں - اسد بن عمرو نے روایت کی ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اول قول سے اسی قول کی طرف رجوع کر لیا تھا - زمخشری کا بھی یہی مسلک ہے - امام رازی نے لکھا ہے کہ لفظ شفق کی لغوی ساخت باریکی رقت اور خفت کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے - نرمی دل کو شفقت کہتے ہیں - بہت زیادہ باریک کپڑے کو شفق - آیت میں بالاتفاق علماء وہ سرخی مراد ہے جو آفتاب کے اثر سے غروب کے بعد افق میں باقی رہتی ہے

امام راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی اور رات کی سیاہی کا جو اختلاط ہے وہ شفق ہے -

قرطبی نے لکھا ہے کہ اکثر صحابہ اور تابعین اور فقہاء کا قول ہے کہ غروب کے بعد والی سرخی کا نام شفق ہے

عکرمہ کا قول مروی ہے کہ شفق سے مراد ہے دن کا بقیہ حصہ -

تفسیر کبیر اور اکثر تفسیروں میں مجاہد کا قول منقول ہے کہ شفق سے پورا دن مراد ہے - ایک روایت میں اس قول کی نسبت حضرت ابوہریرہ کی طرف بھی کی گئی ہے - امام رازی نے لکھا ہے شاید مجاہد نے یہ تفسیر اس لئے کی ہے کہ اس سے متصل واللیل کا لفظ آیا ہے - شفق کا تقابل لیل سے چاہتا ہے کہ شفق سے مراد پورا دن ہو - کیونکہ دن معاش ہے اور رات سکون اور انہی دونوں سے امور عالم کا قوام ہے مجاہد کا یہ قول ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے -

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ مجاہد نے کہا شفق آفتاب ہے -

ابن جریر نے نہایت لطیف اور دل نشین تفسیر کی ہے - لکھا ہے اللہ نے شفق کی قسم کھائی یعنی دن کے جانے کے وقت کی اور رات کی قسم کھائی یعنی سیاہی کے آنے کی حالت کی - اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابن جریر کے نزدیک شفق نام ہے سرخی کا کیونکہ سرخی ہی دن کی روگردانی کے بعد اس کے آثار باقیہ میں سے ہوتی ہے -

ابن جریر نے یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کے نزدیک سرخی کا نام بھی شفق ہے اور سفیدی کا بھی - گویا لفظ شفق ان علماء کی نظر میں دونوں معنی کا احتمال رکھتا ہے شفق کی فقہی تنقیح مغرب اور عشاء کے اوقات کے سلسلے میں کتب فقہ میں دیکھنا چاہیئے - حضرت ابوسعید خدری حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت جابر کی روایت کردہ حدیث اور ایک حدیث پر دوسری کی ترجیح کے لئے دیکھو ترمذی، بخاری، الطحاوی

واللیل وما وسق - لغت میں وسق کا معنی ہے جمع کرنا، اکٹھا کرنا - وسقت الابل اونٹ جمع ہو گئے - آپس میں مل گئے - استوسقہ الراعی - چرواہے نے ان کو ملا دیا - جمع کر دیا -

ما وسق سے مراد ہیں وہ چیزیں جن کو رات اکٹھا کر دیتی ہے - حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور حسن بصری سے یہی تفسیر مروی ہے - قتادہ نے بطور تمثیل کہا ستارے اور حیوانات وغیرہ - عکرمہ نے کہا جب رات آتی ہے اور اندھیرا حملہ کرتا ہے تو ہر جاندار اپنے بسیرے کی جگہ جمع ہو جاتا ہے (ابن کثیر) قفال نے لکھا ہے کہ مفسرین سلف کے تمام اقوال دلالت کرتے ہیں اس بات پر کہ رات ستاروں کو جمع کرتی ہے رات میں جاندار اپنے ٹھکانوں پر آجاتے ہیں اور کیڑے مکوڑے اس وقت تک حرکت میں آجاتے ہیں - رازی نے لکھا ہے شاید لفظ ما سے تمام چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے - کیونکہ رات ہر چیز پر چھا جاتی ہے - جیسے دوسری جگہ تمام چیزوں کی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے فلا اقسم بما تبصرون وما لا تبصرون -

(تفسیر کبیر) یہی تشریح زیادہ مناسب ہے۔ حضرت ابن عباس اور جلیل العلم تابعین نے اسی لئے کسی چیز کی تخصیص نہیں کی۔ رات کو ہر جاندار اپنے مسکن پر لوٹ آتا ہے۔ خیر وشر کے اجتماعات عموماً رات میں ہوتے ہیں۔ قومی جلسہ وعظ وارشاد کی مجلسیں، ذکر وفکر کے حلقے، دعوتوں کی محفلیں، رقص وسرود عیش وطرب، مے کشی اور بدحمالی کے ہنگامے اکثر رات ہی میں کئے جاتے ہیں۔ ہر شخص کا اپنے اہل وعیال سے اختلاط رات ہی کو ہوتا ہے۔ خیالات کا اجتماع اور کسی عزم کا جزم بھی رات کو ہی ہوتا ہے۔ دن بھر کے مشاغل اور نفع نقصان کا اجمالی جائزہ بھی آدمی رات کو ہی لیتا ہے۔ غرض رات ساتر الذنوب ہے، راحتِ ابدان ہے۔ سکون ارواح ہے۔ جامع المتفرقین ہے۔ محبوب سے محب کو اور اللہ سے بندہ کو ملانے والی ہے۔

والقمر اذا اتسق۔ پہلی قسم شفق کی تھی۔ دوسری شفق کے بعد آنے والی رات کی۔ یہ تیسری قسم چودھویں کے چاندکی ہے۔ جب چاند کی پوری روشنی چاند میں جمع ہو جاتی ہے اور تاریکی کو دور کر کے ہر چیز کو نمودار کر دیتی ہے۔

اتسق کی تفسیر ابن عباس سے مروی ہے اجتمع واستوی یعنی قسم چاند کی۔ جب اس کی چاندنی مجتمع اور ٹھیک ہو جائے: عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، مسروق، ابو صالح، ابن زید اور ضحاک سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ حسن بصری نے فرمایا جب چاند مجتمع ہو کر نور سے بھر جائے۔ قتادہ نے فرمایا جب چاند گول ہو جائے۔ حاصل سب کا ایک ہے۔ اِتسق کا مادہ وَسْقٌ ہے اور وسق کا معنی جمع کرنا باب افتعال میں اگر اِتِّسَاقٌ کا معنی ہو گیا جمع ہونا مرتب، منظم اور ٹھیک ہو جانا۔ پورا ہو جانا۔

لترکبن طبقا عن طبق یہ حقیقت ہے کہ تم سب کو منزل بہ منزل اور درجہ بدرجہ چڑھنا ہوگا۔ اس آیت کا مطلب مفسرین نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ کسی نے لَتَرْکَبَنَّ واحد کا صیغہ قرار دے کر صرف کافر یا صرف مومن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب سمجھ کر تاویلیں کی ہیں۔ کسی نے واحد کے صیغے کا مخاطب جنس انسان کو قرار دیا ہے جس میں مومن اور کافر دونوں شامل ہیں۔ لیکن متواتر قرأت میں جمع کا صیغہ لَتَرْکَبُنَّ اس صورت میں تمام انسان مخاطب ہوں گے۔

طبقاً عن طبق کی تشریح بھی مختلف طور پر کی گئی ہے۔ امام رازی نے طبق کا معنی مطابق لکھا ہے۔ یعنی انسان کا ہر حال دوسرے حال سے مطابق ہوگا۔ کافروں کے لئے شدتِ عذاب اور مومنوں کے لئے راحت وثواب۔

ابن کثیر نے بحوالہ بخاری ابن عباس رض کا قول نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا حالاً بعد حال قال ہذا نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت ابن عباس کے اس قول کا مطلب دو طرح سے سمجھا گیا ہے اول یہ کہ ابن عباس نے فرمایا یہ تمہارے پیغمبر ہیں۔ یعنی اس آیت میں مخاطب رسول اللہ ہیں کہ آپ کو حال بحال عروج ہوگا۔ یہ مطلب ضعیف ہیں۔ دوسرا مطلب جو بہت واضح ہے یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے کہا طبقاً عن طبق کا معنی ہے حالاً بحال اور یہ بات رسول اللہ صلعم نے فرمائی ہے۔ اس مطلب کی تائید مجاہد کے اس قول سے ہوتی ہے جس کو ابن جریر نے نہایت قابلِ وثوق راوی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے کہا طبقاً عن طبق قال یعنی نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم یقول حال بعد حال۔ اس تشریحی قول کے بعد اول مطلب کا ضعف ظاہر ہے۔

بہر حال طبقاً عن طبق کی تفسیر حالاً بحال۔ سے حضرت ابن عباس نے فرمائی اسی کو مجاہد، ضحاک، حسن بصری اور مرۃ الطیب نے اختیار کیا۔

صحیح مسلم میں حضرت انس کی ایک حدیث آئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بعد کو آنے والا سال پہلے سال سے برا ہوگا۔ حضرت انس کی اس حدیث کو حضرت ابن عباس کی حدیث کی توضیح بعض علماء نے قرار دے کر آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ تم طبقہ در طبقہ بدلتے رہو گے۔ ہر پچھلا زمانہ گذرے زمانے سے بدلا ہوا ہوگا۔ سب سے بہتر زمانہ رسول اللہ صلعم کا تھا اس کے بعد زمانہ عہد صحابہ پھر دور تابعین پھر یونہی انحطاط در انحطاط ہوتا رہے گا۔ اس مضمون کی ایک اور حدیث مشہور بھی ہے جس کے اکثر طریقے طحاوی نے جمع کر دیئے ہیں۔ اس فقیر کو یہ توضیح کچھ پسند نہیں اور وجہ ظاہر ہے۔ آیت کے الفاظ اس مفہوم پر دلالت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اول تو لفظ رکوب ہے جو سفر پر دلالت کر رہا ہے دوسرے لفظ طبق ہے جو عروج وصعود کی طرف۔ اشارہ کر رہا ہے توضیح مذکور کو اگر صحیح مان لیا جائے تو یہ تغیر بصورتِ تنزل وانحطاط ہوگا۔ اس میں حرکت ہبوطی ہوگی صعودی کیسے ہوگی۔ صحیح مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں ابتدائے استقرار نطفہ سے وقت موت تک جو تغیرات ہوتے ہیں وہ ناقابلِ انکار ہیں۔ حالات کا یہ تبدل بدیہی ہے اور اس تغیر کا رو بہ ترقی ہونا بھی ظاہر ہے جسمانی، شعوری، ادراکی ہر

حالتِ ترقی کی طرف میلان کی ایک تصویر ہے جس طرح آسمان کا ہر طبقہ دوسرے طبقے سے بلند ہے اور عمارت کی ہر منزل زیرین منزل سے اونچی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کی ہر آنے والی تخلیقی حالت کا درجہ گذشتہ درجہ سے جسمانی پختگی، پٹھوں کی سختی، شعور کی افزونی اور ادراک کی وسعت کے اعتبار سے زیادہ ہوتا ہے۔ جاہل عالم، کافر مومن ہر شخص اس کو جانتا اور مانتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کا سورج ڈوبتا ہے اور گزشتہ سفر کو ہم آئندہ سفر کے لئے دلیل بنا سکتے ہیں۔ حالتِ سابقہ حالتِ لاحقہ کی علت ہے اور مستقبل ماضی کا نتیجہ۔ جب علت و معلول اور مبادی و نتائج کا یہ سلسلہ واضح ناقابلِ انکار ہے تو یہ دلیل اور پیش خیمہ ہے اس بات کا کہ انسان آئندہ بھی یوں ہی درجہ بدرجہ اور منزل بمنزل چڑھتا جائے گا۔ پس مرنے کے بعد انسان کی حالت شفق کی طرح ہوگی۔ شفق کے وقت دن کی روشنی جا چکتی ہے۔ کچھ خفیف آثار باقی رہتے ہیں۔ کسی قدر جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سامنے سے اندھیرا آتا دکھائی دیتا ہے جو بہت ہی کم وقت میں چھا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد تھوڑی مدت تک انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ زندگی کا کچھ اثر۔ بدن سے کچھ علاقہ۔ عزیزوں اور دوستوں سے لگاؤ باقی رہتا ہے۔ مردہ اس وقت زندوں کی مدد کا محتاج اور منتظر ہوتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ میں ابھی مرا ہی نہیں اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کہتا ہے دعونی اصلی مجھے نماز پڑھنے دو۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس وقت مُردے کی حالت ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہوتی ہے جو بچنے کے لئے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ مُردے کو بھی اس وقت زندوں سے آس لگی رہتی ہے، اس لئے نماز، دعا اور ایصالِ ثواب کے مختلف طریقوں سے اس کی مدد کی کوشش کی جاتی ہے۔ غروبِ شفق کے بعد ہر طرف تاریکی چھا جاتی ہے۔ حرکت میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ مشاغلِ نہار ختم ہو جاتے ہیں۔ حواس سے کام لینے کا وقت آخر ہو جاتا ہے۔ ہر جاندار بسیرا کرتا ہے۔ انسان دن بھر کے کام کا جائزہ لیتا ہے۔ تمام اچھے برے کاموں کی صورتیں دماغ میں حاضر ہوتی ہیں۔ نفع نقصان کی شکل اجمالی طور پر سامنے آنے لگتی ہے۔ نفع کی شکل کو دیکھ کر خوشی اور نقصان کی صورت دیکھ کر دماغی رنج ہوتا ہے کامیاب کو اپنی کامیابی اور ناکامیاب کو اپنی ناکامی مصور دکھائی دیتی ہے، مگر دھندلی جس کے نقوش ابھرے ہوئے نہیں ہوتے۔ یہی حالت انسان کی اس وقت ہوتی ہے جب زندگی کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ موت کی گھٹا ٹوپ اندھیاری زندگی کی یاد مٹا دیتی ہے۔ عزیزوں اور دوستوں سے رشتہ بالکل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام مرغوبات و مکروہات سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ البتہ زندگی کے اچھے برے سارے کام سمٹ کر جمع ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ عدم کی رات زندگی کے ہر عمل کو اکٹھا کر دیتی ہے اور اس برزخی دور میں کی ہوئی نیکی کی صورت دیکھ کر آدمی کو اجمالی مسرت اور ایک طرح کی اہتزازی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور گناہ کی مکروہ شکل کو دیکھ کر دکھ اور اذیت ہوتی ہے۔ مگر دن کو کیا ہوا کام اچھا یا برا رات کو اپنی شکل اور کیفیت بدل نہیں سکتا۔ اسی طرح حالتِ حیات کے اعمال میں اس وقت تغیر نہیں ہو سکتا عمل کا زمانہ ختم ہو چکتا ہے۔ نتائج کا مجمل خاکہ سامنے آنے لگتا ہے۔ یہ برزخی دور یونہی گزرتا جائے گا۔ انکشافِ نتائج اور ظہورِ ثمرات درجہ بدرجہ اور طبق در طبق اور حال در حال ترقی کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ برزخی پردہ بھی اٹھ جائیگا اور اعمال پوری تفصیل کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ حقیقت جلوہ گر ہو جائے گی۔ چودھویں کی چاندنی نمودار ہو جائے گی۔ اس سے آگے اور اس سے بڑھ کر ظہور و انکشاف کا کوئی درجہ نہ ہوگا۔ جب اعمال بالکل واضح ہو جائیں گے اور آدمی بحکیم الٰہی اپنے ہر عمل کی اصلی شکل دیکھ لے گا اور زندگی کے ہر عمل کا جائزہ حاصل ہو چکے گا تو نتائج مطابق اعمال سامنے آئیں گے اور ہر شخص کو اصلی مستقر تک پہنچا دیا جائے گا لیکن یہ صعودی حرکت پھر بھی باقی رہے گی۔ عذاب کی طرف یا ثواب کی طرف دکھ کی جانب یا سکھ کی جانب۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اہلِ ایمان کے لئے رفتہ رفتہ کتنے نوری حجاب اٹھائے جائیں اور اہلِ کفر کو کتنے ناری پردوں میں لپیٹا جائے۔ مگر ہوگی بہرحال ہر شخص کی ترقی کی جانب حرکت۔

بہر چودھویں کا چاند قیامت کا چاند ہوگا جو روزِ زندگی کے ہر کام کو اجاگر کر دے گا۔ برزخی اندھیاری نے مشاغلِ زندگی کی تصویروں کو سمیٹ کر جو جمع کر دیا تھا ان سب تصویروں کے تمام نقوش چاندنی میں واضح طور پر دکھائی دیں گے۔ آخر چاند کی روشنی سورج کی روشنی کا ہی تو عکس اور پرتو ہوتی ہے۔ سورج کی جیسی روشنی ہوگی ویسی چاند سے ظاہر ہوگی۔ برزخ زمین جو کسی قدر دونوں کے درمیان حائل تھی اور جس کی وجہ سے شعاعِ آفتاب کامل طور پر عکس ریزی سے قاصر تھی۔ جب وہ پردہ ہٹ گیا تو آفتاب زندگی کی پوری شعاعیں اپنی حقیقت اور کیفیت قیامت کے چاند پر پرتو افگن ہوں گی اور ہر کیا ہوا کام اصلیت کے لباس میں واضح طور پر نمودار ہو جائے گا۔

جب انسانی حیات و موت کی یہ دوڑ بدیہی ہے اور روحِ انسان کی ہمہ وقت حرکت رو بہ ترقی ہے تو اس حرکت کو موت پر ختم سمجھنا اور ماضی

کو دلیل مستقبل نہ قرار دینا اور قیامت کا اقرار نہ کرنا نادانی ہے۔ چار و ناچار ہر شخص انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے خالق اور رب کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔
فما لھم لا یؤمنون۔ پس کیا وجہ کہ لوگ دوسری زندگی کو نہیں مانتے اور اعمال کے حساب کتاب کا یقین نہیں رکھتے اور اس لقینی سفر کو سچ نہیں جانتے۔ آخر قرآن ان سے اور کیا کہتا ہے صرف یہی بات تو کہتا ہے کہ مرنے پر زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ سفر کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اعمال نتائج سے بے بہرہ نہیں ہیں جس طرح موجودہ اور گذشتہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے اسی طرح مابعد موت کی ہر حالت ماقبل موت کی ہر حالت سے مربوط ہے۔ اس لئے زندگی کی زمین میں عمل کے اچھے بیج کی کاشت بروقت کر لی جائے تاکہ فصل کٹنے کے وقت حاصل کاشت اچھا ملے۔ اسی واضح حقیقت کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ پھر کیوں

واذا قرئ علیھم القرآن لا یسجدون۔ جب قرآن ان کو سنایا جاتا ہے تو نہیں مانتے اس کی صداقت کا اقرار نہیں کرتے اور سر افگندہ ہو کر اطاعت و تسلیم کا مظاہرہ نہیں کرتے اور اللہ کی ربوبیت اعلیٰ یعنی عدم سے روز وجود میں لاکر رفتہ رفتہ ترقی دے کر شب برزخی میں پہنچا کر اصلی مستقر تک لے جانے کو تسلیم نہیں کرتے۔

بل الذین کفروا یکذبون بلکہ یہ منکر حقیقت و صداقت قرآن کو جھوٹا قرار دیتے ہیں اور روز قیامت کی جزا سزا کو نہیں مانتے۔
واللہ اعلم بما یوعون جو کچھ یہ کافر اپنے دل و دماغ کے برتنوں میں بھرتے اور بھر کر رکھتے ہیں اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ قیامت کا انکار، قرآن کی تکذیب، گناہوں کی محبت، آیات الٰہیہ سے نفرت، مال و اولاد کی رغبت، اعمال صالحہ سے کراہت۔ یہ کافروں کا مخفی سرمایہ ہے جس کو دل و دماغ کے خانوں میں انہوں نے جگہ دی ہے۔ اور متاع عزیز سمجھ کر چھپا کر رکھا ہے، لیکن اللہ ان کے اندرونی اسرار سے خوب واقف ہے جب وقت آئے گا تو ان کا یہ سارا سرمایہ کھولا جائے گا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ رات کے اندھیرے میں جس سانپ کو پھولوں کا گجرا سمجھ کر زیب گلو کیا تھا وہ ہلاکت آفرین افعی تھا یہ لوگ اپنے سرمایہ کو سامان راحت و سرور

فبشرھم بعذاب الیم سمجھے ہوئے ہیں لہٰذا ان کو عذاب الیم کی بشارت دے دو۔ مرنے کے بعد ان کا یہ سرمایہ سرور و راحت سامان رنج و الم بن جائے گا۔

الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت لھم اجر غیر ممنون۔ ہاں نیکو کار اہل ایمان کو عذاب کی بشارت نہ دو ان کے لئے دوامی اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔ زندگی کے بہت اوقات ایسے گذرتے ہیں کہ آدمی اعمال صالحہ کامل طور پر ادا کرنے سے عاجز ہوتا خواب سفر اور نادانستہ غفلت اس سلسلے کو کاٹ دیتی ہے اور موت سے تو پوری زندگی ہی کا سلسلہ کٹ جاتا ہے، لیکن اللہ کی رحمت کہ خواب، اور دوسرے موانع سے پہلی حالت کا اعتبار کرتے ہوئے اللہ نے عمل صالح کے اس انقطاع کو تسلسل کے حکم میں برقرار رکھا اور اجر غیر منقطع کا وعدہ فرمایا۔
لا یسجدون پر سجدہ تلاوت امام اعظم کے نزدیک واجب ہے۔ کیونکہ سجدہ نہ کرنے والوں کی اس آیت میں مذمت فرمائی ہے اور اللہ کی طرف سے مذمت صرف ترک امر پر ہوتی ہے۔ قرآن میں جہاں سجدۂ تلاوت کا حکم ہے وہاں یا سجدہ کرنے والوں کی مدح کی گئی ہے یا نہ کرنے والوں کی مذمت۔ یہ دونوں قرینے ہیں اس بات کے کہ سجدۂ تلاوت ہر آیت سجدہ پر واجب ہے۔ عموماً شوافع اور احناف میں سے طحاوی سجدۂ تلاوت کو مسنون قرار دیتے ہیں۔
حضرت ابوہریرہ نے اس جگہ سجدہ کیا اور ابو رافع کے سوال کے جواب میں فرمایا میں نے حضرت ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سجدہ کیا ہے تو ہمیشہ مرتے دم تک سجدہ کرتا رہوں گا (بخاری و مسلم)
دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا ہم نے رسول اللہ کے ساتھ سورۂ اذا السماء انشقت اور سورۂ اقرأ باسم ربک الذی خلق میں سجدہ کیا ہے (رواہ مسلم و اصحاب السنن)

مقصود بیان قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا۔ زمین لمبی چوڑی اور ہموار ہو جائے گی کہیں عمارت یا ٹیلہ نہ ہوگا نہ گڑھا اور غار ہوگا۔ زمین کے اندر سے تمام دفینے، خزانے، معدنی قیمتی دھاتیں اور مردے باہر نکل پڑیں گے۔ دونوں جگہ حقت کا لفظ بتا رہا ہے کہ کائنات علوی و سفلی کا انقلاب تحقیقی ہے۔ اسی لئے ان کائنات میں انقلاب کو قبول کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں نہ داخلی نہ عارضی نہ اندرونی

نہ بیرونی۔ پس جھوٹے ہیں وہ یونانی فلاسفر اور ان کی کورانہ تقلید کرنے والے مسلمان عالم جو آسمانوں کے پھٹنے اور ٹوٹنے کو محال سمجھتے ہیں

آیت یا ایہا الانسان سے ثابت ہو رہا ہے کہ ہر شخص دانستہ یا نادانستہ اپنے مرکز کی طرف کو دوڑا جا رہا ہے۔ استقرار نطفہ سے لے کر وقت موت تک انسانی زندگی آہستہ آہستہ یا تیزی کے ساتھ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں ہے اور یہ فطری رفتار ہے جو ناقابل انکار ہے۔ پس موت کو آخری منزل سمجھنا بے وقوفی ہے۔ یہ فرودگاہ ہے، موقف راہ ہے منزلِ مقصود نہیں۔ موت ایک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر۔ فلا اقسم سے اذا تسق تک زندگی کے تصورات، برزخ کے تغیرات اور قیامت کی کیفیات کی طرف تمہیدی اشارہ کرنے کے بعد آیت لترکبن طبقا عن طبق سے رفتارِ حیات کی درجہ بدرجہ اور منزل بمنزل ترقی پر تبصرہ فرمایا ہے۔ لفظ لترکبن اور طبقاً سے مترشح ہوتا ہے کہ انسانی رفتار صعودی ہے۔ ہر قدم بالائی زینہ پر رکھا جا رہا ہے یا بقول بعض مفسرین یوں کہا جائے کہ آیت لترکبن میں امت اسلامیہ کے متعلق پیشین گوئی ہے۔ ترقی تنزل عروج زوال عمل صالح معصیت غرض ان تمام امور کی جو گذشتہ اقوام کو پیش آئے تھے۔ یہ امت بھی انہی کے قدم بقدم چلے گی۔ اس میں بھی اسی قسم کے معصیت کوش اور نافرمان پیدا ہوں گے جیسے اقوام پارینہ میں گذرے ہیں۔ وغیرہ۔

سورۃ البروج

اس سورت کا نام سورۃ البروج ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ قرطبی نے بلا خوف اس کا مکی ہونا لکھا ہے۔

اس میں ۲۲ آیات۔ ۱۰۹ کلمات اور ۴۵۸ حروف ہیں (سراج) حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ عشاء کی نماز میں والسماء ذات البروج اور والسماء والطارق پڑھا کرتے تھے (رواہ احمد)

حضرت جابر بن سمرہ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ ظہر اور عصر کی نمازوں میں والسماء والطارق اور والسماء ذاتِ البروج پڑھتے تھے (احمد، دارمی، ابوداؤد، نسائی، ترمذی) اور ان دونوں کی مانند سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ (الحاوی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ قُتِلَ اَصْحٰبُ

قسم ہے برجوں والے آسمان کی (اور قسم ہے) وعدہ کئے ہوئے دن کی اور حاضر ہونیوالے کی اور (قسم ہے) اس (دن) کی جس میں حاضری ہوتی ہے کہ

الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ

خندق والے یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہوئے جس وقت وہ لوگ اس (آگ) کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ

بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ

(ظلم و ستم) کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اسکے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست سزاوار

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

حمد ہے ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں اور زمین میں اور (آگے ظالموں کیلئے عام وعید ہے اور مظلوموں کیلئے عام وعدہ ہے) اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے

فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ

جنہوں نے مسلمان مردوں کو اور عورتوں کو تکلیف پہنچائی (اور) پھر توبہ نہیں کی تو ان کیلئے جہنم کا عذاب ہے اور (جہنم میں بالخصوص) ان کیلئے جلنے کا عذاب ہے

الْحَرِيقِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اُن کے لئے (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری

الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ

ہوں گی (اور) یہ بڑی کامیابی ہے آپ کے رب کی دار و گیر بڑی سخت ہے وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے

وَيُعِيدُ ۝ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ۝

اور وہ دوبارہ (قیامت میں) بھی پیدا کریگا اور وہی بخشنے والا اور بڑی محبت کرنیوالا ہے عرش کا مالک (اللہ) عظمت والا ہے وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ

کیا آپ کو ان لشکروں کا قصہ پہنچا ہے یعنی فرعون اور ثمود کا بلکہ یہ کافر تکذیب میں لگے ہیں اور (انجام کار اسکی سزا

وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ۝

بھگتیں گے کیونکہ) اللہ انکو ادھر ادھر سے گھیرے ہوئے ہے بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے

تفسیر آفتاب نے اپنی سیرگاہ اور دائرہ حرکت میں چلنا شروع کیا ۔ برج حمل سے سیر کا آغاز کیا ۔ خشک درختوں میں پتیاں پھوٹنے لگیں ۔ زرد اور سبز کونپلوں کا ہرا پیلا لباس ننگی شاخوں نے پہنا ۔ طرح طرح کے پھول کھلنے لگے ۔ ہر آدمی اور جانور کے بدن میں نئے خون کا دوران تیز ہوگیا ۔ موسم بہار آگیا ۔ ایک مہینہ کے بعد آفتاب برج ثور میں پہنچا ۔ اب تو بیلا ، موتیا ، مدن بان اور قسم قسم کے پھولوں سے باغ مہکنے لگے ۔ درختوں کی پتیاں بالکل سبز ہوگئیں اور بہار کا شباب آگیا ۔ ایک مہینہ تک یہی حالت رہی ۔ چلتے چلتے سورج برج جوزا میں پہنچا ۔ بہار کا شباب ڈھلنے لگا ۔ سبزہ میں خشکی ، ہرے درختوں پر افسردگی اور ہر طرح کے پھولوں میں پژمردگی آنے لگی ۔ عروس بہار بوڑھی ہوگئی ۔ ایک مہینہ بچپن کا گذرا ۔ ایک مہینہ جوانی کا اور ایک مہینہ پیری کا ۔ آخر موت کا وقت آگیا ۔ سدا رہے نام اللہ کا ۔ چوتھے مہینے سورج برج سرطان میں پہنچا ۔ ہوا گرم ہوگئی ۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے ، زمین سے خاک اُڑنے لگی ، چشمے اور دریا کچھ سوکھ گئے ۔ کچھ ساتھیوں کے غم میں روتے روتے رہ گئے ۔ ساری فضا تابناک ہوگئی ۔ دھرتی کا ذرہ ذرہ العطش پکار اٹھا ۔ یوں ہی ایک مہینہ گزر گیا ۔ پانچواں مہینہ آیا سورج برج اسد میں پہنچ گیا ۔ دھوپ میں آگ برسنے لگی ۔ ہرن کالے پڑ گئے ۔ آدمیوں کی کھوپڑیاں کھولنے لگیں ، ہوا کا دم گھٹ گیا ۔ اگر کوئی جھونکا کہیں سے آگیا تو مردوں میں جان پڑ گئی ۔ یہ گرمی کا شباب تھا ۔ غریب کی جوانی آئی اور گئی ۔ پیری کے آثار نمودار ہو گئے ۔ چھٹے مہینے کا منہ دیکھنے لگا ۔ آفتاب برج سنبلہ میں پہنچا ۔ پسینہ میں خشکی آنے لگی ۔ پیاس میں کمی ہونے لگی ۔ زمین کے اندر سے نمی اوپر کو ابھرنے لگی ۔ خشکی کی موت آنے لگی ۔ آخر ایک مہینہ میں گرمی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی ۔ گرمی کی بے جان نعش پر آسمان نے آنسو بہانے شروع کئے ۔ آفتاب برج میزان میں آیا بارش کی ہوائیں چلنے لگیں ، سمندروں سے مان سون اٹھنے لگے ۔ آج یہاں اور کل وہاں ابر باراں برسنے لگا ۔ باغوں اور کھیتوں اور چراگاہوں کے مردے زندہ ہونا شروع ہو گئے ۔ آج یہ اٹھا کل وہ ابھرا پرسوں اس نے انگڑائی لی ۔ غرض یونہی سوتے ہوئے جاگنے لگے اور مردے زندہ ہونا شروع ہوئے ۔ ایک مہینہ اسی ہیجان کی فضا میں گزر گیا ۔ یہ برسات کا آغاز تھا ۔ اس بچہ نے جوانی کی طرف بڑھنا شروع کیا ۔ آفتاب برج عقرب میں پہنچا ۔ طفل کیہ ماہ جوان ہو گیا ۔ فضا میں برنائی آگئی ۔ جنگل ہرا دل ہو گئے ۔ سب بے جان جاندار ہو گئے ۔ ہر بے جان سبزہ روح زندگی پاکر لہلہانے لگا ۔ زمین کے جس حصہ میں جو قابلیت تھی ویسا ہی سبزہ اس سے پھوٹ نکلا ۔ جنگل کی ہریالی کے عکس نے فضائی لہروں کو بھی ہرا کر دیا ، لیکن

سرسبز ہوئے پتھر اور ناقابل ریگستان قدرت کی اس جان بخشی سے پھر بھی محروم رہے۔ نہ پانی ان کے لئے زندگی بخش ثابت ہوا نہ نمناک ہوائیں نہ جان آفرین سورج کی کرنیں۔ محروم ازلی کو کون زندگی دے سکتا ہے۔ آخر دھرتی کا یہ شباب بھی ایک مہینے تک رہا اور کھولت کا سن آگیا۔ سورج برج قوس میں پہنچا۔ بارشیں تھم تھم کے پڑنے لگیں چھم چھم نہ رہی۔ بادل کی رگوں سے ہواؤں نے آخری بوندیں نچوڑنی شروع کر دیں یا یوں کہو کہ پیری شباب پر آنسو بہانے لگی۔ آخر اسی بوندا باندی میں کا جنگی میں برسات ختم ہو گئی اور خشکی کے اسی بھوت نے منہ چڑانا شروع کیا جس نے زمین کی ساری بہار کو اپنا لقمہ بنایا تھا اور جس نے عروس ربیع کا ہر زیور لوٹا بلکہ زیور اور سنگھار بھی چھین لیا تھا، لیکن یہ بھوت بہروپیہ کی شکل میں دوسرا لباس پہن کر نمودار ہوا تاکہ پہچانا نہ جائے۔ آفتاب نے برج جدی میں قدم رکھا سردی کا آغاز ہوا۔ زمین کی قوت بالیدگی پہلے مہینے میں ختم ہو چکی تھی۔ اب روئیدگی کی طاقت بھی سلب ہو گئی۔ دھرتی کے سارے اعضا کمزور پڑ گئے۔ ہر سبزہ اور نونہال عفریت برودت کا مقابلہ کرتے لگا۔ مگر کسی مقابلے میں اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ سردی کے دیو نے ہر حملہ میں اس کو شکست دی۔ آخر ایک ماہ کے بعد مقابلہ کی تاب نہ لا کر ہر نونہال مارا گیا۔ سورج برج دلو میں داخل ہوا اور سردی کا لشکر پہاڑ کی ہر چوٹی پر راغ و باغ کے ہر ٹکڑے پر اور انسانی آبادیوں کی ہر کوٹھڑی اور کمرہ اور حجرہ پر قابض ہو گیا۔ اور جاڑے کے دیوتا کی حکومت کا ڈنکا ہر سمت بجنے لگا، لیکن ایک ہی مہینہ اس شہنشاہی کو گذرا تھا کہ سورج برج حوت میں پہنچا اور اس شاہی لشکر کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ آپس میں لڑتے لڑتے آج ایک مرا کل دوسرا بھاگا اور سیدھا قطب شمالی جا پہنچا۔ پرسوں تیسرا منہ موڑ کر کرۂ زمہریر میں پناہ گزین ہوا اس طرح سردی کی شاہنشاہیت ایک مہینہ میں برباد ہو گئی اور سورج کا دورہ پورا ہو گیا۔ ہر موسم کے دیوتاؤں اور حکمرانوں نے جیسا دوسروں کے ساتھ کیا تھا ویسا ان کے سامنے آیا۔ جیسے اعمال تھے ویسے نتائج بھگتنا پڑے۔ آسمان کی کسی گردش کو بقا نہیں۔ سورج کی رفتار کو ایک حالت پر قیام نہیں۔ سردی گرمی اور ربیع خریف کا تبادل تصادم اور مہاد کہ یک کتاب انقلاب ہے جس کی ہر سطر درس فنا دے رہی ہے۔ پس کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظام یوں ہی چلتا رہے گا۔ سورج کی رفتار کائنات میں یوں ہی ہلچل مچاتی رہے گی۔ اور خود ہر تغیر سے محفوظ رہے گا۔ برجوں والا آسمان یونہی سیرگاہ آفتاب بنا رہے گا۔ کائنات فضائی اور ارضی کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رکھے گا۔ اور خود ہر فنا سے محفوظ رہے گا۔ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ اس کو بھی تباہ ہونا پڑے گا۔ اس کی بھی ایک دن بربادی ہو گی۔ ایک مقرر وقت پر زمین و آسمان اور کل جہان تہ و بالا ہو جائے گا۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات ارضی و فضائی کے ذرّے ذرّے کو تو اس کے کرتوت کی سزا جزا ملے (جیسی کہ مل رہی ہے) اور خود مختار ذی شعور، صاحب ارادہ انسان اعمال کی جزا سزا سے بے نیاز رہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو زیادہ قابل باز پرس ہے۔ یقیناً بلاشک و شبہ انسان کو ایک روز حاضر کیا جائے گا۔ اس کے اعمال اس کے سامنے ہوں گے۔ جن کی شہادت فرشتے بھی دیں گے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور ناک کان بھی دیں گے اور وہ خود بھی دے گا۔

پس قسم ہے اسی برجوں والے آسمان کی جو کائنات ارضی و فضائی میں نیرنگیاں پیدا کر رہا ہے اور خود بھی فنا کی مورتی ہے اور قسم ہے اس مقررہ دن کی جس میں یہ نظام شمسی تباہ ہو جائے گا بلکہ ہر کرہ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور قسم ہے انسانی اعمال پر شہادت دینے والے ملائکہ کی اور ہر شاہد کی اور انسانی کردار کی جس پر خود اس کے جسمانی اعضا شہادت دیں گے کہ قیامت کے دن ہر مردہ کو زندہ کیا جائے گا اور اعمال کی فہرست سامنے لائی جائے گی اور اس زندگی کا فیصلہ کیا جائے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ آخر کسی کو وہم و گمان سے بھی زیادہ سکھ نصیب ہو گا اور کوئی عذاب حریق میں ہمیشہ جلتا رہے گا۔ اس زمین پر بھی انسانی اقتدار کی کائناتی موسموں کی طرح تین حالتیں آتی رہی ہیں۔ قوموں کے بچپن کا زمانہ گذرا ہے اور جوانی کا بھی اور پھر پیری کا بھی۔ آخر موت آ گئی۔ اور قوموں کے نام نشان مٹ گئے۔ خندقوں کو آگ سے بھر کر اہل ایمان کو اس میں جھونکنے والے یمن کے یہودی حکمران یوسف ذونواس اور اس کے ساتھی کہاں گئے۔ ناقۂ صالح کے خون سے ہاتھ رنگنے والے ثمود جو پتھروں کو لکڑی کی طرح تراش کر پہاڑوں میں رہتے اور کوس لمن الملکی بجاتے تھے کیا ہوئے۔ اور قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا کر مدتوں تک ان سے خدمت لینے والے فرعون اور فرعونی کدھر چلے گئے۔ موت کی آندھی کا ایک جھونکا سب کو سمیٹ کر لے گیا اور نام نشان مٹا گیا۔ مگر ان کے برے کرتوت باقی ہیں، ان کے روزنامچے موجود ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ سب اٹھایا جائے گا۔ روزنامچوں کی شہادت لی جائے گی۔ روزنامچے لکھنے والے فرشتے گواہی دیں گے اور خود ان کے اعضاء زندگی کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ قرآن کا کوئی فیصلہ ہے جو اٹل اور ناقابل تغیر ہے۔ قرآنی فیصلے انسانی ہاتھوں کے ساختہ پرداختہ نہیں کہ بدل جائیں بلکہ

الٰہی فیصلے ہیں۔ بااقتدار، پرجبروت، حکمرانِ مطلق شہنشاہِ کائنات کے فیصلے ہیں جو ہر تغیر و تبدل اور مخلوق کی دست رس سے محفوظ ہیں۔ اس لازوال ضابطۂ الٰہی سے نہ گذشتہ قومیں بچ سکی ہیں نہ موجودہ طاقت ور مغرور سرکش انسان بچ سکتا ہے۔ قریش ہوں یا کوئی قوم۔ قانونِ الٰہی اور فیصلۂ قرآنی سب پر لاگو ہے۔ اہلِ ایمان کو دکھ پہنچانے والے ظالم بھی محفوظ کبھی نہیں رہ سکتے۔ بس گذشتہ غلط کاریوں کے ازالہ کی بس ایک شکل ہے اور وہ یہ کہ اللہ کو اپنی مخلوق سے اتنی محبت ہے کہ کسی مخلوق کو مخلوق سے نہیں، اس لئے وہ جرم پوش عذر نیوش ہے۔ توبہ کے بعد ہر گناہ کو معاف کر دے گا۔ توبہ ہی گناہ کو مٹانے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ سچی توبہ کرنے والوں کو نیکوں کے گروہ کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ضابطۂ قدرت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ بروج والے آسمان کی قسم۔ منہال بن عمرو نے کہا بروج کا معنی ہے خلق، زینت، سجاوٹ یعنی زینت والے آسمان کی قسم۔ عکرمہ اور یحییٰ بن رافع نے کہا بروج آسمان میں قصر ہیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، حسن بصری، قتادہ اور سدی کا قول ہے بروج ستارے ہیں (ابن کثیر)۔ مجاہد نے یہ بھی فرمایا یہ بارہ بروج ہیں۔ برج کو قصر سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح قصر میں آدمی اترتے ہیں اسی طرح برج میں سیارے اترتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا بروج آسمان کے دروازے ہیں۔ (سراج) ایک روایت میں مجاہد کا قول بھی عکرمہ کے قول کی طرح آیا ہے کہ بروج آسمان میں قصر ہیں (فتح البیان) ابو عبیدہ اور یحییٰ بن سلام نے کہا کہ بروج کواکب کی منزلیں ہیں۔ حقیقت میں منہال کے قول کو چھوڑ کر باقی اقوال میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ بروج واقع میں ستارے ہیں اور چاند سورج کی فرودگاہیں اور منازل سیر بھی ہیں اور فرودگاہ ہونے کے لحاظ سے ان کو قصر بھی کہا جا سکتا ہے، اس لئے حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے نہ منزل شمس و قمر ہونے سے بروج کے ستارہ ہونے کی نفی ہوتی ہے نہ ان کو کواکب قرار دینے سے فرودگاہ مہر و ماہ ہونے کا انکار لازم آتا ہے۔ ابن خیثمہ نے کہا صحیح یہ ہے کہ بروج شمس و قمر کی فرودگاہیں ہیں اور بارہ ہیں۔ ہر برج میں آفتاب ایک ماہ رہتا ہے اور چاند ہر برج میں ۲⅓ دن رہتا ہے اور دو روز چھپا رہتا ہے اس لئے چاند کی ۲۸ منزلیں ہوئیں (ابن کثیر)

انسانی نحوست سعادت، موت، زندگی، صحت، بیماری، امن، جنگ بلکہ اس زمین پر ہونے والے ہر حادثہ اور واقعہ کو اہلِ نجوم ستاروں اور سیاروں کی رفتار اور تاثیر سے وابستہ جانتے ہیں سیاروں کی رفتار کا قرآن منکر نہیں اور ان کی رفتار کو باذنِ الٰہی اگر حوادث کا سبب قرار دیا جائے تو اس کو تسلیم کرنے سے بھی نہ عقیدۂ شرک پیدا ہوتا ہے نہ مشابہت شرک لازم آتی ہے۔ یہ کارخانہ اور اس کی رفتار سلسلۂ اسباب سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اس کا نہ اسلام کو انکار ہے نہ اس کی تفصیل قرآن مجید اور احادیث مقدسہ میں بیان کی گئی ہے۔ صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کواکب سے آسمان کی سجاوٹ ہے۔ مسافروں کو ان سے راستہ معلوم ہو جاتا ہے۔ چاند اور سورج کو اللہ نے نورانی بنایا ہے۔ دن معاش کے لئے اور رات سکون حاصل کرنے کے لئے بنائی ہے۔ چاند کی رفتار اور گھٹنے بڑھنے سے حج کا وقت اور انسانی مشاغل کے زمانے کی رفتار معلوم ہوتی ہے اور سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے دنوں کا پتہ چلتا ہے۔ غرض ظاہر اور ناقابلِ انکار فوائد کو ان سیاروں سے وابستہ قرار دیا ہے جن کا قائل ہر عامی آدمی بھی ہے۔ باقی غور طلب امور تاثیرات کی کوئی توضیح نہیں کی۔ نہ کہیں انکار کیا۔ قرآن نہ فلسفۂ طبعیات کی کتاب ہے نہ فضائیات اور سماویات کی حقائق بیان کرنے والا کوئی حکمت نامہ لیکن اگر کوئی کائنات ارضی، فضائی اور سماوی پر غور کرے اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ جائے اور بعض چیزوں کو بعض نتائج کے پیدا ہونے کا سبب قرار دے تو قرآن کو اس کا انکار بھی نہیں۔ انکار تو اس بات کا ہے کہ نحوست، سعادت، کامیابی، ناکامی، ترقی، تنزل، بیماری، صحت اور موت و زندگی کا خالق، سببِ حقیقی اور علتِ تامہ اور فاعلِ مختار ستاروں سیاروں یا مادی غیر مادی طاقتوں کو قرار دیا جائے اور مشیتِ الٰہیہ کو ان اسبابِ ظاہری کے ہاتھوں میں مجبور و مقہور سمجھا جائے۔ اسی لئے مخبرِ صادق نے بارش کا عقیدہ رکھنے والوں کو مشرک قرار دیا۔ کیونکہ وہ لوگ ان ستاروں کے طلوع کو بارش ہونے کا سبب حقیقی جانتے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ بخارات سمندر سے اٹھتے ہیں، مان سون کی ہوائیں چلتی ہیں۔ بارش پیدا ہونے کے یہ طبعی اور قدرتی اسباب ہیں۔

ہاں یہ ضرور کہا ہے کہ زمین کے حوادث سیاروں کے حالات پر اثر نہیں ڈالتے۔ کسی کے مرنے سے چاند سورج کو گہن نہیں لگتا۔

اب جو مشرقی مغربی محقق ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی، قدیم نجومی ہوں یا جدید ماہرِ فلکیات اگر برجوں کو بارہ قرار دیتے ہیں اور ان کو شمس و قمر کی سیرگاہیں اور منازل کہتے ہیں اور نیچے ہونے والے حوادث کو ان کی رفتار سے وابستہ کرتے ہیں تو اسلامی عقیدہ میں اس کے تسلیم کرنے

سے کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی طرح جس طرح سورج کو روشنی بخشی حرارت آفرینی، چاند کو ضیاء، آگیں سکون افزا اور سیاروں کو مسافروں کا راہنما اور آسمان کے لئے سجاوٹ تسلیم کرنے سے شرک کی تو بھی نہیں آتی۔ ان تمام اسباب کی نتیجہ آفرینی باختیار خود نہیں بلکہ مالک الملک، حکمران مطلق منعم حقیقی کے حکم سے ہے، اسی لئے علماء اسلام نے رفتار نجوم اور تعداد بروج کا انکار نہیں کیا بلکہ چاند سورج کی فرودگاہیں قرار دیا ہے۔ یہ سیارے اور ستارے نہ خالق ہیں نہ رازق نہ حیات بخشی نہ موت، آفریں نہ صحت و بیماری کے دیوتا نہ نحوست، سعادت، علم، جہالت، کامیابی، ناکامی اور دوسرے حوادث کے ارباب فقط رب حقیقی اور خالق و رازق اللہ کے حکم کی تعمیل کرنے والے کارندے اور مجبور عاجز خدمت گزار ہیں اور قادر مطلق کی قدرت میں جکڑے ہوئے بے بس اسباب۔

رفتار نجوم کے ماہر کہتے ہیں کہ آفتاب کی گردش سے آسمان پر ایک دائرہ پیدا ہوتا ہے جس کو دائرۃ البروج کہتے ہیں۔ آفتاب اس دائرہ کو ایک سال میں طے کرتا ہے۔ آفتاب کی رفتار سے سال میں چار موسم پیدا ہوتے ہیں۔ ہر موسم کے احوال، کیفیات، پیداوار اور آثار دوسری فصل کے احوال سے بالکل جدا ہیں۔ گرمی، سردی، ربیع، خریف۔ چاروں موسم تین تین مہینے کے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک کی خصوصیات دوسرے کی خصوصیات سے واضح طور پر ممتاز ہیں۔ پھر ہر موسم کے بھی تین حصے ہیں۔ ابتدائی، وسطی، آخری۔ ابتدائی حصہ خصوصیات موسمی کے آغاز کا زمانہ ہوتا ہے۔ گزشتہ موسم کے چھوڑے ہوئے کچھ آثار بھی اس میں ہوتے ہیں اور آنے والے مہینے کا ہراول دستہ اور پیش خیمہ بھی ہوتا ہے۔ گویا موسم کے بچپن کا زمانہ ہوتا ہے جو لمحہ لمحہ ترقی کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ وسطی حصہ موسم کی جوانی کا ہوتا ہے جس میں موسم کی خصوصیات کامل طور پر نمایاں ہوتی ہیں۔ آخری حصہ موسم کی خصوصیات کا انحطاطی اور زوالی دور ہوتا ہے۔ اس طرح خصوصیات موسمی کا لحاظ کر کے پورے سال کے بارہ مہینے ہو گئے اور سیرگاہ آفتاب یا دائرۃ البروج کے بارہ حصے قرار پائے اور ہر حصہ کا نام برج ہوا۔ ہر برج میں آفتاب کا نزول ایک ماہ تک رہتا ہے۔ اول برج جہاں سے آفتاب کی سیر شروع ہوتی ہے اور موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے حمل کہلاتا ہے اس کے بعد ثور۔ پھر جوزا، اسی طرح سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت ایک کے بعد دوسرا بترتیب وار سیرگاہ مہر ہے۔

ہر برج میں آفتاب کی سیر ۳۰ دن رہتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر برج کو تیس حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ کا نام درجہ ہے۔ گویا درجہ نام ہوا ایک دن یا ۲۴ گھنٹے کا۔ پھر ہر درجہ کے ساٹھ حصے کئے گئے۔ اور ہر حصہ کا نام دقیقہ یا گھڑی ہے پھر ہر دقیقہ کے ساٹھ حصے کر کے ہر حصہ کا نام ثانیہ یا پل رکھا گیا پھر ہر ثانیہ کے ساٹھ حصے بنا کر ہر حصہ کو ثالثہ یا چھن کہا گیا۔

برج حمل کی شکل ۱۳ تاروں کے اجتماع سے بنی ہے۔ پانچ ستارے اور بھی اس برج سے تعلق رکھتے ہیں مگر برج کی شکل سے خارج ہیں۔ برج کی صورت بنانے میں ان کو دخل نہیں ہے۔

برج ثور ۲۳ تاروں سے بنا ہے اور اس کی ترکیبی صورت سے خارج مگر تعلق رکھنے والے کچھ اور تارے بھی ہیں جیسے ثریا اور عین الثور۔

برج جوزا کی صورت ۱۸ تاروں سے بنی ہے۔ سات تارے باہر ہیں مگر ہیں اس سے تعلق رکھنے والے جیسے ذراع اور نعیمہ۔

برج سرطان کی شکل ۹ ستاروں کے اجتماع سے بنی ہے۔

برج اسد کی تخلیقی صورت میں ۲۷ ستاروں کو دخل ہے اور کچھ تعلق رکھنے والے ستارے اس کی صورت سے باہر بھی ہیں جیسے زہرہ اور قلب الاسد

برج سنبلہ کی ترکیبی ساخت ۲۶ ستاروں سے ہے۔ کچھ خارجی تارے بھی اس سے متعلق ہیں جن میں نمایاں سماک اعزل ہے۔

برج میزان آٹھ تاروں سے بنا ہے۔

برج عقرب ۲۱ تاروں سے بنا ہے۔ قلب العقرب اور اکلیل وغیرہ ستارے اس سے خارج ہیں مگر تعلق رکھتے ہیں۔

برج قوس کی تشکیل ۳۱ تاروں سے ہوئی ہے۔

برج جدی کی تصویر ۲۸ تاروں سے بنی ہے اور سعد ذابح وغیرہ اس سے متعلق ہیں۔

برج دلو کی ساخت ۴۲ تاروں سے ہوئی ہے۔

برج حوت کی صورت کی تخلیق میں ۳۴ تاروں کو دخل ہے۔

یہ تمام برج تمام سیاروں کے گھر ہیں۔ کوئی کسی کا کوئی کسی کا۔ کوئی کسی سیارے کے لئے ہبوط ہے کسی کے لئے شرف۔ جس کی توضیح علم النجیم میں کی گئی ہے۔ اندرونی تاثیرات سے قطع نظر ان کا شمس وقمر کی فرودگاہیں ہونا اور فصول کے تغیرات ان کی وجہ سے نمودار ہونا ناقابلِ انکار ہے۔ موسموں کا تبادلہ کائنات ارضی میں سے ہر جاندار اور بے جان پر تدریجی یا انقلابی اثر ڈالتا ہے۔ معدنیات اور نظرات کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں اور مختلف دھاتوں کی مختلف خصوصیتیں گرمی اور سردی کے تغیر ہی کا نتیجہ ہیں۔ سبزہ کی نمو، نشو، جوانی اور فنا اور درختوں کی روئیدگی، بالیدگی، تناوری، ثمر آوری اور پھر خشک ہو کر جولہے اور تنور کا ایندھن بن جانا۔ سب گردشِ لیل ونہار کا کرشمہ ہیں۔ جانداروں کا جنینی دور، عہد طفولیت، ایامِ برنائی وتوانائی اور ذہول وپیری ہر چیز اور ہر حالت اسی حرارت وبرودت اور خزاں وبہار کے چکر کا فطری حاصل ہے۔ پس سماء ذات البروج کے یہ دورے دلیل ہیں اس بات کی کہ آسمان اور سیاروں کی یہ قدرتی رفتار اور فضائیات وارضیات میں اس سے پیدا ہونے والے آثار بھی استمراری نہیں۔ ان میں سے ہر چیز فنا پذیر ہے اور یوم انقلاب کو دعوت دے رہی ہے۔ اسی انقلاب کے ثبوت کے لئے برجوں والے آسمان کی شہادت پیش کی گئی ہے۔

والیوم الموعود اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یعنی روزِ قیامت کی قسم جس کا وعدہ ہر آسمانی کتاب میں کیا گیا ہے۔ باجماع علماء تفسیر الیوم الموعود سے مراد روزِ قیامت ہے۔ قیامت کا انقلاب ہی سب سے بڑا انقلاب ہوگا۔ ارضی کائنات کے تمام احوال کا انقلاب علویات کی تاثیر سے ہوتا ہے مگر آسمان اور ستارے انقلاب سے محفوظ نظر آتے ہیں۔ قیامت کے دن ان میں بھی شکست وریخت ہو جائے گی اور اس طرح سارا جہان ہی لٹ جائے گا۔ یوم موعود کی یہی عظمت تھی جس کی وجہ سے اس کی قسم کھائی۔ اس کے علاوہ یہ کہ جب تک سیاروں کی موجودہ رفتار باقی ہے۔ زندہ انسانوں کے لئے اچھے برے عمل کے دروازے کھلے ہیں، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ دروازے بند ہو جائیں گے اور پاداشِ عمل کا زمانہ آئے گا۔ یہی روزِ قیامت ہوگا، مگر ہر عمل کی جزا وسزا کے لئے ثبوت ضروری ہے اور ثبوت شہادت سے ہوتا ہے اور ہر ملزم کی ثبوت کے وقت حاضری بھی ضروری ہونی چاہیئے اور فہرست اعمال بھی اس کو سنانی لازم ہے اور حاکم کے سامنے موجود ہونے کی بھی حاجت ہوتی ہے، اسی لئے یوم موعود کی قسم کے بعد شاہد ومشہود کی قسم کھائی اور فرمایا۔

وشاھد ومشھود ان دونوں کا مصدر یا شہود ہے یا شہادت شہود کا معنی حاضر ہونا مشاہدہ کرنا اور شہادت کا معنی گواہی دینا۔ ہر معنی کے لحاظ سے تفسیری اقوال متعدد ہیں۔

اگر شاہد ومشہود کا مصدر شہود قرار دیا جائے تو شاہد کا معنی ہوا حاضر ہونے والا اور اس سے مراد انسان اور فرشتے اور جن ہیں۔ قیامت کے دن یہ سب مخلوق ترتیبی صورت میں حاضر ہوگی۔ اور مشہود کا معنی ہوا وہ چیز جس کے پاس حاضری دی جائے یا وہ چیز جس کا مشاہدہ کیا ہے۔

اچھے برے تمام اعمال ہر شخص کے ساتھ قیامت کے دن متشہد ہوں گے۔

عذاب ثواب کے فرشتے رنگا رنگ صورتوں میں سامنے ہوں گے۔

عرش کو اٹھانے والے اور آسمانوں پر رہنے والے فرشتے صف بستہ ہوں گے۔

اعمال کو لکھنے والے فرشتے بے حجاب نظر آئیں گے۔

اعمال نامے ہر شخص کو پڑھنے کے لئے دے جائیں گے۔

اعمال کی وزن کشی ہر شخص کے سامنے ہوگی۔

اللہ کی تجلی بے حجاب نظر آئے گی۔

دوزخ جنت اس دنیا میں مخفی ہیں قیامت کے دن پوشیدہ نہیں رہیں گی۔

مذکورہ بالا اشیاء میں سے ہر چیز مشہود سے مراد ہو سکتی ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام میں سے کسی نے کچھ مراد قرار دیا ہے اور کسی نے کچھ۔ ہر قول کے قائل کا نام اس جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا موجب طوالت ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے حضور نے فرمایا شاہد جمعہ ہے اور مشہود عرفہ۔ ابن ابی مالک اشعری سے بھی یہی مروی ہے (احمد، ابن جریر

ترمذی فی جامع السنن) ہر شہر میں جمعہ پڑھا جاتا ہے اور اس کی برکتیں حاضر ہوتی ہیں۔ عرفہ کے دن ساری دنیا کے حاجی حج کے لئے جمع ہوں گے۔ شاید اسی وجہ سے جمعہ کو شاہد اور یوم عرفہ کو مشہود قرار دیا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ جس دن عبادت کے لئے مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہو وہ مشہود ہے اور جمع ہونے والے مسلمان شاہد۔ اس قول پر جمعہ، عرفہ، عید اور یوم ترویہ سب مشہود کی فہرست میں داخل ہو جائیں گے۔

جن لوگوں نے شاہد و مشہود کو شہادت سے مشتق مانا ہے ان کے اقوال بھی مختلف ہیں۔ ہر ایک نے مختلف مراد بیان کی ہے مثلاً شاہد اللہ اور مشہود مخلوق ہے۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ کفیٰ باللّٰہ شہیدا (سالم بن عبد اللہ)

شاہد اللہ ہے اور مشہود توحید۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو (سعید بن جبیر وغیرہ)

شاہد اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں اور مشہود وہ لوگ جن کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وجاءت کل نفس معھا سائق وشہید

شاہد تمام پیغمبر ہیں اور مشہود یہ آیت فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید۔

شاہد انسان کے اعضاء ہیں اور مشہود آدمی کی ذات۔ اللہ نے فرمایا ہے یوم تشہد علیہم السنتہم وایدیہم وارجلہم۔

شاہد رات دن ہیں اور مشہود انسان کے اعمال (حسن بصری وغیرہ)

شاہد زمین آسمان ہیں اور مشہود آدمی کے اچھے برے کام جو زمین کے کسی حصہ پر آسمان کے نیچے کئے جاتے ہیں۔

شاہد رسول اللہ کی ذات مبارک ہے اور مشہود تمام امتیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا۔

شاہد سنگ اسود ہے اور مشہود تمام حاجی جو سنگ اسود کو چومتے ہیں۔ حدیث صحیح میں آیا ہے الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض یجیٔ یوم القیامۃ لہ عینان یبصر بہما ولسان ینطق بہ یشہد علی من استلمہ بحق۔ یعنی سنگ اسود زمین پر اللہ کا دست راست ہے۔ قیامت کے دن اس کی دونوں آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے اس شخص کے متعلق سچی شہادت دے گا جس نے اس کو چوما ہوگا۔

امام رازی نے ہر ذرۂ کائنات کو شاہد اور اللہ کی ذات وصفات کو مشہود قرار دیا ہے۔ ہر ذرہ اللہ کی ہستی، توحید، خلاقیت، ربوبیت، الوہیت اور تمام صفات کی شہادت دے رہا ہے۔

صوفیہ نے لکھا ہے کہ پرتو اندازی اور جلوہ افگنی کے لحاظ سے اللہ شاہد اور مخلوق مشہود ہے اور جلوہ طلبی کے لحاظ سے مخلوق شاہد اور اللہ مشہود ہے۔ ان اقوال کے علاوہ دوسرے تشریحی اقوال بھی ہیں جن کی نسبت مختلف علماء کی طرف کی گئی ہے، سب کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

بہرحال مراد کچھ بھی ہو شاہد و مشہود بہر صورت قابل قسم ہے۔ لیکن الیوم الموعود کے لحاظ سے اگر ملائکہ کو شاہد اور انسانی اعمال کو مشہود قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ انقلاب نظام اسی دار العمل میں ہوتا رہتا ہے، اس لئے سماء ذات البروج کی قسم کھائی اور انقلاب کامل قیامت کے دن ہوگا۔ جب عمل کی دنیا ختم ہو جائے گی اور نتیجہ سامنے آنے کا وقت ہوگا، اس لئے روز قیامت کی قسم کھائی اور قیامت کے دن اعمال فاسد پیش کئے جائیں گے اور فرشتے شہادت دیں گے جن کی شہادت پر عذاب ثواب کے فیصلے ہوں گے اس لئے ان کی قسم کھائی۔ واللہ اعلم۔

جواب قسم کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے اگلی آیت یعنی قتل اصحاب الاخدود کو جواب قرار دیا ہے۔

بعض نے کہا کہ کلام میں تقدیم تاخیر ہے۔ اصل کلام یوں تھا قتل اصحاب الاخدود والسماء ذات البروج الخ۔ مارے گئے خندقوں والے قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود اور قتادہ سے مروی ہے کہ قسموں کا جواب ان بطش ربک لشدید ہے۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ جواب قسم محذوف ہے جس پر آیت قتل اصحاب الاخدود دلالت کر رہی ہے۔ یعنی قسم ہے سماء ذات البروج کی اور یوم موعود کی اور شاہد و مشہود کی کہ مومنوں کو دکھ دینے والے ملعون ہیں جس طرح خندقوں والے ملعون ہوئے۔ شاہ عبد العزیز رحمہ نے ان الذین فتنوا الخ کو جواب قسم قرار دیا ہے۔

قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود اذ ھم علیھا قعود سے شھود تک۔ پوری سورت کا مضمون اور اس پر تفصیلی تبصرہ ہم تفسیر مقاصد میں لکھ چکے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے اس جگہ اصحاب الاخدود کا مختصر تذکرہ فرمایا ہے اور آخر سورت میں فرعون و ثمود کے قصوں کی طرف مجمل اشارہ کیا ہے اور اصحاب الاخدود کے قصہ کے بعد مومنوں کو ایذاء دینے والوں کو آتشیں عذاب سے ڈرایا ہے اور توبہ کرنے والوں کو مغفرت کا امیدوار بنایا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اہل حق کو دکھ دینے والے اور اہل صداقت پر ظلم کرنے والے بھی تباہی اور ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے۔ اُن کو قدرتی سزا دی جاتی ہے اور آخرت میں بھی ان کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ قصہ ہائے ماضیہ درس عبرت اور پیغام نصیحت ہیں موجودہ ظالموں اور آنے والے جفاکاروں کے لئے یہ ضابطۂ الٰہیہ اور صراحت قرآنیہ ہے جس کو کسی طرح بدلا نہیں جاسکتا۔ نزول سے پہلے کچھ ظالم تھے جنھوں نے خندقیں کھود کر آگ سے بھر دیا اہل ایمان کو ان میں جھونکا تھا اور خود خندقوں کے کنارے تماشا دیکھنے کے لئے آکر بیٹھ گئے تھے۔ ربیع بن انس اور واقدی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب الاخدود سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جن کو ظالموں نے آگ میں ڈال کر جلایا تھا مگر یہ قول صراحت قرآنی کے خلاف ہے۔ کیونکہ پورے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب الاخدود وہی تھے جو خندقوں کے کنارے سوختگان ایمان کے جلنے کی سیر کرنے کے لئے بیٹھے تھے پھر اصحاب الاخدود سے اہل ایمان کیسے مراد ہو سکتے ہیں۔

اہل ایمان نے نہ کسی کا خون کیا تھا نہ ملک و دولت حاصل کرنے کے لئے بغاوت کی تھی نہ کوئی اور کام موجب قتل کیا تھا۔ اگر قصور تھا تو یہ تھا کہ وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ۔ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ بس ان بیچاروں کو دکھ دینے اور انتقام لینے کی اگر کوئی وجہ تھی تو یہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ قصور اور جرم نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ پر ایمان رکھنے کے جرم میں کافروں نے اہل ایمان کو ہلاک کیا تو اللہ نے بے قصور اہل ایمان کی مدد کیوں نہیں کی۔ کیا خدا کمزور تھا یا وہ ظالم اس کے اقتدار سے باہر تھے یا خدا خود ہی ایسی نازیبا حرکتوں کا حامی ہے یا خدا کو اس واقعہ کا اس وقت علم نہیں ہوا۔ ان شبہات کو دور کرنے کے لئے فرمایا

العزیز الحمید الذی لہ ملک السموٰت سے علی کل شیء شھید تک۔ یعنی اللہ غالب ہے عاجز نہیں، عزت والا ہے ذلیل نہیں، طاقتور ہے کمزور نہیں۔ آسمانوں و زمینوں میں اُسی کا حکم چلتا ہے۔ سب ملک اُسی کا ہے اس کے اقتدار سے کوئی باہر نہیں۔ وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ایسا کہ اس کو جاسوسوں اور مخبروں کی بھی ضرورت نہیں۔ کائنات کی ہر چیز کا مشاہدہ وہ خود کرتا ہے۔ اس کا علم حضوری ہے حصولی نہیں پھر اس کا ہر قول و عمل ستائش کا مستحق ہے ناسزا اور غیر محمود نہیں۔ اہل ایمان کو سوختہ چھوڑ دینے اور کافروں کو ان پر دسترس عطا کرنے میں اس کی کوئی ایسی مصلحت تھی جو اس سختی کو بھی محمود بنا دیتی تھی۔ مثلاً عمومی درس عبرت، اس واقعہ سے متاثر ہو کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مومن بنا دینا، اہل ایمان کو اجر شہادت عطا کرنا، منافقوں پر اپنی حجت کو تمام کرنا، مسلمانوں کی ثابت قدمی دکھا کر آنے والے مسلمانوں کو صبر کی تعلیم دینا اور عزم و ثبات کی تلقین کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بکثرت فوائد ہیں جن کے پیش نظر اللہ کے اس فعل کو کبھی غیر محمود نہیں کہا جا سکتا۔

اصحاب الاخدود کون تھے؟

قدیم سے دستور چلا آیا ہے کہ ظالم انسان اپنی ستم گار طبیعت کی پیاس بجھانے کے لئے ظلم کے نت نئے طریقے ایجاد اور استعمال کرتا رہا ہے۔ کسی بادشاہ نے دشمن کو دیوار میں چنوا دیا۔ کسی نے زندہ زمین میں دفن کرا دیا۔ کسی نے کھولتے تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوا دیا۔ کسی نے پیر بغل کر کے صلیب پر لٹکوا دیا اور کسی نے زمین میں خندق کھدوا کر اس میں آگ بھروا کر اس میں پھینکوا دیا۔ دریا میں ڈبونا اور پہاڑ سے گرانا بھی اسی زمانہ کی اختراع ہے۔ ایسی ظلم کیش طبیعت رکھنے والے بادشاہ اور ڈاکو ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ قرآنی قصے کا کس ظالم سے تعلق ہے اس کی تعیین کے لئے اہل تفسیر نے مختلف روایات بیان کی ہیں۔ پوری روایات نقل کرنے سے کئی جز اوراق سیاہ کرنے پڑیں گے۔ ہم مختصراً چند روایات لکھتے ہیں۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا فارس کے کسی بادشاہ نے بہن اور بیٹی سے نکاح جائز قرار دیا تھا۔ لوگوں نے اس حکم کو نہ مانا اس نے منکروں کو مذکورہ سزا دی۔ آیت میں وہی بادشاہ اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔ خطیب نے سراج میں اس روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا فارس والوں کے پاس آسمانی کتاب تھی جس پر وہ عمل کرتے تھے۔

فارس کی تاریخ اب تک گوشۂ خمول میں ہے۔ ممکن ہے کوئی ایسا واقعہ کسی بادشاہ کے زمانے میں گذرا ہو۔ لیکن قرآنی بیان کا تعلق کیانی اور ساسانی اور

پیش دادی افسانہ سے نہیں ہو سکتا۔ کتاب کا نزول باب میں ہوا اولین مخاطب عرب تھے جن کو تعلق نہ ہندوستان سے تھا نہ روم اور ایران سے اور نہ عربی پرانا جس کو عرب کو معلوم نہیں۔ نہ ذاتی طور پر کسی کو معلوم نہ قومی افسانہ کی شکل میں کسی کے کانوں میں پڑا اس لئے وجہ نہیں کہ اصحاب الاخدود کا متعین مصداق بھی کسی گروہ کو قرار دیا جائے۔ بجز روایت باعتبار روایت بھی نا قابل وثوق اور مجہول الاسناد ہے

ابن کثیر نے حضرت علی کی دو روایتیں اور بھی نقل کی ہیں ایک یہ کہ اصحاب الاخدود حبش میں تھے۔ دوسری یہ کہ یمن میں اہل ایمان اور اہل کفر کی لڑائی ہوئی کافر غالب آئے اور مومنوں کو آگ کی خندقوں میں جھونک دیا۔ یہ دونوں روایتیں انتہائی مبہم اور مجمل ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول بروایت عوفی منقول ہے کہ اسرائیلیوں سے اس واقعہ کا تعلق ہے۔ کچھ اسرائیلیوں کو دہکتی آگ میں جھونکا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت دانیال اور ان کے ساتھی تھے۔ ضحاک بن مزاحم تابعی سے بھی یہی قول مروی ہے۔

امام احمد نے بروایت عفان از حماد بن سلمہ از ثابت از عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ از صہیبؓ مندرجہ ذیل قصہ بیان کیا ہے۔ نسائی نے بھی انہی اسناد سے نقل کیا ہے۔ لیکن مسلم نے صحیح کے آخر میں اس قصہ کو بروایت ہدبہ بن خالد از حماد بن سلمہ بیان کیا ہے اور ترمذی نے از محمود بن غیلان وعبد بن حمید از عبدالرزاق از معمر از ثابت بیان کرنے کے بعد اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔ لیکن عبدالرزاق عن معمر کے سلسلے سے حدیث کی غرابت کی صراحت کی ہے۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کسی بادشاہ کے زمانے میں کوئی بڑا جادوگر تھا جب بوڑھا ہو گیا تو بادشاہ کے کسی غلام کو اس نے چیلہ بنایا اور سحر کی تعلیم دینی شروع کی۔ راستے میں کسی عیسائی راہب کا مکان تھا۔ آمد و رفت کے وقت غلام راہب کے پاس آنے جانے لگا اور فیض صحبت اور تعلیم سے پکا مومن اور صاحب کرامت ولی ہو گیا۔ ساحر کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔ اتفاق سے ایک روز راستہ میں کسی درندے نے لوگوں کا راستہ روک لیا تھا۔ راہگیر بہت پریشان کھڑے تھے۔ غلام نے اللہ کا نام لے کر ایک پتھر درندے کے مارا۔ درندہ مر گیا۔ غلام نے راہب سے آکر واقعہ بیان کیا۔ راہب نے کہا بیٹا تیرا مرتبہ مجھ سے بڑھ گیا مگر اللہ کی طرف سے تجھے آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ اُس وقت میرا پتہ نہ بتانا۔ اس غلام کی کرامتوں کا سلسلہ بہت پھیل گیا۔ اندھے کوڑھی اور لاعلاج بیمار اس کے پاس آنے لگے اور اس کی دعا سے صحت یاب ہونے لگے۔ شاہی اسٹاف کا ایک ممبر بھی اندھا ہو کر نوکری سے معزول ہو گیا تھا۔ وہ بھی غلام کی دعا سے اچھا ہو گیا۔ بادشاہ نے وجہ صحت دریافت کی تو اُس نے کہا میرے رب نے مجھ کو شفا عطا فرمائی ہے۔ بادشاہ کو اللہ کا نام سن کر تعجب ہوا اور سختی کے ساتھ کیفیت واقعہ دریافت کی۔ اُس نے غلام کا پتہ دے دیا۔ غلام کو بلوایا گیا اور گفتگو کے دوران بادشاہ پر ظاہر ہو گیا کہ لڑکا عیسائی ہو گیا ہے تو اس پر انتہائی سختی کی گئی اور استاد کا نام پوچھا گیا۔ غلام نے راہب کا پتہ دے دیا۔ راہب کو طلب کیا گیا بادشاہ نے کہا تو اس غلام کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کا مذہب بگاڑتا ہے۔ غریب کو آرے سے چروا دیا گیا۔ اور غلام کے حکم دے دیا اس کو پہاڑ پر لے جاکر نیچے لڑھکا دو۔ لوگ غلام کو پہاڑ پر لے گئے۔ اتفاقاً سب لوگ خود ہی پھسل کر غار میں گر کر ہلاک ہو گئے اور غلام صحیح سالم واپس آگیا۔ دوبارہ دریا میں ڈبو دینے کا حکم ہوا۔ سپاہی دریا میں ڈبونے کے لئے اس کو کسی کشتی میں لے کر سوار ہوئے بتلاطم کی وجہ سے کشتی اُلٹ گئی سب ڈوب گئے۔ غلام کسی تختے پر بچ گیا۔ بادشاہ غلام کو قتل کرنے سے عاجز ہو گیا۔ غلام نے تبلیغ اسلام کی ایک مخفی تدبیر کی۔ بادشاہ سے کہا اگر آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں تو ایک میدان میں لوگوں کو جمع کیجئے۔ مجھے کسی پیڑ سے باندھ کر سب کے سامنے تیر مار کر ختم کیجئے اور بسم اللہ رب الغلام کہہ کر تیر مارئیے۔ اس طرح میں مر جاؤں گا۔ بادشاہ نے یہی تدبیر کی۔ تیر کنپٹی پر لگا۔ غلام کا ہاتھ بے اختیار کنپٹی پر پہنچا۔ لوگوں کو بادشاہ کا عجز اور اللہ کا قادر مطلق ہونا ظاہر ہو گیا۔ سب حاضرین مسلمان ہو گئے۔ سب نے شرک سے توبہ کی اور عیسائی مذہب میں داخل ہو گئے۔ پہلے بادشاہ کو ایک کی فکر تھی۔ اب بکثرت رعایا نے مذہب تبدیل کر لیا۔ ملک میں عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ شاہی حکم سے ہر کوچہ کے دہانے پر خندقیں کھدوا کر ایندھن سے بھر کر آگ لگادی گئی۔ جب الاؤ دہکنے لگے تو سرکاری سپاہیوں نے اہل ایمان کو پکڑ پکڑ کر اس میں جھونکنا شروع کر دیا جو مرتد ہو جاتا اس کو چھوڑ دیتے جو ایمان پر ثابت قدم رہتا اس کو خندق میں ڈال دیتے۔ ایک مومن عورت کو بھی لایا گیا جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا۔ بھڑکتی خندق کو دیکھ کر وہ عورت کچھ جھجکی۔ بچہ بولا اماں صبر کر تو حق پر ہے۔

پورا قصہ پڑھنے کے بعد یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ قصہ کس ملک اور کس بادشاہ کا ہے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیسائی دور کا۔ حضرت صہیب رومی اصلاً رومی نہ تھے بلکہ عربی النسل قبیلۂ نمر بن قاسط کے ایک فرد تھے۔ بچپن کے زمانے میں رومیوں نے آپ کو پکڑ کر غلام بنا لیا تھا۔ آپ کی پرورش روم میں ہی ہوئی تھی، اس لئے آپ کا لہجہ بھی عربی نہ تھا۔ حضرت صہیب کا راوی ہونا اور عیسائی قصہ بیان کرنا ایک قرینہ ہے اس بات کا کہ شاید یہ واقعہ بلاد روم کا ہے ممکن ہے اطراف شام کا ہو۔

لیکن ابن اسحاق نے محمد بن کعب قرظی کے بیان کے مطابق یہ قصہ نجران (یمن) کا لکھا ہے۔ وہب بن منبہ نے راہب کا نام فیمون اور اس کے چیلے کا نام عبداللہ بن تامر بیان کیا ہے کہ عبداللہ کو اللہ کا اسم اعظم بھی معلوم ہو گیا تھا۔ جس کی برکت سے لاعلاج بیمار اس کی دعا سے صحت یاب ہو جاتے اور ایمان لے آتے تھے۔ اس روایت میں لڑکے کا تیر سے مارا جانا مذکور نہیں۔ بلکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ عاجز ہوا تو لڑکے کے کہنے سے اللہ کے واحد ہونے کی شہادت دی اور عبداللہ کا نام لے کر لڑکے کے چہرے پر مارا، لڑکا مر گیا اور بادشاہ بھی اس کے بعد فوراً مر گیا۔ یہ دیکھ کر تمام نجرانی عیسائی ہو گئے۔ یہ خبر سن کر ذونواس یہودی (جو یمن کا حمیری شہنشاہ تھا اور شاہان تبابعہ میں سے تھا) فوج لے کر نجران پر چڑھ آیا اور لوگوں کو جبراً یہودی بنانے لگا۔ اسی نے خندقیں کھود کر عیسائیوں کو آگ میں جھونکا تھا۔ تقریباً بیس ہزار عیسائیوں کو جلا دیا گیا۔ ذونواس وغیرہ کے حق میں ہی آیت قتل اصحاب الاخدود نازل ہوئی۔

ذونواس کی گرفت سے ایک عیسائی مومن جس کا نام دوس ذو ثعلبان تھا بچ کر بھاگ گیا اور قیصر کے پاس شام پہنچ کر امداد کا طالب ہوا۔ قیصر نے شاہ حبش کو امداد دینے کا حکم دیا۔ شاہ حبش نے ابرہہ اور ارباط کی کمان میں کچھ فوج یمن پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیج دی۔ ذونواس حبشیوں کی فوج سے شکست کھا کر بھاگا اور دریا میں گر کر غرق ہو گیا۔ اس طرح یمن پر حبشیوں کا تسلط ہوا جو مذہباً عیسائی تھے۔ یمن پر ان کا تسلط ستر سال تک رہا۔ سیف بن ذی یزن حمیری شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ ابرہہ حبشی حاکم یمن نے اس کی بیوی چھین لی۔ وہ فریاد لے کر قیصر کے پاس پہنچا۔ قیصر نے کچھ مدد نہ کی تو کسریٰ شاہ ایران کے پاس پہنچا۔ کسریٰ نے ٹال دیا۔ کچھ مدت کے بعد نوشیروان تخت ایران پر بیٹھا۔ سیف نے اس سے امداد کی خواہش کی۔ نوشیروان نے سات سو قیدیوں کو رہا کر کے سیف کی ماتحتی میں دے کر روانہ کر دیا۔ ان قیدیوں کے سردار کا نام ہرمز تھا۔ یہ فوج ساحل پر اتری تو ابرہہ مر چکا تھا۔ اور اس کا بیٹا مسروق یمن کا حکمران تھا۔ یمن کی عام آبادی حبشیوں کے مظالم سے تنگ آ چکی تھی۔ لاکھوں آدمی سیف کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد مسروق مارا گیا۔ حبشیوں نے شکست کھائی ہرمز فتحیاب ہو گیا اور سیف یمن پر کسریٰ کی طرف سے حکمران بن گیا۔ اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ مبارکباد کے لئے عبدالمطلب بھی قریش کے سرداروں کو لے کر گئے تھے۔ ایک مہینہ تک سیف نے سب کو نہایت عزت کے ساتھ مہمان رکھا۔ آخر بہت بڑے اعزاز و انعام کے ساتھ رخصت کیا اور روانگی کے وقت عبدالمطلب سے رازدارانہ طور پر کتب سابقہ کی وہ تمام پیشین گوئیاں بھی بیان کر دیں جو رسول اللہؐ کے متعلق اس نے پڑھی تھیں۔ کہا گیا ہے کہ سیف کی ماں اور عبدالمطلب کی ماں دونوں بہنیں تھیں واللہ اعلم۔

سدی نے کہا آگ کی خندقیں تین جگہ تھیں۔ عراق میں، شام میں، یمن میں (رواہ ابن ابی حاتم) مقاتل نے کہا تین جگہ خندقوں میں جلایا گیا تھا۔ ایک یمن کے نجران میں۔ دوم شام میں۔ سوم فارس میں۔ شام میں عذاب خندق دینے والا ظالم انطیانوس رومی تھا۔ فارس میں بخت نصر اور نجران میں یوسف ذونواس۔ اسی ذونواس کے متعلق اللہ نے آیت قتل اصحاب الاخدود نازل فرمائی اور شام و فارس کے واقعات کے متعلق کوئی ذکر نہیں فرمایا انتہیٰ۔

کہا جاتا ہے کہ بخت نصر کو اہل فارس بہمن بن اسفندیار خیال کرتے تھے۔ بہمن کی بیٹی کا نام ہمایون تھا جس سے اس نے قربت جنسی کی تھی۔ ذونواس کا اصل نام زرعہ تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے یوسف نام اختیار کر لیا۔

ہماری رائے میں قرآنی آیات کا مصداق اسی واقعہ اخدود ہے۔ مجاہد کا بھی یہی خیال ہے۔ دیکھو تفسیر ابن جریر جلد ۳۰ صفحہ ۷۳۔ پھر تاریخ سے قوی شہادت اس کی تائید میں ملتی ہے۔ دیکھو معجم البلدان جلد ہشتم صفحہ ۲۶۲ اور تاریخ الکامل لابن الاثیر الجزری جلد اول صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۰ و ۱۵۲ طبع مصر۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں کسی جگہ شاہان روم میں یا ملوک فارس میں سے کسی کا ذکر اجمالاً بھی نہیں ملتا۔ ہاں سرزمین عرب کی اقوام بائدہ کا ذکر جابجا آیا ہے۔ ثمود، عاد، اصحاب الایکہ، اصحاب کہف وغیرہم یہاں تک کہ مصر کے فرعون ہامان اور عراق کے مغرور حکمران کا ذکر بھی آیا ہے اور یمن کے شاہان اذواء میں سے ذوالقرنین کے قصے کو بھی مفصل بیان کیا ہے۔ قوم تبع کے عروج کا بھی اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔ قریش کو اپنی طاقت، عزت اور دولت پر گھمنڈ تھا۔ اس غرور کو توڑنے کے لئے فرمایا تھا اھم خیر ام قوم تبع۔ اسی طرح عرب کی اقوام قدیمہ کی طاقت، تمدن، عمارات اور عسکری قوت کو قریش سے بہتر قرار دے کر عرب کے لئے سرمایۂ عبرت فراہم کیا ہے۔ یہ تمام امور دلالت کر رہے ہیں کہ اصحاب الاخدود کا بھی کوئی عربی گروہ ہی تھا جس نے اہل ایمان کو جلایا تھا۔ اگرچہ اخدود کے واقعات دنیا میں بارہا ہوتے رہے ہیں۔ بقول ابن ابی حاتم قوی روایت سے ثابت ہے چنانچہ قسطنطنیہ میں شاہ فلسطین (کانسٹنٹائن) کے زمانہ میں عقیدہ ابن اللہی کو پھیلانے کے لئے اسّی سو عیسائی موحدوں کو آگ کی خندقوں میں پھنکوا دیا تھا۔ عراق میں بخت نصر نے بتوں کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے حضرت دانیال اور ان کے دونوں ساتھیوں عزو یا (عزریا) اور میشائیل کو آگ میں ڈلوا دیا تھا۔ مگر اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ گشتاسپ یا بہمن بن اسفندیار یا کسی دوسرے ایرانی بادشاہ نے بھی زردشتی یا مانوی یا مزدکی مذہب

سے انکار کرنے والوں کو اسی قسم کی سزا دی ہوئی، مگر اول تو یہ واقعات گوشۂ خمول میں ہیں دوسرے عرب کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے بیرونِ عرب کے واقعات کو مصداق آیات نہیں قرار دیا جا سکتا۔

آیت کی توضیح کا تکملہ ربیع بن انس: (بروایت ابن ابی حاتم) کا خیال تھا کہ قُتِلَ اصحاب الاخدود میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اصحاب اخدود نے جب اہلِ ایمان کو خندقوں میں ڈالا تو خود بھی محفوظ نہ رہ سکے اس آگ نے ان کو بھی جلا دیا آگ ایسی بھڑکی کہ اس کے شعلے بادل کی طرف پھیل گئے اور تماشا بین ظالم خود بھی جل کر خاکستر ہو گئے۔ جمہور مفسرین نے لفظ قُتِلَ کو بد دعا پر محمول کیا ہے۔ یعنی اللہ کی لعنت ہو اصحابِ اخدود پر اور اللہ کے کلام میں جو بد دعا کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں وہ مفہوم طلب سے خالی ہیں۔ اللہ کو طلب کی ضرورت نہیں۔ حقیقت میں اُن کا مفہوم خبری ہوتا ہے، لیکن خبر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلے ایسا واقعہ ہو بھی چکا ہو جس کی خبر دی گئی ہو۔ بلکہ مجازی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور بکثرت مجازی معنی مراد ہوتے ہیں۔ چونکہ مستقبل میں ہونے والے واقعات اتنے یقینی الوقوع ہوتے ہیں کہ گویا ہو چکے، اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال کر لیا جاتا ہے۔ قُتِلَ کا استعمال بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔ ظالموں کو جہنم کی سزا اور عذاب الحریق قیامت کے دن ملے گا مگر ملے گا ضرور اس لئے قُتِلَ فرمایا گیا۔

ان الّذین فتنوا سے عذاب الحریق تک جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو آگ میں ڈال کر جلایا ان کو جہنم کا عذاب ہوگا۔ خصوصاً آتشِ سوزاں ان کو جلائے گی۔ بقولِ امام رازی پہلے خاص اصحابِ اخدود کا تذکرہ تھا لیکن ان کی مذمت ذاتی نہیں تھی بلکہ صفاتی تھی۔ ان کی ظالمانہ حرکات نے ان کو اللہ کی لعنت کا مستحق بنا دیا تھا۔ اس لئے اب عمومی ضابطہ بیان فرما دیا کہ اہلِ ایمان کو دکھ دینے والا اور جلانے والا کوئی ہو اس کو جہنم کی سزا ملے گی۔

حضرت ابن عباس۔ قتادہ، مجاہد، ضحاک اور ابن ابزی نے لفظ فتنوا کی تفسیر حرقوا سے کی ہے یعنی جن لوگوں نے مومنوں کو جلایا۔ خطیب نے لکھا ہے فتنہ کا معنی جلانا بھی آتا ہے۔ آیت یوم ھم علی النار یفتنون میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ دینار اور درہم کو اگر کوئی شخص آگ میں ڈال کر تپاتا ہے تو عرب کہتے ہیں فلانٌ فَتَنَ دینارہٗ ودرہمہٗ۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کی اس تفسیر پر مذکورہ آیت کا تعلق اصحابِ اخدود سے ہی ہوگا اور انہیں کے لئے عذابِ جہنم کی وعید ہوگی یا زیادہ سے زیادہ اگر ضابطۂ عام ہی اس کو قرار دیا جائے گا تو صرف ان لوگوں کے لئے جو مسلمانوں کو جلاتے ہیں۔ عام دکھ دینے والوں اور ایذا پہنچانے والوں کے لئے جہنم کی وعید نہ ہوگی۔ اس تقدیر پر ان قریشیوں کے لئے کوئی درسِ عبرت ان آیات میں نہ ہوگا اور نہ قیامت تک آنے والے اُن ظالموں کے لئے کوئی سبق آموز نصیحت مستفاد ہوگی جو اہلِ حق کو طرح طرح کے دکھ پہنچاتے ہیں مگر آگ میں نہیں ڈالتے۔ حالانکہ مقام کا اقتضاء یہی تھا کہ ہر ایذا رساں اور ظالم کو ڈرایا جائے اور اس کو ظلم سے روکا جائے واللہ اعلم۔

ان الذین امنوا سے الفوز الکبیر تک قرآن کا طرزِ بیان ہے (اور ہر حکیم واعظ کا یہی طریقہ ہوتا ہے) کہ وعید کے ساتھ وعدہ اور ترہیب کے ساتھ ترغیب کا اظہار ہوتا ہے تاکہ نافرمانی سے نفرت اور اس کی سزا کا ڈر ہو اور فرماں برداری کی طرف رغبت اور اس کی جزا کی امید پیدا ہو۔ پہلی آیت میں ظالموں کے لئے عذاب کی دھمکی تھی اور اس آیت میں نیکوکار اہلِ ایمان کے لئے جنت کی بشارت ہے اور جنت ہی کو بڑے پایہ کی کامیابی فرمایا ہے۔ کیونکہ کیفیت، کمیت، مدتِ بقاء اور ہر حالت کے اعتبار سے جنت ناقابلِ تصور ہے۔ اس کی نعمتیں بے شمار، بزرگ ترین اور دوامی ہیں۔ سب سے بڑی نعمت رضوانِ الٰہی اور دیدارِ کبریائی ہے۔

ان بطش ربک لشدید۔ اللہ کی گرفت یقیناً بہت سخت ہے۔ انسانوں کی گرفت کی آخری حد یہی زندگی ہے۔ انسانی غضب زیادہ سے زیادہ اسی زندگی کو چھین سکتا ہے اور وہ بھی صرف ظاہری طور پر۔ اللہ کی پکڑ صرف یہی نہیں کہ اس زندگی کو برباد کر دے ہلاک کر دے بلکہ وہ دوبارہ زندہ کر کے غیر میعادی عذاب میں پکڑ سکتا ہے ابتدائی گرفت اور آخری گرفت دونوں اسی کے قبضہ میں ہیں۔ اسی لئے آگے فرمایا۔

انہ ھو یبدئ ویعید۔ یعنی اول پکڑ بھی اللہ کرتا ہے اور دوبارہ (قیامت کے دن) بھی وہی پکڑا کرے گا۔ عکرمہ کے نزدیک اس آیت میں ابتدائی تخلیق یعنی یہی دنیوی زندگی اور ثانوی تخلیق یعنی اخروی زندگی مراد ہے۔ یعنی اللہ ایجاد کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا دنیا میں کافروں پر عذاب الحریق شروع کرتا ہے اور آخرت میں عذابِ جہنم کا اعادہ فرمائے گا۔ شیخ ابن جریر نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اس وقت آیت کا تعلق یقیناً ان ظالم کافروں سے ہوگا جنہوں نے اہلِ ایمان کو جلایا تھا۔ کیونکہ ہر کافر تو اس دنیا میں عذاب الحریق میں ماخوذ نہیں ہوتا

وھو الغفور الودود - اگر کوئی سچے دل سے اللہ سے توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنی مخلوق سے بہت زیادہ محبت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ مخلوق جہنم میں پڑی رہے اور بغیر توبہ بھی بہت گناہوں سے درگزر فرماتا ہے۔ اگر انسانی بداعمالی پر پوری گرفت کرتا تو کوئی جاندار روئے زمین پر باقی نہ رہتا۔

ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس جگہ ودود بمعنی حبیب ہے۔ خطیب نے حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ اس جگہ ودود کا معنی ہے بندوں کی مغفرت کو بہت چاہنے والا۔ مجاہد نے کہا اللہ اپنے نیک بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔

ابن زید نے کہا ودود بمعنی رحیم ہے یعنی اللہ غفور رحیم ہے۔

مبرد نے اسمٰعیل قاضی محدث کبیر کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہا کہ ودود وہ ہوتا ہے جس کے لڑکا نہ ہو۔ یہ معنی لغوی اعتبار سے اگر صحیح بھی ہو تب بھی سیاق اور سباق کے خلاف ہے۔

ازہری نے کہا اللہ اپنے نیک بندوں سے محبت کرتا ہے اور اہل ایمان اس سے محبت رکھتے ہیں، اس لئے ودود بمعنی فاعل و مفعول دونوں طرح صحیح ہے۔ ہم نے جو تفسیر کی ہے وہ تمام اقوال سے زیادہ عام اور شان الٰہی کے شایان ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ گناہگاروں کے گناہوں کا معاف کرنے والا ہے۔ اس کو اپنی مخلوق سے بہت ہی محبت ہے۔ لیکن کیا اس کو

ذو العرش المجید - کسی کی گرفت کرنے، عذاب دینے اور معاف کرنے اور ثواب دینے کی طاقت ہے یا اس کی عظمت بے چارگی کی وجہ سے ہے، اس کی وضاحت کے لئے فرمایا۔ وہ عرش والا ہے یعنی خالق، مالک، متصرف اور حاکم ہے۔ ساری کائنات کا تخت اقتدار اسی کے قبضۂ تصرف میں ہے۔ (بلکہ) اس کی شان اس سے بھی بزرگ ہے۔ وہ مجید والا ہے۔ کثیر بزرگی کا مالک۔

فعال لما یرید - وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قفال نے تفسیری مطلب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے نہ کوئی اس پر اعتراض کر سکتا ہے نہ اس کو عاجز بنا سکتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو جنت میں داخل فرماتا اور دشمنوں کو جہنم میں بھیجتا ہے۔ کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور گنہگاروں کو اپنی مشیت کے مطابق مہلت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب چاہتا ہے گرفتار کر لیتا ہے۔ قفال کی یہ تشریح فعال اور ما یرید کی تعمیم کے خلاف ہے۔ گنہگاروں کا مغفور ہونا اس تشریح سے بھی نہیں ہوتا۔ دوستوں کو بشارت اور دشمنوں کو دنیوی اور اخروی عذاب کی وعید۔ اس تفسیر سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس فقیر کی رائے میں اللہ کی فعالیت ہر تخصیص سے آزاد ہے۔ اسی طرح اس کا ارادہ بھی بے قید ہے۔ اللہ کے ارادہ کا تعلق ہر کافر کے کفر اور مومن کے ایمان سے ہوتا ہے رہی پسندیدگی وہ الگ چیز ہے۔ پھر اللہ کی فعالیت اور ارادیت کا تعلق جس طرح امور آخرت سے ہے اسی طرح دنیا کی ہر چیز سے ہے۔ اگر شروع سے آیات کو مسلسل مربوط قرار دیا جائے تو آیت کا مضمون واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دنیا میں کسی کو اقتدار اور کسی کو عاجز بنانا اسی کے زیر حکم ہے۔ ظالم کو مظلوم پر قدرت دینا اسی کا کام ہے۔ مومنوں کو کافروں کے اقتدار میں دیا اور ان کو جلوایا پھر کافروں کو برباد کیا اور اہل ایمان کا بول بالا کیا۔ یہ سب اسی کا فعل ہے۔ اسی طرح اہل جنت کو جنت میں اور اہل جہنم کو جہنم میں پہنچانے کا تعلق بھی اسی کی مشیت سے ہے، لیکن اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی مصلحت کو خود جانتا ہے اور اپنی مصلحت کے تحت جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ قریش اور دوسرے سرداران کفر کو تنبیہ ہے کہ مسلمانوں

ھل اتٰک حدیث الجنود فرعون و ثمود - کو نہ ستاؤ اور ان کو عاجز اور بے بس سمجھ کر دکھ نہ دو۔ اپنی طاقت، سیادت اور جیرہ دستی پر نہ اتراؤ۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ دم بھر میں کایا پلٹ جاتی ہے۔ انقلاب عالم دعوت انقلاب دے رہا ہے تم سے بڑے طاقتور اور حاکم اہل حق پر ظلم کرنے کے بعد اللہ کی گرفت سے بچ نہ سکے۔ اصحاب الاخدود جن کی ستم گاری اس حد پر پہنچ گئی تھی کہ زندہ اہل ایمان کو پکڑ کر آگ بھری خندقوں میں جھونکتے تھے۔ کہاں گئے۔ سب کا تختہ تاراج ہو گیا۔ سب تباہ کر دیے گئے۔

فرعونیوں کا لشکر اور ثمود کے جتھے کیا ہوئے۔ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کو طرح طرح سے ستایا تھا۔ یہاں تک کہ پیدا ہونے والے اسرائیلی لڑکوں کو ان کی ماؤں کی گودوں سے چھین کر ذبح کر دیا کرتے تھے اور قوم ثمود والے جو حجاز و شام کے درمیان پہاڑوں کو تراش کر سنگین کوٹھیاں بنا کر رہتے تھے۔

حضرت صالح کو ہر طرح سے دکھ دیتے تھے اور مومنوں کو حقیر سمجھ کر ستاتے تھے ۔ یہاں تک کہ بے زبان مظلوم ناقہ صالح کو ذبح کرنے میں بھی انہوں نے پس و پیش نہیں کیا ۔ سب کو اللہ نے مہلت دی ۔ عذاب کو ٹالا مگر جب ان کا ظلم حد سے بڑھ گیا تو ایک کڑک سے سب کو تباہ کر دیا گیا ۔

کفار ایسی عبرت انگیز سبق آموز نصیحتوں کو سن کر کہتے یہ پارینہ داستانیں ہیں گزشتہ لوگوں نے اپنی باتیں منوانے کے لئے خود بنالی تھیں ۔ مگر بات ایسی نہ تھی کہ واقعات بزرگوں نے خود بنا لئے ہوں بلکہ

بل الذین کفروا فی تکذیب کافر خود تکذیب میں پڑے ہوئے ہیں جو شخص کسی رنگ میں رنگا ہوتا ہے اس کو دنیا اسی رنگ میں نظر آتی ہے ۔ جب منکرین حق تمام سچی حقیقتوں کو نہیں مانتے اور کوئی عقیدہ بھی ان کا صحیح نہیں اور سر سے پاؤں تک تکذیب میں غرق ہیں تو پھر ان کو صحیح واقعہ بھی غلط دکھائی دے گا ۔ علاوہ ازیں بھی یہ اللہ کا اقتدار اور احاطہ علمی سے

واللہ من ورائھم محیط ۔ خارج نہیں ہیں ۔ ہر طرف سے اللہ کا علم اور اقتدار ان کو گھیرے ہوئے ہے ۔ ان کا کوئی فعل اللہ سے اب بھی پوشیدہ نہیں ۔ اور نہ ان کی زندگی اور زندگی کی کوئی حرکت قدرت خداوندی سے خارج ہے یعنی گزشتہ واقعات سے بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا سرکش بادشاہ اور پر جبروت حاکم اللہ کی گرفت سے نہ بچ سکا اور جب اللہ کی بھیجی ہوئی صداقت سے ٹکرایا تو پاش پاش ہو گیا اس کو نہ ماننے کی کیا وجہ اور اس میں خود ساختہ ہونے کا کیا احتمال ۔ یہ قانون تو اب بھی جاری ہے ۔ یہ کافر بھی اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہیں ۔ قرآن کا یہ بیان انسانی دماغ کا ساختہ پرداختہ نہیں بلکہ ۔

بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ اللہ کی (اس علمی) لوح سے نقل ہو کر آیا ہے جو تمام مخلوق کی دست رس، قطع برید اور تغیر و ترمیم سے محفوظ ہے امٹ ہے، لازوال ہے ازلی ہے ابدی ہے حدوث امکان سے پاک ہے ۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ غلط ہو سکے ۔

بغوی، سیوطی، طبرانی اور بعض دوسرے اہل تفسیر نے لوح محفوظ کی ماہیت، ہیئت، ساخت اور مختلف کیفیات کے متعلق حضرت ابن عباس، مقاتل اور بعض دوسرے تابعین کے اقوال نقل کئے ہیں جو اہل نقد کی نظر میں سراسر موضوع ہیں ۔ سلسلۂ اسناد کے لحاظ سے غریب منکر ہیں ۔ یہ ممکن ہے کہ ابن عباس نے کعب احبار سے سن کر کچھ بیان ہو اور ظاہر ہے کہ ان تفصیلات اور توضیحات کے مسئلہ میں حضرت کعب احبار کا ماخذ صرف اسرائیلیات ہیں جن کو علمائے اسلام اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے جب تک اسلامی روایات سے ان کی تائید نہ ہوتی ہو ۔

اسی لئے ابن کثیر، ابن جریر، ابن المنذر اور سیوطی وغیرہ نے جو کچھ لوح محفوظ کے متعلق تفصیل حضرت ابن عباس یا کسی تابعی کی طرف مستند کرتے ہوئے بیان کی ہے ۔ یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے فتح العزیز میں بھی اس کا کچھ حصہ نقل کیا ہے ۔ ہم نے اس کو ناقابل وثوق سمجھ کر قلم انداز کر دیا ۔

مقصود بیان

شروع سورت میں تین مرتب قسمیں کھانے سے اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ ہم ہمہ وقت انقلاب تین باتوں کو ظاہر کر رہا ہے ۔ ۱ کسی حالت کو قرار نہیں نہ دولت کو نہ فقر کو ۔ نہ دنیوی عزت کو نہ ذلت کو اس لئے کسی کو اپنی ظاہری عزت و دولت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے ۔ نہ بے کس مفلس کو دل شکستہ ہونا چاہیئے ۔ ۲ کائنات میں تغیر پیدا ہونے والے اسباب بھی ایک روز منتشر ہو جائیں گے ۔ ان کی باہم وابستگی بھی قائم نہیں رہے گی ۔ ان میں بھی انقلاب آئے گا ۔ ۳ اعمال رائیگاں نہیں جائیں گے ۔ ہر عمل اپنے پیچھے نتیجہ ضرور لائے گا ۔ سزا جزا ضرور ملے گی ۔

اصحاب اخدود کا قصہ اور فرعون و ثمود کا اجمالی تذکرہ درس عبرت دے رہا ہے خود سر مغرور باطل پرستوں کو اور تسکین دے رہا ہے نادار اہل ایمان کو اور ثبات و صبر کی تلقین کر رہا ہے ان اہل صداقت کو جن کو زندگی پر اذیت خارزار سے گزرنا پڑ رہا ہے اور رقی العلیٰ اشارہ ہے ان کی آخری کامرانی اور فلاح کی طرف ۔

آیت واللہ علی کل شیء شہید سے اللہ کا علم حضوری ثابت ہو رہا ہے جو بلا واسطہ ہے نہ مخبر اور جاسوس کی ضرورت نہ کسی چیز کی ذہنی شکل حاصل کرنے کی حاجت ۔ پھر اللہ کے علم کی ہمہ گیری کا اظہار بھی اس سے ہو رہا ہے

آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ میں بھی ہر فار بنا لانے سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ ایمان اور حسن عمل موجب جنت نہیں ہے عطاء ۔ جنت اللہ کے کرم پر موقوف ہے ۔

الغفور اور الودود کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ سب سے زیادہ خطا پوش اور مخلوق سے محبت کرنے والا اللہ ہے ۔

ذوالعرش سے اللہ کا اقتدار کامل اور فعال سے اختیار کلی ظاہر ہو رہا ہے ۔

واللہ من ورائہم محیط سے تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ کوئی بادۂ پندار سے سرمست ہو کر یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اقتدار خداوندی کے احاطہ سے نکل گیا یا اس کا کوئی فعل اللہ سے چھپا رہ سکتا ہے ۔ بَلْ ہُوَ قُرْاٰنٌ مجید سے مترشح ہو رہا ہے کہ انقلاب عالم اور ہر سبب سے نتیجہ کی وابستگی اور آخر میں سلسلۂ اسباب کی ہر کڑی کی ہم آہنگی قرآنی نظریہ ہے کسی انسان کا دماغی زائیدہ نہیں ہے اسی طرح باطل پرستوں کا عارضی عروج اور ان کو مہلت اور اہل حق کی وقتی مغلوبیت اور اس پر ثبات بھی قرآنی ضابطے کے تحت ہے جس کا نتیجہ اللہ کی گرفت کے بعد یہ نکلے گا کہ جو کچھ باطل پرستوں کو اللہ نے شروع میں دیا ہے آخر میں اس کو واپس لے لے گا ۔ اسی طرح اہل صداقت کا ابتدائی فقر و افلاس اور ذلت و نکبت بھی ناپائیدار ہے ۔ آخر میں اللہ ان کی اس حالت کو پلٹ دیگا ۔

فی لوح محفوظ کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کے علم کی لوح ناقابل تغیر امٹ لازوال اور غیر متبدل ہے اور مخلوق کی دست رس اور خورد برد سے باہر ہے اور قرآن بھی اسی کی نقل ہے ۔ اس لئے اس کے ضوابط بھی دوامی اور لازوال ہیں وغیرہ ۔

سُورۃ الطارق

باجماع علماء یہ سورت مکی ہے ۔ اس میں ۱۷ ۔ آیات ۶۲ کلمات اور ۲۷۱ حروف ہیں ۔ ایک روز ابوطالب حضرت علیؓ کے والد رسول اللہ ؐ کی ملاقات کے لئے آئے ۔ حضورؐ نے چچا کے سامنے یا دودھ میں بھیگی ہوئی روٹی کھانے کے لئے رکھی ۔ دونوں نے کھانا شروع کیا ۔ یکایک ایک تارا ٹوٹا اور اتنی تیز روشنی ہوئی کہ گھر میں اجالا پھیل گیا ۔ ابوطالب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔ گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے یہ کیا ہوا ۔ حضرت والا نے فرمایا ۔ یہ تارا تھا ۔ آسمان کی حفاظت کے لئے فرشتے نے کسی شیطان کے پھینک مارا تھا ۔ قدرت الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔ کچھ دیر کے بعد یہ سورت نازل ہوئی (سراج وکبیر)

حضرت خالد بن جبل عدوانی کا بیان ہے میں نے خود دیکھا کہ قبیلہ ثقیف کے بازار میں رسول اللہ ؐ کمان یا لاٹھی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے لوگوں کو یہ سورت سنا رہے تھے میں اس وقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا مگر زبان مبارک سے پوری سورت سن کر میں نے یاد کر لی تھی ۔ لوگوں نے مجھ سے پوچھا ۔ یہ انہوں نے کیا پڑھا ۔ میں نے پوری سورت پڑھ کر سنا دی ۔ سن کر لوگوں کو تعجب ہوا کچھ قریشی بھی تھے وہ کہنے لگے ۔ یہ شخص ہم میں سے ہے ۔ ہم اس کا حال تم سے زیادہ جانتے ہیں ۔ اگر ہم جانتے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ سچ ہے تو سب سے پہلے ہم اس کی پیروی کرتے (رواہ البخاری فی التاریخ واحمد والطبرانی وابن مردویہ)

حضرت معاذ سے رسول اللہ ؐ نے ارشاد فرمایا تھا کیا تمہارے لئے کافی نہیں ہے کہ (عشاء کی نماز میں) والسماء والطارق اور والشمس والضحٰہا پڑھا کرو (نسائی) لوگوں نے حضورؐ سے شکایت کی تھی کہ معاذ عشاء کی نماز میں طویل قرأت کرتے ہیں (حضرت معاذ سورۂ بقرہ اور نساء پڑھا کرتے تھے) تو حضورؐ نے مذکورہ بالا حکم دیا تھا ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ اِنْ كُلُّ

قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے وہ روشن ستارہ ہے کوئی شخص ایسا نہیں

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ

جس پر (اعمال کا) کوئی یاد رکھنے والا (فرشتہ) مقرر نہ ہو تو انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے　وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے

دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝

جو پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے (تو اس سے ثابت ہوا کہ) وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے (اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝ فَمَا لَهُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝

ہوگا) جس روز سب کی قلعی کھل جائے گی　پھر اس انسان کو نہ تو خود (مدافعت کی) قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی حامی ہوگا قسم ہے آسمان کی جس سے بارش

وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ إِنَّهُمْ

ہوتی ہے اور زمین کی جو بیج نکلنے وقت) پھٹ جاتی ہے (آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن ایک فیصلہ کرنے والا کلام ہے کوئی لغو چیز نہیں ہے　یہ لوگ طرح

يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں　اور میں بھی طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں تو آپ ان کافروں کو یونہی رہنے دیجئے انکو تھوڑے ہی دن رہنے دیجئے

تفسیر اس کائنات کا کوئی فرد کتنا ہی طاقتور اور مضبوط ہو مگر صرف اپنی طاقت کے بل پر اس کی بقا ناممکن ہے۔ اللہ کی غیبی اعانت اور پوشیدہ کارسازی جب تک اس کی پشت پناہ، نگراں اور محافظ نہ ہو۔ کوئی بھی ارضی و فضائی دشمنوں سے اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اگر اللہ اپنے قبضۂ حکمت اور دستِ قدرت کو ایک لمحہ کے لئے اس کائنات سے اٹھالے تو بعض حصوں کا بعض سے ٹکرا کر تباہ ہو جانا یقینی ہے۔ مضبوط ترین مخلوق سماوی کرے ہیں جو زوال زبول کھنگی پیرانہ سالی اور ہر تغیر سے محفوظ ہیں۔ آغاز آفرینش سے جیسے چلے آتے ہیں ویسے ہی ہیں۔ وہی ان کی چال ہے اور وہی خصوصیات۔ ان کی ہر حالت مستغنی ہے۔ تبدل اور ہر کیفیت سے بے نیاز ہے بگاڑ سے، لیکن اس کے باوجود فضائی کائنات ان پر حملہ کرنے کی تاک میں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ اجسام سماویہ لطیف ہیں، لیکن ان کی لطافت کو تباہ کرنے کے درپے کثیف اجسام رہتے ہیں۔ ارضی پیداوار کا تو انتہائی عروج بھی بالائی کروں تک پہنچانے سے قاصر ہے۔ انسان بہت کوشش کر رہا ہے۔ ہزاروں میل زمین سے اٹھنے کے باوجود اگلی منزلِ مقصود اتنی دور ہے کہ تصوری پیمائش بھی اس کا صحیح اندازہ کرنے سے عاجز ہے۔ عنصری اجسام میں سب سے زیادہ لطیف ناری مخلوق ہے محسوس پرست اہل مادہ خواہ اس کے وجود کا انکار کریں یا اقرار مگر ہے ایک حقیقت واقعیہ جس کی تائیدی صراحتیں تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ ناری غیر مرئی اجسام اگرچہ ارضی اجسام سے زیادہ لطیف ہیں، لیکن ہے پھر بھی ان کی سرشت دخانی، کثیف، تاریک۔ شیاطین کی اڑان کتنی ہی اونچی ہو اور وہ ارواح سماویہ کے فرائض میں دخیل ہونے اور اسرار غیبی معلوم کرنے کی کیسی ہی کوشش کریں مگر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے ان کو روکنے اور دفع کرنے کے لئے اپنی غیبی مخلوق مقرر کر رکھی ہے جو آگ کے شعلوں، دہکتے انگاروں اور بھڑکتے ہوئے آتش پاروں کے پتھراؤ سے مارتی ہے۔ اس طرح سماوی کروں تک شیطان نہیں پہنچ سکتے اور نہ ان اسرارِ ربانی سے قبل از وقوع واقف ہو سکتے ہیں جن کا تعلق نظم کائنات سے ہوتا ہے۔

اللہ نے کرۂ ارض کے رہنے والوں میں سے انسان کو اپنے خاص جلوے کا مظہر بنایا ہے۔ اس کی روح سے خالق الارواح کا جو خاص تعلق ہے وہ

کسی دوسری مخلوق سے نہیں۔ یہ روح خالص نورانی عرفانی اور بے کیف و کم ربانی ہے۔ دخانی سرشت رکھنے والے شیاطین اس کے ذاتی دشمن ہیں۔ نفخ روح کی وجہ سے ابوالشیاطین نے مجسمۂ آب و گل کو سجدہ کرنے سے سرتابی کی تھی اور اس کی سیادت ماننے سے انکار کیا تھا۔ شیاطین ہر وقت اس کو تباہ کرنے کے درپے رہتے ہیں، مگر روحِ انسانی ابدی ہے۔ انما خلقتم للابد کی مصداق ہے، لباس کتنا ہی بدلتا رہے، لیکن مغز حیات لازوال ہے اس لئے رب الناس نے اس کی حفاظت کا بھی غیبی انتظام کر دیا ہے۔ نورانی فرشتے اس کی حفاظت پر بھی مامور ہیں۔ ظلماتی سرشت والے جن نورانی فرشتوں کو دیکھ کر بھاگتے ہیں۔ تاریکی کا روشنی سے جوڑ نہیں ہو سکتا۔ کثافت اور لطافت کا اجتماع ناممکن ہے۔ زہر تریاق کی صورت سے نفرت کرتا ہے۔ اس طرح انسان کی روح عرفانی اور حیاتِ ملکوتی کی حفاظت ہوتی ہے۔ رہی حسی، ادراکی، شعوری، شعبی اور دوسری جسمانی قوتیں تو ان میں ان شیاطین کو کبھی کبھی دخیل ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ انسانی خون کی رگوں اور نسوں کے اندر شیطان حلول کر لیتا ہے۔ شعور و ادراک میں وسوسے بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ارادوں اور نیتوں کو بھی اغوا کر لیتا ہے، مگر یہ تصرف بھی بحکمِ الٰہی ہوتا ہے اور خاص حد تک ہوتا ہے۔ انسان کو قبل از وقت مار دینے پر کوئی شیطان قدرت نہیں رکھتا۔ اس کا انتظام بھی پروردگارِ حکیم نے فرشتوں کے ذریعہ سے کر دیا ہے۔ اس طرح روح کا تعلق مجسمۂ آب و گل بحفظِ غیبی وقتِ مخصوص تک باقی رہتا ہے، لیکن انسانی جسم فانی الاصل اور ضعیف البنیان ہے۔ ہر دم رو بزوال ہے اور انحلال پذیر ہے۔ جسم کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی صرف غذا کی ممنون ہے۔ ہر وقت نئے ذراتِ بدن پیدا ہوتے اور پچھلے فنا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں ہی نمو زبول اور گھٹنے بڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ حقیقت میں انسان کی تخلیق نطفہ بیجان سے ہوئی ہے۔ نطفہ بھی وہ جسم حیات اختیار کرنے کے لئے بیتاب ہوتا اور اچھلتا کودتا نکل کر اپنے مستقر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ یہ حقیر قطرہ صرف باپ یا ماں اور باپ کے ہر حصۂ بدن کی رطوبت لعابیہ کا خلاصہ ہوتا ہے اور ماں باپ کے بدن میں یہ رطوبتِ لعابیہ نباتی اور حیوانی غذاؤں سے بڑھتی اور بنتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہی قطرہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور ایک وقت پر روحِ حیات کے تعلق پیدا ہو جانے کی وجہ سے جیتا جاگتا انسان بن کر نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص میعاد گزر جانے کے بعد اس بدنی پنجرہ سے روح آزاد ہو جاتی ہے اور انسانی اجزاء بدن پراگندہ ہو کر مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس خدا نے ان اجزا کو ان گنت مقامات سے چن کر جمع کیا تھا، پھر ان سے روحِ حیات کا تعلق پیدا کرایا تھا۔ وہ پراگندگی کے بعد دوبارہ ان اجزا کو جمع کر کے پھر ان میں روحِ زندگی پھونک سکتا ہے، لیکن یہ ثانوی زندگی اس وقت ہوگی جب اول زندگی کے پوشیدہ کارنامے اور مخفی اعمال سامنے لائے جائیں گے۔ جب پورے کرتوت اپنی ساری چھپی ڈھکی کیفیتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائیں گے۔ پھر ان کے نتائج کو کوئی بھی دفع نہیں کر سکتا نہ خود آدمی میں ان کو روکنے کی مجال ہوگی نہ کسی دوسرے مددگار اور حمایتی میں ان سے بچانے کی طاقت۔

پس قسم ہے ابر ریزاں کی جس کا ہر قطرہ نباتی کائنات کے لئے نطفۂ روئیدگی ہے اور قسم ہے کہ اس زمین کی جس کا ہر مسام نطفۂ سحابی کے استقرار کے لئے رحمِ مادر کا حکم رکھتا ہے کہ جس طرح سماوی اور ارضی اثر انگیزی اور اثر پذیری سے نبات کی آغاز آفرینش ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ اسی کی ترقی سے نطفہ انسانی بن کر جسم انسانی بنا۔ اور روحِ ربانی کے تعلق سے مردہ جسم کو جان ملی اور پھر انقطاعِ روح کے بعد اجزائے جسم فرسودہ بوسیدہ ہو کر خاک میں مل گئے اسی طرح دوبارہ زندگی ہوگی۔ اجزائے بے جان پر تحت العرش سے زندگی کی بارش ہوگی اور انسان اٹھ کر اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا اور ثواب عذاب اٹھائے گا۔ یہ ضابطۂ فطرت ہے، قانونِ الٰہی ہے۔ اٹل فیصلہ ہے، دل لگی نہیں، مذاق نہیں۔ جو مانتا ہے مانے، جانتا ہے جانے۔ نہیں مانتا تو حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔ وقتِ حیات تک اس کو ہر تکذیب کی آزادی ہے۔ اللہ کی طرف سے ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ رسی کشادہ ہے۔ آخر گرفت ہوگی۔ رسی کھینچ جائے گی، پھندا گلے میں تنگ کر دیا جائے گا اور لوٹ کر اللہ کی طرف جانا پڑے گا۔ آزادی کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اختیار کا زمانہ گزر جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تحلیلِ اجزاء

والسماء والطارق وما ادرئك ما الطارق النجم الثاقب۔ باوردی نے لکھا ہے طارق اسم فاعل، طروق مصدر، طروق کا معنی کوٹنا، طارق کوٹنے والا۔ اس کے بعد رات کو آنے والے مہمان کو طارق کہا جانے لگا، کیونکہ رات کو عموماً دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ باہر سے آنے والے کو اندر آنے کے لئے دروازہ کوٹنا پڑتا ہے۔ پھر محبوب کی خیالی صورت جو عاشق کو عموماً رات کو آکر ستاتی ہے اور

دماغ کے دروازے کو کوٹ کر اندر داخل ہوتی ہے، طارق کہنے لگے ۔ غیبی مصائب اور بلاؤں کا نزول بھی رات کو ہوتا ہے، اس لئے طارق اللیل مصیبت و بلا کو کہتے ہیں ۔ امام رازی نے طارق کا استعمال رات کے ساتھ کیا ہے ۔ دن میں آنے والے کو طارق نہیں کہتے ، مگر امام کی رائے استعمال عرب کے خلاف ہے ۔ حدیث میں آیا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ طَوَارِقِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ اِلَّا طَارِقًا یَّطْرُقُ بِخَیْرٍ یَا رَحْمٰن ۔ اے اللہ اے رحمٰن میں تیری پناہ چاہتا ہوں ۔ رات اور دن کو آنے والی بلاؤں اور مصیبتوں سے ۔ ہاں جو طارق خیر کو لے کر (اُس سے پناہ نہیں چاہتا) فتح البیان ۔ رات کو نکلنے والے تارے کو بھی طارق اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے ۔

ما ادراك ۔ آپ کو کیا معلوم یعنی آپ نہیں جانتے کہ طارق کیا ہے ہم بتاتے ہیں کہ طارق سے نجم ثاقب ہے ۔ سفیان بن عیینہ محدث نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جس جگہ ما ادراک فرمایا ہے وہاں رسول اللہ کو بتا دیا گیا ہے اور جس چیز کے لئے ما یدریک فرمایا ہے اس سے رسول اللہ کو واقف نہیں کیا گیا ہے جیسے ما یدریک لعل الساعۃ قریب (کبیر و سراج)

النجم الثاقب ۔ روشن تارہ ۔ اس سے زحل مراد ہے (فراء) صبح کے ستارہ کو الطارق کہا جاتا ہے (جوہری فی الصحاح) واحدی نے کہا کہ بعض مفسرین کے نزدیک تمام ستارے مراد ہیں جو دن کو نظر نہیں آتے اور رات کو چمکتے ہیں قتادہ کا بھی یہی قول ہے ۔

اکثر اہل تفسیر کے نزدیک شہاب ثاقب مراد ہے ۔ ثقب روشن ہونا ۔ ثاقب روشن (ابن عباس) یا ثقب کا معنی سوراخ کرنا یا ثاقب سوراخ کرنے والا یعنی شیاطین کے بدن کے اندر (گولی کی طرح) گھس کر سوراخ کرنے والا ۔ (سدی) خطیب نے دونوں لغوی معنی کو جمع کر دیا اور فرمایا روشنی دینے والا اور اندھیرے میں سوراخ کرنے والا ۔ (سراج) خطیب کا یہ مقصود نہیں ہے کہ نجم ثاقب یعنی شہاب ثاقب سے شیاطین کو مارا نہیں جاتا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ثقب کے دونوں معنی نجم میں موجود ہوتے ہیں ۔ وہ روشن ہوتا ہے اور روشنی تاریکی میں گھس کر اس کو پھاڑتی اور سوراخ کر دیتی ہے ۔ اس لئے ثاقب کے دونوں معنی اس میں موجود ہوتے ہیں ۔

امام رازی نے لکھا ہے نجم کو ثاقب کہنے کی چند وجوہ ہیں ۔ تاریکی میں اس کی روشنی سوراخ کرتی اور پار ہو جاتی ہے ۔ شیاطین میں نفوذ کرتا اور ان کو جلاتا ہے ۔ ثاقب کے معنی بلند بھی ہے ۔ فراء نے اس کی صراحت کی ہے ۔ بلند پرواز پرندے کو طائر ثاقب کہا جاتا ہے ۔ نجم کا بلند ہونا ظاہر ہے ۔ صحیح حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ شہاب ثاقب سے فرشتے شیطانوں کو مارتے ہیں ۔ اللہ کے احکام ملائکہ پر نازل ہوتے ہیں ۔ شیاطین اوپر چڑھ کر فرشتوں کی باہمی گفتگو معلوم کرنا چاہتے ہیں ۔ شیاطین ان کے آتشیں گولے مارتے ہیں ۔ شیاطین بھاگتے ہیں اور بھاگتے بھاگتے کسی نے کوئی راز سن لیا ہوتا ہے تو وہ نیچے والے شیطان سے کہہ دیتا ہے اور اس طرح سلسلہ وار ہر شیطان نیچے والے کو وہ اطلاع دیتا ہے ۔ آخری شیطان کسی کاہن سے وہ بات کہہ دیتا ہے اور کاہن اس میں سچ جھوٹ ملا کر لوگوں سے کہتا اور ان کو اپنی غیب دانی کا یقین دلا کر گمراہ کرتا ہے ۔ شاہ عبد العزیز صاحب کی تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطانوں کی سرشت دخانی مادہ سے ہوئی ہے ۔ اسی لئے تاریکی ان کو پسند ہے اور روشنی سے نفرت ہے ۔ اگر مکان میں روشنی ہو تو اس میں شیاطین کا دخل کم ہوتا ہے ۔ اللہ نے آسمان کو نورانی قندیلوں سے روشن کیا تاکہ شیاطین ادھر سے بھاگیں ۔ اس کے علاوہ ستاروں کی شعاعوں کی گیند بنا کر ملائکہ ان کو مارتے ہیں ۔ جیسے دشمن کو توپ کے گولے سے مارا جاتا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ توپ کو گولہ یا گولے کو توپ نہیں کہا جاتا اور نجم کا اطلاق ستارہ پر بھی ہوتا ہے ۔ اور ستارے کی شعاعوں کی گیند پر بھی ۔

چونکہ آسمانی ستارے اپنے گردوں سے باہر نہیں جاتے نہ وہ ٹوٹنے اور پھینک کر مارنے کی چیزیں ہیں ، اس لئے شاہ صاحب نے شہاب ثاقب یعنی آتشیں گولے کے متعلق فرمایا کہ اس کو بھی عربی میں نجم کہتے ہیں ۔ لیکن شہاب کی حقیقت کیا ہے ۔ اس پر شاہ صاحب نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔

ستاروں کے تین فوائد قرآن میں بیان کئے گئے ہیں ۔ آسمان کی زینت ہیں ، جنگل میں مسافروں کے راہنما ہیں ۔ ستاروں کو دیکھ کر مسافر کو سمت معلوم ہو جاتی ہے ۔ مشرق مغرب جنوب شمال کا پتہ چل جاتا ہے ۔ آسمان کی طرف چڑھنے والے شیطانوں کو ان کے ذریعہ سے مار بھگایا جاتا ہے ۔ مؤخر الذکر فائدہ ان شعاعوں کا ہے جن کا آتشیں گولہ بنا کر شیطانوں پر پھینکا جاتا ہے اوّل اور دوسرا فائدہ ستاروں کی ذات سے وابستہ ہے ۔

فن ائیات کے عالم نجم ثاقب کو مادی اسباب سے وابستہ سمجھتے ہیں ۔ دخانی یا بخاری اجزاء کا اوپر کو اٹھنا اور وہاں پہنچ کر مشتعل ہو جانا اس کی

تخلیق کا سبب ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ تخلیقی اسباب یہ ہوں یا کچھ اور ۔ قرآن مجید اشیاء کی ماہیت نہیں بیان کرتا ۔ یہ طبعیات کا کتابچہ ہے ۔ تنقیح ماہیات کے لیے اس نے انسانی افکار کو آزاد چھوڑ دیا ہے بلکہ عبرت اندوزی اور نصیحت پذیری کے لیے اس نے موجوداتِ ارضی ، فضائی اور فلکی پر غور کرنے کی ترغیب بار بار دی ہے ۔ قرآن مجید ان سطحی اور ظاہری منافع کو بار بار بیان کرتا ہے جو عامی اور ناواقف آدمی کے لیے بھی ناقابلِ انکار ہے ۔ چونکہ تمام معلولات علت پر دلالت کرتے ہیں ، اس لیے ان آثار کو دیکھ کر افعالِ الٰہیہ پر استدلال کیا جاتا ہے اور کوئی فعل بغیر قوت اور صفت کے نہیں ہوتا ، اس لیے اللہ کی قدرت ، حکمت ، صفت ، مشیت اور دوسری صفات کا پتہ چلتا ہے اور صفات کا تحقق بغیر ذات کے ناممکن ہے ۔ اس طرح ذاتِ مقدس صفات کا ثبوت ملتا ہے جو مرکزِ الوہیت ہے ۔ رہے مادی اسباب اور کائنات کی شکلیں ان کے بیان سے قرآن نے اعراض کیا ہے ۔ ان مباحث کی نظری تنقیح سے فائدہ اندوز صرف اربابِ علم اور دانشور ہو سکتے ہیں ۔ عوام ان کو سمجھ نہیں سکتے اور اہم اصلاح عوام کی اصلاح ہے ۔

ان کل نفس لما علیہا حافظ شہاب ثاقب کی روشنی سے بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ مل جاتا ہے ۔ آسمان کی زینت بھی ہوتی ہے اور شیاطین کو بھی دفع کیا جاتا ہے تاکہ وہ نظامِ علوی میں دخیل نہ ہو سکیں اور غیبی اسرارِ ملکوتی ان پر ظاہر نہ ہوں ۔ اس طرح اللہ نے ملأ اعلیٰ اور عالمِ بالا کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے ، لیکن عالمِ ملکوت کی ایک خاص کرن انسان کو بھی عطا کی گئی ہے جو حقیقت میں انسان کو انسان بنانے اور کہلوانے کی اصل علت ہے ۔ اگر وہ نہ ہو تو انسان گوشت پوست کا لوتھڑا اور آب و گل کا مجسمہ ہے ۔ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ۔ اس ملکوتی شعاع کا نام روح ہے ۔ یہی حاملِ وحی و الہام ہے ۔ یہی صاحبِ ادراک و عرفان ہے ، یہی سرچشمۂ حیات ہے ۔ یہی موجبِ حرکات اور منبع شعور ہے ۔ یہی فاعلِ مختار اور لذت و الم کا احساس کرنے والی جان ہے ۔ یہ روح حیوانی نہیں ، روحِ نفسانی نہیں ، روحِ طبعی نہیں ، آکسیجن اور اجزائے نسیم نہیں بلکہ روحِ الٰہی ہے ، شعاعِ ملکوتی ہے ، ملأ اعلیٰ کی چمک ہے ، جلوۂ قدس کا پرتو ہے ۔ ارضی کائنات میں اس کے دشمن اور بڑے دشمن شیاطین ہیں خصوصاً نفسِ مومن سے شیطان کی خصومت تو موروثی ہے ۔ آدم کو سجدہ کرنے سے ابلیس نے انکار کیا ۔ اس کی علت یہی نفسِ مطمئنہ تھا ۔ اسی کو آدم کے اندر دیکھ کر اس کو حسد ہوا تھا ۔ اس روح کی حفاظت کا انتظام بھی اللہ نے کر دیا ہے ۔ ملکوتی طاقتوں کو اس کا محافظ بنا ہے ۔ زمخشری نے ایک حدیث نقل کی ہے اور زمخشری کے حوالے سے خطیب نے بھی اس کو لکھا ہے کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا وُکِّلَ بِالْمُؤْمِنِ مِائَةٌ وَسِتُّوْنَ مَلَكًا يَذُبُّوْنَ عَنْهُ كما يذب عن قصعة العسل الذباب ولو وكل العبد الى نفسه طرفة عين لاختطفته الشياطين عضوا عضوا یعنی مومن کی حفاظت کے لیے ایک سو ساٹھ فرشتوں کو مقرر کر دیا گیا ہے جو (شیاطین کو) اس سے دفع کرتے ہیں ۔ جس طرح شہد کے پیالے سے مکھیوں کو دفع کیا جاتا ہے ۔ اگر پل بھر کے لیے بندہ کی حفاظت خود اس کے سپرد کر دی جائے تو شیطان اس کی بوٹی بوٹی چبا کر لے جائیں ۔

یوں تو ہر روح کے محافظ فرشتے ہیں ، لیکن روحِ مومن کی حفاظت کے لیے فرشتوں کی تعداد زیادہ کر دی گئی ہے ۔ کیونکہ اس کی تاک میں شیاطین بھی زیادہ لگے رہتے ہیں ۔ سورۂ رعد کی ایک آیت میں بھی حَفَظَةً سے یہی نگہبان مراد ہیں ۔ ارشاد فرمایا ہے وهو القاهر فوق عباده ويرسل عليكم حفظة حتى اذا جاء احدكم الموت توفته رسلنا وهم لا يفرطون ۔ ایک اور آیت میں انہی کو معقبات فرمایا گیا ہے ۔ ارشاد ہوا ہے ۔ له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من امر الله ۔ یعنی آدمی کی حفاظت کے لیے آگے پیچھے کچھ نگہبان لگے رہتے ہیں جو بحکمِ خداوندی اس کی حفاظت رکھتے ہیں ۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہر نفس کی حفاظت کے لیے ملائکہ مقرر ہیں ۔ آیت مذکورہ کا یہی مطلب ہے ۔ مذکورہ بالا دونوں آیات بھی عموم حفاظت کو ظاہر کر رہی ہیں ۔ مومن ہو یا کافر ، فرماں بردار ہو یا نافرمان ہر نفس کی حفاظت فرشتے کرتے ہیں ۔

انسانی اعمال کو لکھنے والے اور اچھے برے عمل کو درج رجسٹر کرنے والے ملائکہ جدا ہیں جن کی صراحت آیت ان علیکم لحافظین کراماً کاتبین میں کی گئی ہے اور صرف الفاظ کو لکھنے والے اور ان کی نگہداشت کرنے والے الگ ہیں جن کو آیت ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید میں بیان کیا گیا ہے ۔ اور ممکن ہے اس آیت میں بھی کراماً کاتبین ہی مراد ہوں ۔ بہر حال حفاظت روح کرنے والے ملائکہ سے اعمال و اقوال لکھنے والے فرشتے مراد نہیں ۔ مفسر زجاج کی غلطی فہم ہے کہ انہوں نے دونوں کے ایک ہونے کے امکان کو جائز قرار دیا ہے ۔ ہماری مذکورہ تفسیر اس صورت میں ہو گی کہ نفس سے مراد صرف روح لی جائے ، لیکن اگر کل نفس کل شخص مراد لیا جائے جیسا کہ زمخشری کی

نقل کردہ حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اور مذکورہ بالا سورۂ رعد کی آیت اور اس کے بعد والی آیت سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کی حفاظت کے لئے فرشتے مامور ہیں جو بحکم الٰہی غیبی آفات سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ شیاطین ہوں یا غیر معمولی بلائیں سب سے بچانا انہی فرشتوں کا کام ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطری تغیرات سے بھی بدن کو فرشتے بچاتے ہیں۔ بیماری، صحت ہر آن ذرات بدن کا انحلال اور پیداوار بچپن، جوانی اور پیری غیر معمولی حوادث نہیں۔ یہ تو زمانہ کے تغیرات اور انقلابات ہیں جن سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ ہاں جسمانی تغیر سے روح حیات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ روح نہ جوان ہوتی ہے نہ بڈھی نہ بیمار۔ انسان کی انانیت اور انفرادیت میں کبھی فرق نہیں آتا لباس بدلتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت پر یہ مادی لباس بالکل تار تار ہو کر مٹی میں مل جائے گا، ذرات عنصری بکھر جائیں گے، لیکن روح بہرحال باقی رہے گی اور قیامت کے دن اجزائے اصلیہ کو جمع کر لینا عقلاً محال نہیں ہے ہاں لیکن کم فہم لوگوں کے لئے باعث تعجب ضرور ہے۔ اسی تعجب کو دور کرنے کے لئے بطور تنبیہ فرمایا۔

فلینظر الانسان مم خلق من ماءٍ دافقٍ یخرج سے والترائب تک آدمی کو غور کرنا چاہیئے کہ اس کی یہ لمبی چوڑی ساخت کس چیز سے ہوئی۔ ایک قطرہ ہی تو تھا جو (دماغ سے چل کر) سینہ اور پشت کی ہڈیوں کے درمیانی راستے سے ہو کر کود کر باہر آیا تھا اور ماں کے پیٹ میں اس کا خمیر ہو کر رفتہ رفتہ انسانی مجسمہ تیار ہوا تھا۔ اس پانی سے اتنا لمبا چوڑا جسم کیسے بنا، پانی کہاں سے اور کیسے آیا، نباتی اور حیوانی غذاؤں کے اجزا کہاں سے اور کس طرح فراہم کئے گئے۔ ایک سبق ہے۔ بہت زیادہ غور طلب۔ سارے جہان کے دانشور مل کر بھی آج اس کی پوری تفصیل سے واقف نہیں ہو سکے۔ ماں باپ کو اجزاء غذا کہاں سے حاصل ہوئے اور کیسے حاصل ہوئے۔ پانی مٹی ہوا کے قوام اور حرارت کے اثر کرنے سے سبزہ کیسے پیدا ہوا۔ اس میں مختلف خاصیات کیسے پیدا ہوئیں۔ نوعی اور شخصی تقاضوں میں چگونگی اور نیرنگی کیوں ہے اور کیسے ہے۔ انڈے، ملک، کاغذی لیموں اور کیلے وغیرہ میں فاسفورس، اور وٹامن کیوں زائد ہے۔ انسان کو وٹامن کے مختلف نمبروں کی مختلف مقداروں میں کیوں ضرورت ہے۔ یہ تمام مباحث اتنے تنقیح طلب ہیں کہ لاکھوں صفحات بھی اب تک مکمل تشریح کے لئے کافی نہ ہو سکے اور ہر روز معراج علمی رو بہ ترقی ہے۔ اتنی طویل فکری کاوش سے قطع نظر کر کے صرف اتنا ہی مطالعہ کم حیرت آفریں نہیں ہے کہ ماں باپ کا نطفہ کیا چیز ہے اور ماں باپ کے بدن کے ہر حصہ سے یہاں تک کہ ہر بال ہو سے کھنچ کر کیسے آتا ہے اور تمام اجزاء بدن سے کھنچ کر آئی ہوئی رطوبت جو صلب و ترائب کے درمیانی راستوں سے نکل کر اچھل کر حدیقۃ الرحم اور خصیۃ الذکر سے چکر کاٹ کر رحم میں گرتی ہے۔ کیا ہے۔ اور اس کے اندر کون سی استعداد تخمیری ہے جس کی وجہ سے اتنا لمبا چوڑا آدمی بن جاتا ہے۔ کمزور باکورہ عروق شعریہ (بالوں کی طرح باریک رگیں جو نالی دار ہیں) سے رطوبت لعابیہ کا کھنچ کر ایک خاص ضابطہ کے تحت آنا کیا کم تعجب خیز ہے پھر کود کر اچھل کر آنا اور بھی حیرت آفریں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی دباؤ نے دھکیل کر اس کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا یا عالم حیات میں پہنچنے کا اس کو فطری شوق اس قدر ہے کہ کود کر باہر آتا ہے اور کوئی طاقت اس کے شوق کو روک نہیں سکتی۔

بدن کے پراگندہ اجزاء کی تو ایک ہستی تھی۔ پہلے ان میں اتصال تھا۔ مرنے کے بعد پراگندگی پیدا ہو گئی۔ پہلے ان کی خصوصیات کچھ اور تھیں پراگندگی کے بعد وہ خصوصیات باقی نہیں رہیں اور نئی کیفیات پیدا ہو گئیں۔ نطفہ کی تخلیقی صلاحیتیں تو نیستی سے ہستی کی مظہر ہیں۔ وجود کے بعد عدم عارضی کو دور کر کے دوبارہ ہست کر دینا زیادہ دشوار نہیں۔ پراگندہ کو سمیٹ دینا آسان ہے۔ ٹیڑھے کو سیدھا کرنا اور بگڑی کو بنانا کتنا ہی دشوار ہو مگر نا قابل فہم نہیں۔ نیست سے ہست کرنا اور اصلی عدم سے نکال کر موجود کرنا نہ تو فقط دشوار بلکہ نا قابل فہم ہے۔

ہو سکتا ہے اور سمجھ میں آتا ہے یہ امر کہ اجزاء بدن کے عارضی انتشار اور غیر زوال پذیر تبدیل کو دور کر کے اصلی خصوصیات اور اجتماع کی طرف اجزاء کو پہنچا دیا جائے مگر جس کی نہ صورت نہ مادہ اس کی ایجاد تو ہر فہم رسا کی حدود سے بھی باہر ہے۔

دافق۔ صیغہ اسم فاعل۔ دفق مصدر۔ دھکیلنا۔ آگے کو دفع کرنا۔ ابن عطیہ نے کہا اجزاء باہم دوسرے کو دھکیلتے ہیں، اس لئے نطفہ کا پانی دافق بنا۔ بعض نے کہا اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے دھکیلا گیا۔ کود کر نکالا گیا۔

منتخب نے لکھا ہے دفق کا معنی بہانا، ثعلبی کے قول پر بھی دافق بمعنی مدفوق کے ہوگا۔ مراد وہ مخلوط پانی ہے جو مرد اور عورت کے بدن سے کھنچ کر آتا ہے اور قرارگاہ رحم میں جمع ہوتا ہے۔

صلب اور ترائب کی تشریح کے لئے مختلف روایات آئی ہیں۔

پانی مرد کی پشت اور عورت کے ترائب کے راستے سے آتا ہے (عکرمہ از ابن عباس و سعید بن جبیر و قتادہ و سدی)

حضرت ابن عباسؓ نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ ترائب ہے (رواہ ابن ابی حاتم) علی بن ابی طلحہ کے سلسلہ سے حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے کہ عورت کی دونوں پستانوں کے بیچ (کی ہڈیاں) ترائب ہیں۔

سفیان ثوری نے کہا عورت کی پستان سے اوپر ترائب ہیں۔ مجاہد نے کہا دونوں مونڈھوں اور سینے کے درمیان ترائب ہیں۔ مجاہد سے دوسری روایت یہ بھی آئی ہے کہ ہنسلی سے نیچے ترائب ہیں۔

نطفہ اول کہاں پیدا ہوتا ہے اس کی تشریح امام رازی، ابو السعود اور خطیب وغیرہ نے بڑی تفصیل سے کی ہے، لیکن بے حاصل ہے۔ قرآنی آیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت میں نطفہ کے آنے کا راستہ پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے بتایا ہے اور یہ بدیہی حقیقت ہے۔ نطفہ کی اصل پیدائش کا مقام کون سا ہے اس سے مفہوم آیت کا کوئی علاقہ نہیں۔

انہ علی رجعہ لقادر۔ نطفہ کے تمام تخلیقی تغیرات حسب اللہ کے علمی اندازہ کے موافق اس کی قدرت سے ہوئے تو بلاشبہ وہ اس کو دوبارہ لوٹا کرلانے پر قادر ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے رَجْعِہٖ کی ضمیر یا ماء دافق کی طرف راجع ہے یعنی انسان کو پھر پیدا کرنے پر اللہ قادر ہے۔ یہ قول ضحاک کا ہے۔ شیخ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اسی کو امام رازی نے ترجیح دی ہے۔

یوم تبلی السرائر۔ تبلٰی بَلُوٌ سے مشتق ہے بلو کا معنی جانچنا، پرکھنا یا کھول دینا۔ قفال نے اول معنی کو پسند کیا ہے۔ اور یہ تشریح کی ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے سامنے لایا جائے گا اور اس کو دیا جائے گا۔ پھر ہر عمل کو اصلی حالت میں بھی اس کے سامنے کر دیا جائے گا اور آدمی خود جانچ کرے گا کہ اس کا وہ عمل اعمال نامے میں درج ہے یا اس کے خلاف درج ہے بعض لوگوں نے اول معنی کو تو اختیار کیا ہے مگر تشریح میں قفال سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک جانچنے کا معنی یہ ہے کہ ہر عمل کی اصلی خوبی یا برائی کی پرکھ کی جائے گی۔ بظاہر بعض اعمال اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر واقع میں برے ہیں جیسے دکھاوٹ کی عبادت۔ بعض کام بظاہر برے ہیں مگر عند اللہ اچھے ہیں۔ اول پر عذاب اور دوسرے پر ثواب مرتب ہوگا۔

اکثر اہل تفسیر نے دوسرا معنی پسند کیا ہے یعنی قیامت کے دن اچھے برے کھول دیئے جائیں گے۔ امام رازی نے فرمایا یعنی عقائد، قلبی ارادے اور پوشیدہ عقائد سب واشگاف ہوں گے۔ السرائر کا لفظ ان تینوں کو شامل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا قیامت کے دن اللہ ہر چھپی چیز کو ظاہر فرما دے گا۔ پس بعض چہروں پر رونق ہوگی اور بعض چہروں پر بدرونقی۔

فمالہ من قوۃ ولا ناصر۔ نہ کسی میں خود مدافعت دفاع ہوگی نہ کوئی واقف کے ساتھ حمایت کرنے والا ہوگا۔ حمایت کر کے بچانا تو درکنار لہا حمایتی ہی نہ ہوگا۔

ایک وہم کا ازالہ

اس آیت میں نفی شفاعت لازم نہیں آتی۔ ناصر وہ ہوتا ہے جو اپنے بل بوتے پر حمایت کرتا ہے اور شفیع باذن الٰہی شفاعت کریں گے۔ اپنی طاقت وقوت سے نصرت کرنے والے نہ ہوں گے۔ عکرمہ نے دوسرے مفسروں سے ہٹ کر آیت کا مصداق ان بادشاہوں کو قرار دیا ہے جن کے پاس دنیا میں ہر طرح کی طاقت ہوتی ہے اور تو جیس مددگار رہوتی ہیں۔ مگر قیامت کے دن کچھ نہ ہوگا (فتح)

اہل معارف کیلئے چند معرفت افزا نکات

شیخ شیرازی نے لکھا ہے کہ ہر صدیق کا قلب آسمان ہے جس میں تجلی ذات وصفات کے ستارے چمکتے ہیں۔ شیخ ابن عربی نے لکھا ہے آسمان روح ہے اور طارق عقل

جو نفس کی تاریکی کو دور کرنے والا روشن ستارہ ہے۔ اسی سے ہدایت ملتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے یوم تبلی السرائر کے ذیل میں لکھا ہے کہ دنیا میں بدن کے احکام غالب ہیں اور روح کے احکام مغلوب۔ اسی لئے آدمی روح کی مذموم صفات کو یہاں چھپا لیتا ہے۔ بزدلی، کنجوسی اور دوسرے قلبی امراض کو اس طرح پوشیدہ رکھتا ہے کہ چہرے پر گھبراہٹ اور اضطراب کے آثار بھی نمودار نہیں ہونے دیتا، لیکن قیامت کے دن روح کے احکام غالب ہوں گے۔ جوہر روح کی سیاہی چہرے کی سیاہی بن کر نمودار ہو جائے گی۔ باطنی کثافت چھپائے نہ چھپے گی۔ تمام پوشیدہ اوصاف ظاہر ہو جائیں گے۔

والسماء ذات الرجع والارض ذات الصدع انہ لقول فصل وماھو بالھزل رجع کا معنی ہے لوٹنا۔ بارش کو بھی رجع اسی مناسبت سے کہتے ہیں کہ آبی اجزاء ہوائی اجزا سے مخلوط ہو کر مان سون کی شکل میں سمندر، دریا اور مرطوب مقامات سے اٹھتے ہیں۔ فضا میں گھٹا چھا جاتی ہے پھر سردی پا کر وزنی ہو کر نیچے گرتے ہیں حرکت سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے تخلخل ہوتا ہے اور اسی طرح بھاپ دوبارہ پانی بن کر برستی ہے گویا نزولی حرکت رجعی ہوتی ہے۔ زمین سے اٹھنے والا پانی پھر لوٹ کر پانی کی شکل میں ہو کر زمین پر آ جاتا ہے۔ رہا دورہ اور چکر تو اس میں بہرحال مبدء حرکت کی طرف ہر متحرک لوٹتا ہی ہے۔

زجاج، خلیل، رازی، ابوالسعود اور اکثر اہل تفسیر نے رجع بمعنی بارش لیا ہے۔ واحدی نے اس پر اجماع مفسرین نقل کیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ بارش کو رجع کہنے کی وجہ ایک تو ہم نے اوپر ذکر کر دی۔ دوسری وجہ قفال نے یہ بیان کی ہے کہ ہمیشہ بار بار لوٹ کر آتا ہے۔ برسنے کے بعد ابر چلا جاتا ہے پھر دوسری فصل میں ابر لوٹ کر آتا ہے۔ ابن زید نے رجع سے مراد لیا ہے چاند، سورج اور ستاروں کے طلوع و غروب کا دورہ۔ خطیب نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ قتادہ نے سالانہ غلہ اور بعض لوگوں نے نفع مراد لیا ہے۔

بہرحال رجع کا کوئی معنی مراد لیا جائے لوٹنے کا مفہوم تمام معانی میں مشترک ہے۔ صدع کا معنی ہے پھٹنا اور شگاف کو بھی صدع کہتے ہیں۔ زمین نباتات کی روئیدگی سے پھٹ جاتی ہے (حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، ابو مالک، ضحاک، حسن بصری، قتادہ وغیرہ) لیث نے کہا صدع زمین کی نباتات کو کہتے ہیں (کبیر) خطیب نے لکھا ہے کہ زمین پھٹ کر سبزہ نہریں اور چشمے برآمد ہو جاتے ہیں، اس لئے زمین ذات الصدع ہوئی۔ مجاہد نے کہا صدع کا معنی ہے پہاڑی راستے یعنی کوہستانی تنگ ڈنڈیاں۔ شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ زمین پھٹ کر طرح طرح کی نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ چشمے جاری ہوتے ہیں۔ جواہر کانوں سے نکلتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آسمان اور ستارے دورہ کرتے ہیں۔ ہر ایک چکر میں ہے یا ابر سے مینہ برستا ہے جہاں سے مان سون چلتے ہیں۔ لوٹ کر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک چکر جاری ہے۔ پس قسم ہے فلک دوار یا ابر ریزاں کی کہ انسانی روح کو بھی دوبارہ جسم کے اندر داخل ہونا اور مکرر زندہ ہونا ہے۔ اور قسم ہے شگافتہ زمین کی جس کے شگافوں سے بارش اور سمندروں کا پانی چشموں اور فواروں کی شکل میں ابھرتا اور پوشیدہ ذخیرہ جواہر کی صورت میں نکلتا ہے کہ زمین قیامت کے دن اپنے سارے دفینوں کو اگل دے گی اور مردوں کو اوپر لے آئے گی۔

اس بعثت اور حیات ثانوی کا فیصلہ اٹل ہے مذاق نہیں ہے۔

انھم یکیدون کیدا و اکید کیدا۔ کافر قرآن کے اس اٹل فیصلے کو غلط قرار دینے کے لئے ہر طرح کے داؤں کرتے ہیں (کبھی اس کو داستان پارینہ کہتے ہیں کبھی جھوٹے ڈراوے۔ کبھی وہمی شبہات وارد کرتے ہیں۔ کبھی اجزاء پراگندہ کے دوبارہ اجتماع کو محال قرار دیتے ہیں)۔ مگر اللہ بھی ان کے مقابل مخفی تدبیر کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں ان کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ مال دیا، اولاد دی، عزت دی، حکومت دی، ہمت دی، طاقت دی تاکہ ان نعمتوں میں گھمنڈ کریں کفر اور بدکاری میں آگے بڑھتے جائیں۔ آخر ان کو نتیجہ اجل میں گرفتار ہونا ہے اور مرنے کے بعد سخت ترین عذاب میں گرفتار ہونا ہے۔ یہی اللہ کی مخفی تدبیر ہے جس کو کافر سمجھ نہیں سکتے اور اس مخفی تدبیر سے ان کو جو عذاب پہنچنے والا ہے اس کی طرف سے غافل ہیں۔

فمھل الکفرین امھلھم رویدا۔ کافروں کی ان مکاریوں سے آپ تنگ دل نہ ہوں۔ ان کی یہ مکاریاں اور زور آزمائیاں ہی اسلام کی اشاعت میں

کی کثرت وقوت اور کافروں کی تباہی کے لئے اللہ کی مخفی تدبیر ہے۔ اس لئے آپ ان کو ڈھیل دیں اور ان کے لئے بددعا کرنے یا ان سے مسلمانوں کا انتقام لینے میں جلدی نہ کریں بلکہ

امھلھم رویدا۔ کچھ مدت تک ان کو مہلت دیں کہ سوچنے والے سوچ کر راہِ راست پر آجائیں اور ضدی معاندوں کے مقابل اتمام حجت ہو جائے اور پھر ان کی جڑ اکھاڑ دی جائے۔ چنانچہ اللہ کے رسول نے مکہ کے کافروں کے ہاتھوں سے ہر قسم کا دکھ اٹھایا۔ اہلِ ایمان نے شدید ترین مصائب برداشت کیں مگر بددعا کا ایک لفظ زبان پر نہ لائے اور اللہ نے بھی چودہ برس تک ڈھیل دی۔ انتقام لینے کا حکم نازل نہیں کیا۔ چودہ سال کی مدت میں نابالغ بلوغ کی حد میں داخل ہو جاتا ہے نہ سمجھنے والا اچھا بُرا سمجھنے لگتا ہے۔ شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈھیل کی یہ مدت کافی تھی جب عقلی نقلی بیانی اور خطابی ہر رنگ سے سمجھانے کا دور ختم ہو گیا اور ہٹ دھرم اہلِ عناد کو فہمائش کرنے کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہا تو حکمِ انتقام نازل ہوا اور دفاعی جہاد کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت مل گئی۔

ایک نکتہ شیخ شیرازی نے کہا آسمانِ قدس سے تجلیات کی بارش عارف کے دل کی زمین پر ہوتی ہے جس سے محبت کا سبزہ اور حکمت کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ السماء ذات الرجع والارض ذات الصدع سے اسی طرف اشارہ ہے۔

مقصودِ بیان پوری سورت کا نزول قیامت کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے ہوا اور آخر میں بطور اتمام حجت کافروں کو ڈھیل اور مہلت دینے کا حکم ہوا۔ قیامت کے اثبات کے لئے آغاز سورت میں سماء اور طارق کی قسم کھائی ہے جس پر غور کرنے کے بعد قیامت کا برپا ہونا نہ فقط ممکن بلکہ لازم ہو جاتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی کسی مخلوق کو یہاں تک کہ آسمان کو بھی غیر محفوظ نہیں چھوڑا ہے بلکہ غیبی اسبابِ حفاظت فراہم کر رہے ہیں۔ جو اپنے فرض کو ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ ایک بات یہ بھی مترشح ہوتی ہے کہ ظہور سے پہلے اسرارِ غیبی اور اللہ کے احکامِ انتظامی تک رسائی کسی شیطان کی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ کے مقررہ کارندوں کی طرف سے اس پر مار پڑتی ہے۔ اس سے یہ امر بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ وحی چونکہ اللہ کا ایک سربستہ راز ہے۔ پیغمبروں تک پہنچانے میں اس کی حفاظت کا زبردست غیبی انتظام کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی شیطان اس سے واقف نہ ہو سکے اور کسی قسم کا بگاڑ نہ کر سکے۔ اسی لئے وحی کے وحیِ الٰہی ہونے میں نہ پیغمبر کو شبہ ہوتا ہے نہ وحی میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر شیطان کی دست برد اور وہم کی مداخلت سے محفوظ ہوتی ہے۔

ہر شخص کی (شیاطین سے) حفاظت کے لئے اللہ کی طرف سے نگہبان مقرر ہیں۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ کوئی شخص اللہ کی دیدبانی اور نگرانی سے خارج نہیں اور نہ اپنے خاتی بل بوتہ پر زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ بحیثیت خالق ہونے کے اللہ کو اپنی مخلوق سے بہت زیادہ محبت ہے اور اسی کی محبت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کے لئے غیبی محافظ مقرر ہیں۔ خواہ کافر ہوں یا مومن۔ گنہگار یا اطاعت شعار قیامت کی دو خصوصی حالتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اس روز تمام ڈھکی چھپی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ افکارِ دماغی۔ نیاتِ قلبی اور پوشیدہ اعمالِ جسمانی کوئی بھی چھپا نہیں رہے گا۔ انسان کے تمام وجدانیات اور قلبی واردات اور صفاتِ نفسانیہ کا ظہور ہو جائے گا اور روح کی صحت و بیماری کی ہر حالت مصور ہو کر سامنے آجائے گی۔

دوسری یہ کہ اعمال کی پاداش کو دفع کرنے کی طاقت نہ کسی میں خود ہو گی نہ کوئی دوسرا حامی ہو گا کہ اللہ کے عذاب کے مقابلے میں حمایت کر سکے۔

اکید کیدا میں کیدا کی تنوین بتا رہی ہے کہ اللہ کی مخفی تدبیریں نامعلوم ہیں۔ کافروں کو نعمتوں سے سرفراز کرنا اور دن دونی رات چوگنی ترقی دینا اس کی طرف سے خطرناک مخفی تدبیر ہے جس کا غور بہت سخت ہے۔ اللہ کے داؤں سے محفوظ رہنا ناممکن ہے وغیرہ۔

(بقیہ پارہ دوسری قسط میں جلد پیش کیا جائے گا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السبحان

کا

پارہ نمبر ۳۰

(جزو ثانی)

عم

از

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ "مولوی" دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے اصرار پر

بصورت پارہ

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک و مدیر ماہنامہ مولوی دہلی

نے برائے اشاعت معارف القرآن

وسیم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی) سے شائع کیا

تیسواں پارہ سورۃ الاعلیٰ جزو ثانی

اس کا نام الاعلیٰ اور سورۃ سبح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ سورت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے۔ ضحاک نے اس کو مدنی کہا ہے (سراج) نووی شارح مسلم نے کہا اس سورت میں علوم و معارف بکثرت ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ کو اس سے بڑی محبت تھی۔ اس سورت میں ۱۹ آیات، ۷۲ کلمات اور ۲۸۴ حروف ہیں (سراج) صحیح روایات میں اس کے فضائل بکثرت منقول ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا سورۃ سبح اسم ربک الاعلیٰ سے رسول اللہ کو بہت محبت تھی (رواہ احمد والبزار وابن مردویہ) حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ عید الفطر اور عید الضحیٰ اور جمعہ میں رسول اللہ صلعم سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ہل اتاک حدیث الغاشیہ پڑھتے تھے اگر (عید اور جمعہ) دونوں کا اجتماع ایک دن ہو جاتا تو دونوں میں یہی پڑھتے تھے (رواہ احمد ومسلم واہل السنن) حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں حضور سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تھے (رواہ مسلم) حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ رسول اللہ وتر میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ احد پڑھتے تھے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارقطنی والحاکم والبیہقی) حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ وتر کی پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ دوسری رکعت میں قل یا ایہا الکافرون اور تیسری رکعت میں قل ہو اللہ احد یا قل اعوذ برب الفلق یا قل اعوذ برب الناس پڑھتے تھے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والحاکم والبیہقی) یہ حدیث مجمل اور مفصل صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے جیسے عبداللہ ابن عباس عبدالرحمن ابن ابزیٰ جابر ابوامامہ عبداللہ ابن مسعود امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِىْ قَدَّرَ

(اے پیغمبر) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے جس نے (ہر شے کو) بنایا پھر (اسکو) ٹھیک بنایا اور جس نے تجویز کیا

فَهَدٰى ۙ وَالَّذِىْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ۙ سَنُقْرِئُكَ

پھر راہ بتلائی اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا پھر اس کو سیاہ کوڑا کر دیا ہم (جتنا) قرآن (نازل کرتے جاویں) آپ کو پڑھا دیا کرینگے

فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۙ وَنُيَسِّرُكَ

پھر آپ نہیں بھولیں گے مگر جس قدر (بھلانا) اللہ کو منظور ہو گا (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے) وہ ہر ظاہر اور مخفی کو جانتا ہے اور (اسی طرح) ہم اس آسان شریعت

لِلْيُسْرٰى ښ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۭ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾

کیلئے آپکو سہولت دیں گے تو آپ نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾

اور جو شخص بدنصیب ہو وہ اس سے گریز کرتا ہے جو (آخرکار) بڑی آگ میں (دوزخ) داخل ہو گا پھر نہ اس میں مر ہی جاویگا اور نہ (آرام کی زندگی) جیے گا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝

بامراد ہوا جو شخص پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا مگر تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر ہے

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝

اور پائدار ہے یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں (پس زیادہ تر متوکل رہو)

تفسیر اللہ کی ذات مقدس لغزش بازی اور آلودگی زنہار سے وہ تو ازل الآزال اور ابدالآباد سے ماوراء ہے۔ وہ تعقل اور توہم سے بالاتر ہے وہ ہر تجسیم تشکل تشبیہ اور تکیف سے بھی بلند ہے۔ وہ ہر عیب ہر نقص اور برائی سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح جو نام اس نے اپنے صفات کے لئے لیا فرمائے ہیں، وہ بھی ہر کثافت، نقص اور ہر عیب سے پاک ہیں۔ جس اے انسان اگر تو اپنے ذہن، اپنے ادراک اور اپنی زبان کو پاک رکھنا چاہتا ہے تو اللہ کی ذات و صفات کے متعلق کوئی ناپاک تصور نہ کر۔ نہ کہ وجدان میں بھی اس کی طرف کسی گندی صفت کی نسبت نہ کر۔ اس کے ناموں کے پاک ہونے کا زبان سے بھی اقرار کر اور دل سے بھی یقین رکھ۔ دیکھ وہ تیرا رب ہے تیری روحانی اور جسمانی تربیت و ترقی کا کفیل ہے۔ وہی تیرے جسم کو آہستہ آہستہ ترقی دے کر حد کمال تک پہنچاتا ہے اور وہی تیرے شعور باطن احساس ظاہر، ادراک کلی اور وجدان قلبی کو رفتہ رفتہ بڑھاتا اور بڑھا کر انتہائے تکمیل پر پہنچاتا ہے۔ اسی نے ہر چیز کو اندازہ کے موافق بنایا۔ بنا کر ٹھیک کیا اور کیفیت اعتدالیہ پیدا کی۔ اسی نے خیر شر، حق ناحق، صحیح غلط اور اچھے برے کا علمی اندازہ کیا۔ چیزوں کی اچھائی برائی بتائی اور قوت اختیار کو نازل کرنے کے بعد بناؤ بگاڑ اور صلاح و فساد کے الگ الگ راستے دکھائے ہیں۔ اور اس صفت کا تعلق صرف انسان سے ہی نہیں بلکہ ہر نوع کے ہر فرد سے ہے شخصی اور نوعی اچھائی برائی اور کامیابی و ناکامی کے راستے اللہ نے ہر جامد ذرہ، ہر سیال قطرے، ہر لرزاں پتے اور زندگی کے ہر متحرک جرثومے کو بتا دیئے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات اپنی غذا گرمی یا مٹی نارمی۔ مائی اور حیوانی اجزا سے حاصل کر لیتا ہے اور یہ صرف اللہ کی رہنمائی کا نتیجہ ہے۔

وہی تو ہے جو پردہ عدم سے عالم ظہور میں سبزہ کو لایا۔ زمین کا پیٹ پھاڑ کر ہر کونپل کی سوئی کو اس نے برآمد کیا اور وہی تو ہر سبزہ کو اس کے آخری انتہائی درجہ پر پہنچا کر خشک کر دیتا پھر کالا کوڑا بنا دیتا ہے۔ پس اے انسان جب وہ تجھے انسانی زندگی کا دستور العمل دے رہا ہے اور سکھا رہا ہے اور ہر دفعات باقی رہ گئی ہیں وہ عنقریب تجھے سکھا پڑھا دے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ حد کمال پر پہنچائے بغیر اس دستور کا کوئی حصہ تو بھول جائے یا کوئی دفعہ تیرے دماغ سے محو ہو جائے یا کوئی نقش آئینی تیرے دماغ سے مٹ جائے وہ ہر دفعہ کی کامل توضیح، تشریح اور پوری تفصیل تجھ پر عیاں کر دے گا اور تیری زندگی کو استوار کرنے والے دستور و ضوابط کو بغیر کمال تک پہنچائے ہوئے نہ چھوڑے گا کیونکہ وہ تیرا رب ہے۔ ہاں جتنا حصہ جب وہ خود مناسب سمجھے گا اور جب مناسب سمجھے گا اتنا حصہ تجھے فراموش کرا دے گا تیرے دل کی لوح اور دماغ کے ورق سے مٹا دے گا۔ پھر تجھے یاد بھی نہ ہوگا کہ وہ محو کردہ حصہ کیا تھا۔ اس لئے اس پر عمل نہ کر سکے گا۔ بات یہ ہے کہ اللہ دنیا کی ہر کھلی ڈھکی چیز سے واقف ہے۔ وہ موجودہ اور آئندہ ضروریات کو جانتا ہے۔ وہ انسان کی وقتی اور دوامی مصلحتوں کو پہچانتا ہے۔ وہ تیرے ان اوصاف کا بھی مشاہدہ کرتا ہے جو تیرے اندر اس وقت موجود ہیں اور ان مراتب ترقی کو بھی دیکھ رہا ہے جو آئندہ تجھے ملنے والے ہیں۔ غرض وہ تیرے بیرونی بالفعل کمالات اور اندرونی بالقوہ استعداد سے کامل واقفیت رکھتا ہے، اس لئے وہ تیرے لئے اسی راہ زندگی کی آسانیاں فراہم کرنے لگے گا جو سہل ہے نہ اتنی نرم اور دلدل ہے کہ انسانیت کا پاؤں اس میں پھنس جائے یا آدمیت پھسل کر نیچے گر پڑے نہ اتنی دشوار گزار ہے کہ نوکیلے پتھر پاؤں کو زخمی کر دیں اور آگے قدم بڑھانا دوبھر ہو جائے۔ پس تو خود بھی اس راستے پر چل اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کی بار بار نصیحت کر۔ اگرچہ ہر آدمی اس راہ پر چلنے کا اقرار اپنے رب سے کر چکا ہے مگر پیدائش سے پہلے کیا ہوا عہد اس کو بھول گیا ہے۔ تو اس کو یاد دلا۔ تیری یہ یاد دہانی اس کے لئے سود مند ہوگی۔ مگر نقوش نصیحت قبول

کرنے کی شرط یہ ہے کہ دل میں رقت اور نرمی ہو۔ اگر دل میں خشیۃ الٰہی اور روح میں بیم آمیز رجا آفرین محبت کا گداز ہوگا تو یقیناً تیری نصیحت و سبق آموزی اور موعظت فائدہ رساں ہوگی، لیکن اگر کسی کا دل پتھر کا بنا ہوا ہو تو اس کی سنگینیٔ شقاوت ہر نقش پند کو قبول کرنے سے انکار کرے گی اور کوئی تذکر اس کے لئے سود مند نہ ہوگی۔ ایسے سنگ دلی سے نکلنے والے شرارے اور شعلے یعنی بداعمالیاں اس کو جلا ڈالیں گی۔ اس زندگی میں انسانیت کو سوختہ کر دینے والی بداعمالی اور بداعتقادی اس کو بھونتی رہے گی اور آخرت میں عذاب کی بڑی آگ میں اس کو گھسنا اور جلنا پڑے گا۔ وہاں اس کو نہ موت آسکے گی کہ روح اور جان ختم ہو کر رکھ سے نجات مل جائے نہ جسم ہر آن کی موت اور سوختگی سے محفوظ رہے گا۔ غرض اسی طرح وہ موت و زندگی کے ادھر میں معلق رہے گا بدن کا رونگٹا رونگٹا جلتا جائے گا۔ کوئلہ ہو جائے گا پھر درست ہو جائے گا پھر بریاں کیا جاتا رہے گا۔ اے انسان خوب سمجھ لے کہ

فلاح یاب اور سعادت اندوز ہے وہ آدمی جس کی فکر و نظر، غلطی اور بداعتقادی کے میل کچیل سے پاک ہے۔ جس کا ضمیر بغض، حسد، کینہ، خود پسندی اور دوسرے باطنی عیوب کی سیاہی سے پاک ہے جس کی زبان غیبت، تہمت، جھوٹ، طعن، تشنیع اور ہر طرح کی بدکلامی کی کثافت سے طاہر ہے جس کی آنکھیں ہر گناہ کی شکل دیکھنے سے، کان ہر بری بات سننے سے، قوتِ شامہ ہر حرام خوشبو سونگھنے سے اور پیٹ ہر رشوت، چوری، ڈاکہ، بے ایمانی اور دوسرے ناجائز طریقوں سے حاصل کردہ غذا کی گندگی سے آلودہ نہیں جس کے دست و پا سر و ابرو اور اشارہ و ایماء کسی حرام گرفت، اقدام، حرکت اور کیفیت کی آلائش سے ملوث نہیں۔ جس کے بدن کا رونگٹا رونگٹا اور لباس کا تار تار کراہت آفریں عفونت اور کثافت سے شستہ ہے۔ جس کا اندرون و بیرون اور ظاہر و باطن ہر آلائش سے منجھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ماسویٰ اللہ کو مرکزِ توجہ بنانے اور غیر اللہ سے قلبی تعلق جوڑنے کا غبار بھی اس کے تصور و وجدان کے آئینہ پر نہیں۔ اس سارے میل کچیل اور کثافت و غلاظت کو دور کرنے اور آئینۂ ہستی کو شستہ رفتہ بنانے کے بعد وہ جلا کرتا ہے اپنے دل زبان اور تمام اعضاء بدن پر یادِ الٰہی کی امتثال اوامر کی اطاعت و عبدیت کی۔ پھر قدم بڑھاتا ہے ذکر سے فکر کی طرف معائنۂ آثار سے مکاشفۂ افعال و صفات کی طرف اور آخر میں ہر سیاہی اور سپاہی کی حدود سے گزر کر مطالعۂ جمال کے بحرِ ناپید کنار میں ڈوب جاتا ہے۔ آفتاب وجود کی خیرہ کن نور پاشیاں اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور اس کو اس کی معراجِ ہستی تک پہنچا دیتی ہیں۔

مگر اے اولادِ آدم تم عام طور سے اس زندگی پر ریجھے ہوئے ہو۔ حالانکہ یہ ہر آن رو بزوال ہے، ناپائیدار ہے، حقیر ہے، بے مقدار ہے، آنے والی دوسری زندگی لافانی بھی ہے اور اہلِ ذکر و فکر کے لئے سراسر خیر بھی ہے اس کی منفعت، لذت، عزت و جاہت اس زندگی کی ہر خوبی سے افضل ہے۔ جس نے اس زندگی کو انسانیت کا اصلی مرکز و مقام سمجھ لیا ہے اور آخرت کی طرف سے غافل ہے۔ وہ سعادت اندوز کیسے ہو سکتا ہے۔ کامیابی اور ناکامیابی کا یہ معیار، نجات و ہلاکت کا یہ ضابطہ، سعادت و شقاوت کا یہ قانونِ عام اور حقانیت و بطلان کا یہ فیصلہ الٰہی فیصلہ ہے جس کی تعلیم ہر پیغمبر کو دی گئی تھی۔ بڑے سے بڑا نبی یہاں تک کہ شاہ مورابی کی خدائی کو مٹانے والا ابراہیم اور فرعون کی دعویٔ ربوبیت کو تباہ کر دینے والا موسیٰ بھی اسی قانون کا پابند تھا۔ نمرود تمرد میں مبتلا تھا اور فرعون ربِ اعلیٰ ہونے کا جھوٹا مدعی مگر ربِ اعلیٰ تو وہی ہے جو خلاق اول اور علی الاطلاق ہے۔ اسی نے اپنی تمام کتابوں اور صحیفوں میں نجات و ہلاکت کا یہ ضابطہ ظاہر کر دیا تھا۔ غرض قرآن کسی نئے آئینِ حیات کو پیش کرنے والا نہیں۔ اس کی تعلیم استمراری اور دوامی ہے وغیرہ

تحلیلِ اجزاء

سبح اسم ربک الاعلیٰ اپنے ربِ اعلیٰ کے اسم کی پاکی بیان کرو اور دل سے یقین رکھو اور اپنے اعمال کا اسی سے اظہار کرو۔ لفظ تسبیح تسبیحِ قلبی اور تسبیحِ زبانی اور تسبیحِ اعضائی سب کو شامل ہے۔ اصل خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور حکم عام ہے۔ اسم ربک سے مراد کیا ہے۔ علماء سلف کے اس کے متعلق دو قول ہیں۔ پہلا یہ کہ لفظ اسم زائد نہیں ہے بلکہ ذات کی طرح اللہ کے نام کی پاکی کا بھی اعتراف، یقین اور اظہار کرنا لازم ہے۔ اس صورت میں مطلب کی توضیح چار طرح سے کی جا سکتی ہے۔ ۱۔ اللہ کے نام کو پاک رکھو یعنی اس کے نام کا اطلاق کسی دوسرے پر نہ کرو، کسی کو الٰہ، رب نہ کہو اور نہ ان وصفی ناموں کو حامل قرار دو جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں۔

۲۔ اللہ کے ناموں کا مفہوم اپنی خود ساختہ توضیح اور اختراعی تفصیل سے پاک رکھو۔ اسماء ذات و صفات کے وہ معنی مت بیان کرو جو شارع

نے نہیں بیان کئے۔

۳ اللہ کے ناموں کی عظمت کا لحاظ رکھو۔ غلط استعمال سے ان کی بے توقیری نہ کرو۔ مثلاً اللہ کو شاہد حاضر ناظر جان کر جھوٹ نہ بولو۔ اللہ کو جھوٹا شاہد نہ بناؤ۔

۴ اللہ کے مقررہ ناموں کو اپنے تراشیدہ ناموں سے الگ رکھو۔ مثلاً شریعت نے تم اس کو کاریگر نہ کہو۔ اسی طرح انبیاء کو بغیر کسب کے علم عطا فرمایا ہے تم اس کو معلم نہ کہو۔ اللہ کے نام توقیفی ہیں۔ شارع نے مقرر کر دیئے ہیں ان کے علاوہ ایسے ناموں سے اس کو نامزد نہ کرو جن سے توہین کی بو آتی ہو۔

دوسرا یہ کہ تسبیح ذات مراد ہے خواہ اس طور پر کہ لفظ اسم زائد ہے یا اسم سے مراد مسمی ہے۔ شق ثانی کے پیش نظر بغوی نے معالم میں ذکر کیا ہے کہ اسی جگہ سے بعض لوگ اسم و مسمی کے اتحاد کے قائل ہوئے ہیں۔ ظاہراً احادیث اسی کی مؤید ہیں۔ قتادہ کی مرسل روایت ہے کہ حضور انور جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے سبحان ربی الاعلیٰ۔ یعنی سبحان اسم ربی الاعلیٰ نہیں فرماتے اس سے معلوم ہوا کہ اسم سے مراد مسمی ہی ہے (ابن کثیر) حضرت علی نے جب نماز میں سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا تو کہا سبحان ربی الاعلیٰ۔ نماز کے بعد کسی نے عرض کیا۔ قرآن مجید میں اس جگہ کیا یہ جملہ زائد ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ ہم کو حکم دیا گیا تھا، اس لئے میں نے کہہ لیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابی بن کعب سے بھی اس آیت کی قرأت کے وقت نماز میں یہی الفاظ کہنا مروی ہے (ابن کثیر) سعید بن جبیر کو حضرت ابن عباس نے یہی حکم دیا تھا (رواہ ابن جریر و عبد بن حمید و عبد الرزاق و ابن ابی شیبہ)

صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ آیت سبح باسم ربک العظیم میں بھی اسم سے مراد مسمی ہے۔ صحیح روایات سے یہی ثابت ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر نے فرمایا جب آیت سبح باسم ربک العظیم نازل ہوئی تو حضور اقدس نے فرمایا اس کو اپنے رکوع میں رکھو (چنانچہ رکوع میں صحابہ نے سبحان ربی العظیم پڑھنا شروع کر دیا) رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ و ابن المنذر و ابن مردویہ)

ابو السعود نے اتنی بات زیادہ لکھی ہے کہ صحابہ پہلے رکوع میں اللّٰھم لک رکعت اور سجدہ میں اللّٰھم لک سجدت کہتے تھے۔

الاعلیٰ۔ یعنی سب سے بالا۔ رتبہ میں سب سے اونچا۔ اعلیٰ شان والا۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی دوسرا رب بھی ہے جو اللہ سے ادنیٰ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جتنی بھی اس کی تعریف تسبیح اور اطاعت و عبادت کی جائے۔ وہ سب سے برتر ہے۔ اس کے مرتبہ کے موافق نہ اس کی حمد و ستائش ہو سکتی ہے اور نہ اطاعت و عبادت (رازی و ابو السعود وغیرہ)

الذی خلق فسویٰ۔ تسبیح کیا تھی۔ ہر تشبیہ سے تنزیہ اور ہر شرک سے تقدیس۔ نقصان۔ زوال اور عجز و جہالت کے جو عیوب مخلوق میں ہیں۔ ان سے اللہ کی برتری کا اظہار، لیکن یہ تمام صفات سلبیہ ہیں۔ منفی اوصاف سے مثبت حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے اور معرفت توحید جو اصل مقصود ہے اس منفی بیان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ تسبیح ذاتی ہو یا وصفی یا فعلی یا اسمی کوئی بھی حقیقت مدعا کو نہیں سمجھاتی، اس لئے دو مثبت اوصاف ذکر کئے۔ ایک اس جملہ میں اور دوسرا آئندہ جملہ میں۔ ایجاد اور ایجاد کے بعد بقاء کے تمام اسباب کا عطا، یہی دو چیزیں ہیں جو کل مخلوق کو اللہ کا محتاج بناتی ہیں اور اس کے سامنے ساری کائنات کا سر نیاز خم کرا دیتی ہیں۔ پیدا کرنا یعنی عدم سے وجود میں لانا اور اسباب وجود میں سے کسی سبب کو ناتمام چھوڑنا یہ خلاقیت کا مفہوم ہے۔ وقت معین تک موجود رہنے کے بعد جس اندرونی بیرونی ظاہری باطنی سامان کی ضرورت ہے قوت حافظۃ للترکیب یعنی اجزائے تخلیقی کو فراہم رکھنے کی طاقت اور پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی قوت۔ جسم اور حجم میں اضافہ کرنے کی طاقت اور فنا شدہ اجزا کا بدل فراہم کر لینے والی قوت۔ حرکت و شعور کی طاقت، فہم و ادراک کی قوت۔ تحصیل مرغوب اور دفع نامرغوب کی طاقت۔ عمل اور ترک کی ارادی قوت۔ یہ تمام داخلی اسباب ہیں جو مختلف کائنات کو مختلف طور پر اللہ نے عطا کئے ہیں۔ ان کے علاوہ بیرونی اسباب ہیں جو ان داخلی اسباب کے مددگار ہیں۔ روشنی تاریکی، سردی گرمی، تری خشکی، فصلوں کا تبادل، حرکات علویہ کا انقلاب، فضائی اور ارضی تغیرات اور تغیرات سے پیدا شدہ آثار یہ کل کے کل اسباب بقاء ہیں۔ پس خلاقیت اور ہدایت ہی وہ اوصاف تمیزی ہیں جو انسانی دماغ کو کشاں کشاں اللہ کی توحید اور ربوبیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی لئے حضرت ابراہیم نے کہا تھا الذی خلقنی فہو یہدین اور حضرت موسیٰ نے فرعون کے مقابل

میں فرمایا تھا۔ ربنا الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ۔ اس جگہ بھی انہی دونوں اوصاف کو ذکر کیا ہے تاکہ توحید الوہیت کامل طور پر ثابت ہو جائے۔ تخلیق سے مراد یا صرف تخلیق انسان ہے۔ اس وقت تسویہ کا معنی ہوگا اعضاء جسمانی کو درست کرنا، اعتدال مزاج درستی قویٰ، حسن صورت کمال شعور اور روشنی ادراک عطا کرنا

یا تخلیق عالم مقصود ہے تو تسویہ کا معنی ہوا ہر چیز کو اس کی شخصی اور نوعی اقتضاء کے مطابق تمام لوازم اور مناسبات عطا کرنا۔ یعنی اللہ نے سارا جہان بنایا اور ہر ایک کی ہستی کے لئے جو چیزیں ضروری اور مناسب تھیں وہ سب اس کو عطا فرمائیں۔

والذی قدر فھدیٰ۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ کیا اور راستہ بتایا۔ بغوی نے معالم میں لکھا ہے کہ ہر چیز کی جنس نوعی شخص مقدار صفت عمل اجل رزق عمل وغیرہ کا اندازہ پہلے سے ہی کر لیا اور ہر چیز کو اس کے ضروریات کے پورا کرنے کا راستہ بتا دیا۔ سدی نے بطور تمثیل فرمایا کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی مدت قرار مقدر کی اور وہاں سے نکلنے کا طبعی راستہ بتایا۔ غذا اور تحصیل غذا کی ہدایت کی۔ چرندوں پرندوں کو ان کی ضروریات کی طرف راہنمائی کی۔ خطیب اور ابو السعود نے لکھا ہے کہ جاندار اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ذہنی قوتوں سے کام لیتے ہیں کسی کے سکھانے بتانے کے محتاج نہیں ہیں۔ اس جگہ اہل تفسیر نے جانوروں اور درختوں کے حیرت انگیز قصے نقل کئے ہیں۔ ابو السعود، خطیب، ابن جوزی ابن کثیر وغیرہم نے ایسی واقعی چشم دید یا قابل اعتماد اشخاص کی زبانی حکایات نقل کی ہیں جن سے اللہ کے علم کامل، قدرت محیط اور عطاء مناسب پر روشنی پڑتی ہے اور اوراق کائنات کو پڑھنے کے بعد اہل علم کے لئے معرفت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ امام رازی نے لکھا ہے علماء سلف نے آیت کی تفسیر دو طرح سے کی ہے۔ ایک گروہ نے تو ہدایت کرنے سے فطری ہدایت کرنا اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا راستہ بتانا مراد لیا ہے۔ کیونکہ۔ الذی خلق فسوی والذی قدر میں جن تین اوصاف کا ذکر ہے ان کا تعلق کائنات کی اسی ہستی سے ہے، اس لئے ہدایت سے مراد بھی ہدایت فطری ہوگی۔ دوسرے گروہ نے ہدایت سے مراد دین کی ہدایت لی ہے۔ اس وقت پیدا کرنے سے مراد انسان کا پیدا کرنا ہوگا اور باقی دونوں لفظوں کا بھی انسان ہی سے تعلق ہوگا۔ رازی نے اسی مطلب کو پسند کیا ہے۔ اس فقیر کے نزدیک یہی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ خلق فسوی کا لفظ ہر تخلیق کو شامل ہے۔ جسمانی ہو یا غیر جسمانی یہاں تک کہ شعور، حس، ارادہ اور ادراک کی تخلیق بھی اسی میں داخل ہے۔ اس کے بعد قدر کے تحت ہر تقدیر آگئی۔ ہر علمی تقدیر یہاں تک کہ اشیاء اور اعمال کا خیر شر، اچھا برا اور صحیح غلط ہونا بھی اسی کے ذیل میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد کرنے نہ کرنے کے آخری فیصلہ اور حکم کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا اظہار ھدیٰ سے کیا۔ اب مسلسل مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے ہر طرح کی تخلیق کی۔ اچھے برے اور صحیح غلط کا علمی اندازہ کیا۔ پھر جائز ناجائز حرام حلال اور خیر و شر ہر ایک کو جدا کر کے بتایا۔ ہدایت کا یہ مفہوم آیت فھدینا النجدین میں بھی مراد ہے۔

والذی اخرج المرعیٰ فجعلہ غثاءً احویٰ۔ مرعیٰ سے مراد ہر سبزہ، گھاس، کھیتی، سرسبز درخت۔ غثاء جمع۔ غثارۃ مفرد کوڑا کرکٹ (قطرب) احوی سیاہ یا سیاہی مائل نیل گوں۔ زمخشری نے احوی کو المرعیٰ سے حال قرار دیا ہے اور فراء نیز ابو عبیدہ نے احوی کا ترجمہ سبز کا ہی یعنی گہرا سبز مائل بسیاہی کیا ہے اور اس کو اخرج سے متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ نے ہر سبزہ کو تر و تازہ مائل بسیاہی بنایا پھر اس کو خشک کوڑا کر دیا، لیکن حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے احوی کو غثاءً سے متعلق قرار دے کر ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اللہ نے سبزہ پیدا کیا پھر اس کو خشک متغیر کر دیا۔ ابن کثیر، شیخ ابن جریر نے اسی تفسیر کو پسند کیا ہے اور اول تشریح کو موافق لغت قرار دیتے ہوئے بھی سلف کی تفسیر کے خلاف کہا ہے۔

ابن زید نے فرمایا کافروں کے لئے اللہ نے تنبیہ فرمائی کہ دنیا بھی سرسبز اور لہلہاتی کھیتی کی طرح ہے جس کا انجام فنا ہے۔

حاصل مطلب یہ کہ نیست سے ہست کرنا پھر ترقی دے کر حد کمال پر پہنچانا پھر اصل عدم کی طرف ہر سبزہ کو لوٹا دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ اس لئے جب اللہ کو دین اسلام کا پھیلانا اور حد کمال پر پہنچانا مقصود ہے تو وہ ضرور اس کی تکمیل کرے گا۔

سنقرئک فلا تنسیٰ الا ما شاء اللہ۔ مجاہد، کلبی اور مقاتل نے کہا کہ جب جبرئیل وحی کی قرأت کرنے اور حضور سیکھتے تو دوران قرأت میں آپ جلدی جلدی زیر لب پڑھتے رہتے تھے تاکہ کوئی حصہ فراموش نہ ہو جائے۔ اسی اندیشہ نسیان کے ازالہ کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ آیت لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ۔ اور آیت لا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے

فلا تنسیٰ کو بعض علماء نے نہی قرار دیا ہے۔ اور بعض نے نہی بصورت نفی۔ آپ نہیں بھولیں گے۔ آپ نہ بھولیں۔ رازی نے اس تفسیر کو ضعیف قرار دیا ہے
جمہور مفسرین نے اس کو خبر منفی ہی کہا ہے۔ یعنی اللہ نے بطور اعجاز خبر دے دی کہ آپ نہیں بھولیں گے

نسیان قرآن کی دو صورتیں ہیں۔ ۱۔ بالکل حافظہ سے مٹ جائے۔ کسی کے یاد دلانے سے بھی یاد نہ ہو۔ ۲۔ وقتی ذہول ہو جائے۔ پھر کسی کا ازخود یا کسی کے یاد دلانے سے یاد ہو جائے۔ رسول اللہ کے متعلق بعض آیات کے سلسلہ میں دونوں صورتیں منقول ہیں۔ صحیح روایت ہے کہ نماز میں ایک مرتبہ حضور ایک آیت بھول گئے۔ حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ فرمایا نہیں مجھے فراموش کرا دی گئی۔ بعض آیات کا منسوخ التلاوت ہونا اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ قرآن میں منافقوں کے نام آ گئے تھے، لیکن پھر منسوخ کر دیئے گئے۔ بہرحال ذہول ہو یا نسیان بمعنی نسخ کوئی بھی شیطانی مداخلت سے نہیں ہوا بلکہ اللہ کی مشیت کے تحت ہوا۔ جتنا حصہ اللہ نے چاہا دوامی رکھا جتنا چاہا مٹا دیا۔

عام اہل تفسیر یہاں تک کہ رازی نے بھی فلا تنسیٰ پر توجہ زیادہ کی ہے اور ماشاء اللہ سے صرف نظر کر لیا ہے بلکہ کلبی وغیرہ نے تو یہاں تک کہا کہ: قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ والا نہیں ہونے اور استثناء سے جو بعض آیات کے نسیان کا شبہ ہوتا ہے تو ایسا شبہ بے بنیاد ہے اور زبان عربی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک استثناء سے اپنی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ قرآن کا کوئی حصہ نہیں بھولیں گے۔ لیکن اگر کچھ حصہ فراموش ہو جائے گا تو وہ اللہ کی مشیت کے تحت ہوگا یعنی اللہ کی مشیت سے باہر نہ ہوگا۔ پھر نزیر بحث پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے مشیت نسیان کا واقع ہونا لازم نہیں ہوتا۔ جیسے لئن اشرکت لیحبطن عملک یا آیت ولئن شئنا لنذہبن بالذی اوحینا الیک میں عمل کو شرک پر اور محو وحی کو مشیت پر موقوف رکھا ہے اور یہ مری بات ہے کہ حضور سے نہ کبھی وقوع شرک ہوا کہ حبط عمل ہو جاتا نہ مشیت ایسی ہوئی کہ محو قرآن ہو جاتا۔ اسی لئے فراء نے بھی اس جگہ استثناء کو اظہار عظمت کے لئے قرار دیا ہے۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ شاید ماشاء اللہ کا وقوع بطور نادر ہوا ہو اور وہ بھی کسی تعبیر غیر ضروری امر کے متعلق ہو کیونکہ واجبات کا نسیان تو ممکن ہی نہیں امام کا یہ قول اس فقیر کی نظر میں صحیح نہیں۔ اگر کسی وقتی واجب کا نسیان بھی بہ مشیت الٰہی کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایسا واجب دوامی نہ ہوگا۔ پھر نسخ کے ساتھ مقید کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی لئے مقاتل کے نزدیک اس جگہ نسیان سے مراد نسخ ہے

صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو شروع میں لکھ دی گئی کہ نسیان بمعنی ذہول ہو یا بمعنی نسخ۔ ہر ضرور ہوگا بمشیت الٰہیہ۔ اور جب مشیت الٰہیہ ہو تو ایسا نسیان نہ قطعاً ممکن ہے بلکہ ضروری اور مفید بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

انہ یعلم الجہر وما یخفیٰ۔ یہ آیت اوپر والی آیت کی علت اور تائید کی حیثیت رکھتی ہے یعنی اللہ امور حاضرہ اور امور آئندہ سے واقف ہے۔ وقت حاضر کی ضرورت اور زمانۂ آئندہ کی ضرورت کوئی بھی اس سے چھپی نہیں ہے۔ اس لئے وہ جتنے حصۂ قرآن کو مناسب سمجھے گا اور جب مناسب سمجھے گا تمہارے حافظہ سے محو کر دے گا کہ پھر کبھی اس کی یاد نہ ہوگی یا حافظہ میں اس کی طرف سے ذہول پیدا کر دے گا یا یہ مراد کہ

تیرے اندر اس وقت جو کمالات ہیں جیسی صلاحیت اور قابلیت ہے اور جو سب کو معلوم ہے اس کو بھی خدا جانتا ہے اور جن کمالات کی استعداد چھپی ہوئی ہے اور وہ مراتب تجھے آئندہ حاصل ہونے والے ہیں ان سے بھی اللہ واقف ہے۔ پس جو مناسب سمجھے گا وہ حکم اللہ تجھے دے گا اور جس آیت یا حکم کو چاہے گا فراموش کرا دے گا

ونیسرک للیسریٰ۔ یسریٰ آسان طریقہ۔ ایسی شریعت جس میں تنگی اور دشواری نہ ہو۔ ہموار معتدل ہو۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا، الیسریٰ جنت ہے۔ حضرت کی مراد یہ ہے کہ الیسریٰ ایسا طریقۂ زندگی ہے جس کا نتیجہ جنت ہے۔ یہاں مراد شریعت اسلامیہ ہے۔ یعنی ہم آپ کو ایسی شریعت پر عمل کرنے کی توفیق دیں گے جس پر عمل کرنا آسان ہے۔ گزشتہ شریعت موسوی کی طرح اس میں سختیاں نہیں ہیں۔

فذکر ان نفعت الذکریٰ۔ اوپر کی آیات میں دو امر بیان کئے تھے۔ ایک یہ کہ ہر چیز مقدر ہے۔ علم الٰہی میں پہلے ہی اس کا واقعی اندازہ کر لیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شریعت اسلامیہ زندگی کی سہل ترین شاہراہ ہے۔ اندازۂ الٰہیہ کا صحیح علم کسی کو نہیں نہ تقدیر خداوندی کسی کے لئے عذر ہو سکتی ہے۔ سعادت و نجات کے راستے پر چلنا ہر ایک کا فرض ہے۔ اور نجات کا راستہ وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے، اس لئے نغمۂ روح لوگوں کو بار بار بیدار کرنا

اور موٹی دماغ والوں کو بھی سمجھانا لازم ہے۔ مگر وعظ و پند بھی اسی وقت سود مند ہوتا ہے جب سمجھ حکمت اور اثر انگیز اسلوب سے کی جائے۔ بعض بے موقع نصیحت بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث بن جاتی ہے اس لئے فرمایا کہ

آپ نصیحت کریں، بار بار نصیحت کریں یعنی آپ اس نصیحت کی یاد دلائیں جس کی شاہد ہر شخص کی فطرت ہے مگر اس طریقہ سے پند کریں جو غیر بے محل نہ ہو۔

ایک شبہ ۔ رسول اللہ پر عمومی تبلیغ فرض تھی۔ آپ سب کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ کسی کو آپ کی رسالت سے فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے آپ کا فرض تبلیغ کرنا تھا۔ پھر نفع رسانی کی شرط کے ساتھ تذکیر کو مشروط کرنے کا کیا معنی؟ کیا رسول اللہ کی پند اگر کسی کے لئے سود مند نہ ہو تو آپ کا فرض رسالت ساقط ہو جاتا ہے۔

ازالہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اِنْ حرف شرط ہے مگر یہ اصلی معنی کے لئے یہاں مستعمل نہیں ہے بلکہ حیث کے معنی کے لئے استعمال کیا ہے یعنی اس طور سے نصیحت کیجئے جو آپ کی نظر میں فائدہ رساں ہو۔ اسی کو آیت ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ میں فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا اگر تم لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان سے بات نہ کرو گے تو تمہاری گفتگو بعض کے حق میں فتنہ ہو جائے گی۔ تم ایسی باتیں کیا کرو جن کو لوگ سمجھ جائیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔

واحدی نے کہا شرط کا دوسرا جزء قرینہ کی وجہ سے محذوف ہے۔ بغیر ذکر کے خود ہی سمجھ میں آتا ہے اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ آپ بار بار نصیحت کریں۔ اگر نصیحت سود مند ہو یا نہ ہو۔ جرجانی، فراء، نحاس اور زہراوی سے بھی اسی کے ہم معنی تفسیر مروی ہے۔

امام رازی نے لکھا ہے وعظ کے مفید ہونے کی شرط اس لئے لگائی تاکہ سننے والے کو تنبیہ ہو اور وہ سمجھ جائے کہ نصیحت کی اصل غرض نفع پذیری ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نصیحت سود مند نہ ہو تو نہ کی جائے کیونکہ شرط کے وجود کے وقت مشروط کا پایا جانا ضروری ہے، مگر انتفاء شرط کی صورت میں مشروط کا انتفاء لازم نہیں۔ (بشرطیکہ شرط احترازی نہ ہو۔ فقیر) جیسے کہا جاتا ہے اگر کل بارش ہوئی تو یہ درخت سرسبز ہو جائے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ بارش نہ ہو تو درخت سرسبز نہ ہو۔ ممکن ہے دوسرے کسی طریقہ سے سیراب کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس طرح کا استعمال بکثرت ہے۔ جیسے

اشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔ شکر کو عبادت کے ساتھ مشروط کیا تاکہ عبادت کی رغبت ہو ورنہ شکر بہر حال واجب ہے۔

لا جناح علیکم ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم۔ قصر صلوٰۃ کے جواز کو خوف اعداء کے ساتھ مشروط کیا حالانکہ بالاجماع ہر سفر میں قصر مشروع ہے خوف ہو یا نہ ہو۔

فلا جناح علیہما ان یتراجعا ان ظنا۔ طلاق کے بعد رجوع کرنے کو اقامت حدود اللہ کے ظن کے ساتھ مشروط کیا حالانکہ یہ شرط ضروری نہیں۔ مرد کو رجوع کا حق بہر حال ہے۔

یہ فقیر ان بزرگوں کے سامنے اپنی نادانی کا اقرار کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ نصیحت کا فائدہ کس کو پہنچے گا کس کو نہ پہنچے گا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اسی کے ازلی علم کا یہ تابع ہیں۔ پیغمبر کو بھی کسی کی فطری صلاحیت اور قلبی استعداد معلوم نہیں۔ اس لئے ناصح کی نظر میں تو ہر شخص کو نصیحت سود مند ہی ہوتی ہے اور اسی نفع کی خیال سے ہر شخص کو نصیحت کرنا واجب تھا۔ دوسری آیت فذکر بالقرآن من یخاف وعید کا بھی یہی مفہوم ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ واقع میں نصیحت پذیری کی کس میں صلاحیت ہے اور کس کو فائدہ پہنچے گا اور کس میں استعداد مفقود ہے اور کوئی نصیحت اس کے لئے نافع نہ ہوگی۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ

سیذکر من یخشی ویتجنبہا الاشقی۔ جس کے دل میں خشیۃ الٰہی ہے، خوف بھی ہے اور رجا بھی ہے۔ ایک لطیف نسبت ہے جو دل میں گداز پیدا کرتی ہے۔ اور نافرمانی سے ڈراتی ہے۔ دل میں ایک رقت ہے جو بجا آوری احکام کا موجب ہے۔ ایسا شخص ضرور نصیحت پذیر ہوگا۔ اور جس کے دل میں سختی اور قساوت ہے اور پتھر سے زیادہ اس کا اندرونی حصہ ہے وہ یقیناً نصیحت کرنے سے گریز کرے گا اور رہے گا جو تعمیل سے پہلو تہی کرے گا ہر کا فرشقی ہے، لیکن شقاوت کے درجات کم و بیش ہیں۔ ابتدائی درجہ کی شقاوت ممکن ہے کہ وعظ و تذکیر سے دور ہو جائے اور نصیحت پذیری سے مانع نہ ہو، لیکن آخری مرتبہ کی شقاوت تو کسی طرح قبول حق کی صلاحیت نہیں رکھتی اسی لئے الاشقی فرمایا

امام رازی نے لکھا ہے کہ (الناس لوگ) کے تین فرقے ہیں۔ عارف۔ متوقف۔ معاند۔ عارف سعید ہے۔ متوقف شقی ہے اور معاند اشقی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے متعلق ہوا تھا۔

الذی یصلی النار الکبریٰ اشقی وہ جو سب سے بڑی آگ میں داخل ہوگا مگر یہ جہنم کی آگ میں شقی بھی داخل ہوگا اور رہے گا مگر سب سے زیادہ گرم آگ میں اشقی داخل ہوگا جیسی شقاوت اسی درجہ کی آگ۔

ثم لا یموت فیہا ولا یحییٰ۔ انتہائی سوزش اور عذاب کے باوجود وہ کبھی نہیں مرے گا کہ مر کر عذاب سے چھوٹ جائے بلکہ زندہ رہے گا اور عذاب سے جلتا رہے گا، لیکن زندگی کی یہ کیفیت موت سے بدتر ہوگی، اس لئے اس کو زندہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ زندگی تو وہی ہے جس میں راحت ہو جو زندگی عذاب مجسم ہو وہ موت سے بُری ہے۔

امام احمد نے حضرت ابوسعید خدری کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا آگاہ رہو کہ جہنم میں جانے والے جو جہنم کے لوگ ہیں (یعنی ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں) ان کا یہ حال ہوگا کہ وہاں نہ جئیں گے نہ مریں گے۔ ان کے سوا کچھ اور لوگ ہوں گے جن پر رحمت کرنا اللہ کو منظور ہوگا تو جہنم ہی اللہ ان کو موت دے دے گا (وہ مر جائیں گے) پھر شفاعت کرنے والے وہاں جا کر ایک گروہ کو نکال لائیں گے اور نہرِ حیات میں ان کو ڈالا جائیگا جس طرح سیلاب کی پس ماندہ کیچڑ میں دانہ اُگتا ہے اسی طرح وہ پیدا ہوں گے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ دانہ پہلے زرد (کونپل کی شکل میں) نمودار ہوتا ہے پھر سبز ہو جاتا ہے۔ دوسری اسناد سے امام احمد نے ہی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جہنمی جو جہنم کے ہی رہنے والے ہیں وہ وہاں نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ لیکن کچھ لوگ اپنے گناہوں اور خطاؤں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ اور اللہ ان کو مردہ کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے۔ ان کے لئے شفاعت کی اجازت ہوگی اور گروہ در گروہ ان کو نکال کر جنت کی نہروں پر پراگندہ کیا جائے گا اور اہل جنت کو حکم ہوگا کہ ان پر پانی ڈالو۔ پانی ڈالنے سے وہ ایسے اُگیں گے جیسے سیلاب کی کیچڑ میں دانہ (وقد رواہ مسلم ایضاً)

قد افلح من تزکیٰ۔ اشقی کی سزا کا بیان اوپر کی آیت میں کیا گیا تھا۔ اس آیت میں غیر اشقی یعنی صاحب تزکیہ کا اس کے اوصاف اور جزا کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

ابوالعالیہ تابعی نے ابوخلدہ سے کہا کل جب تم عیدگاہ کو جاؤ تو میرے پاس سے ہو کر جانا۔ حسب الحکم ابوخلدہ ان کے پاس گئے۔ ابوالعالیہ نے کہا کیا تم نے کچھ کھا لیا ہے۔ ابوخلدہ نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے غسل کر لیا ہے۔ ابوخلدہ نے کہا جی ہاں۔ بولے بتاؤ تمہاری زکوٰۃ (یعنی صدقۂ فطر) کا کیا ہوا۔ ابوخلدہ نے کہا میں دے چکا۔ فرمایا اسی لئے میں نے تمہیں بلایا تھا۔ پھر آیت قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربہ فصلیٰ پڑھی (ابن جریر) اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوالعالیہ کے نزدیک تزکّیٰ سے صدقۂ فطر دینا مراد ہے۔ عمر بن عبدالعزیز بھی صدقۂ فطر دینے کا حکم دیتے تھے اور یہی آیت تلاوت کرتے تھے۔ ابوالاحوص کہتے تھے اگر کسی کے پاس سائل آ جائے اور وہ نماز کو جانے کا ارادہ کر رہا ہو تو پہلے زکوٰۃ (یعنی صدقۂ فطر) دے دے۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربہ فصلیٰ (ابن کثیر) ان روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تزکیٰ سے صدقۂ فطر ادا کرنا مراد ہے۔ عکرمہ سے بھی یہی مروی ہے۔

قتادہ کہتے تھے کہ مال کی سالانہ زکوٰۃ مفروضہ مراد ہے۔ مگر یہ سب روایات درایت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اور مکہ میں نہ زکوٰۃ فرض ہوئی نہ صدقۂ فطر واجب۔ ہاں بغیر تعین مقدار اموال کی زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ امام ثعلبی نے بھی یہی لکھا ہے کہ مکہ میں نہ عید (کی نماز) تھی نہ صدقۂ فطر۔

حافظ ابوبکر بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ کی مرفوع خبر نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا قد افلح من تزکیٰ من شہد ان لا الٰہ الا اللہ وخلع الانداد وشہد انی رسول اللہ یعنی آیت مذکورہ تلاوت فرمانے کے بعد فرمایا جس نے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دی اور جھوٹے شریکوں کو چھوڑا اور میرے رسول اللہ ہونے کی گواہی دی (اس نے فلاح پائی) اس خبر سے ثابت ہے کہ تزکیٰ سے مراد ہے اقرار توحید و رسالت۔ امام رازی کے نزدیک بھی نجاست شرک سے پاک ہونا مراد ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

زجاج نے تزکیٰ کی تشریح میں فرمایا جس نے تقویٰ کی کثرت کی۔ قول فیصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں مطلق تزکیہ کا ذکر ہے۔ تزکیہ کے اسباب و لوازم کا تعدد نزول قرآن کے زمانے کے بدلتے رہنے سے بڑھتا رہا۔ نزول آیت کے وقت تزکیٰ کا معنی تھا اقرار توحید و رسالت و قیامت اور دو وقتی مختصر نماز

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی وغیرہ پر جتنے احکام نازل ہوئے اور جن چیزوں کی حرمت کا حکم ہوتا رہا اتنی ہی تزکیہ کی شاخیں بڑھتی رہیں ۔ مدینہ میں پہنچ کر روزہ بھی فرض ہو گیا ۔ زکوٰۃ مقررہ نمبر، فرض ہوگئی ۔ جہاد بھی فرض ہو گیا اور قسم در قسم فرائض بڑھتے گئے ۔ یہ سب اسباب تزکیہ قرار پائے ۔ انہی میں سے صدقۂ فطر بھی تزکیہ کی ایک شاخ تھی ۔ تکمیل نزول کے بعد وہ تمام فرائض و واجبات ارکان تزکیہ ہو گئے جن کی صراحت قرآن یا حدیث میں آگئی ہے ممنوعات سے اجتناب اور اوامر کا امتثال تزکیہ کے دو ضروری رکن ہیں ۔ جن کی شاخیں گوناگوں ہیں ۔ جن میں سے بعض کو آیات قد افلح المومنون الخ۔ میں بیان فرمایا ہے ۔ اسی لئے زجاج نے تزکیہ کی تشریح میں فرمایا جس نے کثیر تقویٰ کمایا ۔

خلاصہ یہ کہ تزکیٰ سے صرف زکوٰۃ یا صدقۂ فطر ادا کرنا تو مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت مکی ہے ۔ اور زکوٰۃ و صدقۂ فطر کا وجوب مدنی ۔ دوسرے لغت بھی اس کی اجازت نہیں ۔ زکوٰۃ دینے کے تزکیہ آتا ہے جس کا معنی تزکیٰ ہے) نہیں آتا ۔ اگر زکوٰۃ دینا مراد ہو تو زکیٰ ہوتا تزکیٰ نہ ہوتا ۔ بلکہ تزکیٰ کا ترجمہ ہے تطہّر پاکیزہ ہوا ۔ پاکیزگی روحانی بھی ہوتی ہے ۔ اور جسمانی بھی ۔ وجدانیات کی بھی تخیلات کی بھی اور اخلاق ظاہرہ کی بھی ۔ مالی بھی اور قلبی بھی پاکیزگی کی تمام شاخوں کے مجموعہ کو ہم مختصر لفظ میں کامل تقویٰ یا امتثال مامورات اور اجتناب از منہیات کہہ سکتے ہیں اور کامل تقویٰ کی اعلیٰ چوٹی مرتبۂ احسان ہے جس پر پہنچ کر آدمی مطالعہ جمال میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ اپنی ہستی سے بھی غافل ہو جاتا ہے ۔

وذکر اسم ربہ فصلّٰی ۔ بعض اہل تفسیر نے ذکر رب سے مراد لیا ہے ذکر لسانی اور ذکر قلبی جو نماز کے اندر تکبیر تحریمہ میں بھی ہوتا ہے اور قرأت تسبیح اور تشہد میں بھی، لیکن بیرون نماز ذکر کے لئے کوئی مخصوص وقت نہیں ۔ آیت مذکورہ کی تفسیر میں علماء تفسیر کے متعدد اقوال ہیں جن کو امام رازی نے جمع کیا ہے ۔

۱۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا رب کی یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی اُس شان کو یاد کرتا ہے جب کہ قیامت کے دن اللہ دوبارہ زندہ کرے گا ۔ اس کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا ۔ یہ یاد کر کے وہ نماز پڑھتا اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے ۔

۲۔ عکرمہ ۔ ابو العالیہ ، ابن منیر وغیرہم کا قول ہے کہ ذکر رب تکبیر ہے اور نماز سے عید الفطر کی نماز مراد ہے ۔

۳۔ ذکر رب سے مراد ہے اللہ کی وحدانیت کو یاد کرنا اور نماز سے مراد ہے عام نماز ۔ (ذکرہ مقاتل)

۴۔ بعض روایات میں حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ ذکر رب سے مراد ہے تکبیر عید جیسے اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد اور نماز سے مراد ہے عید کی نماز ۔ یہ روایت ناقابل وثوق ہے ۔

یہ نماز سے مراد ہر فرض و نفل نماز ہے ۔ اور رب کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کی طرح نماز نہ ہو جو صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں ۔ یاد خدا مقصود نہیں ہوتی ۔ فقہاء نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب ہے ۔ امام اعظم نے فرمایا کہ فصلّٰی میں ف حرف عطف تعقیبی ہے اور معطوف و معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہیئے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر تحریمہ نماز کا جز نہیں ہے بلکہ واجبی شرط ہے ۔ پھر چونکہ ذکر رب کے لئے کسی خاص نام کی تعیین نہیں کی ، اس لئے اللہ کے نام کے ساتھ نماز کا افتتاح درست ہے ۔ مثلاً الرحمٰن اکبر الرحیم اکبر وغیرہ البتہ مسنون ہونے کی وجہ سے اللہ اکبر کہنا افضل ہے ۔ اس کے علاوہ اسم اللہ تمام اسمائے صفات کو جامع بھی ہے (ذکرہ الرازی)

بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا والآخرۃ خیر و ابقٰی تزکیہ بہت دشوار کام ہے ۔ بہت منافع کو چھوڑنا اور عیش و راحت سے منہ موڑنا پڑتا ہے اکثر فقر و فاقہ پر صبر کرنا ہوتا ہے ۔ طرح طرح کے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں ۔ پوری زندگی تپتے ہوئے کندن کی طرح گزرتی ہے تب کہیں نکھرتی ہے اور پاک ہوتی ہے ۔ تمام منکر آخرت اور معیاتِ ثانوی کا اقرار کرنے والوں میں سے اکثر افراد اس مبالکاہ اور زندگی سوز قربانی کے لئے تیار نہیں ہوتے ان کے پیش نظر تو بس دنیوی زندگی ہوتی ہے ۔ آخرت کے وہ قائل نہیں ہوتے اور قائل ہوتے بھی ہیں تو مصائب کا خوف اور ظاہری منافع کا لالچ ان کے قدم کو تزکیہ کی راہ داری میں داخل ہونے سے روکتا ہے ، اس لئے وہ اسی حاضر زندگی کو آنے والی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں ۔ اور غور نہیں کرتے کہ یہاں کا ہر نفع زوال پذیر بھی ہے اور کتنا ہی بڑا ہو حقیر بھی ہے ۔ آخرت لازوال ہے اور وہاں کی ہر لذت منفعت اور راحت بے مثال ہے ۔ اس سے وہ کہیں بہتر اور ناقابل زوال ہے ۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے سرکار عالی نے ارشاد فرمایا دنیا ایسے شخص کا گھر ہے جس کا گھر نہیں ہے اور ایسے شخص کا مال ہے

جس کا مال نہیں ہے ۔ دنیا کے لئے بیوقوف ہی جمع کرتا ہے ۔ (رواہ احمد)

ابن جریر نے عرفجہ ثقفی تابعی کا قول نقل کیا ہے کہ ایک روز حضرت ابن مسعود نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی ۔ جب آیت بل تؤثرون الخ پر پہنچے تو پڑھنا روک دیا اور شاگردوں سے خطاب کر کے فرمایا ہم نے (یعنی انسانوں نے) دنیا کو آخرت پر ترجیح دی ۔ شاگرد چپ رہے ۔ پھر فرمایا ہم نے دنیا کو اس لئے پسند کیا کہ دنیا کی زینت عورتیں اور کھانا پینا ہماری نظروں کے سامنے تھا ۔ اور آخرت پوشیدہ تھی ، اس لئے ہم نے حاضر کی طرف توجہ کی اور غیر حاضر کی طرف رخ نہیں کیا

حسن بصری نے فرمایا منافق کی پہچان یہ ہے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے ۔ عام اہل تفسیر نے بل تؤثرون کا مخاطب کافروں کو قرار دیا ہے لیکن جمہور کے نزدیک انسانوں کو خطاب ہے ۔ کافر و مومن کی تخصیص نہیں ۔ دنیا پرستی کافرانہ فعل ہے ۔ خواہ عقیدۃً آدمی مسلمان ہی ہو ۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا عملی نفاق ہے ۔ اس لئے حسن بصری نے اس کو منافق کی علامت قرار دیا ۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ ایمان کا کمترین درجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا کو خواہ کتنی ہی کثیر ہو آخرت سے بہتر نہ سمجھے ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ دنیا کی ہر لذت ناقص کلفت آمیز اور ناپائیدار ہے اور آخرت کی نعمتیں کامل ہر کلفت سے خالی اور لازوال ہیں ۔ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم و موسیٰ ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت حضرت موسیٰ کے زمانے تک جاری رہی اور حضرت موسیٰ کی شریعت رسول اللہ ؐ کے عہد تک قائم رہی ۔ حضرت عیسیٰ کو اگرچہ کتاب جدید دی گئی ، لیکن سوا چند احکام کو نرم کرنے کے باقی بیشتر حصہ قائم رکھا گیا ۔ بیشتر تغیر قرآنی احکام سے ہوا ، اس لئے سمجھ لو دنیا کے لئے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ ہی وہ جلیل القدر نبی تھے کہ رسول اللہ ؐ کے دور سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ان کی مانند صاحب شریعت نہیں گزرا ۔

اس کے علاوہ حضرت ابراہیم کا مقابلہ عظیم الشان متمدن طاقتور سلطنت کے حکمران اعظم سے ہوا اور آپ کو اس کے مقابلے میں کامیابی عطا کی گئی اور آپ نے شام کی طرف ہجرت کی ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ٹکراؤ بھی ایک ظالم پر غرور مغرور جابر بادشاہ سے ہوا اور آپ کو رسول اللہ کا باہم تصادم بھی بڑے بڑے سرداران کفر سے ہوا ۔ آپ کو بھی ترک وطن کرنا پڑا اور بالآخر آپ ہی کامیاب ہوئے ۔

شریعتوں کے اختلاف کے باوجود ایک چیز سب میں مشترک تھی ۔ توحید کامل ، اقرار رسالت ، بعثت قیامت اور جزا سزا کا عقیدہ اس بنیادی اعتقادی شرکت کے ساتھ تمام شرائع کا ایک عملی اشتراک بھی تھا اور وہ تھا نجات و ہلاکت کا مشترک ضابطہ یعنی اشقیٰ کا جہنمی ہونا اور رستہ ضمیر ، درست کردار رکھنے والے کا فلاح یاب ہونا آخری کامیابی کے لئے نفس کا تزکیہ ، ذکر خدا اور اپنی عاجزی کا اعتراف ہر شریعت میں ضروری تھا ۔ قرآن مجید نے انسانی سعادت و شقاوت اور نجات و ہلاکت کا موٹا ضابطہ بیان کیا ، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ گزشتہ صحیفے اور کتابیں مختلف زبانوں میں تھیں اور قرآن مجید عربی میں ہے ۔ مگر ضابطۂ نجات و فلاح سب میں مشترک ہے ۔

ابوبکر بزار نے بروایت موصولہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا یہ پوری سورت ابراہیم ؑ و موسیٰ ؑ کے صحیفوں میں تھی ۔ ابن المنذر اور حاکم نے بھی اس روایت کو لکھا ہے ۔ حضرت ابن عباس خود بھی اسی قول کے قائل تھے ۔ نسائی نے دوسرے سلسلے سے بھی اسی مضمون کی خبر مرفوع نقل کی ہے ۔

شیخ ابن جریر نے مختلف روایات کو نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک قابل ترجیح یہ امر ہے کہ ہذا کا اشارہ پوری سورت کی طرف نہ قرار دیا جائے بلکہ قد افلح من تزکیٰ سے آخر سورت تک مشار الیہ قرار دیا جائے ۔ مدارک میں نسفی نے لکھا ہے کہ آیت ان ہذا لفی الصحف الاولیٰ سے معلوم ہوا کہ قدیم صحیفوں کی مختلف زبانوں میں یہ قرآن تھا اور نماز میں قرآن کی قرأت واجب ہے ، اس لئے مختلف زبانوں میں نماز میں قرآن پڑھا جا سکتا ہے ۔ علامہ نسفی کی یہ غلط فہمی ہے ۔ کیونکہ تمام مفسرین اور خود نسفی بھی قائل ہیں کہ صحیفوں کی زبانیں مختلف تھیں ، اس لئے قرآن عربی کے ساتھ تو ان میں موجود نہیں ہو سکتا ۔ مضامین قرآن موجود ہوں گے اور مضامین بھی وہ جو مشترک حیثیت رکھتے ہیں ۔ باقی قرآن کی جہاں تک انفرادیت اور خصوصیت کا مسئلہ ہے اس سے تمام آسمانی صحیفے خالی تھے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ شرائع اور ضوابط الگ الگ ہیں اور دین سب میں مشترک ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن نام شریعت اسلامیہ کا ہے جو اپنی خصوصیات کی حامل ہے اور دینی اشتراک کے باوجود شرعی خصوصیات

سے تمام کتب سالقہ خالی ہیں، اس لئے دینی اشتراک سے نماز کے اندر مختلف زبانوں میں قرأت قرآن پر استدلال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جب یہ مسلّم ہے کہ قرآن بحیثیت شریعت مستقلہ کتب سالقہ میں نہ تھا اور قرأت قرآن نماز میں لازم ہے تو لامحالہ عربی میں ہی قرأت کرنی ہوگی ۔ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ کل مضامین قرآن صحف سالقہ میں تھے ۔ ورنہ قرآن کی پھر ضرورت ہی کیا تھی ۔

اس کے علاوہ قرآن کے مضامین عربی میں ادا کئے گئے ہوں یا عبرانی اور سریانی میں ۔ بہرحال عبارتِ الٰہیہ میں ادا کئے گئے ہوں گے تو زائد سے زائد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ الفاظ میں مضامین قرآن کو قرآن کہا جا سکتا ہے ۔ خواہ الفاظ کسی زبان کے ہوں ۔ خود ساختہ الفاظ میں ادا کئے ہوئے مضامین کو قرآن کس طرح کہا جا سکتا ہے اور جب انسانی الفاظ میں ادا کئے ہوئے مضامین قرآن نہیں ہیں تو پھر نماز میں قرآنی الفاظ کے علاوہ قرأت کیسے کی جا سکتی ہے ۔

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ نماز میں اسی قرآن کی قرأت فرض ہے جو رسول اللہؐ پر نازل کیا گیا تھا ۔ اس قرآن کی قرأت کا حکم نہیں ہے جو مختلف صحیفوں میں تھا اور اس قرآن کے متعلق فرمایا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ جب نازل شدہ قرآن عربی ہے تو اس کی قرأت بھی ہونی چاہیئے ۔ واللہ اعلم ۔

مقصودِ بیان

لفظ سبّح کا اطلاق بتا رہا ہے کہ دل سے اللہ کو پاک جاننا، زبان سے اس کی پاکی کا اقرار کرنا اور تمام اعضاء و جوارح سے اس کی پاکی کا مظاہرہ کرنا لازم ہے ۔ الاعلیٰ کا لفظ اللہ کے برترین ہونے پر دلالت کر رہا ہے ۔ ہر مشابہت و مماثلت سے ہر وہم و تخیل سے ہر فہم و ادراک سے، ہر کلام و بیان سے اور ہر اندازہ و تخمین سے ۔

اللہ کا صاحب تکوین و تشریع ہونا اس کی وحدانیت و الوہیت کو ثابت کر رہا ہے اور چونکہ اس کی خلاقیت بے تکی نہیں اور اس کی ہدایت بغیر علم و اندازہ کے نہیں اس لئے اسی کا رب بھی ہونا ضروری ہے ۔ خَلَقَ اور ہدیٰ سے اوّل معنی کی طرف اشارہ ہے اور سوّیٰ اور قدّر دوسرے مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے ۔

سنقرئک سے دو باتیں مستنبط ہوتی ہیں اوّل یہ کہ رسول اللہؐ کے اُمّی اور بغیر پڑھا ہونے کا معنی یہ ہے کہ کسی کاغذ یا تحریر کو آپ پڑھنا نہیں جانتے تھے نہ آپ نے کسی سے اس طرح پڑھنا سیکھا تھا ۔ آپ کو پڑھانے والا براہِ راست اللہ تھا ۔ دوسرے یہ کہ قرآن کا کوئی ایسا حصہ جس کا ظاہر کرنا، تعلیم دینا اور پھیلانا ضروری تھا ۔ رسول اللہ کے ذہن سے فراموش نہیں ہوا ۔ اگر ہوا تو وہی حصہ فراموش ہوا جس کی اشاعت کو روکنا اللہ چاہتا تھا ۔

الیُسریٰ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ شریعت اسلامیہ بہت سہل ہے ۔ اگرچہ سہولت کا معیار خواہ معصیت خو انسانوں کی منشاء کے مطابق نہ ہو ۔ واقع میں انسانی زندگی کے ہر دکھ کا علاج اس میں سہل ترین بتا دیا گیا ہے ۔ اس کے ضوابط ناقابلِ برداشت نہیں ۔ اس کی تعلیم انسان کی فطری انسانیت کو تباہ کرنے والی نہیں ۔ فذکر کا لفظ وعظ و پند کے وجوب پر دلالت کر رہا ہے خواہ واقع میں نصیحت مفید ہو یا بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گر بامید منفعت کرنا ضروری ہے ۔ من یخشیٰ اور الاشقیٰ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ خشیۃ اللہ یعنی دل کا محبت آفریں خوف انگیں گداز ہدایت یابی کے لئے ضروری ہے اور دل کی سختی باعثِ محرومی و سرکشی ہے ۔

قد افلح الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح یابی کے لئے فکر و عمل کا تزکیہ اور روح و بدن کی نظافت ضروری ہے وغیرہ ۔

سورۃ الغاشیۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝

آپ کو اس محیطِ عام واقعہ کی کچھ خبر پہنچی ہے (مراد اس واقعہ سے قیامت ہے) بہت سے چہرے اس روز ذلیل (اور) مصیبت جھیلتے خستہ ہوں گے

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ﴿۴﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ؕ﴿۵﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿۶﴾

(اور) آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے (اور) کھولتے ہوئے چشمہ سے پانی پلائے جائیں گے (اور) انکو بجز ایک خاردار (۱) جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا۔

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ؕ﴿۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ

جو نہ تو فربہ کرے گا اور نہ بھوک کو دفع کرے گا بہت سے چہرے اس روز بارونق (اور) اپنے (نیک) کاموں کی بدولت خوش ہونگے (اور)

جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ؕ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿۱۳﴾

بہشت بریں میں ہوں گے جس میں کوئی لغویات نہ سنیں گے اس (بہشت) میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے (اور) اس (بہشت) میں اونچے اونچے تخت ہیں،

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾ اَفَلَا

اور رکھے ہوئے آبخورے ہیں اور برابر برابر لگے ہوئے گدے (تکیے) ہیں اور سب طرف قالین پھیلے پڑے ہیں تو (انکی غلطی ہے کیونکہ)

يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى

کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو (نہیں

الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ ۟ اِنَّمَآ اَنْتَ

دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے تو آپ نصیحت کر دیا کیجئے آپ تو نصیحت کرنے والے ہیں

مُذَكِّرٌ ؕ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ

(اور) آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) ہاں مگر جو روگردانی اور کفر کرے گا تو خدا اس کو (آخرت میں) بڑی سزا دے گا (کیونکہ) ہمارے ہی

الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ؕ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

ع ۱۳

پاس ان کا آنا ہوگا پھر ہمارا ہی کام ان سے حساب لینا ہے (آپ زیادہ غم میں نہ پڑیئے)

تفسیر ۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اس میں ۲۶ آیات ۹۲ کلمات اور ۳۸۱ حروف ہیں۔ حضرت نعمان بن بشیر کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ جمعہ کی نماز کی دو رکعتوں میں سورۃ جمعہ کے ساتھ یا سبح اسم ربک کے ساتھ اس سورت کو پڑھتے تھے یعنی پہلی رکعت میں سورۃ جمعہ یا سورۃ اعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ غاشیہ۔ اوّل ٹکڑے کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ مسلم اور داؤد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ درمیانی دو راویوں میں اختلاف ہے کسی میں قتیبہ کسی میں سفیان بن عیینہ اور کسی میں امام مالک کا نام ہے، لیکن مرجع روایت سب کا ضمرہ بن سعید اور از عبیداللہ از عبداللہ ہے۔

سورۃ اعلیٰ سے اس سورت کی لفظی اور معنوی مناسبت بھی ظاہر ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں فذکر ان نفعت الذکریٰ تھا۔ یہاں فذکر انما انت مذکر

ہے ۔ وہاں یعنی انشاراکبری تھا ۔ یہاں تصلی ناراً حامیۃً ہے ۔ وہاں دوزخیوں اور جنتیوں کا مجمل حال بیان کیا گیا تھا ۔ یہاں تفصیل دی گئی ہے وغیرہ ۔ نیا نیت
احوالِ قیامت ، جنت و دوزخ اور سزا جزا کا بیان صرف نصیحت پذیری کے لئے کیا جاتا ہے ۔ انسان کی شہوانی اور غضبی قوتوں کا تقاضا ہے اور فطری
جذبات داعی ہیں کہ مادی لذتوں اور راحتوں کو حاصل کرنے کے لئے آدمی کوشش کرے اور نامرغوب ، کراہت آگین ، الم انگیز اور دکھ پہنچانے والی چیزوں
سے اجتناب کرے ۔ غیر مادی لذت والم کی صورت محسوس نہیں اور عقل خالص سے کام لینے والے افراد ایک فی کروڑ بھی نہیں ۔ عموماً انسانوں کا فہم نارسا
ہے ، نظریں کوتاہ ہیں ، تصور کی اڑان زیادہ اونچی نہیں ، اس لئے غیر مادی لذتوں اور تکلیفوں کو جب تک مادی صورتوں میں مصور کر کے نہ پیش کیا جائے
عام آدمی ان کو سمجھ نہیں سکتے ۔ عالمِ قیامت دوسرا عالم ہے ۔ اس دنیا کے رہنے والے اس عالم کے احوال کو سمجھنے سے قاصر ہیں ۔ بچہ شکمِ مادر کے
اندر اس دنیا کی کیفیت کو کیسے سمجھ سکتا ہے ۔ شعور و ادراک کا نقص اس جہان کی کیفیت جاننے اور سمجھنے سے روکتا ہے جہاں کے حالات سمجھنے
کے لئے کامل شعور و ادراک کی ضرورت ہے لیکن ترغیب و ترہیب ضروری ہے ۔ برے نتائج سے ڈرانا اور اچھے نتائج کی طرف میلانِ خاطر پیدا کرنا
لازم ہے تاکہ عقائد میں صحت اور کردار میں درستی پیدا ہو اور زندگی صاف ستھری بن جائے ، اس لئے احوالِ قیامت اور سزا جزا کی تصویر ایسے الفاظ
میں قرآن کھینچتا ہے جو عوام کے لئے قابلِ فہم اور سہل القبول ہوں ۔ حقیقت میں آخرت کی راحت و تکلیف اور دکھ سکھ کی کیفیت وتو ہیں جا کر معلوم
ہوگی ۔ ذلت ، نکبت ، خواری ، پژمردگی ، افسردگی غیر مفید بلکہ ضرر رساں بدمزہ ناگوار طبع خوراک اور کراہت آفریں مشروبات سے انسان نفرت
کرتا ہے اکتاتا ہے اس کے تصور سے ہی دل متلاتا ہے ۔ عزت و احترام ، چہرہ کی شگفتگی ، نکھار ، نعومت ، لذیذ ترین خوراک ، اعلیٰ مسکن بڑھیا
لباس اور عیش و نشاط کا آدمی خواہش مند ہوتا ہے ۔ انہی چیزوں کو مختلف مؤثر الفاظ اور متعدد اسلوبِ بیان کے ساتھ قرآن نے پیش کیا ہے ۔
یوں تو پورے قرآن کا طرزِ بیان حکیمانہ ہے ۔ نہ صرف واعظانہ اور خطیبانہ بلکہ اپنا نرالا اسلوب ہے جو انسانوں کے کلام سے بالکل الگ ہے ، مگر
مفصلات میں خصوصاً جدتِ بیان اعجازِ قرآن کا واضح ثبوت ہے ۔ نئے نئے رنگ سے مطالعۂ کائنات کا درس دینا اچھوتے اسلوب سے لذت و
الم کی تصویر کھینچنا اور ہر بیان کی ندرت و جدت کے ساتھ گہری اثر آفرینی کو پیشِ نظر رکھنا جادو سے زیادہ مؤثر ہے ۔ پھولوں کی خوشبو سے زیادہ پُرکیف ہو ۔
بادۂ دوشینہ کے نشہ سے زیادہ مستی آفریں ہے ۔ اہتزازِ نسیم سے زیادہ سکون بخش ہے ۔ اور خنک چاندنی سے زیادہ فرحت آفریں ہے ۔ غرض سراسر اعجاز ہے ۔
اس سورت کا اسلوبِ بیان بھی باوجود وحدتِ مضمون کے باوجود ندرت کا حامل ہے ۔ اس میں لذت والم کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے ۔ درسِ تذکیر بھی دیا
گیا ہے ۔ مطالعۂ کائنات کا حکم بھی دیا گیا ہے ۔ فرائضِ نبوت کی حد بندی بھی کی گئی ہے اور آخر میں فلسفۂ آغاز و انجام پر لطیف تبصرہ بھی کیا گیا ہے ۔ مگر
ہر بیان کا طرز نرالا ہے ۔

تحلیلِ اجزاء هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ بے شک آپ کے پاس قیامت کی خبر آ چکی ۔ ہل اس جگہ اصلی استفہامی معنی کے لئے مستعمل نہیں
بلکہ قَدْ کے معنی میں ہے ۔ قطرب اور اہلِ تفسیر کی بڑی جماعت کا یہی قول ہے ۔ کلبی نے کہا ترغیب اور شوق آفرینی کے لئے اس
جگہ استعمال کیا گیا ہے ۔

الغاشیہ چھا جانے والی ڈھانک لینے والی چیز جیسے سرپوش ، زین پوش اسی لئے اس ہمہ گیر مصیبت کو بھی غاشیہ کہا جاتا ہے جو پورے خاندان
پر چھا جائے اور سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے ۔ قیامت تمام کائنات پر چھا جائے گی ۔ ہول عام ہوگا ۔ کوئی بھی قیامت کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہے گا ۔
اس لئے اس کا نام الغاشیہ ہوا (حضرت ابن عباس ۔ قتادہ ۔ ابن زید) بعض کے نزدیک الغاشیہ سے مراد آگ ہے ۔ کیونکہ سب دوزخیوں کو محیط ہوگی
آیتِ مبارکہ میں آیا ہے تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۔ بعض کے نزدیک دوسرا نفخہ مراد ہے جس سے سب مُردے اٹھ کھڑے ہوں گے ۔ (سراج و ابن کثیر و
فتح البیان)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۔ بہت چہرے یعنی کافر (خطیب) اس روز ذلیل (قتادہ) ہوں گے ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت کے دن
ان کے اعمال اکارت جائیں گے تو ان کے چہروں پر خواری چھا جائے گی ۔ دنیا میں اپنی عزت ، خوشحالی ، فارغ البالی ، صحت ، طاقت اور فراخی عیش
پر پھولے نہ سماتے تھے ۔ چہرے نکھرے ہوئے ، صورتیں بشاش اور مزاج میں تمکنت تھی ۔ قیامت کے دن اس کے عوض چہروں پر افسردگی اور خواری

کی علامات نمودار ہوں گی۔

عاملۃ ناصبۃ محنت مشقت میں مبتلا اور دکھی رنجیدہ عمل کے معنی کام محنت۔ اور نصب کا معنی رنج دکھ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کافروں کی یہ دونوں حالتیں دنیا میں ہوتی ہیں۔ سادھو تارک الدنیا مشرک فقیر اور راہب شرک کرنے اور حالت شرک میں طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں۔ بے کار تکلیفیں جھیلتے اور دکھ اٹھاتے ہیں۔ بغیر توحید کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ مفت میں یہ لوگ اپنی جانوں کو دکھ میں ڈالتے ہیں۔ تفسیر البحر میں ان کی تائید میں صراحت کی گئی ہے کہ آیت کا نزول یہودیوں، عیسائیوں، اہل بدعت پرستوں کے متعلق ہوا جو کفر کے طریقہ پر ریاضت وعبادت کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے ایک اثر سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ دونوں اوصاف اسی زندگی میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہوتے ہیں۔ گویا آیت کا نزول تارک الدنیا راہبوں کے لئے ہوا۔ حافظ ابوبکر برقانی نے صحیح اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ کا گزر کسی نصرانی راہب کی طرف سے ہوا۔ آپ اس کو دیکھ کر رونے لگے۔ ساتھیوں نے عرض کیا امیر المؤمنین رونے کی کیا وجہ۔ فرمایا مجھے اس کی صورت دیکھ کر آیت عاملۃ ناصبۃ تصلی نارا حامیۃ یاد آگئی۔ اس لئے میں رونے لگا۔ حضرت کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص اتنی ریاضت اور عبادت کرتا ہے کہ صورت بگڑ گئی ہے چہرے سے دکھ برستا ہے، مگر قیامت کے دن اس کی یہ ساری ریاضت کفر آمیزی کی وجہ سے مقبول نہ ہوگی اور یہ دوزخ میں جائے گا۔

عکرمہ، سدی، حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے کہ اول وصف کا تعلق دنیا سے اور دوسرے وصف کا تعلق آخرت سے ہے۔ یعنی کافر دنیا میں گناہوں کے کام کرتے ہیں۔ آخرت میں اس کا دکھ اٹھائیں گے اور دہکتی گرم آگ میں داخل ہوں گے۔ بعض علماء سلف کا خیال ہے کہ کافروں کی یہ دونوں حالتیں آخرت میں ہوں گی۔ عمل کرنے سے یہ مراد ہے کہ دوزخ کے اندر آگ کے پہاڑ پر چڑھنا پڑے گا۔ آیت سارہقہ صعودا کا یہی مفہوم ہے۔ جہنم کی آگ میں بار بار چکر لگانے پڑیں گے۔ پیاس ہوگی تو گرم کھولتے ہوئے پانی کی طرف دوڑیں گے ابلتے پانی سے انتڑیاں کٹ جائیں گی۔ گرم بھاپ سے منہ جھلس جائیں گے۔ آیت میں آیا ہے یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا یطوفون بینها وبین حمیم آن۔ آگ کے طوق اور زنجیروں میں جکڑ کر گھسیٹے جائیں گے۔ آیت میں وارد ہے خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ۔ ثم فی سلسلۃ ذرعها سبعون ذراعا فاسلکوہ

تصلی نارا حامیۃ دنیا میں خس خانوں اور ایرکنڈیشنڈ مکانوں میں رہتے تھے۔ قیامت کے دن کفر کے عوض گرم آگ میں جھونکے جائیں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کی آگ ایک ہزار برس تک پھونکی گئی تو سفید ہوگئی۔ پھر ہزار برس تک پھونکی گئی تو سرخ ہوگئی۔ پھر ہزار برس تک پھونکی گئی تو سیاہ ہوگئی۔ اب اسی سیاہی پر ہے۔ آگ کی حرارت کے یہی ترتیبی درجات ہوتے ہیں جو حدیث میں بیان کئے گئے ہیں۔

تسقی من عین آنیۃ ان کو کھولتے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔ انتہائی گرمی اور سوزش سے پیاس پیدا ہوگی۔ ہر کافر العطش العطش کی پکار مچائے گا دنیا میں حرام کمائی سے حاصل کئے ہوئے مفرح مشروبات استعمال کرتے تھے۔ برف آلود شربت پیتے تھے۔ دوزخ میں کھولتا پانی پینا پڑے گا۔ پیتے ہی ہونٹ سوختہ اور آنتیں پارہ پارہ ہو جائیں گی پھر فوراً درست کر دی جائیں گی۔ اسی طرح دوامی عذاب میں مبتلا رہیں گے (کذا فی الصحیح)

لیس لهم طعام الا من ضریع پیٹ کی گرمی بھوک کو بھڑکائے گی۔ ایک ہزار برس تک بھوک کا عذاب مسلط رہے گا اور تنہا بھوک کا عذاب دوزخیوں کو دوزخ کے سارے عذاب کی برابر محسوس ہوگا۔ (کما فی الصحیح) ہزار برس کے بعد کھانے کو ملے گا تو ایسی چیز جو نہایت بدمزہ، تلخ، متعفن، بدن کو دبلا کرنے والی سیری نہ پیدا کرنے والی ہوگی جس کا نام ضریع ہے۔ ضریع عرب کے ریگستان میں ایک بوٹی ہوتی ہے۔ خاردار۔ سبز کو شبرق کہتے ہیں۔ اس کو اونٹ کھاتے ہیں۔ خشک ہو جانے کے بعد زہر قاتل بن جاتی ہے۔ کوئی جانور اس کو نہیں کھاتا۔ حدیث میں آیا ہے جس ضریع کا آیت میں ذکر ہے وہ دوزخ کی ایک چیز ہے۔ چبھنے میں کانٹے کی طرح۔ مزے میں ایلوے سے زیادہ تلخ، بدبو میں مردار سے بدتر۔ گرمی میں آگ سے بڑھ کر۔

لا یسمن ولا یغنی من جوع۔ ضریع جہنم۔ دنیوی ضریع نہیں کہ کچھ نہ کچھ اس میں فائدہ ہے۔ وہ تو دوزخ کی پیداوار ہے۔ اس کا تخلیقی خمیر آتشین ہے۔ زمین پر رہنے والے انسانوں کی غذا بننے کی صلاحیت ناری جوہر رکھنے والی چیزوں میں کس طرح ہو سکتی ہے، اس لئے ضریع جہنم غذائی فائدہ سے خالی ہے۔ نہ اس کے کھانے سے فربہی پیدا ہوگی۔ نہ بھوک کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ رہی لذت تو اس کا مفقود ہونا بالکل بدیہی تھا۔

اس لئے آیت میں اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

تنبیہ آیت ان شجرۃ الزقوم طعام الاثیم میں زقوم کو گنہگاروں کی غذا بتایا گیا ہے اور آیت ولا طعام الا من غسلین میں غسلین ہی کے طعام ہونے کی صراحت کی ہے اور اس جگہ حصر کے ساتھ ضریع کو دوزخیوں کی خوراک فرمایا ہے تو اس سے بیان میں تضاد نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ دوزخ کے درجات مختلف ہیں اور دوزخیوں کے مدارج بھی جدا جدا ہیں۔ ہر درجہ والوں کی خوراک الگ الگ ہوگی کسی درجہ والے کی ضریع۔ کسی کی غسلین۔ کسی کی زقوم۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ضریع سے کوئی خاص غذا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ غذا ہے جو حالت اور خاصیت میں ضریع کی طرح ہو۔ بدمزہ۔ تلخ۔ ناگوار۔ موٹا نہ کرنے والی۔ سیری پیدا نہ کرنے والی

بعض نے لکھا ہے کہ ضریع صفت کا صیغہ ہے ضراعت سے مشتق ہے۔ جو کھانا نقاہت، ذلت (یا جسم ہونے) لاغری، نقاہت اور کام و دہن کی تلخی کا سبب ہو وہ ضریع ہے۔ خواہ کچھ ہی ہو غسلین یا زقوم یا کچھ اور۔

وجوہ یومئذ ناعمۃ۔ گزشتہ آیات میں دوزخیوں کے کچھ احوال کفر و معصیت سے روکنے کے لئے بیان کئے گئے تھے۔ یہاں کے اہل جنت کے احوال ایمان و عمل صالح کی ترغیب دینے کے لئے بیان فرمائے ہیں۔ چہروں کا نازک خوش منظر گداز اور پررونق ہونا۔ خوشی، راحت، بے فکری اور عیش و نشاط کی علامت ہے۔ اہل جنت کے چہرے نازک، گداز اور خوش منظر ہوں گے۔ وہ بے فکر ہوں گے ہر دکھ اور رنج سے۔

لسعیہا راضیۃ۔ خوش ہوں گے اپنی کوششوں کے نتیجے سے۔ دنیا میں انھوں نے راہ خدا میں بہت دکھ اٹھائے تھے۔ دین پر استقامت اور اقامت کی بہت کوشش کی تھی۔ قیامت کے دن ان کی یہ محنت ٹھکانے لگ جائے گی اور وہ اپنے اعمال کے اچھے نتائج کو دیکھ کر ہر طرح مطمئن اور خوش ہو جائیں گے۔

فی جنۃ عالیۃ۔ اونچی جنت میں ہوں گے نشیبی باغ کے بالمقابل اونچا باغ زیادہ پرفضا اور صحت بخش اور راحت آفریں ہوگا، اس لئے جنت کا محل وقوع بھی اونچا ہوگا یا اونچا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دوزخ کا مقام پست ترین ہونے کے سبب سے دوزخیوں کی چیخ و پکار اور واویلا کی آواز آگ کی تپش اور گرمی، وہ دور عذاب کی طرف تکلیفیں جنت والوں کو نہ سنائی دیں گی نہ ان تک پہنچیں گی نہ دکھیں گی۔ یا بلند ہونے سے مراد ہے مرتبہ کا اونچا ہونا یعنی بڑی شاندار عالی رتبہ جنت میں ہوں گے۔

لا تسمع فیہا لاغیۃ۔ جنت والوں کو جنت میں کوئی بیہودہ بات نہ سنائی دے گی۔ نہ جاہلانہ گفتگو نہ بیاری اور مصیبت زدوں کی پکار نہ دوزخیوں کی فریاد۔ غرض عیش کو مکدر کرنے والی کوئی بات نہ ہوگی۔ جنت میں عیش و سرور اور خوش عیشی کا ہر سامان ہوگا مثلاً۔

فیہا عین جاریۃ۔ شہد سے زیادہ شیریں۔ دودھ سے زیادہ سفید۔ برف سے زیادہ ٹھنڈے آب رواں کے چشمے ہوں گے۔

فیہا سرر مرفوعۃ واکواب موضوعۃ ونمارق مصفوفۃ وزرابی مبثوثۃ اونچے تخت نشین، قرینے سے رکھے ہوئے جام۔ قطار در قطار بچھے ہوئے مسندیں اور مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے غالیچے اور قالین۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ دوزخ کے آلام اور جنت کے آرام کی پوری حقیقت تو آخرت میں معلوم ہوگی، لیکن راحت و تکلیف کی اہل اللہ نے اس میں قرآن مجید نے جو تصویر کشی کی ہے وہ مومن کے لئے بھی اچھی سمجھ کی چیز ہے رہے کافر تو ان کا ذکر ہی کیا ہے وہ تو منکر ہی ہیں۔ ان کے فہم تک فہم میں جو چیز نہ آئے اس کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار ہی نہیں ہوتے۔ ان کو تو قدرت الٰہیہ کی ہمہ گیری کا انکار ہے۔ قرآن نے پکار پکار کر مطالعہ کائنات کی دعوت دی۔ انفسی اور آفاقی براہین قدرت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہدایت کی انسانی تخلیق و انجام، ستاروں کی ساخت، روشنی اور طلوع و غروب وہ حوادث دہر، علویات کا سفلیات پر اثر انداز ہونا۔ غرض مختلف شواہد و دلائل کی روشنی دکھائی۔ لیکن نابینا دماغ والوں کو کسی سورج کی روشنی نہ دکھی۔ اب چار چیزیں ایسی پیش کی جا رہی ہیں جن سے عرب کا ہر دیہاتی اور شہری بھی واقف تھا۔ متمدن دنیا کے رہنے والوں کے لئے ان چار چیزوں کا مطالعہ سبق آموز ہے اور وحشی انسان بھی ان سے ناواقف رہنے کا عذر پیش نہیں کر سکتے۔

بیشہ سے خطاب رہا ہے ۔ پھر یہ بات بھی دعوت فکر دے رہی ہے کہ زمین باوجود ثقل اور وزن کے کسی طرح نہ نیچے کو گرتی ہے نہ اوپر کو اٹھتی ہے ۔ قوانین کائنات کی کشش پانی اور ہوا کا دباؤ اس کی سلامتی اور بحالی میں کس قدر مددگار ہے

غرض قدرت الٰہی کا مطالعہ کرنے اور اللہ پر یقین کرنے کے لئے ان گنت شواہد و آثار میں مگر یکتائی میں یہ ہیں ۔ وہ بھی کم سے کم عقلی پر ذہن اور نیم انسان پیش نظر کو پر ملاہو رہا ہے ۔ ماحول میں سب سے مفید اور عجیب جانور اونٹ کو ہر وقت دیکھ سکتا ہے اور ذرا اونچی نظر اٹھاتے تو بغیر کسی غور و فکر کے مصنوع سے صانع کی قدرت کاملہ حکمت بالغہ ربوبیت عامہ اور الوہیت تامہ پر استدلال کر سکتا ہے ۔ بہر حال دیکھنے کے لئے آنکھیں ہیں لعبارت اور اثر پذیری کے لئے دماغ میں بصیرت ہونی چاہیے جس کی بینائی اور دانائی پر جہالت اور عناد کا پردہ پڑا ہو اس کو بھولا ہوا نظری سبق کون یاد دلا سکتا ہے جو شخص خود بار بار اپنی فطری آنکھوں پر تعصب نہ سیاہ غلاف چڑھا رہا ہو اس کو زبردستی منکر لید بنا سکتا ہے ۔ راہنما کا کام راہنمائی ہے ۔ راستہ دکھانا نہ دیکھنا اور دیکھ کر چلانا یا آنکھیں بند کر کے کھائیوں میں گرنا اور پتھروں سے سر پھوڑنا خود مسافر حیات کا کام ہے غرض حسابیت زندگی لے کر ناہر ایک کے لئے ضروری ہے ۔ اس دوری زنجیر کا نقطۂ آغاز اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حلقۂ انتہا بھی اسی کے دست قدرت میں ہے اسی لئے اسی کی طرف سب کی واپسی ہونی لازم ہے ۔ راہ زندگی پر چلنے والے ہر قدم کا شمار اس کو معلوم ہے وہی حساب فہمی کرے گا ۔

تحلیلِ اجزاء

الی الابل کیف خلقت ۔ الابل اسم جمع ہے ۔ اونٹوں کی جماعت نر ہوں یا مادہ سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ۔ مبرد نے کہا بادل کے بھاری ٹکڑے مراد ہیں ۔ ثعلبی نے اس کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ لغت تفسیر میں کہیں الابل کا اس معنی میں استعمال منقول نہیں ۔ ماوردی نے دونوں معنی لکھے ہیں ۔ اور اول معنی کو زیادہ ظاہر کیا ہے جمہور اہل تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے ۔

اوپر کی آیات میں دوزخ اور اس کے گوناگوں عذاب اور جنت اور اس کے اندر حیرت آفریں عجیب عجیب نعمتیں ہونے کا ذکر کیا گیا ہے ۔ کوتاہ نظر رکھنے والے جہالت کیش اس غیر معقول اور نامحسوس عذاب و ثواب کی کیفیات کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور نہ اب کرتے ہیں ۔ قرآن کا رنگ اگرچہ خطابی اور تقریری ہے لیکن دعوت استقرار دینے والا برہان آفریں ایسا کہ دیہاتی جاہل ہو یا عالی کا فلاسفر سب اپنے ذہنی ظرف کے موافق سمجھ جائیں ۔ نامحسوس کو محسوس پر اور غیر معقول کو معقول پر قیاس کرنا عقل نظری اور بدیہی دونوں کا تقاضا ہے ۔ اللہ کی قدرت اور محیط کل عظمت و حکمت کا احاطہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن اجمالی اندازہ اس کی بے حد و بے نہایت طاقت کے اقرار پر اس کائنات کی ساخت اور پر حکمت تخلیق اور حیرت آفریں بناوٹ شہادت دے رہی ہے ۔ اگر مؤثر کی ذات و صفات کو آثار و علامات سے شناخت کیا جا سکتا ہے ۔ خواہ ذات یا صفات کی حقیقت کا علم کرنے سے ذہن عاجز ہو تو پھر دیکھا جا سکتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی وحدانیت، الوہیت، قدرت اور صنعت و حکمت پتہ دے رہی ہے ۔ آسمان کا ہر ستارہ اور سیارہ دعوت غور دے رہا ہے ۔ زمین کا ہر پھول، سبزہ اور پودا اپنی طرف کھینچ رہا ہے ۔ سمندروں کی تمام آبی مخلوق ہر قدم پر دامن فکر کو کھینچ کر اپنی طرف متوجہ بنا رہی ہے ۔ پہاڑوں کے تمام معدنی ذخائر بھی عقل رسا کی تمام تصور آفرینیوں کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں ۔ غرض یہ ہر قطرہ ہر ذرہ درس حکمت سے پر ہیں چرند و پرند اپنے حسن صورت معنویت اور خصوصیت کا علمبردار ہے اور انسان کے لئے سبق آفریں ۔ کیسے کیسے خوشنما پرندے ، خوبصورت چوپائے اور پر جمال حیوان ہیں جو ہاتھ لگانے سے میلے ہوتے ہیں ۔ گویا عالم اول سے لے کر عرش بریں کی آخری چوٹی تک ہر چیز درس معرفت و بصیرت دے رہی ہے ۔ مگر یہ دقیقہ رسی اور نکتہ نشینی اور تنقیح حقیقت صرف روشن فکر رکھنے والے دانشوروں کا کام ہے ۔ دیہاتی اور خصوصاً گیانی خانہ بدوش بدویوں کی عقل نارسا تو اتنی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی ۔ یہ نیم انسان تو صرف آسمان، زمین اور پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور اونٹ طرز پلٹ اس کے سامنے ہوتا ہے بدوی کی معاشی زندگی نہ زراعت سے وابستہ ہے نہ تجارت سے نہ مزدوری اور صنعت سے ۔ اونٹ ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے اونٹ ہی سے اس کا لباس ہے اونٹ کا ہی دودھ اور گوشت اس کی خوراک ہے ۔ اونٹ ہی اس کی سواری ہے اور بار برداری ہے ۔ ریگزار میں اونٹ ہی اس کا جہاز ہے حقیقت میں معاشی، سماجی اور صحرائی ضرورتوں کی وابستگی جتنی اونٹ سے ہے اتنی کسی اور جانور سے نہیں ۔ پھر فرمانبردار ایسا کہ ایک بچہ کے اشارہ پر اٹھتا بیٹھتا اور چلتا ٹھہرتا ہے ۔ سخت جگر رکھنے کے باوجود بقول ابوالسعود رقیق القلب ایسا کہ حدی کی آواز سے مست ہو جاتا ہے ۔ قوت برداشت اتنی کہ مہینوں بھوکا پیاسا رہ سکتا ہے ۔ جفاکش

اتنا کہ سینکڑوں میل چل کر بھی نہیں تھکتا ۔ بار کش ایسا کہ لدا ہوا بیٹھتا اور لدا ہوا اٹھتا ہے ۔ سادہ خوراک اتنا کہ کڑوی بیٹوں اور کانٹوں پر گزارا کرتا ہے لم هذا الیاکہ باوجود اس قدر قد آور ہونے کے گاۓ سے زیادہ نہیں کھاتا عجیب الخلقت ، عجیب الہیئت ، عجیب الخصوصیات اور عجیب المنافع اونٹ کے بعد بدوی اور ریگ زار کی بدوی کے سامنے پہاڑ ہوتے ہیں ۔ نیچے زمین اور اوپر آسمان ہوتا ہے ۔ پہاڑوں کی اور آسمان و زمین کی اعجوبہ زائی حکمت انگیزی اور منفعت آفرینی دیہاتی اپنی سمجھ کے مطابق جانتا ہے اور فلکیات و ارضیات کا ماہر اپنی ذہانت اور ریسرچ کے موافق ۔ غرض اول ہو یا آخر پہنچتا ہر ایک اس اقرار پر ہے کہ یہ سلسلۂ کائنات بے ربط نہیں ۔ خود رو نہیں ، خود بخود نہیں ۔ بلکہ آثار ہیں کسی مؤثر کے ، نتیجہ افعال ہیں کسی فاعل کے ، رازداں ہیں کسی خلاق حکیم کے اور صدائے بازگشت ہیں کسی مستی آفریں نغمہ خواں کے ۔

پس کیوں غور نہیں کرتے غور کرنے والے کائنات کی گہرائی میں اور کیوں نہیں دیکھتے دیکھنے والے آئینۂ ہستی میں ۔ اللہ کی قدرت و علم و حکمت کی غیر مرئی صورت ۔ حقیقت تو بالکل عیاں ہے ۔ فطرت خاطر کی غماز ہے ۔ اگر فطرت کا سبق یاد نہیں رہا ۔

فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمصیطر تو یاد دلانے کے لئے اللہ نے اپنے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج دیا اور ان کو حکم دے دیا کہ بھولا ہوا سبق ان سب فطرت فراموش لوگوں کو یاد دلاؤ ۔ صرف یاد دلانا اور نصیحت کرنا آپ کا کام ہے ۔ زبردستی اقرار کرانا (ابن قتیبہ) اور دلوں میں انقلاب پیدا کر دینا (ابن عباس و مجاہد) آپ کا کام نہیں ۔ اس یاد دہانی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سعید روحوں والے بھولا ہوا سبق یاد کر لیں گے ۔ ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ جائے گا ۔

الا من تولی وکفر ہاں جس کا ظاہر و باطن مردہ ہو چکا یعنی جو شخص تمہاری نصیحت و یاد دہانی سے روگرداں ہے ماننا ہی نہیں چاہتا اور دل سے منکر ہے ۔

فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر ۔ اس کو اللہ بہت بڑی سزا دے گا ۔ اس کو تمہاری رہنمائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا ۔

آیت میں استثناء منقطع ہے ۔ یعنی صرف عملی سرکشی اور اعتقاداً انکار کرنے والوں کے سب کو نصیحت کرو ۔ سراج منیر میں خطیب نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے نزدیک آیت سیف سے اس آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا ۔ شیخ ابن کثیر نے بھی اس جگہ حدیث جہاد کو ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حکم جہاد سے اس آیت کا حکم منسوخ ہے ۔ لیکن خطیب کو اس جگہ غلط فہمی ہوئی ۔ ابن عباس کی مراد نسخ اصطلاحی نہیں ہے آیت بہر حال محکم ہے ۔ کیونکہ لست علیہم بمصیطر خبر قولی ہے جس پر نسخ وارد ہی نہیں ہو سکتا ۔ امر نہیں ہے ۔ سادہ مطلب ناقابل شک یہ ہے کہ اگرچہ عمومی تبلیغ رسول اللہ پر فرض تھی اور حضورؐ نے اس فرض کو ادا بھی کیا ، مگر بار بار ایسے لوگوں کو نصیحت کرنا جو سرکش اونٹوں کی طرح بد کنے والے اور قلبی عناد و انکار کے ساتھ ساتھ عملاً انتہائی نفرت کرنے والے تھے ۔ حضور والا کا نہ فرض تھا نہ شیوہ کیونکہ کسی کے ماننے نہ ماننے کے آپ ذمہ دار نہ تھے ۔ زبردستی عامل بنانا اور زبردستی انقلاب پیدا کر دینا آپ کا کام نہ تھا ۔ جو کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا ۔ اصول حیات اور ضوابط فطرت سے روگردانی دونوں جہان میں بربادی کا موجب ہے مگر اس دنیا میں کتنی ہی مصائب و شدائد پیش آئیں پھر بھی آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کم اور محدود اور سہل ہیں آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے بہت بڑا ہے

ان الینا ایابہم ثم ان علینا حسابہم ۔ کوتاہ نظر رکھنے والے خیال کرتے ہیں کہ ہم بالکل مختار ہیں ۔ ہماری دانش انفراداً یا اجتماعاً ہماری رہنما ہے اسی کی رہنمائی کافی ہے ۔ کیسا خدا اور کہاں کا عذاب بے شک اس زندگی میں آدمی کو ایک حد تک اختیار دیا گیا ہے ۔ شعور و عقل کا بھی مالک بنایا گیا ہے ۔ لیکن کیا انسان کی یہ زندگی دوسرے جانوروں کی طرح صرف مادی ہے ۔ کیا آدمی کے افکار و اعمال سزا و جزا سے بے نیاز ہیں ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو سوچنا چاہیئے کہ اس زندگی کا مآل کیا ہے ۔ جب تک آدمی با اختیار ہے عمل کرتا ہے اور جب تک عمل کرتا رہے گا پوری سزا و جزا کا امکان ہی نہیں ہے آخر یہ عالم تکلیف ختم ہوگا ۔ زندگی اپنی اسی بے اختیاری کی طرف لوٹے گی جہاں سے چلی تھی ۔ خداداد اختیار ختم ہو جائے گا اور سزا و جزا کا وقت آ جائے گا ۔ اختیار عمل سلب ہو جائے گا اور دوسری بے اختیار زندگی جو سزا و جزا کی حامل ہوگی ۔ ملنا اللہ کی طرف سے واپس ہونا ہے ۔ جب تک آدمی با اختیار ہوتا ہے زندگی کے ہر دور کو اپنا ساختہ پرداختہ خیال کرتا ہے ۔ لیکن دوسری زندگی تو بے اختیاری کی ہوگی وہاں کے دکھ سکھ کو کوئی بھی اپنا اختیاری قرار نہیں دے سکتا ۔ وہ تو براہ راست بلا واسطہ اللہ کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوگا ۔ اس لئے

آخر کو اسی نتیجہ کو برداشت کرنے کی طرف رجوع کرنا ہوگا، لیکن ہر نتیجہ کا ایک سبب ہوتا ہے اور ہر سبب کا ایک نتیجہ ۔ نتیجہ اور عمل میں خصوصی مناسبت اور تعلق کا ہونا ضروری ہے ، اسی لیے اعمال کی حساب فہمی ہوگی اور ضرور ہوگی ۔

مقصودِ بیان افلا ینظرون سے بلیغ درس ہے کائنات مادیہ کی تخلیق ، صنعت ، حکمت اور منفعت پر غور کرنے کا اور مطالعہ فطرت سے فاطر پر استدلال کرنے کا ۔ پس کوتاہ اندیش ہیں وہ سادہ لوح اہل ظاہر جو معرفت الٰہیہ کے حصول کے لیے مطالعہ کائنات سے غافل رہا ۔ اسی طرح اصل مقصد مطالعہ سے جاہل ہیں وہ سائنس داں بھی جو مادہ اور مادیات کی تحقیق کا مقصود صرف آثار کے امکان کو قرار دیتے ہیں ۔ موجودات کی زنجیر کو حلقہ در حلقہ مربوط جانتے ہوئے اسباب و نتائج کی باہم وابستگی کو طبعی غیر ارادی سمجھتے ہیں اور علۃ العلل مختار مطلق تک ان کی فکری رسائی نہیں ہوتی ۔

مذکر میں عام انسانوں کو بھولا ہوا فطری سبق یاد دلانے کی تعلیم ہے انما انت مذکر میں فرض نبوت کا بیان ہے اور لست علیہم بمصیطر میں فرض نبوت کی حد بندی ہے اور صراحت ہے اس امر کی کہ پیغمبر کو ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی قدرت نہیں دی گئی ۔ نیز تسکین کا پیام ہے رسول اللہ صلعم کے لئے کسی کے انکار اور سرکشی کی بازپرس آپ سے نہیں کی جائے گی ۔

ایابہم کا لفظ بتا رہا ہے کہ نوعِ انسانی کے آغاز کا سر واجب تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر قطرہ کو محیط سے مل کر رہنا ضرور ہے ۔ در مبدء و معاد کا درمیانی دورِ حیات یوں ہی رائیگاں نہ جائے گا اور سارے کار و اعمال یونہی فنا نہیں ہو جائیں گے بلکہ

انا علینا حسابہم ۔ سب کی حساب فہمی ہوگی وغیرہ ۔

سُورة الفجر

یہ سورت مکی ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ ، حضرت ابن زبیرؓ ، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے صراحۃً یہی منقول ہے صرف علی بن ابی طلحہ نے ایک قول میں اس کو مدنی کہا ہے ۔

معالم اور تفسیر کبیر میں آیات کی تعداد تیس لکھی ہے اور بیضاوی و ابو السعود نے انتیس[۲۹] اور خطیب نے سراج میں تیس[۳۰] اور انتیس[۲۹] دونوں نقل کئے ہیں ۔ کلمات ایک سو انتالیس[۱۳۹] اور حروف پانچ سو ستانوے[۵۹۷] ہیں ۔

حضرت معاذ بن جبل کی امامت کے سلسلے میں حضرت جابر نے ایک حدیث نقل کی ہے جو کتب صحاح میں موجود ہے ۔ اس حدیث میں حضور اقدس صلعم نے حضرت معاذ سے فرمایا تھا کہ تم سبح اسم ربک الاعلیٰ والشمس وضحاھا والفجر اور واللیل اذا یغشیٰ کی طرح کیوں نہیں پڑھتے ۔ اس حدیث سے اس سورت کا نام الفجر ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ اس روایت کو نسائی نے مفصل بیان کیا ہے اور طحاوی نے اس مضمون کی اکثر روایات کو مسنداً نقل کیا ہے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں (ذی الحجہ) کی اور جفت کی اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلنے لگے (گزرنے لگے) کیونکہ اس میں عقلمند کے واسطے کافی قسم ہے

لِّذِيْ حِجْرٍ ۭ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستون جیسے (دراز تھے) اور جن کی برابر زور و قوت

مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝

یں دنیا بھر کے شہروں میں کوئی شخص نہیں پیدا کیا گیا اور قوم ثمود کے ساتھ کیا معاملہ کیا جو وادی قریٰ میں پتھروں کو تراشا کرتے تھے اور مکانات بنایا کرتے تھے اور میخوں وا

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ

والے فرعون کے ساتھ جنہوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا سو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا

عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ

بیشک آپ کا رب (نافرمانوں کی) گھات میں ہے سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو (ظاہرا) انعام و اکرام دیتا ہے تو وہ

وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ

(بطور فخر یہ) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی اور جب اس کو آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ (شکایۃً) کہتا ہے کہ میرے رب

رَبِّي أَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

نے میری قدر گھٹا دی ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم (میں اترانا اور بھی جو سبب عذاب ہے یہ ہیں کہ تم) لوگ یتیم کی قدر (اور خاطر) نہیں کرتے ہو اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ كَلَّا إِذَا دُكَّتِ

ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو ہرگز ایسا نہیں جس وقت زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ ریزہ

الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ

کر دیا جائے گا اور آپ کا پروردگار اور جوق جوق فرشتے (میدان محشر میں) آویں گے اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا اس روز

بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۝ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ

انسان کو سمجھ آوے گی اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں رہا کہے گا کاش میں اس زندگی کے لئے کوئی عمل (نیک) آگے بھیج لیتا پس

لِحَيَاتِي ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ

اس روز نہ تو خدا کے عذاب کی برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا اور نہ اس کے جکڑنے کی برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار

الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا (کہ یہی نعمت روحانی ہے) اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

کے اول عشرہ کی دس راتیں ہیں یا رمضان کا عشرہ اول (ابن کثیر) یا آخری دہائی مراد ہے (معالم و سراج بروایت ضحاک از ابن عباس)

ایک دوسری حضرت جابر کی مرفوع روایت ہے جس کو امام احمد اور نسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ الوتر ذی الحجہ کی نویں تاریخ (یوم عرفہ) ہے اور الشفع ذی الحجہ کی دسویں تاریخ (قربانی کا دن) حضرت ابن عباس، عکرمہ اور ضحاک سے بھی یہی قول منقول ہے۔ عطاء کا قول اس کے برعکس ہے (رواہ ابن ابی حاتم) ابو سعید بن عوف نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن زبیر نے دوران خطبہ میں فرمایا کہ الشفع یہ آیت ہے فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ اور الوتر یہ آیت ہے ومن تاخر فلا اثم علیہ یعنی ایام منیٰ کے پہلے دو دن الشفع ہیں اور تیسرا دن الوتر ہے (ابن ابی حاتم) یا شفع اور وتر دونوں سے کل مخلوق مراد ہے کیونکہ کائنات میں سے کوئی جفت ہے کوئی طاق۔ گویا اللہ نے کل مخلوق کی قسم کھائی (حسن بصری کا مزید ایک قول) حضرت ابن عباس کا ایک قول عوفی نے نقل کیا ہے کہ الوتر اللہ ہے اور الشفع مخلوق (ابن کثیر) مجاہد کے مختلف اقوال مروی ہیں سب سے قوی قول یہی ہے (ابن ابی نجیح اور ابن ابی حاتم) قتادہ نے حسن بصری کا ایک قول نقل کیا ہے کہ شفع و وتر سے مراد جفت و طاق عدد ہیں (ابن ابی حاتم و ابن جریر) ابو العالیہ اور ربیع بن انس کے نزدیک جفت و طاق نماز مراد ہیں (رواہ احمد عن ابی داؤد الطیالسی) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قتادہ نے حضرت عمران کو نہیں پایا (ابن جریر اور ترمذی نے قتادہ اور عمران کے درمیان ایک بصری شخص کا ذکر کیا ہے مگر نام نہیں ذکر کیا۔ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے، لیکن ابن ابی حاتم نے اس بصری شخص کا نام عمران بن عصام ضبعی لکھا ہے۔ گویا ضبعی عمران نے حضرت عمران بن حصین صحابی کی روایت سے حدیث کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی تفسیر سے نقل روایت کے بعد اتنا مزید لکھا ہے کہ عمران بن عصام کی کنیت ابو عمارہ تھی نمازوں کا امام تھا۔ ابو جمرہ ضبعی عمران کا بیٹا تھا۔ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور خلیفہ بن خیاط نے ان کا شمار تابعین بصرہ میں کیا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جفت مخلوق کی صفات ہیں۔ مخلوق کی کوئی صفت ایسی نہیں جس کے مقابل اس کی ضد نہ ہو۔ نور و ظلمت، سعادت و شقاوت، علم و جہالت، کفر و ایمان، عزت و ذلت، صحت و مرض، قوت و ضعف، نیند و بیداری، حرکت و سکون غرض مخلوق کی ہر صفت زوجیت کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے اور اللہ کی صفات وتر ہیں عظمت و بلندی بغیر پستی کے۔ علم جہالت کے بغیر۔ نور ہے بغیر ظلمت کے۔ عزت ہے بغیر ذلت کے۔ قوت ہے بغیر ضعف کے۔ یہاں تک کہ حیات ہے بغیر موت کے۔

اسی طرح مختلف علماء نے بقدر مبلغ علم شفع و وتر کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ مثلاً جفت وہ بارہ چشمے جو اسباط بنی اسرائیل کے لئے زمین سے برآمد کئے گئے تھے اور طاق حضرت موسیٰ کے نو معجزات۔

جفت دنیا کے دن رات اور طاق قیامت کا دن جس کے بعد رات نہیں۔

جفت وہ پیغمبر جن کے دو دو نام ہیں محمد، احمد۔ عیسیٰ، مسیح۔ یونس، ذوالنون وغیرہ اور طاق وہ پیغمبر جن کا ایک ہی نام ہے جیسے ابراہیم۔ موسیٰ۔ ہارون وغیرہ۔

جفت قوم عاد پر طوفان آنے کے آٹھ دن اور طاق طوفان عاد کی سات راتیں۔

جفت آسمان کے بارہ برج اور طاق سات سیارے۔

جفت وہ اعضائے انسانی جو دو دو ہیں جیسے دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ۔ دو پاؤں اور طاق وہ اعضاء جو ایک ایک ہیں جیسے دل، جگر، زبان وغیرہ۔

جفت تیس دن کا مہینہ اور طاق انتیس دن کا مہینہ۔

جفت دو لب اور طاق ایک زبان۔

جفت ہر رکعت کے دو سجدے اور طاق ہر رکعت کا رکوع۔

جفت جنت کے آٹھ دروازے اور آٹھ درجات اور طاق جہنم کے سات درجات۔

صاحب فتح البیان نے لکھا ہے کہ مذکورہ اقوال میں اکثر اقوال انفرادی آراء پر مبنی ہیں ۔ نہ کسی مرفوع حدیث سے ان کا ثبوت ہے نہ اجماع
اہل تفسیر سے ثابت ہیں، اس لئے ان کو فکری اجتہادی کہہ سکتے ہیں اور بغیر کسی یقین و تعیین کے تفسیر محتمل قرار دے سکتے ہیں
قوی ترین قول یہ ہے کہ الفجر سے مراد ہے ہر فجر ۔ کوئی ہو اور لیال عشر سے مراد ہیں دس متبرک راتیں ۔ خواہ محرم کا ابتدائی عشرہ ہو یا ذی الحجہ
کا یا رمضان کا آخری عشرہ یا متفرق راتیں اور شفع و وتر میں بھی بغیر تعیین کے ہر جفت و طاق مراد ہے عددی ہو یا معدودی۔

ایک لطیف تشریح

صوفیہ صافیہ کی گہری نظر پوست سے بڑھ کر مغز تک پہنچتی ہے ۔ اور ان کی ہر فکر مشکوٰۃ نبوت سے نور چیں ہوتی ہے
خواہ نقل روایت ہو یا وجدان و کشف کے زیر اثر ۔ ان کا کوئی قول حقیقت میں فرمان نبوی کا مخالف نہیں
ہوتا بلکہ کاشف اور موضح ہوتا ہے ۔ (۲) ہمارے شیخ الشیوخ حضرت بحر عرفان نے لطیف ترین تشریح کی ہے جس کی ہم نہ تائید کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ
روایات صحیحہ میں کہیں مرفوعاً نہیں آئی ۔ نہ تردید کر سکتے ہیں کیونکہ اس تشریح کا مدار وجدان صحیح اور معرفت پر ہے ۔ بہر حال ہے جاذب
قلب ۔ لذت روحانی عطا کرنے والی اور کیف معرفت سے لبریز
فرماتے ہیں نور حق کا پہلا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب روح بدن پر پرتو انداز ہوتی ہے اور آدمی نیست سے ہست بنتا ہے ۔ عدم
سے وجود میں آتا ہے ۔ حیات جمادی و نباتی سے حیات حیوانی کی حدود میں داخل ہوتا ہے ۔
دوسرا درجہ نور حق کے ظہور کا وہ ہوتا ہے کہ آدمی کی شعوری طاقتیں برسر ظہور آتی ہیں ۔ احساس زندہ ہوتا ہے ۔ علم کی ترقی ہوتی ہے ۔
اور اس طرح روزانہ جزئیات کے استقراء تمثیل اور تتبع سے علوم کلیہ اور عقلیہ تک اس کو رسائی حاصل ہوتی ہے ۔ پھر اس سے آگے وجدانیات
کے جلوے اس کے آئینۂ قلب پر پڑتے ہیں اور تجلیات الٰہیہ پرتو انداز ہوتی ہیں ۔
تیسرے درجہ میں پہنچ کر آفتاب قدس کا اس پر طلوع ہوتا ہے ۔ محبوب کی پو پھٹتی ہے ۔ نور ذات نمودار ہوتا ہے ۔ کشف جمال ہوتا ہے ۔
تجلیات صفاتیہ سے آگے بڑھ کر انوار ذاتیہ کی فیض پاشی ہونے لگتی ہے ۔ دنیا میں یہ مرتبہ عموماً انبیاء اور بعض مقربین بارگاہ کو حاصل ہوتا ہے ۔
اور آخرت میں عام اہل ایمان اس سے بہرہ اندوز ہوں گے ۔ یہی طلوع فجر ہے جو ظلمت کدۂ نیستی کے خوابیدہ علم والوں کو بیدار کر دیتی ہے ۔
اس سے عالم انسانی کی ہستی ہے ۔ یہی لعل شب چراغ ہے ۔ جس کی روشنی انسانی قلب و روح کو منور کر کے حیات جمادی کی تاریک رات
کی ظلمت دور کر دیتی ہے ۔
رہیں دس راتیں تو وہ حواس عشرہ ہیں ۔ پانچ ظاہری اور پانچ باطنی ۔ یہ آلات ادراک ضرور ہیں ، مگر بجائے خود کثیف ، تاریک اور
مادی ہیں ۔ نفس انسانی ان کے علوم و ادراکات میں ڈوب کر انوار حق کے حصول سے بے بہرہ رہ جاتا ہے ۔ مادیات میں انہماک مجردات کے عرفان
سے روکتا ہے ۔ علوم مجردہ تک پہنچنے اور کمال عرفانی حاصل کرنے کا یہ زینہ ضرور ہیں مگر ان کے علوم اور ان کے اکتسابیات میں استغراق کمال معرفت
سے مانع بھی ہیں ۔ لیکن جب لب بند ، چشم بند ، گوش بند یہاں تک کہ حسی ہوش بند ہو جاتا ہے اور ان سے روگرداں ہو کر نفس کا توجہ ملاء اعلیٰ
اور صحف بالا سے ہوتا ہے ۔ اس وقت طلوع حق کی کامل فجر نمودار ہوتی ہے ۔ مگر ہم کہہ چکے ہیں کہ کمال عرفان تک پہنچنے کا یہ زینہ ہیں ۔ اکتسابی
علوم کے حصول کا ذریعہ ہیں ۔ بشرطیکہ نفس انہیں کی ادراکی اور تحصیلی لذتوں میں ڈوب نہ جائے ۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آفتاب حق کی فجر کے
مبادی بھی لیالی عشرہ ہیں ۔ اور بجائے خود بڑی عظمت رکھتے ہیں ۔ جمادی اور نباتی بے حس زندگی سے نکال کر حیوانیت کے دائرہ میں لاتے
ہیں اور کمال انسانی کے مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچاتے ہیں ۔ علوم کسبیہ کا سرچشمہ یہی ہیں ۔ معارف وجدانیہ کا زینہ (؟) ہیں ۔
رہی وتر و شفع کی اشاراتی تنقیح تو غالباً اس سے اشارہ مادی اور علمی قوتوں کی طرف ہے ۔ مادی قوتیں شفع ہیں ۔ دو ہیں ۔ ایک شہوانی
یعنی دوسری غضبی سبعی ۔ ایک کا کام مادی لذتوں کا حصول ہے ۔ دوسری کا کام موانع کو دفع کرنا ہے اور تیسری قوت علمی اور عقلی ہے ۔ یہ تنہا
ہے وتر ہے کبھی مادی قوتوں پر حکومت کرتی ہے کبھی ان سے مغلوب ہو جاتی ہے واللہ اعلم ۔

ف: اللیل ۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے ہر رات مراد ہے ۔ کوئی ہو ۔ لیکن مقاتل کے نزدیک اللیل میں الف لام عہدی ہے اور اس سے

خاص رات یعنی حج کے زمانے میں قیام مزدلفہ کی رات مراد ہے کہ اوّل رات میں عرفات سے چل کر لوگ مزدلفہ میں آتے ہیں اور آخر رات میں فجر سے پہلے ہی کمزور لوگ اور عورتیں یہاں سے منا کی طرف چلے جاتے ہیں ۔

یَسْرِ ۔ اصل میں یَسْرِیْ تھا ۔ اخفش بلکہ جمہور کے نزدیک یہ لفظ سریٰ سے مشتق ہے ۔ اور سریٰ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی راہ کا چلنا ۔ رات کی طرف چلنے کی نسبت مجازی ہے ۔ اس کی تائید مقاتل کی مذکورۂ بالا تشریح سے بھی ہوتی ہے ، لیکن شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ ممکن ہے یہ لفظ سرایۃ سے بنا ہو اور سریٰ سے بھی بنا ہو تو سریٰ سے مراد ہو مطلق چلنا ۔ گزرنا نہ کہ رات کو چلنا (اس وقت سریٰ کا ترجمہ گزرنا بطور مجاز لغوی ہوگا لیکن) سریٰ کی نسبت رات کی طرف حقیقی ہوگی ۔ جمہور کے نزدیک یسر کا ترجمہ اس جگہ ہے جب رات جائے یعنی ڈھلے ۔ قتادہ اور ابوالعالیہ نے کہا سریٰ کا معنی ہے رات کا آنا ۔ جب رات آئے ۔

کیا قیامت کا آنا لازم ہے ۔ اگر ہے تو تاخیر کیوں ہے ؟

یہ دو سوال ہیں جو کوتاہ نظر نفسیات الفہم لوگوں کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں ، یہ شبہات ان کی نگاہ عقل میں ایسے رچے ہیں کہ وہ ..... وجود قیامت ہی کے منکر ہو گئے ۔ آخرت کی جزا سزا کا ہی مذاق اڑانے لگے ۔ اوّل الذکر سوال کا ازالہ ناقابل شکست دلائل کے ساتھ گزشتہ سورت میں مذکور ہو چکا ۔ اس جگہ وجودِ قیامت کی تاخیر کے اسباب لطیف ترین اسلوب بیان کے ساتھ ذکر کئے گئے ۔

دو چیزیں اہلِ عقل کے لئے قابل غور ہیں ۔ ١ رات دن کا تبادل ، روشنی اور تاریکی کا چکر ، ساری کائنات کا عروج و زوال خصوصاً انسانی سوسائٹی اور افراد کی ترقی و تنزل ، کیا آہستہ آہستہ اور تدریجی ہے ۔ یا یکدم اور ایک آن میں ۔ ٢ کیا کسی چیز کا وقت معین سے پہلے ظہور ہو سکتا ہے ۔ کیا اس نظام ہستی کی زنجیر اس طرح دوری حرکت کرتی ہے کہ اگلی کڑی درمیانی کڑیوں سے رشتہ توڑ کر پہلی کڑی سے یکدم آکر مل جائے اور اس سے وابستگی پیدا کر لے ۔ اور اسباب و نتائج کے فطری تسلسل کو ابتر کر دے ۔ دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی ہے کہ یہ کائنات نظامِ ہستی دفعی نہیں تدریجی ہے ۔ آنی نہیں زمانی ہے ۔ سورج کا طلوع و غروب ۔ ستاروں کا ظہور و خفا ، دن اور رات کا ادل بدل ، صبح زندگی اور شام موت ۔ افراد و اقوام کی پستی و بلندی ، ترقی و تنزل ، حوادث دہر اور واقعات عالم ۔ غرض ہر چیز تدریجی ہے ۔ ہر شے اپنے وقت پر آتی ہے ۔ ایک رات دوسری رات سے بغیر نہاری فاصلہ کے نہیں مل سکتی ۔ ایک دن دوسرے دن سے بغیر تاریکی کی مسافت طے کرنے کے بغیر اپنا رشتہ نہیں جوڑ سکتا ۔ ایک کا عروج دوسرے کا زوال ۔ ایک کا ظہور دوسرے کا خفا ، باہم لازم ملزوم ہیں ۔ قسم ہے فجر حیات اور شام موت کی ۔ قسم ہے ان عظیم الشان راتوں کی جو اپنے اندر بڑے بڑے دنیوی اور دینی واقعات و حوادث کو لپیٹے ہوئے رواں دواں ہیں ۔ قسم ہے اس ساری کائنات کی عددی اور معدودی انفرادیت و اجتماعیت کی ۔ قسم ہے اس سنسار کے باہمی تصادم ، تناقض ، تضاد اور کشمکش کی ۔ قسم ہے اس مخلوق کے علم و جہالت کی ۔ عزت و ذلت ، قوت و ضعف ، ہبوط و علو اور حیات و موت کی اور قسم ہے خلاق عالم کی وحدت و وحدانیت ۔ یکتائی و بے مثالی کی کہ وجودِ قیامت نظام فطرت اور سلسلۂ خلاقیت کے خلاف نہیں ہوگا ۔ جس طرح ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے اور ہر وقت کے لئے ایک چیز معین ہے ۔ صبح ہو یا شام یا رات ہو یا دن ۔ کوئی عدد ہو یا معدود ، غرض کل نظام حیات و موت آہستہ آہستہ چل رہا ہے ۔ اور ہر آنے والی چیز کا آنا اپنے وقت پر ضروری ہے نہ اس کو ٹالا جا سکتا ہے نہ وقت سے پہلے لایا جا سکتا ہے ۔ وقت سے پہلے آنے اور لانے کی تمنا اور خواہش حماقت ہے ۔ جہالت ہے اور نظام کائنات سے غفلت ہے ۔ پس قیامت بھی اپنے وقت پر آئے گی ۔ انسان کی عملی زندگی کا دور ختم ہوگا تو پاداشی زندگی کا آغاز ہوگا ۔ جب کل انسان مر جائیں گے تو جزا سزا کا وقت آئے گا ۔ عمل کے زمانے میں نتیجہ کی خواہش بے وقوفی ہے ۔ دانشوروں کے لئے یہ کائناتی شہادت عظیم الشان شہادت ہے شواہد لیل و نہار کا پیش کردہ ثبوت ناقابل تردید ہے ۔

الم تر کیف فعل ربك بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلها فی البلاد ۔ اے نبی یا اے مخاطب کیا تو نے نظر بصیرت اور چشم عبرت سے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد ارم کے ساتھ کیا کیا ۔

عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح۔ یعنی عاد کا دادا ارم حضرت نوح کا پوتا تھا۔ عاد اور نوح کے درمیان تین نسلیں تھیں۔ مورثِ اعلیٰ کے نام پر عرب پورے قبیلہ کو نامزد کر دیتے ہیں۔ مثلاً بنو جعفر، کنانہ، تغلب وغیرہ۔ اشخاص ہی کے نام تھے، آگے چل کر ان کا اطلاق ان کی قوموں پر ہونے لگا۔ عاد کا اطلاق بھی ایک قوم پر ہوتا تھا جو عاد نامی شخص کی نسل سے تھی اور عاد کو دادا ارم کی طرف نسبت کر کے عاد ارم بھی کہا گیا ہے۔ ارم کے نام پر یمن میں ایک عظیم الشان شہر بھی آباد کیا گیا تھا۔ عاد دو فرقوں کا نام تھا۔ ایک عاد اولیٰ یا عاد قدیم دوسرا عاد اخریٰ جو حضرت ہود کی قوم کہلاتی تھی۔ عاد قدیم اور عاد اخریٰ دونوں بڑی دیو قامت، طاقتور، قد آور اور بڑی توانا قومیں تھیں۔ بہت بڑے ڈیرے خیمے اونچے اونچے ستونوں پر قائم کر کے اور بہت بلند ستونوں کی عمارتیں بنا کر رہتے تھے۔ خصوصاً عاد اولیٰ والے تو بہت ہی دراز قامت کہتے ہیں۔ جن کی مثل اس زمانے میں عرب اور عجم کی کوئی قوم نہ تھی۔ عاد اولیٰ کا تمدن اور کلچر بھی بہت وسیع تھا۔ حکومت بھی ہمہ گیر تھی۔ یہاں تک کہ [illegible] ان کے زیر اقتدار آ گیا تھا۔ اصلاً یہ یمنی تھے۔ حضر موت کے قریب احقاف کے رہنے والے تھے۔ عمان سے بصرہ تک بلکہ تمام بلاد شام پر چھائے ہوئے تھے۔ عمان کے قریب شہر ارم بھی انہوں نے تعمیر کیا تھا۔ ارم کی داستانیں اور شداد کے افسانے اسرائیلیات سے اخذ کر کے رازی اور بغوی جیسے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بکثرت بھر دیے ہیں۔ یہاں تک بھی لکھ دیا ہے کہ عبداللہ بن ابو قلابہ نے حضرت معاویہ کے عہد سلطنت میں شداد کی جنت دیکھی تھی اور وہاں سے کچھ جواہر بھی لایا تھا بلکہ عبداللہ کو صحابی قرار دیا ہے مگر ابن کثیر نے اس ساری خرافات کو موضوع قرار دیا ہے اور ابن خلدون نے اس کا خوب خوب مذاق اڑایا ہے۔ نہ یہ افسانہ روایۃً صحیح ہے نہ درایۃً۔ نہ عبداللہ بن ابو قلابہ نام کا کوئی صحابی تھا۔ ممکن ہے اہلِ اسلام کو بدنام کرنے والا کوئی مکار یہودی ہو۔ جو اسلام کے لبادہ میں سامنے آ کر افسانہ طرازی کرنے لگا ہو۔ تعجب ہے کہ زمخشری اور بیضاوی جیسے اہلِ تفسیر نے یہ بے سروپا حکایت بیان کی ہے۔ حدیث کے حوالے سے عبداللہ کا حلیہ بھی لکھا ہے جو بالکل موضوع ہے۔ عاد اخریٰ یعنی قوم ہود عاد اولیٰ ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ بڑی اقتدار اور تمکنت والی تھی اسی کی ہدایت کے لئے حضرت ہود کو بھیجا گیا تھا۔

عاد اولیٰ کا تذکرہ قرآن مجید میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک اس جگہ۔ دوسرا سورہ والنجم میں۔ باقی جس جگہ عاد کا ذکر آیا ہے وہاں عاد ثانیہ یعنی حضرت ہود کی امت مراد ہے۔

ابن کثیر نے محمد بن اسحاق کا قول نقل کیا ہے کہ عاد کے باپ کا نام ارم تھا۔ یعنی عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح۔ بغوی نے مقاتل کے قول کی بنا پر لکھا ہے کہ ارم وہ قبیلہ تھا جس کی حکومت قبائل عاد پر ہوتی تھی۔ یہ لوگ مہرہ (علاقہ یمن) میں رہتے تھے۔ یہ ارم عاد بن سیم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا، لیکن محمد بن اسحاق کے حوالے سے بغوی نے عاد کو عوص بن ارم بن سام بن نوح کا بیٹا قرار دیا ہے۔ اور صحیح بھی ہے۔ کلبی کے قول پر بھی عاد ارم کا پوتا تھا۔ رازی، بیضاوی، خطیب، ابو السعود بلکہ اکثر اہل تفسیر نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔

ارم کی دوسری شاخ کا نام آگے چل کر ثمود ہوا۔ جس کا تذکرہ ابھی آتا ہے۔ ثمود کو ثمود ارم بھی کہا جاتا ہے یعنی دادا کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ یہاں عاد سے جمہور مفسرین کے نزدیک عاد اولیٰ مراد ہے۔ کلبی اور بغوی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود مراد ہے مگر یہ غلط ہے۔ ثمود کا ذکر اس کے بعد کیا گیا ہے۔

ذات العماد کا ترجمہ ہے عماد والے۔ مجاہد، کلبی اور قتادہ نے کہا۔ یہ قوم ستونوں والی تھی یعنی لمبے لمبے ستونوں پر اپنے ڈیرے خیمے قائم کر لیا کرتی تھی۔ عمارتیں بنا کر کہیں نہیں رہتی تھی یا ان کی عمارتیں لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہوتی تھیں۔ عوفی نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ عماد سے مراد ہیں لمبے قد و قامت، لیکن چونکہ عوفی کی یہ روایت قابلِ اعتماد سند سے مروی نہیں ہے اس لئے ابن کثیر اور ابن جریر نے قول اول ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔

لم یخلق مثلھا کی تشریح میں ابن زید نے کہا کہ قوم عاد کے کھمبوں یا عمارتوں کے جیسے ستون تھے ویسے دوسرے شہروں اور آبادیوں میں نہیں بنائے گئے۔ ابن کثیر نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ قتادہ، ابن جریر، ابن کثیر اور اکثر اہل تفسیر نے بیان کیا کہ عاد جیسی قد آور، قوی ہیکل، باسطوت قوم ممالک عرب میں نہیں پیدا کی گئی۔ عاد کے تسلط، پھیلاؤ اور اقتدار کا قصہ عرب کو معلوم تھا۔ یہ چرچا اتنا ہمہ گیر تھا کہ گویا ہر شخص نے اپنی آنکھوں سے

اُن قوموں کے حالات دیکھے ہیں ۔ اسی لئے الم تعلم کی جگہ الم تر فرمایا مگر عدم رویت سے مراد عدم علم ہی ہے

وثمود الذین جابوا الصخر بالواد ۔ ابن اسحاق نے کتاب السیر میں لکھا ہے کہ یہ لوگ بھی عرب تھے ۔ وادی القریٰ میں رہتے تھے ۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ پتھروں کو تراش کر یہ لوگ عمارتیں بناتے تھے ۔ ثمود کے باپ کا نام عابر اور دادا کا نام ارم بن سام کہا گیا ہے ۔ لیکن ہزاروں بستیاں سنگین عمارتوں کی انہوں نے بنائی تھیں (کبیر، سراج، فتح البیان، وغیرہ) ان کی آبادی حجر سے وادی القریٰ تک تھی ۔ وادی القریٰ مرکزی شہر حدود حجاز سے متصل تھا ۔ اور یثرب سے متصل تھا ۔ وادی القریٰ کے کھنڈر رسول اللہؐ کے عہد مبارک تک موجود تھے ۔ حضرت صالحؑ ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے ۔ عاد نے حضرت ہودؑ کی مخالفت کی اور ثمود نے حضرت صالحؑ کی ۔ آخر دونوں ناگہانی آفتوں سے تباہ کر دیے گئے ۔ نسل میں بھی کوئی نہیں بچا ان کی آبادی تمدن بکثرت شاداب باغ ۔ لہلہاتی کھیتیاں ۔ پتھروں پر کندہ تصاویر و نقوش اور سنگین عمارتیں بحر میں کچی نہیں اور وادی القریٰ میں کندہ مگر وادی القریٰ کے کچھ کھنڈر موجود تھے ۔ تجارتی عرب قریب کی وجہ سے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے ۔ اور مقام حجر بہت دور تھا عموماً حجاز والوں کو اس کی تفصیل معلوم نہ تھی اس لئے وادی القریٰ کا خاص طور پر ذکر کیا ۔ وادی القریٰ کی آبادی تقریباً مکہ کے برابر تھی ۔ غرض عاد کے بعد ثمود کا تمدن ، سطوت ، جبروت ، صناعی ، آرٹ ، تجارت ، حکومت ، اقتدار ترقی کی انتہائی تمام عرب سے بڑھ چڑھ کر تھی ۔ سورۃ والشمس میں اس کا مفصل قصہ آچکا ہے ۔

وفرعون ذی الاوتاد ۔ یہ تیسرا قصہ مذکور ہے جس سے بنی اسرائیل خوب واقف تھے ۔ حضرت موسیٰ کے زمانے کے فرعون نے اپنی ربوبیت کا اعلان کیا تھا ۔ یہ قبطی تمدن کا پیرو تھا ۔ منظم حکومت ، تربیت یافتہ فوج ، پرجبروت اقتدار اور ہر طرح کا سامان عیش اس کو حاصل تھا ۔ شمالی افریقہ کے کچھ حصوں پر بھی اسی کی حکومت تھی ۔ فلسفہ اور حکمت پر ناز تھا سحر اور علم نیرنجات میں امتیاز تھا ۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے سے اولاد اسرائیل نے مصر کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ چار سو برس کی مدت میں ان کی نسلیں بہت بڑھ گئی تھیں ۔ بعید نہیں اگر لاکھوں تک تعداد پہنچ گئی ہو ، لیکن فرعون نے ان کو غلام بنا رکھا تھا ۔ نہ مصر میں ان غریبوں کو سکھ تھا نہ حقوق شہریت حاصل تھے نہ قبطیوں کے ہم پلہ ہونے کا وہ تصور کر سکتے تھے نہ ان کو ترک وطن کی اجازت تھی کہ مصر کو چھوڑ کر حضرت یعقوبؑ کے اصل وطن شام کو چلے جائیں نہ ان کی جانیں محفوظ تھیں ۔ نہ عزت و مال نہ مذہبی آزادی میسر تھی نہ امن و عافیت ۔ فرعون اپنی طاقت میں مست تھا ۔ پرجبروت حکومت اور اونچے تمدن کے نشہ میں چور تھا ۔ مشرق وسطیٰ مشرق ادنیٰ اور افریقہ میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا ۔ استبداد اور ظلم کا ایک دیو بنا ہوا تھا ۔ عاد اولیٰ کو اپنی دراز قامتی اور قوی ہیکلی اور تعداد کی کثرت پر ناز تھا ۔ اور ثمود کو اپنی سنگ تراشی ، صناعی اور ہنر کا غرور تھا ۔ مگر فرعون کو تو علم و فلسفہ کی روشنی ، تہذیب و تمدن کے فروغ اور فوج و خزانہ کی کثرت نے اتنا بدخود غلط بنا دیا تھا کہ وہ بشریت اور مخلوقیت سے بھی اپنے کو اعلیٰ اور برتر سمجھنے لگا تھا ۔ جور آفرینی ، ستم آگینی ، رعونت کی تو اس کو حاصل تھی ہی ۔ وہ شہنشاہی کی حدود سے آگے نکل کر اپنے آپ کو رعایا کا ان داتا اور پروردگار سمجھنے لگا تھا ۔ رعایا پر خصوصاً بنی اسرائیل پر ظالمانہ محاصل اور ٹیکسوں کا بار تھا ۔ اسرائیلیوں کو تو عموماً شاہی کام بیگار میں بغیر اجرت کے کرنے پڑتے تھے ۔ بنی اسرائیل پر فرعونی مظالم اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اسرائیلی نوزائیدہ لڑکے شاہی حکم سے ذبح کیے جانے لگے جو لڑکا پیدا ہوتا اس کو قتل کر دیا جاتا اور لڑکی کو اس لئے زندہ چھوڑ دیا جاتا کہ وہ قبطیوں کے کام آئے گی ۔ انکار خدا ، ربوبیت کا دعویٰ ، عمومی شرک اور بت پرستی کی ترغیب اور جابرانہ حکم ، بےکس بےبس رعایا نصیب تھا ۔ اسی طرح طرح کے مظالم ۔ یہ تھے فرعون اور فرعونیوں کے جرائم ۔ جس شخص پر شاہی عتاب ہوتا اس کو پو میخ کر دیا جاتا ۔ ہاتھوں اور پاؤں میں کسی درخت سے چسپاں کر کے کیلیں اور میخیں ٹھونک دی جاتیں ۔ وہ غریب یونہی تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا ۔ مجاہد ، سعید بن جبیر ، حسن بصری اور سدی نے فرعون کو ذی الاوتاد (میخوں والا) کہنے کی یہی وجہ بیان کی ہے ، لیکن قتادہ نے کہا کہ میخیں اکھاڑنے کا کرتب فرعون کو دکھایا جاتا تھا اس لئے اس کو ذی الاوتاد کہا گیا ۔ خطیب اور امام رازی وغیرہ نے لکھا ہے کہ فرعون کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ جہاں اس کا پڑاؤ ہوتا تھا وہاں گھوڑوں کے باندھنے اور خیمے نصب کرنے کے لئے) میخوں کے نشانات بکثرت ہوتے ، اسی لئے اس کو ذی الاوتاد کہا گیا ۔ ان سب حضرات کے مختلف بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وتد کے حقیقی معنی ان بزرگوں کے نزدیک مراد ہے ، لیکن وتد کا مجازی معنی طاقت اور استحکام بھی ہے اور فوج

کی قوت اور شوکت منظم کثیر لشکر سے تھی ۔ اسی لئے عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول مروی ہے کہ اوتاد فرعون کے لشکر والے تھے ۔ اس صورت میں ذی الاوتاد کا معنی ہوا کثیر اور قوی لشکر والا۔

الذین طغوا فی البلاد فاکثروا فیھا الفساد ۔ یہ مذموم صفت مذکورہ بالا تینوں اقوام کی ہیں ۔ تینوں قوموں نے اپنے اپنے ملک میں بڑا اسر اٹھایا تھا ۔ سب ہی انانیت اور غرور کے نشہ میں سرشار تھے ۔ سب ہی نے ملک میں تباہی مچا رکھی تھی ۔ مقدم ترین طغیان اور اعلیٰ ترین فساد تو شرک اور توحید کا انکار تھا ۔ پھر برحق پیغمبروں کی مخالفت اور ان کو دکھ پہنچانے کی کوشش اس پر مزید تھی ۔ عزت ، حکومت ، جسمانی طاقت اور جتھہ کی کثرت ، صنعت اور اونچی مدنیت ان سب نے ان کو برخود غلط بنا دیا تھا ۔ پھر آپس میں ان کے اندر ناہمواری اور غلط فرق مراتب تھا کہ اعلیٰ ادنیٰ کو اور اونچا نیچے کو آدمی ہی نہیں جانتا تھا ۔ جابرانہ آلات استعمال اور ناقص حیوانات سے زیادہ نچلے طبقے کی اپنے طبقہ کی نظر میں حیثیت ہی نہیں تھی ۔ جائز ناجائز کی تمیز نہ تھی ۔ مقصد حصول زر تھا خواہ ذریعہ سے ہو یا زاری سے ۔ طبقہ زیریں کو اسی لئے ستایا کہ اس کی عزت ، صحت ، قوت اور محنت بالائی گروہ کی ہوس رانی کو ہموار کر دے ۔ اس کے حقوق بالکل نہ تھے اور فرائض نامحدود تھے ۔ با اقتدار گروہ اور مال دار طبقہ ظالم اور ستم کیش ہی نہ تھا ۔ بلکہ عیش پسند عیش کوش اور عیش پرست بھی تھا ۔ وہ اپنی ثروت ، دولت اور حکومت کو زیادہ سے زیادہ عیاشی و فحاشی کے کام میں لاتا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ غریب کی عصمت و عفت بھی محفوظ نہ تھی ۔ یہ تھا ان اقوام ثلاثہ کا طغیان اور فساد ، سرکشی اور تباہ کاری ، ستم گاری ، فحاشی ، عیاشی ، اخلاقی بربادی اور سماجی موت ۔ آخر ۔

فصب علیھم ربک سوط عذاب وہ اللہ جو حقیقت میں ہر ایک کا رب ہے ۔ جو انسان اور انسانیت کو جسمانی ، ادراکی اور روحانی ترقی دیکر حد کمال تک پہنچانا چاہتا ہے ۔ جس کے پیش نظر کسی کی تخریب نہیں تعمیر ہے ۔ انسانیت کی ویرانی نہیں چاہتا آبادی چاہتا ہے ۔ وہ مہربان اور رؤف ہے مفسد اور مخرب نہیں ۔ اس کو بھی غضب آ گیا ۔ وہ بھی خشمناک ہو گیا اور ان طاغی باغی مفسد قوموں پر اس نے عذاب کے کوڑے برسائے ۔ ایسی پیہم سزا دی جیسے مسلسل بارش کا بہاؤ اور ایسی سخت عبرت ناک جیسی سزا تازیانہ ۔ عاد کا نام نشان طوفان نے برباد کر دیا ۔ ثمود والے زلزلہ ارضی اور صیحۂ سماوی (آسمانی کڑاکے) سے یک دم مر کر رہ گئے کوئی بھی نہیں بچا ۔ اور فرعون اپنی فوجی طاقت سمیت دریا میں ڈوب کر جہنم میں پہنچا نہ عاد کی قد آوری اور جسمانی طاقت کام آئی نہ ثمود کو ان کے ہنر اور آرٹ اور سنگ تراشی اور جتھے کی کثرت نے فائدہ پہنچایا ۔ نہ فرعون کو اس کے لشکر نے عذاب سے بچایا بلکہ لشکر خود بھی نہ بچ سکا ۔ یہ ہے ان اقوام پارینہ کی سزا کا عبرت انگیز بیان جو حجاز کے قریب وادی القریٰ میں اور یمن و شام میں اور مصر میں رہتی تھیں ۔ کل اقوام عالم کے احوال کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے ۔ تین قوموں کی آبادی اور بربادی عروج و زوال کا تذکرہ تو بطور تمثیل کیا گیا ہے ورنہ ہند ہو یا اقصیٰ چین ، مشرق ہو یا مغرب ، یونان ہو یا سائبیریا اور منگولیا سب کے لئے قدرت کا یہی قانون ہے جس قوم نے سرکشی کی غرور و رعونت کے نشہ میں سرشار رہوئی ۔ ستم رانی اور عیاشی کی خوگر بنی ، خودی میں مست ہو کر خدا کو بھولی ۔ آخرت کی زندگی سے بے نیاز یا منکر ہو کر اسی فنا پذیر زندگی کی شیدائی ہو گئی اس کا تختہ تاراج کر دیا گیا ۔ صفحۂ ہستی سے اس کا اقتدار مٹا دیا گیا ۔ کسی کا نام اور کچھ آثار صفحات تاریخ اور سطح زمین پر موجود ہیں اور کسی کا نشان بھی آغوش زمین میں چلا گیا ۔

ان ربک لبالمرصاد ۔ اللہ سے افراد ، اقوام کے اطوار زندگی رفتار گفتار اور افکار پوشیدہ نہیں ۔ سو چونکہ اللہ ہر ایک کا رب ہے اور رب کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص اور ہر قوم کو جسمانی اور علمی اور روحانی ترقی دے کر اس کو اس درجے پر پہنچا دے جو اس کی نوع یا شخص کے لئے مناسب ہے ۔ ایسی حالت میں وہ کسی کی رفتار ، کردار اور اطوار سے ناواقف یا غافل کیسے ہو سکتا ہے ، لیکن جب اس کی ربوبیت سے اشخاص یا اقوام سرکشی کرتے ہیں اور قانون عروج و ترقی کو توڑتے ہیں اور بلندی کی طرف جانے کی بجائے پستی کی طرف گرتے ہیں تو وہ عبرت ناک سزا دیتا ہے کیونکہ وہ کسی کے احوال سے غافل اور ناواقف تو ہے نہیں ۔ ہر ایک کے حال کا نگراں ہے ۔ ہر چیز اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہے جیسے کمین گاہ میں بیٹھے والے چوکیداروں کے سامنے دشمن کی نقل و حرکت ہوتی ہے یا پوشیدہ تاک کے مقام میں چھپنے والے شکاری کے پیش نظر شکار کے احوال و کوائف ہوتے ہیں ۔ دشمن کو دیدبان کے اندر بیٹھنے والے جاسوس نہیں دکھتے ۔ شکار کو گھات میں بیٹھنے والا شکاری نظر نہیں آتا ۔ یونہی سرکش بدکردار

انسانوں کو یہ شم قدرت کی دیدبانی محسوس نہیں ہوتی ۔ اللہ کی غیبی آنکھ ان کو دیکھتی ہے مگر وہ اس کو نہیں دیکھتے ۔ ابن کثیر نے اس آیت میں سوط کا معنی تازیانہ نہیں بلکہ نوع لکھا ہے یعنی اللہ نے ان پر ایک خاص قسم کا عذاب نازل کیا جو دنیا میں ان کے لئے مناسب تھا ۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ سنتا اور دیکھتا ہے اور مخلوق کے افعال کا نگراں ہے تو ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا سزا دنیا و آخرت میں دیتا ہے ۔ الخ ۔

خطیب نے لکھا ہے کہ سوط عذاب میں تشبیہ ہے جس طرح تازیانہ کی پیہم ضرب پڑتی رہتی ہے یہاں تک کہ مجرم ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ کا عذاب ہے ۔ مرصاد کا ترجمہ ہے کمین گاہ ۔ گھات کا مقام ۔ لیکن اللہ کی کوئی کمین گاہ اور مقام خفا نہیں ، اس لئے مرصاد کا حقیقی معنی یہاں مراد نہیں بلکہ وہی تفسیر مراد ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور اس کی مکمل تفصیل ہم نے ابھی کر دی ہے ۔ ایک عرب سے پوچھا گیا تیرا رب کہاں ہے اس نے فوراً جواب دیا بالمرصاد ۔

فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن سے اہانن تک ۔ الانسان سے مراد کلبی کے نزدیک ابی بن خلف اور مقاتل کے نزدیک امیہ بن خلف اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس کے نزدیک عتبہ بن ربیعہ وغیرہ ہے یعنی اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا ہے ۔ یہ ہے کہ سبب نزول کسی خاص شخص کا واقعہ ہو تب بھی آیت کا مصداق صرف وہی شخص نہیں بلکہ ہر شخص جو مورد آیات کے مشابہ ہو آیات کا مصداق ہے ۔ البتہ یہ امر قابل غور ہے کہ الانسان سے صرف کافر انسان مراد ہے کیونکہ سیاق کلام اور مفہوم آیات کا یہی تقاضا ہے ۔ یہ خیال عام اہل تفسیر کا ہے یا کافر و مسلم دونوں کو یہ لفظ شامل ہے اور بعض صورتوں میں مسلم بھی اس کا مصداق بن جاتا ہے ۔ یہ خیال امام رازی کا ہے ۔ اگرچہ صراحت کے ساتھ تو اس کا اظہار نہیں کیا مگر آیت کی جو تشریح کی ہے اس سے اسی خیال کا ترشح ہوتا ہے ۔ ہم رازی کے بیان کا خلاصہ لکھتے ہیں ۔ آیات سابقہ میں بتایا کہ اللہ بندوں کے اعمال و اقوال کا نگراں ہے یعنی ہر فعل و قول کی آخرت میں سزا و جزا ضرور دے گا ، لیکن انسان کا حال کیا ہے اس کی تفصیل ان آیات میں کی ہے ۔ انسان کی پوری توجہ دنیوی اہتمام کی طرف ہے ۔ آخرت کی طرف سے وہ غافل ہے ۔ اس کے قول سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آخرت کے خیال کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس کا فعل بھی شہادت دے رہا ہے کہ اس کا اصلی مطمح نظر صرف دنیا ہے ۔ قولی مخالفت کی تصویر کشی مندرجہ بالا آیات میں کی ہے ۔ اور فعلی مخالفت کا اظہار آیت بل لا تکرمون الیتیم الخ میں کیا ہے جو آگے آرہی ہے ۔ دنیا اور خواہشات دنیا میں انسان اس قدر غرق ہے کہ اگر اس کو راحت و عیش کا سامان مل گیا تو کہتا ہے میرے رب نے میری عزت کی نہیں ملتا تو کہتا ہے میرے رب نے میری توہین کی ، یعنی اس کی توجہ صرف ظاہری زندگی پر مرکوز ہوتی ہے ۔ آخرت سے وہ بالکل غافل ہے ۔ یعلمون ظاہرا من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون میں بھی اسی مفہوم کو بیان فرمایا ہے ۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ چند وجوہ سے کافروں کے یہ خیالات غلط ہیں ۔ ۱؎ دنیا کی خوش نصیبی اور بد نصیبی آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہے ۔ آخرت کی سعادت و شقاوت ایک سمندر ہے اور دنیوی دکھ سکھ ایک قطرہ ۔ آخرت میں اگر دکھ ہو تو دنیوی سکھ ہیچ ہے ۔ اگر آخرت میں انسان خوش نصیب ہوا اور دنیا میں مفلس محتاج اور دکھ رسیدہ تو یہ اس کی اہانت نہیں ۔ اسی طرح جو یہاں مالدار اور سکھی ہے اور آخرت میں خوار ذلیل ہو تو یہ دنیوی ثروت و نعمت اور خوش نصیبی کی علامت نہیں ۔ ۲؎ دنیا کا دکھ سکھ کسی ذاتی قابلیت پر مبنی نہیں ہے ۔ ناکارہ نا سمجھوں اور بدکاروں کو بھی دولت حشمت اور سلطنت مل جاتی ہے ۔ حالانکہ ان میں ذاتی صلاحیت اور قابلیت نہیں ہوتی ۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ عزت ، حکومت ، دولت ثروت اگرچہ خدا داد ہے مگر میری قابلیت اور استحقاق کی وجہ سے ہے ، یہ غلط ہے بلکہ یہ محض خدا کی مصلحت اور حکمت ہے ۔ ۳؎ اگر دنیا میں دولت و عزت میسر ہو تو انجام کار غافل ہو جانا اور موجودہ حال پر رکھنا اور اس کو لازوال سمجھ لینا غلط ہے ۔ اعتبار خاتمہ کا ہے ۔ ہر محتاج پر اللہ کا احسان عظیم ہے ، صحت جسم ، درستی حواس دین صحیح عمل صالح سب ہی اللہ کے انعامات ہیں ۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دولت کا نہ ہونا اللہ کی طرف سے توہین ہے ۔ ۴؎ انسان کی سرشت خاکی ہے ۔ اسی لئے زمین کی چیزیں اس کو بالطبع مرغوب ہیں اور زمینی نعمتوں سے اس کو وابستگی ہے ۔ حالانکہ یہاں کی تمام چیزیں زوال پذیر ہیں ، فانی ہیں ، ان سے وابستگی دانشمند کا شیوہ نہیں ۔ اس کی محبت ترقی درجات سے

مانع ہے۔ مفلس المال فارغ البال ہوتا ہے۔ مفلسی اس کے لئے وبال اور توہین نہیں نعمت واکرام ہے انتہی۔

ابوالسعود اور خطیب نے لکھا ہے کہ دنیوی دولت کو خداداد عزت قرار دینے والے کی یہ غرض نہیں کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے اور اپنے اوپر اللہ کا احسان سمجھے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں اسی قابل تھا کہ خدا نے مجھے دولت اور ثروت دی اور مفلس ہو جاتا ہے تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ خدا نے میری حق تلفی کی۔ میری قابلیت کی قدر نہیں کی۔

ابوالسعود کی اس توضیح کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مالدار مغرور کفار ریکہ مسلمانوں سے کہتے تھے ہم خدا کی نظر میں تم سے زیادہ محبوب ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم مالدار اور تم محتاج کیوں ہوتے۔ اگر محمد کے کہنے کے موافق قیامت ہوگی تب بھی ہم وہاں تم سے افضل ہوں گے کیونکہ ہماری فضیلت اس دنیا میں ہی عیاں ہو چکی ہے۔ آج کل بھی عموماً غیر مسلم اور بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی افلاس اور ناداری کو معصیت اور ثروت و آسائش کو قوت بازو اور جوہر قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں۔ ہندو تو فقیروں اور محتاجوں کو چنڈال اور منحوس خیال کرتے ہیں۔ مسلمان بھی غریبی کو بدقسمتی جانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کم حوصلہ کوتاہ نظر اور مآل سے غافل انسان ناشکر بھی ہوتا ہے اور بے صبر بھی۔ مال کی فراوانی، طاقت جسمانی کی بے مثالی، قبیلے اور قوم کی افزائش، عزت کی بلندی، جاہ و جلال کی برتری اور اقتدار و حکومت کی ہمہ گیری اس کو خدا سے غافل اور مستغنی بنا دیتی ہے۔ وہ ان خداداد نعمتوں پر ریجھ جاتا ہے، اتراجاتا ہے۔ پندار اور انانیت سے سرشار ہوکر ان تمام نعمتوں کو اپنی کوشش کا نتیجہ اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرنے لگتا ہے۔ اگر خدا کا نام بھی لیتا ہے اور نعمت خداداد کہتا بھی ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کا شکر کرے، اس کی طرف سے انعام سمجھے، اس کا احسان خیال کرے بلکہ عطاء نعمت کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں بھی اس کو اپنی فرعونیت، انانیت، قابلیت اور غرور کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ نام خدا کا لیتا ہے مگر تعریف اپنی اہلیت و صلاحیت کی کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اور چونکہ اس کے خیال میں ہر نعمت خود آوردہ ہوتی ہے (زیادہ سے زیادہ یہ کہ خدا پر جو اپنا فرض بزعم خویش سمجھتا تھا خدا نے اس کو ادا کر دیا) اس لئے وہ اپنی دولت، حکومت، عزت اور طاقت کو جیسا چاہتا ہے صرف کرتا ہے نہ مداخل میں اس کو حدود الٰہیہ کی پرواہ ہوتی ہے نہ مخارج میں قیود خداوندی کی پرواہ کرتا ہے۔ عاد ثمود اور قبط سب کی یہی حالت تھی۔ تینوں قوموں کو دنیا میں برتری اور عظمت حاصل تھی۔ ہر قوم کا جتھہ بڑا، مال کثیر، طاقت ہمہ گیر اور اقتدار پر جبروت تھا آخر نشہ میں چور ہو گئے۔ انعام کے سرچشمہ سے غافل ہو کر بر خود غلط بن گئے ہر قسم کی توانائی میسر آتے ہی خود سے خدا بن بیٹھے۔ اور بجائے شکر کے شرک میں مبتلا ہوکر (السٰئور و اعظور) اور بر خود غلط پیغمبروں کی حیات آفریں نصیحتوں کو استحقار، نفرت بلکہ بغض و عداوت کی ٹھوکروں سے ٹھکرانے لگے۔ ایسے ناشکروں اور کافروں کا نتیجہ ہیبت آفریں اور ہولناک ہوتا ہے۔ اللہ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے۔ دیوانے کے ہاتھ سے چھری چھین ہی لی جاتی ہے۔ اب بھی ناشکرے کافروں کو موقع ہوتا ہے کہ اپنی عاجزی کا اعتراف کریں، پچھتائیں، اپنی غلط روی کا اقرار کریں۔ آئندہ زندگی میں ٹیڑھے راستے پر نہ چلنے کا عہد کر لیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا جس کو عیش میں خدا یاد نہیں ہوتی وہ دکھوں میں کیسے خدا کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ اس کو زوال نعمت پر مزید طیش آتا ہے۔ وہ اپنا حق چھینا ہوا دیکھتا ہے اس کو اپنا قصور نظر نہیں آتا۔ اپنا جرم دکھائی نہیں دیتا۔ خدا کو مجرم قرار دیتا ہے۔ کہتا ہے خدا نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ مجھے تباہ کر دیا۔ میرے کمال کی ہنر کی علمی جوہر اور قوت بازو کی قدر نہیں کی۔ اس نے میری توہین اور تذلیل کی۔ میں اونچا تھا۔ اس نے مجھے نیچا کر دیا بلند نفالیت کر دیا۔

کَلَّآ۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مالداری اور ناداری معیار عزت و ذلت نہیں۔ کسی کو صاحب ثروت بنانے سے مقصود اس کی عزت افزائی نہیں اور نہ کسی کو مفلس بنانے کا مقصد اس کی اہانت و تذلیل ہے۔ یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔ شکر و کفر کی جانچ مقصود ہے۔ دولت بڑا نشہ ہے اور فقر مصائب کی جڑ۔ کون مالدار اپنے کو سنبھالے رکھتا ہے کون اس کو اللہ کا احسان اور بلا استحقاق انعام جانتا ہے اور کون اپنی اہلیت اور محنت کا استحقاقی نتیجہ۔ کون پندار اور غرور کے نشہ سے سرشار ہوکر بیہوش ہو جاتا ہے اور کون سلطنت و اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر اپنے کو عبد مسکین کہتا ہے۔ کون فقیروں، یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کی خبر گیری کرتا اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور کون اہل حاجت کو ذلت کی ٹھوکروں سے ٹھکراتا ہے۔ کون فقیر ایسا ہے کہ فقر کو نعمت جانتا ہے۔ فقر اس کے عزم کو پست نہیں کرتا۔ فقر کے سبب وہ حوادث کے سیلاب میں بہہ کر اللہ کے مقرر کردہ جادۂ اعتدال سے باہر نہیں نکلتا۔ فقیر ہونے کے باوجود کبھی اس کا بھروسہ اللہ سے زائل نہیں ہوتا۔ ایمان باللہ میں کمزوری نہیں آتی۔ فقر اس کو معصیت پر آمادہ

نہیں کرتا ۔ اور کون ناداری کو بدنصیبی اور روسیاہی قرار دیتا ہے اور ایمان کو چند ٹکوں میں بیچ ڈالتا ہے ۔ پس ثروت و افلاس امتحان ہے مالداروں کی ہوشیاری اور مدہوشی کا اور فقیروں کے عزم ، توکل اور ایمان کا ۔ اللہ کے ہاں باعزت اور ذلیل ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ۔

بل لا تکرمون الیتیم و لا تحاضون علی طعام المسکین و تاکلون التراث اکلا لما سے حبا جما تک بلکہ آدمی کو ذلیل بنانے والی عزت کو برباد اور ثروت کو تباہ کر دینے والی اور افراد و اقوام کو ذلت ، نکبت اور ہلاکت کے غار میں گرا دینے والی دنیا میں چار چیزیں ہیں دو کا تعلق آمد و خرچ سے ہے ، اور دو کا تعلق خرچ و صرف سے ۔ یہ بیماریاں مذموم اوصاف ، اشخاص و اقوام کے قوام کو کھا جانے والے گھن ہیں ، اخلاق دیمک ہیں ۔ معاشرتی اور سماجی جذام ہیں ۔ قبائل اور خاندانوں کو ذلیل کرنے والے ہیں ۔ سماجی ناہمواری اور بے اعتدالی پیدا کرکے جماعتی تنظیم کو بگاڑ کر قوم کا شیرازہ بکھیر دینے والے ہیں ۔ انہی امراض خبیثہ کی پاداش اور نتیجہ میں خدا ان لوگوں کی دولت چھین لیتا ہے اور اہل استحقاق کے حقوق تلف کرنے والوں کو نادار اور ننگا کر دیتا ہے ۔ ۱ ۔ یتیم کا اکرام نہیں کرتے یعنی اس سے اچھا سلوک نہیں کرتے ۔ اس کی پرورش نہیں کرتے اس کی پرداخت میں بے پرواہی کرتے ہو ، اس کا مال کھاتے ہو ، اس کو ذلیل کرتے ہو اس پر رحم نہیں کرتے ۔ اس سے نرم گفتگو نہیں کرتے ۔ بے وجہ اس کو جھڑکتے ہو ، دھکے دے کر نکال دیتے ہو مارتے ہو ۔ یتیم اپنے بھائی کا ہو یا خاندان کا یا غیر کا ۔ ہر ایک سے تم تعلق قطع کر لیتے ہو ۔ اکرام یتیم نہ کرنے کی یہ سب صورتیں ہیں ۔ بقول مقاتل امیہ بن خلف رئیس قریش کے پاس قدامہ بن مظعون یتیمی کی حالت میں تھا ۔ امیہ نہ فقط یہ کہ قدامہ کی دیکھ بھال اور پرورش اپنی طرف سے نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا مال جو وراثت میں اس کو ملا تھا خود رکھتا تھا اس کو نہیں دیتا تھا ۔ (رازی) اکرام نہ کرنا سرپرستی نہ کرنے کو بھی شامل ہے ۔ اگر یتیم کا مال اسی کے صرف میں لایا جائے مگر بے دریغ برباد کیا جائے اس کی تعلیم تربیت ، اور ادب میں خرچ نہ کیا جائے اور اپنے بچوں کی طرح اس کی پرداخت نہ کی جائے تو یہ بھی عدم اکرام کی ایک شاخ ہے ۔

عبداللہ بن مبارک نے اسناد کے ساتھ حضرت ابوہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے مسلمانوں کا وہ گھر سب سے اچھا ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اکرام اور بھلائی کی جاتی ہو اور مسلمانوں کا وہ گھر بدترین ہے جس میں یتیم سے اچھا سلوک نہ کیا جاتا ہو ۔ پھر حضور ؐ نے کلمہ کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ملا کر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے ۔ (ابن کثیر)

حضرت سہل بن سعد کی روایت میں ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا میں اور یتیم کی پرداخت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے یعنی دونوں انگلیوں کو ملا کر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا (ابوداؤد)

۲ ۔ اور غریبوں کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرنے کی آپس میں کوئی کسی کو ترغیب نہیں دیتا ۔ جو لوگ معاشرتی اور سماجی کوڑھ میں مبتلا ہیں ۔ ان کے اندر اقتصادی ناہمواری اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ کوئی مال دار کسی نادار کی خبر ہی نہیں لیتا ۔ ہر سرمایہ دار کو اپنی ، اپنے بچوں کی اور اپنا سرمایہ بڑھانے کی فکر ہوتی ہے کروڑوں انسانوں کی اس کے چہرے اور ہاتھوں کی طرف آس کی نظریں اٹھی ہوتی ہیں مگر ہر نظر کی آس یاس سے بدل جاتی ہے ۔ ہر قوم میں اہل حاجت دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک تو وہ نونہال ہوتے ہیں جن کی رکھوالی کرنے والا باغبان مرچکا ہوتا ہے ۔ وہ یتیم بچے ہر بزرگ کو اپنا باپ اور چچا کہتے اور جانتے ہیں ۔ ہر شخص کی طرف حسرت آلود نگاہ اٹھاتے اور امداد طلب ہاتھ بڑھاتے ہیں مگر وائے مایوسی کہ شقی القلب سرمایہ پرستوں میں کوئی ان کی خبر گیری نہیں کرتا ۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھاتے ، دکان دکان بھیک مانگتے اور گلی گلی خاک اڑاتے پھرتے ہیں ، مگر کوئی ان کو نہیں پوچھتا ۔ کوئی ان کے سر پر دستِ شفقت نہیں پھیرتا ۔ کوئی ان کے گرد آلود سروں اور چہروں سے خاک صاف نہیں کرتا ۔ حالانکہ ان میں بکثرت جواہر بریزے ہوتے ہیں ۔ گدڑیوں کے لال ہوتے ہیں ۔ ذہانت ، فطانت ، استعداد اور فطری صلاحیتوں میں بے نیاز ہوتے ہیں مگر بدبخت قوم کے عیش پسند حضرات ان کی قدر نہیں کرتے ۔ ان کے پروان چڑھنے کا سامان فراہم نہیں کرتے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم اپنے مستحکم قوام سے محروم ہو جاتی ہے ۔ اور قوم کی ریڑھ کی ہڈی میں ناقابل بدل کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۔ چند گنے چنے سرمایہ داروں کے پوت اگر ابھرتے بھی ہیں تو بدترین موروثی ذہنیت لیکر اٹھتے ہیں ۔ جو ماں باپ کے لئے گو سپوت ہوں مگر قوم کے لئے کپوت ثابت ہوتے ہیں ۔ سانپوں کے بچے سپولیا اور گدھوں کے بچے گدھے بلکہ بچھو کے بچے بچھو ہو پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کو کھانا شروع کر دیتے ہیں ۔ یہی بڑھ کر قوم کا خون پیتے اور سب کو ہلاکت کے غار کی طرف لے جاتے ہیں ۔

دوسرا طبقہ ان نو سو ننانوے فی ہزار ناداروں اور نان شبینہ کے محتاجوں کا ہے جن سے قوم بنتی ہے ۔ حقیقت میں انھیں کا نام قوم ہے ۔ یہ ہی جسم

قوم کے اعضاء ترکیبی ہیں۔ ان کی نگہداشت، پرداخت، نگرانی اور خبر گیری ضروری ہے۔ جو اونچا طبقہ اس نچلے طبقہ کی پرواہ نہیں کرتا اس کی مفلسی اور ناداری دور کرنے کی فکر نہیں کرتا، اس کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کا خیال نہیں رکھتا۔ ان کے بیماروں کو سڑک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یونہی مرنے چھوڑ دیتا ہے۔ ان کی صحت، تعلیم اور بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف سے غفلت برتتا ہے۔ وہ حقیقت میں خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ قوم کا غریب طبقہ چوپایوں کا ریوڑ نہیں ہوتا۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ قابل غور ہے کہ اسی کی صنعت اور کاشتکاری ہی سرمایہ دار کی سرمایہ ہے اور قوم کی بقا کا خمیر ہے۔ وہ کپڑے بنتا، سیتا اور دھوتا ہے۔ سرمایہ دار کپڑے پھاڑتا اور میلے کرتا ہے۔ وہ چمڑا پکاتا اور جوتے بناتا ہے۔ سرمایہ دار پہنتا اور توڑتا ہے۔ وہ زمین جوتتا اور دانے بوتا اور کھیتی کاٹتا ہے۔ سرمایہ دار کھاتا اور مزے اڑاتا ہے۔ اور غریب طبقہ نہ ہو تو سرمایہ دار برباد ہو جائے۔ ہلاک ہو جائے بلکہ اس کا وجود ہی نہ ہو۔ پس کسی قوم کا اپنے یتیم نونہالوں اور مفلوک الحال ناداروں کی طرف سے غفلت اختیار کرنا اور ان کی پرداخت و نگہداشت نہ کرنا دوسری دانشمند قوموں کی نظر میں ذلیل کر دیتا ہے۔ اور آخر میں سب قوم کو ہلاکت کے غار میں گرا دیتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں بنیادی نظریوں کا تعلق تو سرمایہ کے صرف اور گردش سے تھا۔ انہی کے مقابل دو اصول آمد و دخل کے بھی ہیں جن پر عمل کرنا موجب بربادی اور باعث اہانت ہے۔ مال حاصل ہونے کے صرف دو راستے ہیں۔ موروثی اور کسبی، مختلف اسلاف اور اقرباء کا پس ماندہ اور متروکہ مال وارثوں کو منتقل کیا جاتا ہے۔ حصول میراث میں وارث کے اپنے کسب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کمائی کے جائز ناجائز جتنے راستے ہیں وہ سب حصول کسبی کی شاخیں ہیں۔ چوری، ڈاکہ، ہبہ، تجارت، سود، غبن، رشوت، مزدوری۔ غرض اچھا برا ہر قسم کا ذریعہ اسی حصول کسبی کی قسم ہے۔

۱۔ میراث قانون عدل کے زیر تقسیم حاصل کی ہوئی مال کو تلف ہونے سے بچاتی ہے۔ بڑے سرمایہ کو چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے۔ اس طرح پڑا سرمایہ گردش میں آجاتا ہے اور مستحقین کو پہنچ جاتا ہے، لیکن اہل ہوس تا قانون عدل کے زیر اثر تقسیم میراث نہیں کرتے بلکہ بے ایمانی غبن اور حیل سازی سے کل میراث متروکہ کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں، اس صورت میں بہت یتیم، بکثرت بیوائیں اور بے گنتی غریب محروم ہو جاتے ہیں اور اہل ہوس کے سرمایہ کے ساتھ متروکہ میراث مل کر بزرگ ترین سرمایہ بنا لیتی ہے۔ بڑی دولت چھوٹے حصوں میں نہیں بٹتی بلکہ چھوٹی میراث بڑے سرمایہ کی تاسیس کرتی ہے ادھر یتیم اور دوسرے غریب اہل حق میراث سے محروم ہو کر تباہی بردوش اور ہلاکت در آغوش آوارہ ناکارہ بن کر غریب ضرورت مندوں اور فاقہ کشوں کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ پہلے یتیموں کا سرپرست باپ تھا اس کے مرنے کے بعد کوئی نہیں رہا۔ پہلے خاندانی عزیزوں کی خبر لینے والا وہ مورث تھا۔ اسی کے مال سے غریب رشتہ داروں کو کچھ فائدہ پہنچ جاتا تھا، مگر اس کے مرنے کے بعد سب شکستہ حال اور بدحال ہو گئے۔ نہ پیٹ نہ طاقت پرواز نہ زر نہ زردار۔ اسی بے رحمی، بے ایمانی اور ظلم کا نتیجہ قوم کی اہانت، ذلت، نکبت اور ہلاکت کی شکل میں نکلتا ہے۔

اکلاً لمّاً کی تشریح میں زجاج نے کہا کہ مشرکین اپنے بھائی بندوں کی میراث خوب اڑاتے تھے اور مردہ کے بال بچوں کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ گویا سب سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے تھے۔ حسن بصری نے فرمایا اپنا حصہ اور دوسروں کا حصہ ملا کر سب کھا جاتے تھے کل میراث سمیٹ کر کھا جانے کا مطلب ابن کثیر نے یہ لکھا ہے کہ میت کا ترکہ کچھ حرام ہوتا ہے کچھ حلال اور کچھ مشتبہ (جس ذریعہ سے میت نے حاصل کیا ہو ویسا ہی حکم مال کا ہوگا)۔ مشرکین حرام حلال کی تمیز کے بغیر سب میراث سمیٹ کر کھا جاتے تھے۔ رازی نے ابن کثیر کی توجیہ کے علاوہ ایک صورت یہ بھی لکھی ہے کہ پرائے حق اور اپنے حق کی تمیز کے بغیر کل ترکہ کھا جاتے تھے۔ زمخشری نے کشاف میں اکلاً لمّاً کا تفسیری معنی یہ بھی لکھا ہے کہ پرائے حق اور اپنے حق کی تمیز کے بغیر کل ترکہ کھا جاتے تھے۔ میراث بلا دولت حاصل ہوتی تھی۔ مفت کی دولت کو خوب برباد کرتے تھے۔

۲۔ حد سے زیادہ مال کی محبت جذبۂ رحم کو مردہ کر دیتی ہے۔ صلۂ رحمی، کنبہ پروری، غریب نوازی اور ہر معروف خیر سے روک دیتی ہے۔ اخلاق فاضلہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ اچھی معاشرت مفقود ہو جاتی ہے۔ صالح سماج ناپید ہو جاتا ہے۔ حلال حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ انسان حصول زر کی مشین بن جاتا ہے۔ تقسیم حقوق کرنے والا قانون عدل معطل ہو جاتا ہے۔ اس طرح قومی معاشرہ تباہی کے غار میں گر جاتا ہے۔ امن عام مفقود اور امانت معدوم ہو جاتی ہے۔ آخر افراد کی جوع زر اشخاص اور قوم سب کو ذلیل اور بے عزت اور ہلاک کر دیتی ہے۔

درحقیقت مذکورہ بالا چاروں امور ہی گر ہیں تو تعمیر و تخریب اور عزت و ذلت کے۔ ان پر عمل موجب اہانت و ہلاکت اور ان کی خلاف ورزی

باعثِ عزت وسعادت ہیں۔

۷ امور تو وہ ہیں جن کے نتیجہ میں دنیا ہی میں ذلت اور بربادی حاصل ہوتی ہے۔ رہی آخرت کی بربادی اور ذلت اس کا ایک دن مقرر ہے جس کا بیان مندرجہ ذیل آیات میں کیا گیا ہے۔

کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا۔ دنیوی ذلت کیا ہے اور عزت کیا۔ مال داری اور ناداری اللہ کے نزدیک معیارِ عزت وذلت نہیں بلکہ مال کو جائز رستوں سے حاصل کرنا اور صحیح مصارف میں خرچ کرنا دنیوی عزت وذلت اور قومی موت وحیات کا معیار ہے۔ جائز ناجائز ہر طرح سے میراث کو سمیٹنا پیسہ پیسہ جوڑ کر جمع کرنا اور اہلِ استحقاق کو روکنا اور حاجت مندوں کی حاجت روائی نہ کرنا اور اس طرح آخرت کے عذاب ثواب اور حساب کتاب کا انکار کر دینا ہرگز درست نہیں (یہ ہے اس جگہ امام رازی کے نزدیک کَلَّا کا مفہوم) کیونکہ قیامت ضرور آئے گی اور انسان کا عملی اختیار ضرور چھین لیا جائے گا۔ اور پاداشِ عمل ضرور دی جائے گی نتیجۂ عمل اچھا ہو یا برا ضرور سامنے آئے گا۔ پس عزت حقیقت میں دوسری زندگی کی عزت ہے اور ذلت واقع میں دوسری زندگی کی ذلت ہے۔

دَکٌّ دیوار یا ٹیلہ یا پہاڑی وغیرہ کو توڑ دینا (خلیل فراہیدی) کسی بلند چیز کو گرا کر پھیلا دینا (مبرد) اس لئے ابن کثیر نے آیت کا تفسیری معنی اس طرح بیان کیا کہ پہاڑوں کو پست کر کے اور ہموار کر کے زمین کو یکساں کر دیا جائے گا۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ دَکًّا کی تکرار بتا رہی ہے کہ زمین کو بار بار کوفتہ کیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس کا تفسیری قول مروی ہے کہ زمین قیامت کے روز پھیلا دی جائے گی یعنی ہموار کر دی جائے گی نہ کوئی گڑھا ہے گا نہ بلندی نہ نشیب وفراز نہ ٹیلہ نہ غار۔ زمین کا یہ دک زلزلہ کے بعد ہوگا یعنی زلزلہ پر زلزلہ آجائے گا تو زمین پر جو بلندیاں ٹیلے پہاڑیاں درخت وغیرہ ہیں سب ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گے اور غار پٹ جائیں گے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً۔

وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا۔ رب آئے گا اور صف درصف ملائکہ۔ آنا جانا حرکت کے بغیر ممکن نہیں اور حرکت جسمانی عوارض میں سے ہے اور خدا نہ جسم ہے نہ جسمانی، اس لئے قیامت کے دن رب کا آنا جسمانی نہیں۔ پھر کیا مراد ہے۔ امام رازی نے مختلف تاویلی معنی لکھے ہیں۔ ۱ اللہ کی طرف سے جزا سزا۔ ۲ رب کا قہر۔ ۳ اللہ کی بڑی نشانیاں ۴ رب کا ظہور اس طرح کہ کافر کو بھی انکار کی مجال نہ ہوگی۔ ۵ رب بمعنی مربی یعنی وہ بڑا فرشتہ جو انسان کا مربی ہے (اور ملائکہ کا سردار) ۶ اللہ کی طرف سے فیصلے کا حکم وغیرہ۔ شیخ ابو السعود اور بیضاوی نے بھی بعض تاویلی معانی بیان کئے ہیں۔ نمبر ششم کو بغوی نے معالم میں نقل کیا ہے، اور اس قول کی نسبت حسن بصری کی طرف کی ہے۔ شیخ ابن کثیر نے اس جگہ طویل حدیث شفاعت کبریٰ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلعم شفاعت کریں گے اور عرض پرداز ہوں گے کہ رب تبارک وتعالیٰ فیصلہ کے لئے تشریف فرما ہو۔ پس اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہوگا۔ گویا ابن کثیر کے نزدیک آنے کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف مجازی نہیں۔ بلکہ آنے سے حقیقی مفہوم ہی مراد ہے مگر اللہ کے آنے کی کیفیت مجہول ہے۔ بہرحال خدا کا آنا جسمانی نہیں۔ یہ یقینی ہے۔ پھر اس کے آنے کا کیا معنی۔ یہ معلوم نہیں۔ جو آنا اس کی شان کے مناسب ہے اسی طرح وہ آئے گا۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ نورِ الٰہی کا بلا واسطہ ظہور، امرِ الٰہی کا براہِ راست نفاذ۔ تمام حجابات کے پردوں کا اٹھ جانا اور مخلوق کے سارے ظاہری اختیارات ختم ہو کر حقیقی فاعل مختار کے ہاتھ میں ہر اختیار کا پہنچ جانا اور اسی کی بارگاہِ قدس سے فیصلۂ قضا ہونا۔ ہر ادنیٰ اعلیٰ کافر مومن یہاں تک کہ انبیاء وملائکہ پر بھی اس کی ہیبت کا چھا جانا۔ شاید یہ سب معانی ہی آنے کے مفہوم میں داخل ہیں اور غالباً یہ سب مراد ہیں۔

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ۔ اس روز جہنم کو لایا جائے گا یعنی ظاہر کیا جائے گا جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی (رازی) حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اس روز جہنم لائی جائے گی۔ اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی۔ ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے تھامے ہوں گے۔ (رواہ مسلم عن عمرو بن حفص عن حفص عن العلاء ورواہ الترمذی عن الدارمی عن ابن حفص وعن عبد بن حمید عن ابی عامر عن سفیان عن العلاء ولکن لم یرفعہ۔ ورواہ ابن جریر عن الحسن بن عرفہ عن مروان بن معاویۃ عن العلاء ولم یرفعہ) واحدی نے لکھا ہے کہ جماعت مفسرین نے آیت کی تفسیر میں صراحت کی ہے کہ جہنم کو لایا جائیگا۔ اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی۔ ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے کھینچے ہوں گے۔ عرش کے بائیں جانب لا کر اس کو قائم کیا جائے گا۔ اس کا شور ایسا ہیبت ناک ہوگا کہ ہر مقرب فرشتہ اور ہر مرسل پیغمبر اس کی ہیبت سے گھٹنوں کے بل جھک جائے گا۔

جہنم کو لائے جانے کی حدیث کو ابن مردویہ ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے مسنداً نقل کیا ہے ۔ بظاہر ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کو لائے جانے سے مراد نقل مکانی ہی ہے ۔ یہ صرف اظہار مراد نہیں ہے ۔ جیسا کہ امام رازی نے بیان کیا ۔ اسی لئے شیخ ابن جریر ابن کثیر بلکہ شیخ ابو السعود نے بھی اس جگہ اسی نقلی ظاہری تفسیر کو پسند کیا ہے ۔ لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ جہنم تو بہت بڑا مکان ہے ۔ اول تو مکان ناقابل انتقال ہوتا ہے اور انتقال تسلیم بھی کر لیا جائے تو کلی جہنم کا انتقال ناقابل تصور ہے ۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جہنم کے لانے سے مراد ہے جہنم کا کوئی حصہ یعنی عنق النار کہ لانا حدیث میں آیا ہے کہ عنق النار یعنی جہنم کا ایک ٹکڑا برآمد کیا جائے گا ۔ جس کے تین حصے ہوں گے نور (یعنی نار خفیف) اور آتشی دخان اور آتشی شعلے ۔ الخ ۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں ظلّ ذی ثلٰثہ شعب کی تشریح میں اسی حدیث کو نقل کیا ہے ۔

اس فقیر کے نزدیک امام رازی کی تفسیر بالدرایۃ اور اہل حدیث کی تفسیر بالروایۃ میں کوئی نمایاں فرق نہیں ۔ یہ تو حقیقت ہے کہ اس روز جہنم سامنے آ جائے گی اب پردہ میں ہے اس وقت اس کا ظہور ہوگا ۔ شعلے ، چنگاریاں انگارے اور تپش ہر چیز نمایاں ہوگی ۔ وہ اپنی زبان میں اللہ سے ہل من مزید کی درخواست کرتی ۔ وہ اپنی خوراک سے واقف بھی ہوگی ۔ پس اس کی چنگاریوں اور شعلوں کا ابھرنا ، اونچا ہونا ، پھیلنا ، بڑھنا اور وسیع ہونا ممکن نہیں بلکہ امر واقعہ ہے ۔ اس کو نقل مکانی کہو یا ظہور و بروز مطلب ایک ہی ہے ۔ واللہ اعلم ۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۔ الانسان سے مراد ہے وہی انسان جس کا ذکر پہلے کلام میں آ چکا ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ آیت فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ الخ ۔ میں اگر الانسان سے امیہ بن خلف یا عتبہ بن ربیعہ یا کوئی اور معین آدمی مراد ہو تو اس جگہ بھی وہی آدمی مراد ہوگا ، مگر حکم کا حصر اسی پر نہ ہوگا بلکہ اس جیسا کوئی آدمی ہو سب کو یہ حکم شامل ہے یا اس جگہ الانسان سے مراد ہے کافر یا غیر مومن ۔ یا عموماً انسان مراد ہے ۔ کوئی ہو ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس روز ہر انسان کو ندامت ہوگی ۔ کافر کو کفر پر گناہگار مسلمان کو گناہ پر اور نیک مسلمان کو نیکی کم کرنے پر ۔ حضرت محمد بن عمرہ صحابی کا قول ہے جس کو امام احمد نے بالاسناد بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص روز پیدائش سے مرتے دم تک سر بسجود رہے تو قیامت کے دن وہ بھی اپنے اعمال کو حقیر جانے گا اور آرزو کرے گا کہ کاش اس کو دنیا میں واپس کر دیا جائے اور وہ از سر نو زیادہ سے زیادہ اللہ کی اطاعت کر سکے ۔

امام احمد نے حضرت عتبہ بن عبد السلمی کے حوالے سے اس کو رسول اللہ ؐ کی حدیث بھی کہا ہے ۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۔ بعض کے نزدیک حیاتی سے مراد ہے عند حیاتی ۔ یعنی کافر یا ہر بداعمال کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی میں کچھ ذخیرہ پہلے سے بھیج دیا ہوتا جو آج میرے کام آتا ۔ اکثر علماء تفسیر کے نزدیک حیات سے آخرت کی حیات مراد ہے یعنی وہ افسوس کرے گا اور کہے گا کاش اس زندگی کے لئے میں نے کچھ پہلے بھیجا ہوتا ۔ (ابن کثیر)

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ۔ کسائی اور یعقوب کی قرأت میں لایُعذَّب اور لایوثق بصیغۂ مجہول ہے ۔ اس وقت اگر الانسان سے کافر مراد ہو اور الف لام جنسی ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ قیامت کے دن کافر کی طرح کسی دوسرے (غیر کافر یعنی گناہگار مومن) کو نہ عذاب ہوگا نہ اس کی طرح کسی دوسرے کی زنجیروں اور طوقوں میں گردش ۔ اور الانسان سے مراد اگر معین کافر ہو اور الف لام عہد کا ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ امیہ بن خلف یا عتبہ وغیرہ کی طرح کسی دوسرے انسان کو (خواہ کافر ہو یا گناہگار مسلمان) نہ عذاب ہوگا نہ بندش ۔

کسائی اور یعقوب کے علاوہ جمہور کی قرأت میں لایُعذِّب اور لایوثق بصیغۂ معروف ہے ۔ اس وقت یومئذ لایعذب اور لایوثق کا ظرف زمان ہے ۔ اور عذابہ و وثاقہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یا کافر انسان کی طرف اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اللہ اس کو خود عذاب دے گا خود زنجیروں میں جکڑے گا ۔ کوئی اور فرشتہ وغیرہ اس کام پر مامور نہ ہوگا اس کو عذاب دینے کا معاملہ براہ راست خدا کے ہاتھ میں ہوگا ۔ دوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ کوئی عذاب کا فرشتہ (کسی اور کو) ایسا عذاب نہیں دے گا جیسا اس کافر کو دے گا نہ کسی کو ایسی جکڑ بند کرے جیسی اس کی کرے گا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یومئذ کا تعلق عذابہ و وثاقہ سے ہو ۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ قیامت کے جیسا عذاب اور جوڑ بند اس کافر کا ہوگا ایسا دنیا میں اول سے آخر اور پیدائش عالم سے قیامت تک کوئی کسی کو نہیں کرتا اور نہ کرے گا ۔ (مظہری)

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الخ سے آیت مذکورہ بالا تک ، اخروی ذلت و اہانت کا بیان تھا ۔ اس جگہ سے آخر سورت يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔

تک اخروی اکرام اور عزت افزائی کا اظہار ہے ۔ اس طرح منکرین قیامت کے اس خیال کی بیخ کنی ہو گئی کہ معیار عزت و ذلت یہی دنیوی مال داری و ناداری ہے باقی کچھ نہیں ۔ اللہ کی طرف سے یہ خطاب قیامت کے دن نفس مطمئنہ کو ہو گا ۔ بقول رازی درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہو گا ۔ نفس مطمئنہ کون سا نفس ہے اور مطمئنہ کے کیا معنی ہیں ۔ علماء تفسیر کے اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں ۱۔ محکم یقین اور ناقابل شکست ایمان والا ۔ ۲۔ بے خوف بے غم ۔ ایسا اطمینان موت کے وقت ہوتا ہے جب ملائکہ بشارت دیتے ہیں ۔ گویا اللہ کی توحید الوہیت و ربوبیت کا اعتراف کرنے والے اور اس پر استقامت رکھنے والے اور سیدھی چال چلنے والے نفوس مطمئنہ کے مالک ہیں ۔ جن کو فرشتے عدم خوف عدم خون اور عطاء جنت کی خوشخبری دیتے ہیں ۔ ۳۔ اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل کرلے والے کیونکہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۔ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (رازی فی الکبیر) ۴۔ اللہ کی توحید اور یقین آخرت پر رسول اللہ کی ہدایت کے موافق جو شخص جما رہے وہی نفس مطمئنہ ہے ۔ (حسن بصری) قاضی ثناء اللہ صاحب نے فرمایا جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون حاصل ہوتا ہے ۔ اسی طرح بعض نفوس کو اللہ کے ذکر اور اس کی طاعت سے سکون حاصل ہوتا ہے ۔ ایسے سکون والا نفس مطمئنہ ہوتا ہے ۔ لیکن اس درجہ کا اطمینان اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب تمام اخلاق خبیثہ اور اوصاف رذیلہ کو نکال کر پھینک دیا جائے اور ان گندے اخلاق و اطوار سے نظافت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب اللہ کی صفات جمیلہ پر تو انداز ہوں اور نفس ان میں مستغرق ہو کر اپنی ہستی کا احساس کھو بیٹھے ۔ کتا نمکستان میں گر کر فنا ہو کر ہی پاک ہوتا ہے ۔ (مظہری)

ارْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔ یعنی اپنے رب کی ذات کی طرف لوٹ آ ۔ ذات مجرد کی طرف کہ اسماء و صفات کا پردہ بھی نہ رہے ۔ قرب ذات کے مراتب اور تجلیات ذات کی ضیا پاشیوں کی طرف واپس آجا کہ سیر مجاز ختم ہو جائے اور ہر حجاب اٹھ جائے ۔ اے نفس مطمئنہ اللہ کی ربوبیت والوہیت دین اسلام کی حقانیت اور نبوت محمدی پر رضامند ہو کر اور جو کچھ اللہ نے مقدر کر دیا ہے سب پر راضی رہنے کی حالت میں لوٹ آ ۔ تو اللہ کا پسندیدہ اور محبوب منظور نظر ہے ۔ اللہ کی الوہیت اور اللہ کے بھیجے ہوئے رسول محمد ؐ کی رسالت پر راضی ہونا اور رضامند رہنا اس امر کی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے وہ اللہ کا محبوب و منظور ہے ۔ رسول اللہ ؐ نے ارشاد فرمایا جو اللہ کے رب پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ؐ کے رسول ہونے پر راضی ہوا اس نے ایمان کا مزہ پا لیا (یعنی اس کو حقیقی ایمان کی چاشنی حاصل ہو گئی) حسن بصری نے فرمایا جب نفس مطمئنہ کو اللہ قبض کرتا ہے تو وہ اللہ سے راضی ہوتا ہے اور اللہ اس سے راضی ہوتا ہے ۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے رسول اللہ ؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے ۔ اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جس کو اللہ سے ملنا ناگوار ہوتا ہے اللہ کو بھی اس سے ملنا گوارا نہیں ہوتا ۔ حضرت عائشہ یا کسی دوسری بی بی نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کو تو موت بری معلوم ہوتی ہے ۔ فرمایا یہ مراد نہیں مطلب یہ ہے کہ جب مومن کے سامنے موت آتی ہے تو اس کو اللہ کی خوشنودی اور عزت کی بشارت دی جاتی ہے اس وقت موت سے زیادہ محبوب اس کی نظر میں کوئی چیز نہیں ہوتی لامحالہ اللہ سے ملنا اس کو محبوب ہو جاتا ہے اور اللہ بھی اس سے ملنا پسند فرماتا ہے اور کافر کے سامنے موت آتی ہے تو اس کو عذاب الٰہی اور سزا کی اطلاع دی جاتی ہے اس لئے موت سے زیادہ نفرت اس کو کسی سے نہیں ہوتی اور وہ اللہ کے سامنے جانے کو پسند نہیں کرتا ۔ لامحالہ اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں فرماتا ۔ (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے ارشاد فرمایا جب مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشم کا کپڑا لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے روح) اللہ کی رحمت و راحت کی طرف اور اس رب کی جانب جو تجھ سے ناراض نہیں ہے نکل کر چل تجھ سے وہ رضامند ہے ۔ اور تو اس سے خوش ۔ حسب الحکم روح ایسی خوشبو کے ساتھ نکلتی ہے جیسی مشک کی بہترین خوشبو ہوتی ہے ۔ فرشتے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر آسمان کے دروازوں تک پہنچتے ۔ آسمان والے کہتے ہیں زمین کی طرف سے یہ کیسی پاکیزہ خوشبو آرہی ہے ۔ فرشتے اس روح کو مومنوں کی روحوں تک پہنچا دیتے ہیں ۔ مومنوں کی روحوں کو اس کے پہنچنے سے اتنی مسرت ہوتی ہے کہ کسی غائب مسافر کے واپس آنے سے تم کو اتنی مسرت نہیں ہوتی ۔ روحیں اس سے پوچھتی ہیں فلاں شخص کیسا ہے ۔ پھر خود ہی بعض روحیں کہتی ہیں ۔ ابھی اس سے کچھ نہ پوچھو یہ تو خود دنیا کے افکار میں تھا ۔ مومن کی روح کہتی ہے فلاں شخص تو مر چکا ہے کیا تمہارے پاس نہیں پہنچا ۔ دوسری روحیں کہتی ہیں اس کو اس کے سرچشمہ (یا مصدر) یعنی ہاویہ (دوزخ کی طرف لے گئے ۔ کافر کے مرنے کا جب وقت آتا ہے تو عذاب کے فرشتے ایک ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے روح) باہر نکل اللہ کے عذاب کی طرف چل ۔ آنے والی چیز ہی تیرے لئے خوش کن نہیں ۔ اللہ تجھ سے ناراض ہے پھر وہ ...

مردار کی بو جیسی بدبو کے ساتھ روح برآمد ہوتی ہے۔ فرشتے اس کو لے کر زمین (سفلیین) کے دروازے تک پہنچتے ہیں۔ وہاں کے ساکن کہتے ہیں یہ کیسی سخت بدبو ہے غرض فرشتے اس کو کفار کی ارواح میں داخل کر دیتے ہیں (احمد و نسائی)

بعض علماء نے کہا کہ اللہ کی طرف لوٹنے سے مراد ہے اللہ کے حکم و ارادہ کی طرف لوٹنا۔ حسن بصری نے کہا کہ اللہ کے مقرر کردہ ثواب و اعزاز کی طرف لوٹنا مراد ہے۔ (سراج منیر)

عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ رب کی طرف لوٹنے سے مراد ہے (اللہ کے حکم سے) اپنے ساتھی یعنی بدن کی طرف لوٹنا۔ عکرمہ، عطا ضحاک اور کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ اسی کو شیخ ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے فادخلی فی عبادی کی جگہ حضرت ابن عباس (بقول بعض) فادخلی فی جسدکِ پڑھتے تھے۔ لیکن یہ روایت غریب ہے۔

توضیح مقام حکم واپسی کس وقت ہوگا اور حکم دخول کس وقت۔ یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے۔ ابو صالح کا قول ہے کہ واپسی کا حکم تو مرنے کے وقت ہوتا ہے اور دخول کا حکم قیامت کے دن ہوگا۔ عکرمہ، عطاء اور ضحاک وغیرہ کے نزدیک حکم واپسی بھی قیامت کے ہی دن قبروں سے اٹھنے کے وقت ہوگا۔ (مظہری) شیخ ابو السعود نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ حکم مومنوں کو قیامت کے دن اس وقت ہوگا جب حساب کتاب سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ حساب کتاب کے بعد نفس مطمئنہ سے کہا جائے گا کہ میرے خاص عباد یعنی انبیاء و صدیقین میں شامل ہو جا۔ حسن بصری نے فی عبادی کی تفسیر کی ہے میرے بندوں کے ساتھ (مظہری) مؤلف تفسیر مظہری نے مختلف احادیث و اقوال کے پیش نظر صراحت کی ہے کہ قول مذکور دونوں وقت کہا جا سکتا ہے۔ مرنے کے وقت بھی اور حشر کے وقت بھی بلکہ اس خطاب کا استحقاق نفس مطمئنہ کو دنیا ہی میں ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

بعض صوفیہ نے آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے اے وہ نفس جو دنیا پر اطمینان کر بیٹھا ہے دنیا کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹ آ اور اللہ کی راہ پر چل۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ۔ میرے صالح بندوں میں شامل ہو جا۔ انہیں صالحین میں داخل ہونے کی تمنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی تھی اور عرض کیا تھا وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین۔ انہی میں شمول کی درخواست حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی۔ دعا کی تھی توفنی مسلماً و الحقنی بالصالحین۔ اور انہی عباد کے متعلق اللہ نے ابلیس سے فرمایا تھا ان عبادی لیس لک علیہم سلطان۔

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ اور میری خصوصی جنت میں داخل ہو جا۔ بغوی نے بحوالہ سعید بن جبیر لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کی وفات طائف میں ہوئی میں جنازہ میں شریک تھا۔ اچانک ایک ایسا پرندہ آیا جس کی شکل کا کوئی اور پرندہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اور آ کر جنازے کے اندر داخل ہو گیا۔ جب میت دفن کر دی گئی تو قبر کے کنارے سے آیت یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ پڑھنے کی آواز آئی، مگر پڑھنے والا کوئی معلوم نہیں ہوا۔ اس واقعہ کو ابن عساکر نے سعید بن جبیر، عکرمہ، میمون بن مہران، مجاہد، عبداللہ بن یامین اور بکر بن ابی عبید کی روایت سے مختلف مختلف اسنادوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ملا ابن ابی حاتم نے بروایت بریدہ بیان کیا کہ اس آیت کا نزول حضرت حمزہ کے حق میں ہوا تھا۔ ابن ابی حاتم نے بسند جید بروایت سعید بن جبیر بیان کیا کہ حضرت ابن عباس فرماتے تھے کہ جب آیت ایتہا النفس المطمئنۃ الخ نازل ہوئی۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ بیٹھے ہوئے تھے سن کر عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا خوب بشارت ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا ابو بکرؓ وقت قریب ہے تم سے بھی یہی کہا جائے گا۔ ابن جریر نے اس حدیث کو مرسلاً اچھی اسناد سے نقل کیا ہے۔

مقصود بیان عاد، ثمود اور فرعون کی اقوام کی صناعی، آرٹ، شوکت، قوت اور اقتدار کا مختصر ذکر اور پھر ان کی تباہی کی اطلاع اشارہ کر رہی ہے کہ کوئی فرد یا قوم اپنے کمال، ہنر، صنعت، بہ گر تسلط اور عملی اقتدار کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اخلاقی سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حالت درست نہ ہو، حکومت الٰہیہ اور ضابطہ قدرت سے سرتابی تباہ کن ہے۔ بڑی سے بڑی عزت بھی اخلاقی نامناسبتی اور قوانین الٰہیہ کی مخالفت کی موجودگی میں ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔

اما الانسان اذا ما ابتلاہ الخ ۔ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان بر خود غلط واقع ہوا ہے ۔ اگر وہ خدا کا نام لیتا بھی ہے تو انانیت کو برقرار رکھتے ہوئے ۔ پندار خودی کی سرمستیاں اور شخصی کمال وسعی کی نشہ آفرینیاں اس کو خدا سے بے نیاز کر دیتی ہیں ۔ خدا کا تصور خودی کے نشہ میں چھپ جاتا ہے ۔ اور وہ ہر عزت و جاہ اور مال و منال کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھتا ہے اگر اس کی بے راہ روی اور غیر معتدل ضابطۂ حیات سے سرکشی کی وجہ سے اس کا اقتدار اور مال ضائع ہو جاتا ہے تو وہ خدا کو ظالم قرار دینے سے بھی نہیں چوکتا ۔ پھر ذلت و عزت کا معیار بھی اس کی نظر میں صرف افلاس اور سرمایہ داری ہوتا ہے ۔ اخلاق فاضلہ اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے ۔ وہ ذاتی سرمایہ داری کو ہی عزت اور ناداری کو ہی اہانت جانتا ہے ۔ قوم کی سماج کی سوسائٹی کی وطن کی اور ملک کی بربادی اور آبادی ذلت اور عزت اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتی ۔

بل لا تکرمون الیتیم الخ میں اقوام و اشخاص کی تعمیر و تخریب ، آبادی اور بربادی عزت و ذلت کے اسباب بتائے ہیں اور آمد و خرچ کے اچھے برے ذرائع کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس میں درس نصیحت ہے ۔ تمام اقوام عالم خصوصاً مدعیان اسلام کے لئے کہ یتیموں اور ناداروں کی خبرگیری ، نگہداشت اور پرداخت تعمیر قومی کا سنگ بنیاد ہے ۔ زرداروں کی ناداروں کی طرف سے غفلت اور اولاد والوں کا یتیموں کی طرف سے تساہل پوری قوم کو تباہ کر دیتا ہے ۔

تاکلون التراث اور تحبون المال سے ناجائز ظالمانہ سرمایہ اندوزی ، سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کی مذمت کرنی مقصود ہے ۔ اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ طلب معاش اور حصول روزی کے لئے ایسے ذرائع قوموں کو تباہ کر دیتے ہیں ۔

آخر میں یا ایتہا النفس الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ناداری ہو یا مالداری دکھ ہو یا سکھ ہر حال میں نفس کو اللہ پر اس کے بتائے ہوئے احکام پر اور اس کے مقرر کئے ہوئے ضوابط پر اطمینان رکھنا چاہیئے ۔ دنیوی مصائب و آلام سے تنگ آکر اعتماد علی اللہ کی رسی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے ۔ اطمینان کا نتیجہ بہرحال اچھا ہے ۔ تردد ، شک ، دودلی منافقت دنیا میں تو بے چین رکھتی ہے آخرت کو بھی تباہ کر دیتی ہے ۔ وغیرہ

سُورَةُ الْبَلَد

اس سورت کا نام سورۃ لا اقسم بھی ہے ۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر کا بھی یہی قول ہے ۔
اس میں ۲۰ آیات ۸۲ کلمات اور ۳۲۰ حروف ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَأَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ لَقَدْ

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی کہ ہم نے (انسان کو بڑی

خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۝ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝ يَقُولُ أَهْلَكْتُ

مشقت میں پیدا کیا ہے کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا (اور) کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ

مَالًا لُّبَدًا ۝ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۝ أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا

کر ڈالا کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور

وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ

(پھر) ہم نے اس کو دونوں رستے (خیروشر کے) بتلادیئے سو وہ شخص (دین کی) گھاٹی سے ہوکر نہ نکلا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی (سے) کیا

مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا

(مراد) ہے وہ کسی (کی) گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک نشین محتاج کو (یعنی ان احکام الٰہیہ

ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کو بجا لانا چاہیے تھا) پھر (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ان لوگوں میں سے نہ ہوا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو (ایمان کی) پابندی کی فہمائش کی اور ایک دوسرے

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝

کو رحم (علی الخلق) کی (یعنی ترک ظلم کی) فہمائش کی یہی لوگ داہنے والے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہیں وہ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

ع ۲۰ ۱۵

لوگ بائیں والے ہیں ان پر آگ محیط ہوگی جس کو بند کر دیا جاوے گا

تفسیر ہر جاندار خواہ کسی نوع اور کسی صفت کا ہو ابتدائی تخلیق سے لے کر آخر دور حیات تک مختلف ادوار و اطوار سے گزرتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر دور اپنے اندر گوناگوں اور چند در چند مصائب و شدائد کو لے کر آتا ہے اور ہر حساس کو ان آلام کا بقدر قوت حس احساس بھی ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں محبوس ہونا مشیمۃ الجنین کے اندر زندانی زندگی گزارنا، گندہ، بودار اور بدمزہ خون کھانا، پھر عسرت سے اس سطح ارضی پر آنا یا غلاف بیضوی سے برآمد ہونا۔ پھر روزی اور نقل و حرکت میں دوسرے کا محتاج ہونا اور باوجود فقدان دہن اور دست و پا ہونے کے سراپا مجبور کی زندگی گزارنا۔ پھر مختلف اسقام و امراض کا ہدف بنتے رہنا۔ پھر ہر ضعف سے قوت کی طرف بتدریج منتقل ہونا پھر ذی حس اور صاحب شعور ہو کر اپنی حس و شعور کے موافق روزی کی تلاش کرنا۔ سردی، گرمی، زہریلے و سموم کے دکھ اٹھانا، قدرتی دشمنوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا، کمزوروں کو لقمہ بنانا اور طاقتوروں کی خوراک بننے سے حتی الامکان بچنا اور آخر تدریجی انحطاط سے گھل گھل کر یا ناگہانی طوفان موت کے پنجہ میں گرفتار ہو کر مر جانا۔ یہ دکھ یہ الم۔ یہ مصیبت اور یہ حوادث تمام ہی حیوانوں پر آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سکھ اور راحت لذت اور عافیت بہت کم ہے۔ کم وقت کے لئے گویا ہر جاندار کی زندگی تخلیقاً مجموعۂ آلام ہے۔ انسان بھی ایک حیوان ہے ضابطۂ حیوانی سے یہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ بلکہ ہوش و خرد اور کمال ارادہ نے اس کو اور بھی ہدف شدائد بنا دیا ہے۔ اس کی اقدار حیات دوسرے حیوانوں کی اقدار حیات سے زیادہ شدائد آمیز اور مصائب آگیں ہیں۔ یہ صرف احکام تکوینی سے ہی مجبور نہیں بلکہ اس کے ہوش و اختیار نے اس کو اوامر تشریعی کا بھی پابند بنا دیا ہے اس کو دوسری زندگی کا بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ حیات اخروی کے منکر بھی صداقت موت اور حقانیت فنا کا اقرار تو بہر حال کرتے ہیں فنا پذیر راحت اور جلد برباد ہونے والی لذت ان کو مہنگائی سکون سے بھی محروم رکھتی ہے۔ وہ اپنے کو ہر طرف سے خطرات میں محصور پاتے ہیں۔ جتنا ہوش بیدار اور دانش روشن ہوتا ہے اتنا ہی احساس دکھ اور تاثر الم زیادہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ کوئی انسان اس سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ سچ ہے کہ انسان تخلیقاً شدائد میں محصور

ہے اور بقائے حیات کی کوشش میں ہر وقت متحرک ، منہمک ، مستغرق اور مضطرب ۔

اس قدر بے بس اور سرشتی قیدی ہونے کے باوجود بعض آدمی اپنے اس اضطراب اور فطری اضطرار کو حقیقی اختیار سمجھ کر انانیت کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں اور ضروریاتِ حیات کے فطری اسباب کو اپنے اختیار و ہوش کی پیداوار قرار دے کر خود غلط بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں میرا مال ہے ۔ میری قوت بازو اور روشنی فرد کا نتیجہ ہے ۔ میں جیسا چاہوں صرف کر سکتا ہوں کسی اچھے راستے میں صرف کروں یا برباد کر دوں ۔ لٹاؤں تباہ کروں ۔ ہر چیز کا مجھے حق ہے ۔ گویا ایسے کور دانشوں کا خیال ہوتا ہے کہ دینے والا کوئی رب نہیں ۔ عطا کرنے والا کوئی خالق نہیں ۔ ساری کائنات کا مالک قادر اس پر اور اس کے مال پر قادر نہیں ۔ وہ فراخی کو تنگی سے نہیں بدل سکتا وہ زوردار کو نادار نہیں بنا سکتا ۔ انسان کی یہ سرتابیاں ، ناشکریاں ، بدقماشیاں اور بد معاشیاں اس سے چھپی ہوئی ہیں ۔ وہ نہ محیط کل قدرت رکھتا ہے نہ ہمہ گیر علم ۔ اس دشمنِ عقل کو نہیں دکھتا کہ دیکھنے والی اور اچھے برے کو شناخت کرنے والی آنکھیں اور ضمیر و ارادہ کو ظاہر کرنے والے کام و دہن کس نے اس کو دیئے ۔ کیا آنکھیں اچھے برے کو دیکھنے اور تمیز کرنے کے لئے نہیں ۔ کیا لب و زبان کھانے بولنے اور ضمیر کی تعبیر کے لئے نہیں ۔ دماغ ، ذہن ، عقل اور ہوش کو چھوڑو صرف رویت و نطق دو ہی نعمتوں پر غور کرو ۔ کیا یہ دو ظاہری نعمتیں ایسی نہیں کہ انسان کے ارادہ و اختیار اور فہم و دانش کا اظہار ناممکن ہے ۔ یہی مافی الضمیر کے اظہار کے آلات ہیں اور یہی حصولِ مال اور فراہمی رزق کے ذرائع ہیں ۔ نابینا اور گونگا کیا دیکھ سکتا اور کیا بول سکتا ہے اور کس طرح کھا سکتا ہے اور کس طرح اپنی زندگی کا پروردگار ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے خلاقِ کل اور ربِ مطلق نے انسان کو دیکھنے اور بولنے کی صلاحیتیں دیں اور نہ فقط اس تکوینی بخشش پر اکتفا کی بلکہ ضابطۂ زندگی بھی سکھایا ۔ خیر و شر ، نیک و بد اور خطا و صواب کا راستہ الگ الگ بتایا ۔ تحصیلِ منفعت اور دفعِ مضرت کی تخلیقی تعلیم بھی دی اور انبیاء و رسل کے ذریعہ سے تشریعی ہدایت بھی کی ، مگر مردہ عقل انسان نے انبیاء کی تعلیم کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور نورِ فطرت کو بھی بجھا دیا ۔ خود کو حاکم اور مختارِ مطلق سمجھ کر اپنی زندگی کا رخ جس طرف چاہا موڑ دیا ۔ خیر کو شر بنایا اور خطا کو صواب قرار دیا ۔ خداداد مال کو ہوس رانی کا ذریعہ بنا کر جہاں اور جتنا چاہا خرچ کیا ۔ اگر اتفاقاً کسی اچھے کام میں صرف بھی کیا تو جذبۂ غرور کے زیر اثر اور داعیۂ خود نمائی کے زیر اثر حکومت صرف شہرت و نمود کی خاطر ۔ وہ خدا کی ہستی کا قائل نہیں ۔ حاکمِ کل کی حاکمیت کا اقراری نہیں ۔ خودی اور خود پرستی کا بازیچہ ہے ۔ غرور و پندار کی لعبت شگرف ہے ۔ ضابطۂ انسانیت سے جاہل ہے ۔ قانونِ فطرت سے بے بہرہ ہے یہ مفلس الذہن نا سمجھ انسان واقف نہیں کہ اللہ کو ماننا اس کو ربوبیت الوہیت اور حاکمیت میں منفرد جاننا انسانیت کا درسِ اول ہے ۔ پھر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلنا اور ان کے احکام کا پابند ہونا ضروری ہے ۔ اس راستے میں جو حوادث کے نوکیلے ، اونچے ، ناقابلِ عبور سنگستان آجائیں یا موانع اور عوائق کے خار زار یا عیش و طرب کے مرغ زار ، نعمت و نکبت اور راحت و الم کے طوفان میں اپنے کو ثابت قدم رکھنا اور دوسروں کو ثابت قدم رکھنے کی کوشش فرضِ انسانیت ہے ۔ ننگے بھوکے مسکین اور بے سر بے پدر یتیم انسانیت کے چراغ ہیں ۔ صدفِ بشریت کے موتی ہیں ۔ اقوام قومی انہی سے ہے ان کو افلاس سے نجات دینا اور مصائب کی قید میں بند ہونے سے قیدیوں کو رہا کرنا اور گرفتار بلا غلاموں کو چھڑانا اور ہوس کے زنداں میں محبوس انسانوں کی قید توڑنا غرضِ انسان اور انسانیت کو قید رکھنے والی طاغوتی طاقت کو تباہ کرنا آدمی کا مقدس فرض ہے ۔ پھر کیوں کالے دماغ کے یہ انسان نما حیوان خدا کو نہیں مانتے اس کے بتائے ہوئے احکام پر نہیں چلتے ۔ کوہستانِ حیات میں جو یتیم پروری ، غریب نوازی اور اعتاقِ غلامی کی قابلِ عبور منزلِ مقصود پر پہنچانے والی نمایاں اور صاف پگڈنڈی ہے اس پر کیوں نہیں چلتے اور کیوں ادھر ادھر ہوا پرستی خود نمائی اور پندار کے نوکیلے پتھروں سے سر ٹکراتے پھرتے ہیں ۔ یاد رکھو یمن و برکت والے ہیں وہ لوگ جو اللہ کو واحد اور کارسازِ مطلق جان کر اس کے بتائے ہوئے ضابطۂ حیات کے پابند ہیں اور شوم و نحوست والے ہیں وہ لوگ جو خدا کے منکر اور الٰہی ضابطہ سے سرتابی کرنے والے ہیں ۔ ان کی فکری بے راہ روی اور عملی گمراہی ایک آگ ہے ۔ طبق در طبق اور تہ بر تہ جو اس زندگی میں بھی ان پر مسلط ہے اور آئندہ زندگی میں بھی ان کو کھائے گی ۔

تحلیلِ اجزاء لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۔ سورۂ فجر میں عاد ثمود اور قوم فرعون کی تباہی اور وجوہ تباہی کو بیان فرمایا تھا اور ان کی نگاہ میں جو عروج و زوال کا معیار تھا ۔ اس کو ظاہر کرنے کے بعد اس کی غلطی پر متنبہ کیا تھا ۔ پھر تعمیر و تخریب اقوام کے جو حقیقی

اسباب ہیں ان کی تفصیل فرمائی تھی اور یتامیٰ و فقراء کی پرداخت و نگہداشت نہ کرنے کو موجب تباہی قرار دیا تھا اور ناجائز حرص مالی کی مخالفت بلیغ فرمائی تھی۔
(۲) اس سورت میں یتامیٰ اور مساکین کی امداد معاشی کی ترغیب دی ہے۔ اہل استحقاق پر رحم (جو مواسات و مساوات کی اساس ہے) کی تلقین کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شدائد و مصائب سے تنگ آکر یا عیش و طرب کے نشہ سے سرشار ہو کر راہ حق سے منہ موڑنے اور راہ حق میں تزلزل پیدا کرنے سے بھی باز داشت فرمائی ہے اور چونکہ ہر عمل خیر کی تعمیر ایمان ہی کی اساس پر ہونی لازم ہے۔ جذبہ نفس اور داعیۂ غرور کے زیر اثر ہر نیکی بے ثمر ہے۔ وقتی امداد اور ہنگامی ضرورت کا دفع کسی قدر ہو جاتا ہے مگر جب منفعت اور دفع مضرت کے جذبہ کی اس سے حد بندی نہیں ہوتی۔ تعاون بین الناس پیدا نہیں ہوتا اور تعاون کے بغیر تعمیر قومی کا امکان نہیں، اس لئے ایمان باللہ کو ہر خیر کا سرچشمہ بلکہ بنیاد قرار دیا۔ گویا گذشتہ سورت میں اقوام و افراد کی تعمیر و تخریب کے اصول بتلائے تھے اور اس سورت میں وہ اصول بھی ظاہر کئے اور ان اصول کی نتیجہ آفرینی جس بنیادی نظریہ سے وابستہ تھی اس کو بھی بتایا اور خود پرستی و خدا پرستی کا فرق واضح کر دیا۔

لا اقسم میں تاکید قسم کے لئے لا زائد ہے۔ کلام اگرچہ مثبت ہے اور لا کی زیادتی عموماً کلام منفی میں ہوتی ہے جیسے لا واللہ لا افعل کذا، لیکن کلام مثبت میں بھی کبھی لا زائد آتا ہے جیسے اس شعر میں ہے۔

تذکرت لیلیٰ فاعترتنی صبابۃ — وکاد صمیم القلب لا یتصدع

لیلیٰ کی یاد سے میرے اندر اتنی سوزش عشق پیدا ہوئی کہ قریب تھا میرا مضبوط دل پھٹ جائے۔ ایک اور آیت میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ ما منعک ان لا تسجد یعنی ان تسجد۔ لا اقسم بیوم القیامۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ میں بھی زائد ہے اور کلام مثبت ہے (رازی)

خصیف نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ لا نفی کے لئے ہے یعنی رسالت، قیامت اور توحید کا انکار جو مشرکوں نے کیا تھا پہلے اس کی نفی کی اور پھر اس کو قسم سے کیا۔ مؤلف تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ لا کو نفی کے لئے قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ جس چیز کے متعلق قسم کھائی جا رہی ہے وہ بالکل واضح ہے۔ اس کا ثبوت محتاج قسم نہیں ہے۔ رازی کے قول کو قدماء اور متاخرین سب ہی اہل تفسیر نے پسند کیا ہے۔

البلد سے مراد باجماع مفسرین مکہ ہے صرف واسطی کے نزدیک مدینہ مراد ہے مگر سورت مکی ہے، اس لئے یہ قول خارق اجماع ہونے کے علاوہ سیاق و صحت کلام کے بھی منافی ہے۔ بلد حرام یعنی مکہ تمام شہروں سے زیادہ باعظمت ہے۔ اس میں سب سے زیادہ عظمت رکھنے والی مسجد حرام ہے جس میں مقام ابراہیم ہے۔ کعبہ ہی ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز ہے۔ اسی کا حج فرض ہے۔ شہر مکہ بلکہ کل حرم زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم تھا۔ مقام امن تھا۔ حدود حرم کے اندر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل سے بھی انتقام نہیں لیتا تھا۔ حرم کے اندر شکار ممنوع تھا۔ حرم ہر جاندار کا مقام امن تھا۔ اسلام نے بھی حرمت حرم کو قائم رکھا۔ بلکہ یہاں کی گھاس کاٹنے کی ممانعت کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا تھا آسمان و زمین کی پیدائش کے دن ہی اللہ نے اس شہر کو حرم بنا دیا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن تک بحرمت الٰہی یہ حرام ہے۔ مجھ سے پہلے یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہ تھا اور میرے لئے بھی یہاں قتال کرنا دن میں صرف ایک ساعت کے لئے حلال ہوا تھا۔ اب قیامت تک بحرمت الٰہی یہ حرام ہے۔ یہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں، اس کے اندر سے شکار کو باہر نہ بھگایا جائے۔ یہاں کی گری پڑی چیز نہ لی جائے۔ یہاں کی گھاس نہ کاٹی جائے (متفق علیہ) مکہ کو خطاب کر کے حضور ﷺ نے فرمایا تھا تو کیسا پاکیزہ شہر ہے۔ اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ اگر میری قوم والے مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں تیرے سوا کہیں نہیں رہتا (ترمذی از ابن عباس وقال حدیث حسن صحیح غریب)

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عدی کی روایت سے بیان کیا کہ حضور نے فرمایا خدا کی قسم تو اللہ کی زمین ہے اللہ کو سب سے پیارا اور سب سے پیارا اور سب سے افضل ہے۔ اگر مجھے تیرے اندر سے نکالا نہ جاتا تو میں نہ نکلتا۔

وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ۔ حِل کا معنی ہے حلول و نزول۔ اس وقت رازی نے ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے حلؐ کا معنی لکھا ہے۔ مقیم، ساکن، فروکش۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ مکان کی عظمت مکین کی عظمت سے ہوتی ہے (قصر شاہی سکونت شاہ کی وجہ سے قابل احترام ہوتا ہے) گویا شہر مکہ کی عظمت ایک تو پہلے ہی سے ہے۔ پھر حضور ﷺ کی سکونت کی وجہ سے اس کی بزرگی میں اور چار چاند لگ گئے۔ اسی لئے اَنتَ حِلٌّ کے ساتھ مقسم بہ یعنی مکہ کو مقید کیا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ حل حرمت کی ضد بمعنی حلت بھی آتا ہے۔ واحدی نے کہا حل۔ حلال۔ محل سب کا ایک ہی معنی ہے یعنی حرمت کی ضد اس وقت مراد لینے میں اختلاف ہے۔ ابو صالح۔ عطیہ۔ ضحاک۔ قتادہ۔ سدی۔ ابن زید۔ حسن بصری اور مجاہد وغیرہ کے نزدیک حل سے مراد یہ ہے کہ

آپ کے لئے یہاں قتال حرام ہے ۔ نسفی نے لکھا ہے کہ اس وقت جملہ حالیہ ہونے کے باوجود معنی استقبال کے ہوں گے ۔ کیونکہ سورت مکی ہے اور حضور کے لئے اذن فتح مکہ کے وقت ایک ساعت کے لئے قتال حلال کیا گیا تھا ۔ جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں آیا ہے ۔ عبداللہ بن خطل ۔ نضر اور مقیس بن ضبابہ وغیرہ کو ان کے جرائم کی پاداش میں فتح مکہ کے دن حضور ؐ نے قتل کرایا تھا ، لیکن ایک ہی ساعت کے بعد بدستور سابق حرمت حرم کا دوامی حکم دیدیا ۔ رازی وغیرہ نے حلال ہونے کا ایک معنی یہ لکھا ہے کہ مشرکین کے نزدیک تمہارا خون حلال ہے ۔ باوجودیکہ ہر جاندار کے لئے یہ مقام امن ہے ، مگر تمہارے لئے مشرکوں نے اس کو ہی مقام حلت بنا رکھا ہے ۔ شرجیل نے اسی توضیح کو بیان کیا ہے ۔

حلال ہونے کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ آپ اس شہر میں کوئی ایسا فعل نہیں کرتے جو حرمت مکہ کے خلاف ہو بلکہ ہر حلال کام ہی کرتے ہیں ۔ البتہ مشرک یہاں بت پرستی ، بے ایمانی ، کفر اور مختلف حرام عمل کرتے ہیں ۔ البتہ مشرک یہاں بت پرستی ، بے ایمانی ، کفر اور مختلف حرام عمل کرتے ہیں ۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۔ اور قسم ہے والد و مولود کی ۔ والد سے مراد ہیں آدم ؑ اور ما ولد سے ان کی اولاد (مجاہد ، ابو صالح ، قتادہ ، ضحاک ، سعید بن جبیر ، حسن بصری ، خصیف ، شرجیل ، سفیان ثوری) رازی نے بھی یہی لکھا ہے اور وجہ یہ لکھی ہے کہ جس طرح مکہ ہر شہر سے افضل ہے اسی طرح آدم اور اولاد آدم ہر مخلوق سے اعلیٰ ہے ۔ دونوں کی عظمت کی وجہ سے ان کی قسم کھائی ۔ ابو عمران جونی تابعی نے لکھا ہے کہ ابراہیم اور ان کی اولاد مراد ہے ۔ (ابن جریر و ابن ابی حاتم) ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ شیخ ابن جریر کے نزدیک ہر والد اور مولود یعنی ہر حیوان مراد ہے ۔ عکرمہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ والد وہ ہے جس کی اولاد ہوتی ہو اور ما ولد وہ ہے جو بانجھ نا قابل ولد ہو ۔ اس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے لیکن اس کی اسناد میں قابضی شریک ہیں جن کا حافظہ کمزور ہے ، اس لئے یہ روایت ناقابل اعتماد ہے ۔ میرے نزدیک رازی کا قول زیادہ قوی اور معتمد ہے ۔ البتہ اس صورت میں ما کو مَن کے معنی میں لینا پڑے گا جو جائز ہے اور کثیر الوقوع ہے ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۔ کبد کا معنی یا مشقت و دشواری ہے یا قد کا سیدھا اور معتدل ہونا ۔ دوسرے معنی کی روایت حضرت ابن مسعود حضرت ابن عباس ، عکرمہ ، مجاہد ، ابراہیم نخعی ، خیثمہ اور ضحاک وغیرہم سے آئی ہے ۔ بقول ابن کثیر اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے انسان کو معتدل القامت اور مستوی پیدا کیا ۔ اسی مضمون کو آیت لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اور الذی خلقک فسواک فعدلک میں بھی بیان فرمایا ہے ۔ حضرت امام محمد باقر نے ایک انصاری سے آیت لقد خلقنا الانسان فی کبد کا معنی دریافت فرمایا ۔ انصاری نے جواب دیا یعنی انسان کو معتدل مستقیم پیدا کیا ۔ امام باقر نے اس کا انکار نہیں کیا ۔ زمخشری نے کشاف میں رازی نے کبیر میں اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور بروایت ابن ابی حاتم حسن بصری نے اول معنی کو اختیار کیا ہے ۔ یعنی انسان کو دکھ میں پیدا کیا ۔ ایک روایت میں مجاہد کا بھی یہی قول آیا ہے ۔ انسان کی تخلیق کس دکھ اور مشقت میں ہوئی ۔ اس کی تشریح مختلف طور پر کی گئی ہے ۔ پیٹ کے اندر ، پیدائش کے وقت ، دودھ پینے کے وقت پھر بڑھ کر معاش کی کوشش کرنا ، یہ سب انسان کے لئے دکھ ہے (سعید بن جبیر اور قتادہ) حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں آیا ہے کہ انسان کو مشقت میں پیدا کیا گیا ۔ پھر آپ نے ماں کے پیٹ میں ہونے پیدا ہونے دانت نکلنے وغیرہ کی مشقت بیان کی ۔ ابن جریر نے بیان کیا کہ دنیا میں انسان دنیوی اور اخروی مہمات کی فراہمی میں تکلیفیں اٹھاتا ہے ۔ ابن جریر کا یہ قول برتقدیر اول ہے مگر ان کے نزدیک مختار دوسرا معنی ہے ۔ مؤلف تفسیر مظہری نے فرمایا یہ تخلیقی شدائد تو ہر حیوان پر ہوتے ہیں ۔ انسان کا خصوصی ذکر صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ صاحب عقل اور کمال شعور کا مالک ہے ۔ حس کامل احساس تکلیف کو بڑھا دیتی ہے ۔ مؤلف مذکور نے لکھا ہے میرے نزدیک شدائد سے مراد ہے میثاق امانت کی برداشت جس کا اقرار ازل میں انسان کر چکا ہے ۔ آیت انا عرضنا الامانۃ علی السموات الخ اس پر دلالت کر رہی ہے اگر انسان اپنے میثاق کو پورا کرتا ہے تو کامیاب ہو جاتا ہے ۔ ورنہ شدائد عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ اس بار کا اٹھانا بہت ہی سخت ہے ۔ واللہ اعلم

الْاِنْسَان سے مراد عام انسان ہے کوئی مہر ۔ بعض لوگوں نے کبد کا ترجمہ شدت (اور قوت) کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ الانسان

میں امتیاز کرنے کے لئے نہیں دیں۔ کیا اللہ نے زبان اور دو لب بولنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے اور کھانے پینے کے لئے نہیں عطا کئے۔ اگر لب و زبان گویائی چشم بینائی نہ ہوتی تو کون کمائی کر سکتا۔ کون بول سکتا کون اچھے برے میں تمیز کر سکتا۔ کون ضرر رساں چیزوں سے اپنے کو محفوظ کر سکتا اور کون فائدہ رساں اشیاء کو پہچان سکتا۔ یہ دونوں اعضاء خود فاعل نہیں۔ ارادہ و عقل کے خادم ہیں۔ ان کی اہمیت جب اتنی ہے تو عقل و شعور اور قصد و ارادہ کی طاقتیں اللہ کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ دیکھو اللہ نے آنکھوں سے اور زبان و لب سے

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔ سمجھ لینا اور اچھے برے کی تمیز کرنے کے لئے عقل مرحمت کی۔ ہوش عطا فرمایا۔ فطری طور پر انسان کو خیر و شر، خطا و صواب، حق و باطل کے الگ الگ راستے بتا دیئے۔ پھر تکوینی ہدایت ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحیح غلط بتانے کے لئے پیغمبروں کو بھی بھیجا۔ ضحاک اور سعید بن مسیب کے نزدیک محمد بن کعب کی روایت میں حضرت ابن عباس کے نزدیک النجدین سے مراد ہیں۔ دو دودھ پینے کی دو چھاتیاں۔ لیکن حضرت ابن مسعود، حضرت علی (اور بروایت معتبر) حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، ابو وائل، ابو صالح بلکہ اکثر مفسرین کے نزدیک خیر و شر کے دو راستے مراد ہیں۔ ہم نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت انس کی روایت سے اس تفسیر کو حدیث مرفوع بھی کہا ہے۔ مگر یہ روایت ناقابل اعتماد ہے۔ سنان بن سعد اس اسناد میں ایک راوی ہے جس پر امام نسائی، احمد، جوزجانی نے اعتماد نہیں کیا۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ مغرور انسان نے اپنی مرضی سے اپنا مال تباہ کیا خودی کے نشہ سے سرشار ہو کر محض خود پرستی کے زیر اثر کثیر دولت خرچ کر ڈالی۔ یہ تو راہ نجات نہیں۔ یہ گھاٹی نہ تعمیر انسانیت تک پہنچاتی ہے نہ آخرت میں جنت تک۔ کوہستان حیات میں جنت تک پہنچانے والی گھاٹی میں یہ کیوں نہیں داخل ہوا۔ زندگی کے اس دشوار گزار پہاڑ سے پار ہونے کے لئے اس نے نجات کی پگڈنڈی کیوں نہیں اختیار کی۔ اقتحام کسی سخت کام میں داخل ہونا۔ قحم وہ امور جن میں جان کا خطرہ ہو۔ (رازی فی الکبیر) صاحب فتح نے اقتحام کا معنی بے سوچ کسی کام میں گھس پڑنا کیا ہے مگر رازی کی توضیح صحیح ہے۔ کیونکہ خفیف اور معمولی کام میں اگر کوئی بے سوچے بھی داخل ہو تو اس کو اقتحام نہیں کہا جاتا۔ اِقْتَحَمَ الْأَكْلَ لغت کے خلاف ہے۔ العقبۃ پہاڑ کا دشوار گزار راستہ جس میں کہیں اتار ہو کہیں چڑھاؤ۔ یہاں عقبہ سے جو راستہ مراد ہے اس کی صراحت آئندہ آیت میں کی گئی ہے۔

فَكُّ رَقَبَةٍ۔ یہ عقبہ کی مرادی تفصیل ہے یعنی زندگانی کے کوہساریں (مندرجہ آیات) نیکیوں کی گھاٹی نفس کے لئے سخت دشوار گزار ہے اس میں ان گنت پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ ہیں جو اس راہ میں داخل ہو گیا اور راستہ سے گزر گیا وہ سعادت دینی اور نجات اخروی کی فرودگاہ تک پہنچ گیا اور منزل مقصود اس کے ہاتھ آ گئی۔ العقبۃ کی جو تفسیر ہم نے کی ہے وہ ابن زید کے قول پر مبنی ہے۔ ابن زید نے آیت کی تشریح میں فرمایا تھا۔ ایسی راہ کیوں نہیں چلا جس میں اس کی بھلائی اور نجات تھی۔ پھر فرمایا یہ راہ فک رقبہ اور الطعام ہے۔ خطیب نے بھی ہماری تفسیر کے مطابق تشریح کی ہے اور کلام کو تمثیلی قرار دیا ہے کہ نیک کام کرنے والا گویا دشوار گزار گھاٹی طے کرنے والا ہے جس پر مشقت کے ساتھ چڑھتا ہے۔ قتادہ کے قول کا بھی یہی مطلب ہے خطیب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے گناہوں کو گھاٹی سے تشبیہ دی اور فک رقبہ وغیرہ کو گناہوں کا کفارہ قرار دیا۔ گویا کفارہ ادا کر کے آدمی گناہوں کی گھاٹی سے پار ہو گیا۔ تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ اگر عقبہ سے مراد نیک کام ہوں تو کلام میں کسی لفظ کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں اور اگر گناہ مراد ہوں تو تقدیر کلام اس طرح ہوگی وما ادراک ما اقتحام العقبۃ والخروج عنہا۔ یعنی کیا تم کو گھاٹی میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کی مراد معلوم ہے۔

قدماء نے عقبہ کی تشریح مختلف طور پر کی ہے۔ جہنم و جنت کے درمیان ایک گھاٹی ہے (کلبی) جہنم میں ایسی گھاٹی ہے جس پر پاؤں پھسلتے ہیں (حضرت ابن عمرؓ) عقبہ پل صراط ہے (مجاہد و ضحاک) پل صراط سے ورے ایک سخت گھاٹی ہے (حسن و قتادہ) قدماء کی یہ تشریحات بظاہر نص قرآنی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ نے تو عقبہ کے مرادی معنی کی خود صراحت فرما دی اور فرما دیا فک رقبۃ الخ۔ لیکن حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ آخرت کے عقبہ کو آسانی کے ساتھ طے کرنے کا راستہ اللہ نے یہ بیان کیا ہو بلکہ یقینی یہی مطلب ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ گناہوں کا راستہ دشوار گزار ہے اور نیکیوں کے راستے میں بہت پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ ہیں۔ کوہستان زندگی کے یہ دونوں راستے سخت ہیں جو راہ زندگی میں دشواریوں میں پھنس کر رہ گیا وہ عقبات جہنم کے پار نہ ہوگا اور جو یہاں اس راہ کو طے کر گیا وہ عقبات آخرت کو بھی بآسانی طے کر لے گا اور اس راہ کو طے کرنے کا طریقہ اور ذریعہ وہ ہے جس کو فک رقبۃ وغیرہ سے تعبیر فرمایا، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ آخرت کے عقبات کو طے کرنا فک رقبہ وغیرہ کی راہ کو طے کرنے پر موقوف ہے۔ واللہ اعلم

فَکُّ رَقَبَۃٍ ۔ گردن رہا کرانا ، بردہ آزاد کرنا ، مکاتب کی آزادی مدد دینا ۔ حضرت عکرمہ کے نزدیک اپنے نفس کو دوزخ سے توبہ کے ذریعہ کرنا (بھی) مراد ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ شاید قرضدار کا قرضہ چکا کر یا اپنے قرضدار کو قرض معاف کر کے اس کی گردن کو آزاد کرنا بھی اسی میں داخل ہو ۔ والعلم عند اللّٰہ ۔

امام احمد نے جید اسناد کے ساتھ سعید بن مرجانہ کی روایت سے نقل کیا کہ حضرت ابوہریرہ نے بیان کیا حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مومن کی گردن کو آزاد کیا اللہ اس کے ہر عضو کے عوض میں اس کے ہر عضو کو آزاد فرمائے گا ۔ یہاں تک ہاتھ کی آزادی کے عوض اس کے ہاتھوں کو ، پاؤں کے بدلے پاؤں کو اور شرم گاہ کے بدلے شرم گاہ کو ۔ سعید بن مرجانہ سے حضرت امام زین العابدین نے یہ حدیث سن کر فرمایا سعید کیا تم نے خود ابوہریرہ سے یہ حدیث سنی ہے ۔ سعید نے کہا جی ہاں ۔ حضرت نے فرمایا مطرف کو بلاؤ ۔ مطرف حاضر ہوا تو فرمایا ۔ جا تو اللہ کے واسطے آزاد ہے (بخاری ، مسلم ، ترمذی ، نسائی) صحیح مسلم میں اتنا اور بھی ہے کہ اس غلام کی قیمت حضرت امام کو دس ہزار درہم ملتی تھی ۔ نہایت قوی اسناد سے شیخ ابن جریر نے بیان کیا کہ حضرت ابونجیح عمرو بن عبسہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس مرد مسلمان نے مسلمان غلام کو آزاد کیا تو اللہ اس کی ہر ہڈی کے عوض آزاد کرنے والے کی ہر ہڈی کو آزاد کر دے گا ۔ اور جس مسلمان عورت نے مسلمان باندی کو آزاد کیا تو اللہ اس کی ہر ہڈی کے عوض اس کی ہر ہڈی کو دوزخ سے آزاد کر دے گا ۔

امام احمد نے عمرو بن عبسہ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ جس نے مسلمان کو آزاد کیا وہ آزاد کرنے والے کیلئے دوزخ سے بچنے کے واسطے فدیہ ہوگا ۔ ابوداؤد ، نسائی اور احمد نے عمرو بن عبسہ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ بھی حدیث بیان کی ہے کہ جس نے مسلمان گردن کو آزاد کیا اس کے ہر عضو کے عوض اس کے ہر عضو کو آگ سے رہائی ہوگی ۔ حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مسلمان رقبہ آزاد کیا وہ آگ سے اس کا فدیہ ہوگا (احمد) حضرت واثلہ بن الاسقع نے کہا ہم اپنے ایک ساتھی کو جو قاتل تھا لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معاملہ عرض کیا ۔ فرمایا اس قاتل کی طرف سے ایک رقبہ آزاد کرو ۔ اللہ اس کے ہر عضو کے عوض اس کے ہر عضو کو آزاد فرمائے گا (ابوداؤد) حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کے ذریعہ سے اللہ مجھے جنت میں داخل فرما دے ارشاد فرمایا تو نے عبارت مختصر بولی مگر بات لمبی پوچھی ! نسمہ (جان) آزاد کر اور رقبہ (گردن) رہا کر ۔ اعرابی نے عرض کیا حضور ﷺ کیا دونوں کا مطلب ایک ہی نہیں ہے ۔ فرمایا نہیں ، نسمہ آزاد کرنا یہ ہے کہ تو خود کسی بردہ کو آزاد کر لے اور گردن کی رہائی یہ ہے کہ کسی گردن کی آزادی یہ ہے کہ کسی گردن کی آزادی میں مدد کرے ۔ (یعنی مکاتب کی قیمت ادا کرنے میں مدد کرنا ۔ اور منحہ یہ ہے کہ ظالم قرابتدار کی طرف نرمی اور مہربانی سے تو رجوع کرے یہ بات اگر تجھ سے نہ ہو سکے تو بھوکے کو کھانا کھلا ، پیاسے کو پانی پلا ۔ اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے باز داشت کر اور یہ بھی نہ ہو سکے تو خیر کے علاوہ ہر بات کو زبان سے روکے رکھ (احمد ورازی)

تتمہ ابتدار بعثت ، وقت ہجرت اور ہنگام وفات تینوں زمانوں میں عرب ، عجم ، ایران ، روم ، ہند ہر جگہ غلامی کا بازار گرم اور پر رونق تھا ۔ تمام خدمت گار غلام ہی ہوتے تھے ۔ کروڑوں انسان غلامی کی زندگی گزارتے تھے ۔ لیکن اسلام کے پیش نظر غلاموں کی آزادی تھی ۔ اسلام کا مقصود تھا انسانوں کی برادری سے ناجائز تفوق کا نشان مٹا دینا انسانیت کو اونچ نیچ شرافت ، رذالت ، امارت ، غربت ، مغربیت ، مشرقیت اور رنگ کی سیاہی سفیدی کے بیجا امتیازات سے چھڑانا اور ہر قسم کی غلامی کی جڑ اکھاڑ دینا ، لیکن دفعتہً انقلاب ممکن نہ تھا ۔ ہمہ گیر اور محیط کل عادت بلکہ طبیعت ثانیہ کو الٹ دینا فقط دشوار نہیں دشوار ترین تھا ۔ اور تکلیف مالا یطاق تھی ، اس لئے غلامی کی جڑ کاٹنے میں اس نے دو صورتیں پیدا کیں ۔ دائمی و گناہوں کے کفارہ میں غلاموں کو آزاد کرنے کا آئینی حکم دیا ۔ حج میں کوئی قصور ہو جائے احکام حج کی خلاف ورزی ہو جائے تو غلام آزاد کرو ۔ روزہ میں کوئی قصور ہو جائے کوئی خامی پیدا ہو جائے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو غلام آزاد کرو ۔ جھوٹی قسم کھا لو تو غلام آزاد کرو ۔ غرض عبادت اور حقوق اللہ میں کوئی خامی کوئی قصور ہو جائے تو مسکینوں کو کھانا کھلانا قربانی کرنا اور دوسری تلافی گناہ کی صورتوں کے ساتھ مقدم ترین صورت غلاموں کی آزادی کو قرار دیا ۔ یہ قانونی اور آئینی احکام دیئے ساں کے علاوہ بغیر کسی جرم اور گناہ کے غلاموں کی آزادی کی ترغیب ایسے امید افزا پر شوکت الفاظ میں دی کہ طلب گاران نجات اخروی کے لئے وہ ترغیب حکم کی حیثیت میں سمجھی جانے لگی ۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں چند ضروری اہم ہدایات میں سے ایک مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ یعنی غلاموں کے حقوق کی پاسداری کے اور ان سے حسن سلوک کی ہدایت بھی تھی ۔ ۲ ۔ اگر مذکورۂ بالا تمام صورتوں کے بعد بھی کسی کے پاس کوئی غلام باقی رہ جائے تو ضابطہ کے تحت غلام کے ایسے معاشرتی

اور سماجی حقوق مقرر کر دیے کہ ان کو ادا کرنے کے بعد نہ غلام غلام رہتا ہے نہ آقا آقا ۔ لباس اور کھانے میں مساوات کا حکم معمولی نہیں ۔ غلام کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنا سخت ترین ضابطۂ سماج ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی حکم کے زیر اثر مسلمانوں نے لاتعداد غلاموں کو آزاد کیا اور ان آزاد غلاموں نے ایسے ایسے کارِ نمایاں انجام دیے جن کو احرار انجام نہ دے سکے ۔ نقل احادیث اور اشاعتِ دین میں بڑا حصہ غلاموں کا ہی ہے بڑے بڑے جلیل القدر نمبر اوّل و دوم و سوم کے تابعی محدث فقیہ مفسر اصلاً غلام ہی تھے ۔ اگر یہ موالی نہ ہوتے تو اسلامی تعلیم کا بیشتر حصہ ضائع ہو جاتا ، اس لئے اطعام الیتٰمیٰ و المساکین سے پہلے فک رقبۃ کا ذکر کیا ۔ تقدم ذکر بتا رہا ہے کہ یتیم نوازی اور غریب پروری سے مقدم غلاموں کو آزاد کرنا ہے ۔ اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک ہر قسم کے صدقہ اور خیرات سے بردہ آزاد کرنا افضل ہے ۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۔ یا بھوک کے دن قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا ۔

مسغبۃ ، بھوک ۔ یوم ذی مسغبۃ ، بھوک کا دن (حضرت ابن عباس ، مجاہد ، عکرمہ ، ضحاک وغیرہم) یا طعام کی کمیابی کا دن (ابراہیم نخعی) یا ایسا دن جس میں طعام کی خواہش اور ضرورت ہو (قتادہ) ذا مقربۃ قرابت دار ، رشتہ دار (حضرت ابن عباس ، عکرمہ ، حسن بصری ، ضحاک ، سدی) مسند امام احمد میں حضرت سلمان بن عامر کی ایک حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا مسکین کو خیرات دینا ایک صدقہ ہے اور قرابتی کو دینا دوہرا ہے ، ایک خیرات دوسرا سلوک قرابت (رواہ الترمذی والنسائی ایضاً اسنادہ صحیح) ذا متربۃ خاک میں پڑا ہوا مٹی میں آلودہ

حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ مسکین خاکسار جو راہ میں پڑا ہو نہ اس کا گھر ہو نہ خاک سے بچاؤ کا کوئی ذریعہ ۔ عکرمہ نے فرمایا فقیر قرضدار محتاج ۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ایسا فقیر جس کا کوئی دست گیر اور خبر لینے والا نہ ہو ۔ قتادہ اور مقاتل نے فرمایا عیال دار محتاج ایک روایت میں حضرت ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے ۔ تمام معانی مآل کے اعتبار سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغرور مال دار انسان کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال (مہمان نوازی وغیرہ میں یا رسول اللہ ؐ کی مخالفت میں) خرچ کر ڈالا ، مگر چونکہ یہ خرچ نمائشی اور نام نمود کے لئے تھا ، اس لئے بے جا ، غیر ضروری اور بے بنیاد تھا ۔ رہ گزر حیات کی دشوار گذار گھاٹی تو قرابتدار یتیموں کو کھلانا پلانا ، دینا دلانا اور خاک نشین مفلسوں کی پرورش کرنا ہے جس نے یہ گھاٹی طے کر لی اس کو منزل سعادت و نجات مل گئی اور ان سب سے مقدم غلاموں کی آزادی ہے ۔ انسانیت کی حریت ہے ۔ گردنوں سے غلامی کا طوق کھول دینا اعلیٰ ترین مصرف مالی ہے ۔ اگر یہ دشواری قابلِ برداشت نہ ہو تو پھر یتیموں کی نگہداشت اور پرداخت کا نمبر ہے اور یتیم بھی سب سے اول وہ جو قرابتدار ہو ۔ ایک تو اس کی یتیمی ہی اس کو مستحق بناتی ہے دوسرے نسبتی قرابت موجب استحقاق ہے ۔ آخر میں ان خاک نشین فقراء کی پرورش ضروری ہے جو واقعی مسکین ہیں سخت ضرورت مند ہیں ۔ نانِ شبینہ کو محتاج ہیں ۔

یاد رکھو کہ لفظ اطعام (کھانا کھلانا) حصر کے لئے نہیں ، اس سے مراد پکا کر کھانا دینا ہی نہیں ، نہ فقط لقمات معاشی مقصود ہے یہ لفظ تو بنیادی ضرورتوں میں سے سب سے اہم ضرورت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے ۔ حفظانِ صحت ، علاج مرض ، سکونت ، لباس ، تعلیم سب ہی بنیادی ضرورتیں ہیں ، لیکن بقائے حیات کے لئے کھانے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے ۔ مدنیت کی وسعت بنیادی ضرورتوں کو بڑھاتی چلی جائے گی ۔ اور ہر ضرورت کو پورا کرنا سرمایہ داروں کا فرض بھی ہے ۔ مگر کھانا کھلانا اور کسی کو فاقے سے نہ مرنے دینا تو سب اساسی ضروریات میں اہم ترین ہے ، اسی لئے دوسری امانتوں کا ذکر نہیں کیا اور صرف لفظ اطعام فرمایا ۔ مگر غلاموں کی آزادی یا یتیم پروری اور غریب نوازی اگر ان میں سے کوئی اچھے سے اچھا عمل داعیۂ نفس اور جذبۂ خود پرستی کے زیرِ اثر کیا جائے یا خود ساختہ دماغی تراشیدہ ضابطۂ زندگی کے تحت عمل میں لایا جائے تو بعض اوقات وہ بالکل ناکارہ غیر مفید بلکہ مضر ہوتا ہے اور بعض اوقات بظاہر نفع بخش ہوتا ہے مگر اس کا نفع ناقص ہوتا ہے ۔ اس لئے اس معروف خیر کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کی حاکمیت پر ایمان ہو ، اسی لئے فرمایا

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ نہ زندگی کی دشوار گذار گھاٹی (یعنی غلاموں کی آزادی ، یتیم پروری اور غریب نوازی) میں داخل نہ ہونا اور اس کو طے نہ کرنا اخلاقی معاشرتی اور سماجی عملی جرم ہے اور سنگ دل مالدار کافر اس جرم کا مرتکب ہے ، لیکن اس سے بڑا اور سنگین جرم تو بنیادی عقیدہ کی غلطی ہے ۔ یہ جماعت مومنین میں داخل نہیں ۔ خدا صفات خدا مبدء معاد اور رسالت و احکامِ رسالت پر اس کو یقین نہیں ۔ وہ صحیح فکر کے ساتھ ان چیزوں کو مانتا ہی نہیں ۔ مجموعۂ آیات کا مطلب اس طرح ہوا کہ مغرور مال دار کافر اول تو سعادت و نجات تک پہنچانے والی راہ پر ہی نہیں چلا ۔

غلاموں کی آزادی، یتیم پروری اور غریب نوازی کی راہِ نجات سے اس نے سرتابی کی بلکہ اس سے بھی بڑا جرم یہ کیا کہ اللہ کی ذات صفات رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور جزا سزا کی حقانیت کو بھی اس نے صحیح طور پر نہیں مانا۔

تنبیہ کلام عربی میں ثُمَّ تاخیر کے لئے آتا ہے یعنی ثُمَّ سے پہلے کلام کی نسبت کا زمانہ ثم کے بعد والے کلام کی نسبت سے مقدم ہوتا ہے۔ یہ ثُمَّ کا حقیقی استعمال ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے آیات کا مطلب غیر واضح بلکہ معکوس ہو جاتا ہے۔ پہلے غلاموں کی آزادی اور یتیم پروری ہو پھر مومن بنے۔ حالانکہ ایمان ایک بنیادی نظریہ ہے اس کا زمانہ مقدم ہے اور دوسرے اعمال خیر کا مؤخر۔

امام رازی نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے اس جگہ ثُمَّ کو محض تاخیر بیان کے لئے قرار دیا ہے۔ رشاید رازی کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اعمال خیر کا درجہ ایمان کے مقابلے میں ادنیٰ ہے اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ترقی ہوتی ہے اس لئے بیان میں بھی اعمالِ خیر کا ذکر پہلے کر دیا اور ایمان کا ذکر بعد اور ثم اس جگہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ترقی کو ظاہر کر رہا ہے۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ مطلب بالکل صاف ہے اور ثُمَّ کو حقیقی معنی یعنی تاخیر زمانی میں بھی اگر اس جگہ قرار دیا جائے تو کوئی خرابی نہیں۔ کیونکہ غلاموں کو آزاد کرنا اور یتامیٰ و مساکین کو کھانا کھلانا تو ہر کیش و مذہب میں مستحسن ہے اور ہر مذہب و ملت والے اس کو اچھا سمجھتے ہی ہیں اور اس ضابطۂ خیر سے سرکشی کرنے والوں کو بداخلاق ہی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ عرب کے مشرک حالتِ شرک میں بھی غلاموں کی آزادی، یتیم پروری اور غریب نوازی کو فعل حسن ہی جانتے تھے۔ آیات میں یہ بتایا مقصود ہے کہ اسلام سے پہلے بھی محاسن اخلاق سے یہ شخص محروم تھا پھر اسلام آیا تب بھی ایمان اور حق پرستی سے محروم رہا۔ گویا وہ ہر دور میں بدبخت رہا اور مجمع القباحتین قرار پایا۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ رازی اور اکثر علماء نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ صبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ ممنوعات سے نفس کو روکنا اور طاعات پر ثابت قدم رہنا اور راہِ حق میں جو حوادث و مصائب آئیں ان کو استقامت کے ساتھ برداشت کرنا اور کسی اللہ کے اوامر و نواہی سے روگرداں نہ ہونا۔ گویا صبر کا تعلق اللہ کے اوامر و نواہی اور تقدیری مصائب سے ہے۔ خواہ کسی ممنوع چیز سے نفس کی باز داشت ہو یا کسی اطاعت اور حکم خداوندی کی تعمیل میں پیش آنے والی مصیبت پر ثبات و استقامت اور مرحمت کا تعلق مخلوق سے ہے۔ فقراء، مساکین اور دوسرے بے زر بے پر لوگوں پر ترس کھانا اور ان کی امداد کرنا رحم کی مختلف شاخیں ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا جو اہل ایمان باہم ایک دوسرے کو اللہ کے احکام پر پابند رہنے اور مخلوق پر رحم کرنے کی نصیحت کرتے ہیں یہ ان میں وہ مغرور کافر شامل نہ ہوا۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ انسان یا مالدار ہوتا ہے یا نادار، تندرست اور طاقتور ہوتا ہے یا بیمار اور کمزور، حاکم ہوتا ہے یا محکوم۔ خادم ہوتا ہے یا مخدوم، مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے یا عافیت میں آزاد۔ بہر حال دکھ سکھ اور قوت و ضعف کا یہ تضاد اس دنیا میں جاری ہے۔ نادار کمزور، بیمار، مصیبت میں گرفتار اور ذلت و غلامی کا شکار اپنے کو بے کس بے بس سمجھ کر حوصلہ توڑ دیتا ہے۔ ہمت ہار دیتا ہے۔ اس کے اخلاقی اقدار تباہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جی چھوڑ بیٹھتا ہے۔ خدا کی طرف سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے اور اپنی صداقت و حق پرستی کو متاعِ سوختنی اور ایمان و یقین کو بنبرم فروختنی سمجھنے لگتا ہے اور واقعی اس کا دین و ایمان، اس کا علم و عرفان، اس کی شرافت و انسانیت اس کی ساری ترقی پذیر اور تعمیر اخلاقی طاقتیں فروخت ہو جاتی ہیں یا پژمردہ اور افسردہ ہو کر آخر میں مردہ بن جاتی ہیں۔ خسر الدنیا والآخرۃ وذلک ہو الخسران المبین۔

لیکن کچھ نادار، مصیبت میں گرفتار، حوادثِ زمانہ کا شکار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ راہِ حق میں ہر پیش آنے والی مصیبت کو راحت اور ہر اذیت رساں رنج کو سکھ خیال کرتے ہیں۔ حوادث کا طوفان اور مصائب کا سیلاب ان کے ایمانی اور اخلاقی قدموں کو جنبش نہیں دے سکتا وہ انسانیت اور حق پرستی کی راہ سے نہیں ہٹتے۔ ان کی استقامت، بلندی، حوصلہ، رفعت، ہمت، اللہ پر اعتماد و بھروسہ اور ایمانی پختگی آفات و بلیات میں پھنس کر اور چمک جاتی ہے۔ آگ میں پڑ کر کندن بن جاتی ہے ہر عسر کے بعد یسر اور ہر دکھ کے بعد سکھ کا ان کو یقین ہوتا ہے۔ وہ کسی سعی و عمل سے کسی صورت میں دریغ نہیں کرتے۔ خود بھی اپنے نظریۂ حق اور فکرِ صداقت پر ثابت

قدم رہتے ہیں۔ اور اپنے ہم فکر لوگوں کو بھی ثابت قدم اور مستقیم العمل رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مبارک ہیں ایسی پرنور، بلند و مسلم ہستیاں اور قابل مدح خداوندی ہیں۔ یہ ثابت الجنان، ثابت اللسان اور ثابت الارکان اہل ایمان فاولئک الذین سعدوا و سادوا۔ دوسرے رخ پر دولت مند، زردار، ہمہ گیر حکمران اور طاقتور حیوان ہیں جو اپنے نشہ میں مست ہیں۔ دولت کی نشہ آفرینیاں حکومت کی سرمستیاں بلکہ خومستیاں اور جوانی و طاقت کی سکرانگیزیاں کیف بیزیاں آدمی کو آدمیت سے پرے پھینک دیتی ہیں۔ طاقتور کمزور کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ بندۂ زر یتامیٰ و مساکین کو ترساتا ترٹپاتا بلکہ کچوکے لگاتا ہے۔ حاکم محکوم کو غلام سمجھتا ہے اس کو ستانے میں لذت محسوس کرتا ہے اس کی عزت سے کھیلتا ہے۔ جوان تندرست بیمار ناتواں کی خدمت کرنے کی بجائے اس کو حقیر جاننا اور اپنی صاف ستھری زندگی کے لئے عفونت آگیں بورا سمجھتا ہے، لیکن ایسے بدمست، رعونت کیش انسان تا بعیرلوں کے مقابل ایک ایسا انسان بھی ہے جو دولت صحت طاقت اور حکومت کو اللہ کی نعمت جانتا ہے۔ بدمستی کے ان اربعہ عناصر کی موجودگی میں اس کا انسانی مزاج نہیں بگڑتا۔ وہ سرکش کے سامنے سربلند رکھتا اور بے کس کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ اپنے مال کو یتیموں اور مسکینوں کا مال اور اپنی طاقت کو کمزوروں کی طاقت، اپنی صحت و توانائی کو بیماروں کی صحت اور اپنی حکومت کو مظلوموں کی حکومت جانتا ہے۔ وہ ہر نادار پر مہربان، ہر کمزور کا شفیق، ہر مظلوم کا مددگار ہر بیمار کا خدمت گار اور ہر مجبور کا ہمدرد ہوتا ہے۔ وہ اپنی دولت، حکومت، طاقت اور صحت کا حاصل اسی بات کو جانتا ہے کہ ان چیزوں کو اہل حاجت کے کام میں لائے اور دوسرے بالادست لوگوں کو بھی نصیحت کرتا ہے کہ زیر دست طبقہ پر شفقت کرو۔ پس ایمان والوں کے ایمان راسخ کا یہی تقاضا ہے کہ زیر دست اور ہر طرح ناتواں ہو تو کسی حالت میں ثابت قدم رہیں۔ اور دوسروں کو استقامت رکھنے کی نصیحت کریں اور بالادست صاحب مقدرت ہونے کی صورت میں اللہ کے کمزور بندوں پر رحم کریں خود بھی ان کی عزت کریں اور دوسرے اصحاب مقدرت کو بھی رحم کی تلقین کریں، لیکن وہ مغرور کافر جو اسلام سے پہلے بھی جذبۂ رحم سے عاری تھا اور دور اسلامی میں بھی ایمان سے بے بہرہ رہا۔ وہ قوت و ضعف بالادستی اور زیر دستی، حاکمیت اور محکومیت غرض کسی حال میں ایمانی تقاضا پورا نہیں کرتا جو لوگ ایمانی تقاضوں کو ہر حال میں پورا کرنے والے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ۔ وہی دائیں جانب والے ہیں یا برکت و سعادت والے ہیں۔ (زمخشری فی الکشاف)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ اور جن لوگوں نے اللہ کے احکام کا انکار کیا

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ۔ وہی بائیں جانب والے ہیں یا منحوس اور بدبخت ہیں۔ اللہ کے احکام کا انکار دو طرح ہوتا ہے ۱۔ رسالت کا انکار کر دیا جائے اور رسول کو رسول ہی نہ مانا جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ رسول جن احکام کو خداوندی احکام کہتا ہے ان کا انکار ہو جائے گا۔ کیونکہ زعم میں وہ احکام رسول کے ساختہ پرداختہ ہوں گے۔ خدا کے بھیجے ہوئے نہ ہوں گے ۲۔ خدا کی ہستی یا ہستی کی ضرورت ہی کا انکار کر دیا۔ اپنی انفرادی یا اجتماعی عقل کو صحیح غلط مفید مضر اور خیر و شر کا امتیاز کرنے اور ضوابط حیات وضع کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ خدا کی ہستی ہی نہیں ہے اور بالفرض اگر ہے تو تشریعی احکام کے لئے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں طرح کے کافروں کو منکر احکام خداوندی کہا جاتا ہے اور آیت میں دونوں قسمیں مراد ہیں۔ قیامت کے دن دائیں جانب جنت۔ اور بائیں جانب دوزخ ہوگی۔ اس لئے اصحاب المیمنہ اہل جنت اور اصحاب المشئمہ جہنمی ہوں گے۔ میمنہ کا مادہ یمن اور مشئمہ کا مادہ شؤم ہے یمن کا معنی ہے برکت و سعادت اور شؤم کا معنی ہے برکت و سعادت اور شؤم کا معنی ہے نحوست اس لئے زمخشری نے اصحاب الیمن اور اصحاب الشؤم سے ترجمہ کیا ہے۔ اصحاب الیمن بھی اہل جنت ہی ہوں گے اور اصحاب الشؤم دوزخی۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ۔ مؤصدۃ۔ مطبقۃ۔ سرپوش ڈھکی ہوئی حضرت ابو ہریرہ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، مجاہد، محمد بن کعب علیہ، عوفی، حسن بصری، قتادہ، سدی، حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں آیا ہے مؤصدہ سے مراد یہ ہے کہ اس کے دروازے جہنم کے بعد ہر طرف سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ مجاہد نے اس کو صد قرار دیا ہے۔ ضحاک نے کہا آگ اس طرح محیط ہوگی کہ کوئی دروازہ ہی نہ ہوگا۔ قتادہ نے کہا نہ اس کے اندر روشنی ہوگی نہ نکلنے کی راہ۔ ابو عمران جونی نے کہا وہ آسمان کو کبھی نہیں دیکھیں گے (ابن ابی حاتم)

دعوتِ نظر

شیخ ابن العربی نے لکھا ہے کہ ہذا البلد بلد حرام ہے۔ مقدس شہر یعنی رفیق اعلیٰ کی بستی۔ وادی بک۔ انت حل۔ یعنی وادی بک

اور رفیق اعلیٰ کی بستی میں پہنچ کر آپ کے لئے تمام صفات نفس اور آلائش طبیعت سے آزادی ہے اور یہی حقیقی آزادی ہے ۔ والد روح القدس ہے اور ما ولد نفوس ۔ روح القدس تمام نفوس قدسیہ کا سرپرست ہے ، سردار ہے ۔ فی کبد یعنی انسان اپنے نفس اور اس کی خواہشات کی مشقت میں گرفتار ہے

ایحسب ان لم یرہ احد کیا وہ جانتا ہے کہ اس کی باطنی نیت سے کوئی واقف نہیں

الم نجعل له عینین ابن عطاء نے کہا یعنی ظاہری آنکھیں آثار قدرتِ الٰہیہ دیکھنے کے لئے اور باطنی کی آنکھیں مواقع غیب کا مشاہدہ کرنے کے لئے ۔ شیخ العرائس نے لکھا ہے کہ قلب کی آنکھ سے بڑھ کر روح کی آنکھ ہے اور روح کی آنکھ سے بڑھ کر سر باطنی کی آنکھ ہے ۔

فلا اقتحم العقبة شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ عقبہ نفسانی خواہشات کی گھاٹی ہے ۔ اس میں اقتحام ، ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعہ سے قلب کا پردہ ہٹانا ہے ۔

فک رقبة واسطی نے کہا نفس کو خواہشات کے آزاد کرنا اور افعال و طاعات کو ترک کرنا فک رقبہ ہے ۔ قاسم نے کہا مخلوق کی بندگی سے آزاد کرنا اور طاعتِ الٰہیہ میں نفس کو لگانا فک رقبہ ہے ۔ ابن عربی نے کہا جی کی خواہش کو ختم کر دینا نفسانی مرغوبات سے بالکل الگ ہو جانا فک رقبہ ہے ۔ شیخ العرائس نے کہا نفس کی قید سے آزاد ہو جانا فک رقبہ ہے

یتیما ذا مقربة او مسکینا ذا متربة ۔ یتیم حقیقت میں وہ ہے جو مقام مواصلت سے منقطع ہو جائے اور مسکین وہ عاشق ہے جو عشق میں حیران اور مسجد کی خاک میں آلودہ ہو

اصحب المیمنة عالم قدس کے رہنے والے ۔ اصحب المشئمة ہمیشہ گندگی میں پڑے رہنے والے علیہم نار موصدة ان پر طبیعت کی آگ غالب ہے ۔ ہر طرف سے طبیعت کی آگ میں محبوس ہیں ۔ روح کی طرف جانے کا ہر راستہ بند ہے ۔ یاد رکھو یہ ساری متصوفانہ تشریح تفسیر آیات نہیں بلکہ حقیقت شناسوں کے لئے دعوتِ نظر ہے ۔ تفسیر وہی ہے جو تحلیل الجزاء کے ذیل میں بیان کی گئی ہے ۔

مقصودِ بیان

لا اقسم بهذا البلد ۔ سے مکہ شریف کی جلالت قدر مترشح ہے اور اس امر پر بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ مکہ سے اللہ کو محبت ہے ۔ ووالد وما ولد کا فقرہ دعوت دے رہا ہے اس بات پر غور کرنے کی کہ انسان و حیوان کا تناسلی سلسلہ بڑا حیرت انگیز ہے ۔ باپ کے نطفہ میں یہ صلاحیت ہو کہ اس سے اسی کی نسل کا کوئی مکمل فرد بن جائے اور پھر اس فرد کا پوری خصوصیات نوعی کا حامل بن کر آنا عجیب صنعتِ الٰہیہ اور قدرتِ خالقیہ ہے ۔ جس کی نظیر کوئی دانشور آج تک ایجاد نہ کر سکا بلکہ سلسلۂ تولید کو دیکھ کر اسباب و نتائج کو مطالعہ کرنے کے سوا کبھی آنا نہ سمجھ سکا کہ نطفہ خلاصۂ والد کیسے ہوتا ہے اور اس سے اولاد کیوں بنتی ہے ۔ نطفہ کے اندر ایسے خواص کیوں ہیں اور کیسے ہیں کہ اس سے بچہ بنتا اور پورے خواص نوعی کا حامل بنتا ہے اور رحم مادر کی قوت مصورہ بچہ کا ہر خاص خاص عضو نطفہ کے اسی جز سے کیوں اور کیسے بناتی ہے جو باپ کے اسی عضو سے کھینچ کر آتا ہے ۔ مصورہ کی تصویر کشی کے وقت باپ کے کان کے جز نطفی سے بیٹے کی آنکھ کیوں نہیں بنتی اور باپ کی آنکھ کے جز نطفی سے بیٹے کا کان کیوں نہیں بنتا ۔ پھر باپ کی آنکھ کی سفیدی سے جو رطوبت کھنچ کر آتی ہے اس سے بیٹے کی آنکھ کی پتلی کیوں نہیں بنتی اور پتلی کی رطوبت سے بیٹے کی آنکھ کی سفیدی کیوں نہیں بنتی ۔ علیٰ ہٰذا یہ سلسلہ توالد و تناسل اپنے اندر لاکھوں درس بصیرت اور لا تعداد عبرت رکھتا ہے اور ہر درس اتنا تعجب انگیز اور حیرت آفریں ہے کہ اس کی توضیح کے لئے بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی کافی نہیں ہیں ۔ قسم تین طرح کی ہی ہوتی ہے یا تو جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ قسم کھانے والے کی نظر میں جلیل القدر عظیم المرتبہ ہوتی ہے یا محبوب ہوتی ہے یا تعجب انگیز ہوتی ہے ۔ مکہ شریف کی قسم سے مکہ کی عظمت و محبت کی طرف اشارہ ہے اور ووالد وما ولد سے سلسلۂ توالد کے فی نفسہ حیرت انگیز ہونے کی طرف اور وانت حل سے محبت رسول اور محبت مکہ بھی ٹپک رہی ہے ۔ اور آئندہ فتح مکہ ہونے کی پیشین گوئی بھی ۔

لقد خلقنا الانسان فی کبد کا اطلاق بتا رہا ہے کہ انسان مہمل مطلق العنان نہیں ۔ یہ آغاز آفرینش سے مدارج تخلیقی بھی بد شواری طے کر رہا ہے ۔ اس کو تخلیقی حریت بھی میسر نہیں اور احکام تشریعی کی صعوبت میں بھی گرفتار ہے ۔ اس کو نہ جسمانی خود مختاری حاصل ہے نہ تصوراتی عملی آزادی اور

برائے نام جتنی آزادی ارادہ حاصل ہے وہ بھی تحقیقاً انتہائی صعوبت آگیں ہے۔ ایحسب ان لن یقدر علیہ احد اور ایحسب ان لم یرہٗ احد میں اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور علم یا رویت خداوندی کا احاطہ ثابت ہوتا ہے۔ بداعمالی اور فساد نیت وضمیر کی اصل علت یہ ہے کہ آدمی اپنی مالی جسمانی طاقت یا حکومت کے اقتدار کو کامل اور مستغنی قرار دے لیتا ہے۔ کسی بالادست اور اپنے سے اونچی طاقت کو نہیں مانتا، اس لئے طاقت کے نشے میں ہر برے سے کام پر جسارت کرنے لگتا ہے اور اگر ملوکیت، سلطنت یا وقتی حکومت کو اپنے اقتدار سے اعلیٰ سمجھتا بھی ہے تو خیال کرتا ہے کہ میری بدکرداری مخفی رہے گی۔ کوئی اس کو جاننے والا نہیں۔ خصوصاً وہ بداعمالی جو خوش کرداری کے روپ میں ہو بظاہر اچھی ہو اور باطن میں اس کی بناء خبث نفس، دھوکہ دہی، فریب، مکر، لالچ اور خودغرضی پر ہو۔ نیت وضمیر کی خرابی چونکہ پوشیدہ ہوتی ہی ہے اور کردار کی ظاہری شکل اچھی ہوتی ہے، اس لئے شکر نے اندرونی زہر سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے مذکورہ بالا آیات میں اپنی قدرت کی بالادستی اور علم کی ہمہ گیری ظاہر فرما دی۔ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے بدکردار طاقتور حکمرانوں، آقاؤں اور ظالم مال داروں کو اور مکار، ریاکار، فریبی، کھوٹے صوفیوں اور درویشوں اور عالموں کو جو لوگوں کے دکھانے اور مخلوق کی نظر میں عزیز، متقی اور صالح بننے کے لئے ظاہری نیک اعمال کرتے ہیں۔ اور باطن میں خلوص نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد دین سے دنیا کا حصول ہوتا ہے۔ اور دنیوی سیادت، قیادت، دولت اور عزت کے علاوہ ان کا اولین مقصود کوئی اور نہیں ہوتا۔ الم نجعل لہ الخ سے اس طرف اشارہ فرمایا۔ ہے کہ مرئیات کو دیکھنے کے لئے انسان کو ظاہری آنکھیں دی گئی ہیں اور معقولات کو دیکھنے کیلئے باطنی آنکھیں آدمی یا محسوس کا علم حاصل کرتا ہے۔ یا غیر محسوس کا ظاہری حسن و قبح دیکھنا چہرہ کی آنکھ کا کام ہے اور کسی چیز کی ظاہری شکل دیکھنے کے بعد یا ناقابل رویت اشکال کو دیکھنے کے بعد اچھا برا نتیجہ اخذ کرنا چشم باطن اور عالم عقل کا کام ہے پھر دیکھی اور سمجھی بات کو ظاہر کرنا اور دوسروں کو بتلانا لب و زبان کا فریضہ ہے۔ حصول علم کے مذکورہ بالا دونوں ذریعہ (یعنی چشم ظاہر و چشم باطن) ہیں تو فطری اور تخلیقی، مگر ان سے کام لینے میں انسانی قصد و اختیار کو دخل ہے۔ اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز آدمی آنکھوں سے دیکھ کر یا غور و فکر سے کام لے کر کرتا ہے لیکن تیسرا ذریعہ موہبی اور فطرت کا عطائی محض ہے۔ وہ ہے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ سے حق و باطل اور خیر و شر کا فیصلہ۔ اللہ نے ہر انسان کے سامنے دونوں راستے کھول دیئے ہیں اور پیغمبروں نے سیدھا اور ٹیڑھا راستہ الگ الگ بتا دیا ہے۔ اسی موہبی اور عطائی ذریعہ علم کی طرف ہدیناہ النجدین میں اشارہ ہے۔

فک رقبۃ۔ پورے غلام کو یا شرکت کے غلام کو اپنے حصہ یا مکاتب کو یا قرض دار کی گردن کو قرض کی قید سے رہائی دلانا سب کو یہ لفظ شامل ہے۔ جو ملکم رعایا کو اور جو مخدوم خادم کو غلام سمجھتا ہے اس کے پنجۂ ظلم سے محکوم یا خادم کو رہائی دلانے کو بھی شاید یہ لفظ شامل ہے۔ یتیم پروری خصوصاً رشتہ دار یتیم کی نگہداشت اور غریب نوازی کا ہر وقت کے نزدیک اچھا فعل ہے۔ اسلام نے بھی اس کو مستحسن اور بعض مواقع پر واجب قرار دیا ہے مگر ذا متربہ کے بعد ثم کان من الذین آمنوا اور آخر میں الذین کفروا بآیاتنا اولئک اصحاب المشئمۃ کہہ بتا رہا ہے کہ ایمان کے بغیر یہ اچھے اعمال بھی آخرت میں مفید نہیں ہوں گے۔ دنیا میں قومی استحکام، جماعتی طاقت اور عمومی راحت اگرچہ حاصل ہو جائے اور یہ منافع دنیا میں حاصل ہوتے بھی ہیں مگر آخرت میں ایمان کا انکار کرنے والے اصحاب المشئمۃ ہی ہوں گے۔ تواصوا بالصبر اور تواصوا بالمرحمۃ میں اہل ایمان کا فریضہ یاد دلایا گیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کے بعد دکھ میں ثابت قدم رہنا اور سکھ میں دوسروں پر رحم کرنا اگرچہ ضروری ہے مگر خود نمونۂ عمل بننے کے بعد دوسروں کو بھی صبر و رحمت کی نصیحت کرنی واجب العمل ہے۔ ہر نظریۂ زندگی خواہ انسان کا ساختہ پرداختہ ہو یا خدا کا بھیجا ہوا۔ باطل ہو یا حق ہر حال اس کا فروغ دو باتوں پر موقوف ہے۔ ۱۔ اس نظریہ کو اپنانے والے شروع میں کتنے ہی کمزور، بے بضاعت اور بے کس ہوں لیکن اس دستور کے سانچہ میں اپنی زندگی ڈھال لیں۔ اور اس پر قائم رہنے یا اس کو پھیلانے کی راہ میں جو مصائب اور دشواریاں سامنے آئیں ان کی پرواہ نہ کریں۔ پست حوصلہ نہ بنیں اور منزل سے اپنے عمل کا رخ نہ پھیریں اور جب کہ دکھ و محنت اور استقامت کے بعد کامیابی حاصل ہو جائے اور طاقت ہاتھ میں آجائے تو

۲۔ کمزوروں پر ظلم نہ کریں۔ کسی حقدار کی حق تلفی نہ کریں۔ زیر دستوں کی بہبودی کے طلب گار رہیں اور ہر ایک سے مہربانی کا سلوک کریں۔ خود بھی ایسا ہی کریں اور دوسروں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت کریں۔ آیت مذکورہ میں انہی دونوں اصولوں کی طرف اشارہ ہے۔

پس علمائے دین ہوں یا دوسرے اہلِ تبلیغ سب کے لئے اس جملہ میں درسِ نصیحت ہے کہ صبر و استقامت اور رحمت و شفقت کے بغیر تبلیغِ اسلام میں اللہ کامیاب رہے گی۔ صبر پیغمبرانہ اور شفقت مربیانہ لازم ہے وغیرہ۔

سورۃ والشمس

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی یہی روایت ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس سورت کے مکی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے کسی کو اختلاف نہیں۔ اس سورت میں پندرہ آیات۔ ۵۴ کلمات اور ۲۴۷ حروف ہیں (سراج وغیرہ) حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم عشاء کی نماز میں والشمس وضحاہا اور اس کی مانند سورتیں پڑھتے تھے (احمد۔ ترمذی۔ نسائی) حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ معاذ بن جبلؓ سے حضور صلعم نے فرمایا تم نے سبح اسم ربک الاعلیٰ اور والشمس وضحاہا اور واللیل اذا یغشیٰ کیوں نہیں پڑھی (صحاح) حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عشاء کی نماز میں واللیل اذا یغشیٰ اور والشمس وضحاہا پڑھنے کا مجھے حکم دیا (رواہ الطبرانی) حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم نے چاشت کی نماز میں ہم لوگوں کو دو سورتیں پڑھنے کا حکم دیا۔ ایک والشمس وضحاہا اور دوسری والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور چاندنی کی جب سورج کے غروب ہونے کے پیچھے آئے اور (قسم ہے) دن کی جب وہ اس (سورج) کو خوب روشن کردے اور

يَغْشٰىهَا ۝ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝ وَنَفْسٍ وَّمَا

(قسم ہے) رات کی جب وہ اس (سورج) کو چھپالے اور (قسم ہے) آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اسکو بنایا اور زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسکو بچھایا اور (قسم ہے) انسان کی

سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ

جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتیں) اسکو القا کیں یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا جس

خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝

نے اسکو (گناہوں میں) دبا دیا قوم ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالح علیہ السلام) کی تکذیب کی جبکہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ (اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے) اٹھ کھڑا

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ

ہوا تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالح) نے فرمایا کہ اللہ کی اونٹنی سے اور اس کے پانی سے خبردار رہنا سو انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے

عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝

ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت نازل فرمائی پھر اس (ہلاکت) کو عام فرمادیا اور اللہ کو اس ہلاکت کے اخیر میں کسی خرابی کا اندیشہ نہیں ہوا۔

کے نصف اول میں ہو یا نصف دوم میں۔ قرآن کے اطلاق کی تائید علم ہئیات کی شہادت سے ہو رہی ہے
وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ قسم دن کی جب سورج کو روشن کر دے (مجاہد) یا جب وہ سورج کو ڈھانپ لے (قتادہ) یا ظلمت کو دور کر دے (قول بعض علماء رواہ ابن جریر) اوّل ترجمہ کی تائید حضرت ابن عباس کی تشریح سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب دن چڑھتا ہے تو آفتاب خوب چمک جاتا ہے۔ اگرچہ آفتاب کے چمکنے سے ہی روشنی ہوتی ہے۔ ابن جریر نے اسی کو پسند کیا ہے
وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۔ اور قسم رات کی جب وہ سورج کو ڈھانپ لے۔ سورج پر چھا جائے۔ یزید بن ذی حمایہ کی روایت سے ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ رات آتی ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندوں کو ایک عظیم الشان مخلوق نے گھیر لیا۔ رات سے لوگ ڈرتے ہیں۔ حالانکہ ڈرنا اس سے چاہیئے جس نے رات کو پیدا کیا ہے۔ اس روایت اور مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رات بھی ایک وجودی مخلوق ہے۔ یعنی ظلمت عدم النور ہی کا نام نہیں۔ بلکہ تاریکی ایک ایسی موجود چیز ہے جس میں نور شمس نہیں ہوتا۔ صناع حکیم کی عجیب نیرنگی قدرت ہے کہ اس کائنات کی تخلیق متضاد عناصر اور متخالف کیفیات سے کی نہ خالص روشنی ہے نہ دوامی تاریکی نہ ہمیشہ دن نہ زوال رات۔ نور و ظلمت ہمراز ہیں پھر ظلمت خالصہ بغیر آمیزش نور بھی نہیں نہ نور خالص بغیر تاریکی کے شائبہ کے کہیں موجود ہے۔ رات کی تاریکی میں سورج کی روشنی نہیں ہوتی۔ مگر چاندنی ہوتی ہے۔ پھر نصف کرہ میں دن اور نصف کرہ میں رات ایک ہی وقت میں ہوتی ہے نہ کبھی پورا کرہ تاریک ہوتا ہے نہ روشن۔ پھر مزید یہ کہ سورج کی تمازت حرارت بخش ہے تو چاندنی چاندنی فرحت آفریں۔ اور برودت آگیں۔ گرمی سردی کا توارد اور مختلف کیفیات کا تعارض بتاتا ہے کہ عالم نہ خالص خیر کونی ہے جس میں شر کی آمیزش نہ ہو نہ شر محض ہے جس میں خیر کا اختلاط نہ ہو اور ان متضاد احوال کا توازن اور مختلف الآثار کائنات کی حرکت اتنی منظم اور مرتب ہے کہ ذرہ برابر کہیں ٹکراؤ نہیں نہ بے ربطی ہے نہ اختلال ترتیب۔
وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا۔ ما مصدری ہے یعنی قسم ہے آسمان کی اور اس کی ساخت کی (قتادہ) یا ما بمعنی مَنْ ہے یعنی قسم ہے آسمان کی اور اس کو بنانے والے کی (مجاہد)
وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا۔ اور قسم ہے زمین کی اور اس کو بچھانے کی یا بچھانے والے کی۔ جس طرح اس کائنات میں نہ خالص حرارت ہے نہ برودت نہ نور نہ ظلمت نہ خالص نفع نہ سراسر مضرت۔ اسی طرح اس سنسار میں نہ بلندی ہے بغیر پستی کے نہ پستی بغیر بلندی کے نہ کثافت بغیر لطافت کے نہ لطافت بغیر کثافت کے نہ صرف فاعلی قوتیں ہی ہیں۔ اثر پذیر طاقتوں سے محروم نہ صرف منفعل طاقتیں ہیں جن پر کوئی اثر انداز قوت نہ ہو۔ کائنات علویہ اور سفلیہ کا ایک توازن ہے، تناسب ہے، توافق ہے جو گوناگوں تاثیرات و تاثرات کا حامل ہے۔ آسمان قبہ نما بلند ہے اور زمین فرش نما ہموار قابل استراحت۔ طحاہا یعنی اس کو بچھایا اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور لغت عربی کے بھی یہی مناسب ہے، لیکن عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ طحاہا کا معنی ہے زمین میں مخلوق کو پھیلایا۔ شاید اس قول میں آیت کی مراد بیان کی گئی ہے جیسا کہ اکثر اہل تفسیر نے شواہد آیات کے زیر اثر فیصلہ کیا ہے کہ اوّل زمین اور اس کی تمام قوتوں کی تخلیق ہوئی پھر آسمان کی پھر زمین کو بچھایا گیا اور اس میں جانداروں کو پیدا کر کے پھیلایا گیا۔
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ ما مصدریہ ہے یعنی قسم نفس کی اور اس کی درست تخلیق کی۔ انسان کی تقویم احسن ہے۔ جسمانی بھی اور عقلی و شعوری بھی۔ اور روحانی و وجدانی بھی۔ انسان خلاصۂ کائنات ہے، عالم صغیر ہے جو عالم کبیر کا مجمل مجموعہ ہے رات کی ظلمت، دن کی روشنی، چاند کا خنک نور اور سورج کی خیرہ کر دینے والی کرنیں، آسمان کی رفعت، زینت اور ہمہ گیری، زمین کی پستی، قوت نمو اور بہار آفرینی سب انسان کے اندر موجود ہیں۔ آدمی کی جہالت اور کور دماغی رات سے زیادہ تاریک ہے اور اس کی علمی روشنی، عرفانی ضو، آگہی اور نور آفرینی چاند اور سورج کو مات کرتی ہے۔ اسکے تخیلات کی پرواز، تصورات کی بلندی اور ماوراکی وجدانی رفعت آسمان سے اونچی ہے۔ اس کے اندرونی اور بیرونی اخلاق فاضلہ اور روحانی و جسمانی آرائشیں آسمان کی سجاوٹ اور زمین کی بہاروں کو شرمندہ کرنے والی ہیں۔ غرض یہ جو ہر ہستی ہے بسلالہٗ موجود ہے اور بے مثال نمونۂ قدرت ہے۔ اس کی تخلیق کے اندر قوت خیر بھی ودیعت ہے۔ اور قوت شر بھی۔ مادی قوتوں کی موت نما کی بھی ہے اور ہیجانی بیشی بھی۔ اسی طرح روحانی طاقتوں کی افسردگی

اور پژمردگی بھی ہے اور نکھار و بہار کی تمع گیر تی بھی۔ پس لیل و نہار اور شمس و قمر اور سماء وارض جیسی آیات عظیمہ الشان لاتعداد دلائل قدرت میں سے اور اس کی تخلیق کی قسم تمام قسموں کا خلاصہ ہے جو اہل بصیرت کے لئے بڑا لطف آگیں ہے۔

بعض اہل تفسیر نے ما سواہا کی تشریح میں بعض احادیث نقل کی ہیں۔ گویا احادیث کو اس لفظ کی تفسیر قرار دیا ہے۔ صحیحین میں ایک حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ حضرت عیاض کی روایت میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا پھر شیاطین ان کے پاس پہنچ کر ان کو دین سے پھیر دیا۔ (مسلم) ان احادیث کو اگر آیات کی تشریح قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ما سواہا سے مراد ہے دین فطرت یعنی توحید لیکن اس سے آئندہ آیت الھمہا فجورہا و تقواہا کا کوئی ربط واقع نہیں ہوتا بجز تقویم جسمانی اور استعدادی مادی و روحانی کی تکمیل بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے اس فقیر کی نظر میں مذکورہ احادیث با وجود صحیح ہونے کے واشف آیت نہیں ہیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ روشن سورج ہو یا چمکدار چاند سقف بریں ہو یا فرش زمین رات کی پوشش ہو یا دن کی بے پردگی۔ یہاں تک کہ انسان اور اس کی جسمانی ساخت اور علمی وادراکی طاقتیں ہر چیز اپنی آفرینش آغاز آفرینش انتہائے آفرینش مقصد آفرینش اور جگہ جگہ آفرینش میں اللہ کے علم اور قدرت اور حکمت کی محتاج ہے، لیکن مجبور المطلق سرکش انسان کہتا ہے کہ پیدا ہو کر شعوری اور عقلی حدود میں داخل ہونے کے بعد مجھے خدا کی کیا ضرورت۔ میں خود اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہوں خیر و شر کو پہچانتا ہوں، اپنی زندگی کا خود دستور ساز ہوں، واضع آئین ہوں۔ میرا ارادہ میری مشیت، میرا انتخاب اور میری تمام شعوری علمی طاقتیں آزاد ہیں۔ اس باطل خیال کا رد مذکورہ بالا فقرہ سے نکلتا ہے کہ انسان کو اگرچہ علم و اختیار اور ارادہ وادراک کی طاقتیں بخشی گئی ہیں، لیکن ان طاقتوں کو موثر نما اللہ نے اپنے اختیار میں رکھا ہے نفس کے اندر نیکی بدی اور ہدایت و ضلالت کا القاء اور الہام وہی کرتا ہے۔ الہام سے کیا مراد ہے تعیین مراد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ الہام کا لغوی معنی ہے دل میں کوئی بات ڈالنا عرف عام میں اس کا استعمال اچھی بات کے ساتھ مخصوص ہے۔ بُری بات کا قلب میں القاء لغت کے اعتبار سے اگرچہ الہام کہلاتا ہے عرف میں اس کو الہام نہیں کہتے۔ اس جگہ اَلْهَمَ کا معنی ہے سمجھا دیا۔ علم دے دیا۔ (مجاہد و فراء) یا نیکی اور بدی کی راہ بتا دی۔ بیان کر دی۔ (حضرت ابن عباس) مجاہد کا قول دوم یہی ہے۔ قتادہ ضحاک اور سفیان ثوری نے بھی یہی بیان کیا (ابن کثیر) غالباً قول اول کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خیر و شر کرنے کی نفس میں قوت پیدا کر دی ہے اور وہی طاقت خیر و شر کی شناخت کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہر ایک کے دل میں اس کا راہ نما موجود ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان ہوتا ہے۔ فرشتہ نیک کام کا الہام کرتا ہے اور شیطان بُرے کام کا۔ دوسرے قول کا غالباً یہ مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ اللہ نے حق و باطل اور خیر و شر کو ہر شخص کے سامنے کھول دیا ہے۔

ابن زید کے نزدیک الہام سے توفیق مراد ہے۔ نیکی کی توفیق یا اس سے کمزوری۔ دونوں خداداد ہیں۔ زجاج نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ واحدی نے کہا تعلیم اور بیان دونوں چیزیں الہام کے علاوہ ہیں۔ لفظ الہام ان پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لئے الہام سے توفیق خیر و شر سے مراد لینی ہی اولیٰ ہے۔ یعنی تقوی بھی خدا نے ہی پیدا کیا اور فجور کا خالق بھی وہی ہے۔ احمد۔ مسلم۔ عبد بن حمید۔ ابن جریر۔ ابن المنذر۔ اور ابن مردویہ کی نقل کردہ صحیح حدیث ہے۔ جس کے راوی حضرت عمران بن حصین ہیں کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ لوگ جو عمل اور کوشش کرتے ہیں یہ پہلے سے ان کے لئے مقدر ہو چکی ہوتی ہے یا فی الحال جو کچھ ان کے خیال میں آتا ہے وہ کرتے ہیں اور پیغمبر کی تعلیم ان کے لئے باعث ہوتی ہے۔ فرمایا نہیں۔ یہ پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ اس نے عرض کیا جب ہر معاملہ طے شدہ ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا اللہ نے بندہ کو جس منزل کے لئے پیدا کیا ہے اسی کے سامان بھی اس کے لئے فراہم فرما دیتا ہے اور اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں موجود ہے۔ ونفس وما سواہا۔ فالہمہا فجورہا و تقواہا حضرت زید بن ارقم کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ دعا کرتے تھے اللھم آت نفسی تقواہا و زکہا انت خیر من زکاہا انت ولیہا و مولاہا۔ (رواہ ابن ابی شیبۃ واحمد والنسائی و مسلم) امام احمد نے حضرت عائشہ کی روایت سے اور ابن المنذر و طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت

نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے ۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ رسول اللہ جب آیت ونفس وما سوٰاہا فالہمہا فجورہا وتقوٰاہا کو نماز میں پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے ۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ اور تزکیہ اللہ ہی کے دستِ قدرت میں ہے ۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۔ جب تقویٰ اور فجور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے اور توفیقِ خیر دینا یا محروم رکھنا اسی کا کام ہے تو جس کا تزکیہ اللہ کر دے وہی کامیاب ہے اور جس کو گم کرا دے وہ ناکام ہوگا ۔

دسّٰی چھپانا ۔ دسّٰہا ماضی ۔ باب تفعیل ۔ مصدر تدسیس ۔ دوسرے سین کو الف سے بدل دیا ۔ دسیسہ خفیہ جاسوس ۔ دسّ فی متاعہ او را سکے سامان میں کوئی غیر چیز چھپا دی ۔ معتزلہ چونکہ انسان کو اپنے افعال کا خالق جانتے ہیں ، اس لئے اس آیت میں ان کے نزدیک زکّٰی اور دسّٰی کا فاعل من ہے ۔ یعنی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ فلاح یاب ہوا اور جس نے اپنے نفس کو گم کیا وہ نامراد ہوا ۔ نفس کو چھپانے سے مراد ہے خوار اور ذلیل ہونا ، اس لئے کہ عرب میں شہرت اور ناموری کے طلب گار بہادر لوگ اپنے مکانوں کے سامنے رات کو آگ جلاتے تھے تاکہ بھولا بھٹکا مسافر آگ کو دیکھ کر ادھر چلا آئے اور اس طرح ان کا مہمان بن جائے اور دنیا میں ان کی سخاوت کا چرچا پھیلے ، لیکن کنجوس لوگ ایسا نہیں کرتے تھے نہ رات کو آگ روشن رکھتے تھے نہ دن کو دھواں تاکہ کسی کو ان کا مکان معلوم نہ ہو اور کوئی مسافر نہ آ جائے ۔ یہ طریقہ گمنامی ان کی ذلت پر دلالت کرتا ہے ۔ اسی لئے ان کو ذلیل سمجھا جاتا تھا ۔ یا چھپانے اور گم کر دینے سے مراد ہے گناہوں میں گم کر دینا اور جرائم میں چھپانا یا اپنی بدکاری کو نیکی کے گروہ یا نیکی کے لباس میں چھپا دینا ۔

معتزلہ کے علاوہ باقی اہلِ تفسیر نے زکّٰی اور دسّٰی کی ضمیریں اللہ کی طرف راجع کی ہیں ۔ کیونکہ اللہ ہی ہادی ہے اور اللہ ہی مضل ۔ وہی الہام تقویٰ کرتا ہے اور وہی القاء فجور ۔ خیر و شر کی توفیق اسی کی طرف سے ہوتی ہے ۔ اس جگہ چھپانے سے مراد ہے نجات سعادت اور رحمت سے گم کر دینا الگ کر دینا ، محروم کر دینا جیسے آیت لاتکونوا کالذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم میں نفسوں کو فراموش کرا دینے سے مراد ہے اپنے آپ کو اسبابِ خیر اور اعمالِ نجات سے محروم بنا دینا ۔ پس نامراد رہا وہ شخص جس کے نفس کو اللہ نے گم کرا دیا وہ اپنے نفس کو بھول گیا اور اعمالِ نجات سے اس نے اپنے نفس کو محروم رکھا ۔ اس فقیر کی نظر میں مطلب بالکل واضح ہے اور الفاظ ناقابلِ تاویل ہیں اضلال کا معنی ہے گمراہ کر دینا یعنی اصل راہِ نجات نہ بتانا یا راہِ نجات پر چلنے کی توفیق نہ دینا یا راہِ نجات کو آدمی کی نظر سے اوجھل رکھنا ۔ گویا راہِ سعادت پر چلنے کی توفیق نہ دینا جس کو اللہ نے توفیقِ راہِ نجات دے دی اور وہ راہِ نجات پر چل دیا وہ فلاح یاب ہو گیا اور جس کو گم کر دیا راہِ نجات نہ بتائی یا چلنے کی توفیق نہیں دی وہ نامراد رہا ۔ واللہ اعلم ۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا ۔ گمراہ قومیں تو اس روئے زمین پر بکثرت گذری ہیں اور اللہ نے سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان کو تباہ کیا ہے لیکن قرآن کی زبان عربی ہے ۔ ملکِ عرب اس کی فرودگاہ ہے ۔ نبی عربی مہبطِ اصلی ہیں ۔ قومِ عرب اوّلین مخاطب ہے ۔ ثمود و عاد عربِ عاربہ یا مستعربہ کی شاخیں تھیں ۔ طسم جدیس اور جرہم کی طرح ان کا شمار بھی عرب کی اول ترین اقوام میں ہوتا تھا ۔ ان کے تمدن کی وسعت اور دولت کی فراوانی اور حکومت و اقتدار کی ہمہ گیری کے آثار پیچھے آنے والی عربی قوموں کی نظروں کے سامنے تھے ، اس لئے قرآن نے جہاں سرکش قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے ۔ ان کی تمثیل میں مصر ، یمن ، بابل اور وادی القریٰ کی اقوام ہالکہ کو بطور تمثیل پیش کیا ہے ۔ اس جگہ بھی وقد خاب من دسّٰہا فرمایا تھا ، اس لئے بطور مثال قومِ ثمود کی سرکشی ، نافرمانی اور تباہی کا ذکر فرما دیا ۔

ثمود کون قوم تھی ، کہاں رہتی تھی ۔ اس کی تنقیح ہم کئی جگہ کر چکے ہیں ۔ یہاں تفصیل موجبِ طوالت ہے ۔ قومِ ثمود کے پیغمبر حضرت صالح تھے ۔ ثمود نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی اور معجزہ کے طور پر پہاڑ سے اونٹنی پیدا کرنے کی درخواست کی ۔ حسبِ درخواست معجزہ ظاہر ہو گیا ۔ پھر بھی وہ ایمان نہ لائے بلکہ اونٹنی کو قتل کر دیا ۔ اور اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور طوفانِ غیبی نے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ۔ کذّبت کا مفعول محذوف ہے یعنی ثمود نے حضرت صالح کی نبوت یا آپ کا معجزہ یا ہدایت کی تکذیب اپنی سرکشی کی وجہ سے کی ۔ طغوٰی اسم ہے بمعنی طغیان (سراج) بقول واحدی ، اکثر اہلِ تفسیر نے بھی یہی تشریح کی ہے ۔ محمد بن کعب قرظی نے بطغوٰہا کا ترجمہ با جمعہا کیا ہے یعنی تمام ثمود نے تکذیب کی ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک طغوٰی سے مراد ہے عذاب طاغیہ ۔ جس سے ثمود کو تباہ کیا گیا ۔ اس وقت طغوٰہا مفعول ہوگا ۔ یعنی حضرت صالح نے

جو ثمود کو نافرمانی سے ڈرایا اور عذاب کی دھمکی دی تو انھوں نے عذاب کی دھمکی کو سچا نہ جانا۔

اِذِ انۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا۔ قوم ثمود میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ اونٹنی کو قتل کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا تیار ہو گیا۔ اس کا نام قدار بن سالف تھا۔ سب قوم کا مشورہ طے پایا تھا کہ اونٹنی کو قتل کر دیا جائے اسی لئے آگے کی آیت فَعَقَرُوْهَا میں پوری قوم کی طرف قتل کی نسبت کی ہے قتادہ کا یہی قول ہے۔ ابن کثیر اور رازی نے اس کا نام قدار بن سالف لکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سب سے بدبخت شقی بڑا شریر، بدکار اور طاقت ور فرمایا تھا۔ اور حضرت ابو زمعہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔ اس کا کنبہ قوی تھا، اس لئے اس سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا جیسے قریش میں ابو زمعہ۔ اس حدیث کے راوی عبد اللہ بن زمعہ ہیں۔ (رواہ احمد والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن جریر وابن ابی حاتم) حضرت عمار بن یاسر کی روایت میں قاتل ناقہ کو ثمود کا سرغنہ فرمایا ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ ممکن ہے قاتل چند ہوں۔ اشقاھم میں اشقی مضاف اور ھم مضاف الیہ ہے، اس لئے قاتل کا ایک ہونا ضروری نہیں۔ اس کی تائید فَعَقَرُوْهَا سے ہوتی ہے۔ امام کی یہ توجیہ حدیث صحیح کے خلاف ہے۔ رہ گیا فعقروھا کا جواب۔ تو ظاہر ہے کہ سب لوگ مشورہ میں شریک تھے، اس لئے سب کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی۔ حقیقت میں قاتل قدار ہی تھا۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا۔ امام رازی وغیرہ نے لکھا ہے کہ ثمود کی درخواست پر حضرت صالح کی دعا سے پہاڑ سے اونٹنی پیدا کر دی گئی۔ مگر وہ بہت ہی عظیم الجثہ تھی۔ پانی کی قلت تھی۔ تالاب یا چشمہ کا سارا پانی اونٹنی پی جاتی تھی۔ دوسرے جانور پیاسے رہتے تھے۔ قوم کے لئے اونٹنی مصیبت بن گئی۔ یہ تکلیف دیکھ کر حضرت صالح نے حکم دیا کہ ایک روز کا سارا پانی اونٹنی کے لئے محفوظ رکھا جائے اور دوسرے دن کا سب پانی دوسرے جانوروں کے لئے مخصوص ہو جائے۔ لوگوں نے یہ بات مان لی، لیکن کب تک۔ آخر شرارت پر اتر آئے۔ اور مشورہ کے بعد طے کر لیا کہ اونٹنی کو قتل کر دیا جائے۔ قدار بن سالف ایک قوی ہیکل طاقت ور سرخ رنگ کا شقی القلب آدمی تھا۔ اس کو قتل پر مامور کر دیا۔ حضرت صالح نے فرمایا دیکھو اس اونٹنی سے اور اس کے پانی سے الگ رہو۔ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اور اس کی قدرت کی واضح نشانی ہے۔ اس کو کھانے پینے دو کچھ دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تم پر عذاب آجائے گا۔

ناقۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس اونٹنی کو ایک خصوصی تعلق اللہ سے حاصل تھا نہ تناسلی طور پر اونٹنی نہ تھی بلکہ پتھر سے برآمد ہوئی تھی۔ معمولی اسباب و فطرت سے اس کی پیدائش بالاتر تھی۔ تناسلی سلسلہ بھی اللہ کی قدرت کی نشانی ہے، اگر ہر شخص کو پیش نظر ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور نارسا فہم والے کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہی اور ناقہ صالح سلسلۂ اسباب کے خلاف نمودار ہوئی تھی، اس لئے مادیت زدہ فلسفی اور عامی جاہل سب ہی کے لئے اس کا وجود حیرت آفریں تھا اور سوا اس کے قادر کی قدرت کی ایک مخصوص نشانی قرار دیا جائے اور کوئی احتمال وہمی پیدا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس کو ناقۃ اللہ کہا گیا۔ جیسے حضرت عیسیٰ کو غیر معمولی پیدائش کی وجہ سے روح اللہ فرمایا کہ بغیر باپ کے بچے کی پیدائش اسباب تناسلی کے خلاف تھی یا جیسے کوئی روح جو رحمت و غضب دونوں کی مظہر ہو فرشتوں نے نہیں دیکھی تھی اور آدم میں ان دونوں کا ظہور تھا، اس لئے ملائکہ سے فرمایا تھا نفخت فیہ من روحی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا۔ قوم ثمود نے وعید عذاب کو جھوٹ سمجھا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں وہ بیچاری مر گئی۔ حضرت صالح کو اونٹنی کے قتل کی اطلاع ملی آپ فوراً مقام جرم پر پہنچے اور واقعہ کی ہولناکی دیکھ کر فرمایا تمتعوا فی دارکم ثلثۃ ایام تین روز تک اپنے گھروں میں مزے کرتے رہو۔ تین روز کے بعد تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ آخر تین روز کے بعد۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا۔ جرم کی سزا میں اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور اللہ نے سب کو برباد کر دیا۔ یکساں سب پر عذاب نازل فرمایا۔ دمدم علیھم یعنی اللہ نے ان پر غضب نازل فرمایا (ابن الانباری وابن کثیر) یا ان پر عذاب محیط کر دیا اور ڈھانپ دیا (زجاج، ابو السعود وخطیب) ابن الاعرابی اور فراء نے کہا زمین میں زلزلہ پیدا کر دیا اور زمین نے زلزلے میں ان کو گرفتار کر لیا۔ سوّاھا کا ترجمہ امام رازی نے کیا ہے کہ دمدمہ کا عذاب ان سب پر عام کر دیا۔ یعنی جبرئیلؑ کی چیخ سے یکدم سب مر گئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ دمدم علیھم کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے ان کو زمین میں دفن کر دیا اور

سواہا کا معنی یہ ہے کہ ان پر خاک برابر کردی، نشان بھی مٹا دیا۔

وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا۔ اور اللہ کو ان کے انجام کا کوئی خوف نہیں۔ (حضرت ابن عباس، حسن بصری، مجاہد، بکر بن عبداللہ المزنی) یعنی اللہ کا یہ فعل حق اور مبنی بر حکمت تھا، اس لئے انجام کا اس کو خوف نہیں۔ (رازی) اس فقیر کے نزدیک سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ثمود کی تباہی سے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ اگر یہ قوم تباہ ہو جائے گی تو پھر دنیا سے تمدن اٹھ جائے گا۔ آبادی جاتی رہے گی، صنعت برباد ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ان باتوں سے بے نیاز ہے۔ وہ قادر مختار ہے جیسا چاہتا ہے ویسا کرتا ہے۔ ضحاک اور سدی نے لا یخاف کی ضمیر قاتل ناقہ کی طرف راجع کی ہے کہ اس نے تو ثمود کے انجام کا کوئی خوف نہیں کیا اور بے باکی کے ساتھ اونٹنی کو قتل کر دیا۔

مقصودِ بیان

والشمس سے وما طحاہا تک مخفی ایماء ہے اس بات کی طرف کہ تاریکی اور روشنی، بلندی و پستی، وجود و عدم ہمہ الٰہیہ اور امور اضافیہ ہیں۔ ونفس وما سواہا کا لفظ دلالت کر رہا ہے نفس کی جامعیت اور تخلیقی حیرت انگیزی پر۔ فالہمہا الخ میں صراحت ہے کہ خیر و شر اور نیکی و بدی کا الہام یا توفیق یا تعلیم خدا کی طرف سے ہے۔ قد افلح سے واضح ہے کہ ہر شخص کا ایمان و کفر ہدایت و ضلالت منجانب اللہ ہے وغیرہ۔

سورۃ اللیل

سورۃ اللیل مکی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر سے یہی منقول ہے۔ جمہور سلف کا یہی قول ہے۔ بعض علماء نے خصوصی شان نزول کی وجہ سے اس کو مدنی کہا ہے۔ اس میں ۲۱ آیات ۔ ۷۱ کلمات اور ۳۱۰ حروف ہیں (سراج منیر) حضرت جابر بن سمرہ کی روایت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں رسول اللہ والیل اذا یغشیٰ اور اس کی مانند (کوئی دوسری سورت) پڑھا کرتے تھے (بیہقی، حضرت انس کی روایت سے بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ نے ظہر کی نماز میں سورۃ والشمس وضحاہا اور والیل اذا یغشیٰ پڑھی (الطبرانی فی الاوسط) امام رازی نے قفال کا قول نقل کیا ہے کہ اس سورت کا نزول حضرت ابوبکر صدیق اور امیہ بن خلف کے حق میں ہوا۔ گویا اعطیٰ اور صدق میں حضرت ابوبکر صدیق کی خصوصی مدح اور من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ میں امیہ کی مخصوص مذمت کی گئی ہے۔ لیکن حکم بہرحال عام ہے (کبیر مع تغیر بعض الالفاظ) حضرت علی کی ایک طویل روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمل کئے جاؤ۔ ہر ایک کو وہی میسر ہوگا جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ پھر حضور نے پڑھا فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واما من بخل واستغنیٰ الخ (بعض الصحاح) اس حدیث میں روئے خطاب عموم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکم بھی عام ہے۔ مزید توضیح تحلیل اجزا کے ذیل میں پڑھو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝ إِنَّ

قسم ہے رات کی جبکہ وہ (آفتاب کو اور دن کو) چھپا لے اور (قسم ہے) دن کی جبکہ وہ روشن ہو جائے اور (قسم ہے) اس کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا کہ بیشک تمہاری

سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ

کوششیں (اعمال) مختلف ہیں۔ سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (ملت اسلام) کو اچھا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان

لِلْيُسْرٰى ؕ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۙ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ

دیدینگے اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دیدیں گے اور اس کا

وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ؕ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۚۖ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى

مال اس کے کام نہ آوے گا جب وہ برباد ہونے لگے گا واقعی ہمارے ذمہ راہ کا بتلا دینا ہے اور جیسی راہ کوئی شخص اختیار کریگا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِيْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ؕ وَ سَيُجَنَّبُهَا

ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا تو میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں اس میں وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے (دین حق کو) جھٹلایا اور روگردانی کی اور

الْاَتْقَى ۙ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۙ

اس سے ایسا شخص دور رکھا جائیگا جو بڑا پرہیزگار ہے جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہوجائے اور بجز اپنے عالیشان پروردگار کی رضاجوئی کے اس کے ذمہ

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ۧ

کسی کا احسان نہ تھا کہ اس کا بدلا اتارنا ہو اور یہ شخص عنقریب خوش ہوجاوے گا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی)

تفسیر گردشِ لیل و نہار تکوینی ہے ۔ رات کی غطا پوشی اور دن کی جلوہ پاشی میں کسی مخلوق کے دستِ صنعت کو دخل نہیں ۔ اس شبانہ روز کے دائرہ کے اندر ہر چیز خصوصاً حیوان کی تذکیر و تانیث بھی فطری ہے ۔ نر اور مادہ کی الگ الگ صنف اللہ نے امتیازی شکل میں بنائی ہر صنف کے لوازم اور خصوصیات اسی کے آفریدہ اور ساختہ پرداختہ ہیں ۔ تمام قوتیں جدا جدا اسی نے بنائی ہیں ، لیکن تخلیقی قوتوں سے کام لینے کا اختیار عورت مرد دونوں کو اس نے دیدیا ہے ۔ انسان کی مشیت و ارادہ اگرچہ پیدائش میں آزاد نہیں ، لیکن عمل میں آزاد ہے ۔ کسی کو کام کرنے کے لئے اول علم پر قصد پھر حرکاتِ آزادی و عضلاتی انسان کی کوشش کہلاتی ہے ، لیکن یہ سعی بذاتِ خود خدا سے مستغنی ہو کر نتیجہ تک پہنچانے میں مستقل نہیں ہے ۔ کوشش اور نتیجہ کی وابستگی ناقابلِ انقطاع اور لاینحل نہیں ، یہ تعلق ایسا نہیں جیسا ذات اور لوازم ذات کا ہوتا ہے ورنہ قوت کی تخلیق کے بعد خدا کی انسان کے لئے کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی ۔ اور مخلوق مخلوق ہونے کے بعد خالق سے مستغنی ہوجائے گی بلکہ ہر عمل کی اپنے نتیجہ سے وابستگی اور ہر تائید کی اثر آفرینی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے ۔ تیسیر توفیق اور منزل تک پہنچانا اللہ کا کام ہے ۔ ہاں اللہ کا وعدہ ضرور ہے کہ جیسی کوشش ہوگی اسی کے موافق نتیجہ تک وہ بآسانی پہنچا دے گا اور چونکہ خدا کا وعدہ غلط نہیں ، اس لئے ہر کوشش کا اچھا یا برا پھل وہ ضرور عطا فرمائے گا ۔ انسان کی کوشش کے اقسام مختلف ہیں اور ان کے خداداد نتیجے بھی مختلف ہیں ۔ تصدیقِ حق اور تکذیبِ حق جود ممدوح اور بخل مذموم اللہ کے ممنوعات سے پرہیز اور اللہ کے احکام کی طرف سے بے پروائی ۔ غرض ارادے اور اعمال مختلف ہیں ۔ اور انہیں اعمال کے اختلاف کے مطابق اللہ اچھے برے نتیجہ تک پہنچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے ۔ جس طرح آغازِ آفرینش اللہ کے دستِ کرم کی ممنون ہے ۔ کوئی خود پیدا نہیں ہو سکتا نہ اپنے اسبابِ آفرینش میں اس کو دخل ہے ۔ اسی طرح نتیجہ تک پہنچانا بھی اللہ کے دستِ قدرت میں مرہون ہے ۔ کوئی خود نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ ساری کائنات اللہ ہی نے بنائی ہے ۔ ہر چیز کے تخلیقی اسباب بھی اسی نے بنائے اور سارا نظام بھی اپنے ہاتھوں میں رکھا شب و روز کی گردش اور آفتاب و ماہتاب کا طلوع و غروب ۔ اور تمام علوی و سفلی مخلوق کا سفرِ حیات اسی کے ارادہ اور حکم سے وابستہ ہے ۔

اور اس کائنات کے سفری نتائج بھی اسی کے قبضہ میں ہیں ۔ یہ استمراری حرکات کن نتائج کی حامل ہیں ۔ ان کا مآل کیا ہوتا ہے اور آخر کیا ہوگا ۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی مشیت وقدرت میں ہے ۔ پس ساری کائنات کی طرح انسان کی رہنمائی اور اس کو سوجھاؤ دینا اور کوشش کے موافق آخری منزل تک پہنچانا بھی اللہ ہی کا کام ہے لیکن اس نے یہ ضابطہ مقرر کر دیا ہے کہ حق کی تکذیب کرنے والے اور اللہ سے منہ موڑ کر خودی ہی میں مست رہنے والے یہاں مادی ، شہوانی اور غضبی آگ میں جلتے رہتے ہیں ۔ اور دوسری زندگی میں اسی مادہ پرستی کے نتیجہ والی آگ میں جلیں گے ، جس کا نام دوزخ ہے اور جو لوگ پیام حق کی تصدیق کرتے ہیں اور ممنوعات سے پرہیز رکھتے ہیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مالی قربانیاں بھی دیتے ہیں ۔ گویا حق کے مقابلے میں ان کی شہوانی و غضبی قوتیں شکستہ ہو جاتی ہیں ۔ اور صرف رضائے مولیٰ کی طلب میں جسمانی اور مالی ایثار کرتے ہیں ۔ نہ کسی کا احسان اتارنا ان کو مقصود ہوتا ہے نہ کسی پر احسان رکھنا ۔ ان کو یہاں ہی نفس کی پاکیزگی اور ارادہ و اخلاق کی طہارت حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان کی جزا خوش کن ہوگی وغیرہ ۔

والیل اذا یغشیٰ والنھار اذا تجلّیٰ ۔ چھاتی رات اور چمکتے دن کی قسم ۔

تحلیلِ اجزاء وما خلق الذکر والانثیٰ ۔ ما مصدریہ ہے اور نر و مادہ کی تخلیق کی قسم (مقاتل) یا ما بمعنی مَن ہے ۔ یعنی نر و مادہ پیدا کرنے والے کی قسم (حسن بصری ۔ کلبی ۔ ابو عبیدہ)

بیان قرآنی کا ایک خاص اسلوب ہے کہ کسی خاص مقصد کو ثابت کرنے کے لئے آفاق اور انفس ، بیرونی اور اندرونی شہادتیں پیش کرتا ہے ۔ تاکہ اہل بصیرت اندرونی اور بیرونی ثبوت پر غور کریں اور پیش کردہ شہادتوں کو سمجھنے کے بعد اصل دعوے کو مان لیں ۔ قرآن مجید میں جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ ان کی تخلیق اپنے اندر عظمت ، شان ، حکمت ، نیرنگی اور حیرت آفرینی رکھتی ہے ۔ عوام اور خواص ؛ جاہل اور عالم ، سادہ لوح اور فلاسفر سب ہی اپنے اپنے ذہنی درجہ اور عقلی مرتبہ کے مطابق ان کی صنعت اور فطرت کو عظمت اور حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ اس کائنات خارجیہ میں سب سے زیادہ عام اور بدیہی حقیقتیں رات اور دن ہیں اور انسانی تخلیق میں بہت ہی واضح حقیقت تذکیر و تانیث ہے ۔ رات اور دن کے کیا منافع ہیں ۔ اور کیوں ہیں ۔ مذکر اور مؤنث کا امتیاز کس وجہ سے ہے ۔ سائنٹیفک دماغ رکھنے والے ماہرین ہوں یا سطح بین نظر رکھنے والے صحرائی ۔ اس سے اوپر کسی کی ذہنی پرواز نہیں کہ اگر روشنی اور تاریکی کا تبادل نہ ہوتا تو کوئی جاندار اور نامی زندہ نہ رہتا ۔ بلکہ عالم ہستی میں نہ آتا اور تذکیر و تانیث میں نسبت اضافی نہ ہوتی اور کائنات حیوانیہ میں جوڑا جوڑا نہ ہوتا تو کسی جاندار کا وجود ہی نہ ہوتا ۔ مثبت منفی حقائق کے جوڑ سے ہی ظہور موجودات ہے بلکہ متضاد چیزوں کے عدم و وجود کے ارتباط ہی کا نام زندگی ہے ، لیکن ایسا کیوں ہے ۔ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ فطرت یونہی ہے ۔ اشیاء کے خواص ذاتی کا تقاضا اسی طرح ہے ۔ دن کی روشنی سورج کی ممنون ہے ۔ سورج کو روشن کرنے والی کون چیز ہے اور سورج یعنی ضوئیات کیوں روشن ہیں ۔ رات کی تاریکی سورج کے غائب ہونے کا نام ہے ۔ لیکن سورج غائب کیوں ہوتا ہے ۔ حرکت دوری کا اقتضاء ہے مگر دوری حرکت کا محرک کس کا حکم رواں ہے یہ کون بتائے ۔ ماں کی قوت مصورہ اور تخم کی اندرونی صلاحیت تذکیر و تانیث کا فرق کر دیتی ہے ، لیکن نطفہ اور تخم کے اندر پوشیدہ قوت میں یہ تصویر کشی اور امتیاز بخشی کہاں سے آئی ۔ یہ کس کو معلوم ہے ۔ اس کا علم صرف اُسی صانع قادر مختار کو ہے جو نیست سے ہست اور ہست سے نیست کرتا ہے ۔ پس نور و ظلمت کی کشاکش اور تذکیر و تانیث کا متضاد تلون بتا رہا ہے کہ خدا آفرینش عالم سے پہلے بھی قادر علیم تھا ۔ اور اب بھی سارے جہان کی حیات میں اُسی کا تصرف کار فرما ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے وابستہ ہے اور دوبارہ تخلیق بھی اس کی قدرت کی ہمہ گیری اور علم کے احاطہ سے خارج نہیں ۔ رہی تخلیق دوئم کی ضرورت تو ظاہر ہے کہ آدمی اگرچہ تخلیق میں بے بس ہے ۔ مگر معنی میں بے بس نہیں ۔ انسانی علم ، ارادہ اور عمل کی طاقت آزاد ہے ۔ مجبور رہا اور مجبور ہے آزاد تھا نہ انسان پھر اس کی حقیقت کی مجبوریاں نہ مختار مطلق اور خود عنان وہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی ، مجبور بھی ہے مختار بھی ہے ۔ اس کے اعمال کے رخ مختلف ہیں اور توجہ کے رخ جدا جدا ہیں ۔ لامحالہ نتیجہ میں اختلاف ضروری ہے ۔ سب کا ایک نتیجہ ضابطہ عدل کے خلاف ہے اور اس زندگی کا ہر لمحہ وقت عمل ہے ۔ مسافت جبلت

کا ہر لمحہ میدانِ سعی ہے۔ میدانِ عمل کے بعد نشانِ منزل آتا ہے۔ اوقاتِ عمل ختم ہونے کے بعد نتیجۂ عمل نمودار ہونا چاہیے۔ پس اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے۔ ہر رات کے بعد دن آنا ضروری ہے۔ وہ زندگی پاداشِ عمل کی زندگی ہوگی۔ سعی و عمل کی زندگی نہ ہوگی۔ یہاں کا ساز و سامان وہاں کام نہ آئے گا۔ وہاں نیکوں کا ٹھکانہ اچھا اور بدوں کا مالویٰ بُرا ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ نے چھ مسلمان غلام اور باندیاں مشرکوں سے خرید کر آزاد کئے تھے۔ مشرک ان کو مسلمان ہونے کی وجہ سے بہت دکھ دیتے تھے (دامعی) عامر بن حضرت عبداللہ بن الزبیر کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق غلاموں کو اس شرط پر خرید کر آزاد کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہو جائیں یہاں تک کہ بوڑھی عورتوں کو بھی خرید کر آزاد کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے دس اوقیہ اور ایک چادر کے عوض خرید کر آزاد کیا تھا۔ (ابن ابی حاتم و ابن عساکر) قاضی ثناء اللہ مؤلف تفسیر مظہری نے اس جگہ کچھ باندیوں اور غلاموں کے نام لکھے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق نے خرید کر آزاد کئے تھے۔ بہرحال آیت کے حکم میں عموم ہے جو ضابطہ اس آیت میں بیان کیا ہے وہ آج بھی جاری ہے اور ان آیات میں جن اصول کو بیان کیا ہے وہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ مورد نزول کی تخصیص سے صرف اس شخص کی فضیلت یا مذمت کی طرف اشارہ ہے جس کے حق میں آیات کا نزول ہوا تھا۔ بغیر تعیین اسمی کے نظمی صراحت نہیں ہوتی۔ احادیث آحاد مفید ظن ہوتی ہیں۔ قطعیت تو ضابطے کے عموم کی ہے۔

دینے سے مراد ہے مالی حق ادا کرنا (قتادہ) مفسرین نے لکھا ہے کہ حلال کمائی میں سے راہِ حق میں دینا مراد ہے۔ (ابن کثیر وغیرہ)

وَاتَّقٰی اور وہ بچ گیا۔ یعنی اپنے تمام معاملات میں اللہ سے تقویٰ رکھا یا ممنوعاتِ شرعیہ سے پرہیز رکھا (ابن کثیر وغیرہ)

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی اور بھلائی کو سچ جانا۔ اَلْحُسْنٰی سے مراد ہے ثواب کا یقین (خصیف) یعنی اس بات کا یقین کیا کہ ان نیکیوں کا ثواب ضرور ملے گا (قتادہ) حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، ابوصالح اور زید بن اسلم کے تفسیری اقوال کا بھی یہی مطلب ہے۔ الفاظ جدا جدا ہیں۔ ایک روایت میں زید بن اسلم کا قول آیا ہے کہ الحسنیٰ سے مراد ہے نماز زکوٰۃ اور روزہ یا صدقۂ فطر۔ حسن بصری ابوعبدالرحمن سلمی اور ضحاک کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ مراد ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابی بن کعب کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں حضرت ابی بن کعب نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے صدق بالحسنیٰ کا مطلب دریافت کیا۔ ارشاد فرمایا الحسنیٰ جنت ہے۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ لیکن ایک راوی کا نام مذکور نہیں ہے۔ بر تقدیر صحت اس روایت سے خصیف اور قتادہ وغیرہ کے قول کی فی الجملہ تائید ہوتی ہے۔ آیت کے تینوں فقروں میں تین امور کی جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔ (۱) مالی حقوق ادا کرنا (۲) اوامر کو ادا کرنا اور نواہی سے پرہیز رکھنا۔ تقویٰ کے اندر یہ دونوں چیزیں داخل ہیں۔ (۳) آخرت کے ثواب پر یقین رکھنا یا توحید ذاتی و صفاتی اور رسالت اور آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کا مجموعہ یہی تین امور ہیں۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی۔ اَلْيُسْرٰی آسان چیز مراد خیر اور بھلائی (حضرت ابن عباس) یا جنت (زید بن اسلم) یا نیک خصلت (ابن کثیر وغیرہ) یعنی ہم اس کو نیکی یا اچھے خصائل یا جنت میں پہنچنے کی سہولت عطا کر دیں گے

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ اور جس نے راہِ حق میں خرچ کرنے سے کنجوسی کی

وَاسْتَغْنٰی اور (مال کی کثرت، جتھے کی فراوانی، جسمانی طاقت کی افزونی، عزت دنیوی کی برتری اور حکومت کی طاقت میں مگن ہو کر) اللہ کی طرف سے مستغنی اور بے پرواہ ہو گیا (حضرت ابن عباس بروایت عکرمہ۔ نقلہ ابن ابی حاتم)

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی اور لا الٰہ الا اللہ یا جزائے آخرت یا جنت کی اس نے تکذیب کی، توحید کو نہ مانا، جزائے آخرت کا یقین نہ کیا۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی۔ تو ہم عسریٰ کو اس کے لئے سہل کر دیں گے اس کو عسریٰ میسر کر دیں گے۔ العسریٰ دشواری سختی۔ مراد ہے ہر شرارت اور بد اعمالی جو موجب جہنم ہے یا جہنم مراد ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو مالی کثرت اور دنیوی جاہ و عزت اور جماعت کی فراوانی کے نشہ میں مست ہو کر اپنا تعلق خدا سے توڑ لیتا ہے اور بے پرواہ بن جاتا ہے اور نفسانی لذتوں اور عیش کوشیوں کے لئے کتنا ہی مال برباد کر دے مگر راہِ حق میں پیسہ نہیں دیتا اور آخرت کے ثواب کو غلط خیال کرتا ہے اور توحید خداوندی کی تکذیب کرتا ہے۔ اللہ بھی اس کے سامنے بدی کی راہیں کھول دیتا ہے۔

نیکی کی توفیق روک لیتا ہے ۔ گناہ کے اسباب اس کو میسر کر دیتا ہے اور وہ بدی کے راستہ میں گھستا چلا جاتا ہے ۔

وَمَا یُغْنِی عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۔ اور جب وہ ہلاک ہوگا تو اس کا مال کام نہیں آئے گا ۔ ہلاکت سے نہیں بچائے گا ۔ جس مال پر وہ گھمنڈ کرتا اور جس دولت کی وجہ سے وہ بے پرواہ ہو گیا تھا وہ مال و دولت اس کی کچھ مدد نہ کر سکے گی ۔ چنانچہ امیہ بن خلف بدر کی لڑائی میں مارا گیا ۔ اس کی دولت و وجاہت دنیوی عزت اور جتھہ کی کثرت سب بے کار ثابت ہوئی ۔

کیا توفیقِ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے

حضرت ابوبکر صدیق رض خود راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جو کچھ کرتے ہیں کیا اس فیصلہ کی تعمیل ہوتی ہے جو پہلے ہو چکا ہے یا ہماری طرف سے تاسیسی طور پر ہوتا ہے ۔ فرمایا تعمیل شدہ امر کی بنا پر ہوتا ہے ۔ میں نے عرض کیا پھر عمل کا کیا فائدہ ۔ فرمایا ہر ایک کو اسی کام کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے (احمد)

حضرت علی رض کا بیان ہے ہم لوگ رسول اللہ ؐ کے ساتھ قبرستان غرقد میں ایک جنازہ میں شریک تھے ۔ حضورؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ اس کا جنتی یا جہنمی مقام (پہلے سے) مقرر نہ کر دیا گیا ہو ۔ صحابہ نے عرض کیا پھر نوشتۂ تقدیر پر اعتماد کیوں نہ کر لیا جائے ۔ فرمایا عمل کئے جاؤ ۔ ہر ایک کو اسی کام کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے ۔ پھر آپ نے یہ تلاوت فرمائی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (بخاری) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم لوگ بقیع غرقد میں حضورؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ سر جھکائے چھڑی سے زمین کرید رہے تھے یکدم سر اٹھا کر فرمایا تم میں سے جو شخص بھی پیدا ہوا اس کی جگہ دوزخ یا جنت میں پہلے ہی لکھ دی گئی ہے ۔ اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ سعید ہے یا شقی ۔ ایک شخص نے عرض کیا پھر ہم نوشتۂ تقدیر پر کیوں بھروسہ نہ کر لیں اور عمل کو ترک کیوں نہ کر دیں کیونکہ جو سعید ہے وہ اہل سعادت کے ساتھ ہی چلا جائے گا ۔ اور جو شقی ہے وہ اہل شقاوت کے ساتھ ہی ہوگا ۔ فرمایا بات یہ ہے کہ جو لوگ سعید ہیں ان کو اہل سعادت کے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے اور جو لوگ شقی ہیں انکو اہل شقاوت کے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد حضورؐ نے آیت مذکورہ کی تلاوت فرمائی (رواہ البخاری و مسلم و ابو داؤد والترمذی والنسائی و ابن ماجۃ)

حضرت ابن عمر رض کی روایت ہے کہ حضرت عمر رض نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں کیا یہ فیصل شدہ امر کے تحت ہے ۔ جو پہلے ہو چکا ہے یا ہماری طرف سے ایجاد و تاسیس ہوتی ہے ۔ فرمایا یہ فیصل شدہ امر ہے (ابن خطاب) عمل کئے جاؤ کیونکہ ہر ایک کو اللہ کی طرف سے ہی توفیق ملتی ہے ۔ جو اہل سعادت میں سے ہے اس کو عمل سعادت کی توفیق ملتی ہے اور جو اہل شقاوت میں سے ہے اس کو اہل شقاوت کے عمل کی سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے ۔ (رواہ احمد والترمذی وقال حسن صحیح) حضرت جابر بن عبد اللہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ؐ کیا ہمارا عمل اس لائحۂ کار کے زیر اثر ہوتا ہے جو پہلے طے کر دیا گیا ہے یا ہماری طرف سے تاسیس کے طور پر ہوتا ہے ۔ فرمایا طے شدہ عمل کے زیر اثر ہوتا ہے ۔ سراقہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ؐ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے ۔ فرمایا ہر کرنے والے کو اسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے جو مقدر ہو چکا ہے ۔ (رواہ مسلم)

حضرت بشیر بن کعب کی روایت ہے کہ دو نوجوانوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ؐ کیا ہمارے اعمال وہی ہوتے ہیں جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور مقدر ہو چکے یا تاسیسی طور پر ہوتے ہیں ۔ فرمایا نہیں ۔ بلکہ وہی ہو چکے جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور مقدر ہو چکے ۔ انھوں نے عرض کیا پھر عمل کی کیا ضرورت ہے ۔ فرمایا عمل کئے جاؤ ہر عامل کو اسی کی توفیق ملتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے ۔ انھوں نے عرض کیا تو ہم کوشش کریں گے اور عمل جاری رکھیں گے (ابن جریر)

حضرت ابو درداء رض سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے جس کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں ، لیکن آخر میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ ہر آدمی کے لئے وہی چیز بہم کی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے (احمد)

شانِ نزول :

واحدی ، ابن جریر ، ابن کثیر اور رازی وغیرہ نے اس سورت کا تنزل حضرت ابوبکر صدیق رض اور امیہ بن خلف

کے حق میں قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے عامر کی روایت سے بھی یہی ثابت ہے۔ اس قول کی فی الجملہ تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ بلکہ اس کے مکی ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے ایک طویل قصہ مدینہ کا نقل کیا ہے کہ کسی کے گھر میں کھجور کا ایک درخت تھا۔ جس کے پھل بہت عمدہ ہوتے تھے۔ کسی غریب آدمی کا مکان اس کے برابر تھا اور درخت کی کوئی شاخ اس کے گھر میں جھکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کوئی کھجور کبھی اس غریب کے گھر بھی گر جاتی تھی۔ ایک بار غریب کے بچہ نے گری ہوئی کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی، مگر مالک درخت نے آکر انگلیاں ڈال کر اس کے منہ سے کھجور نکال لی۔ اور غریب آدمی نے یا مالک درخت نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ آپ نے مالک درخت سے فرمایا۔ میں تیرا درخت خریدنا چاہتا ہوں اور اس کی قیمت میں تجھے جنت کے اندر کھجور کا درخت ملے گا۔ اس شخص نے بیچنے سے انکار کر دیا اور چلا گیا۔ ایک آدمی اس گفتگو کے وقت موجود تھا وہ مالک درخت سے جا کر ملا اور کھجور کے چالیس درختوں کے عوض وہ درخت خرید لیا اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر حضور کو اس درخت کا مالک بنا دیا اور حضورؐ نے اس غریب آدمی کو وہ درخت عطا فرما دیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس پر آیات وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی الخ نازل ہوئیں۔

ہم نے طویل روایات کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ اس روایت کی وجہ سے بعض لوگوں نے اس سورت کی ابتدائی آیات کو مدنی قرار دیا ہے مگر یہ روایت غریب ہے۔ اجماع رواۃ کے مقابلے میں اس کی کوئی وقعت نہیں پھر سورت کی تمام آیات اتنی مربوط ہیں کہ سب کا نزول ایک ہی واقعہ کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ بعض آیات کو مدنی اور بعض کو مکی قرار دینا سیاق قرآنی کے خلاف ہے۔ اور بالفرض روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی اس سے سورت کے مکی ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے بعض آیات کا مکرر نزول ہوا ہو جیسے سورۂ فاتحہ کی تکرار نزول کے سلسلے میں روایات آئی ہیں۔ والعلم عنداللہ۔

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى. وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى — مذکورہ بالا آیات میں بیان کیا تھا کہ انسانی کوشش کے میدان، اسلوب رفتار اور منازل و مقاصد مختلف ہیں لیکن تیسیر و توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ نیکی اور بدی کے ارتکاب کا القاء فطرۃً بھی اسی کے قبضہ میں ہے۔ پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہ نمائی اور خیر و شر کا بیان بھی اسی کے ذمہ ہے۔ کوئی اپنی فکری طاقتوں سے کام لے کر خدا سے مستغنی ہو کر خیر و شر اور صحیح و غلط کا خود امتیاز کر لے اور اپنا راہ نما خود بن جائے یہ ناممکن ہے۔ نہ یہ کسی کے امکان میں ہے کہ اپنی کوشش کو منزل مقصود تک پہنچا دے اور اپنے عمل سے نتیجہ تک پہنچ جائے۔ راہ نما بھی حقیقت میں اللہ ہی ہے اور کشتی کو کنارے لگانے والا بھی وہی ہے۔ کیونکہ آفرینش، اسباب آفرینش مقصد آفرینش اور منتہائے آفرینش ہر چیز اسی کی تخلیق کی ممنون ہے اور ہر تصرف اسی کے دست قدرت میں مرہون ہے۔ یعنی وہی دنیا اور آخرت کا خالق، مالک اور حکمران مطلق ہے۔ پس جس طرح صحیح غلط اور خیر و شر کا امتیاز اس کے بیان کا محتاج ہے اسی طرح بدکار اور اطاعت گزار کا برا اچھا نتیجہ بھی اسی کا مقرر کردہ ہے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى. پس میں تم کو لپٹیں مارتی ہوئی آگ سے ڈراتا ہوں (مجاہد) یہ وہی آگ ہوگی جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ مومن سے کہے گی تو چلا جا تیرے نور رحمت سے میری آتش غضب بجھی جاتی ہے۔ یہ آگ میدان حشر میں پکار کر کہے گی کہ میں مشرک، مغرور، ظالم پر مسلط ہوں۔ حضرت نعمان بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ دوران خطبہ میں اتنی بلند آواز سے جو بازار تک پہنچ رہی تھی بار بار فرماتے تھے۔ لوگوں میں نے تم کو آگ سے ڈرا دیا (یعنی نافرمانی کرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ رواہ احمد

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى. اس آگ کے وسط میں سوا بدبخت ترین کافر کے اور کوئی داخل نہ ہوگا یعنی اشقی وہ ہے جس نے دل اور زبان سے اللہ کی توحید، رسول کی رسالت اور جزائے آخرت کا انکار کیا اور احکام شریعت کو ماننے اور ان کے مطابق چلنے سے روگردانی کی۔ مومن جو دل سے توحید رسالت وغیرہ پر یقین رکھتا ہے اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہے اگر بداعمال ہو اور بغیر توبہ کے مر جائے تو معتزلہ اس کو کافروں کے گروہ میں شامل سمجھ کر دوامی جہنمی قرار دیتے ہیں۔ مرجیہ کا گروہ معتزلہ کے بالکل برعکس

قائل ہے۔ کہ اگر دل سے توحید وغیرہ لوازم ایمان پر یقین ہوگیا تو پھر کوئی بداعمالی موجب جہنم نہیں۔ ہر بدکاری معاف ہے۔ مرجئہ کی طرف سے اسی آیت کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے جس میں داخلۂ دوزخ کو صرف کافروں کے لئے محدود کر دیا گیا ہے۔ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اگر گنہگار مومن بغیر توبہ کے مر جائے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ چاہے معاف کر دے یا عذاب دے۔ بہرحال اس کا دوزخ میں داخلہ دوامی نہ ہوگا نہ کافروں کی طرح وہ دوزخ کے اندر اس طرح داخل ہوگا کہ اس کو ہر طرف سے آگ محیط ہو اور وہ آگ کے اندر ہر سمت سے گھر جائے۔ چونکہ آیت میں الاشقی سے مراد کافر ہی ہے۔ کیونکہ الاشقی کی تشریح اَلَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی سے فرمائی اور مومن کیسا ہی فاسق ہو دل سے منکر نہیں عقائد ایمانیہ کی تکذیب نہیں کرتا، اس لئے آیت کا مصداق کوئی مومن خواہ کیسا ہی گنہگار ہو نہیں ہو سکتا۔ رہا مرجئہ کے استدلال تو وہ اس طرح ہے کہ لَا یَصْلٰی کا معنی صرف لا یدخل نہیں ہے بلکہ دوزخ میں ایسے داخلے کو کافروں کے لئے محدود کر دیا گیا ہے جس میں آگ ہر طرف سے محیط ہو۔ یہاں تک کہ اور مقاماتِ سجدہ کو بھی جلا ڈالے۔ یقیناً ایسا داخلہ کسی فاسق مومن کا نہ ہوگا، لیکن اس سے مطلقاً عذابِ فاسق کی نفی نہیں مستفاد ہوتی۔ قبر بھی عذاب کا ایک مقام ہے۔ درجاتِ جہنم بھی عذاب کی مختلف کیفیات رکھتے ہیں نَارٌ مُّوْصَدَۃٌ بھی عذابِ جہنم ہی ہے درکِ اسفل بھی نار ہی کا ایک طبقہ ہے۔ آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ الخ میں شرک کی عدمِ مغفرت کی صراحت ہے اور غیر شرک گناہگار کی مغفرت کو مشیت پر معلق کر دیا گیا ہے۔ اگر ہر مومن فاسق کی مغفرت یقینی ہوتی تو مشیت پر اس کے معاملہ کو محول نہ کیا جاتا بلکہ قطعی مغفرت کی صراحت کر دی جاتی۔ جانوروں کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کے لئے میدانِ حشر میں جانوروں کے کھروں اور موزوں سے پامال ہونے اور سینگوں سے مارے جانے کی سزا کا تفصیلی بیان صحیح حدیث میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والے مسلمانوں کی سزا کا مقام میدانِ حشر بھی ہوگا۔ حاصل یہ کہ آیت سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ مومن فاسق کو عذاب نہ ہوگا وہ بہرحال مغفور ہوگا یا اس کا دوزخ کے اندر داخلہ بالکل نہ ہوگا۔ ہاں اتنی بات ضرور مستفاد ہوتی ہے کہ کافروں کا دوزخ میں داخلہ اس طرح ہوگا کہ وہ آگ میں ہر طرف سے گھر جائیں گے اور مومن گنہگار کا داخلہ ایسا نہ ہوگا۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو جانا کفر کی علامت ہے کیونکہ اللہ کے عذاب سے وہی بے خوف ہو سکتے ہیں جو کافر ہیں۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے کیونکہ رحمتِ خدا سے مایوس بھی صرف کافر ہی ہوتے ہیں۔

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی۔ یعنی وہ مومن جو اللہ کی نافرمانی سے بہت دور رہتا ہے اور اپنا حلال مال راہِ حق میں حکمِ شریعت کے مطابق خرچ کر کے خبثِ نفس اور غیر اللہ کی اطاعت سے پاک ہو جاتا ہے، دوزخ سے بالکل الگ رکھا جائے گا اس کو دوزخ کی ہوا بھی نہیں چھوئے گی۔ گزشتہ آیت میں بدبخت ترین منکر ایمان نافرمان کا نتیجہ بیان فرمایا تھا یعنی امیہ بن خلف اور اسی کے مثل دوسرے لوگوں کا۔ اس کے مقابل اس آیت میں انتہائی پرہیزگار اطاعت گزار اوامر و نواہی کے پابند مومن کے مآل کی صراحت فرمائی۔ تقویٰ کا تعلق قلب سے بھی ہے اور اعضاءِ جسم سے بھی اور تصرفاتِ مالیہ سے بھی۔ قلب کا تقویٰ ہے شرک نہ کرنا اور ہر گناہ کا ارادہ ترک کر دینا اعضا کا تقویٰ ہے۔ ممنوعاتِ شرعیہ سے اعضاء کو محفوظ رکھنا اور اطاعت میں لگا دینا اور تصرفاتِ مالیہ میں تقویٰ ہے مال حلال کو کسی پر احسان رکھے بغیر صرف خوشنودیٔ رب حاصل کرنے کے لئے اہلِ احتیاج کو دینا اور ہر راہِ حق میں حکمِ شریعت کے موافق صرف کرنا۔ اگر تقویٰ کی یہ تمام صورتیں کسی میں جمع ہو جائیں تو اس کو اتقیٰ کہا جائے گا اور عذابِ جہنم کی ہوا بھی اس کو نہ لگے گی۔ اس کا گناہوں سے تقویٰ جہنم سے تقویٰ بن جائے گا۔ الاتقیٰ سے مراد اس جگہ براہِ راست حضرت ابوبکر صدیق اور بالواسطہ وہ تمام مومن ہیں جن میں یہ اوصاف موجود ہوں۔ کچھ لوگ اس آیت کا نزول حضرت علیؓ کے حق میں قرار دیتے ہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اس کے نزول کے وقت حضرت علیؓ خود نادار تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے زیر کفالت تھے، اس لئے راہِ خدا میں مال خرچ کرنا اس وقت ان پر لازم ہی نہ تھا۔ دس سال کی عمر میں ایمان لائے اور ہجرت تک تقریباً رسول اللہ ﷺ کے ہی زیر کفالت رہے۔ ہجرت سے پہلے چند سال شاید مالی اعتبار سے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لائق ہونے کے قابل ہوئے تھے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ہی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ اگرچہ مدینہ پہنچنے کے بعد جب حضرت علیؓ مالی اعتبار سے خودکفیل ہو گئے۔ اس وقت آپ بھی اس آیت کے مصداق ہو گئے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا بیش قیمت کافر غلام دے کر حضرت بلال جیسے ضعیف الجثہ غلام کو خرید کر آزاد کیا تو کافروں نے کہا ابوبکر پر بلال نے کچھ احسان کیا ہوگا۔ جس کو اس طرح ابوبکر نے اتارا ہے اس کی تردید میں یہ جملہ نازل ہوا کہ اس عبد اتقی پر کسی کا کوئی احسان اور استحقاق نہ تھا کہ وہ اس کے بدلہ میں احسان کر رہا ہو بلکہ محض اپنے رب کی خوشنودی کی طلب میں وہ اپنا مال صرف کرتا ہے (تفسیر مظہری) بہرحال روایت صحیح ہو یا نہ ہو آیت کا مطلب صاف ہے کہ کسی محتاج کو دینا اس وقت قابل ستائش ہے اور موجب ثواب ہے جب دنیوی معاوضہ اور لالچ پیش نظر نہ ہو۔ مرضیٔ مولا کی طلب ہو۔ اور بس۔

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۔ یعنی جب عبد اتقی کو فقیر پروری اور غلاموں کو آزاد کرنے سے مقصود صرف رب کی مرضی حاصل کرنا ہے نہ کسی کا احسان اتارنا نہ کسی کو منت کش بنانا اور نہ کسی قسم کا کوئی دوسرا دنیوی لالچ مقصود ہے، اس لیے آئندہ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسا عظیم الشان ثواب جزیل عنایت فرمائے گا کہ وہ اس ثواب پر راضی اور خوش ہو جائے گا۔

مقصودِ بیان آغاز سورت کی قسمیں دعوت دے رہی ہیں۔ دن اور رات کی متبادل روشنی اور تاریکی پر غور کرنے کی ان کی تخلیقی حقیقت اور پُر منفعت تغیر کو گہری نظر سے دیکھنے کی۔ اسی طرح مرد و عورت بلکہ تمام حیوانات کے جفتی تنوع کی وجوہ و اسباب کو مطالعہ کرنے اور اس سے درس بصیرت حاصل کرنے کی۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى سے معلوم ہو رہا ہے کہ کوشش انسان کا کام ہے۔ ساعی حقیقت میں انسان ہی ہے اور مختلف انسانوں کی کوششوں کے رخ، مقاصد، منازل اور طریقے جدا جدا ہیں۔ کوئی ایمان دار ہے کوئی منکر ایمان۔ کوئی سخی ہے کوئی بخیل۔ کوئی اللہ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے کوئی اللہ سے بے نیاز ہو کر اپنی عقل و بصیرت اپنی دولت و عزت اور اپنی وجاہت و حکومت پر مگن ہے۔ پس قابل ستائش اور موجب ثواب ہے اس مومن متقی کی کوشش جو محض رضائے مولیٰ کا طالب ہے اور قابل مذمت و موجب عذاب ہے اس کافر بخیل کی کوشش جو محبت مالی میں پھنس کر خدا سے بے پرواہ ہو گیا ہے۔ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى میں مخفی ترغیب ہے اس بات کی کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک شہرت نیک نامی یا کسی دنیوی منفعت کے حصول کے لئے کرنا نہ قابل مدح ہے نہ ثواب۔ آخرت کے حصول کا ذریعہ بلکہ ہر حسن سلوک اور افادۂ خلق محض رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہونا چاہیئے۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى سے لطیف استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جب بندہ رضائے مولیٰ کی طلب میں اس کی فرمان پذیری کرتا ہے تو آخرت میں اللہ بھی اس کو راضی فرما دے گا۔ موت خدا نیز رب خدا ہو جاتا ہے وغیرہ۔

سورۃ الضحٰی

یہ سورت بالاتفاق اہل روایت مکی ہے۔ اس میں گیارہ آیات چالیس کلمات اور ایک سو ستر حروف ہیں۔ (خطیب) ایک مدت تک انقطاع وحی کے بعد یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے انتہائی مسرت سے اس کے نزول کے بعد تکبیر یعنی اللہ اکبر یا لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کے الفاظ ایک بار کہے تھے چنانچہ ابن کثیر نے امام قرأت ابن بزی کی روایت سے لکھا ہے کہ سورۂ والضحٰی پر تکبیر کہنی سنت ہے۔ بلکہ بعض علماء نے اس لیے ختم پر اور آئندہ آنے والی ہر سورت کے خاتمہ پر تکبیر کہنی مستحب قرار دی ہے۔ لیکن کیا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى کے خاتمہ پر بھی تکبیر کہی جائے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ مثبت منفی دونوں قول ہیں (ملاحظہ ابن کثیر و مظہری)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب وہ قرار پکڑ لے ۱۱ کہ تیرے رب نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے دشمنی کی اور آخرت آپ کے لئے بہتر ہے

وصل کامل اور ہر وقت بہر جہت اتصال کمال انسانیت نہیں۔ یکسانیت ہو تو ہو سکتا ہے لیکن خلق کے ہر صحو آفریں وقتی فصل اور تھوڑی دیر کے لئے
ہجر خالق و مخلوق کی طرف آئینہ قلب کا منہ موڑ دیا ہوا ہے کمال کا اور طریقہ ہے سونے کو کندن بنانے کا۔ ظلمت شب ہی تو پیغام بردہ ہے
نور صبح کی پردہ پوشی کا۔ یہی تو تسوید تخلیق انسانی کی فطرت تکمیل ہے۔ بحکم محبوب نزول وحی تو عرش رب ہی کی ایک عادت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ جبرئیل کو
بیدار نہ کردے اور خطیرۂ قدس میں اپنی مسکون اور معنوی عطا نہ فرمائے تو اس یتیم عقل کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ بغیر وجدان عرفانی کے عقل یتیم ہے
اور تحیر و گم کردہ راہی کے کوچوں میں انسان کا ادراک آوارہ و سرگرداں ہے۔ ربوبیت ربانی اور رحمت رحمانی ہی تو اس آوارہ عقل میں سرگرداں
آوارہ کو نور وجدان کی مشعل دے کر خطیرۂ قدس کا راستہ بتاتی اور حجابات نور اٹھا کر جمال بے کیف دکھاتی ہے۔ پس اسی کی رحمت کا یہ تقاضا نہیں
کہ سو جو کا کر منہ چھپا دے اور مشعل نور کو بجھا کر عاشق بے قرار کو پھر آوارہ چھوڑ دے اس کی ربوبیت تو یہ ہے کہ جب یتیم عقل کو اس نے اپنی گود
میں اٹھا کر اس کے چہرے سے مادیت کا گرد و غبار صاف کیا ہے پھر اس کو کس جہری دلدل میں پھینک دے۔ ہاں ذات ربانی اگر کسی وقت کمی
کرتی ہے تو یہ بھی محبوب کی ایک ادا ہوتی ہے اور اطلاق نیت کا ایک عشق نواز حربہ۔ پس قسم ہے پردہ اٹھانے والے آفتاب کی اور رات کی جب
تمہیں کو یہ منظور نہیں کہ عاشق بے قرار سے قطع تعلق کرنے اور بے چارے دل باختہ پر جور روا رکھے کیونکہ اسی نے اس جسمانی یتیم کو دامن
فراق سے اٹھا کر صاف ستھرا کرکے اپنی گود میں بٹھایا تھا اور اسی نے اس آوارہ گرد وادی عشق کی مشعل وجدان روشن کرکے اپنے گھر کا راستہ بتا کر
شبستان جمال میں داخلے کی اجازت دی تھی جو شدت ہے کہ اس وقتی لطافتی بے رخی کا نتیجہ عاشق نوازی ہی ہے۔ یہ بھی ایک ادائے محبوبی
ہے اور اس سے مقصود آتش عشق کو تیز بنانا ہے۔ تاکہ تیری چشم دید ہو اور انجام کار آفتاب محبوبی کی جلوہ پاشیوں کو سہنے کی صلاحیت پختہ ہو جائے۔
جلوہ ساز جبرئیل سے سر سوختگان عشق کو محبوب مطلق کی کیسی پیار بھری بے کیف دعوت ملا آئی کہ اے پیارے بندے ہمارا پیام چند روز تیرے
پاس نہیں آیا۔ تیرے دل کے کانوں میں چند ساعات ہماری آواز زندگی میں نہیں گونجی تو نا واقفان اسرار محبت اور نامحرمان حرم حسن کہنے لگے کہ اب
تیرا محبوب تجھ سے روٹھ گیا خفا ہو گیا۔ تجھے اس نے چھوڑ دیا۔ اب نہ وہ تیرے پاس آئے گا نہ اپنا پیام بھیجے گا نہ تجھے شبستان وصل میں داخلے کی
اجازت دے گا۔ قسم ہے جلوہ پاش نور کائنات کی اور نقاب پوش ہمہ گیر تاریکی کی کہ ہم تجھ سے خفا نہیں ہیں۔ روٹھ نہیں گئے ہیں۔ اپنے
سینے سے جدا کرکے دوسروں کی گود میں تمہیں پھینک دیا ہے بلکہ اس سے مقصود کیف عشق کو بڑھانا ہے۔ آتش محبت کو تیز کرنا ہے تاکہ
لمحاتی فراق کے بعد حاصل ہونے والی وصل کی لذت دوبالا ہو جائے اور انجام آغاز سے بہترین بن جائے۔ غور کر تو یتیم تھا تیرا باپ مر چکا تھا کوئی
تیرا سرپرست نہ تھا تو یونہی مکہ کی گلیوں میں بے سر یتیموں کی طرح گھومتا پھرتا تھا اسی وقت ہم ہی نے تو تیری سرپرستی کی اپنی گود میں اٹھایا اور جوان
بنا کر تیرے سرداروں کا سردار بنایا اور سب کی طرف سے امین صادق کا لقب دلوایا اور سب کی طرف سے امین صادق کا لقب دلوایا۔ جب تو
جوان ہو گیا تب بھی یتیم ہی تھا۔ تیری عقل یتیم تھی وادی حیرت میں آوارہ پھر رہی تھی۔ تیرے پاس ہوش تھا مگر بے ہوش اور سمجھ تھی مگر بے سمجھ۔ تیری اس عقل حیرت
کو ہم نے وجدان کا آفتاب چمکا کر دور کیا۔ حریم جمال کا راستہ بتایا۔ غیب کے پیچھے سے بے صوت آواز دی۔ ادھر آ۔ تو صراط مستقیم پر دوڑتا
چلا آیا۔ ہم نے اپنے حریم کا دروازہ تیرے لئے کھلا رکھا تو اندر آ گیا۔ ہم نے چہرے سے نور کا پردہ ہٹایا۔ تیری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ہم نے نقاب
چھوڑ دیا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم تجھ سے روٹھ گئے۔ تجھ سے ہمیشہ کے لئے منہ چھپا لیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ تیری پختگی مقصود ہے۔ ابھی ایک منزل تجھے
اور طے کرنی ہے۔ دیکھ

تو نادار تھا مفلس تھا جوان تھا مگر تیری جوانی بے نشاط تھی۔ تیری روزی کا مدار دوسروں پر تھا۔ ہم نے تجھے زردار بنایا مالدار بنایا اور
دوسروں کے سہارے سے بے نیاز کر دیا۔ تو نے تجارت کی۔ کمائی کی۔ خدیجہ سے نکاح کیا۔ اب کسی کا محتاج نہ رہا۔ پھر تو غنی تھا مگر تیری عقل غنی
نہ تھی۔ تو مالدار ہو گیا تھا مگر دماغ مالدار نہ تھا۔ تیری عقل محتاج تھی۔ روشنی کے تیرے حواس ضرورت مند تھے۔ تو نکہ تیرے پاس روشنی اور ہدایت
کا سرمایہ نہ تھا ہم نے تجھے قلبی وجدان عطا کیا۔ نور باطن چمکا دیا۔ پہلے تیری عقل نادار تھی اب خود ضیا بار ہو گئی۔ کسی کی ٹمٹماتی شمع سے نور چینی کی اس
کو ضرورت نہ رہی۔ یہ سب کچھ ہم نے ہی تو کیا تھا۔ پھر کیسے سمجھ گیا کہ ہم تجھ سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے۔ ہمارا کار ربوبیت ہی تیرا سہارا ہے۔ ربوبیت

چھوڑنے والی نہیں ہم رد کرنے والے نہیں۔ بلکہ اس لمحاتی نقاب پوشی کی غرض یہ ہے کہ کچھ دیر کے لئے تیرا رخ دوسری طرف ہو جائے۔ ہمارے حرم وصال سے باہر جا کر ہمارے حکم سے اپنے جیسے دوسرے سرگرداں بندوں اور دربدر پھرنے والے فقیروں کو ہماری ربوبیت سے آگاہ کر جو تو نے دیکھا ہے اس کا پرتو دوسروں کو دکھا جو تو نے چکھا ہے وہ دوسروں کو چکھا۔ ہماری آواز جو تو نے سنی ہے وہ دوسروں کو سنا۔ ہمارے در پر دوسروں کو کھینچ کے لا۔ بچھڑے ہوؤں کو ہم سے ملا دے۔

تیری طرح دوسرے بن باپ کے بچے اور بے سہارا یتیم بہت ہیں لطف کے سروں تو ان کے سروں پر دست محبت پھیر۔ ان کے منہ سے گرد صاف کر، اپنی گود میں اٹھا لے۔ ہماری ربوبیت کا ایک حصہ ان کو بھی دے دے بہت سے تیم عقل والے بھی تیرے در پر آئیں گے جو دین کے سایہ سے محروم ہیں اور تجھ سے روشنی مانگیں گے۔ تو ان کی حق تلفی نہ کرنا، ان پر غصہ نہ کرنا۔ ہمارے عطا کردہ نور کی ایک کرن ان کو بھی دینا دیکھ کچھ نادار بے کس بے بس تیرے سامنے دست سوال پھیلائیں گے تو بھی نادار تھا وہ بھی ہوں گے۔ تیرے محتاج ہوں گے ان کو جھڑک نہ دینا ہم نے تجھے نوازا۔ تو بقدر استطاعت ان کو نوازنا۔ کچھ عقلی افلاس میں مبتلا بھی آئیں گے۔ دانشمند ہوں گے مگر بے دانش۔ ہدایت کی روشنی سے محروم۔ اپنے آئینہ نبوت پر پڑنے والی شعاعوں سے ایک کرن ان کو بھی دے دینا۔ ان کی عقل کو بھی چمکا دینا۔ تو ہمارے حریم قدس میں اس وقت تنہا آیا ہے۔ ہم نے تجھے باخبر کر دیا، نبی بنا دیا جا یہ پیام دے کر جا۔ رسول بن جا اور سب کو ساتھ لے کر آ۔ تیری عظمت دوبالا ہوگی۔ سونا کندن بن جائے گا۔ جب تو ٹوٹے ہوؤں کو ہم سے جوڑ دے گا اور ہمارے دروازے پہ لا کر کھڑا کر دے گا تو ہم ہمیشہ کے لئے تجھ اپنے خلوت کدے میں باریاب کر دیں گے اور ہمیشہ کے لئے نور کے چہرے سے نقاب اٹھا دیں گے۔

تحلیلِ اجزاء

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۔ امام احمد نے حضرت جندب بن عبداللہ البجلی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ کسی بیماری کی وجہ سے قیام شب نہ کر سکے (اور تلاوت قرآن کی آواز سنائی نہ دی) تو ایک کافر عورت نے کہا محمد میرے خیال میں تمہارے جن نے تم کو چھوڑ دیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ حضرت جندب کی روایت ہے یہ حدیث بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی بیان کی ہے۔ غالباً حضورؐ کی طبیعت کی ناسازی انگلی میں چوٹ لگنے کی وجہ سے تھی اور یہ طعن کرنے والی کافر عورت ابولہب کی بیوی ام جمیل تھی ملخصاً ابن کثیر عن ابن ابی حاتم۔

ابن جریر نے عبداللہ بن شداد کا قول لکھا ہے کہ خدیجہؓ نے رسول اللہ سے کہا تھا میرے خیال میں آپ کا رب آپ سے ناخوش ہو گیا ہے۔ دوسری روایت میں عروہ بن زبیر کا قول بھی آیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں اور غالباً سہو راوی سے اس روایت میں حضرت خدیجہ کا نام آ گیا ہے۔ کیونکہ حضرت خدیجہ کی وفات تو معراج سے پہلے ہو گئی تھی اور یہ سورت معراج کے قریب نازل ہوئی۔ سورۂ والنجم میں جو آیت فاوحی الی عبدہ ما اوحی آئی ہے اور جس وحی کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اس سے مراد بعض علماء کے نزدیک سورۂ والضحیٰ ہی ہے۔ محمد بن اسحاق تابعی کا بھی یہی قول ہے۔

ابن کثیر نے عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ جب چند روز تک وحی نہیں آئی تو کافروں نے کہنا شروع کیا کہ محمد کے رب نے اس کو چھوڑ دیا اسی پر یہ سورت نازل ہوئی۔

خطیب، رازی، بغوی، ابن کثیر اور اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ضحیٰ سے مراد وقت ضحیٰ ہے یعنی چاشت کا وقت جب سورج افق سے اٹھ آتا ہے اور اس کی کرنیں پھیل جاتی ہیں۔ بعض کے نزدیک پورا دن مراد ہے۔ اہل لغت نے سجیٰ کے تین معانی بیان کئے ہیں :

(۱) ٹھہر گئی یعنی قسم اس رات کی جو ٹھہر گئی یہ ابو عبیدہ مبرد اور زجاج کا یہی قول ہے۔ لیلۂ ساجی وہ رات جس میں ہوا رک گئی ہو۔ (۲) لمبی ہو گئی تاریک ہو گئی۔ لمبی اور تاریک رات کو بھی لیلۂ ساجی کہتے ہیں (فراء) (۳) ڈھانک لیا، آفاق پر چھا گئی، چھپا لیا جیسے کپڑا بدن کو چھپا لیتا ہے (اصمعی و ابن الاعرابی) اول معنی کی تائید مجاہد، قتادہ، و سدی کے قول سے ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سجیٰ کا ترجمہ کیا رات نے اپنی اندھیری سے ڈھانک لیا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ رات آتی ہے تو ہر چیز کو ڈھانک لیتی ہے حسن بصری

نے سجیٰ کا ترجمہ کیا رات نے لوگوں کو اپنی تاریکی کا لباس پہنا دیا۔ دوسرا معنی تاویل کے بعد تیسرے کے ذیل میں آجاتا ہے۔ اصمعی اور ابن الاعرابی کے قول کو مفسرین نے ترجیح دی ہے

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ یہ ان تصوں اور عام خیالیوں کی تردید ہے جن کا بیان شانِ نزول کے تفصیل کے وقت کر دیا گیا ہے۔ چند روز تک وحی نہیں آئی تھی۔ بارہ دن (ابن جریج) پندرہ دن (کلبی) یا پچیس روز (حضرت ابن عباس) یا چالیس روز (سدی و مقاتل) یہ تمام اقوال امام رازی نے تفسیر میں بیان کئے ہیں اور سب ضعیف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ انقطاعِ وحی کی مدت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں بہرحال انقطاعِ وحی کا زمانہ تھا۔ اور حضور اقدسؐ کی انگلی بھی کسی کافر کے پتھر سے زخمی ہو گئی تھی۔ جس کی تکلیف سے بقول ابن کثیر آپ دو تین رات نماز کے لئے نہیں اٹھے۔ اس پر کافر باتیں بنانے لگے کہ محمد کا خدا محمد سے ناراض ہو گیا۔ اس نے اس سے تعلق توڑ لیا۔ اللہ نے اس کے جواب میں قسم فرمایا نہ خدا نے تم کو چھوڑ دیا ہے نہ تمہارا دشمن ہو گیا ہے

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ خطیب اور ابن کثیر وغیرہم نے ترکیب اولیٰ سے مراد دیا ہے یعنی آخرت آپ کے لئے دنیا سے بہتر ہے امام رازی نے مطلب کی توضیح اس طرح کی کہ جب دنیا میں سلسلہ وحی منقطع ہو جائے گا یعنی آپ کی وفات ہو جائے گی تو آخرت میں اس سے بڑھ کر آپ کے لئے اعزاز ہوگا۔ امام احمد نے باسناد صحیح حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت نقل کی ہے کہ کھجور کی چٹائی پر سونے کی وجہ سے رسول اللہؐ کے پہلو پر نشان پڑ گئے میں نے نشانات پر ہاتھ پھیر کر عرض کیا۔ حضور نے ہم کو اطلاع نہیں دی۔ ہم چٹائی پر کچھ بستر کر دیتے۔ فرمایا مجھے دنیا سے کیا تعلق میں اس کی فکر نہیں کرتا۔ میری اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوار دھوپ کی شدت کی وجہ سے کسی درخت کے سایہ میں فروکش ہو جائے اور سورج ڈھلے اس کو چھوڑ کر چل دے۔ یہ حدیث ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی بیان کی ہے اور ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ حضرت عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا ہمارے لئے آخرت ہے اور روم و ایران کے کافروں کے لئے دنیا۔ دنیا ایسے شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں۔ یہ اس شخص کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں۔ دنیا کے لئے وہ جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں۔

اس فقیر کی نظر میں آخرت اور اولیٰ کے الفاظ عام ہیں۔ اولیٰ سے اگر دنیا مراد لی جائے تو گزشتہ آیت سے کوئی ربط ظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ تاویل کے بعد ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ الفاظ کو عموم پر چھوڑ دیا جائے۔ گزشتہ آیت میں کہا گیا تھا کہ دفعۃً وحی ترک کی نہیں۔ اللہ نے تم کو چھوڑ نہیں دیا نہ اس کو تم سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اس کلام میں پہلے کلام کا مثبتاً ثبوت پیش فرمایا کہ آپ کے لئے تو ہر آئندہ حالت پہلی حالت سے بہتر ہوگی۔ مال کے لحاظ سے بھی عزت کے اعتبار سے بھی۔ اقتدار کی حیثیت سے بھی، دشمنوں پر غلبہ اور رسالت کی روز افزوں کثرت کی وجہ سے بھی اور عرفانی مدارج اور قرب الٰہی کے مراتب کے حصول کی صورت میں بھی۔ اور آخر مرنے کے بعد خصوصی اعزاز و فضیلت کی شکل میں بھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رسول اللہؐ کی ہر حالت پہلی حالت سے بہتر ہوئی۔ اس سورت کے نزول کے وقت چند خصوصی سعادت مندوں کے سوا حضورؐ کی آواز پر کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا۔ بھائی برادر تمام اہلِ وطن، اپنے پرائے سب دشمن تھے۔ کوئی جادوگر کہتا تھا کوئی کاہن کوئی شاعر، کوئی مفتری۔ ہر شخص آزار کے درپے تھا لیکن رفتہ رفتہ جاں نثاروں کی کثرت ہونے لگی۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت جمنے لگی۔ سرکشوں کے سر جھکنے لگے۔ دشمن دوستوں کے صفوں میں آنے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زیادہ جاں نثار جمع ہو گئے اصحاب وہ تھے جو رسول اللہؐ کے عرق گرنے کے مقام پر اپنا پسینہ بہانے کو تیار نہ تھے اور اب حضورؐ کا پسینہ بہنے کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار ہو گئے۔ معاملہ الٹ گیا۔ نتیجہ تمام جزیرۂ عرب کا ظاہری اقتدار کے لحاظ سے بادشاہ ہو گیا اور روحانی اعتبار سے محبوب ترین رسول کریم۔ جس کو کبھی اپنے گھر کے اندر بھی چین سے نہ رہ سکتے تھے اور گھر بار کو چھوڑ کر ترکِ وطن کرنے پر مجبور کئے گئے تھے۔ اسی مکہ کے تمام باشندے رواج ملک کے لحاظ سے غلام ہو گئے۔ جن کو برسرِ منبر لسان نبوت سے آزادی سنا دیا گیا۔ وہ آغاز تھا یہ انجام ہوا۔ عرفانی مدارج کی ترقی کی بھی کیفیت یہی ہے۔ آغاز وحی کے وقت انتہائی اضطرار اور اختلاجِ قلب کا دورہ تھا اور حالت وحی منقطع ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔ جبرئیل امین کی اصلی شکل دیکھنے کے بعد دہشت طاری ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ قرب بڑھتا گیا۔ روحانیات سے لگاؤ زیادہ ہونے لگا۔ عالم ملکوت کی سیر ہونے لگی۔ مراتبِ قرب میں

اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار مرتبہ او ادنیٰ پر فائز ہو گئے پیہم وحی آنے لگی۔ اور یہاں تک کہ اندرون خانہ ہوں یا باہر جاں نثاروں کے حلقہ میں۔ ہر حال میں نزولِ وحی ہونے لگا۔ وہ ابتدا تھی۔ یہ انتہا ہوئی۔ سب آخرت کے مدارج ان کی تفصیل احادیث میں مذکور ہے۔ اس جگہ ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

طبرانی نے اوسط میں اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ کے لئے وہ معاملہ کھول دیا گیا جو آپ کے بعد آپ کی امت کو بشکل فتوحات پیش آنے والا تھا۔ (یعنی ایران و روم کے خزانوں کی فتح) میں اللہ نے نازل فرمایا وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَكَ مِنَ الْأُولَىٰ۔ حضرت ابن عباس کا یہ قول بتا رہا ہے کہ آخرت سے مراد صرف حیات بعد الموت ہی نہیں اور نہ رسول اللہ کی زندگی میں پیش آنے والی سہولتیں مراد ہیں بلکہ حضورؐ کے بعد بھی امت کو جو اقتدار حاصل ہوگا اور ان کی حکومت کی وسعت ہوگی۔ اس کا اظہار بھی اس آیت میں کیا گیا ہے۔ رازی نے بھی تقسیم کے بعد یہی لکھا ہے کہ یہ آیت عام ہے دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ۔ اور کچھ مدت کے بعد تمہارا رب تم کو ایسا کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے تم کو کوئی ناگواری باقی نہیں رہے گی۔

زمخشری، رازی، بیضاوی اور خطیب وغیرہ نے لَسَوْفَ کے لام کو تاکیدی ابتدائی کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ لام قسمیہ نہیں ہے ورنہ لیعطینک بنونِ ثقیلہ ہونا چاہیئے۔ لام قسمیہ مضارع پر اس وقت تک نہیں آتا جب تک مضارع کے آخر میں نونِ ثقیلہ نہ لایا جائے اور چونکہ لام ابتدائیہ صرف مبتدا پر آتا ہے اور کلام میں مبتدا مذکور نہیں ہے، اس لئے مقدر ماننا پڑے گا اصل کلام تھا لأنت لسوف يعطيك الخ۔ شیخ ابو علی فارسی نے اس کو لام قسمیہ کہا ہے اور صراحت کی ہے کہ نون ثقیلہ کے بجائے سَوْفَ تاکید کے لئے آگیا ہے، اس لئے نون ثقیلہ کی ضرورت نہیں۔

شیخ ابن کثیرؒ کے نزدیک اس آیت میں عطاء کا وعدہ کیا گیا ہے وہ آخرت کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی حوضِ کوثر وسیلہ مقامِ محمود۔ شفاعت امت اجابت اہل بیت کی مغفرت وغیرہ۔ توضیح مقصد کے لئے ہم چند احادیث و آثار نقل کرتے ہیں۔ ان احادیث کا تعلق صرف شفاعت سے ہے باقی امتیازات کا ذکر اس جگہ موجب طوالت ہے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مسند میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہم اہل بیت ہیں۔ ہمارے لئے اللہ نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی ہے (اور فرمایا ہے) ولسوف يعطيك ربك فترضى (ابن کثیر) صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت کردہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہؐ نے آیت فمن تبعني فانه مني الخ تلاوت فرمائی (یہ حضرت ابراہیم کے مقولہ کی نقل ہے) اور آیت ان تعذبهم فانهم عبادك الخ تلاوت فرمائی (یہ حضرت عیسیٰ کے قول کی نقل ہے) پھر دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور رو رو کر عرض کیا اللّٰهم امتي امتي (دعا قبول ہوئی) حضرت جبرئیل اللہ کا پیام لائے کہ ہم تمہیں امت کے معاملے میں ناخوش نہیں کریں گے راضی رکھیں گے۔ سدی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ کی رضامندی میں سے یہ بات بھی ہے کہ آپ کے اہل بیت میں سے کوئی جہنم میں داخل نہ ہو۔ (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم) دوسری روایت میں حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی آیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی میں سے یہ بات بھی ہے کہ آپ کی سب امت جنت میں داخل ہو۔ خطیب بغدادی نے تلخیص میں ان الفاظ کے ساتھ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ ہوں گے جب تک آپ کی امت کا کوئی شخص بھی جہنم میں ہوگا۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حرب بن شریح کا بیان نقل کیا ہے۔ حرب نے بیان کیا کہ میں نے ابو جعفر محمد باقر بن علی بن الحسینؓ سے عرض کیا۔ یہ شفاعت جو اہل عراق بیان کرتے ہیں کیا یہ حق ہے فرمایا ہاں۔ واللہ یہ سچ ہے مجھ سے محمد بن الحنفیہ نے اپنے والد حضرت علیؓ کی روایت نقل کی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا میں امت کے لئے برابر شفاعت کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ میرا رب مجھ سے فرمائے گا محمد کیا تو اب راضی ہوا؟ میں عرض کروں گا جی ہاں۔ میرے رب میں اب خوش ہو گیا۔ پھر امام باقر نے فرمایا تم اہل عراق کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید آفریں آیت قل يا عبادي الذين اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعا۔ ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا ہم اہل بیت کہتے آئے ہیں کہ سب سے بڑھ کر امید افزا آیت ولسوف يعطيك ربك فترضى ہے لامحالہ یہ شفاعت ہے (رواہ ابن المنذر و ابن مردویہ) شیخ ابن کثیر نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ عطیہ مرضیہ سے مراد شفاعت ہے۔ رازی نے گزشتہ آیت کی طرح اس

آیت کو عام معنی پر محمول کیا ہے۔ عطاء دنیوی ہو یا اخروی، ملی ہو یا اعتقادی، ظاہری ہو یا باطنی سب کو بعطیک کا وعدہ شامل ہے۔ اس فقیر کی رائے میں یہی اولیٰ ہے۔ جن آثار میں اس آیت کے ذیل میں شفاعت کا ذکر کیا گیا ہے وہ شفاعت کی تعیین داخلی کے لئے کیا گیا ہے تخصیص مقصود نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى - کیا اس نے تجھے یتیم پاکر ٹھکانا نہیں دیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ بی بی آمنہ کو حمل تھا کہ ان کے شوہر عبداللہ بن عبدالمطلب اپنی ننہیال سے ملنے مدینہ کو گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ چھ مہینے کا حمل تھا۔ بعض کا قول ہے کہ ولادت مبارکہ سے دو ماہ بعد والد کا انتقال ہوا۔ مفسر الفتح نے لکھا ہے کہ عبداللہ کو دار النابغہ یا مقام ابواء میں دفن کیا گیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد بی بی آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا جس وقت آپ کی عمر چھ سال (ابن کثیر) یا آٹھ سال (خطیب و ابو السعود) یا چار سال یا پانچ سال یا سات یا نو سال یا بارہ سال کی تھی (فتح الباری) مکہ کو ابواء یا حجون میں دفن کیا گیا (ابو الفتح) قوی ترین قول یہ ہے کہ والدہ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی۔ عبدالمطلب آپ کے دادا تھے۔ ان ہی کی نگہداشت اور کفالت میں آپ کی پرورش ہوئی۔ سن مبارک آٹھ سال کا تھا کہ دادا کا بھی انتقال ہو گیا اور عبدالمطلب کی وصیت کے مطابق آپ کے حقیقی چچا کفیل ہوئے۔ چچا تو عباس اور ابولہب بھی تھے مگر وہ عبداللہ کے علاتی بھائی تھے۔ ایک ماں سے تو صرف عبداللہ اور ابوطالب تھے۔ ابوطالب کا انتقال ہجرت سے کچھ پہلے ہوا۔ مجاہد کے نزدیک یتیم سے مراد دُرِّ یتیم ہے۔ عرب کا یکتا موتی بے مثال۔ فرد۔ بے نظیر۔ یعنی اللہ کیا اس نے دُرِّ یتیم اور فرد بے مثال پایا۔ اور ایسے جاں نثاروں میں جگہ دی جو جان و مال سے تم پر فدا تھے۔

خطیب نے اس تشریح کو ظاہر آیت کے خلاف قرار دیا ہے اور زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ انوکھی تفسیر ہے۔ رازی نے صراحت کی ہے کہ یتیم سے وہی لغوی اور شرعی یتیم مراد ہے جس کی عمر پندرہ سال ہونے سے پہلے اس کا باپ مر گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک رازی کا قول ہی صحیح ہے اور یہی تفسیر مراد ہے۔ چونکہ آخر صورت میں یتیم پروری نہ کرنے اور سائل کو نہ جھڑکنے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے اس جگہ یاد دلایا تھا کہ دیکھو تم یتیم تھے۔ اگر اللہ کسی کو تمہارا سرپرست اور نگراں نہ بناتا اور تمہاری کفالت کسی سے نہ کراتا۔ تمہاری بے کسی اور بے بسی کا کیا حال ہوتا اور تم محتاج بے زر بے پرتھے اگر خدا اپنے فضل سے تم کو غنی نہ بناتا اور تجارت کے شغل کے لئے ہی دوسروں کے محتاج رہتے تو تمہاری خستہ حالی و درماندگی کس درجہ کی ہوتی مزید تفصیل کے لئے آغاز صورت کے تحت تفسیری مقالہ پڑھو۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور تم کو (وادی عشق میں) سرگرداں پایا تو دین کے ذریعہ سے راہ دکھا دیا اور مقصد انسانیت کی منزل تک پہنچا دیا۔ ضالٌّ اسم فاعل۔ ضلالت، ضلول۔ مصدر۔ ضَلَّ یَضِلُّ۔ اسم مصدر۔ گمراہ ہو جانا۔ راستہ گم کر دینا۔ متحیر ہو جانا۔ کھو دینا۔ کلبی نے اس جگہ ضالًّا کا ترجمہ کیا ہے کافر اور قوم پرست یعنی ضالّ اور رافضیوں کا ایک فرقہ قائل ہے کہ نبوت سے پہلے نبی کا کافر ہونا جائز ہے۔ (دیکھو شرح تجرید)

سدی کا قول منقول ہے کہ آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ اللہ نے تجھے چالیس برس تک قوم کے طریقے پر پایا پھر اپنے نبی کو ہدایت دی (تفسیر الرازی فی الکبیر) یہ سب خرافات ہے۔ بقول امام رازی تمام فرقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ محمد بن عبداللہ پیدائش سے لے کر وفات تک کبھی کفر نہیں کیا نہ بت کو سجدہ کیا نہ شرک کیا۔ اس لئے ضالًّا کا ترجمہ کافر باطنی اور اعتقادی گمراہ کسی طرح درست نہیں بلکہ ضلالت سے کوئی دوسری معنی مراد ہے۔ تیسری مراد میں سلف کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن عباس، ضحاک، حسن بصری، شہر بن حوشب اور اکثر اہل تفسیر نے توضیح و اضافہ کی ہے کہ آپ کو احکام نبوت اور احکام شریعت سے ناواقف پایا۔ اس کی تائید میں دوسری آیت مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ اور ہے ہوتی ہے (الکبیر، بیضاوی وغیرہ) ایک روایت میں ضحاک کا قول اس طرح آیا ہے کہ تم قرآن اور شریعت اسلام سے واقف نہ تھے۔ خدا نے تم کو واقف بنا دیا (خطیب فی السراج) قتادہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ابن کثیر نے بغوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک ضلال سے مراد ہے کہ بچپنے میں مکہ کی گلیوں میں گم ہو گئے تھے۔ کلبی نے کہا ضلالت سے مراد یہ ہے کہ آپ کے اہل و عیال مر گئے تھے تو اللہ نے دادا اور چچا کے پاس پہنچا دیا۔ امام بغوی نے بعض کا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب ابوطالب کے ساتھ رسول اللہ شام کو گئے تھے تو شیطان نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر اس کو راستہ سے پھیر دیا تھا اور رات کی تاریکی میں راہ بھٹک گئی تھی۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ ضلال الماء فی اللبن۔ پانی

دودھ میں غائب ہو گیا - یہ عرب کا محاورہ ہے - اسی لئے ضالاً سے ماخوذ ہے یعنی اللہ نے کافروں کے اندر تجھ کو گمنام پایا پھر تجھے ہدایت دی اور تیرا نام روشن کیا یا یوں کہا جائے کہ ضال اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی بیابان میں اکیلا ہو۔ رسول اللہؐ بھی اکیلے درخت کی طرح مکہ میں تھے۔ کوئی ساتھی نہ تھا پھر اللہ نے آپ کو ہدایت کے راستے بتائے اور ان طریقوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے اس اکیلے درخت سے بہت سے درخت بن گئے یا ضالاً سے مراد ہے بچپن کا زمانہ جب کہ علم معرفت حاصل نہ تھا پھر اللہ نے معرفت عطا کر دی یا یہ مراد ہے کہ تم اپنی نبوت سے غافل تھے تم کو اپنا نبی بننا معلوم نہ تھا اللہ نے تم کو نبی بنایا۔ ضالاً کی تشریح میں متعدد اقوال اور بھی آئے ہیں کوئی روایت کے خلاف ہے کوئی درایت کے، اس لئے ان کو ذکر کرنا غیر مفید ہے۔ اس فقیر کی نظر میں سب سے زیادہ صحیح ترجمہ متحیر ہے یعنی اللہ نے تم کو متحیر پایا تو راہِ منزل بتا دی۔ تحیر کسی چیز میں تھا، حیرت کا باعث کیا تھا اس کے متعلق بکثرت اہل تفسیر نے لکھا ہے۔ آخری وقت میں مفتی عبدہ مصری اور فاضل کامل رشید رضا مصری کا قول ہے کہ رسول اللہؐ نبوت سے پہلے بھی اعتقاداً اور عملاً صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے نہ تھے۔ آپ کو فطری ہدایت حاصل تھی۔ شیطانی اغواء کا تو احتمال ہی نہ تھا ہاں یہ دھن ہر وقت تھی کہ گرد و پیش والوں کو راہِ مستقیم کس طرح دکھائی جائے۔ قبیلہ، قوم اور اہلِ وطن عموماً مشرک اور بت پرست تھے فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ بلکہ عیوب کو محاسن سمجھتے تھے۔ ایک سے ایک زیادہ جاہل، خدا ناشناس، سفاک، قمار باز اور ظالم تھا۔ رسول اللہؐ کو ملکی حکومت حاصل نہ تھی۔ ہمہ گیر انتشار منتشر تھا۔ انسانیت کا قافلہ گمراہی کی وادی میں بھٹکتا پھر رہا تھا اور آپ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ان کو سیدھا راستہ کیسے دکھاؤں آخر خدا نے وہ راستہ بتا دیا۔ قوتِ قدسیہ عطا کر دی اور نبوت کی طاقت مرحمت فرمائی۔ بے شک رشید رضا کی تحقیق اپنی جگہ صحت آگیں ہے، لیکن اس فقیر کی نظر میں تحیر کی ایک لطیف توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے خدا کی ذات و صفات پہچاننے کے لئے عقلِ بشری ناکافی ہے۔ سونا تولنے کی ترازو میں پہاڑ کو نہیں تولا جا سکتا۔ معروف کے اندازہ کے موافق ظرف کی وسعت ہونی چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ عقلِ انسانی فلک پیما ہے اور نجوم سے ماوراء پہنچتی ہے۔ مگر واجب قدیم کی ہستی امکان کی دنیا سے اونچی ہے۔ عقل ایک شعاع ہے آفتاب قدم کی مگر عکسی اور ظلی شعاع ہے جس کے اندر عکس ریز آفتاب قدم کی سمائی نہیں ہے۔ رسول اللہؐ اپنی قوم، ماحول اور وطن کے عقائد افکار اور اعمال کو اپنی عقلِ سلیم کے خلاف پاتے تھے، اس لئے فطری طور پر سب سے بیزار تھے، لیکن آپ کی عقلی روشنی مطالعہ ذات و صفات تک پہنچانے کے لئے ناکافی تھی۔ عقل نے چوراہے پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ منزلِ اصلی تک پہنچانے والی صرف ایک راہ تھی باقی راستے ٹیڑھے تھے، لیکن راہِ مستقیم کی تعیین عقل کا کام نہ تھا۔ آپ کج راہ نہ تھے، گمراہ نہ تھے، گم کردہ راہ تھے صراطِ مستقیم کی کوشش میں تھے۔ یکایک فیضانِ قدسی شروع ہو گیا شمع وجدان روشن ہو گئی۔ بابِ نبوت کھل گیا، آفتابِ قدم کی شعاعوں کی بارش ہونے لگی، حواس مغلوب ہو گئے، عقل سراسیمہ ہو گئی۔ چشمِ حقیقت بین میں خیرگی آگئی۔ آفتابِ حقیقت پر نظر نہ ٹھہر سکی۔ قدسی شعاعوں نے عقلِ بشری کی ٹمٹماتی شمع کی روشنی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سمندر میں قطرہ مل کر اپنی ہستی کھو بیٹھا۔ یہی سراسیمگی، حیرانی اور خیرگی تھی کہ رب رحیم نے ہاتھ پکڑا، خود راہ نمائی کی استغراق انجذاب اور بے خودی کو دور کیا۔ حواس میں طاقت، ہوش میں درستی اور عقل میں سلامتی لوٹا کر دی۔ ہمہ جہتی شعاعوں کی پرتو اندازی کے باوجود راہِ سلوک بتا دی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ وَرَاٰی مَا رَاٰی۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی۔ عروج کی انتہا پر پہنچنے کے بعد نزول ہو گیا۔ قطرہ اپنی جگہ پر قطرہ رہا اور سمندر اپنی جگہ سمندر۔ خیرگی جاتی رہی، استقامت پیدا ہو گئی۔ عبد کا معبود میں ادغام اور انضمام نہ ہوا۔ معبود نے عبد میں حلول نہ کیا۔ شعاع آفتاب میں حل ہو کر یکذات نہ بنی اور توحید الوہیت و ربوبیت کا راستہ مل گیا۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰی۔ اور اللہ نے تم کو محتاج پایا تو بے نیاز کر دیا۔ عائل نادار یا عیال دار محتاج۔ رازی نے کہا اس جگہ عائل سے مراد ہے نادار۔ اس کی تائید مصحف ابن مسعود کی روایت سے ہوتی ہے جس میں عائلاً کی بجائے عدیماً (نادار) آیا ہے۔

رسول اللہؐ نادار تھے۔ اللہ نے آپ کو غنی بنا دیا۔ غنی بنانے سے مراد ہے مال دار بنا دینا، لیکن اللہ نے کس مال سے آپ کو غنی بنایا، کسی نے کہا خدیجہؓ کے مال سے کسی نے کہا ابوبکر صدیقؓ کے مال سے۔ کسی نے کہا انصار کے مال سے۔ کسی نے کہا مالِ غنیمت سے۔ آخری دونوں قول غلط ہیں۔ سورت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ اور اس وقت نہ جہاد کا حکم ہوا کہ مالِ غنیمت حاصل ہوتا نہ ہجرت ہوئی تھی کہ انصار کا مال ہاتھ لگتا۔ بیوی کا مال یا کسی دوست کا مال اپنی ملک جیسا نہیں ہوتا اور غنی ہونے کا اطلاق اس وقت ہو سکتا ہے جب اپنی ملک میں مال ہو کوئی اپنے مال میں تصرف کرنے کا

مختلف ہدیہ ہدیے تو اس سے ملکیت حاصل نہیں ہوجاتی اور بغیر ملکیت کے غنی ناممکن ہے ۔ اس لئے لفظ جس طرح مطلق ہے اس کو مطلق ہی رکھا جائے تو بہتر ہے ۔ گویا غنی بنانے سے مراد بے نیاز کر دینا ہے ۔ اللہ نے اپنے رسول کو بے نیاز کر دیا یعنی ضروریات زندگی پوری کر دیں ۔ خواہ کسی کے ہدیہ سے ہوں یا ہبہ سے ۔ یا کسی اور حلال ذریعہ سے کلبی کا قول اس جگہ زیادہ مناسب ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کے قلب کو غنی بنا دیا ۔ مالداری اور ناداری دونوں حالتوں میں اضطراب آفریں فقر باقی نہیں رہا ۔ قدر کفالت پر آپ قانع ہوگئے اور یہی سب سے بڑی غناء ہے ۔ فراء نے بھی اسی تشریح کو پسند کیا ہے مزید تنقیح کے لئے تمہیدی مقالہ دیکھو ۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ روئے خطاب رسول اللہ ؐ کی طرف ہے اور مراد خطاب عمومی ہے ۔ سابقہ یتیمی اور اس کی غیبی امداد یاد دلانے کے بعد حکم دیا کہ یتیم پر قہر نہ کرو ۔ یعنی ایسی بات نہ کرنا جس میں یتیم کی ذلت اور اہانت ہو ۔ بے وارث جان کر اس کا حق نہ دبانا (فراء) اس کے ساتھ مہربان باپ کی طرح برتاؤ کرنا (قتادہ) یتیم پر ظلم نہ کرنا اور یاد رکھنا کہ تو بھی یتیم تھا (مجاہد) نقلناہ من السراج

رسول اللہ ؐ نے فرمایا مسلمانوں کی بستی میں وہ گھر سب سے اچھا ہے جس میں کوئی یتیم اچھی طرح سے پرورش پاتا ہو اور وہ گھر بہت برا ہے جس میں کسی یتیم سے بدسلوکی کی جاتی ہو ۔ فرمایا یتیم کی کفالت کرنے والا میرے ساتھ جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا ۔ حضور ؐ نے اپنی دونوں انگلیاں ملا کر بتایا ۔ فرمایا جس شخص نے یتیم کا کھانا پینا اور دوسرا خرچ اپنے ساتھ ملا لیا (یعنی ان چیزوں کی کفالت کی) تو یہ فعل قیامت کے دن اس کے لئے دوزخ سے روک ہو جائے گا ۔ فرمایا جس شخص نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کے لئے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہوگی (الصحاح)
امام رازی نے تفسیر کبیر میں حضرت انس ؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب یتیم کو رلایا جاتا ہے تو اس کے آنسو اللہ کی گود میں (یعنی بارگاہ خداوندی میں) گرتے ہیں ۔ اللہ فرماتا ہے جس نے اس یتیم کو رلایا (کیا) وہ نہیں جانتا کہ میں نے اس کے باپ کو خاک کے نیچے دبا دیا ہے جو کوئی اس کو چپ کرے اس کے لئے جنت ہے ۔ (یتیم کی مزید تشریح کے لئے دیکھو تمہیدی مقالہ)

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ حسن بصری کے نزدیک اس آیت میں سائل سے مراد ہے طالب علم ۔ اگر کوئی شخص شریعت و معرفت کا کوئی مسئلہ دریافت کرے تو اس کو جھڑکنے کی اس آیت میں ممانعت فرما دی ۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے جب حضور سے کوئی مسئلہ دین پوچھا اور حضور والا ؐ نے ترش روئی کا اظہار کیا تو سورہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی میں اللہ نے ناخوشی اور عتاب آمیز ناخوشی ظاہر فرمائی ۔ عام اہل تفسیر کے نزدیک سائل سے مسکین مراد ہے ۔ یعنی اگر مسکین کا سوال پورا نہ کر سکو پھیر دینا پڑے تو نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ واپس کرو (قتادہ بروایت ابن کثیر) صحاح میں آیا ہے کہ رسول اللہ ؐ کسی قسم کے سائل کو رد نہ فرماتے تھے ۔ ہوتا تو دیدیتے نہ ہوتا تو دوسرے وقت کا وعدہ فرما لیتے ۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ کے ضعیف بندوں کے ساتھ سخت کلامی اور سنگ دلی سے پیش نہ آؤ ۔

آیت میں سائل کی کوئی خاص قسم بیان نہیں فرمائی نہ کسی مخصوص نوع کی طرف اشارہ ہے ۔ اس فقیر کے نزدیک مطلقاً سائل مراد لینا ہی اولیٰ ہے ۔ یہ جدا بات ہے کہ طالب علم کا درجہ طالب مال سے چونکہ اونچا ہے ، اس لئے اس کو زجر کی ممانعت طالب مال کو جھڑکنے کی ممانعت سے زیادہ سخت ہے مگر اس آیت میں اس فرق مرتبہ کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ۔ خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ مشہور دلال تصوف ابراہیم بن ادھم نے فرمایا سائل اچھے لوگ ہوتے ہیں کہ ہمارا توشہ آخرت ہمارے لئے اپنے اوپر لاد کر چلتے ہیں ۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ سائل ہمارے زندوں کی طرف مردوں کے لئے سوغات پہنچاتے ہیں ۔ سائل تمہارے دروازوں پر آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا اپنے عزیزوں کے یہاں کچھ سوغات بھیجو گے

کس سائل کو رد کرنا اور جھڑکنا جائز ہے زمخشری نے رسول اللہ ؐ کی طرف اس حدیث کی نسبت کی ہے کہ جب تین مرتبہ تونے سائل کو جواب دے دیا تو پھر اس کو جھڑکنے میں تجھ پر ملامت نہیں ۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ جو لوگ مسجدوں کے اندر نمازیوں سے سوال کرتے ہیں ان کو کچھ نہ دینا چاہیئے اور اس حرکت سے روکا جائے ۔

کیا سائل صرف مسکین ہی ہوتا ہے ۔ سوال کی کثرت احادیث میں بکثرت وارد ہے ۔ مثلاً نہ کسی نے توانگر کے لئے سوال حلال ہے ۔

نہ تندرست طاقتور کے لئے ۔ سوا اس کے کہ محتاجی کمر توڑ دے یا پریشان کن قرض کا بار ہو جائے ۔ یاد رکھو کہ جو شخص مانگ مانگ کر اپنا مال بڑھاتا ہے تو وہ مال قیامت کے دن اس کے چہرے کی خراشیں ہو گا اور وہ جہنم کے انگارے کھائے گا (ترمذی و طبرانی) جو شخص لوگوں سے مانگتا رہے گا قیامت کے دن اس کے چہرے پر بالکل گوشت نہ ہو گا (ابن ماجہ) اگر کسی کے پاس بقدر ضرورت یا بے نیاز کرنے والا مال ہو اور پھر وہ لوگوں سے سوال کرے تو وہ روز قیامت کے دن اس کے چہرے کی خراش ہو گا (ابوداؤد)

ان احادیث کی روشنی میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر صبح کا کھانا موجود ہو تو شام کے کھانے کا سوال کرنا جائز نہیں، لیکن سوال کی ایسی مذمت کے ساتھ دولت مندوں کو یہی حکم ہے کہ کسی سائل کو ناکام واپس نہ کریں اور ظاہری حالت کو دیکھ کر کسی سائل کو مالدار نہ سمجھیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ سائل کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر آئے (ابن ماجہ) یعنی اگرچہ سائل گھوڑے پر سوار ہو اور بظاہر مالدار معلوم ہوتا ہو، لیکن کیا معلوم اس پر کیا مصیبت پڑی ہے اور کتنا مقروض ہے، اس لئے سوال کو رد نہ کرنا چاہیئے۔

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔ اللہ کی نعمتیں ان گنت ہیں، کوئی شمار بھی نہیں کر سکتا۔ بیان کرنا اور شکر کرنا تو درکنار۔ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ نعمت کو بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کی توفیق بھی ایک نعمت ہے، اس طرح یہ سلسلہ غیر محدود ہے، اس لئے آیت میں ہر نعمت کو بیان کا حکم مراد نہیں۔ کیونکہ ایسے حکم کی تعمیل استطاعت سے خارج ہے۔ البتہ لفظ نعمت چونکہ غیر مقید ہے، اس لئے ہر روحانی، عقلی، جسمانی اور مالی نعمتیں اس کے اندر داخل ہیں۔ صحت، عزت، حکومت، مالی استغناء، نور دانش، سلامتی حواس، دینداری تقویٰ اور تجلیات معرفت سب ہی خداداد ہیں۔ اکتسابی نعمتوں کا بالآخر رجوع مرہبت اور عطاء خداوندی کی طرف ہوتا ہے، اس لئے ہر نعمت واجب التحدیث اور موجب شکر ہے۔

شیخ ابن کثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے نزدیک نعمت سے مادی نعمت ہی مراد ہے اور تحدیث نعمت سے نعمت کا بیان۔ کیونکہ امام ابن جریر کی نقل کردہ حدیث میں آیا ہے کہ سعید بن ابی نضرہ تابعی نے فرمایا کہ مسلمانوں کے نزدیک شکر نعمت صرف یہ تھا کہ نعمت کو بیان کیا جائے۔ سنن کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس نے آدمیوں کا شکر نہیں کیا۔ ابوداؤد کی روایت میں حضرت جابرؓ کی حدیث آئی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جس کو نعمت دی گئی اور اس نے اس کو بیان کیا تو (حقیقت میں) شکر ادا کیا اور جس نے نعمت کو چھپایا اس نے ناشکری کی۔ ابوداؤد کی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے اگر کسی کو کچھ دیا جائے اور دینے والے کا بدلہ دینے کے لئے کچھ اس کے پاس ہو تو بدلہ دیدے اور بدلہ دینے کے لئے کچھ نہ ہو تو دینے والے کی تعریف کرے جس نے تعریف کر دی اس نے شکر ادا کر دیا اور جس نے (کسی کو دی ہوئی) نعمت کو چھپایا اس نے ناشکری کی یعنی کسی کی عطا کردہ نعمت کو مخفی نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ واضح طور پر اقرار کرنا چاہیئے کہ فلاں شخص نے مجھے یہ چیز عطا کی ہے۔ اگر کسی کے عطیہ کے اظہار کو اپنی کسر شان سمجھ کر اخفاء کی کوشش کرے گا تو ناشکری ہوگی۔ مگر یاد رکھو کہ اظہار نعمت غرور و خودداری کے جذبے کے زیر اثر نہ ہو ایسا اظہار حرام ہے۔ دولت، عزت یا حکومت وغیرہ کا اظہار جو دواعی رعونت و تکبر کے تحت جائز نہیں۔ اسی لئے علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عبادت گزاری اور شب بیداری کا تذکرہ دوسروں کی ترغیب و تشویق کے لئے کرتا ہے تو مستحسن ہے ورنہ درست نہیں۔ اسی طرح صدقات مالیہ کا اظہار تہمت سے بچنے یا دوسروں کو ترغیب دینے کے لئے مستحب ہے اور اظہار تفاخر کے لئے حرام۔ ابن کثیر اور خطیب نے لکھا ہے کہ مجاہد کے نزدیک نعمت سے مراد نبوت ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ مجاہد کے نزدیک قرآن مراد ہے۔ محمد بن اسحاق نے مجاہد کے اول قول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ نے جو نبوت تم کو عطا کی ہے اس کو بیان کرو اور دوسروں کو اس کی دعوت دو اور دوسرے قول کی تشریح میں خطیب نے لکھا ہے کہ قرآن خود بھی پڑھو اور دوسروں کو بھی پڑھ کر سناؤ۔ مطلب دونوں قولوں کا ایک ہی ہے کہ اللہ نے جو حکم نازل فرمایا اور جو وحی بھیجی ہے اس کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ تحدیث نعمت کی ایک صورت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر اللہ کسی کو اپنی نعمت سے نوازے تو لازم ہے کہ وہ ہیئت اور لباس وغیرہ سے اپنی فقیری نمایاں نہ کرے اور مسکینی نمائی نہ بنے۔ کیونکہ سنن کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک شخص پھٹے حالوں بیٹھا تھا حضورؐ نے دریافت فرمایا کیا تیرے پاس مال ہے اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا جب اللہ نے تجھے نعمت دی تو اپنی دی ہوئی نعمت کا نشان تیرے اوپر دیکھنا اس کو پسند ہے۔ (سراج)

مقصودِ بیان ۔ والضحیٰ والیل اذا سجیٰ میں تاریخی انقلابات عروج و نزول اور کائنات کو گھیرنے والے حیات و موت کے چکر کو شہادت

میں پیش کیا گیا ہے جو شہادت دے رہا ہے کہ سعادت شعار، حق پرست افراد کی حالت خدا کرتا ہے۔ بظاہر کچھ مدت کے لئے اگرچہ ان کو خود کبھی اور دوسروں کو بھی ان کی پستی، کمزوری اور شکستہ حالت اور کم مائیگی نظر آتی اور محسوس ہوتی ہے، لیکن بارگاہ الوہیت اور حظیرۂ قدس سے ان کا تعلق منقطع نہیں ہوتا ہے۔ اللہ کو ان سے دشمنی اور نفرت پیدا نہیں ہو جاتی۔ وہ بے یار و مددگار ان کو نہیں چھوڑ دیتا۔ ان کا ہر انجام آغاز سے اور مستقبل ماضی سے بہتر ہوتا ہے۔ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ میں صراحت ہے کہ پیدائش سے لے کر وفات تک اور وفات سے لے کر غیر منقطع ابدی زندگی اخرٰی۔ رسول اللہ صلعم کا ہر ساعت حیات اور ہر لمحۂ وجود رو بہ ترقی ہوتا اور رہے گا۔ ایمان و یقین، علم و عرفان، عزت و شوکت، اکرام خدا دوندی اور قرب الٰہی تمکین مادی اور روحانی حیثیت سے رسول اللہ صلعم الاً فحالاً ابداً آناً فاناً عروج و ترقی کی جانب مائل تھے اور رہیں گے۔ فاما الیتیم اور اما السائل میں خصوصیت کے ساتھ صراحت ہے اس بات کی کہ کسی یتیم کی حق تلفی نہ کی جائے۔ حقوق العباد میں تمام احکام سے پہلے یتیم و سائل پر مہربانی کے حکم کا نزول بتارہا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ بجائے خود کتنے ہی اہم ہیں اور یقیناً ان پر اسلام کی بنیاد ہے اور عبادت بدنیہ و مالیہ عبادت ہیں۔ لیکن معاملات انسانیہ میں کمزوروں پر رحم اور بے کسوں کی دست گیری ہی اسلامی سماج کی بنیادی اینٹیں ہیں۔ اسلامی معاشرے میں خستہ حالوں پر ظلم کرنے یہاں تک کہ کسی شکستہ دل سے درشت کلامی کرنے کی بھی اجازت نہیں گویا اسلام کی جماعتی تاسیس ہی نہیں ہوتی جب تک مظلوم، مجبور، بے کس، بے بس، ضعیف الحال اور ناتوان و نزار طبقہ کو اوپر نہ اٹھایا جائے اور اس کی مدد نہ کی جائے۔

سُورَةُ الانشراح

اس سورت کا نام سورۂ الم نشرح بھی ہے۔ تمام روایات متفق ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ حضرت عائشہ رض کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ والضحیٰ کے بعد اس کا نزول ہوا۔ اس میں آٹھ آیات ۲۹ کلمات اور ۱۰۳ حروف ہیں۔

طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز والضحیٰ اور الم نشرح کو ایک سورت کہتے تھے، اسی لئے دونوں کو ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور الم نشرح سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے تھے (رازی) باتفاق علماء، والضحیٰ اور الم نشرح الگ الگ سورتیں ہیں۔ مصحف عثمانی میں بھی ان کو الگ الگ سورتیں ہی لکھا گیا تھا۔ رہا طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز کا قول تو شاید راوی نے ان کے قول کا مطلب نہیں سمجھا۔ چونکہ دونوں سورتوں کا تعلق رسول اللہ کی ذات سے ہے اور مضمون میں انتہائی یگانگت ہے، اس لئے ممکن ہے کہ طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہو کہ دونوں ایک ہی ہیں یعنی ایک ہی مضمون کی ہیں۔ رہا ترک تسمیہ کا سوال تو ظاہر ہے کہ امام اعظم کے نزدیک بسم اللہ کسی سورت کا جز نہیں۔ پس ہوسکتا ہے کہ ان بزرگوں نے بھی اسی مسلک کو پسند کیا ہو اور امام کا مسلک انہی کے مسلک کے موافق ہو۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اُتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؕ فَاِذَا

نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا سو بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہے تو جب آپ تبلیغ احکام سے

ع ۸ ۱۹

فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھیئے

تفسیر اللہ کی عطا کردہ نعمتیں بے شمار ہیں۔ سورج کی گرم روشنی، چاند کی خنکی آمیز ضیا پاشی، ستاروں کی فیض بیزی، باران نعمت، سبزہ زار مرغزار، کھیتی، غلہ، پھل پھول، غرض بیرونی عمومی ان گنت نعمتوں کے علاوہ خصوصی کرم کا فیضان بھی ناقابلِ احاطہ ہے۔ جوانی، صحت جسمانی، حسن تناسب اعضاء، توازن قویٰ، طاقت، دولت، عزت، وجاہت، اقتدار، درستی حواس اور علوم حسیہ، روشنی عقل اور علوم عقلیہ صحت وجدان اور معارف روحانیہ سب ہی خداداد نعمتیں ہیں اور آیت واما بنعمۃ ربک فحدث میں بلاتخصیص تمام نعمتوں کو شکریہ ادا کرنے کا حکم ہے۔ لیکن سینہ کی ایسی وہبی کشائش کہ جس میں جہانِ حق وصداقت سما جائے اور قلب کی وہ وجدانی وسعت جو ہدایت کی تمام پہنائیوں کو محیط ہو اور روح کو وہ نورانیت جس کی ضیا پاشیاں، حق و باطل، شک و یقین اور تردد و ایمان کے امتیاز کو واضح طور پر سامنے لا رہی ہوں۔ ایسی عظیم الشان نعمت ہے جس کی نظیر میں کسی دوسری کسبی یا وہبی نعمت کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس سے مقربین بارگاہ خصوصاً انبیائے کرام سرفراز کئے جاتے ہیں۔ آئینۂ نبوت پر یہی تدبیر توانگن ہو کر بورے آئینہ کو نورِ مجسم بنا دیتا ہے۔ تمام انبیاء کی قوت قدسیہ کم و بیش حسب تفاوت درجہ اسی نور سے اقتباس کرتی ہے۔ لیکن ان کا آئینۂ نبوت ظلمت کدۂ جہالت میں پڑے ہوئے سیاہ باطن والوں کی کثیف روح کو کس طرح روشن کرے۔ ضیا اندوزی کے بعد نور پاشی کی کیا تدبیر ہو نابیناؤں کی چشم بصیرت میں بینائی کس طرح پیدا کی جائے۔ گرفتاران مادیت کو کثافت مادیت سے کیونکر رہائی دی جائے بیچ در بیچ گمشدگان وادی گمراہی کو کس طور رہیر ہدایت بنایا جائے یہ بار گراں ابتدا میں ان کے لیے قوت شکن اور حوصلہ فرسا ہوتا ہے۔ ان کی خواہش کی تکمیل عوائق راہ دور کئے بغیر نہیں ہوتی اور راستے کے پتھر ہٹانا طاقت بشری سے خارج ہوتا ہے۔ ان کے پاس مادی اسباب نہیں ہوتے، اقتدار محیط نہیں ہوتا ملوکیت عامہ حاصل نہیں ہوتی۔ فرماں برداروں کی کثرت نہیں ہوتی۔ مال کی قارونی فراوانی نہیں ہوتی۔ ہاں عزم راسخ ہوتا ہے۔ کوشش فوق البشریت ہوتی ہے کد و کاوش پیہم ہوتی ہے۔ عمل مسلسل ہوتا ہے۔ آخر غیبی قدرت ان کی مساعدت کرتی ہے۔ ناخن تدبیر جس گرہ کو کھول نہیں سکتا تھا۔ اعانت تقدیر اس کو وا کر دیتی ہے۔ کوشش رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ کامیاب ہونے لگتی ہے۔ بارِ ثقیل ہلکا ہونے لگتا ہے۔ مخالفتوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ چمنستان ہدایت کے خوشہ چین پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں بینائی نمودار ہونے لگتی ہے۔ دلوں میں زنگ صاف ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مخالف موافق اور گمراہ رہ یاب بن جاتے ہیں۔ دشمن دوست اور نافرمان فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ مردم جاں نثاری سے بدل جاتا ہے۔ پیغمبروں کی گمراہی تہمت عامہ کے عوض زائل ہو جاتی ہے۔ عزت ذلت کی جگہ لے لیتی ہے۔ تنگی اور دشواری کی جگہ سہولت اور فراخی حاصل ہو جاتی ہے۔ مصیبت متغیر ہو کر راحت بن جاتی ہے۔ اطاعت گزاروں کا جتھہ تیار ہو جاتا ہے اور اس دکھ کے عوض ان کو دو سکھ حاصل ہو جاتے ہیں۔ دنیوی اور دینی، عزت دنیا اور فلاح آخرت لیکن وہ اپنی اس کامیابی پر مغرور نہیں ہو جاتے مخلوق کی سیادت و قیادت خالق سے ان کا رشتہ منقطع نہیں کر دیتی بلکہ حالت نزول اور اصلاح خلق کی تکمیل کے بعد وہ پھر عروج کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ فرض تبلیغ سے فارغ ہو کر اپنے اصلی مرکز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں نزول سے نکل کر عروج کی طرف جانا اور عروج سے پھر نزول کی طرف آنا۔ ان کا ہمہ وقتی پوری زندگی کو گھیرنے والا مشغلہ بن جاتا ہے۔ کبھی طلب گاران حق و ہدایت کو تبلیغ کرتے اور راہِ زندگی کے چھوٹے چھوٹے موڑ بتاتے ہیں۔ پھر فوراً ہی اپنے رخ کو پھیر کر حظیرۂ قدس کے رہنے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ کر قربِ خداوندی میں پہنچ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین تھے۔ تمام اہل قرب سے زیادہ مقرب تھے۔ مبلغ اعظم تھے۔ آپ کو بھی ہر نعمت سے بڑی نعمت شرح صدر کی عطا کی گئی تھی۔ شرح صدر کہو یا شق صدر یا قلب کی پہنائی یا وجدان روحانی کی وسعت سب کا ایک ہی معنی ہے۔ ہر حال فیضانِ قدسی کا وہ بحر نا پیدا کنار موجزن تھا جس کے اندر علوم اولین و آخرین سمائے ہوئے تھے۔ آفتاب الوہیت کی کرنوں کی پرتو اندازی تھی جس نے

قلب کو نور مجسم بنا دیا تھا۔ آپ کو بھی پرتو اندازی کے بعد ضو پاشی کی فکر تھی، لیکن کوئی نور چین نہ تھا۔ آپ کی بشری طاقت، مختار مطلق نہ تھی کہ دلوں کی کایا پلٹ دیتی۔ ہر قدم پر کفر و جہالت کے پتھر حائل تھے جو راستہ روک رہے تھے۔ معاً ..... اسلام کی کالی گھٹا آفاق گیر تھی۔ ہر سمت تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی تدبیر سود مند نہ تھی۔ بیگانہ تو بیگانہ ہر شخص دشمن تھا۔ سنگ و خشت و خون کا پیاسا تھا۔ آخر غیبی قدرت نے راہ نمائی کی، کارسازی کی، دلوں کے زنگ دور ہونے لگے۔ سیہ روحیں چمکنے لگیں۔ کثیف دماغوں میں جلا ہونے لگی۔ دشمن دوست بن گئے۔ نافرمان گمراہ ہدایت یافتہ فرمانبردار ہو گئے۔ کلمۂ توحید کے ساتھ کلمۂ رسالت بھی حرز جان اور ورد زبان بن گیا۔ نازک اندام خواتین، مشہ زور مرد اور باشعور بچے سب ہی حلقہ بگوش رسالت ہو گئے۔ ایوانوں میں، نازوں میں نشست میں برخواست میں، رفتار میں گفتار میں جلوت میں خلوت میں بہر طور ہر ایک شخص محمد رسول اللہ کے ذکر سے رطب اللسان رہنے لگا۔

آپ یہ حالت دیکھ کر سربسجود ہو گئے اور تکمیل نزول کے بعد پھر عروج کی طرف توجہ کی۔ عروج سے نزول کی طرف آئے تھے۔ اب پھر ہبوط تحتانی کی تکمیل کے بعد صعود فوقانی میں مشغول ہو گئے۔ ایک ملکۂ راسخہ اور ایک قوت مستقلہ حاصل ہو گئی۔ باہمہ بے ہمہ کے مصداق بن گئے۔ جہان ہست و بود کی ہر موڑ پر اصلاح کرتے کے ساتھ ہی خالق کائنات کے اشارۂ مخفی کو بھی پیش قلب کے سامنے رکھنے لگے۔ دنیا اور اسباب دنیا سے ظاہری تعلق برقرار رکھنے کے باوجود بر رشتہ تھی توڑ دیا اور جس وسیع کی ربوبیت تفصیلی کا یہ فیضان تھا اسی کی طرف راغب ہو گئے۔

تحلیل اجزاء

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ گزشتہ سورت اور اس سورت میں معنوی اتحاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جن نعمتوں کا خصوصی فیضان ہوا ان کا ذکر گزشتہ سورت میں بھی کیا گیا ہے اور اس سورت میں بھی۔ اور ذکر نعمت کے ذیل میں اس سورت میں بھی کچھ عملی ہدایت کی گئی تھی اور الما الیتیم فلا تقہر اما السائل فلا تنہر اور اما بنعمۃ ربک فحدث فرمایا تھا اور اس سورت میں بھی تذکرۂ احسان پر متفرع کر کے دو حکم دیئے۔ اور فرمایا فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب۔ فرق یہ ہے کہ سورت گزشتہ میں جن ہدایات کا ذکر تھا ان کا تعلق مخلوق سے تھا اور اس سورت میں جو ہدایات ہیں ان کا تعلق ذات خالق سے ہے۔ گویا اول الذکر سے مقصود حالت نزول کی تکمیل ہے اور آخر الذکر کی مراد حالت عروج کی تکمیل۔ کیونکہ نبی کا رشتہ نہ مخلوق سے قابل شکست ہے نہ خالق سے۔ آئینۂ نبوت کا کنکشن آفتاب الوہیت سے بھی ضروری ہے تاکہ نور بین ہو سکے اور مخلوق سے بھی ضروری ہے تاکہ پرتو انداز اور عکس ریز بن سکے۔ شرح صدر سے کیا مراد ہے علماء کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں۔ لفظی ترجمہ ہے سینہ کا کشادہ ہونا تنگ نہ ہونا۔ شیطانی وسوسوں کا مقام سینہ ہی ہے۔ جب سینہ میں تنگی نہ ہوگی تو شیطانی وسوسہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ محمد بن علی ترمذی کا قول ہے کہ دل ہی عقل و معرفت کا مقام ہے اور دل کا قلعہ سینہ ہے۔ شیطان کو اس قلعہ کے اندر رسائی مل جاتی ہے تو دل پر چھاپہ مارتا ہے۔ اور دل کے اندر اپنا لشکر اتار دیتا ہے۔ حرص و ہوا، رنج و الم، مایوسیاں، آرزوئیں، ناامیدیاں اور امیدیں غرض تمام دنیوی افکار و خیالات کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ اس وقت نہ ایمان کی لذت ملتی ہے نہ اسلام کی چاشنی اور حلاوت، لیکن اگر اس قلعہ کے اندر شیطان کو رسائی نہیں ملتی تو دل کشادہ رہتا ہے۔ امن و ایمان کا محل بن جاتا ہے۔ (سراج) دوسری جگہ اللہ نے اسی مضمون کی صراحت فرمائی ہے۔ فرمایا ہے فمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فہو علی نور من ربہ میں حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کا نور جب دل میں داخل ہوتا ہے تو سینہ اس کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس غریب خانہ یعنی دنیا سے اس کا قلبی تعلق باقی نہیں رہتا اور خانۂ ابدی کی جانب جھکاؤ ہو جاتا ہے اور موت سے پہلے اس کا سامان فراہم کرتا ہے۔

ابوالسعود نے بیضاوی اور زمخشری کے اتباع میں شرح صدر کا یہ مطلب لکھا ہے کہ چونکہ سینہ ہی تمام علوم اور ادراکات اور ارادوں کا مقام ہے پس اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے دل کے اندر انسانی فضائل و کمالات بھر دیئے علوم ربانیہ سے دل لبریز ہو گیا۔ دوسروں کو ہدایت و تلقین کرنے کی قوت پیدا ہو گئی۔ جسمانی تعلقات اور آویزشیں، روحانی کمالات حاصل کرنے سے مانع نہیں ہوئے اور خلق سے تعلق استغراق حق کا حجاب نہ بن سکا۔
امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک شرح صدر سے شق صدر مراد ہے جو نبوت سے پہلے بچپن کی حالت میں بطور ارہاص (معجزہ قبل از نبوت) بھی واقع ہوا تھا۔ اور حضرت جبرئیلؑ نے سیاہ خون رسول اللہ ﷺ کے سینے سے نکال دیا تھا اور نبوت کے بعد بھی شاید دو مرتبہ ہوا۔ گویا یہ علامت تھی اس بات کی کہ آئندہ گناہوں کی طرف دل کا میلان نہ ہوگا۔ اور تمام معاصی سے قلب معصوم رہے گا۔ ابوالسعود نے لکھا ہے کہ دل سے سیاہ خون کو نکال دینے سے مراد شاید تمثیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شق صدر کی حقیقی کیفیت حسی عقل سے نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس کو سمجھنے کیلئے

عقل وجدانی اور فہم نورانی کی ضرورت ہے ۔ اہلِ حق کا مسلمہ ہے کہ اہلِ ایمان ، جہالت کفر ، اطاعت ، معصیت غرض تمام معانی کی عالم مثال میں تمثیلیں موجود ہیں ۔ روح اور روحانیات کی سب خصوصی غیر مادی صورتیں ہیں جن کو حسی آنکھ نہیں دیکھتی ۔ پس ممکن ہے کہ علماء علم و ایمان بصورت شق صدر ہوا اور جہالت و کفر کی شکل خون کے سیاہ لوتھڑے کی ہو ۔ معانی روحانیہ کی تعبیر کے لئے حسی اشکال کی ضرورت ہے ورنہ وسعت دانش میں ان کی سمائی ناممکن ہے ۔ ان کو دیکھنے کے لئے چشم وجدان کی ضرورت ہے ۔ اور وجدان کی دنیا فوق الشعور ہے ۔ بغوی نے فراء کا قول نقل کیا ہے کہ شرح صدر سے مراد ہے ایمان و نبوت اور علم و حکمت کے لئے قلب میں صلاحیت پیدا کر دینا اور دل کو نرم کر دینا (معالم)

وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۔ یعنی وہ بارِ ثقیل جو تمہاری پشت کو بوجھل بنائے ہوئے تھا کیا ہم نے نہیں اتار دیا ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ گزشتہ آیت پر اس کا عطف ہے ، لیکن یہ قول شبر دعطف لفظی نہیں ہے ورنہ وضعنا لم کے تحت آکر الم وضعنا ہو جائے گا اور یہ درست نہیں بلکہ عطف معنوی ہے ۔

نقض ظہرک کی تشریح کرتے ہوئے زجاج وغیرہ نے لکھا ہے کہ نقیض چرچراہٹ کی آواز کو کہتے ہیں ۔ جب کسی اونٹنی کی پشت پر اتنا بوجھ لدا ہو کہ چرچر کی خفیف آواز سنائی دے اس وقت عرب کہتے ہیں انقض الحمل ظہر الناقۃ ۔ آیت کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارا سینہ کھول دیا ۔ اور عبادات کی بوجھ ہلکا کر دیا ۔ وزر کا لغوی معنی ہے بار یا گناہ ۔ آیت میں کیا مراد ہے ۔ بقول امام رازی اس میں اختلاف ہے اور علماء تفسیر کے متعدد اقوال منقول ہیں ۔ ۱ بار وحی ۔ حضرت جبرئیل جب پہلی بار وحی لے کر آئے تو رسول اللہ پر اتنا بار گراں پڑا کہ آپ کانپنے لگے اور انقطاع وحی کے بعد گھر واپس آئے تب بھی لرزاں اور ہراساں تھے ۔ یہاں تک کہ سردی کا دورہ ہو گیا اور کمبل اوڑھ لیا ، لیکن رفتہ رفتہ یہ بار ہلکا ہونے لگا ۔ وحی میں لذت روحانی آنے لگی اور اتنا اشتیاق بڑھ گیا کہ چند روز کے لئے جب سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا تو اضطرار کی حالت میں اپنے کو پہاڑ سے گرانے کا ارادہ کر لیا اور آخر میں تو اٹھتے بیٹھتے اندرونِ خانہ اور بیرون کاشانہ وحی مسلسل آنے لگی اور ایسی وسعت قلب ہوئی کہ وحی بار نہ رہی ۔

۲ بار رسالت ۔ رسول اللہ کے گرد و پیش کفر کا احاطہ تھا ۔ ہر طرف شرک ، فسق اور معصیت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے ۔ گویا شرک اور گناہ اور بدکرداری لوگوں کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی ۔ جب رسول اللہ ؐ کو اصلاح و تبلیغ کا حکم دیا گیا تو اس حکم کی تعمیل آپ کے لئے سخت دشوار تھی ۔ خوگرانِ شرک و معصیت سے ان کے محبوب کو چھڑانا اور واحد لا شریک لہ کے دروازے پر پیشانیاں جھکوا دینا معمولی کام نہ تھا ۔ تعمیل حکم خدا میں اپنے قوم اور بیگانوں کو دشمن بنا لینا اور پھر دشمنوں کو اللہ کا فرمان بردار کر دینا کتنا خطرناک ، کتنا دشوار اور کتنا پشت شکن بار تھا ، لیکن اللہ نے قوت برداشت عطا فرمائی ۔ کنبہ والوں کی دشمنی محلہ والوں کی عداوت اور شہر و ملک کی مخالفت کی آپ کو پرواہ نہ رہی ۔ حوصلہ بلند ہو گیا ۔ عزم راسخ بن گیا کوشش پیہم کی توفیق مل گئی ۔ جہانِ کفر کی عظمت آپ کی نظر میں پرِ کاہ کی برابر نہیں رہی ۔ آخر عسر کے بعد اللہ نے یسر عطا کیا اور برداشت مشقت کے بعد کامیابی مرحمت فرمائی ۔ دشمن دوست بن گئے ۔ نافرمان اطاعت گذار ہو گئے ۔ خوگرانِ شرک پرستارانِ توحید ہو گئے ۔ عقیدہ اور اعمال کا فساد صحت و صلاح سے بدل گیا ۔

۳ وزر سے مراد وہ زنگ اور کدورت ہے جو چالیس برس تک ماحول کے کافر ہونے سے رسول اللہ ؐ کے قلب مبارک پر آگئی تھی ۔ یہ صحیح ہے کہ قلب مبارک کا تاثر لوہے کا میل نہ تھا ۔ موتی کا غبار تھا ۔ شیشے کی کثافت نہ تھی ، آفتاب کی چھائیں تھی ، لیکن پھر بھی کدورت تھی جس کو دور کرنے کی فکر آپ کو ہر وقت لگی رہتی تھی ۔ آپ سے نبوت سے پہلے بھی کسی کبیرہ گناہ کا صدور نہیں ہوا نہ کسی صریح گناہ کی طرف میلان طبع ہوا ، لیکن صحبت کفار اور منادمت فساق اور مجالست مشرکین بھی آپ کے لئے بارِ عظیم تھی ۔ روحانی بوجھ تھا ۔ معصوم روحانیت کے لئے پشت شکن تھا ۔ اللہ نے اس سے درگذر فرمائی ۔ آئینۂ روح کو ہر قلیل ترین کثافت سے بھی پاک کر دیا ۔ گزشتہ کدورت سے صاف اور آئندہ لغزش سے معصوم بنا دیا ۔ بے شک اس کثافت کو دور کرنے کے لئے بڑی ریاضت اور رعونت شکن مجاہدہ کرنا پڑا ۔ عزلت گزینی اختیار کرنی پڑی ، نفس امارہ کا زور توڑنا پڑا ، لیکن اللہ نے شرح صدر کر دیا ۔ حق و باطل میں کھلا ہوا امتیاز کر دیا ۔ راہِ صدق دکھا دی ۔ تکلیف کو راحت سے اور عسر قلبی کو یسر سے بدل دیا ۔

۴ وزر سے مراد وہ تحیر ہے جو نبوت سے پہلے رسول اللہ کے قلب پر ہر وقت طاری رہتا تھا ۔ یہ تو یقین راسخ تھا کہ قوم کے مشرکانہ عقائد

اور فاسقانہ اعمال غلط ہیں۔ یہ سب بے راہ ہیں، لیکن راہِ حق کون سی ہے۔ افکارِ صحیحہ کون سے ہیں۔ توحیدِ الوہیت و ربوبیت کی کیا تفصیل ہے۔ مبدء و معاد کے صحیح خد و خال کیا ہیں۔ مآلِ انسانیت کیا ہونا چاہیئے۔ انہماک فی الدنیا بے شک برا ہے۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے۔ اس سے جذبۂ انسانیت مُردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا رہبانیت اور ترکِ دنیا راہِ نجات ہے۔ کیا ان تمام حیوانی قوتوں کو جو انسان کو دی گئی ہیں مردہ کر لینا درست ہے اگر ان کی موت ہی موجبِ سعادت ہے تو انسان کو یہ دی ہی کیوں گئیں۔ ان کے ہونے سے انسان کو فائدہ کیا پہنچا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے افکار قلب مبارک کو متحیر بنائے ہوئے تھے۔ آخر اللہ نے بابِ نبوت کھول دیا۔ شرحِ صدر کر دیا اور اس بارِ ثقیل کو دور کر دیا۔ اہلِ تفسیر وزر کی تشریح میں چند دوسرے اقوال بھی بیان کئے ہیں، لیکن ہم نے زیادہ مناسب، اور مربوط مطلب کو پسند کیا اور چار معانی پر اکتفا کیا۔ تفصیل کے لئے دیکھو امام رازی کی تفسیر کبیر وغیرہ

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ گزشتہ آیات میں دو خصوصی انعامات کا ذکر فرمایا تھا شرحِ صدر اور تخفیفِ بار۔ یہ تیسرے احسان کا بیان ہے۔ اور یہ ایسا اعزاز ہے کہ سوا رسول پاک کی ذاتِ گرامی کے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ جو رفعتِ ذکر، نام آوری، شہرتِ عظمیٰ اور عزتِ کبریٰ حضور ﷺ کو عطا کی گئی وہ نہ کسی نبی مرسل کو ملی نہ ملک مقرب کو۔ رفعتِ ذکر سے کیا مراد ہے۔ اس کی تعیین مشکل ہے۔ ہم اول علماء کے چند اقوال نقل کرتے ہیں پھر قولِ فیصل لکھیں گے۔ صاحب معالم نے فراء کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور مجاہد کے نزدیک بلندی ذکر سے مراد اذان ہے یعنی اذان میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اشہد ان محمد الرسول اللہ کہا جاتا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے بھی اپنے نعتیہ کلام میں کہا تھا۔

وَضَمَّ الْإِلٰهُ اسْمَ النَّبِيِّ إِلَى اسْمِهٖ إِذَا قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ أَشْهَدُ

یعنی اللہ نے اپنے نبی کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جب مؤذن پانچوں نمازوں کے لئے اذان دیتا ہے تو اللہ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا نام بھی لیتا ہے اور شہادتِ توحید کے ساتھ رسالت کی شہادت بھی دیتا ہے۔ قتادہ نے ذرا عموم کے ساتھ کہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا ذکر دونوں جہان میں بلند کیا خطیب خطبہ میں رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتا ہے۔ ہر کتاب میں حمد کے ساتھ نعت ضرور لکھی جاتی ہے۔ نماز میں درود پڑھی جاتی ہے اور اذان میں شہادتِ توحید کے ساتھ شہادتِ رسالت ضرور دی جاتی ہے۔ شیخ صرصری نے کہا ہمارا فریضہ صحیح نہیں ہوتا جب تک مکرر سہ کرر حضور کا ذکر نہ کریں۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا نام اپنے نام کے ساتھ ہر جگہ بلند کیا۔ اذان میں، اقامت میں، تشہد میں، جمعہ کے خطبہ میں، عید الفطر، عید الضحیٰ اور عرفہ کے دن، ایامِ تشریق میں، کنکریاں مارنے کے وقت صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کے وقت۔ یہاں تک کہ نکاح کے خطبہ میں بلکہ اقرارِ رسالت کو داخلۂ جنت کی شرطِ ضروری قرار دیا۔ حضرت ابو سعید خدری کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے آکر کہا کہ رب جلیل فرماتا ہے محمد میں نے تیرا نام کیوں کر بلند کیا۔ میں نے جواب دیا میرا رب ہی خوب واقف ہے۔ فرمایا جب میرا ذکر کیا جاتا ہے تو تیرا نام بھی ذکر کیا جاتا ہے (رواہ ابن ابی حاتم و ابو یعلی و ابن المنذر و ابن حبان) اس مضمون کی تائید بعض دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے جو ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں ذکر کی ہیں اور ابن کثیر نے ان کو نقل کیا ہے۔

امام رازی نے کبیر میں لکھا ہے کہ رفعتِ ذکر کی جتنی صورتیں اہلِ تفسیر نے بیان کی ہیں وہ تعیینی نہیں ہیں (مثلاً حضرت ابن عباس کا قول کہ رفعت ذکر سے اذان میں مؤذن کی شہادتِ رسالت مراد ہے یہ تعیین نہیں ہے صرف تمثیل ہے کیونکہ اذان کا اجرا مکہ میں نہیں ہوا مدینہ میں ہوا اور یہ سورت مکی ہے، اس لئے حضرت ابن عباس کی تفسیر کو تعیین مراد پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ رفعتِ ذکر کی آپ نے ایک مثال دے دی) بلکہ عموم آیت میں سب داخل ہیں۔ اللہ نے اپنے ذکر کے ساتھ رسول اللہ کا ذکر قرآن میں بکثرت فرمایا ہے مثلاً فرمایا واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ وغیرہ۔ اس فقیر کی نظر میں بھی آیت کو عموم پر رکھنا ہی اولیٰ ہے۔ اسی لئے شیخ ابن کثیر نے انبیاء کے عہد ازل کو بھی رفعتِ ذکر کی ہی ایک شاخ قرار دیا۔ آیت واذ اخذ اللہ میثاق النبیین الخ۔ میں جس میثاق کو بیان کیا ہے وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے رفعتِ ذکر کی ایک واضح شکل ہے۔ بعض علماء نے توراۃ اور انجیل اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی ان

بشارتوں کو اسی رفعت کی ایک شاخ قرار دیا ہے جن میں رسول اللہ کے متعلق پیشین گوئیاں کی گئی ہیں یا حضورؐ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں یا انبیاءؑ نے اپنے خلفاء اور امتوں کو حضورؐ کے اتباع کی وصیتیں کی ہیں سب کا شمول اسی رفعت ذکر میں ہے واللہ اعلم۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ بلاغت عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی ایک ہی لفظ کو الف لام کے ساتھ مکرر ذکر کیا جائے تو دونوں لفظوں کی مراد ایک ہی ہوتی ہے۔ تکرار لفظ موجب استیناف نہیں ہوتی اور اگر کسی لفظ کو بصورت نکرہ مکرر ذکر کر دیا جائے تو دونوں لفظوں کی مراد جدا جدا ہوتی ہے۔ تکرار لفظ معنی کے تعدد کو ظاہر کرتی ہے۔

آیت مذکورہ میں العسر کو الف لام کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا اور یسراً کا ذکر بصورت نکرہ ہے، اس لئے العسر سے باوجود تعدد لفظ کے ایک ہی عسر مراد ہے اور یسراً کی تکرار بتا رہی ہے کہ دونوں یسر مختلف ہیں۔ عسر کا معنی مشقت، دشواری سختی اور یسر کا معنی ہے راحت آسائش۔ حسن بصری نے فرمایا سلف (صحابہ) کہتے تھے کہ اکیلا عسر دو یسر پر غالب نہیں آسکتا۔ (ابن کثیر کذا رواہ ابن ابی حاتم) دوسری روایت میں آیا ہے حسن بصری نے کہا ایک روز رسول اللہؐ ہشاش بشاش شگفتہ رو یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے ہرگز دو یسر پر ایک عسر غالب نہیں آسکتا۔ حضورؐ یہ الفاظ بار بار فرما رہے تھے۔ پھر آپ نے آیت فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا تلاوت فرمائی (رواہ ابن جریر باسنادہ صحیح) قتادہ نے فرمایا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے صحابہ کو اس آیت سے خوش خبری دی اور فرمایا کہ ایک عسر کبھی دو یسر پر غالب نہیں ہوگا۔

ایک عسر کے ساتھ دو یسر ہونے کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ پہلے آسائش تھی پھر تکلیف آگئی پھر تکلیف راحت سے بدل گئی۔ مَعَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ عسر کی مدت یسر کے مقابلے میں اتنی قلیل ہوتی ہے کہ یسر اگرچہ عسر کے بعد ہوتا ہے مگر عسر کی مدت کم ہونے کی بنا پر گویا یسر عسر کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ عسر و یسر سے مراد کیا ہے تو جن علماء کے نزدیک عام قاعدۂ بلاغت کے مطابق ایک عسر اور دو یسر مراد ہیں ان کے نزدیک دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید نہ ہوگا بلکہ عسر اول کے ساتھ یسر جدید کی بشارت باخبر ہوگی۔ یعنی مشقت اور سختی برداشت کرنے کے دو خوش گوار نتیجے ہیں ایک دنیا میں فلاح دوسرے آخرت میں کامیابی یا ایک صلاح دنیا دوسرا فلاح آخرت یا ایک ایمان اور اطمینان قلب اور دوسرا سعادت ابدی یا ایک ابتدائی سہولت اور دوسری مشقت کے بعد فوراً ظاہر ہونے والی راحت۔ حقیقت میں اس میں رسول اللہؐ اور صحابہ کے لئے بشارت ہے کہ اس وقت اگرچہ تم پریشان حال، نادار، قلیل التعداد اور کمزور ہو، لیکن عنقریب وقت آرہا ہے کہ تمہاری پریشان حالی راحت سے، ناداری دولت سے، قلت تعداد کثرت سے اور کمزوری قوت سے بدل جائے گی، تمہارا بول بالا ہوگا۔ دولت، عزت، حکومت، اقتدار سب کچھ تمہارے قبضہ میں آجائے گا پھر آخرت میں نجات ابدی تم کو نصیب ہوگی۔ گویا اس کلام سے مقصود ہے بلندی حوصلہ، عزم راسخ اور سعی پیہم کی تلقین اور ایمان و توحید پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم۔

لیکن بعض علماء کا قول ہے کہ دوسرا جملہ اول جملہ کی تاکید ہے کیونکہ نکرہ کو بصورت نکرہ ذکر کرنے سے یہ ضروری نہیں کہ دوسرے لفظ کا معنی اول لفظ کے معنی سے جدا ہو دیکھو اِنَّ مَعَ الفَارِسِ سَيْفًا۔ ان مع الفارس سیفاً میں دوسرا جملہ تاکیدی ہے دو تلواریں مراد نہیں ہیں۔ اسی مضمون کی فخر الاسلام بزدوی نے تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان مع زید کتابا۔ ان مع زید کتابا میں دو کتابیں مراد نہیں ہیں بلکہ دوسرا جملہ محض تاکیدی ہے۔ کتاب ایک ہی مراد ہے۔ صدر الشریعت نے بھی اسی قول کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے اوّل معنی کو ترجیح دی ہے حسن بصری قتادہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کے تشریحی اقوال اور بعض مرسل احادیث اوّل معنی کی تائید کرتی ہیں۔ رہا فخر الاسلام بزدوی کے اعتراض کا جواب تو ظاہر ہے کہ اگر قرینہ ایسا موجود ہو جس سے سمجھا جا رہا ہو کہ دوسرے نکرہ سے وہی معنی مراد ہے جو پہلے نکرہ کا ہے تو ضرور تاکید کا فائدہ ہوگا۔ تعدد معنی نہ ہوگا۔ جیسے ان مع الفارس سیفا یا ان مع زید کتابا میں ہے، لیکن اگر وحدت کا قرینہ نہ ہو تو بلاغت کا تقاضا ہے کہ تکرار لفظ کو تعدد معنی پر محمول کیا جائے۔

خطیب نے آیت اور حدیث سے ایک لطیف نکتہ استنباط کیا ہے فرماتے ہیں ایک عسر دو یسر پر غالب نہیں آسکتا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک یسر (یعنی دنیوی راحت) پر تو عسر کا غلبہ ممکن ہے (جیسا کہ بعض صالحین ہمیشہ عسر میں مبتلا رہے) لیکن دوسرے یسر پر عسر کو غلبہ

حاصل نہیں ہو سکتا۔ مومنین صالحین کے لئے یسر آخرت تو بہر حال حاصل ہی ہوگا۔ یہ نکتہ لطیف ہے مگر سیاق آیت کے خلاف ہے۔

یہ سب اختلاف اس صورت میں ہے کہ دوسرے العسر کے الف لام کو عہدی مانا جائے لیکن اگر اس کو محض تعریف جنسی کے لئے قرار دیا جائے تو دوسرا جملہ یقیناً مستقل معنی رکھتا ہے اور اول جملہ کی تاکید ہے۔ گویا مطلب یہ ہوگا کہ عسر کے ساتھ یسر توام ہے۔ رات کے بعد دن کا آنا، خشکی کے بعد بارش ہونا، اندھیری شب کے بعد صبح کا پیدا ہونا ضابطۂ فطرت ہے۔ سنت الٰہیہ ہے۔ اس لئے موجودہ مصائب کے بعد راحت کا دور آنا ضروری ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو تحیر عقلی کے بعد ہدایت وجدانی عطا فرمائی۔ فقر کے بعد غنا مرحمت کی، پشت شکن ثقل کے بعد خفت عنایت کی۔ بس یقین رکھو کہ وہ پیغمبر کو اور مومنین صالحین کو مشقت وسعی کے بعد سکون و راحت عنایت کر دے گا۔ دکھ کے بعد سکھ دے گا۔ ظلمت کفر کی جگہ نور اسلام چمکے گا۔ دنیوی ذلت و نکبت عزت و دولت سے بدل جائے گی۔ خدا کسی کی محنت ضائع نہیں کرے گا۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۔ نصب کا معنی ہے قیام۔ کھڑا ہونا جب تم فارغ ہو جاؤ تو قیام کرو۔ جملہ کے مرادی معنی مختلف طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود و حضرت ابن عباس نے فرمایا جب تم نماز فریضہ سے فارغ ہو جاؤ تو تہجد کے لئے قیام کرو۔ حضرت ابن عباس کا دوسرا قول ہے جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو دعا کے لئے قیام کرو۔ یہ قول علی بن ابی طلحہ کی روایت میں آیا ہے۔ شاید ان اقوال میں فرض نماز سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔ کیونکہ اس سورت کا نزول معراج سے پہلے ہوا اس وقت پنجگانہ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں۔ ہاں اگر معراج سے بعد سورت کا نزول ثابت کر دیا جائے تو پنجگانہ فرض نمازیں مراد ہوں گی۔ زید بن اسلم اور ضحاک کا قول ہے کہ جب تم جہاد سے فارغ ہو تو عبادت میں قیام کرو۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ جہاد کا حکم مدینہ میں ہوا تھا اور یہ سورت مکی ہے۔ فراء نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ جب نماز سے فراغت ہو تو دعا میں کوشش کرو۔ شیخ ابن کثیر نے مجاہد کا یہ قول لکھا ہے کہ جب تم دنیوی امور سے فارغ ہو جاؤ تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

بغوی نے فَانْصَبْ کا ترجمہ کیا ہے محنت کرو مشقت اٹھاؤ۔ کیونکہ نصب کا معنی ہے تعب تکان۔ اسی بناء پر قتادہ، مقاتل اور کلبی سے یہ مطلب منقول ہے کہ جب نماز فرض سے فارغ ہو تو دعا کرنے میں کوشش کرو۔ ضحاک کا بھی ایک قول اسی طرح مروی ہے، لیکن یہ مطلب غلط ہے۔ کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ رض کی صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نماز فرض کے سلام کے بعد رسول اللہ ﷺ اتنے بیٹھتے تھے کہ اللّٰھم انت السلام ومنک السلام تبارکت ربنا وتعالیت یا ذا الجلال والاکرام پڑھ لیتے تھے۔ علی بن ابی طلحہ کا قول منقول ہے کہ فراغت سے مراد ہے تندرستی یعنی تندرستی کی حالت میں عبادت کی محنت برداشت کرو۔ بعض لوگوں نے شریح کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ فراغت سے مراد فکر معاش سے فراغت ہے۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ۔ یعنی دوزخ کا ڈر اور جنت کی امید رکھتے ہوئے اللہ ہی کی جانب تضرع کرو اسی سے زاری کرو۔ بعض علماء نے کہا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ ہی کی طرف رغبت کرو۔ زجاج کا قول بھی اسی کے قریب ہے (معالم) حاصل یہ کہ فراغت کے بعد خلق سے اپنا رشتہ توڑ لو خالق سے جوڑ لو۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف اپنا رخ پھیر لو۔ اس فقیر کی نظر میں آیت کو الفاظ کے مطابق سیاق کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے عموم پر رکھنا بہتر ہے آیت میں فراغت کا تعین نہیں ہے۔ نہ ضعف و بیماری سے فراغت نہ فکر معاش سے فراغت نہ نماز فرض سے فراغت نہ مطلق نماز سے فراغت نہ جہاد سے فراغت نہ دنیوی امور سے فراغت کسی صحیح حدیث میں بھی کوئی خاص تفسیر مروی نہیں۔ خود ساختہ تعین ناقابل اعتبار ہے۔ رفتار کلام کا تقاضہ ہے کہ آیت کے معنی میں عموم قائم رکھا جائے۔

(پارۂ عم کی باقی تفسیر جزء سوم میں جلد پیش کی جائیگی)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبحَان

کا

پارہ نمبر ۳۰

(جزو سوم)

عم

از

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ "مولوی" دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی

ناظرین "مولوی" کے اصرار پر

بصورت پارہ

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بک ڈپو دیوبند

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی)

٣٠
تیسواں پارہ
(جزو سوم)

اور اس کے ذیل میں تمام مذکورہ بالا معانی کو داخل کیا جائے ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ جب تم نزول کی تکمیل کر چکے تو اب عروج کی طرف آؤ ۔ تم یتیم الاب تھے ہم نے تمہاری خبر گیری کی اور پرورش کرائی ۔ تم یتیم العقل تھے ہم نے تم کو عقل وجدانی عطا کی ۔ تم مفلس تھے ہم نے تمہیں مال دیا ۔ تمہارے پاس علمی سرمایہ نہ تھا ہم نے تم کو علم عطا کیا ۔ وہ کون سی نعمت ہے جو ہم نے تم کو عطا نہیں کی ۔ ہماری نعمتوں کو یاد کرو ۔ تم کو وسعتِ قلب دی تمہاری روح کو روشن کیا ۔ بندشِ قلب دور کی ، انبساطِ خاطر عطا کیا ۔ ایسی روحانی بینائی مرحمت کی جس میں علوم اوّلین و آخرین سما گئے ۔ حقیقت واضح ہو گئی ۔ حق سامنے آ گیا ۔ تمہاری ہر دلعزیزی ، عزت اور محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ۔ تمہارا نام ہر شخص کے وردِ زبان ہو گیا ۔ اذانوں میں نمازوں میں ، زمینوں میں اور آسمانوں میں تمہارا ذکر جمیل ہونے لگا ۔ تم نے تعلق بالخلق کی حالت میں تکلیفیں اٹھائی تھیں ۔ ہمارے حکم کی تعمیل میں جسم کو جسمانی اور دماغی رنج پہنچا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم نے تم کو چھوڑ دیا ، لیکن ایسا نہ تھا آخر وہ دکھ سکھ سے بدل گیا ۔ محنت بار آور ہوئی ۔ عسر کے بعد یسر مل گیا ۔ اب سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کسی کے ساتھ نہ رہو ۔ کسی سے قلبی وابستگی نہ پیدا کرو ۔ کسی کی طرف رُخ نہ کرو ۔ کسی سے قلبی رشتہ نہ جوڑو ۔ لوٹ کر ہماری طرف ہی آؤ ۔ ہر حال میں ۔ ہر قال میں ۔ ہر رفتار میں ۔ تمام اطوار میں ہمارا وصل ہمارا قرب اور ہمارے حضور کی تمنا تمہارا مرکزِ ارادہ ہونا چاہیئے ۔ واللہ اعلم ۔

مقصودِ بیان انبساطِ قلبی اور شرحِ صدر بڑی نعمت ہے ۔ تمام جسمانی اور مادی نعمتوں سے اس کا مرتبہ اعلیٰ اور بالا ہے ۔ اسی لئے تو مادی نعمتوں کے تذکرے کے بعد اس کا ذکر کیا ۔ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے اور ہوا بھی اسی طرح ۔ حالتِ یتیمی سے نوازشِ الٰہیہ حضور اقدس صلعم کے شاملِ حال رہی صحت ، عزت ، دولت اور فرماں برداربیوی سب ہی خداداد نعمتیں تھیں ، لیکن حقیقت پر انبساطِ خاطر ان سے نہیں ہوا تھا ۔ ابھی حقیقت پردہ کے اندر مستور تھی ۔ عارف کی نظر اونچی ہوتی ہے ۔ یہ تمام چیزیں اس کی نظر میں خداداد نعمتیں ضرور ہوتی ہیں ، لیکن مرکزِ طلب نہیں ہوتیں ، دل کش نہیں ہوتیں ، اصل مقصودِ انسانیت نہیں ہوتیں ۔ بلکہ شرحِ صدر قلب کی علمی وسعت اور روح کی ہمہ گیری روشنی اس کے لئے مآل سپتی ہوتا ہے ۔ کیونکہ قربِ خداوندی کا حصول ان کے بغیر ممکن نہیں ۔ ہر عالم اور عارف کا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیئے ۔ دنیوی مال ومنال اور عزت وجمال کو مقصودِ انسانیت قرار دینا شانِ عرفان کے خلاف ہے ۔ یہ نعمتیں تو موانع راہ کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہیں ۔ اصل مقصد تو شرحِ صدر اور قلب کی وسعتِ علمی ہے ۔ اس کے حصول کے لئے کمر بہت مضبوط باندھنا لازم ہے ۔ دنیوی علائق و موانع کاپشت شکن اور حوصلہ فرسا یا ، سنگِ راہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ کوشش اور محنت سے ان موانع پر قابو پانا لازم ہے ۔ پیہم سعی سے ہی یہ کامیں دور ہو جاتی ہیں ۔ عوائق اور موانع کو دیکھ کر مایوس نہ ہونا چاہیئے ۔ دکھ کے بعد سکھ حاصل ہونا یقینی ہے ۔ رفعنا لک ذکرک سے معلوم ہوتا ہے کہ شہرتِ عامہ اور لوگوں کے دلوں میں جمی ہوئی عزت بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے ، لیکن یہ رفعتِ ذکر کبھی ضرر رساں بھی ہوتی ہے ۔ بڑے مکاروں کو بھی عوامی عزت حاصل ہو جاتی ہے ۔ فریبی پروپیگنڈسٹ بھی لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں ، لیکن ان کے لئے یہ عزت سودمند نہیں ۔ نقصان رساں ہوتی ہے ۔ کچھ لوگ علم وعرفان اور نیکی کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کے سامنے اپنی نمائش کرتے ہیں اور ان کے خرقۂ سالوس کے اندر شیطان چھپا ہوا ہوتا ہے ۔ بھولے بھالے بے علم عوام ان کے شکار بن جاتے ہیں ۔ ان کو ولی اللہ اور قطبِ وقت قرار دے کر سر آنکھوں پر بٹھاتے اور دلوں میں جگہ دیتے ہیں ، لیکن کچھ مدت کے بعد یا تو ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور دنیا حقیقتِ پس پردہ سے واقف ہو جاتی ہے اور وہ لوگوں کی نظر

سے گر جاتے ہیں، اور دنیا ہی میں ان کی رسوائی ہو جاتی ہے۔ اور اگر مرتے دم تک لوگوں کو ان کے اصل خد و خال دکھائی نہیں بھی دیئے تو قیامت کے دن تو ضرور ان کا پردہ چاک ہوگا۔ اور فریب علم و عمل ان کے لئے ضرر رساں ثابت ہوگا۔ اسی لئے رفعنا لک فرمایا۔ یعنی آپ کی شہرت عامہ اور عزت جمیلہ دنیا میں بھی اور دین میں بھی ہر جگہ آپ کے لئے سود مند ہوگی۔ کیونکہ یہ جھوٹی عزت نہیں۔ مکاری سے حاصل کی ہوئی شہرت نہیں۔ غلط نظریہ حیات پیش کر کے حاصل کی ہوئی محبت نہیں بلکہ خالص تکریم الٰہی ہے اور تبلیغ حق کے عوض عطا کی ہوئی عزت ہے۔

فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا میں عمومی پیام ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو پیش آمدہ مصائب کو دیکھ کر ہمت شکستہ ہو بیٹھتے ہیں اور کوشش سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ آئندہ کبھی فلاح حاصل نہیں ہوگی۔ یہ آیت صراحۃً ایک ضابطۂ فطرت کو بتا رہی ہے جو سارے انسانوں کو محیط ہے۔ خیر و شر، نیکی بدی، دکھ سکھ، صحت مرض، افلاس و دولت، ذلت عزت اور تمام متقابل حالات اس دنیا میں ہمزاد ہیں، قائم ہیں۔ ہر کیفیت اپنے ساتھ ہی دوسری متقابل کیفیت کو لے کر چل رہی ہے۔ قوت پیام ضعف ہے، زوال عروج سے ہم کنار ہے، رات دن کی قاصد ہے، لیکن تغیر حالات کے لئے کوشش شرط اولیں ہے۔ کائنات کی رفتار موجب تغیر ہے۔ سکون محال ہے۔ قدرت کے کارخانے ہیں۔ اسی کشاکش حیات اور دور عروج و زوال کا نام زندگی ہے۔ لیکن یہ تنازع کمال زندگی نہیں، مرکز زندگی نہیں، راہ زندگی ہے۔ منزل زندگی تو مقام قرب الٰہی ہے۔ اس لئے اس کشاکش سے فراغت کے وقت اسی کے حصول کی تمنا کرنی اور اسی کو مقصد سفر قرار دینا لازم ہے۔ فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب سے یہی ہدایت مستفاد ہو رہی ہے۔ وغیرہ۔

سورۃ التین

خطیب نے قتادہ کا اور قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے، لیکن ابن الضریس اور نحاس اور ابن مردویہ اور بیہقی نے قوی اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سورۃ التین مکہ میں نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن زبیر کی طرف بھی اسی قول کی نسبت کی ہے۔ بہرحال جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس سورت میں آٹھ آیات ۳۴ کلمات اور ۱۵۰ حروف ہیں (السراج)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر (مکہ معظمہ) کی اور ہم نے انسان کو

الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۡ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے پھر (انہیں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اسکو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں لیکن جو لوگ ایمان لائے اور

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۭ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۭ

اچھے کام کئے تو ان کے لئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔ پھر کون چیز تجھ کو قیامت کے بارے میں منکر بنا رہی ہے

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۧ

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے۔

تفسیر

آفتاب ربوبیت کی نور پاشیاں یوں تو کائنات کے ذرہ ذرہ پہ اپنا پرتو ڈال رہی ہیں۔ قدرت، قادر، صنعت صانع اور رحمت رحمان کی شعاعیں سارے جہانِ ہست و بود کو جگمگا رہی ہیں۔ عرش سے فرش تک اور ثریٰ سے ثریا تک کوئی ذرہ کوئی قطرہ اور کوئی جزو کوہر ربوبیت عامہ کی فیض اندوزی سے مستغنی نہیں۔ تکوینی اور تخلیقی طور پر ہر چیز رب العالمین کی ربوبیت اور الٰہ الخلق کی الوہیت کے سامنے سربسجود اور منقاد حکم ہے، لیکن عمومی رحمت اضطراری کی احتیاج کے علاوہ یہ عالم مجمل، یہ مجموعہ کائنات جس کو انسان کہا جاتا ہے خصوصی، اختیاری ارادی رحمت کا بھی ضرورت مند ہے کیونکہ اس کی تقویم احسن ہے۔ اس کا جسمانی مادی اور غیر جسمانی نظمی نظام سارے جہان سے بڑھیا ہے۔ دیکھنے میں یہ مشتِ خاک ہے، لیکن خالقِ کائنات کا یہی مظہر اتم ہے۔ جلوہ گاہِ اکمل ہے۔ اس کی صورت ایسی حسین ہے کہ چاند اور سورج کو شرمندہ کرتی ہے۔ اس کے استواء قامت کے آگے چوپائے تو کیا سرو و صنوبر ہیچ ہیں۔ اس کا توازن اعضاء اور تناسب اجزا مفقود النظیر ہے۔ اس کا شعور ادراک جزئیات کا کامل اکبر ہے۔ اس کی عقل فلک پیما ستاروں کو تسخیر کرنے والی اور علوم کلیہ کا خزانہ ہے۔ اس کا قلب مسکن وجدان ہے۔ مقام عرفان ہے، انوارِ قدسیہ کی تجلی گاہ ہے۔ حظیرۂ قدس کی شعاعیں اس سے پھوٹتی ہیں۔ قدوسِ اکبر کے نور بے کیف کی بارش اس پر ہوتی ہے پس یہ جسم و نور کی معجون ہے مادہ و تجرد کا خمیر ہے۔ اخلاق الٰہیہ کی پرتو گاہ ہے۔ صفات خداوندی کا مظہر ہے۔ جلال و جمال کا سنگم ہے۔ مجمع البحرین ہے۔ اگر اس کے حقیقی خد و خال دیکھنے ہوں تو کوہِ سعیر پر جاؤ۔ فلسطین کے پہاڑوں میں ایک بن باپ کے بچہ پر نور قدس کی بارش دیکھو۔ مجسم کلمۃ اللہ سے کلام معرفت سنو اور انسان کی صورت میں مجموعہ کائنات کا مشاہدہ کرو۔ یہاں سے چل کر کوہ زیتون یعنی سرزمین شام میں قدم رکھو۔ وہاں تم کو ایسا نورِ قدس دکھائی دے گا جس کی خنکی دارین کو بجھانے والی ہے اور ایسا جلال نظر آئے گا جس کی تیزی کے سامنے صحرا و بنا کی آتش بارحرارت ماند پڑ گئی۔ زیتون سے لوٹ کر طور کی طرف آؤ وہاں سینا کی وادیٔ ایمن میں ہر طرف ایک نغمۂ الوہیت گونجتا سنائی دے گا اور جمال الوہیت کا نور برستا دکھائی دے گا۔ ایک جانب سنگ دل پہاڑ کے ٹکڑے الگ الگ پڑے ملیں گے جو باوجود بے حس ہونے کے تابِ جمال نہ لا سکا اور دوسری جانب ایک بے ہوش انسان نظر آئے گا جس کی حسی قوت بے حس اور مادی عقل بے عمل ہو چکی ہے، لیکن فوق العقل قلبی وجدان لاکھوں عرفانی شعاعوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔ پھر یہ انسان جمال و جلال کا پیکر بن کر اٹھتا دیکھے گا جس کے ایک ہاتھ میں نور بار شریعت کا شعلۂ جوالا ہوگا جو مادی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے باوجود روحوں کی تاریکی کو دور کر کے جمالِ حقیقت کا عکس ان پر ڈالنے والا ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں قوتِ جلال کا مظہر عصا ہوگا جو اپنی جبروتی طاقت سے کفر کے بڑے بڑے اژدہوں پر غالب آئے گا۔ طور کو چھوڑ کر لق و دق صحرا کو پار کر کے کوہ فاران کی وادی میں سیر کرو۔ اس وادی میں ایک شہر ہے امن کا شہر۔ ایک بستی ہے سلامتی کی بستی۔ وہاں کوئی کسی کو نہیں لوٹتا۔ کوئی اپنے باپ کے قاتل کو بھی نہیں مارتا۔ کوئی کسی وحشی پرندے اور اڑنے والے پرندہ کو بھی نہیں پکڑتا۔ کوئی کسی جانور یا انسان کا خون نہیں بہاتا۔ یہاں تک کہ وہاں کے درخت نہیں کاٹے جاتے۔ گھاس نہیں تراشی جاتی۔ کانٹے نہیں توڑے جاتے۔ ایسا کیوں ہے۔ صرف اس لئے کہ وہاں بادشاہِ قدوس کی عبادت کا گھر ہے۔ قدوسی فرشتے وہاں کے محافظ ہیں اور ایک قدوسی انسان کا وہ گہوارہ ہے۔ اس کا سینہ علم الوہیت کا فوارہ ہے۔ اس کی زبان کلام خداوندی کے خزانہ کی کنجی ہے۔ رب قدوس اس کی زبان سے بولتا ہے۔ وہ کسی چیز کو پکڑتا ہے تو خدا کے ہاتھوں سے۔ سنتا ہے تو خدا کے کانوں سے، دیکھتا ہے تو خدا کی آنکھوں سے۔ اس کا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا چلنا پھرنا از خود نہیں حسب حکم خدا ہے۔ وہ انسان ہے خدا نما، عبد ہے قبلہ نما۔ اس کی صورت انسانی ہے، اس کی حقیقت انسانی ہے، لیکن ایسا انسان جس پر الوہیت کا دھوکہ ہوتا ہے، ایسا بندہ جس پر رب ہونے کا شبہ ہوتا ہے وہ نور ہے ظلمت کو دور کرنے والا وہ جہانِ انسانیت کے لئے رحمت ہے، رافت عطوفت ہے، مہر مجسم ہے۔ جنت کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔ خزانۂ رحمت اس کے قبضہ میں ہے۔ کیا ایسے انسانوں کو دیکھ کر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ انسان کی تقویم سب سے اچھی نہیں ہے۔ کیا اس کی ہستی واجب و ممکن کا سنگم نہیں ہے۔ کیا یہ خلاصۂ کائنات نہیں ہے۔ یہ اونچا اٹھتا ہے تو اتنا اونچا کہ جبریل کے پر بھی وہاں پہنچنے سے عاجز ہیں۔ اور گرتا ہے تو اتنا کہ اسفل السافلین میں پہنچ جاتا ہے اور ذلیل ترین چوپائے سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔ حسن تقویم اور فطری جامعیت تو سب ہی انسانوں کو حاصل ہے، لیکن پھر بھی احسن تقویم والا انتہائی پستی کے غار میں کیوں گر پڑتا ہے اور رینگنے والے کیڑے سے زیادہ ذلیل کیوں ہو جاتا ہے صرف ناشکری کی وجہ سے۔ خداداد فطری نعمت کی اس کو قدر نہیں ہوتی۔ اپنی نوعی برتری کو کھو دیتا ہے۔

قرب کو بعد سے بدل ڈالتا ہے۔ مخلوق کے در کا بھکاری ہو جاتا ہے۔ خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ وہ گھومنے والی کٹھ پتلیوں کو اپنا دیوتا، منعم، معطی، محی، مربی اور خالق سمجھ لیتا ہے۔ ان کے سامنے خمیدہ گردن اور سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ جس رب نے اپنی خصوصی ربوبیت سے نواز کر ساری کائنات سے زیادہ اس کو اپنا قرب عنایت کیا تھا وہ اس کو نہیں جانتا، اس کے احکام کو نہیں مانتا۔ فکر نہیں کرتا۔ کفر کرتا ہے۔ شکر نہیں کرتا شرک کرتا ہے۔ ایسا انسان نافرمان، بے طاعتی باغی، اسفل السافلین میں گرنے والا۔ دوزخ کے آخری طبقہ میں گھر بنانے والا۔ ہاں خالص موحد، نیکوکار، خوش کردار، راست گفتار جو ساری مخلوق سے منہ موڑ کر صرف بارگاہِ احدیت میں گردن جھکاتا ہے جس کو نعمت خداداد کا اعتراف ہو تک ہے جو جانتا ہے کہ انسان خلیفۂ الٰہی ہے۔ سلالۂ کائنات ہے۔ ہر چیز سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ اس کو اللہ نے اپنے لئے پیدا کیا ہے جو عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ نے اختیار و ارادہ کی قوت مجھے بے کار نہیں عطا فرمائی۔ مجھے بے فائدہ نہیں پیدا کیا گیا۔ ایمان اور اطاعت احکام میرا فرض ہے۔ جزا سزا ضرور ہوگی۔ اللہ سب کا فیصلہ ضرور کرے گا۔ فیصلہ کا ایک دن مقرر ہے۔ اس روز کسی کی حکومت نہیں ہوگی۔ اللہ ہی احکم الحاکمین ہے وہی فیصلہ کرے گا۔ ایسا شخص بہائم کی قطار میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اسفل السافلین میں اس کو نہیں گرایا جائے گا اس کو دوامی سکھ ملے گا۔ کبھی ختم نہ ہونے والا۔ لازوال راحت ملے گی بے منت خلق۔

تحلیل اجزاء

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ عربی لغت میں التین اور الزیتون دو پھلوں کے نام ہیں۔ تینؔ یہی معمولی انجیر اور زیتون ایک کسیلا پھل جو پک کر کسی قدر شیریں ہو جاتا ہے۔ فلسطین کے بعض پہاڑوں میں یہ دونوں پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ تعیین مراد میں علماء تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔

(۱) تینؔ اور زیتونؔ سے مراد یہی معمولی پھل ہیں (مجاہد اور حضرت ابن عباس کا ایک قول ایک روایت میں) عکرمہ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی جاتی ہے۔ عام علماء تفسیر نے یہی تفسیر کی ہے۔ رہی وجہ قسم تو رازی نے انجیر اور زیتون کے مختلف طبی فوائد اور تعجب آفریں تخلیقی احوال کہم میں جن سے ان دونوں پھلوں کی وجوہ فضیلت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم اس لاطائل تفصیل کو ترک کرتے ہیں۔

(۲) تینؔ سے مراد مسجد دمشق اور زیتونؔ سے مراد مسجد بیت المقدس ہے (ابن زید) یا تین سے مراد مسجد دمشق اور زیتون سے مراد مسجد اصحاب کہف یا مسجد نوحؑ ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

(۳) تین سے مراد شہر دمشق اور زیتون سے مراد شہر بیت المقدس ہے (کعب احبار)

(۴) تین سے مراد کوفہ اور زیتون سے مراد شام ہے (شہر بن حوشب)

(۵) تین اور زیتون حلوان اور ہمدان کے درمیان دو پہاڑ ہیں۔ (ربیع بن انس)

شہر بیت المقدس ایک پہاڑ پر آباد ہے۔ اس پہاڑ کے دو ٹکڑے ہیں۔ اس زمانے میں ایک ٹکڑے کو تین اور دوسرے کو زیتون کہتے رہیں۔ میرے نزدیک تین و زیتون سے مراد یہی دو ٹکڑے ہیں۔ بہرحال بیت المقدس، شام، طور اور مکہ سب متبرک مقامات ہیں اور مہبط انوار الٰہیہ ہونے کا ان کو فخر حاصل ہے۔

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ۔ طور، پہاڑ، ٹیلہ۔ سینین بروزن فعلیل (ابوعلی فارسی) ارض مقدسہ میں ایک پہاڑی ہے جس کو طور سینین یا طور سینا کہتے ہیں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ برکت اور خوب صورتی کی وجہ سے اس مقام کو سینین اور سینا کہتے ہیں۔ (کبیر) یہ وہی طور ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو نبوت اور خطاب کی سعادت حاصل ہوئی اور جلوۂ الٰہیہ پڑنے سے اس کے ٹکڑے ہو گئے اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو توراۃ عطا فرمائی گئی۔

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔ بلد امین سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ امن والا شہر جس کے حدود کے اندر جاہلیت کے زمانے میں بھی قانوناً کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ سارے ملک میں لوٹ مار ہوتی تھی مگر یہ بستی ہر غارت گری سے محفوظ تھی۔ یہاں کسی وحشی چوپائے کا بھی شکار نہیں کیا جاتا تھا۔ نہ کوئی پرندہ کو مارتا تھا نہ یہاں کے درخت کاٹنے کی اجازت تھی۔ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں تراشی جاتی اور کانٹے بھی نہیں توڑے جاتے تھے۔ اگر کوئی اس کے خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کو مجرم سمجھا جاتا تھا۔ دورِ اسلام میں بھی یہی حکم قائم رہا البتہ مخصوص قسم کی گھاس کاٹنے

کی اجازت ہوگئی اور یہ حکمِ امن حرم کی تمام حدود کے لئے عام ہوگیا۔ اسی شہر میں دنیا کا سب سے قدیمی معبد یعنی کعبہ ہے۔ یہی حضور خاتم المرسلینؐ کی پیدائش گاہ اور میدانِ تربیت اور گہوارۂ نمو اور سیرگاہِ شباب ہے۔ اسی کے ایک پہاڑ حرا کے غار میں رسول اللہ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا اور سارے جہان کو ایک پیامِ امن سنایا گیا۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا تھا حرم کے اندر کسی کے لئے قتال جائز نہیں کیا گیا۔ صرف میرے لئے ایک ساعت کے واسطے حلال کیا گیا تھا اور اب وہ بھی قیامت تک نہیں ہو سکتا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ فلسطین کے پہاڑ حضرت عیسیٰؑ کا مسکن اور مہبط انوارِ غیبیہ تھے۔ اور کوہِ طور حضرت موسیٰؑ کے لئے منزلِ تجلیاتِ الٰہیہ اور مقامِ معراجِ نبوت تھا۔ اور شہر مکہ حضور خاتم الانبیاء کا مولد، منشاء، تربیت گاہ اور مرکزِ انوارِ نبوت ہے۔ یہودیوں کو حضرت موسیٰؑ کی امت ہونے کا دعویٰ ہے اور عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے مطیع ہونے کے مدعی ہیں اور امتِ محمدیہ کا دل تو مکہ میں ہی تھا اور ہے بس یہ تینوں عظیم الشان مقامات اپنی عظمت، برکت، جلالت اور افادیت میں مفقود النظیر ہیں۔ اس لئے ان ہر سہ مقدس مقامات کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا یعنی سارے جہان سے انسان کی عقلی، جسمانی، شعوری اور وجدانی ساخت حسین، بہتر اور برتر ہے۔ جب انسان صورت، صفات و اخلاق، علمی ملکات، ظاہری حواس، باطنی مدارک، عقلِ مجرد اور وجدانِ عرفانی کے لحاظ سے اشرف المخلوقات، سلالۂ کائنات اور تجرد و مادیت کا مجمع البحرین قرار پایا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا سر نیاز کسی ناطق یا صامت، نامی یا جامد، ملکوتی یا ناسوتی مخلوق کے سامنے خمیدہ ہو، لیکن یہ سر بلند انسان جب اپنے اس خالق سے جس نے اس کو سارے سنسار پر برتری عطا فرمائی اور اس تقویم مرحمت کی اپنا رخ موڑ کر زیریں مخلوق کی طرف کر لیتا ہے اور اپنے خادموں کو مخدوم قرار دے کر ان کو کارساز، داتا اور معبود بنانے لگتا ہے تو

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ پھر اللہ ہی اس کو فطری اور تخلیقی مرتبہ سے گرا کر رذیل ترین مخلوق سے بھی زیادہ رذیل اور پست ترین ذلیل ترین کمتر ادنیٰ سے بھی زیادہ پست کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی آدمی نہیں رہتا، بے عقل چوپایہ بن جاتا ہے بلکہ چوپایوں سے زیادہ گمراہ۔ مجاہد، ابو العالیہ، حسن، اور ابن زید کے نزدیک اسفل سافلین سے جہنم مراد ہے یعنی مومنین صالحین کے علاوہ باقی سب لوگوں کو اللہ لوٹا کر جہنم میں لے جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ کے نزدیک ارذل عمر یعنی وہ بڑھاپا جس میں آدمی مخبوط الحواس اور بے علم ہو جاتا ہے مراد ہے۔ خدا تعالیٰ مومنین صالحین کو بڑھاپے میں ضعیف ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر یہ قول بہت کمزور معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مومنین صالحین کے علاوہ کیا سب لوگ ارذل عمر تک پہنچ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا پھر استثناء بے سود ہے۔ اسی طرح ابن قتیبہ کا قول بھی غلط ہے کہ اسفل سافلین میں پہنچنے سے مراد ہے ضعیف، اپاہج، لولا لنگڑا ہو جانا اور ضعف کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے سے معذور بن جانا۔ کیونکہ تمام ناسوتی کافر ایسے نہیں بن جاتے۔ یہ انتشار بے حقیقت ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک صحیح تشریح وہی ہے جو ہم نے اوپر آیت کے ذیل میں کر دی۔

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ان لوگوں کو تخلیقی بزرگی سے نیچے نہیں گرایا جاتا اور شرفِ فطری سے اتار کر طبقۂ سفلی کی طرف نہیں گرایا جاتا جو اپنی تخلیقی اغراض سے واقف ہوتے ہیں۔ خالق سے تعلق توڑ کر مخلوق سے رشتہ نہیں جوڑتے۔ ... کے اندر مربوبیت کی صفات نہیں مانتے اور مخلوق کو محلِ الوہیت قرار دے کر خالق سے اس کو نہیں ملاتے جو فکر و نظر صحیح رکھتے ہیں اور اپنی پیدائش کو بے کار نہیں جانتے۔ انکا کی علتِ اپنے اعمال کو بھی رائیگاں نہیں قرار دیتے بلکہ اپنے قول اور عمل کو مجموعۂ خیر و شر جانتے ہیں۔ صحیح اور غلط کا مرکب مانتے ہیں۔ اچھے کو چاہتے ہیں اور برے سے نفرت کرتے ہیں۔ بھلائیاں کرتے ہیں اور برائیوں سے بچتے ہیں۔ اس لئے ان کا عقیدہ آنے والی دوسری زندگی پر بھی ہوتا ہے تاکہ ان کے اعمال کا جزا و سزا ان کو مل سکے۔ پس تخلیقی شرف سے محروم نہیں ہو سکتے۔ وہ جو اللہ کو صفاتِ کمالیہ کا واحد سرچشمہ مانتے ہیں۔ ... غیبی فرستادوں پر عقیدہ اور پیغمبروں پر ایمان اور اس کے بھیجے ہوئے احکام کا یقین رکھتے ہیں جو اعمال کے خیر و شر ہونے کے قائل اور ہر عمل کی جزا یا سزا کے معترف ہیں اور اللہ ہی کو خیر و شر اور نیکی بدی میں تفریق کرنے والا سمجھ کر منکرات کو ترک کرنے اور معروفات کو اختیار کرتے ہیں۔

فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ایسے مومنین صالحین کو ہر دو اجر ملے گا جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ۔ جب انسان کے عقائد اور اعمال و اقوال بے کار نہیں اور خیر و شر کے ضابطے میں بند ہیں تو لامحالہ ان کی جزا سزا ہونی چاہیئے۔ اچھے برے بدلے سے بے نیاز ہو کر نہ اچھائی اچھائی رہتی ہے نہ برائی برائی۔ خیر و شر کا امتیاز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر نتیجہ کو معیار نہ قرار دیا جائے تو صحیح غلط اور خطا صواب کا فرق مٹ جاتا ہے، اس لئے ہر عمل کی جزا سزا ہونی چاہیئے اور ظاہر ہے کہ یہ زندگی میدان عمل ہے، اس کی ہر گھڑی ہر پل عمل ہی کی جولانگاہ ہے۔ یہ آخری دار الجزا نہیں ہو سکتی۔ آغاز زندگی کا نتیجہ کسی قدر آخر زندگی میں سامنے آ سکتا ہے، لیکن زندگی کے اوقات ایک مسلسل زنجیر ہیں جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے وابستہ ہے۔ ہر گھڑی بذات خود ایک سعی حیات ہے۔ اس لئے زندگی کے آخری حصے کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے نہیں آ سکتا۔ آنے والا کسی کے سامنے آئے تو آئے جانے والی ہستی اس سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ ایک دوسری زندگی ماننی پڑے گی جو محض دار الجزا ہوگی۔ میدان عمل نہ ہوگی۔ اس بدیہی حقیقت کا کون انکار کر سکتا ہے۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ۔ لیکن جزا سزا دینے والا کون ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی دنیوی حاکم، بادشاہ، جن یا فرشتہ نہ ہوگا کیوں کہ صحیح غلط اور خیر و شر کا ضابطہ بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ اس دنیا میں روشنی اور تاریکی کا امتیاز پیدا کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ اسی نے انسان کے ضوابط زندگی بنائے کسی عمل کو منکر اور کسی کو معروف قرار دیا۔ لہٰذا اسی کے ہاتھ میں فیصلہ بھی ہونا چاہیئے۔ وہ خود دیکھ لے گا اور جانچ لے گا کہ اس کے بنائے ہوئے ضوابط پر کس نے کتنا عمل کیا۔ پھر وہی جانچ کے بعد سزا دے گا۔ یوں تو دنیا میں حاکم بہت ہیں یعنی ظاہری حکمران۔ لیکن دستور سازی کا کسی کو حق نہیں۔ آئین حیات بنانا کسی کا کام نہیں۔ پس ان سب سے اعلیٰ و بالا حاکم وہی ہستی ہے جو حقیقی حکمران ہے، دستور حیات بنانے والی ہے اور خیر و شر میں امتیاز قائم کرنے والی ہے۔ اس سے بڑا حاکم اور کون ہو سکتا ہے لہٰذا وہی قیامت کے دن اچھے برے اعمال کا فیصلہ کرے گا اور ثواب عذاب دے گا۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جو شخص سورۂ والتین والزیتون کی قرأت کرے اور آخری آیت پڑھ چکے تو کہے بَلٰى وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ۔

مقصود بیان آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ میں نص ہے اس امر پر کہ انسان کی جسمانی، عقلی اور روحانی ساخت تمام کائنات سے بہتر ہے۔ یعنی یہ سنگم ہے روحانیت اور مادیت کا۔ لاہوت اور ناسوت کا، مظہر ہے جلال و جمال کا اور پرتو اعظم ہے خالق کی خلاقیت کا۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے خیر ہی خیر ہے۔ حسن ہی حسن ہے۔ اس میں شر اور قبح اضافی ہے۔ شیطانی تاثر ہے۔ اس کی جبلت سادہ ہے، شفاف ہے۔ اس خاکہ میں رنگینی بیرونی تاثر سے پیدا ہو جاتی ہے۔ تکریم انسانی پر بھی اس آیت سے روشنی پڑ رہی ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ انسان اشرف کائنات ہے، افضل ہے، احسن ہے، اجمل ہے، لیکن جب یہ اپنی فطری تفضیلت و عزت کو نظر انداز کر دیتا ہے اور خالق سے منہ پھیر کر مخلوق کی طرف کر لیتا ہے تو سب سے زیادہ رذیل ہو جاتا ہے۔ اگلی آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ میں یہی صراحت ہے کہ نیکوکار اہل ایمان کے علاوہ کہ وہ اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ باقی انسان بہت ہی نچلے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ فطرت اور جبلت کو چھوڑ کر سب رذیلوں سے رذیل بن جاتے ہیں۔

آیت اِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا الخ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ وضع فطرت کے موافق ہیں۔ تقویم انسانی کا حسن انہی سے عیاں ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو حسن تقویم قبح تصنع سے بدل جاتا ہے۔ فطرت پر بناوٹ کا لبادہ آ جاتا ہے۔ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ سے دو امر بطور صراحت معلوم ہو رہے ہیں۔ ایک یہ کہ اعمال صالحہ اور افکار صحیحہ بے حقیقت اور رائیگاں نہیں ہیں ان کا اجر ضرور ملے گا۔ دوسرا یہ کہ ان محدود اعمال و عقائد کا نتیجہ غیر محدود اور لازوال ہوگا۔ بطور مفہوم مخالف اس صراحت سے یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ جن کے افکار و عقائد صحت سے خالی اور اعمال برے ہوں ان کو سزا بھی ضرور ملے گی۔ وہ عقائد اور اعمال بھی نتیجہ سے خالی نہیں رہیں گے اور سزا بھی غیر منقطع اور ابدی ہوگی۔ آیت فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ بتا رہی ہے کہ اس زندگی میں انسان کا احسن تقویم پر ہونا اور کسی کا اسفل سافلین کی طرف لوٹنا دلالت

کر رہا ہے کہ انسان کی علمی اور عملی طاقتیں بے کار نہیں پیدا کی گئی ہیں۔ آغاز کا انجام اور مبدء کا منتہیٰ ہونا لازم ہے، اس لئے سزا جزا کا دن ضرور ہوگا۔ عقل کی روشنی اور فطرت کے نور میں کوئی یوم جزا کی تکذیب نہیں کرسکتا وغیرہ۔

سورۃ العلق

اس سورت کا نام سورۂ اقرأ اور سورۂ قلم بھی ہے۔ اس میں ۲۰ آیات ۷۲ کلمات اور ۲۷۰ حروف ہیں (سراج) بلا خوف یہ سورت مکی ہے۔ اور سب سے اوّل اسی کا نزول ہوا (یعنی مالم یعلم تک اس سورت کا نزول تمام قرآن میں پہلے ہوا۔ مؤلف) ابن کثیرؒ، رازی، خطیب، البغوی، اور اکثر مفسرین نے اسی پر جزم کیا ہے بحضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ سے یہی قول مروی ہے۔ صحیحین اور مسند احمد میں حضرت عائشہ کا مفصل بیان موجود ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالم یعلم تک چند آیات کا نزول سب سے اوّل ہوا۔ یہ حدیث مرسل ہے، لیکن مرسل صحابی ہمارے نزدیک مقبول ہے۔ خلاصۂ بیان یہ ہے کہ

رسول اللہ پر آغاز وحی سچے خوابوں کی صورت میں ہوا۔ آپ کا ہر خواب سپیدۂ سحر کی طرح سامنے آجاتا تھا۔ پھر قلب مبارک خلوت کی طرف مائل ہونے لگا اور آپ تنہائی اختیار کرنے کے کوہ حرا کے غار میں جانے لگے۔ کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں چلے جاتے اور چند روز کے بعد جب کھانا ختم ہوجاتا تو پھر آکر گھر سے لے جاتے۔ کچھ مدت کے بعد جبرئیل وحی لے کر نمودار ہوگئے اور رسول اللہ سے کہا اقرأ۔ آپ نے جواب دیا ما انا بقارئ۔ جبرئیل نے پکڑ کر آپ کو زور سے دبوچ ڈالا اور پھر چھوڑ کر کہا اقرأ آپ نے وہی پہلا جواب دیا۔ دوبارہ جبرئیل نے اتنی زور سے دبوچا کہ آپ کو سخت تکلیف ہوئی اور چھوڑ کر وہی پہلا لفظ اقرأ کہا آپ نے پھر وہی پہلا جواب دیدیا کہ ما انا بقارئ تیسری بار جبرئیل نے پھر زور سے دبایا کہ آپ کو سخت دکھ ہوا پھر چھوڑ کر کہا اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ مالم یعلم تک۔ آپ لرزنے کانپتے عبارت وحی پڑھتے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا مجھے کمبل اوڑھاؤ۔ خدیجہؓ نے کمبل اوڑھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سکون ہوگیا تو فرمایا مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے خدیجہؓ نے تسلی دی اور کہا آپ حق کی طرف داری کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، ناداروں کو کھانا کھلاتے ہیں خدا آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ خدیجہ کے چچا یا چچیرے رشتہ دار تھے اور زور جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے۔ اور انجیل کو عربی میں لکھتے تھے۔ ورقہ سے حضور کی کیفیت بیان کی۔ ورقہ نے تسلی دی اور کہا یہ وہی ناموس ہے جو عیسیٰ یا موسیٰ پر آتا تھا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب تمہاری قوم تم کو شہر سے نکال دے گی۔ پھر چند روز کے بعد ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی آنا بند ہوگئی۔ بندش وحی سے آپ رنجیدہ رہنے لگے۔ بارہا پہاڑ پر چڑھ کر اپنے کو نیچے گرانے کا ارادہ کیا مگر جب کبھی خودکشی کا ارادہ کیا جبرئیل نے نمودار ہوکر تسکین دی اور کہا محمد آپ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ کچھ مدت کے بعد بندش وحی جاتی رہی۔ ہم نے حدیث کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ یہ روایت صحیحین میں بھی ہے لفظوں کا کچھ تغیر ہے۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اس روایت سے اقرأ کا سب سے اوّل نازل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت علی نے فرمایا کہ سب سے اوّل سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔

حضرت جابر کے قول کے موافق سب سے پہلے سورۂ مدثر کا نزول ہوا لیکن جمہور صحابہ و تابعین کا قول وہی ہے جو ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے۔ ان مختلف روایات کو دور کرنے کے لئے بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ مالم یعلم تک اقرأ کے نزول سے آغاز وحی ہوا۔ پھر نماز میں پڑھنے کے لئے سب سے اوّل سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ پھر بندش وحی کے بعد جو سورت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ مدثر تھی۔

اگر الفاظ بالا کی اس طرح توجیہ کی جائے تو بہتر ہے کہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات سے آغاز نبوت ہوا اور سورۂ مدثر کے نزول سے آغاز رسالت اور سورۂ فاتحہ کے نزول سے آغاز صلوٰۃ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ

(اے پیغمبر) آپ (پر جو قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لیکر پڑھا کیجئے جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھا کیجئے اور آپ کا

الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۭ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ

رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو اُن چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ سچ مچ بیشک (کافر) آدمی حد سے نکل جاتا ہے اس وجہ سے کہ اپنے آپ کو

اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۭ

مستغنی دیکھتا ہے۔ اے مخاطب تیرے رب ہی کی طرف سب کو لوٹنا ہوگا اے مخاطب بھلا اس شخص کا حال تو بتاؤ جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ اے

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَي الْهُدٰٓى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۭ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ اَلَمْ

مخاطب بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر وہ بندہ ہدایت پر ہو یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہو اے مخاطب بھلا یہ تو بتا کہ اگر وہ شخص (ناحق دین کو) جھٹلاتا ہو اور (حق سے) روگردانی کرتا ہو کیا اس کو

يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۭ كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ ڏ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۙ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ

خبر نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے ہرگز (ایسا) نہیں کرنا چاہیئے اور اگر یہ شخص باز نہ آئیگا تو ہم پیشانی پکڑ کر جو کہ دروغ اور خطا میں آلودہ پیشانی ہے (جہنم کی طرف) گھسیٹیں گے سو یہ اپنے ہم

خَاطِئَةٍ ۚ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۧ ۩

جلسہ کے لوگوں کو بلالے ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بلالیں گے۔ ہرگز نہیں آپ اس کا کہنا نہ مانیئے اور نماز پڑھتے رہیئے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہیئے۔

تفسیر اس سورت کے مندرجہ ذیل الفاظ دعوت غور دے رہے ہیں اقرا۔ باسم۔ ربک۔ خلق۔ خلق الانسان من علق۔ الاکرم۔ علم بالقلم۔ علم مالم یعلم۔ یہ اور پانچ آیتیں باعتبار علماء وحی اول ہے انہی الفاظ سے آغاز نبوت ہوا۔ انہی کے اندر پیام آیا۔ سارے جہان کے انکار و عقائد [illegible] تعلیم دی۔ اس کے بعد انسان کا طغیان استغناء پر مبنی قرار دیا۔ انکار حیات آخرت اور بعض دوسرے عقائد کو بیان فرمایا اور آخر میں عذاب کی وعید اور دھمکی دے کر سورت کو ختم کردیا۔ پوری سورت کا خصوصاً ابتدا سے مالم یعلم تک کا مضمون سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت دانشوران عالم اور علماء انسانیت کے بنیادی افکار اور خدا کے متعلق خیالات کیا تھے۔ اور ان آیات میں کن کن خیالات کی تردید اور کن کن عقائد کی صراحت ہے۔ مغرب میں دیمقراطیس اور بعض دوسرے وزراء یونان وجود خدا کے منکر تھے۔ اس کائنات کا سارا نظام اُن کے نزدیک خود رو ہے۔ اتفاقی ہے۔ سلسلۂ اسباب غیر ذی شعور طبیعت کے زیر حکم ہے۔ مادہ ہی مادہ ہے تمام شعوری طاقتیں بے شعور مادہ کی ممنون کرم اور اسی کی پیداوار ہیں۔ خدا کا وجود یا علت العلل کا تصور ہمارا دماغی زائیدہ ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے یونہی ہے اور ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا نہ آغاز ہے نہ انجام ایک مسلسل زنجیر کی دوری حرکت ہے ہر حلقہ دوسرے سے وابستہ نہ کوئی علت اول ہے نہ سلسلہ کی انتہا بھی انہیں خدا کے عقیدہ سے خالی نہیں تھا۔ لیکن مغربی منکرین اور مشرقی منکرین کے طرز فکر اور نتیجہ فکر میں عظیم الشان

فرق تھا مغربی دہریے فوق المادہ روحانیت کے قائل ہی نہ تھے۔ تمام ذہنی قوتوں کو اسی مادہ کی پیداوار جانتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک علم واحساس تخیل اور تعقل غرض تمام تصورات مختلف الظہور مادی لہروں کے ہی نام تھے۔ مشرقی منکرین ہستی خدا کے اقرار کو ضروری نہیں قرار دیتے تھے اسی طرح کھلم کھلا انکار بھی نہیں کرتے تھے۔ خدا کی ہستی سے ان کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ تخلیق تربیت اور نظم کائنات کی تمام وہ خدا کے ہاتھ میں نہیں جانتے تھے۔ ان کی نظر میں صرف ایک غیبی حقیقت مستور موجود تھی۔ روحِ کائنات کہا جاتا ہے مگر اس کی ہستی ایسی جاری اور ساری ہے کہ اس انتشار میں گم ہو گئی۔ ہم کو اس کی حقیقت معلوم نہیں نہ اس کے صفات کا واقعی اندازہ کیا جا سکتا ہے گویا وہ ایک حقیقتِ مجہولہ ہے اور اس کی صفات اگر ہیں تو وہ بھی نامعلوم۔ پس ایسی ہستی کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو نہ خود دیکھی جا سکتی ہے نہ اس کی صفات جانی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف ہمارا مفروضہ ہے کہ ہم اس کی ہستی اور اس کے صفات کو از خود گڑھ کر تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی ہستی کو ماننے کا کوئی نتیجہ نہیں نہ ماننا جہالت کی وجہ سے ہے اور ماننا غیر محققانہ فعل ہے۔ آفاقی مطالعہ سے منتقل ہو کر انفسی مطالعہ کرو۔ اپنی ذات پر غور کرو۔ جذبات کو چھوڑ دو۔ مادیت کو توڑ دو۔ ہر طرف سے رُخ پھیر لو۔ حقیقت تمہارے اندر ہے۔ گیان و دھیان لگاؤ۔ روشنی چمکے گی۔ نورِ حقیقت برس جائے گا۔ یہ نظریہ گوتم بدھ کا تھا بدھ کے افکار اقوال کی تعبیر و تفسیر اس کے مقلدین و متبعین نے مختلف طور پر کی ہے۔ یہاں تک کہ چینی بدھسٹ تقریباً تثلیثی بن گئے ایک وجودِ مستمر کے یہ بھی قائل تھے کہ اصل الوجود سے دوسری ہستی بغیر اختیار و ارادہ کے ظاہر ہوئی اور دونوں سے مل کر تیسری پھر تینوں سے ہر چیز کا ظہور ہوا۔ خالق کوئی نہیں۔ عدم سے وجود میں لانے والا با اختیار کوئی نہیں۔ لفظ اوم سے اصل الوجود کی طرف اشارہ ہے ہمزہ حلقی باطنی ہے اور میم شفتی یا لب سے نکلنے والا ظاہری حرف۔ مراد یہ کہ اصل الوجود ظاہر باطن اور اول آخر ہے وہ نہ کسی کا خالق ہے نہ کوئی مخلوق۔ ایک وجود مستمر ہے حقیقتِ مطلقہ ہے (گویا ہے اور نہیں۔ مثبت۔ منفی۔ موجود۔ معدوم۔)

جو اہل فکر وجود واجب یا ہستی خدا کا اقرار کرتے ہیں۔ ان کے خیالات میں باہم تصادم اور ماتحت کار میں ٹکراؤ اتنا زائد ہے کہ غور کرنے کے بعد ہم کو ان کا اقرار واجب انکار کی طرف رُخ پھیرتا نظر آتا ہے اور توحید کثرت میں گم ہو جاتی ہے یا کثرت کے اجزاء مجموعہ کا نام توحید قرار پاتا ہے۔ ایک تین ہیں اور تین ایک میں منضم یا مدغم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کا ہندو پرماتما کا قائل ہے یعنی روحِ کائنات کو سارے عالم میں جاری اور ساری مانتا ہے اگر اس کے نظریے کی تحلیل کی جائے تو پرماتما کسی با اختیار ہمہ گیر علم والی حقیقت کا نام نہیں بلکہ ایک مطلق الوجود منزہ عن الماہیۃ غیر محمول حقیقت کا نام پرماتما قرار پاتا ہے۔ وجود اول کا نام برہما رکھا گیا۔ یہ سادہ ہستی بغیر صفات کے تھی پھر وصفِ خالقیت نمودار ہوا جو برہما خالق ہو گیا پھر وصفِ حفاظت نگہداشت نمودار ہوا تو وشنو ہو گیا پھر ہلاکت آفرینی اور تباہ کاری کا وصف نمودار ہوا تو شیو ہو گیا اس طرح برہما تری مورتی بن گیا گویا ذاتِ ثلاثہ کے مجموعہ کا نام برہما تھا۔ تثلیث عیسائیت تو مشہور ہی ہے حیات علم قدرت کو اقانیم ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ الوہ نے کلمہ بنایا اور دونوں نے مل کر روح القدس کو۔ اللہ کے یہی اوصاف ثلاثہ اجزائے ثلاثہ ہیں۔

ایران والے بھی بقول ہیگن تثلیث کے قائل تھے۔ ایک مزدہ تھا یعنی خلاق۔ دوسرا امترودس یعنی کلمہ اور نجات دہندہ۔ تیسرا اہرمان یعنی ہلاکت آفرین تباہ کار۔ گویا عیسائیت اور ہندوؤں کی تثلیث کو توڑ مروڑ کر نئی تثلیث ایرانیوں نے بنائی۔

یونانی بھی ارسطو کے زمانے سے بلکہ اس سے بھی پہلے تثلیث کے قائل تھے ایک ہستی واجب بالذات تھی۔ اس سے بلا سمجھے سوچے اور بلا ارادہ اختیار عقلِ اول کا صدور ہوا جیسے آفتاب سے شعاعیں نکلتی ہیں پھر عقل سے نفسِ کلی کا صدور ہوا۔ یہ بھی بلا ارادہ بلا اختیار محض اضطراری تھا۔ پھر نفسِ کلی سے افلاک وکواکب اور سیارات و عناصر سے نفوس جزئیہ بنے۔ گویا واجب بالذات مرتبۂ ذات میں بے علم تھا، بے قدرت تھا۔ بے ارادہ تھا۔ پھر عقل بنی پھر نفس۔ ارسطو بھی اس فکر و نظر کا حامل تھا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہا کہ افلاک کا وجود اور حرکت دائمی ازلی ابدی ہے عناصر کے مواد اور صورتیں اگرچہ مرتبہ کے لحاظ سے افلاک سے مؤخر ہیں مگر ہیں سب قدیم۔ یہ ساری کائنات سرمدی ہے۔ جزئیات اگرچہ حادث ہیں مسبوق بالعدم ہیں مگر کلیات سب قدیم ہیں۔ زمان اور مکان بھی قدیم ہے۔ عناصر کی انواع قدیم ہیں۔ مرکبات عنصری کی انواع بھی قدیم ہیں۔ ہر نوع کی صورتِ نوعیہ خصوصی ہے۔ مبدء حرکت وسکون ہے۔ بے شعور ہے۔ تمام جزئی تغیرات اور نوعی خصوصیات کا مرکز ہے۔ گویا عالم عناصر کا ہر تغیر و تبدل، ترکیب، ترتیب اور نظم ایک بے شعور بے ارادہ فاعل کے زیر اثر اور زیر حکم ہو رہا ہے اور عالم علوی کی تمام منظم حرکات بھی ان کی نوعی اقتضا

کے تحت صورتِ نوعیہ کے زیرِ عمل ہو رہی ہیں۔ غرض ہر جزئی تغیر کی خالق بے شعور نوعیہ ہے واجب تعالیٰ نہ خالق ہے نہ عالمِ جزئیات تفصیلاً ۔ نہ اُس کے ارادہ کو حوادثِ عالم میں کوئی دخل ہے۔

افلاطون اور اس کے پیرو بھی اس کائنات کو ازلی ابدی مانتے ہیں، مگر بے شعور صورتِ نوعیہ کو مبدءِ حوادث نہیں جانتے بلکہ جس طرح ہندو ہر جنس اور ہر وصف کا ایک خود مختار دیوتا مانتے ہیں۔ جیسے محبت کا دیوتا، بابا کا دیوتا، جنگ کا دیوتا، امن کا دیوتا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح کسی قدر فرق کے ساتھ افلاطون ہر نوع کا جدا جدا خود مختار بارادہ رب مانتا ہے اور ہر نوع کے ماتحت ہر شخص اور ہر فرد میں جو تغیرات انقلابات تبدلات ترقیات تنزلات غرض جو حادثات ہوتے ہیں۔ ان سب کا فاعل مختار بارادہ باشعور اس نوع کے رب کو قرار دیتا ہے اور رب النوع کو پکار کر فلاح و بہبود کی دعا کرتا ہے اور اس سے خیر کا طالب ہوتا ہے۔ افلاطون بھی واجب تعالیٰ کو مرتبۂ ذات میں بے علم جانتا ہے۔ اشکال کائنات اور تماثیل عالم کا مجموعہ اُس کے نزدیک ذاتِ واجب سے بالکل الگ موجود ہے۔ اسی کو وہ علم واجب کہتا ہے۔ جزئیاتِ حوادث میں افلاطون کے نزدیک بھی واجب کے ارادہ مشیت اور قدرت کو کوئی دخل نہیں۔ یہ کام ارباب انواع کا ہے اور انہی ارباب کے ماتحت مختلف قوتوں کا۔ صابئین کا بھی ایک گروہ تھا جو ایران، عراق اور عرب کے بعض حصوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ملائکہ تمام افلاک اور ستاروں سیاروں کی ارواح ہیں اور نجوم ان کے پیکر ہیں۔ یہ ارواح نجوم کو حرکت دیتی ہیں۔ ستاروں کے تمام جزو کل کی یہ مختار ہیں اور حرکات نجوم ساری کائنات پر اثر انداز ہیں۔ ان کی تاثیر سے حوادثِ کائنات کا کوئی ذرہ بے نیاز نہیں۔ یہاں تک کہ انسان کی نحوست و سعادت بھی انہی کی حرکات سے وابستہ ہے۔ جاندار کی موت و زندگی کا بھی انہی پر انحصار ہے۔ یہ عقیدہ ہندوستان کے ہندوؤں کے مسلمہ عقیدہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ ستاروں کی خیالی مورتیاں بنائی جانے لگیں۔ مصر کا جوزا ربت بھی اسی نظریہ کے تحت بنایا گیا۔ یہاں تک کہ پرانی مورتیوں کی پوجا ہونے لگی۔ صابئین کے نزدیک ملائکہ نور خالص ہیں۔ مادیت کی آلائش سے پاک ہیں، اسلئے انسان سے افضل ہیں۔ ستاروں کے نام پر بت بنانے کا نظریہ نہ فقط صابیوں کا تھا بلکہ ایتھنز اور فارس میں ستاروں کے فرضی مجسمے بنائے جاتے تھے اور ستاروں کے نام پر بت خانے قائم کیے گئے تھے۔ ضحاک نے صنعاء (یمن) میں زہرہ کے نام پر غمدانی مندر بنایا تھا۔ منوچہر نے بلخ میں چاند کے نام کا ایک مندر بنایا تھا جس کا نام نوبہار رکھا تھا۔

رہی صنم پرستی تو وہ دنیا کے ہر حصہ میں موجود تھی۔ گو بت پرستی کی ابتدائی بنیادوں میں اختلاف تھا مگر نتیجہ ہر آغاز کا ایک ہی تھا کہ لوگ مبدا اور اصل کو بھول گئے اور بتوں کی ہی پرستش کرنے لگے۔ ہندوستان میں مصر میں اور اکثر ممالک میں علماء، عرفاء اور صلحاء کے مرنے کے بعد ان کی یاد قائم رکھنے اور اُن کی ہدایت کو شمعِ زندگی بنانے کے لئے ان کی مورتیاں بنائی گئیں تاکہ محسوس سے غیر محسوس کی طرف دماغ منتقل ہو سکے اور ہادیانِ قوم کی ہدایتیں دماغوں پر چھائی رہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اولیاء اور صلحاء کی ہدایت کو فراموش کرنے لگے اور صنم پرستی کے گرویدہ ہو گئے۔ صابی گروہ کے آخری لوگوں نے ستاروں کی مورتیاں بنالی تھیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں ستاروں کی حرکات، تمام کائنات یہاں تک کہ انسان کی صحت، بیماری، مالداری، افلاس اور نحوست و سعادت کی سرچشمہ تھیں۔ عرب کے قبائل مضر میں دینِ حنیف یعنی مذہبِ اسماعیلی رائج تھا مگر شاپور ذی الاکتاف کے عہد میں ایک عرب عمرو بن لحی مقام بلقاء سے ہبل نام کی ایک مورتی لے آیا اور اس کو کعبہ میں نصب کر دیا۔ اس طرح کعبہ میں بھی بت پرستی شروع ہو گئی۔ باقی مختلف قبائل کے بت جدا جدا نام کے تھے۔

ایران میں مجوسیوں کا مذہب رائج تھا جس کی شاخیں عراق، یمن اور بحرین وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس عالم میں دو ہی چیزیں ہیں۔ نور یا ظلمت یزدان یا اہرمن نور ہے اور اہرمن ظلمت ہے۔ نور سراسر خیر ہے اور ظلمت عین شر۔ اس سنسار میں یہ دونوں طاقتیں متصادم ہیں اور دونوں خود مختار ہیں۔ لیکن نورِ مطلق کے مظاہر علویات میں سیارے ستارے اور خصوصاً آفتاب ہے اور سفلیات میں مظہرِ نور آگ ہے۔ لہٰذا آفتاب کو اور آگ کو قبلۂ سجود بنانا چاہیئے اور ان کی طرف رُخ کر کے عبادت کی جانی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ لوگ نورِ مطلق کے تصور کو بھی بھول گئے اور آفتاب و آتش کی پرستش کرنے لگے۔ فرقہ مالویہ کا بھی عقیدہ اسی کے قریب تھا۔ یہودی بھی خدا کی ہستی کو مانتے تھے اور خالقِ عالم کو بہت سے انبیاء کا خدا مانتے تھے، لیکن اُن میں سے ایک جمہور نے گروہ بعض انسانوں کو خدا کے درجہ تک پہنچا دیا تھا اور عزیز کو خدا کا حقیقی بیٹا بنا دیا تھا۔ باقی گروہ نے خدا کو اس کی کرسی سے نیچے اتار کر مخلوق کی صف میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اور انسانی اعضاء و اجزاء کی طرح تمام اعضاء کا مجموعہ جسم خداوندی کو قرار دے رکھا تھا۔ دوسرے مذاہب والے اگر ذات یا صفات

میں شرک کے قائل تھے تو یہ تشبیہ و تجسیم کو مانتے تھے ۔ دوسروں نے مخلوق و مصنوع کو خالق و صانع کا ہم پلہ بنا دیا تھا تو انھوں نے خالق و صانع میں مخلوق کی صفات تسلیم کی تھیں ۔ پھر عقیدۂ جزا سزا بھی ان کا مرا ہوا تھا نہ اشراقیہ اور ہندوؤں کی طرح یہ تناسخ کے قائل تھے نہ دوسرے مدعیانِ الٰہیات کی طرح رسخ فسخ اور مسخ کو مانتے تھے بلکہ جزا سزا کا ایک خاص دن تسلیم کرتے تھے ۔ مگر اپنے لئے عذاب کو محدود اور معدود اور دوسروں کے لئے ان گنت لامحدود اور غیر متناہی ۔ یہودی کچھ عراق میں تھے کچھ ایران میں کچھ شام میں کچھ جزیرۂ عرب مدینہ ، حوالی مدینہ ، خیبر اور دوسرے علاقوں میں ۔

مکہ میں خصوصاً قریش خدا کی ہستی کے قائل تھے ۔ خالق ارض و سماء اسی کو جانتے تھے ۔ رزق پیدا کرنے والا اسی کو خیال کرتے تھے ۔ مگر کچھ غیبی کارگزار قوتوں کو خود مختار بھی مانتے تھے ۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ملائکہ یعنی غیبی کارندوں کو دیوتا اور خدا کی بیٹیاں بھی قرار دیتے تھے ۔ آخرت کی جزا سزا کے منکر تھے ۔ اول کو دوسری گھاس پھونس اور خود رو سبزہ کی طرح موجود اور پھر معدوم سمجھتے تھے ۔ مرنے کے بعد جی اٹھنا ان کے نزدیک محال تھا خدا کے پاس لوٹ کر جانا ناممکن تھا ۔ بتوں کی پوجا ضرور کرتے تھے مگر محض توہمات اور تخیلات کی بنا پر ۔ کردار کا بدلہ پانے کا ان کو تصور ہی نہ تھا ۔ ہاں کچھ سمجھ دار لوگ موہومی دیوتاؤں کی پرستش صرف اس لئے کرتے تھے کہ وہ غیبی دیوتا خدا کے مقرب ہیں ۔ ہم ان کو راضی رکھیں گے تو وہ ہم کو خدا تک پہنچا دیں گے ۔ ناراض رکھیں گے تو نہ صرف خدا کے قرب سے محروم رہیں گے بلکہ دنیا میں بھی تباہ ہو جائیں گے ۔ دیوتاؤں کی ناراضگی ہمارے بچوں کو مار ڈالے گی ۔ مویشیوں کو ہلاک کر دے گی ۔ باغوں اور کھیتیوں کو تباہ کر دے گی ۔ ہم کو رزق سے محروم بنا دیگی آخر کار ہمارا ستیاناس ہو جائیگا ۔

یہ مختصر خاکہ ہے اس وقت کا جب وحی کا آغاز ہوا سارے آفاق پر سیاہی چھائی ہوئی تھی ۔ فکری اور عملی گمراہی کا دیو پوری انسانی کائنات کو اپنے دانتوں میں دبائے ہوئے تھا ۔ نور میں بھی چمک نہیں رہی تھی اور تاریکی تہ تاریکی تھی ہی ۔ حقانیت اور صداقت روپوش ہو چکی تھی ۔ اس زمین پر باطل و افترا کی حکومت تھی ۔ فکر انسانی نارسا اور غلط تھی ۔ وجدان اور توہم میں فرق نہیں رہا تھا ۔ زندگی کا شعور غیر محققانہ تعقل جاہلانہ اور کردار بہیمانہ تھا ۔ تحقیقات طبعیات پر تصحیحاتِ الٰہیات کی بنا تھی اور اسی اساس پر مافوق الطبعیات کی عمارت بنائی گئی تھی ۔ غیر محسوس کو محسوس پر نامرئی کو مرئی پر بلکہ وجدانیات کو احساسات پر قیاس کیا جاتا تھا جو سراسر غلط تھا نہ عدم سے وجود میں آنے اور مخلوق ہونے کا صحیح شعور تھا نہ نظم کائنات اور ربوبیت عامہ کا درست تصور نہ انسان کے علم و حکمت کے خصوصی امتیاز کا واقعی ادراک ۔ کوئی مادہ کی تاریک وادیوں میں سرگرداں تھا تو کوئی نورِ بصیرت کو احولانہ استعمال کرنے سے کج نگاہ اور خیرہ چشم بن گیا تھا اور کوئی جہالت کے بیابان میں ہر طرف گھوم رہا تھا ۔ ایسی حالت اور ایسے وقت میں ایک ایسے انسان کو جس کی قوت خیالی ماحول کے ہر نقش سے خالی اور آئینۂ فکر ہر بدنما صورت اور مکروہ رنگینی سے معرا اور سادہ تھی جس کی فطرت اپنی اصل سادگی پر تھی اور جس کا وجدان بسیط تھا ۔ مکہ کے باہر غارِ حرا کے اندر نورِ مجردِ مطلق کی بے کیف بے صوت آواز نور مقید کی زبانی سنائی دی اقرأ باسم ربک الذی خلق الخ ۔ پڑھو اپنے رب کا نام لے کر جس نے سارے سنسار کو پیدا کیا خصوصاً انسان کی تخلیق علق سے کی الخ ۔ یعنی (۱) یہ کائنات اپنے وجود اور ہستی میں موجد اور مخترع کی محتاج ہے ۔ از خود نہیں ہے ، قدیم نہیں ہے ازلی اور سرمدی نہیں ہے ۔ حادث ہے تو پیدا ہے ناپید تھی پیدا ہوئی ۔ معدوم تھی موجود ہوئی ۔ (۲) اس کائنات کا حدوث اور ظہور اضطراری نہیں کسی فاعل مختار کے ارادہ اور اختیار سے اندازہ اور مصلحت و حکمت کے زیر اثر ہے (۳) پیدا کرنے کے بعد ساری کائنات کا انتظام ہر لمحہ تبدیلی تغیر ہر پل بگاڑ بناؤ ہر آن ترقی تنزل عروج و زوال زندگی موت ابھار دگراؤ حرکت سکون غرض ہر حال کسی حکمراں کے زیر حکم ہے ۔ پیدا ہونے کے بعد یہ جہانِ ہست و بود خالق سے مستغنی نہیں ہو گیا ۔ ہر لحظہ ہر وقت ہر صورت میں ہر چیز اس کی محتاج ہے (۴) ہر چیز کو اس کے محدود دائرۂ نوعی و شخصی کے اندر زندہ رہنے اور ضروریاتِ زندگی کو فراہم کرنے کا راستہ اسی خالق اور رب نے سکھا دیا ہے بتلا دیا ہے سمجھا دیا ہے ۔ اس کے قلم حکمت اور رہبر قدرت نے ضوابط حیات اور قوانین بقا ہر چیز کی لوحِ فطرت پر لکھ کر پڑھا دیے ہیں ۔ ہر شئی کو فطری تعلیم دے دی ہے ۔ معلم قدرت کی جبلی اور فطری تعلیم سے اس کائنات کا کوئی ذرہ بے بہرہ نہیں ۔ (۵) تمام کائنات میں انسان کی تخلیق ، تربیت ، اور تعلیم بہت خصوصیات کی حامل ہے ۔ اس کی جسمانی بناوٹ اس کی عقلی اور علمی قوتوں کی تربیت اور اس کا بدیہی اور فکری اور وجدانی علم ساری کائنات سے زیادہ حیرت آفریں اور تعجب انگیز ہے (۶) آخر کار اس دنیا کے ہر ذرہ کو خالق کی طرف لوٹنا ہے ۔ انجام کا سرا آغاز سے ملتا ہے ۔

منتہی کو مبتدا سے جوڑتا ہے۔ (۶) پس ساری کائنات کی لوحِ فطرت پر جو نقوش ثبت ہیں وہ صانع کی طرف سے خاموش پیام کا اور ساکت پیام ہیں۔ ان کو پڑھو اور اس پیامِ خالق کو بھی پڑھو جو منطوق ہے جس کو الفاظ کا جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ لوحِ فطرت پر کھودے ہوئے نقوش اور قلب و وجدان پر عکس ریزی کرنے والے الفاظ سب کو پڑھو۔ سب کا حاصل اور مطلب ایک ہی ہے کہ اس عالم کو بنانے والا ایک ہے۔ تمام جہان کو اسی نے نیست سے ہست کیا اور پر حکمت اندازہ کے زیر اثر اس کو پیدا کیا۔ خصوصاً انسان کو اس نے جراثیم حیات سے بنایا، بڑھایا زندگی عطا کی۔ وہ خالق سب کا ہے اور اسی کے دستِ قدرت میں اس منسار کی حکومت ہے، انتظام ہے۔ بناؤ اور بگاڑ ہے شخصی اور نوعی زندگی کو باقی رکھنے کا نظام ہے۔ ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا اختیار ہے۔ وہی ہر چیز کو عدم سے وجود میں لا کر شخصی اور نوعی تکمیل تک آہستہ آہستہ پہنچاتا ہے۔ وہ خصوصیت کے ساتھ تمہارا رب ہے۔ ادنیٰ درجہ تیار دیتے ہیے تم کو انسانیت کی اعلیٰ چوٹی پر پہنچانا اسی کا کرم ہے۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہ تھا، مگر وہ اکرم ہے سب سے بڑا کریم ہے۔ اس نے اپنے کرم سے نواز کر تم کو اعلیٰ انسان بنایا۔ اس نے تمام مخلوق کو ضرورتِ زندگی کے مطابق علم عطا کیا۔ راہ بقا بتائی، لوازم زندگی کی فراہمی سکھائی۔ دوسری مخلوق کی طرح انسان بھی ناواقف تھا۔ میدانِ زندگانی میں دوڑنے سے عاجز تھا۔ اس کو خالق نے ہر طرح سے عملی اور فطری علم سکھایا، روحانی اور وجدانی فیضان سے نوازا۔ تحت الشعور اور فوق الشعور علوم عطا فرمائے محسوس، نیم محسوس اور غیر محسوس کی معرفت عنایت کی، لیکن جب انسان خداداد علم سے کام لے کر اور عطاء الٰہی سے خوشہ چین ہو کر مالدار بن گیا اور اپنے کو مستغنی سمجھنے لگا تو پندار کے نشہ سے سرشار ہو گیا اور لگا خالق کے حکم سے سرتابی کرنے۔ اور اپنی حدود سے آگے بڑھنے۔ باوجودیکہ وہ اللہ کی گرفت سے آزاد نہیں۔ قبضۂ قدرت سے باہر نہیں اس کو یقیناً اسی مالک کی طرف واپس جانا ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور پالا پوسا ہے۔ اگر کرم خالق اور عطار مالک کے باوجود انسان اپنے طغیان سے باز نہ آیا اور اللہ سے سرکشی کرتا رہا تو خالق کریم کا کرم عتاب سے بدل جائے گا۔ عطاء کی جگہ عذاب لے لے گا۔ اور قادر مطلق اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھوڑے اور گدھے کی طرح دھر گھسیٹے گا پھر اس کو راہِ فرار نہیں ملے گی اور طاقتِ جسمانی، جتھے کی فراوانی اور مال کی کثرت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ کوئی چیز کام نہ دے گی۔

خلاصۂ بیان سات امور ہیں: (۱) عالم کا کوئی خالق یعنی حکمت کے ساتھ پیدا کرنے والا ہے (۲) عالم کا کوئی فرماں روا، حاکم منتظم اور ایک ضابطۂ بقا جاری کرنے والا ہے (۳) موجودات کے ہر ذرہ کو راہِ زندگی بتانے والا اور ضروریاتِ حیات فراہم کرنے کی تعلیم دینے والا کوئی ہے۔ (۴) انسان کی تخلیق تربیت اور تمام کائنات سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اسی لئے صانع عالم اگرچہ سب کا صانع اور رب کائنات سب کا رب اور معلم جہاں سب کا معلم ہے، مگر انسان کے ساتھ اس کی خلاقیت، ربوبیت اور تعلیم کا جو تعلق ہے ویسا کسی دوسری مخلوق سے نہیں۔ (۵) اللہ کی ذات اور صفات کی پوری حقیقت اگرچہ معلوم نہیں، لیکن انسانی ذہن و فکر کی رسائی اسم تک ضرور ہے اور ہر اسم اپنے مسمیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ خواہ مسمیٰ کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ لہٰذا استعانت اور طلب برکت کے لئے اس کا اسم ضروری اور کافی ہے۔ (۶) آخر کار خالق کی طرف مخلوق کی واپسی ضروری ہے۔ (۷) سب سے آخر میں ہم کو اس پر بھی غور کرنا ہے کہ اس سورت کی ابتداء لفظ اقرء سے کی گئی ہے اور مالم یعلم تک لفظ اقرء دوبارہ لفظ رب دوبار لفظ خلق دوبار اور لفظ علم دوبارہ ذکر کیا ہے۔ ہم ہر نمبر کی توضیح کسی قدر تفصیل سے کرنی چاہتے ہیں۔ تاکہ الحاد انکار پر جو مادیاتی اندھیریاں تہ بہ تہ چھائی ہوئی ہیں ان کے اندر سے عقیدۂ قرآن کا روشن سورج چمکتا ہوا نظر آجائے اور پیدائشی اندھوں کے علاوہ ہر کور نظر والے کو بھی اس کی چمک دکھ جائے اور وہ بقدر قوتِ نگاہ نور چیں ہو سکے۔

ا و ۲ تاریخ کی آغاز آفرینش سے انسان میں سوچنے کی طاقت کارفرما رہی ہے۔ انسان اپنے اور کائنات کے بارے میں سوچتا رہا گردو پیش کی سطحی ضروریات فراہم کرنے، پیٹ بھرنے، پیاس بجھانے، صنفی تقاضا پورا کرنے اور ہم جنسوں سے مختصر تعلقات قائم کرنے کے بعد آسودہ حال ہو کر جب انسان لیٹتا تھا تو چاند سورج زمین آسمان اور دوسرے مظاہر قدرت کو وہ غیر شعوری طور پر غور کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہ چیزیں کیا ہیں ایسی کیوں ہیں، مجھ سے ان کا کیا تعلق ہے؟ یہ میرے کس کام آتی ہیں۔ میں کیا ہوں۔ کیا تھا، کہاں سے آیا، کہاں جاؤں گا، مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ تمام تصورات غیر شعوری طور پر غیر مرتب صدیوں کے ساتھ انسان کے ذہن کو جھنجھوڑتے تھے۔ اس کو اپنی زندگی قفس الطیر بن کر تار ے کی طرح نظر آتی تھی۔

جس کی ابتدا اور انتہا سے وہ بے خبر تھا۔ یہ مابعد الطبعیاتی خیالات انسان کے دماغ کو تمام معاشی اور سیاسی مسائل کی پیدائش سے بہت پہلے اپنے ابتدائی تصورات سے اثر پذیر بنائے ہوئے تھے یا دو باراں کے طوفان اور جھکڑ، زمین کے بھونچال، سورج اور چاند کا گرہن، گھنے جنگلوں کی ہیبت، بیابانوں کا سناٹا، پہاڑوں کی سرفلک بلندی، غاروں کا زمین دوز گہراؤ، سمندروں کا ہمہ گیر پھیلاؤ، بڑے بڑے دریاؤں کی روانی اور سیلابوں کی طغیانی انسان کے ذہن سادہ پر ایسی اثر انداز تھی جس کے اندر اس کو غیبی موہومی ایک یا متعدد طاقتوں کی کارفرمائی رکھتی تھی۔ ان موجودات کے پیچھے پردہ کے اندر چھپے ہوئے ہاتھوں کی قوت نظر آتی تھی۔ اور اس کے مقابل اپنی بے بسی محسوس ہوتی تھی۔ اسی احساس بے بسی نے اس کو تخیل پرست بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس پردۂ زنگاری کے اندر کس طاقت کا ہاتھ بنانے اور بگاڑنے میں مشغول ہے۔ قدیم زمانے میں ان سادہ دماغوں کے اندر کچھ ایسے ذہن پیدا ہوئے جو دوسروں سے اپنی ذہنیت اور ذہانت میں ممتاز تھے۔ وہ کسی قدر اہل فکر تھے۔ ان کے غور میں کچھ ترتیب تھی۔ سوچ بچار کی طاقتیں اجاگر تھیں۔ انہوں نے انفسی اور آفاقی مطالعہ کے بعد دیکھا اور سمجھا کہ ان سب چیزوں کے اندر خالص جسمانیت ہے۔ لمبائی چوڑائی اور موٹائی ہے۔ آنے جانے والی صورتیں اور شکلیں ہیں، لیکن ہر حالت میں قائم اور باقی رہنے والی ایک مادیت ہے۔ ضخامت ہے اسی مادیت کی اندھی اور بے شعور مشیت کی یہ سب کچھ اعجوبہ انگیزی ہے۔ مادہ کی مہیب طاقت ہی اس کائنات تشکل کی حاکم ہے۔ رنگ، شکل، مقدار اور دوسرے احوال و کیفیات کا تبدل تغیر کوعادت ہے ہوتا رہتا ہے ہوتا رہا ہے۔ ہوتا رہے گا، مگر یہ سلسلہ زمانی ابتدا رکھتا ہے نہ انتہا۔ نہ اس کا آغاز ہے نہ اختتام۔ جو کچھ ہو رہا ہے حسن اتفاق سے ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ بس یونہی یہ نظم چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ نیچرل ضابطۂ حیات ان کو حاوی ہے۔ ہر چیز کا طبعی تقاضا ہی یوں ہے جیسا ہو رہا ہے۔

مشرق اور مغرب کی قدیم انسانی جماعت کی سمجھ میں مذکورہ بات نہیں آئی ان کا اس سے اطمینان نہیں ہوا کہ اپنے کو دوسرے گھاس پھوس، چرندوں پرندوں اور مٹی پتھر کی طرح تسلیم کرلیں اور سب کو بے شعور، بے ارادہ بے طاقت طبیعت کے زیر اقتدار مان لیں۔ اس لئے قدیم زمانے کے مختلف دوروں میں کچھ اہل فکر ایسے آئے جنہوں نے کہا کہ کچھ غیبی طاقتیں ضرور موجود ہیں جو کائنات کے اس نظام کو چلا رہی ہیں۔ سب طاقتوں میں اتفاق ہے، اتحاد ہے۔ ہر طاقت خود مختار ہے۔ مگر وہ کیا ہے، کیسی ہے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں بیان کرسکتا۔ اس مٹی اور پانی کی دنیا سے ماوراء ایک اور عالم ارواح ہے۔ جہاں مرنے والے جاتے ہیں اور جہاں سے اس دنیائے آب و گل پر حکومت ہوتی ہے۔ اگنی بھی ایک حکمران غیبی طاقت ہے۔ اندر بھی پوشیدہ حکمران ہے۔ محبت، عداوت، امن، جنگ، ترقی، تنزل، افلاس، دولت غرض ہر چیز اور ہر حالت کا ایک مخفی حاکم ہے جس کے ہاتھ میں اپنی حدود سلطنت کا انتظام ہے۔ وہ کسی کا محکوم نہیں۔ سب اس کے محکوم ہیں۔ اس کی رضامندی آلام و مصائب سے بچنے کے لئے ضرور ہے۔ وہ ناراض ہوا تو زندگی تباہ ہو جائے گی۔ کھیتیاں تباہ ہو جائیں گی۔ باغ اجڑ جائیں گے۔ آبادیاں ویران ہو جائیں گی۔ طوفانی آندھیاں چلیں گی جو زمین دوز سر بفلک درختوں کو بھی اکھاڑ پھینکیں گی۔ آدمی کی تو طاقت ہی کیا ہے کہ ان کے سامنے ٹھہر سکے۔ اس قسم کے توہمات قدیم زمانے کے اہل فکر نے سادہ لوح انسانوں میں پھیلا دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم انسان بچوں کی طرح دیو، جن، بھوت اور خیالی پیکروں سے مرعوب ہو گیا اور دیوتاؤں کو راضی رکھنے کے لئے ان کی خیالی مورتیاں بنا کر ان کے سامنے سربسجود رہنے لگا۔ ہندوستان اور یونان کا علم الاصنام انہی فرضی دیوی اور دیوتاؤں کا مجموعہ ہے۔ قدیم یونان میں ایلیڈ کے اندر ان مافوق البشر خیالی ہستیوں کے کارناموں کے تذکرے بھرے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم دانشوروں نے بھی غیر متناہی دیوتائی کثرت کی اشاعت کی اور ہر ایک کو بجائے خود مختار مانا مگر قدیم ترین تین اصل معبود قرار دیئے۔ اندر، اگنی اور دوسرے متعدد دیوتا، اپسرائیں اور راکشس سب ہی حکمران طاقتیں قرار دیئے گئے، مگر برہما کو دنیا کا خالق وشنو کو رب، محافظ اور شیو کو برباد کرنے والا سمجھا گیا۔ ویدوں اور پرانوں میں اگرچہ بکثرت دیوتاؤں کا ذکر ہے، مگر برہما، وشنو اور شیو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

قدیم ہندو عقلمندوں کی یہ کثرت پرستی دور متوسط تک بڑے زور شور سے قائم رہی، لیکن مسیح سے تقریباً چار یا پانچ سو برس پہلے اس کا رد عمل شروع ہوا۔ برہمن ازم سے بغاوت شروع ہو گئی۔ ناستک گروہ پیدا ہو گیا۔ ناستک گروہ میں سے ایک بدھ (عارف) نے جس کا نام گوتم تھا ہندوستانی چینی سرحد سے مورتی پرستی اور خیالی دیوتاؤں کی حکومت کے خلاف جھنڈا بلند کیا اور قدیم ترین یونانی مفکرین کی طرز فکر سے ہٹ کر آفاقی اور انفسی

غیر مادی حقائق پر غور شروع کر دیا ۔ آخر شجرۃ العرفان کے نیچے بیٹھے بیٹھے جب اس کو مدت گذر گئی تو ایک روز نورِ حقیقت برسنا شروع ہو گیا ۔ مگر یہ روشنی خالص عقلی تھی وجدانی نہ تھی ۔ ترتیب ذہنی کا نتیجہ تھی انکشافی نہ تھی ۔ حصولی تھی حضوری نہ تھی ۔ اشیاء اپنی اصلی صورتوں کے ساتھ اس کے آئینۂ روح کے سامنے نہیں آئی تھیں بلکہ ناہموار آئینۂ فکر پر حقیقت کی عکس ریزی ہوئی تھی اسی وجہ سے جہاں اس نے کثرتِ الٰہیہ سے انکار کیا وحدتِ الٰہ کی بھی کوئی یقینی حقیقت اس کے سامنے نہ آئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ حقیقت تمہارے اندر ہے غور کرو وچار کرو دھیان لگاؤ ۔ تمام صورتوں اور شکلوں کو قوتِ خیالیہ سے نکال دو ۔ جذبات کو مردہ کر دو اور ان کی مردگی کا بھی احساس چھوڑ دو ۔ رنج و راحت کے احساس سے دماغ کو آزاد کر لو حقیقت کھل جائے گی نورِ ہستی کی بارش ہونے لگے گی ۔ اگر اس ہستی کا سرچشمہ کوئی وجود اصلی ہے تو ہونے دو نہیں ہے تو اس کے پیچھے نہ پڑو نہ اس کے اقرار سے سروکار رکھو نہ انکار سے ۔ خود اپنی اور کائناتی ہستی پر غور کرو ۔ اگر اصل الوجود کوئی ہے تو وہ مجہول الحقیقت اور غیر معلوم الصفات ہے ۔ اس کی ذات و صفات کا ہم کو کچھ علم نہیں ۔ اس کے دماغی مجسمے اور مفروضہ خیالی پیکر بنانے کا کچھ حاصل نہیں ۔ یہ بدھ کا عرفان تھا ۔ جین مذہب بھی ناستک گروہ کے طرزِ فکر کا ایک نتیجہ اسی دور میں نکل آیا تھا مگر ان کے سوچ وچار کا طرز اتنا تجرد نہ تھا کہ تمام صورتوں سے قوتِ تخیل کو آزاد کرنے پر اس کا مدار ہوتا تاہم انکار وحدت ہی ان کی ذہنی تفکرات کا منتہا تھا ۔ بدھ ازم ملک پر چھا گیا ۔ ہندوستان ، چین ، وسط ایشیا ، جنوبی مشرقی ایشیا اور لنکا تک اس کے زیر اقتدار آگئے ۔ اشوک اور کنشک جیسے حکمران اس کے حلقہ بگوش ہو گئے ۔ برہمن ازم شکست کھا کر ہند کے شمالی اور جنوبی گوشوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا ۔ لیکن ہندو دھرم اتنی آسانی سے شکست قبول کرنے والا نہ تھا ۔ مذہبی لذت کوشی برہمنوں کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے تھی شکست خوردہ ہندو ازم کو ابھارنے اور احیاء کرنے کی کوششیں برابر جاری تھیں ۔ آخر بدھ ازم کے خلاف ردِ عمل کے ظہور کا زمانہ آگیا اور گپت بادشاہوں کے عہد اقتدار میں تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں برہمن ازم پھر شمالی ہندوستان پر چھا گیا ۔ بلکہ برہم پتر کے مشرقی کنارہ سے لے کر سندھ کی وادیوں تک اس کی حکمرانی مستحکم ہو گئی ۔ البتہ گنگا کی وادیوں نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کی بہت سی چوٹیاں بھی ہندو ازم نے مسخر کر لیں اور بدھ ازم ہندوستان کے میدانوں سے بہت حد تک ہٹ گیا ، لیکن چین ، مشرقی افغانی ، لنکا اور جنوبی ایشیا پر برابر قابض رہا ۔ ہمالیہ کی وسطی اور شمالی آبادیاں بھی اسی کے زیر نگین ہیں ۔ چھٹی صدی عیسوی تک ہندوستان مشرقی ایشیا جنوبی ایشیا اور چین وغیرہ کا انکار مذہبی کی یہ ہی حالت تھی ۔ دوسری طرف ایران میں دسویں زردشت سے بھی بہت پہلے سے مجوسی مذہب پھیلا ہوا تھا جس کے حلقہ بگوش کیانی اور ساسانی خاندان کے اکثر بادشاہ ہو گئے تھے چھٹی صدی عیسوی کے ربع سوئم تک مجوسی افکار کل ایران اور قفقاز کی وادیوں میں نیز عراق کے بعض حصوں میں پھیلے ہوئے تھے ۔ یہ گروہ خیر و شر کی دو غیبی طاقتوں کو کائنات کا حکمران خیال کرتا تھا ۔ یزداں و اہرمان کا تصادم مانتا تھا ۔ شروع میں قبلۂ سجود تمام ستاروں سیاروں خصوصاً آفتاب اور آگ کو جانتا تھا اور رفتہ رفتہ ہر مظہر نور کو حقیقی مسجود لہ سمجھنے لگا تھا ۔ مانی عراقی کے افکار مزعومہ بھی مجوسیوں کے خیالات سے مشابہ تھے ۔ عراق میں صابی گروہ نجوم و کواکب کے اندر ارواح غیبیہ کے حلول کا قائل تھا اور سیاروں نیز ستاروں کی حرکات کو مستقل طور پر کائنات عنصری پر اثر انداز بلکہ حقیقی مؤثر خیال کرتا تھا اسی لئے ان میں ستارہ پرستی عام تھی ۔

یونان میں مختلف نظریاتِ فکر تھے ۔ دیمقراطیس سے لے کر افلاطون تک ہر صاحب فکر عقلی الٰہیات کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا ۔ دیمقراطیس اور اس کے متبع مادہ پرست اور شیفتگانِ طبیعت تھے ۔ ان کی نظر میں ساری کائنات کے اندر بے شعور طبیعت اور بے علم مادہ کی کارفرمائی تھی نہ کوئی خالق تھا نہ کوئی مخلوق ۔ حسن اتفاق اور سوء اتفاق پر اس سنسار کا نظام مبنی تھا ۔ ارسطو اور اس کے متبع یعنی مشائیہ گروہ کے حکماء یعنی اوّل ترین ہستی علۃ العلل کو مانتے تھے جس کو وہ واجب الوجود اور واحد بہمہ جہات جانتے تھے ۔ یعنی نہ اس کی صفات متعدد تھیں نہ جہات کی کثرت ۔ اس سے عقل اول کا ظہور ہوا مگر اس ظہور میں واجب کے علم مرضی مشیت اور قدرت کو دخل نہ تھا بلکہ یہ ظہور ایک قسم کا اضطراری غیر اختیاری عروج تھا ۔ واجب اور عقل اوّل کے زمانہ میں بھی کوئی فرق نہ تھا ۔ فقط علت معلول کا فرق تھا یعنی دونوں قدیم ازلی بے آغاز ۔ پھر عقل اوّل سے نفس کلی نکلی اور عقل دوئم کا صدور ہوا ۔ مگر یہ ترتیب ظہور بھی زمانی نہ تھی ۔ اس میں تقدیم اور تاخیر کو دخل نہ تھا ۔ ترتیب کے آخر میں مادہ عنصری اور صورت جسمیہ کلی کا ظہور ہوا اور یہ تاخر بھی زمانی نہ تھا ۔ گویا عناصر کا مادہ اور صورت کلیہ اور افلاک کا خصوصی مادہ و صورت اور نفس اور دسوں عقلیں اور واجب الوجود سب ہم زمانہ

اور ہم سن تھے۔ فرق صرف علیت اور معلولیت کا تھا۔ ورنہ خالق کوئی نہ تھا نہ کسی کو مخلوق کہا جا سکتا تھا۔ طبیعت ان کے نزدیک حکمران تھی۔ کائنات عنصری کے تمام تغیرات اور تبدیلات اسی بے شعور تیچر کے زیر حکم تھے۔ اوضاع فلکی اور علویات بھی طبائع فلکیہ کے ماتحت تھے اور کائنات کے اس سلسلہ کا نہ کوئی آغاز تھا نہ آخری کنارہ

افلاطون اور اس کے گروہ والے یعنی اشراقیہ اور تمام نو افلاطونی واجب الوجود اور علۃ العلل کے قائل تھے اور واجب الوجود کو عالم کل بھی جانتے تھے مگر عالم واجب کو واجب کی ذات سے الگ بصورت تصاویر و تماثیل مانتے تھے اور سنسار کا نظام ارباب انواع کے ہاتھوں میں سمجھتے تھے۔ یہ لوگ آواگون کے بھی قائل تھے۔ افلاطون نے یہ عقیدہ مشرق سے سیکھا تھا۔ افلاطون کے افکار پر یقیناً عزورت کے نظریات کا بھی کسی قدر اثر پڑا تھا۔ مغرب اور متبعین مغرب کی یہ حالت بھی چھٹی صدی عیسوی کے ربع آخر تک تھی۔

ممالک عربیہ میں عموماً بت پرستی کا رواج تھا۔ عموماً ناخواندہ بدوی اور نیم خواندہ شعراء و خطباء بت پرست یا توہم پرست تھے۔ اکثر حیات اخروی کے بھی منکر تھے۔ رومیوں کے اثر سے شام کے غسانی بادشاہ اور رعایا اور عرب کے قبائل، تغلب، تمیم اور کچھ دوسرے قبائل تثلیثی عیسائی تھے یمن میں اگرچہ مجوسیت کا اقتدار تھا مگر مشرک عیسائیت بھی پھیلی ہوئی تھی۔

مدینہ اور خیبر اور کسی قدر شام میں بگڑی ہوئی یہودیت بھی دھار مک حیثیت کی مدعی تھی۔ عیسائی اور یہودی باہم اتنے متصادم تھے کہ ایک فریق دوسرے کو کافر اور باطل پرست جانتا تھا۔ یہودیوں کا ایک گروہ عزیزؑ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا اور مجسمہ تو سب ہی تھے۔ اگر تثلیث نے توحید کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور ایک الوہیت کے تین ٹکڑے یا تین پاروں کو ایک بنا دیا تھا تو یہودیت نے بھی موسیٰ کے اس خدا کو جو موسیٰؑ کو بھی مجسم دکھائی نہ دے سکتا تھا۔ مجسم مان لیا تھا اور وہ اعضاء مفروضہ کے اعضاء مقرر کر دیے تھے۔ اصل نصرانیت و یہودیت مسخ ہو چکی تھی۔ فکر و عمل دونوں کو اہواء دنیوی کے زہریلے جراثیم نے مہلک بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہبی کتابوں کے کچھ الفاظ بدل دیے تھے اور معنوی تحریف تو خواہش کے مطابق ہوتی ہی رہتی تھی مذہب بازیچہ بن کر رہ گیا تھا۔ احبار و علماء اللہ کے علاوہ ارباب بن کر بیٹھ گئے تھے۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیا کرتے تھے۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دینا ان کا شعار بن گیا تھا۔ علماء و مشائخ نے عوام کا رشتہ خدا سے منقطع کر دیا تھا۔ عبد کو معبود سے کاٹ دیا تھا اور خود مدعیان توسل بن بیٹھے تھے جن کو راضی کئے بغیر بارگاہ الوہیت تک نہ عیسائی کی رسائی تھی نہ یہودی کی۔ حبر اکبر اور پاپائے اعظم حاکم مطلق تھے۔ تمام لوگ خدا کو چھوڑ کر انہی کے دروازوں پر سر عقیدت جھکاتے اور سجدہ ریزی کرتے تھے۔ درستی اعمال کے مکلف نہ عیسائی رہے تھے نہ یہودی۔ عقیدۂ کفارہ نے عیسائیوں کو اعمال صالحہ سے بے نیاز کر دیا تھا اور یہودی تو ابناء اللہ اور احباءہ کے مدعی تھے۔ باوجودیکہ حضرت عیسیٰ جیسے پاک اور معصوم نبی کو ولد الزنا اور آپ کی معصوم ماں کو زانیہ کہتے تھے پھر بھی شریعت موسوی کے علمبردار ہونے کے مدعی تھے۔ ادھر عیسائیوں نے مخلوق کو خالق کی اولاد اور انسان کو خدا کا بیٹا بنا رکھا تھا۔ ممکن کو واجب اور حادث کو قدیم کی کرسی پر جا بٹھایا تھا۔ حاملان کتب الٰہیہ کی یہ حالت بھی چھٹی صدی عیسوی کے آخری ربع تک تھی۔ خلاصہ یہ کہ

پورب پچھم میں توحید خالص مفقود تھی اور افکار انسانی چار حصوں میں بٹ گئے تھے۔
۱۔ ایک گروہ صراحۃً وجود خدا کا منکر تھا۔ ۲۔ دوسرے گروہ کے عقیدہ میں خدا کا انکار اگرچہ صراحۃً نہ تھا لیکن اقرار بھی ضروری نہ تھا۔ ۳۔ تیسرا گروہ خالص مشرک فی الذات تھا ۴۔ چوتھا گروہ مشرک فی الصفات تھا۔

کائنات کی تخلیق، تکوین، ایجاد، اس کا نظم، تربیت، بقاء حیات، اس کی تعلیم فطری اور سارے جہان کے آغاز و انجام سے کوئی صحیح طور پر واقف نہ تھا۔ نہ یہ معلوم کہ سارا سنسار کب بنا اور کیسے بنا نہ اس سے واقفیت کہ کیسے چل رہا ہے اور کون چلا رہا ہے نہ اس کا شعور کہ اس کا آخری کنارہ کہاں ہے۔ نہ انسان کے امتیازات و خصوصیات کا ادراک نہ فرائض انسانی اور لوازم فکر و عمل جانے بلکہ کوئی راستہ۔ گویا انسان اندھیری رات میں بحر ظلمات میں گھر گیا تھا۔ اوپر کالی گھٹائیں اور نیچے موج در موج بحر اسود۔ عقل و دانش کے دیے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے مگر راہ نمائی سے قاصر تھے ان کو خود تو بڑی تاریکیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ ان کے اندر روغن زیتون نہ تھا بلکہ روشنی کو بجھا دینے والا پانی تھا۔ انسان کی دانش لاہیات کی وادیوں میں سرگرداں تھی۔ تو کیلے پتھروں نے اس کے قدموں کو چھلنی کر دیا تھا۔ بہت سے دانشور گمراہی کے غاروں میں گر چکے تھے۔ سادہ لوح عوام بیابان ضلالت میں بھٹکے پھر رہے تھے۔ توہم پرستی کی جھلسا دینے والی گرمی

اُن کی روحِ فکر کو جلا رہی تھی۔ اور کہیں پناہ لینے کی جگہ نہ تھی۔ مذہبی پیاسوں نے ان کے عقائد و اعمال کے حلق خشک کر دیے تھے اور کوئی ایسا شیریں چشمہ نہ تھا کہ دو قطرے پانی ان کے حلق کی پیاسیں دور کر سکتا۔ اگر وادیٔ ضلالت میں کوئی درخت نظر آتا اور بھولے بسرے انسانوں کو تمنا ہوتی کہ اس کے سائے میں کچھ زمانہ سکون حاصل کریں تو تجربہ بڑا تلخ ثابت ہوتا۔ سارے درخت تھوہر، سینٹھ اور کیکر کے ملتے جن میں نہ فرحت بخش خنکی تھی نہ تسکین عطا کرنے والا سایہ بلکہ تمام درخت شجرۃ النار تھے۔ سایہ گیر مسافروں کو جلانے والے جھلسانے والے غرض دانا اور نادان فرزانہ اور احمق۔ عالم اور جاہل خاص اور عام ہر آدمی زمین کی گردن کا بار تھا اور زیرِ آسمان چوپایوں اور کیڑوں سے زیادہ ذلیل مخلوق۔

ایسے ماحول اور ایسے وقت میں مکہ کا ایک صالح قریشی نورِ حق کی تلاش میں کوہِ حرا کے ایک غار میں بحرِ تفکر میں غرق تھا اور اس کو یقین تھا کہ انسانیت کا قافلہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہے اور راہ تو کھو گیا ہے یا ذہنی کج روی میں مبتلا۔ منزلِ مقصود تک پہنچانے والے راستہ پر نہ کوئی چل رہا ہے نہ کوئی کسی کو لیجا رہا ہے، لیکن وہ صراطِ مستقیم جو حقیقت تک پہنچادے کون سی ہے اور اس پر چلنا اور دوسروں کو چلانا کس طرح ممکن ہے۔ نورانی دانش رکھنے والا قریشی تنہائی کے قیمتی اوقات میں اسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا اور ترتیبِ فطری کسی قطعی نتیجہ تک نہیں پہنچا رہی تھی۔ سامنے اتنی روشنی تھی کہ عقل کی آنکھ اس پر ٹھہرتی نہ تھی۔ ایک تحیر تھا ایک خیرگی تھی، نگاہِ دانش میں چکاچوند تھی۔ یکایک عقل و ذہن سے ماورا نورِ وجدانی چمک اٹھا اور عرفانی شعاعوں کی بارش شروع ہوگئی اصل الوجود نورِ مطلق کی آواز بغیر کسی صوتی کیفیت کے کسی پہاڑ، درخت، سمندر یا خلا سے نہیں، کسی مادی مجسم سے نہیں، بلکہ اس نورِ مقدس کی زبانی سنائی دی جو خود بھی سراسر روشنی تھا اور انوارِ قدسیہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ یہ آواز اگرچہ کیفیتِ صوتیہ مادیہ سے خالی تھی مگر صورتِ محدد سے خالی نہ تھی صرف الہام و القاء نہ تھا بلکہ حقیقت مقیدہ روح کے سامنے تھی بول رہی تھی سمجھا رہی تھی سنا رہی تھی پڑھا رہی تھی حکم دے رہی تھی۔ وہ پیامِ حق تھا صداقت جو اس وقت کی تمام انسانی دانش کی حدود سے خارج تھا پہنچا رہی تھی۔ افکارِ صحیحہ و باطلہ کا فیصلہ کر رہی تھی۔ اس نے پہلی بار اقرء کہا پھر دوسری بار بھی پڑھنے کا حکم دیا۔ ایک اقرء دوسرے اقرء کی محض تاکیدی نہ تھا بلکہ مفرد جدا جدا تھا ایک مرتبہ حکم دیا کہ اپنی لوحِ وجدان پر لکھے ہوئے نقوش پڑھو یہ وہی نقوش ہیں جن کو میں لفظوں میں ادا کر رہا ہوں، بول رہا ہوں۔ تم دل کے کانوں سے سن رہے ہو۔ میری آواز تمہارے قلب خفی اخفیٰ سرا اور روح میں پیوست ہو رہی ہے۔ پھر حکم دیا کہ لوحِ کائنات کو پڑھو۔ اس لوح پر بھی وہی نقوش ثبت ہیں جو تمہارے وجدان پر لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ خاموش ہیں بولتے نہیں بے لفظ ہیں سنائی نہیں دیتے۔ دونوں نقوش باہم متفق ہیں جو تمہارے وجدانی نقوش ہیں۔ وہی ہر ذرے کی فطرت کے نقوش ہیں۔ دونوں کو پڑھو کہ

تمہارا رب وہی ہے جو سارے جہان کا خالق ہے۔ یعنی یہ جہان ازلی ابدی اور قدیم نہیں۔ فانی اور ہالک الاصل اور زوال پذیر ہے۔ اس کی کوئی چیز لازوال اور غیر مخلوق نہیں۔ یہ معدوم تھا پھر موجود ہوا۔ نیست تھا پھر ہست ہوا۔ یہ خالق اور موجد سے بے نیاز نہیں۔ ایک الناس کا خالق ہے اسی نے اپنے علمی اندازہ کے تحت سارے سنسار کو پیدا کیا۔ وہی اس کا ناظم، مرتب، ترقی دہندہ اور وقت مقررہ تک باقی رکھنے والا ہے۔ عدم سے وجود میں لانا ہو یا ہستی کو قائم رکھنا اور انتظام کو چلانا کوئی چیز بھی اتفاقی اور بلا ارادہ نہیں۔ نہ اس جہان کا کوئی فعل بغیر فاعل کے ہے نہ اس کے متعدد خود مختار خالق اور ناظم ہیں۔ اس عالم کی تخلیق اور تربیت کا ہر پرزہ محض محتاج پرزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤثر حقیقی مختارِ مطلق اور غیر محتاج کوئی نہیں۔ کسی کا منصوبہ اور پلان کسی کا علمی اندازہ اور تخمین اس عالم کی تکوین اور انتظام میں دخل نہیں رکھتا۔ نہ سورج کی روشنی اور نور ریزی از خود ہے نہ آگ کی گرمی اور حرارت آفرینی نہ ستاروں کی ضیاء پاشی اور اثر اندازی نہ پانی کی روانی نہ ہوا کا سیلان اور میلان نہ زمین کی حرکت نہ پھولوں کی عطر بیزی اور سبزہ زار کی شادابی اور دل فریبی نہ بیابان کا سناٹا نہ سمندروں کی اتھاہ گہرائی اور ہمہ گیر پہنائی غرض اس کائنات میں سے کسی کا وجود از خود نہیں نہ کسی کی صورتِ نوعیہ اور طبیعت خود مختار اور مؤثر حقیقی ہے نہ غیبی کارندے اور پس پردہ قوتیں فاعل حقیقی اور کارساز بے نیاز ہیں اس ساری وجود کی ہستی ایک ہی ہے اور انجام بھی ایک ہی ہے۔ پلاننگ اور منصوبہ بندی بھی ایک ہی ہے۔ آغاز ایک ہی سا ہے اور انجام بھی ایک ہی ہے۔ فاعل پر فعل سے استدلال کیا جاتا ہے اور فن نتیجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ نظم کائنات کی استواری، ہمواری، یگانگت، دقتِ صنعت، توافق، عدم تضاد اور باہمی تعاون اگر از خود نہیں اور یقیناً نہیں تو ضرور یہ سب کچھ ایک جامع الصفات ہستی کے علمی اندازہ کے زیر اثر ہے جس کا علم ہمہ گیر، قدرت اور حکمت محیط، کل، ربوبیت تامہ اور تنظیم تامہ ہے، جو کائنات سے خارج ہے، مگر کوئی بھی اس سے مستغنی نہیں۔ ہر چیز اپنے کل احوال میں اس کی

محتاج ہے ۔ اس کی ذات اور صفات کی حقیقت اگرچہ معلوم نہیں نہ معلوم ہو سکتی ہے ۔ حادث قدیم کو اور ممکن واجب کو اپنے اندر نہیں سما سکتا، لیکن ہر معلول علت پر دلالت کرتا ہے ۔ ہر عمل کا ایک عامل ہونا لازم ہے ۔ نتیجہ بغیر فعل کے اور فعل بغیر فاعل کے نہیں ہوتا ۔ اثر مؤثر کا ضرورت مند ہے ۔ پس اس جہان کی صنعت اور ساخت کی اعجوبہ انگیزی اور حیرت آفرینی بتا رہی ہے کہ اس کا موجد ہمہ گیر علم و قدرت رکھتا ہے ۔ اس کی نظمی طاقت اتھاہ ہے ۔ ہر ذرہ کی پیشانی پر اس کی صنعت اور قدرت و حکمت کے نقوش ثبت ہیں ۔ ہر قطرہ کی فطرت اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر اسی کے مشیت کے موافق چل رہی ہے ۔ وہی ایسا معلم ہے جس نے ہر نوع کے ہر فرد کو خواص نوعی اور شخصی عطا کر کے بننا بگڑنا ، رنگ ، بو ، حجم ، شکل اور دوسری کیفیات کا بدلنا سکھایا ۔ ہر مادی چیز کو اور ہر غیر مادی کو بارہ کو عدم سے وجود میں آنے اور راہ زندگی پر چل کر اپنی اپنی حد کمال تک پہنچنا بتایا ۔ زیر و بالا ادنیٰ اور اعلیٰ کوئی بھی اس کے ضابطہ ایجاد اور قانون بقاء کے دائرہ سے نہیں نکل سکتا کوئی ذرہ ۔ قطرہ ۔ پتہ اور جرثومہ اپنی حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کی حد میں داخل نہیں ہو سکتا ۔ یہ آثار اور نتائج ہم کو اس کی ذات و صفات کا پتہ دے رہے ہیں ۔ مسمی کی حقیقت اور مدلول کی صفات کی ماہیت جاننا ضروری نہیں ۔ ہر علم علت سے معلول پر استدلال ہی کا نام نہیں ۔ ہر برہان لمی ہی نہیں ہوتی ۔ دھواں بھی تو آگ پر دلالت کرتا ہے ۔ دھوپ سے بھی تو سورج کے وجود کا علم ہو جاتا ہے ۔ مسمی کی اصلی حقیقت کا علم تو اس کائنات کو دیا ہی نہیں گیا ۔ کسی غیر ممکن کی حقیقت کا بھی تو عرفان نہیں ۔ ہم اس کائنات کے احوال ہی تو جانتے ہیں آثار اور ظاہری خواص کا ہی تو ہم کو پتہ ہے ۔ تنکے کی حقیقت بھی آج تک کسی حکیم کو معلوم نہ ہو سکی ۔ فصل و خاصہ اور جنس و عرض عام کا امتیاز تام کوئی بھی تو آج تک نہ کر سکا ۔ ہمارے پاس تو صرف الفاظ ہیں ۔ اور الفاظ ہی سے ان کی مراد پر دلالت ہوتی ہے ۔ الفاظ ہی اگرچہ حقائق کو نہیں بتاتے ، مگر حقائق کا راستہ تو بتاتے ہیں ۔ پس خالق کائنات اور رب ارض و سموات کی حقیقت کے پیچھے کیوں پڑتے ہو ۔ ایک رتی تولنے والی عقل سے پہاڑ کیوں تولتے ہو پس اس کا ذاتی اور وصفی نام لو نام ہی سے استعانت کرو ۔ تبرک حاصل کرو ۔ یہ نام اگرچہ حقیقت کو تمہارے دماغوں کے اندر نہ لا سکے گا مگر حقیقت کا راستہ ضرور بتا دے گا ۔ لہٰذا پڑھو اپنے رب کا نام اور اپنے رب کے نام کی استعانت اور برکت سے پڑھو پیام فطرت کو وہ پیام خاموش ہو یا ناطق ۔ آواز والا ہو یا صامت ۔ سننے کے قابل ہو یا ناقابل شنوائی ۔ لوح مادیات کے نقوش ہو یا مجردات کے انوار مرتسمہ ۔

حاصل پیام یہ ہے کہ اللہ ہی اپنے اندازۂ علمی اور منصوبہ تقدیری کے زیر اثر سارے جہان کا خالق ہے ۔ خصوصاً انسان کی تخلیق اپنے اندر بڑی عظمت ، حیرت اور ندرت رکھتی ہے ۔ پس یہ کائنات قدیم نہیں اور نہ یونہی حسن اتفاق سے بن گئی ہے نہ اس کی تخلیق میں سوا اللہ کے کسی اور کا دخل ہے ۔ اللہ ہی کو سارے جہان کی ربوبیت تکوینیہ حاصل ہے ۔ یعنی وہی اس جہان کا انتظام اپنے علم ازلی اور مشیت کے مطابق اپنے ارادہ سے چلا رہا ہے اس کا نظم اور ترتیب اور اسباب زندگی کی فراہمی نہ اتفاقی اور غیر ارادی ہے نہ غیبی دیوتاؤں اور کارندوں کی خود مختاری اور کارسازی کو اس میں مستقل دخل ہے نہ طبعی قوتوں اور نوعی صورتوں کے ہاتھ میں اس کی لگام ہے ۔

اللہ ہی انسان کا رب ہے یعنی اس کی ربوبیت تکوینیہ تو ہمہ گیر ہے ہی لیکن انسان کے لئے ضوابط زندگی اور دستور حیات بنانا بھی اسی کی ربوبیت خاصہ اور علو قدرت و کرم کا نتیجہ ہے یعنی انسان کی ربوبیت تشریعیہ کا مالک بھی وہی ہے ۔ پس کوئی انسان از خود اپنا دستور حیات نہیں بنا سکتا نہ انفراداً نہ اجتماعاً ۔

اللہ ہی نے ہر ذرہ کو فطری تعلیم سے نوازا ہے ۔ اسی کی تعلیم سے ہر جرثومہ زندگی کے میدان میں دوڑ رہا ہے جس کا مقصد اپنی زندگی کو حد معین تک باقی رکھنا اور کائنات کی مشین چلانے میں مدد کرنا ہے ۔

اللہ ہی نے خصوصیت کے ساتھ انسان کو علم کا ایک ممتاز درجہ عنایت فرمایا اور جس علم سے دوسری مخلوق بے بہرہ ہے وہ انسان کو عطا فرمایا ۔

اللہ کی ہر حکمت خلاقیت ، ربوبیت تکوینیہ ، فطری تعلیم اللہ نے انسان کی جسمانی ساخت اور علمی و عملی قوتوں میں تخلیقی طور پر جو خصوصیت اور ندرت رکھی ہے ۔ جس کی وجہ سے عمومی علوق کے بعد خلق الانسان فرمایا اس کی توضیح ہم بعد کو کریں گے ۔ اسی طرح ربوبیت انسانیہ اور خصوصی تعلیم انسانی سے بحث بھی آئندہ کی جائے گی ۔ اول اللہ کی یہ حکمت عمومی خلاقیت محیط کل نظم کائنات اور ہمہ گیر فطری تعلیم کو بیان کرنا ضروری ہے ۔

ایک مشہور مغربی مفکر کریسی مارلیسن نے کتاب "آدمی اکیلا نہیں" میں اپنے مطالعہ کائنات کا نتیجہ بیان کیا ہے جس سے عالم کے لئے خالق وحدہٗ لاشریک لہٗ

کا وجود، اس کی وحدت، اس کا عالمِ کل، معلمِ کل اور مختارِ کل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ انکارِ ہستی خالق، شرک تخلیقی اور متعدد خود مختار حکام ہونے کی جڑ اکھڑ جاتی ہے۔
ہم اس کی تحریر کا خلاصہ مزید تشریح کے ساتھ لکھتے ہیں۔ موریسن کہتا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اگر اس کی رفتار گھٹ کر صرف سو میل فی گھنٹہ رہ جائے تو ہمارے دن اور ہماری راتیں دس گنا لمبی ہو جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۱۲۰ گھنٹہ کا طویل دن سورج کی تپش سے اکثر پودوں اور درختوں کو جلا ڈالے گا۔ سبزہ برائے نام بھی باقی نہیں رہے گا اور جانوروں کے بدن میں دوران خون تیز ہو جائے گا۔ اعضاء ڈھیلے پڑ کے مضمحل اور ضعیف، دماغوں میں غیر معمولی تھکاوٹ اور خرگی پیدا ہو جائے گی اس کے بعد آنے والی طویل رات ۱۲۰ گھنٹہ کی سخت سردی پالے سے بچے کھچے پودوں کو ختم کر ڈالے گی اور ایک ہی دن رات میں زمین چٹیل میدان بن جائے گی۔ زراعت تباہ، باغ اجاڑ اور جانوروں کی خوراک برباد ہو جائے گی۔ روئے زمین ہر جاندار کی غذا سے خالی ہو جائے گی۔ اگر کچھ غذائی اشیاء بچ بھی جائیں گی تو ناکافی۔ ایسی حالت میں کیا انسان اپنی زندگی قائم رکھنے کا سامان فراہم کر سکے گا۔ یہ مدنیت، یہ سماج یہ بھرے پرے بازار، ہفت منزلہ عمارتیں، سر بفلک کوٹھیاں، طرح طرح کے ریشمی سوتی اور اونی کپڑے، نو بہ نو ایجادات اور ضروریاتِ زندگی کس طرح مہیا ہو سکیں گی۔ مقامِ غور ہے کہ کیا زمین کی رفتار کی مخصوص مقدار محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ کیا اس کے پیچھے کسی ایک صانع کی قدرت، حکمت اور تدبیر کار فرما نہیں ہے۔ موجودہ رفتار سے کائناتِ ارضی کی زندگی کے اسباب فراہم ہونا اور رفتار زمین میں کمی بیشی نہ ہونے دینا تاکہ سطحِ زمین پر رہنے والے زندہ رہ سکیں۔ کیا یونہی بے سوچے سمجھے محض بے شعور مادہ کے زیر اثر اور صورتِ نوعیہ کے تقاضے کے زیر عمل ہو رہا ہے یا کسی خالق مختار علیم و حکیم کے ارادہ اور قدرت پر اس نظم و ترتیب کا مدار ہے۔

اور غور کرو سورج روشنی اور گرمی دے رہا ہے۔ اس کی روشنی اور گرمی نہ ہو تو پودے، پرندے، چوپائے اور انسان سبھی کے لئے زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ اس کی سطح کا درجۂ حرارت ۱۲ ہزار فارن ہیٹ ہے اور ہمارا کرۂ ارضی اس سے ٹھیک اتنے فاصلہ پر ہے۔ جہاں سورج کی ختم نہ ہونے والی آگ سے فقط اس قدر گرمی پہنچتی ہے جتنی کہ دنیا کی چیزوں کو زندہ رہنے کے لئے درکار ہے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر سورج کی گرمی کرۂ ارض سے کچھ فاصلہ پر ہی رہ جائے یا آدھی ہو جائے تو کائناتِ ارضی یخ بستہ ہو جائے اور سب جم کر ٹھنڈا ہو جائیں۔ اور اگر اس کی گرمی دوگنی ہو جائے تو ہم سب کو کباب سیخ کی طرح بھون کر رکھ دے اور سب سوختہ ہو جائیں۔ کیا سورج کا زمین سے مناسب فاصلہ پر ہونا اور اس کی گرمی کی مناسب مقدار زمین تک اور فاصلہ و مقدار میں کمی بیشی نہ ہونا محض اتفاقی ہے یا اندر اگنی اور دوسرے لاتعداد دیوتاؤں اور نوعی ارباب کے اتفاق آراء کا نتیجہ ہے یا ایک ہی حاکمِ مطلق خالق حکیم کے حکمِ تخلیقی اور امرِ تنظیمی کے زیر اثر ہے۔

اور غور کیجئے زمین کا محور اگر ۲۳ درجے کا جھکا ہوا نہ ہوتا تو موسموں کا تغیر و تبدل کیونکر ممکن تھا کیونکہ اس صورت میں سمندر سے اٹھنے والے بخارات سیدھے جنوب یا شمال کا رخ کرتے اور زمین کے اکثر حصے برف سے ڈھک جاتے۔ پس محورِ ارضی کا یہ مناسب مقدار کے ساتھ جھکاؤ مادہ کا تقاضا ہے یا زمین کی صورتِ نوعیہ کا اثر یا نبات و حیوان اور آب و ہوا کے نوعی ارباب کی کارگیری یا محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ عقلِ سلیم کے سامنے استغاثہ ہے۔ فریاد اُن دانشوروں کی بے دانشی کے خلاف ہے جو ان خارجی حقیقتوں پر بھی غور نہیں کرتے۔ یہ کوئی مجرد عقلی برہان نہیں جس میں وہم مداخلت کر سکے۔ اور فہم و وہم میں فرق کرنا دشوار ہو جائے یہ تو مشاہدۂ بصر اور معاینۂ بصیرت ہے جس سے معمولی جغرافیائی عالم بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اور غور کرو اگر چاند ہم سے کچھ اور قریب ہوتا تو جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ سمندروں کے پانی کا مد و جزر ہلاکت انگیز صورت اختیار کر لیتا۔ ۵۰ ہزار میل کے فاصلے سے چاند کی کشش اتنی پر زور ہوتی کہ سمندروں میں ہر روز دو مرتبہ جوار بھاٹے کی صورت میں طوفان آیا کرتے جس سے تمام بر اعظم روزانہ دو بار پانی میں غرق ہو جاتے اور پانی کی لہریں ہمالیہ کی آخری چوٹیوں کو بھی بہا لے جاتیں۔ کیا چاند کا زمین سے موجودہ فاصلہ محض اتفاقی ہے کیا زمین، کائناتِ زمین اور تمام جانداروں کی حفاظت اور غرقابی سے بچانے کے منصوبۂ علمی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ کیا چاند، دھرتی اور عناصرِ منفردہ و اجسامِ مرکبہ کے ارباب نوعیہ اور دیوتاؤں نے باہم اتحاد کر لیا ہے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اور سوچیئے زمین کی گولائی کہا جاتا ہے کہ ۲۴ ہزار میل ہے۔ اسی کے حساب سے زمین کا قطر قائم کرو۔ ہزاروں میل کا قطر ہوگا۔ اب سوچو اگر اس کی موٹائی تین گز بھی زیادہ ہوتی تو آکسیجن کا حصول ناممکن ہو جاتا اور آکسیجن (اجزاء نسیم) پر ہی تمام موجوداتِ ارضی کی زندگی موقوف

ہے اس لئے کسی کی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ لیکن اگر چند گز زمین کی موٹائی کم ہوتی اور بحر الکاہل اور اٹلانٹک اور دوسرے سمندر جو کہیں کہیں میلوں گہرے ہیں۔ چند گز اور گہرے ہو جاتے تو آکسیجن اور کاربن آکسائڈ سبھی پانی میں جذب ہو چکی ہوتیں اور سبزہ کا کہیں نشان بھی نہ ہوتا اور جانداروں کا نام بھی سطح زمین سے مٹ جاتا۔ اگر وہ کرۂ ہوائی جس میں ہم سانس لیتے ہیں چوڑائی میں کم ہوتا تو شہاب ثاقب جو روزانہ لاکھوں کی تعداد میں زمین کی طرف آئے ہوئے ہمیں نقصان پہنچا سکنے سے پہلے ہی راستہ میں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی دن میں سب بستیوں، باغوں، کھیتوں اور چرندوں پرندوں کو جلا کر خاکستر کر چکے ہوتے۔ کیا یہ سب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ سب چیزیں ٹھیک اس حالت میں ہیں کہ تمام کائنات انہی کے دشمن ہونے کے بجائے ہماری خادم ثابت ہو رہی ہیں۔ ان سب کا ٹھیک اندازہ کے مطابق ہونا محض حسنِ اتفاق ہی ہے یا ہوا پانی زمین اور سیاروں ستاروں نے اور نجمیات کی ارواح غیبیہ نے اور تمام دیوتاؤں نے اور سارے اربابِ انواع نے مل کر تبادلۂ خیالات و افکار کے بعد اتفاق کر لیا ہے کہ سب مل کر اس کارخانہ کو چلائیں گے۔ اور کوئی کسی کی مخالفت نہیں کرے گا۔ مخالفت سے گریز اور اتفاق کی طرف میلان تو دانا، بینا، ذی شعور، مآل اندیش، نتیجہ فہم اور واقف آغاز و انجام ہستی کا کام ہے۔ گونگا، بہرا، جاہل، نافہم، مادہ و طبیعت اور مآل و مبدء کو سمجھنے سے عاجز، محدود الاختیار، اربابِ نوع اور دیوتا اس ترتیب و نظم سے سنسار کی یہ گاڑی کیسے چلا سکتے ہیں۔ یہ کام تو کسی دانا، بینا، مختارِ کل، ہمہ گیر علم رکھنے والے قادرِ مطلق اور ناظم، واحد لاشریک کا ہو سکتا ہے جس نے خود کسی کی مدد کے بغیر اپنے علم و ارادہ سے ہر چیز کو پیدا کیا اور اسی کی قدرِ علمی کے زیرِ اثر سارا سنسار چل رہا ہے۔ اس عالم کا ہر کارندہ اور موکل اسی کا تابعِ فرمان ہے اور ہر چیز اسی کی تعلیم کے مطابق راہِ زندگی طے کر رہی ہے اور اس مشین کے تمام پرزے باہم تعاون کر رہے ہیں۔

اور غور کرو اور بتاؤ کہ زندگی کیا ہے۔ انسانی ذہن و دماغ کی بلند ترین پرواز بھی اس حقیقت کو نہیں پا سکی کہ زندگی آخر چیز کیا ہے۔ یقیناً یہ مادی نہیں کیونکہ مادی اشیاء کے متعلق ارسطو سے لے کر اس زمانے تک تمام دانشوروں کا اتفاق ہے کہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہوں مگر ان کا وزن بھی ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ حجم بھی مگر زندگی ایسی چیز نہیں جس کو تولا یا ناپا جا سکے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی قوت رکھتی ہے۔ چٹان میں اگنے والے کسی ننھے سے پودے کی نازک جڑ بھی اپنے اندر اس قدر قوت رکھتی ہے کہ چٹان کے سنگین سینے کو شق کر ڈالے۔ زندگی فاتحِ عالم قوت کی مالک ہے۔ ہوا، پانی، خشکی سب ہی اس کے قبضے میں آ گئے ہیں۔ عناصر اس کے حلقہ بگوش ہیں اور یہ جس طرح چاہتی ہے ان کو توڑ پھوڑ کر یا نئے انداز سے جوڑ کر اپنے کام میں لاتی ہے۔ ستارے اور سیارے سب ہی زندگی کی طاقت سے حرکت میں ہیں۔ زمین اسی کے بل بوتے پر گھوم رہی ہے۔ زندگی نہ ہو تو نہ کسی چیز میں تغیر ہوتا نہ نمو نہ شعور و احساس نہ علم و تعقل نہ کسی حقیر ترین مادی ذرہ کی کوئی ہستی نہ کسی قسم کی شعاع نہ برق نہ حرارت۔ ماریسن کہتا ہے کہ:۔

زندگی کی مثال ایک سنگ تراش کی سی ہے جو پتھروں کے بے جان مجسمے نہیں بلکہ زندہ چیزیں بناتا ہے۔ اس کی مثال ایک مصور کی سی ہے جو سبزہ کی ہر پتی اور پھول کی ہر پنکھڑی کی صورت گری اور رنگ آمیزی کرتا ہے جو ہر ذرہ اور قطرہ کی مشین شکل بناتا ہے اور ہر جرثومہ کو جمیل خطوط سے نوازتا ہے۔ اس کی مثال اس مطربہ کی سی ہے جس کے استادانہ کمال نے ہر پرندہ کی زبان کو نغمہ بار بنا دیا اور کیڑوں بلکہ ریت کے ذروں اور پودوں کی پتیوں کو باہمی اظہارِ خیال کے لئے موسیقی سکھا دی۔ اس کی مثال ایک ماہر کیمیا دان کی سی ہے جو پھلوں اور مسالوں کو لذت اور خوشبو سے بھرتا ہے۔ پانی اور کاربونک ایسڈ کو باہم ملا کر کبھی چینی اور کبھی لکڑی تیار کرتا ہے اور اس کے ذریعہ آکسیجن کو الگ کرتا ہے کہ زندہ اشیاء اس میں سانس لے سکیں۔

چھوٹے سے چھوٹے زندہ جسم کو دیکھو ننھا سا ذرۂ حیات گھلے ہوئے گوند کے چھوٹے سے قطرہ کی طرح لیلپا اور شفاف ہوتا ہے مگر حرکت کر سکتا ہے۔ توانائی اسے سورج کی روشنی سے حاصل ہوتی ہے۔ زندگی اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور شاید یہی وہ زندہ چیز ہے جو سب سے پہلے عالمِ وجود میں آئی۔ نباتات اور حیوانات اسی سے پیدا ہوئے۔ اب تک سائنس کی شہادت یہی ہے ممکن ہے آئندہ یہ بھی انکشاف ہو جائے کہ جمادات کی پیدائش بھی اسی کی رہینِ منت ہے۔ ہم اسی پروٹوپلازم (Pruotohlasme) کو دیکھو غور کرو اور بتاؤ کہ کیا مادی عناصر اس کی تخلیق پر قادر ہو سکتے ہیں۔ کیا گرمی میں جلتی ہوئی چٹانیں اور بے نمک سمندروں کا پانی اس کو عدم سے وجود میں لا سکتے تھے۔ کیا کوئی ریزہ کوئی برق اور کسی قسم

کی حرارت اور کسی سیارہ یا ستارہ کی شعاع کو اس کی ایجاد پر قدرت ہو سکتی تھی۔ پھر یہ کس کی کارسازی اور صنعت ہے۔ افلاطون کی نظر ارباب انواع تک قاصر رہی۔ دیمقراطیس کی شعاع دانش بے جان اور بے شعور مادہ سے باہر نہ نکل سکی۔ ارسطو صورت نوعیہ کے جال میں گرفتار رہا۔ بیچارے ہندو دیوتاؤں کے گورکھ دھندے میں پھنسے رہے۔ اور مجوسی نوری ریزی کی عکس ریزی کے گرویدہ ہو گئے۔ گوتم نے حیرانی اور تردد کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالا۔ کوئی بھی نہیں سمجھا کہ یہ وحدہ لاشریک قادر مطلق عالم کل کی اعجوبہ کاری ہے۔ زندگی اس کا امر ہی ہے جو عالم خلق پر حاوی ہے سچ ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ زندگی اسی کی ایک شان کا نام ہے۔ کل یوم ھو فی شان۔

اور غور کرو

اگر اللہ کی ہستی اس کی تکوینی ربوبیت اور فطری تعلیم کا مشاہدہ کرنا ہو تو دیکھ لو کہ جانوروں کا علم احساسی اس خالق اکرم کے وجود اور ربوبیت اور تعلیم فطری پر کس طرح گواہی دے رہا ہے جس نے بے یار و مددگار مخلوق کو احساس و شعور کے ذریعہ اپنی تعلیم فطری کے زیر اثر گرد و پیش کے حالات سمجھنے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈالنے کے قابل بنایا اور سارے جہان کے دوسرے پرندوں کے ساتھ مل کر اس ستسار کی مشین چلانے کی توفیق بخشی۔

سامن مچھلی کو دیکھو جسامت میں چھوٹی مگر شعور میں تیز۔ برسوں دور دراز سمندروں میں رہنے کے بعد جب اسی ندی کی طرف لوٹتی ہے جس کے کسی پایاب حصہ میں اس نے پہلی بار اپنی آنکھ کھولی تو وہ اپنے وطن کی راہ کبھی نہیں بھولتی۔ سمندر سے دریا میں داخل ہوتی ہے تو اسی کنارے کے ساتھ ساتھ تیرتی ہے جس میں وہ ندی آکر گرتی ہے جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ دیکھو وہ کون طاقت ہے جو ان وسعتوں میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ آپ ذرا اس کا رخ کسی دوسری ندی کی طرف پھیر دیجیئے پھر دیکھئے کہ وہ اس بے راہ روی پر فوراً مطلع ہو جاتی ہے اور لپرا نہ وار لگا کر دریا کی طرف واپس آنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایل مچھلی کی زندگی کا احوال سامن سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہ مچھلی جوان ہونے کے بعد ندیوں اور نالوں سے نکل کر ہزاروں میل دور وسطی امریکہ کے قریب جزائر برمودا کے نواح میں پانی کی انتہا گہرائیوں کی طرف رخ کرتی ہے تاکہ وہاں اپنی نسل اور زندگی کے باقی ایام بسر کر سکے پھر وہاں سے اس کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان جوہڑوں اور نالوں کی طرف چل پڑتے ہیں جہاں سے ان کی مائیں آئی تھیں۔ سامن کی واپسی ضرور تعجب خیز ہے مگر ایل کے بچوں کا یہ سفر تو عجیب تحیر آگیں ہے۔ بتاؤ سامن مچھلی کا اتنا تیز شعور اور ایل کے بچوں کا بغیر دیکھے راستوں پر صحیح طور سے گامزن ہونا کہاں سے آیا کس نے ان کو راستہ بتایا اور کس نے اطلاع دی کہ ان کا اصل مسکن ہزاروں میل دور فلاں جوہڑ اور نالاب ہے اور وہاں تک پہنچنے کا یہ راستہ ہے۔ یہی اللہ ہی تو ہے جس نے ہر چیز کو ٹھیک اندازہ کے مطابق بنایا۔ اس کے لئے زندہ رہنے کا ضابطہ مقرر کیا اور ارتقاء حیات کے راستہ پر چلنا سکھایا۔

اور دیکھو

بھڑ جھینگر سے لڑتی ہے۔ جھینگر مغلوب ہو جاتا ہے بھڑ فتح یاب ہوتی ہے جھینگر کو کھینچ کر لے جاتی ہے۔ زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر جھینگر کو وہاں رکھتی ہے اور جھینگر کے ایسے مقام پر ڈنک مارتی ہے کہ وہ بے ہوش ہو جائے مرنے نہ پائے پھر بیہوش جھینگر پر اپنے انڈے پھیلاتی ہے کہ بچے انڈوں سے نکل کر بے ہوش جھینگر کے گوشت کو نوچ کر کھائیں اور پرورش پائیں۔ مردہ جھینگر کا گوشت بچوں کے لئے مہلک ہوتا ہے۔ اس لئے بچے انڈوں سے نکلتے ہی جھینگر کا گوشت ایسے مقامات سے نوچ کر کھاتے ہیں کہ ان کی پرورش ہو جائے اور جھینگر مرنے نہ پائے۔ بچوں کی ماں بچوں کے لئے رزق فراہم کر کے چلی جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آتی۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں اور ماں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ بتاؤ ایسا انتظام کون کرتا ہے۔ کون بھڑ اور بھڑ کے بچوں کو ایسی تعلیم دیتا ہے۔ کیا وہی اللہ خالق کائنات رب کائنات اور معلم کائنات نہیں ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور دیوتا، رب النوع اور بے شعور طبیعت ایسی پر حکمت نوازشیں کرتی ہے یا یہ بن اتفاق ہے۔

ذرا اور صانع عالم کی پر حکمت تخلیق و ربوبیت کا معائنہ کرو

زندہ اشیاء نباتات ہوں یا حیوان سب میں یہ قانون جاری اور ساری ہے کہ ماں باپ کے خصائل عادات اشکال اور دوسری خصوصیات بیشتر اولاد کو ورثہ میں ملتی ہیں۔ کیوں ملتی ہیں۔ منکر خدا سائنسدانوں کا دماغ بھی ان گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا تھا جو آج ہستی باری تعالیٰ کا اقرار کرنے والوں کی نظر کے سامنے منارہ راہ کی حیثیت میں آگئی ہیں۔

ہستی خدا کو ظاہر کرنے والا اور خلاق مطلق کے بے پایاں علم و قدرت کو بتانے والا سفید منارہ آج کے سائنس دانوں کے سامنے جین (GENE)

موجود ہے جین کہا ہے۔ ایک بہت ہی ننھا ذرہ بلکہ ذرہ سے بھی بہت چھوٹا جس کو خوردبین سے بھی دیکھنا ممکن نہیں۔ جسامت اتنی کم کہ اگر تمام جاندار مخلوق میں سے نکال کر اس کو جمع کر لیا جائے تو ایک انگوٹھی کے نگینے کے نیچے سما جائے۔ لیکن یہ جین ہی کی کارفرمائی ہے کہ بچہ کو ماں باپ کی طرف سے شکل، رنگ، عادت، خصلت اور جو کچھ ورثہ میں ملتا ہے وہ انہی ذروں کے ذریعہ سے ملتا ہے۔

نباتات ہوں یا حیوانات کسی زندہ جسم کا کوئی چھوٹا حصہ اور کسی عضو کا کوئی حقیر ترین جزء ان ذرات سے ان کے ملنے کا ردوسرے ذرات سے جن کو کروموسوم (CHROMOSOME) کہا جاتا ہے خالی نہیں اور انہی کا فعل و عمل اس شئی کا ذمہ دار ہے جس کو فزیالوجی یعنی علم وظائف الاعضاء میں توارث کہتے ہیں۔ یہ ان گنت ذرے اتنی چھوٹی جسامت کے ساتھ ہر خلیے کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور ماں باپ سے منتقل ہونے والے جسمانی، دماغی اور نفسیاتی و جذباتی ورثہ کا مالک اولاد کو بنا رہے ہیں۔ جین وہ حقیر ذرہ ہے کہ اس کے مقابل ریت کا ذرہ ایک دیو نظر آتا ہے۔ سلسلۂ ارتقاء میں اس حیثیت کا مالک ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو ارتقاء کی ہر کڑی دوسری سے جدا ہو جائے۔ ڈارون نے سلسلۂ ارتقاء کو دیکھا، مگر اس کی نظر میں وہ گہرائی نہ تھی جو صنعت الٰہی کے اس پر حکمت خزانہ کو دیکھ سکتی، اس لئے ہستی باری تعالیٰ سے منکر ہو گیا۔ آج کا سائنس داں اس چوٹی پر پہنچ چکا ہے جس کے سامنے ڈارون اور اس کی تھیوری کے شارح طفلِ مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ جین کے فعل کو حیرت کے دریا میں غرق ہیں اور بے اختیار پکار اٹھے ہیں۔ سبحان اللّٰہ الذی خلق کل شئی وقدرہ وہدٰی۔ ربک الذی علم بالقلم۔ خلقنا کل شئی بقدر۔

اطباء یونان اور طب یونان کی شارح اطباء اسلام کہتے تھے کہ ہر زندہ چیز کے تخم میں ماں باپ کے ہر حصۂ جسم اور ہر جزء بدن کی رطوبت بہت ہی خلاصہ ہو کر کھنچ کر آتی ہے اور ماں باپ کے ہر جزء عضوی سے کھنچ کر آنے والے خلاصۂ رطوبت کا نام تخم اور نطفہ ہے۔ اس تخم اور نطفہ میں بحیثیت مجموعی وہ تمام یا بیشتر خواص اشکال اور اطوار اور عادات ہوتی ہیں جو مورث کے جسم اور اعضاء جسم میں ہوتی ہیں پھر اس خلاصۂ رطوبت کے ہر ننھے سے ذرہ سے وہی حصہ عضو بنتا ہے جس سے وہ کھنچ کر آتا ہے مثلاً یوں سمجھو کہ آنکھ کے جس پردے کے جس حقیر ترین حصہ سے جو ذرۂ رطوبت کھنچ کر نطفہ کے قطرہ یا تخم میں شامل ہوا ہے۔ اس سے آنکھ کے اسی پردہ کا وہی حصہ بنتا ہے۔ اسی طرح کان ناک کھال بال وغیرہ میں بھی یہی دقت صنعت اور پر حکمت قدرت کارفرما ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ خلاصۂ رطوبت کا کھنچ کر آیا ہوا ہر حقیر ترین ذرہ اپنی تمام کیفیات، خواص، شکل اور عادات و اطوار کو لے کر آتا ہے۔ اسی لئے تو بیشتر اولاد میں ماں باپ کی جسمانی اور اطواری خصوصیات ہوتی ہیں۔

مقام انصاف ہے فیصلہ کرو کہ بے جان اور بے شعور مادہ یا طبیعت یا کوئی محدود الاختیار عاجز دیوتا یا ربّ النوع ایسا کر سکتا ہے۔ یہ ضابطۂ فطرت تو عام ہے۔ قانون کلی ہے جو ایک ہی نوع کے افراد کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام نباتات اور حیوانات کی کل انواع اسی ضابطہ میں مقید ہیں اور ایسی بے بس ہیں کہ عام قانونِ تخلیق کے خلاف حرکت کرنے کی مجال نہیں۔ اسی قانونِ تولید میں کہیں تفاوت نہیں۔ بیرونی مظاہر مختلف ہیں۔ ہر نوع کے ہر فرد کی شکل، رنگ، مقدار، طور طریق، خاصیت، عادت میں ہزار اختلاف صحیح، مگر سب ہی کے اندر ایک اٹل ضابطہ جاری اور ساری ہے۔ کیا یہ اللّٰہ کے سوا کسی اور کی کاریگری ہو سکتی ہے۔ اسی کی چشمِ علم ہر چیز کے ہر حصہ کو دیکھ رہی ہے۔ اسی کا دماغ حکمت ہر شئی کے ہر جزء اور ہر کیفیت و خاصیت کا اندازہ کر رہا ہے اور اسی کا دستِ قدرت ہر چیز اور اس کی ہر خاصیت کو تیار رہا ہے اور وہی ہر چیز کو لقاء شخصی و نوعی کے راستہ پر کھینچ کر لئے جا رہا ہے۔ پس کسی دیوتا، مؤکل، ملک، رب النوع، طبیعت، مادہ اور ارواح علوی کا نام نہ لو کسی کی طرف اس مخلوق کی تخلیق اس مصنوع کی صنعت، اس مربوب کی ربوبیت اور اس متعلم کی تعلیم کی حقیقی نسبت نہ کرو۔ ہر ایک کا ذکر چھوڑ دو۔ ہر طرف سے منہ موڑ لو اور ایک اللّٰہ ہی کا نام جپو جو تمہارا رب ہے جس نے ہر چیز کو بنایا سنوارا بڑھایا اٹھایا سکھایا پڑھایا اور درجۂ کمال تک پہنچایا۔ کوئی کریم نہیں کسی کا اپنا کرم نہیں۔ کسی کی از خود عنایت نہیں۔ کسی کا استحقاق نہیں کوئی مستحق نہیں۔ سارا کرم اسی اللّٰہ کا ہے جو رب ہے، خالق ہے، معلم کائنات ہے۔ وہی اکرم ہے، مجموعۂ کرم ہے۔

ہم نے مذکورہ بالا عبارت میں مایسن کی تحریر کا اقتباس حسن زمانی عالمگیر مدیرۂ عکس نو کے ترجمہ پر اعتماد کرتے ہوئے کیا ہے۔ کہیں ترجمہ سے اختلاف بھی کیا ہے اور تشریح و توضیح خود کی ہے۔ بیشتر توضیحات دانشورانِ عالم کی تصریحات کی روشنی میں کی ہیں۔ تاکہ اہل علم کو اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔

مزید غور کرنا چاہتے ہو تو سوچو کہ :۔ صناع قدرت کے پُرحکمت دماغ نے ہزار، دو ہزار رنگوں کے اختلاف کے باوجود ان کے آپس ہر

کیسی یگانگت اور تعاون قائم رکھا ہے کہ اگر کسی رنگ کو صفحۂ کائنات سے غائب کر دیا جائے تو نہ فقط یہ کہ وہ خود غائب ہو جائے گا بلکہ ساری کائنات کو پردۂ عدم میں لے جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق، تربیت اور تنظیم صرف نظام الوان کے بل بوتہ پر قائم ہے اور سوچو اور کسی ماہر صورتگر سے پوچھو کہ اس کائنات کے اجزاء کی ان گنت شکلیں اور صورتیں ہونے کے باوجود تمام اشکال و تصاویر میں کیسی یگانگت اور باہمی امداد کا قانون جاری ہے۔ ہر شکل اس عالم کے لئے کتنی ضروری اور بجائے خود کتنی اہم ہے اور تمام شکلوں کا باہمی تناسب کتنا گہرا ہے اور آپس میں سب کی کتنی وابستگی ہے کہ اگر کسی شکل کو معدوم کر دیا جائے اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے یا نوعی اشکال میں تغیر کر دیا جائے تو نہ فقط یہ کہ اس جگہ خلا پیدا ہو جائے گا بلکہ اشکال عالم کی یہ زنجیر کھل جائے گی۔ اور ہر کڑی دوسری کڑی سے جدا ہو جائے گی۔ اور سارا نظام تباہ ہو جائے گا اور تمام جہان ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے نظام اشکال پر بقاء کائنات ہے اور یہی انتظام بس مدار ربوبیت ہے اور سوچو اور کسی ماہر ریاضی داں سے پوچھو کہ اس سنسار کی تمام چیزوں میں کیسا توازن حسابی ہے۔ چیزیں بے شمار ہیں مگر تناسب شمار سے خالی نہیں ہیں۔ ایک حسابی توازن کی رسی سب کو جکڑے ہوئے ہے۔ ہیں لاتعداد ذرات و جراثیم، بے شمار قطروں، پتوں اور پھولوں کے اجزاء ترکیبیہ، ان گنت خلیات اور برقیات اور شعاعیں باہم توازن حسابی رکھتی ہیں۔ ممکن نہیں کہ کسی اکائی کو معدوم کر دیا جائے اور پھر کائنات کو باقی رکھا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے حساب اور شمار پر ہی اس کی بقاء ہستی کا مدار ہے۔ اس کائنات کی ہر اینٹ ایسی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا یا کم کر دیا جائے تو جہانِ وجود کی عمارت گر جائے ــــــ اور سوچو اور کسی نغمہ بار موسیقی کے ماہر سے پوچھو کہ اس کائنات کی کیفیت صوتیہ میں کیسا توازن ہے۔ آبشار کے پتھروں پر گرنے کی سریلی آوازیں، قہار دریاؤں کے غراٹے، بیابانوں کے سناٹے، سمندر کی لہروں کی گونج، بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ، پرندوں کے چہچہے، پتوں کی سرسراہٹ، شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ۔ غرض تمام نباتاتی اور حیوانی ذرات کی نازک ترین ناقابل سماعت مترنم آوازیں اور شعلہ بار بجارات کے دلوں کو دہلا دینے والے دھماکے باہم کتنے ہم آہنگ اور متوازن ہیں اور علویات و سفلیات کی آوازوں میں کس قدر تناسب تناسق ترتیب اور تنظیم ہے۔ گویا ایک مسلسل زنجیر ہے جو گردش کر رہی ہے۔ اگر ایک حلقہ کو وسط میں سے نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ بیچ میں سے خلا ہو جائے گا بلکہ ہر پچھلا حلقہ اگلی کڑی سے ٹکرا جائے گا اور کائنات کا نظام صوتی بگڑ جائے گا۔ جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اجزائے عالم کے ٹکراؤ سے ایک ہولناک آواز پیدا ہو گی اور دنیائے وجود درہم برہم ہو جائے گی۔

اور غور کرو کہ اس سارے جہان میں کیسا تقابل اضافی اور تناسب نسبتی ہے۔ بلندی و پستی، خوبصورتی و بدصورتی، جودت و رذالت، سفیدی و سیاہی، قرابت و اجنبیت، والدیت و مولودیت، نر و مادہ، نور و ظلمت، رات و دن، خیر و شر، غرض ساری کائنات انہی اضافیات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر یہ نسبتی تناسب اور اضافی تقابل نہ ہو تو کوئی چیز موجود نہ رہ سکے گی بلکہ عدم سے وجود میں ہی نہ آ سکے گی۔ تمام مقادیر، الوان، روائح، اشکال، احوال، کیفیات، تعلقات اضافی ہی تو ہیں۔ حرکت سکون، مکان کا قریب و بعید وقت کی قلت و کثرت غرض تغیر اضافی سے کون چیز خارج ہے۔ اول آخر تقدم تاخر آگے پیچھے چھوٹائی اور بڑائی، علم اور جہالت، چلنا پن اور ٹھہراؤ پن، تری اور خشکی، تری اور خشکی سردی اور گرمی، سختی اور نرمی، جمود اور سیلان، قیام و میلان۔ خلاصہ یہ کہ بنائے کائنات اسی اضافی تقابل پر ہے۔ اگر کسی چیز کے مقابل کے اضافی تصور اور وجود کو معدوم مان لیا جائے تو کائنات کی ہستی ہی معدوم ہو جائے۔ اگر شر کا وجود خیر سے خالی ہے تو خیر کے وجود کا تعین محال ہے۔ اگر ظلمت میں نور کی حقیقت کو روشن کرنے والا نور نہیں تو نور کی حقیقت ظلمت کو کیسے واضح کر سکتی ہے اور خود ہی اپنا ظہور کیسے کر سکتی ہے۔ زردشت کو نور میں خیر دکھائی دی اور ظلمت کی خیر کا اس کو علم نہ ہو سکا۔ کیا رات کی تاریکی دن کی روشنی کو واضح کرنے والی روشنی اپنے اندر نہیں رکھتی۔ یہ تناسب یہ اضافت اور یہ تقابل ساری کائنات میں کس نے پیدا کیا۔ کیا سارے سنسار کا یہ اضافی توازن حسن اتفاق کا نتیجہ ہے یا متعدد ارباب کی کارفرمائی۔ سارے جہان کا اضافی توازن ایک ہے۔ جو پورے نظام کو تھامے ہوئے ہے اور ایک حی و قیوم خدا کی بیدار آنکھ اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ مجال نہیں کہ وحدتِ نظام میں فرق آ جائے۔ سچ ہے خلق من کل شئی زوجین۔

ذرا اور سوچو کہ موجوداتِ عالم کا قافلہ معدومات کے دوش بدوش صحرائے امکان میں بڑھا جا رہا ہے۔ حیات و موت کا کاروان سفر میں ہے ہر آن ہر چیز اور ہر کیفیت کا قدم آگے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ پچھلا قدم اٹھنے کو فنا کر رہا ہے اور خود اس کی جگہ لے رہا ہے اور اگلا

قدم اپنی جگہ چھوڑ کر اپنے سے اگلے قدم کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ دے تاکہ یہ اُس کا قائم مقام بن سکے ۔ یہ نیستی اور ہستی کی کشاکش ہے ۔ دونوں باہم ہم آغوش ہیں ، دوش بدوش ہیں ۔ واقع میں نہ کوئی عدم پائیدار ہے نہ وجود لازوال ۔ طلبِ بقاء زندگی کی کوشش میں مصروف ہے ۔ فلسفی وجود غیر فانی کے حصول کا متمنی ہے ۔ ہر چیز تنازع للبقاء کی گردش میں مبتلا ہے ۔ ان کو کون بتلائے کہ عدم ہی تو وجود ہے اور موت ہی تو زندگی ہے ۔ اگر کاروانِ زندگی کہیں ٹھہر جائے تو ٹھہرنے والوں سے کیا آنے والوں کا تصادم نہیں ہو جائے گا ۔ کیا اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں دونوں آغوش موت میں نہ سو جائیں گے ۔ نہ باپ رہے گا نہ بیٹا نہ ماں نہ بیٹی نہ اصل نہ نسل نہ مہلک نہ ہالک نہ کوئی شکل دنیا میں قائم رہے گی نہ رنگ نہ مقدار نہ ترتیب نہ ذراتِ مادیہ کا اجتماع نہ برقیات کا ائتلاف نہ خلیات کا منظم اختلاط نہ شعاعوں کا تناسق نہ آسمان نہ زمین نہ علویات نہ سفلیات ۔ سوچو کہ زندگی اور موت کا یہ قافلہ کس کے منصوبے کے زیرِ اثر اور کس کے پلاننگ کے زیرِ عمل چل رہا ہے ۔ کون سا ذہنِ رسا اور علم محیط رکھنے والا ہے جس نے ہر چیز کو آگے قدم بڑھنا اور آگے جانے والے کی جگہ لینا سکھایا اور آگے جانے والے کو پیچھے آنے والے کے لئے جگہ خالی کرنا بتایا ۔ زندگی کے یہ مسافر کس کے حکم سے ہر لمحہ حرکت میں مشغول ہیں اور کیوں کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتا ۔ ایک علام دماغ ہے جس کے زیرِ نگرانی سب ترتیب کے ساتھ چل رہے ہیں ۔ ایک فعال ہاتھ ہے جس کے ہاتھ میں زنجیرِ حیات ہے ۔ وہی خلاق ہے ۔ پلاننگ کے تحت ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی رب ہے ۔ ہر شے کو آگے بڑھانے والا اور وہی معلم ہے ہر چیز کو کاروانِ ہستی کے ساتھ گامزنی اور حرکتِ حیات سکھانے والا ۔ کیا بننا بگڑنا ، گرنا ابھرنا ، معدوم اور موجود ہونا اور ہر دم آگے کو حرکت کرنا بغیر فکر و علم کے ہے ۔ کیا یہ بے علم بے حس طبیعت کی کار فرمائی ہے یا فعلی وجود نہ رکھنے والے مادے کا تقاضا یا حسنِ اتفاق ۔ سبحان اللہ عما یفترون ۔

انسان کی مخصوص تخلیق اور تربیت تکوینی تعلیم

سورۂ اقرء میں دو بار لفظ اقرء آیا ہے ۔ اس کی تشریح سطور بالا میں کر دی گئی ۔ دو بار خلق کا لفظ آیا ہے ۔ اسی طرح دو بار لفظ علّم ۔ اول جگہ مفعول مذکور نہیں اور عربی بلاغت کا قاعدہ یہی ہے کہ اگر مفعول عام ہو تو اس کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس کو ذکر کرنا بلاغت کے خلاف ہے ۔ جیسے اَبْکِیْ (میں روتا ہوں) کے بعد ماءً (پانی) ذکر کرنا خلافِ بلاغت ہے ۔ ہاں اگر مفعول میں کوئی ندرت اور خصوصیت ہو تو اس کو ذکر کرنا لازم ہوتا ہے ۔ جیسے اگر خون کے آنسو دل سے رونے کا اظہار کرنا ہو تو اَبْکِیْ دَمًا کہنا ضروری ہے ۔ پس اگر خلق و تعلیم کے مفعول کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ ہر چیز کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور فطری تعلیم دی ہے ۔ ہاں انسان اپنے اندر جسمانی روحانی احساسی علمی اور جبلی گوناگوں ندرتیں رکھتا ہے ، اس لئے خصوصیت کے ساتھ دوسرے خلق اور علّم کے بعد الانسان کا ذکر کیا ۔

عمومی تخلیق ، تعلیم اور تربیت کے بیان کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ کچھ انسان کی تکوینی خصوصیات کا تذکرہ کر دیں تاکہ الانسان کے ساتھ خاص طور پر خلق اور علّم کو ذکر کرنے کی وجہ سمجھ میں آجائے ۔ احسن الخالقین اور فی احسن تقویم کے ذیل میں ہم انسان کی مخصوص جسمانی تخلیق کے متعلق مفصل بحث کر چکے ہیں ، اس لئے یہاں صرف ضروری بیان پر ہی اکتفا کیا جائے گا ۔

کائنات کے ہر ذرہ میں حس ہے ۔ شعور ہے علم ہے ۔ اپنی حدود کے اندر ادراک ہے ۔ ریگستان کے غیر متناہی ذرات ، سمندر کے بے شمار قطرات ، درختوں کی ان گنت پتیاں ، پھولوں کی لامحدود پنکھڑیاں ، ہر نامی و جامد جسم کے غیر محدود اجزاءِ ترکیبیہ ، تمام خلیات ، برقیات اور سیال و لامع کائنات اللہ کی تسبیح اپنی نوعی زبان سے پڑھ رہی ہے ، ربوبیت اور خلاقیت کا اقرار کر رہی ہے ۔ تمام موجودات جوق در جوق اور گروہ در گروہ نوعِ انسانی کے افراد کی طرح ایک امت ہے ۔ اپنے نوعی تقاضے سے واقف ، اپنے شخصی بقاء کے لئے کوشاں اور نظمِ عالم کو قائم رکھنے والا متحرک پرزہ ۔

انسان بھی عالمی مشین کا ایک متحرک پرزہ ہے ۔ قانونِ تکوینی کا مسخر نظامِ کائناتی کا پابند ، لیکن یہ صورت میں ساری کائنات کے حسن کا مرقع ہے ۔ اقوامِ جسمانی میں تمام اجسام جمادیہ ، نباتیہ ، حیوانیہ کا زبدہ اور خلاصہ ۔ اس بحث کو ہم طول دینا اس جگہ نہیں چاہتے ۔ اس مقام پر قابلِ غور انسان کا صرف نظامِ ادراکی و علمی ہے اور نظام بھی جو صرف تکوینی اور تربیتی ہے ۔ کیونکہ اللہ کی ربوبیتِ انسانیہ اور تخلیقِ انسانی بھی دوسری مخلوق کی تخلیق و تربیت کی طرح ہے جس طرح کسی ذی حیات کو اپنی تخلیق اور انتظامِ تخلیق میں دخل نہیں ۔ اسی طرح انسان بھی نہ اپنی مرضی سے آیا نہ اپنے ارادہ سے بنا بلکہ جس طرح اس کی

تمام جسمانی قوتیں اور مبادیٔ اعمال اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کی تمام علمی اور ادراکی طاقتیں بھی محض تکوین خداوندی سے وابستہ ہیں اور اللہ کی قدرت وارادہ کی مظہر اتم۔

بیشک یہ صحیح ہے کہ حیوانات میں شعور اور علم ہے، لیکن انسان کو جو ادراکی اور وجدانی قوتیں عطا کی گئی ہیں وہ ندرت، وسعت، بلندی، ہمہ گیری کے لحاظ سے ساری کائنات سے برتر ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر ذرۂ کائنات اپنا ایک مقام اور خصوصیت رکھتا ہے۔ اپنے نوعی اور شخصی تقاضوں کو پورا بھی کرتا ہے۔ مکان اور زمان کی تاثیر سے متاثر بھی ہے۔ ہر جاندار غذائی اور صنفی تقاضوں کو جانتا ہی ہے اس کو جماعتی شعور بھی ہے۔ اس کی ایک تنظیم بھی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کا احساس وادراک اتنا پست اور محدود ہے کہ سائنس دانوں کے قول کے بموجب وہ دس تک گنتی کی قابلیت بھی نہیں رکھتا بلکہ دس کے عدد کا تصور اور مطلب بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ ذرات جمادیہ، نباتات اور حیوانات کا علم ایک محدود دائرے کے اندر بند ہے جس سے باہر نکلنے کا ان کو تصور ہی نہیں ہوتا اور اگر باہر قدم رکھنے کی کوشش کرنا فرض کر لیں تو جہالت کا اندھیرا ان پر چھا جاتا ہے مگر انسان اور اس کی علمی طاقتیں لامحدود ہیں۔ اس کے بیرونی آلات، حس، اندرونی مشاعر، استنباط کرنے والی دانش اور فیضان کو قبول کرنے والا قلب کامل اور مکمل ہے۔ جزئیات کی جستجو اور ان گنت اشخاص کو استقرار کرنے کی صلاحیت اس میں اتھاہ ہے۔ تمثیل سے ہر جزئی کی حالت کو جاننے کی قابلیت بے پایاں ہے۔ علامات اور لوازم سے استدلال۔ جزئیات سے حکم عام کا استخراج۔ چند ایک جیسی چیزوں کے درمیان امر مشترک، تمیز کی شناخت، اشیاء کے خواص و ماہیات کے فرق کی پہچان۔ غرض ساری کائنات مادیہ میں احساسی اور عقلی تصرف اور علمی توڑ جوڑ اور بناؤ بگاڑ اس کی خصوصیت ہے۔ اس کے دماغ میں نہ فقط حس مشترک کا عمل کامل ہے بلکہ اس کے تحفظ اور تعقل کی ہمہ گیری بھی بے نظیر ہے اور اس سے بھی آگے اس کا خصوصی تعقل بھی محیط کل ہے۔ حیوان اور انسان کی ذہنی قوتوں کا فرق سطحی نظر سے ایک بنسری اور قوالی کے پورے سازوسامان پر قیاس کر لیجے۔ بنسری کی آواز بہت دلکش ہے لیکن اس میں سے صرف ایک خاص قسم کے سُر نکل سکتے ہیں۔ اس کے برعکس قوالی کا پورا سازوسامان ہر قسم کی تانیں بلند کر سکتا ہے۔ موسیقی سے واقفیت رکھنے والے کے لئے ان تمام آلات کی مدد سے بزم میں روح انبساط پھونکنے والا نغمہ، رزم میں جذبات آفریں رجز اور رنج والم کی حالت میں غم انگیز، رقت آگیں نالہ بلند کرنا مشکل نہیں۔ ہرے درختوں میں آگ لگا دینا، خود جلنا اور ماحول کو سوختہ بنا دینا۔ کھلی دھوپ میں ہوائی رطوبات کو جمع کر کے قطرات آب برسا دینا۔ شکار ہونے والے اور شکار کرنے والے پرندوں اور درندوں کو مسحور کر کے اس طرح ایک جگہ جمع کر دینا کہ نہ کسی کو اپنے شکار ہو جانے کا اندیشہ رہے نہ شکار کرنے کا احساس وارادہ۔ یہ سب کام ماہر موسیقار اپنے آلات موسیقی اور حلق کے اوتار الصوت کے بل بوتے پر کر سکتا ہے۔ انسان کے پاس حس وشعور اور تخیل وفہم کا وہ مکمل ذخیرہ ہے اور اسکے اندر قوت استدلالی ہے جس سے کام لے کر وہ علم کے بے کنار اتھاہ سمندروں کو اپنے دماغ میں سما سکتا ہے اور ہزاروں زبانوں کے کروڑوں الفاظ کی تدوین کر سکتا ہے اور سب کو اپنے خیالات کے اظہار کا آلہ بنا سکتا ہے۔ جمادی، نباتی اور حیوانی ادویہ دریافت کر سکتا ہے اور ان کی تحلیل و ترکیب اپنی مرضی کے مطابق کر سکتا ہے۔ سائنٹیفک تحقیقات کے لئے چاند تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کی نظر تمام شعاعوں کے پار جا سکتی ہے۔ اس کی نگاہ کی کوئی حد نہیں کہ آگے بڑھنے سے روک دے۔ اس کی بصیرت کا کوئی کنارہ نہیں کہ آگے جانا ممکن نہ ہو۔ اس کا دائرۂ علم محیط کل ہے۔ ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں لینے والا۔ یہ اس نور کی چنگاری ہے جو علم وحکمت کا ختم نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ انسانی علم کی بلند پروازی، تعقل اور کائناتی ادراک پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ تو ابتدائی منزل ہوتی ہے۔ علم کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ زیر افلاک بالا افلاک اور سیر کائنات سے حاصل ہونے والا علم تو آفتاب علم کی ضیاء پاش کرنوں میں ایک چھوٹی سی کرن اور دمکتے ہوئے نور کی عکس ریزیوں میں سے ادنیٰ ریزہ ہوتا ہے۔ دماغی فہم تو کم وبیش ہر وحشی انسان کو بھی ہوتا ہے اور سائنٹسٹ اور فلاسفر کو بھی مگر یہ سارا علم ترتیب فکری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مبادی سے مطالب اخذ کئے جاتے ہیں جن میں درستی بھی ہوتی ہے اور نادرستی بھی صحت بھی اور غلطی بھی اسی وجہ سے فلاسفر کا علم گو کتنا ہی چمکدار ہو اور اس کی ذہنی قطع برید اور ترتیب کیسی ہی روشن ہو پھر بھی اکثر ترتیب یا اخذ نتیجہ میں غلطی ہوتی ہے، لیکن فوق العقل سرچشمۂ علم دماغ نہیں قلب ہے فکر نہیں وجدان ہے۔ حصولی نہیں حضوری ہے۔ کسبی نہیں عکسی ہے فلسفہ نہیں نبوت ہے۔ نور مطلق سے بغیر غور وفکر اور بلا عمل ذہنی کے عکس جبینی کرنا نہ حس مشترک کا کام ہے نہ واہمہ کا نہ تخیل کا نہ تحفظ کا نہ قوت متصرفہ کا

قوتِ حافظہ کا۔ یہ چیزیں انسانی امتیازات ضرور ہیں مگر زیادہ سے زیادہ انسان کو حیوانات کی چوٹی پر پہنچا دینے اور دوسرے جانداروں کو اس چوٹی تک پہنچنے سے عاجز بنانے والے یہ کمالِ انسانیت تو وجدانی روشنی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا نورِ مطلق کے چہرے پر لاکھوں کروڑوں نورانی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر نقاب بالکل اٹھ جائیں تو سارا سنسار سوختہ ہو جائے پھر بھی اس کی کچھ نہ کچھ کرنیں وجدانِ انسانی پر حسبِ مرضی عکس ریزی اور پرتو اندازی کرتی رہتی ہیں۔ جتنا ظرف ملتا ہے اتنا ہی مظروف مرحمت کیا جاتا ہے۔ معمولی انکشاف سے وحی تک اس کے مدارج ہیں اور ابتدائی وحی سے معراجِ نبوت تک اس کی مسافت ہے۔ انسانیت کا نقطۂ آغاز افریقہ اور کوہستان ایشیا کا انسان نما حیوان تھا اور آخری سطح کمال قابَ قوسین اور ادنیٰ ہے۔

پس انسانی تخلیق جسمانی ہی ساری کائنات کے حسن و جمال کا مجمہ نہیں ہے بلکہ اس کی تربیت علمی اور تعلیم ربِ حکیم کی شانِ ربوبیت و تعلیم کی مظہرِ کامل ہے۔ اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور علم کی بے پایاں وسعت اور ربوبیت کا کمال انسان کی صورت اور اندرونی علمی و ذہنی طاقتوں کو دیکھ کر ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کا رب العالمین ہونا صحیح اور ربّ الناس اور ربّ الملائکہ بھی ہونا درست مگر ربّک میں جو شانِ کمال کا ظہور ہے وہ کسی میں نہیں۔ اسی لئے خصوصی طور پر خطاب کا کاف ذکر کیا۔ کہاں ایک انسان نطفۂ بے جان لا یعقل جماد اور اس کا اتنا وسیع عرفان و وجدان کہ نورِ غیبی کے آبشاروں کی اس پر بارش ہو اور معارف حقائق کا فیضان وسیلان اور آئندہ پھر یہ اختیار بھی ملے و الاکرم اس روشنی کو چار دانگ عالم میں پھیلاؤ۔ ہر طرف نور برساؤ۔ پیامِ حقیقت سب کو پہنچاؤ۔ رب کی ربوبیت کا اعلان کرو۔ اس کی عظمت و بزرگی کے ڈنکے بجاؤ۔ اس سے بڑھ کر شانِ ربوبیت کا ظہور اور کیا ہو سکتا ہے کہ ربِّ کائنات نے انسان کی تربیت کی اور معلمِ کل نے جاہل انسان کو علم عطا کیا اور ایسی تربیت و تعلیم دی جو زیر و بالا ادنیٰ و اعلیٰ کسی کو نہیں دی۔ پس عام انسان عمومی انسانیت کے عام جسمانی و ذہنی کمال کا حامل ہے اور الانسان (رسول اللہ کی ذاتِ مبارک) تمام خصوصی کمالاتِ انسانی کا مجموعہ۔

اللہ کی ربوبیتِ تشریعیہ

سطور بالا کے مطالعہ سے آپ اتنی حقیقت سمجھ گئے ہوں گے کہ تمام جہان کو خصوصاً انسان کو پیدا کرنے والا، ایک مخصوص حد تک باقی رکھنے والا اور کمال کی چوٹی پر پہنچانے والا اور ہر ذرّہ کو خصوصاً انسان کو بقائے زندگی کا راستہ بتانے والا اور فطری تعلیم دینے والا بس اللہ ہی ہے نہ کوئی چیز خود رو ہے جس کو طبیعت کی کارفرمائی یا اتفاق کا نتیجہ کہا جائے نہ متعدد خود مختار عاملوں کے عمل کا مظاہرہ قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ ایک نظامِ تکوین ہے ایک ضابطۂ تخلیق ہے۔ ایک دستورِ ربوبیت ہے اور ایک قانونِ تعلیم ہے جو نشیب و فراز جامد و نامی اور سیال و لامع سب میں جاری و ساری ہے اور سب کو اپنی بندش میں جکڑے ہوئے ہے۔ تکوین اور فطری تربیت میں کائنات کے کسی فرد کو دخل نہیں نہ انسانی ارادہ و اختیار کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کیونکہ کسی ذی حیات کے ارادہ کا اس کے عمل میں کوئی واسطہ نہیں۔

لیکن کیا اس ربوبیتِ تکوینیہ کے علاوہ اللہ کی طرف سے کائنات کے تمام انواع و افراد کے لئے کچھ ایسے ضوابط کی بھی تعلیم دی گئی ہے جو پر ان کی شعوری اور ارادی زندگی کی اصلاح کا مدار ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہر چیز میں شعور و حس ہے تو شعور و احساس کا مبدء یا خاصہ یعنی ارادہ بھی ضرور ہوگا اور فطرت یا طبیعت بے شعور کے علاوہ ہر شی کی ایک ارادی تنظیمِ حیات بھی ہوگی۔ اور کوئی تنظیم ارادی بغیر ضوابط کے ناممکن ہے، اس لئے ہر جاندار کا ایک ضابطۂ حیات یا نظامِ زندگی کو درست رکھنے اور بگاڑنے سے بچانے کا قانون بھی ہوگا، لیکن اس قانون کی واضع ظاہر ہے کہ کسی جاندار کی انفرادی یا اجتماعی رائے نہ ہوگی۔ کیونکہ ہر نوعِ حیوان کا احساس ایک خاص دائرہ کے اندر محدود ہے۔ فکرِ آزاد اور عقل ہمہ گیر تو کسی کو ملی نہیں کہ مبدء پر مآل کو اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کوئی نتیجہ اخذ کر سکے اور کسی قسم کا کوئی اخلاقی سماجی معاشی اور معاشرتی ضابطہ بنا سکے۔ اور ترتیبِ نظر کے ابد حق کو باطل سے اور صواب کو خطا سے جدا کر سکے۔ اس لئے کوئی حیوانِ ذی شعور بجائے خود اپنی حیاتِ ارادی کے قوانین و ضوابط بنانے کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ ہر حیوان کی تنظیمِ حیات اور ارادی زندگی کی ترتیب کے لئے ایک الٰہی تعلیم کی ضرورت ہے اور اچھے برے کا راستہ بتانے والا ایک غیبی معلم ضروری ہے۔ اللہ کی یہ ربوبیتِ تشریعیہ ہے جس سے ہر حیوان بلکہ ہر ذرّہ کائنات فائدہ اٹھا رہا ہے اور جو شرعِ الٰہی سے سرتابی کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ ہم اس جگہ عام طور پر ربوبیتِ تشریعیہ کی تفصیل بیان نہیں کرنی چاہتے۔ اس مقام پر صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ جس طرح اللہ نے ہر چیز کی تخلیق اپنی ہاتھ میں رکھی ہے اسی طرح تربیت اور تعلیم کا ذمہ دار بھی خود ہی بنا ہے وہی خالقِ کل ہے وہی ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی رب ہے ہر چیز کو

کمالِ نوعی تک پہنچانے والا اور وہی معلم ہے ہر چیز کو اس کے اخلاقی، سماجی، معاشی و تنظیمی ضوابط سکھانے والا، سارا جہان اپنے وجود و بقائے وجود
میں اس کا محتاج ہے اور تنظیم حیات میں بھی اسی کا دست نگر۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ اقرا میں دو بار لفظ اقرا ذکر فرمایا۔ ایک بار لوح فطرتِ انسانی کو
پڑھنے کا حکم دیا۔ اور دوسری بار لوحِ کائنات پڑھنے کا۔ پہلے ربک کے لفظ سے ربوبیت تکوینیہ کی طرف اشارہ فرمایا اور دوسری بار اسی لفظ سے ربوبیت
تشریعیہ کی جانب ایمار کیا۔ پہلے لفظ خَلَقَ سے تخلیق عمومی کو ظاہر کیا اور دوسرے خَلَقَ سے خصوصیت کے ساتھ تخلیق انسانی کو۔ پہلے لفظ عَلَّمَ سے تعلیم عام کا اعلان
فرمایا۔ تمام کائنات کی تنظیم حیات کے لئے ضوابط و قوانین کی وضع و تاسیس جن پر ہر جاندار کی ارادی تنظیم کی درستی موقوف ہے۔ تنظیم غیبی پر ہی اس کا
مدار ہے۔ صریر الہی نے لوحِ کائنات پر ہر جاندار کی تنظیم و اصلاح کے لئے اس کے مناسب انفرادی و اجتماعی ضوابط ثبت کر دیئے ہیں۔ ہر جاندار لوحِ
غیبی کے لکھے ہوئے نقوش پڑھتا ہے۔ ان کو سمجھتا اور سمجھ کر عمل کرتا ہے یہی اس کا نظام تشریعی ہے پھر دوسری بار لفظ عَلَّمَ سے انسان کے لئے خصوصیت
کے ساتھ ربوبیت تشریعیہ کا ذکر فرمایا۔ اس کا تذکرہ اس جگہ ہم ذرا تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سطور بالا میں توضیح کر چکے ہیں کہ اللہ نے انسان
کو وہ شرف تکوینی عطا فرمایا ہے جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ تقویم جسم، کمال حواس اور جزئیات کو جاننے والی طاقتیں اور سب سے اعلیٰ عقل و دانش
انسان کے لئے باعثِ امتیاز ہے۔ غور و فکر اور نظر و فہم سے تمام حیوان بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی جانور بھی نہ جزئیات سے کلیات کا
استنباط کر سکتا ہے نہ مبادی کو ترتیب فکری دے کر نتائج اخذ کر سکتا ہے نہ اجزاء و ارکان کی کیمیاوی تحلیل و ترکیب انسان کی طرح کر سکتا ہے نہ حقائق
طبعیات اور فوق الطبعیات تک اس کی ذہنی رسائی ہے نہ الہیات کا فہم ہے نہ مبدء و معاد کا تصور اس کے لئے ممکن ہے۔ یہ خصوصیت صرف
دانش انسان کی ہے کہ ماضی میں بعید، آفرینش اور مستقبل میں معاد تک پہنچتی ہے۔ عالم طبعیات کے تمام اجزاء کی موشگافی کرتی ہے یہ زمین دوز ہے
ہوا پیما ہے فلک رس ہے۔ خلاؤں میں گھومتی اور فضاؤں میں تیرتی ہے۔ اس کی رسائی خلیات تک ہے۔ برقیات اس کے دائرہ سے باہر نہیں
شعاعیں اس کی جولانگاہ ہیں۔ غرض ہر لامع، سیال اور جامد پر اس کی حکومت ہے۔ یہ عناصر تکوینی کو توڑتی مروڑتی اور جوڑتی ہے۔ بناتی بگاڑتی اور پھر
سنوارتی سدھارتی اور جس شکل میں چاہتی ہے نمودار کرتی ہے اس کے کوکبۂ شاہیت نے غیر مادی کائنات کی سرزمین میں بھی ڈیرے ڈالے ہیں۔
حکمت مجردات کو فتح کرنے کی بھی کوشش کی ہے خالق کائنات پر بھی اپنا جال پھینکا ہے اور واجب تعالیٰ کو بھی اپنی امکانی رسی میں جکڑ لینے کی کوشش کی
ہے۔ مشرق اور مغرب کے فلاسفروں نے اپنے اسی سرمایہ سے سارے جہان کو خریدنے کی تگ و دو کی ہے یہ جہان کہاں سے آیا، کب آیا، کیوں آیا،
کہاں کو جا رہا ہے کیوں اور کس طرح جا رہا ہے اس کا نقطۂ آغاز و انجام کیا ہے سب ہی باتوں پر غور کیا ہے۔ دانشورانِ شرق و غرب کو ان کی فکری
وسعت اور نظری پہنائی نے اتنا پر خود غلط بنا دیا کہ وہ انسان کے موجودہ معاشرہ اور نامعلوم اللانتہا مستقبل کے لئے دستورِ حیات بنانے لگے اور
حاضر کی کمان سے تاریک مستقبل کی تہ بر تہ تاریکیوں میں تیر چلانے لگے۔ انھوں نے مادیات پر مجردات کو قیاس کیا۔ ممکن اور حادث کے دائرہ میں
واجب اور قدیم کو بند کرنے کی کوشش کی۔ اجسام کی دنیا میں رہ کر مملکت ارواح کی تسخیر کے لئے جد و جہد کی۔ وہ نہیں سمجھے کہ عقلِ انسانی باوجود گہرائی
اور بلند پروازی کے علمی سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ وسعت نہیں رکھتی۔ ابھی تک علم دانش بھی ناقص ہے۔ ریگستان کے کسی ذرہ، درختوں کے کسی
پتہ اور لامحدود شعاعوں میں سے کسی کرن کی کامل حقیقت اور پورے خواص کا علم آج تک نہ ہو سکا۔ فلاسفروں کے افکار میں تضاد ہے، مخالفت
ہے۔ مثبت منفی کا فرق ہے۔ کسی کا یقین کیجیے کسی کا یقین نہ کیجیے۔ لائے ہیں ان کی بزم سے لوگ خبر الگ الگ۔ عقل باوجود اپنی تسخیر کل کے مادۂ عنصر کا
سے اوپر نہ اٹھ سکی اور عنصری پوری حقیقت بھی دانش کی ترازو میں ابھی تک نہیں تولی جا سکی نہ تولی جا سکتی ہے۔ آغاز آفرینش سے علمبرداران عقل اجزا
عنصری کی ادھیڑ بن میں مشغول ہیں۔ اسطقسات عالم کی جستجو میں ہیں، لیکن علم کا آخری کنارہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔ پھر کرۂ در کرۂ علویات میں سے تو
اقرب ترین کرہ تک بھی کامل رسائی نہیں ہو سکی جو کچھ ہاتھ آیا وہ غیر حاصل کے مقابلے میں اتنا بھی نہیں تھا جتنا ذرہ آفتاب کے مقابل اور قطرہ سمندر
کی نسبت سے ہوتا ہے۔ کس نے جانا اور کس نے دیکھا کہ ہمارے نظام کہکشاں کی کشش سے کتنے کرۂ درکرۂ بندھے ہوئے ہیں کون بتائے کہ
ہر کرہ میں کیا ہے۔ کون ہے کیسا ہے۔ وہاں کی مخلوق کا کیا حال ہے۔ وہاں کے دن رات کی کیا کیفیت ہے۔ ابھی تک تو بعض کرنوں کی شعاعیں نوری
رفتار سے چل کر آغاز آفرینش سے ہماری طرف آ رہی ہیں، لیکن نہیں پہنچ سکی ہے۔ علویات کے اس بے کنار ناپیدا سمندر میں کتنے قطرے ہیں کسی کو معلوم نہیں

ڈاروِن بیچارے نے صرف اسی مادی عناصر کی مفروضہ سیڑھیاں طے کی ہیں اور زینہ بہ زینہ چڑھا۔ گویا ارب در ارب مخلوق میں سے پہلے ہی زینے کے پیچ در پیچ نشیب و فراز میں گم ہو کر رہ گیا۔ آئن اسٹائن نے اپنے نظریۂ اضافت کی ترازو میں چند میل کی بلند خلاء اور فضا کو تولا، ناپا، جانچا اور کشش ارض سے اونچی پرواز اس کی نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ برہان کلی کا مدار تلاش جزئیات پر ہے اور استقراء انہی جزئیات کا ممکن ہے جو اسی کرۂ ارض کی حدودِ کشش میں منتشر ہیں۔ مان لو کہ انسان کبھی چاند یا مریخ کی فضاؤں میں گھوم سکے گا، لیکن ایسا کب ہوگا کون جانے اور اگر مستقبل قریب میں ہو بھی گیا تو بھی سے اس وقت تک تو یقیناً انسان کا علم اسی کرہ کے ساتھ گھومتا رہا ہے اور ابھی تک اتنا ناقص ہے جیسے سیاہ گائے کے بدن پر کوئی ایک سفید بال جب اس کرہ کا بالائی علم صرف اتنا ہے تو اندرونِ زمین اپنے اندر کتنا ذخیرہ اور خزانہ رکھتا ہے اور اس کے احوال و خواص کیا ہیں۔ اس کا علم تو ابھی تک ناقص ترین ہے تقریباً نامعلوم۔ علم طبقات الارض کے مدعی کتنے ہی عالم کل ہونے کے مدعی ہوں، لیکن ابھی تک ان کی ذہنی رسائی بطنِ ارضی میں پیدا ہونے والے چند کیڑوں سے آگے نہ بڑھ سکی ہے۔ اندرونی موجودات کے خواص اور ماہیات کی تو ابجد سے ابھی تک کوئی واقف نہیں۔

علماء سائنس اور فلاسفروں کا علمی بلوغ جب اس کرہ کے اندر اور باہر کی چیزوں کے متعلق اتنا نارسا ہے تو با آسمان تیر پرداختن کا نتیجہ نامعلوم۔ شاید ہزاروں لاکھوں برس میں تو مریخ و قمر کی کائنات کا علم اتنا بھی نہ ہو سکے گا جتنا کرۂ ارضی کی موجودات کا ہے۔ رہے باقی کروڑوں کرے اور ان کی تنظیم کشش اور اختلاف احوال پر عبور دانش تو ظاہر ہے کہ عقلی ترقی کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے باقی علم کا حصول اتنا بعید ہے کہ ہم اس کو ناممکن کہہ سکتے ہیں۔ وہ امکان جس کے وقوع کے لئے مستقبل کے کروڑوں برس کی مقدار بھی کم ہو امکان نہیں عدم امکان ہے۔

ایسی نارسا فکر اور محدود نظر اپنی ترازو میں تو موجودہ احوال کو بھی پورا پورا نہیں تول سکتی۔ مستقبل کے ان گنت احوال کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ دانش بشری تو بدیہی چیزوں میں بھی غلطی کر جاتی ہے، قرائن سے کام لیتی ہے، قیاس کرتی ہے۔ ظن اور تخمین کے تیر چلاتی ہے، کبھی تیر نشانہ پر بیٹھ جاتا ہے کبھی خطا کر جاتا ہے۔ انسان کے وجدانیات اور نفسیات کس قدر بدیہی ہیں۔ الم و راحت سے کون ناواقف ہے، رضا و غضب اور سرور و غم کا کس کو علم نہیں۔ کیا ان بدیہی حقائق کا کسی کو پورے طور پر علم ہے۔ کیا ان حقائق کے نتائج اور علل و اسباب سے کوئی پورے طور پر واقف ہے۔ رنج میں انقباض سرور میں انبساط ہوتا ہے، قلب بستہ یا شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اعصاب میں تمدد یا تشنج ہونے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ درست ہے، مگر ناقص ہے، سرور و رنج کی پوری تصویر کشی اس سے نہیں ہوتی۔ مال، صحت، عزت، سیادت، حکومت اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اسباب سرور و راحت ہیں، لیکن کیا سب کے لئے یہ اسبابِ راحت و مسرت ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔ اختلاف طبائع اور تنوع مقاصد اس کی علت ہے، لیکن یہ اختلاف اور تنوع کیوں ہے۔ عقل کا تقاضا تو وحدت ہے۔ پھر یہ تضاد و تخالف کیوں ہے۔ کیوں یہ سب چیزیں سکونِ ذہنی پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہیں یہ سب باتیں مجہول ہیں۔ خود اختلافِ عقول ایک مجہول الاسباب چیز ہے بلکہ ایک ہی شخص کی عقل مختلف اوقات میں مختلف نتائج پر پہنچتی ہے۔ یہ بجائے خود انتہائی حیرانی آفریں حقیقت ہے۔

گرمی سردی، تری خشکی، روشنی تاریکی، سیاہی سفیدی اور اسی طرح کی دوسری ہزاروں کیفیات سے ہر شخص ہر وقت دوچار ہوتا رہتا ہے اور روشن دانش والے کسی قدر ان کی حقیقت اور خاصیت سے بھی واقف ہیں، لیکن وہ کون دانشور ہے جو چند تجربی احوال سے آگے قدم بڑھا سکا ہو اور ان اعراض کی کامل حقیقت اور پورے احوال جاننے کا دعوے دار ہو۔

عقل کی رسائی اپنی ماہیت تک بھی نہیں اور اپنے پورے احوال کا اس کو علم بھی نہیں۔ یہاں تک کہ اپنے جذبات کو بڑے سے بڑا فلاسفر صرف محسوس کرتا ہے۔ لوازم جذبات سے اس کو پوری واقفیت نہیں ہوتی۔ میلانات و عواطف اور تنفرات و استکراہات کے اجزاء و جزئیات کتنے ہیں اور مظاہر کیا کیا ہیں۔ انتہائی تحلیل و تجزیہ کے بعد بھی کوئی عقلمند نہیں بتا سکا۔ پھر انسان کے عجز دانش کی انتہا یہ ہے کہ کوئی دانشمند خواہ وہ ارسطو ہو یا افلاطون نیوٹن ہو یا ڈاروِن یہاں تک کہ کوئی زردشت اور کوئی بدھ بھی اپنی عقل کو جذبات کے پنجے سے آزاد نہیں کر سکا اور علائق انسانی کے ضعف و قوت کے فرق کو نہ مٹا سکا تو کس طرح کہا جا سکتا ہے اور کیا جواز ہے اس امر کا کہ معاشرۂ بشری اور جمہورِ

انسانی کے نظم کو عدل کے ساتھ درست رکھنے اور فکری و عملی اصلاح کرنے کے لئے عقل فلسفی دستور بنا سکتی ہے جس کو اپنی حدود کا خود پتہ نہیں وہ انسانی جماعت کے لئے ابدی قوانین کی وضع کیسے کر سکتی ہے۔

ذرا سوچو کہ جب مسائل طبعیہ کی تحقیق اور حقائق مادیہ کی تحلیل میں اہل حق کا اس قدر اختلاف ہے کہ اس فضائے بسیط کی لہروں میں اس اختلاف نے ایک ارتعاشی گونج اور لرزہ خیز جھنکار پیدا کر دی ہے اور اس معمورہ کے اوپر ساری خلاء میں مختلف اقوال کا تصادم ہولناک دھماکے پیدا کر رہا ہے تو فوق الطبعیات اور الہیات کے الجھے ہوئے مسائل کا عقلی حل کس طرح ممکن ہے۔ صفات و ذات اور مبدء و معاد کے متعلق صحیح عقیدہ پر پہنچنا تو فکر انسانی کی ذاتی کوشش سے باہر ہے۔ اس بارگاہ کے اندر داخلہ تنہا تفکر بشری کا کام نہیں۔ بحر ظلمات میں اگر نابینا داخل بھی ہو جائے تو اس کے لئے غرق ہو نے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر کسی تاریک غار کے اندر کسی شب دیجور میں چند اندھوں کو گھسنے کا موقع مل جائے تو وہاں کے اندرونی کیفیات اور موجودات کی منظر کشی وہ بیچارے کیا کر سکتے ہیں۔ ان کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اندرون ظلمات کیسی حسین تصویریں آویزاں اور رونما ہیں۔ کہیں چھونے اور ٹٹولنے سے جمال داخلی اور حقیقت واقعی کا پتہ چل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الہیاتی مسائل کو کسی فلاسفر کی نابینا عقل واشگاف نہ کر سکی اور تاریکی میں تیر چلانے سے کوئی نائدہ نہ نکل سکا اور کوئی صاحب فکر اپنے آغاز و انجام مجردات فوقانیہ اور خالق کائنات کی ذات و صفات کو نہ پہچان سکا۔ اگر گوتم بدھ اور اس جیسے دوسرے مدعیان عرفان کو کوئی جلوہ نظر آیا بھی تو چونکہ وہ ترتیب فکری کا نتیجہ تھا اور فکر کی بینائی محدود ہے، اس لئے وہ کرن کو آفتاب اور پرتو کو اصل سمجھ بیٹھا۔ حقیقت مستور اس کو دکھائی نہیں دی۔ اس حقیقت کو دیکھنے اور اس کی شعاعوں کو اپنے اندر سمیٹنے اور سمونے کے لئے تو عقل سے بالاتر ایک قوت کی ضرورت ہے جس کو ہم قلبی وجدان کہتے ہیں۔ آئینۂ وجدان اگر صاف اور روشن ہے تو بغیر کسی ترتیب فکری کے اس پر یکدم حقیقت مستور کی عکس ریزی اور جلوہ پاشی ہو سکتی ہے۔ اور حسن مجسم کے تمام اعضا کا پورا انعکاس اس پر ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ناز و انداز اور عشوہ و ادا کی بھی عکاسی ہو سکتی ہے۔ وجدان ہی وہ آئینۂ حقیقت نما ہے کہ جب اس میں ثبت ہونے والی علمی صورتوں کا کوئی پرتو عقل پر پڑ جاتا ہے تو اس کو بھی لمعۂ نور بنا دیتا ہے۔ وجدان کی نگاہ ہی وہ دوررس اور نکتہ شناس نگاہ ہے کہ تمام حقائق کونیہ کو سامنے دیکھتی ہے۔ آغاز و انجام، مبدء و معاد، تعمیر انسانی کے ضوابط و قوانین اور تنظیم بشری کے روابط کوئی چیز بھی اس سے غائب نہیں ہوتی۔ وہ حضور کی آنکھ سے ماضی، حال اور مستقبل کے انسان کے فلاح و بہبود کی شکلیں دیکھتی ہے۔ اخلاق، سماج، معاشرت اور سیاست کی درستگی کی تمام اصلی صورتیں اس کے سامنے ترتیب وار آتی ہیں اور اس پر یہ کل فیضان براہ راست نور مطلق کا ہوتا ہے اور بارگاہ الوہیت سے قدوسی، علمی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں، اسی لئے اس کی عکس چینی عکس ریزی اور عکس بیزی میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ وجدان قوت قدسیہ ضرور ہے جو صرف اولیاء و انبیاء کو حاصل ہوتی ہے، مگر یہ ارسطو کی بیان کردہ عقل بالملکہ کی آخری چوٹی نہیں ہوتی کہ جس میں صرف بدیہیات کا استحضار ہو اور نظریات کی طرف انتقال کرنے کی قریبی صلاحیت۔ یہ تو ارسطو کی عقل بالفعل اور عقل مستفاد سے بھی اونچی مقدس طاقت ہے۔ جس مملکت کے حدود میں عقل بالفعل کی رسائی نہیں وہاں اسپ وجدان آزادی کے ساتھ دوڑتا اور گھومتا ہے۔ یہ وجدان اولیاء اور آئینۂ نبوت ہے۔ صاف، روشن، بے داغ، زنگ خوردہ، عقل حکما نہیں۔ تیرہ و تاریک جس میں کہیں کہیں روشنی کے نقطے پڑ جاتے ہیں۔

ہمارے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ اللہ اگرچہ رب العالمین ہے اس کی تکوینی اور تشریعی ربوبیت عام ہے، لیکن انبیاء کی قوت قدسیہ اور وجدان ربوبیت تکوینیہ کا مظہر اکمل ہے۔ تخلیق خداوندی کا ظہور اگرچہ کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہو رہا ہے اور اس کی ربوبیت کی ہر چیز شاہد ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ اور بالا نعمت تکوین یعنی وجدان نبوت صرف انبیاء کو ہی حاصل ہے۔ اسی طرح ربوبیت تشریعیہ سے اگرچہ کائنات کا ذرہ ذرہ بہرہ اندوز ہے۔ ہر قطرہ کو تعلیم الٰہی سے نصیب ملا ہے، لیکن انبیاء کے آئینۂ وجدان میں جو حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے اور انسان کو علمی اور عملی اصلاح کے جو ضوابط براہ راست پیغمبروں کو اور پیغمبروں کی معرفت دوسرے انسانوں کو سکھائے جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی ربوبیت تشریعیہ کا سب سے بڑا اور افضل حصہ ہے۔ اگر انبیاء کے وجدان پر آفتاب الوہیت کی عکس ریزی نہ ہوتی اور نظام

بشری کی درستگی کے لئے ضوابطِ شرعیہ کا نزول نہ ہوتا اور دستورِ زندگی اللہ کی طرف سے انسان کو نہ ملتا تو عقلِ انسانی گمراہی کی اندھیریوں میں بھٹکتی پھرتی۔ نہ افکار کو راہِ صواب ملتی نہ طریق کو راہِ نجات۔ دانشوروں کی انتہائی عقلی راہنمائی کے بعد بھی انسان اپنی ابتدائی جہالت کی وادی سے باہر نہ نکل سکتا اور انجام کار تباہ ہو جاتا۔ پھر انبیاء کے مدارج میں بھی عظیم الشان تفاوت ہے۔ ستارے سب ہیں۔ آئینۂ وجدان سب کا روشن ہے۔ سب پر ایک ہی روشنی پڑ رہی ہے، لیکن ذاتی صلاحیت اور روشنی کی مقدار میں تفاوت عظیم ہے۔ کوئی عروج کی آخری چوٹی پر فائز ہے، کوئی درمیانی مواقف میں ہے۔ کوئی عروج و نزول دونوں میں کامل ہے۔ پس اللہ اگرچہ رب العالمین ہے اور رب الناس بھی اور خاص کر رب الانبیاء بھی ہے، لیکن سید الانبیاء کی صورت سیرت، ظاہر باطن، حسن تقویم، کمالِ حواس، روشنیٔ مشاعر، ضیائے فکر اور برقِ وجدان پر جتنی نورِ مطلق کی شعاعیں عکس ریزی کر رہی ہیں اور ربوبیت تکوینیہ و تشریعیہ کی مظہر جیسی آپ کی ذات ہے اس کی نظیر تو نوعِ انسانی میں مفقود ہے۔ آپ کو دیکھ کر تمام انبیاء خیر بجیب تفکر ہیں اور ملائکہ متحیر۔ اسی لئے اول وحی میں خطابِ اوّل کے موقع پر ربوبیت کاملہ کی طرف خصوصی توجہ دلانے کے لئے ربک فرمایا اور ربوبیت عامہ کا ذکر نہیں کیا پھر ربوبیت کے دونوں قسموں کے کمال کی طرف اشارہ کرنے کے لئے دوبارہ ربک فرما کر خطاب کیا یعنی اللہ نے آپ کو تکوین کا بھی مظہر اتم بنایا اور تشریعی کمال بھی عنایت فرمایا۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ خیر و شر اور اشیاء کے اچھے برے کا صحیح فیصلہ عقل کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ افکار و اعمال کے حسن و قبح اور صحت و غلطی کو عقل کا سمجھ سکنا بجائے خود ممکن صحیح لیکن عقل قاضی اور حاکم نہیں بلکہ علام الغیوب کے غیبی فیصلہ کی محتاج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عقل ناقص العلم ہے اور اللہ کا علم ماضی و مستقبل کو محیط ہے۔ اب غور کرنا یہ ہے کہ تشریعاتِ الٰہیہ کیا ہیں اور تمام انبیاء کو کس پیام کا حامل بنا کر بھیجا گیا۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کی فکری اور عملی اصلاح ہی مقصدِ نبوت ہے۔ مخلوق کو خالق سے جوڑنا اور درمیانی رکاوٹوں کو دور کرنا ہی حاصلِ وحی ہے یعنی عقیدے اور اقوال و اطوار زندگی کی درستی تعلیم انبیاء کا مشترک مقصد ہے۔ انسانی افکار کی اساسی غلطی کیا ہے وہی جو ہم اوپر مفصل بیان کر چکے ہیں کہ کائنات کو وجود یا بقائے وجود یا ترقی وجود یا تنظیم دستورِ زندگی میں اللہ سے بے نیاز سمجھنا، خواہ اس طور پر کہ اللہ کی ہستی ہی کا انکار کر دیا جائے اور اس عالم کو خود زائیدہ اور خود رو سمجھ لیا جائے یا اس طور پر کہ ایجادِ کائنات میں کسی مخلوق کو خدا کا ساتھی اور خدا کو اس کا محتاج قرار دیا جائے۔ گویا وجود باری تعالیٰ کا انکار اور شرک اور تشبیہ انسان کی بنیادی فکری غلطی ہے اور انبیاء اسی باطل عقیدے کو دور کرنے کے لئے آئے اور سب نے یک زبان ہو کر اعلان کیا کہ اللہ کے سوا نہ کوئی خالق اور موجد ہے نہ رب اور پروردگار نہ دستورِ حیات کا واضع اور معلم۔ وہی خیر و شر میں حدِ فاصل قائم کرنے والا ہے اور وہی اچھے برے کا فیصلہ کرنے والا۔ اسی کے ساتھ تمام انبیاء نے ایک اجماعی اعلان یہ بھی کیا کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور اعمال کے حسن و قبح میں حدِ فاصل قائم کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ رکھتا ہے۔ قول ہو یا فعل کوئی بھی اثر سے خالی نہیں۔ اور ایمان و اعمال کی جزا کامل طور پر اس دنیا میں ناممکن ہے۔ آخری لمحۂ زندگی بھی عمل کا لمحہ ہے اس کی جزا سزا کے لئے ایک اور زندگی آنے والی ہے۔ فاعل سے صادر ہونے کے بعد فعل معدوم نہیں ہو جاتا۔ یہاں تک کہ دماغی افکار اور ذہنی خیالات بھی ناقابلِ فنا ہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کے تمام افکار، اقوال اور اطوار ایک متحرک مسلسل زنجیر ہے یا ایک پیوستہ ناگسستہ نظم ہے۔ کسی حلقہ یا کسی تصویر کا نظر سے غائب ہو جانا اس کے فنا ہونے کی علامت نہیں بلکہ آغاز و انجام کے دونوں کنارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ابتدار آفرینش کا سرا بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور آخری رجوع بھی اسی کی جانب ہو گا اور وہ آخر کار ایک مقررہ وقت میں پوری زندگی کے اچھے برے صحیح غلط سارے تصورات و اعمال سامنے لائے گا اور جزا سزا دے گا۔ اگر انسان اپنی عقلی روشنی، جسمانی حسن و طاقت، قومی سیادت و وجاہت، جتھہ کی کثرت، ملکی حکومت اور مال کی فراوانی پر خود غلط بن جائے اور از خود رفتہ ہو جائے اور اللہ سے اپنے کو بے نیاز سمجھ بیٹھے اور افکار و اعمال کی جزا سزا کا انکار کرنے لگے تو یہ اس کی حماقت ہے اور حماقت کا نتیجہ دنیوی تباہی کے علاوہ آئندہ زندگی کی بھی بربادی ہے۔ اللہ کی گرفت سے انسان آزاد نہیں۔ خدا کی غیبی طاقتیں آدمی کو محیط ہیں۔ اپنی طاقت پر مغرور ہو کر اللہ سے سرکشی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عذاب کے پوشیدہ اسباب اللہ مسلط فرما دے گا اور عذاب کے فرشتوں کے مقابل انسانی جتھہ بندی اور رعونت کشی بے کار ہو گی اور آخر کار فرشتے چوٹی اور پیشانی کے بال پکڑ کر بدعملی و بداعتقادی کے نتیجہ کی دہکتی آگ میں جھونک دیں گے۔

تعلیم انبیاء کا یہ فکری اصلاحی رخ تھا جس کو مجملاً ہم نے بیان کر دیا۔ دوسرا پہلو اللہ کی بھیجی ہوئی عملی اصلاحات کا ہے۔

ربوبیتِ تشریعیہ کا عملی رخ: ذہنِ انسانی نے انفراداً اور اجتماعاً ہمیشہ ہی اخلاق کو سنوارنے اور انسانی جماعت کے باہمی تعلقات کو

سدھارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ پہلے واضح کی جاچکی ہے جب فکر بشری محیط کل نہیں، مستقبل کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ حال کے متعلق بھی اس کی نظر محدود اور ناقص ہے۔ پھر کوئی فکر ذاتی اور خاندانی اغراض سے آزاد نہیں، نفسانیت، زوجیت، قرابت، وطنیت، مؤدت اور صداقت کے عواطف و میلانات کی زنجیروں میں بندھی ہوئی ہیں۔ رسم، رواج، تہذیب، کلچر، زمان، مکان اور زبان کی جنبہ داری کا دیو بھی اس کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ ایسی حالات میں بین الانسانی ضوابط عامہ جن میں کسی گروہ کسی کلچر، کسی زبان، کسی زوجیت، کسی قرابت، کسی وطن، کسی صداقت اور کسی وطن کی خصوصی رعایت نہ ہو اور تمام جذبات و دواعی سے آزاد ہو کر فکر انسانی انفرادی یا شورائی حیثیت میں کام کرے قطعاً ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام انسانی اخلاق و معاشرت اور سماج و تنظیم کی درستی کے لئے ایسی واضع قوانین ہستی کی تشریعات کی ضرورت ہے جس کا علم ماضی اور مستقبل کو محیط ہو۔ جس کی نظر کے سامنے انسان کی سعادت و شقاوت کا ہر دقیق ترین نقطہ ہو جس کا خصوصی تعلق نہ کسی فرد سے ہو نہ گروہ سے نہ کسی تہذیب اور زبان سے نہ کسی وطن اور جہت سے نہ اس کا کسی سے رشتۂ قرابت و زوجیت ہو نہ علاقۂ والدیت و مولودیت نہ اس کے اندر جذبۂ صداقت و عداوت کارفرما ہو نہ داعیۂ نفسانیت و خود غرضی جلوہ نما۔ سب مخلوق اس کی نظر میں ایک ہو اور اس کی غرض صرف یہ ہو کہ انسان تباہ نہ ہو، اپنی خداداد صلاحیتوں کو برباد نہ کرے اور کوئی شقاوت کے گڑھے میں نہ گر پڑے۔ اسی غرض کو سامنے رکھ کر خالق انسان نے انسانی معاشرہ کو درست کرنے اور سماج میں تعادل پیدا کرنے کے لئے انبیاء کی معرفت اپنے وضع کردہ اصلاحی قوانین بھیجے جن کو ہم اللہ کی ربوبیت تشریعیہ کا عملی رخ کہتے ہیں۔ ان قوانین میں اگرچہ مصالح زمان و مکان اور تقاضائے ضرورت کے زیر اثر تنوع تکثر اور اختلاف ہے، لیکن تمام ضوابط کی ایک روح ہے۔ ایک امر مشترک ہے امتیازات کے باوجود ایک ضابطۂ اصلاح ہر دور میں، ہر جگہ، ہر قوم اور ہر انسان کے لئے تمام انبیاء کی تعلیم کا مرکزی نقطہ رہا ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔ ہر پیغمبر نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا اور خلاف تقویٰ حرکات سے روکا۔

تقویٰ کیا ہے

یاد رکھو کہ تقویٰ خوف خدا یا عذاب آخرت سے ڈرنے کا نام نہیں۔ اللہ کا خوف اور عذاب کا ڈر تو انسان کو تقوے پر آمادہ کرتا ہے۔ تقویٰ حقیقت میں نام ہے شریعت الٰہیہ کی ادنیٰ خلاف ورزی سے بچنے کا۔ فکری صحت سے لیکر ادنیٰ عمل کی درستی تک جتنے الٰہی تشریعات ہیں سب پر عمل پیرا ہونے کا اور زندگی کے ہر علمی و عملی رخ کو قانون شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کا۔

صوفیۂ باصفا کے تقوے سے بحث نہیں۔ تشریعی تقوے کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ حرام کو ترک کر دیا جائے اور حلال کو اختیار کر دیا جائے یہاں تک کہ مستحبات کی پابندی اور مکروہات سے اجتناب بھی تقوے ہی کی شاخیں ہیں۔ سورۂ اقرء میں اسلامی تقویٰ کی تفصیل نہیں بیان کی گئی نہ مفصل اوامر و نواہی کے بیان کا موقع تھا صرف امر بالتقویٰ کو رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ظاہر کی گئی، اس لئے ہم بھی اس جگہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف مجمل طور پر اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ باطنی عیوب سے ذہن و قلب کو صاف رکھنا محاسن وجدانیات اپنے اندر پیدا کرنا، اخلاق فاضلہ اختیار کرنا، اپنے اور دوسرے انسانوں کے علائق کو ناہمواری سے محفوظ رکھنا، باہمی فرائض و حقوق میں تعادل قائم رکھنا اور معاشرہ کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنا۔ کمزوروں، ناداروں، بیماروں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور معاشی ناہمواری کو دور کرنا۔ زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کے راستوں میں مال خرچ کرنا۔ سود، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی اور طمع کاری سے تحصیل مال کے راستوں کو محفوظ رکھنا۔ بنوابہ حاکمانہ، ظلم اور بے رحمی سے اپنے کو بچانا اور دوسروں کو بچانے کی کوشش کرنا یہ سب تقوے کی ہی شاخیں ہیں اور زندگی کا ان تمام شعبوں میں شریعت الٰہیہ کی پابندی لازم ہے اور تمام عملی زندگی میں اخلاص ضروری ہے۔ یعنی یہ خیال ذہن میں جمائے رکھنا لازم ہے کہ اللہ کے تمام اوامر و نواہی کی تعمیل اپنی دنیوی زندگی کو سدھارنے، سلوانے اور آخرت کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔ ہر حرکت، سکون اور قول و عمل میں رضائے خالق کی جستجو لازم ہے اور رضائے خالق کا حصول تعمیل احکام کے بغیر ناممکن ہے وغیرہ۔

تقویٰ کا فرد کامل نماز ہے

اللہ کے خالق رب اور شارع ہونے کا اقرار اور اسی کے اوامر و نواہی کی پابندی کا اعتراف تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور یہی دین سماوی ہے۔ اوامر و نواہی میں زمان و مکان اور ملل و عوام کے اختلاف کی وجہ سے کتنا ہی تنوع اور اختلاف ہو، مگر شرع الٰہی ہونا سب کا مسلم ہے اور تمام اوامر و نواہی کا ایک خلاصہ، ایک مجموعہ، ایک ہی

عملی مظاہرہ اور تمام عبادات و معاملات کی ایک ہی روح سب میں موجود ہے۔ یعنی نماز کا حکم ہر پیغمبر کی شریعت میں موجود رہا ہے۔ نماز میں عبدیت کا پورا پورا مظاہرہ ہے۔ اللہ کی الوہیت، ربوبیت، خلاقیت اور شارعیت کا قلبی قولی اور عملی اعتراف ہے۔ معاشرۂ انسانی کو تباہ کرنے والے اسباب کے خلاف عملی اظہار ہے۔ انسانی برادری میں پھوٹ ڈالنے والے امور کی یکسر نفی ہے۔ سماجی حقوق کی مساوات بین الاقوامی تنظیم اور طریق تنظیم کی خاموش تعلیم ہے۔ طہارت جسم اور نظافت اخلاق کا درس ہے۔ راہِ سعادت پر چلنے اور شقاوت کے غاروں سے بچے رہنے کا سبق ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عبد و معبود اور مخلوق و خالق کے درمیان حائل ہونے والے تمام موانع کا ازالہ ہے اور انوار قدسیہ کے بلاواسطہ فیضان کا مرادی نقطہ ہے۔ نماز کے وقت تمام بیرونی ظاہری اور مجازی اسباب کے پردے بھی عبد و معبود کے درمیان باقی نہیں رہتے۔ قادر نما کائناتی مورتیاں بھی مومن کے سامنے سے ہٹ جاتی ہیں۔ اس وقت مومن کے قلب میں نہ کسی جلیل القدر شہنشاہ کی عظمت و جلالت کا کوئی اثر رہتا ہے۔ نہ مقدس ہادی اور پاک پیغمبروں کی بزرگی کا تصور، نہ اہل و عیال مال و منال، جاہ و حشم اور خیل و خدم کا کوئی نشان۔ یہی وجوہ ہیں کہ ہر پیغمبر کو اصلاحِ فکر کے بعد سب سے اول نماز کی تعلیم دی گئی اور نماز کو ہی کفر و اسلام کے درمیان عملی فاصل قرار دیا گیا اور اعدائے انبیاء کو سب سے زیادہ عناد نماز سے ہی ہوتا رہا اور ہادیانِ برحق کو وہ نماز سے روکتے اور استہزاء کرتے رہے۔ کیونکہ نماز ہی انسانی ذہن و عمل میں انقلاب پیدا کرنے کا اول و آخر پیام ہے۔

اس سورت میں بھی صاف صراحت ہے کہ اللہ کے دشمن اور طاغی دشمن رسول اللہ کو جہاں تقویٰ پر کاربند رہنے کی نصیحت کرنے سے روکتے تھے وہاں نماز سے بھی باز داشت کرتے تھے۔

تحلیلِ اجزاء

اِقْرَأْ پڑھو۔ صحیحین میں جو حضرت عائشہؓ کی مرسل حدیث مذکور ہے اس کو اختصار کے ساتھ ہم افتتاحی مقالہ کے آغاز میں لکھ چکے ہیں۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ وحی کے شروع ہونے سے پہلے رسول اللہ کے خواب سچے ہوتے تھے اور سفیدۂ صبح کی طرح سامنے آجاتے تھے۔

۲۔ پھر کچھ مدت کے بعد آپ (مکہ سے منیٰ کی جانب تخمیناً دو میل کے فاصلہ پر جاکر) کوہ حرا کے ایک غار میں معتکف ہو گئے اور گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

۳۔ ایک روز فرشتہ نے آکر کہا (جو غالباً انسانی شکل میں آیا تھا) پڑھو۔ آپ نے انکار کر دیا۔ فرشتہ نے پکڑ کر دبایا پھر کہا پڑھو آپ نے کہا۔ ما انا بقارئ۔ میں نہیں پڑھتا۔ یا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یہ رد و ایجاب تین بار رہا۔ آخر تیسری بار جب فرشتہ نے اقرأ کہا تو آپ نے پڑھا اور مالم یعلم تک (فرشتہ کی قرأت کے موافق) پڑھا۔

۴۔ فرشتہ غائب ہو گیا (کہاں گیا کیسے گیا حدیث میں کوئی ذکر نہیں) آپ ترساں لرزاں گھر پہنچے اور اپنی ہلاکت کا اندیشہ ظاہر کیا۔

۵۔ بیوی نے تسلی دی۔ اللہ کی امداد کا یقین دلایا اور ورقہ کے پاس لے گئیں۔ ورقہ سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ یہ ناموس اکبر (جبرئیل) تھے جو موسیٰ کے پاس بھی وحی لے کر آتے تھے۔ الخ

اس حدیث میں کسی جگہ اشارہ بھی نہیں کہ پڑھنے کا حکم دینے والے کے پاس کسی کاغذ یا پتھر یا کپڑے پر لکھا ہوا کچھ موجود تھا جس کو وہ پڑھوانا چاہتا تھا۔ بعض اہل روایت نے جو لکھا ہے کہ ریشمی کپڑے پر ایک تحریر تھی۔ یہ روایت ضعیف الاسناد ہونے کے باوجود درایت کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ وحی ایک ادراکِ وجدانی ہے تحریر خارجی کی محتاج نہیں۔ پھر اقرأ کا مفعول کیا ہے۔ تو ابو عبیدہ کے نزدیک باسم ربک میں باء زائد ہے اور اسم ربک مفعول ہے۔ یعنی اپنے رب کا نام پڑھو۔ بعض نے کہا۔ مفعول محذوف ہے۔ یعنی جو کچھ تمہارے سامنے پڑھا جا رہا ہے اس کو پڑھو۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ پھر پڑھنے سے انکار کا کوئی معنی نہیں۔ حضورؐ نے بیشک پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا تحریر نہیں پڑھ سکتے تھے لیکن اقرأ کے مختصر الفاظ اگر کوئی آپ کے سامنے بولتا تو اس کی نقل تو کر سکتے تھے۔ اپنی زبان کے الفاظ تھے آپ قدرتاً بلیغ اللسان تھے۔ پھر اس کا کیا معنی کہ میں پڑھ نہیں سکتا یا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اور ہی تھی جس کو آپ پورے

طور پر یا بالکل نہیں پڑھ سکتے تھے اور آپ کا انکار اپنی جگہ درست تھا۔ پھر جبرئیل نے دبایا اور حکم دیا: پڑھو۔ تب بھی آپ نے انکار کیا یعنی پڑھنے کے قابل نہیں ہوئے۔ دوبارہ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر تیسری بار دبانے کے بعد پڑھنے لگے۔ حدیث مذکور کے نمبر اول سے معلوم ہوتا ہے کہ سچے خوابوں سے آگے کی منزل تک وحی سے پہلے حضورؐ کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی خواب میں جب تک بیرونی مادی حواس بند اور معطل نہ ہو جائیں قوتِ عقلیہ میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ بیداری میں وہ اپنے ملکوتی وجدان کا مطالعہ کر سکتی اور غیر مادی مبشرات کو حواس مادی کی قید میں رہ کر ادراک کر سکتی۔

اس مضمون کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اہلِ عرفان کے ملفوظات اور تصریحات کی طرف رجوع کریں۔ خواب کیا ہے۔ مادہ پرست اور منکرِ روحانیت اس کی کچھ تاویل کریں۔ تحت الشعور صورتوں کا ادراک قرار دیں۔ یا خارجی چیزوں کے فوق الشعور نقوش کی طرف توجہ۔ اہلِ روحانیت کی شہادت ہی ہمارے لئے قابلِ اعتماد ہے۔ اللہ نے بیرونی اشیاء کا علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہمارے انہی بیرونی حواس کو قرار دیا ہے۔ اگر بقول ارسطو اندرونی پانچ حواس اور بھی ہیں جن کو حسِ مشترک خیال وہم حافظ اور متصرفہ حکماءِ مشائیہ کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے اور اثیر الدین ابہری نیز شیخ ابن سینا نے ان کی تقلید میں ان پانچوں کے ناموں اور کاموں کی صراحت کی ہے تب بھی مشاعر باطنہ یا اندرونی حواس بغیر ظاہری حواس کے بیکار ہیں۔ جو کچھ باہر سے اندر جاتا ہے وہ بیرونی حواس کے ذریعہ سے ہی جاتا ہے۔ پھر اندرونی حواس بھی بقول ارسطو بجائے خود مدرک اور عالم نہیں بلکہ آلۂ ادراک ہیں۔ ادراک کرنے والا نفسِ ناطقہ ہے۔ بیرونی جزئیات کا احساس ظاہری حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے حسِ مشترک کی قوت بیرونی صورتوں کو ظاہری حواس کے ذریعہ سے حاصل کر کے قوتِ خیالیہ کے پاس جمع کر دیتی ہے اور بیرونی حاصل شدہ صورتوں سے قوتِ واہمہ معانی جزئیہ کا استخراج کر کے قوتِ حافظہ کے سپرد کر دیتی ہے اور قوتِ متصرفہ ان جزئی صورتوں اور ان کے معانی میں صحیح یا غلط توڑ مروڑ کرتی رہتی ہے اور نفسِ ناطقہ ان صور اور معانی کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کے اندر سے کلی اور عام صور و معانی کا استنباط کرتا ہے۔ بیرونی مادی اشیاء کے علم حاصل کرنے کی یہ آخری حد ہوتی ہے لیکن موجودات کا حصر صرف مادیات میں ہی نہیں ہے۔ اول تو خارج میں صرف جزئیات یعنی افراد و اشخاص ہی موجود ہیں حقائقِ عامہ کا بالذات کہیں وجود ہی نہیں۔ ان کا وجود صرف ذہنی ہے۔ نفسِ ناطقہ ہی ان جزئیات کے اندر سے حقیقتِ کلیہ کا استنباط کرتا ہے۔ پھر کائنات اور موجوداتِ ذہنیہ بھی صرف یہی حقائقِ کلیہ نہیں جن کا استخراج و استنباط نفسِ ناطقہ باہر سے لائے ہوئے جزئیات سے کرتا ہے بلکہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

کچھ مجردات بھی ہیں۔ غیر مادی اُن کا علم بھی نفس کو کسی نہ کسی طرح اور صحیح یا غلط ہوتا ہی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ کے اندر کچھ غیر مادی نقوش بھی ہیں جن کا مطالعہ نفس کرتا ہے۔ مبدء معاد اور عقولِ عشرہ اور واجب تعالیٰ کی صفات اور تمام الٰہیات یہاں تک کہ خود نفسِ ناطقہ کی حقیقت یہ تمام چیزیں غیر مادی ہیں اور بقول فلاسفۂ قدیم نفسِ ناطقہ کو ان کا علم ہوتا ہے لیکن کیسے ہوتا ہے اس کی کوئی توضیح و تفصیل حکمائے مشائیہ نے نہیں کی۔ صرف اہلِ عرفان نے اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے باوجودیکہ اہلِ حق باطنی حواس کی جداگانہ طاقتیں نہیں مانتے مگر عقل کو مدرک اور اندرونی و بیرونی حواس کو آلۂ ادراک ضرور کہتے ہیں مگر عقلی ادراک کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ کبھی عقل کے ذریعہ سے اشیاء کا صحیح علم ہو جاتا ہے اور کبھی غلط باقی غیر مادی حقائق کی بارگاہ میں اور الٰہیاتی حدود میں ان کے نزدیک براہِ راست عقل کا قدم رکھنا ناممکن ہے۔ اہلِ مشاہدہ کہتے ہیں کہ ہر انسان میں عقل سے بالاتر ایک اور علمی طاقت ہے جس کو وجدان یا شہود کی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ عقل کا علم تو صرف کسبی اور تحصیلی ہوتا ہے لیکن شہود و وجدان عالم معائنہ اور ملاحظہ سے ہوتا ہے۔

الٰہیاتی دربار سے عقل کو جو کچھ ملتا ہے وہ وجدان کے دروازہ سے مل سکتا ہے۔ اس کے بغیر غیر مادی حقائق کا ادراک ناممکن ہے بلکہ اس مادی کائنات کا علم جو صرف عقلی بغیر وجدان کے ہو وہ کبھی صحیح ہوتا ہے کبھی غلط مگر وجدان کا علمی فیصلہ قطعی صحیح ہوتا ہے۔ پس جس شخص کے شہود وجدان کی قوت تیز ہے اس کا علم وسیع بھی ہے اور صحیح بھی اور جس کی قوتِ وجدانیہ کمزور ہے اس کا علم بھی کمزور ہے۔ مگر کمزوری کے باوجود

ہوتا صحیح ہے۔ یہی قوت براہِ راست ملاءِ اعلیٰ کا مطالعہ کرتی ہے اور یہی قوت اس مادی کائنات کی حقائق کو مشاہدہ بھی کرتی ہے۔ اس کے سامنے تمام غیر مادی اور مادی عام حقائق متشخص اور نمایاں ہوکر آتی ہیں۔ انسان کی کلیت اور جبرئیل کی حقیقت کو تشخص اور تعیین کے ساتھ بھی دیکھتی ہے۔ ہر انسان صاحبِ وجدان ہے۔ مگر عام طور پر لوگوں کا وجدان مغلوب اور مادی انہماک غالب ہے۔ جب تک مادی انہماک اور بیرونی استغراق میں کمی نہیں کی جائے گی اور آمیزش کے باوجود مادی چیزوں کی آلائش اور آویزش سے نفس کو بچایا نہیں جائے گا، وجدان میں تیزی نہیں آئے گی۔ خواب میں بیرونی حواس بالکل یا اکثر معطل ہوتے ہیں اس لئے بیرونی مادی تعلقات میں کمزوری آتی ہے یا بالکل انقطاع ہو جاتا ہے لیکن حواسِ باطنہ یا ذہن کے اندر پہلے سے آئی ہوئی صورتیں یا معانی ہوتے ہیں اُن سے نفس کا تعلق باقی رہتا ہے اور نفس اُن ہی کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔

نفس کی پیشی کرنے والی طاقت ذہنی موجودات کو ہی غلط یا صحیح ترتیب کے ساتھ نفس کے سامنے لاتی ہے۔ موجوداتِ ذہنی میں نفس کی مشغولیت کے باوجود چونکہ بیرونی مصروفیات و توجہات کی کامل یا بیشتر بندش ہو چکی ہوتی ہے اس لئے نفس کو ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ بالا یعنی غیر مادی حقائق کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ مجرد حقائق کا مشاہدہ غیر مادی اشکال میں کرتا ہے۔ گویا خواب میں نفس کے کم و بیش دو مشغلے ہوتے ہیں۔ ایک رُخ تو باہر سے بیداری میں آئی ہوئی صورتوں اور اُن کے معانی کی طرف ہوتا ہے اور انہیں کے اُلٹ پھیر میں نفس مشغول ہوتا ہے۔ اس وقت یہ توڑ جوڑ بیرونی واقعات کے موافق بھی ہوتی ہے اور غلط بھی لیکن اگر نفس کا تعلق باہر سے آئی ہوئی معلومات سے بہت کمزور ہے تو پھر اس کی وجدانی طاقت تیز ہوتی ہے اور اس کا رُخ کامل طور پر عالمِ بالا کے غیر مادی نقوش کی طرف ہوتا ہے۔ اول صورت میں تو ممکن ہے کہ بیرونی واقعات ذہن کے اندر دیکھی ہوئی صورتوں کے خلاف ہو جائیں لیکن دوسری صورت میں نفس کا وجدانی علم بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوتا ہے۔ انہی منامی صورتوں کو سچا خواب یا مبشرات کہتے ہیں اور نفس کی تجردی اور وجدانی طاقت کی کمی بیشی کے لحاظ سے ہر شخص کو کم و بیش سچے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان مبشرات کا حصول اور عالمِ بالا سے تعلق صرف خواب میں ہوتا ہے بیداری میں بیرونی مشاغل کی وجہ سے نفس کو تجرد اور یکسوئی کا موقع ہی نہیں ملتا کہ بارگاہِ تجرد میں اس کی رسائی ہو سکے۔ اس لئے مبشرات کا حصول بیداری میں نہیں ہوتا۔ ہاں کچھ نفوس ایسے بھی ہوتے ہیں جو باہمہ بے ہمہ ہونے کی وجہ سے کسی کسی وقت بیداری میں بھی ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ ملکوت کی سیر کرتے اور نقوشِ مجردات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ شروع میں ان کے نفوس مشاغلِ مادیت کے ساتھ آمیزش اور اختلاط رکھنے کے باوجود آلودگی سے پاک ہوتے ہیں اس لئے مبشرات کا پیہم نزول ان پر ہوتا رہتا ہے اور ان کا ہر خواب سپیدۂ صبح کی طرح واقعاتی دنیا میں نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے نفوسِ قدسیہ کی وجدانی اور شہودی طاقت اتنی غالب اور قوی ہو جاتی ہے کہ بیداری میں بھی ان کا رُخ غیر مادی حقائق ملکوتیہ کی طرف ہونے لگتا ہے بلکہ ملکوتی طاقت ان کے وجدانی رُخ کو خود اپنی طرف کھینچنے اور موڑنے لگتی ہے۔ شروع میں اس ملکوتی جذب و انجذاب سے ان کو کچھ تکلیف ہوتی ہے اور معاملہ چونکہ ابتدائی ہوتا ہے اس لئے وہ لرزاں اور ترساں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جوں جوں وجدانی طاقت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی ان کی اُنسیت ملاءِ اعلیٰ سے بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا وجدان صرف اپنی ہی لوح کے نہیں بلکہ ساری کائنات کے نقوش پڑھنے لگتا ہے۔

پس اقرأ کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی لوحِ وجدان کو پڑھو جس پر اللہ کا رب خلاق اور معلم کل ہونا لکھا ہوا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ حکمِ قرأت کا یہ مطلب ہے کہ لوحِ کائنات کو پڑھو جس کی تحریر بغیر کسی نقطہ کی کمی بیشی کے لوحِ وجدانِ انسانی کے مطابق ہے۔

رسول اللہ پر مبشرات کا تواردِ پیہم ہوتا رہا تھا۔ طبیعت خلوت پسند ہو گئی تھی۔ مراقبہ کی طاقت میں روشنی آگئی تھی۔ بابِ وجدان کھل گیا تھا۔ لیکن ابھی وجدان میں وہ طاقت اور تیزی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ بیداری میں بھی نقوشِ وجدانی پڑھ سکتے اس لئے حکمِ قرأت ملنے کے جواب میں آپ نے فرمایا میں پڑھ نہیں سکتا یعنی نقوشِ وجدان تک ابھی میری وجدانی رسائی نہیں۔ یہ جواب سن کر سب سے بڑی ملکوتی طاقت نے آپ کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا دباؤ ڈالا تاکہ اس طاقت کا زور ٹوٹ جائے اور بقیہ کثافت دور ہو جائے۔ لیکن پہلی مرتبہ جذب سے پورا فائدہ نہیں ہوا۔ اور تحریرِ وجدان پڑھنے کی صلاحیت بروئے کار نہیں آئی۔

اسی طرح دوبارہ حکم اور اس کا جواب اور جذب و انجذاب ہوا۔ پھر بھی کامل طور پر انجلاء عرفانی نہیں ہوا۔ آخر تیسری بار جب ملکوتی طاقت غالب آئی تو اس کے دباؤ نے کا یا پلٹ دی۔ اب وجدانِ قلبی کی تحریر بھی پڑھنے کی قابلیت نمودار ہو گئی اور صفحۂ کائنات کے مخفی نقوش بھی۔ اور نقوشِ وجدانی پڑھنے کے بعد زبان پر وہی الفاظ رواں ہو گئے جو روح اعظم نے پڑھے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس جگہ اہلِ تصوف سے کچھ اصطلاحات مستعار لی ہیں اور توجہ عارفین کے تاثیر کے لحاظ سے چار مراتب قائم کر کے ہر مرتبہ کا نام جدا جدا بیان کیا ہے۔ اول ضعیف ترین توجہ کا نام تاثیر انعکاسی ہے۔ کسی کامل کے پاس رہنے سے مرید میں ایک خاص عرفانی اثر پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک ہم نشینی اور قربِ صحبت رہتا ہے اس کے بعد زائل ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص خوب عطر لگا کر مجلس میں آئے اور خوشبو سے حاضرین کے دماغوں کو معطر کر دے اور مجلس سے چلا جائے یا حاضرین اٹھ جائیں تو کسی کے دماغ میں خوشبو باقی نہیں رہتی۔ توجہ کی دوسری قسم کا نام تاثیر القائی ہے۔ مرشدِ کامل مرید کے دل میں اپنی توجہ سے کچھ روشنی اور ہدایت کا ذخیرہ پیدا کر دیتا ہے لیکن اس کے نفس اور لطائف کی درستی نہیں ہوتی۔ اس لئے مصائب و آفات یا عیش و راحت کے حملوں سے روشنی بجھ جاتی ہے جیسے کسی چراغ میں تیل اور بتی موجود ہو اور کوئی دیا سلائی گھس کر اس کو روشن کر دے اور وہ کچھ مدت تک روشن بھی رہے لیکن تیز ہواؤں اور اندھیوں کا طوفان اس کو بجھا دے اور وہ طوفان کے مقابل اپنی روشنی قائم نہ رکھ سکے۔

تیسری قسم کا نام تاثیر اصلاحی ہے۔ اس صورت میں مرید کے ظرف اور سمائی اور حقوقِ شرع کی نگہداشت کے موافق مرشد کے قلب سے مرید کے قلب میں عرفانی رَو آتی ہے اور آتی رہتی ہے۔ لیکن اگر مرید کا قلب صاف نہ رہے یا مرید کے دل کو مرشد کے دل سے دُوری ہو جائے تو توجہ کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی دریا سے نہر نکال کر کسی خزانے میں پانی جمع کیا جاتا ہے اور پھر نالی کھود کر حوض میں پانی لاتے ہیں۔ پس حوض میں پانی اتنا ہی آتا ہے جتنی اس کی اور درمیانی نالیوں کی وسعت ہوتی ہے لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ نالیاں صاف ہوں کوڑے کرکٹ سے پٹی نہ گئی ہوں اور حوض بھی درست ہو شکستہ نہ ہو۔ اگر حوض شکستہ اور نالیاں گندی اور کوڑے سے بھری ہوئی ہوں گی تو پانی پہنچنے میں کمی ہو جائے گی یا سلسلہ ہی بند ہو جائے گا۔ پھر نالیاں زیادہ دُور تک بھی نہ ہوں ورنہ راستہ کی رکاوٹیں پانی کو حوض تک پہنچنے ہی نہ دیں گی چوتھی قسم کا نام تاثیر اتحادی ہے۔ اس میں شیخ اپنی روح کو طالب کی روح سے بالکل متصل کر دیتا ہے۔ قرب و اتصال اتنا قوی ہوتا ہے کہ گویا دو قالب اور ایک روح ہوتی ہے۔ اس صورت میں روحِ مرشد کا ہر کمال طالب کی روح میں سما جاتا ہے جیسے کسی رنگ میں کپڑے کو ڈبو دیا جائے تو وہ بھی رنگین ہو جاتا ہے اور کپڑے کے ساتھ رنگ کا اتصال اتنی قوت کے ساتھ ہوتا ہے کہ رنگ اور رنگین میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ تاثیر اتحادی کا مرتبہ سب مراتب سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تاثیر اتحادی کی وجہ سے طالب کی صورت بھی مرشد کی طرح ہو جاتی ہے اور شکلوں میں بھی فرق باقی نہیں رہتا۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد حضرت جبرئیل نے چمٹانے اور دبانے کو تاثیر اتحادی کا ذریعہ بتایا ہے جس کی وجہ حضور اقدس اس وقت بالکل ملکوتی رنگ میں رنگے گئے اور جس کا مطالعہ یا تلاوت جبرئیل کر رہے تھے اسی کا مشاہدہ اور قرأت آپ بھی کرنے لگے۔ لیکن اس فقیر کے خیال میں حضرت شاہ صاحب کی یہ صراحت ناقابلِ قبول ہے۔ کیونکہ تاثیر اتحادی کے بعد تو مرید کا اپنا رنگ بالکل فنا ہو چکتا ہے۔ موانع اور حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ مرشد اور طالب دونوں یک روح ہو جاتے ہیں۔ پھر مرید کے اندر سے مرشد کا رنگ چند منٹ کے لئے دور ہونا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ آخری مرتبہ نبوت میں معراج کے بعد یہ تاثیر پیدا ہو سکنے کا امکان ہے۔ آغاز نبوت میں تو اس کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا حضور کا ترساں لرزاں واپس آنا اور بیوی خدیجہ سے اپنی ہلاکت کے اندیشہ کا اظہار کرنا اور پھر ورقہ کے پاس دریافت حال کے لئے بیوی کے ساتھ جانا تو بتا رہا ہے کہ آپ اس وقت تک پورے طور پر جبرئیل سے واقف بھی نہیں ہوئے تھے اور سکونِ خاطر کے طلبگار تھے۔ اتحاد کے بعد تو نہ کسی سکون کی طلب رہتی ہے نہ کوئی بیگانگی۔ لیکن رسول اللہ کو اس وقت تک بیگانگی باقی تھی۔ ہاں اس کو تاثیر اصلاحی کا مرتبہ کہا جا سکتا ہے جس میں بعد مسافت یا دوری یا راہ کے موانع کی وجہ سے فیضان کا سلسلہ عارضی طور پر بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی وحی کے بعد پھر ایک مدت

تک وحی کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور آپ پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ کی پیاس میں بہت شدت ہوگئی اور پانی کی طلب بڑھ گئی۔ اگر تاثیر اتحادی ہو چکی ہوتی تو نہ طول زمانہ کا پھر کوئی اثر پڑتا نہ طلب میں شدت ہوتی۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

اقرء امر کا صیغہ ہے اور امر بھی وجوب کے لئے ہے اور اس وقت پڑھنا آپ کے لئے ناممکن تھا۔ کیونکہ آپ قرأت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے اسی لئے آپ نے ما انا بقاری فرمایا تھا اور ما لا یطاق فعل کرنے پر مکلف کرنا عقلاً محال ہے اس لئے حضرت شاہ صاحب اور بعض دوسرے اہلِ تفسیر نے اس امر کو تکلیفی نہیں تلقینی قرار دیا ہے۔ جیسے چھوٹے بچے سے اس کا استاد یا باپ کہتا ہے پڑھو حالانکہ وہ پڑھنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔

استاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا میں کہوں تم بھی اسی طرح کہو۔ اس فقیر کے نزدیک اصل شبہ ہی لغو ہے۔ کوئی تحریر یا کتاب پڑھانے کا امر ہی نہیں تھا بلکہ نقوشِ وجدان اور تحریرِ آفاق پڑھنے کا حکم دیا تھا اور اس صحیفہ کو پڑھنا حضور کے لئے ناممکن نہیں تھا اس وقت دشوار ضرور تھا اسی لئے حضور نے جواب میں فرمایا تھا۔ ما انا بقاری میں پڑھ نہیں سکتا۔ اگر ناممکن ہوتا تو چند لمحات کے بعد ہی ناممکن ممکن کیسے بن جاتا۔ اور تیسری بار اقرء سننے کے بعد آپ کیسے پڑھنے لگتے۔ ایجاب اور تکلیف میں کوئی فرق نہیں۔ امر تلقینی تو استحبابی ہوتا ہے ایجابی نہیں ہوتا اور حکم کی تعمیل رسول اللہ پر واجب تھی۔ کیونکہ حکم خدا تھا لہٰذا اس کو تلقینی نہیں کہا جا سکتا یقیناً تکلیفی ہی تھا مگر تکلیف ما لا یطاق نہ تھی تکلیف بالعسیر تھی اور عسر تھوڑی دیر کے بعد دور ہوگیا۔

اقرء میں امر قرأت ہے اور جس چیز کو پڑھنے کا حکم تھا اس کا ذکر بعد کو کیا گیا۔ اس لئے بعض اہلِ علم کو شبہ ہوا کہ شاید اقرء وحی کا جز نہیں، بلکہ جبرئیل کا کلام ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے سورہ کافرون و اخلاص و فلق و ناس کے شروع میں جو لفظ قل آیا ہے اس کو بھی سورتوں کا جز قرار نہیں دیا۔ مگر یہ قول بے بنیاد ہے۔ آغاز نبوت کلام جبرئیل سے نہیں ہوا کلام اللہ سے ہوا تھا۔ اگر اقرء کو جز وحی یا جز سورت نہ قرار دیا جائے تو آئندہ کلام باسم ربک الذی خلق الخ کا تعلق کس سے قرار دیا جائے گا۔ نتیجہ میں یہ جملہ بلکہ اس کے بعد والا حصہ مالم یعلم تک بھی جز وحی نہ ہوگا۔ کیونکہ آئندہ جملہ کا افتتاح بھی اقرء ہی سے کیا گیا ہے اور جو متکلم پہلے اقرء کا ہے وہی دوسرے اقرء کا بھی متکلم ہے۔ پھر جار مجرور کی وابستگی تو کسی فعل سے ضروری ہے۔ جب اس اقرء سے تعلق نہ ہوگا تو کسی محذوف فعل قرأت سے ہوگا۔ جیسے سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کا کوئی متعلق محذوف ماننا پڑتا ہے پس کلام اس طرح ہوگا کہ جبرئیل نے کہا پڑھو (اللہ کا یہ کلام) پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ۔ یہ ترکیب کلام علاوہ غیر مفید ہونے کے انتہائی لغو اور بھدی بھی ہوگی۔ حقیقۃً جبرئیل نے اپنی طرف سے کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ نہ اپنا جبرئیل ہونا ظاہر کیا تھا۔ ایک ملکوتی حقیقت تھی جس نے انسانی لباس میں آکر کلامِ خداوندی حضور کے سامنے پڑھنا شروع کر دیا۔ اقرء ضرور دوسرے الفاظ وحی کی طرح جبرئیل کی زبان سے نکلا تھا۔ مگر حکمِ قرأت دینے والے جبرئیل نہیں تھے بلکہ خدا تھا۔ اسی طرح لفظ قل خواہ سورتوں کے آغاز میں ہو یا کلام کے درمیان اللہ ہی کے کلام کا جز ہے بلکہ جتنے امر کے صیغے رسول اللہ کو مخاطب کر کے قرآن میں آئے ہیں وہ سب کلام الٰہی کے ہی اجزاء ہیں۔ کتاب یا خط کے اندر مصنف یا کاتب اگر اعلم یا لبث نا سند یہ جاننا چاہئے کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو وہ الفاظ اسی کتاب یا خط کے اجزاء ہوتے ہیں

بِاسْمِ رَبِّكَ۔ اپنے رب کے نام کے ساتھ۔ یہ سورت ابتدائی ہے اور سارے عالم کے خلاف پیامِ انقلاب ہے۔ اور انقلاب کی بنیاد ہے توحید۔ لہٰذا تقاضائے وقت و ضرورت تو یہ تھا کہ اس طرح کہا جاتا۔ اقرء باسم اللہ الواحد یا باسم اللہ الذی لا الٰہ الا ہو۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اللہ الواحد یا اللہ الذی لا الٰہ الا ہو کی بجائے اللہ کے تین خصوصی اوصاف بیان کئے تاکہ اوصاف کی روشنی میں توحید الوہیت ثابت ہو جائے ہم افتتاحی مقالہ میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ آغازِ نبوت کے زمانے میں کچھ لوگ۔ اللہ ہی کے منکر تھے ان کو وجودِ خدا کا ہی انکار تھا۔ اور بیشتر لوگ اللہ کی الوہیت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ وہ خدا کو مانتے ضرور تھے، وہ اللہ کی الوہیت کے قائل ضرور تھے مگر توحید الوہیت ان کو تسلیم نہ تھی۔ کوئی تعددِ الوہیت کا قائل تھا کوئی تجزیۂ الٰہ کرتا تھا۔ الوہیت کی کوئی مستقرہ حقیقت ان کے سامنے نہ تھی۔ کوئی لاکھوں ارباب اور دیوتاؤں کو مانتا تھا۔ کوئی عالم کے اقتدار کو ذاتی حق جانتا تھا۔ کوئی انسانی دانش کو تعلیمِ خداوندی سے بے نیاز سمجھتا تھا

غرض تجزیۂ ذات کے علاوہ تفصیل صفات میں اتنا اختلاف تھا کہ کوئی رعدانی مرکزی نقطہ ہی نہ تھا۔ تشبیہ تجسیم اور شرک صفات مختلف نظریات و مسلمات تھے۔ مخلوق و خالق اور عبد و معبود کے درمیان کوئی حد فاصل نہ تھی۔ انکار کی یہی بنیادی غلطیاں تھیں جن کو اول دور کرنا ضروری تھا۔ تاکہ غلطیوں کے ازالہ کے بعد فکر انسانی کے سامنے بے داغ آفتاب الوہیت آجائے اور الوہیت کا ایک مرکزی تصور انسانوں کے ذہنوں میں جم جائے۔

یوں تو اللہ کو ایک بڑے معبود اور دیوتا اور بادشاہ کی حیثیت سے بہت لوگ جانتے اور مانتے تھے مگر صفات الوہیت کی کوئی ٹھوس حقیقت ان کے سامنے نہ تھی اسی لئے ذاتِ الوہیت بھی ان کی فکر و نظر سے مخفی تھی۔ آغازِ نبوت میں الوہیت کی انہیں تین صفات کا بیان ضروری تھا تاکہ اللہ کی ایک واضح متشخص متعین ہستی سامنے آجائے اور فکری غلطی کرنے والے یا وادیٔ حیرت میں بھٹکنے والے صحیح صفات کا تصور کر سکیں اور صفات کی روشنی میں وحدتِ الوہیت سمجھ جائیں۔

باسم۔ میں ب قول ابو عبیدہ بار زائد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مصاحبت کے لئے ہے۔ یعنی اللہ کا نام لیتے ہوئے یا اس کے نام کی برکت کے ساتھ پڑھو۔ بعض نے استعانت کے لئے بار کو قرار دیا ہے یعنی اللہ کے نام کی مدد سے پڑھو۔

اسم کا معنی ہے نام۔ لیکن اس سے عَلَم مراد نہیں ہے۔ کیونکہ علم تو تنہا ذات پر دلالت کرتا ہے جس کے اندر صفات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا یا صفات کا مبہم اور دھندلا سا تصور بھی ہوتا ہے لیکن اس کی طرف ذہنی توجہ بالکل نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی مجرد ذات کا تصور ناممکن ہے۔ اس کی حقیقت کس ذہن میں سما سکتی ہے۔ اس لئے ذات سے استعانت یا تبرک کی تمنا کس طرح کر سکتا ہے معلوم ہوا کہ اسم سے اسمِ صفت مراد ہے لیکن باری تعالیٰ کی صفات کا حقیقی تصور بھی ناممکن ہے۔ صفات قدیم لامحدود کی حقیقت انسانی محدود دماغ میں نہیں آسکتی۔ ہمارے پاس جو سرمایۂ استعانت و تبرک ہے وہ صفات کے اسماء ہیں اس کی ربوبیت اور خلاقیت کی حقیقت ہماری ذہنی رسائی سے ماوراء ہے۔ ہم جو کچھ اس کی ربوبیت، خلاقیت اور دوسری صفات کی تشریح کرتے ہیں اس سے پوری حقیقتِ صفات کی تصویر کشی نہیں ہوتی ایک مبہم سا نقشہ دماغ میں آجاتا ہے جو صفات کی حقیقت سے ہمارے ذہنوں کو قریب کر دیتا ہے پس اسماء صفات سے بھی مراد وہ اسماء ہیں جو اللہ نے اپنی صفات کے لئے مقرر کر دئیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جگہ نہ باللہ فرمایا نہ بربک، بلکہ باسم ربک فرمایا۔

ربوبیت کا معنی اور دونوں قسمیں یعنی تکوینیہ اور تشریعیہ ہم ابتدائی تقریر میں واضح کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا جان لینا ضروری ہے کہ ہر چیز کو حالتِ عدم سے وجود میں لا کر اس کے مناسب ترقی دے کر حد کمال تک پہنچانے والا اللہ ہی ہے۔ گھاس کی ہر پتی، درخت کی ہر کونپل، ریت کا ہر ذرہ اور سمندر کا ہر قطرہ اپنے وجود، بقاء وجود، ترقی وجود اور کمالِ زندگی میں اسی کا محتاج ہے۔ کرور در کرور عالمین کے لاتعداد سیارات اور خلیات کی بقاء و ترقی اسی کی حکمت قدرت اور کرم سے وابستہ ہے۔ ارواح مجردہ ملکوتی ہوں یا اجسام ناسوتی کوئی بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ پس وہ رب العالمین ہے اور رب الناس بھی اور رب الاولیاء والانبیاء بھی۔ لیکن صرف ربک فرمایا اور دو بار فرمایا اور ربوبیت عامہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اول ترین وحی میں اول ترین خطاب کا موقع ہے اور روئے خطاب رسول اللہ کی طرف ہے۔ اس لئے ربوبیت عامہ کا ذکر چھوڑ کر اس خصوصی ربوبیت کو یاد دلایا جو صرف حضور کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی تاکہ مخاطب کے ساتھ متکلم کا ایک خصوصی ارتباط ظاہر ہو اور مخاطب کے ذہن میں اپنی پستی اور متکلم کی بلندی کی وجہ سے جو حجاب تھا وہ اٹھ جائے اور وہ سمجھ جائے کہ اللہ میرا خصوصی مربی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یوں تو ہر ذرۂ کائنات اللہ کی صفتِ ربوبیت کا مظہر ہے مگر روحانیت و جسمانیت اور نور و ظلمت کا مجمع البحرین کوئی بھی نہیں۔ انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو ذلیل ترین مخلوق سے زیادہ ذلیل اور عزیز ترین ملائکہ سے زیادہ معزز ہے۔ یہ نفسانیات و روحانیات اور مادیت و تجرد کا سنگم ہے۔ پھر انسان بھی سب ایک طرح کے نہیں۔ ربوبیتِ الٰہیہ کے مظہر سب ہیں۔ لیکن

میں کمی بیشی ہے۔ کیونکہ انسانوں کی صلاحیتوں میں اختلاف ہے۔ سب سے برتر مظہر ربوبیت انبیاء کی ہستیاں ہیں جن کی تخلیق گو عنصری ظہور میں ہے مگر ان کی نگاہِ وجدان پلک جھپکتے میں عرش بریں کے پار ہو جاتی ہے۔ پھر صف انبیاء میں مظہر اتم اور جلوہ گاہ اکمل رسول اللہ کی ذات قدسی صفات ہے۔ جس رُخ سے آپ کو دیکھا جائے ربوبیت الٰہیہ کا نور پھوٹتا نظر آتا ہے اسی لئے ربک فرمایا۔ پہلے ربک سے شاید ربوبیت تکوینیہ اور دوسرے ربک سے ربوبیت تشریعیہ کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ وہ رب جس نے (تمام عالم کو) انداز ے کے ساتھ پیدا کیا۔ (خصوصاً) انسان کی تخلیق علق سے کی۔

خَلَقَ (باب ضرب) عدم سے وجود میں لانا۔ کسی شی کا اندازہ کرنا۔ ہموار چکنا اور نرم بنانا۔ گویا خَلْقٌ کا مفہوم ہے اندازہ کے تحت درستگی کے ساتھ کسی چیز کی ایجاد۔ ہر قسم کی تبدیلی اور تطور کا نام خلق نہیں بلکہ وہ خاص تبدل و تطور اور تغیر جو عدم سے نکل کر وجود کے دائرہ میں آنے سے ہوتا ہے خلق کہلاتا ہے۔ الانسان میں الف لام جنسی یا استغراقی ہے۔ یعنی نوع انسانی کے عام افراد یا تمام افراد۔ عَلَقٌ جمع ہے اس کا واحد عَلَقَۃٌ ہے۔ علق کا معنی ہے بستہ خون، یا خون یا جونک (کیونکہ جونک بھی خون پی کر جمے ہوئے خون کے لچھے لوتھڑے کی طرح ہوتی ہے۔)

قدماء مفسرین اور اس زمانے کے بیشتر علماء نے قرآن کی آیات تخلیق میں علق کا ترجمہ بستہ خون ہی کیا ہے۔ جن احادیث صحیحہ میں تخلیقِ جنین کے مدارج بیان کیئے گئے ہیں ان میں بھی لفظ علق کا ترجمہ علمائے حدیث نے بستہ خون ہی کیا ہے۔ لیکن اس زمانے کے ایک فاضل مفسر نے شہادت لغت کا سہارا لے کر جونک ترجمہ کیا ہے جو تقریباً اجماع مفسرین کے خلاف ہے۔ اس کی بحث ہم آئندہ بیان میں کریں گے۔

پہلے خَلَقَ کا مفعول چونکہ عام تھا بغیر ذکر کئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ یعنی اللہ نے علمی اندازہ کے مطابق ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا اور نیست سے ہست کیا۔ لیکن انسان کی تخلیق چونکہ گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے اس لئے دوسرے خلق کے بعد الانسان فرما دیا۔

ہمارے زمانہ کے ایک فاضل عالم نے آیاتِ تخلیق جنین کی تمام قدیم اور جدید تفسیروں کو ارسطو اور جالینوس کی تحقیقات جنین پر مبنی قرار دیتے ہوئے غلط کہا ہے اور صحابہ سے لے کر سرسید، مفتی محمد عبدہ اور طنطاوی تک سب ہی علماء کو آیات کی صحیح تفسیر سے ناواقف قرار دیا ہے۔ شاید کسی سیاسی حکمت کی بنا پر حضرت مولانا محمود الحسن شیخ العلوم فی الہند اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیروں کی غلطی کی صراحت نہیں کی یا ان کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا ورنہ علق کی تشریح جو ان حضرات نے کی ہے وہ چونکہ علمائے سلف کی تصریحات کے موافق ہے۔ اس لئے یقیناً غلط ہی ہونا چاہیئے۔

ارسطو با وجود یکہ انقلاب عناصر کو جائز قرار دیتا ہے لیکن انقلاب نوعی اس کی نظر میں محال ہے۔ انواع جمادات، انواع نباتات اور انواع حیوان سب ارسطو کی نظر میں جدا جدا مستقل حیثیت اور حقیقت ہر نوع کی الگ الگ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ پہلے کوئی چیز نوع نباتی میں داخل تھی۔ پھر اپنی حقیقت بدلتی گئی۔ یہاں تک کہ نوع حیوانی میں داخل ہو گئی، اندر پھر نوع حیوانی کے مدارج ترقی طے کرتے کرتے نوعِ انسانی کے دائرہ میں آگئی۔ ہاں تبدل حالات تطورات اور کیفی و کمی تغیرات ہوتے رہتے ہیں لیکن ان تلونات تشکلات اور تکیفات کی تبدیلی کا اثر حقیقت نوعی پر نہیں پڑتا۔ گویا انسان آغازِ تخلیق سے ہی انسان بنتا ہے۔ انسانی نطفہ انسان کے تمام خواص ماہیت اور لوازم حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اجمال تفصیل خفا ظہور اور ابہام و توضیح کا فرق ہوتا ہے۔ بیض نسوانی کے اندر ہو یا رحم کے اندر تخم انسانی بہر حال تخم انسانی ہی ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت تخم نباتی کے ساتھ نوعی اشتراک نہیں رکھتی۔ نہ گھوڑے گدھے بیل اور بندر کے تخم کی حقیقت سے اس کا ماہیتی اشتراک ہوتا ہے۔ کوئی درجہ ایسا نہیں کہ ہم تخمِ انسانی کا تخم نباتی و حیوانی سے امتیاز نہ کر سکیں۔ گویا اس عنصری دنیا میں انواع

مرکبہ کروروں ہیں اور ہر نوع اپنی جگہ مستقل حقیقت رکھتی ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ ایک نچلی نوع ترقی کر کے بالائی نوع کی حدود میں داخل ہو جائے۔ بلکہ آغازِ آفرینش سے ہر نوع کا تخم اپنی نوعی خصوصیات و لوازم کا حامل ہوتا ہے اور کبھی اپنی خصوصیات ذاتی کو چھوڑ کر دوسری نوع کی خصوصیات حاصل نہیں کر سکتا۔

اصحاب الکمون والبروز تو یہاں تک کہتے ہیں کہ عناصر میں بھی انقلاب نہیں ہوتا۔ کوئی عنصر اپنی حقیقت نہیں بدلتا۔ پانی کا ہوا اور ہوا کا پانی بن جانا محال ہے۔ صرف کیفیات یا اجزاء مخفی کا ظہور ہوتا ہے جس کو ہم انقلاب عنصری کہتے ہیں۔ ورنہ واقع میں خفاء ظہور سے بدل جاتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

ارسطو کے متبعین نے کمون و بروز کے قائلین کے قول کی تردید و تغلیط کر کے ثابت کیا کہ عناصر میں انقلاب ہی ہوتا ہے۔ بشیخ الرئیس نے اشارات میں اس کی کامل تنقیح کی ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں تخلیق جنین پر غور خورد بینی آلات کے ذریعہ شروع ہوا اور پھر فارمیشن تھیوری مانی گئی۔ یعنی مبیض اناث میں جو کامل وجود ہوتا ہے وہ اپنی ابتدائی ساخت میں ہی انسان یا بیل یا گھوڑا یا بندر وغیرہ ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کے تخم حیات میں پورا انسان اپنے تمام لوازم خواص اور اعضاء و اجزاء کے ساتھ موجود ہوتا ہے لیکن مبہم مخفی اور اتنا صغیر ہوتا ہے کہ کسی طرح دیکھا نہیں جا سکتا۔ پھر مبیض کے اندر ہی کھلتا بڑھتا اور واضح ہوتا جاتا ہے اور مبیض ہی اس کے تغیرات کی جولان گاہ ہے۔ ایک ڈچ عالم نے سترھویں صدی میں ہی جراثیم منویہ کو حیاتِ جنینی کی اصل قرار دیا۔ بہر حال مبیضِ اناث کو اصل قرار دیا جائے یا جراثیم منویہ کو۔ ارسطو کا عام نظریہ اپنی جگہ قائم رہا کہ انقلابِ نوعی اس مرکباتِ عنصری کی دنیا میں نہیں ہوتا اس لئے تخمِ انسانی آغازِ آفرینش سے ہی تخمِ حیوانی و نباتی سے ممتاز ہوتا ہے اور نطفۂ انسانی کبھی سادہ نباتی حالت میں نہیں تھا بلکہ انسانی نطفہ ہی تھا تمام امتیازات کو اپنے ساتھ لئے ہوئے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس نظریہ کی مخالفت کی گئی اور نوعی ترقی کے قول کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط میں ڈارون نے ایک کتاب اصلیت انواع لکھی ہے اور اس میں انقلابِ نوعی کا اعلان کیا۔ اس فلسفۂ ارتقاء کا تقاضہ ہے کہ پیدائش کے حیات کے ضابطہ کی ہمہ گیر وحدت تسلیم کی جائے۔ نباتات سے لے کر نوعِ انسان تک زندگی اور زندگی کے نشو و ارتقاء کا قانون ایک ہی ہے اور جس قدر امتیازات و اختلافات محسوس ہوتے ہیں وہ انہی حدود کے اندر اور انہی تدریجی ترتیبات کے مطابق ہیں جو نظریٔ ارتقاء کے لئے مقرر ہیں۔ تمام انواع کی ابتدائی ماہیت اور فطرت ایک ہی ہے۔ فرق صرف احوال اور خصوصیات کا ہے اور یہ فرق بھی ایک باضابطہ ترتیب و تدریج کے زیر اثر ہے۔

انیسویں صدی کے آخر میں ارنسٹ ہیکل نے اصلیت انواع کی تائید اور تشریح میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک نیچرل ہسٹری آف کریئیشن اور دوسری ایوولیوشن آف مین۔ ان دونوں کتابوں میں وحدتِ نوعی کی توضیح کی فطری تخلیقی یگانگت کا اظہار کیا۔ گویا کروروں انواع کی جگہ فلسفۂ ارتقاء نے ایک نوع کو دیدی اور جس چیز کو گزشتہ فلاسفر اور سائنسٹ اجزائے ماہیت اور ذاتیات کا اختلاف کہتے چلے آئے تھے سائنسی نظریہ نے اس کو اختلافِ احوال اور وہ بھی ترتیبی و تدریجی قرار دیا۔

اس نظریہ کے مطابق تخم نباتی ہو یا حیوانی یا انسانی اس کا ابتدائی خلیہ ایک ہی حقیقت اور ایک ہی حالت رکھتا ہے۔ انسانی تخم کے خلیات کی یہ ابتدائی حالت اور یگانگت ایک ہفتہ تک رہتی ہے۔ یہ دوسرے ہفتہ میں ابتدائی خلیات کا کروی مجموعہ نباتی حالت سے ترقی کر کے حیوانی دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور نباتی خلیات سے اس کو انفصال حاصل ہو جاتا ہے۔ کرویت تدریجاً طول میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے واسطے ہیکل نے سول شیپڈ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ پھر تیسرے ہفتہ میں یہ تغیر پختہ ہو جاتا ہے اور طوالت دگنی ہو جاتی ہے جس کو ہیکل نے سینڈل شیپڈ کہا ہے۔ پھر چوتھے ہفتہ میں جنین کے اندر حیوانات لبونہ (گھوڑا اونٹ بندر وغیرہ) کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پانچویں ہفتہ میں جنین کی شکل بعینہ بندر کی ایسی ہو جاتی ہے۔ پھر چھٹے ساتویں ہفتہ میں جنین انسانی آہستہ آہستہ اپنے

قسم کا بندر (گوریلا، شمپانزی وغیرہ) بن جاتا ہے۔ آٹھویں ہفتہ میں انسانی خدوخال اور شکل و صورت نمایاں ہوتی ہے اور انسانی ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وطنی، نسلی، خاندانی، رنگ، شکل اور قوتیں اور اطوار و خصوصیات نمودار ہونے لگتی ہیں اور ابتدائی دو ماہ کے بعد یہ سلسلۂ ترقی مزید چار ماہ سے سات ماہ تک جاری رہتا ہے۔

قرآن اور احادیث مقدسہ کی تصریحات کسی انسان کی قائم کردہ تھیوری اور کسی کے تسلیم کئے ہوئے فلسفی نظریہ پر مبنی نہیں۔ قرآنی حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے، لازوال ہے۔ فلسفے آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ سائنس کے مشاہدے اور تجربے ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہم کسی نظریہ اور تھیوری کو قرآن کی روشنی میں نہ بکمالہ غلط کہہ سکتے ہیں نہ بتمامہ صحیح۔ قرآن جس طرح تاریخ کی کتاب نہیں اسی طرح فلسفہ کی پوٹ بھی نہیں۔ اس کی غرض صرف الٰہیاتی عقائد کی دُرستی اور شخصی و سماجی اعمال کی اصلاح ہے۔ علوم عقلیہ ہمیشہ ناقص رہے ہیں اور ناقص رہیں گے۔ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے لیکن افسوس ہے اُن لوگوں پر جو قرآن کو توڑ مروڑ کر سائنس یا فلسفہ کے سانچہ میں مکمل طور پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جس سائنسی تھیوری یا فلسفی نظریہ سے قرآنی صراحت کو موافق بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بجائے خود مکمل طور پر صحیح نہیں ہے۔ جس طرح پچھلے نظریات کی یکسر تغلیط دَورِ حاضر کے علماء نے کردی اسی طرح آنے والے اہلِ تحقیق موجودہ گروہ کی تنقیحات کا مذاق اُڑائیں گے اور ان کے نظریات کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے۔

اس دور کے ایک ہندی عالم نے ایک چوٹی کی ادبی کتاب لکھی جس کو تفسیر کا نام دیا۔ ڈارون اور ہیکل کے نظریۂ ارتقاء کی مجمل تصویر کشی کرنے کے بعد قرآنی آیات کو اُس سے جا ٹکرایا۔ تمام علمائے سلف کو آیتِ تخلیق کے اصلی مفہوم سے ناواقف قرار دیتے ہوئے اب بیسویں صدی میں تخلیقِ انسانی کی قرآنی صراحتوں کو کامل طور پر سمجھنے کا دعویٰ کیا۔ فاضل مفسّر سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سلف اور خلف کی تمام تفسیروں کو گزشتہ فلسفیوں کے مسلمہ نظریات پر مبنی قرار دیا۔ حالانکہ کسی ایک دوسرے بڑے مفسّروں کے علاوہ علمائے اہلِ سنّت نے کبھی تفسیرِ قرآن کو فلسفی نظریات پر مبنی قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔ اور اہلِ حق نے ہمیشہ قرآن کی تشریح احادیث کی روشنی میں کی اور اسی کو تفسیر قرار دیا۔ ہاں احتمالات لغویہ نے اگر اجازت دی تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک عبارت کے مختلف محمل قرار دیئے مگر تعیین کے ساتھ کسی کو بھی تفسیری درجہ نہیں دیا۔ احتمالاتِ تفسیری جدا چیز ہے اور تعیینِ مراد الگ حقیقت ہے۔ یہی صورت آیاتِ تخلیقِ جنینی میں لفظ علق کی ہے۔ کسی نے ارسطو کی کتاب الحیوانات یا جالینوس کے مکتوبات کو مسلمہ نظریہ قرار دے کر قرآن کو اس سے مطابق بنانے یا اس پر مبنی کرنے کی تفسیری کوشش نہیں کی۔ لیکن ہمارے فاضل مفسّر کی نگاہ نقد کے منتہی پر ذرا نظر ڈالیے کہ کتنی دور رس ہے۔ کسی ایک مفسّر کی تفسیر خواہ صحابی کی ہو یا تابعی کی یا بعد کو آنے والے اہلِ تحقیق کی آپ کو صحیح نظر نہ آئی۔ فرماتے ہیں۔

چونکہ مراتبِ پیدائش کی کوئی ایسی انقلابی حالت ہمارے مفسّروں کے سامنے نہ تھی اس لئے قدرتی طور پر اس کی کوئی ہمتی ہوئی تفسیر ان سے بن نہ آئی اور مختلف وادیوں میں نکل گئے۔ اس کے آگے چند سطر (ا) کے بعد فرماتے ہیں۔ لیکن اگر اس مقام کی شرح و تحقیق کا حق ادا نہ ہوسکا تو اُسے مفسّروں کے تصورِ فہم پر محمول نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس باب میں وہ یقیناً معذور رہتے۔ علم و تحقیق کا یہ گوشہ تمام تر زمانۂ حال کی پیداوار ہے اور زمانۂ حال کی پیداوار میں بھی سب سے آخری عہد کی پیداوار۔

انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ جو تمام علومِ جدیدہ کے انکشاف و تکمیل کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ ہے پورا گزر گیا۔ اور کارخانہ فطرت کے اس گوشۂ مستور کے تمام حجاب نہ اُٹھ سکے۔ پس اگر اٹھارویں صدی کے علماء معذور تھے تو کیونکر کہے جاسکتے ہیں کہ اس بارے میں بالکل غلط رُخ پر جارہے تھے۔ حالانکہ خورد بین ایجاد ہوچکی تھی اور انسانی جسم کی تشریح کا باب بہت کچھ کھل چکا تھا تو ظاہر ہے کہ نویں اور دسویں صدی کے مفسّر ہیں، قرآن کیوں معذور تصور نہ کئے جائیں جن کے سامنے اس سے زیادہ کچھ نہ تھا بجز اس کے کہ ارسطو اپنی

کتاب الحیوانات میں اور جالینوس اپنے مقالات میں لکھ چکا ہے۔ فاضل مفسر نے مذکورۂ بالا حملہ نویں دسویں صدی کے اہل تفسیر پر کیا مگر اس حملے کی زد سے تمام اکابر قدماء محفوظ نہ رہے۔ کیونکہ تبع تابعین ہوں یا تابعین یا صحابہ سب ہی نے علقہ کی تشریح بیک قلم وہی کی ہے جو بقول فاضل مفسر ارسطو کی کتاب الحیوانات کے نظریہ پر مبنی ہے۔ پھر اس سے آگے چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

چونکہ انیسویں صدی کے اواخر تک یہی نظریہ طبور و بروزہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور فن طب و تشریح نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے جس طرح قدیم مفسروں کو شرح و تحقیق آیت میں دشواریاں پیش آئیں اور طرح طرح کی توجیہات کرنی پڑیں اسی طرح مصر اور ہندستان کے بعض نئے مفسروں کو بھی ٹھوکر لگی اور رفاعہ بک طنطاوی حسن پاشا محمود، سر سید احمد خاں، شیخ محمد عبدہ وغیرہم اسی نظریہ کی وادیوں میں گم ہو گئے اور نہیں سمجھے کہ یہ قطع و برید چند سالوں کے بعد یکسر بیکار ہو جائے گی؟[1]

فاضل مفسر اگر ارسطو کے نظریہ کو غلط قرار دیتے ہیں تو ممکن ہے غلط ہو۔ اگر پرنار لیشن تھیوری کو تسلیم نہیں کرتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ تھیوری غیر واقعی ہو۔ لیکن یہ کیا غضب ہے کہ تمام علمائے متقدمین و متاخرین کو یکسر ناواقف اور آیات تخلیق انسانی کی تفسیر سے بے علم قرار دے رہے ہیں اور اس دعوے کی بنا اس پر ہے کہ ڈارون اور ہیکل کا نظریۂ ارتقاء جس کی حقیقت آنکھوں سے دیکھی جا چکی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر کا انکشاف ہے اور اس انکشاف سے فاضل مفسر کے علاوہ کوئی قدیم و جدید عالم واقف نہ تھا اور آیت کی تفسیر کا مدار ڈارون اور ہیکل کے نظریہ کو جاننے پر ہے اس لئے ترجمان القرآن کے علاوہ ہر مفسر نادان اور ناواقف تھا مگر اس ناواقفیت میں اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں کیونکہ آیت کی تفسیر سمجھانے والے استاد ڈارون اور ہیکل پیدا ہی نہیں ہوئے پھر سمجھاتا کون۔ ارسطو سے جا کر سب نے ان آیات کی تفسیر پوچھی مگر وہ بتا نہ سکا اور جو کچھ اس نے بتایا وہ تسلی بخش نہ تھا اس لئے یہ تمام حضرات وادی جہالت میں گم کردہ راہ ہو کر پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ مفسر قرآن جناب ڈارون اور ہیکل کو رحم آگیا اور انھوں نے نظریۂ ارتقاء سمجھایا اور جنین کی تیسرے ہفتہ والی شکل کو بتایا، یہ ہے علقہ یہ ہے نعل نما جونک اور یہی مراد ہے قرآن کی علقہ سے۔

راغب بیچارہ مفردات القرآن میں بہت چلایا کہ بھائیو مفردات قرآنی کا میں سب سے بڑا مترجم ہوں۔ قرآن میں علقہ سے مراد خون بستہ ہی ہے۔ دوسری طرف سے قرطبی نے شور مچا دیا کہ علقہ صرف خون بستہ کو کہتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خون اس رطوبت سے معلق رہتا ہے جو اس میں لگی ہوتی ہے لیکن کسی کو رحم نہیں آیا اور فاضل مفسر نے بانگ دہل اعلان کر دیا ہم نے اس کے لئے (یعنی ہیکل کے بتائے ہوئے لفظ سول شیپڈ اور مینڈل شیپڈ کے لئے) صرف نعل نما حالت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اسی مرتبۂ تحول کو قرآن نے علقہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ علقہ کی تعبیر اس مرتبہ کے لئے ہر اعتبار سے اتنی صاف اور چسپاں تعبیر ہے کہ جونہی میری پہلی نظر اس نعل نما جنین کی تصویر پر پڑی تھی، بے اختیار زبان سے خلق الانسان من علق نکل گیا تھا۔

دیکھا آپ نے اس بلند بانگ دعوے کو کہ اسی مرتبۂ تحول کو قرآن نے علقہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی علقہ کا ترجمہ اللہ کے کلام میں صرف جونک ہے اور جونک سے مراد ہے نعل نما لمبوتری شکل کا جنین جس کی عمر دو ہفتے سے تین ہفتے تک ہوتی ہے اور جو حیوانات لبونیہ کے دائرہ میں داخل ہو چکا ہے۔ یعنی حیوانات لبونیہ کے جنین میں اور انسان کے جنین میں اس مرتبہ کے اندر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یا للعجب۔ جو مفسر تمام مفسروں کی تفسیر کی تغلیط اس وجہ سے کر رہا ہے کہ ان کی تفسیر کا مدار ارسطو کے نظریہ پر ہے۔ حالانکہ قرآن اٹل حقیقت ہے۔ وہی مفسر نہایت بلند آہنگی سے اعلان کر رہا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ نظام تخلیق کو ہیکل اور ڈارون کے ارتقائی نظریہ سے پہلے سمجھنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا اور صراحت قرآنی ڈارون کے نظریہ پر مبنی ہے۔ فاضل مفسر کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ جس طرح ارسطو کی تردید دو ہزار برس کے بعد ڈارون نے کر دی اور محققین نے ڈارون کی ارتقائی تھیوری کو تسلیم کر لیا۔ اسی طرح چند ہی سال میں اہل علم ڈارون

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم مؤلفہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ صفحہ ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۱۵۴

کی تھیوری کو بھی اضحوکۃ العلم قرار دیں گے اور اول ترین مظہر زندگی ایک ننھے سے ذرۂ حیات پروٹوپلازم (Protoplasm) کو کہیں گے جو گھلے ہوئے گوند کے چھوٹے سے قطرے کی طرح لجلجا اور شفاف ہے مگر حرکت کر سکتا ہے۔ اس کے اندر زندگی سرایت کئے ہوئے ہے تمام نباتات اور حیوانات اسی سے پیدا ہوئے۔ علقہ (خون بستہ) اگر رحم کے اندر بدلی ہوئی شکل کے نطفہ کی خون آمیز رطوبت کو قرار دیا جائے تو کیا پروٹوپلازم ہی تو علقہ نہیں ہے۔ اگرچہ یقینی طور پر اس کو بھی ہم تفسیری مراد قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ تشریحی سائنس کا کوئی منتہائے سفر نہیں ہے۔ ہر روز نیا سورج نکلتا ہے اور دنیائے علم میں نئے انکشاف کو لے کر آتا ہے۔

کاش فاضل مفسر ڈارون کی تھیوری کی بجائے آیاتِ تخلیقِ انسانی کی تشریح کے لئے احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے تو ان کو ڈارون کا مسلمہ نظریہ احادیثِ صحیحہ سے اتنا متعارض نظر آتا کہ پھر قرآن کو دارونی فلسفہ کے سانچہ میں ڈھالنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔

مختلف کتب صحاح میں متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رحم کے اندر چالیس روز مجموعۃ الحمل بصورت نطفہ اور چالیس روز بصورت مضغہ رہتا ہے۔ ہم اس جگہ صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ ہے اور راوی بھی قدیم الاسلام جلیل القدر صحابی یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

مطلب حدیث یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مادۂ تخلیق پیٹ میں بصورتِ نطفہ چالیس روز اور بصورتِ علقہ اسی کی مثل اور بصورت مضغہ اتنا ہی رہتا ہے۔ الی آخر الحدیث ۔ اسی کی مثل کی تشریح ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں چالیس روز کی ہے۔

اب ہیکل کے قائم کردہ مدارج جنینی کی فہرست دیکھو کہ سول شیپڈ یا سینڈل شیپڈ کا درجہ اس نے تیسرا رکھا ہے۔ یعنی دوسرے ہفتہ سے تیسرے ہفتہ تک نعل نما شکل مکمل ہو جاتی ہے گویا جونک کی صورت تیار ہو جاتی ہے۔ اب اگر بقول فاضل مفسر علقہ سے مراد یہی نعل نما شکل ہے جس نے نطفہ کو حیواناتِ لبونہ کی صف میں لا بٹھایا ہے تو خدا را بتاؤ کہ وہ کونسا علقہ ہے جس کا آغاز چالیس روز کے بعد سے اور اختتام دوسرے چلے کے ختم پر ہوتا ہے۔ افسوس ایسی سائنس پرستی پر کہ ہیکل کی صرف استقرائی ظنی تشریح کو یقین کا درجہ دے دیا جائے اور صحیح فرمانِ رسول کو ٹھکرا دیا جائے۔ حدیث صحیح ہے کوئی راوی مجروح نہیں۔ روایات میں اختلاف نہیں پھر کیا جواز تفسیری ہے اس بات کا کہ دوسرا چلہ آنے سے پہلے ہم قوامِ نطفی کو علقہ کہہ سکیں۔

پس اس فقیر کے نزدیک علق کا ترجمہ جما ہوا خون ہی اولیٰ ہے جو اگلے پچھلے تمام مفسروں نے کیا ہے اور ظاہر احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن جمے ہوئے خون سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

۱ رحم کے اندر رطوبت نطفیہ یا جراثیم منویہ کی ہیئت اور قوام میں فرق آ جاتا ہے خواہ ارسطو پر کہ مادہ کے خون کا کچھ حصہ اس میں شامل ہو جاتا ہے یا خود اس کا قوام اور رنگ بدل جاتا ہے۔ بہرحال نطفہ کے جراثیم رنگین ہو جاتے ہیں اور جم کر اس میں لجلجا پن آ جاتا ہے۔ یہ کیفیت چالیس روز کے بعد شروع ہو جاتی ہے اور حمل کے دوسرے چلہ کے اختتام تک پختہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے چلہ کے بعد آسی سے مضغہ بنتا ہے۔ اس سے پہلے دو دور گزر چکتے ہیں۔ یوں تو عناصر خصوصاً عنصر ارضی میں گوناگوں تغیرات ہو کر غذا نباتی و حیوانی بن کر انسان کے بدن میں خون بنتا ہے۔ پھر اس خون سے ہی بکثرت تبدیلیاں ہونے کے بعد نطفہ بنتا ہے۔ لیکن حالتِ عنصری سے حالتِ غذائی پیدا ہونا صرف بقائے شخصی کے لئے ہوتا ہے۔ انسان کے بدن کی جو مقدار اور جو قوت حرکاتِ بدنی و نفسانی کی وجہ سے تحلیل ہو جاتی ہے اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے عناصر غذائی کو جو سب کے سب اسی زمین کی پیداوار ہوتے ہیں مقرر کر دیا ہے۔ نباتی اور حیوانی اجزاء انسان کے بدن میں داخل ہوتے اور پیہم ہضم کے بعد جزو بدن بنتے اور ہیئتِ اعضائی اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح آدمی کا بدن جلد فنا ہونے سے بچ جاتا ہے اور انسان کی شخصی زندگی باقی رہتی ہے۔ یہ مکمل ایک دور ہوتا ہے اور انسان کے علاوہ تمام نباتی و حیوانی اجسام بھی اسی طرح باقی رہتے ہیں لیکن اس عہدِ شخصی کے بعد ایک اور دور آتا ہے جب نوع کا تسلسل باقی رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر نبات و حیوان کا نوعی بقا چاہتا ہے کہ ایک فرد سے دوسرا فرد اسی جیسا پیدا ہو اور اس طرح نوعی تسلسل قائم رہے۔ اس کے لئے اللہ نے نر کے بدن کے ہر حصہ کے اندر

جراثیم منویہ کی پیداوار کا سلسلہ قائم کر دیا ہے اور ان کی پیدائش کا مقام جسم کا کوئی مخصوص حصہ نہیں۔ کیونکہ آئندہ انہی سے دوسرا پورا بدن بنتا ہے اس لئے نر کا ہر حقیر ترین حصۂ بدن بھی ان کی پیدائش گاہ ہے۔ انہی کے مجموعہ کو تخم یا نطفہ کہتے ہیں۔ اسی طرح کچھ نطفی جراثیم قابلہ کی پیداوار مادہ کے بدن کے اندر بھی ہوتی ہے اور دونوں کے تلقیحی اتصال سے اُس نوع کے آئندہ فرد کی تیاری ہوتی ہے۔

پس کسی شخصی بدن سے کھنچ کر جراثیم منویہ کا تیار ہونا دوسرے دَور کی نمایاں کارگزاری ہے۔ کیونکہ پہلا غذائی دور بقائے شخصی کے اسباب کی فراہمی کا تھا اور دوسرے دَور میں بقائے نوعی کا سامان مہیا کیا جاتا ہے لیکن جراثیم منویہ بہت سے مُردہ ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں یا تو پہلے ہی سے مردہ ہوتے ہیں یا رحم میں پہنچ کر مُردہ ہو جاتے ہیں اور اُن کی موت کے اسباب گوناگوں ہوتے ہیں۔ جب تمام اندرونی و بیرونی مخالفوں کے حملوں سے محفوظ رہ کر ان کا عمل تلقیح مکمل ہو جاتا ہے تو اب حیاتِ ثانوی کا ابتدائی دَور آتا ہے۔ یہ تیسرا دَور ہوتا ہے تکمیل تلقیح کے بعد اجزائے نطفیہ کے ساتھ کچھ خون یا خون نما اجزائے اناث شامل ہو کر ایک مخلوط گاڑھا لجلجا قوام تیار ہوتا ہے جس کے اندر کرور ہا کرور ذراتِ حیات مخفی ہوتے ہیں شاید انہی کو سائنس والے پروٹو پلازم کہتے ہوں ہم اس کو علقہ کہتے ہیں۔ یہ تیسرا نمایاں دَور ہوتا ہے جو حقیقت میں حیاتِ نوعی کا پہلا ہی دَور ہوتا ہے کیونکہ اس سے پہلے اجزائے نطفیہ بغیر تلقیح کے ناکارہ ہوتے ہیں اور علقہ کی تخلیق عمل تلقیح کے بعد ہوتی ہے۔ اور تلقیح کے بغیر حیاتِ نوعی کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے آیت میں خلق الانسان من علق فرمایا یعنی انسان کی حیاتِ نوعی کے حقیقی ابتدائی دَور کا ذکر فرما دیا۔ لیکن بعض دوسری آیات میں صرف دورِ نطفی یا دورِ نطفی کے ساتھ دورِ ترابی کا بھی ذکر کیا گیا ہے تو اُن میں بقائے شخصی کے اسباب کا بھی تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ تخلیقِ شخصی و نوعی کا پورا خاکہ سامنے آجائے۔

علقہ کے مفہوم کی اس طور پر تشریح کرنے کی صورت میں خلقِ انسانی سے مراد ہوگی وہ تخلیقِ انسانی جو بقائے نوع کے لئے ہوتی ہے یعنی تولیدی اور تناسلی اس وقت الانسان میں الف لام جنسی ہوگا استغراقی نہ ہوگا۔ کیونکہ حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش اس ضابطہ کے زیرِ اثر نہیں ہوئی۔

حضرت آدم کی پیدائش بغیر ماں باپ کے دورِ ترابی کے بعد ہی ہوگئی اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے لئے عملِ تلقیح اور نر کے اجزائے نطفیہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ رطوبتِ مادری نے ممکن ہے علقہ کی شکل کسی نئی تدبیر سے اختیار کر لی ہو۔ مگر مذکورہ بالا ضابطۂ تناسلی کو پیدائشِ عیسیٰ میں کوئی دخل نہیں تھا۔

علقہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ رحمِ مادر کے اندر جو خون بستہ ہو جاتا ہے وہی علق سے مراد نہیں ہے بلکہ عام خون مراد ہے۔ علق کا یہ مفہوم اگرچہ راغب اور قرطبی کے بیان کے خلاف ہے لیکن صاحبِ قاموس اور دوسرے اہلِ لغت نے لکھا ہے اور لغوی شہادتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور بعض اہلِ تفسیر (مثلاً حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ) نے لکھا بھی ہے۔ گویا اس وقت آیت میں تخلیق سے مراد ہوگی عام تخلیق۔ ہر شخص کی تخلیق آدم ہوں یا عیسیٰ کوئی بھی اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر شخص کا بقائے شخصی خون پر موقوف ہے۔ تمام اعضائے بدن کی ساخت کا مدار خون ہی پر ہے۔ لہٰذا اگر خون نہ بنائے تو بدنی ساخت اور بقائے ساخت کچھ بھی نہ ہو۔ ہر انسان کی بناوٹ اللہ نے خون پر موقوف رکھی ہے۔ ہر بچہ پیدائش سے پہلے اگر ماں کے پیٹ میں ہو اور پیدائش کے بعد جب زمین پر آگیا ہو غذائے دموی کا محتاج ہے اس لئے استغراق کے ساتھ خلق الانسان من علق کہنا صحیح ہے۔ واللہ اعلم

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الاکرم بڑے اور بہت کرم والا سب سے زیادہ کریم۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ کرم کا معنی ہے کسی کو اس کے فائدہ کی چیز بغیر عوض کے دینا۔ اس فقیر کے نزدیک مفہوم کرم میں دو شرطیں اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ بلا عوض کسی کو اس کے فائدہ کی چیز دینا اپنے اختیار سے۔ دوسری یہ کہ بلا استحقاق کے سورج کی شعاعیں کائناتِ ارضی پر پڑ رہی ہیں اور اس سے سبزے میں نمو حیوان میں نشو اور ترقی اور تمام موجوداتِ ارضی و ہوائی کو روشنی اور حرارت کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اس کو سورج کا کرم نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ سورج کے اختیار کو اس میں دخل نہیں۔ ادائے قرض و فرض کو بھی کرم نہیں کہتے۔ کیونکہ ایک میں معاوضہ کی ادائیگی ہوتی ہے اور دوسرے میں ادائے حق واجب

اور بقول رازی، بچہ کے ہاتھ میں چھری دینے کو بھی کرم نہیں کہتے اس لئے کہ نادان بچہ کو چھری سے نقصان ہی کا اندیشہ ہے فائدہ کی امید نہیں۔
اللہ نے اس عالم کو نیست سے ہست کیا۔ کسی کو نعمتِ وجود سے سرفراز ہونے کا استحقاق نہ تھا۔ نہ خدا پر لازم تھا کہ وہ فرور ہی پیدا کرے نہ بے اختیار اس جہان کا اس سے صدور آفتاب کی شعاعوں کی طرح ہو رہا ہے۔ موجود ہونے کے بعد بھی تنوع اقسام اور ہر قسم کی خصوصیات ذی حاصل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ نہ مادہ نباتی کو نبات بننے کا، نہ مادہ حیوانی کو حیوان بننے کا، نہ مادہ انسانی کو انسان بننے کا، نہ کسی مادہ کو کوئی مخصوص نوع بننے کا۔ یہ عطائے خداوندی بلا استحقاق ہے کہ کسی مادہ نباتی کو انار کی صورت عطا فرمادی اور کسی کو سیب کی اور کسی کو انگور کی اور کسی کو کیکر اور نقصہر کی۔ کسی مادہ حیوانی کو شکل خنزیری عطا کی اور کسی کو گھوڑے، مور اور بلبل کے خلعت سے سرفراز کیا۔ پھر کسی حیوان کو چرندہ پرندہ اور درندہ بنا دیا اور کسی کو ناطق ذی فہم باہوش صاحب وجدان۔ پھر انسانوں میں سے کوئی انسان نما حیوان یعنی ابوجہل وابولہب ہوا۔ اور کسی کے سر پر ختمِ نبوت کا تاج رکھ کر صورتِ محمدی میں جلوہ گر کیا۔ سورج چاند اور ستاروں کو روشن کیا۔ آگ بجلی اور تمام ذرات لائع کو چمک عطا کی اور مٹی کو سیاہی بخشی۔ فرشتہ کو نور مجرد بنا دیا اور ابلیس کو آتشیں فطرت ہونے کے باوجود دخانِ مجسم۔
پس اللہ سے کسی مخلوق کا صدور بلا اختیار نہیں ہوا۔ اس نے جب چاہا اور جس کو چاہا پیدا کیا۔ نہ پیدا ہونے کے بعد اچھے انجام کا کوئی مستحق ہوتا ہے۔ اسی لئے سعادتِ اخروی کا کسی کو ذاتی حق نہیں۔ وعدہ الٰہی کے بعد صالحین کو جنت کا استحقاق ہو جانا الگ بات ہے۔ یہ تو اللہ کے وعدۂ کرم کے بعد پیدا ہوا ہے اور اس کی بنا بھی اس کے کرم ہی پر ہے۔ مخلوق کی ذات تقاضائے رحمت نہیں کرتی۔ رحمٰن کی مشیت باعث کرم ہے۔
فرمایا تم میں سے کوئی اپنے اعمال کی بدولت جنت میں نہیں جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسولُ اللہ کیا آپ بھی۔ فرمایا ہاں میں بھی مگر یہ کہ اللہ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانک لے (اور جنت میں لے جائے) (بخاری)
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ وہ رب جس نے قلم سے سکھایا اور علم عطا کیا۔ کس کو سکھایا۔ کیا سکھایا۔ سارے جہان کی ہر چیز کو سکھایا۔ عرش سے فرش تک اور ملائکہ سے لے کر ہر ذرۂ جمادی تک ہر شے کو سکھایا۔ ضابطۂ زندگی۔ راہِ زندگی کی رفتار۔ شخصی اور نوعی بقا کے رنگ ڈھنگ ضروریاتِ حیات کی فراہمی اور کارخانۂ عالم میں ایک ضروری پرزہ کی حیثیت سے حرکت کرنا۔
اس سے پہلے ربوبیتِ عامہ وخاصہ اور خلاقیتِ تامہ کا بیان تھا۔ اور ربوبیت وخلاقیت کی بنا اپنے ذاتی کرم کو قرار دیا تھا۔ اس فقرے میں ضابطۂ حیات کی تعلیم کو اپنی طرف منسوب کیا۔ گویا موجود ہونے موجود رہنے، راہِ زندگی طے کرنے اور موقف ومنزل کو پہچاننے کے لئے بھی ہر چیز اللہ کی رہنمائی اور تعلیم کی محتاج ہے۔ تخلیق اسباب زندگی کے بعد بھی کوئی مخلوق خالق سے بے نیاز نہیں۔ بلکہ اپنی شخصی اور نوعی حدود میں رہنے اور مسافتِ زندگی کو طے کرنے کے لئے ہر آن تعلیم خداوندی کی دستِ نگر ہے۔
علم بالقلم میں اول مفعول مذکور نہیں۔ حذف مفعول اطلاق وعموم پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرا مفعول بھی مذکور نہیں کہ کیا سکھایا۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ وہی چیز سکھائی جو مفید تھی۔ لفظ الاکرم کا یہی تقاضا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے ہر چیز کو اس کا ضابطۂ حیات سکھایا لیکن ہر چیز کو لکھنا تو سکھایا نہیں اس لئے بالقلم کی با کو زائد نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ با استعانت کی ہے کیونکہ اللہ نے ہر چیز کو قلم سے لکھنا نہیں سکھایا۔ ہاں استعانت کی با، اس طرح ہو سکتی ہے کہ قلم سے قلمِ الٰہی مراد لیا جائے۔ یعنی قدرت حکمت اور ربوبیت کا قلم۔ اور یہی صحیح بھی ہے۔ قلمِ قدرت نے صفحۂ کائنات پر الگ الگ راہِ زندگی طے کرنے کے ضوابط لکھ دیئے ہیں۔ ہر چیز کی فطرت پر نقوش ہدایت ثبت ہیں جن کو ہر چیز مطالعہ کر رہی ہے اور پڑھ کر سمجھ رہی ہے اور سمجھ کر راہِ زندگی پر چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کا کسی سے ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کوئی مخلوق کسی کی مزاحم نہیں ہوتی۔ سب اپنی اپنی راہ پر چل رہے ہیں۔ درخت انار شیشم کی حدود میں داخل نہیں ہوتا اور نہ شیشم انار کی سرزمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ نبات وادی حیوان میں داخل ہوتا ہے نہ کوئی نوع حیوان دوسری نوع کے دائرہ میں قدم رکھتی ہے۔ لا الشمس ینبغی لہا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار کل فی فلک یسبحون۔ دیکھو

کہیں تم کو انواع یا اجناس کی کوئی جنگ ہوتی نظر آرہی ہے۔ کیا کوئی تعلیمِ الٰہی سے سرکشی کر رہا ہے۔ فارجع البصر کرتین ھل تریٰ من فطور۔

لیکن اگر دوسرے عَلَّمَ کو پہلے عَلَّمَ کی تاکید قرار دیا جائے اور الانسان کو دونوں کا مفعول سمجھ لیا جائے تو قلم سے مراد بھی معمولی قلم ہو سکتا ہے۔ مگر مقام کا تقاضا ہے کہ اول مفعول کو عام ہی قرار دیا جائے۔ جیسے اول خَلَقَ کے مفعول کو عام قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ قلم سے مراد بھی قلم مراد لینے سے سیاقِ کلام بھی انکار کر رہا ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین نے اسی کی صراحت کی ہے اور قلم کے گوناگوں فائدے بیان کئے ہیں کیونکہ خطاب کا اولین رُخ رسول اللہ کی طرف ہے اور آپ نہ فقط یہ کہ خطاب کے وقت لکھنا نہیں جانتے تھے بلکہ آخر ساعتِ زندگی تک بھی فنِ کتابت سے ناواقف تھے۔ علم لدنی الگ چیز ہے۔ اس کو سکھانے کے لئے قلمِ قدرت کی ضرورت ہے جس کے نقوشِ کتابت آپ خوب پڑھ سکتے تھے اور تمام انبیاء سے زیادہ پڑھتے تھے۔ پس اگر قلم سے معمولی قلم مراد لیا جائے تو جس طرح ربوبیتِ خداوندی اور خلاقیتِ الٰہیہ کی مظہر اتم رسول اللہ کی ذاتِ مبارک تھی اور کرمِ خداوندی سب سے زیادہ آپ کے شاملِ حال تھا اسی طرح کتابت کی تعلیم کا کامل ترین نمونہ بھی آپ ہی کی ذات کو ہونا چاہیئے تھا باوجودیکہ آپ کبھی محرر یا کاتب نہ ہوئے نہ کتابت سیکھی نہ آپ کے پاس وحی مکتوب آئی۔ پس رفتارِ کلام کا اقتضا ہے کہ قلم سے قلمِ الٰہی ہی مراد لیا جائے قلمِ انسانی مراد نہ لیا جائے۔ واللہ اعلم وعلمہ اعلیٰ واتم۔

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ اللہ نے انسان کو وہ چیزیں سکھائیں جن سے وہ ناواقف تھا۔ اگر الانسان میں الف لام جنسی ہو تو ظاہر ہے کہ کوئی انسان ماں کے پیٹ میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب وقتِ پیدائش آیا تو اللہ نے اس کو راہِ خروج بتائی۔ تحصیلِ غذا کا طریقہ سکھایا۔ پھر ابتدائی شعور پیدا کیا۔ شعور و حس میں ترقی دی۔ چھوٹی چھوٹی سادہ چیزوں کی شناخت بتادی۔ ماں باپ بھائی بہن پھر ہمسائے اہلِ محلہ کو پہچاننے لگا۔ اچھے بُرے کی کچھ واقفیت ہوگئی۔ غرض یونہی ترقی کرتے کرتے بدیہیات سے نظریات تک پہنچنے لگا۔ جزئیات سے حقیقتِ کلیہ کے استنباط پر قادر ہوگیا معاشرت سماج مدنیت سیاست کے اچھے بُرے ضوابط میں درک پیدا ہوگیا۔ طرح طرح کے علوم و فنون حاصل کرنے لگا پھر محقق اور چوٹی کا عقلی عالم بن گیا۔ حقائقِ کائنات کی تسخیر کرنے لگا۔ بعض لوگوں نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا۔ فوق الطبیعیات کے وجدانی انکشافات ان کو ہونے لگے بلاواسطہ آفتابِ الوہیت کی علمی شعاعوں کا فیضان اُن کے دلوں پر ہونے لگا۔ مقاماتِ قدس کی سیر شروع ہوگئی۔ سیر آثار سے افعال کی طرف سے اور سیرِ افعال سے صفات کی طرف قوتِ شہود کا رُخ ہوگیا اور علم کا سمندر انسان کے وجدانی کوزہ میں سما گیا۔

بعض مفسرین نے الانسان سے رسول اللہ کی ذاتِ مقدس مراد لی ہے۔ اس وقت جملہ کا مطلب بالکل واضح ہے۔ آپ پڑھے لکھے نہ تھے کتاب اور کتابت سے واقف نہ تھے۔ انبیاءِ سابقین کی کتابوں کو جانتے نہ تھے لیکن اللہ نے بغیر پڑھے آپ کو علومِ اولین و آخرین عطا فرمائے ساری کائنات کے علماء کا سردار بنا یا۔ معارفِ شرعیہ، حقائقِ کونیہ اور علومِ ذاتیہ کی تعلیم دی اور تعلیم بھی تعلیمِ انکشافی انجلائی۔ تمام کتبِ مرسلین اور صحفِ انبیاء کی کشفی تفصیل بتادی۔ سب کا خلاصہ بشکلِ قرآن عطا فرما دیا اور علم کے عرشِ بریں کی آخری چوٹی پر پہنچا دیا۔ اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ ابتدائی وحی اس آیت پر ختم ہوگئی اور انہی آیات کی تلاوت کرتے حضورؐ مکان واپس آئے۔

ان آیات کے چند لفظوں نے فلسفۂ الٰہیات میں انقلابی غلغلہ برپا کردیا۔ فلسفۂ دہریت کا قصر گر پڑا۔ عقیدۂ تشبیہ تجسیم اور شرک کا جھنڈا سرنگوں ہوگیا۔ ایشیا اور یورپ کی فضا مرتعش ہوگئی۔ یہ صدائے لاہوتی جب ناسوتی دنیا کو سنائی دی تو غیر صحیح علوم کو سینوں کے اندر چھپائے ہوئے گدھے اپنی چوکڑی بھول گئے۔

ایران و عراق کے مجوسیوں کے آتشکدے بجھنے لگے۔ فلسفۂ یونان بحیرۂ ایجین میں غرق ہوگیا۔ ہندوازم کے ناقوس کی گونجتی ہوئی فلک بوس آواز بند ہوگئی۔ بدھ ازم گپھاؤں اور غاروں میں جا چھپا۔ نجران اور شام کے راہب اور بیت المقدس کے حبر انگشتِ تحیر دندانِ تفکر سے کاٹنے لگے۔ غرض اللہ کی ربوبیت و خلاقیت کی توحید کا اعلان سنکر منکرینِ الوہیت کی تمام طاغوتی طاقتیں راہِ فرار اختیار کرلینے پر مجبور ہوگئیں۔ مکہ کے رہنے والوں کو عموماً اور قریش کو خصوصاً توحیدِ الوہیت کے اعلان سے تکلیف ہوئی۔ جہالت بُری بلا ہے۔ جاہل نہ فقط یہ کہ علم

سے بے بہرہ ہوتا ہے بلکہ بر خود غلط بھی ہوتا ہے۔ محسوسات سے اونچی اس کی نظر نہیں جاتی۔ جسمانی طاقت خاندانی شوکت، جتھے کی کثرت، مال کی فراوانی اور خیل و خدم کی جمعیت اس کو مغرور بنا دیتی ہے، خود پسند بنا دیتی ہے، وہ اپنے کو دوسروں کا دست نگر نہیں پاتا تو اس کا غرور انانیت اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ بھی کرنے لگتا ہے۔ یہی حالت مشرکینِ مکہ خصوصاً بعض قریشی سرداروں کی ہوئی ذیل کی آیات کا وقت نزولِ آغازِ وحی سے بہت بعد کو ہے۔ (رازی)

شاید ابو طالب کے بھی انتقال کے بعد ان کا نزول ہوا۔ لیکن حضرت جبرئیل کے حکم کے موافق رسول اللہ نے ان آیات کو گزشتہ پانچ آیات سے ملانے کا حکم دیا۔ اصل تو یہی ہے کہ بحکمِ الٰہی آیات کو مرتب کیا گیا ہے۔ خواہ کسی کو ان میں ربط نظر آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ آیات کی ترتیب توفیقی ہے۔ علماء کے سمجھے ہوئے لفظی یا معنوی ربط پر ترتیبِ آیات مبنی نہیں۔ پھر بھی علماء نے بقدرِ علم ترتیبِ آیات کی حکمت سمجھنے کی کوشش کی ہے اور بلاغت لفظی و معنوی کے لحاظ سے بعض آیات کو بعض سے مربوط قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس جگہ بھی اسی طرح کی کوشش کی ہے کہ گزشتہ پانچ آیات میں اللہ کی عظمت شان ربوبیت خلاقیت فضل و کرم اور عطائے علم کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اللہ کی ان بے پایاں رحمتوں اور عنایتوں کا استقبال کیسے کیا اور اس کی لامحدود قدرت ہمہ گیر علم و حکمت اور محیطِ کل ربوبیت کے مقابلے میں اپنی کس طاقت کو لائے۔ اس کا بیان اس جگہ سے آخر سورت فرما دیا۔ اور اسی بیان کے اندر رب اکرم نے اس باغی سرکش انسان کی بے بسی، اپنی ہر جہتی طاقت اور متمرد جاہل کے انجام بد کی بھی صراحت کر دی۔

قاعدہ ہے کہ رات کی ظلمت سے دن کی روشنی واضح ہو جاتی ہے اور دن کی روشنی سے رات کی تاریکی کھل جاتی ہے۔ دو چیزوں کا علاقۂ تضاد چاہتا ہے کہ ایک کے بعد دوسرے کی حالت بیان کی جائے۔ اس لئے رب خلاق کے خصوصی اوصاف کے بیان کے بعد سرکش انسان کے طغیان کا اظہار فرمایا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى۔ کلا اس جگہ حرف زجر ہے (خطیب) یا حَقًّا (یقیناً) کے معنی میں ہے یعنی حرفِ تحقیق ہے (کسائی و جرجانی) یا حرف تنبیہ ہے (ابو حیان) ابن ہشام نے اسی کو اختیار کیا ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ اس کے بعد اِنَّ بکسر ہمزہ ہے اس لئے حرف زجر نہیں ہو سکتا۔ حرف زجر ہونے کی صورت میں اَنَّ بفتح ہمزہ آتا ہے۔ حرف تنبیہ کے بعد اِنَّ بکسر ہمزہ آتا ہے۔ الانسان میں اکثر مفسرین کے نزدیک الف لام عہدی اور انسان سے خاص انسان یعنی ابو جہل مراد ہے اور سورت کے ختم تک اسی کی مذمت اور اسی کو زجر ہے۔ بعض مفسروں کے نزدیک بقول رازی ارأیت الذی ینھٰی سے اخر تک ابو جہل کے حق میں نزول ہوا کیونکہ حضرت ابن عباس کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ (مسجد حرام میں) نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو جہل آگیا اور کہنے لگا کیا میں نے تجھے اس کام سے منع نہیں کر دیا تھا۔ رسول اللہ نے غصہ سے اُسے جھڑک دیا۔ ابو جہل کہنے لگا۔ محمد تم خوب جانتے ہو کہ اس وادی میں میری چوپال والے سب سے زیادہ ہیں۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا فلیدع نادیہ الخ حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا۔ خدا کی قسم اگر وہ مردود اپنی چوپال والوں کو بلاتا تو دوزخ کے فرشتے اس کو گرفتار کر لیتے۔

بہرحال الانسان سے ابو جہل مراد ہو یا الذی ینھٰی سے ابو جہل اور الانسان سے ہر طاغی مستغنی عن اللہ انسان مراد ہو۔ کچھ بھی ہو مورد کی تخصیص سے حکم میں تخصیص نہیں ہوتی۔ اگر ابو جہل ہی کے حق میں آیت کا نزول ہوا ہو تو پھر بھی ہر وہ شخص جو ابو جہل کی صفات کا حامل ہو اس حکم اور اس وعید کے اندر داخل ہے۔ طغیان کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا اور بقول رازی متمرد اور سرکش ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ سن لو آگاہ ہو جاؤ یا یقیناً وہ آدمی بلاشبہ سرکشی کرتا رہتا ہے یا اپنی حد سے آگے بڑھتا رہتا ہے صرف

اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے کو مستغنی پاتا ہے۔ امام رازی نے فرمایا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استغنیٰ باب استفعال کی خصوصیت یعنی طلب پر چونکہ دلالت کر رہا ہے اور غنی کی طلب کا تقاضہ ہے کہ عملی جد و جہد تو گویا وہ سمجھتا ہے کہ میں جو غنی کی کوشش کرتا ہوں یہ غنا اسی کا ثمرہ ہے مجھے خدا کی کیا ضرورت ہے۔ امام کی یہ توجیہ اگرچہ صحیح ہے مگر ہے دور از فہم۔ سادہ مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھ دیا کہ جو نکہ وہ (مال کی کثرت خادموں کی بہتات اور جتھے کی افزونی دیکھتا ہے اس لئے) اپنے کو اللہ سے بے نیاز جانتا ہے۔ بقول خطیب ابو جہل

لوگوں کو اپنی سواری اور خادموں کا جلو میں ہونا دکھانے کے لئے جلوس کی صورت میں نکلتا تھا۔ اللہ فرماتا ہے۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی۔ یہ حقیقت ہے کہ تیرے مالک ہی کی طرف اس کی واپسی (اور بازگشت) ہوگی۔ یعنی یہ مال اور دولت قبیلہ حشم اور خدام غلام نہیں رہ جائیں گے۔ یہ ضرور مرے گا اور مر کر معدوم مطلق نہیں ہو جائے گا بلکہ خدا کے دربار میں پیش ہوگی اور عذاب کے فرشتے اس پر مسلط ہوں گے۔ خدا کی گرفت سے اس کو کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

آیت مذکورہ کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہی زیادہ صحیح بھی ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی نعمت اللہ کی طرف سے مل جاتی ہے تو وہ اپنے کو غنی سمجھنے لگتا ہے۔ خصوصاً منکر خدا تو ہر وقت یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ مجھ میں طاقت ہے، میرے پاس دولت ہے میری حکومت ہے۔ ہزاروں لاکھوں جان نثار میرے پاس موجود ہیں۔ تمام اسباب عیش و عزت میرے قبضہ میں ہیں۔ اب مجھے خدا کی کیا ضرورت۔ کیسا خدا کون خدا۔ ان الانسان لیطغیٰ سے انہی تمام مضامین کو مجمل طور پر بیان کر دیا اور طغیان کے اندر ہر علمی اور فکری طغیان آ گئی۔ پھر اس کی علت بھی ان راٰہ استغنیٰ میں بیان کر دی کہ فراہمی اسباب پر اعتماد کرتے ہوئے انسان اپنے کو مستغنی اور بے نیاز سمجھنے لگتا ہے اور یہ استغنا ہی اس کے طغیان کا سبب ہوتی ہے اس کے بعد ان الی ربک الرجعیٰ سے استغناء کی تردید فرما دی۔

رجوع الی اللہ ایک تو مرنے کے بعد ہوگا۔ اس میں تو ایا منکر کے لئے کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے مگر منکر خدا اور منکر جزا سزا کا اس پر یقین نہیں ہے۔ دوسرا رجوع الی اللہ ہر لمحہ ہے جس سے منکر قیامت بلکہ منکر خدا بھی انکار نہیں کر سکتا یہ ہر شخص جانتا ہے کہ دولت لازوال نہیں، عزت و حکومت دوامی نہیں، جوانی پائیدار نہیں، طاقت اور صحت بھی ہر وقت خطرات کی زد میں ہے بلکہ جو غذا آدمی کھا لیتا ہے اس کا بھی مفید ہونا اور جزو بدن بن جانا یقینی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لوٹ کر استفراغ ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اندر پہنچ کر زہر بن جائے۔ اور بدن میں پھیل کر صحت کو تباہ کر دے۔ اندوختہ مال کا ضائع ہو جانا ممکن ہے۔ ضائع نہ بھی ہو تو کام میں آنا ضروری نہیں۔ اولاد کا سرکش اور آوارہ بن جانا کثیر الوقوع چیز ہے۔ شخصی اور جمہوری حکومت کا تغیر تبدل اور زوال و انقلاب روز کے واقعات ہیں۔ آخر کار موت آتی ہے اور اس پر کسی کا ظاہری اختیار بھی نہیں۔

سورج چاند اور ستاروں کا طلوع غروب اس کائنات کے فضائی اور ارضی تغیرات پر اثر انداز ہے۔ موسموں کا تغیر انہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ کھیتی کا پیدا ہونا اور درختوں کا ثمر آور ہونا اور انسان و حیوان کے بدن میں نمودار ہونا ہونا اور سلسلۂ تنفس کا درست یا نادرست ہونا یہ سب بیرونی عوامل کے زیر اثر ہے اور اندرونی و بیرونی عوامل میں سے کسی ایک پر انسان کو قدرت نہیں۔ ہوا، پانی، زمین، سورج، چاند، سیارے، ستارے، شعاعیں کونسی چیز ہے جس کی اندرونی طاقتیں انسان کے قبضہ میں ہیں۔ کوئی سائنسٹ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ نظام تکوینی کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے یا کم از کم نظام ترتیب عالم پر اس کو اقتدار حاصل ہے۔ علمی انکشافات اور وہ بھی اتنے جتنا سمندر میں ایک قطرہ یا ریگستان میں ایک ذرہ ضرور انسان کو حاصل ہیں لیکن ان سے کیا حاصل۔ عالم تکوین و ترتیب پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے تو اتھاہ علمی سمندروں کو ظرفِ ذہن میں سمانا ہوگا اور ساری کائنات کی تخلیقی و ترتیبی طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

پس ایسا بے بس بے کس انسان کہ جس کا خود اپنے اندرونی و بیرونی ذاتی احوال پر بھی قابو نہیں اور اپنا ایک قطرۂ خون اور ایک تنفس اور ایک تصور اس کی قدرت و حکومت میں نہیں وہ اپنے کو اگر مستغنی اور بے نیاز پالے یا سمجھ لے تو یہ اس کی حماقت ہی ہو سکتی ہے۔ ہر آن فطری طور پر ہر مادی لہر اور تصوری موج کا رجوع تو خالق عالم کی طرف ہے۔ ہر چیز کے آغاز و انجام کے دونوں سرے تو اس کے دستِ قدرت میں ہیں۔ جب چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جب چاہتا ہے کھینچ لیتا ہے۔ انہ یبدء و یعید۔

پس جب یہ سارا عالم اسباب اپنے مسبب سے بے نیاز نہیں اور ہر معلول اپنی حقیقی علت کا ہر آن محتاج ہے تو لامحالہ تخلیق، بقاء، عصمت وجود اور قیام حیات کے لئے ہر انسان کا اسی کی طرف لوٹنا بالکل ظاہر ہے۔

حاصل یہ کہ اللہ خالقِ کائنات بھی ہے اور رب ہر ذرہ کا معلمِ حیات بھی تو اب انسان کو کس چیز میں اس سے استغنا ہو سکتا

ہر عمل اثر اور حرکت کونی کا رجوع ہر وقت جب اللہ کی طرف ہے کیونکہ وہ ربِ کائنات ہے تو انسان کی زندگی کا ہر لمحہ بھی اسی کی طرف راجع ہے یہ کس قدر بے دانشی اور کور بصیرتی ہے کہ ساری کائنات تو اضطراراً و اختیاراً اپنے رب خالق کے سامنے سربسجود ہو اور احسان فراموش بے وقوف انسان باوجود تکوینی اور ترتیبی اضطراری انقیاد کے اختیاری دنیا میں آکر اس سے سرکشی کرے اور گردنِ نیاز اس کی بارگاہ میں خم نہ کرے بلکہ

اَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى کس قدر عجیب ہے اس کی یہ حرکت کہ اگر کوئی نیک اور کامل بندہ اللہ کی فرمانبرداری کا اظہار اپنے قلبی اعتراف زبانی اقرار اور اعضائے جسم کی حرکات سے کرتا ہے۔ اپنے رب کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا دو زانو بیٹھتا خمیدہ ہو کر رکوع کرتا اور نیاز کی پیشانی زمین پر رکھتا ہے اور اس کی ربوبیت و خلاقیت اور حکومت و اقتدار کا دل سے عقیدہ رکھتا اور زبان سے اقرار کرتا ہے تو یہ طاغی انسان اس کو زبان سے روکتا اور عمل سے باز داشت کرتا ہے۔ حالانکہ اس کو خود بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ دوسروں کو روکنے کا تو جواز ہی کیا ہو سکتا ہے۔ کیا اس کو نہیں معلوم کہ کوئی نیکی ہو یا بدی بے نتیجہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی دوسرے کو کسی کی اچھائی برائی سے کوئی نفع نقصان پہنچتا ہے۔ اچھا برا جو کچھ آدمی کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى۔ خوب سمجھ لو اور اس کو بتا دو کہ اگر یہ خدا کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلتا اور دوسروں کو اللہ کی نافرمانی اور کفرانِ نعمت سے بچنے کا مشورہ دیتا تو اسی کو فائدہ پہنچتا۔ صراطِ مستقیم پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کا حکم دینا اسی کو منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔ اللہ اس کو جزا دے گا اور

اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۔ سمجھا دو کہ اگر اس نے ضابطۂ فطرت اور ہدایتِ الٰہی اور پیامِ رسول کو نہیں مانا اور مونھ موڑ کر چل دیا تو اس کا وبال اسی کو برداشت کرنا ہوگا۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى۔ کیا یہ نہیں جانتا ہے کہ اللہ اس کے تمام اذکار اور اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا علم حضوری اور شہودی ہے اس کے علم سے نہ کوئی چیز غائب ہو سکتی ہے نہ علمی غلطی کا امکان ہے۔ پس ایسا محیط کل علم اور ہمہ گیر قدرت رکھنے والا خدا اس سرکش کی حرکاتِ قبیحہ سے ناواقف نہیں ہے یقیناً اس کو سزا دے گا۔

كَلَّا۔ اب بھی اس کو اپنی بدرفتاری اور کج اعمالی اور غلط پنداری سے باز آجانا چاہیئے اور فرمانِ رسول پر عمل کرنا چاہیئے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ۔ ورنہ اگر یہ اپنی ناشائستہ حرکات اور تباہ کن بداعمالی سے باز نہ آیا اور پیامِ حق سے سرتابی کرتا رہا تو (گھوڑوں اور گدھوں کی طرح) ہم اس کی جھوٹی خطاکار پیشانی کی ایال پکڑ کر اس کو دھر گھسیٹیں گے (اور جہنم میں اوندھے منہ گرا دیں گے)

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ۔ اس وقت وہ اپنی حمایت کے لئے اپنے حوالی موالی لوگوں کو بلا لئے اور اہلِ مجلس کو پکارے۔ دیکھیں کون اس کو بچانے آتا ہے اور کون اس کو ہمارے پنجہ سے رہائی دیتا ہے۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ۔ ہم اس کو عذاب دینے کے لئے دوزخ کے فرشتوں کو حکم دے دیں گے اور مسلط کر دیں گے۔ اس وقت اس کو اپنے پندار و غرور کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

كَلَّا آپ ہرگز اس کی دھمکی کی پرواہ نہ کریں۔

لَا تُطِعْهُ اس کے کہنے پر نہ چلیں یعنی اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر قائم رہیں اور

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ سرِ نیاز کو بارگاہِ الٰہی میں افگندہ رکھیں۔ انقیاد و اطاعت ہی تقربِ الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے سرکشی اور تمرد اللہ کے غضب میں گرفتار کرنے والا ہے۔ پس آپ قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے انقیاد و عبادت میں مشغول رہیں اور اللہ کے سامنے زمین پر سر رکھ دیں۔

چند ضروری الفاظ کی تشریح۔ اَرَءَيْتَ۔ عام مفسروں کے نزدیک ہر شخص کو خطاب ہے جس میں یہ حقیقت سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

امام رازی نے لکھا ہے۔ رو ئے خطاب رسول اللہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ دوسرے اور تیسرے امایت کا مخاطب وہی کافر انسان ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ الذی ینہیٰ سے مراد ابوجہل ہے اگرچہ حکم ابوجہل جیسے دوسرے لوگوں کو بھی شامل ہے کیونکہ بقول ابن کثیر ابوجہل نے ہی رسول اللہ کو نماز سے روکا اور دھمکایا تھا۔ عَبْدًا میں تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے یعنی کامل بندہ۔ مراد رسول اللہ کی ذاتِ گرامی۔ اَرَأَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْهُدٰٓی اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی اَرَاَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی میں کَانَ اور اَمَرَ اور کَذَّبَ اور تَوَلّٰی کی ضمیریں اَلَّذِیْ یَنْهٰی کی طرف راجع ہیں یعنی اسی سرکش انسان کی حالت کا ان آیات میں بیان ہے جو رسول اللہ کو نماز سے روکتا تھا امام رازی، ابوالسعود اور اکثر تفسیر نے یہی لکھا ہے اور دونوں جگہ ان کی جزا محذوف ہے جس کی تعیین زیادہ مناسب تھی وہ بیان مطلب کے ذیل میں کر دی ہے لیکن ابن کثیر نے کان علی الہدیٰ اوامر بالتقویٰ کی ضمیریں عَبْدًا کی طرف راجع کی ہیں۔ اس صورت میں توضیح مطلب اس طرح ہوگی کہ اے سرکش انسان ذرا غور تو کر جو کامل بندے کو نماز سے روکتا ہے۔ اگر وہ ہدایت پر ہو اور راہ راست پر چلنے کا حکم دے رہا ہو تو تیرے عذاب سے بچنے کی کیا شکل ہے اس وقت نماز سے روکنے کی تیری اپنے کیا وجہ ہو سکتی ہے اور وبال سے محفوظ رہنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک عام اہل تفسیر کا بیان کردہ مطلب زیادہ صحیح تھا اس لئے اسی کو اختیار کیا۔

لَنَسْفَعًا۔ جمع متکلم۔ لام اور نون خفیفہ تاکیدی ہے۔ سَفْعٌ مادہ بسفع کا معنی ہے مضبوطی سے گرفت کر کے گھسیٹنا۔ (رازی) ہم نے اور تمام اہل تفسیر نے یہی ترجمہ اختیار کیا ہے۔ لیکن سفع سیاہ داغ کو بھی کہتے ہیں اور داغ لگانے کو بھی امام رازی کے نزدیک یہ دونوں ترجمے بھی آیت میں صحیح ہیں۔ اول ترجمہ پر یہ مطلب ہوگا کہ ہم اس کی پیشانی یعنی منہ کو کالا کر دیں گے اور دوسرے ترجمہ کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم اس کی پیشانی پر داغ لگائیں گے۔ یہ دونوں ترجمے جمہور کے خلاف ہیں۔

بِالنَّاصِيَةِ۔ پیشانی کے بال پکڑ کر کسی کو گھسیٹنا موجب ذلت ہے۔ گھوڑوں اور گدھوں کو پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچا جاتا ہے۔ پھر مغرور انسان کی پیشانی ہی مرکز غرور ہوتی ہے۔ نخوت اسی میں بھری ہوتی ہے۔ اس لئے مغرور بر خود غلط آدمی کے پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنا ہی مناسب ہے تاکہ اس کے پر غرور سر کی تذلیل ہو جائے۔ ناصیہ سے مراد ذات اور شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔ جزو اعظم کو بول کر کل مراد لینا جائز ہے۔ کَاذِبَةٍ۔ ناصیہ کی صفت بایں معنی ہے کہ غرور، حق سے انکار اور صداقت کی تکذیب سب کا مرکز دماغ ہی ہے خصوصًا دماغ کا اگلا حصہ جس میں بیرونی حواس کے ذریعہ سے تمام بیرونی شکلیں پہنچتی ہیں۔ اور انہیں کو دیکھ کر ذہن کوئی اچھا برا غلط صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ اطاعت وانقیاد یا سرکشی و انکار کا مدار دماغ کے اگلے حصہ کے تصورات پر ہی ہے۔

خَاطِئَةٍ خطاء سے مشتق ہے اور مُخْطی کا مصدر اخطاء ہے۔ اول مجرد ہے اور دوسرا مزید۔ خاطی اس شخص کو کہتے ہیں جو خطا کار، خطا کا عادی اور دانستہ قصدًا گناہ کرنے والا ہو اور مخطی وہ شخص ہوتا ہے جس سے گناہ کا صدور نادانستگی میں ہو جاتا ہے۔ خاطی کا عذاب سخت ہے غسلین خاطی ہی کی غذا ہوگی۔ لا یاکلہ الا الخاطئون۔ اور مومن مخطی سے معافی کا وعدہ فرمایا ہے اور اس طرح دعا کرنے کی تلقین کی ہے۔ ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا۔

الزَّبَانِيَةَ دوزخ کے فرشتے۔ بعض اہل لغت کے نزدیک یہ ایسی جمع ہے جس کا مفرد ہی نہیں ہے۔ بعض نے اس کا مفرد زبنیت (بروزن عفریت) کو قرار دیا ہے۔ زبنیت متمرد شریر کو کہتے ہیں) اس کا مادہ زبن ہے اور زبن کا معنی ہے دفع کرنا دھکیل دینا۔ زبانیہ کی تعداد سورہ مدثر میں انیس بتائی گئی ہے۔ سردار کا نام مالک ہے اور اٹھارہ فرشتے اس کے زیر حکم ہیں۔ زبانیہ کی ہیئت بعض احادیث میں اس طرح آئی ہے کہ ان کی آنکھیں بجلی کی طرح کوندتی ہوتی ہیں۔ دانت بارہ سنگھے کے سینگوں کی طرح اینٹھے ہوئے ہیں۔ بال زمین پر گھسٹتے ہوئے ہیں اور منہ سے شعلے نکلتے ہیں۔ دونوں کندھوں کی درمیانی مسافت ایک سال کی راہ کے برابر ہے۔ ایک ایک ہتھیلی کی وسعت اتنی ہے کہ ستر ستر ہزار آدمی اس پر سما جائیں۔ قوت اتنی ہے کہ پاؤں زمین پر اور سر آسمان پر ہوگا۔ یہ اور اس قسم کی احادیث محض تہدیدی ہیں اور ان سے مراد عذاب کی سختی اور ہولناکی کا اظہار ہے۔ واللہ اعلم

ابن جریر نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ ابو جہل نے کہا اب اگر کبھی محمدؐ نے مقام ابراہیم کے قریب نماز پڑھی تو قدموں سے روند کے مار ڈالوں گا۔ لیکن ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ پھر حسب ہدایت وہاں نماز پڑھنے تشریف لے گئے اور نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ لوگوں نے ابو جہل سے کہا۔ اب وہاں کیوں نہیں جاتا۔ کہنے لگا میرے اور اس کے درمیان لشکر بھرے پڑے ہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ابو جہل نے کہا۔ آگ کی خندق ہے اور کچھ (پرندوں کے ایسے) بازو حائل ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر وہ جنبش کرتا تو زبانیہ لوگوں کی نظروں کے سامنے اس کو گرفتار کر لیتے۔

امام احمد، مسلم اور ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے لوگوں سے کہا کہ محمد تمہارے سامنے اپنا منہ خاک پر رکھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا ہاں کہنے لگا مجھے لات و عزیٰ کی قسم ہے اگر میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا اور منہ خاک ہی میں ملا دوں گا۔ پھر رسول اللہ وہاں نماز پڑھنے تشریف لے گئے اور لوگوں نے دیکھا کہ ابو جہل دونوں ہاتھوں کو سامنے کئے اپنے منہ کو کسی چیز سے بچاتے ہوئے الٹے پاؤں پیچھے کو بھاگ رہا ہے۔ پوچھا کیوں کیا بات ہے؟ کہنے لگا۔ لوگو میرے اور اس کے درمیان آگ کی خندق اور دہشت اور (پرندوں کی طرح کے) کچھ بازو ہیں (یعنی فرشتے حائل ہیں) حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اگر وہ میرے قریب آتا تو ملائکہ اس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔

رسول اللہؐ نے ابو جہل کو اس امت کا فرعون فرمایا ہے۔ بلکہ یہ خبیث فرعون سے بھی زیادہ متمرد تھا۔ فرعون کے بارے میں تو اللہ نے إِنَّهُ طَغٰى بصیغۂ ماضی فرمایا اور اس کے بارے میں ان الانسان لیطغیٰ بصیغۂ مضارع بالام تاکید فرمایا۔ وہ تو پھر بھی عالی فی الارض یعنی اس ملک کا سب سے بڑا آدمی تھا اور یہ خبیث تو محض برخود غلط اور پندار کے نشہ میں چور تھا۔ چند پیسوں پر اتنا پھولا تھا کہ اپنے کو خدا سے مستغنی سمجھنے لگا تھا۔ جب دو نوجوان انصاریوں نے میدانِ بدر میں اس کو مار کر گرا دیا تو کہنے لگا۔ لَوْ غَيْرُ أَكَّارٍ قَتَلَنِيْ کاش ان کسانوں کے علاوہ کوئی اور مجھے قتل کرتا۔ حضرت ابن مسعود گردن کاٹنے سینے پر چڑھے تو بولا۔ يَا رَاعِيَ الْغَنَمِ لَقَدْ اِرْتَقَيْتَ مُرْتَقًى صَعْبًا۔ اے بکریوں کے چرواہے تو اس بڑے مقام پر چڑھا ہے جس پر چڑھنا بہت ہی دشوار تھا۔ پھر کہنے لگا هَلْ رَأَيْتُمْ أَعْظَمَ مِنْ رَجُلٍ قَتَلْتُمُوْهُ کیا جس شخص کو تم نے قتل کر دیا اس سے بڑا آدمی تم نے دیکھا ہے۔

لَا تُطِعْهُ۔ رسول اللہؐ کی ذات سے تو احتمال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ فرعون کا کہا مان لیں گے اور اس کی پیروی کریں گے اس لئے یا تو عام مخاطب مراد ہے یا نہی اطاعت سے مراد یہ ہے کہ ابو جہل کی تہدید کی پرواہ نہ کرو اطاعتِ الٰہی پر ثابت قدم رہو۔

وَاسْجُدْ۔ تشریح انسانی کے ماہر کہتے ہیں کہ سب سے پہلے رحم مادر کے اندر خلیہ سر ہی کی نشو و نما ہوتی ہے اور سر کا سانچہ ہی پہلے بنایا جاتا ہے۔ سر مرکزِ حواس اور جلوہ گاہِ عقل ہونے کی وجہ سے سب سے اعلیٰ اونچا اور محفوظ بھی ہے۔ رب العزت کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر کو جھکانے سے سربلندی حاصل ہوتی ہے۔ عبد معبود کی چوکھٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا فیہ الدعاء۔ یعنی سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے قریب بہت زیادہ پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا سجدہ میں دعا خوب مانگا کرو۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے سجدہ میں کوشش سے دعا مانگو وہ قبولیت کی زیادہ سزاوار ہے۔

مقصود بیان لفظ اقرأ باسم سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرأت قرآن واجب ہے اور اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرنا لازم ہے۔ کیونکہ آغاز نبوت اسی حکم سے ہوا۔ لفظ اسم کی زیادتی سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کا حقیقی واقعی تصور محال ہے۔ اس کا اسم ہی ہم کو اس کی ذات و صفات کی حقیقت سے قریب پہنچانے والا ہے اس لئے صفات و ذات کے اسرار ہی کا توسل اختیار کرنا چاہیے۔

اقرأ کی تکرار بتا رہی ہے کہ اگرچہ مقروء ایک ہی ہے یعنی یہی آیات لیکن ان کے نقوش دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ نقوش جو رسول اللہ کی قوت شہود و وجدان پر ثبت ہوئے۔ دوسرے وہ نقوش جو صفحات کائنات پر کندہ ہیں اور دونوں باہم موافق ہیں۔

اس سورت میں صرف تین صفات کا ذکر اس لئے کیا کہ انسان کے بنیادی افکار یہی ہیں جن کے بگڑنے سے دنیا گمراہ ہوگئی۔ اللہ کی ربوبیت، خلاقیت اور شارعیت کا عقیدہ ہی ایسی اساس ہے جس پر دین کی تعمیر ہے اور اس عقیدے کو صحیح صحیح ماننے کے بعد مرد مومن توحید الوہیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اسی عقیدے کو ماننے سے انکار خدا، شرک، تجسیم، تشبیہ، اضطرار، حلول اور دوسرے فاسد افکار کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔ رب کے لفظ کی تکرار ربوبیت کی دو قسموں کی طرف شاید اشارہ کر رہی ہے۔ تکوینیہ اور تشریعیہ۔ لفظ خلق بتا رہا ہے کہ تخلیق کائنات تقدیر یعنی اندازے کے ماتحت ہوئی ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ بغیر علم و ارادہ کے ہوئی ہے کیونکہ اندازے کے لئے علم و ارادہ ضروری ہے۔ خلق الانسان کا لفظ انسان کی پیدائش کی اہمیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ من علق کا لفظ شاید تطورات حیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس جگہ ذکر کیا۔ کیونکہ علق سے پہلے جراثیم منویہ میں اگرچہ تخلیق نوعی کا مادہ تھا مگر فعلیت کی طرف قدم علقی صورت ہی میں اٹھتا ہے۔ اس سے پہلے نطفہ میں دوسرا انسان پیدا کرنے کی صلاحیت و قابلیت کے علاوہ کسی تغیر نوعی کا بالفعل ظہور نہیں ہوتا۔ لفظ الاکرم بتا رہا ہے کہ اللہ پر کوئی چیز بالذات واجب نہیں۔ آغاز آفرینش سے لے کر عطائے جنت تک سب اس کا کرم ہی کرم ہے۔

علّم کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ مادی یا غیر مادی انجان جاہل کائنات کو علم کی روشنی حواس و عقل کے ذریعہ سے یا براہ راست صرف اللہ ہی کا کام ہے۔ اسی کا علمی پرتو ہے جس نے مخلوق کو ایک حد تک علم عطا کر دیا۔

علم الانسان سے انسان کے علم کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے۔

ان الی ربک الرجعیٰ سے معلوم ہو رہا ہے کہ کائنات با وجود موجود ہو جانے کے پھر بھی اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی قدرت جس طرح مبدء آفرینش ہے اسی طرح حدِ انجام بھی وہی ہے۔ کوئی چیز کسی وقت اس سے بے نیاز نہیں۔ کائنات کی سیر حیات خط مستقیم پر نہیں کہ نہ آغاز کا کوئی نقطہ ہو نہ انجام کی کوئی آخری حد۔ بلکہ رفتار ہستی خط دوری پر ہے کہ جو نقطۂ آغاز ہے وہی نقطۂ انجام۔

ارأیت الذی ینہیٰ عبداً اذا صلّٰی سے مستفاد ہو رہا ہے کہ نماز سے کسی کو روکنا ممنوع ہے۔ یعنی فرض یا سنت یا مستحب نماز سے بغیر استحقاق شرعی کے روکنا مستحق وعید بنا دیتا ہے۔ لیکن جن اوقات یا مقامات میں اور جن طریقوں سے نماز مکروہ یا ممنوع ہے ان سے روکنے کی ممانعت آیت سے مترشح نہیں ہے۔

ان کان علی الہدیٰ اور امر بالتقویٰ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ انسان کو خود راہ راست پر چلنا چاہئے۔ اپنی فکری اور عملی اصلاح جس کی تعبیر آیت میں لفظ الہدیٰ سے کی ہے کرنی چاہئے۔ دوسری یہ کہ دوسروں تک پیام اصلاح پہنچا دینا چاہئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر واجب ہے۔ آیت میں امر بالتقویٰ سے یہی مراد ہے۔

ان کذب وتولّٰی سے دونوں چیزوں کی ممانعت اور ہر ایک کی مذمت مستفاد ہو رہی ہے۔ (۱) تکذیب رسالت یعنی رسول اللہ کو دعویٰ رسالت میں جھوٹا کہنا یا جو چیزیں آپ اللہ کی طرف سے لائے ہیں ان کو اللہ کی طرف سے آیا ہوا نہ ماننا۔ (۲) عملاً روگردانی کرنا فرمانِ رسول جانتے ہوئے تعمیل نہ کرنا۔ لئن لم ینتہ لنسفعن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ جائے تو مخالفوں کی سخت گرفت دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور نافرمان تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔

ولندع الزبانیۃ سے حمایت کے لئے پکارنا مراد نہیں ہے بلکہ حکم دینا مراد ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ اللہ کے پاس عذاب کی مخفی طاقتیں بھی ہیں جن کی پوری کیفیت کوئی نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک زبانیہ بھی ہے جس سے اللہ کی قہاریت کا ظہور ہوتا ہے۔

اسجد واقترب سے ثابت ہو رہا ہے کہ سجود موجب قربت ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں ناک اور پیشانی رگڑنا انسان کو اتنی عزت عطا کرتا ہے کہ قرب خداوندی میں پہنچا دیتا ہے جو آخری معراج انسانی ہے۔ وغیرہ

سورۃ القدر

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی بلکہ واحدی نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ مدینہ میں سب سے اول یہی سورت نازل ہوئی۔

لیکن ماوردی کا قول ہے کہ اکثر اہلِ تفسیر اس کو مکی قرار دیتے ہیں (سراج) ابن کثیر نے بھی اس کو مکی ہی کہا ہے۔ رازی نے کبیر میں بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ شیخ ابوالسعود نے لکھا ہے کہ اس کے مکی مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے مکی ہونے کی صراحت تو کی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس سورت کے نزول کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان سے اس کا مدنی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے قصوں کا مدینہ ہی میں ذکر ہوا اور ممبر بھی مدینہ ہی میں بنایا گیا۔

مفسر سراج نے اس کی آیات پانچ کلمات تیس اور حروف ایک سو بارہ لکھے ہیں۔ لیکن شیخ جلال نے لکھا ہے کہ اس کی آیات پانچ یا چھ ہیں سلیمان نے جمل میں لکھا ہے کہ ہماری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی نے اس کی چھ آیات قرار دی ہوں۔ قلبی نے الفتح میں مدنی ہونے کی تائید کی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ

بیشک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اُتارا ہے — اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے — شب قدر ہزار مہینے سے بہتر

مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝

ہے (اور ایسی ہے کہ) اس شب میں فرشتے اور روح القدس (جبرئیلؑ) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امرِ خیر کو لے کر (زمین پر) اترتے ہیں — سراپا سلام ہے

سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

(وہ شب اسی صفت و برکت کے ساتھ) طلوعِ فجر تک رہتی ہے

تفسیر اوقات و مقامات بذاتِ خود نہ حاملِ نحوست ہیں نہ موجبِ برکت نہ قابلِ عزت ہیں نہ مستحقِ ذلت۔ سیاروں کی رفتار میں کوئی فرق نہیں، منازلِ سیر میں تفاوت نہیں۔ گردشِ لیل و نہار اور تبادلِ نور و ظلمت حقیقی نہیں، اعتباری ہے۔ سماوی ہوں یا ارضی تمام مقامات ایک ہی جیسے ہیں۔ نہ بجائے خود کوئی متبرک ہے، نہ بے برکت۔ مسجد اور مندر، گرجا اور مے خانہ سب ہی کی ساخت اینٹ پتھر، لکڑی اور لوہے پر موقوف ہے اور اینٹ پتھر کی صرف مادی قدروں میں فرق ہو سکتا ہے۔ برکت اور نحوست کا تعلق عقیدت اور روحانیت سے ہے۔ ہفتہ کے سب دن برابر ہیں۔ سورج کی شعاعیں نور آفریں اور حرارت آگیں روز ایک ہی طرح سے ہوتی ہیں۔ صبح و شام اور دوپہر، عشاء اور سحر کی تفریق اوقات محض مادی آثار و نتائج کے اختلاف اور جسمانی و دماغی سکون و راحت یا الم و اضطراب کی شکل میں نمودار ہوتی ہے ورنہ دورِ ارضی اور سیرِ شمسی میں کوئی فرق نہیں۔ کسی نقطۂ سیر پر پہنچ کر کسی کی حرکت نہ نحوست آگیں ہو جاتی ہے نہ برکت آفریں۔

ہاں کسی خاص دن اور معین رات کی فضیلت دوسرے ایام و لیال پر اور کسی مخصوص مقام کی برتری دوسرے مکانوں پر ہوتی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اُس دن یا اُس رات میں اس مقام اور اس خطہ میں کائنات کی فلاح خصوصاً انسان کی بہبود و صلاح کے لئے اللہ نے اپنی مشعلِ ہدایت روشن کی۔ انسانیت کی درستی کے لئے احکام نازل فرمائے۔ گمراہوں کی چشمِ بصیرت کو نور عطا فرما کر راہِ راست دکھا دی۔ حق و باطل میں تمیز کر لینے کے لئے کچھ ضوابط و اصول بتا دیئے۔ ملکی یا انسانی شکل میں بعض اوقات میں بعض مقامات پر کچھ روشن چراغ بھیج دیئے جنہوں نے اپنے نور سے گرد و پیش کو روشن کر دیا۔ کسی دن یا کسی رات کسی بستی میں نورانی صحائف کے ذریعہ سے اپنے صحیفے یا کتابیں یا زبانی پیام کسی نورانی انسان پر نازل فرما دیئے۔ اور ان متبرک انسانوں نے کسی خاص مقام پر لوگوں کو جمع کر کے اللہ کے بھیجے ہوئے

احکام سنائے۔ یا اللہ کے احکام کی اشاعت کا کوئی مرکز مقرر کردیا یا فرمانبردار انسانوں نے بارگاہِ الٰہی میں سر جھکانے اور مظاہرہ عبدیت کرنے کے لئے کوئی مقام چن لیا اور کوئی عمارت بنادی۔ ان تمام اسباب کے زیرِ اثر مخصوص ایام ایام اللہ اور مخصوص مقامات شعائر اللہ یا بیوت اللہ کہلانے کے مستحق ہو گئے۔ ایسے دنوں کو ایامِ برکت اور ایسی راتوں کو شب ہائے قدر و عزت کہا جانے لگا۔ ایامِ حج و تشریق یوم العید، یوم الجمعہ، شب مبارکہ یعنی شب برات، عشرۂ محرم، شب قدر، مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی، بیت المقدس اور روئے زمین کی تمام مساجد کی عزت و عظمت صرف ذکر اللہ عبادت اشاعتِ دین، مہبطِ ملائکہ، منازلِ انبیاء، مساکنِ اولیاء اور کتبِ سماویہ کے نزول کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔

شبِ قدر بھی ایک معمولی رات ہے۔ جو کسی ایک تاریخ کو آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیانی وقت کا نام ہے لیکن اسی تاریک رات کو وہ شرف حاصل ہے جو سال کی کسی دوسری رات کو حاصل نہیں۔ یہ تجلیاتِ الٰہیہ کی پرتو افگنی کی خصوصی رات ہے۔ انوارِ قدس خطیرۂ قدس سے پھوٹ کر اطرافِ کائنات کو روشن کر دیتے ہیں۔ لاہوتی شعاعیں اور ملکوتی لمعات ناسوتی دنیا کو جگمگا دیتی ہیں۔ چار دانگ عالم میں رحمت کردگار اطاعت شعار بندوں کی عبادت کی طلبگار ہوتی ہے۔ عالمِ تجرد کی رہنے والی غیر مادی مخلوق نیکوکار عبادت گزار فرماں بردار بندوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ ارواح و ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ فضا اور یہ زمین ان کی جلوہ گاہ بنتی ہے۔ غروبِ آفتاب سے طلوعِ فجر تک کائناتِ سماوی و ارضی پر کرمِ الٰہی کی نورانی بارش ہوتی رہتی ہے۔ (ہر طرف سے او تار الصوت کی منت کشی کے بغیر بے کیف نغمہ بار آواز آتی ہے کہ اے میرے اطاعت گزار بندو! اے خوفِ عذاب اور خشیۂ خدا سے سجدے میں پڑ کر زاری کرنے والو اور اے عظمتِ کبریا کے سامنے با ادب کھڑے ہونے والو آؤ رحمتِ پروردگار کی طرف آؤ تمہارے لئے ہر آن بشارت ہے، صدائے سلامت ہے۔ تم غضب و عتاب سے محفوظ ہو، تم عذاب و عقاب سے مصون ہو، تم زجر و توبیخ سے مامون ہو۔ تم کو سلامتی ہو۔ ہر دکھ اور الم سے، ہر خوف اور پشیمانی سے، ہر ناکامی اور خسران سے، قبر کے عذاب سے حساب کی سختی سے، صراط کے خدشات سے اور دوزخ کی آنچ سے۔ آؤ میرے بندو، میرے جوارِ رحمت میں آجاؤ، میرے سایۂ عاطفت میں سما جاؤ اور میرے قرب میں پہنچ جاؤ۔ اے نافرمان بندو تم بھی آجاؤ، اطاعت گزاری اور فرماں برداری کی طرف، توبہ اور ندامت کی طرف، باز آجاؤ گناہوں، اور نافرمانیوں سے اور رجوع کرلو شیطانی سرکشوں سے۔)

یہی وہ لیلۂ مبارکہ ہے جس میں کسی وقت قیامت تک کے لئے انسانوں کی سعادت و نجات اور شقاوت و بربادی میں حدِ فاصل قائم کرنے والے اصول و ضوابط اندازۂ الٰہی کے مطابق آسمانِ دنیا کے مقام بیت العزت پر اتارے گئے تھے جن کا نزول اس دنیا میں رسول اللہ کے قلب مبارک پر ماہ ربیع الاول سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ حسبِ ضرورت ۲۳ سال تک ہوتا رہا اور آخر جب تکمیل ہو گئی تو ۲۳ برس کے بعد ماہ ربیع الاول میں ہی ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ پس یہ اللہ کے قائم کئے ہوئے اندازۂ اصول کی رات ہے اسی لئے بڑی قدر و منزلت والی رات ہے۔

یہی وہ رات ہے جس میں جبرئیلؑ اپنے جلو میں ملائکہ کے پرے لے کر آتے ہیں اور فرمانبردار بندوں کو عبادت میں مشغول پاتے ہیں تو ان کے قریب آتے ہیں۔ اطاعت گزار بندوں کے دل ملائکہ کے قرب سے سکون پاتے ہیں۔ اطمینان بڑھ جاتا ہے۔ عبادت کی لذت میں زیادتی ہو جاتی ہے اور ایمان کی حلاوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فرشتوں کا روحانی پرتو صالحین کے دلوں کو روشن کر دیتا ہے۔ غیبوبت سے شہود کی طرف انتقال ہو جاتا ہے۔ نورِ رب آنکھوں سے مکشف لگتا ہے اور رحمتِ خداوندی ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔ ہر رات کی انتہا فجر پر ہوتی ہے۔ شب قدر بھی فجر پر ختم ہو جاتی ہے لیکن عاشقانِ الٰہی کی لیلۃ القدر کبھی ختم نہیں ہوتی۔ شب قدر میں نورِ الٰہی کے پرتو سے روشن ہونے والے دلوں کی روشنی کو کسی نجر کے آفتاب کی روشنی ماند نہیں کر سکتی۔ اس عزت والی رات میں پرستارانِ الٰہی کی روحوں میں معرفت کی جو شمع روشن ہو جاتی ہے اس کی نور پیمانی اور ضیا پاشی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ سلامتی ہو اللہ کی طرف سے

السلام ہو ملائکہ کی جانب سے ان عابدانِ پاکباز کے لئے جو شب قدر کو زندہ رکھتے اور اس کے نور سے اپنے دلوں کو زندہ کرتے ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

شانِ نزول۔ (۱) قاسم بن الفضل حدانی نے بحوالہ یوسف بن سعد بیان کیا کہ جب حضرت حسنؓ نے معاویہ سے بیعت کرلی یعنی خلافت سپرد کردی تو ایک شخص نے حضرت سے کہا: آپ نے مومنوں کے مونھ کالے کردیئے یا یہ کہا کہ آپ نے مومنوں کو روسیاہ کردیا۔ آپ نے فرمایا اللہ تجھ پر رحم فرمائے مجھے ملامت نہ کر۔ رسول اللہ کو تو پہلے ہی خواب میں دکھا دیا گیا تھا کہ آپ کے ممبر پر بنی امیہ چڑھے ہوئے ہیں۔ اس خواب سے حضور کو رنج ہوا تو سورۂ انا اعطینٰک الکوثر نازل ہوئی اور نازل ہوا انا انزلناہ فی لیلۃ القدر وما ادراک ما لیلۃ القدر لیلۃ القدر لیلۃ القدر خیر من الف شہر۔ یعنی شب قدر ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ قاسم بن الفضل کا بیان ہے کہ ہم نے بنی امیہ کی بادشاہت کی مدت شمار کی تو پورے ایک ہزار مہینے ہی پائے نہ کم نہ زیادہ۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہا یہ روایت غریب ہے صرف اسی اسناد سے ہم کو پہنچی ہے بعض لوگوں نے یوسف بن سعد کی جگہ یوسف بن مازن ذکر کیا ہے۔ قاسم بن الفضل ثقہ ہے۔ یحییٰ القطان اور عبد الرحمٰن بن مہدی نے اس کو ثقہ کہا ہے لیکن یوسف بن سعد مجہول ہے۔ یوسف بن مازن کا ذکر حاکم نے مستدرک میں کیا ہے۔ اگر یوسف بن مازن اور یوسف بن سعد ایک ہی شخص ہے تو پھر یوسف بن سعد کو مجہول کہنا محل تامل ہے۔ کیونکہ بن مازن مشہور تابعی ہے اس کی روایت کو حماد بن سلمہ، ابو خالد حذاء اور یونس بن عبید اور ابن معین وغیرہم نے لیا ہے (ابن کثیر) میزان میں قاسم بن الفضل کو فرقہ موحبہ میں لکھا ہے۔ لیکن تقریب میں لکھا ہے کہ یہ ثقہ ہے۔ مرجئہ میں ہونے کی اس پر تہمت ہے۔ ذہبی نے اس کو صدوق عبد الرحمٰن بن مہدی امام احمد ابن معین اور نسائی نے ثقہ کہا ہے۔ ترمذی نے اس کی حدیث راعی غنم کو صحیح کہا ہے۔ صاحب تقریب نے یوسف بن سعد اور یوسف بن مازن دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے اور توثیق کی ہے۔

مگر مذکورہ بالا روایت منفرد غریب ہے۔ اسی لئے ابن کثیر اور حافظ ابو الحجاج المزی نے اس کو منکر کہا ہے۔

ہزار مہینوں کے تقریباً ۸۳ سال ہوتے ہیں۔ سنہ ۴۰ھ میں معاویہ کی بیعت عام کی گئی اور بنی امیہ کی حکومت شروع ہوئی۔ یزید کے بعد تقریباً نو برس حرمین اور اہواز و عراق وغیرہ بنی امیہ کی حکومت سے نکل گئے اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کی خلافت ان مقامات پر تسلیم کی گئی اور یہ ملک آپ کے زیر حکومت آگئے۔ نو سال کے بعد جب حجاج نے آپ کو شہید کردیا تو پھر تمام ممالک پر بنی امیہ کی حکومت ہوگئی اور سنہ ۱۳۲ھ تک قائم رہی پھر زمامِ سلطنت بنی عباس کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔ سنہ ۴۰ھ سے سنہ ۱۳۲ھ تک ۹۲ سال ہوتے ہیں اور ۹۲ میں سے نو سال ساقط کرنے کے بعد ۸۳ باقی رہتے ہیں۔ لہٰذا قاسم بن الفضل کا حساب صحیح ہے۔ علامہ سیوطی نے اتقان میں بعض مفسرین کا قول نقل کیا ہے کہ الف شہر سے بنی امیہ کی حکومت کے ہزار ماہ مراد لینا بدعت ہے۔ (یعنی نئی بات ہے جو حدیث سے ثابت نہیں)

(۲) شیخ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کرتے ہوئے مجاہد کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ رسول اللہ نے کسی اسرائیلی شخص کا ذکر فرمایا جو ہزار ماہ تک راہِ خدا میں جہاد کرنے کے لئے ہتھیار بند رہا تھا۔ صحابہ کو اس شخص کی اطاعت گزاری پر تعجب ہوا تو یہ سورت نازل ہوئی دوسری روایت میں آیا ہے کہ وہ شخص ہزار ماہ تک راہِ خدا میں دن میں جہاد کرتا اور رات کو عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے ابو زرعہ کی وساطت سے اس روایت کی نسبت مجاہد کی طرف کی ہے۔ بلکہ یونس بوساطت ابن وہب از مسلمہ بن علی کی اسناد سے علی بن عروہ کا قول بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے ایک روز چار اسرائیلیوں کا ذکر فرمایا۔ حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل ابن العجوز اور حضرت یوشع بن نون۔ کہ یہ حضرات اسی برس تک مسلسل اللہ کی فرماں برداری کرتے رہے۔ ایک دم کے لئے بھی نافرمانی نہیں کی۔ صحابہ کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا تو اللہ نے سورہ انا انزلناہ فی لیلۃ القدر نازل فرمائی۔

(۳) شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ کو خواب میں امتوں کی عمریں دکھائی گئیں جو اکثر ساٹھ اور ستر برس کے درمیان تھیں۔ آپ کو اس خواب سے فکر پیدا ہوگئی کہ اتنی سی عمر میں میری امت کیا کام کرے گی۔ قیامت کے روز گزشتہ امتوں والے اپنی بڑی بڑی عمروں کی نیکیوں کا ثواب پالیں گے اور میری امت والے اپنی عبادت کی قلت پر شرمندہ ہوں گے۔ اس پر اللہ نے آپ کی تسلی کے لئے یہ سورت نازل فرمائی۔

مؤخر الذکر دونوں روایات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں اس لئے تعیین کے ساتھ کسی واقعہ کو نزول سورت کا سبب نہیں قرار دیا جاسکتا [illegible]۔

ممکن ہے کہ یہ اور ان جیسے دوسرے واقعات نزول سورت سے پہلے ہوئے ہوں اور تمام ماحول کے اقتضا کے تحت اس سورت کا نزول ہوا ہو۔

لیلۃ القدر کا ذکر احادیث میں

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ جب رمضان کا مہینہ آیا تو رسول اللہ نے فرمایا۔ لوگو ماہ رمضان آگیا۔ یہ برکت کا مہینہ ہے۔ اللہ نے اس مہینے کے روزے تم پر فرض کئے ہیں۔ اس ماہ میں جنت کے دروازے کھول دیئے اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ شیاطین کو طوق و سلاسل میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے افضل ہے۔ جو کوئی اس رات کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہے۔ (رواہ النسائی واحمد باسناد جید)

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے شب قدر میں ایمان و یقین کے ساتھ بامید ثواب قیام کیا (یعنی ذکر و عبادت میں مشغول رہا) اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (رواہ البخاری و مسلم)

شب قدر کا مہینہ اور تاریخ

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ لیلۃ القدر رمضان ہی میں ہوتی ہے اور ہر رمضان میں ہوتی ہے۔ ابو داؤد نے سنن میں اس کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور حضرت ابن عمر کی مرفوع حدیث نقل کی ہے جس کے راوی سب ثقہ ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس کو حضرت ابن عمر کا اثر قرار دیا ہے۔ چونکہ حضرت ابن عمر کا قول مبہم ہے اس لئے امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ پورے رمضان میں (احتیاطاً) تلاش کرنی چاہیئے۔

تعیین تاریخ کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ (۱) ابو رزین کے نزدیک اول رات میں ہوتی ہے (۲) سترہویں شب لیلۃ القدر ہے۔ اس سلسلہ میں ابو داؤد نے حضرت ابن مسعود کی ایک حدیث مرفوعاً اور موقوفاً نقل کی ہے۔ حضرت زید بن ارقم اور حضرت عثمان بن العاص کا یہی قول ہے۔ امام شافعی اور حسن بصری سے بھی یہی منقول ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ یہی لیلۃ القدر تھی۔ رمضان کی سترھویں تاریخ اور دن جمعہ کا تھا۔ اور اسی کی صبح کو جنگ بدر ہوئی۔ اسی کو یوم الفرقان کہا گیا ہے۔

(۳) لیلۃ القدر انیسویں رمضان ہے۔ اس قول کی نسبت حضرت علی نیز حضرت ابن مسعود کی طرف کی گئی ہے۔

(۴) اکیسویں رمضان ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ نے رمضان کے پہلے عشرے میں اعتکاف کیا اور ہم لوگوں نے بھی حضور کے ساتھ اعتکاف کیا۔ پھر حضرت جبرئیلؑ نے آکر حضور کو اطلاع دی کہ جس چیز کو آپ ڈھونڈ رہے ہیں وہ آگے ہے۔ آپ نے پھر درمیانی عشرے میں اعتکاف کیا اور ہم لوگوں نے بھی کیا۔ حضرت جبرئیلؑ نے پھر آکر کہا کہ جو بات آپ تلاش کر رہے ہیں وہ آگے ہے۔ اس کے بعد حضور نے بیسویں تاریخ کی صبح کو ایک تقریر فرمائی اور ارشاد فرمایا جو میرے ساتھ اعتکاف کر چکا ہے وہ پھر (اعتکاف میں) آجائے۔ میں نے لیلۃ القدر دیکھی تھی مگر میرے ذہن سے (اس کی تعیین) فراموش کرا دی گئی۔ وہ آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے۔ میں نے دیکھا کہ گویا پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں۔ حضرت ابو سعید کا بیان ہے کہ مسجد کی چھت درخت کھجور کی کڑیوں سے پٹی ہوئی تھی (شام کو) آسمان پر کہیں بادل کا نشان بھی نہ تھا لیکن رات میں ابر کا ٹکڑا آیا اور بارش ہو گئی۔ صبح کو حضور نے ہم کو نماز پڑھائی تو اللہ نے آپ کا خواب سچ کر دکھایا۔ کیونکہ میں نے خود دیکھا کہ (رات کو چھت ٹپکنے کی وجہ سے مسجد کے اندر کیچڑ ہو گئی اور کیچڑ میں سجدہ کرنے کی وجہ سے) حضور کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا نشان تھا۔ یہ واقعہ اکیسویں صبح کا ہے۔ شافعی نے تمام روایات میں اسی کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔

(۵) تیئیسویں رمضان ہے۔ اس کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن انیس کی حدیث لائی جاتی ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ عبداللہ بن انیس کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ لیلۃ القدر میں پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں۔ رات کو اتفاقاً پانی برسا اور صبح کو حضورؐ نے ہم کو نماز پڑھائی تو میں نے خود دیکھا کہ آپ نے پانی اور مٹی میں سجدہ کیا اور یہ تیئیسویں رمضان کی صبح تھی۔ طحاوی نے اس حدیث کو مسند کیا ہے۔

(۶) رمضان کی چوبیسویں شب ہے۔ ابو داؤد طیالسی نے ابو نضرہ کی روایت سے حضرت ابو سعید خدری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ لیلۃ القدر چوبیسویں رات ہے۔ اس حدیث کے راوی سب ثقہ ہیں۔ طحاوی نے یہی حدیث حضرت بلالؓ کے بیان کے حوالے سے

نقل کی ہے۔ لیکن ان کی اسناد میں عبداللہ بن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔ امام احمد نے ابن لہیعہ کی یہی روایت لکھی ہے۔ بخاری نے حضرت بلالؓ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ لیلۃ القدر آخر عشرہ میں ہفتہ کی پہلی ہے یہ قول اگرچہ حضرت بلال کا ہے رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہے لیکن اس کی سند زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن مسعود حضرت ابن عباس حضرت جابر حسن بصری (ایک قول) قتادہ اور عبداللہ بن وہب نے بھی چوبیسویں کو لیلۃ القدر کہا ہے۔ ۲۹ کے حساب سے ہفتہ کی اول رات تیئیسویں ہوتی ہے اور ۳۰ کے حساب سے چوبیسویں غرض آخری ہفتہ کی پہلی شب پر دونوں روایتوں کا اتفاق ہے۔ طحاوی اور ابو داؤد نے بروایت حمید بن زنجویہ بحوالہ حضرت ابن عمر لکھا ہے کہ حضور سے لیلۃ القدر کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کل رمضان میں ہے۔ طحاوی نے کہا اس جملہ کے دو معنی ہوسکتے ہیں کہ لیلۃ القدر ہونے کا احتمال ہر عشرہ میں ہے اول عشرہ ہو یا درمیانی یا آخری۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ لیلۃ القدر قیامت تک ہر رمضان میں ہوگی۔ بعض ثقہ اصحاب روایت نے اس جز کو حضرت ابن عمرؓ کا قول کہا ہے یعنی رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہے۔ ہاں ایک دوسرے سلسلۂ روایت سے بحوالہ ابن عمر رسول اللہ کا یہ ارشاد آیا ہے کہ رمضان کے آخری ہفتہ میں تلاش کرو۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ حدیث حضرت ابوذر کی روایت سے بھی آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس والی حدیث مختلف سندوں سے مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ ایک میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔ اسے باقی سات راتوں میں تلاش کرو۔ یہ بات آپ نے بائیس راتیں گزرنے کے بعد فرمائی تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ تیئیسویں شب کو حضور نے فرمایا آج تلاش کرو۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ یہ آٹھ میں سے پہلی رات ہے۔ فرمایا نہیں۔ سات میں سے پہلی ہے۔ یہ مہینہ پورا (تیس دن کا) نہ ہوگا۔ ایک اور سند سے بھی حدیث انہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ غرض چھ سات سندوں سے [illegible] عبداللہ بن انیس کی روایت سے مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے اور حاصل سب کا یہ ہے کہ شب قدر کو آخری ہفتہ میں تلاش کرنا چاہیئے۔ لیکن حضرت ابن عمر کی جو مرفوع حدیث طحاوی نے نقل کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شب قدر آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ لوگوں نے خواب میں لیلۃ القدر آخری عشرے میں دیکھی تو حضورؐ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ آخری عشرے میں شب قدر ہونے پر تم سب کے خواب متفق ہیں لہٰذا اس کو آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ حضرت ابوذر کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اول، آخری دس میں پھر آخری سات میں ہونے کا اظہار فرمایا۔ یہی قول حضرت ابن عمر کی ایک روایت سے بھی ثابت ہے کہ حضور نے فرمایا لیلۃ القدر آخری عشرے میں ڈھونڈو۔ اگر ایسا نہ کرسکو تو آخری ہفتہ میں تلاش کرنے سے تو دریغ نہ کرو۔ طحاوی نے لکھا اختلاف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعات مختلف سالوں کے ہیں۔ ہر سال کے متعلق حضور نے جدا جدا شب قدر ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔

(۷) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ پچیسویں شب کو بھی لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔ نویں باقیہ میں اور ساتویں باقیہ میں اور پانچویں باقیہ میں۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ اس سے طاق راتیں مراد ہیں جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید کی روایت سے منقول ہے۔

(۸) لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہے۔ حضرت ابی بن کعب کی روایت میں بھی آیا ہے اور یہ روایت مرفوع ہے۔ رواہ مسلم۔ زر بن حبیش کا بیان ہے۔ میں نے حضرت ابی بن کعب سے عرض کیا۔ ابو المنذر آپ کے بھائی ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جو شخص پورے سال قیام شب کرے گا اس کو شب قدر ضرور مل جائے گی تو آپ کیا فرماتے ہیں۔ حضرت ابی نے جواب دیا۔ ابن مسعود پر اللہ کی رحمت ہو۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ شب قدر رمضان میں ہے اور ستائیسویں رات ہے یہی۔ میں نے عرض کیا۔ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ فرمایا ان علامات سے ہم کو معلوم ہوا جو ہم کو بتلائی گئی تھیں کہ اس کی صبح کو طلوع کے وقت آفتاب کی شعاعیں نہیں ہوں گی (یعنی کرنیں ماند اور دھیمی محسوس ہونگی) رواہ احمد فی المسند، مسلم اور طحاوی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے مگر حضرت ابی کے الفاظ میں کچھ رد و بدل ہے۔ طحاوی نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں حضرت ابن مسعود کا قول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کی انیسویں میں تلاش کرو جس کی صبح کو

جنگِ بدر واقع ہوئی نہ ملے تو اکیسویں اور تیئیسویں میں تلاش کرو۔ حضرت ابی کے قول کو ایک جماعت نے ترجیح دی اور امام احمد نے بھی اسی پر جزم کیا ہے اور امام اعظمؒ کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے استنباط اور قیاس سے کام لے کر ستائیسویں شب کو لیلۃ القدر قرار دیا ہے دیکھو جملہ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ میں لفظ ہِیَ اس سورت کا ستائیسواں لفظ ہے اور لیلۃ القدر کی طرف یہ ضمیر راجع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر ستائیسویں ہے۔

طبرانی نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا یہ قول بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے صحابہ سے لیلۃ القدر کو دریافت کیا۔ سب نے باتفاق آراء ظاہر کیا کہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ میرے خیال میں فلاں رات ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ فلاں کونسی۔ میں نے عرض کیا گزری ہوئی ساتویں یا آنے والی ساتویں (یعنی آخری عشرہ کی ساتویں مراد ستائیسویں) فرمایا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ میں نے عرض کیا۔ امیر المومنین اللہ نے سات آسمان بنائے اور سات زمینیں اور سات ایام اور زمینہ کا دور ہفتہ پر مقرر کیا۔ اور انسان کو سات سے پیدا کیا اور آدمی سات چیزوں میں سے کھاتا ہے اور سات ہڈیوں سے سجدہ کرتا ہے۔ طواف کے بھی سات چکر ہوتے ہیں اور منیٰ میں کنکریاں بھی سات ماری جاتی ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا تم ایسی بات سمجھے جو ہم نہیں سمجھے۔ قتادہ نے کہا۔ سات میں سے کھانے کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا الخ۔ اس میں کھانے کی سات چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ واللہ اعلم

(۹) بعض آیات میں انتیسویں شب لیلۃ القدر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام احمد نے حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ سے لیلۃ القدر کے متعلق دریافت کیا گیا۔ فرمایا آخری عشرہ میں تلاش کرو۔ وہ طاق رات ہے۔ ۲۱ یا ۲۳ یا ۲۵ یا ۲۷ یا ۲۹ یا آخری رات امام احمد نے بحوالہ ابو داؤد طیالسی حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایت لکھی ہے کہ لیلۃ القدر بیس کے بعد ساتویں (۲۷) یا نویں (۲۹) ہے۔ اس رات ملائکہ زمین پر کنکریوں کی شمار سے بھی زائد ہوتے ہیں۔ امام احمد نے حضرت ابو بکر کی روایت مرفوعاً نقل کی ہے کہ باقی رہنے والی نویں یا ساتویں یا پانچویں یا تیسری یا آخری رات کو تلاش کرو۔ (یعنی ۲۱-۲۳-۲۵-۲۷ یا ۲۹ میں تلاش کرو) ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ طحاوی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

قولِ فیصل امام شافعی قائل ہیں کہ ہمیشہ ہر رمضان کی ایک ہی تاریخ کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور اختلافِ روایات کا سبب یہ ہے کہ سائل جب سوال کرتے تھے کہ ہم فلاں رات میں عبادت کریں تو حضور اجازت دے دیتے تھے۔ سوالات مختلف تھے اس لئے جواب بھی مختلف طور پر دیئے گئے۔ امام مالک، امام سفیان ثوری، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، مزنی اور ابن خزیمہ وغیرہم کے نزدیک آخری عشرہ میں کسی طاق رات کو ہوتی ہے اور تاریخ بدلتی رہتی ہے۔ ترمذی نے ابو قلابہ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے جو معین طور پر ستائیسویں شب ہونے کی صراحت کی تھی اس کی روشنی میں سلف کا ایک گروہ ستائیسویں کی تعیین کا ہی قائل ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل قول یہ ہے کہ آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے اور ستائیسویں تاریخ ہونے کا قوی گمان ہے۔

شبِ قدر کی دعا ام المومنین حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ اگر میں شبِ قدر پالوں تو کیا دعا کروں۔ فرمایا یہ دعا پڑھو۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ۔

تنبیہ عوام میں مشہور ہے کہ شبِ قدر کو سارے جہان میں خصوصی نور پھیل جاتا ہے۔ دنیا جگمگا جاتی ہے۔ ہر درخت سبزہ اور مکان سربسجود ہوجاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری خرافات بے اصل ہے۔ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ ہاں لاتعداد فرشتوں کا نزول رحمتِ الٰہی کی نورانی بارش اہلِ ایمان کے دلوں میں مزید طمانیت اور سکینۂ روحانی کا ثبات اور ان کے لئے فرشتوں کا استغفار اور اللہ کی طرف سے مومنوں کو سلامتی عافیت اور رحمت کی بشارت اور صبح کو بغیر تیز شعاعوں کے سورج کی شکل میں سورج کا طلوع اور ایک رات کی عبادت کا ہزار ماہ کی عبادت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ثواب اور اس طرح کی دوسری خصوصیات کا ذکر نصِ قرآن صحیح احادیث اور استنباط قیاسی سے ثابت ہے۔

[illegible] آلام آکلیف ذہنی پر ام [illegible]

ہوتا ہے۔ بعض لوگ قائل ہیں کہ مکروہات کا نزول تو پندرھویں شعبان کی رات میں ہوتا ہے اور نیکیاں اور بھلائیاں شب قدر میں نازل ہوتی ہیں خطیب نے تفسیر سراج میں اس قول کو نقل کیا ہے مگر یہ محض قیاسی قول ہے۔ کسی صحیح روایت میں یہ تفصیل نہیں آئی۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن الضریس اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے اتار کر آسمانِ دنیا کے بیت العزت میں رکھ دیا گیا۔ پھر بیت العزت سے حضرت جبرئیلؑ حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا بحکم الٰہی دنیا میں لے کر آئے اور اس طرح ۲۳ سال میں تمام قرآن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ واللہ اعلم

انا انزلناہ۔ ہم ہی نے نازل کیا قرآن۔ باجماع مفسرین ہٗ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ چونکہ پورا قرآن رسول اللہ پر اس رات کو نازل نہیں ہوا اس لئے یا تو یہ مراد ہے کہ آسمانِ دنیا پر لوحِ محفوظ سے پورا قرآن اس رات میں اُتار دیا۔ لفظ انزلنا اس مطلب کی تائید کر رہا ہے۔ کیونکہ لفظ انزال کا معنی یہ نہیں ہے کہ تھوڑا تھوڑا نازل کیا اور دنیا میں قرآن کا نزول تدریجاً ہوا تھا اسی لئے جہاں تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کو ظاہر کرنا مقصود ہے وہاں تنزیل (بابِ تفعیل) استعمال کیا ہے۔ جیسے تنزیل من رب العالمین۔ ما نزلنا علیٰ عبدنا۔ تنزیل الکتاب وغیرہ یا انزلنا سے مراد مطلقاً نازل کرنا ہے۔ کیونکہ انزال کے مفہوم میں نہ تدریج شرط ہے نہ یکدم نزول۔ بلکہ اس کا معنی ہے اتارنا۔ اس وقت ہو سکتا ہے کہ قرآن کا رسول اللہ پر اسی رات میں نازل کرنا مراد ہو یعنی آغازِ نزول اسی رات کو ہوا اگرچہ تکمیلِ نزول مختلف اوقات و ایام میں ۲۳ برس میں ہوئی۔

انا انزلناہ کو جملۂ اسمیہ کی صورت میں ذکر کرنا اور ضمیرِ متکلم کو آغازِ کلام میں ذکر کر کے دوبارہ انزلنا کو ذکر کرنا کلام میں زور، استحکام، تاکید اور ازالۂ شبہات کو ظاہر کر رہا ہے۔ مضامین کی ندرت، کمال اور افکار و اعمال کی اصلاح کا مجموعہ ہونے کے علاوہ اسلوبِ ادا، طرزِ تعبیر الفاظ کی ترتیب و ترکیب اور اثر آفرینی کے لحاظ سے بھی قرآن کی مثل اس عالم میں کسی زبان کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے اور عربی میں تو بہرحال موجود تھی ہی نہیں۔ نہ نزولِ قرآن کے بعد کسی عربی کلام کو بلاغت جزالت حلاوت ملاحت دل نشینی تاثیر انقلابی اور رعایتِ اعجازی کا یہ پایہ حاصل ہو سکا اس لئے اس کے آغازِ نزول کے بعد تاریک باطل کور دماغ اور کج ذہن رکھنے والوں کو طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ امر مسلم ہے کہ یہ کلام فوق البشر طاقت کا ہے اور رسول اللہ کی زبان اس کلام کے لئے صرف آلۂ اظہار ہے لیکن اصل متکلم کون ہے کوئی کہتا جن کا کلام ہے۔ کوئی کہتا یہ کہانت کا نتیجہ ہے اور کوئی اس کو سحر کہتا اور شاید زیادہ سنتوری روحانیت کا دعویٰ کرنے والے فلسفۂ الٰہیات کے کالے ہوئے یہ بھی کہنے لگیں کہ کسی عقل مجرد یا روحِ اعلیٰ یا جبرئیل کا کلام ہے اور اسی عقل روح اور جبرئیل سے ربط پیدا ہو جانے یا اس کے حلول کرنے کی وجہ سے محمدؐ کی زبان سے اس کا اظہار ہونے لگا۔ اس تمام خرافات کی تردید کے لئے اللہ نے فرما دیا کہ ہم ہی نے اس کو اُتارا ہے۔ کوئی دوسرا اس کلام کو بنانے والا اور بھیجنے والا نہیں ہے۔ یعنی جبرئیل صرف حامل اور قاصد کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ وہ خود بولنے والا اور پڑھنے والا ہے۔ نہ کلام بنانے والا اور بھیجنے والا اور درستی کرنے والا۔

لیکن ایک اعتراض اور معترضین کی نظر میں ناقابلِ حل اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ ازلی ہے، ابدی ہے، سرمدی ہے، غیر مادّی ہے، فرید مجرد ہے، واجب ہے، لافانی اس کی حقیقت وجود اور نور ہے اور انسان نہ ازلی ہے، نہ ابدی ہے، نہ واجب، نہ لافانی، نہ اس کی حقیقت وجود اور نور ہے۔ یہ ظلوم و جہول ہے، کثیف اور مادّی ہے، ممکن اور حادث ہے۔ دونوں کا اتصال ممکن ہی نہیں۔ واجب اور ممکن دو متضاد وجود ہیں۔ کلامِ الٰہی کلامِ [illegible] کلامِ [illegible]، کلامِ نورانی اور کلامِ واجب کی حامل انسانِ ناقص، انسانِ مادّی۔ انسانِ کثیف و فانی کی زبان ہو جائے یہ ناممکن ہے۔ کلامِ الٰہی [illegible] ہے۔ بے صوت ہے۔ اس کے کسی حصہ کا کسی حصہ سے نہ تقدم ہے نہ تاخر۔ نہ وہ ادوارِ الصوت [illegible] شکل پکڑ سکتا ہے نہ اس کے لئے کوئی [illegible] ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی ہوا یا بجلی یا کوئی اور سیال یا لامع چیز اس کی حامل بن سکتی ہے۔ پھر [illegible] کی کلام کیسے ہو سکتا ہے۔ [illegible] آواز اس کی حامل ہے۔ کلام اس کو کہتے ہیں، الفاظ جو ان کی ساخت ہے [illegible]

[illegible]

بناوٹ، اور وارفتگی میں دوسرے کلام کی طرح پورا دخل ہے۔ اس مختصر لفظ انا انزلناہ میں اس مکڑی کے جال سے زیادہ کمزور شبہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ کلام واجب بھی واجب ہوتا ہے اور کلام مقدس کا قدسی ہونا لازم ہے۔ نور نور ہے، ظلمت نہیں بن سکتا لیکن یہ تصور سمجھ وقت کیا جاسکتا ہے جب وجوب و امکان اور قدم و حدوث کے درمیان کوئی نقطۂ اجتماع و اتصال نہ مانا جائے۔ دو نقیضوں کا اجتماع محال ہے مگر دو ضدوں کا اجتماع تو ممکن ہے۔ واجب و ممکن قدیم و حادث اور نور و ظلمت باہم متناقض نہیں متضاد ہیں اور ایسا ممکن ہے کہ ایک چیز اپنی بلندی کی انتہائی چوٹی کی سطح پر پہنچ جائے اور اس کی ضد اپنی پستی کے آخری نقطہ پر آجائے۔ اس طرح دونوں کا اتصال و اجتماع ہوسکتا ہے۔ کیا رات دن، روشنی تاریکی، سیاہی سفیدی اور تمام متضاد چیزوں کا اتصال اس طرح نہیں ہوتا ہے۔ حرارت، برودت، تری خشکی، کثافت، لطافت، قوت ضعف، تمام امور اسی طرح مل کر اعتدالی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور نقطۂ اعتدال پر آتے ہیں۔ پس اسی طرح افراد بشری میں سے ایک فرد کو اللہ نے سطح کمال امکانی تک اونچا کیا، عبدیت کی چوٹی پر پہنچایا۔ بشریت کی تکمیل کی۔ دوسری طرف اپنے بے کیف، بے صوت اور ترتیب و ترکیب سے مستغنی کلام وجوب و نورانیت کی نچلی سطح پر لایا۔ بارگاہ الوہیت سے نیچے اتارا۔ دائرۂ ممکن کے قریب بنایا۔ اس طور پر جس بشر کے گوش شنوا اور عقل رسا سے اس کلام کا اتصال ہوا اس پر الوہیت کا پرتو پڑ گیا۔ وہ بہمہ حیثیت عبد ہوتے ہوئے بھی تمام عباد میں ممتاز ہوگیا۔ مجمع البحرین بن گیا۔ تمام مخلوق سے زیادہ اس کا ربط خالق سے پیدا ہوگیا۔ اور جو کلام اس کی روح مقدس اور دانش انور کے کانوں نے سنا وہ کلام باوجود بے صوتی اور بے کیفی کے سنا جانے لگا، زمان و مکان کی حدود میں آگیا۔ اس کے تلفظ میں ترتیب ہوگئی اور اس کے ترکیبی حروف میں تقدم و تاخر بھی پیدا ہوگیا۔ پس اللہ ہی نے اس کلام نورانی قدیم قدسی کو بشریت کی انتہائی بلند چوٹی تک اتارا اور انسانیت کی یہی منزل مجمع البحرین قرار پائی۔ واللہ اعلم

فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ۔ قدر کی رات میں۔ دوسری آیت میں آیا ہے انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ۔ ہم نے ہی برکت والی ایک رات میں اس قرآن کو اتارا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکۃ ایک ہی ہے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔ ماہ رمضان وہی ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان میں ہے۔

قدر کے تین معنی ہیں۔ (۱) عظمت بزرگی یعنی عظمت والی رات میں ہم نے قرآن اتارا (زہری) (۲) تقدیر، اندازہ فرمانا یعنی ایسی رات جس میں بندوں کے تمام احوال موت و حیات مقدر کردیئے جاتے ہیں۔ ہر ایک کی تقدیر کا لکھا فرشتوں کو بتا دیا جاتا ہے۔ (۳) تنگ ہوجانا یعنی اس رات میں زمین پر اتنے فرشتے اترتے ہیں کہ زمین تنگ ہوجاتی ہے۔ (خلیل بن احمد فراہیدی امام نحو) مفسرین نے عموماً زہری کی تفسیر کو پسند کیا ہے۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ۔ اور آپ کو معلوم بھی ہے کہ شب قدر کیسی عظیم الشان رات ہے۔ سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ رسول اللہ کو خطاب کرکے جہاں جہاں وما ادراک فرمایا ہے وہاں حضور کو ضرور آگاہ کیا ہے (اس قول کے موافق رسول اللہ کو شب قدر کی تاریخ تعیین کے ساتھ اللہ نے بتا دی تھی لیکن حضور نے مصلحت کے زیر اثر امت کو کوئی خاص معین تاریخ نہیں بتائی بلکہ رمضان کے آخری عشرہ کی مختلف طاق راتوں میں بغیر خصوصی تعیین کے شب قدر ہونے کا تذکرہ فرما دیا)

لیلۃ القدر خیر من الف شہر۔ یعنی جن ہزار مہینوں میں شب قدر نہ ہو ان سے ایک شب قدر افضل ہے۔ ہزار ماہ کے تراسی برس ہوتے ہیں اور ہر سال میں شب قدر ہونا ضروری ہے لیکن ہزار مہینوں میں شب قدر ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ ہر سال کا رمضان کا مہینہ خارج کرکے مہینوں کا حساب کیا جائے تو شب قدر کا مہینہ شمار میں نہیں آئے گا۔ مجاہد، قتادہ اور امام شافعی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور [illegible] ۸۳ [illegible] کی یہی وجہ سمجھی جاتی ہے [illegible] اسی کو [illegible] ہے۔

[illegible] ایک رات [illegible] داری کی

رات کے ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

شب قدر کی یہ فضیلت کن کن چیزوں میں ہے۔ عبادت کے ثواب کے لحاظ سے عطاء قرب و معرفت کے لحاظ سے فیضانِ رحمت و قبولِ دعا کے لحاظ سے نزولِ برکات کے لحاظ سے، تقدیرِ امور اور تقسیمِ کار کے لحاظ سے ملائکہ کی ڈیوٹیاں مقرر کرنے اور انسانوں کی تمام خدمات کی سرانجام دہی اور بہم رسانی کے لحاظ سے غرض بکثرت مادی، معاشی، روحانی اور عرفانی امور کے لحاظ سے اس رات کو باقی ایام پر فضیلت حاصل ہے۔ چنانچہ آگے ارشاد ہوا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ شبِ قدر میں رب کے حکم سے ملائکہ اور روح اترتے ہیں۔ اس جملہ میں چند لفظ تحقیق طلب ہیں۔ (۱) تنزل الملائکۃ۔ یعنی فرشتے ٹکڑیوں اور گروہوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اُترتے رہتے ہیں یوں تو تعلقی ملائکہ جن کے متعلق دریاؤں کی، پہاڑوں کی، درختوں کی، بارش اور ہواؤں کی اور دوسری کائناتِ ارضی کی خدمت ہے ہمیشہ زمین پر پھیلے رہتے اور خدمتِ مقررہ کی انجام دہی میں مشغول رہتے ہیں۔ خیر و شر لکھنے والے کاتب بھی ہمیشہ دن رات کی ڈیوٹیاں پوری کرتے رہتے ہیں۔ لیکن لفظ تنزل سے معلوم ہو رہا ہے کہ شبِ قدر میں اوپر سے اُترنے والے ملائکہ وہ ملائکہ نہیں ہوتے جو زمین پر خدمت پر مامور ہیں بلکہ دوسرے سماوی ملائکہ ہوتے ہیں جو عذاب کے نہیں رحمت کے، مصیبت کے نہیں سلامتی اور عافیت کے فرشتے ہوتے ہیں۔

یہ ملائکہ کتنے ہوتے ہیں۔ صحیح تعداد کسی صحیح حدیث میں نہیں آئی۔ ابوداؤد طیالسی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا لیلۃ القدر ستائیسویں یا انتیسویں ہے۔ اس رات ملائکہ زمین پر کنکریوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ملائکہ کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایک دم سب کی سمائی زمین پر نہیں ہو سکتی اس لئے تَنْزِلُ نہیں فرمایا بلکہ تَنَزَّلُ فرمایا یعنی گروہ گروہ ہو کر یکے بعد دیگرے ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ ایک ٹکڑی جاتی ہے دوسری آتی ہے۔

(۲) والروح۔ جمہور مفسرین کے نزدیک روح امین یعنی جبرئیل مراد ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ روح ملائکہ کی ایک خاص قسم ہے۔ بعض نے کہا کہ روح ایک فرشتہ کا نام ہے جس کا مسکن زیرِ عرش ہے۔ خطیب نے حضرت علی کی روایت سے اس کی کلانی اور عظمت کی تصویر کشی کی ہے جو اصولِ روایت کے لحاظ سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

حضرت انس کی مرفوع روایت ہے کہ لیلۃ القدر میں جبرئیل ملائکہ کی جماعت کو ساتھ لے کر اترتے ہیں اور ہر بندہ جو نماز یا ذکر و تلاوت میں مشغول ہوتا ہے اس کو اللہ کی طرف سے درود و سلام پہنچاتے ہیں۔

خطیب نے لکھا ہے کہ جس گھر میں کوئی مومن مرد یا عورت موجود ہوتا ہے جبرئیل وہاں پہنچ کر اللہ کی طرف سے پیام سلامتی پہنچاتے ہیں۔ ہاں جو شراب خواری کا عادی ہو اور اس نے توبہ نہ کی ہو اور قرابت داری کو قطع کرنے والا اور سور کا گوشت کھانے والا اس پیام سے محروم رہتے ہیں۔ خطیب نے یہ بھی لکھا ہے۔ اگرچہ اس کی روایتی سند نہیں ہے کہ حضرت جبرئیل چار جھنڈے لے کر آتے ہیں۔ ایک جھنڈا کعبہ پر ایک بیت المقدس پر، ایک رسول اللہ کے روضۂ اقدس پر ایک کوہِ طور پر نصب کرتے ہیں۔

ابن کثیر نے لکھا ہے یوں بھی تلاوتِ قرآن کے وقت ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور جس مجلس میں ذکرِ الٰہی ہوتا ہے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ اور جو شخص سچی نیت سے علمِ دین کا طلبگار ہوتا ہے اس کے قدموں کے نیچے اپنے بازو بچھاتے ہیں۔ یہ تو عمومی حالت ہوتی ہے اور اس رات میں تو ان گنت ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی بے پایاں رحمت اللہ کے ایماندار عبادت گزار، اطاعت شعار بندوں کو گھیر لیتی ہے۔ فرشتے ان کے لئے استغفار اور دعائے رحمت کرتے ہیں۔

ہم اس تفسیر میں متعدد جگہ لکھ چکے ہیں اور بیضاوی وغیرہ نے بھی لکھا ہے کہ ملائکہ کا لفظ یا الاکۃ سے مشتق ہے یا ملاک سے یعنی اس کے حروفِ اصلیہ ہیں واؤ دونوں ہیں باہم۔ اول کا معنی ہے پیام رسانی اور دوسرے کا معنی ہے دار و مدار۔ فرشتوں کے متعلق اللہ نے دونوں طرف کا اشارہ کر دی ہے کچھ فرشتے اللہ کا پیام ہر آن ہر ذرۂ کائنات کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے جلیل القدر امین

صاحب قوت فرشتہ کا نام جبرئیل ہے جو سب کے سردار ہیں اور دیگر خدمات کے علاوہ پیغمبروں کے پاس اللہ کی طرف سے وحی پہنچانا بھی ان کا کام ہے۔ کچھ ملائکہ انتظامی ہیں۔ عرش سے فرش تک اور ذرے سے آفتاب تک تمام ارضی فضائی اور سماوی کائنات کا انتظام ایجاد تربیت اٹھانا گرانا سکون عطا کرنا اور حرکت دینا، یہاں تک کہ زندہ رکھنا یا مارنا ہر چیز کے ہر نظم کا تعلق بحکم الٰہی انہی سے ہے یہی مؤکل، خادم اور ناظم ہیں۔

الملائکہ کے ساتھ الروح کو ذکر کرنا شاید اس بات کا قرینہ ہے کہ الملائکہ سے وہ فرشتے مراد ہیں جو ہر ذرۂ کائنات کو پیام خداوندی پہنچاتے ہیں جن کے سردار حضرت جبرئیل ہیں۔ یہی ملائکہ شبِ قدر میں اہلِ ایمان اور عبادت گزار بندوں کو اللہ کی طرف سے سلامتی و رحمت کے پیام پہنچاتے ہیں۔ واللہ اعلم

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ - اپنے رب کی اجازت سے۔ رب کا معنی ہے آہستہ آہستہ ترقی اور تربیت دے کر حد کمال تک پہنچانے والا۔ یہ لفظ مالک کے بھی مستعمل ہے۔ یوں تو عالم کا کوئی ذرہ بغیر اذنِ رب کے ادنیٰ حرکت بھی نہیں کر سکتا لیکن یہ اذنِ فطری اور ضابطہ فطرت کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ لیکن زمین پر جوق در جوق آسمانی ملائکہ کا اترنا اور جبرئیل کا فرشتوں کی جماعت کے ساتھ ہر مومن کے گھر پر جا کر اللہ کی طرف سے پیام سلامتی پہنچانا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور اللہ کی غیبی ربوبیت کا اس سے عظیم الشان ظہور ہوتا ہے۔ ایک رات کی عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت کے برابر کر دینا اور فرشتوں کو اہلِ ایمان کے پاس طمانیت و سکینہ دے کر بھیجنا ایسی ربوبیت ہے جس کی تعبیر کے لئے ہم اللہ کی رحمت کا طرہ ہی کا لفظ کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ ملائکہ اور جبرئیل رب کے حکم سے نیچے اترتے ہیں، اور آسمانوں سے زمین پر آتے ہیں۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ - من کل امر کا تعلق یا سلام سے ہے یا سلام کا تعلق آگے آنے والے لفظ ہی سے ہے اور من کل امر کا تعلق تنزّلُ سے ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ ملائکہ ہر امر یعنی ہر طرح کی رحمت اور خیر سے اترتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ سب رحمت کے فرشتے ہوتے ہیں۔ ان فرشتوں کے نزول کا سبب ہر خیر و برکت ہوتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر خیر و برکت کے ساتھ اترتے ہیں۔ اول صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ ہر امر کی طرف سے اہلِ ایمان اور عبادت گزاروں کے لئے رحمت ہی رحمت اور سلامتی ہی سلامتی ہوتی ہے مؤخر الذکر صورت میں سلامٌ خبر اور ہی مبتدا ہوگا۔ یعنی شبِ قدر سلامتی اور بچاؤ ہوتی ہے۔ دوزخ کے عذاب سے اللہ کی ناراضگی سے ہر شر اور آفت سے شیطان اور نفس کے اغوا سے ہر بلا اور دینی دنیوی تباہی سے۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ - یہ شبِ فجر صادق کے طلوع تک رہتی ہے۔ اس کی ساری برکات اور نور کی بارشیں صبح صادق تک رہتی ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے رحمت اور خیر کا نزول تو ہر رات ہوتا ہے۔ بعض بعض اشخاص پر برکات کی بارش بھی ہوتی ہے۔ نور عرفان بھی برستا ہے لیکن روزانہ ایسا خاص خاص اوقات میں اور رات کے کسی حصۂ مخصوص میں ہوتا ہے۔ مثلاً آدمی رات کو یا پچھلی رات سے صبح تک لیکن شب قدر کی برکات اور رحمتیں غروبِ آفتاب سے فجر صادق کے طلوع تک یعنی پوری رات نازل ہوتی ہیں۔ رحمتِ الٰہیہ عبادت گزار مومن بندوں کو مژدۂ مغفرت و قربت سناتی ہے اور گناہگار بندوں کو گناہوں سے توبہ کر کے اپنے دامنِ عاطفت میں آنے کی دعوت دیتی ہے اور الہامات برستا رہتا ہے۔

مقصود بیان

[illegible] ثابت [illegible] نزول قرآن کا آغاز یعنی سورۂ اقرأ کا نزول دنیا میں شبِ قدر میں ہوا اور آیت شہر رمضان الذی انزل فیه القرآن سے ثابت ہے کہ نزول قرآن کا آغاز ماہ رمضان میں ہوا [illegible] [illegible] شروع ہوا [illegible] لیلۃ القدر فرمایا یعنی عظمت کی رات اور [illegible] کسی آسمانی کتاب کو بھی پیش نہیں کیا [illegible]

[illegible]

اتنا قرب ہو جائے کہ اس کا کلام الفاظ وعبارت کا جامہ پہن کر سامنے آجائے اور اس قابل ہو جائے کہ بندہ اس کو پڑھ اور سن سکے ۔اور اپنی تاریک راہِ زندگی کو طے کرنے کے لئے روشنی حاصل کر سکے۔

لیلۃ القدر خیر من الف شہر میں صاف صراحت ہے کہ ہزار مہینوں پر شب قدر کو فضیلت حاصل ہے۔یعنی اس کی افادیت اور برکت ہزار مہینوں سے زائد ہے۔ہزار کا لفظ غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ عرب کی زبان میں ہزار سے زیادہ عدد کے لئے کوئی لفظ موجود نہیں ہے اسی کو ضرب دینے سے زیادہ اعداد کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔لاکھ کروڑ نیل سنکھ کوئی گنتی بھی عربی زبان میں نہیں ہے۔اس صورت میں الف شہر سے مراد ہو گی طویل مدت جس کی کوئی گنتی نہیں تو گویا مقصود یہ ہو گا کہ ایک شب قدر جس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا قیامت تک آنے والے ہر دن سے بہتر ہے۔اسی طرح ماضی کے تمام ایام پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔اور کیوں نہ ہو کلام الٰہی کا اپنی پوری عظمت وجلال کے ساتھ مسموع ہونا اور قابلِ فہم صورت میں نمودار ہونا ایک ایسا شرف اور برکت ہے جس کی وجہ سے وہ قلب جس پر نزول ہوا تمام انسانوں کے قلوب سے زیادہ پر عظمت بابرکت اور افضل ہو گیا اور جس رات میں اس کا نزول ہوا وہ رات افضل الزمان بن گئی۔

تنزل الملائکۃ والروح فیہا کی عبارت بتا رہی ہے کہ ملائکہ اور روح یعنی جبرئیل کا نزول اس رات کو ہوتا ہے لیکن اگر لفظ تنزل کو گزشتہ شب قدر میں نزولِ قرآن سے مربوط قرار دے کر ماضی کی حکایت کہا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ نزولِ قرآن کے وقت قرآن کے جلو میں تمام ملائکہ اور روح القدس تھے۔تمام آسمانی خیر وبرکات اور زمینی شر وفساد کی غیبی طاقتیں کلام الٰہی کے جلو میں گرد اگرد آگے پیچھے لگی ہوئی تھیں، تاکہ شر کی تمام طاقتوں سے پورے طور پر کلام مقدس کی حفاظت ہو جائے۔کروڑ در کروڑ فرشتے آسمان سے زمین کے گوشہ گوشہ تک چھائے ہوئے تھے تاکہ کائناتِ انسانی کو پورے فکری وعملی انقلاب کے لئے ہدایتِ الٰہی مل جائے۔ادھر سے زمین کے ملائکہ استقبال کے لئے تیار تھے۔ اُدھر آسمان کے ملائکہ اپنے جھرمٹ میں ایسے کلام مقدس کو لے کر آرہے تھے جس کو کسی ناپاک (مادی) مخلوق کے ہاتھوں نے کبھی نہیں چھوا۔نہ اوہام کی نجاست سے گندہ عقلوں کو کبھی اس سے مس کرنا نصیب ہوا۔نہ اس کا امکان تھا کہ سوائے اُس مخلوق کے جس کو اللہ نے ہر کثافت ونجاست سے فطرۃً پاک کر دیا ہے کوئی اور اس کو چھو سکے۔اور یہ سب کچھ

باِذْنِ رَبِّہِمْ۔رب کی اجازت اور اس کے حکم سے ہو رہا تھا۔یعنی یہ وہ عمومی حکم نہ تھا جس کے زیر اثر ساری کائنات کا فطری نظام چل رہا ہے اور تکوینی اور تخلیقی طور پر ہر ذرہ اس حکم کا مسخر ہے بلکہ یہ خصوصی حکم اور امتیازی اذن تھا جس نے مادی اور علمی وعملی انقلاب کے پیام کے ساتھ تمام غیبی اصلاحی طاقتوں اور خیر مجسم نورانی مخلوق کو کر دیا تھا۔برکات، اور اصلاحات اور تعمیر خیر کی تمام قوتوں کا یکدم ایک وقت میں نزول اور کل روئے زمین پر شر کی طاقتوں کو شکست دے کر حق اور خیر کا جھنڈا نصب کر دینا اللہ کی خصوصی مشیت اور مرضی کے ماتحت ہوا تھا۔اللہ کو منظور ہی یہ تھا اور اس نے یہی صورت مقدر کر دی تھی کہ ایک رات میں کفر شرک اور بد عقیدگی کی کایا پلٹ جائے۔اور انسانیت کی ہستی سے بہیمیت کا اثر مٹ جائے۔اب ہر طرف سے

من کل امر سلام ہر شعبۂ زندگی میں سلامتی عافیت اور صلاح وفلاح کا لشکر یلغار کرنے لگا۔اور رات کی پوری تاریکی میں گمراہی اور ضلالت اور تباہی وبربادی کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا جانے لگا۔شرک، کفر، اوہام پرستی، سلف کی کورانہ تقلید قومی گروہی قبائلی ملکی وطنی اور لسانی جاہلیتوں کی عصبیت کو برباد کیا جانے لگا۔آخر تمام اندھیریاں چھٹ گئیں۔طاغوتی اور شیطانی طاقتیں ٹوٹ گئیں۔شر کے تمام حصار مٹ گئے اور قیامت تک اس روشنی کو ماند کرنے والی کوئی طاقت روئے زمین پر نہیں رہی۔توحید، ربوبیت، والوہیت کا اعلان کرنے والا اور معاشرۂ انسانی کو سدھارنے والا کلام انسان کے دل میں جم گیا، دماغ پر چھا گیا۔زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا اور فجر قیامت کے طلوع تک باقی رہنے والی برکات وعافیت نے معمورۂ انسانی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

ہی حتّٰی مطلع الفجر میں صراحت کر دی گئی کہ شب قدر صبح صادق کے طلوع تک رہتی ہے۔اس سے تردید ہو گئی ان علماء کے قول کی جو شب قدر کے بعد کئی دن کو بھی شب قدر کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔لیکن اگر تنزل الملائکہ کو گزشتہ نزول قرآن کے آغاز کی حکایت قرار دیا جائے

تو شاید مطلب وہی ہوگا جو ہم نے ابھی لکھا ہے کہ صبح قیامت کے طلوع تک شب قدر کی یہ عظمتیں برکتیں اور رحمتیں باقی رہیں گی۔ اور قیامت تک تعلیم قرآنی نہ مٹ سکے گی۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

سُورۃ البینۃ

اس سورت کا نام سورت لم یکن الذین کفروا اور سورۃ القیامۃ اور سورۃ المنفکین اور سورۃ البریۃ بھی ہے (سراج) اس میں آٹھ آیات چورانوے کلمات اور ۳۹۴ (بقول خطیب) اور ۳۹۶ (بقول شاہ عبدالعزیز دہلوی) حروف ہیں۔ رازی بیضاوی اور ابن کثیر نے اس کو بلا اختلاف مدنی کہا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ اس سورت کا نزول مدینہ میں ہوا۔ جمہور علماء کا بھی یہی قول ہے لیکن شیخ ابو السعود نے لکھا ہے کہ اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن سلام نے اس کو مکی کہا ہے۔

امام احمد نے حضرت مالک بن عمرو بن ثابت انصاری کی روایت سے لکھا ہے کہ جب سورۃ لم یکن الذین کفروا نازل ہوئی تو رسول اللہ نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا۔ مجھے جبرئیل نے اللہ کا حکم پہنچایا ہے کہ تم کو یہ سورت پڑھ کر سناؤں۔ حضرت ابی نے عرض کیا کیا میرا نام لیا گیا۔ حضور نے فرمایا ہاں۔ ابی رونے لگے۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ علی بن زید ضعیف راوی ہیں مگر اس کی تائید دوسری صحیح الاسناد روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔ اس روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ راوی نے یہ حدیث سن کر ابی بن کعب سے پوچھا۔ ابو المنذر آپ کو تو یہ فرمان سن کر بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ حضرت ابی نے فرمایا۔ بیشک خوشی نہ ہونے کی کیا وجہ۔ اللہ نے تو خود فرمایا ہے۔ فبذلک فلیفرحوا ہو خیر مما یجمعون۔

بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے بھی صحیح اسنادوں سے اسی مضمون کی احادیث نقل کی ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابی بن کعب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تجھے قرآن پڑھ کر سناؤں پھر آپ نے لم یکن الذین کفروا من اہل الکتاب۔ آخر سورت تک پڑھ کر سنائی اور آخر میں یہ بھی پڑھا۔ ولو ان ابن آدم سال وادیا الخ یعنی اگر آدمی وادی بھر مال مانگے اور میں اس کو دے دوں تو وہ دوسرا وادی بھر مال مانگے گا اور وہ بھی دیدوں تو پھر تیسرا وادی مانگے گا۔ آدمی کا پیٹ سوائے خاک کے اور کسی چیز سے نہیں بھرتا۔ جو اللہ سے توبہ کرے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ کے نزدیک دین ملت حنفیہ ہی ہے نہ مذہب شرک اور نہ نصرانیت و یہودیت۔ اور کسی کی نیکی برباد نہ جائے گی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ ذٰلک دین القیمہ پر مشہور قرأت کے مطابق سورت ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے جو ترمذی کی روایت میں آیا ہے ممکن ہے کہ وہ رسول اللہ کا کلام ہو یا آیات قرآنی ہی ہوں اور پھر منسوخ التلاوت ہو گئی ہوں۔ صحیح ترین روایت یہی ہے کہ صرف یہی سورت دین القیمہ تک سنانے کا حکم ہوا تھا اور یہی حضور نے سنائی تھی۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعود نے بعض آیات کی ایک خاص لہجہ سے قرأت کی۔ حضرت ابی بن کعب نے کہا۔ یہ طرز غلط ہے مجھے رسول اللہ نے دوسرے طرز سے پڑھنے کی تعلیم دی تھی۔ دونوں حضور کی خدمت میں پہنچے۔ دونوں سے حضور نے قرأت سنی اور فرمایا یوں بھی نازل ہوا ہے اور یوں بھی۔ حضرت ابی کا بیان ہے یہ سنکر شیطان نے میرے دل میں ایسا شک ڈالا کہ جاہلیت کے زمانہ میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ نے فوراً میرے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے میرا سارا شک کافور ہو گیا اور بدن سے پسینہ پھوٹ گیا۔ پھر حضور نے فرمایا۔ جبرئیل نے مجھے حکم پہنچایا تھا کہ اپنی امت کو ایک لہجہ سے قرآن پڑھائیے میں نے کہا میں اللہ سے درگزر کرنے کا خواستگار ہوں۔ جبرئیل نے دوبارہ آکر دو لہجوں سے تعلیم دینے کا حکم پہنچایا۔ میں نے پھر معافی کی درخواست کی۔ اس طرح ہوتے ہوتے آخر میں حکم دیا کہ سات لہجوں سے قرآن کی تعلیم دو۔ حضرت ابی کو یہ تفصیل سننے کے بعد بڑی پشیمانی ہوئی۔ اس کے بعد یہ سورت نازل ہوئی اور حضرت ابی کو خوش کرنے کے لئے اللہ نے حکم دیا کہ یہ سورت ابی کو سنائی جائے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحانُ

کا

پارہ نمبر ۳۰

(جزو چہارم)

عَمَّ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدّائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ "مولوی" دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

بصورتِ پارہ

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بک ڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمّدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی) سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے (قبل بعثتِ نبویہ) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے ہرگز) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آتی (یعنی) ایک

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اللہ کا رسول جو (ان کو) پاک صحیفے پڑھ کر سنا دے جن میں درست مضامین لکھے ہوں اور جو لوگ اہل کتاب تھے (اور غیر اہل کتاب تو بدرجۂ اولیٰ)

اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد (دین میں) مختلف ہو گئے حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خاص

حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

رکھیں یکسو ہو کر اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا بے شک جو لوگ اہل کتاب

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝

اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتشِ دوزخ میں جاویں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بیشک جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے نزدیک

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ

ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے۔

رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝

(یہ جنت اور رضا) اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے

تفسیر حق ناحق اور غلط صحیح کا قطعی فیصلہ کچھ فلسفہ و دانش کے دعویداروں نے اپنی ذہنی قوتوں اور فکری طاقتوں کے سپرد کر دیا جس چیز کو ان کی دانش نے صحیح کہا اس کو وہ صحیح کہنے لگے اور جس کو غلط کہا اس کو انھوں نے غلط سمجھ لیا۔ یہ مدعیانِ دانش و بینش اتنا بھی نہ سمجھے کہ انسانی فکر آزاد نہیں۔ زمان و مکان ماحول رسم رواج اور مختلف جذبات شخصی و دائمی قومی و وطنی اور عواطف مودت و نفرت سے گھری ہوئی ہے اس کی کوئی برہان تجربہ استقراء اور تمثیل کی بندشوں سے آزاد نہیں اور تجربہ و استقراء و تمثیل کی بناء صرف حال پر ہے۔ نہ ماضی کے دامن تک اس کی رسائی ہے نہ مستقبل کی سطح پر اس کی پہنچ ہے اور جس کو حال کہا جاتا ہے اس کا تجربہ بھی انتہائی ناقص ہے۔ روئے زمین پر زمانہ حاضر کی کل موجود

مثالیں نظر کے سامنے نہیں۔ نہ اکثر افراد کی موجودہ حالات کا پتہ اگر اکثر کو دیکھ کر عمومی ضابطہ بنا لیا جاتا تو وہ بھی ناقص ہی ہوتا۔ چہ جائیکہ چند مثالوں کو دیکھ کر عام ضابطہ اور اس آئین کی وضع اور اس پر عقل کے محیط کل اور اصلاحات بشری کے لئے کافی ہونے کا دعویٰ۔ پس جس فلسفہ زدہ چاہ نشین مینڈک نے کنوئیں کے پانی کو دیکھ کر اور اس میں چند غیر اصولی غوطے کھا کر قعر سمندر اور ناپیدا کنار بحر محیط کی اتھاہ گہرائی اور غیر متناہی سطح بسیط کے طول کو جاننے کا دعوےٰ کیا۔ اس کے ذہنی افلاس کا کون انکار کر سکتا ہے۔ مقام غور ہے کہ بڑے سے بڑا دانشمند اپنے ذہن و فکر کی ابری حرکتوں سے بھی ناواقف ہے۔ اس کے تصورات۔ کا آتار چڑھاؤ برقرار رہتا ہے جس نظریہ کو صبح کے وقت انتہائی غور و خوض کے بعد وہ حق سمجھتا ہے اسی دن شام کو اپنے نظریہ کی تکذیب کرتا اور اس کے خلاف رائے قائم کرتا ہے اور اس کو علمی ترقی کہتا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ جس سطح کو وہ آج شام کو علمی منتہا قرار دے رہا ہے آئندہ صبح کو ایک شب گزارنے کے بعد ہی وہ علمی پستی نہیں کہے گا۔ سوائے بدیہیات اور ابتدائی مسلمات کے کسی فکری مسئلہ میں آج کا دانشوروں کا اتفاق نہ ہو سکا۔ نہ کوئی عقلمند اپنے فہم اور فہمیدہ حقائق کو ناقابل ازالہ کہہ سکا۔ پس یہ حکمت گزیدہ اور دانش زدہ طبقہ انسانی معاشرے کو سدھارنے اور استوار کرنے کا کام کس طرح پورا کر سکتا ہے جبکہ اس کا علم ہی ناقص نارسا غیر یقینی اور ہر آن تزلزل پذیر ہے۔

انسان اور غیبی ملکوتی طاقتوں اور روحانی قوتوں کو اٹھا کر معبودیت اور الوہیت کے درجہ تک پہنچانا دانشمندوں کے ایک طبقہ کا ہی نتیجہ فکر ہے اور الٰہ مطلق کے لازوال غیر مادی وجود کو مادی مخلوق کی صفات سے موصوف بنا کر مجسم قرار دینا اور مخلوق کے اعراض کا محل و معروض سمجھ لینا بھی اہل عقل کے ایک گروہ کا ہی مسلمہ ہے۔ شرک کے قائل بھی اہل حکمت ہی ہیں اور تشبیہ و تجسیم کے قائل بھی انہی جیسے دوسرے عقلمند ہیں۔ فسخ نسخ مسخ اور رسخ کو ماننے والے یونان کے بہت سے اشراقی اور ہندوستان کے دانش مند برہمن اور آسنک وناسک فرقوں والے ہیں جو اپنی اپنی جگہ بڑی روشن عقلوں کے مرکز تھے اور مرنے کے بعد انسان کو معدوم مطلق اور ناقابل جزا سزا اور اچھے برے انجام سے بے نیاز قرار دینے والے بھی روحانیت کے منکر مادہ پرست بڑے بڑے سائنٹسٹ ہی ہیں۔ سچ ہے

کس کا یقین کیجئے، کس کا یقیں نہ کیجئے
لائے ہیں ان کی بزم سے لوگ خبر الگ الگ

رہبانیت، سادھوپن اور ترک لذات کو حق سمجھنے والا بھی مشرقی عقلمندوں کا ایک بڑا طبقہ ہے اور لذتیات کو مآل زندگی سمجھنے والے بھی یونان کے بعض فلاسفر ہی تھے۔

کیا ایسی ناقص الفہم لنگڑی اپاہج عقل سے امید کی جا سکتی ہے کہ اصلاح انسانی کے اس لق و دق بیابان کو قطع کر کے انسانی معاشرے کو منزل مراد تک پہنچا سکے گی۔ پس مشرک ہوں جو مخلوق کو صفات الوہیت کا حامل قرار دیتے ہوں اور ارباب انواع یا مؤکلوں یا دیوتاؤں، یا بزرگوں کی روحوں کو مختار مطلق اور کارساز کل جانتے ہوں یا مدعیان علوم الٰہیہ ہوں جو الہامی ودیعت کا حامل اپنی شخصیتوں کو قرار دیتے ہوں اور اس کے باوجود ابدیت و الوہیت کی کوئی نمایاں حد فاصل ان کی نظر میں نہ ہو۔ کہیں ایک کو تین اور کہیں تین کو ایک کر دیتے ہوں۔ عبد کے اندر الوہیت کے حلول کر جانے کے قائل ہوں یا مخلوق کو جزو خالق سمجھتے ہوں اور مشرکوں کی طرح قومی رواج قبائلی رسم گروہی مسلمات اور حمایات فرقہ برادری سے آزاد نہ ہو سکتے ہوں اور ہر چیز کے حق و ناحق کے فیصلے کا معیار کسی انسان کی شخصیت یا سوسائٹی کے عملی مفروضات کو قرار دیتے ہوں۔ یہ دونوں گروہ اپنی افکاری دلدل اور رسم و آئین کی کیچڑ سے نکلنے اور روح و اخلاق کو کسی معمولی ہادی کی ہدایت یا اپنی سمجھ کی ذکاوت کی وجہ سے پاک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا معجزہ کار خدا کی طرف سے آ کر ان کو راہ ہدایت بتا دے مگر اس کی ہستی اتنی بڑی ہو اور اس کے اندر ایسی خصوصیات ہوں جو کسی دوسرے انسان میں نہ ہوں وہ اپنے ساتھ اصلاحی پیغام لے کر آئے اور معاشرے کی اصلاح کرے۔ اس خواہش میں سب متفق ہوتے ہیں اور ایسے اعجازی انسان کی سب کو طلب ہوتی ہے مگر ان طلب گاروں میں دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی طلب سچی ہوتی ہے۔ وہ اپنے معاشرے سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔ ان کو حق کی خواہش ہوتی ہے خواہ کہیں مل جائے۔ حق کے مقابلہ میں وہ اپنی قوم اپنے وطن اور اپنے خاندان کی بے جا طرفداری نہیں کرتے۔ ان کے اندر جاہلیت کارفرما ہوتی ہے۔ مگر غالب نہیں ہوتی ہے۔ ان کی روحیں سعید ہوتی ہیں حق کی جویاں مگر زندگیاں دوسرے لوگوں کی طرح سیاہ ہوتی ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو

اپنی جاہلانہ اغراض کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا زبانی دعویٰ طلبِ حق کا بہت کچھ کرتا ہے لیکن اس کا دماغ اور دل اس حق کو ماننا چاہتا ہے جو اس کی خواہش کے مطابق ہو جس کی وجہ سے اس کے فکریات اور اعمال پر ضرب نہ پڑتی ہو۔ اس کے قبائلی قومی وطنی اور رواجی مرغوبات کو ٹھیس نہ لگتی ہو۔ وہ حق کا خواستگار اس لئے ہوتا ہے کہ حق کی غیبی طاقت اس کے ساتھ ہو جائے گی اور وہ دوسرے قبائل دوسری اقوام اور دوسرے اشخاص کو اپنی خواہش عزت اور اقتدار کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے گا اور اس کی نفسانیت سب پر غالب آ جائیگی اب اگر اس گروہ کی منشا کے خلاف کہیں حق کی روشنی چمکتی ہے اور کسی طرف سے حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ بجائے تائید حق کے الٹا اس کا مخالف ہو جاتا ہے اور اس نوخیز نورِ ہدایت کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اس کی ساری کوششیں حق سے عناد تضاد اور تصادم کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ کی بعثت سے پہلے بھی دنیا کی یہی حالت تھی۔ ایک بڑا طبقہ خود ساختہ عقلی فریب کاریوں کا شکار تھا۔ مشرق مغرب اور وسط ایشیا میں بہت دانشور اسی بر خود غلطی میں مبتلا تھے کہ ہماری دانش و فکر عام انسانی سوسائٹی کی انفرادی و اجتماعی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ ہمیں کسی غیبی وہبی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہودی عیسائی ثنویہ، مجوسیہ، صابیہ اور بکثرت مشرک تنہا عقل کی رہنمائی کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ جب تک اللہ کی طرف سے کوئی پیامبرِ ہدایت کسی غیبی معجزہ کار اور صاحب قوت قدسیہ کی معرفت نہ آئے انسانی افکار اور ضوابط زندگی کی درستی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ سب لوگ رسول اللہ سے بہت پہلے سے خدائی بھیجے ہوؤں کی جستجو اور طلب میں رہتے تھے لیکن ظہور ہادی کے بعد کچھ لوگوں نے تو سر جھکا دیا اور اس کی ہدایت کو مان لیا۔ خاندانی قبائلی اور شخصی غلط نظریات اور رواجی آئین و وضع کی درستی کر لی اور حق کے حامی ہو گئے اور بکثرت طلب گارانِ ہدایت اور امیدوارانِ حق و صداقت ایسے تھے کہ غیبی ہادی کی ہدایت ان کے مسلمات مفروضات اور معمولات کے خلاف تھی۔ محض اللہ کی پرستش و عبادت اور اس کے حکم کے مطابق اپنا مال دوسرے ضرورتمندوں کی حاجت روائی کے لئے دینا کسی طرح ان کے لئے قابلِ تسلیم نہ تھا اور نہ اُن کو یہ گوارا تھا کہ ان کے قبیلہ اور قوم کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ میں ہادی کا ظہور ہو اور اُن کو دوسرے خاندان کی برتری کے سامنے جھکنا پڑے۔ نتیجہ میں حامیانِ حق اور معاندین کے دونوں گروہ آپس میں ٹکرائے حق کی فتح ہوئی اور باطل پاش پاش ہو گیا۔

حسب دستورِ انسانی رسول اللہ کی بعثت سے پہلے بھی لوگ غیبی ہدایت کے منتظر تھے۔ یہودی عیسائی اپنی مذہبی بشارتوں کے ذریعہ اور عام مشرکوں کا گروہ اہلِ کتاب سے اختلاط کی وجہ سے یقین رکھتے تھے کہ افکار اور ضوابطِ زندگی کی اصلاح کے لئے اللہ کی طرف سے ایک نبی ضرور پیدا ہو گا جو تاریکی کو دور کرے گا اور بگاڑ کو سنوارے گا۔ جب آپ کی بعثت ہو گئی تو انہی لوگوں کے دو فرقے بن گئے۔ سعید روحوں نے تو حضورؐ کی ہدایت کو بغیر کسی جھجک کے مان لیا۔ اپنے عقائد و خیالات اور کردار و اطوار کی درستی کر لی اور بہر قیمت حق کے حامی بن گئے جاہلیت اولی کی حمیت کی جگہ حق کی حمایت نے لے لی اور نفس و نفسانیات کے بندے اللہ کے بندے بن گئے لیکن جن کی ذہنی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں جن کی چشمِ بصیرت بالکل نابینا تھی ان کو صداقت کی روشنی نظر نہ آئی۔ اُن کا جذبۂ عناد اس کھلی ہوئی واضح صداقت کے مقابل بھڑک اٹھا۔ ان کو مشرکانہ پوجا کے بجائے خالص نیت کے ساتھ محض خدا کی عبادت کرنے اور سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ سے رابطہ جوڑنے کا حکم دیا گیا تھا مگر انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر ستاروں کی فرشتوں کی غیبی ارواح کی جنات کی موہوم دیوتاؤں کی یہاں تک کہ بے جان پتھروں اور درختوں کی پوجا کی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ نمازیں قائم کریں، اللہ کے سامنے جھکیں اور اسی کے سامنے سربسجود ہوں مگر انہوں نے اس حکم کے خلاف مخلوق کے سامنے سرِ نیاز جھکایا اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سجدے کئے۔ اُن سے کہا گیا تھا کہ ضرورتمندوں اور محتاجوں کی معاش کی خبر گیری رکھیں۔ ان کی مالی مدد کریں تاکہ ان کے نفوس مال کی محبت سے پاک ہو جائیں مگر انھوں نے اس ہدایت کو ٹھکرایا اور خداداد مال کو اپنا کسبی مال قرار دیتے ہوئے انسانوں کی تنظیمِ معاش کا شیرازہ بکھیر دیا اور تطہیرِ مالی کے حکم کی پروا نہ کی۔ آخر نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا کہ اول گروہ فائز المرام اور دوامی نجات یافتہ ہو گیا اور دوسرا گروہ ہمیشہ کے لئے تباہ اور جہنمی بن گیا۔

تحلیل اجزاء ۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا سے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ تک ۔ اہلِ کتاب سے مراد ہیں یہودی عیسائی اور وہ تمام اقوام

جن کے پاس اللہ نے پیغمبروں کی معرفت اپنی کوئی کتاب یا صحیفے بھیجے تھے اور انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ بدل ڈالے یا معانی میں تحریف اور تبدیل اور تغیر کردی۔

مشرکوں سے مراد ہیں اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا کرنے والے اور صفاتِ خداوندی میں مخلوق کو شریک قرار دینے والے خواہ ملائکہ اور غیبی ارواح اور موہومی دیوتاؤں کے پجاری ہوں یا سورج چاند کواکب اور پتھروں درختوں کی پرستش کرنے والے۔ عرب میں یہ سب لوگ موجود تھے۔ مکہ میں بت پرست بھی تھے اور ملائکہ پرست بھی اور جنات کی پوجا کرنے والے بھی اور بعض درختوں کو معبود قرار دینے والے بھی۔ باقی جزیرے میں یہودی تھے عیسائی تھے صابی تھے زردشتی اور مجوسی تھے اور کہیں کہیں شرک آمیز توحید کے قائل بھی۔ خالص ملت براہیمی مفقود ہو چکی تھی اگرچہ دعویٰ اور نام باقی تھا۔ مدینہ اور اطراف مدینہ میں خصوصیت کے ساتھ یہودی اور بت پرست قبائل آباد تھے۔ مشرک قبائل سے یہودیوں کا ربط ضبط تھا۔ مکہ کے مشرک تجارتی قافلے لے کر یمن، شام اور عراق کو جاتے تھے۔ وہاں مختلف اہل کتاب اور مجوسیوں سے ان کا اختلاط ہوتا تھا۔

یہودی مدعی تھے کہ ہم اہلِ علم اور آسمانی مذہب کے حامل ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم میں ایک نبی برحق مبعوث ہوگا ہم اس کے ساتھ ہو کر مشرک قبائل کو برباد کر ڈالیں گے اور ان مشرکوں کے مقابل فتح یاب ہوں گے۔ ان میں خالص توحید باقی نہیں رہی تھی۔ خدائی مذہب کو انھوں نے ہواؤ ہوس کے سانچے میں ڈھال رکھا تھا اور تشبیہ و تجسیم کے قائل ہو گئے تھے۔ عیسائیوں کا خیال تھا کہ نبی برحق جس کی مسیح نے بشارت دی تھی ہم میں مبعوث ہوگا۔ انھوں نے بھی توحید کو کھو دیا تھا اور ایک خدا کو تین حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ یہ بھی ہواو ہوس کے غلام ہو گئے ان مدعیانِ علم کے اختلاط سے مشرکوں کو بھی کسی خدائی ہادی کے پیدا ہونے کا خیال پیدا ہو گیا تھا مگر بہت ضعیف سا جو خیال کے حدود سے آگے نہ تھا۔ یہ تمام فرقے اپنے افکار و عقائد اور قومی آئین و ضوابط اور خاندانی رسم و رواج کی قید میں گرفتار تھے اور سب اپنے اسلاف کی اندھی پیروی کے شیدائی تھے۔ کوئی بھی اپنے گروہ کے مسلمات مفروضات اور معمولات چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا اور ان کی آپس میں ہی افتراق و انشقاق اور بر خود غلطی اور خود پنداری مسلسل مدت دراز سے چلی آتی تھی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا کوئی صورت نہ تھی کہ یہ اپنے توہمات اور عملی خرافات کو ترک کر سکیں۔ آخر کار رسول اللہ مبعوث ہوئے اور تمام مذہبوں کے مسلمہ عقائد منصوبہ اعمال اور معمولہ آئین و دستور کے خلاف آپ نے اللہ کے حکم سے اعلان کیا۔

اَلْبَيِّنَةُ۔ واضح دلیل، کھلی ہوئی حقیقت۔ قتادہ کے نزدیک اس سے مراد قرآن مجید ہے اور جمہور علماء کے نزدیک رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کیونکہ اس کے بعد بطور تشریح خود رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ فرمایا ہے۔ کتاب بسیط میں واحدی نے اور واحدی کی تقلید میں امام رازی وغیرہ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرک اپنا دین، آئین اور وضع چھوڑنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس روشن دلیل آگئی یعنی اللہ کا رسول آگیا۔ جب رسول آگیا تو ان لوگوں نے کفر و شرک چھوڑا۔ گویا واحدی نے تاتی صیغہ مضارع کو ماضی کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بعد واحدی نے لکھا ہے کہ آیت کی ترکیب اور ربط بظاہر ژولیدہ اور ایسا پیچیدہ ہے کہ اس کا حل سوا اس صورت توضیحیہ کے جو ہم نے اختیار کی ہے اور کوئی ممکن نہیں۔

امام رازی نے اس الجھاؤ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مطلب پر رسول اللہ کی بعثت کے بعد کفر و شرک کا خاتمہ ہو جانا چاہیے کیونکہ بر تفسیر مذکور کفر کی آخری انتہا بعثت قرار پاتی ہے۔ حالانکہ اس سے اگلی آیت صاف دلالت کر رہی ہے کہ اہل کتاب میں تفرقہ بعثت رسول کے بعد (زائد) ہوا۔ صاحب کشاف زمخشری نے آیت کا توضیحی مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین رسول اللہ کی بعثت سے پہلے کہا کرتے تھے کہ ہم اپنا دین و آئین اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک پیغمبر موعود ہمارے پاس نہ آ جائے۔ یعنی جب پیغمبر موعود پیدا ہو جائے گا تو ہم اس پر ایمان لائیں گے اور تصدیق کریں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب پیغمبر مبعوث ہو گیا تو ان کے کفر میں مزید اضافہ ہو گیا اور پہلے جو دعویٰ کیا کرتے تھے پیغمبر کی پیدائش کے بعد اس کے خلاف عمل کیا۔

اس فقیر کے نزدیک اس تشریح کو تسلیم کرنے کے بعد کہ آیت وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الامن بعد ما جاءتہم البینۃ سابق آیت سے مربوط ہے۔ واحدی نے جس توضیح کو اختیار کیا ہے وہ غلط یا کم از کم لاحاصل ہے۔ کیونکہ جس اعتراض کو دُور کرنے کے لئے یہ تاویل کی گئی ہے وہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا اور نہ تاتی مضارع کو ماضی کے معنی میں لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مضارع پر جب حتّٰی آتا ہے تو اس کے بعد اَنْ ناصبہ مقدر ہوتا ہے۔ اسی لئے مضارع کو منصوب پڑھا جاتا ہے ورنہ حتّٰی مضارع کو نصب دینے والے حروف میں سے نہیں ہے اور جب اَنْ مضارع پر آتا ہے تو فعل کو مصدری معنی پر باقی رکھتا ہے اور اقتران زمانی کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ اب مطلب صاف ہے کہ مشرکین اور اہل کتاب اپنے دین و آئین کو اپنی عقلوں کی روشنی اور سوجھ بوجھ سے اور کسی کے کہنے سے رسول کی بعثت و ہدایت کے بغیر ہرگز چھوڑنے والے نہ تھے۔ جب رسول آگیا قرآن میں سے بہتوں کو ہدایت ہوگئی اور بہت سے کفر پر قائم رہے۔ اب ان کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک ہدایت یاب اور دوسرا قدیم گمراہی پر قائم۔ ان میں یہ تفرقہ رسول اللہ کی بعثت کے بعد ہی پیدا ہوا۔ ورنہ اس کے پہلے تو سب اہل کتاب نبی موعود کے بالاتفاق منتظر تھے۔

لیکن اگر کلام کو فیہا کتب قیمۃ پر ختم مانا جائے اور اس سے بعد والے کلام کا ذکر بطور ضابطۂ کلیہ کے قرار دیا جائے کہ ہمیشہ ان اہل کتاب کا یہ دستور رہا ہے کہ جب اللہ نے ان کو اپنے دین کا علم عطا کیا اور کوئی پیغمبر مبعوث ہوا تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ بعض نے مانا اور اکثر مخالف ہو گئے۔ پس اسی طرح جب محمد رسول اللہ مبعوث ہوئے تو باوجودیکہ انھوں نے پہلے سے وعدہ کر رکھا تھا اور انتظار کر رہے تھے کہ پیغمبر موعود پیدا ہو اور وہ اُس پر ایمان لائیں مگر بحیثیت مجموعی ایسا نہ ہوا۔ کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ منکر ہو گئے۔ اس طرح ان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ مومن اور کافر۔ واللہ اعلم۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ۔ یعنی واضح نشانی اور صداقت کی روشن دلیل اللہ کے بھیجے ہوئے رسولؐ کی خود ذات ہے۔ رسول کی ذات خود بتا رہی ہے کہ ایسا جامع الصفات انسان جھوٹ نہیں بول سکتا اور اس کے اندر محل رسالت ہونے کی پوری اہلیت ہے۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ جو ایسے اوراق پڑھتا ہے جن کو ہر قسم کی انسانی، ملکی اور جناتی صنعت و ساخت سے پاک بنایا گیا ہے۔ اس کے احکام میں گمراہی نہیں، بیان میں جھوٹ نہیں، تعلیم میں تناقض نہیں۔ طرز ادا اور عبارت میں نامناسبت نہیں اللہ نے اُن کو ہر عیب نقص اور غلطی سے پاک کر دیا ہے۔ انسانی عقل اگرچہ اس کی عبارت کی جزالت و حلاوت اور مضامین کی صداقت و افادیت حسب درجہ سمجھتی ہے مگر ایسا بنا نہیں سکتی کیونکہ اس کو مخلوق کے کلام کی مشابہت سے پاک بنایا گیا ہے۔ معاشرۂ بشری کے لئے اس کی تعلیم تعمیری اخلاقی اصلاحی اور تنویری ہے۔ ہر طرح کی تخریب شخصی فساد اجتماعی اور بگاڑ سے پاک ہے۔ غرض ان اوراق کا ظاہر پاک ہے باطن پاک ہے، الفاظ کی ساخت و ترکیب پاک، معانی کی تعلیم پاک ہے۔

فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ اُن اوراق کے اندر جو تحریریں اور نوشتے اور مکتوبات ہیں وہ (بڑے قیمتی) محکم اور مضبوط ہیں وہ ناقابل ترمیم و تغیر ہیں، کسی زمانے میں ان کی تبدیل اور قطع برید نہیں کی جاسکتی۔ کسی زمانے کی مصلحت کسی مکان کی خواہش اور کسی تعمیری دماغ رکھنے والے انسان کی رفتار ذہنی اس کو گھٹانے بڑھانے بدلنے اور منسوخ کرنے کی خواستگار نہیں ہوسکتی۔ اس کے اصول ہر ماحول کو سدھارنے والے اور تباہی سے بچانے والے ہیں۔ گزشتہ آسمانی کتابوں کا سارا نچوڑ اور مغز اس میں موجود ہے۔ وہ ایسی معتدل غذا اور صحت آگیں دوا ہے جو ہر مزاج اور ہر شخص کے روحانی اور اخلاقی امراض کو دفع کرنے اور طاقت بہم پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ خوب سمجھ لو کہ جو برہان ناطق اور دلیل روشن ہے اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا قاصد ہے وہ جس کتاب کی تعلیم دیتا اور جو اوراق ہدایت سناتا ہے وہ اللہ کے فرستادہ ہیں اس کے خود ساختہ پرداختہ نہیں۔ رسول کا کام صرف پڑھنا اور سنانا ہے۔ خود بنانا اور کاٹ چھانٹ کرنا نہیں۔ ان تصرفات سے تو اللہ نے اپنی ہدایات تعلیمات اور کلام کی عبارت کو پاک بنایا ہے۔

تنبیہ ظاہر عبارت سے دو طرح کے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔
(۱) یتلو صحفًا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ قرآن لکھا ہوا نازل ہوا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پھر لکھے ہوئے اوراق کو رسول اللہؐ کا پڑھنا ثابت ہو رہا ہے۔ حالانکہ بنص قرآنی ثابت ہے اور اجماع اُمت ہے کہ رسولؐ اللہ لکھے پڑھے نہ تھے۔ نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔
(۲) فیہا کتبٌ کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن گزشتہ کتابوں کی نقل ہے (بشرطیکہ کتب سے گزشتہ الہامی کتابیں مراد لی جائیں) حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ بالاجماع قرآن پچھلی کتابوں کے بہت سے احکام کا ناسخ ہے۔

ازالہ صحف سے مراد اوراقِ مکتوبہ نہیں۔ کیونکہ کوئی لکھا ہوا ورق نازل نہیں ہوا بلکہ بطور وحی تدریجًا کلام الٰہی کا نزول ہوا اگر وحی سے جو آیات حضور کو معلوم ہوتی تھیں آپ ان کو لکھوا دیا کرتے تھے اور اس کام کے لئے کاتب وحی مقرر تھے۔ آپ بولتے جاتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے۔ چونکہ یہ آیات بلکہ پورا قرآن لکھے جانے کے قابل تھا اور تدریجًا اس کو سپردِ تحریر کیا بھی گیا اس لئے اس کو صحفًا فرما دیا جیسے ذٰلک الکتاب سورۂ بقرہ کے آغاز میں فرمایا تھا۔ باوجودیکہ کتاب اس وقت تک مرتب نہیں ہوئی تھی۔ نہ آسمان سے لکھی ہوئی اُتری تھی مگر آئندہ مرتب ہو کر لکھی جانے والی تھی اس لئے اس کو کتاب فرمایا۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ تلاوت سے مراد بھی کتاب کو دیکھ کر پڑھنا نہیں ہے بلکہ یاد سے پڑھنے کو بھی تلاوت کہا جاتا ہے اور یہی اس جگہ مراد ہے۔

رہا آسمانی کتابوں کا قرآن میں موجود ہونا تو یہ ظاہر ہے کہ دینِ الٰہی ازل سے ابد تک ایک ہی ہے قرآن بھی انہی اصولِ ایمانی اور امہات عبادات و معاملات کی تعلیم دیتا ہے جو پہلی کتابوں میں دی گئی تھی۔ قرآن پچھلی کتابوں کے بعض جزئی اور فروعی مسائل کا ناسخ ہے۔ اُن کے دینی اصول اور امہات مسائل کی تو تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ اس کے منزل من اللہ اور صادق و برحق ہونے کی یہی واضح نشانی ہے کہ مصلحت زمان و مکان سے قطع نظر اصولِ ایمانیات اور تنظیم عبادات و معاملات کے ضوابطِ کلیہ قرآن کے بھی وہی ہیں جو گزشتہ آسمانی کتابوں کے۔ اسی لئے کتب کی صفت قیّمۃٌ بیان کی۔ قیمہ کا ترجمہ محکم یا مضبوط کیا گیا ہے اور محکم چیز ناقابلِ زوال اور غیر متغیر ہوتی ہے۔ گزشتہ کتابوں کے جزئی اور خاص خاص احکام تو قرآن سے بدل دیئے گئے اُن کو تو محکم اور غیر متغیر نہیں کہا جا سکتا ہاں اصول کلیہ ضرور محکم ہیں جن کی قرآن نے بھی تائید کی ہے۔ اللہ کی ذات صفات ملائکہ اور تمام انبیاء پر ایمان قیامت اور حشر نشر کی تصدیق، جزا سزا، جنت دوزخ کا یقین تمام تشریعی اختیارات کا مالک اللہ کو جاننا، خیر و شر کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ماننا اور کیفیاتِ تفصیلی سے قطع نظر کر کے نفس، نماز، روزہ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور اسی قسم کی دوسری تعلیم تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے۔ قرآن کے اندر بھی یہی ناقابلِ تغیر محکم اصول ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ سے دِيْنُ الْقَيِّمَةِ تک اس عبارت کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ البینۃ سے اس جگہ بھی رسول اللہ کی ذاتِ گرامی مراد ہو۔ اس صورت میں سابق و لاحق آیات کا ملا کر یہ مطلب ہوگا کہ کافر اہلِ کتاب اور مشرک رسول اللہ کی بعثت کے بغیر کفر کی دلدل سے نہیں نکل سکتے تھے۔ یہودیوں کے ہر فرقہ نے اپنی خواہش کے مطابق تورات کی آیات اور تعلیم کو ڈھال لیا تھا۔ ہر گروہ نے اپنے قول کو ثابت کرنے کے لئے توریت کے اندر لفظی اور معنوی تحریف کر لی تھی اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ کثرتِ تنقیحات و تاویلات میں اصل توحید گم ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر تورات میں حضرت عیسٰی اور رسول اللہ کے متعلق جو بشارتیں دی گئی تھیں یہودیوں نے ضد اور عناد کی وجہ سے ان کو مسخ کر دیا اور کچھ کا کچھ بنا دیا۔ غرض کتابِ الٰہی کتابِ انسانی بن گئی۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی حضرت عیسٰی کے اقوال و تعلیم اور انجیل کی قیمتی تصریحات کو تاویلات زائدہ کر کے بگاڑ دیا تھا۔ ایک تو یہودیوں نے انجیل کو تہ و بالا کر دیا تھا پھر عیسائیوں نے خود اپنے ہاتھوں اور اپنے دماغوں سے اس پر کتر بریدکی۔ نتیجہ میں توحید تثلیث میں گم ہو گئی۔ پھر یہودیوں اور عیسائیوں نے باہم ایسے مناظرے اور مجادلے اور معرکہ آرائیاں کیں کہ ایک نے دوسرے کی ضد میں اپنے مسلمات اور اپنی اپنی کتابوں کی تعلیم کو بگاڑ دیا۔ دوسری طرف مشرک بھی ان سے پیچھے نہ تھے بلکہ گمراہی میں کچھ آگے ہی تھے۔ ستاروں، دیوتاؤں اور ارواحِ غیبیہ کے نام پر یا مرے ہوئے بزرگوں، پیروں، پیغمبروں کے نام پر پتھر پیتل سونے چاندی اور لکڑی بلکہ حلوے اور مٹھائی کی مورتیاں بنا کر ان کو پوجتے تھے اور ان گنت خداؤں

کو مرکز عبدیت و عبودیت جانتے تھے۔ان کی یہ گمراہی یہ اختلاف یہ تصادم اور یہ عناد و تضاد و دوری نہیں ہوسکتا ہے اور خالص توحید اور اصل تعلیم الٰہی ان کو میسر ہی نہیں آسکتی تھی۔یہاں تک کہ رسول اللہ کی بعثت ہوئی اور آپ نے اختلافی مسائل و مباحث کا صحیح حل پیش کیا اور فکری و عملی درستی کی روشن تعلیم دی۔اس احسانِ عظیم کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام اہلِ ملل باتفاق آرا حضورؐ کے کفش بردار بن جاتے اور آپس کے ضد و عناد کو چھوڑ کر آپ پر ایمان لاتے اور قرآن کی تصدیق کرتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہر گروہ کے دو گروہ بن گئے۔ایک عقلمند مآل اندیش حق طلب گروہ نے تو رسولؐ اللہ کی تصدیق کی اور آپ کی پیش کی ہوئی کتاب کو اللہ کی کتاب مانا۔اور دوسرے گروہ نے آپ کی تکذیب اور آپ کی پیش کردہ کتاب کی تغلیط کی۔اس طرح یہ قدیم گمراہی میں اور راسخ ہو گئے بلکہ ضلالت میں مزید اندھے ہو گئے۔(تفسیر ابن کثیر مع توضیح کامل از فقیر)

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ البینۃ سے کتابِ ہدایت یا ہر پیغمبر کی ذات مراد ہو اور ما تفرق الذین سے ایک عام دستور کا اظہار مقصود ہو۔اس تقریر پر مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ کتاب کا ہمیشہ سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ جب ان کے پاس پیغمبر برحق آگیا اور کتاب ہدایت پہنچ گئی تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔اول اختلاف تو یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے تصدیق کی اور کچھ نے تکذیب۔اس طرح مومن اور کافر دو گروہ بن گئے۔پھر جو لوگ اہلِ حق اور مومن تھے کچھ مدت کے بعد ان میں بھی تفرقہ پڑ گیا۔ہر گروہ نے مذہبی کتاب اور پیغمبر کی ہدایات کو اپنے ہوا و ہوس کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔شروع میں طلبِ حق کے زیرِ اثر خلوصِ نیت کے ساتھ اختلافِ رائے ہوا۔پھر عصبیت، ہٹ، ضد اور عناد کا دماغوں پر تسلط ہو گیا تو اختلافِ رائے نے مخالفت اور مجادلے کی شکل اختیار کر لی۔آخر کار ہر قیاسی حیلہ اور اختراعی تدبیر سے ہر فرقہ نے دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔مذہب کی اصل تعلیم سے سب غافل ہو گئے۔پیغمبر کی تعلیم کا مغز گوشۂ خمول میں چھپ گیا۔صرف پوست اور چھلکوں پر مناظرہ بازی پھر مکابرہ پھر مجادلہ اور پھر مقاتلہ ہونے لگا۔اور اللہ کی پاک زمین ان مدعیانِ حق کے ناپاک خون سے رنگ گئی۔ایک جماعت کے ستر بہتر فرقے ہو گئے اور حق بحیثیت مجموعی کسی کے پاس نہ رہا۔اور کوئی صورت فیصلۂ صداقت کی نہ رہی۔کیونکہ کوئی گروہ بھی اپنے گروہی مسلمات و معمولات اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا

آخر کار ایک عظیم الشان واضح ناقابلِ شک حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی شہادت اللہ نے بھیجی۔یہ عظیم الشان مجسم شہادت خاتم المرسلین کی شکل میں سامنے آئی جو اپنے کردارِ زندگی، رفتارِ زندگی اور گفتارِ زندگی کے لحاظ سے خیرِ مجسم اور عظیم امین تھے، جن کے افکار اور اعمال کی نورانی سطح پر عیب و نقص کا کوئی داغ دھبہ نہ تھا۔آپ نے آکر پیامِ حق سنایا۔اللہ کے دین میں لوگوں نے جو خود ساختہ آمیزشیں کر رکھی تھیں اُن کی نشاندہی کی دماغی اختراعات کو الٰہی تعلیمات سے چھانٹ کر پھینک دیا اور جس طرح اہلِ کتاب کو خلوصِ نیت کے ساتھ بغیر کسی شرکِ خفی و جلی کے اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا اور نماز و زکوٰۃ یعنی ام العبادات البدنیہ اور راس العبادات المالیہ کا مکلف کیا گیا تھا۔اسی طرح آپ نے بھی توحیدِ خالص کا اعلان کیا اور تن من دھن سے اللہ کی طرف رجوع ہونے کی تعلیم دی مگر اتفاقِ رائے خیر و صلاح پر پھر بھی نہ ہوا۔کچھ لوگوں نے تصدیق کی اور برہانِ ناطق کا فیصلہ مان لیا اور کچھ لوگوں نے پائے عناد سے ٹھکرا دیا۔جن لوگوں نے مانا اور صحیح تسلیم کرنے کے بعد اپنے کردار و گفتار و رفتار کو درست کر لیا وہ اشرف الخلق قرار پائے اور دوامی جنت کے مستحق ہو گئے اور جن لوگوں نے انکار کیا اور نہ مانا وہ ابدی جہنمی بن گئے اور بدترین کائنات ہو گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۔مشرکوں کے پاس تو کوئی آسمانی کتاب ہی نہ تھی نہ اُن کو آسمانی کتاب کے حامل ہونے کا دعویٰ تھا ہاں یہودی اور عیسائی وغیرہ آسمانی مذہب پر چلنے کے دعویدار اور حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے علمبردار تھے۔مشرک کج روی اور گمراہی کے مجرم ضرور تھے۔مگر اہلِ کتاب کا جرم ان سے بھی زائد تھا کہ وہ گمراہ ہونے کے ساتھ کتابِ الٰہی میں تحریف تبدیل اور کاٹ چھانٹ کرنے کے بھی مجرم تھے۔بہرحال دُہرے مجرم ہوں یا اکہرے آفتاب کو دیکھ کر سب کو اس کی روشنی اور ضیا افگنی کا اقرار کرنا چاہیئے تھا اور اپنی زندگی کی سیدھی شاہراہ اس کی روشنی میں تلاش کر کے اس کو اپنا رہنما اور رہبر بنا لینا چاہیئے تھا مگر ان سب نے آفتابِ عالمتاب کے وجود سے انکار کر دیا۔ان نابیناؤں کی بصیرت چونکہ مفقود ہو گئی تھی اس لئے ان عقل کے اندھوں کو دن کی روشنی بھی دکھائی نہ دی۔

آخر بھٹکتے چکر کاٹتے ٹھوکریں کھاتے جہنم کے غار میں گر پڑنا ان کا ضروری ہو گیا جس کے اندر سے رہائی کبھی ممکن نہیں۔ جہنم کے باہر جب تک میدانِ زندگی میں گامزن رہے اس وقت تک تو ممکن تھا کہ کج مج پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر شاید کبھی منزلِ مقصود تک پہنچانے والی عام سڑک پر آ پڑیں گے اور جب ایسا نہ ہو سکا اور جہنم میں گر کر ابدی ہلاکت سے ہمکنار ہو گئے تو پھر دوڑنے اور چلنے کے لئے کونسی زندگی ملے گی کہ راہِ مستقیم پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ ان سے زیادہ بدنصیب اور بُری مخلوق اور کونسی ہو سکتی ہے جن کو فطرۃً بینائی سے محروم رکھا گیا ہو اور اُن کو سیاہ و سفید اور اچھے و بُرے کی تمیز کی صلاحیت ہی نہ ہو وہ تو معذور اور مجبور ہیں۔ نہ ان کے پاؤں ہیں کہ چل سکیں، نہ ان کی آنکھیں ہیں کہ دیکھ سکیں، نہ ان کے کان ہیں کہ سُن سکیں، نہ ان کے پاس دانش و عقل ہے کہ خود سمجھ سکیں۔ وہ تو فطرۃً چوپائے ہیں، جانور ہیں، اسبابِ تکلیفیہ سے محروم اس لئے کسی حکم کے مکلف نہیں، لیکن جن کے پاس آنکھیں ہیں دیکھنے والی، کان ہیں سننے والے، پاؤں ہیں چلنے کے قابل اور فہم و بصیرت ہے سوچنے سمجھنے والی اور پھر وہ اپنی آنکھوں کو پھوڑ لیں، کانوں میں ڈاٹ لگا لیں، پاؤں کو توڑ دیں اور بصیرت کو مردہ بنا لیں اور اندھا دھند بغیر صحیح قدم اٹھانے کے لڑھکتے ہوئے جہنم کے غار میں جا گریں تو اُن سے زیادہ بُری مخلوق اور بدنصیب کون ہو سکتا ہے۔

امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے شر البریہ کی تشریح میں فرمایا۔ الذی یسال باللہ ولا یعطی جو اللہ کے نام پر خود تو مانگتا ہے مگر خود دیتا نہیں۔ یعنی منافق ہے کہ اسلام کے جو فوائد اللہ نے مقرر کر رکھے ہیں ان کا تو وہ طالب رہتا ہے مگر اسلام کے جو حقوق اللہ نے اس کے ذمہ لگا رکھے ہیں اُن کو ادا نہیں کرتا۔

ایک اور آیت میں کافروں کے متعلق فرمایا ہے۔ ان ہم الا کالانعام بل ہم اضل سبیلاً۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ ایک دوسری آیت میں کافروں کے ہی بابت فرمایا ہے۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔ ہم نے اس کو پست ترین درجے میں پہنچا دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سے خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا تک۔ بدکار کافروں کے برعکس جن لوگوں نے شہادتِ مبین کی تصدیق کی اور قرآن مجید پر ایمان لائے اور تعلیم رسول کے موافق اپنی عملی زندگیاں درست کر لیں۔ گویا زندگی کی مسافت میں رسول اللہ کے بتائے ہوئے راستہ کو حق اور سیدھا جانا اور نہ فقط جانا بلکہ مانا اور مان کر پوری زندگی اُس پر چلتے رہے۔ وہ افضل الخلق اور خیر البریہ بن گئے اور منزلِ المقصود پر یعنی جنتِ دوامی میں پہنچ گئے۔ کیونکہ آئندہ کبھی گزشتہ تکلیفی زندگی کی مسافت تو طے کرنا نہیں کہ شاید بھٹک جائیں اور کسی غار میں گر پڑیں جب چلتے چلتے منزل مراد پر پہنچ گئے تو پھر منزل سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔

تمام جاندار اور بے جان جامد اور نامی گو حس و شعور رکھتے ہوں انہیں جزئی ادراک کی فی الجملہ صلاحیت بھی ہو لیکن کسی قدر دوست دشمن اور مرغوب و مکروہ کو پہچانتے بھی ہوں لیکن ادراکِ کلی سے محروم ہیں۔ بصیرت اور فہم سے بے بہرہ ہیں اور انسان صاحبِ بصیرت ہے، دانشور ہے، قوتِ عقلیہ کا حامل ہے، اس لئے اگر آدمی بصیرت سے کام لے، عقلِ سلیم کو کام میں لا کر خیر و شر اور غلط صحیح کے درمیان اللہ کے قائم کردہ فرق کو سمجھے اور پھر عقلِ عملی کے زیر اثر قوتِ عاملہ سے کام لیکر راہِ حق پر گامزن ہو تو اُس کا ہم پایہ نہ کوئی نامی ہو سکتا ہے نہ جامد، نہ حساس نہ متحرک بالارادہ۔ پھر انسان کے اندر خیر سے روکنے والی مادی قوتیں بھی ہیں۔ اس کے اندر نامرغوب کو بہر طور دفع کرنے والی قوت غضبیہ ہے اور مرغوب کو حاصل کرنے والی قوت شہوانیہ بھی ہے۔ ان مادی قوتوں کے بجا اور بے جا استعمال سے انسانی کامرانی اور بدبختی وابستہ ہے۔ دونوں قوتوں کو افراط و تفریط سے روک کر اعتدال پر لانا بہت دشوار امر ہے لیکن نفوس زکیہ والے جن کی روحانیت اور عقلیت اُن کی ہستی پر حکمراں ہوتی ہے وہ ان بے لگام مادی گھوڑوں کو قابو میں رکھتے ہیں نہ اتنا بے لگام چھوڑتے ہیں کہ جس غار میں چاہیں گرا دیں اور جس پتھر سے چاہیں ٹکرا دیں نہ اتنا افسردہ اور مردہ کر دیتے ہیں کہ عقل بشری کی سواری ہی مر جائے اور انسان کو راہِ زندگی طے کرنا ممکن نہ رہے آدمی آدمیت چھوڑ بیٹھے۔ ملائکہ اور ارواح مجردہ میں تو مادی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں فطرۃً ان میں ارتکابِ شر کا ارادہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ معصوم ہیں مگر اُن کی عصمت بے چارگی کی وجہ سے ہے اور انسان جس طرح ارادۂ خیر کی استعداد رکھتا ہے اسی طرح ارادۂ شر اور اعمالِ سیئہ کے ارتکاب کی صلاحیت بھی [illegible] میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں اس کا خیر کی طرف متوجہ ہونا اور شر سے بھاگنا صحیح کو اختیار کرنا اور غلط کو ترک

کرنا بےچارگی اور اضطرار کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ارادہ اور اختیار کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی روحانی چمک فرشتوں کے نور پر غالب آجاتی ہے اور وہ خیر البریہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے جس کو ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مومن صالح ملائکہ سے افضل ہے۔ اللہ نے حضرت آدم کے متعلق فرمایا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اور دوسری مخلوق کے متعلق فرمایا کُنْ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت ہے۔ المومن اکرم علی اللہ من بعض الملائکۃ الذین عندہ۔ یعنی بعض مقرب فرشتوں سے بھی اللہ کے نزدیک مومن زیادہ باعزت ہے۔ علامہ حافظ الدین نسفی نے اہلِ سنت کا اجماعی عقیدہ لکھا ہے۔ خواص بنی آدم وہم المرسلون افضل من جملۃ الملائکۃ وعوام بنی آدم وہم الاولیاء والزہاد افضل من عوام بنی آدم۔ خاص لوگ یعنی انبیاء تمام ملائکہ سے افضل ہیں اور عام انسان یعنی اولیاء اور زاہدین عام ملائکہ سے افضل ہیں اور خاص ملائکہ عام آدمیوں سے افضل ہیں۔

ایک ضروری تنبیہ امام رازی نے اس جگہ ایک شبہ نقل کیا ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں کو بھی یہ وسواس ہو سکتا ہے کہ فرشتوں سے انبیاء اولیاء کا افضل ہونا محلِ تامل ہے۔ کیونکہ ملائکہ کی تخلیق نور سے ہوئی جس میں ظلمت نام کو بھی نہیں اور انسان کی تخلیق سڑی ہوئی مٹی سے ہوئی جس میں لطافت اور جلاء نام کو نہیں۔ بکثرت ملائکہ عرش و کرسی کے نیچے رہتے ہیں اور انسان کو معمولی جنت سے بھی نکال دیا گیا۔ فرشتوں کا مسکن سارا جہان ہے اور انسان کا مسکن صرف زمین۔ ہمارے تمام کام مصالح رزق یہاں تک کہ پیدائش اور موت بھی انہیں کے سپرد کر دی گئی ہیں اور ہمارا ان پر کوئی دسترس نہیں۔ فرشتے عالم ہیں اور ہم نادان۔ فرشتے ہر دم عبادت اور تعمیل امرِ الٰہی میں غرق ہیں۔ جو خدمت اُن کے سپرد کر دی گئی، اس کی تکمیل میں سرگرم ہیں اور ہم ہر وقت پیٹ کی فکر میں ہیں اور آپس کی محبت اور عداوت اور دوسرے جذبات نفس کے ہاتھوں میں گرفتار۔ اسی طرح کی دوسری فضیلتیں مثلاً قوتِ کاملہ، قدرت، وسیع علم اللہ کے پیام ہر ذرۂ کائنات کو پہنچانا اور کسی طرح حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خیال بھی نہ آنا یہ تمام خصوصیات فرشتوں کی ہیں۔ پھر انسان کو فرشتوں پر فضیلت کیسے ہو سکتی ہے۔

ازالہ یہ اور اس قسم کے شبہات حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ظلوم و جہول ہونا انسان کا عیب نہیں بلکہ امتیازی نشان ہے۔ اگر انسان صرف ظلوم و جہول ہوتا اور معلم الملائکہ نہ ہوتا اور معرفتِ الٰہیہ میں فرشتوں سے آگے نہ ہوتا اور باوجود آزاد ارادہ رکھنے کے مرتبۂ تسلیم و رضا پر فائز نہ ہوتا اور اس کے اندر عقلِ جزئی نہ ہوتی اور حقائقِ کائنات سے فرشتوں سے زیادہ واقف نہ ہوتا اور مادی ایجادات و اختراعات میں صانعِ عالم کا مظہر اتم نہ ہوتا اور روحانی سیر میں حضرت جبرئیل سے آگے اس کی رسائی نہ ہوتی اور اتنا مرتبۂ قرب اس کو حاصل نہ ہو گیا ہوتا جس سے انضمام ادغام اور حلول کا دھوکہ ہو جاتا ہے تو اس شبہ کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ مگر انسان تو مجموعۂ کائنات ہے۔ عالمِ صغیر ہے۔ تمام جہان کی خصوصیات اور قوتیں اس کو حاصل ہیں۔ فرشتوں میں نمو نہیں، اختیار اور ارادہ آزاد نہیں۔ علومِ عرفانیہ میں ترقی نہیں، مرتبۂ قرب میں اضافہ نہیں۔ جزاءِ اعمال کا استحقاق نہیں۔ ایسی مادی کثافت نہیں کہ روحانیت و عقل سے اس کو مغلوب کر لیا ہو۔ اُن کے اندر شر سے روکنے والی کوئی شر نہیں، اور جو خیر ہے وہ غیر اختیاری ہے۔ اپنے ذاتی کسب کو اس میں دخل نہیں۔ شیطنت کو مغلوب کرنا اور جذباتِ شر پر غالب آنا اُن کے بس میں نہیں۔ ان کے اندر شکمی اور صنفی تقاضے نہیں بلکہ ان کی روحانیت اور اطاعت گزاری ہر عائق اور مانع سے آزاد ہے اور انسان باوجود صنفی اور شکمی تقاضوں کے اللہ کی فرمانبرداری کرتا اور بحرِ معرفت میں غوطہ لگاتا اور عرفانِ صفات کے موتی نکال کر لاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے روحانی فضائل صرف انسان کو حاصل ہیں اور فرشتے ان سے محروم ہیں۔

جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ یعنی دنیا میں کامرانی، اقتدار، تسلط، عزت اور بالادستی و نعمت جو خوش کردار اطاعت گزار اہلِ ایمان کو اللہ کے احکام پر چلنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان کے لئے حقیقی جزا نہیں۔ پورا پورا بدلہ نہیں بلکہ ان کے لئے اللہ کی مقرر کی ہوئی جزا ایک اور ہے جو آخرت میں ملے گی یعنی قیام لازوال کے لئے جنتیں ہوں گی جن کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ خود وہاں سے ان کا نکلنے کو دل چاہے گا نہ نکالا جائے گا۔ نہ کسی ناراضگی کی وجہ سے اُن سے وہ نعمتیں چھینی جائیں گی۔ نہ وہاں موت ہو گی نہ حوادث کا خوف بلکہ ہمیشہ کے لئے جن کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ جنتوں کے اندر قیام پذیر رہیں گے اور یہ جزا ہو گی اُن کے ایمان و اعمال کی جو اللہ نے مقرر کر رکھی ہے یعنی ان کے اعمال کا بجائے خود اگرچہ تقاضہ نہیں کہ اُن کو آخرت میں

یہ ثوابِ عظیم دیا جائے۔ کیونکہ محدود کوششوں کا بدلہ بھی محدود ہونا چاہیئے۔ پھر یہ اطاعت و فرمانبرداری ان انعامات کے مقابلہ میں بھی کم ہے جو دنیا میں اللہ نے ان کو دے رکھی ہیں۔ لیکن اللہ کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ان کو لازوال انعام سے نوازے اس لئے دوسروں کے لئے لازوال جنتیں مقرر کر رکھی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ فرماتا ہے میں اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی کے دماغ میں ان کا تصور آیا۔ صحیحین۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۔ اللہ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی وجہ تو ہے کہ انھوں نے سارے افکار باطلہ عقائدِ غیر صحیحہ اور اعمالِ سیئہ چھوڑ کر ہر طرف سے منہ موڑ کر اللہ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور اطاعت خدا کے مقابل مال و دولت، عزت حکومت، اولاد، مال باپ، دوست عزیز اور راحت و آرام کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس کا صلہ اللہ نے اتنا عظیم الشان دیا کہ ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ قیامت کے دن جنت میں پہنچنے کے بعد جب اللہ اُن سے پوچھے گا کہ میرے بندو تم مجھ سے راضی ہو تو وہ اقرار کریں گے۔ اس وقت اللہ کی طرف ایک اور عظیم المرتبت نعمت عطا ہونے کا اعلان کیا جائے گا اور وہ ہوگی مولیٰ کی خوشنودی۔ ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔ ورضوانٌ من اللہ اکبر کہ اللہ کی تھوڑی خوشنودی بھی ہر نعمت سے بڑی ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ ۔ یعنی یہ جزا ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو اصحاب خشیہ ہیں (جمہور المفسرین) یا یہ پیام ان لوگوں کی ہدایت کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں (عزیزی) مراد یہ ہے کہ جو اللہ کی ربوبیتِ عامہ اور عطوفتِ تامہ اور کرم محیط کو دیکھ کر مغرور اور فریب خوردہ نہیں ہو جاتے اور گناہوں پہ جرأت نہیں کرتے بلکہ امید کے ساتھ محبت آمیز خوف بھی رکھتے ہیں۔ اللہ کی عزت، عظمت، جلالت اور کبریائی اُن کے دلوں پر چھا جاتی ہے اور اللہ کا خوف ان کو ممنوعات سے روکتا ہے جس طرح اللہ کی ربوبیت ان کو رحمت کا امیدوار بناتی اور اطاعت پہ آمادہ کرتی ہے۔ یہ خشیہ والے کون سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے متعلق کلمہ حصر کے ساتھ فرمایا ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ کہ اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو جانتے ہیں اللہ کے مقام عظمت و جلالت کو پہچانتے ہیں۔ اس کی محیط کل قدرت سے واقف ہیں۔ سارے جہان کو اُس کی مٹھی میں مانتے ہیں۔ اس کے علم کو سارے سنسار میں جاری دیکھتے ہیں اور اس کی شانِ ربوبیت کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے عظیم الشان انعام و اکرام کا بھی ان کو علم ہے۔ مالک کائنات وہی اللہ ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ لائق پرستش سوائے ایک ذات کے اور کوئی نہیں اور قابلِ اطاعت اسی کے احکام ہیں، اُسی کے قبضہ میں ہر دُکھ سُکھ، بیماری صحت، زندگی موت، اور ثواب عذاب ہے۔

مقصودِ بیان

لم یکن الذین کفروا: سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ کی بعثت سے پہلے وہ لوگ جو کتب سماویہ کے حامل نہ تھے اور وہ لوگ جن کے پاس آسمانی کتابیں تھیں سب ہی آپس کے عناد اور ضد کی اس حد پہ پہنچ گئے تھے کہ کوئی بھی اپنے معمولات مفروضات مسلمات آئین زندگی اور رسم و رواج کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ان کی اصلاح کے لئے سوائے اس کے کوئی اور صورت نہ تھی کہ اللہ کی طرف سے کوئی برہانِ ناطق اور کوئی واضح شہادت آجائے اور اُن کے جھگڑوں کا فیصلہ کر دے۔ بظاہر عبارت میں یہ گزشتہ افراد اور قوموں کے احوال کا اظہار ہے لیکن اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اُن اشخاص اور ملت اسلامیہ کے فرقوں کو جن کی اندرونی پھوٹ اور آپس کے بغض و عناد کی حدود بھی سابق مشرکین و اہلِ کتاب کے اندرونی نفاق و تشقاق کی حدود سے کم وسیع نہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ ہیں۔ اور بقول شیخ ابن عربی کے یہ فرقے اور اشخاص اندرونی اختلافات میں اتنے غرق ہیں کہ اُن کو خود اپنی پھوٹ دُور کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لئے اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی واضح شہادت یعنی امام مہدی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں، کاش یہ لوگ سمجھ جاتے کہ امام مہدی آئیں یا نہ آئیں اللہ کی طرف سے بینہ یعنی رسول کریم تو تشریف لا چکے اور قرآن مجید اپنا فیصلہ کر چکا اور احادیث مقدسہ صحیحہ میں راہِ مستقیم دکھا دی گئی۔ یہ صحیح کہ مسلمانوں نے قرآن میں تحریف لفظی نہیں کی اور نہ کسی کی مجال تھی کہ اس میں خرد برد کر سکتا کیونکہ اللہ خود اس کا محافظ ہے مگر غلط تفسیریں اور تاویلیں کرنے میں مسلمانوں نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔ دور از کار اور خود ساختہ معانی کا اس سے استنباط کیا تاکہ اللہ کی کتاب کی تعلیم کو اپنے نفسانی سانچے میں ڈھال لیں۔ اس کے علاوہ احادیثِ مقدسہ میں تو لفظی تحریف کرنے اور رسول اللہ پہ دروغ بندی کرنے سے نہ چوکے اور لفظی تحریف کے

ساتھ معانی میں تغیر کرنے سے غافل نہ ہے۔ کیا یہ مزید بینہ کے نزول کے منتظر ہیں۔ کیا کسی کلمۂ جامعہ پر ان سب کا اتفاق ناممکن ہو گیا۔ ان کو اقوامِ گزشتہ کے حالات سے سبق حاصل کرنا چاہیئے ورنہ تباہی اُن کی منتظر ہے۔

صحفاً مطہرۃ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس امر کی طرف کہ جس طرح اوراقِ قرآنی کو اللہ نے باطنی اور معنوی طور پر کلام مخلوق کی آمیزش اور خرد برد سے پاک کر دیا ہے اور اس کی تعلیم و ہدایت کو ہر نقص خرابی اور بگاڑ سے صاف رکھا ہے۔ اسی طرح اس کی ظاہری طہارت کا بھی حکم دے دیا ہے کہ کوئی نجس ہاتھ اس کو چھو نہیں سکتا۔ پاک فرشتے اس کو لائے اور پاک انسانوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے اس کو لکھا اور پاک دلوں نے سمجھا اور پاک زبانوں نے اس کی اشاعت کی۔ لہٰذا کوئی ناپاک آدمی اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء میں تین لفظ ہیں جو مدعیانِ اسلام کے لئے اپنے اندر سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں۔ (۱) الا لیعبدوا اللہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ پرستش پوجا سوائے خدا کے کسی کی نہیں کی جا سکتی۔ دنیوی بادشاہ ہو یا شیخ وقت یہاں تک کہ پیغمبر اعظم کے سامنے بھی سر نیاز نہیں جھکایا جا سکتا۔ رکوع اور سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور عبادت کا ادنیٰ مظاہرہ بھی ان کے سامنے کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔ وہ تعظیم جو مشابہت عبادت پیدا کر دے حرام ہے۔ مخلصین لہ الدین بتا رہا ہے کہ دینی ریاکاری حرام ہے۔ دنیوی اغراض کے لئے دین کی نمائش جائز نہیں۔ قابلِ استحسان اور مستحق مدح صرف وہی لوگ ہیں جو خلوص کے ساتھ اطاعتِ الٰہی کرتے ہیں۔ کسی مخلوق کی خوشنودی حاصل کر کے دنیوی فائدہ حاصل کرنا ان کی اطاعت کا اصلی مقصد نہیں ہوتا۔ حنفاء ہر باطل سے منہ موڑ کر حق کی طرف جھکنے والے ناجائز دنیوی اُبھاوؤں کو چھوڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑنے والے ہی مستحقِ تاجِ ستائش ہیں۔ ہر قسم کے قلبی روابط و دواعی سے توجہ کو ہٹا کر اور ہر آلائش و آمیزش سے ارادہ اور عمل کو صاف کر کے صرف مولیٰ کی طرف توجہ کرنے والے ہی حنیف کہلاتے ہیں اور وہی مطلوب خداوندی ہیں۔

خیر البریۃ اور شر البریۃ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ فضیلت و ذلت اور بلندی و پستی کا معیار انسان کے فکر کی صحت و غلطی اور عمل کی درستی و کجی ہے۔ مبدء معاد الٰہیات اور قوانینِ زندگی میں قوتِ فکریہ سے صحیح کام لینے والے اور صراحتِ الٰہی کے مطابق عقیدہ رکھنے والے اور پھر قانونِ خداوندی کی عملی پابندی کرنے والے تمام جہان سے برگزیدہ اور اشرافِ کائنات ہیں اور علم و عمل میں ان کے مخالف ارذل ترین مخلوق ہیں۔ بہت ہی ذلیل بے شعور کیڑوں اور بے حس پتھروں سے بھی زیادہ۔ وغیرہ

سورۃ الزلزال

اس سورت کا نام سورہ اذا زلزلت بھی ہے خطیب سے سراج میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کے قول پر یہ سورت مکی ہے (ابن کثیر اور امام رازی نے اسی قول کی بنا پر اس کو مکی قرار دیا ہے) حضرت ابن مسعود، عطاء اور جابر بن یزید کے قول پر مدنی ہے۔ اسی لئے ابو السعود نے صراحت کی ہے کہ اس سورت کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ اس سورت میں بر قولِ خطیب آٹھ اور بر قول ابو السعود نو آیات ہیں۔ کلمات کی تعداد ۳۵ اور حروف کا شمار ۱۴۹ ہے۔

فضائل امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے (کچھ قرآن) پڑھائیے۔ فرمایا راء والی تین سورتیں (یعنی جن سورتوں کے شروع میں الر ہے) پڑھا کر۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں بوڑھا ہو گیا، زبان موٹی ہو گئی اور دل میں نشاط نہیں رہی (اتنی لمبی سورتیں روز پڑھنا اور ان کو سیکھنا دشوار ہے) فرمایا تو حٰم والی تین سورتیں پڑھا کر۔ اس نے پھر مذکورہ بالا جواب دیا۔ حضور نے فرمایا تو مسبحات (یعنی جن کے شروع میں سبح اور یسبح ہے) پڑھا کر۔ اس نے حسب سابق پھر عذر کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے ایک جامع سورت بتا دیجئے۔ فرمایا تو سورت اذا زلزلت الارض پڑھا کر۔ اس نے عرض کیا۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو برحق پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کروں گا جب وہ واپس چلا گیا تو حضور نے فرمایا۔ مردک کامیاب ہو گیا مردک نے فلاح پائی الخ۔ رواہ ابو داؤد والنسائی ومحمد بن نصر المروزی والحاکم والطبرانی وابن مردویہ والبیہقی۔

ترمذی نے محمد بن موسیٰ البصری کی اسناد سے حضرت انس کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے سورت اذا زلزلت پڑھی۔ اس نے آدھا قرآن (اس کے ثواب) کے برابر پڑھا جس نے قل یا ایہا الکافرون پڑھی۔ اس نے چہارم قرآن کے برابر پڑھا اور جس نے قل ہو اللہ احد پڑھی اس نے تہائی قرآن کے برابر پڑھا۔ ترمذی نے لکھا ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ ابوبکر بزار نے اسی اسناد سے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث بیان کی ہے کہ قل ہو اللہ احد تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اور اذا زلزلت الارض چوتھائی قرآن کے برابر۔

ترمذی نے ایک غریب حدیث حضرت ابن عباس کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ لکھی ہے کہ اذا زلزلت آدھے قرآن کے برابر ہے اور قل ہو اللہ احد تہائی قرآن کے برابر اور قل یا ایہا الکافرون چوتھائی قرآن کے برابر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ

جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی　اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی　اور اس حالت کو دیکھ کر آدمی

مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ

کہنے لگا کہ اس کو کیا ہوا　اس روز زمین اپنی سب خبریں بیان کرنے لگے گی　اس سبب سے کہ آپ کے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا　اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر

النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝

واپس ہوں گے　تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں　سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا　وہ اس کو دیکھ لے گا

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا　وہ اس کو　دیکھ لے گا۔

تفسیر: تمام دنیا کے مذاہب الہامیہ اس زندگی کے ہر کرتوت کی جزا سزا کے قائل ہیں۔ ہندو، جینی، بدھ مت، افلاطون اور اس کے متبعین اور یونانی اشراقی اور بکثرت اہل مشرق آواگون، جنم چکر اور تناسخ ہی کو جزا سزا کا معیار مانتے ہیں۔ پھر تناسخ کے تنزل کو پتھروں تک لے جاتے ہیں اور ترقی کی اعلیٰ چوٹی نفس کے مطلق کو قرار دیتے ہیں اور اس تمام مدارج نسخ فسخ مسخ اور رسخ کو پاداش عمل کے مظاہر خیال کرتے ہیں اور اس چکر کو نہ ختم ہونے والا سلسلہ سمجھ کر کبھی جدید نوع انسانی کی عملی زندگی کا خاتمہ نہیں مانتے اور نہ اس دنیائے انسانی کے موجودہ نظام عمل کو کبھی منقطع ہونے والا تصور کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک نہ موجودہ روئے زمین کا انسانی آبادی سے خالی ہو جانے اور سب کا یکدم مر جانے کا تخیل صحیح ہے۔ نہ مرنے کے بعد گزشتہ مادی جسمانی ذرات کی ہیئت ترکیبی کے الٹ اور ایک قبرستان میں سمٹ کے اچھے برے اعمال کا توازن اور حساب ہو کر اچھا برا بدلہ ملنا درست ہے۔ اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی اور صابی ضرور تمام اعمال کی پاداش کا ایک مقرر دن مانتے ہیں مگر قیامت کے متعلق اللہ کی گزشتہ کتابوں کی ناقابل تاویل صراحتوں کو دانستہ مزخرفات کے حال میں انتا الجھاتے ہیں کہ موجودہ نظام حیات کے تمام اعمال سزا جزا سے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ کوئی مسیح کی صلیبی زندگی کو اپنے نزدیک تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ خیال کرتا ہے اور کوئی برے اعمال یہود یوں کی جہنمی سزا کو چند ساعت کے لئے محدود کر دیتا ہے۔ اور یہ مقبوت، اقرار بھی انکار کا مغز اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسلام کا نظریہ قیامت کے متعلق بالکل واضح اور صاف ہے۔ وہ نہ جنم چکر کو مانتا ہے نہ اس سلسلہ زندگی کو مبداء اور منتہی سے مستغنی اور دائمی جانتا ہے۔ بیشک بعض مخصوص صورتوں میں وہ اس زندگی کے راحت و رنج، دکھ سکھ، ذلت عزت، بخت

دولت کو بعض لوگوں کے اچھے برے اعمال کا نتیجہ قرار دیتا ہے لیکن اس نتیجہ کو وہ ناقص تصور کرتا ہے۔ پاداشِ کامل کے لئے اس کے نزدیک وہ دن ہوگا جب تمام انسانوں کے موجودہ نظامِ حیات سے روئے زمین یکسر خالی ہوجائے گی جس کی صورت یہ ہوگی کہ ساری زمین میں یکدم بھونچال آئے گا۔ پوری زمین کو قدرتی طور پر جھنجھوڑ دیا جائے گا اور جھنجھوڑنی ایسی ہوگی جس کی نظیر میں کسی دوسرے بھونچال کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم نہیں ارتعاشی و اضطرابی لرزہ ہوگا یا دوری اور کروی۔ بہرحال زمین کے مناسب۔ جو زلزلہ ہوگا وہ کل زمین پر جاری اور ساری ہوجائے گا جس کا ابتدائی نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین کے تمام باطنی اور شکمی دفینے روئے زمین پر آجائیں گے اور انسان حیرت زدہ اور سکراتی حالت میں ہوکر تعجب سے باہم دریافت کریں گے زمین کو کیا ہوگیا۔ ایسا تو نہ کبھی دیکھا نہ سنا یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر ایک کی حالت نیم غشی کی ہوگی جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ زمین اپنی مخصوص زبان سے مزید جواب دے گی (کہ اسباب و مسببات کی وابستگی کا دور ختم ہوگیا۔ میدانِ عمل طے ہوچکا۔ زندگی کے مسافروں کی منزل آگئی۔ گردشِ لیل و نہار و تمام ہوگئی، نظامِ کہکشانی مختل ہوگیا، قانونِ جاذب و انجذاب کو ناکارہ بنا دیا گیا) مالکِ کائنات کا اب اشارۂ خفی یہی ہے کہ تعمیرِ ارضی کو تخریب سے بدل دیا جائے۔ زمین آسمان بدل دیئے جائیں۔ بحر و بر کی کایا پلٹ جائے تاکہ دوبارہ تعمیر جزائی ہوسکے۔ زمین کا جواب کون سنے گا۔ سننے والے کان ہی نہ ہوں گے۔ اس کا پیغام کون سمجھے گا، سمجھنے والے دماغ ہی نہ ہوں گے۔ حس و شعور سے بے بہرہ انسان صور کی امتدادی آواز سے حیاتِ نباتی بھی کھوچکے ہوں گے۔ سب مرجائیں گے۔ پھر کچھ مدت کے بعد سب مردے اپنے اپنے مسکن موت سے زندہ ہوکر نکل کھڑے ہوں گے مگر نہ ان کے اندر تنظیم ہوگی نہ اجتماعیت، نہ ترتیب نہ انضباط، سب پراگندہ پریشان حال منتشر ریوڑ کی طرح سرگرداں ہوں گے اس وقت خدائے واحد قہار کے سپاہی سب کو ہنکاکر میدانِ حشر میں لاکھڑا کردیں گے اور حساب فہمی کے بعد جزا سزا کا آخری فیصلہ عرشِ خداوندی سے صادر ہوگا۔ اور ہر ایک کا کیا دھرا سامنے آئے گا۔ زندگی کے تمام لمحات کے کل حرکات سکنات کی مرتب فلم نظر کے سامنے آجائے گی۔ نہ ذرہ برابر نیکی غائب ہوگی نہ چیونٹی برابر بدی۔ سب کے اعمالنامے یعنی پوری زندگی کا نوشتۂ تقدیر ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اسی کے مطابق اچھی بری پاداش ملے گی۔

تحلیلِ اجزاء اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (سوچو کہ) جب زمین کو جھنجھوڑی دی جائے گی جیسی اس کے مناسب ہوگی یعنی زمین میں ایک ہمہ گیر انقلابی زلزلہ آئے گا کہ اندرونی اور بیرونی کوئی چیز اس بھونچال سے محفوظ نہیں رہے گی حضرت ابن عباس نے فرمایا زمین اندر سے اضطراب اور زلزلے میں آئے گی۔

اسی زلزلہ کی ہولناکی دوسری آیت میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم یعنی قیامت کا زلزلہ عظیم الشان ہوگا۔ اس کے ہول سے دودھ پلانے والی عورت اپنے بچہ سے غافل ہوجائے گی اور حاملہ کا اسقاطِ حمل ہوجائے گا اور لوگ مدہوش نظر آئیں گے، حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے۔ (ابن کثیر)

مجاہد کے نزدیک یہ زلزلہ پہلی مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ یوم ترجف الراجفۃ تتبعہا الرادفۃ جس روز کہ پہلا زلزلہ آئے گا جس کے پیچھے دوسرا آئے گا (خازن) ابن کثیر بلکہ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک یہ زلزلہ اسی زندگی میں قیامت سے پہلے آئے گا۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ زمین اپنے جگر پارے (دفینے) ستونوں کی طرح اگل دے گی۔ قاتل کہے گا میں نے اسی کے لئے قتل کیا تھا اور رشتہ داریاں منقطع کرنے والا کہے گا میں نے اسی کے لئے قرابتیں ختم کی تھیں اور چور کہے گا اسی کی چوری میں میرا ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ پھر سب اس کو چھوڑ دیں گے کوئی بھی نہیں لے گا۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا۔ اور زمین اپنا اندرونی بار باہر نکال دے گی۔ اثقال سے مراد ہیں دفینے سونا چاندی وغیرہ (مسلم ترمذی) یا قبروں کے مردے مراد ہیں۔ مؤخر الذکر قول مجاہد کے قول کی تائید کرتا ہے اور اول الذکر تفسیر سے ابن کثیر اور عام مفسروں کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ اس فقیر کے نزدیک یہی قول قابلِ ترجیح ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اللہ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا۔ اور لوگ (حیرت سراسیمگی اور تعجب کی حالت میں) کہیں گے کہ زمین کی یہ کیا حالت ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اگر زلزلہ ہے

اول بار صور پھونکا جانا مراد ہو تو کسی کو یہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا۔ صور کی ہیبت سب کو مدہوش بلکہ مُردہ کر دے گی۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۔ اس روز زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کہ آپ کے رب کا حکم اس کو یہی ہو گا۔ اس آیت کا ... تفسیری مطلب جو بعض احادیث کے بھی مطابق ہے یہی ہے کہ زمین کو اللہ کا حکم ہو گا وہ ہر شخص کے اُن اعمال کی شہادت دے گی جو اس کی پشت پر کئے گئے ہوں گے۔ امام احمد ترمذی اور نسائی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کیا تم واقف ہو کہ زمین کیا خبریں بیان کرے گی۔ صحابہ نے عرض کیا۔ اللہ اور اس کے رسول ہی کو بخوبی علم ہے۔ فرمایا زمین ہر مرد اور عورت پر گواہی دے گی کہ اس نے میری پیٹھ پر ایسے کام کئے ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ زمین کو حکم دے گا تو بیان کر۔ حسب الحکم وہ بیان کرنے لگے گی۔ طبرانی نے حضرت ربیعہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا زمین سے ہوشیار رہو۔ یہ تمہاری ماں ہے اس پر جو شخص نیکی، بدی کرے گا وہ ضرور اطلاع دے گی۔ حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا زمین پر جو عمل کیا گیا ہو گا قیامت کے دن وہ اس کو ضرور پیش کرے گی پھر حضور نے آیت اذا زلزلت الارض..... اخبارہا تک تلاوت فرمائی۔ ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ کا دن قیامت کا ہو گا، کیونکہ قیامت کے دن ہی زمین ہر اچھائی بُرائی لوگوں کی بیان کرے گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب زمین میں ہمہ گیر زلزلہ آئے گا تو لوگوں کو حیرت ہو گی کہ ایسا زلزلہ تو پہلے کبھی نہیں آیا کہ زمین کے تمام دفینے باہر نکل آئے ہوں۔ لوگ سراسیمہ اور بدحواس ہو کر باہم پوچھیں گے (یا کافر پوچھیں گے) کہ زمین کو کیا ہو گیا تو زمین اپنی نوعی زبان سے بیان کرے گی کہ مجھے خود کچھ نہیں ہوا بلکہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے۔ اسی کے حکم کے مطابق میرے اندر یہ انقلاب اور توڑ پھوڑ پیدا ہوئی ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۔ جس روز یہ واقعات ہوں گے اسی روز لوگ جماعت در جماعت برآمد ہوں گے تاکہ اُن کے (اچھے بُرے) اعمال (کے نتائج) ان کو دکھائے جائیں۔ اشتات کے معنی ہے فرقے (سدی) لیکن ابن جریر نے لکھا ہے کہ پھر کبھی جمع نہ ہوں گے یعنی اشتاتا کا مطلب یہ ہے کہ لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔ ایک گروہ اہل جنت کا، دوسرا دوزخیوں کا دونوں کو جدا جدا کر دیا جائے گا اور پھر اُن کا اختلاط کبھی نہ ہو گا۔

نکل کر چلنے کی تشریح دو طرح کی گئی ہے۔ (۱) خطیب نے لکھا ہے کہ قبروں سے نکل کر میدانِ حشر کی طرف چلیں گے (۲) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ موقف حساب سے نکل کر دو گروہ بن جائیں گے۔ ایک گروہ جنت کی طرف اور دوسرا جہنم کی جانب چلا جائے گا۔ حضرت ابن عباس کے قول سے اسی کی تائید ہوتی ہے آپ نے فرمایا تھا کہ اعمال کے موافق لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔ بعض دائیں جانب یعنی جنت کی راہ پر اور بعض بائیں جانب یعنی جہنم کے راستے پر چلے جائیں گے۔

بہرحال قبروں سے برآمدگی مراد ہو یا موقف حساب سے غرض دونوں کی ایک ہی ہو گی کہ جو کچھ کیا کرایا ہو گا آنکھوں کے سامنے آئے گا جس کی تفصیل آئندہ آیت میں آئی ہے۔

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۔ ذرہ چھوٹی چیونٹی۔ مراد ادنیٰ ترین مقدار۔ مثقال وزن مراد مقدار۔ مقصد یہ ہے کہ جو حقیر ترین نیکی کرے گا وہ بھی اُس کے سامنے آئے گی۔ اور حقیر ترین بدی بھی سامنے آئے گی۔ عام اہل تفسیر نے نیکی بدی سامنے آنے اور اس کو دیکھنے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ہر نیکی بدی کا اچھا بُرا بدلہ سامنے آئے گا اور برداشت کرنا پڑے گا یعنی دیکھنے سے مراد ہے برداشت کرنا اور نیکی بدی سے مراد ہے نیکی بدی کی جزا سزا۔

لیکن کلام کو اگر حقیقت پر محمول کیا جائے اور مجاز فی الحذف نہ قرار دیا جائے اور اعمالناموں میں مندرج نیکی بدی کو دیکھنا ہی مراد لیا جائے تب بھی اس فقیر کی نظر میں سیاقِ کلام کے خلاف نہ ہو گا کیونکہ بنص قرآنی ہر چھوٹا بڑا عمل اللہ کے فرشتے لکھ لیتے ہیں۔ انسان کی کسی حرکت سکون کو نامۂ اعمال میں درج کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہی اعمالنامے قیامت کے دن دکھائے جائیں گے اور انسان تمام اعمال اس میں لکھے ہوئے پائے گا۔

ایک ضروری تنبیہ اعمالنامے کیا ہیں۔ کسی کاغذ کے ہیں یا چمڑے کے یا کسی اور چیز کے، ان میں اندراج کس قلم اور کس روشنائی سے ہوتا ہے اور کس طرح ان کو لپیٹ کر محفوظ کر دیا جاتا ہے اور قیامت کے دن اُن کو کیسے کھول کر پھیلایا جائے گا اور

انسان ان کو کس طرح پڑھے گا باوجودیکہ اُس رسم خط اور زبان سے واقف بھی نہ ہوگا یہ تمام امور اور ان سے تعلق رکھنے والے جزئیات ایمانی ہیں جن کو قوت واہمہ اپنے توہم کی آماجگاہ بناتی ہی رہے گی۔ لیکن صرف سمجھنے سمجھانے اور تسکین ایمانی کے لئے ہم انسانی زندگی کے اطوار، کردار، گفتار اور تصوری لہروں کی رفتار کو ایک مرتب نظم سے تشبیہ دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ اپنی جگہ طے ہے کہ عالمِ دہر میں نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل بلکہ حوادث و واقعات ایک مسلسل زنجیر کی طرح ہیں جس میں ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے وابستہ ہے۔ انسان کے ہر عمل کے ہونے نہ ہونے کا مطلب اس کا وجود و عدم نہیں بلکہ ظہور و خفا ہے۔ کوئی بات زبان سے نکل کر اور کوئی حرکت ہاتھ پاؤں، آنکھ، ابرو اور دوسرے اعضائے جسم سے سرزد ہو کر بلکہ کوئی ارادہ تصوری لہروں سے گزر کر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اس نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے جس سے ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ سائنس کا اٹل مبنی بر مشاہدہ فیصلہ ہے کہ اس کائنات کے اندر ان گنت فلمیں ہیں اور ہر فلم بجائے خود مربوط ہے جس کے اندر کوئی خلا نہیں۔ اس وقت ہم کو اپنی زندگی کی گزشتہ حرکات سکنات اور آئندہ واقعات اصل شکل میں دکھائی نہیں دیتے اور ہم ہر ماضی کو زائل اور مستقبل کو غیر موجود سمجھتے ہیں لیکن وہ فطری غیبی طاقتیں جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہیں ہماری ساری زندگی کو اپنے احاطہ تصرف میں رکھتی ہیں۔ ہمارا کوئی کردار ان کی رسائی سے باہر نہیں۔ ہمارے اعمال و حرکات اور تصورات و تخیلات کی لہریں اس خلاء میں ہوا کے دوش پر بہہ رہی ہوں یا ریڈیائی اور برقی لہروں کی پیشانی پر ثبت ہوں یا شعاعوں سے آگے بڑھ کر کسی خالص روحانی طاقت کے غیر مادی دستِ قدرت سے غیر مادی صحفِ فطرت پر منقوش ہوں۔ بہرحال یہ یقینی ہے اور سائنس کو بھی گوارا ہے کہ وہ ایک مربوط نظم یا منتشر نقوش کی شکل میں موجود ہیں اور نقوش بھی ایسے نہیں جن کو اصل سے جدا کر دیا جائے بلکہ وہ ٹیلی ویژن کی طرح یا جامِ جہاں نما کی مثل ہمارے کردار و ارادوں کے اصلی خد و خال کی مظہر ہیں جن کے وقوع سے انکار ایسا ہی ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں جامِ مے ہو اور وہ اس کو اپنے لبوں سے لگائے پی رہا ہو اور پھر ایسی حالت میں جام پکڑنے اور لبوں سے لگانے کا منکر بھی ہو یا تیز رفتار سے چلتے رہنے کے باوجود وہ دوڑنے کی حالت میں دعویٰ کرے کہ میرا قدم نہیں اٹھ رہا ہے اور نہ میں دوڑ رہا ہوں۔ ایسی بدیہی حقیقت کا انکار جس کی شہادت ہاتھ اور پاؤں اور لب اور زبان دے رہے ہوں یا دیوانگی ہے یا روشن دن میں آفتاب کی تکذیب کی طرح سراسر ضد کا مظاہرہ۔ پس خیر ہو یا شر، نیک عمل اور ارادہ اور فکر ہو یا برا عمل و ارادہ اور فکر جب اسی کائنات میں اصلی حالت میں موجود ہے تو اس کو نہ دیکھ سکنے کا خیال محض بے بنیاد ہے۔ فرق صرف موجودہ جہالت اور مدارجِ علم کے طے کرنے کا ہے۔ آدمی جس طرح پہلے ریڈیو اور شعاعوں کے علم سے ناواقف تھا اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں واقع ہونے والے حوادث سے واقفیت صرف اطلاع اور اخبار کے ذریعہ سے حاصل کرتا تھا یا پھر اشراقِ نوری کا مدعی تھا اور تخیل کی پہنائیوں میں حوادثِ غائبہ کے چہرے دیکھ لیا کرتا تھا لیکن علم کی وسعت نے اس کو شعاعوں سے روشناس کرایا۔ اس نے اول آواز کو اپنی مٹھی میں بند کیا۔ پھر آواز دینے والی اصل صورتوں کو بھی شعاعوں کی وساطت سے قیدی بنا لیا کہ جہاں چاہتا ہے ہر آواز کو بھی پکڑ لیتا ہے اور ہر صورت کو بھی گرفتار کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی موجودہ جہالت انسان کے گزشتہ کردار کی مربوط نظم کا مشاہدہ کرنے سے مانع ہے۔ جوں جوں جہالت کا پردہ اٹھتا جائے گا علم کا میدان وسیع ہوتا جائے گا اور آخرکار تمام کردار و اطوار اور پوشیدہ تخیلات و ارادے ایک زنجیر کی شکل میں مربوط طریقے سے لپٹے ہوئے اس کے دائیں بائیں ہاتھ میں آجائیں گے اور ان کو کھول کر پڑھے گا گو چونکہ وہ تحریریں کسی رسم الخط کی محتاج نہ ہوں گی اور نہ پڑھنے والے کسی طرزِ تحریر کے جاننے کے محتاج ہوں گے۔ بلکہ اپنا ہاتھ، اپنا پاؤں، اپنی آنکھ، اپنا کان، اپنی ناک اور اپنا دل و دماغ اصل صورت اور واقعی حالت میں اچھی بری حالت میں مشغول دکھائی دے گا اس لئے نہ پڑھنے میں دشواری ہوگی نہ سمجھنے میں دقت، نہ انکار کی مجال۔ کیا خوب فرمایا ہے۔ تشہد ایدیہم وارجلہم۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔

واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان قیامت کے شروع میں یا آغازِ قیامت سے پہلے ایک عظیم الشان زلزلہ آئے گا جس سے ساری زمین میں ہلچل پیدا ہو جائے گی اور ایسا الٹ پلٹ ہوگا کہ اندرونِ زمین کی کائنات اوپر آجائے گی اور زمین اپنی نوعی زبان یا حالی بیان سے ظاہر کرے گی کہ زمین میں زلزلہ آنے اور ضابطۂ استعدادیات کے معطل ہو جانے کی اصلی علت حکمِ خداوندی ہے۔ یعنی اسباب و نتائج کی باہم وابستگی کے قانون کو اس میں دخل کامل نہیں۔ اس کے بعد انسان بھی اٹھیں گے۔ اپنے اپنے مقاماتِ سکون اور مواقفِ استقرار سے باہر آجائیں گے اور آخر اس زندگی کا سارا کیا کرایا

سامنے آئے گا اور ہر حرکت و سکون کی جزا سزا اٹھانی ہوگی۔ وغیرہ

تکملۂ توضیحی حضرت ابن مسعود نے فرمایا قرآن میں سب سے محکم آیت فمن یعمل مثقال ذرۃ الخ ہے۔ کعب احبار نے فرمایا۔ یہ دو آیات توریت انجیل اور تمام صحیفوں کے کل مضامین کو محیط ہیں۔ رسول اللہ نے اس آیت کو آیت فاذّہ جامعہ فرمایا ہے۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ سعید بن جبیر تابعی نے فرمایا جب آیت ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً ویتیماً و اسیراً نازل ہوئی تو مسلمانوں کا خیال ہوا کہ ثواب اسی کھانا کھلانے کا ہوگا جو دینے والے کو خود بھی مرغوب ہو۔ ذرا سا دینے سے کوئی ثواب نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک چھوارہ یا ایک نوالہ حقیر سمجھنے کی وجہ سے کسی مسکین سائل کو وہ نہیں دیتے تھے اور اس کو ناکارہ خیال کرتے تھے۔ بعض مسلمان یہ بھی سمجھتے تھے کہ خفیف گناہوں کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ ایک بار جھوٹ بول دینا، اجنبی عورت کو ذرا دیکھ لینا۔ کسی کی تھوڑی سی غیبت کرنا اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گناہ ناقابلِ مواخذہ ہیں۔ گرفت صرف بڑے گناہوں پر ہوگی۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے آیت فمن یعمل مثقال ذرۃ کا نزول ہوا۔

امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ خبردار حقیر گناہوں سے (بھی) بچتے رہو۔ ایسے گناہ جمع ہو کر آدمی کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ حضور نے اس کی مثال اس طرح دی کہ کچھ لوگ جنگل میں (کسی فرود گاہ پر) اترے۔ ایک شخص ایک لکڑی لایا اور دوسرا دوسری۔ اس طرح ایک ایک کر کے انبار ہو گیا اور جو کچھ پکانا تھا سب بخوبی پکا لیا۔

امام احمد و نسائی نے لکھا ہے کہ حضرت صعصعہ بن معاویہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے اُن کو آیت فمن یعمل مثقال ذرۃ الخ سنائی۔ صعصعہ نے کہا میرے لئے یہی کافی ہے۔ حضرت عدی کی روایت کردہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا آگ سے بچو خواہ چھوارے کا ایک ٹکڑا دے کر ہی ہو۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ نے ایک بار ایک انگور دیا اور فرمایا اس میں بہت سے ذرات ہیں۔

رسول اللہ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا۔ ایسے گناہوں سے ڈرنا اور بچنا جن کو حقیر سمجھ کر کیا جائے۔ اللہ کی طرف سے اُن کی باز پرس کرنے والا بھی ہوگا۔ رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ

سُورۃ والعادیات

شیخ ابو السعود نے لکھا ہے کہ اس سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک اور قتادہ کے نزدیک مدنی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود حضرت جابر، حسن بصری، عکرمہ اور عطاء کے قول پر مکی ہے۔ امام رازی اور شیخ ابن کثیر کے نزدیک یہی قول راجح ہے۔ خطیب نے سراج میں اس کی آیات گیارہ، کلمات چالیس اور حروف ایک سو ترسٹھ بتائے ہیں۔

حسن بصری کی مرسل روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ سورۂ اذا زلزلت نصف قرآن کے برابر ہے اور والعادیات نصف قرآن کے مساوی۔ حضرت ابن عباس کی ایک مرفوع روایت میں بھی ایسا ہی آیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِہٖ

قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر (پتھر پر) ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں پھر صبح کے وقت تاخت تاراج کرتے ہیں پھر اس وقت غبار اڑاتے

ابراہیم نخعی اور قرطبی کے نزدیک حاجیوں کے اونٹ مراد ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ
حضرت ابن عباس نے فرمایا میں (حج کے زمانہ میں) حجر میں بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے والعادیات ضبحًا کی تشریح پوچھی۔ میں نے کہا اس سے مراد مجاہدوں
کے گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں دشمن پر چھاپہ مارکر رات کو اپنی جگہ واپس آکر کھانا تیار کرنے کے لئے آگ جلاتے ہیں (یعنی ان کے سوار دشمن پر چھاپہ
مار کر واپس لشکرگاہ میں آکر کھانا تیار کرتے اور آگ جلاتے ہیں) وہ شخص چلا گیا اور زمزم کے سقایہ کے پاس جاکر امیر المومنین حضرت علی سے آیت کی تشریح پوچھی
آپ نے فرمایا۔ مجھ سے پہلے تو نے کسی اور سے بھی دریافت کیا تھا۔ اس شخص نے جواب دیا میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ گھوڑے مراد ہیں۔
جو اللہ کی راہ میں چھاپہ مارتے ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا جاکر ابن عباس کو میرے پاس لے آؤ۔ حسب الحکم میں حاضر ہوگیا۔ فرمایا تم بغیر جانے لوگوں کو فتویٰ دیتے
ہو۔ واللہ اسلام میں سب سے پہلے جہاد بدر تھا لیکن بدر کی لڑائی میں ہمارے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک زبیر بن العوام کے پاس تھا اور ایک
مقداد بن اسود کے پاس۔ اس صورت میں والعادیات سے مراد گھوڑے کیسے ہوسکتے ہیں۔ حقیقت میں العادیات سے مراد عرفہ سے مزدلفہ کی طرف اور مزدلفہ
سے منیٰ کی طرف (دوڑ کر) جانے والے اونٹ ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اس کے بعد میں نے پہلا قول چھوڑ دیا اور حضرت علی کا قول لے لیا۔ اس کی
کی سند صحیح ہے۔ دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔ العادیات سے مراد ہیں عرفہ سے مزدلفہ کو جانے والے پھر مزدلفہ پہنچ کر آگ
جلاتے ہیں۔ امام رازی نے حضرت ابن عباس کے اول قول کو پسند کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ ضبح (ہچر ہچر کرنے کی آواز) گھوڑے کی دوڑ میں ہوتی ہے
اونٹ کی دوڑ میں نہیں ہوتی۔ یہی ابن کثیر نے لکھا ہے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے گھوڑوں کے ضبح کو آدمیوں کے اح اح کرنے سے
تشبیہ دی تھی۔ رازی نے لکھا ہے کہ اگر اونٹ مراد ہوں تو یہ مطلب ہوگا کہ قسم ہے عرفہ سے مزدلفہ کی طرف تیزی کے ساتھ دوڑ کر جانے والے اونٹوں کی
جو تیزی کے ساتھ دوڑتے ہیں اور ان سے غبار اڑتا ہے اور مقام جمع (مزدلفہ) کے اندر وہ پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر کھانا پکانے کے لئے آگ جلاتے ہیں۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ امام رازی اور شیخ ابن کثیر اور ابن جریر مجاہد عکرمہ و عطاء کے نزدیک جب یہ سورت مکی ہے تو ان فضلاء متبحرین پر تعجب ہے کہ
ان کے نزدیک العادیات سے مجاہدین کے گھوڑے مراد ہیں۔ مکہ میں جہاد کا حکم کہاں تھا اور مجاہدین کے گھوڑے کس کے تصور میں تھے۔ سورت کو مدنی قرار
دیا جائے جیسا کہ اکثر صحابہ سے منقول ہے تو دونوں معنی کا احتمال ہوسکتا ہے۔ حاجیوں کے اونٹ مراد ہوں یا مجاہدوں کے گھوڑے۔ اگرچہ موخر الذکر مراد
پر حضرت علی کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا کہ جنگ بدر میں مجاہدوں کے گھوڑے موجود ہی نہ تھے اُن کی قسم کھانے کا معنی ہی کیا ہوسکتا ہے لیکن
ممکن ہے کہ نزولِ سورت کے وقت مجاہدوں کے گھوڑے اور سامان کے رسالے تیار ہوگئے ہوں اس لئے مدنی ہونے کی تقدیر پر گھوڑے مراد لینے جائز
ہیں لیکن مکہ میں تو نہ کوئی جنگی مجاہد تھا نہ کسی کا گھوڑا اس لئے مکی ہونے کو اگر ترجیح دی جائیگی تو گھوڑے مراد ہونا بغیر تاویل کے ممکن نہیں۔ واللہ اعلم۔

بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ الموریات سے مراد ٹاپوں سے چنگاریاں اڑانا نہیں ہے۔ (ٹاپوں سے چنگاریاں ریت اور مٹی پر دوڑنے سے نہیں نکلتیں)
بلکہ لڑائی کی آگ بھڑکانا مراد ہے۔ ابوبکر بزار نے حضرت ابن عباس کی روایت سے ایک غریب حدیث نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اللہ
نے (کہیں جہاد پر) کچھ سواروں کو بھیجا۔ ایک ماہ تک ان لوگوں کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ منافقوں اور یہودیوں نے کہنا شروع کیا وہ لوگ مارے گئے۔
اس پر یہ سورت جمعًا تک نازل ہوئی۔ اس روایت کے راوی سوائے حفص کے باقی سب قابلِ اعتماد ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۔ بلاشبہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ (حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ضحاک، عکرمہ) یعنی اللہ کی
نعمتیں دیکھتا جانتا اور سمجھتا ہے۔ پھر بھی دیدہ دانستہ منکر ہوجاتا ہے اور شکر ادا نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ابراہیم نخعی، ابو الجوزاء، ابو العالیہ
ابو الضحیٰ، سعید بن جبیر، محمد بن قیس، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، الربیع بن انس اور ابن زید نے یہی تشریح کی ہے۔ حسن بصری نے لفظ کنود کی تشریح
کرتے ہوئے فرمایا کہ کنود وہ شخص ہے جو اپنی مصیبتوں کو تو بیان کرے اور اللہ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اُن کو بھول جائے۔
عرف میں کنود اس شخص کو کہتے ہیں جو حق ادا نہ کرے اور بھلائی سے رک جائے۔ ابن جریر نے حضرت ابو امامہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کنود وہ ہے جو تنہا

کھاتا ہے۔ غلام کو مارے اور کسی کو فائدہ نہ پہنچائے۔ (ابن کثیر) کلبی نے بیان کیا کہ قبیلۂ کندہ کے محاورہ میں کنود نافرمان کو اور بنی مالک کے محاورہ میں بخیل کو مضر و ربیعہ کے محاورہ میں ناشکرے کو کہتے ہیں۔

کیا الانسان سے کوئی خاص شخص مراد ہے

حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ اس آیت کا نزول قرط بن عبداللہ بن عمرو بن نوفل قرشی کے متعلق ہوا۔ اکثر اہلِ تفسیر کی یہی رائے ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب واضح اور ناقابلِ اعتراض ہے لیکن اگر الانسان سے مراد عام انسان ہو اور الف لام کو جنسی کہا جائے تو ظاہر مطلب پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ عموماً انسان کا ناشکرا ہونا صحیح نہیں۔ بعض افراد شکرگزار اور اللہ کے نیک بندے بھی ہیں۔ لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں خیال کیا کہ الف لام جنسی استغراق افراد کے لئے نہیں ہوتا۔ اگر بعض مثالیں حکم کے عموم سے مستثنیٰ ہوں تو جنسیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کے علاوہ آیت میں تو انسانی طبیعت کے تقاضا کا اظہار ہے۔ آدمی کی قوتِ شہوانیہ اور غضبیہ اگر عقل کے دباؤ سے مغلوب نہ ہوں تو انسان کو کنود ہونے پر ابھارتی ہیں۔ پس عام انسان کے کنود ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس کا ثبوت آئندہ آیت میں خود موجود ہے کہ انسان کی توتیں اور میلاناتِ طبیعت خود شاہد ہیں کہ انسان کنود ہے۔ اس کا قلبی میلان و رجحان (اگر نصرتِ الٰہی دستگیر نہ ہو تو) حبِ جاہ و مال اور متاعِ دنیا کی طرف اللہ سے زیادہ ہے۔ اس کو نعمت سے محبت ہے اور منعم کا درجہ اس کے نزدیک ثانوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی وعدہ کے مقابلہ میں انسان کو موجودہ مقبوضہ مال پر زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۔ انسان (کی عمومی حالت اور زندگی کا طور طریق) خود ناشکر ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے آیت کا تشریحی مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن قتادہ اور سفیان ثوری نے اِنَّهٗ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع کی ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ انسان کے کنود ہونے پر اللہ شاہد ہے۔ اس فقیر کی نظر میں آیت کا سادہ مطلب وہی ہے جو اوپر ذکر کر دیا گیا کہ عموماً انسان کنود ہے۔ کیونکہ اس کی حالت اور زندگی کا طور طریق اس کی شہادت دے رہا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۔ یہاں شدید کا ترجمہ بخیل بھی کیا گیا ہے۔ یعنی انسان مال، جاہ اور متاعِ دنیا کی محبت میں غرق ہے اور یہ محبتِ مال ہی اس کو کنجوس بنائے ہوئے ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مال کی محبت میں انسان بہت سخت ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں دونوں مطلب بیان کئے ہیں۔ اور دونوں کو صحیح کہا ہے۔ (مال جمع کرنے اور جمع رکھنے کے جائز ناجائز ہر طرح کے منصوبے بناتا ہے اور تدبیریں سوچتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھتے ہیں کہ اس طور پر مال جمع کرنا چاہیئے اگرچہ وہ اپنے خیالات اور ارادوں کو چھپاتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا)

افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور وحصل ما فی الصدور ان ربهم بهم یومئذ لخبیر کیا اس حریص کنجوس محبتِ مال میں گرفتار انسان کو اس وقت کے آنے کا یقین نہیں کہ جب عالمِ برزخ کے بے جان مردے (زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے۔ اور دلوں کے اندر جو باتیں چھپاتے تھے وہ (بھی) سب ظاہر کر دی جائیں گی اور ان کا مالک اس روز ان کے تمام حالات سے باخبر ہوگا۔ کوئی ظاہری باطنی بات مالک کے علم سے اوجھل نہ ہوگی۔ قبروں کے اندر چونکہ بے جان مردے یا منتشر اجزائے خاکی رہ جاتے ہیں اور بے جان کے لئے عربی زبان میں ما کا لفظ آتا ہے اس لئے بجائے من فی القبور کے ما فی القبور فرمایا۔ شیخ ابو السعود نے یہی تشریح کی ہے۔

شیخ ابن عربی کی اشاراتی تشریح

العادیات وہ نفوس جو راہِ الٰہی میں سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ اور فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ کے حکم کی تعمیل میں تیزی کے ساتھ دوڑتے ہیں۔ الموریات وہ نفوس جو بتوفیقِ الٰہی عقل کی حقائق کو رگڑ کر معلومات کی ترتیب دیکر فکر کی روشنی میں نامعلوم چیزوں کو جانتے ہیں اور نتائج نکالتے ہیں۔ المغیراتِ صبحاً۔ وہ نفوس جو صبحِ توفیق کی روشنی میں نفسانی کدورتوں اور آلودگیوں کو غارت کرتے ہیں۔ فاثرن بہ نقعاً۔ اور ریاضت و مراقبات کے ذریعہ سے کثافتِ نفس کا غبار اڑاتے ہیں (تاکہ ہلکے پھلکے ہو کر عروج کر سکیں)

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۔ پھر جب ان میں سکینہ اور طمانیت آجاتی ہے تو تمام اوصاف (شہوانیت و غضب اور فکر عقلی) میں اعتدال اختیار کرتے

اور (افراط تفریط سے محفوظ ہوکر) متوسط مقام پر آجاتے ہیں۔ شیخ کی یہ تشریح اگرچہ خوب ہے۔ اور یہی تصوف و شریعت کی جان ہے لیکن تفسیری روایات کے خلاف ہے اسی لئے اس کو تفسیر نہیں، بلکہ اشاراتی تشریح اور پوشیدہ کنز معانی کا ایک طرح کا اظہار اس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

مقصود بیان العادیات سے اگر گھوڑے مراد ہوں تو مجاہدین کے گھوڑوں کی مدح اور اظہار پسندیدگی کی صراحت اور جہاد کی در پردہ ترغیب ہوگی اور اگر حاجیوں کے اونٹ مراد ہوں تو حج کی مخفی تلقین اور حاجیوں کے اعمال حج کے پسندیدہ ہونے کی طرف اشارہ ہوگا۔

ان الانسان لربہ لکنود میں لفظ رب بتا رہا ہے کہ ہر قسم کی جسمانی علمی مالی اور اعزازی نعمت دینے والا تو اللہ ہے اس لئے اسی کو معبود قرار دیا جائے۔ کسی دوسرے کو رب نہ مانا جائے اور اللہ ہی کا شکر ادا کیا جائے یعنی کفر و شرک نہ کیا جائے مگر عموماً انسان ایسا نہیں کرتا۔ چاند، سورج، کواکب، پانی، ہوا، زمین اور غیر مرئی اسباب غیبیہ کو رب مانتا اور معبود قرار دیتا ہے بلکہ فرضی دیوتاؤں کے سامنے سر جھکاتا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ظاہر نظر سے اللہ کی غیبی کارسازی تو اس کو نظر نہیں آتی اور مال و جاہ و حکومت سے اس کو دلی شغف ہوتا ہے اور ظاہری اسباب ہی اس کو پروردگار دکھائی دیتے ہیں اس لئے خدا کی ناشکری کرتا اور دوسروں کو کارساز جانتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اور زندگی کے احوال اسی کفران نعمت اور احسان فراموشی کو ظاہر کر رہے ہیں۔

وانہ لحب الخیر لشدید کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ (باستثناء بعض) عموماً انسان مالی محبت میں سخت مبتلا ہے۔ گویا مال کی محبت ہی تمام نفرائی کا سرچشمہ ہے سچ فرمایا ہے کہ حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔

افلا یعلم سے انسان کی غفلت اور جہالت پر تنبیہ ہے کہ حب دنیا نے اس کی علمی آنکھوں کو بند کر رکھا ہے۔ اور قیامت و حشر اور حساب کتاب پر بھی اس کا ایمان نہیں رہا۔ وغیرہ

سُورَةُ القَارِعَة

بالاتفاق یہ سورت مکی ہے۔ آیات کی تعداد بعض علماء کے نزدیک آٹھ اور شیخ ابوالسعود کے نزدیک دس اور رازی و خطیب کے نزدیک گیارہ ہے کلمات ۳۶ اور حروف ۱۵۲ ہیں۔

گزشتہ سورت کے آخر میں قبروں سے اٹھائے جانے اور احوال زندگی کے ظاہر ہو جانے کی صراحت کی گئی ہے۔ اس سورت میں اس عملی طور کی تباہی بربادی اور بربادی کے بعد خیر و شر اور نجات و ہلاکت پیش آنے کی صراحت کی گئی ہے۔ اور نیکی بدی کے موازنہ کی صورت بتائی گئی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۭ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ

وہ کھڑکھڑانے والی چیز کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز اور آپکو معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز جس روز آدمی پریشان پروانوں کی طرح

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۭ فَاَمَّا مَنْ

ہو جاویں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جاویں گے (وجہ تشبیہ متفرق ہو کر اڑ جانا ہے) پھر (وزن اعمال

ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۭ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ

کے بعد) جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا (یعنی ناجی ہوگا) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) (یعنی

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝

وہ کافر ہوگا) تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کیا چیز ہے (وہ) ایک دہکتی ہوئی آگ ہے

تفسیر کچھ لوگ ہیں جو انسانی زندگی کو خورد و سبزہ کی زندگی کی طرح ہر نتیجہ سے بے بہرہ اور انجام سے مستغنی جانتے ہیں۔ اس کارگاہِ ہستی میں بے شعور کائنات کی طبعی حرکات کی طرح انسان کے اعمال و اقوال بھی ہر باداش سے خالی اور جزا سزا سے پاک ہیں۔ ضابطۂ اسباب و مسببات کی ایک کڑی انسان بھی ہے جو پچھلی اور اگلی کڑی سے وابستہ ہے اور قانونِ جذب و انجذاب کے زیر اثر اگلے حلقہ کو کھینچتی اور اس کے ساتھ کھنچتی چلی جاتی ہے۔ سلسلۂ کائنات ایک زنجیر ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ اس زنجیر کی حرکت دوری ہے نہ کہیں نقطۂ ابتدا ہے نہ اختتام۔

کچھ لوگ ہیں جو اس ہنگامہ کو ناقابل تخریب جانتے ہیں۔ یہ دار العمل ہی ان کے نزدیک دار الجزاء بھی ہے۔ موجودہ جنم گزشتہ جنم کا نتیجہ ہے۔ آواگون ایک چکر ہے جو چل رہا ہے۔ گویا یہ زندگی گزشتہ زندگی کا نتیجہ بھی ہے اور آئندہ زندگی کا تخم بھی پس انسان کا نقطۂ سیر کسی مبدء کا نام نہیں اور جب تک انسان انسان ہے اس کی مسافتِ سفر کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ہاں جب کثافت اور زنگ بالکل صاف ہو جائے گا اور انسان کی آتما پاک ہو جائے گی تو قطرہ سمندر میں مل جائے گا اور آفتاب وجود اس شعاعِ آدمیت کو اپنے اندر جذب کر لے گا۔ اس گروہ کے نزدیک بھی نہ کوئی مخصوص روزِ جزا ہے نہ اس محل گاہ کا کبھی خاتمہ۔ لیکن دین سماوی انسانی حیات کو نہ کارہ اور سزا جزا سے خالی نہیں نہ تناسخی چکر کا قائل ہے نہ فسخ و مسخ کا نہ فنائے کامل کا نہ عدم تام کا نہ جہت ماضی کو قدیم اور بے کنارہ جانتا ہے نہ اس ہنگامہ اور عرصہ گاہ کو غیر فانی۔ آسمانی مذاہب کہتے ہیں کہ ماضی میں ایک وقت تھا کہ اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر سب کچھ ہوا یہاں تک کہ اس کائنات کا خلاصہ بھی زمین پر نمودار ہو گیا جس کا نام آدم رکھا گیا۔ آدم اور آدم کی تمام نسل ضابطۂ عمل و پاداش سے وابستہ ہے۔ عوارضِ اضطراریہ کو چھوڑ کر آدمی کی ہر حرکت و سکون کو قانونِ خیر و شر محیط ہے۔ ہر انسان مسافتِ زندگی کی رہ نوردی میں اختیار و ارادہ کے اعتبار سے آزاد ہے مگر قانونِ حسن و قبح کا پابند اور احکام تشریعی کا قیدی۔ ایک روز اس زندگی کا آخری آفتاب غروب ہوگا تو پھر اس دار العمل میں دوبارہ عملی زندگی کی کوئی کرن نمودار نہ ہوگی اور بالآخر ایک دن ایسا آئے گا کہ کائنات کی موجودہ ہیئت، ترتیب اور نظام بقاء تباہ ہو جائے گا۔ جذب و انجذاب کا ضابطہ ٹوٹ جائے گا۔ تمام کردوں کا توازن ختم ہو جائے گا۔ نفخۂ اول سے تباہی شروع ہوگی۔ جاندار مخلوق بے ہوش ہو جائے گی۔ پھر مر جائے گی، زلزلے آئیں گے جن کی گڑگڑاہٹ کانوں کے پردے پھاڑ دے گی اور ہول سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہیں اس لئے مختلف رنگ کے اون کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ان کی پائیداری، ثبات، اوزان اور ثقل معدوم ہو جائے گا۔ زمین اپنے سارے دفینے گرمی لاوا اور معدنیات اگل کر باہر پھینک دے گی۔ آسمان پھٹ دیئے جائیں گے۔ بالآخر از سر نو زمین آسمان اور ستاروں کی نئے ڈھنگ اور جدید ہیئت کے ساتھ تعمیر ہوگی اور آخری صور کی آواز سے آغازِ آفرینش سے روزِ قیامت تک کے تمام مردہ انسان جی اٹھیں گے لیکن ہول منظر سے منتشر پتنگوں کی طرح جس طرف جس کے سینگ سمائیں گے پریشان حال بھاگے پھریں گے اور کثرتِ اجتماع کے سبب ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے گا۔ آخر ان کے اعمال کا وزن ہوگا، جانچ ہوگی، کسی کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا، کسی کا ہلکا۔ اول گروہ جنت میں اور دوسرا دوزخ میں جائے گا۔

تحلیلِ اجزا اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ ۔ القارعۃ زور سے کھٹکھٹانے والی یعنی وہ ساعت جس میں کائنات ٹکرائے گی یا وہ حادثۂ عظیمہ جو کافروں کے دلوں پر شدید ضرب لگائے گا۔ قَرْعٌ زور سے ضرب لگانا (رازی) ابو السعود نے کہا۔ قرع زور کی ضرب جس سے سخت آواز پیدا ہو۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ قارعہ حادثۂ عظیم کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے دوسری آیت میں آیا ہے۔ تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ۔ القارعہ سے مراد قیامت ہے جس کی ابتدا اول مرتبہ صور پھونکنے سے اور انتہا فیصلہ خلق پر ہوگی (ابو السعود) قیامت کو القارعہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ علوی اور سفلی کائنات کے تصادم سے ہولناک آواز پیدا ہوگی (کلبی) یا تصادمِ کائنات کی کرخت آواز اللہ

کے دشمنوں کو اپنی ہولناکی سے گرفتہ کردیگی۔ (مظہری)

مطلب یہ ہے کہ ایک عظیم الشان حادثہ قیامت کا دن ہوگا اور کیسا ہولناک حادثہ ہوگا۔

وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْقَارِعَةُ ۔ کوئی نہیں جانتا کہ کیسا ہولناک حادثہ ہوگا۔ ما ادراک میں خطاب ہے یا عمومی ہے یعنی اے انسان تجھے کیا معلوم کہ وہ حادثہ کیسا ہیبت ناک ہوگا یا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی اے محمد ﷺ (آپ بھی باوجود خاتم الانبیاء اور سید العلماء ہونے کے) نہیں جانتے اور اس زندگی میں نہیں جان سکتے کہ وہ ہیبت ناک واقعہ کس قدر عظیم الشان اور ہولناک ہوگا اور اس کی تفصیلی کیفیت کیا ہوگی۔

سفیان بن عیینہ نے کہا کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے کے لئے قرآن میں ما ادراک استعمال کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپ کو یہ بات معلوم نہیں، لیکن آئندہ بتادی جائے گی اور اگر ما یدریک استعمال کیا ہے تو حال و مستقبل دونوں میں علم کی نفی مراد ہوتی ہے۔ اس قول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سورت کے نزول کے وقت قیامت کی ہیبت ناکی سے رسول اللہ ﷺ ناواقف تھے لیکن اس کے بعد واقف ہوگئے۔ واللہ اعلم۔

يَوْمَ يَكُونُ ٱلنَّاسُ كَٱلْفَرَاشِ ٱلْمَبْثُوثِ ۔ یہ ہولناک کڑکڑاہٹ اس روز ہوگی جس روز لوگ منتشر پتنگوں کی طرح پراگندہ صور اسرافیل کی آواز کی طرف تیزی سے دوڑنے والے اور حقیقتاً الحرکت مضطرب حالت میں ہوں گے۔ قتادہ نے حسب نقل خطیب فراش کو فراشۃ کی جمع کہا ہے اور فراشۃ کا ترجمہ کیا ہے، لیکن فراء نے پھر اور ٹڈیوں کا شمار بھی فراش میں کیا ہے (کیونکہ دوسری آیت میں منتشر ٹڈیوں سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کالجراد المنتشر)

شیخ ابو السعود نے لکھا ہے کہ لوگوں کی یہ حالت اور پہاڑوں کا ان کے گالوں کی طرح دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا تاکہ زمین کی ہیئت کی تبدیل پہاڑوں کی بربادی اور آسمانوں کی تباہی لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

بہرحال صور کی آواز سن کر لوگ تیزی کے ساتھ قبروں سے اٹھ کر اسرافیل کی آواز کی طرف دوڑیں گے۔ اور پتنگوں کی طرح تلے اوپر گریں گے دوسری آیت میں آیا ہے یومئذ یتبعون الداعی لاعوج لہ یعنی اس روز پکارنے والے کی طرف براہ راست دوڑیں گے۔

ثقل دو طرح کا ہوتا ہے ثقل اور وزن کا ایک معنی ہے وقار، تمکین، استقلال، ارادہ کی پختگی، دل کی مضبوطی، حواس کا بجا رہنا، مصائب اور خطرات سے نہ ڈرنا۔ اس کے مقابلے میں چھچھورا پن۔ بزدلی، حوصلہ کی کمی، گھبراہٹ اور انتشار حواس ہوتا ہے۔ دوسرا ثقل طبعی ثقل ہوتا ہے اس کو بھاری پن کہا جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب جسامت ٹھوس ہو کر کھوکھلی نہ ہو۔ ثقل کی اول قسم کا تعلق ارادہ سے ہے۔ جتنا ارادہ میں استحکام اور حواس میں ثبات ہوگا اتنا ہی بھاری بھرکم پن اور تمکین میں اضافہ اور خطرات و مصائب کے وقت استقلال ہوگا۔ دوسرا ثقل طبعی ہوتا ہے۔ قسم اول کے لحاظ سے جن و انس کو ثقلین کہتے ہیں اور دوسری قسم میں پہاڑوں کی پائیداری ضرب المثل ہے۔ قیامت کے دن جب صور کی آواز سے مردے جی اٹھیں گے تو منظر کی ہولناکی اور ہیبت آگیں خطرات کو دیکھ کر تمام لوگوں کے ارادوں میں خفت، استقلال حواس میں پراگندگی، ہوش میں انتشار اور تمکنت و وقار میں ضعف پیدا ہوجائے گا۔ ایسی گھبراہٹ ہوگی کہ صور کی آواز کی طرف بلاسوچے دوڑیں گے اور پتنگوں کی طرح ایک دوسرے پر گرے گا۔ ہر شخص کی حرکت اضطراری اور مضطربانہ ہوگی۔ دوسری قسم کے ثقیل اجسام کی کیفیت آئندہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔

وَتَكُونُ ٱلْجِبَالُ كَٱلْعِهْنِ ٱلْمَنفُوشِ اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کی طرح ہوجائیں گے (اور رنگین اون کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے) اُون کو رنگ کرہی عموماً دھنا جاتا ہے اور مختلف رنگوں سے اون رنگی جاتی ہے۔ پہاڑوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ پتھر سرخ بھی ہوتے ہیں اور سفید بھی۔ سیاہ بھی اور خاکی بھی۔ سبز بھی اور بھورے بھی، اس لیے ہلکے رنگین اونی گالوں کی طرح اڑتے نظر آئیں گے۔ سارا ثقل خفت سے بدل جائے گا۔ پائیداری ہوا میں اڑ جائے گی۔ وزن ختم ہوجائے گا۔ ٹھوس ذرات کھوکھلے ہوجائیں گے۔ حقیقت، خاصیت

اور ہیئت پلٹ جائے گی۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ آخر سب کو میدان میں جمع کیا جائے گا۔ حسب درجہ صف بندی ہوگی۔ زندگی بھر کے اعمال کی حساب فہمی ہوگی۔ میزانِ عدل قائم ہوگی۔ اعمال تولے جائیں گے۔ جس کے اعمال کی اللہ کے نزدیک قدر ہوگی وہ وزنی ہو لیں گے اور جو اعمال اللہ کے نزدیک بے قدر ہوں گے وہ ہلکے ہوں۔ وزنی اعمال والے پسندیدہ خوش عیش زندگی پائیں گے۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَا اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ نَارٌ حَامِيَةٌ اور ہلکے اعمال والے یعنی اللہ کی طرف سے وزن کشی کے وقت جو اعمال ہلکے ہوں گے ان کو کرنے والے اپنے اصل مرکز ہاویہ کی طرف چلے جائیں گے۔ درخت کی چھال درخت سے چمٹتی ہے۔ بچے کو ماں کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہر چیز اپنے طبعی مرکز کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پس دوزخیوں کو ہاویہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ ہاویہ کی حقیقت تو سوائے خدا کے کون جانے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ وہ دہکتی گرم آگ ہوگی حقیقت سراسر مجہول ہوگی۔ پوری کیفیت نامعلوم۔ بیان میں آنے والی حالت صرف یہ ہے کہ وہ مجسم آگ ہوگی تپتی ہوئی۔

موازین میزان (ترازو) کی بھی جمع ہے اور موزون (جس چیز کو تولا جائے) کی بھی۔ ایک شخص کے لئے مختلف متعدد ترازو ہونے کی کھلی صراحت نہیں آئی اور عقلی طور پر بھی یہ غلط ہی ہے، اس لئے موزونات ہی مراد ہیں اور موزون اعمال ہوں گے (فراء) یا اعمال نامے۔ (ابو السعود) حقیقت میں دونوں باتوں کا مآل ایک ہی ہے۔ اگر اعمالنامے موزون ہوں جیسا کہ حدیث بطاقہ میں آیا ہے کہ ایک شخص کے ننانوے ناجائے اعمال ہلکے نکلیں گے اور ایک بطاقہ (نامہ) جس میں شہادت توحید و رسالت لکھی ہوگی۔ بھاری ثابت ہوگا۔ تب بھی وزن اعمال ہی کا ہوگا۔ کیونکہ ایک بطاقہ کا وزن ننانوے اعمالناموں سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ وزن کی کمی بیشی کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی مادی وزن اور جسمانی ثقل ہوگا بلکہ اللہ کے نزدیک قدر اور بے قدری قبول و عدم قبول اعمال اور اعمالناموں کے ثقیل و خفیف بنانے کا سبب ہوگا۔

ایک تنقیح معتزلہ اور بکثرت علماء متاخرین کے نزدیک وزن کشی سے مراد ہے جانچ اور نیکیوں بدیوں کا تقابل اور پھر انصاف کے ساتھ فیصلہ۔ کیونکہ اعمال کا کوئی حجم اور جسم نہیں کہ ہلکے بھاری ہوں اور جسمانی طور پر ان کو تولا جائے اعمال اعراض اور حرکات جسمانیہ یا تصورات جسمانیہ کا نام ہے جن کا کوئی وزن نہیں، مگر ہم نے لکھ دیا ہے کہ وزن اور ثقل و خفت سے مراد جسمانیت کا بھاری ہلکا ہونا نہیں بلکہ اللہ کی نظر میں مردود و مقبول اور ثقیل و خفیف ہونا ہے۔ اللہ جس عمل کو چاہے گا بھاری اور وزنی قرار دے گا یعنی اس کی قدر کرے گا اور جس عمل کو چاہے گا رد کر دے گا۔ وہ خفیف اور ہلکا نکلے گا۔ کفار و مشرکین کی نیکیوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے۔ فلا نقیم لهم یوم القیامة وزنا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض موٹے تازے آدمیوں کا مچھر برابر وزن اللہ کے نزدیک نہیں ہوگا۔ یعنی اللہ کے نزدیک اس کی قدر نہ ہوگی۔ خواہ وہ دنیا میں کیسا ہی قوی الجثہ اور طاقتور ہو۔ پس معیار ثقل و خفت اللہ کی طرف سے قدر دانی اور نا قدری ہے، اس لئے یہ اعتراض ہی بے بنیاد ہے کہ وزن کے لئے جسمانیت ہونی چاہیئے اور اعراض ناقابلِ وزن ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ نظریہ جس کو علماء یونان اندھی تقلید میں بعض فلاسفہ (اسلام) نے مسلمہ حقیقت سمجھ رکھا ہے کہ فعل بغیر فاعل کے حرکت بغیر متحرک کے اور عمل بغیر عامل کے عرض ہے جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں (۱) کا وجود حقیقی وہی ہے جو وجود اضافی ہے۔ جب اضافت الی الفاعل ختم ہو جائے تو ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ یہ نظریہ (ہی) غلط ہے۔ اس عالم کون و فساد میں کوئی چیز بے وزن نہیں۔ اکتشافات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ تصوراتی لہروں کا بھی وزن ہے۔ نور نظر کا بھی وزن ہے۔ برقی شعاعوں کا بھی وزن ہے۔ کوئی جسمانی عمل ہو یا خیالی تصور کی لہر عالم وجود میں آنے کے بعد اس کو فنا نہیں۔ پھر اگر وہ عرض ہے اور بقول فلاسفہ عرض بغیر محل کے قائم نہیں ہوتا [illegible] کا وجود ہے خود مستقل نہیں ہوتا تو اعمالِ ماضیہ اور حرکاتِ صادرہ اور تصورات

متخیلہ جانب ماضی میں کہاں چلے جاتے ہیں؟ ان کا محل کیا چیز ہے ۔ یقیناً یہ کسی محل میں تو ہوں گے کسی شے پر تو ثبت ہوں گے ۔ یہ کہنا کہ ان کا معدوم محض ہوجانا اہلِ تحقیق کی تنقیح کے خلاف ہے ۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ بھی اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے ۔ زبان سے نکلی ہوئی آواز، اعضاء جسمانی کی حرکات کی صوتی کیفیت بلکہ تمام جسمانی نقوش نہ تصادم کو ہم جب چاہیں اور جہاں چاہیں بند کر سکتے ہیں ۔ روک سکتے ہیں پھر ظاہر کر سکتے ہیں ۔ نکال سکتے ہیں پھیلا سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں ۔ گزشتہ فلاسفہ کی ذہنی رسائی اتنی گہرائی اور بلندی تک نہیں ہوئی تھی کہ وہ سمجھ سکتے کہ کوئی عمل حامل سے اور کوئی فعل فاعل سے سرزد ہونے کے بعد فنا نہیں ہوجاتا بلکہ اسی مادی کائنات میں کہربائی اور اثیری لہروں میں رہتا ہے ۔ یہی لہریں اس کی حامل ہوتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں اور اپنے اندر جمع رکھتی ہیں ۔ آخر اعمال نامے کسی کاغذ یا ہرن کی جھلی یا بانس کے چھلکوں سے تو تھوڑی ہی بنائے گئے ہیں ۔ اللہ کی مخلوق مرئی اور غیر مرئی محسوس اور غیر محسوس لاتعداد ظاہر اور خفی اور ان گنت ہیں ۔ جس چیز کو چاہے اللہ حامل اعمال قرار دے سکتا ہے ۔ اسی کو اعمال نامے کہا جائے گا اور اسی کا وزن کیا جائے گا ۔ اللہ کی ترازو کیسی ہے یا کیسی نہیں ۔ معلوم نہیں کس چیز کی ہوگی ۔ جب ہم برقی لہروں کو تول اور ناپ سکتے ہیں تو کیا وہ خدا جس کے علم و قدرت میں ہم سے اربوں گنی زیادہ ہے جس کا کوئی حساب اور موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ کیا وہ ہمارے اعمال کو اپنی مخصوص ترازو میں تولنے سے عاجز ہے ۔ واللہ اعلم ۔

مزید یہ کہ علمائے حقیقت اور محققین تصوف کی علمی کسبی اور وجدانی تحقیق اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ معانی و اعراض بھی مادہ و جسم سے ماوراء اپنی ایک حقیقت بلکہ شکل و وزن بھی رکھتے ہیں ۔ ان کی حقیقت اپنی جگہ اس مادہ سے اونچی اور مستقل علم ہو یا جہالت ...... عدل ہو یا ظلم، سخاوت ہو یا بخل، شجاعت ہو یا جبن غرض تمام اعمال باطنہ و ظاہرہ اور ملکات نفسانیہ کا ایک مستقل بعینہ ممتاز وجود ہے یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اعراض کا وجود حقیقی سوائے وجود حقیقی کے اور کوئی نہیں ۔ اچھے عمال کی اچھی شکلیں اور برے اعمال کی بری شکلیں ...... بجائے خود ہیں، اس لئے اس خالی بے حقیقت دنیا سے نکل کر جب واقعی اور حقیقی وجود میں اعمال سامنے آئیں گے تو ان کا ہونا قابل وزن قرار دینا علم کو اپنی جہالت پر قیاس کرنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔

زیادہ توضیح کے لئے ہم فلسفی اصطلاحات سے یہی کام لے کر کہتے ہیں کہ علم نام صورت فرضیہ کا نہیں ہے کہ جو ہر کی صورت جو ہر اور عرض کی صورت عرض ہو بلکہ اہل منطق و فلسفہ کی تحقیق ہم کو بتاتی ہے کہ حقیقت میں علم نام ہے کیفیت انجلائیہ کا جس کو حالت ادراکیہ کہا جا سکتا ہے ۔ اور کیفیت انجلائیہ یقیناً عرض ہے لہٰذا علم عرض ہے اور چونکہ فلسفی کہتے ہیں کہ ذہن خلط و تخلیہ کا ظرف ہے لہٰذا کیفیت انجلائیہ اگر کلیہ ہے تو مادہ کے ساتھ مخلوط نہ ہوگی مادہ سے مجرد ہوگی ۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اول غیر مادی کیفیت کلیہ کا محل کہاں ہے کیا وہ باطنی حواس ہیں جن کی رسائی صرف مادیات تک ہے یا عقل ہی اس کا محل ہے جو کسی طور پر مادی نہیں ہے نہ ذاتاً نہ عملاً یعنی مادہ سے بالکل مجرد ہے ۔ ظاہر ہے کہ کیفیت انجلائیہ یا علم کلی کی حامل عقل ہی ہوگی جو بجائے خود غیر جسمانی اور غیر مادی ہے، اور اس کا محمول یعنی کیفیت انجلائیہ کلیہ بھی غیر مادی اور غیر جسمانی ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کیفیت انجلائیہ کا اتنا دباؤ اور وزن اعضاء جسم پر کیسے پڑتا ہے کہ بعض وقت تصورات کے زیر اثر اعضاء جسم شل ہو جاتے ہیں ۔ کلیات پر عقلی غور دماغ کو شل کر دیتا ہے ۔ موزوں کی جو خصوصیات ہیں وہ اس میں موجود ہوتی ہیں ۔ بجائے خود کلیات باہم ممتاز بھی ہوتی ہیں ۔ مختلف علوم کلیہ میں سے ہر ایک علم مستقل حیثیت اور ممتاز وجود رکھتا ہے ۔ اپنے لوازم رکھتا ہے اور اپنی خصوصیات کو نہیں چھوڑتا ۔ انسان کلی فرس کلی سے الگ اپنا وجود حقیقت عقل میں رکھتا ہے اور ان کلی علوم سے اندرونی حواس جسمانی اعصاب و عضلات اتنے متاثر ہوتے ہیں اور ایسا بوجھ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی مادی طاقت مغلوب ہو جاتی ہے اگر یہ عرض اور خالص عرض کا بوجھ نہیں تو اور کیا ہوتا ہے ۔ مادی طاقتوں اور اصلاحی حسی قوتوں کا یہ تاثر غیر مادی موثر سے مغلوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی مغلوبیت کو ہم دباؤ وزن اور ثقل سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ اگرچہ اعمال کا وزن قیامت کے دن بعینہٖ ایسا نہ ہوگا ۔ نہ اعمال ناموں کے دباؤ کی یہ کیفیت ہوگی پھر بھی اس تقریر سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ غیر جسمانی

بے مادہ اعراض بغیر مادی عمل کے اپنا دباؤ اور وزن رکھتے ہیں گو یہ وزن دماغ اور اعصاب پر مادی تول ناپ کی شکل میں نہیں ہوتا، مگر تاثیر و تاثر کا یہ غیر مادی سلسلہ قائم ہوتا ہے دباؤ کے تحت۔ اور ہمارے پاس عقلی ترازو ہے جو اس دباؤ کی کمی بیشی اور ثقل و خفت کو تولتی اور اپنے پلڑوں میں اس دباؤ کی وزن کشی کر کے قوتِ مؤثرہ کے بار کا اندازہ کرتی ہیں۔

آتشِ دوزخ کی تفصیلی کیفیت

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا لوگ جو آگ جلاتے ہیں وہ آتشِ جہنم کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلعم یہی آگ کافی تھی۔ فرمایا وہ اس سے انہتر گونہ زائد ہے۔ (البخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ کی دوسری روایت میں جس کو امام نے برشرط نقل کیا ہے ستر کی جگہ سو کا لفظ ہے۔ یعنی دنیا کی آگ سے دوزخ کی آگ ننانوے گونہ زیادہ گرم ہے۔ دونوں روایتوں میں حصر عدد مقصود نہیں بلکہ تکثیر کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ کی موقوفہ حدیث بیان کی ہے کہ تمہاری آگ کے دھوئیں سے ستر گونہ ناگوار نہیں تم کیاہ ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بیان کی ہے کہا جہنم کی آگ ہزار برس دہکتی رہی تو سرخ ہو گئی پھر ہزار برس دہکائی گئی تو سفید ہو گئی پھر ہزار برس دہکائی گئی تو سیاہ ہو گئی۔ اب وہ تاریکی آمیز بنا رہا ہے۔ حضرت انس و حضرت عمر کی روایات بھی اسی طرح آئی ہیں۔

حضرت انس حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایات میں آیا ہے کہ دوزخیوں میں سب سے آسان عذاب اس شخص کا ہوگا جس کو آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی اور ان کی وجہ سے اس کا دماغ ابال کھا رہا ہوگا۔ وہ اپنی تکلیف کو سب سے بڑی تکلیف خیال کرے گا۔ حالانکہ اس پر سب سے ہلکا عذاب ہوگا۔ العیاذ باللہ۔

مقصودِ بیان

ساعت قیامت (اپنی ہولناکی اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ اور پہاڑوں کے ٹوٹنے پھٹنے، اڑنے اور کائنات سماری کے تصادم کی کرخت اور ہیبت ناک آوازوں کی وجہ سے) کانوں اور دماغوں اور دلوں پر ضرب شدید لگائے گی۔ اس کی واقعی حقیقت اور پوری تفصیلی کیفیت تو سمجھی نہیں جا سکتی نہ الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے مجملاً اس جگہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس روز پہاڑ اپنا ثبات چھوڑ کر ہلکے ہو کر دھنی ہوئی اون کے گالوں کی طرح ہواؤں میں اڑتے پھریں گے (اون کا سارا ثقل یا تو ختم ہو جائے گا یا طوفانی آندھیاں ان کو اکھاڑ کر فضا میں اٹھا لے جائیں گی) انسان اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ کر ایسا مواس باختہ ہوگا کہ پتنگوں اور ٹڈیوں کی طرح قبروں سے اٹھ کر دل کے دل ادھر ادھر بھاگے پھریں گے اور اضطرابی حالت میں ایک دوسرے پر گرے گا۔ آخر رب کی طرف پیشی ہوگی۔ اور اعمال کا وزن ہوگا۔ جس کے اعمال باوزن ہوں گے وہ عیش کے ساتھ رہے گا اس کی زندگی خوشگوار اور پسندیدہ ہوگی اور جس کے اعمال ہلکے اور بے مقدار ہوں گے وہ دوزخ کے ہاویہ طبقے میں ایسا کھنچ کر جائے گا جیسے بچہ ماں کی طرف۔ ماں کی کشش بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتی اور چمٹا لیتی ہے، ہاویہ بھی اس کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ بچہ ماں کا جزو ہوتا ہے وہ بھی ہاویہ کا جزو ہوگا۔ ہر شے اپنے مبدء کی طرف کھنچتی ہے۔ وہ بھی بلا ارادہ دوزخ کی طرف کھنچے گا۔ ہاویہ کی حقیقت کیا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اس کی تفصیلی حالت کیا ہے یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ ہاں اتنا یقینی ہے کہ وہ سراسر آگ ہے اور آگ بھی دہکتی ہوئی وغیرہ۔

سورۃ التکاثر

باتفاق علماء یہ سورت مکی ہے۔ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اس میں آٹھ آیات اٹھائیس کلمات اور ایک سو بلیس (سراق) یا ایک سو تلیس (تفسیر عزیزی) حروف ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ ثُمَّ کَلَّا

(دنیاوی سامان پر) فخر کرنا (جو علامت ہے محبت و طلب کی) تم کو (آخرت سے) غافل کئے رکھتا ہے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی) معلوم ہو جائیگا پھر

سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ

(دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے) ہرگز (تمہاری یہ حالت ٹھیک) نہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا ہرگز (اور) اگر تم یقینی طور پر (دلائل صحیحہ سے اس بات کو) جان لیتے واللہ تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو

ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ٪

ع ۲۷

پھر (مکرر تاکید کیلئے کہا جاتا ہے کہ) واللہ تم لوگ اسکو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو کہ خود یقین ہے پھر (اور بات سنو کہ) اس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی ۔

تفسیر جو لوگ خدا پرست نہیں بلکہ خود پرست اور خدائی پرست ہیں ان کا معیارِ فضل و کمال نہ ایمان اور عمل صالح ہے نہ جذبۂ دینی نہ فکرِ آخرت ۔ وہ روزِ قیامت کے منکر ہیں اور موت کو اگرچہ یقینی طور پر مانتے ہیں، لیکن اس کو بھولے ہوئے ہیں، تصورِ موت کو دماغوں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک برتری اور بزرگی کا معیار دنیوی جاہ و سطوت، حکومت و اقتدار مال و منال کی وسعت اولاد کی کثرت و طاقت، مرغزاروں میں فلک بوس آثار و محلات پہاڑوں میں مضبوط بنیادوں کی عمارات میلوں لمبے چوڑے سرسبز باغات بھرپور لہلہاتی کھیتیاں اور ان سب سے بڑھ کر اپنی جسمانی طاقت اور توازن اعضاء کی جاذبیت ہے۔ یہی ان کا سرمایۂ ناز ہے، یہی متاعِ غرور ہے، یہی منبع تفاخر ہے اور یہی غایت زندگی ۔ ایک کہتا ہے دیکھو میرے قبیلہ اور برادری میں کیسے طاقتور پہلوان، کتنے لکھ پتی سیٹھ اور کس قدر باجبروت پر شوکت سطوت مند سردار موجود ہیں۔ دوسرا کہتا ہے میرا باپ نواب تھا۔ دادا شہنشاہ کا وزیر تھا، چچا قارون تھا۔ تیرے خاندان میں ایسی جلیل القدر ہستیاں کہاں ہیں؟ میں پوتڑوں کا رئیس ہوں تیرا باپ ننگا فقیر تھا۔ میرا بھائی گاما تھا اور تیرا بھائی خفش ۔ غرض یہ خام کاریاں، خود پنداریاں، جاہلانہ جتھہ بندیاں اور کورانہ تفاخر و غرور کا شور مرتے دم تک رہتا ہے۔ آخر اس میں موت آدباتی ہے۔ دولت اور حکومت کا غرور مٹ جاتا ہے طاقت اور خاندانی کثرت کا نشہ اتر جاتا ہے۔ کوئی موت سے بچانے والا نہیں ہوتا۔ کوئی ان بے حقیقت فخر آفرینیوں کو ساتھ نہیں لے جاتا نہ جتھہ کام آتا ہے نہ لشکر نہ قومی سیادت نہ حاکمانہ سطوت و طاقت پھر جب قیامت کا دن ہوگا اور سارا کیا کرایا سامنے آئے گا اور دہکتی ہوئی جہنم کا عین الیقین ہو جائے گا اور یہ بے بصیرت شیخی باز اپنی آنکھوں سے عذاب الٰہی کو دیکھ لیں گے اور اپنی بےبسی اور بے کسی محسوس کرلیں گے تو اس وقت ان سے پوچھا جائے گا وہ تمہاری حکومت و سطوت کیا ہوئی، دولت اور مال کی کثرت کہاں گئی ۔ ہمالیہ سے دعوی ہمسری کرنے والے محلات کس طرف چلے گئے اور دنیا کا وہ عیش و آرام جس پر تم ریجھے ہوئے تھے کہاں فنا ہو گیا۔

تحلیلِ اجزاء سبب نزول حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ قریش کے دو گروہ تھے ۱ بنی عبد مناف ۲ بنی سہم۔ مؤخر الذکر گروہ کا سردار العاص بن وائل سہمی تھا۔ ایک روز دونوں گروہوں میں تفاخر کی مجلس گرم ہوئی۔ ہر ایک نے اپنے سرداروں کے کارناموں، مہمان نوازیوں اور مال داریوں کے بڑھ بڑھ کر تذکرے کئے اور جتھہ کی کثرت پر فخر کیا۔ آخر ہر قبیلہ کی مردم شماری کی گئی۔ عبد مناف کی تعداد بنی سہم سے زیادہ نکلی۔ بنی سہم نے کہا ہمارے بہادر لڑائیوں میں بہت مارے گئے ہیں۔ زندوں مردوں کی ملا کر گنتی کرو۔ آخر مردوں کی گنتی کرنے قبرستانا

سینے۔ مردوں کو ملا کر گنا تو بنی سہم کی تعداد بڑھ گئی۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب کا یہ بیان کلبی کی روایت پر مبنی ہے۔ کلبی نے یہ قصہ بیان کرنے کے بعد کہا تھا۔ دونوں قبیلوں میں یہ تفاخر اسلام میں ہوا تھا۔ اس کلام کا مطلب دو طرح ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ مسلمان ہونے کے بعد دونوں قبیلوں میں اپنے ان افراد کی کثرت کا ذکر کیا جو مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ ابوالسعود نے بھی بیان کیا ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ مکہ میں بنی عبد مناف یا بنی سہم کی اتنی تعداد مسلمان نہیں ہوئی تھی جس پر فخر کیا جا سکتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ آغاز اسلام ہو چکا تھا۔ اگرچہ بنی عبد مناف اور بنی سہم میں زیادہ مقبول نہ ہوا تھا۔ اس وقت دونوں قبیلوں کے مشرکوں میں یہ تفاخر ہوا۔ یہ مطلب بھی غلط ہے کیونکہ اس وقت کفار کو ایمان سے پہلے اس قسم کی نصیحت بے سود تھی۔ لہٰذا کلبی کی یہ روایت ناقابلِ اعتماد ہے۔ پھر اس کی روایت میں بجائے خود بھی ضعف ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابن بریدہ تابعی کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ باہمی تفاخر انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی حارث میں ہوا تھا اور دونوں نے قبرستان میں جا کر اپنے اپنے مردوں کی گنتی کی تھی۔

مقاتل اور قتادہ نے سورت کا نزول یہود کے متعلق قرار دیا ہے۔ جب کہ انھوں نے کہا تھا کہ ہماری تعداد فلاں قبیلہ سے زائد ہے اور فلاں قبیلہ کی شعار فلاں خاندان سے زیادہ ہے۔

ابن بریدہ اور مقاتل و قتادہ کی روایات کو اگر صحیح مانا جائے تو سورت کو مدنی قرار دینا پڑے گا جو اجماعِ علماء کے خلاف ہے۔ اس فقیر کے نزدیک زیارتِ قبور کا جو صحیح مطلب ہے اس کی طرف افتتاحی مقالہ میں اشارہ کر دیا گیا ہے اور اس کی تائید خطیب کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ زرتم المقابر سے مراد ہے مرنے کے بعد قبروں تک پہنچنا یعنی مال و اولاد کی کثرت پر تمہارا تفاخر مرتے دم تک رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سورت کا کوئی خاص سبب نزول نہیں اور اگر کوئی واقعہ گزرا بھی ہو تو صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ ابن ابی حاتم نے ایک مرسل حدیث زید بن اسلم کی روایت سے لکھی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا الھٰکم التکاثر یعنی دنیوی مال و اولاد کے تکاثر کی خواہش نے تم کو اللہ کی طاعت سے غافل بنا دیا۔ اس حد تک کہ تمہاری موت آ گئی۔ حضرت عبداللہ بن الشخیر کا بیان ہے میں خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا تو آپ الھٰکم التکاثر پڑھ رہے تھے اور فرما رہے تھے آدمی کہا کرتا ہے یہ مال میرا ہے وہ مال میرا ہے۔ ارے تیرا مال کوئی بھی نہیں سوا اس کے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا (رواہ مسلم والترمذی والنسائی) مسلم نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بھی لکھی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا آدمی کہتا ہے یہ مال میرا ہے وہ مال میرا ہے حالانکہ اس کا کچھ بھی نہیں۔ سوا اس کے کہ جو کھا لیا وہ فنا کر دیا اور جو پہن لیا وہ پرانا کر کے پھاڑ ڈالا اور جو خیرات میں دے دیا وہ جمع کر لیا اور جو باقی بچ گیا وہ چھوڑ کر چلا گیا۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ تفاخر اور تکاثر دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے کیا ہر تکاثر اور تفاخر مذموم ہے؟ ہر تکاثر مذموم نہیں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ محاسن اور امورِ خیر میں تکاثر برا نہیں۔ ایک بار حضرت عباس اور حضرت شیبہ نے تفاخر کیا حضرت عباس نے حاجیوں کو پانی پلانے پر فخر کا اظہار کیا اور شیبہ نے کعبہ کی کنجی کا امین اور خادمِ کعبہ ہونے پر، لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا میں نے اپنی تلوار سے شرک و کفر کی ناک کاٹ ڈالی تب تم لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ بات لوگوں پر گراں گزری (تو حضرت علیؓ کی تائید میں) اللہ نے آیت اجعلتم سقایۃ الحاج الخ نازل فرمائی۔ اس کے اما بنعمۃ ربک فحدث کا حکم تو موجود ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاقِ حمیدہ اور امورِ خیر میں تکاثر اچھی چیز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بطور رعونت یہ غرور نہ ہو اور یہ امید ہو کہ ان محاسن کے اظہار کا لوگوں پر اچھا اثر پڑے گا۔

بعض لوگ مطلق تفاخر کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور ثبوت میں ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔

میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں (یعنی یہ کلام بطور فخر نہیں کر رہا ہوں بلکہ واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں) اس فقیر کی نظر میں امام رازی کا قول زیادہ صحت کے قریب ہے ۔ اور حدیث میں لا فخر کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس پر غرور اور رعونت نہیں ۔ واللہ اعلم ۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ اے منکرین اسلام و جاحدین قیامت تم دنیوی مال متاع کثرت اولاد اور عزت وجاہ کی طلب میں اتنے غافل ہو گئے کہ مرتے دم تک تم کو ہوش نہیں آتا اور نہیں سمجھتے کہ مرنے کے بعد عذاب ضرور ہوگا ۔ قیامت ضرور آئے گی اور قیامت کی تیاری ضروری ہے اور یہ مال و اولاد فانی ہے کچھ ساتھ نہیں جائے گا ۔

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ یعنی مرتے دم تک تم کو تعدادِ افراد اور مال متاع کی کثرت کی ہوس رہتی ہے ، دوسروں سے بڑھ چڑھ کر رہنے کی حرص قبر تک ساتھ جاتی ہے ۔ اور یہ دنیوی تفاخر تم کو مآلِ ہستی اور انجام زندگی کو سمجھنے اور آخرت کی زندگی کے لئے تیاری کرنے سے غافل رکھتا ہے ۔

کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون حضرت علیؓ نے دونوں جگہ تعلمون کا مخاطب کافروں کو قرار دیا ہے ۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہی قول مروی ہے اور حسن بصری کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ کافروں کو مکرر وعید ہے ۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس کے نزدیک اول فقرہ کی مراد یہ ہے کہ عنقریب مرتے ہی تم قبر میں جاؤ گے جب عذاب میں مبتلا ہو گے کہ تمہارا قول غلط تھا اور اللہ کا وعدۂ عذاب سچا تھا ۔ پھر قیامت کے دن تم کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول اللہ کا قول حق تھا اور تمہارا انکار باطل ۔ یہ علم اُس وقت ہوگا جب مومن جنت میں اور کافر دوزخ میں پائیں گے ۔

زر بن حبیش کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا ہم الہاکم التکاثر حتی زرتم المقابر کے نازل ہونے سے پہلے عذاب قبر کو جانتے بھی نہ تھے ۔ بقول خطیب حضرت علیؓ کے اس کلام میں اس طرف اشارہ ہے کہ آیت میں اول تعلمون سے مراد ہے عذاب قبر کو جاننا ۔ اور دوسرے تعلمون سے مراد ہے آخرت کے عذاب کو جاننا ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول بار جاننے سے مراد ہو اسی دنیاوی زندگی میں جاننا کہ قتل قید بربادی اور تباہی کی شکل میں اول بار اللہ کا عذاب آئے گا اور دوسری بار جاننے سے مراد ہو کہ مرنے کے بعد جاننا اور عذاب میں مبتلا ہونا ۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی کہ اس وقت جو تمہارے اردگرد قوم و برادری کے لوگ کثرت سے جمع ہیں ۔ ان کے جمع ہونے سے دھوکہ نہ کھانا ۔ عنقریب تم مرنے کے بعد ہمارے پاس تنہا آؤ گے اور جان لو گے کہ تمہارا کوئی ساتھی نہیں ۔ دوسری آیت سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے ۔ فرمایا ہے لقد جئتمونا فرادی کما خلقنٰکم اول مرۃ یعنی جیسے ہم نے تم کو اکیلے اکیلے پیدا کیا تھا ایسے ہی تم ہمارے پاس تنہا آئے ہو ۔

ضحاک کا قول شیخ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ اول تعلمون میں کفار مخاطب ہیں اور دوسرے تعلمون سے مومنوں کو خطاب ہے ۔

خطیب و رازی نے لکھا ہے کہ اس صورت میں اول تعلمون میں کافروں کو عذاب دوزخ کی وعید اور دوسرے تعلمون میں مومنوں سے ثواب جنت کا وعدہ ہوگا ۔ ضحاک کا قول ضعیف ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں دونوں کے درمیان ثمّ لانے کی کوئی صحیح وجہ قائم نہیں کی جاسکتی ۔ اول قول جمہور مفسرین کا ہے اور وہی صحیح ہے ۔

کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم ثم لترونھا عین الیقین ۔ شیخ ابن کثیر اور اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس جگہ کلاّ حرف تنبیہ ہے یعنی باز رہو ہوش کرو ۔ فراء کے نزدیک کلمۂ تحقیق ہے ۔ یعنی قطعاً یقیناً ۔

ابن ابی حاتم نے کہا کلاّ ہر جگہ تنبیہ کے لئے ہی آتا ہے ۔ باتفاق اہل تفسیر لو تعلمون کا جواب محذوف ہے ۔ لترون الجحیم اس کا جواب نہیں ہے ۔

امام رازی نے اس کی وجہ بیان کی ہے کہ لو کا جواب اگر مثبت ہو تو لو کے داخل ہونے کے بعد نفی کا معنی ہو جاتا ہے اور منفی ہو تو

اثبات کا معنی ہو جاتا ہے اور اس جگہ لترون مثبت ہے تو اگر اس کو جواب قرار دیا جائے گا تو نفی کا معنی ہو جائے گا۔ اس صورت میں معنی اس طرح ہوگا۔ کاش تم کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے تو ضرور جحیم کو دیکھو گے اور یقینی طور پر چونکہ علم نہیں، اس لئے جحیم کو نہیں دیکھو گے۔ یہ معنی خلاف مقصود ہے، اس لئے لَو کا جواب لَتَرَوُنَّ نہیں ہے بلکہ محذوف ہے۔ مطلب بقول خطیب یہ ہے کہ کاش تم کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتا کہ تمہارے آگے آنے والے معاملات بڑے ہولناک ہیں۔ اس وقت تم اس تفاخر اور تکاثر کو بھول جاتے روتے زیادہ اور ہنستے کم۔ شیخ ابن کثیر نے مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ کاش تم کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے تو دنیوی تکاثر کی غفلت میں نہ پڑتے۔

قتادہ کے نزدیک الیقین سے مراد موت ہے۔ یعنی مرنے کے بعد جو چیز تم کو معلوم ہوگی وہ اگر آج معلوم ہو جاتی تو سوا گریہ و زاری کے سب کچھ بھول جاتے۔

تم ضرور جحیم کو دیکھو گے پھر تمہارا علم عین الیقین ہو جائے گا۔ یہ جملہ تاکیدیہ مستقل ہے۔ رازی نے لکھا ہے اول دیکھنے سے مراد ہے دور سے دیکھنا اور دوسرے دیکھنے سے مراد ہے دوزخ کے کنارہ پر پہنچ کر دیکھنا۔ ابوعلی فارسی نے لکھا ہے کہ اول دیکھنا تو کافر مومن سب کے لئے ہے۔ (اللہ نے فرمایا ہے وان منکم الا واردہا) اور دوسرے دیکھنے سے مراد ہے جہنم کے عذاب کو دیکھنا۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ جہنم کے کنارے پر پہنچ کر دیکھنا یا عذاب جہنم کو دیکھنا تو کافروں کے لئے مخصوص ہے اور آیت میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ کافر ہوں یا مومن سب کے متعلق دیکھنے کی صراحت ہے۔ اس لئے دوسرے جملہ کو پہلے جملہ کی اگر محض تاکید قرار دیا جائے تو اولیٰ ہے۔ خطیب نے اس جگہ بہتر توجیہ کی ہے کہ اول دیکھنے سے مراد ہے دل سے دیکھنا (یعنی یقینی طور پر جان لینا) اور دوسرے دیکھنے سے مراد ہے آنکھوں سے یقینی طور پر دیکھنا اور ظاہر ہے کہ آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنے کا درجہ محض خبری علم سے بڑھ کر ہے۔ اول میں کسی قدر احتمال شک کی گنجائش ہے۔ اگرچہ شک ہوتا نہیں ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کسی شک کی گنجائش کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم۔ پھر اس روز تم سے نعمتوں کی باز پرس ہوگی یعنی بطور ملامت پوچھا جائے گا کہ جن نعمتوں پر تم دنیا میں فخر کیا کرتے تھے وہ کہاں گئیں یا بطور حساب سوال کیا جائے گا کہ جو نعمتیں ہم نے تم کو دنیا میں دیں ان کو تم نے کس طرح صرف کیا۔ حکم کے موافق یا حکم کے خلاف۔ اول صورت میں مخاطب صرف کفار ہوں گے اور دوسری صورت میں کافر و مومن سب اس سوال میں مشترک ہوں گے۔ اول قول حسن بصری کا ہے اور ابو السعود نے اسی کو پسند کیا ہے۔ النعیم سے مراد کیا ہے۔ علماء کے اقوال اس کی تعیین میں مختلف ہیں۔ ٹھنڈا پانی۔ سایہ۔ لباس۔ گرم ریت سے حفاظت کرنے والے جوتے۔ عافیت، صحت، شریعت، قرآن، شہد کا شربت، گھی، شہد، روٹی، سواری، مکان وغیرہ وغیرہ۔

مختلف صحابہ و تابعین کے اقوال میں مختلف چیزوں کا ذکر آیا، لیکن صحیح یہ ہے کہ نعمتوں کا یہ ذکر بطور تمثیل ہے تعیین نہیں ہے۔ اسی لئے امام رازی نے النعیم کے الف لام کو عہدی نہیں قرار دیا بلکہ استغراقی لکھا ہے اور صراحت کی ہے کہ ہر قسم کی ظاہری باطنی روحانی جسمانی نعمتوں کو یہ لفظ شامل ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ہر بندہ سے چار باتیں پوچھی جائیں گی ۱ عمر کس کام میں صرف کی ۲ جوانی کس کام میں لگائی ۳ مال کس طرح کمایا اور کہاں خرچ کیا ۴ علم کے ذریعہ سے عمل کیا، مگر حدیث میں جن عام سوالات کا ذکر ہے یہ تو ہر شخص سے کئے جائیں گے کافر ہو یا مومن۔ اسی لئے امام رازی نے لَتُسْئَلُنَّ کا مخاطب عام تسلیم کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ کافر و مومن سب سے ہر نعمت کے متعلق باز پرس ہوگی۔

لیکن سیاق کلام کا تقاضا ہے کہ مخاطب صرف کفار کو کہا جائے، اس لئے حدیث مذکور اس آیت کی تفسیر نہیں ہے اور شیخ ابو السعود اور حسن بصری کا تفسیری قول راجح ہے۔ البتہ نعیم سے ہر نعمت مراد ہے۔ اور کسی خاص نعمت کا تذکرہ احادیث یا آثار صحابہ یا اقوال تابعین میں بطور حصر نہیں۔ محض تمثیلاً ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

قرآن کی صراحت کے بموجب معیار برتری اور وجہ فضیلت، مال کی فراوانی، اولاد اور قبیلہ کی کثرت اور جسمانی شرکت وطاقت نہیں۔ یہ چیزیں کافروں کے لئے مایۂ افتخار ہیں۔ اہل ایمان کو دنیا کی کسی چیز پر فخر نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے ان علماء کو جو دنیوی مال کے لالچ میں اپنے علم کو بیچتے پھرتے ہیں اور سبق سیکھنا چاہیئے ان جھوٹے صوفیوں کو جو مال کے لئے مکاری کا جال پھیلاتے ہیں۔ اور نصیحت پذیر ہونا چاہیئے ان دولت مند تاجروں کو اور حکومت پرست حاکموں کو جو اپنی دولت و حکومت کے مقابلے میں حق اور اہلِ حق کو حقیر سمجھتے ہیں اور موعظت اندوز ہونا چاہیئے مسلمانوں کو اور ان کے عام گروہ کو جس کا مقصد اوّل دنیا کے مال کا حصول ہے۔ یہاں تک کہ مرتے وقت بھی دنیوی مال کے انتظام کی اس کو فکر لگی رہتی ہے اور ایمان و عمل صالح اس کی زندگی کا مقصد ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو دوسرے درجہ میں وغیرہ۔

سورۃ العصر

اس سورت میں تین آیات ۱۴ کلمات اور ۶۸ حروف ہیں (سراج وغیرہ)

حضرت ابن عباس بلکہ جمہور اہلِ روایت کے نزدیک یہ سورت مکّی ہے۔ علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس کے مکّی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن خطیب نے حضرت عبادہ اور حضرت ابن عباس کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس سورت کا مدنی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ قتادہ نے بھی اس کو مدنی قرار دیا ہے، مگر مؤخر الذکر روایات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچیں، اس لئے بقول سیوطی تمام علماء نے اس کو مکّی مانا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

قسم ہے زمانہ کی کہ انسان (بوجہ تضییع عمر کے) بڑے خسارہ میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے

الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

ع ۱ ۲۸

اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

تفسیر

انقلاب امم اور تاریخ انسانی گواہ ہے، حوادثِ دہر گواہ ہیں۔ مہر و ماہ کا طلوع و غروب اور صعود و ہبوط گواہ ہے۔ بہار و خزاں کا چکر اور رات دن کا دور گواہ ہے۔ اقوام و افراد کا عروج و زوال اور حیات و موت گواہ ہے۔ غرض سارا زمانہ گواہ ہے کہ تعمیر عالم اور اقامتِ عدل وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے مبدء و معاد اور خالق و خلق کو صحیح طور سے جان لیا ہو اور اللہ کی وحدت و الوہیت کو مان کر اپنے اقوال و اعمال درست کر لئے ہوں جو اقامتِ عدل اور اعلان حق اور تبلیغ صداقت میں کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوں جو حق بات اور حق عمل پر قائم رہنے کی پختہ نصیحت کرتے ہوں اور باہم تاکیدی حکم دیتے ہوں کہ حق پر قائم رہنے حق کو قائم کرنے اور حق کا علی الاعلان اظہار کرنے میں سستی نہ کرنا تمہاری راہ میں چند در چند خطرات آئیں گے۔ شیطانی طاقتیں تم کو ہر طرح دکھ دینے کے درپے ہوں گی۔ ظلم کی قوتیں تمہاری راہ میں کانٹے بچھائیں گی۔ مالی اور جسمانی ایذائیں دیں گی، لیکن تم حق اور اظہارِ حق کو نہ چھوڑنا۔ تظلم توڑ، کفر شعار قومیں اور حکومتیں جب

طرح دکھ دینے کے بعد کبھی تم کو حق کے راستہ سے نہ ہٹا سکیں گی تو شیطانی فریب کے جال بچھائیں گی، تم کو مال و جاہ کا لالچ دیں گی۔ سیادت اور قیادت کی پیش کش کر کے تم کو راہِ صداقت سے بہکائیں گی، لیکن خبردار اِتم کسی نفسانی لالچ میں نہ آنا شیطان کے ہاتھوں شکار نہ ہو جانا۔ اگر ترغیب و ترہیب اور لالچ و خوف کے امتحانوں میں تم کامیاب ہو گئے اور ایمان و عمل صالح کے حامل ہو کر دوسروں کو حق کے راستے سے موڑ دینے والے مصائب اور رغائب میں ثابت قدم رہنے کی ہدایت کرتے رہے تو تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا سرمایۂ زندگی برباد نہ جائے گا۔ اوقاتِ حیات رائیگاں نہ ہوں گے۔ اس زندگی میں بھی سراسر نفع ہی ملے گا۔ امن عافیت، قومی طاقت و عزت، اقتدار و حکومت، مال و جاہ غرض ہر دنیوی راحت و نعمت تمہاری گود میں آجائے گی، تم آمر و ناہی بن جاؤ گے۔ دنیا تمہاری مامور اور خادم ہوگی، تم خدا کا بول بالا رکھو گے، اللہ تمہارا جھنڈا بلند رکھے گا جس کا پرچم سارے سنسار کے سروں پر لہرائے گا اور آخرت میں بھی سرخرو ہو گے۔ جنت تمہاری ہوگی، اللہ کی رحمت تمہاری ہوگی، ایک ایک نیکی کا ہزار ہزار گونہ نفع ملے گا، لیکن اگر تم نے ایمان و عمل صالح سے منہ نہ موڑا اور راہِ حق کو چھوڑا تو زندگی کا سودا سراسر گھاٹے کا رہے گا۔ دنیا میں ذلت، نکبت، غلامی اور افلاس سے ہم کنار ہو گے۔ طرح طرح کے امراض اور بد اخلاقیوں کے شکار ہو گے۔ اور آخرت میں تباہ حال خسران مآل، اللہ کی رحمت سے محرومی اور دوزخ کا ٹھکانہ۔

تحلیلِ اجزاء

شانِ نزول شیخ عبدالعزیز دہلوی نے اس سورت کا سبب نزول اپنی تفسیر میں اس طرح لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکر صدیق کی دوستی ابو الاسد بن کلدہ بن اسید سے تھی۔ بعثت کے بعد جب حضرت ابوبکر اسلام لے آئے تو ایک روز اسید نے کہا ابوبکر تم تو بڑے عقلمند آدمی تھے۔ ہمیشہ بیوپار میں ہوشیاری اور عقلمندی کے ساتھ نفع کماتے تھے۔ اب تم کو کیا ہو گیا کہ بالکل گھاٹے میں پڑ گئے۔ باپ دادا کا دین چھوڑا۔ لات و عزیٰ کی پوجا سے محروم اور ان کی شفاعت سے ناامید ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا جو شخص حق کو قبول اور نیک کام اختیار کرتا ہے وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی جس میں حضرت ابوبکرؓ کے قول کی تائید اور کلدہ کے قول کی تردید کی طرف اشارہ ہے۔

وَالْعَصْرِ۔ عصر کی قسم۔ قسم کسی دعوے کو پختہ کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے۔ گویا جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو شاہد بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ شہادت بھی دعوے کی تائید کے لئے ہوتی ہے، اس لئے اس لفظ کا ترجمہ اس طرح ہو گیا کہ عصر گواہ ہے عصر سے کیا مراد ہے، اس کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں:

عہ زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کا وقت (حسن بصری)

عہ دن کی آخری گھڑی (قتادہ) عہ نماز عصر (مقاتل) عہ نماز عصر کا وقت (زید بن اسلم۔ عہ شب و روز کیونکہ رات اور دن کو عرب عصران یعنی دو عصر کہتے ہیں (ابن کیسان)

عہ دن کے دونوں کنارے یعنی طلوع و غروب سے کچھ پہلے کا وقت۔ طلوع سے کچھ پہلے کا وقت جب لوگ نیند سے اٹھتے ہیں اور دن نکلتا ہے۔ صبح قیامت کا نمونہ ہے۔ اس وقت کی قسم والضحیٰ کے لفظ سے بھی کھائی ہے اور غروب سے کچھ پہلے کا وقت موت کا وقت ہے جس کے بعد یہ عالم تاریک ہو جاتا ہے اور قبر کی اندھیری آجاتی ہے۔ یہ دونوں حالتیں انسان کی موت و حیات اور زوال و عروج کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور عروج و زوال شہادت دے رہا ہے کہ کون انسان گھاٹے میں ہے اور کون فائدے میں (ابو المسلم)

عہ حضرت علیؓ کے نزدیک حوادثِ دہر مراد ہیں۔ کیونکہ آپ نے اس سورت کی تلاوت اس طرح کی تھی۔ والعصر ونوائب الدہر ان الانسان لفی خسر انہ فیہ الا آخر الدہر الا الذین آمنوا الخ۔ (رواہ الفریابی و عبد بن حمید وابو عبید وابن جریر وابن المنذر

وابن الانباری)

حضرت ابن مسعود نے اس طرح تلاوت کی تھی والعصر ان الانسان لفی خسر انہ لفیہ الی آخر الدہر الخ۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت علی (اور حضرت ابن مسعود) نے بطور تفسیر ان الفاظ کا اضافہ کیا تھا۔ قرأت میں کوئی اختلاف نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کے نزدیک عصر سے مراد حوادث زمانہ ہیں۔ یعنی حوادث وانقلابات زمانہ گواہ ہیں کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کن افکار و اعمال کے زیر اثر ہوتی ہے۔

لفی خسر کی تفسیر میں جو جملہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کی روایت میں آیا ہے اور جو معنوی طور پر ایک ہی ہے اس سے اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ انسان کبھی فنا نہ ہوگا۔ روح کو کبھی فنا نہیں، ابدالآباد تک اس کی بقاء ہے۔ پس جو یہاں خسارے میں رہا وہ ہمیشہ خسارے میں رہے گا اور ہولناک عذاب اس پر مسلط رہے گا اور جو یہاں خسارہ میں نہیں رہا وہ کبھی خسارہ میں نہیں ہوگا۔ ایمان و عمل صالح کے بعد زندگی خسارہ میں نہیں رہتی۔ عمر کا گھٹاؤ اور مالی خسارہ خواہ کتنا ہی ہو، لیکن اس کے عوض جو چیز ہاتھ آنے والی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس خسارہ کو خسارہ نہیں کہا جاسکتا۔ برف ہر آن گھلتی رہتی ہے۔ عمر بھی ہر آن گھٹتی رہتی ہے، لیکن برف کی طرح اگر اوقات عمر کا جو گھٹاؤ مآل کے اعتبار سے سود بخش ہو تو اس کو خسارہ نہیں کہہ سکتے۔

۸۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک زمانہ مراد ہے۔ زمانہ کی ہستی بھی عجیب ہے۔ صحت، بیماری، تنگ حالی، فراخ دستی، قحط، اور سرسبزی۔ غرض ان گنت حوادث اسی لیل و نہار کی گردش میں ہوتے ہیں۔ ماہ و سال اسی سے بنتے ہیں۔ عروج و زوال اور موت و حیات اسی میں آتی ہیں۔ سارے حوادث اور انقلابات کا یہی ظرف ہے، اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ کا وجود ہے اور ساری کائنات کو محیط ہے۔

لیکن ماضی حال میں معدوم ہے اور مستقبل آیا نہیں۔ اور حال ایک آن موہوم کا نام ہے۔ اگر اس کا بالفرض تجزیہ کیا جاسکے تو کچھ حصہ ماضی اور کچھ مستقبل قرار پائے گا۔ حال کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور جب زمانہ حال کی کوئی ہستی نہیں تو ماضی و مستقبل کہاں پیدا ہوسکتا ہے۔ نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ ایک امر موہوم کا نام ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ زمانہ کی ہستی و نیستی اسی کشاکش کا نتیجہ ہے کہ زمانہ کسی فعال مختار طاقت کا نام نہیں نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ زمانہ ہی ہماری موت و حیات کا فاعل ہے اور دہر ہی ہم کو ہلاک کرتا ہے نہ زمانہ کی عدم مساعدت کا تصور کرکے یا خیبتہ الدہر (ہائے ناکامی زمانہ) کہنا درست ہے۔ ہاں اسی گردش لیل و نہار میں اگر ایمان و عمل صالح کی توفیق مل جائے تو یہ ایک ساعت ساری عمر سے بہتر ہے۔ اسی پر انسان کی نجات و سعادت کا مدار ہے۔ یہی ساری گردش علویات و سفلیات کا انسان کے لئے سود مند آفریں حصہ ہے۔ کافر ستر سوار کا کلمۂ توحید پڑھ لینا اور ایمان لے آنا اور پھر فوراً سر کے بل گر کر مرجانا ساری گزشتہ زندگی سے افضل اور دوامی راحت بخش زندگی عطا کرنے والا ہے۔ پس اس اعجوبہ زا دہر کی قسم کہ مدار کامیابی ایمان و عمل صالح ہے۔ ورنہ سراسر گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

۹۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک رسول اللہ صلعم کی نبوت کا زمانہ مراد ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ تم لوگوں اور تم سے پہلے والے (یہود و نصاریٰ) کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی شخص نے کچھ مزدور کام کرنے کے لئے رکھے۔ مزدوروں نے دوپہر تک کام کیا پھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ہم کو مزدوری کی ضرورت نہیں۔ کام کرانے والے نے کچھ اور مزدور مقرر کیئے انھوں نے بھی عصر تک کام کر کے چھوڑ دیا اور کہنے لگے ہم کو مزدوری کی ضرورت نہیں ہم کام نہیں کریں گے۔ مالک نے تیسرے مزدور لگائے جنھوں نے عصر سے مغرب تک کام کیا۔ اول گروہ یہود کا ہے۔ دوسرا نصاریٰ کا اور تیسرا اہل اسلام کا۔ مالک نے عصر سے مغرب تک کام کرنے والوں کو دوہری (دو نیر اطم مزدوری دی) یہود و نصاریٰ (یعنی اول و دوئم گروہ نے) شکایت کی کہ کام ہم نے زیادہ وقت

کیا اور مزدوری کم ملی۔ اللہ نے فرمایا کیا میں نے تمہاری مقررہ مزدوری میں کچھ کمی کردی۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا ایسا تو نہیں ہوا۔ اللہ نے فرمایا تو بس یہ میری مہربانی ہے جس کو چاہوں زیادہ دے دوں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی نبوت کا زمانہ عصر سے شروع ہوتا ہے جو غروب دنیا تک باقی رہنے والا ہے۔ پس جس طرح رسول اللہ ؐ کے شہر کی قسم کھائی اور فرمایا فلا اقسم بہذا البلد۔ اور جس طرح حضور ؐ کی عمر کی قسم کھائی اور فرمایا لعمرک انہم لفی سکرتہم یعمہون۔ اسی طرح آپ کے دور نبوت کی قسم کھا کر فرمایا کہ اس نبوت پر جو ایمان لائے گا اور اس کی تعلیم پر عمل کرے گا وہ نفع پائے گا ورنہ گھاٹا اٹھائے گا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ کہ بلاشک یقیناً انسان بڑے گھاٹے میں ہے۔ دنیا میں بھی خسران کار ہے اور مرنے کے بعد بھی خسران مآل۔

الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات۔ ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ اس خسران سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی جن امور کو ماننا شریعت نے ضروری قرار دیا ہے ان کو مان لیا اور جو اوامر و نواہی صادر کئے ہیں ان کی پابندی کی تو صرف وہ لوگ ہی فلاح یاب ہو گئے باقی لوگ خسارہ میں رہیں گے۔

وتواصوا بالحق۔ وصیت کا معنی تاکید کے ساتھ حکم دینا۔ قرآن کی اصطلاح یہی ہے۔ مردہ مرنے سے پہلے جو لوگوں کو آخری حکم دیتا ہے اس کو بھی وصیت اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ حق کا لفظ عام ہے۔ قول میں ہو یا فعل میں یا فکر و عقیدہ میں جو صحیح اور سچا اور واقع کے مطابق ہو حق ہے۔ گویا الحق سے مراد دین حق ہے جو افکار و اعمال سب کو شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ اپنی علمی اور عملی درستی کے بعد دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں کہ حق کو اختیار کرو۔ حق پر ثابت قدم رہو حق کو پھیلاؤ۔ اسی پر جیو اور اسی پر مرو۔

وتواصوا بالصبر۔ اور اس امر کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ حق سے روکنے والی کسی مصیبت و دقت کی پرواہ نہ کرو۔ اگر دنیا کی ساری حکومت اور دولت تم کو راہ حق پر رہنے اور حق کو پھیلانے سے روکے اور شیاطین انس و جن تم کو لالچ دیں تو پرواہ نہ کرو اور اگر مصائب کے پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑیں اور شر کی تمام طاقتیں سنگ راہ بن جائیں تب بھی راہ حق کو نہ چھوڑو۔ رکو ناجائز خواہشات نفس سے اور ثابت قدم، راسخ الارادہ بلند حوصلہ رہو۔ مصائب و حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے۔

مقصود بیان

صرف ایمان اور عمل صالح (اگرچہ بجائے خود ممدوح اور موجب نجات ہے، لیکن) مسلمان کیلئے کافی نہیں بلکہ حق کو اختیار کرنے، حق پر ثابت قدم رہنے اور حق کا اعلان و اظہار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ ارشاد و ہدایت اور تبلیغ بھی فریضہ مسلم ہے۔ پھر حق سے روگرداں کرنے والے لالچ اور ناجائز خواہشات سے اپنے نفس کو روکنا اور دوسروں کو روکنے کی ہدایت کرنا بھی لازم ہے۔ غرض ہر کرپشن، بدمعاشی اور مال کے حصول و صرف کے ناجائز راستوں کی بندش بھی ہر مدعی اسلام پر فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ کمائی اور صرف کے ناجائز راستوں کو بند کرنے اور قانون عدل جاری کرنے میں جو دکھ جھیلنے پڑیں اور جو مصائب آئیں ان کو برداشت کرنا اور دوسروں کو برداشت کرنے کی نصیحت کرنا بھی واجب ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمان اپنی فکری و عملی زندگی شریعت کے مطابق بنانے کے بعد سماج اور سوسائٹی کو درست رکھنے کی کوشش کا بھی ذمہ دار ہے۔ وغیرہ۔

سورۃ الھمزۃ

اس سورت میں نو آیات ۳۳ کلمات اور ۱۹۶ حروف ہیں۔ بالاتفاق یہ سورت بھی مکی ہے۔ شیخ جلال نے اس کے مکی یا مدنی ہونے میں اشتباہ کیا ہے اور شک کے لفظ استعمال کئے ہیں، مگر صحیح یہی ہے کہ یہ مکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ۙ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ يَحْسَبُ

بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو۔ رو در رو طعنہ دینے والا ہو جو مال جمع کرتا ہو اور اسکو بار بار گنتا ہو وہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس

اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ نَارُ اللّٰهِ

کے پاس سدا رہے گا ہرگز نہیں واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں جو کچھ پڑے وہ اسکو توڑ پھوڑ دے اور آپکو کچھ معلوم ہے وہ توڑ پھوڑنے والی آگ کیسی ہے وہ اللہ کی

الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۧ

ع ۹ ۲۹

آگ ہے جو سلگائی گئی ہے جو دلوں تک جا پہنچے گی وہ ان پر بند کر دی جائیگی (اس طرح سے کہ وہ لوگ آگ کے) بڑے لمبے لمبے ستونوں میں گھرے ہوں گے۔

تفسیر کم ظرف، تنگ حوصلہ اور پست ذہنیت رکھنے والے آدمی میں پندار و نخوت پیدا کرنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی علمی کمال پر اس کو غرور ہو جاتا ہے، کبھی صلاح و تقوے پر، کبھی کثرتِ اولاد پر، کبھی حسن و جمال اور جسمانی طاقت پر، کبھی حکومت و سطوت پر اور اکثر دولت و مال کی کثرت پر۔ اس پندار و نخوت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ بدخوئی، بدگوئی اور بدجوئی اس کی خاصیت بن جاتی ہے۔ عیب چین اور غور رہ گیر ہو جاتا ہے۔ اس کو تمام لوگوں میں عیب دکھتے ہیں۔ جن کو کبھی رو در رو اور اکثر پس پشت بیان کرتا ہے۔ مؤخر الذکر کہ وہ مالی پندار میں اتنا سرمست ہو جاتا ہے اور دولت کو ایسا مہ سنر سمجھنے لگتا ہے کہ انتہائی حرص کی وجہ سے جوڑ جوڑ کر رکھتا اور سخت کنجوسی کی وجہ سے گنتا رہتا ہے۔ مال اس کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ مال دوامی زندگی بخشنے والا ہے۔ میرا نام میری شہرت اور بقا اسی کے ذریعہ سے ہے اور زندگی حالانکہ مال متاع فانی ہے عیشِ جاودانی کا ذریعہ نہیں۔ موت کو کوئی چیز دفع نہیں کر سکتی بلکہ ایسی حرص آگیں، بخل آفریں دولت تو مزید تباہی کا ذریعہ ہے۔ قیامت کے دن نارِ حطمہ اس کے دل کے اندرونی اعضاء کو اور بیرونی گوشت پوست کو جلا کر ریزہ ریزہ کردے گی۔ وہ دنیا کی آگ نہ ہوگی نہ عنصری آگ ہوگی جو زمین سے پیدا ہوگی ہے نہ فضائی آگ جو کرۂ ہوائی کے اندر اور اس سے اوپر پیدا ہوتی ہے۔ نہ کوئی آگ جو سورج کی آگ سے نمودار ہوتی ہے نہ کائناتی کرنوں کی حرکت سے پیدا ہونے والی آگ جس کا سرچشمہ حرکت ہے نہ تپ اور بخار اور اخلاط سوختہ سے پیدا ہونے والی آگ جو بدن کے اندر پیدا ہوتی ہے اور کبھی پسینے زردی نفلات کے ساتھ مل کر نکل پڑتی ہے یا زائل ہو جاتی ہے بلکہ وہ اللہ کے غضب کی آگ ہوگی جو براہ راست دل کو متاثر کرے گی۔ یوں تو ہڈیاں رگیں پٹھے اور بیرونی گوشت پوست سبھی اس سے جل کر خاکستر اور ریزہ ریزہ ہو جائے گا، مگر اس کا حملہ براہِ راست دل پر ہوگا اور جسموں کے اندر اس طرح محبوس ہوگی کہ بیرونی خنکی وہاں تک پہنچ بھی نہ سکے گی۔

تحلیل اجزاء

شانِ نزول ۔ اس سورت کا نزول بقول کلبی اخنس بن شریق ثقفی کے حق میں ہوا جو لوگوں کی غیبت اور طعن تشنیع کرتا تھا۔ محمد ابن اسحاق نے کہا ہم سنتے چلے آئے ہیں کہ اس کا نزول امیہ بن خلف جمحی کے حق میں

ہوا۔ مقاتل نے موردِ نزول ولید بن مغیرہ کو قرار دیا ہے جو رسول اللہؐ کی غیبت کرتا اور آپ پر طعن کرتا تھا۔ مجاہد نے کہا جس شخص میں یہ اوصاف ہوں اس کے لئے حکم عام ہے (یعنی موردِ نزول کوئی خاص نہیں اور اگر کوئی خاص موردِ نزول ہو تب بھی حکم عام ہے گا) لکل کا لفظ عمومِ حکم پر صراحتہً دلالت کر رہا ہے اور بقول فراء عموم لفظ خصوص مراد سے مانع نہیں۔ پس اس صورت میں حکم عام ہوگا اور خاص شخص کا اندراج عام کے تحت ہو جائے گا۔

وَیْلٌ۔ عظیم الشان خرابی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ جہنم کے اندر ایک غار ہے جس میں کافر گرتا ہی چلا جائے گا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ عرب لوگ۔ وَیْ لِفلان۔ کسی مصیبت کے وقت کہتے تھے۔ پھر توسیع استعمال کی وجہ سے یہ لفظ وَیْلٌ فلانٍ ہو گیا۔

کسی حالت کی خرابی کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ وَیْل کا استعمال ہوتا ہے اور کسی چیز یا شخص کی حقارت کو ظاہر کرنے کے لئے ولیس مستعمل ہے اور اظہار ترحم کے لفظ ویح آتا ہے۔

لکل ھمزۃ لمزۃ۔ ہر غیبت کرنے والے بدگو عیب چیں کی۔ یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہمز و لمزہ وہ لوگ ہیں جو لگائی بجھائی کرتے، چغلیاں کھاتے، دوستوں میں پھوٹ ڈالتے اور عیب سے پاک لوگوں کو خواہ مخواہ عیب دار ظاہر کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا بیٹھ پیچھے عیب کرنے والا ہمزہ ہے اور رو در رو عیب لگانے والا لمزہ ہے۔ ابوالعالیہ اور حسن بصری نے کہا پس پشت غیبت کرنے والا لمزہ ہے۔ نحاس نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا لوگوں کا گوشت کھانے والا غیبت کرنے والا ہمزہ ہے۔ اور رو در رو طعن کرنے والا لمزہ ہے اور پس پشت عیب لگانے والا لمزہ ہے۔ ابن زید نے کہا ہاتھ کے اشارہ سے کسی کی توہین کرنے والا ہمزہ ہے۔ اور زبان سے طعن تشنیع کرنے والا لمزہ ہے۔ سفیان ثوری نے کہا زبان سے بدگوئی اور عیب چینی کرنے والا ہمزہ ہے اور آنکھ کے اشارہ سے طعن کرنے والا ہمزہ ہے۔ ابن کیسان نے کہا ساتھی کے سامنے اس کی بدگوئی کرنے والا ہمزہ ہے اور آنکھ دبا کر یا سر ہلا کر یا ناک بھوں چڑھا کر تشنیع کرنے والا لمزہ ہے۔

حاصل تمام تشریحات کا تقریباً ایک ہی جیسا ہے کہ غیبت کرنے والے بدگو عیب چین کو ہمزہ اور لمزہ کہتے ہیں۔

کیا کسی کا عیب ظاہر کرنا اور طعن کرنا ہر حالت میں جرم ہے

طعن تشنیع، عیب چینی اور خوردہ گیری کی سولہ قسمیں ہیں اور سب ممنوع و مذموم ہیں۔ کیونکہ طعن کرنے والا کینہ اور حسد کی وجہ سے قصداً ایسا کرے گا یا صرف ہنسنے ہنسانے اور مذاق اڑانے کے لئے۔ پھر ان دونوں صورتوں کا تعلق کسی خاص شخص کے دینی معاملہ سے ہوگا یا دنیوی معاملہ سے یعنی ہیئت، صورت، رفتار، گفتار، چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے وغیرہ سے۔ پھر یہ چاروں طرح کی عیب گیری کسی غائب شخص کی ہوگی اور اس کے پس پشت ایسا کیا جائے گا یا سامنے موجود شخص کی رو در رو عیب گیری ہوگی۔ اس طرح یہ آٹھ قسمیں ہو جائیں گی۔ ان آٹھوں میں سے ہر ایک کے لئے یا زبان استعمال کی جائے گی۔ یعنی زبان سے غیبت، بدگوئی اور عیب چینی کی جائے گی یا آنکھ ناک بھوں اور سر اور ہاتھ کے اشارہ سے طعن تشنیع کا اظہار کیا جائے گا۔

بہرحال عیب چینی، طعن تشنیع اور غیبت ہر طرح کی ممنوع ہے۔

الذی جمع مالا وعدده۔ جس نے مال جوڑا اور گن گن کر رکھا۔ انسان کی برتری اور فضیلت کا معیار حسن و جمال بھی ہے اور جسمانی طاقت کا کمال بھی۔ صنعت و حرفت کی مہارت بھی ہے اور نسبی شرافت بھی۔ وجاہت، سیادت اور حکومت بھی اور مال کی کثرت بھی۔ علم و تقویٰ بھی ہے اور اتباع شریعت بھی۔ اسلام کی نظر میں صرف تقویٰ اور اتباع شریعت وجہ فضیلت ہے باقی کوئی چیز معیارِ برتری نہیں۔ معیارِ شریعت کے علاوہ تمام وجوہ فضیلت کے اندر تفاخر کا جذبہ شیطانی کارفرما ہوتا ہے۔ خصوصاً مال کی کثرت کی شکل میں جذبہ غرور و انانیت کا زیادہ ظہور ہوتا ہے۔ دنیا پرست مال دار آدمی اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے اپنے ہم چشموں خصوصاً

دین داروں اور نیک لوگوں پر طعن تشنیع کرتا اور ان کا مذاق بناتا ہے۔ حب مال اور حرص دولت اس کو بخیل بنا دیتی ہے اور بخیل آدمی مایا کا سانپ بن جاتا ہے۔ جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور گن گن کر رکھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے شخص کے اندر تین بری خصلتیں جمع ہو جاتی ہیں ۱۔ راہِ خیر میں صرف نہ کرنا اور جمع کرنا۔ ۲۔ کنجوسی کے زیرِ اثر جذبۂ حرص کی تشنگی فرو کرنے اور ذہنی لذت حاصل کرنے کے لئے گن گن کر رکھتا چلا جانا۔ ۳۔ سرمایہ داری کے غرور میں دوسروں پر طعن اور مخلوق کی خوردہ گیری کرنا۔ اوّل حرکت خشیتِ اللہ پر سے اعتماد اٹھا دیتی ہے۔ مال صحیح مصرف میں صرف کرنے کے لئے ہے۔ ایسی چیز نہیں کہ اس پر بھروسہ رکھا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ یہ کبھی فنا نہ ہوگا۔ دوسری حرکت دناءتِ طبع کا نتیجہ ہے جو مال کو کمالِ حیات قرار دیتا ہے۔ اخوت، قرابت، صداقت، جوار و وطنیت بلکہ ہر رشتۂ انسانیت کو منقطع کر دیتی ہے۔ کنجوسی بے رحمی کی جڑ ہے۔ انسان کو سنگ دل بنا دیتی ہے۔ کنجوس آدمی علاوہ سنگدل ہونے کے فخر طلب بھی ہو جاتا ہے اور اس کی چال ڈھال دوسروں کے لئے توہین انگیز بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ مال زمانہ کے نشیب و فراز کے لئے جمع کیا ہے حالانکہ نہ وہ زمانے کے نشیب کے وقت صرف کرتا ہے نہ فراز کے وقت بلکہ۔

یحسب ان ماله اخلده۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ باقی رکھے گا کبھی مرنے نہ دے گا۔ وہ اگر زبان سے کہتا ہے کہ موت ضرور آئے گی، مگر اس کا دل ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور چار ناچار بادلِ ناخواستہ مان بھی لے تب بھی اس کی حرص مالی اور کنجوسی اور اونچی عمارتیں بنانا اور کوہ نما فلک بوس آثار قائم کرنا اور کروڑوں روپے کا اسبابِ عیش و راحت جمع کرنا دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ یہ شخص بظاہر موت کا مقر ہے، لیکن دل سے سمجھے ہوئے ہے کہ اس کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ ایسے شخص کا مرکزِ خیال صرف دنیوی زندگی بن جاتی ہے اور ما بعد الموت کا اس کو تصور بھی نہیں ہوتا۔

کلّا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مال اس کو موت سے بچا لے اور وہ دنیا میں ہمیشہ رہے۔ بلکہ یہ کنجوسی اور حرص مالی تو آخرت میں اس کے لئے مزید عذاب کا سبب بن جائے گی۔

لینبذن فی الحطمة۔ ایسے بدگو، عیب جو کنجوس، مکھی چوس کو ضرور بالضرور اس آگ میں پھینکا جائے گا جو (اس کے گوشت پوست عروق و اعصاب اور ہڈیوں کو) ریزہ ریزہ کر دے گی (اس کا چورا ہو جائے گا۔)

حَطْمٌ توڑنا، ریزہ ریزہ کر دینا۔ حُطَمَۃٌ صیغۂ مبالغہ۔ مراد وہ آگ جو جلا کر ریزہ ریزہ اور چورا چورا کر دینے والی ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے کہا کہ حطمہ دوزخ کے دوسرے طبقہ کا نام ہے۔

وَمَا ادراك مَا الحطمة کون جانے کہ حطمہ کی حقیقت، شدت، کیفیت اور نوعیت کیا ہے۔ کسی دانشمند کی عقل رسا اور کسی عالم کے فہم دقیق کو حطمہ کے جاننے کی استعداد ہی نہیں ہے نہ وہ آتشِ ارضی ہے نہ فضائی نہ سماوی نہ طبعی نہ بیماری کی آگ ہے نہ غم و حزن کی نہ شوق و محبت کی نہ حسد اور کینہ کی۔ پھر وہ کیسی آگ ہے بس۔

نار الله الموقدة۔ اللہ کے غضب کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے (جس کو بھڑکانے والی انسان کی بداعمالیاں ہیں)

التی تطلع علی الافئدة۔ جو دلوں پر چھا جائے گی (رازی) یا دلوں کو جھانکے گی (عام مفسرین)

مؤخر الذکر ترجمہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حطمہ کی آگ کا اثر براہِ راست قلب پر ہوگا۔ ہر آگ پہلے کھال بال گوشت اور اندرونی اعضاء کو جلاتی ہے اور آخر کار قلب کے سوختہ ہونے کی نوبت آتی ہے، لیکن دوزخ کی آگ کا اثر اندر سے ہوگا دل پہلے متاثر ہوگا پھر دوسرے اعضاء۔ دوسرا مطلب یہ کہ اس آگ میں شعور ہوگا۔ وہ دلوں میں جھانک کر دیکھ لے گی کہ کس دل میں شرک و کفر اور خواہشاتِ خبیثہ ہیں اور کس دل میں ایمان و اتقاء اور پاک جذبات ہیں۔ اوّل گروہ کو کھینچ لے گی اور دوسرے کو چھوڑ دے گی۔

انّها علیهم مؤصدة۔ وہ آگ بلاشبہ ان پر ڈھانکی ہوئی ہوگی۔ حسن بصری نے فرمایا یعنی بہت تنگی کے ساتھ ان پر ڈھکی ہوئی

ہو گی (سراج)

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے مؤصدۃ لعینی مطبقۃ (ہر طرف سے محیط یعنی ہوئی ڈھانکی ہوئی) ابن ابی شیبہ نے اس کو ابو صالح کا قول قرار دیا ہے (تفسیر ابن کثیر)

شیخ عبدالعزیز دہلوی نے یہ مطلب بیان کیا کہ وہ آگ ان کے اعضاء کے اندر بند کردی گئی ہوگی کہ گرم سانس اندر سے باہر نہ آئے اور باہر کی ٹھنڈی سانس اندر نہ جائے کہ اس میں بھی تھوڑی تسکین ہوتی ہے۔ (تفسیر عزیزی)

فی عمدٍ ممددۃ لمبے ستونوں میں بندھے لٹکتے ہوں گے کہ ہاتھ پاؤں کبھی نہ ہلا سکیں اور تڑپنے کی بھی مجال نہ ہو) یا وہ آگ لمبے ستونوں کے اندر بند ہوگی۔ یعنی آگ کا دروازہ بند کر کے ستونوں کو ان پر پاٹ دیا گیا ہوگا۔

عوفی نے حضرت ابن عباس کا تفسیری قول اس طرح نقل کیا ہے کہ کافروں کو پہلے ہاتھ پاؤں پھیلا کر زنجیروں سے ستونوں میں باندھ دیا جائے گا پھر ستونوں سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔

قتادہ نے کہا ہم سے بیان کیا جائے کہ آگ کے اندر کافروں سے ستونوں سے عذاب ہوگا۔ اسی قول کو ابن جریر نے پسند کیا ہے۔ ابو صالح نے بھاری بیڑیوں میں جکڑ بند ہونا مراد لیا ہے۔ مقاتل نے کہا جس کی تائید قشیری نے بھی کی کہ کافروں کو آگ میں ڈال کر دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ پھر لوہے کے عمودوں سے یہ دروازے جڑ دیے جائیں گے کہ ہوا کا راستہ بھی نہ رہے گا۔ واللہ اعلم

مقصود بیان کسی کی غیبت، عیب چینی، خوردہ گیری مذموم ہے۔ خواہ دین کے معاملہ میں ہو یا دنیوی امور میں چغلیاں کھانا، لگائی بجھائی کرنا، دوستوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنا سب ناجائز، بری حرکات ہیں۔

ویل لکل ہمزۃ لمزۃ سے بھی یہی ہدایت مستفاد ہو رہی ہے۔

جمع مالا وعددہ سے مال کی حرص اور بخل کی ممانعت مستنبط ہو رہی ہے اور اس امر پر تنبیہ بھی نکل رہی ہے کہ مصرف خیر میں مال کو صرف نہ کرنا اور برے وقت کے حیلہ سے جمع رکھنا اور مال پر بھروسہ رکھنا اور اس کو مآل زندگی سمجھنا سخت مذموم ہے۔

سورۃ الفیل

یہ سورت بھی باتفاق مکی ہے۔ اس میں پانچ آیات اور ۲۰ یا ۲۳ کلمات اور ۹۶ یا ۹۹ حروف ہیں۔ چونکہ اس سورت میں اصحاب الفیل کا ذکر کیا گیا ہے، اس لئے اس سورت کا نام سورۃ الفیل رکھا گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا — کیا ان کی تدبیر کو (جو کہ ویرانی کعبہ کے بارے میں تھی) سر تاپا غلط نہیں

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝

کر دیا اور ان پر غول کے غول پرندے بھیجے — جو ان لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے — سو اللہ تعالٰے نے ان کو کھائے

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

ہوئے بھوسے کی طرح (پامال) کر دیا۔

تفسیر اصحاب الفیل حبشی عیسائی تھے جو کعبہ گرڈھانے کے لئے ہاتھیوں کی فوج لے کر آئے تھے۔ تفصیلی جزئیات کی روایات کو اگر ناقابلِ اعتبار قرار دے کر مفید نہ قرار دیا جائے تب بھی اتنا ماننا تو ضروری ہے کہ اصحاب فیل کا واقعہ عرب کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ پورے عربستان میں دورِ جاہلیت قرن اول و دوئم اور اس کے بعد والی صدیوں میں ایک دانش مند بھی اس واقعہ کا منکر نہیں پیدا ہوا۔ مرکز اسلام کی حقانیت اور اس شہر مقدس میں رسول اللہؐ کی بعثت کی صداقت کی۔ یہ ایسی واضح نشانی ہے کہ جس کا ظہور اگرچہ اسلام سے چالیس برس پہلے ہوا، مگر تاریخ پر اس کا معجز نما ذکر ہمیشہ قائم رہے گی۔ بخت نصر اور کیرش نے یروشلم کو تباہ کیا اور محمود نے سومنات کو غارت کیا۔ اور مختلف چیرہ دستوں نے مندروں، معبدوں، گرجاؤں اور صومعوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، مگر عظمتِ کعبہ کی قسم بیت حرام کی طرف بدنیتی سے دیکھنے والے جنرلوں اور بادشاہوں کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں اور گھر والے نے بغیر انسانی مدد کے اپنے گھر کی حفاظت کی۔ واقعۂ فیل واقدی، خطیب اور بعض دوسرے اہلِ روایت و تفسیر کی صراحت کے مطابق اس طرح منقول ہے۔

واقعۂ اصحابِ فیل جب روم و شام کے عیسائی فرقوں میں باہم خانہ جنگی اور قتال ہوا اور جو فرقہ مسیح کو ابن اللہ کہتا تھا۔ غالب آیا تو جو لوگ سچے عیسائی اور موحد تھے وہ بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گئے۔ انہی میں سے ایک موحد نصرانی عبداللہ بن الثامر تھا جو یمن چلا گیا اور نجران میں اس نے اپنی تبلیغ سے تمام آبادی کو موحد بنا لیا۔ ذونواس حمیری شاہ یمن جو مشرک عیسائی یا یہودی تھا ان موحدوں کا دشمن بن گیا اور گڑھے کھود کر ان میں آگ بھر کر بیس ہزار موحدوں کو اس میں جھونک دیا۔ موحدوں کی جماعت میں سے ایک شخص دوس ذو ثعلبان تھا جو بھاگ کر شام کو چلا گیا اور وہاں قیصر روم سے امداد کا طالب ہوا۔ قیصر نے خود تو فوجی امداد دینی مناسب نہ سمجھی، مگر نجاشی شاہ حبش کو لکھ دیا کیونکہ نجاشی موحد عیسائی تھا۔ رسول اللہؐ کے زمانے کے نجاشی کا یہ دادا تھا۔ نجاشی فوج کے دو دستے امداد کے لئے مامور کر دیے۔ ایک دستہ کا کمانڈر ارباط کو اور دوسرے دستہ کا سردار ابو یکسوم ابرہہ بن الصباح کو بنایا۔ حبشی فوج نے جا کر یمن پر قبضہ کر لیا۔ ذونواس حمیری بھاگ کر سمندر میں کود پڑا اور غرق ہو گیا۔ حمیریوں کی حکومت حبشیوں کے ہاتھ میں آگئی۔ پھر ابرہہ اور ارباط میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ فوج کے دونوں دستوں میں لڑائی ہوئی۔ ارباط مارا گیا اور ابرہہ زخمی ہو کر بچ رہا اور مستقل طور پر یمن کا حکمراں بن گیا اور نجاشی سے بھی اپنی حکومت تسلیم کرالی اور بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک عظیم الشان گرجا بھی بنوا دیا جس کا نام قلیس تھا۔ یمن کے قدیمی باشندے بکثرت حج کو مکہ جاتے تھے۔ ابرہہ نے کعبہ کی قلیس کو دینی چاہی، لیکن ناکام رہا۔ بنی کنانہ کا کوئی شخص موقع پا کر قلیس کو نجاست آلود کر گیا، جس سے ابرہہ کو بہت غصہ آیا اور تحقیق کے بعد ثابت بھی ہو گیا کہ مجرم کنانی ہے اور عظمتِ کعبہ کی حرمت میں اس نے یہ ناپاک حرکت کی ہے۔ ابرہہ نے کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ کر لیا۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں قریش کا ایک قافلہ صنعاء میں گرجا کے قریب ٹھہرا۔ اور قافلہ والوں نے کھانا پکانے کے لئے آگ جلائی۔ آگ کا ایک شرارہ گرجا پر جا پڑا اور ایسی آگ بھڑکی کہ گرجا جل کر خاکستر ہو گیا۔ ابرہہ غضبناک ہو گیا اور بڑی کثیر فوج لے کر یمن سے حجاز کی جانب چل دیا اور کہا جاتا ہے کہ بارہ ہاتھی بھی ساتھ لے لئے۔ ہاتھی تو بہرحال ساتھ تھے۔ لیکن یہ تعین نہیں کی جا سکتی۔ کسی نے ایک، کسی نے دو اور کسی نے بارہ اور کسی نے اس سے زیادہ کی صراحت کی ہے۔ قوی قول بارہ والا ہے۔ راستے میں مختلف قبائل نے روکنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ کوئی مارا گیا کوئی گرفتار ہوا۔ شہران و ناہس نے شکست کھائی۔ ذونفر مارا گیا اور نفیل بن حبیب خثعمی گرفتار ہو گیا۔ آگے بڑھا تو قبیلہ ثقیف سے مقابلہ ہوا۔ ثقیف والوں نے اطاعت کر لی اور فوج کی راہ نمائی کے لئے ابو رغال ثقفی ساتھ ہو گیا (ابن کثیر) خطیب نے لکھا ہے کہ مسعود بن معتب ثقفی نے اپنے غلام ابو رغال کو ابرہہ کی راہ نمائی کے لئے ساتھ کر دیا۔ ابو رغال سب کو لے کر مغمس میں پہنچا۔ [illegible] کسی طرح پہاڑ سے لڑھک کر اس کے ایک پتھر لگا اور مر گیا۔ عرب ابو رغال کو ملعون کہتے تھے اور دورِ صحابہ تک اس کی قبر

سنگ باری کیا کرتے تھے۔ غرض وادی محسر یا محصب میں مکہ شریف سے چھ کوس کے فاصلہ پر پہنچ کر یہ لشکر خیمہ زن ہوا اور کچھ آرام کے بعد کعبہ کی طرف چڑھائی کر دی۔ ہاتھیوں کی جماعت کا سرگروہ محمود نامی ایک ہاتھی تھا۔ اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور اگلے پاؤں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ فیل بان ہر چند اس کو مارتے تھے مگر وہ اٹھتا نہ تھا، مگر جب شام اور یمن کی طرف اس کا رخ کیا جاتا تھا تو اٹھ کر تیزی سے چلنے لگتا تھا۔ رسول اللہ ؐ کی ولادت مبارک سے ٹھیک پچپن یا پچاس روز پہلے سمندر کی طرف سے کچھ پرندوں کا غول اٹھا۔ غول اتنا بڑا تھا کہ اس کی گنتی ممکن نہ تھی۔ آگے بڑھ کر اس غول کی ٹکڑیاں بن گئیں۔ یہ پرندے کبوتر سے کچھ چھوٹے تھے۔ اور ابابیلوں کی شکل کے تھے۔ ان کا رنگ زردی مائل سبز کا سا تھا۔ ہر پرندہ کی چونچ میں ایک خاردار کنکری تھی اور ایک ایک کنکری پنجہ میں تھی۔ کنکریاں مسور اور چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ فوج کے سروں پر پہنچ کر یہ پرندے منتشر ہو گئے اور اوپر سے فوجیوں کے سروں پر کنکریاں برسانی شروع کیں۔ کنکری دیکھنے میں تو چھوٹی تھی، مگر اس کا اثر یہ تھا کہ جس شخص کے سر پر پڑتی تھی تو سر و سینہ پھاڑ کر آنتوں کو چیر کر مبرز سے نکل جاتی تھی اور ہاتھ پاؤں پر پڑتی تھی تو کاٹ کر ٹکڑے کر دیتی تھی۔ یہ ناگہانی مصیبت دیکھ کر فوجیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جدھر جس کے سینگ سمائے بھاگا، مگر پرندوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ہر فوجی کے سر پر مسلط رہا۔ آخر کثیر تعداد مر کر اسی وادی میں ڈھیر ہو گئی۔ جو زخمی بچے ان میں وبائی پھوٹ پڑی۔ مختلف اعضاء سڑ گل کر گرنے لگے۔ وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ ابرہہ بھی زخمی ہو کر قبیلہ خثعم کی حدود میں اس حالت میں پہنچا کہ تمام اعضاء کٹ کٹ کر گر چکے تھے اور گوشت بن چکا تھا اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ لوگ ابرہہ کو اسی حالت میں لے کر صنعاء پہنچے اور صنعاء ہی میں اس کی موت ہو گئی۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ حبشی فوج کو اس مصیبت میں مبتلا دیکھ کر نفیل بن حبیب خثعمی بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور وہیں ٹھہرا تماشہ دیکھتا رہا۔ لوگوں نے طلب امداد کے لئے نفیل کی تلاش کی، مگر نفیل غائب ہو گیا تھا۔ اسی واقعہ کے سلسلے میں نفیل نے یہ اشعار کہے ہیں: ؎

الا جنبت عنا یا ردینا نعمناکم مع الاصباح عینا

اے ردینہ تو اس وقت ہم سے الگ تھی۔ صبح ہوتے ہوتے ہم نے تم نے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔

ردینہ لو رأیت ولا تریہ لدی جنب المحصب ما رأینا

اے ردینہ ہم نے وادی محصب کے اطراف میں جو کچھ دیکھا۔ اگر تو دیکھ لیتی (اور تو دیکھ نہ سکتی)

اذاً لعذرتنی وحمدت امری ولم تأسی علی ما فات بینا

تو (ان حبشیوں کی راہنمائی کے معاملہ میں) تو مجھے معذور سمجھتی اور میرے کام کی تعریف کرتی اور ہمارے جو قرابت دار مر گئے ان کا رنج نہ کرتی۔

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرا وخفت حجارۃ تلقی علینا

جب میں نے پرندوں کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور ان پتھروں سے مجھے ڈر لگا جو پرندے ہم پر گرا رہے تھے۔

فکل القوم تسأل عن نفیل کان علی للحبشان دینا

سب لوگ نفیل کی جستجو کر رہے تھے۔ گویا ان حبشیوں کا نفیل پر کچھ قرض آتا تھا۔

محمد بن اسحاق نے یعقوب بن عتبہ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے عرب چیچک اور وبائی والوں سے واقف بھی نہ تھے عکرمہ نے بھی باسناد صحیح اس کو بیان کیا ہے۔ اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ حجارۃ من سجیل سے مراد شاید مرض حصاۃ و جدری (چیچک) ہے جس میں حبشی مبتلا تھے، مگر یہ مرض صریح قرآن کے خلاف ہے۔ لفظ طیر، ترمی، سجیل، ابابیل اور پورے کلام کا سیاق بتا رہا ہے کہ سنگ باری کرنے والے پرندے ہی تھے نہ غول کے غول تھے۔ جدری یا حصاۃ کے دانے کتنے ہی زیادہ ہوں اور کتنے ہی اڑ کر لگ جانے والے کے چھپتے ہوں ابابیل ان کی صفت نہیں آسکتی۔ نہ ان کو طیر کہا جا سکتا۔ کلام عرب میں کوئی مثال اس کی موجود نہیں۔

مرض کو طیر نہیں کہا جاتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سنگ باری کا اثر اتنا زہریلا ہو کہ اس سے چیچک کے دانے پھوٹ نکلے ہوں۔ اس میں کوئی تاویل زائغ بھی بن نہیں سکتی۔ رسول اللہ ﷺ کی وفاتِ مبارک بلکہ قرونِ اولیٰ تک بہت لوگوں نے وہ کنکریاں بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھی تھیں اور اس واقعہ کو اتنی اہمیت دی تھی کہ سن کا آغاز بھی اسی سے کرنے لگے تھے۔ بکثرت جاہلی اور اسلامی شاعروں نے بھی اس سنگباری کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔ نفیل کا کلام اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ پھر اللہ نے قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کا تذکرہ بھی انہیں الفاظ میں کیا ہے فرمایا امطرنا علیہا حجارۃ من سجیل۔ ہم نے ان پر کنکر ملے پتھروں کی بارش کر دی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں ارسلنا علیہم ہے اور قوم لوط کے عذاب میں امطرنا علیہا ہے۔ حجارۃ من سجیل کا لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ پھر اس جگہ چیچک اور قوم لوط کے عذاب میں کھنکر مراد لینا بے سبب تفریق ہے۔ ایک جگہ حقیقی معنی مراد لینا اور دوسری جگہ باوجود عدم تعذر حقیقت کے محض اٹکل اور خام درایت کے زیر اثر دور از کار تاویلیں کرنا کون سی تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔ غیر معمولی اسباب (جو حقیقت میں اسباب عادیہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، مگر وہ اتنے مخفی ہوتے ہیں کہ انسان کا فہم عموماً وہاں تک نہیں پہنچتا) کا استعمال کیا خدا نہیں کر سکتا۔ پھر کیوں اپنی سخیف اور سقیم رائے پر اعتماد کر کے خرقِ عادت کا انکار کیا جائے۔ مجھے تعجب ہے اُن مفسروں پر جو قرآن بالقرآن کے تو مدعی ہیں اور قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ایسا کرتے ہیں جو دوسری آیت میں آئے ہوئے انہی الفاظ کا نہیں ہو سکتا۔ کیا قوم لوط چیچک کے مرض میں مبتلا ہوگئی۔ بحیرۂ مردار کے کنارے آباد ہونے والی قوموں میں تو یہ مرض آج تک نہیں پھیلا۔ طبی اور تاریخی شہادت اس کے خلاف ہے۔ پھر کیا وجہ کہ اصحاب الفیل کے قصہ میں حجارۃ من سجیل کا ترجمہ چیچک کے لوک وارد نے کیا جائے۔ تفسیر قرآن بالقرآن کا یہ معنی تو نہیں کہ اگر تفسیر قرآن کرنے والی احادیث اور اقوال صحابہ سے تردیداً آیت بھی نہ ہوتی ہو بلکہ تفسیری تائید ملتی ہو تو محض اٹکل اور اپنی رائے کو درایت عامہ قرار دے کر ان احادیث و اقوال کی صحت کا انکار کیا جائے۔ دیکھو ابن المنذر، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب وہ (ابرہہ) آگے بڑھا تو عبد المطلب غمگین ہو کر ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور کہنے لگے مجھ سے بیت الحرام کی بربادی اور ان (مکہ والوں) کی تباہی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی جائے گی۔ اچانک سمندر کی جانب سے ایک بادل اٹھا جب قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک قسم کے پرندوں کے جھنڈ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں طیراً ابابیل ترمیہم بحجارۃ من سجیل فرمایا ہے۔ پھر پرندوں نے اصحاب الفیل کے کنکریاں مارنی شروع کر دیں۔ اُن کا ہاتھی بہت ہولناک چیخوں سے دہاڑ نے لگا۔ آخر ان کو کھائے ہوئے بھُوسے کی طرح کر دیا۔

سعید بن جبیر نے کہا یہ پرندے یکایک آسمان پر نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے اور نہ اس کے بعد کبھی دیکھے گئے۔ شیخ ابن جریر نے صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے طیراً ابابیل کے متعلق فرمایا ان کی چونچیں پرندوں کی طرح تھیں اور پنجے درندوں کی طرح تھے۔ ابن جریر نے صحیح سند کے ساتھ عکرمہ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ وہ سبز چڑیاں تھیں جو سمندر سے نکلی تھیں اور ان کے سر درندوں کی طرح تھے۔ یہ بھی شیخ ابن جریر نے صحیح اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت عبید بن عمیر نے فرمایا طیراً ابابیل سیاہ (دریائی یا مگر سے سبز) چڑیوں کے جھنڈ تھے جو سمندر سے نکلی تھیں۔ ان کی چونچ اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔

ابن ابی حاتم نے باسناد صحیح انہی عبید بن عمیر کا بیان نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے اصحاب الفیل کو ہلاک کرنا چاہا تو سمندر سے کچھ [illegible] (ابابیل) کے مشابہ تھیں۔ ہر چڑیا کی چونچ میں ایک پتھری اور پنجوں میں دو پتھریاں تھیں۔ یہ چڑیاں [illegible] کے ٹھیک سروں پر آ کر زور سے چیخیں ماریں اور پتھریاں مارنے لگیں الخ۔ اس روایت کی سند

[illegible] حضرت علیؓ نے اپنی بہن حضرت ام ہانی کے پاس اُن پتھریوں کا ڈھیر دیکھا تھا ان پر سرخ دھاریاں [illegible]

ابن اسحاق نے زمانۂ اسلام کے پہلے شاعروں کے بکثرت اشعار نقل کئے ہیں۔ جن میں چڑیوں کا آنا، سنگباری کرنا، لشکر ہلاک ہو جانا، اور ہاتھی کا دوزانو بیٹھ کر اڑ جانا اور آگے نہ بڑھنا بیان کیا گیا ہے۔ ان اشعار کو نقل کرنا موجب تطویل ہے۔ بطور نمونہ ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں۔ ابن الزبعری کا قول ہے۔ ؎

سائل امیر الحبشی عنہا ما رأی لی فلسوف ینبی الجاہلین علیمہا

تیری سے اس لشکر کا حال دریافت کرو نہ جاننے والوں کو جاننے والا بتادے گا

ستون الفا لم یو بوا ارضہم بل لم یعش بعد الایاب سقیمہا

وہ ساٹھ ہزار تھے جو اپنے ملک کو واپس نہیں گئے بلکہ جو زخمی لوٹ کر گیا وہ بھی زندہ نہ رہا ـــــ ابو قیس بن الاسلت مدنی نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے قدرت کے نمونے بہت ہیں۔ یوم الفیل میں وہ ہاتھی کو مارتے اور ایذائیں دیتے تھے اور وہ اٹھا رہے تھے مگر وہ اُٹھا بھاگ رہا تھا۔ اس کے بعد کہتا ہے :

فارسل من فوقہم حاصبا یلفہم مثل الف القزم

یحض علی الصبر احبارہم وقد ثاجوا کثواج النعم

یعنی اللہ نے ان کے اوپر سے پتھروں کی بوچھار کر دی جو قرم کی طرح ان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا (خرم تنگ گیر)

جب لوگ بھاگنے لگے تو ان کے پادری جمے رہنے پر ان کو آمادہ کرتے رہے اور وہ بھیڑوں بکریوں کی طرح ممیا رہے تھے۔

جو مدعیان تفسیر غیر معمولی خلافِ عادت غیبی غیر محسوس واقعات کی دور از کار غلط تاویلات کرتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے غیر عقلی میلان خاطر کو ثابت کرنے کے لئے نہ کوئی دلیل و برہان ہے نہ نقل و روایت نہ شہادت نہ تاریخ نہ صحابہ و تابعین کا کوئی صحیح روایت قول۔ اگر ہے تو صرف حضرت ابن عباسؓ کا وہ قول ہے جو امام رازیؒ نے بغیر کسی صحیح سند کے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے۔

عن عکرمۃ عن ابن عباس قال لما ارسل اللہ الحجارۃ علی اصحاب الفیل لم یقع حجر علی احد منہم الا نفط جلدہ وثار بہ الجدری وھو قول سعید بن جبیر انتہی کلامہ۔ بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب اللہ نے اصحاب الفیل پر پتھر چھوڑ دیا بھیجے اور برسائے) تو ان میں سے جس کسی کے کوئی پتھر پڑتا تھا اس کی کھال سوج جاتی تھی یا اُس پر دانے نکل آتے تھے۔ اور اس کی وجہ سے چیچک اُبھر آتی تھی۔ سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔

یہ روایت اوّل تو کسی صحیح سند سے امام نے بیان نہیں کی۔ معلوم نہیں امام کو یہ روایت کس قابلِ اعتماد ذریعہ سے ملی۔ اسی طرح سعید بن جبیر تک پہنچنے والا سلسلۂ روایت بھی غیر مستند اور مجہول ہے۔ اس کے علاوہ اگر روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی پرندوں کے پتھریاں برسانے کی اس سے تردید نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔ ارسل اللہ الحجارۃ علی اصحاب الفیل لم یقع حجر علی واحد منہم کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اللہ نے پتھر برسائے تھے اور پتھر لگنے سے چیچک ابھر آئی تھی۔ حجر یا حجارہ چیچک کے دانوں کو نہیں کہتے۔ البتہ حصاۃ اور حصی ضرور چیچک کو کبھی کہا جاتا ہے اور پتھری چٹان کو بھی، مگر حجر کا لفظ تو لغت عربی میں چیچک کیلئے مستعمل نہیں۔ پھر لم یقع حجر علی واحد منہم میں تو صاف صراحت ہے کہ پتھری ہر شخص کے آکر لگتا تھا جس سے چیچک پھوٹ پڑتی تھی اور دانے نکل آتے تھے۔ اس روایت سے کسی طرح بھی پرندوں کے سنگ باری کرنے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ پتھریاں زہریلی ہوں جن کے پڑنے سے عام وبا بصورت چیچک پیدا ہو گئی اور لشکر میں پھیل گئی ہو۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ کسی کی عرب کے چیچک برآمد ہونا کہیں کسی روایت میں نہیں آیا۔ یہ کیسی وبا تھی کہ مکہ پہنچ کر حبشیوں کے سارے لشکر میں تو پھیل گئی اور مکہ کے باشندوں میں سے کسی کو نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پرندوں کی چونچوں اور پنجوں سے گری ہوئی پتھریاں چونکہ مکہ کے باشندوں میں سے کسی کے نہیں لگیں اس لئے سب اہلِ مکہ محفوظ رہے اور ابرہہ کے لشکر میں سے ہر سپاہی کے کوئی نہ کوئی پتھری لگی، اس لئے وہ سب ماؤف ہو گئے۔

پھر یہ مدعیانِ تفسیر جو حقیقت میں خود رائی کا شکار ہیں اتنا نہیں سوچتے کہ چالیس پینتالیس سال پہلے کا ایک واقعہ جس کے شاہد ہزاروں آدمی تھے

کس طرح ولید بن مغیرہ، ابوجہل، امیہ بن خلف اور ان جیسے دوسرے کافر عنادی دشمنوں کے سامنے غلط طور پر رسول اللہ صلعم پیش کر سکتے تھے جب آیت میں ترمیہم بحجارۃ من سجیل کہہ کر اعلان کیا گیا کہ پتھر برسائے گئے تھے تو پھر ان اعدائے قرآن نے کبھی اس کی تکذیب نہیں کی۔

یمن سے ابرہہ کا مع لشکر روانہ ہونے کا تذکرہ معتبر تاریخوں کی تائید کے ساتھ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مزید تفصیل حسب روایت شیخ ابن کثیر مندرجہ ذیل ہے:

عرب کو اس کی روانگی کی اطلاع ملی اور ارادہ کی خبر ہوئی تو ان پر دوہرا اثر پڑا۔ ایک تو حبشیوں کا حجاز میں اور عرب کو مغلوب ہونا دوسرے ان کی عبادت گاہ اور قبیلہ کا تباہ ہو جانا اسی جذبہ کے زیر اثر بعض قبائل نے ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو احبشی لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ سب سے پہلے ایک یمنی سردار نے جو شاہان یمن کی نسل میں سے تھا۔ جس کو ذو نفر کہا جاتا تھا راستہ روکا اور اپنے گروہ کو لے کر مقابلہ پر آ گیا، لیکن مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور گرفتار ہو گیا ابرہہ اس کو گرفتار کرنے کے بعد مکہ کی طرف اور بڑھا تو قبیلۂ خثعم کے سردار نفیل بن حبیب نے اپنی حدود عمل میں مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور ابرہہ نے اس کو بھی قید کر کے ساتھ لے لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو قبیلۂ ثقیف نے اس سے صلح کر لی اور کوئی روک ٹوک نہ کی۔ اُن کو ڈر تھا کہ اگر مقابلہ کریں گے تو ابرہہ ان کے بت کو جس کو لات کہا جاتا تھا۔ توڑ پھوڑ ڈالے گا۔ قبیلۂ ثقیف نے راستہ بتانے کیلئے اپنا ایک آدمی جس کو ابو رغال کہا جاتا تھا ساتھ کر دیا۔ یہاں سے روانہ ہو کر ابرہہ مکہ کے قریب مقام مغمس تک پہنچا۔ یہاں مکہ والوں کے کچھ اونٹ چر رہے تھے اُن کو پکڑوا لیا۔ انھیں اونٹوں میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ وہ بھی پکڑ لئے گئے۔ اونٹوں کی یہ لوٹ حبشیوں کے ہراول دستہ کے سردار اسود بن معصود نے کی تھی، اس لئے عربی شاعروں نے آئندہ زمانے میں اس کی اپنے اشعار میں بڑی ہجو کی ہے۔ یہ تفصیلی اشعار سیرت ابن اسحاق میں منقول ہیں۔ ابرہہ نے مغمس سے اپنا ایک قاصد جس کا نام حناطہ حمیری تھا مکہ والوں کے پاس بھیجا اور یہ پیام دیا کہ میں تم لوگوں سے لڑنے نہیں آیا ہوں۔ میرا ارادہ صرف کعبہ کو ڈھانے کا ہے۔ اگر تم نے مقاومت نہ کی تو مجھے تم سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ تم اپنے سب سے بڑے سردار کو میرے پاس بھیجدو میں اس سے گفتگو کر لوں گا اور تم مکہ میں اعلان کر دو کہ کوئی میرے مقابلے میں اگر کعبہ کی حفاظت کی کوشش نہ کرے۔ حناطہ حمیری مکہ میں آیا لوگوں سے ملاقات کی۔ سب سے بڑے سردار عبدالمطلب بن ہاشم متولی کعبہ تھے ان سے ملا اور ان کو بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔ عبدالمطلب نے کہا واللہ ہم میں بادشاہ سے مقابلے کی طاقت نہیں۔ نہ ہم مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محترم گھر خدا کا ہے اس کے دوست ابراہیمؑ کی یادگار ہے۔ اگر خدا چاہے گا تو اپنے گھر کی خود حفاظت کرے گا۔ ہم میں تو اس کی حفاظت کی طاقت نہیں۔ حناطہ عبدالمطلب کو ساتھ لے کر ابرہہ کے پاس واپس آ گیا۔ عبدالمطلب نہایت حسین جمیل، دراز قامت، تندرست، گل چہرہ آدمی تھے۔ ابرہہ کی جو پہلی نظر ان کے چہرے پر پڑی تو اضطراری طور پر اپنی جگہ سے نیچے اتر آیا اور عبدالمطلب کو عزت سے بٹھایا۔ پھر ترجمان کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ میرے دو سو اونٹ آپ کے آدمی پکڑ لائے ہیں۔ اُن کو واپس کر دیجئے اور بس۔

ابرہہ نے کہا پہلی نظر پڑتے ہی تو میں تجھ سے مرعوب ہو گیا تھا۔ تیری وقعت میرے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست تیرے منہ سے سن کر وہ ساری وقعت جاتی رہی۔ تجھے اپنے اونٹوں کی تو فکر ہوئی اور ساری قوم کے مذہب اور مذہبی عبادت گاہ کی فکر نہ ہوئی۔ جس کو ڈھانے کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔

عبدالمطلب نے جواب دیا۔ بادشاہ سنیے۔ ان اونٹوں کا تو مالک میں ہوں، اس لئے مجھے ان کی فکر ہوئی۔ یہ مال میرا ہے اور خانہ کعبہ خدا کا ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا چاہے گا تو کرے گا۔ ابرہہ بولا۔ تیرا خدا بھی آج اس کو میرے ہاتھ سے نہیں بچا سکتا۔ عبدالمطلب اونٹ لے کر واپس آ گئے۔ مکہ پہنچ کر قریش کو حکم دیا مکہ خالی کر دو۔ پہاڑیوں پر چڑھ جاؤ۔ وہیں سے حالات کا معائنہ کرتے رہو۔ اس کے بعد عبدالمطلب قریش کے چند آدمیوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور کعبہ کا حلقہ پکڑ کر نہایت عاجزی سے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی ساتھیوں نے بھی گڑگڑا کر دعائیں کیں۔ عبدالمطلب نے اس وقت کعبہ کی زنجیر پکڑ کر یہ دعائیہ اشعار پڑھے:

لَاهُمَّ اِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ رَحْلَهٗ فَامْنَعْ رِحَالَكْ

اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔

لَا یَغْلِبَنَّ صَلِیْبُهُمْ وَ مِحَالُهُمْ اَبَدًا مِحَالَكَ

ان (عیسائیوں) کی صلیب اور ان کی طاقت تیری طاقت پر ہرگز نہ آئے۔ اسی قسم کے چھ سات اشعار عبد المطلب نے پڑھے اور دعا کرتے رہے۔ دعا ختم ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو لے کر کعبہ سے ہٹ آئے اور مکہ کے باہر پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور قربانی کے سو اونٹ نشان زدہ کرکے کعبہ کے آس پاس اس خیال سے چھوڑ دیئے کہ یقیناً ابرہہ کے لشکران اونٹوں سے تعرض کریں گے اور اس جرم کی سزا میں خدا انھیں غارت کر دے گا۔ (یہ عبد المطلب اور سرداران مکہ کا خیال تھا۔) صبح ہوئی تو ابرہہ نے لشکر لے کر مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ فیل بان نے محمود ہاتھی کو بادشاہ کے سوار ہونے کے لیے بٹھایا۔ ہاتھی بیٹھ تو گیا، لیکن اگلے دونوں پاؤں اُس نے زمین میں گاڑ دیئے اور اٹھنے سے انکار کر دیا۔ ہر چند فیل بانوں نے کوشش کی، لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ہر جتن کر ڈالا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ یہ لوگ اسی تیاری میں تھے کہ پرندوں کا ایک جھنڈ بادل کی طرح ساحل سمندر سے اٹھ کر امڈتا آتا دکھائی دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری لشکر گاہ پر چھا گیا۔ ہر سپاہی کے سر پر ایک پرندہ مسلط ہو گیا۔ یہ پرندے بقول واقدی جسامت میں کبوتر سے کچھ چھوٹے زرد (یعنی کاہی یا سبز سیاہی مائل) رنگ کے تھے ٹانگیں سرخ تھیں۔ ہر ایک پرندہ کی چونچ میں مسور یا ماش کے دانہ کی برابر ایک خاردار کنکری اور دونوں پنجوں میں دو کنکریاں تھیں۔ آتے ہی پرندوں نے کنکریوں کی بارش شروع کر دی۔ کوئی کنکری نشانہ سے نہیں چوکتی تھی۔ جس کے سر پر لگتی سینہ چیرتی ہوئی مبرز سے نکل جاتی تھی۔ ساری فوج کے لکڑے ہو گئے۔ بھگدڑ پڑ گئی۔ نفیل بن حبیب جس کو رہنمائی کے ساتھ لائے۔ وہ تو پہلے ہی بھاگ کر پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔ یہ لوگ نفیل نفیل کہہ کر چیخ رہے تھے اور وہ پہاڑ پر کھڑا ہوا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

اَیْنَ الْمَفَرُّ وَ الْاِلٰهُ الطَّالِبُ　　　　والاشرم المغلوب لیس الغالب

اب جائے پناہ کہاں ہے جبکہ خدا خود تباہ کرنے کا طلب گار ہے اور بدبخت ابرہہ اشرم اب غالب نہیں آسکتا۔ اس سے آگے نفیل نے چند اشعار اور بھی کہے تھے جو شیخ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کئے ہیں۔ اکثر تو وہیں ہلاک ہو گئے اور جو بھاگ نکلے تھے وہ بھی جاں بر نہ ہو سکے۔ اعضا بھی کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ ابرہہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھی زخمی حالت میں تھا صنعاء علاقہ خثعم میں پہنچ کر اس کی حالت بھی بہت ابتر ہو گئی۔ اعضا کٹ کٹ کر گر گئے اور گوشت کا ایک لوتھڑا ہو کر رہ گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔ اہل مکہ کو حبشیوں کا چھوڑا ہوا بہت مال ہاتھ لگا۔ عبد المطلب نے تو گھر کے اندر گڑھے میں سونا بھر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ عرب میں اسی سال سپندا اور حنظل (اندرائن کے کڑوے درخت) پیدا ہونے لگے اور چیچک کا مرض بھی اس واقعہ کے بعد پیدا ہو گیا۔

ابرہہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یکسوم یمن کا بادشاہ ہوا اور اس کے بعد ابرہہ کا دوسرا بیٹا مسروق بادشاہ ہوا پھر سیف بن ذی یزن حمیری کسریٰ کی طرف سے امدادی فوج لے کر اپنے باپ دادا کا ملک واپس لینے کے لئے یمن پر چڑھ آیا اور حبشیوں کو شکست دے کر حکومت یمن ان سے چھین لی۔ حبشی بھاگ گئے اور یمن کی حکومت حمیری قبیلہ کے ہاتھ میں آگئی۔

حضرت عائشہ رضی کا بیان ہے کہ ابرہہ کے ایک فیلبان اور ایک چرکٹے کو میں نے خود مکہ میں دیکھا۔ دونوں اندھے ہو گئے تھے اور چل پھر نہ سکتے تھے اور بھیک مانگا کرتے تھے

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ یہ آساف اور نائلہ بتوں کے پاس بیٹھے رہتے تھے جہاں مشرکین اپنی قربانیاں (دور جاہلیت میں) کیا کرتے تھے۔ وہیں ان کا قیام تھا اور یہ لوگوں سے بھیک مانگا کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

(نوٹ) بعض مصدقہ روایات سے ثابت ہے کہ پرندوں کی برسائی ہوئی کنکریوں میں کچھ کنکریاں بعض صحابہ کے پاس موجود تھیں۔

تحلیل اجزاء

ابابیل جوق جوق پرے کے پرے ۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ابابیل جمع ہے ۔ اس کا مفرد اس لفظ سے نہیں آیا جیسے شاطیط اور عبادید (فرار) بعض کے نزدیک اس کا مفرد ابالہ ہے ۔ بعض کے نزدیک ابول بروزن عجول یا ابیل بروزن سکین ہے ۔ ابو عبیدہ نے کہا ابابیل متفرق ٹکڑیوں کو کہتے ہیں ۔ عرب کہتے ہیں جاءت الخیل ابابیل من ہہنا وہہنا سوار متفرق ٹکڑیاں بناکر ادھر ادھر سے آگئے ۔

ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یہ پرندے تھے ان کی چونچیں دوسرے پرندوں جیسی ہیں ، لیکن منہ کتوں کی طرح تھے ۔ عکرمہ نے کہا یہ سبز رنگ کے پرندے تھے جو سمندر سے اٹھے تھے ان کے سر درندوں جیسے تھے ۔

سجیل ۔ سجیل کا معنی ہے بہت سخت ۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک یہ سنگ گل کا معرب اور مرکب ہے ۔ یعنی کنکر جس کی ساخت میں پتھر اور مٹی شامل ہوتی ہے ۔ بعض کے نزدیک سجیل اصل میں سجین تھا ۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ سجل سے مشتق ہے اور سجل کا معنی ہے تحریر کرنا یا تحریر شدہ کاغذ یا دفتر یا ہر کنکری پر بخط غیبی اس شخص کا نام لکھا ہوا جس پر اس پتھری کو گرنا تھا ۔ قضا نا خطا نہیں ہو سکتا تھا ۔

عصف ماکول ۔ عصف چارہ گھاس بھوسہ ۔ گیہوں کے پتوں کے ریزہ ریزہ کئے ہوئے ٹکڑے ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا عصف بھوسی کو کہتے ہیں جو اناج کے دانوں پر ہوتی ہے ۔ ابن زید نے کہا جس کھیت کو جانور چر چکے ہوں اور پتوں کے ریزے اور چورا باقی رہ جائے اس کو عصف کہتے ہیں یا گدھے گھوڑے کی لید میں جو گھاس کے ریزے نکلتے ہیں وہ مراد ہیں ۔ اس وقت ماکول کا حقیقی معنی مراد ہوگا ۔

جس سال اصحاب فیل نے مکہ پر چڑھائی کی ۔ اکثر اہل تاریخ کی صراحتوں کے بموجب اسی سال رسول اللہ صلعم کی مبارک پیدائش ہوئی ۔ گویا اصحاب فیل کی تباہی اور کعبہ کی حفاظت رسول اللہ صلعم کی بعثت کی پیش خیمہ اور خاموش غیبی بشارت تھی ۔ اللہ نے اس صورت میں اپنی غیبی قدرت کی ہمہ گیری ، کعبہ اور صاحب کعبہ کی دشمنی کا انجام بد اور قریش پر احسان عظیم کا ذکر کیا ہے اور رسول اللہ صلعم کو در پردہ بشارت اور تسلی دی ہے کہ جس خدا نے اپنے گھر کو ابرہہ اور اصحاب الفیل سے محفوظ رکھا وہ یقیناً آپ کی بھی مدد کرے گا اور یہ کافر آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے ۔ (واللہ اعلم)

مقصود بیان

کعبہ کی عظمت شان کا اظہار ۔ طرز کلام سے یقینی استنباط کیا جا سکتا ہے کہ مقدس کعبہ حقیقت میں اللہ کی قائم کردہ عبادت گاہ ہے جس کا محافظ خود خدا ہے ۔ اللہ کی غیبی پس پردہ طاقت کے مقابلہ میں مادی اور صوری اسباب کی بے بسی اور اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری کا بیان ۔ قریش پر احسان عظیم کی صراحت اور رب کعبہ کی توحید کی درپردہ تلقین اور اس امر کی طرف اشارہ کہ کعبہ قریش اور مکہ والوں کی حفاظت پر قدرت کسی بت کو حاصل نہیں ہے نہ حاصل تھی نہ کوئی اور معبود سوائے ایک معبود برحق کے حفاظت کی طاقت رکھتا ہے ۔ باطل پرستوں اور مادی ظاہری طاقت پر غرور کرنے والوں کیلئے پیام عبرت و درس نصیحت وغیرہ ۔

سورۃ قریش

یہ سورت بھی مکی ہے ۔ اس میں چار آیات ہیں ۔

(سورۃ قریش ، اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِۚ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ

چونکہ قریش خوگر ہوگئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہوگئے ہیں تو (اس نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے

هٰذَا الْبَيْتِۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ

مالک کی عبادت کریں جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔

ع ۱ ۳۱

تفسیر

عثمانی قرآن کی ترتیب میں یہ سورت سورۂ فیل سے علیحدہ ہے۔ دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم حد فاصل کے طور پر لکھی ہوئی ہے۔ اسی پر اجماعِ اُمت ہے۔

مضمون کے لحاظ سے یہ سورت پہلی سورت سے مربوط ہے۔ محمد بن اسحاق نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم وغیرہ کی روایات سے اس کی صراحت کی ہے۔

ضحاک اور کلبی کے نزدیک سورۂ قریش مدنی ہے مگر یہ غلط ہے۔ اخفش اور کسائی کے نزدیک لایلاف قریش ایلافہم رحلۃ الشتاء والصیف مستقل جملہ ہے۔ ماقبل یا مابعد کے کسی فعل سے اس کا تعلق نہیں۔ لایلاف میں یعنی لام تعجب کے لئے مستعمل ہے اور جملہ تعجبیہ ہے۔ شیخ ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ اس صورت میں یہ مطلب ہوگا لوگو تعجب کرو میں سردی گرمی کے سفر (یعنی ملک یمن اور ملک شام کے تجارتی سفر) کا قریش کو کیسا مانوس اور مشتاق بنا رکھا ہے اور کس طرح ان کو اس سفر پر مجتمع کر دیا ہے اور اس سفر کی وجہ سے ان کو غذائی ضروریات سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اور عظمتِ کعبہ اور خدمتِ کعبہ کی وجہ سے ان کو دشمنوں کے خوف سے مامون اور بے خوف کر دیا ہے۔ اسی احسان کا ایک اور آیت میں تذکرہ اس طرح آیا ہے

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا الخ۔ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو صرف یہی حکم دیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اس کو حرم بنا دیا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ قوموں کے لئے اس مادی دنیا میں اذیت رساں وہی دکھ ہیں غذائی ضروریات کا فقدان اور ظالم دشمنوں کے حملہ کا خوف۔ عمومی بھوک۔ قحط اور امن عام کی تباہی۔ جو قوم ان دونوں میں سے کسی مصیبت کا شکار ہے اس کی زندگی میں سکھ اور چین کا تصور بھی ممکن نہیں۔

ایک حدیث آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ قریش والو تم کو خدا یوں راحت و آرام پہنچائے۔ امن سے بیٹھے ہوئے کھلائے پلائے۔ چاروں طرف بدامنی کی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں مگر تمہیں امن و امان سے میٹھی نیند سلائے۔ پھر تم پر کیا مصیبت ہے کہ ایسے پروردگار کی عبادت سے جی چراؤ اور صرف اس کی عبادت نہ کرو، دوسروں کے سامنے سر جھکاؤ۔ الحدیث بمفہومہ

(ابن کثیر)

ابوعبیدہ اور زجاج کے نزدیک لایلاف کا تعلق ایک محذوف فعل سے ہے اور لایلاف کا لام سببیہ یا اجلیہ ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اصحاب فیل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ان کو تباہ کیا اور کعبہ کی حفاظت کی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ (اس کعبہ کی وجہ سے جو) قریش جو جاڑے اور گرمی کے موسم میں) یمن اور شام کے سفر سے مانوس ہیں اور الفت رکھتے ہیں اس کا اہتمام وانتظام قائم رہے۔ اس میں خلل نہ پڑے۔ سو ان کو بھی اس کعبہ کے مالک کی ہی عبادت کرنی چاہیے جس نے بھوک کو دور کرنے کا ان کے لئے انتظام کیا اور دشمنوں کے

خوف سے ان کو مامون بنایا۔

فراء کا خیال ہے کہ لایلاف میں لام بمعنی الیٰ ہے اور فعل محذوف سے اس کا تعلق ہے۔ یعنی ایک احسان تو قریش پر ہم نے کیا کہ ان کے کعبہ کو ڈھانے کے لئے آنے والے اصحاب فیل کو تباہ کیا اور اسی کے ساتھ یہ نعمت بھی ان کو عطا فرمائی کہ ان کو سردی گرمی کے سفر سے مالوف بنایا اور ان کو سفر کا شوق دلایا اور اس طرح بھوک اور خوف اعداء سے ان کو محفوظ رکھا۔

خلیل اور سیبویہ کے نزدیک لایلاف کے لام کا تعلق گزشتہ سورت یا کسی محذوف فعل سے نہیں بلکہ فَلْيَعْبُدُوا سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو اس مکان کے مالک کی عبادت اس نعمت کے شکریہ میں کرنی چاہیئے کہ اس نے ان کو سردی گرمی کے سفر سے مالوس کیا اور اس کے ذریعہ ان کے رزق کی فراہمی کا اور دشمنوں کے خوف سے مامون رہنے کا انتظام کیا۔

اِیْلَاف بمعنی الف بھی آتا ہے اور لطیف تدبیر سے باہم الفت پیدا کر دینے اور ممتنع کر دینے کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی باہم انسیت پیدا ہو جانا یا انسیت پیدا کرا دینا۔ یہی معنی اکثر اہل تفسیر نے پسند کئے ہیں۔ تیسرے معنی جو فراء اور ابن اعرابی نے پسند کئے ہیں تیار کر دینے اور سامان فراہم کر دینے کے ہیں۔

نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کی نسل کو قریش کہا جاتا تھا۔ بعض نے کہا فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ کی نسل پر قریش کا اطلاق ہوتا ہے۔

قریش قرش سے ماخوذ ہے۔ قرش کا معنی ہے کسب کمائی۔ قریش کی بھی ملکوں ملکوں میں تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ یمن اور شام تو ان کے تجارتی جولانگاہ تھے۔

بعض نے کہا قرش کا معنی ہے جمع کرنا۔ قریش پہلے منتشر تھے۔ قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک نے ان کو یکجا کیا۔ سمیٹ کر ایک جگہ آبادی کی۔ اس لئے اس جماعت کو قریش کہا جانے لگا۔ اس صورت میں قریش کا آغاز قصی سے ہوگا اور قصی سے اوپر والی نسلوں کو قریش کہنا غلط قرار پائے گا۔

بہر حال ایلاف کے معنی ہیں موانست۔ شوق۔ الفت پیدا کرنا الفت پیدا کرنا۔ اہل تفسیر نے یہی معنی بیان کئے ہیں اور اسی معنی کو سامنے رکھ کر کسی نے سورۂ فیل سے اس کو متعلق کیا اور مربوط قرار دیا ہے اور کسی نے عدم فاصل کو پیش نظر رکھ کر اس سورت کا کوئی معنوی ربط بھی پہلی سورت سے نہیں مانا۔ یہ فقیر مفسر تمام علماء تفسیر کو لائق صد احترام سمجھتے ہوئے یہی کہتا ہے اور اگر غلط کہتا ہے تو اللہ اس کو معاف فرمائے۔ الخطاء منی والصواب من اللہ۔

کہ لغت کی اکثر کتابوں ایلاف کے معنی ایک اور بھی لکھے ہیں جو مصدری معنی نہیں بلکہ اصطلاحی عرفی معنی ہیں۔ اس معنی کا ذکر فیروز آبادی نے قاموس میں بھی کیا ہے یا پالوس مسیحی نے المنجد میں لکھا ہے الایلاف ایضاً العہد و شبہ الاجازۃ اور جواز کا معنی بیان کرنے کے ذیل میں لکھا ہے صک المسافر وتسمیہ العامۃ تذکرۃ السفر او لسا ابورط۔ یعنی جواز سند مسافر کو بھی کہتے ہیں جس کو عام لوگ سفر کا اجازت نامہ (پروانۂ راہ داری) یا پاسپورٹ کہتے ہیں۔ لغت کی اس صراحت کے بموجب ایلاف معاہدہ کو بھی کہتے ہیں اور اجازت نامہ یعنی پروانۂ راہ داری) کے مشابہ جو چیز ہوتی ہے اس کو بھی کہتے ہیں۔ اس معنی کو سمجھنے کیلئے ہم کو تاریخی پس منظر کی طرف لوٹنا ہوگا۔

قصی نے مدینہ سے آکر جب مکہ میں سکونت اختیار کر لی تو اس وقت قریش کی مختلف شاخیں الگ الگ منتشر حالت میں تھیں۔ قصی نے سب کو جمع کیا سب شاخیں یکجا ہو گئیں اور قریش کے نام سے موسوم ہو گئیں۔

بعض دوسرے قبائل کی طرح قریش کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ ایک طرف یمن تھا اور دوسری طرف شام کا ملک۔ جدہ کا ساحل قریب ہی تھا زیادہ سے زیادہ مکہ سے دو منزل کا فاصلہ ہے۔ بحر قلزم سے مکہ کو جانے والے اسی بندرگاہ سے اتر کر جاتے تھے۔ قصی کو تمام قریش نے سردار مان لیا گیا۔ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کی خدمت آپ ہی سے متعلق کی گئی۔ لیکن

قریش کی تجارت بھی دوسرے قبائل کی تجارت کی طرح ہمیشہ غارت گری کے خطرات سے دوچار تھی۔ سرِراہ آباد ہونے والے قبائل سے ان کے قافلوں کو بھی لوٹے جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ یمن اور شام کی حکومتوں کی طرف سے ان کو تجارت کی کھلی آزادی نہیں تھی۔ اگرچہ یہ حکومتیں عام طور پر تجارتی قافلوں سے تعرض نہیں کرتی تھیں، لیکن قبائل عرب سے ان کا کوئی معاہدہ بھی نہ تھا۔ قریش ان حالات سے گزر رہے تھے۔ کعبہ کی خدمت کرنے کی وجہ سے عرب ان کی عزت ضرور کرتے تھے اور مکہ کے رہنے والے قتل و غارت سے محفوظ بھی تھے، لیکن تجارتی قافلے محفوظ نہیں تھے۔ قصی کے بعد اس کا بیٹا کعبہ کا متولی اور حاجیوں کا خادم اور راہبرِ حج قرار پایا اور قصی کے بنائے ہوئے راستے پر چلتا رہا۔ پھر عبدِ مناف کے بعد اس کے بیٹے ہاشم کو جب حاجیوں کی قیادت و ضیافت اور کعبہ کی تولیت کی عزت حاصل ہوئی تو ہاشم نے قریش کی تجارت کو خطرات محفوظ کرنے اور دوسرے قبائل کی تجارت سے ممتاز بنانے کا ارادہ کیا اور یہ تدبیر کی کہ خود مملکت شام سے مل کر قریش کے تجارتی قافلوں کے لئے درآمد کا ایک معاہدہ کیا۔ روم و شام کے حکمرانوں نے قریش کے قافلوں کے لئے امن کا ایک پروانہ لکھ دیا اور قریش کو آزادی کے ساتھ اپنا مال لانے اور فروخت کرنے اور واپس جانے کا تحریری اجازت نامہ دے دیا۔ یہ رعایت خاص طور پر قریش کو حاصل ہوگئی کہ ان کو بغیر روک ٹوک کے شام و روم سے تجارت کی تحریری اجازت مل گئی۔ اس معاہدہ یا پروانہ راہداری کو ایلاف کہا جاتا تھا۔

روم و شام سے پروانۂ امن حاصل کرنے کے بعد جب ہاشم لوٹے تو حجاز کے دوسرے قبائل کے شیوخ نے بھی اس معاہدہ کا احترام کرتے ہوئے قریش کے قافلوں کے لئے تجارتی آزادی دے دی اور معاہدہ کر لیا کہ ان کے حدود و مقبوضہ میں قریش کے تجارتی قافلوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

ہاشم جب یہ خصوصی اجازت نامہ اور پروانۂ امن لے کر واپس آئے تو ملک شام سے قریش کی تجارت بے خطر ہوگئی اور شامی تو غیرات قریش کی وساطت سے مکہ میں آکر بکثرت فروخت ہونے لگیں، لیکن یمن سے تجارت کو بدستور خطرات کا سامنا تھا۔ ہاشم کے کئے ہوئے معاہدے اور حاصل کئے ہوئے اجازت نامے کی طرح سردارانِ قریش نے یمنی تجارت کو بھی قریش کے لئے بے خطر بنانا چاہا اور اس میں کامیاب بھی ہوگئے۔ یمن کی حکومت اور سرداروں سے انہوں نے جاکر رومی اور شامی معاہدہ کی طرح ایک معاہدۂ امن و حفاظت کر لیا اور یمن کے سرداروں نے تحریری وعدہ کر لیا کہ قریش کے قافلوں سے حدودِ یمن میں کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ یمن کے اس معاہدہ اور پروانۂ امن کو حبل کہا گیا ہے۔

یہ سب رعایت قریش کے لئے تھی۔ قریش نے ان معاہدات سے بیش قرار فائدہ اور بے مثال امتیاز حاصل کر لیا۔ شام سے غلہ اور طرح طرح کی غذائی اجناس مکہ میں آنے لگیں، اور راستہ میں ان کے لئے کوئی روک ٹوک اور خطرہ نہ تھا۔ شام کی پیداوار مکہ والوں کے لئے جتنی ضرورت ہوتی مکہ کے بازار میں اور عکاظ اور ذو المجنہ اور ذو المجاز کے میلوں میں اور حج کے ایام میں قریش فروخت کر دیتے اور جو مال باقی رہ جاتا وہ یمن کو لے جاتے اور وہاں فروخت کرتے۔ واپسی میں یمنی تاجروں سے ہندوستان اور جزائرِ ہند کا گرم مصالحہ اور دوسری اشیاء اور خود یمن کے شہر معوذہ و صنعاء کا ساختہ پرداختہ چمڑا خرید کر مکہ میں لاتے۔ یہاں فروخت کرتے اور پھر شام و روم کو لے جاتے۔ اس طرح قریش کے قبیلہ والے آدمی لاکھ پتی کروڑ پتی بن گئے۔ کوئی قبیلہ ان کی دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ محض کعبہ کی برکت تھی کہ مذہبی لحاظ سے سارا عرب ان کا احترام کرتا تھا۔ اور دنیوی دولت کے لحاظ سے اللہ نے سارے عرب سے زیادہ ان کو مالدار کر دیا تھا۔ مکہ والوں کو نہ دشمن کی غارت گری کا اندیشہ تھا نہ بھوک و افلاس کا خوف۔ رزق وافر تھا اور امن عام اور رب کریم۔ اب آیات کی تفسیر صاف ہوگئی۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے مالک نے قریش کے سردی اور گرمی کے موسموں میں سفر کرنے کا ایک خصوصی پروانۂ امن دلوا دیا اور اس طرح ان کو قتل و غارت اور بھوک و قحط سے محفوظ کر دیا۔ حرم سے ادھر ادھر ہر طرف لوگوں کو لوٹا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، لیکن اہلِ مکہ ہر طرح سے مامون و مصون ہیں۔ اس پروانۂ راہداری یا معاہدۂ امن کے حصول کی وجہ سے اس کعبہ کے مالک کی عبادت قریش پر لازم ہے۔ کیونکہ اسی نے تو ان کے لئے امن عام اور تجارتی آزادی کی دستاویز فراہم کی اور ہر طرح سے ان کو بے خوف بنایا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

سُورۃ مَاعون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ وَ لَا یَحُضُّ

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے سو (اگر آپ اس شخص کا حال سننا چاہیں تو سنئے کہ) وہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور

عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ

محتاج کو کھانا دینے کی (دوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کیلئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں)

سَاہُوۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ﴿ع﴾

جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے

ع ۳۲

تفسیر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کے دن جو جزا و سزا کا دن ہے، جھٹلاتا ہے یتیم پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ اس کا حق مارتا ہے، اس کے ساتھ سلوک و احسان نہیں کرتا، مسکینوں کو خود تو کیا دیتا دوسروں کو بھی کار خیر پر آمادہ نہیں کرتا۔ جیسے اور جگہ ہے۔ کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ۙ وَ لَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۙ یعنی جو برائی تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ نہ تم یتیموں کی عزت کرتے ہو نہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی رغبت دلاتے ہو۔ یعنی اس فقیر جو اتنا نہیں پاتا کہ اُسے کافی ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے۔ نماز کے ساتھ غفلت کرنے والوں کے لئے ویل ہے۔ یعنی اُن منافقوں کے لئے جو لوگوں کے سامنے تو نماز ادا کریں ورنہ کچھ بھی نہیں۔ یہ معنٰی حضرت ابن عباسؓ نے کئے ہیں اور یہ بھی معنٰی ہیں کہ مقرر کردہ وقت ٹال دیتے ہیں۔ جیسے کہ مسروق اور ابوالضحےٰ کہتے ہیں۔ حضرت عطا بن دینار فرماتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ فرمانِ باری میں عَنۡ صَلَاتِہِمۡ ہے فِیۡ صَلٰوتِہِمۡ نہیں۔ یعنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں فرمایا، نمازوں میں غفلت برتتے ہیں نہیں فرمایا۔ اسی طرح یہ لفظ شامل ہے ایسے نمازی کو کہ کبھی جو ہمیشہ نماز کو آخری وقت میں ادا کرے یا عموماً آخری وقت پڑھے یا ارکان و شرط کی پوری رعایت نہ کرے یا خشوع خضوع اور تدبر غور و فکر نہ کرے۔ لفظ قرآن ان میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔ یہ سب باتیں جس میں ہوں وہ تو پورا پورا بدنصیب ہے اور جس میں جتنی ہوں اتنا ہی وہ ویل والا ہے اور نفاق عملی کا حصہ دار ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یہ نماز منافق کی ہے، یہ نماز منافق کی ہے، یہ نماز منافق کی ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کر رہا ہے۔ جب وہ غروب ہونے کے قریب پہنچے اور شیطان اپنے سینگ اس میں ملالے تو کھڑا ہو اور مرغ کی طرح چار ٹھونگیں[۲] مارے۔ جس میں خدا کا ذکر بہت ہی کم کرے۔ یہاں مراد عصر کی نماز ہے جو صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ جیسے کہ حدیث کے لفظوں سے ثابت ہے[۱]۔ یہ شخص مکروہ وقت میں کھڑا ہوتا ہے اور کوّے کی طرح چونچیں مار لیتا ہے جس میں اطمینانِ ارکان بھی نہیں ہوتا

---

[۱] اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "صلوٰۃ وسطیٰ" سے مراد نماز میں عصر ہی ہے۔ کیونکہ آپ نے یہاں خاص طور پر عصر ہی کے اوقات میں غفلت اور تساہل کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ دیر سے نماز پڑھنا دوسری نمازوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ [۲] یعنی نماز تمام آداب، ارکان اور شرائط کے ساتھ ادا نہ کرے بلکہ جلدی جلدی گھاس کاٹ لے

خشوع و خضوع ہوتا ہے بلکہ ذکر اللہ بھی بہت ہی کم ہوتا ہے اور کیا عجب کہ یہ نماز محض دکھاوے کی نماز ہو۔ نہ پڑھی نہ پڑھی یکساں ہے۔ انہیں منافقین کے بارے میں اور جگہ ارشاد ہے۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۔ یعنی منافق خدا کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں، جب بھی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو تھکے ہارے بادلِ ناخواستہ لوگوں کے دکھاوے کے لئے نماز گزارتے ہیں۔ خدا کی یاد بہت کم کرتے ہیں۔ یہاں بھی فرمایا یہ ریاکاری کرتے ہیں۔ لوگوں میں نمازی بنتے ہیں۔

طبرانی کی ایک حدیث میں ہے وَیل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس کی آگ اس قدر تیز ہے کہ آگ جہنم کی اس سے ہر دن چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ یہ وَیل اس امت کے ریاکار علماء کے لئے ہے اور ریاکاری کے طور پر صدقہ خیرات کرنے والوں کے لئے ہے اور ریاکاری کے طور پر حج کرنے والوں کے لئے ہے اور ریاکاری کے طور پر جہاد کرنے والوں کے لئے ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کو سنانے کے لئے کوئی نیک کام کرے اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کو سنا کر عذاب کرے گا اور اسے ذلیل و حقیر کرے گا۔ ہاں اس موقع پر یہ یاد رہے کہ اگر کسی شخص نے بالکل نیک نیتی سے کوئی اچھا کام کیا اور لوگوں کو اس کی خبر ہوگئی اس پر اسے بھی خوشی ہوئی تو یہ ریاکاری نہیں، اس کی دلیل مسند ابو یعلی موصلی کی یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے سرکارِ نبوی میں یہ ذکر کیا کہ حضورؐ میں تو تنہا نوافل پڑھتا ہوں لیکن اچانک کوئی آجاتا ہے تو ذرا مجھے بھی یہ اچھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تجھے دو دو اجر ملیں گے۔ ایک اجر پوشیدگی کا دوسرا ظاہر کرنے کا۔ حضرت ابن المبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ حدیث ریاکاروں کے لئے بھی اچھی چیز ہے۔ یہ حدیث برروئے اسناد غریب ہے، لیکن اس معنیٰ کی حدیث اور سند سے بھی مروی ہے۔ ابن جریر کی ایک بہت ہی ضعیف سند والی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ اکبر۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اس سے کہ تم میں سے ہر شخص کو مثل تمام دنیا کے دیا جائے اس سے مراد وہ شخص ہے کہ نماز پڑھے تو اس کی بھلائی سے اسے کچھ سروکار نہ ہو اور نہ پڑھے تو خدا کا خوف اسے نہ ہو۔ اور روایت میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کرتے ہیں۔ اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ سرے سے پڑھتے ہی نہیں۔ دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ شرعی وقت نکال دیتے ہیں پھر پڑھتے ہیں۔ یہ معنیٰ بھی ہیں کہ اوّل وقت میں ادا نہیں کرتے۔ ایک موقوف روایت میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ تنگ وقت کر ڈالتے ہیں۔ زیادہ صحیح موقوف روایت تو یہی ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ مرفوع تو ضعیف ہے ہاں موقوف صحیح ہے۔ امام حاکم کا قول بھی یہی ہے۔ پس جس طرح یہ لوگ عبادتِ رب میں سست ہیں اسی طرح لوگوں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ برتنے کی کم چیزیں لوگوں کو اس لئے بھی نہیں دیتے کہ وہ اپنا کام نکال لیں اور پھر جوں کی توں واپس کردیں۔ پس ان خسیس لوگوں سے یہ کہاں بن آئے کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں یا اور نیکی کے کام کریں۔

حضرت علی سے ماعون کا مطلب ادائیگی زکوٰۃ بھی مروی ہے اور حضرت ابن عمر سے بھی اور دیگر حضرات مفسرین اور معتبرین سے بھی۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی نماز میں ریاکاری ہے اور اس کے مال کے صدقہ میں رکاوٹ[1] ہے۔

حضرت زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں یہ منافق لوگ ہیں۔ نماز تو چونکہ ظاہر ہے پڑھنی پڑتی ہے اور زکوٰۃ چونکہ پوشیدہ ہے تو ادا نہیں کرتے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ماعون ہر وہ چیز ہے جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے مانگ لیا کرتے ہیں۔ جیسے کدال، پھاوڑا، دیگچی، ڈول وغیرہ۔

---

[1] یعنی اپنے اموال میں سے زکوٰۃ وغیرہ نہیں نکالتا۔

دوسری روایت میں ہے اصحاب رسولؐ اس کا یہی مطلب بیان کرتے ہیں اور روایت میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اور ہم اس کی تفسیر بھی کرتے تھے۔

نسائی کی حدیث میں ہے کہ ہر نیک چیز صدقہ ہے۔ ڈول یا پتیلی یا ہانڈی مانگنے کو ہم دینے پر ہم آنحضرت کے زمانے میں ماعون سے تعبیر کرتے تھے۔ غرض اس کے معنے زکوٰۃ نہ دینے کے، اطاعت نہ کرنے کے مانگی چیز نہ دینے کے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں کوئی مانگنے آئے تو اس سے انکار کر دینا مثلاً چھلنی۔ سوئی، ڈول، سِل بٹا، کدال، پھاوڑا، دیگچی وغیرہ۔

ایک غریب حدیث ہے کہ قبیلۂ نُمیر کے وفد نے حضورؐ سے کہا کہ ہمیں خاص حکم کیا ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ماعون سے منع نہ کرنا۔ انہوں نے پوچھا ماعون کیا۔ فرمایا پتھر، لوہا، پانی۔ انہوں نے پوچھا لوہے سے مراد کون سا لوہا ہے۔ فرمایا یہی تمہاری تانبے کی پتیلیاں اور کدال وغیرہ۔ پوچھا پتھر سے کیا مراد؟ فرمایا یہی دیگچی وغیرہ۔ یہ حدیث بہت ہی غریب ہے بلکہ مرفوع ہونا منکر ہے بلکہ اس کی اسناد میں وہ راوی ہیں جو مشہور نہیں۔

علی نمیریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان کا مسلمان بھائی ہے جب ملے سلام کرے جب سلام کرے تو بہتر جواب دے اور ماعون کا انکار نہ کرے۔ میں نے پوچھا حضورؐ ماعون کیا؟ فرمایا پتھر، لوہا اور اسی جیسی اور چیزیں واللہ اعلم۔

سُورۃ کوثر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ۝ إِنَّ

بیشک ہم نے آپ کو کوثر (ایک حوض کا نام ہے اور ہر خیر کثیر بھی اس میں داخل ہے عطا فرمائی ہے سو (ان نعمتوں کے شکریہ میں) آپ اپنے پروردگار

شَانِئَكَ هُوَ ٱلْأَبْتَرُ ۝

کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے

تفسیر مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی اور دفعتاً سر اٹھا کر مسکرائے پھر یا تو خود آپؐ نے فرمایا یا لوگوں کے اس سوال پر کہ حضورؐ آپ کیوں مسکرائے؟ آپؐ نے فرمایا مجھ پر اس وقت ایک سورت اتری پھر آپ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اس پوری سورت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا جنت میں وہ ایک نہر ہے جس پر بہت بھلائی ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہے جس پر میری اُمت قیامت والے دن آئے گی۔ اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی گنتی کے برابر ہیں۔ بعض لوگ اس سے ہٹائے جائیں گے تو میں کہوں گا اے میرے رب یہ بھی میرے اُمتی ہیں تو کہا جائے گا آپ کو معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے آپؐ کے

لہ یہ ہے اسلام میں باہمی تعاون اور رواداری کہ چیزیں نہ دینے پر خاص ایک سورت میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی اور یہ فرمایا کہ اسلام نام ہے ہمدردی، تعاون اور ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے کا۔

بعد کیا کیا بدعتیں نکالی تھیں[۵] اور حدیث میں آیا ہے کہ اس پر درود پڑھنا لے آسمان سے گرتے ہوں گے ۔ نسائی کی حدیث میں ہے کہ یہ واقعہ
مسجد میں گزرا اسی سے اکثر قاریوں کا استدلال ہے کہ یہ سورت مدنی ہے ۔ ف ۔ اور اکثر فقہا، نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے
کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورت میں اس کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی اور ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے ۔
مسند احمد میں ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا کہ مجھے کوثر عنایت کی گئی ہے جو ایک
جاری نہر ہے، لیکن گڑھا نہیں ہے اس کے دونوں کنارے موتی کے خیمے ہیں، اس کی مٹی خالص مشک ہے ۔ اس کے کنکر بھی سچے
موتی ہیں اور روایت میں ہے کہ معراج والی رات آپ نے آسمان پر جنت میں اس نہر کو دیکھا اور جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ
کون سی نہر ہے ۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ کوثر ہے جو خدا نے آپؐ کو عطا فرمائی ہے اور اس قسم کی بہت سی حدیثیں ہیں اور
بہت سی ہم نے سورۂ اسراؔ کی تفسیر میں بیان کر دی ہیں ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے
زیادہ میٹھا ہے جس کے کنارے پر دراز گردن والے پرندے بیٹھے ہیں ۔ حضرت صدیقؓ نے سن کر فرمایا وہ پرندے تو بہت ہی
خوبصورت ہوں گے ۔ آپ نے فرمایا کھانے میں بھی وہ بہت ہی لذیذ ہیں (ابن جریر)
ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضورؐ سے سوال کیا کہ کوثر کیا ہے ؟ اس پر آپؐ نے یہ حدیث بیان کی
تو حضرت عمرؓ نے ان پرندوں کی نسبت یہ فرمایا ۔ (مسند احمد)
حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ نہر جنت کے وسط میں ہے ۔ ایک منقطع سند سے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ کوثر کے پانی
کے گرنے کی آواز جو سننا چاہے وہ اپنے دونوں کانوں میں اپنی دونوں انگلیاں ڈال لے ف اولاً تو اس کی سند ٹھیک نہیں ۔ دوسرے
اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس جیسی آواز آتی ہے نہ کہ خاص اسی کی آواز ہو ۔ واللہ اعلم ۔
صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے کہ کوثر سے مراد وہ بھلائی اور خیر ہے جو اللہ تعالیٰ
نے آپ کو عطا فرمائی ہے ۔
ابو بشیر کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سُن کر کہا کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ جنت کی ایک نہر ہے تو حضرت سعید
نے فرمایا وہ بھی اُن بھلائیوں اور خیر میں سے ہے جو آپ کو خدا کی طرف سے عنایت ہوئی ہیں اور بھی حضرت ابن عباسؓ سے مروی
ہے کہ اس سے مراد بہت سی خیر ہے ۔ تو یہ تفسیر شامل ہے حوض کوثر وغیرہ سب کو، کوثر ماخوذ ہے کثرت سے جس سے مراد خیر کثیر
ہے اور اُسی خیر کثیر میں حوض جنت بھی ہے جیسے کہ بہت سے مفسرین سے منقول ہے
ف ۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی بہت بہت بھلائیاں مراد ہیں ۔ عکرمہؒ فرماتے ہیں نبوت قرآن
ثواب آخرت کوثر ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کوثر کی تفسیر نہر کوثر سے بھی مروی ہے جیسے کہ
ابن جریر میں سنداً مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کوثر جنت کی ایک نہر ہے جس کے دونوں کنارے سونا چاندی ہے جو یاقوت اور
موتیوں پر بہہ رہی ہے جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے ف حضرت ابن عمر.... رضی اللہ عنہ سے
بھی یہی تفسیر مروی ہے (ابن جریر) ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں یہ روایت مرفوع بھی آئی ہے ۔ امام ترمذی اسے حسن صحیح بتلاتے
ہیں ۔ ابن جریر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کے گھر تشریف لے گئے ۔ آپ اس وقت
گھر پر نہ تھے ۔ آپ کی بیوی صاحبہ جو قبیلۂ بنو نجار سے تھیں، انہوں نے کہا یا نبی اللہ وہ تو ابھی ابھی آپ ہی کی طرف گئے ہیں شاید
بنو نجار میں رک گئے ہوں ۔ آپ تشریف لائیے حضورؐ گھر میں تشریف لے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے سامنے ملیدہ

---

۵ اللہ اکبر یہ ہے اس بدعت کی سزا جس پر آج ہمارے بھائی اصرار کر رہے ہیں ۔

رکھا جو آپؐ نے تناول فرمایا ۔ آپ خوش ہو کر فرمانے لگیں کہ خدا رچائے بچائے اچھا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے ۔ میں تو حاضر دربار ہونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ آپؐ کو حوض کوثر عطا ہونے کی مبارکباد دوں ۔ مجھ سے ابھی ابھی حضرت ابو عمارہ نے کہا تھا ۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اُس حوض کی زمین یاقوت اور مرجان اور زمرد اور موتیوں کی ہے ۔ اس کے ایک راوی حرام بن عثمان ضعیف ہیں ، لیکن واقعہ حسن ہے اور اصل تو تواتر سے ثابت ہو چکی ہے ۔ بہت سے صحابہ اور تابعین وغیرہ سے ثابت ہے کہ کوثر نہر کا نام ہے ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے تمہیں خیر کثیر عنایت فرمائی اور ایسی پر شوکت نہر دی تو تم بھی صرف میری ہی عبادت کرو خصوصاً نفل فرض نماز اُس وحدہٗ لاشریک کے نام کی کرتے رہو ۔ جیسے فرمایا قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ مراد قربانی سے اونٹوں کا نحر کرنا وغیرہ ہے ۔ مشرکین سجدے اور قربانیاں اوروں کے نام کی کرتے تھے ، تو یہاں حکم ہوا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی مخلصانہ عبادتیں کیا کرو ۔ اور جگہ ہے ۔ لَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَفِسْقٌ الخ جس جانور پر خدا کا نام نہ لیا جائے ۔ اُسے نہ کھاؤ یہ تو فسق ہے ف اور کہا گیا ہے کہ مرادی نحر سے دائیں ہاتھ کا بائیں ہاتھ نماز میں سینہ پر رکھنا ہے ۔ یہی حضرت علیؓ سے غیر صحیح سند کے ساتھ مروی ہے ۔ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ اس لفظ کی یہی تفسیر کرتے ہیں ۔ حضرت ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز کے شروع کے وقت رفع الیدین کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مطلب یہ بھی ہے کہ اپنے سینے سے قبلہ کی طرف متوجہ ہو ۔ یہ تینوں قول ابن جریر میں منقول ہیں ۔

ف ابن ابی حاتم میں اس جگہ ایک بہت منکر حدیث مروی ہے جس میں ہے کہ جب یہ سورت نبی اللہ علیہ الصلوٰۃ اللہ پر اُتری تو آپ نے فرمایا اے جبرئیل ! وانحر سے کیا مراد ہے جو مجھے میرے پروردگار کا حکم ہو رہا ہے تو حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اس سے مراد قربانی نہیں بلکہ خدا کا تمہیں حکم ہو رہا ہے کہ نماز کی تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین کرو اور رکوع کے وقت بھی اور جب رکوع سے سر اٹھاؤ تب بھی اور جب سجدہ کرو تب بھی ۔ یہی ہماری نماز ہے ۔ اور ان فرشتوں کی نماز ہے جو ساتوں آسمانوں میں ہیں ۔ ہر چیز کی زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت تکبیر کے وقت رفع الیدین کرنا ہے ۔ یہ حدیث اسی طرح مستدرک حاکم میں بھی ہے ۔

حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وانحر سے مراد یہ ہے کہ اپنی پیٹھ رکوع سے اٹھاؤ تو اعتدال کرو اور سینے کو ظاہر کرو یعنی اطمینان حاصل کرو ۔ (ابن ابی حاتم)

یہ سب اقوال غریب ہیں اور صحیح پہلا قول ہے کہ مراد نحر سے قربانیوں کا ذبح کرنا ہے ، اسی لئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید سے فارغ ہو کر اپنی قربانی ذبح کرتے تھے اور فرماتے تھے جو شخص ہماری نماز پڑھے اور ہم جیسی قربانی کرے اس نے شرعی قربانی کی ، اور جس نے نماز سے پہلے ہی جانور ذبح کر لیا اُس کی قربانی نہیں ہوئی ۔ ابو بردہ بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا رسول اللہؐ میں نے نماز عید سے پہلے ہی قربانی کر لی ۔ یہ سمجھ کر کہ آج کے دن گوشت کی ضرورت ہوگی ، آپ نے فرمایا بس وہ تو کھانے کا گوشت ہو گیا ۔ صحابی نے کہا ، اچھا یا رسول اللہؐ اب میرے پاس بکری کا ایک بچہ ہے جو مجھے دو بکریوں سے بھی زیادہ محبوب ہے ۔ کیا یہ کافی ہوگا ؟ آپؐ نے فرمایا ہاں تجھے تو کافی ہے ، لیکن تیرے بعد چھ مہینہ کا بکری کا بچہ کوئی اور قربانی نہیں دے سکتا ۔

امام ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ٹھیک قول اس کا ہے جو کہتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام نمازیں خالص اللہ ہی کے لئے ادا کر اس کے سوا کسی اور کے لئے نہ کر ۔ اسی طرح اس کی راہ خون بہا کسی اور کے نام پر قربانی نہ کر ۔ اس کا شکر بجا لا جس نے تجھے یہ عظمت دی اور وہ نعمت دی جس جیسی کوئی اور نعمت نہیں ، تجھی کو اس کے ساتھ خاص کیا ۔ یہی قول بہت اچھا ہے ۔ محمد بن کعب قرظی اور عطاء کا بھی یہی قول ہے ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی ! تجھ سے اور تیری طرف وحی سے دشمنی رکھنے والا ہی قلت و ذلت والا ہے برکتا اور دُم بریدہ ہے ۔ یہ آیت عاص بن وائل کے بارے میں اُتری ہے ۔ یہ پاجی جہاں حضورؐ کا ذکر خیر سنتا کہتا اسے چھوڑ دو وہ دُم کٹا ہے اس کے پیچھے اس کے پیچھے اس کی نرینہ اولاد نہیں ہے ۔ اس کے انتقال کرتے ہی اس کا نام دنیا

سے اٹھ جائے گا ۔ اس پر یہ مبارک سورت نازل ہوئی ۔ شمر بن عطیہ فرماتے ہیں کہ عقبہ بن ابو معیط کے حق میں یہ آیت اتری ہے ۔ ابن عباس وغیرہ فرماتے ہیں کہ کعب بن اشرف اور جماعتِ قریش کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے ۔ بزار میں ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ میں آیا تو قریشیوں نے ان سے کہا کہ آپ تو ان کے سردار ہیں ، آپ اس بچہ کی طرف نہیں دیکھتے جو اپنی ساری قوم سے الگ تھلگ ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ افضل ہے ۔ حالانکہ ہم حاجیوں کے اہل ہیں دربست بیت اللہ ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔ زمزم پر ہمارا قبضہ ہے تو یہ خبیث کہنے لگا کہ بے شک تم اس سے بہتر ہو ۔ اس پر یہ آیت اُتری ۔ اس کی سند صحیح ہے ۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ ابو لہب کے بارے میں یہ آیت اُتری ہے ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو یہ بدنصیب مشرکین سے کہنے لگا کہ آج کی رات محمد کی نسل کٹ گئی (صلی اللہ علیہ وسلم وبارک) اس پر اللہ تعالٰے نے یہ آیت اتاری ۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہ منقول ہے ۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضور کا ہر دشمن ہے جن جن کے نام لئے گئے ہیں وہ بھی اور جن کا ذکر نہیں ہوا وہ بھی ۔ اَبْتَرْ کے معنی ہیں تنہا ، عرب کا یہ بھی محاورہ ہے کہ جب کسی کی نرینہ اولاد مر جائے تو کہتے ہیں بَاَتَرَ ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادوں کے انتقال پر انہوں نے یہی کہا جس پر یہ آیت اُتری تو مطلب یہ ہوا کہ اَبْتَرْ وہ ہے جس کے مرنے کے بعد اس کا ذکر مٹ جائے ۔ ان مشرکین نے حضور کی نسبت بھی یہی خیال کیا تھا کہ ان کے لڑکے تو انتقال کر گئے وہ نہ رہے جن کی وجہ سے آپ کے انتقال کے بعد بھی ان کا نام رہتا ۔ حاشا وکلا اللہ تعالٰے آپ کا نام رہتی دنیا تک قائم رکھے گا ، آپ کی شریعت ابدالآباد تک باقی رہے گی ۔ آپ کی اطاعت ہر کہہ ومہ پر فرض کر دی گئی ہے ۔ آپ کا پیارا اور پاک نام ہر ایک مسلمان کی زبان و دل میں ہے اور قیامت تک فضائے آسمانی میں عروج و اقبال کے ساتھ گونجتا رہے گا ۔ بحر و بر میں ہر وقت اس کی منادی ہوتی رہے گی ۔ اللہ تعالٰے آپ پر اور آپ کی آل و اولاد اور ازواج و اصحاب پر قیامت تک درود و سلام بے حد و بکثرت بھیجتا رہے ۔ آمین ۔

سورۃ کافرون

صحیح مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ کو طواف کے بعد دو رکعت نماز میں تلاوت فرمایا ۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ صبح کی دو سنتوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی دو سورتوں کی تلاوت کیا کرتے تھے ۔

مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کے فرضوں سے پہلے کی دو رکعتوں میں اور مغرب کے بعد کی دو رکعتوں میں بیس اوپر کچھ مرتبہ یا دس اوپر کچھ دفعہ سورۂ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور سورہ قل ھو اللہ احد پڑھی (یعنی اتنی مرتبہ میں نے آپ کو یہ سورتیں ان نمازوں میں پڑھتے ہوئے سنا) مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالٰے عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے چوبیس یا پچیس مرتبہ صبح کی دو سنتوں میں ان دونوں سورتوں کو پڑھتے ہوئے بخوبی دیکھا[1] ۔ مسند ہی کی دوسری روایت میں آپ سے مروی ہے کہ مہینہ بھر تک میں نے آپ کو ان دونوں رکعتوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے پایا ۔ یہ روایت ترمذی ، ابن ماجہ اور نسائی میں بھی ہے ۔ امام ترمذی اسے حسن کہتے ہیں وہ روایت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ یہ سورت چوتھائی قرآن کے برابر ہے اور سورۂ اِذَا زُلْزِلَتْ بھی ۔ مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت نوفل بن معاویہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ان سے فرمایا کہ ہماری ربیبہ زینبؓ کی پرورش تم اپنے ہاں کرو ۔ میرے خیال میں یہ حضرت زینبؓ تھیں ۔ یہ ایک مرتبہ پھر حضورؐ کی خدمت میں

---

[1] یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ہی بار آپؐ نے نماز میں ان کو بیس یا پچیس مرتبہ پڑھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیس پچیس مرتبہ بلکہ بارہا میں نے آپ کو یہ سورت پڑھتے ہوئے سنا ہے ۔

حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہو بچی کیا کر رہی ہے؟ کہا میں انہیں ان کی ماں کے پاس چھوڑ آیا ہوں ۔ فرمایا اچھا کیوں آئے ہو ۔ عرض کیا اس لئے کہ آپ سے کوئی وظیفہ سیکھ جاؤں جو سوتے وقت پڑھ لوں ۔ آپ نے فرمایا قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھ کر سو جایا کرو اس میں شرک سے برات اور بیزاری ہے ۔

طبرانی کی روایت میں ہے کہ جبلہ بن حارثہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بھی آپ نے یہی فرمایا تھا ۔ طبرانی کی اور روایت میں ہے کہ خود حضورؐ بھی اپنے بستر پر لیٹ کر اس سورت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے ۔

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت حارث بن جبلہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا یا رسول اللہؐ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے کہ میں سوتے وقت اسے پڑھ لیا کروں ۔ آپؐ نے فرمایا جب تو رات کو اپنے بستر پر جائے تو سورۂ قل یایھا الکفرون پڑھ لیا کر ۔ یہ شرک سے بیزاری ہے واللہ اعلم ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ

آپ (ان کافروں سے) کہہ دیجئے کہ اے کافرو (میرا اور تمہارا طریقہ متحد نہیں ہو سکتا اور) نہ (تو فی الحال) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں

عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ

اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو اور نہ (آئندہ استقبال میں) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے

عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

معبود کی پرستش کروگے تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا

ع ۲

تفسیر اس سورۂ مبارکہ میں مشرکین کے عمل سے بیزاری کا اعلان ہے اور خدا کی عبادت کے اخلاص کا حکم ہے گو یہاں خطاب مکہ کے کفار قریش سے ہے، لیکن دراصل روئے زمین کے تمام کافر مراد ہیں ۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ ان کافروں نے حضورؐ سے کہا تھا کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں تو اگلے سال ہم بھی خدا کی عبادت کریں گے ۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ ان کے دین سے اپنی پوری بیزاری کا اعلان فرما دیں کہ میں تمہارے ان بتوں کو اور جن جن کو تم خدا کا شریک مان رہے ہو ہرگز نہ پوجوں گا ۔ گو تم بھی میرے معبودِ برحق خدا وحدہٗ لاشریک کو نہ پوجو ۔ پس مَا یہاں پر معنے میں مَنْ کے ہے ۔ پھر دوبارہ یہی فرمایا کہ میں تم جیسی عبادت نہ کروں گا ۔ تمہارے مذہب پر میں کاربند نہیں ہو سکتا نہ میں تمہارے پیچھے لگ سکتا ہوں بلکہ میں تو صرف اپنے رب کی عبادت کروں گا اور وہ بھی اس طریقے پر جو اسے پسند ہو اور جیسے وہ چاہے ۔ اسی لئے فرمایا کہ نہ تم میرے رب کے احکام کے آگے سر جھکاؤ گے نہ اس کی عبادت اس کے فرمان کے مطابق بجا لاؤ گے بلکہ تم نے تو اپنی طرف سے طریقے مقرر کر لئے ہیں جیسا کہ ایک اور موقع پر ہے ۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ الخ یہ لوگ صرف اٹکل اور گمان کے اور خواہش نفسانی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے ۔ پس جناب نبی خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح سے اپنا دامن ان سے چھڑا لیا اور صاف طور پر ان کے معبودوں سے اور ان کی عبادت کے طریقوں سے علیحدگی اور ناپسندیدگی کا اعلان فرما دیا ۔

ظاہر ہے کہ ہر عابد کا معبود ہوگا اور طریقۂ عبادت ہوگا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت صرف اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور طریقۂ عبادت ان کا وہ ہے جو سرور رُسل صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے ف اسی لئے کلمۂ اخلاص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا راستہ وہی ہے جس کے بتانے والے محمد ہیں جو اللہ کے پیغمبر ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مشرکین کے معبود بھی خدا کے سوا غیر ہیں اور طریقۂ عبادت بھی خدا کا بتلایا ہوا نہیں، اسی لئے فرمایا کہ تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے۔ جیسے اور جگہ ہے۔ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی اگر یہ جھٹلائیں تو تو کہدے کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے تم کو میرے اعمال سے کوئی سروکار نہیں اور میں تمہارے کاموں سے بیزار ہوں اور جگہ فرمایا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ہمارے عمل ہمارے ساتھ اور تمہارے عمل تمہارے ساتھ۔

صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے یعنی کفر اور میرے لئے میرا دین ہے یعنی اسلام یہ لفظ اصل میں دِیْنِیْ تھا، لیکن چونکہ اور آیتوں کا وقف نون پر ہے، اس لئے اس میں بھی "یا" کو حذف کر دیا جیسے فَهُوَ يَهْدِيْنِ میں اور يَسْقِيْنِ میں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ میں اب تو تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا نہیں اور آگے کے لئے بھی تمہیں نا اُمید کر دیتا ہوں کہ عمر بھر میں کبھی بھی یہ کفر مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح نہ تم اب میرے خدا کو پوجتے ہو نہ آئندہ اس کی عبادت کرو گے۔ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کا ایمان نہ لانا خدا کو معلوم تھا۔ جیسے قرآن میں اور جگہ ہے۔ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۔ یعنی تیری طرف جو اترتا ہے اُس سے ان میں کے اکثر تو سرکشی اور کفر میں بڑھ جاتے ہیں۔ ابن جریرؒ نے بعض عربی داں حضرات سے نقل کیا ہے کہ دو مرتبہ اس جملہ کا لانا صرف تاکید کے لئے ہے جیسے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ہ میں اور جیسے لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ہ بہر حال ان دونوں جملوں کو مکرر لانے کی حکمت میں یہ تین قول ہوئے۔ ایک تو یہ کہ پہلے جملہ سے مراد معبود اور دوسرے سے مراد طریق عبادت، دوسرے یہ کہ پہلے جملہ سے مراد حال دوسرے سے استقبال یعنی آئندہ۔ تیسرے یہ کہ پہلے جملہ کی تاکید دوسرے جملہ سے ہے۔ ایک چوتھی توجیہ ان کے علاوہ بھی ہے جسے حضرت امام ابن تیمیہؒ اپنی بعض تصنیفات میں ترجیح دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ پہلے تو جملہ فعلیہ ہے۔ دوبارہ جملہ اسمیہ ہے تو مراد یہ ہوئی کہ نہ تو میں غیر اللہ کی عبادت کرتا ہوں نہ مجھ سے کبھی بھی امید رکھ سکتا ہے یعنی واقعہ کی بھی نفی ہے اور شرعی طور پر ممکن ہونے کا بھی انکار ہے۔ یہ قول بھی بہت بہتر ہے واللہ اعلم۔ ف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ کفر ایک ہی ملت ہے، اس لئے یہودی نصرانی کا اور نصرانی یہودی کا وارث ہو سکتا ہے۔ جب کہ ان دونوں میں نسب یا سبب وراثت کا پایا جائے، اس لئے کہ اسلام کے سوا کفر کی جتنی راہیں ہیں وہ سب باطل ہونے میں ایک ہی ہیں۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے موافقین کا مذہب اس کے خلاف ہے کہ نہ یہودی نصرانی کا وارث ہو سکتا ہے نہ نصرانی یہودی کا۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ دو مختلف مذہب والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

سورۃ نصر

پہلے وہ حدیث بیان کی جا چکی ہے کہ یہ سورت چوتھائی قرآن کے برابر ہے[1]۔ حضرت ابن عباسؓ نے عبید اللہ بن عبد اللہ سے پوچھا جانتے ہو سب سے آخر کون سی سورت اُتری۔ جواب دیا کہ ہاں یہی سورت اِذَا جَآءَ تو آپ نے فرمایا تم صحیح کہتے ہو (نسائی)

---

[1] یعنی اجر و ثواب کے اعتبار سے، چوتھائی قرآن کی تلاوت پر جتنا ثواب ملتا اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورت پر اتنا ملے گا۔

حافظ ابوبکر بزار اور حافظ بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ یہ سورت ایام تشریق کے درمیان کے دن اُتری تو آپ سمجھ گئے کہ یہ رخصت کی سورت ہے۔ اسی وقت حکم دیا اور آپ کی اونٹنی قصویٰ کسی گئی اور آپ اس پر سوار ہوئے اور اپنا وہ پرزور خطبہ پڑھا جو مشہور ہے۔ بیہقی میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اپنی لخت جگر حضرت فاطمہؓ کو بلایا اور فرمایا مجھے میرے انتقال کی خبر آگئی ہے۔ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا رونے لگیں پھر یکایک ہنس پڑیں۔ جب اور لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔ خبرِ انتقال نے تو رُلا دیا، لیکن روتے ہوئے حضورؐ نے تسلی دی اور فرمایا بیٹی صبر کرو میری اہل میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ

(اے محمدؐ) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے) اور (آثار جو اس پر متفرع ہونے والے ہیں یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دین

أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ع

ع ۳ ۳۵

میں جوق جوق داخل ہوتا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے

تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بڑی عمر والے بدری مجاہدین کے ساتھ ساتھ حضرت عمر فاروقؓ مجھے بھی شامل کر لیا کرتے تھے تو شاید کسی کے دل میں اس سے کچھ ناراضگی پیدا ہوتی ہوگی۔ اُس نے کہا کہ یہ ہمارے ساتھ نہ آیا کریں۔ ان جیسے تو ہمارے بچے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم انہیں خوب جانتے ہو۔ ایک دن سب کو بلایا اور مجھے بھی یاد فرمایا میں سمجھ گیا کہ آج انہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔ جب ہم سب جا پہنچے تو امیر المومنینؓ نے ہم سے پوچھا کہ سورۂ اِذَا جَآءَ کی نسبت تمہیں کیا علم ہے؟ بعض نے کہا اس میں ہمیں خدا کی حمد و ثنا بیان کرنے اور خدا کی بخشش چاہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب مددِ خدا آجائے اور ہماری فتح ہو تو ہم یہ کریں اور بعض بالکل خاموش رہے تو آپ نے میری طرف توجہ فرمائی اور کہا کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا نہیں فرمایا پھر اور کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا یہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا پیغام ہے۔ آپؐ کو معلوم کرایا جا رہا ہے کہ اب آپ کی دنیوی زندگی ختم ہونے کو ہے۔ آپ تسبیح اور حمد میں اور استغفار میں مشغول ہو جائیے۔ حضرت فاروقؓ نے فرمایا یہی میں بھی جانتا ہوں (بخاری) جب یہ سورت اُتری تو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اب اسی سال میرا انتقال ہو جائے گا۔ مجھے میرے انتقال کی خبر دے دی گئی ہے۔ (مسند احمد) مجاہدؒ، ابو العالیہؒ، ضحاکؒ وغیرہ بھی یہی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور مدینہ شریف میں تھے فرمانے لگے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر خدا تعالیٰ کی مدد آگئی اور فتح بھی، یمن والے آگئے۔ پوچھا گیا حضورؐ یمن والے کیسے ہیں؟ فرمایا وہ نرم دل لوگ ہیں سلجھی ہوئی طبیعت والے ہیں۔ ایمان تو یمنیوں کا ہے اور سمجھ بھی یمنیوں کی ہے اور حکمت بھی یمن والوں کی ہے (ابن جریر)

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سورت اُتری تو چونکہ اس میں آپ کے انتقال کی خبر تھی تو آپؐ نے اپنے کاموں میں اور کمر کس لی اور تقریباً وہی فرمایا جو اوپر گزرا (طبرانی) حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ سورتوں میں پوری سورت نازل ہونے کے اعتبار سے سب سے آخری سورت یہی ہے (طبرانی)

اور حدیث میں ہے کہ جب یہ سورت اُتری تو آپ نے اس کی تلاوت کی اور فرمایا کہ لوگ ایک کنارہ ہیں اور میں اور میرے اصحابؓ

ایک کنارہ میں ہیں۔ سنو فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔ البتہ جہاد اور نیت ہے۔ مروان کو جب یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے سنائی
تو یہ کہنے لگا جھوٹ کہتا ہے۔ اس وقت مروان کے ساتھ اس کے تخت پر حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت بھی بیٹھے
ہوئے تھے۔ تو حضرت ابوسعید رضی فرمانے لگے کہ ان دونوں کو بھی اس حدیث کی خبر ہے۔ یہ بھی اس حدیث کو بیان کر سکتے ہیں، لیکن ایک کو
تو اپنی سرداری چھن جانے کا خوف ہے اور دوسرے کو زکوٰۃ کی وصولی کے عہدے سے سبکدوش ہو جانے کا ڈر ہے۔ مروان نے یہ سن کر کوڑا اٹھا کر حضرت
ابوسعید رضی کو مارنا چاہا۔ ان دونوں بزرگوں نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگے۔ مروان سن حضرت ابوسعید رضی نے سچ بیان فرمایا ہے (مسند احمد) یہ
حدیث ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی سے بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فتح مکہ کے دن فرمایا ہجرت نہیں رہی۔ ہاں جہاد اور
نیت ہے۔ جب تمہیں چلنے کو کہا جائے تو اٹھ کھڑے ہو جایا کرو۔ صحیح بخاری اور مسلم شریف میں یہ حدیث موجود ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رہے
کہ جن صحابہ رضی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اس سورت کا یہ مطلب بیان کیا کہ جب ہم پر اللہ تعالیٰ شہر اور قلعے فتح کر دے
اور ہماری مدد فرمائے تو ہمیں حکم مل رہا ہے کہ ہم اس کی تعریفیں بیان کریں، اس کا شکر ادا کریں، اس کی پاکیزگی بیان کریں، نماز ادا کریں
اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کریں۔ یہ مطلب بھی بالکل صحیح ہے اور یہ تفسیر بھی نہایت عمدہ ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فتح مکہ والے دن ضحٰے کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ گو لوگ کہتے ہیں کہ یہ ضحٰے کی نماز تھی، لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ ضحٰے کی نماز آپ
ہمیشہ نہیں پڑھتے تھے۔ پھر اس دن جب کہ اور کام بہت زیادہ تھا، مسافرت تھی۔ اسے کیسے پڑھی۔ آپ کی اقامت فتح مکہ کے موقعہ
پر مکہ شریف میں رمضان شریف کے آخر تک انیس ۱۹ دن رہی۔ آپ فرض نماز کو بھی قصر کرتے رہے۔ روزہ بھی نہیں رکھا اور تمام
لشکر جو تقریباً دس ہزار تھا اسی طرح کرتا رہا۔

ان حقائق سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ یہ نماز فتح مکہ کے شکریہ کی نماز تھی۔ اسی لئے سردار لشکر امام وقت پر مستحب
ہے کہ جب کوئی شہر فتح ہو تو داخل ہوتے ہی آٹھ رکعت نماز ادا کرے۔ سعد بن ابی وقاص رضی نے فتح مدائن والے دن ایسا ہی کیا تھا۔
ان آٹھ رکعتوں کو دو دو رکعتیں کر کے ادا کرے۔ گو بعض کا قول یہ بھی ہے کہ آٹھ رکعتوں کو ایک ہی سلام سے پڑھ لے، لیکن
ابوداؤد میں صراحتاً ہے کہ حضور نے اس نماز میں ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرا ہے۔ دوسری تفسیر بھی صحیح ہے جو ابن عباس رضی
وغیرہ نے کی ہے کہ اس میں آپ کو آپ کے وصال کی خبر دی گئی کہ جب آپ مکہ فتح کر لیں جہاں سے اُن کفار نے آپ کو
نکل جانے پر مجبور کیا تھا اور آپ اپنی آنکھوں سے اپنی محنت کا پھل دیکھ لیں کہ فوجوں کی فوجیں آپ کے جھنڈے تلے آ جائیں۔ جوق
در جوق لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو ہماری طرف آنے کی اور ہم سے ملاقات کی تیاری میں لگ جائیں۔ سمجھ لو کہ جو کام ہمیں
تم سے لینا تھا پورا ہو چکا۔ اب آخرت کی طرف نگاہیں ڈالو جہاں آپ کے لئے بہت بہتری ہے اور اس دنیا سے بہت زیادہ
بھلائی آپ کے لئے وہاں ہے۔ وہیں آپ کی مہمانی تیار ہے اور مجھ جیسا میزبان ہے۔ آپ ان نشانات کو دیکھ کر بکثرت
میری حمد و ثنا کریں اور توبہ و استغفار میں لگ جائیں۔

صحیح بخاری شریف کی حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
رکوع سجدے میں بکثرت سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ پڑھا کرتے تھے۔ آپ قرآن کی اس آیت فَسَبِّحْ الخ پر عمل
کرتے تھے اور روایت میں ہے کہ حضور اپنی آخری عمر میں ان کلمات کا اکثر ورد کرتے تھے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ
خدا کی ذات پاک ہے اسی کے لئے سب تعریفیں سزاوار ہیں۔ میں خدا سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف جھکتا ہوں۔ اور فرماتے
تھے کہ میرے رب نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ جب میں یہ علامت دیکھ لوں کہ مکہ فتح ہو گیا اور دین اسلام میں فوجوں کی فوجیں
داخل ہونے لگیں تو میں ان کلمات کو بکثرت کہوں۔ چنانچہ بحمد اللہ میں اسے دیکھ چکا اب اس وظیفے میں مشغول ہوں (مسند احمد)
ابن جریر میں حضرت ام سلمہ رضی سے مروی ہے کہ حضور اپنی آخری عمر میں بیٹھتے اٹھتے چلتے پھرتے آتے جاتے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ پڑھا

کرتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ حضورؐ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپؐ نے اس سورت کی تلاوت کی اور فرمایا مجھے حکم خدا یہی ہے۔ کسی مجلس میں بیٹھیں اور وہ مجلس برخاست ہو تو کیا پڑھنا چاہیئے۔ اسے ہم اپنی ایک مستقل تصنیف میں لکھ چکے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ جب یہ سورت اُتری تو حضور اکثر اپنی نماز میں تلاوت کرتے اور رکوع میں ۳ مرتبہ پڑھتے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ فتح سے مراد یہاں فتح مکہ ہے اس پر اتفاق ہے، عموماً عرب قبائل اسی کے منتظر تھے کہ اگر یہ اپنی قوم پر غالب آجائیں اور مکہ ان کے زیرِ نگیں آجائے تو پھر ان کے نبی ہونے میں ذرا سا بھی شبہ نہیں۔ اب جب کہ خدا نے اپنے حبیب کے ہاتھوں مکہ فتح کرا دیا تو یہ سب اسلام میں آگئے۔ اس کے بعد دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ عرب سارے کا سارا مسلمان ہو گیا اور ہر قبیلے میں اسلام اپنا راج کرنے لگا۔ الحمدللہ۔

صحیح بخاری شریف میں بھی حضرت عمرو بن سلمہؓ کا یہ مقولہ موجود ہے کہ مکہ فتح ہوتے ہی ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف سبقت کی ان سب کو اسی بات کا انتظار تھا اور کہتے تھے کہ انھیں اور ان کی قوم کو چھوڑ دیکھو۔ اگر یہ نبی برحق ہیں تو یہ اپنی قوم پر غالب آجائیں گے اور مکہ پر ان کا جھنڈا نصب ہو جائے گا۔ ہم نے غزوۂ فتح مکہ کا پورا پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ اپنی سیرت کی کتاب میں لکھا ہے جو صاحب تفصیلات دیکھنا چاہیں وہ اس کتاب کو دیکھ لیں۔ فالحمدللہ۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پڑوسی جب اپنے کسی سفر سے واپس آئے تو حضرت جابر ان سے ملاقات کرنے کے لئے گئے انہوں نے لوگوں کے باہمی اختلاف کا حال بیان کیا اور ان کی افسوسناک بدعتوں کا ذکر کیا تو صحابیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور روتے ہوئے فرمانے لگے کہ میں نے حبیبِ خدا شافعِ روزِ جزا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ لوگوں کی فوجوں کی فوجیں خدا کے دین میں داخل ہوئیں، لیکن عنقریب جماعتوں کی جماعتیں ان میں سے نکلنے بھی لگ جائیں گی۔

سورۂ لہب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی (مال سے مراد سرمایہ اور ما کسب سے مراد اس کا نفع

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝

در آخرت میں) وہ عنقریب (مرنے کے متصل) ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا وہ بھی اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے (مراد خار دار لکڑیاں ہیں جن کا

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

ع ۵ ۳۶

شانِ نزول میں ذکر ہے اور دوزخ میں) اس کے گلے میں ایک رسی ہوگی خوب بٹی ہوئی

تفسیر صحیح بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطحا میں جاکر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے اور اونچی اونچی آواز سے یَا صَبَاحَاہ یَا صَبَاحَاہ کہنے لگے۔ قریش سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا اگر میں تم سے کہوں کہ صبح یا شام دشمن

تم پر چھاپہ مارنے والا ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے ؟ سب نے جواب دیا جی ہاں ۔ آپؐ نے فرمایا سنو میں تمہیں خدا تعالیٰ کے سخت عذاب کے آنے کی خبر دے رہا ہوں تو ابولہب[1] کہنے لگا تجھے ہلاکی ہو ۔ کیا اسی لئے تو نے ہمیں جمع کیا تھا ؟ اس پر یہ سورت اتری (بخاری) دوسری روایت میں ہے کہ یہ ہاتھ جھاڑتا ہوا یوں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تَبَّتْ بددعا ہے اور تَبَّ خبر ہے ۔ یہ ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا اس کا عبد العزیٰ بن عبد المطلب تھا اس کی کنیت ابوعتبہ تھی ۔ اس کے چہرے کی خوب صورتی اور چمک دمک کی وجہ سے اس کو ابولہب یعنی شعلے والا کہا جاتا تھا ۔ یہ حضورؐ کا بدترین دشمن تھا ۔ ہر وقت ایذا دہی تکلیف رسانی اور نقصان پہنچانے کے درپے رہا کرتا تھا ۔

ربیعہ بن عباد دیلی اپنے اسلام لانے کے بعد اپنا جاہلیت کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ آپؐ فرما رہے ہیں کہ لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہو تو فلاح پاؤ گے ۔ لوگوں کا مجمع آپ کے آس پاس لگا ہوا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کے پیچھے ہی ایک گورے چٹے چمکتے چہرے اور بھینگی آنکھ والا جس کے سر کے بڑے بڑے بالوں کی دو مینڈھیاں تھیں، آیا اور کہنے لگا ۔ لوگو یہ بے دین ہے ۔ جھوٹا ہے ۔ غرض کہ آپؐ لوگوں کے مجمع میں جا کر خدا کی توحید کی دعوت دیتے تھے اور یہ شخص پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے ؟ لوگوں نے کہا یہ آپؐ کا چچا ابولہب ہے لَعَنَہُ اللہُ (مسند احمد) ابوالزناد نے راوی حدیث حضرت ربیعہؓ سے کہا آپ تو اس وقت بچے سے ہوں گے ۔ فرمایا نہیں میں اس وقت خاصی عمر کا تھا ۔ مشک لاد کر پانی بھر لایا کرتا تھا ۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ تھا اور ان دنوں جوان تھا ۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے اور فرماتے لوگو ! میں تمہاری طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ ایک اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ۔ مجھے سچا جانو ۔ مجھے میرے دشمنوں سے بچاؤ تاکہ میں اس کام کو بجا لاؤں جس کا حکم دے کر خدائے تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے ۔ آپؐ جہاں یہ پیغام پہنچا کر فارغ ہوتے کہ آپؐ کا چچا ابولہب پیچھے سے پہنچتا اور کہتا اے فلاں قبیلہ کے لوگو یہ شخص تو تمہیں لات و عزیٰ سے ہٹانا چاہتا ہے اور بنو مالک بن اقیش کے تمہارے حلیف جنّوں سے تمہیں دور کر رہا ہے اور اپنی لائی ہوئی گمراہی کی طرف تمہیں بھی گھسیٹ رہا ہے ۔ خبردار ! نہ اس کی سننا نہ ماننا ۔ (احمد وطبرانی) اللہ تعالیٰ اس سورت میں فرماتا ہے کہ ابولہب برباد ہوا ۔ اس کی کوشش غارت ہوئی ، اس کے اعمال ہلاک ہوئے ۔ بالیقین اس کی بربادی ہو چکی ۔ اس کی اولاد اس کے کام نہ آئی ۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو خدا کی طرف بلایا تو ابولہب کہنے لگا ۔ اگر میرے بھتیجے کی باتیں حق بھی ہیں تو میں قیامت کے دن اپنا مال و اولاد خدا کو فدیے میں دے کر اس کے عذاب سے چھوٹ جاؤں گا ۔ اس پر یہ آیت مَآ اَغْنٰی الخ اتری ۔ پھر فرمایا کہ شعلے مارنے والی آگ میں جو سخت جلانے والی اور بہت تیز ہے داخل ہو گا اور اس کی بیوی جو قریش عورتوں کی سردارہ تھی ، اس کی کنیت اُمِّ جمیل تھی ۔ نام اَروی تھا ۔ حرب بن اُمیہ کی لڑکی تھی ۔ ابوسفیان کی بہن تھی اور اپنے خاوند کے کفر و عناد اور سرکشی و دشمنی میں یہ بھی اس کے ساتھ تھی ، اس لئے قیامت کے دن عذاب میں بھی اس کے ساتھ ہو گی ۔ لکڑیاں اٹھا کر لائے گی اور جس آگ میں اس کا خاوند جل رہا ہو گا ڈالتی جائے گی ۔ اس کے گلے میں آگ کی رسّی ہو گی اور جہنم کا ایندھن سمیٹتی رہے گی ۔ یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ سے مراد اس کا غیبت گو ہونا ہے ۔ امام ابن جریر اسی کو پسند کرتے ہیں ۔ ابن عباسؓ وغیرہ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ جنگل سے خاردار لکڑیاں چن لاتی تھی اور حضورؐ کی راہ میں بچھا دیا کرتی تھی ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ

---

[1] بعض محققین نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں ابولہب بطور کنیت نہیں آیا بلکہ بطور پیشگوئی آیا ہے کہ اس کا انجام جہنمی ہونا ہے چنانچہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ قال بعض المفسرین انہ لم یقصد بذالک مقصد کنیتہ التی اشتھر بھا وانما قصد الی اثبات النار لہ وانہ من اھلھا ۔

چونکہ یہ عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فقیری کا طعنہ دیا کرتی تھی تو اسے اس کا لکڑیاں چننا یاد دلایا گیا، لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے پاس ایک نفیس ہار تھا کہتی تھی کہ میں اسے فروخت کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر خرچ کروں گی تو یہاں فرمایا گیا کہ اس کے بدلے اس کے گلے میں آگ کا طوق ڈالا جائے گا۔ مَسَد کے معنی کھجور کی رسی کے ہیں۔ حضرت عروہؒ فرماتے ہیں کہ یہ جہنم کی زنجیر ہے جس کی ایک ایک کڑی ستر ستر گز کی ہے۔ ثوریؒ فرماتے ہیں کہ یہ جہنم کا طوق ہے جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے۔ جوہریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اونٹ کی کھال کی اور اونٹ کے بالوں کی بنائی جاتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ یعنی لوہے کا طوق۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو یہ بھینگی عورت ام جمیل بنت حرب اپنے ہاتھ میں نوکدار پتھر لئے یوں کہتی ہوئی حضورؐ کے پاس آئی ۔

مُذَمَّمًا اَبَيْنَا ۞ وَدِيْنَهٗ قَلَيْنَا ۞ وَاَمْرَهٗ عَصَيْنَا۔

یعنی ہم مذمم کے منکر ہیں، اس کے دین کے دشمن ہیں اور نافرمان ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے ساتھ میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بھی تھے۔ صدیق اکبرؓ نے اسے اسی حالت میں دیکھ کر حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ آ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپؐ کو دیکھ لے۔ آپؐ نے فرمایا صدیقؓ بے غم رہو یہ مجھے نہیں دیکھ سکتی۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی تاکہ اس سے بچ جائیں۔ خود قرآن فرماتا ہے۔ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا۔ یعنی جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ایمان نہ لانے والوں کے درمیان پوشیدہ پردے ڈال دیتے ہیں۔ یہ چڑیل یعنی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی گو حضورؐ بھی حضرت صدیق اکبر کے پاس بالکل ظاہر ہی بیٹھے ہوئے تھے، لیکن قدرتی حجابوں نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ وہ حضورؐ کو نہ دیکھ سکی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہنے لگی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے یعنی شعروں میں میری مذمت کی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا نہیں نہیں۔ رب البیت کی قسم حضورؐ نے تیری کوئی ہجو نہیں کی تو یہ کہتی ہوئی لوٹ گئی کہ قریش جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔ (ابن ابی حاتم)

ایک مرتبہ یہ اپنی لمبی چادر اوڑھے ہوئے طواف کر رہی تھی۔ پیر چادر میں الجھ گیا اور پھسل پڑی تو کہنے لگی مذمم غارت ہو، ام حکیم بنت عبدالمطلب نے کہا۔ میں تو پاک دامن عورت ہوں اپنی زبان نہیں بگاڑوں گی اور دوست کرنے والی ہوں پس داغ نہ لگاؤں گی۔ اور ہم سارے ایک ہی دادا کی اولاد میں ہیں۔ اور قریش ہی پھر تو زیادہ جاننے والے ہیں۔ بزار میں ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے قسم کھا کر جواب دیا کہ نہ تو آپؐ شعر گوئی جانتے ہیں نہ کبھی آپؐ نے شعر کہے۔ اس کے جانے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا اس نے آپ کو دیکھا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا فرشتہ آڑ بن کر کھڑا ہوا تھا جب تک وہ واپس چلی نہ گئی۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس کے گلے میں جہنم کی آگ کی رسی ہوگی جس سے اُسے کھینچ کر جہنم کے اوپر لایا جائے گا۔ پھر ڈھیلی چھوڑ کر جہنم کی تہ میں پہنچایا جائے گا۔ یہی عذاب اسے ہوتا رہے گا۔ ڈول کی رسی کو عرب مَسَد کہہ دیا کرتے ہیں۔ عربی شعروں میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہاں یاد رہے کہ یہ بابرکت سورت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی اعلیٰ دلیل ہے۔ کیونکہ جس طرح ان کی بدبختی کی خبر اس سورت میں دی گئی تھی اسی طرح واقعہ بھی ہوا۔ ان دونوں کو ایمان لانا آخر تک نصیب ہی نہ ہوا۔ نہ تو وہ ظاہر میں مسلمان ہوئے نہ باطن میں نہ چھپے نہ کھلے۔ پس یہ سورت زبردست، بہت صاف اور روشن دلیل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی۔

سورۂ اخلاص

اس کی شانِ نزول اور اس کی فضیلت کا بیان : مسند احمد میں ہے کہ مشرکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے
کہا اپنے رب کے اوصاف بیان کرو۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی صَمَدٌ کے معنی ہیں جو نہ تو پیدا ہوا ہو نہ اس کی اولاد ہو، اس لئے کہ
جو پیدا ہوا ہے وہ ایک وقت مرے گا بھی اور دوسرے اس کے وارث ہوں گے ۔ اللہ عزوجل نہ مرے نہ اُس کے وارث ہوں۔ اُس
جیسا اور اس کی جنس کا کوئی نہیں نہ اُس کے مثل کوئی چیز ہے۔ ترمذی وغیرہ میں بھی یہ روایت ہے ۔ ابو یعلیٰ موصلی میں بھی ہے کہ ایک
اعرابی نے یہ سوال کیا تھا اور روایت میں ہے کہ مشرکین کے اس سوال کے جواب میں یہ سورت اتری ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں کہ ہر چیز کی نسبت ہے اور خدا کی نسبت یہ سورت ہے۔ صَمَد اُسے کہتے ہیں جو کھوکھلا نہ ہو۔

بخاری شریف کتاب التوحید میں ہے کہ حضورؐ نے ایک چھوٹا سا لشکر کہیں بھیجا ۔ جس وقت وہ پلٹے تو انہوں نے کہا کہ حضورؐ نے ہم
پر جسے سردار بنایا تھا وہ ہر نماز کی قرأت کے خاتمہ پر سورہ قل ہو اللہ الخ پڑھا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُن سے پوچھو وہ ایسا کیوں
کرتے تھے۔ پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ یہ سورۂ رحمان کی صفت ہے ۔ مجھے اس کا پڑھنا بہت ہی پسند ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں
خبر دو کہ خدا بھی اس سے محبت رکھتا ہے۔

بخاری شریف کی کتابِ الصلوٰۃ میں ہے کہ ایک انصاری مسجد قبا کے امام تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ الحمد ختم کر کے پھر اس سورت
کو پڑھتے پھر جو سورت پڑھنی ہوتی یا جہاں سے چاہتے قرآن پڑھتے۔ ایک دن مقتدیوں نے کہا کہ آپ اس سورت کو پڑھتے ہیں پھر
دوسری سورت ملاتے ہیں یہ کیا ؟ یا تو آپ صرف اسی کو پڑھئے یا چھوڑ دیجیے ، دوسری سورت ہی پڑھا کیجیے ۔ انہوں نے کہا میں تو
جس طرح کرتا ہوں کرتا رہوں گا ۔ تم چاہو تو مجھے امام رکھو ۔ کہو تو میں تمہاری امامت چھوڑ دوں ۔ اب انھیں یہ مشکل معلوم ہوا کیونکہ
ان سب میں یہ زیادہ افضل ہیں ۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کا نماز پڑھانا بھی انھیں گوارا نہ ہوا ۔ ایک دن جب کہ حضورؐ ان کے
پاس تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا ۔ آپؐ نے امام صاحب سے فرمایا کہ تم کیوں اپنے ساتھیوں کی بات نہیں
مانتے اور ہر رکعت میں اس سورت کو کیوں پڑھتے ہو ؟ وہ کہنے لگے یا رسول اللہؐ اس سورت سے مجھے بڑی محبت ہے ۔ آپؐ نے فرمایا
اس کی محبت نے تجھے جنت میں پہنچا دیا (ترمذی) اور مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے کہا کہ میں اس سورت
سے بہت محبت رکھتا ہوں ۔ آپ نے فرمایا اس کی محبت نے تجھے جنت میں پہنچا دیا ۔ ایک شخص نے اس سورت کو پڑھتے ہوئے کسی
کو رات کے وقت سنا کہ وہ بار بار اسی کو دہرا رہا ہے ۔ صبح کے وقت آکر اُس نے حضورؐ سے ذکر کیا گویا وہ اسے ایک ہلکے ثواب کا
کام جانتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ سورت مثل تہائی قرآن ہے (بخاری)
صحیح بخاری شریف کی اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ کیا تم سے یہ نہیں ہو سکتا
کہ ایک رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لو۔ تو یہ صحابہ کو دشوار معلوم ہوا اور عرض کیا کہ اتنی طاقت تو ہر ایک میں نہیں ۔ آپ نے فرمایا سنو
سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ الخ تہائی قرآن ہے ۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت قتادہ بن نعمانؓ ساری رات اسی سورت کو پڑھتے رہے ۔ حضورؐ
سے جب ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سورت آدھے قرآن یا تہائی قرآن کے برابر ہے ۔
ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو اس کی طاقت ہے کہ وہ ہر رات تیسرا حصہ
قرآن کا پڑھ لیا کرے ۔ عرض کیا گیا یہ کس سے ہو سکے گا ؟ آپ نے فرمایا سنو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ تہائی قرآن کے برابر ہے ۔ اتنے
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے آپؐ نے سن لیا اور فرمایا کہ ابو ایوب ٹھیک کہتے ہیں (مسند احمد)
ترمذی میں ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جمع ہو جاؤ میں تمہیں آج تہائی قرآن سناؤں گا ۔ لوگ جمع

ہو کر بیٹھ گئے آپ گھر سے تشریف لائے۔ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ پڑھی اور پھر گھر تشریف لے گئے۔ اب صحابہ میں باتیں ہونے لگیں کہ وعدہ تو حضورؐ کا یہ تھا کہ تہائی قرآن سنائیں گے۔ شاید آسمان سے کوئی وحی آگئی ہو۔ اتنے میں آپ پھر واپس تشریف لائے اور فرمایا میں نے تم سے تہائی قرآن سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ سُنو یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر دن تہائی قرآن شریف پڑھ لیا کرو۔ لوگوں نے عرض کیا حضورؐ ہم سے بہت مشکل اور دشوار ہے۔ آپؐ نے فرمایا سنو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے تین حصے کئے ہیں۔ قل ھو اللّٰہ احد الخ تیسرا حصہ ہے۔ (مسلم، نسائی وغیرہ) ایسی ہی روایتیں صحابۂ کرام کی ایک بہت بڑی جماعت سے منقول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ کہیں سے تشریف لا رہے تھے آپ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے تو آپؐ نے ایک شخص کو اس سورت کی تلاوت کرتے ہوئے سن کر فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پوچھا کیا واجب ہوگئی۔ فرمایا جنت (ترمذی و نسائی) ابویعلیٰ کی ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ کیا تم میں سے کوئی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ کو رات میں تین بار پڑھ لے۔ یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ عبداللہ بن خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم پیاسے تھے رات اندھیری تھی۔ حضورؐ کا انتظار تھا کہ آپؐ تشریف لائیں اور نماز پڑھائیں۔ آپؐ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے پڑھ۔ میں چپ رہا۔ آپ نے پھر فرمایا پڑھ۔ میں نے عرض کیا کیا پڑھوں؟ آپؐ نے فرمایا ہر صبح و شام تین تین مرتبہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ پڑھ لیا کر یہ کافی ہو جائے گی۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ ہر چیز سے تجھے یہ کفایت کرے گی۔ مسند کی ایک اور ضعیف حدیث میں ہے کہ جس نے ان کلمات کو دس مرتبہ پڑھ لیا اسے چالیس لاکھ نیکیاں ملیں گی۔ وہ کلمات یہ ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاحِدًا اَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ اس کے راوی خلیل بن مرہ ہیں۔ جنہیں حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بہت ضعیف بتلاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اس پوری سورت کو دس مرتبہ پڑھ لے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل تعمیر کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہؐ ہم تو بہت سے محل بنوالیں گے۔ آپؐ نے فرمایا خدا اس سے بھی زیادہ اور اس سے بھی اچھے دینے والا ہے۔ دارمی میں ہے کہ دس مرتبہ پر ایک محل بیس مرتبہ پر دو تیس مرتبہ پر تین الخ۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ ابویعلیٰ موصلی کی ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ جو شخص اس سورت کو پچاس مرتبہ پڑھ لے تو اس کے پچاس سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی کی ایک اور ضعیف سند والی حدیث میں ہے کہ جو شخص اس سورت کو ایک دن میں دو سو مرتبہ پڑھ لے اس کے ایک ہزار پانچ سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ بشرطیکہ اس پر قرض[1] نہ ہو۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ اس کے پچاس سال کے گناہ معاف کئے جاتے ہیں مگر یہ کہ اس پر قرض نہ ہو۔ ترمذی کی ایک غریب حدیث میں ہے کہ جو شخص سونے کے لئے اپنے بستر پر جائے پھر داہنی کروٹ پر لیٹ کر سو مرتبہ اس سورت کو پڑھ لے تو قیامت کے دن رب عز و جل فرمائے گا۔ اے میرے بندے اپنی داہنی طرف سے جنت میں چلا جا۔ بزار کی ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ جو شخص اس سورت کو دو سو مرتبہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دو سو سال کے گناہ معاف فرما دیتا ہے[2]

نسائی شریف میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے

---

[1] یعنی کوئی حق العبد نہ ہو کیونکہ حقوق العباد کا مسئلہ بہت اہم ہے اور حقوق العباد میں قرض کا معاملہ نہایت شدید ہے۔

[2] حدیث میں کھلا ضعف یہی ہے کہ دو سو سال کی عمر تو امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کسی کی بھی نہیں۔

دعا مانگ رہا ہے اپنی دعا میں کہتا ہے :- اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یعنی اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں - اس بات کی گواہی دے کر تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو اکیلا ہے بے نیاز ہے نہ اس کے ماں باپ نہ اولاد نہ ہمسر نہ ساتھی نہ کوئی اور - آپؐ یہ سن کر فرمانے لگے اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے - اس نے اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگی ہے - خدا کے اس بڑے نام کے ساتھ کہ جب کبھی اس نام کے ساتھ سوال کیا جائے تو عطا ہو اور جب کبھی اس نام کے ساتھ دعا کی جائے تو قبول ہو -

ابو یعلیٰ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تین کام ہیں جو انھیں ایمان کے ساتھ لے کر وہ جنت کے دروازوں میں سے جس سے چاہے جنت میں چلا جائے اور جس کسی حورِ جنت سے چاہے نکاح کرا دیا جائے جو اپنے قاتل کو معاف کر دے اور پوشیدہ قرض ادا کر دے اور ہر فرض نماز کے بعد دس مرتبہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ کو پڑھ لے - حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہؐ جو ان تینوں کاموں میں سے ایک کر لے - آپؐ نے فرمایا ایک پر بھی یہی درجہ ہے -

طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اس سورت کو گھر میں جاتے وقت پڑھ لے تو اللہ تعالےٰ اُس گھر والوں سے اور اس کے پڑوسیوں سے فقیری دور کر دے گا اس کی اسناد ضعیف ہے ف مسند ابو یعلیٰ میں ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدانِ تبوک میں تھے - سورج ایسی روشنی، نور اور شعاعوں کے ساتھ نکلا کہ ہم نے اس سے پہلے ایسا صاف شفاف اور منور نہیں دیکھا تھا - حضورؐ کے پاس جبرئیلؑ تشریف لائے تو حضور نے دریافت فرمایا کہ آج سورج کی اتنی تیز روشنی اور زیادہ نور اور چمکیلی شعاعوں کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا آج مدینہ میں معاویہ بن معاویہ رضؓ کا انتقال ہو گیا ہے جن کے جنازے کی نماز کے لئے اللہ تعالےٰ نے ستر ہزار فرشتے آسمان سے بھیجے ہیں - فرمایا اُن کے کس عمل کے باعث؟ فرمایا وہ سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ کو دن رات چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے پڑھا کرتے تھے - اگر آپ کا ارادہ ہو تو میں زمین سمیٹ لوں اور آپ ان کے جنازے کی نماز ادا کر لیں - آپ نے فرمایا بہت اچھا - پس آپؐ نے ان کے جنازے کی نماز ادا کی - اس حدیث کو حافظ ابوبکر بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب " دلائل النبوۃ " میں یزید بن ہارون کی روایت سے لائے ہیں - وہ علاء بن محمد سے روایت کرتے ہیں ان پر موضوع حدیثیں بیان کرنے کا الزام ہے - واللہ اعلم -

مسند ابو یعلیٰ میں اس کی دوسری سند بھی ہے جس میں یہ راوی نہیں - اُس میں ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسولِ مقبولؐ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ معاویہ بن معاویہ لیثی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے - آپؐ اُن کے جنازے کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں - حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پر زمین پر مارا تمام درخت اور سب ٹیلے وغیرہ پست ہو گئے اُن کا جنازہ حضورؐ کو نظر آنے لگا، آپؐ نے نماز ادا کی اور آپؐ کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں تھیں - ہر صف میں ستر ہزار فرشتے تھے - آپؐ نے دریافت فرمایا کہ آخر اس مرتبہ کی کیا وجہ ؟ حضرت جبرئیل نے فرمایا ان کی اس سورت سے محبت اور ہر وقت آتے جاتے اُٹھتے بیٹھتے اس کی تلاوت - اسے بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور بیہقی کی سند میں محبوب بن ہلال ہیں - ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ یہ مشہور نہیں - ابو یعلےٰ میں یہ راوی نہیں - وہاں ان کی جگہ ابو عبد اللہ بن محمود ہیں، لیکن ٹھیک بات یہ ہے کہ محبوب اس میں ہے - اس روایت کی اور بھی بہت سی سندیں ہیں اور سب ضعیف ہیں - ہم نے اختصار کے لئے انھیں یہاں نقل نہیں کیا - مسند احمد میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، میں نے جلدی سے آپ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا یا رسول اللہؐ ! مومن کی نجات کس عمل پر ہے - آپؐ نے فرمایا اے عقبہ ! زبان تھامے رکھ[1] - اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہا کر[2] اور اپنی خطاؤں پر روتا رہ - پھر دوبارہ

---

[1] یعنی اپنی زبان پر قابو رکھو - کسی کو بُرا بھلا مت کہو، غیبت نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، بُری بات منہ سے نہ نکالو - واقعہ یہ ہے کہ تمام امراض کی جڑ تو یہی زبان ہے -
[2] بلا ضرورت گھر سے نہ نکلو - لوگوں کے ساتھ کم اٹھنا بیٹھنا رکھو کہ اٹھنے بیٹھنے سے آدمی سینکڑوں مرتبہ کی برائیوں میں پھنستا ہے -

جب حضورؐ سے میری ملاقات ہوئی تو آپ نے خود میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا عقبہ! کیا میں توراۃ اور زبور اور انجیل اور قرآن میں اُتری ہوئی تمام سورتوں سے بہترین سورتیں نہ بتاؤں۔ میں نے کہا ہاں حضورؐ ضرور ارشاد فرمائیے۔ اللہ تعالٰی مجھے آپ پر فدا کرے۔ پس آپؐ نے مجھے سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ پڑھائیں۔ پھر فرمایا دیکھو عقبہ! انہیں نہ بھولنا اور ہر رات انہیں پڑھ لیا کرنا۔ فرماتے ہیں پھر نہ میں انھیں بھولا اور نہ کوئی رات انہیں پڑھے بغیر گزاری۔ میں نے پھر آپؐ سے ملاقات کی اور جلدی کرکے آپؐ کے دستِ مبارک کو اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بہترین اعمال کا ارشاد فرمائیے۔ آپ نے فرمایا سُن جو تجھ سے توڑے تو اس سے جوڑ۔ جو تجھے محروم رکھے تو اُسے دے۔ جو تجھ پر ظلم کرے تو اس سے درگزر کر اور معاف کر دے۔ اس کا بعض حصہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی زہد کے باب میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے یہ حدیث حسن ہے۔ مسند احمد میں بھی اس کی ایک اور سند ہے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت جب بستر پر تشریف لے جاتے تو ہر رات ان تینوں سورتوں کو پڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں ملا کر اس پر دم کر کے اپنے جسمِ مبارک پر پھیر لیا کرتے۔ جہاں تک ہاتھ پہنچتے پہنچاتے پہلے سر پر پھیر منہ پر پھیرا اپنے سامنے کے جسم پر تین مرتبہ اسی طرح کرتے۔ یہ حدیث سنن میں بھی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ

آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات و صفات میں) ایک ہے اللہ (ایسا) بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۧ

ہیں) اس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے

تفسیر اس کے نازل ہونے کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہود کہتے تھے ہم حضرت عزیرؑ کو پوجتے ہیں جو خدا کے بیٹے ہیں اور نصرانی کہتے تھے ہم حضرت مسیحؑ کو پوجتے ہیں جو خدا کے بیٹے ہیں اور مجوسی کہتے تھے ہم چاند سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ اور مشرک کہتے تھے ہم بُت پرست ہیں تو اللہ تعالٰی نے یہ سورت اتاری کہ اے نبی تم کہہ دو کہ ہمارا معبود تو اللہ تعالٰی ہے جو واحد اور احد ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ جس کا کوئی وزیر نہیں جس کا کوئی شریک نہیں جس کا کوئی ہمسر نہیں، جس کا کوئی ہمسر نہیں، جس کا کوئی ہم جنس نہیں، جس کا برابر کوئی نہیں، جس کے سوا کسی میں الوہیت نہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف اسی کی ذات پاک پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی صفتوں میں اور اپنے حکمت بھرے کاموں میں یکتا اور بے نظیر ہے۔ وہ صمد ہے یعنی ساری مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ صمد وہ ہے جو اپنی سرداری میں اپنی شرافت میں، اپنی بزرگی میں اور اپنی عظمت، اپنے حلم و علم، اپنی حکمت و تدبر میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ صفتیں صرف اللہ تعالٰی جل شانہٗ میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کا ہمسر اور اس جیسا کوئی اور نہیں۔ وہ اللہ سبحانہٗ وتعالٰی سب پر غالب ہے۔ اور اپنی ذات و صفات میں یکتا اور بے نظیر ہے۔ صمد کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ جو تمام مخلوق کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہے۔ جو ہمیشہ بقا والا سب کی حفاظت کرنے والا ہو۔ جس کی ذات لازوال اور غیر فانی ہو۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں صمد وہ ہے جو نہ کچھ کھائے نہ اس میں سے کچھ نکلے۔ نہ وہ کسی میں سے نکلے۔ یعنی نہ اس کی اولاد ہو نہ ماں باپ۔ یہ تفسیر بہت عمدہ ہے اور

ۓ یعنی مسلمان اگر تم سے ملنا جلنا چھوڑ دیں، ترکِ تعلق کر لیں، لیکن تم اس کے باوجود بہ اخلاص ان سے برابر ملتے جلتے رہو۔ تعلق ختم نہ کرو۔

ابن جریر کی روایت سے حضرت ابی بن کعب سے صراحتاً یہ قول منقول ہے جیسے کہ پہلے گزرا اور بہت سے صحابہ اور تابعین سے مروی ہے کہ صمد کہتے ہیں ٹھوس چیز کو جو کھوکھلی نہ ہو جس کا پیٹ نہ ہو۔ شعبی کہتے ہیں جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو۔ عبداللہ بن بریدہ فرماتے ہیں صمد وہ نور ہے جو روشن ہو اور چمک دمک والا ہو۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی ہے کہ صمد وہ ہے جس کا پیٹ نہ ہو، لیکن اس کا مرفوع ہونا ٹھیک نہیں صحیح یہ ہے کہ موقوف ہے۔ حافظ ابوالقاسم طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب السنۃ" میں لفظ صمد کی تفسیر میں ان تمام اقوال وغیرہ کو ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ دراصل یہ سب ٹھیک ہیں۔ اور صحیح ہیں۔ یہ کل صفتیں ہمارے رب عزوجل میں ہیں۔ اس کی طرف سب محتاج بھی ہیں۔ وہ سب سے بڑھ کر سردار اور سب سے بڑا ہے۔ اُسے نہ پیٹ ہے نہ وہ کھوکھلا ہے نہ وہ کھاتا ہے نہ پیے۔ سب فانی ہیں اور وہ باقی ہے وغیرہ پھر فرمایا کہ اس کی اولاد نہیں نہ اُس کے ماں باپ ہیں نہ بیوی۔ جیسے اور جگہ ہے۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ یعنی وہ زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُسے اولاد کیسے ہوگی۔ اُس کی بیوی نہیں۔ ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ یعنی وہی ہر چیز کا خالق ومالک ہے۔ پھر اس کی مخلوق اور ملکیت میں سے اُس کی برابری اور ہمسری کرنے والا کون ہوگا۔ وہ ان تمام عیوب اور نقصان سے پاک ہے جیسے اور جگہ فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا الخ یعنی یہ کفار کہتے ہیں کہ خدا کی اولاد ہے۔ تم تو ایک بڑی بُری چیز لائے۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہوجائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہوکر گر پڑیں اس بنا پر کہ انہوں نے کہا خدا کی اولاد ہے۔ حالانکہ خدا کو یہ لائق ہی نہیں کہ اس کی اولاد ہو۔ تمام زمین وآسمان میں کُل کے کُل خدا کے غلام ہی بن کر آنے والے ہیں۔ خدا کے پاس تمام کا شمار ہے اور انہیں ایک ایک کرکے گن رکھا ہے۔ اور یہ سب کے سب تنہا تنہا اُس کے پاس قیامت کے دن حاضر ہونے والے ہیں۔ اور جگہ ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ الخ یعنی ان کافروں نے کہا کہ رحمان کی اولاد ہے۔ خدا اس سے پاک ہے بلکہ وہ تو خدا کے باعزت بندے ہیں بات میں بھی اس سے سبقت نہیں کرتے۔ اُسی کے فرمان پر عامل ہیں اور جگہ ہے وَجَعَلُوا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۔ الخ یعنی انہوں نے اللہ کے اور جنات کے درمیان نسب قائم کر رکھا ہے۔ حالانکہ جنات تو خود اس کی فرماں برداری میں حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے بیان کردہ عیوب سے پاک وبرتر ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ایذا دینے والی باتوں کو سنتے ہوئے صبر کرنے میں خدا سے زیادہ صابر کوئی نہیں۔ لوگ اس کی اولاد بتاتے ہیں اور پھر بھی وہ انہیں روزیاں دیتا ہے۔ اور عافیت وتندرستی عطا فرماتا ہے۔

بخاری کی اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے۔ حالانکہ اُسے ایسا نہ چاہیئے۔ مجھے گالیاں دیتا ہے۔ اور اسے یہ لائق بھی نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے اولاً مجھے پیدا کیا ایسے پھر نہیں لوٹائے گا۔ حالانکہ پہلی مرتبہ کی پیدائش دوسری مرتبہ کی پیدائش سے آسان تو نہ تھی جب میں اس پر قادر ہوں تو اس پر کیوں نہیں اور اس کا مجھے گالیاں دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ حالانکہ میں تنہا ہوں۔ میں ایک ہی ہوں۔ میں صمد ہوں۔ نہ میری اولاد نہ میرے ماں باپ نہ مجھ جیسا کوئی اور۔ الحمدللہ سورۂ اخلاص کی تفسیر خدا کے فضل وکرم سے ختم ہوئی۔ [۱]

---

[۱] سورۂ اخلاص کے فضائل پر بڑی سیر حاصل بحث تو ابن کثیر ہی نے کرلی، لیکن صاحب تفسیر کبیری کی یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح سورۂ کوثر شان رسالت میں کامل ومکمل ہے۔ ایسے ہی سورۂ اخلاص توحید کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی توحید ذاتی، توحید صفاتی اور توحید افعالی کے لحاظ سے یہ سورت عدیم النظیر ہے اسی وجہ سے اس کو حدیث میں ثلث قرآن قرار دیا گیا کیونکہ پورے قرآن کریم میں بھی تین اہم مضامین تفصیل سے آگئے ہیں یعنی توحید ذاتی، توحید صفاتی اور توحید افعال)۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ اجر وثواب کے اعتبار سے سورۂ اخلاص کو پڑھنے سے اتنا ثواب ملتا ہے جتنا ثلث قرآن کی تلاوت پر۔

سورۂ فلق اور سورۂ ناس

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس سورت کو اور اس کے بعد کی سورت کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میری گواہی ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھے خبر دی کہ جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ سے فرمایا قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ الخ تو حضورؐ نے بھی یہی کہا۔ پھر فرمایا قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ۔ تو میں نے یہی کہا تو ہم بھی اسی طرح کہتے تھے جس طرح حضورؐ نے کہا۔ حضرت اُبی بن کعبؓ سے ان دونوں سورتوں کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے بھائی حضرت ابن مسعودؓ تو ان دونوں کو قرآن شریف میں سے علیحدہ کر دیا کرتے تھے۔ تو فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا کہو تو میں نے کہا۔ پس ہم بھی کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا (ابوبکر حمیدیؒ) مسند میں بھی یہ روایت الفاظ کے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ موجود ہے اور بخاری شریف میں بھی۔ مسند ابی یعلیٰ وغیرہ میں ہے کہ ابن مسعودؓ ان دونوں سورتوں کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے اور نہ قرآن میں انہیں شمار کرتے تھے۔ بلکہ قاریوں اور فقیہوں کے نزدیک مشہور بات یہی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ ان دونوں سورتوں کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے۔ شاید انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو اور تواتر کے ساتھ ان تک نہ پہنچا ہو پھر یہ اپنے اس قول سے رجوع کر کے جماعت کے قول کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان سورتوں کو ائمہ کے قرآن میں داخل کیا جس کے نسخے ہر طرف پھیلے۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

صحیح مسلم شریف میں ہے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے نہیں دیکھا کہ چند آیتیں مجھ پر اس رات ایسی نازل ہوئی ہیں کہ ان جیسی کبھی نہیں دیکھی گئیں۔ پھر آپؐ نے ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی۔ یہ حدیث مسند احمد، ترمذی اور نسائی میں بھی ہے۔ امام ترمذی اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عقبہؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی گلیوں میں آپ کی سواری کی نکیل تھامے چلا جا رہا تھا کہ آپ نے مجھ سے فرمایا۔ اب آؤ تم سوار ہو جاؤ۔ میں نے اس خیال سے کہ اگر آپؐ کی بات نہ مانوں گا تو نافرمانی ہو گی۔ سوار ہونا منظور کر لیا۔ تھوڑی دیر میں اتر گیا اور حضورؐ سوار ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا عقبہؓ! میں تجھے دو بہترین سورتیں کیا نہ سکھاؤں؟ میں نے عرض کیا ہاں رسول اللہؐ ضرور سکھایئے۔ پس آپؐ نے مجھے سورہ قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور سورہ قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھائیں پھر نماز کھڑی ہوئی آپ نے نماز پڑھائی اور ان ہی دونوں سورتوں کی تلاوت کی۔ پھر مجھ سے فرمایا تو نے دیکھ لیا؟ سن جب تو سوئے اور جب کھڑا ہو انہیں پڑھ لیا کر (ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں بھی یہ حدیث ہے)

مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت ان سورتوں کی تلاوت کا حکم دیا۔ یہ حدیث بھی ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں ہے۔ امام ترمذیؒ اسے غریب بتلاتے ہیں اور روایت میں ہے کہ ان جیسی سورتیں تو نے پڑھیں ہی نہیں۔ حضرت عقبہؓ والی حدیث میں جس میں حضورؐ کی سواری کے ساتھ آپ کا ہونا مذکور ہے۔ اس کی بعض طرق یہ بھی ہے کہ جب حضورؐ نے مجھے یہ سورتیں بتلائیں تو مجھے کچھ زیادہ خوش نہ ہوتے دیکھ کر فرمایا شاید تو انہیں چھوٹی سی سورتیں سمجھتا ہے۔ سن نماز کے قیام میں ان جیسی سورتوں کی قرأت اور ہے ہی نہیں۔

نسائی شریف کی حدیث میں ہے کہ ان جیسی سورتیں کسی پناہ پکڑنے والے کے لئے اور نہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عقبہؓ سے یہ سورتیں حضورؐ نے پڑھوائیں پھر فرمایا کہ ان جیسی پناہ مانگنے کی اور سورتیں نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ صبح کی فرض نماز حضورؐ نے ان ہی دونوں سورتوں سے پڑھائی[1] اور حدیث میں ہے کہ حضرت عقبہؓ حضورؐ کی سواری کے پیچھے جاتے ہیں اور آپؐ کے قدم پر ہاتھ رکھ کر عرض کرتے ہیں۔

---

[1] صرف یہ دکھانے کیلئے نماز ان سورتوں کی قرأت سے بھی ہو جاتی ہے۔ اگر چہ لمبی سورتوں کی قرأت بہر حال افضل ہے۔

حضورؐ مجھے سورۂ ہود یا سورۂ یوسف پڑھائیے ۔ آپؐ نے فرمایا خدا کے پاس نفع دینے والی کوئی سورت قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ نہیں ۔ اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ پناہ حاصل کرنے والوں کے لئے ان دونوں سورتوں سے افضل سورت اور کوئی نہیں ۔ پس بہت سی حدیثیں اپنے تواتر کی وجہ سے اکثر علماء کے نزدیک قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں اور وہ حدیث بھی بیان ہو چکی) آپؐ نے ان دونوں سورتوں اور سورۂ اخلاص کی نسبت فرمایا کہ چاروں کتابوں میں ان جیسی سورتیں نہیں اتریں ۔ نسائی وغیرہ میں ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ان سفر میں تھے ۔ سواریاں کم تھیں باری باری سوار ہوتے تھے ۔ حضرتؐ نے ایک شخص کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھ کر یہ دونوں سورتیں پڑھائیں اور فرمایا جب نماز پڑھے تو انہیں پڑھا کر ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص عقبہ بن عامرؓ ہوں گے واللہ اعلم ۔ حضرت عبداللہ بن اسلم کے سینے پر ہاتھ رکھ کر آپؐ نے فرمایا کہہ! وہ نہ سمجھے کہ کیا کہیں ۔ پھر فرمایا کہہ تو انہوں نے سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ آخر پڑھی ۔ آپؐ نے فرمایا کہہ پھر سورۂ فلق پڑھی ۔ آپؐ نے پھر یہی فرمایا تو سورۂ ناس پڑھی ۔ آپؐ نے فرمایا اسی طرح پناہ مانگا کر ۔ اس جیسی پناہ مانگنے کی اور سورتیں نہیں (نسائی) نسائی کی اور حدیث میں ہے کہ حضرت جابرؓ سے یہ دونوں سورتیں پڑھوائیں ۔ پھر فرمایا انہیں پڑھا کر ان جیسی سورتیں اور نہ پڑھے گا ۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ والی وہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضورؐ انہیں پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک کر اپنے سر، چہرے اور سارے جسم پر پھیر لیتے تھے ۔ مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑے تو ان دونوں سورتوں کو پڑھ کر اپنے اوپر پھونک لیا کرتے تھے ۔ جب آپؐ کی بیماری سخت ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا معوذات پڑھ کر خود آپؐ کے ہاتھوں کو آپؐ کے جسم مبارک پر پھیرتی تھیں اور اس سے مقصد آپ کا آپؐ کے ہاتھوں کی برکت کا ہوتا تھا ۔ سورۂ ن کی تفسیر کے آخر میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنات کی اور انسانوں کی آنکھوں سے پناہ مانگا کرتے تھے جب یہ دونوں سورتیں اتریں تو آپؐ نے انہیں لے لیا[1] اور باقی سب چھوڑ دیں ۔ امام ترمذیؒ اسے حسن صحیح فرماتے ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ

آپ (اپنے استفادہ کیلئے) کہیے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تمام مخلوقات کے شر سے اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات آجائے

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۧ

(اور شب میں شرور کا احتمال ظاہر ہے) اور (بالخصوص گنڈے کی) گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے

تفسیر حضرت جابر وغیرہ فرماتے ہیں کہ فلق کہتے ہیں صبح کو ۔ خود قرآن میں اور جگہ ہے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فلق سے مراد مخلوق ہے ۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فلق جہنم میں ایک جگہ ہے ۔ جب اس کا دروازہ کھلتا ہے تو اس کی آگ کی گرمی اور سختی کی وجہ سے تمام جہنمی چیخنے لگتے ہیں ۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی اسی کے قریب قریب ہے لیکن وہ حدیث منکر ہے ۔ یہ بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جہنم کا نام ہے ۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ ٹھیک قول پہلا ہی ہے ۔ یعنی مراد اس سے صبح ہے ۔ امام بخاری بھی یہی فرماتے ہیں اور یہی صحیح ہے ۔

تمام مخلوق کی برائی سے جس میں داخل ہے اور ابلیس اور اولادِ ابلیس بھی ۔ غَاسِقٍ سے مراد رات ہے ۔ اِذَا وَقَبَ سے سورج نکلنے کا وقت ہو جانا مراد ہے یعنی رات جب اندھیرا لئے ہوئے آجائے ۔ ابن زید کہتے ہیں کہ عرب ثریا ستارے کے غروب ہونے کو غاسق کہتے ہیں ۔ بیماریاں اور وبائیں اس کے

[1] یعنی اس مقصد کے لئے صرف انہیں سورتوں کا پڑھنا شروع کیا اور پہلے سے پڑھنے کا جو معمول تھا اس کو چھوڑ دیا۔

واقع ہوتے وقت بڑھ جاتی تھیں اور اس کے طلوع ہونے کے وقت اٹھ جاتی تھیں[1]۔

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ستارہ غاسق ہے، لیکن اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مراد اس سے چاند ہے۔ ان کی دلیل مسند احمد کی یہ حدیث ہے جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ تھامے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ اللہ سے اس غاسق کی برائی سے پناہ مانگ۔ اور روایت میں ہے کہ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ سے یہی مراد ہے۔ دونوں قولوں میں بآسانی یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ چاند کا چڑھنا اور ستاروں کا ظاہر ہونا وغیرہ، یہ سب رات ہی کے وقت ہوتا ہے جب رات آجائے واللہ اعلم۔ گرہ لگا کر پھونکنے والیوں سے مراد جادوگر عورتیں ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ شرک کے بالکل قریب وہ منتر ہیں جنہیں پڑھ کر سانپ کے کاٹے پر دم کیا جاتا ہے اور آسیب زدہ پر۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ بیمار ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ دعا پڑھی۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ دَاءٍ يُّؤْذِيْكَ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ حَاسِدٍ وَّعَيْنٍ اللّٰهُ يَشْفِيْكَ اللہ تعالیٰ کے نام سے میں دم کرتا ہوں ہر اس بیماری سے جو تجھے دکھ پہنچائے اور ہر حاسد کی برائی اور بدنظر سے اللہ تعالیٰ تجھے شفا دے۔ اس بیماری سے مراد شاید وہ بیماری ہے جب کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عافیت اور شفا بخشی۔ اور حاسد یہودیوں کے جادو کے مکر کو ختم کر دیا اور ان کی تدبیروں کو بے اثر کر دیا اور انہیں رسوا و ذلیل کیا، لیکن باوجود اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنے اوپر جادو کرنے والے کو ڈانٹا ڈپٹا تک نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی اور آپؐ کو عافیت اور شفا بخشی۔

مسند احمد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے جادو کیا جس سے کئی روز تک آپ بیمار رہے پھر حضرت جبرئیلؑ نے آکر بتایا کہ فلاں یہودی نے آپ پر جادو کیا ہے اور فلاں فلاں کنوئیں میں گرہیں لگا کر رکھا ہے۔ آپ کسی کو بھیج کر اسے نکلوا لیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی بھیجا اور اس کنوئیں سے وہ جادو نکلوا لیا۔ گرہیں کھول دیں سارا اثر جاتا رہا۔ پھر نہ تو آپؐ نے اس یہودی سے نہ تو کبھی اس کا ذکر کیا اور نہ کبھی اس کے سامنے اظہارِ خفگی کیا۔

صحیح بخاری شریف کتاب الطب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا۔ آپ سمجھتے تھے کہ آپ ازواجِ مطہرات کے پاس آئے حالانکہ نہ آئے تھے[2]۔ حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ یہی سب سے بڑا جادو کا اثر ہے۔ جب یہ حالت آپؐ کی ہوگئی۔ ایک دن آپؐ فرمانے لگے۔ عائشہ! میں نے اپنے رب سے پوچھا اور میرے پروردگار نے مجھے بتلا دیا۔ دو شخص آئے ایک میرے سرہانے بیٹھا ایک پائنتی۔ سرہانے والے نے اس دوسرے سے پوچھا ان کا کیا حال ہے۔ دوسرے نے کہا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پوچھا کس نے جادو کیا ہے؟ کہا لبید بن اعصم نے جو بنو زریق کے قبیلہ کا ہے جو یہودی کا حلیف ہے اور منافق شخص ہے۔ کہا کس چیز میں؟ کہا سر کے بالوں اور کنگھی میں۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ کہا نر کھجور کی درخت کی چھال میں، پتھر کی چٹان تلے ذروان کے کنوئیں میں۔ پھر حضور علیہ السلام اس کنوئیں کے پاس تشریف لائے اور اس میں سے وہ نکلوایا۔ اس کا پانی ایسا تھا گویا مہندی کا گدلا پانی۔ اس کے پاس کھجوروں کے درخت شیطانوں کے سر جیسے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بدلا لینا چاہیئے۔ آپؐ نے فرمایا الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تو شفا دیدی اور میں لوگوں میں برائی پھیلانا ناپسند نہیں کرتا۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ ایک کام کرتے نہ تھے اور اس کے اثر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں کر چکا ہوں اور یہ بھی ہے کہ اس کنوئیں کو آپؐ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ چھ مہینے تک آپ کی یہی حالت رہی۔

---

[1] یعنی مشرکین عرب کے عقیدہ کے مطابق [2] یعنی نسیان اور بھول جانے کا غلبہ آپ پر اس قدر ہوگیا تھا کہ ایک چیز آپؐ کرتے تک نہ تھے اور خیال آپ کو یہ ہوتا تھا کہ میں یہ امر کر چکا ہوں۔ حضرت سیدنا الامام مولانا انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ جادو کی ایک قسم ایسی ہے جس سے مرد کی قوتِ مجامعت کو باندھ دیا جاتا ہے جس سے وہ ہمبستری کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح کا سحر کیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حدیث میں جو الفاظ آئے ہیں وہ مردانگی قوت کو باندھنے کے لئے ہی عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔

تفسیر ثعلبی میں حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہود کا ایک بچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ اسے یہودیوں نے بہکا سکھا کر آپ کے چند بال اور آپ کی کنگھی کے چند دندانے منگوالئے اور ان میں جادو کیا۔ اس کام میں زیادہ تر کوشش کرنے والا لبید بن اعصم تھا پھر ذرواں نامی کنوئیں میں جو بنو زریق کا تھا اس میں ڈال دیا پھر حضور بیمار ہوگئے سر کے بال جھڑنے لگے۔ خیال آتا تھا کہ میں عورتوں کے پاس ہو آیا حالانکہ آتے نہ تھے گو آپ اسے دور کرنے کی کوشش میں تھے، لیکن وجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ چھ ماہ تک یہی حالت رہی پھر وہ واقعہ ہوا جو اوپر بیان کیا کہ فرشتوں کے ذریعہ آپ کو اس تمام حال کا علم ہوگیا اور آپ نے حضرت علی کو حضرت زبیر کو اور حضرت عامر بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھیجکر کنوئیں میں سے وہ سب چیزیں نکلوائیں۔ ان میں سے ایک تانت تھی جس میں بارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں اور ہر گرہ پر ایک سوئی چبھی ہوئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں سورتیں اتاریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک آیت ان پر پڑھتے جاتے تھے اور ایک گرہ اس کی خود بخود کھلتی جاتی تھی۔ جب یہ دونوں سورتیں پوری ہوئیں وہ سب گرہیں کھل گئیں۔ اور آپ بالکل شفایاب ہوگئے۔ ادھر جبرئیل علیہ السلام نے وہ دعا پڑھی جو اوپر گزر چکی ہے۔ لوگوں نے کہا حضور ہمیں اجازت دیدیجئے کہ ہم اس خبیث کو پکڑ کر قتل کردیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ خدا تعالیٰ نے تو مجھے تندرستی عطا فرمائی اور میں لوگوں میں شر و فساد پھیلانا نہیں چاہتا[1]۔ یہ روایت تفسیر ثعلبی میں بلا سند مروی ہے۔ اس میں غرابت بھی ہے اور اس کے بعض حصے میں سخت نکارت اور بعض کے شواہد بھی ہیں جو پہلے بیان ہوچکے۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ

آپ کہئے (جس طرح کہ فلق میں گزرا) کہ میں آدمیوں کے مالک آدمیوں کے بادشاہ آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں وسوسہ

شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ

ڈالنے پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ

خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والا) جن ہو یا آدمی (ہو)

تفسیر اس میں اللہ تعالیٰ عزوجل کی تین صفات بیان ہوئی ہیں پہلے یہ کہ وہی پالنے اور پرورش کرنے والے ہیں۔ مالک اور شہنشاہ ہیں۔ اور صرف وہی معبود لائق عبادت ہیں۔ تمام چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اسی کی ملکیت میں ہیں اور اسی کی بندگی میں مشغول ہیں۔ پس وہ حکم دیتا ہے کہ اس پاک اور برتر صفات والے خدا کی پناہ میں آجائے جو بھی پناہ اور حفاظت کا طالب ہو۔ شیطان جو انسان پر مقرر ہے اس کے وسوسوں سے وہی بچانے والا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ یہ ہے۔ برائیوں اور بدکاریوں کو خوب آراستہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے اور بہکانے میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ اس کے شر سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جسے خدا بچالے۔ صحیح حدیث شریف میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ لوگوں نے عرض کیا، کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے[2]۔ پس میں سلامت رہتا ہوں۔

[1] یہ بات ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام انسان ہوا کرتے ہیں، اس لئے ان پر وہی چیزیں برا اثر ڈالتی ہیں جو عام انسانوں کے حق میں مضر ہوں اور نفع بھی انہیں چیزوں سے پہنچتا ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے، اس لئے یہ سمجھنا کہ سحر کا اثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے ہوگیا اور اثر سحر کیا منافی نبوت ہے غلط خیال ہے۔

[2] یعنی اس کے مقابلے میں خدا تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور میں نے اس کو مغلوب کرلیا۔ چنانچہ وہ مجھ کو برائی کی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔

وہ مجھے صرف نیکی اور اچھائی کی بات ہی کہتا ہے[۱]۔ بخاری، مسلم کی اور حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی ایک واقعہ منقول ہے جس میں بیان ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف میں تھے تو ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے پاس رات کے وقت آئیں جب واپس جانے لگیں تو حضورؐ بھی پہنچانے کے لئے ساتھ چلے۔ راستے میں دو انصاری صحابیؓ مل گئے جو آپؐ کو بی بی صاحبہ کے ساتھ دیکھکر جلدی چل دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آواز دے کر ٹھہرایا اور فرمایا سنو! میرے ساتھ میری بیوی صفیہ بنت حُیی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہیں۔ انہوں نے کہا سبحان اللہ! یا رسول اللہؐ اس ارشاد کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپؐ نے فرمایا انسان کے خون کے جاری ہونے کی جگہ میں شیطان گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں وہ کوئی بدگمانی نہ ڈال دے[۲]۔

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شیطان اپنا ہاتھ انسان کے دل پر رکھے ہوئے ہے اگر یہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تب تو اس کا ہاتھ ہٹ جاتا ہے اور اگر یہ ذکر بھول جاتا ہے تو وہ اس کے دل پر پورا قبضہ کر لیتا ہے۔ یہی وسواس الخناس ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گدھے پر سوار ہو کر کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک صحابی آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ گدھے نے ٹھوکر کھائی تو ان کے منہ سے نکلا شیطان برباد ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں نہ کہو اس سے شیطان بڑھ جاتا ہے کہ میں نے اپنی قوت سے گرا دیا ہے[۳]۔ اور جب تم بسم اللہ کہو تو وہ گھٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مکھی کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ذکر اللہ سے شیطان پست اور مغلوب ہو جاتا ہے اور اس کے چھوڑ دینے سے وہ بڑا ہو جاتا ہے اور غالب آ جاتا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں ہوتا ہے تو اس کے پاس شیطان آتا ہے اور اسے تھپکتا اور بہلاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنے جانور کو بہلاتا ہو۔ پھر اگر وہ خاموش رہا تو وہ ناک میں نکیل یا منہ میں لگام چڑھا دیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان فرما کر فرمایا کہ تم خود اسے دیکھتے ہو۔ نکیل والا تو وہ ہے جو ایک طرف جھکا کھڑا ہو اور اللہ کا ذکر نہ کرتا ہو اور لگام والا وہ ہے جو منہ کھولے ہوئے ہو اور اللہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ شیطان ابن آدم کے دل پر قبضہ کئے ہوئے ہے جہاں یہ بھولا اور غفلت کی اس نے وسوسے ڈالنے شروع کر دیے اور جہاں اس نے ذکر اللہ کیا اور یہ پیچھے ہٹا۔

سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ شیطان راحت و رنج کے وقت انسان کے دل میں سوراخ کرنا چاہتا ہے یعنی اسے بہکانا چاہتا ہے۔ اگر یہ خدا کا ذکر کرے تو یہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ شیطان برائی سکھاتا ہے جہاں انسان نے اس کی مان لی پھر ہٹ جاتا ہے[۴]۔ پھر فرمایا جو وسوسے ڈالتا ہے لوگوں کے سینے میں لفظِ ناس جو انسان کے معنی میں ہے اس کا اطلاق جنوں پر بھی بطور غلبہ کے آ جاتا ہے۔ قرآن شریف میں اور جگہ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ کہا گیا ہے تو جنات کو لفظ ناس میں داخل کر لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ غرض یہ ہے کہ شیطان جنات کے اور انسان کے سینے میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اس کے بعد کے جملے مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جن کے سینوں میں شیطان وسوسے ڈالتا ہے وہ جن بھی ہیں اور انسان بھی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ وسواس ڈالنے والا خواہ کوئی جن ہو یا انسان جیسے اور جگہ ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا یعنی اس طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن انسانی اور جناتی شیطان بنائے ہیں۔ ایک دوسرے کے کان میں دھوکہ کی باتیں بنا سنوار کر ڈالتے رہتے ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسجد میں آیا اور بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا نماز بھی پڑھی؟

---

[۱] مسخر ہونے کے بعد شیطان آپؐ کے ساتھ وہی معاملہ کرنے لگا جو آپؐ کا اصل مزاج تھا یعنی خیر و نیکی میں انہماک۔ [۲] اور تم یہ سمجھو کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی غیر عورت تھی۔ [۳] اور وہ سمجھتا ہے کہ جو حادثہ پیش آیا انسان اس کو میری قدرت کا کرشمہ سمجھ رہا ہے اور پھر وہ خوب خوش ہوتا ہے اور اگر انسان تمام طاقتوں کا مظہر بس صرف خدا تعالیٰ ہی کو قرار دے جس کا ایک مظہر بسم اللہ ہے تو وہ رنجیدہ ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان نے مجھ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ [۴] اس لئے کہ اب اس کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اب ٹھہرنے کی کیا ضرورت۔

میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعتیں ادا کرلو۔ میں اٹھا اور دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا اے ابو ذرؓ! اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔ انسان شیطانوں اور جن شیطان سے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا انسانی شیطان بھی ہوتے ہیں[1]؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ میں نے کہا یا رسول اللہؐ نماز کیسی چیز ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا بہترین چیز ہے جو چاہے کم کرے جو چاہے زیادتی کرے[2]، میں نے عرض کیا روزہ؟ فرمایا کافی ہونے[3] والا فرض ہے اور خدا کے پاس زیادتی[4] ہے۔ میں نے پھر پوچھا صدقہ؟ حضورؐ نے فرمایا بہت ہی بڑھا بڑھا کر کئی کئی گنا کر کے بدلہ دیا جائے گا۔ میں نے پھر عرض کیا حضورؐ کون سا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا باوجود مال کی کمی کے صدقہ کرنا یا چپکے سے چھپا کر کسی مسکین فقیر کے ساتھ سلوک کرنا۔ میں نے سوال کیا حضورؐ! سب سے پہلے نبی کون تھے؟ آپؐ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام۔ میں نے کہا کیا وہ نبی تھے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں یہ حرف ان انبیاء میں سے تھے۔ جن سے خدا نے کلام فرمایا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! رسول کتنے ہوئے فرمایا تین سو کچھ اوپر دس بہت بڑی جماعت اور کبھی فرمایا تین سو پندرہ۔ میں نے کہا یا رسول اللہؐ! آپؐ پر جو کچھ نازل کیا گیا ان میں سب سے بڑی عظمت والی آیت کون سی ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا آیۃ الکرسی اَللّٰہُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ حدیث نسائی میں بھی ہے اور ابو حاتم بن حبان کی "صحیح ابن حبان" میں تو دوسری سند سے دوسرے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث بہت بڑی ہے واللہ اعلم۔

مسند احمد کی ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! میرے دل میں تو ایسے ایسے خیالات آتے ہیں کہ ان کا زبان سے نکالنا مجھ پر آسمان سے گر پڑنے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے حمد وثنا ہے جس نے شیطان کے مکر وفریب کو وسوسے میں ہی لوٹا دیا[5]۔ یہ حدیث ابو داؤد اور نسائی میں بھی ہے۔

الحمد للہ سورۂ ناس کی تفسیر ختم ہوئی[6]۔

---

[1] جو بھی دوسروں کو گمراہ کرے شیطان کا کردار ادا کرنے کی وجہ سے وہ شیطان ہی کہلائے گا۔

[2] یعنی فرائض کے علاوہ نوافل وغیرہ جو چاہے بکثرت پڑھے اور چاہے کم، لیکن فرائض میں تو کوئی کمی ہو ہی نہیں سکتی۔

[3] یعنی مسلمان اگر روزہ اخلاص کے ساتھ رکھے تو اس کو یہی کافی ہوگا۔ خدا تعالیٰ کے عذاب کو روکنے اور رحمت کو حاصل کرنے کا ایک ہی قوی ذریعہ اور کافی ووافی علاج یہی روزہ ہے۔

[4] یعنی اللہ تعالیٰ واجبی اجر پر جتنا چاہیں اضافہ فرما سکتے ہیں۔

[5] یعنی ایسے بُرے خیالات دل میں آتے ہیں کہ ان کو زبان سے میں کہہ بھی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ بُرے خیالات پر اتنی نفرت اور رنج کہ آدمی اس کو زبان سے کہنا بھی گوارا نہ کرے خود اسلام اور ایمان کی کھلی دلیل ہے۔ رہا دل تو وہ وساوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ زبان اپنے کنٹرول میں ہے۔ اُس سے اظہار نہ کرنا عین ایمان ہے۔ اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ تمہارا معاملہ وساوس تک ہے جس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ ہاں بدعملی سے محفوظ رہنا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اسی پر آتا ہے۔

[6] بعض محققین نے لکھا ہے کہ سورۂ فلق میں دنیاوی نقصانات سے محفوظ رہنے کی مکمل تدبیر زیر بحث تھی تو سورۂ والناس میں دینی مضرتوں سے حفاظت کی کامل تعلیم ہے اور اسی لئے اس سورت پر ختم قرآن مجید مناسب ہے۔

(پارۂ عم ختم شد)